صلی اللہ علیہ وسلم

رسولؐ نمبر

نقوش

۵

رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۱۲ ٹیلی فون نمبر ۵۳۵۲۵

زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمائندہ

نقوش

رسولؐ نمبر

جلد پنجم

شمارہ نمبر ۱۳۰
دسمبر ۱۹۸۳ء

مُدیر:
محمد طفیل

اِدارۂ فروغِ اُردو ، لاہور

قیمت لائبریری ایڈیشن: ۱۲۵ روپے

ترتیب

عہدِ نبویؐ میں ریاست کا نشو و ارتقاء

بعثتِ نبویؐ کے وقت دُنیا کا سیاسی نظام

تاسیسِ ریاست

توسیعِ ریاست

استحکامِ ریاست

انتظامِ ریاست

عہدِ نبویؐ میں تنظیمِ ریاست و حکومت

اسلامی ریاست کا ارتقاء

قبائلِ عرب اور اسلام

شمالی قبائل عرب، ۴۸۰

جنوبی قبائل عرب، ۴۹۲

قبائل پراگندہ عرب، ۵۱۰

فوجی تنظیم عہدِ رسالت میں

اسلامی ریاست کا شہری نظم و نسق

اسلامی ریاست کا مالی انتظام

عہدِ نبویؐ کا مذہبی نظام

○

محمد طفیل پرنٹر، پبلشر و ایڈیٹر نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر ادارۂ فروغِ اردو لاہور سے شائع کیا۔

اہلِ علم نے فرمایا

نقوش کی چار جلدیں، میرے چار امتحان، اُن کے متعلق نامور حضرات کے فیصلے!

شیخ آفتاب حسین (چیف جسٹس وفاقی شرعی عدالت) نے لکھا ——"نقوش کا رسول نمبر بلاشبہ قیمتی علمی مواد پر مشتمل ہے۔ اِن شاءاللہ یہ نمبر قبولِ دوام کی مسند پر فائز ہوگا۔ آپ نے اس سمت میں نہایت موزوں، بر وقت اور صحیح اقدام اٹھایا ہے۔"

مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے لکھا ——"اسے نمبر کیوں کہیے، یہ تو اردو زبان کی 'سیرتِ طیبہ پر انسائیکلو پیڈیا' ہے۔ سبحان اللہ آپ نے کیا دلکش اور دل آفرین نمبر شائع کیا ہے۔"

مولانا نعیم صدیقی نے لکھا ——"علامہ شبلی اور سلیمان ندوی نے سیرت نگاری کے میدان میں ایک سنگِ میل قایم کیا تھا۔ اب ویسا ہی دوسرا سنگِ میل، شاید کچھ زیادہ بڑا اور اونچا آپ نے قایم کیا۔"

مولانا سید محمد متین ہاشمی نے لکھا ——"سیرتِ پاک سے متعلق مواد کا ایک ایسا گلدستہ اور مجموعہ اُردو تو کیا، دنیا کی کسی زبان میں نہیں ملے گا۔ ان جلدوں کو دیکھ کر آپ کے لیے دل سے دعا نکلتی ہے۔"

شیخ الحدیث مولانا محمد مالک کاندھلوی نے لکھا ——"نقوش کا رسول نمبر سیرتِ نبوی کے موضوع پر ایک عظیم ترین خدمت ہے۔ اس میں جمع کردہ مضامین مستند اور بلند پایہ تحقیقی مضامین ہیں۔"

سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے لکھا ——"رسول نمبر دیکھ کر طبیعت خوش ہوگئی۔ کیا عجب کہ آپ کے لیے عاقبت میں زادِ راہ سفر ہو جائے۔ یہ نمبر ظاہری اور معنوی حیثیت سے بھی راحتِ دل ہے۔"

سید ابوالحسن علی ندوی نے لکھا ——"اِس مبارک، قیمتی، قابلِ قدر اور تاریخی نمبر کے ذریعہ آپ نے سعادتِ دارین کا اچھا سامان کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے قبولیت بخشے اور آپ کی محنت ٹھکانے لگے۔"

ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے فرمایا ——"رسول نمبر کی چاروں جلدیں کل شام پہنچیں۔ عنایت کے بوجھ سے کچل گیا۔ خدا آپ کو حسناتِ دارین سے نوازے!"

مولانا سید مرتضیٰ حسین نے لکھا ——"محمد طفیل کی عاجزانہ اور منکسرانہ پیش کش کا سلیقہ اور طریقہ ان کی عقیدت و محبت، ان کا عشق اور جذبہ جو رنگ لایا ہے وہ ان کے چہرے اور لبوں سے بول رہا ہے۔ یہ سرخروئی مبارک ہو۔"

اب ایک جملہ اس عاجز کی طرف سے بھی، اہلِ علم نے سراہا، اہلِ دل نے نوازا، میں ممنون! میں احسان مند! —— مگر میرے ارمان ابھی پورے نہیں ہوئے۔

محمد طفیل

انتساب

ایک صحابی نے سرورِ کائنات سے پُوچھا: ادائیگیِ حقوق کے سلسلہ میں پہلا حقدار کون ہے؟ تو حضورؐ نے فرمایا:

"اُمّکَ" (تیری ماں)۔

دُوسری مرتبہ پوچھا تو دوبارہ فرمایا: "اُمّکَ" (تیری ماں)۔

تیسری مرتبہ پوچھا تو سہ بارہ فرمایا: "اُمّکَ" (تیری ماں)۔

چوتھی مرتبہ پوچھا تو فرمایا: "اَبُوکَ" (تیرا باپ)۔

جب میں نے رسولؐ نمبر کا ڈول ڈالا تو ماں کی قبر پر گیا، کیونکہ وُہ زاہدہ اور عابدہ تھیں، بڑی کنی والی تھیں۔ دُعا مانگی: مولا! مدد کیجئے، مدد کیجئے۔

ماں کی قبر پر اِس لیے گیا تھا کہ وہ میرے بارے میں بڑے اونچے خواب دیکھا کرتی تھیں، مگر کبھی کبھی پوچھ لیا کرتی تھیں:

"میرا سبق یاد ہے؟"

"یاد ہے!"

"بھلا کیا؟"

"اپنی زندگی کو دوسروں کے لیے مفید بنانا!"

محمد طفیل

طلوع

قرآن کی آیت ہے:

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ ۚ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ ۝ (سورۃ الشوریٰ)

(جو کوئی آخرت کی کھیتی کا طالب ہے ہم اُسے اُس کی کھیتی میں ترقی دیں گے، اور جو کوئی دنیا کی کھیتی کا طالب ہے ہم اُسے کچھ دنیا میں سے دیں گے اور آخرت میں اس کا کچھ حصّہ نہ ہو گا)

ایک دن عجیب واقعہ ہوا۔

میں نے دیکھا کہ کئی بزرگ ہستیاں میرے سامنے کھڑی ہیں۔ کمرہ بھر گیا، میں کرسیاں ڈھونڈنے لگا۔ بتایا گیا، ڈیوڑھی میں بھی آدمی کھڑے ہیں —— باہر سڑک پر بھی کھڑے ہیں —— حدِّ نگاہ تک ایسا ہی تھا۔

میں نے پوچھا: "میرے لیے حکم؟"

"رسولؐ نمبر دیکھا تھا، دُعا مانگنے آ گئے ہیں"

کون تھے وہ لوگ؟

میں کون ہوں —— شاید ایک گواہ!

ہر چند کہ میں نے زندگی کے ہر دن کو یومِ حساب جانا، اس کے باوجود یومِ حساب سے ڈر لگتا ہے۔

حجۃ الوداع کے خطبے کو یاد کیجئے، لوگو! گواہ رہنا، گواہ رہنا۔

گواہ رہنا!

محمد طفیل

اس شمارے میں

میں بیمار رہنے لگا ہُوں۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے کچھ جلدی ہے۔ ڈرتا ہُوں خواب کہیں ادھورا نہ رہ جائے۔ یہ سارا قصّہ خواب ہی کا تو ہے۔ نہ اپنے کیے پر یقین، نہ ہونے والے کام پر بھروسا، بہرحال دربارِ رسالت میں یہ میرا تیرھواں سال ہے۔ خوشی ہے تو اتنی!

جب ابتدائی چار جلدیں چھپی تھیں تو دوست سوال کرتے تھے "باقی جلدوں میں کیا چھاپو گے، سب کچھ تو ان جلدوں میں آگیا!"

اُنھیں اپنے سوال کا جواب موجودہ جلدوں سے مل جائے گا۔ یہ موضوع تو سمندروں جیسی گہرائی اور آسمانوں جیسی وسعت رکھتا ہے۔ ایسے میں، مَیں بھاگتے وقت کو جتنا روک سکوں گا اُتنا روکوں گا تاکہ حضوری میں زیادہ سے زیادہ وقت گزار سکوں۔

اِس جلد میں دو بڑے قیمتی مقالے پیش کیے جا رہے ہیں۔ موضوع "عہدِ نبویؐ کا نظامِ حکومت" ہے۔ مقالات کے سلسلے میں 'قیمتی' کا لفظ میں نے ایسے نہیں لکھ دیا پوری ذمہ داری کے ساتھ لکھا ہے۔ آپ صاحب نظر ہیں خود فیصلہ کریں۔

یہ جلد اپنی جگہ مکمل ہے۔ لیکن ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر کے مضمون کے حواشی باقی ہیں۔ علاوہ ازیں کچھ اسی طرح کے بنیادی مضامین اور بھی ہیں جو اس جلد کے دوسرے حصّہ کی صورت میں آیندہ پیش کروں گا۔ یعنی آپ دیکھیں گے کہ انتہا کی بھی انتہا ہوتی ہے۔

اگر میں نے اور کچھ بھی نہ کیا ہوتا اور صرف یہی دو (غیر مطبوعہ) مقالے پیش کیے ہوتے تو بھی میرے اطمینان کے لیے بہت تھے۔

صراحت:

ہرچند کہ میں نے بیچ میں، ایک دوسرے موضوع پر، ایک اور شمارہ بھی چھاپا۔ مگر میں نے اسے شمارہ نمبر ۱۳۰ ہی لکھا، اس لیے کہ پہلی چار جلدیں اسی شمارہ نمبر سے چھپی تھیں۔ بہرحال جلدیں دو مختلف وقفوں سے چھپی ہیں۔ بس اتنی بات ذہن میں رہنی چاہیے اللہ نے توفیق دی تو جملہ جلدوں کو نئی ترتیب کے ساتھ پیش کروں گا۔ اور جو مشورے اہلِ علم نے دیے اُن کی روشنی میں پیش کروں گا۔

محمد نقوش

هُوَ الَّذِيْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ
عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ۝

وہ (اللہ) وہی ہے جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت اور سچا دین دے کر بھیجا ہے
تاکہ اس دین کو تمام دینوں پر غالب کر دے، گو مشرکوں کو (کیسا ہی) گراں گزرے

عہدِ نبویؐ میں
ریاست کا نشو و ارتقا



عہدِ نبویؐ میں

ریاست کا نشو و ارتقاء

ڈاکٹر نثار احمد

افتتاحیہ

(۱)

انسان کی اجتماعی زندگی کی تہذیب و ترتیب میں ریاست کا ادارہ ہمیشہ سے اہم رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کا نام، اس کی ہیئت اور نوعیت، حالات، وقت اور زمانہ کے ساتھ ساتھ بدلتی رہی۔ مگر ریاست کا جوہری کردار بہرحال انسان کی تہذیبی زندگی کے آغازِ سفر سے اب تک ایک ہی رہا ہے۔ ریاست یا مملکت کے لیے انگریزی زبان میں اسٹیٹ (STATE) کا لفظ مستعمل ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یونانی زبان کے لفظ (STATUS) سے ماخوذ ہے[1]۔ اس لفظ کے بنیادی مفہوم میں حالتِ قائمہ اور ماحول داخل ہے۔ لیکن اس کے علاوہ بھی دوسرے متعدد معانی اس لفظ سے وابستہ ہیں۔ البتہ ایک مخصوص سیاسی ہیئت یا حکومت یا منظم سیاسی شخصیت کے معنی میں تاریخی طور پر اس لفظ کا استعمال سولھویں صدی عیسوی (۱۵۳۸ء) میں شروع ہوا۔ اور اس کے تضمنات کی تکمیل غالباً اٹھارھویں صدی عیسوی (۱۷۰۱ء) تک ہوئی[2]۔ یہی وجہ ہے کہ اس سے پہلے "اسٹیٹ" کے مفہوم کو ادا کرنے کے لیے دوسرے الفاظ کا سہارا لیا جاتا تھا۔ چنانچہ یونانیوں کے یہاں بالعموم پولس (ΠΟΛΙΣ) کا لفظ مستعمل رہا، جس کے لفظی معنی شہر (CITY) کے ہیں۔ یہ اس امر کی علامت ہے کہ ان کا تصورِ ریاست "شہر" پر مبنی اور انتہائی محدود تھا[3] اور اس سے محض ایک "میونسپل ریاست" کا تصور قائم ہوتا تھا نہ کہ ایک قومی یا ملکی ریاست کا[4]۔ رومیوں نے ریاست کے مفہوم کو سیویٹاس (CIVITAS) کے ذریعہ نسبتاً وسعت کے ساتھ ظاہر کیا۔ رومیوں کے یہاں ایک دُوسرا لفظ ریس پبلیکا (RESPUBLICA) بھی ملتا ہے۔ جو ریاست کے مفہوم پر دلالت کرتا ہے۔

۱- Shipley, Joseph, T., Dictionary of Word Origins, Philosophical Lib., New York, 1945, p. 334.

۲- William Little, H.W. Fowler, J. Coulson, (edd), The Shorter Oxford English Dictionary, The Clarendon Press, London, 1965, p. 2005.

۳- بلنچلی۔ جے۔ کے۔ نظریہ سلطنت۔ ترجمہ قاضی تلمذ حسین۔ جامعہ عثمانیہ۔ دکن ۱۹۲۶ء۔ ص ۲۲۔

۴- Barker, Sir Earnest, Greek Political Theory, University Paperbacks, Methuen, London, 1960, p. 22.

کیونکہ اس سے نہ صرف شہریت بلکہ ریس پوپلی (RESPOPULI) یعنی ایک قوم اور اس قوم کے مفادات کی طرف بھی نشان دہی ہوتی ہے۔[1]

اب جہاں تک ریاست کی تعریف کا تعلق ہے تو قدیم و جدید مفکرین سیاسیات نے بے شمار تعریفیں کی ہیں اور ان لاتعداد تعریفات میں سے کوئی ایک بھی متفق علیہ نہیں ہے۔ بلکہ جس طرح علم سیاسیات کے دوسرے موضوعات اختلافی نوعیت رکھتے ہیں اسی طرح ریاست کی تعریف بھی اختلافات کا مرکز رہی ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے، ہر سیاسی مفکر نے تعریف کا دائرہ اپنے علم، ذاتی خیالات، ماحول اور اپنی سمجھ و بصیرت کے مطابق قائم کیا ہے۔ چنانچہ ماہرین عمرانیات نے اسے ایک خالص معاشرتی ادارہ قرار دیا تو فقہا اور قانون دان طبقہ نے اسے ایک قانونی ادارہ سمجھا۔ بین الاقوامی قانون کے علمانے اپنے ذوق کے لحاظ سے حیثیت متعین کی تو فلسفیوں نے اسے اپنے نظریات کے مطابق بیان کیا۔ اس کی تائید ارسطو، سسرو، گروشیس، بودین، ہالینڈ، ہال، برجیس، بلنٹشلے، اسمین، ڈرگٹ، مالبرگ، فلیمور، بوسانکے، ہیگل وغیرہ کی تعریفات سے بخوبی ہوجاتی ہے۔[2] یہاں یہ حقیقت بھی نہیں بھلائی جاسکتی کہ کوئی بھی سیاسی نظریہ یا عمل اپنے دور کے مخصوص حالات سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔[3] نیز یہ کہنے میں ہم کوئی حرج نہیں سمجھتے کہ جملہ تعریفات کی روشنی میں ریاست کا اطلاق سیاسی ماحول، سیاسی تنظیم، سیاسی اقتدار کی مختلف اشکال، تمام سیاسی سرگرمیوں، شخصیات اور ہر اس چیز پر کیا جاسکتا ہے جو حکومت سے متعلق ہو یا کسی ملک کی باعتبار سیاسی قوت سے مربوط و متعلق ہو۔[4]

بہرحال لفظی اختلافات اور تعریفات کی کثرت سے قطع نظر ریاست کے چار عناصر ترکیبی ایسے ہیں جن پر علمائے سیاسیات زیادہ تر متفق نظر آتے ہیں۔ یعنی ان کے نزدیک ان عناصر کا وجود ایک ریاست کی تشکیل و ترتیب کے لیے بہرصورت لازمی امر ہے یعنی آبادی، رقبہ، حکومت اور اقتدار اعلیٰ۔[5] مندرجہ بالا بیان سے مقصود یہ وضاحت ہے کہ آئندہ صفحات میں ہم نے ریاست

۱۔ بلنٹشلی۔ ص ۲۲۔

۲۔ مثلاً دیکھئے: Greaves, H.R.G., The Foundations of Political Theory, Allen and Unwin Ltd., London, 1958, p. 11.

۳۔ Barker, p. 16.

۴۔ William Little & Others, p. 2005

۱۔ Gilchrist, R.N., Principles of Political Science, Orient Longmans, Madras, 1955, p. 21.

نیز ملاحظہ ہو: Holland, Sir Thomas Erskine, The Elements of Jurisprudence, Clarendon Press, London, 1924, pp. 19, 46, 47 48.

کا مطالعہ کرنے میں ریاست کے لفظی، معنوی اور اصطلاحی اختلافات اور اس کی فنی پیچیدگیوں میں پڑے بغیر ریاست کے ادارہ کو اس کے حقیقی، علمی اور عمومی خدوخال کے لحاظ سے دیکھا ہے۔ اور آبادی، رقبہ، حکومت اور اقتدارِ اعلیٰ کے لزوم میں اس کا مطالعہ کیا ہے۔

(۲)

اگر یہ صحیح ہے کہ "ریاست ایک منظم معاشرہ کا نام ہے اور یہ اس وقت وجود پذیر ہوتا ہے جب ایک طرف افراد پر اقتدار قائم کرنے اور دوسری طرف افراد کی جانب سے اطاعت کرنے کا دوگونہ رابطہ عمل میں آجائے۔ اور اطاعت کا امر واقع ہونا اس بات کو مستلزم ہے کہ ریاست وجود میں آگئی"۔ تو ریاست نبوی کے باب میں اس قسم کا پہلا رابطہ بیعتِ عقبۂ کبیرہ میں استوار ہوا۔ جبکہ ریاست کے جائے قیام یعنی مدینہ کی معتدبہ آبادی کے ایک نمائندہ گروہ نے رسول اللہؐ کو اپنا دینی و مذہبی رہنما، سیاسی قائد اور مطاع تسلیم کیا اور اس کی خاطر ہر قسم کی قربانی دینے کا عہد کیا۔ اسی معاہدہ کے نتیجہ میں ہجرت کے بعد ہی (سنہ۱ھ/۶۲۲ء) ریاست مدینہ کا قیام عمل میں آگیا۔ پھر یہی ریاست رفتہ رفتہ توسیع و ترقی کے مدارج طے کرتی ہوئی بالآخر وصال نبوی (سنہ۱۱ھ/سنہ۶۳۲ء) کے وقت پورے جزیرہ نمائے عرب پر پھیل گئی۔ اور بقول ڈاکٹر حمید اللہ: "دس سالہ مدنی زندگی میں رسول اللہؐ کا اقتدار شہر مدینہ سے پھیل کر جزیرہ نمائے عرب اور جنوبی فلسطین کے دس لاکھ مربع میل پر محیط ہو گیا۔ اس عرصہ میں آپ کو بہت سی لڑائیاں بھی لڑنی پڑیں، لیکن اس پوری فتح کے لیے دشمن کے بمشکل ڈھائی سو آدمیوں کا خون بہایا گیا اور (اگر بئر معونہ میں دھوکے سے اور اُحد میں فوجی نافرمانی کے نتیجے میں قتل شدہ ۱۲۰ آدمی مستثنیٰ کر دیے جائیں تو) مسلمانوں کے بمشکل ایک سو آدمی مارے گئے تھے۔ غرض عہدِ نبویؐ میں دس سال تک اوسطاً روزانہ دو سو چھتر مربع میل کا رقبہ فتح ہوا۔ اور مسلمان فوج سے دس سال تک اوسطاً ماہانہ صرف ایک آدمی مارا جاتا رہا"[1]

(۳)

ہمارے پیشِ نظر اسی ریاست کا مطالعہ ہے۔ ہمیں یہ دیکھنا ہو گا کہ ریاست نبوی کی تاسیس کس ماحول اور کن حالات میں کیونکر ہوئی؟ اور پھر کس طرح توسیع و ارتقاء کے مراحل طے کر کے وصالِ نبویؐ کے وقت کس حد تک جا پہنچی۔ اور پھر یہ کہ ریاست کے ضمن میں رسول اللہ کے سیاسی کارنامہ کی قدر و قیمت کیا ہے۔

(۴)

ریاست نبوی کو موضوع تحقیق کی حیثیت سے منتخب کرنے کی وجوہ دو ہیں:

---

[1] حمید اللہ۔ قانون بین الممالک۔ مکتبہ ابراہیمیہ۔ دکن۔ سنہ۱۳۶۴ھ۔ ص ۳۴۔

(الف) اس معاملہ پر اختلاف رائے نہیں ہو سکتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ اور آپ کے کارناموں پر دنیا کی تقریباً ہر زبان میں اتنا کام ہو چکا ہے کہ فی الواقع اس کا احاطہ کرنا ناممکن ہے۔ لیکن ہماری معلومات کی حد تک ریاست نبوی کے بارے میں کوئی قابلِ ذکر مفصل اور وقیع کام اب تک سامنے نہیں آیا۔ جہاں تک مسلمان مورخین کا تعلق ہے انہوں نے یا تو اس پہلو پر کوئی توجہ ہی نہیں دی، یا پھر زیادہ سے زیادہ واجبی ذکر سے کام لیا ہے۔ رہے مغربی علماء اور مستشرقین تو اوّل تو اپنے خاص تہذیبی پس منظر، نیز اسلام، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے بارے میں مخصوص زاویۂ نظر کی بدولت اس موضوع پر ان کا مطالعہ بھی معروضی، فراخدلانہ اور مکمل نہیں۔ ریاست اسلامی (ISLAMIC STATE) کو بیان کرتے وقت ریاست نبوی کو یا تو وہ سرے سے درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے یا پھر اس سے محض سرسری طور پر گزر جاتے ہیں اور سارا زورِ قلم آپ کے بعد کی تاریخ پر صرف کر دیتے ہیں، اور ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ مستشرقین کے یہاں رسولؐ اللہ کے بارے میں بالعموم یہ موقف پایا جاتا ہے کہ جب تک آپ کا قیام مکہ میں رہا آپ کی حیثیت ایک مبلغ اور پیغمبر کی رہی لیکن ہجرتِ مدینہ کے بعد آپ نے ایک سیاستدان اور ایک حکمران کی حیثیت اختیار کر لی[1] لیکن پھر یہ واضح نہیں کرتے کہ سیاست و حکمرانی کے منصب پر فائز ہونے کے بعد آپ نے کون کون سے کام انجام دیے۔ محض چند اشارات سے بحث مکمل نہیں ہوتی۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی تھی کہ ریاستِ نبویؐ پر ایک مفصل اور جامع مطالعہ پیش کیا جائے۔ کیونکہ رسولؐ اللہ کی قائم کردہ ریاست ہی نے بعد کے تمام اسلامی ادارات کو جنم دیا اور آپ کے بعد آنے والے تمام خلفاء آپ ہی کے سیاسی جانشین تھے۔

(ب) جدید مسلمان مورخین میں سے البتہ علامہ شبلی، سید سلیمان ندوی (سیرت النبی)، حامد الانصاری غازی (اسلام کا نظامِ حکومت) اور ڈاکٹر حمید اللہ (عہدِ نبویؐ میں نظامِ حکمرانی، رسولِ اکرمؐ کی سیاسی زندگی) وغیرہ نے ریاست نبویؐ کے بعض پہلوؤں پر قلم اٹھایا۔ ان فضلاء میں بطورِ خاص ڈاکٹر حمید اللہ نے چند مسائل پر بلا شبہ محققانہ اور سیر حاصل بحث کی ہے حقیقت یہ ہے کہ ان تمام حضرات کی کاوشیں انتہائی وقیع اور قابلِ قدر ہونے کے باوجود ریاستِ نبویؐ کے تمام پہلوؤں پر محیط نہیں ہیں۔ اس لئے یہ ضرورت سمجھی گئی کہ ریاست نبویؐ کی تاسیس، اس کے نشوو ارتقاء اور دیگر پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کی جائے اور اسلامی تاریخ کی روشنی میں اس کے امتیازات اور مقام و مرتبہ کا تعین کیا جائے۔

زیرِ نظر مقالہ میں ان ہی ضروریات کو پورا کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس ضمن میں سب سے پہلے یہ بیان کیا گیا ہے کہ رسولؐ اللہ نے تاریخ کے جس دور میں ریاست کی تاسیس فرمائی، اس وقت سیاسی اعتبار سے دنیا کے مختلف حصوں میں کس قسم کے رجحانات پائے جاتے تھے خصوصاً عرب میں سیاسی ماحول کیا تھا۔ یہ بیان کئے بغیر ظاہر ہے ریاست نبویؐ کے آغاز کو صحیح طور پر نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ پھر یہ بتایا گیا ہے کہ ریاست نبویؐ کو دین کی کن فکری بنیادوں پر استوار کیا گیا۔ معاشرہ کی تشکیل اور

---

[1] Hell, Joseph, The Arab Civilization, Tr. S.K. Baksh, Sh. M. Ashraf, Lahore, 1943, p.22.

تنظیم کے مراحل کس طرح طے ہوئے۔ اور پھر قیامِ ریاست کی منزل کیسے آئی۔ اس کے بعد ریاست کے توسیع وارتقاء کا جائزہ لیتے ہوئے ان اقدامات سے بحث کی گئی ہے جن کے نتیجہ میں اسے توسیع واستحکام حاصل ہوا۔ اور پھر آخر میں انتظامِ ریاست سے بحث کی گئی ہے۔

(۵)

یہ بات اہلِ فکر ونظر سے مخفی نہ ہوگی کہ زیرِ نظر مقالہ کا موضوع "ریاست عہدِ نبویؐ میں" بلا مبالغہ ایک نہایت اہم مگر وسیع موضوع ہے۔ عہدِ نبوی میں ریاست کے نشوو ارتقاء کے مراحل سلہ تا سلاھ کے دوران تکمیل پذیر ہوئے اس لحاظ سے اگرچہ مطالعہ اسی دس سالہ دَور کا ہے لیکن یہ مختصر عرصہ بجائے خود مختلف النوع مباحث کا حامل ہے۔ پھر سیرت پر بے شمار تصنیفات کی موجودگی نے اس کو مزید مشکل بنا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے اگر ایک طرف ان تمام کتابوں سے استفادہ کیا ہے جو ہمیں دستیاب ہوسکیں تو دوسری طرف ہماری کوشش یہ رہی کہ مطالعہ کو اسلامی تاریخ کے اہم اور قدیم ترین مآخذ کی روشنی میں پیش کیا جائے۔ ہاں اگر کسی بحث کے سلسلے میں قدیم مآخذ سے مدد نہیں مل سکی تو اس کے بعد بتدریج دوسرے مآخذ سے فائدہ اٹھایا گیا۔ یہاں تک کہ ریاست کی قدر وقیمت کو متعین کرنے میں جدید مصنفین اور ان کی تصانیف کو بھی سامنے رکھا گیا ہے۔ یہ بیان کر دینا بھی ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ عہدِ نبویؐ میں ریاست کے نشوو ارتقاء کا جائزہ لینے میں اگرچہ ہم نے تاریخ کے بنیادی مآخذ کو استعمال کیا ہے۔ لیکن اپنی بحث کا تمام تر دارومدار قرآن اور احادیثِ نبویؐ پر رکھا ہے۔ یہ کہنا تحصیل حاصل ہے کہ رسول اللہؐ کی زندگی کا انتہائی اہم اور سب سے زیادہ مستند ماخذ قرآن ہے اور حدیث تو خود رسول اللہؐ کے قول، فعل اور تقریر سے عبارت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان دونوں مآخذ کو ہم نے اپنے مطالعہ میں ہر جگہ اولیت دی ہے۔ نیز آخر میں یہ وضاحت بھی مناسب ہے کہ ہم نے سہولت کی خاطر متن کے حوالوں کو (علاوہ افتتاحیہ اور اختتامیہ) ہر باب کے آخر میں شامل کیا ہے۔

اگر مندرجہ بالا گزارشات کی روشنی میں اس مقالہ کا مطالعہ کیا گیا تو مجھے امید ہے کہ صاحبانِ فکر ونظر اسے مفید، محققانہ اور فکر انگیز پائیں گے۔

ڈاکٹر نثار احمد
شعبہ اسلامی تاریخ، جامعہ کراچی

۲۷ دسمبر ۱۹۷۶ء / ۲۵ ذی الحجہ ۱۳۹۶ھ

باب اوّل

بعثتِ نبویؐ کے وقت دنیا کا سیاسی نظام

عہدِ نبویؐ میں ریاست کے نشوو ارتقا کا مطالعہ کرنے سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے کے سیاسی رجحانات اور دُنیا کے مختلف حصّوں میں پائے جانے والے نظام ہائے حکومت کا مختصر سا جائزہ پیش کر دیا جائے تاکہ ریاستِ نبویؐ کو اس کے صحیح پس منظر میں سمجھنے کے ساتھ ساتھ اس کی نوعیت اور قدر و قیمت کا بھی اندازہ لگایا جا سکے۔

زیرِ بحث دَور یعنی چھٹی اور ساتویں صدی عیسوی میں دنیا آج سے بہت کم تھی۔ نہ امریکہ کے دونوں براعظم دریافت ہوئے تھے اور نہ آسٹریلیا سے لوگ واقف تھے۔ افریقہ کے بڑے حصّہ پر تاریکی کا تسلط تھا۔ اور ایشیا و یورپ کے انتہائی شمالی علاقے بھی انسانی دسترس سے باہر تھے۔ البتہ عرب، چین، ہندوستان، وسطِ ایشیا، ایران، عراق، شام، مصر، مغرب اقصیٰ، حبشہ، نیز جنوبی یورپ کے کچھ ممالک مثلاً یونان، اطالیہ، فرانس، اسپین اور وسطی و شمالی یورپ کے چند علاقے ایسے ضرور تھے جہاں آفتابِ تمدّن ضوفگن تھا۔ مگر کہیں اس کی روشنی تیز تھی اور کہیں بہت مدھم۔ اور خاص بات یہ ہے کہ اس روشنی اور چمک دمک کے سب جلوے دراصل ظاہری اور سطحی تھے۔ جن کی تہ میں تاریکی ہی تاریکی تھی اور اسی تاریکی میں انسان بھٹک رہا تھا۔

آگے بڑھنے سے پہلے یہاں یہ وضاحت بہت ضروری ہے کہ ہمارے لیے مذکورہ بالا تمام علاقوں کے سیاسی رجحانات و میلانات کا مطالعہ نہ تو ممکن ہے اور نہ ضروری۔ لہٰذا ہم اپنی توجہ صرف ان ملکوں اور خطّوں تک محدود رکھیں گے جو تمدن و حضارت جہانگیری و جہانبانی اور حکومت و سلطنت کے باب میں نہایت اہمیت رکھتے تھے اور جن کے پرچمِ اقتدار کے سائے میں دنیا کی مختلف قومیں آباد تھیں۔ نیز عرب کی وہ سرزمین بھی ہمارے جائزہ کی خصوصی مستحق ہے۔ جہاں رسول اللہؐ کی بعثت ہوئی، جہاں آپ نے ۱ھ میں ریاست کو قائم فرمایا اور جو پھر کم و بیش دس سال کے قلیل عرصہ میں نشوو ارتقاء کے مراحل طے کر کے تقریباً تمام عرب پر محیط ہو گئی۔

روم

سلطنت روما کی تاریخ اگرچہ بہت طویل اور ایک بڑے عرصہ پر پھیلی ہوئی ہے اور اسے ہم کئی ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں لیکن مختصراً یہ عرض کر دینا کافی ہے کہ رومی شہنشاہیت کا آغاز دراصل جولیس سیزر (JULIUS CEASAR) سے ہوتا ہے جس نے اپنے دورِ اقتدار میں پورے طور پر استبداد اور مطلق العنانی کا مظاہرہ کیا۔[1] اور اسی وقت سے دراصل اس عقیدہ کا بھی آغاز ہوا کہ "قیصر صفاتِ الوہیت کا مالک ہے" لیکن وہ شخص جس نے رومی شہنشاہی کو استوار کیا اور جس نے بعد کی تمام

سیاسی نشوونما پر بہت گہرا اثر ڈالا وہ اغسطس (AUGUSTUS) تھا۔[۲] اس نے بادشاہت کو موروثی کرنے کی تدابیر کیں۔[۳] اس کی قوت کا راز دولت، فوج پر قبضہ اور عنانِ حکومت پر مضبوط گرفت میں پوشیدہ تھا۔[۴] اس کی وفات کے بعد ٹائیرس (۱۴ء تا ۳۷ء) برسرِ اقتدار آیا۔[۵] اس کی تخت نشینی کے وقت مطلق العنانیت کا دعوٰی پھر کیا گیا کہ "ناقابلِ تقسیم شے کو تقسیم کرنا غیر ممکن ہے۔ سلطنت ایک جسمِ واحد ہے اور صرف ایک ہی شخص کا دماغ اس پر حکمرانی کر سکتا ہے"۔[۶] اس کے بعد سلطنت پر جنگی عنصر کا غلبہ بہت زیادہ بڑھ گیا۔ چنانچہ کلاڈیس (CLAUDIUS) اور نیرو (NERO) دونوں کی تخت نشینی رومہ کے مقامی عساکر کی تائید کا نتیجہ تھی۔ پھر ۶۹ء کے واقعات سے یہ بات اور بھی ظاہر ہو گئی کہ بادشاہ کا بنانا اور بگاڑنا فوج کا کام ہے۔[۷]

بہرحال مارکس آریلیئس (MARCUS AURELIUS) کی موت کے بعد ۱۸۰ء سے رومیوں کے زوال کی ابتداء ہوئی۔[۸] رومی سلطنت برابر انتشار سے دوچار ہوتی رہی اور پیہم خارجی حملوں کو سہتی رہی یہاں تک کہ جب ۳۰۶ء میں "قسطنطین اعظم" قیصر ہوا[۹] تو گویا سلطنت میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ اس نے رومی سلطنت کی از سرِ نو تنظیم کی اور اسے متحد کیا، اس نے پہلا قدم یہ اٹھایا کہ سیاسی و جنگی مصالح کی بناء پر پایہ تخت کو روم سے قسطنطنیہ منتقل کیا۔[۱۰] یونانی زبان کو دفتری زبان قرار دیا۔ اس سے ایک طرف تو بازنطینی سلطنت کی بنیاد پڑی اور دوسری طرف روم میں ایک سیاسی خلا پیدا ہو گیا جسے بعد میں پاپائے روم نے پُر کیا۔ اس نے دوسرا اہم ترین قدم یہ اٹھایا کہ عیسائیت کو خود بھی اپنایا[۱۱] اور قانونی طور پر اس کو سلطنت کا مذہب بھی قرار دیا۔[۱۲] تاریخ سلطنت رومہ میں یہ ایک ایسا موڑ ہے جس کی بنا پر نہ صرف سلطنت کا ارتقاء متاثر ہوا بلکہ عیسائیت نے ازمنۂ وسطیٰ کے سیاسی افکار و ادارات کو بھی اس درجہ مغلوب کیا کہ ان کو عیسائی اعتقادات سے جدا کر کے سمجھنا ناممکن ہے[۱۳] اور ایک افکار سیاسی پر ہی کیا موقوف پوری مغربی تہذیب پر اس کے اثرات نمایاں ہیں۔

تاریخ بتاتی ہے کہ "قسطنطین اعظم" کے یہ سارے اقدامات بھی سلطنت رومہ کے انتشار و زوال کو نہ روک سکے سلطنت کے حصے بخرے ہو گئے، مشرقی اور مغربی حصے اور ان کے تاج دار الگ الگ ہو گئے اور قسطنطین کی موت (۳۳۷ء) کے بعد ہی سیاسی خانہ جنگیوں کے شعلے بھڑک اُٹھے۔ سلطنت کی تقسیم کا آغاز باقاعدہ طور پر اگرچہ ولنٹینین (VALENTINIAN) کے زمانہ (۳۶۴ء) سے ہی ہو چکا تھا[۱۴] لیکن قطعی تقسیم سلطنت ۳۹۵ء میں اس طرح ہو گئی کہ مشرقی حصوں کا آرکیڈیس (ARCEDIUS) اور مغربی حصوں کا ہونوریس (HONORIUS) تاجدار بن گیا۔[۱۵] اعیانِ سلطنت میں گروہ بندیاں قائم ہو گئیں۔ باہمی نفاق اور فتنہ و فساد کا بازار گرم ہو گیا اور دُور افتادہ صوبوں کی رعایا بغاوت پر آمادہ ہو گئی۔ اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر وحشی اقوام نے حملے شروع کر دئے۔ چنانچہ روم قسطنطین کے بعد پوری طرح سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ ۴۱۰ء میں وزی گاتھ نے روم کو بڑی حد تک تاخت و تاراج کر دیا۔[۱۶] رومہ کی اس تباہی و بربادی کی عام وجہ دورِ حاضر کے ایک مصنف نے یہ بیان کی کہ "یہ بات بڑی حیرت انگیز ہے کہ عیسائیت کا زوال اس کے عروج کے فوراً بعد شروع ہو گیا۔ جس کا نظارہ عیسائی اور غیر قوموں نے بھی کیا کہ عیسائیت کی تحریک" تباہ کن "ثابت ہوئی اور اس نے رومی سلطنت کو کمزور کر دیا۔ رومیوں کے اعلیٰ طبقہ کو دیکھتے ہوئے

یہ نظر آتا ہے کہ عیسائیوں میں دنیاوی اور مادی خواہشات ، نفسانی اغراض، عیش و عشرت کی ہوس، سرد مہری ، عوامی معاملات کی طرف سے بے توجہی، قومی معبودوں اور خداؤں کے لیے ذلت و حقارت ایسی خصوصیات ہیں جنہوں نے مستقلاً رومی طاقت کو رفتہ رفتہ رُو بہ زوال کر دیا۔ پھر عیسائیوں کا یہ اصرار کہ وہ وفاداری میں اوّلیت روم کو نہ دیں گے مزید بدنامی کا باعث ہوا۔"(۱۷)

اس تباہی و بربادی کے ٹھیک ۴۵ سال بعد ۴۵۵ء میں ونڈال نے پھر رومہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ اس طرح سلطنت رومہ کی حالت دگرگوں ہوتی چلی گئی۔ پانچویں صدی عیسوی کے آخر میں اس کا مغربی حصہ جو برطانیہ، فرانس وغیرہ پر مشتمل تھا بالکل کٹ گیا اور خود روم کا دارالحکومت دشمنوں کے حملوں سے محفوظ نہ رہ سکا اور تقریباً ۵۶۰ء میں سلطنت کے مغربی حصہ پر وحشی اقوام کا مکمل قبضہ ہو گیا جسے جسٹینین (JUSTINIAN)(۱۸) جیسا بہادر فرمانروا بھی دوبارہ حاصل نہ کر سکا، حالانکہ اس کی بہادری یورپ میں ضرب المثل تھی۔(۱۹)

مغربی حصہ نکل جانے کے بعد مشرقی صوبوں پر مشتمل سلطنت کی حالت بھی روز بروز نازک سے نازک تر ہوتی جاتی تھی۔ سلطنت کی عدم مقبولیت کا عالم یہ تھا کہ خود رعایا حکمرانوں سے اس حد تک نفرت کرتی تھی کہ وحشی اقوام کو رومیوں پر ترجیح دی جاتی تھی۔ امراً، وزرأ اور سلاطین میں اتنی طاقت بھی نہیں تھی کہ عوام کو بغاوت سے روک سکیں۔ ان اندرونی بدنظمیوں سے ملک کا جو حال ہو گیا تھا اس کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر روم کے تمام بیرونی مخالفین ختم بھی ہو جاتے تب بھی سلطنت زوال و انحطاط سے اپنا دامن نہیں بچا سکتی تھی۔ مزید بر آں ان کے پاس ایسی کوئی اخلاقی قوت اور ذہنی وسائل بھی نہیں تھے جو ان حالات میں ان کی دلجمعی اور قوت کا سہارا بن سکتے۔ چنانچہ ڈننگ نے لکھا ہے کہ "رومی و یونانی علم و ادب کے حیرت انگیز افلاس نے (جو روم کی سیاسی فنا سے صدیوں پہلے ظاہر ہو چکا تھا) اس پُرآشوب زمانے کے لیے کوئی ذہنی وسائل باقی نہ چھوڑے اور یورپ مایوسانہ اور شرمناک وہم پرستی میں مبتلا ہو گیا۔ زمانۂ وسطیٰ، غیر سیاسی، زمانہ تھا اور اس کے عزائم و تصورات مذہبی عقیدے کی شکل و معنی کے گرد مرکوز تھے۔"(۲۰)

بہرصورت چھٹی صدی عیسوی کے خاتمہ پر (یعنی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے چند سال بعد) روم بقول گبن زوال کے پست ترین نقطہ تک پہنچ گیا تھا۔ گبن کے الفاظ کا خلاصہ یہ ہے کہ "اس کی مثال بعینہٖ اس عظیم الشان درخت کی ہو گئی تھی جس کے سائے میں ایک وقت تک تمام اقوام عالم آباد تھیں مگر اب ایسی خزاں آئی کہ برگ و بار کے ساتھ ساتھ اس کی شاخیں اور ٹہنیاں بھی رخصت ہو گئی تھیں اور اب خالی تنا خشک ہو رہا تھا۔"(۲۱)

غرض رومہ کا یہ مختصر سا تاریخی و سیاسی جائزہ اس بیان پر مہرِ صداقت ثبت کر دیتا ہے کہ "شہنشاہی رومہ کی تاریخ اگرچہ جزءً جزءً نہایت عظیم الشان معلوم ہوتی ہے مگر دنیا کو وہ یہ سبق دے گئی کہ ایسا لامتناہی اختیار نہ حکمران کے لیے مفید ہے اور نہ اس کی رعایا کے لیے۔"(۲۲)

اب جہاں تک سلطنت کے نظریہ، تخیل اور نظام وغیرہ کا تعلق ہے تو اصولی طور پر مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ:

(الف) سلطنت رومہ کا اصل الاصول "بادشاہت" تھا۔ بادشاہ کے اختیارات غیر محدود تھے اور وہ تمام سیاسی

اور مذہبی عہدوں کا سرچشمہ تھا۔ سلطنت کا تمام طرز عمل شاہی مرضی کے تابع اور تمام تنظیمات کا تعلق بادشاہ سے ہی تھا[۲۳] اسی لیے[۲۴] جو ادارے مثلاً امراء کی مجلس (SENATE) یا مجلس جمہور (CONCILIUM PLABIS) وغیرہ بظاہر جمہوری نظر آتے ہیں وہ بالکل مصنوعی تھے۔ بادشاہت صرف ایک مخصوص گروہ، جماعت اور وطن کے اندر محصور تھی۔ حکمرانوں کی یہی وہ مخصوص جماعت تھی جس کی خاطرداری سلطنت کا مقصود تھی۔ اسی لیے رابرٹ بریفالٹ (ROBERT BRIFFAULT) لکھتا ہے کہ "جیساکہ ہم دیکھ چکے ہیں، رومی سلطنت . . . . انسانوں سے (ظلم و زیادتی کے ذریعہ) ناجائز فائدہ اٹھاکر انسانوں کی مخصوص جماعت (حکمرانوں) کی راحت رسانی اور عیش و آرام کا سامان فراہم کرتی تھی"۔[۲۵]

(ب) سلطنت روما کا تخیل اگرچہ "بہبود عامہ" کے اصول پر مبنی تھا لیکن یہ اصول خیال سے نکل کر عمل میں بہت کم آتا تھا۔[۲۶] اس کے تخیل میں یونانی اثرات بھی کارفرما نظر آتے ہیں۔ چنانچہ سسرو نے اپنی سیاسی تحریروں میں ایتھنز کے نمونے کو برابر پیش نظر رکھا ہے۔ لیکن اس کے باوجود رومی تصور میں چند امتیازات بھی موجود ہیں مثلاً رومیوں نے سلطنت کی قانونی حیثیت زیادہ واضح کی۔ قانون کو اخلاق سے ممیز کیا۔ رومیوں کا خاندان، یونانیوں کی بہ نسبت سلطنت کی مداخلت سے زیادہ آزاد تھا۔[۲۷] نیز رومی سلطنت شہری اور مقامی نہیں بلکہ قومی سلطنت تھی اور اس کا نصب العین ایک عالمگیر سلطنت کا تھا۔[۲۸] اس کی نوعیت کے بارے میں سسرو کا خیال تھا کہ سلطنت روما ایک ایسی سلطنت ہے جو نام نہاد "ممزوج" سلطنت کا نمونہ ہے۔ یعنی وہ بادشاہی، اعیانیت اور جمہوریت سب شکلوں کا مجموعہ اور سب سے بہتر ہے۔ لیکن ٹاسی ٹس نے کیا خوب کہا ہے کہ "اوّل تو اس قسم کی سلطنت کا وجود میں آنا ہی ناممکن ہے اور اگر آجائے تو برقرار رہنا ناممکن ہے"۔[۲۹]

(ج) رومی شہنشاہ کو کلیسا (CHURCH) کی حمایت حاصل تھی۔ چنانچہ یہ عقیدہ پختہ ہوگیا کہ "رومی شہنشاہیت عطیہ خداوندی ہے" تاکہ اس کی حکومت تمام دنیا پر "تا ابد قائم رہے"۔[۳۰] پھر جب مسیحیت رومی سلطنت کا سرکاری مذہب قرار پائی تو اس کا استعمال بالکل سیاسی زور آزمائی کے لیے ہونے لگا۔[۳۱] اگر ایک طرف بادشاہ نے مذہب کے معاملہ میں بھی سند قطعی حاصل کر لی اور سب کچھ اسی کے حکم کا محتاج ہوگیا تو دوسری طرف پاپائیت کو فروغ حاصل ہوا اور اس نے اصل طاقت حاصل کر لی۔ پھر کلیسا اور ریاست کے درمیان کشمکش اور چپقلش کا آغاز ہوا جو پورے ازمنۂ وسطیٰ کی بڑی نمایاں اور اہم خصوصیت ہے۔ اس کشمکش کی داستان ہے تو بہت طویل مگر یہاں اس کی ایک جھلک ملاحظہ کر لیجئے۔

ڈننگ لکھتا ہے: "(پوپ) گریگری کی پیشوائی مذہبی کے وقت (۵۹۰ء تا ۶۰۴ء) سے معقول حد تک پاپائیت کے تغیر کا اظہار ہو جاتا ہے۔ اس زمانے میں سیاسی معاملات قطعی طور پر پاپاؤں کی توجہ کے محتاج ہو گئے۔ اوّلاً یہ صورت صرف روم کے لیے ہوئی اور بعد ازاں کل اطالیہ کے لیے۔ کچھ زمانے تک قسطنطنیہ کا اقتدار اعلیٰ اور اس کے نائب مملکت (مقیم روما) کا اختیار زور و قوت کے ساتھ تسلیم کیا جاتا رہا۔ مگر جب اطالیہ میں اہل لمبارڈی کی مداخلتوں کے ساتھ، ساتویں صدی میں، مشرق میں مسلمانوں کے فاتحانہ حملوں کا بھی شمول ہوگیا تو شہر روم کے بارے میں شہنشاہی دربار کی دلچسپی اور اس کا اثر برائے نام رہ گیا۔ قدیم اور جدید روم کے تعلقات کے ٹوٹنے میں کلیسائی اسباب نے مدد دی۔ دربار سے قریبی تعلق رکھنے کی وجہ سے قسطنطنیہ کا بطریق

وقتاً فوقتاً یہ دعویٰ کیا کرتا تھا کہ اسے کلیسا کے تمام دوسرے حکام پر تقدم و تفوق حاصل ہے۔ شہنشاہ بھی اس ادعا کو کسی قدر تسلیم کرتا تھا مگر پوپ نہایت شدت کے ساتھ اسے ناپسند کرتے تھے اور اس سے سیاسی معاملات میں ان کی خود مختاری کے میلان کی تصدیق ہوتی تھی بالآخر میں بت پرستی کے متعلق اختلافِ عظیم برپا ہوا، جس سے یونانی اور رومی مسیحیت کے تمام متغائر میلانات نازک حد کو پہنچ گئے۔ کلیسا دو حصوں میں منقسم ہو گیا۔"(۳۲)

یہی مصنف آگے چل کر لکھتا ہے کہ "پوپ کی سیاسی حیثیت میں سب سے زیادہ کمزور نقطہ اس کا وہ تعلق تھا جو اسے روم کی آبادی کے ساتھ تھا۔ قدیم شہنشاہی کے زمانے سے نئے اسقف کے انتخاب کے موقع پر اکثر عام شورش اور خونریزی ہو جایا کرتی تھی ازمنۂ وسطیٰ کو جنم دینے والے حالات کی بدولت یہ عہدہ ان امیر خاندانوں کے تحت اقتدار آگیا جنھوں نے شہر کو باہم تقسیم کر لیا تھا۔"(۳۳)

پھر بطور نتیجہ رقمطراز ہے کہ: "عام طور پر یہ کہنا چاہیے کہ زمانۂ وسطیٰ کی اس ختم ہونے والی صدی کا فلسفہ ان تصورات پر محتوی تھا جو اقتدار اعلیٰ، حکومت کی عمومی بنیاد، فطری قانون وحقوق اور معاشرتی معاہدے سے متعلق تھے۔ یہ وہی تصورات ہیں جو مادی زندگی کے تغیر شدہ حالات کے زیر اثر دورِ جدید کی خصوصیت قائم کرنے والے تھے۔ مگر جن لوگوں نے اپنے کو باقاعدہ تخیل و تفکر کے لیے وقف کر دیا تھا وہ ہنوز پاپائیت و شہنشاہیت کے قدیم تصورات کے اس قدر زیر اثر تھے کہ وُہ اپنے فلسفے کے طرز بیان یا مطالب کو ازمنۂ سابقہ کے معیار سے آزاد نہیں کر سکتے تھے۔ سیاسی نظریات کی کل رو کے متغیر کر دینے کا آوازہ پندرھویں صدی کے ختم ہونے کے عین بعد میکاویلی (۱۴۹۶ء تا ۱۵۲۷ء) کی طباعی نے بلند کیا۔"(۳۴)

(د) کشمکش صرف ریاست و کلیسا ہی میں نہیں، شہنشاہ پاپائیت اور ٹیوٹنی بربریت(۳۵) کے درمیان بھی برپا ہوئی اور ان سب میں تصفیہ کی ایک شکل نظام جاگیرداری (FEUDALISM) میں تلاش کی گئی(۳۶)۔ مگر وہ بجائے خود ایک سیاسی مصیبت ثابت ہوا۔ ٹیوٹنوں کے سیاسی تصورات کا اثر زیادہ تر ادارات پر پڑا تو مسیحیت کا رومی سیاسی فلسفہ پر(۳۷)۔ جبکہ نظام جاگیرداری کا دائرہ بالکل عملی تھا۔ لہٰذا ایک مصنف کے بقول "کسی دو نظاموں میں اتنی زیادہ مغایرت نہیں پائی جا سکتی جتنی کہ مغایرت مقدس رومی سلطنت (جو لوگوں کے صرف ذہنوں پر حاوی تھی) اور واقعی جاگیردارانہ حکومت (جس میں عملاً لوگ رہتے تھے) میں پائی جاتی تھی(۳۸)۔" اس کے بعد ان دونوں کے درمیان جو لطیف اختلافات تھے ان کا اندازہ اس اقتباس سے بخوبی ہو سکتا ہے: "(ان میں) سے ایک (طاقت) مرکزی تھی تو ایک مقامی، ایک بلند و عظیم نظریہ پر مبنی تھی تو دوسری نراجیت کی غیر مہذب اولاد (RUDE - OFFSPRING) ایک نے تمام قوت غیر ذمہ دار حکمران کے ہاتھوں میں مرتکز کرنے کی کوشش کی تو دُوسری نے اس کے حقوق کو محدود کرنے اور اس کے احکام کے خلاف شدید مزاحمت کی سعی کی، ایک کا مطالبہ تمام شہریوں کی برابری اور مساوات کا تھا، کیونکہ وہ (مالک سماوات کی) یکساں مخلوق ہیں تو دوسرے نے "اشرافیہ" کے افتخار اور دُوسرے درجات کے امتیازات (چشم یورپ نے جواب تک نہ دیکھے تھے) تک محدود رکھا۔"(۳۹)

سلطنت رومہ کے سلسلے میں نسبتاً تفصیلی گفتگو ہم نے اس لیے کی ہے کہ یورپ میں قرونِ وسطیٰ کے سیاسی افکار، نظریات، مزاج اور ادارات کو سمجھنے کے لیے یہ انتہائی اہم ہے کیونکہ سلطنت رومہ کے احوال و ظروف کا مطالعہ دراصل یورپ کا

مطالعہ ہے اور نظری و عملی اعتبار سے جو خصوصیات عہد رومہ کی ہیں وہی خصوصیات قرونِ وسطیٰ میں پورے یورپ کی ہیں۔ البتہ ازمنۂ وسطیٰ میں بحیثیت مجموعی جب ہم پورے یورپ کے افکارِ سیاسی کا جائزہ لیتے ہیں تو اس کا اختتام مندرجہ ذیل امور کے ضروری اضافے کے بغیر نہیں ہو سکتا یعنی یہ کہ :

۱۔ بنیادی طور پر ازمنۂ وسطیٰ میں کوئی خاص سیاسی فکر یا کوئی بڑا سیاسی فلسفی پورے یورپ میں خصوصاً اور تمام دنیا میں عموماً نظر نہیں آتا۔[40]

۲۔ قرونِ وسطیٰ کے سیاسی نظریات و ادارات نہ تو واقعی اور حقیقی حالات کے مطالعہ و تجزیہ پر مبنی تھے اور نہ ہی کلیۃً ماضی کے تصورات و تجربات سے ماخوذ تھے۔ یہ کچھ تو یونانی و رومی دنیا سے وراثتاً ملے تھے اور کچھ ما بعد الطبیعیاتی تصورات مذہبی سے مستنبط تھے۔[41] اور اسی لیے اس میں جا بجا فکری اور عملی دونوں اعتبار سے تضادات نظر آتے ہیں۔

۳۔ ازمنۂ وسطیٰ کے افکارِ سیاسی کا سرمایہ، غیر تاریخی، غیر سائنٹیفک، غیر منطقی، غیر تنقیدی اور مذہبی و تخیلاتی ہے جس کو تجربہ و تحقیق اور واقعہ سے قریب کا واسطہ نہ تھا۔ تعلیم و تعلم محدود اور نظریات و افکار تنگ نظری اور متعصبانہ مذہبی محدودیت کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے، تضاد و انتشار کا شکار تھے۔[42]

فارس

فارس اپنی قدامت تہذیب کے لحاظ سے دُنیا کے ان چند حصّوں میں شامل ہے جن کی تاریخ انتہائی قدیم اور طولانی ہے۔[43]

عام طور پر اس کی تاریخ کا مطالعہ دو حصّوں میں کیا جاتا ہے۔ ایک افسانوی دور اور دُوسرا تاریخی دور۔ اگر افسانوی دور کو پیشِ نظر رکھا جائے تو شاید اس کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہو جاتی ہے جتنا کہ خود انسان ہے لیکن اس کا خالص تاریخی دور بھی ایک زمانہ دراز پر محیط ہے۔ فارس کئی سو سال قبل مسیح میں ہی رفعت و سربلندی حاصل کر چکا تھا اور وہ زمانہ جبکہ یونان میں افلاطون و ارسطو کا طوطی بول رہا تھا۔ یا یُوں کہیے کہ جب یونان بڑی حد تک عروج سے ہمکنار تھا تو اس وقت فارس انحطاط و زوال کی سرحدوں کو چھو رہا تھا۔ مختصر یہ کہ فارس نے جریدۂ عالم پر بہت گہرا نقش ثبت کیا تھا اور ملوک فارس اپنے دائرہ اقتدار و حاکمیت کو اس قدر وسیع اور مستحکم کر چکے تھے کہ اس وقت کی معلوم دنیا کے بیشتر ممالک ان کے حضور نذرانۂ اطاعت پیش کرنے پر مجبور تھے۔[44] مزید برآں اس زمانے میں بھی جبکہ ان کا آفتابِ اقتدار گہنا گیا تھا اور "ملوک طوائف" فارس پر حکمرانی کر رہے تھے، وہ دنیا کے دُوسرے حکمرانوں کے مقابلہ میں زیادہ قوت و جبروت کے مالک تھے۔ چنانچہ ان ہی ملوک طوائف[45] کے زمانے میں یونان و روم پر حملے اور آس پاس کے علاقوں (مثلاً عراق و عرب) پر فوج کشی وغیرہ ہوئی۔ ان کے بعد ساسانیوں کے زمانے (۲۲۶ء تا ۶۵۳ء) میں بھی یہ روایت باقی رہی۔[46]

بہرصورت قدامت تہذیب اور قدامت حکومت دونوں کے اعتبار سے فارس کی بادشاہی، تاریخ سیاست کے نہایت اہم باب کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور جیسا کہ ہم اُوپر اشارہ کر چکے ہیں اس کی تاریخ بہت طویل ہے جسے مختلف ادوار میں

تقسیم کیا جاتا ہے[۴۷]۔ لیکن ہم بالفصل جس دور کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں اس کا تعلق ان کے چوتھے طبقہ یعنی "ساسانیہ" سے ہے۔ اس دور میں ملوک ساسانیہ کی ایک چھوٹی سی تعداد تو بلاشبہ ایسی ہے جس نے اپنے حکم و اقتدار کا سکہ کافی عرصہ تک چلایا[۴۸] اور اس زمانے میں کوئی ان کی ہمسری کا دعوٰی بھی بمشکل کر سکتا تھا لیکن تاریخ کا مطالعہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ ساسانی جاہ و جلال بھی ماند پڑتا چلا گیا اس کے اوراق عظمت منتشر اور پراگندہ ہوتے چلے گئے۔ نااہل حکمرانوں، مسلسل بغاوتوں، سفاکانہ خونریزیوں، سیاسی بدامنیوں، اختلافات و ہنگاموں اور آپس کی ریشہ دوانیوں نے آہستہ آہستہ ان کے شجر اقتدار کو کھوکھلا اور ان کی قبائے سیاست کو تار تار کر دیا۔

روم کی طرح فارس میں بھی شخصی، موروثی اور مطلق العنان بادشاہت تھی، اور یہی ایرانی نظام فکر و سیاست میں محور کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر ایک طرف حکمران یہ دعوٰی کرتے تھے کہ "ان کی رگوں میں خدائی خون ہے"۔ تو دوسری طرف اہلِ فارس بھی انہیں اسی نظر سے دیکھتے تھے کہ گویا وہ خدا ہیں۔ ان کا اعتقاد تھا کہ ان حکمرانوں کی فطرت میں ایک مقدس آسمانی چیز موجود ہے۔ چنانچہ یہ لوگ ان کے آگے سربسجود ہوتے تھے ان کی الوہیت کے ترانے گاتے تھے اور انہیں قانون، تنقید اور بشریت سے بالاتر تصور کرتے تھے۔[۴۹]

ملک و قوم پر حکومت کرنے کے لیے ایک خاص گھرانہ متعین تھا۔ اہلِ فارس سمجھتے تھے کہ صرف اسی گھرانے کے افراد تخت و تاج کے وارث اور ملک و سلطنت کے مالک ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ لوگ بادشاہ پر ایمان رکھتے اور حکومت کو شاہی خاندان کا موروثی حق سمجھتے تھے[۵۰] اور اسی لیے اگر اس خاندان میں کوئی سن رسیدہ شخص نہ ملتا تو کسی نابالغ اور بچہ کو اپنا شہنشاہ تسلیم کر لینے میں بھی کوئی مضائقہ نہ سمجھتے تھے[۵۱] بلکہ اگر خاندان میں کوئی مرد باقی نہ رہتا تو عورت کو ہی تاجِ شاہی پہنا دیتے تھے۔[۵۲] پھر تماشہ یہ کہ تختِ شاہی پر نصب و عزل کا یہ کھیل اس شان سے کھیلا جاتا تھا کہ اس میں کسی اصول اور ضابطے کی قید، اخلاق و کردار کی کوئی پابندی، رشتہ و علائق کی کوئی پروا، چھوٹے بڑے کی کوئی تمیز اور حلال و حرام، جائز و ناجائز اور حق و ناحق کا کوئی لحاظ نہ تھا، بس فکر صرف تخت کی اور ہوس محض اقتدار کی تھی اور مقصود صرف یہ تھا کہ تختِ حکومت حاصل ہو جائے خواہ اس کے لیے کوئی بھی راستہ کیوں نہ اختیار کرنا پڑے اور خواہ اس کے لیے اپنے دشمنوں سے ہی مدد کیوں نہ مانگنی پڑے اسی لیے ہرمز سوم (۴۵۷ء تا ۴۵۹ء) کے مقابلہ پر اس کے بھائی فیروز اوّل (۴۵۹ء تا ۴۸۳ء) نے تاتاریوں (سفید ہن قبائل) سے مدد مانگی تھی۔[۵۳] اور جب قباد اوّل (۴۸۸ء تا ۵۳۱ء) نے مزدکی مذہب کی سرپرستی قبول کی تو ملک میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا جس کے نتیجہ میں قباد کو تخت سے معزول کر دیا گیا اور اس نے قید سے بھاگ کر تاتاریوں کے پاس پناہ لی اور بالآخر انہی کی مدد سے دوبارہ تخت نشین ہوا۔[۵۴] اسی اقتدار کی خاطر بلاش (۴۸۳ء تا ۴۸۸ء) کو معزول کیا گیا۔ اسی تخت کی ہوس میں نوشیرواں سے (۵۳۱ء تا ۵۷۹ء) ولیعہد سلطنت کے قتل کی حرکتِ قبیحہ سرزد ہوئی۔ اسی کے لیے ہرمز چہارم اور خسرو پرویز (۵۹۰ء تا ۶۲۸ء) قتل ہوئے اور اردشیر بن شیرویہ بمشکل ڈیڑھ سال حکمران رہا۔[۵۵] شہر براز (یا شہر یار)[۵۶] صرف چار دن حکومت کے مزے لوٹ سکا۔[۵۷] اس کی جانشین بوران بنت کسریٰ پرویز

صرف ایک سال چار ماہ تک بادشاہت کر سکی۔[۵۸] اس کے بعد آنے والے حکمران جشندہ کی مدتِ ریاست تو ایک ماہ سے بھی کم رہی۔[۵۹] آزرمیدخت محض چھ ماہ حکمرانی پر متمکن رہی۔[۶۰] اس کا جانشین کسریٰ بن مہر جشنس چند دن بعد ہی قتل ہوگیا۔[۶۱] یہی انجام فیروز بن مہر جشنس کا ہوا۔[۶۲] فرخزاد خسرو کی سلطانی چھ ماہ سے آگے نہ بڑھ سکی[۶۳] اور آخری بادشاہ[۶۴] (یزدجرد یا) یزدگرد بن شہریار کی عمر قتل کے وقت صرف ۲۲ سال تھی جبکہ اس کی حکمرانی کو دو یا چار سال گزرے تھے[۶۵] اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اقتدار کی یہ ہوس صرف خاندان شاہی کے افراد تک محدود نہ تھی بلکہ بوران سے پہلے بعض دوسرے لوگوں نے بھی طالع آزمائی کی کوشش کی تھی۔ چنانچہ مذکورہ شہرباز (یا شہریار) کا تعلق خاندان شاہی سے نہ تھا۔[۶۶]

سلطنت فارس اگرچہ شخصی، موروثی اور مطلق العنان تھی اور بادشاہ اپنے حکم اور فیصلہ میں کسی کا پابند نہ تھا مگر اسی کے ساتھ ساتھ متعدد تاریخی واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہاں "عظمائے فارس" پر مشتمل ایک نوع کی "مجلس مشاورت" بھی تھی جو اگرچہ درباری اور شاہی خاندان کے افراد پر مشتمل تھی لیکن اپنی نوعیت میں وہ کتنی ہی محدود سہی بہرحال بادشاہ وقتاً فوقتاً احکام کے اجراء و نفاذ، والیوں کے تقرر اور دوسرے اہم مواقع پر اس کی ضرورت محسوس کرتا تھا۔ مثلاً جس زمانے میں یمن پر "مسروق" کی حکمرانی قائم تھی سیف بن ذی یزن نامی ایک شخص اپنی قوم کی طرف سے پہلے قیصر روم کے دربار میں فریادی ہوا اور مسروق سے نجات دلانے کی درخواست کی لیکن وہاں سے مایوسی ہوئی تو عامل حیرہ نعمان بن منذر کی وساطت سے سیف نے نوشیرواں کے دربار میں بھی اس درخواست کو دہرایا۔ نوشیرواں نے سیف کی درخواست کو ہمدردی سے سُنا اور مدد کے لیے آمادہ ہوگیا۔ مگر مدد کا طریقہ کار کیا ہو اور کیا صورت اختیار کی جائے تو اس سلسلے میں اس نے اہلِ دربار سے مشورہ کیا[۶۷] اور اسی مشورہ کے مطابق وہرز کی سرکردگی میں ایک لشکر یمن روانہ کیا گیا جس نے مسروق کو قتل کرکے سیف کا یمن پر اقتدار قائم کردیا۔[۶۸] اسی طرح اردشیر بن شیرویہ کو جس وقت شہنشاہ بنایا گیا تو اس کی عمر مشکل سے سات سال تھی اور ظاہر ہے کہ اس عمر میں حکمرانی کے لیے وہ دوسروں کی مدد کا سخت محتاج بھی تھا۔ چنانچہ اس کی رہنمائی اور مشورہ کے لیے "مہاذرجنشس" کو منتخب کیا گیا تھا۔[۶۹]

سلطنت فارس کی تاریخ کا یہ ایک مختصر سا عمومی جائزہ تھا۔ اب جہاں تک چھٹی صدی عیسوی کے ربع آخر اور ساتویں صدی عیسوی میں بالخصوص اس سلطنت کی نوعیت و ماہیت کا تعلق ہے تو ہمیں مندرجہ ذیل اہم باتیں نظر آتی ہیں:

(الف) فارس میں شخصی، موروثی اور مطلق العنان شہنشاہیت کی روایت اپنے پورے التزام کے ساتھ جاری تھی۔ ایران کے حکمران جو اس زمانے میں انسانی قیادت کے دعویدار تھے ایک پُرفریب اور مصنوعی زندگی گزار رہے تھے۔ ان کے رؤسا، امراء اور وزراء کو لذت اندوزی کے سوا کسی بات کی فکر نہ تھی "عیاشی کی وہ انتہا تھی کہ قیاس کام نہیں کرتا۔ تکلفاتِ زندگی، تعیشات اور سامانِ آرائش کی وہ بہتات تھی اور اس میں ان باریکیوں اور نکتہ سنجیوں سے کام لیا جاتا تھا کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔"[۷۰] اس بے پناہ عیاشی اور امور سلطنت سے غفلت کا نتیجہ یہ

نکلا تھا کہ سازشیں، بغاوتیں اور خونریزیاں روز کا معمول بن گئیں اور بدامنی و بے چینی عام ہو گئی اور یوں نظمِ مملکت روز بروز کمزور سے کمزور تر ہوتا چلا گیا۔

(ب) مجموعی طور پر سلطنتِ فارس روبہ زوال تھی۔ اگرچہ بعض حوصلہ مند حکمرانوں کے زمانے میں اس نے وقتی طور پر سنبھالا لیا لیکن یہ شمع زیادہ عرصہ تک اپنی تابانی نہ پھیلا سکی اور ایک مختصر سے عرصہ میں ہی بادشاہوں کی ایک بڑی تعداد زوال کے ناقوس بجاتی گزر گئی۔ سلطنت فارس کے اواخر عہد کا سب سے جلیل القدر حکمران' نوشیرواں تھا جس نے تقریباً ۴۸ سال تک[۱] ایک بڑے علاقے کو اپنے زیرِ نگیں رکھا اور اس کی حکومت کے ختم ہونے میں ۴ سال باقی تھے کہ انسانیت کا آخری نجات دہندہ' دنیا کی ظلمتوں کو چیرتا ہوا اس عالمِ آب و گل میں تشریف لایا۔ نوشیرواں کا جانشین ہرمز بنا پھر بارہ سال کے بعد[۲] تختِ فارس پر کسریٰ پرویز نامی وہ آخری حوصلہ مند بادشاہ متمکن ہوا جس کی ۳۲ سالہ فرمانروائی[۳] کے بعد انحطاط و زوال سلطنت کی رفتار انتہائی تیز ہو گئی[۴]۔ اسی کسریٰ پرویز کے دورِ حکومت میں آفتابِ رسالت طلوع ہوا[۵]۔ اسی کے عہد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے مدینہ ہجرت فرمائی[۶] اور اسی کے عہد میں "ذی قار[۷]" کا وہ فیصلہ کن واقعہ پیش آیا جس کے بعد عرب و عجم کے درمیان تفریق ہو گئی[۸] اور رسالت محمدی کے ایک ادنیٰ سے مظاہرے نے سلطنت فارس کے عظیم سلسلہ حکومت کو فی الواقع منقرض و منقطع کر دیا[۹] اور چند ہی برس میں فتوحاتِ اسلامی کا سیلاب ایرانی شوکت و سطوت کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے گیا[۱۰]۔

(ج) سلطنت فارس کے انحطاط و زوال میں جن عوامل نے حصہ لیا اور اس کی سیاسی تنظیم و ادارات کو بڑی حد تک متاثر کیا۔ ان میں سے ایک ایران کی معاشرتی و اخلاقی حالت ہے جسے سیاسی تاریخ کے مطالعہ میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اگر وہاں ایک طبقہ مسرفانہ اور عیش پسندانہ زندگی میں مشغول ہو کر دوسرے مشاغل و فرائض سے غافل ہو چکا تھا اور اس کا بار دوسرے طبقہ پر تھا جو محصولات اور حکومت کے بے جا مطالبات کی چکی میں پس رہا تھا نیز تیسرا طبقہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا جانوروں سے بدتر زندگی گزارنے پر مجبور تھا۔ اس کشمکش نے یقیناً اجتماعی بدنظمی اور انتشار کو دعوت دی کیونکہ رعایا زیادہ عرصہ تک ظلم و تشدد اور بنیادی حقوق سے محرومی کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

اس کے اخلاقی زوال اور مذہبی انتشار کی تاریخ بھی ابتدأ سے شانہ بشانہ چل رہی تھی۔ زمانہ قدیم میں اہلِ فارس مظاہرِ قدرت کے پرستار تھے۔ ساتویں صدی قبل مسیح میں زرتشتی مذہب کا آغاز ہوا اور ساسانی حکمرانوں کا بھی سرکاری مذہب یہی تھا۔ تیسری صدی عیسوی میں شہوت پرستی اور جنسی تحریکات نے مذہب کا چولا اختیار کیا۔ مانی مذہب کا آغاز ہوا جو مسیحت و مجوسیت کی آمیزش کا مرقع تھا اور جس میں نور و ظلمت کا ایسا گورکھ دھندا تھا جس سے آخر تک نکلنا اس قوم کو نصیب نہیں ہوا[۱۱]۔ بہرام نے ۲۷۶ء میں مانی کو یہ کہتے ہوئے قتل کر ڈالا کہ تو دنیا کو تباہی کی طرف دعوت دیتا ہے[۱۲] اس کے قتل ہو جانے کے باوجود اس مذہب کے اثرات صدیوں فارس میں قائم رہے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں ایک دوسرا مذہب پیدا ہوا جس کا بانی مزدک تھا۔ عیش پرستوں اور ہوس رانوں نے اس کو خوشی خوشی قبول کیا اور بہت جلد اس مذہب کو حکمران وقت قباد

(۴۸۸ء تا ۵۳۱ء) کی سرپرستی حاصل ہوگئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پورا ملک جنسی بحران میں ڈوب گیا[۸۳] مگر اہلِ فارس جلد ہی اس سے عاجز آگئے۔ چنانچہ نوشیرواں نے برسرِ اقتدار آتے ہی اس مذہب کے ایک لاکھ سے زاید پیروؤں کو قتل کر ڈالا۔ ان مشہور مذاہب کے علاوہ شاہ پرستی نے بھی تقریباً ایک مذہب کی شکل اختیار کر لی تھی۔

مختصر یہ کہ ان معاشرتی اور اخلاقی بدحالیوں نے سیاسی حالات کو ابتر کرنے میں موثر کردار ادا کیا اور ایرانی سیاست کی قبائے دراز کو کرم خوردہ کر دیا۔

ہندوستان

اختصار کی خاطر ہندوستان کے مطالعہ کو ہم مندرجہ ذیل نکات کی صورت میں پیش کرنا چاہتے ہیں :

(الف) اپنے انتہائی قدیم زمانے سے قرونِ وسطیٰ تک ہندوستان میں حاکمیت کا ایک ہی تصور ہمیشہ قایم رہا کہ راجہ ہی سیاسی تنظیم کا سربراہ، خدائی ارادہ کا مظہر، دیوتاؤں سے نسلی تعلق رکھنے والا اور اپنے ہم عصر فارسیوں کی طرح ہر قسم کی تنقید اور رائے زنی سے بالاتر ہوتا ہے۔ راجہ ہی تمام طاقتوں کا سرچشمہ اور دیوتاؤں کا محبوب و نائب ہے اس کا حکم قانون ہے اس کا دربار سب سے بڑی عدالت ہے اور اس کی ذات غلطیوں سے پاک و منزّہ ہے۔ اخلاقیات کے گورکھ دھندوں سے دور محض سیاسی غلبہ کا حصول راجہ کا مقصود ہے جس کے ضمن میں ہر جائز و ناجائز ذریعہ اختیار کر سکتا ہے۔ بہر صورت یہ بات طے ہے کہ ازمنۂ قدیم سے ہندوستان میں عام طرزِ جہانبانی "بادشاہت" اور ملوکیت رہا ہے۔[۸۴] البتہ اس میں اختلاف ہے کہ یہ بادشاہتیں بذریعہ انتخاب عمل میں آتی تھیں یا بذریعہ نامزدگی۔ تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ عام اصول نامزدگی اور موروثیت کا ہی تھا۔ اور بعض اوقات جو کچھ انتخابی عمل نظر آتا ہے وہ محض نمائشی اور مصنوعی تھا۔[۸۵]

(ب) راجہ اگرچہ تمام انتظامی، عدالتی اور فوجی شعبوں کا مالک تھا لیکن تمام کاموں کو اکیلا انجام نہیں دے سکتا تھا اس لیے اس نے مشیروں کی ایک مجلس قایم کر رکھی تھی جو اسے اہم امور میں مشورہ دیتی تھی اور اس کے کام میں ہاتھ بٹاتی تھی بلکہ ویدوں کے زمانے میں تو مقامی کونسل (سبھا) اور مرکزی کونسل (سمتا) کی بنا پر بادشاہ کے اختیارات نسبتاً محدود ہو گئے تھے۔ ہاں ویدوں کے آخری زمانے میں "سمتا" کا نام و نشان بالکل مٹ گیا تھا۔[۸۶] اسی طرح ہرش کے عہد میں بھی راجہ فرمانروائے مطلق نہ تھا بلکہ اس کے اختیارات میں وزراء کا بھی عمل دخل تھا۔[۸۷]

(ج) ہندوستان میں "اشرافیہ" (ARISTOCRACY) طرز کی فرمانروائی کا آغاز کم از کم شمالی حصّہ میں تقریباً اسی زمانہ میں ہوا جس زمانہ میں کہ یونان میں ہوا تھا۔ یہ "اشرافی جمہوریتیں" بہرحال بادشاہت کے شانہ بشانہ قائم ہوئیں کیونکہ عام چلن بہرکیف "بادشاہت" ہی تھا۔[۸۸]

(د) سیاسی اعتبار سے ہندوستان کی حالت بھی روم اور ایران سے کچھ کم خراب نہیں تھی۔ پانچویں صدی عیسوی کے اختتام سے ساتویں صدی عیسوی کے آغاز تک کا زمانہ ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں ابتری اور گمنامی کا زمانہ شمار

کیا جاتا ہے۔[۸۹] ۳۲۰ء میں جس عظیم الشان گپت سلطنت کی بنیاد پڑی تھی وہ پانچویں صدی کے پہلے نصف تک ہندوستان کی مرکزی حیثیت سے قائم رہی لیکن پھر روم اور ایران کی طرح وسطِ ایشیا کی وحشی اقوام نے گپت سلطنت کو بھی زمانہ شباب میں زوال سے ہمکنار کر دیا اور اس طرح ہندوستان بھی ان کی عظیم الشان سلطنت کا ایک صوبہ بن گیا جو ایشیا اور یورپ پر پھیلی ہوئی تھی۔[۹۰] گپت سلطنت کے زوال کے بعد سے ہرش وردھن کے تخت نشین ہونے تک کا زمانہ (۵۰۰ء تا ۶۰۶ء) ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں ایک تاریک باب کی حیثیت رکھتا ہے۔ گپت سلطنت کا زوال اور وردھن حملہ آوروں کی آمد ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں دراصل ایک نہایت اہم موڑ تھا۔[۹۱]

(ھ) گپت سلطنت کا زوال بہت سے ناگزیر نتائج کا سبب بنا۔ صوبائی راجاؤں، گورنروں اور جاگیردار ریاستوں نے اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ پورا شمالی ہندوستان بہت سی آزاد ریاستوں میں منقسم ہو گیا۔[۹۲] ہندوستان کی اس سیاسی صورتِ حال کے بارے میں اسمتھ لکھتا ہے "چھٹی صدی عیسوی کے دوسرے نصف میں ہندوستان کی تاریخ کے متعلق بہت ہی کم معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ لیکن یہ بات یقینی ہے کہ وہاں کسی کامل اقتدار رکھنے والی طاقت کا وجود نہیں تھا اور وادیِ گنگا کی تمام ریاستیں ھن قبائل کے حملوں سے تہہ و بالا ہو چکی تھیں۔"[۹۳]

ایک اور مصنف کا بیان ہے کہ:

"قرونِ وسطیٰ کے آخری حصہ پر ہندوستان کی ملکی حالت بہت قابلِ اطمینان نہ تھی۔ چھوٹے چھوٹے راج بنتے جاتے تھے ہرش اور پل کیشی کے بعد تو ان کی سلطنتیں کئی حصوں میں تقسیم ہو گئی تھیں۔ سولنکی، پال، سین، پرتیہار، جادو، گوھل، راٹھور، متعدد خاندان اپنی اپنی ترقی میں کوشاں تھے۔ اس لیے ہندوستان کی مجموعی طاقت کوئی نہ تھی۔ صدہا ریاستوں میں بٹ جانے کے باعث ملک کی طاقت بکھری ہوئی تھی۔ قومیت کا احساس بالکل نہ تھا۔ ان راجاؤں میں برابر لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں اور سیاسی کیفیت روز بروز نازک ہوتی جاتی تھی۔ ملک کی سیاسیات اور دیگر انتظامی شعبہ جات پر ان حالات کا اثر پڑنا لازمی تھا۔ سب ریاستیں رفتہ رفتہ زیادہ آزاد اور مطلق العنان ہوتی گئیں۔ راجاؤں کو رعایا کی بہبود کا خیال نہ رہا۔ رعایا کی رائے پیروں سے ٹھکرائی جانے لگی۔ آپس کی لڑائیوں سے اتنی فرصت ہی نہ تھی کہ رعایا کی آسائش کا خیال کریں۔ ہاں لڑائیوں کے لیے جب روپے کی ضرورت ہوتی رعایا پر محصول کا اضافہ کر دیا جاتا تھا۔"[۹۴]

ایک اور مصنف صورتِ حال کی عکاسی یوں کرتا ہے:

"پانچویں صدی عیسوی کے اواخر میں ہن کے حملوں نے گپت سلطنت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اور شاہانِ گپت ایک مقامی راجہ کی حیثیت میں ڈوب گئے جو محض ایک محدود علاقے پر حکومت کر سکتا تھا۔ ساتویں صدی عیسوی میں شمالی ہندوستان کی سیاسی قیادت ہرش وردھن کے تحت قنوج کو منتقل ہو گئی جس نے اپنی سیاسی لیاقت اور فتحمندی سے آخری بار شمالی ہندوستان کے منتشر اجزاء کو جوڑنے کی کامیاب کوشش کی۔"[۹۵]

مزید برآں جو خودمختار ریاستیں گپت سلطنت کے کھنڈرات پر قائم ہوئیں ان میں سے کسی ایک کو بھی مرکزی

حیثیت حاصل نہ تھی۔ صرف وسط ہندوستان میں نو خود مختار ریاستیں قائم تھیں۔ بنگال کئی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم تھا اور ہسنتو کے بقول کشمیر، سندھ، آسام اور نیپال میں الگ الگ ریاستیں قایم تھیں۔ ان ریاستوں کی آپس کی کشمکش کے نتیجہ میں بالآخر ہرش وردھن کی حکومت نے مخالفین کو مغلوب کرکے اپنے آپ کو مستحکم کیا اور اس کے بعد کے دور کو ہم ہندوستان کی سیاسی یکجہتی کا عارضی زمانہ کہہ سکتے ہیں۔

(د) ملک کے اندرونی و بیرونی خلفشار میں معاشرتی، اخلاقی اور مذہبی عناصر کا کردار بھی بہت اہم رہا ہے۔ وہی طبقاتی کشمکش جو روم اور ایران میں تھی ہندوستان میں بھی موجود تھی بلکہ ہندوستان طبقہ واریت میں تمام اقوامِ عالم سے بڑھ گیا تھا۔ امراء اور مقتدر طبقہ متوسط اور غلام تو خیر موجود ہی تھے اونچ نیچ کا فرق اور ذاتوں کی تقسیم اس پر مستزاد تھی بلکہ راجہ کے دیگر فرائض میں سے ایک فرض یہ بھی تھا کہ وہ ذاتوں کے فرق کو قائم رکھے۔ منوشاستر میں چار ذاتیں بیان کی گئی ہیں :

۱۔ برہمن یا مذہبی پیشوا

۲۔ چھتری (حکمران اور لڑنے والے)

۳۔ ویش (زراعت و تجارت پیشہ) اور

۴۔ شودر[۹۶] جن کا کوئی خاص پیشہ نہیں تھا اور جو دوسری ذاتوں کے صرف خادم تھے۔

یہ تقسیم ذات اور الہامی سمجھی جاتی تھی۔ مزید برآں ایسے قوانین وضع کیے گئے تھے جس سے علانیہ بعض ذاتوں کی پاسداری حمایت اور بعض پر جبر و ستم مقصود تھا۔ مثلاً :

(الف) برہمن کو کسی حالت میں خواہ وہ کتنے ہی سنگین جرائم کا مرتکب رہ چکا ہو سزائے موت نہیں دی جا سکتی۔

(ب) کسی اونچی ذات کے مرد کا نیچی ذات کی عورت کے ساتھ زنا کرنا کوئی جرم نہیں۔

(ج) کسی بدھ راہبہ تک کی عصمت دری کی سزا میں کچھ جرمانہ کافی تھا۔

(د) اگر کوئی اچھوت ذات کا شخص کسی اعلیٰ ذات والے کو چھو لے تو اس کی سزا موت ہے۔

(ہ) اگر کوئی نیچی ذات والا اپنے سے اونچی ذات والے کو مارے تو اس کے اعضاء قطع کر ڈالنا چاہئیں۔ اگر اسے گالی دے تو اس کی زبان کاٹ ڈالنی چاہیے اور اگر اس کو تعلیم دینے کا دعویٰ کرے تو گرم تیل اس کے منہ میں ڈالنا چاہیے۔[۹۷]

ہندوستانی معاشرہ میں مظاہر پرستی اور بت پرستی بنیادی حیثیت رکھتی تھیں۔ عوام کا مذاق اور مزاج کسی ایسے مذہب کو قبول کرنے پر تیار ہی نہ ہوتا تھا جس میں بت پرستی نہ ہو۔ ہندوستان کی تاریخ میں چھٹی صدی عیسوی کا زمانہ معبودوں کی کثرت کا زمانہ ہے ویدمیں دیوتاؤں کی تعداد ۳۳ تھی لیکن اس زمانہ میں ۳۳ کروڑ ہوگئی تھی۔ دنیا کی ہر پسندیدہ شے قوت والی چیز اور ہر ناقابلِ تسخیر طاقت اہلِ ہند کے نزدیک عبادت اور پرستش کے لائق تھی۔ اسی طرح بتوں، دیوتاؤں، دیویوں کا کوئی شمار نہیں تھا اور قابلِ پرستش اشیأ میں معدنیات و جمادات، اشجار و نباتات، پہاڑ، دریا، حیوانات حتّٰی کہ اعضائے مخصوصہ وغیرہ سب ہی

شامل تھے۔ اس طرح یہ قدیم مذہب افسانوی روایات اور عقاید و عبادات کا ایک دیومالا بن کر رہ گیا تھا۔[98] یہی وجہ ہے کہ روز افزوں بت پرستی سے متاثر ہو کر جین مت اور بدھ مت نے بھی بت پرستی کو اپنے مذہب کا جزو قرار دیا اور اپنی ترقی اور استحکام کا ذریعہ سمجھا اور عبادات کے طریقوں میں سحر و اوہام داخل کر لیے۔[99] ادھر ہندوؤں نے بدھ کو وشنو کا نواں اوتار مان لیا' اور بدھ عوام کی نظروں میں مقبولیت حاصل کی یہاں تک کہ دونوں مذاہب میں اس قدر یک رنگی پیدا ہو گئی کہ بدھ اور ہندو دونوں میں تمیز کرنا مشکل ہو گیا۔[100]

چین

چین کی تہذیب اور اس کا تمدن اتنا قدیم ہے کہ صحیح معنوں میں اس کے آغاز کا تعین اب تک نہیں ہو سکا۔[101] چین کے تاریخی دور کی ابتدا، جیسا کہ کہا جاتا ہے یاؤ (YAO) کے زمانہ (۲۰۸۵ء تا ۲۰۰۴ء ق م) سے ہوئی۔[102] اس کے بعد بتدریج شون (SHONE) ہیا (HAIA)، شانگ (SHANG) اور اینگ کے خاندان برسرِ اقتدار آئے۔[103] پھر طوائف الملوکی کا طویل دور شروع ہوا جو ہان (HAN) خاندان کی حکومت کے قیام تک جاری رہا۔ ہان کا پہلا فرمانروا کوٹی (KAO-TI) تھا۔[104] اس کے زمانے میں ملک کی علمی و سیاسی قوت نے فروغ پایا۔ اس خانوادہ کو تیسری صدی عیسوی تک حکومت کا موقع ملا۔ لیکن آغاز سے کچھ ہی عرصہ بعد ضعف و انحطاط کا عمل جاری ہو گیا تھا۔ رفتہ رفتہ خانہ جنگیاں' بغاوتیں اور دوسرے فتنے بڑھ گئے یہاں تک کہ ایک فوجی سردار نے بغاوت کر کے ۲۲۱ء میں اس کا خاتمہ کر دیا۔[105] اس کی وجہ سے اندرونی خلفشار اور افراتفری مزید بڑھ گئی اور صورتِ حال اس حد تک خراب ہو گئی کہ چالیس سال سے زائد عرصہ تک تختِ شاہی خالی رہا اور کوئی حکومت وہاں قایم نہ ہو سکی۔ آخر کار ۲۶۵ء میں خاندان شی چیو (SHEE-CHEU) نے حالات پر قابو پایا اور اپنی بساط اقتدار کو چھٹی صدی عیسوی تک پھیلا دیا۔[106] بظاہر حکومت و سیادت کا یہ ایک طویل عرصہ ہے لیکن فی الحقیقت چین کی تاریخ میں اسے کوئی اہمیت حاصل نہیں۔ کیونکہ ساڑھے تین سو سال کا یہ دور سخت انتشار و اضطراب سے عبارت ہے[107] اور طوائف الملوکی سے مختلف نہیں ہے۔ بہرحال عرصۂ دراز کے افتراق کے بعد ۵۸۹ء میں سوئی (SUI) خاندان سریر آرائے سلطنت ہوا۔ تو کچھ مدت کے لیے ملک کے حالات سدھر گئے۔ اس کے باشندوں کو امن و امان میسر آیا اور ایک گونہ سیاسی اتحاد قائم ہونے کے علاوہ ملک کا وقار بھی بلند ہوا۔ مگر ۶۱۸ء میں یعنی ہجرتِ نبویؐ سے چار سال پہلے سوئی خاندان کو تانگ خاندان کے لیے جگہ خالی کرنا پڑی۔[108] تانگ کا دور ۶۱۸ء سے ۹۰۶ء تک رہا۔[109]

اس تفصیل سے یہ واضح ہے کہ حضور کی بعثت کے وقت چین میں سوئی خاندان مسندِ اقتدار پر فائز تھا اور تانگ خاندان نے اس وقت زمامِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی جبکہ رسول اللہ کی بعثت کو آٹھ سال ہو چکے تھے اور آپ قریش کے معاشی و معاشرتی مقاطعہ کا سامنا کر رہے تھے۔ تانگ کا دورِ حکومت بہت طویل رہا۔ اس کا دوسرا فرمانروا تائی شنگ (TAI TSUNG) تھا۔[110] اس نے ۶۲۷ء سے ۶۴۹ء تک حکومت کی۔[111] اسی کے زمانے میں حضورؐ نے رحلت فرمائی اور خود جب وہ مرا تو اس وقت حضرت عثمانؓ

تختِ خلافت پر متمکن تھے۔[۱۱۲] بہرحال مجموعی طور پر یہ کہنا چاہیے کہ خاندان تانگ سے چین کی سیاست میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ مزید برآں چین نے بت پرستی، کنفیوشس ازم اور بدھ مت کے عروج و زوال اور نسطوری و مانوی مذہب کے بعد اسلام کا جلوہ بھی اسی دور میں دیکھا۔[۱۱۳]

روم، ایران اور ہندوستان کی طرح چین میں بھی آمریت اور مطلق العنانیت کا دور دورہ تھا۔ ان کی حکومت شخصی، استبدادی اور موروثی تھی۔ بادشاہ ان کا فرمانروائے مطلق تھا۔ اسی کو تمام اختیارات حاصل تھے۔ اس کا حکم قانون تھا اور اس کا ایوان ملک کی سب سے بڑی عدالت تھی۔ اہلِ چین اپنے بادشاہ کو "شہنشاہ فرزند آسمان" کہتے تھے کیونکہ ان کا عقیدہ تھا کہ آسمان نر ہے اور زمین مادہ۔ اور کائنات کو انھیں دونوں نے جنم دیا ہے اور شہنشاہ خطا اوّل زمین و آسمان کے جوڑے کی پہلی اولاد ہے۔[۱۱۴] اسی بنا پر شاہِ وقت کو قوم کا تنہا باپ تصور کیا جاتا تھا۔ اس کو حق تھا کہ جو چاہے کرے۔ لوگ اس سے کہتے تھے کہ "آپ ہی قوم کے مائی باپ ہیں۔"[۱۱۵] لیکن اوپر کے سیاسی جائزہ سے یہ عجیب بات سامنے آتی ہے کہ اتنی سخت شاہ پرستی کے باوجود بعثتِ نبویؐ سے قبل چین میں سلطنت کو استحکام حاصل نہیں ہو سکا۔ خانہ جنگیاں معمول بن چکی تھیں اور بیرونی حملہ آوروں نے پورے نظامِ سیاست کو برباد کر رکھا تھا۔

دوسرے ممالک

عرب کا مطالعہ تو ہم آیندہ صفحات میں کریں گے۔ یہاں ہم مختصراً دنیا کے بعض دوسرے ممالک کی سیاسی و تمدنی کیفیت پر بھی ایک نظر ڈالنا چاہتے ہیں تاکہ دنیا کے سیاسی نظام کی مکمل تصویر ہمارے سامنے آجائے۔ البتہ یہ بات نہ بھولنی چاہیے کہ اب تک ہم جن ممالک کا جائزہ لے چکے ہیں ان کے علاوہ دوسرے ممالک کے بارے میں تفصیلات بہت کم ملتی ہیں مثلاً کمبوڈیا کے بارے میں صرف اتنا پتا چلتا ہے کہ بعثتِ رسولؐ کے وقت وہاں کھمیر خاندان کی حکومت تھی جو ۶۰۰ء سے ۱۳۰۰ء تک قائم رہی۔ مصر کی تاریخ اگرچہ بہت قدیم ہے لیکن ملکۂ قلوپطرہ کے انتقال (۳۰ ق م) کے بعد سے آغازِ اسلام تک مصر کی حیثیت سلطنت رومہ کے ایک صوبہ کی رہی۔ یہی صورت رسول اللہؐ کی ولادت اور بعثت کے وقت تھی۔ قیصرِ روم کی طرف سے مقرر کردہ مصر کا گورنر اسکندریہ میں رہتا تھا۔ مقوقس بھی مصر کا گورنر ہی تھا جسے رسول اللہؐ نے نامۂ مبارک بھیجا تھا۔ حبشہ بھی اس وقت سلطنتِ رومہ کے زیرِ اثر تھا پہلی صدی عیسوی میں جب یمن میں حمیر خاندان کی حکومت قائم ہوئی تو حبشہ کے باشندوں نے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا اور اکسوم کو اپنا دار الحکومت قرار دیا۔ اس وقت سے یہاں بھی عیسائیت کو قبول کر لیا گیا۔ چنانچہ رسول اللہؐ کی ولادت اور بعثت کے وقت یہاں عیسائیت رائج تھی اور یہاں کے بادشاہ کو نجاشی کہتے تھے۔[۱۱۶] دنیا کے دوسرے ممالک کی طرح اسپین کی سیاسی حالت بھی اس زمانے میں ابتر تھی۔ وہ رومی حکومت کے زوال کے بعد سے وحشی اقوام کی گزرگاہ بن گیا تھا یہاں پہلے گاتھ فرمانروا ہوئے پھر ونڈال آئے اور پھر دوبارہ گاتھ قوم حکمران ہوئی۔ گاتھ قوم کا سیاسی نظام شاہی کونسل اور مذہبی کونسل کے اشتراک سے رُو بہ عمل آیا۔ راہب اور پادری ہر وقت اپنے اپنے اقتدار کی فکر میں رہتے تھے۔ سیاسی

رسہ کشی اور معیشت و معاشرت میں ابتری عام تھی۔[117] ابنِ خلدون کے بیان کے مطابق اسپین کے ملوک میں سے شیشوط رسول اللہؐ کا ہمعصر تھا۔[118] جزائر برطانیہ میں رسول اللہؐ کی ولادت سے ایک صدی قبل تین قبیلے اینگل، سیکسن اور جوٹ، جٹ لینڈ اور جرمنی کے شمالی علاقے سے آکر انگلینڈ پر قابض ہو گئے تھے۔ یہی قبیلے انگریزوں کے مورثِ اعلیٰ ہیں اور تاریخ میں اینگلو سیکسن کہلاتے ہیں۔ رسولؐ اللہ کی بعثت کے وقت جزائر برطانیہ متعدد آزاد ریاستوں میں منقسم تھا جن پر مختلف بادشاہ حکومت کرتے تھے۔[119] رسولؐ اللہ کی ولادت کے وقت قبیلہ جوٹ کا فرمانروا ایتھلبرٹ تھا۔ ۶۱۶ء میں وہ مرگیا تو اینگل کے ایڈون نے اقتدار سنبھالا تاہم ملک میں نہ تو کوئی مرکزیت قائم ہو سکی اور نہ تہذیب و تمدن نے کوئی خاص ترقی حاصل کی۔ سیاسی، اخلاقی اور روحانی پستی پورے ملک میں تھی۔ باقی یورپ تمدن سے قطعاً نا آشنا تھا۔ وحشی اور غیر مہذب قبائل براعظم کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے تھے۔ اب جہاں تک مشرق اور وسط ایشیا کی دوسری قوموں کا تعلق ہے تو ان کا حال بُرا تھا۔ نہ کوئی علمی دولت ان کے پاس تھی نہ کوئی نظام سیاست ان کے ہاں موجود تھا۔ فی الحقیقت یہ قومیں (مغل، ترک، جاپانی وغیرہ) اپنے عبوری دور میں تھیں۔ جاہلانہ بت پرستی سے نکل کر تمدن کی طرف آرہی تھیں اور چند قومیں ایسی بھی تھیں جو اس وقت تک شہریت اور زندگی کی ابتدائی منزل میں تھیں اور عقلی و تمدنی حیثیت سے ان کا دور طفولیت تھا۔[120] اور وہ مغربی قومیں جو بالکل شمال و مغرب میں آباد تھیں جہالت و ناخواندگی کا شکار اور خونی جنگوں سے زار و نزار تھیں اور جنگ و جہالت کی پیدا کی ہوئی تاریکی میں ہاتھ پاؤں مار رہی تھیں۔ ان ممالک میں اب تک علم و تمدن کی صبح نمودار نہ ہوئی تھی۔[121]

عرب

اب ہم آخیر میں سرزمینِ عرب کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں کہ اس کا ہمارے موضوع سے براہِ راست تعلق ہے اور اس کا جائزہ لئے بغیر پیشِ نظر ریاست کے نشوو ارتقا کو نہیں سمجھا جا سکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ عرب کی تہذیب اور اس کی تاریخ اتنی ہی پُرانی ہے جتنی قدیم کہ اس خطۂ ارضی پر انسانی آبادی کیونکہ اس خطہ کو امم سامیہ کا مسکن ہونے کا شرف حاصل ہے۔[122] یہ علاقہ مدتِ مدید سے مختلف اقوام و ملل کی آماجگاہ اور ان کے عروج و زوال کا امین رہا ہے۔ بقول سید سلیمان ندوی کہ "عرب کے ملک میں پانی کا دریا نہیں لیکن وہاں انسانوں کا دریا ہے۔ تاریخ نے چار بار اس دریا میں طوفان آتے دیکھا ہے۔ ایک مسیح سے ڈھائی یا تین ہزار برس پہلے جب یہاں سے قبائل کا سیلاب موجیں مارتا ہوا بابل و اسیریا، مصر اور فنیشیا (کنعان) میں پھیل گیا۔ اس سیلاب کا زور کم ہو رہا تھا کہ ۱۵۰۰ ق م میں ایک اور طوفان آدومی، موآبی اور مدیانی قبائل کا اٹھا اور پاس کے ملکوں میں پھیل گیا۔ لیکن اس کا دائرہ پہلے سے کم تھا۔ تیسری بار معینی، سبائی وغیرہ اُٹھے اور پھیلے، لیکن سب سے آخری طوفان جو پہلی صدی ہجری میں مسیح سے چھ سو برس بعد اُٹھا وہ سب سے زیادہ وسیع الاثر تھا۔ جو ایک طرف گنگا کے دہانے سے مل گیا اور دوسری طرف بحر محیط سے۔"[123]

قومِ نوح کی بربادی کے بعد عرب میں جو سب سے پہلی مقتدر اور حکمران جماعت ظہور پذیر ہوئی قرآن کی زبان میں اس کا

نام عاد ہے۔[۱۲۴] جس کا تعلق عرب مورخین کے نزدیک اُمم بائدہ (برباد ہوجانے والے قبائل) سے ہے[۱۲۵]۔ لیکن عاد محض ایک محدود مختصر قبیلہ نہ تھا بلکہ ایک عظیم الشان قوم تھی جو دنیا کی قدیم ترین تہذیب کی بانی تھی۔ ایشیا اور افریقہ کا کثیر حصّہ اس کے زور و قوت کا تماشہ گاہ تھا۔ بڑی بڑی عظیم الشان عمارتیں اس کے دستِ صنعت کا نتیجہ تھیں۔ اس لیے قرآن نے عرب کے لیے اسے عبرت و بصیرت کا ایک نمونہ بنا کر پیش کیا اور اس کی داستان بار بار دُہرائی۔[۱۲۶] عاد کی عظمت اور ترقی کا زمانہ ۲۲۰۰ ق م سے ۱۷۰۰ ق م تک ہے اور صالحین عاد کا وجود اس کے بعد بھی ابتدائے عہدِ مسیح تک باقی رہا ہے۔[۱۲۷] عاد کی مرکزی آبادی، عرب کے بہترین حصّہ یعنی یمن و حضرموت میں سواحل خلیج فارس سے حدودِ عراق تک پھیلی ہوئی تھی۔[۱۲۸] مرکزِ حکومت ملک یمن میں تھا لیکن خلیج فارس کے کنارے کنارے وہ عراق تک وسیع تھی۔[۱۲۹] عاد کی سیاسی تاریخ کی دو جولانگاہیں تھیں، ایک بیرونِ عرب اور دوسری اندرونِ عرب۔[۱۳۰] بیرونِ عرب ان کی حکومتیں پہلے مرحلہ میں (۲۰۰۰ تا ۱۹۰۰ ق م) بابل، مصر اور دیگر ممالک میں قائم ہوئیں۔[۱۳۱] اور دوسرے مرحلہ میں حضرموت سواحل خلیج فارس کے طول میں عراق تک عاد ثانیہ، عرب میں حجاز سے حدودِ سینا تک ثمود، یمامہ میں طسم وجدیس اور یمن میں اہلِ معین نے حکومتیں قایم کیں۔[۱۳۲] لیکن ہمیں باوجود کوشش کے یہ نہیں معلوم ہوسکا کہ ان کے اقتدار و نظمِ حکومت کی نوعیت کیا تھی۔

عاد کے بعد شہرت اور سیاسی جانشینی ثمود کو حاصل ہوئی۔[۱۳۳] ثمود عرب کے شمالی و مغربی علاقے پر قابض تھے جس کا نام اس زمانے میں وادی القریٰ تھا۔[۱۳۴] ثمود کے ملک کا دار الحکومت حجر تھا۔ یہ شہر اس قدیم راستہ پر واقع ہے جو حجاز سے شام کو جاتا ہے۔ اس قوم کے سیاسی حالات کا علم نہیں ہو سکا ہے لیکن اتنا معلوم ہے کہ یہ شمالی عرب کی ایک زبردست قوم تھی فنِ تعمیر میں عاد کی طرح اس کو بھی کمال حاصل تھا۔ پہاڑوں کو کاٹ کر مکان بنانا، پتھروں کی عمارات و مقابر تیار کرنا اس قوم کا خاص پیشہ تھا۔ یہ یادگاریں اب تک باقی ہیں۔ ان پر آرامی و ثمودی خط میں کتبے منقوش ہیں لیکن ان میں سے اکثر آرامی کتابت نبطی اقوام کی ہے جنھوں نے قبل مسیح و بعد اسی مقام پر حکومت قایم کی تھی۔[۱۳۵] ان کا زمانہ تقریباً ۱۸۰۰ ق م تا ۱۶۰۰ ق م تک ہے۔[۱۳۶] اس قوم کی اصلاح و تعلیم کے لیے حضرت صالح کو مبعوث کیا گیا تھا۔[۱۳۷] ثمود اولی کے جانشین اہلِ مدین ہوئے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۹۰۰ یا ۱۰۰۰ ق م میں اہلِ مدین جب بنی اسرائیل کے ہاتھ سے کلیتاً برباد ہو گئے تو ثمود ثانیہ نے پھر ایک بار سنبھالا لیا اور یہ وہی زمانہ ہے جس میں شاہ اشور نے شمالی عرب پر حملہ کر کے ثمود سے ۷۰۰ ق م میں خراج وصول کیا اس کے بعد ظہورِ مسیح سے پہلے انباط نے ثمود کو فتح کر لیا اس کے بعد جب رومیوں نے انباط پر حملہ کیا تو ثمود دشمنوں کے ساتھ ہو گئے اور اس خصوصیت سے تاریخ روم میں ثمود کا ذکر آیا۔ اسلام جب آیا تو ثمود کا نام و نشان نہ تھا۔ یہاں قبائل جہینہ، وبلی اور یہود اس وقت آباد تھے۔[۱۳۸]

اب جہاں تک دوسری قدیم ترین حکومتوں مثلاً معینی[۱۳۹]، سبائی[۱۴۰]، حمیری[۱۴۱] وغیرہ کا تعلق ہے جن کا غلبہ اور وجود ایک عرصہ تک قایم رہا تو ان کی تفصیلات کا جاننا اس وقت طوالت کا باعث اور غیر ضروری ہے۔ مختصر یہ کہ عرب کے سلسلہ میں ان قدیم تاریخی صداقتوں کا ذکر ہم نے اس لیے کیا ہے کہ کچھ باتیں بطور مقدمہ معلوم کر لی جائیں۔ یعنی:

(الف) عرب کا علاقہ ازمنۂ قدیم سے تہذیب و ثقافت کا گہوارہ رہا ہے اور اپنے ثقافتی اثرات اس نے دنیا کے دوسرے

حصوں تک منتقل کیے ہیں۔

(ب) اہلِ عرب ابتدا نے عہد تاریخ سے تمدّن وحضارت اور حکومت وسلطنت سے واقف رہے ہیں اور ان میں سیاست کا واضح تصور اور شعور موجود رہا ہے اور شاید اسی لیے مارگولیتھ کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ:

"کتبات سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ عرب میں منظم ریاستوں کا ایک سلسلہ نامعلوم زمانے سے چلا آرہا ہے۔"(۱۴۲)

مزید برآں وہاں کے حالات کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس علاقے سے "ایک منظم سیاسی تنظیم کی یادیں وابستہ ہیں جو اپنی روایات و رسوم رکھتی ہیں اور جن کے پیچھے ایک تاریخ موجود ہے۔"(۱۴۳)

(ج) عرب میں اگرچہ ریاستوں کا وجود قدیم ہے لیکن کسی زمانے میں بھی کوئی ایک ہمہ گیر، ملک گیر اور متحدہ ریاست عرب میں قائم نہیں ہوسکی (دنیا کے دوسرے بہت سے علاقوں کی طرح مثلاً یونان) اور نہ کبھی پورا عرب ایک پرچم تلے جمع ہوا۔ بہرصورت رفتہ رفتہ تمام قدیم حکومتیں تباہ و برباد ہوگئیں۔ البتہ ظہورِ اسلام سے کچھ پہلے، چند حکومتیں کسی نہ کسی شکل میں باقی تھیں۔ مثلاً:

(۱) حیرہ وعراق میں آلِ منذر (لخمیوں) کی موروثی حکومت تھی(۱۴۴) جو سلطنت فارس کے ماتحت تھی اور عرب وایران کے درمیان ایک طفیلی ریاست (BUFFER STATE) کی حیثیت سے قائم تھی۔ آلِ منذر نے ساسانی دور میں بڑی اہمیت حاصل کرلی تھی "اسی کے توسط سے ساسانی خاندان نے عربوں پر اپنی برتری ثابت کی اور اسی کے ذریعہ شام کے وسیع وشاداب علاقوں کو بار بار روندا۔ ساسانی خاندان سرحدی امور میں ان ہی پر تکیہ کرتا تھا۔ خصوصیت سے منذر اوّل اور منذر ثالث کے دور میں تو ساسانی خاندان نے لخمیوں کی نازبرداری بھی کی۔ انھیں بڑے بڑے انعامات سے نوازا اور ان کی فوجوں سے شام کی تباہی وبربادی میں کام لیا۔" اسی خاندان کے حکمران عمرو بن المنذر کے دورِ حکومت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ہوئی جبکہ اس کی حکومت کے ۸ سال، ۸ ماہ گزر چکے تھے(۱۴۵)۔ بروایت ابن خلدون اس کا جانشین شقیقہ قابوس اور اس کا جانشین منذر رہا اور اس کے بعد نعمان بن منذر برسرِ اقتدار آیا۔(۱۴۶) نعمان کی کل مدتِ حکومت ۲۲ سال ہے یعنی ۸ سال ہرمز کے زمانہ میں اور ۱۴ سال کسریٰ پرویز کے زمانہ میں۔ کسریٰ پرویز نے نعمان کو قتل کیا اور لخمی خاندان کا اقتدار ختم کیا۔ اور حیرہ اور اس کے ساتھ اس سارے علاقہ کو جہاں تک لخمی خاندان کی ردائے اقتدار پھیلی ہوئی تھی براہِ راست اپنے تسلط میں لے لیا۔ گویا نعمان ملوک حیرہ کا آخری بادشاہ اور خاندان لخم کا آخری تاجدار تھا۔(۱۴۷) اس کے بعد کسریٰ نے ایاس بن قبیصہ الطائی(۱۴۸) کو وہاں کا حاکم بنایا اور یوں حیرہ کی ریاست مرزبانانِ فارس کے قبضہ میں چلی گئی(۱۴۹) یہاں تک کہ مسلمانوں نے حیرہ کو فتح کیا۔(۱۵۰)

(۲) عرب کے شمال میں شام کی سرحد پر آلِ غسان (بنو جفنہ) کی حکومت قائم تھی اور مدتِ دراز سے چلی آرہی تھی اور جیسا کہ مشہور ہے کہ یہ ریاست انتداب روم کے ماتحت تھی "یہ اس زمانے کی بات ہے جب رومیوں اور ایرانیوں میں جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ قیصرِ روم نے اس اندیشہ سے کہ مبادا غسانی اہلِ فارس کی مدد کردیں، ان کے سردار ثعلبہ بن عمرو اور اس کے بھائی جزع بن عمرو کو بلایا اور ان سے اس بات پر معاہدہ کرلیا کہ اگر کوئی عرب قبیلہ غسان پر حملہ کرے گا تو قیصر ۴۰ ہزار رومی فوج

سکے ساتھ ان کی مدد کرے گا۔" اور اگر کوئی دشمن قیصرِ روم پر حملہ آور ہوگا تو غسّانی ۲۰ ہزار سپاہ کے ساتھ اس کی مدد کو پہنچیں گے۔[۱۵۱] چنانچہ اس معاہدہ سے غسّانیوں کی حکومت مضبوط و مستحکم ہوگئی اور ایک حکمران سے دوسرے حکمران کو ورثہ میں ملتی رہی۔[۱۵۲] ہمارے خیال میں ابن خلدون کا یہ بیان اس کی نوعیت کو اور واضح کر دیتا ہے کہ ملوک غسّان کی کل تعداد ۳۲ اور ان کی مدتِ حکومت تقریباً ۲۰۰ سال ہے۔[۱۵۳] ان کا مرکزِ حکومت بصری تھا۔[۱۵۴] غساسنہ کے ایک حاکم "حارث بن ابی شمر" کے عہدِ حکومت میں بعثتِ نبویؐ ہوئی۔ یہ نعمان بن منذر حاکمِ حیرہ کا ہم عصر تھا اور ان دونوں میں کشمکش ہوتی رہتی تھی۔ غساسنہ کا آخری فرمانروا جبلہ بن ایہم تھا۔[۱۵۵]

آلِ غسّان کی تاریخ تمام تر ایران و روم کی تاریخ کا خلاصہ ہے اور اسی تعلّق سے غسّان ہمیشہ حیرہ کے بادشاہوں سے لڑتے رہتے تھے۔ ایرانیوں کے مقابلہ میں رومیوں کو اگر کبھی کامیابی ہوئی تو وُہ ہمیشہ غسّانیوں کی امداد کا ہی نتیجہ تھی اور خود رومی بھی شکرگزاری کے ساتھ اس نتیجہ کا احساس رکھتے تھے۔ علاوہ ازیں چھٹی صدی کی ابتدا سے رُبع صدی تک (۶۰۱ء تا ۶۲۵ء) مشرق و مغرب میں یا مجوسیت اور عیسائیت میں جو زور آزمائیاں ہوئیں ان سے غسّانیوں کی یہ چھوٹی سلطنت بھی مستثنیٰ نہ تھی۔ خسرو پرویز کی اولوالعزمیوں نے پندرہ برس میں دامنِ فرات سے وادیِ نیل اور ساحل باسفورس تک ہر جگہ خاک اڑا دی تھی پھر شام میں رومیوں کی شکست نے غسّانیوں کی بساط اُلٹ دی۔ رومی اپنی شہنشاہی کا تمام مشرقی حصہ کھو چکے تھے۔ آرمینیہ، شام، مصر، ایشیائے کوچک ہر جگہ صلیبی علم کے بجائے درفش کاویانی لہرا رہا تھا۔ ایرانی قسطنطنیہ کا محاصرہ کیے ہوئے پڑے تھے۔ ہرقل، قیصرِ روم قسطنطنیہ سے فرار کا سامان کر چکا تھا کہ دفعتہً ہوا کا رُخ بدل گیا[۱۵۶] اور کچھ ہی عرصہ میں قرآن کی یہ پیشگوئی پوری ہوگئی کہ:

الٓمٓ غلبت الروم فی ادنی الارض وھم من بعد غلبھم سیغلبون فی بضع سنین۔[۱۵۷]

(الٓم۔ رومی قریب کے ملک میں مغلوب ہوگئے وہ مغلوبی کے بعد عنقریب چند سالوں کے اندر غلبہ پالیں گے)

اور پھر یہی ہُوا کہ رومیوں نے ایک ایک کر کے اپنے تمام علاقے واپس لے لیے۔

بہرحال بعثت نبویؐ تک کا یہ مختصر سا تاریخی جائزہ ہماری اس بات کی تصدیق کرنے کے لیے کافی ہے کہ غسّانیوں کی حکومت رومیوں کے زیرِ سایہ تھی اور ان ہی کے مفاد کا تحفظ اس کا مقصدِ اولیں تھا۔ آلِ غسّان کی تاریخ میں ایک اور اہم بات یہ نظر آتی ہے کہ رومی نہ صرف یہ کہ ان کے بادشاہوں کو نامزد یا مقرر کر دیتے تھے بلکہ ان تاجداران بالاستقلال کے علاوہ اپنی طرف سے ایسے عامل و حاکم بھی مقرر کرتے تھے جو غالباً خود مختار حیثیت رکھتے تھے ممکن ہے بیک وقت دو قسم کے حکمرانوں کا تقرر کرنے سے ان کا مقصد یہ ہو کہ اگر ایک حکمران رومی مفادات کے تحفظ سے گریز کرے تو مقامی طور پر دُوسرے حکمرانوں کے ذریعہ اس کی سرکوبی کر دی جائے۔ چنانچہ "معان" میں بنو فاخرہ (بطن نفاثہ) کی ریاست تھی اور جب ان میں سے ایک شخص فروہ بن عمر بن الفاخرہ حکمران ہوا تو اس کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا نامۂ گرامی بھیجا تھا اس کے جواب میں اس نے اپنے قبولِ اسلام کی اطلاع حضور کو دی اور ایک سفید خچر بھی بطور ہدیہ ارسال کیا۔ قیصر نے یہ سُن کر

حارث بن ابی شمر غسانی کو اس کی گرفتاری کے لیے روانہ کیا۔ چنانچہ حارث نے اس کو گرفتار کیا اور فلسطین میں مصلوب کر دیا۔[158] اسی طرح ایک اور حاکم ابوجبلہ بن عبداللہ کو بھی رومیوں نے ہی مقرر کیا تھا۔[159] یہ وہی ابوجبلہ ہے جس سے مالک بن عجلان نے مدینہ کے یہود کے خلاف مدد مانگی تھی۔[160] اس سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ سرحدی حکومتیں عرب کے اندرونی علاقوں پر اپنے اثرات ڈالنے کے مواقع حاصل کرنے میں غفلت نہیں برتتی تھیں۔

(۳) بنو قضاعہ کی ایک اور حکومت بھی تھی جس کی باگ ڈور کلب بن وبرہ کے ہاتھ میں تھی۔ مگر زمامِ حکومت کبھی کبھی کندہ کی شاخ سکون کے ہاتھ میں چلی جاتی تھی۔ چنانچہ دُومۃ الجندل اور تبوک کے مقامات، بنوکلب کے قبضہ میں تھے اور وہ نصرانیت اختیار کر چکے تھے۔ ظہورِ اسلام میں دُومۃ الجندل کا حکمران اکیدر بن عبدالملک بن سکون تھا۔ یہ کندی تھا اور ان حکمرانوں کی ذریّت میں سے تھا جن کو ملوک تبابعہ نے بنوکلب کا حاکم مقرر کیا تھا اور اس کو خالد بن ولید گرفتار کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے تھے۔[161]

(۴) عمان قبیلہ دوس کا وطن اور ان کا جائے قرار تھا۔ ان کے بعد عمان کی حکومت ان کے بھائیوں بنو نصر زہران کی طرف منتقل ہو گئی۔ ظہورِ اسلام سے ذرا پہلے ان کا حکمران مستکبر بن مسعود بن جرار تھا۔ مگر ان میں سے جس نے اسلام کا زمانہ دیکھا وہ جیفر بن الجلندی اور اس کا بھائی عیاذ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کی طرف ایک مراسلہ بھیجا تھا جس پر انھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا اور رسولؐ اللہ نے ان کے علاقے پر عمرو بن العاص کو عامل مقرر فرمایا تھا۔[162]

(۵) ایک اور قدیم حکومت جو ولادتِ نبویؐ سے کچھ عرصہ پہلے ہی (امرأ القیس کے دورِ حکومت کے بعد) چھٹی صدی عیسوی کے وسط (وفات امرأ القیس ۵۶۰ء) میں پارہ پارہ ہو چکی تھی۔ "دولت کندہ" تھی۔[163] ان کا اصلی وطن تو غالباً یمن کے مشرقی حصہ میں تھا[164] اور ابتداءً یہ بنو حمیر کے ساتھ ملک و حکومت میں شریک تھے لیکن بعد میں زمامِ حکومت صرف بنو حمیر کے قبضہ میں آگئی تو یہ ان کے ماتحت رہے۔[165] ملوکِ یمن ان کے ساتھ رشتے ناطے کرتے رہے اور ان کو حجاز کے قبائل معد (بن عدنان) کا حاکم مقرر کرتے رہے۔[166] پھر جب بنو حمیر کی حکومت منقرض ہو گئی تو عرب بادیہ پر یہی لوگ یکے بعد دیگرے حکمران ہوئے۔[167] دولت کندہ کا آخری حکمران امرأ القیس تھا۔ یہ اپنے باپ حجر بن الحارث (م۔ ۵۵۰ء) کا بدلہ لینے اور امداد حاصل کرنے کے لیے قیصر روم کے پاس بھی پہنچا مگر اسی نے امرأ القیس کی زندگی کا چراغ بھی گل کرا دیا اور یوں دولت کندہ منقرض ہو گئی۔ شاہانِ کندہ کے بعد حکومت بنو جبلہ بن عدی بن ربیعہ کی طرف منتقل ہو گئی۔ اس خاندان میں سے قیس بن معدیکرب نے خاص شہرت حاصل کی۔[168]

(۶) حضرموت میں، خاندان حضرموت کے یہاں حکومت و ریاست عہد اسلام تک قائم رہی۔ ان میں سے ہی وائل بن حجر ہیں جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شرفِ ملاقات نصیب ہوا۔[169] جب وائل ۱۰ھ میں بنو کندہ کے وفد کے ساتھ رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو رسولؐ اللہ نے وائل کو حضرموت کی حکومت کا فرمان عطا فرمایا تھا۔[170]

(۷) یمن کی تاریخ انتہائی طویل اور قدیم ہے۔ مختصر یہ کہ یہ علاقہ بڑی بڑی تہذیبوں کا گہوارہ اور حکومت و سیاست کا مدتِ مدید تک مرکز رہا ہے۔ مختلف ادوار میں مختلف سلطنتیں یہاں قائم ہوئیں۔ چنانچہ پہلے مرحلہ میں دولت معینیہ قائم ہوئی (جو

اصلاً بابل سے تعلق رکھتی تھی مگر دولت حرابی کے بعد ہجرت کے نتیجہ میں قائم ہوئی۔[171] دوسرے مرحلہ میں دولت سبائیہ آتی ہے جس کا حقیقی دور ۸۰۰ ق م تا ۱۱۵ ق م ہے اور تیسرے مرحلہ میں دولتِ حمیریہ کا قیام ہوا اور جس کی مدتِ حکومت ۱۱۵ ق م سے ۵۲۵ء تک ہے۔

آخری سلطنت حمیر کے بھی دو حصے کیے جا سکتے ہیں:

(الف) پہلی صدی قبل مسیح سے تیسری صدی عیسوی کے اواخر تک حمیر کا طبقہ اول یا سبا کا طبقہ ثالث فرمانروائی کرتا رہا۔[172] اس حصہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس دور کے سلاطین کا لقب "ملک سبأ و ذوریدان" ہے نیز اس زمانے میں حمیر کا رقبہ حکومتِ یمن تک محدود تھا۔[173] اس مدت میں یہاں عموماً کواکب پرستی رائج تھی۔[174] معاصر حکومتوں میں ایک طرف حبش تھا تو دوسری طرف مصر و شام پر رومی اقتدار کا سکہ رواں تھا اور تیسری طرف ساسانی فارس میں حکومت کر رہے تھے۔

(ب) دوسرا دور تیسری صدی عیسوی کے اواخر سے ۵۲۵ء تک جاری رہا۔[175] لیکن اس دوران تقریباً ۳۴۰ء سے ۳۷۸ء تک اکسومیوں کی عارضی حکومت قائم رہی اور پھر ۵۲۵ء میں انھوں نے ہی دوبارہ حملہ کر کے سلطنت حمیر کا خاتمہ کر دیا اور اس طرح یمن و حضرموت پر ان کی حقیقی حکومت قائم ہو گئی۔[176] چنانچہ اس دور میں سلاطین کا لقب "ملک سبأ و ذوریدان و حضرموت" ہو گیا۔[177] کیونکہ اس دور میں رقبۂ حکومت حضرموت تک ممتد ہو گیا تھا۔ نیز اسی دور میں سلاطینِ حمیر میں سے بعض عیسائی اور اکثر یہودی المذہب تھے۔[178] ان سلاطین یعنی "ملک سبأ، ذوریدان و حضرموت" کو عرب مورخین "تبع" کہتے ہیں اور اسی کی جمع تبابعہ ہے۔ حبشی زبان میں اس کے معنی قادر و جبار اور صاحبِ قوت کے ہیں۔[179]

بہرحال حمیر کا آخری بادشاہ[180] "ذونواس"[181] تھا۔ اس کے دور کا خاص واقعہ یہ ہے کہ وہ یہودیت کے تعصب میں دیوانہ ہو گیا اور نجران کا محاصرہ کر کے شہر فتح کیا۔ بعد ازاں بڑے بڑے گڑھوں میں آگ دہکائی اور ایک ایک کر کے عیسائیوں کو بلوایا جس نے بھی یہودیت کو قبول کرنے سے انکار کیا اس کو نذرِ آتش کر دیا۔[182] قرآن میں "اصحاب الاخدود" کے نام سے اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔[183] ذونواس کی اس ظالمانہ حرکت نے اطراف کے تمام عیسائیوں کو بھڑکا دیا۔ چنانچہ دوس بن ثعلبان نامی یمن کے ایک عیسائی امیر نے نجاشی کے یہاں فریاد کی۔[184] نجاشی نے قیصر روم کے اشارہ سے یمن پر فوج کشی کی اور بالآخر ۵۲۵ء میں یمن کو فتح کر لیا۔

یمن کے فاتح اور پہلے حبشی حکمران کا نام مسلمان مورخین کے نزدیک "ارياط" ہے۔[185] ارياط کے خلاف "ابرہہ" نے قیادت کی اور اسے قتل کر کے خود اقتدار سنبھال لیا۔[186] ابرہہ کے دورِ حکومت کا سب سے بڑا اور عظیم الشان واقعہ یہ ہے کہ اس نے ہاتھیوں کی ایک بڑی فوج (اصحاب الفیل)[187] کے ساتھ مکہ پر چڑھائی کی اور خانہ کعبہ کو منہدم کرنا چاہا۔[188] مگر منزلِ مقصود پر پہنچنے سے پہلے ہی اسے خائب و خاسر اور ناکام لوٹنا پڑا۔ یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ اسی واقعہ کے کوئی چالیس روز بعد ۵۶۹ء میں پیغمبرِ اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت مبارکہ ہوئی۔[189]

ابرہہ کا جانشین اس کا بیٹا یکسوم اور پھر اس کا جانشین مسروق ہوا۔[190] اس دوران حالات خراب ہوئے اور اہلِ یمن

تکالیف و مصیبت میں گرفتار ہوئے تو ایک شخص جس کا نام سیف بن ذی یزن حمیری اور کنیت ابو مرۃ تھی۔ اپنی قوم کی طرف سے بادشاہ روم کے پاس فریادی ہوا اور حبشی حکمرانوں کی شکایت کی۔ مگر وہاں سے اسے مایوسی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔ تو پھر نعمان بن منذر عامل حیرہ کے توسط سے کسریٰ تک رسائی حاصل کی اور اس سے امداد کا خواہاں ہوا۔ (۱۹۱) کسریٰ نے غور و خوض اور مشاورت کے بعد مدد کا وعدہ کیا اور "وھرز" کی سرکردگی میں ایک لشکر یمن روانہ کر دیا جس نے مسروق کو قتل کر کے سیف بن ذی یزن کو حکمران کر دیا (۱۹۲) اور یمن کا علاقہ انتداب فارس کا ایمن بن گیا۔ (۱۹۴) سیف کے بعد کچھ عرصہ وھرز نے حکومت کی، پھر مرزبان مقرر ہونے لگے، چنانچہ بالترتیب ابن وھرز، نیلجان بن مرزبان اور باذان کسریٰ کی طرف سے ہی برسر اقتدار آئے تھے۔ باذان آخری گورنر ثابت ہوا کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت یہی باذان یمن کا گورنر تھا (۱۹۵) اور یہ حضورؐ کی صداقت سے متاثر ہو کر اسلام لے آیا تھا۔ اپنے اسلام کی اطلاع باذان نے حضورؐ کو دی تو آپؐ نے فرمایا:

انتم منّا و الینا اھل البیت۔ (۱۹۶)

(اب تم میری طرف منسوب ہو اور میرے اہل بیت ہو)

اب جہاں تک اہل یمن کے اجتماعی و سیاسی نظام کا تعلق ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک ریاست و مملکت "قصور" و "محافد" (۱۹۷) کے مجموعہ کا نام تھا۔ ہر قصر اور محفد کا ایک الگ مالک یا شیخ یا امیر ہوتا تھا۔ ہر محفد میں ایک ہیکل یا معبود کا ہونا بھی ضروری تھا کیونکہ اس علاقے یا قصر کی نسبت اس کے مالک یا اس کے معبود کی طرف ہی کی جاتی تھی۔

سربراہ ریاست "بادشاہ" (ملک) تھا (۱۹۸) جس کا حکم مطلق تھا، حکومت موروثی تھی، جو اس کے لڑکوں اور بھائیوں وغیرہ میں منتقل ہوتی چلی جاتی تھی (سوائے حضرموت کے جہاں حکومت اشراف (اوّل مولود) کی طرف منتقل ہوتی تھی) (۱۹۹)۔ بادشاہوں کے القاب و آداب مختلف ہوتے تھے۔ (۲۰۰)

اہل یمن نے ایسا سکہ بھی جاری کیا تھا جس پر بادشاہ کی صورت نقش ہوتی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ اس کا نام اور دار الضرب کا نام بھی کندہ ہوتا تھا۔ مختلف سیاسی و مذہبی اشکال و حروف اور رموز و اشارات بھی کندہ کرائے جاتے تھے۔ (۲۰۱)

یمنی معاشرہ چار عناصر سے مرکب تھا:

۱۔ فوجی

۲۔ کسان

۳۔ صنّاع اور کاریگر اور

۴۔ تجّار۔

ان میں سے ہر ایک طبقہ کے حقوق و فرائض اور حدود متعین تھے جن سے کوئی تجاوز نہیں کر سکتا تھا۔ (۲۰۲) بنیادی طور پر اہل یمن تجارت میں خصوصیت و شہرت عام رکھتے تھے۔ ان کی درآمد و برآمد کا سلسلہ برسہا برس سے قائم تھا اور تجارتی تعلقات اس وقت کی معلوم دنیا کے تمام حصوں سے برّی اور بحری دونوں طرح سے استوار تھے۔ (۲۰۳) اہل یمن تمدن و معاشرت اور حضارت ہر معاملہ میں عرب کے

دوسرے تمام حصّوں سے بہت آگے تھے وہ محلات، مکانات، قلعے، محافد اور ہیکل کے مالک تھے۔ ریشم اور حریر و دیبا کے قیمتی ملبوسات اور میوہ جات، مرغن غذائیں اور سونے چاندی کے بیشمار اقسام کے ظروف استعمال کرنا ان کے لیے غیر معمولی بات نہ تھی کہ وہ محض محاورتاً نہیں بلکہ واقعتاً سونے چاندی اور زر و جواہرات سے کھیلنے والے لوگ تھے۔"(۲۰۴)

اس تفصیل کے ساتھ ہی ہماری وُہ بحث مکمل ہو جاتی ہے جو عرب کا سیاسی جائزہ لیتے وقت ابتدا میں کی گئی تھی۔ یعنی پہلے درجہ میں ملوکیت اور بادشاہی کا رواج عرب کے متعدد علاقوں میں بہت مدت سے چلا آرہا تھا اور ظہورِ اسلام کے وقت بھی یہ بادشاہتیں اور حکومتیں کسی نہ کسی شکل میں موجود تھیں۔ یمن کے سلسلے میں ہم یہ بیان بھی کر چکے ہیں کہ ملوک بالاستقلال کے علاوہ اذواء اور اقیال کی خود مختار حکومتیں بھی قایم تھیں۔

بہرحال اب دوسرا پہلو یہ ہے کہ ان بادشاہتوں اور حکومتوں کے علاوہ دوسرے درجہ میں اعیانیت بھی عرب کے مختلف حصّوں میں مکمل یا نامکمل صورت میں موجود تھی۔ یعنی وہ رؤسائے قبائل جو اپنے قبیلوں کے امیر مانے جاتے تھے اور انہوں نے کہیں کہیں کسی حد تک خود مختار اور آزاد چھوٹی چھوٹی شہری مملکتیں قائم کر رکھی تھیں۔ چنانچہ "مکہ، مدینہ، ینبوع، جرش، عدن، صحار، دبی۔ یمامہ، دومۃ الجندل، فدک، ایلہ اور مشرقی ساحل پر اچھی خاصی بستیاں تھیں جو کم و بیش شہری مملکتیں کہی جا سکتی ہیں۔" (۲۰۵)

مگر ان میں سب سے زیادہ مشہور و معروف، اہم اور منظم ترین مکہ کی شہری مملکت (CITY STATE)(۲۰۶) تھی۔ جسے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جدِ امجد قصی بن کلاب نے مکہ پر قبضہ کر کے سنہ ۴۴۰ء میں قائم کیا تھا۔(۲۰۷) قصی بہت ہی جلد ایک مقبول حکمران بن گئے تھے حتیٰ کہ ابنِ سعد کے الفاظ میں "جس طرح مذہب کی پیروی کی جاتی ہے اہلِ مکہ اسی طرح قصی کے حکم کی پیروی کرتے تھے اور زندگی تو زندگی مرجانے کے بعد بھی ان کے حکم پر عمل ہوتا تھا۔(۲۰۸) قصی نے مملکت کے نظم و نسق کو بہترین حالت میں رکھنے کے لیے مختلف محکموں کو قایم کیا۔ پھر قصی کے بعد امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ ان میں اضافہ ہوتا رہا(۲۰۹)۔ بہرحال مجموعی طور پر اگر ان عہدوں کی فہرست مرتب کی جائے(۲۱۰) تو مندرجہ ذیل عہدوں کا پتا چلتا ہے:

۱ - حجابہ (خانہ کعبہ کی دربانی)

۲ - سقایہ (حاجیوں کو پانی پلانا)

۳ - رفادہ (حاجیوں کے لیے کھانے کا انتظام اور مالی بندوبست)

۴ - لواء (جھنڈا - جنگی عہدہ)

۵ - ندوہ (اجتماع گاہ - مشورت گاہ)

۶ - مشورہ (امورِ مہمہ میں مشورہ)

۷ - قیادہ (جنگ میں لشکر کی قیادت)

۸ - قبہ (شامیانہ - فوجی معسکر کا انتظام)

۹۔ اعنہ (گھوڑے کی لگام۔سواروں کے رسالے کی سپہ سالاری)
۱۰۔ اموال المحجرہ (بتوں کے چڑھاوے، نذرانے اور جائداد کا انتظام)
۱۱۔ الیسار و ازلام (بتوں سے استخارہ)
۱۲۔ اشناق (خون بہا، جرمانے اور مالی تاوان، دیت وغیرہ کا انتظام)
۱۳۔ حکومتہ (مقدمات کا فیصلہ وغیرہ)
۱۴۔ سفارہ (سفارت)
۱۵۔ عقاب (جھنڈا۔جنگ کے وقت نشان قومی کی علمبرداری)
۱۶۔ سدانہ (کعبہ کی دربانی، کلید برداری اور رکھوالی)
۱۸۔ افاضہ
۱۹۔ اجازہ
۲۰۔ نسئی (مہینے بدل دینا)
۲۱۔ حلوان النفر (بدلے میں دوسرا فوجی بھیج دینا۔جنگی عہدہ)

یہ تمام عہدے اگرچہ اپنی ایک اہمیت و حیثیت رکھتے تھے مگر ان سب میں اہم ترین اور قابلِ ذکر "ندوہ" تھا جسے یقیناً قصی نے ہی قائم کیا تھا[۲۱۱] دارالندوہ قریش کا منتدا، محلِ اجتماع سبھی کچھ تھا اور مکّہ کی سیاسی و معاشرتی اور تہذیبی و ثقافتی اور معاشی و تجارتی زندگی میں اس نے انتہائی موثر کردار ادا کیا۔قریش کے تمام معاملات اسی دارالندوہ میں طے پاتے تھے۔جنگ و صلح، ثقافتی وانتظامی امور اور دیگر پیش آمدہ معاملات میں مشورہ اسی عمارت میں ہوتا تھا۔حتّٰی کہ نکاح و بلوغ کا اعلان بھی اسی گھر سے ہوتا تھا۔[۲۱۲]

اپنی زندگی میں مذکورہ بالا تمام عہدوں میں ربط وارتباط اور ہم آہنگی کو قصی نے پوری طرح برقرار رکھا۔لیکن قصی کی وفات کے بعد ایک اعیانیت قایم ہوگئی[۲۱۳]۔کیونکہ اپنی وفات کے وقت اس نے اپنے سیاسی فرائض اپنے بیٹوں کو بانٹ دیے تھے اور وہ پھر کسی ایک فرد میں دوبارہ جمع نہ ہو سکے بلکہ منتشر ہی ہوتے چلے گئے۔[۲۱۴] اور ظہور اسلام تک یہی حال رہا۔تمام عہدے قریش کی مختلف شاخوں میں تقسیم تھے۔اس کی وجہ سے مختلف شاخوں کو مختلف دوسری بطون پر سیاسی و مذہبی برتری حاصل تھی۔خصوصاً تولیتِ کعبہ ایک ایسا معزز عہدہ تھا جس کی وجہ سے حامل عہدہ کی نہ صرف مکّہ بلکہ پورے عرب میں مذہبی و سیاسی برتری تسلیم کی جاتی تھی۔

بعثت نبویؐ کے وقت مکّہ میں صورت یہ تھی کہ کل چودہ عہدے باقی تھے اور یہ دس مختلف قبائل میں اس طرح تقسیم تھے کہ سقایہ بمعہ عمارہ بنو ہاشم، رفادہ بنو نوفل، لوأ ندوہ اور سدانہ بمعہ حجابہ بنو عبدالدار، مشورہ بنو اسد، عقاب بنو امیہ، اموال المحجرہ اور حکومتہ بنو سہم، الیسار و ازلام بنو جمح، اشناق بنو تیم، قبہ اور اعنہ بنو مخزوم اور سفارت کے عہدے

بنو عدی کے پاس تھے۔[۲۱۵] یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ اپنے طور پر ہر قبیلہ اپنے متعلقہ انتظامی شعبہ کا ذمہ دار تھا اور واقعہ یہ ہے کہ ہر ایک نے انتظامی حسن و کارکردگی کا ثبوت فراہم کر دیا تھا اور ان کی کارکردگی کے پیشِ نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اہلِ مکہ انتظامِ ریاست کا بڑی حد تک سلیقہ رکھتے تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ خودسری اور آپس کی چپقلش یا عصبیت کی بنا پر ان کے درمیان ارتباط و ہم آہنگی میں کمی تھی اور قبائلی و معاشرتی امتیازات ان کے اتحاد میں مانع تھے۔

بہرحال اب ہم تیسرے مرحلے میں عرب کی ایک تیسری سیاسی اکائی "قبائل" کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔ عرب کا سیاسی جائزہ لیا جائے تو یہ بات صاف نظر آئے گی کہ وہاں اگرچہ طوکیت، اعیانیت اور دوسری سیاسی تنصیبات وادارے موجود تھے لیکن بنیادی طور پر "قبائل" کا نظم ان سب ادارات پر حاوی تھا۔ گویا حکومت سے زیادہ فرد اور قبیلہ کو اہمیت حاصل تھی۔

پورے ملک میں چھوٹے بڑے سیکڑوں قبائل آباد تھے۔ ہر قبیلہ آزاد و خود مختار تھا۔ اس کی بنیاد خون کے رشتوں پر تھی۔ اسی لیے حسب و نسب بہت اہمیت رکھتے تھے۔ ہر قبیلہ کا ایک سردار ہوتا تھا جو شیخ کہلاتا تھا۔ سرداری کے لیے باہم رقابت بھی ہو جاتی تھی۔ قبیلہ کی سرداری اور سیاست کے لیے چند شرائط کا ہونا اکثر ضروری سمجھا جاتا تھا۔ مگر کبھی کبھی اس سے گریز بھی کر لیا جاتا تھا۔[۲۱۶] مزید برآں ہر قبیلہ کے نزدیک بعض شرائط و صفات لازمی درجہ رکھتی تھیں تو دوسروں کے نزدیک وہی صفات اضافی حیثیت کی مالک تھیں۔ مثلاً مضر کے نزدیک "صاحب رائے" آدمی کا ہونا ضروری تھا۔ ربیعہ سیادت کے لیے ایسے لوگوں کو پسند کرتے تھے جو لوگوں کو کھانا کھلائے جبکہ اہلِ یمن کے یہاں اصل معیار "حسب و نسب" تھا۔[۲۱۷] لیکن اس بات پر بہرحال سب کا اتفاق تھا کہ ایک شیخ قبیلہ کو خصوصیات و فضائل عرب سے ضرور متصف ہونا چاہیے۔ یعنی سخاوت، شجاعت و بہادری، صبر و استقلال، حلم، تواضع، قادر الکلامی اور قوتِ بیان۔ نیز کبر سنی، عطا و بخشش، عقلمندی، کثرتِ تعداد اور تونگری وغیرہ۔[۲۱۸]

عرب چونکہ جمہوری مذاق رکھتے تھے اس لیے قبیلہ کا سردار اہلِ قبیلہ میں سے منتخب کر لیتے تھے اور جمہوری اصول کے مطابق وہی اس منصب کا اہل ہو سکتا تھا جسے عمر، عزت، اولاد، مال اور قابلیت کے علاوہ عرب کی فطری خصوصیات میں دوسروں پر تفوق حاصل ہو اور جس کے حامی سب سے زیادہ ہوں۔ کبھی کبھی اگر ان ہی خصوصیات کا حامل کسی سردار کا لڑکا ہوتا تو اسے بھی سرداری موروثی طور پر مل جاتی تھی۔

ایک شیخ قبیلہ یا کبیر کو اہلِ قبیلہ پر اختیار حاصل تھا اور وہ امور سیاسی و انتظامی کے علاوہ قانونی معاملات میں بھی مختار تھا۔ وہی قانون بناتا، یا پہلے سے بنے ہوئے قوانین یا شریعت سے اخذ کر کے ان کا نفاذ کرتا اور قانون کی خلاف کی صورت میں جرمانہ اور سزا (مثلاً مکوں یا سلاخ کی ضربیں) بھی دے سکتا تھا۔[۲۱۹] سرداروں کو قبیلہ میں حقوق کے اعتبار سے کوئی خاص امتیاز حاصل نہ تھا لیکن اس کے برعکس ان کے فرائض سب سے زیادہ تھے ان کا سب سے بڑا فریضہ قبیلہ میں اتحاد و یکجہتی کا قائم رکھنا تھا۔ قبیلہ کے معاملات اجتماعی طور پر باہم مشاورت کے ذریعہ بھی طے کیے جاتے تھے۔[۲۲۰]

ہر قبیلہ میں ہر دس آدمیوں پر ایک عریف اور ہر ایک سو پر ایک قائد یا نقیب ہوتا تھا۔ قبیلہ میں بطن، فخذ،

شعب وغیرہ کی شاخ در شاخ تنظیم و تقسیم پائی جاتی تھی۔[۲۲۱] موالی بنانے اور قبائل کو حلیف بنانے کا طریقہ رائج تھا۔ کسی قبیلہ کے خلاف کوئی بیرونی حاکم اصولی طور پر کسی طرح کا اختیارِ سماعت نہ رکھتا تھا۔ بعض قوی قبیلے کمزور قبیلوں کو زیر کر کے ان سے خراج وصول کرتے تھے۔ قبائل پر بیرونی اثرات بھی ہوتے تھے۔ مگر ایک بہترین قبیلہ بیرونی اثر سے بالکل آزاد ہوتا تھا۔

شہروں میں جتنے محلے یعنی قبائلی آبادیاں تھیں اتنی ہی مجالس محلہ بھی تھیں، جن کو "نادی" کہا جاتا تھا۔ ان نادیوں یا قبائل کی مجلس محلہ میں ہی اجنبیوں کو معاہدے کے ذریعہ مولا یعنی فرد خاندان بنانے کی رسم ادا کی جاتی تھی اور کسی فرد یا خاندان سے طرد و خلع وغیرہ کرنے کا اعلان بھی وہیں سے کیا جاتا تھا۔ شبانہ قصہ گوئی، انتظامی تجارتی معاملات، کاروانوں کی آمد و رفت وغیرہ قبائلی نادیوں سے ہوتی تھی۔[۲۲۲] علاوہ ازیں ہر قبیلہ میں چند مناصب یا کچھ اہم اور ذمہ دار اشخاص بھی ہوتے تھے۔[۲۲۳] مثلاً:

۱۔ نقیب: جسے منادی یا موذن کہتے تھے۔ جس کا کام یہ ہوتا تھا کہ مجالس کے انعقاد کا ڈھنڈورا پیٹے۔ اس کے علاوہ ہر قبیلہ کے سردار کے پاس اپنے خصوصی منادی بھی ہوا کرتے تھے کسی تقریب یا دعوت کا بلاوا یا کسی خاندان یا فرد کے طرد و خلع کی اطلاع دوسرے محلّوں کو کرنا بھی ان ہی سے متعلق تھا۔[۲۲۴]

۲۔ عریف: قبیلے اور محلے کا منتظم۔ تمام امور کا انتظام اسی کے ذمہ ہوتا تھا۔ اہم لوگوں کے حالات اسی سے دریافت کیے جاتے تھے۔[۲۲۵]

۳۔ رائد: عرب کے ہر قبیلے کا ایک رائد ہوتا تھا جسے زمینوں اور پانیوں وغیرہ کے حالات سے تجربہ و واقفیت ہوتی تھی۔ وہی پانی اور گھاس کی تلاش میں اپنی قوم سے پہلے جاتا تھا تاکہ اس کی قوم وہاں پہنچ کر اطمینان سے اتر سکے۔[۲۲۶]

۴۔ شاعر: عربوں کے یہاں ایک رسم یہ بھی تھی کہ جب ان کے کسی قبیلے میں شاعر کا ظہور ہوتا تو دیگر قبائل آکر مبارکباد دیتے پھر دعوت ہوتی اور مجلس رقص و سرور جمتی، گویا شادی کی تقریب ہے پھر ایک دوسرے کو مبارک سلامت کہتے اور بشارت دیتے تھے کیونکہ شاعر:

(الف) ان کی عزتوں کا بچانے والا۔

(ب) ان کے حسب و نسب کا دفاع کرنے والا۔

(ج) ان کے کارناموں کو ہمیشگی اور دوام بخشنے والا۔ اور

(د) ان کی شہرت کو بلند کرنے والا ہوتا تھا۔

نیز یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ عرب صرف تین مواقع پر ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے تھے ایک لڑکے کی پیدائش پر، دوسرے گھوڑے کے بچہ جننے پر اور تیسرے شاعر کے ظاہر ہونے پر۔[۲۲۷]

۵۔ خطیب: ہر قبیلے میں ہوتا تھا۔[۲۲۸]

۶۔ نساب: کوئی قبیلہ ایسا نہ تھا جس میں کوئی ایسا نسب دان نہ ہو جو فرع کو اصل سے ملا دے اور ایسے لوگوں کو باہر نہ نکال دے جو قبیلے میں سے نہ ہوں۔[۲۲۹]

۷۔ منصف یا حاکم: ہر قبیلے کا ایک منصف ہوتا تھا جس کے پاس وُہ اپنے مقدمات لے کر جاتے تھے۔ ان کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ ان کو شمار نہیں کیا جا سکتا۔[۲۳۰] بعض اوقات منصف کو مقبولیت حاصل ہو جاتی تھی اور اپنی قابلیت و اہلیت کی بناء پر وہ دُوسروں کے لیے بھی واجب التسلیم بن جاتا تھا۔ اور ان پر بھی اس کا حکم نافذ ہوتا تھا۔ مشہور حکّام میں اکثم بن صیفی بن رباح (بنی تمیم)، حاجب بن زرارہ، اقرع بن حابس، ربیعہ بن مخاشن، ضمرہ بن ضمرہ (بنی تمیم)، عامر بن الظرب العدوانی (قیس)، غیلان بن سلمہ ثقفی (قیس) اور ابو طالب بن عبدالمطلب (قریش) وغیرہ شامل ہیں۔[۲۳۱] اور دلچسپ بات یہ ہے کہ منصف و حاکم کے منصب پر نہ صرف مرد بلکہ عورتیں بھی متمکن تھیں چنانچہ حکیمات العرب میں سے ہند بنت الخس الایادی، خمعہ بنت حابس الایادی، صحر بنت لقمان، خصیلہ بنت عامر بن الظرب العدوانی اور حذام بنت الریان مشہور ہیں۔[۲۳۲] لیکن تعجب خیز امر یہ ہے کہ عرب میں بے شمار منصف اور حاکم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہونے کے باوجود وہاں کے معاشرہ میں عدل قائم نہیں ہو سکا۔ بلکہ دنیا کے دوسرے تمام معاشروں کی طرح ظلم و عدوان کا پرچم وہاں بھی انتہائی بلندی پر لہراتا رہا۔ علاوہ ازیں قاتل یا مجرم کو بجائے اس کے کہ کوئی ریاست یا قوتِ قاہرہ مناسب سزا دیتی، ثار و انتقام کے ذریعہ عداوت و نفرت کی آگ اور ظلم و تعدی کے سلسلے کو اور دراز کر دیا جاتا تھا۔

اب آخر میں اہلِ عرب کے ایک ایسے ادارہ کا سیاسی پہلو بھی دیکھ لینا چاہیے جو بنیادی طور پر معاشی و اقتصادی مقاصد رکھتا تھا یعنی وہ مجامع، بازار اور میلے جو عرب کے مختلف حصّوں میں سال بھر تک جاری و ساری رہتے تھے۔ بڑے بڑے بازار (اسواق) عرب کے تیرہ مقامات (یعنی دومۃ الجندل، مشقر، صحار، دبیٰ، شجرہ، عدن، صنعا، حضرموت، عکاظ، ذوالمجاز، منیٰ، خیبر اور یمامہ) پر لگا کرتے تھے۔[۲۳۳] سیاسی طور پر ان کی اہمیت اس لیے معلوم ہوتی ہے کہ یہی وہ مواقع تھے جہاں ایک ہی وقت میں بہت سے قبائل جمع ہوتے تھے۔ آپس کے معاملات کو طے کرتے، باہمی خون کے مقدمات، سرداروں کے اختلافات، مقدمات کے فیصلے وغیرہ کو شہرت یہیں حاصل ہوتی تھی۔ اس اعتبار سے ان مجامع کو ایک قسم کی بین القبائلی عدالت (INTER-TRIBAL COURT) کا نام دیا جا سکتا ہے۔

ان اسواق و مجامع میں سب سے زیادہ اہم اور ایام جاہلیت کا سب سے بڑا بازار "عکاظ" تھا۔ یہاں قریش، ہوازن، غطفان، خزاعہ، حارث، ابن عبد مناف، عضل، مصطلق وغیرہ جمع ہوتے تھے۔[۲۳۴] اس میں حسب تذکرہ امور کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوتا تھا مثلاً اس بازار کو اہل عرب کی لیاقت کی امتحان گاہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ جو شخص جس فن میں قابل ہوتا تسلیم کر لیا جاتا اور پھر اس کے ذریعہ تمام ملک میں اس کی شہرت ہو جاتی تھی۔" شعرا اپنے قصائد یہیں سناتے تھے، خطبا تقریریں کرتے تھے، حکام اپنے فیصلے سناتے تھے اور شیوخ معاہدہ کی دفعات طے کرتے تھے۔[۲۳۵] ان بازاروں کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ ان بازاروں نے پُورے عرب میں جغرافیائی اور معاشی مشکلات کے باوجود نہ صرف یہ کہ ایک معاشی وفاق قائم کر دیا تھا بلکہ اس وفاق کی بدولت آئندہ کے لیے سیاسی وفاق کی راہ بھی ہموار کر دی۔

مجموعی طور پر عرب کی پوری آبادی بدوی اور حضری میں منقسم تھی۔ شہروں میں رہنے والوں کو حضری اور صحراؤں میں بسنے والوں کو خانہ بدوش یا بدوی کہا جاتا تھا اور مستقل سیاسی زندگی اور سیاسی طور پر اہمیت فی الواقعہ حضری آبادی کو ہی حاصل تھی۔ بعض اوقات یہ دلچسپ صورتِ حال بھی دیکھنے میں آتی ہے کہ ایک ہی قبیلے میں بیک وقت بدوی اور حضری آبادی پائی جاتی تھی یعنی قبیلہ کے کچھ لوگ تو خانہ بدوشانہ یا بدویانہ زندگی گزارتے تھے تو کچھ بستیوں میں مستقل قیام کر کے حضری زندگی گزارتے تھے۔[۲۳۶]

حضری باشندوں کا ایک مستقل مقام اور مسکن تھا اور چونکہ عرب کے مختلف حصے تہذیب و تمدّن کے لحاظ سے مختلف تھے اس لیے ان کے شہری رواج و رسوم اور عادات و اطوار میں بھی اختلاف پایا جاتا تھا۔ صنعت و حرفت، تجارت و زراعت، نظم و حکومت اور ریاست و مملکت کے مراکز "حضری آبادی" میں ہی پائے جاتے تھے۔

اہلِ عرب میں سے بڑی تعداد بدویانہ طریقِ زندگی کو اپنائے ہوئے تھی۔ ان کا نہ تو کوئی مسکن تھا نہ مرکز۔ یہ لوگ خیموں میں رہا کرتے تھے اور زیادہ تر ان کے پڑاؤ ریگستان کے کنارے شاداب مقامات پر ہوا کرتے تھے۔[۲۳۷] لیکن یہ سرسبزی و شادابی چونکہ عارضی ہوتی تھی اس لیے ان کا قیام بھی مختصر ہوتا تھا۔ بدویوں کا گزارا اکثر مویشیوں کے گوشت اور دودھ پر تھا نیز ان کی معاش کا ایک ذریعہ لُوٹ مار بھی تھا جس کو وہ اپنا حق سمجھتے تھے۔ ان کی عزیز ترین چیز اونٹ تھی۔ فی الحقیقت اونٹ کے بغیر بدویت کا تصور ہی محال ہے۔ اونٹ ان کا سب کچھ تھا۔[۲۳۸] ایک جگہ جم کر نہ رہنے کی وجہ سے بدوی تجارت، زراعت، صنعت و حرفت اور تمدن و سیاست سے بے نیاز اور بیگانہ تھے بلکہ انھیں ایسے کاموں سے نفرت تھی اور انھیں اپنی آزادی اور حریت کے منافی سمجھتے تھے۔[۲۳۹]

ہمارے خیال میں عرب اور اہلِ عرب کے سیاسی میلانات و رجحانات کا یہ جائزہ ہمارے آئندہ مطالعہ کے لحاظ سے کافی ہے۔ اس جائزہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عرب میں اس وقت نہ تو کوئی منظم اور ہمہ گیر ریاست قائم تھی، نہ ان میں اتحاد، یک جہتی اور قومیت کا تصور تھا بلکہ اس کی جگہ مذہبی، اخلاقی، روحانی اور بالخصوص سیاسی دائرہ میں سخت انتشار و تشتت، افراتفری، لامرکزیت تھی اور نزاع کا دور دورہ تھا۔ اب ہم یہ مطالعہ کریں گے کہ رسول اللہ نے اپنے جہد و عمل سے ان حالات کو کس حد تک منقلب کیا اور ان حالات میں کس طرح ایک ریاست کو قائم کر کے اسے نشو و ارتقاء کی بلندیوں سے ہمکنار کیا۔

باب دوم

تاسیسِ ریاست

(۱) ریاست کی فکری بنیادیں

پچھلے مباحث میں دنیا کے مختلف علاقوں کی صورتِ حال کا عموماً اور عرب کے حالات کا خصوصاً جائزہ لینے سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ چھٹی اور ساتویں صدی عیسوی کا زمانہ ایک ایسا پُر آشوب دَور تھا جبکہ عالمِ انسانی کا نظامِ فکر و عمل مجموعی طور پر منتشر اور پراگندہ تھا۔ معاشرہ کی اخلاقی و روحانی قدریں پامال ہو چکی تھیں۔ ہیئت اجتماعیہ کا سیاسی مزاج بگڑ گیا تھا۔ آئین سیاست کی بنیاد عدل و انصاف کے بجائے مطلق العنانی، آمریت، استبداد، ظلم و جبر، فتنہ و فساد اور کُشت و خون پر قایم تھی۔ سلطنت کا تمام تر استحکام طاقت پر تھا اور سیاست کا کمال یہ سمجھا جاتا تھا کہ مخالف کو تمام اختیارات سے محروم کر دیا جائے۔ مختصر یہ کہ نسل آدم تباہ کن ذہنی و سیاسی خلفشار میں مبتلا تھی اور نقشۂ حیات زیر و زبر ہو چکا تھا۔

دوسری طرف جزیرہ نمائے عرب کا حال تو اور گیا گزرا تھا۔ وہ ایک ایسی سرزمین تھی جہاں نہ تو کوئی مرکزی حکومت تھی اور نہ ہی عرب معاشرہ کسی ایک بالاتر قوت و اختیار سے متعارف تھا۔ وہاں کے بسنے والے بے قید آزادی کے سوا اطاعت و انقیاد کی روش سے ناواقف تھے۔ اتحاد و یگانگت مفقود اور وحدتِ ملی پارہ پارہ تھی۔ ہر طرف انتشار اور قبائلی جنگوں کے غیر مختتم سلسلے جاری تھے۔ قبیلہ قبیلہ کے مقابل، طبقہ طبقہ کے مقابل اور فرد فرد کے مقابل کھڑا تھا اور ایک ناقابل علاج انفرادیت اہلِ عرب کے رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی۔ ان وجوہ سے عرب کو محض ایک جغرافیائی حد سے تعبیر کرنا اور محض ایک انسانی اجتماع کہنا غلط نہیں ہے۔

ان حالات میں یہ توقع بہت مشکل تھی کہ انسانیت کا کوئی ایسا نجات دہندہ بھی آئے گا جو دنیا کو غیر الٰہی حاکمیت، جبر و استبداد، ظلم اور مطلق العنانیت کے حلقہ ہائے تنگ سے آزاد کرے گا اور عرب جیسی سرزمین کے حالات بھی منقلب ہوں گے۔ یعنی ایک نئی زمین و آسمان کی از سرِ نو تخلیق ہوگی۔

مگر تاریخ بتاتی ہے کہ یہ بالکل غیر متوقع واقعہ بالآخر رونما ہوا۔ دنیائے انسانیت کو ماسوائے اللہ ہر قسم کی غلامی سے نجات ملی، امن و صلح، عدل و انصاف کی حکمرانی قائم ہوئی۔ عرب میں بھی انقلاب برپا ہوا اور دنیا نے دیکھا کہ جہاں کبھی کوئی ملک گیر مملکت قایم نہ ہوئی تھی، جہاں نظم و ضبط اور قاعدہ و قانون اجنبی تھے اور جہاں تنظیم اور سیاسی وحدت ناپید تھی، وہاں ایک ملک گیر بلکہ ہمہ گیر ریاست قایم ہوئی۔ پورا عرب ایک پرچم کے سائے میں آیا۔ حکومت، نظم و ضبط، قانون، تنظیم اور سیاسی وحدت قائم ہوئی اور یہ سب کچھ اتنی قلیل مدت میں انجام پذیر ہوا کہ تاریخ عالم میں اس کی کوئی نظیر موجود نہیں ہے۔

عالمِ انسانیت کا یہ عظیم انقلاب اس محسنِ انسانیت کے ہاتھوں برپا ہوا جو نہ صرف ایک انسان بلکہ اللہ کے آخری نبی اور رسول تھے اور جنھوں نے ایک عالمگیر و ہمہ گیر مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔

انقلاب کا یہ عمل ظاہر ہے کسی درجہ آسان نہ تھا آپ کے سامنے مشکلات کے ناقابلِ تسخیر پہاڑ تھے۔ آپؐ کو تاریکی میں سے روشنی کو نکالنا تھا، موت میں سے زندگی کو جنم دینا تھا، انتشار میں سے نظم کو پیدا کرنا تھا، ضعف میں سے قوت حاصل کرنا تھی اور اختلافات کو اتحاد سے بدلنا تھا۔ یہ تمام کام اگرچہ بہت مشکل تھے تاہم آپ نے انھیں انجام دیا اور پوری کامیابی کے ساتھ مطلوبہ نتائج حاصل کیے۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس بدترین ماحول، انتہائی مایوس کن حالات اور بہت ناساز گار فضا میں عظیم ترین انقلاب کا پیغام لے کر یکہ و تنہا اُٹھے اور ایک سوچے سمجھے منصوبے، ایک نقشۂ فکر و عمل، ایک متعین رہنمائی اور ایک ہمہ گیر اصلاح کے پروگرام لے کر آگے بڑھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس انقلاب کامل کی بنیاد رنگ، نسل، وطن، زبان، قوم یا پاپائیت و شہنشاہیت وغیرہ جیسے کسی نظام پر رکھنے کے بجائے "دین" پر رکھی[1]۔ اس دین پر جس کا نام اسلام ہے[2] اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ دین زندگی کا ایک جزو نہیں بلکہ تمام تر زندگی ہے۔ زندگی کی رُوح اور اس کی قوتِ محرکہ ہے۔ فہم و شعور اور فکر و نظر ہے۔ پُوری زندگی کا ضابطہ ہے۔ دستورِ حیات ہے اور زندگی کے لامتناہی سفر میں دنیا سے لے کر آخرت تک کا راہنما ہے۔ یہ انسان کی پوری زندگی سے بحث کرتا ہے اور جس قدر اللہ اور انسان کے تعلق سے بحث کرتا ہے اسی قدر انسان اور انسان کے تعلق اور انسان اور کائنات کے تعلق سے بھی کرتا ہے، اسلام کے نزدیک تعلقات کے یہ شعبے الگ الگ اور ایک دوسرے سے بیگانہ نہیں ہیں بلکہ ایک مجموعہ کے مربوط اور مرتب اجزا ہیں اور ان کی صحیح ترکیب ہی پر انسان کی فلاح کا مدار ہے[3]۔ یہ دین انسانی زندگی کی تمام مساعی اور فکر و عمل کے تمام شعبوں کو ایک ایسی وحدت بنا دیتا ہے جس کے افراد میں ایک مقصدی ہم آہنگی اور ایک ارادی ربط پایا جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب آپ نے اس "دین" کو لوگوں کے سامنے پیش کیا تو عرب جاہلیت کے ادنیٰ سے ادنیٰ دماغ رکھنے والے نے بھی یہ محسوس کر لیا کہ یہ دین ہمارے آبائی مذاہب میں چند تبدیلیاں یا صدیوں کے متعین رسوم و رواج سے انحراف کا ہی داعی نہیں ہے بلکہ پُوری زندگی کو ایک نئے سانچے میں ڈھالنا چاہتا ہے۔ وہ جلد سمجھ گئے کہ یہ تبدیلی صرف عقیدہ کی حد تک نہیں بلکہ تمام نظریۂ حیات اور نظامِ فکر و عمل کی ہمہ گیر تبدیلی ہے۔ یہاں یہ واضح کر دینا مناسب ہے کہ رسول اللہ کے پیشِ نظر جہاں اعتقادی اور اخلاقی انقلاب تھا وہاں پُوری اہمیت کے ساتھ سیاسی انقلاب بھی تھا اور جہاں فرد کی اصلاح مطلوب تھی وہاں تمدن کی درستی بھی مقصود تھی۔ چنانچہ قرآن نے آپؐ کی بعثت و رسالت کے مقاصد پر اس طرح روشنی ڈالی ہے کہ:

لقد ارسلنا رسلنا بالبیّنٰت و انزلنا معھم الکتاب و المیزان لیقوم الناس بالقسط۔[4]

(ہم نے اپنے رسولوں کو واضح ہدایات کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان کو نازل کیا تاکہ

لوگ انصاف پر قایم ہوجائیں)

اور ایک جگہ ارشاد ہے کہ:

ھوالذی ارسل رسولہ بالھدیٰ و دین الحق لیظھرہ علی الدین کلّہ و لوکرہ المشرکون۔(۵)

(وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اس کو تمام ادیان پر غالب کرے خواہ مشرکین کو کتنا ہی ناگوار کیوں نہ ہو)

مطالعۂ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہؐ نے اپنا پیغام اگرچہ انتہائی سادہ الفاظ اور آسان و مختصر لب و لہجہ میں پیش کیا لیکن مخاطبین نے اس کی کُنہ و حقیقت کو فوراً پہچان لیا اور اس کے پیچھے انقلاب کی جھلک دیکھ لی۔ رسول اللہؐ کا مقصد بھی یہی تھا کہ وہ آپ کی پیش کی ہوئی دعوت کو ہلکا نہ سمجھیں بلکہ اس کی ہمہ گیری و جامعیت کا ادراک کرلیں۔ چنانچہ بعثت کے بعد تبلیغ کے بالکل ابتدائی مرحلہ میں ہی قریش کے ایک وفد سے بات چیت کرتے ہوئے یہ سمجھا دیا تھا کہ:

فان تقبلوا منی ما جئتکم بہ فھو حظکم فی الدنیا و الاٰخرۃ۔(۶)

(اگر تم وہ قبول کرلو جسے میں پیش کر رہا ہوں تو اس میں تمہاری دنیا اور آخرت دونوں کی بہتری ہے)

پھر اسی ابتدائی دور میں ایک موقع پر حضورؐ یہ معنی خیز جملہ ادا کرتے ہیں کہ:

کلمہ ان انتم تکلمتم بھا ملکتم بھا العرب و دانت لکم بھا العجم۔(۷)

(ایک کلمہ ہے، اگر تم اسے اختیار کرلو تو اس کے نتیجے میں سارا عرب تمہارے زیرِ نگیں ہوجائے گا اور تمام عجم تمہارے پیچھے چلے گا)

قریشِ مکّہ کو یقین تھا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت دین کوئی معمولی چیز نہیں ہے بلکہ اس سے بڑے عظیم نتائج پیدا ہونے والے ہیں۔ ایک مرتبہ عتبہ کو سردارانِ مکّہ نے حضورؐ سے گفتگو کے لیے بھیجا۔ عتبہ نے ترغیب و ترہیب کا ہر انداز اختیار کرکے آپ کو اپنی انقلابی مہم اور دعوتی سرگرمیوں سے روکنا چاہا تو حضورؐ نے جواب میں سورۂ حٰم کی کچھ آیات اسے سنا دیں۔ اس پر عتبہ منفعل ہوکر اٹھا اور رؤسا سے جاکر کہا کہ:

فواللہ لیکونن لقولہ الذی سمعت منہ نباء عظیم فان تصبہ العرب فقد کفیتموہ بغیرکم وان یظھر علی العرب فملکہ ملککم و عزہ عزکم وکنتم اسعد الناس بہ۔(۸)

(واللہ اس کی جو بات میں نے سنی ہے اس میں ایک نباءِ عظیم مضمر ہے۔ اگر عربوں نے اس پر قابو پا لیا تو سمجھ لینا کہ انہوں نے تمہیں اس سے بے نیاز کردیا۔ اور اگر اس نے عربوں پر غلبہ حاصل کرلیا تو اس کی حکومت تمہاری حکومت اور اس کی عزت تمہاری عزت ہوجائے گی۔ تم اس کے طفیل تمام لوگوں میں سب سے زیادہ خوش بخت ہوگے)

اس کے معنی یہ ہیں کہ عتبہ اور اس جیسے دوسرے صاحبانِ نظر رسول اللہؐ کی دعوت کے جلو میں انقلاب کے آثار صاف طور پر

دیکھ رہے تھے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ دین کی بنیاد پر یہ انقلاب کیونکر برپا ہوا! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب جاہلیت کے معاشرہ کو کس طرح بدلا، اور پھر یہ کہ ریاست کی تاسیس کیسے ہوئی!

سیرت کا مطالعہ کرنے سے مجملاً یہ بات سامنے آتی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کام کا نقشہ یوں مرتب کیا کہ:

۱۔ پہلے تو دین کی بنیادوں یعنی عقاید کی تعلیم دی۔

۲۔ پھر اس تعلیم کی بنیاد پر ایک گروہ منظم کیا۔ اور جب ایک تنظیم بن گئی تو

۳۔ پھر اسی کی بنیاد پر ایک ریاست کی تاسیس فرمائی۔ اسی لیے ہمیں ولہازن کی یہ بات درست معلوم ہوتی ہے کہ "اسلام کا سیاسی اجتماع، دینی اجتماع سے ظہور پذیر ہوا۔"(۹)

ترتیب کار میں رسول اللہؐ کا عقاید کی تعلیم کو اولیت دینا بالکل منطقی، فطری اور ضروری تھا۔ عقاید انسان کے تمام افعال، اعمال اور حرکات کا صدور ہوتا ہے "یہی وہ نقطہ ہے جس سے انسانی عمل کا ہر خط نکلتا ہے اور اس کے دائرۂ حیات کا ہر خط اسی پر جا کر ختم ہوتا ہے۔"(۱۰) انسانی سیرت کی تعمیر و تخریب کا تمام تر مدار عقائد پر ہی ہوتا ہے کیونکہ اگر ذہن پراگندہ خیالی کا شکار ہو، مختلف نظریات کی آماجگاہ بن جائے اور اعمال بھی اس کے زیر اثر منتشر طور پر سرزد ہوں تو اصطلاحی حیثیت سے اسے "سیرت" نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ اگر مخصوص خیالات دل کی گہرائیوں میں جم جائیں اور وہی قوت وعمل کا محرک بھی ہوں۔ ایک مخصوص طرز زندگی اور مستقل نظریہ اختیار کر لیا جائے تو یہی سیرت کی تعریف ہے۔ لہٰذا "انسان کی عملی زندگی کا ایک قابل اعتماد نظم و ترتیب اختیار کرنا اس بات پر منحصر ہے کہ اس کی ایک مستقل سیرت بن جائے اور سیرت بننے کا انحصار اس پر ہے کہ اس کا ذہن پراگندہ خیالی کی حالت سے نکل جائے۔"(۱۱) چنانچہ اگر مختلف افراد مختلف قسم کے عقاید و افکار پر ایمان رکھتے ہوں اور اس کی سیرتیں مختلف و متضاد بنیادوں پر قائم ہوں تو کوئی اجتماعی ہیئت نہیں بن سکتی۔ ان کی مثال ایسی ہو گی جیسے ایک میدان میں بہت سے پتھر بکھرے پڑے ہوں، ہر پتھر بلاشبہ اپنی جگہ مضبوط ہے مگر ان کے درمیان کوئی ربط نہیں ہے بخلاف اس کے اگر ایک ہی مشترک تخیل بہت سے افراد کے دلوں میں ایمان بن کر جم جائے تو اشتراک ایمانی کا رابطہ ان کو ایک قوم بنا دے گا۔ گویا وہی پتھر جو بکھرے پڑے تھے چونے سے جوڑ دیے گئے اور ایک مضبوط دیوار قایم ہو گئی۔ اب ان کے درمیان تعاون شروع ہو جائے گا جس سے ترقی کی رفتار تیز اور تیز تر ہوتی چلی جائے گی۔ ایک قسم کا ایمان ان کی سیرتوں میں ہم آہنگی اور ان کے اعمال میں ایک رنگی پیدا کر دے گا۔ اس سے ایک خاص تمدن پیدا ہو گا۔ ایک خاص شان کی تہذیب ظاہر ہو گی۔ ایک نئی قوم، نئی سیرت، نئی ذہنیت، نئے خیالات، نئے طریق عمل کے ساتھ اٹھے گی اور اپنی حضریت کا قصر ایک نئے انداز پر تعمیر کرے گی۔"(۱۲)

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاشرہ کی اصلاح اور تعمیر نو کے لیے سب سے پہلے عقاید کی تعلیم دی۔

یہ عقاید پانچ ہیں جو نہ صرف مذہبی و روحانی حیثیت رکھتے ہیں بلکہ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ اسلام اپنے روحانی، اخلاقی، سیاسی اور

معاشرتی و تمدنی نظام کی بنیاد بھی ان ہی پر رکھتا ہے۔ اس بنا پر یہ بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ ان ہی عقاید پر اسلامی ریاست کی فکری بنیادیں استوار ہوتی ہیں۔ درحقیقت ان ہی عقاید نے ریاست کی تعمیر کے لیے زمین بھی ہموار کی اور انہی کی بدولت لوگوں کے اذہان و قلوب بدلے۔ ان کی فکر و نظر میں انقلاب آیا، ان کی عادات و رسوم میں تبدیلی ہوئی، ان کے اندر ہم آہنگی، اتحاد و یک رنگی پیدا ہوئی اور بھرے دلوں کے جڑنے سے اجتماع منظم ہوا جس نے بالآخر ریاست کو جنم دیا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ جن عقاید و ایمانیات سے اتنا بڑا کام لیا گیا ان کی حقیقت و ماہیت کیا ہے۔

الف - ایمان باللہ

عقاید میں سب سے مقدم عقیدۂ توحید ہے۔ توحید اپنی اہمیت و اصل کے اعتبار سے تمام دین کا خلاصہ اور دوسرے تمام عقاید و اعمال کا سرچشمہ ہے۔ "سب اسی اصل کی فرع ہیں اور جتنے اخلاقی احکام اور تمدنی قوانین ہیں سب اسی مرکز سے قوت حاصل کرتے ہیں۔"(۱۳) اسلام میں جو چیز بھی ہے خواہ وہ عقیدہ ہو یا عمل اس کی بنیاد صرف ایمان باللہ پر قائم ہے۔

اس عقیدہ کا مطلب جو اسلام کے عظیم الشان فکری و عملی نظام میں مرکز اور منبع قوت کی حیثیت رکھتا ہے، صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ اللہ کے وجود کا اقرار کر لیا جائے بلکہ اس کے تحت اللہ کی صفات کا ایک مکمل اور صحیح تصور رکھنا بھی ضروری ہے کیونکہ اسی سے وہ قوت حاصل ہوتی ہے جو انسان کے قوائے فکر و عمل پر محیط ہو جاتی ہے۔ مزید برآں جاہلی تصور الٰہ اور اسلامی تصور الٰہ میں یہی تصور صفات، حقیقی فرق پیدا کرنے والا ہے ورنہ محض ہستی باری تعالیٰ کا اثبات دورِ جاہلیت میں بھی پایا جاتا تھا۔(۱۴)

اسلام کے تصورِ الٰہ کا اصل امتیاز یہ ہے کہ "اس نے صفاتِ باری کا صحیح، مکمل اور مفصل علم بخشا اور پھر اسی علم کو ایمان بلکہ اصل الایمان بنا کر ان سے تزکیۂ نفس، اصلاح اخلاق، تنظیم اعمال، نشر خیر و منع شر اور بنائے تمدن کا اتنا بڑا کام لیا ہے جو دُنیا کے کسی مذہب و ملت نے نہیں لیا۔"(۱۵)

عقیدۂ توحید کے اقرار سے انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی پر ہمہ گیر اثرات رونما ہوتے ہیں۔ آدمی میں وسعتِ نظر پیدا ہوتی ہے۔ انسان پستی و ذلت سے اُٹھ کر خود داری و عزتِ نفس کے بلند ترین مدارج پر پہنچتا ہے۔ انکسار و تخشع، رجائیت و اطمینانِ قلب، صبر و توکل، شجاعت، امانت و دیانت، قناعت و استغنا کی صفات پیدا ہوتی ہیں۔ غلط توقعات، اوہام و خرافات کا ابطال ہو جاتا ہے اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ اس عقیدہ سے نفوس میں پاکیزگی اور اعمال میں پرہیزگاری پیدا ہوتی ہے۔ لوگوں میں ذمہ داری کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ معاشرہ کے افراد کے باہمی معاملات درست ہوتے ہیں۔ پابندیٔ قانون کی حس پیدا ہوتی ہے اور ایک بالاتر قوت کی نگرانی و گرفت کو آدمی دل و جان سے محسوس کرتا ہے۔ اطاعت امر اور نظم و ضبط کا مادہ پیدا ہوتا ہے اور افراد ایک زبردست باطنی قوت سے اندر ہی اندر سدھر کر ایک صالح اور منظم سوسائٹی بنانے کے لیے مستعد ہو جاتے ہیں۔(۱۶)

توحید کی انقلاب خیز تعلیم کا صحیح اندازہ اس وقت ہو سکتا ہے جبکہ یہ پیشِ نظر رہے کہ افقِ تاریخ پر جب اسلام طلوع ہوا تو

دنیا کی بیشتر مہذب قومیں کثرت پرستی اور اوتار پرستی میں مبتلا تھیں۔ تمام دُنیا میں بالعموم اور جزیرہ نمائے عرب میں بالخصوص آدمی چاند، سورج، ستارے، سیارے، شجر، حجر، غرض دنیا کی ہر حقیر سے حقیر چیز کے آگے سرنگوں ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ آدمی آدمی کے آگے جھکتا تھا۔ توحید کے فعال تصور نے طلسمِ جاہلیت کو توڑا اور تسخیر قدرت کی تعلیم اسی معاشرہ میں پیش کی جہاں خود انسان صدیوں سے مسخر ہوتا چلا آ رہا تھا۔ اس عقیدہ نے انسان کو ہر قسم کی غلامی سے نجات دی۔ طبعی پابندیوں اور حیاتیاتی کائنات سے آزادی بخشی۔ انسان کی عظمت و رفعت کو تمام مخلوقات پر ثابت کیا۔ شرک و بت پرستی کے تمام بندھنوں کو کاٹ دیا۔ انسانیت کو افتخارِ آدمیت کی نئی تعبیر سے روشناس کرایا اور یہ بتایا کہ ملکیت و حکمرانی کا اصل حق اللہ تعالیٰ رب العالمین کو حاصل ہے۔

علاوہ ازیں اس عقیدہ توحید نے انسانیت کو عدل و مساوات کی اقدار عطا کیں۔ انسانی معاشرت کی بنیاد کامل عدل اور صحیح مساوات کے بغیر قائم نہیں ہو سکتی اور کامل عدل اور صحیح مساوات وحدت الٰہ اور وحدت آدم کے بغیر ناممکن ہے جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ اس وقت اقوام و ملل میں افراتفری اور انتشار کا یہ عالم تھا کہ ان میں نہ خدا مشترک تھا نہ آدم۔ ہر ایک کا خدا الگ تھا، ہر ایک کی نسل، زبان، رنگ، وطن، ذات پات، شہریت، معتقدات اور اخلاق جُدا تھے۔ اس صورتِ حال میں صرف ایک ہی رشتۂ توحید الیسا رشتہ ہو سکتا تھا جو تمام لوگوں کو ایک مرکز پر متحد کر دے یعنی یہ کہ سب ایک ہی الٰہ کو مانیں، اسی کے اتارے ہوئے قانون و شریعت کو تسلیم کریں اور ایک ہی آدم کے مشترک گھرانے کا اپنے آپ کو فرد سمجھیں۔ اس اساس پر بلا شبہ ایک عالمگیر سیاسی تنظیم کی عمارت قائم ہو سکتی ہے۔ اسی نظریۂ توحید نے مختلف و متضاد انسانی عناصر کو جمع کیا ان کو ملا کر ایک ملت بنایا۔ ان کے تخیلات، اعمال و اطوار میں غایت درجہ کی یکجہتی پیدا کی اور ان کے اندر اختلافِ ظروف و احوال کے باوجود ایک تہذیب کی نشوونما کر کے ایک انتہائی اعلیٰ نصب العین کے لیے جینے و مرنے کا حوصلہ عطا کیا۔

مزید برآں چونکہ عقیدۂ توحید کی رُو سے سب کا اللہ ایک ہے اور سب خدا کے بندے ہیں اس لیے بربنائے عبدیت و انسانیت ایک انسان کو دُوسرے پر کوئی برتری حاصل نہیں ہے۔ اس بات نے ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان تمام اختلافات کو مٹا دیا اور انسانیت کو شہنشاہیت، پاپائیت، آمریت، مطلق العنانیت، استبداد اور غیر الٰہی حاکمیت کے ہر بندِ غلامی سے نجات دلا دی۔

(ب) ایمان بالملائکہ

فرشتوں پر ایمان دراصل ایمان باللہ کا تتمہ اور اس کا ضمیمہ و لازمہ ہے۔ اس عقیدہ کا مقصد صرف یہی نہیں ہے کہ ملائکہ کے وجود کا اثبات و اقرار کیا جائے بلکہ یہ کہ نظامِ وجود میں ان کی صحیح حیثیت کو سمجھ لیا جائے "تاکہ ایمان باللہ خالص توحید پر قائم ہو اور شرک و عبادت ماسوائے اللہ کے تمام شائبوں سے پاک ہو جائے"۔[۱۷] دورِ جاہلیت میں اہلِ عرب کے یہاں ملائکہ کا تصور موجود تھا[۱۸] لیکن اس میں سخت افراط و تفریط تھی۔ قرآن نے ایک طرف تو ملائکہ کا صحیح تصور پیش کیا اور دوسری طرف ان کے اس عقیدہ کی بھی تردید کی کہ فرشتے اللہ کی اولاد ہیں یا اس کی خدائی میں شریک یا لائق عبادت ہیں۔ کیونکہ اس وقت وہاں یہ عقیدہ

پایا جاتا تھا کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں اور الوہیت میں اس کے شریک ہیں[19]۔ قرآن نے بتایا کہ فرشتے اللہ کے معزز بندے ہیں اطاعت گزار ہیں، اس کے حکم پر چلتے ہیں اور صرف وہی کرتے ہیں جس کا وہ حکم دیتا ہے[20]۔ اس کی حمد و ثنا بیان کرتے ہیں[21] اور کسی حال میں اللہ کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کرتے۔[22]

ایمان بالملائکہ سے انسان میں عزتِ نفس کا احساس پیدا ہوتا ہے اور اس کے تمام جذبات عبودیت اللہ پرستی کے مرکز پر سمٹ آتے ہیں۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ موجوداتِ عالم میں کوئی چیز اس سے افضل نہیں ہے اور فرشتے تو خود انسان کے آگے سربسجود ہو چکے ہیں تو بھلا وہ انسان کے مسجود و معبود کس طرح بن سکتے ہیں؟ اس عقیدہ نے یہ تعلیم بھی دی کہ انسان کائنات کی کارکن طاقتوں میں سے کسی کو کارفرما نہ سمجھ بیٹھے جس طرح تمام کائنات اور خود انسان کی زندگی کے غیر اختیاری شعبہ میں اللہ کی حکومت ہے اسی طرح انسان اپنی زندگی کے اختیاری شعبہ میں بھی اللہ کی حکومت تسلیم کرے ہر معاملہ میں اللہ کو واضع قانون اور اپنے آپ کو صرف متبع قانون سمجھے اور اپنے اختیارات کو ان حدود کے اندر محدود کر دے جو اللہ نے مقرر کیے ہیں جس طرح فرشتوں کا یہ طرزِ عمل ہے[23]۔ فرشتوں پر ایمان اس لیے بھی لازمی ہے کہ ان پر ایمان لائے بغیر وہ پیغام ہی قابلِ اعتبار نہیں ٹھہر سکتا جسے وہ رسول اللہ کے پاس لے کر آتے ہیں۔

(ج) ایمان بالرسالت

امام راغب کا بیان ہے کہ "جو سفارت اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے درمیان ان سے امور دنیوی اور اُخروی میں خرابیوں کو دُور کرنے کے لیے جاری ہوتی ہے اسے نبوت (النبوہ) کہا جاتا ہے"[24] اور اصطلاحِ شریعت میں رسالت اس سفارت کو کہتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے انسانوں تک اپنے تشریعی احکام پہنچانے اور انھیں اپنی مرضی کی راہ بتانے کے لیے قائم کیا ہے۔ ایمانیات میں عقیدہ رسالت کا شمار اگرچہ ایمان باللہ کے بعد ہوتا ہے لیکن عملاً رسول کے بغیر اللہ کے احکام اور اس کی ذات و صفات کا علم نہیں ہو سکتا۔ اس اعتبار سے عقیدۂ رسالت کی حیثیت مقدم ہے۔

عقیدۂ رسالت کا ایک جزو تو یہ ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے سچے رسول ہیں[25]۔ اور دوسرا یہ کہ آپ خاتم النبیین ہیں[26]۔ آپ کی رسالت سارے انسانوں تمام عالم کے لیے ہے[27] اور آپ کے ہاتھوں دین کی تکمیل ہو گئی ہے[28]۔ اس لیے اب آئندہ نہ کسی نبی اور رسول کے آنے کی گنجائش ہے اور نہ ہی کسی نئی شریعت کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ ایمان بالرسل کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ تمام گزشتہ انبیاء و رسل پر ایمان لایا جائے۔ اس سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ مسلمانوں سے گویا تمام اقوامِ عالم میں اتحاد و یگانگت پیدا کرنے کے لیے کہا گیا اور یہ بھی بتا دیا گیا کہ تمام انبیاء و رسل الگ الگ جو پیغامِ الٰہی لائے تھے وہ ہمیشہ سے یکساں اور ایک رہا ہے[29]۔ پیغام میں یکسانیت آدمی کو اس طرف بھی راغب کرتی ہے کہ اختلاف کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے البتہ پچھلے انبیاء و رسل اور آنحضرتؐ کی رسالت میں یہ فرق موجود ہے کہ گزشتہ انبیاء و رسل . . . . کا پیغام مقامی اور محدود تھا جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت عام اور تام ہے۔ تمام انسانوں، تمام عالم اور آنے والے تمام زمانوں کے لیے ہے[30]۔ گویا آپ کا لایا ہوا پیغام ہدایت، ابدیت اور عالمگیریت کا

حاصل ہے۔ علاوہ ازیں آپ دیگر رسولوں کی طرح صفات بشریت[۳۱] و ہبیت[۳۲] اور عصمت سے متصف ہیں، نیز آپ مطاع[۳۳]، شارح کتاب الٰہی[۳۴]، معلم و مربی[۳۵]، پیشوا اور نمونہ تقلید[۳۶]، شارع اور قانون ساز[۳۷]، قاضی حکم[۳۸]، غرض سب ہی کچھ ہیں کیونکہ معاشرہ کی صلاح و فلاح اور ریاست کی تعمیر میں یہ تمام صفات ناگزیر ہیں اور یہ امر تو بہت واضح ہے۔ آپ کو وحی[۳۹] کے ذریعہ ایک ایسا ذریعہ علم عطا کیا گیا جو ہر قسم کے خطا و نسیان اور تخمین و ظن سے ماورا ہے۔

یہ آخری خصوصیت ایسی ہے جو بعض دوسری حقیقتوں کو بھی واضح کرتی ہے ایک تو یہ کہ صرف ایمان بالرسل ہی وہ چیز ہے جو بنی نوع انسان کو ایک مرکز پر جمع کر سکتی ہے کیونکہ اختلاف کی بنا در اصل جہالت ہوتی ہے[۴۰]۔ دوسری یہ کہ رسول اللہؐ جو طریق فکر یا اصولِ اخلاق و سیاست یا اصولِ قانون و معاش مقرر کرتے ہیں وہ قومی رجحانات یا زمانی خصوصیات پر نہیں بلکہ علم، حق اور صداقت پر مبنی ہوتے ہیں اور علم، حق و صداقت وہ اقدار ہیں جو مشرق و مغرب، سیاہ و سفید اور قدیم و جدید کے دائرۂ امتیاز میں نہیں آتیں۔ لہٰذا رسول کے لائے ہوئے ضابطۂ حیات میں ہی یہ قابلیت ہو سکتی ہے کہ اپنے اصول و اساس کو بدلے بغیر ہر ملک، ہر قوم اور ہر زمانے کے لیے مناسب حال ہو اور رسول اللہؐ کا یہ ضابطۂ حیات انتہائی موزوں اور مناسب وقت پر لے کر آئے۔ آپ بلا شبہ آخری نبی تھے لیکن آپ سے پہلے آنے والے انبیاء جب اپنی تعلیم و تربیت سے قوموں کا اخلاقی شعور اس حد تک بیدار کر چکے کہ وہ ایک عالمگیر نظام کے تحت زندگی بسر کر سکیں۔ علاوہ ازیں دنیا کے مادی وسائل اجتماع و تمدن نے اس حد تک ترقی کر لی کہ ایک ہادی کا پیغام ہدایت دنیا کے ہر گوشہ میں بسہولت پہنچ سکے تو خاتم الانبیاء محمدؐ رسول اللہؐ کی بعثت ہوئی۔ اور جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں کہ آپ کی دعوت تمام بنی نوع انسان کے لیے ہے اور اس لحاظ سے یہ عالمگیر دعوت، کاملیت و ابدیت بھی رکھتی ہے کہ اس کے بعد کوئی اور دین یا دعوت یا شریعت آنے والی نہیں ہے۔ آپ کی رسالت، رسالت عام اور آپ کی دعوت، دعوت عام ہے اور اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو رحمۃ للعٰلمین کہا ہے[۴۱]۔

جہاں تک اہلِ عرب کا تعلق ہے تو عربوں میں ایسے افراد کی کمی نہ تھی جو رسولوں کے بارے میں طرح طرح کے شکوک و شبہات رکھتے تھے اور اسی لیے جب رسول اللہؐ نے اپنی رسالت کا اعلان کیا تو انھوں نے مختلف قسم کے اعتراضات وارد کیے۔ مثلاً یہ کہ:

> وقالوا مال ھذا الرسول یاکل الطعام ویمشی فی الاسواق لولا انزل الیہ ملک فیکون معہ نذیرا۔[۴۲]
>
> (یہ ایسا رسول ہے جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں گھومتا پھرتا ہے اس کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہ اتارا گیا جو اس کے ساتھ لوگوں کو ڈراتا)

انکارِ رسالت کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ وہ حضورؐ کو پاگل و مجنون اور ساحر کہہ کر مخاطب کرتے تھے[۴۳] تاکہ اقرارِ رسالت کے بار سے سبکدوش ہو جائیں۔ کچھ لوگ بعثتِ انبیاء کے تو قائل تھے مگر یہ چاہتے تھے کہ کوئی فرشتہ نبی بنا کر بھیجا جائے، عام انسان کو رسول کی حیثیت سے قبول کرنے کو ان کا ذہن آمادہ نہ تھا۔

وما منع الناس ان یؤمنوا اذ جآءھم الھدٰی الآ ان قالوا ابعث اللہ بشراً رسولا۔[۴۴]

(اور جب ان لوگوں کے پاس ہدایت پہنچ چکی تو انہیں ایمان لانے سے صرف یہ بات مانع ہوئی کہ انھوں نے کہا کہ کیا اللہ نے ایک انسان کو رسول بنا کر بھیجا ہے؟)

ان تمام شکوک و شبہات اور اعتراضات کا مسکت و مدلل جواب دیا گیا۔ چنانچہ ایک طرف تو یہ بتا دیا گیا کہ اصولی طور پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں تک اپنے احکام و ہدایات بھیجنے کا ذریعہ ہمیشہ انسانوں کو ہی بنایا ہے تاکہ انسانوں پر انسانی فطرت کے مقتضیات انسانوں کے ذریعہ سے واضح ہوں اور لوگوں کے لیے یہ کہنے کا موقع باقی نہ رہے کہ انسان کے لیے کسی غیر انسان کا علم و عمل کیسے نمونے کا کام دے سکتا ہے۔ اس لیے جب بھی کوئی رسول بھیجا گیا نوعِ انسانی میں سے ہی بھیجا گیا۔ ما ارسلنا من قبلك الاّ رجالاً نوحی الیھم۔[۴۵]

(اے محمد! ہم نے تم سے پہلے بھی رسول بنا کر صرف آدمیوں کو ہی بھیجا تھا جن پر ہم اپنی وحی نازل کرتے تھے)

اور دوسری طرف رسالت کے بارے میں اللہ کا ایک متعین ضابطہ بتا دیا گیا جس کی تائید عقل عام بھی کرتی ہے کہ رسول کو اسی جنس اور اسی مخلوق میں سے ہونا چاہیے جس کے پاس جا کر اسے رسالت کا فرض انجام دینا ہے۔ اسی لیے فرمایا گیا کہ:

قل لوکان فی الارض ملٰئکۃ یمشون مطمئنین لنزلنا علیھم من السمآء ملکا رسولا۔[۴۶]

(اے نبی! ان سے کہہ دو کہ اگر زمین میں فرشتے چلتے پھرتے اور آباد ہوتے تو ہم ضرور ان پر آسمان سے کسی فرشتے (ہی) کو رسول بنا کر بھیجتے)

ایک اعتراض اہلِ عرب کا یہ بھی تھا کہ ایسے شخص کو رسول کیوں بنایا گیا جس کے پاس نہ مال ہے نہ اولاد، نہ عزت نہ مرتبہ۔ اگر اللہ کو رسول بنا کر بھیجنا ہی تھا تو مکہ یا طائف کی بستیوں میں سے کسی بڑے آدمی کو بناتا۔[۴۷] اس کا جواب یہ دیا گیا کہ:

اللّٰہ اعلم حیث یجعل رسالتہ۔[۴۸]

(اللہ خوب جانتا ہے کہ رسالت کا محل کون سا ہے اور اپنی پیغمبری کسے عنایت فرمائے)

بہرحال رسالت پر ایمان نے ایک طرف تو اہلِ عرب کے شکوک و شبہات کو رفع کر کے رسول کی حیثیت و عظمت کو متعین کیا اور دوسری طرف اہلِ عرب کے تمام اوہام اور افسانوں و فسوں کا خاتمہ کر دیا۔ علم کی روشنی میں اچھائی اور برائی کے غلط معیارات کی بیخ کنی ہو گئی اور رسول کے منبع علم قرار پا جانے سے تمام پاپائیت کا اور نامعلوم مدت سے چلی آنے والی روایاتِ باطلہ اور غیب و الہام کی مفسدانہ صورتوں کا خاتمہ ہو گیا۔ کاہن و عراف اور غیبی خبریں بتانے والوں کی قدر و قیمت خاک میں مل گئی اور لوگوں کو اعتقاد و یقین کی دولت سے مالا مال کر دیا گیا۔

یہاں یہ بات نہ بھولنا چاہیے کہ رسول پر ایمان و اطاعت کا حکم سب سے پہلے ایک ایسے معاشرہ میں دیا گیا جہاں اطاعت و انقیاد کا کوئی تصور نہ تھا۔

(د) ایمان بالکتب

"اسلام کی اصطلاح میں کتاب سے مراد وہ کتاب ہے جو بندوں کی رہنمائی کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول پر نازل کی جاتی ہے۔ اور جسے لوگوں تک پہنچانے اور جس کی توضیح و تشریح کرنے اور جس کو عمل کا جامہ پہنانے کے لیے رسول دنیا میں بھیجا جاتا ہے۔ رسول اس کلام کو ایک امانت دار قاصد کی حیثیت سے لوگوں تک پہنچاتا ہے۔ پھر خدا کی عطا کی ہوئی حکمت و بصیرت سے اس کے معانی و مطالب کی تشریح کرتا ہے اور ان ہی الہامی اصولوں پر تمدن و اخلاق، معاشرت و سیاست کا نظام قایم کرتا ہے۔"(۴۹)

ایمان بالکتب دراصل ایمان بالرسالت کا ایک ضروری تقاضہ اور لازمہ ہے۔ چنانچہ کتاب کو رسالت سے جُدا نہیں کیا جاسکتا کیونکہ کتاب لفظی بیان ہے اور رسول اس کا عملی نمونہ و مظہر۔ اس لیے انسان کی ہدایت و رہنمائی کے لیے دونوں کی یکساں ضرورت ہے۔

ایک مسلمان کو اگرچہ عقیدہ کے طور پر تمام کتب آسمانی پر ایمان لانے کی تلقین کی گئی ہے(۵۰) تاہم عمل کے میدان میں اسے صرف قرآن کا مکلّف بنایا گیا۔ خود قرآن تمام اہلِ ایمان کو یہ دعوت دیتا ہے کہ اسی کتاب کو اپنا دستور العمل بنائیں(۵۱) کیونکہ یہ کتاب منزل من اللہ ہے(۵۲) پوری طرح محفوظ و مامون ہے(۵۳)۔ ہر قسم کی کمی بیشی اور تحریف و تبدیلی سے پاک ہے(۵۴)۔ تمام انسانوں کی رہنمائی کے لیے ہے(۵۵)۔ اس میں ہر زمانے اور ہر عالم کے لیے نصیحت ہے(۵۶) اور جو کچھ بھی اس کتاب کے خلاف ہے وُہ ہرگز قابلِ اتباع نہیں ہے(۵۷)۔ یہ کتاب گزشتہ رسولوں کی تعلیمات کی محافظ و نگران اور جامع ہے(۵۸)۔ یہ کتاب سراسر حق ہے(۵۹)۔ باطل کو اس میں قطعی کوئی راہ نہیں ملی(۶۰)۔ نہ اندازہ یا گمان کا اس میں دخل ہے(۶۱) اور نہ کسی شیطانی قوت(۶۲) یا نبی کی ذاتی خواہش و مرضی کا(۶۳)

مختصر یہ کہ اللہ کی کتاب پر ان لوازمات کے ساتھ ایمان لانے سے اور پھر ایک رسول پر ایمان و اتباع سے آدمی کے سامنے راستہ متعین ہو جاتا ہے اور ذہنیت ایک خاص سانچے میں ڈھل جاتی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جب ان ہی ماخذ سے تمام اعتقادات، عبادات، اخلاق و معاملات اور جملہ سیاسی و تمدنی اور تہذیبی و ثقافتی قوانین ماخوذ ہوں گے اور اسی ایمان، اطاعت اور اتباع کے رشتہ میں تمام اہلِ ایمان منسلک ہو جائیں گے تو ایک مستقل تہذیب بنے گی اور ایک ایسی امت کی تشکیل ہو گی جہاں نسل و رنگ اور زبان و وطن کے بجائے عقاید کی کارفرمائی ہے۔

(ہ) ایمان بالآخرت

آخرت اس دنیا کے بعد آنے والی (دوسری) زندگی کا نام ہے جس پر ایمان لائے بغیر کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا۔(۶۴)
اور عقیدۂ آخرت کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اس پر یقین رکھے کہ "جس طرح دنیا کی ہر چیز فرداً فرداً ایک عمر رکھتی ہے اسی طرح پورے نظامِ عالم کی بھی ایک عمر ہے جس کے تمام ہونے پر یہ سارا کارخانہ درہم برہم ہو جائے گا اور دُوسرا نظام اس کی جگہ لے گا جس کے قوانینِ طبیعی اس نظام کے قوانینِ طبیعی سے مختلف ہوں گے اس نظام کے درہم برہم ہونے پر ایک زبردست عدالت قایم ہو گی

جس میں ہر چیز کا حساب لیا جائے گا۔ انسان کو اس روز پھر ایک نئی جسمانی زندگی ملے گی وہ اپنے خدا کے سامنے حاضر ہو گا اس کے تمام اعمال جانچے اور تولے جائیں گے حق اور انصاف کے ساتھ اس کے مقدمے کا فیصلہ کیا جائے گا۔ اچھے اعمال کی اچھی جزا اور بُرے اعمال کی بُری سزا دی جائے گی۔"(۶۵)

اس عقیدہ کو تسلیم کر لینے سے دنیوی زندگی اور اس کے معاملات کے متعلق انسان کا نقطۂ نظر بنیادی طور پر منقلب ہو جاتا ہے انسان اپنے آپ کو ایک ذمہ دار اور جواب دہ ہستی سمجھتا ہے اور اپنی زندگی کے تمام معاملات کو یہ سمجھتے ہوئے انجام دیتا ہے کہ وہ اپنی ہر حرکت اور ہر فعل کا ذمہ دار ہے پھر چونکہ اس کی نظر اپنے افعال و اعمال کے صرف دنیاوی اور ظاہری و مادی نتائج پر ہی نہ ہو گی بلکہ آخرت پر ہو گی اس لیے یہ احساس ایک ایسے طاقتور ضمیر کی شکل میں ظاہر ہو گا جو انسان کو معروفات پر قایم اور منکرات سے مجتنب رکھے گا۔ اس لحاظ سے یہ عقیدہ انسان میں تقویٰ و طہارت، پاکیزگی و پاکبازی، سرفروشی، بے خوفی اور بہادری، مصائب پر صبر، نیک کاموں میں جان و مال خرچ کرنے کی ترغیب، اچھے کاموں کو اختیار کرنے اور بُرے کاموں سے بچنے کی صلاحیت پیدا کرتا ہے۔

آخرت پر ایمان نے دنیا کو عموماً اور اہلِ عرب کو خصوصاً انسانیت و آدمیت کی تعلیم دی۔ زندگی کو منضبط و محتاط بنایا۔ ذاتی مفاد پرستی اور خود غرضی و جارحیت کی فضا کو تبدیل کیا۔ اس کی وجہ سے غیر مختتم سلسلہ ہائے جنگ کا بھی خاتمہ ہوا جو محض فخر و مباہات یا قبائلی انتقام و عداوت پر مبنی تھیں۔ اب ان کے سامنے اس دنیا کے تجملات بے وقعت ہو گئے اور اصل توجہ انجام و آخرت پر مرکوز ہو گئی۔ ایک متعین راہِ عمل اور عالمگیر مشن کے لیے لگن پیدا ہوئی اور اس مقصد یا نصب العین کے حصول کے لیے اپنی تمام صلاحیتوں کو اس طرح وقف کر دیا کہ اپنی جان تک کی پروا نہ کی۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ دنیا کی موت اخروی مسرت کا پیش خیمہ ہے ایمانیات نے ایک کمزور آدمی کو بھی دلیر بنا دیا اور طاقتوروں کے حوصلے پست کر دیے کیونکہ دونوں کو یہ معلوم ہو گیا کہ ایک دن حق کی عدالت میں حاضر ہو کر جواب دہی کرنی پڑے گی۔ نظریہ آخرت و معاد نے اہلِ عرب کو بالغ نظری عطا کی اور وہ یہ سمجھ گئے کہ اس دنیا کی خوشحالی و بدحالی اور منفعت و مضرت اصل نہیں ہے۔ مطلوب حقیقی تو اللہ کی رضا و خوشنودی ہے۔(۶۶)

بہرحال دین کی یہ وہ بنیادیں ہیں جن پر اسلام کا نظام تہذیب و تمدن، نظام معیشت و معاشرت اور نظام سیاست قایم ہے۔ عہد نبویؐ میں ان ہی فکری بنیادوں پر ایک معاشرہ کی تشکیل ہوئی اور ان ہی عقاید کو تسلیم کرنے والے ایک مجتمع جدید کی شکل میں ظاہر ہوئے اور پھر اسی مجتمع جدید پر ریاست نبویؐ کی عمارت تعمیر کی گئی۔

(۲) تشکیلِ معاشرہ

جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں یہ تھے وہ بنیادی اصول جن پر نہ صرف دین کی عمارت قایم ہوئی بلکہ ان ہی اصولوں پر ایک سوسائٹی کو منظم کیا گیا اور پھر معاشرتی و سیاسی نظام کی تمام ترتیب و تہذیب بھی ان ہی عقاید و ایمانیات کے ذریعہ کی گئی۔ ان اصولوں اور

عقاید کی حقیقت و ماہیت پر پچھلے اوراق میں بحث کی جا چکی ہے اس لیے اب دوسرے مرحلہ میں یہ دیکھنا ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان اصولوں پر ایک نئے معاشرہ کی نشو و نما کا کام کس طرح انجام دیا۔ لیکن آگے بڑھنے سے پہلے تین بنیادی نکات کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے :

(۱) اوّل یہ کہ اسلامی تاریخ کی روشنی میں تاسیس ریاست کے جو تین مراحل ہم نے مقرر کیے ہیں (یعنی پہلے فکری بنیادوں کی تعلیم، پھر سوسائٹی کی تشکیل و تنظیم اور اس کے بعد ریاست کی تاسیس) ان کے پیشِ نظر یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ عہدِ رسالت میں ریاست کی تاسیس اور معاشرے کا قیام چند بنیادی اصولوں کا مرہونِ منت ہے اس کو ہم اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ عقاید و نظریات پہلے وجود میں آئے اور ریاست بعد میں۔ یہ نکتہ اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ سیاسی افکار و اعمال کی تاریخ میں عموماً اور مغرب کے فلسفۂ سیاسی میں خصوصاً یہ ترتیب نظر نہیں آتی۔ اس کی رُو سے پہلے سوسائٹی اور ریاست کا قیام عمل میں آتا ہے اور پھر ان کے زیرِ اثر نظریات جنم لیتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ احوال و ظروف کی تبدیلی اور معاشرہ یا ریاست کی ہیئت میں ہر تغیر کے ساتھ سیاسی نظریات میں بھی انقلاب آتا رہا۔ اس کے برعکس ریاستِ نبوی کے سیاق و سباق میں یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ یہاں معاشرہ اور ریاست دونوں کا ظہور تمام تر عقاید و نظریات کا مرہونِ منت ہے۔

(۲) دوم یہ کہ افرادِ معاشرہ کے اتحاد و انجذاب کے لیے دین کو بنیاد بنایا گیا حالانکہ دنیا اس وقت تک سیاسی و معاشرتی اتحاد کی جن بنیادوں کا عملی تجربہ کر چکی تھی ان میں زبان، رنگ، نسل، وطن اور قومیت خاص ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف یہ کہ معاشرہ کے اتحاد کے لیے ان بنیادوں کو استعمال نہیں کیا بلکہ رنگ و نسل و زبان اور وطن و قومیت کے تمام معیارات کو باطل قرار دے دیا[٦٧] اور ہر قسم کی عصبیت کو حرام ٹھہرایا[٦٨] کیونکہ یہ امتیازات اگر ایک طرف وحدتِ انسانیت کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں اور ان کی بنیاد پر کوئی عالمگیر معاشرہ قایم نہیں کیا جا سکتا تو دوسری طرف یہ معیارات انسانیت کو مختلف طبقات میں تقسیم کرتے ہیں اور ایک انسان اور دُوسرے انسان کے درمیان نفرت و ذلت کی دیوار کھڑی کرتے ہیں۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیم و تلقین کا ہدف عقیدہ، ایمان اور دین کو قرار دیا اور ان معیاراتِ باطلہ کو پرِ کاہ کی حیثیت بھی نہ دی اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ رسول اللہ ایک عالمگیر پیغام کے علمبردار تھے۔[٦٩] آپ کا مقصد تمام انسانیت کو ایک رشتہ میں جوڑنا، انھیں ایک اُمت بنانا اور ایک عالمی اخوت میں منسلک کرنا تھا[٧٠] وہ نہ تو امتیازات رکھنے والے طبقات کے خلاف کسی سیاسی یا معاشی تعصب میں مبتلا تھے اور نہ گرے ہوئے طبقات کے لیے ان کے دل میں کوئی بے جا عصبیت تھی کہ طبقاتی جنگ برپا کر کے مقدم الذکر کو پست اور موخر الذکر کو بلند کرنے کی کوشش کریں۔ رسولؐ اللہ ایک فساد کو دُوسرے فساد سے بدلنے کے لیے نہیں آئے تھے بلکہ آپ کی پوری دعوت سر تا سر مثبت تھی۔

(۳) معاشرہ کی بنیاد عام طور سے مادیت بتلائی جاتی ہے۔ یعنی انسانی جہد و سعی کا مقصود یہ ہے کہ انسان کو تین بنیادی ضروریات (غذا، مکان اور لباس) حاصل ہو جائیں جبکہ رسولؐ اللہ نے سوسائٹی کی بنیاد مادیت کے بجائے روحانیت پر رکھی اور یہ امر واضح کیا کہ اگرچہ مادیت زندگی کے قیام و بقا کے لیے ناگزیر ہے اور اسے بہرحال حاصل کرنا چاہیے[٧١] لیکن

انسانی جدوجہد کا اصل ہدف فلاحِ آخرت ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی تبلا دیا گیا کہ دنیاوی مال و متاع کو زندگی کا مقصود نہ بنا لیا جائے[۴۲] کہ مادی مفروضیں انسان کی روحانی اقدار کو پامال کر دیں۔

بہرحال آنحضرتؐ نے اپنے کام کا آغاز کیا اور لوگوں کو اللہ کے دین کی طرف بلایا جس نے اس دین کو تسلیم کیا وہ صاحبِ ایمان ہوا اور نئی برادری کا رکن بن گیا، خواہ اس کی زبان، نسل، وطن، رنگ وغیرہ کچھ ہی ہو اور جس نے اسس کو نہیں مانا وہ اس مجمع کی رکنیت سے محروم رہا خواہ وہ قریشی و ہاشمی ہی کیوں نہ ہو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ نسل و نسب کی بنیاد منہدم ہو گئی۔ دین کے سوا کوئی دُوسرا رشتہ ایسا نہ تھا جس کے ذریعہ افراد کو اُمت کی شکل میں جوڑا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ابتداءً اہلِ مکہ میں سے جن لوگوں نے اس دعوت پر لبیک کہا ان کا تعلق مختلف شعوب و قبائل سے تھا۔ وہ تمام امتیازات کو پامال کرتے ہوئے پرانے معاشرہ سے کٹ کر نئے مرکز پر جمع اور خالص عقیدہ کی بنیاد پر ایک دُوسرے سے وابستہ ہوتے چلے گئے اور اس طرح ایک نئے معاشرہ کا آغاز ہو گیا۔

اب ہم ان اسباب و عوامل سے بحث کرنا چاہتے ہیں جو اس معاشرہ کے قیام اور اس کی توسیع میں مدد و معاون ثابت ہوئے اور وہ مندرجہ ذیل ہیں :

(الف) پہلا سبب جسے ہم فطری سبب کہہ سکتے ہیں یہ تھا کہ زندگی کے ہر میدان میں لپستی و زوال اور انتشار و افتراق کی جو کیفیت اس زمانے میں طاری تھی اس نے لوگوں کو ذہنی طور پر تبدیلیٔ حالات پر آمادہ کیا۔ جیساکہ ہم پچھلے باب میں مطالعہ کر چکے ہیں کہ یہ انحطاط و زوال مجموعی طور پر دنیا کے تمام متمدن علاقوں میں پایا جاتا تھا اس لیے حالات جتنے زیادہ خراب تھے کرب و اضطراب بھی اسی قدر زیادہ تھا۔ ہدایت و اصلاح کی شدید پیاس لوگوں میں پیدا ہو چکی تھی اور وہ ایک حیات بخش ضابطۂ حیات کا خیر مقدم کرنے کے لیے بالکل تیار تھے بلکہ تاریخ بتاتی ہے کہ ظہورِ اسلام کے وقت بحر و بر میں مفاسد کی یورش اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ[۴۳] بعض نیک دل افراد تو گھبرا کر تلاشِ حق میں نکل کھڑے ہوئے۔ چنانچہ ابن ہشام نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت سے حضرت سلمان فارسی کی جو سرگذشت نقل کی ہے[۴۴] اس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہدایت کی تلاش میں کہاں کہاں پھرتے رہے بالآخر عموریہ کے ایک راہب کی وصیت کے مطابق رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے[۴۵]۔ اسی سے متصل ابنِ ہشام کا ایک دُوسرا بیان نہایت قابلِ توجہ ہے وُہ کہتا ہے کہ ایک موقع پر قریش اپنے ایک بُت کے گرد جمع ہو کر تقریبِ عید منا رہے تھے عین اس وقت چار آدمی یعنی ورقہ بن نوفل، عبیداللہ بن جحش، عثمان بن الحویرث اور زید بن عمرو بن نفیل اس ہنگامہ سے بیزار الگ تھلگ بیٹھے یہ گفتگو کر رہے تھے کہ :

واللہ ما قومکم علیٰ شئ ۔ لقد اخطئوا دین ابیھم ابراھیم ۔ ما حجر نطیف به ، لا یسمع ولا یبصر ولا یضر ولا ینفع ۔ یا قوم، التمسوا بانفسکم (دیناً) فانکم واللہ ما انتم علیٰ شئ ۔ فتفرقوا فی البلدان یلتمسون الحنیفیه دین ابراھیم۔[۴۶]

(خدا کی قسم ہماری قوم ایک بے بنیاد مسلک پر چل رہی ہے۔ اپنے باپ ابراہیم کے دین کو انہوں نے

گنوا دیا۔ جس پتھر کا ہم طواف کر رہے ہیں وہ نہ دیکھتا ہے نہ سنتا ہے، نہ نفع پہنچا سکتا ہے نہ نقصان۔
ساتھیو! اپنے دلوں (دین) کو ٹٹولو۔ خدا کی قسم تم محسوس کرو گے کہ تمہاری کوئی بنیاد نہیں ہے، ملک ملک
گھومو اور کھوج لگاؤ دینِ ابراہیم کے سچے پیروؤں کا)

چنانچہ حق کی تلاش و جستجو میں بقول ابن ہشام ورقہ بن نوفل عیسائی ہو گیا۔ عبید اللہ بن جحش عالمِ اضطراب میں پہلے اسلام لایا پھر اسی اضطراب میں مرتد ہو کر عیسائی ہوا"۔ عثمان نے قیصرِ روم کے یہاں جا کر عیسائیت اختیار کر لی اور زید نے یہودیت قبول کی نہ نصرانیت البتہ اپنی قوم کا دین ترک کر دیا۔ بت پرستی چھوڑ دی۔ مردار اور استھان کے ذبیحوں سے پرہیز کرنا شروع کر دیا۔ بیٹیوں کے قتل سے لوگوں کو باز رکھنے کی تلقین کرتا اور کہا کرتا:

اعبد رب ابراھیم۔[۸۸]

(میں تو ابراہیم کے رب کا پرستار ہوں)

ابن ہشام اس سے آگے جو کچھ لکھتا ہے وہ بھی پڑھنے کے لائق ہے وہ کہتا ہے کہ:

اسماء بنت ابوبکر کا بیان ہے کہ میں نے بوڑھے سردار زید بن عمرو کو کعبہ کے ساتھ ٹیک لگائے ہوئے دیکھا، وہ کہہ رہا تھا کہ اے قریشیو! اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں زید بن عمرو کی جان ہے، میرے سوا تم میں کوئی بھی ابراہیم کے دین پر قایم نہیں رہا۔ پھر کہنے لگا کہ اے اللہ! اگر مجھ کو معلوم ہو کہ میں کس طرح سے تیری عبادت کروں تو میں اس کو بجا لاؤں مگر افسوس کہ میں تیری عبادت کا طریقہ نہیں جانتا۔[۸۹]

مکہ اس نیک نفس آدمی کے وجود کو بھی برداشت نہ کر سکا اور بالآخر زید کو شہر بدر کر دیا اور مکہ میں اس کا داخلہ ممنوع قرار دیا۔ نتیجتاً زید بن عمرو نے وطن چھوڑا اور دینِ ابراہیمی کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ موصل، الجزیرہ، شام وغیرہ کی خاک چھانتے ہوئے میفعہ (بلقا) کے ایک راہب کے پاس پہنچا اور اس سے گم گشتہ مسلکِ ابراہیمی کا سراغ پوچھا۔ راہب نے کہا:

"آج تجھے اس مسلک پر چلنے والا کوئی ایک متنفس بھی نہ ملے گا البتہ ایک نبی کے ظہور کا وقت آ پہنچا ہے جو اسی جگہ سے اٹھے گا جہاں سے تو نکل کر آیا ہے۔ وہ دینِ ابراہیمی کا علمبردار بن کے اٹھے گا۔ جا کر اس سے مل۔ اس کی بعثت ہو چکی ہے۔"[۹۰]

زید راہب کی ہدایت کے مطابق مکہ کی طرف روانہ ہوا مگر منزل پر پہنچنے سے پہلے بلادِ لخم میں قتل ہو گیا۔[۹۱]

ان روایات کو ہم نے اس لیے نقل کیا تاکہ یہ ثابت ہو جائے کہ بعثتِ نبوی کے وقت اذہان و قلوب میں سخت اضطراب پیدا ہو چکا تھا اور فطرتِ انسانی ماحول کے خلاف جذبہ احتجاج کے ساتھ بیدار ہو رہی تھی اور کم از کم عرب میں تو حنفاء کا ایک طبقہ ایسا ضرور موجود تھا[۹۲] جو صنم پرستانہ جاہلی طرزِ فکر سے بغاوت کر چکا تھا۔ اس صورتِ حال میں رسول اللہ کی بعثت اور آپ کی دعوت وقت کی آواز بن گئی۔ زمینوں کی طرح روحوں اور دلوں کے بھی موسم ہوتے ہیں اس لیے وہ موسم آ پہنچا تھا جبکہ

دلوں میں ایمان کے بیج ڈالے جائیں ان کے اضطراب کو سکون سے بدلا جائے اور رُوحوں کو عقیدہ کی لذّت سے آشنا کیا جائے۔ بہرحال رسول اللہؐ نے ٹھیک وقت پر زمانہ کی نبض پر ہاتھ رکھا اور دلوں کے احساس کو حقیقت کے طور پر پیش کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ جب لوگوں کے سامنے آپ کی دعوت واضح ہوئی تو انھوں نے اسے فوراً قبول کر لیا۔ انھوں نے یہ محسوس کیا کہ گویا اپنے ہی دل کی آواز سُن رہے ہیں ان کے قبولِ حق میں نہ تو معجزات کی ضرورت پیش آئی اور نہ اس بات کی کہ قرآن ان کے سامنے بار بار پیش کیا جائے۔ درحقیقت وہ پیاسے تھے اس وجہ سے جوں ہی ان کے سامنے پانی پیش کیا گیا وہ اس کی طرف دوڑ پڑے[83]۔ ان کی آنکھیں طلبِ ہدایت کے لیے کھلی ہوئی تھیں، اور جن کی آنکھیں کھلی ہوئی ہوں ان کو روشنی سے زیادہ عزیز کوئی چیز نہیں ہوا کرتی۔ پس جس طرح آئینہ روشنی میں چمک جاتا ہے یہ بھی روشنی پا کر چمک اُٹھے[84]۔ البتہ جو لوگ ضد، ہٹ دھرمی اور فریبِ نفس میں مبتلا تھے یا جن کو اپنے ذاتی مفادات عزیز تھے انھوں نے جانتے بُوجھتے انکار و کفر کی روش اختیار کی[85]۔

غرض ایک طرف تو حالات کے رُخ نے لوگوں کے اذہان و قلوب میں مدّ و جزر پیدا کیے اور دُوسری طرف اہلِ کتاب کی وساطت سے یہ روایات عرب میں بالعموم اور مکہ میں بالخصوص عام تھیں کہ ایک نئے نبی کی بعثت ہونے والی ہے[86]۔ رسول اللہؐ سے پہلے جو انبیاؑ و رسل اس دنیا کے مختلف حصّوں میں تشریف لائے انھوں نے متواتر یہ خوشخبری سُنائی کہ ایک نبیِ رحمت کی آخرکار بعثت ہوگی۔ ان انبیاؑ و رسل میں سے کم از کم حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کی پیش گوئیاں تو اب تک محفوظ ہیں[87]۔ اسی بنا پر اندرون و بیرون عرب بعثتِ محمدی کا چرچا عام تھا جیسا کہ ہم زید بن عمرو کے واقعات اور سلمان فارسی کی سرگزشت میں دیکھ چکے ہیں کہ مختلف علاقوں کے رہبان و احبار نے یکساں پیش گوئی کا اظہار کیا تھا۔ ابنِ ہشام نے آنحضرتؐ کی تبلیغی مساعی کے سلسلے میں لکھا ہے کہ طائف سے واپسی کے بعد جب بھی کہیں کوئی مجمع دکھائی دیتا یا حج کا موسم آتا تو آپ حج پر آنے والے تمام قبائل کا دورہ کر کے انھیں اسلام سے روشناس کراتے، توحید و رسالت کی دعوت دیتے اور ان کو دینِ خداوندی کی نصرت و اعانت پر آمادہ کرنے کی کوشش فرماتے تھے۔ چنانچہ یہ دعوت آپ نے قبیلہ بنو عامر کو بھی دی۔ بنو عامر جب اپنے علاقے میں واپس پہنچے تو وہاں ان کے ایک بڑے بوڑھے نے حج کے حالات دریافت کیے۔ بنو عامر نے کہا:

"اس دفعہ ایک عجیب واقعہ ہم نے یہ دیکھا کہ قریش میں سے بنی عبد المطلب کے ایک نوجوان نے ہم سے کہا کہ "میں خدا کا رسول ہوں" اور ہم کو اس بات کی طرف بلایا کہ ہم اس کے ساتھ ہو کر اس کے مخالفوں سے مقابلہ کریں اور اس کو اپنے شہر میں لے آئیں۔"

اس بوڑھے نے یہ بات سُن کر دونوں ہاتھ اپنے سر پر رکھ لیے اور کہا کہ "اے بنی عامر! اس بات کی کیا تلافی ہو سکتی ہے کہ تم ایک نبی کو چھوڑ آئے۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے اس سے بڑھ کر کوئی مطلوب ہی نہیں اور بیشک وُہ نبی جو کچھ کہتے ہیں حق کہتے ہیں۔"[88]

ہم نے اُوپر جو پیشگوئیاں اور صداقتیں نقل کی ہیں ان کی خاص تاریخی اہمیت بھی ہے۔ کیونکہ ان کی بازگشت عہدِ رسالت کے تاریخی واقعات میں صاف سنائی دیتی ہے۔ مثلاً بیعت عقبہ کے موقع پر انصار کی سبقت ایمانی اس وجہ سے تھی کہ وُہ یہود پر فوقیت

حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس کی تفصیل تو ہم آئندہ بیان کریں گے البتہ یہاں یہ سمجھ لینا کافی ہے کہ مذکورہ پیشگوئیوں کے اثرات اہلِ کتاب اور انصار دونوں پر مرتب ہوئے۔(۸۹)

(ب) پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوتِ دین کا آغاز کیا تو آپ کی عمر چالیس سال تھی۔ چالیس سال کی مدت تھوڑی نہیں ہوتی۔ اس پوری مدت میں آپ کی زندگی اہلِ مکہ اور دوسرے اہلِ عرب کے سامنے ایک کھلی کتاب کی طرح تھی جس کی تحریر کا ہر حرف پاکیزہ، روشن اور مستحکم تھا۔ آپ کے بے داغ اخلاق و کردار، آپ کی امانت، دیانت، صداقت اور عالی نسبی و عالی ظرفی کا ہر شخص معترف تھا۔ اہلِ مکہ بچشمِ سر یہ دیکھ چکے تھے کہ اس صادق اور امین نے پوری زندگی ایسی شرافت، پاکیزگی اور احتیاط کے ساتھ گزاری ہے کہ اس سے زیادہ پاکیزگی کا تصور ممکن نہیں ہے۔ شراب کو کبھی ہاتھ نہیں لگایا، جذبات کبھی بے قابو نہیں ہوئے، بیحیائی کا کبھی مظاہرہ نہیں کیا، بدکاری و فحاشی اس کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آئی۔(۹۰) کسی موقع پر عصمت و عفت کا سودا یا لڑائی جھگڑا نہیں کیا، کسی کا ناحق خون نہیں بہایا، چوری، ڈکیتی، بت پرستی، غیر اللہ کے سامنے نذر و نیاز، مراسمِ جاہلیہ اور لہو و لعب سے وہ کوسوں دور رہا۔ غرض جاہلیت کے اس دور میں جو مفاسد بھی موجود تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب سے اپنے آپ کو بچا کر عظمت و شرافتِ نفس کا ایسا نمونہ پیش کیا جو اس ماحول میں ایک "عجوبہ" سے کم حیثیت نہ رکھتا تھا۔

یہ تو ایک پہلو تھا، اسی کے ساتھ ساتھ اخلاقِ محمدیؐ کا دوسرا پہلو بھی اہلِ مکہ کی نظروں سے اوجھل نہ تھا وہ جانتے تھے کہ ابو طالب کا بھتیجا فضول و لایعنی مشاغل سے اپنی توجہ ہٹا کر مظلوموں کی دادرسی، غریبوں کی مدد، مسکینوں کی اعانت اور خیر و صلاح کے فروغ میں صرف کرتا ہے۔ چنانچہ حربِ فجار(۹۱) میں شرکت اور حلف الفضول(۹۲) کا عہد اسی قبیل سے ہے۔ اسی طرح تعمیرِ کعبہ کے سلسلہ میں تنصیبِ حجرِ اسود کے موقع پر بھی اہلِ مکہ صادق و امین کے جذبۂ امن و آشتی اور حکم و سیاست کا مظاہرہ دیکھ چکے تھے جبکہ قریش میں سخت کشمکش پیدا ہو گئی تھی "لعقۃ الدم" ہو چکا تھا اور تلواریں چلنے میں کچھ دیر نہ رہ گئی تھی کہ اس عقدۂ لاینحل کو محمد رسول اللہ نے اپنے ناخنِ تدبیر سے ذرا دیر میں سلجھا دیا یہاں تک کہ سب کے دل کی گہرائیوں سے یہ آواز نکلتی تھی کہ:

"هذا الامين قد رضينا بما قضى بيننا۔"(۹۳)

(یہ امین ہیں ہم ان کے فیصلے پر راضی ہیں)

پھر خاص بات یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ طرزِ عمل وقتی نہ تھا بلکہ مستقل تھا۔ آپ کا اخلاقِ کریمانہ ہر آن و ہر گام یہی رہا چنانچہ جب آپ پر پہلی وحی غارِ حرا میں نازل ہوئی اور آپ نے گھر آ کر حضرت خدیجہؓ سے کچھ اندیشوں کا اظہار کیا تو حضرت خدیجہؓ نے آپ کے اخلاق و کردار کی شہادت دیتے ہوئے جو کچھ کہا تھا اس کا مفہوم یہ تھا کہ اے محمدؐ! آپ بالکل نہ ڈریں۔ اللہ آپؐ کو رسوا نہ کرے گا بلکہ آپ تو نبی بنائے جا رہے ہیں۔ اور پھر آپؐ تو سچ بولتے ہیں، رشتوں کو جوڑتے ہیں اور امانتیں ادا کرتے ہیں۔(۹۴)

غرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کردار کی عظمت اہلِ مکہ اور اہلِ عرب سب کے نزدیک مسلم تھی۔(۹۵) یہی وجہ ہے کہ جب آپ نے انقلابِ نو کی دعوت دی اور لوگوں نے اپنی ضد اور ہٹ دھرمی بلکہ اپنے ذاتی مفادات کی بنا پر انکار کی روش اختیار کی تو قرآن کے الفاظ میں رسول اللہؐ نے بطور دلیل ان سے کہا کہ:

فقد لبثت فیکم عمراً من قبلہ۔ افلا تعقلون۔ (۹۶)

(میں اس سے پہلے تم میں ایک عمر گزار چکا ہوں۔ کیا تم سمجھتے نہیں؟)

اسی طرح کوہِ صفا پر کھڑے ہو کر پہلی مرتبہ قوم کو مخاطب کیا تو یہ فرمایا تھا کہ:

"اگر میں یہ کہوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے سے ایک حملہ آور فوج چلی آ رہی ہے تو کیا تم میری بات پر یقین کرو گے؟"

اس پر اہلِ مکہ کے پورے مجمع نے بالاتفاق و بیک آواز یہ جواب دیا تھا کہ:

قالوا نعم انت عندنا غیر متھم وما جربنا علیک کذباً قط۔ (۹۷)

(ہاں ہم ضرور یقین کریں گے۔ تمہارے کردار پر کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا۔ تم نے کبھی جھوٹ نہیں بولا)

پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے کردار کی یہی وہ رفعت و بلندی ہے کہ ابُو جہل جیسا دشمنِ خدا و رسول بھی خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کرتے ہوئے اعتراف کرتا ہے کہ:

انا لا نکذبك ولکن نکذب ما جئت بہ۔ (۹۸)

(ہم آپ کو تو جھُوٹا نہیں کہتے مگر جو کچھ آپ پیش کر رہے ہیں اسے جھُوٹا قرار دیتے ہیں)

جنگِ بدر کے موقع پر اخنس بن شریق نے تخلیہ میں ابوجہل سے پُوچھا کہ یہاں میرے اور تمہارے سوا کوئی تیسرا موجود نہیں ہے۔ سچ بتاؤ کہ محمدؐ کو تم سچا سمجھتے ہو یا جھوٹا؟ تو ابوجہل نے جواب دیا کہ:

"خدا کی قسم محمد ایک سچا آدمی ہے۔ عمر بھر کبھی جھوٹ نہیں بولا، مگر جب لواء اور سقایت اور حجابت اور نبوت سب ہی کچھ بنی قصی کے حصہ میں آ جائے تو بتاؤ باقی سارے قریش کے پاس کیا رہ گیا" (۹۹)

ان حقائق کی تاریخی شہادت خود قرآن اس طرح دیتا ہے کہ:

فانھم لا یکذبونك ولکن الظالمین بآیات اللہ یجحدون۔ (۱۰۰)

(لیکن یہ لوگ تمہیں نہیں جھٹلاتے بلکہ یہ ظالم دراصل اللہ کی آیات کا انکار کر رہے ہیں)

بہر حال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس بے داغ سیرت نے بہت سے لوگوں کو متاثر کیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ مسلمان ہو گئے۔ چنانچہ ابتدائی ایام میں بہت سے لوگ آپ کی اسی سیرت کے پیشِ نظر ایمان کا اقرار کر کے جدید معاشرہ کے رکن بنے تھے۔ (۱۰۱)

(ج) واقعہ یہ ہے کہ آدمی کی ذہنیت کو تبدیل کرنا اور اس کے نقطۂ نظر یا نصب العین کو منقلب کرنا آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لیے غیر معمولی ذہانت، حکمت و تدبّر اور سب سے بڑھ کر ایسے استدلال سے کام لینا پڑتا ہے جو مخاطب کو ذہنی طور پر ہموار کر کے نئی بات قبول کرنے پر آمادہ کر سکے۔ جس طرح ایک بیج کی نشو و نما کے لیے تنہا بیج کی صلاحیتوں پر ہی نظر نہیں رکھنی پڑتی بلکہ زمین کی آمادگی و مستعدی اور فصل و موسم کی سازگاری و موافقت کا بھی لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ اسی طرح ایک داعیِ انقلاب کو بھی لازماً تخمِ ایمان کی آبیاری کے لیے قلوب و اذہان کی آمادگی و موافقت کو پیشِ نظر رکھنا پڑتا ہے اور یہ آمادگی اسی وقت

پیدا ہوسکتی ہے جبکہ استدلال محکم اور پائدار ہو۔

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عقاید اور تعلیماتِ دین کو دلوں میں اتارنے کے لیے ایک طرف تو ایسے دلائل و براہین سے کام لیا جن کا ادراک ایک ادنیٰ سے ادنیٰ عقل رکھنے والا آدمی بھی کر سکتا ہے نیز ان دلائل و آثار میں تنوع کا خیال بھی رکھا تاکہ افہام و تفہیم کا حق ادا ہو سکے اور دوسری طرف رسولؐ اللہ نے اہلِ عرب کی تمام خوبیوں اور خرابیوں، ان کی انفرادی و قومی روایات اور ان کے عادات و خصائل کی رعایت رکھتے ہوئے کشتِ ایمان کی آبیاری کی۔ جس طرح ایک طبیب مریض کی کیفیت و مرض کی ٹھیک ٹھیک نشان دہی کرنے کے بعد دوا تجویز کرتا ہے اسی طرح رسولؐ اللہ نے قوم کی حالت و کیفیت کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کرکے پوری حکمت و دانائی کے ساتھ لوگوں کی صلاح و فلاح کا کام انجام دیا۔

رسولؐ اللہ نے تبلیغ دعوت اور اشاعت تعلیم کے سلسلے میں مخاطب کی ذہنی نزاکتوں کا پورا پورا خیال رکھا۔ عرب کے مشرکین اور اہل کتاب پر جس طرح آنحضرتؐ نے اتمامِ حجت فرمایا ہے اس کی تمام تفصیلات قرآن میں موجود ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سے کسی ایسی بات کا مطالبہ نہیں کیا گیا جو ان کے لیے بالکل نادر اور انوکھی ہو اور ان کی تاریخ، ان کی روایات، ان کے معروف و منکر اور ان کے عقاید و اخلاق میں اس کی کوئی اصل یا شکل موجود نہ ہو۔ اس لیے آنحضرتؐ کا مطالبہ یہ تھا کہ اصول و جزئیات میں جو تناقض اور کجی پیدا ہو گئی ہے اس کو دور کیا جائے بلکہ اپنے پیغمبرانہ کام کی تکمیل میں آپ کی مستقل سیاست ہی یہ رہی ہے۔ آپ نے پہلے درجہ میں تو بعض مراسم جاہلیت کو جو بہت پہلے سے چلے آرہے تھے متعدد ترامیم و اصلاح کے بعد قبول کر لیا۔ دوسرے درجہ میں بعض دساتیر جاہلیہ پر کلیۃً خطِ تنسیخ پھیر دیا۔ اور تیسرے درجہ میں بالکل نئے اصول و قوانین عطا فرمائے۔

اس موقف کی وضاحت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے بہتر طور پر اس طرح کی ہے کہ:

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ملتِ حنیفیہ اسماعیلیہ کی کجی کو درست کرنے، اس کی تحریف کو دور کرنے اور اس کی روشنی کو پھیلانے کے لیے تھی۔ اور اللہ کے اس قول میں یہی مراد ہے کہ "ملة ابیکم ابراھیم"۔ اور جبکہ حالت ایسی ہے تو ضروری ہے کہ ملت ابراہیم کے اصول قابلِ تسلیم اور اس کا طریقہ مقرر ہو، اس لیے کہ نبی جب ایسی قوم میں مبعوث ہوتا ہے جن میں عمدہ طریقے باقی ہیں تو ان طریقوں میں تغیر و تبدل بے معنی ہے بلکہ ان کو قایم رکھنا ضروری ہے کیونکہ ان لوگوں کے نفوس ان کو اچھی طرح سے قبول کر لیتے ہیں اور ان سے ان پر خوب حجت قائم ہو سکتی ہے۔"(۱۰۲)

شاہ صاحبؒ آگے چل کر لکھتے ہیں کہ:

"اللہ تعالیٰ نے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی کج روی کو درست کرنے اور ان کی خرابیوں کی اصلاح کے لیے مبعوث فرمایا۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی اسماعیل کی شریعت میں غور کیا اور اس میں جو طریقہ حضرت اسماعیل کے مسلک کے موافق یا منجملہ شعائر الٰہی کے مطابق پایا اس کو باقی رکھا اور جس میں تحریف ہو گئی تھی یا اس میں خرابی پیدا ہو گئی تھی یا اس میں شرک و کفر کی علامات تھیں اس کو مٹا دیا اور اس کا بطلان مستحکم کر دیا اور جو امور عادات وغیرہ کی قسم سے تھے ان کی خوبیاں اور برائیاں اس طرح بیان کر دیں کہ ان سے احتراز کیا جا سکے، بری رسموں سے آپ نے منع فرما دیا اور عمدہ رسموں کا

حکم دیا اور جو مسائل اصلی یا عملی زمانہ فترت میں متروک ہوگئے تھے ان کو ویسا ہی شاداب و تر و تازہ کر دیا جیسا کہ وہ تھے اس طرح خدا کا انعام مکمل اور اس کا دین مستقیم ہوگیا۔" (۱۰۳)

آگے چل کر شاہ صاحبؒ اپنے دعوے کے ثبوت میں زمانہ جاہلیت کے بعض رسوم ورواج، اور اصول و فروعات کو پیش کر کے لکھتے ہیں کہ:

"اگر تم کو ہمارے مذکورہ بیان میں شبہ ہو تو ان مضامین میں غور کرو جن کو اللہ نے قرآن میں بیان فرمایا اور اس باقی علم کے ذریعہ جو ان کے پاس رہ گیا تھا ان پر دلیل قایم کی اور ان شکوک و شبہات کو دُور فرمایا جو انہوں نے اپنی معلومات میں داخل کر لیے تھے بالخصوص اس آیت کو دیکھو:

قل من انزل الکتاب الذی جاء به موسٰی۔

اور جب ان لوگوں نے کہا:

مال ھذا الرسول یاکل الطعام ویمشی فی الاسواق۔

تو اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ:

قل ماکنت بدعاً من الرسل۔

(آپ کہہ دیجئے کہ میں رسولوں میں سے کوئی انوکھا اور عجیب نہیں ہوں)

ایسی ہی بہت سی مثالیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین اگرچہ راہِ راست سے دُور ہٹ گئے تھے لیکن جو علمی حصہ ان میں باقی رہ گیا تھا اس کے ذریعہ سے ان پر حجت قائم ہوسکتی تھی۔ اہلِ جاہلیت میں جو لوگ حکیم ہوئے ان کے خطبوں کو دیکھو مثلاً قس بن ساعدہ، زید بن عمرو بن نفیل اور عمرو بن لحی سے پیشتر کے نیک لوگوں کے کلام کو دیکھو گے تو سب میں یہ بات مفصلاً معلوم ہوگی بلکہ ان کے کلام میں اگر نہایت غور و خوض کرو گے تو ان کے فضلاء اور حکماء کو پاؤ گے کہ وہ عالم معاد اور فرشتوں وغیرہ کا اعتقاد رکھتے تھے۔" (۱۰۴)

آگے لکھتے ہیں:

"اور یہ سب وہ باتیں تھیں جو ان میں حضرت اسماعیل کے طریقہ سے وراثۃً چلی آئی تھیں اور اہل کتاب سے ان کو حاصل ہوئی تھیں۔ ان کو بخوبی علم تھا کہ انسان کا اصلی کمال یہی ہے کہ وہ اپنے رب کے سامنے سرنگوں ہو اور انتہائی کوشش سے خدا کی عبادت کرے اور عبادت کے ابواب میں سے ان کے ہاں ایک طہارت بھی تھی اور غسلِ جنابت تو ان کے یہاں کا ایک معمول تھا اور اسی طرح ختنہ اور تمام فطری خصائل ان میں تھے۔ توریت میں ہے کہ اللہ نے ختنہ کو حضرت ابراہیم اور ان کی اولاد کے لیے ایک نشان قرار دیا تھا اور اس وضو کو مجوس اور یہود وغیرہ سب کیا کرتے تھے اور حکماءِ عرب بھی اس کے پابند تھے۔ ان میں نماز بھی مروج تھی۔ حضرت ابو ذرؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونے سے پہلے نماز پڑھا کرتے تھے اور قس بن ساعدہ الایادی بھی نماز پڑھا کرتے تھے، یہود، مجوس اور بقیہ عرب میں نماز کے تعظیمی افعال مروج تھے خاص

طور پر سجود کے پابند تھے اور دعا و ذکرِ الٰہی سے متعلق اقوال بھی تھے اور وہ لوگ زکوٰۃ بھی دیا کرتے تھے اور مہمان کی ضیافت کرنا، مسافر کو کھانا کھلانا، کسی کے اہل و عیال کا نفقہ مساکین کو صدقہ دینا اہلِ قرابت سے صلہ رحمی کرنا اور مصائب حق میں مدد کرنا ان کا دستور تھا اور یہ سب زکوٰۃ میں داخل تھے۔ انہی امور سے ان کی مدح ہوتی تھی اور انہی امور کو انسان کا کمال اور اس کی سعادت سمجھتے تھے۔ چنانچہ حضرت خدیجہؓ نے آپ سے عرض کیا تھا کہ "اللہ آپ کو رسوا نہ کرے گا کیونکہ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں۔ مہمانوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔ دوسروں کے عیال اور ضعفاء کے کفیل ہوتے ہیں۔ حوادث میں لوگوں کی اعانت کرتے ہیں۔" ایسا ہی ابنِ دغنہ نے حضرت ابوبکرؓ کی نسبت کہا تھا۔ اور وہ لوگ صبح صادق سے غروبِ آفتاب تک روزہ رکھا کرتے تھے اور مسجد میں اعتکاف کیا کرتے تھے۔ اور حضرت عمرؓ نے زمانۂ جاہلیت میں ایک شب کے اعتکاف کی نذر کی تھی اور رسولؐ اللہ سے اس بارے میں استفسار کیا تھا۔ اور عاص بن وائل نے وصیت کی تھی کہ میری جانب سے فلاں فلاں غلام آزاد کیے جائیں۔ حاصل کلام یہ ہے کہ اہل جاہلیت مختلف تعلیمات کے ذریعہ اللہ کی عبادت کیا کرتے تھے لیکن حج بیت اللہ اور اس کے شعائر کی تعظیم اور اشہر حرم تو اہلِ عرب میں ایسے مشہور تھے جو کسی پر مخفی نہیں۔ ان کے پاس کئی قسم کے منتر اور تعویذات بھی تھے لیکن ان میں شرک کی باتیں داخل کر دی تھیں۔ ذبح کرنا اور گردن میں برچھا مارنا ان کا طریقہ تھا، نہ وہ ذبیحہ کا گلا گھونٹتے تھے اور نہ پیٹ چاک کرتے تھے۔ وہ بقیہ دین ابراہیمؑ پر قایم تھے۔"[(۱۰۵)]

اور اسی سلسلۂ بیان میں آگے لکھتے ہیں:

"ان لوگوں کے کھانے میں، پینے میں، لباس میں، دعوتوں میں، مردوں کے دفن کرنے میں، نکاح، طلاق، عدت، سوگ اور خرید و فروخت و معاملات میں نہایت مستحکم طریقے متعین تھے جن کے ترک کرنے پر لوگوں کو ملامت کی جاتی تھی اور ہمیشہ سے وہ محارم کو جیسے بیٹیاں، مائیں، بہنیں وغیرہ حرام سمجھتے تھے۔ ظلم اور تعدی کے موقع پر ان کے ہاں سزائیں مقرر تھیں جیسے قصاص، دیت اور قسامت۔ اسی طرح زنا اور چوری کی سزائیں مقرر تھیں۔ نیز ایران و روم کی سلطنتوں کے ذریعہ سے ان میں منزلی اور تمدنی تدابیر و علوم بھی آگئے تھے۔ لیکن ان میں بدکاری کی کثرت ہوگئی تھی۔ آپس میں ایک دوسرے کو قید کر کے اور لوٹ مار کر کے ظلم کرتے تھے۔ زنا، فاسد نکاح اور سود خوری خوب پھیل گئی تھی۔ نماز اور ذکرِ الٰہی کو بالکل ترک کر دیا تھا اور ان کی طرف کچھ توجہ نہ کرتے تھے۔ پس ان حالات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے۔ آپ نے ان کے تمام امور میں غور و خوض کیا۔ ان میں سے جو حصہ ملتِ ابراہیمی کا صحیح تھا اس کو باقی رکھا اور اس پر عمل کرنے کی تاکید فرمائی اور آپ نے اسباب و اوقات، شروط و ارکان، آداب و مفسدات، رخصت و عزیمت اور ادا و قضا کی تعلیم دے کر انھیں منضبط کر دیا اور گناہوں کی روک تھام کے لیے حدود، سزائیں اور کفارات معین فرمائے۔ ترغیب اور ترہیب کے ذریعہ دین کو ان کے لیے آسان کر دیا، گناہوں کے تمام ذرائع بند کر دیے اور ان امور پر آمادہ کیا جن سے نیکی کی تکمیل ہوتی ہے...... ان کی تمام تحریفات کو مٹا دیا اور ان کے مٹانے میں انتہائی کوشش کی اور جو رسوم صحیح تھیں ان کو باقی رکھا اور ان کا حکم فرمایا اور جس قدر ان کی رسوم فاسدہ تھیں ان سے روک دیا اور خلافتِ کبریٰ کو ان میں قایم کیا۔"[(۱۰۶)]

بہرحال اس طرزِ استدلال سے فائدہ یہ ہوا کہ داعی کے متعلق یہ بدگمانی پیدا نہیں ہوتی کہ یہ کوئی ایسا شخص ہے جو انفرادیت کے زعم میں تمام ماضی پر خطِ تنسیخ پھیرنا چاہتا ہے اور اپنی شخصیت کا سکہ جمانا چاہتا ہے بلکہ یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ ہمارے ہی اگلوں کا ورثہ ہماری طرف منتقل کرنے آیا ہے۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ آپ نے مخاطب سے لڑائی لڑنے یا براہِ راست چوٹ کرنے کے بجائے اس بات کی کوشش فرمائی کہ جن اصولوں پر اشتراک و اتحاد ہے اس کے مشترک پہلوؤں کو استدلال کے ذریعہ واضح کر دیا جائے تاکہ مخاطب داعیِ حق کی بات سننے کی طرف راغب ہو۔ اس میں ضد اور ہٹ دھرمی کا مادہ کم سے کم پیدا ہو اور پھر اس کے سامنے ان نتائج کو رکھا جائے جو اس کے اپنے اقرار کردہ اصولوں سے لازمی طور پر نکلتے ہیں تاکہ وہ ان کو اپنی بات سمجھ کر قبول کرنے کی طرف مائل ہو۔ چنانچہ سورۂ عنکبوت میں یہ ہدایت موجود ہے کہ:

ولا تجادلوا اھل الکتاب۔ (۱۰۷)

(اہلِ کتاب سے مجادلہ نہ کرو!)

اور ایک جگہ قرآن میں اس طرح ارشاد ہوا کہ:

قل یآھل الکتاب تعالوا الیٰ کلمۃٍ سواءٍ بیننا و بینکم۔ (۱۰۸)

(اے اہلِ کتاب! اس بات کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے)

بہرصورت رسول اللہؐ نے اپنے اور مخاطب کے درمیان قدرِ مشترک کو تلاش کیا اور اس کو بنائے بحث و استدلال بنایا۔ کیونکہ نوعِ انسانی اپنے ظاہری اختلافات کے لحاظ سے کتنی ہی متفرق اور پراگندہ کیوں نہ نظر آئے لیکن اس کے اس تفرق اور پراگندگی کی تہہ میں بے شمار اصول و قواعد ایسے بھی ہیں جن میں سب متحد ہیں۔ آفاق کے قوانین و ضوابط، فطرت کے یقینیات، تاریخ کے مسلمات اور بنیادی اخلاقیات میں سے بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن میں شرق و غرب اور عرب و عجم سب ایک ہی نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔ (۱۰۹)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرزِ استدلال اور طریقِ دعوت کا نتیجہ یہ بھی نکلا کہ وہ لوگ جو ایمان قبول کرتے گئے ان کو ذہنی و فکری طور پر مزید اطمینان حاصل ہوا اور وہ اس پر پوری طرح جم گئے۔ پھر معاشرہ کا وہ طبقہ جو شک و تذبذب اور شبہات و احتمالات کا شکار تھا اور قبولِ حق میں پسندرکاوٹوں کے سبب جھجکا رہا تھا۔ اس طرزِ استدلال سے مطمئن ہو کر داخلِ اسلام ہونے لگا۔ اور تیسرا طبقہ جس میں شامل لوگوں نے اپنی فطری صلاحیتیں بالکل برباد کر ڈالی تھیں اور جن کی فطرت کا قالب بالکل ٹیڑھا ہو چکا تھا۔ ان لوگوں نے البتہ کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں، پیغامِ نبویؐ کے سننے اور سمجھنے سے انکار کر دیا اور یہ کہہ دیا کہ رسول کی تعلیمات بالکل انوکھی ہیں' ان کا یہ انکار بقول قرآن درحقیقت ان کے بہت سے سابق انکاروں کا لازمی نتیجہ تھا۔ چنانچہ سورۂ اعراف میں آتا ہے کہ:

تلک القریٰ نقص علیک من انبآءھا ولقد جآءتھم رسلھم بالبینٰت فما کانوا لیؤمنوا بما کذبوا من قبل کذٰلک یطبع اللہ علیٰ قلوب الکافرین۔ (۱۱۰)

(یہ بستیاں ہیں جن کے کچھ حالات ہم تم کو سناتے ہیں اور ان کے پاس ان کے رسول نشانیاں لے کر آئے
مگر وُہ ایسے نہیں تھے کہ جس چیز کو جھٹلا چکے ہوں اسے مان لیں اسی طرح اللہ کافروں کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے)

یہود کے معاملہ میں بھی یہی صورت پیش آئی۔ یہود کی اکثریت نے تعلیماتِ رسولؐ کا انکار کیا۔[111] ٹھیک یہی حال نصارٰی کا ہوا۔ ان کی جماعت کے بڑے حصّے نے جو اپنے اگلوں کی تقلید و پیروی میں گمراہ ہو کر دین کی اصل تعلیمات سے محروم ہو چکا تھا اسلام کو نہیں سمجھا بلکہ وہ اس کا دشمن بن گیا۔[112] الغرض اس گروہ کا طرزِ عمل جو کچھ بھی رہا ہو۔ اس سے یہ بات سب کے سامنے کھل کر آگئی کہ یہ لوگ جان بُوجھ کر تکذیبِ حق کر رہے ہیں۔[113] اس طرزِ استدلال کا یہ لازمی اثر بھی ہُوا کہ ایک عام عقلی و ذہنی بیداری پیدا ہوئی، صدیوں کا جمود ٹوٹا۔ اب ہر ایک کو جھنجھوڑ دیا گیا اور وُہ سوچنے پر مجبور ہو گیا۔

(د) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیاتِ طیبہ میں دعوت و تبلیغ کا جو فریضہ انجام دیا اس کا جائزہ لینے سے طرزِ تخاطب کا ایک خاص فرق سامنے آتا ہے یعنی ہجرت سے پہلے دعوت و تبلیغ کے ابتدائی دور میں طرزِ تخاطب بالکل عام ہے اور اسی لیے مکّی سورتوں میں زیادہ تر "یٰآیہا الانسان[114] ، یٰآیہا الناس[115] ، یا قوم[116]" وغیرہ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ اس سے دعوتِ دین کی عمومیت و ہمہ گیری ثابت ہوتی ہے۔ البتہ جب ایک مدت کی دعوت و تبلیغ کے بعد قوم پر اللہ کی حجت پُوری ہو گئی اور نہ ماننے والے اس حد تک آگے بڑھ گئے کہ خود پیغمبر کے قتل کے منصوبے بنانے لگے تو اس وقت صاف صاف یٰآیہا الذین کفروا کے ذریعہ خطاب کا رُخ بدل دیا گیا کیونکہ اب حق و باطل واضح ہو چکا تھا اور مکّہ کی سرزمین سے تمام سعید روحوں کو ایک رشتہ ایمانی میں پرو کر بالکل علیحدہ گروہ کی شکل دے دی گئی تھی۔[117] اس لیے اس کے بعد خطاب کا رُخ بھی یٰآیہا الذین اٰمنوا کے الفاظ میں ڈھل جاتا ہے اور پھر مدنی زندگی میں زیادہ تر اسی انداز پر ہر گروہ کی تفریق کر کے علیحدہ علیحدہ خطاب کیا جاتا ہے۔

طرزِ تخاطب کے سلسلہ میں ایک اہم پہلو یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ رسولؐ اللہ نے اپنی تعلیم و تلقین کے لیے جو زبان اور انداز اختیار کیا وُہ انتہائی مؤثر اور دلنشین تھا۔ کلام میں نامانوس الفاظ، پیچیدہ عبارات، قواعدِ صرف و نحو اور محاورات عام کی مخالفت، دُور از کار استعارات، بعید از فہم تلمیحات، غیر واضح تشبیہات و کنایات اور جملوں کی ترکیب و ترتیب میں ایچ پیچ بالکل نہیں۔ بلکہ اندازِ بیان اور کلام بالکل صاف، آسان، شستہ، پاکیزہ اور مختصر ہے۔[119] اور اس کی دُوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس کلام میں محض استدلال ہی نہیں ہے اور نہ صرف یہ کہ خشک فلسفیوں کی طرح عقل ہی کو خطاب کیا گیا بلکہ کلام میں براہِ راست انسان کے اعلیٰ جذبات سے اپیل موجود ہے۔ مزید برآں خطاب کا انداز سرد نہیں بلکہ اس میں گرمی ہے، جوش و جذبہ ہے اور اس پیمانے پر ہے کہ جس کی تہہ میں اخلاص کی شدّت کو ہر مخاطب محسوس کر سکتا تھا۔[120] اگرچہ کلام میں شاعر کی طرح کوئی ہیر پھیر نہیں[121]، کاہنوں کی طرح کوئی راز اور سریت نہیں[122] اور جھوٹوں اور کاذبوں کی طرح تصنّع اور بناوٹ نہیں[123]، اس کے باوجود کلام میں بلا کی شیرینی، صداقت، اخلاص اور تاثیر ہے۔[124] اس طرزِ کلام نے بلاشبہ لاتعداد دلوں کی کایا پلٹ دی اور انسانوں کے اس انبوہِ عظیم کو جو اس سے پہلے بالکل اندھا، بہرا اور گونگا تھا اور گنتی کے چند نفس پرست انسانوں کے پیچھے لگا ہوا خدا فراموشی اور دنیا پرستی کی

راہ پر چلا جا رہا تھا۔ دفعتاً اپنی آنکھوں سے دیکھنے اور اپنے کانوں سے سننے کے قابل بنا دیا جو بھی ایک مرتبہ گفت گو کرنے گیا متاثر ہوئے بغیر نہ لوٹ سکا۔[۱۲۵]

(۵) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اس میں شک نہیں کہ تمام انسانوں کے لیے ہوئی تھی لیکن ظاہر ہے کہ پہلے مرحلہ میں اہلِ عرب کی اصلاح کے بغیر کسی عالمگیر اصلاح کا تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ آغازِ کار میں رسول اللہ کا سب سے پہلے اپنی ہی قوم کے اربابِ اثر کا انتخاب کرنا بالکل فطری اور منطقی تھا۔ یہ بات بالکل صاف ہے کہ عوام الناس علم و عمل اور اخلاق و کردار میں ان لوگوں کے تابع ہوتے ہیں جو سوسائٹی میں اثر و اقتدار رکھتے ہیں۔ چنانچہ مثل مشہور ہے کہ:

الناس علیٰ دین ملوکھم۔

یعنی لوگ اربابِ اقتدار کے طریقے پر چلتے ہیں۔

اس کے معنی یہ ہوئے کہ اگر اربابِ اقتدار اصلاح قبول کر لیں تو عوام الناس خود بخود ٹھیک ہو جاتے ہیں۔[۱۲۶] اور درحقیقت یہی اونچے طبقات وہ ہوتے ہیں جن کی بیماریوں کی چھوت سے دوسرے بھی بیمار ہو جاتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ اگر ان کے علاج کی فکر پہلے کی جائے تو دوسروں کے علاج میں زیادہ زحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔[۱۲۷]

مزید برآں جو طبقہ قوم میں اونچا ہوتا ہے عموماً ذہنی اعتبار سے بھی وہی برتر ہوتا ہے۔ بلکہ یہ ذہنی برتری ہی اس کو قیادت کی جگہ دلاتی ہے۔ پھر اس طبقہ میں سے بھی جو لوگ ذہانت کے ساتھ ساتھ سیرت کی بلندی بھی رکھتے ہیں وہ جب اس دعوت کو قبول کر لیتے ہیں تو ان کی تائید سے دعوت کی قوت دوچند ہو جاتی ہے اور اگر کسی صحیح فکر کو قبول کر لیتے ہیں تو اس کی اساس پر بڑے نظام کو چلا سکتے ہیں۔

ان وجوہات کی بنا پر کوئی دعوت جس کا مقصد ایک اہم فکری و عملی انقلاب ہو اس طبقہ سے اغماض نہیں برت سکتی۔ چنانچہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تو اوّلین درجہ میں یہ حکم دیا گیا کہ:

فاصدع بما تؤمر۔[۱۲۸]

(اور تجھ کو جو حکم دیا گیا ہے صاف صاف سنا دے)

اور یہ کہ:

انذر عشیرتك الاقربین۔[۱۲۹]

(اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈراؤ)

اور تاریخ کا ہر طالب یہ جانتا ہے کہ قریبی رشتہ دار قریش کے وہ لوگ تھے جو مکہ کی اعیانی حکومت کے اربابِ حل و عقد تھے اور اس کے واسطے سے گویا اہلِ عرب کی اخلاقی و سیاسی رہنمائی کر رہے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکمِ الٰہی کے مطابق قریش کو دعوت دی۔[۱۳۰] قریش کے سرداروں میں سے ایک ایک کے سامنے دین پیش کیا اور جب ان کی طرف سے شدید نفرت و مخالفت کا اظہار ہوا تو انتہائی جذبۂ خیر خواہی کے ساتھ ان کے قبولِ اسلام کے لیے دعائیں بھی کیں۔[۱۳۱] یہاں

یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ رسول اللہؐ کی مثبت دعوت کے مقابلے میں قریش کے اعلیٰ طبقہ نے یہ منفی رویّہ کیونکر اختیار کیا۔ تو اس کے جواب میں ایک جدید العہد مصنف کا یہ بیان ہمارے نزدیک درست ہے کہ:

"دعوتِ حق کی مخالفت بالعموم وہ کرتے ہیں جو روایتی دینداری یا روایتی مالداری کی وجہ سے نظامِ جاہلی کے اندر پیشوائی اور سرداری کے مقام پر متمکن ہوتے ہیں۔ یہ ایک طرف تو یہ لوگ آگے چلتے رہنے کی وجہ سے آگے چلنے کے ایسے عادی ہو جاتے ہیں کہ حق کے پیچھے چلنے میں بھی انھیں عار محسوس ہوتا ہے۔ اور وہ بجائے اس کے کہ حق کے پیچھے چلیں کوشش اس بات کی کرتے ہیں کہ حق کو اپنے پیچھے چلائیں"۔ (۱۳۲)

پھر آگے لکھتے ہیں کہ:

"اس طرح کی ذہنیت کے لوگوں کو جب کوئی ایسی دعوت چیلنج کرتی ہے جو ان کی روایتی دینداری کے خلاف ہوتی ہے یا جس کی زد ان کی خواہشوں پر پڑتی ہے تو یہ تلملا کے اس کی مخالفت کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں بالخصوص اس صورت میں ان کی مخالفت بہت ہی سخت و شدید ہو جاتی ہے جب یہ دعوت ان کے حلقہ کے سوا کسی اور حلقہ سے بلند ہوئی ہو"۔ (۱۳۳)

بہرحال قریش کی مذہبی اجارہ داری اور دینی قیادت کو جو شدید خطرہ لاحق ہو گیا تھا وہ ان کی مخالفت کا ایک بنیادی سبب بن گیا۔ لیکن مذہبی قیادت کے تحت در اصل مادی وسائل اور مالی آمدنی کا معاملہ بھی قریش کو سخت خطرے میں نظر آ رہا تھا کیونکہ کعبہ کی مجاوری و کلید برداری اور خانۂ کعبہ سے متعلق دوسرے اہم مناصب ذریعۂ منفعت بنے ہوئے تھے۔ دوسرا اہم سبب ان کی مخالفت کا یہ تھا کہ رسول اللہؐ جو دین پیش کر رہے تھے وہ ان کے اپنے آبائی دین کے خلاف تھا اور اس آبائی دین اور اس کی روایات کا ان کو اس قدر پاس تھا کہ اس کے خلاف کسی حلقہ سے کوئی بات سننا انھیں گوارا نہ تھا۔ علاوہ ازیں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ قرآن نے ان کی ایک ایک بات کو کھول کر رکھ دیا۔ ان کے اخلاق و معاشرت پر سخت گرفت کی اور ان کی خرابیوں کی نشان دہی کی۔ (۱۳۴) اس سے یہ تو ضرور ہوا کہ اچھائی اور برائی کا فرق واضح ہو گیا۔ کھرا اور کھوٹا سب کے سامنے آ گیا لیکن کفار و مشرکین کو یہ بات سخت ناگوار گزری کہ ہمارا سارا بھرم اپنے تمام غرور و وقار کے باوجود کھلتا جا رہا ہے اور ملمع کاری کا نقاب ہٹ کر اصل بھیانک کردار لوگوں کے سامنے آتا جا رہا ہے۔ اس چیز نے فطری طور پر ان کو سخت ترین مخالفت پر آمادہ کر دیا۔ ہمارے نزدیک قریش کی مخالفت کا سب سے اہم اور بنیادی سبب یہ تھا کہ رسول اللہؐ کی تعلیمات کے نتیجہ میں در اصل جاہلی معاشرہ کا تار و پود بکھر رہا تھا۔ اس وقت تک حال یہ تھا کہ ان کی اصل معاشرتی تنظیم قبائلی تھی۔ معاشرہ میں کوئی آدمی کسی نہ کسی قبیلہ سے کسی نہ کسی نوع کا تعلق پیدا کیے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا تھا اور ہر شخص کے لیے یہ بھی لازمی تھا کہ قبیلہ کے نظم کی سختی سے پابندی کرے۔ شیخِ قبیلہ کی اطاعت اور قبیلہ کی روایات کا احترام بھی اس کے لیے لازمی تھا۔ بصورتِ دیگر وہ معتوب، مستحق عذاب اور طرد کے قابل تھا۔ ادھر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوت کا آغاز کیا تو اس کے نتیجہ میں لوگ پرانے جاہلی معاشرہ سے ٹوٹ ٹوٹ کر اس نئے معاشرہ کے رکن بننے لگے جس کی داغ بیل رسول اللہؐ نے دین کی بنیاد پر ڈال دی تھی اور دین کا رشتہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں ایسا رشتہ تھا جس نے تمام آدابِ جاہلیت کو پامال کر ڈالا تھا۔ جو لوگ اسلامی معاشرہ کے رکن

بن رہے تھے انھوں نے اپنے سارے جاہلی مراسم اور معاشرتی آداب کو بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ وہ ایک طرف تو شیخ قبیلہ، عزیز اقارب، دوست احباب سب کی نصیحتوں اور مرضی و خوشنودی کے علی الرغم مجتمع جدید کے رکن بنتے جا رہے تھے اور دوسری طرف نتائج و عواقب کی پروا کیے بغیر اس میں جڑتے چلے جا رہے تھے اور وہ بھی اس اولوالعزمی اور ثابت قدمی کے ساتھ کہ پھر اس رشتہ کو کوئی چیز منقطع نہ کر سکتی تھی۔ اب باپ بیٹے کے لیے غیر اور بیٹا باپ کے لیے اجنبی بن گیا۔ حسب و نسب کے تمام بت سجدہ ریز ہو گئے۔ امتیاز و افتخار کے جھوٹے معیار باطل قرار پائے۔ گویا اجتماعیت کی ایک نئی بنیاد اور اتحاد و تعلق کی نئی اساس پر جو گروہ بن رہا تھا وہ اہلِ عرب کے لیے کھلا چیلنج بھی تھا اور اس نے ان کے صدیوں پرانے معاشرتی نظم کو بھی درہم برہم کر کے رکھ دیا تھا۔

اس صورتِ حال نے اہلِ عرب کو عموماً اور قریش کو خصوصاً انتہائی پریشانی اور سخت غم و اندوہ میں مبتلا کر رکھا تھا۔ ابن ہشام کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ زمانہ حج کے قریب چند اشخاص ولید بن مغیرہ سے یہ مشورہ لینے آئے کہ:

"اب حج کے دن آ رہے ہیں ہر چہار جانب سے اہلِ عرب تمہارے ہاں آئیں گے اور تمہارے صاحب یعنی حضورؐ کا حال وہ سن چکے ہیں۔ پس اب تم رائے دو کہ اس کا کیا بندوبست کرنا چاہیے؟" (۱۳۵)

اس کے جواب میں ولید بن مغیرہ نے حضورؐ کے لیے کاہن، مجنون، شاعر وغیرہ کے الزامات کی تردید کرتے ہوئے کہا:

"اے قریش! جس قدر باتیں تم نے بیان کیں ان میں سے جو بات تم کہو گے فوراً معلوم ہو جائے گا کہ یہ جھوٹ اور باطل ہے مگر یہی بات مناسب معلوم ہوتی ہے کہ تم ساحر کہو کہ اس سحر ہی کے سبب سے محمد نے لوگوں میں تفرقہ ڈال دیا ہے اور اس کا قول ایسا ہے کہ اس سے میاں بیوی اور باپ بیٹے اور بھائی اور کنبے اور برادری میں جدائی ہو جاتی ہے۔" (۱۳۶)

اسی طرح ایک مرتبہ قریش نے عتبہ بن ربیعہ کو حضورؐ سے گفتگو کے لیے بھیجا تو اس نے آ کر کچھ الزامات لگاتے ہوئے یہ کہا کہ:

"اے میرے بھتیجے! تم جانتے ہو کہ ہمارا خاندانی شرف کیا ہے اور نسب میں مقام و مرتبہ کیا ہے اور تم یہ بھی دیکھتے ہو کہ تم اپنی قوم کے پاس ایک ایسی چیز لائے ہو جس کے ذریعے سے تم نے اسے متفرق و منتشر کر دیا ہے۔" (۱۳۷)

ایک اور موقعہ پر تمام سردارانِ قریش حضورؐ سے مباحثہ کرنے کے لیے جمع ہوئے پھر حضورؐ کو اپنے پاس بلوایا اور جب آپ اس مجلس میں تشریف لے آئے تو سب نے متفق اللفظ یہ شکایت کی کہ:

"اے محمد! ہم نے تم کو گفتگو کرنے کے لیے بلایا ہے کیونکہ واللہ ہم عرب میں سے کسی اور شخص کو ایسا نہیں جانتے کہ جس نے اپنی قوم کو ایسی آفت میں مبتلا کیا ہو جو تم نے ہمارے باپ دادا کو برا کہتے ہو، ہمارے معبودوں کو گالیاں دیتے ہو، ہمارے نوجوانوں کو بیوقوف بناتے ہو اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تم نے ہماری جماعت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے ہیں۔" (۱۳۸)

رسول اللہؐ پر باپ کو بیٹے سے، بیٹے کو باپ سے اور بھائی سے بھائی کو جدا کرنے کا یہ الزام اس قدر مستحکم تھا کہ بدر کے موقع پر جب ابوجہل نے دیکھا کہ اس نئے دین نے قریش کو قریش ہی کے خلاف صف آرا کر دیا ہے تو اس نے میدانِ جنگ میں

پورے جوش کے ساتھ اللہ سے یہ دعا کی کہ :

اللھم اقطعنا للرحم و اتنا بما لا یعرف فاحنه الغداة ۔ (۱۳۹)

(اے اللہ! ہم میں سے جو سب سے زیادہ رشتۂ رحم کا توڑنے والا اور اس بدعت کا باعث ہوا ہو اس کو کل شکست دیجیو!)

بہر حال قریش کی مخالفت کا انداز کوئی بھی ہو اور انھوں نے رسولؐ اللہ کی عداوت میں خواہ کسی بھی الزام کا سہارا لیا ہو واقعہ یہ ہے کہ رسولؐ اللہ کی دعوت کے جواب میں ان کے طرزِ عمل سے نہ صرف یہ کہ خود ان پر حجت قائم ہوگئی بلکہ قریش کے رؤسا بلکہ کہنا چاہیے کہ اربابِ ریاست کا انکار پوری قوم پر اظہر من الشمس ہوگیا اور ہر صاحبِ عقل یہ سمجھ گیا کہ ان کا انکار کن اسباب کا نتیجہ ہے ۔ اس سے ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ عقل و شعور رکھنے والے لوگوں کی کثیر تعداد پیغامِ نو کو قبول کرنے پر آمادہ ہوگئی اور دوسرا فائدہ ان لوگوں کے حق میں ظاہر ہوا جو اس وقت تک خاموش تبلیغ کے نتیجہ میں حلقہ بگوشِ اسلام ہو چکے تھے مزید برآں جو لوگ اسلام قبول کرتے جا رہے تھے (۱۴۰) ان کے دلوں میں بڑوں کی مخالفت سے جھجکنے اور ڈرنے کے بجائے حق کی حمایت میں ایک غیر معمولی رفعت کا احساس پیدا ہوا اور اس چیز نے ان کو ذہنی اور اخلاقی اعتبار سے اتنا اونچا کر دیا کہ وہ اپنی بے سروسامانی کے باوجود بڑے بڑے غرق آہن سورماؤں اور حسب و نسب اور جاہ و جلال رکھنے والے صنادید کے مقابلہ میں ڈٹ گئے ۔

(د) ابن خلدون کے نزدیک چونکہ اہلِ عرب تہذیب و تمدن سے گریزاں، مدنی زندگی کے لوازمات سے عاری تھے (۱۴۱) اور ان کی فطرت انتہائی سادہ تھی اس لیے وہ تمام اقوامِ عالم میں قبولیتِ حق و خیر کی استعداد سب سے زیادہ رکھتے تھے ابن خلدون کا یہ نظریہ بجا طور پر تاریخی صداقت کا حامل ہے ۔ دنیا کی متمدن ترین مملکتوں اور جزیرہ نمائے عرب کے درمیان لق و دق صحرا اور بے آب و گیاہ میدان حائل تھے ۔ اس وجہ سے تہذیب و تمدن کی نیرنگیاں اور اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے اثرات سے سرزمین عرب محفوظ تھی ۔ اور پھر سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ عرب وہ قوم تھی جو کسی بیرونی تہذیب کے قدموں سے پامال نہ ہوئی تھی اس کے تمام قوائے فطری علیٰ حالہ قائم تھے ۔ نیز ان کی طبیعت پر جوش اور فطرت بے نقش تھی اس لیے ان کی لوحِ حیات پر نقش تازہ ثبت کیے جانے کی گنجایش موجود تھی ۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جس دین کو پیش کیا وہ بجائے خود انسان کی فطرت اور اس کی حاجیات و ضروریات کے عین مطابق ہے جس کی تائید قرآن کے ان الفاظ سے ہوتی ہے کہ :

فاقم وجهك للدين حنيفا ۔ فطرة الله التی فطر الناس علیها ۔ (۱۴۲)

(ہر طرف سے کٹ کر اپنے رُخ کو دین کی طرف سیدھا کر لو اور اللہ کی بنائی ہوئی اس فطرت کی پیروی کرو جس پر اس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے)

گویا اس دین کا سرچشمہ فطرت کے چند بنیادی حقائق ہیں اور اس کی صحیح نوعیت "دین فطرت" کی ہے ۔ چنانچہ رسولؐ اللہ کے

لائے ہوئے دین کی یہی وہ بنیادی صفت تھی جس نے اہلِ عرب کی ایک بڑی تعداد کو اس کی طرف مائل کیا اور اس کے لیے ان کے دلوں کو کھول دیا۔ اس دین کو قبول کر لینے کے بعد ان کی زندگیوں میں جو انقلاب واقع ہوا اس نے بجائے خود معاشرہ کے دوسرے افراد کو متاثر کیا اور اس طرح یہ دائرہ بڑھتا چلا گیا۔ دین کی تعلیمات کی اثر انگیزی اور انقلاب آفرینی کا سب سے بڑا ثبوت ہمیں اس وقت ملتا ہے جب نجاشی (شاہِ حبش) کے دربار میں تقریر کرتے ہوئے جعفر طیار یہ اعتراف کرتے ہیں کہ:

"اے بادشاہ! ہم لوگ پہلے سخت جاہل تھے، بتوں کی پرستش ہمارا مذہب تھا مردار خوری ہم کرتے تھے، خواہش اور گناہ کا ارتکاب ہمارا وطیرہ تھا، قطع رحم اور پڑوسی کی حق تلفی اور ظلم وستم کو ہم نے جائز کر رکھا تھا جو زبردست ہوتا وہ کمزور کو کھا جاتا، پس ہم ایسی ہی ذلیل حالت میں تھے کہ اللہ نے ہم پر کرم کیا اور اپنا رسول ہمارے پاس بھیجا جس کے نسب اور شرف اور صدق اور امانت اور عفاف سے ہم بخوبی واقف ہیں۔ اس رسول نے ہم کو توحیدِ الٰہی اور معرفت کی طرف بلایا اور بت پرستی جو ہمارے باپ دادا سے چلی آتی تھی اس سے ہم کو منع کیا اور صدق مقال اور ادائے امانت اور صلہ رحم اور ہمسائے کے حقوق اور گناہوں سے بچنے اور خواہش کے ترک کرنے کا حکم دیا اور یتیم کا حق تلف کرنے اور عورتوں پر تہمت لگانے سے منع فرمایا اور اللہ واحد کی عبادت اور نماز اور روزہ اور زکوٰۃ کو ہم پر فرض کیا ..... ہم نے اس رسول کی تصدیق کی اور ان پر ایمان لائے اور ہم نے شرک و کفر کو چھوڑ دیا اور جس چیز کو رسول نے حلال بتایا ہم نے حلال سمجھا اور جس کو حرام بتایا ہم نے حرام سمجھا۔" (۱۴۳)

حضرت جعفر کی یہ تقریر کم از کم یہ بات تو صاف طور پر ثابت کر رہی ہے کہ رسول اللہ کی تعلیمات کو بہر حال لوگوں نے قبول کیا اور ان تعلیمات کو تسلیم کر لینے والوں کی زندگیوں پر انقلابی اثرات رونما ہوئے۔ اب ظاہر ہے کہ جو لوگ معاشرہ میں ایسی واضح تبدیلیاں دیکھ رہے تھے اس کی طرف فوری طور پر متوجہ ہونے پر مجبور ہو گئے۔ یہاں ایک اہم نکتہ قابلِ لحاظ ہے کہ رسول اللہ کی پیش کردہ تعلیمات کے اثرات سے زندگیوں میں تبدیلیاں صرف اسی لیے نہیں آئیں کہ ان کی فطرت سادہ تھی بلکہ فی الحقیقت زندگی میں تبدیلی اقتضائے ایمانی تھی۔ یعنی جو لوگ حلقہ بگوش اسلام ہوئے ان کو رسوم جاہلیت کا ترک کرنا اور اخلاقِ فاضلہ کو اختیار کرنا بر بنائے ایمان ضروری تھا۔ بخاری کی متعدد روایتوں میں رسول اللہ نے یہ فرمایا ہے کہ جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہو اُسے چاہیے کہ پڑوسی کو نہ ستائے، مہمان کی ضیافت اور توقیر کرے، اچھی بات کہے یا خاموش رہے، زنا نہ کرے، شراب نہ پیئے اور چوری نہ کرے۔ (۱۴۴)

مختصر یہ کہ رسومِ جاہلیت کو مکی زندگی میں اوّلاً تقاضائے ایمانی کے طور پر مٹا دیا گیا اور پھر جب مدینہ میں اسلامی ریاست کا قیام عمل میں آگیا تو قانونی و دستوری طور پر ختم کر دیا گیا۔

(۳) اوپر ہم نے جعفر بن ابی طالب کی تقریر کے بعض حصے نقل کیے تھے۔ انہوں نے اس تقریر میں یہ بھی کہا تھا کہ ہماری قوم نے اس دین حق کے اختیار کرنے پر ہم کو تکلیفیں پہنچائیں اور ہم کو بہت ستایا تاکہ ہم اس دین کو ترک کر دیں اور دوبارہ بتوں کی پرستش اختیار کریں اور جس طرح کہ وہ خبائث کو حلال سمجھتے ہیں ہم بھی حلال سمجھیں۔ پس جب ان کا ظلم

ہم پر حد سے زائد ہُوا اور انہوں نے ہمارا وہاں رہنا دشوار کر دیا تو ہم وہاں سے نکل کھڑے ہُوئے اور آپ کے دامنِ پناہ میں آ گئے۔" (۱۴۵)

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ آغازِ اسلام کے بعد ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ پر ایمان لانے والے اصحاب کو شدید تکالیف، بے انتہا مظالم اور بہت سی آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ ترغیب و ترہیب کا کوئی انداز ایسا نہیں ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صاحبانِ ایمان پر نہ استعمال کیا گیا ہو۔ ان کو ڈرایا دھمکایا گیا (۱۴۶) ان پر طرح طرح کے الزامات اور پھبتیاں کسی گئیں، متہم کیا گیا اور دعوتِ محمدی کو روکنے کی ہر ممکن کوششیں کی گئیں۔ قریش نے رسول اللہ کو عاجز کرنے کے لیے یُوں تو بہت سے حربے استعمال کیے لیکن شاید مکّی دَور کے دو واقعات قابلِ ذکر ہیں۔ ایک یہ کہ سنہ ۷ نبوی میں قریش نے بنو ہاشم کا معاشرتی مقاطعہ کر دیا۔ اس سے زیادہ شدید اذیت پہلے کبھی نہ دی گئی تھی۔ محرم سنہ ۷ نبوی سے لے کر سنہ ۱۰ نبوی تک تین سال کا عرصہ قریش کی ظالمانہ تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ ایک حلف نامے کے ذریعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خاندان بنو ہاشم کو غیر معینہ مدت کے لیے معاشی و معاشرتی دونوں اعتبار سے مفلوج کر دینے کا منصوبہ بنایا گیا (۱۴۷)۔ لیکن وہ تین سال سے زیادہ برقرار نہ رہ سکا اور اس مقاطعہ کے نتائج اگرچہ کفارِ قریش کی توقعات کے مطابق نہ نکل سکے، لیکن اس دوران رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور بنو ہاشم کو بہر حال مبتلائے عذاب رکھا گیا۔

اور دوسرا واقعہ یہ ہے کہ ہجرت سے کچھ پہلے رسول اللہ کے قتل کا منصوبہ کفارِ قریش کے ایک خصوصی اجلاس میں تیار کیا گیا۔ دار الندوہ میں مکہ کے اعاظم و اکابر کا ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں تمام خاندانوں کے سر برآوردہ لوگوں نے شرکت کی (۱۴۸) حاضرین نے مختلف تجاویز پیش کیں۔ کسی نے کہا آپ کو قید کر دیا جائے، کسی کی تجویز یہ تھی کہ جلا وطن کیا جائے۔ آخر میں ابوجہل نے نہایت غور و خوض کے بعد کہا کہ محمد کو قید یا جلا وطن کرنے سے یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ میرے نزدیک سب سے زیادہ مناسب بات یہ ہے کہ ان کو قتل کر دیا جائے۔ قتل میں بھی سب قبیلوں کے لوگ حصہ لیں۔ ہر قبیلہ میں سے ایک ایک جوان منتخب کیا جائے اور یہ سب مل کر محمد کی شمعِ حیات کو گُل کر دیں۔ اس صورت میں قتل کی ذمہ داری تمام قبیلوں پر آ پڑے گی اور محمد کے قبیلہ میں اتنی ہمت نہ ہوگی کہ وہ ان کے خُون کا بدلہ لینے کے لیے سب قبیلوں سے جنگ کر سکے۔ زیادہ سے زیادہ خون بہا ادا کر کے معاملہ رفع دفع کر دیا جائے گا (۱۴۹)۔ "ملاءِ قریش" کا یہ منصوبہ اگرچہ بڑی مستعدی سے بنایا گیا تھا تاہم تاریخ کی شہادت یہ ہے کہ مخالفین و کفّار کی یہ کوشش بھی ناکام ہو گئی اور رسول اللہ بحفاظت تمام مدینہ تشریف لے گئے۔

قریش کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب پر مظالم کا یہ دور مختلف نتائج بروئے کار لایا۔ مثلاً :

(۱) مسلمان آزمائشوں کی بھٹّی سے گزر کر کندن بن گئے۔ ان کے ایمان و اسلام کو جانچ لیا گیا اور سب پر یہ واضح ہو گیا کہ ایمان کی قوت کو مٹایا نہیں جا سکتا۔ یہ بھی عیاں ہو گیا کہ ایمان و اسلام سے زندگی میں کیسی انقلابی تبدیلیاں آ جاتی ہیں۔

(۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اور آپ کے اصحاب کا اخلاص و للّٰہیت الم نشرح ہوگئی۔ دُنیا نے دیکھ لیا کہ داعیِ حق اور اس کے متبعین نہ کسی اجر کے طالب ہیں نہ داد و دہش یا منصب و جاہ، یا مال و منال کے خواہشمند ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہ کسی لالچ یا خوف سے بھی متاثر نہیں ہوتے۔ اور تمام دنیاوی محبتوں سے بالاتر سب کی فلاح و صلاح چاہتے ہیں۔ مسلمانوں کے اس گہرے اخلاص نے لوگوں کے دلوں میں بالآخر ہمدردی کے جذبات پیدا کیے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بنو ہاشم کے معاشی و معاشرتی مقاطعہ پر کم از کم پانچ آدمیوں یعنی ہشام بن عمرو (بنو عامر) زہیر بن ابی امیہ (بنو مخزوم) مطعم بن عدی (بنو نوفل) اور ابوالبختری و زمعہ بن الاسود (بنو اسد) نے اس ظلم و تشدد کے خلاف آواز بلند کی اور سراپا احتجاج بن گئے۔ انہوں نے صاف صاف کہا:

یا اھل مکہ، أنأکل الطعام ونلبس الثیاب و بنو ھاشم ھلکی لا یباع ولا یبتاع منھم، و اللہ لا اقعد حتی تشق ھٰذہ الصحیفۃ القاطعۃ الظالمۃ۔[150]

(اے اہلِ مکّہ! یہ کیا انصاف ہے کہ ہم کھائیں، پہنیں، آرام سے بسر کریں اور بنو ہاشم کو آب و دانہ نصیب نہ ہو؟ خدا کی قسم جب تک یہ ظالمانہ معاہدہ چاک نہ کر دیا جائے گا ہم چین سے نہ بیٹھیں گے)

اور پھر بالآخر انہی لوگوں کی کوششوں سے یہ معاہدہ ختم ہوا۔[151]

(۳) ان مظالم اور مخالفت کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ رسول اللہؐ کی دعوت کا چرچا نہ صرف مکّہ اور پُورے عرب بلکہ دوسرے بلاد و ممالک میں بھی پھیل گیا۔ ایک طرف مخالفانہ طور پر قریش اور دوسرے زائرینِ مکّہ نے اطراف و جوانب میں اسلام کا پیغام پہنچایا اور دُوسری طرف اہلِ مکّہ کی سرد مہری اور مخالفت نے رسول اللہؐ اور آپ کے اصحاب کو مکّہ سے باہر تعلقات استوار کرنے کا موقع عطا کیا۔ ان ہی وجوہ سے صحابہؓ نے دو مرتبہ حبشہ کی طرف ہجرت کی اور پھر مدینہ کی طرف کوچ کیا۔ علاوہ بریں رسول اللہؐ نے مکّہ سے باہر طائف میں مضافاتِ مکّہ میں اور حج پر آنے والے دوسرے قبائل کو دعوتِ اسلام دی۔ اور اس طرح اسلام کی تبلیغ و شیوع کا دائرہ بڑی تیزی کے ساتھ دُور دور پھیل گیا۔ اس سلسلہ میں مدینہ کے قبائل اوس و خزرج نے اس دعوت کو سُن کر لبیک کہا نتیجتاً بیعت ہائے عقبہ کا انعقاد ہوا جن کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ آپ مدینہ تشریف لے گئے بلکہ ایک ریاست کی تاسیس فوری طور پر عمل میں آگئی۔ (اس بیعت کا ہم مطالعہ آیندہ کے صفحات میں کریں گے)

غرض یہ تھے وہ بنیادی اسباب و عوامل جو اس نئے معاشرہ کے قیام و توسیع میں مدد و معاون ثابت ہوئے اور یہی وہ حالات تھے جن کے تحت اس نوزائیدہ اسلامی معاشرہ نے فروغ پایا۔ بہ الفاظِ دیگر یہ دراصل وہ اقدامات تھے جن کو اختیار کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عرب کے جاہلی معاشرہ میں انقلاب آفرین تبدیلیاں لائے۔ ان کے ذریعہ اس معاشرہ کے ایک ایک آدمی کو توڑا اور خالص دینی بنیاد پر نئی وحدت میں جوڑ دیا اور یوں ایک علیحدہ منظم معاشرہ کی تشکیل ہوگئی۔ یہ نیا معاشرہ جاہلی معاشرہ سے بالکل ممتاز و ممیز تھا اور اس کے ارکان یعنی صاحبانِ ایمان بھی جاہلی معاشرہ کے ارکان یعنی اہلِ کفر سے بالکل جداگانہ نظریات رکھتے تھے

ایمان اور کفر کی بنیاد پر بننے والے یہ دو علیحدہ علیحدہ گروہ متضاد و مخالف افکار و اعمال کے اعتبار سے مکہ میں ہی متشکل ہو کر سامنے آ گئے تھے۔ چنانچہ قرآن کریم کی جو سورتیں ہجرت سے پہلے مکہ میں نازل ہوئیں ان میں ان دونوں گروہوں کی واضح نشان دہی موجود ہے۔ اس لیے ہمارے نزدیک یہ کہنا غلط ہوگا کہ مکی دور میں ایمان و کفر کی واضح اجتماعیت سامنے نہ آئی تھی۔ اس کے ثبوت میں مکی سورتوں کے متعدد فقرے اور الفاظ قابل غور ہیں جن میں نہ صرف اہلِ ایمان و کفر کا امتیاز موجود ہے بلکہ ان دونوں گروہوں کی خصوصیات بھی بتادی گئی ہیں[۱۵۲]۔ علاوہ ازیں اوپر کے مباحث میں حضرت جعفر طیار کی جو تقریر نقل کی جا چکی ہے اس سے بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ صاحبانِ ایمان کا ایک علیحدہ گروہ جاہلی معاشرہ سے اُبھر کر سامنے آ رہا تھا۔

مجتمع جدید کی یہ تشکیل و ترتیب اور اہلِ ایمان کا ثبات و استقلال اگرچہ بجائے خود اس بات کا کھلا اعلان تھا کہ بننے والا نیا معاشرہ حسب و نسب، نسل و وطن، لون و لسان اور جاہلی عزّ و افتخار یا دوسرے قسم کے امتیازات و تعصبات سے پاک ہے اور صرف اساس ایمان پر قائم ہے۔ اس معاشرہ ایمانی کی تشکیل و تنظیم کے سلسلے میں رسول اللہؐ نے ایک اہم قدم اور اٹھایا۔ اور وُہ یہ کہ دعوت و ارشاد کے بالکل ابتدائی مکی دور میں ہی ان افراد کے درمیان ایک "عقد مواخاۃ" قایم کیا جو اس وقت تک حلقہ بگوش اسلام ہو چکے تھے۔ تاریخی شہادت کی رُو سے اس پہلی "مواخاۃ" کا انعقاد مکہ میں ہوا اور جن لوگوں کے درمیان ہوا ان میں سے چند کے نام درج ذیل ہیں:

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علیؓ کے درمیان

(۲) حضرت حمزہؓ اور حضرت زیدؓ بن حارثہ کے درمیان

(۳) حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ بن الخطاب کے درمیان

(۴) حضرت عثمانؓ بن عفان اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کے درمیان

(۵) حضرت زبیرؓ بن العوام اور حضرت عبداللہؓ بن مسعود کے درمیان

(۶) حضرت عبیدہؓ بن الحارث اور حضرت بلال مولی ابی بکر کے درمیان

(۷) حضرت مصعبؓ بن عمیر اور حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کے درمیان

(۸) حضرت ابو عبیدہؓ بن الجراح اور حضرت سالم مولی ابی حذیفہ کے درمیان

(۹) حضرت سعیدؓ بن زید اور حضرت طلحہؓ بن عبیداللہ کے درمیان[۱۵۳]

ٹھیک یہی فہرست ابنِ سید الناس نے بھی نقل کی ہے[۱۵۴] البتہ زرقانی علی المواہب میں یہ لکھا ہے کہ حضرت زبیرؓ بن العوام کی مواخاۃ حضرت طلحہؓ سے کرائی گئی تھی[۱۵۵]۔

بہر حال یہ تو چند نام تھے ورنہ بقول زرقانی مواخاۃ ان کے علاوہ اور دوسرے صحابہ کے درمیان بھی ہوئی تھی[۱۵۶]۔ مکہ کی یہ مواخاۃ کہاں ہوئی تھی اس کا ذکر مورخین نے نہیں کیا ہے۔ لیکن یہ بالکل واضح ہے کہ اس کا انعقاد یقیناً دارِ ارقم میں ہوا ہوگا۔ اس لیے کہ مذکورہ صحابہ میں سے حضرت عمرؓ، حضرت حمزہؓ اور حضرت مصعبؓ بن عمیر کے بارے

میں مشہور اور صحیح بات یہ ہے کہ یہ حضرات اس وقت ایمان لائے جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دارِ ارقم میں مقیم تھے۔

مذکورہ مواخاۃ نے مکہ کی اجتماعی و سیاسی زندگی میں اہم کردار ادا کیا اور اس سے متعدد نتائج برآمد ہوئے، جن میں سے مندرجہ ذیل کو بہرحال نظرانداز نہیں کیا جا سکتا:

(۱) اس مواخاۃ کے ذریعہ ایک آدمی کو دوسرے آدمی کا بھائی محض دین و ایمان کی بنیاد پر اور بغیر کسی ذاتی یا نفسانی غرض و غایت کے، صرف اللہ کی خاطر بنایا گیا اور اس طرح ایک قبیلے اور دوسرے قبیلے، ایک نسل اور دوسری نسل اور ایک رنگ اور دوسرے رنگ پر اللہ کا رنگ غالب آ گیا اور اللہ کے رنگ سے بہتر بھلا کون سا رنگ ہے۔[۱۵۰]

(۲) اس مواخاۃ کے ذریعہ گویا رسولؐ اللہ نے اپنے تمام دعووں کو ایک طرح کی قانونی شکل دے دی اور عملاً اس بات کا ثبوت فراہم کر دیا کہ ایمان کی اساس پر بننے والا معاشرہ سب سے الگ ہے۔ اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ جاہلی معاشرہ کی تمام اقدار کو پامال کرتے ہوئے حضرت حمزہ کا بھائی ایک آزاد کردہ غلام زید بن حارثہ کو بنایا جاتا ہے۔ ابو عبیدہ بن الجراح کو سالم مولیٰ ابو حذیفہ سے وابستہ کیا جاتا ہے اور عبیدہ بن حارث، بلال حبشی کے بھائی بنائے جاتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ پستی و بلندی، شرافت و رذالت اور خوب و ناخوب کے پیمانے بدل گئے۔ سب نے اپنی آنکھوں سے یہ دیکھ لیا کہ دین کے رشتہ میں منسلک ہونے والے مندرجہ بالا تمام افراد اگرچہ بالکل متضاد معاشرتی منصب کے مالک تھے مگر اخوت کے نظم میں مساوی طور پر پرو دیئے گئے۔ مواخاۃ نے سب کو ایک ہی سطح پر لا کھڑا کیا۔ امیر و غریب، شریف و رذیل، عالم و جاہل، عام و خاص، غلام و آقا یا کسی بھی ایک اور دوسرے طبقے کے درمیان نہ تو نفرت و غرابت پیدا کی گئی اور نہ ان طبقات کو آپس میں لڑا کر کوئی مادی منفعت یا دنیاوی مقصد حاصل کیا گیا۔

(۳) اس اخوت و مساوات کے نتیجہ میں اصولی طور پر ایک جدید سیاسی مجتمع ممتاز و ممیز ہو گیا۔

(۴) مواخاۃ نے مکہ کے ہمت شکن حالات میں اہلِ ایمان کو ایک دوسرے کے نفع و نقصان، رنج و غم اور خوشی و مسرت میں برابر کا شریک قرار دیا اور حالات کے مقابلہ کا انفرادی و اجتماعی حوصلہ بخشا۔

مختصر یہ کہ مندرجہ بالا اقدامات کے ذریعہ رسولؐ اللہ نے اوّلاً مکہ میں تمام صاحبانِ ایمان کی ایک وحدت بنائی اور پھر ہجرتِ مدینہ کے فوراً بعد اس وحدتِ ایمانی کو اور زیادہ وسیع اور مضبوط بنیادوں پر قائم فرما دیا۔ اہلِ ایمان کے درمیان عہد مواخاۃ کی تجدید ہوئی اور بالآخر رسولؐ اللہ معاشرہ کی تکمیل سے فارغ ہو گئے اور پھر یہی وہ مرحلہ ہے جب کہ مدینہ میں ریاست کا قیام عمل میں آتا ہے۔

(۳) تنظیم معاشرہ

(الف) پہلا مرحلہ

یہ بحث پہلے گذر چکی ہے کہ رسولؐ اللہ نے اسلامی معاشرہ کے نشو و ارتقاء کے لیے نقشۂ کار کس طرح مرتب کیا

اور پھر اس کے مطابق پیش آمدہ حالات و وسائل کا بہترین استعمال کر کے اسے کس حد تک عملی جامہ پہنایا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ قیام معاشرہ سے آگے بڑھ کر قیام ریاست کی راہ کس طرح ہموار ہوئی۔ اس نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہجرتِ نبویؐ سے ذرا پہلے مکہ میں ہی "بیعتِ عقبہ" کا ایک عظیم واقعہ پیش آیا۔ جو نہ صرف انسانی تاریخِ اجتماعیت کا بالکل منفرد واقعہ ہے بلکہ وہ درحقیقت ریاستِ نبویؐ کا سنگِ بنیاد ہے۔ ان وجوہ سے مذکورہ واقعہ کی ضروری تفصیلات کا بیان کر دینا انتہائی اہم ہے کیونکہ اس کے بغیر تاسیسِ ریاست کی بحث نامکمل رہے گی۔

تاریخی طور پر یہ ثابت ہے کہ مدینہ[158] میں اسلام کی تخم ریزی اور اشاعت کا آغاز ہجرت سے کئی سال قبل ہو چکا تھا[159] اور وہاں کے لوگ عرب کے دُوسرے قبیلوں کی بہ نسبت زیادہ آسانی اور تیز رفتاری کے ساتھ اسلام قبول کرتے جا رہے تھے۔ نیز یہ بات طے ہے کہ مدینہ کے مخصوص سیاسی ماحول میں تغیّر و تبدّل کے آثار نمایاں ہو چکے تھے۔

مدینہ کی آبادی مختلف عناصر پر مشتمل تھی۔ خصوصاً ایک طرف تو وہاں اوس اور خزرج[160] کے قبائل اپنی تمام تر تعصبات کے ساتھ موجود تھے تو دوسری طرف یہود[161] کے متعدد قبائل بھی رہتے تھے۔ لیکن عددی کثرت کے اعتبار سے ابنائے قیلہ یعنی اوس اور خزرج ہی فوقیت رکھتے تھے۔ بلکہ کچھ عرصہ پہلے تک ان ہی کو سیاسی و اجتماعی لحاظ سے یہود پر واقعی برتری حاصل تھی۔ لیکن جنگِ بعاث[162] کے نتیجہ میں اوس اور خزرج اس قدر تباہ ہو گئے کہ آخر کار یہود، جو مذہبی برتری کے پہلے ہی مدعی تھے، اقتصادی و سیاسی لحاظ سے بھی ان سے آگے بڑھ گئے۔ اور اس طرح مدینہ کی سیادت و قیادت اوس اور خزرج کے ہاتھ سے نکل کر یہود کو منتقل ہو گئی۔

اس صورتِ حال نے مدینہ کے معاشرہ پر گہرے اثرات مرتّب کیے اور مدنی سیاست کو ایک نیا رُخ عطا کیا۔ اس میں شک نہیں کہ جنگِ بعاث سے پہلے بھی وہاں قبائلی خود مختاری و آزادی، باہمی عصبیت و عداوت، مزاج اور افتراق و انتشار کا دور دورہ تھا۔ کوئی مرکزی اقتدار، کوئی قوتِ قاہرہ، کوئی عدالتِ مرافعہ نہ تھی اور نہ ہی کوئی متعین ضابطہ وہاں مروّج تھا۔ مختصر یہ کہ "زندگی وہاں ناممکن تھی"[163] پھر بھی لوگ زندہ تھے۔ البتہ جنگِ بعاث کے تاریخی حادثہ نے اہلِ مدینہ کے ضبط و تحمّل کے بند توڑ دیے اور انھیں اس حد تک پراگندہ خاطر کر دیا کہ وہ بالآخر عبداللہ بن اُبی[164] کو تقریباً متفقہ طور پر تاجدار بنانے پر آمادہ ہو گئے۔[165] ابن ابی اگرچہ فی الواقع تاجدار نہ بن سکا مگر یہ اس بات کا کافی ثبوت ہے کہ اہلِ مدینہ اس حالت سے بالکل بیزار ہو کر امن و آشتی کے طلبگار، انقلاب کے متمنّی اور ایک منظم حکومت کے خواہشمند تھے اور ان کی اس وقت کی سب سے بڑی ضرورت "اتحاد" تھی۔ چنانچہ ۱۱ نبوی میں جب اہلِ خزرج کا ایک قافلہ موسم حج پر زیارت کعبہ کے لیے مکہ پہنچا تو رسول اللہؐ نے ان سے ملاقات کی جس کے نتیجہ میں چھ آدمی حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے۔ اس پہلی ملاقات میں اہلِ مدینہ نے جو کچھ کہا وہ انتہائی قابلِ غور ہے۔ انہوں نے کہا تھا:

انا قد ترکنا قومنا و لا قوم بینھم من العداوۃ و الشر ما بینھم ، فعسٰی ان یجمعھم اللہ بك فسنقدم علیھم ، فندعوھم الی امرك و نعرض علیھم الذی أجبناك الیہ

من هذا الدين فان يجمعهم الله عليه فلا رجل اعز منك۔[۱۶۶]

(یا رسول اللہ! ہم اپنے پیچھے ایسی قوم کو چھوڑ کر آئے ہیں جس میں فتنہ و عداوت اس قدر ہے کہ کسی دوسری قوم میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ شاید آپ کے ذریعہ سے اللہ انہیں باہم متحد کر دے۔ ہم ان کے پاس جائیں گے اور آپ کے معاملہ (نبوت) کی جانب بھی مدعو کریں گے اور انھیں بھی آپ کے اس دین کی طرف دعوت دیں گے جو ہم نے قبول کر لیا ہے اگر اللہ تعالیٰ نے انہیں آپ پر متفق و متحد کر دیا تو آپ سے زیادہ باعزت کوئی دوسرا نہ ہوگا)

مختصر یہ کہ جنگِ بعاث کے بعد نہ صرف یہ کہ مدینہ کے سیاسی حالات میں تموّج پیدا ہوا اور وہ بتدریج رسولؐ اللہ کے حق میں سازگار ہوتے چلے گئے بلکہ اہلِ مدینہ بھی نئی تبدیلی کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو گئے۔ گویا جنگِ بعاث مدینہ میں رسولؐ اللہ کی آمد کی تمہید تھی۔ اس کی تائید حضرت عائشہؓ کے اس بیان سے ہوتی ہے جس میں آپ نے یہ فرمایا ہے کہ:

كان يوم بعاث يومًا قدّمه الله لرسوله صلى الله عليه وسلم فقدم رسول الله وقد افترق ملؤهم وقتلت سرواتهم وجرجوا۔[۱۶۷]

(جنگِ بعاث ایسی جنگ تھی جسے اللہ نے اپنے رسول کی آمد کا مقدمہ بنا دیا تھا پس جس وقت رسول اللہ نے قدم رنجہ فرمایا تو انصار کے معززین متفرق و منتشر، اور ان کے رؤسا قتل ہو چکے تھے اور زخم کھا کھا کر بہت خستہ و نزار ہو گئے تھے)

بہرحال عقبہ میں رسولؐ اللہ سے اہلِ مدینہ کی پہلی ملاقات اسلامی تاریخ میں ایک اہم موڑ ثابت ہوئی۔ اہلِ مدینہ نے اسلام قبول کیا تو گویا یہ حقیقت بھی مان لی کہ دین و ایمان کے آگے رنگ، نسل، زبان و وطن اور قومیت و عصبیت بے وقعت ہیں۔ اور اتحاد کا سب سے مستحکم ذریعہ "دین" ہی بن سکتا ہے۔ پھر انھیں یہ اطمینان و فخر بھی حاصل ہو گیا کہ وہ یہودیوں سے زیادہ مؤقر اور ان سے بہتر دین و کتاب کے حامل ہو گئے ہیں۔ اس موقع پر اہلِ مدینہ کے الفاظ ہماری بات پر دلالت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ:

والله انه النبي الذي توعدكم به يهود فلا تسبقنّكم اليه۔[۱۶۸]

(واللہ یہ تو وہی نبی ہیں جن کا ذکر تم سے یہودی کرتے تھے۔ دیکھو کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کے معاملہ میں وہ تم پر سبقت لے جائیں)

یہاں یہ وضاحت بے جا نہ ہوگی کہ اگرچہ اہلِ مدینہ کی سب سے اہم اور بنیادی ضرورت "اتحاد" تھی اور اس کے تحت وہ اپنے لوگوں میں سے ہی کسی کو اپنا حاکم بھی بنا سکتے تھے لیکن ان کی صدیوں پرانی قبائلی روایات اور گہرے تعصب کے پیش نظر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کا کوئی قبیلہ کسی دوسرے قبیلہ کے کسی شخص کو مستقلاً حاکم تسلیم نہیں کر سکتا تھا اور ان کی غیرت یہ گوارا نہ کر سکتی تھی کہ وہ اپنے دشمنوں کے آگے سرِ اطاعت خم کریں اور ظاہر ہے کہ یہ صورت عبداللہ بن اُبی کے ساتھ بھی

پیش آسکتی تھی جسے اگرچہ مدینہ کی آبادی تاجدار بنا لینے پر آمادہ تھی مگر یہ دراصل ایک اضطراری کیفیت کا نتیجہ تھا۔ یا شاید اس کی مقبولیت وقتی طور پر اس لیے بڑھ گئی تھی کہ عبداللہ بن ابی جنگِ بعاث میں غیر جانبدار رہا تھا۔[۱۶۹] بہرحال عبداللہ بن ابی کی حکومت بالاستقلال کا کوئی قطعی جواز مہیا کرنا بہت مشکل ہے۔ یہ بات اس لیے بھی سمجھ میں آتی ہے کہ ابن ہشام کی روایت کے بموجب اوس وخزرج کے قبائل نماز تک میں ایک دوسرے کی امامت تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے۔[۱۷۰] یہ حال تو اسلام لانے کے بعد کا ہے۔ اور وہ بھی خالص دینی مسئلہ میں۔ اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ سیاسی دائرہ میں وہ ایک دوسرے کی قیادت وسیادت کو کہاں تک تسلیم کرسکتے تھے۔ غالباً ان ہی تمام موافقات کی بنا پر اہلِ مدینہ نے رسول اللہ کو اپنا حاکم وفرمانروا تسلیم کرلینے میں عافیت زیادہ محسوس کی۔ کیونکہ ایک طرف تو رسولؐ اللہ کا پیغام بجائے خود ہر قسم کی عصبیت کی نفی کرتا تھا۔ اور دُوسری طرف آپ محض حق وانصاف کے داعی اور بالکل غیر جانبدار تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ مدینہ کے مشہور متحارب قبائل میں سے کسی سے بھی آپ کا تعلق نہ تھا۔ علاوہ ازیں نبی ورسولؐ اللہ ہونے کی بنا پر آپ ایک معزز ومحترم شخصیت تھے۔

غرض اب تک کی بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر منفی طور پر جنگِ بعاث نے رسولؐ اللہ کے لیے راہ ہموار کی تو مثبت طور پر مدینہ کے ان چھ افراد کی ملاقات بہت اہم ہے جو انھوں نے آنحضرتؐ سے عقبہ کے مقام پر کی تھی۔ جنگ بعاث کے نتائج کا تو مختصر جائزہ ہم پہلے لے چکے ہیں۔ جہاں تک عقبہ کی ملاقات کا تعلق ہے تو اس کے اثرات بھی مدینہ کے سیاسی ماحول پر بہت گہرے پڑے۔ وُہ چھ افراد[۱۷۱] جو اسلام لاچکے تھے اور اس کی اشاعت کا وعدہ بھی کرچکے تھے (ان کے الفاظ ہم پہلے نقل کرچکے ہیں) وہ جب مدینہ واپس آئے تو پورے جذبہ وخلوص کے ساتھ اپنے اسلام کا برملا اظہار کرنے لگے۔ مدینہ میں جس نے اس پیغام کو سنا متاثر ہوا اور پھر کچھ ہی عرصہ میں اوس وخزرج کا کوئی گھر ایسا نہ تھا جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر نہ ہوا ہو۔[۱۷۲] رسولؐ اللہ کی شخصیت سال بھر ان کا موضوعِ گفتگو بنی رہی۔ اس سے ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ مدینہ کے مخصوص حالات نے لوگوں کے دلوں میں جو تمنائیں پیدا کردی تھیں، لوگوں نے محسوس کیا کہ ان کے پورا ہونے کا وقت جلد آنے والا ہے۔ اور دُوسرا فائدہ یہ ہوا کہ ذہنی اور نفسیاتی اعتبار سے اوس اور خزرج رسولؐ اللہ کے زیادہ قریب آگئے۔ یہی وجہ ہے کہ جب سنہ ۱۱ نبوی میں اوس وخزرج کے افراد مقامِ عقبہ میں حضورؐ سے ملے اور شرک، چوری، زنا، قتلِ اولاد، ناحق افترا پردازی سے بچنے اور حضورؐ کے حکم سے کسی حال میں سرتابی نہ کرنے کا عہد استوار کیا تو ان کی تعداد پہلے سے زائد یعنی بارہ تھی۔[۱۷۳]

اس موقع پر اہلِ مدینہ نے رسولؐ اللہ کے سامنے جن باتوں سے مجتنب رہنے کا عہد کیا تھا وہ باتیں درحقیقت ایسی بنیادی خرابیاں تھیں جن سے مدینہ کا جاہلی معاشرہ بالکل "غیر سیاسی کیفیت اور نزاع کا شکار ہوکر رہ گیا تھا۔ اس بیعت کے ذریعہ گویا وُہ اپنے آپ کو اس بات کا پابند بنا رہے تھے کہ ایک ایسے صحت مند سیاسی معاشرہ کے قیام کے لیے جدوجہد کریں گے جس کی بنیاد توحید پر قایم ہو، جہاں امانت ودیانت ہو اور جہاں دوسروں کی

جان و مال اور عزت و آبرو کو محترم سمجھا جائے۔ لیکن چونکہ اس قسم کے معاشرہ کے لیے جدّ و جہد تعلیم اور تربیت کے بغیر نہیں ہو سکتی اس لیے اہلِ مدینہ نے آنحضرت سے اس بات کی خواہش ظاہر کی کہ ان کے یہاں کوئی معلّم بھیجا جائے۔[۱۷۴] چنانچہ آنحضرت نے ان کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے حضرت مصعب بن عمیر[۱۷۵] کو مدینہ روانہ فرما دیا۔

حضرت مصعب بن عمیر نے مدینہ آ کر اپنی شبانہ روز کوششوں سے تبلیغ و اشاعتِ اسلام کا حق اس طرح ادا کیا کہ رفتہ رفتہ مدینہ سے قبا تک گھر گھر اسلام پھیل گیا۔ صرف بنی اوس میں سے چند گھرانے باقی رہ گئے۔[۱۷۶] تعلیم قرآن و حدیث اور اشاعتِ اسلام کے ساتھ ساتھ حضرت مصعب مدینہ کے اہلِ ایمان کی نمازوں کی امامت بھی فرماتے تھے۔ یہ امامت اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ ان کی اقتداء میں اوس، خزرج اور ایسے قبائل کے افراد شانہ بشانہ کھڑے ہو کر نماز ادا کرتے تھے جو ابھی چند سال قبل تک ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ اور جو اپنی عداوت کو اس حد تک نہیں بھلا سکتے تھے کہ آپس میں ہی ایک دوسرے کی امامت قبول کر لیں۔[۱۷۷] لیکن حضرت مصعب کی امامت ان کے لیے نقطۂ اتحاد ثابت ہو رہی تھی۔

تاریخی مطالعہ کی رو سے بدترین دشمنوں کا ایک جگہ ایک صف میں اس طرح مجتمع ہو جانا اتنا بڑا انقلاب تھا جس کا جاہلی معاشرہ میں تصور بھی نہ کیا جا سکتا تھا۔ اسی لیے قرآن نے بطور احسان خداوندی کے اس خوشگوار انقلاب پر یوں تبصرہ کیا ہے کہ:

> واذکروا نعمة الله علیکم اذ کنتم اعداءً فالّف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمته اخوانا وکنتم علی شفا حفرة من النار فانقذکم منها۔[۱۷۸]
>
> (یعنی اور تم اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو جبکہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے پس اس نے تمہارے دلوں میں الفت پیدا کی اور اپنی نعمت سے تمہیں بھائی بھائی بنا دیا اور تم آگ سے بھرے گڑھے کے قریب تھے تو اس نے تم کو بچا لیا)

اور ایک جگہ یہ بھی ارشاد ہوا کہ،

> ولو انفقت ما فی الارض جمیعاً ما الّفت بین قلوبهم۔[۱۷۹]
>
> (اور اگر آپ جو کچھ زمین میں ہے اس میں سے بہت خرچ کر ڈالتے تب بھی ان کے دلوں میں محبت و الفت کا پیدا کر دینا آپ کے لیے ممکن نہ تھا)

مدنی معاشرہ کے ایک اہم اور با اثر عنصر یہود نے بھی اس انقلاب کو بڑی حیرت سے دیکھا۔ یہود کو یہ توقع ہرگز نہیں تھی کہ اوس اور خزرج کے جنگجو اور خونخوار قبائل یوں آسانی سے اسلام و ایمان کی بنا پر متحد و متفق ہو لیں گے اور کفر و شرک، قتلِ اولاد، زنا اور اس قسم کی دوسری عادات قبیحہ کو ترک کر کے اطاعت و انقیاد کی روش اختیار کر لیں گے۔ چنانچہ سر ولیم میور نے لکھا ہے کہ:[۱۸۰]

"The Jews looked on in amazement at the people, whom they had in vain endeavoured for generations to convince of the errors of Polytheism and to dissuade from the abominations of idolatory, suddenly and of their own accord casting away their idols, and professing belief in the One True God".

(یہود نے ان لوگوں کو بڑی حیرت سے دیکھا، جنھیں شرک والحاد کی غلطیوں پر قائل کرنے اور بت پرستی سے ہٹانے کی سخت ناکام کوششیں وہ نسلاً بعد نسلٍ کرتے چلے آئے تھے، وہی لوگ اب یکایک اور برضاورغبت اپنے بُتوں کو چھوڑ کر صرف ایک سچے خدا پر ایمان کا اظہار کر رہے تھے)

یہود نے یہ بھی محسوس کر لیا کہ اب وہ پہلے کی طرح اوس وخزرج کے درمیان نفرت وعداوت پیدا نہیں کر سکتے اور نہ انھیں لڑا سکتے ہیں۔ دُوسری طرف اوس وخزرج کے قبائل میں بھی بلند حوصلگی پیدا ہوگئی اور وہ یہ سمجھنے لگے کہ جس طرح اسلام قبول کر کے وہ یہود کے مقابلہ میں دینی و مذہبی برتری حاصل کر چکے ہیں اسی طرح ان سے قیادت بھی چھین سکتے ہیں۔ تیسری طرف اوس وخزرج کے درمیان جوں جوں اتحاد وموافقت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا رسولؐ اللہ کی شخصیت ان کے نزدیک محبوب سے محبوب تر ہوتی چلی جا رہی تھی کیونکہ وہ اس بات کا اظہار پہلے خود ہی کر چکے تھے کہ اگر رسولؐ اللہ نے ان کے اختلافات کو دُور کر دیا تو آپ سے زیادہ معزز ان کے نزدیک کوئی دُوسرا نہ ہوگا۔

بہرکیف حضرت مصعب بن عمیر جن کا قیام مدینہ میں تقریباً ایک سال تک رہا نہ صرف تعلیم وتبلیغ اسلام کے فریضہ میں منہمک رہے بلکہ اس تمام مدت میں وہ مدینہ کے سیاسی، اجتماعی، تہذیبی وتمدنی اور معاشی ومعاشرتی حالات کا بھی بغور جائزہ لیتے رہے۔ غالباً ان کی ماموری میں رسولؐ اللہ نے یہ رعایت بھی رکھی کہ وہ سابقین اسلام میں ہونے کی وجہ سے دین کی تعلیم وتربیت بھی بخوبی کر سکتے ہیں اور ذہین و ہوشمند ہونے کی وجہ سے مدینہ کے حالات ومسائل کا براہِ راست مطالعہ و تجزیہ کر کے حضور کو مطلع کر سکتے ہیں کیونکہ یہ معلومات رسولؐ اللہ کو اگلے اقدامات کے تعین میں انتہائی مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ جب دوسرے سال حج کا موقع آیا تو مصعبؓ مدینہ سے مکہ واپس آئے[۱۸۱]۔ ملاقات کر کے حضور کو تمام حالات سے مطلع کیا اور پھر غالباً مصعب نے ہی اہلِ مدینہ کی اس جماعت سے حضور کی ملاقات کا انتظام کیا جو اپنے دیگر ہم وطنوں کے ساتھ حج بیت اللہ کے لیے آئی تھی۔ مورخین کی تصریح کے مطابق ملاقات کے لئے ایامِ تشریق کا درمیانی عرصہ مقرر کیا گیا جس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

یہی وہ تاریخی موقع ہے جبکہ مقام عقبہ پر رسولؐ اللہ اور اہلِ مدینہ کے درمیان وہ تاریخی عہد استوار ہوا جس نے نہ صرف عرب بلکہ بعد کی پوری عالمی تاریخ پر فیصلہ کن اثرات مرتب کئے اور ریاست نبویؐ کے قیام کو فیصلہ کن مرحلہ میں داخل کر دیا۔

بیعت عقبہ کا انعقاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اہلِ مدینہ کے درمیان ذی الحجہ سنہ ۱۲ نبوی کی ۱۲ ویں شب کو بمقام عقبہ (منیٰ) عمل میں آیا۔(۱۴۲) اہلِ مدینہ کا وفد ستر سے زائد نفوس پر مشتمل تھا۔(۱۴۳) وہ حسبِ قرارداد ایک تہائی رات گذر جانے کے بعد رسول اللہ سے ملا۔(۱۴۴) وقت چونکہ بہت کم تھا اور قریش کی جاسوسی کا خطرہ بھی پوری طرح موجود تھا اس لیے مصلحتاً مذاکرات کو طول نہیں دیا گیا۔(۱۴۵) اور مختصر بحث و مباحثہ کے بعد انصار نے اس بات پر رضامندی ظاہر کر دی کہ وہ تمام خطرات کے علی الرغم، رسول اللہ اور آپ کے اصحاب کو اپنے شہر میں جگہ دیں گے، ان کی حمایت و نصرت اور حفاظت کریں گے، ہر حال میں اسلام پر قائم رہیں گے اور ہر موقع پر سمع و طاعت سے کام لیں گے۔(۱۴۶)

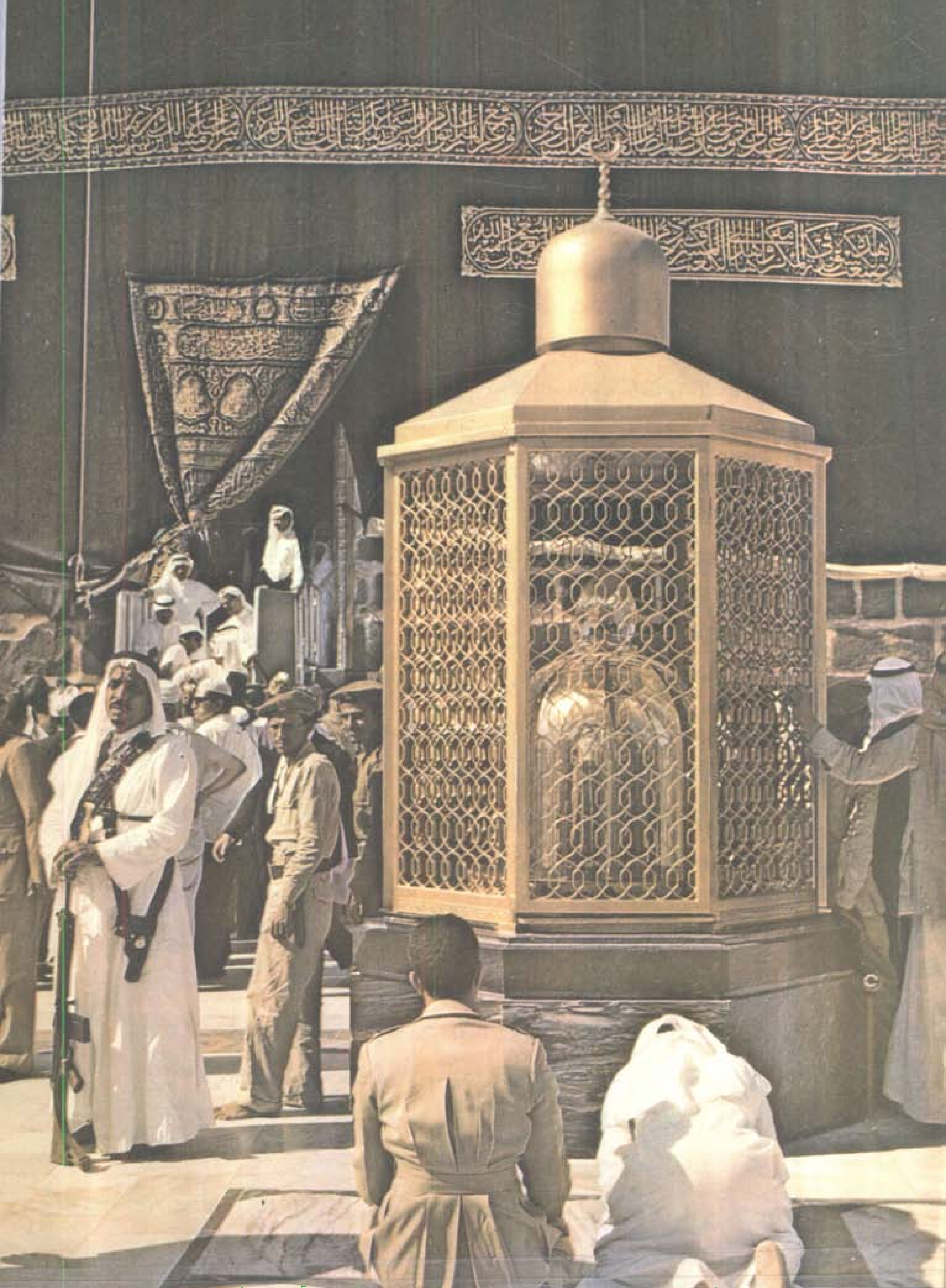
اس عہد یا بیعت کا ایک اہم اور قابلِ ذکر پہلو یہ ہے کہ یہ عہد فریقین کے درمیان انتہائی غور و خوض کے بعد وجود میں آیا تھا۔ اگر ایک طرف رسول اللہ گرد و پیش کی دنیا کا جائزہ لینے اور اہلِ مدینہ کے دو سالہ طرزِ عمل کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد اس مرحلہ تک پہنچے تھے تو دوسری طرف اہلِ مدینہ نے بھی بلا سوچے سمجھے محض تکلفاً اپنی رضامندی کا اظہار نہ کیا تھا بلکہ نتائج کا پوری طرح ادراک کر کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ہاتھ دیا تھا۔ چنانچہ عین اس وقت جبکہ یہ معاہدہ ہو رہا تھا تو عباس بن نضلہ انصاریؓ(۱۴۷) نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ:

هل تدرون علام تبايعون هٰذا الرجل؟ قالوا نعم، قال انكم تبايعونه على حرب الاحمر والاسود من الناس فان كنتم ترون انكم اذا نهكت اموالكم مصيبة و اشرافكم قتلاً أسلمتموه فمن الآن فهو و الله ان فعلتم خزى الدنيا و الآخرة وان كنتم ترون انكم وافون له بما دعوتموه اليه على نهلكة الاموال وقتل الاشراف فخذوه فهو والله خير الدنيا والآخرة۔(۱۴۸)

(جانتے ہو کہ اس شخص سے کس بات کا پیمان باندھ رہے ہو؟ انھوں نے کہا ہاں! پھر اس نے کہا تم اس کے ہاتھ پر بیعت کر کے لوگوں میں سے سُرخ و سیاہ سے جنگ یعنی دُنیا بھر سے لڑائی مول لے رہے ہو پس اگر تمہارا خیال یہ ہو کہ جب تمہارے مال تباہی کے اور تمہارے اشراف ہلاکت کے خطرے میں پڑ جائیں تو تم اسے دشمنوں کے حوالے کر دو گے تو بہتر ہے کہ آج ہی اسے چھوڑ دو، کیونکہ خدا کی قسم یہ دنیا اور آخرت کی رسوائی ہے اور اگر تمہارا ارادہ یہ ہے کہ جو دعوت تم اس شخص کو دے رہے ہو اس کو اپنے اموال کی تباہی اور اشراف کی ہلاکت کے باوجود نباہو گے تو بے شک اس کا ہاتھ تھام لو۔ کیونکہ خدا کی قسم یہ دنیا و آخرت کی بھلائی ہے)

اسی بات کو مدنی وفد کے ایک انتہائی کم سن رکن اسعد بن زرارہؓ(۱۴۹) نے ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ:

رويداً يا اهل يثرب انا لم نضرب اليه اكباد المطى الا و نحن نعلم انه رسول الله وان اخراجه اليوم مفارقة العرب كافة و قتل خياركم وان تعضكم السيوف فاما انتم قوم تصبرون عليها اذا مستكم بقتل خياركم ومفارقة العرب كافة



فخذوه واجركم على الله واما انتم تخافون من انفسكم خيفة فذروه فهو اعذر لكم عند الله۔ (۱۹۰)

(اے اہلِ یثرب! ٹھہرو، ہم ان کی طرف اونٹوں پر بار بار نہیں آئے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ یہ اللہ کے رسول ہیں اور آج یہاں سے انھیں نکال کر لے جانا تمام عرب سے دشمنی مول لینا ہے۔ اس کے نتیجہ میں تمہارے لوگ قتل ہوں گے اور تلواریں تم پر برسیں گی لہٰذا اگر اس کو برداشت کرنے کی طاقت تم اپنے اندر پاتے ہو تو ان کا ہاتھ تھام لو اور اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے اور اگر تمہیں اپنی جانیں عزیز ہیں تو پھر انھیں چھوڑ دو اور صاف صاف عذر کر دو کیونکہ اس وقت عذر کر دینا اللہ کے نزدیک زیادہ قابلِ قبول ہے)

اس پر اہلِ وفد نے پوری ذمہ داری کے ساتھ یہ جواب دیا تھا کہ:

فانّا ناخذه على مصيبة الاموال وقتل الاشراف۔ (۱۹۱)

(ہم اسے لے کر اپنے اموال کی تباہی اور اپنے اشراف کو ہلاکت کے خطرے میں ڈالنے کے لیے تیار ہیں)

اور پھر اس اعلان کے بعد مذکورہ بیعت منعقد ہوئی۔

ہم نے اوپر اہلِ مدینہ کی جو تقاریر نقل کی ہیں ان کا ایک ایک لفظ اس امر کی شہادت دینے کے لیے کافی ہے کہ یہ بیعت نہ تو اظہارِ عقیدت کے لیے تھی اور نہ اس کا مقصد محض قبول ایمان و اسلام تھا۔ حتیٰ کہ اس میں کوئی مذہبی رسم بھی ادا نہیں کی گئی اور نہ دعائیہ کلمات کا تبادلہ ہوا بلکہ علم سیاسیات کے حوالہ سے اس بیعت کو ایک معاہدہ کہنا چاہیے جسے فریقین نے پوری رضا و رغبت کے ساتھ قبول کیا تھا اور جس کے سیاسی مضمرات کا اظہار بھی فریقین کے قول و عمل سے ہو رہا تھا بالفاظِ دیگر اپنے موقف کو اصطلاحی طور پر ہم اس طرح پیش کر سکتے ہیں کہ اب معاملات ایمان و اسلام کے اقرار سے بہت آگے بڑھ کر "بیعت الحرب" تک جا پہنچے تھے۔ (۱۹۲)

اس دو طرفہ معاہدہ کی رُو سے جہاں ایک طرف اہلِ مدینہ نے اپنے شہر میں رسول اللہؐ کو جگہ دینے، ہر حال میں آپ کی اطاعت، حمایت اور حفاظت کی ذمہ داری لی تھی تو دوسری طرف اُنھوں نے یہ اطمینان کر لیا تھا کہ رسول اللہؐ بھی نہ تو انھیں چھوڑیں گے نہ مکہ واپس آئیں گے۔ چنانچہ جب اہلِ مدینہ کی طرف سے یہ کہا گیا کہ:

يا رسول الله ان بيننا وبين الرجال حبالاً وانا قاطعوها يعنى اليهود فهل عسيت ان نحن فعلنا ذلك ثم اظهرك الله ان ترجع الى قومك وتدعنا؟ (۱۹۳)

(یارسول! ہمارے اور لوگوں کے درمیان پیمانِ وفا قائم ہیں اور ہم اس کو قطع کر دیں گے۔ مگر کہیں یہ تو نہ ہو گا کہ ادھر ہم یہود سے معاہدہ ختم کر دیں اور ادھر آپ کو غلبہ و قوت حاصل ہو تو آپ ہمیں بے یار و مددگار چھوڑ کر اپنی قوم سے آ کر مل جائیں)

آنحضرتؐ یہ سُن کر مسکرائے اور انتہائی یقین افروز انداز سے فرمایا کہ:

بل الدم! الدم! والهدم الهدم! انا منكم وانتم منّى! احارب من

حاربتم و اسالم من سالمتم۔[۱۹۴]

(نہیں، بلکہ میرا خون تمہارا خون، اور تمہاری حرمت میری حرمت ہے میں تم سے ہُوں اور تم مجھ سے ہو تم جس سے لڑو گے میں بھی لڑوں گا اور جس سے تم صلح کرو گے میں بھی صلح کروں گا)

رسول اللہ کی اس یقین دہانی پر گویا معاہدہ کی تکمیل ہوگئی تو آنحضرتؐ نے معاہدین و مبایعین سے فرمایا کہ حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل میں سے بارہ نقیب منتخب کئے تھے تم بھی اپنی جماعت میں سے بارہ آدمی منتخب کرو۔[۱۹۵] پھر جب نقبا کا انتخاب ہوچکا تو آنحضرتؐ نے ان کو مخاطب کرکے انھیں اپنی ذمہ داریوں سے آگاہ کیا۔ اس پر بلاذری کی روایت کے مطابق ایک ایک نقیب نے کھڑے ہوکر حمد و ثنا اور اتباعِ نبوی کا اقرار کیا اور اس بات کا حلف اٹھایا کہ وُہ آنحضرتؐ کی دعوت پر لبیک کہیں گے ان کی مدد و نصرت کریں گے اور اپنے عہد و وفا کا پاس و لحاظ کریں گے۔[۱۹۶]

نقبا کا یہ تقرر ممکن ہے بادی النظر میں رسمی کارروائی سمجھا جائے۔ لیکن اگر نقیب کے لغوی و اصطلاحی معنی، اور اس وقت مدینہ کے بدلتے ہوئے حالات کو سامنے رکھا جائے تو مذکورہ تقرر و انتخاب کے بعض اہم معاشرتی و سیاسی مضمرات بڑی حد تک واضح ہو جائیں گے۔

علامہ ابن جوزی کی تصریحات کے مطابق نقیب کے معنی میں ضمانت، ماتحتوں کے حال سے مکمل واقفیت، کفالت، شہادت اور امانت داخل ہے۔ اور یہ لکھا ہے کہ بہرصورت نقیب کے معنی میں گہرائی اور دخول پایا جاتا ہے۔ اور نقیب کو نقیب اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ قوم کے مزاج میں دخیل ہوتا ہے۔ ان کی خامیوں اور خوبیوں کو جانتا ہے اور حالات و معاملات سے پوری طرح واقف ہوتا ہے۔[۱۹۷] علامہ زمخشری نقیب کو متجسس سے تعبیر کرتے ہیں۔[۱۹۸] اور ابن کثیر نے نقبا کو عرفاء کا مرادف قرار دیا ہے۔[۱۹۹]

نقیب کے مقام و مرتبہ کے تعین میں اس بات سے بھی مدد ملتی ہے کہ بیعت عقبۂ مذکورہ میں نقبا کا تقرر کرتے وقت رسول اللہ نے یہ فرمایا تھا کہ:

ان موسیٰ اخذ من بنی اسرائیل اثنی عشر نقیبا وانی اخذ منکم اثنی عشر فلا یجدن احد منکم فی نفسہ شیئا فانما یختار لی جبریل فلما سماھم قال انتم کفلاء علیٰ قومکم ککفالۃ الحواریین۔[۲۰۰]

(حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل میں سے بارہ سردار منتخب کئے تھے اور میں بھی تم میں سے بارہ کا انتخاب کر رہا ہُوں۔ پس تم میں کسی کے دل میں کوئی خیال پیدا نہ ہو کیونکہ میرے لیے اسے جبرئیل نے کیا ہے۔ پھر جب ان کے نام گنائے تو آپ نے فرمایا کہ تم لوگ اپنی قوم کے ذمہ دار ہو حواریوں کی طرح)

توضیحات بالا کی روشنی میں دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اہلِ یثرب کی تجویز پر آنحضرتؐ نے جن بارہ آدمیوں کو نقیب مقرر کیا تھا یہ حضرات[۲۰۱] وہ لوگ تھے جو اپنے اپنے قبائل و بطون میں غیر معمولی اہمیت رکھتے تھے۔ مدنی معاشرہ میں اثر و رسوخ

کے مالک تھے اور اپنے قبیلہ کے سردار یا کسی اہم ذمہ داری پر فائز تھے۔ مثلاً قبائل اوس میں معزز ترین قبیلہ عبدالاشہل کا تھا اور سیادتِ عامہ اوس میں وراثۃً چلی آتی تھی۔ ان کا نقیب حضرت اسید بن حضیر[۲۰۲] کو بنایا گیا جن کے باپ حضیر الکتائب چند سال قبل جنگِ بعاث میں اوس کے قائد و سپہ سالار تھے اور دادِ شجاعت دیتے ہوئے اسی جنگ میں مارے گئے تھے۔ اپنے باپ کے بعد اپنی قوم میں سب سے معزز تھے اور صاحبانِ عقل و رائے میں شمار ہوتے تھے۔[۲۰۳] دوسری طرف قبائل خزرج میں سب سے زیادہ معزز قبیلہ بنو نجار کا تھا۔ ایک روایت کے مطابق اہلِ مدینہ میں سب سے پہلے ایمان لانے والے، سب سے پہلے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کرنے والے یہی اسعد بن زرارہ تھے[۲۰۴] جنھیں بنو نجار کا نقیب بنایا گیا۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ رسول اللہؐ نے انھیں نہ صرف یہ کہ بنو نجار کا نقیب مقرر کیا بلکہ ابنِ سعد کے الفاظ میں "رأس النقباء"[۲۰۵] اور البلاذری کے الفاظ میں "نقیب النقباء"[۲۰۶] بنایا۔ اس منصب پر اسعد بن زرارہ کا فائز ہونا اس لحاظ سے اور زیادہ اہمیت رکھتا ہے کہ وہ اہلِ مدینہ کے وفد میں سب سے کم عمر تھے۔[۲۰۷] لیکن نقباء کے امیر غالباً ایک تو اس لیے بنائے گئے کہ ذاتی عادات و خصائل اسلام کے لیے جذبات و خدمات اور مدینہ میں اپنے اثر و رسوخ نیز تقدمِ ایمانی کی وجوہ سے اس کا استحقاق رکھتے تھے۔ ہمارے نزدیک دوسری وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ چونکہ متابعین کی بڑی تعداد خزرجی قبائل سے تعلق رکھتی تھی اور خزرجی قبائل میں سے بنو نجار کو معزز ترین مقام حاصل تھا اس لیے اس کے نقیب کو تمام نقیبوں کا رئیس بنایا گیا۔ "نقیب النقباء" کے منصب کا اجراء اس امر کی طرف بھی اشارہ کر رہا ہے کہ حضرت مصعب کی تعلیم و تربیت سے اوس و خزرج کے درمیان قبائلی تعصب اور نفرت کی دیوار گرتی جا رہی تھی کیونکہ ایک طرف تو ان کا یہ عالم تھا کہ نماز کی امامت میں بھی ایک دوسرے کی امامت کو پسند نہ کرتے تھے لیکن اب صورتِ حال مختلف ہوچکی تھی اور وہ "نقیب النقباء" کی صورت میں ایک شخص کی اعلیٰ ترین ذمہ داری کو تسلیم کر رہے تھے۔ اور اس کا دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ ان نقباء یا صاحبانِ اثر و اقتدار کا رسولؐ کی سمع و طاعت پر عہد کرلینا یہ معنی رکھتا ہے کہ انھوں نے رسول اللہؐ کو اپنا سیاسی قائد بھی تسلیم کرلیا۔ کیونکہ یہ بات واضح ہے کہ یہ نقباء اور دوسرے متابعین اہلِ مدینہ کی نمائندگی کر رہے تھے۔ چنانچہ واٹ کا یہ بیان درست ہے کہ "مدنی قبائل کے وہ بااثر افراد جو اگرچہ بیعتِ عقبہ کے موقع پر موجود نہ تھے تاہم اپنے اسلام کا اظہار کرچکے تھے اور اپنے قبائل کے ساتھ ساتھ اس میثاق (عقبہ) کے فریق بن چکے تھے۔ حتیٰ کہ عبداللہ بن اُبی بھی (جو مدینہ کا تاجدار بننے والا تھا) اس عہد و پیمان میں شریک ہوچکا تھا۔"[۲۰۸] چنانچہ تفصیلاتِ بالا کی روشنی میں ہم معاہدۂ عقبہ کو اگر ایک "معاہدہ عمرانی"[۲۰۹] سے تعبیر کریں تو بے جا نہ ہوگا۔ کیونکہ مدینہ کے باشندے اور ان کے نمائندے اپنی رضا و رغبت سے رسول اللہؐ کو ایک دینی رہنما، ایک سیاسی قائد اور مطاع تسلیم کرچکے تھے۔ پھر نقباء کا تقرر گویا رسول اللہؐ کی مذکورہ حیثیت کا ہی ایک تقاضا تھا۔ اسی معاہدہ کی وجہ سے رسول اللہؐ نے ہجرت کی اور اسی کی بنیاد پر ایک ایسی سرزمین پر ایک شہری مملکت وجود پذیر ہوئی جہاں اس سے پہلے نراج تھا یا بالفاظِ دیگر ایک غیر سیاسی معاشرہ موجود تھا۔

بہرحال جیسا کہ ہم نقیب کے مفہوم کے تحت بیان کرچکے ہیں نقباء کے فرائض میں جہاں مجموعی طور پر ان کے اپنے

قبیلوں کی کفالت اور ذمہ داری شامل تھی اس کے ساتھ ساتھ اس بات کی نگرانی کہ سمع و طاعت سے کسی حال میں انحراف نہ ہونے پائے، جو کچھ معاہدہ میں طے ہو چکا ہے اس کی حسبِ موقع تعمیل، اور اپنی اپنی آبادی اور علاقے کے لوگوں کی ذہنی و اخلاقی نگہداشت کرنا بھی نقباء کا ہی کام تھا۔ اور یہ بھی فرض ان ہی کا تھا کہ تفتیش و تجسس کے ذریعہ ایک طرف تو رفتارِ کار کا اندازہ لگائیں اور دوسری طرف تحقیقِ حال کر کے نئی ریاست کی تاسیس کے لیے زمین ہموار کرنا بھی نقباء کے منصب کا تقاضہ تھا۔ مختصر یہ کہ معاہدۂ عقبہ کے ساتھ ساتھ نقباء کے تقرر کا فائدہ یہ ہوا کہ مدینہ میں باقاعدہ طور پر اجتماعی نظم کی بنیاد قائم ہو گئی اور نقیبوں کے ذریعہ منظم سیاسی معاشرہ کی تعمیر کا کام پوری طرح شروع ہو گیا۔

اب رہا معاملہ بیعتِ عقبہ کے اثرات کا، تو جہاں تک اہلِ مدینہ کا تعلق ہے، ان کے بارے میں اوپر تفصیل سے بحث آچکی ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس تاریخی معاہدہ کے بعد اہلِ مدینہ سراپا شوق و انتظار بن گئے۔[۲۱۰] چنانچہ جب انھیں یہ اطلاع ملی کہ رسول اللہ جادہ ہجرت طے کر کے اب مدینہ پہنچنے والے ہیں تو ان کے جذباتِ شوق اپنی انتہا کو پہنچ گئے جس کا واضح ثبوت اس موقع پر مل جاتا ہے جبکہ رسول اللہ مدینہ میں داخل ہوئے اور آپ کا انتہائی والہانہ گرمجوشی سے استقبال کیا گیا۔

یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ اہلِ مکہ پر اس بیعتِ عقبہ کے جو اثرات متوقع تھے وہ کسی بھی صاحبِ نظر سے پوشیدہ نہ تھے اور قریش خود بھی اس کی خطرناکیوں کو اچھی طرح محسوس کر رہے تھے اسی لیے جس رات عقبہ کی بیعت منعقد ہوئی علی الصبح ہی قریش اہلِ مدینہ کے خیموں میں آدھمکے۔[۲۱۱] اور اہلِ مدینہ سے یہ پوچھنے لگے کہ "ہم نے سنا ہے تم نے ہمارے خلاف جنگ پر معاہدہ کر لیا ہے اور ہمارے آدمی کو تم یہاں سے نکال کر لے جانا چاہتے ہو۔"[۲۱۲] اس استفسار کا ایک ایک لفظ ان کے اندرونی خدشات کی پردہ دری کر رہا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ مدینہ میں اہلِ ایمان اور اوس و خزرج کی قوت کا مجتمع ہونا ان کے لیے پیغامِ موت سے کم نہیں ہے۔ کیونکہ اوس اور خزرج ایک جنگجو قوم ہے اور وہ آنحضرتؐ اور دوسرے مسلمانوں کی حفاظت کرنے پر پوری طرح قادر ہے نیز مدینہ کی طرف سے مکہ پر حملہ بھی غیر متوقع نہیں ہو سکتا تھا بلکہ اس سے زیادہ بڑا خطرہ اہلِ مکہ کے نزدیک یہ تھا کہ شام کی تجارتی شاہراہ چونکہ مدینہ سے ہو کر گزرتی ہے اس لیے مدینہ سے اس شاہراہ کی ناکہ بندی کی جا سکتی ہے اور اس طرح وہ معاشی شہ رگ بھی کاٹی جا سکتی ہے جس کے محفوظ رہنے پر قریش اور دوسرے بڑے بڑے قبائل کی معاشی زندگی کا انحصار تھا۔ اس راستہ کے کٹ جانے کے بعد تجارت کا حشر اور معاشی بدحالی کا تصور ہر ایک آسانی سے کر سکتا تھا علاوہ ازیں یہ احساس بھی قریشِ مکہ کے لیے کم سوہانِ روح نہ تھا کہ رسول اللہ یوں آسانی کے ساتھ ان کے دستِ تظلم سے بچ کر ایک محفوظ ٹھکانہ پا لیں اور شجرِ اسلام نئی زمین اور نئی فضا میں پرورش پا کر ایسا تناور درخت بن جائے کہ جسے کوئی بادِ مخالف پھر نقصان نہ پہنچا سکے۔

اس واقعہ کے بعد قریش کو یہ یقین ہو گیا کہ اب رسول اللہ مکہ میں زیادہ عرصہ نہیں رہیں گے اور جلد سے جلد مدینہ جانے کا موقع تلاش کریں گے۔[۲۱۳] لہٰذا مکہ کے اعاظم و اکابر رسول اللہ کے متعلق آخری فیصلہ کرنے کے لیے دار الندوہ میں جمع ہوئے۔[۲۱۴] اور

بالآخر اپنے اس خصوصی اجلاس میں انھوں نے ابُو جہل کی یہ تجویز منظور کرلی کہ :

"اری ان ناخذ من کل قبیلہ فتی شابًا جلیداً نسیبًا وسیطاً فینا ثم نعطی کل فتی منھم سیفاصار ما ثم یعمدوا الیہ فیضربوہ بہا ضربہ رجل واحد، فیقتلوہ فنستریح منہ فانھم اذا فعلوا ذالک تفرق دمہ فی القبائل جمیعًا فلم یقدر بنو عبد مناف علیٰ حرب قومھم جمیعا فرضوا منا بالعقل، فعقلناہ لھم۔" (۲۱۵)

(میری رائے یہ ہے کہ ہم ہر قبیلے میں سے ایک جوان مرد، نوعمر، قوی، شریف النسب لے لیں، ان میں سے ہرایک کے ہاتھ میں ایک تیز تلوار دے دیں۔ یہ سب اس کے پاس پہنچیں اور تلواروں سے اس طرح ایک ساتھ ضرب لگائیں کہ گویا یہ ایک ہی شخص کا وار ہے اور اس طرح اس (محمدؐ) کی شمعِ حیات گل کر دیں۔ پھر ہم اس کی طرف سے چین پا سکیں گے کیونکہ اس طرح اس کا خون تمام قبیلوں پر بٹ جائے گا۔ بنی عبد مناف (ظاہر ہے) اپنی قوم کے تمام افراد سے جنگ نہ کر سکیں گے اور ہم سے خونبہا لینے پر راضی ہو جائیں گے اور ہم انھیں خونبہا ادا کر دیں گے)

قرآن نے کفارِ مکہ کے اس سیاہ کارانہ فیصلہ پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ :

واذ یمکر بک الذین کفروا لیثبتوک او یقتلوک او یخرجوک ویمکرون ویمکر اللہ واللہ خیر الماکرین۔ (۲۱۶)

(وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے جبکہ منکرینِ حق تیرے خلاف تدبیریں سوچ رہے تھے کہ تجھے قید کر دیں یا قتل کر ڈالیں یا جلاوطن کر دیں وہ اپنی چالیں چل رہے تھے اور اللہ اپنی تدبیر کر رہا تھا اور اللہ کی تدبیر سب سے بڑھ کر ہوتی ہے)

اگرچہ دار الندوہ کے اس اجلاس کی کارروائی صیغۂ راز میں رکھی گئی تھی لیکن رسول اللہؐ کو اسی دن بذریعہ وحی اس کی اطلاع ہوگئی۔ (۲۱۷) قرآن کی یہ آیت اس صورتِ حال پر کس قدر چسپاں نظر آتی ہے کہ :

ام ابرموا امراً فانا مبرمون، ام یحسبون انا لا نسمع سرھم ونجوٰھم بلیٰ ورسلنا لدیھم یکتبون۔ (۲۱۸)

(کیا ان لوگوں نے کوئی (فیصلہ کن) قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا ہے؟ اچھا تو ہم بھی پھر ایک فیصلہ کیے لیتے ہیں کیا انہوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم ان کی راز کی باتیں اور ان کی سرگوشیاں سُنتے نہیں ہیں؟ ہم سب کچھ سُن رہے ہیں اور ہمارے فرشتے ان کے پاس ہی لکھ رہے ہیں)

اور اللہ کی طرف سے فیصلہ یہ ہوا کہ آپ کو ہجرت کا حکم دے دیا گیا۔ (۲۱۹)

بہر حال اس میں شک نہیں کہ بیعت عقبہ کے فوراً بعد سے ہی مسلمان برابر ہجرت کر رہے تھے اور فی الواقع رسول اللہؐ

نے بھی سفر کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔[۲۲۰] لیکن اہلِ مکہ کی طرف سے بیعتِ عقبہ کے شدید ردِّ عمل کے طور پر آپ کے قتل کا فیصلہ آنحضرتؐ کی فوری روانگی کا سبب بن گیا۔ چنانچہ معاہدہ عقبہ (۱۲ ذی الحجہ سنہ ۱۲ نبوی) کے بعد محرم اور صفر کے صرف دو ماہ گزرے تھے کہ ربیع الاول (۱۳ نبوی) میں رسول اللہؐ حضرت ابوبکرؓ کی معیت میں مدینہ طیبہ روانہ ہو گئے۔

(ب) دُوسرا مرحلہ

گذشتہ بحث سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ رسول اللہؐ اپنی ذاتی اور نجی حیثیت میں مدینہ تشریف نہیں لے گئے تھے بلکہ اہلِ مدینہ کے تسلیم شدہ سیاسی قائد اور پیغمبر کی حیثیت سے پہنچے تھے۔ اس قیادت و پیشوائی کا تقاضا ایک تو یہ تھا کہ مدینہ کے تمام باشندوں کی قیادت و رہنمائی فرمائیں۔ اور دوسرے یہ کہ مسلمانوں میں سے جن لوگوں نے اپنا گھر بار، مال و متاع سب کچھ قربان کر کے مکہ سے مدینہ ہجرت کی تھی ان کی معاشی آسودگی اور آبادکاری کا انتظام کریں۔[۲۲۱] علاوہ ازیں اسلامی معاشرہ کی تنظیم اور اس کی سالمیت و اتحاد کا مسئلہ بھی توجہ طلب تھا۔

یہ مسائل وُہ تھے جو اپنی اہمیت کے اعتبار سے فوری حل کے متقاضی تھے۔ ان پُرپیچ مسئلوں اور مشکلات پر قابو پانے کے لیے رسول اللہؐ نے انتہائی تدبّر اور حکمت سے کام لیا۔ اور ان کو حل کرنے کے لیے نہ تو کسی جبر و زور کا مظاہرہ کیا، نہ کوئی قانون مسلّط کیا اور نہ ہی اہلِ مدینہ پر بے جا بار ڈالا، بلکہ اس جانب بظاہر معمولی لیکن فی الحقیقت ایک جامع اور موثر قدم یہ اٹھایا کہ "انصار و مہاجرین" کے درمیان "عقدِ مواخاہ" کو قایم فرما دیا۔ یہ عقد جس انداز سے روبہ عمل آیا اس کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ یہ محض ایک اخلاقی اپیل تھی لیکن تاریخ کے پیمانے سے اگر اس اقدام کے نتائج و ثمرات کا اندازہ کیا جائے تو بلاشبہ اسے ایک غیر معمولی کارنامہ کہا جائے گا۔ لیکن اس اقدام کے اثرات اور دوسرے اہم پہلوؤں پر غور کرنے سے پہلے مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ عقدِ مواخاہ کی نوعیت اور اس کے زمانۂ وقوع کا تعین کر لیا جائے۔

اس کی نوعیت تو یہ ہے کہ یہ عقد[۲۲۳] "بر بنائے حقِ مواسات اور توارث"[۲۲۲] مہاجرین اور انصار کے درمیان منعقد ہوا۔ ابنِ ہشام کے بیان کے مطابق رسول اللہؐ کا فرمان یہ تھا کہ "خدا کی راہ میں دو دو آدمی آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ۔"[۲۲۴] رسول اللہؐ کے مندرجہ بالا ارشاد کی تعمیل میں مہاجرین و انصار نے برضا و رغبت ایک دوسرے کو اپنا بھائی بنایا اور اس سے اسی طرح تعلقات استوار کیے جس طرح حقیقی بھائیوں سے ہوتے ہیں (۲۲۵) بلکہ بعض صورتوں میں تو انھوں نے حقیقی بھائیوں سے زیادہ حقِ برادری ادا کیا۔ چنانچہ کوئی انصاری وفات پاتا تو اس کی جائداد اور مال کا وارث مہاجر بھائی قرار پاتا تھا اور اس کے دوسرے متعلقین محروم رہتے تھے۔ یہ حقِ توارث جنگِ بدر تک جاری رکھا گیا البتہ جنگِ بدر کے بعد ایک قرآنی حکم[۲۲۶] کے بموجب وراثت کو حقیقی رشتوں کے لحاظ سے دیا جانے لگا اور عقدِ مواخاۃ کے تحت ملنے والے حقِ ولایت و وراثت کو موقوف کر دیا گیا۔ لیکن ان برادرانہ تعلقات و مراسم اور مذہبی اخوت کو بعد میں بھی جاری رہنے دیا گیا۔

اب جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ یہ عقدِ مواخاۃ کس زمانے میں ہوا[۲۲۷] تو اس سلسلے میں بعض مورّخین نے

یہ تصریح کی ہے کہ مواخاۃ کا واقعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ تشریف لانے کے پانچویں مہینے یعنی رجب سنہ ۱ ہجری میں پیش آیا[۲۲۸] اس کے معنی یہ ہیں کہ مسجد نبوی کی تعمیر مکمل ہونے سے پہلے مواخاۃ کا انعقاد عمل میں آ گیا[۲۲۹] یہ زمانۂ وقوع اس لحاظ سے بعید از قیاس نہیں ہے کہ مواخاۃ کا معاہدہ حضرت ابو طلحہ انصاری یعنی حضرت انس بن مالک کے گھر طے پایا[۲۳۰] جس کی ایک وجہ تو غالباً حضور کی قیام گاہ سے قربت ہو سکتی ہے اور دوسری یہ کہ اس وقت تک مسجد نبوی کی تکمیل نہ ہوئی تھی ورنہ یہ مواخاۃ بھی اغلباً مسجد نبوی میں کرائی جاتی۔ بہر حال چونکہ ہم مسجد نبوی کی تعمیر اور مواخاۃ دونوں ایک ہی زمانے میں پاتے ہیں اس لئے اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ یہ دونوں واقعات حضور کی آمد مدینہ کے فوراً بعد ہوئے اور میثاقِ مدینہ سے یقیناً تقدم زمانی رکھتے ہیں۔

عقدِ مواخاۃ کی نوعیت اور زمانۂ وقوع معلوم کر لینے کے بعد ہم اس مسئلہ کی طرف رجوع کرتے ہیں کہ مواخات نے مدینہ کی سیاسی و معاشرتی زندگی میں کیا کردار ادا کیا۔

سرسری نظر ڈالنے سے تو محسوس ہوتا ہے کہ مہاجرین و انصار کے درمیان مواخات کا یہ عمل ایک عارضی اور وقتی عمل تھا جو مہاجرین کو مدینہ کے ماحول سے مانوس کرنے اور ان کی دلدہی و پاسِ خاطر کے تحت کیا گیا تھا[۲۳۱] لیکن بنظرِ غائر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ حقیقت صرف اتنی ہی نہیں ہے بلکہ مواخاۃ کا یہ عمل اپنے دامن میں چند مستقل اور پائدار فوائد و مصالح رکھتا ہے اور تاریخی و سیاسی اعتبار سے اس نے مدنی معاشرت و سیاست پر بہت گہرے اثرات مرتب کیے جن کو ہم مختصراً حسب ذیل نکات کی صورت میں بیان کر سکتے ہیں:

(۱) اس واقعہ سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ مہاجرین و انصار کے درمیان مواخاۃ کی وجہ سے ایک طرف تو بے سر و سامان، غریب الدیار مہاجرینِ مکّہ کی آبادکاری کا مسئلہ حل ہو گیا اور دوسری طرف ان کی معاشی کفالت کی ایک سبیل پیدا ہو گئی۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ مہاجرین نے ضرورت سے زیادہ کوئی عطیہ قبول نہ کیا اور اپنے انصاری بھائی پر بار بننے کے بجائے اپنی قوتِ بازو سے معاش کا بندوبست کیا[۲۳۲] اور جوں جوں ان کے حالات بہتر ہوتے گئے۔ مثلاً زمینیں مل گئیں یا مکانات بن گئے تو وہ جلد سے جلد وہاں منتقل ہو گئے۔ بہر صورت مہاجرین کی آبادکاری کا یہ مسئلہ جو فی الحقیقت ایک پریشان کن مسئلہ تھا وہ اتنی آسانی سے حل ہو گیا کہ جس پر شاید ان لوگوں کو حیرت ہو جو قوموں کی تعمیر و تشکیل کے مطالعہ سے دلچسپی رکھتے ہیں۔

(۲) مہاجرین کو یہ فائدہ بھی پہنچا کہ ان کا احساسِ غربت دُور ہو گیا۔ وطن کی یاد، گھر بار، عزیز و اقارب سے چھٹنے کا فطری احساس و ملال اور مدینہ کی اجنبیت وغیرہ کا جو کچھ تھوڑا بہت خیال ہو سکتا تھا اپنائیت میں تبدیل ہو گیا۔ انصار نے عقبہ کی بیعت اور عہد کے مطابق صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی ہاتھوں ہاتھ نہیں لیا بلکہ آپ کے تمام جاں نثاروں کی خیر خواہی اور دلدہی بھی انتہائی ہمدردی، فراخدلانہ محبّت، خلوص، ایثار اور جذبۂ رفاقت سے کی اور اپنے پرائے کی تمیز کا شائبہ بھی پیدا نہ ہونے دیا اور اس کی انتہا یہ ہے کہ مہاجرین کو اس طرح وصیّت اور وراثت تک میں شامل کر لیا جس طرح ذوی الارحام حق دار ہوتے ہیں، اور یہ صورتِ حال اس وقت تک جاری رہی جب تک کہ غزوۂ بدر کے بعد سنہ ۲ھ میں

سورہ انفال کی یہ آخری آیت نازل نہ ہوگئی کہ :

و اولوا الارحام بعضھم اولیٰ ببعض فی کتاب اللہ ان اللہ بکل شیءٍ علیم (۲۳۳)

(اور رشتہ دار خدا کے حکم کی رُو سے ایک دُوسرے کے زیادہ حقدار ہیں۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز سے واقف ہے)

(۴) مواخاۃ کے ذریعہ ایک مناسب ٹھکانہ میسر آجانے ، بنیادی مادّی ضروریات کی تکمیل اور ایک گونہ معاشی آسودگی حاصل ہوجانے کے بعد مہاجرین نے مدینہ کی معاشی و تجارتی زندگی میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ جیسا کہ معلوم ہے ، مدینہ میں معاشی طور پر تفوق اور برتری یہود کو حاصل تھی۔ یہود مدینہ کی زراعت ، تجارت اور صنعت پر چھائے ہوئے تھے (۲۳۴) خوشحال اور فارغ البال تھے زرخیز زمینیں ، گھنے نخلستان اور باغات ان کے قبضہ میں تھے تجارت پر ان کی اجارہ داری تھی ، منڈی اور بازار ان کے دستِ تصرف میں تھے۔ غرض ان تمام وجوہ سے وُہ بڑے سرمایہ دار بن گئے تھے اور اپنے اس مقام و مرتبہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے معاشی استحصال کے ذریعہ انھوں نے اوس و خزرج (جن کا نام اب انصار ہوگیا تھا) کو اپنا دستِ نگر بنا لیا تھا انصار کا حال بُرا تھا، جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ انصار واقعۂ ہجرت سے پہلے ہی بعاث اور دیگر جنگوں میں نہ صرف اپنی قوتیں ضائع کر چکے تھے بلکہ معاشی اعتبار سے اتنے کمزور ہو گئے تھے کہ وُہ یہودیوں کے مقروض بن کر (۲۳۵) سود در سود کے چکروں میں گرفتار ، اور پھر اس معاشی دباؤ کی وجہ سے بڑی حد تک ان کے زیرِ اثر تھے۔ اس میں شک نہیں کہ انصار تھوڑا بہت تجارت کا شغل بھی رکھتے تھے۔ ان کے بازار مراکز خرید و فروخت بھی تھے (۲۳۶)۔ مگر فنِ تجارت سے فی الواقع وُہ بالکل نابلد تھے اور کم از کم یہ بات طے ہے کہ مدینہ کی تجارت پر ان کا کوئی اقتدار نہ تھا۔ اگرچہ زراعت ان کا آبائی پیشہ اور اصل فن تھا مگر مالی اعتبار سے کمزور ہونے اور زرخیز زمینوں کی قلّت کے سبب ، اس میں بھی وہ خاطر خواہ ترقی نہ کرسکتے تھے۔

اب جہاں تک مہاجرین کا تعلق ہے تو یہ بات مسلّمات میں سے ہے کہ وہ سیکڑوں برس سے فنِ تجارت میں مشغول ، اس کی نزاکتوں سے واقف ، اور اس پیشہ کے امام تھے۔ اُنھوں نے مدینہ آنے کے فوراً بعد ہی بازاروں کا رُخ کیا اور کچھ ہی عرصہ میں تجارت و کاروبار پر اس حد تک چھا گئے کہ منڈی سے یہودیوں کی اجارہ داری ختم ہوگئی اور ان کا سارا زور ٹوٹ گیا۔

بہرحال معاشی طور پر یہود کو جو ضرب کاری لگی تھی ، اس نے اُن کی حیثیت کو بُری طرح متاثر کیا اور اس کی رہی سہی کسر اس طرح پُوری ہوگئی کہ مواخاۃ کے چند ماہ بعد سنہ ۱ ھ میں منشور مدینہ کے نتیجہ میں انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا حکمران اور آخری عدالت مرافعہ مان لیا (جس کی تفصیل آگے آئے گی) ۔ پھر اگلے سال یعنی سنہ ۲ ھ میں یہود کے قبیلۂ بنو قینقاع کا ، سنہ ۴ ھ میں بنو نضیر کا اخراج عمل میں آیا اور سنہ ۵ ھ میں ان کے قبیلۂ بنو قریظہ کا استیصال کر دیا گیا (۲۳۷) اور اس طرح پانچ سال سے بھی کم عرصہ میں نہ صرف یہ کہ مدینہ کی تجارت و صنعت پر سے ان کی اجارہ داری ختم ہوگئی بلکہ منڈی اور بازار بھی ان کے معاشی تسلّط سے کلیتاً آزاد ہو گئے۔ اس صورت حال کے خوشگوار

نتائج ایک طرف تو یہ ہوئے کہ معاشی اور معاشرتی دونوں اعتبار سے انصار کا مرتبہ بلند ہو گیا اور انھوں نے اپنی ساری توجہ تجارت وغیرہ سے ہٹا کر زراعت پر مرکوز کر دی بلکہ وہ رفتہ رفتہ زراعت کے میدان میں آگے بڑھنے لگے۔ اور اس طرح آخرکار مہاجرین و انصار کے اتحاد نے کچھ ہی عرصہ میں مدینہ کی چھوٹی سی بستی میں خوشحالی اور فارغ البالی کا دور دورہ کر دیا۔ مزید برآں اس سے جو معاشرتی بنیادیں استوار ہوئیں، جو تحریک پیدا ہوئی اور جو اجتماعی فضا طاری ہوئی اس نے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کی تشکیل، عام برادرانہ تعلقات کے قیام اور اسلامی تہذیب کی آبیاری میں انتہائی موثر حصہ لیا۔

۴۔ عقد مواخاۃ نے اس بنیادی اصول کو "عہد تازہ" کی صورت میں پھر پیش کیا کہ انسانوں کے باہمی تعلق و ہم آہنگی، وابستگی اور اتحاد کی حقیقی بنیاد وطن، رنگ، نسل زبان وغیرہ نہیں بلکہ صرف دین اور حق ہے۔ اسی نکتہ کی تعلیم توحید کی پہلی دعوت میں دی گئی۔ اسی کے ذریعہ رسول اللہؐ نے اجنبی انسانوں کو اپنا بنایا، اسی کی بنیاد پر ایک نئے معاشرہ کا وجود و قیام عمل میں آیا اور اب اسی کی بنیاد پر اس کی تنظیم کی جا رہی تھی۔ نیز یہ عقد لوگوں کو مزاج و طبائع، رنگ و نسل اور قومیت و وطنیت کے ہزاروں اختلافات کے علی الرغم سب کو ہم مرتبہ و ہم رتبہ بنا کر ایک ہی رشتۂ اخوت میں منسلک کر رہا تھا۔ آرنلڈ (ARNOLD) نے صحیح لکھا ہے کہ،

"اس رشتہ سے تمام قبیلوں کے اختلافات معدوم ہو گئے اور ایک مشترک مذہبی زندگی نسلی رشتوں کی جگہ قائم ہو گئی۔" (۲۳۸)

۵۔ اس مواخاۃ نے مہاجرین و انصار دونوں کو باہمی تربیت، تعلیم دین و دنیا اور اخلاق فاضلہ کے اظہار کا بہترین موقع فراہم کیا۔ مہاجرین چونکہ سبقت ایمانی رکھتے تھے اور علم و اکتساب کی جملہ صلاحیتیں بہم پہنچا چکے تھے اس لیے ان کو انصار کا بھائی بنایا گیا تاکہ ہر گھر میں ایک تربیت یافتہ، فاضل و متقی، دینی معلم موجود ہو اور وہ معلم اس گھر کی خیر و فلاح میں شریک رہنے کے علاوہ تعلیم و تربیت کے فرائض بھی انجام دے۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ اصلاح و تربیت کے ان مواقع کو انتہائی سلیقہ کے ساتھ فراہم کیا گیا اور تربیت پذیری کے لیے جس اتحاد مذاق کی ضرورت ہے وہ رعایت پوری طرح رشتہ ہائے مواخاۃ میں رکھی گئی (۲۳۹) مزید برآں مہاجرین و انصار دونوں کے اتحاد و تعاون اور باہمی تعلیم و تربیت کے نتیجہ میں تعلیمات اسلامی کو کچھ ہی عرصہ میں گھر اور بازار، مسجد اور مدرسہ، منبر اور دفتر، جلوت اور خلوت غرض ہر جگہ پہنچا دیا گیا۔ گویا اشاعت اسلام آسان فطری طریقے اور انتہائی سرعت سے ہونے لگی اور تعلیمات اسلامی کے زندہ نسخے اسلامی معاشرہ میں ہر طرف چلتے پھرتے نظر آنے لگے۔

۶۔ اور مجموعی طور پر سب سے بڑا فائدہ اور عقد مواخاۃ کا انتہائی گہرا اثر یہ ہوا کہ جس اسلامی معاشرہ کی داغ بیل مکہ میں پڑ چکی تھی اس کی ترتیب و تنظیم مکمل ہو گئی اور اس کے تمام ارکان تعلیم و تربیت پا کر اس قابل ہو گئے کہ اپنے جملہ معاشرتی، تمدنی اور سیاسی فرائض کی بجا آوری، اور اپنے حقوق کا تحفظ بہ احسن وجوہ کر سکیں۔ اور ایک ریاست کے ارباب حل و عقد ہونے کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریاں پوری کر سکیں۔ علاوہ بریں اس مواخاۃ کے ذریعہ مہاجرین و انصار

"بنیان مرصوص" (سیسہ پلائی ہوئی دیوار) بن گئے[۲۴۰] اور ایک محسوس قوت بن کر ہر خطرہ کے آگے سینہ سپر ہو گئے (جس کا ادنیٰ سا مظاہرہ کچھ ہی ماہ بعد جنگِ بدر میں نظر آجاتا ہے) عقدِ مواخاۃ کے بعد اسلامی جماعت میں اتحاد، تعاون و ہم آہنگی کی فضا اور مرکزیت پیدا ہو گئی۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ مدینہ میں یہود و منافقین اور ان کے ہم نواؤں کے سوا پُوری آبادی گویا ایک ایسے جسم کی مانند ہو گئی جس کی رگ رگ میں اطاعتِ رسولؐ کا خون پُوری قوت سے گردش کر رہا تھا اور جو آپ کے ہر اشارے پر اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لیے تیار تھا۔

۷۔ جیسا کہ ہم اس بحث کے آغاز میں بتا چکے ہیں کہ ممکن ہے اپنی روح کے اعتبار سے یہ ایک اخلاقی اپیل کی صورت ہے، لیکن اگر حضرت انسؓ کی روایت سامنے رکھی جائے (جن کے گھر میں مواخاۃ کا انعقاد ہوا) تو اس میں اخلاقی سے زیادہ قانونی جھلک پیدا ہو جاتی ہے[۲۴۱]۔ گویا معاشرہ کی تنظیم و ترتیب میں اخوت و مساوات[۲۴۲] کی روح جاری و ساری کرنے کی کوشش، احساس ذمہ داری اور سنجیدگی کے ساتھ کی گئی۔ بہرحال ان معروضات کا مدعا یہ ہے کہ مواخاۃ کے ذریعہ معاشرہ کی تنظیم، ترتیب اور صورت گری مکمل ہو جانے کے بعد مہاجرین و انصار کی مشترکہ جماعت کو مدنی سیاست میں کارفرما حیثیت حاصل ہو گئی۔ لیکن یہاں قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ فراستِ نبویؐ سے یہ امر پوشیدہ نہ تھا کہ یہود اور ان کے ہمنواؤں کو اپنے ساتھ ملائے بغیر مدنی سیاست پر مکمل قابو اور ریاست کا قیام و استقلال ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ لہٰذا آپ نے یہود سے اغماض برت کر انھیں ڈھیل دینے کے بجائے "رشتۂ اتحاد" میں اس طرح کس لیا کہ انہیں طوعاً و کرہاً رسولؐ اللہ کی سیاست و قیادت کو قبول کرنا پڑا۔ چنانچہ منشور مدینہ کا اجرا و نفاذ اس سلسلہ میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے اور ہم اگلے صفحات میں اسی کا مطالعہ کریں گے۔

(۴) آغازِ ریاست

بیعتِ عقبہ کے ذریعہ رسول اللہؐ اور اہلِ مدینہ کے درمیان جس انداز اور پیمانے پر سیاسی رابطہ استوار ہوا اور انہوں نے رسولؐ اللہ کی قیادت کو مکمل سمع و طاعت کے ساتھ جس طرح قبول کر لیا تھا۔ اس کے بعد تو فی الواقع ضرورت اس امر کی رہ گئی تھی کہ کوئی قطعۂ اراضی زیرِ اثر آجائے جس میں کوئی اور سیاسی اقتدار کارفرما نہ ہو تو معاً ایک ریاست رُو بہ عمل آسکتی ہے۔

: چنانچہ ہجرتِ مدینہ کے بعد ایک طرف تو مسلمانوں کی جماعت کو عقدِ مواخاۃ کے ذریعہ ایک منظم معاشرہ کی شکل دے دی گئی اور دوسری طرف ایک سرزمین بھی حاصل ہو گئی جہاں نزاع کی وجہ سے کوئی باقاعدہ سیاسی اقتدار موجود نہ تھا۔ گویا ریاست کے کل عناصر و لوازم میسر آگئے تو ابتدائی مسائل سے فارغ ہوتے ہی رسولؐ اللہ نے ہجرت کے پہلے ہی سال میں "ہیئت سیاسیہ" کی تکمیل کر لی اور ایک نوشتۂ خاص کے ذریعہ مدینہ کی اسلامی ریاست کو وجود بخش دیا۔

دنیا کی تاریخ میں کسی ریاست کا قیام تھوڑی بہت قوت استعمال کئے بغیر شاید ہی ہوا ہو، لیکن یہ تاریخ کی کتنی بڑی حقیقت ہے کہ رسولؐ اللہ نے بالکل اجنبی ماحول میں باہم متضاد و منتشر عناصر کے تعاون سے نہ صرف ریاست بلکہ ایک نظریاتی

ریاست کو قائم فرمایا اور پھر خاص بات یہ ہے کہ اس تعاون کو آپ نے کسی طاقت وتشدد یا جبر وظلم کے بل بوتے پر نہیں بلکہ محض ایک نوشتہ کے ذریعے حاصل کیا تھا۔

یہ نوشتہ یا دستاویز جس کے ذریعہ مدینہ ایک مکمل شہری ریاست کی شکل اختیار کر گیا، اور جس میں حکمران ریاست اور اس کی رعایا کے حقوق وفرائض اور دیگر فوری ضروریات کا تفصیلی ذکر ہے، عام معنوں میں کوئی تحریر یا معاہدہ نہ تھا ورنہ یُوں تو قبائل آپس میں مختلف معاہدے پہلے بھی کر ہی لیا کرتے تھے اور "محالفہ" کر کے زندگی کے سرد وگرم میں ایک دوسرے کا ساتھ دیتے تھے۔ حضورؐ نے باشندگانِ مدینہ کے لئے جو دستاویز مرتب فرمائی اس کے خد وخال یقیناً وہ نہیں ہیں جو دو قبیلوں کے درمیان محالفہ وغیرہ کے ہوتے ہیں بلکہ اس کا انداز صریحاً اس منشور کا سا ہے جو حکمران کی طرف سے رعایا کے لیے جاری کیا جاتا ہے۔

اس کی تصدیق دستاویز کے مکمل متن سے ہوتی ہے جسے قدیم ترین سیرت نگار ابنِ اسحاق نے پُوری طرح نقل کیا اور بعد میں ابو عبید نے بھی بعض معمولی اختلافات کے ساتھ اپنی کتاب "الاموال" میں اسے محفوظ کر لیا۔ ہم نے ذیل میں اس متن کو ابن ہشام سے اخذ کیا ہے اور حواشی میں ان اختلافات کو واضح کر دیا ہے جو ابو عبید(۲۴۳) کے یہاں پائے جاتے ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ھذا کتاب من محمد النبی(۲۴۴) صلی اللہ علیہ وسلم بین المومنین والمسلمین من قریش(۲۴۵) ویثرب، ومن تبعھم، فلحق بھم(۲۴۶)، وجاھد معھم، انھم امۃ واحدۃ من دون الناس(۲۴۷)، المھاجرون من قریش علی ربعتھم(۲۴۸) یتعاقلون بینھم(۲۴۹) وھم یفدون عانیھم بالمعروف والقسط بین المومنین(۲۵۰) وبنو عوف علی ربعتھم(۲۵۱) یتعاقلون معاقلھم الاولی، وکل طائفۃ(۲۵۲) تفدی عانیھا بالمعروف والقسط بین المومنین(۲۵۳)، وبنو الحارث علی ربعتھم یتعاقلون معاقلھم الاولی، وکل طائفۃ منھم تفدی عانیھا بالمعروف والقسط بین المومنین، وبنو ساعدۃ علی ربعتھم یتعاقلون معاقلھم الاولی، وکل طائفۃ تفدی عانیھا بالمعروف والقسط بین المومنین، وبنو جشم علی ربعتھم یتعاقلون معاقلھم الاولی، وکل طائفۃ منھم تفدی عانیھا بالمعروف والقسط بین المومنین، وبنو النجار علی ربعتھم یتعاقلون معاقلھم الاولی وکل طائفۃ منھم تفدی عانیھا بالمعروف والقسط بین المومنین(۲۵۴)، وبنو عمرو بن عوف علی ربعتھم یتعاقلون معاقلھم الاولی وکل طائفۃ تفدی عانیھا بالمعروف والقسط بین المومنین، وبنو النبیت علی ربعتھم یتعاقلون معاقلھم الاولی، وکل طائفۃ تفدی عانیھا بالمعروف والقسط بین المومنین وبنو الاوس علی ربعتھم یتعاقلون معاقلھم الاولی، وکل طائفۃ

منهم تفدى عانيها بالمعروف والقسط بين المومنين وانّ المومنين لا يتركون مفرحاً[255]
بينهم أن يعطوه بالمعروف فى فداءٍ او عقل، وان لا يحالف مومن، مولى مومن دونه،[256]
وان المومنين المتقين[257] على من بغى منهم أو ابتغى دسيعة ظلم أو اثم أو عدوان أو
فساد بين المومنين[258] وان أيديهم عليه جميعاً[259] ولو كان ولد أحدهم ولا
يقتل[260] مومن، مومناً فى كافر ولا ينصر كافراً على مومن، وان ذمّة الله واحدة، يجير
عليهم أدناهم[261] وان المومنين بعضهم موالى بعض دون الناس وأنه من تبعنا من يهود[262]
فان له النصر والاسوة غير مظلومين ولا متناصرين عليهم[263] وان سلم المومنين واحدة[264]
لا يسالم[265] مومن، دون مومن فى قتال فى سبيل الله الا على سواء وعدل بينهم، وان كل
غازية غزت معنا يعقب بعضها بعضاً[266] وأن المؤمنين يبئ بعضهم عن بعض
بما نال دماءهم فى سبيل الله[267] وان المومنين المتقين على أحسن هدًى و أقومه،
وانه لا يجير مشرك مالاً لقريش ولا نفساً ولا يحول دونه على مومن[268] وانه من
اعتبط مومناً قتلاً عن بيّنة[269] فانه قود به الا أن يرضى ولى المقتول[270] وان
المومنين عليه كافّة ولا يحل لهم الا قيام عليه[271] وانه لا يحل لمومن اقر بما فى هذه
الصحيفه و أمن بالله واليوم الاخر أن ينصر محدثاً أو يوويه، وانه من نصره[272]
أو آواه فان عليه لعنة الله وغضبه يوم القيامة ولا يوخذ[273] منه صرف ولا عدل،
وانكم مهما اختلفتم فيه من شئ فان مردّه الى الله عزّ وجلّ والى محمد صلى الله عليه
وسلم[274]۔

وأن اليهود ينفقون مع المومنين ما داموا محاربين، وأن يهود بنى عوف امة
مع المومنين[275] لليهود دينهم وللمسلمين دينهم[276]، مواليهم وانفسهم[277] الا من ظلم و
أثم فانه لا يوتغ الا نفسه واهل بيته، وأن ليهود بنى النجار مثل ما ليهود بنى عوف،
وأن ليهود بنى الحارث مثل ما ليهود بنى عوف، وأن ليهود بنى ساعده[278] مثل ما ليهود
بنى عوف، وأن ليهود بنى جشم مثل ما ليهود بنى عوف، وأن ليهود بنى الاوس[279] مثل
ما ليهود بنى عوف، وأن ليهود بنى ثعلبه مثل ما ليهود بنى عوف[280] الا من ظلم و أثم[281]
فانه لا يوتغ الا نفسه وأهل بيته، وان جفنه بطن من ثعلبه كانفسهم، وأن لبنى
الشطيبه مثل ما ليهود بنى عوف وأنّ البر دون الاثم، وان موالى ثعلبه كانفسهم،
وأن بطانه يهود كانفسهم[282] وأنه، لا يخرج منهم احد[283] الا باذن محمد صلى الله

عليه وسلّم وانّه لا ينحجز على ثار جرح ، وانه من فتك فبنفسه فتك واهل بيته الا من ظلم وانّ الله على أبرهذا ، وأن على اليهود نفقتهم وعلى المسلمين نفقتهم(۲۸۴) وان بينهم النصر على من حارب أهل هذه الصحيفه ، وان بينهم النصح والنصيحة(۲۸۵) والبرّ دون الاثم(۲۸۶) ، وانه لم يأثم امرو بحليفه(۲۸۷) وان النصر للمظلوم ، وان اليهود ينفقون مع المؤمنين ماداموا محاربين(۲۸۸) وأن يثرب حرام جوفها لاهل هذه الصحيفة(۲۸۹) وأن الجار كالنفس غير مضار ولا آثم(۲۹۰) وانه لا تجار حرمه الا باذن اهلها وانه ما كان بين اهل هذه الصحيفة من حدث أو اشتجار يخاف فساده فان مردّه الى الله عزّ وجلّ والى محمد رسول الله(۲۹۱) صلى الله عليه وسلّم وأن الله على أتقى ما فى هذه الصحيفه وابرّه ، وأنه لا تجار قريش ، ولا من نصرها(۲۹۲) وان بينهم النصر على من دهم يثرب ، واذا دعوا الى صلح يصالحونه ويلبسونه فانهم يصالحونه ويلبسونه وأنهم اذا دعوا الى مثل ذلك فانه لهم على المومنين الا من حارب فى الدين(۲۹۳) على كل اناس حصتهم من جانبهم الذى قبلهم(۲۹۴) وأن يهود الاوس مواليهم وأنفسهم على مثل ما لأهل هذه الصحيفه مع البرّ المحض من اهل هذه الصحيفة(۲۹۵) وأن البرّ دون الاثم لا يكسب(۲۹۶) كاسب الا على نفسه وأنّ الله على اصدق ما فى هذه الصحيفة وأبرّه ، وانّه لا يحول هذا الكتاب(۲۹۷) دون ظالم أو آثم وانه من خرج آمن ومن قعد آمن، بالمدينة (۲۹۸) الا من ظلم وأثم وأنّ الله جار لمن برّ واتقى ، ومحمد رسول الله صلى الله عليه وسلّم(۲۹۹)

مندرجہ بالا منشور کو سمجھنے اور آئندہ حوالوں میں آسانی کے لیے مناسب یہ ہے کہ مندرجہ بالا دستاویز کا مطلب (حسبِ سابق قوسین میں دینے کے بجائے) دفعات کی صورت میں لکھا جائے۔ چنانچہ اسے ہم یوں ترتیب دے سکتے ہیں :

۱ - یہ تحریری دستاویز ہے اللہ کے نبی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی قریش اور یثرب کے اہلِ ایمان اور ان لوگوں کے باب میں جو ان کے اتباع میں ان کے ساتھ شامل ہوں اور ان کے ہمراہ جنگ میں حصّہ لیں۔

۲ - یہ (تمام گروہ) دنیا کے (دُوسرے) لوگوں سے ممتاز و ممیز ایک علیحدہ (سیاسی) وحدت متصور ہوں گے۔

۳ - مہاجرین جو قریش میں سے ہیں علیٰ حالہ دیتوں اور خون بہا وغیرہ کے معاملات میں اپنے قبیلہ کے طے شدہ رواج پر عمل کریں گے، اپنے قیدیوں کو مناسب فدیہ دے کر چھڑائیں گے اور دُوسرے مسلمانوں کے ساتھ عدل و انصاف کا برتاؤ کریں گے۔(۳۰۰)

۴ - اور بنو عوف بھی اپنی جگہوں پر قائم رہیں گے اور خُون بہا وغیرہ کا طریقہ ان میں حسبِ سابق قائم رہے گا۔ ہر گروہ عدل و انصاف کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے قیدی کو فدیہ دے کر چھڑائے گا۔

۵ - اور بنو ساعدہ بھی اپنی جگہوں پر قائم رہیں گے اور خون بہا کا طریقہ ان میں حسبِ سابق قائم رہے گا۔ ہر گروہ عدل و انصاف کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے قیدی کو فدیہ دے کر چھڑائے گا۔

۶ - اور بنو حارث بھی اپنی جگہوں پر قائم رہیں گے اور خُون بہا کا طریقہ ان میں حسبِ دستور سابق رہے گا۔ ہر گروہ عدل و انصاف کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہُوئے اپنے قیدی کو فدیہ دے کر چھڑائے گا۔

۷ - اور بنو جشم اپنی جگہوں پر قائم رہیں گے اور حسبِ سابق اپنے خُون بہا مل کر ادا کریں گے اور ہر گروہ عدل و انصاف کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہُوئے اپنے قیدی کو فدیہ دے کر چھڑائے گا۔

۸ - اور بنو نجار اپنی جگہوں پر قائم رہیں گے اور حسبِ دستور سابق اپنا خُون بہا مل کر ادا کریں گے اور ہر گروہ عدل و انصاف کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے قیدی کو فدیہ دے کر چھڑائے گا۔

۹ - اور بنو عمرو بن عوف اپنی جگہوں پر قائم رہیں گے اور خونبہا وغیرہ کا طریقہ ان میں حسبِ سابق جاری رہے گا۔ ہر گروہ عدل و انصاف کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہُوئے اپنے قیدی کو فدیہ دے کر چھڑائے گا۔

۱۰ - اور بنو النبیت اپنی جگہوں پر قائم رہیں گے اور خُون بہا حسبِ سابق مل کر ادا کریں گے اور ہر گروہ عدل و انصاف کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے قیدی کو فدیہ دے کر چھڑائے گا۔

۱۱ - اور بنو الاوس اپنی جگہوں پر قائم رہیں گے اور خُون بہا وغیرہ کا طریقہ ان میں حسبِ سابق قائم ہو گا۔ ہر گروہ عدل و انصاف کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے قیدی کو فدیہ دے کر چھڑائے گا۔

۱۲ - اہلِ ایمان اپنے کسی زیرِ بار قرضدار کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑیں گے بلکہ قاعدہ کے مطابق فدیہ، دیت اور تاوان ادا کرنے میں اس کی مدد کریں گے۔

۱۳ - اور کسی مومن کے آزاد کردہ غلام کو کوئی مومن حلیف نہ بنائے گا۔

۱۴ - اور یہ کہ تمام تقوٰی شعار مومنین متحد ہو کر ہر اس شخص کی مخالفت کریں گے جو سرکشی اختیار کرے، ظلم، گناہ اور تعدی کے ہتھکنڈوں سے کام لے اور ایمان والوں کے درمیان فساد پھیلائے۔ ایسے شخص کی مخالفت میں ایمان والوں کے ہاتھ ایک ساتھ اُٹھیں گے اگرچہ وہ ان میں سے کسی کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔

۱۵ - کوئی مومن، کسی دُوسرے مومن کو، کافر کے عوض قتل نہیں کرے گا اور نہ مومن کے خلاف وہ کسی کافر کی مدد کرے گا۔

۱۶ - اور اللہ کا ذمہ (اور پناہ سب کے لیے یکساں اور) ایک ہے۔ ادنٰی ترین مسلمان بھی کافر کو پناہ دے سکتا ہے۔ اہلِ ایمان دوسرے لوگوں کے مقابلہ میں باہم بھائی بھائی اور مددگار و کارساز ہیں۔

۱۷۔ یہودیوں میں سے جو بھی ہمارا اتباع کرے گا تو اسے مدد اور مساوات حاصل ہوگی۔ ان (یہود) پر نہ تو ظلم کیا جائے گا اور نہ ہی ان کے خلاف کسی (دشمن) کی مدد کی جائے گی۔

۱۸۔ تمام اہلِ ایمان کی صلح یکساں اور برابر کی حیثیت رکھتی ہے۔ کوئی مومن قتال فی سبیل اللہ میں دوسرے مومن کو چھوڑ کر (دشمن سے) صلح نہیں کرے گا۔ اور اسے مسلمانوں کے درمیان عدل و مساوات کو ملحوظ رکھنا ہوگا۔

۱۹۔ جو لشکر ہمارے ساتھ جہاد میں شریک ہوگا اس کے افراد آپس میں باری باری ایک دُوسرے کی جانشینی کریں گے۔

۲۰۔ اہلِ ایمان کفار سے انتقام لینے میں ایک دُوسرے کی مدد کریں گے۔

۲۱۔ تمام تقوٰی شعار مسلمان اسلام کے احسن اور اقوم طریق پر ثابت قدم رہیں گے۔

۲۲۔ اور (مدینہ کا) کوئی مشرک (غیر مسلم اقلیت) قریش کے کسی شخص کو مالی یا جانی کسی طرح کی پناہ نہ دے گا، اور نہ مسلمان کے مقابلہ پر اس (قریشی) کی حمایت و مدد کرے گا۔

۲۳۔ اور جو شخص ناحق کسی مومن کا خون کرے گا اسے مقتول کے عوض (بطور قصاص) قتل کیا جائے گا الّا یہ کہ اس مقتول کا ولی اس کے عوض خُون بہا لینے پر رضامند ہو جائے اور تمام اہلِ ایمان قاتل کے خلاف رہیں گے۔

۲۴۔ کسی ایمان والے کے لیے جو اس دستور العمل کے مندرجات کی تعمیل کا اقرار کر چکا ہے اور اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتا ہے، یہ ہرگز جائز نہ ہوگا کہ وہ کوئی نئی بات نکال کر فتنہ انگیزی کے ذمہ دار کی حمایت کرے یا اسے پناہ دے۔ جو ایسے کسی (مجرم) کی حمایت و نصرت کرے گا یا اسے پناہ دے گا تو وہ قیامت کے دن اللہ کی لعنت اور اس کے غضب کا مستوجب ٹھہرے گا اور (جہاں) اس کی نہ تو یہ قبول کی جائے گی نہ (عذاب کے بدلے) کوئی فدیہ۔

۲۵۔ اور جب تم مسلمانوں میں کسی قسم کا تنازعہ ہوگا تو اسے اللہ اور (اس کے رسول) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سامنے پیش کیا جائے گا۔

۲۶۔ اور یہ کہ جب تک جنگ رہے یہودی اس وقت تک مومنین کے ساتھ مل کر مصارف اٹھائیں گے۔

۲۷۔ اور یہود بنی عوف اور ان کے اپنے حلفاءُ و موالی، سب مل کر مسلمانوں کے ساتھ ایک جماعت (فریق) متصور ہوں گے۔

۲۸۔ یہودی اپنے دین پر (رہنے کے مجاز) ہوں گے اور مومن اپنے دین پر کاربند رہیں گے۔ البتہ جس نے ظلم یا عہد شکنی کا ارتکاب کیا تو وہ محض اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو مصیبت میں ڈالے گا۔

۲۹۔ اور بنی النجار کے یہودیوں کے لیے بھی وہی کچھ مراعات ہیں جو بنی عوف کے یہودیوں کے لیے ہیں۔

۳۰۔ اور بنی الحارث کے یہودیوں کے لیے بھی وہی کچھ ہے جو بنی عوف کے یہودیوں کے لیے ہے۔

۳۱۔ اور بنی ساعدہ کے یہودیوں کے لئے بھی وہی کچھ ہے جو بنی عوف کے یہودیوں کے لئے ہے۔

۳۱ - اور بنی ساعدہ کے یہودیوں کے لئے بھی وہی کچھ ہے جو یہود بنی عوف کے لئے۔
۳۲ اور بنی جشم کے یہودیوں کے لئے بھی وہی کچھ ہے جو یہود بنی عوف کے لئے۔
۳۳ - اور بنی الاوس کے یہودیوں کے لئے بھی وہی کچھ ہے جو یہود بنی عوف کے لئے۔
۳۴ - اور بنی ثعلبہ کے یہودیوں کے لئے بھی وہی کچھ ہے جو یہود بنی عوف کے لئے ہے، البتہ جو ظلم یا عہد شکنی کا مرتکب ہو تو خود اس کی ذات اور اس کے گھرانے کے سوا کوئی دوسرا مصیبت میں نہیں پڑے گا۔
۳۵ - اور جفنہ (جو قبیلہ) ثعلبہ کی شاخ ہے اسے بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اصل کو حاصل ہیں۔
۳۶ - اور بنی الشطیبہ کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو یہود بنی عوف کے لئے ہیں اور ہر ایک پر اس (دستاویز) کی وفا شعاری لازم ہے نہ کہ عہد شکنی۔
۳۷ - اور ثعلبہ کے موالی کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اصل کے لیے ہیں۔
۳۸ - اور یہودی (قبائل کی) ذیلی شاخوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اصل کے ہیں۔
۳۹ - اور یہ کہ ان قبائل میں سے کوئی فرد (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اجازت کے بغیر نہیں نکلے گا۔ (اصل عبارت سے نکلنے کا مقصد واضح نہیں ہوتا اگرچہ ڈاکٹر حمید اللہ نے اسے فوجی کارروائی کے لئے لکھا ہے)[۱]
۴۰ - اور کسی مار یا زخم کا بدلہ لینے میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی جائے گی۔ اور ان میں سے جو فرد (یا جماعت) قتل ناحق اور خونریزی کا ارتکاب کرے تو اس کا وبال اور ذمہ داری اس کی ذات اور اس کے اہل و عیال پر ہوگی (ورنہ ظلم ہوگا)۔ اور اللہ اس کے ساتھ ہے جو اس سے بری الذمہ ہو۔
۴۱ - اور یہودیوں پر ان کے مصارف کا بار ہوگا اور مسلمانوں پر ان کے مصارف کا۔
۴۲ - اور اس صحیفہ والوں کے خلاف جو بھی جنگ کرے گا تو تمام فریق (یہودی اور مسلمان) ایک دوسرے کی مدد کریں گے نیز خلوص کے ساتھ ایک دوسرے کی خیر خواہی کریں گے اور ان کا شیوہ وفاداری ہوگا نہ کہ عہد شکنی۔
۴۳ - اور ہر مظلوم کی بہر حال حمایت و مدد کی جائے گی۔
۴۴ - اور یہ کہ جب تک جنگ رہے۔ یہودی اس وقت تک مومنین کے ساتھ مل کر مصارف اٹھائیں گے۔
۴۵ - اور اس صحیفہ والوں کے لیے حدود یثرب (مدینہ) کا داخلی علاقہ (جوف) حرم کی حیثیت رکھے گا۔
۴۶ - پناہ گزین، پناہ دہندہ کی مانند ہے۔ نہ کوئی اس کو ضرر پہنچائے اور نہ وہ خود عہد شکنی کر کے گناہ گار بنے۔
۴۷ - اور کسی پناہ گاہ میں وہاں والوں کی اجازت کے بغیر کسی کو پناہ نہیں دی جائے گی۔
۴۸ - اور اس صحیفہ کے ماننے والوں میں اگر کوئی نئی بات پیدا ہو (جس کا ذکر اس دستاویز میں نہیں) یا کوئی اور

---

[۱] حمید اللہ (عہد نبوی میں نظام حکمرانی) ص ۱۰۸

جھگڑا جس سے کسی نقصان اور فساد کا اندیشہ ہو تو اس متنازعہ فیہ امر میں فیصلے کے لئے اللہ اور اس کے رسول (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ اور اللہ (کی تائید) اس شخص کے ساتھ ہے جو اس صحیفہ کے مندرجات کی زیادہ سے زیادہ احتیاط اور وفا شعاری کے ساتھ تعمیل کرے۔

۴۹۔ اور قریش (مکہ) اور اس کے حامیوں کو کوئی پناہ نہیں دی جائے گی۔

۵۰۔ اور یثرب (مدینہ) پر جو بھی حملہ آور ہو تو اس کے مقابلہ میں یہ سب (یہودی اور مسلمان) ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔

۵۱۔ ان (مسلمانوں) میں سے جو اپنے حلیف کے ساتھ صلح کرنے کے لئے یہود کو دعوت دے تو یہود اس سے صلح کرلیں گے۔ اسی طرح اگر وہ (یہود) کسی ایسی ہی صلح کو دعوت دیں تو مومنین بھی اس دعوت کو قبول کرلیں گے۔ الّا یہ کوئی دین (و مذہب) کے لئے جنگ کرے۔

۵۲۔ تمام لوگ (فریق) اپنی اپنی جانب کے علاقے کی مدافعت کے ذمّہ دار ہوں گے۔

۵۳۔ اور (قبیلہ) اوس کے یہود کو، خواہ موالی ہوں یا اصل، وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اس تحریر کے ماننے والوں کو حاصل ہیں اور وُہ بھی اس صحیفہ والوں کے ساتھ خالص وفا شعاری کا برتاؤ کریں نیز قرارداد کی پابندی کی جائے گی نہ کہ عہد شکنی۔

۵۴۔ ہر کام کرنے والا اپنے عمل کا ذمّہ دار ہوگا۔ زیادتی کرنے والا اپنے نفس پر زیادتی کرے گا اور اللہ اس کے ساتھ ہے جو اس صحیفہ کے مندرجات کی زیادہ سے زیادہ صداقت اور وفا شعاری کے ساتھ تعمیل کرے۔

۵۵۔ یہ نوشتہ کسی ظالم یا مجرم (کو اس کے جُرم کے عواقب سے بچانے کے لئے) کے آڑے نہ آئے گا۔ جو جنگ کے لئے نکلے (کسی اور جگہ نقلِ مکانی کرے) وہ بھی اور جو گھر (مدینہ) میں بیٹھا رہے (سکونت رکھے) وُہ بھی امن کا حقدار ہوگا (اس پر کوئی مواخذہ نہیں) البتہ اس سے صرف وہ لوگ مستثنیٰ ہوں گے جو ظلم یا جُرم کے مرتکب ہوں۔

۵۶۔ اور جو اس نوشتہ کی وفا شعاری اور احتیاط سے تعمیل کرے گا تو اللہ اور اس کے رسول محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی اس کے نگہبان (اور خیر اندیش) ہیں۔

یہ تاریخی دستاویز جس کا متن اور ترجمہ ہم نے اُوپر نقل کیا ہے۔ تاسیسِ ریاست کے ضمن میں رسولؐ اللہ کا وہ انقلابی اقدام ہے جس کی نظیر پوری تاریخِ سیاست میں مشکل سے ہی ملے گی۔ اس نوشتہ کی بنا پر، جیسا کہ تمہید میں عرض کیا گیا، نہ صرف یہ کہ مدینہ میں ایک ریاست کی تاسیس باضابطہ طور پر ہوگئی بلکہ اس نوشتہ نے مدنی سیاست و معاشرت بلکہ پُورے عرب کی سیاست و مدنیت پر انتہائی دور رس اثرات مرتّب کیے۔ چنانچہ ڈاکٹر حمید اللہ نے لکھا ہے کہ "اصل میں شہر مدینہ کو پہلی دفعہ "شہری مملکت" قرار دینا اور اس کے انتظام کا دستور مرتّب کرنا تھا"[۱۰۳] بہرحال اس

اجمال کی تفصیل اور اس کے مندرجات کی وضاحت مندرجہ ذیل نکات کے تحت کی جاسکتی ہے:

(۱) اس دستاویز کا مجموعی طور پر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کی زبان، اس کی عبارت، اس کی تحریر کا سیاسی سلیقہ، اس کا محتاط و قانونی اندازِ بیان اور اس کے مندرجات وغیرہ (ایک معمولی نوشتہ یا معاہدہ کے نہیں بلکہ) غیر معمولی نوعیت کے ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر حمید اللہ نے اس دستاویز پر بحث کرتے ہوئے اس کا عنوان "دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور" قائم کیا(۳۰۲)۔ اسی مضمون میں وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ "زیرِ بحث دستاویز ایک معاہدہ کی شکل نہیں رکھتی بلکہ ایک فرض اور حکم کی صورت میں نافذ کی جاتی ہے۔ چنانچہ سب لوگ جانتے ہیں کہ "کتاب" کے معنی فرض اور حکم کے ہیں۔"(۳۰۳) اور پھر حوالے دے کر آگے ثابت کرتے ہیں کہ "جرمن، فرانسیسی، انگریزی اور ہسپانوی زبانوں میں بھی اس کے کم و بیش یہی معنی ہیں۔"(۳۰۴)

چنانچہ اس دستاویز کی اس "دستوری" نوعیت کے پیشِ نظر یہ کہنا شاید بے جا نہ ہوگا کہ اس کے کسی ایک فریق کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ جب چاہے علیحدگی اختیار کرلے یا اس کی خلاف ورزی کر ڈالے۔ ایسا کرنا گویا اس "حقِ شہریت" کو ختم کردینا ہے جسے ریاست نبویؐ کے حدود میں یہی دستور عطا کر رہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جن یہودی قبائل نے بعد میں اسے پامال کیا ان کے خلاف وہ کارروائی کی گئی جو غدّاروں اور باغیوں کے خلاف کی جاتی ہے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس دستاویز کو معاہدہ یا میثاق کے بجائے "فرمان" اور "منشور" کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔(۳۰۵) اس کے مندرجات پر غور کرنے سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ اسے اللہ کے نبی و رسول اور ریاست مدینہ کے حکمران کی جانب سے جاری کیا گیا، اس میں یک طرفہ طور پر (معاہدہ کے برخلاف) تمام رعیت کے حقوق و فرائض کو متعین کیا گیا اور ساتھ ہی ساتھ کمال تدبّر سے اس وقت مدنی سیاست و معاشرت کی تمام فوری ضروریات (مثلاً مسلمانوں اور دیگر عناصر آبادی کے درمیان تعلقات کا مسئلہ، قریش کی ناکہ بندی، مدینہ کا دفاع وغیرہ) کا تسلّی بخش انتظام بھی کردیا گیا۔(۳۰۶)

علاوہ ازیں اس منشور میں یہ امر بھی واضح ہے کہ اس کا دائرہ اطلاق مدینے میں رہنے والے تمام باشندوں اور تمام جماعتوں پر یکساں طور پر عائد ہوتا ہے۔ یعنی مہاجرین، انصار، مشرکین اور یہود وغیرہ۔ اس منشور کے ابتدائی فقرے اس کی وسعت اور ہمہ گیری کو متعین کر کے اس بات کی نفی کر دیتے ہیں کہ یہ "یہودیوں سے معاہدہ" قسم کی کوئی چیز ہے۔(۳۰۷)

(۲) اس دستاویز کا آغاز بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے ہوتا ہے اور اس کا سرعنوان ہے "ھذا کتاب من محمد النبی صلی اللہ علیہ وسلم" (یہ کتاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہے جو اللہ کے رسول اور نبی ہیں)۔ گویا پیرایۂ آغاز میں ہی نظریہ اساسی کی بنیاد رکھ دی گئی اور اس کی دیگر دفعات میں اللہ کی حاکمیت اور رسولؐ کی نیابت کی طرف بہرحال مراجعت(۳۰۸) اور دنیاوی و اُخروی عذاب و ثواب کی تلقین(۳۰۹) کر کے

اسلام کو اس دستور کی اساس اور رُوح بنا دیا گیا ہے۔

(۳) دفعہ دوم کی رُو سے اس دستاویز کے تمام مخاطبین کو ایک سیاسی وحدت (امتہ واحدہ)[۳۱۰] قرار دیا گیا۔ اور بھی اس شکل میں کہ ہیئت اجتماعیہ کا مرکزی اور غالب عنصر بہر صورت مسلم جماعت ہی رہے۔ چنانچہ اس دستوری نوشتہ کا دائرہ نامزد کرتے ہوئے پہلے تو یہ کہا گیا کہ "بین المومنین والمسلمین من قریش ویثرب" اور پھر اس پر اضافہ یہ کیا گیا کہ "ومن تبعھم فلحق بھم وجاھد معھم" گویا ریاست کا مرکزی عنصر مکہ اور مدینہ کے اہلِ ایمان ہیں اور بقیہ ان کے تابع، لاحق اور حامی ہونے کی صورت میں شہریت سے بہرہ مند ہیں۔ یہاں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ منشور کے اس پہلے حصہ میں اصل تخاطب مہاجرین و انصار کی جماعت سے ہے۔ جو نظری اور عملی دونوں طرح دین کی اساس پر بھائی بھائی بنائے جا چکے تھے۔ اور جنہیں منشور زیر بحث کی دفعہ میں بھی یہی حیثیت دی گئی۔ چنانچہ تصریح ہے کہ "اہلِ ایمان دوسرے انسانوں کے بالمقابل آپس میں بھائی بھائی ہیں"۔[۳۱۱] اس سے ایک طرف تو یہ واضح ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے باہمی روابط جو پہلے ہی سے "اخوت" کے سائے میں پروان چڑھ رہے تھے اب ان کو قانونی تحفظ بھی دے دیا گیا۔ اور دوسری طرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ مہاجرین و انصار مجموعی طور پر ایک مکمل جماعت ہیں جیسا کہ خود لفظِ اُمت سے مترشح ہے۔ بلکہ ہمارے نزدیک اگر یہاں اس لفظ کا اطلاق مصطلحہ "قوم" (NATION) کے معنوں میں کیا جائے تب بھی یہ جماعت اس کا مصداق بن جائے گی کیونکہ اس کی ترتیب و تنظیم کا مدار دین پر ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اُمتیں اور قومیں اوطان سے نہیں بنا کرتیں بلکہ مخصوص جذبات، رسوم و عقاید اور افکار و نظریات سے بنتی ہیں۔[۳۱۲]

(۴) اسلام جس قسم کا معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے اس کی مرکزی خصوصیت یہ بتائی گئی کہ اس میں معروفات (نیکیاں) فروغ پائیں اور منکرات (برائیوں) کا استیصال ہو۔[۳۱۳] چنانچہ اسلامی حکومت کے فرائض و مقاصد کا تعین کرتے ہوئے قرآن میں ارشاد ہے کہ:

الذین ان مکنّٰھم فی الارض اقاموا الصّلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر۔[۳۱۴]

(یہ مسلمان وُہ ہیں کہ اگر ہم نے انہیں زمین میں صاحبِ اقتدار کر دیا تو وہ نماز قائم کریں گے، ادائے زکوٰۃ میں سرگرم ہوں گے، نیکیوں کا حکم دیں گے اور برائیوں سے روکیں گے)

اسلام کے نظامِ قانون کا مطالعہ یہ امر واضح کرتا ہے کہ اسلام میں حلال و حرام کے معیارات قائم کرنے میں بھی اصل رعایت معروف و منکر کی ہی رکھی گئی ہے، چنانچہ جو چیز انسانی معاشرہ کے لیے سم قاتل ہے، برائیوں کی اصل ہے، اور جس میں سب سے بڑا گناہ ہے اسے شریعت نے بالکل حرام قرار دیا ہے۔ مثلاً قتل ناحق، کیونکہ بقول ایک مصنف کے "انسان کے تمدنی حقوق میں اس کا اوّلین حق زندہ رہنے کا اور اس کے تمدنی فرائض میں اولین فرض زندہ رہنے دینے کا ہے جس قانون اور مذہب میں اسے تسلیم نہ کیا گیا ہو وُہ نہ تو مہذب قانون بن سکتا ہے اور نہ اس کے ماتحت رہ کر کوئی انسانی

جماعت پُرامن زندگی بسر کر سکتی ہے۔"(۳۱۵) اسی طرح جو چیز انسانیت کے لیے رحمت، بھلائیوں کی اصل اور جس میں سب سے بڑا ثواب ہے اسے شریعت نے بہرحال "فرض" قرار دیا ہے۔ مثلاً عبادات و معاملات کی ادائیگی وغیرہ۔ اس اصول کی روشنی میں یہ امر محتاجِ بیان نہیں ہے کہ اس وقت چونکہ رسولؐ اللہ کے سامنے ایک ایسے ہی مثالی معاشرہ کی تعمیر درپیش تھی۔ چنانچہ منشور میں بھی یہ رعایت پُوری طرح رکھی گئی کہ مدینہ کی بستی امن و سلامتی کا گہوارہ بن سکے اور وہاں کے تمام باشندے عملاً اس قسم کی فضا قائم کرنے میں اپنا اپنا حصّہ ادا کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس نوشتہ میں جگہ جگہ "نیکی اور انصاف" سے کام لینے کی تاکید موجود ہے اور جس کا اظہار متعدد دفعات سے ہوتا ہے۔(۳۱۶) نیز یہ بھی مطالبہ کیا گیا ہے کہ برائیوں کی جڑ کاٹی جائے۔ چنانچہ اس ضمن میں ظلم و تعدّی، طغیان و فساد، سرکشی، استحصال بالجبر(۳۱۷) اور قتل(۳۱۸) کو سخت ممنوع بلکہ ناقابلِ معافی جُرم قرار دیا گیا اور یہی وجہ ہے کہ فدیہ و خون بہا(۳۱۹)، قصاص(۳۲۰)، ذمہ و پناہ(۳۲۱)، صلح(۳۲۲)، اخوت(۳۲۳)، خدا کی راہ میں انتقام(۳۲۴)، اُخروی عذاب لعنت سے بچنے(۳۲۵) اور رجوع الی اللہ والرسول(۳۲۶) کو فرض و ضروری قرار دیا گیا ہے۔ یہاں ہم یہ بات بڑے اطمینان سے کہہ سکتے ہیں کہ زیرِ بحث منشور کے یہی بنیادی مقاصد تھے۔ کیونکہ ہر آبادی فی الجملہ پُرسکون زندگی بسر کرنے کی خواہاں ہوتی ہے اور اہلِ مدینہ میں تو یہ خواہش بدرجۂ اتم پائی جاتی تھی۔ علاوہ ازیں ریاست کا داخلی امن و امان اور معاشرہ کے مختلف اعمال و وظائف اور ادارات کا قیام و استحکام اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ فتنہ و فساد کے ہر سرچشمے کا دہانہ بند نہ کر دیا جائے اور بیرونی حملوں اور یورشوں کی روک تھام کا بندوبست نہ کیا جائے۔ منشور میں چونکہ ان تمام باتوں کی ضمانت موجود ہے اس لئے اسے اپنے مقاصد میں بجا طور پر کامیاب کہا جا سکتا ہے۔ تفصیلاتِ بالا سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ رسولؐ اللہ نے اپنے منشور ریاست کی اساس ان اخلاقی قدروں پر رکھی جن کی افادی اور انسانی حیثیت سے عقلِ سلیم انکار نہیں کر سکتی۔ سیاست اور اخلاق کا یہ امتزاج اس وقت اور بھی معنی خیز ہو جاتا ہے جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ جدید تصورِ ریاست و سیاست میں اخلاق کو بالکلیہ خارج کر دیا جاتا ہے۔(۳۲۷)

(۵) منشور کا مطالعہ کرنے سے یہ بات بالکل عیاں ہو جاتی ہے کہ یہ ایک مکمل دستاویز اور جامع فرمان کی حیثیت رکھتا ہے اور اسے ایک ہی دفعہ یعنی سنہ ۱ھ میں جاری کیا گیا جیسا کہ تمام قدیم و جدید مآخذ میں اس کی تصریح موجود ہے اور بعض جدید العہد مصنفین نے بھی (جنہوں نے اس دستاویز کو اپنی تحقیق و کاوش کے لئے منتخب کیا) یہ اعتراف کیا ہے کہ "پُوری دستاویز ایک ہی کل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کی عبارت و اندازِ اسلوب سے بھی ایک ہی مرتّب کنندہ کا ہونا پایا جاتا ہے اور مسلمان مورّخ عام طور پر یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ دستاویز سنہ ۱ھ کی ابتدا میں مرتّب ہوئی(۳۲۸)" لیکن آگے چل کر ان کا بیان یہ ہے کہ "یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سنہ ۱ھ میں دستاویز کا حصّہ اول مرتّب ہوا اور بقیہ حصّہ سنہ ۲ھ میں جنگِ بدر کے بعد مرتب کر کے حصہ اول کے ساتھ شامل کر دیا گیا ہو۔"(۳۲۹) پھر اپنے اس قیاس پر استدلال اس طرح پیش کرتے ہیں کہ "یہودیوں کا بھی اسی ابتدائی زمانہ میں آنحضرتؐ کے سیاسی اقتدار کو مان لینا قرینِ قیاس نہیں۔ میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ دستور کا حصہ دوم یعنی یہودیوں کا دستور العمل جنگِ بدر کے بعد کا واقعہ ہے جبکہ ایک زبردست فتح سے مسلمانوں کی دھاک ہر طرف بیٹھ گئی تھی۔

اہلِ مدینہ نے اپنے سابقہ معاہدات حلیفی جو یہودیوں کے ساتھ تھے منسوخ کر لئے تھے۔ آنحضرتؐ نے آس پاس کے قبائل مثلاً بنی ضمرہ، جہینہ وغیرہ سے حلیفیاں کر کے مسلمانوں کی قوت کو بے حد مضبوط و مستحکم بنا دیا تھا۔ یہودیوں کے دو بڑے گروہ آپس کے حریف و رقیب تھے ان کا مل کر رہنا اور رانگ مستقل رہ کر محفوظ رہنا ممکن نہ تھا اور وہ ہر طرف سے بچھڑ کر بے یار و مددگار اور ہر قوی کا شکار بنے ہوئے تھے۔ ان حالات نے انھیں مجبور کیا کہ اپنی مذہبی آزادی اور اندرونی خود مختاری برقرار رکھتے ہوئے آنحضرت سے ماتحتانہ تعاون کریں اور جیسا کہ عرض کیا گیا میرے خیال میں یہ جنگِ بدر کے بعد کا واقعہ ہو سکتا ہے اس سے پہلے کا ہونا قرینِ قیاس نہیں ہے"(۳۳۰) اسی طرح مشہور مستشرق منٹگمری واٹ بھی کیتانی اور دلہازن کی متابعت میں ایک طرف تو اسے ایک ہی مکمل دستاویز قرار دیتا ہے(۳۳۱) اور دوسری طرف یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ چونکہ اس کی کئی دفعات میں ضمائر و تخاطب کا اختلاف ہے مثلاً کہیں مومنین کا لفظ استعمال ہوا کہیں مسلمین کا' اس لیے ممکن ہے کہ یہ دو یا اس سے زائد مواقع پر طے کی گئی ہوں لیکن پھر یکجا کر دی گئی ہوں(۳۳۲)۔ مزید برآں چونکہ اس میں مشہور یہودی قبائل کا نام نہیں ہے اس لئے ممکن ہے کہ یہ اخراج بنو قریظہ کے بعد کا واقعہ ہو(۳۳۳)۔

ڈاکٹر حمید اللہ اور واٹ نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے انھیں فی الحقیقت دستاویز کے مندرجات اور تاریخی واقعات کی روشنی میں کچھ زیادہ قابلِ قبول قرار نہیں دیا جا سکتا چنانچہ اپنے موقف کی تائید میں ہم مندرجہ ذیل نکات کی وضاحت مناسب سمجھتے ہیں؛

(ل) قدیم و جدید مورخین اور اربابِ سیر عام طور پر یہی بیان کرتے ہیں کہ یہ دستاویز ۱ھ سے تعلق رکھتی ہے اور یہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ ڈاکٹر حمید اللہ اور واٹ دونوں مصنفین اس دستاویز کو اس کی داخلی و خارجی شہادتوں کی بنا پر ایک "کل" تصور کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے جب اس کے ایک جزو کا زمانہ متعین ہے تو دوسرے جزو کا بھی زمانہ منطقی طور پر متعین ہو جاتا ہے اور (قرآن کی سورتوں کی طرح) سیرت کے واقعات میں غالباً اس کی نظیر نہیں ملتی کہ ایک ہی مکمل دستاویز کو دو مختلف زمانوں میں مکمل کر کے بغیر کسی تصریح کے یکجا کر دیا گیا ہو۔

(ب) جہاں تک اس بیان کا تعلق ہے کہ بیرون مدینہ قبائل سے معاہدات کر کے رسول اللہؐ ایک مستحکم حیثیت حاصل کر چکے تھے اور جنگِ بدر سے یہود پر دھاک بیٹھ گئی تھی اس لئے انھوں نے رسول اللہؐ کی سیاست کو قبول کرتے ہوئے ماتحتانہ تعاون پیش کیا۔ تو اس سلسلے میں درج ذیل پہلوؤں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا:

(۱) سوال یہ ہے کہ بیرون مدینہ قبائل نے رسولؐ کی سیادت کو کیوں قبول کر لیا؟ یہودِ مدینہ نے آپ کی سیادت کو تسلیم نہ کیا ہوتا تو اس صورت میں قبائل سے رسول اللہؐ کے حلیفانہ معاہدات موثر نہ ہو سکتے تھے کیونکہ وہ قبائل کہہ سکتے تھے کہ مدینہ کا ایک قابلِ ذکر عنصر تو آپ کی گرفت سے بالکل باہر ہے پہلے ان کو زیرِ اطاعت لائیے اس کے بعد ہم سے مطالبہ کیجئے۔ علاوہ بریں بیرونِ مدینہ جن قبائل سے اس وقت یا بعد میں معاہدات ہوئے ان کے مضامین سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ چند کے سوا تمام فرامین اور امان نامے ہیں اور فرامین و امان ناموں کا اجرا بجائے خود رسول اللہؐ کی قیادت اور اندرونی سیاسی

خود مختاری کو مزید موکد کرتا ہے۔

۲۔ اس دستاویز کے دوسرے حصّہ کو جنگِ بدر کے بعد فرض کرنے کا مطلب یہ بھی ہوگا کہ بنی قینقاع کے اخراج سے پہلے تک مدینہ کے تمام منتشر و متفرق عناصر میں اتحاد پیدا نہ ہو سکا تھا جبکہ واقعہ اس کے برعکس ہے یعنی یہ کہ اس سے پہلے تمام مدنی عناصر میں اتحاد ہو چکا تھا اور مدنی معاشرہ کے بعض عناصر (مثلاً منافقین اور یہود) کی جملہ سرگرمیوں کا اوّلین ہدف ہی یہ تھا کہ کسی طرح مدنی معاشرہ کے اتحاد پر ضرب لگائی جائے اور انتشار و تشتت کو ہوا دی جائے۔

۳۔ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے موقف کو تسلیم کیا جائے تو پھر جنگِ بدر کے بعد محض بنی قینقاع کا اخراج اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ حد سے حد بنی قینقاع پر رسولؐ اللہ کے اقتدار کی دھاک بیٹھی تھی باقی یہودی قبائل یعنی بنی نضیر اور بنی قریظہ پر اس کا کوئی اثر نہ تھا اور اس صورت میں شاید واٹ کی یہ بات صحیح ہو گی کہ دستاویز کو بنی قریظہ کے استیصال کے بعد ۵ھ کا واقعہ مانا جائے۔ حالانکہ تاریخ سے ان باتوں کی تائید نہیں ہوتی۔

۴۔ اگر ہم اس تحریر کا زمانہ بدر کے بعد کا مان لیں تو غالباً بنی قینقاع کے اخراج کو کچھ اور بڑھانا پڑے گا اور وہ ناممکن ہے کیونکہ غزوہ بدر کے لئے رسولؐ اللہ بقول ابنِ ہشام ۸ رمضان ۲ھ کو اور بروایت ابن سعد ۱۲ رمضان ۲ھ کو روانہ ہوئے[۳۳۴] اور آخر رمضان ۲ھ یا اس کے بعد مدینہ مراجعت فرمائی[۳۳۵] اور پھر غزوہ بنی قینقاع کے لئے ۱۵ شوال ۲ھ کو نکلے[۳۳۶] اور ۱۵ دن کے محاصرہ کے بعد یعنی ۳۰ شوال ۲ھ کو فارغ ہوئے۔[۳۳۷] اس کا مطلب یہ کہ غزوہ بدر اور غزوہ بنی قینقاع کی درمیانی مدت ۱۵ دن ہے اور اس قلیل ترین مدت میں تمام یہود کا بدر کے اثرات کو قبول کر کے آمادہ طاعت ہو جانا اور پھر اس دستاویز کی تحریر ناقابلِ فہم معلوم ہوتی ہے۔

۵۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ جنگِ بدر کی دھاک یہود پر بیٹھ گئی اور انہوں نے یہ بھی محسوس کر لیا کہ وہ بے یار و مددگار ہو گئے ہیں تو پھر انہوں نے رسولؐ اللہ کے خلاف جارحانہ اقدام کی جرأت کیوں کی؟ اور نہایت گستاخی سے یہ کہہ کر دعوتِ مبارزت کیوں دی کہ:

یا محمّد انك ترى أنّا قومك؟ لا يغرّنّك انك لقيت قوماً لا علم لهم بالحرب فاصبت منهم فرصةً انّا و الله لئن حاربناك لتعلمنّ أنّا نحن الناس[۳۳۸]!

(اے محمد! تم سمجھتے ہو کہ ہم بھی تمہاری قوم کی طرح ہیں؟ تم کہیں گھمنڈ میں مبتلا نہ ہو جانا! تم نے تو ایسے لوگوں سے مقابلہ کیا تھا جو جنگ سے واقف نہ تھے۔ اس لئے ان پر غلبہ پا لیا۔ لیکن ہم ایسے نہیں ہیں۔ واللہ! ہمیں تم سے لڑنے کی نوبت آئے گی تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ ہم کون لوگ ہیں!)

حالانکہ کم و بیش تمام مورخین (جو عام تاثر کے تحت اس منشور کو معاہدہ سمجھتے ہیں) اس بات پر متفق ہیں کہ بنی قینقاع نے یہ گستاخی کر کے دراصل عہد شکنی کا ارتکاب کیا تھا اور اس منشور کو پسِ پشت ڈال دیا تھا جسے انھوں نے رسولؐ اللہ کی آمدِ مدینہ کے بعد خود تسلیم کیا تھا۔[۳۳۹]

ظاہر ہے کہ بنی قینقاع کے خلاف بدعہدی اور دستور شکنی وغیرہ کا الزام اسی صورت میں قابلِ فہم ہو سکتا ہے

جبکہ بدر سے پہلے وُہ کسی عہد کے پابند ہُوئے ہوں۔ اگر بدر سے پہلے وہ کسی تحریر کے پابند نہیں ہیں تو پھر بدعہدی کا الزام کس بات پر ہے؟ حالانکہ ان پر یہ الزام غزوۂ بدر کی وجہ سے عائد کیا گیا۔ کیونکہ اس جنگ میں منشورِ مدینہ کی رُو سے یہود نے مسلمانوں سے نہ تو تعاون کیا اور نہ ہی خیر خواہی برتی۔ اور اسی پر متنبہ کرنے کے لئے رسولؐ اللہ صحابہ کے ساتھ جب ان کے محلّہ میں تشریف لے گئے تو انھوں نے وہ گستاخانہ جواب دیا جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ پھر معاً ایک مسلمان عورت کی بے حُرمتی ان کے خلاف چارہ جوئی کا فوری سبب بن گئی۔

۶۔ واقعات کی منطقی ترتیب کے اعتبار سے بھی جیسا کہ میور نے واضح کیا ہے کہ یہ تحریر ہجرتِ مدینہ کے زیادہ دنوں بعد کی نہیں ہو سکتی کیونکہ بہت تھوڑے سے ابتدائی عرصہ کے لئے یہودِ مدینہ اور رسولؐ اللہ کے تعلقات دوستانہ رہے لیکن کچھ ہی مدّت کے بعد یہ ظاہر ہو گیا کہ یہودیت اور اسلام میں کوئی مطابقت نہیں ہو سکتی۔ اس لیے یہودِ مدینہ نے جانتے بُوجھتے اپنی ضد، ہٹ دھرمی اور اپنے مذہب کی اندھی تقلید میں رسولؐ اللہ کو مسترد کر دیا[۲۴۰] قرآن کے وُہ حصّے جو اس زمانے میں نازل ہُوئے ان میں بھی اس کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ یہود نے جانتے بُوجھتے رسولؐ اللہ اور آپ کے لائے ہوئے دین سے اعراض کیا تھا[۲۴۱] چنانچہ اس کے بعد نہ صرف یہودیت اور اسلام کا تصادم صاف ظاہر ہو گیا بلکہ اس سے یہودیوں کو اپنی بے جا توقعات کا انجام بھی معلوم ہو گیا۔ (کہ شاید رسولؐ اللہ ان ہی کے دین کی حمایت و نصرت کریں گے یا ان ہی کے دین کے علمبردار بنیں گے) اسی لیے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہود کا طرزِ عمل مخالفانہ، معاندانہ اور مخاصمانہ ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ پھر یہ خلیج اتنی بڑی ہو گئی جس کا پُر ہونا ممکن نہ تھا۔ بالآخر یہود کو شہری مملکت مدینہ سے نکلنا پڑا۔

بہر حال ان دلائل کی روشنی میں یہ کہنا صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ یہ تحریر جنگِ بدر کے بعد کی ہے۔

(ج) اب جہاں تک واٹ کی اس دلیل کا تعلق ہے کہ چونکہ اس منشور میں یہودیوں کے تین مشہور قبائل کا نام مذکور نہیں ہے، اس لیے اس کا زمانۂ تحریر بنو قریظہ کے استیصال کے بعد ہو گا۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ قیاس بھی مندرجہ ذیل وجوہ سے قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔

۱۔ اگر یہود کے بعض قبائل کا ذکر نہیں ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہودی بحیثیت جماعت کے اس منشور کے مخاطب نہیں ہیں کیونکہ پھر اس صورت میں تو مہاجرین کے قبائل کا بھی انفرادی اعتبار سے ذکر موجود نہیں ہے اور انصار کے جن قبائل کا ذکر کیا گیا ہے وہ اوس اور خزرج کی محض چند شاخیں ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ انصار میں سے وُہ لوگ جو دوسرے خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے گویا رسولؐ اللہ کے دائرہ اطاعت سے خارج ہیں اگر یہ استدلال صحیح ہے تو ظاہر ہے کہ جس طرح انصار کے چند قبائل گنا کر تمام مراد لئے گئے اسی طرح یہود کے چند قبائل کا تذکرہ کیا پُوری جماعت یہود کا قائم مقام نہیں بن سکتا؟

۲۔ اس دستاویز کا سرنامہ اصولی طور پر جن جماعتوں پر رسولؐ اللہ کے سیاسی، قانونی اور معاشرتی اقتدار کو ثابت کرتا ہے۔ اس کے الفاظ میں اتنی عمومیت موجود ہے کہ بغیر نام لئے اس میں وہ تمام افراد شامل ہو جاتے ہیں جن کے بارے

یں کہا گیا ہے کہ:

ومن تبعھم فلحق بھم و جاھد معھم۔

اس صریح کنایہ کے علاوہ اس دستاویز کی ایک دفعہ (۲۸) دلالت کرتی ہے کہ یہود کو کُلّی حیثیت سمجھا گیا ہے۔ اسی شق میں مذہبی اعتبار سے یہود کو آزادی دی گئی ہے اور اس میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ جو ظلم و عہد شکنی کا ارتکاب کرے گا تو اس کے تمام نتائج کی ذمہ داری اور وبال خود اس کے اور اس کے خاندان کے علاوہ کسی دوسرے پر نہ ہوگا۔ چنانچہ آئندہ پیش آنے والے تاریخی واقعات اس کی تصدیق کرتے ہیں مثلاً جب کسی بھی ایک یہودی قبیلہ یعنی بنو قینقاع یا بنو نضیر یا بنو قریظہ کے خلاف رسول اللہؐ کی طرف سے کارروائی کی گئی تو دوسرا قبیلہ خاموش رہا اور اس نے کسی قسم کا احتجاج یا تعرض نہیں کیا۔ یہ واقعات اس بات کا مزید ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ خود یہودی بجا طور پر اس دستاویز کا اپنے آپ کو پابند سمجھتے تھے اسی لئے ان میں سے کسی بھی متاثرہ قبیلہ نے رسول اللہؐ سے یہ اعتراض نہیں کیا کہ وہ ان کے خلاف کس ضابطہ اور اختیار کی رُو سے اقدام کر رہے ہیں؟ نہ انھوں نے رسول اللہؐ سے یہ کہا کہ "ہم تو آپ کے حکم کے پابند نہیں ہیں"۔ حالانکہ اگر واٹ کا قیاس درست مانا جائے تو اس صورت میں ایک طرف تو اس قسم کا اعتراض یہود کی طرف سے لامحالہ پیش کیا جا سکتا تھا اور دوسری طرف یہ تینوں مشہور یہودی قبائل رسول اللہؐ کے خلاف مشترکہ محاذ بنا کر پیش قدمی یا کارروائی کر سکتے تھے اور ایک دُوسرے سے اقدام کی صورت میں مدد بھی طلب کر سکتے تھے لیکن چونکہ اس قسم کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا اس لئے واٹ کا قیاس تاریخی اعتبار سے ناقابل قبول ٹھہرتا ہے۔

یہاں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس منشور کے پہلے حصّہ میں (جو عام تقسیم کے مطابق مہاجرین و انصار وغیرہ سے متعلق ہے) یہ دفعہ (۱۷) موجود ہے کہ:

"یہودیوں میں سے جو بھی ہمارا اتباع کرے گا تو اسے مدد اور مساوات حاصل ہوگی۔ ان (یہود) پر نہ تو ظلم کیا جاتے گا اور نہ ان کے خلاف کسی (دشمن) کو مدد دی جائے گی نیز یہ دفعہ (۴۴) بھی شامل منشور ہے کہ مومنین جب تک جنگ میں مصروف رہیں گے جنگی اخراجات میں یہودی ان کے شریک رہیں گے۔"

منشور کی اس دفعہ کے ضمن میں ابو عبید نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"یہ شرط اسی لئے رکھی گئی کہ ان یہود پر آپ کے دشمنوں کے خلاف آپ کی مدد لازم ہو جائے۔"(۴۴۲)

پھر آگے لکھتے ہیں کہ:

"اور ہمارا خیال ہے کہ اس خرچ کرنے کی شرط کے باعث آپ مسلمانوں کے ساتھ جنگ میں شریک ہونے والے یہود کو غنیمت میں سے حصہ دیا کرتے تھے ورنہ بصورتِ دیگر وہ مسلمانوں کی غنیمت میں سے کسی حصّہ کے مستحق نہ ٹھہرتے۔"(۴۴۳)

اس مسئلہ کو یہ روایت بھی واضح کرتی ہے کہ زہری کہتے ہیں کہ:

"یہود رسول اللہؐ کے ساتھ غزوات میں شریک ہوتے تھے تو آپ غنیمت میں ان کا حصہ بھی لگاتے تھے۔"(۴۴۴)

۴ - یہ سوال بھی غور طلب ہے کہ یہ منشور بالفرض محال اگر استیصال بنی قریظہ کے بعد منعقد ہوا تو خود بنی قینقاع بنی نضیر اور بنی قریظہ کے مدینے سے نکالے جانے کی بنیاد کیا ہے؟ نیز بجائے اس کے کہ تمام یہود کا اخراج ایک ہی بار ہو اس طرح دو یا تین وقفوں کے ساتھ ان کے خلاف کارروائی کیوں کی گئی؟ یہ بنیاد ظاہر ہے منشور مدینہ ہی ہو سکتی ہے جو یقیناً ان سب واقعات پر تقدم زمانی رکھتا ہے۔

(۶) اگرچہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ یہ نوشتہ ایک مکمل دستاویز ہے تاہم اس کے مضامین و مندرجات کے پیش نظر اور بغرض مطالعہ ہم اس منشور کو بآسانی دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ منشور کی یہ تقسیم بہت عام اور مشہور ہے۔ منشور کا ابتدائی حصہ مہاجرین و انصار کے حقوق و فرائض سے متعلق ہے اور ہماری ترتیب کے لحاظ سے اس میں ۲۵ دفعات ہیں۔[۳۴۵] جبکہ دوسرا حصہ یہود مدینہ کے حقوق و فرائض سے بحث کرتا ہے اور اس میں ہماری ترتیب کے مطابق ۳۱ دفعات ہیں۔[۳۴۶]

اس تقسیم کی رُو سے پہلے حصہ کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ایک طرف تو مسلمانوں کے مختلف عناصر کو حقوق و فرائض میں مساوی سمجھا گیا۔ صلح و جنگ کے معاملات مشترکہ قرار دئیے گئے اور دوسری طرف یہ سیاسی تنظیم اس صراحت کے ساتھ وجود میں آئی کہ اس کے تمام شرکاء رسول اللہؐ کے احکام کی تعمیل کریں گے اور آپؐ کا فیصلہ آخری اور قطعی ہوگا۔

جہاں تک انصار کا تعلق ہے ان کے متعدد قبائل تھے انھیں اسی شکل میں تسلیم کر لیا گیا اور اس کے بالمقابل تمام مہاجرین کو بھی ایک قبیلہ کے مماثل مانا گیا اور یہ واضح کر دیا گیا کہ جملہ مسلم طبقات کو یکساں حقوق و واجبات حاصل ہوں گے۔ جنگ و صلح کو مرکزی مسئلہ قرار دیا گیا۔ البتہ پناہ دہی کا حق، حسبِ سابق انفرادی طور سے چھوٹے بڑے سب کے لیے یکساں رکھا گیا۔ نظام قضا و عدالت میں اس حد تک انقلاب پیدا کیا گیا کہ اب یہ ایک شخص یا اس کے قبیلہ کا معاملہ نہ رہا بلکہ ایک اجتماعی اور معاشرتی معاملہ بن گیا۔ عدالتی اختیارات کو مرکزیت دے دی گئی اور انصاف کے معاملات میں جانبداری برتنے کو ممنوع قرار دے دیا گیا اور اس سلسلے میں اپنے اعزّہ و اقارب حتیٰ کہ خود حقیقی بیٹے تک کو راستے سے ہٹا دیا گیا۔ اور اس طرح انصاف رسانی میں ہر قسم کی مداخلت کو سختی سے بند کر دیا گیا اور یہ لازم کیا گیا کہ تمام مسلمان مل کر ہر ضرر رساں آدمی کو کیفرِ کردار تک پہنچائیں گے۔ ضمانِ دیت اور قصاص و فدیہ وغیرہ کے معاملات میں اگرچہ بہت سی باتیں حسبِ سابق قائم رکھی گئیں لیکن یہ کیا کم تھا کہ انھیں حقیقی اور عملی شکل دے دی گئی۔ چنانچہ ولہازن نے بجا طور پر لکھا ہے کہ:[۳۴۷]

"There for the first time the talio becomes effective, there it can be enforced. The community, at the head of which God stands, and the Prophet as God's representative, has power to deliver the shedder of blood over to avenger, and it is the duty of the community to see that this is done".

(قصاص و دیت کا ضابطہ وہاں پہلی مرتبہ اتنا موثر بنا کہ اسے نافذ کیا جا سکے۔ وُہ سیاسی وحدت جس کی سربراہی اللہ کے ذمہ تھی اور جہاں رسولؐ کی حیثیت اللہ کے نمائندے کی تھی، یہ اختیار رکھتی تھی کہ قاتل کو منتقم کے حوالے کر سکے اور اس بات کی نگرانی کرنا بھی پُوری جماعت کا کام تھا کہ ضابطہ کی تعمیل کر دی گئی ہے)

بہرحال منشور میں اس قسم کے متعدد اقدامات کے ذریعہ اس نوزائیدہ سیاسی وحدت میں اخوت و مساوات، حریتِ فکر اور آزادیٔ عمل کو بالفعل جاری و ساری کر دیا گیا۔

منشور مدینہ کا دُوسرا حصہ یہودیوں سے متعلق ہے جس میں تمام یہود (مہاجرین و انصار کی طرح) ایک جماعت (امت) کی حیثیت سے شہری ریاست مدینہ سے منسلک کیے گئے۔(۳۴۸) یہود کو ایک علیحدہ فریق سمجھا گیا جس میں تمام اصل و موالی قبائل وغیرہ شامل تھے۔ رسولؐ اللہ کے حکم فیصلے اور سیاسی اختیار کا پُورا اطلاق یہودیوں پر بھی کیا گیا اور ہر اختلاف کی صورت میں رسولؐ اللہ کو آخری عدالت مرافعہ قرار دیا گیا۔(۳۴۹)

اس حصہ سے متعلق پہلی دفعہ (۲۶) میں ہی بتا دیا گیا کہ اگر جنگ میں مسلمان و یہود کے درمیان اتحادِ عمل ہوا تو ہر فریق اپنے مصارفِ جنگ خود برداشت کرے گا۔ اسی بات کو دُوسری دفعات (۴۱ اور ۴۴) میں بھی دُہرایا گیا ہے صلح و جنگ کو مرکزی مسئلہ قرار دیا گیا (۵۰) اور دفاعی سیاست کے لحاظ سے بھی بالادستی رسولؐ اللہ کی رکھی گئی۔(۳۵۱) پھر مدینہ پر قریش کے حملہ کی صورت میں مشترکہ جنگ اور باہمی امداد ضروری قرار دی گئی۔(۳۵۲) البتہ دینی جنگوں میں انھیں رعایت دی گئی۔ دفاع ہی کے سلسلے میں یہ بات طے کر دی گئی کہ "نہ تو قریش کو پناہ دی جائے گی نہ اس کے مددگاروں کو۔"(۳۵۳) اس طرح قریش مکہ کو ان کے ایک اہم حلیف یعنی یہودیوں کی اعانت سے اصولی طور پر محروم کر دیا گیا اگرچہ اس پر یہود نے نیک نیتی سے عمل نہیں کیا اور نہ ہی مسلمانوں سے خیر خواہی برتی جیسا کہ منشور میں ان پر لازم کیا گیا تھا۔(۳۵۴) علاوہ ازیں یہودیوں کو مسلمان رعایا کے ساتھ سیاسی و تمدنی حقوق میں مساوات عطا کی گئی اور یہودیوں کے معاہداتی رشتہ دار دل (موالی، بطن اور بطانہ) کو حقوق اور ذمہ داریوں میں عام اور اصلی یہود کے برابر مان لیا گیا۔(۳۵۵) یہودیوں کے معاشرتی و خانگی مسائل میں رسولؐ اللہ نے کوئی مداخلت نہیں کی۔ ان کو دین اور عقیدہ و مذہب، دیت اور دُوسرے رسوم و رواج میں بالکل آزاد رکھا۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ تمام مخاطبین نوشتہ خصوصاً یہود نے آنحضرتؐ کے اختیار و حاکمیت کے علاوہ شہر مدینہ اور اس کے مضافات کو "حرم" کی حیثیت سے تسلیم کر لیا۔(۳۵۶) حرم کے مفہوم میں جائے امن، جائے پناہ، اور ایک ایسے علاقہ کا تصوّر لازماً شامل ہے جہاں قتل و غارت گری ممنوع ہو۔(۳۵۷) اس لحاظ سے حرم بن جانے کے بعد مدینہ میں بھی قتل و غارت گری حرام ٹھہری اور وہ تمام لوگوں کے لئے مامن بن گیا۔ اور ہمیں نہ بھُولنا چاہئے کہ یہ انقلاب اس سرزمین میں آ رہا تھا جہاں قتل و غارت گری کی وارداتیں روزمرہ کا معمول تھیں۔ اور جہاں خون آشام جنگوں کی طویل روایت صدیوں سے چلی آ رہی تھی نیز وہی علاقہ امن و عافیت کا سب سے زیادہ محتاج تھا۔

منشور کے اس دوسرے حصے کا جائزہ ختم کرنے سے پہلے اس کے دو اہم پہلوؤں کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے۔

(الف) اس حصہ کی جملہ دفعات پر غور وفکر یہ امر واضح کرتا ہے کہ ان دفعات کا تعلق اگرچہ یہود کے عام شہری حقوق وفرائض سے ہے لیکن دفعات کا ایک بڑا حصہ یہود سے جنگی و دفاعی معاملات پر مشتمل ہے۔ چنانچہ اس حصہ کی کم از کم دس دفعات براہِ راست جنگ وصلح کی حالت میں یہود کے کردار سے بحث کرتی ہیں[۳۵۸] اور ضمنی طور پر تقریباً چار دفعات بھی بہر طور اسی سے متعلق ہو جاتی ہیں[۳۵۹]۔ غالباً اسی پہلو کے پیشِ نظر بعض مصنفین نے اسے یہودیوں سے "اصل میں ایک جنگی حلیفی" یا "فوجی اتحاد" قرار دیا ہے جس کا خلاصہ یہ تھا کہ یہود اپنے دین پر رہیں گے، دونوں کی تمدنی و سیاسی ہیئتیں الگ الگ رہیں گی البتہ ایک فریق پر جب کوئی حملہ کرے گا تو دونوں فریق مل کر لڑیں گے اور دونوں اس جنگ میں اپنا اپنا مال خرچ کریں گے۔[۳۶۰]

مدینہ کے حالات پر غور کرنے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہود سے اس قسم کا "دفاعی تعلق" رکھنے کی ضرورت سیاسی اور عسکری دونوں اعتبار سے ناگزیر تھی کیونکہ ایک طرف تو قریش کی طرف سے ممکنہ حملہ کا دفاع مقصود تھا اور دوسری طرف خود یہود کی سرکشی و بغاوت کا سدِّباب اخلاقی طور پر کرنا تھا۔ علاوہ ازیں اس انتظام سے ایک فائدہ رسولؐ اللہ نے یہ بھی حاصل کر لیا کہ علیحدہ ایک مستقل فوج رکھنے اور دفاعی ضرورتوں کے لئے اخراجات مختص کرنے کی زحمت سے بچ گئے اور وہ بھی اس وقت جبکہ وسائل بالکل نایاب تھے۔

(ب) اس حصہ کی دفعات صراحت سے ریاست نبوی میں یہودیوں کی اس حیثیت کو متعین کر دیتی ہیں کہ وہ مسلمانوں کے "تابع اور لاحق" ہونے کی صورت میں حقوقِ شہریت سے متمتع تھے۔ چنانچہ سرنامہ میں اس کی نشان دہی کے علاوہ اس خاص حصہ میں بھی "امّۃ مع المؤمنین"[۳۶۱] (اہلِ ایمان کے ساتھ ایک جماعت) کے الفاظ دلالت کر رہے ہیں کہ اصل جماعت مومنین کی ہے جس کے ساتھ یہودی بھی وابستہ ہیں لیکن وہ وابستگی سیاسی ضرورت اور دفاعی بنیادوں پر استوار ہوئی۔ کیونکہ اسی سے متصل فقرے میں یہ بھی بتا دیا گیا کہ:

"للیھود دینھم وللمسلمین دینھم"[۳۶۲] (یہودیوں کے لئے ان کا دین ہے اور مسلمانوں کے لئے اپنا دین) مطلب یہ ہے کہ جماعت یہود بربنائے مصلحت وضرورت مسلمانوں سے ملحق تھے اور آئندہ کے تاریخی واقعات شاہد ہیں کہ جب جماعتِ یہود نے ان ذمہ داریوں کو پورا نہ کیا جو اس منشور کی رُو سے ان پر عائد ہوتی تھیں تو پھر اسی منشور کی قراردادوں کے مطابق ان کو عہد شکنی کی سزا بھی دی گئی اور ان کے تین مشہور قبائل یعنی بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ کو مدینہ سے نکلنے پر مجبور کر دیا گیا۔

اس وضاحت کا مدعا یہ ہے کہ یہاں "امت" کے اصطلاحی مفہوم کو سامنے رکھتے ہوئے یہود کو "امتِ مسلمہ" کا جزوِ لاینفک قرار نہیں دیا جا سکتا[۳۶۳] کیونکہ یہ مسلّمات میں سے ہے کہ "امت مسلمہ" کی بنیاد خالص دین پر رکھی گئی ہے (جیسا کہ ہم باب کے ابتدائی مباحث میں بتا چکے ہیں) اور جس کی تائید قرآن کے بیان اور رسولؐ اللہ کے اُسوہ وعمل سے ہوتی ہے اور ہم یہ اُوپر بیان کر چکے ہیں کہ جس دفعہ کی رُو سے یہود کو امتِ مسلمہ کا جزوِ لاینفک قرار دیا جا سکتا ہے اس سے متصل فقرے میں ہی یہ صراحت بھی موجود ہے کہ "دین کے معاملہ" میں یہود و مسلمان الگ الگ ہوں گے۔ اس سے دلیل کی عنکبوتیت بھی واضح ہو جاتی ہے پھر تاریخی طور پر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس منشور کے اجرا پر پورا ایک سال بھی نہ گزرا تھا کہ

ان کے ایک قبیلہ بنو قینقاع کا مدینہ سے اخراج عمل میں آیا اور پھر آئندہ تقریباً چار سال کے عرصہ میں یہودِ مدینہ کا انخلاً مکمل ہوگیا اور ادیان و ملل کا ہر طالب علم یہ جانتا ہے کہ اس طرح عنصر "یہود" کے اخراج سے "امتِ مسلمہ" میں کسی قسم کا کوئی نقص یا خلل واقع نہیں ہوا۔

(۷) اس منشور میں یہ بات طے کر دی گئی ہے کہ مدینہ کی پُوری آبادی میں ایک بھی متنفس علی الاعلان قریشؓ کی مدد و اعانت کرنے والا نہ ہوگا۔ اور اس کے خلاف پُورا مدینہ جسمِ واحد کی طرح اُٹھ کھڑا ہوگا۔ تاریخ کے ادنیٰ سے ادنیٰ طالبعلم کے لئے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے کہ رسولؐ اللہ اور مہاجرین کو ذاتی طور پر بھی اور آپ کی قائم کردہ ریاست کو مجموعی طور پر سب سے بڑا خطرہ قریش کی طرف سے لاحق تھا اس لیے ریاست میں محض اندرونی طور پر امن و امان اور استحکام قائم کر دینا ہی کافی نہ تھا بلکہ اس سے زیادہ ضرورت قریش کے متوقع حملہ کی روک تھام کی تھی۔ چنانچہ رسولؐ اللہ کی نگاہِ دوررس نے اس خطرہ (بلکہ فوری ضرورت) کو پُوری طرح محسوس کرتے ہُوئے منشور کی متعدد دفعات کے تحت یہ انتظام کر دیا کہ اہلِ یثرب کے لئے قریش کے ساتھ حلیفانہ تعلقات یا دوستانہ روابط کا کوئی موقع نہ رہے اور قریش کی حیثیت اہلِ یثرب کے مشترکہ دشمن کی ہو جائے چنانچہ اس منشور میں یہ دفعات موجود ہیں کہ اگر یثرب پر حملہ ہوا تو معاہدہ کے جملہ شرکاء کے لئے باہمی امداد و اعانت لازمی ہوگی۔[۳۶۴] کوئی شخص حتیٰ کہ ایک مشرک بھی قریش کی جان و مال کو کوئی پناہ دے گا نہ اس سلسلے میں وُہ کسی مومن کے آڑے آئے گا[۳۶۵] اور یہ کہ نہ تو قریش کو کوئی پناہ دی جائے گی نہ اس کے حامی کو۔"[۳۶۶]

پھر سیاست نبویؐ کا اعجاز یہ ہے کہ رسولؐ اللہ نے صرف مدینہ کی تمام جماعتوں سے ہی قریش کے خلاف یہ ضمانت حاصل نہیں کی بلکہ اس سے بہت آگے بڑھ کر بہ کمال تدبر و فراست، مدینہ سے لے کر براہِ راست ینبوع کی بندرگاہ تک کے علاقے میں رہنے والے قبائل کو یا تو معاہدات کے ذریعہ اپنے ساتھ ملا لیا یا امان نامے دے کر اپنے اختیار کو منوا لیا اور یا پھر انھیں کم از کم قریش کی امداد و اعانت سے کنارہ کش رہنے پر آمادہ کر لیا۔ یہ اہم کارنامہ آپ نے صفر تا جمادی الاخریٰ سنہ ۲ھ کی قلیل مدت میں انجام دیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ قریش سے پہلی باقاعدہ جنگ یعنی غزوۂ بدر سے تقریباً ڈھائی ماہ پہلے اور منشورِ مدینہ کی تحریر و تسوید کے بعد چھ ماہ کے دوران یہ تمام کام طے پا گیا۔

(۸) اس منشور پر ایک نظر ڈالنے سے ہی یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اس منشور کے ذریعہ نہ تو کسی کے ادنیٰ سے ادنیٰ حق کو غصب کیا گیا، نہ کسی متنفس پر کسی قسم کی کوئی زیادتی کی گئی بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ اس منشور کو مدینہ کے رہنے والے تمام باشندوں اور اس میں آباد جملہ متفرق جماعتوں نے اس وجہ سے بھی قبول کر لیا کہ اس میں نہ ان کے کسی حق کو غصب کیا گیا نہ فرائض و واجبات کا بے جا بار ڈالا گیا اور نہ ان سے کوئی بے موقع مطالبہ کیا گیا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی قابلِ غور ہے کہ ان کے معاشرتی رسوم و رواج (مثلاً فدیہ جوار یا پناہ دہی) اور اسی قسم کے دُوسرے معاملات میں مداخلت بے جا سے احتراز کیا گیا۔ نیز چونکہ مدینہ میں امن و سکون کی تلاش، عافیت کی طلب اور اتحاد کی دیرینہ تمنّا ہر دل کی آواز اور وہاں کی سب سے بڑی ضرورت تھی اور یہ منشور ان کی مذکورہ تمام ضروریات کو بدرجۂ اتم پورا کر رہا تھا اور یہ

ضمانت بھی فراہم کر رہا تھا کہ انسانی جماعت اب پُر امن زندگی بسر کر سکتی ہے کیونکہ ایک طرف تو اس علاقے اور اس آبادی میں اب خُونریزی، دنگا فساد، قتل و غارت گری کرنا سخت ممنوع ہے اور دُوسری طرف لوگوں کی جان یا مال عزت و آبرو کی حفاظت کسی ایک فرد یا قبیلہ کا نہیں بلکہ پُورے معاشرہ کا ذمّہ ہے۔ عرب کے جاہلی معاشرہ میں یہ اتنا تعجب خیز انقلاب تھا جسے ہیل (HELL) سیاست نبویؐ کا اعجاز قرار دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ[۳۶۷]:

"Hitherto the individual Arab had no other protection than that of his family or that of his patron. Mohammed rid himself, at one stroke, of the old Arab conception which had kept the Mekkans themselves back from adopting a drastic policy of suppression and repression against him. And with it he dissolved the old ties; broke down old barriers; and placed every Muslim under the protection of the entire community of the Faithful"

(ایک عرب باشندہ کو پہلے اپنے خاندان یا سرپرست کے علاوہ کسی اور کی پناہ یا تحفّظ حاصل نہ تھا۔ لیکن (حضرت) محمد نے بیک جنبش اپنے آپ کو اس دائرہ سے نکال لیا اور اس قدیم جاہلی تصور سے بھی نجات پا لی جس کے زیرِ اثر اہلِ مکہ ان کے خلاف جبر و تشدد کی انتہائی پالیسی اختیار کرنے سے ہچکچاتے رہے۔ اور اس طرح انھوں نے پُرانے رشتوں کو معطل کر دیا، قدیم خلیجوں کو پاٹ دیا اور ہر مسلمان کو پُوری اُمّتِ مسلمہ کا اجتماعی تحفّظ عطا کیا)

وہ اصولِ انفرادیت جو اسلام سے قبل عرب کی طرح مدنی معاشرہ کا بھی طُرّۂ امتیاز تھا اسے اس نوشتہ کے ذریعہ اجتماعیت سے بدل دیا گیا اب ہر معاملہ محض شخصی نہیں بلکہ مرکزی و اجتماعی بن گیا۔[۳۶۸] اور ہر جماعت کو مجموعی طور پر ذمہ دار بنایا گیا۔[۳۶۹] اسی اجتماعیت کا ایک قابلِ ذکر پہلو یہ ہے کہ رسول اللہؐ کی آمد سے پہلے اگرچہ مدینہ کی سربرآوردہ جماعتوں کے افراد اسلام قبول کر کے باہم منسلک ہو گئے تھے اور پھر آمدِ رسولؐ کے بعد تو مسلمانوں کی ایک مضبوط و مستحکم جماعت بھی بن گئی تھی لیکن مدینہ کی کثیر الاجناس آبادی اور اس کے تمام متفرق و منتشر عناصر میں ابھی ایک وحدت قائم نہ ہوئی تھی۔

اس ضرورت کو منشورِ مدینہ نے پُورا کیا اور اس کی وجہ سے ایک طرف تو قبائلی طوائف الملوکی کا خاتمہ ہوا اور نسلی و مذہبی لحاظ سے بے حد متضاد و منتشر افراد ایک نظم میں پرو دیئے گئے اور دوسری طرف تاریخِ عرب میں پہلی بار اتحاد و سالمیت کا

عجیب وغریب مظاہرہ یہ ہُوا کہ اس منشورِ مدینہ نے ایسے لوگوں کو جو نہ کبھی کسی قوتِ قاہرہ کے سامنے جُھکے تھے اور نہ جنھوں نے کسی مرکزی نظم و اقتدار کا جُوا اپنے گلے میں ڈالا تھا۔ ایک قانون، ایک ضابطے اور ایک نظم پر متفق و متحد کر دیا۔ تمام مرکز گریز قوتیں ایک کل میں ضم ہوگئیں۔ سارے امتیازاتِ جاہلیہ کو نظر انداز کرتے ہوئے تمام باشندوں کے حقوق کو یکساں قرار دیا گیا اور ان کے فرائض و واجبات کو متعین کر دیا گیا۔ غرض وہاں کے تمام عناصر کے تعاون و اشتراک سے مدینہ میں ایک ایسا سیاسی نظام قائم ہوگیا جو آگے چل کر دنیا کے تمام نظام ہائے سیاست کے لئے نظیر بن گیا۔ لہٰذا ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کا یہ تبصرہ ہے کہ " ایک چھوٹی سی بستی کو جو بیس ایک محلّوں پر مشتمل تھی شہری مملکت کی صورت میں منظم کیا گیا اور اس کی قلیل لیکن بوقلموں و کثیر الاجناس آبادی کو ایک لچکدار اور قابلِ عمل دستور کے تحت ایک مرکز پر متحد کیا گیا اور ان کے تعاون سے شہرِ مدینہ میں ایک ایسا سیاسی نظام قائم کر کے چلایا گیا کہ وہ بعد میں ایشیا، یورپ اور افریقہ کے تین براعظموں پر پھیلی ہوئی ایک وسیع اور زبردست شہنشاہیت کا بلا کسی دقت کے صدر مقام بھی بن گیا۔" (۳۷۰) اور ولہا زن لکھتا ہے کہ: (۳۷۱)

"The first Arabic community with sovereign power was established by Mohammed in the city of Medina. not upon the basis of blood which naturally tends to diversity, but upon that of religion which is equally binding on all".

(مکمل حاکمانہ اختیارات کے ساتھ پہلا عربی معاشرہ (حضرت) محمد کے ہاتھوں شہر مدینہ میں قائم ہوا۔ لیکن خُون کی بنیاد پر نہیں جو لامحالہ اختلافات کو جنم دیتا ہے بلکہ دین کی بنیاد پر، جس کا اطلاق ہر فرد پر یکساں طور پر ہوتا ہے)

اور منشورِ مدینہ پر نکلسن کا تبصرہ یہ ہے کہ: (۳۷۲)

"Ostensibly a cautious and tactful reform, it was in reality a revolution. Muhammad durst not strike openly at the independence of the tribes, but he destroyed it, in effect, by shifting the centre of power from the tribe to the community; and although the community included Jews and pagans as well as Moslems, he fully recognised, what his opponents failed to foresee, that the Moslems were the active, and must soon be the predominant, partners in the newly founded state".

(مدینہ طور پر یہ ایک محتاط اور ماہرانہ اصلاح بلکہ درحقیقت ایک انقلاب تھا۔ (حضرت) محمدؐ نے قبائل کی خودمختاری پر نہ صرف یہ کہ کھلم کھلا ضرب لگائی بلکہ اسے ختم کر دیا۔ اور انجام کار مرکز قوت قبیلہ سے معاشرہ کو منتقل کر دیا۔ معاشرہ میں اگرچہ مسلمان، یہود اور مشرک سبھی شامل تھے۔ اور وہ اسے اچھی طرح جانتے تھے اور جسے ان کے دشمن نہ دیکھ سکے مگر ان کی نگاہِ دوررس نے دیکھ لیا تھا کہ نئی بننے والی ریاست میں مسلمان ہی نہ صرف فعّال بلکہ اس کا غالب حصّہ ہوں گے)

اور آخر میں وان کریمر کا یہ بیان قابلِ ملاحظہ ہے کہ:

"آنحضرتؐ کی یہ خواہش تھی کہ ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈالیں۔ اور اس میں وہ کامیاب ہوئے لیکن اس کے ساتھ ہی ایک ملکی انتظام بھی انہوں نے پیدا کر دیا جو بالکل جدید اور خالص صورت رکھتا تھا۔ پہلے ان کی صرف یہ خواہش تھی کہ اپنے ملک والوں کو ایک خدا یعنی اللہ کے ایمان پر لائیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انھوں نے اپنے وطن کی قدیم طرزِ حکومت کو بدل دیا اور ایسی عملداری کی جگہ جس میں قبیلوں کے امیر اور سردار حکومت کا کام کریں اور با اختیار خاندان پبلک کے کاموں میں حصّہ لیں۔ انہوں نے ایک خالص خود مختار بادشاہی کو قائم کر دیا اور خود اس کے بادشاہ بطور زمین پر خدا کے نائب کے ہو گئے۔" (۴۳)

ہمیں اگرچہ اس بیان کے ہر حصّہ سے کلّی اتفاق نہیں ہے مگر اس کا مدعا اور ہمارے پچھلے مباحث کا خلاصہ بھی یہی ہے کہ رسول اللہؐ نے بہرحال ایک ریاست کو بالفعل قائم فرما دیا اور وہ منشورِ مدینہ کے اجزا سے ایک صحیح اور متعین خطوط پر گامزن ہو گئی۔

باب سوم

توسیعِ ریاست

گزشتہ مباحث میں یہ بات آگئی ہے کہ ۱ھ میں اس ریاست کی تاسیس عمل میں آگئی جسے رسول اللہ ﷺ نے حاکمیتِ الٰہی کے تحت مدینہ میں قائم فرمایا۔ ابتدائی طور پر اس کا مرکز و مصدر مدینہ ہی تھا لیکن رفتہ رفتہ اس کے حدود میں وسعت پیدا ہوتی گئی یہاں تک کہ اس کا دائرۂ حکومت مدینہ کے حدود سے بہت آگے بڑھ کر کم و بیش تمام جزیرہ نمائے عرب تک پھیل گیا۔ لیکن توسیع و ارتقائے اس دور کا مطالعہ کرنے سے پہلے یہ وضاحت ضروری ہے کہ کسی ریاست کے حدود اور اس کے رقبہ میں اضافہ بھی اگرچہ توسیع و ترقی کا جزو لاینفک ہے۔ مگر یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ محض رقبہ اور حدود میں توسیع کو "ارتقاء" سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ ریاست کا ارتقا ایک ایسی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے جس میں اس کے استحکام اور پائیداری کا پہلو نمایاں ہو۔ اس کے مقابلہ میں کمیت کو غالباً اس لئے زیادہ اہمیت حاصل نہیں کہ وہ دراصل کیفیت ہی کا ایک لازمی نتیجہ ہوتی ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اگر ریاست میں استحکام ہوگا تو حدود میں اضافہ و توسیع کی راہ خود بخود ہموار ہوگی اور ریاست کا ارتقا بھی ناگزیر ہو جائے گا۔ اس لئے ارتقائے ریاست کا اصل مدار اس بات پر ہے کہ ریاست اپنے قیام و بقاء اور اتحاد و تحفظ کی کتنی صلاحیت رکھتی ہے اور وہاں داخلی و خارجی طور پر ایسے انتظامات کس حد تک موجود ہیں جو مقاصدِ ریاست کی تکمیل اور اس کے استحکام کے ضامن ہوتے ہیں۔

اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ریاست نبوی ﷺ میں توسیع و استحکام کا عمل ساتھ ساتھ واقع ہوا۔ بلکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی ساری توجہ ایسے مثبت اقدامات پر صرف فرمائی جن کا تعلق داخلی استحکام، معاشرتی تنظیم، رعایا کی فلاح و صلاح، باشندوں کے حقوق و فرائض کے تعین، عدل و انصاف کے قیام، تشریع و قانون سازی، عام نظم و نسق، تبلیغِ دین اور احکام کے اجراء اور نفاذ وغیرہ سے تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ توسیع و استحکام کے دوسرے تقاضوں کو بھی رسول اللہ ﷺ نے کما حقہٗ ادا کیا۔ چنانچہ ریاست کے داخلی و خارجی امن و امان، اس کے دفاع اور حفاظت و خود مختاری کے ضمن میں بیرونی حملہ آوروں کا مقابلہ، اندرونی دشمنوں کا دفعیہ اور مفسد عناصر کی بیخ کنی کی طرف سے بھی آپ نے کوئی ادنیٰ سی غفلت بھی نہیں برتی۔ مختصر یہ کہ توسیع و ارتقائے ریاست کے باب میں ریاست نبوی ایک معیاری و مثالی نمونہ قائم کرتی ہے۔ اس کے استحکامی پہلوؤں کا مطالعہ تو ہم آئندہ باب میں کریں گے لہٰذا زیرِ نظر باب میں اس کی توسیعی سرگرمیوں کا جائزہ لیں گے۔

اپنے مطالعہ کی غرض سے ہم توسیع ریاست کو مندرجہ ذیل دو ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں:

(۱) دورِ اوّل تو وہ ہے جبکہ ریاست نے اپنے قیام و بقا، اور سلامتی و تحفظ کا بھرپور مظاہرہ کیا اور تمام دُنیا نے دیکھ لیا کہ یہ نوزائیدہ ریاست بیشمار داخلی و خارجی مزاحمتوں کے باوجود قائم و دائم ہے۔ یہ دورا بتدائی پانچ سالہ عرصہ (سلہ تا سلہ) پر پھیلا ہوا ہے۔ اس دَور میں چونکہ ریاست کے حدود بنیادی طور پر مدینہ اور اس کے مضافات تک وسیع تھے اس لئے اس دور میں اسے "ریاستِ مدینہ" یا "شہری مملکت مدینہ" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

(۲) دورِ دوم میں ریاست مدینہ کی حدود سے آگے بڑھ جاتی ہے اس کی تمام مزاحم قوتیں دم توڑ دیتی ہیں اور آخر کار ریاست نبوی کا پرچم پُورے عرب پر لہرانے لگتا ہے۔

اب اگلے صفحات میں ہم ان پر علیحدہ علیحدہ بحث کریں گے۔

(۱) دورِ اول (سلہ تا سلہ)

مدینہ میں ریاست نبوی کا قیام، اس کے باشندوں کے حقوق و فرائض کا تعین اور شہر کی حفاظت و مدافعت کے انتظامات اگرچہ ہجرت کے بعد چند ماہ کے اندر ہی طے پا گئے تھے لیکن یہ بات تاریخ کی مثبت حقیقت ہے کہ مدینہ کی اندرونی حفاظت و مدافعت، استحکام و ترقی اور معاشرہ کی تنظیم اس وقت تک بے معنی تھی جب تک کہ قریش کی طرف سے متوقع حملوں اور مفسدانہ کارروائیوں کا انتظام نہ کر لیا جاتا۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے۔ قریش کی مخالفت کا آغاز مکہ میں اُس وقت ہی ہوگیا تھا جبکہ آنحضرتؐ نے اسلام کی تبلیغ شروع کی تھی لیکن اس میں خالص سیاسی رنگ اہلِ مدینہ کی بیعت عقبہ ثانیہ کے بعد پیدا ہُوا۔ گویا اگر بیعت عقبہ کے سیاسی معاہدہ کو ریاست مدینہ کا سنگِ بنیاد قرار دیا جائے تو قریش کی مخالفت و عداوت کا نیا رُخ بھی اسی وقت متعین ہوگیا۔ قریش کی غیرت و حمیت کے لئے اوّل تو یہی بات ناقابلِ برداشت تھی کہ رسول اللہؐ اور آپ کے اصحاب کو اہلِ مدینہ نے اپنے سر آنکھوں پر بٹھایا ہے۔ اور دوسری جانب انھیں اس بات پر بھی سخت طیش تھا کہ مکہ میں ان کے زیر دست رہنے والے مفلوک الحال لوگ ان کی مرضی کے بغیر پناہ لے کر ان ہی کے خلاف صف آرا ہوگئے ہیں۔ اور یہ امر بھی ان پر بہت شاق گزرا کہ وہ خستہ حال افراد ایک ایسے ماحول میں پہنچ گئے ہیں جو اجنبی ہونے کے باوجود ان کے لئے نہایت سازگار ثابت ہوا ہے۔ اب قریش اہلِ مدینہ کو بھی برابر کا دشمن سمجھتے تھے کیونکہ اُنھوں نے رسول اللہؐ کے لئے اپنے شہر کے دروازے کھول کر ناقابلِ معافی جرم کیا تھا۔ بہر حال ان وجوہ سے ان کے سینوں میں آتشِ حسد اور تیز ہوگئی۔ اور انھوں نے بہر قیمت اپنے مجرموں کو سزا دینے کی ٹھان لی۔

اس کا آغاز انھوں نے اس طرح کیا کہ رسول اللہؐ کے مدینہ پہنچتے ہی ابوسفیان اور ابی بن خلف الجمحی کی طرف سے انصار کو یہ خط لکھا گیا کہ:

امّا بعد فانه لم یکن حی من احیاء العرب أبغض الینا ان یکون بیننا و بینهم نائرة منکم، و انکم عمدتم الی رجل منا، اشرفنا فی الموضع و أعرقنا فی قومنا منصبا، فاویتموه ومنعتموه

ان هذا علیکم لعار و منقصه فخلوا بیننا و بینه فان یك خیرا فنحن اسعد به و ان یك سوی ذلك فنحن احق من ولی ذلك منه(۱)

(اما بعد! ہمارے لئے اس سے زیادہ ناپسندیدہ بات کوئی اور نہیں ہے کہ قبائلِ عرب میں سے کسی قبیلہ اور ہمارے درمیان محض تمہاری وجہ سے عداوت کی آگ بھڑک اُٹھے۔ تم نے جان بُوجھ کر ہمارے آدمی کو رکھا ہے۔ جو ہمارے درمیان نہایت معزز اور ہماری قوم میں ذی حیثیت و منصب تھا۔ تم نے اس کو اپنے یہاں ٹھکانہ مہیا کیا اور اس کی حمایت و حفاظت کا بیڑا اٹھایا۔ بلاشبہ یہ بات خود تمہارے لئے باعثِ ذلت ہے۔ اس لئے تم ہمارے اور اس کے درمیان سے ہٹ جاؤ۔ پس اگر وہ ٹھیک رہتا ہے تو ہم اس سے بہتر طریقے سے پیش آئیں گے اور اگر اس کے علاوہ دُوسرا طرزِ عمل دکھایا تو پھر ہم ہی اس کے ولی ہونے کا زیادہ حق رکھتے ہیں کہ اس کے ساتھ جو چاہیں کریں)

اس خط کا مضمون بتا رہا ہے کہ قریش نے انصار کی جاہلی غیرت و حمیت کو خوشامد و چاپلوسی کے ذریعہ لیکن تحکمانہ لب و لہجہ میں بھڑکانا چاہا۔ لیکن ظاہر ہے انصار پر ان کے تملق یا دھمکی کا کیا اثر ہو سکتا تھا؟ وہ رسول اللہ کے حضور دل و جان نذر کر چکے تھے، اور آپ کی خاطر عرب و عجم سے جنگ کا پختہ عہد کر چکے تھے۔ کفارِ قریش کی یہ کوشش بے نتیجہ رہی تو انہوں نے ایک اور چال چلی۔ اور جنگِ بدر سے کچھ پہلے اُنھوں نے عبداللہ ابن اُبی اور اس کے ہم مشرب ساتھیوں (یعنی اوس اور خزرج کے بت پرستوں) کو ایک تنبیہی خط روانہ کیا، جس کا متن یہ ہے:

انکم آویتم صاحبنا و انا نقسم باللہ لتقاتلنه او لتخرجنه او لنسیرن الیکم باجمعنا حتی نقتل مقاتلتکم و نستبیح نسائکم(۲)

(تم نے ہمارے آدمی کو اپنے ہاں پناہ دے رکھی ہے ہم اللہ کی قسم کھا کر تم سے کہتے ہیں کہ یا تو لوگ اس کو قتل کر ڈالیں یا اپنے شہر سے نکال باہر کریں۔ ورنہ ہم سب مل کر تم پر چڑھ دوڑیں گے یہاں تک کہ تمہیں بُری طرح موت کے گھاٹ اتار دیں گے اور تمہاری عورتوں کو اپنے لئے مباح سمجھیں گے)

اسے خط کے بجائے "حکمنامہ" کہنا حقیقت سے زیادہ قریب ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عبداللہ بن ابی اور دوسرے بت پرستوں کی جماعت نظریاتی طور پر کفارِ قریش ہی سے میل کھا سکتی تھی۔ اور دوسری طرف کفارِ قریش کو اس جماعت پر ہی یہ اعتماد و وثوق ہو سکتا تھا کہ وہ ان کے مفاد کا تحفظ اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے میں ان کے حکم کی تعمیل کر سکتی ہے۔ شاید اسی بھروسہ پر قریش نے ابن ابی اور اس کے حامیوں کو مندرجہ بالا خط تحریر کیا۔ یہاں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ابن ابی اور اس کے ساتھیوں نے بھی قریش کو مایوس نہیں کیا۔ چنانچہ ابو داؤد کی روایت کے مطابق مذکورہ خط کے ملتے ہی وُہ ہتھیار سجا کر جنگ کے لئے تیار بھی ہو گئے۔ رسول اللہ کو تو پل پل کی خبر ملتی رہتی تھی۔ آپ کو ابن ابی وغیرہ کے اس منصوبہ کی اطلاع ملی تو آپ اس گروہ کے پاس گئے اور یہ معنی خیز جملے ارشاد فرمائے جن کے بین السطور آپ کے عزم و حوصلہ، جرأت

بے خوفی حقیقت پسندی اور خیر خواہی کو صاف پڑھا جا سکتا ہے۔ آپ نے فرمایا تھا:

لقد بلغ وعید قریش منکم البالغ ما کانت تکید کم باکثر مما تریدون ان تکیدوا به انفسکم تریدون ان تقاتلوا ابناء کم و اخوانکم[۳]

(قریش نے تم سے ایسی زبردست چال چلی ہے کہ اگر تم ان کی دھمکی میں آ گئے تو تمہارا نقصان بہت زیادہ ہوگا بہ نسبت اس کے کہ تم ان کی بات رد کر دو۔ کیا تم اپنے ہی فرزندوں اور بھائیوں سے لڑنا چاہتے ہو؟)

رسول اللہؐ نے بڑے مختصر لیکن بلیغ انداز میں یہ سمجھا دیا کہ مسلمانوں سے لڑنے کی صورت میں وہ اپنے ہی لوگوں کے خلاف محاذ آرا ہو جائیں گے، جبکہ قریش سے لڑائی میں بالکل غیروں کا مقابلہ ہوگا۔ غرض کچھ تو رسول اللہؐ کی فہمائش اور کچھ اس بنا پر کہ اب مدینہ کا ماحول مزید کسی خانہ جنگی کا بہر حال متحمل نہ ہو سکتا تھا۔ عبداللہ ابن اُبی اور اس کی جماعت اپنے ارادے سے باز آ گئی اور اس طرح رسول اللہؐ کے تدبّر سے ایک ایسا خطرہ ٹل گیا جو ریاستِ مدینہ کی سالمیت و خود مختاری کو نقصان پہنچا سکتا تھا۔ قریش نے اپنی اس تدبیر بلکہ سازش کے ناکام ہو جانے کے بعد ایک اور ناتمام کوشش کی۔ اور جنگِ بدر کے بعد یہودِ مدینہ کے جذبات کو یہ خط لکھ کر ابھارا کہ:

انکم اهل الحلقة والحصون وانکم لتقاتلن صاحبنا او نفعلن کذا ولا یحول بیننا و بین خدم نسائکم شئ۔[۴]

(تم لوگ تو ساز و سامان اور قلعوں کے مالک ہو۔ لہٰذا تم کو ہمارے آدمی سے ضرور جنگ کرنی چاہیئے، ورنہ ہم ایسا کریں گے۔ اور پھر ہمارے اور تمہاری عورتوں کو لونڈیاں بنانے کے درمیان کوئی چیز حائل نہ ہو سکے گی)

لیکن اس سے پہلے کہ یہود اس کو عملی جامہ پہناتے خود رسول اللہؐ نے ان کے استیصال کا انتظام کر دیا۔ اُوپر کی تفصیلات پر ایک ہی نظر ڈالنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ہجرتِ مدینہ کے بعد سے یہودِ مدینہ کے اخراج تک کفارِ قریش نے مدینہ میں خانہ جنگی برپا کرنے، ریاستِ مدینہ کو اندر ہی اندر سبوتاژ کرنے اور انتشار و تفرق پھیلانے کی سیاسی اور سفارتی سطح پر جو مسلسل کوششیں کیں وہ رسول اللہؐ کی انتہائی بیدار مغزی اور سوجھ بوجھ کی بدولت کامیاب نہ ہو سکیں بلکہ آپ نے اسی سیاسی اور سفارتی سطح پر ان کا دفیعہ بھی کر دیا۔

قریشِ مکہ کے ذہین، تجربہ کار اور جہاندیدہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے جہاں ایک طرف سیاسی و سفارتی سطح پر ریاست مدینہ کے خلاف ایک محاذ قائم کیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ دُوسری طرف اپنے مجرموں کو سزا دینے، انھیں پریشان و پراگندہ خاطر کرنے، مدینہ کو تاخت و تاراج کرنے اور اپنی قوت اور وسائل کا مسلمانوں پر سکہ جمانے کے لئے، ہجرت کے فوراً بعد سے عملی کارروائیوں کا سلسلہ بھی شروع کر دیا تھا۔ اس غرض سے چھوٹے چھوٹے مسلح دستے مدینہ کی جانب بھیجنا شروع کر دئیے تھے۔ قریش کی ان عملی کارروائیوں کا آغاز یُوں تو رسول اللہؐ کی ہجرت مدینہ کے فوراً ہی بعد

ہوگیا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ اس سلسلہ میں ان کی دیدہ دلیری اس حد تک بڑھی کہ ربیع الاول ۲ھ میں کرز بن جابر الفہری کی قیادت میں قریشِ مکہ کا ایک دستہ مدینہ کی چراگاہ پر حملہ آور ہوا۔ چراگاہ کو لوٹا اور اس کے مویشی ہنکا لے گیا۔[۵] گویا یہ پیغام دے گیا کہ ہم ڈھائی تین سو میل دور تمہارے گھر پر آ کر حملہ آور ہو سکتے ہیں۔ غالباً اس زمانے میں قریش کے حملوں کا ڈر اتنا بڑھ گیا تھا کہ اہلِ مدینہ کے لئے اکثر راتوں کو آرام کی نیند سونا ممکن نہیں رہا تھا۔[۶]

ظاہر ہے کہ رسول اللہ کے سیاسی تدبر اور آپ کی پُر حکمت قیادت سے یہ قطعی بعید تھا کہ قریش کی ان ریشہ دوانیوں کی طرف توجہ اور مدینہ کی حفاظت اور دفاع کا انتظام نہ کریں۔ نیز یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ قریش کے جواب میں موثر کارروائی کئے بغیر مدینہ کا اندرونی استحکام کسی وقت بھی ختم ہو سکتا تھا۔ لہٰذا قریش کے متوقع حملوں کی پیش بندی اور مدینہ کے دفاع کی خاطر ایک طرف تو رسول اللہ نے منشورِ مدینہ کے ذریعہ اصولی طور پر مدینہ کی پُوری آبادی کو قریش کے خلاف جسمِ واحد بنا دیا تھا اور سب سے یہ اقرار لے لیا تھا کہ ایسی صورت میں مسلمانوں کا ساتھ دیں گے (حالانکہ مدینہ کے بعض عناصر نے اس عہد سے صریحاً انحراف کیا۔ مگر پھر بھی اخلاقی دباؤ کے تحت علی الاعلان قریش کا ساتھ نہ دے سکے) اور دوسری طرف آپ نے صحابہ کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں کو جن میں اکثر و بیشتر مہاجرین ہوتے تھے) مدینہ سے باہر مختلف سمتوں میں بھیجنا شروع کر دیا تھا بڑا مقصد یہ تھا کہ دشمن کم از کم اتنا جان جائے کہ ریاست مدینہ کی قیادت اس کے عزائم سے بے خبر نہیں ہے۔ اور اس میں تابِ مقاومت بدرجۂ اولیٰ موجود ہے۔

مورخین ایسی مہم کو جو کسی صحابی کی سرکردگی میں بھیجی گئی سریہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ ابتدائی دور کے سرایا میں سریۂ حمزہؓ[۷]، سریۂ عبیدہ بن حارثؓ[۸] اور سریۂ سعد بن ابی وقاصؓ[۹] قابلِ ذکر ہیں۔[۱۰] ان میں کوئی جنگ نہیں ہوئی صرف سریۂ عبیدہ میں، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ[۱۱] نے مشرکین پر ایک تیر چلایا اور یہی وُہ پہلا تیر تھا جو مسلمانوں کی طرف سے مشرکین پر چلایا گیا۔[۱۲]

واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ نے ان طلایہ گرد جماعتوں (سرایا) کے بھیجنے میں انتہائی تدبر، منصوبہ بندی، ذہانت، عسکری مہارت اور ملکی وجغرافیائی واقفیت سے بھرپور کام لیا۔ اور پھر ان کے ذریعہ مکمل سیاسی و فوجی فوائد حاصل کئے۔ چنانچہ سرایا کی تعداد، ان کے سپہ سالاروں کا انتخاب اور ان کی منزلوں کا تعیّن وغیرہ ثابت کرتا ہے کہ آپ نے ان مہمّات کو عرب و حجاز کے تمام ضروری مقامات کی طرف روانہ کیا اور پوری بے خوفی، بہادری اور مستعدی سے دشمن کے اپنے علاقے میں بھی فوجی دستے بھیج کر فوجی اہمیت کی کامیابیاں حاصل کیں۔ جس کی ایک روشن مثال نخلہ کا واقعہ ہے۔ جبکہ رسول اللہ نے حضرت عبداللہ بن جحشؓ[۱۳] کو کچھ مجاہدین کے ہمراہ مقام نخلہ کی جانب روانہ کیا اور یہ ہدایت فرمائی کہ وہاں پہنچ کر قریش کی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھیں اور پھر اس کی فوری اطلاع رسول اللہ کو پہنچائیں۔[۱۴] جیسا کہ ظاہر ہے سریہ کی نوعیت خالص جاسوسانہ تھی لیکن یہ محض اتفاق تھا کہ یہی مہم اسلامی فوجی دستے کی پہلی سرحدی جھڑپ ثابت ہُوئی اور اس نے ایک اور فیصلہ کن جنگ (بدر) کو جنم دینے میں اہم کردار ادا کیا (جس کی تفصیل آگے آئے گی)

مذکورہ بالا سرایا کو بھیجنے کے علاوہ رسول اللہؐ جہاں ضرورت محسوس کرتے وہاں خود بھی تشریف لے جاتے تھے۔ چنانچہ ہجرت کے کچھ ہی عرصہ بعد آپ نے مدینہ کے قرب وجوار کے قبائلی علاقوں کا دورہ فرما کر ان سے حلیفانہ تعلقات قائم کرنا شروع کر دیے۔ اس قسم کا پہلا سیاسی و فوجی سفر رسول اللہؐ نے صفر ۲ھ (ہجرت کے گیارھویں مہینے) میں ودّان کی جانب پیش قدمی کر کے اختیار فرمایا[15]۔ اس غزوہ میں اگرچہ جنگ کی نوبت نہیں آئی لیکن آپ نے بنوضمرہ سے معاہدہ کر کے موقع سے فائدہ اٹھایا[16]۔ سرحدی اور مضافاتی قبائل سے معاہدات کا انعقاد توسیع ریاست کے ضمن میں اہمیت رکھنے کے ساتھ ساتھ قریش کے حلفاء طرفداروں اور متوقع حامیوں کو توڑنے میں خاص مقام رکھتا ہے۔

اسی طرح کی دوسری مہم ربیع الاول ۲ھ میں ہوئی، جس میں آپ بہ نفسِ نفیس بواط تک تشریف لے گئے[17]۔ پھر اسی ماہ وادی السفوان تک (جس کا حوالہ پہلے بھی آچکا ہے) سفر فرمایا[18]۔ نیز جمادی الآخر ۲ھ میں ینبوع کے قریب ذی العشیرۃ تک مہم سر کر آئے[19]۔

غرض اس طرح تقریباً پانچ ماہ کے قلیل عرصہ میں ہی مدینہ سے ینبوع تک کے علاقہ میں رہنے والے متعدد قبائل (بنوضمرہ، بنو مدلج اور باشندگانِ بواط (جہینہ) وغیرہ) نے اسلام قبول نہ کرنے کے باوجود اس بات پر آمادگی ظاہر کر دی کہ اگر کوئی مدینہ پر حملہ آور ہوا تو یہ مسلمانوں کو مدد دیں گے اور اگر ان کے علاقوں پر کسی نے چڑھائی کی تو مسلمان ان کو مدد دیں گے[20]۔ اس علاقے کی آبادیوں کو سیاسی اعتبار سے اپنے ساتھ ملا کر رسول اللہؐ نے ایک بہت بڑا کارنامہ انجام دیا تھا۔ ڈاکٹر حمید اللہ کے الفاظ میں "یہ وہی علاقہ ہے جہاں سے کاروانی قافلے گزرا کرتے تھے اور مکّہ والے شام، مصر یا عراق جانا چاہتے تھے تو اسی راستے سے گزرتے تھے۔ اس راستہ کی بندش قریش پر معاشی دباؤ ڈالنے میں اتنی مؤثر ثابت ہوئی کہ بدر کی فاش شکست بھی انھیں اتنا بے بس نہ کر سکی"[21]۔ غرض رسول اللہؐ کے ان اسفار و مہمّات کا نتیجہ صرف اتنا ہی نہ نکلا کہ متذکرہ بالا علاقے اور ان میں آباد قبائل نے مدینہ کی مدافعت و دفاع میں رسول اللہؐ کی امداد کرنے پر اقرار کر لیا بلکہ ان سے ہونے والے معاہدات اور ان کو عطا کئے جانے والے فرامین کی زبان اس بات کا صاف اظہار کر رہی ہے کہ یہ علاقے بھی دراصل ریاستِ مدینہ کے زیرِ اثر آ گئے تھے[22]۔

رسول اللہؐ کو ان سیاسی و دفاعی انتظامات سے فراغت پائے بمشکل تین ماہ ہی ہوئے تھے کہ وہ فیصلہ کن وقت آ پہنچا جس کی تیاریاں قریش برسوں سے کر رہے تھے۔ اور دوسری طرف مسلمان بھی جس کی بہرحال توقع رکھتے تھے۔ دراصل مسلمانوں کا قریش کے دستِ تظلم سے بچ جانا، ان کے ایک اہم شخص عمرو بن الحضرمی کا قتل اور ان کی معاشی شہ رگ پر زبردست دباؤ نے بالآخر قریشِ مکہ کو آمادۂ پیکار کر دیا تھا۔ چنانچہ وہ نشۂ طاقت میں چُور تقریباً ایک ہزار کا لشکر لے کر رمضان ۲ھ میں مدینہ کو تاخت و تاراج کرنے کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔

رسول اللہؐ کو بھی لشکرِ قریش کی آمد کی اطلاع مل گئی۔ آپ نے صحابہ کو جمع کیا اور مشورہ کے بعد شہر سے باہر نکل کر لڑنے کا فیصلہ کیا پھر مہاجرین و انصار پر مشتمل ایک چھوٹا سا لشکر لے کر ۸ رمضان ۲ھ کو مدینہ سے روانہ ہوئے[23] اور

بدر کے قریب پہنچ کر عدوۃ الدنیا کے مقام پر خیمہ زن ہو گئے۔

ادھر قریش بھی اپنے لشکر کو عقنقل کے ٹیلے سے نکال کر بدر کے اس مقام پر پہنچ گئے جو "عدوۃ القصوٰی" کہلاتا ہے۔[۲۴] اس طرح دونوں لشکر آمنے سامنے آ گئے۔ ۱۷ رمضان ۲ھ کی شب کے آخری حصہ میں آنحضرتؐ نے اپنی مختصر سی فوج کی ترتیب قائم کی اور ہدایات دیں۔ دوسری طرف قریش نے بھی اپنی فوج کا میمنہ و میسرہ درست کیا۔ جنگ کا آغاز انفرادی مقابلوں سے ہُوا لیکن قریش نے اپنے تین آدمیوں (عتبہ، شیبہ اور ولید بن عتبہ) کو قتل ہوتے دیکھ کر جنگ مغلوبہ شروع کر دی۔ بالآخر سخت جنگ کے بعد قریش نے راہِ فرار اختیار کی۔ ان کے ستر آدمی قتل اور ستر قید ہوئے۔ مسلمانوں میں سے شہید ہونے والوں کی تعداد چودہ تھی۔[۲۵] جنگ کے بعد رسول اللہؐ نے بدر سے مراجعت کی اور مدینہ واپس تشریف لے آئے۔

اگر جنگوں کی خونریزیوں، ہولناکیوں اور واقعات کو پیش نظر رکھا جائے تو جنگِ بدر کو یقیناً عظیم الشان قرار نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن اس جنگ نے مسلمانوں اور قریش دونوں کے مطلعِ قسمت پر بالخصوص اور پورے عرب کی سیاست و معاشرت پر بالعموم جو گہرے اثرات مرتب کئے ان کی بنا پر اسے بلاشبہ تاریخِ عالم کی انتہائی اہم اور تاریخ ساز جنگوں میں شمار کیا جا سکتا ہے اس اجمال کی تفصیل کے لئے دیکھنا ہوگا کہ ان فریقوں کے حق میں جنگِ بدر کے نتائج کس طرح ظاہر ہوئے۔

جہاں تک قریشِ مکہ کا تعلق ہے تو اس جنگ کی وجہ سے ان کی طاقت کو مجموعی طور پر بے حد صدمہ پہنچا۔ ان کے چوٹی کے سردار، سربرآوردہ شیوخ اور بااثر افراد مارے گئے[۲۶] جن میں سے اکثریت ان لوگوں کی تھی جو اسلام دشمنی میں سب سے آگے تھے اور اہلِ مکہ کے یہاں ان کا اثر و رسوخ، فراست و تدبر، بصیرت و اہلیت اور جنگی قابلیت معروف تھی۔ علاوہ ازیں اس جنگ کے بعد سے مکہ میں طاقت کا توازن بنو اُمیہ کے حق میں ہو گیا اور ابو سفیان کی قیادت مسلّم ہو گئی اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ جنگ ریاستِ نبوی اور قریش کے درمیان آئندہ جنگوں کا مقدمہ بن گئی اور قریش پے بہ پے نقصان اٹھانے کے باوجود ریاستِ مدینہ پر بار بار حملہ کرتے رہے اور اپنی آتشِ انتقام کو بجھاتے رہے۔

دوسری طرف مسلمانوں کی فتح اور کامرانیوں کا نقطۂ آغاز بھی جنگِ بدر رہے۔ اسی جنگ سے شوکتِ اسلام کا مادی اظہار شروع ہوا اور بقول شبلی بدر کا معرکہ "حقیقت میں اسلام کی ترقی کا قدمِ اوّلین تھا"۔[۲۷] مسلمانوں کی قوت میزانِ عمل پر کھری ثابت ہوئی اور ان کے حوصلے بڑھ گئے کیونکہ اب وہ اس قابل ہو گئے تھے کہ اپنے مقابلہ میں کم و بیش تگنی قوت رکھنے والے دشمن کو پسپا کر دیں۔ قرآن میں مسلمانوں کی اس قوت و شوکت کی طرف اشارہ کر کے بطور احسان فرمایا گیا کہ:

واذکروآ اذ انتم قلیل مستضعفون فی الارض تخافون ان یتخطفکم الناس فاٰوٰکم وایدکم بنصرہ۔[۲۸]

(یاد کرو وہ وقت جبکہ تم تھوڑے تھے، زمین میں تم کو ناتواں سمجھا جاتا تھا تم ڈرتے رہتے تھے کہیں لوگ

تمھیں اُچک نہ لیجائیں۔ پھر اللہ نے تم کو جائے پناہ مہیا کی اور اپنی مدد سے تمہارے ہاتھ مضبوط کئے)

اور دوسری جگہ فرمایا گیا کہ:

ولقد نصرکم اللہ ببدر وانتم اذلۃ۔ (۲۹)

(بلاشبہ جنگِ بدر میں اللہ نے تمہاری مدد فرمائی اور اس وقت تم بہت کمزور وبے سہارا تھے)

جنگِ بدر کے نتیجہ میں کفر اور اسلام کے غلبہ کا رُخ بڑی حد تک متعین ہو گیا کیونکہ فتح بدر نے اسلام کو نصرت و فوقیت بخشی اور باطل کو زیر کر دیا۔ اسی لئے قرآن اس کو "یوم الفرقان" (۳۰) سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی جس دن حق و باطل کے درمیان فرق کر دیا گیا اور جس دن اس حقیقتِ کبریٰ کا عملی اعلان کیا گیا کہ قوموں کی تمیز و تفریق کی اصل علت "ایمان" اور "عقیدہ" ہے کیونکہ اس روز دو صفیں جو ایک دوسرے کے مقابل شمشیر بکف کھڑی تھیں ان کے درمیان حسب و نسب، رنگ و نسل، قوم و وطن کی یکسانیت کے باوجود فرق صرف "ایمان" کا تھا۔ اسی لئے حضرت ابوبکرؓ اپنے بیٹے کے مقابل آ جاتے ہیں۔ حضرت حذیفہؓ اپنے باپ عتبہ، حضرت عمرؓ اپنے ماموں اور حضرت علیؓ اپنے بھائی عُقیل کے خلاف صف آرا ہیں اور اسی وجہ سے خود رسول اللہؐ ایک کیمپ میں اور آپ کے حقیقی چچا حضرت عباس اور داماد ابو العاص دشمن کے دُوسرے کیمپ میں موجود ہیں۔

اس جنگ نے ایک طرف تو اندرونِ مدینہ کے غیر مسلم عناصر پر مسلمانوں کا خاطر خواہ رعب قائم کر دیا۔ چنانچہ اسی وجہ سے عبداللہ بن ابی اور اس کے اعوان و انصار نے جو ابھی تک کافر تھے، بظاہر حلقۂ اسلام میں داخل ہونے کو غنیمت جانا اور عمر بھر اسی نفاق میں مبتلا رہے جبکہ دوسرے عنصر یہود نے منشور کی خلاف ورزی کرتے ہوئے عین وقت پر غیر جانب داری کا اعلان کیا اور جب انہوں نے دیکھا کہ مسلمان اپنی تمام تر بے سرو سامانی کے باوجود کفارِ قریش پر غالب آ گئے ہیں تو ان کے دلوں میں حسد کی آگ بھڑک اُٹھی اور ادب و لحاظ کو بالائے طاق رکھ کر وہ مسلمانوں سے کھُلم کھلا دشمنی پر اُتر آئے چنانچہ اس کا جواب دینا پڑا اور آخر کار جنگِ بدر پر ایک ماہ بھی نہ گزرا تھا کہ یہود بنی قینقاع کو مدینہ چھوڑنا پڑا۔ (۳۱)

دوسری طرف جنگِ بدر کا اثر قبائل پر بھی پڑا۔ چنانچہ بعض قبائل تو مرعوب ہو کر مثبت طور پر رسول اللہؐ کی امداد و اعانت پر آمادہ ہو گئے۔ مثلاً جنگِ اُحد کے لئے قریش نے پیش قدمی کی تو خزاعہ کے آدمیوں نے رسول اللہؐ تک اطلاعات بہم پہنچائیں (۳۲) نیز مدینہ کے آس پاس رہنے والے قبائل نے یہ بھی محسوس کر لیا کہ ریاستِ مدینہ اپنے دفاع کے سلسلے میں مؤثر کارروائی کرنے پر قادر ہے۔

لیکن اسی کے ساتھ ساتھ بدر کی فتح کا ایک منفی اثر یہ مرتب ہوا کہ عرب کی وُہ تمام قوتیں بیک جنبش بیدار ہو گئیں جو ریاست مدینہ کا قیام واستقلال پسند نہیں کرتی تھیں چنانچہ اطرافِ مدینہ کے متعدد قبائل کی ہمتیں بڑھیں اور انہوں نے ریاستِ مدینہ پر حملہ آور ہونے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ لہٰذا جب رسول اللہؐ کو یہ اطلاع ملی کہ بنی سلیم و غطفان کا ایک گروہ

چکہ شرارت پر آمادہ ہے تو آپ نے ان کے کسی اقدام سے پہلے ان کا استیصال کرنا مناسب سمجھا۔ آپ محرم ۳ھ میں دو سو مجاہدین کا لشکر لے کر قرقرۃ الکدر (یا قرارۃ الکدر) تک تشریف لے گئے۔[۳۳] پھر تقریباً ایک ماہ کے بعد رسول اللہؐ کو اطلاع ملی کہ بنی ثعلبہ و محارب کی ایک جماعت نے ذی امر میں جمع ہو کر یہ قصد کیا ہے کہ آپ کو تمام اطراف سے گھیر لیں۔ تو آپ نے صحابہ کو جمع کیا اور سب کے مشورہ سے ان پر حملہ آور ہونے کا قصد فرمایا۔ ربیع الاوّل ۳ھ میں چار سو پچاس صحابہ کے ہمراہ سفر اختیار کیا لیکن دشمن سے مڈبھیڑ نہ ہوئی اور آپ مدینہ واپس تشریف لے آئے۔[۳۴] جمادی الاول ۳ھ میں قبیلہ بنی سلیم کے متعلق اطلاع ملی کہ بحران کے مقام پر آپ کے خلاف مجتمع ہو رہے ہیں اور ان کے استیصال کے لئے آپ روانہ ہوئے لیکن وہ لوگ آپ کی آمد کی اطلاع پا کر منتشر ہو گئے اور اس طرح جنگ کی نوبت نہیں آئی۔[۳۵]

ان واقعات سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ جنگِ بدر کے بعد ہر طرف سے طوفان کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مدینہ کی نوزائیدہ ریاست کو مٹا ڈالنے کے لئے سارا عرب تیار ہو گیا ہے۔ مزید برآں اندرونی طور پر بے انتہا خطرات پیدا ہو گئے تھے۔ یہاں تک کہ رسول اللہؐ کی جان کے متعلق ہر وقت اندیشہ لگا رہتا تھا۔ کیونکہ یہ واضح ہو چکا تھا کہ یہود و منافقین اپنی شرارتوں اور عداوتوں سے باز نہیں آ سکتے اور ہر چھچھوری حرکت کر سکتے ہیں نیز قریشِ مکہ کا بھی بدلہ لئے بغیر چین سے بیٹھنا ممکن نہ تھا کیونکہ انھیں جنگِ بدر میں جو جراحت پہنچی تھی اس کا اندمال انتقام سے ہی ممکن تھا۔[۳۶]

اور پھر یہی ہوا کہ انتقام کی گھڑی آ پہنچی۔ شوال ۳ھ میں تین ہزار کا عظیم الشان لشکر، سامانِ حرب سے لیس، ابوسفیان کی قیادت میں مکہ سے روانہ ہوا۔[۳۷] ابوسفیان اگرچہ اپنی کچھ کارگذاری سویق کی مہم میں دکھا چکا تھا۔[۳۸] لیکن اب ایک طرف تو یہ ضروری تھا کہ مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی قوت کو روکا جائے اور دوسری طرف مکہ کے جگر پاروں کا بدلہ اور اپنے عزیزوں کا انتقام لینا بھی ان کے لئے لازمی تھا۔ قریش کے لئے یہ بھی ناقابلِ برداشت تھا کہ مسلمانوں کے قلیل سے گروہ نے ان کے عزت و ناموس کے بت کو سرنگوں کر کے جو چیلنج دیا ہے اسے قبول نہ کریں۔ اس پر مزید تیل منافقین و یہود نے چھڑک کر عداوت کی آگ کو قریش کے سینوں میں اور بھڑکا دیا تھا۔

رسول اللہؐ کو ۵ شوال ۳ھ کو اطلاع دی گئی کہ دشمن اتنے قریب پہنچ گیا ہے کہ اس کے گھوڑوں نے وادیٔ عقیق کی چراگاہوں کو صاف کر دیا ہے۔[۳۹] چنانچہ رسول اللہؐ صحابہ سے صلاح و مشورہ کے بعد ایک ہزار کے لشکر کے ساتھ مقابلے کے لئے روانہ ہوئے۔ اس موقع پر بھی منافقین نے صورتِ حال سے فائدہ اٹھانے کی پوری کوشش کی۔ رئیس المنافقین عبد اللہ بن ابی نے مقام شوط پر پہنچ کر یہ بہانہ کیا کہ: "تم لوگوں نے جنگ کے بارے میں میرے مشورہ کو قبول نہ کیا اس لئے میں تمہارے ساتھ جانے اور جنگ میں شریک ہونے سے معذور ہوں۔"[۴۰] یہ کہہ کر وہ اپنے تین سو ساتھیوں کو لے کر الگ ہو گیا اور اسلامی فوج صرف سات سو رہ گئی۔[۴۱] منافقین کی یہ حرکت ان کی بدنیتی کو صاف ظاہر کر رہی تھی لیکن رسول اللہؐ نے صبر و تحمل سے کام لیا اور مسلمانوں کے عزم میں بھی کوئی فرق نہ آیا اور بالآخر ۷ شوال کو اُحد کے میدان میں معرکہ کارزار گرم ہوا۔[۴۲]

اس غزوہ میں ذراسی بے احتیاطی کی وجہ سے مسلمانوں کو اس صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑا کہ ان کا جانی نقصان قریش کے مقابلہ میں زیادہ ہوا۔ اس کے باوجود قریش کو کچھ حاصل نہ ہوا۔ شاید اسی لئے ابوسفیان میدان اُحد سے چلتے چلتے یہ کہہ گیا تھا کہ: "اگلے سال پھر ہمارا تمہارا مقابلہ بدر میں ہوگا۔"[۴۳]

غزوۂ اُحد کے بعد ریاستِ مدینہ کے لئے خطرات میں مزید اضافہ ہوگیا کیونکہ جنگِ بدر کی وجہ سے مخالفین و معاندین کی جو حوصلہ شکنی ہوئی تھی اس غزوہ کے بعد ان کی ہمتیں پھر سے بڑھ گئیں اور وہ اہلِ مکہ کی طرح یہ سمجھنے لگے کہ نہ صرف ریاستِ مدینہ بلکہ اسلام کی بیخ کنی میں بھی کامیاب ہوجائیں گے۔ اور فی الحقیقت غزوۂ اُحد سے غزوۂ خندق تک پیش آنے والے واقعات سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اپنے ان عزائم کی تکمیل کے لئے انھوں نے بڑی منظم جدوجہد کا منصوبہ بنایا تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حوادث پے بہ پے یہی رُخ اختیار کرتے ہیں مثلاً غزوۂ اُحد پر دو ماہ بھی نہ گزرے تھے کہ نجد کے قبیلہ بنی اسد نے مدینہ طیبہ پر چھاپہ مارنے کی تیاریاں کیں۔ پھر صفر ۴ھ میں قبائل عضل اور قارہ نے حضورؐ سے بغرضِ تبلیغ آدمی مانگے۔ حضورؐ نے چھ اصحاب[۴۴] کو ان کے ساتھ کر دیا مگر رجیع پہنچ کر وہ قبیلہ ہذیل کے کفّار کو ان بے بس مبلّغین پر چڑھا لائے۔ چار کو قتل کر دیا گیا اور دو اصحاب مکّہ میں لاکر دشمنوں کے ہاتھوں فروخت کئے گئے۔[۴۵] پھر اسی ماہ میں بئرِ معونہ کا دردناک واقعہ پیش آیا جس میں چالیس مبلغینِ اسلام کو قبائل بنی سلیم نے شہید کر دیا۔[۴۶] اسی دوران یہود بنو نضیر مسلسل بدعہدیاں کرتے رہے یہاں تک کہ ربیع الاول ۴ھ میں خود رسولؐ اللہ کو شہید کرنے کی سازش کر ڈالی۔[۴۷] مزید برآں جمادی الاول ۴ھ میں بنی غطفان کے دو قبیلوں بنو ثعلبہ اور بنو محارب نے ریاستِ مدینہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کیں۔[۴۸] مختصر یہ کہ غزوۂ اُحد کے بعد ریاستِ مدینہ کے اردگرد فتنوں کا ایسا جال پھیلا دیا گیا تھا جس سے باہر نکلنے کے لئے بے پناہ سیاست و تدبّر، جرأت، حوصلہ مندی اور قوتِ فیصلہ درکار تھی۔ اور ظاہر ہے کہ یہ تمام صفات رسولؐ اللہ میں موجود تھیں۔ چنانچہ آپ نے ان سے کام لے کر تھوڑے ہی عرصہ میں حالات کا رُخ یکسر بدل دیا اور ان فتنوں کی کامیابی کے ساتھ سرکوبی کر دی۔ البتہ جس طرح مسائل یکے بعد دیگرے پیدا ہوتے چلے گئے اسی طرح ضرورت اس بات کی تھی کہ ان کو حل کرنے کے لئے اقدامات بھی اس سرعت اور تسلسل کے ساتھ کئے جائیں تاکہ ریاستِ مدینہ کا دفاع ہو سکے اور اس کے استقلال کو مستحکم کیا جا سکے۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ رسولؐ اللہ نے پُوری مستعدی کے ساتھ حالات کا مقابلہ کیا اور ہر موقع پر بروقت قدم اٹھا کر مخالفینِ ریاست کو کچل دیا مثلاً غزوۂ اُحد کے دُوسرے ہی دن جبکہ رسولؐ اللہ اور دوسرے بکثرت مسلمان زخمی حالت میں تھے اور بہت سے گھر اُجڑ چکے تھے۔[۴۹] رسولؐ اللہ نے جاں نثارانِ اسلام کو لشکرِ کفار کے تعاقب کا حکم دیا تاکہ وُہ کہیں راستہ سے پلٹ کر پھر مدینہ پر حملہ آور نہ ہو جائیں۔[۵۰] بہرکیف دُوسرے دن رسولؐ اللہ نے اس خستہ حال جماعت کو ساتھ لیا اور لشکرِ قریش کے تعاقب میں حمراء الاسد تک تشریف لے گئے۔[۵۱] اس مہم کو غزوۂ اُحد کا تکملہ کہا جا سکتا ہے، کیونکہ جب رسولؐ اللہ نے غیر متوقع طور پر لشکرِ قریش کو میدانِ اُحد سے جاتے ہوئے دیکھا تو آپ کو خیال ہوا کہ ممکن ہے وہ لوگ مدینہ پر حملہ کرنے کا ارادہ کر رہے ہوں یہ صرف آپ کا قیاس ہی نہ تھا بلکہ حقیقت بھی تھی۔ ابوسفیان نے مدینہ سے کچھ دُور جا کر

اپنی غلطی محسوس کی اور پلٹ کر مدینہ پر حملہ کرنے کی فکر میں تھا کہ اسے یہ علم ہو گیا کہ رسول اللہؐ اس کے تعاقب میں آ رہے ہیں تو ارادہ ترک کر دیا اور مکہ چلا گیا۔[۵۲] بہر حال رسول اللہؐ نے حمراُ الاسد پر تین دن تک قیام فرمایا اور جب یہ یقین ہو گیا کہ اب دشمن واپس نہیں آئے گا تو آپ نے مدینہ کی طرف مراجعت فرمائی۔[۵۳]

رسول اللہؐ کی یہ مہم نہ صرف یہ کہ آپ کی بصیرت، پیش بینی اور جنگی مہارت کو ثابت کرتی ہے بلکہ آپ کی ہمت وجرأت پر دلالت کرتی ہے کہ اس خستہ حالی اور پریشانی کے عالم میں کفار و مشرکین کے اتنے بڑے لشکر کا تعاقب کیا اور وہ بھی اس صورت میں کہ جب کہ ایک دن پہلے آپ ان کے ہاتھوں کافی نقصان اٹھا چکے تھے۔ اس کارروائی سے دو فائدے اور ہوئے۔ ایک تو یہ کہ قریش کے بڑھتے ہوئے حوصلے پست ہو گئے اور دوسرے ریاست مدینہ کے نواحی دشمنوں کو یہ علم ہو گیا کہ ریاست اپنے دفاع کے سلسلہ میں پوری طرح چوکس ہے اور اس کی قیادت ایک انتہائی بیدار مغز اور اولوالعزم ہستی کر رہی ہے۔

اس کے بعد آپ نے بنی اسد گروہ کی خبر لی جو غالباً قریش کی شہ پر مدینہ پر چھاپہ مارنے کی تیاریاں کر رہا تھا اور اس کی سرکوبی کے لئے ابو مسلمہ کی قیادت میں ڈیڑھ سو آدمیوں کا ایک لشکر روانہ کیا۔ یہ فوج اچانک ان کے سروں پر پہنچ گئی چنانچہ وہ بدحواسی کے عالم میں اپنا سب کچھ چھوڑ کر بھاگ نکلے اور ان کا سارا مال و اسباب مسلمانوں کے ہاتھ آ گیا۔[۵۴]

بئر معونہ کا واقعہ نہایت المناک تھا۔ اس میں چالیس صحابہ کو تبلیغ کے بہانے لے جا کر قتل کر دیا گیا تھا۔ البتہ ایک صحابی عمرو بن امیہ بچ کر مدینہ واپس آ رہے تھے تو راہ میں انہوں نے بنی عامر کے دو شخصوں کو سوتے میں قتل کر دیا۔ جب مدینہ پہنچے اور حضور کو معلوم ہوا تو آپ نے بہت افسوس ظاہر کیا اس لئے کہ بنو عامر سے آپ کی صلح تھی، اس بنأ پر آپ نے دونوں مقتولین کی دیت دینی چاہی۔ چونکہ یہود بنو نضیر، بنو عامر کے حلیف تھے لہٰذا آپ نے بنی نضیر کو بیچ میں ڈال کر اس معاملہ کو طے کرانا چاہا۔[۵۵] اس سلسلے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خود بنی نضیر کی بستی میں تشریف لے گئے اور وہاں ان سے گفتگو فرمائی۔ دوران گفتگو آپ ایک دیوار سے تکیہ لگائے بیٹھے تھے کہ ان لوگوں نے ایک شخص عمرو بن جحاش کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ پیچھے کی طرف سے دیوار پر چڑھ کر ایک بڑا سا پتھر گرا کر رسول اللہؐ کو ہلاک کر دے۔[۵۶] ان کے ایک سردار سلام بن مشکم نے اس تجویز کی سختی سے مخالفت کی اور کہا کہ اوّل تو اس کی خبر ان کو بذریعہ وحی ہو جائے گی اور دوسرے یہ اس عہد کے قطعاً خلاف ہے جو ہمارے اور ان کے درمیان ہو چکا ہے۔[۵۷] لیکن وہ لوگ اپنے ارادے سے باز نہ آئے اور بدعہدی پر آمادہ ہو گئے۔

رسول اللہؐ گفتگو کے دوران ان کی آپس کی سرگوشیوں سے ان کے ارادے کو بھانپ گئے نیز بذریعہ وحی آپ پر ان کی اسکیم واضح ہو گئی۔ چنانچہ اس سے پہلے کہ وہ اس کو عملی جامہ پہناتے رسول اللہؐ اپنے گھر تشریف لے آئے۔[۵۸]

جس روز بنی نضیر نے رسول اللہؐ کو شہید کرنے کی سازش کی اسی روز آپ نے حضرت محمد بن مسلمہ کے ذریعہ یہود بنی نضیر کو کہلا بھیجا کہ:

اخرجوا من بلدي فلا تساكنوني بها وقد هممتم بما هممتم به من الغدر وقد اجلتكم

عشراً فمن رائی بعد ذالك ضربت عنقه۔[۵۹]

(تم نے جو بدعہدی کی ہے اس کی وجہ سے اب تمہیں ہمارے ساتھ مدینہ میں رہنے کا حق نہیں ہے۔ میں تمہیں دس دن کی مہلت دیتا ہوں کہ اپنا انتظام کر کے جس طرف چاہو نکل جاؤ۔ اس کے بعد تمہارے قبیلہ کا کوئی فرد مدینہ کی حدود میں نظر آئے گا تو اس کو قتل کر دیا جائے گا)

رسول اللہؐ کے اس فرمان پر اگرچہ بنو نضیر نے مدینہ چھوڑنے کی تیاریاں شروع کر دی تھیں لیکن عبد اللہ بن ابی نے انھیں یہ کہہ کر روک لیا کہ:

لا تخرجوا من دیارکم واقیموا فی حصنکم فان معی ألفین من قومی و غیرهم من العرب یدخلون معکم حصنکم فیموتون عن آخرهم وتمدّکم قریظة وحلفاؤکم من غطفان۔[۶۰]

(تمہیں مدینہ سے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنے قلعوں میں مقیم رہو۔ میرے ساتھیوں کے علاوہ دو ہزار عرب اور بنو قریظہ اور غطفان کے لوگ مرتے دم تک تمہاری مدد کریں گے)

چنانچہ ابن ابی کی اس ہمت افزائی پر بنی نضیر نے رسول اللہؐ کو کہلا بھیجا کہ آپ کے جو جی میں آئے کیجئے ہمیں مدینہ سے کوئی نہیں نکال سکتا۔[۶۱] اس پر رسول اللہؐ نے فرمایا کہ اعلانِ جنگ کر دیا ہے۔[۶۲]

لہٰذا رسول اللہؐ نے نوٹس کی میعاد ختم ہوتے ہی ان کا محاصرہ کر لیا اور ان کے حامیوں میں سے کسی کی یہ ہمت نہ پڑی کہ مدد کو آتے۔ انجام کار انھوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور کہہ دیا کہ ہم آپ کا شہر خالی کر کے چلے جائیں گے اور اپنی املاک میں سے اسلحہ کے علاوہ صرف وہ چیزیں لے جائیں گے جو اونٹوں پر لادی جا سکتی ہیں اور باقی تمام چیزیں اسلحہ، زرہیں، نخلستان اور اراضی وغیرہ رسول اللہؐ کا حق ہوں گی۔[۶۳] اس پر محاصرہ اٹھا لیا گیا اور بنی نضیر کو شہر سے جانے کی اجازت دے دی گئی۔ چنانچہ انہوں نے مال و اسباب اونٹوں پر بار کیا کچھ نے اپنے مکانوں کو خود ہی منہدم کیا اور چوکھٹ بھی نکال لیں اور گاتے بجاتے خوشیاں مناتے مدینہ سے نکل کر بعض لوگ شام کی طرف لیکن اکثر لوگ خیبر کی جانب چلے گئے۔[۶۴] اس طرح مضافاتِ مدینہ کا وہ پورا محلہ جس میں بنی نضیر رہتے تھے ان کے باغات، گڑھیاں اور دیگر سامان رسول اللہؐ کے ہاتھ آ گیا۔[۶۵]

یہودِ بنی نضیر سے فراغت پا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کی طرف ایک مرتبہ پھر توجہ دی تاکہ ابوسفیان کے اس چیلنج کا جواب دیا جاتے جو اس نے اُحد سے پلٹتے ہوئے بدر پر ایک اور جنگ کے لئے دیا تھا۔ اور جسے آنحضرتؐ نے بھی بخوشی قبول کر لیا تھا۔[۶۶] سال کی مدت پوری ہوئی تو رسول اللہؐ نے تمام خطرات سے بلند ہو کر جہاد کا اعلان فرما دیا اور مسلمانوں کو یہ ہدایت بھی کر دی کہ وہ سامانِ تجارت بھی ساتھ لے چلیں تاکہ ذیقعدہ کے پہلے ہفتہ میں بدر کے مقام پر جو بازار لگتا ہے اس میں شرکت کر سکیں۔ پھر ذی قعدہ ۴ھ کی چاند رات کو رسول اللہؐ پندرہ سو مسلمانوں کی جمعیت لے کر بدر الصفراء پہنچ گئے۔ دوسرے دن صبح سے وہاں بازار لگ گیا اور مسلمانوں نے ساتھ لایا ہوا سامان فروخت کر کے سو فیصد نفع کمایا۔[۶۷]

ادھر ابوسفیان دو ہزار قریشیوں کا لشکر لے کر بادلِ ناخواستہ مکّہ سے روانہ ہوا لیکن مرالظہران سے آگے بڑھنے کی ہمّت نہ کر سکا اور اپنی خفت مٹانے کے لئے اپنے ساتھیوں سے یہ عذر کیا کہ اس مرتبہ خشک سالی کی وجہ سے ہمیں جانوروں کے لیے چارہ اور پانی کی فراہمی میں کافی دقّت اور دشواری کا سامنا ہے لہٰذا مناسب ہے کہ ہم اس وقت مکّہ لوٹ جائیں اور آئندہ اس مہم پر چلیں۔[۶۸] ادھر رسول ﷺ آٹھ دن تک ابوسفیان کا انتظار کر کے مدینہ واپس آ گئے۔[۶۹]

اس واقعہ سے ایک طرف تو مسلمانوں کی وُہ دھاک جو میدانِ اُحد میں اُکھڑ گئی تھی پہلے سے زیادہ جم گئی۔ اور دوسری طرف پُورے عرب پر یہ واضح ہو گیا کہ اب تنہا قریش رسول ﷺ کے مقابلے کی ہمّت نہیں رکھتے اور حقیقت بھی یہی تھی۔ قریش جنگِ اُحد کے موقع پر اپنی بیشتر طاقت صرف کر چکے تھے نیز سازوسامان اور افرادی قوت کے اعتبار سے بھی انہوں نے تمام ذرائع اور وسائل کو استعمال کر لیا تھا۔ جنگوں میں ان کے بہترین افراد مارے گئے تھے اور ان تمام کارروائیوں کا حاصل صرف یہ تھا کہ وہ بمشکل تمام مسلمانوں کا کچھ جانی نقصان ہی کر سکے تھے۔ علاوہ بریں اپنی انتہائی جدوجُہد کے باوجود نہ تو وہ رسول ﷺ کو خاطر خواہ زک پہنچا سکے تھے، نہ ریاستِ مدینہ کو ختم کرنے کی تدبیر سے کوئی فائدہ اٹھا سکے تھے۔ اور نہ سازشوں اور چالبازیوں سے مسلمانوں کے دامنِ اتحاد کو پارہ پارہ کر سکے تھے۔

اس صورتِ حال میں قریشِ مکّہ کے لئے غالباً ایک راستہ باقی بچا تھا کہ وہ آخری بار ایک بہت بڑی قوت کے ساتھ مدینہ پر حملہ آور ہو کر تلافیٔ مافات کر لیں یا بالفاظِ دیگر انتقام کی پیاس بجھا لیں۔ لیکن ایک بڑی فوج کی تیاری کے لئے بھی صرف یہی شکل ممکن تھی کہ قریش اپنے وسائل پر اکتفا کرنے کے بجائے دوسروں سے مدد لیں۔ بنی نضیر کے یہود تو ان کے ساتھ پہلے سے سازباز رکھتے تھے۔ بلکہ خود قریش کو ایک آخری فیصلہ کن جنگ کے لئے ابھارنے میں اصل محرک بنی نضیر اور بنی وائل سے تعلق رکھنے والے یہود ہی تھے۔[۷۰] مزید برآں قریش کو جنگ کی نشاط افزا دعوت دے کر یہی لوگ مدینہ کے گرد و نواح میں بسنے والے دُوسرے قبائل کے پاس بھی گئے اور انھیں ریاستِ مدینہ کے خلاف آمادۂ پیکار کر دیا۔[۷۱] یہود عداوتِ رسول ﷺ میں اس حد تک پہنچ گئے کہ انہوں نے آپ کے خلاف بعض قبائل کو آمادۂ جنگ کرنے میں رشوت پیش کرنے سے بھی گریز نہیں کیا۔[۷۲] بہرطور ریاستِ مدینہ کے خلاف تمام دُشمن عناصر مجتمع ہو گئے اور قریش بھی پُوری تیاری کرنے لگے کیونکہ ان کی عزت و ناموس کے لئے بڑا نازک لمحہ آ گیا تھا۔

قریش کے برعکس مسلمانوں کا معاملہ یہ تھا کہ ہر آزمائش انہیں اور زیادہ ثبات و استقلال عطا کر دیتی تھی۔ ان کی قوت روز بروز مستحکم ہو رہی تھی اور ریاستِ مدینہ اپنے دفاع کے معاملہ میں خود کفیل ہوتی جا رہی تھی۔ مدینہ پر چاروں طرف سے یلغار کے باوجود رسول ﷺ اور مسلمان قطعاً ہراساں نہیں ہُوئے اور جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ غزوۂ بدر ثالث کی وجہ سے مسلمانوں کی دھاک پھر سے بیٹھ گئی تھی اور قریشِ مکّہ کے لئے تنہا ان سے مقابلہ کی ہمت نہیں ہو سکتی تھی۔ اسی لئے وہ ایک بہت بڑے لشکر کو مدینہ پر چڑھا لانے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ لیکن اس سے پہلے کہ مسلمانوں اور قریش کے اتحادی لشکر میں کوئی تصادم واقع ہو چند واقعات اور ایسے پیش آ گئے جن سے مسلمانوں کی قوت و شوکت میں

مزید اضافہ ہوگیا۔

ایک تو یہ اطلاع مدینہ پہنچی کہ بنی محارب و ثعلبہ کے غطفانی قبائل مدینہ پر حملہ آور ہونے کے لئے پر تول رہے ہیں۔(۴۳) رسول اللہؐ تو ویسے بھی ہر سرکش قوت کو کچلنے، اور کسی بغاوت یا خطرہ کا دفعیہ کرنے میں ہمیشہ مستعد رہتے تھے۔ چنانچہ یہ اطلاع ملتے ہی آپ بغیر کسی توقف کے مجاہدین کے ایک بڑے لشکر کے ساتھ مدینہ سے روانہ ہوتے اور ذات الرقاع تک پیش قدمی فرمائی۔(۴۴) اس اچانک فوج کشی نے دشمن کے حوصلے پست کر دیئے اور وہ حواس باختہ ہو کر پہاڑوں میں رُوپوش ہوگئے۔ چنانچہ جدال و قتال کی نوبت نہیں آئی اور وہاں کئی دن ٹھہر کر مدینہ واپس آگئے۔(۴۵)

دوسرا واقعہ یہ ہوا کہ عرب کی شمالی سرحد پر دومۃ الجندل کا جو اہم مقام تھا اور جہاں کا حاکم اکیدر بن عبد الملک مذہباً نصرانی اور فرمانروائے روم کا اطاعت گزار تھا وہ اور اس کے علاقے کے آدمی مدینہ سے آنے والے آدمیوں اور قافلوں کو لُوٹ لیتے تھے اور مسلمان تاجروں کو بہت پریشان کرتے تھے۔ ان کی زیادتی کی مسلسل اطلاعات مدینہ پہنچنے لگیں تو رسول اللہؐ اس کی سرکوبی کے لئے ربیع الاول ۵ھ میں ایک ہزار صحابہ کے ساتھ دومۃ الجندل کی جانب روانہ ہوئے۔(۴۶) منزل مقصود پر پہنچے تو وہ لوگ آپ کے مقابلہ کی ہمت نہ کر سکے اور بستی چھوڑ کر بھاگ گئے۔(۴۷)

ان مہمات کے نتیجہ میں ایک طرف تو مدینہ کے اطراف و جوانب بلکہ پورے شمالی عرب پر ریاست مدینہ کی ہیبت بیٹھ گئی۔ اور دوسری طرف قریش کے ساتھ ساتھ مدینہ کے دوسرے نواحی قبائل نے بھی اچھی طرح سمجھ لیا کہ حرم مدینہ کو تاخت و تاراج کرنا ایک دو قبیلوں کے بس سے قطعی باہر ہو چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عرب کے بہت سے قبائل کا متحدہ لشکر شوال ۵ھ میں ریاست مدینہ کو پامال کرنے کے لئے آندھی طوفان بن کر آگیا۔ اس میں بنی نضیر اور بنی قینقاع کے جلا وطن یہود بھی تھے۔ غطفان کے قبائل بنی سلیم، فزارہ، مرّہ، اشجع، سعد اور اسعد وغیرہ بھی تھے۔ اور جنوب کی طرف سے قریش تو بہرحال اپنے حلیفوں کی ایک بڑی تعداد کے ساتھ آگے آگے تھے۔(۴۸) اس اتحاد میں کفار قریش کی شرکت کی وجہ صاف ہے وہ نہ تو اپنے مقتولین کا انتقام لے سکے تھے نہ حسبِ وعدہ بدر ثالث کے موقع پر مسلمانوں سے آنکھ ملا سکے تھے اور نہ ہی اپنی بے عزتی و بدنامی کا داغ مٹا سکے تھے۔ اس لئے تلافی کا موقع اس سے بہتر کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔ بنی نضیر اور بنی قینقاع وغیرہ جس طرح مدینہ سے نکالے گئے تھے وہ سب کو معلوم تھا اور اس کے نتیجہ میں وہ مسلمانوں کی دشمنی میں جس حد تک بڑھ جاتے کم تھا۔ بنو غطفان پہلے سے زخم خوردہ تھے انہوں نے اس موقع پر اپنے حلیف بنو اسد کو بھی آمادہ کر لیا تھا۔ ادھر قریش نے بنو سلیم کو اور یہود نے بنو سعد کو شرکت کی دعوت دی اس طرح بڑی آسانی کے ساتھ اتحادیوں کا یہ لشکر گراں بار ہوتا چلا گیا، جو کم و بیش دس ہزار افراد پر مشتمل تھا۔(۴۹) اور ظاہر ہے کہ اس سے قبل عرب میں اتنی بڑی جمعیت کبھی مجتمع نہ ہوئی تھی۔ قرآن نے بھی اس لشکر کی کثرت اور دہشت ناکی کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے کہ:

اذ جاءوکم من فوقکم و من اسفل منکم و اذ زاغت الابصار و بلغت القلوب الحناجر و تظنون باللہ الظنونا۔ ھنالک ابتلی المومنون و زلزلوا زلزالاً شدیداً۔(۵۰)

(جب وہ (اور ان کے لشکر) اوپر سے اور نیچے سے تم پر چڑھ آئے۔ جب خوف کے مارے آنکھیں پتھرا گئیں کلیجے منہ کو آ گئے اور تم لوگ اللہ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کرنے لگے۔ اس وقت ایمان والے خوب آزمائے گئے اور بُری طرح جھنجھوڑ کر رکھ دیے گئے)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو چونکہ پہلے سے ہی اندازہ تھا کہ آپ کے گرد ایک بڑا طوفان اٹھ رہا ہے جو کسی وقت بھی مدینہ کو اپنی لپیٹ میں لے سکتا ہے اور پھر شوال ۵ھ کے اوائل میں آپ کو اطلاع بھی مل گئی کہ اب تمام تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں تو آپ نے صحابہ کے مشورہ سے دفاعی انتظامات شروع کر دیے۔ اور اس سلسلے میں قبل اس کے کہ لشکر اعدا حملہ آور ہوں آپ نے چند ہی دنوں میں مدینہ کے شمال اور مغرب کے رُخ پر یعنی جہاں سے حملہ ہو سکتا تھا ایک خندق تیار کر لی۔[81] اور کوہ سلع کو پشت پر لے کر تین ہزار فوج کے ساتھ مدافعت کے لئے تیار ہو گئے۔[82] لشکر کفار کی آمد کی تاریخوں کا متعین کرنا اگرچہ دشوار ہے اور محاصرہ کی مدت کے بارے میں بھی مورخین مختلف الخیال ہیں تاہم قرینِ صحت یہی بات ہے کہ جنگ کی مجموعی مدت چوبیس دن تھی[83] جس میں فوجوں کی آمد و اجتماع، محاصرہ اور جنگ سب ہی شامل ہیں۔ اگر ابن سعد کی اس روایت کو تسلیم کر لیا جائے کہ بنو قریظہ کا محاصرہ ۲۳ ذی قعدہ کو شروع ہوا تھا[84] تو پھر جنگِ خندق کی تاریخِ اختتام ۲۱، ۲۲ ذی قعدہ سمجھی جائے گی اور کفار کی فوجوں کی آمد ۲۷، ۲۸ شوال ۵ھ متصور ہو گی۔

بہرحال اپنے اپنے مورچوں پر جمنے کے بعد جنگ کا آغاز ہوا، جنگ کا معرکہ کارزار گرم تھا کہ مدینہ کے بعض عناصر نے موقع سے فائدہ اٹھانے کی سوچی ان میں سے منافق تو شروع ہی سے اپنے نفاق کا اظہار کر رہے تھے نہ خندق کھودنے میں انہوں نے دلچسپی لی نہ دورانِ جنگ کوئی نمایاں کام انجام دیا، ہاں مسلمانوں میں طرح طرح کی بدگمانیاں ضرور پھیلاتے تھے۔ ان کی طرف سے ہر وقت ہی خطرہ رہتا تھا۔ اسی زمانے میں مدینہ کے مشرقی گوشے میں رہنے والے اہم یہودی قبیلہ بنی قریظہ نے بھی منشورِ مدینہ سے بغاوت کا مظاہرہ کر دیا۔ یہود کا یہ قبیلہ اگرچہ جنگِ خندق تک منشورِ مدینہ کا پابند چلا آ رہا تھا لیکن بنی نضیر نے جو اس جنگ کے خاص طور پر محرک بنے تھے حُیَی بن اخطب کو بھیج کر بنو قریظہ کو مشتعل کر دیا تھا[85] کیونکہ دیگر یہود اور منافقین یہ برداشت نہ کر سکتے تھے کہ بنی قریظہ مسلمانوں سے وفاداری نبھاتے رہیں۔ علاوہ ازیں ان کی نظر دفاعی پہلو سے اس جانب تھی کہ جنوب کی طرف سے بنو قریظہ کے حملہ آور ہونے کی صورت میں مسلمان دو جانب سے اس طرح گھر جائیں گے کہ ان کی شکست بالکل یقینی ہے۔

دشمنانِ ریاستِ مدینہ کا یہ منصوبہ بظاہر بڑا مناسب اور کامیاب نظر آتا تھا لیکن دوسری طرف رسول اللہ ان معاملات سے بے خبر نہ تھے۔ چنانچہ ان سب باتوں کی بروقت اطلاع مل گئی، آپ نے اتمامِ حجت کی غرض سے چند صحابہ[86] کو بنو قریظہ کے پاس بھیجا وہاں کا نقشہ ہی بدل چکا تھا۔ پورا قبیلہ مخالفت پر آمادہ تھا انھوں نے فہمائش پر کان دھرنا تو درکنار متکبرانہ انداز میں رسول اللہ کے فرستادوں کو یہ جواب دیا کہ "ہم نہ محمد کو جانتے ہیں نہ ان کو رسول مانتے ہیں اور نہ ہی ہمارے اور ان کے درمیان کوئی عہد ہے۔"[87]

بہر حال بنو قریظہ کے اس واضح جواب اور عہد شکنی سے جو سنگین صورتِ حال پیدا ہو گئی تھی اس میں ایک نو مسلم نعیم بن مسعودؓ [۸۸] سے رسول اللہؐ نے جنگی تکنیک کے اعتبار سے ایک ایسا کام لیا جس نے نقشہ حالات پلٹ کر رکھ دیا۔ انہوں نے رسول اللہؐ کی ہدایت پر بنو قریظہ اور لشکرِ کفار میں پھوٹ ڈلوا دی۔[۸۹] اس کارروائی سے جہاں بیک وقت دو جانب سے حملہ کا خطرہ ٹل گیا جو ریاست مدینہ کے لئے تباہ کن ثابت ہو سکتا تھا اسی کے ساتھ ساتھ لشکرِ کفار کے حوصلے بھی پست ہو گئے۔ اس پر مستزاد یہ کہ محاصرہ بیس دن سے زیادہ طویل ہو چکا تھا پھر چند غیر معمولی واقعات نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ یعنی اگرچہ مہینہ ایسا تھا جب نہ شدید سردی کا موسم تھا نہ سخت آندھیوں کا زمانہ، اس کے باوجود ایک دن یکایک ایسی آندھی چلی کہ دشمن کی فوج جو کھلے میدان میں خیمہ زن تھی سخت انتشار میں مبتلا ہو گئی۔ خیمے اکھڑ گئے، دیگیں اور برتن الٹ گئے، اور کھانے پینے کا سارا سامان طوفان کی نذر ہو گیا۔ اس کے ساتھ سردی اتنی بڑھی کہ کفار کا ٹھہرنا مشکل ہو گیا اور نتیجہ یہ نکلا کہ راتوں رات لشکرِ کفار میں شامل تمام جماعتوں نے اپنی اپنی راہ لی اور صبح ہوتے ہوتے میدان دشمنوں سے خالی ہو گیا۔[۹۰] یہ دراصل قدرتِ خداوندی کا ایک مظاہرہ تھا جس کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا کہ:

وکفی اللہ المومنین القتال۔[۹۱]

(اور جنگ میں اللہ ہی مومنین کے لئے کافی ہو گیا)

اب جنگِ احزاب کے اثرات کا مطالعہ کرنے سے پہلے غزوۂ بنی قریظہ کے بارے میں بعض حقائق کا جاننا بھی ضروری ہے کیونکہ اسے جنگِ احزاب کا ہی تتمہ کہا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جیسے ہی حملہ آور فوجیں مدینہ سے رخصت ہوئیں اور ان کی جانب سے اطمینان ہو گیا تو ریاستِ مدینہ کے اندرونی دشمن یعنی یہود بنی قریظہ کی سرکوبی کے لئے رسول اللہؐ نے اس قدر عجلت سے کام لیا کہ آپ میدانِ جنگ سے واپس آ کر اپنے گھر میں آئے ہی تھے کہ حضرت بلال کے ذریعہ دوبارہ منادی کرا دی کہ "سب لوگ دوبارہ جنگ کے لئے تیار ہو جائیں کیونکہ بنو قریظہ کی بستی کا محاصرہ کرنا ہے"۔ آپ نے لوگوں کو مسجدِ نبویؐ میں نماز ادا کرنے کی بھی اجازت نہیں دی بلکہ حکم فرمایا کہ سب لوگ بنو قریظہ کے محلہ میں چل کر نماز (عصر) ادا کریں۔[۹۲]

بنو قریظہ کے استیصال میں اتنی عجلت و مستعدی کا سبب غالباً یہ تھا کہ ان کے قبیلہ نے سنگین جرائم کا ارتکاب کیا تھا ان کی فردِ جرم میں عین لڑائی کے وقت ریاست سے سرکشی و بغاوت منشورِ مدینہ کی خلاف ورزی و عہد شکنی، دشمنانِ ریاست مدینہ سے سازباز، مسلمانوں پر عقب سے حملہ آور ہونے کے لئے ۱۵۰۰ تلواروں، ۳ سو زرہوں، ۲ ہزار نیزوں اور ۱۵ سو ڈھالوں کی فراہمی[۹۳] اور حملہ آوروں سے مل کر مدینہ کی پوری آبادی کو ہلاکت میں مبتلا کر دینے کی کوشش کرنا شامل تھا۔ اس لئے ان کی جانب سے ذرا بھی غفلت نہیں برتی جا سکتی تھی۔ لہٰذا ان کا محاصرہ کر لیا گیا۔ محاصرہ کی شدت کو بنو قریظہ دو تین ہفتوں سے زیادہ برداشت نہ کر سکے۔[۹۴] اور آخرکار انہوں نے اس شرط پر اپنے آپ کو رسول اللہؐ کے حوالے کر دیا کہ قبیلہ اوس کے سردار حضرت سعد بن معاذ ان کے حق میں جو فیصلہ بھی کریں گے انہیں منظور ہو گا۔[۹۵] حضرت سعد

بن معاذ نے فیصلہ دے دیا کہ بنو قریظہ کے تمام قابلِ جنگ مرد قتل کر دیے جائیں، ان کے اموال تقسیم کر دیئے جائیں اور ان کی عورتوں اور بچوں کو قید کر لیا جائے۔(۹۶) چنانچہ اس فیصلے پر عمل کیا گیا۔ بنی قریظہ کے استیصال کے ساتھ ہی مدینہ سے یہودیوں کی آبادی کا کم و بیش خاتمہ ہو گیا۔

اب جہاں تک جنگِ احزاب کے نتائج و اثرات کا تعلق ہے تو تاریخی اعتبار سے غزوۂ احزاب کا واقعہ اسلامی تاریخ میں بالعموم اور ریاستِ مدینہ کے باب میں بالخصوص غیر معمولی مقام و اہمیت رکھتا ہے۔ جنگِ خندق میں کفار و مشرکین اور ان کے اتحادیوں کی پسپائی و ناکامی اور عبرتناک شکست نے کئی قابلِ دید تاریخی نتائج کو جنم دیا۔ مثلاً:

۱ - اتنے طویل محاصرہ کے باوجود مسلمانوں کا جانی نقصان زیادہ نہیں ہوا صرف حضرت سعد بن معاذ کے تیر لگا جس کی وجہ سے وہ تقریباً ایک ماہ بعد انتقال کر گئے۔

۲ - بنو قریظہ کے نقضِ عہد سے یہودیوں پر سے بھروسا بالکل اُٹھ گیا۔

۳ - ریاستِ مدینہ کے مخالفین نے آخری بار اپنا پورا زور صرف کر کے دیکھ لیا کہ اس نوزائیدہ ریاست کو ختم کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس کے بعد پھر کسی دشمن نے مدینہ پر حملہ کرنے کی قابلِ ذکر جرأت نہیں کی۔

۴ - غزوۂ احزاب کے ساتھ ہی مسلمانوں کے ابتلاء و آزمائش کے دور کا خاتمہ ہو گیا۔

۵ - اس بے نتیجہ فوج کشی اور محاصرہ نے پورے عرب کو یقین دلا دیا کہ مسلمان اب ایک ایسی قوت بن چکے ہیں جس کو مختلف قبائل کا اتحاد بھی شکست نہیں دے سکتا۔

۶ - ریاست مدینہ کے ازلی دشمن قریش کا خطرہ ہمیشہ کے لئے ٹل گیا۔ چنانچہ جنگ کے اختتام پر رسول اللہؐ نے یہ ارشاد فرمایا کہ:

لن تغزوکم قریش بعد عامکم ھذا ولکنکم تغزونھم۔(۹۷)

(اب قریش کے لوگ تم پر کبھی چڑھائی نہ کر سکیں گے بلکہ اب تم ان پر چڑھائی کرو گے)

اور فی الحقیقت یہ حالات کا بالکل صحیح اندازہ تھا۔

۷ - یہ سال دشمنانِ اسلام کے لئے جارحیت کا آخری سال ثابت ہوا۔ اس غزوہ کے بعد ہی مسلمانوں نے مدینہ سے باہر قدم نکال کر اطراف و جوانب میں پیش قدمی شروع کی۔ اس غزوہ کے بعد ہی ریاستِ مدینہ کی حدود میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور ریاست مدینہ اپنے توسیع و ارتقاء کے دوسرے دور میں داخل ہوتی ہے جس کا مطالعہ آئندہ صفحات میں کیا جائے گا۔

(۲) دورِ دوم (۶ھ تا ۱۱ھ)

ہم یہ پہلے بیان کر چکے ہیں کہ غزوۂ احزاب میں مسلمانوں کے مقابل متحدہ عساکر کی ناکامی کے بعد ریاستِ مدینہ

توسیع کے ایک نئے دور میں داخل ہوئی۔ اس دور کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ریاست کی حدود مدینہ اور اس کے قرب و جوار سے بہت آگے بڑھ کر تقریباً تمام جزیرۃ العرب تک پھیل گئی۔ سطوتِ یہود کا خاتمہ، قریشِ مکہ کا استیصال، عرب کے ان بڑے بڑے قبائل کا اظہار طاعت جنہیں قریش سے ہمسری کا دعویٰ تھا، جملہ مخالفین ریاست کی فوری سرکوبی اور سرحدی علاقوں کے سرکش قبائل کی تادیب اور ریاست کی سالمیت و خود مختاری کی مکمل حفاظت اس دور کے خاص واقعات ہیں۔ پھر یہی وہ دور ہے جبکہ ریاست کو داخلی و خارجی طور پر استحکام حاصل ہوا۔ اس کا نظم و نسق پوری طرح مرتب ہوا۔ عرب سے باہر کی دنیا میں اسلام کا تعارف اور آپ کے عالمگیر مشن کا آغاز ہوا۔ رومی سلطنت کے منطقۂ اثر میں نفوذ کیا گیا۔ ایران کی برتری کا طلسم ٹوٹا۔ دنیا کے فرمانروایان مطلق سے خطاب کر کے انہیں اسلام کی دعوت دی گئی۔ مختصر یہ کہ زیر نظر میں امورِ ریاست، امورِ دفاع، امورِ دین و دنیا اور تہذیب و تمدن کے باب میں اتنا کام ہوا کہ ان کی تفصیل کے یہ اوراق متحمل نہیں ہو سکتے اس لئے اس اجمال کی تفصیل میں بھی آئندہ ہمیں اختصار سے کام لینا ہوگا۔

یہاں یہ وضاحت کر دینا ضروری ہے کہ زیر بحث دور میں ریاست نبوی کے ارتقائی پہلوؤں کا مطالعہ کرتے وقت واقعات کی سن وار ترتیب کے بجائے مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ توسیع کے نقطۂ نظر سے جو واقعہ جس ضمن میں اثر و اہمیت رکھتا ہے اسے وہاں بیان کر دیا جائے اور یہ کہنا بھی بے محل نہ ہوگا کہ توسیع و ارتقا کا فطری عمل نہ تو راستہ کے موانعات کو دور کئے بغیر جاری رہ سکتا ہے اور نہ حالات کی مساعدت کے بغیر تکمیل پذیر ہو سکتا ہے۔ لہٰذا ریاست مدینہ کی توسیع و ترقی کے لئے بھی یہ ضروری تھا کہ:

(ا) ریاست کے خلاف اُٹھنے والی ہر تحریک کا قلع قمع اور ہر مزاحمت کا خاتمہ کر دیا جائے اور ریاست کی طرف حریصانہ نگاہیں اُٹھانے والوں کی پوری طرح خبر لی جائے تاکہ انہیں دوبارہ اس کا حوصلہ نہ ہو سکے۔

(ب) غزوۂ احزاب متحدہ قبائل کی اسلام دشمنی اور ریاست دشمنی کا نقطۂ عروج تھا۔ اس میں شکست نے اتحادیوں کو ہمیشہ کے لئے منتشر کر دیا تھا اس لئے اب اس بات کا امکان تو ختم ہو چکا تھا کہ عرب کی کوئی طاقت یا سب طاقتیں مل کر ریاست نبوی کو ختم کر دیں۔ البتہ اس کا مطلب یہ بھی نہ تھا کہ ان کی دشمنی اور مخالفت ختم ہو گئی ہے بلکہ وہ اب بھی اپنی عداوت اور بدنیتی کا مظاہرہ کسی بھی موقع پر کر سکتے تھے اس لئے ریاست کی توسیع کا انحصار اس بات پر تھا کہ اندرونِ عرب جو طاقتیں ریاست کے لئے خطرہ بن سکتی ہیں ان کو اول تو آپس میں متحد ہونے کا کوئی موقع نہ دیا جائے اور پھر دوسرے مرحلہ میں ان کی علیحدہ علیحدہ اکائیوں کو سرنگوں کر دیا جائے۔

(ج) اندرونِ عرب کی تمام قابلِ ذکر مزاحمتوں کو ختم کرنے کے بعد بیرونِ عرب بھی اسلام کے مشن کو پہنچایا جائے اور حاکمیتِ الٰہی کی طرح نو ڈالی جائے کہ یہ رسول اللہ کی بعثت کا عین تقاضا تھا۔

اب ہم اسی ترتیب سے ان نکات پر بحث کریں گے:

(الف) جہاں تک ریاست کے خلاف اُٹھنے والی ہر تحریک کے قلع قمع کرنے کا تعلق ہے تو واقعات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہؐ نے اس ضمن میں خاص تدبر اور حکمتِ عملی سے کام لیا۔ یہ بات تو بالکل صاف ہے کہ مزاحمت خواہ کسی جانب سے ہو اور فتنہ کہیں سے بھی اُٹھے، رسول اللہؐ اس کے فرو کرنے میں کسی قسم کی تاخیر گوارا نہیں کرتے تھے۔ بلکہ اس کی اطلاع ملتے ہی پُوری سرگرمی، مستعدی اور پیش بینی کے ساتھ فوری اقدام فرماتے تھے۔

دفاعی سیاست کا یہ اصول بڑا معروف ہے اور اسے عقلِ عام کی تائید بھی حاصل ہے کہ ناگہانی حملہ سے طاقتور دشمن بھی مجبور و بے بس ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جب شعبان ۵ھ میں[98] رسول اللہؐ کو یہ اطلاع ملی کہ بنو مصطلق مسلمانوں کے خلاف جنگ کی تیاریاں کر رہے ہیں[99] تو اس سے قبل کہ وہ لوگ اپنے ارادہ کو عملی جامہ پہنائیں رسول اللہؐ نے ایک بڑے لشکر کے ساتھ مریسیع[100] کے مقام پر اچانک انہیں جا لیا اور معمولی سے حملہ کے بعد پُورے قبیلے کو مال و اسباب سمیت گرفتار کر لیا۔[101] اسی ماہ آپ کو بمقام فدک، بنو سعد بن بکر کے اجتماع کی خبر ملی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ یہودیوں کی مدد کرنا چاہتے ہیں اس پر آپ نے فوری کارروائی کی اور حضرت علی کو سو آدمیوں کا لشکر دے کر ان کی طرف روانہ کیا۔ حضرت علی وہاں پہنچے اور حملہ کر کے انہیں منتشر کر دیا۔[102] یہی حکمت عملی آپ نے ان دوسری مہموں میں بھی اختیار کی جو حضرت عمر بن الخطابؓ[103]، ابوبکر صدیقؓ[104]، بشیر بن سعد الانصاریؓ[105]، غالب بن عبد اللہ اللیثیؓ[106]، ابن ابی العوجا السلمیؓ[107]، شجاع بن وہب الاسدیؓ[108]، ابو عبیدہ بن الجراحؓ[109] اور ابو قتادہ بن ربعیؓ[110] کی سرکردگی میں دار الحکومت مدینہ سے روانہ کی گئیں۔

ان مہمات کا انجام چاہے کچھ ہی رہا ہو (دشمن ہاتھ نہ آیا یا مسلمانوں کو نقصان اٹھانا پڑا یا انھیں اپنے مقصد میں کامیابی ہوئی وغیرہ وغیرہ) لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ رسول اللہؐ نے ان کو بھیج کر سیاسی و عسکری اعتبار سے بے شمار فوائد حاصل کئے مثلاً ان غزوات و سرایا کا پہلا اہم ترین فائدہ معلومات کا حصول تھا اور اس مقصد کے لئے غالباً وہ فوجی دستے زیادہ موثر ثابت ہوئے جو نفری کے اعتبار سے مختصر تھے لیکن دُوربین و تیز رفتار تھے اور جنگ میں اُلجھے بغیر اہم معلومات حاصل کر کے دار الحکومت مدینہ پہنچ جاتے تھے۔ اسی مقصد کے لئے زیادہ بڑے دستے بھی کار آمد تھے لیکن وہ حسبِ ضرورت لڑنے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔ یہ معلومات دشمن، ان کی نقل و حرکت، علاقے، جنگی رازوں اور عزائم وغیرہ کے بارے میں ہوتی تھیں ان مہمات کا دوسرا فائدہ یہ تھا کہ اسلامی افواج کو تیز رفتاری اور ناگہانی حملہ کرنے کی مشق و تربیت حاصل ہو گئی۔ ان مہمات کی وجہ سے مسلمان ان راستوں سے بخوبی واقف ہو گئے جو عرب کے مختلف علاقوں کو گھیرے ہوئے تھے اور خصوصاً جو مدینہ تک پہنچ جاتے تھے۔ مزید برآں ان طلایہ گرد دستوں کے باعث مسلمان ان قبائل سے بھی متعارف ہوئے جو ان راستوں پر قابض تھے۔ شاید اسی تعارف کا نتیجہ تھا کہ جو آگے چل کر متعدد قبائل کے قبولِ اسلام یا معاہداتِ صلح کی صورتوں میں ظاہر ہوا۔ ان غزوات و سرایا کی بناء پر دو بڑے مقاصد اور حاصل ہوئے۔ یعنی ایک تو قریش کی ناکہ بندی اور دوسرے ریاست کی اس کارکردگی اور صلاحیت کا اظہار کہ اس کے خلاف اُٹھنے والی ہر تحریک کو، مقام پر اور ہر حالت میں نشانہ بنایا جا سکتا ہے۔ اور واقعات نے ثابت کر دیا کہ

رسول اللہؐ ان دونوں مقاصد میں پوری طرح کامیاب رہے۔ پہلے مقصد کی کامیابی کی ایک شکل تو یہ تھی جو غزوۂ احزاب تک نظر آ گئی کہ چند ہی سال میں قریش ہمت و حوصلہ کھو بیٹھے اور ہجوم و اقدام کے بجائے دفاع کی پوزیشن میں آ گئے اور پھر اگلے ڈھائی تین سال میں بالکل مفتوح ہو گئے۔ اب جہاں تک دوسرے مقصد کا تعلق ہے تو حقیقت یہ ہے کہ ایک ہی وقت میں مختلف النوع محاذوں پر اس انداز سے فوجی نقل و حرکت کرنا کہ دیگر امورِ ریاست میں کوئی خلل واقع نہ ہو، رسول اللہؐ کی حیرت انگیز سیاسی و عسکری مہارت، دفاعی پیش بینی اور تدبر و حکمت پر دال ہے اور جس کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ (۱۱۱)

اسی سلسلہ میں رسولؐ اللہ کی حکمتِ عملی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ریاست کے سرکشوں، باغیوں اور غداروں سے بدلہ لینے یا محاسبہ کرنے میں کسی قسم کا ظلم یا کسی نوع کی زیادتی نہیں کی بلکہ الہامی ہدایت وان عاقبتم فعاقبوا بمثل ما عوقبتم (۱۱۲) (اور اگر تم بدلہ لو تو بس اسی قدر لے لو جس قدر تم پر زیادتی کی گئی ہے) کی روشنی میں ریاست، مرکز مدینہ یا مسلمانوں کو جراحت پہنچانے والوں سے محض قصاص عادل پر ہی اکتفا کیا گیا۔ چنانچہ زیرِ نظر دور میں غزوات و سرایا کی ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں جن کا مقصد مجرموں کا محاسبہ اور ان سے برابر کا بدلہ لینا تھا۔

اس ضمن میں سب سے پہلا موقع وہ ہے جبکہ غزوۂ بنی قریظہ سے فارغ ہو کر چند ماہ بعد ہی رسولؐ اللہ نے بنی لحیان سے نمٹنے کا فیصلہ کیا (۱۱۳)۔ یہ دراصل واقعۂ رجیع کا ردِ عمل تھا۔ عضل اور قارہ کے لوگ اس تعلیمی و تبلیغی وفد کے ارکان کے قاتل تھے جنہیں رسولؐ اللہ نے انہی کی درخواست پر قرآن و اسلام کی تعلیم کے لئے روانہ فرمایا تھا مگر رجیع پہنچ کر ان لوگوں نے بدعہدی کی اور بنی ہذیل کی شاخ بنی لحیان کو ساتھ ملا کر ان اصحاب میں سے چار کو شہید کر دیا اور دو کو اہل مکہ کے ہاتھوں فروخت کر دیا تھا اور اہلِ مکہ نے ان دونوں کو بھی شہید کر دیا تھا (۱۱۴)۔ رسولؐ اللہ کو اپنے ان اصحاب کے اس طرح شہید کئے جانے کا بہت صدمہ تھا لیکن دیگر مسائل کی مصروفیت کی وجہ سے اس طرف توجہ کرنے کا موقع نہیں ملا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس سلسلے میں بنی لحیان سے بات چیت ہو رہی ہو اور جب وہ بے نتیجہ رہی تو آپ نے مجبوراً فوج کشی فرمائی۔ اس قیاس کا ایک قرینہ یہ ہے کہ اس غزوہ میں آپ کے پہنچنے سے پہلے ہی وہ لوگ اپنے مقام سے فرار ہو چکے تھے حالانکہ آپ نے اس رازداری سے سفر شروع کیا تھا کہ خود اہلِ مدینہ کو اس کی خبر نہ تھی نیز توریہ سفر شام کا فرمایا تھا (۱۱۵)۔ اس احتیاط کے باوجود بنی لحیان کا فرار یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ لوگ مذاکرات کی ناکامی پر آپ کا حملہ متوقع سمجھتے تھے۔ بہر حال واقدی کے علاوہ دوسرے تمام مورخین اس پر متفق ہیں کہ اس غزوہ میں لڑائی کی نوبت نہیں آئی اور دشمن نے آپ کی آمد کی اطلاع پا کر راہِ فرار اختیار کی اور مقابلہ کی تاب نہ لا کر پہاڑوں کی چوٹیوں میں روپوش ہو گیا (۱۱۶)۔ جب حضور نے دیکھا کہ دشمن دسترس سے باہر ہو چکا ہے تو آپ نے اور آگے بڑھ کر عسفان میں قیام کیا اور دو سواروں کو آگے بھیجا۔ وہ کراع الغمیم تک گئے مگر کسی سے مڈبھیڑ نہیں ہوئی۔ اس لئے چند دن بعد آپ واپس مدینہ آ گئے (۱۱۷)۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ عسفان تک رسولؐ اللہ کی پیش قدمی قریش کو مرعوب کرنے میں بڑی کارگر ثابت ہوئی (۱۱۸)۔ اس کی وجہ جیسا کہ ہم

پہلے، کہ چکے ہیں یہ تھی کہ اب تک قریش سے جتنے معرکے ہوئے انہوں نے عموماً اور غزوۂ خندق نے خصوصاً انھیں بالکل چور کر کے رکھ دیا تھا اور وہ آسانی سے مسلمانوں کے مقابلہ کی ہمت نہ کر سکتے تھے۔

رسول اللہؐ کو غزوہ بنی لحیان سے واپس آئے ہوئے چند ہی دن ہوئے تھے کہ عُیینہ بن حصن بن حذیفہ بن بدر الفزاری غطفان کے سواروں کو لے کر الغابہ کی سرکاری چراگاہ پر حملہ آور ہوا[۱۱۹]۔ ابو ذر کے بیٹے کو شہید کیا اور رسول اللہؐ کی بیس اونٹنیاں ہنکا کر لے گیا[۱۲۰]۔ دشمن کی یہ بہت بڑی جسارت تھی جس پر گرفت کرنا لازمی تھی۔ رسول اللہؐ مجاہدین کی معیت میں تعاقب کے لئے نکلے حضرت سلمہ بن الاکوع آپ سے قبل ہی روانہ ہو چکے تھے[۱۲۱]۔ مسلمانوں نے لٹیروں کا دور تک پیچھا کیا۔ دس اونٹنیاں بھی حاصل کر لیں[۱۲۲] اور ان میں سے کئی آدمیوں کو تہ تیغ بھی کر دیا لیکن بالآخر وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے[۱۲۳]۔

پھر اس واقعہ پر بمشکل دو ہفتہ ہی گزرے تھے کہ رسول اللہؐ کو حضرت زید بن حارثہ کی سرکردگی میں پانچ سو آدمیوں کا لشکر بنو جذام کو سزا دینے کے لئے جمادی الآخر ۶ھ میں روانہ کرنا پڑا۔ سبب یہ تھا کہ دحیہ بن خلیفہ الکلبی قیصر روم سے مل کر آ رہے تھے۔ قیصر نے ان کو خلعت اور انعام سے سرفراز کیا تھا۔ جب یہ واپسی میں حسمٰی پہنچے تو بنی جذام کے لوگوں نے راستہ میں ہی ان کو لُوٹ لیا۔ کوئی چیز ان کے پاس باقی نہ چھوڑی اسی حالت میں رسول اللہؐ کی خدمت میں شکایت لے کر آئے تو رسول اللہؐ نے بنی جذام کی تادیب کے لئے حضرت زید کو روانہ فرمایا[۱۲۴]۔ زید بن حارثہ نے انتہائی سرعت لیکن راز داری سے کام لے کر دشمن کو جا دبوچا۔ جن لوگوں نے حضرت دحیہ پر ڈاکہ ڈالا تھا انھیں قتل کیا۔ کافی مالِ غنیمت حاصل کیا اور بہت سوں کو قیدی بنا لیا[۱۲۵]۔ اسی طرح کی کامیابی زید بن حارثہ کو رمضان ۶ھ میں اس وقت بھی حاصل ہوئی جبکہ ان کو رسول اللہؐ نے وادی القریٰ کے نواح میں بنو بدر کی سرزنش کے لئے بھیجا تھا[۱۲۶]۔ یہی زید تجارت کے سلسلے میں شام کی طرف گئے تھے۔ ان کے ہمراہ اصحابِ رسولؐ کا مال بھی تھا جب وہ وادی القریٰ کے قریب پہنچ گئے تو بنو بدر کی شاخ فزارہ کے کچھ لوگ ملے جنھوں نے ان کو اور ان کے ساتھیوں کو مارا اور جو کچھ پاس تھا لے لیا تھا[۱۲۷]۔

پھر شوال ۶ھ میں قبیلہ عرینہ کے آٹھ آدمی رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام لائے۔ مدینہ کی آب و ہوا انھیں راس نہ آئی اور بیمار پڑ گئے تو رسول اللہؐ نے صحت کی غرض سے انھیں نواحِ قبا میں اس چراگاہ کی طرف بھیج دیا' جہاں آپ کے اونٹ چرائے جاتے تھے۔ وہ لوگ وہاں رہے یہاں تک کہ تندرست اور فربہ ہو گئے۔ اس کے بعد ان کی نیت اچانک خراب ہوئی چنانچہ ایک دن سرکاری چرواہے یعنی رسول اللہؐ کے آزاد کردہ غلام یسار کو پکڑا اس کی آنکھوں میں گرم سلائی پھیری' بے رحمانہ طریقے سے اس کے ہاتھ پیر کاٹ کر قتل کیا اور رسول اللہؐ کی اونٹنیاں ہنکا کر لے گئے[۱۲۸]۔

یہ واقعہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے بڑا عجیب و غریب تھا کیونکہ بیک وقت ارتداد، ڈاکہ، قتل، محاربہ اور بے رحمانہ سلوک کے جرائم کا ارتکاب کیا گیا تھا اور گویا عین دار الحکومت مدینہ میں جہاں امن و انتظام قائم کرنے کی ذمہ داری رسول اللہؐ نے لے رکھی تھی وہاں امن و امان خراب کرنے کے علاوہ اس نظامِ صالح کو بھی مجروح کرنے کی کوشش کی گئی جسے قائم کرنا رسول اللہؐ کے فرائض میں داخل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہؐ نے اس کا فوری نوٹس لیا اور ان کو قرار واقعی سزا

دینے کے لئے پہلے تو ۲۰ سواروں کے ساتھ کرز بن جابر الفہری کو تعاقب میں بھیج کر گرفتار کرایا اور اس کے بعد قصاص عادل کا حکم دیا۔ چنانچہ آپ کے حکم کی تعمیل میں ان کے بھی ہاتھ پیر کاٹے گئے، آنکھوں میں سلائیاں پھیری گئیں اور پھر وہیں سُولی پر لٹکا دیا گیا تاکہ دوسروں کو عبرت ہو۔[۱۲۹]

ابنِ سعد کے بیان کے مطابق[۱۳۰] قرآن کی یہ آیت اسی موقع پر نازل ہوئی تھی کہ:

انما جزآء الذین یحاربون اللہ و رسولہ و یسعون فی الارض فساداً ان یقتلوا او یصلبوا او تقطع ایدیھم و ارجلھم من خلاف او ینفوا من الارض۔[۱۳۱]

(جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں اور زمین میں اس لئے دوڑ بھاگ کرتے ہیں کہ فساد برپا کریں ان کی سزا یہ ہے کہ قتل کئے جائیں یا انھیں سُولی دے دی جائے یا ان کے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ ڈالے جائیں یا انہیں جلاوطن کر دیا جائے)

یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ مذکورہ لٹیروں کے تعاقب میں آپ نے جو دستہ روانہ کیا تھا اس کی قیادت کرز بن جابر الفہری کے سپرد تھی جو ایک زمانے میں اسلام لانے سے قبل خود بھی اسی قسم کا مظاہرہ کر چکے تھے اور ڈاکہ زنی اور ڈاکوؤں کے اسرار و رموز سے بہمہ وجوہ واقف تھے۔ اس لحاظ سے اس خاص مہم کے لئے ان کا انتخاب رسول اللہؐ کی بہترین انتظامی صلاحیت اور گہرے نفسیاتی مطالعہ دونوں پر صریح دلالت کرتا ہے۔

(ب) ریاست نبویؐ کی توسیع و ترقی کی راہ میں اب جو طاقتیں سنگِ گراں بنی ہوئی تھیں ان کے خاتمے کی غرض سے رسول اللہؐ نے یہ حکمتِ عملی اختیار کی کہ اوّل تو ان کو آپس میں متحد ہونے کا کوئی موقع نہ دیا جائے اور پھر ان سے علیحدہ علیحدہ طور پر نمٹ لیا جائے۔ تاریخی اعتبار سے اندرونِ عرب ریاست کی قابلِ ذکر مخالفانہ طاقتیں تین تھیں، ایک مشرکینِ مکّہ، دوسرے یہود اور تیسرے قبائلِ عرب۔ خصوصاً اس علاقے کے قبائل جو مدینہ کے شمال مشرق، جنوب مشرق اور مکّہ کی جانب جنوب مغرب میں آباد تھے۔ اور جن کی ہمدردیاں یہودِ خیبر اور مشرکینِ مکّہ میں باہم تقسیم تھیں یا دونوں کے لئے یکساں تھیں۔ غزوۂ احزاب کے موقع پر یہی تینوں طاقتیں مل کر مدینہ پر حملہ آور ہوئی تھیں۔ ان طاقتوں کو اگرچہ اس موقع پر ناکامی ہوئی تھی اور اس نے ان کے وقار کو بہت سخت صدمہ پہنچایا تھا نیز یہ تمام عناصر ایک دوسرے سے بڑی دل شکستگی اور بیزاری کی حالت میں منتشر ہوئے تھے لیکن اس کے باوجود الکفر ملّۃ و احدۃ کے مصداق کسی موقع پر ان کے دوبارہ متحد ہو جانے کے امکان کو نظر انداز نہ کیا جا سکتا تھا۔[۱۳۲] لہٰذا مسئلہ یہ تھا کہ ان طاقتوں کو باہم ملنے سے روکنے کی تدبیر کیا کی جائے اور ان تینوں میں سے پہلے کس سے نبرد آزما ہوا جائے۔

غزوۂ احزاب اور صلح حدیبیہ کے درمیانی عرصہ میں رسول اللہؐ کا عرب کے جن قبائل سے مسلسل سابقہ پیش آیا اور ان کے ساتھ جو معاملہ کیا گیا اس کا اندازہ ان مہمات سے لگایا جا سکتا ہے جن کا ذکر گزشتہ صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ ان کارروائیوں میں اگرچہ صدفی صد کامیابی اس معنیٰ میں نہیں ہو سکی کہ دشمن کو بہر صورت مغلوب کر دیا جاتا کیونکہ بعض مواقع پر ایسا ہوا کہ دشمن

مقابلہ کی تاب نہ لاکر فرار ہوگیا یا اسلامی لشکر مختلف موانعات کی بنا پر اپنا گوہرِ مقصود حاصل نہ کرسکا۔ لیکن یہ بات بہرحال طے ہے کہ ان سرگرمیوں سے یہ ثابت ہوگیا کہ قبائل عرب سخت پریشان ہیں اور ان کے حوصلے پست ہوچکے ہیں اس لئے ریاست نبوی کو فوری طور پر ان سے کوئی بڑا خطرہ متوقع نہیں تھا نیز ان سے فیصلہ کن معرکہ کو موخر بھی کیا جا سکتا تھا۔

دوسری بڑی طاقت یہود کی تھی ان کی اگرچہ متعدد بستیاں تھیں لیکن مرکزی طاقت خیبر میں مرکوز تھی۔ مدینہ سے نکلنے والے یہود بنی قینقاع اور بنی نضیر کی ایک بڑی تعداد بھی یہیں آ بسی تھی۔ ان میں سب سے زیادہ فعّال یہود بنو نضیر تھے جو نہ صرف یہود خیبر بلکہ ہمسایہ عرب قبائل میں بھی اپنے سرمایہ دارانہ اثرات ڈال کر ریاست نبوی کے خلاف جذبات مسلسل ابھارا کرتے تھے غرض خیبر یہودی طاقت کا سب سے بڑا گڑھ، ریاستِ نبویؐ کے خلاف ایک نہایت ہی فعال اڈہ اور جنگی سازشوں کا مرکز تھا۔

اس دوران رسول اللہؐ دوسرے محاذوں پر بہت مصروف رہے لیکن یہودیوں کی طرف سے بھی غفلت نہیں برتی چنانچہ ان کا زور توڑنے کے لئے آپ نے پہلے تو رمضان ۶ھ میں حضرت عبد اللہ بن عتیک کی سرکردگی میں ایک سریہ بھیج کر رئیس خیبر ابو رافع سلام بن ابی الحقیق کو اس کے کیفر کردار تک پہنچا دیا۔[۱۳۳] اس کا قتل یہود خیبر کے لئے غیر معمولی نقصان تھا لیکن اس وار کو وہ سہہ گئے اور پھر اپنا امیر اسیر بن زارم کو بنا لیا وہ بھی ریاستِ نبوی کے خلاف سرگرم ہوگیا اور عرب قبائل خصوصاً غطفان وغیرہ سے سازش کر کے مدینہ پر حملہ کرنے کے منصوبے بنانے لگا۔[۱۳۴] آنحضرت کو اطلاع ملی تو تحقیقِ حال کے بعد عبد اللہ بن رواحہ کی کمان میں تیس آدمیوں کا ایک دستہ اسیر کی فہمائش اور اسے راہِ راست پر لانے کی غرض سے شوال ۶ھ میں خیبر روانہ کیا۔ اسیر ملاقات کے بعد رسول اللہؐ کے پاس آنے کے لئے آمادہ ہوکر عبد اللہ کے ساتھ چل بھی دیا لیکن راستہ میں اس نے ایک مسلمان مجاہد (عبد اللہ بن انیس) کی تلوار چھیننے کی ناکام کوشش کی۔ تلوار پر قبضہ کرنے کی کوشش نیتِ قتل پر صاف دلالت تھی چنانچہ اسیر بن زارم اور اس کے بیشتر ساتھی مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہوئے۔[۱۳۵] اسیر اور اس کے ساتھیوں کے قتل سے یہودیوں پر جو افتاد آپڑی تھی اس سے سنبھلنے کے لئے اور مدینہ پر حملہ کا نئے سرے سے منصوبہ بنانے میں کچھ نہ کچھ وقت کا لگنا فطری تھا۔ رسول اللہؐ نے اسی مختصر سی مہلت سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ کچھ ہی روز بعد ذی قعدہ کا مہینہ شروع ہونے والا تھا جو اہل عرب کے نزدیک حرام مہینہ تھا۔ گویا ذی الحجہ اور ذی قعدہ دو ماہ کا عرصہ التوائے جنگ کا از خود سبب بن گیا اور ٹھیک اسی زمانہ میں قبائل عرب اور یہود خیبر کی طرف سے تمام اندیشوں سے بے نیاز ہوکر رسول اللہؐ نے حرم مکّہ کا رُخ کیا جہاں صلح حدیبیہ کا عظیم الشان واقعہ ظہور پذیر ہوا۔

صلح حدیبیہ کا واقعہ مختصراً یہ ہے کہ شوال ۶ھ میں ایک اشارہ خداوندی (خواب) کی تعمیل میں رسول اللہؐ نے زیارت کعبہ کے لئے مکّہ روانگی کا فیصلہ کیا[۱۳۶] اور اس کا اعلانِ عام بھی کر دیا کہ جو ساتھ چلنا چاہے ہے کاروانِ زیارت میں شامل ہو جائے۔[۱۳۷] اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تقریباً چودہ سو افراد اس سفرِ سعادت میں آپ کے ہمراہ ہوگئے۔[۱۳۸] قریشِ مکّہ کو یہ یقین دلانے کے لئے کہ مسلمانوں کا ارادہ لڑائی جھگڑے کا نہیں صرف زیارت اور عمرہ کا ہے۔ آپ کے حکم سے سب نے ذو الحلیفہ (مدینہ) سے ہی احرام باندھا،[۱۳۹] قربانی کے جانور ساتھ لئے، نیام کی ہوئی تلوار کے سوا کوئی ہتھیار نہ لیا اور ماہ ذی قعدہ میں مکّہ کی جانب

روانہ ہوئے[۱۴۰]۔ تمام صلح جویانہ تدابیر کے باوجود قریشِ مکہ کو آپ کی آمد سخت ناگوار ہوئی اور انہوں نے جمع ہو کر یہ طے کیا کہ آنحضرت یا کسی اور مسلمان کو حدودِ حرم میں داخل نہ ہونے دیا جائے۔ اس کے لئے وہ مرنے مارنے پر تیار ہو گئے۔ یہی نہیں بلکہ انھوں نے باقاعدہ سوار فوج خالد بن ولید کی سرکردگی میں کراع الغمیم کی طرف بھیج دی[۱۴۱]۔ آنحضرت کو ان باتوں کی اطلاع عسفان کے مقام پر ملی[۱۴۲]۔ لہذا آپ نے مکہ کا عام راستہ چھوڑ کر ثنیۃ المرار کی راہ اختیار کی اور دشوار گذار راستے سے ہو کر حدیبیہ پہنچ گئے[۱۴۳]۔ اسی مقام پر آپ کے اور قریش مکہ کے درمیان متعدد سفارتوں کے تبادلے اور مذاکرات کے بعد بالآخر ایک تحریری معاہدہ مرتب ہوا[۱۴۴]، جسے صلح حدیبیہ کہتے ہیں۔

بادی النظر میں یہ واقعات بہت زیادہ اہم نہیں معلوم ہوتے لیکن فی الحقیقت اس صلح کے اتنے گہرے مذہبی، سیاسی، عسکری اور تہذیبی و تمدنی اثرات رُونما ہوئے جس نے اسے آئندہ کی تاریخ میں ایک لازوال مقام عطا کیا۔ اس کا جائزہ لینے کے لئے ہمیں اس واقعہ کی بعض تفصیلات اور چند دوسرے پہلوؤں پر بطورِ خاص نگاہ ڈالنی ہوگی۔

سب سے پہلی قابلِ غور بات رسول ؐ اللہ کی عمرہ کی نیت اور اس کا اعلان عام ہے۔ کسی بھی مہم پر روانگی کے ضمن میں رسولؐ اللہ کا بالعموم طریقہ یہ تھا کہ منزلِ مقصود کے تعین کو مبہم رکھتے تھے اور ظاہر ہے کہ اس طریقہ کار میں جہاں بہت سی حکمتیں ہیں اسی طرح اس موقع پر آپ کا عام منادی کرانا اور منزلِ مقصود کا تعین بھی معنی خیز ہے۔ تاریخی روایات سے اندازہ یہ ہوتا ہے کہ اس اعلان نے مسلم اور غیر مسلم عناصر پر متضاد اور نمایاں اثرات مرتب کئے۔ رسولؐ اللہ اور مسلمانوں کا معاملہ تو یہ تھا کہ حرمِ مکہ ان کا قبلہ تھا اور تحویلِ قبلہ[۱۴۵] کے بعد سے تو بیت اللہ سے مذہبی اور قلبی لگاؤ شوق کی تمام حدود کو عبور کر چکا تھا کہ وہ اب ان کی تمام سعی و کاوش اور جدوجہد کا مرکز، حرکت و عمل کا منتہا، ان کی تمناؤں کا محور اور قبلۂ مقصود تھا۔ اس لئے ایک طرف خواب زیارت نے رسولؐ اللہ کی آتشِ شوق کو بھڑکا دیا اور ان کو گویا مکہ کی جانب کوچ کرنے کا اشارہ دے دیا اور آپ بغیر کسی توقف کے امتثالِ امر میں نکل کھڑے ہوئے تو دوسری طرف وفورِ شوق میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد بھی شرفِ ہم رکابی کے لئے تیار ہو گئی۔ دوسری جانب عمرہ و زیارت کا یہ اعلان منافقین اور اعراب پر بجلی بن کر گرا۔ اعلان کے مطابق یہ لوگ بھی شریکِ کارواں ہو سکتے تھے لیکن کانما یساقون الی الموت[۱۴۶] (گویا موت کے مُنہ میں ہنکائے جا رہے ہیں) کے مصداق ان کی ایک بڑی تعداد نے اس سفر پر جانے کو موت کے منہ میں جانے سے تعبیر کرتے ہُوئے کنارہ کشی اختیار کی۔ بل ظننتم ان لن ینقلب الرسول والمؤمنون الیٰ اھلیھم ابداً و زین ذٰلک فی قلوبکم و ظننتم ظن السوء وکنتم قوماً بوراً[۱۴۷]۔ (بلکہ تم نے یُوں سمجھا کہ رسول اور ان کے ہمراہ مومنین اپنے گھر والوں میں کبھی لوٹ کر نہ آئیں گے اور یہ بات تمہارے دلوں کو اچھی بھی معلوم ہوتی تھی اور تم نے بڑی بدگمانی کی اور تم برباد ہونے والے لوگ ہو گئے)

حقیقت یہ ہے کہ اعراب و منافقین کے یہ خدشات بے وجہ نہ تھے دوسرے ظاہر پرستوں کی طرح وہ لوگ بڑی حیرت سے یہ دیکھ رہے تھے کہ آنحضرت یہ قدم اس وقت اٹھا رہے ہیں جبکہ ریاست نبوی کے لئے خطرات ہی خطرات ہیں۔ اور مدینہ کے چاروں طرف اس کے دشمنوں کے مسکن موجود ہیں پھر سفر بھی قریش مکہ کی سرزمین کا درپیش ہے جن سے کچھ بعید نہیں کہ

اشہرِ حرم کی تمام حرمت کو بالائے طاق رکھ کر اپنے علاقے میں آئے ہوئے (دشمن) کو واپس نہ جانے دیں[۱۴۸]" اس صورتِ حال میں سفرِ مکہ میں شرکت منافقین کے نزدیک اپنے آپ کو خواہ مخواہ ہلاکت میں ڈالنے کے مترادف تھی۔ اعراب و منافقین کے اس طرزِ فکر کی تصدیق قرآن کے متعدد ارشادات سے بھی ہوئی ہے جن کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ لوگ صرف اپنے مفاد کی پرستش کرنے والے تھے اسی لئے سورہ فتح میں مذکورہ بالا آیت سے متصلاً یہ فرمایا کہ:

سیقول لك المخلفون اذا انطلقتم الی مغانم لتاخذوھا ذرونا نتبعکم[۱۴۹]۔

(جو لوگ پیچھے رہ گئے تھے وہ عنقریب جب تم (خیبر کی) غنیمتیں لینے چلو گے کہیں گے کہ ہم کو بھی اجازت دو کہ ہم تمہارے ساتھ چلیں)

غرض ان ہی وجوہ سے اعراب و منافقین نے بالعموم خاموش تماشائی بنے رہنے اور کنارہ کش رہنے میں زیادہ عافیت محسوس کی۔

عمرہ کے لئے رسولؐ اللہ کے اعلان نے قریش کو بھی سخت امتحان میں ڈال دیا اور ایک جدید العہد مصنّف کے بقول ان پر پروپیگنڈے کی زبردست جنگ مسلط کر دی[۱۵۰]۔ قریش کے لئے مشکل یہ تھی کہ اگر وہ قافلہ رسول کو بیت اللہ کی زیارت سے روکتے ہیں تو پورا عرب اسے دیکھ لے گا اور ہر ایک کہہ اُٹھے گا کہ یہ سراسر زیادتی ہے۔ اس سے ہر قبیلہ تشویش میں مبتلا ہو جائے گا کہ نہ معلوم اس کو کب حرمِ کعبہ کے داخلہ سے محروم کر دیا جائے۔ اگر جنگ کرتے ہیں تب بھی یہ بات مشتہر ہوتی ہے کہ قریش نے ذی قعدہ کے حرام مہینہ کا احترام خاک میں ملا دیا جو صدیوں سے حج و زیارت کے لئے متبرک و محترم سمجھا جاتا ہے اور اگر رسولؐ اللہ کو اتنے بڑے قافلے کے ساتھ شہرِ مکہ میں بخیریت داخل ہونے دیتے ہیں تو پورے ملک میں قریش کا رعب و دبدبہ ختم اور اس کی ہوا اکھڑ جائے گی۔ چنانچہ قریش کے اس ذہنی ردِ عمل اور کشمکش کی جھلک بعد کے واقعات میں صاف نظر آتی ہے۔ اسی کشمکش کی بنا پر ان کے زعماء کو کسی ایک نتیجہ پر پہنچنے اور آخری فیصلہ کرنے میں ہفتوں لگ گئے[۱۵۱]۔

مختصراً رسولؐ اللہ کے اعلان پر ردِ عمل کی یہ مختلف لہریں تھیں جو مختلف سمتوں سے اُبھر رہی تھیں۔ ان حالات میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ رسولؐ اللہ کا عمرہ کے لئے روانگی کا اعلان غیر معمولی نوعیت کا تھا اور پھر بحالتِ احرام اور سر بکف ہو کر دشمن کے علاقے میں جانا رسولؐ اللہ کی سیاسی و عسکری ذہانت، تدبّر، معاملہ فہمی، دُور اندیشی، بے جگری، بے خوفی، قائدانہ بصیرت، ہمت و حوصلہ، دلسوزی و پرسوزی اور نگاہِ بلند پر بہت بڑی شہادت فراہم کرتا ہے۔

تاریخی واقعات کے مطالعہ سے اندازہ یہ ہوتا ہے کہ رسولؐ اللہ کسی اندیشہ ہائے خام میں مبتلا نہیں تھے۔ بلا خوف و خطر آپ کی پیش قدمی اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ آپ کو قریش کی اصل حالت کا پوری طرح علم تھا اور آپ کی نگاہ دور رس زمانے کی رفتار کو اچھی طرح جانچ رہی تھی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ دورانِ سفر عسفان کے مقام پر بشر ابن سفیان الکعبی[۱۵۲] ملا اور اس نے کہا:

"یا رسولؐ اللہ! قریش آپ کی آمد کی اطلاع پا چکے ہیں۔ عورتوں بچوں سمیت نکل آئے ہیں۔ چیتے کی کھالوں میں

ملبوس ہیں۔ ذی طویٰ میں اپنے ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں۔ اور انہوں نے یہ عہد کر لیا ہے کہ آپ کو ہرگز داخل نہ ہونے دیں گے۔ اور سواروں کے رسالے کو خالد بن ولید کی کمان میں کراع الغمیم کی طرف بھیج دیا ہے۔"(۱۵۳)

اور کتاب الخراج کی روایت کے مطابق اسی مقام پر بنی کعب کے چند افراد نے یہ اطلاع دی کہ:

"یا رسول اللہ! ہم دیکھ کر آ رہے ہیں کہ قریش نے اپنے احابیش کو جمع کر لیا ہے اور انہیں خزیر کھلا رہے ہیں۔ ان کا ارادہ یہ ہے کہ آپ کو بیت اللہ جانے سے روک دیں۔"(۱۵۴)

لیکن ان اطلاعات کی بنا پر نہ تو رسول اللہ پر ایک لمحہ کے لئے بھی رعب طاری ہوا اور نہ آپ کے عزم میں فرق آیا بلکہ اس موقع پر آپ نے جو کچھ ارشاد فرمایا وہ آپ کی بے باکی اور بے پناہ قائدانہ صلاحیت، جرأت اقدام اور مخالف کی نفسیاتی کیفیت کا پوری طرح اندازہ کر لینے کو ظاہر کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ:

یا ویح قریش لقد اکلتھم الحرب ماذا علیھم لو خلوا بینی و بین سائر العرب، فان ھم اصابونی کان ذلک الذی ارادوا، وان اظہرنی اللہ علیھم دخلوا فی الاسلام و افرین، و ان لم یفعلوا قاتلوا وبھم قوۃ، فما تظن قریش، فواللہ لا ازال اجاھد علی الذی بعثنی اللہ بہ حتی یظھرہ اللہ او تنفرد ھذہ السالفۃ۔(۱۵۵)

(قریش کا برا ہو (کہ راستہ روکتے ہیں!) جنگوں نے ان کا کچومر نکال دیا ہے۔ ان کا کیا حرج ہے کہ وہ بیچ میں سے ہٹ جائیں اور مجھے اور پورے عرب کو نمٹ لینے دیں۔ اگر عرب مجھے ختم کر دیں تو قریش کی مراد بر آئے گی اور اگر اللہ نے مجھے عربوں پر غلبہ عطا کر دیا تو ایسی صورت میں اگر قریش چاہیں تو جوق در جوق اسلام میں داخل ہو جائیں ورنہ وہ قوت رکھتے ہیں، اس وقت لڑ لیں (اور اگر یہ بھی پسند نہیں تو پھر) قریش میرے متعلق کس مغالطہ میں ہیں؛ خدا کی قسم میں اس حق کو لے کر جس کے ساتھ مجھے خدا نے مبعوث کیا ہے آخر دم تک لڑوں گا یہاں تک کہ یا تو اس حق کو خدا غالب کر دے یا میری گردن کٹ جائے)۔

آنحضرتؐ کے اس ارشاد کی تہہ میں اہل مکہ کے لئے رحم و خیر خواہی کا ایک سیل رواں موجزن ہے۔ چاہے اس کی وجہ یہ ہو کہ مکہ میں رسول اللہ اور دیگر مسلمانوں کے اعزہ و اقارب موجود تھے اور ان کے بارے میں یہ توقع ہو سکتی تھی کہ اپنی کج روی سے باز آ جائیں یا دوسرے الفاظ میں اہل مکہ کی تباہی سے زیادہ ان کا اسلام مفید ہو سکتا تھا اور ان کا اسلام اہل عرب پر بھی یقیناً اثر انداز ہو سکتا تھا۔ نیز خواہ اس کی وجہ اشہر حرم اور بیت اللہ کی حرمت و محبت ہو، اور خواہ اس میں یہ حکمت ہو کہ اگر قریش دشمنی سے دست کش ہو جائیں تو دوسرے دشمنوں سے نمٹنا آسان ہو گا اور چاہے اپنے مقصد یعنی اعلائے کلمۃ الحق پر یقین کامل کا اظہار چاہتے ہوں۔ بہر حال یہ بات یقینی ہے کہ رسول اللہ نے تمام اہم اور پیچیدہ معاملات کی عقدہ کشائی کے لئے جنگ کے بجائے امن کی راہ اختیار کی اس لئے اصولاً یہ ارشاد فرمایا تھا کہ صلح آپ کو ہر چیز سے زیادہ عزیز ہے۔(۱۵۶) نیت بھی عمرہ کی تھی (جس پر پورا عرب شاہد تھا) مسلح بھی نہ تھے، قریش سے فوری تصادم

سے بچنے کے لئے حدیبیہ پہنچنے کا راستہ بھی بدل دیا تھا (۱۵۷) ۔ حدیبیہ کے قریب اونٹنی کے بیٹھ جانے پہ یہ مدعا ظاہر کیا تھا کہ آج اہلِ مکہ انسانیت کی بھلائی کے لئے مجھ سے جس شرط کا مطالبہ کریں گے میں اسے تسلیم کر لوں گا (۱۵۸) قریش کے سفراء (مثلاً عروہ بن مسعود) کی گستاخیوں پر بھی ضبط و تحمل سے کام لیا تھا (۱۵۹) یہاں تک کہ جب قریشِ مکہ کا ایک دستہ معسکرِ رسول کا چکر لگانے اور موقع ملنے پر کسی صحابی یا خود رسولؐ اللہ پر ہاتھ صاف کر لینے کی ہدایت لے کر آیا بلکہ اس نے کچھ تیر برسائے اور سنگ باری بھی کی تھی تب بھی آپ نے ان کی یہ شرارت برداشت کر لی اور پھر صلح کی آخری کوشش کی علامت کے طور پر گرفتار ہونے والوں کو معاف کر کے آزاد کر دیا (۱۶۰) علاوہ ازیں اپنے سفیروں کو بھیج کر بھی قریش کو بار بار یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ مسلمانوں کا ارادہ قطعاً مسالمانہ ہے اور وہ جنگ کے ارادے سے یہاں نہیں آئے ہیں چنانچہ بدیل بن ورقاؓ نے قریش سے جا کر یہ کہا تھا کہ "تم لوگ عجلت سے کام لے رہے ہو محمد قتال کے لئے نہیں آئے، زیارت کے لئے آئے ہیں" (۱۶۱) اور حضرت عثمان کے ذریعہ جو پیغام یا خط (۱۶۲) رسولؐ اللہ نے قریش کے نام بھیجا تھا اس سے بھی مقصود ان کی فہمائش تھی اور مدعا یہی تھا کہ آپ کی آمد جنگ کے لئے ہرگز نہیں ہے بلکہ خاص زیارتِ بیت اللہ کے لئے ہے (۱۶۳) اسی خواہش کا اظہار آپ بمقام عسفان بشر بن سفیان الکعبی (۱۶۴) ، بدیل بن ورقاؓ (۱۶۵) ، مکرز بن حفص (۱۶۶) اور عروہ بن مسعود ثقفی (۱۶۷) کے سامنے بھی فرما چکے تھے ۔ تمام لوگوں سے ایک ہی قسم کی بات کہنے کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ رسولؐ اللہ امن و عافیت کے سب سے زیادہ متمنی تھے اور اپنے مقصدِ زیارت کو بار بار موکد کر رہے تھے ۔

بہر صورت رسولؐ اللہ کی ان تمام صلح جویانہ تدابیر کے باوجود بھی جب قریش کی شر پسند طبیعت نے حضرت عثمان کو مکہ میں روک لیا اور یہ خبر مشہور ہو گئی کہ ان کو شہید کر دیا گیا ہے (۱۶۸) تو آپ کا پیمانۂ صبر چھلک اٹھا ۔ اس خبر کو تسلیم کر لینے کی ایک معقول وجہ یہ بھی تھی کہ حضرت عثمان سے پہلے رسولؐ اللہ نے اپنے ایک سفیر خراش بن امیہ الخزاعی کو قریش کے پاس بھیجا تھا تو ان کے ساتھ یہ سلوک کیا گیا تھا کہ اشرافِ قریش نے ان کے اونٹ کی کوچیں کاٹ ڈالیں اور خود خراش کے قتل کا بھی ارادہ کر لیا لیکن احابیش کی مداخلت سے ان کی جان بچ گئی اور وہ رسولؐ اللہ کے پاس واپس آ گئے (۱۶۹) ظاہر ہے کہ جو لوگ ایک دفعہ اس قسم کی حرکت کر چکے تھے ان سے دوبارہ اسی قسم کا سلوک غیر متوقع نہ تھا ۔ لہٰذا حضرت عثمان کی خبرِ شہادت ملتے ہی رسولؐ اللہ نے اپنے صحابہ سے جان نثاری و جان سپاری کی وہ بیعت لی (۱۷۰) جو تاریخ میں "بیعت رضوان" کے نام سے مشہور ہے (۱۷۱) ۔ کیونکہ رسولؐ اللہ کے سفیر کا قتل کر دیا جانا آدابِ سفارت کے لحاظ سے بھی ناقابلِ برداشت تھا اور غیرت و حمیت کے خلاف بھی اور آپ کو یہ حکم بھی مل چکا تھا کہ :

ولا تھنوا ولا تدعوا الی السلم وانتم الاعلون واللہ معکم ۔ (۱۷۲)

(اور کمزوری کا اظہار کرتے ہوئے صلح کی طرف نہ بلاؤ حالانکہ تم ہی سب سے بلند ہو اور اللہ تمہارے ساتھ ہے)

اس لئے اس موقع پر کمزوری دکھانے کا مطلب سیاسی شکست سے کم نہ تھا اس لئے رسولؐ اللہ نے لڑنے مرنے اور

اہلِ مکہ کو سزا دینے کا فیصلہ کر لیا۔ کیونکہ اس کا تمام تر جواز قریش خود مہیا کر چکے تھے اور قرآن اس موقع پر رسول اللہؐ کو حرمت پامال کرنے کی اجازت یہ کہہ کر دے چکا تھا کہ:

الشهر الحرام بالشهر الحرام والحرمات قصاص۔[۱۷۳]

(حرمت والا مہینہ، حرمت والے مہینے کے بدلہ میں ہے اور یہ حرمتیں تو عوض معاوضہ کی چیزیں ہیں)

مطلب یہ ہے کہ اشہر حرم کا احترام، احترام کے بدلہ میں ہے یعنی اگر کوئی تم سے ماہ محترم میں جنگ کرے تو تم بھی اس سے جنگ کرو کیونکہ جب اس نے اس کی حرمت کا خیال نہ کیا تو یہ تم پر بھی واجب نہیں ہے۔ اس جواز کے علاوہ قرآن اس بات کی بھی صراحت کر دیتا ہے کہ اگر اس وقت بالفعل جنگ واقع ہو جاتی تو رسول اللہؐ اور مسلمانوں کو یقیناً فتح حاصل ہوتی اور اہلِ کفر کو ذلت و رسوائی کے سوا کچھ نہ ملتا۔ الفاظ یہ ہیں کہ:

ولو قاتلكم الذين كفروا لولوا الادبار ثم لا يجدون ولياً ولا نصيرا۔[۱۷۴]

(اور اگر تم سے یہ کافر لڑتے تو ضرور پیٹھ پھیر کر بھاگ جاتے۔ پھر نہ ان کو کوئی دوست ملتا نہ مددگار)

بہت ممکن ہے کہ قریش نے حضرت عثمانؓ کی شہادت کی خبر کو محض رسول اللہؐ اور مسلمانوں کا ردِ عمل دیکھنے کے لئے اڑائی ہو یا اس کی وجہ کوئی اور ہو۔[۱۷۵] بہرصورت جب ان تک بیعتِ رضوان کی اطلاع پہنچی اور انہیں رسول اللہؐ کے عزمِ صمیم کا پتہ چل گیا تو آخر کار وہ صلح پر آمادہ ہو گئے[۱۷۶] اور انھوں نے سہیل بن عمرو کو یہ اختیار دے کر بھیجا کہ:

ائت محمداً فصالحه ولا يكن في صلحه الا ان يرجع عنا عامه هذا، فوالله لا تحدث العرب عنا انه دخلها علينا عنوة ابدا۔[۱۷۷]

(تم محمد کے پاس جاؤ اور ان سے مصالحت کرو، لیکن یہ یاد رکھنا کہ یہ اس شرط کے بغیر نہ ہو کہ وہ اس سال یہاں سے واپس چلے جائیں ورنہ خدا کی قسم عرب باتیں بنائیں گے کہ وہ بزور داخل ہوئے تھے)

گویا اس موقع پر بھی قریش کوئی سیاسی یا حربی فائدہ حاصل نہ کر سکے اور ہر دو قسم کی کامیابی رسول اللہؐ کے حصہ میں آئی اور اس طرح فریقین کے صلح پر آمادہ ہو جانے سے ایک فیصلہ کن جنگ ٹل گئی۔ یہاں یہ بتانا بے محل نہ ہوگا کہ قرآن نے یہ تصریح کی ہے کہ جنگ کی صورت میں اہلِ مکہ کا نقصان بہت زیادہ ہوتا لیکن خونریزی کی وجہ سے کفار کے علاوہ ان اہلِ ایمان کو بھی گزند پہنچنے کا احتمال تھا جنہوں نے اپنے ایمان و اسلام کو ظاہر نہیں کیا تھا۔[۱۷۸]

اب دوسرا اہم اور قابلِ غور مسئلہ یہ ہے کہ ان شرائط و دفعات کا مطالعہ کیا جائے جو فریقین یعنی رسول اللہؐ اور قریش کے وکیل سہیل بن عمرو کے درمیان طے پائیں۔ یہاں اصل عبارت یا متن کو نقل کرنے کے بجائے بہتر ہوگا کہ صلح نامہ حدیبیہ کی مرکزی دفعات کو مختلف مآخذ کی روشنی میں بیان کر دیا جائے۔ ان کو ہم اس طرح پیش کر سکتے ہیں:

(۱) اوّل یہ کہ —— (اس مرتبہ) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اہلِ مکہ نے جہاں (حدیبیہ میں) روک دیا ہے۔ وہ قربانی کے جانور وہیں حلال کر دیں۔ اور نہ تو مکہ میں داخل ہوں، نہ (خانہ کعبہ کا) طواف کریں۔[۱۷۹]

(۲) دوم یہ کہ —— فریقین نے اس بات پر صلح کر لی ہے کہ جنگ اس سال تک کے لئے روک دی جائے۔[۱۸۰] اور اس دوران لوگ امن و امان کی زندگی گزاریں۔ اور ایک دوسرے (پر اقدام) سے رُکے رہیں۔[۱۸۱]

(۳) سوم یہ کہ —— قریش میں سے جو آدمی اپنے ولی (یا سرپرست) کی اجازت کے بغیر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس جائے گا تو وہ اسے واپس کر دیں گے۔ اور اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے آدمیوں میں سے کوئی قریش کے پاس آجائے تو وُہ اسے واپس نہیں کریں گے۔[۱۸۲]

(۴) چہارم یہ کہ —— باہم کینے ہر طرح بند رہیں گے۔ اور اس سلسلے میں نہ تو خفیہ بد عہدی ہوگی اور نہ کھلی خیانت کا ارتکاب کیا جائے گا۔

(۵) پنجم یہ کہ —— جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے معاہدہ اور ذمہ داری میں داخل ہونا چاہے، وہ ایسا کر سکتا ہے۔ اور جو قریش کے معاہدے اور ذمّہ داری میں داخل ہونا چاہتا ہے وہ بھی ایسا کر سکے گا۔[۱۸۴]

(۶) ششم یہ کہ —— آپ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اس سال واپس (مدینہ) چلے جائیں اور ہمارے یہاں مکہ میں نہ داخل ہوں۔ ہاں آئندہ سال آئیں گے تو ہم آپ کے لئے (مکّہ سے) نکل کر باہر چلے جائیں گے۔ پھر آپ اپنے ہمراہیوں کے ساتھ مکہ میں داخل ہوں اور تین دن قیام کر لیں۔ اور اس وقت آپ کے پاس صرف ایک مسافر کا ہتھیار (یعنی تلوار) ہونی چاہیے اور وُہ بھی نیام میں ہو۔ دُوسری صورت میں داخلہ ممکن نہ ہوگا۔[۱۸۵]

(۷) ہفتم یہ کہ —— (مسلمانوں میں سے) جو کوئی حج یا عمرہ کے ارادے سے یا یمن یا طائف جاتے ہُوئے مکہ سے گزرے تو اسے امان حاصل ہوگا۔ اور مشرکوں میں سے جو کوئی شام یا مشرق (عراق) جانا چاہے گا تو اسے بھی امان حاصل ہوگا۔[۱۸۶]

مندرجہ بالا دفعات کے ظاہری اسلوب سے معلوم ہوتا ہے کہ قریش نے اپنی ضد پُوری کر لی اور وُہ اپنے منصوبہ کے مطابق رسولؐ اللہ کو حرم کعبہ میں داخل ہونے سے روکنے میں بھی کامیاب ہو گئے نیز اپنے اصرار کے بموجب انہوں نے معاہدہ کے متن سے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اور محمد رسول اللہ حذف کرا کے بالترتیب باسمك اللّٰھم اور محمد بن عبداللہ لکھوا لیا۔[۱۸۷] اور دوسری دفعات بھی حسب منشا مرتّب ہوئیں۔ اپنی دانست میں انہوں نے اسے بڑی کامیابی خیال کیا اور شرائطِ صلح کی معنویت اور اطلاقات پر غالباً وہ اس لئے غور نہ کر سکے کہ جذباتی طور پر مغلوب تھے اور شاید ابوسفیان[۱۸۸] اور دوسرے زعما کی باہم مشورت میں بھی صرف اسی رُخ پر گفتگو ہُوئی کہ کسی طرح رسولؐ اللہ اور مسلمانوں کو حرم میں داخلہ سے روک دیا جائے کیونکہ "پُورے عرب کی نگاہوں میں رُسوا ہونے سے وہ اسی صورت میں بچ سکتے تھے"۔[۱۸۹] شرائطِ صلح کی ترتیب و تبویب کے وقت مسلمانوں میں سے بھی بعض افراد نے اسے قبول کرنے میں سخت تامل کیا کیونکہ اس کا مضمون غیرتِ ایمانی کے خلاف نظر

آتا تھا اور حضرت ابُوجندل کا واقعہ بطور پس منظر موجود تھا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے اس کا اظہار بھی بڑی بے باکی سے کر دیا تھا۔[۱۹۰] لیکن رسولؐ اللہ کی طرف سے جواب یہ تھا کہ:

انا عبد اللہ و رسولہ لن اخالف امرہ و لن یضیعنی۔[۱۹۱]

(میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہُوں۔ میں اس کے حکم کی خلاف ورزی کسی حال میں نہیں کر سکتا۔ اور نہ وہ کسی صورت میں مجھے ضائع ہونے دے گا)

آپ کا یہ جواب صرف وقتی تسلی و تشفی کے لئے یا واجبی نہ تھا بلکہ بعد میں ہونے والے واقعات اور تاریخ نے بھی یہ ثابت کر دیا کہ اللہ کے رسول اور اس کے بندے نے جس دُور اندیشی سے بازی کو پلٹ دیا وہ بلا شبہ سیاست نبویؐ کا بہت بڑا اعجاز ہے چنانچہ حدیبیہ سے مدینہ کی جانب رُخ موڑا ہی تھا[۱۹۲] کہ وحی الٰہی نے یہ مژدہ سنا دیا کہ:

انا فتحنا لك فتحاً مبینا۔[۱۹۳]

ابن سعد نے بروایت مجاہد ان الفاظِ خداوندی کو " انا قضینا لك قضاءً مبینا "[۱۹۴] کے مترادف قرار دے کر بجا طور پر مدعا کو واضح کر دیا ہے۔ یعنی ہم نے آپ کے لئے کھلا ہوا فیصلہ کر دیا۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اس میں قریش کی قسمت کا فیصلہ ہوگیا اور یہ فیصلہ ہوگیا کہ پرچم فتح اب صرف مسلمانوں کے ہاتھ میں رہے گا۔ براُ ابن عازب کا یہ قول کتنی تاریخی صداقت کا حامل ہے کہ جس کو لوگ فتح مکہ کہتے ہیں ہم تو اسے یوم الحدیبیہ (بیعت الرضوان) کہتے ہیں۔[۱۹۵] (کیونکہ یہی باعث فتح مکہ ہے) اور پھر ایسا ہی ہُوا کہ مسلمان مسلسل پیشقدمی کرتے رہے اور ریاست نبویؐ کے حدود میں بھی انتہائی تیز رفتاری سے اضافہ ہوتا چلا گیا۔

صلح نامہ حدیبیہ کی مذکورہ دفعات میں سے اس دفعہ کو جس میں جنگ کو ایک خاص مدت کے لئے ملتوی کرنے پر اتفاق رائے ہوا، سرسری انداز سے لینا مناسب نہیں۔ اس دفعہ کی رُو سے مسلمانوں کا صلح پر راضی ہو جانا تو بالکل منطقی ہے کیونکہ اس طرح وہ دو مخالف سمتوں میں اپنے طاقتور دشمنوں میں سے ایک کو خاموش کر کے دوسری جانب پُوری توجہ دے سکتے تھے اور واقعہ بھی یہی ہُوا کہ صلح حدیبیہ کے ذریعہ قریش کی تلوار نیام میں چلی گئی تو اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر رسولؐ اللہ نے مدینہ کے شورش پسند غداروں کی سرکوبی کی اور شمال میں یہود کو سرنگوں کر کے ان کے یکے بعد دیگرے تمام مراکز توڑ ڈالے اور ساتھ ہی ساتھ متفرق قبائل کی شوریدہ سری کا بھی خاتمہ کر دیا۔ ان تمام کاموں کے لئے یکسوئی اور وقت کی ضرورت تھی جسے صلح حدیبیہ سے التوائے جنگ کی صورت میں رسولؐ اللہ کو مل گیا۔

البتہ قابلِ غور امر یہ ہے کہ قریش نے اس صلح کو اور ایک خاص مدت تک اپنے سب سے بڑے حریف کو آزاد چھوڑنا کیوں گوارا کر لیا؟ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح قریش سے صلح مسلمانوں کی ایک بڑی ضرورت تھی اسی طرح رسولؐ اللہ سے صلح قریش کی سب سے بڑی ضرورت تھی کیونکہ اس وقت صورتِ حال یہ تھی کہ قریش کی عسکری اور فوجی طاقت کو ناقابلِ اندمال چرکے لگ چکے تھے۔ معیشت کا دامن بُری طرح پارہ پارہ تھا۔ ریاست نبویؐ کی طرف سے تجارتی راستوں پر دباؤ ناقابلِ برداشت حد تک بڑھتا چلا جا رہا تھا۔[۱۹۶] قریش کی معاونت کرنے والے قبائل بھی ریاستِ نبویؐ کے خلاف

منفی کارروائیوں میں ناکام ہو چکے تھے۔ مسلمان اپنی حربی وسیاسی برتری کا ثبوت متعدد بار دے چکے تھے۔ شاید اسی لئے قریش کے سب سے زیادہ بااثر سردار ابوسفیان نے جھنجھلا کر خود رسول اللہ پر اوچھا وار کرنا چاہا اور واقعہ حدیبیہ سے ذرا پہلے ایک آدمی کو لالچ دے کر آنحضرت کو قتل کرنے کے لئے بھیجا لیکن وہ اپنے ارادہ میں ناکام رہا اور پھر رسول اللہ کی طرف سے عمرو بن امیہ الضمری کے ذریعہ جوابی کارروائی (۱۹۷) نے ابوسفیان کی غلط فہمیوں کو دُور کر دیا تھا۔

علاوہ بریں رسول اللہ کی اب تک کی تگ و تاز میں مشرکین، یہود، منافقین اور متعصبین غرض سبھی یہ سمجھ چکے تھے کہ ریاست نبوی کی نوخیز طاقت کو محض ہتھیاروں اور فوجوں کے بل پر شکست نہیں دی جاسکتی اور اس واقعہ حدیبیہ کے سلسلے میں بھی قریش رسول اللہ کی پامردی اور مسلمانوں کا عزم و استقلال متعدد پہلوؤں سے جانچ چکے تھے۔ مثلاً جب خالد بن ولید کی سرکردگی میں کفارِ مکہ کے مقدمۃ الجیش کا رسول اللہ سے آمنا سامنا ہوا تو رسول اللہ کی طرف سے مقابلہ کے لئے عباد بن بشر کی کمان میں بیس سواروں کا ہراول دستہ بھی پوری طرح مستعد تھا[۱۹۸] اور وقتِ ضرورت کے لئے بقول طبری مخزن بھی رسول اللہ کے ساتھ تھا۔[۱۹۹] مسلمانوں کے جوش و جذبہ کا عالم یہ تھا کہ جب حدیبیہ آتے ہوئے ایک مقام پر رسول اللہ نے خطاب کر کے مشورہ طلب کیا اور یہ کہا کہ:

"تم لوگ مجھے مشورہ دو کہ تمہاری کیا رائے ہے۔ تمہاری رائے میں ہمیں سیدھی مکہ کی طرف بڑھنا چاہیئے یا ان لوگوں کی طرف چلیں جو ان کی مدد کر رہے ہیں اور ان کی پیٹھ پیچھے ان کی عورتوں اور بچوں کو جالیں۔ پھر اگر یہ (مکہ میں) بیٹھے رہ جاتے ہیں تو شکست خوردہ ہو کر بیٹھیں گے اور انتقام لیا جا چکا ہوگا۔ اور اگر ہمارا پیچھا کرتے ہیں تو کمزور ہو کر پیچھا کریں گے اور اللہ انہیں ذلیل کر دکھائے گا۔" (۲۰۰)

اس پر کسی آدمی نے بھی اپنا قدم پیچھے نہیں ہٹایا اور عزیمت کا انتہائی مظاہرہ کرتے ہوئے رسول اللہ سے یہ عرض کیا کہ:

"یا رسول اللہ! ہماری رائے یہ ہے کہ سیدھی اہلِ مکہ کی طرف چلیں کیونکہ اللہ ضرور آپ کی مدد کرے گا، معاونت فرمائے گا اور آپ کو غلبہ عطا کرے گا۔"

اور مقداد نے کہا کہ خدا کی قسم ہم آپ سے وہ بات نہیں کہیں گے جو بنی اسرائیل نے اپنے نبی سے کہی تھی کہ اذهب انت وربك فقاتلا انا هٰهنا قاعدون۔" (۲۰۱)

اس گفتگو کے پیشِ نظر ہر شخص کی طرح قریش نے بھی اندازہ کر لیا کہ تقریباً ڈیڑھ ہزار افراد کا یہ عزم و حوصلہ، صبر و ثبات اور اپنی فتح پر یقینِ کامل کیا معنی رکھتا ہے۔ پھر قریش عین موقع پر ایک اور مشکل میں گرفتار ہو گئے یعنی اس روز احابیش (۲۰۲) (مختلف قبائل کے لشکروں) کے سردار حلیس بن علقمہ نے قریش کی طرف سے بے جا ضد اور اپنے سامنے ہدی و شعائر اللہ کی بے حرمتی دیکھی تو وہ عالمِ طیش میں قریش پر برس پڑا اور یہ کہہ کر دست کش ہو گیا کہ:

یا معشر قریش! واللہ ما علی هذا حالفناكم ولا علی هذا عاقدناكم ايصد عن بيت الله من

جاء معظماً له ۔ والذی نفس الحلیس بیدہ لتخلن بین محمد و بین ما جاء له ، أو لأنفرن بالاحابیش نفرۃ رجل واحد ۔"(۲۰۳)

(اے قریش کے لوگو! خدا کی قسم اس بات پر ہم تم ایک دوسرے کے حلیف نہیں بنے تھے اور نہ اس بات پر ہمارا تمہارا معاہدہ ہوا تھا کہ جو شخص زیارتِ بیت اللہ اور اس کی عزت و تکریم کی غرض سے آیا ہو اسے روکا جائے گا۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں حلیس کی جان ہے! یا تو محمد جس مقصد سے آئے ہیں انھیں پورا کرنے دو یا میں تمام حبشیوں کو لے کر ایک ساتھ الگ ہوا جاتا ہوں)

قریش نے اس کا غصہ دیکھ کر اس سے درخواست کی کہ :

"مه کف عنّا یا حلیس حتی ناخذ لأنفسنا ما ترضیٰ ۔"(۲۰۴)

(ذرا ٹھہرو ہمیں اتنی مہلت تو دے دو کہ ہم اپنے لئے کوئی ایسی بات تو طے کرلیں جس پر ہم سب راضی ہوں)

ان الفاظ سے قریش کی کمزوری صاف جھلک رہی ہے احابیش عسکری اعتبار سے ان کا بہت بڑا سرمایہ تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ جن اخلاقی وجوہ سے حلیس نے قریش سے تعاون نہ کیا وہی وجوہ قریش کے دوسرے اعیان و انصار کے لئے بھی عدمِ تعاون کا سبب بنے۔ نیز حدیبیہ میں قیام کے دوران رسول اللہؐ نے ہر معاملہ میں جس صبر و وقار، بر و تقویٰ، عفو و درگذر، ایفائے عہد کا ثبوت دیا اور ایک رسول کے شایانِ شان طرزِ عمل اختیار کیا تھا۔(۲۰۵) اور اس کے برعکس قریشیوں کی طرف سے حمیّت و جاہلیّۃ کا جو مظاہرہ ہوا(۲۰۶) اس نے دوست دشمن سب کے قلوب کو مسخر کرنے میں اہم حصّہ لیا اس قسم کے حوصلہ شکن حالات میں ظاہر ہے قریش کے پاس نہ تو مادّی وسائل اتنے وافر تھے کہ وہ مسلمانوں سے لڑ سکیں اور نہ اخلاقی قوت ان کے پاس تھی اور نہ ہی ان کا موقف معیارِ صداقت پر پورا اترتا تھا ان اسباب نے جنگ کے بجائے قریش کو صلح کے لئے مجبور کر دیا، نیز مدّتِ صلح متعین ہو جانے سے قریش کو آئندہ کی جنگ کے لئے زیادہ تیاریوں کا موقع بھی مل رہا تھا۔

صلح نامہ حدیبیہ کی بعض دفعات کو قریش اپنے لئے خاص طور پر مفید سمجھتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ یہ دفعات رسول اللہؐ کے لئے ضرور پریشان کن ثابت ہوں گی۔ مگر واقعہ اس کے برعکس ہُوا۔ معاہدہ حدیبیہ نے دونوں مصافی جماعتوں کو دم لینے کی فرصت دے دی اور اس کا تمام فائدہ آنحضرتؐ کو پہنچا۔ یہ صلح قریب دو سال تک قائم رہی اور اس دوران میں اہلِ مکّہ کے لئے پیہم ناکامیوں اور مسلسل ذلتوں کا باعث ہوئی۔ وہ شرط جس کی رُو سے محمد نے یہ عہد کر لیا تھا کہ مکّہ کے آدمیوں کو ان کے پاس واپس کر دیا جائے گا اور جو بالکل قریش کے حق میں تھی تمام توقعات کے خلاف ان کے لئے باعثِ نقصان ثابت ہُوئی اور بالآخر انھیں خود بھی درخواست کرنی پڑی کہ اس شرط کو بدل دیا جائے۔"(۲۰۷) اس کا سب سے بڑا محرک ابوبصیر کا واقعہ تھا۔(۲۰۸)

شرائطِ معاہدہ کی رُو سے ہی خزاعہ نے آنحضرتؐ سے اور بنو بکر نے قریش سے علی الاعلان الحاق کر لیا تھا۔(۲۰۹)

فریقین پر قرار داد کا احترام اور امانت و دیانت برتنا لازم تھا۔ لیکن قریش نے اس کو بھی پامال کر ڈالا، خیانت کے مرتکب ہوئے اور بغیر کسی جواز کے بنو خزاعہ پر حملہ میں بنو بکر کی آدمیوں اور اسلحہ دونوں سے مدد بھی کی۔(۲۱۰) اس طرح شرائط مذکورہ کی صریح خلاف ورزی بالآخر صلح نامہ حدیبیہ کے خاتمہ کا باعث ہوئی۔ رسول اللہؐ کو ان شرائط سے اس لئے کوئی تشویش لاحق نہیں ہوئی کہ آپ کے پاس سے قریش کی طرف جانے کی کوشش صرف وہی شخص کر سکتا تھا جسے اسلام ناپسند ہو ورنہ ایک مسلمان جیتے جی یہ گوارا نہ کر سکتا تھا۔(۲۱۱)

ان شرائط کا قریش پر ایک الٹا اثر یہ بھی ہوا کہ ایک عرصہ کی کشیدگی اور سلسلہ جنگ و جدال نے کفار اور مسلمانوں کے باہمی میل جول کا سلسلہ منقطع کر رکھا تھا۔ ان شرائط نے آتشِ مبارزت کو فرو کیا تو مخالفین و مشرکین مکہ نے مدینہ آنا جانا شروع کر دیا۔ اس یک طرفہ آمد و رفت سے کفار و مشرکین کی غلط فہمیاں دور ہوئیں۔ انھیں مسلمانوں اور اسلام کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شعوری اور غیر شعوری دونوں طریقوں پر اسلام نے ان کے دلوں کو فتح کرنا شروع کر دیا۔ مشہور بات ہے کہ حدیبیہ کے بعد سے فتح مکہ کے عرصہ میں اسلام کی اشاعت اتنی تیزی سے ہوئی کہ اس سے قبل ۱۹ سال میں بھی اتنی نہ ہوئی تھی۔

دفعہ ہفتم کی ضرورت بھی فی الحقیقت قریش کو ہی تھی۔ ان کے تجارتی روابط شمال کے تمام علاقوں خصوصاً شام سے کم و بیش منقطع ہو چکے تھے اور معاشی طور پر وہ اتنے بے بس ہو گئے تھے جتنے بے بس وہ عسکری شکست سے بھی نہ ہوئے تھے، گویا اس شق کو انہوں نے اپنی قومی ضرورت اور تجارتی آمد و رفت کے پیشِ نظر شامل کیا تھا۔ جنگوں کے پیہم سلسلے نے پہلے ہی قریش کی ہمتیں پست کر رکھی تھیں اور ان میں ان کے جان و مال کا بے حد اتلاف ہو چکا تھا۔ نیز رسول اللہؐ کی طرف سے اقتصادی ناکہ بندی نے ان کو جس صورتِ حال سے دوچار کر دیا تھا ان کی ساری توجہ اسی صورتِ حال کو بہتری سے بدلنے کی طرف تھی۔ اس لئے اس شرط سے یہ مقصد انہوں نے حاصل کرنا مناسب سمجھا اور مسلمانوں کے لئے اس میں وقتی نقطۂ نظر سے یہ گنجائش پیدا ہو گئی کہ وہ جنوب کے علاقوں میں اپنی سرگرمیاں جاری کر سکیں۔ اس کا قرینہ یہ بھی تھا کہ اس زمانہ میں شاہِ ایران شہر براز نے رومیوں سے شکست کھائی اور قرآن میں مذکور الٓمٓ غلبت الروم کی پیشگوئی(۲۱۲) پوری ہو گئی۔ اس کا نتیجہ اور کچھ نہ سہی تو یہ بہر حال ہوا کہ بقول ڈاکٹر حمید اللہ "لاوارث ایرانی صوبے یمن، بحرین، عمان کے متعلق حسبِ دلخواہ کارروائی کرنے کا ایک خداداد موقع ہاتھ آ گیا۔"(۲۱۳)

صلح نامہ حدیبیہ کی اہم دفعات و شرائط اور اس کے بعض اثرات کا جائزہ لینے کے بعد اب آخر میں ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ صلح حدیبیہ سے سیاست پر کیا اثرات مرتب ہوئے اور ریاستِ نبویؐ کے لئے توسیع و ترقی کی راہ کس حد تک ہموار ہوئی۔ چنانچہ اس سلسلے میں چند نکات قابلِ ذکر ہیں :

(۱) صلح نامہ حدیبیہ کا ایک اصولی اور بنیادی نتیجہ یہ نکلا جیسا کہ ایک جگہ مولانا مودودی نے لکھا ہے کہ:(۲۱۴) "اس میں پہلی مرتبہ اسلامی ریاست کا وجود باقاعدہ تسلیم کیا گیا۔ اس سے پہلے تک عربوں کی نگاہ میں حضور کی حیثیت محض قریش اور قبائل عرب کے خلاف خروج کرنے والے ایک گروہ کی تھی اور وہ آپ کو برادری باہر (OUT LAW) سمجھتے تھے۔(۲۱۵) اب خود قریش ہی نے آپ سے معاہدہ کر کے سلطنت اسلامی کے مقبوضات پر آپ کا اقتدار مان لیا اور قبائل عرب کے لئے

یہ دروازہ بھی کھول دیا کہ ان دونوں سیاسی طاقتوں میں سے جس کے ساتھ چاہیں حلیفانہ معاہدات کر لیں۔"[216]

(۲) صلح نامہ حدیبیہ میں قریش نے مسلمانوں کے لئے بیت اللہ کا راستہ روک کر ایک فاش سیاسی غلطی کی تھی۔ اس کی وجہ سے رائے عامہ مسلمانوں کے حق میں ہموار ہوگئی اور بہت سے قبائل مسلمانوں کی طرف جھک گئے اور قریش کے قرب وجوار کا علاقہ بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ان تمام چیزوں نے بعد میں عملی طور پر فتح مکہ کو آسان بنا دیا۔[217] صلح حدیبیہ پر بحث کے بعد اب ہم پھر اس بات کی تمہید کے مطابق اس دور توسیع میں تیسرے پہلو کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

صلح حدیبیہ سے رسول اللہؐ کو اپنی اس پالیسی کو عملی جامہ پہنانے کا موقع میسر آ گیا کہ مخالف طاقتوں کو پہلے درجہ میں تو متحد ہی نہ ہونے دیا جائے اور پھر دوسرے درجہ میں علیحدہ علیحدہ بننے والی سیاسی اکائیوں کو سرنگوں کر دیا جائے۔ صلح حدیبیہ نے ریاست نبوی کے دو زبردست مخالف یعنی قریش مکہ اور یہودی حلیفوں کے مابین تفریق کر دی۔ اب یہ بات طے تھی کہ یہود کی جانب پیش قدمی کی صورت میں نہ تو قریش ان کی مدد کر سکیں گے اور نہ ان سے دارالحکومت مدینہ کو خطرہ لاحق ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ صلح حدیبیہ کے باعث جنوب کی طرف سے اطمینان حاصل ہو جانے کے بعد رسول اللہؐ نے شمالی عرب اور وسط عرب کی تمام مخالف طاقتوں کو بآسانی مسخر کر لیا۔

چنانچہ جیسا کہ ہمیں معلوم ہے صلح حدیبیہ پر بمشکل ڈیڑھ ماہ ہی گزرا تھا[218] کہ رسول اللہؐ نے یہودیوں کے سب سے بڑے مستحکم اور مضبوط مرکز[219] خیبر کو فتح کر لیا۔ بہت ممکن تھا کہ خیبر کو مزید مہلت مل جاتی مگر ایک طرف تو مدینہ کے منافقین، اپنی ریشہ دوانیوں میں مصروف تھے دوسری طرف اس سے یہود کی ہمت بڑھی تو انہوں نے ایک سفارت کے ذریعہ بنی غطفان سے مدد و تعاون کی درخواست کی جسے فوراً قبول کر لیا گیا تھا۔"[220] اس طرح ان تین گروہوں (منافقین، یہود اور قبائل عرب) کی مشترکہ سازش سے مدینہ پر حملہ کا منصوبہ بن گیا لیکن اس سے قبل کہ وہ شرمندۂ تکمیل ہوتا رسول اللہؐ یہود خیبر کی سرکوبی کے لئے بغیر کسی توقف کے روانہ ہوگئے کیونکہ جارحیت کو روکنے کے لئے اس قسم کے اقدامات کرنا کسی بھی ضابطۂ قانون و اخلاق کی رو سے ممنوع نہیں اور آپ کی تو شروع سے یہ حکمتِ عملی رہی ہے کہ دشمن کو اس کے سنبھلنے سے پہلے ہی کچل دیا جائے۔

چنانچہ خیبر کے لئے رسول اللہؐ محرم کی آخری تاریخوں میں[221] چودہ سو مومنین کی جماعت لے کر نکلے[222] اور منزلِ مقصود سے پہلے مصلحتاً غطفان وخیبر کے درمیان واقع ایک میدان رجیع میں قیام کیا۔ تاکہ یہود خیبر کے درمیان حائل ہو کر خیبر کے لئے مدد و کمک کا راستہ روک دیں۔"[223] چنانچہ اہلِ غطفان رسول اللہؐ کی آمد پر یہود کی مدد کے لئے نکلے بھی تھے لیکن ایک منزل سے آگے بڑھنے کی ہمت نہ کر سکے[224]۔ ایک تو اس لئے کہ انہیں یہ اطلاعات ملی تھیں کہ خود ان کی آبادی خطرہ میں ہے[225] اور دوسرے رسول اللہؐ کا رجیع میں قیام ان کے آگے جانے میں مزاحم تھا۔ بہرحال آنحضرتؐ کا جنگی منصوبہ نتیجہ خیز رہا۔ یعنی آپ دشمنوں کے اتحاد اور ان کی کمک کا راستہ روکنے میں کامیاب ہو گئے اس کے بعد خیبر کی مہم سر کرنے میں تقریباً دو ماہ صرف ہوئے۔ لڑائی کا سلسلہ اوائل صفر سے ربیع الثانی کے آخر تک جاری رہا لیکن بالآخر فتح مسلمانوں کو حاصل ہوئی[226] اور اس طرح یہود کا سنگین خطرہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔ خیبر کی فتح کے ساتھ ہی سورہ فتح کے مطابق فتح قریب[227]

مغانم کثیرہ[۲۲۸] اور غنائم اخروی[۲۲۹] کا وعدۂ خداوندی بھی پورا ہوا۔

فتح خیبر نے بعض دوسری فتوحات کو جنم دیا۔ مثلاً خیبر کے انجام کی اطلاع قریب کی یہودی آبادی "فدک" پہنچی تو وہاں کے لوگوں نے بغیر لڑے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی نصف اراضی پیش کر کے صلح کر لی[۲۳۰] البتہ وادی القریٰ کے یہودیوں نے تھوڑی سی مزاحمت کی لیکن جلد ہی ہتھیار ڈال دیے اور ان ہی شرائط پر صلح کر لی جن پر خیبر والوں نے کی تھی اور جزیہ دینا منظور کر لیا[۲۳۱] اسی سے متصل تیماء کا یہودی مرکز بھی جمادی الثانی ۷ھ میں ٹوٹ گیا اور اس طرح یکے بعد دیگرے یہ تمام بستیاں ریاستِ نبویؐ کے زیرِ نگیں آگئیں۔

یہودیوں کے مفتوح ہو جانے سے عرب کی سیاسی صورتِ حال میں واضح تغیّر رونما ہوا۔ اسلامی ریاست کے دشمنوں میں سے ایک دشمن کا بالکل استیصال ہو گیا جو دراصل دوسرے تمام دشمنوں مثلاً قبائل عرب خصوصاً غطفان اور قریش وغیرہ کی نہ صرف پشت پناہی کرتا تھا بلکہ ان کو آمادۂ فساد بھی کرتا تھا۔ اور ان سب کے اتحاد سے خطرناک صورت پیدا ہو جاتی تھی لیکن اب ایک طرف تو قریشِ مکّہ اور یہود نیز دیگر قبائل کا جنگی اتحاد صلح حدیبیہ کی بناء پر ٹوٹ چکا تھا۔ اور دوسری طرف خیبر کے مغلوب ہو جانے سے قبائلِ عرب بھی بے یار و مددگار رہ گئے۔ اس طرح قریشِ مکّہ کا ایک انتہائی اہم بازو ٹوٹ گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ علاقہ جو یہود اور قریش کا منطقہ اثر تھا اسلام کی سیاسی اور حربی برتری سے مرعوب و متاثر ہو گیا اور ان قبائل کے ذہن و فکر تک اسلام کی رسائی ہو گئی جو اب تک اس روشنی سے محروم تھے۔

اس بیان کی تائید تاریخی طور پر اس طرح سامنے آتی ہے کہ جب قریش نے بنی خزاعہ پر حملے میں بنی بکر کی مدد کر کے حدیبیہ کے معاہدہ کو پامال کر دیا[۲۳۲] جس پر قریش کو خود بھی بہت ندامت تھی[۲۳۳] تو رسولؐ اللہ نے دس ہزار آدمیوں کا لشکرِ جرار لے کر رمضان ۸ھ میں ان کی جانب کوچ کیا۔[۲۳۴] اسلامی لشکر کی اتنی بڑی تعداد بجائے خود اس پر دلالت کرتی ہے کہ عرب کے دیگر قبائل نے معاونت و شرکت کی اور قدیم و جدید تاریخی مآخذ میں بھی اس کی تصریح ہے کہ اس لشکر میں قبیلہ سلیم، مزینہ، غفار، اسلم کے بالترتیب ایک ہزار، ایک ہزار، چار سو اور چار سو آدمی اور اسد، تمیم، اشجع اور جہینہ کے بھی کافی افراد شریک تھے۔[۲۳۵] اس کا مطلب یہ ہے کہ عرب کے وہ قبائل جو صلح حدیبیہ سے پہلے عموماً اور غزوۂ خیبر سے پہلے خصوصاً ریاست نبویؐ کے خلاف محاذ آرا تھے۔ صلح حدیبیہ اور فتح خیبر کے بعد اس کے معین و مددگار بن گئے۔ گویا صلح حدیبیہ کے بعد اشاعتِ اسلام کی تحریک نے جیسا کہ پہلے کہا گیا روز افزوں ترقی کی اور بے شمار افراد حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ اس بناء پر نہ تو یہ امر تعجب خیز ہے کہ مکہ کی پیش قدمی میں دس ہزار افراد کیسے شریک ہو گئے جبکہ اس سے پہلے اسلامی لشکر نسبتاً بہت مختصر ہوتا ہے اور نہ اس پر حیرت کی کوئی وجہ ہے کہ اتنی بڑی فوج کے ساتھ مدینہ سے مکہ تک کا طویل سفر اس خاموشی اور رازداری کے ساتھ کیسے کیا گیا کہ قریش کو خبر نہ ہو سکی اور نہ قریش کے ممد و معاون قبائل ان کی مدد کو پہنچ سکے۔ واقعہ یہ ہے کہ رسولؐ اللہ راستہ میں پڑنے والے کم و بیش تمام قبائل کو یا تو اپنا ہمنوا بنا چکے تھے یا آپ نے غیر جانبدار رہنے پر ان کو راضی کر لیا تھا۔ نیز پیش قدمی میں آپ نے ایسی رازداری برتی تھی کہ دشمن بے خبر تھا۔ پھر یہود خیبر، ان کی ہمسایہ بستیاں اور قبائل کی ایک بڑی تعداد مغلوب

ہو چکی تھی اس لئے قریشِ مکّہ تنہا رہ گئے اور تنہا رہ کر قریش یا عرب کی کسی بھی طاقت کے لئے ریاست نبویؐ سے ٹکرلانے کا حوصلہ نہ تھا اس لئے رمضان ۸ھ میں مکّہ بڑی آسانی سے فتح کر لیا گیا۔(۲۳۶)

ایک ایسے شہر کی فتح عمل میں آئی جس کی آغوش میں رسولؐ اللہ اور ریاستِ نبویؐ کی دشمنی پروان چڑھی، جو آٹھ سال تک مدینہ کے خلاف محاذ آرائی کا مرکز رہا اور جس کے باشندوں نے جسم و جان کی ساری صلاحیتیں، اپنا مال و متاع اور اپنے مادی وسائل عداوتِ خدا و رسول کے لئے وقف کر رکھے تھے۔ اس کی فتح اس امن و سلامتی کے ساتھ ہو جاتی ہے کہ نہ قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوتا ہے نہ گھروں کو نذرِ آتش کیا جاتا ہے اور نہ آبروئیں لوٹی جاتی ہیں۔ رسولؐ اللہ کی اس فیاضی اور رواداری کو دنیا کی تاریخ فتوحات میں یقیناً ایک گرانقدر اضافہ قرار دیا جائے گا۔

ان تفصیلات کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ قریش کی طرف سے عہد شکنی کے باوجود رسولؐ اللہ نے صلح حدیبیہ کی معنویت یعنی "امن و سلامتی" کو فتح مکّہ کے موقع پر بھی برقرار رکھا اور اس طرح صلح حدیبیہ میں جس فتح مبین کا اعلان ہوا تھا اس کی تعبیر "فتح مکہ" کی صورت میں سامنے آگئی۔ گویا "صلح حدیبیہ نے دو ہی سال کے اندر عرب میں طاقت کا توازن اتنا بدل دیا کہ قریش اور مشرکین کی طاقت دب کر رہ گئی اور اسلام کا غلبہ یقینی ہو گیا۔

مندرجہ بالا مباحث کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ صلح حدیبیہ کا واقعہ سیاستِ نبویؐ میں ایک اہم موڑ ثابت ہوا، جس نے سہ طرفہ مقاصد کو حاصل کرنے میں ریاست کی مساعدت کی۔ اس کے ذریعہ پہلے درجہ میں قریش کو خاموش کرنے اور دوسرے درجہ میں ان کی طاقت حتمی طور پر ختم کرنے میں مدد ملی، دوسری طرف یہود کے متعدد اہم مراکز زیرِ نگین کرنے کے مواقع اسی صلح نے فراہم کئے اور پھر اسی صلح کے باعث قبائل عرب کی ایک بڑی تعداد ریاست نبویؐ کی مطیع و فرمانبردار بن گئی اور انہوں نے رسولؐ اللہ کے سیاسی اقتدار کو تسلیم کر لیا۔

زیرِ نظر مباحث کی تمہید میں ہم نے قبائل عرب کی جس طاقت کا ذکر کیا تھا اس کی کیفیت اس کے بارے میں ریاست نبوی، کے رویہ پر متعدد مقامات پر بحث آچکی ہے لیکن آگے بڑھنے سے پہلے قبائلِ عرب کے بارے میں چند مزید وضاحتیں بے محل نہ ہوں گی۔

عام قبائل عرب (علاوہ یہود و قریش) کے بارے میں رسولؐ اللہ کی حکمتِ عملی بنیادی طور پر یہ تھی کہ قبائل سے بگاڑ مول لینے کے بجائے صلح کے ذریعہ کام نکالا جائے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ رسولؐ اللہ طبعاً صلح جو، امن پسند تھے اور آپ جس دین یعنی اسلام کو لے کر آئے تھے اس کا لفظی معنوی اور عملی تقاضا بھی یہی تھا کہ تمام معاملات میں امن و سلامتی کی راہ اختیار کی جائے۔ رسولؐ اللہ نے بے فائدہ جنگ و جدال سے سروکار نہیں رکھا اور نہ دشمن کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اسے نیچا دکھانا آپ کا مقصود تھا۔ آپ اس کے علاقے پر تسلط جمانا اور دنیوی حکمرانوں کی طرح قوت و طاقت اور شان و شوکت کا اندھا دھند یا غیر ضروری مظاہرہ بھی پسند نہ کرتے تھے۔ اس کے برعکس دشمن سے اس کی کمزوری کی حالت میں رحمت و شفقت کا سلوک کر کے ہدایت کا سامان بہم پہنچانا اور احسان کی روش اختیار کرنا آپ کا معمول تھا۔ غرض رسولؐ اللہ کی شروع سے ہی

کوشش یہ رہی کہ مصالحت اور مذاکرات کے ذریعہ مقصد کو حاصل کیا جائے۔ مدینہ آنے کے بعد بنو ضمرہ اور بنو مدلج وغیرہ سے معاہدات اس کا کافی ثبوت ہیں۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر بھی آپ نے اہلِ مکہ کو ان کے کرتوتوں کا مزا چکھانے کے بجائے رحم و مروّت کا سلوک کیا۔ البتہ جب آپ کو جنگ پر مجبور کر دیا جاتا تھا، امن کی تمام راہیں مسدود ہو جاتیں اور امن و سلامتی، اسلام اور ریاست اسلامی کو ہدف بنایا جاتا تو اس وقت مدافعت سے کام لینا اور خاموشی اختیار کر لینا فرائضِ حکومت کے لحاظ سے بھی غلط تھا اور فرائض رسالت کے تقاضوں کے خلاف بھی۔ اس لئے آپ ایسے قبائل کی سرکوبی کے لئے ہر آن مستعد رہتے تھے جو یا تو مسلمانوں کے خلاف سازش کرکے دار الحکومت مدینہ پر حملہ آور ہوتے تھے یا اس کے منصوبے بناتے تھے اور جس کی کافی مثالیں صلح حدیبیہ سے پہلے بیان کی جا چکی ہیں۔ علاوہ ازیں چونکہ لا اکراہ فی الدین اسلام کا اصل الاصول ہے اس لئے آپ نے کسی قبیلہ کو اسلام لانے پر مجبور نہیں کیا۔ البتہ اسلام کی سیاسی حاکمیت کے آگے سرنگوں کرنے میں بھی کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا اور اس سلسلے میں آپ نے اس درجہ رعایت سے کام لیا کہ قبائل کے محض ظاہری اقرار ایمان کو کافی سمجھا۔ اسی لئے اس وقت ایسے قبائل بھی نظر آتے ہیں جو اپنے اسلام میں مخلص تھے، ایسے بھی پائے جاتے ہیں جو صرف ظاہری طور پر اسلام لائے تھے اور ایسے بھی تھے جنھوں نے اسلام کا قلادہ اپنے گلے میں تو نہ ڈالا البتہ ریاستِ نبوی کی اطاعت قبول کر لی تھی۔

صلح حدیبیہ سے پہلے تک عرب قبائل کی سرگرمیاں سامنے آ چکی ہیں اور صلح حدیبیہ کے نتیجہ میں فتح مکہ تک ان کا کردار بھی واضح ہو چکا ہے۔ فتح مکہ تک پہنچتے پہنچتے یہ بات تو صاف نظر آتی ہے کہ قبائل عرب کا زور بالکل ٹوٹ گیا ہے کیونکہ ان کی پشت پناہی کرنے والی یہودِ خیبر اور قریشِ مکہ کی دونوں طاقتیں ختم ہو گئیں۔ جو قبائل "انتظار کرو اور دیکھو" کا مسلک رکھتے تھے فتح مکہ کے بعد انھوں نے بھی ہوا کا رُخ دیکھ لیا اور ریاست نبوی کے تابع ہو گئے۔ قبائل عرب پر فتح مکہ کا اثر پڑنا بھی لازمی تھا۔ مسلمانوں کا مکہ پر فتحیاب ہو جانا بہت سے قبائل کے لئے صداقت کی علامت بن گیا کیونکہ سیکڑوں سال سے عرب کی روایت یہ چلی آ رہی تھی کہ مکہ پر اسی کا قبضہ ہو سکتا ہے جو اللہ کا فرستادہ اور اس کا محبوب ہو۔ بصورتِ دیگر اس کا انجام "اصحابِ فیل" (۲۴۷) سے مختلف نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ بخاری نے ان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:

یقولون اترکوہ وقومہ فانہ ان ظھر علیھم فھو نبی صادق۔ (۲۴۸)

(وہ کہتے ہیں اس کو اور اس کی قوم کو چھوڑ دو (بے اعتنائی برتو) پس اگر یہ ان (اپنی قوم) پر غالب آ گیا تو سمجھنا کہ وہ سچا نبی ہے)

اس کے باوجود جن قبائل کو یہ صورتِ حال بھی متاثر نہ کر سکی اور انھوں نے انتظار یا مزاحمت کا رویہ جاری رکھا وہ بالآخر بعد کے واقعات و حوادث سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ چنانچہ فتح مکہ کے بعد جب ہوازن، ثقیف، نصر، جشم اور بعض دوسرے جاہلیت پرست قبائل نے اپنی ساری طاقت حنین کے میدان میں لا کر جھونک دی (۲۴۹) تاکہ اس اصلاحی انقلاب کا آخری بار راستہ روک دیں جو فتح مکہ کے بعد مرحلۂ تکمیل میں داخل ہو گیا تھا تو ان کی یہ آخری کوشش بھی ناکام ہوئی۔ (۲۵۰) غزوۂ حنین پر عربوں کے ساتھ رسول اللہ کی جنگوں کا تقریباً خاتمہ ہو گیا۔ وہ تمام بڑے بڑے قبائل جو اپنے آپ کو قریش کا ہمسر سمجھتے تھے مغلوب

ہو گئے اور اسی کے ساتھ عرب کی قسمت کا بھی قطعی فیصلہ ہو گیا کہ اسے دار الاسلام بن کر رہنا ہے اور یہ ثابت ہو گیا کہ "دین حق دوسرے تمام ادیان (باطلہ) پر غالب آکر رہے گا کیونکہ اللہ کے رسول کو اسی لئے بھیجا گیا تھا۔"(۲۴۱) لیکن یہ غلبہ، یہ سلطانی، نفس کی تسکین اور شان و شکوہ کے اظہار کے لئے نہ تھی بلکہ "لیظھرہ علی الدین کلہ"(۲۴۲) کا تقاضا تھی۔ شاید اسی لئے جب ابوسفیان نے رسولؐ اللہ کے لشکرِ فتح کو دیکھا اور حدِ نظر تک آدمی ہی آدمی دکھائی دئے تو حضرت عباس سے یوں اظہارِ تاثر کیا کہ: "ابوالفضل! تمہارے بھتیجے کی سلطنت تو بہت بڑھ گئی!"

عباس نے کہا: "تمہاری خرابی ہو، یہ سلطنت نہیں ہے یہ تو نبوت ہے۔"

ابوسفیان نے کہا: "بے شک!"(۲۴۳)

یہ حقیقت سامنے آجانے کے بعد کہ اسلام کے سیلِ رواں کو روکنے والی کوئی قوت نہیں رہی ہم دیکھتے ہیں کہ قبائل عرب کا میلان اسلام کی طرف بڑھ جاتا ہے اور وہ جوق در جوق(۲۴۴) مدینہ آکر اظہار اطاعت کرنے لگے بلکہ ابھی آپ مکہ ہی میں مقیم تھے کہ ہوازن کا وفد آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور پھر ثقیف، بنو عبدالقیس، طے، کندہ اور دیگر قبائل کے وفود نے بھی ایمان و اسلام میں دیر نہیں لگائی۔(۲۴۵) اس طرح حنین کے بعد دراصل اندرون عرب، ریاست نبوی کی قابلِ ذکر مخالف قوتوں نے دم توڑ دیا اور اب "صرف چند پراگندہ عناصر ملک کے مختلف گوشوں میں باقی رہ گئے" اور جن کا استیصال کرنے میں بھی مزید ایک سال سے زیادہ کا عرصہ نہ لگا۔

(ج) اب ہم تیسرے نکتہ کی طرف آتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ اندرونِ عرب کی تمام قابلِ ذکر مزاحمتوں کے ختم ہو جانے کے بعد ایک مسئلہ تو ان علاقوں کا تھا جو ابھی تک ریاست نبوی کے مطیع نہ ہوئے تھے۔ دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ بیرونِ عرب اسلام کے پیغام کو پہنچایا جائے اور وہاں بھی حاکمیت الٰہی کی طرح نو ڈالی جائے کہ یہ رسولؐ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا واضح مقصد تھا۔

رسولؐ اللہ سے پہلے جتنے انبیاؑ و رسل اس دنیا میں تشریف لائے ان کی رسالت خاص تھی ان کی نبوت ان کی اپنی قوم اور اپنے قبیلے تک محدود تھی۔ لیکن یہ امتیاز صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے کہ آپ کی بعثت روئے زمین کی ہر قوم اور ہر جنس کے لئے ہوئی۔ تمام انسانوں کے لئے، تمام دنیا کے لئے ہوئی۔ یعنی آپ کی رسالت و نبوت عام ہے اور بعثت، بعثت تام ہے۔ اس پر دلالت قرآن میں بھی موجود ہے(۲۴۶) اور احادیث میں بھی اس کی وضاحت و صراحت پائی جاتی ہے۔(۲۴۷)

چنانچہ بربنائے رسالت رسولؐ اللہ پوری دنیا کو دعوتِ اسلام دینے پر مامور کئے گئے تھے۔ یوں تو آغاز کار سے ہی رسولؐ اللہ نے اپنی دعوت کو محدود و مخصوص نہیں کیا تھا(۲۴۸) آپ کی دعوت ہر شخص، ہر قوم، ہر نسل، ہر قبیلے اور ہر مقام اور ہر زمانے کے لئے تھی۔ اسلام کی بنیاد بھی توحید پر ہے جو ایک عالمگیر وحدت کا نشان ہے۔ آپ کے ماننے والوں میں، ایسے لوگوں کی تعداد شروع سے ہی اچھی خاصی رہی ہے جن کا نسبی و نسلی تعلق عرب سے نہ تھا اور رنگ، زبان اور وطن کے

لحاظ سے بھی وہ مختلف تھے۔ اس سلسلے میں حضرت سلمان فارسی، صہیب رومی، بلال حبشی وغیرہ کا نام روشن مثال ہے۔ حج کے زمانے میں دنیا کے مختلف حصّوں سے آئے ہوئے لوگوں تک تبلیغ کرنا آپ کی مکی زندگی کا خاصہ ہے اور پھر انہی لوگوں کے ذریعہ نیز جاں نثارانِ اسلام کے تجارتی سفروں کے وسیلہ سے اسلام کا پیغام عرب سے باہر پہنچ رہا تھا اور پھر مدینہ آنے کے بعد تو ریاست نبوی کے قیام و فروغ اور پیہم فتح کاموں نے اسلام کا نام اطراف و جوانب میں پھیلا دیا تھا لیکن ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلام کی عالمی حیثیت کے قیام و استحکام کے حوالے سے یہ تمام سرگرمیاں عمومی نوعیت کی تھیں البتہ صلح حدیبیہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عالمی دعوت کے سلسلے میں بطور خاص اہتمام فرمایا۔

چنانچہ اس واقعہ کو تمام مورخین اور اصحابِ سیر نے صراحۃً لکھا ہے کہ صلح حدیبیہ سے فارغ ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد شاہانِ عالم، فرمانروایانِ عرب اور دیگر امراء و رؤسائے قبائل کے نام خطوط و مکاتیب ارسال فرمائے[۲۴۹] (جن کی تفصیل آئے گی) ان مکتوبات گرامی کا بنیادی مقصد تبلیغ و ہدایت تھا[۲۵۰] اور ان خطوط کو سب سے پہلے محرم ۷ھ میں مدینے سے جاری کیا گیا۔[۲۵۱]

ابن سعد کے بیان کے مطابق رسولؐ اللہ نے ایک ہی دن میں چھ قاصدوں کی ایک جماعت کو مراسلات دے کر روانہ کیا۔[۲۵۲] ان کو بھیجتے وقت آپ نے ان پر یہ امر واضح کر دیا تھا کہ میں چونکہ پوری دنیا کے لئے رسولِ رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں اس لئے اب موقع آگیا ہے کہ میں سارے انسانوں سے خطاب کروں۔[۲۵۳] ہمارے نزدیک یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ مراسلات نبوی کا یہ سلسلہ یہیں ختم ہو گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ صحابہ کی اس جماعت کے علاوہ متعدد دوسرے سفیروں اور قاصدوں کو بھی رسولؐ اللہ نے عرب کے مقامی رؤسا اور بیرونی انتداب کے ماتحت ملوک و امراء کے پاس خطوط و فرامین دے کر بھیجا تھا۔ اس لئے تاریخی شہادت کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ آنحضرتؐ کے ان دعوتی و تبلیغی خطوط کا سلسلہ محرم ۷ھ سے ۱۰ھ کے اواخر تک جاری رہا۔ شاید اسی لئے طبری نے مدتِ مراسلت کو وفاتِ نبوی تک شمار کیا ہے۔[۲۵۴] اور ترمذی کی ایک روایت سے بھی یہی متبادر ہوتا ہے کہ سلسلۂ مراسلت آپ کے وصالِ مبارک سے کچھ پہلے تک جاری رہا۔ اصل الفاظ یہ ہیں:

> ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کتب قبل موتہ الی کسریٰ والی قیصر والی النجاشی والی کل جبار یدعوھم الی اللہ۔[۲۵۵]
>
> (رسولؐ اللہ نے اپنی وفات سے قبل ہی کسریٰ، قیصر، نجاشی اور (دنیا کے) ہر صاحبِ اقتدار و اختیار کے نام (خط) لکھا اور انہیں اللہ کی طرف دعوت دی)

بہر حال ہمارے متذکرہ بالا بیان کا خلاصہ یہ ہوا کہ:

۱۔ مراسلت کم و بیش تین سال تک جاری رہی اس لئے مکاتیب کی تعداد ہمارے قدیم مورخین (ابن ہشام ج ۴، ص ۲۔ ابن سعد ج ۱، ص ۲۵۹) کے اندازے سے محض چھ یا نو تک محدود نہیں ہے۔

۲۔ مراسلت محض سلاطینِ روم و فارس سے ہی نہیں کی گئی بلکہ اس کے مخاطب دنیا کے تمام صاحبانِ اقتدار و

سیاست تھے۔ اور

۲۔ ان مکاتیب کا بنیادی مقصد دعوت و تبلیغ تھا۔

رسول اللہؐ کے تمام مکتوبات و مراسلات کے جملہ پہلوؤں کا جائزہ لینا ہمارے موضوع بحث سے خارج ہے اور اس کی بالفعل ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی۔ لہٰذا ہم مذکورہ خطوط کی سیاسی اہمیت اور ان کے بعض اہم نکات کی طرف توجہ صرف کریں گے جن کا براہِ راست تعلق ریاستِ نبوی کی توسیع و ترقی سے ہے۔

مکاتیب کی تحریر اور ترسیل کا آغاز جیسا کہ ہمیں معلوم ہے صلح حدیبیہ کے فوراً بعد ہوا یعنی جبکہ ریاست نبوی کے حالات بڑی نزاکت کے حامل تھے۔ لیکن اسی دور اور ان ہی حالات میں آنحضرتؐ نے دنیا کے بڑے بڑے صاحبانِ اختیار و اقتدار کو حاکمیتِ الٰہی کی طرف بلایا اور ایسے انداز سے بلایا کہ آپ کے لب و لہجہ میں ذرہ برابر نیازمندی نہیں، ذاتی مفاد کی تلویث، مرعوبیت یا کمزوری نہیں بلکہ ایک خاص طنطنہ ہے، وقار ہے، استغنا ہے، عزم و ثبات ہے اور ایک خاص تحکم ہے۔ جس طرح ایک پُراعتماد اور پُرخلوص بات مخاطب پر اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ اسی طرح مکتوب کے اس انداز خاص نے مخاطبین کو مرعوب کئے بغیر نہیں چھوڑا۔ چنانچہ تاریخی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کی دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کے فرمانروا شہنشاہ یعنی قیصرِ روم نے مکتوب نبوی پر جس قسم کے ردِ عمل کا اظہار کیا اس کو ابوسفیان کے اس معنی خیز جملہ میں صاف دیکھا جا سکتا ہے جو سراسر عینی شہادت پر مبنی ہے کہ:

ای عباد اللہ لقد أمر امر ابن ابی کبشہ، اصبح ملوک بنی الاصفر یھابونہ فی سلطانھم بالشام۔ (۲۵۶)

(اللہ کے بندو! دیکھو، ابن ابی کبشہ کا معاملہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے کہ ملوک بنی الاصفر بھی اپنی اپنی سلطنتوں میں شام (جیسے دُور دراز مقام) پر بیٹھے ڈرتے ہیں)

خطوط پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کا ایک خاص اسلوب ہے یعنی ہر خط کا آغاز بسم اللہ سے پھر مرسل کی حیثیت سے اپنا نام پھر مکتوب الیہ کا نام اور پھر کم سے کم الفاظ اور انتہائی جچے تُلے انداز میں اپنے مدعا کا اظہار ایسی زبان میں ہے جو اندازِ سفارت کی تمام نزاکتوں اور جامعیت کی حامل ہے اور جو فی الواقع آنحضرتؐ کی ذہنی و نفسی برتری کو ثابت کرتی ہے۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ رسول اللہؐ نے یہ مکاتیب شاہی درباروں اور امرائے وقت کو کیوں بھیجے اور ان کا تخاطب عام آدمیوں سے کیوں نہیں ہے؟ اس کا ایک سیدھا سادہ جواب تو یہ ہے کہ مکتوب ہمیشہ خاص آدمی کے لئے ہی ہوتے ہیں عام اشخاص کے لئے نہیں۔ نیز بین الاقوامی قوانین کی رُو سے خطوط ہمیشہ سربراہانِ ریاست کو بھیجے جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ اس دور کی بات ہے جبکہ عوام الناس کے شہری حقوق بادشاہوں کے مقابلہ میں کچھ بھی نہ تھے اور نہ انہیں وہ سیاسی آزادی حاصل تھی جس سے کام لے کر وہ اپنے بارے میں خود کوئی فیصلہ کر سکیں۔ اس دور کی بادشاہی قیادتیں خداوندی

کے ہم پلّہ تھیں۔

دنیا کے سیاسی نظام کے تحت ہم یہ مطالعہ کر چکے ہیں کہ روم و فارس کی ہمسایہ سلطنتوں کے سربراہ خدائی حقوق کے دعویدار تھے۔ ملوکیت اور جاگیردارانہ نظام کا وہاں تسلّط تھا اور اس کے تحت قوتِ حاکمہ بالآخر ایک مطلق العنان شخصیت میں مرتکز تھی۔ اس ارتکازِ قوت کا اہم ترین سیاسی نکتہ یہ تھا کہ حاکم کے مُنہ سے نکلا ہوا ہر لفظ قانون ہے اور خود حاکم ہر قانون سے بالاتر ہے۔ اسلام کا نظامِ حیات اور اس کا تصوّرِ سیاست ان سب کی ضد ہے۔ رسولؐ اللہ نے تحریری طور پر "اسلام" کی طرف دعوت دی تو اس کا مطلب یہ تھا کہ مطلق العنان فرمانرواؤں سے کہا گیا کہ وُہ اپنے اس حق کو ترک کر دیں کہ ان کے منہ سے نکلا ہُوا ہر لفظ قانون ہے اور وُہ خود قانون سے مستثنیٰ ہیں۔ اس کے بجائے مطالبہ یہ تھا کہ وہ حاکمیتِ الٰہی کا اقرار کریں اور ایک ایسے قانون و آئین کے تحت آ جائیں جس میں کسی کے ساتھ رو رعایت نہیں کی جاتی۔

علاوہ ازیں آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ان ملوک و امرأ کو حاکمیتِ الٰہی تسلیم کرنے کی دعوت محض ان کی انفرادی حیثیت میں نہیں دی تھی بلکہ (راعی اور رعایا کی پوری اجتماعی ذمہ داری کا احساس دلاتے ہوئے) ان کی قوم کے لئے بھی تھی۔ چنانچہ رسولؐ اللہ نے قیصر کو لکھا کہ:

فان تولیت فعلیك اثم الاریسیین۔(۲۵۷)

(اگر تم نے رُوگردانی کی تو تمہارے اُوپر تمہاری قوم کا بوجھ گناہ بھی ہوگا)

اور حاکمِ مصر (اسکندریہ) کو تحریر کیا تھا کہ:

اثم القبط۔(۲۵۸)

اور کسریٰ کو رقم کیا تھا:

فان ابیت فعلیك اثم المجوس۔(۲۵۹)

مجموعی طور پر اس کا مفہوم یہ تھا کہ اگر تم نے اسلام قبول نہ کیا تو اس صورت میں تمہاری رعایا کا وبال بھی تمہاری گردن پر ہوگا اور اس کے برعکس اگر اسلام قبول کر لو گے تو یوتك اللہ اجرك مرتین(۲۶۰) یعنی اجر و ثواب بھی دوہرا ہوگا۔

مکاتیبِ نبویؐ کا مطالعہ یہ بھی واضح کرتا ہے کہ ملوک و سلاطین کو دعوتِ اسلام دیتے ہُوئے رسولؐ اللہ نے سیاست و تدبر اور بالغ نظری کا صد درجہ ثبوت فراہم کیا۔ اس مرحلہ پر جبکہ ریاستِ نبوی کا بتدریج ارتقا ہو رہا تھا یہ بھی ضروری تھا کہ ریاستِ نبویؐ کو عرب کی سرحدی ریاستوں اور بڑی طاقتوں دونوں کے دست بُرد سے محفوظ کر لیا جائے۔ اس لئے رسولؐ اللہ نے صرف مرکزی قوتوں کو ہی نہیں جھنجھوڑا بلکہ ان مراکز سے قوت پانے والے تمام دوسرے عناصر کو بھی بے اثر کرنا ضروری خیال کیا۔ یعنی ایران و روم کے ماتحت عرب کے جن علاقوں یا سرحدوں پر طفیلی ریاستیں قائم تھیں ان کو نظر انداز کر کے شاہانِ ذی اقتدار کو دعوت دینا ریاستِ نبویؐ کے لئے بجائے خود مفید و موثر نہ ہو سکتا تھا اور اندرونِ عرب ان کی نمائندہ اقتدار کی موجودگی ریاست کے لئے پریشان کن ثابت ہو سکتی تھی۔ چنانچہ رسولؐ اللہ نے جہاں روم و فارس

اور دوسری سلطنتوں کے با اختیار حکمرانوں کو مخاطب کیا تو اسی کے ساتھ ساتھ ذیلی امرا و رؤسا کو بھی اسلام کی دعوت پیش کی۔ اس میں یہ حکمت بھی موجود تھی کہ اعوان و انصار کے علیحدہ ہو جانے سے بڑی قوتیں بھی یقیناً متاثر ہوں گی۔

بہرحال تاریخی طور پر یہ ثابت ہے کہ جب رسولؐ اللہ نے اپنے سفیر حضرت دحیہ کلبی کے ذریعہ قیصرِ روم کو مکتوب روانہ کیا[٢٦١] تو اس کے ساتھ ساتھ انتدابِ روم کے ماتحت تمام علاقوں کے فرمانرواؤں کو بھی خطوط روانہ کئے۔ ان میں نجاشی[٢٦٢] (حاکمِ حبشہ)، مقوقس[٢٦٣] (حاکمِ اسکندریہ)، حارث بن ابی شمر الغسانی[٢٦٤] (حاکمِ دمشق)، جبلہ بن الایہم[٢٦٥] (حاکمِ شام) فروہ بن عمرو الجذامی[٢٦٦] (عاملِ بلقا یا معان) ضغاطر اسقف[٢٦٧] اور سردارانِ قبیلہ لخم، کلب، داریون اور بلی وغیرہ[٢٦٨] کے نام مراسلات قابلِ ذکر ہیں۔ گویا سلطنتِ روم اور اس کے پورے منطقہ اثر کو رسولؐ اللہ نے اپنی دعوت کا ہدف بنایا۔ دوسری جانب سلطنت فارس اور اس کے ماتحت تمام امرا و رؤسا کو بھی مخاطب کیا اور اس سلسلے میں کسریٰ پرویز[٢٦٩] (شاہ فارس) ثمامہ بن اثال اور ہوذہ بن علی[٢٧٠] (حاکمانِ یمامہ) منذر بن ساوی اور ہلال بن امیہ[٢٧١] (حاکمان بحرین) اہلِ بحرین[٢٧٢]، ہرمزان[٢٧٣] (حاکم رامہرمز) اور سردارانِ قبیلہ بکر بن وائل[٢٧٤] وغیرہ کے نام خطوط قابلِ توجہ ہیں۔

مذکورہ بالا اشخاص کے نام مکاتیب ارسال فرما کر رسولؐ اللہ نے اسلام کی عالمی حیثیت کے قیام کے جس عظیم الشان کام کا آغاز کیا اس کے اثرات عالمی سیاسی حالات پر بھی بہت گہرے پڑے اور ریاست نبویؐ کے توسیع و ارتقاء کے باب میں بھی انہوں نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ لہٰذا آگے بڑھنے سے پہلے ہمیں مخاطبین اور ریاستِ نبویؐ دونوں پر مکاتیب کے اثرات کا جائزہ لینا ہوگا۔

اس وقت کی دنیا کے ان ملوک و سلاطین اور رؤسا، کا رویہ جنہیں رسولؐ اللہ نے مخاطب کیا، خواہ کچھ ہی رہا ہو یعنی انہوں نے دعوتِ اسلام کو قبول کیا یا ٹھکرا دیا لیکن یہ بہرحال طے ہے کہ آپ کی یہ خط و کتابت اپنے نتائج کے لحاظ سے یقینی طور پر کامیاب رہی مثلاً عمان[٢٧٥]، بحرین[٢٧٦] اور یمن[٢٧٧] کے امرا اسی مراسلت کے نتیجے میں حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ یہ علاقے اپنی زرخیزی اور دولت و اثرات کے لحاظ سے عرب کے دیگر تمام علاقوں سے بڑھے ہوئے تھے اور دراصل ان عرب قبائل کو جو ریاست نبویؐ سے برسرپیکار رہتے تھے ان ہی علاقوں سے غلہ اور اسلحہ فراہم کیا جاتا تھا۔ اس طرح یہ قبائل مسلمانوں کے خلاف ان کے دشمن کو بالواسطہ مدد پہنچاتے رہتے تھے۔ رسولؐ اللہ جانتے تھے کہ جب تک مسلمانوں کے دشمن قبائل کو ان علاقوں سے غلہ اور اسلحہ فراہم ہوتا رہے گا جنگ و جدل کا سلسلہ جاری رہے گا۔ اس لئے ان امارتوں کے ریاست نبویؐ کے زیرِ اثر آجانے سے رسولؐ اللہ کو زبردست کامیابی حاصل ہوئی اس کا نتیجہ یہ بھی نکلا کہ ریاست نبوی کے حدود مدینہ کے جنوب اور جنوب مشرق میں پُرامن طریقے سے عمان، بحرین اور یمن کے علاقوں تک پھیل گئے۔

بعض حکمرانوں نے بین بین رویہ اختیار کیا یعنی نہ دعوت کو رد کیا نہ قبول مثلاً یمامہ کا ایک امیر ہوذۃ بن علی تھا۔ سلیط بن عمرو العامری اس کے پاس خط لے کر پہنچے[٢٧٨] تو اس نے قبولِ دعوت کے لئے کچھ شرطیں پیش کیں لیکن رسولؐ اللہ نے اس کو نامنظور فرما دیا اور یہ پیشگوئی بھی کر دی کہ:

بادو باد مافی یدیہ۔ (۲۷۹)

(وہ بھی برباد ہوا اور وہ بھی جو اس کے ہاتھوں میں ہے)

چنانچہ ہوذہ کو زیادہ مہلت نہ مل سکی اور ۸ھ میں ان دنوں جبکہ آپ فتح مکّہ سے فارغ ہو کر مدینہ واپس ہو رہے تھے کہ ہوذہ کا انتقال ہو گیا۔(۲۸۰) مقوقس جو شاہِ روم کے ماتحت مصر (اسکندریہ) کا حکمران تھا اسے رسولؐ اللہ کا خط حاطب بن ابی بلتعہ نے پہنچایا۔(۲۸۱) خط پڑھ کر وہ بہت متاثر بھی ہوا اور قاصد اور خط دونوں کی تعظیم و تکریم بھی کی اور رسولؐ اللہ کے لئے ہدایا بھی ارسال کئے لیکن اسلام لانے پر بخل کیا۔(۲۸۲) گویا مذکورہ خطوط و مکاتیب نے اخلاقی اعتبار سے ان علاقوں میں نرم گوشے پیدا کر دئیے۔

مکاتیب پر ردِ عمل کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ مخاطبین نے اسلام کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور جیسا کہ آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا اپنے آپ کو تباہی کی دعوت دے دی۔ مثلاً شہنشاہِ فارس کسریٰ پرویز نے نامۂ مبارک چاک کر ڈالا اور اپنے عامل باذان کو رسولؐ اللہ کی سرزنش کے لئے لکھا۔(۲۸۳) اس کا نتیجہ ایک طرف تو یہ نکلا کہ یمن سلطنتِ ایران سے کٹ کر خود بخود رسول اللہ کے زیرِ سیادت آ گیا اور دوسرے یہ کہ کسریٰ پرویز شیرویہ کے ہاتھوں قتل ہوا(۲۸۴) اور پھر اس کے بعد ایران میں خانہ جنگی شروع ہو گئی اور دور افتادہ سرحدات کا تحفظ کمزور ہو گیا۔ سلطنتِ روم اسی انتظار میں تھی چنانچہ رومی فوجیں حرکت میں آئیں اور ایران کے اکثر علاقے رومیوں کی سلطنت میں شامل ہو گئے۔

فارس کے علاوہ روم کی طرف سے بھی شدید ردِ عمل کا اظہار کیا گیا۔ رسولؐ اللہ نے ایک خط حضرت حارث بن عمیر کے ہاتھوں شاہِ بصریٰ کے پاس بھی بھیجا تھا۔(۲۸۵) حاکم بصریٰ عیسائی تھا اور براہِ راست قیصرِ روم کے احکام کا تابع تھا۔ رسولؐ اللہ کے قاصد موتہ تک پہنچے تھے کہ انھیں شرحبیل بن عمرو الغسانی نے روکا اور قتل کر دیا۔(۲۸۶) تمام بین الاقوامی سفارتی آداب کو پسِ پشت ڈال کر ایک خود مختار ریاست کے سفیر کا قتل معمولی جرم نہ تھا۔ لہٰذا اس سانحہ کی اطلاع ملتے ہی رسولؐ اللہ نے جمادی الاوّل ۸ھ میں تین ہزار مجاہدین کی ایک فوج سرحدِ شام کی جانب روانہ کی(۲۸۷) تاکہ یہ علاقہ بھی آئندہ مسلمانوں کے لئے پُرامن ہو جائے اور یہاں کے لوگ مسلمانوں کو بے زور سمجھ کر ان پر زیادتی کی جرأت نہ کریں۔(۲۸۸) جنگِ موتہ کی تفصیلات سے قطع نظر تین ہزار مجاہدین کی مٹھی بھر جماعت موتہ کے مقام پر شرحبیل بن عمرو کی ایک لاکھ سے زائد فوج سے جا ٹکرائی۔(۲۸۹) اس پر تبصرہ کرتے ہوئے عصرِ حاضر کے ایک مصنف نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ:

"اس تہور کا نتیجہ یہ ہونا چاہیئے تھا کہ مجاہدینِ اسلام بالکل پس جاتے لیکن سارا عرب اور تمام مشرق قریب یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ ایک اور ۳۳ کے اس مقابلہ میں بھی کفار مسلمانوں پر غالب نہ آ سکے۔ یہی چیز تھی جس نے شام اور اس سے متصل رہنے والے نیم آزاد عربی قبائل کو بلکہ عراق کے قریب رہنے والے نجدی قبائل کو بھی جو کسریٰ کے زیرِ اثر تھے اسلام کی طرف متوجہ کر دیا اور وہ ہزاروں کی تعداد میں مسلمان ہو گئے۔ بنی سلیم (جن کے سردار عباس بن عمرو السلمی تھے) اور اشجع اور غطفان اور ذبیان اور فزارہ کے لوگ اسی زمانہ میں داخلِ اسلام ہوئے اور اسی زمانہ میں سلطنتِ روم کی عربی فوجوں کا ایک کمانڈر فروہ بن عمرو الجذامی مسلمان ہوا۔"(۲۹۰)

اس معرکہ کا ایک نتیجہ اور بھی نکلا جسے اکثر و بیشتر نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ جنگِ موتہ سے پہلے کم از کم پانچ سو سال کی پچھلی تاریخ میں اہلِ عرب نے کبھی سوچا ہی نہ تھا کہ وہ شہنشاہِ روم اور اس کی عظیم الشان قوت سے ٹکرا سکتے ہیں۔ لیکن جنگِ موتہ نے عربوں کی اجتماعی نفسیات بدل ڈالی۔ نتیجہ خواہ کچھ ہی رہا ہو یہ سب نے دیکھ لیا کہ ریاست نبوی کی ۳۳ گنا مختصر فوج نے اپنی بے سروسامانی اور قلت کے علی الرغم رومیوں پر حملہ کیا اور بے جگری و بے خوفی کے ساتھ لڑ کر یہ ثابت کر دیا کہ اہل عرب رومیوں سے برسرپیکار ہو سکتے ہیں اور ان کی عددی برتری سے مرعوب نہیں ہو سکتے۔ اسلامی فوج نے اپنے اس سیاسی موقعت کو بھی مخالف پر پُوری طرح واضح کر دیا کہ ریاست نبوی کی آزادی و خودمختاری کو برقرار رکھنے کے لئے ہر سطح پر مقابلہ کیا جائے گا اور فی الحقیقت حربی نتیجہ سے زیادہ بھی اخلاقی و سیاسی نتائج زیادہ اہم ہیں اور ہمارے نزدیک ان کا حصول جنگِ موتہ کے افادی پہلو کو مزید بڑھا دیتا ہے۔

جنگِ موتہ نے بہرحال تمام اہلِ عرب، اطراف و جوانب کے قبائل اور خود قیصرِ روم کو پوری طرح چوکنا کر دیا تھا۔ جنگِ موتہ کے ظاہری نتیجہ نے ممکن ہے ان کی ہمت افزائی کی ہو اور اسی لئے ان عربی قبائل نے بھی مزید مقابلے کی تیاریاں شروع کر دیں جو انتداب روم کے حلقہ میں شامل تھے اور موتہ کے موقع پر جنہوں نے رومیوں کی اعانت بھی کی تھی۔ مثلاً قضاعہ کی ایک جماعت اس ارادہ سے روانہ ہوئی کہ مدینۃ النبی پر حملہ آور ہو۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ اپنے ارادہ میں کامیاب ہو، رسولؐ اللہ نے حسبِ سابق جمادی الآخر ۸ھ میں حضرت عمرو بن العاص کی سرکردگی میں ایک مہم ذات السلاسل کی طرف بھیج کر اس کی سرزنش کر دی۔[۲۹۱]

لیکن اس کے باوجود رومی خطرہ کم نہیں ہوا اور چند ہی روز بعد یہ اطلاعات ملنے لگیں کہ "شام میں رومیوں کا اجتماع عظیم ہو گیا ہے اور ہرقل نے اپنے آدمیوں کو ایک سال کی (پیشگی) تنخواہ دے دی ہے، اس کے ہمراہ قبیلہ لخم، جذام و عاملہ و غسان وغیرہ کو بھی لایا گیا ہے اور اپنے مقدمات الجیوش کو بلقا تک بھیج دیا ہے"[۲۹۲] رسولؐ اللہ ہمیشہ کی طرح اب بھی مستعد تھے، آپ رومیوں کی ان تیاریوں کا مطلب اچھی طرح سمجھتے تھے۔ آپ نے بغیر کسی تامل کے ان سے ٹکرانے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ اس موقع پر کمزوری دکھانا مسلمانوں کی ہوا خیزی کا باعث ہوتا اور شہنشاہِ روم کے اس رعب و دبدبہ میں مزید اضافہ ہو جاتا جو ایرانیوں کو شکست دے کر وہ پہلے ہی قائم کر چکا تھا۔ پھر دارالحکومت مدینہ پر پیش قدمی تو ظاہر تھی۔ ان حربی و سیاسی نقصانات کے علاوہ یہ بھی اندیشہ تھا کہ ایک طرف تو وہ عصبیت جاہلیہ ان واقعات سے شہ پا کر پھر سے جی اُٹھے گی اور کفر و شرک کی ان طاقتوں کو تازہ خون مل جائے گا جن پر آخری ضرب جنگِ حنین میں لگائی جا چکی تھی۔

دوسری طرف مدینہ کے منافقین تھے جو ابو عامر راہب[۲۹۳] کے واسطے سے غسان کے عیسائی امرا اور خود قیصر کے ساتھ اندرونی ساز باز رکھتے تھے اور جنہوں نے اپنی ریشہ دوانیوں پر پردہ ڈالنے کے لئے مدینہ سے متصل ہی مسجد ضرار تعمیر کر رکھی تھی۔ ان کی خواہش تھی کہ ریاست نبویؐ کو جلد سے جلد تباہ کر دیا جائے ان وجوہ سے رسولؐ اللہ نے موقع کی نزاکت محسوس کرتے ہوئے رومیوں کے خلاف فوج کشی کا اعلان فرما دیا اور اس سلسلے میں اتنی عجلت سے کام لیا کہ نہ ملک میں قحط سالی کی پروا کی، نہ موسم کی شدت اور

بے پناہ گرمی کا خیال کیا اور نہ مجاہدین کی بے سروسامانی کو خاطر میں لائے۔ اور ہمیشہ کی طرح اس مرتبہ بھی دشمن کی نقل و حرکت سے قبل ہی رجب ۹ھ میں تیس ہزار فوج کے ساتھ شام کی جانب روانہ ہو گئے (۲۹۴) اور تقریباً دو ہفتہ کے دشوار ترین سفر کے بعد تبوک پہنچ کر خیمہ زن ہو گئے۔ تبوک میں آپ کا قیام بیس دن تک رہا (۲۹۵) اس اثنا میں نہ رومیوں کا کوئی لشکر مقابلہ پر آیا اور نہ لڑائی ہوئی۔ اس موقع پر رومیوں کے سامنے نہ آنے کی یہی یہ توجیہہ مناسب معلوم ہوتی ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رومیوں کی تیاریاں مکمل ہونے سے پہلے ہی مقابلہ پر پہنچ گئے تو انھوں نے سرحد سے فوجیں ہٹا لینے کے سوا کوئی چارہ نہ پایا۔ جنگ موتہ میں ۳ ہزار اور ایک لاکھ کے مقابلہ کی جو شان وہ دیکھ چکے تھے اس کے بعد ان میں اتنی ہمت نہ تھی کہ خود رسولؐ اللہ کی قیادت میں جہاں ۳۰ ہزار فوج آرہی ہو وہاں لاکھ دو لاکھ آدمی لے کر میدان میں آجاتا (۲۹۶)

تبوک کے قیام میں رسولؐ اللہ نے ایک جرأت مندانہ اقدام یہ بھی کیا کہ ایک مکتوب قیصر روم کو یہ تحریر فرمایا کہ "میں تمھیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دیتا ہوں اگر تم اسلام قبول کر لیتے ہو تو جو مراعات مسلمانوں کو حاصل ہوں گی وہ تمھیں حاصل ہوں گی اور جو واجبات ان پر عائد ہوتے ہیں وہی تم پر عائد ہوں گے لیکن اگر تم دائرہ اسلام میں داخل نہیں ہونا چاہتے تو پھر جزیہ ادا کرو۔ اس لئے کہ اللہ فرماتا ہے کہ:

قاتلوا الذین لا یؤمنون باللہ و بالیوم الاٰخر ولا یحرمون ما حرم اللہ و رسولہ ولا یدینون دین الحق من الذین اوتوا الکتٰب حتٰی یعطوا الجزیہ عن ید وھم صاغرون۔

(اہلِ کتاب میں سے جو لوگ اللہ پر اور روزِ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور نہ اللہ و رسول کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حرام قرار دیتے ہیں اور نہ دینِ حق کی اطاعت قبول کرتے ہیں ان سے جنگ جاری رکھو یہاں تک کہ وہ ماتحتی قبول کرتے ہوئے خود آخر جزیہ ادا کریں)

بصورتِ دیگر تم فلاحین اور اسلام کے درمیان حائل نہ رہو۔ وہ چاہیں تو دائرۂ اسلام میں داخل ہو جائیں یا پھر جزیہ دیں (۲۹۷) شاید اس مکتوب کا جواب رسولؐ اللہ کو مطلوب نہ تھا۔ (۲۹۸) مقصود تو صرف اظہار جرأت اور اخلاقی فتح۔ پھر اس اخلاقی فتح سے رسولؐ اللہ نے جو مزید سیاسی اور حربی فوائد حاصل کئے ان میں سے ایک فائدہ تو تبوک کے قیام ہی میں حاصل ہو گیا یعنی وہ سرحدی ریاستیں جو اب تک رومیوں کے زیر اثر تھیں ریاست نبوی کی باجگذار بن گئیں۔ چنانچہ حاکم ایلہ یحنہ بن روبہ خود آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور جزیہ دینا منظور کیا۔ (۲۹۹) رسولؐ اللہ نے اس پر یہ شرط لگائی کہ ان کی آبادیوں میں سے جو مسلمان گزرے گا وہ اس کی مہمان داری کریں گے۔ (۳۰۰) اہل جرباء و اذرح نے بھی جزیہ پر صلح کر لی (۳۰۱) اس کے بعد رسولؐ اللہ نے دُومتہ الجندل کو مطیع بنایا۔ آپ نے ایک دستہ فوج دے کر حضرت خالد بن ولید کو اکیدر بن عبدالملک کی طرف بھیجا۔ ایک معمولی سی جھڑپ کے بعد وہ قید ہوا اور آخرکار اس نے جزیہ پر صلح کر لی۔ (۳۰۲) پھر اہلِ مقنا کے عیسائی رؤسا نے بھی جزیہ کی شرط پر مصالحت کر لی۔ (۳۰۳)

ان سرگرمیوں کا صاف نتیجہ یہ نکلا کہ ریاست نبویؐ کے حدود و اقتدار براہِ راست جزیرہ نمائے عرب کی انتہائی شمالی

سرحدوں تک پہنچ گئے اور وہ عرب قبائل اب خود ان کے حریف بن گئے جن کو رومی سلطنت اب تک عرب کے خلاف استعمال کرتی رہی تھی۔ اور جواب مسلمانوں کے حلیف بن چکے تھے۔ مذکورہ بالا عیسائی قبائل کو ریاست نبویؐ کے زیر اثر لاکر رسول اللہؐ نے ایک بہت بڑا کارنامہ انجام دیا تھا۔ اس سے رومی سلطنت کے منطقہ اثر میں گہرے شگاف پڑ گئے جن کی وجہ سے صفر ۱۱ھ میں اسامہ بن زید کی وہ مہم بالآخر حضرت ابوبکر کے دور میں کامیابی سے ہمکنار ہوئی جسے ابتدائی طور پر رسول اللہؐ نے روانہ کیا تھا[۳۰۴] اور پھر آگے چل کر اسی بنا پر بلاد روم میں اسلام کے اثر و نفوذ، توسیع و اشاعت اور فتوحات کے دروازے کھل گئے۔ اسلام مستقبل قریب کی بین الاقوامی طاقت کی حیثیت سے محسوس کیا جانے لگا اور جنگ موتہ میں مسلمانوں کی عارضی پسپائی کے آثار و نقوش بھی محو ہو گئے۔ علاوہ ازیں مذکورۃ الصدر عیسائی سرحدی ریاستوں کی اطاعت نے رقبہ جنگ پر مسلمانوں کے غلبہ اور تسلط کو قائم کر دیا اور اس طرح "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حدود شمال پر مرکزی نقاط کی تنظیم میں پوری طرح کامیاب رہے۔"[۳۰۵]

غزوۂ تبوک کے نتیجہ میں عیسائیوں، رومیوں اور غسانیوں کا زور ٹوٹا تو ریاست نبوی کے ایک اہم اور خطرناک گروہ کا منصوبہ بھی ناکام ہو گیا۔ منافقین کی تمام ہمدردیاں آغاز سے ہی ریاست نبوی کے دشمنوں کے لئے تھیں اور وہ کوئی ایسا موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے جس کے ذریعہ اسلامی ریاست اور اسلامی معاشرہ کو نقصان پہنچایا جا سکے۔ غزوۂ احد، محاصرہ بنو نضیر، غزوہ احزاب، غزوہ بنو قریظہ، غزوہ بنی مصطلق کے مواقع پر انہوں نے مسلمانوں میں بے دلی پھیلانے، ان میں عصبیت جاہلیت کی آگ بھڑکانے، ان کے خلاف سازشیں کرنے، ریاست نبوی کے دشمنوں کے لئے جاسوسی کرنے اور اسلام و رسولؐ اللہ پر الزامات و اعتراضات کرنے میں کبھی بخل نہیں کیا تھا (مزید تفصیل استحکام کے سلسلے میں آئے گی) ان کی یہ حرکتیں اگرچہ اکثر اوقات سنگین نتائج کی راہ ہموار کر دیتی تھیں تاہم رسول اللہؐ نے ان کے شر و فساد کا دفعیہ کرنے پر ہی اکتفا کیا اور غزوۂ تبوک سے پہلے تک ان کے ساتھ نرمی و ملاطفت اور عفو و درگذر کا سلوک فرماتے رہے۔ رسول اللہؐ کے اس نرم رویہ کا سبب غالباً ایک تو یہ تھا کہ منافقین زبان سے بہرحال اسلام و ایمان کا اقرار کرتے تھے اور ان کا شمار بھی زمرہ مسلمین میں ہوتا تھا اس لئے ان کے خلاف تادیبی کارروائی خود مسلمانوں میں بددلی اور ناگواری کے جذبات پیدا کر سکتی تھی۔ دوسرے یہ کہ ان کے ہم قبیلہ اور ہم محلہ افراد کی جماعت بھی موجود تھی جو اسلام کے معاملہ میں انتہائی مخلص تھے اور اپنے رشتہ دار منافقین پر خود ہی شاہد عادل بنتے جا رہے تھے۔ تیسرے یہ کہ ریاست کے لئے اندرونی و بیرونی طور پر اتنے خطرات درپیش تھے کہ ان سے عہدہ برآ ہوئے بغیر منافقین کا قلع قمع کرنا مناسب نہ تھا۔ لیکن اب جبکہ رسول اللہؐ داخلی و خارجی اور سیاسی و حربی ہر محاذ پر پوری طرح فتحیاب ہو چکے تھے۔ وہ مناسب وقت آگیا تھا کہ اس گروہ کو قرار واقعی سزا دی جائے اور منافقت کی فصل کاٹ کر رکھ دی جائے۔ حاکم حقیقی کی طرف سے بھی ہدایت آگئی تھی کہ:

یٰایھا النبی جاھد الکفار والمنافقین واغلظ علیھم۔[۳۰۶]

(اے پیغمبر! کفار اور منافقین دونوں کا پوری قوت سے مقابلہ کیجئے اور ان کے ساتھ سختی سے پیش آئیے)

گویا کہا یہ گیا کہ جو سخت برتاؤ کھلے ہوئے منکرین حق کے ساتھ ہو وہی سخت برتاؤ ان چھپے ہوئے منکرین حق کے ساتھ بھی روا رکھا جائے۔[۳۰۷] چنانچہ اس کی تعمیل میں غزوۂ تبوک پر جانے سے پہلے ہی رسول اللہؐ نے اس یہودی کے گھر میں آگ لگوادی تھی

جہاں منافقین کا گروہ مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرنے کے لئے جمع ہوتا تھا اور پھر ہدایتِ خداوندی کے تحت ہی تبوک سے واپس تشریف لاتے ہوئے رسول اللہؐ نے مدینہ میں داخلہ سے پہلے چند صحابہ کو یہ حکم دے دیا تھا کہ مسجد ضرار کو منہدم کر دیں (۳۰۸)

واقعہ یہ ہے کہ منافقین کو کم و بیش نو سال تک سوچنے سمجھنے اور دین حق کے بارے میں مطمئن ہو جانے کا موقع دیا جا چکا تھا اور اگر وہ واقعی خیر خواہی اور اخلاص برتتے اور اپنے طرزِ عمل کو درست کر لیتے تو ظاہر ہے ان سے تعرض کا سوال نہ تھا مگر اس طویل مہلت سے بھی انہوں نے فائدہ نہیں اٹھایا۔ اس لئے لامحالہ ان کے خلاف کارروائی کی گئی۔ اب ان کے ساتھ نہ تو مزید رعایت کی کوئی گنجائش موجود تھی اور نہ منشائے خداوندی ان کے حق میں تھی یہاں تک کہ تبوک سے واپسی پر کچھ ہی دنوں بعد عبداللہ بن ابی انتقال ہو گیا۔ رسول اللہؐ نے ازراہِ ترحم نماز اور دعائے مغفرت کرنی چاہی تو آپ کو اس سے بھی روک دیا گیا۔ (۳۰۹)

واقعہ یہ ہے کہ عبداللہ بن اُبی کی موت سے منافقین کو دوہرا نقصان اٹھانا پڑا ایک تو یہ کہ ان کی فعّال قیادت ختم ہو گئی اور دوسرے یہ کہ ان کی ساری تگ و دو ابنِ اُبی کی تاجپوشی کے لئے ہی تھی اس کا موقع غزوۂ تبوک میں رسول اللہؐ کی اخلاقی فتح اور رومیوں کی خاموشی، نیز یہود، کفار قریش اور دیگر قبائل عرب کے مفتوح و مغلوب ہو جانے اور سب سے بڑھ کر ابن ابی کی موت سے حاصل نہ ہو سکا اب ان کے سارے منصوبے بکھر چکے تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ غزوۂ تبوک کے بعد سورۂ توبہ میں منافقین کے کردار، ان کی ایک ایک حرکت اور طرزِ عمل کی پوری قلعی کھول دی گئی (۳۱۰) یہاں تک کہ کسی منافق کے لئے یہ ممکن نہ رہا کہ اپنے آپ کو پوشیدہ رکھ سکے۔ اب تازہ الہامی احکام کی روشنی میں ان سے کسی قسم کی رو رعایت کا سوال بھی نہ تھا۔ ان وجوہ سے بحیثیت ایک گروہ کے منافقین کا خاتمہ ہو گیا اور یہ دراصل غزوۂ تبوک ہی کا ایک نتیجہ ہے۔

تبوک کی مہم سے عصبیت جاہلیہ اور کفر و شرک کی تحریک بھی بُری طرح متاثر ہوئی اس کا مستقبل تاریک ہو گیا اور مولانا مودودی کے الفاظ میں "تبوک کی بلا جنگ فتح نے عرب میں ان لوگوں کی کمر توڑ دی جو اب تک جاہلیت قدیمہ کے بحال ہونے کی آس لگائے بیٹھے تھے خواہ وہ علانیہ مشرک ہوں یا اسلام کے پردہ میں منافق بنے ہوئے ہوں۔ اس آخری مایوسی نے ان میں سے اکثر و بیشتر کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہنے دیا کہ اسلام کے دامن میں پناہ لیں اور اگر خود نعمت ایمانی سے بہرہ ور نہ بھی ہوں تو کم از کم آئندہ نسلیں بالکل اسلام میں جذب ہو جائیں۔ اس کے بعد ایک برائے نام اقلیت شرک و جاہلیت میں ثابت قدم رہ گئی۔ وہ اتنی بے بس ہو گئی تھی کہ اس اصلاحی انقلاب کی تکمیل میں کچھ بھی مانع نہ ہو سکتی تھی جس کے لئے اللہ نے اپنے رسولؐ کو بھیجا تھا"۔ (۳۱۱)

یہاں یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ سورۂ توبہ کی ابتدائی ۳۷ آیات اسی مرحلہ پر یعنی ذی قعدہ ۹ھ میں نازل ہوئیں۔ (۳۱۲) ان آیات میں چند ایسے اقدامات کا حکم دیا گیا تھا جن کی تعمیل سے عرب مکمل طور پر دار الاسلام بن رہا تھا۔ اگرچہ فتح مکہ کے موقع پر بھی کچھ مرکزی مقاماتِ کفر و شرک منہدم کئے گئے تھے (۳۱۳)۔ لیکن اب تقریباً پورے عرب کا نظم و نسق بالکلیہ اہلِ ایمان کے ہاتھ میں آ گیا تھا اور تمام مزاحم قوتیں بے بس ہو کر رہ گئی تھیں اس لئے حکم یہ دیا گیا کہ مشرکین سے اظہارِ برأت کیا جائے (۳۱۴) ان کے ساتھ معاہدات ختم کر دئے جائیں (۳۱۵)، قدیم مشرکانہ نظام کا مکمل استیصال

کر ڈالا جائے[۳۱۶]، کعبہ کا انتظام صرف مسلمانوں کے ہاتھ میں ہونا چاہیئے[۳۱۷]، نیز بیت اللہ کے حدود میں شرک و کفر کی تمام رسمیں بند کر دی جائیں[۳۱۸] اور عرب کی تمدنی زندگی میں جو بھی آثارِ جاہلیت باقی رہ گئے ہیں انھیں محو کر دیا جائے۔ چنانچہ اس سلسلے میں ایک اہم جاہلی رسم نسئی کا قاعدہ موقوف کر دیا گیا۔[۳۱۹]

مہمِ تبوک کا آخری لیکن اہم ترین نتیجہ یہ ظاہر ہوا کہ عرب کے گوشے گوشے سے وفود آنے لگے اور رسول اللہؐ کی سیاسی قیادت پر صاد کرنے لگے۔ وفود کتنے تھے اور عرب کے کس کس گوشے سے آ کر مدینہ حاضر ہوئے اس کا تفصیلی بیان ابنِ سعد کے یہاں موجود ہے، ابنِ سعد کے شمار کے مطابق کل ا، وفود آئے لیکن مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ سب سے پہلا وفد قبیلہ مزینہ کا تھا جو رجب ۵ھ میں رسول اللہؐ کی خدمت میں آیا۔[۳۲۰] اور آخری وفد غالباً محارب کا تھا جو حجۃ الوداع یعنی ذی الحجہ ۱۰ھ میں رسول اللہؐ سے ملا تھا۔[۳۲۱]

ابنِ سعد کی تصریحات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ غزوۂ تبوک سے پہلے تک جو وفود خدمتِ نبویؐ میں حاضر ہو چکے تھے ان کی تعداد پندرہ کے لگ بھگ ہے۔[۳۲۲] ان کے علاوہ فزارہ، مرہ[۳۲۳] اور داریین[۳۲۴] کا وفد تبوک سے رسول اللہؐ کی واپسی پر مدینہ آیا۔ خولان[۳۲۵]، سلامان[۳۲۶]، غسان[۳۲۷]، حارث بن کعب[۳۲۸]، الرہاویین[۳۲۹] اور بجیلہ[۳۳۰] کے وفود ۱۰ھ کے مختلف مہینوں میں آئے۔ جبکہ وفد تمیم[۳۳۱]، کلاب[۳۳۲]، بنی البکا[۳۳۳]، بنی تجیب[۳۳۴]، حمیر[۳۳۵] کے وفود نے ۹ھ میں اظہارِ اطاعت کیا اور تقریباً چالیس وفود ایسے ہیں[۳۳۶] جن کی آمد کو ابنِ سعد نے متعین تو نہیں کیا ہے لیکن غالب امکان یہی ہے کہ ان کی آمد بھی ۹ھ میں واقعہ تبوک کے بعد ہوئی۔ بہرصورت زمانہ کا فرق کچھ ہی ہو جس طرح یہ بات طے ہے کہ مذکورہ وفود نے اسلام کی سیاسی حاکمیت اور ریاستِ نبویؐ کی سیادت کو تسلیم کر لیا۔ اسی طرح ان وفود کی آمد اس امر کو بھی ثابت کر دیتی ہے کہ عرب کے ہر گوشے اور ہر جانب ریاستِ نبوی کا سکّہ رواں ہو گیا۔ یہ تو ہو سکتا ہے اور اس کی تائید بھی تاریخی واقعات سے ہو جاتی ہے کہ عرب میں رہنے والے تمام لوگوں نے اسلام قبول نہ کیا تھا۔ مگر اس میں کسی کو کلام نہیں کہ یہ سب کے سب ریاستِ نبوی کے باشندے تھے خواہ آزاد حیثیت سے اور چاہے ذمّی کی حیثیت سے، اور جیسا کہ ہم اوپر کہہ چکے ہیں کہ آخری وفد ذی الحجہ ۱۰ھ میں رسول اللہؐ کے پاس آیا تھا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ریاستِ نبویؐ کے حدود میں توسیع کا عمل آپ کی وفات سے کچھ عرصہ پہلے تک جاری رہا اور پھر حجۃ الوداع[۳۳۷] کے موقع پر الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا[۳۳۸] (آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے لئے اسلام کو بحیثیت دین کے پسند کر لیا) کے ارشادِ خداوندی کے بموجب دین کے اتمام و اکمال کے ساتھ ہی ساتھ ریاستِ نبوی کا ارتقاء بھی مکمل ہو گیا۔ گویا ۱ھ میں ریاست کی تاسیس سے ۱۰ھ میں ریاست کی تکمیل تک کے دس سالہ عرصہ میں رسول اللہؐ کا اقتدار بلا شرکتِ غیرے پورے عرب پر قائم ہو گیا اور رسول اللہؐ کی ریاست و بعثت کا مقصد (جس کے لئے آپ کو مبعوث کیا گیا تھا) یعنی غلبہ اسلام اور دعوت الی اللہ بھی اتمام کو پہنچا۔ اور اللہ کا یہ ارشاد تاریخ کی پوری روشنی میں ظاہر ہو گیا کہ:

یریدون ان یطفؤا نور اللہ بافواھھم ویابی اللہ الا ان یتم نورہ ولو کرہ

الکافرون ۔ ھوالذی ارسل رسولہ بالھدٰی ودین الحق لیظھرہٗ علی الدین کلہ ولوکرہ المشرکون ۔[۳۳۹]

(یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں مگر اللہ اپنے نور کو اتمام کو پہنچائے بغیر نہ رہے گا ۔ خواہ کافروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو ۔ وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسولؐ کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اسے دوسرے تمام ادیان پر غالب کر دے)

باب چہارم

استحکامِ ریاست

چونکہ توسیع ریاست کا مطالعہ ہم نے دو ادوار کے تحت کیا ہے اس لئے استحکامِ ریاست کے لئے بھی مناسب ہوگا کہ دور کی حسب سابق تقسیم کے مطابق مطالعہ کیا جائے۔

(۱) دورِ اوّل

گزشتہ مباحث سے یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ اس عرصہ میں ریاست مدینہ نے اپنے وجود و قیام کو پُوری طرح ثابت کر دیا اور یہ ظاہر ہوگیا کہ وُہ دنیا کی ہر مخالفت اور ہر منفی کوشش کا بھرپور مقابلہ کرکے اپنی سالمیت و خود مختاری کی بخوبی حفاظت کر سکتی ہے۔ دُوسرے یہ کہ اس دور کا ابتدائی پانچ سالہ عرصہ تاریخی اعتبار سے بہت ہنگامہ خیز، بڑا اہم جُویانہ اور انتہائی صبر آزما ثابت ہوا۔ اس دوران اندرونی و بیرونی شورشوں، مخالفتوں اور عسکری حملوں کی وجہ سے رسولؐ اللہ کو ایک دن بھی امن و سکون حاصل نہ ہو سکا۔[1] تاہم ان تمام شدائد کے باوجود نہ تو رسولؐ اللہ کے عزم و حوصلہ میں کوئی فرق آیا اور نہ ان فرائض اور ذمہ داریوں کے ادا کرنے میں کوئی کوتاہی صادر ہُوئی جو بحیثیت رسولؐ اللہ و بحیثیت حکمران کے آپ پر عائد ہوتی تھیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین عرب، یہودِ مدینہ، کفارِ قریش اور دوسرے مخالفین کی سرگرمیوں کو کچل کر ریاست مدینہ کی آزادانہ حیثیت کو بھی برقرار رکھا اور اسی کے ساتھ ساتھ مدینہ میں جس اسلامی معاشرے کی تشکیل و تنظیم ہو چکی تھی اس کی ترتیب اور حرکت پذیری کے عمل میں کوئی فرق نہ آنے دیا۔ ان باتوں کے علاوہ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ بے شمار مزاحمتوں کے علی الرغم اشاعتِ اسلام کے کام کو بھی رسولؐ اللہ نے انتہائی سرگرمی سے جاری رکھا اور اس پر مستزاد یہ کہ فرائضِ حکومت یعنی قانون سازی، عام نظم و نسق، تنفیذِ احکام اور عدل و انصاف کے قیام کے سلسلے میں بھی کوئی معمولی سی غفلت نہیں برتی۔

ان تمام فرائض و اعمال کا مرکز و منبع آنحضرتؐ کی ذات تھی۔ آپ ہی تمام شعبوں کے صدر اور نگران تھے اس سے جہاں ایک طرف یہ فائدہ ہوا کہ ہر چیز میں نظم و مرکزیت پیدا ہوئی وہاں دوسری طرف تہذیب و تمدن کا فروغ اور ریاستؔ و سلطنت کا استحکام و ارتقا وحی کی روشنی میں ہوا۔ قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت سے تقریباً ایک سال قبل رسولؐ اللہ کو ایسے رہنما اصول دے دیئے گئے تھے جن پر آئندہ اسلامی ریاست اور معاشرہ کی تعمیر پیشِ نظر تھی - یہ اصول جن کو سورہ الاسرا میں بیان کیا گیا ہے[2] ان کا خلاصہ اور مفہوم ہم اپنی زبان میں اس طرح پیش کر سکتے ہیں:

(۱) نہ صرف یہ کہ مذہبی نظامِ زندگی کا محور "توحید" ہوگا۔[۳] بلکہ سیاسی نظام کی بنیاد بھی بلا شرکتِ غیرے حاکمیت و اقتدارِ الٰہی پر ہوگی۔[۴]

(۲) چونکہ معاشرہ کے استحکام کے لئے اس کے اداروں کا مضبوط ہونا ضروری ہے اور تمدن و معاشرت کا اوّلین ادارہ اور سب سے پہلی اکائی خاندان ہے اس لئے ایک طرف تو ماں باپ کے حقوق و فرائض اور ان کا ادب و احترام لازمی قرار دیا گیا[۵] تو دوسری طرف معاشرہ کو منکرات سے بچانے اور خاندان کے ادارہ کو محفوظ کرنے کے لئے زنا اور فواحشات کو سخت مکروہ اور ناپسندیدہ بتایا گیا[۶] اور تیسری طرف قتلِ اولاد کی ممانعت کر دی گئی۔[۷]

(۳) معاشرہ کے استحکام و بقا اور امن و امان کی ضمانت کے لئے انسانی جان کا احترام لازمی شرط ہے اس لئے یہ طے کر دیا گیا کہ کوئی شخص نہ اپنی جان لینے کا حق رکھتا ہے اور نہ دوسرے کی جان۔ البتہ اللہ کی مقرر کی ہوئی یہ حرمت صرف اسی صورت میں ٹوٹ سکتی ہے جبکہ اللہ ہی کا مقرر کیا ہوا کوئی حق اس کے خلاف قائم ہو جائے اور اس میں بھی ظلم و تعدّی جائز نہیں ہے۔[۸]

(۴) اجتماعی زندگی میں تعاون، فیاضی، ہمدردی اور امداد و اعانت کی فضا قائم کرنے کے لئے حق شناسی اور حق رسانی ضروری ہے اور معاشرتی عدل بھی افرادِ معاشرہ میں حقوق و فرائض کے تعین اور حسنِ سلوک کے بغیر جاری و ساری نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہا گیا کہ اقربا، اعزّہ، مساکین، مسافر اور دوسرے حاجت مند حسنِ سلوک، ہمدردی اور احسان و ملاطفت کے مستحق ہیں۔[۹] یتامٰی کے حقوق و مفادات کی حفاظت کا حکم اس وقت تک کے لئے دیا گیا جب تک کہ وہ اپنے پیروں پر خود کھڑے نہ ہو جائیں[۱۰] ایفائے عہد کو انفرادی زندگی کے معاملات کے ساتھ ساتھ خارجی و داخلی سیاست کا بھی سنگِ بنیاد بنایا گیا اور عہد کی خلاف ورزی قابلِ مواخذہ قرار دی گئی[۱۱] اور ہر معاملے میں ہر پیمانے پر وہم و گمان کی پیروی کے بجائے علم و آگہی کی پیروی کرنے کا حکم دیا گیا[۱۲] اور یہ ہر ایک جانتا ہے کہ معاشرہ میں باہمی تعاون اور اعتماد کی روایت قائم کرنے کے لئے یہ نکتہ کتنا اہم ہے۔

(۵) معاشی اصولوں کے ضمن میں بنیادی طور پر اس تخیّل کی نفی کی گئی کہ فطری معاشی تفاوت کو ختم کر کے رزق و وسائل کے اعتبار سے معاشرہ میں لازماً جبری مساوات نافذ کی جائے، بلکہ یہ تعلیم دی گئی کہ فطری معاشی فرق کو مصنوعی طور پر ختم نہیں کرنا چاہئے کیونکہ "اللہ جس کے لئے چاہتا ہے رزق کشادہ کر دیتا ہے اور جس کے لئے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے"[۱۳] صحت مند معیشت کے فروغ کے سلسلے میں کہا گیا کہ فضول خرچی سے بچا جائے[۱۴]، بخل و اسراف سے پرہیز کیا جائے[۱۵] گویا دولت کو غلط طریقوں سے ضائع کرنے یا اس کی گردش کو روک دینے کے بجائے اعتدال و میانہ روی کی تلقین کی گئی۔[۱۶] لین دین میں صحیح ناپ تول کرنے کی ہدایت کی گئی۔[۱۷]

(۶) یہ بھی ہدایت کی گئی کہ زمین پر اکڑ کر نہ چلو[۱۸]، اس طرح جباروں اور متکبروں کی روش پر چلنے کی ممانعت کی گئی۔ جو زندگی کے ہر انفرادی و اجتماعی دائرہ پر یکساں حاوی ہے۔

بہرحال تعلیم کے پہلو میں اخلاق و تمدن کے وہ بڑے بڑے اصول ہیں جن پر زندگی کے نظام کو ہجرت مدینہ کے بعد قائم کرنا تھا۔

مدینہ طیبہ تشریف لانے کے بعد رسول اللہ نے ان اصولوں کو عملی جامہ پہنایا اور حالات و ضروریات کے تقاضوں کے مطابق بتدریج نافذ فرماتے رہے۔ یہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ ہجرت مدینہ کے بعد ریاست کی تشکیل کس طرح ہوئی اور یہ بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ منشورِ مدینہ اور مواخاۃِ صحابہ کے ذریعہ اہلِ مدینہ کے درمیان عموماً اور اہلِ ایمان کے مابین خصوصاً حقوق و فرائض کے تعین، ربط و ارتباط اور تعاون و ہم آہنگی کی جو کوششیں رسول اللہ نے فرمائی تھیں ان کے کیا اثرات و نتائج مرتب ہوئے۔

ان اقدامات کے علاوہ ایک بنیادی کام جو رسول اللہ نے انجام دیا وہ مسجد نبوی کی تعمیر تھی۔ تاریخی ترتیب کے اعتبار سے تعمیرِ مسجد کا کام مواخاۃ صحابہ اور منشورِ مدینہ دونوں پر تقدمِ زمانی رکھتا ہے کیونکہ مسجد نبوی کی تعمیر کا آغاز رسول اللہ نے آمدِ مدینہ کے فوراً بعد ہی کر دیا تھا[19] اور تقریباً سات ماہ کے عرصہ میں جب وہ مکمل ہو گئی تو آپ وہاں مستقلاً فروکش ہو گئے۔[20]

مسجد نبوی نے مدنی معاشرے میں بڑا اہم کردار ادا کیا وہ نہ صرف عبادت گاہ، فرودگاہ رسول اور مرکزی اجتماع گاہ تھی بلکہ مسلمانوں کی معاشرتی زندگی کا بھی مرکز تھی مسجد نبوی کے ذریعہ ایک طرف تو اسلام کی تعلیم و تعلم اور تبلیغ و اشاعت کا سلسلہ دراز ہوا، مسلمانوں کی اخلاقی و روحانی تربیت اور کردار سازی کا ضروری کام انجام پایا۔ مسلمانوں کو اخوت، ہمدردی، غمخواری اور تفادق و تعاون کا سبق ملا۔ بلکہ ان ثقافتی و معاشرتی فوائد سے آگے بڑھ کر دوسری طرف مسجد نبوی نے مسلمانوں کی پاکیزہ سیاسی و شہری تربیت میں بھی اہم حصہ لیا۔ مسجد میں نظام جماعت کا اہتمام اور وہ بھی ایسا مستحکم کہ صف بندی میں ذرا سا بھی رخنہ گوارا نہیں۔ گویا کسی طور تنظیم میں کھوکھلا پن پیدا نہ ہو، پھر ایک امام کی اقتدا، اطاعت کا حکم اور ظاہری و باطنی پاکی و نظافت ایسی چیزیں ہیں جو صرف نماز کی صحت مند ادائیگی کے لئے ضروری نہیں ہیں بلکہ ان کی ضرورت اس سے زیادہ سیاست و حکومت کے معاملات اور بہترین شہری زندگی کی تشکیل میں پڑتی ہے۔ یہی صفات، مساوات، رواداری اور معاشرتی عدل کا موجب بنتی ہیں اور ان ہی سے ایک اچھی حکومت، منظم معاشرہ اور پختہ و مستحکم اجتماع وجود میں آتا ہے۔ مسجد نبوی نے ان بنیادوں کی تعلیم بھی دی اور ان کا دن میں پانچ بار عملی سبق بھی سکھایا جن پر ریاستِ نبوی کو قائم کرنا مقصود تھا۔ بلکہ غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مسجد کا ادارہ بجائے خود ایک ریاست کی عکاسی کرتا ہے۔ مثلاً ایک ریاست کے چار عناصر ترکیبی عام طور پر بیان کئے جاتے ہیں یعنی آبادی، علاقہ، حکومت اور اقتدارِ اعلیٰ۔ اب ظاہر ہے کہ مسجد ایک متعین علاقے یا خطہ پر واقع ہوتی ہے اس کی آبادی اس میں آنے والے نمازیوں سے پوری ہوتی ہے۔ مقتدیوں کا امام کے حکم کا اتباع اور اس کے اشارہ کی پیروی حکومت کی ہم معنی ہے اور اللہ کی کبریائی و حاکمیت اور اقتدار و حکم کا اعتراف و اعلان تو امام و مقتدی سب ہی مل کر بہر صورت کرتے ہیں۔ مسجد نبوی کی تعمیر میں مذکورہ بالا سیاسی، معاشی، معاشرتی، تہذیبی اور تمدنی مضمرات کے

علاوہ دفاعی اور جنگی مصالح کی جھلک بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ مثلاً یہی بات کہ مسجد نبویؐ مدینہ میں بالکل مرکزی جگہ تھی اور قبائل و باشندوں کی چھوٹی چھوٹی بستیوں کا ایک زنجیرہ چاروں جانب پھیلا ہوا تھا۔ اس لئے یہ جگہ بہت محفوظ اور چاروں طرف آبادی سے گھری ہوئی تھی۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ مسجد نبوی کا ادارہ محض رسمی نوعیت کا نہ تھا۔ دین و دنیا کی تمام تعلیمات مسلمانوں کو یہیں سے دی جاتی تھیں۔ قوانین کا اجرا و اعلان یہیں سے ہوتا تھا۔ لشکرِ اسلام کو قواعدِ جنگ کی تعلیم بھی یہیں سے ملتی تھی اور جہاد میں فوج کی روانگی بھی اسی مقام سے عمل میں آتی تھی۔ وفود اور مہمان بھی یہیں اترتے تھے۔ اسی میں مدینہ کا پہلا دار العلوم "صفہ" تھا۔ اسی میں سربراہِ حکومت کا دفتر تھا۔ اسی میں فصل مقدمات ہوتے تھے اور بعض اوقات اسی جگہ مجرموں کو بطور قیدی رکھا جاتا تھا۔[۲۱]

مختصر یہ کہ اس ادارہ نے بکھرے ہوئے انسانوں کو بتدریج جمع کرنے اور انتشار و تشتت کا قلع قمع کرنے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں میں باہمی یگانگت و محبت اور اتحاد و اتفاق کی ناقابلِ تسخیر قوت پیدا کرنے میں بے مثال کردار انجام دیا۔ چنانچہ اجتماعیت و مرکزیت اور نظم و انتثال امر کی اسی تربیت کا نتیجہ تھا کہ شریعت نے مسلمانوں کی شیرازہ بندی کو توڑنے کی کسی حال میں اجازت نہیں دی حتیٰ کہ میدانِ کارزار میں بھی نظمِ جماعت کو درہم برہم نہ ہونے دیا۔[۲۲] اور عام حالات میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ جب بھی ایک سے زیادہ آدمی ہوں تو لوگوں کو چاہئے کہ ایک کو اپنا قائد منتخب کر لیں۔[۲۳]

مزید برآں مسجد نبویؐ کی یہ افادیت و اہمیت اگرچہ پہلے دن سے ہی مسلّم تھی لیکن جب ۲ھ میں اذان[۲۴] اور تحویل قبلہ کا حکم[۲۵] بھی نافذ ہو گیا تو اس کی حیثیت دوچند ہو گئی۔ قبلہ متعین ہو جانے کا مطلب صرف اتنا ہی نہ تھا کہ نماز یا رکوع و سجود کی ایک سمت مقرر ہو گئی بلکہ یہ بھی کہ روحانی، معاشی، سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی و تمدنی نظامِ حیات کا مرکزِ توجہات وہ دینِ خداوندی ہے جسے پہلے حضرت ابراہیم نے پیش کیا تھا اور اب رسول اللہ پیش کر رہے ہیں۔ قرآن میں تحویل قبلہ کی ایک بڑی مصلحت کو لنعلم من یتبع الرسول[۲۶] کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے یعنی دیکھیں رسولؐ کا اتباع کون کرتا ہے؛ گویا یہ ایک امتحان تھا جس میں اہلِ ایمان تو کامیاب رہے مگر سفہاء[۲۷] ناکام ہوئے۔ علاوہ بریں اسی موقع پر یہود و منافقین کے چہرے بھی بے نقاب ہو گئے۔

رسول اللہ ان اقدامات سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ دوسری طرف سے قریشِ مکہ کی مخالفانہ سرگرمیاں شروع ہو گئیں اس لئے ایک ضرورت تو یہ تھی کہ دفاع کا ظاہری سازوسامان فراہم کیا جائے اور مادی طاقت اکٹھی کی جائے۔ اس ضرورت کو رسول اللہ نے کس طرح پورا کیا، اس کا مفصل جائزہ ہم گزشتہ صفحات میں لے چکے ہیں۔ دوسری ضرورت اس بات کی تھی کہ اخلاقی اعتبار سے بھی مسلمانوں کو تیار کیا جائے تاکہ وہ میدانِ جنگ کی طرح زندگی کے ہر میدان میں پیشقدمی کر سکیں اور اسلام پر جاہلی نظامِ زندگی کے ہر وار کو روکنے کی صلاحیت پیدا کر سکیں بلکہ آگے بڑھ کر مسلح مزاحمت کے لئے بھی دل کی قوت مجتمع کر سکیں کہ اس کے بغیر مادی سازوسامان بھی بیکار ہو جاتا ہے۔ اور

کسی بھی جنگ میں کامیابی کے لئے یہ شرط ہمیشہ کی طرح آج بھی ضروری ہے۔ نپولین کا قول ہے کہ "اخلاقی طاقت، جسمانی طاقت سے کم از کم تین گنا زیادہ اہم ہے۔ چونکہ فوج ہر لحاظ سے اپنے ملک و قوم کی علمبردار ہوتی ہے اس لئے جس فوج میں سچائی، بُرد باری، ایثار و جاں نثاری اور صلاحیت و استعداد کی خوبیاں اور عشرت رانی کے بجائے نفس کشی کے اوصاف ہوں گے، وہ ہر جد و جہد میں کامیاب رہے گی۔[28] یہی وجہ ہے کہ قرآن کی جو سُورتیں مدینہ کے ابتدائی دور میں نازل ہوئیں[29] ان میں ایمانیات[30]، خصوصاً ایمان باللہ[31]، ایمان بالرسولؐ[32] اور ایمان بالآخرت[33]، اتباع حق[34]، اطاعتِ خدا اور رسولؐ[35]، اعتماد و توکل علی اللہ[36]، تقویٰ[37]، صبر و استقامت[38]، ثابت قدمی یا استقلال و پامردی[39]، ذکر اللہ[40]، امر بالمعروف ونہی عن المنکر[41]، عمل صالح[42]، اقامت صلوٰۃ[43]، سمع و طاعت[44]، تسلیم و رضا[45]، احسان[46]، شہادت حق[47]، خشیت باری[48]، توبہ و انابت[49]، ایفائے عہد، اقربا، یتامیٰ، مساکین، مسافروں، ضرورت مندوں کی امداد و اعانت، قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک[50] اور اخلاقِ حسنہ کی تعلیم دی گئی اور بعد میں بھی وقتاً فوقتاً ان کو دُہرایا جاتا رہا۔ اسی ابتدائی زمانہ میں اپنے پرایوں دونوں سے ہوشیار و محتاط رہنے کی تاکید[51] اور معاملات میں باہمی مشورہ[52] نیز ہوشیاری[53] سے کام لینے کی تلقین انتہائی معنی خیز اور قابلِ ذکر ہے اس کے ساتھ ساتھ جہاد فی سبیل اللہ[54] اور قتال فی سبیل اللہ[55]، کافروں کی گردن مارنے[56]، منافقت سے پرہیز[57]، نافرمانیِ رسولؐ سے اجتناب[58]، کفار و اعدا کی کثرت سے نہ گھبرانے یا ہمت نہ ہارنے[59]، بخل سے بچنے[60]، انفاق فی سبیل اللہ[61] کرنے، نصرتِ خداوندی[62] پر یقین رکھنے، ہر معاملہ میں امانت و دیانت اختیار کرنے[63] اور دشمن کا مقابلہ کرنے کے لئے ہر قسم کی تیاری کرنے[64] کی واضح تعلیمات دی گئی ہیں۔

ان احکام و ہدایات سے مسلمانوں کو چند دوسرے فوائد بھی حاصل ہُوئے۔ مثلاً ان اوصافِ حمیدہ کی بناء پر مسلمانوں نے اس وقت کے عرب جاہلی معاشرہ میں اپنی انسانی برتری ثابت کی اور پھر اپنے طرزِ عمل سے اچھے انسان اور اچھے مسلمان ہونے کا نقش اپنے ہر مخالف کے دل پر نقش کیا۔ مسلمانوں کے یہی وہ اصل ہتھیار تھے جن سے کام لے کر انہوں نے ایک طرف میدانِ جنگ میں اپنی برتری کا ثبوت پیش کیا، تو دُوسری طرف لوگوں کے قلوب کو مسخر کیا۔ مزید برآں میدانِ سیاست میں بھی سرفرازی حاصل کر کے یہ دکھا دیا کہ اسلام معتقدات کو جن اخلاقی اقدار کے تابع کرتا ہے، سیاست بھی ان ہی کے تابع ہے اور یہ کہنا تحصیل حاصل ہے کہ اس تعلیم نے مسلمانوں کو ریاست نبوی کے اچھے شہری بننے کے لئے ضروری تربیت فراہم کی نیز معاشرہ کی شیرازہ بندی، فلاح و ترقی اور تربیت و تنظیم میں بھی مؤثر کردار ادا کیا۔

یہاں ایک اہم اور قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ اگرچہ مندرجہ بالا احکام کی فہرست بہت طویل ہے اور موقع و محل کے لحاظ سے ان سب کی اہمیت مسلّم ہے تاہم قرآن یہ بتاتا ہے کہ اس وقت معاشرہ کے تنظیمی مراحل میں سب سے زیادہ ضرورت اطاعتِ خدا و رسول، اتحاد و اتفاق اور صبر و استقامت کی تھی۔ چنانچہ ہجرت کے بعد سے کم و بیش پانچ سال تک جتنی سورتیں بھی نازل ہُوئیں ان میں ان موضوعات کو بار بار ذہن نشین کرایا گیا ہے بلکہ جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا ان کی تاکید میں اضافہ ہوتا گیا۔ مثلاً بالکل ابتدائی سورتوں میں تو خدا اور رسولؐ کی اطاعت کا سادہ سا حکم موجود ہے۔ لیکن سورۂ انفال میں

(جو ۲ھ میں غزوۂ بدر کے بعد نازل ہوئی) اس کے دوسرے مضمرات کو بھی اس طرح بیان کیا گیا کہ: و اطیعوا اللّٰہ و رسولہ و لا تنازعوا فتفشلوا و تذھب ریحکم و اصبروا۔(۶۵) (خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں تنازعہ نہ کرو کہ ایسا کرنے سے تو تم بزدل ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اُکھڑ جائے گی اور صبر سے کام لو) علاوہ ازیں اس کے بعد نازل ہونے والی سُورت، سورہ آل عمران میں جنگِ اُحد پر تبصرہ کرتے ہوئے مسلمانوں کی عارضی ہزیمت کا سبب اس طرح بیان کیا گیا کہ:

حتی اذا فشلتم و تنازعتم فی الامر و عصیتم من بعد ما ارٰکم ما تحبون۔(۶۶)

(یہاں تک کہ جو تم چاہتے تھے اللہ نے تم کو دکھا دیا۔ اس کے بعد تم نے ہمت ہار دی اور حکمِ رسول میں تنازعہ کرنے لگے اور اس کی نافرمانی کی)۔

چنانچہ اصولی ہدایت یہ دی گئی کہ:

یاایھا الذین اٰمنوا اصبروا و صابروا و رابطوا و اتقوا اللّٰہ لعلکم تفلحون۔(۶۷)

(اے اہلِ ایمان! ثابت قدم رہو اور استقامت رکھو اور مورچوں پر جمے رہو اور اللہ سے ڈرو تاکہ مراد حاصل ہو)

اس کے بعد سورۂ نساءؑ میں کہا گیا کہ:

اطیعوا اللّٰہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم(۶۸)

(اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور ان کی جو تم میں سے صاحبانِ امر و اختیار ہیں)

یہ آیت اللہ و رسول کو محض رسمی طور پر مطاع ماننے اور اولی الامر کی فرمانبرداری کا سرسری حکم ہی نہیں دیتی بلکہ فی الواقع اس میں گہری معنویت پائی جاتی ہے اور اسی لئے یہ آیت دراصل اسلام کے مذہبی، تمدنی اور سیاسی نظام کی حقیقی بنیادوں کو پوری طرح متعین کر دیتی ہے پھر اسی سورت میں کچھ آگے رسولؐ اللہ کی اطاعت اور آپ کے حکم و فیصلے کو تقاضائے ایمان و اسلام بنایا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے کہ:

فلا و ربک لا یومنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجاً مما قضیت و یسلموا تسلیما۔(۶۹)

(تمہارے رب کی قسم یہ لوگ جب تک اپنے تنازعات میں تمہیں حکم نہ بنائیں اور جو فیصلہ تم کر دو اس سے اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں بلکہ اس کو خوشی سے مان لیں اور راضی بہ رضا ہو جائیں اس وقت تک مومن نہ ہوں گے)

اور سورہ حشر میں جو ۴ھ میں نازل ہوئی یہ طے کر دیا گیا کہ:

ما اٰتکم الرسول فخذوہ و ما نھاکم عنہ فانتھوا۔(۷۰)

(رسول جو کچھ تمہیں دیں، لے لو، اور جس سے منع کریں اس سے رک جاؤ)
پھر غزوۂ خندق کے بعد نازل ہونے والی سورت "الاحزاب" میں رسول اللہ کی ذاتِ گرامی کو نمونہ اور مثال (لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ)[۱] اور خاتم النبیین (ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین)[۲] قرار دے کر اطاعت و انقیاد کی تمام نزاکتوں کو واضح کر دیا گیا۔

اگر ہم ان آیات محولہ بالا پر عمرانی نقطۂ نظر سے غور کریں تو ہمارے سامنے یہ بات آئے گی کہ فی الجملہ اسلامی معاشرہ کے خدوخال متعین ہو گئے اور اس کی عمومی صورت گری بھی ہو گئی۔ کیونکہ اسی دور میں معاشرتی بنیادیں، معاشرتی ادارے، معاشرتی اقدار اور معاشرتی عناصر کے حقوق و فرائض کا تعین عمل میں آیا۔ معاشرہ کے مقاصد طے ہوئے اور نہ صرف یہ کہ معاشرہ کی حرکت پذیری کے لئے جہت مقرر ہو گئی بلکہ معاشرہ کے لئے ایک مثال اور نمونہ کی تعیین بھی ہو گئی اور یہ بات عمرانیات کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ بغیر کسی نمونہ اور مثال کے نہ تو کوئی معاشرہ قوت نمو پا سکتا ہے اور نہ صحیح سمت میں اس کا ارتقاء ممکن ہے۔ اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ریاست مدینہ کے ابتدائی پانچ سالہ دور میں اسلامی معاشرہ کی تکمیل ہو جاتی ہے اور اس کے استحکام و ارتقاء میں بھی غیر معمولی اضافہ ہو جاتا ہے۔

یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معاشرہ کی تنظیم اور نشوو ارتقاء کے تمام مراحل میں رعیت کے تمام طبقات و عناصر سے تعلقات کو بھی نظر انداز نہیں کیا اور جس کے ساتھ جیسا برتاؤ ضروری تھا اس کا لحاظ ہر موقع پر رکھا۔ مدینہ کے باشندوں میں سے جہاں تک مہاجرین و انصار کا تعلق ہے تو اول تو وہ اسی معاہدے پر کاربند رہے جو بیعت عقبۂ کبیرہ کے موقع پر کیا گیا تھا اور جس کی رُو سے انصار پر مہاجرین کی حفاظت و دفاع واجب تھا البتہ مہاجرین کی طرف سے کسی پیش قدمی کی صورت میں وہ مدد کرنے کے پابند نہ تھے۔ غالباً رسولؐ اللہ نے بھی معاہدۂ عقبہ کا پورا لحاظ رکھتے ہوئے ان ابتدائی مہمات میں انصار کو شریک نہیں کیا جو قریش کی نقل و حرکت کا جائزہ لینے اور مناسب کارروائی کرنے کے لئے روانہ کی گئیں۔ یہاں تک کہ جب قریش کا ایک رئیس کرز بن جابر الفہری (ربیع الاول ۲ھ میں) مدینہ میں وادی العقیق سے متصل چراگاہ پر چھاپہ مار کر کچھ مویشی لے گیا تب بھی رسولؐ اللہ مہاجرین ہی کی ایک جماعت لے کر اس کی سرکوبی کے لئے تشریف لے گئے تھے۔[۳] اور حسنِ سیاست و تدبر کا تقاضا بھی یہی تھا کہ اہلِ مدینہ سے صرف ان ہی مواعید کے پورا کرنے کا مطالبہ کیا جاتا جو بیعت عقبہ کے موقع پر انہوں نے اپنی رضا مندی سے کئے تھے اور اس وقت تک ان سے مزید کوئی مطالبہ نہ کیا جاتا جب تک کہ اسلامی جذبہ سے متاثر ہو کر وہ از خود ایسا کرنے پر آمادہ نہ ہو جاتے۔[۴] اس کے بعد معاہدۂ مواخاۃ مہاجرین و انصار دونوں گروہوں کے درمیان رشتہ و تعلق کو مزید مستحکم کرنے کا موجب بنا اور ان کے درمیان نفاق و شقاق پیدا کرنے کی تمام مخالفانہ کوششیں ناکام ہو گئیں۔ اور جس کا تفصیلی بیان پہلے ہم کر چکے ہیں۔ بہرحال ہجرت سے غزوۂ بدر تک کی مدت، مہاجرین و انصار کے درمیان تعلقات کے استحکام، آپس کے اعتماد و اعتبار اور ایک دوسرے میں جذب ہو جانے کے لئے کافی تھی۔ اور واقعات کا مطالعہ کرنے سے اندازہ یہ ہوتا ہے کہ کرز بن جابر الفہری کی ڈاکہ زنی نے

انصار کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ مہاجرین سے اشتراک عمل ضروری ہے کیونکہ اب خود ان کے اموال و نفوس کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ شاید اسی لئے رسول اللہ بدر کے لئے مدینہ سے نکلے تو یہ پہلا موقع تھا کہ انصار بھی ساتھ تھے۔ رسول اللہ کی مشورہ طلب نگاہوں پر انصار کی طرف سے حضرت سعد بن معاذ کی تاریخی تقریر(۵) اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ اب انصار نے رضا کارانہ طور پر اپنے اوپر یہ لازم کر لیا کہ وہ ہر لڑائی میں خواہ مدینہ کے اندر ہو یا مدینہ سے باہر مہاجرین کا ساتھ دیں گے۔

مہاجرین و انصار کے معاملات کی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے رسمی و غیر رسمی تمام معاہدات کو پورے طور پر نبھایا اور منشورِ مدینہ کی رُو سے ان پر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی تھیں انہیں بھی کما حقہٗ پورا کیا۔ نیز چونکہ یہی عناصر ریاست کی مرکزی ہیئت متصور ہوتے تھے اس لئے انہوں نے اپنی اس حیثیت کا جواز اپنے طرزِ عمل سے مہیا کرنے میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں دکھائی۔

مہاجرین و انصار کے علاوہ مدینہ میں رہنے والوں میں سے جو لوگ منشورِ مدینہ کا پاس و لحاظ رکھتے ہوئے اسلامی ریاست کے ارتقاء میں ممد و معاون تھے ان سے تعرض کا تو سوال ہی نہ تھا البتہ جنگِ بدر کے بعد منافقین کا جو گروہ منظرِ عام پر آیا تھا اس سے نمٹنے کے لئے بڑی حکمت اور دُور اندیشی کی ضرورت تھی۔ منافقین کے سلسلے میں خالص مذہبی نقطۂ نظر سے جو کچھ لکھا گیا ہے اور حقیقت نفاق، منافقین کے مختلف الخیال افراد اور ان کے مقاصد اور ان کی اقسام وغیرہ کے ضمن میں جو تفصیلات پائی جاتی ہیں(۶) ان کا نہ تو استقصاء ممکن ہے اور نہ ہمارے موضوع سے ان کا براہِ راست تعلق۔ اس لئے مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ریاست نبوی میں بحیثیت ایک جماعت منافقین کے کردار، ان کے طرزِ عمل اور مقاصد پر تاریخی نقطۂ نظر سے غور کریں اور پھر یہ جائزہ لیں کہ ریاست نبوی کی پالیسی اس گروہ کے بارے میں کیا رہی ہے؛

ایک گروہ کی حیثیت سے منافقین کا اطلاق عموماً ان لوگوں پر ہوتا ہے جو بظاہر ایمان و اسلام کے مدعی ہوں لیکن بباطن ان کے دعوے میں اخلاص و صداقت موجود نہ ہو(۷) اس گروہ میں شامل ہونے والے افراد کا تعلق اگرچہ زیادہ تر اوس اور خزرج کے قبائل سے تھا(۸) اور ان کی قیادت بھی ایک خزرجی سردار عبداللہ بن ابی کے سپرد(۹) تھی لیکن واقعات سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ ان کی پشت پناہی کرنے، ان کو مواد فراہم کرنے اور ان کو مہمیز لگانے والے "یہود" تھے۔ بلکہ اسی گروہ منافقین میں جیسا کہ ابن ہشام نے تصریح کی ہے کم از کم آٹھ افراد بنو قینقاع کے شامل تھے(۱۰)۔ نیز اغراض و مقاصد اور طریقہ کار میں بھی یہود و منافقین کے درمیان حد درجہ مماثلت(۱۱) پائی جاتی تھی۔ یہود کو اسلام سے شدید نفرت، رسول اللہ سے للّٰہی بغض اور مسلمانوں سے انتہائی سخت عداوت تھی اور وہ اسلامی معاشرہ میں انتشار و افتراق پھیلانے کی انتہائی خواہش رکھتے تھے۔ اب یہ دُوسری بات ہے کہ رسول اللہ کے بروقت اقدامات، اور آپ کی ذہانت و فراست کی وجہ سے یہود کو کم و بیش ہر موقع پر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا، تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہود اور منافقین دونوں نے اپنی سی کوشش کرنے میں کبھی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔

ہمارے اوّلین تاریخی مآخذ میں منافقین کے کچھ نام مل جاتے ہیں ان کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ منافقین کے

گروہ میں زیادہ تر معمر با اثر اور خوشحال افراد شامل تھے[۸۲]۔ نوجوان آدمی قیس بن عمرو بن سہل[۸۳] کے علاوہ شاید ہی کوئی ہو۔ زیادہ تر منافقین خوشحال ہونے کے ساتھ ساتھ خوش شکل، خوش رو، خوش وضع، دراز قد، بلکہ جسیم شحیم افراد تھے[۸۴]۔ ان کے خیالات مستحکم، عقاید پختہ، طرزِ عمل سوچا سمجھا اور مفادات متعین تھے۔ ان کے شب و روز رسول اللہؐ، آپ کے اصحاب، ریاست نبوی اور عام مسلمانوں کے خلاف سعی و جہد کے لئے وقف تھے۔ ان کی تمام کوششوں کا مدعا یہ تھا کہ مدینہ کی فضا کو بگاڑا جائے وہاں کی سرزمین پر فساد[۸۵] پھیلایا جائے اور حسد و نفاق کی سرنگیں لگا کر ریاست نبوی کو سبوتاژ کر دیا جائے۔ انہوں نے مصلحتاً اسلام قبول کر لیا تھا اور دکھاوے کے لئے نماز وغیرہ بھی علانیہ پڑھتے تھے[۸۶] مگر دشمنانِ اسلام سے ساز باز کر کے[۸۷] اسلام کی اجتماعی قوت کو توڑنے، دین کی ہوا خیزی کرنے اور عام لوگوں یا کمزور مسلمانوں کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کے لئے نہ تو وہ تفرقہ انگیزی[۸۸] سے چوکتے تھے اور نہ دشمنانِ اسلام کی جاسوسی[۸۹] سے باز آتے تھے بلکہ اسلام قبول کر کے علی الاعلان عجیب و غریب حرکتیں کرتے تھے تاکہ لوگوں کو دینِ حق سے بدظن کیا جا سکے۔ سنجیدہ معاملات میں بھی تضحیک و استہزاء، مسلمانوں کی مجلسوں، مساجد اور اجتماعات میں شرکت اور پھر دشمنانِ اسلام کو اس کی اطلاع و مخبری اور سازشیں کرنا منافقین کا روزمرہ کا معمول تھا[۹۰]۔ علاوہ ازیں مدینہ کی فضا کو مسموم کرنے، معاشرہ کی یکجہتی مٹانے اور امن و امان کو غارت کرنے کے لئے افواہ طرازی، شوشہ بازی، فتنہ جوئی، طعن و تشنیع اور غلط خبریں اڑانے میں انہیں خاص ملکہ حاصل تھا۔ جھوٹ بولنا اور جھوٹی قسمیں کھانا ان کا طرۂ امتیاز تھا[۹۱]۔

یہود کی طرح منافقین کے گروہ پر بھی منشورِ مدینہ کا احترام سخت شاق گزرتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے بھی (یہود کی طرح) اس منشور کو پامال کرتے ہوئے قریش سے تعلقات استوار کئے۔ ان کے لئے جاسوسی کے فرائض انجام دئے اور انہیں فتح کی امید دلا کر مسلمانوں پر فوج کشی کے لئے ابھارا۔ گویا یہ کہنا چاہئے کہ منافقین ہر آن اور ہر لحظہ محض اپنے ذاتی و مادی مفادات کی ہی پرستش کرتے رہے۔ اب جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ ان کوششوں یا مقاصد میں منافقوں کو کس حد تک کامیابی حاصل ہوئی تو تاریخ کی شہادت یہ ہے کہ بلاشبہ وقتی طور پر تو انہیں بعض مواقع پر کچھ کامیابیاں ضرور حاصل ہوئیں لیکن انجام کار انہیں اپنے ہر مقصد میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ قرآن نے یہ کہہ کر شاید اسی طرف اشارہ کیا ہے کہ:

وھمّوا بما لم ینالوا۔[۹۲]

لیکن یہ جان لینے کے باوجود کہ اپنے مقاصد میں انہیں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی یہ حقیقت ہے کہ منافقین نے شرارت کا کبھی کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور رسول اللہؐ مسلمانوں اور ریاست کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے میں پوری تندہی سے کام لیتے رہے۔ مثلاً ایک مرتبہ رسول اللہؐ کسی راستے سے گزر رہے تھے کہ عبد اللہ بن اُبی آپ کے ساتھ بدتمیزی سے پیش آیا۔ اس کی شکایت رسول اللہؐ نے حضرت سعد بن عبادہ سے فرمائی تو انہوں نے عرض کیا: یا رسول اللہؐ! اس کے ساتھ نرمی برتئے آپ کی تشریف آوری سے پہلے ہم اس کے لئے تاجِ شاہی

تیار کر رہے تھے۔ اب یہ سمجھتا ہے کہ آپ نے اس سے بادشاہی چھین لی ہے(۹۳)۔ اس سے یہ سمجھنا آسان ہے کہ منافقین کے قائدِ اعلیٰ کے دل میں رسول اللہؐ اور مسلمانوں کے خلاف بغض و عداوت کا آتشیں لاوا ہجرتِ مدینہ کے پہلے ہی روز سے پکنا شروع ہو گیا تھا اور یہ واضح ہے کہ نفاق کی پوری تاریخ کا مرکزی کردار یہی شخص ہے۔ اسی طرح سرخیلانِ نفاق میں سے زید بن الصلت بنو قینقاع کے بارے میں حضرت عمرؓ سے نبرد آزما ہوا(۹۴) اور ایک موقع پر جبکہ رسول اللہؐ کی اونٹنی کھو گئی تھی تو اس نے رسول اللہؐ سے بطور طنز یہ کہا تھا کہ "غیب کی خبریں تو بتلاتے پھرتے ہو لیکن اتنی خبر نہیں کہ اونٹنی کہاں گئی!"(۹۵) رسول اللہؐ کے قیامِ مدینہ کے بالکل ابتدائی دور میں منافقین کا ایک اعتراض یہ تھا کہ رسول اللہؐ پر ایسی سورت کیوں نازل نہیں ہوئی جس میں جنگ و جہاد کا صریح حکم ہو۔ لیکن جب ان کا مطلوبہ حکم واقعی نازل ہو گیا تو ان کے ہوش اُڑ گئے اور میدانِ جنگ سے جی چرانے لگے(۹۶)۔ جنگِ بدر کے بعد بنو قینقاع کی علانیہ بدعہدی اور بلا اشتعال سرکشی پر رسول اللہؐ نے ان کا محاصرہ کیا تو عبداللہ بن اُبی ان کی حمایت پر کھڑا ہو گیا اور رسول اللہؐ کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگا کہ: "یہ سات سو مردانِ جنگی جو ہر دشمن کے مقابلہ پر میرا ساتھ دیتے رہتے ہیں، آج ایک دن میں آپ انہیں ختم کر ڈالنا چاہتے ہیں، خدا کی قسم میں آپ کو ہرگز نہ چھوڑوں گا جب تک کہ آپ میرے ان حلیفوں کو معاف نہ کریں گے"۔(۹۷)

اس گروہ کا نفاق اس وقت بالکل ظاہر ہو گیا جب جنگِ اُحد کے موقع پر لشکرِ اسلامی روانہ ہوا تو عبداللہ ابن اُبی نے مسلمانوں سے کھلی ہوئی غداری کرتے ہوئے تقریباً تین سو ساتھیوں سمیت انتہائی نازک گھڑی میں علیحدگی اختیار کی اور مسلمانوں کے حوصلوں کو پست کرنے کی ناکام کوشش کی۔ اس کا اندازہ لوگوں کو اچھی طرح ہو گیا تھا۔ چنانچہ جب جنگِ اُحد کے بعد پہلا جمعہ آیا اور عبداللہ بن اُبی حضورؐ کے خطبہ سے پہلے حسبِ معمول تقریر کرنے کے لئے اُٹھا تو لوگوں نے اس کا دامن کھینچ کر بٹھا دیا اور کہا کہ: "بیٹھ جاؤ، یہ باتیں کرنے کے تم اہل نہیں ہو"(۹۸)۔ مدینہ میں یہ پہلا موقع تھا جبکہ قائدِ منافقین کی علانیہ تذلیل کی گئی۔ چنانچہ اس پر وہ برہم ہو کر فوراً مسجد نبوی سے باہر نکل گیا اور رسول اللہؐ سے کسی قسم کی معذرت بھی طلب نہ کی(۹۹)۔ پھر اس گروہ منافقین نے غزوۂ بنو نضیر کے موقع پر جس طرح یہود کی کھلی حمایت و پشت پناہی کی تھی وہ ایک مشہور بات ہے(۱۰۰)۔ انہوں نے یہودِ بنو نضیر کو انتہائی بے باکی سے جو پیغام بھیجا تھا اسے قرآن نے ان ہی کے الفاظ میں یوں نقل کیا ہے کہ:

> الم تر الی الذین نافقوا یقولون لاخوانھم الذین کفروا من اھل الکتاب لئن اخرجتم لنخرجن معکم ولا نطیع فیکم احداً ابداً وان قوتلتم لننصرنکم واللہ یشھد انھم لکاذبون۔(۱۰۱)

پھر آگے یہ الہامی جواب بھی دے دیا گیا کہ:

> لئن اخرجوا لا یخرجون معھم ولئن قوتلوا لا ینصرونھم ولئن نصروھم لیولن الادبار ثم لا ینصرون۔(۱۰۲)

پھر منافقین کے لئے فتنہ پردازی کا ایک اور سنہری موقع اس وقت آیا جبکہ ایک طرف تو شمال کی جانب سے ریاستِ نبوی کے

تمام مخالفین کا ایک لشکر گراں حملہ آور ہوا اور دوسری طرف جنوب کی سمت میں رہنے والے یہود بنو قریظہ نے عہد شکنی کا اعلان کر دیا تھا۔ یہ وقت مسلمانوں کے لئے بڑا نازک تھا۔ دو طرف سے دشمنوں کا نرغہ، مٹھی بھر مسلمان، مخالفین کا اجتماع عظیم، عورتوں اور بچوں کا بنو قریظہ کی جانب کے قلعہ میں قیام وغیرہ نے بجا طور پر پریشان کن صورتِ حال پیدا کر دی تھی۔ منافقین کے گروہ نے ان نازک لمحات میں اہلِ ایمان میں خوف و ہراس پھیلانے، اسلام و رسول کے متعلق بے سروپا باتیں کہنے اور پست حوصلگی کی تدابیر اختیار کرنے میں بڑی سرگرمی دکھائی۔ کبھی تو یہ بات پھیلائی گئی کہ مسلمان سخت خطرے میں ہیں اور انہیں یہود و مشرکین یا کفار وغیرہ میں سے کسی نہ کسی فریق سے سمجھوتہ کر لینا چاہئے کبھی پروپیگنڈے کا یہ طنز بہ پیرایہ اختیار کیا گیا کہ "محمد نے ہم سے وعدہ تو قیصر و کسریٰ کے خزانوں کا کیا تھا مگر اس وقت حال یہ ہے کہ ہم بعافیت رفعِ حاجت کے لئے بھی باہر نہیں جا سکتے"۔(۱۰۳)

اسی کو قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا کہ:

واذ یقول المنافقون والذین فی قلوبھم مرض، ما وعدنا اللہ ورسولہ الا غرورا۔(۱۰۴)

منافقین نے اسی پر بس نہیں کیا۔ رسول اللہ نے تبنیت کی جاہلی رسم کو مٹانے کے لئے غزوۂ احزاب کے بعد حضرت زینب سے نکاح فرمایا۔ منافقین نے اس واقعہ کو ایک خداداد موقع سمجھا اور خیال کیا کہ وہ رسول اللہ کی اس اخلاقی برتری کو ختم کر دیں گے جو مسلمانوں کی کامیابی کا اصل سرچشمہ ہے۔ چنانچہ اصل حقیقت کو چھپاتے ہوئے انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بے سروپا باتیں اور افسانے تراشے اور آپ پر بہو سے بیاہ رچا لینے کا الزام تھوپ دیا۔ ان کے پروپیگنڈے کا یہ طوفان اس قدر شدید تھا کہ بعض مسلمان بھی غلط فہمی کا شکار ہو گئے لیکن اسی مرحلہ پر الہامی ہدایات اور اصلاحی احکام نے مسلمانوں کی مشکل آسان کر دی اور معاشرہ تباہی سے بچ گیا۔

بہرصورت یہ تو صرف چند مثالیں تھیں ورنہ ان کی حرکاتِ قبیحہ کی فہرست بڑی طویل ہے جس کا تقاضا تو یہ تھا کہ ریاست نبوی کی جانب سے ان کی سخت گرفت کی جاتی مگر رسول اللہ نے ان کے ساتھ نرمی اور ملاطفت کا معاملہ کیا اور مسلسل چشم پوشی و درگزر سے کام لیتے رہے۔ منافقین کے ساتھ رسول اللہ کی یہ پالیسی مندرجہ ذیل وجوہات پر مبنی نظر آتی ہے یعنی:

(۱) جو لوگ محض شکوک و شبہات، کج فہمی یا غلط فہمی میں مبتلا ہو کر اس گروہ میں شامل ہو گئے تھے ان کی نفسیاتی اصلاح کی غرض سے بار بار معافی و درگزر سے کام لیا گیا اور اس طرح انہیں راہِ راست پر آنے کا موقع فراہم کیا گیا۔ ظاہر ہے اس قسم کی نفسیاتی اصلاح کے لئے ایک مدت درکار ہوتی ہے۔

(۲) منافقین کی تمام منفی سرگرمیاں چونکہ اسلام کے پردہ میں تھیں اور ان کے خلاف کوئی سخت قدم اس وقت تک نہیں اٹھایا جا سکتا تھا جب تک کہ ان کی طرف سے کسی کھلی بغاوت یا علانیہ جرم کا ارتکاب نہ ہو۔ اس لئے مہلت دی گئی تاکہ وہ اپنے جرائم پر خود ہی شاہد بن جائیں۔ انتظار و مہلت کی اسی توجیہ کو بعد میں رسول اللہ نے حضرت عمر سے خود بھی ارشاد فرمایا تھا کہ:

فکیف یا عمر اذا تحدث الناس ان محمداً یقتل اصحابہ۔(۱۰۵)

(عمر! دنیا کیا کہے گی کہ محمد خود اپنے ہی ساتھیوں کو قتل کر رہا ہے)۔

(۳) عفو و درگزر کی پالیسی اختیار کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ منافقین کا گروہ مختلف النوع مقاصد اور اختلافات[۱۰۶] کے باوجود، تعداد میں خاصا بڑا تھا[۱۰۷] اور اس میں شامل افراد کا تعلق کم و بیش قبائل اوس و خزرج کی ہر شاخ[۱۰۸] سے تھا۔ ایسی صورت میں یہ کسی طرح مناسب نہیں تھا کہ ریاست کے بیرونی دشمنوں اور یہود سے لڑائی کے ساتھ ساتھ اس بڑے گروہ سے بھی جنگ شروع کر دی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی منافقت کا حال جانتے ہوئے بھی رسول اللہؐ ایک مدت تک ان کے ساتھ ظاہری دعویٰ ایمان کے لحاظ سے معاملہ فرماتے رہے۔[۱۰۹] علاوہ ازیں یہ (منافقین) اتنی طاقت اور اخلاقی جرأت بھی نہ رکھتے تھے کہ علانیہ کافر بن کر اہلِ ایمان سے لڑ لینے یا کسی حملہ آور دشمن کے ساتھ مل کر کھلم کھلا میدان میں آ جاتے۔[۱۱۰] قرآن نے بھی اس کی وضاحت یُوں کر دی ہے کہ:

لا یقاتلونکم جمیعاً الا فی قریً محصنة او من ورآء جدر، باسھم بینھم شدید، تحسبھم جمیعاً و قلوبھم شتی، ذٰلك بانھم قوم لا یعقلون۔[۱۱۱]

(۴) منافقین کی پشت پناہی اور حمایت کرنے بلکہ شہ دینے والا عنصر یہود کا تھا۔ مدینہ سے یہود کا مکمل اخراج غزوۂ بنو قریظہ کے بعد عمل میں آیا اس وقت تک منافقین سے بھی سختی نہ برتی گئی تھی۔ اس میں یہ حکمت تھی کہ یہود کا قلع قمع ہو جانے کے بعد منافقین کا زور بھی ٹوٹ جائے گا اور ان سے نمٹنا بھی آسان ہو گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ منافقین یہود کے انجام سے عبرت پکڑ لیں۔ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ سورۂ احزاب میں جو غزوۂ بنی قریظہ کے بعد نازل ہوئی منافقین کو متنبہ کر دیا گیا کہ وہ اپنی روش بدل لیں اور اپنی حرکتوں سے باز آ جائیں ورنہ اب ان کے ساتھ سختی برتی جائے گی۔ کیونکہ اسلامی معاشرے اور ریاست میں اس طرح کے مفسدین کو مزید پھلنے پھُولنے کا موقع نہیں دیا جا سکتا۔ الفاظ یہ ہیں کہ:

لئن لم ینته المنافقون والـذین فی قلوبھم مرض والمرجفون فی المدینه لنغرینك بھم ثم لا یجاورونك فیھا الا قلیلا۔ ملعونین اینما ثقفوا اخذوا و قتلوا تقتیلا۔[۱۱۲]

یعنی اگر منافقین اور وُہ لوگ جن کے دلوں میں خرابی ہے اور وُہ جو مدینہ میں ہیجان انگیز افواہیں پھیلانے والے ہیں اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے تو ہم ان کے خلاف کارروائی کے لئے تمہیں مقرر کریں گے پھر وہ اس شہر میں تمہارے ساتھ مشکل ہی سے رہ سکیں گے۔ ان پر ہر طرف سے لعنت کی بوچھاڑ ہو گی جہاں کہیں پائے جائیں گے پکڑے جائیں گے اور بُری طرح مارے جائیں گے۔

(۵) منافقین کے بیشتر افراد کا تعلق اوس اور خزرج سے تھا ان کے رشتہ دار اور قریبی عزیز نہ صرف یہ کہ اسلام لے آئے تھے بلکہ اخلاص و محبت کے قابلِ رشک جذبات رکھتے تھے اور انہوں نے رسول اللہؐ و مہاجرین سے حسنِ سلوک کا بے مثال معاملہ بھی کیا تھا۔ چنانچہ حُسنِ سیاست اور مروّت کا تقاضا بھی یہی تھا کہ اوس اور خزرج کے مخلص اور صادق الایمان لوگوں کا لحاظ رکھتے ہوئے ان کے بعض نادان رشتہ داروں کی قبیح حرکات سے درگزر کیا جائے۔[۱۱۳]

بہرصورت ان وجوہات کے پیشِ نظر رسول اللہؐ نے ان سے نرمی و درگزر کا سلوک کیا۔ ان کی مذمت کرنے پر اکتفا کیا

ان کی مذمت کرنے پر اکتفا کیا اور ان کی طرف سے ہر مخالفانہ چال کا اپنی حُسنِ تدبیر سے دفعیہ کرتے رہے۔ اس کے بعد ان سے جس قسم کا سلوک کیا گیا اس سے آئندہ بحث کی جائے گی۔

اب جہاں تک یہود کا تعلق ہے تو یہ واضح ہے کہ ان سے رسول اللہؐ کو سابقہ ہجرت کے بعد سے مسلسل پیش آ رہا تھا یہ لوگ اہلِ مذہب اور اہلِ کتاب تھے۔ اس لئے فخر وغرور اور تفاخر میں مبتلا تھے۔ یہود نے بالکل ابتدائی زمانے میں ہی منشورِ مدینہ کو تسلیم کرکے رسول اللہؐ کی حکمرانی وقیادت کو بھی مان لیا تھا اور اپنی اطاعت کا عہد استوار کیا تھا۔ لیکن تاریخی شہادتوں کے مطابق انہوں نے اس عہد کا ذرہ برابر پاس نہ کیا بلکہ ہمیشہ ریاست کے خلاف سرگرمِ عمل رہے اور دوسرے عناصر سے مل کر ریاست کو ختم کرنے کی کوششیں کرتے رہے۔ آخر کار جب ان کی سرکشی حد سے زیادہ بڑھ گئی اور ریاست کے خلاف وُہ پُوری بے باکی سے جرائم کا ارتکاب کرنے لگے تو رسول اللہؐ کو ان کے خلاف سخت قدم اٹھانا پڑا۔ سب سے پہلے یہود بنو قینقاع سے نمٹا گیا، پھر بنو نضیر کی باری آئی اور آخر میں بنو قریظہ کا استیصال کیا گیا۔ رسول اللہؐ کے ان تمام اقدامات کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ زیرِ مطالعہ دَور میں معاشرتی اصلاح اور ریاست کی دستوری ضروریات کے لئے تشریع و قانون سازی یا اجرائے احکام کے سلسلے میں رسول اللہؐ نے کس نہج پر کام کیا۔ اس ضمن میں اگرچہ تفصیلات بہت ہیں لیکن مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ رسول اللہؐ نے حاکمیتِ الٰہی کے تحت فرائضِ حکومت انجام دیئے[114] اور دین و دنیا کے اہم معاملات میں اصحابِ رائے سے مشورہ[115] کرنے کے بعد عمل کیا، مثلاً مسئلۂ اذان، بدر کے لئے روانگی، جنگی قیدیوں کے ساتھ سلوک، جنگِ بدر کے لئے مقامِ جنگ کے انتخاب اور دوسرے اہم معاملات میں آپ نے یہی طرزِ عمل اختیار کیا تھا۔ سرایا اور دُوسری جنگوں میں امیرِ لشکر مقرر کرنا، ائمہ و مؤذنین کا تقرر، جہاد کا اعلان، مالِ غنیمت کی تقسیم، فوجوں کی آراستگی وقیادت، جنگ و صلح کا اعلان، معاہدات کا انعقاد، فرامین کا اجراء، اصلاح بین الناس اور سیاسی تحکیم[116] وغیرہ کی ذمہ داریاں براہِ راست رسول اللہؐ کے اُوپر تھیں۔ نمازوں کی امامت بھی آپ نے فرمائی اور تشریع و قانون سازی کی ضروریات کو بھی آپ ہی نے پُورا فرمایا۔ عدل و انصاف کا صرف حکم ہی نہیں دیا بلکہ اس کے تقاضوں کو پُورا کرنے کے لئے مقدمات کا فیصلہ بھی کیا[117] اور نہ صرف مسلمانوں کے بلکہ غیر مسلموں کے تنازعات بھی بطورِ حکم فیصلہ دیا[118]۔ کیونکہ اول تو منشورِ مدینہ کی رُو سے بھی آخری عدالت مرافعہ آپ کی ذات تھی۔ بحیثیت رسولؐ بھی آپ حکم اور فیصلہ کنندہ تھے اور سربراہِ ریاست ہونے کی حیثیت سے بھی یہ آپ کا کام تھا، نیز آپ کے فیصلے اتنے مبنی بر انصاف ہوتے تھے کہ غیر مسلم از خود اپنے فیصلے رسول اللہؐ سے کرانے میں خوشی محسوس کرتے تھے۔

پانچ سال کا یہی ابتدائی عرصہ وُہ ہے جس میں معاشرتی اصلاح کے لئے احکام کا اجرا ہوا۔ تحویلِ قبلہ کا حکم آیا[119]، اذان فرض ہوئی[120]، صیام کو فرض کیا گیا[121]، امتناعِ شراب کا ابتدائی حکم آیا[122]، سُود خوری کی بطورِ ترغیب مذمت کی گئی[123]، وراثت کے مفصل قانون کا اجراء ہوا[124] اور مواخاۃ کی بناء پر ارث کا قاعدہ موقوف کیا گیا[125]۔ قانون ازدواج میں حقوق الزوجین

مقرر کئے گئے۔ مشرک عورتوں اور مردوں سے نکاح کی ممانعت کر دی گئی[126]، نکاح و طلاق، مہر، عدّت کے احکام[127]، پردہ کے احکام[128]، قانونِ جنگ و صلح[129]، اسیرانِ جنگ کے ساتھ سلوک کا قانون[130]، مالِ غنیمت کا قانون[131]، اراضی مفتوحہ کا قانون[132]، شہادتوں کو چھپانے کی ممانعت کا قاعدہ[133] اور ارتداد کی خاص شکل کا ضابطہ[134] جاری ہوا اور حدود و تعزیرات کے سلسلہ میں مختلف قوانین مثلاً جان کی حرمت قصاص و دیت[135]، لعان، ظہار[136] وغیرہ مرتب ہوئے۔ عدالت و قضا کے اختیارات و حدود کا تعین کیا گیا۔ تبنیت کے مسئلہ[137] کو حل کیا گیا اور رسول اللہؐ کے بعض مستثنیات و مراعات کا تعین بھی کر دیا گیا[138]۔ غرض اس پوری مدت میں ریاست نبوی کی ترقی و استحکام، اسلامی معاشرہ کی تعمیر اور زندگی کے ہر پہلو میں اصلاح کا کام برابر جاری رہا۔

اب تک کے تمام مباحث کا نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ ابتدائی پانچسالہ دور میں اندرونی و بیرونی دونوں سطح پر ریاستِ نبوی کو ترقی و استحکام حاصل ہوا۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس عرصہ میں رسول اللہؐ نے آئندہ آنے والے زمانے کے لئے سیاسی تیاری (مثلاً ہمسایہ قبائل سے دوستی و معاہدات وغیرہ) بھی کر لی اور اس کے ذریعہ ریاست کے باشندوں کا کامل اعتماد حاصل کر لیا۔ اخلاقی و مادّی لحاظ سے بھی مسلمانوں کو اتنا مستحکم کر دیا کہ ریاستِ مدینہ کا کوئی اندرونی و بیرونی دشمن اس پر بے باکانہ حملہ کی جرأت نہیں کر سکتا تھا اور تہذیبی و تمدّنی معیار سے بھی معاشرہ کو صحیح رُخ پر گامزن کر دیا۔

(۲) دَورِ دوم

اب ہم دُوسرے دَور میں داخل ہوتے ہیں جو دَورِ ماقبل کے اختتام سے وصالِ نبوی تک جاری رہتا ہے۔ اس دَور کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ریاستِ نبوی توسیع و ترقی کے مراحل طے کرتی ہوئی مدینہ کے چہار جانب عرب کی آخری سرحدوں تک پہنچ گئی اور پورا جزیرہ نما اس کے پرچم تلے آگیا۔ دُوسری طرف اس عرصہ میں مسلمانوں کی ایک مستقل تہذیب بن گئی جو اپنی تمام تفصیلات میں دُوسروں سے بالکل ممتاز و ممیّز تھی۔ اسلام کا دامن اجتماعی زندگی کے ہر گوشے تک پھیل گیا اور بوجوہ احسن معاشرہ کی تنظیم مکمل ہوگئی۔

قرآنِ کریم کا جو حصہ غزوۂ احزاب کے بعد نازل ہوا اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی معاشرہ کی تعمیر و ترقی کے لئے جو باتیں اہم ہیں ان کے بارے میں وقتاً فوقتاً آیات و احکام کا نزول ہوتا رہا اور موقع و محل کی مناسبت سے کلیات و جزئیات کی تعلیم دی جاتی رہی۔ رسول اللہؐ کا بحیثیت رسولؐ اور بحیثیت تابع امر الٰہی ان پر خود بھی عمل پیرا ہونا ضروری تھا اور حکمران ریاست ہونے کی بنا پر ان کی تنفیذ بھی آپ کے ذمّہ تھی۔

معاشرہ کا قیام اور اسلامی نظامِ معاشرت کی کچھ تفصیلات پچھلے دور میں طے ہو چکی ہیں۔ اب اس تنظیم کو مزید مستحکم کرنے اور ہر اعتبار سے اس کو مکمل کرنے کے لئے جو اقدامات کئے گئے ان کا جائزہ لینا مناسب ہوگا۔

افرادِ معاشرہ کے بنیادی حقوق میں سے ایک اہم حق عزّت و ناموس کی حفاظت کا حق ہے، اور جو خاندان

کی بقا کے لئے بھی ناگزیر ہے۔ ریاست کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ ایسے انتظامات کرے جن سے باشندوں کے دوسرے حقوق کے ساتھ ساتھ عزت و حرمت کا پاس و لحاظ قائم ہو۔

تاریخی روایات کی روشنی میں سورۂ مجادلہ، سورۂ منافقون اور سورۂ نور کا نزول یکے بعد دیگرے غزوۂ احزاب کے بعد تقریباً چھ سات ماہ کے دوران ہوا۔ ان سورتوں میں اور باتوں کے علاوہ ان امور کو بھی بیان کیا گیا ہے جو اسلامی معاشرہ کے فروغ اور افراد کے حقِ عزت و ناموس کے باب میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ مثلاً زنا کی کراہت اور ایک معاشرتی جرم کی حیثیت سے اس سے بچنے کا حکم تو پہلے دَور میں ہی دے دیا گیا تھا[۱۳۹] لیکن اب زنا کو ایک فوجداری جرم قرار دے دیا گیا۔[۱۴۰] اور سو کوڑے کی باقاعدہ سزا رکھی گئی۔ الزام و تہمت کو بھی قابلِ تعزیر ٹھہرایا گیا[۱۴۱] اور ثبوت نہ ملنے کی صورت میں ۸۰ کوڑوں کی سزا مقرر کی گئی تاکہ معاشرہ میں کوئی شخص کسی دوسرے کی عزت سے نہ کھیل سکے۔ حتیٰ کہ اگر شوہر بیوی پر زنا کا الزام لگائے تو اس کے لئے لعان کا قاعدہ مقرر کیا گیا۔ پھر اسی ضمن میں قحبہ گری کی قانونی بندش[۱۴۲]، نکاحِ ایامیٰ و بے زوج کی ہدایت[۱۴۳]، غضِ بصر[۱۴۴]، حفظِ فرج[۱۴۵]، اظہارِ زینت کی ممانعت[۱۴۶]، استئذان[۱۴۷] اور پردہ کے تکمیلی احکام[۱۴۸] وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ان احکام و ہدایات کی معنویت اس صورت میں اور واضح ہو جاتی ہے جبکہ پس منظر میں منافقین کی شرارتوں خصوصاً واقعۂ افک[۱۴۹] کو نگاہ میں رکھا جائے۔

منافقین اچھی طرح جانتے تھے کہ اس وقت تک مسلمانوں کے عروج و ترقی کی اصل وجہ نہ اسلحہ کی برتری تھی اور نہ سازو سامان اور مادی وسائل کی فراوانی۔ اس کا اصل سبب یہ تھا کہ رسولؐ اللہ کی سیرت بے داغ اور صحابہ کا کردار بالکل پاکیزہ تھا۔ اس لئے منافقین نے اس اصل محاذ کو کمزور کرنے کے لئے ایک حملہ تو پچھلے دور میں نکاحِ زینب کے موقع پر کیا تھا اور اس پر پہلے بحث ہو چکی ہے۔ پھر اس میں ناکامی ہوئی تو غزوۂ بنی مصطلق کے موقع پر انہوں نے مہاجرین و انصار کے درمیان عصبیت جاہلہ ابھار کر مسلمانوں کے اخلاقی تفوق کو ختم کرنے کی کوشش کی[۱۵۰] لیکن جب اس میں بھی خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی تو اسی نہج پر انہوں نے ایک اور بڑا حملہ کیا جس سے خود رسولؐ اللہ اور آپ کے ازواجِ مطہرات کی عزت و ناموس کو خطرہ لاحق ہو گیا۔ واقعہ کی سنگینی کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ اس مسئلہ پر رسولؐ اللہ نے مشاورت طلب کی اور خطبہ میں یہ ارشاد فرمایا کہ:

"مسلمانو! کون ہے جو اس شخص کے حملوں سے میری عزت بچائے، جس نے میرے گھر والوں پر الزامات لگا کر مجھے اذیت پہنچانے کی حد کر دی ہے۔ بخدا میں نے نہ تو اپنی بیوی ہی میں کوئی برائی دیکھی ہے اور نہ ہی اس شخص میں جس کے متعلق تہمت لگائی جاتی ہے بلکہ وُہ تو کبھی میری غیر موجودگی میں گھر آیا بھی نہیں[۱۵۱]۔" اس ارشادِ نبوی کے ایک ایک لفظ سے کرب کا اظہار ہو رہا ہے۔ منافقین کا پیدا کردہ یہ فتنہ اتنا خطرناک تھا کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے جان نثار صحابہ انتہائی ضبط و تحمل اور حکمت و دانائی سے کام نہ لیتے تو مدینہ کا نوخیز اسلامی معاشرہ اخلاقی بحران اور خانہ جنگی کا شکار ہو جاتا۔ اس لئے اس موقع پر ان احکام و ہدایات کا نزول عین ضرورت تھا جن کی نشان دہی ہم اوپر کر چکے ہیں۔ علاوہ ازیں چونکہ قوانین و احکام کی تنفیذ بھی ساتھ ساتھ ہوتی جا رہی تھی لہٰذا اس واقعۂ افک کے سلسلہ میں بھی ملوث افراد پر حد جاری کر دی گئی[۱۵۲]۔

پھر حالات نے جو رُخ اختیار کر لیا تھا اس کی مناسبت سے وحی الٰہی میں قانونِ ظہار کا مفصل بیان[۱۵۳]، منافقین کی روش پر

سخت گرفت[۱۵۴]، اخلاص کی ترغیب[۱۵۵]، نفاق کی تردید[۱۵۶] اور نجوٰی کی تحدید[۱۵۷] کی گئی۔ اسی زمانہ میں اصولاً یہ طے کر دیا گیا کہ:

للّٰہ العزّۃ ولرسولہ وللمؤمنین۔[۱۵۸]

(عزت و مرتبہ کے اصل مستحقین اللہ، اس کا رسول اور اہلِ ایمان ہیں)

دوسرے الفاظ میں معاشرہ میں توقیر و تکریم کا اصل معیار دین و تقوٰی ہے نہ کہ دولت، عزت، شہرت وغیرہ۔ اسی دَور میں یہ بھی کہا گیا کہ جو لوگ بیہودہ اور بُری افواہیں پھیلاتے ہیں اور معاشرہ میں فواحش و منکرات کے فروغ میں ممد و معاون ہوتے ہیں وہ عزت افزائی کے نہیں بلکہ سزا کے مستحق ہیں۔[۱۵۹] فواحش پر پابندی کا یہ اصول منافقین کی حرکات کے سیاق و سباق میں بھی بہت اہم تھا اور اسلامی معاشرہ کی ذہنی و اخلاقی تربیت کے باب میں بھی اس کی اہمیت یکساں تھی۔ اسلام کے نزدیک معاشرہ کی عام فضا بہرحال معروفات کے قیام و فروغ اور منکرات و فواحش کے استیصال (امر بالمعروف و نہی عن المنکر) پر قائم ہونی چاہیئے۔ کم و بیش اسی زمانہ میں ایک طرف تو انفرادی و اجتماعی معاملات کی بنیاد حسنِ ظن پر رکھی گئی[۱۶۰] تو دوسری طرف گھریلو معاشرت میں خانگی ملازموں اور نابالغ بچوں کے لئے اوقاتِ خلوت میں اجازت لینے کا قاعدہ مقرر کیا گیا۔[۱۶۱] معاشرہ کے افراد کو ایک دوسرے سے قریب تر کر دیا گیا اور ان کے درمیان سے بیگانگی کے تمام پردے ہٹا دئے گئے تاکہ آپس کی محبت بڑھے اور باہمی اخلاق کے رابطے مضبوط ہوں۔ اس مقصد کے لئے قریبی عزیزوں اور دوستوں کو بے تکلفی کی اجازت دے دی گئی[۱۶۲]، مجلسی تہذیب کے آداب کی تعلیم بھی اسی دَور میں دی گئی۔[۱۶۳] بہرحال مذکورہ بالا احکام و ہدایات نے مسلمانوں کے داخلی محاذ کو پوری طرح مضبوط کر دیا، اسلامی ریاست اور معاشرہ دونوں کو تباہ کرنے کی منافقانہ سازش ناکام ہو گئی اور وہ مدنی معاشرہ جس کو منافقین پستی میں گرانا چاہتے تھے اور اُبھر کر ترقی کی راہ پر گامزن ہو گیا اور اللہ کا یہ قول پورا ہوا کہ:

کتب اللہ لاغلبن انا ورسلی[۱۶۴]

(اللہ نے یہ لکھ دیا تھا کہ میں اور میرا رسول غالب رہے گا)

اور یہ بھی کہ اللہ و رسولؐ کی مخالفت کرنے والوں کو بالآخر ذلت و رسوائی نصیب ہوگی۔[۱۶۵] چنانچہ اس کے بعد پیش آنے والے تاریخی واقعات شاہد ہیں کہ رسول اللہ اور آپ کے اصحاب کو ظاہری اور معنوی دونوں اعتبار سے غلبہ و تمکن حاصل ہوتا چلا گیا۔ مثلاً صلح حدیبیہ کا مشہور واقعہ ظہور پذیر ہوا، جس پر مفصل بحث ہم پچھلے صفحات میں کر چکے ہیں اور جیسا کہ سورۂ نور میں مومنین سے وعدہ استخلاف کرتے ہوئے یہ کہا گیا تھا کہ "اللہ ان کی موجودہ حالت خوف کو امن سے بدل دے گا۔"[۱۶۶] چنانچہ اس کے مطابق ریاستِ نبوی بتدریج ضعف سے قوت اور دفاع سے اقدام کی طرف بڑھنے لگی غلبہ قوت کی یہ تبدیلی جس رفتار سے جاری تھی اس کا اندازہ اس مثال سے لگایا جا سکتا ہے جسے سورۂ فتح کی آخری آیت میں اس طرح بیان کیا گیا کہ:

کزرعٍ اخرج شطأہ فاٰزرہ فاستغلظ فاستوٰی علٰی سوقہٖ یعجب الزراع لیغیظ بھم الکفار
وعد اللہ الذین اٰمنوا وعملوا الصّٰلحٰت منھم مغفرۃً واجراً عظیما۔[۱۶۷]

اس کا مفہوم ایک جدید العہد مصنف کے بقول یہ ہے کہ "شروع میں یہ کیفیت تھی کہ ایمان کی زمین صالح سے اعمال کا تخم حسنہ

نرم و نازک پتی کی شکل میں منصۂ شہود پر آیا پھر اس میں تقویت پیدا ہوئی تو وہ ایک شاخ نو دمیدہ کی صورت اختیار کر گیا۔ پھر اس میں اور توانائی پیدا ہوئی تو وہ دیکھو ایک لہلہاتی کھیتی بن گیا جسے دیکھ کر کسان کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا اور حاسدوں کے سینے پہ سانپ لوٹنے لگے۔ یہ تھے مغفرت اور اجرِ عظیم کے وہ درخشندہ وعدے جو اللہ نے ایمان اور عمل صالح کے بدلہ میں جماعت مومنین سے کئے تھے اور جو اس کی عاجز نوازیوں نے اس طرح پورے کئے۔"(۱۶۸)

صلح حدیبیہ کے بعد ریاست نبوی میں چند نازک قانونی و معاشرتی مسائل پیدا ہوئے اور جنہیں رسول اللہ نے اپنی ذہانت و تدبر سے بآسانی حل کر لیا۔ پہلا مسئلہ اس وقت پیدا ہوا جبکہ بعض مسلمان عورتیں ہجرت کر کے مکہ سے مدینہ آنے لگیں بقول ابن اسحٰق ام کلثوم بنت عقبہ بن ابی معیط نے اسی زمانہ میں ہجرت کی اور حدیبیہ کی قرار داد کے بموجب ان کے دو بھائی عمارہ اور ولید انہیں واپس لینے کے لئے رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔(۱۶۹) لیکن رسول اللہ نے صلح نامہ کی تمام قانونی باریکیوں کو سامنے رکھتے ہوئے ساتھ بھیجنے سے انکار کر دیا۔ آپ کا استدلال یہ تھا کہ:

کان الشرط فی الرجال دون النساء۔(۱۷۰)

(شرط مردوں کے بارے میں تھی نہ کہ عورتوں کے بارے میں)

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ بظاہر یہ شرط صلح نامہ حدیبیہ میں مردوں (رجل) کی صراحت کے ساتھ موجود نہ تھی۔ ہم نے بھی صلح حدیبیہ پر بحث کے سلسلہ میں ابن ہشام کے یہ الفاظ نقل کئے تھے کہ:

من اتی محمداً من قریش بغیر اذن ولیہ ردہ علیہم۔(۱۷۱)

لیکن مذکورہ بالا واقعہ کی روشنی میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت بالمعنیٰ ہے ورنہ اصل میں یہ شرط کفار قریش کی طرف سے تھی اور ان کی جانب سے یہ الفاظ معاہدے میں لکھوائے گئے تھے کہ:

علی انہ لا یاتیک منا رجل وان کان علی دینک الا رددتہ الینا۔(۱۷۲)

(یہ کہ تمہارے پاس ہم میں سے کوئی بھی مرد آئے اگرچہ وہ تمہارے دین ہی پہ ہو تو تم اسے ہماری طرف واپس کر دو گے)

حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ نے شرط صلح کے الفاظ سے جو فائدہ اٹھایا تھا اس انداز پہ خود قریش کے لوگوں نے بھی نہ سوچا تھا پھر رسول اللہ نے مدینہ آنے والی مسلمان عورتوں کے بارے میں جو موقف اختیار کیا تھا اس کی تصدیق وحی الٰہی سے بھی ہو گئی اور اللہ تعالیٰ نے مسلمان مہاجرات کے بارے میں تفصیلی ضابطہ اور اس کے ضمن میں قانونِ شہادت کو سورۂ ممتحنہ(۱۷۳) میں بیان کر دیا۔ ارشاد یہ ہوا کہ:

یآیھا الذین امنوا اذا جاءکم المومنات مھاجرات فامتحنوھن اللہ اعلم بایمانھن فان علمتموھن مومنات فلا ترجعوھن الی الکفار لاھن حل لھم ولا ھم یحلون لھن۔(۱۷۴)

(اے اہلِ ایمان! جب مومن عورتیں ہجرت کر کے تمہارے پاس آئیں تو (ان کے مومن ہونے کی) جانچ پڑتال کر لو۔ اور ان کے ایمان کی حقیقت اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ پھر جب تمہیں معلوم ہو جائے کہ وہ مومن ہیں تو انہیں کفار کی طرف واپس نہ کرو، نہ تو وہ کفار کے لئے حلال ہیں اور نہ کفار ان کے لئے حلال)۔

اسی کے ساتھ ساتھ دوسرا مسئلہ پیدا ہوا کہ جب عورتیں ایمان لا کر بیعت کے لئے رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوں تو آپ ان سے کن باتوں کا عہد لیں، اس کا جواب وحیِ الٰہی نے یہ دیا کہ:

یا یھا النبی اذا جاءك المومنات یبا یعنك علیٰ ان لا یشرکن باللہ شیئًا ولا یسرقن ولا یزنین ولا یقتلن اولادھن ولا یاتین ببھتانٍ یفترینه بین ایدیھن وارجلھن ولا یعصینك فی معروفٍ فبا یعھن واستغفر لھن اللہ۔(۱۷۵)

(اے نبی! جب تمہارے پاس مومن عورتیں بیعت کرنے کے لئے آئیں اور اس بات کا عہد کریں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں گی، چوری نہ کریں گی، زنا نہ کریں گی، اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی، اپنے ہاتھ پاؤں کے آگے کوئی بہتان گھڑ کر نہ لائیں گی اور کسی امرِ معروف میں تمہاری نافرمانی نہ کریں گی تو ان سے بیعت لے لو اور ان کے حق میں اللہ سے دعائے مغفرت کرو)

ان دونوں مسائل کے سلسلے میں مندرجہ ذیل احکام بھی سورۂ ممتحنہ میں بیان کر دئے گئے جن کا تعلق اسلام کے عائلی قانون سے بھی ہے اور بین الاقوامی قانون سے بھی:

۱۔ اوّل یہ کہ جو عورت مسلمان ہو جائے وہ اپنے کافر شوہر کے لئے حلال نہیں رہتی اور نہ کافر شوہر اس کے لئے حلال رہتا ہے۔

۲۔ دُوسرے یہ کہ جو منکوحہ عورت مسلمان ہو کر دارالکفر سے دارالاسلام میں ہجرت کر آئے اس کا نکاح آپ سے آپ ٹوٹ جاتا ہے اور جو مسلمان بھی چاہے اس کا مہر دے کر اس سے نکاح کر سکتا ہے۔

۳۔ تیسرے یہ کہ جو مرد مسلمان ہو جائے اس کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ اس کی بیوی اگر کافر ہے تو وہ اسے اپنے نکاح میں روکے رکھے۔

۴۔ چوتھے یہ کہ اگر دارالکفر اور دارالاسلام کے درمیان صلح کے تعلقات موجود ہوں تو اسلامی حکومت کو دارالکفر کی حکومت سے یہ معاملہ طے کرنے کی کوشش کرنی چاہئے کہ کفار کی جو منکوحہ عورتیں مسلمان ہو کر دارالاسلام میں ہجرت کر آئی ہوں ان کے مہر مسلمانوں کی طرف سے واپس دے دیتے جائیں اور مسلمانوں کی منکوحہ کافر عورتیں جو دارالکفر میں رہ گئی ہوں ان کے مہر کفار کی طرف سے واپس مل جائیں۔(۱۷۶)

بہرحال صلح حدیبیہ کے بعد سورۂ ممتحنہ نے مسلمانوں اور کفار و مشرکین کے درمیان سابق کے ازدواجی رشتوں کو ختم کر دیا اور آئندہ کے لئے ان کے بارے میں ایک قطعی اور واضح قانون بنا دیا۔(۱۷۷)

ایک اور اہم تاریخی معاملہ حاطب بن ابی بلتعہ کا ہے جو اسی سورۂ ممتحنہ میں بیان کیا گیا ہے وہ اپنے زمانہ وقوع کے اعتبار سے اگرچہ کچھ موخر ہے لیکن دراصل صلح حدیبیہ کے نتائج و ثمرات کی ایک اہم کڑی ہے۔ اس لئے اس پر مختصراً گفتگو نامناسب نہ ہوگی۔ حاطب نے فتح مکہ سے کچھ پہلے ایک خفیہ خط کے ذریعہ رسولؐ اللہ کے اہم جنگی رازوں سے قریش مکہ کو مطلع کرنا چاہا، مقصد اپنے اہل و عیال کو جنگ کی عقوبت سے محفوظ رکھنا تھا۔ انہوں نے مکہ پہنچانے کے لئے ایک عورت کی خدمات حاصل کیں۔(۱۷۸) رسولؐ اللہ کو اس مخبری کی اطلاع بذریعہ وحی ہوگئی۔ چنانچہ آپ نے حضرت علی اور زبیر بن العوام کو اس عورت کو پکڑنے کے لئے بھیجا جس کے پاس حاطب کا خط تھا۔ چنانچہ ان دونوں حضرات نے مقام خلیقہ(۱۷۹) پر اس کو پالیا۔ خط اس کے سر کے بالوں میں سے نکلا، خط لے کر رسولؐ اللہ کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔ رسولؐ اللہ نے استفسار کے لئے حاطب کو بلوایا۔ حاطب نے اپنی صفائی پیش کر دی اور رسولؐ اللہ نے اسے قبول فرما لیا۔(۱۸۰) بقول ابن ہشام اسی موقع پر اللہ تعالیٰ نے حاطب کے معاملہ میں، یہ نازل فرمایا کہ:(۱۸۱)

یٰایھا الذین اٰمنوا لا تتخذوا عدوی وعدوکم اولیآء تلقون الیھم بالمودۃ ..... الخ(۱۸۲)

(اے اہلِ ایمان! اگر تم میری راہ میں جہاد کرنے کے لئے اور میری رضا جوئی کی خاطر وطن چھوڑ کر گھروں سے نکلے ہو تو میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ ..... الخ)

حضرت حاطب کا یہ فعل خواہ ذاتی طور پر ان کی خیر خواہی پر کتنی ہی دلالت کیوں نہ کرتا ہو بہرحال ایک جاسوسی اور مخبری کا تھا اور حالت جنگ (کیونکہ صلح حدیبیہ ٹوٹ چکی تھی) کے جس نازک موقع پر ہوا تھا اس سے ہوسکتا تھا کہ ریاست نبوی سنگین نتائج سے دوچار ہو جائے۔ اس لئے حاکمِ حقیقی کی طرف سے اس پر بڑے سخت الفاظ میں گرفت کی گئی البتہ زجر و توبیخ کر کے چھوڑ دیا گیا اور کوئی مالی یا جسمانی سزا تجویز نہیں کی گئی۔ ہاں اگر یہ فعل حضرت حاطب جیسے بدری صحابی سے سرزد نہ ہوتا جن کا ایمان و اخلاص شک و شبہ سے بالاتر تھا تو ایسی حرکت کرنے والے کو قتل کیا جا سکتا تھا جیسا کہ حضرت عمرؓ کی اجازت طلب کرنے سے معلوم ہوتا ہے(۱۸۳) اور "اس سے فقہا کے ایک گروہ نے یہ استدلال کیا ہے کہ مسلمان جاسوس کے لئے عام قانون یہی ہے کہ اسے قتل کیا جائے الا یہ کہ بہت وزنی وجوہ اسے کمتر سزا دینے یا محض ملامت کر کے چھوڑ دینے کے لئے موجود ہوں مگر فقہا کے درمیان اس مسئلے میں اختلاف ہے۔ امام شافعی اور بعض دوسرے فقہاء کا مسلک یہ ہے کہ مسلمان جاسوس کو تعزیر دی جائے گی مگر اس کا قتل جائز نہیں۔ امام ابوحنیفہ اور امام اوزاعی کہتے ہیں کہ اسے جسمانی عقوبت اور طویل قید کی سزا دی جائے گی۔ امام مالک کہتے ہیں اسے قتل کیا جائے گا۔"(۱۸۴)

اوپر کی تفصیلات یہ ظاہر کرنے کے لئے کافی ہیں کہ ابتدائی پانچ سال کے عرصہ میں جو اسلامی معاشرہ اپنی ایک مستقل حیثیت سے وجود پذیر ہو چکا تھا، جس کا تشخص بھی بہت کچھ ہو چکا تھا اور جہاں بہت سی معاشرتی اصلاحات جاری ہو چکی تھیں، نیز نکاح و طلاق اور دیگر دیوانی و فوجداری قوانین بڑی حد تک تفصیل کے ساتھ مدون کر نافذ ہو چکے تھے اب وہ معاشرہ مزید ترقی کرتا ہے اور پردہ کے تکمیلی احکام، استیذان، زنا اور قذف وغیرہ کی سزاؤں کا اجرأ، نشست و برخاست،

گفتگو، وضع قطع اور رہنے سہنے کے طریقوں کی تلقین وغیرہ سے ثابت ہوتا ہے کہ اب اسلامی معاشرہ میں ہر چیز نے اپنی ایک مستقل شکل اختیار کر لی تھی۔ اور ظاہر ہے کہ اندرونی طور پر معاشرتی ارتقا کی یہ کیفیت بیرونی طور پر ریاست کی بتدریج توسیع کا ذریعہ بنتی گئی۔

توسیع و ترقی کے اس سلسلے میں اس واقعہ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جبکہ رسول اللہؐ نے ہمسایہ ممالک کے سلاطین و امراء کو اسلام کی تحریری دعوت دی۔ اسلام کے عالمگیر مشن کو متعارف کرانے کا یہ کام اتنا عظیم الشان تھا جس نے آگے چل کر اس وقت کی عالمی سیاست پر دُور رس اثرات مرتب کئے اور دنیا کو ایک نئی تہذیب و ثقافت اور نظریۂ حیات سے روشناس کرایا۔ رسول اللہؐ کا یہ اقدام ایک مصنف کے بقول "دنیا میں نظریاتی تہذیب کی صبح اوّل کا طلوع تھا۔ اسی مبارک دن سے دنیا نے جاگیرداری اور زمینداری کے نظامِ فکر سے نکل کر انسانی اخوت اور حریت کے نظریات کی طرف اپنے طویل سفر کا آغاز کیا۔"[185] اس کے معاً بعد فتح خیبر کا تاریخی واقعہ پیش آیا۔ غزوۂ خیبر کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں متعدد فقہی احکام کا اعلان اور اجراء ساتھ ساتھ ہوا۔ مثلاً گدھے اور خچر حرام ہو جانے کی منادی رسول اللہؐ نے میدانِ خیبر ہی میں کی اور اس کی تعمیل میں فوراً وہ ہانڈیاں اوندھا دی گئیں جن میں گدھے کا گوشت پک رہا تھا۔[186] گوشت ضائع کر دیا گیا حالانکہ لوگ بھوکے تھے۔[187] یہ ایک ادنیٰ ثبوت اس بات کا ہے کہ احکام و قوانین کا اجرا اور ان کی تنفیذ کس طرح بیک وقت عمل میں آ رہی تھی۔ خیبر کے اسی موقع پر پنجہ دار پرندے درندے اور تقسیم سے قبل غنیمت کی فروخت کو حرام قرار دیا گیا،[188] چاندی سونے کا بہ تفاضل خریدنا موقوف[189] اور متعہ ممنوع ٹھہرایا گیا[190] ان احکام کے اجرا و نفاذ سے ریاستِ نبویؐ کی پُرامن اور مستحکم حالت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ اب مسلمانوں کی اندرونی حالت اتنی سنبھل چکی تھی کہ وہ بآسانی تہذیب و تمدّن کے جدید تقاضوں کو پورا کر سکتے تھے۔ غالباً اسی لئے سورۃ المائدہ میں بیک وقت تین قسم کے مضامین پائے جاتے ہیں۔[191] یعنی ایک تو مسلمانوں کی مذہبی، تمدنی اور سیاسی زندگی سے متعلق مزید احکام و ہدایات دی گئیں، دوسرے چونکہ مسلمان اس وقت ایک حکمران گروہ بن چکے تھے اور وہ وعدۂ استخلاف جو سورۂ نور میں کیا جا چکا تھا[192] اب حقیقت بن کر سامنے آ رہا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں طاقت تھی اور اس بات کا خدشہ تھا کہ کہیں اس کا نشہ انہیں راہِ راست سے بھٹکا نہ دے جیسا کہ یہ پچھلی قوموں خصوصاً بنی اسرائیل کی گمراہی و تباہی کا سبب بن چکا تھا اس لئے یہ کہنا بجا ہوگا کہ آزمائش کے ایک دَور سے نکل کر مسلمان ایک دوسرے عہدِ آزمائش میں داخل ہو رہے تھے اس لئے ضروری ہدایات اور نصیحتیں سورۃ مائدہ میں شامل ہیں۔ تیسرے یہ کہ یہود کا زور بالکل ختم ہو چکا تھا اس لئے اس موقع پر اہلِ کتاب کو ایک بار پھر غلط رویّہ پر متنبہ کرنا اور انہیں راہِ راست پر آنے کی دعوت دینا مناسب تھا۔ اب جہاں تک مسلمانوں کی مذہبی، تمدنی اور سیاسی زندگی کے متعلق احکام و ہدایات کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں سفر حج و عمرہ کے آداب[193]، شعائر اللہ کا احترام اور زائرین سے عدمِ تعرض کا حکم[194]، کھانے پینے کی چیزوں میں حرام و حلال کا قطعی تعین[195]، دورِ جاہلیت کے خود ساختہ قاعدوں کے خاتمہ کی ہدایت[196]، پھر وضو، غسل، تیمم کے ضابطے[197]، قسم توڑنے کا کفارہ[198]، "قانون شہادت کی مزید دفعات[199]، ڈکیتی اور فتنہ و فساد پھیلانے والوں کے لئے سزا کا قانون[200]، چوری کی تعزیر[201]، قصاص عادل[202] اور ارتداد[203] سے متعلق

احکام اور اہل کتاب کے ساتھ اکل وشرب اور نکاح کی اجازت[۲۰۴] لیکن دوستی کی ممانعت[۲۰۵] شامل ہے۔ دوسرے حصے یعنی ایک حکمران گروہ کی حیثیت سے مسلمانوں کو نصائح کے سلسلے میں عدل پر قائم رہنے کا حکم[۲۰۶]، اہلِ کتاب کی روش سے بچنے کی ہدایت[۲۰۷]، اللہ کی اطاعت وفرمانبرداری اور احکام کے اتباع کے عہد پر ثابت قدم رہنے[۲۰۸] کی نصیحت اور اپنے جملہ معاملات کے فیصلوں میں کتابِ الٰہی کی پابندی[۲۰۹] کا حکم قابلِ ذکر ہے۔ اب رہا معاملہ یہود و نصاریٰ کو نصیحت کا تو ایک طرف تو یہود کو ان کے غلط رویّہ پر توجہ دلا کر راہِ راست پر آنے کی دعوت دی گئی[۲۱۰] دوسری طرف عیسائیوں کو تفصیل سے خطاب کیا گیا[۲۱۱] اور اس کے بعد ان سے مطالبہ کیا گیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں[۲۱۲]۔

مائدہ کے بعد نازل ہونے والی سورۂ تحریم کا موضوعِ بحث اگرچہ ازواجِ مطہرات ہیں لیکن ان کے پردہ میں رسول اللہؐ کی قانونی و دستوری حیثیت اور ریاست نبوی میں آپ کے مقام کو بھی متعین کر دیا گیا، مثلاً یہ کہا گیا کہ حلال وحرام اور جائز و ناجائز کے حدود مقرر کرنے کے اختیارات قطعی طور پر اللہ کے ہاتھوں میں ہیں۔ نبی بحیثیت نبی اگرچہ کسی چیز کو حرام یا حلال قرار دے سکتا ہے لیکن صرف اس صورت میں جبکہ اللہ کی طرف سے اس کا حکم ہو۔ علاوہ ازیں یہ بتایا گیا کہ ایک معمولی بات بھی اگر نبی کی زندگی میں پیش آجائے تو وہ قانون کی حیثیت اختیار کر جاتی ہے۔ اس لئے اگر کوئی ایسا فعل بھی نبی سے صادر ہو جو منشائے الٰہی سے ہٹا ہوا ہو تو اس کی فوراً اصلاح کر دی گئی تاکہ اسلامی قانون اور اس کے اصول اپنی صحیح صورت پر رہیں[۲۱۳]۔

غزوۂ تبوک تک پہنچتے پہنچتے حالات بہت کچھ منقلب ہو چکے تھے۔ اندرونِ عرب کی وہ تمام قوتیں جو ریاستِ نبوی کے ارتقا میں مزاحم تھیں بالکل بے بس ہو چکی تھیں اور فتح خیبر، فتح مکہ، فتح حنین، محاصرۂ طائف، سرایا برائے انہدام معبودانِ باطل اور موتہ کا نتیجہ خیز معرکہ ہو چکا تھا اور رسول اللہؐ کا پرچم فتح یکے بعد دیگرے عرب کے تمام علاقوں پر اڑتا چلا جا رہا تھا۔ یہ اس بات کی صاف علامت تھی کہ اب اسلام کا غلبہ یقینی اور ریاست کا پھیلاؤ ناگزیر ہے۔ لہٰذا اس موقع پر یہ برداشت نہیں کیا جا سکتا تھا کہ عرب میں شرک وکفر کے مراکز، جاہلی ادارے اور تعصبات زندہ رکھے جائیں۔ ان انتظامات کا سب سے بڑا محرک سورۂ توبہ کا نزول تھا جس میں کفار ومشرکین سے اعلانِ برأت[۲۱۴] اشہرِ حرم کے بعد ان کا استیصال[۲۱۵] نقضِ میثاق پر ان کو قطعاً معاف نہ کرنے کا حکم[۲۱۶]، اللہ کے گھروں سے ان کا حق ختم کرنے[۲۱۷] اور حج کے سلسلہ میں ان سے اظہارِ برأت کرنے کا حکم دیا گیا[۲۱۸] اور یہ کہہ دیا گیا کہ مشرکین نجس ہیں اس لئے اس سال (۹ھ) کے بعد ان کو مسجد حرام کے قریب بھی نہ پھٹکنے دیا جائے[۲۱۹] اور حکم دیا گیا کہ اہلِ کفر سے قتال کرو یہاں تک کہ وہ مطیع ہو جائیں یا جزیہ پر راضی ہو جائیں[۲۲۰]۔ اس آیت کے بارے میں ابو عبیدہ کی رائے یہ ہے کہ تبوک میں قیام کے دوران رسول اللہؐ نے قیصرِ روم کو ایک مکتوب (علاوہ مکتوب سابق) روانہ کیا تھا جس میں اسے اسلام کی دعوت دی تھی اور اسلام تسلیم نہ کرنے کی صورت میں سرنگوں ہو جانے اور جزیہ ادا کرنے کا مطالبہ کرتے ہوئے بطور استدلال آیت مذکورہ تحریر کی تھی[۲۲۱] اور غالباً یہ رسول اللہؐ کی غایت تدبّر کی دلیل ہے کہ جس زمانہ میں شمالی سرحد پر عیسائی رومیوں سے خطاب کیا گیا اور ان کے آس پاس کے قبائل سے صلح کی گئی کم وبیش اسی زمانہ میں جنوب کی سمت نجران کے علاقے سے ایک وفد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا[۲۲۲] اس وقت نجران کا

علاقہ عیسائیوں کے تابع تھا اور ان کے تین سردار تھے۔[۲۲۳] ایک عاقب کہلاتا تھا جس کی حیثیت امیرِ قوم کی تھی۔ دوسرا سیّد کہلاتا تھا جو ان کے تمدنی و سیاسی امور کی نگرانی کرتا تھا۔ اور تیسرا اسقف تھا جس سے مذہبی پیشوائی متعلق تھی[۲۲۴] رسول اللہ نے انہیں ان کے عقائد کی غلطیاں سمجھائیں[۲۲۵] ان کی سابقہ روِش پر متنبہ کیا[۲۲۶] اور پھر اسلام لانے کی دعوت دی۔[۲۲۷] ان لوگوں نے انکار کیا اور آپس میں بہت گفت گو اور بحث و مباحثہ ہوا آپ نے انہیں قرآن سنایا اور فرمایا کہ: "میں تم سے جو کچھ کہتا ہوں اگر تم انکار کرتے ہو تو آؤ میں تم سے مباہلہ کروں گا۔"[۲۲۸] اس پر وہ مجبور ہوئے اور کہنے لگے کہ ہمیں یہ مناسب معلوم ہوا کہ آپ سے مباہلہ نہ کریں، آپ جو چاہیں حکم دیں ہم مان لیں گے اور آپ سے صلح کرلیں گے۔[۲۲۹] چنانچہ آپ نے ان سے صلح کی اس شرط پر کہ وہ سالانہ کپڑوں کے دو ہزار جوڑے دیا کریں گے، ہر سال رجب میں ہزار جوڑے اور صفر میں ہزار جوڑے۔ ہر جوڑا ایک اوقیہ چاندی (یا اس کی قیمت) کے مساوی ہوگا اور یہ بھی طے ہوا کہ جب بھی یمن میں کوئی شورش یا ناگہانی حادثہ واقع ہوگا تو وہ مسلمانوں کو ۳۰ زرہیں، ۳۰ گھوڑے اور ۳۰ اونٹ بطور عاریت فراہم کریں گے۔ علاوہ ازیں نجران اور اس کے آس پاس والوں کی جان، مال، مذہب، ملک، زمین، حاضر، غائب اور ان کی عبادت گاہوں کو اللہ کی پناہ اور محمد نبی رسول کی ذمہ داری حاصل ہوگی۔[۲۳۰]

مدینہ میں رسول اللہ کے قیام کا نواں سال جس میں پیش آنے والے بعض واقعات کو اوپر بیان کیا گیا ہے کچھ اور واقعات کے لحاظ سے بھی تاریخ اسلام، تاریخ رسالت، ریاست نبوی کے فروغ و استحکام، اسلامی قانون کی تدریج اور ریاست نبوی کے ارتقاء میں غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ تطہیرِ کعبہ کے ساتھ ساتھ حجِ بیت اللہ کی فرضیت اسی ۹ھ میں ہوئی[۲۳۱] سود کی باقاعدہ حرمت[۲۳۲] اور اس کے تفصیلی احکام کا نزول، فرضیت زکوٰۃ کا حکم،[۲۳۳] اور اس کی تعمیل میں محصلین زکوٰۃ کا تقرر[۲۳۴]، تعلیم و تبلیغ اسلام کے لئے مبلغین و دعاۃ کی روانگی[۲۳۵]، سورۂ حجرات کا نزول[۲۳۶] اور نظامِ معاشرت کے بعض اہم تکمیلی احکام کا اجرا[۲۳۷] وغیرہ ۹ھ میں ہی ہوا۔ یہ واقعات زبانِ حال سے حاکمیتِ الٰہی کے تحت رسول اللہ کی انتظامی و سیاسی اہلیت، قانونِ اسلامی کی بتدریج تکمیل اور ریاست نبوی کے مسلسل ارتقاء کو بیان کرنے کے لئے کافی ہیں۔ علاوہ ازیں مذکورہ سال مورخین کی عام اصطلاح میں "عام الوفود" بھی کہلاتا ہے یعنی اسی سن میں عرب کے تقریباً ہر گوشے سے بے شمار وفود نے آآ کر ریاستِ نبوی کے سامنے سرِ اطاعت خم کیا اور جب یہ وفود اپنے اپنے علاقوں کو واپس گئے تو ان کی گردنوں میں ریاست نبوی کا قلادہ پڑا ہوا تھا۔ آخری وفد ۱۰ھ میں رسول اللہ کی خدمت میں حجۃ الوداع کے موقع پر حاضر ہوا تھا۔[۲۳۸] گویا رسول اللہ کے وصالِ مبارک سے تقریباً دو ماہ پیشتر پورا عرب ریاستِ نبوی کے پرچم تلے آگیا اور اس طرح اس کی نشو و ارتقاء کا عمل تکمیل پذیر ہوا۔

متذکرہ بالا تاریخی حقائق سے چند امور کی مزید وضاحت ہوجاتی ہے یعنی؛

(۱) چونکہ ریاست نبوی کا مکمل ارتقاء اور اس کا استحکام وصالِ مبارک سے چند ماہ پیشتر ہی ہوا تھا اس لئے استحکامِ ریاست کے گہرے رسوخ کا پورا موقع رسول اللہ کو میسر نہ آسکا۔

(۲) رسول اللہ کی گزشتہ دس سالہ شبانہ روز مساعی کا نتیجہ یہ نکلا کہ پورے عرب نے اسلام کی سیاسی حاکمیت کو تسلیم کرلیا اور پورا عرب ایک مرکزی اقتدار کے تحت آگیا یہ تاریخ عرب میں پہلا حیرت انگیز اور انقلاب آفریں موقع تھا۔

البتہ یہ نتیجہ نکالنا درست نہ ہوگا کہ پُورے عرب نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ تاریخ سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت عرب میں غیر مسلم آبادی بہرحال موجود تھی جس میں یہود، نصاریٰ، مجوس اور مشرکین وغیرہ شامل ہیں۔ غیر مسلم رعایا اور دیگر شورش پسند عناصر کا اسلام کی سیاسی حاکمیت کو تسلیم کر لینے کا غالب بنیادی سبب یہ تھا کہ وُہ اپنی آنکھوں سے یہ دیکھ رہے تھے کہ اب اسلام محض دین اور عقیدہ نہیں رہا ہے بلکہ ایک ایسی زندہ و متحرک سیاسی قوت بھی بن گیا ہے جس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا اسلامی ریاست کے اقتدار کو تسلیم کر لینے میں انہیں اپنے مفادات کا تحفظ اور جان و مال کی عافیت زیادہ محسوس ہوئی۔ یہاں یہ وضاحت بھی بے محل نہ ہوگی کہ قبائل عرب میں سے جن لوگوں نے اسلام قبول کر لیا تھا ان میں سے اگرچہ ایک تعداد اپنے ایمان و اسلام میں مخلص بھی تھی لیکن ایسے لوگوں کی بھی کمی نہ تھی جنہوں نے اسلام کو رسماً قبول کیا تھا اور قرآن کے بیان کے مطابق اسلام ان کے حلقوں سے نیچے نہ اُترا تھا۔[۲۳۹] چنانچہ تاریخ میں ارتداد کی جو انفرادی و شخصی یا قبائلی و جماعتی مثالیں پائی جاتی ہیں[۲۴۰] ان کا بڑا سبب نفسی و نفسیاتی ہونے کے علاوہ یہی تھا کہ اسلام فی الحقیقت ان کے قلوب میں جاگزیں نہ ہوا تھا۔ بعض لوگوں نے ایک قدم اور آگے بڑھایا تو خود ساختہ پیغمبر بن بیٹھے۔ مثلاً مسیلمۃ الکذاب۔ وہ وفد بنی حنیفہ کے ساتھ ایک مرتبہ مدینہ آیا اور رسولؐ اللہ سے اس کی گفتگو بھی ہوئی۔ اس نے حرص و طمع کا مظاہرہ کیا تو دورانِ گفتگو آپ نے اسے سختی سے جھڑک دیا،

لو سالتنی ھذا العسیب ما أعطیتك۔[۲۴۱]

(اگر تو مجھ سے کھجور کی یہ چھڑی بھی مانگے تو نہ دُوں گا)

واپس گیا تو مرتد ہوگیا اور دعوئ نبوت بھی کر دیا۔[۲۴۲] مسیلمہ نے بہت بے باکی سے رسولؐ اللہ کو خط بھی لکھا تھا لیکن رسولؐ اللہ نے اپنے جواب میں اس کو لاجواب کر دیا۔[۲۴۳] یہ ۱۰ھ کے اواخر کی بات ہے۔ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ رسولؐ اللہ کو اس کے خلاف بھی تادیبی کارروائی کا وقت میسر نہ آ سکا۔ اسود بن کعب العنسی دوسرا شخص تھا جس کے جرائم مسیلمہ کے ہی مماثل تھے، اس کو ٹھکانے لگانے کے لئے رسولؐ اللہ نے جن لوگوں کو مقرر کیا تھا انہوں نے اگرچہ اپنی کارروائی مکمل کر لی اور رسولؐ اللہ کے وصال مبارک سے ایک دن پہلے وہ قتل بھی کر دیا گیا لیکن اس کے قتل کی اطلاع مدینہ بعد میں پہنچی۔[۲۴۴]

رسولؐ اللہ کے وصالِ مبارک کے بعد حضرت ابوبکرؓ جانشینِ ریاست منتخب ہوئے اور انہوں نے مرتدین و کذابین نخیز کا پُوری طرح قلع قمع کیا اور اس طرح استحکام ریاست کا جو گوشہ وقت و مہلت کی کمی کے باعث عہد نبوی میں مکمل نہ ہو پایا تھا اسے عہدِ صدیقی میں پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا گیا۔

رسولؐ اللہ کے بعد ارتداد اور مدعیانِ نبوت کی سرگرمیوں سے ریاست نبوی پر کوئی الزام نہیں آتا کیونکہ دن رات کا تجربہ بتاتا ہے کہ ہر نئی چیز کے قیام و فروغ اور استحکام کے لئے وقت درکار رہے اور جب کوئی ریاست از سرِ نو قائم ہوتی ہے اس کو اس قسم کے حالات سے سابقہ پیش آتا ہی ہے بلکہ دنیا کی تاریخ سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب دوسرے نو قائم شدہ ریاستوں کے ایسے مراحل درپیش ہوتے ہیں تو ملک میں بڑی افراتفری، خانہ جنگی اور انتشار پیدا ہوتا ہے اس عہدِ صدیقی کے ابتدائے ایام میں اس قسم کا خلفشار باعثِ الزام نہیں ہے۔ آخر کار چند ماہ کے بعد استحکام ریاست اپنے داخلی و خارجی تمام پہلوؤں کے ساتھ قائم و دائم ہو گیا تھا۔

باب پنجم

انتظامِ ریاست

ریاست نبویؐ کے نشو و ارتقاء کا مطالعہ کرنے کے بعد دیکھنا یہ ہے کہ مذکورہ ریاست کا نظم و نسق کن بنیادوں پر قائم تھا اور اس کے مختلف انتظامی ادارات کی نوعیت، طریقِ کار، مقاصد اور کارکردگی کیا رہی؛ نکات بالا پر بحث تو ہم آئندہ صفحات میں کریں گے یہاں بطور مقدمہ چند باتیں قابلِ ذکر معلوم ہوتی ہیں:

(۱) پہلی بات تو مجموعی طور پر یہ کہی جاسکتی ہے کہ عہدِ نبویؐ کے تمام ادارات میں ایک خاص ارتباط اور تسلسل پایا جاتا ہے اور جملہ سیاسی اور انتظامی تنصیبات کا ارتقاء ایک خاص ترتیب کے ساتھ ہوا۔ نیز وہ ادارے جو بالکل ابتدائی زمانے میں قائم ہوئے بے شمار موانعات کے باوجود نمو پاتے رہے اور ان میں اس وقت بھی عمل ارتقاء جاری رہا جبکہ سیاسی مخالفوں اور دشمنوں کی تعداد بہت زیادہ لیکن خود ریاست نبوی کا استحکام بہت معمولی تھا۔ اس لحاظ سے ہر قسم کے سرد و گرم حالات کو انگیز کر جانا بھی ان ادارات کا ایک غیر معمولی امتیاز رہے اور اس حقیقت سے بھی صرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا کہ جملہ ادارات کے مسلسل ارتقاء کے باوجود ان کا معیارِ کارکردگی دن بدن بہتر ہوتا چلا گیا اور مدینہ کی مرکزی قیادت ان کو لمحہ بہ لمحہ تقویت پہنچاتی رہی۔

(۲) دوسری قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ان ادارات کا نشو و نما یکایک نہیں ہوا بلکہ حالات و ضروریات کے پیشِ نظر ادارات کی تاسیس یا توسیع عمل میں آتی رہی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ روزہ (صوم) کا سنہ ۲ھ میں اور زکوٰۃ کا ادارہ اس کے سات سال بعد سنہ ۹ھ میں قائم ہوا یا مثلاً مالی ادارات میں سے مالِ غنیمت کے قوانین کا اجراء سنہ ۲ھ میں ہوا اور جزیہ کا حکم اس کے سات سال بعد آیا، یا مثلاً بجائے خود ریاست کا ادارہ سنہ ۱ھ میں قائم ہوا اور پھر شوریٰ کا آغاز بھی بہت جلد ہو گیا لیکن غیر مسلموں یا ذمیوں کے حقوق و فرائض کا تعین فتح خیبر کے بعد ہوا۔ بہرحال حقیقت یہ ہے کہ ریاست نبوی کا کوئی ادارہ نہ تو غیر ضروری تھا اور نہ اس کے اچانک زوال پذیر ہونے کا امکان تھا بلکہ تاریخ کی رُو سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ عہدِ خلافتِ راشدہ میں اور اس کے بعد ریاست کے ادارات جس ترقی یافتہ شکل میں نظر آتے ہیں ان میں سے اکثر کی اساس دورِ رسالت میں ہی پڑ چکی تھی۔

(۳) جس طرح یہ کہنا درست نہیں ہے کہ عہدِ نبویؐ کے تمام ادارات جاہلی ورثہ تھے اور ریاست کا نظم و نسق کلیتاً اندرونِ عرب یا بیرونِ عرب کے نظام ہائے سیاسی سے مستعار تھا اسی طرح یہ کہنا بھی صحیح نہ ہو گا کہ تمام تنصیبات عہدِ نبوی ہی کی پیداوار ہیں کیونکہ بعض سیاسی، سماجی اور مذہبی انتظامات ایسے ہیں جو عہدِ نبوی سے قبل بھی

پائے جاتے تھے۔ مثلاً امورِ ریاست کی انجام دہی میں مشورہ کا اصول (اس کی نوعیت خواہ کوئی بھی ہو)، نیز صوبوں میں گورنروں یا والیوں کا تقرر، یا خراج و جزیہ کا اصول روم و فارس کی سلطنتوں میں بھی موجود تھا اور خود عرب میں مکہ کی اعیانی حکومت میں مشورہ کا شعبہ دار الندوہ کا پایا جانا معروف بات ہے۔ نیز عرب جاہلیت میں نماز، روزہ وغیرہ کی رسوم کسی نہ کسی شکل میں پہلے سے موجود تھیں۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت بھی تاریخ کے طالب علم سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی کہ کسی اور نظام میں بعض ادارات کی محض موجودگی اس بات کی دلیل نہیں بن سکتی کہ دونوں نظام مماثل ہیں یا ایک دوسرے سے ماخوذ ہیں۔ مزید برآں اصل چیز ظاہری خطوط کی مماثلت نہیں ہے بلکہ ان مقاصد کی مماثلت ہے جن کی خاطر کوئی ادارہ تشکیل پاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک ادارہ ظاہری شکل و صورت میں اسی قسم کے دوسرے ادارے سے مشابہ ہو لیکن ان دونوں کے مقاصد مختلف ہوں۔ مقاصد کا اختلاف ادارات کی یکسانیت کی دلیل نہیں بن سکتا۔ بعض ادارات ہر ملک اور ہر زمانے میں نظم و نسق کو قائم رکھنے اور ریاست کی بقا کے لئے بالکل ناگزیر رہے ہیں۔ مثلاً اقتدارِ اعلیٰ، رئیسِ مملکت اور امورِ ریاست کے شعبے ایسے ہیں جنہیں در اصل کسی بھی نظام سیاسی میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ گویا ان کی مثال بالکل تعمیراتی مواد کی ہے۔ تعمیراتی مواد کی یکسانیت کے باوجود معمار کا نقشہ اور تعمیر ایک عمارت کو دوسری عمارت سے مختلف بنا دیتی ہے۔ اسی طرح محض چند ادارات کی مماثلت اہم نہیں۔ اصل چیز یہ ہے کہ ان ادارات کا ایک خاص نظام یا نقشہ میں کیا مقام ہے اور معمار اس کو کس طرح مرتب کرتا ہے۔ علاوہ ازیں معمار کا کام یہ ہے کہ تعمیر کے سلسلے میں زمین کی ساخت و نوعیت، آب و ہوا اور طبعی و جغرافیائی محلِ وقوع کا پورا پورا لحاظ رکھے۔ چونکہ رسول اللہ کے پیشِ نظر بھی ایک ریاست کی تعمیر تھی اس لئے آپ نے بھی ادارات کی تاسیس میں مذکورہ باتوں کا بے حد خیال رکھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک آزاد اور خود مختار ریاست کے سربراہ اور حکمرانِ اعلیٰ تھے۔ آپ نے دنیا کے سامنے جو سیاسی نظام پیش کیا اور پھر ریاست قائم کر کے جن ادارات کا اجرا فرمایا وہ یقینی طور پر تمام نظام ہائے سیاسی سے ممتاز و ممیز ہیں اس کی تفصیل ہم آئندہ صفحات میں پیش کریں گے۔ ابن الطقطقی نے بالکل صحیح کہا ہے، کہ "اسلامی حکومت اپنی غایت، اپنی سادگی اور اپنی عمومیت کے اعتبار سے ایک مستقل اور جداگانہ شے ہے۔ وہ ایک ایسی حکومت ہے جو عام دنیاوی حکومتوں سے بالکل الگ اور پیغمبرانہ اوصاف سے مستفید ہے۔"[1]

(۴) ریاست نبوی کے نظم و نسق کے مآخذ وحیِ الٰہی، رسول اللہ کے احکام و ارشادات، آپ کی تقریر، عمل اور اجتہاد، صحابہ کے آزادانہ مشورے، اور اسلامی معاشرہ کی ضروریات تھیں۔ رسول اللہ ریاست نبوی کے سربراہ تھے اور آپ کی قیادت کو بالآخر پورے عرب نے تسلیم کر لیا تھا۔ نیز اقتدارِ اعلیٰ اور حاکمیت کا منصب اگرچہ اللہ کو حاصل تھا لیکن تمام قانونی، تنفیذی اور انتظامی اختیارات رسول اللہ کی ذات میں مجتمع تھے۔ رسول اللہ کی تمام تر کوشش یہ تھی کہ سیاسی شرعی قوانین کا اظہار انتظامی اداروں سے بھی ہو اور اعمال کا دائرہ شریعت سے متجاوز نہ ہونے پائے۔ آپ کی سیاسی اطاعت اگرچہ تمام باشندگانِ ریاست پر واجب تھی لیکن مسلمانوں پر اطاعت کا وجوب دوہرا تھا۔ یعنی وہ بربنائے حکمران بھی اطاعت کے مکلف تھے اور بربنائے رسول بھی۔ دوسری طرف رسول اللہ کی نافرمانی ان کے حق میں موجب گناہ و معصیت

بھی تھی اور سیاسی جُرم و بغاوت بھی۔

(۵) یہ واضح ہے کہ رسول اللہؐ حاکمیتِ الٰہی کے پابند تھے۔ اور حاکمِ حقیقی کی طرف سے آپ کی ریاست کا مقصد بھی متعین کر دیا گیا تھا اور جسے قرآن نے متعدد مقامات پر بیان کیا ہے۔ مثلاً سورۂ حدید میں ارشاد ہے کہ:

"ہم نے اپنے رسولوں کو واضح ہدایات کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب و میزان کو نازل کیا تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔" (۲)

دُوسری جگہ یہ آتا ہے کہ،

"یہ وُہ لوگ ہیں جن کو اگر ہم زمین پر تمکن و حکومت عطا کریں گے تو یہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم کریں گے اور بدی سے روکیں گے۔" (۳)

ان ارشادات کا مفہوم ایک ایسی ریاست کا تصور پیش کرتا ہے جو بنیادی طور پر ایجابی مقاصد اپنے سامنے رکھتی ہے اور جس کا دائرۂ عمل محدود نہیں ہے بلکہ وُہ ایک مخصوص نقطۂ نظر کے مطابق پوری زندگی کی اصلاح کرنا چاہتی ہے۔ گویا سرحدوں کی حفاظت یا امن و امان کا قیام یا عوام کے معیارِ زندگی کو بلند کرنا ہی اس کا انتہائی اور آخری مقصد نہیں ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جب مقاصدِ ریاست متعین ہیں تو اس ریاست میں قائم ہونے والے تمام ادارات بھی لازماً مقاصد بالا کو ہی پورا کرنے کے لئے قائم کئے گئے۔ رسول اللہؐ کے نزدیک اصل چیز ادارات کی کثرت نہیں تھی بلکہ ان کی بہتر کارکردگی تھی۔ اس لئے اس زمانے میں اگرچہ انتظامی ادارات کی بہتات نہیں ہے اور نہ اعضائے ریاست علیحدہ علیحدہ ہیں۔ لیکن اس کے تمام امورِ ریاست اور مقاصد کی تکمیل پُوری تیزی اور تندہی سے ہُوئی۔ یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ فرائض ریاست کی انجام دہی کے لئے رسول اللہؐ نے علم و تجربہ میں پختہ افراد اور باصلاحیت و باکردار اشخاص کا تقرر کیا اور ہر ذمہ داری کو سونپتے وقت مقام، ماحول اور موزونیت کی بہرحال رعایت رکھی۔

مندرجہ بالا مقدمات کے بعد اب ہم ریاست کے انتظامی اداروں کا جائزہ لیں گے۔ انتظامی ادارے دو قسم کے ہوتے ہیں: ایک مرکزی اور دُوسرے صوبائی۔ اس سلسلے میں ہم سب سے پہلے مرکزی نظم کا مطالعہ کریں گے۔

(۱) مقتدرِ اعلیٰ

ریاست نبوی میں حاکمیت و اقتدارِ اعلیٰ کا منصب اللہ کے لئے خاص ہے اس کی تشریح اور اس کے اطلاقات کا مفصل مطالعہ کرنے سے پہلے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ جس توحید کی تعلیم رسول اللہؐ آغازِ بعثت سے دے رہے تھے اور جس تصورِ حاکمیت کی توضیح آپ اپنی مکی زندگی میں فرماتے رہے اس کی عملی تعبیر اس وقت سامنے آئی جبکہ رسول اللہؐ نے اسی تصورِ حاکمیت کی بنیاد پر مدینہ میں ایک ریاست قائم کی اور تمام امورِ ریاست کو خلیفۃ اللہ کی حیثیت سے انجام دیا۔ حاکمیتِ الٰہی کا یہی وُہ بنیادی اصول ہے جس نے ریاست نبوی کو دنیا کی دوسری ریاستوں میں انفرادیت عطا کی اُد

اس کے نظم و نسق کو ایک خاص نہج پر استوار کیا۔

تاریخ و سیاسیات کا ہر طالب علم اس حقیقت کو محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ حاکمیت و اقتدار اعلیٰ کے اہم مسئلہ کو ریاستِ نبوی میں اللہ کے ساتھ مخصوص کر کے جس آسانی کے ساتھ حل کر دیا گیا وہ انتہائی حیرت انگیز ہے ۔ پھر یہ تحیّر اس وقت اور بڑھ جاتا ہے جبکہ ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کارنامہ اس ماحول اور اس ملک میں انجام دیا گیا جہاں نظم و مرکزیت کا تاریخ کے کسی دَور میں پتا نہیں چلتا۔ اور جہاں کے لوگ ہر چیز کو "پیکرِ محسوس" میں دیکھنے کے عادی ہو چکے تھے اس کے برعکس حاکمیت و اقتدارِ اعلیٰ کا یہی مسئلہ تاریخ عالم خصوصاً تاریخ یورپ میں ہمیشہ ایک عقدہ لاینحل بنا رہا اور اس سوال پر کہ حاکمیت کس کی ہو اور اقتدار اعلیٰ کس کا تسلیم کیا جائے۔ مغرب کے فلاسفۂ سیاسیات و اجتماع کے درمیان کبھی اتفاق رائے نہ ہو سکا۔ ان میں بیحد اختلافات پائے جاتے ہیں بلکہ اب تو بات یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ اگر مغربی فلاسفہ اور مفکرینِ سیاست کا ایک گروہ نظریۂ حاکمیت کا علمبردار ہے اور ریاست کے لئے حاکمیت کو ناگزیر سمجھتا ہے تو دوسری طرف ایک باقاعدہ گروہ ان فلاسفہ کا بھی موجود ہے جو سرے سے کسی حاکمیت کے ہی قائل نہیں ہیں بلکہ انہوں نے حاکمیت کے خلاف علمِ بغاوت بھی بلند کیا۔ چنانچہ اس سلسلے میں علی الترتیب فرانس کے مفکر دیوگی (DUGUIT) اور انگلستان کے پروفیسر لاسکی (LASKI) کو نمائندہ حیثیت سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے نزدیک ان میں سے اول الذکر گروہ کا نظریہ تاریخی حقائق کی روشنی میں درست نظر آتا ہے۔ از منۂ قدیم سے اب تک ہر زمانے میں حاکمیت ریاست کا جزوِ لازم رہی ہے تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ حاکمیت مختلف ادوار میں مختلف ممالک میں، مختلف اجسام میں جلوہ گر ہوتی رہی ۔ اور ایسا بھی ہوا کہ زمامِ حکومت کبھی تو بادشاہت وشہنشاہیت یا استبداد و آمریت کی شکل میں صرف ایک شخص کے ہاتھ میں رہی تو کبھی ایک مذہبی گروہ "پاپائیت" کے روپ میں مسندِ حاکمیت پر فائز ہوا۔ کبھی چند اشراف مقتدرِ اعلیٰ بن گئے اور کبھی جمہور کا اجتماعی وجود مستحقِ حاکمیت سمجھا گیا۔ غرض احوال و ظروف کے اعتبار سے حاکمیت کا نام اور اس کی ہیئت تو بدلتی رہی لیکن اس کا وجود بہرحال تاریخ کے ہر دور میں ثابت ہے۔

ہر نظم سیاسی کے لئے حاکمیت کی اہمیت مسلّم ہے اور فی الواقعہ ریاست کا قیام و بقا اس کے بغیر ناقابلِ تصور ہے البتہ یہ کہنا عین حقیقت ہے کہ ایک "تصورِ سیاسی" کی حیثیت سے حاکمیت کا نظریہ محض دورِ جدید کی پیداوار ہے[۴]۔ حتیٰ کہ یونان و قرونِ وسطیٰ کے مفکرین کے یہاں بھی یہ تصور نہیں پایا جاتا۔ اس کی صاف وجہ یہ ہے کہ "وہ مخصوص حالات جنہوں نے اس قسم کے نظریہ کی ضروریات کا احساس دلایا۔ وہ دورِ جدید کے آغاز میں ہی پیدا ہوئے[۵]۔

لیکن اسلام میں حاکمیت و اقتدارِ اعلیٰ کا تصور اتنا ہی قدیم ہے جتنی پرانی خود اسلام کی تاریخ ہے۔ نیز اسلام میں تصوراتی یا عملی اختلافات بھی نہیں پائے جاتے۔ چنانچہ جیسا کہ کہا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حاکمیتِ الٰہی کا نظریہ پیش بھی کیا اور اسے اپنی ریاست میں بہ تمام و کمال نافذ بھی فرمایا[۶]۔ اور اسلام کے علمائے سیاسیات بھی صدہا سال سے اسی نظریۂ حاکمیت کو پیش کرتے آ رہے ہیں۔ اسلام کے نظریۂ حاکمیت پر مفصل بحث کا یہاں موقع نہیں ہے، علاوہ بریں

مسلمان مفکرین کا اس مسئلہ پر بے انتہا تحریری مواد موجود ہے۔ لہٰذا مختصراً یہ کہنا مناسب ہوگا کہ اگر حاکمیت کے لغوی معنی اور علم سیاسیات کی رُو سے اس کی تعریف اور خصوصیات کا مطالعہ کیا جائے[۷] تو یہ ثابت ہوگا کہ کوئی انسان یا انسانی ادارہ فی الحقیقت صفات حاکمیت سے متصف نہیں ہو سکتا۔ یعنی کوئی انسان یا انسانی ادارہ ایسا نہیں ہو سکتا" جس کا ہر حکم علی الاطلاق قانون کا درجہ رکھتا ہو، اسے افرادِ ریاست پر حکم چلانے کے غیر محدود اختیارات حاصل ہوں اور تمام باشندے اس کی غیر مشروط اطاعت پر مجبور ہوں۔ اس کے اختیاراتِ حکمرانی کو اس کے اپنے ارادے کے سوا کوئی خارجی چیز محدود کرنے والی نہ ہو۔ افراد کو اس کے مقابلہ میں کوئی حق حاصل نہ ہو۔ وُہ اپنی ذات میں قادرِ مطلق ہو جو کچھ کرے وہی چیز صحیح ہو، کوئی تابع اس کو غلط قرار نہ دے سکے اس لیے ناگزیر ہے کہ اسے سبوح و قدوس اور منزہ عن الخطا مانا جائے خواہ وہ ایسا ہو یا نہ ہو۔"[۸]

اس لئے یہی بات زیادہ منطقی اور حقیقت سے قریب ہو سکتی ہے کہ مقتدرِ حقیقی اور حاکم و قانون ساز، انسان کے بجائے اللہ کو تسلیم کیا جائے۔ صفات حاکمیت کا اطلاق و انطباق اسی ذات عالی کے لئے اس لئے بھی سزاوار ہے کہ غیر محدود حاکمیت فی الواقع نہ تو کسی انسانی اقتدار کو حاصل ہو سکتی ہے اور نہ ہی یہ ممکن ہے کہ کسی بادشاہ یا پارلیمنٹ یا قوم یا پارٹی کو ایک محدود دائرہ میں جو حاکمیت حاصل ہو وہ اسے بے عیب اور بے خطا طریقے سے استعمال کر سکے کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ ایسا علم جو تمام متعلقہ حقائق پر حاوی اور زمان و مکان کی حدود سے متجاوز ہو، ایک انسان یا ایک ادارہ کو تو کجا، پوری نوع انسانی کو بھی حاصل نہیں ہے۔"[۹]

مختصر یہ کہ حاکمیتِ الٰہی کا وہ اصول جو ریاستِ نبوی کا سنگِ بنیاد ہے ریاست نبوی کے تمام ادارات کا جامع اور انھیں باہم مربوط کرنے والا ہے۔ درحقیقت اپنی تمام جزئیات و تفصیلات کے ساتھ ایک مکمل اور جامع نظریہ ہے۔ چنانچہ پروفیسر گیٹل کا یہ کہنا درست ہے کہ:

"حاکمیت کے اصول کا براہِ راست نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ حاکمِ اعلیٰ کے جتنے محکوم ہوتے ہیں ان میں بڑائی چھوٹائی نہیں رہتی اس لئے کہ وُہ سب ایک ہی قانون کے پابند ہوتے ہیں۔"[۱۰]

پھر آگے لکھتے ہیں کہ:

"اسلام نے انتہائی مرکزیت کا پرچار کیا اور سب سے بڑا مرکز ایک خدا کو قرار دے کر اسی کو ملک یعنی تمام اقتدار کا سرچشمہ بنایا۔ اسی لئے جتنی مساوات اسلام میں پائی جاتی ہے اس سے زیادہ مساوات مشکل ہی سے کسی دوسرے سلسلے میں نظر آئے گی۔"[۱۱]

ہر نظم کی کیفیت یہ ہے کہ جب تک اس کا ایک مرکز نہ ہو، جب تک کوئی ایسی ذات نہ ہو جس کا حکم ماننا ہر شخص اپنا فرض سمجھے جو اپنے احکام کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سزا دے سکے۔ جس کی اطاعت محض قانونی طور پر ہی نہیں مذہبی تقدس کے ساتھ کی جائے اس وقت تک یہ تنظیم قائم نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حاکمیتِ الٰہی کا نظریہ ان تمام ضرورتوں کو کما حقہ

پورا کرتا ہے کیونکہ اس کے تحت ایک ہی ہستی اعتقاد کا مرکز، اعمال کا محور، ضابطہ و دستور کا سرچشمہ، سیاست و سلطنت کا مبدأ نیز عادلانہ تدبّر اور حکیمانہ انصاف کا مرجعِ اوّل ہے۔ وہ ایک ایسی حقیقی وحدت ہے جس کے نام پر قوموں، اُمتوں، ملتوں، ملکوں اور مملکتی طبقوں اور جماعتوں، مذہبوں اور سیاسی مسلکوں کی تمام تقسیمیں سمٹ کر ایک ہو جاتی ہیں اور عالمگیر وحدت کے رجحان کو پوری طرح ظاہر کرتی ہیں۔ لہٰذا حاکمیتِ الٰہی کے نظریہ پر قائم ہونے والی تنظیم اپنے اندر غایت درجہ کی مرکزیت رکھتی ہے۔

ایک اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ حاکمیتِ الٰہی کے اسلامی اصول میں جو قطعیت پائی جاتی ہے وہ اصولِ حاکمیت کی پوری تاریخ میں بالکل منفرد ہے۔ وقت اور حالات کی تبدیلی، سیاسی و تمدنی ماحول کے فرق اور زمانہ کے تغیرات سے حاکمیتِ الٰہی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس کی یہ خصوصیت اس وقت اور نمایاں ہو جاتی ہے جبکہ ہمارے سامنے یہ رہے کہ یورپ میں افکارِ سیاسی کی تاریخ پیہم انقلابات کا شکار رہی ہے اور اصولِ حاکمیت مسلسل متغیر ہوتا رہا ہے[۱۲]۔ حتیٰ کہ خود حاکمیت کا جسم واحد بھی متعدد قالبوں میں بانٹ دیا گیا مثلاً کائناتی حاکمیت، سیاسی حاکمیت[۱۳]، قانونی حاکمیت[۱۴]، عوامی حاکمیت[۱۵]، حقیقی و غیر حقیقی حاکمیت[۱۶] اور خارجی حاکمیت وغیرہ[۱۷]۔ بدیہی طور پر اصولِ حاکمیت کی تقسیمات اور تغیّرات کا اثر دوسرے سیاسی اصولوں پر بھی پڑا جس کے نتیجہ میں مغرب کے نظریاتی انتشار کا دائرہ عہد بہ عہد وسیع ہوتا رہا۔

اس کے برعکس اسلام کا موقف یہ ہے کہ اللہ کی حاکمیت جس طرح کائناتی ہے اسی طرح سیاسی، قانونی و تشریعی، اخلاقی و اعتقادی اور فطری و حقیقی بھی ہے بلکہ قرآن کی رُو سے اگر کوئی اللہ کی سیاسی و قانونی حاکمیت کو تسلیم نہیں کرتا تو اس کا محض اللہ کی فطری و کائناتی حاکمیت کو مان لینا بے فائدہ ہے[۱۸]۔ اسلام ہر قسم کی حاکمیت کا مبدأ اور مرکز ذاتِ واحد کو قرار دیتا ہے اور کائناتی، سیاسی، قانونی، اخلاقی و اعتقادی اور حقیقی جملہ اقسام کی حاکمیت کا سرچشمہ اللہ کو ٹھہراتا ہے۔ چنانچہ سورۂ زمر میں پیرایۂ بیان یہ اختیار کیا گیا ہے کہ:

ذٰلکم اللّٰہ ربکم لہ الملك لا الٰہ الا ھو فانّٰی تصرفون۔[۱۹]

(یہی اللہ تمہارا رب ہے، بادشاہی اسی کی ہے کوئی الٰہ اس کے سوا نہیں ہے پھر تم کدھر پھرے جا رہے ہو؟)

گویا استدلال یہ قائم کیا گیا کہ جب وہی تمہارا رب ہے اور ساری بادشاہی اسی کی ہے تو پھر لازماً تمہارا معبود بھی وہی ہے۔ کوئی دوسری ذات اس منصب پر کیونکر سرفراز ہو سکتی ہے جبکہ نہ پروردگاری میں اس کا کوئی حصہ ہے نہ بادشاہی میں۔ چنانچہ سورۂ یونس میں دعوتِ فکر دیتے ہوئے کہا گیا کہ:

"اللہ تمہارا رب ہے تم اسی کی عبادت کرو۔"[۲۰]

یعنی جب واقعہ یہ ہے کہ ربوبیت بالکلیہ اللہ کی ہے تو اس کا لازمی تقاضا بھی یہی ہے کہ تم صرف اسی کی عبادت کرو۔ بالفاظِ دیگر عبادت کا استحقاق تو اس کو حاصل ہو سکتا ہے جو اقتدار رکھتا ہے اور اقتدار اسی کو حاصل ہوتا ہے جو عبادت کا

مستحق ہوتا ہے۔ اس منطقی ربط کو مزید واضح کرتے ہوئے کہا گیا کہ:

الا لہ الخلق والامر۔ [۲۱]

اس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ محض خالق ہی نہیں آمر اور حاکم بھی ہے۔ علاوہ ازیں کائنات کو تخلیق کر کے وہ معطل نہیں ہو گیا بلکہ اس پر حکمرانی کر رہا ہے اور اس کا انتظام و انصرام پورے تدبر و حکمت سے کر رہا ہے[۲۲]۔ قرآن صاف صاف کہتا ہے کہ اللہ ہی پوری کائنات کا حاکم حقیقی ہے[۲۳]، حاکمیت اس کے سوا کسی کی نہیں، یعنی اس کی حاکمیت میں کوئی شریک نہیں ہے[۲۴]۔ حلال و حرام کرنے کا کلی اختیار (یعنی قانون سازی کا حق) صرف اسی کے لئے خاص ہے[۲۵]۔ وہ جس طرح رب العالمین[۲۶] اور رب الناس[۲۷] ہے اسی طرح ملک الناس[۲۸] بھی ہے۔ اس کی قوت لامحدود اور اس کی طاقت و وسعت سب پر حاوی ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے[۲۹]۔ ساری طاقتیں اور سارے اختیارات اللہ ہی کے قبضے میں ہیں[۳۰]۔ وہ بالادست ہے[۳۱] کسی کا ماتحت نہیں اور ہر شے پر تصرف کلی اور اپنے بندوں پر کامل اقتدار رکھتا ہے[۳۲]۔ وہ حاکم مطلق ہے اسے پورا اختیار ہے کہ جو چاہے حکم دے[۳۳]۔ اس کی حاکمیت کو محدود کرنے والی بجز اس کے اپنے ارادہ کے کوئی خارجی چیز نہیں ہے[۳۴]۔ یعنی کوئی بالاتر قانون ایسا نہیں ہے جو اس کے اختیارات کو محدود کرتا ہو کیونکہ اپنے قانون کا وہ خود ہی واضع ہے، کوئی دوسری ہستی اس کے حکم یا فیصلے کو نفاذ سے روکنے یا بدلنے یا نظرثانی کرنے والی نہیں ہے[۳۵]۔ وہ خود مختار ہے اور اجرائے حکم کی پوری آزادی کا مالک ہے اور کوئی چیز اسے عاجز کرنے والی نہیں ہے[۳۶]۔ وہ غیر مسئول اور غیر جواب دہ ہے[۳۷]۔ وہ مجرموں اور ظالموں سے پورا انتقام اور بدلہ لینے پر قادر ہے[۳۸]۔ جلالت عامہ اسی کے لئے مخصوص ہے کوئی دوسرا اس کا سزاوار نہیں ہے[۳۹]۔ اللہ کی حکومت و اقتدار محض وقتی اور عارضی نہیں ہے بلکہ ہمیشہ کے لئے ہے کیونکہ وہ خود زندہ و قائم ہے اور ازلی و ابدی حیات اس کے سوا اور کسی کو حاصل نہیں ہے[۴۰]۔ وہ زمین و آسمان اور پوری کائنات میں ہر جگہ، ہر لمحہ، ہر آن حکومت کر رہا ہے[۴۱]۔ یعنی اس کی حاکمیت ہمہ گیر ہے، دین و دنیا پر محیط ہے اور شرکت یا دوئی سے پاک ہے[۴۲]۔ اس کی ذات ہر نقص و عیب یا کمزوری سے پاک اور منزہ عن الخطاء ہے، یعنی وہی سبوح و قدوس ہے[۴۳]۔ اس کا حکم اور فیصلہ اٹل ہے[۴۴] اور صرف اسی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ انسانی اختلافات کا تصفیہ کرے اور حق و باطل کی حقیقت واضح کرے[۴۵]۔ اس کا ہمہ گیر اقتدار ایک بے عیب حکمت اور بے خطا علم کے ساتھ پوری انسانیت پر محیط ہے[۴۶]۔ مختصر یہ کہ جملہ اختیارات، فرمانروائی اور ہر قسم کی حاکمیت اور ہر طرح کی ملکیت و مالکیت کے تمام حقوق صرف اللہ تعالیٰ رب العالمین کو حاصل ہیں[۴۷]۔ پوری کائنات اسی کی ولایت[۴۸] اور اسی کی میراث ہے[۴۹]۔ اس لئے اشیائے کائنات پر مخلوق کا قبضہ و تصرف محض عارضی ہے اور اگر کسی انسان کو کہیں حکمرانی کے اختیارات حاصل ہیں تو وہ بھی اللہ کے دئے ہوئے ہیں[۵۰]۔ لہٰذا دنیا میں کیا جانے والا ہر دعویٰ حاکمیت خواہ وہ کسی بادشاہ یا آمر یا طبقہ یا خاندان یا گروہ وغیرہ کی طرف سے کیا جائے، بہرحال باطل قرار پائے گا کیونکہ حاکمیت اس حکومت کو نہیں کہتے جو کسی کا عطیہ ہو جو کبھی باقی ہو اور کبھی سلب ہو جاتی ہو[۵۱]۔ جسے کسی دوسری طاقت سے خطرہ لاحق ہو سکتا ہو، جس کا قیام و بقاء عارضی ہو اور جس کے دائرۂ اختیار کو بہت سی دوسری متصادم قوتیں محدود کرتی ہوں لہٰذا

فی الواقع اللہ کی حاکمیت اپنے کسی محدود یا مجازی معنی میں نہیں بلکہ اس کے پورے مفہوم کے لحاظ سے حاکمیتِ بادشاہی ہے، بلکہ حاکمیت درحقیقت جس چیز کا نام ہے وُہ اگر نہیں پائی جاتی ہے تو صرف اللہ کے اقتدارِ اعلیٰ ہی میں پائی جاتی ہے۔ وُہ کائنات کے تمام حاکموں کا حاکم اور سب سے بڑا حاکم ہے[۵۲] اس کا نہ کوئی مماثل ہے نہ ہمسر[۵۳] نہ اس کی ذات و صفات، اختیارات اور حقوق میں سے کسی چیز میں بھی کوئی دوسرا حصّہ دار ہے۔

یہی وہ عقیدہ تھا جس نے فراموش کار دنیا کو ایک نئے معاشرہ اور نئے نظریہ ریاست سے آگاہ کیا اور دنیا میں خدائے واحد کو فرمانروائے مطلق ماننے کی طرح ڈالی، یہی وُہ خیال تھا جس نے ایک ایسی خداترس قوم کی تشکیل کی جس کا ہر فرد امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا علمبردار اور ایک کلمہ کی بنا پر آزاد دوسرے کلمہ گو کے برابر اور اس کا بھائی تھا، جس کے تمام کام اور حکومت کی ذمہ داریاں، تدبیر و تنظیم، تعلیم و تبلیغ، تعمیر و اصلاح، صلح و جنگ، معاہدے اور میثاق اللہ ہی کے نام سے شروع ہوتے تھے اور اللہ ہی کی ضمانت پر ختم کئے جاتے تھے۔ اور خدا کے حقیقی تصور اور سچے عرفان نے ان کو یہ یقین دلایا تھا کہ خدا کی حاکمیت کا انکار کر کے دنیا میں کوئی اچھی حکومت قائم نہیں ہو سکتی۔

اُوپر کی تفصیلات سے ایک طرف تو اس تصورِ حاکمیت کی وضاحت ہو جاتی ہے جو اسلام پیش کرتا ہے اور جس کو سلہ ہ میں ایک ریاست قائم فرما کر رسول اللہؐ نے عملاً نافذ فرمایا تھا اور جس کی مزید تاکید و توضیح نیز عملی تعبیر رسول اللہؐ کی مدنی زندگی میں بتدریج ہوتی رہی۔ دوسری طرف مندرجہ بالا جائزہ سے رسول اللہؐ کی اصل حیثیت بھی نکھر کر سامنے آجاتی ہے، یعنی آپ مقتدرِ اعلیٰ نہ تھے بلکہ مقتدرِ اعلیٰ کے نائب و نمائندہ اور اس کے فرستادہ تھے۔ جیسا کہ تفصیلی بیان آگے آرہا ہے۔ یہاں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ تصورِ حاکمیت کے خصائص و تصورات کا یہ مطالعہ بیشتر مکی سورتوں پر ہی مبنی ہے۔ اس میں محض چند تائیدی حوالے مدنی سُورتوں کے بھی ہیں لیکن بنیادی مواد مکی سورتوں سے ہی ماخوذ ہے۔ یہ اس بات کا ایک اور ثبوت ہے کہ اسلام کے نظامِ سیاست میں اصول پہلے دیے جاتے ہیں اور پھر نفاذ و عمل ان کی مطابقت میں انجام پاتا ہے۔

(۲) رئیسِ مملکت

یہ بات طے ہو جانے کے بعد کہ ریاستِ نبویؐ میں اقتدارِ اعلیٰ اور حاکمیت صرف اللہ کو حاصل تھی رسول اللہؐ کی حیثیت حاکمِ حقیقی اور مقتدرِ اعلیٰ کے نائب اور خلیفہ کی قرار پاتی ہے۔ یعنی آپ کی حکومت دنیا میں اللہ کی حکومت بالادست کے ماتحت تھی اور اسے سیاسی تنظیم کے اعتبار سے "خلافت" [۵۴] کہنا چاہئے۔ کیونکہ جو ادارہ سیاسی طاقت سے اللہ کی قانونی حاکمیت کو نافذ کرنے کے لئے قائم ہو اور جس کے اختیارات کو پہلے ہی وحیِ الٰہی کی صورت میں ایک برتر قانون[۵۵] نے محدود اور پابند کر دیا ہو اسے قانون و سیاست کی کسی اصطلاح میں حاکمیت و اقتدارِ اعلیٰ سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔

رسول اللہؐ کے اُسوۂ حسنہ کی شہادت اس بات پر موجود ہے کہ آپ کی زندگی کی تمام جدوجہد کا محور یہ تھا کہ

دنیا میں کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ دوسرے انسان سے اپنا حکم منوائے۔ حکومت کا اصل حق صرف اللہ کو حاصل ہے اس کے سوا کسی کی محکومیت جائز نہیں۔ اسی حقیقتِ کبریٰ کا ابلاغ آپ کی دعوت کا خلاصہ اور آپ سے پہلے آنے والے رسولوں کی تعلیم کا ماحصل تھا[۵۶]۔ نیز آپ کی جملہ انفرادی مساعی اور ریاست کی ساری کوششیں اللہ کے قانون کی برتری کو ہی قائم کرنے کے لئے وقف تھیں اور آپ کا اصل کام احکم الحاکمین کے قانون کا غلبہ و نفاذ تھا[۵۷] اور مختصراً آپ کا مشن حضرت عیسیٰ کے الفاظ میں یہ تھا کہ،

"تیری بادشاہی آئے اور تیری مرضی جیسی آسمان پر پوری ہوتی ہے زمین پر بھی ہو"[۵۸]

قرآن کی تصریحات کے مطابق رسول اللہ انسانیت کے معلم و مربی[۵۹] اور پیشوا اور نمونۂ تقلید[۶۰] ہونے کے علاوہ شارح کتاب اللہ بھی تھے[۶۱]۔ یعنی آپ مقتدرِ اعلیٰ کے قانون کی تشریح و تعبیر کا حق رکھتے تھے نیز آپ کے فرائض رسالت میں یہ بات داخل تھی کہ آپ قانونِ الٰہی کی توضیح فرمائیں اور اس کے مطابق حکم جاری کریں[۶۲]۔ آپ کو یہ بھی حکم ملا تھا کہ الہامی بصیرت کی روشنی میں قوانین کا اطلاق کرنے میں کوئی کوتاہی نہ دکھائیں[۶۳] علاوہ بریں لوگوں کے درمیان اختلافات کی صورت میں فیصلہ کرنے[۶۴] اور ایک محدود دائرہ میں تشریع و قانون سازی کے اختیارات بھی آپ کو مقتدرِ اعلیٰ کی طرف سے دئے گئے تھے[۶۵] لیکن اسی کے ساتھ ساتھ آپ کو یہ اجازت نہ تھی کہ اپنے آپ کو کسی حال میں اس بالاتر قانون سے مستثنیٰ کرلیں جو مقتدرِ اعلیٰ کی طرف سے جاری کیا گیا تھا[۶۶] حتیٰ کہ نجی معاملات میں بھی رسول اللہ کو من مانی کرنے کا اختیار نہ تھا۔ اس کی روشن مثال وہ واقعہ ہے جسے قرآن کی سورۂ تحریم میں بیان کیا گیا ہے[۶۷] اس سے خود بخود یہ مضمون مترشح ہوتا ہے کہ اللہ نے جس کو حلال کیا اسے حرام کرنے کا اختیار کسی کو بھی نہیں اور رسول اللہ نے اس چیز کو شرعاً یا عقیدۃً حرام نہ سمجھا تھا بلکہ صرف اپنی ذات پر اس چیز کے استعمال کو حرام کرلیا تھا جس کی طرف سورہ کی پہلی ہی آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔ چونکہ رسول کی حیثیت سے آپ کا منصب ایک عام آدمی سے مختلف تھا۔ اس لئے آپ کی ذمہ داریاں بھی بہت نازک تھیں۔ آپ کا معمولی سے معمولی فعل بھی خواہ وہ کتنی ہی ذاتی یا نجی نوعیت کا ہو اپنے نتائج و عواقب کے اعتبار سے بہت اہم تھا[۶۸]۔ علاوہ ازیں آپ کے لئے تو ضروری یہ تھا کہ حاکمیتِ الٰہی کو سب سے پہلے تسلیم کریں اور سب سے پہلے عمل پیرا ہوں۔ چنانچہ قرآن میں یہ الفاظ پوری صراحت کے ساتھ موجود ہیں کہ،

انی امرت ان اکون اوّل من اسلم[۶۹]۔

(مجھے یہ حکم ہوا ہے کہ میں سب سے پہلے تابعداری اختیار کروں)

ایک اور جگہ بیان کیا گیا ہے کہ،

انما امرت ان اعبد رب ھذہ البلدۃ الذی حرمھا ولہ کل شئ وامرت ان اکون من المسلمین وان اتلوا القرآن[۷۰]۔

(کہہ دو کہ مجھے یہی حکم ملا ہے کہ اس شہر مکّہ کے مالک کی عبادت کروں جس نے اس کو محترم بنایا ہے اور سب چیز

اسی کی ہے اور مجھے یہی حکم ملا ہے کہ اس کا حکم بردار رہوں اور یہ بھی کہ قرآن پڑھوں)
اور قرآن میں ایک جگہ اللہ کے اتارے ہوئے قانون کے مطابق فیصلہ نہ کرنے کو ظلم فسق اور کفر سے تعبیر کیا گیا ہے[۱]
ان ہدایات کے پیش نظر رسول اللہ نے انسان کی سیاسی تاریخ میں یہ کارنامہ انجام دیا کہ مہبطِ وحی اور شارح کتاب ہونے کے باوجود قانونِ الٰہی کے نفاذ و عمل سے اپنے آپ کو بھی مستثنیٰ قرار نہ دیا بلکہ سب سے پہلے ان احکام کا اطلاق اپنی ذات پر کیا[۲]
خود اپنے ہی خلاف متعدد بار لوگوں سے یہ کہہ کر گویا مقدمہ کی دعوت دی کہ اگر ان کی طرف سے کوئی زیادتی ہوئی ہو تو اس کا بدلہ لے لیا جائے[۳] حضرت عمرؓ بھی شہادت دیتے ہیں کہ:

رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقص من نفسہ۔[۴]

(میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے کہ آپ اپنی ذات سے بھی قصاص لیتے تھے)

یہ کسی معمولی کردار کا مظاہرہ نہیں تھا۔ آپ نے اس کے ذریعہ اگر ایک طرف بادشاہوں اور حکمرانوں کے خدائی حقوق کی جڑ کاٹ دی تو دوسری طرف ریاست میں قانونِ الٰہی کی بالادستی و حکمرانی کو پوری قوت کے ساتھ نافذ فرما دیا۔

یہاں یہ کہنا ضروری ہے کہ اگرچہ رسول اللہ بجائے خود قاضی و حکم تھے اور اُمت کے لئے بہترین نمونۂ عمل ہونے کی بنا پر اپنے وقت میں آپ جن مذہبی اور سیاسی و اجتماعی احکام پر عمل پیرا ہوئے وہ سب کے سب آنے والے زمانوں کے لئے نظیر بن گئے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ریاست کی تاسیس عمل میں آجانے کے بعد معاشرہ کی اصلاح کے لئے آپ کو مقننِ اعلیٰ کی طرف سے وسیع اختیارات عطا کر دیئے گئے تھے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود آپ قانون ساز حقیقی کے مقرر کئے ہوئے حدود سے سرِ مو تجاوز نہ کر سکتے تھے اور اگر بالفرضِ محال کوئی ایسا حکم جاری بھی فرما دیتے تو لوگوں پر اس کی اطاعت کا وجود قائم نہ ہو سکتا تھا کیونکہ قرآن کی رُو سے آپ کی اطاعت پر بھی اطاعت فی المعروف کی قید ہے۔[۵] گویا دنیا میں کسی مخلوق کی اطاعت قانونِ الٰہی کی حدود سے باہر نہیں کی جا سکتی۔ پھر جب اللہ کے رسولؐ کی اطاعت بھی معروف کی شرط سے مشروط ہے تو ظاہر ہے کہ دوسرے صاحبانِ امر کے لئے غیر مشروط اطاعت کا حق کسی طرح قائم نہیں ہو سکتا۔ اور ان کے کسی ایسے حکم یا قانون کی پیروی نہیں کی جا سکتی جو قانونِ الٰہی کے خلاف ہو۔ اس اصول کی وضاحت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے متعدد ارشادات میں فرمائی ہے، مثلاً:

لا طاعة فی معصیة اللہ، انما الطاعة فی المعروف۔[۶]

(اطاعت اللہ کی نافرمانی میں نہیں ہے اطاعت صرف معروف میں ہے)

ایک حدیث میں یہ تفصیل ہے کہ:

السمع والطاعة علی المرء المسلم فی ما احب وکرہ ما لم یومر بمعصیة فاذا امر بمعصیة فلا سمع ولا طاعة۔[۷]

(مسلمان کو لازم ہے کہ اپنے اولی الامر کی بات سُنے اور مانے خواہ اسے پسند ہو یا ناپسند،

"تاوقتیکہ اسے معصیت کا حکم نہ دیا جائے اور جب اسے معصیت کا حکم دیا جائے تو پھر اسے نہ سننا لازم ہے نہ ماننا)

تفصیلاتِ بالا سے رسولؐ اللہ کا سیاسی و قانونی مقام متعین ہو جاتا ہے۔ ریاست میں آپ کی حیثیت ایک خود مختار اور مطلق العنان حکمران کی نہ تھی بلکہ آپ اللہ کی حاکمیت کے تابع اور اس کے حکم کے پیرو تھے اور جیسا کہ ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں کہ رسولؐ اللہ کو بلا شبہ ایک خاص دائرہ کے اندر تصرف کا حق حاصل تھا مگر یہ اختیار بھی آپ کا ذاتی نہیں بلکہ اللہ کا تفویض کردہ تھا اور یہ بالعموم آپ اس وقت استعمال فرماتے تھے جبکہ قرآن خاموش ہو"[۷۸] ایسی صورت میں آپ اجتہاد فرما کر پیش آمدہ مسئلہ حل فرما دیتے تھے۔ اجتہادِ نبوی اگرچہ قرآن سے موخر اور اس کے تابع ہے لیکن بعد میں آنے والوں کے لئے پابندی یہ ہے کہ وہ قانونِ سنّت سے بھی انحراف نہیں کر سکتے۔ کیونکہ رسولؐ کی اطاعت اللہ کی اطاعت کے ہم معنی ہے[۷۹] قرآن میں جگہ جگہ اللہ کے ساتھ ساتھ رسولؐ کی اطاعت و اتباع کا حکم اور ان کی معصیت و نافرمانی سے مجتنب رہنے کا حکم دیا گیا ہے"[۸۰] قرآن کی رُو سے پُوری اُمتِ مُسلمہ کے لئے اطاعتِ رسول واجب ہے اور اس کے لئے یہ اصول متعین کر دیا گیا ہے کہ اوّل الذکر کی اطاعت مشروط بہ اطاعتِ الٰہی ہوگی اور اولی الامر سے اختلاف کی صورت میں ہمیشہ اللہ اور اس کے رسول سے ہی فیصلہ طلب کیا جائے گا"[۸۱] نیز آپ کے اوامر و نواہی کی پوری پوری پیروی کی جائے گی۔[۸۲]

اب جہاں تک سربراہِ حکومت کی حیثیت سے رسول اللہ کی عملی و انتظامی ذمہ داریوں کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں مختصراً ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ آپ ریاست کی سب سے زیادہ ذمہ دار شخصیت، اس کے قائد و منتظم اور حکمران اعلیٰ تھے۔ تمام داخلی و خارجی معاملات کے نگران اور دینی و مذہبی پیشوا ہونے کے ساتھ ساتھ دنیوی امور کے بھی سربراہ تھے۔ شارح قانون اور شارع، سپہ سالار افواج اور قاضی القضاۃ وغیرہ سبھی کچھ تھے اور اس طرح آں حضرت بیک وقت انتظامیہ مقننہ اور عدلیہ تمام شعبوں کے صدر نشین تھے۔ عہدِ رسالت میں ان اعضائے ریاست میں اس قسم کی تحدید و تخصیص نہ تھی جو بعد کو حضرت عمرؓ کے زمانہ میں پیدا ہوئی اور انہوں نے انتظامیہ مقننہ اور عدلیہ کو الگ الگ کر دیا۔ ریاستِ نبوی میں یہ تمام ذمہ داریاں ذاتِ رسالت میں مجتمع تھیں۔ ایک تو اس وقت ریاست کا آغاز تھا اور دوسرے اس زمانہ میں سیاسی ضرورتوں کا تقاضا بھی اتنا ہی تھا۔ بعد میں جب اسلامی ریاست میں پھیلاؤ واقع ہوا اور ریاست کی ضرورتیں بھی بہت زیادہ بڑھ گئیں تو مذکورہ شعبوں کو الگ الگ کر دیا گیا۔ تمام اعضائے ریاست یا مذکورہ شعبوں کے ایک ہی شخصیت میں مجتمع ہونے کا سب سے بڑا نقصان وہ پہلو یہ ہوتا ہے کہ ایک شعبہ دُوسرے شعبہ کے زیرِ اثر آ جاتا ہے اور آزادانہ عمل کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں جبکہ عہدِ نبوی میں تمام ذمہ داریاں ذاتِ واحد میں مجتمع ہو جانے سے یہ خطرہ پیدا نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ ایک طرف تو آپ براہِ راست اللہ کی نگرانی میں تھے اور وہاں کوئی فروگزاشت نظر انداز نہ کی جاتی تھی"[۸۳] علاوہ بریں رسولؐ اللہ طبعاً ایسے نہ تھے کہ کسی کی مجبوری سے فائدہ اٹھائیں یا اپنے مقصد کا بے جا استعمال کریں۔ چنانچہ آپ کے اُسوہ حسنہ میں کوئی ایک مثال بھی خلافِ عدل نہیں مل سکتی۔ آپ کو تو ہر حال میں عدل برتنے کا الہامی حکم ملا تھا۔[۸۴]

اس لئے آپ اس سے پہلوتہی نہیں کر سکتے تھے بلکہ تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ آپ نے کبھی اپنے خلاف کسی تنقید کی حوصلہ شکنی نہیں کی۔ بحیثیت رسول آپؐ کو چند مراعات ضرور حاصل تھیں (مثلاً یہ کہ چار سے زیادہ نکاح کی ...یت، حضور کے بعد ازواجِ مطہرات سے کسی اور کے نکاح کی ممانعت اور میراث کے متعلق کہ آپ کی میراث تقسیم نہ ہو سکتی تھی وغیرہ وغیرہ) لیکن دُوسرے تمام معاملات میں عام مسلمانوں سے زیادہ ادنیٰ استحقاق بھی آپ کو حاصل نہ تھا۔

درحقیقت کسی جمہوری نظامِ حکومت کی معراج یہ ہے کہ حکمران اپنے ذاتی حقوق و معاملات میں عوام کے مساوی ہو اور کسی قسم کا امتیاز یا استثناء اسے حاصل نہ ہو اور عام شہری زندگی میں بھی کوئی امتیاز اس وجہ سے نہ رکھتا ہو کہ وہ حکمران ہے۔ اس کے اختیارات محدود ہوں اور ریاست کے باشندے اس پر تنقید و احتساب کے لئے آزاد ہوں۔ یہ تمام اصول فی الحقیقت ایک صحت مند سیاسی نظام میں نمونہ کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن انہیں پوری رُوح اور فعالیت کے ساتھ عہدِ رسالت میں ہی اپنایا گیا بلکہ معراجِ کمال تک پہنچایا گیا۔

یہاں یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ چونکہ ریاست نبوی کی تاسیس ایک معاہدہ عمرانی پر ہوئی تھی جس کی رُو سے راعی اور رعایا کے تعلقات کی نوعیت جبر و استبداد یا آمریت کے نظام سے مختلف تھی۔ نیز معروف کے مطابق جس طرح باشندوں پر رسولؐ اللہ کی اطاعت و خیر خواہی اور تعاون لازمی تھا اسی طرح رسولؐ اللہ کے لئے بھی ضروری تھا کہ ان کی فلاح و بہبود میں سرگرم عمل رہیں اور اگر ان کو شکایات پیدا ہوں یا آپ پر کوئی اعتراض کریں تو اس صورت میں آپ انہیں مطمئن کریں۔ واقعاتِ سیرت میں اس کی متعدد مثالیں پائی جاتی ہیں مثلاً صلح حدیبیہ کے موقع پر صحابہ کی بے چینی خصوصاً حضرت عمرؓ کا رسولؐ اللہ سے بڑے تلخ لہجے میں سوال اور رسولؐ اللہ کا جواب دے کر انہیں مطمئن کرنا[۸۵] یا مثلاً جب حنین کی تقسیم کے سلسلے میں انصار کو کچھ شکایات پیدا ہوئیں تو رسولؐ اللہ نے اس مسئلہ کو پوری سنجیدگی کے ساتھ حل کیا اور ایک خطبہ میں وضاحتیں فرما کر انصار کو مطمئن کر دیا[۸۶] مختصر یہ کہ عہدِ نبوی میں لوگوں کو اظہارِ رائے اور اختلاف رائے کی آزادی حاصل تھی البتہ وہ اعتراض و تنقید کرنے میں بے لگام نہ تھے۔ نیز رسولؐ اللہ سے یہ بات پہلے دریافت فرما لیا کرتے تھے کہ:

"یا رسولؐ اللہ! آپ نے جو فیصلہ کیا ہے وہ کس حیثیت سے کیا ہے؟ اور اس کی نوعیت کیا ہے؟"

مثلاً جنگِ بدر کے موقع پر پڑاؤ کے لئے جگہ کا انتخاب رسولؐ اللہ نے از خود کیا تھا لیکن بعد میں حباب بن منذر کے استفسار و مشورہ پر دوسری جگہ کو منتخب فرمایا۔[۸۷]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سربراہِ ریاست کی حیثیت سے اپنے فیصلے کبھی آمرانہ انداز سے مسلط نہیں کئے بلکہ امورِ ریاست کی انجام دہی میں ہمیشہ مشاورت کے بعد اقدام فرمایا۔

وشاورھم فی الامر۔[۸۸]

(معاملات میں ان سے مشورہ کیجئے)

اور وامرھم شوریٰ بینھم (۸۹)

(اور ان کے معاملات باہم مشورہ سے طے پاتے ہیں)

کے قرآنی ارشادات کے بموجب تمام معاملات میں مشورہ عہد نبوی کا طرۂ امتیاز تھا۔ تاریخی اعتبار سے مشورہ اور ندوہ کے ادارے عہدِ جاہلیت میں بھی پائے جاتے تھے اور اسلام نے بھی ان اداروں یعنی مشورت و مشاورت کو جاری رکھا۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اجتماعی معاملات میں انسانوں کا ذہنی میلان ہمیشہ سے مشورہ کی جانب رہا ہے اور شاید اسی لئے امورِ ریاست میں مشاورت کی مثالیں (خواہ مشورہ کی نوعیت کچھ ہو، مشاورت کا دائرہ کتنا ہی تنگ ہو اور اصحاب کی تعداد کچھ ہی رہی ہو) ہم کو قدیم ترین شہنشاہیت، مطلق العنانیت اور دُوسرے نظام ہائے استبداد میں بھی ملتی ہیں۔ قرآن کے بیان کے مطابق (یمن کی) ملکۂ سبا نے حضرت سلیمان (حکومت ۹۵۹ تا ۹۲۹ ق م) کا خط موصول ہوتے ہی اپنے درباریوں سے مشورہ کیا تھا(۹۰) یا مثلاً روم و ایران میں شاہی کونسلیں موجود تھیں جو بادشاہ کو حسب خاطر مشورہ دیتی تھیں البتہ مذکورہ مجلسوں کی کارکردگی کو دیکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ مجالس اپنی حقیقت اور روح کے اعتبار سے محض رسمی تھیں اور اقتدار شاہی کے دائرہ میں ان کا رسوخ نہ ہونے کے برابر تھا۔ عرب جاہلیت میں البتہ مشورہ اور ندوہ کے کئی ادارات زیادہ عملی حیثیت رکھتے تھے اور اجتماعی ضرورت کے وقت ان سے کام لیا جاتا تھا۔

اسلام میں مشاورت نہ تو رسمی حیثیت رکھتی ہے اور نہ محض وقتی و اجتماعی ضروریات کی تکمیل اس کا منشا ہے بلکہ اس سے بہت آگے بڑھ کر اسلام میں مشاورت ایک لازمۂ ایمان ہے، ایک طرزِ زندگی ہے، ایک مستقل روایت ہے۔ اللہ کا مقرر کیا ہُوا ایک ضابطہ ہے اور حکومت و خلافت کا ایک اہم اصول ہے۔

یہاں یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ شوریٰ سے متعدد سیاسی فوائد حاصل ہوتے ہیں مثلاً یہ کہ سربراہِ حکومت کو اپنی من مانی کارروائی کرنے کے مواقع نہیں ملتے۔ مشورہ ذاتی اغراض کے لئے دوسروں کا حق مارنے کی کوششوں کو بھی ناکام بناتا ہے اور اس جذبہ کی بھی بیخ کنی کر دیتا ہے کہ اربابِ حل وعقد اپنے آپ کو اعلیٰ اور دوسروں کو حقیر سمجھیں۔ مشورہ کے بعد اقدام کی صورت میں ذمہ داری ایک فرد کی بجائے تمام شرکاءِ مشورہ کی ہو جاتی ہے اور اس میں ان لوگوں کی رائے بھی شامل ہو جاتی ہے جن کا مفاد زیرِ غور معاملات سے وابستہ ہوتا ہے۔ مگر ان تمام باتوں سے زیادہ اہم نکتہ یہ ہے کہ شوریٰ کی کارکردگی صرف اسی صورت میں بہتر ہو سکتی ہے جبکہ شرکاء کو اظہارِ رائے کی پُوری آزادی حاصل ہو اور وہ یہ بھی حق رکھتے ہوں کہ معاملات کی سربراہی میں خامی یا کوتاہی پر ٹوک سکیں۔ نیز یہ کہ اصحابِ شوریٰ اپنے علم، ایمان اور ضمیر کے مطابق رائے پیش کریں۔

جہاں تک رسولؐ اللہ کا تعلق ہے آپ نے ایک مثالی شوریٰ کے تمام تقاضوں کو پُورا فرمایا۔ آپ مشورہ کرتے وقت شرکاء کو اظہارِ رائے کی پُوری آزادی دیتے اور تنقید و تبصرہ کی بھی اجازت عطا فرماتے تھے۔ رسولؐ اللہ شوریٰ کو اس حد تک اہمیت دیتے تھے کہ اس کے فیصلے کے نفاذ میں اپنی ذاتی خواہش تک کو نظر انداز فرما دیتے تھے اور ہر اہم معاملہ میں صحابہ سے مشورہ کرنے میں اتنے مستعد تھے کہ حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ میں نے رسولؐ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

سے زیادہ رائے اور مشورہ کرنے والا انسان نہیں دیکھا۔[۹۱] حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں کہ:

ما رأيت احدا اکثر مشورة لاصحابه من النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔[۹۲]

(میں نے کسی ایسے شخص کو نہیں دیکھا جو اپنے رفقائے سے مشورہ کرنے میں اتنا زیادہ سرگرم ہو جس قدر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے)

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ کی مدنی زندگی میں شوریٰ کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں اور عہدِ نبوی میں اکثر معاملات کو شوریٰ کے ذریعہ طے کرنے کی روایات تاریخ کے صفحات میں جا بجا محفوظ ہیں۔ مثلاً:

(۱) اذان کے سلسلے میں شوریٰ کا اجتماع (سنہ ۱ھ میں) ہوا۔[۹۳]

(۲) غزوۂ بدر کے موقع پر (سنہ ۲ھ میں) معرکۂ بدر سے متعلق شوریٰ کا انعقاد۔[۹۴]

(۳) شوریٰ برائے اسیرانِ بدر (سنہ ۲ھ)۔[۹۵]

(۴) غزوۂ اُحد سے پہلے (سنہ ۳ھ) محاذِ جنگ کے تعین کے لئے اجتماعِ شوریٰ۔[۹۶]

(۵) غزوۂ خندق پر (سنہ ۵ھ) جنگ کی تیاریوں کے سلسلے میں مشورہ۔[۹۷]

(۶) واقعۂ افک کے سلسلے (سنہ ۶ھ) میں حضرت عائشہ پر تہمت والزام کے بعد شوریٰ۔[۹۸]

(۷) صلح حدیبیہ سے پہلے دورانِ سفر مشاورت (سنہ ۶ھ)۔[۹۹]

(۸) شوریٰ برائے اسیرانِ ہوازن (سنہ ۸ھ)۔[۱۰۰]

(۹) رسول اللہ نے (سنہ ۱۰ھ میں) حضرت معاذ بن جبل کو والیِ یمن مقرر کرنے کے لئے شوریٰ طلب فرمایا۔[۱۰۱]

شوریٰ کے سلسلے میں رسول اللہ کا تعامل یہ تھا کہ جب ایک مرتبہ مشاورت کے نتیجہ میں کوئی فیصلہ ہو جاتا تھا تو پھر آپ اس کی پابندی کرتے تھے۔ چنانچہ محاذِ اُحد کے سلسلہ میں جب شہر سے باہر لڑنے کا فیصلہ ہو گیا تو اپنی ذاتی رائے کے برخلاف تیار ہو گئے۔ رسول اللہ کا یہ طرزِ عمل حاکمِ حقیقی کے اس ارشاد کے مطابق تھا کہ:

وشاورهم فی الامر فاذا عزمت فتوکل علی اللہ۔[۱۰۲]

(معاملات میں اپنے اصحاب سے مشورہ کیجئے اور جب آپ مسئلہ متعلقہ میں عزم کر لیں تو پھر اعتماد اللہ پر ہی رکھئے)

اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح مشورہ ضروری ہے اسی طرح اس کے فیصلہ کی پابندی بھی۔ مندرجہ بالا آیت میں عزم سے پہلے شوریٰ کے حکم کا آنا واضح کرتا ہے کہ شوریٰ کے نتیجہ میں فیصلہ عزم کی بنیاد قرار پائے گا۔ ابن کثیر کی بیان کردہ روایت کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دریافت کیا گیا کہ عزم سے کیا مراد ہے؟ تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ:

مشاورة اهل الرای ثم اتباعهم۔[۱۰۳]

(پہلے اہلِ رائے کا باہمی مشورہ اور اس کے بعد شوریٰ کے فیصلے کی پیروی)

اور امام ابوبکر الجصاص آیت مذکورہ کی تفسیر کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ :

وفی ذکر العزیمة عقیب المشاورة دلالة علی انھا صدرت عن المشورة[۱۰۴]

(عزم کو شوریٰ کے بعد ذکر کیا گیا ہے یہ اس امر کی دلیل ہے کہ فیصلہ اور عزم وہی معتبر ہو سکتا ہے جو شوریٰ کا نتیجہ ہو اور شوریٰ سے صادر ہوا ہو)

آخر میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ شوریٰ بہر حال ان حدود کے اندر ہی ہو گا جن کا تعین شریعت نے پہلے سے کر دیا ہے۔ نیز شوریٰ کے اجلاس کے لئے اگرچہ جگہ کی کوئی قید نہ تھی تاہم مدینہ میں مسجد نبوی ہی دراصل دار الشوریٰ کی حیثیت رکھتی تھی۔

یہ بات عین حقیقت ہے کہ تنہا حکمران، ریاست کے تمام کام انجام نہیں دے سکتا لہٰذا مختلف امور کی انجام دہی میں لوگوں کی مدد و اعانت کا محتاج ہوتا ہے اور پھر ریاست کی کارکردگی اس کی نشوونما اور فلاح وخسران کا مدار ان ہی کارکنانِ ریاست پر ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک سربراہِ ریاست کی انتہائی اہم ذمہ داری یہ ہے کہ وہ ریاست کے انتظامی مناصب پر ایسے لوگوں کا انتخاب کرے جو ریاست کے مقصد وجود کو سمجھتے ہوں اور اپنی صلاحیتوں کو ٹھیک ٹھیک استعمال کر کے اپنے عہدوں سے انصاف کر سکتے ہوں۔

رسول اللہؐ نے بحیثیت حکمران اس مسئلہ پر اپنی پوری توجہ صرف کی اور حکومت کے عہدوں اور مناصب پر ایسے خدا ترس، باصلاحیت، بے لوث، پاکیزہ کردار اور مخلص افراد کا تقرر کیا جو اسلام کی رُوح سے واقف، دین کے مزاج شناس، راہِ حق میں شدائد برداشت کرنے والے، تجربہ کار اور پختہ طور پر تربیت یافتہ تھے۔ ان کارکنانِ ریاست کو آپ نے یہ بات ذہن نشین کرادی کہ حکومت کے عُہدے اور مناصب حصولِ عزت وجاہ اور کسبِ دنیا کے ذرائع نہیں ہیں۔ اس لئے ان کے حصول کی جدوجہد ہی غیر مستحسن ہے۔ یہی نہیں اس سے آگے بڑھ کر رسول اللہؐ نے ان مناصب کا رشتہ اخلاق سے جوڑا اور یہ فرمایا کہ :

انا واللہ لا نولی علی عملنا ھذا احداً سأله اوحرص علیه[۱۰۵]

(خدا کی قسم ہم کسی ایسے شخص کو اپنی حکومت کے کسی منصب پر مقرر نہیں کرتے جس نے اس کی درخواست کی ہو یا جو اس کا حریص ہو)

اور آپ کا ارشاد یہ بھی ہے کہ :

ان اخونکم عندنا من طلبه[۱۰۶]

(ہمارے نزدیک سب سے بڑا خائن وہ شخص ہے جو اس کا خود طالب ہو)

ایک صحابی حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ کو رسول اللہؐ نے ہدایت فرماتے ہوئے کہا :

"اے عبدالرحمٰن! امارت کے طالب نہ بنو، اگر یہ بن مانگے تمہیں ملی تو اس کام میں اللہ کی طرف سے تمہاری مدد کی جائے گی، اور اگر اس کو خود مانگ کر حاصل کرو گے تو تمہیں تمہارے حال پر چھوڑ دیا جائے گا۔"[۱۰۷]

ایک مرتبہ حضرت ابوذر نے آنحضرتؐ سے حکومت کے کسی عُہدے پر مقرر کرنے کی درخواست کی تو اس کے جواب میں

فرمانِ نبوی یہ تھا کہ :

" ابوذر ! یہ ایک بھاری امانت ہے اور تم ایک کمزور آدمی ہو۔ قیامت کے دن یہ امانت ندامت اور رسوائی کا سبب ہوگی مگر اس شخص کے لئے نہیں جو اس کے حق کے ساتھ اس کو اٹھائے اور اس سلسلے میں اس پر جو ذمہ داریاں عائد ہوں ان کو ادا کرے " (۱۰۸)

ان ہدایات کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ رسول اللہ نے ایک طرف تو عہدوں کے لالچ اور حرص و طمع کی تحریک کا خاتمہ کیا اور دوسری طرف لوگوں کی نفسیاتی اصلاح کر کے ان کے نفوس کا تزکیہ کیا۔ کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ مناصب کی آزمائشوں میں پڑنے کے لئے از خود پیش ہونے والا یا تو ان مناصب کے تقاضوں سے ناواقف ہے اور یا ان سے غیر معمولی منفعت کا حصول اس کے پیش نظر ہے علاوہ ازیں حکومت کے عہدوں اور مناصب کو رسول اللہ نے آدمی کے حقوق کی فہرست میں شمار کرنے کے بجائے امانت کی حیثیت دی اور اپنے دور میں صرف ان ہی لوگوں کا تقرر فرمایا جو اس بارِ امانت کو اٹھا سکتے تھے۔ قرآن سے اس کی تائید اللہ کے اس حکم میں ملتی ہے کہ :

ان اللہ یامرکم ان تؤدوا الامانات الی اھلھا۔ (۱۰۹)

(اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہلِ امانت کے سپرد کر دو)

امام ابن تیمیہ نے اس آیت کو نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :

" ادائے امانات کی دو قسمیں ہیں : امانت فی الاموال۔ آیت بالا امانت فی الولایات سے متعلق ہے اور یہی اس کی شانِ نزول ہے " (۱۱۰)

پھر آگے لکھتے ہیں کہ :

چنانچہ رسول اللہ نے فرمایا کہ جو شخص مسلمانوں کے کسی کام کا والی ہو اور اس نے یہ جانتے ہوئے کہ ایسا شخص بھی میسر آسکتا ہے جو مسلمانوں کے حق میں اس سے بہتر ہو سکے گا کسی دوسرے شخص کو حکومت دے دی تو اس نے اللہ سے اور اس کے رسول سے اور مومنوں سے خیانت کی " (۱۱۱)

اور اسی مفہوم کی ادائیگی اس آیت سے بھی ہوتی ہے کہ :

یٰایھا الذین اٰمنوا لاتخونوا اللہ والرسول وتخونوا امانتکم وانتم تعلمون۔ (۱۱۲)

(اے اہلِ ایمان ! نہ تو اللہ اور رسول کی امانت میں خیانت کرو اور نہ اپنی امانتوں میں خیانت کرو اور تم ان باتوں کو جانتے ہو)

بہر حال کارکنانِ ریاست کے انتخاب، اربابِ حل و عقد کے تقرر اور اولی الامر کے تعین میں رسول اللہ کا معمول یہ تھا کہ آپ ان کلیدی مناصب پر صرف اس شخص کو مقرر فرماتے تھے جو واقعی اس کا مستحق ہو۔ صاحبِ ایمان ہو اور ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم (۱۱۳) (اللہ کے نزدیک تم میں معزز وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے) کی روشنی میں تقویٰ کا

حامل ہو، دین و شریعت کا عالم، صاحب بصیرت، بے نفس و بے غرض، امر بالمعروف و نہی عن المنکر پر عامل، ریاست اور عوام دونوں کا خیر خواہ ہو[۱۱۴] اور معاملات کو عدل و انصاف سے انجام دینے کا اہل ہو۔ مختصر یہ کہ حکومت و سیاست کے خالص مادی و دنیوی مناصب پر انتخاب کے یہ اصول جہاں رسول اللہ کی سیاسی بصیرت، نکتہ رسی، معاملہ فہمی اور افراد کے ذہنی و نفسیاتی مطالعہ پر دلالت کرتے ہیں اس کے ساتھ ساتھ یہ اعلان بھی کرتے ہیں کہ دین و سیاست میں باہم کوئی تناقض نہیں ہے بلکہ ان کا امتزاج اچھے سیاستدان اور اچھے منتظم پیدا کر سکتا ہے۔

یہاں یہ وضاحت کر دینا مناسب ہے کہ نظم و نسق ریاست کے سلسلے میں مختلف انتظامی مناصب پر محتاط افراد کے تقرر اور امور ریاست کی احساس ذمہ داری کے ساتھ کڑی نگرانی کا نتیجہ یہ تھا کہ ریاست نبوی کو ایک مضبوط انتظامی ڈھانچہ مل گیا اور پھر اس کا مزید خوشگوار نتیجہ یہ تھا کہ معاملاتِ ریاست جس طرح رسول اللہ کی دار الحکومت میں موجودگی میں چلتے تھے اسی طرح آپ کی مدینہ سے غیر حاضری کی صورت میں بھی معمولاً جاری رہتے تھے۔ رسول اللہ کا طریقہ یہ تھا کہ جب آپ مدینہ سے باہر تشریف لے جاتے تو اپنا ایک نائب اور قائم مقام بھی متعین فرما دیتے تھے تاکہ نظم و نسق کے امور میں کسی قسم کی بدنظمی، خلل یا تاخیر پیدا نہ ہو اور آپ کی عدم موجودگی میں معاملاتِ ریاست جاری و ساری رہیں۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ رسول اللہ کی نیابت اور قائم مقامی کا شرف مختلف اوقات میں مختلف حضرات کو ملتا رہا۔[۱۱۵] رسول اللہ کے ان نائبین کی فہرست پر ایک نظر ڈالنے سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ان میں سے بیشتر حضرات معمر، تجربہ کار، تربیت یافتہ اور مہاجرین میں سے تھے نیز یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ مدینہ سے باہر تشریف لے جانے کی صورت میں کسی نائب یا قائم مقام کا تقرر رسول اللہ کا مستقل انتظام تھا خواہ وہ موقع جنگ کا ہو یا صلح کا، حج کا ہو یا عمرہ کا۔[۱۱۶]

کسی بھی ریاست کا نظم و نسق چلانے کے لئے افراد کار کے علاوہ اس کے سیکرٹریٹ یا ایک مرکزی دفتری نظام کی ضرورت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا خواہ اس کی ہیئت اور شکل کچھ ہی ہو لیکن یہ بات طے ہے کہ سیکرٹریٹ ریاست کا مرکز ثقل اور اس کے سربراہ کا حافظہ ہے اور جس طرح حافظہ کے بغیر انسانی زندگی منضبط نہیں رہ سکتی اسی طرح نظام دفاتر کے بغیر ریاستی زندگی کا انضباط بھی ممکن نہیں ہے۔ رسول اللہ نے شاید اس کا اندازہ عہد رسالت کے آغاز پر ہی کر لیا تھا لہٰذا ایک طرف وحی کا نزول ہوا تو دوسری طرف آپ نے اس کی املا و کتابت کا آغاز بھی کر دیا اور ایسے معتمد علیہ امانت دار اور ہنرمند افراد کو اس پر مامور کیا جنہوں نے اس فریضہ کو بحسن و خوبی انجام دیا۔ اصطلاحی طور پر ایسے افراد کو کاتبانِ وحی کہا جاتا ہے۔ کتابتِ وحی پر جن لوگوں کو مامور کیا گیا ان کی تعداد مختلف اوقات میں کم و بیش ہوتی رہی لیکن مجموعی طور پر ان کی تعداد تقریباً چالیس ہے۔[۱۱۷] کتابتِ وحی کے نتیجہ میں قرآن کی حفاظت و تدوین عمل میں آتی چلی گئی اور وہ قانون بھی محفوظ ہوتا چلا گیا جو سیاستِ دین و دنیا کا اولین ماخذ ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں سیکرٹریٹ کی وہ شکل تو نہیں تھی جو بعد کے ادوار میں متشکل ہوئی البتہ اتنا ضرور تھا کہ علیحدہ علیحدہ امور کے لئے الگ الگ افراد ذمہ دار بنائے جاتے تھے، وہ متعلقہ شعبہ کا ریکارڈ رکھتے، سربراہ

حکومت کے احکام کو ضبطِ تحریر میں لاتے اور ان کو متعلقہ افراد تک پہنچاتے بھی تھے۔ اس قسم کا تمام دفتری نظام اور تحریرات کا کام ارباب انشاد کی ایک باصلاحیت اور ذمہ دار جماعت کے سپرد تھا۔ اس جماعت میں شامل جملہ افراد کے نام اور ان کی ذمہ داریوں کی تفصیل اگرچہ ہمارے تاریخی مآخذ میں بہت کم ملتی ہے لیکن جو کچھ معلومات پائی جاتی ہیں ان کی روشنی میں مندرجہ ذیل صیغہ جات کی نشان دہی کی جاسکتی ہے۔

۱۔ صیغۂ خاص

رسول اللہؐ ایک ایسی ریاست کے سربراہ تھے جس کے حدود انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ بڑھتے چلے گئے اور جیسا کہ ہم توسیع ریاست کے باب میں لکھ چکے ہیں کہ انتہائی کم عرصہ میں عرب ریاست نبوی کے پرچم تلے آگیا۔ اور پھر اس ریاست کے امور و وظائف نے بھی اسی تیز رفتاری کے ساتھ ترقی پائی۔ علاوہ ازیں چونکہ رسول اللہؐ کی مصروفیات اپنی مختلف حیثیتوں میں روز بروز دوچند ہوتی چلی گئیں اس لئے رسول اللہؐ کے ذاتی و نجی معاملات اور شخصی امور کا تقسیم کار کے تحت مختلف صحابہ میں تقسیم ہوجانا فطری امر تھا لہٰذا اس نوعیت کے پیشِ نظر اگر اس صیغہ کو پرسنل ڈیپارٹمنٹ سے تعبیر کریں تو بے جا نہ ہوگا۔

تاریخ و سیر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان امور کی انجام دہی کے سلسلے میں متعدد افسران آپ کے عملۂ خاص میں شامل تھے اور مندرجہ ذیل ذمہ داریاں ان کے سپرد کی گئی تھیں۔

(۱) آپ کی ذاتی اشیاء کی حفاظت و نگرانی [۱۱۸]

(۲) آپ کے اسفار کا انتظام [۱۱۹]

(۳) آپ کے لئے سواری کا بندوبست [۱۲۰]

(۴) رازداری اور خفیہ خبریں پہنچانے کا انتظام [۱۲۱]

(۵) ذاتی معتمد یا پرسنل سکریٹری [۱۲۲]

(جن کا کام یہ تھا کہ وہ ہمیشہ رسول اللہؐ کے ساتھ رہیں اور اگر آپ کسی کام کو کرنا بھول جائیں تو آپ کو یاد دلادیں [۱۲۳] اگر کوئی کاتب یا سکریٹری کسی وجہ سے غیر حاضر ہوتا تو اس کے فرائض کی بجا آوری بھی انہیں کے ذمہ ہوتی تھی۔ [۱۲۴]

(۶) سرکاری مہر کی حفاظت و نگرانی [۱۲۵]

(۷) حجابت یعنی رسول اللہؐ کے اجلاس میں لوگوں کو پیش کرنا۔ [۱۲۶]

(۸) آنحضرتؐ کی ذاتی و نجی مراسلت [۱۲۷]

(۹) رسول اللہؐ کے اخراجات کی دیکھ بھال [۱۲۸]

(۱۰) کاشانۂ رسالت یا ازواجِ مطہرات کی حفاظت و نگرانی [۱۲۹]

(۱۱) مجرموں کی گردن مارنے کے لئے جلاد [۱۳۰]

(۱۲) ذات رسالت مآب کی محافظت اور پہرہ داری[۱۴۱]
(۱۳) کسی خبر یا حکم کا اعلان یا منادی۔[۱۴۲]

۲۔ صیغہ توقیعات و فرامین

اس صیغہ کے تحت رسول اللہؐ کے رُوبرو پیش آمدہ مقدمات و معاملات کے احکام و فیصلے لکھے جاتے، ہر قسم کی دستاویزیں، وثیق اور شرائط و معاملات کی کتابت ہوتی تھی۔ قبیلوں کا ریکارڈ، ان کے چشموں کی تفصیل، مردم شماری[۱۴۳]، عمّال و محصلین کے لئے تحریری فرامین کا اجرا[۱۴۴] اور مسلمان قبائل کو سرکاری ہدایات بھیجنا بھی اسی شعبہ کا کام تھا۔[۱۴۵] رسول اللہؐ اور عام لوگوں کے ادھار قرض، لین دین کے معاملات[۱۴۶] اور آنحضرتؐ و اہلِ عرب کے مابین خط و کتابت[۱۴۷]، فرمائشی تحریرات[۱۴۸]، رسول اللہؐ کی حاجات و ضروریات کی کتابت[۱۴۹] نیز اموال صدقات اور کھجور کے درختوں سے آمدنی کا تخمینہ ضبطِ تحریر میں لانا[۱۵۰] اسی شعبۂ توقیعات کے ذمہ تھا۔

۳۔ صیغۂ احتساب

اس کے تحت لوگوں کے عام اخلاق کی نگرانی و اصلاح، عمّال کی تربیت اور ان کا محاسبہ، نیز تجارتی بدعنوانیوں کا انسداد شامل ہے۔ اس صیغہ کی براہِ راست نگرانی خود رسول اللہؐ فرمایا کرتے تھے۔

عوام الناس کے اخلاق کی نگرانی کا یہ کام سرکاری پیمانے پر غالباً اس ارشادِ الٰہی کے بموجب تھا کہ:

الذین ان مکنّٰھم فی الارض اقاموا الصلٰوۃ واٰتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر[۱۵۱]

(اگر ہم ان لوگوں کو اقتدار دیں گے تو یہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے اور لوگوں کو اچھائیوں کا حکم دیں گے اور برائیوں سے روکیں گے)۔

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عام طور پر لوگوں کے اخلاق اور فرائض مذہبی کے متعلق وقتاً فوقتاً داروگیر فرماتے رہتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ ان کو اس بات پر توجہ دلاتے تھے کہ وہ احکامِ خداوندی کی پوری طرح پابندی کریں۔ چنانچہ اسلام کی بنیادی اور اصولی چیزوں کی تعلیم و تربیت کے لئے حضورؐ نے تمام قبائل سے کہا کہ ان میں سے ہر ایک قبیلہ کے کچھ لوگوں کو منتخب کرکے مدینہ بھیجے۔ رسول اللہؐ کا یہ طرزِ عمل بھی سورہ توبہ کی اس آیت کی تفسیر تھا جس کے الفاظ یہ ہیں کہ:

فلولا نفر من کل فرقۃٍ منھم طآئفۃ لیتفقّھوا فی الدین ولینذروا قومھم اذا رجعوا الیھم لعلّھم یحذرون۔[۱۵۲]

(تو یُوں کیوں نہ کیا کہ ہر ایک جماعت میں سے چند اشخاص نکل جاتے تاکہ دین (کا علم سیکھتے اور اس) میں سمجھ پیدا کرتے اور جب اپنی قوم کی طرف واپس آتے تو ان کو ڈرساتے تاکہ وہ حذر کرتے)۔

جہاں تک عمّال کی تربیت اور ان کے محاسبہ کا تعلق ہے تو اس کے دو پہلو کئے جا سکتے ہیں، ایک تو یہ کہ جن لوگوں کو کوئی اہم ذمہ داری سونپی جاتی مثلاً صدقہ یا زکوٰۃ وغیرہ کی وصولیابی کے لئے بھیجا جاتا ان سے رسول اللہؐ اس بات کی پوچھ گچھ کرتے تھے کہ کہیں وصولی میں انہوں نے بے جا ظلم یا زیادتی یا ناجائز طریقہ تو اختیار نہیں کیا۔ چنانچہ مشہور واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ آپ نے ابن اللتبیہ کو بنو سلیم کے صدقات پر عامل بنا کر روانہ کیا جب وُہ وصول کر کے واپس آئے تو انہوں نے دو قسم کا مال رسول اللہؐ کے سامنے یہ کہہ کر رکھ دیا کہ یہ مال مسلمانوں کا ہے اور یہ مال مجھ کو تحفۃً ملا ہے۔ آپ نے یہ ملاحظہ فرمایا تو کہا کہ "گھر بیٹھے تم کو یہ ہدیہ کیوں نہ ملا؟" اس کے بعد آپ نے ایک خطبہ میں اس قسم کے لین دین کی سختی سے ممانعت فرما دی۔(۱۴۳)

رسول اللہؐ ایک عظیم مصلح اور بیدار مغز حکمران تھے آپ کو جہاں یہ خیال تھا کہ عہدیدار اپنے فرائض و واجبات کی بجا آوری صحیح طور پر کریں اس سے زیادہ اہتمام اس بات کا تھا کہ عمّال و حکّام زیورِ اخلاق سے آراستہ ہوں تاکہ جہاں بھی ان کا تقرر کیا جائے وہ کامیاب ثابت ہوں اور کم از کم وہاں کے باشندے ان کے اخلاق کے شاکی نہ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہؐ نے حضرت ابو موسیٰ اشعری اور معاذ ابن جبل کو یمن کی جانب روانہ کیا تو فرمایا تھا کہ:

یسراً و لا تعسّراً و بشّرا و لا تنفرا (۱۴۴)

(تم دونوں سختی نہ کرنا بلکہ آسانی سے کام لینا اور لوگوں کو اچھی باتیں سنانا، نفرت نہ دلانا)

رسول اللہؐ کے اس ارشاد سے اس طرزِ حکومت کی نشان دہی بھی ہو جاتی ہے جو اس وقت اسلامی ریاست میں جاری و ساری تھا!
عہدیداروں کی اہلیت و قابلیت کے ضمن میں یہ بتانا تحصیل حاصل معلوم ہوتا ہے کہ عہدیدار چاہے گورنر ہو یا قاضی، معلّم ہو یا مبلّغ، امام ہو یا مفتی اس کے لئے بنیادی شرط یہ تھی کہ اسلام کے نظریۂ حیات پر یقین اور اس کی تعلیمات سے گہری واقفیت رکھتا ہو۔ احادیث و سیر کی یہ روایت بہت مشہور ہے کہ جب رسول اللہؐ نے حضرت معاذ بن جبل کو یمن کے لئے مامور فرمایا تو روانگی سے پہلے ان کے تبحرِ علمی اور واقفیت شرع کا امتحان لیا یہاں تک کہ آپ مطمئن ہو گئے۔(۱۴۵) اعلیٰ عہدیداروں مثلاً گورنر یا والی کو نہ صرف زبانی بلکہ بعض اوقات تحریری ہدایات اور فرامین رسول اللہؐ کی طرف سے عطا کئے جاتے تھے۔(۱۴۶) افسرانِ محاصل کو ہر قسم کے محاصل کی تفصیل اور اس کے عوض نصاب کی تعلیم دی جاتی، قضاۃ کو فرائضِ عدل و قضا سے مطلع کیا جاتا اور انہیں دیوانی و فوجداری مقدمات میں طرزِ عمل کی ہدایت رسول اللہؐ بنفسِ نفیس عطا فرماتے تھے۔(۱۴۷)

اب رہا معاملہ تجارتی بدعنوانیوں کے انسداد کا تو اس سلسلے میں بھی نگرانی و اہتمام سے رسول اللہؐ غافل نہ تھے۔ بدعنوان تاجروں کو دین و دنیا کی وعید سنانے کے علاوہ آپ نے اچھے اور ایماندار تاجروں کو اُخروی اجر کی بشارت بھی سنائی۔(۱۴۸) نیز چیزوں کی خرید و فروخت کے سلسلے میں آپ نے بات بات پر حلف اٹھانے، جھوٹی قسمیں کھانے، ناپ تول میں کمی کرنے اور اسی قسم کی دوسری نازیبا حرکات کی سخت ممانعت کر دی(۱۴۹) اور پھر اس ترہیب و ترغیب کے ساتھ ساتھ عملی اقدامات بھی فرمائے۔ مثلاً رسول اللہؐ بعض اوقات بازاروں اور منڈیوں کا دَورہ کرتے اور موقع پر ہی تحقیق و تفتیش فرما کر ضروری تنبیہ یا کارروائی عمل میں لے آتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ آپ بازار تشریف لے گئے تو غلّہ کے ایک ڈھیر میں ہاتھ ڈال کر

دیکھا. غلہ اندر سے گیلا تھا۔ آپ نے دکاندار سے دریافت فرمایا: یہ کیا؟ اس نے جواب دیا: بارش سے بھیگ گیا ہے۔ آپ نے فرمایا: تو پھر اُس کو اوپر کیوں نہیں رکھا تاکہ ہر شخص کو نظر آئے۔ پھر فرمایا کہ جو لوگ دھوکہ فریب کریں وہ ہم میں سے نہیں ہیں[۱۵۰] وزن اور ناپ تول کو ٹھیک رکھنا قرآن کی بنیادی تعلیمات میں شامل ہے[۱۵۱] جبکہ رسول اللہ نے بھی اشیاء کو محض اندازہ کے بجائے تول سے دینے اور وزن کرنے کی ہدایت کی ہے۔[۱۵۲] معلوم ہوتا ہے کہ منڈیوں اور بازاروں کی مجموعی نگہداشت اور تجار کے بے جا تصرف سے لوگوں کو محفوظ رکھنے کے لئے رسول اللہ نے بازاروں کے لئے باقاعدہ محتسب (مارکیٹ انسپکٹرز) کا تقرر بھی کیا تھا[۱۵۳] بلکہ تاریخ تو یہ بھی بتاتی ہے کہ بعض اوقات عورتیں بھی بازاروں میں کوڑا لے کر گھومتی تھیں اور لوگوں کو اچھی باتوں کا حکم دیتی اور بُری باتوں سے روکتی تھیں۔[۱۵۴]

ان اقدامات سے یہ اندازہ لگانا آسان ہے کہ رسول اللہ عوام کی معاشی فلاح و بہبود اور ان کے لئے اشیائے صرف کی مناسب شرح اور مناسب نرخوں پر فراہمی کو کتنی اہمیت دیتے تھے۔ نیز اس سے ریاست نبویؐ کے فلاحی پہلو پر بھی بخوبی روشنی پڑ جاتی ہے۔

۴۔ صیغہ جات امورِ داخلہ

استقبال و مہمانداری، عیادت مرضیٰ، جاسوسی اور شرطہ وغیرہ کا انتظام اس شعبہ کے تحت آتا ہے۔

جو لوگ رسول اللہ کی خدمت میں اپنی نجی یا سرکاری حیثیت سے حاضر ہوتے تھے ان کے حسبِ حیثیت استقبال اور قیام و طعام کے لئے ایک منتظم کا باقاعدہ تقرر کیا گیا تھا۔[۱۵۵] استقبال و مہمانداری کے سلسلے میں رسول اللہ کی ذاتی دلچسپی اور مستعدی کا عالم یہ تھا کہ آپ افراد یا وفود کی آمد پر بنفس نفیس پیش قدمی فرماتے ان کی خاطر مدارات میں حصہ لیتے اور استقبال پُورے سرکاری اعزاز کے ساتھ کرتے تھے۔[۱۵۶] کبھی مہمانوں کو مسجد نبوی میں خیمے نصب کرا کر ٹھہرایا جاتا،[۱۵۷] اور کبھی میزبانی کے لئے مختلف صحابہ کو متعین کر دیا جاتا اور پھر وہ مہمانوں کو اپنے گھروں میں ٹھہرا لیتے[۱۵۸] استقبال و مہمانداری کے سلسلے میں ایک خاص بات یہ ہے کہ رسول اللہ دُور دراز سے آنے والے مہمانوں کی نہ صرف یہ کہ تواضع کرتے بلکہ ان کی واپسی کے وقت زادِ سفر اخراجات اور وظائف کا بھی انتظام کر دیتے تھے۔[۱۵۹] نیز ان باتوں کا خود بھی اہتمام کرتے اور دوسروں سے یہ بھی کرواتے تھے بلکہ حضرت ابن عباس کی روایت کے مطابق اپنی وفات کے وقت رسول اللہ نے جو آخری تین وصیتیں فرمائی تھیں ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ:

وجیزوا لوفود بنحو ما کنت اجیزھم۔[۱۶۰]

(جس طرح میں وفود کو عطیہ دیا کرتا تھا تم بھی اسی طرح دیا کرنا)

مہمانوں اور وفود سے رسول اللہ کا یہ سلوک جہاں آپ کی انسانی ہمدردی اور احترام آدمیت پر دلالت کرتا ہے اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ دُور دراز سے آنے والوں کے اذہان و قلوب کو مسخر کرنے میں آپ کے اس حسنِ سلوک نے

بہت اہم اور موثر کردار ادا کیا تھا۔ اوّل تو ایک ایسے علاقے کے لوگوں کی مالی اعانت ہی متاثر کرنے کے لئے کافی تھی جہاں وسائلِ معاش کی سخت قلت تھی اور سفر انتہائی دشوار تھا اور دُوسرے یہ کہ مہمان نوازی اور تواضع کا یہ انداز نفسیاتی سے زیادہ سیاسی حکمت عملی کا آئینہ دار تھا۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے ادارات کی تنظیم و ترتیب میں حالات کی پوری رعایت رکھی اور ان سے بھرپور فائدہ بھی اٹھایا۔[۱۶۱]

اہلِ حاجت اور ضرورت مندوں کے لئے ادھار قرض کا بندوبست بھی آپ کے اسی صیغہ کے ماتحت ہوتا تھا اگر کوئی شخص آپ کو ذاتی طور پر کوئی ہدیہ پیش کرتا تو وہ بھی اسی شعبہ کے زیرِ انتظام صرف کیا جاتا تھا۔[۱۶۲]

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ رسول اللہؐ کے نزدیک استقبال و مہمانداری کی خاص اہمیت تھی، غالباً اسی لئے جب اہلِ تبالہ و جرش نے بغیر جنگ اسلام قبول کیا تو رسول اللہؐ نے انہیں اسی حالت پر جس پر کہ وہ مسلمان ہوئے تھے برقرار رکھا اور ان میں سے جو اہلِ کتاب تھے ان کے ہر بالغ پر ایک دینار جزیہ عائد کیا اور یہ معنی خیز شرط بھی لگائی کہ وہ مسلمانوں کی ضیافت بھی کریں گے۔[۱۶۳] پھر جب ۹ھ میں ایلہ کے سردار سے مصالحت فرمائی تو ان پر جزیہ کے علاوہ یہ شرط بھی عائد کی کہ ان کی آبادیوں میں سے جو مسلمان گزرے گا وہ اس کی مہمانداری کرے گا۔[۱۶۴]

جہاں تک مریضوں کی عیادت اور مسلمانوں کے انتقال کی صورت میں ان کی تجہیز و تکفین میں شرکت کا تعلق ہے تو اس پہلو سے بھی رسول اللہؐ نے پوری سرگرمی کا مظاہرہ کیا، نیز ایک مسلمان کے دُوسرے مسلمان پر حقوق کی فہرست میں عیادت کو بھی شامل فرمایا اور بیمار پرسی کو واجب قرار دیا۔[۱۶۵] عیادت کرنے میں آپ نے رنگ و نسل اور مذہب و ملت کے تمام امتیازات کو پسِ پشت ڈال دیا حتیٰ کہ مشرکین تک کی عیادت کرنے میں کوئی تامل نہیں کیا اور حجۃ الوداع تک کے انتہائی مصروف موقع پر بھی مریضوں کی عیادت کرنے میں تساہل نہیں برتا۔[۱۶۶] جب بھی کسی مریض کے پاس تشریف لے جاتے تو اسے ہمت و حوصلہ کی تلقین کرتے اس کی ہمت کے لئے دعا فرماتے اور لا بأس طهور ان شاء الله (گھبراؤ نہیں انشاء اللہ جلد ہی اچھے ہو جاؤ گے) کہہ کر اس کی دلجوئی کا سامان بہم پہنچاتے تھے[۱۶۷] نیز عیادت کے معاملہ میں اپنے پرائے کی تمیز یا مذہب و ملت کا فرق آپ کے نزدیک بے معنی تھا۔[۱۶۸] کسی مسلمان کا انتقال ہو جانے کی صورت میں تجہیز و تکفین میں شرکت، جنازہ کے ساتھ مشایعت اور پھر میت کے پسماندگان کو صبر کی تلقین کرنا بھی رسول اللہؐ کے روزمرہ کے معمولات میں داخل تھا۔[۱۶۹]

ریاست کے مندرجہ بالا وظائف سے یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ جس طرح رسول اللہؐ کی ریاست عالمگیر تھی اسی طرح آپ کی قائم کردہ ریاست کا مطمح نظر بھی یہ تھا کہ پوری انسانیت کو فائدہ پہنچایا جائے جیسا کہ ایک خاندان یا برادری کے افراد کے ساتھ ہوتا ہے۔[۱۷۰]

ملک میں امن و امان قائم رکھنے، نظم و ضبط برقرار رکھنے اور اسے سیاسی و معاشرتی انتشار سے بچانے کے لئے شرطہ یا پولیس وغیرہ کا انتظام ہر ریاست کی ایک بنیادی ضرورت ہے یہ ضرورت اگرچہ ریاستِ نبوی کو بھی لاحق تھی لیکن اتنی شدید نہ تھی جتنی عام طور پر دنیوی ریاستوں میں ہوتی ہے۔ کیونکہ اوّل تو اسلام اپنے لفظی مفہوم اور صوری و

معنوی شکل میں امن و سلامتی ہے اور اپنی تمام تعلیمات میں اس کا داعی بھی ہے۔ دُوسرے رسولؐ اللہ کا سیاسی کارنامہ ہی یہ تھا کہ آپ نے عرب کے جنگجو قبائل اور متحارب گروہوں میں ہر قسم کے تصادم اور انتقام کی روایات کو ختم کر کے امن و سلامتی کی نئی فضا قائم کی تھی۔ مزید برآں قیامِ مدینہ کے بالکل آغاز ہی میں رسولؐ اللہ نے منشورِ مدینہ کے ذریعہ مدینہ کو حرم قرار دے دیا تھا اور جس کے بارے میں تفصیلات زیرِ نظر مقالہ کے باب تاسیس میں آچکی ہیں۔ حرم کا مطلب صاف ہے یعنی متعینہ علاقے میں لڑائی جھگڑا، دنگا فساد، خون خرابہ، قتل و غارت گری اور بدامنی پھیلانا حرام ٹھہرا اور اس طرح مدنی معاشرہ کو امن و سلامتی کی دولتِ بے بہا مل گئی۔ ان ابتدائی انتظامات کے نتیجے میں یہ بات لازمی تھی کہ امن و امان کو کم سے کم خطرہ درپیش ہو۔ لیکن بہرحال امن و امان کی صورتِ حال کو خراب کرنے والوں کی تادیب کے لئے بھی رسولؐ اللہ نے باقاعدہ انتظام کر رکھا تھا۔ اس غرض سے نہ صرف یہ کہ پولیس کا محکمہ اپنی ابتدائی شکل میں موجود تھا[۱۷۱] اور وہ سرگرم عمل رہتا تھا۔ بلکہ خود رسولؐ اللہ ذاتی طور پر بھی اس میں دلچسپی لیتے تھے۔ چنانچہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا تھا کہ آپ کسی قسم کے خطرہ کی بُو سُونگھ کر تحقیقِ حال کے لئے راتوں میں خود بھی گشت پر نکل جاتے۔[۱۷۲] علاوہ ازیں رات کی پہرہ داری اور چوکیداری کے لئے مدینہ میں ایک "صاحب العسس" بھی مقرر فرمایا تھا جس کا کام یہ تھا کہ راتوں کو گشت کرے، آواز لگائے اور مشکوک افراد کا پیچھا کرے۔[۱۷۳] اس میں شک نہیں کہ اسلام نے کسی بھی شخص کے ذاتی معاملات میں تجسس کو منع کیا ہے۔[۱۷۴] لیکن سیاسی مصالح اور معاشرتی ضرورتوں کے تحت بقدرِ ضرورت تحقیق و تفتیش اور تلاش و تجسس کی اجازت ہے اور جس کی تائید سیرت کے متعدد واقعات سے ہوتی ہے۔ رسولؐ اللہ نے بہرحال وقت اور حالات کے تحت مخبری اور جاسوسی کے ضروری انتظامات کئے اور ایک "متجسس" کا تقرر فرمایا۔[۱۷۵] اس عہدے دار کا کام یہ تھا کہ مخالفین ریاست کی دشمنانہ سرگرمیوں کی اطلاع بہم پہنچائے[۱۷۶] اور دار الحرب میں رہنے والے مسلمانوں کے متعلقین کی خیریت سے مطلع کرے۔[۱۷۷] جاسوسی و مخبری کے سلسلے میں مزید تفصیلات ہم آئندہ رسولؐ اللہ کے عسکری انتظامات کے تحت بیان کریں گے۔

اندرونِ ریاست جُرم کا ارتکاب کرنے والوں سے نمٹنے کے لئے رسولؐ اللہ انہیں تنبیہ بھی کرتے، ضروری سزا دیتے[۱۷۸] اور اگر مناسب سمجھتے تو انھیں محبوس فرما دیتے۔ اس غرض سے کبھی تو مسجدِ نبوی ہی دار الحبس یا قید خانہ کا کام دیتی[۱۷۹] اور کبھی کسی کا گھر استعمال کیا جاتا تھا[۱۸۰] بلکہ تاریخ سے تو یہ بھی پتا چلتا ہے کہ عہدِ رسالت میں مردوں اور عورتوں کو علیحدہ علیحدہ قید خانوں میں رکھا جاتا تھا۔[۱۸۱] جنگی قیدیوں کے معاملہ میں بھی یہی صورت تھی۔[۱۸۲] قیدیوں پر نگرانی کے لئے بھی افسروں کو مقرر کیا جاتا تھا[۱۸۳] جن کو آج کل کی اصطلاح میں جیلر کہا جا سکتا ہے۔ مجرموں پر حدود اللہ قائم کرنے کے لئے افسران علیحدہ تھے۔[۱۸۴] مختصر یہ کہ حدودِ ریاست میں امن و امان کی فضا قائم کرنے کے لئے رسولؐ اللہ نے بھرپور کوششیں کیں، اور اس میں آپ اتنے کامیاب ثابت ہوئے کہ آپ کے عہدِ حکومت میں امن و امان کا مسئلہ قابلِ ذکر طور پر کبھی پیدا نہیں ہوا۔

۵۔ صیغۂ تعلقاتِ خارجہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کوششیں صرف داخلی امن و امان کے قیام، عدل کے فروغ اور فتنہ و فساد کے دفعیہ تک محدود نہ تھیں اور نہ آپ کا منشا محض قومی مفاد کا تحفظ تھا بلکہ آپ کی حکومت کا قیام تمام انسانوں کی فلاح و نجات کے لیے عمل میں آیا تھا۔ آپ کی بعثت سارے عالم کے لئے تھی اور آپ تمام دنیا کو امن و سلامتی سے ہمکنار کرنے آئے تھے ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے رسول اللہ نے اندرون عرب اور بیرونِ عرب کی چھوٹی بڑی طاقتوں، معاصر بادشاہوں اور امراء و رؤسا سے مناسب موقع ملتے ہی ربط پیدا کیا، انہیں دینِ حق کی دعوت دی، ضرورت کے تحت ان سے معاہدے کئے اور خط و کتابت کے ذریعہ انہیں باضابطہ امن و سلامتی کا پیغام پہنچایا۔ چنانچہ ہجرت کے کچھ ہی عرصہ بعد بنو ضمرہ اور جہینہ سے معاہدے، نجاشی سے خطوط کا تبادلہ، ہرقل اور کسریٰ کے نام خطوط کی ترسیل وغیرہ کا مدعا یہی تھا (جیسا کہ ہم اسی مقالہ کے بابِ توسیع میں واضح کر چکے ہیں)

ریاست نبویؐ کی ان سرگرمیوں کا اجراء "صیغۂ تعلقاتِ خارجہ" سے ہوتا ہے اور اس کے تحت بیرونی ملکوں سے خط و کتابت، سفارتی تبادلہ اور معاہدات کا انعقاد جیسے اہم امور انجام دئے جاتے تھے۔ اس شعبہ میں ایسے لوگ خاص طور پر مقرر کئے گئے تھے جو غیر ملکی زبانوں کے ماہر اور ان کے بہترین ترجمان تھے۔ ان کا کام غیر ملکی دستاویزات و خطوط کا مطالعہ و ترجمہ، گفتگو کی صورت میں ترجمانی اور امراء و رؤسا کے نامہ و پیام کا جواب دینا تھا۔ اس سلسلے میں دو اشخاص قابلِ ذکر ہیں۔ ایک حضرت عبداللہ بن ارقم[۱۸۵] جو ملوک و امراء کو خطوط لکھنے پر مامور تھے اور رسول اللہ کو ان پر اس درجہ اعتماد تھا کہ آپ ان کو صرف مضمون بتا دیتے تھے اور پھر ابن ارقم خط لکھ کر بغیر سنائے ہوئے اس پر حضورؐ کی مہر ثبت کر دیتے تھے۔[۱۸۶] دوسرے حضرت زید بن ثابت تھے جو وحیِ الٰہی کی کتابت کے علاوہ اوّل الذکر کی طرح ملوک و رؤسا کو خطوط بھی لکھتے تھے۔[۱۸۸] جب یہ دونوں حضرات موجود نہ ہوتے تھے تو رسول اللہ یہ خدمت کسی اور تربیت یافتہ شخص کے سپرد کر دیتے تھے۔[۱۸۹] جہاں تک غیر ملکی زبانوں کو جاننے اور سیکھنے کا تعلق ہے تو مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ نے اس کی ترغیب دی بلکہ بعض اوقات حکم بھی دیا جس کے نتیجہ میں مختلف صحابہ نے پوری تندہی سے آپ کے ارشاد کو عملی جامہ پہنایا۔ چنانچہ حضرت زید بن ثابت نے بعض غیر ملکی زبانوں کو صرف سترہ دنوں میں سیکھ لیا تھا[۱۹۰] اور کتابِ یہود کی تعلیم پندرہ دنوں سے کم مدت میں مکمل کر لی تھی[۱۹۱] ان کے علاوہ بھی دوسرے متعدد صحابہ نے ملکی و سفارتی ضرورتوں کے تحت مختلف زبانوں کو بڑی مستعدی کے ساتھ سیکھا تھا۔[۱۹۱]

چنانچہ صلح حدیبیہ کے بعد رسول اللہ نے بیرونِ عرب ملوک و سلاطین کو دعوتِ اسلام دینے کے لئے جو سفارتیں روانہ فرمائی تھیں روایات کے مطابق ان کے تمام سفراء ان زبانوں میں گفتگو کر سکتے تھے جن علاقوں میں انہیں بھیجا گیا تھا۔[۱۹۳] مزید برآں چونکہ سفارت صیغۂ تعلقاتِ خارجہ کا اہم ترین عنصر ہے اس لئے منصبِ سفارت پر رسول اللہ نے صرف ان ہی لوگوں کا تقرر فرمایا جو اس کا حق ادا کر سکتے تھے اور جیسا کہ بعد میں پیدا ہونے والے تاریخی نتائج سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تمام سفارتیں انتہائی کامیاب

ثابت ہوئیں اور ان کی وجہ سے جہاں وقت کے جبر و ظلم کے مقابلہ میں امنِ عالم کو فروغ ہوا اسی کے ساتھ ساتھ داخلی امن کو بھی بہت تقویت پہنچی اور جس کے نتیجہ میں جلد ہی عرب کے گوشہ گوشہ سے سفارتیں دارالحکومت مدینہ آنے لگیں[194]۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ رسول اللہ نے مختلف دیار و امصار میں جتنے سفرا بھی روانہ فرمائے وہ آدابِ سفارت سے کما حقہٗ واقف اور صورتِ حال کے مطابق کارروائی کرنے میں ماہر تھے۔ روابط کے استحکام اور تعلقاتِ خارجہ کی بہتری کے سلسلے میں ہدایا اور تحائف کا بھیجنا بھی عالمگیر روایات میں شامل ہے۔ رسول اللہ نے تحفے اور ہدایا کا تبادلہ نہ صرف یہ کہ دوست ممالک یا ہم خیال حکمرانوں سے ہی کیا[195] بلکہ دشمن ممالک اور مخالفوں کو بھی ارسال ہدایا میں تکلف نہیں برتا۔ مثلاً عمرو بن امیہ ضمری کو ابو سفیان بن حرب کے پاس مکہ میں ہدایا دے کر بھیجا۔[196] علاوہ بریں سفراء کا تقرر رسول اللہ نے جنگ، صلح اور پُر امن حالات ہر زمانے میں کیا۔[197]

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے۔ باہر سے وفود آتے تھے تو رسول اللہ ان کا شایان استقبال کرتے۔ ان سے اہم مسائل پر بات چیت کرتے اور ضرورت پڑنے پر ترجمان اور خطیب کی مدد بھی حاصل کیا کرتے تھے۔[198]

جہاں تک معاہدات کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں بھی رسول اللہ نے کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا اور معاہدہ کے ذریعہ سیاسی کامیابیاں حاصل کرتے چلے گئے۔ اس ضمن میں معاہدہ جہینہ، معاہدہ حدیبیہ، معاہدہ ثقیف، معاہدہ دومۃ الجندل، معاہدہ مقنا اور معاہدہ نجران وغیرہ کو بطورِ مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔[199] یہاں یہ بتا دینا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ معاہدات کی تحریر و تسوید کے لئے بھی متعدد اشخاص اس شعبہ سے وابستہ تھے۔ چنانچہ کم و بیش تمام معاہدات کے اخیر میں کاتبِ معاہدہ کا نام دیکھا جا سکتا ہے۔[200] اخیر میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مجموعی طور پر اس شعبہ کی کارکردگی بہت اچھی رہی اور اس کی بنا پر ریاست نبوی کی توسیع و ترقی کے مراحل انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ طے ہوتے چلے گئے۔

۶۔ صیغہ ہائے مالیات

قرآنی احکام کی روشنی میں رسول اللہ کے پیشِ نظر ایک ایسے معاشرے کا قیام تھا جہاں اچھائیاں فروغ پائیں اور برائیوں کا استیصال ہو۔[201] جہاں لوگوں کے حقوق محفوظ ہوں اور جہاں معاشی ظلم و ناانصافی کا خاتمہ کر کے اخلاقی فضائل کا نشو و نما ہو سکے۔ قرآن جس طرح اپنے نظامِ سیاست کی بنیاد حاکمیتِ باری تعالیٰ پر رکھتا ہے اسی طرح نظامِ معیشت کو بھی الہامی ضابطوں اور خدا پرستانہ تصورِ اخلاق پر استوار کرتا ہے۔[202] اسلامی تعلیمات اور رسول اللہ کی تمام تر کوششیں اس بات پر مرکوز تھیں کہ معاشی انصاف کو بغیر کسی جبر کے قائم کیا جائے۔ اس غرض کے لئے زیادہ زور اس بات پر تھا کہ افراد معاشرہ کی ذہنی و اخلاقی تربیت ہو اور قانون و ریاست کی مداخلت کم سے کم ہو۔[203] نیز آپ کی مساعی کا رُخ یہ تھا کہ لوگوں کے اندر ایمان بیدار کرنے اور تعلیم و تربیت کے ذریعہ ان کو بہتر انسان بنانے کی تدابیر کی جائیں تاکہ افراد ایک دوسرے کے ساتھ رضاکارانہ تعاون اور بے غرضانہ فیاضی، ہمدردی اور احسان کا سلوک کرنے کے عادی ہوں۔ پھر جو کسر رہ جائے

اس کو پُورا کرنے کے لئے ریاست و قانون کی طاقت کو استعمال میں لاکر اجتماعی فلاح کا سامان بہم پہنچایا جائے۔

مقاصد بالا کو حاصل کرنے کے لئے رسول اللہؐ نے ایک طرف تو تمام ضروری تدابیر اختیار کیں اور اصولی احکام جاری فرمائے مثلاً شخصی گروہی یا قومی اجارہ داریوں کی حوصلہ شکنی[۲۰۴]، اکتسابِ رزق کے لئے سب کو یکساں اور زیادہ سے زیادہ مواقع کی فراہمی، افراد کو شخصی ملکیت کا حق، مگر لامحدود نہیں بلکہ فرد کے حقِ ملکیت پر دوسرے افراد اور معاشرہ کے مفاد کی خاطر ضروری پابندیوں کے ساتھ دیا گیا[۲۰۵]۔ نیز عورت اور مرد دونوں کو کمائی ہوئی دولت اور میراث یا دوسرے جائز ذرائع سے حاصل شدہ آمدنی کا یکساں مالک اور دونوں کو اپنے حقِ ملکیت سے متمتع ہونے کا حق دیا گیا[۲۰۶]۔ پھر معاشرہ میں معاشی توازن برقرار رکھنے کے لئے ایک جانب لوگوں کو بخل اور رہبانیت سے تو دُوسری جانب اسراف اور فضول خرچی سے روکا گیا[۲۰۷]۔ ایک اہم اصول یہ مقرر کیا گیا کہ دولت زیادہ سے زیادہ گردش میں رہے اور اس کے ذریعہ ان لوگوں کو بطورِ خاص حصہ دیا جائے جو کسی وجہ سے معاشی دوڑ میں پیچھے رہ گئے ہیں اور معاشی امداد و اعانت کے محتاج ہیں[۲۰۸]۔

رسول اللہؐ کے جاری کردہ ان اصولوں کے تھوڑی ہی مدت میں بہت خوشگوار نتائج برآمد ہوئے۔ جیسا کہ ہم تاسیسِ ریاست کے باب میں لکھ چکے ہیں کہ ہجرتِ مدینہ کے فوراً بعد رسول اللہؐ نے مہاجرین و انصار کے درمیان عقدِ مواخاۃ قائم فرمایا اور اس کے جہاں دوسرے نتائج نکلے اس کے ساتھ ساتھ معاشی اعتبار سے بھی مسلمانوں کی حالت بہت جلد سنبھل گئی۔ پھر رفتہ رفتہ ریاست کے فروغ و استحکام، جنگوں کے سلسلہ اور فتوحات وغیرہ کے نتیجہ میں معاشی ترقی بھی ظاہر ہوتی چلی گئی۔

انتظامِ ریاست کے سیاق و سباق میں یہ بات واضح ہے کہ محاصل کے بغیر کوئی حکومت اور اس کا نظم و نسق نہیں چلایا جاسکتا کیونکہ جس طرح ہر شخص کو اپنی زندگی گزارنے کے لئے دولت کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح حکومت کو بھی اپنے فرائض کی انجام دہی کے لئے رقم کی ضرورت ہے۔ رسول اللہؐ کی قائم کردہ ریاست کے لئے بھی محاصل ناگزیر تھے۔ ان محاصل کے مداخل و مخارج پر گفتگو سے پہلے یہ بتادینا ضروری ہے کہ ریاست کی آمدنی و اخراجات وغیرہ کی تنظیم و ترتیب کے لئے بھی ایک باقاعدہ صیغہ محاصل قائم تھا۔ اس شعبہ کے تحت ریاست کی آمد و خرچ کا حساب رکھا جاتا اور پھر اس کی محاسبی و تنقیح بھی ہوتی تھی۔ یہ شعبہ بجائے خود مختلف شاخوں میں تقسیم تھا اور ہر شاخ کے ذمہ دار اور ہر محاصل کے افسران الگ الگ تھے۔ کسی کا کام یہ تھا کہ وہ درختوں پر لگے ہوئے پھلوں کا جائزہ لے اور ان کے حساب سے ان پر جس قدر زکوٰۃ واجب ہو اسے باقاعدہ تحریر کرے تاکہ اس کی وصولی کا انتظام کیا جاسکے[۲۰۹]۔ کسی کے ذمہ مغانم ریاست کا حساب رکھنا تھا[۲۱۰]۔ اس میں اموالِ غنیمت کی تقسیم کا کام بھی شامل ہے۔ صدقات و زکوٰۃ کی املاک کا ریکارڈ علیحدہ رکھا جاتا تھا[۲۱۱]۔

مختصر یہ کہ چونکہ صیغۂ مالیات انتظامِ ریاست کے باب میں انتہائی اہمیت رکھتا ہے۔ اس لئے رسول اللہؐ نے اس شعبہ کی بہتر کارکردگی کی طرف پوری طرف توجہ دی اور ایسے لوگوں کو ذمہ داریاں سپرد کیں جو اس کے سب سے زیادہ اہل تھے اور اخلاق و کردار، علمِ دین و دنیا، حسابِ کتاب اور انشاء و کتابت میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے۔ معلوم ایسا

ہوتا ہے کہ مالیاتِ ریاست کی تنظیم کے لئے ایک طرف تو یہ شعبہ مستقل بنیادوں پر قائم تھا اور اس کے افسران اپنے متعینہ فرائض انجام دیتے تھے اور دوسری طرف رسولؐ اللہ وقت اور موقع کی مناسبت سے ایسے افسران کا تقرر بھی کر دیتے تھے جو عارضی طور پر مالیاتی شعبہ کی مختلف ذمہ داریاں سنبھال لیتے تھے۔ مثلاً میدانِ جنگ میں مالِ غنیمت کی دیکھ بھال اور نگرانی کے لئے افسر(۲۱۲) خمس رسول کے نگران(۲۱۳)، صاحب الجزیہ(۲۱۴)، صاحب الاعشار(۲۱۵)، متولیٔ خراج(۲۱۶) خارص(۲۱۷) وغیرہ کا تقرر قابلِ ذکر ہے۔

یہاں یہ واضح کر دینا بھی نہایت ضروری ہے کہ محاصل کے باب میں رسولؐ اللہ نے کوئی نیا اضافہ نہیں کیا بلکہ دنیا کے مختلف حصوں میں جو محاصل پہلے سے معروف و متداول تھے آپ نے ان میں سے ہی چند کو حسبِ ضرورت اختیار فرمایا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان ادارات کو من و عن اخذ کر لیا گیا تھا کیونکہ یہ بات معمولی عقل کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ شکل و صورت کی مشابہت اصل نہیں ہے بلکہ ان کے مقاصد اور رُوح کا ائتلاف و اختلاف حقیقی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اسلام سے قبل دنیا کی بڑی بڑی سلطنتوں کی رعایا اپنے حکمرانوں کی حرص و ہوس کا شکار تھی۔ عرب، روم، ایران اور دوسرے علاقوں میں رعایا محصولوں کے سنگین شکنجوں میں جکڑی ہوئی تھی(۲۱۸) اور مذکورہ تمام سلطنتوں میں محاصل کا مقصد محض حکمرانوں کا عیش و تنعم تھا۔ عوام سے جو رقم مختلف مدّات میں وصول کی جاتی تھی اس کا کوئی فائدہ خود عوام کو نہیں پہنچتا تھا۔ اس کے برخلاف ریاستِ نبوی کی بنیادی پالیسی یہ تھی کہ لوگوں پر محصول کم سے کم عاید کئے جائیں لیکن فائدہ زیادہ سے زیادہ بہم پہنچایا جائے۔

ریاستِ نبوی ایک فلاحی اور خادمِ خلق ریاست تھی جو عوام کی معاشی کفالت و معاونت، قیامِ انصاف، ادائیگیٔ حقوق اور غربت و افلاس کو مٹانے کے لئے وجود میں آئی تھی۔ تمام افرادِ ریاست کی بنیادی ضروریات کا بندوبست اور مجبور و اپاہج لاچار و بے سہارا افراد کی مدد اس کا اہم فریضہ تھا اور محاصل کی تحصیل و تصریف کے یہی مرکزی عوامل تھے۔ اس اعتبار سے گویا سرمایہ دارانہ نظام کے برعکس معاشی دوڑ میں پیچھے رہ جانے والوں کے لئے سہارا بھی تھا اور سعی و جہد کے مواقع میں باشندوں کے درمیان کوئی رکاوٹ بھی نہ تھی۔ مزید برآں ریاستِ نبوی کی یہ پالیسی اشتراکیت سے بھی اس معنی میں مختلف تھی کہ یہ کفالت کی ضمانت آزادی اور انفرادیت کو بھینٹ چڑھا کر نہیں دیتی اور کلی قومی ملکیت بھی اس کے مزاج میں داخل نہیں تھی۔ یہ اس قسم کی جدید فلاحی ریاست سے بھی مختلف تھی جس میں سماجی خدمات اور بنیادی کفالت محض سیاسی ضرورتوں کے تحت کی جاتی ہے۔ بہرحال ان توضیحات کی روشنی میں اب ہم یہ مطالعہ کریں گے کہ ریاستِ نبوی میں بیت المال کے مالی وسائل یا محاصل کیا تھے۔

(الف) غنیمت

تاریخی اعتبار سے چونکہ ریاستِ نبوی کو سب سے پہلی آمدنی مالِ غنیمت سے حاصل ہوئی اس لئے ہمارے

خیال میں اس کا مطالعہ اوّلیت رکھتا ہے۔ مالِ غنیمت دراصل ایک اتفاقی آمدنی ہے جو میدانِ جنگ میں بزور حاصل ہوتی ہے۔ عہد نبوی میں غنیمت کی سب سے پہلی آمدنی اگرچہ سریہ عبداللہ بن جحش میں ہوئی لیکن اسے رسول اللہ نے قبول کرنے سے انکار فرما دیا تھا۔[۲۱۹] اس لئے غنیمت کی باضابطہ آمدنی کو جنگِ بدر میں ہی شمار کرنا چاہئے البتہ اس کے بعد عہد نبوی کی دوسری جنگوں میں یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ غنیمت میں قیدی، عورتیں، اموال وغیرہ سب ہی شامل ہیں۔[۲۲۰] عرب جاہلیت میں بھی مالِ غنیمت کا رواج تھا اور اس مال کو بالعموم شرکائے جنگ میں تقسیم کر دیا جاتا تھا البتہ مالِ غنیمت کا بڑا حصہ قبیلہ کے سردار کو ملتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کی غنیمت کو تمام مسلمانوں میں برابر برابر تقسیم کر دیا تھا، لیکن جنگِ بدر کے بعد قرآن کے حکم کی تعمیل میں آپ اس کے پانچ حصے کرتے تھے۔[۲۲۱] اس میں سے ⅘ حصہ تو شرکائے جنگ میں تقسیم فرما دیتے تھے اور ⅕ حصہ بیت المال کے لئے محفوظ رکھا کرتے تھے[۲۲۲] جسے اصطلاحاً خمس کہتے ہیں۔ اس حکم کے تحت بنو قینقاع کی پہلی غنیمت تھی جس کو آپ نے پانچ حصوں میں تقسیم فرمایا تھا۔[۲۲۳] خمس کے مصارف کو قرآن نے متعین کر دیا ہے[۲۲۴] یعنی خمس اللہ کے لئے، رسول کے لئے، قرابت داروں کے لئے، مساکین اور مسافروں کے لئے مختص ہے۔ اس سے اس امر پر بھی بخوبی روشنی پڑ جاتی ہے کہ پہلے پہل جب بیت المال قائم ہوا تو ابتدائی آمدنی کے وقت سے ہی غریب و مسکین اور نادار لوگوں کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔ مزید برآں اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ بیت المال کے خمس کی آمدنی کا ایک بڑا حصہ ملت ہی کے مفادات و مصالح اور ضرورت مندوں کی امداد و اعانت پر صرف ہوتا تھا اور کل غنیمت کے ⅕ کا ⅕ یعنی غنیمت کا صرف ۲۵ واں حصہ رسول اللہ کے ذاتی صرف میں آتا تھا۔[۲۲۵]

امام ابو یوسف نے تصریح کی ہے کہ خمس کے پانچ حصے کئے جاتے تھے ایک اللہ و رسول کے لئے دوسرا قرابت داروں کے لئے تیسرا یتیموں کے لئے چوتھا مسکینوں کے لئے اور پانچواں مسافروں کے لئے ہوتا تھا۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ رسول اللہ کے حق میں خمس کا جو پانچواں حصہ آتا تھا رسول اللہ اس کو بھی تین حصوں میں بانٹ دیتے تھے یعنی:

(۱) اللہ کی راہ میں خرچ فرما دیتے۔

(۲) قوم میں حضور کا جو نائب ہوتا تھا اس کو بھی اس میں سے دیتے تھے پھر مال زیادہ ہو گیا تو

(۳) یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کو بھی دینے لگے۔[۲۲۶]

ان تفصیلات کی روشنی میں رسول اللہ کا یہ ارشاد بالکل صحیح تھا کہ:

لیس لی من مغنمکم الا الخمس والخمس مردود علیکم۔[۲۲۷]

(تمہارے مالِ غنیمت میں سے میرے لئے صرف پانچواں حصہ ہے اور یہ بھی تم ہی لوگوں کو واپس دے دیا جاتا ہے)

اس اعتبار سے یہ کہنا چاہئے کہ مالِ غنیمت میں سے رسول اللہ کا اصل حصہ صرف وہی ہوتا تھا جسے صفی کہا جاتا تھا یعنی وہ حق خاص جو رسول اللہ مالِ غنیمت میں سے منتخب فرما لیتے تھے مثلاً گھوڑا یا تلوار یا لونڈی۔ چنانچہ خیبر کے موقع پر

سیدہ صفیہ بطور صفی خاص کی گئی تھیں۔(۲۲۸) رسول اللہ کے علاوہ دیگر سپاہیوں کو مالِ غنیمت کا حصہ اس طرح ملتا تھا کہ ہر گھوڑے سوار کو تین حصے اور پیادہ کو ایک حصہ اور ایک روایت کے اعتبار سے سوار کو دو حصے اور پیادہ کو ایک حصہ ملتا تھا۔(۲۲۹)

(ب) فَے

ریاست نبوی کی آمدنی کا ایک بڑا ذریعہ فَے بھی تھا۔ محدود معنوں میں فَے سے مراد وہ مفتوحہ زمینیں تھیں جو بغیر جنگ اور فوج کشی کے براہِ راست ریاست کی ملکیت میں آتی تھیں۔(۲۳۰) مثلاً رسول اللہ نے سکہ ھ میں بنو نضیر کو جلا وطن کیا تو ان لوگوں کے باغات اور کھیت رسول اللہ کے قبضہ میں آ گئے۔(۲۳۱) اسی طرح بعد میں بنو قریظہ کا مال و اسباب اور علاقہ ہاتھ آیا(۲۳۲) نیز خیبر کے قریب کئی علاقے بغیر جنگ رسول اللہ کو مل گئے۔(۲۳۳) چونکہ یہ مالِ غنیمت سے بالکل الگ نوعیت کا تھا اس لئے رسول اللہ نے قرآن کی روشنی میں اس کو سرکاری ملکیت قرار دیا(۲۳۴) اس کو خاص اپنے انتظام میں رکھا اور بعد میں اپنے اختیار سے بنو نضیر کا کچھ علاقہ مہاجرین اور نادار انصار میں تقسیم کیا۔(۲۳۵) بنو نضیر کے اموال میں سے ہی رسول اللہ اپنے گھر کا سالانہ خرچ نکالتے تھے اور جو کچھ باقی رہ جاتا تھا اس کو ہتھیاروں، گھوڑوں اور اللہ کی راہ میں جہاد پر صرف کرتے تھے۔(۲۳۶) اگرچہ مجملاً قرآن میں مالِ فَے کا مصرف اللہ، رسول، اہلِ قرابت، یتامیٰ، مساکین، مسافروں اور مہاجرین کے لئے مخصوص کیا گیا ہے(۲۳۷) لیکن اس بارے میں اصولی طور پر فقہا کے نزدیک اس میں خمس نہیں ہے لیکن امام شافعی اس سے اختلاف رکھتے ہوئے خمس کے قائل ہیں۔(۲۳۸)

(ج) خراج

وہ محصولِ اراضی ہے جو غیر مسلموں سے وصول کیا جاتا تھا۔ یہ سب سے پہلے خیبر سے حاصل ہوا۔ فتح خیبر کے وقت چونکہ ایک طرف تو خود مسلمانوں کے پاس اتنے وسائل نہ تھے کہ وہ مفتوحہ زمینوں کی دیکھ بھال اور کاشت وغیرہ بآسانی کرا سکیں دوسری طرف یہود نے یہ پیشکش کی تھی کہ وہ ریاست نبوی کے اسامی کی حیثیت سے اس زمین پر کاشت کریں گے اس لئے رسول اللہ نے ان کی اس پیشکش کو قبول کرتے ہوئے پیداوار کا نصف بطور خراج مقرر فرما دیا۔(۲۳۹) خراج کی یہ رقم جزیہ کی طرح مجاہدین کی تنخواہوں اور دوسری قومی ضروریات پر خرچ کی جاتی تھی۔ جو کچھ وصول ہو کر آتا آنحضرتؐ سب کو اسی وقت تقسیم فرما دیتے تھے۔ سب سے پہلے آپ ان کو عطا فرماتے جو پہلے غلام رہ چکے تھے۔(۲۴۰) خراج کا محصول بھی کوئی نیا محصول نہ تھا۔ اسلام سے قبل مصر، شام، عراق، ایران، روم وغیرہ کی تمام سلطنتوں میں خراج اور جزیہ کے محصولوں کا رواج موجود تھا۔(۲۴۱)

(د) جزیہ

بقول ماوردی جزیہ جزا سے مشتق ہے اور یہ امن دینے کی جزا یا اس کا معاوضہ ہے۔[۲۴۲] جزیہ کی وصولی کا حکم خود قرآن میں موجود ہے[۲۴۳] بہرحال جزیہ وہ محصول تھا جو غیر مسلموں سے ان کی جان، مال، آبرو کی حفاظت اور عقیدے رائے ضمیر کی آزادی اور فوجی خدمت سے استثناٗ کے بدلے میں وصول کیا جاتا تھا۔ نیز جزیہ غیر مسلموں کے صرف آزاد مردوں پر واجب تھا، عورتوں اور بچوں پر نہیں[۲۴۴]۔ اسی طرح بوڑھے آدمی جو کام کرنے سے معذور ہوں اور مفلس اور فاتر العقل افراد پر سے جزیہ ساقط تھا[۲۴۵] غریب، اندھے، مفلوج اور راہب بھی اس سے مستثنٰی تھے۔[۲۴۶] علاوہ ازیں غیر مسلموں کو جزیہ کی ادائیگی پر بعض دوسرے محاصل سے استثناٗ بھی حاصل ہوجاتا تھا۔ مثلاً فوجی خدمت کی صورت میں[۲۴۷] یا اگر کوئی ذمی مسلمان ہوجاتا تب بھی یہ محصول ساقط ہوجاتا تھا۔[۲۴۸] جزیہ رقم اور اشیاء دونوں کی شکل میں قبول کیا جاسکتا تھا جیسا کہ رسولؐ اللہ نے اہلِ یمن کے لئے اپنے مکتوب میں شرح جزیہ کی توضیح کرتے ہوئے لکھا تھا۔[۲۴۹]

یہاں یہ وضاحت بے جا نہ ہوگی کہ اگرچہ جزیہ کا محصول کوئی نیا محصول نہ تھا اور اسلام سے قبل بھی رومی اور ایرانی سلطنتوں میں اس کا رواج تھا[۲۵۰] لیکن اس کی وصولی کے سلسلے میں جس ظلم و ناانصافی کا سلوک مذکورہ حکومتیں اپنی رعایا سے کرتی تھیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے اس کے برعکس رسولؐ اللہ نے اہلِ ذمہ کے ساتھ جو محتاط رویہ اختیار کیا اور جس سلوک و رواداری کا مظاہرہ کیا وہ تاریخِ سیاست میں یقیناً نیا باب ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ ریاست نبوی میں رعایا کے حقوق کی نگہداشت میں بلا تفریقِ مذہب و ملت کس حد تک مساوات برتی جاتی تھی۔

(ہ) زکوٰۃ

زکوٰۃ اسلام کا ایک بنیادی رُکن، اس کے فرائض میں سے ایک اہم فرض اور مالی عبادت ہے۔ اقتصادی پالیسی کے ذیل میں یہ گویا ایک قسم کا محصول تھا جو صرف مسلمانوں پر واجب الادا تھا اور صرف ان لوگوں سے وصول کیا جاتا تھا جو بالغ، خودکفیل اور صاحبِ نصاب ہوں۔ زکوٰۃ کی حقیقی غرض و غایت خود رسولؐ اللہ کے الفاظ میں یہ تھی کہ:

توخذ من اغنیائھم فترد علی فقرائھم۔[۲۵۱]

(زکوٰۃ مالداروں سے لی جائے اور ان کے ناداروں میں تقسیم کی جائے)

فقہا کے بیان کے مطابق زکوٰۃ ہر اس مال میں واجب ہوتی ہے جو خود بڑھتا ہو یا کام کرکے بڑھایا جاسکتا ہو تاکہ صاحبِ مال پاک ہوجائے اور حاجت مندوں کی حاجت روائی ہو۔[۲۵۲] زکوٰۃ کے بارے میں عام رائے یہی ہے کہ اس کی فرضیت ۹ھ میں ہوئی لیکن ایک مصنف نے نقل کیا ہے کہ زکوٰۃ ۲ھ میں فرض ہوئی[۲۵۳] بہرصورت زکوٰۃ بالعموم درج ذیل مدات سے وصول کی جاتی تھی یعنی:

۱۔ نقدی (یعنی سونا اور چاندی)،
۲۔ پھل اور زرعی پیداوار
۳۔ مویشی اور
۴۔ اسبابِ تجارت سے۔ (۲۵۴)

ان مدات میں سے سونا کم از کم ساڑھے سات تولہ اور چاندی ساڑھے باون تولے ہو تب زکوٰۃ کا اطلاق ہو گا۔ زرعی پیداوار پر زکوٰۃ جسے اصطلاحاً عشر بھی کہا جاتا ہے اور بعض اوقات ایک الگ آمدنی کی مد کہلائی جاتی ہے اس کی شرح خود رسول اللہ نے حضرت معاذ بن جبل کے لئے اپنے مکتوب میں متعین فرما دی تھی۔ اس کے مطابق بارانی زمینوں پر محصول عشر ۱/۱۰ تھا جبکہ چاہی زمینوں پر یہ شرح نصف عشر یعنی ۱/۲۰ تھی۔ (۲۵۵) جانوروں کا نصابِ زکوٰۃ مختلف تھا۔ جانوروں کو تین اقسام میں بانٹ دیا گیا۔ اس میں اونٹ کا شمار پہلی قسم میں، مویشی دوسری قسم میں اور چھوٹے چوپائے تیسری قسم میں داخل کئے گئے۔ زکوٰۃ کے لئے کم از کم ۵ اونٹ ضروری تھے جبکہ مویشی کی تعداد کم سے کم تیس تھی اور بھیڑ بکریاں کم از کم چالیس ہونا ضروری تھیں۔ (۲۵۶) سامانِ تجارت پر زکوٰۃ کا وجوب ثابت ہے چاہے کسی قسم کا مال ہو شرط یہ ہے کہ اس سامان کی قیمت نصاب کے معیار پر پوری اُترے۔ (۲۵۷)

قرآن کریم میں زکوٰۃ کے مصارف کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ (۲۵۸) اس کی رُو سے زکوٰۃ کو فقراء اور مساکین، عاملین صدقات، مولفۃ القلوب، رقاب، قرض داروں، فی سبیل اللہ اور مسافروں پر خرچ کیا جا سکتا ہے۔ ان پر ایک نظر ڈالنے سے ہی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ معاشی و اقتصادی سطح پر زکوٰۃ کا ادارہ معاشرہ میں ضرورت مند و بے سہارا افراد کی مدد سے تقسیمِ دولت، حقوق و فرائض کے تحفظ نیز غربت، فقر و افلاس کو دُور کرنے، معاشرتی عدل قائم کرنے اور افراد معاشرہ کے دینی، دنیاوی اور نفسیاتی اصلاح کے لئے ایک موثر ذریعہ تھا اور فی الحقیقت اس کو اس تاثیر کے ساتھ عہد نبوی میں استعمال بھی کیا گیا بلکہ اس سے آگے بڑھ کر ریاستِ نبوی نے اپنے کسی باشندے کو یہ محسوس تک نہ ہونے دیا کہ وہ تنہا یا لاوارث ہے۔ اسی لئے رسول اللہ نے اعلان فرما دیا تھا کہ: "جس کا کوئی سرپرست نہ ہو اس کا سرپرست اللہ اور اس کا رسول ہے۔" (۲۵۹)

ایک جدید العہد مصنف کے بیان کے مطابق فقراء و مساکین کے دائرہ میں بے روزگاری اور معذوروں کا سماجی تحفظ بھی آ جاتا ہے تاکہ مدافعت اور مسابقت کی قوت بخش کر ان کی خوشحالی بڑھائی جائے۔ (۲۶۰) صدقات کے عاملین میں وصول کرنے والے اور تقسیم کرنے والے دونوں شامل ہیں جبکہ تالیفِ قلوب کا منشاء یہ معلوم ہوتا ہے کہ مال و زر سے کام لے کر مخالف کی قلب ماہیت کر دی جائے نیز اشاعتِ اسلام میں وسعت پیدا ہو۔ (۲۶۱) غارمین یا قرضداروں کی مدد و اعانت کی شق اس لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ ریاست نبوی کی یہ ایک مستقل روایت رہی ہے کہ جو لوگ اپنے قرضوں کو ادا نہیں کر سکتے ان کی مدد کی جاتے۔ اس سلسلے میں ریاست کا سلوک قرضداروں کی زندگی تک ہی محدود

نہ تھا بلکہ انتظامات اس حد تک کر دئے گئے تھے کہ اگر کوئی شخص وفات پا جائے اور اپنے پیچھے قرض یا اولاد چھوڑ جائے تو اس کی کفالت حکومت کے ذمہ ہو جاتی تھی[۲۶۲] اور رسول اللہ کے ارشاد گرامی کا خلاصہ یہ ہے کہ "جو شخص کچھ چھوڑ جائے تو وہ اس کے گھر والوں کے لئے ہے۔ لیکن جو کسی کو بے سہارا چھوڑ جائے تو میں اس کا کارساز و منتظم (مولیٰ) ہوں"[۲۶۳]۔

مختصر یہ کہ زکوٰۃ کے اس نظام کو نافذ کر کے رسول اللہ نے معاشی سطح پر انقلاب آفریں اصلاحات کیں اور ایک ایسا معاشرہ قائم کر دیا جس میں نہ کوئی فرد اپنی زندگی کی بنیادی ضروریات سے محروم تھا اور نہ کوئی فرد دوسرے کی محنت پر عیش کی زندگی بسر کر سکتا تھا۔

(د) صدقات

زکوٰۃ اور صدقات میں باریک فرق صرف یہ ہے کہ صاحبِ نصاب پر زکوٰۃ کی ادائیگی لازمی تھی جبکہ صدقات مسلمان اپنی خوشی سے ریاست کو دیا کرتے تھے۔ البتہ کچھ ان میں ضروری بھی تھے۔ مثلاً صدقۃ الفطر۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں کہ رسول اللہ نے ۲ھ میں زکوٰۃ کی فرضیت سے بہت پہلے صدقۂ فطر کا حکم دیا تھا[۲۶۴] اور آپ ہی نے فطرہ کی مقدار بھی معین فرما دی تھی کہ "ایک صاع کھجور یا ایک صاع جو مسلمانوں میں سے ہر آزاد اور غلام مرد اور عورت پر فرض ہے"[۲۶۵]۔

قرآن کی رُو سے صدقات کے مصارف بھی وہی ہیں جو زکوٰۃ کے ہیں اور زکوٰۃ کی طرح اس کی وصولی کا انتظام بھی ریاست نبوی میں سرکاری طور پر ہوتا تھا۔ اس غرض سے رسول اللہ نے ۹ھ میں زکوٰۃ و صدقات وصول کرنے کے لئے ہر قبیلہ کے لئے الگ الگ محصلین مقرر فرمائے تھے جو قبائل کا دورہ کر کے لوگوں سے وصول کرتے تھے۔ رسول اللہ کا طریقۂ کار یہ تھا کہ جب کسی کو عاملِ زکوٰۃ کی حیثیت سے متعین فرماتے تو زکوٰۃ کی مقدار، اس کی شرح، اس کے حصول کا طریقہ اور دوسری ضروری ہدایات بھی تحریری طور پر اس کے سپرد کر دیتے تھے۔ اور جب عاملین آپ کی خدمت میں واپس آتے تھے تو آپ ان سے باقاعدہ حساب طلب کرتے تھے اور یہ اطمینان کر لیتے تھے کہ زکوٰۃ و صدقات کی وصولیابی میں کسی قسم کا ظلم یا جبر نہیں برتا گیا ہے رسول اللہ زکوٰۃ و صدقات کے محصلین یا عمال کو بقدرِ ضرورت معاوضہ بھی ادا کرتے تھے۔[۲۶۶]

صیغۂ مالیات پر بحث ختم کرنے سے پہلے یہ بتا دینا انتہائی ضروری ہے کہ آمد و خرچ اور دوسرے انتظامات کی دیکھ بھال کے ساتھ ساتھ رسول اللہ نے معاشرہ میں معاشی خوشحالی و فارغ البالی کے لئے بھی متعدد تدابیر اختیار کیں۔ مثلاً بے روزگاری کے مسئلہ کو ختم کرنے کے لئے پہلے بیان کی ہوئی صورتوں کے علاوہ قانونِ وراثت کا اجراء کیا[۲۶۷] (جس کا ذکر ہم استحکام کے باب میں کر چکے ہیں) انسدادِ گداگری کے سلسلے میں آپ نے متنبہ کر دیا تھا کہ جو بھیک مانگتا ہے وہ جب خدا کے سامنے جائے گا تو اس کے چہرے پر گوشت کی ایک بوٹی بھی نہ ہوگی[۲۶۸]۔ ملک کی معدنی دولت اور بے کار زمینوں کو زیرِ استعمال لانے کے لئے بھی آپ کے بعض اقدامات قابلِ ذکر ہیں۔ مثلاً مختلف اشخاص کو کانیں اور جاگیریں عطا فرمائیں[۲۶۹]۔ موات یا بنجر اراضی کو آباد کرنے کے سلسلے میں رسول اللہ کا فرمان یہ تھا کہ "جو شخص کسی زمین کو آباد کرے اور وہ کسی اور کی مملوکہ نہ ہو تو آباد کار اس کا زیادہ حقدار ہے"[۲۷۰]۔ اسی طرح دُومۃ الجندل کے اطراف کے جنگلات کو

آپ نے بیت المال کی ملکیت قرار دیا تھا۔ (۲۷۱)

بہر حال اب تک ہم نے مالیات کے سلسلے میں جو تفصیلات بیان کی ہیں وُہ یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ رسول اللہ نے تقسیمِ دولت کے پیچیدہ مسائل کو اس خوش اسلوبی کے ساتھ حل فرمایا کہ انفرادی حقوق کے تحفظ کے ساتھ ساتھ جماعت اور معاشرے کو زیادہ سے زیادہ ترقی حاصل ہوئی اور کسی گوشہ میں بھی تصادم کی کوئی صورت پیدا نہیں ہونے پائی۔

(۷) صیغہ ہائے عسکری

اس میں شک نہیں کہ اسلام سے قبل جنگ ، وحشت ، بربریت ، بہیمیت اور ہوسِ ملک گیری کا دوسرا نام تھا اور انتقام ، تفاخر یا مال و متاع کا لالچ ہی اس کا اصل محرک تھا۔ عرب ہو یا عجم جب جنگ کے شعلے بھڑکتے تو مقاتلین و غیر مقاتلین کا امتیاز اُٹھ جاتا دشمن قوم کا ہر فرد دشمن بن جاتا ۔ جنگ میں عورتیں ، بچے بوڑھے اور بیمار ہر ایک کے ساتھ یکساں سلوک کیا جاتا ۔ اور یہ سمجھا جاتا کہ دشمن کو ایذا دینے اور ضرر پہنچانے کا غیر محدود حق حاصل ہے ، یہاں تک کہ آگ کا عذاب دینے میں بھی تامل نہ برتا جاتا ۔ نیز وحشیانہ افعال ، لاشوں کا مثلہ ، اسیرانِ جنگ کے ساتھ جانوروں سے بدتر سلوک اور بسا اوقات جوشِ انتقام میں انہیں انتہا درجہ کی اذیتیں دے کر مار ڈالنا اس زمانہ کی عام روایات تھیں ۔ (۲۷۲)

لیکن اسلام آیا تو اس نے جنگ کو بھی ایک پاکیزہ چیز بنایا اور باعثِ رحمت ٹھہرایا ۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے بارے میں یہ ارشاد فرما کر حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ :

انا النبی الرحمه انا النبی الملحمه ۔ (۲۷۳)

(میں رحمت کا پیغمبر ہوں ، میں جنگ کا پیغمبر ہوں)

اور فتح مکہ کے عظیم الشان موقع پر جب مسلمانوں میں سے ہی الیوم یوم الملحمه الیوم تستحل الحرمة (۲۷۴) (آج کا دن جنگ کا دن ہے ، آج کے دن حُرمتیں پامال ہوں گی) کا نعرہ بلند کیا گیا تو رسول اللہ نے اس کی تردید ان الفاظ میں کی :

فقال کذب سعد و لکن ھذا یوم یعظم اللہ فیه الکعبة ۔ (۲۷۵)

(سعد نے غلط کہا ۔ بلکہ آج کے دن تو اللہ کعبہ کی عظمت کو دوبالا کرے گا)

اور پھر تنبیہ کے طور پر اس نعرہ لگانے والے سے علم چھین لیا گیا ۔ (۲۷۶)

مطالعہ تاریخ و سیر کے پیشِ نظر ہم کہہ سکتے ہیں کہ رسول اللہ نے اگرچہ جنگ کے آداب و قوانین کو بھی بہت کچھ بدلا اور طریقۂ جنگ میں بھی بعض نئے تجربات کئے مثلاً خندق کی تدبیر ۔ لیکن آپ نے اصل انقلاب جنگ کے مقاصد ، نقطۂ نظر اور نصب العین میں پیدا کیا ۔ نصب العین کی تبدیلی اور ہدف کے بدل جانے سے ظاہر ہے عسکری ادارات بھی متاثر ہوئے اور اس طرح پُورے فوجی نظام میں بحیثیت مجموعی انفرادیت پیدا ہو گئی ورنہ اہلِ عرب فوج کی صورت میں

پہلے بھی جنگ میں حصہ لیتے تھے۔ جنگ کے بعد مالِ غنیمت کی تقسیم کا بھی انتظام تھا اور اس کے لئے باقاعدہ اصطلاحیں رائج تھیں۔ مثلاً مرباع، نشیطہ، فضول اور صفی وغیرہ۔[۲۶۷] سامانِ حرب میں تلوار، نیزہ، ڈھال، زرہ، تیر، کمان اور محاصرہ کے آلات میں منجنیق، دبابہ، کبش وغیرہ کا استعمال عام تھا۔[۲۶۸] فوجی مراتب کا رواج بھی ان کے یہاں پایا جاتا تھا مثلاً میدانِ جنگ کے لئے جو امیر منتخب کیا جاتا اس کو منکب کہتے تھے اور ہر منکب کے ماتحت پانچ عریف ہوتے۔ ایک عریف بہت سے نفروں پر افسر ہوا کرتا تھا۔[۲۶۹] غرض عسکری سرگرمیاں تو عرب جاہلیت میں بھی پائی جاتی تھیں البتہ اخلاقی اصول و ضوابط اور نصب العین وہ نہ تھا جسے رسول اللہؐ نے پیش کیا۔ نیز یہ فقدان روم و ایران جیسی مہذب و متمدن اقوام میں بھی موجود تھا۔[۲۷۰] اس صورتِ حال میں رسول اللہؐ کا یہ کارنامہ بہت وقیع ہے کہ آپ نے جنگ کے محرکات اور اس کے مقاصد کو بالکل نیا رنگ عطا کیا۔

اسلام میں جنگ کا مقصد نہ آتشِ انتقام بجھانا ہے، نہ مال و منال کا حصول ہے، نہ ہوسِ ملک گیری کی تسکین ہے اور نہ شوقِ حکمرانی کی تکمیل ہے۔ اسلام نے پہلے ہی قدم پر اپنے فوجی نظام کو اخلاقی حدود کا پابند کیا اور ظلم و سفاکی کے جملہ طریقوں کو ختم کر کے جنگ کا ایک نیا تصور پیش کیا اور اسے "جہاد فی سبیل اللہ" کا حسین قالب عطا فرمایا۔[۲۷۱] جہاد کسی کام یا مقصد کے حصول میں انتہائی کوشش صرف کرنے کو کہتے ہیں۔[۲۷۲] جبکہ فی سبیل اللہ کی تحدید نے واضح کر دیا کہ یہ جہاد نفس کی کسی خواہش، ملک کی تسخیر، کسی عورت کے وصال، عداوت کے انتقام، دولت یا اقتدار یا شہرت و ناموری کے حصول کے لئے نہیں ہے بلکہ اللہ کی راہ میں محض دفعِ شر کے لئے ہے۔[۲۷۳] جہاد کے وسیع دائرہ میں اگرچہ ہر قسم کی جدوجہد شامل ہے لیکن اس کی اعلیٰ ترین شکل قتال ہے جس میں آدمی اللہ کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔

رسول اللہؐ نے جنگ کے سلسلے میں ایک مکمل ضابطہ اور قانونِ جنگ و صلح دیا۔ جنگ کے آداب، اس کے اخلاقی حدود، محاربین کے حقوق و فرائض، مقاتلین و غیر مقاتلین کا فرق، معاہدین، مفتوح قوموں، سفرا اور اسیرانِ جنگ کے حقوق وغیرہ کی تعلیم دی اور غفلت میں حملہ کرنے، آگ لگانے، لوٹ مار، تباہ کاری، مثلہ، قتلِ اسیر، بدعہدی، بدنظمی، انتشار اور دوسرے وحشیانہ افعال کو قطعاً ممنوع قرار دیا۔ نیز اس کے مقابلہ میں تقویٰ، خوفِ خدا، ایفائے عہد، غنیمت میں خیانت سے احتراز وغیرہ کی ہدایت فرمائی۔ ان باتوں کا اندازہ اس خطبہ سے لگایا جا سکتا ہے جو جیشِ موتہ کو رخصت کرتے ہوئے آپ نے فرمایا تھا۔[۲۷۴]

بہر حال یہی وہ فلسفہ اور بنیادی اصول تھے جن پر رسول اللہؐ نے ہجرتِ مدینہ کے بعد ایک باقاعدہ فوجی نظام قائم فرمایا۔ فوج کے کمانڈر انچیف اور سربراہِ اعلیٰ کی حیثیت خود آپ کی تھی۔ آپ نے بنفسِ نفیس تقریباً ستائیس جنگوں کی قیادت فرمائی جبکہ دوسری فوجی مہمات میں اپنے نائبوں کو اجرائے جہاد کے لئے روانہ فرمایا۔ سرحدوں کی نگرانی، ریاستی علاقوں کی حفاظت اور دشمن کو مرعوب کرنے کے لئے طلایہ گرد جماعتیں بھی آپ ہی کے حکم سے روانہ ہوتی تھیں۔ مطالعہ تاریخ کی رُو سے رسول اللہؐ کے بعد حضرت عمرؓ کے دور میں خصوصاً فوج کے نظام میں جو توسیع نظر آتی ہے وہ عہدِ رسالت کے

فوجی انتظامات کا ہی نتیجہ ہے۔ مثلاً ایک اہم کام مردم شماری اور جنگ کے قابل افراد کا رجسٹریشن ہے۔ اس کی اولیت کا سہرا مورخین عموماً حضرت عمرؓ کے سر باندھتے ہیں[۲۸۵] جبکہ یہ درحقیقت عہد نبوی کی پیداوار ہے اور جس کی تائید بخاری کی ایک حدیث سے ہو جاتی ہے۔[۲۸۶] اس حدیث میں اگرچہ مردم شماری کے مقصد کی صراحت نہیں کی گئی ہے تاہم کتانی نے اسے "باب فی کتاب الجیش" کے تحت نقل کر کے اسے بالکل واضح کر دیا ہے۔[۲۸۷] گویا رسول اللہؐ کے دور میں ہی ابتدائی قسم کا ایک دیوان مرتب ہو گیا تھا۔ نیز فوج کے لئے اسلحہ کی فراہمی، رسد کا انتظام، مجاہدوں کی بھرتی، اعلان جنگ اور لشکر کی روانگی کا اہتمام، سپاہ کی مشق و تربیت، نگہداشت وغیرہ کے تمام فرائض بھی آپ کے حکم کے تحت انجام دئے جاتے تھے۔

فوج یا لشکر کی فہرست میں گویا تمام تندرست مسلمانوں کا شمار ہوتا تھا۔ تمام شرکاء جوشِ ایمان اور جذبۂ جہاد سے سرشار، ہر قسم کی نفسانی حرص و ہوس سے آزاد تھے اور میدانِ جنگ میں دین کی ترقی و حفاظت اور اس کی خاطر اپنی جان تک قربان کر دینے کے عزم سے اترتے تھے۔ پھر یا تو شہادت پا کر کامیابی و کامرانی کے بلند ترین مرتبہ پر فائز ہوتے یا غازی بن کر مالِ غنیمت میں سے اپنا حصہ پاتے تھے۔ ایسی تاریخی مثالیں بھی ملتی ہیں جن سے یہ پتا چلتا ہے کہ بعض اوقات مالِ غنیمت میں سے حصہ ان لوگوں کو بھی دیا جاتا تھا جو اگرچہ محاذِ جنگ پر موجود نہ ہوں مگر عملاً کسی نہ کسی نوع سے جہاد میں حصہ لے رہے ہوں۔[۲۸۸]

اسلامی فوج پانچ حصوں یعنی قلب یا مرکز، میمنہ، میسرہ، مقدمہ اور عقبی فوج یا ساقہ پر مشتمل ہوتی تھی۔ لشکر کی یہ تقسیم اگرچہ دورِ جاہلیت میں بھی موجود تھی لیکن رسول اللہؐ نے ظاہری شکل و صورت اختیار کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ ان تمام حصوں میں جدید نظم و ترتیب پیدا کی، نئی روح پھونکی اور ان حصوں کو ظاہری و معنوی ہر اعتبار سے پہلے سے کہیں زیادہ متحد و متفق کر کے ایک ناقابلِ تسخیر اکائی یا قرآن کے الفاظ میں "بنیان مرصوص" بنا دیا۔[۲۸۹] میدانِ جنگ میں صف بندی کا رسول اللہؐ کو اتنا اہتمام تھا کہ موقع پر خود ہاتھ میں چھڑی لے کر صفیں درست فرماتے تھے[۲۹۰] بلکہ بقول طبری فتح مکہ کے وقت تو صف آرائی ایک مخصوص افسر کے سپرد ہو گئی تھی جو وازع کہلاتا تھا۔[۲۹۱] ہر فوج کا مہم پر روانگی سے پہلے شہر کے باہر معائنہ (عرض) ہوتا تھا اور کم عمر رضاکار یا سواری یا اسلحہ نہ رکھنے والے یا نامناسب افراد واپس کر دیئے جاتے تھے۔[۲۹۲] جنگِ بدر میں صف آرائی کے بعد جو جامع ہدایات دی گئی تھیں وہ یہ تھیں کہ "جب تک میں حکم نہ دوں، کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے، دشمن دُور ہو تو تیر چلا کر بے کار ضائع نہ کرے بلکہ جب نزدیک آئے تو مارے، اس سے قریب آئے تو پتھر پھینک کر مارے، اس سے بھی قریب آئے تو نیزہ اور پھر تلوار چلائے۔"[۲۹۳] ان ہدایات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ رسول اللہؐ اسلحہ اور سامانِ حرب کے محتاط استعمال اور اس کے بے جا صرف پر کتنی کڑی نظر رکھتے تھے۔

سپہ سالارِ فوج یا امیرِ لشکر کے حکم سے جنگ شروع ہوتی۔ اجرائے حکم کے بعد تکبیر یا دعا کے ذریعہ اللہ کی امداد و استعانت طلب کی جاتی۔[۲۹۴] محاذِ جنگ پر سپاہ کے دلوں میں جوش و جذبہ اور ہمت و حوصلہ پیدا کیا جاتا کیونکہ ترغیب جہاد بھی ایک اہم ضرورت ہے۔[۲۹۵] عام طور پر پہلے انفرادی مقابلے ہوتے اور پھر جنگ مغلوبہ۔ لشکر میں دو قسم کے دستے ہوتے تھے، ایک پیادہ اور دوسرے سوار۔ جنگِ بدر میں اسلامی فوج کے ساتھ صرف دو سوار تھے پھر اُحد میں مستقل

سوار فوج قائم ہوئی جس کے کمانڈر حضرت زبیر بن العوام تھے جبکہ تبوک کے محاذ پر سوار فوج کی تعداد دس ہزار تک جا پہنچی تھی۔ (۲۹۶)
ان دو قسم کے دستوں کے علاوہ بعد میں زرہ پوش پلٹن کا بھی اضافہ ہو گیا۔ احد میں پہلی مرتبہ ۱۰۰ سپاہیوں کی زرہ پوش پلٹن تھی جبکہ فتح مکہ کے موقع پر فوج کا ہر سپاہی فولاد میں غرق تھا۔(۲۹۷) میدانِ جنگ میں سپہ سالار فوج کا مستقر علیحدہ کسی محفوظ اور اونچی جگہ پر بنایا جاتا تھا تاکہ وہ فوجوں کی نقل و حرکت اور محاذِ جنگ کے نقشہ پر نظر رکھتے ہوئے ہدایات جاری کر سکے جیسا کہ غزوۂ بدر میں رسول اللہؐ کے لئے "عریش" تیار کیا گیا تھا۔(۲۹۸) سالارِ فوج کی حفاظت اور پہرہ داری کے لئے بھی افسر الگ الگ تھے بلکہ دو قسم کے افسر تھے، ایک "صاحب اللواء" کہلاتا اور دوسرا "صاحب الرایہ"۔ کتانی کی وضاحت کے مطابق لوا، رایہ کے علاوہ ہوتا تھا۔ لوا بڑا جھنڈا تھا اور امیرِ فوج کے مستقر پر بطور علامت لہراتا تھا' جبکہ رایہ اس سے الگ جھنڈا تھا۔(۲۹۹) رسول اللہؐ کا جھنڈا "عقاب" سے موسوم تھا۔(۳۰۰) معلوم ہوتا ہے کہ سپاہ فوج میں جوشِ جہاد اور حمیت وغیرت کو بیدار رکھنے اور اپنے آدمیوں کو دور سے پہچان لینے کے لئے لشکر میں شامل قبائل کے جھنڈے الگ الگ ہوتے تھے اور ان کا رنگ بھی علیحدہ علیحدہ ہوتا تھا۔ مثلاً ایک موقع پر انصار کے جھنڈے کا رنگ پیلا تھا۔(۳۰۱) محاذ پر دوست دشمن کی تمیز جنگی ضرورتوں اور خفیہ نقل و حرکت کے پیشِ نظر مسلمان فوجیوں کے لئے شعار (یا علامتی نعرہ) بھی مقرر کیا گیا تھا اور رسول اللہؐ نے اس سلسلے میں عسکری تدبر کا یہاں تک ثبوت دیا تھا کہ ہر جنگ میں شعار کے خفیہ الفاظ کو تبدیل فرما دیتے تھے۔(۳۰۲)

میدانِ جنگ میں کامیابی، دشمن کی سرگرمیوں پر کڑی نظر اور فوج کی صحیح نقل و حرکت کے لئے نظامِ جاسوسی ناگزیر ہے رسول اللہؐ نے اس سلسلہ میں جو انتظامات کئے تھے اس کی کچھ وضاحت ہم پہلے بھی کر چکے ہیں۔ فوجی جاسوسی کے لئے رسول اللہؐ نے جن افراد کو مقرر کیا تھا ان کا کام یہ تھا کہ مطلوبہ معلومات سے رسول اللہؐ کو مطلع کریں۔(۳۰۳) یوں تو ہر چھوٹی بڑی مہم میں رسول اللہؐ جاسوسوں سے کام لیتے تھے لیکن غزوۂ احزاب کے معرکہ میں نعیم بن مسعود اشجعی نے جتنا کامیاب کردار ادا کیا تھا اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جاسوسوں کے ذریعہ خبر رسانی کا یہ کام رسول اللہؐ نے جنگ سے پہلے اور جنگ کے دوران نہیں ہی لیا بلکہ عام حالات میں بھی خطرات کے پیشِ نظر یہ نظام موثر طور پر کام کرتا تھا۔ اس سلسلے میں رسول اللہؐ نے "حبس الطریق" سے بھی کام لیا۔ چنانچہ وہ واقعہ تاریخ و سیر میں بہت مشہور ہے جبکہ مدینہ کے ایک مخلص مسلمان کی طرف سے مشرکینِ مکہ کو رسول اللہؐ کی جنگی تیاریوں کی تحریری اطلاع دینے کی ناکام کوشش کی گئی لیکن سخت ناکہ بندی کے باعث وہ تحریر پکڑی گئی۔(۳۰۴)

مخالف قوتوں اور دشمنوں پر قابو پانے کے لئے رسول اللہؐ نے یہ تدبیر بھی اختیار کی کہ ان کے دوستوں اور حلیفوں کو توڑ لیا جائے۔ اس میں بھی رسول اللہؐ کو خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی اور جس کی سب سے روشن مثال صلح حدیبیہ ہے۔ علاوہ ازیں جنگ جیتنے کے لئے رسول اللہؐ نے بعض نئے تجربات بھی کئے مثلاً غزوۂ احزاب کے موقع پر خندق میں محصور رہ کر جنگ کرنا اہلِ عرب کے لئے بالکل نئی چیز تھی۔ اسی طرح خیبر کی لڑائی میں منجنیق سے دشمن کے محصور قلعہ پر پتھر برسائے گئے۔ طائف کے محاصرہ میں دبابے استعمال کئے گئے۔ نیز منجنیق کے علاوہ عرادہ بھی استعمال کیا گیا۔(۳۰۵)

عہدِ نبویؐ میں لشکر کے ساتھ ساتھ ضروری عملہ بھی جاتا تھا۔ اس عملہ میں راستہ بتانے والے[۳۰۶]، سپہ سالارِ فوج پر سایہ کرنے والے[۳۰۷]، لشکر سے آگے لشکر کے انتظامات کرنے والا دستہ یا "طلیعۃ الجیش"[۳۰۸]، جاسوس[۳۰۹]، صاحبِ مغانم[۳۱۰]، صاحب الخمس[۳۱۱]، صاحب الثقل[۳۱۲] (مسافروں کا سامان اٹھانے والے) اور حراس عسکر یعنی لشکر کے پہرہ دار[۳۱۳] وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

جنگ کے نتیجہ میں جو مال و متاع ہاتھ آتا اور جسے مالِ غنیمت کہا جاتا ہے اس کی تقسیم و مصارف ہم پہلے ہی بیان کر چکے ہیں۔ جنگی قیدیوں کے بارے میں قرآن کی ہدایت یہ ہے کہ شدید اور فیصلہ کن جنگ کے بعد انہیں اسیر کیا جا سکتا ہے البتہ یہاں اس تفصیل کا موقع نہیں ہے کہ جنگی قیدیوں کے باب میں اسلام نے کس سلوک کی تعلیم دی ہے۔ اور یہ امر بھی باعثِ طوالت ہے کہ اس وقت کی متمدن دنیا میں اس حسن سلوک کا شائبہ تک موجود نہ تھا۔

سپہ سالارِ فوج یا کمانڈر کے فرائض میں جس طرح فوج کی نگہداشت، جنگی امور کا انتظام اور لڑائی کی قیادت شامل ہے اسی طرح صلح کے لئے گفت و شنید، صلح ناموں پر دستخط اور دُوسرے جنگی فیصلے کرنا بھی اسی کا کام ہے۔ مسلمان مجاہدین کے لئے جہاں ایک طرف یہ ممنوع کہ میدانِ جنگ میں پیٹھ دکھائیں، تو دُوسری طرف یہ حکم بھی ہے کہ:

وان جنحوا للسلم فاجنح لہا وتوکل علی اللہ۔[۳۱۴]

(اور دیکھو اگر دشمن صلح کی طرف جھکے تو چاہیے کہ تم بھی اس کی طرف جھک جاؤ اور ہر حال میں اللہ پر بھروسا رکھو)

اس قرآنی ہدایت کے تحت رسولؐ اللہ کا معمول یہ رہا کہ آپ دشمن کی طرف سے معمولی سا اشارہ پاتے ہی صلح پر آمادہ ہو جاتے اور حتی الوسع جنگ سے مجتنب رہتے۔ چنانچہ اس کی واضح ترین مثال حدیبیہ کے موقع پر نظر آتی ہے۔ صلح حدیبیہ پر مفصل گفتگو ہم پہلے کر چکے ہیں اس لئے یہاں اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ رسولؐ اللہ صلح کے حد درجہ متلاشی تھے اسی لئے آپ بظاہر مغلوبانہ شرائط پر بھی رضامندی کا اظہار کر دیتے تھے تاکہ ہر ممکن طریقے سے جنگ کو ٹال دیا جائے۔ آپ کی انتہائی کوشش یہ ہوتی تھی کہ اختلافات کو سفارتی بنیادوں پر طے کر کے جنگ کو ملتوی کر دیا جائے لیکن جب یہ ساری کوششیں رائیگاں جاتیں تو پھر جنگ کے معاملہ میں بھی آپ کی مستعدی میں کوئی فرق نہ آتا تھا۔

۸۔ صیغۂ عدالت

عدل و انصاف کا قیام ہر مہذب و متمدن انسانی معاشرہ کی اوّلین ضرورت اور ہر مہذب و متمدن حکومت کا سب سے اہم فریضہ ہے۔ عدل کے بغیر نہ لوگوں کے درمیان حقوق و فرائض کا تعین ہو سکتا ہے اور نہ ظلم و استحصال کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ ہر زمانہ میں قانون سازی اور تشریع کا بنیادی مقصد اسی کو سمجھا گیا ہے۔ قرآن کریم میں ایک مقام پر مختصراً پیغمبروں اور رسولوں کے مشن پر اس طرح روشنی ڈالی گئی ہے کہ:

لقد ارسلنا رسلنا بالبینٰت وانزلنا معھم الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط۔[۳۱۵]
(ہم نے اپنے رسولوں کو واضح ہدایات کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان کو نازل کیا تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں)

اس اعتبار سے رسول اللہؐ بحیثیت رسول اور بحیثیت سربراہ ریاست معاشرہ میں عدل و انصاف کے قیام و اجرا کے ذمہ دار تھے اور اسی لئے صیغۂ عدالت ریاستِ نبویؐ کا ایک مستقل اور اہم ترین شعبہ تھا۔

عہد نبویؐ میں عدالت و قضا کے تمام اختیارات اور قانونِ اسلامی کا نفاذ رسول اللہؐ کے ہاتھ میں تھا اور آپ شارعِ حقیقی کے حکم کے بموجب فیصلے فرماتے تھے۔ آپ کے لئے حکم یہ تھا کہ:

و ان حکمت فاحکم بینھم بالقسط ان اللہ یحب المقسطین۔[۳۱۶]
(اور آپ فیصلہ کریں تو ان کے درمیان عدل و انصاف سے فیصلہ کیجئے کہ بلاشبہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے)

اور اسی سے متصل یہ بھی آتا ہے کہ:

فاحکم بینھم بما انزل اللہ۔[۳۱۷]

(ان کے درمیان اسی (قانون) کے مطابق فیصلہ کیجئے جو اللہ نے نازل کیا ہے)

متعدد مقامات پر رسول اللہؐ کو یہ تاکید بھی کی گئی ہے کہ فیصلہ حق و انصاف کے ساتھ کیا جائے اور اس میں کسی قسم کی کوتاہی سرزد نہ ہو۔[۳۱۸] بلکہ وہ ٹھیک ٹھیک میزان عدل پر پورا اترے۔[۳۱۹] اور سورۂ شوریٰ میں زبانِ رسالت مآب سے یہ کہلایا گیا کہ:

امرت لاعدل بینکم۔[۳۲۰]

(مجھے یہ حکم ہوا ہے کہ تمہارے درمیان عدل قائم کروں)

ان ہدایات کے پیشِ نظر رسول اللہؐ نے ریاست نبوی میں انصاف رسانی کے موثر اقدامات فرمائے۔ مرکز میں آپ خود ہی گویا قاضی القضاۃ اور مفتیِ اعظم تھے۔ تمام مقدمات آپ کی عدالت میں پیش ہوتے تھے اور بالعموم مسجد نبوی کو ہی ایوانِ عدالت کی حیثیت حاصل تھی۔ نیز چونکہ لوگوں کے درمیان اختلافات کو ختم کرنا اور ان کے نزاعات کا فیصلہ کرنا آپ کا فرض منصبی تھا[۳۲۱] اور ریاست میں امن و اتحاد کی فضا قائم کرنے کے لئے بھی یہ امر ناگزیر تھا اس لئے ہجرتِ مدینہ کے فوراً بعد ہی رسول اللہؐ نے متحارب گروہوں کو شیر و شکر کرنے کے بعد سب سے بڑا کارنامہ یہ انجام دیا تھا کہ عدل و انصاف کو شخصی اور قبائلی سطح سے اٹھا کر مرکزی معاملہ بنا دیا۔ اور انصاف رسانی کے لئے سادہ لیکن موثر طریقۂ کار اختیار کیا۔ پھر یہی وہ موقع تھا جبکہ رسول اللہؐ کو آخری عدالت مرافعہ کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ اس سلسلے میں یہاں مواخاۃ مہاجرین و انصار اور منشورِ مدینہ کا حوالہ دینا مناسب ہے جس پر تفصیلی بحث اس مقالہ کے گزشتہ ابواب میں کی جاچکی ہے۔

قاضی اور حکم کی حیثیت سے آپ کا معمول یہ تھا کہ جب بھی کوئی مسئلہ آپ کے سامنے پیش کیا جاتا تو آپ اس کا جواب

دے دیتے۔ اس قسم کے سوال و جواب کے لئے (جس کو ہم فتویٰ کہہ سکتے ہیں) کوئی وقت اور مقام مقرر نہ تھا۔ ہر لمحہ اور ہر آن آپ اس فریضے کو انجام دیتے رہتے تھے۔ رسول اللہؐ کے یہ فتاویٰ احادیث میں پوری طرح محفوظ ہیں۔ اور جس پر بحث ہمارے دائرہ سے خارج ہے۔ رسول اللہؐ کا طریقۂ کار یہ تھا کہ جب کسی معاملہ میں کتاب اللہ کا کوئی حکم موجود نہ ہوتا تو آپ اپنی بصیرت اور اجتہاد سے فیصلہ دے دیتے تھے یا صحابہ سے مشورہ فرما کر کسی نتیجہ پر پہنچ جاتے اور پھر وہی فیصلہ اسلام کا قانون اور حکم بن جاتا تھا۔ لیکن اپنے ذاتی اجتہاد اور فیصلے کے سلسلے میں رسول اللہؐ نے علی الاعلان یہ وضاحت کر دی تھی کہ:

انّما انا بشر و انکم تختصمون الیّ ولعلّ بعضکم ان یکون الحن بحجته من بعض فاقضی له علی نحو ما اسمع منه فمن قضیت له بشئ من حق اخیه فلا یاخذ منه شیئاً فانما اقطع له قطعةً من النار۔[۳۲۲]

(میں بھی ایک انسان ہوں اور تم میرے پاس لڑتے جھگڑتے آتے ہو۔ ہو سکتا ہے کہ تم میں سے ایک اپنی چرب زبانی سے یا باتیں بنا کر اپنے دعوے یا دلیل کو ثابت کر دے اور میں اس کی باتیں سن کر اس کے حق میں فیصلہ کر دوں۔ پس اگر میں اس طرح ایسے شخص کے لئے اس کے بھائی کے حصہ میں سے حق دلا دوں تو اسے چاہئے کہ وہ اس میں سے کچھ نہ لے کیونکہ میں اسے آگ کا ایک ٹکڑا دے رہا ہوں)

جہاں تک فیصلے کے نفاذ کا تعلق ہے تو اس کے لئے آپ اپنی طرف سے نائبین بھی مقرر فرماتے تھے۔ مثلاً ایک زانیہ کے معاملہ میں انیس الاسلمی کا تقرر فرمایا تھا۔[۳۲۳]

مقدمات کے باب میں اثبات دعویٰ کی بڑی اہمیت ہے۔ چنانچہ رسول اللہؐ کا ارشاد ہے کہ:

لو یعطی الناس بدعواهم لادعی ناس دماء رجال و اموالهم[۳۲۴]

(اگر لوگوں کے دعوے یوں ہی تسلیم کر لئے جائیں تو عدالتوں میں خون کے اور مال کے بہت سے دعوے دائر ہو جائیں)

بہر حال قانونی نقطۂ نظر سے صرف وہی دعوے معتبر ہیں جو ثابت ہو جائیں اس لئے رسول اللہؐ لوازمات ثبوت کے طور پر جن ذرائع اور وسائل کو اختیار فرماتے تھے ان میں سے ایک بیّنہ یعنی شہادت ہے۔ شہادت یا بیّنہ کا قاعدہ نہ صرف دورِ جاہلیت میں معروف و متداول تھا بلکہ دورِ جدید میں بھی۔ چنانچہ المجلّہ کی عبارت یہ ہے کہ:

البیّنة لمدعی والیمین علی من انکر۔[۳۲۵]

اور جس کی دلیل یہ حدیث ہے کہ:

البیّنة علی المدعی والیمین علی المدعی علیه او علی من انکر۔[۳۲۶]

(مدعی ثبوت پیش کرے اور مدعا علیہ یا انکار کرنے والا حلف اٹھائے)

گویا رسول اللہؐ نے بیّنہ کے ساتھ ساتھ یمین کو معتبر ٹھہرایا۔[۳۲۷] علاوہ ازیں قیافہ شناسی اور فراست کو بھی رسول اللہؐ نے

لوازمات ثبوت میں شمار کیا ہے اور بعض اوقات اس سلسلہ میں ظاہری حالات و دلائل، قرعہ اندازی اور قسامت[۳۲۸] کا بھی اعتبار فرمایا ہے۔

غرض رسول اللہ کی تمام تر کوشش اس بات پر مرکوز تھی کہ انصاف سہل الحصول ہو اور اس معاملہ میں تعصب یا جانبداری سے کام نہ لیا جائے۔ قرآن میں بھی متعدد مقامات پر غیر جانبدارانہ عدل کی جو ہدایات دی گئی ہیں[۳۲۹] اس کے پیش نظر آپ کے نزدیک قانون ہر ایک پر یکساں طور پر عائد ہوتا تھا۔ حتیٰ کہ ایک مرتبہ آپ نے یہ کہہ کر عدل و انصاف کے معاملہ میں ہر قسم کی بدعنوانیوں کا خاتمہ کر دیا کہ:

والذی نفس محمد بیدہ لو ان فاطمہ بنت محمد سرقت لقطعت یدھا۔[۳۳۰]

(اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمد کی جان ہے اگر فاطمہ بنت محمد نے بھی چوری کی ہوتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا)

اور یہ اس سیاسی اور قانونی مساوات کا ایک ادنیٰ نمونہ ہے جسے رسول اللہ نے ریاست میں قائم فرمایا تھا۔ اس سے یہ بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ صیغہ عدالت کے ذریعہ ریاست کے تمام شہریوں کے حقوق امن و آزادی اور مساوات کا تحفظ رسول اللہ کیسی تندہی کے ساتھ فرماتے تھے۔

یہاں یہ وضاحت بے محل نہ ہوگی کہ رسول اللہ کے دور میں مقدمات بہت کم تعداد میں آتے تھے۔ اس کی خاص وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ریاست نبوی میں قانون کا اجراء و نفاذ معاشرہ کے اخلاقی ارتقا کے ساتھ ساتھ ہوا اور یوں قانون کے ساتھ اس کی اصل رُوح عمل کے سانچے میں ڈھلتی چلی گئی۔ غالباً اسی لئے جب بھی رسول اللہ کی طرف سے کوئی حکم جاری ہوتا یا کوئی فیصلہ کر دیا جاتا تو اسے فی الفور تسلیم کر لیا جاتا تھا۔ کیونکہ یہ محض ایک قانونی معاملہ تھا بلکہ دین و ایمان کا ایک اہم تقاضہ بھی تھا جس کی شہادت قرآن ان الفاظ میں دیتا ہے کہ:

فلا وربّك لایؤمنون حتی یحکموك فیما شجر بینھم ثمّ لا یجدوا فی انفسھم حرجاً مّمّا قضیت و یسلّموا تسلیما۔[۳۳۱]

(تمہارے رب کی قسم یہ اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ تم کو اپنا حکم تسلیم نہ کریں ان معاملات میں جس میں یہ اختلاف کرتے ہیں۔ پھر جس بات کا تم فیصلہ کر دو اس کے بارے میں ان کے دلوں میں کوئی تنگی واقع نہ ہو اور تمہارے فیصلہ کو بسر و چشم قبول کر لیں)

گویا نفاذِ قانون کے لئے ریاست کی طاقت کو استعمال کرنے کی ضرورت شاذ و نادر ہی پڑتی تھی اور اپنی روح تقدس کی وجہ سے ہر ایک اس قانون پر از خود عمل پیرا ہو جاتا تھا۔ اسی کے ساتھ ساتھ رسول اللہ کی کوشش یہ بھی ہوتی تھی کہ تنازعہ یا مقدمہ عدالت میں باقاعدہ طور پر آنے سے پہلے ہی فریقین کی رضامندی سے ختم ہو جائے تو زیادہ بہتر ہے۔ قرآن نے بھی اس کی طرف والصلح خیر[۳۳۲] فرما کر توجہ دلائی ہے اور یہ حکم دیا ہے کہ اگر مسلمانوں میں باہم کوئی اختلاف یا نزاع کی صورت پیدا

ہو جائے تو صلح کی اجتماعی کوششوں میں کمی نہ کرنی چاہیے۔(۳۳۳) ہاں اگر نچلی سطح پر معاملات طے نہ ہو سکیں تو پھر عدالت عالیہ سے رجوع کیا جائے تاکہ انصاف کے تقاضے پورے ہوں۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں جو جیسا جرم کرے گا اس کی سزا بھی ویسی ہی پائے گا(۳۳۴) اور کسی فرد کو دوسرے کے جرم کی سزا نہیں دی جا سکے گی(۳۳۵) پھر انصاف کے تقاضوں کو کما حقہٗ ادا کرنے کے لئے آپ کی یہ ہدایت بھی موجود ہے کہ:

لا یقضین حکم بین اثنین وھو غضبان۔(۳۳۶)

(کوئی حاکم دو آدمیوں کے درمیان غصہ کی حالت میں فیصلہ نہ کرے)

کیونکہ اس صورت میں آدمی عدل سے تجاوز کر سکتا ہے۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ توسیع ریاست کے ساتھ ساتھ نظامِ عدالت میں بھی توسیع پیدا ہوئی۔ مرکز میں تو آپ خود منصب قضا پر فائز تھے لیکن اس کے علاوہ صوبائی سطح پر بھی رسول اللہ نے قاضیوں کا تقرر کیا۔ اور عدالت و قضا کی ذمہ داریاں بھی بالعموم صوبائی سربراہوں یا والیوں کے سپرد کیں۔ گویا والی اپنے عہدہ کے لحاظ سے قاضی بھی تھا۔ چنانچہ حضرت معاذ بن جبل کو یمن کا حاکم اور عتاب بن اسید کو مکہ کا والی مقرر کیا تو یہ حضرات حکومت عامہ کے ساتھ ساتھ فصل خصومات اور عدالت کا کام بھی انجام دیتے تھے۔

ان دونوں ادارات انتظامی کو یکجا کرنے کا سبب غالباً یہ تھا کہ ایک طرف تو انتظامِ ریاست اپنے ابتدائی مراحل میں تھا اور دوسری طرف مقدمات بہت کم آتے تھے۔ صوبائی قضاۃ اپنے فیصلوں میں پہلے کتاب اللہ اور پھر سنتِ رسول کو پیشِ نظر رکھتے تھے اور جب ان دونوں مآخذ میں کوئی راہنمائی نہیں ملتی تو بالآخر اپنے اجتہاد اور بصیرت سے کام لیتے تھے جیسا کہ حضرت معاذ بن جبل کی اس مشہور حدیث سے معلوم ہوتا ہے جس کا تذکرہ ہم پہلے بھی کر چکے ہیں۔(۳۳۷) اسی طرح جب آپ نے حضرت علی کو یمن کی جانب روانہ فرمایا تو یہ وصیت بھی فرمائی کہ جب تک تم فریق اوّل کی طرح فریق ثانی کا بیان نہ سن لو فیصلہ نہ دینا۔(۳۳۸) اور آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اگر تم نے اجتہاد کیا اور اس میں ثابت قدم رہے تو دوہرا اجر ہوگا اور اگر خطا کر گئے تب بھی ایک اجر ضرور ملے گا(۳۳۹) کتانی کا بیان ہے کہ رسول اللہ نے صحابہ میں سے جن لوگوں کو منصبِ قضا پر سرفراز فرمایا تھا ان میں حضرت عمر بن الخطاب، عثمان بن عفان، علی بن ابی طالب، عبداللہ بن مسعود، اُبی بن کعب، زید بن ثابت اور ابو موسیٰ اشعری شامل ہیں۔(۳۴۰) لیکن یہ وضاحت نہیں کی کہ ان لوگوں کو کن مقامات پر قاضی کی حیثیت سے متعین کیا گیا تھا۔

یہاں یہ بتا دینا برمحل ہے کہ جس زمانے میں رسول اللہ نے یہ نظامِ عدالت قائم فرمایا تھا اس وقت دنیا عدالت و قضا کی حقیقتوں سے بہت دور تھی۔ بظاہر روم و ایران کی متمدن سلطنتوں میں عدالتی ادارے موجود تھے اور عرب جاہلیت میں بھی بلا شبہ شیخ قبیلہ، حکم کاہن اور عراف وغیرہ نزاعات کے فیصلے کیا کرتے تھے اور یہ بھی صحیح ہے کہ لوازماتِ ثبوت کے ضمن میں قیافہ شناسی، فراست، قسامت، قرعہ اندازی اور شہادت کا بھی رواج تھا اور قس بن ساعدہ کا یہ قول کہ:

البیّنۃ علی من ادعی والیمین علی من انکر۔(۳۴۱)

(مدعی ثبوت پیش کرے اور انکار کرنے والا حلف اٹھائے)

زبان زد خاص و عام تھا لیکن قضا کی یہ تمام صورتیں کسی قاعدے اور ضابطے کی پابند نہ تھیں اور عرب میں خصوصاً ایسی کوئی بااختیار انتظامیہ بھی موجود نہ تھی جو تنفیذ احکام کی ذمہ دار ہو جو شخص طاقت، قوت اور اثر و رسوخ کا مالک ہوتا وہ فیصلوں پر اثرانداز ہونے اور انہیں بدلنے کی بھی پوری صلاحیت رکھتا تھا اور عجیب بات یہ ہے کہ فیصلوں کی پابندی کی صورت میں بھی اہلِ عرب کے درمیان غیر مختتم لڑائیوں کے دروازے کھل جاتے تھے اور "ایام العرب"[۲۴۲] کی صورت میں جن کا تاریخی ریکارڈ آج بھی موجود ہے۔ نظامِ عدالت کے سیاق و سباق میں رسولؐ اللہ نے سب سے بڑا انقلاب یہ پیدا کیا کہ سیاسی و معاشرتی اتحاد کے ساتھ ساتھ عدالتی اختیارات کو بھی مرکزیت عطا کی۔ عدالت ایک شخص یا قبیلہ کا معاملہ نہ رہا بلکہ وہ اجتماعی اور معاشرتی بن گیا۔ قانونی انتشار کے بجائے قانونی مساوات قائم ہوئی اور ہر اختلاف کی صورت میں مرجع خدا اور رسول کی ذات ہو گئی۔[۲۴۳]

(۹) صیغہ ہائے تعلیم و تربیت

قرآن کی رُو سے رسولؐ اللہ بنیادی طور پر معلمِ انسانیت بنا کر بھیجے گئے تھے۔ اس کے تحت تعلیم کتاب و حکمت اور تزکیہ نفس آپ کا بنیادی کام تھا۔[۲۴۴] آپ نے خود بھی یہ اعلان کیا تھا کہ:

انما انا بعثت معلما۔[۲۴۵]

(بلاشبہ میں تو معلّم ہی بنا کر بھیجا گیا ہوں)

رسولؐ اللہ کی تعلیم زندگی کے کسی ایک گوشہ سے متعلق نہ تھی بلکہ ہر لحاظ سے جامع اور ہر شعبۂ حیات پر حاوی تھی۔ ہجرتِ مدینہ سے پہلے کی مکّی زندگی اور جدّ و جہد کو نوعیت کے اعتبار سے علمی کہا جا سکتا ہے۔ آپ پر نازل شدہ پہلی وحی میں اسی حقیقت کی جھلک نظر آتی ہے۔[۲۴۶] پھر ہجرتِ مدینہ کے بعد تو رسولؐ اللہ نے بطور خاص تعلیم و تعلّم کی سرگرمیاں سرکاری حیثیت سے جاری فرمائیں۔ اسلامی نظریۂ حیات کی تعلیم، ان تعلیمات کا عملی سبق سکھانے اور ان بنیادوں کو واضح کرنے کے لئے جن پر اسلامی ریاست کو قائم کیا گیا تھا حضورؐ نے مسجد کو اپنی تمام سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔ آپ نے تمام مسلمانوں پر جماعت سے نماز ادا کرنا لازم کیا تاکہ ایک طرف تو مسلمان مساوات، اخوت، تعاون اور نظم و اطاعت کا عملی سبق سیکھیں اور دوسری طرف جمعہ اور دیگر مواقع پہ خطبات کے ذریعہ دین و دنیا کی تعلیم دی جا سکے۔ مسجد نبوی میں بڑے پیمانے پر تعلیم و تربیت کے انتظامات کے سلسلے میں، مسجد سے ملحق "صفہ" کو کسی طور نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مدینہ تشریف آوری کے بعد سب سے پہلے مسجد نبوی کی تعمیر ہوئی تھی اور اسی کے ساتھ ساتھ صفہ یا چبوترہ بھی تعمیر کیا گیا تھا۔ بقول ڈاکٹر حمید اللہ صفہ کو اوّلین اسلامی اقامتی جامعہ کہا جا سکتا ہے۔[۲۴۷] اس اقامتی جامعہ میں قرآن کی تعلیم، حفظ و ناظرہ، تجوید اور دیگر اسلامی علوم کی تعلیم کا بند و بست تھا جس کی نگرانی خود رسولؐ اللہ فرماتے تھے اور وہاں پر مقیم طالبان علم کی غذا وغیرہ کا اہتمام بھی کیا کرتے تھے۔[۲۴۸] درسگاہِ صُفّہ میں، نہ صرف مقیم طلباء کی تعلیم کا انتظام تھا بلکہ ایسے لوگوں کی تعلیم کا بھی جن کے گھر مدینہ میں تھے اور وہ صرف درس کے لئے وہاں حاضر ہوا کرتے تھے۔[۲۴۹] مقیم طلباء کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی تھی اور ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک وقت ان کی تعداد

ستر بھی تھی۔ (۳۵۰)

مختصر یہ کہ تعلیم و تعلّم کے لئے رسول اللہ نے مستقل انتظامات فرمائے تھے اور اس سلسلے میں آپ ہمہ وقت سرگرم اور زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کرنے میں ہمیشہ کوشاں رہتے تھے یہاں تک کہ اسیرانِ جنگِ بدر کے لئے فدیہ کے طور پر رقم کے علاوہ یہ بات طے کی تھی کہ جو قیدی لکھنا پڑھنا جانتا ہو وہ دس مسلمان بچوں کو اس فن کی تعلیم دے۔ (۳۵۱) بعض مورخین کی تصریحات کے مطابق مدینہ میں صفّہ کے علاوہ ایک اور اقامتی درس گاہ بھی تھی جو مخرمہ بن نوفل کے مکان میں "دار القراء" کے نام سے قائم تھی۔ (۳۵۲) علاوہ ازیں جس طرح مسجد نبوی علم کی نشر و اشاعت کا بڑا ذریعہ تھی اسی طرح مدینہ کی دیگر مساجد بھی اس باب میں خاصی اہمیت رکھتی ہیں، جن کی تعداد نو تک پہنچ گئی تھی۔ (۳۵۳) مسجد قبا کے مدرسے کی نگرانی بقول ڈاکٹر حمید اللہ شخصی طور پر خود رسول اللہ فرمایا کرتے تھے۔ (۳۵۴)

مدینہ سے باہر تعلیم کی غرض سے رسول اللہ وقتاً فوقتاً معلمین، قرّاء اور دعاۃ کو روانہ فرمایا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں تاریخ کے دو واقعات بہت مشہور ہیں یعنی ایک تو بیر معونہ کا واقعہ جس میں رسول اللہ نے ستر قرّاء کو قبائل نجد میں تعلیم و تربیت کے لئے صفر ۴ھ میں روانہ کیا تھا۔ (۳۵۵) دوسرا واقعہ رجیع کا ہے۔ یہ دوسری تعلیمی مہم تھی۔ عاصم بن ثابت انصاری کو نو صحابہ کے ساتھ عضل و قارہ کی جماعتوں کی درخواست پر روانہ فرمایا تھا۔ (۳۵۶) یہ مہمات اگرچہ افسوسناک واقعات پر منتج ہوئیں لیکن اس سے مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ قبائل کی تعلیم و تربیت اور ریاست میں علمی ترقی کے لئے رسول اللہ کی مستقل سیاست یہ تھی کہ معلّموں اور قاریوں کو برابر ملک کے مختلف حصّوں میں بھیجا جاتا رہے۔ یہاں خاص طور پر یمن کا ذکر کیا جا سکتا ہے جہاں اسلام کی ترویج و اشاعت بالکل پرامن ذرائع اور معلمین کے ذریعہ ہوئی۔ رسول اللہ نے یمن میں جند کا قاضی بنا کر حضرت معاذ کو بھیجا تاکہ وہ قضا کے ساتھ ساتھ لوگوں کو قرآن اور شرائع اسلام کی تعلیم دیں۔ (۳۵۷) نجران پر عمرو بن حزم کو عامل بنایا اور ان کا کام بتایا گیا کہ "لوگوں کو فقہ کی تعلیم دیں، قرآن سکھائیں اور ان سے صدقات وصول کریں"۔ (۳۵۸) اس کا مطلب یہ ہے کہ تعلیم دین کے لئے کوششیں اور انتظامات رسول اللہ نے بالکل سرکاری پیمانے پر کئے۔ نیز تعلیم دین کو تربیت یافتہ معلّمین کے علاوہ صوبہ کے گورنروں کے فرائض منصبی کا حصہ بنایا۔ اور یہ انتظامات صرف یمن یا ملک کے کسی ایک حصّہ کے لئے مخصوص نہ تھے بلکہ تمام حدود مملکت میں اس قسم کا اہتمام کیا گیا تھا۔ چنانچہ عتاب بن اسید کو مکہ پر عامل بنایا تو ان کے ساتھ معاذ بن جبل کو بھی مقرر کیا تاکہ وہ لوگوں کو دین کی تعلیم دیں اور قرآن سکھائیں۔ (۳۵۹) علاوہ ازیں جہاں ضروری سمجھا انفرادی طور پر بھی معلّمین کا تقرر فرمایا (۳۶۰) بلکہ رسول اللہ کی تعلیمی سیاست میں مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کو بھی اہمیت دی گئی چنانچہ تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ عہد نبوی میں نہ صرف معلّمین بلکہ معلّمات بھی اشاعتِ تعلیم میں حصّہ لیتی تھیں۔ (۳۶۱)

ڈاکٹر حمید اللہ کے بیان کے مطابق "صوبائی درس گاہوں کا معیار بلند کرنے کے لئے رسول اللہ نے صوبہ یمن میں ایک صدر ناظر تعلیمات بھی مقرر کیا تھا جس کا کام یہ تھا کہ مختلف اضلاع و تعلقات میں ہمیشہ دورہ کرتا رہے اور وہاں کی تعلیم اور تعلیم گاہوں کی نگرانی کرے۔ کوئی تعجب نہیں کہ اور صوبہ جات میں بھی اسی طرح کے افسر مامور کئے گئے ہوں"۔ (۳۶۲)

مختصر یہ کہ اشاعتِ اسلام اور تبلیغِ دین رسول اللہ کا فرض منصبی بھی تھا اور آپ دینی سربراہ اور سیاسی قائد ہونے کی حیثیت سے جس طرح اشاعتِ اسلام کے ذمہ دار تھے اسی طرح ائمہ اور مؤذنین کا تقرر، ارکانِ اسلام نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کا انتظام اور نگہداشت بھی آپ کے ذمہ تھی۔ چنانچہ یہ پہلے کہا جاچکا ہے کہ نماز کے سلسلے میں مساجد کی تعمیر، زکوٰۃ کے ضمن میں مصدقین کا تقرر، ۹ھ میں بسلسلہ حج ایک امیر الحاج کا تقرر اور احکام برأت کا اعلان[۳۶۳] بھی آپ ہی کے حکم سے عمل میں آیا تھا اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی تمام سرگرمیاں جیسا کہ ہم صیغہ احتساب میں بیان کر چکے ہیں براہِ راست رسول اللہ کی نگرانی میں جاری و ساری تھیں۔

صوبائی نظام

مرکزی نظامِ ریاست کا مطالعہ کرنے کے بعد صوبائی نظام کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ رسول اللہ ایک منظم و مرتب حکومت کے سربراہ تھے۔ مدینہ پوری ریاست کا صدر مقام تھا اور اس کا نیز اس سے ملحق علاقوں کا انتظام و انصرام براہِ راست رسول اللہ کے سپرد تھا۔ تاہم انتظامِ حکومت کو بہتر طور پر چلانے کے لئے آپ نے پوری ریاست کو مختلف حصّوں یا صوبوں میں منقسم کر دیا تھا اور ہر علاقہ پر ایک گورنر مقرر کیا تھا۔ یہ امر بالکل بدیہی ہے کہ چونکہ ریاست کی نشوونما بتدریج مکمل ہوئی اس لئے صوبوں کی تشکیل اور انتظامیہ میں بھی حالات و ضروریات کے لحاظ سے تبدیلی کی گئی۔ اس کی واضح ترین مثال یہ ہے کہ یمن کا جو صوبہ ریاست نبوی کے قیام سے پہلے چلا آ رہا تھا۔ رسول اللہ نے اسے حسبِ سابق ایک صوبہ رہنے دیا اور اس پر باذان بن ساسان کو والی متعین کیا[۳۶۴] جبکہ باذان کے انتقال کے بعد رسول اللہ نے اس کے لڑکے شہر کو والی بنایا لیکن اس کی ولایت کو صنعاء اور اس کے مضافات تک محدود کر دیا[۳۶۵] اور پھر شہر بن باذان کے قتل کے بعد آپ نے خالد بن سعید بن ابی العاص کو صرف صنعاء کی حد تک والی بنایا۔[۳۶۶] مزید برآں پورے یمن کو پانچ حصّوں میں تقسیم کر کے ان پر علیحدہ علیحدہ والیوں کا تقرر کیا۔ بہرحال ہمارے اس بیان سے واضح ہو جاتا ہے کہ صوبائی نظم اور ہیئت دونوں میں وقتاً فوقتاً ضروری تغیرات واقع ہوتے رہے۔ مجموعی طور پر عہد نبوی میں صوبائی تقسیم کافی وسیع نظر آتی ہے جس کی کچھ نہ کچھ تفصیل اگرچہ اوّلین ماخذ میں بھی ملتی ہے لیکن ابن حزم نے اپنی کتاب جوامع السیرۃ میں صوبوں اور ان کے والیوں کا ذکر اتنے سلیقے اور تفصیل سے کیا ہے کہ ہم اسی سے استفادہ کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔

ابنِ حزم کی تصریح کے مطابق رسول اللہ نے مدینہ کے علاوہ پوری ریاست کو چودہ صوبوں میں تقسیم فرمایا تھا اور جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں یمن کو ایک کے بجائے پانچ صوبوں میں بانٹ دیا یعنی صنعاء[۳۶۷]، کندہ وصدف[۳۶۸]، حضرموت[۳۶۹]، جند[۳۷۰] اور زبید و عدن و زمعہ و سواحل[۳۷۱]۔ ان کے علاوہ دوسرے صوبے یہ تھے، نجران[۳۷۲]، مکہ[۳۷۳]، تیما[۳۷۴]، وادی القریٰ[۳۷۵]، عربنہ یا فدک[۳۷۶] وغیرہ، بحرین[۳۷۷] و قطیف بحرین[۳۷۸]، عمان اور اس کے مضافات[۳۷۹] اور طائف[۳۸۰]۔

والیوں اور گورنروں کے تقرر میں رسول اللہ کا معیار وہی تھا جس کا ذکر ہم صیغہ جات کی تمہید میں کر چکے ہیں۔ یعنی اس عہدے کے لئے بھی ان لوگوں کو نااہل سمجھا جاتا تھا جو اپنی خدمات خود پیش کرنا چاہتے تھے۔ رسول اللہ کے نزدیک کسی بھی والی یا

حاکم کی اہلیت کی سب سے اہم شرط یہ بھی کہ وہ اسلام سے نہ صرف یہ کہ واقف ہو بلکہ اس کا عالم ہو اور دین و دنیا کے مسائل میں اتنا درک اور ایسی بالغ نظری یا بصیرت رکھتا ہو کہ وقت ضرورت آزادانہ اجتہاد کر سکے۔ حضرت معاذ بن جبل کے مشہور واقعہ کا ہم پہلے حوالہ دے چکے ہیں کہ روانگی کے وقت رسول اللہ نے ان سے مذکورہ باتوں کا امتحان لیا تھا۔[۳۱] حکام وولاۃ دونوں کے لئے اس شرط کو پورا کرنا دو وجوہات سے ضروری تھا، ایک تو اس لئے کہ ریاست نبویؐ ایک نظریاتی اور دستوری ریاست تھی اور اس کے کلیدی مناصب پر لازماً ایسے ہی لوگوں کو فائز کیا جا سکتا تھا جو اس نظریۂ حیات پر یقین کامل رکھتے ہوں اور دوسری وجہ یہ تھی کہ حکام و ولاۃ منتظم صوبہ سے بڑھ کر اسلام کے داعی اور مبلغ تھے۔ اس لئے ان کے فرائض ولایت میں سے ایک اہم اور مقدس فریضہ اشاعت اسلام اور تعلیم دین تھا جیسا کہ ہم صیغۂ تعلیم وتربیت کے تحت بیان کر چکے ہیں۔ تاہم اس کی مزید صراحت کی غرض سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ مذکورہ فریضہ کو اس تحریری دستاویز میں بھی مندرج کر دیتے تھے جو تقرر کے وقت والیوں کو "ہدایت نامۂ تقرر" (INSTRUMENT OF INSTRUCTIONS) کے طور پر دی جاتی تھی۔ ہماری اس بات کی وضاحت اور والیوں کے دیگر فرائض کو سمجھنے کے لئے عمرو بن حزم کے نام رسول اللہ کے گرامی نامہ کا حوالہ دینا ضروری ہے۔ بروایت طبری آپ کا یہ مکتوب بہت طویل ہے اس لئے پورا نقل کرنے کے بجائے ہم اس کے اہم نکات کا خلاصہ ذیل میں دے رہے ہیں۔ طبری کے بیان کے مطابق رسول اللہ نے عمرو بن حزم کو پہلے تو تقویٰ اختیار کرنے کی ہدایت کی اور پھر یہ فرمایا کہ:

(۱) لوگوں کو خوشخبری سناؤ اور انہیں اچھائیاں اختیار کرنے اور برائیاں چھوڑنے کی ہدایت کرو۔

(۲) تمام امور میں عدل وانصاف سے کام لو۔

(۳) تنذیر اور تبشیر دونوں کی تلقین کرو۔

(۴) لوگوں کے دل موہ لینے کی کوشش کرو۔

(۵) شرائع اسلام کی تعلیم دو خصوصاً حج اور عمرہ کے ارکان وآداب بتاؤ۔

(۶) نعرۂ عصبیت بلند کرنا ممنوع ہے۔

(۷) وضو کے مکمل اور صحیح طریقے کی تفصیل۔

(۸) نمازوں کو وقت پر ادا کرنے کی ہدایت اور اوقات کا مفصل بیان۔

(۹) مال غنیمت کا خمس، عشر اور نصف عشر کا نصاب، شرح اور وصولی کی وضاحت۔

(۱۰) ادائیگی صدقات کا حکم۔

(۱۱) اہل کتاب میں سے جو لوگ اسلام قبول کر لیں ان کے حقوق و فرائض عام مسلمانوں کے برابر ہوں گے لیکن جو اسلام نہ قبول کریں ان کے حقوق اس کے مطابق ہوں گے اور انہیں جزیہ ایک دینار فی کس کے حساب سے دینا ہوگا۔[۳۲]

کم وبیش اسی سے ملتا جلتا مضمون اس وصیت نامہ کا بھی ہے جو یمن کو روانہ کرتے وقت حضرت معاذ بن جبل کو دیا گیا تھا۔ اس میں رسول اللہ نے یہ لکھا تھا کہ:

"انك ستاتی قوما من اهل الکتاب فاذا جئتھم فادعھم الی ان یشھدوا ان لا الٰہ الا اللّٰہ وان محمداً رسول اللّٰہ فان ھم اطاعوا لك بذلك فاخبرھم ان اللّٰہ قد فرض علیکم خمس صلوٰت فی کل یوم ولیلۃ فان ھم اطاعوا لك بذلك فاخبرھم ان اللّٰہ قد فرض علیکم صدقۃً توخذ من اغنیائھم فترد علی فقرائھم فان ھم اطاعوا لك بذلك فایاك و کرائم اموالھم واتق دعوۃ المظلوم فانہ لیس بینہ و بین اللّٰہ حجاب۔"(۳۸۳)

(تم اہلِ کتاب کے پاس جاؤ تو پہلے ان کو کلمۂ توحید کی دعوت دینا اگر وہ اس کو مان لیں تو ان کو بتاؤ کہ اللہ نے ان پر صدقہ فرض کیا ہے جو ان کے امرأ سے لے کر ان کے فقرأ پر تقسیم کر دیا جائے گا۔ اگر وہ اس کو بھی تسلیم کر لیں تو ان کے بہترین مال سے احتراز کرنا اور مظلوم کی بددعا سے بچنا کیونکہ اس کے اور اللہ کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں ہوتا)

مندرجہ بالا بیانات کی روشنی میں جہاں تک والیِ ریاست کے فرائض کا تعلق ہے تو وہ حسب ذیل تھے:

(۱) صوبہ میں قانون کی تنفیذ اور امن و امان کے قیام کی ذمہ داری۔

(۲) صوبہ کا عام انتظام۔

(۳) اشاعتِ اسلام اور فرائض و سنت کی تعلیم۔

(۴) مقدمات و نزاعات کا فیصلہ اور

(۵) تحصیل محاصل (خراج، جزیہ، صدقات وغیرہ)۔

ان فرائض میں سے آخری دو ذمہ داریاں بعض اوقات دو علیحدہ افسروں کے سپرد کی جاتی تھیں یعنی عامل صدقات علیحدہ مقرر ہوتا اور قاضی علیحدہ، کبھی ایک ہی شخص کو تحصیل محاصل اور قضا دونوں پر مامور کر دیا جاتا(۳۸۴) اور کبھی ولایت، قضا اور تحصیل صدقات کے تمام مناصب ایک ہی شخص یعنی والی کو سونپ دیے جاتے تھے جس کا اندازہ عمرو بن حزم اور معاذ بن جبل دونوں کے نام مکتوب نبوی سے لگایا جا سکتا ہے۔ اور جس کی وضاحت ہم صیغہ ہائے تعلیم و تربیت کے تحت بھی کر چکے ہیں۔

ان فرائض کی بجا آوری پر ریاست کی جانب سے والیوں کو تنخواہ اور بقدر ضرورت معاوضہ بھی ادا کیا جاتا تھا(۳۸۵) اور اس کی شرح رسول اللہؐ نے خود مقرر فرما دی تھی، یعنی:

من کان لنا عاملاً فلیکتسب زوجۃ فان لم یکن لہ خادم فلیکتسب خادماً وان لم یکن لہ مسکن فلیکتسب مسکناً ومن اتخذ غیر ذلك فھو غال۔(۳۸۶)

(جو شخص ہمارا عامل ہو اس کو ایک بیوی کا خرچ لینا چاہیے اگر اس کے پاس نوکر نہ ہو تو نوکر کا اگر مکان نہ ہو تو مکان کا خرچ لینا چاہیے لیکن اگر کوئی اس سے زیادہ لے گا تو وہ خائن ہوگا)

ہر صوبہ میں گورنروں کا تقرر بھی رسول اللہؐ خود فرماتے تھے اور اگر ان کے بارے میں کسی قسم کی شکایتیں ملتی تھیں یا ایک

جگہ کے بجائے کسی دُوسری جگہ کا تقاضا شدید ہوتا تھا تو ایک والی کا تبادلہ دوسری جگہ کر دیا جاتا تھا۔ نیز اطمینان بخش کارکردگی نہ ہونے کی بنا پر معزول بھی فرمادیا کرتے تھے۔

بہر حال صوبہ کی امارت و ولایت کے سلسلے میں مندرجہ بالا پہلو ایسے ہیں جن کی بکثرت مثالیں ماضی و حال کے انتظام حکومت میں مل سکتی ہیں اور اس قسم کی لچک کا ہونا ایک صحت مند سیاسی نظام کے لئے بہت ضروری ہے۔ ہمارا جائزہ اس بات کو واضح کرنے کے لئے کافی ہے کہ رسولؐ اللہ نے گورنروں کے تقرر اور صوبائی نظام کی ترکیب و ترتیب دونوں میں گہرے سیاسی شعور و تجربہ اور بیدار مغزی کا ثبوت پیش کیا۔

حواشی

باب اوّل ۔ بعثت نبوی کے وقت دنیا کا سیاسی نظام

[۱] Bryce, James Viscount, The Holy Roman Empire, MacMillan & Co. Ltd., London, 1950, p. XXXI.

[۲] بلنچلی ۔ جے ۔ کے ۔ نظریۂ سلطنت ۔ ترجمہ قاضی تلمذ حسین (مقابلہ کتاب اصل جرمن ۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی) جامعہ عثمانیہ ۔ دکن ۱۹۲۸ء (ص ۳۰۸) ۔ اغسطس ۲۷ قم میں برسرِ اقتدار آیا (BRYCE, P. XIX) اس کی حکومت کے ۴۲ برس بعد حضرت عیسیٰؑ پیدا ہوئے (ابنِ خلدون ۔ عبدالرحمٰن المغربی ۔ کتاب العبر و دیوان المبتدا و الخبر فی ایام العرب والعجم والبربر ومن عاصرہم من ذوی السلطان الاکبر ۔ تصحیح نصر ابو الوفا الهورینی (بولاق مصر ۱۲۸۴ھ ج ۲ ص ۱۹۸) اسی کے دور سے "رومی امن" کا آغاز ہوتا ہے (کرین برنٹن، جان بی کرسٹوفر، رابرٹ ایل ولف ۔ تاریخ تہذیب ۔ ترجمہ غلام رسول مہر ۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ۱۹۶۵ء حصہ اوّل ص ۱۵)

[۳] بیوری ۔ جے ۔ بی ۔ تاریخ سلطنت روما ۔ ترجمہ ہاشمی فرید آبادی ۔ جامعہ عثمانیہ ۔ دکن ۱۹۲۹ء ۔ ص ۱۹۹ ۔

[۴] کرین برنٹن وغیرہ ۔ ص ۱۴۳ ۔

[۵] Webster's Biographical Dictionary. G. & C. Marrian Co., U.S.A.

[۶] بلنچلی ۔ ص ۳۰۸ ۔ [۷] بیوری ۔ ص ۸۵۷، ۸۵۸ ۔

[۸] کرین برنٹن وغیرہ ۔ ص ۱۵ ۔ [۹] BRYCE, P. XX.

[۱۰] IBID., P. XXXI قسطنطنیہ کی بنیاد (۳۲۶ء تا ۳۳۰ء میں) پڑی ۔ پہلے یہ شہر بزنطیم کہلاتا تھا لیکن قسطنطین نے اسے از سرِ نو آباد کر کے اپنے نام پر قسطنطنیہ سے موسوم کیا (ابن خلدون ج ۲ ص ۲۱۰)

[۱۱] ایضاً ج ۲ ص ۲۱۰ [۱۲] Bryce, p.XXXI اور دیکھیے:

Gibbon, Edward, The Decline and Fall of the Roman Empire, The Modern Library, New York, Vol.I, p.634.

[۱۳] ڈننگ لکھتا ہے: "فلسفۂ سیاسیہ کے نقطۂ نظر سے ازمنۂ وسطیٰ کا خاص الخاص واقعہ یہ ہے کہ تمام رومی شہنشاہی بلکہ اس کی حدود کے باہر بھی مذہب عیسوی قائم ہو گیا اور مسیحی کلیسا کو ترقی ہوئی۔" (ڈننگ ۔ ولیم آرچ بالڈ ۔ نظریاتِ سیاسیہ ۔ (ازمنۂ قدیم و قرونِ وسطیٰ) ترجمہ قاضی تلمذ حسین ۔ جامعہ عثمانیہ ۔ دکن ۱۹۴۴ء ج ۱ ص ۱۴۳)

[۱۴] BRYCE, P. XXXI. [۱۵] LBID. نیز دیکھیے GIBBON, VOL.1, P. 1027

[۱۶] BRYCE, P. XXXI. [۱۷] Ebenstein, William, Great Political Thinkers (Plato to the Present), Holt Rinehart & Winston, Inc., New York, 1969, p. 171.

[۱۸] جسٹینین کا دور شہنشاہی ۵۲۷ء میں شروع ہوتا ہے اور ۵۶۵ء میں ختم ہو جاتا ہے (WEBSTERS, P. 1684) سانٹا صوفیہ کی تعمیر اسی کے عہد میں ہوئی (کرین برنٹن وغیرہ ص ۱۵) اور رومی قوانین کی ترتیب نو (۵۲۹ء۔ ۵۳۴ء) بھی اسی کے زمانہ میں ہوئی۔ (BRYCE, P. XXXIII)

[۱۹] تھیچر، آلیور، اور شول فرڈینڈ۔ تاریخ یورپ۔ ترجمہ عبدالماجد، نواب حیدر یار جنگ، قاضی تلمذ حسین۔ جامعہ عثمانیہ۔ دکن ۱۹۳۲ء حصہ اول ص ۴۵۔ [۲۰] ڈننگ ص ۱۳۳۔

[۲۱] GIBBON, VOL.II, P.752.

[۲۲] بلنچلی۔ حکمران کے اختیار و اقتدار کے لیے: ص ۳۸۳ تا ۳۸۵، ۳۸۸، ۳۸۹ اور ۳۹۰۔

[۲۳] ایضاً ص ۳۸۵۔ [۲۴] ایضاً ص ۳۸۶۔

[۲۵] Briffault, Robert, The Making of Humanity, Allen & Unwin Ltd., London, 1928, p. 159.

[۲۶] بلنچلی ص ۳۸۹ [۲۷] ایضاً ص ۴۰۔

[۲۸] ایضاً ص ۴۱۔ [۲۹] ایضاً ص ۳۴۹۔

[۳۰] Lawrence C. Wanlass, Gettell's History of Political Thought, Allen & Unwin, Ltd., London, 1961, p. 94.

[۳۱] ایضاً [۳۲] ڈننگ ص ۱۳۹ [۳۳] ایضاً ص ۱۴۱ [۳۴] ایضاً ص ۲۸۷-۲۸۸

[۳۵] ٹیوٹن جرمن نسل وہ تھی جس نے روم کی شہنشاہی کو شکست دے کر شاہی اقتدار حاصل کر لیا تھا۔ ازمنۂ وسطیٰ میں ہر جگہ ٹیوٹن حکمران تھے۔ کلیسا کا مذہبی تصور اور رومی تہذیب دونوں ان میں جمع تھیں۔ اس کے بعد جدید دور (پندرھویں صدی کے نصف آخر سے) شروع ہوتا ہے۔ بلنچلی ص ۲۶۹۔

[۳۶] تفصیل کے لیے: LAWRENCE, PP. 105, 106 [۳۷] ایضاً ص ۹۳

[۳۸] ایضاً ص ۱۰۷ [۳۹] ایضاً ص ۱۰۷ [۴۰] ڈننگ لکھتا ہے کہ:

"زمانۂ وسطیٰ غیر سیاسی زمانہ تھا" (ج ۱ ص ۱۳۳) اور سبائن رقمطراز ہے کہ:

"سیاسی اور علمی دونوں اعتبار سے مغربی یورپ جس کا مرکز بحیرۂ متوسط تھا پوری دنیا میں تگ و تاز کرنے کے بجائے محض اپنے ہی حدود میں محدود ہو گیا تھا۔" اور پھر لکھتا ہے کہ:

"چھٹی سے نویں صدی عیسوی تک یورپ کی حالت ایسی تھی کہ جہاں فلسفیانہ و مذہبی سرگرمیوں کی زیادہ گنجائش نہ تھی۔"

Sabine, George, H. A History of Political Theory, G.G. Harrap & Co., Ltd., London, 1966, p. 198, 199.

[۴۱] LAWRENCE, P. 107.

[۴۲] مشہور امریکی مستشرق ایس پی اسکاٹ نے ایک جگہ لکھا ہے، "حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مولود مسعود سے ایک صدی پیشتر سخت ترین افسوسناک جہالت نے دُنیائے مسیحی کے منہ کو کالا کر رکھا تھا" (اسکاٹ۔ ایس پی، تاریخ اندلس۔ ترجمہ محمد خلیل الرحمٰن۔ مطبوعہ لاہور۔ ص ۴۶) آگے لکھتا ہے:

"تمام ملک تباہی کامل کی تصویر تھا۔ عوام الناس کے قوائے عقلی و دماغی اور جذبات بلند نظری کو دبائے رکھنا سلطنت کا ایک قاعدہ مستمرہ تھا (ایضاً ص ۷۰)۔ بدقسمتی تو یہ ہے کہ اس زمانے میں صرف یہی خرابیاں نہیں تھیں، علم کے خلاف ایک باقاعدہ سازش ہو رہی تھی۔ اس کا اثر ان مقامات پر زیادہ تھا کہ جہاں تعلیم کی سخت ضرورت تھی خواہ نامکمل اور ناقص ہی سہی، اگر تعلیم ہوتی تو کم از کم آثارِ قدیمہ کی قدر و قیمت کو تو سمجھتے اور ان کو باقی رکھنے کی فکر تو کرتے۔" (ایضاً ص ۷۰، اور ملاحظہ ہو ص ۱۱۱) [۴۳] ایضاً ص ۱۱۱۔

فارس میں شہنشاہیت کا دور (از کیومرث تا یزدجرد) بقول ابنِ خلدون تقریباً چار ہزار دو سو اٹھاسی سال کی مدت پر پھیلا ہوا ہے۔ جیسا کہ ابنِ سعید نے کتاب "تاریخ الامم" تصنیف علی بن حمزہ اصفہانی سے نقل کیا ہے (ابن خلدون ج ۲ ص ۱۵۴)

کیومرث در اصل دُوسرے افسانوی دور کا پہلا آدمی ہے جس نے نئے شاہی خاندان (پیشدادیہ) کی بنیاد رکھی۔ طہورث، جمشید، فریدون، منوچہر وغیرہ اس کے بعد آتے ہیں۔ گرشاسپ اس دور (پیشدادیہ) کا آخری حکمران تھا۔ تیسرا افسانوی دور (کیانیہ) کے ممتاز حکمران کیقباد، کیخسرو وغیرہ ہیں۔

[۴۴] طبری کا بیان ہے کہ:

"لہراسب کے زمانہ میں ملوک روم، ملوک مغرب، ملوک ہند وغیرہ شاہانہ فارس کو سالانہ خراج و وظائف ادا کرتے تھے اور لہراسب کی عظمت و جلالت اور ہیبت و تعظیم کا اظہار "ملک الملوک" (شاہوں کے شاہ) کے الفاظ سے کیا کرتے تھے۔" (طبری۔ ابوجعفر محمد ابن جریر۔ تاریخ الرسل والملوک۔ تحقیق۔ محمد ابوالفضل ابراہیم۔ دار المعارف۔ مصر۔ ۱۹۶۰ء۔ ج ا ص ۵۴۱)

[۴۵] سکندر کے حملے کے بعد تقریباً دو سو چھیاسٹھ سال تک اشکانی (اشغانی) ملوک الطوائف نے فارس پر حکومت کی۔ ان اشکانیوں کے زمانہ میں ہی حضرت عیسیٰؑ نے ارضِ فلسطین میں خدا کی بادشاہت کا اعلان کیا۔ اشکانیوں

اور ملوک الطوائف کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو:
الدینوری - ابوحنیفہ احمد بن داؤد - الاخبار الطوال - دار احیاء الکتب العربیہ - قاہرہ ۱۹۶۰ء ص ۳۸ تا ۶۱) نیز طبری (ج ۱ ص ۵۰۰ تا ۵۸۴) اور المسعودی - ابی الحسن علی بن الحسین بن علی - مروج الذہب و معادن الجوہر - مطبعۃ السعادۃ - مصر - ۱۹۵۸ء (ج ۱ ص ۲۲۴ و مابعد) وغیرہ۔

[۴۶] مثلاً سابور ذوالاکتاف کی عرب پر فوج کشی (ابن خلدون ج ۲ ص ۱۶۲) اور بلادِ روم پر حملہ (ایضاً ص ۱۶۳) یا اسی طرح نوشیرواں بن قباد (جس کے عہدِ حکومت میں پیغمبرِ اسلام کی ولادت ہوئی) نے رومیوں پر چڑھائی کی، حلب، قبرص، حمص، انطاکیہ اور اسکندریہ کو فتح کیا۔ ملوک قبط پر خراج قایم کیا، رومی، چینی، تبتی بادشاہوں نے بطور نذرانہ تحائف بھیجے، سراندیپ پر فوج کشی، حیرہ پر قبضہ اور یمن میں مسروق (شاہِ حبشہ) کو قتل کرا کے ابن ذی یزن کو حکمران بنایا (ایضاً ص ۱۷۷) پرویز نے بھی رومیوں سے جنگ کی (الدینوری ص ۱۰۶، ۱۰۷)۔ عربوں سے لڑائیاں (ایضاً ص ۱۱۱، ۱۲۰) [۴۷] ان میں سے یہ چار ادوار یا طبقات مشہور ہیں:

۱۔ پیشدادیہ ۲۔ کیانیہ ۳۔ اشکانیہ اور ۴۔ ساسانیہ۔

ان طبقات کی تفصیل بادشاہوں کے نام اور اہم واقعات کی تصریح اگرچہ اکثر مورخین نے کی ہے مثلاً طبری (ج ۱ ص ۳۰۵ و مابعد)، مسعودی (ج ۱ ص ۲۲۰ تا ۲۸۱)، ابنِ اثیر (عزالدین ابی الحسن علی۔ الکامل فی التاریخ دار صادر للطباعۃ والنشر۔ بیروت ۱۹۶۵ء ج ۱ ص ۲۰۷ تا ۵۰۱) وغیرہ لیکن اس سلسلے میں واضح ترین بیان ابنِ خلدون (ج ۲ ص ۱۵۴ تا ۱۸۲) کا ہے۔

[۴۸] اس میں سابور (شاپور) اوّل (مدّتِ حکومت ۳۱ سال - طبری ج ۲ ص ۴۴)، سابور ذوالاکتاف (۷۲ سال - طبری ج ۲ ص ۶۱)، فیروز بن یزدگرد (۲۶ سال - ایضاً ص ۸۸)، قباد بن فیروز (۴۵ سال - الدینوری ص ۵۹ تا ۶۱)، نوشیرواں (۴۲ سال یا ۵۴ سال - طبری ج ۲ ص ۱۰۳) اور ساسانیوں کے آخری حوصلہ مند حکمران خسرو پرویز بن ہرمز (۳۲ سال - ایضاً ص ۲۱۸) کو شامل کیا جا سکتا ہے۔

[۴۹] ندوی - ابوالحسن علی - انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر - مکتبۂ اسلام - لکھنؤ (مقدمہ ۱۹۷۳ء) ص ۵۰ - [۵۰] ایضاً ص ۵۰، ۵۱۔

[۵۱] سابور ذوالاکتاف جس نے ایک عرصہ تک حکمرانی کی، جب تخت پر بیٹھا تو شیر خوار ہی تھا - دیکھیے: ابن خلدون (ج ۲ - ص ۱۶۲) اسی طرح اردشیر بن شیرویہ بمشکل سات سال کا تھا کہ اسے شہنشاہ بنا لیا گیا۔
(طبری ج ۲ ص ۲۳۰)

[۵۲] کسریٰ پرویز کی دونوں لڑکیوں یعنی پوران (طبری ج ۲ ص ۲۳۱) اور آزرمیدخت (ایضاً ص ۲۳۲) کو تختِ حکومت پر جلوہ افروز کیا گیا۔

[۵۳] غلام سرور - ڈاکٹر - تاریخِ ایرانِ قدیم - مکتبہ خورشید جہاں - کراچی - ۱۹۶۵ء ج ۱ ص ۱۴۶-

[۵۴] ایضاً ص ۱۴۷، ۱۴۸ - [۵۵] طبری ج ۲ ص ۲۳۰ [۵۶] مسعودی ج ۱ ص ۲۸۰

[۵۷] طبری ص ۲۳۱ [۵۸] ایضاً ص ۲۳۲ [۵۹] ایضاً ص ۲۳۲ [۶۰] ایضاً ص ۲۳۲

[۶۱] ایضاً ص ۲۳۲
ابنِ اثیر نے بھی طبری کی تائید میں آزرمیدخت کے جانشین کی حیثیت سے کسریٰ بن مہر جشنس کا ذکر کیا ہے (ج ۱ ص ۵۰۰) لیکن ابن خلدون نے اس کا کوئی ذکر نہیں کیا اور آزرمیدخت کے بعد فرخ زاد کا نام رکھا ہے (ج ۱ ص ۱۸۲) [۶۲] طبری ج ۲ ص ۲۳۳ - ابنِ اثیر اور ابنِ خلدون دونوں نے اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔

[۶۳] طبری ج ۲ ص ۲۳۴ -

[۶۴] یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ آخری بادشاہ یزدگرد سے پہلے ابنِ خلدون نے ایک اور حکمران حض جاره کا بھی ذکر (ج ۲ ص ۱۸۲) کیا ہے جو ۶ ماہ بعد قتل ہو گیا لیکن دوسرے مآخذ میں عام طور پر اس کا نام نہیں ملتا۔

[۶۵] یہ طبری کا بیان ہے (ج ۲ ص ۲۳۴) ابنِ اثیر مدت صرف ۲ سال لکھتا ہے (ج ۱ ص ۵۰۱)۔

[۶۶] ولم یکن من بیت الملك (ابن اثیر ج ۱ ص ۴۹۹)۔

[۶۷] ابن ہشام - السیرة النبویہ (تحقیق و شرح وغیرہ مصطفیٰ السقا، ابراہیم الابیاری، عبدالحفیظ شبلی، مطبعۃ مصطفیٰ البابی الحلبی و اولادہ - مصر ۱۹۳۶ء ج ۱ ص ۶۴، ۶۵)۔ اس واقعہ کا تذکرہ کم و بیش تمام مورخین نے صراحت سے کیا ہے۔ مثلاً طبری (ج ۲ ص ۱۳۹ و مابعد)، مسعودی (ج ۱ ص ۶۷) وغیرہ۔ اہلِ دربار (عظمائے فارس یا شاہی مجلس مشاورت) نے یہ مشورہ دیا تھا کہ "ان فی سجونك رجالاً قد حبستم للقتل (ابنِ ہشام ج ۱ ص ۶۵)۔

[۶۸] ایضاً ج ۱ ص ۶۵، ۶۶ - [۶۹] طبری ج ۲ ص ۲۲۰ [۷۰] ندوی - ابوالحسن علی - ص ۸۵

[۷۱] طبری ج ۲ ص ۱۰۳ (یعنی از ۵۳۱ء تا ۵۷۹ء) مدتِ حکومت کے بارے میں جزوی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ مثلاً طبری نے ہی ۴۸ سال کی مدت بھی دی ہے۔ اسی طرح ابنِ اثیر نے ۴۴ یا ۴۷ سال لکھے (ج ۱ ص ۴۳۹)۔

[۷۲] طبری ج ۲ ص ۱۷۶ - دینوری نے نہ معلوم کس طرح اس کی مدتِ فرمانروائی ۱۹ سال لکھ دی ہے جو صحیح نہیں ہے۔

[۷۳] طبری ج ۲ ص ۲۱۸ -

[۷۴] یہاں یہ وضاحت بے جا نہ ہو گی کہ زوال و انحطاط کی تیز رفتاری اور حکمرانوں کے عزل و نصب کا جو عالم فارس میں رہا ہے اسی طرح کم و بیش روم میں بھی رہا ہے۔ بلکہ روم میں معاملہ دو طرفہ ہے۔ یعنی حکمرانوں کا انتشار و زوال علیحدہ اور بطارقہ یا مذہبی و کلیسائی قواد (پاپائے روم) کا علیحدہ مثلاً سلاطین کی فہرست دیکھیے جسٹین دوم (۵۶۵ء تا ۵۷۸ء)، ٹائبرس دوم (۵۷۸ء تا ۵۸۲ء)، مارس (MAURICE - ۵۸۲ء تا ۶۰۲ء) فوکس (PHOCAS - ۶۰۲ء تا ۶۱۰ء) اور عہدِ نبوی کا آخری معاصر - ہرقل: (HERACLUIS - ۶۱۰ء تا ۶۴۱ء) دوسری طرف،

پاپائے روم کا سلسلہ ملاحظہ کیجئے (جان سوم ۵۶۰ء) گریگری اعظم (۵۹۰ء) بینین (۶۰۴ء) بونیفس سوم (۶۰۴ء) بونیفس چہارم (۶۰۷ء) ڈیئسڈیڈٹ (۶۱۵ء) بونیفس پنجم (۶۱۸ء) ہونوریس اوّل (۶۲۵ء) تفصیل کے لیے: BRYCE, P. XXII, XXIII. [۷۵] طبری ۲ ص ۱۵۴۔

[۷۶] طبری نے لکھا ہے کہ ہجرتِ نبویؐ کے وقت پرویز کی حکومت کو ۳۲ سال ۵ ماہ اور ۱۵ دن ہو چکے تھے (ج ۲ ص ۲۱۸)

[۷۷] طبری ج ۲ ص ۱۹۳۔ [۷۸] ایضاً

[۷۹] ھذا اول یوم انتصف العرب من العجم و بی نصروا (ایضاً)

[۸۰] سلطنت فارس کا خاتمہ ۶۵۲ء میں ہوا۔

[۸۱] سلیمان ندوی۔ سید۔ سیرۃ النبیؐ۔ مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۹۵۱ء۔ ج ۴ ص ۲۱۳۔

[۸۲] ندوی۔ ابوالحسن علی۔ ص ۴۸۔ [۸۳] ایضاً ص ۴۹۔

[۸۴] Luigi Parati, History of Mankind (Cultural & Scientific Develop- ment), Tr. G.F.[illegible]. Chiloq and Sylina Chilver, London, 1965, Vol.II, p. 160.

[۸۵] ایضاً (واضح رہے کہ راجہ بالعموم اپنے بڑے بیٹے کو نامزد کیا کرتا تھا) [۸۶] ایضاً ص ۱۶۰۔

[۸۷] ہیراچند اوجھا۔ رائے بہادر مھوپا دھیائے گوری شنکر۔ قرونِ وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب۔ ترجمہ منشی پریم چند۔ ہندوستانی اکیڈیمی۔ الہ آباد، ۱۹۳۱ء ص ۱۸۱۔ [۸۸] LUIGI PARATI, P. 164.

[۸۹] [illegible], History of India, Calcutta, 25th (ed), p. 17[illegible].

[۹۰] Smith, V.A., History of India, Oxford, 1957, p. 335.

[۹۱] ایضاً ص ۱۷۶۔

[۹۲] MUJAMDAR, R.C. ANCIENT INDIA, BANARAS, 1952, P. 260.

[۹۳] SMITH, P. 176. [۹۴] ہیراچند اوجھا ص ۱۹۳، ۱۹۴۔

[۹۵] BANERJEA, PRAMATHANATH, PUBLIC ADMINISTRATION IN ANCIENT INDIA, MACMILLAN & CO., LTD., LONDON, 1916, P. 61.

[۹۶] شودر، وہ بدقسمت طبقہ تھا جس کو قانونی طور پر اپنے سے تین بڑی ذات والوں کی خدمت کرنی پڑتی تھی۔ ان کی حیثیت شہری اور مذہبی قانون کی رُو سے جانوروں سے پست اور کتوں سے زیادہ ذلیل تھی (ندوی۔ ابوالحسن علی۔ ص ۶۴)

مولانا سلیمان ندوی نے لکھا ہے:

"شودروں کی قوم ایک ایسی غلامی میں مبتلا تھی کہ تعلیم و تربیت، تہذیب و اخلاق اور دین و ایمان سے محروم رہنا

اس کا فرض تھا۔ وید کی آواز بھی اس کے کان میں پڑ جائے تو اس میں سیسہ پگھلا کر ڈال دینے کا حکم تھا" (سلیمان ندوی۔ ج ۴ ص ۲۲۲، ۲۲۳)

[۹۷] سلیمان ندوی ج ۴ ص ۲۲۱ (بحوالہ آر۔ سی۔ دت کی ہندوستان قدیم ص ۲۴۲، ۲۴۳)

[۹۸] (تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: سلیمان ندوی (ج ۴ ص ۲۳۲) اور ندوی، ابوالحسن علی (ص ۵۷) وغیرہ۔

[۹۹] ایضاً ص ۵۵۔ [۱۰۰] ہیرا چند اوجھا ص ۹۔

[۱۰۱] Benton William (ed), Encyclopaedia Britannica, Encyclopaedia Britannica Inc., Chicago, 1970, Vol.V, p.574.

[۱۰۲] چینی۔ بدرالدین، مولوی۔ چین و عرب کے تعلقات اور ان کے نتائج۔ انجمن ترقی اردو۔ کراچی ۱۹۴۹ء ص ۴۔

[۱۰۳] ایضاً ص ۴، ۵ [۱۰۴] ایضاً ص ۹ [۱۰۵] ایضاً ص ۱۱ [۱۰۶] ایضاً ص ۱۱۔

[۱۰۷] بینٹن (برٹانیکا) ص ۵۸۰ [۱۰۸] ایضاً [۱۰۹] ایضاً [۱۱۰] ایضاً [۱۱۱] ایضاً

[۱۱۲] چینی۔ ص ۱۲ [۱۱۳] ایضاً [۱۱۴] ندوی۔ ابوالحسن علی۔ ص ۲۷ [۱۱۵] ایضاً

[۱۱۶] حبشہ کے سلسلے میں تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: سلیمان ندوی، سید۔ ارض القرآن۔ مطبع معارف اعظم گڑھ۔ ۱۹۵۵ء۔ جلد اول ص ۳۰۳۔

[۱۱۷] تفصیلات کے لیے دیکھئے: ندوی، ریاست علی، سید۔ تاریخ اندلس۔ مطبع معارف اعظم گڑھ۔ ۱۹۵۰ء۔ ص ۵۳ تا ۵۹۔ [۱۱۸] ابن خلدون۔ ج ۲۔ ص ۲۳۶ [۱۱۹] ندوی۔ ابوالحسن علی۔ ص ۴۳

[۱۲۰] ایضاً ص ۵۶ [۱۲۱] ایضاً ص ۴۴، ۴۵

[۱۲۲] اس مسئلہ پر اگرچہ اختلافات پائے جاتے ہیں لیکن سید سلیمان ندوی نے مختلف دلائل و براہین قائم کرکے اس کو مرجح قرار دیا ہے (سلیمان ندوی۔ ارض القرآن ج ۱ ص ۱۰۷ تا ۱۱۵) [۱۲۳] ایضاً ص ۱۱۶۔

[۱۲۴] ایضاً ص ۱۲۷۔ عاد کے سلسلے میں قرآن کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: الاعراف (۶۵ تا ۷۲)، الفجر (۷)، حم السجدہ (۱۵)، ہود (۵۰ تا ۶۰)، الشعراء (۱۲۳ تا ۱۴۰)، العنکبوت (۳۸)، الاحقاف (۲۱ تا ۲۷)، الفرقان (۳۸) وغیرہ۔ اس قوم کی اصلاح کے لیے حضرت ہود کو پیغمبر بنا کر مبعوث کیا گیا تھا مگر اپنے غرور، قوت، ظلم و جور، پرستش باطل کی بنا پر قوم عاد نے ان کی دعوت کو قبول نہ کیا جس کے نتیجے میں وہ تباہ و برباد ہو گئی۔

[۱۲۵] یعنی عاد، ثمود، جرہم، طسم، جدیس وغیرہ۔ [۱۲۶] سلیمان ندوی ج ۱ ص ۱۶۳ [۱۲۷] ایضاً ص ۱۲۹

[۱۲۸] ایضاً ص ۱۳۰ [۱۲۹] ایضاً ص ۱۳۰ [۱۳۰] ایضاً ص ۱۳۱ [۱۳۱] ایضاً ص ۱۳۲

[۱۳۲] ایضاً ص ۱۷۷ [۱۳۳] ایضاً ص ۱۸۵۔ اور قرآن میں ہے (الاعراف ۷۳)۔ [۱۳۴] ایضاً ص ۱۸۶۔

[۱۳۵] ایضاً ص ۱۸۶۔ قرآن میں ثمود کے بارے میں جو تفصیلات آئی ہیں ان کے لیے دیکھئے:

الفجر (۹)، الاعراف (۷۳ تا ۷۹)، الشعراء (۱۴۱ تا ۱۵۹)، المومن (۳۰، ۳۱)، النمل (۴۵ تا ۵۳)، الحاقہ (۴، ۵)، النجم (۵۱)، القمر (۲۳)، الشمس (۱۱ تا ۱۵)، ہود (۶۱ تا ۶۸، ۹۵)، التوبہ (۷۰)، ابراہیم (۹)، الاسراء (۵۹)، الحج (۴۲)، الفرقان (۳۸)، العنکبوت (۳۸)، صٓ (۱۳)، فصلت یا حٰم السجدہ (۱۳، ۱۷)، قٓ (۱۲)، الذاریات (۴۳ تا ۴۵)، البروج (۱۸)، الحجر (۸۰ تا ۸۴) وغیرہ۔

[۱۳۶] سلیمان ندوی ج ۱ ص ۱۸۷۔ [۱۳۷] الاعراف (۷۳)، النمل (۴۵) [۱۳۸] سلیمان ندوی ج ۱ ص ۱۹۸

[۱۳۹] جوفِ یمن میں معین نامی ایک آبادی تھی اس کے مشرق میں حضرموت اور جنوب میں سبا (موجودہ صنعا) واقع تھا اس کا وجود دوسری صدی ہجری تک باقی تھا۔ یہ شہر کسی زمانے میں حکومت کا مستقر تھا۔ عہدِ حکومت ۱۵۰۰ تا ۶۰۰ ق م تک رہا۔ معین کی حکومت یمن سے شروع ہو کر شام و مصر اور اشوریا (اسیریا) تک قائم تھی۔ (ایضاً ص ۲۰۴ تا ۲۰۶)

[۱۴۰] معین کے بعد سبا کا زمانہ آتا ہے۔ زمانۂ عروج غالباً ۱۱۰۰ ق م ہے، سبا کا اصلی مرکز حکومت جنوب عرب میں یمن کا مشرقی حصہ تھا۔ دارالحکومت شہر مآرب تھا لیکن رفتہ رفتہ اس کا دائرہ مغرب میں حضرموت تک وسیع ہو گیا تھا۔ سبا کے جانشین حمیر بنے۔ سبا اور حضرت سلیمان (۹۵۰ ق م) کی معاصرت قرآن، اسفارِ یہود اور انجیل سے ثابت ہے۔ یمن کے علاوہ حبشہ اور شمالی عرب میں بھی سبا کی آبادیاں تھیں۔ ۱۱۵ ق م میں اس کے مقبوضات کا شیرازہ بکھر گیا۔ حبش پر اکسومی خاندان قبضہ کر بیٹھا، شمالی عرب میں اسماعیلی عربوں نے خروج کیا، یمن میں حمیر نے ظہور کیا اور بقیہ قبائلی تمام ممالک میں تتر بتر ہو گئے۔ (ایضاً ص ۲۳۳ تا ۲۸۶ ملخصاً)

[۱۴۱] حمیر یا سبا کا طبقہ ثالثہ رابعہ (قوم تبع و اصحاب الاُخدود) کا آغاز پہلی صدی ق م سے اور اختتام ۵۲۵ء یعنی ذونواس کی موت پر ہوتا ہے۔ (ایضاً ص ۲۷۰)

[۱۴۲] Margolionth, D.S., The Relations Between Arabs and Israelites Prior to the Rise of Islam, Oxford University Press, London, 1924, p. 24.

[۱۴۳] LBID, P. 25.

[۱۴۴] آلِ منذر یا ملوکِ حیرہ کی تعداد ان کی ترتیب، مدتِ حکومت اور بعض دوسری تفصیلات میں مورخین کے یہاں کافی اختلاف پائے جاتے ہیں۔ دیکھئے: طبری (ج ۲ ص ۱۰۴ تا ۲۱۴)، مسعودی (ص ۹۰ تا ۱۰۲، ج ۱)، ابنِ اثیر (ج ۱ ص ۳۴۸ تا ۴۹۵) ابنِ خلدون (ج ۲ ص ۲۵۹ تا ۲۷۱)، جرجی زیدان۔ العرب قبل الاسلام۔ دارالہلال۔ مصر (ص ۲۲۰ تا ۲۳۹)۔

[۱۴۵] طبری (ج ۲ ص ۱۰۴)، ابنِ اثیر (ج ۱ ص ۳۹۴) اور ابنِ خلدون (ج ۲ ص ۲۶۵)۔

[۱۴۶] ابنِ خلدون (ج ۲ ص ۲۶۵) [۱۴۷] ایضاً ص ۲۷۰۔

[۱۴۸] ایاس ۹ سال تک نعمان کے بجائے حیرہ کا حاکم رہا۔ ایرانی مرزبان ہمرجان (یا نخیرجان۔ طبری ج ۲ ص ۲۱۳)

اس کے ساتھ حکومت میں شریک تھا۔ اس کے عہد ولایت کے آٹھویں سال (آلوسی نے نامعلوم کن مآخذ کی بنا پر ایاس کی کل مدتِ حکومت ۸ ماہ لکھی ہے۔ آلوسی۔ محمود شکری۔ بلوغ الارب فی احوال العرب۔ مطبعۃ دارالسلام بغداد۔ ۱۳۱۴ھ۔ ج ۲ ص ۱۹۱) رسول اللہ کی ہجرت ہوئی۔ اس کے بعد حیرہ کی ولایت زادویہ بن ماہان (طبری نے نام آزادبہ بن ماہان ج ۲ ص ۲۱۲ لکھا ہے) کے پاس آئی وہ حیرہ کا آخری مرزبان ثابت ہوا۔ اس نے کسریٰ کی بیٹی بوران کے عہدِ حکومت تک ، ۱ سال حکومت کی (ابن خلدون ج ۲ ص ۲۶۸)

[۱۴۹] زادویہ (یا زاوبہ ۶۱۸ء تا ۶۲۸ء) کے بعد المنذر بن النعمان المغرور پھر حکمران (۶۲۸ء تا ۶۳۲ء) ہوا اور یہی آخری ملوک حیرہ تھا۔ بحرین میں قتل ہوا۔ (جرجی زیدان ص ۲۳۹) [۱۵۰] ابن خلدون ص ۲۷۱ ج ۲

[۱۵۱] ابن خلدون ج ۲ ص ۲۷۹ [۱۵۲] ایضاً ص ۲۸۰

[۱۵۳] جرجی زیدان ص ۲۰۸۔ بروایت حمزہ الاصفہانی۔ لیکن علامہ سید سلیمان ندوی نے اس روایت کی تردید (ارض القرآن ج ۲ ص ۸۰) کی ہے اور لکھا ہے کہ یہ قطعاً غلط ہے۔ کیونکہ یہ قطعی طور سے معلوم ہے کہ انباط کی حکومت رومیوں کے زیر اقتدار ۱۰۶ء تک باقی تھی نیز بطلیموس کے عہد تک یعنی دوسری صدی عیسوی تک آل غسان تہامہ میں موجود تھے۔ اس لیے بطور نتیجہ وہ لکھتے ہیں کہ ان کا زمانہ ۲۰۰ء تقریباً سے ۶۳۶ء (جبلہ بن ایہم) تک یعنی کوئی چارسو سال کا ہے۔ (دلائل کے لیے دیکھیے ص ۸۱، ۸۲) آل غسان کے بادشاہوں کی تعداد میں بھی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ مثلاً حمزہ نے تعداد ۳۲ بیان کی ہے (جبکہ اس میں عموماً بعض معاصر حکمران غسانی شہزادوں کو بھی شمار کرلیا گیا ہے) مسعودی نے تعداد ۱۹ (مروج، ج ۲ ص ۱۰۷) اور ابن قتیبہ نے ملوک الشام کے تحت صرف چند کا تذکرہ کیا ہے (ابن قتیبہ الدینوری۔ المعارف۔ المکتبۃ الحسینیہ۔ مصر ۱۹۳۴ء ص ۲۸۰ تا ۲۸۱) لیکن بقول سلیمان ندوی چارسو برس کی مدت کے لیے یہ تعداد کم ہے (سلیمان ندوی ج ۲ ص ۸۱) نولدیکی نے بھی تعداد ۱۰ بتائی ہے (جرجی زیدان ص ۲۰۹)۔

[۱۵۴] جرجی زیدان (ص ۲۰۰) یہ حوران میں تھا۔ عرب و شام کے درمیان جو حدود ہیں ان کو حوران کہتے ہیں اور ان ہی کا نام اذرعات بھی ہے۔ یہ قدیم زمانہ میں موآب عمان اور ادوم سے متعلق تھا۔ اور اس عہد سے پہلے یہاں انباط کی حکومت تھی۔ تدمر، رقیم، عمان، معان وغیرہ شہر اس میں آباد تھے اور مشہور ترین شہر بصریٰ تھا (سلیمان ندوی ج ۲ ص ۸۱) [۱۵۵] ابن خلدون ج ۲ ص ۲۸۰۔

[۱۵۶] سلیمان ندوی (ج ۲ ص ۸۳)۔ علامہ سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ ۶۱۶ء تک رومیوں نے ایک ایک کرکے اپنا ملک واپس لے لیا۔ حالانکہ یہ واقعہ ۶۲۳ء کا ہے جبکہ مسلمان بدر کی خوشیاں منا رہے تھے اور قرآن کی پیشگوئی کی صداقت ثابت ہو رہی تھی۔

[۱۵۷] الروم (۱ تا ۴)۔ ان آیات کی توضیح اور تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: القرطبی، الجامع الاحکام القرآن ج ۱۴

ص ا تا ۴ - نیز آلوسی - روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی ج ۲۱ ص ۱۶ -

[۱۵۸] ابن خلدون ج ۲ ص ۲۵۶ - [۱۵۹] ایضاً ص ۲۸۱ [۱۶۰] ایضاً ص ۲۸۲

[۱۶۱] ایضاً ص ۲۴۹ [۱۶۲] ایضاً ص ۲۵۳

[۱۶۳] بقول جرجی زیدان کندہ کی اصل اور ان کے وطن دونوں کے بارے میں مورخین کے بیانات مختلف ہیں (ص ۲۴۲) -
ہم نے قول راجح کو اختیار کیا ہے اور زیادہ تر ابن خلدون کے بیان کو معتبر مانا ہے -

[۱۶۴] ابنِ خلدون ج ۲ ص ۲۶۳ [۱۶۵] ایضاً ص ۲۷۲ [۱۶۶] ایضاً ص ۲۷۳

[۱۶۷] ایضاً ص ۲۵۲ [۱۶۸] ایضاً ص ۲۷۶ [۱۶۹] ایضاً ص ۲۴۴

[۱۷۰] ابنِ حزم کا قول ہے کہ علاؔ بن الحضرمی بھی حضرموت کی اولاد سے ہیں - رسول اللہؐ نے انھیں بحرین (جہاں غالباً پہلے اہل بحرین کی حکومت تھی - المحبر ص ۷۷) کا والی مقرر کیا تھا (ابنِ خلدون ص ۲۷۵) -

[۱۷۱] دیکھیے : جرجی زیدان ص ۱۳۰ تا ۱۳۵ - [۱۷۲] سلیمان ندوی ج ۱ ص ۲۷۷ -

[۱۷۳] ایضاً ص ۲۷۸ [۱۷۴] ایضاً ص ۲۷۹ [۱۷۵] ایضاً ص ۲۷۸

[۱۷۶] ایضاً ص ۲۸۵ ، ۲۸۶ - [۱۷۷] ایضاً ص ۲۷۸ [۱۷۸] ایضاً ص ۲۷۹

[۱۷۹] ایضاً ص ۲۸۷ - قرآن میں بھی قومِ تُبّع کا دو مرتبہ ذکر کیا گیا ہے - دیکھیے : الدخان (۳۷) ، ق (۱۴) اور دونوں جگہ ان کے زور و قوت اور جبروت وعظمت کی طرف ہی اشارہ موجود ہے -

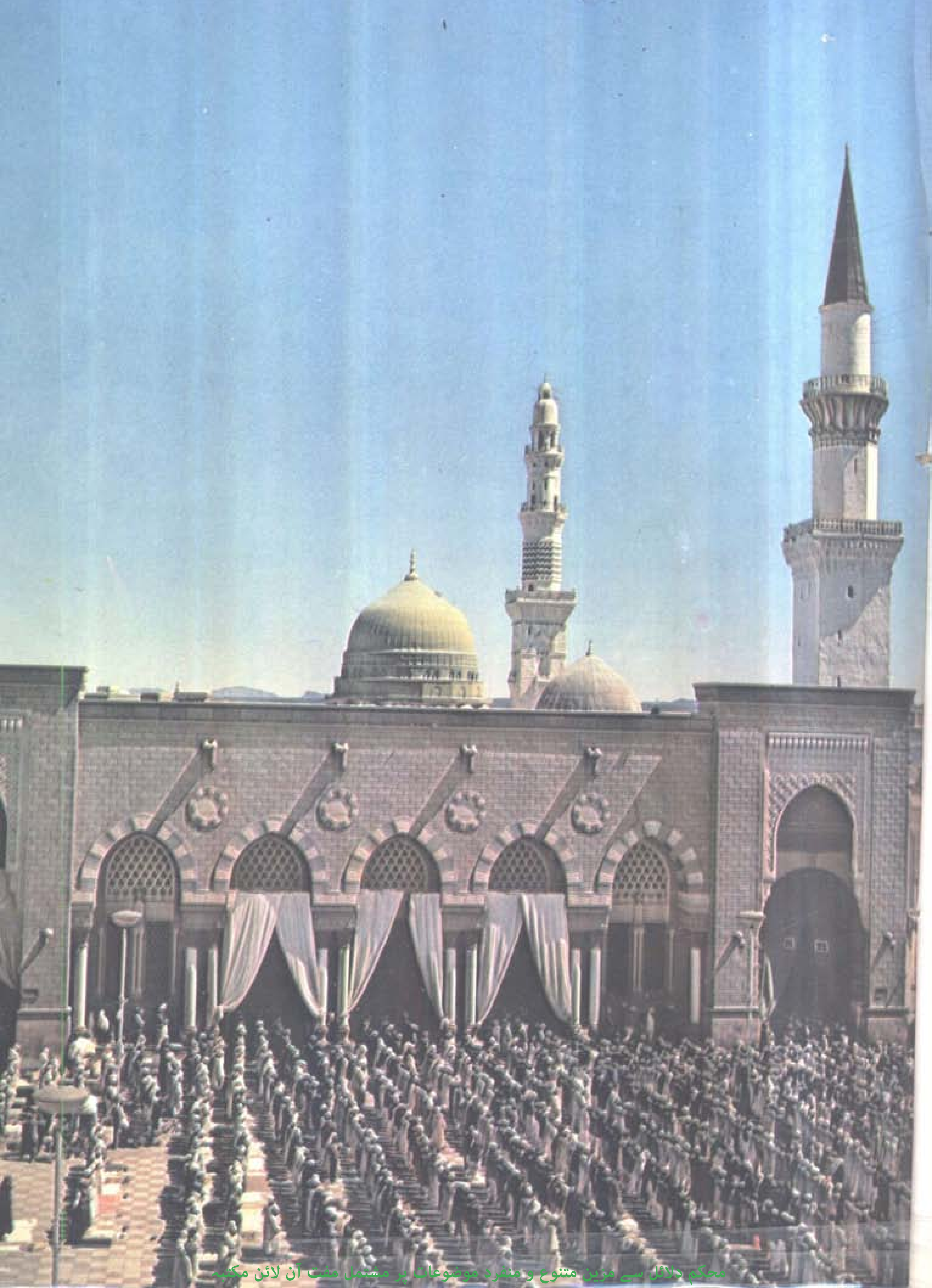
[۱۸۰] اس پر تقریباً تمام مورخین متفق ہیں - مثلاً ابنِ ہشام (ج ۱ ص ۳۲) - طبری (ج ۲ ص ۱۲۳) ، مسعودی (ج ۲ ص ۷۶) ، ابنِ اثیر (ج ۱ ص ۲۵۴ - ۴۳۱) وغیرہ -

[۱۸۱] مارگولیتھ نے لکھا ہے کہ : "زیادہ تر روایات کی رُو سے صرف ذونواس ہی اکیلا یہودی بادشاہ ہوا اور جب اس نے مذہب تبدیل کیا تھا تو اس نے اپنا نام یوسف (JOSEPH) رکھا جبکہ حبش مآخذ اور روایات سے اسے PHINEAS کے نام سے موسوم کرتے ہیں" (MARGOLIOUTH, P. 65)
الدینوری نے لکھا ہے کہ اس کا نام ذونواس اس لیے پڑا کہ اس کے ماتھے پر بالوں کی ایک لٹ لہراتی رہتی تھی - (ص ۶۱) [۱۸۲] ابنِ ہشام (ج ۱ ص ۳۷) اور طبری (ج ۲ ص ۱۲۳) وغیرہ -

[۱۸۳] البروج (۴ تا ۶) [۱۸۴] ابنِ ہشام (ج ۱ ص ۳۸) [۱۸۵] ایضاً ص ۳۹

[۱۸۶] ایضاً ص ۴۳ ، ۴۴ [۱۸۷] الفیل (۱) [۱۸۸] ابنِ ہشام ج ۱ ص ۵۰

[۱۸۹] اگرچہ روایتی طور پر تاریخ ولادت ۵۶۹ء سے ۵۷۱ء تک بیان کی جاتی ہے - لیکن ڈاکٹر حمید اللہ کی جدید تحقیقات کی روشنی میں آپ کی ولادت ۱۲ ربیع الاول ۵۳ ق ھ مطابق ۹ ستمبر ۵۶۹ء بروز پیر ہوئی - تفصیلات اور مباحث کے لیے دیکھیے :



Hamidullah, M., THE NASI, The Hijrah Calendar and the need of preparing a new concordance for the Hijrah and Gregorian Eras, Journal of the Pakistan Historical Society, Karachi, January 1968, Vol.XVI, p. 1 to 18.

[۱۹۰] ابن ہشام ج ۱ ص ۶۲ - نیز طبری ج ۲ ص ۱۳۳۔

[۱۹۱] ابنِ ہشام ج ۱ ص ۶۴، ۶۵ [۱۹۲] ایضاً ص ۶۶ تا ۷۰ [۱۹۳] ایضاً ص ۱۷

[۱۹۴] MARGOLIOUTH, P. 65. [۱۹۵] ابن ہشام ص ۱۷ [۱۹۶] ایضاً ص ۲۷

[۱۹۷] "ایک قلعہ ہوتا تھا۔ قلعہ کے آس پاس گاؤں کی صورت میں مختلف چھوٹی چھوٹی آبادیاں ہوتی تھیں۔ ان ہی کے مجموعہ کو "محفد" کہتے تھے۔ قلعہ داران کا حاکم ہوتا تھا۔ اس کا لقب اس کے قلعہ کے انتساب و اضافت سے رکھا جاتا تھا۔ مثلاً ذوغمدان، ذوثعلبان وغیرہ۔ ذو یمن زبان میں کلمۂ اضافت ہے اور اس کے معنی آقا کے ہوتے ہیں۔ ذو کی جمع اذواء (قلعہ داران) ہے۔ دُوسرے مرحلے میں یہ قلعے یا محافد مل کر ایک "مخلاف" کے تابع ہوتے تھے جس کو صوبہ کا ہم معنی سمجھنا چاہیے۔ حاکم مخلاف کا لقب "قیل" تھا۔ اس کی جمع اقیال ہے۔ یہ تمام اقیال ایک بادشاہ کے ماتحت ہوتے تھے۔ (سلیمان ندوی ج ۱ ص ۲۴۶ ملخصاً)

[۱۹۸] ملک یا بادشاہ کے علاوہ بعض دوسرے سیاسی عہدوں اور اداروں کا علم تاریخ عرب کے مطالعہ سے بخوبی ہو جاتا ہے مثلاً:
(۱) رداف یا ردف (وہ شخص جو بادشاہ کے دائیں جانب بیٹھتا۔ جب بادشاہ کسی مہم پر جاتا تو ردف اس کی جگہ بیٹھتا اور بادشاہ کی واپسی تک اس کا جانشین ہوتا تھا اور جب بادشاہ کی فوج آجاتی تو ردف مالِ غنیمت کا چوتھائی حصہ لیتا تھا) دیکھیے: آلوسی ج ۲ ص ۱۹۹۔
(۲) قواد (حمیر کے اقیال اور رومیوں کے یہاں بطریق کا جو درجہ تھا وہی عربوں کے یہاں قواد کا تھا)۔ ایضاً ص ۱۹۰۔
(۳) عریف (قبیلے اور محلہ کا منتظم ہوتا تھا وہ تمام امور کا انتظام کرتا۔ اہم لوگوں کے حالات اسی سے دریافت کیے جاتے تھے) ایضاً ص ۱۹۹، ۲۰۰۔

یہاں یہ وضاحت بھی نامناسب نہ ہوگی کہ اگرچہ وزارت کا عہدہ باقاعدہ طور پر عربوں کے یہاں رائج نہ تھا مگر عملاً کچھ لوگ وزیر کی حیثیت سے ہر ملک کے یہاں ہوتے تھے نیز اہلِ عرب "وزیر" کا واضح تصور رکھتے تھے مثلاً ملوک یمن میں سے ابوکرب تبع الاوسط کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتا تھا چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کچھ اشعار بھی مورخین نے نقل کیے ہیں (ایضاً ص ۱۰۵) اور یہ بعثت نبوی سے تقریباً ۷۰۰ سال قبل کا واقعہ ہے (ایضاً) [۱۹۹] جرجی زیدان ص ۱۵۷ [۲۰۰] ایضاً ص ۱۵۷

[۲۰۱] ایضاً ص ۱۵۷ [۲۰۲] ایضاً ص ۱۵۸ [۲۰۳] ایضاً ص ۱۷۸ [۲۰۴] ایضاً ص ۱۸۱

[۲۰۵] حمید اللہ۔ عہدِ نبویؐ میں نظامِ حکمرانی۔ مکتبہ ابراہیمیہ۔ دکن۔ طبع دوم۔ ج ۱ ص ۲۳۳۔

[۲۰۶] علامہ سلیمان ندوی نے اس کی نوعیت کے بارے میں لکھا ہے کہ "قصی نے مکہ میں جو چھوٹی سی ریاست قائم کی تھی اس کی حیثیت ایک شہری جمہوریت کی تھی۔ یونان کے شہر ایتھنز اور اسپارٹا کے طرزِ حکومت کا ایک دھندلا سا خاکہ قریش کی سرزمین میں نظر آتا ہے۔" (ارض القرآن ج ۲ ص ۱۰۴)

[۲۰۷]
Muir, Sir William, Life of Mahomet, London, 1861, Vol.I,p.ccii

علامہ سلیمان ندوی نے مختلف دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ قصی کا زمانہ پانچویں صدی عیسوی کا عہد اواسط ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: ارض القرآن (ج ۲ ص ۱۰۳، ۱۰۴)

[۲۰۸] ابنِ سعد۔ الطبقات الکبریٰ۔ دار صادر للطباعۃ والنشر۔ بیروت ۱۹۶۰ء۔ ج ۱ ص ۷۰۔

[۲۰۹] ان کی صحیح تعداد کے بارے میں اختلاف ہے۔ تقریباً تمام مورخین نے پانچ کے بارے میں تو بالکل اتفاق کیا ہے کہ یہ ادارے اس کے زمانے میں موجود تھے یعنی حجابہ، سقایہ، رفادہ، ندوہ اور لواء (ابنِ ہشام ج ۱ ص ۱۳۱، ۱۳۲) جبکہ الازرقی نے ان میں "قیادہ" کا اضافہ کیا ہے (الازرقی۔ ابو الولید محمد بن عبد اللہ بن احمد۔ اخبار مکۃ و ماجاء فیہا من الآثار۔ المطبعۃ الماجدیہ۔ مکہ۔ ۱۳۵۲ھ ج ۱ ص ۶۲) ابنِ سعد نے "حکومتہ" کو بھی شامل کیا ہے (ابنِ سعد ج ۱ ص ۷۰، ۷۱) اور ابن عبد ربہ نے مزید عمارہ، عقاب، سدانہ، مشورہ، اشناق، قبہ، اعنّہ، سفارہ، ایسار اور اموال المحجرہ کے عہدے بتائے ہیں (ابن عبد ربہ۔ شہاب الدین احمد۔ العقد الفرید۔ مطبعۃ العامرہ۔ مصر۔ ۱۲۹۳ھ ج ۲ ص ۴۶) یہ پتا نہیں چلتا کہ فی الحقیقت ان میں سے کتنے عہدے خود قصی کے زمانہ میں قائم تھے۔ اور کتنے عہدوں کا اضافہ بعد میں ہوا۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے مندرجہ بالا مناصب پر مزید چار (یعنی افاضہ، اجازہ، نسئی اور حلوان النفر) کا اضافہ تحریر کیا ہے مگر کسی سند کا ذکر نہیں کیا ہے (عہدِ نبویؐ میں نظامِ حکمرانی ص ۴۳)۔ صرف افاضہ کی تفصیل ابن ہشام نے "ما کانت علیہ عدوان من افاضۃ المزدلفہ" کے تحت دی ہے (ج ۱ ص ۱۲۷، ۱۲۸)۔ [۲۱۰] یہ فہرست ڈاکٹر حمید اللہ کے یہاں بھی (ص ۴۲) موجود ہے۔

[۲۱۱] ابنِ ہشام ج ۱ ص ۱۳۲۔ نیز دیکھیے: الازرقی (ج ۱ ص ۶۱)۔

[۲۱۲] تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: ابنِ ہشام (ج ۱، ص ۱۳۱، ۱۳۲) ابنِ سعد (ج ۱ ص ۷۰، ۷۱) الازرقی (ج ۲ ص ۶۰۔ ۶۱)۔ نیز دیکھیے: آلوسی (ج ۱ ص ۲۵۰ تا ۲۶۶) وغیرہ۔

[۲۱۳] حمید اللہ (عہدِ نبویؐ میں نظامِ حکمرانی) ص ۴۲۔ [۲۱۴] ایضاً ص ۴۳۔

[۲۱۵] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: ابن عبد ربہ (ج ۲ ص ۴۵) اور آلوسی (ج ۱ ص ۲۶۶، ۲۶۷)

[۲۱۶] مثلاً ایک شرط کبرسنی تھی۔ مگر ابوجہل نوعمر تھا۔ عطا و بخشش کی صفت ضروری تھی مگر ابوسفیان اور عامر بن طفیل بخیل تھے۔ کلیب بن وائل اور حذیفہ بن بدر ظالم ہونے کے باوجود بالترتیب ربیعہ اور غطفان کے سردار تھے۔ عقلمندی بھی

ایک لازمۂ سیادت تھی مگر عُیینہ بن حصن احمق ہونے کے باوجود سردار تھا افرادِ قبیلہ کی کثرتِ تعداد بھی ایک صفت تھی مگر سبل بن معبد سردار تھا حالانکہ بصرہ میں اس کے قبیلے کے دو آدمی بھی نہ تھے اور عتبہ بن ربیعہ تنگدست ہونے کے باوجود سردار تھا۔ (ملاحظہ ہو: آلوسی ص ۲۰۱) [۲۱۷] ایضاً ص ۲۰۰، ۲۰۱ [۲۱۸] ایضاً ص ۲۰۱۔

[۲۱۹] LBID. [۲۲۰] MARGOLIOUTH, P. 26.

[۲۲۱] حمید اللہ (عہدِ نبویؐ میں نظامِ حکمرانی) ص ۷۲ [۲۲۲] ایضاً ص ۳۹، ۴۰۔

[۲۲۳] اس سلسلے میں ہمیں متقدمین کے یہاں تفصیلات نہیں مل سکیں۔ لہٰذا ہم زیادہ تر آلوسی کے مرہونِ منت ہیں۔

[۲۲۴] حمید اللہ (عہدِ نبویؐ میں نظامِ حکمرانی) ص ۴۱، ۴۲ [۲۲۵] آلوسی ج ۲ ص ۱۹۹، ۲۰۰۔

[۲۲۶] ایضاً ص ۲۰۰ [۲۲۷] ایضاً ج ۳ ص ۱۹ [۲۲۸] ایضاً ص ۱۴۹ تا ۱۷۳ (بمعہ فہرست خطباءٌ)

[۲۲۹] ایضاً ص ۱۹۶۔ نسابوں کی فہرست کے لیے: ص ۱۹۶ تا ۲۰۵۔ [۲۳۰] ایضاً ج ۱ ص ۳۳۸۔

[۲۳۱] تفصیلات کے لیے: ایضاً ص ۳۳۸ تا ۳۶۱ [۲۳۲] ایضاً ص ۳۶۷ تا ۳۷۸۔

[۲۳۳] اسواق العرب پر تفصیلی بحث متقدمین میں سے ابن حبیب بغدادی نے اپنی کتاب المحبر (ص ۲۶۳ تا ۲۶۸) میں اور جدید مصنفین میں سے سید سلیمان ندوی (ارض۔ ج ۲ ص ۱۲۱ تا ۱۲۸) اور ڈاکٹر حمید اللہ نے (عہدِ نبویؐ میں نظامِ حکمرانی ص ۲۳۶ تا ۲۴۵) کی ہے۔

[۲۳۴] سلیمان ندوی (ارض القرآن) ج ۲ ص ۱۲۳، ۱۲۴ [۲۳۵] ایضاً

[۲۳۶] شلاً قریش۔ ابتداً میں قریش کے تمام خاندان مکہ سے باہر رہتے تھے مگر بعد ازاں ان کے دو فرقے ہو گئے۔ قریش البطاح اور قریش الظواہر (مسعودی ج ۲ ص ۵۹، ابنِ کثیر ج ۲ ص ۲۰۷) قریش البطاح تو قصی بن کلاب کی اولاد تھے اور قریش الظواہر ان کے علاوہ دیگر قبیلے تھے۔ قریش الظواہر وہ قبیلے تھے جو مکہ سے ایک مرحلہ یعنی ایک دن کی مسافت سے کم فاصلے کے اندر آباد تھے۔ اور "ضواحی" اس سے زیادہ فاصلے پر رہتے تھے۔ قریش اور کنانہ کے علاوہ مکہ کے قبائل مضر (اشجع، عبس، فزارہ، مرہ، سلیم، سعد بن بکر، عامر بن صعصعہ، ثقیف، تیم، رباب، ضبّہ، بنو اسد، ہذیل اور قارہ) تھے۔ تمام بادیہ نشین تھے جو چارہ اور پانی کی تلاش میں صحرا نوردی کرتے تھے۔

(دیکھئے: ابن خلدون ج ۲ ص ۳۳۴)

[۲۳۷] لیبان۔ گستاو۔ ڈاکٹر۔ تمدنِ عرب۔ ترجمہ سید علی بلگرامی۔ مقبول اکیڈیمی لاہور۔ سنہ ۱۹۳۶ء۔ ص ۴۰۔

[۲۳۸] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو:
حِطّی (HITTI)۔ عرب اور اسلام۔ ترجمہ مبارز الدین و محمد معین خان۔ ندوۃ المصنفین۔ دہلی۔ سنہ ۱۹۵۹ء۔ ص ۱۰۔

[۲۳۹] احمد امین۔ فجر الاسلام۔ مکتبہ النہضۃ المصریۃ۔ قاہرہ۔ سنہ ۱۹۶۴ء۔ ص ۹ تا ۱۱۔

حواشی

باب دوم ——— تاسیسِ ریاست

(۱) ریاست کی فکری بنیادیں

[۱] عربی زبان میں "دین" کا لفظ مندرجہ ذیل معنوں میں استعمال ہوتا ہے:
(الف) غلبہ واقتدار حکمرانی و فرمانروائی، دُوسرے کو اطاعت پر مجبور کرنا، اس کو اپنا غلام اور تابع امر بنانا۔
(ب) اطاعت، بندگی، خدمت، کسی کے لئے مسخر ہو جانا، کسی کے تحت امر ہونا۔
(ج) شریعت، قانون، طریقہ، کیش و ملت رسوم و عادات۔
(د) جزائے عمل، بدلہ، مکافات، فیصلہ، محاسبہ۔
ان معانی کے علاوہ قرآن لفظِ دین کو ایک جامع اصطلاح کی حیثیت سے استعمال کرتا ہے اور "اس سے ایک ایسا نظامِ زندگی مراد لیتا ہے جس میں انسان کسی کا اقتدار اعلیٰ تسلیم کر کے اس کی اطاعت و فرمانبرداری قبول کر کے اس کے حدود و ضوابط اور قوانین کے تحت زندگی بسر کرے۔ اس کی فرمانبرداری پر عزت، ترقی اور انعام کا امیدوار ہو اور اس کی نافرمانی پر ذلت و خواری اور سزا سے ڈرے۔" حوالہ اور تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: مودودی، ابوالاعلیٰ۔ قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں۔ مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی۔ لاہور۔ سنہ ۱۹۵۴ء۔ ص ۱۳۵ تا ۱۴۸۔

[۲] قرآن کی رُو سے صرف اسلام ہی حقیقی دین ہے اور اللہ کے یہاں اس کے سوا کوئی اور دین مقبول نہیں۔ دیکھئے: آل عمران (۱۹، ۸۵)، المائدہ (۳)۔

[۳] مودودی: مذہب کا اسلامی تصوّر۔ جماعت اسلامی۔ کراچی ۱۹۶۵ء ص ۴۔ [۴] الحدید (۲۵)۔

[۵] الصف (۹) یہی مضمون دو اور مقامات پر بھی بیان کیا گیا ہے: التوبہ (۳۳)، الفتح (۲۸)

[۶] ابنِ ہشام۔ ج ۱، ص ۳۱۶ [۷] ابنِ سعد۔ ج ۱۔ ص ۲۰۲ [۸] ابنِ ہشام ج ۱ ص ۳۱۴۔

[۹] Wellhausen, J. The Arab Kingdom and its Fall, tr. Margaret Graham Weir, Khayats, Beruit, 1963, Chap-1 (Introduction), p. 1.

[۱۰] سلیمان ندوی، سید: سیرۃ النبیؐ۔ مطبع معارف اعظم گڈھ۔ طبع سوم۔ ۱۹۵۱ء۔ ج ۴، ص ۴۰۵۔

[۱۱] مودودی، سید ابو الاعلیٰ۔ اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی۔ مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان۔ لاہور۔ طبع اول ۱۹۵۵ء، ص ۱۰۱۔ [۱۲] ایضاً ص ۱۰۲، ۱۰۳ [۱۳] ایضاً ص ۱۴۱

[۱۴] العنکبوت (۶۱، ۶۳)، لقمان (۲۵)، الزمر (۳۸)، الزخرف (۹)، مزید: المائدہ (۷۳)، النحل (۵۱)، المومنون (۹۱، ۱۱۷)، الحجر (۹۶)، الانعام (۱۹)، الانبیاء (۲۲)۔

[۱۵] مودودی۔ اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی۔ ص ۱۴۲

[۱۶] تفصیل کے لئے: ایضاً ص ۱۴۵ تا ۱۵۸ [۱۷] ایضاً ص ۱۶۳

[۱۸] الانعام (۸، ۵۰)، ھود (۱۲، ۳۱)، الفرقان (۷)

[۱۹] آل عمران (۸۰)، الاسراء (۴۰)، السبا (۴۰)، الصافات (۱۵۰)، النجم (۲۷)

[۲۰] الانبیآء (۲۷) [۲۱] الرعد (۱۳) [۲۲] المریم (۶) [۲۳] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: مودودی۔ اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی۔ ص ۱۶۰۔ ۱۶۷

[۲۴] راغب اصفہانی: المفردات فی غریب القرآن۔ مصطفی البابی۔ مصر ۱۹۶۱ء، ص ۴۰۱۔

[۲۵] البقرہ (۱۱۹)، الفاطر (۲۴) [۲۶] الاحزاب (۴۰)

[۲۷] النسآء (۷۹)، الانبیآء (۱۰۷)، السبا (۲۸) [۲۸] المائدہ (۳)

[۲۹] المائدہ (۷۲)، الاعراف (۵۹، ۶۵، ۷۳، ۸۵)، ہود (۵۰، ۶۱، ۸۴)، النحل (۳۶)، المومنون (۲۳، ۳۲)، النمل (۴۵)، العنکبوت (۱۶، ۳۶)، نوح (۳)، الرعد (۳۶)، الزمر (۱۱)

[۳۰] النسآء (۷۹)، الانبیآء (۱۰۷)، السبا (۲۸) [۳۱] الکہف (۱۱۰) [۳۲] الانعام (۱۲۵)

[۳۳] النسآء (۶۴، ۶۵، ۸۰)، الشعرآء (۱۳۱) [۳۴] النحل (۴۴) [۳۵] آل عمران (۱۶۴)

[۳۶] آل عمران (۳۱)، الاحزاب (۲۱) [۳۷] الاعراف (۱۵۷)، الحشر (۷) [۳۸] النسآء (۱۰۵)

[۳۹] لغت میں لفظ وحی متعدد معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً اشارہ کرنا، ارسال یعنی پیغام بھیجنا یا بتانا، چپکے سے کسی سے کچھ کہہ دینا اور فطرتاً کسی حکم پر مامور و مقرر کر دینا وغیرہ (ابن درید۔ جمھرۃ اللغہ۔ مطبع معارف العثمانیہ۔ دکن ۱۳۴۵ھ، ج ۱، ص ۱۷۱، ۱۷۲) لیکن شریعت اسلامی کی اصطلاح میں جو کلام یا اشارۂ الٰہی نبیوں اور رسولوں کی طرف بھیجا جاتا ہے اسے وحی کہتے ہیں۔ اسے ہم دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ "وحی خاص اس ذریعۂ غیبی کا نام ہے جس کے ذریعہ غور و فکر کسب و نظر اور تجربہ و استدلال کے بغیر خاص اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے فضل و لطف خاص سے کسی نبی کو کوئی علم حاصل ہوتا ہے۔" (سعید احمد اکبر آبادی۔ وحی الٰہی۔ ندوۃ المصنفین، دہلی ۱۹۵۲ء، ص ۲۵)

[۴۰] مودودی۔ اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی، ص ۱۷۴ [۴۱] الانبیآ (۱۰۷)
[۴۲] الفرقان (۷)، الاعراف (۱۸۴)، یونس (۲)، الحجر (۶) [۴۳] [۴۴] الاسرآ (۹۴)
[۴۵] یوسف (۱۰۹) مزید حوالے کے لئے: النحل (۴۳) ، الانبیآ (۷) [۴۶] الاسرآ (۹۵)
[۴۷] الزخرف (۳۱) [۴۸] الانعام (۱۲۴)
[۴۹] مودودی۔ اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی۔ ص ۲۰۴، ۲۰۵
[۵۰] البقرہ (۴، ۲۸۵)، آل عمران (۳، ۴، ۸۴)، الحدید (۲۵) [۵۱] الاعراف (۱۵۷)
[۵۲] الشعرآ (۱۹۲)، الحاقہ (۴۳)، الواقعہ (۸۰)، السجدہ (۲)
[۵۳] القیامہ (۱۷ تا ۱۹)، الاعلیٰ (۶)، الحجر (۹) [۵۴] ایضاً [۵۵] البقرہ (۱۸۵)
[۵۶] الفرقان (۱)، المدثر (۵۵)، عبس (۹۰) [۵۷] الاعراف (۳) [۵۸] المائدہ (۴۸)
[۵۹] البقرہ (۲)، السبا (۶)، الحاقہ (۵۱)، الاعراف (۵۲)، الفرقان (۶)، الکہف (۱)، الاسرآ (۹)
[۶۰] حٰم السجدہ (۴۲) [۶۱] البقرہ (۲، ۱۷۶)، آل عمران (۳)، المائدہ (۴۸)
[۶۲] النحل (۱۰ تا ۱۲) [۶۳] النجم (۳، ۴)، یونس (۱۵)
[۶۴] البقرہ (۴)، الانعام (۹۲)، الاعراف (۱۴۷)، النحل (۲۲)، الاسراء (۱۰)، المومنون (۷۴)۔
[۶۵] مودودی۔ اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی۔ ص ۲۴۴ [۶۶] الانعام (۱۶۲)

۲۔ تشکیلِ معاشرہ

[۶۷] رسول اللہؐ کا صاف ارشاد یہ ہے کہ: لیس لاحد علی احد فضل الا بدین و تقوٰی۔
(کسی کو کسی پر کوئی فضیلت حاصل نہیں مگر ہاں دین اور تقوٰی کے سبب)
ملاحظہ ہو: الخطیب العمری التبریزی۔ مشکٰوۃ المصابیح۔ اصح المطابع۔ کراچی ۱۳۶۸ھ۔ باب المفاخرہ والعصبیۃ۔ ص ۴۱۸۔
[۶۸] آپؐ کا ارشاد ہے: لیس منّا من دعا الی عصبیۃ۔ (جو عصبیت کی طرف بلائے وہ ہم میں سے نہیں ہے)
دیکھئے: ابوداؤد السجستانی۔ سنن۔ نور محمد۔ اصح المطابع، کراچی، ۱۳۶۹ھ، کتاب الادب، باب فی العصبیۃ، ج ۲، ص ۶۹۸، مزید دیکھئے: الخطیب العمری، ص ۴۱۸
[۶۹] الانبیآ (۱۰۷)، السبا (۲۸)، الفرقان (۱) [۷۰] الحجرات (۱۰)
[۷۱] القصص (۷۷) [۷۲] الحجر (۸۸)
[۷۳] قرآن کے یہ الفاظ اس نقشۂ حالات پر مہرِ صداقت ثبت کرتے ہیں کہ ظہر الفساد فی البرّ والبحر بما کسبت

ایدی الناس۔(الروم۔آیت ۴۱) [۷۴] یہ سرگزشت بہت طویل ہے۔ ملاحظہ ہو: ابن ہشام - ج ۱ ص ۲۲۸ تا ۲۳۶ [۷۵] ایضاً ص ۲۳۱، ۲۳۲ [۷۶] ایضاً ص ۲۳۸

[۷۷] ایضاً ص ۲۳۸ [۷۸] ایضاً ص ۲۳۹، ۲۴۰ [۷۹] ایضاً ص ۲۴۰

[۸۰] ایضاً ص ۲۴۶، ۲۴۷ [۸۱] ایضاً ص ۲۴۷

[۸۲] حنفاء کا یہ طبقہ عرب کی مذہبی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ لغوی اعتبار سے حنیف کا لفظ "حنف" سے بنا ہے جس کے معنی مُڑنے کے ہیں۔ لیکن جاہلیت میں اصطلاحی طور پر اس سے یہ سمجھا جاتا تھا کہ حنیف وہ شخص ہے جو دینِ ابراہیمی کی بعض رسموں مثلاً ختنہ اور حجِ بیت اللہ کو ادا کرتا ہے (ابن منظور الافریقی۔ لسان العرب۔ مطبعۃ الامیریہ۔ بولاق۔ ۱۳۰۳ھ، ج ۱۰، ص ۴۰۴)۔ حنیف اور حنفاء کے سلسلے میں مفصل بحث، تحقیق، تنقید اور تبصرہ کے لئے ملاحظہ ہو: سلیمان ندوی سید۔ ارض القرآن۔ معارف پریس۔ دار المصنفین۔ اعظم گڈھ۔ طبع چہارم۔ ۱۹۵۶ء، ج ۲، ص ۲۰۹ تا ۲۱۶)

[۸۳] ایک متفق علیہ حدیث میں رسول اللہؐ نے اپنی بعثت کو بارش سے تشبیہ دی ہے۔ دیکھئے: محمد فواد عبد الباقی۔ اللؤلؤ والمرجان فیما اتفق علیہ الشیخان۔ عیسی البابی الحلبی۔ دار احیاء الکتب العربیہ۔ قاہرہ ۱۹۴۹ء، ج ۳، ص ۲۰ (بحوالہ بخاری۔ کتاب العلم)

[۸۴] قرآن نے سورۂ نور میں اس حقیقت کو یوں بیان فرمایا ہے کہ صحیح فطرت کی مثال صاف و شفاف روغن کی ہے، جو ہر طرح کی آمیزش اور ملاوٹ سے پاک ہے۔ اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ بغیر اس کے کہ اس کو آگ چھوئے بھڑک اُٹھنے کے لئے تیار رہتا ہے۔ پس جُوں ہی وحی والہام کی چنگاری اس سے مس ہوتی ہے فوراً بھڑک اُٹھتا ہے (آیت ۳۵)۔

[۸۵] الانعام (۲۰)، النحل (۴۳)

[۸۶] اہلِ کتاب چونکہ "کتاب مقدس" رکھتے تھے اس لئے انھیں بعثتِ رسولؐ کے بارے میں روایات کا پوری طرح علم تھا اور وہ کفار و مشرکین سے اسی نبیٔ موعود کے بل بوتے پر اظہارِ شیخت بھی کیا کرتے تھے۔ چنانچہ سورہ البقرہ میں اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے (آیت ۱۴۶ اور ۸۹)۔ [۸۷] ملاحظہ ہو: الصف (۶)

[۸۸] ابنِ ہشام۔ ج ۲، ص ۶۶

[۸۹] ابنِ ہشام نے بیان کیا ہے کہ بنی عمرو بن عوف کا ایک شخص سوید بن صامت تھا۔ اس کی قوم کے لوگ شرف و بزرگی اور بہادری کی وجہ سے اس کو "کامل" کہتے تھے (ج ۲، ص ۶۷)۔ مکہ میں حج یا عمرہ کے ارادہ سے آیا۔ حضور اس کی خبر سُن کر اس کے پاس گئے اور اس کو اسلام کی دعوت دی۔ سوید نے کہا شاید جیسی چیز میرے پاس ہے ایسی ہی کوئی چیز تمہارے پاس بھی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا تمہارے پاس کیا چیز ہے؟ اس نے کہا لقمان کا نصیحت نامہ! آپ نے فرمایا اس کو میرے سامنے پیش کرو۔ سوید نے وہ حضورؐ کو دکھایا۔ حضورؐ نے فرمایا ہاں یہ بھی اچھی چیز ہے

مگر جو چیز میرے پاس ہے وہ اس سے بدرجہا بہتر و افضل ہے۔ وہ قرآن ہے جس کو اللہ نے مجھ پر نازل کیا ہے وہ ہدایت اور نور ہے۔ پھر حضورؐ نے سوید کو قرآن پڑھ کر سنایا اور اسلام کی دعوت دی اس نے قبول کیا اور پھر وہ مدینہ میں اپنی قوم کے پاس گیا اور زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ خزرج نے اس کو قتل کر دیا۔ (ابنِ ہشام، ج ۲، ص ۶۸، ۶۹)

[۹۰] لم یکن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فاحشًا ولا متفحشًا وکان یقول: انّ من خیارکم احسنکم اخلاقًا۔ (محمد فواد، عبدالباقی، ج ۳، ص ۱۳۵، بحوالہ بخاری کتاب المناقب)

[۹۱] حربِ فجار کا واقعہ پیش آیا تو اس وقت آپ کی عمر چودہ یا پندرہ سال کی تھی۔ ایک روایت کے اعتبار سے بیس برس کی تھی۔ اس جنگ کا نام فجار اس لئے ہوا کہ دونوں فریقوں (قریش، بنی کنانہ اور بنی قیس عیلان) نے اشہر حرم میں جنگ کی تھی (ابنِ ہشام، ج ۱، ص ۱۹۵ تا ۱۹۸۔ مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: ابنِ سعد، ص ۱۲۶ تا ۱۲۸)۔ حربِ فجار زمانہ جاہلیت کی جنگوں میں سب سے زیادہ مشہور اور عظیم الشان سمجھی جاتی ہے۔ حروب فجار کی کل تعداد چار ہے۔ متذکرہ بالا حربِ فجار چوتھی اور آخری ہے۔ اس سے پہلے ایک بنی کنانہ اور ہوازن کے درمیان، دوسری قریش اور ہوازن کے درمیان، اور تیسری پھر کنانہ اور ہوازن کے درمیان ہوئی تھی۔ (ابنِ ہشام، ص ۱۹۵، حاشیہ)

[۹۲] حربِ فجار کے بعد حلف الفضول کا واقعہ پیش آیا۔ رسولؐ اللہ کی عمر اس وقت بیس سال تھی۔ اس معاہدہ کی طرف سب سے پہلے بنی ہاشم مائل ہوئے۔ زبیر بن عبدالمطلب نے دعوت دی، سب لوگ (بنی ہاشم، بنی زہرہ، بنی تیم) عبداللہ بن جدعان کے گھر میں جمع ہوئے۔ زبیر نے سب کے کھانے کا انتظام کیا، سب نے اللہ تعالیٰ کو گواہ بنا کر ان الفاظ میں عہد کیا کہ "جب تک دریا میں صوف کے بھگونے کی شان باقی ہے ہم مظلوم کا ساتھ دیں گے"۔ رسولؐ اللہ فرماتے ہیں کہ میں اس حلف میں شریک تھا اور اگر مجھ کو اب بھی اس میں بلایا جائے تو قبول کروں گا۔ (ابنِ سعد، ج ۱، ص ۱۲۸، ۱۲۹)

[۹۳] ابنِ سعد، ج ۱، ص ۱۴۶ [۹۴] ایضاً، ج ۱، ص ۱۹۵

[۹۵] رسولؐ اللہ کے کردار کی اس عظمت پر قرآن نے بھی شہادت دی ہے۔ ملاحظہ ہو: القلم (۴)

[۹۶] یونس (۱۶) [۹۷] ابنِ سعد، ج ۱، ص ۲۰۰

[۹۸] الخطیب العمری، ص ۵۲۱ (باب المبعث و بدءُ الوحی)

[۹۹] مودودی۔ سید ابوالاعلیٰ۔ تفہیم القرآن۔ مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند۔ دہلی، ج ۱، ص ۵۳۵

[۱۰۰] الانعام (۳۳)

[۱۰۱] مثلاً حضرت ابوبکرؓ اور بعض اِن کی وجہ سے دوسرے ایمان لائے۔ (ابنِ ہشام، ج ۱، ص ۲۶۷)

[۱۰۲] شاہ ولی اللہ۔ الشیخ احمد۔ حجۃ اللہ البالغہ۔ ادارۃ الطباعۃ المنیریۃ۔ مصر ۱۳۵۲ھ، ج ۱، ص ۱۲۴۔
[۱۰۳] ایضاً ص ۱۲۴-۱۲۵ [۱۰۴] ایضاً ص ۱۲۶ [۱۰۵] ایضاً ص ۱۲۷
[۱۰۶] ایضاً ص ۱۲۷، ۱۲۸ [۱۰۷] العنکبوت (۴۶) [۱۰۸] آل عمران (۶۴)
[۱۰۹] اصلاحی، امین احسن۔ دعوتِ دین اور اس کا طریقِ کار۔ مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی۔ لاہور۔ ۱۹۵۸ء، ص ۱۴۷، ۱۴۸۔ [۱۱۰] الاعراف ۱۰۱
[۱۱۱] یہود کا بڑا حصہ جو توراۃ و انجیل کی تعلیمات کو چھوڑ کر شہواتِ نفس اور رغباتِ دنیا کا شکار ہو چکا تھا، محروم ہدایت رہا۔ صرف ایک مختصر سی جماعت ان میں اہلِ حق کی رہ گئی تھی جو رسولِ آخر کی آمد کے منتظر تھے۔ جونہی اس کی صدا ان کے کانوں میں پڑی حق قبول کر لیا۔ قرآن نے جہاں یہود کی عام بدبختی کا ذکر کیا ہے وہاں اس چھوٹی جماعت کی حق پسندی کی تعریف بھی کی ہے۔ دیکھئے: المائدہ (۶۶)
[۱۱۲] ان میں سے بھی وہ لوگ جن میں صحیح تعلیم کی روشنی موجود تھی انہوں نے پورے جوش کے ساتھ اس دین کا استقبال کیا۔ المائدہ (۸۳) [۱۱۳] سورۃ اعراف میں آتا ہے:
"جن لوگوں نے ہماری آیتوں کی تکذیب کی ان کی مثال کتنی بُری ہے۔ انہوں نے نقصان کیا تو اپنا ہی کیا۔ جس کو خدا ہدایت دے وہی راہ یاب ہے اور جس کو گمراہ کرے تو ایسے ہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں اور ہم نے بہت سے جن اور انسان دوزخ کے لیے پیدا کئے ہیں۔ ان کے دل ہیں لیکن سمجھتے نہیں ان کی آنکھیں ہیں مگر دیکھتے نہیں اور ان کے کان ہیں پر ان سے سنتے نہیں یہ لوگ بالکل چارپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی بدتر۔ یہی وہ ہیں جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔ (آیت ۱۷۷ تا ۱۷۹)
[۱۱۴] بعض مدنی سورتوں میں بھی یہ الفاظ موجود ہیں۔ مثلاً:
البقرہ (۲۱، ۱۶۸)، الحج (۱، ۵، ۴۹، ۷۳)، النسآء (۱، ۱۷۰، ۱۷۴) اور الحجرات (۱۳) میں سورۃ حج کے بارے میں اختلاف ہے کہ مکی سورہ ہے یا مدنی۔ ایک گروہ مکی قرار دیتا ہے جبکہ حضرت ابن عباسؓ وغیرہ کا دوسرا گروہ اسے مدنی کہتا ہے۔ اسی طرح یا قوم! کا خطاب البقرہ (۵۴)، المائدہ (۲۰، ۲۱) اور الصف (۵) میں بھی موجود ہے۔ [۱۱۵] الانفطار (۶)، الانشقاق (۶)
[۱۱۶] الاعراف (۱۵۸)، یونس (۲۳، ۵۷، ۱۰۴، ۱۰۸)، النحل (۱۶)، لقمان (۳۳)، الفاطر (۳، ۵، ۱۵)
[۱۱۷] الانعام (۷۸، ۱۳۵)، الاعراف (۵۹، ۶۱، ۶۵، ۶۷، ۷۳، ۷۹، ۸۵، ۹۳)، یونس (۷۱، ۸۴)، الھود (۲۸، ۲۹، ۳۰، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۶۱، ۶۳، ۶۴، ۷۸، ۸۴، ۸۵، ۸۸، ۸۹، ۹۲، ۹۳)، طٰہٰ (۸۶، ۹۰)، المومنون (۲۳)، النحل (۴۶)، العنکبوت (۳۶)، یٰسین (۲۰)،

الزمر (۳۹)، المومن (۲۹، ۳۰، ۳۲، ۳۸، ۳۹، ۴۱)، الزخرف (۵۱)، النوح (۲) - یاایھا الذین امنوا اگرچہ مدنی سورتوں کا نشانِ امتیاز ہے مثلاً البقرہ، آل عمران، النساء، المائدہ، الانفال، التوبہ، الحج، النور، الاحزاب، المحمد، الحجرات، الحدید، المجادلہ، الحشر، الصف، المنافقون، التغابن اور التحریم وغیرہ میں اسے استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن مکہ میں بھی انہی الفاظ سے اہلِ ایمان کو خطاب کیا گیا ہے۔ (دیکھئے: العنکبوت)(۱۱۸] اصلاحی - ص ۹، [۱۱۹] یہی خصوصیات مکی سورتوں میں پائی جاتی ہیں۔

[۱۲۰] اخلاص کی شدت کا اندازہ ایک طرف تو خود قرآن مجید کے متعدد بیانات سے ہوتا ہے۔ مثلاً دیکھئے: الکہف (۶)، التوبہ (۱۲۸) اور دوسری طرف رسول اللہ خود یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

انما مثلی و مثل الناس کمثل رجل استوقد نارا فلما اضاءت ما حوله جعل الفراش و ھذہ الدواب التی تقع فی النار یقعن فیھا فجعل ینزعھن و یغلبنہ فیقتحمن فیھا فانا آخذ بحجزکم عن النار وھم یقتحمون فیھا۔ (محمد فواد عبدالباقی - ج ۳، ص ۱۲۱، ۱۲۲ بحوالہ بخاری کتاب الرقاق)

[۱۲۱] یٰسین (۶۹) [۱۲۲] الحاقہ (۴۲)، الطور (۲۹)

[۱۲۳] الاحقاف (۸)، المومنون (۳۸)، الانبیاء (۵) وغیرہ

[۱۲۴] تاریخی لحاظ سے یہ امر دلچسپ ہے کہ ابنِ ہشام کی روایت کے مطابق ابوسفیان بن ہشام اور اخنس بن شریق جیسے معززینِ قریش تک کو قرآن سننے کا شوق اس حد تک پیدا ہو گیا کہ وہ آپ کے مکان کے باہر کسی جگہ چھپ کر بیٹھ گئے اور متواتر تین دن تک آ کر سنتے رہے اور محظوظ ہوتے رہے۔ کلام کی شیرینی غالباً اثر کرنے لگی تو آپس میں عہد کیا کہ اب ہم ہرگز نہ آئیں گے۔ اس کی وجہ انہوں نے یہ ظاہر کی کہ ان کے آنے سے بعض لوگ جو ان میں سے جاہل اور بے عقل ہیں نہ معلوم کیا سمجھنے لگیں۔ (ابنِ ہشام، ج ۱، ص ۳۳۷)

[۱۲۵] یہ واقعہ بہت مشہور ہے کہ ایک مرتبہ قریش نے عتبہ بن ربیعہ کو گفتگو کے لئے حضورؐ کے پاس بھیجا۔ عتبہ گفتگو کرنے کے بعد جب قریش کے پاس واپس پہنچا تو اس نے کہا کہ:

"میں نے تو ایسی بات سُنی ہے کہ قسم کھا کر کہتا ہوں ایسی بات کبھی نہیں سُنی۔ نہ تو وہ شعر ہے نہ جادو ہے نہ کہاوت ہے۔ اے قریش! میری بات مانو تو اس شخص (محمدؐ) کو چھوڑ دو اور اس کے مزاحم نہ ہو۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ یہ جو بات میں نے اس شخص سے سنی ہے یہ تمام عالم میں پھیلے گی۔ پس اگر عرب ان کے مخالف ہو گئے تب تم کو ان کی مخالفت کی زحمت نہ اٹھانی پڑے گی۔ عرب ان سے سمجھ لیں گے اور اگر یہ عرب پر غالب ہوئے تو ان کا ملک تمہارا ملک ہو گا اور ان کی عزت تمہاری عزت ہو گی، تم کو ان سے برسرِ فساد نہ رہنا چاہئے۔ اس تدبیر سے تم بہت اچھے رہو گے۔ قریش کہنے لگے: اے ابوالولید! قسم ہے خدا کی تم پر بھی اس نے جادو کر دیا ہے۔" (ایضاً، ص ۳۱۴)[۱۲۶] اصلاحی، ص ۶۰، ۶۱ [۱۲۷] ایضاً ص ۶۱، ۶۲

[۱۲۸] الشعراء (۲۱۴)

[۱۲۹] بخاری میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ جب وانذر عشیرتك الاقربین کی آیت نازل ہوئی تو آپ دعوت و تبلیغ پر مستعد ہو گئے اور فرمایا کہ:

یا معشر قریش" او کلمته نحوها" اشتروا انفسکم لا اغنی عنکم من الله شیئا یا بنی عبد مناف! لا اغنی عنکم من الله شیئا یا عباس بن عبد المطلب! لا اغنی عنك من الله شیئا یا صفیه عمة رسول الله! لا اغنی عنك من الله شیئا یا فاطمه بنت محمد سلینی ما شئت من مالی لا اغنی عنك من الله شیئا۔ (محمد فواد عبدالباقی، ج ۱، ص ۵۷، بحوالہ کتاب الوصایا)

[۱۳۰] ابن سعد نے لکھا ہے کہ جب آیت وانذر عشیرتك الاقربین نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صفا پر چڑھے اور قریش کو اس طرح پکارا:

"یا معشر قریش .... فقالوا: مالك یا محمد؟ قال: ارئیتکم واخبرتکم ان خیلا بسفح هذا الجبل أکنتم تصدقونی؟ قالوا: نعم انت عندنا غیر متهم وما جربنا علیك کذبا قط، قال: فانی نذیر لکم بین یدی عذاب شدید یا بنی عبد المطلب یا بنی عبد مناف یا بنی زهره، حتی عدد الافخاذ من قریش، ان الله امرنی أن انذر عشیرتی الاقربین وانی لا أملك لکم من الدنیا منفعه ولا من الآخره نصیبا الا ان تقولوا لا اله الا الله

(ابن سعد، ج ۱، ص ۲۰۰)

طبری کی ایک روایت کے مطابق رسول اللہ نے کھانے کی دعوتوں میں بھی اپنی دعوت کو پیش کیا۔

(طبری، ج ۲، ص ۳۲۰، ۳۲۱)

[۱۳۱] حضورؐ نے یہ دعا کی تھی کہ "اے اللہ! ابوحکم بن ہشام (یعنی ابوجہل) یا عمر بن خطاب کے ساتھ اسلام کی تائید فرما" (ابن ہشام، ج ۱، ص ۳۷۰) [۱۳۲] اصلاحی، ص ۲۱۸ [۱۳۳] ایضاً ص ۲۱۹

[۱۳۴] ان کی جن بے شمار معاشرتی اور اخلاقی خرابیوں کا پردہ چاک کیا گیا ان کی فہرست بہت طویل ہے۔ خاص یہ ہیں، کذب، بخل، ناشکرا پن، لالچ اور مال کی ہوس، شقی القلبی، تکاثر، تفاخر، تکذیب و طغیان، روزمرہ ضروریات کی اشیا دوسروں کو دینے سے انکار، یتیموں کی ناقدری، ہزل، حق سے اعراض، تکبر و گمراہی، کفر، ظلم، فسق، ادبار، حسد، لڑکیوں کو زندہ درگور کرنا، اسراف (الیل، العادیات، التکاثر، الھمزہ، المعارج، الماعون، الطارق، القیامہ، النوح، النازعات، المدثر، التطفیف، القلم، التکویر اور الذاریات)، اعتدا، شک و تذبذب، مناع للخیر، استہزاءِ رسول، عدوان، لہو و لعب، شرارت،

غفلت، شرک، جھوٹ، قتلِ ناحق، زنا، فواحش و سیئات، حُبِّ دنیا، طغیٰ، کفر (الغاشیہ، النبا، ق، الاحقاف، حٰم السجدہ، الطور، ص، الحجر، الکہف، المومنون، الانبیاء، یٰسین، الشعراء، الرعد، الفرقان، الشوریٰ، السبا، المومن، الزمر، الکافرون)، بے جا اکڑ، انتہا پسندی، فتنہ و فساد (لقمان، القصص، یوسف، ابراہیم)، منافقت، پیٹھ پیچھے بُرائی، جدائی پیدا کرنا، مسلسل انکار، تبذیر، قتلِ اولاد، یتیم کا مال ہڑپ کر جانا، تہمت لگانا، عصیان، بغاوت، الزام تراشی، ایمان بالباطل (الروم، الاعراف، العنکبوت، الفاطر، حٰم سجدہ، الجن، الجاثیہ، الزخرف، النحل، الاسراء، ھود، یونس، النحل، الانعام) [۱۳۵] ابنِ ہشام، ج ۱، ص ۲۰۸ [۱۳۶] ایضاً، ص ۲۰۹

[۱۳۷] ایضاً، ص ۳۱۳ [۱۳۸] ایضاً، ص ۳۱۵ [۱۳۹] ایضاً، ج ۲، ص ۲۸۰

[۱۴۰] یہاں اس غلط فہمی کو دُور کر دینا چاہیے کہ مکّی دور کے ابتدائی چند سالوں میں جن لوگوں نے اسلام قبول کیا وہ محض نوجوان، غریب اور غلام تھے۔ اگر ایک نظر صرف اس فہرست پر ڈال لی جائے جو قبولِ اسلام کے سلسلہ میں ابنِ ہشام نے دی ہے اور جن لوگوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ سابقون الاولون میں سے اکثر لوگ عرب کے مختلف شعوب و قبائل کے معزز و محترم ارکان اور باضابطہ و آزاد شہری تھے۔

[۱۴۱] اصل عبارت کے لئے ملاحظہ ہو: ابنِ خلدون، عبدالرحمٰن۔ مقدمہ۔ المکتبۃ التجاریہ قاہرہ، الفصل السابع والعشرون، ص ۱۵۱۔ [۱۴۲] الروم (۳۰) اس آیت کے ذیل میں مفسرین نے بہت کچھ لکھا ہے اور بخاری و مسلم کی اس مشہور حدیث کا حوالہ بھی دیا ہے جس میں رسول اللہ نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ،

ہر مولود فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے ماں باپ اسے یہودی، نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔

مزید تفصیل اور متن کے لئے ملاحظہ ہو: ابن الجوزی۔ ابی الفرج عبدالرحمٰن۔ زاد المسیر فی علم التفسیر۔ المکتب الاسلامی للطباعۃ والنشر، ج ۶، ص ۳۰۰ تا ۳۰۲۔

نیز دیکھیے: ابن کثیر الدمشقی۔ تفسیر القرآن العظیم۔ دار الاندلس للطباعۃ والنشر۔ بیروت ۱۹۶۶ء، ص ۳۵۹، ۳۶۰۔ [۱۴۳] ابنِ ہشام، ج ۱، ص ۳۵۹، ۳۶۰

[۱۴۴] حوالے اور متن کے لئے ملاحظہ ہو: محمد فواد عبدالباقی، ج ۳، ص ۱۱ تا ۱۳ بحوالہ بخاری کتاب الادب اور کتاب الاشربہ [۱۴۵] ابنِ ہشام، ج ۱، ص ۳۶۰

[۱۴۶] ابوجہل کو جب کسی کے مسلمان ہونے کی خبر ملتی تو فوراً اس کو جاکر دھمکاتا اور کہتا کہ تُو نے اپنے باپ دادا کا دین چھوڑ دیا ہم تجھ کو ذلیل کر دیں گے اور اگر وہ سوداگر ہوتا تو اس کی تجارت برباد کر دینے کا خوف دلاتا اور اگر غریب ہوتا تو مارتا، ستاتا اور ایذا پہنچاتا (ایضاً، ج ۱، ص ۳۴۲)۔

[۱۴۷] تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو: ایضاً ص ۳۷۵، ۳۷۶ [۱۴۸] ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:

عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ اور ابوسفیان بن حرب بن امیہ (بنی عبد شمس)، طعیمہ بن عدی، جبیر بن مطعم اور حارث بن عامر بن نوفل (بنی نوفل)، نضر بن حارث بن کلدہ (بنی عبد الدار)، ابوالبختری بن ہشام، زمعہ بن الاسود اور حکیم بن حزام (بنی اسد)، ابوجہل عمر بن ہشام (بنی مخزوم)، نبیہ اور منبّہ بن الحجاج (بنی سہم) اور امیہ بن خلف (بنی جمح میں سے) ان کے علاوہ اور لوگ بھی جن میں سے اکثر قریش اور بعض غیر قریش تھے۔ (ایضاً ج ۲، ص ۱۲۵) [۱۴۹] ایضاً ص ۱۲۶ [۱۵۰] ایضاً ص ۱۶

[۱۵۱] ایک روایت یہ بھی ہے کہ قدرتِ خداوندی سے اس تحریری معاہدہ کو دیمک چاٹ گئی تھی۔ (ایضاً)

[۱۵۲] ملاحظہ ہو: البلد (۱۷، ۱۸)، التطفیف (۲۹)، حٰم السجدہ (۲۶)، العنکبوت (۳، ۴، ۷، ۹، ۱۱، ۱۲)

[۱۵۳] ابن حبیب بغدادی۔ محمد۔ کتاب المحبّر۔ دائرۃ المعارف۔ حیدر آباد دکن ۱۹۴۲ء، ص ۷۰، ۱۷۱

[۱۵۴] ابن سید الناس۔ عیون الاثر فی فنون المغازی والشمائل والسیر۔ مکتبہ القدس۔ قاہرہ، ۱۳۵۶ھ، ج ۱، ص ۱۹۹۔

[۱۵۵] زرقانی۔ الزرقانی علی المواہب اللدنیہ۔ مطبعۃ ازہریہ۔ مصر۔ ۱۳۲۵ھ، ج ۱، ص ۳۷۳۔

[۱۵۶] ایضاً [۱۵۷] البقرہ (۱۴۸)۔

۳ تنظیمِ معاشرہ

[۱۵۸] ہجرتِ نبویؐ سے قبل مدینہ کا نام یثرب تھا۔ اس شہر کو یثرب نامی عمالقی نے بسایا تھا اور اسی کے نام سے بعد کو موسوم ہوا (الفیومی، احمد بن محمد بن علی المقری۔ المصباح المنیر فی غریب الشرح الکبیر للرافعی۔ مطبعہ مصطفی البابی۔ مصر۔ ج ۱، ص ۹۸) اس کی تاریخ نہایت قدیم ہے۔ تفصیل کے لئے: یاقوت الحموی الرومی۔ شہاب الدین ابی عبداللہ معجم البلدان۔ دار صادر للطباعۃ والنشر۔ بیروت۔ ۱۹۵۷ء، ج ۵، ص ۸۴، ۸۵) شہر کی تعمیر کا زمانہ ۱۶ق م اور ۲۲ق م کے درمیان ہے۔ پہلے یہاں عمالیق آباد تھے۔ لیکن عہدِ اسلام میں یہاں یہود اور قبائلِ اوس وخزرج آباد تھے (سلیمان ندوی۔ ارض القرآن، ج ۱، ص ۹۹)
رسول اللہؐ نے شہر مدینہ کو یثرب کے نام سے موسوم کرنے سے منع فرمایا ہے۔ اس کراہت کی توجیہ مختلف انداز سے کی گئی ہے (السمہودی، علی نور الدین۔ وفاء الوفا باخبار دار المصطفیٰ۔ مطبعۃ الآداب والموید۔ مصر۔ ۱۳۲۶ھ ج ۱، ص ۸) جس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے۔ ہمارے خیال میں اس کے لفظی اور لغوی معنے اچھے نہیں ہیں (ثرب اس چربی کو کہتے ہیں جو اوجھڑی اور انتڑیوں پر ہوتی ہے اور تثریب گناہ اور برائی پر دلالت کرتا ہے۔ ابن درید، ج ۱، ص ۲۰۱۔ اس کی جمع ثروب، اثرب اور اثارب آتی ہے۔ الفیروز آبادی۔

مجد الدین ۔ القاموس ۔ المحیط ۔ مطبعہ دار المامون ۔ ۱۹۳۸ء ، ج ۱ ، ص ۴۰) قرآن میں یثرب کا نام صرف ایک جگہ (الاحزاب : ۱۳) آیا ہے ۔ اور وہ بھی منافقین کے ایک قول کے حوالے سے ۔ چنانچہ علامہ السمہودی نے یہی بات لکھی ہے کہ قرآن میں مذکورہ نام اس موقع پر آیا ہے کہ جہاں منافقین کے قول کو بطور حکایت کے بیان کیا گیا ہے اور اس میں کراہت ہے (السمہودی ج ۱ ص ۸) ۔ ایک تحقیق کے مطابق یثرب رومی لفظ "اتھربیس" کی تعریب ہے (سلیمان ندوی ج ۱ ص ۹۹) یثرب کی وجہ تسمیہ اور مشتقات کی تفصیل کے لئے مزید ملاحظہ ہو :

(الشریف ، احمد ابراہیم ، مکہ والمدینہ فی الجاہلیہ وعہد الرسول ۔ مطبوعہ دار الفکر العربی ۔ مصر ۔ ص ۲۹۱، ۲۹۲)

بہرحال رسول اللہ نے یثرب کا نام بدل کر طیبہ اور طابہ رکھا (ایضاً ، ج ۱ ، ص ۱۲) مورخین اور دیگر علماء نے اس کے دوسرے بہت سے نام بھی لکھے ہیں ۔ مثلاً یاقوت حموی نے انتیس نام گنائے ہیں (یاقوت الحموی ج ۵ ص ۸۳) جبکہ السمہودی نے ترتیب وار چورانوے نام مرتب کئے ہیں (السمہودی ج ۱ ص ۸ تا ۱۹) اس فہرست میں تہتروان نام "المدینہ" اور چہتروان "مدینۃ الرسول" لکھا ہے (ایضاً ص ۱۶) اس وقت ہم دوسرے ناموں کے بجائے مختصراً صرف مدینہ سے بحث کرنا چاہتے ہیں ۔ کیونکہ سب سے زیادہ مشہور بھی یہی ہے اور ہم نے اپنے مقالہ میں ہر جگہ یثرب یا دوسرے اسماء کے مقابلہ میں "مدینہ" کو ترجیح دی ہے اور اسی کو اختیار کیا ہے ۔

قرآن میں "مدینہ" کو بطور خاص شہر یثرب کے لئے کم و بیش چار مقامات پر ذکر کیا گیا ہے (التوبہ : ۱۰۱، ۱۲۰ ۔ الاحزاب : ۶۰ اور المنافقون : ۸) لغوی اعتبار سے "مدینہ" "مدن" سے بنا ہے ۔ السمہودی کا بیان ہے :

من مدن بالمکان اذا أطاع (السمہودی ج ۱ ص ۱۶) پھر آگے لکھتے ہیں :

والمدینہ أبیات مجتمعہ کثیرۃ تجاوز حد القریٰ کثرۃ وعمارۃ ولم تبلغ حد الامصار ۔

(ایضاً ص ۱۶) اور ابن منظور الافریقی نے ایک قول نقل کیا ہے کہ :

انہ مفعلہ من دنت ای ملکت (ابن منظور الافریقی ج ۱۷ ص ۲۸۹) ۔

اب قابل غور مسئلہ یہ ہے کہ مدینہ کو "مدینہ" کیوں کہا جاتا ہے ؟ اور اس کا رواج کب سے ہوا ؟ حقیقت یہ ہے کہ ان مسائل پر باوجود تلاش کے تشفی بخش مواد نہ مل سکا ۔ تعجب ہے کہ ہمارے یہاں کے مورخین اور اصحاب سیر نے اس پر قابل ذکر توجہ نہ دی ۔

ہمارے مطالعہ کی رو سے مدینہ کو "مدینہ" کہنے کی متعدد وجوہ ہو سکتی ہیں :

(الف) مدینہ رسول اللہ کا مسکن بنا اور آپ نے یہاں اقامت اختیار فرمائی (قیل لانہ صلی اللہ علیہ وسلم سکنہا ۔ السمہودی ج ۱ ص ۱۶) نیز العباس ، احمد بن عبد الحمید ۔ کتاب عمدۃ الاخبار فی مدینۃ المختار ۔ مطبعۃ المدنی ۔ قاہرہ ۔ طبع ثالث ۔ ص ۶) ۔

(ب) مدینہ قلعہ (الحصن) کہتے ہیں جو اس خطۂ زمین کے وسط میں بنا ہو جہاں شہر واقع ہے ۔ پھر اس سے

ہر ایسے شہر کو کہنے لگے جہاں قلعے (ابن منظور الافریقی ج ۱۷، ص ۲۸۹) بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں محفوظ و مستحکم پناہ گاہیں اور اطم (گڑھی) بنے ہوں۔ اور ہر تاریخ کا طالب علم یہ جانتا ہے کہ جس شہر کو "مدینہ" کا خاص نام دیا گیا وہاں اطم اور قلعے وغیرہ کثرت سے پائے جاتے تھے (تفصیل کے لئے السمہودی ج ۱ ص ۱۱۱ تا ۱۱۶) اس لئے اس مقام کو مدینہ سے تعبیر کرنا انتہائی موزوں ہے۔

(ج) مدینہ کو اس لئے بھی مدینہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ نے اس کو مغلوب کر کے اسے شرف و عظمت عطا کی (والمدینہ اسم مدینہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاصہ غلبت علیہا تفخیما لہا (ابن منظور الافریقی ج ۱۷، ص ۲۸۹) اور وہاں کے باشندے پُرامن طریقے پر مطیع و منقاد بن گئے (السمہودی ج ۱، ص ۱۶)۔ نیز العباس ص ۶۷)۔ یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ رسولؐ اللہ کا اس شہر میں غلبہ و تمکن اور سکانِ مدینہ کی اطاعت گزاری کسی جبر و قہر یا عسکری مہم جوئی کا نتیجہ نہ تھی بلکہ اس شہر کی تسخیر کا باعث دُنیا کے دُوسرے تمام شہروں کے برخلاف تلوار نہیں بلکہ قرآن ہے۔ اور اس کی واضح دلیل حضرت عائشہؓ کی وہ روایت ہے جسے بلاذری نے نقل کیا ہے۔ یعنی: قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما یفتح من مصر او مدینہ عنوہ فان المدینہ فتحت بالقرآن (بلاذری، احمد بن یحیٰی بن جابر۔ فتوح البلدان۔ مطبعہ الموسوعات۔ مصر، ۱۹۰۱ء ص ۱۴) ہمارے نزدیک یہی توجیہ سب سے زیادہ قوی ہے۔

اب جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ اسے مدینہ کے نام سے کب موسوم کیا گیا تو اس سلسلے میں عام خیال یہ ہے کہ "حضورؐ کی آمد کے بعد اس کا نام "مدینۃ النبی" ہوا اور پھر کثرتِ استعمال سے صرف مدینہ رہ گیا" (سلیمان ندوی ۔ ارض القرآن ج ۱، ص ۹۸)۔ یہ بیان کچھ مبہم سا معلوم ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ شہر آمدِ رسولؐ کے بعد کب سے "مدینۃ النبی" کہلایا؟ بعض شواہد کے پیشِ نظر ہمارا قیاس یہ ہے کہ منشورِ مدینہ کے اجراء تک تو اس کا نام یثرب ہی تھا جیسا کہ خود منشورِ مدینہ کے الفاظ میں اسے استعمال کیا گیا ہے:

ھذا کتاب من محمد النبی صلی اللہ علیہ وسلم بین المومنین والمسلمین من قریش و یثرب۔ (ابنِ ہشام، ج ۲، ص ۱۴۷)

البتہ اس کے بعد اس کا نام مدینہ ہوا، یہاں تک کہ سورۂ احزاب میں جس کا نزول ۵ھ میں ہوا (مودودی، ابوالاعلیٰ۔ تفہیم القرآن۔ مکتبہ تعمیرِ انسانیت۔ لاہور ۱۹۶۶ء ج ۴ ص ۵۴) اور غالباً لفظ مدینہ بھی جہاں سب سے پہلے استعمال کیا گیا ہے یہ ارشاد ہوا کہ اگر منافقین اور وُہ لوگ جن کے دلوں میں خرابی ہے اور جو مدینہ میں ہیجان انگیز افواہیں پھیلانے والے ہیں اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے تو ہم ان کے خلاف کارروائی کرنے کے لئے تمہیں کھڑا کریں گے پھر وہ اس شہر میں مشکل ہی سے تمہارے ساتھ رہ سکیں گے (الاحزاب: ۶۰) اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ اسی سُورہ کی بالکل ابتدا میں اہلِ یثرب کے بارے میں منافقین ہی کا ایک قول اللہ نے نقل کیا ہے جس کے بین السطور

ان کی اسلام دشمنی، ریاکاری اور اہلِ ایمان کے لئے ان کی بدخواہی کو صاف طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ گویا ایک ہی سورت میں ایک ہی شہر کے لئے یثرب اور مدینہ کے دو مختلف نام، دو نقطہ ہائے نظر کی عکاسی کر رہے ہیں۔ اس سے یہ بھی خیال کیا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کے نزدیک وہ شہر "مدینۃ النبیؐ یا مدینہ" کی حیثیت سے اس وقت مشہور و متداول ہے جبکہ منافقین اسے "یثرب" ہی کہتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ منافقین کے گروہ نے تو رسولؐ اللہ کو ہی تسلیم نہ کیا تھا تو بھلا وہ اس شہر کو آپ کے نام سے منسوب کرنا کب پسند کرتے تھے۔ بہرحال ان تمام باتوں سے غزوۂ احزاب سے پہلے یثرب کا مدینہ کی حیثیت سے مشہور ہونا قرینِ صواب ہے اور بالفرض محال اگر ۵ھ سے پہلے "مدینہ" کا مشہور و متداول ہونا تسلیم نہ کیا جائے تو یہ بات طے ہے کہ ۵ھ کے بعد اس نے رواج پایا۔ لہٰذا یہ کہنا بھی علمی زیادتی ہے کہ "یہ نام بعد کی پیداوار ہے۔"

(Gibb, H.A.R., and Kramers J.H. (edd), Shorter Encyclopaedia of Islam, E.J. Brill, Leiden, 1953, p. 291)

[۱۵۹] مدینہ کا پہلا شخص جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سے متاثر ہوا سوید بن الصامت تھا۔ اپنی بہادری، سرداری، عالی نسبی اور شاعری وغیرہ کی وجہ سے اہلِ مدینہ میں اسے ایک خاص مقام حاصل تھا اور لوگوں نے اسے "کامل" کا خطاب دے رکھا تھا۔ جنگِ بعاث سے کچھ عرصہ پہلے وہ مکہ آیا تو اس کی ملاقات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوئی۔ اس زمانہ میں رسولؐ اللہ کا معمول یہ تھا کہ آپ موسمِ حج وغیرہ میں جہاں آپ کو کسی کے بارے میں یہ اطلاع ملتی کہ فلاں شخص نامور ہے اور اپنی قوم کا سربرآوردہ ہے تو آپ اس کی طرف متوجہ ہو جاتے اور اسے اللہ کی طرف بلاتے اور اپنے اصول اس کے سامنے بیان فرماتے۔ رسولؐ اللہ نے سوید کو بھی دعوتِ اسلام دی۔ سوید نے اس کے جواب میں کہا کہ ایک ایسی ہی چیز میرے پاس بھی ہے یعنی صحیفۂ لقمان۔ حضورؐ نے فرمایا:

ان ھذا الکلام، حسن، والذی معی افضل من ھذا قرآن انزلہ اللہ علی ھو ھدیً و نور۔

(بے شک یہ کلام تو اچھا ہے مگر جو چیز میرے پاس ہے وہ اس سے بہتر ہے یعنی قرآن جسے اللہ نے مجھ پر نازل کیا ہے اور جو سراپا ہدایت و نور ہے)

پھر رسولؐ اللہ نے اسے قرآن پڑھ کر سنایا اور اسلام کی دعوت دی۔ تو یہ پیغام اس کے دل میں گھر کر گیا اور وہ پکار اٹھا کہ: "ان ھذا القول حسن۔" (بے شک یہ کلام تو بہت خوب ہے)

پھر یہ واپس مدینہ پہنچا۔ لیکن جلد ہی خزرجیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس کے بارے میں لوگوں کا کہنا یہ تھا کہ وہ مسلمان ہونے کی حیثیت میں قتل ہوا۔ اس کا قتل جنگِ بعاث سے پہلے کا واقعہ ہے (ابنِ ہشام ج ۲ ص ۶۰ تا ۶۹)۔ دعوتِ اسلام سے بہرہ اندوز ہونے والا دوسرا شخص ایاس بن معاذ تھا۔ یہ اہلِ مدینہ کے اس وفد میں شامل تھا جو جنگِ بعاث سے پہلے خزرج کے خلاف قریش سے حلیفانہ معاہدہ کرنے اور امداد حاصل کرنے آیا تھا

رسول اللہؐ نے اس وفد کی آمد کی خبر سُنی تو معمول کے مطابق دعوت پیش کی، قرآن سنایا۔ ایاس نے جو اس وقت کم سن نوجوان تھا کہا کہ "اے قوم! واللہ یہ تو اس سے بہتر ہے جس کے لئے تم آئے ہو۔" اس پر وفد کے ایک رکن ابوالحیسر انس نے مٹی ایاس کے منہ پر ماری اور کہا "ہمارے درمیان سے نکل جاؤ۔" اس کے بعد یہ لوگ مدینہ چلے گئے پھر جب جنگ بعاث چھڑ گئی اور اس کے چند روز بعد ہی ایاس کا انتقال ہوگیا۔ انتقال کے وقت تکبیر اس کی زبان پر تھی (ایضاً ص ۶۹، ۷۰) سوید اور ایاس کے بعد رسول اللہؐ کی دعوت اہلِ مدینہ کے اس چھ نفری گروہ تک پہنچی جو عقبہ کے مقام پر آپ سے ملا تھا۔ ابنِ سعد کی ایک روایت کے مطابق اسعد ابن زرارہ اہلِ مدینہ میں سے پہلے شخص ہیں جنھوں نے اسلام قبول کیا اور مکہ میں حضورؐ سے ملاقات کی۔ دیکھیے: ابنِ سعد، ج ۳، ص ۶۰۸، ۶۰۹)

[۱۶۰] اوس اور خزرج کے قبائل سیلِ عرم کے بعد یمن سے نکلے اور مدینہ میں چاہ صرار کے پاس آکر اُترے (ابنِ خلدون، ج ۲، ص ۲۸۷۔ مارگولیتھ نے بھی اسے تسلیم کیا ہے، MARGOLIOUTH, P. 60) ابنِ سعد نے ان دونوں کا پورا سلسلۂ نسب نقل کیا ہے اور لکھا ہے کہ اوس و خزرج کی ماں قیلہ بنت کاہل بن عذرہ تھی (ابن سعد، ج ۳، ص ۴۱۹) نہ معلوم دائرہ معارف اسلامیہ میں ماں کا نام قیلہ بنت الارقم کیوں لکھا ہوا ہے) ڈاکٹر سید محمد عبداللہ اور دیگر۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ۔ دانش گاہ پنجاب۔ لاہور۔ ۱۹۶۸ء، ج ۳، ص ۷۴۵) بہر حال یہ بات طے ہے کہ اپنی ماں کی وجہ سے ہی وہ بنو قیلہ یا ابنائے قیلہ کہلاتے ہیں۔ جب اوس اور خزرج مدینہ آئے تو وہاں مختلف یہودی قبائل آباد تھے مثلاً بنو ثعلبہ، بنو زرعہ، بنو قینقاع، بنو زید، بنو نضیر، بنو قریظہ (یہ دونوں کاہنان کہلاتے تھے)، بنو عوف، بنو قصیص یا عصیص اور بنو بہدل وغیرہ (ابنِ خلدون ج ۲ ص ۲۸۷) سمہودی نے بجائے بہدل کے ہدل دیا ہے (السمہودی ج ۱ ص ۱۱۵) مدینہ میں اس وقت چونکہ غلبہ یہود کو حاصل تھا اس لئے اچھے نخلستان اور املاک ان کے ہاتھ نہ آئیں بلکہ چند جوہڑ، معمولی اور بنجر زمینیں اور کچھ مویشی بنو قیلہ کے پاس تھے ایک عرصہ تک یہ اسی حالت میں رہے یہاں تک کہ مالک بن عجلان کی کوششوں اور ابو جبلہ غسانی کی امداد سے اوس اور خزرج کو غلبہ حاصل ہوگیا۔ بہت سے سردارانِ یہود قتل ہوئے۔ جس کا نتیجہ ایک تو یہ نکلا کہ ان کے درمیان عداوت کا بیج پڑ گیا اور دُوسرا یہ کہ یہود نے سہم کر ان سے امداد اور دوستی کی درخواست بھی کی۔ ایک مدت تک اوس اور خزرج کو مدینہ میں شوکت و سیادت حاصل رہی تا آنکہ ان کے ہمسایہ مغربی قبائل ان سے عہد و فا استوار کرنے لگے۔ لیکن بعد میں اوس اور خزرج کی باہمی خونریزیوں نے نہ صرف ان کی شوکت و سطوت کا خاتمہ کر دیا بلکہ ان کی ہوا اُکھڑ گئی۔ یہود نے ان سے پیمانِ صلح توڑ دیا۔ یہود کو غلبہ حاصل ہوگیا (ابنِ خلدون ج ۲ ص ۲۸۷، ۲۸۸۔ نیز السمہودی ج ۱ ص ۱۲۵ تا ۱۳۲)۔ اور اوس و خزرج خائب و خاسر ہو کر رہ گئے۔ خاص طور پر ان کی آخری جنگ نے جو بعاث کے نام سے مشہور ہے ان کو بالکل خستہ و نزار کر دیا تھا جیسا کہ ہم متن میں کئی جگہ صراحت کر چکے ہیں۔

[۱۲۱] یہود (یا بنی اسرائیل) کی تاریخ بہت پُرانی بھی ہے اور دردناک بھی۔ یہ لوگ فرعون آمن حوطف سوم (م سنہ ۱۲۷۵ ق م) کے زمانے میں حضرت موسٰی علیہ السلام کی رہنمائی میں مصر سے نکلے۔ (تفصیلات کے لئے

Breasted, James, A

History of Egypt (From the Earliest times to the Persian Conquest), Hodder and Stoughton, London, 1952.

اس کے بعد آزادی پائی۔ پھر دشت نوردی کرکے بالآخر فلسطین پہنچے لیکن کچھ ہی عرصہ میں خانہ جنگیوں کے شکار ہوکر ذلیل وخوار ہوگئے یہاں تک کہ حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کے زمانہ میں عظیم الشان سلطنت کے مالک ہوئے مگر لیکن بعد میں پھر خانہ جنگیوں، باہمی اختلافات اور اندرونی چپقلش میں مبتلا ہوکر ٹکڑے ٹکڑے ہوئے اور تتر بتر ہوگئے۔ جہاں تک جزیرہ نمائے عرب میں یہود کی تاریخ کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں کوئی مستند تاریخ دنیا میں موجود نہیں ہے، نہ تو انہوں نے خود کوئی ایسی تحریر یا کتاب چھوڑی جس سے ان کے ماضی پر کوئی روشنی پڑسکے اور نہ عرب سے باہر کے مورخین نے ان کا کوئی ذکر کیا۔ اس لئے یہود عرب کی تاریخ کا بیشتر انحصار ان زبانی روایات پر ہے جو اہلِ عرب میں مشہور تھیں (مودودی۔ تفہیم القرآن۔ ادارہ ترجمان القرآن۔ لاہور۔ سنہ ۱۹۷۱ء۔ ج ۵، ص ۲۰۰) ان کی رُو سے یہود کی سب سے پہلی ہجرت خود حضرت موسیٰؑ کے آخر عہد میں ہوئی۔ (تفصیل کے لئے: یاقوت حموی۔ ج ۵، ص ۸۴، ۸۵۔ السمہودی ج ۱ ص ۱۱۱۔ نیز MARGOLIOUTH, P.59,60.) دوسری ہجرت یہودیوں کی اپنی روایت کے مطابق سنہ ۵۸۶ ق م میں ہوئی (مودودی۔ ج ۵، ص ۲۷۱) تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ "سنہ ۷۰ء میں رومیوں نے فلسطین میں یہودیوں کا قتلِ عام کیا اور پھر سنہ ۱۳۲ء میں انھیں اس سرزمین سے نکال باہر کیا۔ اس دور میں بہت سے یہودی قبائل بھاگ کر حجاز میں پناہ گزیں ہوگئے تھے۔ کیونکہ یہ علاقہ فلسطین کے جنوب میں متصل ہی واقع تھا۔ یہاں آکر انھوں نے جہاں جہاں چشمے اور سرسبز مقامات دیکھے وہاں ٹھہر گئے اور پھر رفتہ رفتہ اپنے جوڑ توڑ اور سُود خواری کے ذریعہ سے ان پر قبضہ جمالیا۔ ایلہ، مقنا، تبوک، تیما، وادی القریٰ، فدک اور خیبر پر ان کا تسلط اسی دَور میں قائم ہُوا اور بنی قریظہ، بنی نضیر، بنی بہدل اور بنی قینقاع بھی اسی دَور میں آکر مدینہ پر قابض ہوئے (ایضاً ج ۵، ص ۲۷۱۔ نیز MARGOLIOUTH, P.60.) اس کے تقریباً تین صدی بعد سنہ ۴۵۰ء میں یمن کے اس سیلابِ عظیم کا واقعہ پیش آیا جس کی وجہ سے قوم سبا کے مختلف قبیلے یمن سے نکل کر عرب کے اطراف میں پھیل جانے پر مجبور ہوئے (ایضاً ج ۵ ص ۲۷۱۔ مزید تفصیل اور حوالے کے لئے: السمہودی۔ ج ۱ ص ۱۱۱ تا ۱۱۶۔ ابنِ خلدون ج ۲ ص ۲۸۶، ۲۸۷ اور مجیب اللہ ندوی۔ اہلِ کتاب صحابہ و تابعین۔ معارف پریس اعظم گڑھ۔ سنہ ۱۹۵۱ء ص ۲ تا ۶)

یہ ہم پچھلے حاشیہ میں بیان کرچکے ہیں کہ اوس اور خزرج کے قبائل پر جو ان کے بعد مدینہ میں آباد ہوئے یہود کو غلبہ کس طرح حاصل ہوا۔

رسول اللہؐ کی آمدِ مدینہ سے قبل یہود کو عرب میں بالعموم اور حجاز میں بالخصوص جو مقام حاصل تھا اسے سمجھنے کے لئے یہود کی کچھ اہم خصوصیات اور ان کے نمایاں خدوخال کو سامنے رکھنا ہوگا۔

(۱) زبان، لباس، تہذیب، تمدن ہر لحاظ سے انھوں نے پوری طرح عربیت کا رنگ اختیار کر لیا تھا۔ حتیٰ کہ ان کی غالب اکثریت کے نام تک عربی ہو گئے (مودودی۔ (تفہیم) ج ۵ ص ۲۷۳، ۲۷۴) شاید اسی لئے مغربی علماء اور مستشرقین کو یہ متعین کرنے میں دقت پیش آئی کہ وہ عربی قبائل ہیں یا باہر سے آئے ہیں۔ حالانکہ جدید تحقیق کے مطابق حجازی یہود، اصل میں بنی اسرائیل سے تعلق رکھتے تھے اور عربی قبائل نہیں تھے (دروزہ۔ محمد عزّة۔ عصر النبی۔ دار الیقظة العربیة۔ بیروت ۱۹۶۴ء ص ۱۰۷)

(۲) یہود چونکہ کتاب و شریعت کے حامل تھے اور نسلی فخر و غرور اور تعصب ان میں بہت پایا جاتا تھا اس لئے وہ اہلِ عرب کو اُمّی (GENTILES) کہتے تھے جس کے معنی صرف اَن پڑھ کے نہیں بلکہ وحشی اور جاہل کے بھی ہیں۔ (مودودی۔ ج ۵ ص ۲۷۳، ۲۷۴) ان کا عقیدہ یہ تھا کہ ان امیوں کو وہ انسانی حقوق حاصل نہیں ہیں جو اسرائیلیوں کے لئے ہیں۔ اور ان کا مال ہر جائز و ناجائز طریقے سے مار کھانا اسرائیلیوں کے لئے حلال و طیب ہے۔ (ایضاً) یہود کی اس تفوق پسندی کو اس لئے اور بھی ترقی ہوتی رہی کہ عام عرب انھیں حاملانِ دین و شریعت ہونے کی وجہ سے اپنے آپ سے برتر سمجھتے تھے اور دینی معاملات میں ان سے رہنمائی کے طالب ہوتے تھے۔ چنانچہ قریش نے ہی متعدد بار اپنے وفد مدینہ کے پاس اس لئے بھیجے کہ وہ آپ کی نبوت اور آپ کی صفات کتب سابقہ کی روشنی میں ان سے دریافت کریں (مجیب اللہ ندوی۔ ص ۳۰)۔ عام عربوں کے علاوہ دینی لحاظ سے یہود کی برتری کا سکہ اوس اور خزرج پر تو یہاں تک قائم تھا کہ جب ان کے بچے زندہ نہیں بچتے تھے تو وہ منت مانتے تھے کہ بچہ زندہ رہ جائے گا تو اسے یہودی بنائیں گے (ابوداؤد۔ سنن۔ اصح المطابع۔ کراچی۔ ۱۳۶۹ھ۔ ج ۲۔ ص ۳۶۵۔ کتاب الجہاد۔ باب فی الاسیر یکرہ علی الاسلام) چنانچہ مدینہ میں اس طرح کے بہت سے جدید الیہودیہ افراد موجود تھے (مجیب اللہ ندوی، ص ۳۰)۔

(۳) یہودیوں کی معاشی اور اقتصادی حالت بہت اچھی تھی۔ اور اس اعتبار سے بھی وہ دیگر عرب قبائل پر فوقیت رکھتے تھے۔ اس کی ایک وجہ غالباً یہ تھی کہ وہ فلسطین و شام کے متمدن علاقوں سے آئے تھے۔ اس لئے وہ بہت سے ایسے فنون جانتے تھے جو اہلِ عرب میں رائج نہ تھے اور باہر کی دنیا سے ان کے کاروباری تعلقات بھی تھے (مودودی۔ ج ۵، ص ۲۷۳، ۲۷۴) قریشِ مکہ جن کی تجارت ضرب المثل ہے وہ بھی بعض اوقات مثلاً شادی بیاہ کے مواقع پر خیبر کے یہودیوں سے زیورات کرائے پر لیا کرتے تھے (مجیب اللہ ندوی، ص ۳۰)۔ مدینہ میں چونکہ اوس اور خزرج کے قبائل مالی لحاظ سے کمزور ہو گئے تھے اس لئے وہ عام طور پر یہود کے مقروض تھے (مجیب اللہ ندوی۔ ص ۳۰) بلکہ یہود کو وہ خراج ادا کرتے تھے (یاقوت حموی۔ ج ۵۔ ص ۸۳) اگر ایک طرف ان کے تجارتی و مالی مفادات کا تقاضا یہ تھا کہ عربوں میں سے کسی سے نہ بگاڑیں تو دوسری طرف ان کے مفاد کا تقاضا یہ بھی تھا کہ عربوں کو باہم متحد نہ ہونے دیں اور

انھیں ایک دوسرے سے لڑاتے رہیں (مودودی - ج ۵۔ ص ۴،۳۴)۔

(۴) عرب کا معاشرتی نظم قبائلی تھا اس لئے یہود کے ہر قبیلے کو بھی اپنی حفاظت کے لئے کسی نہ کسی طاقتور عرب سے حلیفانہ تعلقات بھی قائم کرنے پڑتے تھے تاکہ کوئی دُوسرا زبردست قبیلہ ان پر ہاتھ نہ ڈال سکے۔ اس بناؑ پر بارہا انھیں نہ صرف ان عرب قبائل کی باہمی لڑائیوں میں حصہ لینا پڑتا تھا بلکہ بسا اوقات ایک یہودی قبیلہ اپنے حلیف عرب قبیلے کے ساتھ مل کر دوسرے یہودی قبیلہ کے خلاف جنگ آزما ہوجاتا تھا جس کے حلیفانہ تعلقات فریق مخالف سے ہوتے تھے (مودودی ج ۵ ص ۴ ۳۷) چنانچہ جنگِ بعاث کے موقع پر یہ تصویر واضح ہوجاتی ہے۔

بہرحال جیسا کہ ڈاکٹر حمید اللہ نے لکھا ہے کہ "عہدِ نبوی ؐ کے آغاز پر یہودی ہم کو عرب کے ہر حصہ میں ملتے ہیں۔ ٹھوس بستیوں میں بھی اکّے دُکّے بھی بلکہ بستیوں کا ایک زنجیرہ نظر آتا ہے جو ایلہ (عقبہ)، مقنا، خیبر، وادی القریٰ، تیماؔ، فدک، مدینہ (یثرب) اور طائف و جرش سے لے کر یمن اور عمان و بحرین تک عرب میں شمالاً جنوباً چلا گیا تھا (ڈاکٹر حمید اللہ - رسولِ اکرمؐ کی سیاسی زندگی - دار الاشاعت - کراچی - سنہ ۱۹۶۱ء ص ۲۱۰)۔ ہجرتِ مدینہ کے بعد رسول اللہؐ اور یہود سے تعلقات پر بحث مقالہ میں کی گئی ہے، اس لئے مزید تفصیل یہاں غیر ضروری ہے۔

[۱۶۲] بعاث کی جنگ وہ جنگ تھی جس میں اوس اور خزرج باہم برسرِ پیکار ہوئے تھے۔ اس جنگ میں بالآخر خزرج پر اوس کو فتح حاصل ہوئی۔ اس وقت اوس کا سردار ابو اسید حضیر بن سماک الاشہلی اور خزرج کا سردار عمرو بن النعمان البیاضی تھا۔ یہ دونوں اس جنگ میں مارے گئے (ابنِ ہشام ج ۲ ص ۲۰۴) اوس و خزرج کے مابین اگرچہ لڑائیاں بہت سی ہوئیں جو حربِ سمیر، حربِ کعب، حربِ حاطب، یوم السرارہ، یوم الربیع، یوم فارع، یوم البقیع، یوم معبس و مفرس وغیرہ کے ناموں سے مشہور ہیں (تفصیلات کے لئے: محمد احمد جاد، علی محمد البجاوی اور محمد ابو الفضل ابراہیم ایام العرب فی الجاہلیہ - مطبعہ عیسٰی البابی الحلبی - مصر - سنہ ۱۹۴۲ء ص ۶۲ اور ۶۳، تا ۷۴)۔ لیکن بعاث وہ آخری جنگ ہے جو مذکورہ گروہوں کے درمیان واقع ہوئی بلکہ ان کے ہمراہ ان کے اعوان و انصار نے بھی حصہ لیا۔ چنانچہ خزرج کے ساتھ ان کے حلیف اشجع اور جہینہ کے قبیلے تھے جبکہ اوس کے ساتھ مزینہ کے علاوہ قریظہ اور نضیر کے یہودی قبائل بھی تھے۔ اس جنگ کا آغاز بعثتِ نبویؐ سے قبل ہوا (ابنِ خلدون ج ۲ ص ۲۰۹) اور اختتام ہجرت سے چند سال پہلے ہوا۔

[۱۶۳] ولہازن اپنے مضمون The Tribal Life of the Epic Period میں رسول اللہؐ کی آمد سے پہلے حالات کی نقشہ کشی ان الفاظ پر ختم کرتا ہے کہ:

"Life was then indeed impossible" (زندگی فی الحقیقت ناممکن تھی)

ملاحظہ ہو:

Williams, Henry Smith (edd), The Historians History of the World, The Times, London, 1908, Vol.VIII, p. 291.

[۱۶۴] عبداللہ بن ابی سلول ایک خزرجی سردار تھا۔ بیعت عقبہ ثانیہ کے دوران موسم حج میں دیگر اہلِ مدینہ کے ساتھ مکہ گیا تھا قریش کو جب بیعت عقبہ ثانیہ کی بھنک پڑی اور وہ تحقیق حال کے لئے ابن ابی کے پاس پہنچے تو اس نے کہا تھا یہ بالکل جھوٹ ہے اگر یہ واقعہ پیش آتا تو مجھ سے ضرور مشورہ لیا جاتا (ابنِ ہشام ج ۲ ص ۹۱) ابن ابی کی یہ توقع بے جا نہ تھی۔ کیونکہ اسے اہلِ مدینہ میں خاص مقام و اہمیت حاصل تھی (ایضاً ج ۳ ص ۱۱۱) اور اس کی سرداری و عزت کا عالم یہ تھا کہ رسولؐ اللہ کی آمد سے پہلے اسے تاجدار بنانے کی تیاریاں پورے زور شور سے ہو رہی تھیں اور اس کے لئے موتیوں کا ایک تاج بھی بن رہا تھا (ایضاً ج ۳ ص ۳۰۴)۔ مگر رسولؐ اللہ کے پہنچ جانے سے اُس کا خواب شرمندۂ تکمیل نہ ہو سکا۔ اس کا افسوس ابن ابی کو غالباً زندگی بھر رہا لیکن اس میں اتنی اخلاقی جرأت نہ تھی کہ علی الاعلان رسولؐ اللہ کی مخالفت کر گزرتا اس لئے بظاہر اسلام قبول کر لیا۔ اور اس طرح منافقوں کا سردار بن گیا۔ ابن ابی نے رسولؐ اللہ کے خلاف اور اسلام کے رد میں جو سرگرمیاں روا رکھیں ان کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ ابن ابی کا انتقال ۹ھ میں ہوا۔ [۱۶۵] ایضاً ج ۳ ص ۳۰۴ [۱۶۶] ایضاً ج ۲ ص ۷۱

[۱۶۷] البخاری۔ ج ۱۔ ص ۳۳۵ (کتاب المناقب) [۱۶۸] ابنِ ہشام۔ ج ۲۔ ص ۷۰

[۱۶۹] سعید انصاری۔ سیر انصار۔ مطبع معارف اعظم گڈھ، ۱۳۴۳ھ۔ حصہ اول۔ ص ۴۰۔ نیز دیکھئے:

Watt, W. Montgomery, Muhammad at Mecca, Clarendon Press, London, 1953, p.144.

یہاں واٹ کی ایک توجیہہ قابلِ ذکر ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اہلِ مدینہ سرد جنگ سے اتنے عاجز آ چکے تھے کہ وہ کسی بھی ایسے طریقے کو اپنانے کے لیے آمادہ تھے جو انھیں سکون و عافیت کی ضمانت مہیا کر سکے۔ اور یہ جذبہ اتنا مقبول بلکہ شدید تھا کہ عبداللہ ابن ابی جیسا شخص بھی اس کے خلاف نہ جا سکتا تھا خواہ یہ چیز اس کے ذاتی مفاد کے کتنے ہی خلاف کیوں نہ ہو۔" ملاحظہ ہو:

Watt, W. Montgomery, Islam and the Integration of Society, Routledge and Kegan Paul, London, 1961, p. 21.

[۱۷۰] ابن ہشام ج ۲ ص ۷۰ [۱۷۱] ابنِ ہشام کی روایت کے مطابق ان کے نام یہ ہیں:

(۱) ابو امامہ اسعد بن زرارہ (۲) عوف بن الحارث (۳) رافع بن مالک (۴) قطبہ بن عامر (۵) عقبہ بن عامر (۶) جابر بن عبداللہ (ج ۲ ص ۷۱، ۷۲)

ان لوگوں کی تعداد بعض نے آٹھ بیان کی ہے۔ اسعد بن زرارہ اور ابو الہیثم کا پہلے سے موجود ہونا ابنِ سعد نے لکھا ہے (ج ۱ ص ۲۱۸) جبکہ واقدی کا بیان ہے کہ اسعد بن زرارہ اس سے پہلے مکہ میں جا کر آنحضرتؐ پر

اسلام لا چکے تھے۔ بعض نے ابوالہیثم کی جگہ عقبہ بن عامر کا نام لیا ہے اور بعض نے جابر بن عبداللہؓ کے بجائے عبادہ بن الصامت کو جگہ دی ہے۔ (شبلی ج ۱ ص ۲۶۳) [۲ ۔ ۱] ابن ہشام ج ۲ ص ۴۲۔

[۳ ۔ ۱] ابن سعد ج ۱ ص ۲۲۰ ۔ واضح رہے کہ اس بیعت کو اصطلاحاً "بیعت النساء" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ (ابن ہشام ج ۲ ص ۴۳)

[۴ ۔ ۱] اس بات میں مورخین کے درمیان اختلاف ہے کہ اہلِ مدینہ نے معلّم کی درخواست کب اور کس طرح کی تھی۔ ابن ہشام کے اس بیان سے کہ "بعث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معھم مصعب (ج ۲ ص ۴۶) سے مترشح ہوتا ہے کہ بیعت کے موقع پر ہی انھوں نے اس خواہش کا اظہار کیا تھا۔ جبکہ ابن سعد نے لکھا ہے کہ جب بیعتِ عقبۂ اُولیٰ کے بارہ آدمی مدینہ واپس پہنچے اور انصار کے گھر گھر اسلام پھیل گیا تو انھوں نے ایک آدمی کے ذریعہ رسول اللہؐ کو خط لکھا جس میں مذکورہ خواہش کا اظہار تھا (ابن سعد ج ۱ ص ۲۲۰ اور ج ۳ ص ۱۱۸)۔ نیز دیکھئے:
البلاذری ۔ احمد بن یحییٰ ۔ انساب الاشراف ۔ تحقیق ۔ الدکتور محمد حمید اللہ ۔ معھد المخطوطات ۔ جامعۃ الدول العربیۃ دار المعارف ۔ مصر ۔ ۱۹۵۹ء (ج ۱ ص ۲۳۹)

[۵ ۔ ۱] مصعب نام، ابو محمد کنیت، والد کا نام عمیر اور والدہ کا خناس بنت مالک تھا۔ پورا سلسلۂ نسب یہ ہے: مصعب بن عمیر بن ہاشم بن عبد مناف بن عبدالدار بن قصی (ابن سعد ج ۳ ص ۱۱۶) بچپن میں ان کی پرورش انتہائی نازونعم میں ہوئی، خود رسول اللہؐ کا یہ ارشاد تھا کہ "میں نے مکہ میں مصعب سے زیادہ کوئی حسین، خوش پوشش اور پروردۂ نعمت نہیں دیکھا۔ لیکن اسلام لانے کے بعد اللہ اور اس کے رسولؐ کی محبت میں خستہ حال ہو گئے۔" (ایضاً ص ۱۱۶، ۱۱۷) اس وقت ایمان لائے جبکہ رسول اللہؐ کا قیام دار ارقم میں تھا۔ حبشہ ہجرت کی۔ پھر بیعتِ عقبہ کے بعد بطور معلّم و قاری مدینہ بھیجے گئے (جس کی تفصیل پہلے آچکی ہے)۔ اس دوران ان کی پُر خلوص کوششوں کی وجہ سے مدینہ کے بڑے بڑے سردار مثلاً سعد بن معاذ اور اسید بن حضیر وغیرہ نے اسلام قبول کیا اور بہت ہی قلیل عرصہ میں اسلام انصار کے گھر گھر پھیل گیا (ابن ہشام ج ۲ ص ۷۹، ۸۰) حضور کی اجازت سے انھوں نے سب سے پہلے نمازِ جمعہ باجماعت (کی روایت قائم کی (ایک رائے کے مطابق جمعہ پہلی مرتبہ اسعد بن زرارہ نے قائم کیا تھا۔ ابن سعد ج ۳ ص ۱۱۸) بیعت عقبۂ ثانیہ کے بعد مکہ ہی میں قیام کیا، یہاں تک کہ رسول اللہؐ کے سفرِ ہجرت سے چند دن قبل یعنی یکم ربیع الاول ۱۳ نبوی کو عازمِ مدینہ ہوئے (ایضاً ص ۱۱۹) اور مدینہ پہنچ کر حضرت سعد بن معاذ کے مکان پر اترے (ایضاً ص ۱۱۷) ہجرتِ مدینہ کے بعد ان کی مواخات حضرت ابوایوب انصاری سے (ابن ہشام ج ۲ ص ۱۵۲) یا سعد بن ابی وقاص یا ذکوان بن عبد قیس (ابن سعد ج ۳ ص ۱۲۰) سے ہوئی) غزوۂ بدر میں شریک ہوئے تو سفید علم (ابن ہشام ج ۲ ص ۲۶۴) یعنی مہاجرین کا بڑا جھنڈا ان کے ہاتھ میں تھا (ابن سعد ج ۳ ص ۱۲۰) اور یہ عجیب اتفاق تھا کہ دوسری طرف قریش کی جانب النضر بن الحارث کے بعد مشرکین کا علمبردار ان کا بھائی ابوعزیز

بن عمیر تھا جو بالآخر قید ہوا اور چار ہزار درہم کے فدیہ پر رہا ہوا (ابنِ ہشام ج ۲ ص ۳۰۰)۔ غزوۂ اُحد میں بھی علم بردار مصعب بن عمیر ہی تھے۔ آخر وقت تک علم کو نیچے نہ گرنے دیا۔ اسی غزوہ میں شہادت پائی۔ شہادت کے وقت عمر چالیس سال یا کچھ زائد تھی (ابنِ سعد ج ۳ ص ۱۲۲)۔ مزید حوالے کے لئے دیکھئے: ابن عبد البر: الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب۔ مطبعہ دائرۃ المعارف النظامیہ۔ دکن ۱۳۳۶ھ (ج ۱ ص ۲۷۹)۔ نیز ابن حجر العسقلانی۔ الاصابہ فی تمییز الصحابہ۔ المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ۔ مصر۔ ۱۹۳۹ء۔ (ج ۳ ص ۴۰۱)۔

[۱۷۶] ان گھرانوں کے نام یہ ہیں:

بنی امیّہ بن زید، خطمہ، وائل اور واقف (یہ اوسں اللہ کہلاتے تھے اور اوس بن حارثہ کی اولاد تھے۔ انہیں اسلام سے روکنے میں ان کا قائد اور شاعر ابو قیس بن لاسلت صیفی پیش پیش تھا۔ اسی کی وجہ سے کم و بیش غزوۂ خندق تک یہ گھرانے اور وُہ خود بھی دولتِ اسلام سے محروم رہا۔ (ابن ہشام ج ۲ ص ۸۰)

[۱۷۷] ایضاً ج ۲ ص ۷۷۔ [۱۷۸] آل عمران (۱۰۳) [۱۷۹] الانفال (۶۳)

[۱۸۰] Muir, William, The Life of Mahomet, Smith-Elder & Co.,

[۱۸۱] طبری کی روایت ہے کہ مصعب موسم حج سے کچھ پہلے مکہ آئے تھے۔ اور پھر بعد میں مدینہ کے مسلمان دوسرے مشرکوں کے ساتھ ادائیگی فریضۂ حج کے لئے آئے (طبری ج ۲ ص ۳۶۰)۔ محمد حسین ہیکل نے بغیر کسی حوالے کے یہ لکھا ہے کہ حضرت مصعب بہت پہلے یعنی رجب ۱۲ سنہ نبوی میں مکہ آ گئے تھے (ہیکل، محمد حسین۔ حیاۃ محمد۔ مکتبہ النہضۃ المصریہ۔ قاہرہ ۱۹۴۷ء۔ ص ۲۰۲)

[۱۸۲] اسلامی تاریخ کے تقریباً تمام مآخذ میں عقبہ کی اس ملاقات کے لئے "اوسط ایام التشریق" (ابنِ ہشام ج ۲ ص ۸۱ مزید حوالے کے لئے: طبری ج ۲ ص ۳۶۰، ابن عبد البر۔ الدرر فی اختصار المغازی والسیر۔ لجنۃ احیاء التراث الاسلامی۔ مصر۔ ۱۹۶۶ء۔ مطبعۃ السعادۃ۔ مصر ۱۹۳۲ء ج ۳ ص ۱۵۸ نیز ابنِ کثیر کی کتاب، السیرۃ النبویہ۔ مطبعۃ عیسیٰ البابی حلبی۔ قاہرہ ۱۹۶۴ء ج ۲ ص ۱۹۲ وغیرہ وغیرہ) کی ایک رات کو مقرر کیا گیا ہے۔ لیکن یہ تعین کچھ مبہم ہے۔ اس لئے ابنِ سعد کے بیان "ایام التشریق لیلہ النفر الاوّل (ج ۱ ص ۲۲۱) سے اس کی تصریح ہو جاتی ہے۔ اور البلاذری نے اس کی مزید تشریح یوں کر دی ہے کہ: "اللیلۃ التی صبحتہا النفر الآخر باسفل العقبہ ویقال فی اللیلۃ التی صبحتہا النفر الاوّل"۔ (انساب ج ۱ ص ۲۵۴)۔ بہرحال اگر النفر الاوّل کو مانا جائے تو اس سے مراد ۱۲ ذی الحجہ ہے (MUIR. P. 233. حاشیہ)

[۱۸۳] ابنِ ہشام کا بیان ہے کہ اہلِ مدینہ کی کل تعداد پچھتّر تھی یعنی ۷۳ مرد اور دو عورتیں (ابنِ ہشام ج ۲ ص ۹۷۔ ناموں کی تفصیل کے ساتھ) البلاذری نے (الانساب الاشراف میں) ستر بتائی ہے بلکہ عنوان ہی یہ قائم کیا ہے کہ تسمیۃ

السبعین الذین بایعوا عند العقبہ (ج ۱ ص ۲۴۰) البتہ ابن حزم نے ابنِ ہشام کی متابعت میں تعداد پچھتّر ہی بتائی ہے (ابنِ حزم ۔ جوامع السیرۃ ص ۷۵) یہی بیان السہیلی (الروض الانف ۔ مطبعۃ الجمالیہ ۔ مصر ۱۹۱۴ء ج ۱ ص ۲۷۵) کا بھی ہے ۔ [۱۸۴] ابنِ ہشام ج ۲ ص ۸۴ ۔

[۱۸۵] اس موقع پر دورانِ گفتگو حضرت عباس بن عبدالمطلب نے حاضرین کو خبردار کیا تھا کہ باتیں آہستہ اور مختصر کی جائیں اس لئے کہ جاسوس لگے ہُوئے ہیں (ابنِ سعد ج ۱ ص ۲۲۲) جبکہ الہیثمی کی روایت کردہ حدیث کے مطابق مقامِ عقبہ پر پہنچتے ہی رسولؐ اللہ نے یہ ہدایت فرما دی تھی کہ :

"اوجزوا فی الخطبہ فانی اخاف علیکم کفار قریش" (الہیثمی ، نورالدین علی بن ابی بکر ۔ مجمع الزوائد و منبع الفوائد ۔ مکتبۃ القدس ۔ قاہرہ ۔ ۱۳۵۳ھ ۔ ج ۶ ص ۴۷)

[۱۸۶] عام طور پر مورخین نے ان تمام باتوں کا یکجا ذکر نہیں کیا ہے ۔ ہم نے یہاں مجموعی طور پر تمام روایات کا خلاصہ دے دیا ہے ۔ تفصیلات اور حوالوں کے لئے ملاحظہ ہو :

ابنِ ہشام (ج ۲ ص ۸۴ ، ۸۵ ، ۹۷) ، ابنِ سعد (ج ۱ ص ۲۲۲) ، الیعقوبی (تاریخ الیعقوبی ، دار صادر ، بیروت ۱۹۶۰ء ۔ ج ۲ ص ۳۸) ، طبری (ج ۲ ص ۳۶۲ ، ۳۶۳ ، ۳۶۳) ، ابنِ حزم (ص ۷۴) ، ابنِ عبدالبر (الدرر ص ۴۷) ، ابن سید الناس (ج ۱ ص ۱۶۵) ، الذہبی (تاریخ الاسلام و طبقات المشاہیر و الاعلام ۔ مکتبۃ القدس قاہرہ ۱۳۶۷ھ ج ۱ ص ۱۸۱) ، ابنِ قیم (زادالمعاد فی ہدی خیر العباد مطبعہ مصطفیٰ البابی الحلبی ، مصر ، ۱۹۵۰ء ج ۲ ص ۵۱) ، ابنِ کثیر (البدایہ ج ۳ ص ۱۵۹ ، ۱۶۰ ، ۱۶۳ ، ۱۶۴) ، السیرۃ ج ۲ ص ۱۹۵) ، ابنِ خلدون (ج ۲ ، بقیہ الجزء الثانی ص ۱۲) ، الہیثمی (ج ۶ ص ۴۷ ، ۴۸ ، ۴۹) وغیرہ ۔

[۱۸۷] عباس نام ، قبیلہ خزرج سے ہیں ۔ نسب نامہ یہ ہے :

عباس بن عبادہ بن نضلہ بن مالک بن عجلان بن زید بن غنم بن سالم بن عوف بن عمرو بن عوف بن الخزرج ۔ بیعت عقبہ ثانیہ میں شریک تھے (جیسا کہ خود ان کی مذکورہ تقریر سے ثابت ہے) ۔ بیعت کے بعد مکہ ہی میں مقیم ہو گئے پھر ہجرت کر کے دیگر مہاجرین کے ہمراہ مدینہ آئے اس بنا پر وہ مہاجری انصاری ہیں (ابنِ ہشام ج ۲ ص ۱۰۷) وہ رسولؐ اللہ کے مہمان یعنی اصحابِ صُفّہ میں داخل تھے ۔ مدینہ آکر حضرت عثمان بن مظعون سے مواخاۃ ہوئی بدر میں شریک نہ تھے ۔ غزوۂ اُحد میں شریک ہوئے اور لڑ کر شہادت پائی (سعید انصاری ج ۲ ص ۸۹ ، ۹۰) ۔

[۱۸۸] ابنِ ہشام ج ۲ ص ۸۸ ، ۸۹ ۔

[۱۸۹] اسعد نام ، ابوامامہ کنیت ، خیر لقب ، قبیلہ خزرج سے تھے اور نجار کے خاندان سے وابستہ تھے ۔ نسب نامہ یہ ہے :

اسعد بن زرارہ بن عدس بن عبید بن ثعلبہ بن غنم بن مالک بن النجار (ابن سعد ج ۳ ص ۱۰۸)

اپنی فطرت سلیمہ کی بنا پر کفر و شرک سے متنفر تھے۔ ایک روایت کے بموجب اہلِ مدینہ میں سب سے پہلے ایمان لانے والے یہی تھے (ایضاً) اور انھوں نے ہی سب سے پہلے حضورؐ سے مکہ میں ملاقات کی تھی (ایضاً ص ۶۰۹) عقبہ اولیٰ اور ثانیہ دونوں میں شریک تھے۔ اور عقبہ ثانیہ کے موقع پر جو تقریر کی وہ آگے ہم نے نقل کی ہے۔ اسی موقع پر انھیں بنو نجار کا نقیب مقرر کیا گیا۔ نقباؑ میں یہ سن و سال کے لحاظ سے اگرچہ سب سے کم تھے لیکن ابنِ سعد کے بقول "راس النقباء" (ج ۳ ص ۶۱۱) اور البلاذری کی روایت کے مطابق رسول اللہؐ نے انھیں "نقیب النقباء" بنایا تھا (البلاذری۔ الانساب، ج ۱ ص ۲۴۳) رسولؐ کی آمد مدینہ سے قبل اسعد لوگوں کے ساتھ پنج وقتہ نمازیں ادا کرتے تھے۔ اور نماز با جماعت کا اہتمام بھی کر رکھا تھا۔ جب حضرت مصعب مدینہ پہنچے تو وہ بھی ان حضرات کے ساتھ نمازیں ادا کرتے تھے اور رسول اللہؐ کے حکم سے نمازِ جمعہ کا اہتمام کرتے تھے (ابنِ سعد ج ۳ ص ۶۰۹) ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ ایک روایت کے مطابق اسعد بن زرارہ ہی پہلے شخص تھے جنھوں نے مدینہ میں جمعہ کی بنیاد ڈالی (ابن ہشام ج ۲ ص ۷۷) اس دوران حضرت مصعب کا قیام بھی اسعد کے گھر میں رہا (ایضاً ص ۷۶)۔

ہجرتِ نبویؐ کے وقت اگرچہ رسول اللہؐ کا قیام ابو ایوب انصاری کے یہاں رہا تاہم آپ کی اونٹنی اسعد بن زرارہ کی مہمان تھی (ابنِ سعد ج ۱ ص ۲۳۷) حضرت اسعد کی عمر نے مزید وفا نہ کی اور جلد ہی شوال ۱ھ میں یعنی جبکہ مسجد نبویؐ کی تعمیر ہو رہی تھی کہ آپ کا انتقال ہو گیا (ایضاً ج ۳ ص ۶۱۱) قبرستانِ بقیع میں دفن ہونے والے پہلے مسلمان ہیں (ایضاً ص ۶۱۲) اسعد چونکہ بنو نجار کے نقیب تھے اس لیے وفات کے بعد انھوں نے رسول اللہؐ سے کسی دوسرے کو ان کا نقیب مقرر کرنے کی درخواست کی۔ رسول اللہؐ نے فرمایا: "میں تمہارا نقیب ہوں۔" (ایضاً ص ۶۱۱)۔ معلوم ہوتا ہے کہ نقباؑ کا ادارہ اس وقت بھی موثر تھا۔

[۱۹۰] ابنِ سید الناس ج ۱ ص ۱۶۵۔ ابنِ سعد نے اسعد بن زرارہ کی جو تقریر نقل کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:
یا ایہا الناس ھل تدرون علی ما تبایعون محمداً؟ انکم تبایعونہ علیٰ ان تحاربوا العرب والعجم والجن والانس مجلبۃ۔ (ابن سعد ج ۳ ص ۶۰۹) [۱۹۱] ابنِ ہشام ج ۲ ص ۸۹۔

[۱۹۲] بیعت العقبۃ الاولیٰ کو "بیعۃ النساء" اور بیعت العقبۃ الثانیہ کو "بیعت الحرب" سے موسوم کیا جاتا ہے۔ موخر الذکر کی توجیہہ یہ ہے کہ اس بیعت میں اہلِ مدینہ نے جہاد، کفار سے لڑنے اور حضورؐ کی جان کی حفاظت و دفاع کرنے پر بیعت کی تھی اس بیعت کے موقع پر براؑ بن معرور نے اہلِ مدینہ کی نمائندگی کرتے ہوئے کہا تھا "یا رسول فنحن واللہ ابناء الحروب و اھل الحلقۃ" (ابن ہشام ج ۲ ص ۸۵) اور عباس بن نضلہ نے اپنے ہم وطنوں کو خبردار کیا تھا کہ "انکم تبایعونہ، علی حرب الاحمر و الاسود من الناس" (ایضاً ص ۸۸) اور ان ہی عباس نے رسول اللہؐ سے جنگ کی اجازت مانگی تھی اور کہا تھا کہ:
واللہ الذی بعثک بالحق ان شئت لنمیلین علیٰ اھل منیٰ غداً باسیافنا؟ قال فقال رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لو نومر بذلك (ایضاً ص ۹۰)

صرف یہی نہیں کہ اہلِ مدینہ اور اہلِ ایمان ہی بیعتِ مذکورہ کو ہمہ گیر جنگ کا پیش خیمہ سمجھ رہے تھے بلکہ اس حقیقت کا احساس قریشِ مکہ میں بھی موجود تھا چنانچہ شب عقبہ کے بعد صبح کو خزرجیوں سے تفتیشِ حال کے لئے ان الفاظ کا سہارا لیا تھا کہ:

یا معشر الخزرج انہ قد بلغنا انکم قد جئتم الیٰ صاحبنا ھذا تستخرجونہ من بین اظھرنا وتبایعونہ علیٰ حربنا؟ (ایضاً ص ۹۰)

یہاں بخاری کی اس روایت سے غلط فہمی نہ ہونی چاہئے جس میں یہ مذکور ہے کہ عقبۂ ثانیہ کی شرائط میں شرک، چوری، زنا، قتلِ اولاد سے اجتناب شامل تھا (البخاری، صحیح۔ اصح المطابع۔ دہلی ۱۹۳۸ء ج ۱ ص ۵۰۵ کتاب المناقب) کیونکہ تمام مورخین اور اصحابِ سیر اس پر متفق ہیں کہ یہ عقبۂ اولیٰ کی شرائط ہیں۔

[۱۹۳] ابنِ ہشام ج ۲ ص ۸۵۔

[۱۹۴] ایضاً (ج ۲ ص ۸۵) رسول اللہؐ کے اس ارشاد کے علاوہ اہلِ مدینہ نے بھی یہ کہا تھا کہ:

"نحن حرب لمن حارب وسلم لمن سالم" (ابنِ سعد ج ۳ ص ۶۰۹)

یہی روایت الہیثمی نے بھی نقل کی ہے (الہیثمی ج ۶ ص ۴۹)

[۱۹۵] ابنِ ہشام ج ۲ ص ۸۵۔ [۱۹۶] البلاذری (انساب) ج ۱ ص ۲۵۴۔

[۱۹۷] ابن الجوزی۔ ابی الفرج عبدالرحمٰن۔ زاد المسیر فی علم التفسیر۔ المکتب الاسلامی للطباعۃ والنشر۔ بیروت ۱۹۶۵ء ج ۲ ص ۳۱۰، ۳۱۱۔

[۱۹۸] الزمخشری۔ ابی القاسم جار اللہ محمود بن عمر۔ الکشاف عن حقائق التنزیل وعیون الاقاویل فی وجوہ التاویل۔ مطبعہ مصطفیٰ البابی الحلبی۔ مصر ۱۹۴۸ء، ج ۱ ص ۴۵۰۔

[۱۹۹] ابنِ کثیر (تفسیر) ج ۲ ص ۵۲۴۔

[۲۰۰] البلاذری (انساب) ج ۱ ص ۲۵۴ رسول اللہؐ کے ارشاد میں حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ سے متعلق دونوں حوالے قرآن میں بھی موجود ہیں۔ دیکھئے: المائدہ (۱۳) اور الصف (۱۴)

[۲۰۱] بارہ نقبا کی تفصیل یہ ہے:

اوس میں سے: اسید بن حضیر، سعد بن خیثمہ اور ابو الہیثم بن التیہان یا رفاعہ بن عبدالمنذر (ابنِ ہشام ج ۲ ص ۸۷۔ رفاعہ کا نام ابنِ ہشام نے لکھا ہے مگر اس کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ یہ قابلِ التفات نہیں ہے کیونکہ کعب بن مالک نے جو انصار کے شاعر تھے اور اس بیعت میں شریک تھے نقبا کے نام ایک نظم میں بیان کئے ہیں لیکن اس میں رفاعہ کا نام نہیں ہے۔ ایضاً ص ۸۷، ۸۸)۔

خزرج میں سے: اسعد بن زرارہ، سعد بن ربیع، عبداللہ بن رواحہ، براء بن معرور، عبداللہ بن عمرو، عبادہ بن الصامت، رافع بن مالک اور سعد بن عبادہ و منذر بن عمرو (ایضاً ص ۸۶، ۸۷۔ ابنِ سعد ج ۳ ص ۶۰۲ تا ۶۲۲)

[۲۰۲] اسید نام کنیت ابوالحضیر تھی۔ سلسلۂ نسب یہ ہے:
اسید بن حضیر بن سماک بن عتیک بن امرئ القیس بن زید بن عبدالاشہل۔ باپ حضیر الکتائب جنگِ بعاث میں اوس کے کمانڈر تھے۔ اسید باپ کے بعد اپنی قوم میں سب سے معزز تھے۔ فنِ کتابت سے واقف تھے حالانکہ اس زمانہ میں عرب میں اس کا رواج بہت کم تھا۔ اعلیٰ خصوصیات کی بنا پر "الکامل" کے نام سے پکارے جاتے تھے حضرت مصعب بن عمیر کے ہاتھ پر ایمان لائے۔ عقبۂ ثانیہ میں شریک تھے اور نقیب بنائے گئے۔ ان کی مواخاۃ ہجرت کے بعد زید بن حارثہ سے ہوئی۔ بدر میں شریک نہ تھے اس کے بعد دیگر تمام غزوات میں شریک رہے۔ انتقال شعبان ۲۰ھ میں ہوا۔ (ابنِ سعد ج ۳ ص ۶۰۳ تا ۶۰۵)

[۲۰۳] ابنِ سعد ج ۳ ص ۶۰۴۔

[۲۰۴] ایضاً ص ۶۰۸، ۶۰۹ (ان کے تفصیلی حالات حاشیہ نمبر ۱۸۹ میں آچکے ہیں)۔ [۲۰۵] ایضاً ص ۶۱۱

[۲۰۶] البلاذری (انساب) ج ۱ ص ۲۴۳۔ [۲۰۷] ابن سید الناس ج ۱ ص ۱۹۵۔

[۲۰۸]
Ilyas Ahmad, The Social Contract and the Islamic State, The Urdu Publishing House, Allahabad, 1944, p. 1-20)

[۲۰۹] ایک سیاسی تصور کے طور پر "معاہدۂ عمرانی" کی تاریخ کافی طویل ہے۔ (ملاحظہ ہو
Watt, (Islam and the Integration of Society), p. 21.
لیکن اس تصور کے ضمن میں ہابس، لاک اور روسو کے نظریات قابلِ ذکر ہیں۔ بحیثیت مجموعی ہم کہہ سکتے ہیں کہ معاہدہ عمرانی کا مقصد قدرتی زمانۂ جنگ اور نزاجیت سے آزادی حاصل کرنا، غیر سیاسی معاشرہ سے سیاسی معاشرہ کی طرف ارتقاء، اس کے ذریعہ ایک سیاسی معاشرہ اور اس کے بعد بالآخر ایک ریاست کی تشکیل، اور افراد کا اپنے اختیارات کو کسی فردِ واحد یا مجموعۂ افراد، یا معاشرے یا ارادۂ عامہ کو برضا و رغبت سپرد کر دینا ہے۔ یہاں یہ کہنا ضروری ہے کہ فلسفۂ سیاسیات کی تاریخ کی رُو سے "معاہدۂ عمرانی" کا نظریہ محض تصوراتی شے ہے جس کی کوئی تاریخی و مادی تعبیر یا دلیل نہیں پائی جاتی۔ چنانچہ کانٹ (KANT) کے بقول اس نظریہ کو فی الحقیقت کسی ریاست کا ماخذ تسلیم کرنے an explanation of the actual origin of) سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ اسے سیاسی تصور کا ایک فلسفیانہ بیان (A PHILOSO- (the state a philosophical explanation مانا جائے۔ ملاحظہ ہو:
(Ilyas Ahmad, p. 2

لیکن شہری مملکت مدینہ کے باب میں معاہدۂ عقبہ کے حوالہ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر معاہدۂ عمرانی کا کوئی مفہوم اور حقیقت ہے تو وہ اپنے بہترین معنی اور تمام حقیقتوں کے ساتھ یہاں موجود ہے۔

[۲۱۰] لوگ گھروں سے نکلتے اور شہر سے باہر جمع ہوکر انتظار کرتے اور جب سورج کی تمازت ناقابل برداشت ہوجاتی توحسرت زدہ ہوکر اپنے گھروں کو لوٹ جاتے تھے (ابن سعد ج ۱ ص ۲۳۳)۔ نیز دیکھئے: طبری (ج ۲ ص ۳۸۱) اور البخاری ج ۱ ص ۵۵۵ (باب ہجرۃ النبی واصحابہ الی المدینہ) [۲۱۱] ابنِ ہشام ج ۲ ص ۹۰۔

[۲۱۲] ایضاً۔ [۲۱۳] ابنِ سعد ج ۱ ص ۲۲۷۔

[۲۱۴] شرکاءِ محفل کے ناموں کی تفصیل کے لئے دیکھئے: ابنِ ہشام ج ۲ ص ۱۲۴ تا ۱۲۵۔ [۲۱۵] ایضاً ص ۱۲۶۔

[۲۱۶] الانفال (۳۰)۔ [۲۱۷] ابنِ ہشام ج ۲ ص ۱۲۶، ابنِ سعد ج ۱ ص ۲۲۷۔

[۲۱۸] الزخرف (۷۹، ۸۰)۔ [۲۱۹] ابنِ سعد ج ۱ ص ۲۲۷ نیز البخاری ج ۱ ص ۵۵۳ (باب بنیان الکعبہ)۔

[۲۲۰] حضرت ابوبکرؓ نے کئی بار رسولؐ اللہ سے ہجرت کی اجازت مانگی لیکن آپؐ نے فرمایا کہ جلدی نہ کرو شاید اللہ تمہارا کوئی اور بھی ساتھی کردے (ابنِ ہشام ج ۲ ص ۱۲۸)۔ علاوہ ازیں سفرِ ہجرت کے لیے دو اونٹنیوں اور زادِ سفر کا انتظام قابلِ لحاظ ہے (ایضاً ص ۱۲۹)۔ نیز (ابنِ سعد ج ۱ ص ۲۲۸، ۲۲۹)۔

[۲۲۱] یہاں یہ وضاحت مناسب ہے کہ رسولؐ اللہ بنیادی طور پر خود دُوسروں کے لئے فکرمند رہا کرتے تھے۔ اس لئے فی الواقع یہ آپ کا کوئی ذاتی مسئلہ نہ تھا اور نہ ہی آپ اس کے لئے پریشان تھے۔ اس کی تاریخی توجیہہ کے ضمن میں یہ پیش نظر رہنا چاہیے کہ جب حضورؐ مدینہ پہنچے تھے تو مدینہ کا ہر باشندہ آپؐ کی میزبانی کا حریص تھا۔ (خواہ اس کا سبب وفورِ جذبات ہو، خدمتِ رسولؐ ہو یا پاسِ عہد) لیکن کسی دُوسرے کے یہاں ٹھہرنے کے بجائے آپ حضرت ابُوایوب انصاری کے یہاں مقیم ہُوئے (ابنِ ہشام ج ۲ ص ۱۴۱) ممکن ہے ابوایوب انصاری کے یہاں آپؐ کا قیام وحی والہام کی متابعت میں ہو کیونکہ اثنائے راہ میں آپ نے بار بار یہ فرمایا تھا کہ: خلّوا سبیلھا فانھا مامورہ (ابنِ ہشام ج ۲ ص ۱۴۰)۔ لیکن یہ بات تاریخ سے ثابت ہے کہ مدینہ رسولؐ اللہ کے لئے کوئی اجنبی شہر نہ تھا۔ اس کے محلّہ بنو نجار میں آپ کا ننھیال تھا اور کم سنی کے زمانہ میں والدۂ محترمہ کے ساتھ آپ کا یہاں قیام بھی رہ چکا تھا۔ یہیں پر آپ ایک انصاری لڑکی انیسہ کے ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ اطم پر سے چڑیا کو اڑانا آپؐ کا مشغلہ رہا تھا۔ اور یہیں ایک تالاب میں آپ نے پیراکی بھی سیکھی تھی (ابنِ سعد ج ۱ ص ۱۱۶) لہٰذا ابوایوب کے گھر اترنا قرینِ قیاس یہی ہے کہ قرابت داری کی وجہ سے تھا۔

[۲۲۲] ابنِ حبیب البغدادی۔ ص ۷۱۔ نیز ابنِ سعد ج ۱ ص ۲۳۸۔

[۲۲۳] یہ امر باعثِ تعجب ہے کہ ایک طرف تو مورّخین اور اصحابِ سیر لکھتے ہیں کہ مواخاۃ مہاجرین اور انصار کے درمیان ہُوئی لیکن دوسری طرف رشتوں کی تفصیل میں یہ فرق سرے سے نظر انداز کر دیتے ہیں۔ مثلاً ابنِ ہشام کا بیان ملاحظہ ہو:

وہ لکھتا ہے :

"واخی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بین اصحابہ من المہاجرین والانصار"

اور پھر آگے لکھتا ہے کہ :

"تاخوا فی اللہ أخوین أخوین ثم اخذ بید علی بن ابی طالب فقال : ھٰذا اخی" (ابنِ ہشام ج ۲ ص ۱۵۰)

ہمارے نزدیک اس بیان میں تضاد موجود ہے۔ علاوہ ازیں چونکہ اصولی طور پر مہاجرین و انصار کے درمیان انعقاد مواخاۃ ہوا تھا اس لئے ایک مہاجر کی دوسرے مہاجر سے مواخاۃ قابلِ فہم نہیں معلوم ہوتی۔ چنانچہ اس قسم کی تمام روایات پر تبصرہ اور محاکمہ یہاں ممکن نہیں (اس کے لئے راقم الحروف کا رسالہ ملاحظہ ہو۔ نثار احمد مواخاۃ صحابہ۔ جمعیت الفلاح۔ کراچی۔ ۱۹۷۱ء) البتہ یہاں ابنِ ہشام کے مندرجہ بالا بیان میں رسولُ اللہ اور حضرت علیؓ کی جس مواخاۃ کو ذکر کیا گیا ہے اور جو بالعموم مشہور رہا ہے۔ اس کے بارے میں چند گزارشات بے محل نہ ہوں گی۔

ابن سعد نے اگرچہ اس روایت کو جس میں حضرت علیؓ کی مواخاۃ حضورؐ سے بیان کی گئی ہے، نقل کیا ہے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ :

اخی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بین علی ابن ابی طالب و سھل بن حنیف (ابنِ سعد ج ۳ ص ۲۳)

اول الذکر روایت کو بعض دوسرے مورخین بھی تسلیم نہیں کرتے۔ مثلاً ابن عبدالبر (الدرر) ص ۹۷۔

اور علامہ ابنِ کثیر لکھتے ہیں کہ :

اما مواخاۃ النبی و علی فان من العلماء ینکر ذٰلک و یمنع صحتہ و مستندہ فی ذٰلک ان ھذہ المواخاۃ انما شرعت لاجل ارتفاق بعضھم من بعض و یتالف قلوب بعضھم علی بعض فلا معنی لمواخاۃ النبی لاحد منھم و لا مھاجری لمھاجری (ابنِ کثیر۔ السیرۃ النبویہ۔ ج ۲۔ ص ۲۲۶)

اور بقول امام زرقانی علامہ ابنِ تیمیہ نے بھی اس مواخاۃ کا انکار کیا ہے اور یہاں تک دعوٰی کر دیا ہے کہ :

ان ذٰلک من الاکاذیب و انہ لم یواخ بین مھاجری و مھاجری (زرقانی۔ ج ۱۔ ص ۳۷۳)۔

اسی طرح سے بعض دوسرے اصحابِ سیر نے مواخاۃ کے اغراض و مقاصد، نیز مصالح اور خواص کے پیشِ نظر اسے رد کر دیا ہے۔ چنانچہ علامہ ابنِ قیم نے بطورِ خاص اور بطرزِ مناظرہ یہ بحث اصولی طور پر کی ہے کہ اوّل تو ایک مہاجر سے دوسرے مہاجر کی مواخاۃ ہی ناقابلِ قبول ہے اور دوسرے یہ کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم مہاجرین میں سے ہی کسی کو اپنا بھائی بناتے تو تمام لوگوں سے زیادہ تو اس کے مستحق حضرت ابوبکر تھے، جو حضورؐ کے محبوب ترین ساتھی اور رفیقِ ہجرت، انیسِ غار، دیگر تمام صحابہ سے افضل و اکرم ہیں اور جن کے بارے میں آپ یہ فرما چکے تھے کہ "دنیا والوں میں سے اگر میں کسی کو اپنا دوست بناتا تو ابوبکر کو بناتا مگر یہ کہ اسلامی اخوت سب سے بہتر ہے۔" ان کے اصل الفاظ کے لئے دیکھئے (ابنِ قیم۔ ج ۲۔ ص ۷۵)۔ ان روایات اور دلائل کے پیشِ نظر ہمارا خیال یہ ہے کہ مورخین

کو زیرِ بحث رشتہ مواخاۃ میں التباس ہوگیا ہے۔ اس کی اصل حقیقت یہ ہے کہ حضورؐ اور حضرت علی کے درمیان مواخاۃ یقیناً ہوئی ہے مگر مکہ میں، مدینہ میں نہیں۔ صحیح قرینِ قیاس اور مناسب حال بات یہی نظر آتی ہے کہ حضرت علی کی مواخاۃ حضورؐ سے نہیں بلکہ حضرت سہل بن حنیف سے قائم کی گئی تھی۔ اور حضرت علی کی یہ مواخاۃ اس امر کو مستلزم نہیں ہے کہ اب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی رشتہ مواخاۃ متعین طور پر کسی نہ کسی انصاری سے ضرور جوڑا جائے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ دوسرے بہت سے مہاجرین کی طرح (اگر مواخاۃ میں شرکا کی تعداد اور کیفیت روایتی طور پر ۴۵ یا ۵۰ تسلیم کر لی جائے) حضورؐ کی مواخاۃ بھی کسی سے نہیں ہوئی۔ دوسرے یہ کہ حضورؐ چونکہ تمام انصار سے بحیثیت مجموعی بیعت عقبۂ کبیرہ میں یہ کہہ چکے تھے کہ تمہارا خون میرا خون، تمہاری جان میری جان ہے۔ تم اطمینان رکھو جس سے تم لڑو گے اس سے میں لڑوں گا اور جس سے تم صلح کرو گے اس سے میں بھی صلح کروں گا۔ تمہارا ذمہ میرا ذمہ ہے اور تمہاری حُرمت میری حُرمت، میرا جینا اور مرنا تمہارے ساتھ ہوگا (ابنِ ہشام ج ۲ ص ۸۵)۔ تو پھر ظاہر ہے کہ دوبارہ انفرادی طور پر کسی انصاری سے رشتۂ اخوت استوار کرنا محض ایک تکلف اور غیر ضروری امر ہوتا اور اگر حضورؐ کسی ایک انصاری سے بھی مواخاۃ کر لیتے تو شاید یہ عقد دوسرے انصار کی دل شکنی کا باعث بنتا۔ علاوہ ازیں آپ کی نبوت کی انفرادیت کا تقاضا یہی تھا کہ آپ کسی ایک سے وابستہ ہونے کے بجائے سب سے وابستہ رہیں۔

[۲۲۴] ابنِ ہشام ج ۲ ص ۱۵۰۔

[۲۲۵] جن انصار و مہاجرین کے درمیان یہ رشتۂ خاص قائم کیا گیا ان کی کل تعداد اصحابِ سیر و تاریخ کے نزدیک نوّے (۹۰) یا سَو (۱۰۰) ہے (ابنِ سعد ج ۱ ص ۲۳۸)۔ قطع نظر اس کے یہ تعداد مہاجرین کی اس تعداد کی ایک تہائی ہے جنھوں نے مکہ سے مدینہ ہجرت کی تھی (ایک اندازے کے مطابق اس وقت مہاجرین کی تعداد کم از کم ڈیڑھ سو تھی۔ دیکھئے: Ghulam Sarwar, Hafiz, Mhammad - The Holy Prophet, Sh. Mohd. Ashraf, Lahore, 1964, p. 152) لیکن دقت یہ ہے کہ بالعموم اٹھارہ (۱۸)، انیس (۱۹) مخصوص حضرات کے ناموں (ابنِ ہشام ج ۲ ص ۱۵۰ تا ۱۵۳) کے علاوہ دُوسرے مہاجرین کے رشتہ ہائے مواخاۃ کے ذکر سے اکثر قدیم و جدید مآخذ خالی ہیں۔ بہر طور غنیمت یہ ہے کہ ابنِ سعد نے کہیں کہیں تراجم رجال کے ضمن میں مواخاۃ کی وضاحت بھی کر دی ہے۔ علاوہ ازیں محمد ابن حبیب البغدادی نے بھی اپنی کتاب المحبّر میں پچپن (۵۵) آدمیوں کے نام لکھے ہیں (ص ۷۱ تا ۷۵) لیکن پھر بھی یہ تعداد کل مہاجرین سے بہت کم ہے۔ اس صورت حال سے تین باتیں متبادر ہوتی ہیں یعنی (الف) تمام مہاجرین کے درمیان عقد مواخاۃ قائم ہوا لیکن اتفاقاً ان کے نام اور رشتوں کی تفصیل کو محفوظ نہیں کیا گیا اس قیاس کو تقویت رسولؐ اللہ کے اس ارشاد میں ملتی ہے کہ "خدا کی راہ میں دو دو اشخاص آپس میں بھائی بھائی بن جائیں"۔ گویا تعداد کی کوئی تحدید خود زبانِ رسالت سے نہیں کی گئی۔ غالباً اسی لئے رشتۂ اخوت میں منسلک ہونے والے حضرات کے اسمأ اور ان کے رشتوں میں

فرق واختلاف پایا جاتا ہے (تفصیلات کے لئے ؛ نثار احمد، ص ۱۳، ۱۴)۔
(ب) مواخاۃ صرف ان ہی مہاجرین وانصار کے درمیان ہوئی تھی جو حضرت انس بن مالک کے گھر میں موجود تھے۔
(ج) اسے مواخاۃ کا پہلا مرحلہ مانا جائے تو دوسرے مرحلہ میں باقی مہاجرین کی مواخاۃ بھی انصار سے متوقع تھی لیکن پھر ممکن ہے کہ مسجد نبویؐ کی تکمیل اور منشورِ مدینہ کے اجرأ کے بعد ضرورت نہ سمجھی گئی ہو۔ اس لئے کہ مسجد نبویؐ نے بھی اسلامی معاشرہ کی سالمیت واتحاد کے لئے عموماً اور اہلِ مدینہ میں مرکزیت پیدا کرنے کے سلسلے میں خصوصاً انتہائی اہم اور مؤثر کردار ادا کیا۔ اسی طرح منشورِ مدینہ کے بعد مدینہ میں رہنے والے تمام عناصر کے درمیان حقوق وفرائض کا تعین ہوگیا اور مسلمانوں کی امتیازی حیثیت بھی واضح ہوگئی (اس کی تفصیل آئندہ آئے گی) یہ بھی ممکن ہے کہ انّما المؤمنون اخوۃ (تمام اہلِ ایمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ الحجرات ۱۰) اور المسلم اخو المسلم (الخطیب العمری ص ۲۲۴) کی اصولی ہدایات کے بعد نام بنام رشتۂ مواخاۃ استوار کرنے کی حاجت باقی نہ رہ گئی ہو۔
یہاں یہ واضح رہے کہ مہاجرین وانصار کے ان برادرانہ تعلقات کو اللہ تعالیٰ نے بھی بہ نظرِ استحسان دیکھا ہے۔ ملاحظہ ہو : الانفال (۲۰)، [۲۲۶] الانفال (۷۵)

[۲۲۷] مدینہ آنے کے فوراً بعد رسول اللہؐ نے چند اقدامات فرمائے، ان میں سے مسجد نبویؐ کی تعمیر، مواخاۃ کا قیام اور منشورِ مدینہ کا اجرا انتہائی اہم ہیں۔ ان تینوں میں کوئی زمانی ترتیب حتمی طور پر قائم کرنا اگرچہ مشکل ہے لیکن یہ بات طے ہے کہ یہ اقدامات سنہ ۱ھ میں ہی کیے گئے البتہ اصحابِ سیر نے جس انداز سے ان کا ذکر کیا ہے اس میں اختلافات پائے جاتے ہیں۔ مثلاً متقدمین میں سے ابنِ ہشام (ج ۲ ص ۱۴۱ تا ۱۵۳) نے پہلے مسجد نبویؐ کی تعمیر پھر منشورِ مدینہ اور پھر مواخاۃ صحابہ سے بحث کی ہے۔ متاخرین میں سے ابنِ خلدون (تاریخ، ج ۲ ص ۱۶، ۱۷) نے ٹھیک، اسی ترتیب کا اتباع کیا ہے جبکہ بعض مورخین ایسے ہیں جنھوں نے پہلے مسجد نبویؐ پھر مواخاۃ اور اس کے بعد منشورِ مدینہ کو رکھا ہے۔ مثلاً ہمارے یہاں علامہ شبلی (ج ۱ ص ۲۷۶ تا ۲۹۴) نے یہی ترتیب برقرار رکھی ہے جبکہ ابنِ سعد نے نئی ترتیب یہ قائم کی ہے کہ پہلے مواخاۃ پھر بنائے مسجد سے بحث کی ہے (ابنِ سعد ج ۱ ص ۲۳۸، ۲۳۹) ہمیں مدینہ کی مخصوص صورتِ حال اور مسائل کی نوعیت کے اعتبار سے دوسری ترتیب ہی زیادہ صحیح اور مرجح معلوم ہوتی ہے۔ یعنی پہلے مسجد نبویؐ کی تعمیر اور اس کے بعد مواخاۃ صحابہ۔

[۲۲۸] ابنِ عبدالبر نے اسے پانچویں مہینہ (یعنی رجب) کا واقعہ قرار دیا ہے (الاستیعاب ج ۱ ص ۱۸) نیز علامہ قسطلانی کا بیان بھی یہی ہے۔ اور ہمیں زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے ورنہ روایات مختلف ہیں کسی میں اسے آٹھویں مہینے، ساتویں مہینے، بدر سے قبل تیرھویں مہینے کا واقعہ اور بعض میں مسجد نبوی کی تعمیر کے وقت کا واقعہ بتایا گیا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ مسجد نبوی کے بننے سے پہلے کا ہے (زرقانی ج ۱ ص ۳۰۲)۔

[۲۲۹] اگرچہ مسجد کی تعمیر پہلا قدم ہے تاہم تعمیر کا کام کئی ماہ کی مدت پر پھیلا ہوا ہے۔ چنانچہ ابنِ ہشام نے لکھا ہے کہ حضرت

ابو ایوب انصاری کے مکان میں ٹھہرنے کے فوراً بعد آپ نے مسجد بنانے کا منصوبہ بنایا اور پھر زمین خرید کر تعمیر کا آغاز بھی کر دیا (ج ۲ ص ۱۴۳) - پھر ابن اسحاق کے حوالے سے وہ آگے لکھتا ہے کہ ربیع الاوّل میں حضورؐ مدینہ میں رونق افروز ہوئے اور (اس کے دس ماہ بعد) صفر میں آپ کی مسجد اور مکان بن کر تیار ہوا (ایضاً ص ۱۴۶) اور ظاہر ہے کہ ان تعمیرات کے مکمل ہونے کے بعد آپ دارِ ایوب سے مسجد (نبوی) میں منتقل ہوئے۔ ابن ہشام نے تعمیر کے سلسلے میں دس ماہ سے زائد کی جس مدت کا ذکر کیا ہے بعض مورخین مثلاً متاخرین میں سے ابنِ قیمؒ (ج ۱ ص ۲۵) نے یہ مدت سات ماہ بھی لکھی ہے۔ بہرحال مسجد نبویؐ اور حجرات کی تعمیر میں اتنا عرصہ لگنا بالکل قرینِ قیاس ہے کیونکہ مسجد نبویؐ اپنی انتہائی سادہ شکل اور غیر مزیّن ہونے کے باوجود تقریباً ڈھائی ہزار مربع گز پر محیط تھی۔

[۲۲۰] ابنِ سعد ج ۱ ص ۲۳۹ - نیز زرقانی ج ۱ ص ۳۷۴۔ [۲۲۱] صاحبِ روض الانف علامہ سہیلی لکھتے ہیں کہ:

لیذهب عنهم وحشة الغربة و یؤنسهم من مفارقة لاهل والعشیره و یشد ازر بعضهم ببعض (ج ۲ ص ۱۸) اور علامہ ابن کثیر نے لکھا ہے:

لاجل ارتفاق بعضهم من بعض ولیتالف قلوب بعضهم علی بعض (السیرہ) ج ۲ ص ۳۲۶۔

[۲۲۲] اس کی ایک روشن مثال حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی ہے۔ جب ان کے انصاری بھائی حضرت سعد بن الربیع نے اہل و مال دونوں میں نصف حصہ کی پیش کش کی (البخاری ج ۱ ص ۵۶۱ باب بنیان الکعبہ) اور یہاں تک کہہ دیا کہ میری دو بیویاں ہیں ان میں سے کسی ایک کو منتخب کر لو، میں اس کو طلاق دے دوں گا تم نکاح کر لینا" (زرقانی ج ۱ ص ۳۷۴) تو ابن عوف نے گوارا نہ کیا اور جواب دیا کہ "خدا تمہارے مال و منال میں برکت دے مجھے تو تم بازار کا رستہ دکھا دو"۔ (البخاری ج ۱ ص ۵۶۱) چنانچہ پھر حضرت ابنِ عوف نے کاروبار شروع کیا اور اس میں اللہ نے اتنی برکت دی کہ مٹی سے سونا پیدا کرنے لگے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے مال کا آٹھواں حصہ چار بیویوں پر تقسیم کیا گیا تو ہر ایک کو اسی (۸۰) ہزار درہم ملے (حاجی معین الدین، مہاجرین مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۹۲۸ء حصہ اول ص ۱۲۷)۔ [۲۲۳] الانفال (۷۵)۔

[۲۲۴] حمید اللہ (رسولِ اکرمؐ کی سیاسی زندگی) ص ۲۲۲ - بحوالہ صحیح بخاری (اس کا حوالہ راقم الحروف کو تلاش کے باوجود نہ مل سکا)۔

[۲۲۵] انصار کس حد تک یہود کے مقروض تھے۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ بنونضیر نے جلاوطنی کے حکم پر رسول اللہؐ کی توجہ دلائی تھی کہ ان کے قرضے مقامی باشندوں سے وصول طلب ہیں تو آنحضرتؐ نے فرمایا کہ ضعوا و تعجلوا (السرخسی، محمد بن احمد بن ابی سهل - شرح السیر الکبیر۔ مطبعة دائرة المعارف النظامیہ۔ دکن۔ ۱۳۳۵ھ ج ۳ ص ۲۲۹) اس کا ترجمہ ڈاکٹر حمید اللہ نے یہ کیا ہے کہ "رقم گھٹا کر میعاد سے قبل حساب بے باق کر لو" (رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی، ص ۲۲۷)۔

[۲۳۶] انصار نے اپنے لئے (یہود کے بازاروں سے الگ) چند بازار قائم کر رکھے تھے۔ چنانچہ مدینہ کا سب سے بڑا بازار وُہ تھا جو مہرذر میں لگتا تھا اور جس کے قریب بنو ساعدہ کی آبادی تھی۔ ایک بازار قبا میں، ایک بازار ام العیال نامی ایک چشمہ کے کنارے اور ایک بازار مسجد الرایہ کے قریب تھا (یہ مدینہ کا قدیم بازار تھا اور پشت پر الوداع کی پہاڑیاں تھیں) ایک بازار مزاحم تھا اور یہ اوائل اسلام تک لگتا تھا (سعید احمد انصاری ج ا ص ۶۶)۔

[۲۳۷] بنو قینقاع کے اخراج کے لئے دیکھئے (ابنِ سعد ج ۲ ص ۲۹) بنو نضیر اور بنو قریظہ کے لئے (ابنِ ہشام ج ۳ ص ۲۰۱، ۲۴۹ تا ۲۶۴) نیز ابنِ سعد ج ۲ ص ۵۸، ۷۵ تا ۷۷)۔

[۲۳۸] آرنلڈ۔ ڈاکٹر سر تھامس۔ دی پریچنگ آف اسلام (دعوتِ اسلام) اردو ترجمہ۔ محمد عنایت اللہ دہلوی مسعود پبلشنگ ہاؤس۔ کراچی ۱۹۶۴ء۔ ص ۳۴۔

[۲۳۹] اس کی واضح مثالیں متعدد رشتوں میں نظر آتی ہیں۔ مثلاً حضرت عمر اور عتبان بن مالک کی مواخاۃ، حضرت سعید بن زید اور رافع بن مالک بن عجلان کی مواخاۃ، حضرت طلحہ بن عبید اللہ اور ابی ابنِ کعب کی مواخاۃ، حضرت خباب اور جبّار بن صخر کی مواخاۃ وغیرہ (تفصیلات کے لئے: نثار احمد، ص ۲۰ تا ۲۲)۔

[۲۴۰] الصف (۴)۔ ایک حدیث میں بھی رسولؐ اللہ نے مسلمانوں کے باہمی تعلق کو پختہ دیوار سے مشابہ قرار دیا ہے۔ الفاظ یہ ہیں:

المومن للمومن کالبنیان یشد بعضہ بعضاً ثم شبك بين اصابعه (الخطيب العمري ص ۲۴۴)۔

[۲۴۱] روایت کے الفاظ یہ ہیں:

عن عاصم قلت لانس ابلغك ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال لا حلف في الاسلام فقال قد حالف النبي صلى الله عليه وسلم بين قريش والانصار في داري (زرقانی ج ا ص ۳۷۴)۔

[۲۴۲] زرقانی نے مواخاۃ کی حکمت بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ:

فآخى بين الاعلىٰ والادنىٰ ليرتفق الادنىٰ بالاعلىٰ وليستعين الاعلىٰ بالادنىٰ وبهذا تظهر حكمه مواخاة (ايضاً ص ۳۷۳)۔

۴۔ آغازِ ریاست

[۲۴۳] ابو عبید القاسم بن سلام۔ کتاب الاموال۔ تصحیح و تعلیق۔ محمد حامد الفقی۔ المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ۔ مصر (تصحیح ۱۳۵۳ھ) الجزء الثانی۔ ص ۲۰۲ تا ۲۰۵ (فقرہ نمبر ۵۱۶)۔ اور ابنِ ہشام کے لئے دیکھئے: (ج ۲ ص ۱۴۸ تا ۱۵۰)۔ [۲۴۴] ابو عبید کے یہاں اس کے بعد "رسولؐ اللہ" کے الفاظ کا اضافہ ہے (ص ۲۰۲)۔

[۲۴۵] اضافہ ابوعبید ۔" اھل" (ص ۲۰۲) [۲۴۶] اضافہ ابوعبید ۔" فحل معھم" (ص ۲۰۲) ۔
[۲۴۷] ابوعبید: "امۃ واحدہ دون الناس" (ص ۲۰۲) ۔
[۲۴۸] ابوعبید: "رباعتھم" (ص ۲۰۲) روایت عبداللہ بن صالح: ربعاتھم (ص ۲۰۲)
[۲۴۹] اضافہ ابوعبید: "معاقلھم الاولیٰ" (ص ۲۰۲) [۲۵۰] اضافہ ابوعبید: "و المسلمین" (ص ۲۰۳) ۔
[۲۵۱] ابوعبید: "رباعتھم" (ص ۲۰۳) ہرجگہ اسی طرح دہرایا ہے ۔
[۲۵۲] اضافہ ابوعبید: منھم (ص ۲۰۳) ہر دفعہ میں (جہاں یہ الفاظ ہیں) یہی اضافہ موجود ہے ۔
[۲۵۳] ابوعبید نے پہلے "بنوالحوث بن الخزرج علیٰ رباعتھم ..... الخ" کا ذکر کیا ہے ۔ اس کے بعد بنوساعدہ کا (ص ۲۰۳) ۔
[۲۵۴] ابوعبید نے اس ترتیب کو اُلٹ کر لکھا ہے یعنی بالقسط والمعروف (ص ۲۰۳) ۔
[۲۵۵] اس کے بعد ابوعبید کے الفاظ یہ ہیں: "منھم ان یعینوہ بالمعروف" (ص ۲۰۳) ۔
[۲۵۶] یہ فقرہ ابوعبید کے یہاں نہیں ہے ۔ [۲۵۷] اضافہ ابوعبید "أیدیھم" (ص ۲۰۳) ۔
[۲۵۸] ابوعبید نے اس جملہ کو یوں لکھا ہے: علیٰ کل من بغی و ابتغی منھم دسیعہ ظلم أو اثم أو عدوان اوفسادٍ بین المؤمنین (ص ۲۰۳) [۲۵۹] ابوعبید: جمیعہ (ص ۲۰۳) ۔
[۲۶۰] ابوعبید: لایقتل (ص ۲۰۳) ۔
[۲۶۱] ابوعبید کے یہاں یہ فقرہ موجود نہیں ۔ اس کے بعد فقرہ ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے کہ والمومنون ..... الخ (ص ۲۰۳) ۔ [۲۶۲] ابوعبید: الیھود (ص ۲۰۳) ۔
[۲۶۳] ابوعبید کے یہاں اس فقرہ کی ترکیب اور الفاظ یہ ہیں: فان لہ المعروف والاسوہ غیر مظلومین ولا متناصر علیھم (ص ۲۰۳) ۔ [۲۶۴] ابوعبید: "واحد" (ص ۲۰۳)
[۲۶۵] ابوعبید: "ولا یسالم" (ص ۲۰۳) [۲۶۶] ابوعبید: "یعقب بعضھم بعضا" (ص ۲۰۳) ۔
[۲۶۷] ابوعبید کے یہاں یہ فقرہ نہیں ہے ۔ [۲۶۸] ابوعبید: "مالاً لقریشٍ ولا یعینھا علی مومن" (۲۰۴) ۔
[۲۶۹] ابوعبید نے "عن بینہ" کے الفاظ کو حذف کر دیا ہے ۔
[۲۷۰] ابوعبید: فانہ قود الّا ان یرضی ولیّ المقتول بالعقل (ص ۲۰۴) ۔
[۲۷۱] ابوعبید نے ولا یحل لھم الّا قیام علیہ کے الفاظ نقل نہیں کئے ۔
[۲۷۲] ابوعبید: فمن نصرہ (ص ۲۰۴) ۔
[۲۷۳] ابوعبید: الیٰ یوم القیامۃ لایقبل مینہ (ص ۲۰۴) ۔
[۲۷۴] ابوعبید کے یہاں یہ فقرہ اس طرح ہے کہ: وانکم ما اختلفتم فیہ من شیٔ فان حکمہ الی اللہ تبارک و

تعالیٰ والی الرسول صلی اللہ علیہ وسلم (ص ۲۰۴)۔

[۲۷۵] ابوعبید : وان یہود بنی عوف و موالیهم و انفسهم امه من المومنین (ص ۲۰۴)۔

[۲۷۶] ابوعبید : للمومنین (ص ۲۰۴)[۲۷۷] یہ ابوعبید کے فقرہ ماقبل میں شامل ہے (ص ۲۰۴)۔

[۲۷۸] ابوعبید کے یہاں پہلے بنوجشم کا ذکر ہے اس کے بعد بنوساعدہ کا۔

[۲۷۹] ابوعبید : وان لیهود الاوس (ص ۲۰۴)[۲۸۰] ابوعبید کے متن میں یہ ٹکڑا شامل نہیں ہے۔

[۲۸۱] ابوعبید کے بیان میں " اثم " موجود نہیں ہے۔

[۲۸۲] وان جفنه سے یہاں (.... کانفسهم) تک کا حصہ ابوعبید کے یہاں منقول نہیں۔ صرف اس صحیفہ کے آخری جملوں میں بنی الشطیبہ کے بارے میں یہ ہے کہ : وان بنی الشطیبه بطن من جفنه (ص ۲۰۴)۔

[۲۸۳] ابوعبید : احد منهم (ص ۲۰۴)۔

[۲۸۴] ابوعبید کے متن میں وانه لا ینحجز سے یہاں (نفقتهم) تک کے تین فقرے موجود نہیں ہیں۔

[۲۸۵] ابوعبید : وان بینهم النصیحة والنصر للمظلوم (ص ۲۰۴)۔

[۲۸۶ تا ۲۸۸] ابوعبید کے یہاں یہ فقرے نہیں ہیں۔

[۲۸۹] ابوعبید : وان المدینہ جوفها حرم لاهل هذه الصحیفه (ص ۲۰۴)۔

[۲۹۰] یہ دونوں فقرے ابوعبید نے نقل نہیں کئے۔

[۲۹۱] ابوعبید : وانه ما کان بین اهل هذه الصحیفه من حدث یخاف فساده فان اُمره الی اللہ والی محمد النبی (ص ۲۰۴)[۲۹۲] یہ فقرے ابوعبید کے یہاں نہیں ہیں۔

[۲۹۳] ابوعبید : "وانهم اذا دعوا الیهود الی صلح حلیف لهم فانهم یصالحونه ، وان دعونا الی مثل ذٰلك فانه لهم علی المومنین ، الا من حارب الدین۔" (ص ۲۰۴)۔

[۲۹۴] ابوعبید : وعلیٰ کل اناس حصتهم من النفقه (ص ۲۰۴)۔

[۲۹۵] ابوعبید : ان یهود الاوس وموالیهم وانفسهم مع البر المحسن من اهل هذه الصحیفة و ان بنی الشطیبه بطن من جفنه (ص ۲۰۴) [۲۹۶] ابوعبید : فلا یکسب (ص ۲۰۴)۔

[۲۹۷] ابوعبید : لا یحول الکتاب (ص ۲۰۴) [۲۹۸] "بالمدینه" کے الفاظ ابوعبید کے یہاں محذوف ہیں۔

[۲۹۹] ابوعبید کے یہاں "انّ اللہ ..... الخ" کا جملہ نہیں ہے اس کے بجائے بطور اضافہ یہ عبارت لکھی ہے کہ : وان اولاهم بهذه الصحیفه البر المحسن (ص ۲۰۵)۔

[۳۰۰] ڈاکٹر حمید اللہ نے منشورِ مدینہ کا ترجمہ "دستورِ مملکت مدینہ بعہد نبوی" کے عنوان سے اپنی کتاب (عہد نبوی میں نظام حکمرانی۔ مکتبہ ابراہیمیہ۔ دکن۔ طبع دوم۔ جلد اول۔ ص ۱۰۲ تا ۱۱۱) میں شامل کیا ہے۔ وہ ترجمہ ہمارے پیشِ نظر ہے لیکن

اس دستاویز کی ابتدائی شقوں میں بار بار استعمال ہونے والی اصطلاح "علی ربا عتھم" کی ترجمانی "اپنے محلّے کے ذمہ دار" سے کرنا ہمارے نزدیک محلِ نظر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ابن منظور الافریقی نے "ربع" کے تحت جو بحث کی ہے اور لکھا ہے کہ:

وفی روایه من رباع الربع المنزل و دار الاقامه و ربع القوم محلتھم .... الخ

(ابن منظور الافریقی - ج ۹ - ص ۴۵۸)

اس سے ڈاکٹر صاحب کے مطلب کی گنجائش نکلتی ہے۔ لیکن دراصل اس دستاویز میں جہاں یہ اصطلاح استعمال کی گئی ہے اس سے وہی مفہوم نکلتا ہے جو ہم نے اپنے ترجمہ میں ظاہر کیا ہے۔ چنانچہ زمخشری نے لکھا ہے کہ: والقوم علی رباعتھم ای علی حالھم التی کانوا علیھا (زمخشری۔ اساس البلاغہ۔ مطبعہ دار الکتب المصریہ۔ قاہرہ ۱۹۵۳ء، ص ۱۵۲)

اور سیرۃ ابن ہشام کے مرتبین (مصطفی السقا، ابراہیم الابیاری، عبدالحفیظ شبلی) نے بھی حاشیہ (ج ۲ ص ۱۴۷) میں واضح کیا ہے کہ الربعۃ۔ الحال التی جاء الاسلام وھم علیھا۔

علاوہ ازیں خود ابوعبید جس نے دستاویز زیر بحث کو محفوظ کیا ہے۔ متن نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ:

قولہ "بنو فلان علی رباعتھم"۔ الرباعه ھی المعاقل وقد یقال فلان علی رباعه قومه، اذا کان المتقلد لامورھم .... الخ (ج ۲ ص ۲۰۵)

[۲۰۱] حمید اللہ (عہد نبویؐ میں نظامِ حکمرانی) ص ۸۲ علاوہ ازیں مشہور مستشرق نکلسن (R.A. NICHOLSON) نے اپنی کتاب تاریخ ادبیات عرب (A. LITERARY HISTORY OF THE ARABS) میں جہاں اس دستاویز سے بحث کی ہے اس کا عنوان ہی یہ قائم کیا ہے کہ "اسلامی ریاست کا آغاز" (BEGINNINGS OF THE MOSLEM STATE) (ص ۱۷۳) اور ہیل (JOSEPH HELL) نے نوشتۂ مذکور کی بعض دفعات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"These passages read as if they were laying down the basis of an Islamic Empire". (Hell, J. The Arab Civilization, Tr.(eng.) S. Khuda Baksh, Sh. Mohd. Ashraf, Lahore, 1943, pp. 25,26).

[۲۰۲] ملاحظہ ہو: حمید اللہ (عہد نبویؐ میں نظامِ حکمرانی) ص ۷۶۔ [۲۰۳] ایضاً ص ۸۳

[۲۰۴] ایضاً ص ۸۳، ۸۴

[۲۰۵] ڈاکٹر حمید اللہ نے لکھا ہے کہ "زیر بحث دستاویز ایک معاہدے کی شکل نہیں رکھتی بلکہ ایک فرمان اور حکم کی صورت

ہیں نافذ کی جاتی ہے۔" (ص ۸۳) ولہاؤزن بھی اسے معاہدہ کے دائرہ سے نکال کر فرمان (DEGREE) قرار دیتا ہے۔ (Nicholson, R.A., A Literary History of the Arabs, University Press, Cambridge, 1962, p. 173).
نکلسن اسے منشور (CHARTER) سے تعبیر کرتا ہے (NICHOLSON, P.173) اور ہیل (HELL) اسے حکم نامہ (ORDINANCE) سے موسوم کرتا ہے۔ واٹ نے اسے دستور مدینہ (A CONSTITUTION OF MEDINA) کے تحت بیان کیا ہے جبکہ ایک جدید مغربی مورخ صونڈرز (SAUNDERS) اسے معاہدہ یا دستور (Treaty or Constitution) کہتا ہے۔ (ملاحظہ ہو: Saunders, J.J.: A History of Medieval Islam, Routledge and Kegan Paul, London, 1965, p. 26.)

[۲۰۶] ڈاکٹر حمید اللہ نے لکھا ہے کہ "سلھ میں مدینہ منورہ میں ہجرت کر آنے کے پہلے ہی سال ایک نوشتہ مرتب فرمایا جس میں حکمران کے حقوق اور فرائض اور دیگر فوری ضروریات کا تفصیلی ذکر ہے (حمید اللہ۔ عہد نبوی میں نظام حکمرانی ص ۷۹) اور دیکھئے: (HELL P. 26) وغیرہ۔

[۲۰۷] ہمارے قدیم و جدید سیرت نگاروں کا عام تاثر یہی ہے کہ یہ (منشورِ مدینہ) رسول اللہؐ اور یہودیوں کے مابین ایک معاہدہ تھا۔ مثلاً دیکھئے: ابن ہشام (ج ۲ ص ۱۴۷)، ابن سیدالناس (ج ۱ ص ۱۹۷)، المقریزی (امتاع الاسماع ۔ ج ۱ ص ۴۹) وغیرہ۔ اور بزبانِ اُردو: سلمان منصورپوری. قاضی محمد سلیمان۔ رحمۃ للعلمین ۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز۔ لاہور۔ ۱۹۵۲ء۔ (ج ۱ ص ۱۲۸)، اور شبلی (ج ۱ ص ۲۷۵) وغیرہ وغیرہ۔

[۲۰۸] حوالے کے لئے دیکھئے: دستاویز کی دفعہ ۲۴، ۲۵، ۴۸، ۵۴ اور ۵۶۔

[۲۰۹] ازروئے دفعہ ۲۴: ۴۰، ۴۸ اور ۵۴۔

[۲۱۰] عربی زبان میں لفظ امّۃ متعدد معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً حالت و کیفیت، سنّت، طریقہ، دین، وقت یا زمانہ (قرن)، جماعت یا گروہ، انسانوں کا، حیوانوں کا بلکہ دوسرے جانداروں کا بھی، مقتدا اور پیشوا وغیرہ (ابن منظور الافریقی، ج ۱۴ ص ۲۸۸ تا ۲۹۳) منشور زیرِ بحث کا دائرۂ کار چونکہ خالص عمرانی ہے، اس لئے مبیّنہ طور پر یہاں اُمّۃ سے مراد لازماً ایک گروہ یا جماعت ہے (والامة الجماعة ۔ ایضاً ص ۲۹۳)۔ اور صاحب المفردات نے لکھا ہے کہ "ہر وہ جماعت جس میں کوئی امر مشترک پایا جائے اسے امۃ کہا جاتا ہے خواہ یہ اشتراک مذہبی وحدت کی بنا پر ہو یا جغرافیائی اور عصری وحدت کی وجہ سے اور اس امر مشترک کے اختیاری یا غیر اختیاری ہونے کی قید بھی نہیں ہے (راغب اصفہانی، ص ۲۳)۔ لہٰذا یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ منشور میں امتزاج و ائتلاف اور ضم و ادغام کا مدعا مشترکہ مقصد میں اتحاد و اتفاق ہے نہ کہ کسی متحدہ قومیت

کی تکوین۔ علاوہ ازیں چونکہ منشور کو مدنی معاشرہ کی سیاسی ضروریات کے پیشِ نظر مرتب کیا گیا تھا اس لئے سیاسی ضرورتوں کا حل سیاسی وحدت کے ذریعہ ہی ممکن تھا۔

[۲۱۱] ملاحظہ ہو: دفعہ (۱۹)۔ و ان المؤمنین بعضھم موالی لبعض دون الناس۔ (ابن ہشام، ج ۲، ص ۱۴۸)

[۲۱۲] قوم، قومیت کا مفہوم، اس کے بارے میں اسلام کا تصور اور متحدہ قومیت پر تفصیلی مباحث کے لئے ملاحظہ ہو: مودودی۔ مسئلہ قومیت۔ مکتبہ جماعت اسلامی۔ دار الاسلام۔ پٹھانکوٹ۔ ۱۹۴۷ء، (ص ۴۹ تا ۵۸)۔

[۲۱۳] قرآن کی رُو سے ایسا کرنا معاشرہ کے تمام افراد کی انفرادی ذمہ داری بھی ہے (لقمان ۱۰۷) اجتماعی اور گروہی بھی ہے (آل عمران ۱۰۴) اور بحیثیت مجموعی پُوری اُمت مسلمہ کی بھی ذمہ داری یہی ہے کہ نیکیوں کو فروغ دیں اور بُرائیوں کو مٹائیں۔ (آل عمران ۱۱۰) [۲۱۴] الحج (۴۱)

[۲۱۵] مودودی۔ الجہاد فی الاسلام۔ اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ لاہور۔ ۱۹۶۲ء۔ ص ۱۔

[۲۱۶] مثلاً دفعات ۳ تا ۱۲ ملاحظہ ہوں۔ [۲۱۷] ازروئے دفعہ ۱۴ [۲۱۸] ازروئے دفعہ ۱۵

[۲۱۹] ازروئے دفعہ ۳ تا ۱۲ [۲۲۰] ازروئے دفعہ ۲۳ [۲۲۱] ازروئے دفعہ ۱۶، ۴۶ اور ۴۷

[۲۲۲] ازروئے دفعہ ۱۸ [۲۲۳] ازروئے دفعہ ۱۹ [۲۲۴] ازروئے دفعہ ۲۰

[۲۲۵] ازروئے دفعہ ۲۴ [۲۲۶] ازروئے دفعہ ۲۵

[۲۲۷] یہاں بطور مثال ہم مکیاویلی (MACHIAVELLI) کے نظریات کو پیش کر سکتے ہیں۔ جو نہ صرف اپنی تصنیف بادشاہ کے لئے مشہور ہے بلکہ جدید تصورِ ریاست کا بانی ہے۔ اس کے نزدیک سیاست میں چالبازی، دغا اور فریب اس قسم کے دُوسرے ہتھیاروں سے کام لینا چاہیے۔ وُہ یہ بھی کہتا ہے کہ جہاں ریاست کی زندگی اور موت کا سوال ہو اور عام اخلاقی اصولوں کو بالائے طاق رکھنے سے کام نکل سکتا ہو تو مکیاویلی کے خیال میں اسے اختیار کرنا نہ صرف جائز بلکہ "یہی ایک اصول ہے جس کی پابندی فرض ہے"۔ مکیاویلی بدعہدی، بے وفائی اور دھوکہ فریب کو بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دینے کا سبب گردانتا ہے اور راست بازی وغیرہ کو تنزل و انحطاط کا۔ ملاحظہ ہو: مکیاویلی پرنس (بادشاہ) ترجمہ مقدمہ مع حواشی۔ ڈاکٹر محمود حسین۔ اردو اکیڈمی سندھ۔ کراچی۔ ۱۹۵۷ء (ص ۲۲، ۱۳۴)۔ مختصر یہ کہ اس نے سیاست کی بنیاد اخلاق سے قطع نظر "سیاسی مصلحت" پر رکھی جو اسلام کی ضد ہے۔ [۲۲۸] حمید اللہ۔ (عہدِ نبویؐ میں نظامِ حکمرانی) ص ۸۸۔

[۲۲۹] ایضاً ص ۸۸ [۲۳۰] ایضاً ص ۸۷، ۸۸۔

[۲۳۱] WATT (MUHAMMAD AT MADINA), P. 226.

[۲۳۲] ایضاً ص ۲۲۶ [۲۳۳] ایضاً ص ۲۲۷۔

[۳۳۴] ابنِ ہشام (ج ۲ ص ۲۹۳) ، ابنِ سعد ج ۲ ص ۱۲ ۔
[۳۳۵] ابنِ ہشام نے لکھا ہے کہ : وکان فراغ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من بدر فی عقب شھر رمضان اوفی شوال (ج ۳ ص ۴۵) [۳۳۶] ابنِ سعد ج ۲ ص ۲۸ ، ۲۹ ۔
[۳۳۷] ایضاً ج ۲ ص ۲۹ ۔ [۳۳۸] ابنِ ہشام ج ۳ ص ۵۰ ۔
[۳۳۹] ابنِ ہشام نے لکھا ہے کہ : ان بنی قینقاع کانوا اوّل یھود نقضوا ما بینھم و بین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم وحاربوا فیما بین بدر و اُحد (ج ۳ ص ۵۱) ۔
مزید حوالے کے لئے ملاحظہ ہو : طبری (ج ۲ ص ۴۷۹) ، ابن اثیر (ج ۲ ص ۱۳۷) ، المقریزی (امتاع الاسماع ج ۱ ص ۱۰۴) وغیرہ ۔ [۳۴۰] ، تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو :
MUIR (THE LIFE OF MAHOMET, LONDON 1861), VOL. III, P. 31 TO 37.
[۳۴۱] البقرہ (۲۴۶) ، الانعام (۲۰) ۔ [۳۴۲] ابوعبید ، ج ۲ ص ۲۰۶ (تحت فقرہ ۵۱۷) ۔
[۳۴۳] ایضاً [۳۴۴] ایضاً ص ۲۰۷ (فقرہ ۵۱۸)
[۳۴۵] ڈاکٹر حمید اللہ نے ولہاوزن اور جملہ یورپی مصنفین کے اتباع میں ۱ سے ۲۳ دفعات میں محصور کیا ہے (عہدِ نبویؐ میں نظامِ حکمرانی ص ۸۵) لیکن مکمل متن نقل کر دینے کے بعد ہم نے اپنے لئے اس پابندی کو ضروری خیال نہیں کیا ۔
[۳۴۶] ڈاکٹر حمید اللہ کے نزدیک اس میں ۴۷ فقرات یا دفعات ہیں (ص ۸۶) جبکہ ہمارے حساب سے کل ۵۶ دفعات ہیں ۔

[۳۴۷] Wellhausen (The Historians History of the World) Vol.VIII p. 291.

[۳۴۸] از روئے دفعہ ۲۷ ، ۲۸ [۳۴۹] از روئے دفعہ ۴۰ [۳۵۰] دفعہ ۴۲ ، ۵۱
[۳۵۱] دفعہ ۳۹ [۳۵۲] دفعہ ۴۲ ، ۵۰ اور ۵۱ [۳۵۳] دفعہ ۴۹ [۳۵۴] دفعہ ۴۲
[۳۵۵] دفعہ ۳۵ تا ۳۸ [۳۵۶] دفعہ ۴۵
[۳۵۷] لفظ حرم کی لغوی بحث کے لئے ملاحظہ ہو (ابن منظور الافریقی ج ۱۵ ص ۹ تا ۱۳) اسی مصنّف نے لکھا ہے کہ اہلِ عرب ایسے شہر کو حرم سے موسوم کرتے تھے جہاں قتل و قتال جائز نہ ہو (ایضاً ص ۱۰) حرم کی معنویت کو سمجھنے کے لئے حرمِ مکہ کے احکام کا مطالعہ مفید ہے ، مثلاً جن میں یہ کہا گیا ہے کہ وہاں قتل ، خونریزی اور درختوں کو کاٹنا وغیرہ ممنوع ہے ، البخاری (ج ۲ ۔ ص ۶۱۵) ۔ کتاب المغازی اور الجزیری ۔ عبد الرحمٰن ۔ کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ ۔ المکتبہ التجاریہ الکبریٰ ۔ مصر ۔ طبع ثانی (ج ۱ ص ۶۴۸ تا ۶۵۰) نیز دیکھئے : بحر العلوم ابی العیاش عبد العلی محمد ۔ رسائل الارکان ، مطبع الیوسفی ۔ لکھنؤ ۔ ۱۳۲۵ھ (ص ۲۷۴ تا ۲۷۶) ۔ میجر جنرل

اکبر خاں نے "حدیث دفاع" میں لکھا ہے کہ آپ نے مدینہ کے حدود قائم کرکے اس کو حرم قرار دیا۔ اسے آجکل کی اصطلاح میں کھلا شہر (OPEN CITY) کہتے ہیں اور اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس شہر کے اندر اور اس کے گرد و نواح میں اہلِ شہر مخالفین سے جنگ کرنا نہیں چاہتے۔ پھر آگے حرم کی مذہبی اہمیت (مثلاً تقدیس و احترام، ہر چیز کا تقدس، درختوں کی قطع و برید، جانوروں کی ایذا رسانی، شکار سے محفوظ، ہر شخص کے لئے امن وغیرہ)۔ نیز اس کی سیاسی اہمیت سے بحث کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ "گویا حرم اپنے حدود کے اندر ایک مملکت ہوتا ہے جس کے رسوم و ضوابط اس سے مختص ہوتے ہیں" (اکبر خان، میجر جنرل۔ حدیثِ دفاع۔ فیروز سنز۔ لاہور۔ ۱۹۵۴ء۔ ص ۱۱۰)۔

[۲۵۸] ملاحظہ ہو دفعات ۳۶، ۳۹ تا ۴۲، ۵۰ تا ۲ ۵ اور ۵۵۔ [۲۵۹] دفعہ ۴۳، ۴۵، ۴۶، ۴۷ اور ۴۷۔

[۲۶۰] مودودی۔ (مسئلۂ قومیت) ص ۵۸، ۵۹ [۲۶۱] دفعہ ۲۷۔

[۲۶۲] دفعہ ۲۸۔ ابو عبید نے اس دفعہ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: انما اراد نصرهم المومنين ومعاونتهم اياهم على عدوهم بالنفقه التى شرطها عليهم فاما الدين فليسوا منه فى شئ۔ الاتراه قد بيّن ذٰلك فقال لليهود دينهم وللمؤمنين دينهم ..... (ابو عبید۔ ج ۲ ص ۲۰۷) ایک جدید مصنف کے بقول: ان هٰذه المعاهدة أطلقت فى عبارتها فشلت اليهود جميعا فيما ارادت ان تصرفه اليهم وهو اشتراكهم فى النفقه فى الحرب ومن عدم اجازه قريش ولا نصرها (وصبف۔ الدكتور مصطفىٰ كمال۔ محمد صلّى الله عليه وسلم وبنو اسرائيل۔ المجلس الاعلىٰ للشئون الاسلاميه۔ قاهره۔ سنه ۱۹۷۰ء ص ۳۷، ۳۸)۔

[۲۶۳] جیسا کہ "متحدہ قومیت" کے سلسلہ میں دلائل دیتے ہوئے مولانا محمود حسن دیوبندی نے اپنے ایک رسالہ "متحدہ قومیت اور اسلام" میں ان یہود بنی عوف امه مع المؤمنین سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ دیکھئے: مودودی (مسئلہ قومیت) ص ۴۹۔ [۲۶۴] دفعہ ۵۰ [۲۶۵] دفعہ ۲۲ [۲۶۶] دفعہ ۴۹

[۲۶۷] HELL. P. 25. [۲۶۸] دیکھئے دفعہ ۳ تا ۱۴، ۱۸، ۲۰، ۲۱ اور ۲۳۔

[۲۶۹] دیکھئے دفعہ ۳ تا ۱۱۔ [۲۷۰] حمید اللہ (عہدِ نبویؐ میں نظامِ حکمرانی) ص ۹۹۔

[۲۷۱] Wellhausen (The Historians History of the World), Vol.VIII, p. 291.

[۲۷۲] NICHOLSON, P. 173.

[۲۷۳] آرنلڈ (دعوتِ اسلام) ص ۴۵۔

حواشی

باب سوم —— توسیع ریاست

(۱) ابن حبیب بغدادی، ص ۲۷۱ (۲) ابوداؤد، ج ۲، ص ۴۲۳ (کتاب الخراج والفئے والامارہ) (۳) ایضاً (۴) ایضاً، قاضی سلیمان منصورپوری نے لکھا ہے کہ قریش مکہ نے اندر ہی اندر یثرب کے یہودیوں سے سازش کرنی شروع کر دی اور جب خفیہ طور پر ان کو اپنے ساتھ ملا چکے تب اپنی کامیابی پر پورا بھروسا کر کے مسلمانوں کو کہلا بھیجا "تم مغرور نہ ہو جانا کہ تم مکہ سے صاف بچ کر نکل آئے۔ ہم یثرب ہی پہنچ کر تمہارا استیاناس کئے دیتے ہیں" (سلمان منصورپوری۔ قاضی محمد سلیمان۔ رحمۃ للعالمین۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز۔ لاہور۔ ۱۹۵۳ء۔ ج ۱، ص ۱۳۲) قریش کا یہ پیغام اگرچہ ان کی بدطینتی کے عین مطابق ہے مگر راقم الحروف کو اس کا کہیں اور حوالہ نہیں مل سکا۔ (۵) ابن سعد، ج ۲، ص ۹ (کرز بن جابر الفہری کی تادیب کے لئے خود رسول اللہ ﷺ تشریف لے گئے۔ مدینہ میں حضرت زید بن حارثہ کو اپنا نائب بنایا۔ اور پھر کرز کی تلاش میں وادئ سفوان تک جا پہنچے جو بدر کے نواح میں ہے۔ لیکن وہ ہاتھ نہ آیا۔ چنانچہ آپ مدینہ واپس تشریف لے آئے (ایضاً) اس مہم کو غزوہ طلب کرز بن جابر الفہری (ایضاً) غزوۂ سفوان اور غزوۂ بدر اولیٰ (ابن ہشام ج ۲ ص ۲۵۱) بھی کہتے ہیں۔ ابن ہشام نے ابن اسحاق کے حوالے سے اسے غزوۂ ذی العشیرہ کے بعد جمادی الآخر کا واقعہ بتایا ہے (ایضاً) جبکہ واقدی (الواقدی۔ ابی عبداللہ محمد بن عمر۔ کتاب المغازی۔ مطبع بپٹسٹ مشن۔ کلکتہ ۱۸۵۵ء ص ۳) اور دیگر مورخین کے نزدیک بالاتفاق ماہ ربیع الاول میں پیش آیا۔ ہمارے نزدیک یہی روایت متواتر اور قوی ہے۔ (۶) بخاری میں حضرت عائشہ کی روایت ہے کہ خود رسول اللہ ﷺ راتوں کو جاگا کرتے تھے (کان النبی سھر) اور آپ کی خواہش یہ تھی کہ کوئی رات کی پہرہ داری کرے۔ اتنے میں ہتھیاروں کی جھنکار سنائی دی۔ دیکھا تو حضرت سعد بن ابی وقاص تھے جو پہرہ داری کے لئے حاضر ہوئے تھے۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے آرام فرمایا (البخاری ج ۱ ص ۴۰۴ نیز دیکھئے ص ۴۲۶، کتاب الجہاد) (۷) واقدی اور ابن سعد کی متفقہ رائے یہ ہے کہ یہ سب سے پہلا سریہ تھا جو حضرت حمزہ کی قیادت میں سیف البحر تک بھیجا گیا (الواقدی، ص ۲۔ ابن سعد، ج ۲، ص ۶) یہ تیس افراد پر مشتمل تھا اور رمضان ۱ھ (یعنی ہجرت کے ساتویں مہینہ) میں روانہ کیا گیا تھا (ایضاً) ابن ہشام نے سب سے پہلے سریۂ عبیدہ بن الحارث کا ذکر کیا ہے اور پھر سریۂ حمزہ کے، تحت دونوں روایتوں میں تطبیق کے لئے یہ کہا ہے کہ دراصل ان دونوں سرایا کو ایک ساتھ روانہ کیا گیا تھا (ابن ہشام ج ۲ ص ۲۴۱، ۲۴۵) (۸) ہجرت کے آٹھویں مہینے (شوال ۱ھ) میں ساٹھ یا اسی سواروں کا دستہ عبیدہ بن حارث کی کمانڈری میں رابغ کی جانب بھیجا گیا (الواقدی ص ۲، نیز ابن سعد ج ۲ ص ۷)۔ (۹) ہجرت کے نویں مہینے (ذیقعدہ ۱ھ) میں حضرت سعد بن ابی وقاص بیس سواروں کا دستہ لے کر خرار تک گئے (ابن سعد ج ۲ ص ۷)۔ ابن ہشام نے بعض اہل علم کے

حوالے سے لکھا ہے اسے سریۂ حمزہ کے بعد بھیجا گیا تھا (ج ۲ ص ۲۵۱) (۱۰) سرایا کی کل تعداد کے بارے میں مورخین اور اصحاب سیر کے بیانات مختلف ہیں ۔ ابن سعد کے نزدیک سرایا سینتالیس ہیں (ج ۲ ص ۶) کچھ انہیں صرف چھتیس یا اڑتیس قرار دیتے ہیں۔ بعض کے نزدیک اڑتالیس، بعض کے خیال میں چھپن اور مسعودی کے مطابق ساٹھ ہے۔ جبکہ کچھ اسے ستر اور بعض سو سے اوپر بتاتے ہیں (تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو زرقانی ج ا ص ۳۸۸) (۱۱) حضرت سعد بن ابی وقاص کی کنیت ابو اسحٰق تھی۔ ماں کا نام حمنہ تھا۔ سلسلہ نسب زہرہ بن کلاب تک پہنچتا تھا (ابن سعد ج ۳ ص ۱۳۷) ۔ ابتدائی مسلمانوں میں سے ایک ہیں ۔ نیز خود کہتے ہیں کہ جس دن میں اسلام لایا وہ وہ دن تھا جب اللہ نے نماز فرض کی تھی ۔ ایمان کے وقت عمر سترہ سال کے قریب تھی (ایضاً ج ۳ ص ۱۳۹) ۔ ہجرتِ مدینہ کے بعد ایک روایت کے بموجب مصعب بن عمیر سے اور دوسری روایت کے مطابق سعد بن معاذ سے ان کی مواخاۃ ہوئی تھی ۔ سب سے پہلے سریۂ حمزہ بن عبد المطلب میں بھی شریک تھے اور سریۂ عبیدہ بن الحارث میں بھی نہ صرف شریک ہوئے بلکہ اللہ کی راہ میں سب سے پہلا تیر چلانے کا شرف بھی حاصل کیا (ایضاً ص ۱۳۹، ۱۴۰) اور یہ افتخار و اعزاز بھی انہی کو حاصل ہے کہ غزوۂ احد میں رسول اللہؐ نے ان سے مخاطب ہو کر یہ کہا تھا کہ "ارم سعد، فداك ابی و امی" (سعد تیر چلاؤ تم پر میرے ماں باپ فدا ہوں ۔ ایضاً ص ۱۴۱) ۔ حضرت سعد بدر، احد، خندق، حدیبیہ، خیبر، فتح مکہ وغیرہ تمام غزوات میں شریک رہے (ایضاً ص ۱۴۲) ۔ مدینہ سے کچھ فاصلہ پر بمقام عقیق ۵۵ھ میں انتقال ہوا اور نماز جنازہ والی مدینہ مروان بن الحکم نے پڑھائی ۔ اس وقت ان کی عمر ستر سے متجاوز تھی (ایضاً ص ۱۴۸، ۱۴۹) (۱۲) ابن ہشام ج ۲ ص ۱۴۱ ۔ (۱۳) عبداللہ بن جحش ابن اثاب بن یعمر بن صبرہ بن مرہ بن کبیر بن غنم بن دودان ابن اسد ابن خزیمہ کنیت ابو محمد، ماں کا نام امیمہ تھا ۔ دارِ ارقم میں رسول اللہؐ کے قیام سے پہلے ایمان لائے (ابن سعد ج ۳ ص ۸۹) ۔ ابن جحش اور ان کے پورے گھرانے نے ہجرت کی تھی ۔ ان کی سرکردگی میں جو سریہ بطن نخلہ کی جانب بھیجا گیا اسی میں ان کا نام "امیر المومنین" رکھا گیا (ایضاً ص ۹۰) ۔ غزوۂ احد میں جام شہادت نوش کیا ۔ حضرت حمزہ کے ساتھ ایک ہی قبر میں مدفون ہوئے ۔ شہادت کے وقت عمر چالیس سال سے کچھ اوپر تھی ۔ (ایضاً ص ۹۱) (۱۴) یہ ہدایت تحریری تھی ۔ رسول اللہؐ نے چلتے وقت ابن جحش کو ایک سربمہر لفافہ حوالے کیا تھا جس میں یہ تحریر تھا کہ جب تم میرا خط دیکھو تو مکہ اور طائف کے درمیان مقام نخلہ تک اترتے چلے جانا اور وہاں پہنچ کر قریش کی گھات میں رہنا اور ان کے بارے میں اطلاعات ہمیں بھیجتے رہنا ۔ (ابن ہشام ج ۲ ص ۲۵۲) (۱۵) غزوۂ ودان کو غزوہ الابوا بھی کہتے ہیں ۔ ودان کی جانب اس پیش قدمی کا سبب ابن ہشام کی رائے میں قریش اور بنی ضمرہ سے جنگ کا ارادہ تھا (ابن ہشام ج ۲ ص ۲۴۱) ابن سعد کے نزدیک قافلۂ قریش کی ناکہ بندی مقصود تھی (ابن سعد ج ۲ ص ۸) لیکن قرین قیاس امر یہ ہے کہ بنی ضمرہ چونکہ قریش کے ہم نسب تھے اس لئے قریش مکہ سے ان کی ساز باز تھی ۔ اس بات کے امکانات اس لئے اور بھی روشن ہو جاتے ہیں کہ اس قبیلہ کی آبادی اس شاہراہ پر واقع تھی جس سے قریش کے قافلے شام کی طرف جانے کے لئے گزرتے تھے ۔ لہذا آتے جاتے قریش کو ان لوگوں سے ملنے اور مسلمانوں کے خلاف بھڑکانے کا پورا موقع میسر تھا ۔ غالباً رسول اللہؐ نے اس خطرہ کو پوری طرح محسوس کیا کہ دشمن کا ایک حلیف آپ کے اتنے قریب ہے لہذا آپ نے ضرورت سمجھی کہ ان سے صلح

کرکے اس خطرہ کا سدِ باب کردیا جائے۔ (۱۶) ابنِ ہشام ج ۲ ص ۱۴۱-۱۴۲۔ ابنِ سعد کی روایت کے بموجب معاہدہ میں (جو بنی ضمرہ کے سردار فحشی بن عمرو سے ہوا) یہ طے پایا کہ نہ تو رسول اللہ بنی ضمرہ سے جنگ کریں گے اور نہ بنی ضمرہ آپ سے لڑیں گے، نہ آپ کے خلاف لشکر جمع کریں گے اور نہ دشمن کو مدد دیں گے (ابن سعد ج ۲ ص ۸)۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ معاہدہ مصالحت کرنے کے علاوہ رسول اللہؐ نے ایک فرمان بھی تحریر کرکے دیا۔ ہم گزشتہ باب میں ڈاکٹر حمید اللہ کے حوالہ سے کتاب کا ترجمہ فرمان تسلیم کرچکے ہیں اس لئے ابن سعد کے ایک ہی پیراگراف میں دو قسم کے الفاظ (وادع) اور (کتب بینہ و بینھم کتابا) سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ معاہدہ الگ تھا اور فرمان یا امان نامہ الگ تھا۔ ہمارا قیاس اس بنا پر بھی قابلِ التفات ہے کہ مورخین عام طور پر "معاہدہ" کے ذیل میں جو الفاظ نقل کرتے ہیں وہ اپنے مضمون اور اندازِ بیان کے اعتبار سے فرمان ہونے کی داخلی شہادت دیتے ہیں جبکہ ابنِ سعد نے مصالحہ کی جن شرائط کا ذکر کیا ہے وہ مختلف ہیں۔ چنانچہ فرمان (یا مروجہ صلح نامہ) کا متن یہ ہے کہ: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ ھذا کتاب من محمد رسول اللہ لبنی ضمرہ بانھم آمنون علیٰ اموالھم وانفسھم وان لھم النصر علی من رامھم ان لا یحاربوا فی دین اللہ ما بل بحر صوفۃ (زرقانی ج ۱ ص ۳۹۶)۔ (۱۷) اس میں رسول اللہؐ تقریباً دو سو مہاجرین کے ہمراہ اس تجارتی قافلہ پر مسلمانوں کی قوت کا رعب قائم کرنے کے لئے تشریف لے گئے جو امیہ بن خلف الجمحی کی سرکردگی میں جا رہا تھا۔ بواط مدینہ سے تقریباً اڑتالیس میل کے فاصلہ پر علاقہ جہینہ کا ایک پہاڑی مقام تھا اور شام کے تجارتی راستے سے متصل واقع تھا (ابن سعد ج ۲ ص ۹)۔ (۱۸) جیسا کہ ہم پہلے ضمناً اشارہ کرچکے ہیں کہ غزوہَ سفوان کا سبب کرز بن جابر الفہری کی تاخت و تاراج تھی (ابن سعد ج ۲ ص ۹)۔ (۱۹) ابن سعد (ج ۲ ص ۹)۔ غزوہَ ذی العشیرہ کی وجہ مورخین نے یہ بیان کی ہے کہ قریشِ مکہ نے جو تجارتی قافلہ شام کی طرف روانہ کیا تھا رسول اللہؐ اس کو روکنا چاہتے تھے (ایضاً ص ۱۰) لیکن یہ بات اس لئے محلِ نظر ہے کہ سرما میں تجارتی قافلہ پورے ساز و سامان کے ساتھ یمن کے بجائے شام کی طرف روانہ کیا گیا تھا حالانکہ قرآن کے بیان کے مطابق سردی کے زمانہ میں قریش کا تجارتی قافلہ یمن اور موسم گرما میں شام کی طرف جاتا تھا (قریش - ۱)۔ بہرحال اگر سبب یہی تھا تو ماننا پڑے گا کہ قریش نے یہ اقدام بہت غیر معمولی حالات میں کیا تھا۔ انھوں نے نامناسب موسم میں ایک بڑا قافلہ روانہ کیا اور جیسا کہ مورخین نے لکھا ہے کہ اس میں قریش کے تمام مردوں اور عورتوں نے اپنا روپیہ لگا دیا تھا۔ اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرکے مسلمانوں کے خلاف جنگی تیاریاں کی جاسکیں۔ ان متوقع تیاریوں کے پیشِ نظر رسول اللہؐ نے مناسب سمجھا کہ اس قافلہ کو راستہ میں ہی روک دیا جائے۔ چنانچہ آپ ذی العشیرہ پہنچے لیکن قافلہ ہاتھ نہیں آیا اس لئے کچھ دن وہاں قیام فرمایا اور بنو مدلج سے معاہدہ کرکے لوٹ آئے (ابنِ ہشام ج ۲ ص ۲۴۹)

یہاں یہ وضاحت بھی مناسب ہوگی کہ مورخین نے عام طور پر جنگِ بدر کا سبب بیان کرنے میں اسی قافلۂ تجارت کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ جو تجارتی قافلہ غزوہَ ذی العشیرہ کے موقع پر شام جاتے ہوئے بچ کر نکل گیا تھا وہ جب شام سے واپس آنے لگا تو اس کو روکنے کے لئے رسول اللہؐ مع انصار و مہاجرین مدینہ سے روانہ ہوئے لیکن جب بدر کے قریب پہنچے،

تو قافلہ جاچکا تھا (ابنِ ہشام ج ۲ ص ۲۵۷، ۲۵۸) لیکن پھر اس لشکر سے جنگ واقع ہوگئی، جو امیرِ قافلہ ابوسفیان کی طلبی پر قافلہ کی امداد کے لئے مکہ سے آیا تھا۔ مورخین کا عام رجحان اسی طرف ہے لیکن علامہ شبلی نے متعدد دلائل کے ذریعہ اس موقف کی پُرزور تردید کی ہے (ج ۱ ص ۳۱۵ تا ۳۵۹) اور شہادتوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ غزوۂ بدر کا حقیقی سبب ابن حضرمی کا قتل تھا (ایضاً ص ۳۵۹ تا ۳۶۴)۔ شبلی کا بیان بہت مفصل اور مدلل ہے جس کا یہاں دُہرانا تحصیل حاصل ہے۔ البتہ ان کے اہم نکات کا خلاصہ یہ ہے کہ: (i) قافلۂ تجارت میں مکہ کو تمام سرمایہ اُگل دینے کی ضرورت کیا تھی؟ (ii) قافلہ ابھی شام سے روانہ نہیں ہوا تھا کہ حضرمی کے قتل کا اتفاقیہ واقعہ پیش آگیا (iii) اس قدر عموماً مسلّم ہے کہ جب آنحضرتؐ کو یہ خبر معلوم ہوئی کہ قریش بڑی تیاری کے ساتھ مکہ سے نکلے ہیں تو آپ نے صحابہ سے مخاطب ہوکر استمزاج کیا۔ مہاجرین نے جوش کے ساتھ آمادگی ظاہر کردی۔ مگر رسول اللہؐ انصار کی مرضی کے خواہاں تھے۔ چنانچہ ان کی طرف سے حضرت مقداد نے کہا کہ "ہم موسیٰ کی قوم کی طرح یہ نہ کہیں گے کہ آپ اور آپ کا خدا جاکر لڑیں، ہم آپ کے دائیں بائیں سے، سامنے سے اور پیچھے سے لڑیں گے۔" ان کی اس تقریر سے رسول اللہؐ کا چہرہ چمک اٹھا اور پھر آپ روانہ ہوگئے۔ رسولؐ اللہ کا انصار کی مرضی معلوم کرنے کی وجہ ظاہر ہے۔ اُنھوں نے بیعت کے وقت صرف یہ اقرار کیا تھا کہ وہ اس وقت تلوار اٹھائیں گے جب دشمن مدینہ پر حملہ آور ہو۔ آنحضرتؐ نے اسی لئے انصار کو شرکت کی دعوت دی۔ ورنہ بصورتِ دیگر اربابِ سیر کے عام بیان کے مطابق واقعہ یہ ہونا چاہئے تھا کہ انصار معاہدہ اور معمول سابق کے خلاف شرکت کے لئے نکلے۔ نیز انصار کو مخاطب کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اب انصار سے کام لینے کا وقت آچکا تھا۔ (iv) آنحضرتؐ نے اس سے پہلے قریش کے قافلوں پر حملہ کرنے کے لئے جس قدر سرایا بھیجے ان میں بیس سے دوسو تک کی جمعیت تھی اور کبھی کسی انصاری کو شریک نہیں کیا حالانکہ اس واقعہ میں انصار کی تعداد مہاجرین سے بہت زیادہ تھی یعنی کل فوج ۳۰۵ تھی جس میں ۸۴ مہاجرین اور باقی سب انصار تھے۔ (v) اگر کاروانِ تجارت پر حملہ مقصود ہوتا تو شام کی طرف بڑھنا تھا۔ یہ خلافِ قیاس ہے کہ کاروان شام سے آرہا ہے اور آپ کو خبر ہوچکی لیکن شام کی طرف بڑھنے کے بجائے مکہ کی طرف جاتے ہیں اور پانچ منزل مکہ کی طرف پہنچ کر خبر آتی ہے کہ قافلہ بچ کر نکل گیا۔ (vi) مدینے سے ایک میل چل کر نابالغ افراد کو واپس کردیا جانا قابلِ لحاظ ہے۔ اگر صرف قافلہ کا مال لوٹنا مقصود تھا تو یہ کام نوخیز نوجوان زیادہ خوبی سے انجام دے سکتے تھے جبکہ فی الواقع جہاد مقصود تھا۔ (vii) اربابِ سیر لکھتے ہیں کہ مدینہ سے جب آپ نکلے تو صرف قافلۂ تجارت پر حملہ مقصود تھا۔ دو چار منزل چل کر قریش کی فوج کا پتا چلا۔ لیکن قرآن کی سورۂ انفال میں جہاں غزوۂ بدر کا سب سے مستند بیان موجود ہے، یہ فرمایا جاتا ہے کہ: کما اخرجک ربک من بیتك بالحق وان فریقاً من المومنون لکرھون یجادلونك فی الحق بعد ما تبین کانما یساقون الی الموت وھم ینظرون واذ یعدکم الله احد الطائفتین انھا لکم وتودون ان غیر ذات الشوکة تکون لکم ویرید الله ان یحق الحق بکلماته ویقطع دابر الکافرین (آیت ۵ تا ۷)۔ آیت مذکورہ میں یہ تصریح مذکور ہے کہ یہ جس وقت کا واقعہ ہے اس وقت دو گروہ تھے ایک کاروانِ تجارت اور دوسرا قریش مکہ کی فوج کی طرف جانا چاہتا تھا گویا مدینہ سے نکلنے سے پہلے ہی صورتِ حال واضح تھی اور انصار سے مشورہ ہوا تھا ورنہ اتنے آگے جاکر انصار کہاں ملتے؟

اور یہ تصریح بھی ہے کہ مسلمانوں کی ایک ایسی جماعت تھی جو چاہتی تھی کہ کاروان پر حملہ کیا جائے خدا نے ان پر ناراضی ظاہر کی۔ علاوہ ازیں اگر صرف قافلۂ تجارت پر حملہ مقصود ہوتا تو یہ خوف و اضطراب اور پہلو تہی (جسے آیت میں بیان کیا گیا ہے) کس بناء پر تھی؟ اس سے پہلے بارہا (بقول اربابِ سیر) قافلۂ قریش پر حملہ کرنے کے لئے تھوڑے تھوڑے آدمی بھیجے گئے تھے اور کبھی ان کو ضرر نہیں پہنچا۔ اس دفعہ اسی قافلہ سے اتنا ڈر کہ تین سو کی چیدہ اور منتخب فوج ہے اور پھر لوگ ڈر کے مارے سہمے جاتے ہیں۔ مزید برآں عام اربابِ سیر اور احادیث نے لوگوں کے کسمسانے کی توجیہ یہ کی ہے کہ جانتے تھے کہ جہاد یا غزوہ نہیں ہے صرف قافلہ کا مال لوٹنا ہے حالانکہ قرآن میں صاف ہے کہ یہ کسمسانا عدم ضرورت کی بناء پر نہیں بلکہ اس وجہ سے تھا کہ ان کو یہ نظر آتا تھا کہ موت کے منہ میں جا رہے ہیں۔ (viii) کفارِ قریش جو مکہ سے لڑنے کے لئے آئے ان کی نسبت قرآن میں ہے: ولا تکونوا کالذین خرجوا من دیارھم بطراً ورئاء الناس ویصدون عن سبیل اللہ (الانفال - ۴۷) اگر صرف قافلۂ تجارت کے لئے نکلتے تو خدا کیوں کہتا کہ دکھاوے کے لئے اور خدا کی راہ سے لوگوں کو روکتے ہوئے نکلے؟ پھر خدا کی راہ سے لوگوں کو روکنا کیا تھا؟

علامہ شبلی کے اس موقف کے برخلاف ڈاکٹر حمید اللہ نے یہ بیان کیا ہے کہ "مدینہ سے مسلمانوں کا قریش پر معاشی دباؤ ڈالنا اور بزور قریش قافلوں کی آمد و رفت کو اپنے زیر اثر علاقے میں روک دینا۔ یہی بدر کی لڑائی کا باعث ہو سکتے ہیں" (حمید اللہ۔ محمد۔ عہدِ نبوی کے میدانِ جنگ۔ نشریۂ شرکت وراقت۔ دکن ۱۹۴۵ء ص ۱۷)

پھر آگے لکھتے ہیں کہ "شبلی مرحوم نے کانما یساقون الی الموت کی آیت سے استدلال کر کے کم از کم جنگِ بدر کی حد تک اپنی رائے کو مستحکم کر لیا ہے کہ آنحضرتؐ قافلے کو روکنے کے لئے نہیں بلکہ قریشی امدادی دستے سے مقابلہ کے لئے نکلے تھے لیکن...... الخ (ایضاً ص ۱۷)۔ ہمیں اس سے تو انکار نہیں ہے کہ قریش کے تجارتی قافلوں کو روکنے اور ان پر چھاپہ مارنے کے لئے مہمات روانہ کیں۔ ان میں سے چند کو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں اور یہ غزوۂ ذی العشیرہ کا مقصد بھی (اگرچہ بالکل غیر معمولی حالات میں ہوا) یہی تھا۔ لیکن جہاں تک جنگِ بدر کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں ہمیں علامہ شبلی کی رائے اور دلائل سے اتفاق ہے اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جنگِ بدر بہرحال ایک سوچی سمجھی اسکیم، متعدد واقعات (جن میں تجارتی قافلوں پر مسلمانوں کے حملے بھی شامل ہیں) اور طویل منصوبہ بندی کا نتیجہ تھی۔ اور سب سے اہم کردار یا یوں کہہ لیجئے کہ اس کا فوری سبب ابنِ حضرمی کا قتل ہی تھا۔ یہی عرب کی قدیم روایات کا خلاصہ، ان کے قومی خاصہ کے مطابق اور حالات کا تقاضا تھا۔

(۲۰) ابنِ سعد (ج ۲ ص ۸ ، ۱۰)۔ نیز تفصیلات کے لئے دیکھئے: حمید اللہ، الدکتور محمد۔ مجموعۃ الوثائق السیاسیۃ فی العہد نبوی والخلافۃ الراشدہ۔ مطبعہ لجنۃ التالیف والترجمۃ والنشر۔ قاہرہ۔ ۱۹۴۱ء۔ ص ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۳)۔

ابنِ حبیب بغدادی کے بیان کے مطابق ان قبائل کے علاوہ رسول اللہؐ نے غزوۂ سفوان میں بنی غفار اور اسلم سے بھی معاہدات استوار کئے (ابنِ حبیب، ص ۱۱۱) واقدی نے بغیر نام لئے بروایت مخرمہ لکھا ہے کہ قد حالف علینا اھل الطریق وادعھم (الواقدی، ص ۱۲)۔ اس سے معلوم ہوا کہ باشندگانِ میانہ راہ سے آپ نے (غالباً غیر جانبداری پر) حلف

لیا تھا اور ان سے مصالحہ کر لیا تھا۔ (۲۱) حمید اللہ، ڈاکٹر محمد۔ رسولِ اکرمؐ کی سیاسی زندگی۔ دارالاشاعت۔ کراچی۔ ۱۹۶۱ء۔ ص ۸۴) (۲۲) ڈاکٹر حمید اللہ نے بھی ۱ھ میں "مملکتِ نبویہ کی توسیع" کو نقشہ کے ذریعہ مدینہ تا ینبوع ظاہر کیا ہے (ایضاً ص ۸۳)۔ (۲۳) بروایت ابن ہشام کل لشکر ۳۱۴ صحابہ پر مشتمل تھا یعنی مہاجرین ۸۳، اوس ۶۱ اور خزرج ۱۷۰ (ابن ہشام ج ۲ ص ۳۶۴) اس لشکر میں سے آٹھ صحابہ کو رسول اللہ نے بعض کاموں پر متعین کر دیا تھا اس لئے وہ جدال و قتال میں شریک نہیں ہو سکے لیکن مالِ غنیمت میں ان سب کو برابر کا حصہ ملا۔ گویا اس طرح میدانِ جنگ میں موجود مسلمانوں کی کل تعداد ۳۰۶ تھی۔ ابن سعد نے ان آٹھ کو نکال کر شرکاءِ بدر کی تعداد ۳۰۵ لکھی ہے (ج ۲ ص ۱۲)۔ لشکر کی روانگی کے بارے میں ابنِ ہشام نے ۸ رمضان کی تاریخ لکھی ہے (ج ۲ ص ۲۶۳) لیکن ابن سعد کے نزدیک یہ ۱۲ رمضان تھی (ج ۲ ص ۱۲) ہمیں ابنِ ہشام کا قول زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ (۲۴) ابنِ ہشام (ج ۲ ص ۲۷۱)۔ وادی کے ایک کنارے کے لئے عدوۃ الدنیا (جہاں رسول اللہ کا قیام تھا) اور دوسرے کنارے کے لئے (جہاں کفارِ قریش کا پڑاؤ تھا) عدوۃ القصویٰ کی اصطلاحات قرآن نے استعمال کی ہیں (الانفال ۴۲)۔ (۲۵) تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو: الواقدی ص ۴۹ تا ۱۱۹ (ضرورت سے زیادہ تفصیل موجود ہے)، نیز ابنِ ہشام ج ۲ ص ۲۶۳ تا ۳۰۰ (تمام ضروری تفصیلات کے ساتھ) لیکن سب سے اچھا صاف ستھرا اور واضح بیان ابنِ سعد کا ہے، دیکھئے: ابنِ سعد ج ۲، ص ۱۲ تا ۱۹۔ (۲۶) رسول اللہ نے خود لوگوں کے سامنے یہ اظہار کر دیا تھا کہ: ھذہ مکۃ قد القت افلاذ کبدھا" (یہ مکہ ہے جس نے اپنے جگر پاروں کو سامنے ڈال دیا ہے) ملاحظہ ہو: الواقدی ص ۸۴ اور ابن ہشام ج ۲ ص ۲۶۹۔ ان جگر پاروں میں سے چند کے نام قابلِ ذکر ہیں مثلاً عقبہ بن ابی معیط، عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ (بنو شمس) الحارث بن عامر، طعیمہ بن عدی (بنو نوفل) زمعہ بن الحجاج اور اس کا بھائی نبیہہ (بنو سہم) امیہ بن خلف (بنو جمح) اور سب سے بڑھ کر ابوجہل (بنو مخزوم) وغیرہ۔ (۲۷) شبلی ج ۱ ص ۲۶۴۔ (۲۸) الانفال (۲۶)۔ (۲۹) آل عمران (۱۲۳)۔ (۳۰) الانفال (۴۱)۔ (۳۱) جنگ بدر ۱۷ رمضان ۲ھ کو ہوئی تھی (الواقدی ص ۳) اور اس سے رسول اللہ رمضان کے اواخر یا شوال کے آغاز میں فارغ ہوئے (ابن ہشام ج ۳ ص ۴۵) پھر غزوۂ بنو قینقاع ۱۵ شوال ۲ھ کو ہوا (واقدی ص ۳) ان کا محاصرہ پندرہ دن تک جاری رہا (ابن ہشام ج ۳ ص ۵۲) اور اس کے بعد ان کا اخراج عمل میں آیا۔ (۳۲) WATT (MUHAMMAD AT MEDINA) P. 17. (۳۳) الواقدی (ص ۳) اور ابنِ سعد (ج ۲ ص ۳۱) نے اسے محرم ۳ھ کا واقعہ لکھا ہے جبکہ ابنِ ہشام نے شوال کا۔ (ج ۳ ص ۴۶)۔ (۳۴) ابن سعد ج ۲ ص ۳۴، ۳۵۔ اس غزوہ کو ابن ہشام نے غزوہ ذی امر کے نام سے (ج ۳ ص ۴۹) اور واقدی (ص ۳) اور ابن سعد (ص ۳۴) نے غزوۂ غطفان کے عنوان سے لکھا ہے۔ (۳۵) ابنِ سعد ص ۳۵، ۳۶۔ اس غزوہ کو ابن سعد نے غزوۂ بنی سلیم کا عنوان دیا ہے۔ جبکہ واقدی نے غزوۂ بحران (ص ۴) اور ابن ہشام نے اسے "غزوۃ الفرع من بحران" (ج ۳ ص ۵۰) کے نام سے لکھا ہے۔

(۳۶) بدر کے انتقام میں رسول اللہ کی جان لینے کی کوشش کے ضمن میں ایک مثال عمیر بن وہب کی ہے۔ جس کا بیٹا وہب

رسولؐ اللہ کے اسیرانِ بدر میں شامل تھا۔ عمیر نے اپنے رنج والم کا اظہار صفوان بن امیہ سے کیا۔ بالآخر دونوں نے مقامِ حِجر میں گفتگو کر کے باہم یہ طے کر لیا کہ صفوان عمیر کا قرض بھی ادا کرے گا اور اس کے بال بچوں، خاندان کی تاحیات کفالت کرے گا جبکہ عمیر نے قسم کھا کر یہ اقرار کیا کہ وہ انتہائی رازداری کے ساتھ مدینہ پہنچ کر شمعِ رسالت کو گل کر دے گا۔ اس غرض سے اس نے، اپنی تلوار کو خوب تیز کر کے زہر میں بجھا لیا اور مدینہ آ گیا۔ مگر شومیِ قسمت سے ایک تو سب سے پہلے اس کی مڈبھیڑ حضرت عمرؓ سے ہو گئی اور انہوں نے اسے پکڑ کر حضور کی خدمت میں پیش کر دیا اور دوسری طرف خود رسولؐ اللہ کو بذریعہ وحی اس کے منصوبہ کی اطلاع ہو گئی مختصر یہ کہ عمیر اپنے ارادہ میں ناکام ہوا بلکہ ایمان لا کر مکہ لوٹا (واقدی ص ۱۱۸ تا ۱۲۲ ملخصاً) اس واقعہ کو ابن ہشام نے بھی 'اسلام عمیر بن وہب' کے تحت نقل کیا ہے (ج ۲ ص ۳۱۶ تا ۳۱۸)۔ (۳۷) اس لشکر میں تمام قریش، ان کے حلفا، احابیش بلکہ قبائل کنانہ کے لوگ اور اہل تہامہ اور عورتیں بھی شامل تھیں (ابن ہشام ج ۳ ص ۶۵ "۶۶)۔ (۳۸) غزوۂ سویق ذی الحجہ ۲ھ میں ہُوا۔ ابوسفیان نے بدر کی رسواکن شکست پر منّت مانی تھی کہ جب تک مسلمانوں سے انتقام نہ لے گا چین سے نہ بیٹھے گا۔ چنانچہ دو ماہ کا توقف کرنے کے بعد ایک رات مدینہ پہنچا اور رات ہی کے وقت مدینہ کے حصّہ عریض نامی پر حملہ کر دیا۔ وہاں ایک انصاری کی کھیتی اور کچھ کھجور کے درخت تھے ان میں آگ لگا دی۔ اور ان انصاری اور ان کے ایک ساتھی کو سوتے میں شہید کر دیا اس کے بعد بڑی تیزی سے راہِ فرار اختیار کی۔ رسولؐ اللہ کو معلوم ہوا تو آپ نے دو سو صحابہ کے ہمراہ ابوسفیان کا تعاقب کیا لیکن وُہ اپنی منّت پُورا کر کے اس طرح بھاگ چکا تھا ستّو (سویق) کے بہت سے بورے جو بطور رسد ساتھ لایا تھا راستے میں پھینکتا گیا جو مسلمانوں کے ہاتھ آئے (ایضاً ج ۳ ص ۴۷، ۴۸)۔

(۳۹) ابن سعد ج ۲ ص ۳۷ (۴۰) ابن ہشام ج ۳ ص ۴۷۔ واٹ نے اپنی کتاب (MUHAMMAD AT MEDINA, P.22) میں یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ عبداللہ بن ابی کی اس طرح سے علیحدگی بدنیتی پر مبنی نہ تھی جیسا کہ اولین مآخذ سے معلوم ہوتا ہے بلکہ یہ قیاس پیش کیا ہے کہ عبداللہ بن ابی نے علیحدگی اس لئے اختیار کی کہ وُہ مدینہ کی مرکزی آبادی کا تحفظ کر سکے۔ ہمارے نزدیک واٹ کے اس قیاس کی تائید نہ تو اوّلین ماخذ سے ہوتی ہے جیسا کہ واٹ نے خود اعتراف کیا ہے اور نہ ہی واقعات سے۔ پھر ابن ابی کے اس فعل کی نوعیت اس وقت اور واضح ہو جاتی ہے جبکہ ہم اس روز اسی گروہ منافقین کی گفتگو کو سامنے رکھتے ہیں (مثلاً انہوں نے اس موقع پر کہا تھا کہ اگر ہمیں معلوم ہوتا اور یقین ہوتا کہ جنگ ضرور ہو گی تو ہم تمہارے ساتھ بے شک چلتے اور تمہاری طرف سے لڑتے مگر ہمارے خیال میں جنگ نہیں ہو گی (ابنِ ہشام ج ۳ ص ۲۵) علاوہ ازیں جنگِ اُحد کے بعد پہلے جمعہ کو مسجد نبوی میں ابن ابی کو اسی بناء پر ذلیل و خوار کیا گیا کہ اس نے جنگ کے نازک موقع پر انتہائی گھناؤنے کردار کا مظاہرہ کیا تھا (ابنِ ہشام ج ۳ ص ۱۱۱)۔ منافقوں نے رسولؐ اللہ اور دیگر مسلمانوں کو نقصان اٹھانے پر خوشیاں بھی منائیں (ابن سعد ج ۲ ص ۴۴)۔ (۴۱) ابن ہشام ج ۳ ص ۶۸ (۴۲) ابن سعد ج ۲ ص ۲۶۔ (۴۳) ایضاً ص ۵۹۔ نیز دیکھئے طبری ج ۲ ص ۵۲۷۔ (۴۴) ان کے نام یہ ہیں: مرثد بن ابی مرثد غنوی، خالد بن بکیر، عاصم بن ثابت، خبیب بن عدی، زید بن دثنہ اور عبداللہ بن طارق (ابن ہشام ج ۳ ص ۱۷۸)۔

(۴۵) چار شہداء میں مرثد، خالد، عاصم اور عبداللہ بن طارق شامل ہیں (ابن ہشام ج ۳ ص ۱۷۹، ۱۸۰) جبکہ خبیب اور زید کو بنو ہذیل نے اپنے قیدیوں کے بدلے میں (جو مکہ میں قید تھے) فروخت کر دیا۔ خبیبؓ کو حجیر بن ابی وہاب تمیمی (حلیف بنو نوفل) نے خریدا، تاکہ اپنے باپ کا بدلہ لے۔ اور زید بن دثنہ کو صفوان بن امیہ نے اپنے باپ امیہ بن خلف کے بدلہ میں قتل کرنے کے لئے خریدا (ایضاً ص ۱۸۰، ۱۸۱) ان واقعات کو ابن سعد نے سریہ مرثد بن ابی مرثد کے تحت بیان کیا ہے (ابن سعد ج ۲ ص ۵۵، ۵۶)۔ (۴۶) ان مبلغین کو رسول اللہؐ نے بنی عامر کے ایک سردار ابو براء عامر بن مالک بن جعفر کی درخواست اور اصرار پر روانہ فرمایا تھا۔ (ابن ہشام ج ۳ ص ۱۹۳، ۱۹۴) مگر ان کے ساتھ بھی غداری کی گئی اور عامر بن الطفیل کی شہ پر بنی سلیم کے قبائل عصیہ رعل اور ذکوان نے بئر معونہ کے مقام پر اچانک نرغہ کر کے ان سب کو قتل کر دیا۔ صرف ایک صحابی کعب بن زید بچ گئے تھے جو لبعد میں غزوۂ خندق میں شہید ہوئے (ایضاً ص ۱۹۴)۔ ان واقعات کو ابن سعد نے سریۂ منذر بن عمرو کے نام سے ذکر کیا ہے (ج ۲ ص ۵۱ تا ۵۴)۔ (۴۷) تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو: الواقدی (ص ۳۵۴ تا ۳۵۶)، ابن ہشام (ج ۳ ص ۱۹۹، ۲۰۰)، ابن سعد (ج ۲ ص ۵۷، ۵۸)۔ (۴۸) ان کی سرکوبی کے لئے حضورؐ کی مہم کو غزوۂ ذات الرقاع کہا جاتا ہے (ابن ہشام ج ۳ ص ۲۱۳، ۲۱۴)۔ (۴۹) ابن سعد نے غزوۂ حمراء الاسد کے لئے روانگی کے وقت آپ کی یہ حالت بیان کی ہے کہ "آپ اس حالت میں روانہ ہوئے کہ چہرہ مبارک مجروح تھا اور پیشانی زخمی تھی، دندان مبارک ٹوٹا ہوا تھا اور نیچے کا ہونٹ اندر کی جانب ہوگیا تھا، واہنا شانہ ابن قمیہ کی تلوار کی ضرب سے سست تھا اور دونوں گھٹنے چھلے ہوئے تھے (ابن سعد ج ۲، ص ۴۹)۔ (۵۰) حضرت علی کو رسول اللہؐ نے حکم دیا کہ تم مشرکین کے پیچھے جا کر دیکھو کہ وہ کیا کر رہے ہیں اور آئندہ کیا کرنا چاہتے ہیں اگر انہوں نے گھوڑوں کو کوتل ساتھ لیا ہوا ور خود وہ اونٹوں پر سوار ہوں تو سمجھ لینا کہ اب وہ مکہ پلٹ رہے ہیں اور اگر اس کے برعکس وہ گھوڑوں پر سوار ہوں اور اونٹوں کو خالی ساتھ لے جا رہے ہوں تو سمجھنا کہ ان کا ارادہ مدینہ کا ہے۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر وہ مدینہ کا رُخ کریں گے تو میں ضرور فوراً پہنچ کر ان سے لڑوں گا (طبری ج ۲ ص ۵۲۷) اس ارشاد میں بصیرت، عزم اور حوصلہ کا کتنا صاف اظہار پایا جاتا ہے۔ (۵۱) ابن سعد (ج ۲ ص ۴۹)۔ (۵۲) ابن ہشام ج ۳ ص ۱۱۰۔ نیز ملاحظہ ہو: طبری ج ۲ ص ۵۲۵۔ (۵۳) ابن سعد ج ۲ ص ۴۹۔ (۵۴) ایضاً ج ۲ ص ۵۰۔ (۵۵) ابن ہشام ج ۳ ص ۱۹۹۔ (۵۶) ایضاً۔ (۵۷) ابن سعد ج ۲ ص ۵۷ (۵۸) ابن ہشام ج ۲ ص ۲۰۰۔ (۵۹) ابن سعد ج ۲ ص ۵۷۔ (۶۰) ایضاً (۶۱) ایضاً (۶۲) ایضاً ص ۵۸۔ (۶۳) البلاذری (فتوح) ص ۲۴۔ (۶۴) ابن ہشام ج ۳ ص ۲۰۱۔ (۶۵) ایضاً (۶۶) ابن سعد ج ۲ ص ۵۹۔ (۶۷) ایضاً ص ۵۹، ۶۰۔ (۶۸) ایضاً ص ۶۰۔ (۶۹) طبری ج ۲ ص ۵۵۹ (واضح رہے کہ طبری نے اسے "الخبر عن غزوۃ السویق" کے تحت بیان کیا ہے)۔ (۷۰) ابن ہشام ج ۳ ص ۲۲۵۔ (۷۱) ایضاً ص ۲۲۶۔ (۷۲) واٹ نے واقدی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ بنو نضیر نے جنھیں مدینہ سے جلا وطن کیا گیا اور اس وقت خیبر میں تھے لیکن مدینہ میں دوبارہ آباد ہونے کی آرزو رکھتے تھے اور جنہوں نے اتحادی لشکر تیار کرنے میں بڑی جانفشانی دکھائی تھی۔ انہوں نے بنو غطفان کو خیبر کی کھجوروں کی

آدھی آمدنی کے وعدہ پر جنگ میں ساتھ دینے کے لئے آمادہ کیا۔ ملاحظہ ہو: WATT. (MUHAMMAD AT MEDINA)
P. 36۔ (۷۳) ابنِ ہشام ج ۲ ص ۲۱۴۔ (۷۴) ایضاً۔ ابنِ ہشام نے اسے جمادی الاولیٰ ۴ھ کا واقعہ بتایا ہے
جبکہ ابنِ سعد لکھتا ہے کہ رسول اللہؐ غزوۂ ذات الرقاع کے لئے محرم ۵ھ میں نکلے (ابنِ سعد ج ۲ ص ۶۱)۔ (۷۵) ابنِ ہشام
ج ۲ ص ۲۱۴۔ (۷۶) ایضاً۔ ابنِ سعد کا بیان واضح ہے۔ لیکن ابنِ ہشام کا یہ لکھنا ہمارے لئے ناقابلِ فہم ہے کہ: ثم رجع
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبل ان یصل الیہا و لم یلق کیدا (ج ۲ ص ۲۲۴)۔ یہ کہنا کہ لم یلق کیدا تو اسی
وقت صحیح ہو سکتا ہے جبکہ وہاں تک پہنچے ہوں ورنہ یہ کہنا لاحاصل ہے۔ طبری نے بھی صاف صاف بیان کیا ہے کہ: حتی بلغ
دومۃ الجندل (طبری ج ۲ ص ۵۶۴)۔ (۷۸) واقدی نے قریش اور اس کے اتحادی لشکر میں شامل جماعتوں اور
اس کی کیفیت کے بارے میں لکھا ہے کہ: ان قریش جمعوا الجموع واستاجروا حیا من قبائل العرب فسارت
غطفان واسد وسلیم وقریش ومن دخل فیها فاجتمع منهم نضیر جم فساروا جمیعا (الواقدی ص ۳۶۲)
اور حی بن اخطب اور بنی قریظہ کی گفتگو کے دوران یہ اشارہ کیا ہے کہ دشمنانِ اسلام کے لشکر میں پندرہ ہزار جنگجو شامل تھے
(ایضاً ص ۳۶۴)۔ ابنِ ہشام نے بیان کیا ہے کہ قریش کے ساتھ فوج دس ہزار تھی جو احابیش اور بنو کنانہ اور اہلِ تہامہ
میں سے ان کے پیروؤں پر مشتمل تھی۔ ساتھ ہی قبیلہ غطفان اور اہلِ نجد میں سے ان کے متبعین بھی تھے جو ذنب نقمی میں پہنچ کر ٹھہر گئے۔
(ابنِ ہشام ج ۲ ص ۲۳۰، ۲۳۱ نیز دیکھئے ص ۲۲۶)۔ ابنِ سعد نے اتحادیوں کے لشکر میں شامل تمام جماعتوں اور ان کے جملہ
شرکاء کی تفصیل بتا دی ہے (ابنِ سعد ج ۲ ص ۶۶) تعجب خیز امر یہ ہے کہ یہودیوں نے اگرچہ آگ لگانے اور اس اتحادی لشکر کی
فراہمی میں انہوں نے مرکزی کردار ادا کیا تھا لیکن وہ خود لشکر میں شریک نہ تھے ورنہ بقول ڈاکٹر حمید اللہ "مجوزہ حملے میں کچھ نہیں تو
تین چار ہزار مزید سپاہیوں کا اضافہ ہو جاتا" (حمید اللہ۔ رسول اکرم کی سیاسی زندگی۔ ص ۸۵)۔ (۷۹) ابنِ سعد ج ۲
ص ۶۶۔ (۸۰) الاحزاب (۱۰، ۱۱)۔ (۸۱) شہر مدینہ مشرق اور مغرب کی جانب سے حراۃ اور جنوب کی طرف مشرقی حراۃ
کی ایک شاخ اور جبل عیر سے گھرا ہوا ہے۔ اس زمانے میں اکثر حصے کھجور کے باغات اور گھنے جنگلات سے ڈھکے ہوئے تھے
جن سے ہو کر راستہ بنانا مشکل تھا اور فوج کشی کرنا تو قطعاً ناممکن تھا۔ شمال کی جانب جبلِ اُحد اور وادی قناۃ کی وجہ سے شہر محفوظ تھا
صرف شمال مغربی علاقہ کھلا ہوا تھا۔ جہاں وادیٔ قناۃ، وادیٔ بطحان اور وادی العقیق نے مل کر ایک وسیع ہموار میدان بنا دیا تھا اور
اس میدان سے فوج کو بآسانی گذار کر شہر پر حملہ کیا جا سکتا تھا۔ لہٰذا سب سے زیادہ ضرورت اسی طرف کے استحکام کی تھی۔ چنانچہ
جب یہ بات طے ہو گئی کہ خندق کھودی جائے تو آپ نے اس کے لئے نشانات قائم کئے۔ دیارِ بنی عبد الاشہل اس کا مشرقی
سرا قرار پایا۔ وہاں سے شروع کر کے ساڑھے تین میل پر وادی بطحان کے پار حرۃ الوبرہ پر واقع کچھ پہاڑی ٹیلوں کو مغربی حد
قرار دیا گیا۔ اس طرح لمبائی ساڑھے تین میل ہوئی (مغربی جانب حرۃ الوبرہ اور وادی بطحان کے بعض حصوں میں مختلف خاندانوں
نے اپنے اپنے محلوں کے آگے خندق کھود کر اس سلسلہ کو مسجد نبویؐ کے جنوب تک وسیع کر دیا تھا) مدینہ کی آبادی اور جبل سلع
کو خندق کے جنوب میں رکھا گیا تھا (تفصیلات کے لئے: ابنِ سعد ج ۲ ص ۶۶، ۶۷) خندق کی چوڑائی اور گہرائی کی

کیفیت بالعموم بیان نہیں کی گئی اس لئے اندازاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی چوڑائی اوسطاً دس گز (۳۰ فٹ) اور گہرائی پانچ گز (۱۵ فٹ) سے دس گز (۳۰ فٹ) تک تھی۔ نیز اس خندق کی کھدائی کو تین ہفتوں کے اندر اندر مکمل کیا گیا تھا۔ (۸۲) ابن سعد ج ۲ ص ۶۶۔ (۸۳) ابن ہشام نے لکھا ہے کہ اتحادیوں اور رسول اللہؐ کا آمنا سامنا بیس دن سے کچھ زائد تک رہا (ج ۳، ص ۲۳۲) (۸۴) ابن سعد ج ۲ ص ۶۷۔ (۸۵) الواقدی ص ۳۶۴، ۳۶۵۔ نیز ابن ہشام ج ۳ ص ۲۳۱، ۲۳۲۔ (۸۶) ان میں سے حضرت سعد بن معاذ، سعد بن عبادہ، عبد اللہ بن رواحہ اور خوات بن جبیر کو بھیجا گیا تھا (ابن ہشام ج ۳ ص ۲۳۲) (۸۷) ایضاً ص ۲۳۳ (۸۸) نعیم بن مسعود کا تعلق قبیلۂ اشجع سے تھا۔ نام و نسب یہ ہے: نعیم بن مسعود بن عامر بن اُنیف بن ثعلبہ بن قنفذ بن خلاوہ بن سبیع بن بکر بن اشجع۔ غزوۂ احزاب کے موقع پر قریش کی معیت میں جن قبائل نے مدینہ پر حملہ کرنے میں حصہ لیا تھا ان میں ان کا قبیلہ بھی شامل تھا۔ اور یہ خود بھی اسی لشکر کے ساتھ آئے لیکن اس وقت تک اپنی قوم کے دین پر تھے۔ اسی اثنا میں ان کے دل میں اللہ نے اسلام کی محبت پیدا کی لیکن اس کا اظہار کئے بغیر یہ خاموشی سے رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام لائے۔ چونکہ ان کے مسلمان ہونے کا علم دوسروں خصوصاً قریش یا بنی قریظہ کو نہ تھا اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انھوں نے لشکرِ اسلام اور ریاستِ مدینہ کی زبردست خدمت انجام دی۔ یہ بظاہر خیر خواہ بن کر باری باری قریظہ، قریش اور غطفان کے پاس گئے اور انہیں ایک دوسرے کے خلاف بدظن کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ریاست مدینہ کے دشمنوں میں پھوٹ پڑ گئی ورنہ ان کا اتحاد سخت نقصان پہنچاتا۔ اس غزوہ کے بعد انہوں نے ہجرت کی اور مستقل مدینہ میں سکونت اختیار کر لی (ابنِ سعد ج ۴ ص ۲۷۷ تا ۲۷۹)۔ (۸۹) ابن سعد ج ۲ ص ۶۹، ۷۰۔ (۹۰) ایضاً۔ (۹۱) الاحزاب (۲۵)۔ (۹۲) ابنِ سعد ج ۲ ص ۷۴۔ (۹۳) ایضاً ص ۷۵۔ (۹۴) محاصرہ کے سلسلے میں ابن سعد نے ایک روایت پندرہ روز کی لکھی ہے (ج ۲ ص ۷۴) ہمارے نزدیک یہی صحیح ہے۔ لیکن دوسری روایت چودہ روز کی بھی لکھی (ص ۷۶)، جبکہ ابنِ ہشام کا بیان ہے کہ بنی قریظہ کا محاصرہ پچیس دن تک جاری رہا (ج ۳ ص ۲۴۶)۔ (۹۵) ابنِ ہشام ج ۳ ص ۲۵۰، ۲۵۱۔ (۹۶) ایضاً ص ۲۵۱۔ (۹۷) ایضاً ص ۲۴۲ (۹۸) اگرچہ یہ غزوہ اپنے بعض واقعات کی وجہ سے نہایت اہم ہے لیکن اس کے زمانہ وقوع میں مورخین اور اصحابِ سیر نے اختلاف کیا ہے۔ ابن اسحاق ابن ہشام (ج ۳، ص ۳۰۲)، ابن حبیب بغدادی (ص ۱۱۴، ۱۱۵)، طبری (ج ۱ ص ۶۰۴)، ابن اثیر (ج ۲ ص ۱۹۲)، طبرانی (الہیثمی ج ۶ ص ۱۴۳) وغیرہ نے اسے شعبان ۶ھ کا واقعہ بتایا ہے جبکہ واقدی (ص ۴) اور ابن سعد (ج ۲ ص ۶۳) وغیرہ کی روایت شعبان ۵ھ کی ہے۔ ہم نے پہلی روایت کو ترجیح دی ہے اس کے مندرجہ ذیل وجوہ ہیں: (۱) اکثر مورخین اور سیرت نگاروں کے نزدیک یہ امر متفق علیہ ہے کہ قرآن کی سورۂ نور اسی غزوہ کے بعد نازل ہوئی۔ خود قرآن کے بیان سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا نزول واقعہ افک کے سلسلے میں ہوا تھا (آیت ۱۱ تا ۲۰)۔ نیز کثیر التعداد معتبر روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ واقعہ افک سے پہلے احکام حجاب نازل ہو چکے تھے اور وہ متعین طور پر سورۂ احزاب (آیت ۵۹) میں پائے جاتے ہیں اور یہ بھی طے ہے کہ سورۂ احزاب غزوۂ خندق کے بعد نازل ہوئی تھی۔ اس طرح یہ بھی تعین ہو جاتا ہے

کہ سورۂ نور کا نزول سُورۂ احزاب کے بعد ہوا یا دوسرے الفاظ میں واقعۂ افک غزوۂ خندق اور غزوۂ بنی قریظہ کے بعد پیش آیا۔ (ii) معتبر روایات یہ بھی بتاتی ہیں کہ واقعہ افک سے پیشتر حضرت زینب کا حضورؐ سے نکاح ہو چکا تھا اور وہ غزوۂ احزاب کے بعد ذی قعدہ سنہ ھ کا واقعہ ہے۔ علاوہ ازیں یہ ثابت ہے کہ حضرت عائشہ پر تہمت لگانے والوں میں حمنہ بنت جحش بھی شامل تھیں۔ ان کے اس فعل میں یہ قرینہ پایا جاتا ہے کہ حضرت عائشہ ان کی بہن کی سوکن تھیں اور ظاہر ہے کہ بہن کی سوکن کے خلاف اس طرح کے جذبات کا پیدا ہو جانا بڑی حد تک فطری امر ہے اور اس نفسیاتی عمل کے لئے کچھ نہ کچھ مدت بھی درکار رہے (مودودی تفہیم القرآن، مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند۔ دہلی۔ ج ۳، ص ۳۰۷)۔ (iii) بعض روایات میں واقعہ افک کے زمانہ میں حضرت سعد بن معاذ کی موجودگی کا ذکر آیا ہے (جن کا انتقال سنہ ھ میں ہوا تھا) مگر یہ مشکل اس لئے رفع ہو جاتی ہے کہ اس کے برخلاف بعض روایات میں حضرت اسید بن حضیر کا ذکر موجود ہے جو دوسرے تمام واقعات و روایات سے عین مطابقت رکھتا ہے۔ (ایضاً)۔ (۹۷) ابن سعد کا بیان یہ ہے کہ منافقین کی اتنی بڑی تعداد پہلی مرتبہ اس غزوہ میں رسولؐ اللہ کے ہمراہ تھی (ج ۲ ص ۶۳)۔ منافقین کا پہلی مرتبہ اس بڑی تعداد میں شریک ہونا اور پھر ان کا طرزِ عمل بھی اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ یہ غزوہ احزاب کے بعد کا واقعہ ہے۔ (۹۹) ابن سعد ج ۲ ص ۶۳۔ (۱۰۰) مریسیع ایک آبگیر کا نام تھا جس کا محلِ وقوع قدید سے متصل تھا (ابنِ ہشام ج ۲ ص ۳۰۲)۔ (۱۰۱) آنحضرتؐ نے حکم دیا کہ تمام مردوں، عورتوں اور بچوں کو گرفتار کر لیا جائے۔ ان ہی اسیرانِ جنگ میں سردار قبیلہ کی صاحبزادی جویریہ بھی تھیں جو بعد میں ام المومنین بنیں۔ قیدیوں کے علاوہ مالِ غنیمت میں دو ہزار اونٹ اور پانچ ہزار بکریاں بھی مسلمانوں کے ہاتھ آئیں (ابنِ سعد ج ۲ ص ۶۴)۔

(۱۰۲) ایضاً ج ۲ ص ۸۹، ۹۰ (واضح رہے کہ فدک کی دوسری متعدد مہمیں بھی روانہ کی گئی تھیں)۔ (۱۰۳) حضرت عمر بن خطاب شعبان سنہ ھ میں تیس آدمیوں کے ہمراہ بنو ہوازن کی تادیب کے لئے بجانب تربہ روانہ ہوئے مگر دشمن ہاتھ نہ آیا۔ چنانچہ مدینہ واپس آ گئے (ابنِ سعد ج ۲ ص ۱۱۷)۔ (۱۰۴) بنی کلاب کی تادیب کے لئے حضرت ابوبکر صدیق شعبان سنہ ھ میں (نجد کے نواح میں) تشریف لے گئے تھے (ایضاً ص ۱۱۷-۱۱۸)۔ (۱۰۵) بشیر بن سعد الانصاری کی سرکردگی میں دو مرتبہ مہمیں روانہ کی گئیں ایک تو بنی مرہ کی تادیب کے لئے تیس آدمیوں کے ہمراہ انھیں شعبان سنہ ھ میں فدک بھیجا گیا (ایضاً، ص ۱۱۸، ۱۱۹) پھر دوبارہ شوال سنہ ھ میں انہیں تادیبِ غطفان کے لئے تین سو آدمیوں کے ہمراہ یمن و جبار کی طرف روانہ کیا گیا لیکن جب پہنچے تو دشمن ان کی اطلاع پا کر فرار ہو چکا تھا اس لئے مڈبھیڑ نہ ہوئی صرف دو آدمی ملے جن کو قید کر کے مدینہ لے آئے اور وہ دونوں مسلمان بھی ہو گئے (ایضاً ص ۱۲۰)۔ (۱۰۶) غالب بن عبداللہ اللیثی تین مرتبہ مہم لے کر گئے تھے۔ ایک مرتبہ تو مہم لے کر بنو عوال اور بنی عبد ابن ثعلبہ کی تادیب کے لئے رمضان سنہ ھ میں ایک سو تیس آدمیوں کے ہمراہ میفعہ (نجد) گئے اور دشمن کو بُری طرح پامال کیا (ایضاً ص ۱۱۹)۔ دوسری بار انہوں نے صفر سنہ ھ میں تادیب بنو الملوح کے لئے بجانب کدید سفر اختیار کیا۔ (ایضاً ص ۱۲۴ تا ۱۲۵) اور تیسری بار صفر سنہ ھ میں فدک کی جانب گئے تاکہ اس سے قبل سریۂ بشر بن سعد کے نقصان کا بدلہ لے سکیں۔ دو سو آدمیوں کے ہمراہ گئے اور فتح مند واپس آئے (ایضاً ص ۱۲۶)۔

(۱۰۷) ابن ابی العوجاء السلمی کو رسولؐ اللہ نے ذی الحجہ ۷ھ میں پچاس آدمیوں کے ہمراہ بنی سلیم کی طرف بھیجا تھا (ایضاً ص ۱۲۳) (۱۰۸) سریۂ شجاع بن وہب الاسدی ربیع الاوّل ۸ھ میں ہوا۔ یہ بنی عامر کی گوشمالی کے لئے بستی (نواح رکبہ عقب معدن) گئے تھے۔ لڑائی نہیں ہوئی لیکن اونٹ بکریاں وغیرہ بہت ہاتھ آئیں (ایضاً، ص ۱۲۷)۔ (۱۰۹) جہینہ کے ایک قبیلہ کی تادیب کے لئے رسولؐ اللہ نے ابوعبیدہ بن الجراح کو رجب ۸ھ میں تین سو مجاہدین کے ایک لشکر کے ساتھ (ساحلِ سمندر سے متصل) القبلیہ روانہ کیا تھا (ایضاً ص ۱۳۲)۔ (۱۱۰) خضرہ (نجد میں قبیلہ محارب کی سرزمین) کی جانب ابوقتادہ بن ربعی الانصاری کا سریہ شعبان ۸ھ میں ہوا۔ ابوقتادہ کے ہمراہ ۱۵ آدمی تھے اور مقصد یہ تھا کہ بنوغطفان کی سرکوبی کی جائے (ایضاً ص ۱۳۲، ۱۳۳)۔ (۱۱۱) مشہور مغربی عالم مارگولیتھ Margoliouth ایک جگہ رقمطراز ہے کہ:

"Wars are won in the first place by science, but in the second by discipline, in the third by enthusiasm. Military science is a recent invention; it is clear, however, that the Prophet gladly availed himself of such technical knowledge of the subject as was current in his time, and highly rewarded strategic talent".

(Margoliouth, D.S. Mohammedanism, Thornton Butterworth Ltd., London, 1928, p. 76).

(۱۱۲) النحل (۱۲۶)۔ (۱۱۳) ابنِ ہشام (ج ۳ ص ۲۹۲، ۲۹۳)، طبری (ج ۲ ص ۵۹۵) اور ابن اثیر (ج ۲، ص ۱۸۸) وغیرہ نے غزوۂ بنی لحیان کو جمادی الاوّل ۶ھ (یعنی غزوۂ بنی قریظہ کے تقریباً چھ ماہ بعد) کا واقعہ قرار دیا ہے لیکن واقدی (ص ۵) اور ابن سعد (ج ۲ ص ۸۰) نے اسے ربیع الاوّل ۶ھ میں محسوب کیا ہے۔ (۱۱۴) ابن ہشام ج ۳ ص ۱۷۸ تا ۱۸۲)۔ (۱۱۵) ایضاً ص ۲۹۲۔ (۱۱۶) ایضاً۔ ابن سعد (ج ۲ ص ۷۸ تا ۸۰) وغیرہ۔ البتہ واقدی نے یہ لکھا ہے کہ "ثم خرج رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یرید بنی لحیان فلقیھم وھزمھم اللّٰہ وقتلھم" (الواقدی ص ۳۷۴)۔ (۱۱۷) ابنِ ہشام ج ۳ ص ۲۹۳۔ (۱۱۸) عسفان تک پیشقدمی کی یہ حکمت خود رسولؐ اللہ نے بھی ارشاد فرمائی تھی (ایضاً ص ۲۹۲)۔ (۱۱۹) ایضاً ص ۲۹۳ تا ۲۹۴۔ غزوۂ غابہ یا ذی قرد کو ابن ہشام نے جمادی الاوّل ۶ھ میں بیان کیا ہے (ایضاً) لیکن ابنِ سعد نے اسے ربیع الاول ۶ھ کا واقعہ بتایا ہے (ج ۲ ص ۸۰) غابہ مدینہ منورہ کے شمال میں شام کے راستہ پر ایک جنگل تھا جہاں چراگاہیں تھیں جن میں چرنے کے لئے مدینہ کے بعض لوگ اپنے جانور چھوڑ دیتے تھے۔ رسولؐ اللہ نے بھی اپنی دودھ دینے والی بیس اونٹنیاں اسی جگہ چھوڑ رکھی تھیں اور ان کی نگرانی پر ابوذر غفاری کے بیٹے مامور تھے۔ غابہ کا مدینہ سے فاصلہ بارہ میل یا ایک دن کی مسافت کے بقدر تھا (ابن سعد، ج ۲ ص ۸۰)۔ (۱۲۰) ایضاً (۱۲۱) ایضاً ص ۸۱ (۱۲۲) ایضاً (۱۲۳) ایضاً (۱۲۴) ایضاً ص ۸۸۔

(۱۲۵) ایضاً (۱۲۶) ایضاً ص ۹۰، ۹۱۔ (۱۲۷) ایضاً (۱۲۸) ایضاً ص ۹۳ (۱۲۹) ایضاً (۱۳۰) ایضاً (۱۳۱) المائدہ (۳۳)۔ (۱۳۲) ڈاکٹر حمید اللہ نے المبسوط کے حوالے سے کہا ہے کہ قریش اور اہلِ خیبر میں معاہدہ تھا۔ حمید اللہ (رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی) ص ۸۵۔ (۱۳۳) تفصیل کے لئے دیکھئے: ابن سعد ج ۲ ص ۹۱، ۹۲۔ (۱۳۴) ایضاً ص ۹۲ (۱۳۵) ایضاً (۱۳۶) خواب یہ دیکھا کہ اپنے اصحاب کے ساتھ مکہ گئے اور طواف سے متمتع ہوئے ہیں (زرقانی ج ۲ ص ۱۷۹)۔ (۱۳۷) واقدی نے لکھا ہے ثم اذن رسول اللہ فی الحج (الواقدی ص ۳۸۳) نیز ملاحظہ ہو: ابنِ ہشام ج ۳ ص ۳۲۲۔ (۱۳۸) شرکائے سفر کے بارے میں روایات مختلف ہیں۔ ابنِ ہشام نے دو روایتیں نقل کی ہیں: ایک سات سو کی اور دوسری چودہ سو کی (ج ۳ ص ۳۲۲) ابن سعد نے چودہ سو کے علاوہ سوا پندرہ سو اور سولہ سو کی تعداد کا بھی ذکر کیا ہے (ج ۲ ص ۹۵) طبری نے سات سو، تیرہ سو، چودہ سو، پندرہ سو کی روایات لکھی ہیں (ج ۲، ص ۶۲۱) ابنِ حزم کے بیان کے مطابق تیرہ سو سے پندرہ سو کے درمیان تھی (جوامع السیرۃ ص ۲۰۷)۔ ان تمام روایات میں سے چودہ سو کی روایت زیادہ مشہور و متداول ہے۔ نیز بخاری میں بھی حضرت براءؓ بن عازب اور جابر بن عبداللہ وغیرہ سے یہی تعداد مروی ہے (البخاری ج ۲ ص ۵۹۸ کتاب المغازی) اور ہمارے نزدیک بھی اس کی ترجیح کی ایک مزید دلیل یہ ہے کہ غزوۂ خیبر کے موقع پر رسولؐ اللہ نے یہ اعلان فرما دیا تھا کہ: لا یخرجن معنا الا راغب فی الجهاد (ابن سعد ج ۲، ص ۱۰۶) اس کے نتیجہ میں وہی لوگ اس میں شامل ہوئے جو حدیبیہ میں رسولؐ اللہ کے ہمسفر تھے اور ان کی تعداد بھی چودہ سو ہی تھی (ایضاً)۔ (۱۳۹) الواقدی ص ۳۸۳۔ نیز البخاری ج ۲ ص ۵۹۸ ذوالحلیفہ ہی اہلِ مدینہ کی میقات ہے اور مدینہ سے اس کا فاصلہ تقریباً چھ میل ہے۔ (۱۴۰) مورخین و اصحاب سیر کی متفقہ روایت یہی ہے کہ رمضان و شوال میں رسولؐ اللہ کا قیام مدینہ میں رہا اور ذیقعدہ ۶ھ میں عمرہ کی نیت سے نکلے (ابنِ ہشام ج ۳ ص ۳۲۱) البتہ امام ابو یوسف کا بیان ذرا مختلف ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ رسولؐ اللہ حدیبیہ کے لئے رمضان میں نکلے (دیکھئے: ابو یوسف۔ یعقوب بن ابراہیم۔ کتاب الخراج۔ المطبعۃ السلفیہ۔ قاہرہ۔ ۱۳۵۲ھ ص ۲۰۸)۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ چونکہ ۱۰ھ سے پہلے تک اسلامی تقویم درست نہ ہوئی تھی اور نسی وغیرہ کا قاعدہ مروج تھا اس لئے قمری اور کبیسہ کے دو قسم کے کیلنڈر رائج تھے، چنانچہ ۶ھ میں ان دونوں کے درمیان دو ماہ کا فرق تھا۔ چنانچہ مثال کے طور پر قمری کا ماہ رمضان کبیسہ کے ذوالقعدہ کے مساوی تھا (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو

Hamidullah, Dr. M., <u>Diplomatic Relations of Islam with Iran in the time of the Prophet</u>. (A paper read at the second session of Idara-i-Ma'arif-i-Islamia) Proceedings of the Idara-i-Ma'arif-i-Islamia, Lahore, 1938, p. 97.

ڈاکٹر حمید اللہ کی اس تصریح کی روشنی میں امام ابو یوسف کے قول میں کوئی معارضہ باقی نہیں رہتا۔ ہاں ایک روایت

عبداللہ سے رجب کے بارے میں بھی منقول ہے۔ لیکن اس کی تردید خود حضرت عائشہ نے یہ کہہ کر فرمادی کہ ابن عمر سے بھول ہوئی ہے۔ علاوہ ازیں حضرت انس بن مالک اور دوسرے صحابہ کے اقوال سے بھی حضرت عائشہ کے قول کی تائید ہوتی ہے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: البخاری (ج ۱ ص ۲۳۸، ۲۳۹) کتاب المناسک۔ (۱۴۱) ابنِ ہشام ج ۳ ص ۳۲۳۔ (۱۴۲) ایضاً ص ۳۲۲۔ (۱۴۳) ایضاً ص ۳۲۳، ۳۲۴۔ واقدی نے لکھا ہے کہ جب اہلِ مکّہ کو معلوم ہوا کہ رسول اللہ نے حدیبیہ پر نزول اجلال فرمالیا ہے تو یہ خبر ان پر بجلی بن کر گری (فشق ذلك عليهم) دیکھئے: الواقدی ص ۳۰۴۔ حدیبیہ کا مقام حدودِ حرم سے متصل واقع ہے حدیبیہ اور مکہ کے درمیان ایک منزل کی مسافت ہے۔ اس جگہ ایک کنواں تھا جس کا نام حدیبیہ تھا اور پھر بعد میں یہ علاقہ بھی حدیبیہ کہلانے لگا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا کچھ حصہ حدودِ حرم کے اندر اور کچھ باہر واقع ہے (یاقوت الحموی۔ ج ۲ ص ۲۲۹)۔ ابن سعد نے مکّہ سے حدیبیہ کا فاصلہ نو میل لکھا ہے۔ (ج ۲ ص ۹۶)۔ (۱۴۴) واقدی ص ۳۰۷۔ تفصیل کے لئے: ابن ہشام ج ۳ ص ۳۲۵ تا ۳۳۱۔ (۱۴۵) البقرہ (۱۴۴)۔ (۱۴۶) الانفال (۶) (۱۴۷) الفتح (۱۲)۔ (۱۴۸) شاید اس خدشہ کو مسلمانوں نے بھی محسوس کیا تھا کہ قریش مکّہ کی بدطینتی رنگ لاسکتی ہے۔ چنانچہ رسول اللہ جب ذی الحلیفہ پہنچے تو حضرت عمر نے آپ کی توجہ اس طرف دلائی کہ آپ دشمن کے علاقہ میں بغیر اسلحہ اور دوسری جنگی تیاری کے بغیر تشریف لے جارہے ہیں، جو مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ اس پر رسول اللہ نے کسی کو مدینہ بھیجا۔ وہ وہاں سے پورا مخزن یعنی وہاں جس قدر اسلحہ اور جانور وغیرہ تھے سب کو ساتھ لے آیا۔ لیکن مکّہ کے قریب پہنچ کر وہاں لیجانے سے روک دیا۔ (طبری ج ۲ ص ۶۲۲)۔ (۱۴۹) الفتح (۱۵)۔ (۱۵۰) محمود شیت خطاب۔ الرسول القائد۔ دارالقلم ۱۹۶۴ء ص ۲۷۹۔ (۱۵۱) مورخین نے حدیبیہ میں قیام کی مدت ۱۹، ۲۰ دن بتائی ہے۔ ملاحظہ ہو: (الحلبی، ج ۳ ص ۲۷)۔ (۱۵۲) ابن سعد کی روایت کے مطابق یہ بسر بن سفیان تھا اور غدیر الاشطاط (عقب عسفان) پر ملا تھا۔ (ابن سعد ج ۲ ص ۹۵)۔ (۱۵۳) ابنِ ہشام ج ۳، ص ۳۲۲، ۳۲۳۔ (۱۵۴) ابویوسف ص ۲۰۴۔ (۱۵۵) ابن ہشام ج ۳ ص ۳۲۳۔ (۱۵۶) الواقدی ص ۳۰۵۔ (۱۵۷) ابنِ ہشام ج ۳ ص ۳۲۳۔ (۱۵۸) ایضاً ص ۳۲۴۔ (۱۵۹) ایضاً ص ۳۲۷۔ (۱۶۰) ایضاً ص ۳۲۹۔ یہاں یہ بتانا بے جا نہ ہوگا کہ اس روز رسول اللہ کی نگہبانی کا فریضہ حضرت محمد بن مسلمہ انجام دے رہے تھے اور انہوں نے ہی قریش کے دستہ کو پکڑا تھا (الحلبی ج ۳ ص ۲۱)۔ (۱۶۱) ابن ہشام ج ۳ ص ۳۲۵۔ (۱۶۲) واقدی ص ۳۰۴۔ (۱۶۳) ابن ہشام ج ۳ ص ۳۲۹۔ (۱۶۴) ایضاً، ص ۳۲۲، ۳۲۳۔ (۱۶۵) ایضاً ص ۳۲۵ (۱۶۶) ایضاً ص ۳۲۶۔ (۱۶۷) امام ابویوسف نے لکھا ہے کہ عروہ بن مسعود سے گفتگو کے دوران رسول اللہ نے یہ واضح کردیا کہ "ہم لوگ جنگ کرنے نہیں آئے ہیں بلکہ عمرہ ادا کرنے اور اپنے قربانی کے جانور قربان کرنے آئے ہیں۔ کیا تم اتنا کرسکتے ہو کہ میری قوم کے پاس جاؤ کہ یہ لوگ اب بھی میرے اہلِ خاندان ہیں انھیں جنگ نے ڈرادیا ہے ان کی بھلائی اس میں نہیں کہ جنگ ان کو جو نقصانات پہنچاچکی ہے اب اس پر مزید کوئی اضافہ کریں (اور ان سے کہنا کہ) وہ میرے اور اپنے درمیان ایک مدت (امن) طے کرلیں جس میں ان کی نسل بڑھے گی ہمیں

ان کے شر سے نجات حاصل رہے گی (ابو یوسف ص ۲۰۹)۔ (۱۶۸) ابن ہشام ج ۳ ص ۳۲۹۔ (۱۶۹) ایضاً ص ۳۲۸۔ (۱۷۰) ابن ہشام کے بیان کی رو سے بایعهم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی الموت (ایضاً ص ۳۳۰) جابر کہتے ہیں بایعنا علی الموت (ایضاً)۔ (۱۷۱) بیعتِ رضوان یعنی جس میں اللہ کی رضا شامل تھی اور جس سے اللہ راضی ہوا۔ دیکھئے سورہ الفتح (آیت ۱۰، ۱۸)۔ (۱۷۲) محمد (۳۵) اسے ابو عبید نے اپنی کتاب الاموال میں بھی ذکر کیا ہے (ابو عبید، ج ۲ ص ۱۶۱ - فقرہ ۴۴۴)۔ (۱۷۳) البقرہ (۱۹۴)۔ (۱۷۴) الفتح (۲۲)۔ (۱۷۵) ابو عبید نے لکھا ہے کہ اس بیعت نے یرغمال شدہ مشرکین کو ترغیب دلائی اور انہوں نے امن و صلح کی پیش کش کی۔ اس پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ: وھو الذی کف ایدیھم عنکم و ایدیکم عنھم ببطن مکۃ من بعد ان اظفرکم علیھم و کان اللہ بما تعملون بصیرا (الفتح ۲۴)۔ ملاحظہ ہو: ابو عبید (ج ۲ ص ۱۵۷ فقرہ ۴۴۱)۔ اسی طرح ابن سید الناس نے اپنی کتاب عیون الاثر میں یہ لکھا ہے کہ مشرکینِ مکہ نے حضرت عثمان کو یرغمال بنا لیا اور رسول اللہ نے اپنے پاس مشرکین کو خطرات کے پیشِ نظر یرغمال بنا لیا تھا (ج ۲ ص ۱۲۲)۔ چالیس پچاس قریشیوں کا جو دستہ رسول اللہ پر حملہ آور ہونے کے لئے آیا تھا پھر گرفتار ہوا تھا اس کے آدمیوں کو روک لیا اور بقیہ اس وقت تک یرغمال بنائے رکھے جب تک کہ حضرت عثمان ان کے ہاں سے واپس معسکرِ رسول میں نہ آ گئے۔ (۱۷۶) دیکھئے واقدی (ص ۳۰۶)۔ نیز ابنِ ہشام (ج ۳ ص ۳۳۰) اور سیرۃ حلبیہ میں ہے کہ: ولما علمت قریش بھذہ البیعۃ خافوا و اشار اھل الرای بالصلح (الحلبی ج ۳ ص ۲۲) واقدی نے یہ بھی لکھا ہے کہ صلح کی درخواست کے ساتھ قریش نے عروہ بن مسعود اور مکرز بن جعفر کو بھیجا تھا (الواقدی ص ۳۰۵) اور امام ابو یوسف کا بیان ہے کہ صلح کے لئے سہیل بن عمرو کے ساتھ ساتھ مکرز بن حفص کو بھی اختیارِ صلح دیا تھا (ابو یوسف ص ۲۱۰) اور طبری کی تصریح کے مطابق صلح کرنے کے لئے قریش نے سہیل بن عمرو، حویطب بن عبد العزی اور حفص کو بھیجا تھا (طبری ج ۲ ص ۶۲۹)۔ (۱۷۷) ابن ہشام ج ۳ ص ۳۳۱۔ (۱۷۸) الفتح (۲۵)۔ (۱۷۹) الواقدی ص ۳۰۷۔ (۱۸۰) ابن ہشام ج ۳ ص ۳۳۲۔ صلح کی مدت واقدی کے یہاں دو سال (ص ۳۰۷) اور ابو عبید کی کتاب الاموال میں چار سال (ابو عبید ج ۲ ص ۱۵۷ فقرہ ۴۴۱) مذکور ہے۔ (۱۸۱) ابن ہشام ج ۳ ص ۳۳۲۔ واقدی کا جملہ یہ ہے کہ: نہ ہمارے لوگ تم کو اور نہ تمہارے لوگ ہم کو ایذا پہنچائیں (الواقدی ص ۳۰۷)۔ ابو عبید کے یہاں فقرہ اس طرح ہے: ان یأمن بعضھم بعضاً۔ اور اضافہ یہ ہے کہ علی الا اغلال ولا اسلال (ابو عبید ج ۲ ص ۱۵۷) یہ اضافہ ابن سعد نے بھی نقل کیا ہے (ابن سعد ج ۲ ص ۹۷)۔ (۱۸۲) ابن ہشام ج ۳ ص ۳۳۲۔ واقدی کے یہاں جملہ اس طرح ہے: ومن اتاہ من اھل مکۃ مسلماً ردہ الیھم و من جاء من اھل مکۃ من اصحابہ فھو لھم (ص ۳۰۷) اور ابو عبید کے الفاظ یہ ہیں: انہ من اتی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلماً ردہ الیھم و من اتاھم من المسلمین لم یردوہ الیہ (ج ۲ ص ۱۵۷ - فقرہ ۴۴۱)۔ (۱۸۳) ابن ہشام کا فقرہ یہ ہے کہ: وان بیننا عیبۃ مکفوفۃ و انہ لا اسلال ولا اغلال (ج ۳ ص ۳۳۲)۔ اس کے پہلے حصے کا ترجمہ ہم نے ڈاکٹر حمید اللہ

سے لیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس شق کا پورا ترجمہ یوں کیا ہے: "یہ کہ ہم میں باہم سینے ہر طرح بند رہیں گے (جن میں باہر سے کوئی غداری داخل نہ ہو سکے گی) اور نہ تو خفیہ کسی دوسرے کو مدد دی جائے گی نہ علانیہ خود خلاف عہد دغا کریں گے" (حمید اللہ۔ رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی۔ ص ۹۱)۔ محمود شیت خطاب نے اس کا مدعا یہ سمجھا ہے کہ "یعنی ہم تم سے رکے رہیں گے اور تم ہم سے" (محمود شیت خطاب۔ ص ۲۷۰)۔ ہمارے نزدیک اس کا مفہوم یہ ہے کہ باہم ہر طرح راز داری برتی جائے گی، نیز دل کو ایک دوسرے سے صاف رکھیں گے یعنی باہم خلوص برتا جائے گا۔ یا یہ کہ دلوں کی عداوتیں دلوں میں رہیں گی، نہ انھیں ظاہر کیا جائے گا نہ بدعہدی اور خیانت کی جائے گی۔ نیز دیکھئے: ابویوسف ص ۲۱۰۔ (۱۸۴) ابن ہشام ج ۳ ص ۳۳۲۔ اس شق کے تحت قبائل خزاعہ نے رسول اللہ کے معاہدے اور ذمہ داری میں اور بنی بکر نے قریش کے معاہدہ اور ذمہ داری میں شریک ہونے کا اعلان کیا (ایضاً)۔ (۱۸۵) ایضاً۔ واقدی کے یہاں اس دفعہ کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ: "وعلی اهل مكه لمحمد بن عبد الله ان يخلوا له مكه عاماً قابلا ثلاثة ايام وعلىٰ محمد لاهل مكه ان لا يدخل احد منهم بسلاح الا سلاح يجعل فى قراب وهو السيف" (الواقدی ص ۳۸۸)۔ (۱۸۶) ابوعبید ج ۲ ص ۱۵۱ فقرہ ۴۱۴۔ اس دفعہ کو بلاذری نے بھی ابوعبید کے حوالہ سے نقل کیا ہے (البلاذری۔ فتوح۔ ص ۴۴)۔ یہاں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس شق کو بالعموم مورخین اور اصحابِ سیر نے ذکر نہیں کیا ہے۔ نیز ڈاکٹر حمید اللہ نے دفعات کے سلسلہ میں معاہدہ کے حوالے سے یہ صراحت کی ہے کہ ہمارے اور تمہارے حقوق و واجبات برابر ہوں گے" (حمید اللہ۔ رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی۔ ص ۹۱) لیکن ہمیں اس کا حوالہ نہیں مل سکا۔ (۱۸۷) ابنِ ہشام ج ۳ ص ۳۳۲۔ (۱۸۸) ڈاکٹر حمید اللہ نے بغیر کسی حوالے کے یہ عجیب بات لکھی ہے کہ "ان کا سب سے بااثر سردار ابوسفیان کسی نامعلوم راستے سے چھپ چھپا کر اور بچ بچا کر ان دنوں شام گیا ہوا تھا اس لئے حضرت عثمان نظر بند ہو گئے ...... الخ" (رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی، ص ۸۸) حالانکہ اگر روایات صحیح ہیں تو متعدد مآخذ میں اس کی موجودگی کا تذکرہ پایا جاتا ہے۔ مثلاً ابن ہشام نے حضرت عثمان کی سفارت کے ضمن میں بروایت ابن اسحاق صراحت سے لکھا ہے کہ "حضرت عثمان مکہ کی جانب گئے تو ابان بن سعید العاص سے ملے (مکہ میں داخل ہونے پر یا اس سے پہلے) اور رسول اللہ کا پیغام پہنچایا پھر عثمان آگے چلے یہاں تک کہ ابوسفیان اور دوسرے عظمائے قریش تک جا پہنچے اور رسول اللہ کا پیغام پہنچا دیا" (ج ۳ ص ۳۲۹) کم و بیش یہی بیان واقدی کا بھی ہے، بلکہ لکھا ہے کہ جب حضرت عثمان نے رسول اللہ کا خط ابوسفیان کو پہنچایا تو اسے لے کر وہ دوسرے امرا سے مشورہ کے لئے نکل کھڑا ہوا (الواقدی ص ۴۰۴) اور طبری نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ اس وقت جبکہ صلح کی تیاری ہو رہی تھی فنتك به ابو سفيان (ابوسفیان نے رسول اللہ پر اچانک یورش کر دی) ملاحظہ ہو: (ج ۲ ص ۶۲۹) اور حضرت عثمان کی سفارت کے سلسلے میں لکھا ہے کہ: فانطلق عثمان حتى اتى الى ابا سفيان وعظماء قريش (ایضاً ص ۶۳۱) اور السیرۃ الحلبیہ میں بھی ابوسفیان کی موجودگی کا ثبوت موجود ہے (الحلبی: ج ۳ ص ۱۴)۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ "اس وقت مکہ میں عجیب بدنظمی تھی" (رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی ص ۸۸) ہمارے خیال میں

اس وقت کی مخصوص صورتِ حال میں اسے بدنظمی کی بجائے "اختلاف رائے" کہنا زیادہ مناسب ہوگا کیونکہ رسول اللہؐ نے حدیبیہ پہنچ کر اور اعلان عمرہ کی شکل میں پروپیگنڈہ کی جو جنگ ان پر مسلط کر دی تھی۔ اس سے عہدہ برآ ہونے میں انہیں سخت دقت پیش آرہی تھی اور پھر یہی ہوا کہ انہوں نے ایک طرف سے اپنا دامن بچایا تو دوسری طرف اُلجھ کر رہ گیا۔ (۱۸۹) ابنِ ہشام ج ۲ ص ۳۳۱۔ (۱۹۰) حضرت عمرؓ کے ردِ عمل کی شدت کا اندازہ ان کے لب و لہجہ سے لگایا جا سکتا ہے جس کا اظہار انہوں نے حضرت ابوبکرؓ سے اور اس کے بعد رسول اللہؐ سے کیا ابنِ اسحاق کی روایت کے مطابق حضرت عمرؓ نے رسول اللہؐ کو مخاطب کر کے کہا تھا: الست برسول اللہ ؟ قال بلیٰ ! قال اولسنا بالمسلمین ؟ قال بلیٰ ! قال او لیسوا بالمشرکین ؟ قال بلیٰ ۔ قال فعلام نعطی الدنیة فی دیننا (ابن ہشام ج ۳ ص ۳۳۱) ۔ لیکن بعد میں جوش سرد پڑنے پر انہیں اپنی گفتگو کا احساس ہوا چنانچہ زندگی بھر پچھتاتے رہے اور نماز، روزہ، صدقہ، خیرات کی صورت میں اس کا کفارہ ادا کرنے کی کوشش کرتے رہے (ایضاً) ۔ (۱۹۱) ایضاً۔ رسول اللہؐ کا یہ جواب اس لحاظ سے قابلِ غور ہے کہ اس میں رسول اللہؐ نے حاکمیت باری تعالیٰ کا اظہار بھی کر دیا اور اپنی حیثیت بھی واضح کر دی۔ علاوہ ازیں اس ایک جملہ میں اسلام کے سیاسی نظریہ کی توضیح بھی موجود ہے یعنی یہ کہ اسلام میں سیاست بھی الٰہی ہدایات کے تابع ہے۔ (۱۹۲) سورہ الفتح کا نزول مکہ و مدینہ کے درمیان راستہ میں ہوا (ابن ہشام ج ۳ ص ۳۴۴) ابنِ سعد کے بقول یہ سورۃ مقام ضجنان (یعنی مکہ سے تقریباً ۲۵ میل دور) میں نازل ہوئی (ج ۲ ص ۹۸)۔ (۱۹۳) الفتح (۱)۔ (۱۹۴) ابنِ سعد ج ۲ ص ۱۰۴ (۱۹۵) ایضاً

(۱۹۶) علامہ ابن قیم کے بیان کے مطابق اس سے پہلے سریۂ نجد ہو چکا تھا جس میں یمامہ سے بنی حنیفہ کے سردار ثمامہ بن آثال الحنفی کو گرفتار کر کے لایا گیا تھا۔ رسول اللہؐ کے اصرار پر ثمامہ نے اسلام قبول کر لیا اس کا اسلام قبول کرنا قریشِ مکہ کے لئے تباہ کن ثابت ہوا کیونکہ یمامہ مکہ کا پیداواری علاقہ تھا۔ ثمامہ نے (جوش اسلام میں) مکہ کی طرف غلّہ بھیجنا بند کر دیا۔ اس سے قریش سخت تنگ آ گئے اور انہوں نے رسول اللہؐ سے قرابت داری کا واسطہ دے کر درخواست کی کہ ثمامہ کو لکھیں کہ غلہ ان کی طرف بھیجا جائے۔ چنانچہ آپ نے ازراہِ کرم گندم بھیجنے کی ہدایت فرمادی (زاد المعاد ج ۲) بقول ڈاکٹر حمید اللہ اسی زمانے میں حجاز میں سخت قحط پڑا تھا اور اس موقع پر آپ نے قریش مکہ کی خاموش دلدہی کے کام جاری رکھے (رسولِ اکرمؐ کی سیاسی زندگی ص ۸۶، ۸۷) پھر حدیبیہ سے پہلے تک رسول اللہؐ کی روانہ کی ہوئی متعدد مہموں کے نتیجے میں قریش کے لئے تمام شمالی علاقوں خصوصاً شام سے تجارت کرنا بالکل ناممکن ہو گیا تھا اور اس لئے انہوں نے معاہدہ کی ایک دفعہ میں اس مشکل کے ازالہ کی کوشش کی۔ (۱۹۷) ابن سعد ج ۲ ص ۹۲، ۹۳ (سریہ عمرو بن امیۃ الضمری)۔ (۱۹۸) ایضاً ص ۹۵۔ (۱۹۹) طبری ج ۲ ص ۶۲۲ (۲۰۰) ابو یوسف ص ۲۰۸ (۲۰۱) ایضاً۔

(۲۰۲) احابیش عرب میں تیرانداز قبائل تھے۔ سیاہ رنگ ہونے کی وجہ سے ان کو حبشیوں کی طرف منسوب کیا گیا۔ یا یہ حبشی کی بنا پر کہلاتے ہیں جو مکہ کی ایک جانب ایک پہاڑ کا نام تھا (محمود شیت خطاب ص ۲۶۹) اس کے علاوہ احابیش ان مختلف افراد پر بھی بولا جاتا تھا جو مختلف قبائل سے تعلق رکھتے ہوں۔ (۲۰۳) ابن ہشام ج ۳ ص ۳۲۶ (۲۰۴) ایضاً۔

(۲۰۵) دیکھیے الفتح (۲۶) (۲۰۶) ایضاً۔ (۲۰۷) پرویز۔ معراج انسانیت۔ ادارہ طلوع اسلام۔ لاہور۔ ۱۹۶۸ء۔ ص ۲۷۱۔ (۲۰۸) تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو: ابنِ ہشام ج ۳ ص ۳۳۷، ۳۳۸۔ (۲۰۹) ایضاً ص ۳۳۲۔ (۲۱۰) ابنِ سعد ج ۲ ص ۱۳۴۔ (۲۱۱) اس ضمن میں وہ جواب قابلِ ذکر ہے جو رسولؐ اللہ نے حضرت عمرؓ کے استفسار پر دیا تھا۔ دیکھئے: واقدی ص ۳۸۷۔ (۲۱۲) الروم (۱)۔ (۲۱۳) حمید اللہ، رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی۔ ص ۸۷۔ (۲۱۴) مودودی۔ تفہیم القرآن۔ ج ۵۔ ص ۴۱۔ (۲۱۵) قریش کی شکست میں ایک وجہ غالباً یہی تھی کہ وہ اب تک رسولؐ اللہ اور مسلمانوں کو محض "ایک گروہ" سمجھتے رہے اور اس حقیقت سے صرفِ نظر کرتے رہے کہ ان کا مقابلہ اب محض ایک گروہ سے نہیں ہے بلکہ ایک "ریاست" سے ہے (MARGOLIOUTH, P.56) غلطی کا احساس اب ہوا ہے مگر بے سود۔ (۲۱۶) یہ بات تو خود صلح نامہ میں موجود ہے (دفعہ ۵)۔ (۲۱۷) محمود شیت خطاب، ص ۲۸۰۔ (۲۱۸) رسول اللہ حدیبیہ سے ذی قعدہ ۶ھ کی بالکل آخری تاریخوں میں واپس تشریف لائے اور پھر ذی الحجہ کے بعد محرّم میں خیبر کے لئے تشریف لے گئے (ثم اقام رسول الله بالمدينه حين رجع من المدينه ذاالحجه وبعض المحرم) ابنِ ہشام ج ۳ ص ۳۴۲۔ (۲۱۹) اس کی مضبوطی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہود نے وہاں متعدد قلعے تعمیر کر رکھے تھے ان قلعوں کی تعداد مورخین نے مختلف بتائی ہے لیکن ابنِ سعد نے ۹ قلعوں کے نام لکھے ہیں۔ تفصیل کے لئے دیکھئے (ابنِ سعد ج ۲ ص ۱۰۶) علامہ شبلی نے خیبر کے قلعوں کی تعداد ۶ بتائی ہے اور ان کے نام سالم، قموص، نطاۃ، قصارہ، شق اور مربعہ لکھے ہیں (شبلی، سیرۃ النبی ج ۱ ص ۴۸۴)۔ (۲۲۰) ابن ہشام ج ۳ ص ۲۲۶، ۳۴۴۔ نیز ملاحظہ ہو: WATT (MUHAMMAD AT MEDINA). P.93, 217, 218.۔ (۲۲۱) عموماً مورخین نے غزوۂ خیبر کے لئے رسول اللہ کی روانگی محرّم میں بتائی ہے لیکن ابنِ سعد نے اسے جمادی الاوّل ۷ھ کا واقعہ بتایا ہے (ج ۲ ص ۱۰۶)۔ ہو سکتا ہے رسولؐ اللہ ربیع الثانی تک خیبر، فدک اور وادی القریٰ کے معاملات سے فارغ ہو کر جب مدینہ واپس پہنچے ہوں تو جمادی الاول کا مہینہ شروع ہو گیا ہو اور شاید اسی بنا پر ابنِ سعد نے اس غزوہ کو جمادی الاوّل کا واقعہ بتایا ہو۔ (۲۲۲) ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ حدیبیہ کے سفر میں بھی تعداد یہی چودہ سو تھی۔ کیونکہ صلح حدیبیہ کے فوراً بعد نازل ہونے والی سورہ الفتح میں رسولؐ اللہ کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ خیبر کی مہم پر صرف انھیں لوگوں کو لے جائیں جو حدیبیہ میں آپ کے ساتھ تھے (الفتح ۱۵) اور رسولؐ اللہ نے مدینہ سے چلتے وقت یہ اعلان کر دیا تھا کہ "ہمارے ہمراہ اس کے سوا کوئی نہ جائے جسے جہاد کا شوق ہو (ابن سعد، ج ۲، ص ۱۰۶)۔ (۲۲۳) ابن ہشام ج ۳ ص ۳۴۳۔ (۲۲۴) ایضاً (۲۲۵) ایضاً۔ (۲۲۶) ابنِ سعد ج ۲ ص ۱۱۰۔ (۲۲۷) الفتح (۱۸)۔ (۲۲۸) ایضاً (۱۹)۔ (۲۲۹) ایضاً (۲۱)۔ (۲۳۰) ابنِ ہشام ج ۳ ص ۳۶۸۔ (۲۳۱) البلاذری (فتوح) ص ۴۱۔ (۲۳۲) ابنِ ہشام ج ۴ ص ۳۲، ۳۶۔ (۲۳۳) ابن سعد ج ۲ ص ۱۳۴۔ (۲۳۴) ایضاً (۲۳۵) ابنِ ہشام ج ۴ ص ۴۲۔ (۲۳۶) ایضاً۔ ابن سعد نے تصریح کی ہے کہ دن بدھ کا تھا اور آپ بعد عصر روانہ ہوئے (ابنِ سعد ج ۲ ص ۱۳۵)۔ (۲۳۷) الفیل (۱ تا ۵)۔ (۲۳۸) البخاری

(۲۳۹) ابنِ ہشام ج ۴ ص ۸۰۔ (۲۴۰) ایضاً ص ۹۲۔ (۲۴۱) الفتح (۲۸)۔ (۲۴۲) ایضاً (۲۴۳) ابنِ سعد ج ۲ ص ۱۳۵۔ (۲۴۴) اس کی پیشگوئی خود قرآن نے کر دی تھی: النصر (۱، ۲) (۲۴۵) الصعیدی ص ۱۰۸۔ (۲۴۶) دیکھئے القرآن: التوبہ (۳۳)، الفتح (۲۸)، النساٗ (۷۹)، الانبیاء (۱۰۷)، الاعراف (۱۰۴)، الاحزاب (۲۱)، السباء (۲۸) اور الفرقان (۱)۔ وغیرہ وغیرہ۔ (۲۴۷) بخاری میں حضرت جابر سے روایت ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا: مجھے پانچ چیزیں ایسی دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی پیغمبر کو نہیں دی گئیں۔ یعنی:

۱۔ مجھے رُعب اور دھاک کے ذریعہ سے فتح و نصرت دی گئی۔

۲۔ میرے لئے تمام رُوئے زمین سجدہ گاہ بنائی گئی۔

۳۔ غنیمت کا مال میرے لئے حلال کیا گیا اور مجھ سے پہلے کسی پیغمبر کے لئے حلال نہ تھا۔

۴۔ مجھے شفاعت کا مرتبہ عنایت ہوا۔

۵۔ مجھ سے پہلے انبیاء خاص اپنی اپنی قوم کی طرف مبعوث ہوئے تھے اور میں تمام دنیا کے لئے مبعوث ہوا۔ (البخاری ج ۱ ص ۶۲ کتاب الصلوٰۃ)۔

(۲۴۸) اظہارِ دعوت کے موقع پر دیکھئے رسول اللہؐ کا پہلا خطبہ بمقام صفا، جس میں صاف فرما دیا کہ: واللہ الذی لا الٰہ الا ھو انی رسول اللہ الیکم خاصۃً و الی الناس عامۃ (ابن اثیر ج ۲ ص ۶۱) نیز دیکھئے: زکی صفوت احمد۔ جمہرۃ خطب العرب فی عصور العربیہ الزاہرہ۔ مطبعۃ مصطفیٰ البابی۔ مصر۔ ۱۹۳۳ء۔ ج ۱، ص ۵۱۔

(۲۴۹) ابنِ ہشام ج ۴ ص ۲۵۴۔ (۲۵۰) ایضاً۔ (۲۵۱) ابنِ سعد ج ۱ ص ۲۵۸۔ ابنِ ہشام نے بتصریح لکھا ہے کہ حدیبیہ سے فارغ ہو کر رسول اللہؐ نے خطوط ارسال کئے (ج ۴ ص ۲۵۴) اور یہ واضح ہے کہ حدیبیہ سے فراغت ذی الحجہ ۶ھ کے اواخر یا محرم ۷ھ کے اوائل میں ہوئی (ابن حبیب بغدادی ص ۱۱۵) اس لئے محرم ۷ھ میں ہی ارسال مکاتیب قرینِ صحت ہے۔ البتہ بعض مورخین نے اسے ۶ھ کا واقعہ بتایا ہے۔ مثلاً طبری (ج ۲ ص ۶۴۴) اور ابنِ کثیر (البدایہ والنہایہ۔ مکتبۃ المعارف۔ بیروت ۱۹۶۶ء۔ ج ۴۔ ص ۲۶۲) لیکن اپنے بیان و تفصیل میں ۷ھ کی تصریح و ترجیح بھی قائم کر دی ہے۔ (۲۵۲) ابن سعد ج ۱ ص ۲۵۸۔ ابن سعد نے جن چھ قاصدوں کا نام لیا ہے ان میں عمرو بن امیۃ الضمری، دحیۃ الکلبی، عبداللہ بن حذافہ، حاطب بن ابی بلتعہ، شجاع بن وہب اور سلیط بن عمرو شامل ہیں جن کو بالترتیب نجاشی، قیصر روم، کسریٰ، شاہِ مصر، ابن شمر الغسانی اور ہوذۃ بن علی الحنفی کے پاس خط دے کر بھیجا گیا (ایضاً ص ۲۵۸ تا ۲۶۲)۔ ابنِ ہشام نے اس کے مقابلہ میں تفصیل کچھ زیادہ دی ہے اور مزید قاصدوں میں عمرو بن العاص، علاٗ بن الحضرمی اور مہاجر بن امیہ کا ذکر کیا ہے جن کو علی الترتیب رؤسائے عمان، حاکم بحرین اور حاکم یمن کی جانب روانہ کیا گیا۔ علاوہ ازیں ابنِ ہشام نے سلیط بن عمرو کو ثمامہ بن آثال اور ہوذہ بن علی دونوں کی جانب سفیر مانا ہے اور شجاع بن وہب کے لئے لکھا ہے کہ انھیں حارث بن ابی شمر کے ساتھ ساتھ جبلہ بن ایہم کی طرف بھی بھیجا گیا تھا (ایضاً ص ۲۵۴، ۲۵۵)۔

(۲۵۳) ایضاً (۲۵۴) طبری، ج ۲ ص ۶۴۵ - (۲۵۵) ترمذی - ابوعیسیٰ - جامع الترمذی - ایمن کمپنی (کتب خانہ رشیدیہ) دہلی، ج ۲ ص ۹۶ (ابواب الاستیذان والادب عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) اس حدیث کو مسلم نے بھی معمولی سے تغیر کے ساتھ نقل کیا ہے - ملاحظہ ہو: مسلم بن الحجاج القشیری - الصحیح - اصح المطابع - دہلی ۱۳۴۹ھ - ج ۲، ص ۹۹ (کتاب الجہاد والسیر) - (۲۵۶) طبری ج ۲ ص ۶۴۸ - مسلم نے بھی ابوسفیان کا یہ قول ایک طویل حدیث میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے کہ: لقد امر امر ابن ابی کبشۃ انہ لیخافہ، ملك بنی الاصفر (مسلم، ج ۲، ص ۹۹) - (۲۵۷) البخاری ج ۲ ص ۶۵۴ - نیز ابن سعد ج ۱ ص ۲۶۱ - (۲۵۸) الحلبی ج ۳ ص ۲۸۱ - (۲۵۹) طبری ج ۲ ص ۶۵۴، ۶۵۵ - (۲۶۰) ابوعبید - ج ۱ ص ۲۲ فقرہ ۵۶ - نیز الحلبی ج ۳ ص ۲۸۱ - واضح رہے کہ اس فقرہ کو اہلِ کتاب کے قبولِ اسلام کے لئے بھی سمجھا جاسکتا ہے - یعنی ایک تو اپنے اسرائیلی مذہب کے ماننے کا ثواب اور دوسرا قبول اسلام کا ثواب و اجر - لیکن ہماری موجودہ بحث کے سیاق و سباق میں اسے رعایا کے تعلق سے عام معنوں میں لینا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے یعنی ایک اجر ذاتی قبول دین کا اور دوسرا اجر اس کے اتباع میں قوم کے اسلام کا - (۲۶۱) دحیہ کلبی کے ذریعہ قیصر روم کو مکتوب پہنچانے کی روایت عام طور پر تمام ماخذ میں منقول ہے - (مثلاً ابن ہشام ج ۴ ص ۲۵۴ - ابن سعد ج ۱ ص ۲۵۹ وغیرہ) لیکن ایک روایت یہ بھی ہے کہ دحیہ کے ساتھ ساتھ عدی بن حاتم کو بھی روانہ کیا گیا جو اس وقت تک اگرچہ نصرانی تھے لیکن دحیہ کی معیت میں گئے تھے (زرقانی ج ۳ ص ۳۳۵) خط کے متن کے لئے ملاحظہ ہو: ابوعبید (ج ۱ ص ۲۲، ۲۳، ۲۴، فقرہ ۵۶، ۵۹) البخاری (ج ۲ ص ۶۵۴، کتاب التفسیر) مسلم (ج ۲ ص ۹۸، ۹۹ کتاب الجہاد والسیر) ترمذی (ج ۲ ص ۹۶ ابواب الاستیذان والادب) نیز طبری (ج ۲ ص ۶۴۹) وغیرہ - طبری نے متن میں دوسروں کے برخلاف یہ جملہ نقل کیا ہے کہ وان تتول فان اثم الاکارین علیك (ایضاً) - ابن طولون نے لکھا ہے کہ جب قیصر کے سامنے رسول اللہ کا مکتوب گرامی پڑھا گیا تو اس نے یہ کہا کہ ھذا الکتاب لم اسمع بہ بعد سلیمان النبی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم (ابن طولون - شمس الدین محمد بن علی بن محمد - اعلام السائلین عن کتب سید المرسلین - مکتبہ القدس - دمشق ۱۳۴۸ھ ص ۱۴) یہاں یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ رسول اللہ نے قیصر روم کے نام ایک دوسرا مکتوب اور سفارت تبوک سے بھی بھیجی تھی - ابوعبید (ج ۱ ص ۲۱، ۲۲ فقرہ ۵۵) - (۲۶۲) ابن سعد ج ۱ ص ۲۵۸ (سب سے پہلے ان ہی کو روانہ کیا گیا) - متن کے لئے ملاحظہ ہو: طبری ج ۲ ص ۶۵۲ - نجاشی نے اس کا جواب رسول اللہ کی خدمت میں بھیجا تھا (ایضاً ص ۶۵۲، ۶۵۳) - (۲۶۳) ابن سعد ج ۱ ص ۲۶۰، ۲۶۱ - الحلبی ج ۳ ص ۲۸۱ - (۲۶۴) ابن ہشام ج ۴ ص ۲۵۴، طبری ج ۲ ص ۶۵۲ - نیز دیکھئے: حمید اللہ، الدکتور محمد - مجموعۃ الوثائق السیاسیہ فی العہد النبوی والخلافۃ الراشدہ - مطبعۃ لجنۃ التالیف والترجمہ والنشر - قاہرہ - ۱۹۴۱ء ص ۴۱ (مکتوب ۲۷) - (۲۶۵) ابن ہشام کے مطابق جبلہ کے لئے خط لے کر شجاع بن وہب گئے تھے (ج ۴ ص ۲۵۵) نیز حمید اللہ (الوثائق) ص ۴۲ - (۲۶۶) ابن سعد

ج ۱ ص ۲۸۱۔ (۲۶۷) ایضاً ص ۲۶۹۔ نیز حمید اللہ (الوثائق) ص ۳۲، ۳۳۔ (۲۶۸) ان کے نام خطوط کی تفصیل و متن کے لئے ملاحظہ ہو، حمید اللہ (الوثائق ص ۴۲ تا ۴۹)۔ (۲۶۹) طبری ج ۲ ص ۶۵۴، ۶۵۵۔

(۲۷۰) ابن ہشام ج ۴ ص ۲۵۴۔ ابنِ سعد ج ۱ ص ۲۶۲۔ نیز حمید اللہ (الوثائق) ص ۶۵۔ (۲۷۱) ابنِ ہشام ج ۴ ص ۲۵۴۔ ابن سعد ج ۱ ص ۲۷۴، ۲۷۶ نیز حمید اللہ (الوثائق) ص ۵۵، ۵۶، ۵۷ اور ۶۴۔ (۲۷۲) ابن حبیب بغدادی ص ۷۷، نیز حمید اللہ (الوثائق) ص ۵۹۔ (۲۷۳) حمید اللہ (الوثائق) ص ۵۴۔ (۲۷۴) ایضاً ص ۱۳۲۔

(۲۷۵) عمان پر اس زمانے میں جلندی کے دو بیٹوں جیفر و عیاذ (یا جیفر و عبد۔ ابن حبیب بغدادی ص ۷۷) کی حکمرانی تھی۔ ان دونوں بھائیوں کی طرف حضرت عمرو بن العاص رسولؐ اللہ کا مکتوب لے کر گئے (ابنِ ہشام ج ۴ ص ۲۵۴) تھوڑی سی ردّ و کد کے بعد ان دونوں بھائیوں نے اسلام قبول کر لیا۔ عمرو بن العاص زکوٰۃ اور وصولی کے لئے وہیں ٹھہر گئے یہاں تک کہ جب رسولؐ اللہ کا وصال ہوا تو یہ وہیں تھے (ابنِ سعد ج ۱ ص ۲۶۳)۔ (۲۷۶) بحرین کا حاکم منذر بن ساوی تھا رسولؐ اللہ نے علاء بن الحضرمی کو قاصد بنا کر بھیجا تھا (ابنِ ہشام ج ۴ ص ۲۵۴) اسے خط جعرانہ سے واپسی پر روانہ کیا گیا تھا اور یہ لکھا تھا کہ: "تم جب تک اصلاح کرتے رہو گے تمہیں تمہارے عہدے سے نہیں ہٹائیں گے" (ابنِ سعد ج ۱ ص ۲۶۳) یہاں چونکہ سلطنت ایران کے اثر سے مجوس و یہود بھی رہتے تھے اس لئے ان پر جزیہ عائد کیا گیا (ایضاً)۔

(۲۷۷) یمن کا صوبہ ایران کے زیرِ اثر تھا۔ وہاں کا عامل باذان تھا۔ رسولؐ اللہ کا مکتوب جس وقت کسریٰ کو ملا تھا تو اس نے اسے پھاڑ کر باذان کو لکھا تھا کہ دو بہادر آدمیوں کو بھیجو جو اس گستاخ شخص کو گرفتار کر کے میرے سامنے حاضر کرے جس نے مجھے خط لکھنے کی جرأت کی ہے۔ باذان نے شہنشاہ کے حکم کی تعمیل میں دو اشخاص کو رسولؐ اللہ کی گرفتاری کے لئے مدینہ بھیجا۔ یہ دونوں حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ رسولؐ اللہ نے انہیں کسریٰ کے قتل کی خبر دی۔ وہ اس خبر کو لے کر باذان کے پاس واپس گئے تو باذان اور وہ سب مولد قبائل جو یمن میں ابناء کہلاتے تھے اسلام لے آئے۔ ملاحظہ ہو: ابنِ سعد (ج ۱ ص ۲۶۰) اور طبری (ج ۲ ص ۶۵۵)۔ (۲۷۸) ابنِ ہشام ج ۴ ص ۲۵۴۔

(۲۷۹) ابنِ سعد ج ۱ ص ۲۶۲۔ (۲۸۰) ایضاً۔ (۲۸۱) ابنِ ہشام ج ۴ ص ۲۵۴۔ (۲۸۲) ابنِ سعد ج ۱ ص ۲۶۰۔ (۲۸۳) ایضاً ج ۲ ص ۱۲۸۔ طبری ج ۲ ص ۶۵۵۔ (۲۸۴) طبری ج ۲ ص ۶۵۶۔

(۲۸۵) ابن سعد ج ۲ ص ۱۲۸۔ (۲۸۶) ایضاً (۲۸۷) ایضاً (۲۸۸) واضح رہے کہ اس سے پہلے یہ واقعہ ہو چکا تھا کہ ربیع الاول ۸ھ میں (یعنی موتہ سے بمشکل ایک ماہ قبل) رسولؐ اللہ نے ۱۵ آدمیوں کا ایک وفد حضرت کعب بن عمیر الغفاری کی قیادت میں سرحد شام سے متصل قبائل میں دعوتِ اسلام دینے کے لئے روانہ کیا تھا۔ یہ قبائل زیادہ تر عیسائی تھے اور رومی سلطنت کے زیرِ اثر تھے ان کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ ان لوگوں نے اسلام قبول کرنے کے بجائے وفد پر تیروں سے بارش کی مجبوراً اہلِ وفد کو بھی مقابلہ کرنا پڑا لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس وفد کے تمام آدمی قتل ہو گئے صرف ایک (قائدِ وفد) باقی بچے اور رسولؐ اللہ کے پاس پہنچے اور واقعہ عرض کیا۔ ایضاً (ص ۱۲۷، ۱۲۸)۔

(۲۸۹) اس عظیم الشان فوج میں شمالی عرب کے سرحدی قبائل مثلاً بہرا، وائل، بکر، لخم، جذام وغیرہ کے لوگ بھی شامل تھے (تفصیل: ابن سعد ج ۲ ص ۱۶۹) ڈاکٹر حمید اللہ نے لکھا ہے کہ یہ مذکورہ قبائل نیز کلب، تغلب، قین، بلی اور قضاعہ وغیرہ رومی بازنطینی سلطنت کے زیرِ اثر تھے اور جن کو قیصرِ روم کی طرف سے سالانہ ۵ اسیر سونا بطور وظیفہ ملتا تھا (رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی ص ۱۶۷)۔ (۲۹۰) مودودی۔ تفہیم القرآن۔ ج ۲ ص ۱۶۸، ۱۶۹۔ (۲۹۱) ابن سعد ج ۲ ص ۱۳۱۔ (۲۹۲) ایضاً ص ۱۶۵۔ (۲۹۳) ابو عامر راہب کا تعلق قبیلۂ اوس سے تھا۔ قبیلہ میں برتری اور بڑا اثر و رسوخ رکھتا تھا اس کا پورا نام ابو عامر عبد عمرو صیفی بن النعمان تھا جو بنی ضبیعہ بن زید میں سے تھا۔ یہی شخص حنظلہ الغسیل کا باپ تھا۔ ابو عامر نے زمانۂ جاہلیت ہی میں رہبانیت اختیار کرلی تھی۔ موٹے کپڑے پہنا کرتا اور راہب کہلاتا تھا (ابن ہشام ج ۲ ص ۲۳۴)۔ رسول اللہؐ مدینہ پہنچے تو اس کی اہمیت و برتری ختم ہوگئی۔ اور عبد اللہ بن اُبی کی طرح اس کے دل میں بھی کینہ پیدا ہوگیا بلکہ اس معاملہ میں ابن ابی سے آگے بڑھ گیا۔ اسے کسی قیمت پر اسلام اور رسول اللہؐ کی برتری و سیادت منظور نہ تھی اس لئے اپنے دس ہم مشرب آدمیوں کو لے کر مکہ چلا گیا۔ رسول اللہؐ نے مکہ فتح فرمایا تو وہاں سے طائف بھاگا لیکن طائف کے لوگوں نے بھی اسلام قبول کرلیا تو شام میں جا بسا اور پھر اس کی زندگی کا سورج بھی وہیں غروب ہوگیا (ایضاً ص ۲۳۵)۔ (۲۹۴) ابن سعد ج ۲ ص ۱۶۶۔ (۲۹۵) ایضاً۔ (۲۹۶) مودودی (تفہیم القرآن) ج ۲ ص ۱۷۰، ۱۷۱۔ (۲۹۷) ابو عبید۔ ج ا ص ۲۱، ۲۲ فقرہ ۵۵۔ ابو عبید کہتے ہیں کہ آپ کی یہ عبارت کہ بصورتِ دیگر تم فلاحین اور اسلام کے درمیان حائل نہ رہو سے مراد خاص طور پر کاشتکار اور کسان طبقہ نہیں ہے بلکہ اس سے مراد اس کی مملکت کے تمام باشندے ہیں (ایضاً) ابو عبید کے متن میں قرآن کی جس آیت کو نقل کیا گیا ہے وہ سورۂ توبہ کی ۲۹ آیت ہے۔ (۲۹۸) ڈاکٹر حمید اللہ نے لکھا ہے کہ "قیصر کا جواب جو یعقوبی نے محفوظ کیا ہے اور جس میں قیصر کے اسلام کا اعلان ہے صریحاً فرضی معلوم ہوتا ہے کیونکہ بعد کے واقعات اس کی تائید نہیں کرتے۔ علاوہ بریں قیصر کا خط بزنطینی اسلوب میں ہونا چاہئے حالانکہ یہ جواب خالص عربی بدوی انداز میں ہے" (رسولِ اکرمؐ کی سیاسی زندگی۔ ص ۱۸۰)۔ (۲۹۹) ابنِ ہشام ج ۴ ص ۱۶۹۔ (۳۰۰) البلاذری (فتوح) ص ۶۶۔ (۳۰۱) ابن ہشام ج ۴ ص ۱۶۹۔ نیز دیکھئے: البلاذری (فتوح) ص ۶۶۔ (۳۰۲) ابنِ ہشام ج ۴ ص ۱۷۰۔ نیز بلاذری (فتوح) ص ۶۸۔ (۳۰۳) مصالحت کی تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو: البلاذری (فتوح) ص ۶۶، ۶۷۔ (۳۰۴) ابنِ ہشام ج ۴ ص ۲۵۳۔ (۳۰۵) محمود شیت خطاب۔ ص ۴۸۹۔ (۳۰۶) التوبہ (۴۳)۔ (۳۰۷) سویلم الیہودی کا گھر جاسوم میں تھا۔ منافقین وہاں جمع ہوکر مسلمانوں کو تبوک میں جانے سے روکنے کی سازشیں کرتے تھے۔ چنانچہ رسول اللہؐ نے طلحہ بن عبید اللہ اور کچھ دوسرے صحابہ کو اسے جلانے اور منہدم کرنے کے لئے بھیجا تھا (ابن ہشام ج ۴ ص ۱۶۰)۔ (۳۰۸) ابنِ اسحاق کے قول کے مطابق رسول اللہؐ جب ذی اوان پہنچے جو مدینہ سے ایک منزل کے فاصلہ پر تھا تو آپ نے مسجد ضرار کو ڈھانے کے لئے چند صحابہ کو روانہ فرمایا تھا (ایضاً ص ۱۷۳)۔ ان میں سے دو کے نام ابنِ ہشام نے دئے ہیں یعنی مالک بن الدخشم اور معن بن عدی یا اس کا بھائی عاصم بن عدی (ایضاً ص ۱۷۴)۔ جن منافقین

نے اس مسجد کی بنیاد ڈالی اور بنایا ان کی تعداد تقریباً بارہ ہے (ناموں کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: ایضاً ص ۴ ۱۷)۔ منافقین اس مسجد کی آڑ میں جو کھیل کھیلنا چاہتے تھے اس کی منصوبہ بندی میں عبداللہ بن ابی اور منافقین کے دوسرے اکابرین کے علاوہ ابو عامر راہب کا دماغ بھی شامل تھا۔ جس کے بارے میں ہم بتا چکے ہیں کہ وہ پہلے مدینہ سے بھاگ کر مکہ گیا تھا جہاں مسلمانوں کے خلاف جنگوں میں کفار و مشرکین کا حامی و ناصر بنا رہا۔ اور پھر شام میں جاکر رومیوں کو ریاست نبوی پر حملہ کے لئے بھڑکاتا رہا بہر حال مسجد ضرار کا مدعا یہ تھا کہ ایک طرف تو ابو عامر کی اسلام دشمن سرگرمیوں کو مدد پہنچائی جا سکے اور دوسری طرف ایک ایسا محفوظ مقام میسر آ جائے جہاں عام مسلمانوں سے بچ کر وہ جمع ہوسکیں۔ وہاں سازو سامان جمع کر سکیں اور ان سب پر مذہب کا پردہ بھی پڑا رہے۔ مختصر یہ کہ مسجد ضرار کی تعمیر جیسا کہ قرآن نے کہا ہے خالص ناپاک سازش کے تحت عمل میں آئی تھی (التوبہ ۱۰۷ تا ۱۱۰)۔ مزید برآں منافقین نے اپنے اعمال بد کی مکمل پردہ پوشی کی غرض سے یہ جسارت بھی کر ڈالی کہ رسول اللہؐ پر اس کے افتتاح کے لئے زور ڈالا جائے۔ اس سلسلے میں انہوں نے معصومانہ انداز سے خدمتِ نبوی میں یہ عرض کیا کہ اس سے بارش میں اور سرد راتوں میں عام لوگوں خصوصاً ضعیفوں اور معذوروں کو آسانی ہو جائے گی جو مسجد نبوی اور مسجد قبا سے دُور رہتے ہیں اور جن کو ان مساجد میں وقت پر حاضری میں مشکل ہوتی ہے۔ رسول اللہؐ نے ان کی اس درخواست کو ٹال دیا اور یہ فرمایا کہ "اس وقت میں جنگ کی تیاری میں مشغول ہوں اور ایک بڑی مہم درپیش ہے اس سے واپس آکر دیکھوں گا" اس کے بعد آپ تبوک روانہ ہو گئے اور آپ کی عدم موجودگی میں یہ اپنی حرکتیں کرتے رہے۔ لیکن اس سے پہلے کہ یہ مزید کوئی گل کھلاتے رسول اللہؐ نے تبوک سے واپسی میں اس کے منہدم کرنے کا حکم دے دیا۔ (۳۰۹) التوبہ (۸۴)۔ (۳۱۰) التوبہ (۷۴ تا ۱۰۱)۔ (۳۱۱) مودودی (تفہیم القرآن) ج ۲ ص ۱۷۱۔ (۳۱۲) سورۂ توبہ کے مباحث، مضامین اور اس کے مختلف اجزاء پر تفصیلی بحث کے لئے دیکھئے: ایضاً (ص ۱۶۶ تا ۱۷۲)۔ (۳۱۳) بیت اللہ کی تطہیر اور اس میں موجود تمام بتوں کو خود رسول اللہؐ نے اپنے ہاتھوں سے سرنگوں کیا۔ آپ کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی جس کی ضرب ہر بت پر مارتے تھے اور جاء الحق و زھق الباطل ..... الخ پڑھتے جاتے تھے (ابن ہشام ج ۴ ص ۵۹۔ ابنِ سعد ج ۲ ص ۱۳۶)۔ خانۂ کعبہ کی تصویروں کو بھی مٹا دیا گیا (ابن ہشام ج ۴ ص ۵۵)۔ خانہ کعبہ کی تطہیر کے علاوہ دوسرے اہم مقامات پر جو سنگی بت نصب تھے اور اہل عرب جن کی پرستش کرتے تھے ان کو ڈھانے کے لئے آپ نے فتح مکہ کے ساتھ ہی صحابہ کو روانہ فرمایا جن میں سے خالد بن ولید کو تہامہ کی جانب (ایضاً ص ۱۷) اور عزّیٰ کے انہدام کے لئے بھی (ابن سعد ج ۲ ص ۱۴۵، ۱۴۶)، علی ابن ابی طالب کو بنو جذیمہ کی طرف (ابن ہشام ج ۴ ص ۷۲، ۷۰)، پھر رسول اللہؐ نے سعد بن زید الاشہلی کو بجانب مناۃ رمضان ۸ھ میں بھی روانہ کیا۔ عمرو بن العاص کو سواع کی جانب بھیجا اور اسی طرح سے دوسرے بتوں مثلاً بوانہ، ذوالکفین وغیرہ کا قصہ ختم کرنے کے لئے صحابہ کو مقرر کیا (ابنِ سعد ج ۲ ص ۱۳۷)۔ (۳۱۴) التوبہ (۱)۔ (۳۱۵) ایضاً (۴، ۷، ۱۰، ۱۲، ۱۳)۔ (۳۱۶) ایضاً (۵ تا ۱۶)۔ (۳۱۷) ایضاً (۱۷ تا ۲۷)۔ (۳۱۸) ایضاً (۲۸، ۲۹، ۳۲، ۳۳، ۳۶، ۳۷)۔ (۳۱۹) ایضاً (۳۶، ۳۷، ۳۶)۔ (۳۲۰) ابن سعد ج ۱ ص ۲۹۱۔ (۳۲۱) ایضاً (ص ۲۹۹)۔ (۳۲۲) ان وفود کے

نام یہ ہیں (۱) وفد مزینہ (ایضاً ج ا ص ۲۹۱) ۔ (۲) وفد اشجع (ایضاً ص ۳۰۶)۔ (۳) وفد الاشعرین (ایضاً ص ۳۴۸)۔ (۴) وفد جذام (ایضاً ص ۳۵۴) (۵) وفد جہینہ (ایضاً ص ۳۳۲) (۶) وفد ازد (ایضاً ص ۳۳۷)۔ (۷) وفد ثعلبہ (ایضاً ص ۲۹۸) (۸) وفد باہلہ (ایضاً ص ۳۰۸)۔ (۹) وفد سلیم (ایضاً ص ۳۰۷) ۔ (۱۰) وفد ثقیف (ایضاً ص ۳۱۲)۔ (۱۱) وفد صداء (ایضاً ص ۳۲۶) ۔ (۱۲) وفد خشین (ایضاً ص ۳۲۹) (۱۳) وفد عذرہ (ایضاً ص ۳۳۱) ۔ (۱۴) وفد سعد بن بکر (ایضاً ص ۲۹۹) (۱۵) وفد اسد (ایضاً ص ۲۹۲)۔ (۳۲۳) ابن سعد ج ا ص ۲۹۷۔ (۳۲۴) ایضاً ج ا ص ۳۴۳۔ (۳۲۵) ایضاً ص ۳۲۴ ۔ (۳۲۶) ایضاً ص ۳۳۲ ۔ (۳۲۷) ایضاً ص ۳۳۸۔ (۳۲۸) ایضاً ص ۳۳۹۔ (۳۲۹) ایضاً ص ۳۴۴ (۳۳۰) ایضاً ص ۳۴۷۔ (۳۳۱) ایضاً ص ۲۹۲۔ (۳۳۲) ایضاً ص ۳۰۰۔ (۳۳۳) ایضاً ص ۳۰۴۔ (۳۳۴) ایضاً ص ۳۲۳۔ (۳۳۵) ایضاً ص ۳۵۶۔ (۳۳۶) ایضاً ص ۲۹۱ تا ۳۵۹۔ (۳۳۷) حجۃ الوداع کے موقع پر آپؐ کا خطبہ ہم نے طوالت کے خوف سے نقل نہیں کیا۔

(۳۳۸) سورہ المائدہ (۳) ۔ (۳۳۹) التوبہ (۳۲، ۳۳) یہی مضمون الصف (۸) میں بیان کیا گیا ہے۔

حواشی

باب چہارم ——— استحکامِ ریاست

(۱) دورِ اوّل

(۱) اس پانچ سالہ عرصہ میں رسول اللہؐ نے بذاتِ خود جن عسکری مہمات کی قیادت فرمائی ان کی تعداد اٹھارہ ہے جبکہ غزوات کی مجموعی تعداد ۲۷ ہے۔ رسول اللہؐ کے غزوات کا سلسلہ صفر ۲ھ سے شروع ہوتا ہے۔ اس سے قبل آپ صحابہ کی جن طلایہ گرد جماعتوں کو وقتاً فوقتاً روانہ فرماتے رہے ان کی تعداد کے بارے میں اگرچہ اصحابِ مغازی میں اختلاف ہے تاہم کم سے کم تعداد ۳۶ اور زیادہ سے زیادہ ۱۰۰ ہے (زرقانی ج ۱ ص ۳۸۸)۔ ان سرایا کے دوران آنحضرتؐ مدینہ میں مقیم رہ کر انتظامات فرماتے رہے۔ ان اعداد و شمار کو سامنے رکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ سرایا کی کم سے کم تعداد کو ماننے کی صورت میں عسکری مہمات کی کل تعداد ۶۳ اور زیادہ سے زیادہ ماننے کی صورت میں مذکورہ مہمات کی تعداد ۱۲۷ تک جا پہنچتی ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اتنی کثیر التعداد فوجی مہمات کا انتظام کرنا (جبکہ دُوسرے ریاستی امور بھی توجہ کے مستحق تھے اور مسلمانوں کی قوت ہنوز مراحلِ تکمیل میں تھی) کس قدر مشکل تھا اور کتنی سیاسی و عسکری مہارت اور سیاست و تدبّر کا متقاضی تھا۔ (۲) سورہ الاسرأ کا نزول واقعہ معراج کے بعد ہوا تھا۔ ملاحظہ ہو: مودودی (تفہیم۔ ج ۲۔ ص ۵۸۶)۔ (۳) از روئے آیت (۲۳)۔ (۴) از روئے آیت (۱۱۱)۔ (۵) از روئے آیت (۲۳، ۲۴)۔ (۶) از روئے آیت (۲۲)۔ (۷) از روئے آیت (۳۱)۔

(۸) از روئے آیت (۳۳)۔ (۹) از روئے آیت (۲۶، ۲۸)۔ (۱۰) از روئے آیت (۳۴)۔

(۱۱) از روئے آیت (۳۴)۔ (۱۲) از روئے آیت (۳۶)۔ (۱۳) آیت (۳۰)۔ (۱۴) آیت (۲۶)۔

(۱۵) آیت (۲۹)۔ (۱۶) ایضاً۔ (۱۷) آیت (۳۵)۔ (۱۸) آیت (۳۰)۔ (۱۹) ابنِ ہشام، ج ۲، ص ۱۴۱۔

(۲۰) ایضاً ص ۱۴۳۔ (۲۱) ایضاً، ج ۳، ص ۲۴۷۔ (۲۲) النساء (۱۰۲)۔ (۲۳) رسول اللہؐ کا فرمان ہے کہ: اذا کان ثلاثۃ فی سفر فلیؤمروا احدھم۔ دیکھئے: الخطیب العمری ص ۳۳۹، کتاب الجہاد، باب آداب السفر۔ بحوالہ ابوداؤد۔ (۲۴) ابنِ ہشام، ج ۲، ص ۱۵۴ تا ۱۵۶۔ (۲۵) تحویلِ قبلہ کا حکم ہجرت کے ۱۶ یا ۱۷ ماہ بعد نازل ہوا۔ ابنِ سعد نے دونوں روایتیں نقل کی ہیں (ابنِ سعد، ج ۱، ص ۲۴۱ تا ۲۴۲)۔ (۲۶) البقرہ (۱۴۳)۔ (۲۷) البقرہ (۱۴۲)۔ (۲۸) اکبر خان۔ میجر جنرل، حدیثِ دفاع، فیروز سنز۔ کراچی ۱۹۵۴ء، ص ۱۱۹ (اس کا

حوالہ مصنف نے نقل نہیں کیا)۔(۲۹) مثلاً سورۃ الحج، التغابن، البقرہ، محمد، طلاق، الانفال وغیرہ۔ (۳۰) البقرہ (۲ تا ۴، ۶۲، ۱۳۶، ۱۷۷، ۲۸۵)۔(۳۱) التغابن (۸)، محمد (۲)، البقرہ (۲۵، ۶۲، ۸۲، ۱۰۳)، الطلاق (۲) (۳۲) التغابن (۸)۔(۳۳) البقرہ (۴)، الطلاق (۲)۔(۳۴) محمد (۳، ۲۱)۔(۳۵) التغابن (۸، ۱۲)، محمد (۳۳)، الانفال (۱، ۴، ۲۴، ۴۶)۔(۳۶) التغابن (۱۳)، محمد (۳۳)، الطلاق (۳)، الانفال (۴۹، ۶۱) (۳۷) التغابن (۱۲)، البقرہ (۱۰۳، ۱۱۷)۔(۳۸) البقرہ (۴۵، ۱۷۷)۔(۳۹) محمد (۷)، البقرہ (۱۷۷)، الانفال (۴۵)۔(۴۰) الحج (۳۷)، البقرہ (۱۵۲)، الانفال (۲، ۴۵)۔(۴۱) الحج (۳۷)، البقرہ (۱۴۳)۔ (۴۲) التغابن (۹)، البقرہ (۲۵، ۶۲، ۸۲)، الطلاق (۱۱)۔(۴۳) البقرہ (۳، ۴۳، ۱۱۰)، الانفال (۳)، الحج (۴۱)۔ (۴۴) البقرہ (۱۰۴)، الانفال (۲۱)۔(۴۵) البقرہ (۱۱۲)۔(۴۶) البقرہ (۱۱۲، ۱۹۵)۔ (۴۷) البقرہ (۱۴۳)، الطلاق (۲)۔(۴۸) البقرہ (۱۵۰)۔(۴۹) البقرہ (۱۶۰)۔(۵۰) البقرہ (۸۳، ۱۷۷، ۲۱۵)، النساء (۲، ۳۶، ۱۲۷)، الانفال (۵۶) وغیرہ (۵۱) التغابن (۱۴)۔(۵۲) آل عمران (۱۵۹)۔(۵۳) آل عمران (۲۰۰)۔(۵۴) الحج (۷۸)، الصف (۱۱)، البقرہ (۲۱۸)، الانفال (۲، ۷۴، ۷۲) (۵۵) البقرہ (۱۹۰، ۱۹۳، ۲۴۴)، آل عمران (۱۶۷)، الانفال (۳۹)، النساء (۸۴)۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ قرآن نے جہاد اور قتال دونوں کے معاملہ میں فی سبیل اللہ کی قید لگائی ہے۔ دفاعی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ قید معنی خیز بن جاتی ہے کیونکہ جنگ میں کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ فوج کو اپنے دفاعی مقاصد یا نصب العین سے واضح طور پر علم و واقفیت حاصل ہو۔(۵۶) محمد (۴)، الانفال (۳۹)، البقرہ (۱۹۰)، الانفال (۶۵)۔ (۵۷) محمد (۲۰)، البقرہ (۸ تا ۱۲)۔(۵۸) محمد (۲۲)، الانفال (۱۳)۔(۵۹) محمد (۳۵)۔ (۶۰) ایضاً (۳۸)۔(۶۱) محمد (۳۸)، البقرہ (۲۵۴، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۵، ۲۶۷، ۲۷۲، ۲۷۴)، الانفال (۳)۔(۶۲) محمد (۳۵)۔(۶۳) الانفال (۲۷، ۵۸)۔(۶۴) الانفال (۶۰)۔(۶۵) الانفال (۴۶)۔ (۶۶) آل عمران (۱۵۲)۔(۶۷) آل عمران (۲۰۰)۔(۶۸) النساء (۵۹)۔(۶۹) النساء (۶۵)۔(۷۰) الحشر (۷)۔ (۷۱) الاحزاب (۲۱)۔(۷۲) الاحزاب (۴۰)۔(۷۳) ابن سعد کے الفاظ یہ ہیں: ثم غزوۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لطلب کرز بن جابر الفهری فی شهر ربیع الاوّل علی رأس ثلاثة عشر شهراً من مهاجره (ابن سعد، ج ۲ ص ۹)۔(۷۴) الصعیدی۔ عبد المتعال۔ السیاسة الاسلامیه فی عهد النبوة۔ دار الفکر العربی۔ الطبعة الثانیه۔ ص ۴۵۔(۷۵) ابن ہشام ج ۲، ص ۲۶۷۔ (۷۶) مثلاً شاہ ولی اللہ نے الفوز الکبیر میں منافقین کے گروہ کی تفصیل، ان کی خصوصیات اور ان کے بارے میں قرآنی احکام کی تفصیل دی ہے۔ متن کے لئے ملاحظہ ہو: شاہ ولی اللہ الفوز الکبیر فی اصول التفسیر مع فتح الخبیر۔ مترجم۔ سید محمد مہدی الحسنی و حبیب الرحمٰن صدیقی۔ قرآن محل۔ کراچی ۱۳۸۳ھ، ص ۳۷ تا ۴۰۔ (الفوز الکبیر کے عربی ترجمہ (جو ۱۲۹۵ھ سے قبل کیا گیا تھا) کے حوالہ کے لئے دیکھئے: الفوز الکبیر فی

اصول التفسیر و یلیہ الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف۔ المکتبۃ السلفیہ۔ لاہور ۱۹۵۱ء، ص ۱۱، ۱۲)
(۷۷) البتہ یہ سمجھ لینا چاہئے کہ انہوں نے اسلام کو بطور دین کے قبول کیا تھا اور وہ مسلمانوں میں سے ہی سمجھے جاتے تھے۔ یہ بات نہ تھی کہ محض ایک سازشی گروہ بھیس بدل کر مسلمانوں میں آملا اور مسلمانوں میں سے نہ ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو نہ تو ان کو پہچاننا مشکل تھا اور نہ ان سے سلوک اس قسم کا کیا جاتا۔ مشکل یہی تھی کہ وہ بظاہر مسلمانوں کی صفوں میں تھے اور اعمال و افعال میں بھی ان کے ساتھ شریک تھے البتہ دل جدا تھا۔ چونکہ عام آدمی ظاہر پر ہی حکم لگاتا ہے اور باطن کا حال صرف خدا کو معلوم ہے اس لئے اس گروہ کو پہچاننا آسان نہ تھا اس لئے ان کے ساتھ سلوک کرنے میں بڑے ٹھنڈے طریقے سے کام لیا گیا اور جب قانونی اعتبار سے ان کے خلاف قدم اٹھانے کا جواز پیدا ہو گیا تب ان کی گرفت کی گئی۔
(۷۸) منافقین کی مکمل فہرست تو کسی ماخذ میں نہیں ملتی۔ البتہ ابن ہشام نے کافی نام لکھے ہیں ان سے یہی ظاہر ہوتا ہے (ج ۲، ص ۱۶۶ تا ۱۷۶)۔ (۷۹) ابن ہشام ج ۲ ص ۱۷۳۔ (۸۰) ان کے نام یہ ہیں: سعد بن حنیف، زید بن الصلت، نعمان بن اوفی بن عمرو، عثمان بن اوفی، رافع بن حرملہ، رفاعہ بن زید بن التابوت، سلسلہ بن برہام اور کنانہ بن صوریا (ابن ہشام ج ۲ ص ۱۷۴ تا ۱۷۵)۔ (۸۱) دونوں بخل، انکار حق اور حسد کی بنا پر انکارِ رسالت پر سختی سے قائم تھے (ابن ہشام ج ۲ ص ۲۰۸ تا ۲۱۴)۔ (۸۲) اس کی طرف اشارہ قرآن نے بھی کیا ہے: فلا تعجبك اموالهم و لا اولادهم (التوبہ ۵۵)۔ (۸۳) ابن ہشام ج ۲ ص ۱۷۳ (۸۴) سورۂ منافقون میں ان کا نقشہ یوں کھینچا گیا کہ: واذا رایتهم تعجبك اجسامهم ان یقولوا تسمع لقولهم کانهم خشب مسندة (آیت ۴) ترجمہ یہ ہے کہ: "انھیں دیکھو تو ان کے جثے تمہیں بڑے شاندار نظر آئیں، بولیں تو تم ان کی باتیں سنتے رہ جاؤ مگر اصل میں یہ گویا لکڑی کے کندے ہیں جو دیوار کے ساتھ چن کر رکھ دئے گئے ہیں۔" (۸۵) البقرہ (۱۱)۔ (۸۶) الماعون (۵، ۶)، النساء (۱۴۲)) ان کے یہ تمام اعمال اللہ کے ہاں نامقبول ہیں (الحدید ۱۴)۔ (۸۷) محمد (۱۶، ۲۶) (۸۸) یہودیوں سے دوستی۔ المجادلہ (۱۴)، الحشر (۱۱، ۱۲، ۱۴)، الاحزاب (۱۲، ۱۳، ۱۴ تا ۲۰)۔ (۸۹) آل عمران (۱۱۸، ۱۱۹)، النساء (۱۰۸، ۱۱۴، ۱۳۸، ۱۳۹)، التوبہ (۷۴)۔ (۹۰) البقرہ (۱۳ تا ۱۶)، آل عمران (۱۵۶، ۱۶۷)، النساء (۶۲، ۷۳، ۸۱، ۸۳)، التوبہ (۷۴ تا ۵۹)، محمد (۱۶، ۲۰، ۲۲، ۲۹)۔ (۹۱) الحشر (۱۱)، المجادلہ (۱۶)، المنافقون (۱، ۲)۔ (۹۲) التوبہ (۷۴)۔ (۹۳) ابن ہشام ج ۲ ص ۲۳۸ (۹۴) ایضاً، ج ۲ ص ۱۷۴۔ (۹۵) ایضاً (۹۶) سورۂ محمد (۲۰، ۲۱)۔ (۹۷) ابن ہشام ج ۳، ص ۵۲ (۹۸) ایضاً ج ۳ ص ۱۱۱۔ (۹۹) ایضاً، ج ۳، ص ۱۱۱ (۱۰۰) ایضاً ج ۳ ص ۲۰۰، ۲۰۱۔ (۱۰۱) الحشر (۱۱) (۱۰۲) ایضاً (۱۲)۔ (۱۰۳) بقول ابن ہشام یہ معتب بن قشیر نے کہا تھا (ج ۲، ص ۱۶۹)۔ (۱۰۴) الاحزاب (۱۲)۔
(۱۰۵) ابن ہشام ج ۳ ص ۲۰۳ (۱۰۶) قرآن نے اس کی ترجمانی ان الفاظ میں کی ہے کہ: تحسبهم جمیعاً وقلوبهم شتّٰی۔ دیکھئے: الحشر (۱۴)۔ (۱۰۷) جنگِ احد کے موقع پر تقریباً ۳۰۰ افراد مسلمانوں سے الگ ہوئے تھے

اور مورخین کی فراہم کردہ فہرست کے مطابق کم از کم تعداد ۶۳ تھی (ابنِ ہشام ج ۲ ص ۶۶ ۱ تا ۱۷۶)(۱۰۸) تفصیل کے لئے دیکھئے: ابن ہشام ج ۲ ص ۱۲۶ تا ۱۷۴۔ (۱۰۹) مودودی، ابو الاعلیٰ، تفہیم القرآن۔ ادارہ ترجمان القرآن۔ لاہور ۱۹۷۱ء، ج ۵ ص ۵۱۰۔ (۱۱۰) ایضاً (۱۱۱) الحشر (۱۴)۔ (۱۱۲) الاحزاب (۶۰، ۶۱)۔ (۱۱۳) الصعیدی، ص ۱۶۴ (۱۱۴) کیونکہ حاکمیت تو صرف اللہ کے لئے مخصوص ہے۔ دیکھئے: یوسف (۴۰)، الاسراء (۱۱۱)، الحشر (۱)، الاحزاب (۱، ۲)، النساء (۵۹)۔ (۱۱۵) اس کا حکم بھی آپ کو مل چکا تھا۔ آل عمران (۱۵۹)۔ (۱۱۶) بنو قریظہ سے اسی طرح کا معاملہ ہوا۔ حضرت سعد بن معاذ نے فیصلہ دیا (ابنِ ہشام، ج ۳، ص ۲۵۰)۔ (۱۱۷) النساء (۵۸، ۶۵، ۱۰۵، ۱۲۵)، الحدید (۲۵)۔ (۱۱۸) حضورؐ کے حکم سے ایک یہودی مرد اور عورت کو مسجد بنی غنم بن مالک کے پاس سنگسار کیا گیا (ابنِ ہشام، ج ۲، ص ۲۱۴)۔ (۱۱۹) البقرہ (۱۴۴) (۱۲۰) ابن ہشام، ج ۲، ص ۱۵۴، ۱۵۵۔ (۱۲۱) البقرہ (۱۸۳ تا ۱۸۷)۔ (۱۲۲) البقرہ (۲۱۵)، النساء (۴۳)۔ (۱۲۳) البقرہ (۱۷۵)۔ (۱۲۴) النساء (۱۱ تا ۱۴)۔ (۱۲۵) سورۃ الانفال کی آخری آیت: واولوا الارحام بعضھم اولیٰ ببعض فی کتاب اللہ (۷۵) نازل ہو جانے کے بعد موقوف ہوا۔ (۱۲۶) البقرہ (۲۲۱)۔ (۱۲۷) اس سلسلے میں ملاحظہ ہو قرآن کی سورہ الطلاق اور النساء۔ (۱۲۸) الاحزاب (۵۹)۔ (۱۲۹) قانونِ جنگ و صلح کی تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو: سورۂ محمد اور سورہ الانفال۔ (۱۳۰) ایضاً۔ (۱۳۱) ایضاً۔ (۱۳۲) الحشر (۶ تا ۱۰)۔ (۱۳۳) البقرہ (۲۸۳)۔ (۱۳۴) البقرہ (۲۱۷)، النساء (۱۳۷)۔ مدینہ میں ارتداد کا اولین حادثہ حارث بن سوید بن صامت کے ساتھ پیش آیا۔ وُہ اگرچہ غزوۂ اُحد میں بحیثیت مسلمان شریک ہوا تھا لیکن مجذر بن زیاد البلوی کو قتل کر کے مکہ بھاگ گیا تھا۔ (ابنِ ہشام، ج ۲، ص ۱۶۷)۔ (۱۳۵) البقرہ (۱۷۹)، النساء (۹۰ تا ۹۳)۔ (۱۳۶) ظہار کے شرعی احکام۔ المجادلہ (۱ تا ۴)۔ دورِ جاہلیت کا نظام۔ طلاق و ظہار۔ المجادلہ (۱ تا ۴)۔ (۱۳۷) الاحزاب (۴۰)۔ (۱۳۸) مثلاً دیکھئے: الاحزاب (۵۰ تا ۵۲)۔

(۲) دورِ دوم

(۱۳۹) الاسراء (۳۲) (۱۴۰) النور (۲)۔ (۱۴۱) ایضاً (آیات ۴، ۵ تا ۱۰، ۲۳، ۲۴)۔ (۱۴۲) ایضاً (۳۳) (۱۴۳) ایضاً (۲۲، ۲۳)۔ (۱۴۴) ایضاً (۳۰، ۳۱)۔ (۱۴۵) ایضاً۔ (۱۴۶) ایضاً۔ (۱۴۷) ایضاً (۲۷ تا ۲۹)۔ (۱۴۸) ایضاً (۵۸، ۵۹، ۶۰)۔ (۱۴۹) واقعہ افک سے مراد حضرت عائشہ پر تہمت کا واقعہ ہے۔ اس واقعہ کی مختصر روداد یہ ہے کہ حضرت عائشہ غزوۂ بنی المصطلق میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شریکِ سفر تھیں۔ اس غزوہ سے واپسی پر مدینہ سے قریب ایک منزل پر اسلامی لشکر نے پڑاؤ کیا اور ابھی رات کا کچھ حصہ باقی تھا کہ کوچ کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ اسی اثنا میں رفعِ حاجت اور گلے کے گم شدہ ہار کی تلاش میں حضرت عائشہ تو پیچھے رہ گئیں اور لشکر آگے نکل گیا۔ صبح کے وقت ایک صحابی صفوان بن المعطل السلمی بھی اس جگہ سے گزرے جہاں حضرت عائشہ موجود تھیں اُنہوں نے کوئی بات نہیں کی اور حضرت عائشہ کے

قریب اپنا اونٹ لاکر بٹھادیا اور خود الگ کھڑے ہو گئے۔ حضرت عائشہ اونٹ پر سوار ہو گئیں اس پر بہتان اٹھانے والوں نے بہتان اٹھا دیئے اور ان میں سب سے پیش پیش عبداللہ بن ابی تھا۔ مگر حضرت عائشہ ابتداءً اس سے بے خبر تھیں کہ ان پر کیا باتیں بن رہی ہیں۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: ابنِ ہشام ج ۳ ص ۳۱۱۔ اس کے بعد منافقین نے اس بے بنیاد الزام کو ایسی شہرت دی کہ خود مسلمانوں میں سے بعض اس پروپیگنڈے سے متاثر ہو گئے تھے جن میں مسطح، حسّان اور حمنہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ آخر کچھ دنوں بعد اس الزام سے حضرت عائشہ کی برأت کو جب وحی الٰہی کے ذریعہ سورۂ نور (آیات ۱۱ تا ۲۰) میں نازل کر دیا گیا تو یہ قضیہ ختم ہوا۔ واقعہ افک کی پوری تفصیل خود حضرت عائشہ سے مروی ہے۔ اکثر محدثین اور مورخین نے حضرت عائشہ کی روایت کو ہی بہ تمام و کمال نقل کیا ہے۔ متنِ روایت کے لئے ملاحظہ ہو: البخاری۔ محمد بن اسماعیل۔ الصحیح، اصح المطابع۔ دہلی۔ ۱۹۳۸ء ج ۲۔ ص ۶۹۶ تا ۶۹۸۔ کتاب التفسیر، باب ان الذین جاؤا بالافك۔ (۱۵۰) یہاں ہم اس واقعہ کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں جبکہ حضرت عمر کے غلام جہجاہ بن مسعود اور سنان بن وبر کے درمیان پانی کے مسئلہ پر معمولی سا جھگڑا ہوا۔ لیکن عبداللہ بن ابی نے اسے بڑی بات بنا دیا اور عصبیت جاہلیہ کو ابھارا جس کے نتیجہ میں مہاجرین و انصار کے درمیان جنگ کی نوبت آتے آتے رہ گئی۔ ملاحظہ ہو: ابنِ ہشام، ج ۳، ص ۳۰۳۔ (۱۵۱) ایضاً ج ۳، ص ۳۱۲۔ نیز دیکھئے: البخاری ج ۲ ص ۶۹۷، ۶۹۹ (کتاب التفسیر)۔ (۱۵۲) جن لوگوں پر حد جاری کی گئی ان میں حضرت مسطح، حسان اور حمنہ کا نام ابنِ ہشام (ج ۳، ص ۳۱۵) اور دوسرے تمام مورخین لیتے ہیں لیکن یہ بات ہمارے لئے اب تک ناقابلِ فہم ہے کہ عبداللہ بن ابی اس سے، کس طرح مستثنیٰ رہا جبکہ فتنہ جوئی میں اس کا نام سرِ فہرست آتا ہے۔ اور اس کا شمار بھی بہرحال مسلمانوں میں ہوتا تھا۔

(۱۵۳) المجادلہ (۱ تا ۶)۔ (۱۵۴) المجادلہ (۷ تا ۱۰)، المنافقون (۱ تا ۴)۔ نیز النور (۴۸ تا ۵۰ اور ۵۳، ۵۴)۔ (۱۵۵) المجادلہ (۱۴ تا آخر سورہ)۔ (۱۵۶) ایضاً۔ (۱۵۷) ایضاً (۷ تا ۱۳)۔ (۱۵۸) المنافقون (۸)۔ آیت کا شانِ نزول خود اسی کے اندر موجود ہے کہ وہ (منافقین) کہتے ہیں کہ: لئن رجعنا الی المدینة لیخرجن الآعزّ منها الاذل۔ یہ دراصل عبداللہ بن ابی کا قول تھا جو غزوۂ بنی المصطلق کے موقع پر اس نے کہا تھا (ابنِ ہشام، ج ۳، ص ۳۰۳)۔ (۱۵۹) النور (۱۹)۔ (۱۶۰) الحجرات (۱۲)۔ (۱۶۱) النور (۵۸، ۵۹)۔ (۱۶۲) ایضاً (۶۱)۔ (۱۶۳) المجادلہ (۱۱ تا ۱۳)۔ (۱۶۴) ایضاً (۲۱)۔ (۱۶۵) ایضاً (۵)۔ (۱۶۶) النور (۵۵)۔ (۱۶۷) الفتح (۱۹) (۱۶۸) پرویز۔ غلام احمد: معراجِ انسانیت۔ ادارہ طلوعِ اسلام۔ لاہور۔ ۱۹۴۹ء۔ ص ۵۶۱، ۵۶۲۔ (۱۶۹) ابن ہشام، ج ۳، ص ۳۴۰۔ (۱۷۰) مودودی (تفہیم القرآن) ج ۵ ص ۴۲۵۔ (۱۷۱) ابن ہشام، ج ۳، ص ۳۳۲۔ (۱۷۲) البخاری، ج ۱، ص ۳۸۰، کتاب الشروط، باب الشروط فی الجہاد۔ (۱۷۳) الممتحنہ (آیات ۱۰ تا ۱۲) (۱۷۴) ایضاً (۱۰)۔ (۱۷۵) ایضاً (۱۲)۔ (۱۷۶) مودودی۔ تفہیم القرآن، ج ۵، ص ۴۲۷، ۴۳۸۔ (۱۷۷) ایضاً، ص ۴۳۸۔ واضح رہے کہ اس قانون کو فقہائے اسلام نے چار بڑے بڑے عنوانات کے تحت مرتّب کیا ہے۔ ان عنوانات اور ان کی ضروری تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو: (ایضاً، ص ۴۳۰ تا ۴۴۴)۔ (۱۷۸) ابن ہشام

ج ۴ ص ۴۰) ۔ (۱۷۹) بخاری میں حضرت علی کی روایت سے اس قصہ کو بیان کیا گیا ہے ۔ اس میں ابن ہشام کے بتائے ہوئے مقام کے بجائے خاخ کے باغ کا نام آتا ہے ۔ دیکھئے : البخاری ۔ ج ۲ ، ص ۷۲۶ ، کتاب التفسیر ۔ باب لا تتخذوا عدوّی ۔ (۱۸۰) ابن ہشام ، ج ۴ ص ۴۱ ۔ صحیح بخاری میں اس واقعہ کو اور زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے ۔ ملاحظہ ہو : البخاری ، ج ۲ ، ص ۷۲۶ ، کتاب التفسیر ۔ (۱۸۱) ابن ہشام ، ج ۴ ، ص ۴۱ ۔ یہاں جن آیات کی طرف اشارہ کیا ہے وہ سورہ الممتحنہ کی ابتدائی نو (۹) آیات ہیں ۔ صحیح بخاری میں بھی شانِ نزول یہی بیان کیا گیا ہے ۔ دیکھئے : البخاری ، ج ۲ ، ص ۵۶۷ کتاب المغازی ، ص ۷۲۶ ، کتاب التفسیر ۔ (۱۸۲) الممتحنہ (۱) ۔ (۱۸۳) البخاری ۔ ج ۲ ، ص ۷۲۶ ، کتاب التفسیر ۔ (۱۸۴) مودودی ۔ تفہیم القرآن ، ج ۵ ، ص ۴۲۷ ، ۴۲۸ (بحوالہ احکام القرآن ابن العربی ، عمدۃ القاری اور فتح الباری) ۔ (۱۸۵) احسان ۔ بی اے ۔ رسول اللہ میدانِ جہاد میں ۔ پاک پبلشرز لمیٹڈ ، کراچی ۔ ۱۹۶۸ء ص ۱۸۶ ۔ (۱۸۶) ابنِ ہشام ، ج ۴ ، ص ۳۴۵ ۔ (۱۸۷) ابنِ سعد ، ج ۲ ، ص ۱۱۳ ۔ (۱۸۸) ابنِ ہشام ، ج ۴ ، ص ۳۴۵ ۔ (۱۸۹) ایضاً ص ۳۴۶ ۔ (۱۹۰) البخاری ۔ ج ۲ ، ص ۶۰۷ کتاب المغازی ۔ (۱۹۱) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو : مودودی ، تفہیم القرآن ، ج ۱ ص ۴۳۶ ۔ (۱۹۲) النور (۵۵) ۔ (۱۹۳) المائدہ (۲ ، ۹۴ ، ۹۵ ، ۹۶) ۔

(۱۹۴) ایضاً (۲) ۔ (۱۹۵) ایضاً (۱ تا ۵ ، ۸۷ ، ۸۸ ، ۹۰ ، ۹۱ ، ۹۴ ، ۹۶ تا ۱۰۳) ۔ (۱۹۶) ایضاً (۲) ۔

(۱۹۷) ایضاً (۶) ۔ (۱۹۸) ایضاً (۸۹) ۔ (۱۹۹) ایضاً (۱۰۶ تا ۱۰۸) ۔ (۲۰۰) ایضاً (۲۳ ، ۲۴) ۔

(۲۰۱) ایضاً (۳۸) ۔ (۲۰۲) ایضاً (۳۲) ۔ (۲۰۳) ایضاً (۵۴) ۔ (۲۰۴) ایضاً (۵) ۔ (۲۰۵) ایضاً (۵۱ ، ۵۷)

(۲۰۶) ایضاً (۲ ، ۸ ، ۴۲) ۔ (۲۰۷) ایضاً (۱۳ ، ۷۱) ۔ (۲۰۸) ایضاً (۱ ، ۳۵ ، ۹۲) ۔ (۲۰۹) ایضاً (۴۸ ، ۴۹)

(۲۱۰) ایضاً (۱۵ ، ۵۹ ، ۶۳ تا ۶۶ ، ۶۸) ۔ (۲۱۱) ایضاً (۱۹ ، ۲۷ ، ۳۷ ، ۷۵ تا ۸۰ ، ۱۱۰ تا ۱۱۸) ۔

(۲۱۲) ایضاً (۱۵ ، ۱۹ ، ۸۱) ۔ (۲۱۳) رسول اللہ نے اپنے وصال مبارک سے ذرا پہلے لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ : وانّی واللہ ما تمسکون علی بشیءٍ ، انّی لم احل الّا ما احل القرآن ، ولم احرّم الّا ما حرّم القرآن ۔ (خدا کی قسم تم میرے ذمہ کوئی چیز نہیں لگا سکتے ۔ میں نے کوئی چیز حلال نہیں کی بجز اس کے جو قرآن نے حلال کی اور میں نے کوئی چیز حرام نہیں کی بجز اس کے جو قرآن نے حرام کی) دیکھئے : ابن ہشام ، ج ۴ ، ص ۳۰۴ ۔ (۲۱۴) التوبہ (۱) ۔ (۲۱۵) ایضاً (۵ ، ۱۲۳) ۔ (۲۱۶) ایضاً (۱۲) ۔ (۲۱۷) ایضاً (۱۷) ۔ (۲۱۸) ایضاً (۳) ۔ (۲۱۹) ایضاً (۲۸) ۔

(۲۲۰) ایضاً (۲۹) ۔ (۲۲۱) ابو عبید ' ج ۱ ، ص ۲۲ ، فقرہ ۵۵ ۔ (۲۲۲) بقول ابنِ سعد رسول اللہ نے ایک فرمان اہلِ نجران کے نام لکھا تھا جس کے جواب میں ان کے چودہ شرفائے نصاریٰ کا ایک وفد آپ کی خدمت میں آیا تھا (ابن سعد ج ۱ ، ص ۳۵۷) ۔ ابنِ ہشام کے بیان کے مطابق یہ وفد ساٹھ (۶۰) سواروں پر مشتمل تھا ۔ اور اس نے یہ وضاحت بھی کی ہے کہ ان ۶۰ میں سے ۱۴ ان کے سربرآوردہ لوگ تھے ۔ پھر ان چودہ میں سے تین اشخاص ایسے تھے جو مرجع عام تھے (ابنِ ہشام ، ج ۲ ، ص ۲۲۲) ۔ اس وفد کی آمد رسول اللہ کے پاس ۹ھ میں ہوئی تھی (ندوی ، سلیمان ۔ ارض القرآن ، ج ۱ ،

ص ۶۹)۔ اسی موقع پر سورۂ آل عمران کی تقریباً ۸۰ آیات نازل ہوئی تھیں (ابنِ ہشام، ج ۲، ص ۲۲۵)۔ ان کا آغاز ان اللہ اصطفیٰ ادم ونوحًا و ال ابراھیم و ال عمران علی العالمین سے ہوتا ہے (مودودی، تفہیم القرآن، ج ۱، ص ۲۲۸)۔ (۲۲۳) مولانا مودودی نے اپنی کتاب تفہیم القرآن میں لکھا ہے کہ "اس وقت اس علاقے میں ۷۳ بستیاں شامل تھیں اور کہا جاتا ہے کہ ایک لاکھ بیس ہزار قابلِ جنگ مرد اس میں سے نکل سکتے تھے۔ آبادی تمام تر عیسائی تھی" (ج ۱، ص ۲۴۶) البتہ اس کا حوالہ نقل نہیں کیا ہے۔ اس بات پر قریب قریب تمام مورخین کا اتفاق ہے کہ نجران کی پوری آبادی ان ہی تین سرداروں کے زیرِ حکم تھی۔ مثلاً دیکھئے: ابنِ سعد، ج ۱، ص ۳۵۷۔ (۲۲۴) ابنِ ہشام نے لکھا ہے کہ عاقب قوم کا سردار اور ان سب کو ایسا مشورہ اور رائے دینے والا تھا کہ بجز اس کی رائے کے وہ لوگ کسی طرف نہ پھرتے تھے۔ اس کا نام عبدالمسیح تھا۔ سیّد ان کی دیکھ بھال کرنے والا اور ان کے سفروں اور اجتماعات کا منتظم تھا، اس کا نام الایہم تھا، جبکہ اسقف ابوحارثہ بن علقمہ تھا، وہ بنی بکر بن وائل کا ایک فرد، ان کا دینی پیشوا، ماہر عالم، امام اور ان کی درسگاہوں کا افسر تھا (ابن ہشام، ج ۲، ص ۲۲۲)۔ ابنِ ہشام نے یہ بھی لکھا ہے کہ ان تینوں سرداروں میں سے ابوحارثہ نے ان سب میں بلند مقام حاصل کرلیا تھا۔ وہ مذہبی کتابوں کی تعلیم دیا کرتا تھا اور اسے اپنے علوم میں خوب مہارت حاصل ہوگئی تھی یہاں تک کہ روم کے عیسائی بادشاہوں کو دینی علوم میں اس کی مہارت کی خبر پہنچی تو انہوں نے اسے بڑا مرتبہ دے دیا اور مال ومنال خدم وحشم والا بنادیا۔ انہوں نے اس کے لئے کئی کلیسے بنا دئے تھے اور طرح طرح کے اعزازات دئے تھے (ایضاً)۔ (۲۲۵) آل عمران (۵۹ تا ۶۳)۔ (۲۲۶) ایضاً (۶۲، ۶۳، ۷۷، ۹۹، ۱۱۲، ۱۱۸ تا ۱۲۰)۔ (۲۲۷) ابنِ سعد، ج ۱، ص ۳۵۷۔ (۲۲۸) ایضاً (۲۲۹) ایضاً ص ۳۵۷ تا ۳۵۸ (۲۳۰) صلح نامہ کے اصل متن کے لئے ملاحظہ ہو: ابویوسف (ص ۷۲)، ابنِ سعد (ج ۱، ص ۳۵۸) بلاذری۔ فتوح البلدان (ص ۷۰ تا ۷۲) نیز الدکتور محمد حمید اللہ الحیدر آبادی۔ مجموعۃ الوثائق السیاسیۃ فی العہد النبوی والخلافۃ الراشدہ۔ مطبعہ لجنۃ التالیف والترجمہ والنشر۔ قاہرہ، ۱۹۴۱ء (ص ۸۱)۔ (۲۳۱) ابنِ قیّم، زاد المعاد، ج ۱، ص ۱۷۵۔ (۲۳۲) البقرہ (۲۷۸، ۲۷۹)، یہ آیات فتح مکہ کے بعد نازل ہوئی تھیں۔ ان آیات کے نزول کے بعد اسلامی حکومت کے دائرہ میں سُودی کاروبار ایک فوجداری جُرم بن گیا۔ عرب کے جو قبیلے سُود کھاتے تھے ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمّال کے ذریعہ سے آگاہ فرما دیا کہ اگر وہ اب اس لین دین سے باز نہ آئے تو ان کے خلاف جنگ کی جائے گی۔ نجران کے عیسائیوں کو جب اسلامی حکومت کے تحت اندرونی خود مختاری دی گئی تو معاہدے میں یہ تصریح کردی گئی کہ اگر تم سُودی کاروبار کروگے تو معاہدہ فسخ ہوجائے گا اور ہمارے تمہارے درمیان حالتِ جنگ قائم ہوجائے گی۔ (مودودی۔ تفہیم القرآن، ج ۱، ص ۲۱۸)۔ نیز ابویوسف (ص ۷۲، ۷۳)۔

(۲۳۳) شبلی نے لکھا ہے کہ ۸ھ تک زکوٰۃ فرض نہیں ہوئی۔ فتح مکّہ کے بعد اس کی فرضیت ہوئی تو اس کے مصارف بیان کئے گئے (شبلی نعمانی وسید سلیمان ندوی۔ سیرت النبی۔ مطبع اعظم گڑھ، ۱۳۷۵ھ، ج ۲، ص ۱۲۲)۔

(۲۳۴) محصلینِ زکوٰۃ وصدقات اور ان کے تقرر کی تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو: ابن ہشام (ج ۴، ص ۲۴۶)۔

شبلی نے لکھا ہے کہ ان محصلین کا تقرر رسول اللہؐ نے یکم محرم الحرام ۹ھ کو فرمایا (شبلی، ج ۲، ص ۲۷)۔(۲۳۵) تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو: شبلی، ج ۲، ص ۹۶ تا ۹۹۔(۲۳۶) سورۂ حجرات کا نزول ۹ھ میں وفد بنی تمیم کی آمد پر ہوا تھا جبکہ وفد کے لوگوں نے حجراتِ ازواج کے باہر رسول اللہؐ کو پکارنا شروع کر دیا تھا۔ ابن ہشام نے تو عنوان ہی یہ لکھا ہے کہ :
قدوم وفد بنی تمیم و نزول سورہ الحجرات (ج ۴ ص ۲۰۶)۔(۲۳۷) الحجرات (۱، ۲، ۶، ۱۰، ۱۱ تا ۱۴)۔
(۲۳۸) یہ وفد محارب تھا جو ۱۰ھ میں حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ یہ دس افراد پر مشتمل تھا۔ ملاحظہ ہو: ابنِ سعد، ج ۱، ص ۲۹۹۔ (۲۳۹) الحجرات (۱۴)۔(۲۴۰) مثلاً حارث بن سوید کا ارتداد (ابن ہشام، ج ۲، ص ۱۶۷) عبداللہ بن اخطل کا ارتداد جس کے قتل کا حکم رسول اللہؐ نے فتح مکہ کے موقع پر دیا تھا (ایضاً، ج ۴، ص ۵۲) واضح رہے کہ شبلی نے بڑی تفصیل سے "اشتہاریان قتل" پر بحث کی ہے اور اس سلسلہ میں مذکورہ ابن خطل کا بھی ذکر کیا ہے۔ نیز اس کے ارتداد کا واقعہ نقل کر کے ابو داؤد کے حوالہ سے حدیث پر تنقید و جرح سے کام لیا ہے۔ ملاحظہ ہو (شبلی، ج ۱، ص ۵۲۳ تا ۵۲۵)۔ ابن ہشام کی رُو سے مسیلمۃ الکذاب نے ارتداد بھی اختیار کیا تھا اور جھوٹی نبوت کا دعویٰ بھی (ابنِ ہشام، ج ۴، ص ۲۲۳)۔(۲۴۱) ابنِ ہشام، ج ۴، ص ۲۲۲۔(۲۴۲) ایضاً (۲۴۳) ایضاً ص ۲۲۴۔
(۲۴۴) عہدِ نبویؐ میں تحریکِ ارتداد کا بانی اسود عنسی تھا اس نے حجۃ الوداع کے بعد خروج کیا تھا اور مذحج کے اکثر افراد اس کے ساتھ ہو گئے تھے۔ بڑا شعبدہ باز تھا عجیب و غریب تماشے دکھاتا تھا۔ رسول اللہؐ کو جب اس کی تحریک کی اطلاع ملی تو آپ نے فوج کشی کرنے کے بجائے محض چند اشخاص کی سفارتی اور سیاسی کوششوں سے کام لیا جس کی وجہ سے مرتدین کے تمام راستے بند ہو گئے۔ آپ کی وفات سے ایک دن پہلے وہ مارا گیا۔ دیکھئے: طبری، ج ۳، ص ۱۸۵ تا ۱۸۷۔

حواشی

باب پنجم — انتظامِ ریاست

(۱) ابن الطقطقی۔ محمد بن علی بن طبا طبا۔ الفخری فی الآداب السلطانیہ والدول الاسلامیہ۔ المطبعۃ الرحمانیہ، مصر ۱۹۲۷ء، ص ۵۲ (الفصل الثانی) (۲) الحدید (۲۵) (۳) الحج (۴۱) (۴) اس نظریہ کو متعارف کرانے کا سہرا بودین (BODIN) کے سر ہے جس نے ۱۵۷۶ء میں اسے پہلی مرتبہ دنیا کے سامنے پیش کیا۔

(Gilchrist, R.N., Principles of Political Science, Orient Longman, Calcutta, 1961, p. 93).

یہ نظریہ حاکمیت بودین نے اپنی کتاب "ON THE COMMONWEALTH" میں واضح طور پر بیان کیا۔ تاریخی اعتبار سے چونکہ اس کا نظریہ لوئیس یازدہم (Louis XI) کے دور کی غمازی کرتا ہے۔ اس لئے اس کا تصور در اصل استبداد یت پر مبنی ہے۔

(L.R. Sn. Sovereignty, Encyclopaedia Britannica, edd. William Benton, Ency. Britannica Inc., Chicago, 1955, Vol.21, p.1

بودین سے پہلے حاکمیت (Sovereignty) یا حاکمِ اعلیٰ (Sovereign) کی اصطلاح کو استعمال نہیں کیا جاتا تھا بلکہ اس کے لئے قوّتِ بالادست ((Supreme power) یا اتمام و اکمال طاقت ('Fullness of power) کے الفاظ کا سہارا لیا جاتا تھا۔ (دیکھئے

(Ilyas Ahmad, Sovereignty, Islamic and Modern, The Allies Book Corporation, Karachi, 1965, p. 5)

بودین کے بعد جن لوگوں نے حاکمیت کے بارے میں خاص طور پر اپنے نظریات پیش کئے ان میں ہابس Hobbes لاک Locke، روسو Rousseau اور اسپینوزا Spinoza قابل ذکر ہیں جبکہ آسٹن Austin نے حاکمیت کے نظریہ کو بالکل واضح اور غیر مبہم انداز سے بیان کر کے اسے سائنسی جامہ عطا کیا اور جو کچھ پہلے سوا سو ڈیڑھ سو برس میں حاکمیت کے بارے میں سوچا گیا تھا، وہ یا تو آسٹن کے نظریہ کی تفسیر ہے یا تنقید (شیروانی، ہارون خاں: سیاسیات کے اصول۔ انجمن ترقی ہند۔ علی گڑھ۔ مدینہ پریس بجنور، ۱۹۵۳ء۔ حصہ اوّل، ص ۵۹) (۵) Jones, W.T.,

Masters of Political Thought, Harrap., London, 1960, Vol.II, p. 19.

(۶) رسول اللہؐ سے قبل دوسرے انبیاءؑ نے بھی حاکمیتِ الٰہی کے تصور کی تعلیم دی تھی جیسا کہ متعدد مقامات پر قرآن کے بعض بیانات مثلاً الاعراف (۵۹، ۶۵، ۷۳، ۸۵)، ھود (۵۰، ۶۱، ۸۴) اور المومنون (۲۳، ۳۲) کے

مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ (۷) جدید نظریات کی رُو سے مقتدرِ اعلیٰ کو مطلق العنان Absolute جامع و ہمہ گیر (Universal or all comprehensive)، ناقابلِ انتقال (Inallienable)، مستقل Permanent، ناقابلِ تقسیم (Indivisable) (دیکھئے: Gilchrist, p. 10) طبع زاد (Original) (Ilyas Ahmad, p. 3) اور بلا شرکت غیر Excessive or Exclusive ہونا چاہیئے۔ (Garner James Wilford, Political Science and Government, The World Press Ltd., Calcutta, 1952, p. 170).

(۸) مودودی، سید ابو الاعلیٰ۔ اسلامی ریاست۔ اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ لاہور۔ ۱۹۶۷ء، ص ۳۱۲، ۳۱۴۔ (۹) حاکمیت کے لغوی معنی تعریف، اوصاف و شرائط اور دیگر تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو:

(i) William Little, H.W. Fowler, J. Coulson (edd), The Shorter Oxford English Dictionary, On Historical Principles' The Clarendon Press, London.1965, p. 1954.

(ii) Marshall, G. Sovereignty, A Dictionary of the Social Sciences (edd), Juluis Gould, William L. Kolb, The Free Press of Glencoe, New York, 1964, pp. 686, 687.

(iii) Coker, Francis W. Sovereignty, Encyclopaedia of Social Sciences (edd) Seligman, Edwin R.A. Macmillan, New York, 1950, Vol. 13, pp. 268, 269.

(۱۰) شیروانی حصہ اول۔ ص ۵۳۔ (۱۱) ایضاً۔

(۱۲) اس کا اندازہ صحیح طور پر اس وقت ہو سکتا ہے جبکہ یورپ میں نظریۂ حاکمیت کی مختصر تاریخ سامنے رہے۔ تاریخی نقطۂ نظر سے یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ قرونِ وسطیٰ میں انتہائی کوششوں کے باوجود کسی قسم کی مرکزیت قائم نہیں ہو سکی تھی اور بجائے اکائی کے دُوئی قائم ہو گئی تھی۔ یعنی شہنشاہ اور پوپ دونوں نے اپنے اپنے دائرہ کے اندر حاکمیت کا دعویٰ کر دیا تھا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان دونوں میں ایسی طویل کشمکش شروع ہوئی جو بالآخر سولھویں صدی عیسوی میں پروٹسٹنٹ اور رومن کیتھولک مذہبوں کی شکل میں منتج ہوئی۔ پھر ان دونوں مذہبوں کے درمیان جو مناقشے اور لڑائیاں ہوئیں ان کے باعث تمام یورپ گویا ایک بڑا میدانِ جنگ بن گیا اور جرمنی اور فرانس دو دو حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ چنانچہ اس صورتِ حال کے لحاظ سے بودین نے اپنا نظریۂ حاکمیت پیش کیا (شیروانی، حصہ اوّل۔ ص ۵۴) اور حاکمیت و اقتدارِ اعلیٰ کا مظہر شخص واحد کو قرار دیا کیونکہ بودین خود شہنشاہ فرانس (لوئیس یازدہم) کا حامی و ناصر تھا (L.B.SN.P.100) جو جاگیرداروں اور کلیسا کے اختیارات کو چھین کر تختِ شاہی کے لئے زیادہ سے زیادہ اختیار حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے وہ تو یہاں تک کہتا ہے کہ مقتدرِ اعلیٰ نہ تو اپنے پیشروؤں یا جانشینوں کا پابند ہے اور نہ قانون کا پابند۔ کوئی قانون ساز ادارہ جو خود

اس کی آزادانہ مرضی کے تابع ہے مقتدر اعلیٰ کو کسی معاملہ میں پابند نہیں بنا سکتا (MARSHALL, P. 686) مختصر یہ کہ بودین کا نظریہ تمام تر استبدادیت پر مبنی تھا۔

سترھویں صدی عیسوی میں ہابس نے استبدادیت کا جو نظریہ پیش کیا اس میں اس نے مقتدر اعلیٰ کے لئے بغیر کسی تحدید کے زیادہ سے زیادہ اختیارات کا مطالبہ کیا اور اپنے زمانے کی شخصی حکومت کو معاہدہ عمرانی کے ذریعہ سے ثابت کرنے کی کوشش کی۔ اس کے نظریہ کی خاص بات یہ ہے کہ اس کے نزدیک چونکہ خود مقتدر اعلیٰ اس معاہدہ کا فریق نہیں ہوتا اس لئے وہ جس طرح چاہتا ہے اختیارات حکومت استعمال کرتا ہے (GILCHRIST, P. 101)۔

اس کے برعکس جان لاک نے نظریۂ حاکمیت کے سلسلہ میں لفظ حاکمیت (SOVEREIGNTY) سے بچتے ہوئے ایک "بالادست قوت" (SUPREME POWER) کی اصطلاح استعمال کی۔ اس کے نزدیک یہ قوت فردِ واحد کے بجائے ایک مطلق ادارہ قانون سازی کے سپرد ہو گی (LBID, P. 101) لاک کے نظریات نے یہ حقیقت بھی واضح کی کہ حاکمیت کو کم از کم جزوی طور پر عوام کے ذریعہ محدود کیا جا سکتا ہے (LBID. P. 102)۔

یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ حاکمیت و اقتدار اعلیٰ کا مسئلہ تاریخ یورپ میں ہمیشہ ایک نزاعی مسئلہ رہا ہے اور افکار سیاسی کے باب میں مسئلہ حاکمیت پر شدید اختلافات ہر زمانے میں رہے ہیں بلکہ ماضی قریب میں اختلافات نے صورتِ حال اس حد تک پہنچا دی ہے کہ اگر ایک گروہ نظریۂ حاکمیت کا علمبردار اور ریاست کے لئے اسے ناگزیر سمجھتا ہے۔ اور جن میں سے چند کا تعارف ہم اوپر کرا چکے ہیں۔ لیکن دوسری طرف ایک گروہ ان فلاسفر کا بھی ہے جو سرے سے کسی حاکمیت کے ہی قائل نہیں ہیں بلکہ انھوں نے حاکمیت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا۔ چنانچہ اس سلسلے میں فرانس کے مفکر دیوگی (DUGUIT) اور انگلستان کے پروفیسر لاسکی (LASKI) کو نمائندہ حیثیت سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: Droit اور Problem of Sovereignty بحوالہ Garner, pp. 200, 201 Constitutional, Vol. I, pp. 86, 1 اور لنڈسے Lindsay) نے تو اس موقف پر یہ کہہ کر مہر ثبت کر دی ہے کہ "مقتدر ریاست کا نظریہ اب دم توڑ چکا ہے"

Ibid., p. 200, "The State in Recent Political Theory", The Political Quarterly, No. 1, February, 1914, p. 136).

جبکہ پروفیسر کریب (Krabbe) نے یہ سفارش کی ہے کہ چونکہ اب نظریہ حاکمیت متمدن دنیا میں تسلیم نہیں کیا جاتا اس لئے نظریات سیاسی سے اسے خارج کر دینا چاہیئے (LBID. P. 200 بحوالہ "THE MODERN IDEA OF THE STATE" (TRANSLATED BY SBINE AND SHEPARD), P. 35.

ہمارے اوپر کے بیان میں اگرچہ زیادہ تفصیلات نہیں آسکی ہیں لیکن اس سے یہ اندازہ بہرحال ہو جاتا ہے کہ حاکمیت کے سلسلے میں جتنے بھی نظریات پیش کئے گئے وہ حالات و زمانہ کے تابع تھے اور مجموعی طور پر اس وقت پیش کئے گئے جبکہ

سیاسی اقتدار و اختیار رُو بہ زوال تھا اور ضرورت اس بات کی سمجھی گئی تھی کہ اس کا وقتاً از سر نو بحال کیا جائے۔
(۱۳) قانونی حکمران کے پیچھے ایک انتخابی ادارہ کی قوت ہوتی ہے جو اگرچہ قانونی طور پر اپنی رائے کا اظہار نہیں کر سکتا لیکن بہرحال اس کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ یہی انتخابی ادارہ سیاسی مقتدر اعلیٰ کو جنم دیتا ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے: (GARNER, P. 160)۔ (۱۴) انگلستان کے فقیہہ جان آسٹن نے اپنے خطبات قانون (LECTURES ON JURISPRUDENCE) میں مقتدر اعلیٰ کی تعریف ایک متعین اور برتر و اعلیٰ انسان کی شخصیت میں کی ہے۔ ایک قانون دان کی حیثیت سے اس کے ذہن میں یقیناً یہ بات تھی کہ عدالت جو حکم نافذ کرتی ہے وہ صرف قانون کو دیکھتی ہے اس قطع نظر کہ قانون رائے عامہ کی تائید رکھتا ہے یا نہیں (تفصیل کے لئے: (GARNER, PP. 179, 180) آسٹن کے نزدیک حاکم اعلیٰ سے برتر کوئی ایسی انسانی ہستی نہیں ہونی چاہیے جس کا حکم وہ مانتا ہو۔ لیکن اسے کوئی ایسا شخص نظر نہ آیا جو واقعتہً آزاد ہو اور جو کسی دوسری انسانی ہستی یا انسانی مجموعہ کا کسی نہ کسی طرح تابع نہ ہو یا اس سے اثر نہ لیتا ہو (تفصیل کے لئے: (GILCHRIST, PP. 114-116) اس لئے انیسویں صدی کے وسط میں ڈائسی (DICEY) نے قانون اور سیاسی حاکمیت کا نیا نظریہ پیش کیا۔ جس میں اس نے کہا کہ قانونی حاکمیت تو یقیناً اس شخص یا ریاست کو حاصل ہو گی جو قانون بنانے اور اس میں ترمیم کرنے کی اہل ہو لیکن جو اقتدار ان لوگوں کو حاصل ہو جو اس قانونی حاکم اعلیٰ پر اثر ڈالتے ہوں تو ایسے اقتدار کو بھی ہم نظر انداز نہیں کر سکتے اور جسے سیاسی حاکمیت کا نام دیا جا سکتا ہے۔ تفصیلات اور بحث کے لئے ملاحظہ ہو (GARNER, P. 160 حاشیہ) (۱۵) ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں عمومی حاکمیت (POPULAR SOVEREIGNTY) کی اصطلاح بھی استعمال کی گئی لیکن اس کا استعمال بالکل غیر متعین ہے۔ بالعموم یہ انتخابی ادارہ (ELECTORATE) کے بجائے لوگوں کا وہ بڑا غیر منظم گروہ ہے جو اپنی رائے کے اظہار کی کوئی قانونی شکل نہ رکھتا ہو۔ (تفصیل کے لئے: (LBID., PP. 164, 165) (۱۶) جب ایک قانونی حکمران اعلیٰ انقلاب یا حملہ کے نتیجہ میں ہٹ جائے تو اس صورت میں وہ شخص یا مجموعہ اشخاص جو اپنی مرضی کو نافذ کر سکے DEFACTO SOVEREIGN کہلائے گا، اور DEJURE SOVEREIGNTY کا قیام عملی قوت (PHYSICAL POWER) کے بجائے قانون کی وجہ سے وجود میں آتا ہے۔ آسٹن دونوں قسم کی حاکمیت کو ماننے سے انکار کرتا ہے (LBID. PP. 167, 168)۔
(۱۷) خارجی حاکمیت (EXTERNAL SOVEREIGNTY) کا مطلب بیرونی ریاستوں کی حاکمیت سے آزادی ہے۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے: (LBID., PP. 169, 170)۔ (۱۸) دیکھئے: المائدہ (۴۴)، نیز اللہ کے سوا کسی اور کی حاکمیت تسلیم کرنے کی صورت میں قرآن کا اسلوب و لہجہ یہ ہے کہ: یریدون ان یتحاکموا الی الطاغوت وقد امروا ان یکفروا بہ (آیت ۶۰) یعنی چاہتے یہ ہیں کہ اپنے معاملات کا فیصلہ کرانے کے لئے طاغوت کی طرف رجوع کریں حالانکہ انہیں طاغوت سے کفر کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ (۱۹) آیت (۶) مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: الفاطر (۱۲)، الانعام (۱۰۲) اور المومن (۶۲)۔ (۲۰) یونس (۳) (۲۱) الاعراف (۵۴)۔ (۲۲) دیکھئے

یونس (۳۱)، السجدہ (۵)(۲۳) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: الانعام (۵۷، ۶۲)، یوسف (۴۰، ۶۷)، المومن (۲)، قصص (۷۰)، آل عمران (۱۵۴)، الشوریٰ (۱۰)۔(۲۴) ملاحظہ ہو: آل عمران (۱۵۴)، الاسرأ (۱۱۱)، الفرقان (۲)، الکہف (۲۶)، النحل (۱۱۶) اور الرعد (۴۱)۔(۲۵) النحل (۱۱۶)(۲۶) الفاتحہ (۱)، الانعام (۴۵)۔(۲۷) الناس (۱)۔(۲۸) ایضاً (۲)۔(۲۹) ان خصائص کے لئے ملاحظہ ہو: البقرہ (۲۰، ۱۰۹)، الانعام (۱۷)، النحل (۷۷)، الملک (۱)، الفاطر (۱)، النور (۴۵)، الطلاق (۱۲)، الکہف (۴۵)، الروم (۵۰، ۵۴)، یٰسٓ (۸۳) اور المومن (۶۸) وغیرہ وغیرہ۔(۳۰) البقرہ (۱۶۵)، الذاریات (۵۸)۔(۳۱) المومنون (۱۱۶)، طٰہٰ (۱۱۴)، لقمان (۳۰)، الجاثیہ (۳۷)، الحشر (۲۳)۔(۳۲) الانعام (۱۸، ۶۱، ۱۰۲)، الحشر (۲۳)، العنکبوت (۴۲)، الروم (۲۷)، لقمان (۲۷)، یوسف (۲۱)، الشوریٰ (۳)۔(۳۳) المائدہ (۱)، ابرٰہیم (۲۷)، ھود (۱۰۷)، یٰسٓ (۸۳)۔(۳۴) یوسف (۲۱)۔(۳۵) دیکھئے: الرعد (۴۱)۔(۳۶) الفاطر (۴۴)، ابرٰہیم (۲۷)۔(۳۷) الانبیأ (۲۳)، المومنون (۸۸)۔(۳۸) السجدہ (۲۲)، الزمر (۳۷)(۳۹) رحمٰن (۲۷، ۸)۔

(۴۰) البقرہ (۲۵۵)، آل عمران (۲)، طٰہٰ (۱۱۱)، المومن (۶۵)۔(۴۱) الزخرف (۸۴، ۸۵)، الجاثیہ (۳۷)، القصص (۷۰، ۸۸)، الانعام (۳)۔(۴۲) الانبیاء (۲۲)۔(۴۳) الحشر (۲۳)، الجمعہ (۱)، التغابن (۱)، (۴۴) الانعام (۱۱۵)، الکہف (۲۹)۔(۴۵) الشوریٰ (۱۰)۔(۴۶) الطلاق (۱۱۲)، الاعلیٰ (۷)، المجادلہ (۶)، الانعام (۱۸، ۷۳)، ھود (۱۲۳)، حٰمٓ السجدہ (۵۴)، ابراہیم (۳۸)، الفجر (۲۵)، النحل (۱۹)، طٰہٰ (۹۸، ۱۱۰)، القصص (۶۹)، العنکبوت (۶۲)، لقمان (۳۴)، المومن (۱۹)۔

(۴۷) حوالے کے لئے ملاحظہ ہو: البقرہ (۱۰۷)، آل عمران (۲۶، ۱۸۹)، المائدہ (۱۷، ۱۸، ۴۰، ۱۲۰)، الاعراف (۱۵۸)، التوبہ (۱۱۶)، النور (۴۲)، الفرقان (۲)، الفاطر (۱۳)، الزمر (۶، ۴۴)، الشوریٰ (۴۹)، الزخرف (۸۵)، الجاثیہ (۲۷)، الفتح (۱۴)، الحدید (۲، ۵)، التغابن (۱)، البروج (۹)۔

(۴۸) الکہف (۴۴)۔(۴۹) آل عمران (۱۸۰)، الحدید (۱۰)۔(۵۰) البقرہ (۲۴۷)، آل عمران (۲۶)۔(۵۱) ایضاً (۵۲) ھود (۴۵)، التین (۸)، ھود (۲۳)، الاعراف (۸۷)، یوسف (۸۰)، یونس (۱۰۹)۔

(۵۳) الشوریٰ (۱۱)۔(۵۴) خلافت عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی نیابت، جانشینی اور قائم مقامی کے ہیں امام راغب اصفہانی کے الفاظ میں یہ نیابت خواہ سابق کی غیر حاضری کی وجہ سے ہو، موت، عزل، عجز سے ہو یا نائب کو محض شرف بخشنے کی صورت میں ہو (راغب۔ المفردات فی غریب القرآن۔ مصر۔ ۱۹۶۱ء، ص ۱۵۶) اسی سے لفظ خلیفہ بنا ہے یعنی نائب و جانشین۔ اصطلاحی طور پر خلافت محض فرمانروائی اور غلبہ و تمکن کا نام نہیں ہے بلکہ یہ حکومت کی ایک شکل ہے جس میں اللہ کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرتے ہوئے اس کے امر شرعی کے مطابق اختیارات کو استعمال کیا جاتا ہے اور اصطلاحی طور پر خلیفہ وہ شخص ہوتا جو کسی اسلامی ریاست میں حکومت کا سربراہ اور اس کے باشندوں کے دینی و دنیاوی

معاملات کا ناظم و نگران ہوتا ہے (مزید تشریح کے لئے: مودودی۔ اسلامی ریاست ص ۴۹، ۱۷، اور اصلاحی امین احسن "ریاست کا اسلامی تصور"، الندوۃ العالمیہ للاسلامیات۔ جامعہ پنجاب، لاہور ۱۳۷۹ھ، ص ۱۴ تا ۲۰)۔ یہاں یہ وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ اسلامی مفکرینِ سیاست نے تصورِ خلافت کو امامت سے بھی موسوم کیا ہے۔ لیکن یہ تصور شیعی تصورِ امامت سے بالکل مختلف ہے۔ چنانچہ علامہ ابن تیمیہ نے اپنی ایک کتاب میں اس مسئلہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے (دیکھئے: ابنِ تیمیہ۔ منہاج السنۃ النبویہ فی نقض کلام الشیعہ القدریہ۔ مکتبہ دار العروبہ۔ مطبعۃ المدنی۔ قاہرہ۔ سنہ ۱۹۶۲ء خصوصاً ج ۱، ص ۳۴۰)

ہماری بحث کا مدعا یہ ہے کہ رسول اللہؐ کی حیثیت مقتدرِ اعلیٰ کی نہیں بلکہ "خلیفہ کی تھی۔ چنانچہ اس کی تائید اس امر سے بخوبی ہو جاتی ہے کہ رسول اللہؐ سے پہلے جو انبیاؑ اور رسل حکومت و سلطنت سے سرفراز کئے گئے وہ سب خلیفۃ اللہ فی الارض تھے۔ چنانچہ قرآن میں اللہ نے حضرت داؤدؑ کو "خلیفہ" کہہ کر ہی مخاطب کیا (ملاحظہ ہو: ص (۲۶)۔ پھر یہ کہ ان سے جو کچھ کہا گیا اس سے ایک طرف تو حاکمیتِ الٰہی کا واضح ثبوت ملتا ہے تو دوسری طرف خلافت و نیابت کا یہ اشارہ کرنا برمحل ہوگا کہ رسول اللہؐ "خلیفۃ اللہ" تھے، اور ان کے جانشین "خلیفہ رسول اللہ"۔ جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ نے اپنے آپ کو کہا تھا (امام احمد بن حنبل۔ المسند۔ شرحہ و وضع فہارسہ۔ احمد محمد شاکر۔ دار المعارف للطباعۃ والنشر۔ مصر سنہ ۱۹۴۹ء (ج ۱، حدیث نمبر ۵۹ و ۶۴)۔

(۵۵) یہ قانون قرآن ہے جو حاکمِ حقیقی اور مقتدرِ اعلیٰ کی طرف سے نازل کردہ ہے: الشعرآ (۱۹۲)، الحاقہ (۴۳)، الواقعہ (۸۰)، السجدہ (۲)، المومن (۲)، الجاثیہ (۲)، الاحقاف (۲) ہے۔ یہ قانون مکمل ہے: المائدہ (۳) بلند و برتر ہے، الواقعہ (۷۷) اور تحریری مجموعۂ احکام ہے: البقرہ (۲)، الطور (۲، ۳)۔ یہ قانون غیر مبدل اور ہر قسم کی کمی بیشی یا تغیر سے محفوظ ہے: القیامۃ (۱۷ تا ۱۹)، الاعلیٰ (۶)، الحجر (۹)، الکہف (۲۷)۔ اس میں ردّ و بدل کا حق یا اختیار کسی انسان بلکہ کسی پیغمبر کو نہیں ہے: یونس (۱۵)۔ اس میں نہ تو نبی و رسول کی کسی خواہش کا دخل ہے: النجم (۳، ۴) اور نہ کسی شیطانی قوت کا: النمل (۲۱۰ تا ۲۱۲)۔ یہ قانون صحت و صداقت کے معیار پر کامل اترتا ہے بلکہ یہ عین صداقت ہے: البقرہ (۲)، السبا (۶)، الحاقہ (۵۱)، الاعراف (۵۲)، الفرقان (۶)، الکہف (۱)، الاسراء (۹)، الواقعہ (۹۵)۔ اس میں کوئی بات بے سر و پا یا گمان و اندازہ پر نہیں ہے: المائدہ (۴۸)، آل عمران (۳)، البقرہ (۱۷۶، ۲)۔ کسی قسم کا بطلان اس قانون میں موجود نہیں ہے: حٰم السجدہ (۴۲)۔ اس قانون کی ہر دفعہ صاف و واضح اور روشن ہے: ھود (۱)، البقرہ (۹۹، ۱۸۵)، آل عمران (۸۶)، المائدہ (۱۵، ۳۲)، النور (۱، ۳۴)، یوسف (۱)، الحجر (۱)، الشعراء (۲)، النمل (۱)، یٰسٓ (۶۹)، النساء (۱۷۴)، النحل (۸۹)۔ یہ قانون کائنات کے خالق و مالک اور حاکم و فرمانروا کی طرف سے بصورت محکم نازل ہوا ہے: آل عمران (۷)، ھود (۱۱)، اور اس کی طرف سے رہتی دنیا تک اس کی حفاظت کی ضمانت

دی گئی ہے: الحجر (۹)۔ یہی وہ اساسی قانون ہے جو خلافت و حکومت کی روح ہے اور جس سے حاکمیتِ الٰہی کے قوانین و ضوابط کا صاف اظہار ہوتا ہے۔ انسانیتِ عامہ کی صحیح رہنمائی: البقرہ (۱۸۵)، الزمر (۴۱)۔ انسانی زندگی کے اجتماعی نظم و ضبط کا انصاف پر قیام: الحدید (۲۵)۔ معاشرہ کی قانونی شیرازہ بندی اور اختلافات کو مٹانا: البقرہ (۲۱۳)، الشوریٰ (۱۰)۔ اس میں زندگی کے ہر اجتماعی رجحان کے لئے ایک قابلِ عمل ضابطہ موجود ہے: البقرہ (۲۱۳)، النساء (۱۰۵)، ابراہیم (۱)۔ یہ قانون پچھلے تمام سچے اور الہامی قوانین کا محافظ و جامع ہے: المائدہ (۴۸)، الانعام (۳۸) اور جو کچھ بھی اس قانون کے خلاف ہے وہ ہرگز قابلِ اتباع نہیں ہے: الاعراف (۳)۔ اس قانون کی رُو سے مقتدرِ اعلیٰ نے دراصل قانون اسلامی کی تمام اساسی دفعات کو طے کر دیا ہے۔ (۵۶) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: الجن (۲۰)، النحل (۳۶)، الانبیاء (۲۵، ۱۰۸) وغیرہ (۵۷) دیکھئے: التوبہ (۳۲)، الفتح (۲۸)، الصف (۹)، الحدید (۲۵)۔ (۵۸) کتابِ مقدس یعنی پرانا اور نیا عہد نامہ۔ پاکستان بائبل سوسائٹی۔ لاہور۔ ۱۹۵۹ء۔ نیا عہد نامہ، ص ۹ (متی ب ۶: ۱۰)۔ (۵۹) البقرہ (۱۲۷، ۱۲۹، ۱۵۱) آلِ عمران (۱۶۴)، الجمعہ (۲)۔ (۶۰) الاحزاب (۲۱)، آلِ عمران (۳۱، ۳۲)۔ (۶۱) النحل (۴۴، ۶۴)۔

(۶۲) النساء (۵۹، ۱۰۵)، الشوریٰ (۱۵)۔ (۶۳) النساء (۱۰۵)۔ (۶۴) النحل (۶۴)، النساء (۶۵)۔ سورۂ نساء کی اس آیت کے سببِ نزول میں محدثین نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ زبیر بن العوام کا کسی شخص سے جھگڑا ہو گیا۔ یہ مقدمہ رسول اللہؐ کے سامنے پیش ہوا تو رسول اللہؐ نے زبیر کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ اس پر اس شخص نے رسول اللہؐ سے کہا کہ انھوں نے زبیر کے حق میں اس لئے فیصلہ دے دیا ہے کہ وہ ان کا رشتہ کا بھائی ہے۔ اس موقع پر مذکورہ آیت نازل ہوئی۔ ملاحظہ ہو: الحمیدی، ابی بکر عبداللہ بن الزبیر۔ المسند۔ تحقیق۔ حبیب الرحمٰن الاعظمی۔ المجلس العلمی۔ کراچی ۱۹۶۳ء، ج ۲، ص ۱۴۴ (حدیث نمبر ۳۰۰) نیز امام احمد، ج ۴، ص ۱۳، ۱۴ (حدیث نمبر ۱۴۱۹)۔ (۶۵) الاعراف (۱۵۷)، الحشر (۷)۔

(۶۶) الانعام (۱۱۴، ۱۱۶)، یونس (۱۰۹)، الاحقاف (۹)، المومن (۶۶)، الشوریٰ (۱۰)، الزخرف (۴۳)۔

(۶۷) دیکھئے آیات (۱ تا ۳) مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: البخاری ج ۲ ص ۲۹، کتاب التفسیر۔ نیز دیکھئے ص ۹۹۰ کتاب الایمان والنذور۔ (۶۸) اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ قرآن نے ازواجِ نبوی کو برے اور اچھے کاموں پر عام عورتوں کے مقابلہ میں بالترتیب دوہرے عذاب اور دوہرے اجر کی بشارت سنائی ہے۔ ملاحظہ ہو: الاحزاب (۳۰، ۳۱)۔ (۶۹) الانعام (۱۴)۔ (۷۰) النحل (۹۱، ۹۲)۔ مزید یونس (۱۰۴)۔ (۷۱) ملاحظہ ہو: المائدہ (۴۴، ۴۵، ۴۷)۔ (۷۲) الاعراف (۱۴۳)، الانعام (۱۶۳)۔ (۷۳) اس کا تاریخی ثبوت بروایت ابنِ سعد یہ ہے کہ مرضِ وفات میں رسول اللہؐ فضل بن عباس کے سہارے مسجد نبوی میں داخل ہوئے اور اللہ کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا: "تم میں سے بعض کے حقوق مجھ سے وابستہ تھے۔ میں بھی ایک بشر ہوں اس لئے جس شخص کی آبرو کو میں نے کچھ نقصان پہنچایا ہو تو یہ میری آبرو موجود ہے اسے بدلہ لے لینا چاہیئے، جس شخص کے جسم کو میں نے کچھ تکلیف دی ہے تو یہ میرا جسم موجود ہے اسے بدلہ لے لینا چاہیئے۔ جس شخص کے مال کو میں نے کچھ نقصان پہنچایا ہو تو یہ میرا مال موجود ہے اسے لے لینا چاہیئے۔"

جان لو کہ تم میں سب سے زیادہ مجھ سے محبت کرنے والا وہ شخص ہوگا کہ ان حقوق میں سے اس کا کوئی حق ہو اور وہ اسے لے لے یا مجھے بری کر دے تاکہ میں اپنے رب سے اس حالت میں ملوں کہ میں اپنے کو بری کر چکا ہوں۔ کوئی شخص ہرگز یہ نہ کہے کہ مجھے انتقام لینے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عداوت و بغض کا اندیشہ تھا۔ کیونکہ یہ دونوں باتیں میری طبیعت میں نہیں ہیں۔ جس شخص کا نفس کسی بُری بات میں اس پر غالب آ گیا تو اسے بھی مجھ سے مدد لینا چاہیے کہ میں اس کے لئے دعا کروں گا" (ابن سعد ج ۲ ص ۲۵۵) ایک شخص کھڑا ہوا اور اس نے کہا کہ آپ کے پاس ایک سائل آیا تھا آپ نے مجھے حکم دیا تھا تو میں نے اسے تین درہم دے دئے تھے۔ فرمایا: سچ ہے اے فضل ان کو درہم دے دو۔" (ایضاً) ابن اثیر کے بیان کے مطابق ان باتوں کے علاوہ رسول اللہؐ نے یہ بھی کہا تھا کہ" جس کسی کی پشت پر میں نے کوڑا مارا ہو تو میری پشت حاضر ہے وہ آئے اور بدلہ لے۔ مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: ابن اثیر (ج ۲ ص ۳۱۹)۔ اسی طرح ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کچھ تقسیم فرما رہے تھے اتنے میں سامنے سے ایک شخص آ کر آپ کے اُوپر گر گیا۔ رسول اللہ کے دستِ مبارک میں چھڑی تھی، اس چھڑی سے آپ نے اسے ٹھوکا دیا۔ اتفاق سے چھڑی کا سرا اس کے منہ پر لگا اور خراش آ گئی۔ آپ نے اس سے فرمایا: آؤ مجھ سے بدلہ (قصاص) لے لو۔ اس نے عرض کیا: نہیں یا رسولؐ اللہ! میں نے معاف کر دیا ہے (ابوداؤد۔ سلیمان بن اشعث۔ سنن۔ اصح المطابع۔ کراچی ۱۳۶۹ھ، ج ۲، ص ۲۴۴ کتاب الدیات)۔ (۴۷) ابو یُوسف۔ قاضی۔ یعقوب بن ابراہیم۔ کتاب الخراج۔ المطبعۃ السلفیہ و مکتبہا۔ قاہرہ ۱۳۵۲ھ، ص ۱۱۵۔ (۷۵) الممتحنہ (۱۲)۔ (۷۶) البخاری، ج ۲، ص ۱۰۵۰۔ کتاب الاحکام۔ (۷۷) ایضاً ج ۲ ص ۱۰۵۷ کتاب الاحکام۔ (۷۸) امام ابوبکر جصاص نے آیت وشاورھم فی الامر کے تحت کہا ہے کہ ولابد من ان تکون مشاورۃ النبی ایام فیما لا نصّ فیہ اذ غیر جائز ان یشاورھم فی المنصوصات ...... الخ دیکھئے (جصاص۔ ابوبکر۔ احکام القرآن۔ مطبعۃ البہیۃ مصر۔ ۱۳۴۷ھ۔ ج ۲، ص ۵۰)۔ (۷۹) النساء (۸۰)۔ (۸۰) ملاحظہ ہو: النساء (۱۳، ۵۹، ۶۴، ۶۹)، النور (۵۲، ۵۴)، الاحزاب (۲۲، ۷۱)، الفتح (۱۷)، التوبہ (۷۱)، آل عمران (۳۲، ۱۳۲)، المائدہ (۹۲)، الانفال (۱، ۲۰، ۴۶)، محمد (۳۳)، المجادلہ (۱۳)، التغابن (۱۲، ۱۶)۔ (۸۱) دیکھئے: الشوریٰ (۱۰)، البقرہ (۲۱۳)، النحل (۶۴)، النساء (۵۹، ۶۰، ۶۵)۔ (۸۲) الحشر (۷)۔ (۸۳) مثلاً دیکھئے: التوبہ (۴۳)، عبس (۱ تا ۱۰)۔ (۸۴) الشوریٰ (۱۵)۔ (۸۵) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: ابنِ ہشام ج ۳ ص ۳۳۱۔ (۸۶) تفصیل کے لئے دیکھئے: ابنِ ہشام ج ۴ ص ۱۴۲۔ (۸۷) ابنِ ہشام: ج ۲، ص ۲۷۲۔ مزید حوالے کے لئے دیکھئے: ابن عربی۔ احکام القرآن۔ دار احیاء الکتب العربیہ۔ مصر ۱۹۵۷ء۔ ج ۱، ص ۲۹۹۔ (۸۸) آل عمران (۱۵۹)۔ (۸۹) الشوریٰ (۳۸)۔ (۹۰) النمل (۲۹ تا ۳۵)۔ (۹۱) پانی پتی، محمد ثناء اللہ قاضی، تفسیر المظہری۔ مجلس اشاعۃ العلوم۔ دکن۔ ج ۲ ص ۱۶۱۔ بحوالہ البغوی۔ (۹۲) الترمذی۔ ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ جامع۔ امین کمپنی۔ دہلی۔ ۱۳۷۷ھ۔ ج ۱، ص ۲۰۴۔ ابواب فضائل الجہاد۔ (۹۳) ابنِ ہشام ج ۲، ص ۱۵۴ تا ۱۶۱۔ (۹۴) ایضاً۔ ص ۲۶۷۔ نیز دیکھئے: ابن کثیر التفسیر، ج ۲، ص ۱۴۲۔ (۹۵) طبری ج ۲ ص ۴۷۶۔ (۹۶) ابنِ ہشام

ج ۳، ص ۶۷، ۶۸ - (۹۷) طبری، ج ۲، ص ۵۶۶ - مزید شوریٰ یہ بھی ہوا کہ جب رسول اللہ نے مدینہ کی ⅓ کھجوروں پر اتحادیوں سے مصالحت کا ارادہ کیا تو سعد بن معاذ اور سعد بن عبادہ نے مخالفت کی۔ چنانچہ اس تجویز کو رسول اللہ نے ترک کر دیا (ابن کثیر، تفسیر، ج ۲، ص ۱۴۲)۔ (۹۸) ابن ہشام، ج ۳، ص ۳۱۲، ۳۱۳ - (۹۹) ابو یوسف؛ ص ۲۰۸، نیز البخاری: ج ۲ ص ۶۰۰ (کتاب المغازی) - (۱۰۰) طبری ج ۳ ص ۸۶، ۸۷ (۱۰۱) غازی، حامد الانصاری - اسلام کا نظام حکومت۔ ندوۃ المصنفین - دہلی - ۱۹۴۳ء، ص ۴۲۸ - (۱۰۲) آل عمران (۱۵۹) - (۱۰۳) ابن کثیر - تفسیر - ج ۲ - ص ۱۴۳ - (۱۰۴) جصاص، ج ۲، ص ۲۵۰ - شوریٰ کے سلسلہ میں مزید ملاحظہ ہو: راغب الاصفہانی - الذریعۃ الیٰ مکارم الشریعۃ - المطبعۃ الحیدریہ - نجف - ۱۹۶۷ء - ص ۱۶۳، ۱۶۴ - (۱۰۵) الخلیب العمری - ص ۳۲۰ - اس حدیث کو بخاری اور مسلم دونوں نے روایت کیا ہے لیکن الفاظ کا معمولی سا فرق ہے۔ چنانچہ بخاری کے الفاظ یہ ہیں: انا لا نولی ھذا من سالہ ولا من حرص علیہ (ج ۲ ص ۱۰۵۸ کتاب الاحکام)۔ (۱۰۶) ابو داؤد - ج ۲ ص ۴۰۶ کتاب الخراج والفئ والامارہ - (۱۰۷) البخاری - ج ۲ ص ۱۰۵۸ کتاب الایمان والنذور - (۱۰۸) ابو یوسف: ص ۹ - نیز دیکھئے: الخلیب العمری، ص ۳۲۰ - (۱۰۹) النساء (۵۸) - (۱۱۰) ابن تیمیہ - السیاسۃ الشرعیۃ فی اصلاح الراعی والرعیۃ - مکتبہ انصار السنۃ المحمدیہ - مطبعہ دار الجہاد - قاہرہ - ۱۹۶۱ء - ص ۱۰ - (۱۱۱) ایضاً، ص ۱۰ - (۱۱۲) الانفال (۲۷) - (۱۱۳) الحجرات (۱۳) - (۱۱۴) معقل بن یسار سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ نے فرمایا کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے کچھ لوگوں کا راعی (حاکم) بنایا اور وہ اس حال میں مرا کہ اس نے لوگوں کی بد خواہی کی ہے تو اللہ اس پر جنت حرام کر دے گا (الخلیب العمری، ص ۳۲) ان ہی سے دوسری روایت یہ ہے "جو شخص مسلمانوں کے معاملات کا ذمہ دار بنایا جائے پھر نہ تو وہ ان کے لئے کوشش کرے اور نہ ان کی خیر خواہی کرے تو وہ جنت کی خوشبو تک نہ پا سکے گا (ایضاً)

(۱۱۵) تفصیلات کے مطابق ان حضرات میں سب سے زیادہ شرفِ نیابت حضرت ابن ام مکتوم کو حاصل ہوا۔ رسول اللہ نے انہیں غزوۂ بدر عظمیٰ (ابنِ ہشام: ج ۲، ص ۲۶۳)، غزوۂ نجران (ایضاً ص ۵۰)، غزوۂ اُحد (ایضاً ج ۳، ص ۶۸)، غزوۂ خندق (ایضاً ص ۲۳۱)، غزوۂ بنی قریظہ (ایضاً ص ۲۴۵)، غزوہ بنی لحیان (ایضاً ص ۲۹۲) اور غزوہ ذی قرد (ایضاً ص ۲۹۰) کے مواقع پر مدینہ سے روانگی اور دار الحکومت سے عدم موجودگی کی صورت میں متعین فرمایا تھا۔ مزید تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو: ابنِ ہشام، ج ۲ (ص ۲۴۸، ۲۵۱ اور ۲۶۳) ج ۳ (ص ۴۶، ۴۸، ۴۹، ۵۲، ۲۲۰، ۲۲۴، ۳۰۲، ۳۲۱، ۳۴۲) ج ۴ (ص ۱۲، ۴۲، ۱۶۳، ۲۴۸) وغیرہ۔ یہاں یہ وضاحت بے جا نہ ہوگی کہ رسول اللہ نے سب سے پہلے حضرت سعد بن عبادہ کو اپنا قائم مقام اس وقت مقرر فرمایا جبکہ آپ صفر ۲ھ میں غزوۂ ودّان یا ابواء کے لئے تشریف لے گئے تھے۔ ملاحظہ ہو: ابنِ سعد، طبقات، ج ۲ ص ۸ - (۱۱۶) دیکھئے: ابنِ ہشام ج ۳ ص ۳۲۱ اور ج ۴ ص ۱۲ و ۲۴۸ - (۱۱۷) اصحابِ سیر میں سے متقدمین نے اکثر مشہور و معروف کاتبانِ وحی کے ذکر پر اکتفا کیا ہے جبکہ ابن سید الناس نے اپنی کتاب عیون الاثر فی فنون المغازی والشمائل والسیر میں ان حضرات کی مکمل فہرست قلمبند کر دی ہے۔

طوالت کے خوف سے ہم بھی ناموں کی تفصیل حذف کرتے ہیں۔ حوالے کے لئے ملاحظہ ہو (ج ۲ ص ۳۱۵ تا ۳۱۷) مورخین کی تصریحات کے مطابق قریش میں سے سب سے پہلے حضرت عبداللہ بن ابی السرح العامری نے کتابتِ وحی کی خدمت انجام دی، جبکہ مدینہ میں سب سے پہلے حضرت ابی بن کعب کو یہ شرف حاصل ہوا (الحلبی۔ علی بن برہان الدین۔ السیرۃ الحلبیہ۔ التجاریہ۔ قاہرہ۔ ۱۹۶۲ء، ج ۳، ص ۳۶۴۔ مزید حوالے کے لئے دیکھئے: زرقانی، ج ۳ ص ۳۲۶)۔(۱۱۸) حضرت عبداللہ بن مسعود اس خدمت پر مامور تھے۔ وُہ آپ کی مسواک، جوتوں اور لباس کی دیکھ بھال کرتے تھے اور آپ کے آگے عصا لے کر چلتے تھے۔ الحلبی۔ ج ۳ ص ۳۶۲۔(۱۱۹) اس کے منتظم عقبہ بن عامر تھے (ایضاً ص ۳۶۳)۔ (۱۲۰) منتظم سواری اسقع بن شریک تھے (ایضاً)۔(۱۲۱) حضرت حذیفہ بن الیمان "صاحب السر" کی حیثیت سے مشہور تھے (ابن عبدالبر۔ ج ۱۔ ص ۱۰۴) صاحب السر کی توجیہہ قدیم مآخذ میں نہیں ملتی۔ البتہ خطیب نے بیان کیا ہے کہ "الذی لم یکن یعلمه غیرہ (الخطیب البغدادی۔ تاریخ بغداد او مدینۃ السلام۔ دار الکتاب العربی۔ بیروت۔ ج ۱۔ ص ۱۶۲) اس کی مزید صراحت کے لئے دیکھئے: کتانی (ج ۱ ص ۲۰) یہاں یہ بتا دینا بے محل نہ ہوگا کہ زرقانی نے حضرت عثمان کے بارے میں وضاحت کی ہے کہ وُہ رسول اللہؐ کے "کاتب السر" تھے۔ یعنی ان امور کے لکھنے پر مامور تھے جن کو لوگوں سے مخفی رکھنا چاہتے تھے (زرقانی ج ۳ ص ۳۱۶)۔(۱۲۲) ابن عبدالبر، ج ۱، ص ۱۰۵۔ مزید حوالے کے لئے: ابنِ حجر العسقلانی۔ احمد بن علی بن محمد۔ الاصابہ فی تمییز الصحابہ۔ المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ۔ مصر۔ ۱۹۳۹ء، ج ۱، ص ۳۵۹۔(۱۲۳) الصعیدی ص ۲۳۶۔(۱۲۴) مسعودی ابی الحسن علی بن الحسین۔ التنبیہ والاشراف۔ مکتبۃ المثنیٰ۔ بغداد۔ ۱۹۳۸ء۔ ص ۲۴۶۔(۱۲۵) ابن عبدالبر۔ ج ۱۔ ص ۱۰۵۔ نیز دیکھئے: النووی۔ تہذیب الاسماء واللغات۔ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ۔ مصر (ج ۲ ص ۱۰۸)۔ اس منصب پر حنظلہ بن الربیع فائز تھے۔ بعض اوقات جب مہر موجود نہ ہوتی تو رسول اللہؐ اپنے ناخن سے ہی مہر لگایا کرتے تھے (کتانی۔ ج ۱۔ ص ۱۷۹)۔(۱۲۶) طبری۔ ج ۳۔ ص ۱۷۱۔ یہ فرائض رسول اللہؐ کے ایک مولیٰ انسہ کے ذمہ تھے۔ ابنِ سعد کی تصریح کے مطابق رسول اللہؐ بعد ظہر اپنے پاس آنے کی عام اجازت دیتے تھے اور یہی سنّت ہے (ابن سعد، ج ۳، ص ۴۹)۔ (۱۲۷) مسعودی، ص ۲۴۵ و ۲۴۶۔ بعض مورخین نے لکھا ہے کہ حضرت معاویہ اور زید بن ثابت بطور خاص کتابت کے لئے رکھے گئے تھے۔ جو رسول اللہؐ کے سامنے وحی اور دیگر اشیاء کو تحریر کرتے تھے اور اس کے علاوہ انھیں کوئی کام یا مشغولیت نہ تھی۔ دیکھئے: ابنِ حزم (جوامع السیرۃ) ص ۲۷۔ نیز الحلبی ج ۳ ص ۳۶۴۔(۱۲۸) الحلبی، ج ۳، ص ۳۶۵۔ (اس کے افسر حضرت بلال تھے)(۱۲۹) ایضاً۔ (حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اور ابو اسید بن الساعدی اس خدمت کو انجام دیتے تھے)۔(۱۳۰) ابن سید الناس، ج ۲، ص ۳۱۷ (حضرت علی، زبیر، مقداد، محمد بن مسلمہ اور عاصم بن ثابت بارگاہِ رسالت کے جلّاد تھے)۔(۱۳۱) ایضاً۔ ص ۳۱۶، ۳۱۷ (افسران یہ تھے: سعد بن معاذ، محمد بن مسلمہ، زبیر بن العوام، ابو ایوب الانصاری)۔(۱۳۲) کتانی۔ ج ۱۔ ص ۲۹۰، ۲۹۱۔(۱۳۳) رسول اللہؐ نے مردم شماری بھی کرائی تھی۔ دیکھئے: البخاری، ج ۱، ص ۳۰۴۔ کتاب الجہاد۔(۱۳۴) مثلاً جب عمرو بن حزم کو یمن کا گورنر بنا کر

بھیجا گیا تو ان کو تحریری ہدایت نامہ (INSTRUMENT OF INSTRUCTIONS) بھی دیا گیا تھا۔ ملاحظہ ہو: ابنِ ہشام، ج ۴ ص ۲۴۱ - نیز طبری ج ۳ ص ۱۲۸، ۱۲۹ - (۱۳۵) بقول مسعودی ان امور کے نگران اور اس شعبہ کے سکریٹری حضرت عبداللہ بن ارقم تھے۔ مسعودی، ص ۲۴۵ - (۱۳۶) مسعودی - ص ۲۴۵، ۲۴۶ - اور دیکھئے کتانی: ج ۱، ص ۱۲۰ و ۱۲۴ - (۱۳۷) خدمت حضرت معاویہ کے سپرد تھی۔ ملاحظہ ہو: زرقانی، ج ۳، ص ۳۲۲ - نیز دیکھئے: کتانی ج ۱ ص ۱۲۱ -

(۱۳۸) مثلاً تبوک کے موقع پر ایک وفد آیا۔ مالک بن احمر نے اسلام قبول کیا اور ایک تحریر کی درخواست کی۔ چنانچہ چمڑے کے ایک ٹکڑے پر لکھ کر دے دی گئی۔ (کتانی: ج ۱ ص ۱۲۲)۔ (۱۳۹) کتانی: ص ۱۲۳ - (۱۴۰) ایضاً - ص ۱۲۴ -

(۱۴۱) الحج (۴۱) - (۱۴۲) التوبہ (۱۲۳) - (۱۴۳) البخاری - ج ۲ - ص ۱۰۶۴ اور ۱۰۶۸ وغیرہ۔ کتانی نے بھی اس واقعہ کو محاسبہ کے تحت ہی نقل کیا ہے۔ دیکھئے (ج ۱ ص ۲۳۷)۔ (۱۴۴) البخاری - ج ۲ - ص ۱۰۶۳ - کتاب الاحکام - (۱۴۵) الترمذی - ج ۱ - ص ۱۵۹ - (ابواب الاحکام) ابن عبدالبر، ج ۱، ص ۲۳۸ - (تذکرہ معاذ بن جبل) - (۱۴۶) ہم پہلے بھی عمرو بن حزم کے سلسلہ میں رسول اللہؐ کے تحریری فرمان کا ذکر کر چکے ہیں۔ ملاحظہ ہو: حوالہ سابق نمبر ۱۳۴ - (۱۴۷) اس کی تصریح تاریخ کے اہم ماخذ میں ہمیں نہیں مل سکی البتہ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے ایک مضمون میں ان باتوں کی تفصیل ہے مگر حوالہ مذکور نہیں۔ ملاحظہ ہو: DR. HAMIDULLAH, THE GOVERMENT OF THE HOLY PROPHET, II THE ISLAMIC REVIEW WOKING, ENGLAND, JUNE 1942, NO.6, VOL.XXX, P.282.

(۱۴۸) رسول اللہؐ کا ارشاد ہے کہ التاجر الصدوق الامین مع النبیین والصدیقین والشہداء (الدارمی، ابو محمد عبداللہ بن عبدالرحمٰن - سنن - مطبع النظام کانپور، ۱۲۹۳ھ ص ۳۳۸) مزید ملاحظہ ہو: ابن ماجہ - القزوینی - محمد بن یزید ابی عبداللہ - سنن المصطفیٰ (ومعہ حاشیہ السندی) المطبعۃ التازیہ - مصر - ج ۲ - ص ۲ (ابواب التجارت)۔ (۱۴۹) احادیث میں بڑی تفصیل سے یہ تمام ہدایات مذکور ہیں۔ طوالت کے خوف سے ہم یہاں نقل کرنا مناسب نہیں سمجھتے۔ البتہ بطور مثال ملاحظہ ہو: البخاری، ج ۱ ص ۲۷۸ تا ۲۸۰ (کتاب البیوع) اور ص ۳۶۷ (کتاب الشہادات)۔ مسلم بن الحجاج بن مسلم القشیری۔ الصحیح۔ اصح المطابع - دہلی - ۱۳۴۹ھ، ج ۱ ص ۷۰ (کتاب الایمان) ابو داؤد، ج ۲ ص ۵۰۷ اور الخطیب العمری، ص ۲۴۱ وغیرہ وغیرہ - (۱۵۰) مسلم - ج ۱ - ص ۷۰ (کتاب الایمان) - (۱۵۱) قرآن کے حوالہ کے لئے ملاحظہ ہو: الانعام (۱۵۲)، الاعراف (۸۵)، ھود (۸۴، ۸۵)، الاسراء (۳۵)، الشعراء (۱۸۱)، الرحمٰن (۸، ۹)، المطففین (۱ تا ۳) اور حدیث کے حوالے کے لئے دیکھئے: البخاری ج ۱، ص ۲۸۵، ۲۸۶ (کتاب البیوع) -

(۱۵۲) دیکھئے: کتانی ج ۱ ص ۲۸۴ - (۱۵۳) چنانچہ بعد فتح سوق مکہ کے نگران سعد بن سعید بن العاص اور سوق مدینہ کے نگران و محتسب عمر بن الخطاب تھے (الحلبی ج ۳ ص ۳۶۵) - (۱۵۴) کتانی نے سمراء بنت نہیک الاسدیہ کے بارے میں اسی طرح کا احوال لکھا ہے۔ ملاحظہ ہو: ج ۱ ص ۲۸۵ - (۱۵۵) یہ افسر حضرت بلال تھے

(ابنِ حزم ص ۲۷)۔ اس منصب پر حضرت بلال رسول اللہؐ کے وصال مبارک تک فائز رہے (ابو داؤد، ج ۲ ص ۳۳۴، کتاب الخراج والفئی والامارہ)۔(۱۵۶) کتانی نے لکھا ہے کہ "ان النبی اذا قدم علیہ الوفد لبس احسن ثیابہ وامر اصحابہ بذلک مزابتہ وفد علیہ وفد کندہ وعلیہ حلّۃ یمانیہ وعلی ابی بکر و عمر مثلہ (ج ۱ ص ۴۵۲)۔
(۱۵۷) مثلاً وفد طائف کو مسجد نبوی میں اتارا گیا تھا (شبلی ج ۲ ص ۶۴) نیز وفد نجران کو بھی مسجد نبوی ہی میں ٹھہرایا گیا تھا (ابنِ قیم: زاد المعاد، ج ۳، ص ۳۸)۔ (۱۵۸) وفد ثقیف کے آنے پر ایسا ہی ہُوا۔ تفصیل ملاحظہ ہو: کتانی ج ۱، ص ۴۴۸۔ (۱۵۹) کتانی، ج ۱، ص ۴۵۱۔ (۱۶۰) البخاری ج ۱ ص ۴۹۴ (کتاب الجہاد) مزید حوالے کے لئے دیکھئے: ابو داؤد، ج ۲، ص ۴۹ (کتاب الخراج والفئی) اور کتانی ج ۱ ص ۴۵۱۔ (۱۶۱) ابو داؤد ج ۲ ص ۳۳۴ (کتاب الخراج والفئی)۔
(۱۶۲) ایضاً ص ۴۴۴۔ (۱۶۳) بلاذری (فتوح) ص ۶۶۔ (۱۶۴) ایضاً۔ (۱۶۵) البخاری ج ۲ ص ۴۴۸ (کتاب المرضیٰ) نیز الخطیب العمری ص ۱۳۳۔ (۱۶۶) البخاری ج ۲ ص ۸۴۴، ۸۴۶ (کتاب المرضیٰ)۔ (۱۶۷) ایضاً ص ۸۴۵ (کتاب المرضیٰ)۔ (۱۶۸) ایضاً ص ۸۴۴ (کتاب المرضیٰ) خصوصاً ملاحظہ ہو: باب عیادۃ الصبیان، باب عیادۃ الاعراب اور باب عیادۃ المشرک)۔ (۱۶۹) احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہؐ نے مسلمانوں کو کبھی ان باتوں کے اختیار کرنے کا بطور معمول روزمرہ حکم دیا تھا۔ مثلاً دیکھئے: البخاری (ج ۱ ص ۳۳۱، ابواب المظالم والقصاص) اور متعدد احادیث میں ان باتوں کو ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر حقوق میں شمار کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو: الخطیب العمری (ص ۱۳۳، باب عیادۃ المریض وثواب المریض)۔ (۱۷۰) ایک حدیث میں رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا ہے کہ الخلق عیال اللہ فاحب الخلق الی اللہ من احسن الی عیالہ (ساری مخلوق اللہ کی عیال ہے تو مخلوق میں سب سے زیادہ اللہ کو محبوب وُہ ہے جو اللہ کی عیال سے اچھا سلوک کرتا ہے)۔ ملاحظہ ہو: الخطیب العمری ص ۴۲۵ (باب الشفقۃ والرحمۃ)۔
(۱۷۱) محدثین اور اصحابِ سیر نے یہ صراحت سے بیان کیا ہے کہ عہدِ رسالت میں قیس بن سعد بن عبادہ "صاحب الشرطہ" کی حیثیت رکھتے تھے۔ دیکھئے: الخطیب العمری ص ۳۲۱ (کتاب الامارہ والقضاء) نیز کتانی ج ۱ ص ۱۴۔ (۱۷۲) امام بخاری نے لکھا ہے: ولقد فزع اھل المدینہ ذات لیلہ فانطلق الناس قبل الصوت فاستقبلھم النبی صلی اللہ علیہ وسلم قد سبق الناس الی الصوت وھو یقول لم تراعوا لم تراعوا۔ وھو علی فرس لابی طلحہ عربی ما علیہ سرج وفی عنقہ سیف فقال لقد وجدتہ بحراً او انہ لبحر (البخاری ج ۲ ص ۹۱۸ کتاب الادب)
(۱۷۳) کتانی ج ۱ ص ۲۹۲، ۲۹۳۔ (۱۷۴) الحجرات (۱۲)۔ (۱۷۵) کتانی ج ۱ ص ۳۶۱۔ (۱۷۶) مثالوں کے لئے: ایضاً ص ۳۶۱، ۳۶۲۔ (۱۷۷) ایضاً ص ۳۶۲۔ (۱۷۸) ایضاً ص ۳۰۰۔ (۱۷۹) ایضاً ص ۲۹۵۔ (۱۸۰) ایضاً۔ (۱۸۱) ایضاً ص ۲۹۵ اور ۳۰۰۔ (۱۸۲) ایضاً ص ۲۹۵۔ (۱۸۳) ایضاً ص ۳۱۲، ۳۱۳۔ (۱۸۴) ایضاً، ص ۳۱۳۔ (۱۸۵) عبداللہ بن ارقم کا نام پہلے عبد یغوث تھا۔ فتح مکّہ کے دن ایمان لائے۔ رسول اللہ کے لئے ملوک و امرا اور دوسرے لوگوں کو خطوط لکھنے پر مامور ہُوئے۔ اس سلسلے میں ان کی امانت اس درجہ قابلِ اعتماد تھی کہ رسول اللہؐ کے حکم سے

خط کا جواب لکھ کر اس پر مُہر ثبت کر کے روانہ کر دیتے تھے اور رسول اللہؐ ان کے جواب کو سننے کی ضرورت نہیں سمجھتے تھے۔ اسی لئے آپ نے یہ صداقت نامہ حضرت عبداللہ کو دے دیا تھا کہ" اصبت بما کتبت (تم نے جو کچھ لکھا ٹھیک تھا) رسول اللہؐ کے بعد حضرت ابوبکر کے دور میں بھی عبداللہؓ بن ارقم اسی منصب پر فائز رہے۔ پھر حضرت عمرؓ نے اپنے دورِ خلافت میں ان کو بیت المال کا نگران بنایا۔ پھر حضرت عثمان نے بھی انھیں اسی عہدہ پر برقرار رکھا لیکن بعد میں مستعفی ہو گئے۔ حضرت عثمان نے خدمات کے صلہ میں ان کو تیس ہزار کی رقم پیش کی تو عبداللہ بن ارقم نے یہ کہہ کر واپس کر دی کہ" میں نے تو اللہؐ کی رضا کی خاطر یہ خدمت انجام دی تھی"۔ ایک روایت کے مطابق ان کا انتقال حضرت عثمان کے دور میں ہوا (زرقانی ج ۳ ص ۳۱۹) ۔(۱۸۶) ابن عبدالبر۔ ج ۱، ص ۳۳۶۔ نیز زرقانی ج ۳ ص ۳۱۹ (۱۸۷) حضرت زید بن ثابت کا پورا نام و نسب یہ ہے: زید بن ثابت بن الضحاک بن زید بن لوذان بن عمرو بن عبد عوف بن غنم بن مالک بن النجار الانصاری الخزرجی النجاری (زرقانی ج ۳ ص ۲۲۲) ان کی کنیت ابوسعید یا ابوعبدالرحمٰن اور لقب کاتب الوحی و المصحف تھا (نووی ج ۱ ص ۲۰۰)۔

حضرت زید نے حضرت مصعب بن عمیر کی دعوت پر اسلام قبول کیا۔ اس وقت ان کی عمر ۱۱ برس تھی اور اسی زمانے میں رسول اللہؐ بھی مکہ سے مدینہ تشریف لائے تھے۔ انتہائی صغر سنی سے ہی اسلام، قرآن اور کتابت سے انتہائی شغف رکھتے تھے اور ان کی غیر معمولی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے ہی رسول اللہؐ نے ان سے لکھنے پڑھنے میں مزید مہارت پیدا کرنے کو کہا تھا۔ غالباً سب سے پہلے غزوۂ احزاب میں شرکت کی جبکہ ان کی عمر ۱۶ برس کی تھی (ابن حجر العسقلانی، ج ۱، ص ۵۴۳) پھر اس کے بعد تمام غزوات میں شریک رہے۔

اسلام کے لئے حضرت زید کی خدمات کی فہرست طویل ہے لیکن ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ (جیسا کہ ان کے لقب سے بھی ظاہر ہے) ممتاز کاتبِ وحی بلکہ کاتبانِ وحی کے سردار تھے اور حضرت ابوبکر کے دور میں قرآن کو مدون کرنے کا شرف بھی ان ہی کو حاصل ہے (السیوطی۔ جلال الدین۔ الاتقان فی علوم القرآن مصطفی البابی۔ مصر ۱۹۵۱ء، ج ۱، ص ۵۰، ۵۸) اپنے علوم و فضل کی بنا پر مسعود بن مخرمہ ان کا ذکر ان چھ اشخاص میں کرتے ہیں جن پر اصحابِ رسول کے علم کی انتہا ہے (ابنِ سعد، ج ۱، ص ۳۵۱) قرآن و حدیث میں مہارت کے ساتھ ساتھ فقہ میں بھی اجتہادی درجہ رکھتے تھے اور ان کا شمار ان حضرات میں ہوتا تھا جو رسول اللہؐ کے عہد مبارک میں فتویٰ دیتے تھے (ابن سعد، ج ۲، ص ۳۵۱) فقیہہ و مفتی کی حیثیت سے حضرت زید نے اپنی زندگی میں جس قدر فتاویٰ جاری کئے ان کے بارے میں ابنِ قیم کا بیان ہے کہ" اگر ان سب کو الگ جگہ جمع کیا جائے تو کئی ضخیم جلدیں تیار ہو سکتی ہیں (ابن قیم۔ اعلام الموقعین۔ مطبعۃ السعادۃ ۱۹۵۵ء ج ۱ ص ۱۲) حضرت زید بن ثابت کی دلچسپی کا اصل میدان "فرائض" کا فن تھا۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ رسول اللہؐ خود فرماتے تھے کہ افرض امتی زید بن ثابت (ابن سعد، ج ۲، ص ۳۵۹) یعنی میری اُمت کے سب سے بڑے فرائض دان زید ہیں۔ حضرت زید نے رسول اللہؐ کے حکم کی تعمیل میں عبرانی اور سریانی زبانیں بھی سیکھ لی تھیں اور ذہانت و فطانت کا عالم یہ تھا کہ پندرہ دن کی مدت میں ہی استعداد بہم پہنچالی تھی اور توراۃ و انجیل کی زبانوں کے عالم بن گئے تھے۔

مسعودی کے بیان کے مطابق آپ کا کام یہ تھا کہ بادشاہوں اور امراء کو رسول اللہ کی طرف سے جواب لکھیں۔ وقت ضرورت آپ رسول اللہ کی ترجمانی کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ اور بقول مسعودی فارسی، رومی، قبطی اور حبشی زبانوں میں گفتگو کر سکتے تھے (مسعودی ص ۲۴۶)۔ رسول اللہ کے بعد حضرت ابوبکر و عمر کی خلافتوں میں حضرت زید مختلف اہم مناصب پر فائز رہے اور بالآخر مشہور روایت کے مطابق ۴۵ھ میں اور بعض روایات کے مطابق ۴۲ھ یا ۵۵ھ میں مدینہ میں وفات پائی (الاصابہ ج ۱ ص ۵۴۴)۔(۱۸۸) ابن عبدالبر، ج ۱، ص ۳۳۶، ۳۳۷۔ نیز دیکھئے ابن حجر العسقلانی ج ۱ ص ۵۴۳۔(۱۸۹) ابن عبدالبر، ج ۱، ص ۳۳۷۔ (۱۹۰) ابن سعد، ج ۲ ص ۳۵۸۔(۱۹۱) ایضاً ص ۳۵۹۔ (۱۹۲) ابن سعد کے بیان کے مطابق یہ سفارتیں نجاشی (ج ۱ ص ۲۵۰) قیصر روم (ایضاً ص ۲۵۹) کسریٰ (ایضاً) اور منقوس (ایضاً ص ۲۶۰) وغیرہ کو روانہ کی گئی تھیں۔(۱۹۳) ابن ہشام ج ۴ ص ۲۵۵۔(۱۹۴) ان سفارتوں میں سے چند سفارتیں قابل ذکر ہیں مثلاً سفارت بنی ثقیف (ابن سعد ج ۱ ص ۳۱۲) سفارت بنی تمیم (ایضاً ص ۲۹۳) سفارت عامر بن صعصعہ (ایضاً ص ۳۱۰) سفارت بنی سعد (ایضاً ص ۲۹۹) سفارت عبدالقیس (ایضاً ص ۳۱۴) سفارت بنی حنیفہ (ایضاً ص ۳۱۶) سفارت بنی طے (ایضاً ص ۳۲۱) سفارت بنی زبید (ایضاً ص ۳۲۸) سفارت بنی کندہ (ایضاً) سفارت شاہان حمیر (ایضاً ص ۳۶۵) سفارت ازد (ایضاً ص ۳۳۷) اور سفارت ہمدان (ایضاً ص ۳۴۰) وغیرہ۔(۱۹۵) ابن سعد ج ۱ ص ۲۶۲ (بسلسلہ فروہ بن عمرو الجذامی)۔(۱۹۶) کتانی ج ۱ ص ۱۹۰۔(۱۹۷) ایضاً ص ۱۹۵۔(۱۹۸) ترجمانی کے فرائض اکثر حضرت زید بن ثابت انجام دیتے اور رسول اللہ کی طرف سے جواب دینے والے خطیب حضرت ثابت بن قیس تھے۔ ملاحظہ ہو: البخاری ج ۲ ص ۱۰۶۸ (کتاب الاحکام)، ابن حزم، ص ۲۸۔ اور کتانی ج ۱ ص ۲۰۲۔(۱۹۹) تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو: ڈاکٹر حمیداللہ (الوثائق السیاسیہ) ص ۱۴، ۳۶، ۸۰ تا ۸۲، ۸۵ تا ۹۶، ۱۴۲، ۱۵۹، ۱۶۹، ۱۷۰۔ (۲۰۰) ایضاً۔(۲۰۱) الحج (۴۱)۔(۲۰۲) دیکھئے: البقرہ (۲۹، ۱۶۸)، الاعراف (۱۰، ۳۱، ۱۵۷)، الرعد (۳)، ابراہیم (۳۲ تا ۳۴)، النحل (۱۱۶)، الاسراء (۳۰)، الحدید (۲۵) اور الملک (۱۵) وغیرہ وغیرہ۔(۲۰۳) ملاحظہ ہو: البقرہ (۱۷۷، ۱۸۸، ۲۶۲ تا ۲۶۴، ۲۷۸، ۲۸۰ تا ۲۸۳)، النساء (۱۰، ۲۹، ۳۶ تا ۳۸)، المائدہ (۳۳، ۸۸)، الاسراء (۲۶، ۲۷)، المطففین (۱ تا ۳)، الہمزہ (۱ تا ۴) وغیرہ وغیرہ۔(۲۰۴) البقرہ (۲۵)، الاعراف (۳۲)۔ (۲۰۵) النساء (۲، ۴، ۷، ۱۰، ۲۴، ۲۰، ۳۶ تا ۳۸، ۵، ۶)، البقرہ (۲۷۵، ۲۷۹، ۲۶۱، ۱۸۸، ۲۷۸ تا ۲۸۰، ۲۱۹، ۱۷۷، ۱۸۰، ۲۷۳، ۲۶۲ تا ۲۶۷)، المائدہ (۳۳، ۳۸، ۸۹)، الانعام (۱۴۱)، الاعراف (۳۱)، التوبہ (۳۴، ۱۰۳)، آل عمران (۹۲، ۱۶۱، ۱۸۰)، الاسراء (۲۹)، الفرقان (۶۷)، النور (۲۷، ۳۲)، یٰسٓ (۷۱)، الذاریات (۱۹) اور الدہر (۸، ۹) وغیرہ۔(۲۰۶) النساء (۴، ۷ تا ۱۲، ۲۰، ۳۲، ۱۷۶)۔(۲۰۷) الاعراف (۳۱، ۳۲)، الحدید (۲۵)۔(۲۰۸) البقرہ (۱۷۷، ۲۷۳، ۲۷۵)، آل عمران (۱۸۰)، النساء (۳۶ تا ۳۸)، المائدہ (۸۹)، الانعام (۱۴۱)، التوبہ (۳۴، ۶۰، ۱۰۳)، النور (۳۳)،

التغابن (۱۶)، المجادلہ (۳، ۴)، المعارج (۲۴، ۲۵)، الدھر (۸، ۹)، التکاثر (۱ تا ۳)۔ (۲۰۹) الصعیدی، ص ۲۳۶۔ یہ ذمہ داری حضرت حذیفہ بن الیمان کے سپرد تھی۔ مسعودی کی تصریح کے مطابق یہ حجاز کی آمدنی کا تخمینہ بھی لگاتے تھے (مسعودی ص ۲۴۵)۔ (۲۱۰) یہ کام معیقیب بن ابی فاطمہ کرتے تھے (مسعودی ص ۲۴۵، ۲۴۶)۔ (۲۱۱) زبیر بن العوام اور الجہم بن الصلت اس شعبہ کے افسران تھے (ایضاً، ص ۲۴۵)۔ (۲۱۲) مثلاً بدر کے دن صاحب المغانم عبداللہ بن کعب تھے (کتانی ج ۱ ص ۳۸۰)۔ (۲۱۳) ایضاً ص ۳۸۲۔ (۲۱۴) ایضاً ص ۳۹۲۔ (۲۱۵) ایضاً ص ۳۹۲۔ (۲۱۶) ایضاً ص ۳۹۳۔ (۲۱۷) یعنی اندازہ اور تخمینہ لگانے والے (ایضاً ص ۳۹۹)۔ (۲۱۸) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو یوسف الدین، ج ۲ ص ۵۹۳۔ (۲۱۹) ابن ہشام ج ۲ ص ۲۵۴ نیز ابن سعد ج ۲ ص ۱۱۔ (۲۲۰) تفصیل کے لئے دیکھئے: الماوردی ص ۱۱۶۔ (۲۲۱) سورہ الانفال (۴۱)۔ (۲۲۲) ابو یوسف ص ۱۸۔ (۲۲۳) الماوردی ص ۱۲۴۔ (۲۲۴) الانفال (۴۱)۔ (۲۲۵) ابو عبید۔ ص ۳۲۴، ۳۲۵ (فقرہ نمبر ۸۱۳)۔ (۲۲۶) ابو یوسف ص ۲۰۔ (۲۲۷) یوسف الدین ج ۲ ص ۶۱۷ (بحوالہ البخاری و مسلم)۔ (۲۲۸) ابو یوسف ص ۲۲، ۲۳۔ (۲۲۹) ایضاً ص ۱۰۔ (۲۳۰) فئے کی وسیع تعریف کے لحاظ سے "جو مال مشرکوں (غیر مسلموں) سے بغیر قتال اور چڑھائی کے حاصل ہو جیسے مال صلح، جزیہ، ان کی تجارت کا عشر اور جس کے حاصل ہونے کا سبب ان کی طرف سے ہو جیسے مال خراج (الماوردی ص ۱۱۱) فئے اور غنیمت میں بعض باتیں مشترکہ ہیں اور بعض مختلف جیسے دونوں اہل کفر کے مال سے وابستہ ہیں اور ان کے خمس کے مصارف یکساں ہیں جبکہ ان میں ایک اختلاف تو یہ ہے کہ مالِ فئے برضامندی لیا جاتا ہے اور مالِ غنیمت زبردستی، نیز دوسرا اختلاف یہ ہے کہ مالِ فئے کے چار خمس کا مصرف مالِ غنیمت کے چار خمس کے مصرف سے جدا ہے (ایضاً) محدود معنوں کے لحاظ سے امام ابو یوسف لکھتے ہیں کہ: "فئے ہمارے نزدیک خراج ہے زمین کا خراج" (ابو یوسف ص ۲۳)۔ (۲۳۱) بلاذری ص ۲۴۔ (۲۳۲) ایضاً ص ۲۸۔ (۲۳۳) ایضاً ص ۳۶، ۳۷ اور ۴۲۔ نیز ابو داؤد ج ۲ ص ۴۱۳ (کتاب الخراج و الفئی)۔ (۲۳۴) الحشر (۶، ۷)۔ (۲۳۵) بلاذری ص ۲۴ تا ۲۶۔ (۲۳۶) البخاری ج ۱ ص ۳۶۴ (کتاب الجہاد) ابو داؤد ج ۲ ص ۴۱۳ (کتاب الخراج والفئی)۔ (۲۳۷) الحشر (۷، ۸)۔ (۲۳۸) ابن رشد القرطبی۔ محمد بن احمد۔ بدایۃ المجتہد و نہایۃ المقتصد۔ مکتبہ الکلیات۔ الازہریہ۔ ۱۹۶۶ء، ج ۱ ص ۴۱۴۔ (۲۳۹) ابو عبید ص ۷۶۔ (۲۴۰) شبلی ج ۲ ص ۸۳۔ (۲۴۱) یوسف الدین ج ۲ ص ۶۰۲۔ (۲۴۲) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: الماوردی ص ۱۲۷ (الباب الثالث عشر)۔ (۲۴۳) التوبہ (۲۹)۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ یہاں قرآن سے تو صرف اہلِ کتاب کی حفاظت کی ذمہ داری ثابت ہوتی ہے لیکن رسول اللہ نے اس کے اطلاق میں وسعت پیدا کی اور آپ نے ہجر و بحرین کے مجوسیوں کا بھی جزیہ قبول فرما لیا (یوسف الدین ج ۲ ص ۶۱۷) اس کی صراحت احادیث میں ہے کہ مجوس ہجر و بحرین سے رسول اللہ نے جزیہ وصول کیا۔ دیکھئے: ناصف ج ۴ ص ۳۹۴ (کتاب الجہاد)۔ (۲۴۴) ابو یوسف ص ۱۲۲۔ (۲۴۵) ایضاً ص ۱۲۲۔ (۲۴۶) ایضاً ص ۱۲۲۔ (۲۴۷) یوسف الدین ج ۲ ص ۶۱۸۔ (۲۴۸) رسول اللہ نے فرمایا: "کسی مسلمان پر

جو یہ واجب الادا نہیں"۔ ابو عبید نے یہ حدیث نقل کر کے اس کے مطلب کی وضاحت میں یہی کہا ہے (ابو عبید ص ۴۷) (فقرہ ۱۲۱) نیز دیکھئے: طبری ج ۳ ص ۱۲۹۔ (۲۴۹) ابو عبید ص ۲۷ (فقرہ ۶۶)۔ (۲۵۰) یوسف الدین ج ۲ ص ۶۱۲۔
(۲۵۱) البخاری۔ ج ۲ ص ۶۲۳ (کتاب المغازی)۔ (۲۵۲) الماوردی۔ ص ۹۹ (باب الحادی عشر)۔
(۲۵۳) یہ بیان ڈاکٹر یوسف الدین کا ہے (ج ۲ ص ۶۶۰) اور انھوں نے حوالہ طبری کا دیا ہے جبکہ راقم الحروف کو طبری میں باوجود تلاش کے یہ نہیں مل سکا کہ "زکوٰۃ ۲ھ میں فرض ہوئی"۔ البتہ اس نے صدقۂ فطر کے بارے میں یہ ضرور لکھا ہے کہ "فیھا امر الناس باخراج زکوٰۃ الفطر" (ج ۲ ص ۴۱۸)۔ ہمارے لئے یہ ناقابلِ فہم ہے کہ اس سے زکوٰۃ کس طرح مراد لی جاسکتی ہے۔ علاوہ دُوسری جگہ طبری کا بیان بالکل واضح ہے۔ طبری نے ۹ھ کے ضمن میں لکھا ہے کہ "فرضت الصدقات وفرق فیھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عمالہ علی الصدقات" (ج ۳ ص ۱۲۳) اس لحاظ سے ۹ھ میں زکوٰۃ کی فرضیت کا بیان اور مذکورہ بالا ۲ھ والا بیان یا تو محض تسامح ہے یا کتابت کی غلطی ہے۔ (۲۵۴) ان اشیاء کا نصاب اور شرح وغیرہ کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: البخاری (ج ۱ ص ۱۹۴ تا ۱۹۹ کتاب الزکوٰۃ) ابو داؤد (ج ۱ ص ۲۱۸ تا ۲۲۳، کتاب الزکوٰۃ) الخطیب العمری (ص ۱۵۵ تا ۱۵۹ کتاب الزکوٰۃ) وغیرہ۔ (۲۵۵) ابو عبید ص ۴۷۶، ۴۷۷ (فقرہ ۱۲۱۳)۔
(۲۵۶) البخاری (ج ۱ ص ۱۹۴ تا ۱۹۹ کتاب الزکوٰۃ)، الخطیب العمری (ص ۱۵۵ تا ۱۵۹ کتاب الزکوٰۃ)۔
(۲۵۷) ابو داؤد ج ۱ ص ۲۱۸ (کتاب الزکوٰۃ)۔ (۲۵۸) التوبہ (۶۰)۔ (۲۵۹) الترمذی ج ۲ ص ۳۱۔
(۲۶۰) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: (یوسف الدین ج ۲ ص ۲۶، تا ۲۸) "انگلستان میں کلیسائی نظام کے زوال کے بعد سے یہ بات مان لی گئی کہ مفلسوں کی امداد بھی حکومت کا ایک فرض ہے اور محتاجوں کی اس وقت تک خاطر خواہ مدد نہیں کی جاسکتی جب تک کہ حکومت کی نگرانی میں اس کا باقاعدہ انتظام نہ ہو۔ اسی بنا پر ۱۶۰۱ء میں قانونِ محتاجاں منظور کیا گیا (ایضاً ص ۲۹، ۷)۔ (۲۶۱) تفصیل کے لئے: الماوردی ص ۱۰۸ (الباب الحادی والعشر)۔ (۲۶۲) آنحضرتؐ کا ارشاد ہے: انا اولیٰ بالمومنین من انفسھم من ترک مالاً فلاھلہ و من ترک دیناً او ضیاعاً فالیّ وعلیّ (ابو داؤد ج ۲ ص ۴۱۰ کتاب الخراج والفئی والامارہ)۔ یہ بھی آپ کا ارشاد ہے کہ: من ترک مالا فلورثتہ و من ترک کلا فالینا (ایضاً) مزید حوالے کے لئے ملاحظہ ہو: الترمذی ج ۲ ص ۳۰۔ (۲۶۳) الخطیب العمری ص ۲۶۳ (باب الفرائض)۔
(۲۶۴) ابنِ سعد ج ۱ ص ۲۴۸، طبری ج ۲ ص ۴۱۸۔ (۲۶۵) البخاری ج ۱ ص ۲۰۴ (کتاب الزکوٰۃ)۔
(۲۶۶) ابو داؤد ج ۲ ص ۴۰۸، ۴۰۹ (کتاب الخراج والفئی والامارہ)۔ (۲۶۷) قانون وراثت کی تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو: النساء (۱۱ تا ۱۲) البخاری ج ۱، ص ۳۸۲ تا ۳۹۰ (کتاب الوصایا) نیز ج ۲ ص ۹۹۵ تا ۱۰۰۱ (کتاب الفرائض)۔ (۲۶۸) النووی۔ ریاض الصالحین من کلام سید المرسلین۔ مطبعہ مصطفی البابی الحلبی۔ مصر ۱۹۳۸ء ص ۲۶۷ (باب القناعۃ و ذم السوال من غیر ضرورہ)۔ (۲۶۹) مثلاً یزید بن الحجل الحارثی کو نمرہ اور اس کی آبپاشی کے راستے اور جنگل میں سے وادی الرحمٰن عطا کی گئی (ابنِ سعد ج ۱ ص ۲۶۸) بنی شمخ جہنی کو صفینہ کی وُہ زمین عطا فرمائی جس پر ان لوگوں نے خط لگا لیا اور

زراعت کی (ایضاً ص ۲۷۱) بلال بن الحارث المزنی کو النخل اور جزعہ وغیرہ (ایضاً ص ۲۷۲) عداد بن خالد بن ہوذہ کو المصباعہ کے درمیان سے الزج و لوابہ یعنی لوابہ الخرار تک کے درمیان جو کچھ ہے (ایضاً ص ۲۷۳) اور راشد بن عبد السلمی کو اتنی زمین عطا کی جتنی دُور دو مرتبہ تیر اور ایک مرتبہ پتھر جا سکے (ایضاً ص ۲۷۴) مزید حوالے کے لئے دیکھئے: ابو عبید ص ۲۷۲ تا ۲۸۲ (فقرات نمبر ۶۷۴ تا ۶۹۳)، ناصف۔ منصور علی۔ التاج الجامع لاصول فی احادیث الرسول۔ مطبعہ مصطفی البابی الحلبی مصر ۱۹۳۴ء ج ۲ ص ۲۷۱ تا ۲۷۲ (کتاب الزکوٰۃ)۔ (۲۷۰) البخاری ج ۱ ص ۳۱۴ (ابواب الحرث والمزارعۃ) نیز ابو عبید ص ۱۰۰، ابو داؤد ج ۲ ص ۳۷، ۴۳۴، ۴۳۸ (کتاب الخراج والفئے والامارہ)۔ (۲۷۱) ابو عبید ص ۱۹۴ تا ۱۹۶ (فقرہ ۵۰۸) نیز بلاذری ص ۶۸۔ (۲۷۲) تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو: مودودی۔ الجہاد فی الاسلام۔ اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ لاہور۔ ۱۹۶۲ء۔ ص ۱۶۴ تا ۱۶۸۔ (۲۷۳) حمید اللہ (عہد نبوی میں نظام حکمرانی) ص ۲۶۵۔ (۲۷۴) ابن ہشام ج ۴ ص ۴۹۔ (۲۷۵) البخاری ج ۲ ص ۶۱۳۔ (۲۷۶) ابن ہشام ج ۴ ص ۴۹۔ (۲۷۷) تفصیلات کے لئے: حمید اللہ (عہد نبوی میں نظام حکمرانی) ص ۶۷، ۶۸ اور HUSSANI, S.Q., ARAB ADMINISTRATION, MADRAS, 1949, P. 13. (۲۷۸) ملاحظہ ہو: ناصف۔ ج ۴ ص ۳۶۶ (کتاب الجہاد والغزوات) نیز دیکھئے: جرجی زیدان۔ تاریخ التمدن الاسلامی۔ دار الہلال۔ قاہرہ۔ ج ۱۔ ص ۱۹۲ تا ۱۹۸۔ (۲۷۹) ایضاً ص ۱۸۵۔ (۲۸۰) تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو: مودودی (الجہاد) ص ۱۶۹ تا ۱۸۰۔ (۲۸۱) التوبہ (۴۱)، الحج (۷۸)۔

(۲۸۲) امام راغب اصفہانی نے لکھا ہے کہ الجہاد والمجاھدہ کے معنی دشمن کے مقابلہ میں پوری طاقت صرف کرنے کے ہیں۔ اور جہاد تین قسم پر ہوتا ہے یعنی (۱) کفار سے (۲) شیطان سے اور (۳) نفس سے۔ اور آیت وجاھدوا فی اللہ حق جہادہ تینوں قسم کے جہاد پر مشتمل ہے۔ (ملاحظہ ہو: راغب اصفہانی ص ۱۰۱۔ (۲۸۳) البقرہ (۱۹۱ تا ۱۹۳، ۲۱۶، ۲۵۱)، الانفال (۳۹)۔ (۲۸۴) زرقانی ج ۲ ص ۲۶۹۔ جنگ وصلح کے سلسلے میں رسول اللہؐ کی مزید ہدایات کے حوالے کے لئے دیکھئے: ابن ہشام ج ۴ ص ۱۰۰، ابو یوسف ص ۱۹۳، الخطیب العمری ص ۳۴۱ تا ۳۴۳؛ ناصف ج ۴ ص ۳۶۳، ۳۷۴ (کتاب الجہاد والغزوات)۔ (۲۸۵) شبلی۔ الفاروق۔ ایم ثناء اللہ خاں۔ لاہور۔ ۱۹۶۱ء ج ۲ ص ۲۹۸۔ وان کریمر نے ایک موقع پر اگرچہ یہ بیان حضرت عمرؓ کے دور سے متعلق دیا ہے لیکن اس کی روشنی میں خود رسول اللہؐ کے عہد میں مردم شماری کی اہمیت و نوعیت کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ مردم شماری کا رواج اگر قدیم ایشیائی سلطنتوں اور سلطنت روما میں بھی تھا لیکن اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ رعایا پر محصول کے بوجھ کو زیادہ سے زیادہ بڑھایا جائے اور حکومت کے پنجۂ تظلم کو زیادہ سے زیادہ سخت کیا جائے جبکہ حضرت عمر اوّل کے دور میں مردم شماری ایک بالکل دوسرے جذبے کے تحت کی گئی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ تمام مسلمانوں کو ریاست کے محاصل اور آمدنی میں سے جائز حقوق عطا کئے جائیں۔ VON KREMER, THE ORIENT UNDER THE CALIPH'S TR. S. KHUDA BAKSH, UNIVERSITY OF CALCUTTA, 1920, P. 79, 80.

(۲۸۶) البخاری ج ا ص ۴۳۰ (کتاب الجہاد) اسی سے متصل حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ فہرست جہاد رسول اللہؐ کے دور میں ہی مرتب ہو چکی تھی جیسا کہ آپ کی خدمت میں حاضر ہونے والے شخص نے اپنی درخواست میں کہا تھا (ایضاً) یہاں حوالہ سابق (۲۸۵) بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ (۲۸۷) کتانی ج ا ص ۲۲۰۔ (۲۸۸) مورخین کے بیان کے مطابق بدر کے معرکۂ کار زار میں آٹھ آدمی (عثمان بن عفان، طلحہ بن عبیداللہ، سعید بن زید، حارث بن صمہ، خوات بن جبیر، حارث بن حاطب، عاصم بن عدی اور ابولبابہ بشیر بن عبدالمنذر انصاری) موجود نہ تھے۔ مگر مال غنیمت میں ان لوگوں کے حصے بھی لگائے گئے۔ ملاحظہ ہو: ابن سعد ج ۲ ص ۱۹ نیز مسعودی (التنبیہہ) ص ۲۰۵، ۲۰۶۔ (۲۸۹) الصف (۴)۔ (۲۹۰) ناصف، ج ا، ص ۲۰۲ (کتاب الصلوٰۃ باب فی تسویۃ الصفوف)۔ (۲۹۱) حمید اللہ۔ عہد نبوی میں نظام حکمرانی۔ ص ۲۶۶۔ (۲۹۲) رسول اللہؐ بدر کے لئے شہر سے نکلے تو ایک میل چل کر فوج کا جائزہ لیا جو کم عمر تھے واپس کر دئے گئے۔ ابن سعد (ج ۲ ص ۱۲) نیز طبری (ج ۲ ص ۴۷۷)۔ (۲۹۳) حمید اللہ (عہد نبوی میں نظام حکمرانی) ص ۲۶۶۔ (۲۹۴) مثلاً بدر کے موقع پر رسول اللہؐ کی دعا کہ "اللھم انجزلی ما وعدتنی اللھم آت ما وعدتنی۔ اللھم ان تھلک ھذہ العصابہ من اھل الاسلام لا تعبد فی الارض (ناصف ج ۴ ص ۱۵ اہم کتاب الجہاد والغزوات)۔ (۲۹۵) قرآن میں رسول اللہؐ کو یہ حکم دیا گیا کہ، یآیھا النبی حرّض المؤمنین علی القتال (اے نبی! مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب دو) ۔ الانفال (۶۵)۔ (۲۹۶) غازی انصاری۔ اسلام کا نظام حکومت، ص ۵۰۹، ۵۱۰۔ (۲۹۷) ایضاً ص ۵۱۰۔ (۲۹۸) ابن ہشام ج ۲ ص ۲۷۲۔ (۲۹۹) کتانی ج ا ص ۳۱۷۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ عہد رسالت میں لوا کا رنگ سفید تھا، اور رایہ سیاہ رنگ کا اور دھاری دار (سوداً مربعہ من نمرہ)۔ دیکھئے: ناصف ج ۴ ص ۳۶۸ (کتاب الجہاد والغزوات)۔ (۳۰۰) ایضاً ص ۳۲۲۔ (۳۰۱) ایضاً ۔ (۳۰۲) مثلاً غزوۂ بدر میں شعار احد احد (ابن ہشام ج ۲ ص ۲۸۷) احد میں امت امت (ایضاً ج ۳ ص ۲۷) احزاب و بنی قریظہ میں حٰمٓ لا ینصرون (ایضاً ج ۳ ص ۲۳۷) بنی المصطلق میں یا منصور امت امت (ایضاً ج ۳ ص ۳۰۶) اور فتح مکہ، حنین اور طائف میں مہاجرین کا شعار یا بنی عبدالرحمٰن، خزرج کا یا بنی عبداللہ اور اوس کا یا بنی عبیداللہ تھا (ایضاً ج ۴ ص ۵۱) نیز دیکھئے: ناصف، ج ۴ ص ۳۷۸، ۳۷۹۔ کتاب الجہاد والغزوات (باب الشعار فی الحرب)۔ (۳۰۳) یہ پتا نہیں چلتا کہ جاسوسوں کی کل تعداد کتنی تھی مگر یہ بات طے ہے کہ جاسوسی کے لئے رسول اللہؐ نے کافی لوگوں کو مقرر کر رکھا تھا۔ اور بعض اوقات ایک ایک مہم کے لئے متعدد جاسوسوں کو روانہ کیا جاتا تھا۔ مثلاً دیکھئے: البخاری ج ۲ ص ۵۶۰، ۵۶۸ (کتاب المغازی)۔ (۳۰۴) ایضاً ص ۵۶۷ اور ۶۱۲، ۶۲۷ (کتاب التفسیر)۔ (۳۰۵) حمید اللہ (عہد نبوی میں نظام حکمرانی)، ص ۲۶۴، ۲۶۵۔ (۳۰۶) کتانی ج ا ص ۳۴۸۔ (۳۰۷) ایضاً ص ۳۵۱۔ (۳۰۸) ایضاً ص ۳۶۰۔ (۳۰۹) ایضاً ص ۳۶۱ تا ۳۶۳۔ (۳۱۰) ایضاً ص ۳۸۰۔ (۳۱۱) ایضاً ص ۳۸۲۔ (۳۱۲) ایضاً ص ۳۵۱۔ (۳۱۳) ایضاً ص ۳۵۶ تا ۳۵۸۔ (۳۱۴) الانفال (۶۱)۔ (۳۱۵) الحدید (۲۵)۔ (۳۱۶) المائدہ (۴۲)۔ (۳۱۷) ایضاً

(۴۸)۔(۳۱۸) ملاحظہ ہو: ایضاً (۴۹)، ص (۲۶)۔(۳۱۹) النساء (۵۸)۔(۳۲۰) الشوریٰ (۱۵)۔
(۳۲۱) البقرہ (۲۱۳)، النحل (۶۴)۔(۳۲۲) امام مالک۔ موطا (مع شرح تنویر الحوالک از سیوطی) مطبعہ مصطفیٰ البابی الحلبی۔ مصر۔ ۱۹۵۱ء۔ ج ۲ ص ۱۰۶، ۱۰۷ (کتاب الاقضیہ)۔ یہی روایت چند الفاظ کے تغیر کے ساتھ امام بخاری نے بھی لکھی ہے۔ ملاحظہ ہو: البخاری ج ۲ ص ۱۰۶۲ (کتاب الاحکام) نیز الترمذی ج ۱ ص ۱۶۰ (ابواب الاحکام)۔
(۳۲۳) البخاری ج ۱ ص ۳۱۱ (کتاب الوکالہ)۔(۳۲۴) مسلم ج ۱ ص ۷۴ (کتاب الاقضیہ)۔ شہادت کے مسائل اور اثبات دعویٰ کے سلسلہ میں تفصیلی مباحث کے لئے ملاحظہ ہو: محمصانی۔ صبحی۔ فلسفۃ التشریع فی الاسلام۔ مکتبۃ الکشاف۔ بیروت۔ ۱۹۴۶ء۔ ص ۲۶۹ تا ۲۷۷۔(۳۲۵) محمصانی ص ۲۷۲۔(۳۲۶) ایضاً۔(۳۲۷) ابن قیم نے لکھا ہے کہ "قد حکم النبی صلی اللہ علیہ وسلم بشاھد ویمین"۔ اور اس کی دلیل میں یہ دلیل دی ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے کہا کہ "قضی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بشاھد ویمین"۔ (بحوالہ مسلم) دیکھئے: ابن قیم۔ الطرق الحکمیہ فی السیاسۃ الشرعیہ۔ مطبعۃ المدنی۔ قاہرہ۔ ۱۹۶۱ء۔ ص ۷۳۔ یہاں یہ بتا دینا مناسب ہے کہ حضرت ابن عباس کی تصریح کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدعا علیہ سے حلف لیتے تھے اور اس کے الفاظ یہ ہوتے تھے کہ احلف باللہ الذی لا الٰہ الا ھو ما لہ عندك شیٔ (الخطیب العمری ص ۳۲۸، باب الاقضیۃ والشھادات)۔(۳۲۸) اس سلسلے میں ابن قیم نے بڑی تفصیل سے گفتگو کی ہے اور کتاب وسنت کے آثار وشواہد اور تاریخی واقعات سے استدلال کیا ہے۔ ملاحظہ ہو: ابن قیم (الطرق الحکمیہ) ص ۱۱، ۲۷، ۲۹، ۳۱، ۹۴، ۱۰۶، ۱۰۷، ۲۳۴ تا ۲۳۸، ۲۴۰ اور ۳۰۸ وغیرہ۔ امام مالک نے لکھا ہے کہ دور نبوی میں پہلا واقعہ جس میں قسامت کا طریقہ جاری کیا گیا، عبداللہ بن سہل کے خیبر میں قتل ہو جانے کے سلسلے میں برتا گیا۔ تفصیل کے لئے دیکھئے: امام مالک۔ ج ۲ ص ۱۹۵ تا ۱۹۷ (کتاب القسامت)۔(۳۲۹) المائدہ (۸)، الانعام (۱۵۲)، الحجرات (۹)۔(۳۳۰) البخاری۔ ج ۲ ص ۶۱۶ (کتاب المغازی)۔(۳۳۱) النساء (۶۵)۔ نیز دیکھئے: الاحزاب (۳۶)۔(۳۳۲) النساء (۱۲۸)۔(۳۳۳) الحجرات (۹)، البقرہ (۲۲۸)۔(۳۳۴) ملاحظہ ہو: النحل (۱۲۶)، النساء (۱۲۳)، الشوریٰ (۴۰)۔(۳۳۵) الانعام (۱۶۴)، الفاطر (۱۸)، الاسراء (۱۵)، النجم (۳۸)۔
(۳۳۶) الترمذی ج ۱ ص ۱۵۹ (ابواب الاحکام)۔(۳۳۷) ایضاً۔(۳۳۸) الخطیب العمری ص ۳۲۵۔
(۳۳۹) البخاری ج ۱ ص ۱۰۹۲ (کتاب الاعتصام) نیز دیکھئے: الترمذی ج ۱ ص ۱۵۸ (ابواب الاحکام)۔
(۳۴۰) کتانی ج ۱ ص ۲۵۷، ۲۵۸۔(۳۴۱) خلیل حامدی۔ اسلام کا نظام قضا۔ چراغ راہ۔ اسلامی قانون نمبر۔ جون ۱۹۵۸ء۔ ج ۱ ص ۱۹۳ (جلد ۱۲ شمارہ ۶)۔(۳۴۲) تفصیل کے لئے: محمد احمد جاد، علی محمد البجادی، محمد ابو الفضل ابراہیم۔ ایام العرب فی الجاہلیۃ۔ دار احیاء الکتب العربیہ۔ عیسی البابی الحلبی۔ مصر۔ ۱۹۴۶ء۔
(۳۴۳) الشوریٰ (۱۰)، النحل (۶۴)، النساء (۵۸)۔(۳۴۴) البقرہ (۱۲۹، ۱۵۱)، آل عمران (۴۸، ۱۶۴)۔(۳۴۵) الخطیب العمری ص ۳۶ (کتاب العلم) نیز دیکھئے: ابن ماجہ ج ۱ ص ۱۰۱ (باب فضل العلماء)۔

(۳۴۶) العلق (ا تا ۵) ۔ (۳۴۷) حمید اللہ ۔ الصحیفۃ الصحیحہ موسوم بہ صحیفہ ہمام بن منبہ ۔ دیباچہ (پیغمبرِ اسلام کی تعلیمی سیاست) ص ۱۸ ۔ اسلامک پبلیکیشنز سوسائٹی ۔ مکتبہ نشاۃ ثانیہ ۔ دکن ۔ ۱۹۵۶ء ۔ (۳۴۸) حمید اللہ (عہدِ نبوی میں نظامِ حکمرانی ۔ ص ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴ ۔ (۳۴۹) ایضاً ص ۲۱۳ ۔ (۳۵۰) ایضاً ۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے صحیفۂ امام ابن منبہ کے دیباچہ میں یہ بھی بیان کیا ہے "بعض مؤلف اہلِ صُفّہ کے چار سو طلبہ کا ذکر کرتے ہیں جو تعجب نہیں کہ ایک ہی دن کی حاضری ہو" (ملاحظہ ہو: (ص ۱۸، حاشیہ ۲) ۔ محدثین نے اصحابِ صفّہ کی تعداد ۷۰ لکھی ہے ۔ الخطیب العمری ص ۴۴۷ (کتاب الرقاق) ۔
(۳۵۱) ابنِ سعد، ج ۲ ص ۲۲ ۔ (۳۵۲) کتانی ج ۱ ص ۵۶ ۔ (۳۵۳) یہ مورخین کا عام بیان ہے جبکہ علامہ شبلی کی تحقیق کے مطابق مساجد کی تعداد ۱۳ ہے ان کے نام اور تفصیل کے لئے دیکھئے: شبلی ج ۲ ص ۹۲ ۔ (۳۵۴) حمید اللہ ۔ عہدِ نبوی میں نظامِ حکمرانی ۔ ص ۲۰۶ ۔ (۳۵۵) ابنِ ہشام ج ۳ ص ۱۹۳، ۱۹۴ ۔ (۳۵۶) ایضاً ص ۱۷۸ ۔
(۳۵۷) ابن عبد البر، ج ۱، ص ۲۳۸ ۔ نیز کتانی ج ۱ ص ۴۳ ۔ (۳۵۸) کتانی ج ۱ ص ۴۳ ۔ (۳۵۹) ایضاً ۔ (۳۶۰) ایضاً ص ۴۸ ۔ اس قسم کے معلمین میں عبد اللہ بن سعید اور عبادہ بن الصامت کا نام لیا جا سکتا ہے ۔ (۳۶۱) کتانی نے الشفاء ام سلیمان بن ابی حثمہ کا ذکر کیا ہے (ج ۱، ص ۴۹، ۵۰) ۔ (۳۶۲) عہدِ نبوی میں نظامِ حکمرانی ۔ ص ۲۲۶ ۔ (۳۶۳) ابنِ سعد ج ۲ ص ۱۶۸، ۱۶۹ ۔ (۳۶۴) ابنِ حزم ص ۲۳ ۔ (۳۶۵) ایضاً ۔ (۳۶۶) ایضاً ۔ (۳۶۷) اس کے والی خالد بن سعید بن ابی العاص تھے ۔ شہر بن باذان کے قتل کے بعد انہیں مقرر کیا گیا تھا (ایضاً) ۔ (۳۶۸) والیِ مہاجرین ابی امیہ تھے (ایضاً) (۳۶۹) والی زیاد بن بید البیاضی تھے (ایضاً) ۔ (۳۷۰) والی معاذ بن جبل تھے (ایضاً) ۔ (۳۷۱) والی ابوموسیٰ الاشعری تھے (ایضاً) ۔ (۳۷۲) والی ابوسفیان صخر بن حرب بن امیہ تھے اور انہیں عمرو بن حزم کے بعد والی بنایا گیا تھا (ایضاً) ۔ (۳۷۳) والی عتاب بن اسید تھے (ایضاً) ۔ (۳۷۴) والی یزید بن ابی سفیان تھے (ایضاً) ۔ (۳۷۵) والی عمرو بن سعید بن ابی العاص تھے (ایضاً ص ۲۴) ۔ (۳۷۶) والی حکم بن سعید بن ابی العاص تھے (ایضاً) ۔ (۳۷۷) والی ابان بن سعید بن ابی العاص تھے (ایضاً) ۔ بلاذری نے اسی بات کو ترجیحاً بیان کیا ہے کہ پہلے والی علاء بن الحضرمی تھے اور ابان بن سعید ان کے جانشین بنے (ایضاً) ۔ (۳۷۸) والی علاء بن الحضرمی تھے (ایضاً) ۔ (۳۷۹) والی عمرو بن العاص تھے (ایضاً) ۔ (۳۸۰) والی عثمان بن ابی العاص تھے (ایضاً)
(۳۸۱) ابنِ سعد ج ۲ ص ۳۴۷، ۳۴۸ ۔ نیز دیکھئے: الترمذی ج ۱ ص ۱۵۹ (ابواب الاحکام) ۔ (۳۸۲) ملاحظہ ہو: طبری ج ۳ ص ۱۲۸، ۱۲۹ ۔ (۳۸۳) البخاری ج ۲ ص ۶۲۳ (کتاب المغازی) ۔ (۳۸۴) ابنِ حزم نے لکھا ہے کہ حضرت علی اخماس یمن اور قضا دونوں پر مامور کئے گئے تھے (ابنِ حزم ص ۲۴) ۔ (۳۸۵) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب عتاب بن اسید کو گورنر مقرر فرمایا تو ان کی تنخواہ ایک درہم یومیہ مقرر فرمائی یعنی ماہانہ تیس درہم (کتانی ج ۱ ص ۲۶۴) نیز ابوداؤد ج ۲ ص ۴۰۷ (کتاب الخراج والفئ) ۔ (۳۸۶) ابوداؤد، ج ۲ ص ۴۰۹ (کتاب الخراج والفئ) ۔

اختتامیہ

عہدِ نبوی میں ریاست کے نشوو ارتقاء کا تفصیلی مطالعہ گزشتہ صفحات میں پیش کیا جاچکا ہے۔ لہذا اب اختتام سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بطور خلاصہ تمام مباحث پر ایک مجموعی نظر ڈال لی جائے۔

تاریخی حقائق اس بات کا کافی ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ رسول اللہ نے سیاست و ریاست کے انداز و اسالیب میں انقلابی تبدیلیاں فرمائیں اور سخت انتشار بلکہ نزاع کے پس منظر سے سیاسی اتحاد کو ابھارا۔ یہ ہم معلوم کر چکے ہیں کہ اس وقت دنیا کے تمام متمدن و مہذب ممالک سیاسی طوائف الملوکی، معاشرتی بے راہ روی اور اخلاقی تنزل کا شکار تھے۔ ایسے عالم میں رسول اللہ نے خالص عقیدہ کی بنیاد پر ایک جدید معاشرہ کی تشکیل کی، اسے دین کے مثبت اصولوں پر ترقی دی، اخوت، مساوات اور ہمدردی و تعاون کے رشتوں سے اسے مضبوط و مستحکم کیا اور پھر اس تنظیم پر بالآخر ایک ریاست کو وجود بخشا۔

ریاست کے باب میں سب سے اہم تغیر یہ تھا کہ آپ نے شہنشاہیت اور مطلق العنانیت کے نقوش کہنہ کو محو کر کے حاکمیت باری تعالیٰ کا نقش تازہ ثبت کیا۔ حکمرانوں کو الوہیت و اوتار کی مسندوں سے اتار کر عام انسانوں کے برابر کھڑا کیا اور جبر و استبداد ظلم و ناانصافی، استحصال، خیانت، دغابازی، کشت و خون، فتنہ و فساد اور دھوکہ و فریب کے بجائے حریت فکر و عمل، تقویٰ، امانت و دیانت، شوریٰ، امن و صلح، نظم و ضبط، عدل و انصاف، مساوات، رواداری کی روایات[1] کو زندہ و تابندہ کیا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دین و سیاست کو متحد کیا۔ حالانکہ اس وقت دنیا میں دین و سیاست کی تفریق عام تھی۔ یہ ایک غیر معمولی کارنامہ، ایک انقلاب تھا جسے روسو (ROUSSEAU) جیسے مفکرِ سیاسیات نے بھی محسوس کیا۔ چنانچہ مسیحی دنیا کے نظامِ سیاسی پر تبصرہ کرتے ہوئے اس نے لکھا ہے کہ، "مذہبی مسلک اس سے پہلے ہمیشہ اور اس وقت بھی فرمانروا (کے تسلط) سے آزاد رہنے میں کامیاب ہوا۔ مذہبی مسلک اور ریاست کے درمیان لازمی طور پر کوئی علاقہ نہ تھا۔ اس مسئلہ میں (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)

---

(۱) ڈوزی لکھتا ہے، انقلابِ فرانس کے مبادیات یعنی حریت، مساوات اور اخوت کی بنیاد ان (عربوں) ہی نے ڈالی۔ اور ایک بدوی کو وہ آزادی حاصل ہے جس کی مثال روئے زمین پر نہیں۔ اس کا قول ہے کہ وہ خالقِ کائنات کے علاوہ کسی اور کو اپنا آقا نہیں مانتا۔ وہ حریت کے اس درجہ پر فائز ہے کہ اگر اس کا موازنہ ہمارے انتہائی ترقی یافتہ اصولِ آزادی سے کیا جائے تو وہ عربوں کی آزادی کے مقابلہ میں ایک قسم کا استبداد معلوم ہو گی (کرد علی۔ الاسلام و الحضارۃ العربیۃ (ترجمہ) شاہ معین الدین احمد ندوی (اسلام اور عربی تمدن) دار المصنفین۔ اعظم گڑھ۔ ص ۱۴۰۔

کا نظریہ نہایت مستحکم تھا انہوں نے اپنے سیاسی نظام کو مکمل طور پر متحد و منظم کر لیا تھا چنانچہ جب تک ان کے جانشین خلفاء کے تحت یہ نظام جاری رہا۔ حکومت ہر لحاظ سے متحد، غیر منقسم اور اچھی رہی۔"(۱) یہاں یہ امر قابلِ غور ہے کہ دین و ریاست کے درمیان اتحاد و تعلق کا یہ رشتہ خارجی یا مصنوعی نہ تھا بلکہ فطری اور حقیقی تھا کہ ریاست دین ہی کے نتیجہ میں رُو بہ عمل آئی تھی(۲) علاوہ ازیں اس سیاسی نظام کو رسول اللہؐ نے اس سرزمین پر جاری و ساری کیا جہاں کی تاریخ میں ایک متحد سیاسی نظام یا ہمہ گیر ریاست کا قیام کبھی نہ ہوا تھا۔ اور وہ لوگ ایک پرچم تلے آ گئے(۳) جنھوں نے کسی قوتِ قاہرہ کے آگے جھکنا ہی نہ سیکھا تھا، جن کی سرشت میں سرکشی، خودسری اور آزادی کے عناصر داخل تھے۔ اور ریاست کے ارتقائی تکمیل ہوتے ہی جزیرہ نمائے عرب پر خدا کا وہ امن چھا گیا، جو دن رات لوٹ مار، قتل و غارت گری میں سرگرم رہنے والے عربوں کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ آ سکتا تھا۔

علمِ سیاسیات کی رُو سے ریاست کی تعریف کچھ ہی مقرر کیوں نہ کی جائے ریاست نبوی بہرصورت ایک مکمل ریاست، ایک مؤثر، آزاد، خودمختار، حقیقی، سیاسی طاقت اور اپنے تمام لوازمات کے ساتھ ایک مثالی و معیاری مملکت تھی۔ اس ریاست کے وظائف و اعمال کا مطالعہ اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ وُہ ایک نظریاتی و دستوری اور فلاحی و خادمِ خلق ریاست تھی۔ جہاں معاش و معاد کو یکساں اہمیت حاصل تھی اور ایک عادلانہ اجتماعی نظام سایہ فگن تھا۔ نیز ہم دیکھتے ہیں کہ اگر ایک طرف قرآن میں "خلافت ارضی" کے لئے حقوق و فرائض کا جو دائرہ مقرر کیا گیا ہے(۴) ریاست نبوی میں اس سے سرِ مو تجاوز نہیں کیا گیا تو دوسری طرف ریاست کے جن مقاصد کی وحیِ الٰہی میں نشان دہی کی گئی ہے(۵) ریاستِ نبویؐ نے ان کو بھی کما حقہ، پورا کیا۔(۶)

علاوہ ازیں رسول اللہؐ نے جیسا مضبوط اور لچکدار نظامِ حکومت مرتب کیا تھا اس کے پیشِ نظر یہ بات بڑے اطمینان سے کہی جا سکتی ہے کہ عہدِ نبوی میں قائم ہونے والے ادارات نے اپنے بعد کی تاریخ پر گہرا اثر ڈالا۔ خصوصاً مسلمانوں کی ریاست کا تاریخی ارتقا رسول اللہؐ کی قائم کردہ ریاست پر ہی ہُوا تھا اور آپ نے اپنے زمانہ میں جن انتظامی ادارات کی بنا ڈالی تھی، بعد میں ان ہی کو مزید ترقی دے کر ایک متنوع اور وسیع نظام کی صورت میں ڈھال دیا گیا۔

---

(۱) ROUSSEAU, JEAN JACQUES, THE SOCIAL CONTRACT OR PRINCIPLES OF POLITICAL RIGHT, TR. TOZER, HENRY, J., GEORGE ALLEN AND UNWIN LTD. LONDON, 1948, P. 22.

(۲) ایضاً (حاشیہ)۔ (۳) یہ کہنا غلط ہوگا کہ رسول اللہؐ نے اتحاد کی راہ "کشت و خون" کے ذریعہ ہموار کی۔ جیسا کہ مارک سائیکس نے لکھا ہے۔ دیکھئے: SYKES, SIR MARK, THE CALIPH'S LAST HERITAGE, MACMILLAN & CO. LTD. LONDON, 1915, P. 74.

(۴) الحج (۴۱)، ص (۲۶)، الحدید (۲۵)۔ (۵) ایضاً (۶) لہٰذا نولدیکے کا یہ بیان درست نہیں معلوم ہوتا کہ رسول اللہؐ کو حالات کے دباؤ نے آگے بڑھایا اور پھر خلافِ توقع وہ ایک بادشاہ اور فاتح بن گئے۔ NOLDEKE, THEODOR, SKETCHES FROM EASTERN HISTORY, TR. BLACK, JOHN SUTHARLAND, EDINBURGH, 1892, P. 61.

کتابیات

(ا) قرآن اور علوم قرآن

۱ - القرآن

۲ - آلوسی۔ شہاب الدین، السید محمود ۔ روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی ۔ مصر۔ (الطباعة المنیریہ)

۳ - ابن الجوزی ۔ زاد المسیر فی علم التفسیر ۔ بیروت ۔ سنہ ۱۹۶۵ء ۔

۴ - ابن کثیر الدمشقی ۔ تفسیر القرآن العظیم ۔ بیروت ۔ سنہ ۱۹۶۶ء ۔

۵ - ابن عربی ۔ احکام القرآن ۔ مصر ۔ سنہ ۱۹۵۷ء ۔

۶ - پانی پتی ۔ محمد ثناء اللہ ۔ تفسیر المظہری ۔ دکن ۔ (مجلس اشاعة العلوم)

۷ - جصاص ۔ ابوبکر ۔ احکام القرآن ۔ مصر ۔ سنہ ۱۳۴۷ھ ۔

۸ - راغب اصفہانی ۔ المفردات فی غریب القرآن ۔ مصر ۔ سنہ ۱۹۶۱ء ۔

۹ - الزمخشری ۔ ابی القاسم جار اللہ ۔ الکشاف عن حقائق التنزیل وعیون الاقاویل فی وجوہ التاویل ۔ مصر ۔ سنہ ۱۹۴۸ء ۔

۱۰ - السیوطی ۔ جلال الدین ۔ الاتقان فی علوم القرآن ۔ مصر ۔ سنہ ۱۹۵۱ء ۔

۱۱ - شاہ ولی اللہ ۔ الفوز الکبیر فی اصول التفسیر ۔ لاہور ۔ سنہ ۱۹۵۱ء ۔

۱۲ - القرطبی ۔ ابی عبداللہ محمد بن احمد الانصاری ۔ الجامع لاحکام القرآن ۔ قاہرہ ۔ سنہ ۱۹۳۵ء ۔

(ب) احادیث و تراجم

۱۳ - ابن حجر العسقلانی ۔ الاصابہ فی تمییز الصحابہ ۔ مصر ۔ سنہ ۱۹۳۹ ۔

۱۴ - ابن عبد البر ۔ الاستیعاب فی معرفة الاصحاب ۔ دکن ۔ سنہ ۱۳۳۶ھ ۔

۱۵ - ابن ماجہ ۔ القزوینی ۔ سنن المصطفیٰ ۔ مصر (مطبعة التازیہ) ۔

۱۶ - ابو داؤد ۔ السجستانی ۔ سنن ۔ کراچی ۔ سنہ ۱۳۶۹ھ ۔

۱۷ - احمد بن حنبل ۔ المسند ۔ مصر ۔ سنہ ۱۹۴۹ء ۔

۱۸ - البخاری ۔ صحیح ۔ دہلی ۔ سنہ ۱۹۳۸ء ۔

۱۹ - الترمذی - جامع الترمذی - دہلی - ۱۳۷۷ھ -
۲۰ - الحمیدی - ابی بکر عبداللہ - المسند - کراچی - ۱۹۶۳ء -
۲۱ - الدارمی - ابو محمد عبداللہ بن عبدالرحمن - سنن - کانپور - ۱۲۹۳ھ -
۲۲ - امام مالک - موطا - مصر - ۱۹۵۱ء -
۲۳ - محمد فواد عبدالباقی - اللؤلؤ والمرجان فیما اتفق علیہ الشیخان - قاہرہ - ۱۹۴۹ء -
۲۴ - مسلم بن الحجاج القشیری - الصحیح - دہلی - ۱۳۴۹ھ -
۲۵ - ناصف منصور علی - التاج الجامع لاصول فی احادیث الرسول - مصر - ۱۹۳۴ء -
۲۶ - النووی - ریاض الصالحین من کلام سید المرسلین - مصر - ۱۹۳۸ء -
۲۷ - النووی - تہذیب الاسماء واللغات - مصر (المنیریہ) -
۲۸ - الہیثمی - نور الدین علی - مجمع الزوائد و منبع الفوائد - قاہرہ - ۱۳۵۳ھ -

(ج) فقہ اور اصولِ فقہ

۲۹ - ابن رشد القرطبی - بدایۃ المجتہد و نہایۃ المقتصد - مصر (ازہریہ) - ۱۹۶۶ء
۳۰ - بحرالعلوم ابی العیاش عبدالعلی محمد - رسائل الارکان - لکھنؤ - ۱۳۲۸ھ -
۳۱ - الجزیری - عبدالرحمن - کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ - مصر (طبع ثانی) -
۳۲ - السرخسی - شرح السیر الکبیر - دکن - ۱۳۳۵ھ -
۳۳ - المحمصانی - صبحی - فلسفۃ التشریع فی الاسلام - بیروت - ۱۹۴۶ء -

(د) دیگر کتب

۳۴ - الازرقی - ابوالولید - محمد بن عبداللہ - اخبار مکۃ وما جاء فیہا من الآثار مکہ ۱۳۵۲ھ
۳۵ - آلوسی - محمود شکری - بلوغ الارب فی احوال العرب - بغداد - ۱۳۱۴ھ -
۳۶ - ابن اثیر - عزالدین - الکامل فی التاریخ - بیروت - ۱۹۶۵ء -
۳۷ - ابن تیمیہ - السیاسۃ الشرعیۃ فی اصلاح الراعی والرعیۃ - قاہرہ - ۱۹۶۱ء -
۳۸ - ابن تیمیہ - منہاج السنۃ النبویہ فی نقض کلام الشیعۃ القدریۃ - قاہرہ - ۱۳۸۲ھ -
۳۹ - ابن حزم - جوامع السیرۃ - مصر (دارالمعارف) -
۴۰ - ابن حبیب بغدادی - کتاب المحبر - دکن - ۱۹۴۲ء -

۴۱ - ابنِ خلدون - عبدالرحمٰن - مقدمہ - قاہرہ (مکتبۃ التجاریہ) ۔
۴۲ - ابنِ خلدون - عبدالرحمٰن - کتاب العبر و دیوان المبتدا و الخبر فی ایام العرب والعجم والبربر و من عاصرہم من ذوی السلطان الاکبر - بولاق - ۱۲۸۴ھ ۔
۴۳ - ابن سعد - الطبقات الکبریٰ - بیروت - ۱۹۶۰ء ۔
۴۴ - ابن سید الناس - عیون الاثر فی فنون المغازی والشمائل والسیر - قاہرہ - ۱۳۵۶ھ ۔
۴۵ - ابن الطقطقی - محمد بن علی بن طباطبا - الفخری فی الآداب السلطانیہ والدول الاسلامیہ - مصر - ۱۹۲۷ء ۔
۴۶ - ابن طولون - شمس الدین محمد بن علی - اعلام السائلین عن کتب سید المرسلین - دمشق - ۱۳۴۸ھ ۔
۴۷ - ابن عبدالبر - الدرر فی اختصار المغازی والسیر - مصر - ۱۹۶۶ء ۔
۴۸ - ابن عبدربہ - شہاب الدین احمد - العقد الفرید - مصر - ۱۲۹۳ھ ۔
۴۹ - ابن قیم الجوزیہ - زاد المعاد فی ھدی خیر العباد - مصر - ۱۹۵۰ء ۔
۵۰ - ابن قیم الجوزیہ - الطرق الحکمیہ فی السیاسۃ الشرعیۃ - مصر - ۱۹۶۱ء ۔
۵۱ - ابن قتیبہ الدینوری - المعارف - مصر - ۱۹۳۴ء ۔
۵۲ - ابنِ کثیر - عماد الدین ابی الفداء اسماعیل - السیرۃ النبویہ - قاہرہ - ۱۹۶۴ء ۔
۵۳ - ابن کثیر - عماد الدین ابی الفداء اسماعیل - البدایۃ والنہایۃ - بیروت - ۱۹۶۶ء ۔
۵۴ - ابنِ ہشام - السیرۃ النبویۃ - مصر - ۱۹۳۶ء ۔
۵۵ - ابوالفداء - عماد الدین اسماعیل - کتاب المختصر فی اخبار البشر - مصر (الحسینیہ)
۵۶ - ابوعبید القاسم بن سلام - کتاب الاموال - مصر - ۱۳۵۳ھ ۔
۵۷ - ابویوسف - کتاب الخراج - قاہرہ - ۱۳۵۲ھ ۔
۵۸ - احمد امین - فجر الاسلام - قاہرہ - ۱۹۶۴ء ۔
۵۹ - بلاذری - احمد بن یحییٰ بن جابر - فتوح البلدان - مصر - ۱۹۰۱ء ۔
۶۰ - بلاذری - احمد بن یحییٰ بن جابر - انساب الاشراف - مصر - ۱۹۵۹ء ۔
۶۱ - جرجی زیدان - تاریخ التمدن الاسلامی - مصر (دار الہلال) ۔
۶۲ - جرجی زیدان - العرب قبل الاسلام - مصر (دار الہلال) ۔
۶۳ - الحلبی - علی بن برہان الدین - السیرۃ الحلبیہ - قاہرہ - ۱۹۶۲ء ۔
۶۴ - الخطیب البغدادی - تاریخ بغداد او مدینۃ السلام - بیروت - (دار الکتاب العربی) ۔
۶۵ - الدینوری - ابوحنیفہ احمد بن داؤد - الاخبار الطوال - قاہرہ - ۱۹۶۰ء ۔

۶۶ - دروزہ - محمد عزة - عصر النبی - بیروت - ۱۹۶۴ء -

۶۷ - الذہبی - تاریخ الاسلام وطبقات المشاہیر والاعلام - قاہرہ - ۱۳۶۷ھ -

۶۸ - راغب اصفہانی - الذریعة الیٰ مکارم الشریعة - نجف - ۱۹۶۷ء -

۶۹ - زرقانی محمد بن عبدالباقی - علی المواہب اللدنیہ - مصر - ۱۳۲۵ھ -

۷۰ - زکی صفوت احمد - جمہرة خطب العرب فی عصور العربیة الزاہرة - مصر - ۱۹۳۳ء -

۷۱ - السمہودی - علی نور الدین - وفاء الوفاء باخبار دار المصطفیٰ - مصر - ۱۳۲۶ھ -

۷۲ - السہیلی - ابی القاسم عبدالرحمٰن - کتاب الروض الانف - مصر - ۱۹۱۴ء -

۷۳ - الشریف احمد ابراہیم - مکة والمدینة فی الجاہلیة وعہد الرسول - مصر (دار الفکر) -

۷۴ - الصعیدی - عبدالمتعال - السیاسة الاسلامیة فی عہد النبوة - قاہرہ (دار الفکر) طبع ثانی -

۷۵ - العباس احمد - بن عبدالحمید - کتاب عمدة الاخبار فی مدینة المختار - قاہرہ - (طبع ثالث)

۷۶ - طبری - ابوجعفر محمد ابن جریر - تاریخ الرسل والملوک - مصر - ۱۹۶۰ء -

۷۷ - کتانی الفاسی - التراتیب الاداریہ والعمالات والصناعات والمتاجر والحالة العلمیة التی کانت علی عہد تاسیس المدینة الاسلامیہ فی المدینة المنورة العلیة - رباط - ۱۳۴۶ھ -

۷۸ - الماوردی - الاحکام السلطانیہ - مصر - ۱۹۰۹ء -

۷۹ - محمد احمد جاد وغیرہ - ایام العرب فی الجاہلیة - مصر - ۱۹۴۶ء -

۸۰ - محمود شیت خطاب - الرسول القائد - ۱۹۶۲ء (دار القلم) -

۸۱ - المقریزی - تقی الدین احمد - امتاع الاسماع بما للرسول من الانباء والاموال والحفدة والمتاع - ۱۹۴۱ء - (مطبعة لجنة التالیف) -

۸۲ - المسعودی - ابی الحسن علی بن الحسین - مروج الذہب ومعادن الجوہر - مصر - ۱۹۵۸ء -

۸۳ - ہیکل - محمد حسین - حیاة محمد - قاہرہ - ۱۹۴۷ء -

۸۴ - وصفی - الدکتور مصطفیٰ کمال - محمد صلی اللہ علیہ وسلم و بنو اسرائیل - قاہرہ - ۱۹۷۰ء -

۸۵ - الواقدی - ابی عبداللہ محمد بن عمر - کتاب المغازی - کلکتہ - ۱۸۵۵ء -

۸۶ - الیعقوبی - تاریخ الیعقوبی - بیروت - ۱۹۶۰ء -

(ھ) لغات اور معجم وغیرہ

۸۷ - ابن درید - جمہرة اللغة - دکن - ۱۳۴۵ھ -

۸۸ - ابن منظور الافریقی۔ لسان العرب۔ بولاق۔ ۱۳۰۳ھ۔
۸۹ - الزمخشری۔ اساس البلاغۃ۔ قاہرہ۔ ۱۹۵۳ء۔
۹۰ - الفیروز آبادی۔ مجد الدین۔ القاموس المحیط۔ ۱۹۳۸ء (دار المامون)۔
۹۱ - الفیومی۔ احمد بن محمد بن علی۔ المصباح المنیر فی غریب الشرح الکبیر۔ مصر۔
۹۲ - یاقوت الحموی الرومی۔ معجم البلدان۔ بیروت۔ ۱۹۵۷ء۔

(و) کُتبِ اُردو

۹۳ - آرنلڈ۔ سر تھامس۔ دی پریچنگ آف اسلام (دعوتِ اسلام)۔ ترجمہ: عنایت اللہ دہلوی۔ کراچی۔ ۱۹۶۴ء۔
۹۴ - احسان بی۔اے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میدانِ جہاد میں۔ کراچی۔ ۱۹۶۸ء۔
۹۵ - اسکاٹ۔ ایس پی۔ تاریخِ اندلس۔ ترجمہ: محمد خلیل الرحمٰن۔ مطبوعہ لاہور۔
۹۶ - اصلاحی۔ امین احسن۔ دعوتِ دین اور اس کا طریق کار۔ لاہور۔ ۱۹۵۸ء۔
۹۷ - اکبر خان۔ میجر جنرل۔ حدیثِ دفاع۔ لاہور۔ ۱۹۵۴ء۔
۹۸ - بیوری۔ جے۔ بی۔ تاریخ سلطنت رومہ۔ ترجمہ: ہاشمی فرید آبادی۔ دکن۔ ۱۹۲۹ء۔
۹۹ - بلنچلی۔ جے۔ کے۔ نظریۂ سلطنت۔ ترجمہ: قاضی تلمذ حسین۔ دکن۔ ۱۹۲۸ء۔
۱۰۰ - پرویز۔ معراجِ انسانیت۔ لاہور۔ ۱۹۶۸ء۔
۱۰۱ - تھیچر آلیور۔ تاریخ یورپ۔ ترجمہ: عبدالماجد وغیرہ۔ دکن۔ ۱۹۳۲ء۔
۱۰۲ - چینی۔ بدر الدین چینی و عرب کے تعلقات۔ کراچی۔ ۱۹۴۹ء۔
۱۰۳ - حطی۔ عرب اور اسلام۔ ترجمہ: مبارز الدین و معین خان۔ دہلی۔ ۱۹۵۹ء۔
۱۰۴ - حمید اللہ۔ قانون بین الممالک۔ دکن۔ ۱۳۶۴ھ۔
۱۰۵ - حمید اللہ۔ عہدِ نبوی میں نظامِ حکمرانی۔ دکن (طبع دوم)۔
۱۰۶ - حمید اللہ۔ رسولِ اکرم کی سیاسی زندگی۔ کراچی ۱۹۶۱ء۔
۱۰۷ - حمید اللہ۔ عہدِ نبوی کے میدانِ جنگ۔ دکن۔ ۱۹۴۵ء۔
۱۰۸ - ڈننگ۔ نظریات سیاسیہ۔ ترجمہ: قاضی تلمذ حسین۔ دکن۔ ۱۹۲۴ء۔
۱۰۹ - سعید انصاری۔ سیر انصار۔ اعظم گڑھ۔ ۱۳۴۳ھ۔
۱۱۰ - سعید احمد اکبر آبادی۔ وحی الٰہی۔ دہلی۔ ۱۹۵۲ء۔
۱۱۱ - سلیمان ندوی۔ ارض القرآن۔ اعظم گڑھ۔ ۱۹۵۰ء تا ۱۹۵۶ء۔

۱۱۲۔ سلیمان ندوی و شبلی نعمانی۔ سیرۃ النبیؐ۔ ج ا تا ۴۔ اعظم گڑھ۔ ۱۳۵۱ھ تا ۱۳۷۵ھ۔

۱۱۳۔ سلیمان منصور پوری۔ رحمۃ للعالمین۔ لاہور۔ ۱۹۵۳ء۔

۱۱۴۔ شاہ معین الدین احمد ندوی۔ اسلام اور عربی تمدن۔ اعظم گڑھ (دار المصنفین)

۱۱۵۔ شیروانی، ہارون خان۔ سیاسیات کے اصول۔ علی گڑھ۔ ۱۹۵۳ء۔

۱۱۶۔ غازی۔ حامد الانصاری۔ اسلام کا نظامِ حکومت۔ دہلی۔ ۱۹۴۳ء۔

۱۱۷۔ کرین برنٹن، جان بی کرسٹوفر، رابرٹ ای ولف۔ تاریخ تہذیب۔ ترجمہ: غلام رسول مہر۔ لاہور۔ ۱۹۶۵ء۔

۱۱۸۔ لیبان۔ گستاوَ۔ تمدنِ عرب۔ ترجمہ: سید علی بلگرامی۔ لاہور۔ ۱۹۳۶ء۔

۱۱۹۔ مجیب اللہ ندوی۔ اہل کتاب صحابہ و تابعین۔ اعظم گڑھ۔ ۱۹۵۱ء۔

۱۲۰۔ مودودی۔ قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں۔ لاہور۔ ۱۹۵۴ء۔

۱۲۱۔ مودودی۔ مذہب کا اسلامی تصور۔ کراچی۔ ۱۹۶۵ء۔

۱۲۲۔ مودودی۔ اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی۔ لاہور۔ ۱۹۵۵ء۔

۱۲۳۔ مودودی۔ مسئلہ قومیت۔ پٹھانکوٹ۔ ۱۹۴۶ء۔

۱۲۴۔ مودودی۔ الجہاد فی الاسلام۔ لاہور۔ ۱۹۶۲ء۔

۱۲۵۔ مودودی۔ اسلامی ریاست۔ لاہور۔ ۱۹۶۲ء۔

۱۲۶۔ مودودی۔ تفہیم القرآن (جلد اوّل تا سوم مطبوعہ دہلی، اور جلد چہارم تا ششم مطبوعہ لاہور)۔

۱۲۷۔ میکیاویلی۔ پرنس (بادشاہ)۔ ترجمہ: ڈاکٹر محمود حسین۔ کراچی۔ ۱۹۵۷ء۔

۱۲۸۔ ندوی۔ ابوالحسن علی۔ انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر۔ لکھنؤ۔

۱۲۹۔ یوسف الدین۔ اسلام کے معاشی نظریے۔ دکن۔ ۱۹۵۰ء۔

۱۳۰۔ الندوۃ العالمیۃ الاسلامیات۔ لاہور۔ ۱۳۷۹ھ۔

۱۳۱۔ چراغِ راہ۔ اسلامی قانون نمبر۔ جون ۱۹۵۸ء۔

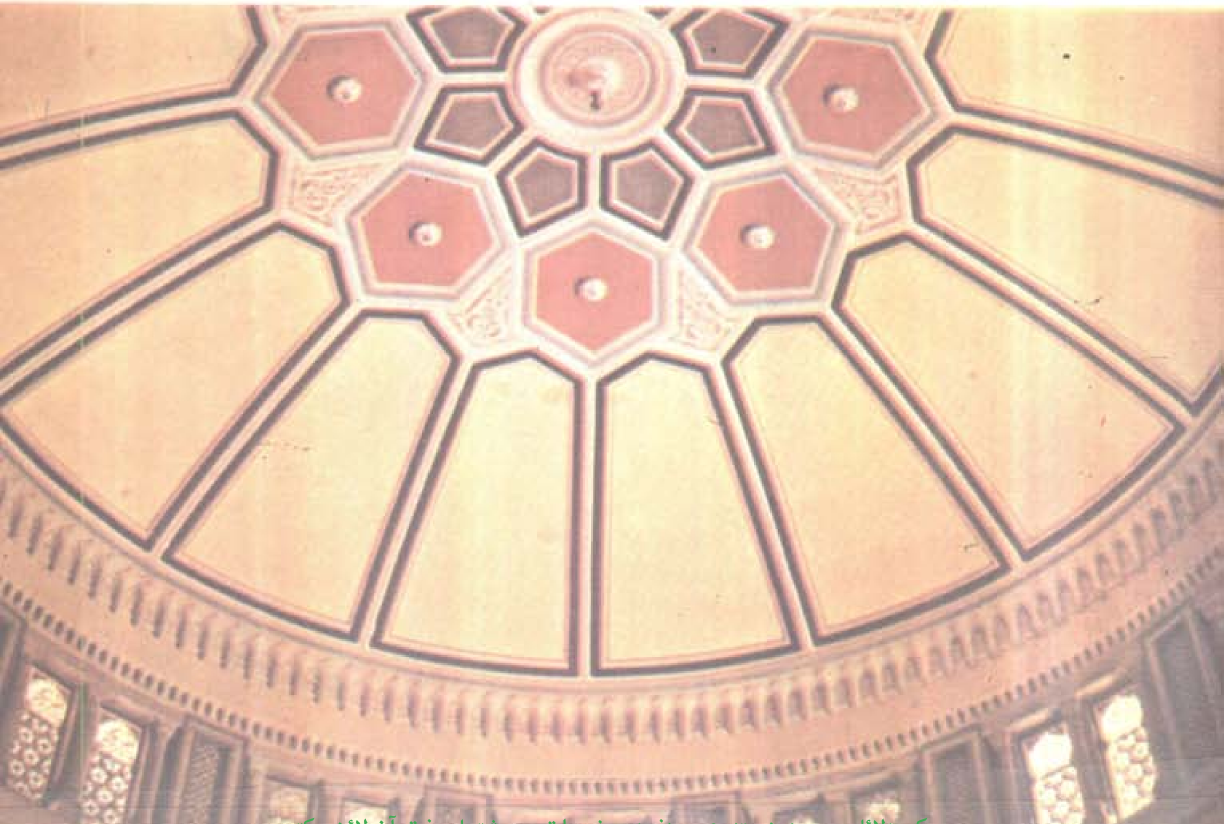
۱۳۲۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ۔ لاہور۔ ۱۹۶۸ء۔

إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ

حکم (تو اور کسی کا) نہیں بجز اللہ کے

(الانعام: ۵۷)

عہدِ نبوی میں
تنظیمِ ریاست و حکومت



عہدِ نبویؐ میں

تنظیمِ ریاست و حکومت

ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی

باب اوّل

اسلامی ریاست کا ارتقاء

اسلامی ریاست : منہاج و مقصد

عہدِ نبوی میں اسلامی ریاست کا قیام نہ صرف مدینہ منورہ یا جزیرہ نمائے عرب میں بلکہ تمام انسانی دنیا کے لئے ایک نیا سیاسی تجربہ تھا۔ سلطنتوں اور حکومتوں کا خمیر محض مادی ضروریات کی تکمیل اور آسائشوں کی فراہمی کے لئے حیوانی اور بہیمی فطرت کی مٹی سے اٹھایا جاتا ہے۔ ان کا مقصد جہانگیری و جہانبانی ہوتا ہے، حکمروں کی اقتصادی دولت سے فائدہ اٹھانا ہوتا ہے۔ غریب و بے بس رعایا کی سیاسی غلامی اور سماجی تحقیر سے حکامِ وقت کے جذباتِ حکمرانی و فرمانروائی کی تسکین مقصود ہوتی ہے۔ حکمرانوں کو نہ معاشرتی اصلاح کی فکر ہوتی ہے اور نہ سیاسی بہبود کی، نہ ان کو اقتصادی حالات کو سدھارنے کا غم ستاتا ہے نہ عوام کے اخلاق بلند کرنے کا۔ سلاطین، فرمانرواؤں اور طبقاتِ حکمراں کو محض اپنے مادی فوائد عام طور سے عزیز ہوتے ہیں۔ مدینہ منورہ میں ۱۲ ربیع الاول سنہ ۱ھ / ۲۴ ستمبر سنہ ۶۲۲ء کو جس اسلامی ریاست کی داغ بیل پڑی تھی وہ دوسری دنیاوی سلطنتوں اور حکومتوں اور ریاستوں کی مانند ایک اور دنیاوی ریاست یا حکومت نہ تھی، بلکہ وہ ایک ایسی مثالی ریاست اور قابلِ تقلید حکومت تھی جس کی بنیادیں خدائے قادر و مطلق کی حاکمیتِ اعلیٰ، پیغمبرِ خدا کی نیابتِ خداوندی، اُمتِ مسلمہ کی اخوّت و مساوات اور احترام و محبتِ بنی آدم کے عظیم اصولوں اور عملی نمونوں پر قائم کی گئی تھیں۔ یہی وہ بنیادی خصوصیات ہیں جو اسلامی ریاست و حکومت کو اپنی تمام پیشرو اور جانشین دنیاوی حکومتوں اور ریاستوں سے ممتاز کرتی ہیں۔[1]

دوسری طرف جزیرہ نمائے عرب کے قبائلی نظام میں ریاست کا کوئی تصوّر نہ تھا اور نہ منظم حکومت کا کوئی نظریہ و خیال۔ سیاسی تصورات دھندلے تھے اور سیاسی نظام خام۔ بدوی عربوں (اھل البداوۃ) میں سیاسی نظام کی جگہ سیاسی انارکی تھی۔ ہر قبیلہ اپنی جگہ آزاد و خود مختار تھا، مرکزیت و اجتماعیت مفقود تھی۔ نتیجہ یہ کہ بدوی قبیلوں کی زندگی باہمی اختلافات، چپقلش، نزاع اور تصادم و تحارب کی تفسیر تھی، جو اپنی آزادی اور خود مختاری کے اظہار و اقرار کے لئے دوسروں کی زندگی، مال اور آزادی سے کھیلتے رہتے تھے۔ ان کا نظریۂ حیات و سیاست معاصر ریاستوں اور اقوام کے نظریاتِ زندگی سے کچھ مختلف نہ تھا۔ مادی آسائشیں، دنیاوی راحتیں اور اقتصادی سہولتیں ان کا بھی مطمحِ نظر تھیں۔ اگرچہ ایرانی ساسانی سلطنت، رومی بازنطینی سلطنت اور ان دونوں کی ماتحت و باجگذار بادشاہتیں — لخمی، غسانی، کندی اور حبشی وغیرہ — ایک منظم و مرتب سیاسی ڈھانچہ رکھتی تھیں اور ان کے مقابلے میں عرب کی بدو قبائلی آبادیاں خاص کر اور شہری بستیاں

(اهل الحضارة) عام طور سے منظم نظامِ سیاست سے عاری اور تہی تھیں[۲]، تاہم دونوں کے نظریہ ہائے حیات اور سیاسی نظاموں کے اثرات یکساں تھے۔ دونوں کا بس ایک مقصد تھا: اپنی فلاح دوسروں کی قیمت پر۔

ان کے برعکس اسلامی ریاست کا مقصود صرف اپنی فلاح یا محض امتِ مسلمہ کی بہبودی نہ تھا۔ اس کا مطمحِ نظر پوری انسانیت، تمام کائناتِ انسانی کی فلاح و بہبود تھا۔ اس عظیم و بے مثل مقصود کے ساتھ یہ ریاست وجود میں آئی تھی۔ عملی طور پر اس کا ارتقاء ہجرتِ نبوی کے معاً بعد شروع ہوگیا اور حیاتِ نبوی کے آخری دنوں میں وہ تکمیل کو پہنچ گیا تھا جب پورے جزیرہ نمائے عرب نے مدینہ کے حاکم و رسول کی حکمرانی تسلیم کر لی تھی۔ لیکن اس اسلامی ریاست کا نظریاتی ارتقاء اس سے بہت پہلے شروع ہوا تھا۔ اس کی پہلی اینٹ تیرہ برس قبل غارِ حرا میں اُترنے والی پہلی وحی نے جبرئیل امین کے ہاتھوں قلبِ نبوی میں رکھی تھی اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ ایک کے بعد دوسری اینٹ رکھی جاتی رہی اور نظریاتی ارتقاء کا عمل جاری رہا تاآنکہ اس کا دھارا عملی ارتقاء کے دھارے میں مل گیا۔ اور پھر دونوں کی تکمیل ساتھ ساتھ ہوئی۔ لیکن نقطۂ کمال تک پہنچنے کے لئے ریاستِ اسلامی کو مختلف تشریعی و تکوینی منزلوں، سیاسی نشیب و فراز اور معاشرتی شکست و ریخت کے تعمیری عمل سے گزرنا پڑا۔

تاریخی و نظریاتی پس منظر

عہدِ نبوی کی اسلامی ریاست کا بنیادی پتھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا سماجی تحفظ کا نظام تھا جو بذاتِ خود "اُمۃ" کے تصور و نظریہ پر مبنی تھا۔ اُمتِ مسلمہ کا کلیدی تصور و نظریہ بنیادی طور سے مکی دورِ حیات میں ابھرا اور نشو و نما پذیر ہوا تھا جو ساتویں صدی عیسوی کے عربوں کے سیاسی نظریے سے یکسر مختلف تھا۔ غیر مسلم عربوں کا مرکزی خیال قبیلہ تھا جو بنیادی طور پر خون کے رشتہ[۳] کی اساس پر ایک انسانی گروہ ہوتا تھا۔ اگرچہ قبیلے حِلف، وِلاء اور جوار کے مصنوعی رشتوں[۴] کی بناء پر اپنے ارکان کی عددی قوت اور اس کے نتیجے میں عسکری طاقت بڑھاتے رہتے تھے تاہم ان کی سماجی بنیاد خون کا رشتہ ہی فراہم کرتا تھا۔ مصنوعی رشتوں کے ذریعہ نئے سیاسی و سماجی اتحاد و معاہدے تو قائم کئے جا سکتے تھے مگر وہ انسانی محبت، بھائی چارے، قربانی اور دوسروں کی خاطر کچھ کرنے کا جذبہ عام طور سے نہیں پیدا کرتے تھے۔ پھر یہ مصنوعی رشتے اپنے دائرہ کار اور افادیت کے اعتبار سے محدود ہوتے تھے۔ عموماً ان کا مقصد دشمن قبائل کے خلاف سیاسی اور عسکری اتحاد قائم کرنا ہوتا تھا۔ مصنوعی رشتوں کی بناء پر خون کے رشتہ کی اہمیت میں ذرا بھی کمی نہ آئی تھی اور نہ ہی قبیلہ کی سیاسی اہمیت میں۔ چنانچہ عرب کے قبائلی نظام میں سماجی تحفظ کا سرچشمہ قبیلہ کی اجتماعی طاقت تھی۔ قبیلہ افراد کو جان و مال کے تحفظ کی ضمانت دیتا تھا تو معاوضہ میں اپنے لئے غیر مشروط و غیر متزلزل وفاداری کا طالب تھا۔ یہی قبائلی فطرت تھی جس نے ہر اہم اور بڑے قبیلہ کو ایک آزاد و خود مختار سیاسی و معاشرتی وحدت کا درجہ عطا کر دیا تھا۔ اگرچہ عربوں کو، چاہے وہ بدو ہوں یا شہری، منظم و باقاعدہ سیاسی نظاموں خاص کر اپنی سرحدوں پر واقع اس وقت کی دو عظیم ترین سلطنتوں —— بازنطینی اور ساسانی —— اور ان کی ماتحت متعدد دوسری بادشاہتوں اور ریاستوں کا بخوبی علم و تجربہ تھا تاہم ان کو

اپنی قبائلی زندگی اور اس کی عطا کردہ آزادی و خود مختاری اتنی عزیز تھی کہ وہ مرکزیت و تنظیم کے خیال سے لرزاں اور ریاست کے تصور سے بے بہرہ تھے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جب کبھی ان کو ریاستی تنظیم کا خیال آتا تھا جو عموماً ایک یا دو قبیلوں یا شہروں اور علاقوں تک محدود ہوتا تھا تو صرف بادشاہت (ملوکیۃ)[۵] ہی کو اپنانے کی کوشش کرتے تھے۔ اس کی وجہ شاید جزیرہ نمائے عرب میں قائم بعض قدیم و معاصر بادشاہتوں کا اور سرحدوں پر رومی اور ایرانی سلطنتوں کا اثر تھا۔

امت اسلامی کا جو تصور مکہ میں پیدا اور ترقی پذیر ہوا اس کی بنیاد خون کے رشتے پر نہیں بلکہ مذہب ——اسلام—— پر رکھی گئی تھی۔ یہ ایک انقلاب آفریں تصور تھا۔ اپنی ماہیت و حقیقت کے اعتبار سے ہی یہ نظریہ ان تمام سماجی تفریقوں، سیاسی سماجی اونچ نیچ اور اقتصادی ناہمواری کی کاٹ کرتا تھا جس کی بنیاد خون کے رشتہ پر قائم سماج اور ریاست میں ہوتی ہے۔ چنانچہ رنگ، نسل، وطن، علاقے اور قوم کے تمام تفرقے مٹ گئے تھے اور اُمتِ اسلامی میں وہ تمام لوگ شامل اور اس کے رکن بن گئے جو اسلام کو مانتے اور اس پر عمل کرتے تھے۔ یہ خیال کہ اُمتِ اسلامی کا یہ تصور و نظریہ واضح طور سے قرآن و حدیث اور سنتِ نبوی میں بیان نہیں ہوا ہے بلکہ ہر جگہ مضمر و محذوف ہے[۶] صحیح نہیں ہے۔ قرآن کی متعدد آیات، بے شمار احادیثِ نبوی اور مختلف سننِ رسول میں اس نظریہ کو واضح اور واشگاف انداز میں بیان کیا گیا ہے[۷]۔ پھر محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدائے واحد و مطلق کا پیغمبر تسلیم کرنا ہی یہ ثابت و لازم کر دیتا ہے کہ رسول کا ایک فرضِ منصبی تو یہ ہے کہ وہ پیغامِ خداوندی کو قبول کر کے اسے انسانوں تک پہنچائے اور پھر اس کو عملی جامہ پہنا کر ان کے لئے ایک اُسوۂ عمل قائم کرے۔ ظاہر ہے کہ پیغمبرِ خدا کی مرضی اور اس کے قوانین و احکام کو انسانوں تک پہنچاتا اور پھر ان پر عمل کراتا ہے۔ اس اعتبار سے پیغمبر خدا کا نائب اور جانشین ارضی ہوتا ہے اور اصل کارساز و مقتدر خداوند تعالیٰ ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے خدا خود امتِ اسلامی کا حاکمِ اعلیٰ ہوتا ہے۔ گویا کہ اسلامی معاشرہ اور اُمت کا سرچشمۂ حکمرانی اور فرمانروائی جس کو موجودہ سیاسی اصطلاح میں اقتدارِ اعلیٰ یا حاکمیت مطلقہ تامہ کہتے ہیں۔ خدا کی ذاتِ اقدس ہوتی ہے کیونکہ وہ تمام کائنات کا خالق و مالک ہے۔ مگر اس خدائی اقتدارِ اعلیٰ کو نافذ و جاری پیغمبر کی ذات کرتی ہے اور اس کے بعد یہ ذمہ داری اس کے سیاسی خلفاء پر انفرادی طور سے اور امتِ مسلمہ پر اجتماعی طور سے عائد ہوتی ہے۔ عہدِ جدید کے بعض عظیم مسلم مفکرین نے قرآن مجید کی وہ سیاسی تعلیمات ایک جگہ جمع کر دی ہیں جو اسلام کے تصورِ کائنات، حاکمیتِ الٰہیہ، اللہ کی قانونی حاکمیت، رسول کی حیثیت، قانون کی بالاتری، خلافتِ الٰہی اور اس کی اجتماعی اہمیت، اسلامی ریاست کی اطاعت کے حدود، اس کے مقصد، رعایا یا باشندوں اور شہریوں کے حقوق، حکمرانوں کی صفات و خصائص اور سیاسی اصولوں سے متعلق ہیں[۸]۔ ان سے اسلام کے سیاسی اصولوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور اس کے اصولِ حکمرانی مستنبط کئے جا سکتے ہیں۔

مکہ میں چونکہ قریشی اشرافیہ کی بالادستی ہر میدانِ حیات میں قائم و دائم تھی اس لئے وہاں اسلام اُمت کے تصور کو ایک اخلاقی و نظریاتی بنیاد تو فراہم کر سکا لیکن اس کو مکمل طور سے کوئی عملی شکل نہ دے سکا۔ تاہم جب اسلام مکہ میں ایک سماجی اور سیاسی نظریہ کی شکل میں اُبھرا تو اسلامی اُمت کے ایک مخصوص و ممتاز نظریہ کا اوّلین اظہار مواخاۃ (بھائی چارے) کی شکل میں ہوا۔ ابنِ اسحاق اور دُوسرے ابتدائی سیرت نگاروں اور اسلامی مورخین کا بیان ہے کہ جب مکہ میں مسلمانوں کی ایک معتدبہ تعداد ہو گئی

اور ایک جماعت وجود میں آگئی تو آپ نے مسلمانوں کے درمیان مواخاۃ قائم کر دیا۔ یعنی دو مکی مسلمانوں کو ایک دوسرے کا اصلی بھائی بنا دیا جاتا تھا جو عملی و نظری دونوں اعتبار سے خون کے رشتہ سے زیادہ پکّا اور مستحکم رشتہ بن جاتا تھا۔ اس طرح حضرت طلحہ بن عبید اللہ تیمی اور حضرت زبیر بن عوام اسدی بھائی بھائی بن گئے تھے تو دوسری طرف جناب رسالتمآبؐ نے حضرت علی کو اپنا اسلامی بھائی قرار دیا تھا۔[۹] ظاہر ہے کہ اسی طرح دُوسرے تمام مسلمانانِ مکہ ایک دوسرے کے بھائی بنے تھے۔ اس نئے رشتۂ اخوت نے، ایک طرف تو اسلام با مذہب کی افادیت، اہمیت اور فعالیت بڑھا دی اور مسلمانوں کے ذہن نشین کر دی تھی تو دُوسری طرف دو مسلمانوں کے درمیان جذبۂ اخوت کو مضبوط تر کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کو اپنے خاندان اور رشتہ داروں سے کٹ جانے کے غم کو ہلکا کر دیا تھا اور جینے کا ایک عزم جزم، ایک جوش و ولولہ اور ایک نیا رنگ و آہنگ ان کو عطا کر دیا تھا۔ مکی دور کا یہ رشتۂ اخوت و مواخات اُمتِ اسلامی کے قیام کا پہلا بنیادی پتھر تھا۔ مگر مکی عہد میں متعدد اور گوناگوں سماجی، سیاسی اور اقتصادی دشواریوں اور رکاوٹوں کے سبب اس پتھر پر امتِ اسلامی کی مکمل عمارت تعمیر نہیں کی جا سکی۔ تقدیرِ الٰہی نے یہ اہم ترین کام مدنی مسلمانوں کی نصرت و حمایت کے سایہ میں لینا چاہا تھا اس لئے ہجرتِ مدینہ تک ملت و امتِ اسلامی کو اپنے مکمل و منظم وجود و ارتقاء کے لئے انتظارِ ساغر کھینچنا تھا۔

(۱) پہلا مرحلہ : ہجرت

یثرب میں اسلام کا تعارف کافی پہلے ہو چکا تھا۔ روایت ہے کہ شہر انصار کا ایک سربرآوردہ و سرکردہ سردار سوید بن صامت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں بعثت کے صدرِ اوّل ہی میں مکہ جا کر حاضر ہوا تھا اور اسلام کی حقانیت کا قائل بھی ہو گیا تھا لیکن شرفِ اسلام سے محروم رہا اور جنگِ بعاث (۶۱۵ء) میں اظہار و اقبالِ اسلام سے قبل مارا گیا۔[۱۰] اسی طرح اسی زمانہ کے قریب اوس کے ایک اہم سردار ایاس بن معاذ بھی اسلام سے مکہ میں متعارف ہوئے تھے اور وہ بھی اسلام کے اعلان و اجہار سے پہلے جنگِ بعاث میں مارے گئے۔[۱۱] محض یہی دو واقعات تنہا نہیں تھے متعدد ایسے واقعات رہے ہوں گے اور اسلام سے یثرب والے ابتدا ہی میں روشناس ہو گئے ہوں گے کیونکہ ان کے مکہ والوں سے تجارتی، معاشرتی اور مذہبی تعلقات تھے اور دونوں شہروں کے درمیان آمد و رفت کا سلسلہ برابر لگا رہتا تھا۔ اسلام کے اس ابتدائی تعارف نے یثرب میں اس کے قبول کرنے کے لئے زمین ہموار اور ذہن تیار کر دئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ۱۰ نبوی / ۶۲۰ء میں آپ نے خزرج کے چھ صالح و سرکردہ جوانوں کو اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے بلا کسی پس و پیش کے اسے قبول کر لیا۔[۱۲] بظاہر یہ ایک معمولی واقعہ تھا کیونکہ مسلمان ہونے والے یثربیوں کی تعداد بہت حقیر تھی تاہم یہی سرزمین یثرب میں اسلام کا پہلا پودا تھا اور اسی نے اسلامی اُمت کا پہلا بیج بویا تھا۔ ان نو مسلم خزرجیوں نے اسلام کی اشاعت کا فریضہ اپنے ذمے لے لیا اور اس تندہی اور جوش سے کام کیا کہ یثرب میں مسلمانوں کی تعداد معتد بہ ہو گئی[۱۳] اور ان میں سے بارہ مسلمان نمائندوں نے دوسرے برس ۱۱ نبوی / ۶۲۱ء میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مکہ جا کر ملاقات کی اور پہلی بیعت عقبہ کی۔ یہ معاہدہ یا بیعت اپنی

شرائط کے اعتبار سے سیاسی لحاظ سے زیادہ اہم نہ تھی کہ ان کے مطابق مسلمانانِ یثرب نے چند اخلاقی ضوابط کی بجا آوری کا وعدہ کیا تھا۔ اسی بنا پر اس بیعت کو ہمارے مستند مورخین عموماً بیعت النسائ (عورتوں کی بیعت) کے نام سے یاد کرتے ہیں کہ اسی قسم کے وعدے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسلمان خواتین سے قبولِ اسلام کے وقت لیتے تھے[۱۴] سیاسی اہمیت نہ ہو، مگر ان شرائط نے مسلم سماج کے اخلاقی اصول وضع کئے تھے اور اُمتِ اسلامیہ کو ایک پاکیزہ، قائم و دائم روایات فراہم کی تھیں جنہوں نے بعد میں اسلامی معاشرہ کی اساسی تشکیل کی تھی۔ اس بیعت کی دوسری سماجی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں یثرب کے دونوں متحارب و متصادم قبیلوں —— اوس و خزرج —— کے نمائندے شامل تھے۔ یہ حقیقت اور یثرب میں اسلام کی اشاعت اور اس کے سماجی پس منظر کے واقعات ثابت کرتے ہیں کہ اسلام کو یثرب میں روزِ اوّل سے ایک معاشرہ ساز سماجی اصلاحی تحریک کے طور پر قبول کیا گیا تھا کیونکہ اسلام نے مدتوں سے باہم دست بگریباں رہنے والے یثربیوں کو ایک دوسرے کا بھائی، ہمدم اور دوست بنا دیا تھا۔ شہر کے دونوں حریف و متقابل سماجی طبقات نے اسلام کی اس شیرازہ بندی کی صلاحیت اور سماجی فعالیت کو بخوبی سمجھ لیا تھا[۱۵] یہی وجہ ہے کہ یثرب میں اسلام کی اشاعت قبائلی خطوط پر نہیں ہوئی تھی کہ ایک قبیلہ یا چند خاندانوں میں وہ محدود رہتی بلکہ وہ طبقاتی حد بندی کو پار کر کے آفاقی بنی تھی اور اس طرح اسلام نے قبائلی عصبیت کو دبایا تھا اور ایسا نہیں ہونے دیا تھا کہ ایک قبیلہ کی دشمنی یا تعصب میں دوسرے مخالف قبیلہ نے اسے ماننے سے انکار کر دیا ہو۔ بہر حال جس طرح سے بیعت عقبۂ اولیٰ میں چھ خزرجی اور تین اوسی مسلمانوں نے دستِ مبارک رسول پر بیعت کی تھی اور ایک مشترک مقصد کے حصول کی خاطر ایک دوسرے سے جس طرح تعاون کا اظہار کیا تھا وہ دراصل یثرب میں امتِ مسلمہ کے قیام کا پیش خیمہ تھا۔

ظاہر ہے کہ اسلام کی اشاعت پر امتِ مسلمہ کا اور اس پر اسلامی ریاست کے قیام کا انحصار تھا۔ مدینہ منورہ میں اشاعتِ اسلام کا کام یثربی —— اوسی اور خزرجی —— مسلمان جس تندہی، جوش اور ولولے سے کر رہے تھے اور اس میں جتنی ان کو کامیابی مل رہی تھی اس کے لئے کسی خارجی مدد کی ضرورت نہ تھی[۱۶]۔ تاہم مسلمانانِ شہر نو کی مذہبی و تعلیمی تربیت اور اس سے زیادہ معاشرتی تنظیم کے لئے ایک ایسے صحابیٔ رسول کی ضرورت تھی جو کہ اسلام کی صحیح نمائندگی کر سکے اور مقامی قبائلی تعصبات سے بلند تر ہو تاکہ دونوں طبقات اس پر یکساں اعتماد و یقین کر سکیں۔ اسی لئے انہوں نے بیعتِ عقبۂ اولیٰ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک معلّم کی درخواست کی تھی جو ان کو قرآن اور اسلام کی تعلیم دے سکے۔ آپ کی نگاہِ انتخاب قریش کے خاندان عبد الدار کے ایک نوجوان مسلمان حضرت مصعب بن عمیر پر پڑی جنہوں نے راہِ حق میں خاندانی وجاہت و ثروت اور دنیاوی عیش و عشرت کو تج دیا تھا۔ مدینہ پہنچ کر حضرت مصعب عبدری نے اشاعتِ اسلام کے ساتھ ساتھ اسلامی معاشرے کی شیرازہ بندی کا بھی کام کیا۔ وہ مسلمان آبادی کے معلّم، امام اور ایک معنی میں خلیفہ و نائبِ رسول تھے۔[۱۷]

یثربی مسلمانوں اور حضرت مصعب عبدری کی کوششیں رنگ لائیں اور یثرب میں اسلام اتنی تیزی اور ہمہ گیری سے پھیلا کہ اوس و خزرج کا کوئی خاندان خاص مدینہ میں ایسا نہ تھا جس کے گھر میں خدا اور رسول کا نام نہ گونجتا ہو۔ مورخین کا بیان ہے کہ اوس مناۃ کے صرف چار گھرانے بنو خطمہ، بنو وائل اور بنو واقف اور بنو امیہ بن زید دائرہ اسلام کے باہر رہ گئے تھے[۱۸]۔ یثرب

کی سرزمین پر اسلام کی کامیابی کا اظہار اور پیغمبر اسلام کی خدمت میں نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کے لئے ۱۲ سنہ نبوی / ۶۲۲ء میں امت مسلمہ کے تقریباً پچھتر[۱۹] اشخاص دافراد مکہ میں بارگاہِ نبوی میں حاضر ہوئے۔ یہ بیعتِ عقبہ ثانیہ کہلاتی ہے۔ اور اس کو بیعتِ حرب (جنگ کی بیعت یا معاہدہ) بھی کہا جاتا ہے کیونکہ اس موقعہ پر خزرج واوس کے مسلمان نمائندوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے وطن میں آ بسنے کی دعوت دی اور جب آپ نے اسے قبول کر لیا تو انھوں نے نہ صرف خدا اور اس کے رسول کی غیر مشروط و غیر متزلزل وفاداری کا دم بھرا تھا بلکہ آپ کے جان و مال کی حفاظت کا وعدہ کیا تھا۔ دراصل یہ معاہدہ دفاعی اور جارحانہ جنگ دونوں کا معاہدہ تھا۔[۲۰] یہ وُہ بنیادی اور کلیدی پتھر تھا جس پر ہجرت کے بعد یثرب میں اُمتِ اسلامی کی بنیاد رکھی جانی تھی۔

یثرب میں ہجرتِ نبوی تک امتِ مسلمہ کی تشکیل و شیرازہ بندی کے لئے آپ نے بارہ اشخاص پر مشتمل سربرآوردانِ یثرب کی ایک جماعت مقرر کی۔ ان میں سے ہر ایک نقیب تھا اور ان سب پر ایک نقیب النقباء تھا۔ نو نمائندے خزرج کے مختلف قبیلوں سے اور تین اوس کے مختلف گھرانوں سے منتخب کئے گئے تھے۔ یہ نکتہ اہم ہے کہ نقیبوں کے ناموں کا انتخاب خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بجائے نمائندگانِ یثرب نے کیا تھا۔ اس جماعتِ نقباء کی سرکردگی اور سیادت و ریاست کی فضیلت کا سہرا حضرت اسعد بن زرارہ کے سر بندھا تھا جو خاندان بنی نجار/خزرج کے ایک معزز اور با اثر سردار تھے اور جنہوں نے وطنِ مالوف میں اسلام کی اشاعت اور اُمتِ مسلمہ کی شیرازہ بندی کا کام بڑی لیاقت اور خوبی سے کیا تھا۔ اور اس طرح اپنی قائدانہ صلاحیت، معاملہ فہمی، حُسنِ تدبیر اور مقبولیت و سیادت کا ثبوت دے چکے تھے۔[۲۱]

بیعتِ عقبہ ثانیہ دراصل ہجرتِ یثرب کا دیباچہ تھی۔ اس نے مکہ کے ستم رسیدہ اور منتشر مسلمانوں کے لئے ایک جائے پناہ فراہم کر دی تھی، جہاں نہ صرف مسلمانانِ مکہ بلکہ مسلمانانِ عرب آزادی سے اپنے مذہب وعقیدہ کے مطابق زندگی بسر کر سکتے تھے بلکہ امتِ مسلمہ کی تشکیل کر سکتے تھے جو ہجرت کا اصل مقصد تھا۔ اس ضمن میں یہ نکتہ ذہن نشین رہنا چاہئے کہ محض ہجرت مقصود نہ تھی اور نہ ہی اس کی برکت میں ملنے والی آزادئ فکر وعقیدہ وعمل۔ اگر یہی مطلوب رہا ہوتا تو ۵ سنہ نبوی / ۶۱۵ء میں ہجرتِ حبشہ کافی ہوتی کیونکہ مسلمانانِ مکہ کو نجاشی کے حبش میں مکمل مذہبی و سماجی تحفظ حاصل تھا۔ حبشہ کو بے سروسامان مکی مسلمانوں نے اس لئے ہجرت کی تھی کہ مکہ کے مخالفان ودشمنانِ اسلام نے نہ صرف ان کی آزادیِ فکر وعمل پر قدغن لگا دی تھی بلکہ ان پر عرصۂ حیات بھی تنگ کر دیا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی تعذیب وظلم و جبر سے مسلمانوں کو بچانے کے لئے ان کو ہجرت کی اجازت دے دی تھی مگر تاریخِ اسلامی میں کسی روایت سے بھی یہ نہیں معلوم ہوتا کہ خود رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے حبشہ کی ہجرت کے بارے میں سوچا بھی ہو۔ اذنِ خداوندی ملنے کے بعد آپ نے جب ہجرت کے بارے میں سوچنا اور مختلف مقامات کے انتخاب کے بارے میں غور کرنا شروع کیا تھا تو بھی آپ کی نگہِ فکر اور نظرِ انتخاب جزیرہ نمائے عرب کے کسی مرکزی مقام ہی پر پڑتی تھی۔[۲۲] وطنِ ثانی بلکہ معہدِ اسلام کے لئے مدینہ کا انتخاب سیاسی، سماجی، اقتصادی، فوجی بلکہ ہر اعتبار سے مناسب ترین تھا جسے بعد کے تاریخی واقعات نے صحیح ثابت کر دیا۔ تاریخی دھارے بھی اسی سمت میں بہہ رہے تھے اور ہجرت سے دو سال پہلے کے تاریخی واقعات اور عناصر نے مدینہ کے انتخاب پر مُہرِ تصدیق ثبت کر دی تھی۔[۲۳]

بیعتِ عقبۂ ثانیہ نے مسلمانانِ مکّہ کی ہجرتِ مدینہ کو ایک طرح سے ناگزیر بنا دیا تھا۔ چنانچہ اجازتِ الٰہی اور اذنِ نبوی ملتے ہی[۲۴] صحابۂ کرام نے مدینہ کا رُخ کیا۔ یہ صحیح خیال نہیں ہے کہ مسلمانانِ مکّہ میں سے اکثر نے چھُپ کر اور عالمِ بے سر و سامانی میں ہجرت کی تھی دراصل مہاجرینِ مدینہ کے تین طبقات کئے جا سکتے ہیں: اول وہ مالدار، با اثر اور سیاسی و سماجی اعتبار سے سربرآوردہ مکی مسلمان تھے جنہوں نے علانیہ باجماعت اور اپنی تمام منقولہ جائداد، اثاثوں اور مال و دولت سمیت ہجرت کی تھی۔ دوسرا طبقہ ان مہاجرینِ مکہ پر مشتمل تھا جو قریش اور دوسرے عرب قبائل کے مختلف خاندانوں کے نوجوان، سماجی و سیاسی طور سے خاصے معزز افراد تھے مگر اقتصادی اعتبار سے اپنے خاندان یا قبیلے پر منحصر تھے اس لئے بوقتِ ہجرت وُہ اپنے ساتھ زیادہ مال و دولت بھی نہ لے جا سکے تھے اور عموماً چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں عازمِ سفر ہُوئے تھے۔ ان میں سے کچھ قریشی روک ٹوک کی بنا پر یا اس سے زیادہ اپنے خاندان اور قبیلہ والوں کے خوف سے چھُپ کر ہجرت کے سفر پر نکلے تھے۔ اور تیسرا طبقہ ان نادار، بے آسرا اور سماجی و اقتصادی طور پر مجبور مسلمانوں پر مشتمل تھا جن کو مکّہ میں کسی کی پناہ و حمایت حاصل نہ تھی چنانچہ وُہ موقع پاتے ہی نکل کھڑے ہوتے تھے۔ اور ایسا عموماً خفیہ طور سے ہی ممکن تھا۔[۲۵] مکّہ میں رہ جانے والے مسلمانوں میں صرف غلام، موالی، مفلسی سے مجبور لوگ ہی نہیں رہ گئے تھے بلکہ دُوسرے طبقے کے کافی افراد ایسے تھے جو اپنے خاندان اور قبیلہ والوں کی چیرہ دستی اور جبر کی بنا پر ہجرت نہیں کر سکے تھے بلکہ ان میں سے بعضوں کو تو ہزار ہا بہانوں اور مکر و فریب سے مدینہ سے واپس لا کر قید کر دیا گیا تھا۔ متعدد جاں نثارانِ رسول جیسے حضرات ابوبکر، علی، طلحہ بن عبید اللہ تیمی، عبد الرحمٰن بن عوف، زبیر بن عوام اور دُوسرے کئی عظیم و اکابر صحابہ ایسے تھے جو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرتِ مدینہ کی راہ دیکھ رہے تھے۔ بعض مورخین کا یہ خیال کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکہ مکرمہ میں اکابر صحابہ میں سے صرف اول الذکر دو بزرگ یا محض گنتی کے چند مسلمان رہ گئے تھے صحیح نہیں ہے۔[۲۶] جاں نثاروں کی کافی بڑی جماعت ہم رکابی کا شرف حاصل کرنے کی منتظر تھی یا ذاتِ نبوی کو نرغۂ اعدا میں تنہا چھوڑ کر جانے پر آمادہ نہ تھی۔ جو بزرگ و نوجوان صحابہ کرام پہلے ہجرت کر گئے تھے ان پر کوئی نکیر نہ تھی کہ وہ اذنِ نبوی سے گئے تھے اور وہاں ایک عظیم تعمیری کام میں دل و جان سے لگ گئے تھے یعنی نئے مرکزِ اسلامی میں تنظیمِ معاشرہ اور تشکیلِ اُمت میں اپنا کردار ادا کر رہے تھے۔ بالآخر وُہ ساعتِ مسعود آ پہنچی کہ حکمِ الٰہی نے نبیِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو رخصت و اجازتِ ہجرت دی اور آپ اپنے رفیقِ غار، صدیقِ دیرینہ، جاں نثارِ قدیم حضرت ابوبکر تیمی کی معیت میں پنجشنبہ یکم ربیع الاول سنہ ۱ھ / ۱۴ اگست سنہ ۶۲۲ء کو ہجرتِ مدینہ کے سفر پر نکلے اور ۱۲ ربیع الاول سنہ ۱ھ / ۲۴ ستمبر سنہ ۶۲۲ء کو قبا پہنچے۔[۲۷]

قبا میں حضور پُر نور صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد ہی ریاستِ اسلامی اور اُمتِ مُسلمہ کی تشکیل و تنظیم کا پہلا دن ہے۔ کیونکہ روایات شاہد ہیں کہ قبا میں آپ نے جو پہلا کام کیا وہ پہلی مسجد نبوی کی تعمیر تھی۔[۲۸] اگرچہ ورودِ مسعود سے قبل قبا اور مدینہ کے مسلمان نمازیں ادا کرتے تھے لیکن ان کی کوئی باقاعدہ اور مرکزی مسجد نہ تھی۔ اسلام میں مسجد کو جو مرکزی اہمیت حاصل ہے اور صدرِ اول میں جو اس کی سیاسی اور سماجی حیثیت تھی اس پر زیادہ زور دینے کی ضرورت نہیں کہ وہ معروف و مشہور حقیقت ہے۔ بہرحال مسجدِ قبا کی پہلی اینٹ دراصل مدنی اسلامی معاشرہ کی کلیدی اینٹ تھی۔ دو ہفتے یا چودہ راتیں قبا میں قیام کے بعد آپ مدینہ منورہ پہنچے جبکہ تاریخ ۲۶ ربیع الاول سنہ ۱ھ / ۱۸ ستمبر سنہ ۶۲۲ء تھی۔[۲۹]

(۲) دُوسرا مرحلہ : اُمت کی تشکیل

مقبولِ عام اور مشہور خیال ہے کہ چونکہ مہاجرینِ مکہ بالکل خالی ہاتھ، تہی دست اور بے سرو سامان آئے تھے اس لئے وہ مدینہ کے مسلمانانِ اوس و خزرج کی فیاضی، وسیع القلبی اور مہمان نوازی پر اپنی معیشت و معاش کے لئے منحصر تھے مدنی مسلمانوں نے اپنے مہاجر بھائیوں کی جس محبت، حوصلہ مندی، دل سوزی اور خلوص سے مہمانی کی تھی وہ تاریخِ اسلام کا ایک روشن باب' اسلامی تعلیمات' اخوت و مساوات کا بے نظیر نمونہ اور مذہبی تعلق و بھائی چارے کا عظیم ترین اُسوہ ہے جس نے وسیع قلب و فیاض و مخلص، مدنیوں کو تا قیامت انصار اللہ و الرسول کے عظیم و قابلِ فخر لقب سے ممتاز و مشہور کر دیا۔ انصارِ مدینہ کی مدد اور تعاون' مہمان نوازی اور محبت، پُر خلوص تعلقِ خاطر اور دل سوزی سے کسی دیانت دار مورخ کو انکار نہیں ہو سکتا تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ تمام مہاجرینِ مکہ بالکل ہی بے سرو سامان و تہی دست نہ تھے اور وہ محض فیاضی و سخاوتِ انصار پر منحصر نہ تھے اور نہ ہی وہ مدنی معیشت پر بوجھ بنے تھے جیسا کہ عام خیال ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ انہوں نے مدینہ کے معاشی استحکام میں اپنا بھرپور کردار ادا کیا تھا اور مسلم معیشت کو نئی جہتیں عطا کی تھیں جن کا جائزہ کہیں اور لیا جا چکا ہے[۳۰] اور جس سے سرِ دست ہمیں بحث نہیں ہے۔ لیکن مہاجرینِ مکہ کی ناداری اور مفلسی کے مفروضے نے اس غلط تصور کو شہرت دی ہے کہ مہاجرینِ مکہ اور انصارِ مدینہ کے درمیان رشتۂ محبت و اخوت ——— مواخاۃ ——— اس لئے قائم کیا گیا تھا کہ بے گھر و در مسلمانوں کو اقتصادی بنیاد فراہم کی جائے۔ یہ صحیح ہے کہ انصارِ مدینہ نے مدتوں مہاجرینِ مکہ کی مہمان نوازی کی تھی اور ان کو اپنے گھروں میں رکھا اور کھلایا پلایا تھا حتیٰ کہ اپنی دُور افتادہ زمینیں ان کو بخش دی تھیں اور کسی حد تک ان کو اپنی جائدادوں بالخصوص باغوں اور کھیتوں میں شریک بھی کر لیا تھا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ مسلمانانِ مکہ نے اپنے مالی اور اقتصادی وسائل خود تلاش کر لئے تھے اور وہ کسی کے دستِ نگر محض نہ تھے۔[۳۱]

مواخاۃ دراصل مسلم معاشرہ ——— امۃ ——— کی تشکیل کا دوسرا مرحلہ تھا جس کا مقصد ایک نووارد شہر کو ایک قدیم باشندہ کے ساتھ رشتۂ اخوت و محبت میں منسلک کر دینا تھا تاکہ خارجی و اندرونی، ملکی و غیر ملکی، اپنے پرائے اور فرزندانِ زمین و تازہ واردان بساط اور سب سے بڑھ کر مکی اور مدنی کا فرق مٹ جائے اور مدینہ کی مسلم آبادی ایک مذہبی وحدت ہونے کے ساتھ ساتھ ایک سماجی اور معاشی وحدت بھی ہو جائے۔ جس طرح اسلام اور پیغمبرِ اسلام نے مذہبی نظریۂ اخوت کے ذریعہ اوس و خزرج کی قبائلی تفریق اور قبائلی عداوت کو مٹایا اور ان کو ایک مسلم اکائی بنایا تھا بالکل اسی طرح وہ مدینہ والوں اور مکہ والوں یا انصار و مہاجرین کی سماجی تفریق مٹا کر مدینہ میں صرف ایک سماجی وحدت ——— مسلم معاشرہ ——— کے تصور کو فروغ بلکہ عملی شکل دینا چاہتے تھے۔

چنانچہ جب حضور مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں مسجد نبوی کی تعمیر قریب قریب مکمل کر لی تو روایات کے مطابق مواخاۃ کا پہلا عملی قدم اٹھایا گیا۔ ابتدائی مرحلے میں ابنِ اسحاق کے مطابق تقریباً ۴۵ مہاجرین اتنے ہی انصاریوں کے بھائی بنائے گئے[۳۲]۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ مکہ مکرمہ میں آپ نے دو مکی مسلمانوں کو ایک دُوسرے کا بھائی قرار دیا تھا اور مدینہ منورہ

میں ایک مہاجر اور ایک انصاری کے درمیان یہ رشتۂ مودت قائم کیا تھا۔ شیرازہ بندی کے اس حکیمانہ معاملے اور طریق نے پیمانۂ مکہ کے قبائلی تفرقوں کو مٹایا تھا، نفرتوں کو ختم کیا تھا اور عصبیت کو نابود کیا تھا اور اب اس کو وسعت دے کر دو شہروں کے سماجی قبائلی تعصبات کا خاتمہ کر کے دو مختلف سیاسی، سماجی، اقتصادی اور تہذیبی پس منظر کے طبقوں میں ہم آہنگی پیدا کی تھی۔ یہ دراصل اس سماجی عمل شیر و شکر کا آغاز تھا جس نے روزِ اول سے اخوتِ اسلامی کا اعلان و دعویٰ کیا تھا اور حجۃ الوداع کے عظیم موقعہ پر عالمی اسلامی برادری اور آفاقی اخوتِ اسلامی کے عظیم نظریہ پر منتج ہوا تھا۔ اس کے نتیجے میں کالے، گورے، سرخ و سیاہ، رنگدار و سفید، عربی عجمی غرض کہ نسل، وطن و علاقہ اور رنگ وغیرہ پر مبنی تمام امتیازات کو مٹا دیا گیا تھا اور ایک ایسے آفاقی اور عالمی معاشرہ کا سنگِ بنیاد رکھا گیا تھا جس میں تمام مسلمانانِ عالم بلا کسی امتیاز و تفریق کے ایک دوسرے کے بھائی اور مذہبی اور سماجی طور پر ہم پلّہ، ہم سر اور مساوی تھے۔

عملی اعتبار سے مواخاۃ کا رشتہ خون کے حقیقی رشتوں سے کہیں زیادہ بڑھ گیا تھا۔ عہدِ نبوی میں مواخاۃ نے جن دو مہاجر اور انصاری مسلمانوں یا دو خاندانوں اور گھرانوں کو رشتۂ مودت و الفت میں باندھا تھا۔ وہ اتنا پائیدار اور مستحکم نکلا کہ اکثر و بیشتر صحابۂ کرام نے اپنے مذہبی یا مواخاۃ کے بھائیوں کو اپنے خون کے رشتہ داروں پر ہر لحاظ سے ترجیح دی اور تا عمر وہ اس عظیم رشتۂ اخوت کو سرمایۂ حیات سمجھتے اور نبھاتے رہے۔[۴۳] ہماری تفسیری، اخباری، سیرت اور حدیث کی روایات یہاں تک اعلان کرتی ہیں کہ ایک مذہبی بھائی کے انتقال پر اس کا ترکہ دوسرے مذہبی بھائی کو ملتا تھا اور خون کے حقیقی رشتے دار اس سے محروم رہتے تھے۔[۴۴] لیکن اس دعوے کی تصدیق یا ثبوت میں ہمیں کوئی تاریخی واقعہ نہیں ملتا جس کے مطابق متوفی کی جائداد کا وارث کوئی مسلم بھائی ہوا ہو۔ یہ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سورہ انفال کی آیت عظ میں مذکور الفاظ خداوندی بعضھم اولیاء بعض (وہ لوگ باہم بھائی بھائی ہیں) کی تفسیر میں مسلم بھائی کے لئے اپنے متوفی بھائی کی جائداد و ترکہ میں جس حق کا دعویٰ کیا گیا ہے وہ اس نظریہ و خیال کا منطقی نتیجہ ہے جس کے تحت مواخاۃ کے رشتہ کے قیام کا سبب مہاجرین کی اقتصادی ناداری کو بتایا گیا ہے۔ اسی بنا پر بعض مغربی مورخین کا خیال ہے ترکہ و وراثت میں مشکلات ہونے کے سبب غزوۂ بدر کے معاً بعد یا کچھ مدت کے بعد رشتۂ مواخات ہی کو ختم کر دیا گیا۔[۴۵] ہمارے مسلم مورخین میں بعض اس کے قائل ہیں کہ آیات متعلقہ بہ وراثت کے نزول کے بعد صرف میراث کا حق مسلم یا دینی بھائی سے حقیقی اور خون کے رشتہ داروں کو منتقل کر دیا گیا تھا اور بقیہ سماجی اور مذہبی اخوت قائم رہی تھی۔[۴۶] مگر بعض دوسرے مسلمان علماء و مورخین نے پوری طرح مغربی فکر کا تتبع کیا ہے۔[۴۷] غالباً یہ دونوں ہی نقطۂ نظر غیر تاریخی ہیں۔ مواخاۃ کا مقصد نہ تو ایک مسلمان بھائی کی موت پر دوسرے کو جائداد دلانا تھا اور نہ دورانِ حیات فریقین اقتصادی طور پر نادار بھائی کا مالدار بھائی کے مال میں حصہ لگانا تھا۔ ان دونوں نقطہ ہائے نظر کی تردید مواخاۃ کی اوّل تاریخ سے بھی ہوتی ہے اور بعد کی کچھ اور مثالوں سے۔ روایات کے مطابق مواخاۃ کی مدینہ میں پہلی مثال ہجرت نبوی کے تقریباً سات ماہ بعد —— اواخر رمضان یا اوائل شوال سنہ ۱ھ / مارچ۔ اپریل سنہ ۶۲۳ء —— میں قائم ہوئی تھی۔[۴۸] منطقی اعتبار سے نادار و مفلس مہاجرین کو اقتصادی مدد اور ترکۂ مسلم میں حق کی ضرورت مدنی دور کی ابتدا میں زیادہ تھی نہ کہ کچھ مدت کے بعد۔ اسی طرح تاریخی واقعات سے یہ نہیں ثابت ہوتا کہ تمام یا اکثر مہاجرین اس زمانے میں آتنے

مالدار ہوگئے تھے کہ ان کو ترکہ کی دولت کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اس کے علاوہ ہماری روایات سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مواخاۃ کی ایک ہی مثال نہ تھی، بلکہ کئی مثالیں تھیں جو بدر سے پہلے شروع ہوئی تھیں اور غالباً فتح مکہ تک چلتی رہی تھیں۔[۳۹] دراصل ان کا انحصار مہاجرین کی انفرادی یا اجتماعی آمد پر تھا جو فرد یا گروہ تازہ وارد ہوتا وہ مواخاۃ کے موثر و فعال ذریعہ کے سبب مدنی مسلم سماج کا جزو بنا دیا جاتا تھا۔ چنانچہ مواخاۃ کی ایسی متعدد مثالیں مذکور ہیں جن میں ان مہاجر صحابہ کو انصار کا بھائی قرار دیا گیا ہے جو بدر کے کافی بعد بلکہ صلح حدیبیہ کے بعد یا غزوۂ خیبر کے بعد مدینہ میں وارد و مقیم ہوئے تھے۔[۴۰] ان شواہد کی بنیاد پر یہ بلا خوف کہا جا سکتا ہے کہ مواخاۃ کا عمل عہدِ نبوی کے اواخر تک جاری رہا تھا۔

اسی طرح مواخاۃ کے بارے میں پیش کردہ نظریہ کہ اس کا اساسی محرک و سبب میدانِ جنگ میں دو مسلمانوں کے درمیان فوجی ہم آہنگی اور عسکری مطابقت پیدا کرنا تھا[۴۱] تاریخی حقائق کی کسوٹی پر کھرا نہیں اُترتا۔ مواخاۃ کا پہلا مظاہرہ مکی عہدِ نبوی میں ہوا تھا جب جنگ و جدال تو درکنار اس کے بارے میں مسلمانانِ مکہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ یہ وہ وقت تھا کہ جب مسلم نقطۂ نظر سے قتال و جدال کے لئے اذنِ الٰہی نہیں ملا تھا[۴۲] اور مغربی نقطۂ نظر سے مسلمان اس فوجی و عسکری صلاحیت اور تنظیم کے مالک نہ تھے کہ دشمنوں سے مسلّح یا غیر مسلّح ٹکر لے سکتے۔ اس کے علاوہ تاریخی واقعات اور ٹھوس حقائق بھی اس خیال کی تردید کرتے ہیں کہ مکی دور میں مواخاۃ کا مقصد عسکری تنظیم و ہم آہنگی رہی ہوگی۔ مدنی عہد میں مواخاۃ کی نوعیت اور حقیقت کو سمجھنے کے لئے اس کی توقیت ضروری ہے۔ اس کی پہلی مثال ہجرت کے بعد سات ماہ کے عرصے کے اندر قائم کی گئی تھی جو جنگِ بدر سے کافی پہلے تھی۔[۴۳] یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ مواخاۃ ابتدائی مہموں میں فوجی تنظیم قائم کرنے کے لئے کی گئی تھی کیونکہ اول تو یہ مہمیں فوجی تھیں ہی نہیں، دوم ان میں سے اکثر میں انصار شامل نہ تھے اور اگر تھے تو مہاجر اور انصار کے سپاہیوں کی تعداد میں کافی فرق رہا ہے۔ غزوۂ بدر کے موقعہ پر یہ فرق بہت ہی واضح طور پر ابھرتا ہے کہ اس جنگ میں مہاجرین کی کل تعداد صرف ۸۲ تھی اور انصار کی ۲۳۱ یعنی دونوں میں ایک اور تین کا تفاوت تھا۔[۴۴] سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انصار کے بقیہ سپاہیوں کا میدانِ جنگ میں ساتھ دینے کے لئے کون تھا؟ پھر مواخاۃ کے متعدد جوڑوں میں سے ایک یا دوسرا فریق غزوۂ بدر میں شامل نہیں ہوا تھا۔[۴۵] اس کے علاوہ مواخاۃ کی دوسری مثالیں صلح حدیبیہ کے بعد تک ملتی ہیں جس زمانے عسکری تنظیم و رفاقت قائم کی چنداں ضرورت نہ رہی تھی۔[۴۶] ان حقائق سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مواخاۃ کا اصل مقصد کچھ اور تھا کم از کم جنگ کے دوران یا میدانِ جنگ میں مسلم سپاہیوں کے دو طبقوں میں فوجی ہم آہنگی پیدا کرنا نہیں تھا۔ وہ اصل مقصد تھا نو مسلم عربوں کا سماجی اور معاشرتی شعور و احساس میں تبدیلی پیدا کرنا کہ وہ عرب کے متعدد اور محدود قبیلوں کے دائرہ میں محصور نہیں ہیں بلکہ مسلم یا اسلامی معاشرہ کی وسیع دنیا کے باشندے اور شہری ہیں جن کی حد بندی یا درجہ بندی علاقہ، زبان، نسل، رنگ یا وطن نہیں کرتے۔ بلکہ وہ ایک عالمی اور آفاقی برادری کے افراد ہیں جن کو دینِ خداوندی کا مضبوط رشتہ ایک قوم، ایک ملّت اور ایک امت بناتا ہے۔ یہ محض نظریہ یا خیال یا تصوّر ہی نہ تھا بلکہ مواخاۃ نے حقیقتاً بے شمار اور مختلف قبائلی اور محدود نظر و تنگ خیال لوگوں کو جو ہمیشہ ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما رہتے تھے ایک مضبوط و مستحکم اور متحدہ اُمت میں تبدیل کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ یہی وہ اسلامی جذبۂ اخوت تھا جس نے مالدار مسلمانوں میں اپنے غلام دینی بھائیوں کو خرید کر

آزاد کرانے کا جذبہ پیدا کیا تھا۔ اسی نے مسلمانوں میں تعاون اور امداد کے ایک غیر معمولی احساس اور عمل کو تحریک دی تھی۔ اسی نے ان کو ایک امت سے وابستہ ہونے کا طاقتور شعور بخشا تھا اور یہی جذبہ ان کو بحرانوں اور مصائب و آلام کے زمانے میں نہ صرف زندہ اور متحرک و فعال رکھتا تھا بلکہ ان کے ملّی شعور یگانگت و وابستگی کو اور مضبوط تر و پائیدار بناتا تھا۔ بہرحال مواخاۃ کا مقصد مختلف پس منظر اور طبقات کے مسلمانوں کو ایک منظم اور متحد اُمت میں تبدیل و تشکیل کرنا تھا اور اس میں اس کو سو فیصد کامیابی ملی تھی۔ اسی مستقل اخوتِ اسلامی اور جزیرہ نمائے عرب کے مسلمانوں کے نئے تاریخی و سماجی شعور کا بہترین مظاہرہ حضرت سلمان فارسی کا وہ جواب تھا جو اُنھوں نے اپنے نسب کے بارے میں پُوچھنے والے ایک شخص کو دیا تھا:

"انا سلمان بن اسلام"[۴۷] (میں سلمان ہوں، اسلام کا ایک فرزند)

(۳) تیسرا مرحلہ: دستورِ نبوی

اُمتِ اسلامی اور ریاستِ اسلامی کی تشکیل کا تیسرا مرحلہ کتاب نبوی کا اجرأ و نفاذ تھا جس کو ہمارے ماخذ میں صحیفہ، کتاب، عہد، میثاق وغیرہ مختلف ناموں سے پکارا جاتا ہے اور جس کو آج کل زیادہ تر مورخین "دستورِ مدینہ یا "اسلام کے پہلے دستور" کے نام سے یاد کرتے ہیں[۴۸] اور دورِ جدید میں یہی زیادہ صحیح مفہوم عطا کرتا ہے۔ صحیفہ یا کتاب[۴۹] نبوی یا دستور مدینہ کے اجراء و نفاذ کی تاریخ کے بارے میں جدید مورخین میں اختلاف ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اس کا متن نقل کرنے والے اولین سیرت نگار ابنِ اسحاق نے اس کی تاریخِ نفاذ کے بارے میں کچھ نہیں کہا ہے۔ انھوں نے اپنی سیرت رسول اللہ میں ہجرت کے بیان کے بعد حتّٰی کہ مواخاۃ وغیرہ کے ذکر سے پہلے ہی اس کو نقل کر دیا ہے۔ مآخذ کے سکوت نے جدید مورخین کو تاریخِ نفاذ و اجرأ کے بارے میں اپنے اپنے نظریات پیش کرنے کا موقعہ دیا ہے۔ ولہاؤزن (WELLHAUSEN) کا خیال ہے کہ وہ غزوۂ بدر سے قبل[۵۰] جاری کیا گیا تھا جبکہ ہیوبرٹ گریم (HUBERT GRIMME) اس کو بدر کے بعد کا صحیفہ مانتے ہیں[۵۱] اور دونوں نے اپنے نظریے کی تائید میں دلیلیں دیتے ہیں۔ مونٹگمری واٹ (MONTGOMERY WATT) کا خیال ہے کہ اصل دستورِ مدینہ تو بدر سے پہلے نافذ ہوا تھا مگر اس میں وقتاً فوقتاً ضرورت کے تحت تبدیلی کی جاتی رہی اور بعض دفعات گھٹائی اور بڑھائی جاتی رہیں اور موجودہ متن مختلف زمانوں میں نافذ ہونے والی دفعات کا مجموعہ ہے[۵۲]۔ برکات احمد نے بھی اسی نظریے سے اتفاق کیا ہے اگرچہ دونوں کی بعض دلیلیں الگ الگ ہیں تاہم اکثر پر ان دونوں کا اتفاق ہے[۵۳]۔ ان دونوں مورخین کے خیال میں یہ دستور یا صحیفہ نبوی ایک اکائی نہیں ہے بلکہ مختلف اکائیوں کا مجموعہ ہے۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ کا یہ خیال معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کو ایک اکائی اور متحدہ متن مانتے ہیں جو ہجرت کے بعد مرتب و نافذ کیا گیا تھا[۵۴]۔ بہرحال واٹ اور برکات احمد کے نظریہ میں خاصی جان ہے اور ان کی بعض دلیلیں بڑی وزنی ہیں تاہم ان کے تمام دلائل اور مزعومات سے اتفاق کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ بقیہ اہم مورخین میں آر، بی سرجنٹ (R.B. SERJEANT)[۵۵]، ریوبن لیوی (RUBEN LEVY)[۵۶]، موشے گل (MOSHE GIL)[۵۷] وغیرہ اس کی تاریخ ماقبل بدر کے قائل نظر آتے ہیں۔ ابنِ اسحاق اور ان کے متبعین سیرت نگار و مورخین کے علاوہ احادیث کے مختلف

مجموعوں سے یہ تاثر ابھرتا ہے کہ دستورِ مدینہ کا اصل مسودہ بدر سے پہلے ترتیب و نفاذ پا چکا تھا چاہے بعد میں اس میں کمی بیشی ہوتی رہی ہو۔

تاریخِ دستورِ مدینہ سے کہیں زیادہ اہم اس کا متن ہے۔ ابنِ اسحاق کے فراہم کردہ متن کو دوسرے عربی مآخذ نے توجوں کا توں شائع کیا ہے مگر اس پر بحث کرنے والے مترجموں اور مورخوں نے اس کو الگ الگ ڈھنگ سے پیش کیا ہے جس کے سبب صحیح نتائج اخذ کرنا مشکل ہوتا ہے کیونکہ بعض علماء نے اس کی مختلف دفعات کو اپنی فہم اور زاویۂ نظر کے مطابق الگ الگ حصوں یا خانوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ بہرحال سب سے اچھی ترتیب دفعات ونسنک (WENSINCK) نے کی ہے جس کو مونٹگمری واٹ نے معمولی ردّ و بدل کے ساتھ قبول کیا ہے اور یہی میرے خیال میں بہترین ترتیب ہے[۵۸]۔ اگرچہ واٹ کا بعض جگہ ترجمہ مبہم اور اضافے (قوسین میں) غیر ضروری بلکہ گمراہ کن ہیں۔ بہرحال متنِ دستورِ مدینہ کا اردو ترجمہ حسب ذیل ہے لیکن یہ عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ صحیفۂ نبوی سے قبل سیرت نگار ابنِ اسحاق کا ایک تعارفی دیباچہ ہے جو متنِ دستور کا جزو نہیں ہے۔ دیباچہ میں ابنِ اسحاق کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین و انصار کے درمیان ایک تحریر (کتاب) لکھی جس میں آپ نے یہودیوں سے ایک معاہدۂ صلح کیا۔ ان کو ان کے مذہب اور ان کے مقبوضات کے حقوق دئے اور ان کو ان میں بدستور قابض رہنے دیا اور ان کے کچھ فرائض اور حقوق مقرر کئے۔ وہ کتاب یہ تھی:

متنِ دستورِ نبوی ؐ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

یہ محمد رسول اللہؐ کی کتاب (معاہدہ) ہے جو قریش کے مسلمانوں اور یثرب کے مومنوں اور ان دونوں کے ان لواحقین (ومن تبعھم) کے درمیان کیا گیا ہے جو ان کے ساتھ آملیں، اتحاد کریں اور جو ان کے ساتھ مل کر جہاد کریں (جاھدوا معھم)۔

۱ - وہ [یعنی مسلمان مہاجرین و انصار کے دو طبقات اور ان کے مسلم لواحقین و متبعین] ایک امت واحدہ ہیں جو دوسرے لوگوں سے الگ و ممتاز ہے (من دون الناس)[۵۹]۔

۲ - قریشی مہاجرین اپنے پرانے دستور کے مطابق اپنے قیدیوں کا زرِ فدیہ اجتماعی طور سے ادا کریں گے اور مسلمانوں کے معاملہ میں انصاف و راستی کو ہاتھ سے جانے نہ دیں گے۔

۳ - بنو عوف اپنے سابق دستور کے مطابق اجتماعی طور سے اپنی پرانی دیت ادا کریں گے اور ہر گروہ (طائفہ) اپنے قیدیوں کا زرِ فدیہ ادا کرے گا اور اس ضمن میں مسلمانوں کے درمیان انصاف و راستی کا خیال رکھے گا۔

۴ - بنو الحارث اپنے سابق دستور کی مانند دیت ادا کریں گے (دفعہ ۳ کی مانند)

۵ - بنو ساعدہ ..... (دفعہ ۳ کی مانند)

۶ - بنو جشم ...... (〃 〃 〃)

۷ - بنو نجار ...... (〃 〃 〃)

۸۔ بنو عمرو بن عوف .... (دفعہ ۳ کی مانند)

۹۔ بنو نبیت ..... (〃)

۱۰۔ بنو اوس ..... (〃)

۱۱۔ مسلمان اپنے کسی مقروض کو نظر انداز نہ کریں گے بلکہ انصاف کے ساتھ اس کے زرِ فدیہ یا دیت کی ادائیگی میں اس کی مدد کریں گے۔

۱۲۔ ایک مسلم کسی دوسرے مسلم کے "مولیٰ" کو اس کے آقا و سرپرست کی اجازت کے بغیر اپنے "حلیف" کے طور پر قبول نہیں کرے گا۔

۱۳۔ خدا ترس مسلمان ہر اس شخص کے خلاف ہیں جو غلط کام کرے یا جو غیر منصفانہ یا غدارانہ، مخالفانہ یا بدعنوان کام کرنے کا ارادہ مسلمانوں کے بیچ کرے۔ ان کے ہاتھ اس شخص کے خلاف متحدہ طور سے اٹھیں گے خواہ وہ ان ہی میں سے کسی کا فرزند کیوں نہ ہو۔

۱۴۔ ایک مسلم کسی دوسرے مسلم کو کسی غیر مسلم کے لئے نہ تو قتل کرے گا اور نہ ہی ایک مسلم کے خلاف کسی غیر مسلم کی مدد کرے گا۔

۱۵۔ خدا کا تحفّظ (ذمّہ) ایک ہے: ان میں سے (مسلمانوں میں سے) کسی ادنیٰ کی بھی ضمانت (جوار) ان سب پر واجب العمل ہے۔ تمام مسلمان ایک دُوسرے کے بھائی اور دوست (موالی) ہیں۔ دوسرے تمام لوگوں کے سوا (من دون الناس)۔

۱۶۔ یہود میں سے جو بھی ہماری اتباع کرے گا اس کے لئے یکساں مدد اور تعاون (نصر، إسوة) ہے جب تک کہ وہ مخالفانہ طرزِ عمل اختیار نہیں کرتا اور ان کے (مسلمانوں کے) خلاف دوسروں کی مدد نہیں کرتا۔

۱۷۔ مسلمانوں کی امان (سِلم) بھی ایک ہے: ایک مسلمان دوسرے مسلمان سے الگ صلح نہیں کرے گا، جبکہ اللہ کے راستہ میں جہاد ہو رہا ہو، سوائے اس کے کہ وہ مساوات و انصاف کے ساتھ کی جائے۔

۱۸۔ ہماری ہر مہم میں ہر گروہ باری باری سے کام کرے گا۔(۶۰)

۱۹۔ ایک مسلم کی راہِ خدا میں شہادت کی صورت میں تمام مسلمان اس کا قصاص لیں گے۔ خدا ترس مسلمانوں کو بہترین اور صحیح ترین رہ نمائی حاصل ہے۔

۲۰۔ کوئی شخص مشرک قریش کے کسی شخص یا سامان کو پناہ (جوار) نہیں دے گا اور نہ اس کی حمایت میں کسی مسلم کے خلاف مداخلت کرے گا۔

۲۱۔ جب کوئی کسی مسلمان کو ناحق قتل کر دے اور اس کی شہادت واضح ہو تو اس کو قصاص میں قتل کیا جائے گا سوائے اس کے کہ مقتول کے ورثہ مطمئن و راضی ہو جائیں۔ تمام مسلمان قاتل کے خلاف ہوں گے۔ اس کی مخالفت کے سوا

ان کے لئے اور کچھ بھی جائز نہ ہوگا۔

۲۲ - ہر اس مسلم کے لئے جو خدا و آخرت پر ایمان اور اس معاہدہ (صحیفہ) میں یقین رکھتا ہے یہ جائز نہ ہوگا کہ وہ کسی غلط کار و بدعنوان شخص کی مدد کرے یا اسے پناہ دے۔

۲۳ - ہر وہ شخص جس کے بارے میں تمہارا (مسلمانوں کا) اختلاف ہو اس کو خدا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے کرنا ہوگا۔

۲۴ - یہود اور مسلمان (دونوں) مشترکہ طور پر جنگ کے اخراجات اس وقت تک اٹھائیں گے جب تک کہ وہ جاری رہے۔

۲۵ - بنو عوف کے یہود مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ایک اُمت ہیں۔ یہودیوں کے لئے ان کا دین ہے اور مسلمانوں کے لئے ان کا دین۔ یہی (ضمانت) ان کے موالی اور ان کے اپنے لئے ہے۔ مگر اس شخص کے سوا جو کوئی غلط کام کرے یا غداری کا کام کرے۔ وہ صرف اپنے لئے مصیبت پیدا کرتا ہے اور اپنے خاندان کے لئے۔

۲۶ - بنو نجار کے یہودیوں کے لئے بھی وہی (احکام و مراعات) ہیں جو یہودانِ بنی عوف کے لئے۔

۲۷ - بنو الحارث کے یہود کے لئے وہی . . . . . .

۲۸ - بنو ساعدہ کے یہود کے لئے وہی . . . .

۲۹ - بنو جُشم کے یہود کے لئے وہی . . . . . .

۳۰ - بنو اوس کے یہود کے لئے وہی . . . . . .

۳۱ - بنو ثعلبہ کے یہود کے لئے وہی ہے جو بنو عوف کے یہود کے لئے۔ سوائے اس شخص کے جو غلط کام یا غداری کا مرتکب ہو۔ وہ صرف اپنے لئے اور اپنے خاندان کے لئے باعثِ مصیبت ہوگا۔

۳۲ - ثعلبہ کا ایک خاندان (بطن) جفنہ بھی انھیں کی مانند ہے۔

۳۳ - بنو شطیبہ کے لئے بھی وہی ہے جو بنو عوف کے یہود کے لئے۔ آبرومندانہ سلوک غداری نہ ہونے کی صورت میں ہوگا۔

۳۴ - ثعلبہ کے موالی اُنھیں کی مانند ہیں۔

۳۵ - بطانہ یہود بھی انھیں کی مانند ہیں۔ (۶۱)

۳۶ - ان میں سے کوئی بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کے بغیر جنگ کے لئے نہیں نکلے گا لیکن اس کو تکلیف و زخموں کا انتقام لینے پر کوئی قدغن نہیں ہے۔ جو بھی بے سمجھے بوجھے اقدام کرتا ہے (فتك) وہ صرف اپنے آپ اور اپنے خاندان کو معرضِ خطر میں ڈالتا ہے۔ سوائے اس کے کہ اس پر ظلم ہوا ہو۔ خدا اس صحیفہ کا سب سے سچا شاہد ہے۔ (۶۲)

۳۷ - یہودیوں کا ذمہ ہے کہ وہ اپنے اخراجات برداشت کریں اور مسلمانوں پر اپنے اخراجات اُٹھانے کی ذمہ داری ہے ان کے درمیان باہمی مدد (نصر) کا معاہدہ ہے ہر اس شخص کے خلاف جو اس صحیفہ کے لوگوں کے خلاف جنگ کرے۔ ان کے درمیان پُرخلوص دوستی اور قابلِ اعتماد صلح و خیر خواہی ہے اور آبرومندانہ رشتہ ہے، غداری نہیں ہے۔

ایک شخص اپنے کسی حلیف کی بنا پر غداری کا مجرم نہ ہوگا۔ ہر مظلوم کے لئے مدد و اعانت ہو گی۔

۳۸۔ یہود مسلمانوں کے ساتھ مل کر جنگ جاری رہنے تک اخراجات مساوی طور پر برداشت کریں گے۔

۳۹۔ وادی یثرب اس صحیفہ والوں کے لئے مقدس حرم ہے۔

۴۰۔ ہر "جار" (محفوظ شخص) اسی وقت تک (محفوظ) رہے گا جب تک کہ وہ نقصان نہیں پہنچاتا اور غداری نہیں کرتا۔

۴۱۔ کسی عورت کو اس کے لوگوں کی اجازت کے بغیر پناہ نہیں دی جائے گی (لا تجارُ)۔

۴۲۔ جب بھی اس صحیفہ والوں کے درمیان کوئی حادثہ یا جھگڑا اٹھ کھڑا ہو جس سے فسادِ خلق کا خوف ہو، اس کو خدا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے کرنا ضروری ہے۔ خدا ہی سب سے زیادہ اس صحیفہ کی شرائط کو نافذ و جاری کرنے والا ہے۔

۴۳۔ قریش کو اور جو ان کی مدد کریں پناہ نہیں دی جائے گی (لا تجار)۔

۴۴۔ ان کے (اہلِ صحیفہ کے) درمیان باہمی تعاون ہوگا ہر اُس شخص کے خلاف جو یثرب پر حملہ کرے۔

۴۵۔ جب بھی ان کو صلح یا معاہدہ کرنے یا قبول کرنے کا حکم دیا جائے وہ اس کو کریں گے اور قبول کریں گے۔ جب وہ اسی طرح کے کسی معاہدہ یا صلح کے لئے بلائیں تو یہ مسلمانوں کے لئے بھی ضروری ہوگا سوائے اس صورت کے کہ جب کوئی مذہب کے سبب جنگ کرے کیونکہ ہر شخص کی وفاداری اس کے اپنے گروہ سے متعلق ہوتی ہے۔[۶۳]

۴۶۔ الاوس کے یہودی، ان کے حلیف اور وُہ خود بھی انھیں (حقوق و مراعات) کے حقدار ہیں جو اس صحیفہ والوں کے لئے ہیں جب تک کہ ان کا طرزِ عمل اس صحیفہ کے لوگوں سے مکمل طور سے آبرومندانہ اور اچھا ہے۔ کیونکہ غداری سے پہلے حُسنِ سلوک کا درجہ ہے۔

۴۷۔ ایک مجرم صرف اپنے لئے ذمہ دار ہوگا۔ خدا ہی اس صحیفہ کو سب سے زیادہ نافذ و جاری کرنے والا ہے۔ یہ معاہدہ کسی غلط کار و ظالم اور غدّار کی پشت پناہی نہیں کرے گا۔ جو بھی مدینہ میں رہے یا باہر جائے محفوظ رہے گا سوائے اس شخص کے جو غلط کام یا غداری کا ارتکاب کرے۔ خدا ہر شخص کا حامی و پناہ گاہ (جار) ہے جو اس سے ڈرتا ہے اور حسنِ سلوک کرتا ہے اور محمد اللہ کے رسول ہیں (صلی اللہ علیہ وسلم)۔

دستورِ مدینہ کا تجزیہ :

موجودہ متنِ دستور سے واضح ہوتا ہے کہ اس میں کل ۴۷ دفعات ہیں۔ اور دستور کے تعارفی کلمات سے بصراحت معلوم ہوتا ہے کہ یہ معاہدہ اساسی اور بنیادی طور پر قریشِ مکّہ اور انصارِ مدینہ کے مسلمانوں اور مومنوں کے درمیان ہوا تھا اور ان دونوں طبقاتِ مسلمین کے لواحقین و تبعین ان کے طفیل میں شریک و سہیم معاہدہ بن گئے تھے۔ اس صحیفہ کی پہلی دفعہ میں جن لوگوں کو "اُمّتِ واحدہ ممتاز از اقوامِ دیگر" کہا گیا ہے وہ بنیادی طور سے صرف مہاجرین و انصار کے دو طبقات تھے۔

اُنھیں کو اُمۃ اللہ کہا گیا ہے جس کا حاکم مطلق خدائے واحد تھا اور اس زمین پر خلیفۃ اللہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ چونکہ یہ نئی "اُمۃ اللہ" ایک نیا مذہب ——— اسلام ——— ماننے کے سبب وجود میں آئی تھی اور وہی اس کی اساس حقیقی بھی تھی، اس لئے صرف اور صرف مسلمان ہی اس اُمت کے ارکان تھے یا بن سکتے تھے۔ یہ بات بڑی صراحت کے ساتھ دستورِ مدینہ کی دفعات نمبر ۱، ۱۵ اور ۲۵ سے بھی معلوم ہوتی ہے۔

"امۃ" اساسی طور سے ایک مخصوص قرآنی اصطلاح ہے اور محمد فواد عبدالباقی کے مطابق وہ قرآن کریم میں کل اکیاون ۵۱ مواقع پر بیان ہوئی ہے اور اس کی جمع ——— اُمم ——— تیرہ مقامات پر۔ ان میں ۴۹ بار مکی سورتوں میں اور محض پندرہ بار مدنی سورتوں میں۔[۶۴] بقول مونٹگمری واٹ "یہ ان لوگوں پر مشتمل اُمت تھی جنہوں نے پیغمبر اسلام اور ان کے پیغام کو قبول کیا تھا۔"[۶۵] انھیں معانی میں اصطلاح "امۃ" کم وبیش ۳۰۳ احادیث نبوی میں استعمال ہوئی ہے۔[۶۶] تمام مغربی اور بعض مشرقی مورخین وعلماء کا یہ خیال کہ غیر مسلم طبقات مدینہ ——— یہودی، عیسائی اور غیر مسلم عرب ——— بھی اس "امت اللہ" کے دائرہ سے خارج نہ تھے،[۶۷] نہ صرف اس دستورِ مدینہ کی روح کے منافی ہے بلکہ بجائے خود مذہب اسلام پر مبنی امت کے نظریہ کی کاٹ کرتا ہے۔ جیسا کہ پہلے حوالہ گزر چکا دستور کی دفعہ اول صرف مسلم مہاجرین وانصار کو تمام دوسرے لوگوں سے الگ ایک امۃ واحدہ قرار دیتی ہے۔ یہی روح دستور کی دفعہ ۱۵ میں کارفرما ہے جو یہ اعلان کرتی ہے کہ مومنین اور مسلمین[۶۸] ہی ایک دوسرے کے موالی (بھائی بند اور دوست) ہیں اور ان کے ساتھ دوسرے لوگ شریک نہیں۔ اسی طرح دفعہ ۲۵ مسلمانوں کو ایک الگ اُمت اور بنو عوف کے یہود کو ایک الگ امت قرار دیتی ہے اور ان کے دینوں کو بھی الگ الگ سمجھتی اور قرار دیتی ہے۔[۶۹] تمام حقائق وشواہد کو مدِنظر رکھنے سے یہ بات بالکل عیاں ہو جاتی ہے کہ مدینہ کی شہری ریاست کے مسلمان اور صرف مسلمان ہی اس اُمت کے ارکان تھے یا بن سکتے تھے۔ شہر کے تمام غیر مسلم طبقات کو، چاہے وہ یہود ہوں یا عیسائی، یا غیر مسلم عرب، زیادہ سے زیادہ حلیت کا ورنہ ذمیوں کا مقام دیا گیا تھا اگرچہ اس حیثیت کا واضح اعلان نہیں ملتا لیکن تمام دفعاتِ دستور میں مضمر ومحذوف یہی ہے۔ خاص کر ان دفعات میں جن کا تعلق یہودیوں اور مسلمانوں کے مابین یا اسلامی ریاست سے روابط سے ہے۔ مثال کے طور پر دفعہ ۱۶ یہود کو امداد و تعاون کی ضمانت اسی صورت میں دیتی ہے جبکہ وہ مسلمانوں کی اتباع کریں اور ان کے دشمنوں کی امداد و اعانت نہ کریں۔ اسی طرح دفعہ ۲۵ ان کو مذہبی آزادی کی ضمانت بھی اس شرط پر دیتی ہے اور دفعات ۲۴، ۳۷ اور ۳۸ ان پر مسلمانوں کی مدد و نصرت کو تمام معاملات میں لازمی قرار دیتی ہیں۔ امتِ اسلامی اور یہودی یا غیر مسلم طبقات کے درمیان جو بھی تعلقات یا روابط قائم ہوئے وہ محض اس بنا پر کہ وہ مدینہ میں بستے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کو اُمت اسلامی کا رکن نہیں بنایا جا سکتا تھا کیونکہ پھر اس کی مذہبی خصوصیت جو اس کی اساسی و امتیازی چیز تھی کیا رہ جاتی۔ لیکن دوسری طرف ان کو لاتعلق بھی نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ مدینہ کے معاشرہ میں ان کو کسی نہ کسی طرح کھپانا اور قبول کرنا تھا۔ اور ان کی قبولیت وشمولیت کا بہترین طریقہ وہی تھا جس کو عرب حلف کے نام سے جانتے تھے اور جو در اصل اسلام سے پہلے یہودی قبائل اور اوس وخزرج کے قبائل کے درمیان قائم بھی رہا تھا۔ اس بنا پر دستورِ مدینہ یہودی طبقات پر بھی مسلمانوں کی طرح یکساں فرائض عائد کرتا ہے۔ اور یہ فرائض تھے اپنے قبائلی دستور و

روایات کے مطابق دیت (معقلہ) ادا کرنا، شہر کے تمام باسیوں کے ساتھ امن و امان کے ساتھ رہنا، غیر ملکی یا خارجی حملے یا جارحیت کی صورت میں شہری ریاست کا دفاع کرنا اور اس پر آنے اخراجات و مصارف کو برابر برابر برداشت کرنا اور سب سے بڑھ کر اللہ کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مکمل فرمانبرداری و اطاعت کرنا۔

امۃ کا جو نظریہ ولہاؤزن نے ایجاد کیا اور واٹ اور ان کے دوسرے مغربی و مشرقی خوشہ چینوں نے قبول و شائع کیا مسلم ارکانِ اُمت اور یہودی اور دوسرے غیر مسلم باشندگانِ شہر کے حقوق کے فرق کے پس منظر میں بھی نہیں ٹھہرتا ہے۔ منطق کا تقاضا ہے کہ ایک اُمت کے تمام ارکان کو یکساں اور برابر کے حقوق حاصل ہوں۔ دستورِ مدینہ بہرحال یہ مساوی اور یکساں حقوق مسلمانوں کو عطا کرتا ہے کہ وہ امتِ واحدہ کے افراد تھے مگر یہود یا دُوسرے غیر مسلم طبقات کو برابر کے حقوق نہیں دیتا ہے۔ ولہاؤزن کو تو اس کا تھوڑا سا اعتراف بھی ہے کہ "یہود ان شہر کو اُمت سے وہ قریبی تعلق و ربط حاصل نہ تھا جو انصار و مہاجرین کو تھا اور نہ ہی ان کو برابر کے حقوق و فرائض حاصل تھے"۔ مگر حیرت کی بات ہے کہ واٹ نے اس نکتہ کی طرف ذرا بھی اشارہ نہیں کیا ہے۔ بہرحال یہ امر واقعہ ہے کہ دستورِ مدینہ یہودیوں اور دوسرے غیر مسلم طبقات کو مدینہ کے سماجی نظام اور اسلامی شہری ریاست میں دوسرے درجہ کا مقام دیتا ہے جو کہ حلیف کے درجہ سے یا بعد کے ذمیوں کے مقام سے بڑی حد تک مشابہ و مماثل تھا۔ اس حقیقت بدیہی پر نہ تو شرمانے کی ضرورت ہے، نہ معذرت کرنے یا معذرت خواہانہ لہجہ اپنانے کی۔ اور تاویل کرنے کی تو کوئی گنجائش نہیں ہے کہ وہ تاریخی دیانت کے خلاف اور اسلامی اصولوں کی تحریف کے مراوف ہوگی۔

بہرحال دستورِ مدینہ کی کل اہم دفعات کے ایک ناقدانہ تجزیے اور مبصرانہ تحلیل سے ایک طرف تو خود دستورِ مدینہ کی نوعیت و ماہیت اجاگر ہوگی اور دُوسری طرف مدینہ منورہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کس قسم کا سماجی معاشرہ اور سیاسی ڈھانچہ کھڑا کیا تھا اس پر بھی روشنی پڑے گی۔ ایک اہم نکتہ جو عام طور سے علماً تاریخ و سماجیات کی نگاہ سے اوجھل رہ گیا یہ ہے کہ دستورِ مدینہ کے دُو دیباچے ہیں؛

ایک سیرت نگار ابنِ اسحاق کا دیباچہ یا تعارفی نوٹ۔

اور دُوسرا قلم نبوی کا دیباچہ جو متن دستور کی ابتدائی سطروں پر مشتمل ہے۔

ان دونوں میں ایک بڑا فرق ہے: ابنِ اسحاق نے مہاجرینِ قریش اور انصارِ مدینہ کے درمیان ہونے والے معاہدہ یا صحیفۂ اولین میں یہودیوں کو بھی ایک فریق کی مانند شامل کر دیا ہے جس سے یہ تصور رہتا ہے کہ وہ دو مسلم طبقات کے ہم پلّہ و ہم سر فریق تھے جب کہ دیباچۂ دستورِ نبوی میں صرف مہاجرین و انصار اور ان کے متبعین و لواحقین کو دو فریقوں کا درجہ یا شرکاءِ معاہدہ قرار دیا گیا ہے اور اس طور سے یہی دونوں مسلم طبقات اصل اہلِ صحیفہ تھے۔ ان میں یہود کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ بعد میں یہودیوں کو بھی حلیف، یا جس کو موجودہ اصطلاح میں مشاہد رکن کہتے ہیں' کا درجہ دیا گیا تھا۔ غالباً مورخین و علماءِ سیرت کے امتِ اسلامی کے بارے میں غلط نظریہ کا ایک یہ بھی سبب رہا ہے۔ بہرحال یہ امر واضح رہنا چاہئے کہ دستورِ مدینہ کی اوّلین دفعہ میں جن لوگوں کو ضمیر جمع غائب (وہ لوگ = ھُم) کہا گیا ہے ان سے مراد وہ لوگ ہیں جن کا ذکر دیباچۂ نبوی میں ہے نہ کہ دیباچۂ ابن اسحاق میں۔

دفعات ۲ تا ۱۱ عربوں کی ایک سماجی روایت و دستور —— زرِ فدیہ[1] اور دیت[2] —— سے متعلق ہیں جو بدوی اور قبائلی عربوں کے سماجی تحفظ کے نظام کی عظیم ترین ضمانتیں تھیں[3]۔ "شہر رسول کے ہر قبیلہ/ سماجی اکائی، کو بشمول مہاجرین مکہ جن کو بھی عملی اعتبار سے ایک متحدہ قبیلہ یا ایک سماجی وحدت گردانا گیا تھا[4]" ان دونوں سماجی روایات کی پاسداری مسلمہ قبائلی اصولوں کے مطابق کرنی تھی اور اس میں ایک اہم بات یہ تھی کہ دیت اور زرِ فدیہ کی ادائیگی کو ہر قبیلہ کی اجتماعی ذمہ داری قرار دیا گیا تھا[5]" ظاہر ہے کہ انفرادی ذمہ داری کی صورت میں مجرم یا خطاکار راہِ فرار اختیار کر سکتا تھا اور اس وقت کے عرب سماج میں کوئی ایسی فعال و کارگر قوت نہ تھی کہ وہ اس سے زور و زبردستی سے وصولیابی کر سکتی۔ اس کے مقابلہ میں پورا قبیلہ نہ بھاگ سکتا تھا اور نہ ہی ذمہ داری کو کسی اور طریقہ سے قانوناً نظر انداز کر سکتا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو سماجی تحفظ کا نظام قائم کیا تھا اس کے یہ دو اہم پتھر تھے ؛ جان و مال کا تحفظ۔ اور ان دونوں کا تحفظ اسی صورت کیا جا سکتا تھا کہ شہری ریاست کے کسی فرد کو نہ کسی کی جان سے کھیلنے کا موقعہ دیا جائے اور نہ مال سے۔ اور اگر کوئی جان و مال کو کسی طرح کا نقصان پہنچائے تو اس کو اس کی سزا یا جرمانے کا خوف لاحق رہے۔ جان کی ضیاع کی صورت میں وہ قصاص کے قبائلی اصول کے تحت اپنی جان سے ہاتھ دھو سکتا تھا یا مقتول کے وارثین کی رضامندی کی صورت میں مال دے کر جان تو بچا سکتا تھا لیکن اپنی دولت کے خاصے بڑے حصے سے محروم ہو جاتا۔ اس کے علاوہ وہ اپنی مذموم حرکت سے اپنے پورے قبیلہ کا نام اور عزت و آبرو کو کلنک لگا تا جو عربوں کے نزدیک موت سے زیادہ بری شے تھی۔ چنانچہ جان و مال کے مزید تحفظ کی ضمانت دستور کی دفعات ۱۲ تا ۱۹ دیتی ہیں۔

دفعہ ۱۲ مدنی سماج میں حلیف و مولیٰ کے رشتوں کو بلا اجازت و مرضیٔ فریقین بدلنے کی اجازت نہیں دیتی کیونکہ بصورتِ دیگر سماج کے مختلف افراد میں تعلقات کشیدہ ہوتے اور ان کے نتیجے میں تفرقے اور انتشار کی راہیں کھل جاتیں۔ جبکہ دفعہ ۱۳ غلط کار، مجرم اور انتشار پھیلانے والے اشخاص کے مذموم اثرات سے معاشرہ کو بچانے کی تدبیر کرتی ہے۔ وہ مجرم کو جرم کرنے کا موقعہ نہیں دیتی ہے اور ارتکابِ جرم کرنے کی صورت میں اس کی پناہ کی تمام راہیں مسدود کر دیتی ہے۔ یہاں یہ امر قابلِ غور ہے کہ مجرم کو پورے سماج کا دشمن سمجھا گیا ہے اور تمام مسلمانوں کا فرض قرار دیا گیا ہے کہ خواہ مجرم کوئی ہو سب کے سب اس کے دشمن ہوں گے اور اسے کسی قسم کی پناہ یا اعانت نہ دیں گے۔ دفعات ۱۴، ۱۵ اور ۱۹ مسلمان طبقات کو غیر مسلم طبقات پر سماجی فوقیت عطا کرتی ہیں جو سماجی اعتبار سے کافی اہم ہے۔ قبائلی روایات کے مطابق قتل کا قصاص قتل یا خون کا بدلہ خون تھا۔ لیکن اسلامی معاشرہ میں یہ اہم اور انقلاب آفریں تبدیلی کی گئی تھی کہ کسی کافر کے قتل کے بدلے میں یا کسی کافر کے سبب کسی مسلمان کو قتل نہیں کیا جا سکتا تھا اور نہ ہی کسی مسلمان کے خلاف کسی کافر کی مدد و اعانت کی جا سکتی تھی۔ اس دفعہ نے قبائلی عصبیت پر کاری ضرب لگائی تھی اور عربوں کے سماجی شعور کو قبائلی روایات کے گورکھ دھندے سے نکال کر اسلامی اخوت پر مبنی وسیع تر نگاہ عطا کی تھی۔ بقیہ دونوں دفعات مسلمانوں کے تمام طبقات کو صلح و امن اور ضمانت کے برابر حقوق کی ضمانت دیتی ہیں کہ اگر ادنیٰ ترین مسلمان نے بھی کسی کو پناہ دے دی، امن و صلح کر لی یا ضمانت کی حامی بھر لی تو وہ تمام افرادِ امت پر لازم و عائد ہو گی۔ یہ اخوت و یگانگت کے مضبوط بندھن اور "مسلمان ایک جماعت" کے تصور کا مظاہرہ اعلان تھا۔ ان تینوں

دفعات سے یہ اہم نکتہ بھی اُبھرتا ہے کہ مسلمانوں کو مدینہ کے سماجی نظام میں یک گونہ برتری حاصل تھی۔ اور اس سے اہم بات یہ ہے کہ اس سماجی برتری کو غیر مسلم طبقات نے خواہ مرضی سے یا خواہ بادلِ نخواستہ قبول و تسلیم بھی کیا تھا۔ دراصل مسلمانوں کی یہ معاشرتی حیثیت اور سماجی برتری ان تاریخی واقعات اور عناصر و رجحانات کا لازمی اور منطقی نتیجہ تھا جو ہجرت کے بعد مدینہ میں رونما ہو رہے تھے۔[۶] اور ظاہر ہے کہ مدینہ کے مسلمانوں کا پلڑا اپنی سیاسی و سماجی برتری اور تنظیم کے سبب بھاری ہوتا جا رہا تھا۔ شہر کے غیر مسلم طبقات خاص کر یہودی قبائل جو اسلام سے قبل مدنی سماج اور سیاست میں سرداری یا کم از کم پاسنگ کا درجہ رکھتے تھے اب ماتحت و زیرنگیں طبقات بن کر رہ گئے تھے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مہاجرین مکہ کے طفیل مسلم طبقات کی طرف سیادت و سرداری پوری طرح سے منتقل ہو گئی تھی۔ اور اس کے نتیجے میں مسلمانوں کے یک گونہ بہتر و برتر سماجی حقوق ایک لازمی اور منطقی امر تھے۔ یہ بات یہاں ذہن نشین رہنی چاہئے کہ مسلمانوں کی یہ سماجی برتری کسی ناانصافی یا سماجی بے دیانتی پر مبنی نہیں تھی۔ مساوات و اخوت کا اسلامی تصور و نظریہ اور اس کا عملی مظاہرہ افرادِ اُمت کے لئے ہو سکتا تھا اور تھا جو خدا اور رسول اور ان کے احکام و تعلیمات پر ایمان رکھتے تھے۔ جو اس سیاسی اور سماجی نظریۂ حیات نصب العین یا آئیڈیالوجی کو نہیں تسلیم کرتے تھے ان سے سماجی اخوت و مساوات نہیں برتی جا سکتی تھی۔ مگر ان سے تعلقات احترامِ آدمیت اور انسانیت کے ناطے اور سماجی انصاف کے اصول و بنیاد پر قائم کئے اور نبھائے جاتے تھے۔

اسی لئے جہاں تک انسانی جان و مال کے تحفظات کا تعلق ہے وہ بلا کسی تفریق و امتیاز کے شہری ریاست کے تمام باشندوں کو عطا کئے گئے تھے چاہے وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم۔ جیسا کہ دفعات ۱۶، ۱۷، ۲۱، ۲۲، ۴۰، ۴۱ اور ۴۷ سے بخوبی واضح ہوتا ہے۔ ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تمام افراد اور سماجی طبقے اپنے کاموں کے لئے ذمہ دار اور جواب دہ تھے اور کسی کو بھی اس بات کی اجازت نہ تھی کہ وہ کسی مجرم یا سماج دشمن شخص یا اشخاص کو پناہ و امداد دے۔ یہ دفعات قتل و قصاص کے معاملات، مجرم کے ساتھ معاشرہ کے بحیثیت مجموعی برتاؤ، جار یا محفوظ اشخاص بالخصوص عورتوں کو جوار دینے کے مسائل و معاملات وغیرہ سے بحث کرتی ہیں جن کا لب لباب یہ ہے کہ سماج سے جرم اور مجرم اور ان کے بُرے اثرات کو ختم کیا جائے اور قبائلی عصبیت کے سبب ان کی پشت پناہی نہ کی جائے جیسا کہ ماقبل اسلام عرب کے قبائلی نظام میں دستور و طریقہ تھا۔ اب اسلامی معاشرہ اور شریعت افراد و قبائل کے کاموں کو ان کے قبائلی خطوط و بنیادوں کے بجائے ان کی اچھائی یا برائی سے تولا جاتا تھا۔ گویا کہ ایک ایسا معاشرہ وجود میں لایا جا رہا تھا جس میں سماجی انصاف سب افراد کو برابر سے مل سکے اور ان کے جان و مال کو مکمل طور سے تحفظ دیا جا سکے اور جس میں سماجی حیثیت و رتبہ کی بنیاد عمل تھا نہ کہ خاندان، قبیلہ یا پیدائشی نجابت و شرافت کا جھوٹا تصور۔

دفعات ۲۴ تا ۳۵ کا تعلق مدینہ منورہ کے مختلف یہودی قبائل سے ہے جو ان کو مذہبی آزادی اور سماجی خودمختاری عطا کرتی ہیں۔ یہ نکتہ اہم ہے کہ ان یہودیوں کو یہ مذہبی اور سماجی تحفظات غیر مشروط طور پر نہیں حاصل تھے ان کو یہ حقوق و مراعات امن و امان قائم رکھنے، وفاداری و استواری کا مظاہرہ کرنے اور سماج میں انتشار نہ پیدا کرنے اور غداری سے مکمل پرہیز

رکھنے کی شرائط پر عطا کئے گئے تھے۔ اس کے علاوہ دفعات ۳۶، ۳۷، ۳۸ اور ۴۶ یہودی قبائل کے مسلمان طبقات اور مسلم ریاست سے تعلق پر بحث کرتی ہیں۔ ان کے مطابق دونوں مذہبی گروہوں کو ایک دوسرے کے ساتھ دوستی و آشتی، صلح و مفاہمت، امداد و تعاون اور خیر و نصیحت کے سایہ میں رہنا ضروری تھا۔ مزید برآں دونوں طبقات کے لئے ضروری قرار دیا گیا تھا کہ وہ اپنے قبائلی یا قومی اخراجات خود اٹھائیں گے مگر مدینہ کے دفاع کے ضمن میں جو اخراجات و مصارف ہوں گے ان میں شراکت کا اصول چلے گا۔ یہ فریضہ یا ذمہ داری اور واضح انداز میں دفعات ۱۸، ۲۴، ۳۸ اور ۴۵ سے مزید معلوم ہوتی ہے۔ کسی بیرونی جارحیت سے مدینہ کے دفاع کی ذمہ داری مساوی طور سے مدینہ کے تمام طبقات پر ڈالی گئی تھی جیسا کہ دفعات ۳۹ اور ۴۴ سے معلوم ہوتا ہے۔ دفعہ ۳۶ بصراحت بتاتی ہے کہ دستورِ مدینہ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو شہر کا سب سے بڑا سردار و حکمران بنا دیا تھا اور آپ کی اس حیثیت کو مسلمانوں کے ساتھ ساتھ یہودیوں نے بھی تسلیم کیا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ یہودیوں میں سے بیشتر نے آپ کی نبوت و رسالت سے انکار کر دیا تھا تاہم انھوں نے آپ کو شہری ریاست کے سیاسی سربراہ اور مسلمانوں کے علاوہ اپنے بھی سیاسی رہنما اور سردار کی حیثیت سے قبول کر لیا تھا۔

چونکہ مدینہ کی نوزائیدہ اسلامی ریاست کو سب سے اہم اور خطرناک ترین خدشات و خطرات مکہ کی طاقتور اشرافیہ سے لاحق تھے اور اب تک وہی سب سے بڑے اسلام اور پیغمبر اسلام کے دشمن ثابت ہوئے تھے اس لئے دستورِ مدینہ کی بعض دفعات مثلاً ۲۰ اور ۴۳ نے یہ واضح کر دیا تھا کہ قریش کے کسی شخص یا ان کے مال یعنی کاروانوں کی حفاظت کی ذمہ داری اور ضمانت کوئی بھی فریق معاہدہ نہیں لے گا۔ اور نہ ہی ان کے کسی شخص کو کسی قسم کی مدد و تعاون دے گا۔ خاص کر کسی مسلمان کے خلاف کسی بھی قریشی کی مدد نہیں کی جائے گی۔ دستورِ مدینہ کی یہ دونوں شقیں بڑی اہمیت کی حامل ہیں اور ان کی اہمیت مسلمان قریشیوں اور مدینہ کے بعض یہودی اور عربی قبیلوں اور خاندانوں اور افراد کے قریش مکہ سے سیاسی، سماجی اور تجارتی تعلقات کے پس منظر میں اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ فطری بات تھی کہ قریشی مسلمان کسی وقتی جوش و وفاداری و محبت قبیلہ میں کوئی ایسا کام کر سکتے تھے کہ جو مسلمان قوم یا معاشرہ کے مفادات کے خلاف ہوتا جیسا کہ بعض مواقع پر ہوا[۷۸]۔ اسی طرح سے یہودی قبائل میں بنو نضیر کے بعض سرداروں کے تعلقات دوستانہ مکہ کے رؤسا سے تھے[۷۹]۔ حتیٰ کہ اوس قبیلہ کے سردار حضرت سعد بن معاذ کے تعلقات بنو جمح کے ایک اہم سردار امیہ بن خلف سے تھے[۸۰]۔ اسی قسم کے اور بہت سے تعلقات تھے۔ ان دفعات نے دراصل ان خطرات و نقصانات کا سدباب کیا تھا جو ان قدیم تعلقات کے سبب مسلم معاشرہ اور مسلم ریاست کو پہنچ سکتے تھے۔

مقامِ رسولِ کریمؐ

(۸۱)

ایک اہم ترین مسئلہ یہ تھا کہ اس مدنی معاشرہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا مقام تھا؟ مغربی مورخین و علماء سیرت نے اس مسئلہ پر بڑی طویل طویل بحثیں کی ہیں اور اپنے علم و تحقیق، تاویل و تفسیر، بیان و زبان اور دلائل و نظائر کے ترکش کے سارے تیر خرچ کر ڈالے اور ساری قوت لگا دی ہے خاص کر یہ ثابت کرنے میں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ابتدائی

پانچ برسوں میں محض مہاجرین کے قبیلہ کے ایک جماعتی سردار کا مقام حاصل تھا اور آپ مدینہ کے دوسرے مسلم اور غیر مسلم سرداروں میں سے محض ایک تھے۔ آپ کو کوئی خاص یا بلند وارفع مقام اور وسیع تر اختیارات نہیں حاصل تھے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ چونکہ مہاجرین کو مدینہ کے دوسرے قبائل اور خاندانوں کا ہم پلہ قرار دیا گیا ہے اس لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی محض ایک سردار ہی تھے۔ اور چونکہ مہاجرین کو پہلے دستور مدینہ میں ذکر کیا گیا ہے اس لئے آپ کو زیادہ سے زیادہ تمام سرداروں میں صرف سبقت کا اعزاز و افتخار حاصل تھا۔ بلکہ ان مورخین کے نزدیک ابتدائی تعمیری سالوں میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہیں زیادہ بااثر اور طاقتور سردار مدینہ میں موجود تھے۔ چنانچہ آپ کے مقام کی نظریاتی کمزوری متعدد واقعات سے ثابت کی جاتی ہے۔ ان میں واقعۂ افک میں عبد اللہ بن اُبی بن سلول کے ملوث ہونے کے باوجود اس کے خلاف آپ کا کوئی اقدام نہ کرنا اور بنو قریظہ کے خلاف سزا کا اعلان خود کرنے کے بجائے حضرت سعد بن معاذ سے کرانا آپ کی کمزور سیاسی حیثیت اور مدینہ میں آپ سے زیادہ طاقت ور افراد و قبائلی سرداروں کی موجودگی کی دلیلیں بتایا گیا ہے۔ اور ثابت یہ کیا گیا ہے کہ مدینہ کے بیشتر قبائل اور ان کے سرداروں کی طاقت و شوکت برقرار رہی تھی اس لئے انھوں نے آپ کی قوت و حشمت اور اقتدار و اختیار کو محدود کر کے آپ کو محض ایک قبائلی سردار کا درجہ دے دیا تھا۔[۸۲]

حیرت کی بات ہے کہ مغربی مورخین نے دانستہ طور سے بڑی جرأت اور بے باکی سے دستور مدینہ کی ان دفعات کی الٹی سیدھی تاویل و تفسیر کی ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ کے معاشرہ و سماج میں روز اوّل سے اہم ترین مقام سیادت اور اعلیٰ ترین اختیارات و اقتدار عطا کرتی ہیں۔ کم از کم تین دفعات مثلاً ۲۳، ۳۶ اور ۴۲ آپ کے مقام اور اختیارات کو واضح طور سے بیان کرتی ہیں۔ پہلی دفعہ کے مطابق صرف اور صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام اختلافات اور مقدمات میں فیصلہ کرنے کا حق حاصل تھا۔ اور نہ صرف یہ حق حاصل تھا بلکہ تمام فریقوں کے لئے آپ کا فیصلہ ماننا ضروری تھا۔ واٹ نے عجیب و غریب تاویل یہ کی ہے کہ اس اختیار کا تعلق مذہبی معاملات اور امور سے تھا اور اس لئے وہ محض مسلمانوں تک محدود تھا کیونکہ ان کے خیال میں اختلافات کو آپ کے حوالے کرنے کے سلسلہ میں فقرہ " خدا اور اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے کرنے کا " آیا ہے اور اس ضمن میں مورخ موصوف نے قرآن کریم کی بعض آیات سے استشہاد کیا ہے کہ یہ حق و اختیار محض مذہبی تھا اور صرف مسلمانوں سے متعلق۔[۸۳] مگر دستور مدینہ کی عبارت سے یہ نہیں معلوم ہوتا۔ بلکہ اس کے برعکس یا اس سے وسیع تر مفہوم قطعی طور پر یہ نکلتا ہے کہ تمام اختلافات و جھگڑے جن سے کسی قسم کا خدشۂ فساد ہو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کے لئے پیش کرنا ضروری تھا اور اس میں مذہبی یا غیر مذہبی، سماجی یا معاشی، سیاسی یا تہذیبی پالیسی کے معاملات یا معمولی جھگڑے کی کوئی قید یا شرط نہ تھی۔ قرآن کریم کی وہ تمام آیات جو مختلف فیہ اور متنازعہ امور کو فیصلہ کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے کرنے کا حکم دیتی ہیں دراصل اسی سماجی و سیاسی اقتدار کی تشریح و تعبیر ہیں۔ بحیثیت رسول خدا آپ کو مدینہ والوں نے بیعت عقبہ ثانیہ میں تسلیم کیا تھا اور اسی کے ساتھ تسلیم کیا تھا: آپ کی غیر مشروط فرمانبرداری کے حق کو۔ اس کے علاوہ تاریخی واقعات بھی آپ کے اس حق و اقتدار کے شروع سے قائم اور واجب التعمیل ہونے کی تصدیق کرتے ہیں۔

پہلے ابتدائی پانچ برسوں میں جب آپ کی کمزور سیاسی حیثیت اور محدود اختیارات ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی جاتی ہے۔ آپ کے فیصلے ایک یہودی جوڑ عورت اور ایک یہودی زناکار کے مقدمات میں کسی اور نے نہیں خود یہودیوں نے نافذ کئے تھے[۸۴] غزوہ بنو قینقاع اور بنو نضیر میں آپ نے بذاتِ خود اور بہ نفس نفیس اقدامات کئے اور فیصلے نافذ کئے تھے جن کی تعمیل کی گئی تھی۔ یہ دونوں فیصلے غزوہ بنو قریظہ اور بنو مصطلق سے پہلے نافذ کئے گئے تھے۔ کیا یہ حیرت کی بات نہ ہوگی کہ ایک سال یا دو سال قبل تو آپ صاحب اختیار تھے لیکن بعد میں آپ کی پوزیشن کمزور ہو گئی تھی۔ واقعۂ افک اور غزوہ بنو قریظہ کے ضمن میں آپ نے جو پالیسی اپنائی تھی اس کا تعلق مصلحت و حکمتِ عملی سے تھا کسی سیاسی کمزوری اور اختیارات کے محدود یا زیر قدغن ہونے سے نہ تھا۔ عبداللہ بن ابی بن سلول کے ساتھ آپ کا طرزِ عمل دراصل آپ کی منافقین کے بارے میں اصل پالیسی اور حکمت سے تھا۔ آپ نے منافقین میں سے کسی ایک کے خلاف بھی کوئی سخت قدم نہیں اٹھایا تھا اور نہ ان میں سے کسی کو سزا دی تھی۔[۸۵] حتیٰ کہ غزوۂ تبوک کے زمانے میں جب آپ نے منافق سازشیوں کی مسجد ضرار کو آگ لگوائی تھی تاہم ان میں سے کسی بھی شخص کو سزا نہیں دی گئی تھی[۸۶] یہ وہ زمانہ تھا جب آپ کے تمام اختیارات کے اعلیٰ و ارفع ہونے کے مغربی مورخین بھی قائل ہیں۔

مونٹگمری واٹ نے اسی طرح سے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی فوجی پوزیشن کو ہلکا دکھانے کی کوشش کی ہے اور اس کو مبہم و غیر واضح قرار دیا ہے اور یہ دلیل دی ہے کہ "بیعۃ الحرب" کی شرائط نے صرف دفاعی اقدام کی بات کہی تھی اور اس میں بھی یہ واضح نہیں کیا تھا کہ قیادت کی زمام کس کے ہاتھ میں رہے گی۔[۸۷] بڑی حیرت اور تعجب کی بات ہے کہ مورخ موصوف نے اس ضمن میں دستورِ مدینہ کی دفعہ ۳۶ کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا ہے جو بلا کسی شک و شبہ کے جنگ کے لئے مدینہ سے باہر نکلنے کی اجازت دینے کے اختیار کو جن میں دفاعی اور جارحانہ دونوں طرح کے اقدامات شامل تھے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اختیار بلا شرکت غیرے قرار دیتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ مورخ مذکور نے تاریخی ٹھوس اور ناقابلِ انکار تردید واقعات کو بھی اپنی عجیب و غریب تاویل کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بیعۃ الحرب میں قیادت کا مسئلہ طے نہیں کیا گیا تھا لیکن یہ بھی اتنا ہی صحیح ہے کہ جب آپ کو قائد یا امام تسلیم کیا گیا تھا اور آپ کی غیر مشروط اطاعت کا دم بھرا گیا تھا تب ہی قیادت کا اختیار آپ کو منتقل ہو گیا تھا اور باقی رہی سہی کسر دستورِ مدینہ کی اس دفعہ نے پوری کر دی۔ پھر دفاعی اور جارحانہ اقدامات دونوں دفاع کے لئے ہوتے ہیں یہ بات فوجی تاریخ و اصول کے کسی طالبِ علم سے پوشیدہ نہیں اس لئے دفاعی اور جارحانہ اقدامات کی تفریق کا سوال اٹھانا مضحکہ خیز ہے۔ اس کے علاوہ عہدِ مدینہ کی دہ سالہ تاریخ بلا شک و شبہ یہ ثابت کرتی ہے کہ قیادت عسکری کا منبع و سرچشمہ صرف آپ کی ذات تھی اور آپ ہی مدینہ کے اصل مستقل اور عظیم ترین قائد تھے۔ اس پر مفصل بحث تو اپنے مقام پر آئے گی یہاں یہ کہنا کافی ہوگا کہ واقدی کے شمار غزوات و سرایا کے مطابق پہلی مہم سے آخری مہم تک تقریباً ۷۴ مہموں میں یہ اختیار آپ کو حاصل رہا اور نہ صرف حاصل رہا بلکہ آپ نے اس کو پوری طرح سے استعمال فرمایا اور آپ کے ماننے والوں نے اسے مانا اور تسلیم بھی کیا بہرحال یہاں آپ کے مقامِ سیادت و قیادت و اختیار سے مکمل بحث نہیں کرنی ہے۔ دستورِ مدینہ کی بعض دفعات کی روشنی میں آپ کے مقام کو متعین کرنا مقصود تھا اور ان سے یہ واضح و صریح طور سے ثابت ہوتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کو تمام معاملات میں، خواہ وہ سیاسی ہوں یا سماجی، اقتصادی ہوں یا شہری، فوجی ہوں یا مذہبی، مکمل اور ارفع و اعلیٰ اختیارات حاصل تھے اور آپ کی یہ سیادت وقیادت اعلیٰ ہجرت کے بعد خاص کر دستورِ مدینہ کے نفاذ کے بعد سب کو تسلیم اور ماننی پڑی تھی۔ مسلمانوں کو اس لئے کہ آپ اللہ کے نبی اور رسول تھے اور اس اعتبار سے آپ کے تمام احکام کی بجا آوری سب کے لئے ضروری اور واجب التعمیل تھی۔ اور غیر مسلموں کے لئے اس بنا پر کہ انھوں نے آپ کو دستورِ مدینہ اور دوسرے مختلف انفرادی معاہدوں کے تحت مدینہ کا سردار اعلیٰ اور نائب اعظم تسلیم کیا تھا اور وہ آپ کو سیاسی رہ نما مانتے تھے اور اس کی بنا پر آپ کی اطاعت وفرمانبرداری کے پابند تھے۔

دستورِ مدینہ کی مختلف دفعات کے تجزیے سے یہ حقیقت اُبھر کر سامنے آتی ہے کہ ہجرت کے بعد مدینہ میں ایک سیاسی نظام کی داغ بیل ڈالی گئی تھی جس میں شہر کے مختلف سماجی طبقات کو ایک سیاسی وحدت میں مدغم کیا گیا تھا۔ اصولی طور پر اس سیاسی وحدت میں دو قسم کے مذہبی اور سماجی طبقات شامل تھے؛ ایک مسلم جو مہاجرین و انصار پر مشتمل تھا اور دوسرا غیر مسلم جو یہودی قبائل غیر مسلم عربوں اور اکا دکا نصرانیوں پر مشتمل تھا۔ مسلم طبقہ کے ذیلی گروہ ہی امۃ اللہ یا امت مسلمہ کے ارکان و افراد تھے کیونکہ اس کی بنیاد مذہب —— اسلام —— تھا، جو ایک نیا سیاسی نصب العین بن کر اُبھرا تھا۔ اس کے مطابق امۃ اللہ کا حاکم مطلق و مقتدر اعلیٰ خدائے واحد وقدوس کی ذات تھی اور اس کے نائب اور رسول کی حیثیت سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تنفیذ مرضی و احکامِ الٰہی کا حقِ اوّلین تھا جس نے آپ کو سیاسی، سماجی، مذہبی، فوجی اختیارات کا مرکز ومحور بنایا تھا۔ اور اس بنیاد پر مسلم طبقات آپ کی بلا مشروط و غیر متزلزل فرمانبرداری کے پابند تھے۔ اگرچہ غیر مسلم طبقات آپ کو رسولِ خدا اور مذہبی رہ نما نہیں تسلیم کرتے تھے مگر چونکہ مدینہ کے علاقہ میں بستے تھے اور حکمران یا سیاسی وسماجی اعتبار سے برتر مسلمان طبقات کے ساتھ رہتے تھے اس لئے وہ آپ کی بالادستی —— سیاسی بالادستی —— کو قبول وتسلیم کرنے پر مجبور تھے اور دوسری طرف مسلمان بھی ان کے ساتھ کسی نہ کسی قسم کا تعلق رکھنے پر مجبور تھے اس لئے ان کو اسلام کے سیاسی نظام میں بطور حلیف یا شریک و مشاہد رکن کر لیا گیا تھا اور ان کے کچھ فرائض وحقوق مقرر کئے گئے تھے جو بنیادی طور پر شہر کے غالب وحکمران مسلم طبقات کے حقوق سے فروتر تھے۔ وہ اسلامی امت کے افراد و ارکان نہیں تھے اور نہ اصولی اور عملی طور سے ہو سکتے تھے کیونکہ اللہ کی حاکمیت اعلیٰ اور رسولِ اکرم کی رسالت اور قرآن کریم کے احکامِ الٰہی پر ایمان نہیں رکھتے تھے یا دوسرے الفاظ میں ان کا مذہب اسلام نہیں تھا اور وہ اسلام کی سیاسی آئیڈیالوجی کو نہیں مانتے تھے۔ اس طرح یہ تاریخی ارتقا ثابت کرتا ہے کہ دستورِ مدینہ نے ایک طرف تو امت مسلمہ کو وسعت واستحکام دیا تھا تو مدینہ کی اسلامی ریاست کو دوسری طرف وجود بخشا تھا۔ اور یوں مواخاۃ کے بعد دستورِ مدینہ کا نفاذ اجزا اسلامی ریاست کے ارتقا کا تیسرا مرحلہ عظیم تھا۔

(۴) چوتھا مرحلہ: ابتدائی مہمیں

عہدِ نبوی کی ابتدائی مہمیں اور ان کے نتیجے میں ہونے والے قبائل عرب سے معاہدے اور صلح نامے اسلامی ریاست کے

ارتقا کا جو تھا مرحلہ تھا۔ ہمارے مستند مورخین کے بیانات کے مطابق ہجرت کے چھ ماہ کے اندر اندر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی مہم ترتیب دی تھی اور اس کو شہر مدینہ کے مغرب کے ایک قبیلہ کے علاقے میں بھیجا گیا تھا۔ اور اس کے بعد ہجرت کے اٹھارہ ماہ کے اندر واقدی کے بقول جناب رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید سات مہمیں ترتیب دی تھیں[۸۸] جن میں سے ایک کے سوا سب کی سب قرب و جوار کے علاقے میں گئی تھیں۔ ایک کم معروف مورخ کے مطابق بدر سے پہلے دو اور مہمیں بھیجی گئی تھیں اور ان کے بھی منازل مدینہ کے قریبی قبائل تھے۔[۸۹] اس طرح سے غزوۂ بدر سے پہلے ترتیب دی جانے والی مہمیں دس ہو جاتی ہیں۔ ان مہموں کی نوعیت اور حقیقت کو عموماً بہت ہی غلط انداز میں سمجھا، سمجھایا اور پیش کیا گیا ہے۔ ہمارے مغربی علمائے تاریخ نے تو غلط فہمی، غلط تفسیر اور غلط تشریح کی ایک بے نظیر مثال پیش کی ہے۔ اس میں کچھ تو بقول مولانا شبلی نعمانی ہماری روسیاہی کے لئے سیاہی ہمارے ہی اوّلین مورخین و سیرت نگاروں نے فراہم کی ہے، اور کچھ مہمات نبوی کی اقتصادی اہمیت سے ان کی غیر معمولی اور اکثر حالات میں غیر حقیقی اور مبالغہ آمیز دلچسپی کو دخل ہے۔ بعض ابتدائی مورخین مغرب نے تو اس سلسلہ میں صریح بددیانتی اور افترا پردازی سے کام لیا ہے مگر بعد کے جدید مورخین پر بددیانتی کا اتنا شبہ نہیں کیا جا سکتا جتنا کہ اپنے پیشروؤں کے نظریات سے متاثر ہو کر اپنے طرزِ خیال اور طرزِ فکر کو ڈھالنے کا احساس ملتا ہے۔ چونکہ یہ خیال اتنا یقینی اور پختہ ہو گیا کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے مہاجر اصحاب خالی ہاتھ اور بے سر و سامان مدینہ آئے تھے[۹۰] لہٰذا ان کو معاشی ضروریات کی فراہمی کا کوئی ذریعہ درکار تھا۔ مدینہ میں انصار کی پہلے سے خراب معیشت نے ان کی کوئی مستقل مدد نہیں کی اور ان کی فیاضی و سخاوت اور سیر چشمی بس ایک حد تک کفایت کر سکتی تھی اس لئے جلد ہی رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے تہی دست و نادار اصحاب کے لئے ایک ذریعہ آمدنی تلاش کرنا پڑا اور آپ کے سامنے عربوں کے پرانے لوٹ مار ——— رزیہ ——— کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں تھا جس کو اخلاقی طور سے برا نہیں سمجھا جاتا تھا اور عرب قبائلی سماج میں جسے سندِ قبولیت حاصل تھی۔ چنانچہ آپ نے یہ سلسلہ شروع کیا اور اسی مقصد کے لئے دس ابتدائی مہمیں ترتیب دی گئیں جو بالآخر غزوۂ بدر پر منتج ہوئیں اور پھر اس کے نتیجے میں مکہ والوں سے باقی فوجی آویزش ہوئی۔

ہمارے سیرت کے ابتدائی مؤلفین نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اقدامات کو قریشی عداوت و خطرے کے پس منظر میں سمجھا، دیکھا اور پھر ہمیں دکھایا ہے۔ چونکہ مدینہ منورہ شام سے مکہ والوں کی تجارت کی بین الاقوامی شاہراہ پر پڑتا تھا اس لئے ان مؤلفینِ سیرت نے آپ کی ان ابتدائی مہموں کو قریشی کاروانوں کی روک ٹوک اور چھیڑ چھاڑ قرار دے دیا۔[۹۱] اس سے جدید مغربی مورخین اور ان کے خوشہ چیں مشرقی اور مسلم سیرت نگاروں اور مورخوں نے ایک قدم آگے بڑھایا اور یہ نتیجہ نکالا کہ قریشی مال و دولت سے لدے کاروانوں نے مسلمانوں میں طمع، حرص و ہوس اور آسانی سے مل جانے والی دولت کی آگ بھڑکا دی اور وہ اپنی اقتصادی مجبوریوں سے تنگ آ کر لوٹ مار کے لئے نکل کھڑے ہوئے اور یہ ابتدائی مہمیں انھیں کا دوسرا اور عملی روپ تھیں۔[۹۲] دوسری طرف بعض مسلم مورخین نے تھوڑی سی یہ تاویل کی کہ ان مہموں کا مقصد دولت یا کاروان لوٹنا نہیں تھا بلکہ مکہ کی اقتصادی ناکہ بندی تھی جس کے ذریعہ مکہ کی اشرافیہ کو مدینہ کی اسلامی ریاست سے کسی قسم کی مفاہمت پیدا کرنا تھا۔[۹۳] بہرحال ان دونوں صورتوں میں ان ابتدائی مہموں کا مقصد محرک اور مسائل و معاملات اقتصادی و معاشی تھے۔ لیکن ان ابتدائی مہموں کا ایک

تنقیدی اور تحلیلی تجزیہ ان کے مقاصد، محرکات اور مسائل کے بارے میں بالکل دوسرے نتائج نکالنے پر مجبور کرتا ہے جو در اصل صحیح اور واقعی تھے۔

اگر واقدی کی روایت تسلیم کر لی جائے تو سریہ حضرت حمزہ بن عبد المطلب اسلام کی پہلی مہم تھی جو رمضان ۱ھ / مارچ ۶۲۳ء میں بحر قلزم کے ساحل پر واقع ایک مقام العیص کی طرف بھیجی گئی تھی۔(۹۴) طبری اور ابن اثیر کا بیان ہے کہ اس مہم کا مقامِ مقصود قبیلہ جہینہ کا علاقہ تھا۔(۹۵) یہ حقیقت دلچسپ ہے کہ جہینہ والے مدینہ کے قبیلہ خزرج کے حلیف و معاہد تھے اور اس کے تحت جنگ بعاث میں جو ۶۱۵ء کے ابتدائی زمانے میں ہوئی تھی خزرج کی طرف سے شریک جنگ ہوئے تھے۔ دوسرا فریق مدینہ کا اوس اور ان کا اتحادی حلیف قبیلہ مزینہ تھا جو مدینہ کے نواح مغرب میں آباد تھا اور وہ اپنے حلیف قبیلہ کی طرف سے جنگ میں شریک ہوا تھا۔ قبائل جہینہ اور مزینہ کے اپنے اپنے حلقۂ مدینہ خزرج اور اوس کے ساتھ بالترتیب قریبی اور دوستانہ تعلقات قائم اور بعد ہجرت نبوی بدستور قدیم قائم تھے۔ چنانچہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شہر میں معاشرۂ امت اور اسلامی ریاست کا رنگ بنیاد رکھا تو فطری طور سے ان حلیف و قریب و دوست قبائل سے تعلقات کا مسئلہ زیر بحث آیا اور لازمی طور سے یہ فیصلہ کیا گیا کہ ان قبائل سے بھی وہی حلف و معاونت باہمی کے رشتے استوار رکھے جائیں جس طرح مدینہ کے یہودی حلیف قبیلوں سے قائم رکھے گئے تھے کیونکہ یہ قبائل مدینہ کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی دائرہ کار میں رہتے تھے اور جغرافیائی سیاسیات کے اصول کے ماتحت ان سے تعلقات قائم رکھنا لازمی و ناگزیر تھا۔(۹۶) جدید مغربی مورخین اور علماء سیرت کو بھی اس کا اعتراف ہے کہ مدینہ کے ارد گرد بسے ہوئے قبائل امت اسلامی کے حلقہ میں سب سے پہلے داخل ہوئے تھے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مہاجرین و انصار کے بعد سب سے بڑے جاں نثار و وفادار تھے۔(۹۷) اس امر کی صریح و صاف تصدیق ان معاہدوں سے ہوتی ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مغربی قبائل سے خصوصاً اور مشرق مدینہ کے باسی قبائل سے عموماً کئے تھے۔ اگرچہ ان تمام معاہدوں کی تاریخ اور وقت کے بارے میں ماخذ کے بیانات صاف نہیں ہیں تاہم خوش قسمتی سے بعض معاہدوں کے وقت اور حالات کا ذکر صریح طور پر ملتا ہے، جن سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ یا تو یہ معاہدات حلف و باہمی تعاون انھیں ابتدائی مہموں کے زمانے اور دوران میں ہوئے تھے یا ان کے نتیجے میں طے پائے تھے۔ حضرت حمزہ کی مہم العیص کا مقصد قبیلہ جہینہ کی دوستی و تعاون حاصل کرنا تھا نہ کہ قریشی کارواں پر چھاپہ مارنا۔ اس ضمن میں جہینہ کے سردار مجدی بن عمرو کا کردار بہت اہم ہے۔ اتفاق سے جب مسلم جماعت ان کے علاقہ میں پہنچی تو اس کا سامنا شام سے لوٹنے والے ایک کارواں سے ہو گیا۔ قریب تھا کہ جھڑپ ہو جاتی مگر مجدی بن عمرو نے بیچ بچاؤ کیا۔ ہمارے ماخذ بصراحت کہتے ہیں کہ قبیلہ جہینہ کے مسلمانوں اور مکہ والوں دونوں سے دوستانہ تعلقات تھے اسی لئے ان کے سردار نے ثالث، حکم یا صلح کے علمبردار کا کردار ادا کیا تھا۔(۹۸)

دوسری مہم رابغ کی وادی کی طرف حضرت عبیدہ بن الحارث کی زیر قیادت شوال ۱ھ / اپریل ۶۲۳ء میں بھیجی گئی تھی۔ اس کا مقصد بھی اس علاقے کے بدوؤں یا بدوی قبیلوں سے دوستی کے روابط قائم کرنا تھا۔ اس مہم میں بھی اسلامی دستے کا سامنا ایک اور قریشی کارواں سے ہوا تھا مگر دونوں میں جنگ و جدال کی نوبت نہیں آئی۔(۹۹) ان دو مہموں کے علاوہ تیسری مہم

حضرت سعد بن ابی وقاص کے زیر کمان ایک ماہ بعد خرّار کے علاقے میں بھیجی گئی تھی۔ ہمارے مورخین اس مہم کی منزل کے باسیوں کے بارے میں کچھ نہیں کہتے اور یہ تاثر دیتے ہیں کہ اس کا مقصد بھی ایک قریشی کارواں تھا مگر وہ مسلم جماعت کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی نکل گیا تھا۔ مسلمانوں کی کسی دشمن سے ملاقات نہیں ہوئی اور وہ بسلامت مدینہ منورہ واپس آ گئے۔(۱۰۰)

اس کے بعد پے بہ پے چار غزوات ہوئے:

اوّل غزوۂ ابواء، یا ودّان صفر ۱ھ / اگست ۶۲۳ء میں،

دوم غزوۂ بواط ربیع الاوّل ۲ھ / ستمبر ۶۲۳ء میں،

سوم غزوۂ سفوان اسی ماہ میں، اور

چہارم غزوۂ ذو العشیرہ جمادی الاولیٰ ۲ھ / دسمبر ۶۲۳ء میں۔

ان غزوات پر تمام مورخین و سیرت نگاروں کا اتفاق ہے کہ بدر سے پہلے صرف چار مہموں میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شرکت فرمائی تھی۔(۱۰۱) مگر محمد بن حبیب بغدادی ان کے بعد دو اور غزووں کا ہونا بتاتا ہے اور بظاہر تمام قرائن کہتے ہیں کہ اس کا اضافہ غلط نہیں ہے۔ اس کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعرات ۲ شعبان ۲ھ / ۲۹ جنوری ۶۲۴ء اور پھر منگل ۱۴ شعبان ۲ھ / ۱۲ فروری ۶۲۴ء کو بالترتیب ینبع اور سفوان کا سفر کیا تھا۔ پہلی مہم کے محرک و مقصد کے بارے میں وہ کچھ نہیں کہتا البتہ دوسرے سفر کا نتیجہ وہ یہ بتاتا ہے کہ آپ نے پہلے غفار سے اور پھر اسلم سے دوستی و باہمی تعاون کے معاہدے کئے تھے۔(۱۰۲) پہلے چار غزوات کے بارے میں عمومی تاثر یہ ہے کہ وہ قریشی کاروانوں کی روک تھام کے لئے واقع ہوئے تھے اور یہ تاثر ہمارے ابتدائی سیرت نگاروں نے فراہم کیا ہے اگرچہ وہ یہ بھی تصریح کرتے ہیں کہ ان میں سے کسی میں بھی دشمن سے سامنا نہیں ہوا تھا۔(۱۰۳) بہر حال ان کے بیانات کا تنقیدی تجزیہ کرنے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جو محرکات و مقاصد ان مہموں کے ابتدائی مولفینِ سیرت نے مقرر کئے ہیں وہ دراصل ان کے اپنے تاثرات کا نتیجہ ہیں نہ کہ واقعات اور حقائق کا۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ ان غزوات کے بارے میں انھیں مورخین و سیرت نگاروں کے بیانات سے ان کے تاثرات کی تردید ہو جاتی ہے۔

مثال کے طور پر ابنِ اسحاق پہلی دو مہمات نبوی کے بارے میں یہ قطعی نہیں بیان کرتے کہ وہ کن لوگوں کے خلاف بھیجی گئی تھیں۔ ان کا بیان بس اس حد تک ہے کہ وہ غزوات اپنے علاقوں کی طرف گئے جہاں ان کی ملاقات اتفاقاً قریشی کاروانوں سے ہو گئی دراصل یہ ملاقات ایک اتفاقی حادثہ تھا نہ کہ سوچا سمجھا منصوبہ۔(۱۰۴) ابنِ اسحاق کے ان بیانات کی کم و بیش یکساں پیروی ابنِ ہشام، واقدی، ابنِ سعد اور ابنِ اثیر کے یہاں ملتی ہے۔(۱۰۵) طبری واحد مورخ ہیں جو یہ حتمی بیان دیتے ہیں کہ یہ دونوں مہمات قریشی کاروانوں پر چھاپہ مارنے کے لئے وجود پذیر ہوئی تھیں۔(۱۰۶) اگرچہ اوّل چار غزواتِ نبوی کے بارے میں ہمارے اکثر سیرت نگار اپنے بیانات کا آغاز اس ٹیپ کے بند سے کرتے ہیں کہ "آپ قریش کے ارادے سے نکلے"، مگر بعد میں غزوات کے اصل بیانات میں حیرت کی بات ہے کہ وہ قریش یا قریشی کاروانوں کا حوالہ نہیں دیتے ہیں۔(۱۰۷) غزوۂ ودّان یا ابواء کے بیان میں سارا زور قبیلہ کنانہ کے ایک خاندان بنو ضمرہ سے معاہدہ صلح و تعاون پر مرکوز رہتا ہے جو آپ نے ان کے سردار

مخشی بن عمرو ضمری کے ذریعہ کیا تھا۔[۱۰۸] ابن اسحاق اور واقدی نے اگرچہ غزوۂ بواط کے بارے میں صرف یہی کہا ہے کہ وہ قریشی کارواں پر چھاپہ مارنے کی غرض سے ہوا تھا مگر چونکہ شکار ہاتھ سے نکل گیا اس لئے آپ ناکام واپس آ گئے۔[۱۰۹] ابن سعد نے اگرچہ اکثر نکات پر اپنے استاد سے اتفاق کیا ہے تاہم وہ ایک اہم اور نیا حوالہ یہ دیتا ہے کہ بواط کا علاقہ قبیلہ جہینہ کا تھا جہاں مسلم جماعت تقریباً ایک ماہ مقیم رہی۔[۱۱۰] اسی طرح اگرچہ غزوہ ذوالعشیرہ کے بارے میں مورخین صدر اول کا تاثر یہی ہے کہ وہ قریشی کارواں کے لئے ہوا تھا لیکن ان کا سارا بیان سفر نبوی کی منازل اور راستوں سے متعلق ہے اور آخر میں یہ حتمی بیان ہے کہ آپ نے بنو مدلج اور ان کے حلیف بنو ضمرہ سے معاہدۂ صلح و اعانتِ باہمی کیا تھا۔[۱۱۱] باقی دو مزید غزواتِ نبوی کے بارے میں محمد بن حبیب بغدادی کے بیان میں کہیں بھی قریش یا قریشی کارواں کا ذکر نہیں بلکہ قبیلۂ غفار اور قبیلۂ اسلم سے معاہداتِ نبوی کا واضح بیان ملتا ہے۔[۱۱۲] جہاں تک سریہ نخلہ کا تعلق ہے وہ حضرت عبداللہ بن جحش کی زیرِ قیادت مکہ اور طائف کے درمیان واقع مقام نخلہ کو بھیجی گئی تھی اور اس کا مقصد قریشِ مکہ کے بارے میں معلومات فراہم کرنا تھا۔ اس پر بحث کہیں اور کی جا چکی ہے۔[۱۱۳] لہذا تفصیلات سے گریز کیا جاتا ہے۔ یہاں صرف اتنا کہنا کافی ہوگا کہ مہم نخلہ در اصل ایک طلیعہ تھا جس کا کام صرف معلومات فراہم کرنا تھا۔ اور یہی حال ان میں سے بیشتر سرایا کا تھا جہاں تک اولین غزواتِ نبوی کا تعلق ہے وہ فوجی مہمیں ہرگز نہ تھیں بلکہ سیاسی مہمیں یا مشن تھے جن کا مقصد پڑوسی قبائل سے جو مدینہ کے زیرِ اثر علاقے میں آباد تھے دوستانہ اور باہمی تعاون و نصرت کے تعلقات قائم کرنا تھے۔ اور اس طرح مدینہ کی اسلامی ریاست کے زیرِ اثر علاقے اور باہمی تعاون و نصرت کے تعلقات قائم کرنا تھے۔ اور اس طرح مدینہ کی اسلامی ریاست کے زیرِ اثر علاقے یا سیاسی حلقۂ اثر کو وسیع تر کرنا مقصود تھا۔ چنانچہ قبائل بنو مدلج، بنو ضمرہ، غفار، اسلم، مزینہ، جہینہ اور متعدد دوسرے قبائل سے معاہدے اسی زمانے کی یادگار ہیں اور وہ بالواسطہ طور پر ان ابتدائی مہماتِ نبوی کی نوعیت و حقیقت کو اجاگر کرتے ہیں۔[۱۱۴]

ان مہموں کے بارے میں ابتدائی مولفینِ سیرت اور جدید مسلم و مغربی مورخین کے اس نظریہ کی کہ وہ قریشی کاروانوں پر چھاپہ مارنے کے لئے منظم کی گئی تھیں متعدد دوسرے دلائل اور شواہد سے قطعی اور حتمی تردید ہوتی ہے۔ اول یہ کہ نظریاتی طور سے مسلمانوں کو اقدامِ جنگ کی اجازت نہ تھی۔[۱۱۵] اس کے علاوہ مسلم ریاست اس وقت اس فوجی صلاحیت اور سیاسی طاقت کی مالک نہ تھی کہ وہ جزیرہ نمائے عرب کے سب سے بڑی سیاسی اور فوجی طاقت سے ٹکر لے سکتی۔ چنانچہ مسلمان نہ تو قریشی کاروانوں پر سامنے سے بالمشافہ حملہ کرنے کا خطرہ مول لے سکتے تھے اور نہ ہی ان پر چھپ کر چھاپہ مار سکتے، گھات لگا کر حملہ کر سکتے یا شبخون مار سکتے تھے۔[۱۱۶] اس کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ قریشی کاروانوں کے ساتھ محافظین کی تعداد کافی ہوتی تھی اور عددی لحاظ سے مسلم مہموں کی طاقت بہت کم تھی جیسا کہ چاروں سرایا کی عددی طاقت سے خاص طور پر معلوم ہوتا ہے اور چھ غزواتِ نبوی میں سے محض تین میں مسلم دستوں کی عددی طاقت سو اور دو سو مسلمانوں پر مشتمل تھی جبکہ ان کے مقابلے میں قریشی کاروانوں کی عددی قوت خاص کر ان کی جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں سے سامنا ہوا تھا کئی گنا زیادہ تھی۔[۱۱۷]

ایک دوسرا اور کہیں زیادہ اہم معاملہ تھا مغربی شاہراہِ تجارت پر بسے ہوئے قبائلِ عرب کے رویے اور طرزِ عمل کا۔

تمام آثار و شواہد اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ مدینہ میں اسلامی ریاست کے قیام اور استحکام سے پہلے

تمام قبائلِ عرب جو اس علاقے میں بستے تھے قریشی تاجران مکّہ سے حلف و دوستی کے تعلقات رکھتے تھے۔ یہ زمانۂ جاہلیت کے قبائلی اور سماجی اور اقتصادی تعلقات کی دین تھے۔ عموماً تاجر قبیلے شاہراہ تجارت کے اردگرد بسے ہوئے قبائل سے دوستی کے معاہدے کر لیتے تھے۔ یہ معاہدے باہمی تعاون کے ہوتے تھے۔ تاجر قبائل ان بدوی یا ساکن قبیلوں کو چند مراعات یا ایک خاص قسم کا ٹیکس دیتے تھے جو عموماً بدو قبائل کی مادی ضروریات مثلاً کھجور، کپڑے، ہتھیار وغیرہ پر مشتمل ہوتا تھا۔ اور اس کے بدلے میں یہ بدو قبیلے تجارتی کاروانوں کی اپنے علاقے میں حفاظت کرتے تھے بلکہ ان کو دوسرے علاقوں تک حفاظت سے پہنچانے کا اہتمام کرتے تھے قریش نے اسی قسم کے معاہدے تمام قبیلوں سے کر رکھے تھے[۱۱۸] جیسا کہ جہینہ کے سردار مجدی بن عمرو جہنی کے رویہ اور جملہ سے ہوتا ہے اور دُوسرے متعدد ثبوت سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان علاقوں میں مسلم دستے آسانی سے کامیاب نہیں ہو سکتے تھے اگر وہ تجارتی قافلوں پر حملہ کرتے۔ اس صورت میں وُہ نہ صرف قریش مکّہ سے جنگ کا خطرہ مول لیتے بلکہ پڑوس کے بدوی قبائل کو بھی اپنا دشمن بنا لیتے اور اس طرح نہ صرف مسلم دستوں کی بہ حفاظت واپسی مشکل ہو جاتی بلکہ خود نوزائیدہ اسلامی ریاست کی زندگی اور وجود معرضِ خطر میں پڑ جاتا۔

شاہراہِ تجارت پر بسے ہُوئے قبائلِ عرب کے رویے اور طرزِ عمل سے زیادہ حیرت انگیز رویہ خود قریشی کاروانوں کا نظر آئے گا اگر مسلم مہموں کو چھاپہ مار کارروائی مان لیا جائے۔ اگر بالفرض پہلی مہم میں جہنی سردار کی کوششوں کے سبب تصادم کی نوبت نہیں آئی تھی اور مسلم دستہ صاف بچ گیا تھا تو دوسری مہم رابغ میں برتر قریشی کارواں نے فروتر مسلم دستہ کو تہس نہس کر کے اس خطرہ کا سدِباب ہمیشہ کے لئے کیوں نہیں کر دیا؟ لیکن اگر یہ دلیل بھی تسلیم کر لی جائے کہ قریشی کارواں بلاوجہ کوئی جھگڑا مول لینا نہیں چاہتے تھے اور اپنی تجارت کی آئندہ سلامتی کی خاطر جنگ و جدال سے پہلو تہی کرنے کی حکمتِ عملی پر عمل پیرا تھے[۱۱۹] تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی تجارت پر مسلسل منڈلاتے ہُوئے اس خطرہ کا مستقل سدِباب کیوں نہیں کیا تھا، کیا وُہ اپنی تجارت کے بارے میں اتنے ہی لاپروا تھے؟ اور کیا تھا تو کیا اور کیوں کر کیا تھا؟ کیا انھوں نے اپنے کاروانوں میں محافظ دستہ کی فوجی طاقت میں اضافہ کیا تھا یا عرب قبائل سے مزید امداد مانگی تھی؟ بظاہر دوسری صورت تو پیش نہیں آئی تھی کیونکہ واقعات و حقائق اس کی نفی کرتے ہیں۔ رہی پہلی صورت تو ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ بجائے محافظین کی تعداد میں اضافہ کے ان میں مسلسل کمی آتی جا رہی تھی۔ حتّٰی کہ بدر سے ذرا پہلے جو عظیم اور مالامال قریشی کارواں شام گیا تھا اس میں محافظین کی تعداد بہت ہی کم تھی۔[۱۲۰] یہ حقیقت اس بات کی غماز ہے کہ ہمارے جدید مغربی مورخین اور ان کے خوشہ چیں مسلم مولفینِ سیرت اور مورخین کو قریشی تجارت پر ان ابتدائی مہموں کی صورت میں جو خطرہ منڈلاتا نظر آ رہا ہے وُہ کم از کم اس وقت کے تاجرانِ مکّہ کو غالباً بالکل نظر نہیں آیا یا محسوس ہوا تھا۔ ورنہ وُہ یُوں اپنے کاروانوں کے محافظین کی تعداد میں مسلسل کمی کرتے نہ رہتے اور اس طرح خود اپنی تجارت کے ہلاکت کے درپے نہ ہوتے۔ حالات و واقعات اس طرف اشارہ کرتے ہیں کہ مدینہ میں اسلامی ریاست کے قیام کے بعد قریشِ مکّہ کو یقیناً اپنی تجارت اور تجارتی کاروانوں کے لئے خدشہ پیدا ہوا ہوگا اور اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ ابتدائی کاروانوں میں افرادی طاقت مقابلتاً کہیں زیادہ تھی لیکن جُوں جُوں

وقت گزرتا گیا ان کو مدینہ کی طرف سے لاحق خدشات، اگر کوئی تھے بھی تو وہ مٹتے گئے اور وہ رفتہ رفتہ اپنے کاروانوں کی حفاظت کے بارے میں مطمئن ہوتے گئے۔ پھر قریش مکہ اچھی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور فکر و عمل سے واقف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ مکہ کا الامین مدینہ میں اپنی فطرت و طبیعت کے خلاف اپنی روایاتِ امانت و دیانت سے یوں گریز نہ کرے گا کہ کسبِ معاش کے لئے لوٹ مار کی راہ اختیار کرے۔ مآخذ سیرت و حدیث کی بعض روایات سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہوتی ہے کہ بدر سے پہلے تک مکہ والوں کو اپنی تجارت کے لئے مدینہ والوں سے کوئی خطرہ نہیں تھا، جیسا کہ حضرت سعد بن معاذ کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔[۱۴۱]

ابتدائی مہموں کے ذیل میں ایک اہم نکتہ ان کی منزلوں کا بھی ہے۔ ان دسوں مہموں میں مہماتِ نبوی کی منزلیں ایک دوسرے سے قطعی مختلف اور فاصلہ کے لحاظ سے الگ الگ تھیں۔ سفوان اور نخلہ مکہ کے قرب میں اور کافی جنوب مشرق میں واقع تھے جبکہ بقیہ منازل کا مدینہ منورہ سے فاصلہ تیس اور سو میلوں کے درمیان تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام منازل مغربی شاہراہ تجارت پر واقع نہ تھیں۔ اور اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ یہ تمام منازل اس شاہراہ پر ہی واقع تھیں تو مورخین کے بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ کئی مہماتِ نبوی کی منزلِ مقصود شاہراہ تجارت سے ہٹ کر بدوی قبیلوں کے علاقے میں تھی۔[۱۴۲]

اس کے علاوہ ایک اہم ترین نکتہ جو ان مہموں کے چھاپہ مار ہونے کے الزامِ خام کی قطعی تردید کرتا ہے وہ ان مہموں میں لگنے والی مدت خاص کر مسلم دستوں کے اپنی منازلِ مقصود پر قیام سے متعلق ہے۔ مورخین ان مہماتِ نبوی خاص کر غزوات کے بارے میں صراحت سے بیان کرتے ہیں کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان بدوی علاقوں میں کتنی مدت تک قیام کیا۔ مثلاً غزوہ ودّان کے دوران آپ نے منزل پر تقریباً دو ہفتے تک قیام کیا تھا جبکہ بُواط اور ذو العشیرہ میں آپ کا قیام دونوں مقامات پر ایک ماہ کے لگ بھگ رہا تھا۔ اگرچہ محمد بن حبیب بغدادی اپنی بیان کردہ دو نئی مہموں کے دوران منازلِ مہمات پر قیام نبوی کی مدت کا کوئی حوالہ نہیں دیتے تاہم یہ واضح ہے کہ وہ خاصی طویل رہی ہوگی۔ یہ بات عجیب نظر آتی ہے کہ آپ نے یا آپ کے امراء سرایا نے ظاہری طور پر کاروانِ قریش کے ہاتھ سے نکل جانے کے باوجود اتنی مدت تک ان علاقوں میں قیام رکھا تھا۔ یہ سوچنا غلط ہے کہ آپ یا آپ کے امرا تجارتی کاروانوں کی واپسی کے منتظر تھے یا دوسرے کاروانوں کی تاک میں تھے۔ پہلی صورت میں قریشی کاروان شام سے اتنی جلد واپس نہیں آسکتے تھے کیونکہ آمدورفت میں کم از کم تین ماہ یا اس کے لگ بھگ مدت لگتی تھی۔ پھر یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے کہ جب کاروانوں کی واپسی کا وقت قیاساً قریب آیا تو آپ مدینہ لوٹ آئے۔ جہاں تک دوسرے کاروانوں پر حملہ کا سوال ہے تو ہمارے تمام مآخذ اس پر متفق ہیں کہ ایسا کوئی واقعہ نہیں پیش آیا۔[۱۴۳]

پھر ایک بڑا سوال قریشی کاروانوں کی آمدورفت کی تیز رفتاری اور سرعت اور اسی کے ضمن میں مکی تجارت کے معیار کے بارے میں پیدا ہوتا ہے۔ اگر مغربی مورخین کا یہ نظریہ مان لیا جائے کہ کرز بن جابر فہری کے خلاف کئے گئے غزوۂ سفوان کے علاوہ بقیہ تمام مہموں کا مقصد چھاپہ مار کارروائی تھی تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر مکی تجارت کتنی بڑی اور عظیم تھی کہ ہجرت کے بعد دس ماہ کی قلیل مدت میں تاجرانِ مکہ نے لگ بھگ نو کاروان شام کو بھیجے تھے اور وہ بھی ابوجہل، ابوسفیان، امیہ بن خلف

جیسے بڑے بڑے سردارانِ قریش کے زیرِ کمان۔ جبکہ بعد کے زمانے میں پورے چار برسوں کی مدت میں ـــــ بدر اور حدیبیہ کے دوران ـــــ یہی تاجرانِ مکہ صرف دو کاروان شام کو بھیج سکے تھے۔ اور دونوں ہی کاروان اسلامی ریاست کی حدود سے بچ کر نہیں نکل سکے تھے اور مسلم فوجی دستوں کے ہاتھوں پکڑے گئے تھے۔ یہ نکتہ ہمیں اس بحث کی طرف بھی لے جاتا ہے کہ کیا مسلم امرا و قائدینِ مدینہ اتنے بے تدبیر، فوجی حکمتِ عملی سے عاری، سیاسی بصیرت سے محروم اور عمل کے کورے تھے کہ انھوں نے کم و بیش نو بار گھات لگائی اور سوائے ایک موقعہ کے ہر بار ناکام رہے۔ بعد کی فوجی کارروائیوں بلکہ کارناموں سے اسی غلط تاثر و نتیجہ کی نہ صرف تردید ہوتی ہے بلکہ یہ حقیقت ابھر کر سامنے آتی ہے کہ جب جب مسلمانوں نے تلوار اٹھائی وہ کاری ضرب لگائے بغیر نیام میں نہ گئی۔ انھوں نے جب یہ فیصلہ کر لیا کہ قریشی کاروانوں کو اپنے علاقے سے یا کسی بھی تجارتی شاہراہ سے خواہ وہ مشرقی ہو یا مغربی نہیں گزرنے دینا ہے تو کوئی کاروان بچ کر نہیں نکل سکا، حتّٰی کہ صلح حدیبیہ کے بعد جب مکہ کے بےبس و لاچار مسلمانوں نے عیص میں پناہ لی تھی تو انھوں نے اپنی فوجی بے سروسامانی کے باوجود قریشی کاروانوں کو بچ کر نہیں نکلنے دیا تھا۔ یہ حقیقت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اس وقت تک مسلمانوں نے چھاپہ مار کارروائی کا منصوبہ ہی نہیں بنایا تھا۔ اور نہ ہی قریشِ مکہ کو اپنی تجارت یا تجارتی قافلوں کے لئے کوئی خطرہ تھا یا ان مہماتِ نبوی سے محسوس ہوا تھا۔[۱۲۴]

ان ابتدائی مہموں کا اولین و آخرین مقصد دراصل مدینہ کے اردگرد بسے ہوئے قبائل سے دوستی و باہمی تعاون کے تعلقات کو فروغ دینا اور مدینہ کی اسلامی ریاست کو ایک محفوظ و مامون علاقہ فراہم کرنا تھا۔ ان کا عملی نتیجہ یہ نکلا کہ مدینہ کے مغربی نواح میں بسے ہوئے تقریباً تمام بدوی قبائل جیسے خزاعہ اور ان کی ایک اہم شاخ اسلم اور کنانہ کی متعدد شاخوں جیسے ضمرہ، غفار، لیث، دیل اور مدلج، قبائل جہینہ اور مزینہ اور ازدِ شنوءہ کے بعض خاندانوں سے مسلم ریاست کے باہمی تعاون اور دوستی کے تعلقات قائم ہو گئے۔[۱۲۵] یہ دفاعی معاہدے تھے جو ان سے اس زمانے میں کئے گئے تھے۔ چونکہ ان قبائل کے انصارِ مدینہ سے دوستی کے دیرینہ تعلقات تھے اس لئے اسلامی ریاست کو ان سے تعلقات قائم کرنے میں مدد بھی ملی اور مدینہ کے مسلمانوں کی سیاسی اور فوجی طاقت میں بھی اضافہ ہوا۔ مغربی قبیلوں کے علاوہ بعض مشرقی قبائل سے بھی جن میں اسد بن خزیمہ اور سُلیم کے بعض خاندان شامل تھے اسی زمانے میں تعلقاتِ حلفت استوار ہوئے تھے۔ ان مہموں کے نتیجے میں اسلامی ریاست کے حدود میں خاصی توسیع ہوئی تھی۔ اور یہ توسیع دو طرح کی تھی:

اوّل تو مدینہ منورہ کے قریب ترین علاقے تھے جن میں جہینہ اور مزینہ کے قبیلوں کے بعض اہم خاندان آباد تھے۔ یہ قبائل/ خاندان نہ صرف اسلامی ریاست کے حلیف رکن بنے تھے بلکہ اسلامی معاشرہ ـــــ امت ـــــ کے رکن بھی بن گئے تھے اس لئے مدنی ریاست کی سیاسی حدود محض شہرِ رسولؐ تک محدود نہیں رہی تھیں بلکہ شہری ریاست کے مرکز کے اردگرد کے علاقوں تک وسیع ہو گئی تھیں۔

دوم یہ کہ وسعت کے لحاظ سے مدینہ کی اسلامی ریاست کا حلقۂ اثر و نفوذ اس عملی دائرے سے کہیں زیادہ بڑا تھا۔ اور غزوۂ بدر تک ایک طرف تو مغربی شاہراہ تجارت کی پوری ساحلی پٹی جو شمال میں العیص اور ینبوع اور جنوب میں رابغ کے

درمیان تھی مدینہ[126] کی اسلامی ریاست کے سیاسی اور مذہبی اثر میں آگئی تھی اور اس سے زیادہ مدینہ اور ان تینوں مقامات کے درمیانی علاقہ کے قبائل اور ان کے خطوں کا معاملہ تھا ان کے علاوہ یہ بھی قوی امکان ہے کہ مدینہ کے عین مشرق اور مشرق شمال اور مشرق جنوب کا علاقہ بھی اسلامی ریاست کے اثرات محسوس کرنے لگا ہو۔ بہرحال یہ حقیقت ہے کہ مدینہ شہر کے چاروں سمت میں ارد گرد کا خاصا وسیع علاقہ یا تو مدنی ریاست کا جزو بن گیا تھا یا اس کے حلقۂ اثر کا علاقہ۔ اور یہ ابتدائی مہمات کا اصل کارنامہ تھا جو انھوں نے اسلامی ریاست کے ارتقا کے ایک اہم مرحلہ کے بطور انجام دیا تھا۔

(۵) پانچواں مرحلہ: عظیم جدّ و جہد کا زمانہ

رمضان ۲ھ / مارچ ۶۲۴ء میں غزوۂ بدر[127] مدینہ منورہ کے سیاسی حلقۂ اثر کی توسیع اور اس کے نتیجے میں نئی امت اسلامی کے دائرے کے پھیلاؤ میں ایک اہم سنگ میل ثابت ہوا۔ بے سروسامان، غیر منظم اور عددی اعتبار سے کہیں زیادہ فروتر اسلامی فوج کی طاقتور و مالدار مکی اشرافیہ کی کیل کانٹے سے لیس، تجربہ کار سپاہ پر مشتمل اور وقت کے بہترین قائدین کی زیر کمان برتر فوج پر عظیم الشان فتح نے تقریباً پورے جزیرہ نمائے عرب کو انگشت بدنداں بلکہ شل کر دیا تھا۔[128] ماضی قریب میں قریش مکہ نے اتنی بڑی شکست کا منہ نہیں دیکھا تھا بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ اس سے پہلے پے در پے فتوحات سے ہم کنار ہوتے رہے تھے اور اپنی ان عسکری فتوحات اور قبیلہ کنانہ وغیرہ سے اتحاد کے سبب ایک عظیم ترین فوجی طاقت بن کر ابھرے تھے۔ ان کی اس حیثیت میں ان کے کثیر مال و دولت اور مذہبی برتری نے بھی اپنا حصہ ادا کیا تھا۔ اپنی فطری صلاحیتوں اور قائدانہ لیاقتوں کے سبب وہ ساتویں صدی عیسوی کے آغاز میں عرب کی سب سے بڑی سیاسی، فوجی، مذہبی اور اقتصادی وحدت تھے۔ بدر کے میدان میں ان کی یہ ذلت آمیز شکست ان کے سیاسی و سماجی وقار، مذہبی چودھراہٹ، اقتصادی بالادستی اور فوجی برتری کا جنازہ نکال سکتی تھی۔ خود قریش مکہ کو اس شکست کے دور رس اثرات کا اندازہ تھا[129] ورنہ شاید وہ اپنی شامی تجارت کو بچانے کے لئے مدینہ والوں سے بھی دوسرے قبائل عرب کی مانند صلح یا دوستی کرنے کی کوشش کرتے اور بدر کے زخموں کو اپنی حکمت عملی کے مرہم سے بھرنے کا مداوا پسند کرتے۔ لیکن اپنے زخم خوردہ سیاسی و سماجی وقار کی بحالی اور فوجی بالادستی کے غیر متزلزل ہونے کا یقین خود ان کو اس وقت تک نہیں ہو سکتا تھا جب تک کہ وہ مدینہ کی ابھرتی فوجی اور سیاسی طاقت کو ہمیشہ کے لئے صفحۂ ہستی سے نابود نہ کر دیتے یا اس کو اس حد تک کچل نہ دیتے کہ وہ پھر سر نہ اٹھا سکتی۔

دوسری طرف بدر کی فتح عظیم نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وقار میں زبردست اضافہ کیا اور مسلمانوں کی دھاک بٹھا دی۔ مدینہ کے عرب قبائل خاص کر اور دوسرے نواحی بدو قبیلے عام طور سے مسلمانوں کی جیت سے یقیناً متاثر ہوئے تھے۔ ان کو اس حقیقت کا اندازہ ہو گیا تھا کہ اسلامی ریاست ایک سیاسی اور فوجی طاقت بن چکی ہے جس سے بہ آسانی صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ قریش جیسی عظیم طاقت کی شکست نے ان کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ معاہدے کرنے کی تحریک دی ہو گی اور اس کا بھی قوی امکان ہے کہ اس فتح مبین کے نتیجے میں بعض قبائل اور جماعتوں اور افراد نے اسلام کے بارے میں

اپنی رائے تبدیل کی ہو اور غور و فکر کے بعد اسلامی اُمت کا ایک رُکن بننے کی صدقِ دل سے کوشش کی ہو۔ بہرحال یہ یقینی بات ہے کہ اس وقت تک یا اس زمانے میں کم از کم دو مغربی قبیلے جُہینہ اور مُزینہ اسلام کے دائرہ میں تقریباً مکمل طور سے داخل ہو چکے تھے اور بعض دوسرے قبیلوں نے اسلامی ریاست کی سیاسی دوستی کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ خزاعہ جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان سے زمانۂ عبدالمطلب سے حلف کے تعلقات رکھتے تھے[۱۳۰] اور قریب آ گئے تھے اور ان جیسے قدیم[۱۳۱] دوست اور حلیف قبائل نے مکمل طور سے یکسو ہو کر مدنی ریاست سے اپنی سیاسی وفاداری وابستہ کر لی تھی۔ خاص طور سے اسلم اور غفار کے قبیلوں نے، کیونکہ وہ بوقت ہجرت نبوی تقریباً پورے کے پورے مسلمان ہو چکے تھے اور ان میں جو تھوڑی بہت کسر رہ گئی تھی وہ اس فتح کے بعد یقیناً پوری ہو گئی تھی۔[۱۳۲] ان جیسے اور نہ جانے کتنے قبائل ہوں گے جنھوں نے اپنا رُخ اب مکّہ کے بجائے مدینہ کی طرف کر لیا تھا۔ اگرچہ اس جنگ کے بعد بظاہر ہمارے مآخذ سے جزیرہ نمائے عرب کی سیاست میں کوئی واضح انقلاب نظر نہیں آتا تاہم یہ یقینی ہے کہ بدر کی فتح نے طاقت کا توازن کم از کم پڑوسی قبائل اور علاقوں کی حد تک اسلامی ریاست کے حق میں کافی جھکا دیا تھا۔

اس حقیقت کا اندازہ اس بین الاقوامی ردِ عمل سے بھی ہوتا ہے جو بدر کی فتح نے کم از کم ایک غیر ملک حبشہ میں پیدا کیا تھا۔ مآخذ کا بیان ہے کہ جب شاہ نجاشی کو مسلمانوں کی اس فتح کی خبر پہنچی تو اس نے حبشہ میں موجود مسلم مہاجرین کے سامنے زبردست خوشی کا اظہار کیا۔ غالباً قریشِ مکّہ کو بھی اس بین الاقوامی ردِ عمل کا جو ان کے حق میں قطعی نہیں تھا خدشہ یا علم تھا چنانچہ اُنھوں نے اسی زمانے میں حبشہ کے دربار میں دو سفارتیں اس غرض سے بھیجی تھیں کہ مسلمانوں کو وہاں سے نکلوایا جائے لیکن یہ دونوں کوششیں ناکام رہیں کچھ تو اس سبب سے کہ شاہِ حبش مسلمانوں کا حامی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا پیرو تھا اور کچھ اس سیاسی حکمتِ عملی کی بنا پر جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قریشی چالوں کے توڑ کے لئے اپنائی تھی۔ ابن ہشام کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریشی ارادوں کی سن گن پا کر اپنے ایک نمائندے حضرت عمرو بن امیہ ضمری کو دربارِ حبش میں سفیر بنا کر بھیجا تھا تاکہ ان کو کامیاب نہ ہونے دیا جائے اور ظاہر ہے کہ ان کا مشن پُوری طرح کامیاب رہا تھا۔[۱۳۳] اسلامی ریاست کو اس فتح مبین کے نتیجے میں محض کامیابیاں اور کامرانیاں ہی نہیں ملی تھیں بلکہ ان کے ساتھ ساتھ زیادہ صبر آزما مراحل اور تکلیف دہ زمانے سے گزرنا پڑا تھا۔ خطرات بڑھے تھے، مصائب میں اضافہ ہُوا تھا، یلغار و نرغہ کی سرحدوں میں توسیع ہُوئی تھی اور پہلے سے کہیں زیادہ مشکلات و آزمائشوں کا سامنا تھا۔

جہاں تک قریش کا تعلق تھا بدر کی شکست بجائے خود ان کے لئے ایک زبردست اشتعال کا سبب تھی۔ مسلمان بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ قریش کا احساسِ شکست غرور ان کو نچلا نہ بیٹھنے دے گا اور وہ اس وقت تک چین سے نہ بیٹھیں گے جب تک کہ وہ اس کا بدلہ نہ لے لیں۔ دُوسری طرف مسلمانوں کو ہر ممکن تدبیر اور ہر قابلِ حصول طاقت کا استعمال کرنا تھا تاکہ وہ اپنی ریاست اپنے معاشرے اور اپنے مذہب کی حفاظت کر سکیں۔[۱۳۴] چنانچہ ۲ھ / ۶۲۴ء اور ۸ھ / ۶۳۰ء کے درمیان مکّہ اور مدینہ کے درمیان جتنی آویزشیں، تصادم اور محاربات ہُوئے وہ دونوں فریقوں کے انھیں مقاصد کے پس منظر میں تھے۔ اگرچہ ۳ھ / ۶۲۵ء میں غزوۂ اُحد کا نتیجہ مسلمانوں کے خلاف قطعی طور پر رہا تھا لیکن انھوں نے اپنی اس ہزیمت پر جلد ہی قابو پا لیا اور اس سے

بڑھ کر یہ کہ انھوں نے طاقت کا توازن جو مکیوں کے حق میں جھک سکتا تھا اپنی حکمتِ عملی سے نہ جھکنے دیا اور اقدام اپنے ہی ہاتھوں میں رکھا۔[۱۳۵] مکہ والوں کو اس خوں ریز تصادم اور اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والی عارضی کامیابی سے قطعی کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ ان کا منصوبہ تو یہ تھا کہ مدینہ کی اسلامی ریاست کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے مگر وہ مدینہ میں داخل تک نہ ہو سکے۔ حضرت عمرو بن العاص سہمی جو اس معرکہ میں قریشی افواج کے ایک شہسوار دستے کے سالار تھے اور اپنی جنگی لیاقت کے لئے اس وقت بھی شہرت رکھتے تھے بعد میں بیان کیا کرتے تھے کہ جنگ کے ابتدائی مرحلے میں جب مسلمان سپاہی حاوی تھے تو انھوں نے تاک تاک کر تیروں سے تمام قریشی فوج کے گھوڑوں کو بیکار کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ جلد ہی افراتفری پر قابو پا لیا گیا تھا اور اسی جنگی حکمتِ عملی کا نتیجہ تھا کہ قریشی فوج نہ صرف یہ کہ مدینہ میں داخل نہیں ہو سکی تھی بلکہ پسپا ہونے پر مجبور ہو گئی تھی۔[۱۳۶] قریش کو جو کچھ فوجی اور سیاسی فائدہ عارضی طور سے ہوا تھا وہ بھی دوسری صبح ختم ہو گیا کہ جب زخمی رسول اللہ اور شکستہ دل مگر جواں عزم مسلمان سپاہ نے پسپا ہوتی قریشی فوج کا حمراء الاسد تک پیچھا کیا تھا۔[۱۳۷] اس جرأت مندانہ اقدام کا نتیجہ یہ نکلا کہ نہ صرف مسلمان فوجیوں کے حوصلے بلند، عزم پختہ اور ہمت بالا ہو گئی تھی بلکہ مخالفوں کی صفوں میں مایوسی اور زیاں کا احساس پیدا ہوا تھا۔ اور اس سے بڑھ کر مسلمانوں کے بارے میں ان کے پڑوسی قبائل میں خاص کر اور دور دراز کے قبائل میں عام طور سے یہ تاثر پیدا ہوا تھا کہ مسلمانوں کی فوجی طاقت اگر بڑھی نہیں تو کسی طور سے کم بھی نہیں ہوئی اور وہ اب بھی اس قابل تھے کہ طاقتور اور کسی حد تک فاتح دشمن کو پسپائی پر مجبور کر سکتے تھے۔ قریشی اتحاد کے بارے میں ان کا تاثر یقیناً یہی رہا ہو گا جو حقیقی بھی تھا اور جس کی طرف حوالہ خزاعہ کے ایک سردار کے تبصرے اور ابوسفیان سے اس کے ایک مکالمے کے دوران بھی ملتا ہے کہ مسلم طاقت میں اضافہ اور اسلامی ریاست کے حلقۂ اثر و نفوذ میں روزافزوں توسیع ہو رہی تھی[۱۳۸] مسلمانوں کی اس بالا دستی اور اپنی روزافزوں دگرگوں حیثیت کا احساس خود مکیوں کو بھی تھا چنانچہ غزوۂ اُحد سے پہلے اور اس کے بعد جنگِ خندق تک کسی بھی موقعہ پر (جیسے سویق، قردہ، بدر الموعد وغیرہ میں) وہ کوئی موثر اقدام نہیں کر سکے تھے بلکہ ان تمام مواقع پر ان کی فوجی طاقت کے کھوکھلے پن اور سیاسی ساکھ کے انحطاط کا کچھ زیادہ اظہار ہوا تھا۔[۱۳۹]

غزوۂ اُحد کے دو سال بعد جنگِ خندق (۵ھ/۶۲۷ء) کے موقعہ پر قریشِ مکہ نے اپنی پوری فوجی طاقت جھونک دی تھی۔ اس بار وہ اپنی عسکری طاقت کے علاوہ اپنے اتحادیوں غطفان، سلیم و اسد وغیرہ کا احزابِ عظیم لے کر آئے تھے جو دس ہزار مسلح اور کیل کانٹے سے لیس سپاہیوں پر مشتمل تھا۔[۱۴۰] دوسری طرف مسلمانوں کی جو حالت تھی یا جو ان کی فوجی و عسکری طاقت تھی اس کا بہترین نقشہ قرآن کریم نے کھینچا ہے کہ "زمین اپنی وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہو گئی تھی اور زبردست کپکپی (زلزال) طاری تھی اور دل حلق میں آ کر اٹک گئے تھے"۔ یہ خوف و ہیبت فطری تھی تاہم اس نے ان پر مایوسی اور بے دلی یا بزدلی نہیں طاری ہونے دی تھی بلکہ ان کے دلوں میں ایک عزمِ مصمم، ایک جذبۂ بیکراں، ایک قوتِ لامحدود اور ایک ایمانِ عظیم پیدا کر دیا تھا جو ان کو یقین دلاتا تھا کہ فتح ان کی ہو گی۔[۱۴۱] ایک ماہ کے شدید، طویل و صبر آزما محاصرے کی آزمائش کے بعد وہ امتحان میں سرخرو ہوئے تھے اور ان کی سیاسی اور فوجی حکمتِ عملی پوری طرح کامیاب رہی تھی جبکہ ان کے حریفوں کی فوجی و سیاسی طاقت کے تابوت میں یہ ناکامی کی آخری کیل تھی۔ یہ واضح تھا کہ مکہ اپنی سیاسی برتری اور فوجی بالا دستی کو نہ صرف کھو رہا تھا بلکہ ان کے پیروں کے نیچے سے زمین آہستہ آہستہ

سرک رہی تھی۔[۱۴۲] قریشِ مکہ اور مدینہ کی اسلامی ریاست کے درمیان سیاسی و فوجی توازن کے تقابلی مطالعہ کی بہترین مثال اس حدیث نبوی میں ملتی ہے جس کے مطابق مدبر و سیاستدان پیغمبر اعظمؐ نے فرمایا تھا کہ "قریش اپنی ساری طاقت آزما چکے اور جنگِ خندق ان کے فوجی ترکش کا آخری تیر تھا۔ اب وہ آئندہ کبھی مدینہ پر حملہ آور نہ ہو سکیں گے بلکہ اب ہم ان کے خلاف فوج کشی کریں گے۔"[۱۴۳] یہ محض ایک نبی کی پیشگوئی نہ تھی بلکہ ایک سیاسی قائد اور فوجی سالار اور ایک عظیم مدبر اور دُور بیں سیاستدان کا اس وقت کے حالات کا تجزیہ تھا جو حقیقت پر مبنی تھا اور جو بعد کے دو تین برسوں میں حرف بہ حرف سچا ثابت ہوا۔ اس مرحلے میں اسلامی ریاست اتنی طاقتور اور با اثر ہو چکی تھی کہ اس کا صحیح معنوں میں کوئی حریف و مقابل نہیں رہا تھا جیسا کہ ہم ابھی کچھ دیر بعد دیکھیں گے۔

(۶) چھٹا مرحلہ : اندرونی مخالفت

اپنی ارتقاء کے پانچویں مرحلے میں اسلامی ریاست کا اگرچہ سارا زور قریشِ مکہ اور ان کی ریشہ دوانیوں، سازشوں اور فوجی اقدامات پر مرکوز رہا تھا تاہم رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی بصیرت سے دُوسرے علاقوں اور قبائل کے معاملات پوشیدہ نہیں تھے اور نہ ہی آپ اپنے گھر کے بھیدیوں اور دشمنوں کی مکارانہ چالوں اور دشمنانہ تدبیروں سے غافل تھے اگرچہ نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسیرانِ بدر کے ساتھ خاص کر اور دُوسرے جھکے ہوئے دشمنوں کے ساتھ عام طور سے رحمت و رافت کا سلوک کیا تھا جس نے نہ صرف کئی قیدیوں اور قبیلہ والوں کے دل جیت لئے تھے اور ان کو آپ کا ہم نوا بنا دیا تھا بلکہ آپ کے دشمنوں کو یہ احساس بھی بخوبی دلا دیا تھا کہ رحمتِ عالم کو اپنے دشمنوں کی تباہی اور بربادی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، وہ تو صرف ان کی دشمنی اور عداوت کو ختم کر کے ان کو اسلامی ریاست کا رکن یا اسلامی اُمت کا فرد بنانا چاہتے تھے، تاہم یہ بھی حقیقت تھی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے معاہد قبائل اور حلیف دوستوں کی غداری اور باغیانہ حرکتوں کو برداشت کرنے کے لئے ہرگز تیار نہ تھے۔ بعض یہودی سازشیوں اور غدار حلیفوں کا قتل دراصل ان کی ان باغیانہ حرکتوں کا سبب ہوا تھا جو وہ اسلامی ریاست کو تباہ کرنے یا اسلامی ریاست میں تفرقہ اندازی پیدا کرنے کے لئے کر رہے تھے۔ وہ اس سماجی معاشرہ اور سیاسی نظام کے درپے ہو گئے تھے جس کو قائم و دائم رکھنے کے لئے انھوں نے حلف اٹھایا تھا اور جس کے وہ خود رکن تھے۔[۱۴۵] بعض مورخین کا یہ خیال غلط ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان افراد کو اس لئے قتل کرا دیا تھا کہ آپ اپنی تنقید یا مخالفت نہیں برداشت کر سکتے تھے۔[۱۴۶] آپ اپنی ذاتی تنقید بلکہ بہتان تراشی تک کو کھلے دل سے برداشت کر لیتے تھے اور دشمنوں کے زبان و قلم سے تو آپ نے اسلام، اسلامی اُمت اور اسلامی ریاست تک پر تنقید و نکتہ چینی برداشت کی تھی۔ اس کی متعدد مثالیں ہیں جن میں سے سہیل بن عمرو عامری،[۱۴۷] ابوسفیان بن حارث ہاشمی،[۱۴۸] عکرمہ بن ابی جہل مخزومی،[۱۴۹] ابوسفیان بن حرب اموی[۱۵۰] اور نہ جانے کتنے دوسروں کی مثالیں بہت ہی واضح اور بیّن ہیں۔ لیکن اگر اسلامی ریاست کا ایک رکن یا حلیف دشمنوں سے ساز باز کرے، ان کو اخلاقی یا مادی امداد دے یا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلامی ریاست پر تنقید و نکتہ چینی کرے تو اس کی حرکت غداری کے مترادف ہو گی جو کسی بھی حال میں قابلِ برداشت نہیں ہو سکتی تھی، اور نہ ہوئی چنانچہ آپ کا سخت ردِّ عمل اور طرزِ معاملہ اسلامی ریاست کے

گھر کے بھیدیوں کے ساتھ صحیح تھا اور اس نے نہ صرف ان کو ان اعمال و افعال کے سنگین نتائج کا احساس دلا دیا بلکہ ان میں سے جو لوگ ابھی تک حیص بیص اور گومگو کے عالم میں تھے ان کو اسلامی امت کے دائرۂ اثر میں داخل ہونے کی حکمت اور افادیت کا قائل کر دیا جیسا کہ بنو حنظلہ کے یہودیوں کے معاملہ سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے۔ [(۱۵۱)] [(۱۵۲)]

انھیں اسباب و علل سے اور تقریباً انھیں حالات میں آپ نے مدینہ منورہ کے تین یہودی قبیلوں ——— بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ ——— اور محمد بن حبیب بغدادی کے مطابق ایک چوتھے قبیلہ ——— بنو قطیون ——— کے خلاف فوجی اقدامات کئے تھے۔ [(۱۵۳)] موخر الذکر کے بارے میں ہمیں تاریخ واقعہ اور اس کے اسباب و محرکات وغیرہ کے بارے میں تفصیلات کا علم نہیں ہے مگر بغدادی کے بیان سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ یہ پہلا یہودی قبیلہ تھا جسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ سے ان کی باغیانہ اور مغرورانہ حرکتوں کے سبب نکالا تھا۔ بنو قطیون غالباً بنو قریظہ کا ایک اہم حلیف و معاہد بنو ہدل کی ایک ذیلی شاخ بنو ثعلبہ کا حصہ تھا جو اپنے مشہور بدکار رئیس کے نام سے مشہور ہو گیا تھا جیسا کہ سمہودی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے۔ [(۱۵۵)] بنو قینقاع کے بارے میں عام روایت یہ ہے کہ وہ مدینہ کے زرگر، مالدار مہاجن اور تاجر پیشہ یہودی تھے جن کو غزوۂ بدر کے فوراً بعد ذی قعدہ ۲ھ / اپریل ۶۲۴ء میں معاہدۂ صلح توڑنے، سازشیں کرنے اور اسلامی ریاست کے خلاف بغاوت اور مسلح جنگ کرنے کے جرم میں مدینہ سے نکالا گیا تھا اور ان کے مکانات، قلعوں (آطام) اور دکانوں اور بازار پر قبضہ کر لیا گیا تھا۔ لیکن عہد جدید کے دو مسلمان مورخوں محمد حمید اللہ اور برکات احمد کا خیال ہے کہ بنو قینقاع کے غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دینے کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو معاف کر دیا تھا اور مدینہ میں رہنے کی حسبِ دستور سابق اجازت دے دی تھی موخر الذکر نے اپنے نظریہ کے ثبوت میں خاصے وقیع، وزنی اور دل کو چھو لینے والے دلائل دیے ہیں۔ [(۱۵۷)] [(۱۵۸)] ربیع الاول ۴ھ / اگست ۶۲۵ء میں غداری و بغاوت کے جرم میں بنو نضیر کی خیبر کو جلاوطنی پر تمام قدیم و جدید مورخین کا اتفاق ہے۔ مگر مدینہ کے ایک چوتھے یہودی قبیلہ بنو قریظہ کے بارے میں اب تک مشہور اور مقبول روایت یہی رہی ہے کہ ذی قعدہ۔ ذی الحجہ ۵ھ / مئی ۶۲۷ء میں بغاوت، سازش، غداری، دشمنوں کے ساتھ ساز باز کے جرم میں اُن کے تمام مردوں کو قتل کر دیا گیا تھا اور ان کے بچوں اور عورتوں کو مدینہ، نجد اور شام وغیرہ کے بازاروں میں غلام بنا کر بیچ دیا گیا تھا۔ لیکن دورِ جدید کے مورخوں برکات احمد اور ڈبلو۔ این۔ عرفات نے اپنی شاندار تحقیقات سے ثابت کیا ہے کہ بنو قریظہ کے قتل عام کی [(۱۵۹)] [(۱۶۰)] کہانی غلط اور تراشیدۂ دشمنانِ اسلام ہے۔ صرف چند مجرم سرداروں یا افراد کو قتل کیا گیا تھا بقیہ کو معاف کر کے مدینہ میں رہنے کی اجازت بھی دے دی گئی تھی۔

بہرحال ان تمام یہودی افراد و قبائل کے ساتھ اسلامی ریاست نے سختی کا سلوک کیا تھا کیونکہ انھوں نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے صلح و تعاون کے معاہدے کر رکھے تھے مگر پھر اپنی طاقت کے زعم، اسلام دشمنی، قومی عصبیت، یہودی مزاج غدر و مکر و فریب کی بنا پر اسی ریاست اسلامی کی جڑیں کاٹنے لگے جس کی حفاظت و حمایت کی انھوں نے قسم کھائی اور حلف اٹھایا تھا۔ ۵ھ کے اواخر تک مدینہ منورہ کو ان یہودی سازشیوں سے پاک کیا جا چکا تھا اگرچہ اب بھی مدینہ منورہ میں یہودی آبادی بشمول افراد و قبائل کے خاصی بڑی تھی لیکن چونکہ انھوں نے معاہدہ صلح و تعاون کی پُر خلوص پابندی کی تھی اس لئے ان سے

کوئی تعرض نہیں کیا گیا اور ان کو مسلمانوں اور ان کی ریاست کے ایک حلیف دوست اور بعد میں ذمی کی حیثیت سے تمام حقوق و مراعات حاصل رہے۔

مدینہ منورہ میں ایک اور اسلام دشمن یا رسالتمآبؐ کا مخالف عنصر منافقین پر مشتمل تھا۔ مآخذ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے، کہ یہ طبقہ یہودیوں اور عربوں دونوں پر مشتمل تھا[161] جو بظاہر مسلمان اور اسلامی ریاست کے رکن تھے لیکن دل سے دشمن اور اہل میں مارِ آستین تھے۔ ان کا سردار عبداللہ بن ابی بن سلول تھا جو قبیلۂ خزرج کے ایک طاقتور اور با اثر خاندان کا رئیس تھا[162] سیاسی طور پر کچھ دُوسرے خاندان بھی اس کے زیرِ اثر تھے۔ چونکہ ہجرتِ نبویؐ سے قبل بلکہ مدینہ میں اشاعتِ اسلام سے پہلے سردارِ منافق کو سیاسی بالادستی اور تفوق حاصل تھا جو اسے ہجرتِ نبویؐ کے بعد حاصل نہ رہا اس لئے اسے اور اس کے ہمنواؤں کو اسلام و رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کد پیدا ہوگئی تھی اور جُوں جُوں اسلام کو عروج، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کامیابی اور ریاست اسلامی کو توسیع و استحکام حاصل ہوتا جاتا تھا توں توں منافقین کی آتشِ حسد بھڑکتی جاتی تھی اور وہ اسلام و ریاست مدینہ کی بیخ کنی کی تدبیریں کرتے جاتے تھے۔ چونکہ وُہ تنہا خود کچھ نہ کر سکتے تھے اس لئے انھوں نے بعض یہودی قبیلوں[163] اور مکّہ کے قریش کے علاوہ کچھ بدوی قبائل سے بھی سازباز کر رکھی تھی مگر جغرافیائی سیاسیات کے دباؤ میں وہ بظاہر مسلمان بنے ہوئے تھے بدر کے بعد بنو قینقاع کو بھڑکانے میں انھیں کا ہاتھ تھا اسی طرح بنو نضیر کی سرکشی و تمرد کو بھی ان کی اسلام دشمنی نے طول دیا تھا[166]۔ اس سے پہلے غزوۂ اُحد میں اُنھوں نے اپنا دستہ عین وقت پر مسلم فوج سے الگ کر کے جاں نثارانِ اسلام کی ہمت شکنی کی کوشش کی تھی[167] مگر وہ ایک طرح سے مسلمانوں اور ریاست اسلامی کے حق میں امدادِ غیبی اور رحمتِ خداوندی بن گئی[168]۔ غزوۂ خندق کے زمانۂ محاصرہ میں اُنھوں نے جو کچھ کیا اس کو قرآنِ کریم نے خاصی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے[169]۔ حیرت کی بات ہے، کہ منافقین کا کسی بھی کردار کا، منفی یا مثبت، کوئی ذکر احزاب کے بارے میں نہیں ملا ہے[170] حالانکہ اسی زمانے سے متصل انھوں نے غزوۂ مریسیع میں سفرِ مراجعت میں مہاجرین و انصار کے درمیان قبائلی عصبیت بھڑکانے کی کوشش کی تھی جو ناکام رہی[171]۔ اسی طرح اُنھوں نے واقعۂ افک میں کلیدی کردار ادا کیا تھا تاکہ مسلم معاشرے کو پراگندگی کا شکار بنایا جائے مگر وہاں بھی زک اٹھائی[172]۔ اگرچہ ان کی سازشوں کا سلسلہ تبوک کے غزوہ کے زمانے تک مسجدِ ضرار[173] وغیرہ کی صورت میں جاری رہا تاہم یہ یقینی معلوم ہوتا ہے کہ ۵ھ / ۶۲۷ء میں احزاب کی شکستِ فاش سے پہلے ہی ان کے زہر کا کانٹا ٹوٹ گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ واقعہ افک میں ان کا حصہ اور اس سے کچھ پہلے مریسیع کی مہم کے دوران ان کی فتنہ انگیزی ان کے ترکش کا آخری تیر یا ان کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہُوئی۔ اتفاق کی بات ہے کہ منافقین اور یہودی[174] سازشیوں کی طاقت ایک ہی زمانے میں ٹوٹی۔ بہرحال مدینہ منورہ کے ان دونوں گھر کے بھیدیوں کے خاتمے کے ساتھ ہی مسلمانوں کو اپنے عقب کی حفاظت کی ضمانت فراہم ہوگئی۔ اسلامی ریاست کو اب کسی اندرونی سازش، بغاوت یا غدّاری کا خطرہ نہ رہا کہ وہ اس کے وجود یا استحکام کے لئے کوئی غلط یا خطرناک صورت پیدا کر سکتا۔ اس اندرونی استحکام نے ہی اسلامی ریاست کو اس قابل بنایا تھا کہ وُہ اپنے بیرونی دشمنوں کے خلاف مؤثر اور مستقل اقدام کر سکے۔

(۷) ساتواں مرحلہ : قبائلِ عرب کی عداوت

اسلامی ریاست کو اپنے اندرونی دشمنوں، غدار یہودیوں اور سازشی منافقوں کے علاوہ متعدد بیرونی دشمنوں کی عداوت کا بھی مسلسل سامنا رہا۔ قریشِ مکہ کے علاوہ بعض سرکش قبائل بھی مدینہ کی ریاست کو پنپنے دینا نہیں چاہتے تھے کیونکہ ان کو اس صورت میں اپنی امن دشمن حرکات جاری رکھنے کا موقعہ نہیں ملتا۔ کچھ ان کی اسلام دشمنی اور قبائلی عصبیت بھی اس کی ذمہ دار و محرک تھی اور غالباً اس سے زیادہ اسلام کی سیاسی اور سماجی و مذہبی برتری میں وہ اپنی آزادی اور خود مختاری کی موت دیکھتے تھے اس لئے وہ مسلسل مدینہ کے خلاف اقدامات کرتے یا ان کے منصوبے بناتے رہتے تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دوربین نگاہیں مدینہ کے قرب وجوار یا دُور دراز کے ان خطرات کو بخوبی اور بروقت دیکھ لیتی تھیں اور آپ ان کے موثر تدارک کی صحیح وقت پر تدبیر کر لیتے تھے۔ بدر تک اسلامی ریاست کو قبائل عرب کی ایسی کسی دشمنی کا سابقہ نہیں پڑا تھا کیونکہ غالباً ان بدوی قبائل کو ان کی سیاسی مصالح نے ابھی تک اپنے مفادات کے لئے کوئی بڑا خطرہ نہیں دکھایا تھا لیکن قریشِ مکہ کی طاقتور فوج کے خلاف مسلمانوں کی فتح نے کچھ بدوی قبائل کی آتشِ حسد و نفرت بھڑکا دی اور ان کو یہ احساس دلا دیا کہ مدینہ کی اسلامی ریاست ان کے لئے بھی کسی وقت خطرہ کا سبب بن سکتی ہے۔ چنانچہ یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ بدر کی فتح عظیم نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کام کو بیک وقت آسان بھی بنا دیا تھا اور مشکل بھی۔ اگر اس کامیابی نے بعض قبائل عرب کو مدینہ کی سیاسی بالادستی ماننے پر مجبور کر دیا تھا تو دوسری جانب اس نے نبرد آزمائی اور تصادم کے دائرے کو وسیع تر بنا دیا تھا۔ اب رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک سے زیادہ محاذوں پر بیک وقت متعدد دشمنوں سے لڑنا پڑ رہا تھا۔ سب سے پہلے ۲ھ/ ۶۲۴ء کے وسط میں آپ کو مشرقی علاقے کے ایک قبیلہ بنو سُلیم کی طرف توجہ دینا پڑی جس نے اپنی عددی طاقت کے زعم میں مدینہ کی ریاست کے خلاف سرکشی و تمرد کی راہ اپنائی تھی اور مسلمانوں کی حکومت کے خلاف درپے تھا۔ چنانچہ صفر ۳ھ/ جولائی ۶۲۵ء اور ربیع الثانی ۴ھ/ ستمبر ۶۲۶ء کے درمیان آپ کو اس قبیلہ کے مختلف خاندانوں کے خلاف اقدام کرنا اور ان کی ناپاک سازشوں کو کچلنا پڑا۔ پہلی دو مہموں کی قیادت آپ نے بنفس نفیس فرمائی اور ان کے علاقوں پر اچانک چھاپے مارے۔ ہمارے مآخذ کے مطابق آپ مقام کدر تک پہنچے اور وہاں آپ نے پندرہ دنوں تک قیام فرمایا اور مدینہ کو بغیر کسی لڑائی اور تصادم کے لوٹ آئے۔[۱۶۹] دوسری مہم کے دوران جو جمادی الاولیٰ ۳ھ/ اکتوبر، نومبر ۶۲۴ء میں واقع ہوئی۔ مسلمان سپاہ بحران نامی مقام تک گئی جو فرع کے علاقے میں حجاز کی ایک مشہور کان تھی۔ اس مہم میں بھی آپ نے منزل مہم پر تقریباً دو ماہ تک قیام فرمایا اور بغیر کسی جنگ و جدال کے مدینہ منورہ لوٹ آئے۔[۱۷۰] اگرچہ ہمارے مآخذ کا بیان ہے کہ پہلی مہم میں مسلمانوں کو کچھ معمولی سی غنیمت بھی ہاتھ آئی تھی اور دُوسری مہم میں کوئی مال و منال نہیں ملا تھا، تاہم یہ معاملہ خاصا اہم ہے کہ آپ نے ان دونوں مہموں کے دوران کافی طویل مدت تک قیام ان قبیلوں کے علاقوں میں کیا تھا جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ مدینہ کے خلاف سازشوں اور منصوبوں میں ملوث تھے۔ ہماری روایات کا یہ اصرار کہ آپ نے یہ اقدامات ان علاقوں کے قبیلوں کی شرارت اور دشمنی کی سن گن پاکر کئے تھے بالکل صحیح بھی ہوسکتا ہے

اور آپ کا بروقت اقدام کرنا حکمت عملی کی دلیل بھی تھی تاہم اس سے بڑی دلیل حکمت آپ کے ان طویل قیاموں میں پوشیدہ ہے جو آپ نے ان علاقوں میں رکھے تھے آخر اتنا طویل قیام آپ نے کیوں کیا تھا جب کہ کوئی جنگ و جدال بھی نہیں ہوئی تھی؟ اس کا جواب اگرچہ واضح انداز میں ہمارے مآخذ سے نہیں ملتا تاہم یہ نتیجہ نکالنا قطعی صحیح اور حقیقت کے مطابق ہوگا کہ آپ نے ان دونوں مہموں کے دوران متعلقہ قبائل سے دوستی اور تعاون کے معاہدے کئے ہوں گے اور ان میں اسلام کی تبلیغ کی ہوگی۔ اس نتیجہ کی مزید تائید دوسری مہم میں پیش آنے والے ایک واقعہ سے ہوتی ہے جس میں غطفان کی ایک شاخ بنو محارب کے سردار حضرت دعثور بن حارث نے بڑے ڈرامائی طریقہ سے اسلام قبول کر لیا تھا۔[۱۶۸] ہمارے سیرت نگاروں نے یہ واقعہ جس انداز میں بیان کیا ہے اس سے یہ غلط تاثر اُبھرتا ہے کہ حضرت دعثور کا اسلام محض ایک انفرادی اور شخصی واقعہ تھا جس کا حالاتِ حاضرہ و واقعہ سے نہ کوئی تعلق تھا نہ اس کا کوئی اثر۔ حالانکہ یہ بالکل صحیح نہیں ہے۔ واقعات کی ترتیب اور نہج کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو بخوبی واضح ہوتا ہے کہ حضرت دعثور کا اسلام لانا دراصل پورے قبیلہ/خاندان کا مشرف بہ اسلام ہونا تھا چاہے یہ فوراً ہوا ہو یا اس میں کچھ مدت لگی ہو۔[۱۶۹] یہ حقیقت ذہن نشین رکھنی چاہیئے کہ سردارِ قبیلہ کا اسلام دراصل اس کے قبیلہ والوں کے لئے ایک حکم و مثال کا درجہ رکھتا تھا۔ پھر دُوسری روایات سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت دعثور نے اپنے قبیلہ کو اسلام سے روشناس اور اس کا پیرو بنا دیا تھا۔ ان واقعات و دلائل کی روشنی میں یہ بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دونوں مہمیں دراصل سیاسی اور مذہبی دورے تھے نہ کہ فوجی مہمیں۔ اور ان کے نتیجے میں سُلیم، غطفان اور اس کے خاندان بنو محارب میں اسلام پھیلا تھا اور کدر، ذوامر اور ارحضیہ کے علاقوں تک اسلامی ریاست کی سرحد وسیع ہوئی تھی یا حلقۂ اثر بڑھا تھا۔

صفر ۴ھ / جولائی ۶۲۵ء میں بئرِ معونہ کا حادثۂ فاجعہ پیش آیا جس میں تقریباً ستر مسلمان مبلغین نے اپنے خُون سے کلمۂ حق سرزمینِ معونہ پر لکھ دیا تھا اور اسلامی ریاست کی لکیر بنا دی تھی۔ اس قتلِ عظیم میں کلیدی کردار قبیلۂ غطفان کے خاندان بنو مالک کے سردار عامر بن طفیل نے ادا کیا تھا اور اپنے اس گھناؤنے جرم میں عُصیّہ، رِعل اور ذکوان نامی تین خاندانِ بنی سُلیم سے مدد لی تھی۔ یہ دلچسپ حقیقت یاد رکھنے کی ہے کہ پہلے عامر بن طفیل نے اپنے خاندان بنو عامر بن صعصعہ سے مدد چاہی تھی مگر انھوں نے اپنے سردار ابو براء مالک بن عامر کے اس عہدِ ضمانت و تحفظ کو توڑنے سے انکار کر دیا تھا جس کے سایہ میں مسلمان مبلغین نے سفر کیا تھا۔ اگرچہ مسلمانوں کا بڑا قیمتی جانی نقصان ہوا تھا مگر اس واقعہ سے دو اہم فائدے مسلمانوں کو حاصل ہوئے تھے: اوّل یہ کہ غطفان کے بعض خاندانوں مثلاً بنو عامر وغیرہ کی سیاسی حمایت ملی تھی جیسا کہ ابو براء مالک کے بعد کے رویّے سے ثابت ہوتا ہے اور دوسرے یہ کہ اسلام نہ صرف ان حامی قبیلے یا اس کی شاخوں میں پھیلنے لگا تھا بلکہ قاتل/قاتلین کے خاندانوں میں بھی اس نے اپنی راہ بنا لی تھی۔[۱۸۰] اسلام کی یہی تاثیر تھی جس نے مسلمانوں کے دائرۂ اثر و نفوذ کو مسلسل بڑھایا اور وسیع کیا تھا۔ ستر[۱۸۱] شہدائے بئرِ معونہ نے اپنے خون سے ان دو بڑے قبیلوں یعنی سُلیم اور غطفان کے علاقوں میں اسلامی انقلاب کی بنیاد رکھی تھی جس نے باقی دشمنانِ اسلام کی سیاسی، مذہبی اور فوجی طاقت کو مسلسل گھٹایا اور مسلمانوں کی طاقت کو برابر بڑھایا تھا۔

اس خونیں واقعہ کے دو برس بعد بنو سُلیم کے دشمن خاندانوں اور افراد کے سات سو نمائندوں نے اگرچہ اسلامی ریاست کے خلاف مکی اتحادِ احزاب عظیم میں حصہ لیا تھا[182] تاہم ان کی طاقت مسلسل گھٹ رہی تھی اور ربیع الثانی ۶ھ / ستمبر ۶۲۷ء میں بنو سُلیم کے خلاف حضرت زید بن حارثہ کی تیسری مہم آخری ثابت ہُوئی جس نے اس قبیلہ کی دشمنی کا جنازہ نکال دیا۔[183] اس مہم کے بعد مسلمانوں کو ان کے خلاف کوئی اور فوجی کارروائی نہیں کرنی پڑی۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ قبیلہ سُلیم کے متعدد سرداروں اور سربرآوردہ افراد کے ساتھ کافی لوگوں نے اسلام قبول کرلیا تھا[184] اور صلح حدیبیہ تک، اس کے معاً بعد پورا قبیلہ اسلام لاچکا تھا اور وہ اسلامی ریاست کا رکن رکین بن چکا تھا[185] فتح مکہ سے قبل ہی بنو سلیم اسلامی امت کا مکمل رکن بن چکے تھے[186] اور اس طرح اسلامی ریاست کی سرحدیں قبیلہ سلیم کے علاقوں تک وسیع ہوگئی تھیں۔[187]

اگرچہ ذو امر کی مہم[188] نے بنو محارب کو اسلامی اُمت کا رکن بنا دیا تھا[189] تاہم یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اسی قبیلہ غطفان کی ایک اور شاخ بنو ثعلبہ نے کچھ مزید مدت تک اسلامی ریاست کی مخالفت جاری رکھی تھی۔ چنانچہ ۶۲۶ء اور ۶۲۹ء کے دوران پانچ اور مہمیں ان کے خلاف بھیجی گئی تھیں۔ ان میں سے اہم ترین مہم غزوۂ ذات الرقاع[190] کی تھی جس کی قیادت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہ نفس نفیس فرمائی تھی۔ یہ مہم محرم ۵ھ / جون ۶۲۶ء میں ہُوئی تھی اور اس میں مسلمان سپاہ کی تعداد مختلف روایات کے مطابق چار سو اور آٹھ سو نفوس پر مشتمل تھی۔[191] اس مہم کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا۔ اس کے بعد بنو ثعلبہ کی مخالفت اسلام کی آخری چنگاری بھی بجھ گئی۔ چنانچہ اس کے بعد جو چار مہمیں بھیجی گئیں وہ مہم یا لشکر سے زیادہ تبلیغی یا سیاسی جماعتیں تھیں اور اگر ان کی فوجی نوعیت بھی تھی تو بہت ہی معمولی، کیونکہ یہ مہمیں محض دس،[192] چالیس،[193] پندرہ[194] اور ایک سو تیس[195] افراد پر بالترتیب مشتمل تھیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ مہمیں اس قبیلہ کے شر پسند عناصر کے خلاف بھیجی گئی ہوں گی۔ ظاہر ہے کہ اتنی چھوٹی چھوٹی جماعتیں کسی بڑے قبیلے کے خلاف نہیں بھیجی جا سکتی تھیں۔ اگرچہ مآخذ کا اصرار ہے کہ ان کی نوعیت سیاسی یا فوجی تھی مگر قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تبلیغی جماعتیں تھیں۔ بہرحال یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ۶۲۹ء کے آغاز تک کم از کم ثعلبہ کے خاندان نے اسلام اور اسلامی ریاست کی بالادستی تسلیم کرلی تھی اگرچہ غطفان کی دشمنی کچھ اور مدت تک جاری رہی تھی۔

مشرقی علاقے کے ایک اور قبیلہ اسد نے جو خزیمہ کا سب سے بڑا اور معروف قبیلہ / رکن تھا، اسی زمانے میں غزوۂ اُحد کے بعد سر اُٹھایا۔ محرم ۴ھ / جون ۶۲۵ء میں طے اور بنو غطفان کے اس پڑوسی قبیلہ نے مدینہ پر اچانک حملہ کرکے مسلمانوں کی ریاست کو مٹانے کا منصوبہ بنایا[196] مگر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہِ دُوربیں اس خطرہ کو پہلے ہی بھانپ چکی تھی۔ چنانچہ آپ نے خود اقدام کرکے ان کے منصوبہ کو خاک میں ملا دیا۔ مسلمان لشکر نے تیزی سے پیش قدمی کی اور ان کی آمد کی خبر سن کر دشمن بھاگ کھڑا ہوا اور بغیر کسی تصادم یا خونریزی کے اس خطرہ کا سدِّباب ہوگیا۔[197] اس بروقت اور سخت اقدام کا اتنا اثر ہوا کہ بنو اسد / خزیمہ کے شر پسند عناصر نے کافی مدت تک سر نہیں اُٹھایا۔ دو برس کے بعد ربیع الثانی ۶ھ / اگست ستمبر ۶۲۷ء میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے الغمر نامی[198] مقام پر جمع ہونے والے اسد کے کچھ خطرپسند و دشمن عناصر کی شرارت کے منصوبوں کو ایک دُوسری چھوٹی سی فوج بھیج کر پھلنے پھُولنے سے پہلے ہی کچل دیا اس بار بھی دشمن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ مسلمانوں کی آمد کی خبر سن کر راہِ فرار

اختیار کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ بہرحال اس واقعہ کے بعد اسد/خزیمہ کے کسی اسلام دشمن کارروائی میں ملوث ہونے کی کوئی شہادت نہیں ملتی۔ یہ اور ایسی ہی دوسری شہادتیں ثابت کرتی ہیں کہ اسد/خزیمہ نے اسلامی ریاست کے ساتھ کوئی سیاسی یا مذہبی یا دونوں قسم کا سمجھوتہ کر لیا تھا اور اس طرح وہ اسلامی ریاست کے دائرۂ اثر و نفوذ میں آگئے تھے۔(۱۹۹)

اسی زمانے میں قبیلۂ بنو لحیان کے سردار سفیان بن خالد ہذلی نے مدینہ منورہ کی اسلامی ریاست پر حملے کا منصوبہ بنایا مگر حضرت عبداللہ بن انیس کی ایک شخصی مہم نے اس کا کام تمام کر دیا(۲۰۰) اور اس طرح یہ منصوبہ سر چڑھنے سے پہلے ہی دم توڑ گیا۔ مآخذ میں سے بعض روایات کا بیان ہے کہ اس سیاسی قتل کے نتیجہ میں واقعہ رجیع پیش آیا جس میں سات یا آٹھ یا دس مسلم مبلغین نے جامِ شہادت نوش کیا تھا۔(۲۰۱) عام طور سے ہمارے مآخذ اس حادثہ پر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی شدید فوجی ردِ عمل کا اظہار نہیں کرتے ہیں تاہم محمد بن حبیب بغدادی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ غزوہ کدر کی مہم اسی حادثۂ فاجعہ کے ردِ عمل کے طور پر پیش آئی تھی۔(۲۰۲) بہرحال کوئی بھی صورت رہی ہو یہ حقیقت ابھرتی ہے کہ اس واقعہ کے بعد بنو لحیان یا اس کے دوسرے خاندانوں نے اسلامی ریاست کے ساتھ تصادم کی راہ نہیں اختیار کی تھی۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہو گا کہ ان قبیلوں نے اسلامی ریاست کے ساتھ کسی نہ کسی قسم کا سمجھوتہ کر لیا ہو گا۔ واقعہ رجیع کے اثرات اور شہداء کا خُون یُوں رائیگاں جانے والا نہ تھا۔ اس نے اپنا رنگ دکھایا اور اسلام نے اس قبیلہ میں اپنے قدم جما لئے تھے۔(۲۰۳)

ربیع الثانی ۵ھ/ اگست، ستمبر ۶۲۶ء میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے شمال میں واقع دومۃ الجندل(۲۰۴) کی طرف پیش قدمی فرمائی۔ بظاہر اس کا سبب یہ تھا کہ شمال کے بعض قبائل نے سرِ تمرد و عصیان اٹھایا تھا وہ فسادِ خلق کے مرتکب ہو رہے تھے۔ اگرچہ ابنِ اسحاق، ان کے جامع ابنِ ہشام اور ان کے خوشہ چیں طبری کے بیانات اپنے اختصار و ابہام کے سبب تشنہ ہیں تاہم واقدی کے بیانات سے کچھ تفصیل معلوم ہوتی ہے۔ اس کے مطابق دومۃ الجندل میں ایک بڑا علاقائی بازار تھا جہاں جزیرہ نمائے عرب کے مختلف علاقوں سے خاص کر شمال، شمال مغرب و مشرق کے علاقوں سے تاجر آتے تھے اور تجارت کا بازار گرم کرتے تھے۔ بعض شر پسند شمالی عرب کے قبیلوں نے بدوی قبائل سے ساز باز کر کے بازار دومۃ الجندل میں لوٹ مار مچائی بلکہ آتے جاتے کاروانوں کے لئے مستقل خطرہ بن گئے۔ ان کا منصوبہ مدینہ کی اسلامی ریاست پر بھی حملہ کرنے کا تھا۔ اگرچہ ہمارے مآخذ ان دونوں معاملات کے درمیان تعلق کا برملا ذکر نہیں کرتے تاہم یہ بات واضح ہے کہ اگر کوئی سیاسی یا فوجی طاقت ان لٹیروں کو کچل سکتی اور ان کی لُوٹ مار کا سدِ باب کر سکتی تھی تو وہ مدینہ کی اسلامی ریاست تھی کیونکہ اس نے روزِ اوّل سے یہ اپنا فرضِ منصبی قرار دے لیا تھا کہ مظلوموں کی فریاد کو پہنچے اور ان کی ظالم کے ظلم اور شر سے حفاظت کرے۔ اور حقیقتاً ہُوا بھی یہی۔ اندازہ ہوتا ہے کہ بازار دومۃ الجندل کے باسیوں یا آنے جانے کاروانوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مداخلت کی درخواست کی۔ اور عین ممکن ہے کہ یہ مدینہ کی اقتصادی ناکہ بندی کی دشمن قبائل کی کوشش ہو اور مسلمانوں کی تجارت کو برباد کرنا اس کا مقصد رہا ہو۔(۲۰۵) چنانچہ آپ ایک ہزار صحابہ پر مشتمل ایک لشکر لے کر روانہ ہوئے اور لٹیروں کی سرکوبی کی۔ مہم کے نتیجہ میں مسلمانوں کو کچھ مالِ غنیمت مویشیوں اور قیدیوں کی شکل میں ملا مگر اس سے زیادہ اہم اور دیرپا نتیجہ اس مہم کا سیاسی اور فوجی اثر تھا۔ آپ نے

دومۃ الجندل میں کچھ مدت قیام کیا اور مختلف علاقوں میں چھوٹے چھوٹے سرایا بھیجے۔ ان کا، ظاہر ہے، قرب و جوار کے علاقے کے قبیلوں پر خاصا اثر پڑا، اور عجب نہیں کہ ان میں کچھ نے اسلامی ریاست سے صلح و امن کے معاہدے کر لئے ہوں۔(۲۰۶) اس کی ایک شہادت طبری کے ایک بیان سے ملتی ہے کہ اس مہم کے دوران رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کے ایک طاقتور ترین قبیلہ غطفان کے ایک اہم خاندان بنو فزارہ کے سردار عُیینہ بن حصن فزاری سے جو اسی نواح میں مشرقی علاقوں میں آباد تھا ایک معاہدۂ امن کیا تھا۔(۲۰۷) اس شہادت سے گمان ہوتا ہے جو کافی حد تک یقینی بن جاتا ہے کہ دُوسرے قبیلوں نے بھی اسی قسم کا معاہدہ آپ سے کیا ہوگا۔ اور اگر نہ بھی کیا ہو تو یہ لازمی تھا کہ ان پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی اور فوجی طاقت کا خاصا رعب قائم ہوا ہوگا۔ غالباً یہی سبب تھا کہ اس کے بعد اس علاقے میں تجارتی کاروانوں کو لوٹنے یا بازار دومۃ الجندل میں لوٹ مار کرنے کے ایسے کسی مزید واقعہ کا ذکر نہیں ملتا ہے۔

سیاسی، اقتصادی اور فوجی لحاظ سے یہ مہم کافی اہم اور نتیجہ خیز تھی مگر مونٹگمری واٹ اس مہم میں صرف چند مویشیوں اور قیدیوں پر مشتمل مالِ غنیمت کو ہی کل حاصل سمجھتے ہیں(۲۰۸) اور اپنی قابلیت اور علمیت کا سارا زور اس پر صرف کر دیتے ہیں کہ یہ مہم معمولی اور بے نتیجہ تھی حالانکہ واقعات و مآخذ کی شہادتیں دوسری ہی کہانی سناتی ہیں۔ دراصل مونٹگمری واٹ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شمالی قبائل کے سلسلے میں اپنائی گئی پالیسی کی اہمیت کو گھٹانے کی مسلسل مگر غیر علمی اور تاریخی کوشش کرتے ہیں جیسا کہ ہم اگلے باب میں دیکھیں گے مگر یہاں صرف چند مزید شہادتوں پر اکتفا کی جاتی ہے جو اس مہم یا شمالی پالیسی کی صحیح نوعیت کو اُجاگر کرتی ہیں۔ مآخذ کا بیان ہے کہ اس مہم میں معاہدے کی ایک شق کے مطابق رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عیینہ بن حصن فزاری کو تَغلَمَین اور مراز کی وادیوں میں اپنے جانور چرانے کا حق عطا فرمایا تھا۔(۲۰۹) سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ حق آپ کو کس نے دیا تھا اور آپ نے ایک معاہد و حلیف کو کیونکر اور کس بنیاد پر عطا فرمایا تھا؟ جواب اس کا صرف یہی ہو سکتا ہے کہ اس علاقہ غیر کے قبیلوں نے معاہدوں کے ذریعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلامی ریاست کی سیاسی بالادستی اور اس کے نتیجہ میں ان علاقوں پر اس کے سیاسی اقتدار و قبضہ کو تسلیم کر لیا تھا۔ اسی طرح اس علاقے کے قبائل کے علاوہ مزید شمال کے علاقے یعنی دومۃ الجندل اور شامی سرحد کے بیچ کے خطے کے قبیلوں پر اس کا خاطر خواہ اثر ہوا تھا۔ چنانچہ پورے ایک سال تک مسلمانوں کو ان شمالی قبیلوں سے کسی قسم کا خطرہ محسوس نہیں ہوا تھا۔ بہرحال تمام تاریخی حقائق و شواہد اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ اس غزوہ کے نتیجے میں اسلامی ریاست کا سیاسی اقتدار دومۃ الجندل تک مدینہ کے شمال میں پھیل چکا تھا اور ان علاقوں کے بدوی قبائل میں سے کچھ یقیناً اسلامی ریاست کے زیرِ اثر آچکے تھے۔

اس شمالی مہم کے تین ماہ کے بعد شعبان ۵ھ / جنوری ۶۲۷ء کے آغاز میں اسلامی ریاست کو مدینہ سے تقریباً سو میل جنوب مغرب میں واقع خزاعہ کے ایک خاندان بنو مصطلق کی طرف سے خطرہ پیدا ہوا۔ اگرچہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پرانے حلیف خزاعہ کا ایک حصہ اور نئے حلیف بنو مدلج کے حلیف بھی تھے(۲۱۰) تاہم انھوں نے اسلامی ریاست کے ساتھ ابھی تک کسی قسم کا معاہدہ نہیں کیا تھا اور نہ ہی ابھی تک کسی قسم کی سرکشی اور تمرد کا اظہار کیا تھا۔ لیکن اس موقعہ پر بنو مصطلق کا حارث بن ابی ضرار کی قیادت میں جادۂ غلط ارادوں سے ہو رہا تھا جس کی مسلسل خبریں جاسوسوں کے ذریعہ آپ کو پہنچ رہی تھیں اور

جن کی آپ نے اپنے ایک فرستادہ کے ذریعہ پکّی تصدیق کرلی تھی۔[211] بہرحال آپ نے اقدام کیا[212] اور مریسیع کے چشمہ پر[213] ایک ہلکا سا تصادم بھی ہوا جس میں کچھ لوگ دشمن کے مارے گئے مگر ان کے دوسو خاندان گرفتار کرلئے گئے اور کافی مالِ غنیمت ہاتھ لگا۔[214] رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ کے دوران ہی مفرور سردار قبیلہ کی صاحبزادی حضرت جویریہ سے جو مشرف بہ اسلام ہوگئی تھیں شادی کرلی۔ اس مبارک و مسعود رشتے کے نتیجے میں تقریباً آدھے قیدی[215] بلا معاوضہ اس خوش آئند و مسرت آگیں موقعہ پر رہا کردئے گئے

آپ کے نرم، شرافت و رحمت سے بھرپور اور حکمت و دانائی کے حامل رویے سے نہ صرف سردار قبیلہ بلکہ بیشتر افراد اسلام قبول کرکے امت کا حصہ بن گئے[216] اور اس طرح انھوں نے اسلامی ریاست کی شہریت قبول کرلی۔ یہ مہم ثابت کرتی ہے کہ کس طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اقتدار مختلف علاقوں میں رفتہ رفتہ مگر پوری قوت و طاقت کے ساتھ پھیل رہا تھا اور کس طرح مکہ کے حلقۂ اثر کے لوگ یا دوسرے سیاسی و سماجی علاقوں کے قبائل اسلامی ریاست کے رکن بنتے یا اس کے حلقۂ اثر کے ماتحت آتے جا رہے تھے۔[217] مختلف علاقوں میں اسلام کے سیاسی اور مذہبی اقتدار کے پھیلنے کی یہ دونوں مہمیں —— غزوۂ دومۃ الجندل اور غزوۂ مریسیع —— بہترین مثالیں ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی خاص اہم ہے کہ اکثر مورخین کے نزدیک یہ دونوں مہمیں غزوۂ احزاب سے پہلے واقع ہوئی تھیں۔[218] اس پس منظر میں نہ صرف ان دونوں مہموں کی سیاسی اور فوجی اہمیت میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ اس اہم حقیقت پر روشنی پڑتی ہے کہ مدینہ کی اسلامی ریاست اس وقت تک اتنی طاقت ور ہو چکی تھی کہ کسی ایک قبیلہ یا سیاسی وحدت چاہے وہ طاقتور ترین یا اہم ترین کیوں نہ ہو جیسے مکہ کی قریشی اشرافیہ یا غطفان کا عظیم ترین قبیلہ اس کو تنہا کسی طرح زک نہیں دے سکتی تھی اور یہی احساس قبائل عرب کو تھا جس نے احزاب یا اتحادِ عظیم کی دعوت دی تھی۔

قبیلہ غطفان نے اسلامی ریاست کے خلاف تنہا اور دوسروں سے اتحاد کرکے بھی کئی کوششیں کیں۔ چنانچہ ان کے بعض خاندانوں کی انفرادی کوششوں کے علاوہ، جن کا ذکر اوپر آچکا ہے، غزوۂ احزاب میں ان کا متحدہ لشکر ان کے تین اہم خاندانوں —— فزارہ، اشجع اور مرّہ —— پر مشتمل تھا، جو خود قبیلوں کی حیثیت و طاقت رکھتے تھے۔ اس قبیلہ نے مجموعی طور سے ایک ہزار آٹھ سو سپاہی فراہم کئے تھے۔[219] لیکن یہ اتحادی حملہ کامیاب نہیں ہوسکا جس کے متعدد اسباب تھے۔[220] یہاں یہ نکتہ قابلِ ذکر ہے کہ فزارہ کے سردار عیینہ بن حصن نے وہ معاہدہ بظاہر توڑ دیا تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دومۃ الجندل کی مہم کے دوران کیا گیا تھا۔ بعد میں عیینہ نے مدنی ریاست کے خلاف اپنی فوجی کارروائی جاری رکھی اور مدینہ کی چراگاہ پر حملہ کرکے مسلمانوں کے مویشیوں کو پکڑ لیا اور چراگاہ کے نگراں کو مار ڈالا۔[221] اس کے نتیجے میں غزوۂ ذی قرد ہوا[222] جس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حملہ آوروں کو سزا بھی دی اور اپنے کچھ مویشی بھی واپس لے لئے مگر سردار قبیلہ اور بیشتر حملہ آور فرار ہوگئے۔[223] دوسرے سال کے آغاز میں غطفان کے ایک قبیلہ نے حضرت زید بن حارثہ کی وادی القریٰ سے مدینہ واپسی کے سفر کے دوران مسلم دستے پر حملہ کیا چنانچہ اس کے جواب میں حضرت زید ہی کی کمان میں ایک مہم انتقام لینے کے لئے بھیجی گئی جو اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب رہی۔[224] ۶۲۸ء کے آخری ماہ میں بنو مرہ نے، جو بنو غطفان کا ایک اہم ترین خاندان تھا، حضرت بشیر بن سعد خزرجی کے زیر کمان ایک مسلم دستہ کو قتل کر ڈالا۔[225] لیکن ان ظالموں کو اپنے ظلم کی قیمت اپنے خون سے

اور زیادہ گراں چکانی پڑی۔[۲۲۶] اس کے تین ماہ بعد ۶۲۹ء کے دوسرے ماہ میں حضرت بشیر بن سعد نے ہی یُمن اور جناب کے نواح[۲۲۷] میں جمع ہونے والے غطفانیوں کے ایک قبیلہ کو خاطر خواہ سزا دی۔[۲۲۸] اور اسی مہم کے ساتھ غطفان کی مخالفت کی کمر ٹوٹ گئی۔ بعد میں اگرچہ ایک چھوٹی سی جماعت بنو جُشَم کے کچھ لٹیروں کی سرکوبی کے لئے بھیجی گئی تھی تاہم وہ اتنی چھوٹی تھی کہ اس کا پورے قبیلہ یا غطفان سے کوئی سروکار نہیں تھا۔[۲۲۹] اوپر کی تفصیل سے ثابت ہوتا ہے کہ غطفان نے کافی دنوں تک اور جنگِ احزاب و صلح حدیبیہ کے کچھ بعد تک اپنی اسلام دشمنی اور ریاست اسلامی کی مخالفت پر مبنی پالیسی جاری رکھی تھی لیکن فتح مکہ سے پہلے ہی ان کی طاقت ٹوٹ چکی تھی اور ان کا سرِ غرور جھک چکا تھا۔ بہر حال ۸ھ کے خاتمہ تک نہ صرف غطفان بلکہ مشرق مدینہ کے بیشتر قبائل اسلامی ریاست کی ماتحتی قبول کر چکے تھے یا اسلامی اُمت کے رکن بن کر ریاستِ اسلامی کے رکن بن گئے تھے۔

اکتوبر، نومبر ۶۲۷ء اور مئی، جون ۶۲۸ء (جمادی الآخرہ ۶ھ / محرم ۷ھ) کی درمیانی مدت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ خاص طور پر مدینہ کے شمال میں آباد بعض سرکش قبائل پر مرکوز رہی۔ ۶۲۷ء کے وسط یا ۶ھ کے ابتدائی مہینوں تک اسلامی ریاست نے شمال کے ایک اہم قبیلہ جذام کی کم از کم ایک شاخ کے ساتھ مفاہمت حاصل کر لی تھی اور ان کے ساتھ ایک معاہدۂ امن و دوستی کرنے میں کامیابی حاصل کی تھی۔[۲۳۰] اسی زمانے کے قریب حضرت زید بن حارثہ کلبی کی زیرِ قیادت ایک مہم، جو عام طور سے سریہ حِسمٰی[۲۳۱] کے نام سے مشہور ہے، جذام کے ایک سرکش اور اسلام دشمن قبیلہ کے خلاف بھیجی گئی تھی۔ اس کا سبب یہ ہوا تھا کہ اس قبیلہ نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک سفیر حضرت دحیہ بن خلیفہ کلبی کے ساتھ جو اپنی سفارت کی واپسی پر اس علاقہ سے گزر رہے تھے بدسلوکی کی تھی اور ان کا مال و متاع اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے جو تحائف وہ لا رہے تھے چھین لئے تھے۔ اس مہم نے نہ صرف ان سرکشوں کو ان کے کرتوت کی سزا دی تھی بلکہ قبیلہ کے دوسرے خاندانوں کے ساتھ خصوصاً مدینہ حامی طبقات کے ساتھ تعلقات استوار اور مضبوط کئے تھے۔[۲۳۲] چنانچہ بنو ذُبیب کا طرزِ عمل اس کی ایک بڑی شہادت ہے۔

یہ امر بہت اہم ہے کہ حضرت دحیہ بن خلیفہ کلبی پر حملہ کی خبر جونہی اس مسلم قبیلہ کو ملی اس نے مسلم مہم کے مدینہ سے آنے سے پہلے ہی لٹیروں کے خلاف فوجی اقدام کیا تھا اور نہ صرف ان کو سزا دی تھی بلکہ حضرت دحیہ کے تمام سامان کو ان سے واپس لے کر سفیرِ نبوی کو بحفاظت تمام علاقہ سے گزرنے کا اہتمام کیا تھا۔ ۶۲۸ء کے آغاز تک اس علاقہ میں آباد ایک اور اہم قبیلہ بنو سعد نے اسلامی ریاست کی دوستی قبول کر لی تھی اور حضرت علی کے سریہ فدک نے اس کا آغاز کیا تھا انھوں نے معاہدوں کے ذریعہ اسلامی ریاست کی سیاسی بالادستی تسلیم کر لی تھی۔[۲۳۳] ان مہموں کا مجموعی نتیجہ یہ نکلا تھا کہ وادی القریٰ کا بیشتر علاقہ، جہاں بنو سعد آباد تھے، اسلامی ریاست کے موثر قبضہ میں آ گیا تھا۔ اسی زمانے میں دومۃ الجندل کے علاقے میں آباد ایک اور اہم شمالی قبیلے بنو کلب نے اسلامی ریاست کی رکنیت قبول کی تھی کہ جب حضرت عبدالرحمٰن بن عوف زہری کے زیرِ قیادت سات سو مسلم سپاہ پر مشتمل ایک سریہ نے ان کے ساتھ دوستی اور ازدواج کے تعلقات قائم کئے تھے۔ اس سے زیادہ اہم واقعہ یا نتیجہ یہ تھا کہ اس شادی کے[۲۳۴] نتیجہ میں نہ صرف حضرت تماضر زوجۂ صحابیٔ موصوف نے بلکہ ان کے والد ماجد اصبغ بن عمرو کلبی نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا۔ مآخذ کا بیان ہے کہ ان کے اسلام کے نتیجے میں قبیلۂ بنو کلب کی اس شاخ کے کافی بڑے حصے نے اسلام قبول کر لیا تھا اور

جو لوگ اپنے سابق دین پر قائم رہے تھے انھوں نے جزیہ ادا کرنے کا معاہدہ کیا تھا۔[۲۳۵] مونٹگمری واٹ نے اپنے متعصبانہ یا غیر علمی نظریہ کے مطابق اس مہم کے اثرات کو گھٹا کر دکھانے کی کوشش کی ہے۔[۲۳۶] ورنہ حقیقت یہ ہے کہ دومۃ الجندل کا قبیلہ کلب یا تو اسلام کا باقاعدہ رکن بن گیا تھا یا اس نے ریاست اسلامی کی باجگزاری قبول کر لی تھی۔ اس مدت میں اور کئی چھوٹی بڑی مہمیں شمال کو بھیجی گئیں جنھوں نے اپنا مقصود بخوبی حاصل کیا لیکن اس علاقے کو اسلامی ریاست کا حصہ بننے کے لئے اگلے مرحلے کا انتظار رہا۔

(۸) آٹھواں مرحلہ: اقدام کا آغاز

صلح حدیبیہ اسلام کی تاریخ اور اسلامی ریاست کے ارتقاء کا ایک اہم مرحلہ تھا۔ اگرچہ مسلمانوں کو صلح حدیبیہ کا معاہدہ کرتے وقت اس کی سیاسی اور سماجی اہمیت کا صحیح اندازہ نہیں تھا تاہم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس معاہدۂ صلح کا دوررس، مسلمانوں کے حق میں مفید اور اشاعتِ اسلام میں معاون نتائج و اثرات کا بخوبی علم تھا۔ صلح حدیبیہ کے محرکات و عوامل اور ان تاریخی حالات جن میں وہ عمل پذیر ہوئی تھی کا ابھی تک جائزہ نہیں لیا گیا ہے۔ مونٹگمری واٹ نے اس کی اہمیت اور تاریخی حالات کا تجزیہ کیا ہے لیکن وہ بعض غیر تاریخی تعبیرات سے بھی بھرا ہوا ہے۔[۲۳۷] دوسرے مورخین نے، خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم، مآخذ کا روایتی انداز اپنایا ہے جس میں تجزیہ و تحلیل کا فقدان ہے۔ بعض مآخذ کا بیان ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کعبۃ اللہ کا عمرہ کرنے کا حکم خداوندی خواب میں دیکھا۔ بعض دوسرے اس کو الہام الٰہی سے تعبیر کرتے ہیں۔[۲۳۸] شبلی نعمانی نے اس سفر و غزوۂ حدیبیہ کے اسباب میں مسلمانوں کے اپنے قدیم وطن سے لگاؤ، عمرہ یا حج کی خواہش، کعبہ کی محبت کو گنایا ہے۔[۲۳۹] واٹ نے بھی مختلف سیاسی اور مذہبی اسباب و محرکات بنائے غزوہ قرار دئے ہیں۔

دراصل غزوہ حدیبیہ کے اسباب و علل اور محرکات کو غزوۂ خندق میں قریش اور ان کے اتحادی احزاب کی ناکامی سے پیدا ہونے والے تاریخی حالات میں تلاش کرنا چاہئے۔ ذکر آ چکا ہے کہ مدینہ کے خلاف احزاب کا اجتماع سب سے بڑا فوجی اور سیاسی منصوبہ تھا جو اپنے مقصد یعنی مسلمانوں کی ریاست کو تہس نہس کرنے میں قطعی طور پر ناکام رہا تھا۔ دشمنوں نے اپنی بھرپور طاقت کا استعمال کر کے دیکھ لیا تھا، مگر نتیجہ یہ نکلا کہ نہ صرف ناکام رہے بلکہ اقدام ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔ ان کی ہمتیں پست ہو گئیں، عزائم بکھر گئے اور منصوبے خاک میں مل گئے۔ نہ وہ اپنی سیاسی ساکھ کو بحال کر سکے اور نہ ہی سماجی مقام کو۔ ان کی اقتصادی زندگی جس کا دارومدار بیشتر شامی تجارت پر تھا بے موت مر گئی۔ اس تمام ناکامی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مکی سیاست میں اختلافات پھوٹ پڑے جن کا اظہار صلح حدیبیہ کے حالات سے ہوتا ہے۔ ان کی قیادت متحد نہیں رہی تھی اور گروہی عصبیت بڑھ گئی تھی۔ عام لوگوں کا اپنے قائدین پر سے اعتماد اٹھ گیا تھا اور متعدد قائدین و سرداران مکہ کا بھرم کھل گیا تھا اور ان کی وہ سیاسی اور سماجی حیثیت نہیں رہی تھی جو پہلے کبھی تھی۔ دوسری طرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس ابتلاء و آزمائش سے گزر کر اور کندن بن گئے تھے اور آپ پہلے سے زیادہ طاقتور، بااثر اور زیادہ محبوب قائد کے طور پر ابھرے تھے۔ غزوۂ خندق کے دوران حضرت نعیم بن مسعود اشجعی کے ذریعہ آپ نے نہ صرف احزاب کے مختلف عناصر میں پھوٹ ڈال کر ان کی طاقت

توڑ دی تھی، بلکہ عرب بدوی قبائل سے اپنے زیادہ مضبوط روابط کی بنیاد بھی ڈالی تھی۔[۲۴۰] اس کے علاوہ قبائلِ عرب کو اسلام اور اسلامی ریاست سے قریب لانے اور حامی بنانے کی یہی پالیسی تھی جس کے نتیجے میں آپ نے مختلف علاقوں میں غزوات اور سرایا کی مہمیں بھیجی تھیں یا خود لے کر گئے تھے۔ قریش اور ان کے اتحادیوں کی ناکامی نے قبائلِ عرب کو بھی بخوبی احساس دلایا تھا کہ مدینہ کی اسلامی ریاست ایک ایسی سیاسی اور فوجی طاقت بن چکی ہے جس کی مخالفت میں سراسر زیاں ہے اور جس کی دوستی اور محبت میں مکمل اور بھرپور فائدہ ہے اور اس احساس ہی کا نتیجہ تھا کہ متعدد قبائل عرب اسلام یا اسلامی حکومت کے زیرِ سایہ آچکے تھے اور دوسرے بہت سے قبائل نے مخالفت کی راہ کم از کم ترک کر دی تھی۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی روز افزوں سیاسی طاقت کے ہر لمحہ میں یہ پالیسی عیاں رہی تھی کہ آپ کو اپنے کسی دشمن کی، چاہے وہ بدوی قبائل عرب ہوں یا مغرور قریش مکہ یا قبائلِ شمال و جنوب کی منظم حکومتیں، تباہی مقصود نہ تھی۔ آپ ان کو اسلام کے دائرے میں لانا اور اسلامی حکومت اور امت کا رکن بنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ اس پالیسی کا عملی اظہار ہر غزوہ اور ہر سریہ میں ہوا، جب آپ نے گرے ہوئے دشمن پر وار کرنے اور اس کا کام تمام کرنے کے بجائے اس کو گلے سے لگا لینے کی ہر ممکن کوشش کی۔ قریش مکہ کے ساتھ بھی آپ کی یہ پالیسی شروع ہو رہی تھی اور جنگِ بدر اور اس کے قیدیوں، مختلف سرایا میں پکڑے گئے دوسرے قریشی قیدیوں اور بسا اوقات ان کے مالِ غنیمت کے معاملہ میں آپ نے ان پر واضح کر دیا تھا کہ آپ ان کی تباہی اور بربادی نہیں چاہتے بلکہ ان کو اسلام کا پیرو اور امتِ مسلمہ کا رکن دیکھنا چاہتے تھے۔ قریشِ مکہ بھی آپ کی اس پالیسی سے پوری طرح واقف تھے اور اس کا بخوبی احساس رکھتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ مسلمانوں کی تعداد میں برابر قریشیوں کا اضافہ ہو رہا تھا۔ لیکن دوسری طرف ان کو اسلامی ریاست کی روز افزوں طاقت سے یہ بھی خدشہ تھا (جو اگرچہ حقیقی نہ تھا مگر قریش کے لئے صحیح تھا) کہ مسلمان کسی وقت بھی مکہ پر مسلح حملہ کر سکتے ہیں اور مکہ کی سیادت و قیادت کو آنِ واحد میں بالکل ختم کر سکتے ہیں۔ یہ احساس بھی ممکن ہے بعض مکی تاجروں کے لئے قبولِ اسلام کا سبب بن گیا ہو۔

قریش مکہ کی دن بہ دن دگرگوں سیاسی اور فوجی طاقت اور اسلامی ریاست کی روز افزوں ترقی و استحکام کا یہی زمانہ تھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ جا کر عمرہ کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اپنے سفر پر چودہ سو ۱۴۰۰ یا سولہ سو ۱۶۰۰ مسلمانوں کے ساتھ نکل کھڑے ہوئے۔[۲۴۱] مسلمانوں کی اس جماعت زائرین کے پاس صرف مسافروں کے ہتھیار یعنی تلواریں تھیں، ان کے احرام بندھے ہوئے تھے اور قربانی کے جانور ساتھ تھے۔ اس پورے اہتمام کا مقصد قریشِ مکہ کو خصوصاً اور قبائل عرب کو عموماً یہ تاثر دینا تھا کہ آپ کا مشن پُر امن اور مذہبی فریضہ ادا کرنا تھا۔[۲۴۲] قبائلِ عرب تو پہلے بھی شاید مکہ والوں کی حمایت میں گوناگوں اسباب سے نہ آتے اور اس اظہار مذہب سے تو وہ اتنے متاثر ہو گئے ہوں گے کہ مداخلت کا اگر کوئی خیال بھی تھا تو جاتا رہا ہوگا۔ اس کا مکہ کے مختلف سماجی اور مذہبی حلقوں پر بھی خاطر خواہ اثر ہوا ہوگا۔ اس طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام پڑوسی یا متعلقہ قبائل عرب کو پوری طرح سے، اور مکہ کی آبادی کے خاصے بڑے حصے کو کسی حد تک، کم از کم ایک معاملہ میں اپنا ہمنوا بنا لیا تھا یا کم از کم ان کو غیر جانبدار بنا دیا تھا۔[۲۴۳] اس حکمتِ عملی کے نتیجہ میں خون خرابے یا جنگ کے امکانات کا توسرے سے خاتمہ ہو گیا تھا۔ جس کا بہترین ثبوت ہم کو

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صلح حدیبیہ کے موقعہ پر بھیجے گئے دو سفیروں حضرات خراش بن امیہ اور عثمان بن عفان کے ساتھ مکہ والوں کے سلوک سے ہوتا ہے کہ ان کی مدافعت، محافظت اور حمایت میں خود مکہ کے لوگ آگے آئے تھے۔[۲۴۴] اس کے علاوہ مکہ میں عمومی تاثر یہی تھا کہ زائرین مکہ کو، خواہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے مسلمان رفقا ہی کیوں نہ ہوں، کیونکر روکا جا سکتا ہے۔ یہ خیال بڑی حد تک صحیح ہے کہ خانہ کعبہ کا عمرہ اور مکہ مکرمہ کی مذہبی حیثیت کا اس طرح اظہار کر کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ اور قبائل عرب کے تمام مذہبی عناصر میں اپنے لئے ایک نرم گوشہ ضرور بنا لیا تھا چنانچہ مکہ اور اس کے ارد گرد کے علاقوں میں مسلمانوں سے جنگ نہ کرنے کا خیال جم چکا تھا۔ حضرت خالد بن ولید مخزومی کی کمان میں مکہ کے رؤساء قبائل نے جو شہسوار دستہ بھیجا تھا، اس کا مقصد مسلمانوں کو یوں بے محابا مکہ میں داخل ہونے سے روکنا تھا نہ کہ ان سے کسی قسم کی معرکہ آرائی کرنا۔[۲۴۵] رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد بھی نبرد آزمائی سے گریز کرنا شروع سے رہا تھا چنانچہ اس کے تمام امکانات کو رد کرنے کی خاطر آپ نے مسلمانوں کو تنگ اور دشوار گزار پہاڑی راستوں سے حدیبیہ کی وادی میں پہنچا دیا جو مکہ کے بالکل قریب تھی اور وہیں مسلمانوں نے پڑاؤ ڈال دیا اور حالات کے رُخ کا انتظار کرنے لگے۔[۲۴۶]

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بخوبی احساس تھا کہ مکہ کے مغرور سردار ان کو اور مسلمانوں کو اتنی آسانی سے شہر میں داخل نہ ہونے دیں گے۔ حدیبیہ میں آپ کا قیام اور متعدد دوسرے قرائن اور شواہد اس کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اسی سے یہ بات بھی عیاں ہوتی ہے کہ مذہبی اسباب و محرکات کے ساتھ اس غزوہ کے کچھ سیاسی مقاصد و محرکات بھی تھے۔ دو ہی صورتیں ممکن تھیں، یا تو مسلمان مکہ میں داخل ہوں گے اور عمرہ کریں گے اور یا مسلمان داخل نہ ہوں گے اور دونوں صورتوں میں کسی قسم کے سمجھوتے کا امکان تھا، جس کا ثبوت ہم کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبیلہ خزاعہ کے سردار و نمائندے بدیل بن ورقاء سے گفتگو میں ملتا ہے۔[۲۴۷] بہر حال قیام حدیبیہ کے فوراً بعد ہی گفت و شنید اور نامہ و پیام کا سلسلہ شروع ہوا اور نقطۂ آغاز بدیل بن ورقاء ہی سے شروع ہوا جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے کے لئے آئے تھے اور واپسی پر پیغام رسول مکہ والوں کے پاس لے گئے۔[۲۴۸] اس کے بعد مکرز بن حفص عامری کی سفارت آئی۔ وہ بھی ناکام رہی۔[۲۴۹] پھر قریش نے احابیش کے سردار حلیس بن علقمہ کو بھیجا۔ پھر عروہ بن مسعود ثقفی کی سفارت آئی۔ مگر مکمل گفتگو نہ ہو سکی۔[۲۵۰] اس کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خراش بن امیہ کو مکہ والوں کے پاس بھیجا، مگر ان کی سفارت کا بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ آخر میں حضرت عثمان بن عفان اُموی کو حضرت عمر فاروق کے مشورہ پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیجا جنہیں مکہ والوں نے روک لیا اور اس کے سبب ان کے قتل کی افواہ مشہور ہو گئی[۲۵۱] اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے خون کا قصاص لینے کی بیعت و قسم مسلمانوں سے لی۔[۲۵۲] غالباً اسی عزم مصمم کا اثر تھا کہ مکہ والوں نے صلح کرنے کا فیصلہ کر لیا[۲۵۳] اور ان کی وہ موثر سفارت خطیب قریش سہیل بن عامر عامری کی قیادت میں آئی جس نے صلح حدیبیہ کا معاہدہ مسلمانوں سے حل کر لکھا۔ ممکن ہے کہ درمیان میں کچھ اور سفارتیں بھی آئی گئی ہوں۔ ان متعدد سفارتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ قریش کی قیادت و سیادت میں کس قدر رخنہ پڑ گیا تھا اور سیاست میں کس قدر الجھن اور مایوسی پیدا ہو گئی تھی۔ ایک دوسرا اہم نکتہ یہ ابھرتا ہے کہ قریش مکہ کے ان سرداروں کا صلح حدیبیہ میں نہ ذکر ملتا ہے نہ ان کے اس میں حصہ لینے کا کوئی ثبوت جو اب تک کی سیاست اور

نیادت پر چھائے رہے تھے خاص کر ابوسفیان بن حرب کی غیر موجودگی بہت کھلتی ہے۔ [۲۵۴] اگرچہ ان کے بارے میں عام تاثر یہ ہے کہ وہ اس موقعہ پر مکہ میں موجود نہ تھے تاہم دوسرے زعماء قریش کو کیا ہوا تھا؛ ہم دیکھتے ہیں کہ قریشی اشرافیہ کی جانب سے پہلے ایک خزاعی حلیف نے پھر ایک غیر معروف عامری نے پھر احابیش کے بدوی سردار نے، پھر ایک ثقفی حلیف نے اور آخر میں ایک نسبتاً کم پایہ اور سیاسی طور پر کم رتبہ قریشی خاندان بنو عامر کے نمائندے نے گفت وشنید میں قیادت کی تھی۔ بنو ہاشم، بنو امیہ، بنو مخزوم، بنو سہم وغیرہ کے سردار جو ملکی سیاست کا جوہر تھے اس میں کیوں شامل نہ تھے؛ اس کے دو ہی جواب ہو سکتے ہیں: اوّل یہ کہ مکہ کی سیادت کی صفِ اوّل یا تو ختم ہو چکی تھی جیسا کہ حضرت عمرو بن عاص سہمی کے قبولِ اسلام کے سبب سے ظاہر ہوتا ہے [۲۵۵] یا از کار رفتہ ہو چکی تھی اور اصل قیادت دوسری صف کے سیاستدانوں کے ہاتھ میں آ چکی تھی۔ اور دوم یہ کہ سیادت وقیادت میں اختلاف وانتشار تھا جیسا کہ متعدد قریشی سفارتوں کی آمد اور ان کے حالات سے ہوتا ہے۔

مکہ میں زمامِ قیادت کسی کے ہاتھ میں رہی ہو، ان سیاسی حالات نے بہر حال مکہ کے سنجیدہ طبقۂ اشراف کو سوچنے پر مجبور کر دیا تھا اور وہ دل سے چاہتے تھے کہ اسلامی ریاست سے کسی قسم کا معاہدۂ صلح ہو جائے، تاکہ ان کی معاش کی بگڑتی ہوئی صورتِ حال پر قابو پایا جا سکے اور اس پُر خلوص جذبۂ خیر میں ان کو مکہ کے تمام تاجر طبقات کی خاموش رضا حاصل تھی۔ دوسری طرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر حال میں صلح کے لئے تیار رہتے۔ چنانچہ تھوڑی سی بحث وتمحیص [۲۵۶] کے بعد وہ تاریخی معاہدہ لکھا گیا جو تاریخ میں صلح حدیبیہ کے نام سے مشہور ہوا۔ فریقین نے اس پر اتفاق کیا تھا کہ:

(۱) یہ معاہدۂ صلح دس برس کے لئے ہوگا۔ فریقین اس زمانہ میں جنگ نہ کریں گے۔

(۲) مسلمان اس سال عمرہ نہیں کریں گے اور نہ مکہ میں داخل ہوں گے بلکہ اگلے سال عمرہ کے لئے آئیں گے اور مکہ میں صرف تین دن قیام کریں گے۔

(۳) مکہ کے افراد یا گروہ اگر مدینہ اس دوران اپنے بزرگوں کی اجازت کے بغیر ہجرت کریں گے تو ان کو واپس مکہ بھیجنا مسلمانوں پر لازمی ہوگا لیکن اگر مدینہ کا کوئی شخص یا جماعت مکہ آ جائے تو اس کی واپسی کی شرط مکیوں کے لئے ضروری نہ ہوگی۔

(۴) فریقین میں کسی کے ساتھ دوسرے عرب قبائل حلف ودوستی کے معاہدے کرنے کے لئے آزاد ہوں گے۔ [۲۵۷]

اس صلح کے دُور رس اور بڑے اہم اثرات مرتب ہوئے اگرچہ ابتدا میں یہ معاہدہ اسلامی ریاست کے مفاد میں نظر نہیں آتا تھا اور اس کی اکثر وبیشتر دفعات کا فائدہ قریش کے حق میں جاتا معلوم ہوتا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ قریشِ مکہ کے اس معاہدہ کی وجہ سے بھرم رہ گیا تھا اور ان کی عزت وساکھ بچ گئی تھی۔ ان کی شامی تجارت کا راستہ کھل گیا تھا جس کی ان کو سب سے زیادہ ضرورت تھی لیکن اس سے اسلامی ریاست کو جو گوناگوں فوائد حاصل ہوئے وہ اگرچہ فوری طور پر نہیں محسوس کئے گئے تھے تاہم ان کا پھل کچھ مدت کے بعد نکلا۔ ایک اہم فائدہ یہ ہوا کہ قریشِ مکہ نے اسلامی ریاست کو اپنا ہم پلّہ تسلیم کر لیا۔ دوسرا یہ کہ قبائل عرب کے لئے خاص کر مکہ کے حلقۂ اثر کے قبائل کے لئے راستہ کھل گیا کہ وہ مکہ اور مدینہ میں سے جس کے ساتھ چاہیں حلف کے

معاہدے کرلیں۔ چنانچہ صلح حدیبیہ کے مکمل ہوتے ہی خزاعہ نے اسلامی ریاست سے اور بنو بکر نے قریش سے معاہدے کر لئے۔(۲۵۸) ماخذ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایسے معاہدے صرف دو قبائل نے کئے تھے، لیکن اس کا امکان قوی ہے کہ کچھ اور قبائل عرب نے بھی مدینہ کی اسلامی ریاست سے صلح حدیبیہ کے بعد اس کے روزافزوں سیاسی استحکام اور فوجی طاقت کو دیکھ کر اسی قسم کے باہمی تعاون کے معاہدے کر لئے ہوں گے۔ لیکن سب سے بڑا فائدہ جو اسلامی ریاست کو ہوا وہ اسلام کی تیز رفتاری کے ساتھ تبلیغ ہے ہمارے ماخذ کا بیان ہے کہ اس صلح کے نتیجہ میں فتح مکہ تک یعنی تقریباً دو سال کی قلیل مدت میں اتنے لوگ مسلمان ہوئے تھے جتنے کہ اس سے قبل کی پوری مدت یعنی تقریباً بیس سال میں نہیں ہوئے تھے(۲۵۹) یہ بیان محض خوش گمانی یا مبالغہ پر مبنی نہیں ہے بلکہ اس کے تاریخی ثبوت ہیں کہ وہ قطعی طور پر صحیح ہے۔(۲۶۰) اس سے زیادہ اہم یہ فائدہ تھا کہ خود مکہ میں اشاعتِ اسلام کی رفتار تیز ہوگئی اور لوگ تیزی سے مسلمان ہونے اور مدینہ جانے لگے۔(۲۶۱) ابنِ اسحاق، ابنِ سعد اور دوسرے مؤلفین سیرت نے ان مسلمانوں یا قریشیوں کی فہرست دی ہے جو اس واقعہ کے بعد مسلمان ہوئے تھے۔ ان میں اور ممتاز لوگوں کے علاوہ حضرات خالد بن ولید، عمرو بن العاص، یزید بن ابی سفیان اور ان کے بھائی معاویہ وغیرہ شامل تھے۔(۲۶۲) اسلامی ریاست کو ان باصلاحیت اور قابل اصحاب کے قبول اسلام سے کافی فائدہ ہوا اور اس نے انتظام و انصرام، فتوحات و غزوات، تنظیم و تشکیلِ معاشرہ میں ان کی صلاحیتوں سے بھرپور استفادہ کیا۔(۲۶۳) اس کے علاوہ مسلمانوں کو آزادانہ آمدورفت کے سبب اپنی تجارت کو بھی اشاعت اسلام کے ساتھ ساتھ فروغ دینے کا موقعہ ملا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قریشِ مکہ کی مخالفت اور عداوت ختم ہونے سے راحت ملی ہی تھی کہ مدینہ کے شمال میں خیبر کے طاقتور یہودیوں نے بدوی قبائل خصوصاً غطفان کے ساتھ مل کر اسلامی ریاست پر حملہ کرنے کے منصوبے بنائے لیکن، قبل اس کے کہ وہ اقدام کر سکیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے انھیں جاں نثاروں کے ساتھ جو حدیبیہ میں پیغام امن لے کر گئے تھے۔ خیبر کی طرف جنگ کا پرچم لہراتے ہوئے کوچ کیا اور یہودی آطام یا قلعوں کا محاصرہ کر لیا۔ ایک مختصر سی مدت میں کئی یہودی قلعے مسلمانوں کے قبضے میں آ گئے۔ مقابلہ بیکار سمجھ کر یہودیوں نے صلح کی درخواست کی جو بابِ رحمت سے منظور ہوئی۔ یہودیوں نے اپنی زمینوں پر اسلامی ریاست کی ملکیت کا حق تسلیم کر لیا اور اس کے عوض اپنی تمام پیداوار کا نصف بطورِ خراج مسلمانوں کو ادا کرنا منظور کیا۔(۲۶۴) تقریباً انھیں شرائط پر خیبر کی ماتحت دوسری یہودی بستیوں ——— فدک(۲۶۵)، تیماء(۲۶۶)، وادی القری(۲۶۷) ——— نے بھی صلح کر لی۔(۲۶۸) اسلامی ریاست کے ارتقاء اور اس کی سیاسی طاقت کی افزونی کا یہ ایک انتہائی اہم مرحلہ تھا۔ خراج کی ادائیگی دراصل اسلامی ریاست سے وفاداری کا عہد اور اس کی سیاسی برتری تسلیم کرنے کا اعلان تھا۔ جزیہ کی ادائیگی کی بعض مثالیں ہم کو اسی سال کے کچھ ابتدائی حصے میں مل چکی ہیں۔ یہاں سے اسلامی ریاست کا رویہ دوسرے قبائل عرب کے ساتھ بدلتا ہے آئندہ سے اسلامی حکومت ان سے باہمی نصرت و تعاون کے معاہدے نہیں کرتی بلکہ تمام قبائل اور علاقہ جات عرب کو اسلامی ریاست کی سیاسی برتری تسلیم کرنی ضروری تھی اور اس کے اظہار و اعلان کے لئے زکوٰۃ، جزیہ، خراج جیسے محاصل ادا کرنے اور اپنے علاقوں میں مسلمان حاکموں یا مدینہ کے مقرر کردہ مبلغین و عمال کی موجودگی کو بخوشی برداشت کرنا لازمی ہو گیا تھا۔(۲۶۹)

بہرحال خیبر اور اس کی ملحقہ بستیوں کے زوال اور ان کے اسلامی ریاست کی بالادستی قبول کرنے کے بعد مسلمانوں کا قبضہ و اقتدار پوری وادی القریٰ پر محیط ہو گیا۔ چنانچہ چھ برس کی مختصر مدت میں اسلامی ریاست شمال میں کافی بڑے خطے پر قابض ہو گئی تھی اور اس کی حدود شامی سرحد کے قریب بسے ہوئے قبائل خصوصاً غسان، جذام، لخم وغیرہ کے حدود کے قریب پہنچ گئی تھیں۔ یہ صورتِ حال نہ صرف ان عرب قبائل کے لئے بلکہ ان کے سیاسی آقا رومی شہنشاہ کے لئے باعثِ تشویش تھی۔

صلح حدیبیہ کے معاً بعد رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ریاست کے پڑوس میں آباد عرب حکمرانوں اور ان کے سیاسی آقاؤں کو اسلام قبول کرنے اور اس طرح اسلامی اُمت کا رکن بننے اور اسلامی ریاست کے دائرہ اقتدار میں آجانے کی دعوت دی۔ آپ نے جن لوگوں کو یہ دعوتی خطوط تحریر فرمائے تھے ان میں مملکتِ بصریٰ کے غسانی حکمراں، مصر کے بازنطینی گورنر اور ان کے سیاسی سرپرست رومی شہنشاہ ہرقل شامل تھے۔ اسی طرح مشرقی پٹی کے حکمرانوں اور ان کے سیاسی آقا شہنشاہِ ایران کو بھی دعوت دی گئی تھی۔ یمن کے حکمراں جو ایرانی گورنر تھے اور دوسرے عرب خود مختار شہزادوں کو بھی دعوت دی گئی تھی۔ غرض کہ اس وقت کی جتنی اہم حکومتیں خود جزیرہ نمائے عرب میں تھیں یا اس کے بالکل قریب میں تھیں ان کو ریاست اسلامی کا شہری بننے اور اس کی سیاسی بالادستی قبول کرنے کی دعوت دی گئی تھی[۲۷۰]۔ یہ دعوت بنیادی طور پر مذہبی تھی تاہم اس میں سیاسی مضمرات بھی تھے اور اس دعوت کو قبول کرنے کی صورت میں اسلامی ریاست کی سرپرستی اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بالادستی قبول کرنی لازمی تھی۔ بہرحال ان خطوط و فرامینِ نبوی سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ نہ اسلام صرف ایک عربی دین تھا اور نہ ریاست اسلامی جزیرہ نمائے عرب کی حدود میں مقید رہنے والی تھی۔ دونوں کا نقطۂ نظر عالمی تھا اور دونوں کی نظر پورے عالمِ انسانی پر تھی۔

(۹) نواں مرحلہ: فتوحاتِ عظیم

صلح حدیبیہ کی بعض شرائط اپنی نوعیت کے اعتبار سے زیادہ مدت تک قائم رہنے والی نہ تھیں کیونکہ وہ تاریخی دھاروں کے خلاف مسلمانوں پر ٹھونسی گئی تھیں۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو غالباً پورا احساس و ادراک تھا کہ وہ تمام شقیں جن کو مسلمانوں نے پسند نہیں کیا تھا اور جن کو وہ اپنے لئے ناقابلِ برداشت اور توہین آمیز پاتے تھے جلد یا بدیر از خود ختم ہو جائیں گی۔ چنانچہ اس کا اشارہ حضرت ابوجندل کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان کلماتِ تشفی میں ملتا ہے جو آپ نے ان کی غمزدہ و غمناک واپسی پر فرمائے تھے[۲۷۱] اور پھر آخر کار حضرت ابوبصیر ثقفی اور دوسرے گرفتاران بلا کی مکی ظالموں کی قید سے رہائی اور ساحل بحر پر ینبوع کے علاقہ میں قیام کے نتیجہ میں وہ شق ختم ہو گئی تھی[۲۷۲]۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اس کے خاتمے کی درخواست انھیں ظالموں کی طرف سے آئی تھی جنھوں نے اس کو مسلمانوں پر زبردستی لادا تھا۔ اس زمانے میں ہی شق مسلمان مہاجر عورتوں کے بارے میں پہلے ہی حضرت ام کلثوم بنت عقبہ بن ابی معیط اموی کی دلیرانہ اور مجاہدانہ مہاجرت سے ختم ہو چکی تھی[۲۷۲]۔ دوسری شق مسلمانوں کی ۶ھ میں حدیبیہ سے واپسی اور ۷ھ میں کامیاب عمرہ کی ادائیگی سے ختم ہو چکی تھیں[۲۷۳]۔ باقی دو شقوں کا ایک دوسرے سے بڑا

قریبی تعلق تھا اور بعد کے حالات نے ثابت کر دیا کہ معاہدۂ حدیبیہ فتح مکّہ کا دیباچہ بننے والا تھا۔

مکّہ کے محاذ پر یہ صورتِ حال پیدا ہو رہی تھی اور مدینہ کے شمال میں خیبر کی مہم کے کچھ بعد حالات نے دُوسری کروٹ لی۔ صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کے درمیانی عرصے میں اسلامی ریاست کو مختلف علاقوں میں تگ بھگ سترہ چھوٹی بڑی مہمیں بھیجنی پڑیں۔ ان میں سے کچھ وُہ مہمیں تھیں جو اُن قبائل عرب خصوصاً مشرقی علاقوں کے عربوں کے خلاف بھیجی گئی تھیں جو آہستہ آہستہ اسلامی ریاست کی طرف اپنے مخالفانہ اور معاندانہ رویّے میں لچک پیدا کر رہے تھے اگرچہ ابھی تک انھوں نے مکمل تابعداری اور اطاعت کی راہ نہیں اپنائی تھی۔ یہودی شمالی بستیوں کے زوال کے چھ ماہ بعد ہوازن کے بعض چھوٹے چھوٹے گروہوں نے انتشار برپا کرنے کی کوشش کی۔ رسول کریم صلّی اللہ علیہ وسلم نے اس کو کچلنے کے لئے فوری طور پر اقدام کیا اور دو مہمیں تربہ اور نجد کے علاقے میں[۲۷۴][۲۷۵] بھیجی گئیں جنھوں نے شرپسندوں کا خاتمہ کر دیا۔ جولائی ۶۲۹ء میں ہوازن کا ایک حصّہ جو سی کے علاقے میں آباد اور انتشار میں مشغول تھا راہِ راست پر لایا گیا۔[۲۷۶] یہ تمام مہمیں دراصل بہت ہی معمولی تھیں کیونکہ اصل ہوازن کا قبیلہ مکّہ کے جنوب مشرق میں مقیم و آباد تھا اور اس کا ان شرپسندوں سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ان معمولی مہموں سے بہرحال اسلامی ریاست کی سیاسی طاقت اور اقتدار و اختیار کی وسیع حدود کا اندازہ ہوتا ہے۔

غطفان اور اس کے دو تین اہم خاندان جیسے مرّہ اور ثعلبہ بھی اس زمانے میں کافی سرگرم رہے تھے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طاقت کو کچلنے میں ذرا دیر نہیں لگائی تھی۔ اگرچہ فدک کا سریہ بشیر بن سعد مسلمانوں کی شہادت کا سبب[۲۷۷] بنا تاہم حضرت غالب بن عبداللہ نے اس کا فوری انتقام لے لیا[۲۷۸] اور کچھ مدّت کے بعد حضرت بشیر بن سعد نے غطفان کے خلاف ایک اور کامیاب مہم کی قیادت کی۔[۲۷۹] اسی طرح سلیم کے خلاف حضرت ابن ابی العوجا سُلمی نے فوج کشی کی تھی۔[۲۸۰] بعض چھوٹی موٹی مہمیں دوسرے شرپسند عناصر کے خلاف بھیجی گئی تھیں جو اکثر و بیشتر کامیاب رہی تھیں[۲۸۱] مآخذ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان مہموں میں مسلم سپاہ کی تعداد کافی کم تھی اور غالباً مخالف قبیلوں کے بعض سرکش حصّے ہی اس فوج کشی کا سبب بنے تھے۔ بہرحال رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی ریاست کے خلاف اُٹھنے والی ہر سازش، حرکت اور منصوبے کو فوری طور پر کچلا تھا اور اس طرح ان قبیلوں یا ان کے عناصر پر واضح کر دیا تھا کہ ان کا وجود صرف اسلامی ریاست کے ساتھ دوستی، مفاہمت اور وفاداری ہی کی صورت میں برقرار رہ سکتا ہے۔

اسی مدت میں اسلامی ریاست کو بعض شمالی قبائل اور علاقوں کی طرف توجہ دینی پڑی کیونکہ اس کے خلاف سازشیں، حملے کے لئے فوجی جماؤ اور سیاسی و فوجی مخالفت جنم لے رہی تھی۔ اس کے علاوہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی پرانی پالیسی کے مطابق تبلیغی جماعتیں بھی بھیجتے رہے تھے۔ چنانچہ حضرت کعب بن عمیر غفاری کی قیادت میں جو جماعت ذات اطلاح وادی القریٰ کے علاقے میں واقع ایک مقام تک گئی تھی وہ ایک مذہبی مشن تھا جس کی تکمیل مسلمانوں نے اپنے خُون کی سُرخی سے کی تھی۔[۲۸۲]

دوسری مہم اس حادثہ کے دو ماہ بعد جنوبی اردن کے شہر موتہ کے مقام کو حضرت زید بن حارثہ کے زیر کمان سفیر نبوی حضرت حارث بن عمیر ازدی کے بصریٰ کے غسانی حکمران شرجیل بن عمرو کے ہاتھوں ظالمانہ قتل کا انتقام لینے کے لئے گئی تھی۔ اگرچہ اس مہم میں

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نامزد کردہ تینوں سالار شہیدِ راہ حق ہوئے اور غالباً کچھ دوسرے بھی شہید ہوئے تھے تاہم اس کا مقصد پورا ہوا تھا۔ غسانی حکمراں کو یہ احساس دلا دیا گیا تھا کہ اسلامی حکومت کے خلاف کوئی کارروائی خطرناک نتائج کی حامل ہو سکتی ہے۔[۲۸۳] [۲۸۴] اس کے دوسرے ماہ حضرت عمرو بن العاص سہمی بنو قضاعہ کے ایک فوجی جماؤ کے خلاف ایک مہم لے کر گئے۔ اور بعد میں حضرت ابوعبیدہ بن جراح ان کے لئے امداد لے کر پہنچے۔[۲۸۵] اس مہم کو بڑی کامیابی ملی خاص کر عذرہ، بلی اور بہراد کی کچھ شاخوں میں جنھوں نے نہ صرف اسلامی حکومت اور ریاست کی دوستی کا دم بھرا بلکہ کچھ لوگوں نے اسلام بھی قبول کیا۔[۲۸۶] اس طرح اسلامی حکومت کا حلقۂ اثر شمال میں اور وسیع ہو گیا۔

حالات کا یہی رُخ تھا کہ مکی قائدین کی بے تدبیری اور خراب حکمت عملی نے صورتِ حال کو ان کے لئے بد سے بدتر بنا دیا۔ قبیلہ بنو بکر اور خزاعہ میں مدت سے رقابت چلی آرہی تھی۔ اسی دوران وہ اتنی بڑھی کہ بنو بکر نے قریش کی حمایت اور مدد سے خزاعہ پر اچانک شب خون مارا اور ان کے کئی آدمی مار ڈالے۔ صلح حدیبیہ کی شق ۲ کے مطابق خزاعہ مسلمانوں کے حلیف تھے چنانچہ انھوں نے اس ظلم کے خلاف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فوجی و اخلاقی مدد چاہی جو معاہدہ کے مطابق آپ پر لازمی تھی چنانچہ آپ نے ان کی حمایت کی اور قریش مکہ سے دیت ادا کرنے کا مطالبہ کیا اور نہ ادا کرنے کی صورت میں معاہدہ حدیبیہ کو باطل کرنے کا۔ قریش مکہ کے عاقبت نا اندیش سرداروں نے نتائج کو سوچے سمجھے بغیر معاہدہ حدیبیہ کو توڑنے کا اعلان کر دیا۔ مگر جب سمجھدار اور دانشمند طبقہ نے اس کے خطرناک نتائج کا احساس کیا تو تجدید معاہدہ کے لئے ابوسفیان بن حرب کو مدینہ بھیجا مگر ساری کوششیں بیکار گئیں کہ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ دُوسری طرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ پر فوج کشی کی تیاری کی اور ایک لشکر جرار لے کر حملہ آور ہوئے۔ مکہ میں اتنا دم خم نہ تھا کہ وُہ مقابلہ کر سکتا۔ اس کے علاوہ غالباً مکہ والوں نے غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دینا زیادہ مفید سمجھا۔ چنانچہ رمضان ۸ھ / جنوری ۶۳۰ء میں اس مغرور و ظالم شہر نے اس دُرِ یتیم کے سامنے سر جھکا دیا تھا جس کو اس نے آٹھ سال قبل عالم بے سروسامانی میں جلاوطن کر دیا تھا مگر فاتح مکہ کا حال یہ تھا کہ شہر میں داخلہ کے وقت اس کا سر بارگاہِ خداوندی میں خم تھا اور زبان پر سب کے لئے رحمت و رافت، معافی و بخشش اور رحم و کرم کے الفاظ تھے۔ مکہ نے بالآخر اپنی سیاسی خود مختاری اور بالادستی کھو دی[۲۸۷] اور وُہ اسلامی ریاست کا ایک ماتحت شہر بن کر رہ گیا جس پر مدینہ کا مقرر کردہ گورنر حکومت کرتا تھا۔[۲۸۸] مدینہ کی اسلامی ریاست کی حدود مکہ کی وادی تک وسیع ہو چکی تھیں۔

مکہ کی فتح کے لئے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک لشکر جرار کے ساتھ روانگی نے قریش مکہ کے قدیم دوست، حلیف اور پڑوسی ہوازن اور ان کے خاندان ثقیف کو اپنی طاقت جمع کرنے کا موقعہ فراہم کیا تھا۔ پھر فتح مکہ کی خبر نے ان کو اسلامی ریاست کے ساتھ نبرد آزما ہونے پر اکسایا۔ ان کو اپنی کثیر طاقت، فوجی صلاحیت اور تجربہ کار قیادت کا غرور تھا۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فتح مکہ کے بعد ان کے خطرہ کی طرف توجہ دینی پڑی۔ جنگِ حنین میں مسلمانوں کو ابتدائی ہزیمت کے بعد ایک عظیم الشان فتح آخر کار حاصل ہوئی۔[۲۸۹] بے شمار مالِ غنیمت اور ہزار ہا قیدی قبضہ میں آئے۔[۲۹۰] اس کے فوراً بعد ہوازن کے شکست خوردہ سپاہ اور قائدین نے طائف کے قلعہ میں پناہ لے لی اور اسلامی لشکر نے ان کا محاصرہ کر لیا۔

کچھ مدت کے بعد جب یہ یقین ہوگیا کہ ثقیف اسلامی ریاست کے لئے کوئی خطرہ نہیں بن سکتے تو آپ نے محاصرہ اٹھا لیا۔ جعرانہ میں، قیدیوں کے ساتھ حُسنِ سلوک اور بالآخر ان کی باعزت رہائی نے ہوازن کو اسلام کا پیرو اور اسلامی ریاست کا ہمنوا بنا دیا۔ اگرچہ طائف چند ماہ مزید دائرۂ اسلام سے باہر رہا[۲۹۱] تاہم اسلامی ریاست کی حدود حنین و طائف کے علاقے سے پرے وسیع ہو چکی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب متعدد چھوٹی چھوٹی مہمیں یا جماعتیں جن میں سے کئی ایک یا دو نفری تھیں قرب و جوار کے بتوں اور ان کے معبدوں کو توڑنے کے لئے گئیں توان جھوٹے خداؤں کی حمایت میں کوئی انگلی بھی اٹھانے والا نہ تھا۔[۲۹۲] اسلام کی فتح، اسلامی ریاست کی کامیابی سے کہیں زیادہ وسیع، دیرپا اور شاندار تھی۔ فتح مکہ اور فتح حنین اسلامی ریاست کے ارتقاء کی ایک اہم ترین بلکہ سب سے زیادہ شاندار منزل تھی۔ ان کے نتیجے میں پُورا وسطی و مرکزی جزیرہ نمائے عرب اسلامی ریاست کے دائرۂ اقتدار میں آچکا تھا۔

(۱۰) دسواں مرحلہ : اوجِ تکمیل و کمال

فتح مکہ کے بعد تمام عرب قبائل نے، خواہ وہ بدوی ہوں یا متمدن و شہری، قرب و جوار اور وسطی عرب میں آباد ہوں یا دُور دراز کے مقامات پر' یہ اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ مدینہ کی اسلامی ریاست کی سیاسی بالادستی کو قبول کرنے کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں۔ مآخذ کا بیان ہے کہ سارا عرب مکہ اور مدینہ کے درمیان ہونے والی آویزش کو بڑی دلچسپی، توجہ اور قریب کی نظر سے دیکھ رہا تھا اور منتظر تھا کہ توازن کا پلہ کس کے حق میں جھکتا ہے۔ عرب بڑے عملی اور حقیقت پسند لوگ تھے۔ جوں ہی انھوں نے مکہ کے زوال و انحطاط کی خبر سنی ان کے ہر قبیلے نے اپنی بھلائی اور عافیت اسی میں محسوس کی کہ مدینہ کی سیاسی بالادستی اور اسلام کی مذہبی برتری قبول کر لی جائے چنانچہ اعلان وفاداری و محبت کرنے کے لئے مدینہ میں پے بہ پے اور جوق در جوق وفود عرب آنے لگے۔ اور اتنی کثرت سے آئے کہ نواں ہجری سال وفود کا سال (عام الوفود) ہی کہا جانے لگا۔[۲۹۳] عام طور پر ہمارے مورخین اور سیرت نگار یہ سمجھتے اور بیان کرتے ہیں وفود کی آمد کا سلسلہ اسی برس شروع ہوا تھا۔ یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ وفود عرب کی آمد کا سلسلہ ۵ھ / ۶۲۶-۲۷ء میں کسی وقت شروع ہوگیا تھا۔[۲۹۴] دراصل ہجرت کا نواں سال ان وفود کے مدینہ میں حاضر ہونے کا ایک غیر معمولی موقعہ تھا جب جزیرہ نمائے عرب کے ہر کونے اور گوشے سے چھوٹے بڑے، بدوی شہری، متمدن اور نیم متمدن قبائل عرب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جناب میں اظہار وفاداری کرنے پہنچے تھے۔ ابنِ سعد نے وفود عرب کی کل تعداد ۱۰ بتائی ہے اور کہا ہے کہ ان میں سے اکثر و بیشتر ۹ھ میں مدینہ آئے تھے۔[۲۹۵]

اوپر ذکر گزر چکا ہے کہ فتح مکہ اور غزوہ حنین کے بعد عرب کے وسطی علاقے اسلامی ریاست میں مدغم ہو چکے تھے۔ اب جزیرہ نما کے دُور دراز اور کناروں پر بسے قبائل اور علاقے اس میں شامل ہوگئے۔ ان قبائل نے یا تو اسلامی ریاست کے ساتھ سیاسی تعلقات قائم کئے تھے اور اس کے ذمی یا اہل الذمہ بن گئے تھے جن کے جان و مال کی حفاظت کی اسلامی ریاست ضمانت دیتی تھی اور جس کے عوض یہ قبائل نقدیا جنس یا دونوں میں جزیہ مدینہ کو ادا کرتے تھے جیسا کہ نجران کے عیسائیوں اور بحرین کے زرتشتیوں / مجوسیوں نے کیا تھا یا انھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا اور اسلامی اُمت کے مکمل رکن بن گئے تھے جس کے سبب ان کو مکمل مراعات و حقوق حاصل ہوگئے تھے۔ دونوں صورتوں میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم افراد، گروہوں اور قبائل کو ایک کتاب (صحیفہ، پروانہ) عطا فرماتے تھے:

جس میں، ان کے حقوق اور اسلامی ریاست کے تئیں ان کے فرائض و واجبات بصراحت تحریر ہوتے تھے۔[۲۹۶]

یہ حقیقت یہاں غور کرنے کے قابل ہے کہ غزوۂ احزاب کے بعد کسی حد تک اور فتح مکہ کے بعد پوری طرح سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبائل عرب سے جو معاہدے کئے یا ان کو جو صحیفے اور کتاب عنایت فرمائے وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ماقبل فتح کے زمانے کے معاہدوں اور صحیفوں یا کتابوں سے قطعی مختلف ہیں۔ پہلے زمانے کے معاہدوں اور صحیفوں میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فریق ثانی کے ساتھ باہمی تعاون اور دوستی کے معاہدے کئے ہیں اور جن قبائل عرب سے کسی وجہ سے اس قسم کے دفاعی معاہدے نہیں ہو سکے ان کو غیر جانبدار رکھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ مسلمانوں کی کسی قبیلہ/ شہر سے آویزش کے زمانے میں کسی فریق کا ساتھ نہ دیں۔[۲۹۷] لیکن ان معاہدوں اور صحیفوں میں جو فتح مکہ کے بعد جاری کئے گئے اسلامی ریاست کے سیاسی اقتدار اعلیٰ اور بالادستی کو تسلیم کرنے اور مدینہ منورہ کے مقرر کردہ انتظامی افسروں اور عاملوں کی اطاعت و فرمانبرداری کو لازمی شرط قرار دیا گیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اب عربوں کے سامنے صرف دو متبادل رہ گئے تھے: یا تو وہ اسلام قبول کر کے اسلامی اُمّت کے رکن بن جائیں اور حکمرانوں میں شامل ہو جائیں یا اسلامی ریاست میں سماجی اور سیاسی طور پر ایک فروتر درجہ پر قانع رہیں اور اسلامی حکومت کو جزیہ ادا کریں۔ اب اسلامی حکومت کے حلیف بن کر رہنے کا زمانہ ختم ہو گیا۔[۲۹۸] مختصر یہ کہ اسلامی ریاست کی رکنیت ہر ایک کے لئے ناگزیر ہو گئی تھی۔ کوئی قبیلہ، علاقہ یا فرد مدینہ کے سیاسی دائرہ اقتدار کے پرے نہیں رہ سکتا تھا۔ عرب حالات کے رُخ کو بخوبی پہچانتے تھے اور انھوں نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ کسی نہ کسی شکل میں اسلامی ریاست کی رکنیت اختیار کئے بغیر چارہ نہیں۔ اسی لئے اتنے بےشمار وفود اتنی تیز رفتاری سے مدینہ پہنچ کر اطاعت و فرمانبرداری کا اظہار کرنے لگے تھے۔

لیکن ابھی تک کچھ ایسے علاقے اور قبیلے رہ گئے تھے جو اسلامی ریاست کے حلقۂ وفاداری و اطاعت سے باہر تھے۔ یہ انتشار و مزاحمت کے چھوٹے چھوٹے دائرے یا جزیرے تھے جو زیادہ تر جزیرہ نمائے عرب کے شمال بعید میں سرحد شام و عراق کے قریب اور جنوب بعید میں یمن اور حضرموت میں اور جنوب مشرق بعید میں عمان وغیرہ میں تھے۔ ان کے علاوہ کچھ ایسے ہی مرکز دشمن چھوٹے چھوٹے آبادی کے جزیرے جزیرہ نمائے عرب میں جہاں تہاں بکھرے ہوئے تھے۔ اسلامی ریاست کی سب سے زیادہ اور سخت مزاحمت و مخالفت شمالی علاقوں کے قبائل نے کی تھی، خاص طور سے غسان نے کیونکہ ان کو بازنطینی سلطنت کی پشت پناہی حاصل تھی۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان قبیلوں کے خلاف متعدد مہمیں بھیجنی پڑی تھیں۔ لیکن اس وقت تک شمال کے ان قبیلوں نے اسلامی ریاست کے اقتدار کو نہیں للکارا تھا۔ انھوں نے یا تو حملوں کے منصوبے بنائے تھے یا لوٹ مار کی تھی اور وہ بھی پورے قبیلوں نے نہیں کی تھی بلکہ مجرم تھوڑے سے شرپسند تھے۔ لیکن ۸ھ میں سفیر نبوی کا قتل غسانی حکمراں کے ہاتھوں دراصل ایک منظم حکومت کی اسلامی ریاست کو دھمکی اور للکار تھی۔[۲۹۹] اور اگر اسلامی ریاست کو اپنا وجود، اقتدار اور افتخار برقرار رکھنا تھا تو اس قسم کے اقدامات کا مداوا کرنا لازمی تھا۔ موتہ کی جنگ نے اگرچہ غسانی حکمراں پر اپنی ناراضگی اور ناپسندیدگی ظاہر کر دی تھی تاہم غسانی بادشاہت کے بڑھتے ہوئے حوصلوں کو ابھی پست کرنا باقی تھا۔ اس کے علاوہ بعض دوسرے عرب قبائل کے ساتھ مفاہمت اور دوستی بھی اس علاقہ میں کسی مزید کارروائی کے لئے ضروری تھی۔ اس سلسلے میں ضروری

زمین ہموار کرنے کا فریضہ حضرات عمرو بن العاص اور ابو عبیدہ بن جراح کی مہموں نے انجام دیا تھا۔[۳۰۰] ان کے بعد ایک سال سے زیادہ شمالی سرحد یا محاذ پر مکمل سکون رہا۔ لیکن یہ سکون غالباً کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ تھا۔[۳۰۱] چنانچہ رجب ۹ھ / اکتوبر ۶۳۰ء میں اس محاذ پر جنگ کے بادل منڈلانے لگے جب بلقاء[۳۰۲] میں رومی افواج اور ان کے عرب باجگذار و مددگار قبائل بالخصوص لخم، جذام، غسان اور عاملہ وغیرہ کے اجتماع کی خبریں مدینہ پہنچنے لگیں۔[۳۰۳] نبطی تاجروں[۳۰۴] نے اور غالباً دوسرے ذرائع نے بھی جن میں مسلمان جاسوس بھی شامل تھے اسلامی ریاست پر رومی حملے کا خدشہ ظاہر کیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب ان پیہم خبروں سے یقین ہو گیا تو آپ نے سرحد ہی پر دشمن کو روکنے کی غرض سے تیس ہزار سپاہ پر مشتمل ایک لشکرِ جرار کے ساتھ پیش قدمی کی اور کوچ پر کوچ کرتے ہوئے تبوک میں خیمہ زن ہوئے۔[۳۰۵] آپ کے اس جرأت مندانہ اور بروقت اقدام سے دشمن کو مقابلے پر آنے کی جرأت نہ ہوئی اور وہ اسی خاموشی کے ساتھ تتر بتر ہو گئے تھے جس احتیاط و خاموشی کے ساتھ وہ جمع ہوئے تھے۔

تبوک میں ڈیڑھ دو ماہ کے قیام کے بعد جب آپ کو یقین ہو گیا کہ دشمن کا خطرہ جاتا رہا ہے تو آپ نے کچھ چھوٹے موٹے اور بعض خاصے بڑے سرایا مختلف علاقوں میں بھیجے۔ اتنے بڑے لشکر کے ساتھ تبوک میں آپ کا یوں تزک و احتشام کے ساتھ قیام قرب و جوار کے قبیلوں اور علاقوں کے حکمرانوں اور آبادیوں دونوں کو مرعوب کرنے کے لئے کافی رہا تھا۔ اور ان پر اسلامی ریاست کی سیاسی اور فوجی طاقت کا بے انتہا اثر پڑا تھا۔ چنانچہ اس کا ایک تو یہ اثر ہوا کہ شمالی علاقے کے بازنطینی حکومت کے وفادار و باجگذار حکمران اور سرحد کے پار ان کے سیاسی آقا اچھی طرح سمجھ گئے کہ اب جزیرہ نمائے عرب کے معاملات میں مداخلت مہنگی پڑے گی۔ دوسرا فوری اثر یہ ہوا کہ شامی سرحد کے اس پار کے قبائل نے اپنی قسمت کو اسلامی ریاست کے ساتھ وابستہ کرنے میں بہتری سمجھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان تمام قبیلوں، علاقوں اور چھوٹی موٹی ریاستوں نے جن میں بعض یہودی بستیاں اور عیسائی بادشاہتیں شامل تھیں اسلامی ریاست کے ساتھ معاہدے اور صلح نامے کر لئے تھے۔ بازنطینی سلطنت کے قدیم نمک خوار اور باجگذار یا کم از کم ان کے سیاسی ہمدرد جیسے شاہ ایلہ،[۳۰۶] مقنا،[۳۰۷] جرباء اور اذرح[۳۰۸] کے یہودی اور دومۃ الجندل[۳۰۹] کے عیسائی بادشاہ نے جزیہ دینے کا معاہدہ کیا تھا[۳۱۰] اور اس طرح اسلامی حکومت کے ذمی بن گئے تھے۔ کچھ مدّت کے بعد ان علاقوں میں مدینہ کے مرکزی نمائندے بھی مقرر کر دئے گئے تھے اور غزوۂ تبوک کے بعد متعدد شمالی قبائل نے یا تو اسلام قبول کرنے کے لئے یا سیاسی وفاداری کے اظہار میں اپنے وفود مدینہ بھیجے تھے۔ ان میں عراق کی سرحد کے قریب آباد بنو بکر بن وائل اور بنو تغلب کے عیسائی قبیلے بھی شامل تھے جنھوں نے زکوٰۃ سے دوگنا جزیہ ادا کرنے کا معاہدہ کیا تھا۔[۳۱۱] اس طرح ۹ھ / ۶۳۰ء کے اختتام تک اسلامی اقتدار کی حدود شامی اور عراقی سرحدوں تک وسیع ہو گئی تھیں۔

شمال بعید کے علاقوں کے برعکس جنوب بعید کے علاقوں اور ان کے قبیلوں کا معاملہ قطعی مختلف تھا۔ یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ مکہ کے جنوب بلکہ جنوب بعید میں اسلامی ریاست کے اقتدار کی ہلکی سی بھی پرچھائیں فتح مکہ تک نہیں پڑی تھی اگرچہ اسلام نے اپنے سایۂ رحمت کو روزِ اوّل سے جنوبی عرب پر پھیلا دیا تھا۔ بہرحال اسلامی اقتدار کا پہلا ذائقہ جنوبی عربوں نے اس وقت چکھا جب آغاز ۹ھ / وسط ۶۳۰ء میں پہلی مسلمان مہم وہاں پہنچی۔ لیکن یہ حقیقت ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ یہ جماعت یا مہم فوجی

سے زیادہ مذہبی تھی مگر چونکہ گوناگوں اسباب و عوامل کے سبب عددی اعتبار سے یہ خاصی بڑی جماعت تھی اور فوجی لحاظ سے کسی بھی غیر متوقع حالت یا واقعہ کا سامنا بخوبی کر سکتی تھی اس لئے اس کو یا اس کے بعد آنے والی جماعتوں کو مہم کہہ دیا جاتا ہے۔ بہرحال کل پانچ مہمیں حیاتِ نبویؐ میں صفر ۹ھ / مئی، جون ۶۳۰ء اور ربیع الاوّل ۱۱ھ / جون ۶۳۲ء کے درمیانی عرصے میں جنوبی عرب کے مختلف علاقوں میں بھیجی گئی تھیں۔ ان میں سے پہلی دو مہمیں تو خاصی چھوٹی جماعتیں تھیں جو نہ دیع ۹ھ میں قبیلہ خثعم کے ایک خاندان کے علاقے تبالہ میں اور بنو کلاب کے خلاف بھیجی گئی تھیں۔[۳۱۲] ظاہر ہے کہ وہ پورے قبیلہ کے خلاف کوئی فوجی کارروائی نہیں تھی اگرچہ تیسری مہم کافی بڑی تھی کہ اس میں تین سو مسلم شامل تھے تاہم وہ کسی جنوبی عرب قبیلہ کے خلاف نہ تھی بلکہ اس کا مقصد حبشہ کے بعض لٹیروں کی سرکوبی کرنا تھا جو سمندر پار کر کے لوٹ مار کی غرض سے جنوبی ساحلی علاقے یا جزیرہ شعیبہ میں آ گئے تھے۔ حضرت علقمہ بن مجزز مدلجی کی قیادت میں مسلمان فوج کا یہ پہلا سمندری فوجی کارنامہ تھا کیونکہ واقدی اور ابنِ سعد کے مطابق اُنھوں نے کشتیوں (مراکب) کے ذریعہ جدّہ کے ساحل سے غالباً کسی جزیرہ کا جو بحرِ قلزم میں واقع تھا سفر کیا تھا۔ بہرحال ان کی آمد پر حبشی لٹیرے بھاگ گئے تھے۔[۳۱۳]

کسی جنوبی عرب کے قبیلے یا علاقے میں پہلی اہم مسلم مہم ربیع الاول ۱۰ھ / جون، جولائی ۶۳۱ء میں گئی تھی جب حضرت خالد بن ولید مخزومی چار سو مسلمانوں کو لے کر بنو الحارث بن کعب یا دوسری روایات کے مطابق نجران کے بنو عبدالمدان کے علاقے میں پہنچے تھے۔ طبری کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت خالد کی یہ مہم فوجی ہرگز نہیں تھی بلکہ وہ ایک تبلیغی جماعت تھی جس کا اوّلین و آخرین مقصد اسلام کی اشاعت و تبلیغ کرنا تھا۔ طبری کے علاوہ دوسرے مآخذ سے بھی واضح ہوتا ہے کہ قبیلہ مذکورہ و متعلقہ نے دعوتِ اسلامی قبول کی تھی اور اس میں حضرت خالد بن ولید مخزومی کو مکمل کامیابی حاصل ہوئی تھی۔[۳۱۴] اس کے بعد رمضان ۱۰ھ / دسمبر ۶۳۱ء میں حضرت علی بن ابی طالب ہاشمی کی مہم جنوبی عرب کے ایک اہم قبیلے مذحج میں پہنچی تھی۔ وہ بھی ایک تبلیغی مشن تھا۔ معمولی سی جھڑپ کے بعد مذحج نے ہتھیار ڈال دئے تھے اور اسلام قبول کر لیا تھا۔ ان کے قبولِ اسلام کے بعد حضرت علی نے ان کا مال اور ان کے قیدی واپس کر دئے تھے اور اس طرح ان کے باقی غیر مسلم طبقات کے بھی دل جیت لئے تھے۔ پھر وہ ان کے صدقات لے کر واپس ہوئے اور مکہ میں اس وقت پہنچے جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنا آخری حج ادا کر رہے تھے۔[۳۱۵]

اس طرح یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ عہدِ نبوی میں جنوبی عرب کے قبائل میں سے کسی کے خلاف کوئی فوجی اقدام نہیں کیا گیا تھا۔ مآخذ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جنوبی قبائل میں سے اکثر و بیشتر بلکہ تقریباً سب نے اسلامی ریاست کے ساتھ اپنا رشتہ وفاداری یا تو قبولِ اسلام کے ذریعہ استوار کیا تھا یا سیاسی اتحاد و معاہدہ کے ذریعہ۔ اس کی صریح شہادت بلاذری کے اس بیان میں ملتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ "جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور و عروج کی خبر اہلِ یمن تک پہنچی تو انھوں نے خدمتِ نبوی میں اپنے وفود بھیجنے میں بڑی سرعت کی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو کتاب / صحیفے لکھ کر دئے اور یمنیوں نے اپنے صدقات ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ جب اُنھوں نے اسلام بھی قبول کر لیا تو جناب رسالتمآبؐ نے ان کے پاس اپنے پیغامبر اور منتظمین بھیجے تاکہ وہ ان کو اسلام کے بنیادی اصولوں اور سنّتِ نبویؐ کی تعلیم دیں اور ان کے صدقات وصول کریں۔ آپ نے ان لوگوں پر

جزیہ عائد کیا جو یہودیت، عیسائیت یا مجوسیت پر قائم رہے۔"[۳۱۶] بلاذری کے اس بیان کی تصدیق جنوب عرب سے کثیر تعداد میں آنے والے وفود سے بھی ہوتی ہے۔ ابن سعد کے مطابق عرب کے طول و عرض سے آنے والے اکہتر وفود میں سے تقریباً ایک تہائی صرف جنوبی عرب کے قبیلوں نے بھیجے تھے۔"[۳۱۷] ان تاریخی حقائق کی روشنی میں یہ امر پوری طرح سے واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام تلوار یا طاقت کے بجائے تبلیغ و تحریض، ایقان و اذعان اور دل کا یقین تھا جس نے یمن اور اس کے اردگرد کے علاقے کو اسلامی ریاست میں مدغم کیا تھا۔ ایک طرح سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ جنوبی عرب کے قبیلوں نے اپنی مرضی و خوشی، ارادہ و قصد اور سوچ سمجھ سے اسلام قبول کر کے اسلامی ریاست کی رکنیت کا شرف حاصل کیا تھا۔

مذکورہ بالا طویل تاریخی بحث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے مآخذ کا یہ دعوٰی بالکل بجا اور حقیقی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے جب میدانِ عرفات میں اپنا عظیم اور تاریخی خطبہ ارشاد فرمایا تو اس وقت پورا جزیرہ نمائے عرب شمال میں شام و عراق کی سرحدوں سے یمن و حضرموت کے کناروں تک جنوب میں، اور مغرب میں بحر قلزم سے خلیج فارس و ایرانی حدود تک مشرق میں، نہ صرف اسلامی ریاست کے سیاسی اقتدار اعلیٰ اور برتری کو تسلیم کر چکا تھا بلکہ وہ اسلامی معاشرہ کا ایک جزو بن چکا تھا وہ اسلامی معاشرہ اور وہ اسلامی ریاست جو اسلام پر یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین پر مبنی تھی۔

باب دوم

قبائلِ عرب اور اسلام

اگرچہ اسلامی ریاست کی تنظیم و تشکیل اور ارتقا کے گوناگوں اسباب و عوامل تھے جن میں سیاسی تنظیم، سماجی ہم آہنگی اور فوجی مہموں میں بظاہر سب سے زیادہ حصہ لیا تھا تاہم سچ یہ ہے کہ ان تمام رنگا رنگ کاوشوں اور کاہشوں کی ایک اور صرف ایک اساس تھی — یعنی اسلام، خدائے بزرگ و برتر کا نازل کیا ہوا دین، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا آخری اور کامل مذہب۔ یہی اسلام تھا جس نے مکہ کے بت پرستوں کے بیچ خدائے واحد کے ماننے والوں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اس ذاتِ برتر و اعلیٰ کا فرستادہ اور رسول جاننے والوں کو ایک متحدہ و ممتاز امت کا اولیں تصور عطا کیا تھا۔ خدا کے نازل کردہ اس دین نے مکہ کے لاچار و بے بس مسلمانوں کو اپنے ہموطنوں اور عزیزوں کے ظلم و ستم سہنے کا حوصلہ عطا کیا تھا۔ پھر اسی مذہب احمدی کے لیے انھوں نے اپنے گھر بار، اپنے عزیز و قریب، اپنے اہل و عیال کو چھوڑ کر دیارِ غیر میں بسنا اور آباد ہونا گوارا کیا تھا۔ اسی کیشِ محمدی کے لیے انھوں نے ظلم و جبر، جور و ستم اور جارحیت کے خلاف تلوار اٹھائی تھی اور اپنوں اور غیروں کے مدِمقابل ڈٹ گئے تھے۔ اسی دین کے لیے انھوں نے سب سے دشمنی مول لی تھی۔ اسی عقیدہ کے لیے انھوں نے اپنی جان و مال کی قربانی دی تھی اور آخر کار اسی مذہب نے مکہ کے منتشر و غیر منظم، بے مایہ و فروتر، بے اساس و بے بنیاد مسلمانوں کو ایک وطن، ایک معاشرہ اور ایک ریاست بخشی تھی۔ یہ ریاست جو شہر مدینہ کی حدود میں محدود تھی رفتہ رفتہ وسیع ہوتی رہی تا آنکہ پورا جزیرہ نمائے عرب اس کے اقتدارِ اعلیٰ اور حاکمیت کے دائرہ میں سمٹ کر آ گیا۔ مکی اور دوسرے مسلمانوں کے خلوص و عقیدت، عزمت و صلابت، قربانی اور جفاکشی نے اپنوں، غیروں سب کو اسلام کے بارے میں سوچنے پر مجبور کیا تھا۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمتِ کردار و بلندیٔ سیرت، حُسنِ ہدایت و تبلیغ اور اس سے بڑھ کر رحمۃ للعالمین نے ان کو گرویدہ بنایا اور اسلام کی سادگی اور سچائی، صداقت و حقانیت اور جذب و کشش نے سب کو اپنے دائرہ عمق و صفا میں سمیٹ لیا تھا۔ اسلام ہی دراصل وہ اساسِ اول تھی جس پر پہلے اسلامی معاشرے اور پھر اسلامی ریاست کی بلند و بالا عمارت تعمیر کی گئی تھی۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست مدنی عہدِ نبوی کے دس سال کے قلیل عرصہ میں تشکیل و تنظیم پا گئی تھی مگر یہ حقیقت اولیں و آخریں نگاہوں سے عموماً اوجھل رہ جاتی ہے کہ اس دہ سالہ مدنی دور سے قبل مکہ کی تیرہ برس کی وہ عظیم مدت بھی تھی جس میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اولیں پیرووں — قرآنِ کریم کے الفاظ میں سابقین اولین — نے

اپنے خونِ جگر سے اسلام کی آبیاری کی تھی۔ وہ ابتلا و آزمائش اور امتحان کی سخت گذرگاہوں سے گزرے تھے تب یہاں تک پہونچے تھے۔ مکی دورِ حیات کے ان سخت تیرہ برسوں میں خدائے واحد کے ایک اور تنہا برگزیدہ بندے نے ایک ایک گھر، ایک ایک در کو کھٹکھٹایا تھا۔ ایک ایک کر کے سب کو بلایا اور اکٹھا کیا تھا تب چند ماننے والے بنے تھے۔ ان گنتی کے ماننے والوں نے جب اپنا خونِ جگر، اپنے محبوب و مکرم رسول کے خونِ جگر میں شامل کر دیا تھا تب ایک جماعت، ایک چھوٹی سی جماعت بنی تھی۔ اس چھوٹی سی جماعت کے سر سے جب جوئے خون گزر گئی، ان میں سے بعض کے سینے تلواروں اور نیزوں سے چھلنی ہو گئے، آنکھیں لوہے کی انیوں سے بے نور ہو گئیں، پشت دہکتے انگاروں سے داغ داغ ہو گئی، جسم تپتے پتھروں اور جھلستی ریت سے آبلہ آگین بن گئے۔ پتھروں کی مار سے چوٹی کا خون پاؤں کی جوتی میں بھر بھر گیا تب مکہ کی سنگلاخ و سنگین سرزمین میں اسلام کی کونپل پھوٹی اور خدا کے دین کا پودا پھلا پھولا تھا۔ پھر جیتے جاگتے خون سے سینچے گئے اس پودے کی نشو و نما قابلِ دید تھی۔ صرف مکہ کی تپتی اور پیاسی چٹانیں صدیوں کے بعد ٹھنڈے سائے سے لطف اندوز نہیں ہوئی تھیں بلکہ اس کی شاخیں اتنی وسیع ہوئیں کہ جزیرہ نمائے عرب کے گوشے گوشے اور چپے چپے پر ان کا سایۂ رحمت، رافت پھیل گیا اور عرب کے تمام تپیدہ باشندوں نے اس کے تلے چین و سکون کا سانس لیا تھا۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اسلام پہلے پہل مکہ کے باسیوں خاص کر قریش کے مختلف خاندانوں میں پھیلا تھا ہمارے بعض جدید مؤرخین اور سیرت نگاروں نے یہ غلط فہمی پیدا کر دی ہے کہ قریش کے بعض قبائل یا خاندانوں نے اسلام کی مخالفت سب سے زیادہ کی تھی۔ عہدِ جدید میں برصغیر پاک و ہند کے عظیم ترین سیرت نگار و مورخِ اسلام مولانا شبلی نعمانی فرماتے ہیں کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو خاندانِ بنو امیہ اپنے رقیب (بنو ہاشم) کی فتح خیال کرتا تھا اس لیے سب سے زیادہ اسی قبیلہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی۔ بدر کے سوا باقی تمام لڑائیاں ابو سفیان ہی نے برپا کیں اور وہی ان لڑائیوں میں رئیس لشکر رہا۔"[1] یہ اور اسی قسم کے دوسرے بیانات تاریخ کی کسوٹی پر کھرے نہیں اترتے۔ نہ بنو امیہ اور بنو ہاشم میں اس وقت تک کوئی رقابت تھی، نہ خاندانِ بنو امیہ رسالتِ محمدی کو اپنے مفروضہ رقیب بنو ہاشم کی فتح خیال کرتا تھا اور نہ بنو امیہ نے اسلام کی سب سے زیادہ مخالفت کی تھی اور نہ ہی ابو سفیان بن حرب اموی نے کسی قبائلی عصبیت یا خاندانی رقابت یا ذاتی عداوت کے سبب اسلام کے خلاف جنگیں برپا کی تھیں[2]۔ عموماً حقیقت نگاہوں سے اوجھل رہ جاتی ہے کہ اسلام کی مخالفت یا محبت دونوں ہی قبائلی خطوط پر نہیں ہوئی تھیں اور نہ ہی اس کی مخالفت اور چاہت میں قبائلی یا خاندانی تعصب کو دخل رہا۔ اسلام کی جس نے بھی مخالفت کی تھی اس نے خدا اور رسول کی دشمنی میں کی تھی اور جس نے بھی اسے قبول و منظور کیا تھا اس نے خدا اور رسول کی محبت میں کیا تھا۔ یہ ممکن ہے کہ مخالفین نے اپنی انفرادی حیثیت میں گروہی یا جماعتی یا قبائلی عصبیت سے بھی کام لیا ہو بالکل اسی طرح جس طرح کہ بعض عرب قبائل نے گروہی تعصب، قبائلی عصبیت اور جاہلی حمیّت کی بنا پر اسلامی ریاست کی مخالفت کی تھی لیکن اسلام کی محبت اور دشمنی میں قبائلِ عرب عام طور سے اور قبائلِ قریش خاص طور سے بجائے خود

منقسم تھے۔ چونکہ اسلام کا آغاز قریش مکہ کے درمیان ہوا تھا اور وہی اسلام کے علمبرداروں (اور مخالفوں میں بھی) سر فہرست تھے۔ [۳] رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمنواؤں میں سابقین اولین اور اسلامی ریاست کے بانیوں میں ممتاز و نمایاں ترین تھے اس لیے اسلام کی قبائل عرب کے درمیان اشاعت کا مطالعہ انہی سے شروع کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے اور یہی تاریخی ترتیب واقعات یا ترقیت کا بھی تقاضا ہے

قریش مکہ

اولین مسلم یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہاشمی کے بعد جن چار مکیوں نے اسلام قبول کیا ان میں حضرت خدیجہ بنت خویلد کا تعلق قریش کے خاندان بنی اسد سے، حضرت ابو بکر عبداللہ بن ابی قحافہ عثمان کا بنو تیم سے، حضرت علی ابن ابی طالب کا بنو ہاشم سے اور حضرت زید بن حارثہ کا نسلاً بنو کلب سے مگر عملاً بنو ہاشم سے تھا۔ [۴] یہ وہ سابقین اولین تھے جو اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے سب سے پہلے بے بہا اور گرانقدر جاہر تھے اور بلا کسی کد و کاوش کے پہلے اسلام کے پیرو اور پھر اس کے اولین داعی بنے تھے۔ ان کے سوا قریش کے تمام افراد، خاندانوں اور قبیلوں نے اسلام کی دعوت کو قبول کرنے میں پس و پیش کیا تھا یا اس کو قبول کرنے سے سرے سے انکار کر دیا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو پہلے پہل بنو عبدالمطلب بن ہاشم نے اس طرح ٹھکرا دیا تھا [۵] جس طرح کوہ صفا پر آپ کے اعلان حق کو دوسرے قبائل قریش نے۔ [۶] اگر کوئی قبائلی یا خاندانی عصبیت تھی جس نے اسلام کی مخالفت کی تھی تو وہ ان تمام قبائل قریش مکہ کی یکساں مخالفت و عداوت تھی۔ اس میں کسی کو کسی پر نہ امتیاز حاصل تھا اور نہ ہی ان کے بیچ کوئی تفریق تھی۔ گروہوں، خاندانوں اور قبیلوں نے بحیثیت مجموعی مختلف اسباب و عوامل سے دعوت اسلامی مسترد ضرور کر دی مگر انہی کے افراد اسلام کے سحر حلال کے اثر سے نہ بچ سکے اور رفتہ رفتہ اس کے حلقہ بگوش بنتے گئے۔

مکہ کے اولین مسلمانوں کے درمیان قبول اسلام میں سبقت کے لحاظ سے کس کو شرف عظمت و افتخار دیا جانا چاہیے اس مسئلے پر ہمارے قدیم و جدید دونوں مؤرخین اور اہل سیر کا اختلاف ہے۔ ہماری قدیم روایات میں سے بعض یہ شرف حضرت خدیجہ کو، بعض حضرت ابو بکر کو، بعض حضرت زید بن حارثہ کو اور بعض حضرت علی بن ابی طالب کو دیتی ہیں۔ [۷] قدیم و جدید دونوں مورخین نے اپنے اپنے مذہبی رجحانات اور شخصی میلانات کے سبب ان میں سے بعض کو دوسرے پر ترجیح دی ہے جبکہ بعض صلح جو اور تطبیق پسند طبقوں نے بیچ کی راہ نکالی ہے کہ ان چاروں سابقین اولین کو اپنے اپنے طبقہ کا پہلا مسلمان تسلیم کر لیا ہے۔ [۸] مستشرقین نے بھی اس پر اکثر کلام کیا ہے اور عہد جدید کے نامور مورخ مونٹگمری واٹ نے ان میں سے حضرت خدیجہ کو بلا شک و شبہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے پہلا مسلم گردانا ہے اور ان کے بعد حضرت زید بن حارثہ کو۔ اگرچہ وہ حضرات علی اور ابو بکر کے اسلام کو بھی ایک لحاظ سے قدیم ترین اعلان حق تسلیم کرنے کو تیار ہیں تاہم وہ اول الذکر کے اسلام کو اہمیت کے ان کی صغر سنی کے سبب قائل نہیں ہیں اور موخر الذکر کے بارے میں ان کا



خیال ہے کہ بعد کے زمانے میں ان کی عظمت کا پرتو ان کے ابتدائی عہد پر پڑا ہے اور ان کی اولیت اسلام کی دعویدار روایات اسی کی مظہر ہیں۔ بہرحال وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اپنے سماجی اعتبارات اور تبلیغی اثرات کے لحاظ سے حضرت ابوبکر کا اسلام اہم ترین اور دوررس نتائج کا حامل تھا۔ یہ مسلمہ حقیقت ہے اور اس کا اعتراف کرنا چاہیے۔(۹)

جہاں تک سبقتِ اسلام میں عددی ترتیب یا حساب و ریاضی کے اصولِ ترتیب کا تعلق ہے اس کا سردست ہمارے اس مباحثے سے تعلق نہیں ہے کہ وہ سیرت نگارِ رسول کا کام ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ تاریخی لحاظ سے حضرت ابوبکر کے اسلام کو جو اہمیت حاصل تھی وہ مذکورہ بالا بزرگوں میں سے کسی کو حاصل نہیں تھی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکر اسلام کے سب سے بڑے، سب سے زیادہ پرجوش اور عظیم ترین داعی تھے۔ ان کے سماجی اور سیاسی مرتبے، وسیع تجارتی تعلقات اور ہمہ گیر تہذیبی اور معاشرتی اثرات نے مکہ میں اسلام پھیلانے اور قریش کے نوجوانوں کو مسلمان بنانے میں سب سے بڑا کردار ادا کیا تھا۔(۱۰) اس لیے مآخذ کے اس بیان میں کہ حضرت ابوبکر کی دعوت پر حضرات عثمان بن عفان اموی، زبیر بن عوام اسدی، عبدالرحمٰن بن عوف زہری، سعد بن ابی وقاص زہری اور طلحہ بن عبیداللہ تیمی ایمان لائے تھے اور پہلے آٹھ مسلمانوں میں تھے،(۱۱) کذب و افترا کا ذرا سا بھی عنصر نہیں ہے۔ ان مسلمانوں کی سبقتِ اسلام کو محض اس لیے نہیں مسترد کیا جا سکتا یا مشتبہ سمجھا جا سکتا کہ وہ بعد کے زمانے میں امت کے عظیم ترین افراد اور شہادت عمر کے وقت ریاستِ اسلامی کے عظیم ترین قائدین میں تھے۔(۱۲) ممکن ہے کہ ان میں سب کو یا بعض کو ترتیب ریاضی کے لحاظ سے دوسرے سابقین پر سبقت کی فضیلت نہ حاصل رہی ہو جیسا کہ حضرات عثمان بن مظعون جمحی، خالد بن سعید اموی، ابوذر غفاری اور عمرو بن عبسہ ازدی وغیرہ کے دعوائے اولیت اور ترتیب سبقت سے معلوم ہوتا ہے لیکن محض ان متاخر الذکر بزرگوں یا ان کی جانب سے مورخین کے دعووں کی بنا پر مذکورہ بالا آٹھ سابقین اولین کی سبقتِ اسلام سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ایک مثال کافی ہوگی حضرت ابوذر غفاری کے بارے میں مآخذ کا اتفاق ہے کہ وہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور و بعثت اور اسلام کا شہرہ سن کر اسلام کی طرف مائل ہوئے تھے اور پھر اپنے بھائی کے ذریعہ اس کی تصدیق کی تھی اور جب ان کی روداد سے مطمئن نہیں ہوئے تو خود مکہ آئے۔ یہ وہ وقت تھا کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم دارِ ارقم میں قیام فرما چکے تھے اور مکہ میں مسلمانوں پر قریش کی مخالفت کی دہشت سوار تھی۔(۱۳) مآخذ کے مطابق دارِ ارقم میں قیامِ نبوی کا آغاز ۴ نبوی / ۶۱۴ء سے ہوا تھا جو غالباً اسلام عمر کے زمانے ۶ نبوی / ۶۱۶ء تک جاری رہا تھا۔ اس وقت تک متعدد مکی مسلمان ہو چکے تھے جبکہ ابوذر غفاری اسی مدت کے دوران کسی وقت اسلام لائے تھے لہٰذا ان کو وہ سبقتِ اسلام حاصل نہ تھی جیسا کہ ان کی جانب سے مورخین کا دعویٰ ملتا ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ اسلام میں سبقتِ اسلام کی اہمیت ضرور ہے لیکن محض اس کی بنا پر طبقۂ اشراف (NOBILITY) میں شمولیت نہیں حاصل ہو جاتی۔ اس کی درخشاں مثال حضرت عمر بن خطاب کا اسلام ہے۔ حسابی ترتیب کے مطابق صحابیٔ موصوف کا پچاس مسلمانوں کے بعد نمبر آتا ہے(۱۴) لیکن تاریخ اسلام کا کوئی دیانتدار طالب علم ان کی فضیلت و اہمیت سے انکار نہیں کر سکتا۔ بہرحال، اصولِ ریاضی کی ترتیب حسابی کی مورخین کے

نزدیک یا مآخذ تاریخ اسلامی میں اہمیت ہو نہ ہو اس کی تاریخ اسلام یا مذہب اسلام میں جہاں تک مکی عہد کے مسلمانوں کی ترتیب کا تعلق ہے زیادہ اہمیت نہیں ہے کیوں کہ قرآن کریم سابقین اولین کے معاملے میں اس کی کوئی رو رعایت نہیں کرتا اور نہ ان کے درمیان کوئی خط تفریق کھینچتا ہے[۱۵] عملی لحاظ سے دار ارقم میں قیام نبوی سے ماقبل اور مابعد زمانے کی بھی کوئی خاص تخصیص نہیں ہے۔ ثواب و اجر اخروی کی بات اور ہے لیکن اس دنیا میں اس کی تفریق نہ تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے روا رکھی تھی اور نہ اسلام کے صدر اول میں اس کی کوئی زیادہ اہمیت گردانی گئی۔

بہرحال تمام مکی مسلمانوں کی بلا لحاظ ترتیب حسابی یکساں اہمیت تھی اور ان میں سے ہر ایک کو ایک سا شرف سبقت اور شرف صحبت حاصل تھا کیوں کہ قرآن کریم ہجرت مدینہ کو خط تفریق و امتیاز قرار دیتا ہے[۱۶] ابن اسحاق اور ابن سعد نے جن مکی مسلمانوں کو قدیم الاسلام کہا اور اولین مسلموں میں شمار کیا ہے وہ بلا ریب صحیح ہے اور ان میں حسابی ترتیب تلاش کرنا بے سود ہے۔ ابن اسحاق نے مذکورہ بالا آٹھ نو سابقین اولین کے ذکر کے بعد مزید چھیالیس[۴۶] قدیم مسلمانوں کی فہرست دی ہے ان کا تعلق قریش کے مختلف خاندانوں سے تھا۔ ان میں قریشی بھی تھے اور ان کے قبائل عرب کے متعدد حلفاء اور موالی بھی ان سابقین اولین کے ایک تحلیلی مطالعہ سے یہ بات پایۂ ثبوت و اعتبار کو پہنچ جاتی ہے کہ اسلام کی اشاعت قبائلی یا خاندانی خطوط پر نہیں ہوئی تھی اور نہ اس میں قبائلی رقابت اور خاندانی عصبیت نے کوئی حصہ لیا تھا یا رکاوٹ ڈالی تھی۔ یہ دلچسپی کی بات ہے کہ اس مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قریش کے متعدد سربرآوردہ خاندانوں کے افراد کس طرح اسلام کے حلقہ بگوش بنے تھے۔ ذیل میں ابن اسحاق کی ترتیب کے مطابق[۱۷]، جو کوئی تاریخی یا حسابی ترتیب نہیں ہے۔ ان سابقین اولین کے قبول اسلام کا مطالعہ پیش کیا جارہا ہے

۱۔ بنو حارث بن فہر سے : حضرت ابو عبیدہ بن جراح

۲۔ بنو مخزوم سے : حضرت ابو سلمہ بن ابو الاسد، ارقم بن ابی ارقم، عیاش بن ابی ربیعہ اور ان کی زوجہ، محترمہ سلامہ تمیمی اور اس خاندان کے مذحجی حلیف عمار بن یاسر عنسی

۳۔ بنو جمح سے : حضرت عثمان بن مظعون، ان کے دو بھائی قدامہ اور عبداللہ اور ایک فرزند سائب بن عثمان حاطب بن حارث اور ان کی اہلیہ فاطمہ بنت مجلل، حطاب بن حارث اور ان کی اہلیہ فکیہہ بنت یسار اور حاطب و خطاب کے تیسرے بھائی معمر بن حارث۔

۴۔ بنو المطلب سے : حضرت عبیدہ بن حارث

۵۔ بنو عدی سے : حضرات سعید بن زید اور ان کی اہلیہ فاطمہ بنت خطاب، نعیم بن عبداللہ النحام اور خاندان بنو عدی کے حلفاء، عامر بن ربیعہ عنزی، واقد بن عبداللہ تمیمی اور بنو بکیر/ بنو بکر بن عبد مناۃ / کنانہ کے خالد، عامر عاقل اور ایاس۔

۶۔ بنو تیم سے : حضرات اسماء بنت ابی بکر اور ان کی بہن عائشہ، خاندان صدیق کے مولیٰ عامر بن فہیرہ اور ان کے

حلیف صہیب بن سنان (بنو نمر بن قاسط)

۷۔ بنو زہرہ سے: حضرات عمیر بن ابی وقاص، مطلب بن ازہر اور ان کی اہلیہ رملہ بنت عوف، اور بنو زہرہ کے حلفاء عبداللہ بن مسعود ہذلی، مسعود القاری اور موخر الذکر مولیٰ حضرت خباب بن ارت تمیمی۔

۸۔ بنو عامر بن لوی سے: حضرات سلیط بن عمرو بن عبد شمس اور ان کے برادر حاطب بن عمرو۔

۹۔ بنو سہم سے: حضرت خنیس بن حذافہ

۱۰۔ بنو امیہ سے: حضرات خالد بن سعید بن عاص اور ان کی اہلیہ امینہ بنت خلف خزاعی، ابو حذیفہ بن عتبہ بن ربیعہ اور بنو امیہ کے حلفاء عبداللہ بن جحش اور ان کے بھائی ابو احمد (اسد/خزیمہ)

۱۱۔ بنو ہاشم سے: حضرات جعفر بن ابی طالب اور ان کی بیوی اسماء بنت عمیس خثعمی

ابن اسحاق کا بیان ہے کہ اس زمانے میں مکہ کے لوگوں کی خاصی بڑی تعداد نے جن میں مرد و عورت دونوں شامل تھے اسلام قبول کرنا شروع کر دیا تھا اور شہر خدا میں اسلام کی اتنی شہرت ہو گئی تھی کہ ہر خاص و عام کی زبان پر اس کا ذکر ہونے لگا تھا[۱۸] مکی مسلمانوں کی یہ تعداد اسلام کی خفیہ تبلیغ کے زمانے کی تھی جو بعثت نبوی کے پہلے تین برسوں کی مدت تھی۔ گویا ۶۱۰ء اور ۶۱۳ء کے دوران لگ بھگ سو مکی مسلمان ہو چکے تھے۔ اس کے بعد اسلام کی علانیہ تبلیغ کا زمانہ شروع ہوا تھا۔ یہ عجیب بات ہے کہ ابن اسحاق نے ان ضعفاء المسلمین (کمزور مسلمانوں) کے زمانۂ قبول اسلام کا کسی زمانے میں ذکر نہیں کیا ہے، جن کے بارے میں عام شہرت یہ ہے کہ وہی اسلام کے اولیں پیرو تھے بلکہ اکثر دعویٰ کیا جاتا ہے کہ مذہب کو پہلے ماننے والے ہمیشہ کمزور لوگ ہوتے ہیں۔[۱۹] بہر حال اگرچہ ابن اسحاق کی فہرست مسلمین قدیم میں حضرات خباب بن ارت تمیمی، عبداللہ بن مسعود ہذلی اور عمار بن یاسر مذحجی کا ذکر آ گیا ہے تاہم ثانی الذکر کے بھائی عتبہ اور موخر الذکر کے والدین یاسر اور سمیہ کا ذکر نہیں ہے۔ اسی طرح موذن رسول حضرت بلال حبشی کے زمانۂ اسلام کی صراحت نہیں کی گئی ہے۔ ان کے علاوہ دوسرے ضعفاء مسلمین جیسے حضرات ابو فکیہہ، لبینہ، زنیرہ، نہدیہ اور ام عبیس وغیرہ کے قدیم الاسلام ہونے کا تو ذکر عموماً مآخذ میں ملتا ہے لیکن ان کے قبول اسلام کے زمانے کی تعیین نہیں ملتی۔[۲۰] تمام حقائق اور شواہد بہر حال اس امر کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ مذکورہ بالا تمام کمزور مسلمانوں نے بھی اسلام کی خفیہ تبلیغ کے زمانے میں ہی اسلام قبول کیا تھا۔ عام طور سے ان کمزور مسلمانوں کے قدیم الاسلام ہونے کا ذکر قریش مکہ کے ہاتھوں مسلمانوں کی تعذیب کے بیان میں ملتا ہے[۲۱] جو ۶۱۳ء اور ۶۱۵ء کی درمیانی مدت میں اپنے عروج پر تھی۔ یہ مسلمانوں کی آزمائش و ابتلا کا سخت ترین دور تھا مگر ساتھ ہی مسلمانوں کے تپ کر کندن بننے کا بھی۔

حضرت حمزہ بن عبدالمطلب ہاشمی اور حضرت عمر بن خطاب عدوی کا زمانہ قبول اسلام عموماً ۶ نبوی /۶۱۶ء بتایا جاتا ہے جو خفیہ اور علانیہ تبلیغ کے زمانے کا ایک طرح سے سنگم ہے۔ حضرت حمزہ کے بارے میں عموماً وضاحت نہیں ملتی کہ وہ کتنے مسلمانوں کے بعد اسلام لائے تھے۔ البتہ یہ بیان ملتا ہے کہ انھوں نے دار ارقم میں قیام نبوی کے زمانے میں ۶ نبوی میں اسلام قبول کیا تھا۔[۲۲] غالباً اس وقت تک مکی مسلمانوں کی تعداد تیس چالیس سے اوپر ہو چکی تھی۔ ان کے قبول اسلام کے وقت

مسلمانوں کی پکی تعداد کا صریح ذکر نہیں ملتا لیکن حضرت عمرؓ کے بارے میں روایات شاہد ہیں کہ وہ چالیس مردوں اور دس عورتوں کے بعد اسلام لائے تھے[۲۳] اور ان کا زمانہ قبولِ اسلام غالباً دارِ ارقم میں قیامِ نبوی کا آخری دن تھا۔ اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اولیں داعیوں نے علانیہ تبلیغ شروع کر دی تھی۔ مذکورہ بالا قدیم مسلمانوں کی اگر اتنی ہی تعداد تھی جتنی کہ ابنِ اسحاق نے بتائی ہے تو حضرت عمرؓ کے اسلام کی ترتیب حسابی سے متصادم نظر آتی ہے۔ بہر حال ماخذ کا یہ بیان صحیح معلوم ہوتا ہے کہ پہلی ہجرت حبشہ کے بعد حضرت عمرؓ نے اسلام قبول کیا تھا۔ ممکن ہے ان کا نمبر پچاسواں یا اکیاونواں رہا ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کے اسلام کے بعد مکی مسلمانوں کو ایک احساسِ توقیر و تحفظ ہوا تھا اور اسلام کو ان کے سبب قوت و شوکت نصیب ہوئی تھی۔ اسلام کی تاریخِ اشاعت و تبلیغ میں یہ ایک اہم سنگِ میل تھا جب مسلمانانِ مکہ نے خوف و ہراس کی بجائے پہلی بار ایک مضبوط و مستحکم امت کا احساس کیا تھا۔

ماخذ کے مطابق پہلی ہجرتِ حبشہ ۵ نبوی / ۶۱۵ء میں مکہ کے گیارہ مسلمان مردوں اور چار عورتوں نے پہلی بار خدا کی راہ میں اپنا گھر بار چھوڑا تھا اور وہ باجماعت حبشہ گئے تھے۔[۲۴] اس کے ایک سال بعد ۶ نبوی / ۶۱۶ء میں حبشہ کو دوسری ہجرت ہوئی جس میں ۸۳ یا ۸۶ مکی مسلمانوں نے ہجرت کی تھی۔ ابنِ اسحاق کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسری ہجرتِ حبشہ نہ تو پہلی ہجرت کے مکمل ایک سال بعد ہوئی تھی اور نہ ہی باجماعت بلکہ پہلی ہجرت کے بعد سے مسلسل اکا دکا کرکے مکی مسلمان جاتے رہے تا آنکہ ان کی تعداد دیارِ ہجرت میں ۸۳ یا ۸۶ ہو گئی۔ ابنِ اسحاق نے اس ضمن میں ایک اہم نکتہ یہ بیان کیا ہے کہ مذکورہ بالا تعداد مہاجرینِ مکہ کے بالغ مردوں اور عورتوں کی تھی اور ان میں چھوٹی عمر کے بچے شامل نہیں تھے جو اپنے والدین یا دوسرے بزرگوں کے ساتھ گئے تھے۔[۲۵] اس طرح سے یہ تعدادِ مہاجرین مجموعی طور سے کئی گنا زیادہ ہو جاتی ہے۔ ایک موٹے سے اندازے کے مطابق دو تین سو مسلمانوں نے ۶۱۶ء تک حبشہ میں پناہ لے لی تھی۔

ماخذ سے ثابت ہوتا ہے کہ مہاجرینِ حبشہ کے ترکِ وطن کے بعد بھی مکہ میں مسلمانوں کی معتدبہ تعداد موجود تھی جو گوناگوں اسباب سے ہجرت نہیں کر سکے تھے۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ مکہ میں وہی مسلمان باقی رہ گئے تھے جن کو اپنے خاندانوں کا یا کسی اور طرح کا قبائلی تحفظ (جوار) حاصل تھا اور ہجرتِ حبشہ پر وہ لوگ مجبور ہوئے تھے جو اس قبائلی تحفظ سے محروم ہو گئے تھے اور ان کے اپنے خاندانوں نے ان کو چھوڑ دیا تھا۔[۲۶] بہر حال ہجرتِ حبشہ ثانیہ کے بعد مکہ میں باقی رہ جانے والوں میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اہلِ بیت اطہر کے علاوہ متعدد قریشی سربرآوردہ خاندانوں کے افراد جیسے حضرات ابوبکرؓ، عمرؓ، علیؓ، عبداللہ النحام وغیرہ بھی تھے[۲۷] اور حضرات بلالؓ، زنیرہ، نہدیہ اور ام عُبیس جیسے ضعفا مسلمین بھی۔ یہ کمزور مسلمان اپنی ذاتی مجبوریوں کے سبب ترکِ وطن بھی نہیں کر سکتے تھے[۲۸]

مکی دورِ حیاتِ نبوی کے نصف اول کے خاتمہ پر مسلمانانِ مکہ کی کتنی تعداد تھی؟ اس سوال کا جواب دینا آسان نہیں ہے خصوصاً اس حقیقت کے پیشِ نظر کہ ہمارے پاس اس زمانے کے مکہ کی آبادی کے اعداد و شمار نہیں ہیں تاہم ایک موٹے سے تخمینہ کی بنیاد پر ان کی تعداد کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اگر ۶۱۶ء کے اواخر میں بالغ مکی مسلمانوں

کی تعداد بشمول مہاجرین حبشہ دو سو بھی فرض کرلی جائے جو اس زمانے میں یقینی طور پر تھی اور ہر بالغ کے ماتحت ارکانِ خاندان یعنی بیوی، بچوں، غلام و نوکر اور دوسرے ماتحت افراد کی تعداد فی کس ۵ یا ۶ بھی مان لی جائے تو مکہ کے مسلمانوں کی تعداد ایک ہزار سے بھی تجاوز کر جاتی ہے۔ بالغ مسلمانانِ مکہ میں سے کچھ کو اگر تنہا بھی تسلیم کر لیا جائے تو بھی یہ تعداد کسی طرح سات آٹھ سو سے کم نہیں معلوم ہوتی اس خیال کے ثبوت میں چند مثالوں کی ضرورت ہے

ہم پہلی مثال خود خاندانِ رسالت مآب سے لیتے ہیں۔ مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بعثت تک کئی بچوں اور بچیوں کے والد ماجد بن چکے تھے۔ اگرچہ آپ کی اولادِ نرینہ زیادہ دنوں تک بقید حیات نہیں رہی تاہم آپ کی دخترانِ گرامی چار تھیں جو ہجرت کے بعد تک زندہ رہیں۔[۲۹] اس طرح مکی عہد میں ۹ھ نبوی/۶۱۹ء تک آپ کا مقدس گھرانہ بشمول آپ کے کم از کم چھ افراد پر مشتمل تھا۔ ان میں آپ کے موالی، غلام یا گھریلو یا تجارت کے نوکر شامل نہیں ہیں۔ ان میں سے بعض کے اسمائے گرامی مآخذ میں مذکور ہیں۔ حضرت زید بن حارثہ جو آپ کے آزاد کردہ غلام اور متبنیٰ تھے آپ کے گھرانے کے ہی ایک فرد تھے۔[۳۰] حضرت زید کا اپنا گھرانہ تھا۔ ان کی اہلیہ حضرت ام ایمن تھیں[۳۱] اور ان کے کم از کم ایک فرزند حضرت اسامہ مکہ میں پیدا ہو چکے تھے اور بوقتِ ہجرت لگ بھگ دس برس کے تھے[۳۲] ان کے علاوہ حضرت خدیجہ کے بعض غلاموں اور تجارت میں شامل نوکروں کا ذکر ملتا ہے ان میں حضرت میسرہ کا نام کافی نمایاں ہے۔[۳۳] بعض دوسرے غلامانِ رسول جیسے حضرات ابو رافع،[۳۴] صالح شقران،[۳۵] رافع،[۳۶] ابو کبشہ،[۳۷] انسہ[۳۸] وغیرہ کا بھی ذکر ملتا ہے جو مکی عہد میں خاندانِ رسول سے وابستہ تھے اور ہجرت کرکے مدینہ گئے تھے۔ اس طرح محض خاندانِ رسول کے مسلمانوں کی تعداد کم از کم پندرہ تھی۔

دوسری مثال حضرت ابوبکر صدیق کی ہے۔ عام طور سے ان کے خاندان کے مسلمانوں میں ان کی دو صاحبزادیوں حضرات اسماء اور عائشہ[۳۹] اور ان کے آزاد کردہ غلام عامر بن فہیرہ[۴۰] کا ذکر کیا جاتا ہے۔ گویا کہ خاندانِ صدیقی میں محض چار افراد مکی مسلمان تھے حالانکہ یہ حقیقت کے خلاف ہے۔ تعجب کی بات ہے کہ مورخین نے کم از کم چار مزید ارکانِ خاندان صدیقی یعنی حضرت ابوبکر کی والدہ ماجدہ ام الخیر[۴۱] زوجہ محترمہ حضرت ام رومان[۴۲]، ایک نوجوان صاحبزادے حضرت عبداللہ[۴۳] اور موخر الذکر کی اہلیہ حضرت عاتکہ بنت زید تیمی[۴۴] کو مسلمانانِ مکہ میں شامل نہیں کیا ہے۔ ہمارے جدید عہد کے مستشرقین جو اپنی وسعتِ نظر، خوبیٔ نظر، خوبیٔ تحقیق اور ہمہ گیر نظر کے لیے شہرتِ عام رکھتے ہیں۔ ان ناموں کو یا اسی طرح اور مکی مسلمانوں کے ناموں کو اپنی فہرستوں میں نہیں شامل کر سکے ہیں۔[۴۵] بہرحال ان آٹھ ارکان کے علاوہ یہ یقینی بات ہے کہ خاندانِ صدیقی میں کچھ اور رکن بھی مسلمان تھے یا کم از کم ان کے موالی اور حلیف اور غلام اسلام قبول کر چکے تھے۔ ایک موٹے سے اندازے کے مطابق خاندانِ صدیقی کے کل مکی مسلمانوں کی تعداد دس بارہ سے کسی طور کم نہیں تھی۔

حضرت عمر فاروق کے خاندان کے مکی مسلمانوں میں صرف ان کا[۴۶] اور ان کے نابالغ فرزند حضرت عبداللہ بن عمر کا ذکر کیا جاتا ہے حالانکہ یہ حقیقت سبھی جانتے ہیں کہ ان کی ایک صاحبزادی حضرت حفصہ بھی مکی مسلمان تھیں۔[۴۷] ان دونوں فاروقی اولادوں کے علاوہ جو کافی مشہور

ہیں حضرت عمرؓ کے ایک اور صاحبزادے عبدالرحمٰن اکبر بھی تھے جو ان دونوں مذکورہ بالا کے حقیقی بھائی تھے اور ابتدائی مسلم تھے۔ ان کی والدہ ماجدہ جو حضرت عثمان بن مظعون جمحی کی بہن تھیں بھی ایک قدیم مکی مسلم تھیں۔ حضرت عمرؓ کی کم از کم ایک بہن حضرت فاطمہ بنت خطاب اور ایک بھائی حضرت زید بن خطاب تو قدیم تر مسلم تھے۔ (۴۹) ان دونوں بھائی بہنوں کے اپنے اپنے خاندان تھے۔ حضرت فاطمہ کے شوہر سعید بن زید مسلمان تھے اور ان دونوں کی کئی اولادیں مکہ میں پیدا ہو چکی تھیں۔ (۵۰) حضرت زید بن خطاب کی اہلیہ اور ان کے کم از کم دو لڑکے لڑکی بھی مکی مسلم تھے۔ (۵۱) ان کے علاوہ حضرت عمرؓ کی ایک اور بیوی بھی اسی مکی عہد میں مسلمان ہو گئی تھیں۔ (۵۲) ان کے ایک غلام حضرت مہجع اولین مسلمانوں میں شامل تھے اور بعد میں وہ بدر میں شہید ہوئے۔ (۵۳) اس طرح صرف خاندانِ فاروقی سات آٹھ نفوس پر مشتمل تھا اور اس کا قوی امکان ہے کہ ان کے بعض دوسرے فرزندوں اور دختروں کے علاوہ ان کے بعض غلام اور موالی بھی مسلمان رہے ہوں۔ ان کے بعض مسلمان حلیفوں اور ان کے خاندانوں کے بارے میں بھی تفصیلات ملتی ہیں جن سے ان کے مکی عہد کے مسلمانوں کی تعداد کا اندازہ ہوتا ہے۔

ان تین اہم گھرانوں کے علاوہ مختصراً بعض دوسرے قریشی گھرانوں کے مسلمانوں کی تعداد کا بھی حوالہ دیا جانا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ تفصیلات ذرا دیر بعد قریش مکہ کے مختلف بطون کے مسلمانوں کے مطالعہ کے ضمن میں دیکھیں گے۔ بنو مطلب کے حضرت عبیدہ بن حارث کا اپنا گھرانہ کم از کم بارہ افراد پر مشتمل تھا۔ (۵۴) حضرت عثمان بن مظعون جمحی کا گھرانہ بھی اسی طرح دس بارہ مسلمانوں پر مشتمل تھا۔ اسی طرح حارث بن قیس سہمی کے فرزندوں میں سے تقریباً دس ابتدائی مسلمان تھے۔ (۵۵) ظاہر ہے کہ ان فرزندوں کی ازواج و اولاد بھی تھی اور وہ تقریباً سب مسلمان تھی۔ اس طرح ان کے مسلمانوں کی تعداد کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔

قریشی خاندان کے اصل اراکین کے علاوہ ان کے خاص حلیفوں کے خاندانوں کے مطالعہ سے ہمارے خیال کی مزید تصدیق ہوتی ہے۔ بنو غنم بن دودان جو قریشی خاندان کے حلیف تھے سب کے سب مکی عہد میں مسلمان ہو گئے تھے۔ ابن اسحاق نے ان کے جلیل مردوں اور آٹھ/نو عورتوں کے نام اپنی فہرست مہاجرین مدینہ میں گنائے ہیں اور ان کو مکی عہد کا قدیم مسلم قرار دیا ہے۔ ابن سعد اور ابن حزم اندلسی کی روایت سے نہ صرف اس کی تائید ہوتی ہے بلکہ یہ مزید معلوم ہوتا ہے کہ صرف ان کے بالغ مردوں اور عورتوں کی تعداد چالیس تھی۔ (۵۶) ان کے مردوں میں سے چند کو چھوڑ کر سب نے جنگ بدر اور احد میں حصہ لیا تھا۔ بہرحال قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ان کے بچوں اور غلاموں اور موالی کی تعداد کیا رہی ہو گی؟ ایک تخمینے کے مطابق یہ تعداد کم از کم دو سو افراد صغیر و کبیر پر مشتمل معلوم ہوتی ہے۔ مونٹگمری واٹ اور ان کے پیش رو لیون کیتانی نے ان کے صرف انیس مردوں کے نام اپنی اپنی فہرستوں میں گنائے ہیں۔ (۵۷) حیرت اور عبرت کا مقام ہے کہ ہمارے روشن فکر اور روشن خیال مستشرقین نے تمام مسلمان عورتوں کو اپنی فہرستوں سے خارج کر دیا ہے۔ اور اس طرح بڑی ہوشیاری، سمجھداری بلکہ عیاری سے مکی مسلمانوں کی تعداد کو کم کر کے دکھانے کی کوشش کی ہے۔ اسی طرح سعد بن لیث / کنانہ کے ایک قریشی حلیف خاندانِ بنو بکیر کے کل مرد و عورت مسلمانوں کی تعداد خاصی تھی جب کہ ان کے محض چار پانچ مردوں کو عام طور سے شمار کیا جاتا ہے۔ (۵۸) اس سے زیادہ حیرت انگیز معاملہ بنو غنی کے ساتھ ہوا ہے جو بنو ہاشم خاص کر حضرت حمزہ بن عبدالمطلب ہاشمی کے حلیف تھے۔ عام طور سے ان کے باپ بیٹوں کا مکی مسلمانوں میں ذکر کیا جاتا ہے۔ (۵۹) جبکہ یہ ثابت ہے کہ بنو غنی میں صرف یہی حضرات مکی مسلمانوں میں نہیں شامل تھے۔ ان کے افراد کا کوئی حتمی یا ظنی تعین کے

بغیر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے خاندان کے مسلمانوں کی تعداد بلا ریب اس سے کہیں زیادہ تھی جتنی کہ بتائی جاتی ہے۔[۶۰]

ان متعدد حتمی مثالوں سے یہ دعویٰ دلیل کو پہنچتا ہے کہ فی بالغ مرد کم از کم چھ سات اس کے ماتحت اراکین کو بھی مکی مسلمانوں میں شمار کرنا چاہیے۔ یہ نتیجہ ایک عام اوسط کی بنا پر نکلتا ہے۔ آبادی کے اعداد و شمار کی غیر موجودگی میں یہ اوسط حقیقت اور قیاس کے قرین ہے اور ابتدائی عہد کے مسلمانوں کی کوئی فہرست بھی بناتے وقت اس کا لحاظ رکھنا لازمی ہے۔

عام تاثر یہ ہے کہ مکی عہد کے نصف آخر میں ہجرت حبشہ یا اسلام عمر کے بعد مکہ میں اسلام کی اشاعت رک گئی تھی اور ۶۱۶ء اور ۶۲۲ء کے درمیان شہر خدا نہ صرف بنجر ہو گیا تھا بلکہ اس میں قبولِ اسلام کی صلاحیت ہی نہیں رہ گئی تھی۔[۶۱] ماخذ سے بھی یہی تاثر ملتا ہے اور اس کی وجہ غالباً یہی ہے کہ ہمارے قدیم مؤرخین و مستند سیرت نگاروں کی توجہ اس موضوع سے ہٹ گئی اور وہ دوسرے اہم موضوعات جیسے قریش مکہ کے ہاتھوں ابتدائی مسلمانوں خاص کر ضعفا المسلمین کی تعذیب، خاندان بنی ہاشم کے سماجی مقاطعہ، حضرت خدیجہؓ اور ابو طالب کی وفات کے المناک حادثوں، طائف کے غمناک و حسرت ناک سفر نبوی، قبائل عرب کے سامنے تبلیغ اسلام کی کوششوں اور پھر مدینہ منورہ کے اوس و خزرج میں اشاعتِ اسلام اور ہجرت مدینہ کے موضوعات میں ایسے الجھے کہ اس موضوع پر ان کی نگاہ نہیں رہی تاہم ماخذ میں گنتی کی سہی چند ایسی روایتیں ملتی ہیں جو اس زمانے میں مکہ میں اسلام کی نشر و اشاعت کی طرف واضح اشارہ کرتی ہیں۔

بلاذری کا بیان ہے کہ حضرات عمرؓ و ابو عبیدہ بن جراح اور حمزہ وغیرہ مکہ کے لوگوں میں علانیہ تبلیغ کرتے تھے جبکہ حضرات ابو بکرؓ، عثمانؓ اور سعید بن زید وغیرہ لوگوں کو خفیہ طریقے سے دعوت دیتے تھے۔[۶۲] اگرچہ بلاذری ان پرجوش مبلغوں کی سرگرمیوں کے نتائج کی طرف واضح اشارہ نہیں کرتے تاہم یہ نتیجہ اخذ کرنا درست ہوگا کہ ان کی کوششیں خاصی کامیاب رہی تھیں۔ جدید مؤرخین میں سے بعض کا یہ خیال صحیح معلوم ہوتا ہے کہ بنو عدی، بنو سہم، بنو امیہ اور بنو تیم وغیرہ کے موالی اور حلفاء میں سے بہت سے حضرات اسی زمانے میں اسلام لائے تھے۔[۶۳] اس کے علاوہ متعدد قریشی خاندانوں کے بہت سے مکی مسلمانوں کے زمانۂ قبولِ اسلام کا تعلق بھی اسی مکی حیاتِ نبوی کے دورِ آخر سے تھا جیسے کہ ابنِ سعد کے مکی مسلمانوں کے سوانحی خاکوں سے علم ہوتا ہے۔[۶۴] اس ضمن میں اس روایت کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا جس کے مطابق حضرت ابو بکرؓ قریشِ مکہ کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر حبشہ ہجرت کر جانے کے لیے وطن سے نکلے تھے ہی کہ راستے سے ان کو قبیلۂ قارہ کا سردار ابن الدغنہ اپنی حفاظت و امان میں مکہ واپس لایا۔ امان کی شرط کے مطابق حضرت ابو بکرؓ نے کچھ دنوں تک تو نمازوں میں قرآن کریم کی تلاوت آہستہ آہستہ کی مگر طبیعت کی روانی پر وہ قابو نہیں پا سکے اور زور زور سے تلاوت کرنے لگے۔ رقیق القلب آدمی تھے، خود روتے تھے اور اپنے سننے والوں کو رلاتے۔ پڑوسی کافروں نے ابن الدغنہ سے حضرت ابو بکرؓ کی شکایت کی کہ ان کی تلاوت و گریہ زاری سے ان کے اہلِ خانہ پر اثر پڑتا ہے۔ حضرت ابو بکرؓ نے امان واپس کر دی مگر زور سے تلاوت کرنے سے باز نہیں آئے۔ اس روایت میں اگرچہ صرف یہ بیان کیا گیا ہے کہ ان کی سحر کن تلاوت کلامِ ربانی کا اثر پڑوسی غیر مسلم قریشیوں کے بیوی بچوں پر پڑتا تھا[۶۵] تاہم اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ کفارِ قریش کو شکایت ان کی تلاوت کے سبب ان کے اہلِ خانہ میں تبلیغِ اسلام کے سبب زیادہ تھی۔ بہرحال یہ طے شدہ حقیقت ہے کہ

مکہ میں اسلام کی اشاعت ہجرت مدینہ تک برابر جاری رہی تھی۔ ممکن ہے کہ اس کی رفتار خاصی سست اور پہلے زمانے کے مقابلہ میں کافی کم رہی ہو۔ مکی حیاتِ نبوی کے نصف ثانی کے دوران مکہ میں اشاعت اسلام کی مثالیں ہم کو قریش کے مختلف بطون (خاندانوں) پر بحث میں ملیں گی۔

مکہ مکرمہ میں تبلیغ اسلام کا تیسرا دور ہجرت نبوی اور صلح حدیبیہ کا درمیانی زمانہ یعنی ۶۲۲ء اور ۶۲۸ء کا چھ سالہ درمیانی عرصہ ہے۔ ہمارا عموماً تاثر اس زمانے کے بارے میں بھی اس سے مختلف نہیں ہے جو مکی دورِ حیات کے نصف آخر کے بارے میں ہے۔ یہ تاثر صریح تاریخی حقائق کے خلاف ہے۔ ہجرت نبوی کے بعد نہ مکہ مسلمانوں سے تہی ہو گیا تھا اور نہ ہی قبولِ اسلام کی صلاحیت سے عاری۔ مسلمانانِ مکہ کی غالب اکثریت ضرور ہجرت کر گئی تھی لیکن اسلام نے مکہ سے ہجرت نہیں کی تھی۔ جدید مورخین نے ایک غلط فہمی یہ بھی عام کر دی ہے کہ ہجرتِ نبوی سے کچھ پہلے مکہ سے چند مسلمانوں کے سوا اور باقی سب مدینہ چلے گئے تھے۔[66] حالانکہ یہ حقیقت کے خلاف ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج و اولاد مکہ ہی میں رہ گئی تھی۔[67] اسی طرح خاندانِ صدیقی کے تمام مسلم اراکین نے ہجرتِ نبوی کے بعد مدینہ کے لیے رخت سفر باندھا تھا[68] حضرات طلحہ و زبیر نے بھی رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہجرت کی تھی۔[69] اس کے علاوہ متعدد اکابر صحابہ نے بعد میں مدینہ کو ہجرت کی تھی۔[70] یہ تو مہاجرینِ مکہ کا معاملہ تھا۔ مکہ میں باقی ماندہ ابتدائی مسلمانوں میں حضرت نعیم بن عبداللہ النحام تیمی کا پورا گھرانہ تھا جو تقریباً چالیس افراد پر مشتمل تھا اور انھوں نے کافی مدت کے بعد مدینہ کے لیے رختِ سفر باندھا تھا۔[71] ان کے علاوہ مکہ میں اور بھی متعدد اور سربرآوردہ قریشی خاندانوں کے مسلمان ہجرت کے بعد مقیم رہے تھے اور ان کو اپنے خاندان والوں کا تحفظ حاصل تھا۔[72] بہرحال کمزور مسلمانوں کی ثابت قدمی، تعذیب و ایذا پر صبر اور قید و حبس کے اندھیروں میں بھی عزیمت و صلابت نے اگر ایک طرف مکہ میں اسلام کی شمع روشن رکھی تھی تو دوسری طرف مذہب خداوندی کی اپنی تاثیر تھی۔ اس کی یہ تاثیر اور دلوں میں گھر کر جانے والی صلاحیت تو ایک تھی مگر اس کو قبول کرنے والوں کے طبائع مختلف تھے۔ قرآنِ کریم کے الفاظ و تشبیہ میں بارش کا پانی تو ایک اور اس کی قوتِ نشو و نما یکساں ہوتی ہے مگر اس کو قبول کرنے والی مٹی کی طبیعت مختلف ہوتی ہے۔ نرم مٹی پانی فوراً جذب کر لیتی ہے۔ سخت مٹی قبول و جذب میں نسبتاً دیر لگاتی ہے اور چٹانیں اور پتھر اسے قبول کرنے سے یکسر انکار کر دیتے ہیں لیکن ان میں سے بھی بعض ایسے ہوتے ہیں جو اگر پانی روک لیں تو آہستہ آہستہ نم ہو جاتے ہیں اور کبھی کبھی اس کے مستقل اثر سے پھٹ بھی جاتے ہیں۔ اسلام کی بھی تاثیر یہی تھی جس نے مکہ کے سخت اور پتھر دلوں میں بھی دراڑیں پیدا کر دی تھیں۔ اس دور میں ایک اور عنصر بھی مکیوں کے قبولِ اسلام کا سبب بنا ہوگا اور وہ تھا قریش مکہ اور مسلمانانِ مدینہ کا مسلح تصادم اور مسلسل آویزش، مکہ کے بہت سے سمجھدار لوگوں نے اسلام و کفر کی اس آویزش میں بھی اسلام کی صداقت دیکھی تھی۔ ان میں سے جن لوگوں نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمتِ عام کا تجربہ کیا تھا وہ بلا تکلف اسلام کے دائرہ میں داخل ہو گئے تھے۔ وہب بن عمیر بن امیہ بن خلف جمحی[73] اور ولید بن ولید بن مغیرہ مخزومی[74] کا قبولِ اسلام اس زمانہ کی دو درخشاں مثالیں ہیں۔

صلح حدیبیہ قریش مکہ کے مکمل قبولِ اسلام کا دیباچہ تھی۔ ابن اسحاق وغیرہ(۶۵) قدیم ماخذ نے اس کو تبلیغ اسلام کا اہم ترین زمانہ قرار دیا ہے جب لوگ جوق در جوق اور ذوق و شوق اسلام کی طرف از خود پروانہ وار آتے رہے تھے۔ ماخذ کے اس بیان کو عام جزیرہ نمائے عرب کے قبائل کے پس منظر میں تو دیکھنا ہی چاہئے مگر خاص طور سے اسے قریش کے پس منظر میں بھی دیکھنا ضروری ہے کہ ان کا اصل زور بطونِ قریش کے قبولِ اسلام پر ہے۔ صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کے درمیان دو برس ۶۲۸ء تا ۶۳۰ء کا مختصر وقفہ مکہ میں اشاعت اسلام کا چوتھا اور اہم مرحلہ تھا جب وہاں کا ہر سوچنے سمجھنے والا اور حق کو ماننے والا طبقہ اور فرد اسلام کے دائرے میں داخل ہو چکا تھا۔ ہمارے ماخذ عموماً بعض انتہائی اہم حضرات کے قبولِ اسلام کا ذکر اس زمانے میں کرتے ہیں۔ ابن سعد نے حضرات خالد بن ولید مخزومی، عمرو بن عاص سہمی اور عثمان بن طلحہ عبدری کے ایک ساتھ قبولِ اسلام کا ذکر کیا ہے(۶۶)۔ مگر دوسرے ماخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرات یزید و معاویہ فرزندان ابی سفیان بن حرب اموی اور(۶۷) نہ جانے کتنے دوسرے قریشی زعماء اور قائدین نے اسی زمانے میں اسلام قبول کیا تھا۔ انفرادی اور اجتماعی قبولِ اسلام کی مثالیں ہم کو مختلف بطونِ قریش میں اشاعت اسلام کی بحث میں ملیں گی۔

فتح مکہ ۶۳۰ء جنوری، مکہ میں اسلام کی قبولیت کا نقطۂ عروج و کمال تھا۔ اسلامی ریاست کی دنیاوی جاہ و حشمت کے سائے میں مکہ کے قریشی اسلام کے دائرہ میں داخل ہو چکے تھے اور جو کچھ کسر رہ گئی تھی وہ رحمتِ نبوی، رافتِ احمدی اور عفوِ محمدی نے اپنے بے پایاں و بیکراں اظہارِ عنایت سے پوری کر دی تھی۔ مکہ۔ وہی مغرور و ظالم و ستمگر مکہ جس نے اللہ کا نام لینے کے جرم میں اللہ کے رسول اور مسلمانوں پر جینا حرام کر دیا تھا اور بالآخر ان کو جلا وطن کر کے چھوڑا تھا۔ اسی اللہ کا ماننے والا اور اس کے رسول کا چاہنے والا بن چکا تھا۔ اور قریش کے وہی زعماء اور قائدین جو اسلام کا چراغ بجھانے کی ہر ممکن کوشش کر چکے اور ناکام رہ چکے تھے اب اسی دین کی خاطر خدا کے گھر کو بتوں سے پاک کر رہے تھے۔ یہی نہیں بلکہ عرب کے چپے چپے پر قائم کفر کے مرکزوں اور خدا ناترسی اور ناشناسی کے اداروں کو اپنے ہی ہاتھوں خاک میں ملا رہے تھے۔ وہ سالاران قریش جنہوں نے بدر، احد، خندق اور دوسری متعدد جنگوں اور آویزشوں میں اسلام سے ٹکر لی تھی اب وہی اس کی حفاظت و اشاعت کے لیے کبھی حنین و طائف کے معرکوں میں سرگرمِ کارزار تھے اور کبھی تبوک اور دومہ کے صحراؤں میں اسلام کے علمبردار تھے۔ قریش کے وہی سردار و شیوخ جو اسلام کی اشاعت و تبلیغ میں اب تک رکاوٹیں پیدا کرتے رہے تھے اب خود اس کے مبلغ اور داعی بن چکے تھے اور سب کو اسلام کی دعوت دے رہے تھے۔(۶۸)

مکہ میں اشاعتِ اسلام کے اس عمومی جائزے کے بعد ضروری معلوم ہوتا ہے کہ قریش کے مختلف خاندانوں (بطون)، کے قبولِ اسلام کا الگ الگ تجزیہ کیا جائے۔ اس سے ایک طرف تو یہ حقیقت عیاں ہوگی کہ مکہ میں اسلام کی اشاعت قبائلی خطوط پر نہیں ہوئی تھی اور اس میں قبائلی / خاندانی رقابت و عصبیت کو دخل نہیں تھا اور دوسری طرف قریش کے ہر بطن (خاندان)، کا اسلام اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رویہ و سلوک بھی اجاگر ہوگا۔ یہ ایک بین سماجی حقیقت ہے کہ افراد کا اپنے اپنے خاندانوں میں خاص کر اور اپنے علاقے کے سماج میں عام طور سے ایک مقام اور

اثر ہوتا ہے اور سربرآوردہ اور اہم افراد ہی عموماً کسی سماجی اور تہذیبی تحریک کی داغ بیل ڈالتے ہیں اور اس کو پروان چڑھاتے ہیں۔ اس لیے بھی یہ تجزیہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اس تجزیے سے مکہ میں اسلام کی اشاعت کی تاریخی توقیت بھی متعین کرنے میں مدد ملے گی اور ان سب سے بڑھ کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مکی کارنامے کا خاص کر اور مدنی عہد میں مکہ پر اپنے اثرات کا عام طور سے صحیح جائزہ لینے اور اس کی اصل قدر و قیمت متعین کرنے کا تاریخی ذریعہ بھی پورا کیا جا سکے گا۔

اس جائزے سے پہلے بعض اہم نکات کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے۔ اول یہ کہ کہنے کو قریش ایک قبیلہ تھا اور اس کے متعدد خاندان تھے مگر حقیقت یہ ہے کہ بطون یا خاندان بجائے خود قبیلے بن چکے تھے اور ان خاندانوں کی اپنی ذیلی شاخیں اور گھرانے تھے چنانچہ اس جائزے میں ان بطون کی مختلف شاخوں اور گھرانوں کو مدِنظر رکھ کر بحث کی گئی ہے تاکہ قبائلی اور خاندانی عصبیت یا حمایتِ اسلام کا بھی لگے ہاتھوں تجزیہ ہوتا رہے، دوم یہ کہ اس جائزے میں مختلف بطونِ قریش کی ترتیب عہدِ نبوی کے مکی دور میں ان کی سماجی، اقتصادی اور سیاسی و تہذیبی اہمیت کے مطابق کی گئی ہے۔ مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعثتِ نبوی کے زمانے میں اور اس کے بعد فتح مکہ تک قریش کا سب سے بڑا اور ہر لحاظ سے اہم ترین بطن "بنو عبد مناف" کا تھا جو چار اہم بطون/خاندانوں (۹) — بنو امیہ/بنو عبد شمس، بنو ہاشم، بنو مطلب اور بنو نوفل — پر مشتمل تھا۔ اگرچہ ان چاروں "برادر" خاندانوں میں اپنے اندرونی اختلافات تھے لیکن یہ اختلافات ان کے اتحادات سے کہیں کم تھے۔ وہ تمام اجتماعی معاملات میں اور قریش مکہ کے دوسرے بطون یا قبائل عرب سے تعلقات کے ضمن میں بطور ایک سماجی اکائی کے کام کرتے تھے۔ بنو عبد مناف میں ہر لحاظ سے بنو عبد شمس کو اہمیت اور فوقیت حاصل تھی اور ان میں بھی خاص کر ان کے ذیلی گھرانے بنو امیہ کو۔ اسی بنا پر بنو امیہ سے دراصل تمام بنو عبد شمس مراد لیے جاتے تھے۔ بنو ہاشم رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تک خاص کر ۵۷۸ء میں عبد المطلب بن ہاشم کی وفات کے بعد سماجی، اقتصادی اور سیاسی اعتبار سے پسماندہ ہو گئے تھے جبکہ باقی اور دو خاندان یا تو اپنا سماجی مقام کھو رہے تھے یا کھو چکے تھے اور زیادہ اہم نہیں رہ گئے تھے لیکن آغازِ بحث ہم بنو ہاشم ہی سے کر رہے ہیں کہ یہی رسولِ کریم محمد بن عبد اللہ ہاشمی صلی اللہ علیہ وسلم کا خاندان تھا اور بنو ہاشم کو آپ کی نسبت ولادت سے جو شرف حاصل تھا وہ اوروں کو حاصل نہیں تھا۔

(۱) بنو عبد مناف

(الف) بنو ہاشم

بلاریب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف خاندان بنی ہاشم کے بلکہ سارے جزیرہ نمائے عرب کے اولین

مسلم تھے۔ آپ کے بعد یہ سعادت آپ کی زوجہ محترمہ حضرت خدیجہ بنت خویلد کے حصہ میں آئی تھی جو اگرچہ قبیلہ و خاندان کے لحاظ سے بنو اسد کی فرد تھیں تاہم شادی کے بعد عملی طور سے بنو ہاشم کی رکن بن چکی تھیں۔ عربوں کی قبائلی روایات کے مطابق عموماً اور اصولاً بیویاں اپنے خاوندوں کے خاندان کی رکن سمجھی جاتی تھیں۔ اسی طرح موالی اور حلیف بھی اپنے سرپرستوں یا آقاؤں کے خاندان ہی کے افراد شمار ہوتے تھے چنانچہ حضرت زید بن حارثہ کلبی کے علاوہ حضرات ابو رافع، صالح شقران، ابو کبشہ اور انسہ اور غالباً کچھ اور موالی بھی بنو ہاشم اور اہل بیت رسول کے مکی مسلمان تھے۔ حضرت زید تو تیسرے یا چوتھے مسلم تھے جبکہ باقی حضرات کے بارے میں حتمی بیان نہیں ملتا تاہم یہ بات یقینی ہے کہ وہ سابقین اولین میں شمار ہوتے تھے۔ اہل بیت کرام میں آپ کی چار بنات اطہر۔ حضرت زینب، حضرت رقیہ، حضرت ام کلثوم، حضرت فاطمہ۔ بھی ابتدائی مکی دور کی مسلم تھیں۔ آپ کی کوئی اولاد نرینہ مکہ میں زیادہ دنوں زندہ نہیں رہی ورنہ ان کا بھی شمار کی مسلمانوں میں ہوتا۔ خاندان رسول کے موالی میں حضرت زید بن حارثہ کلبی کی زوجہ محترمہ حضرت ام ایمن بھی قدیم ترین اسلام لانے والیوں میں تھیں۔ ان دونوں کے فرزند حضرت اسامہ بن زید کلبی پیدائشی مسلم تھے۔ امکان یہ ہے کہ خاندان رسول میں ان کے علاوہ بھی کچھ اور حضرات و خواتین مکی مسلم تھے۔ بہر حال موجودہ معلومات کے مطابق کم از کم پندرہ مسلمان خاندان رسالت مآب کے ایسے تھے جو مکی دور حیات کے آغاز ہی میں اسلام سے بہرہ ور ہو چکے تھے۔[80]

خاندان رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یعنی اہل بیت کرام کے علاوہ بنو ہاشم میں آپ کے چچاؤں کے گھرانے تھے ان میں ابو طالب بن عبد المطلب ہاشمی کا گھرانہ سب سے نمایاں تھا اور مدتوں تک وہ اپنے بانی خاندان کی نسبت سے طالبی خاندان (طالبیین کہلاتا رہا۔[81] سربراہ خاندان کے اسلام کے بارے میں روایات کے باوجود قدیم و جدید مورخین کا اتفاق ہے کہ وہ شرف اسلام سے محروم رہے تھے۔ اگرچہ انھوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصی و نجی محبت میں پورے قریش مکہ سے لوہا منوا لیا تھا۔[82] جس شرف سے[83] محروم رہے اس سے ان کے خاندان کے دو افراد اولاً بہرہ یاب ہوئے۔ یہ حضرات علی بن ابی طالب[84] اور جعفر بن ابی طالب تھے۔ موخر الذکر کی زوجہ محترمہ حضرت اسماء بنت عمیس خثعمی بھی قدیم کی مسلمان تھیں۔ انھوں نے اپنے شوہر کے ساتھ حبشہ کو ہجرت کی تھی۔[85] جب کہ حضرت علی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زیر سایہ مکہ میں مقیم رہے تھے۔ دوسرے فرزندان ابی طالب میں فرزند اکبر طالب کی موت کفر ہی میں ہوئی تھی[86] جبکہ تیسرے فرزند عقیل بن ابی طالب نے صلح حدیبیہ کے بعد کسی وقت یا فتح مکہ کے زمانے میں اسلام قبول کر لیا تھا۔[87] یہ دلچسپ بات ہے کہ ابی طالب کی زوجہ مقدسہ حضرت فاطمہ بنت اسد بن ہاشم نے مکہ ہی میں کسی وقت غالباً ابو طالب کی وفات کے بعد اسلام قبول کر لیا تھا اور بعد میں مدینہ کو ہجرت بھی کی تھی۔[88] ان کے فرزند عقیل کی اہلیہ فاطمہ بنت عتبہ بن ربیعہ اموی / عبد شمسی نے بھی غالباً اپنے شوہر کے ساتھ اسلام کا شرف حاصل کیا تھا۔[89] ابو طالب کی بعض دختروں کے قبول اسلام کے بارے میں بھی روایات ملتی ہیں۔ ان میں سے ام ہانی نے فتح مکہ کے دن اسلام قبول کیا تھا۔[90]

ابو لہب بن عبد المطلب ہاشمی نے اسلام کی سب سے زیادہ مخالفت کی تھی اور اس نے اسلام کبھی قبول نہیں کیا

اس دشمن اسلام اور رسول کے دو فرزندوں حضرات عتبہ اور عتیبہ نے فتح مکہ کے دن اسلام قبول کر لیا تھا اور غالباً ان کی تمام اولاد و اخلاف نے بھی (۹۱)

بنو ہاشم کا تیسرا گھرانہ عباسی تھا جس کے سربراہ حضرت عباس بن عبدالمطلب نے غالباً فتح مکہ سے کچھ قبل یا صلح حدیبیہ کے کچھ بعد اسلام قبول کیا تھا۔ اگرچہ بعض روایات ان کو مکی عہد کا قدیم مسلم ثابت کرتی ہیں لیکن یہ تاریخی حقیقت ہے کہ وہ غزوہ بدر تک مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ ان کے صحیح زمانۂ قبول کا ہم کو حتمی علم نہیں ہے کیونکہ ماخذ اس سلسلے میں کسی متعین تاریخ کا ذکر نہیں کرتے ہیں (۹۲) حضرت عباس کے فرزندان گرامی مکی عہد میں کمسن تھے اور غالباً وہ بھی اسلام کے دائرے میں اپنے والد نامدار کے ساتھ داخل ہوئے تھے ان میں حضرات فضل، قثم، عبداللہ، عبیداللہ اور معبد وغیرہ شامل تھے۔ اسی طرح حضرت عباس ہاشمی کی دختروں میں ام حبیب حضرت آمنہ اور حضرت صفیہ بھی غالباً بعد کے زمانے کی مسلمان تھیں (۹۳)۔ یہ ہاشمی گھرانہ مکی دورِ حیات میں اسلام سے آشنا نہیں ہوا تھا۔ اور ان کا زمانۂ قبولِ اسلام بدر اور فتح مکہ کے درمیان متعین کیا جا سکتا ہے جبکہ زیادہ تر حقائق آخری زمانے کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

لیکن بنو ہاشم کا چوتھا گھرانہ ابتدائی عہد کا مسلم تھا۔ یہ تھا حضرت حمزہ بن عبدالمطلب ہاشمی کا خاندان۔ حضرت حمزہ نے دار ارقم میں قیام نبوی کے زمانے میں ۶ھ نبوی میں اسلام قبول کیا تھا (۹۴)۔ ان کے خاندان کے دوسرے افراد کے اسلام کے بارے میں ہمارے ماخذ خاموش ہیں۔ اندازہ یہ ہوتا ہے کہ حضرت حمزہ کی اہلیہ غالباً اسلام نہیں لائی تھیں یا لائی تھیں اور ہجرت سے قبل وفات پا چکی تھیں کیوں کہ ان کی ایک صاحبزادی حضرت امامہ بنت حمزہ فتح مکہ کے دن بھی کافی کم عمر تھیں اور غالباً ہجرت سے کچھ قبل مکہ ہی میں پیدا ہوئیں اور وہیں رہ گئی تھیں۔ وہ غزوۂ عمرۃ القضاء (۶۲۹ء) میں حضرت جعفر بن ابی طالب ہاشمی کی تولیت میں دی گئی تھیں کیونکہ ان کی ماں سلمیٰ بنت عمیس خثعمی حضرت جعفر کی اہلیہ حضرت اسماء کی حقیقی بہن اور حضرت امامہ کی خالہ تھیں (۹۵)۔ حضرت حمزہ بن عبدالمطلب کی کوئی اولادِ نرینہ نہ تھی۔ البتہ ان کے موالی بنو غنی ابتدائی مکی مسلم تھے۔ عموماً ان میں سے صرف دو باپ بیٹوں ابو مرثد اور مرثد غنوی کا ذکر کیا جاتا ہے لیکن ابن اثیر نے ابو مرثد غنوی کے دو مزید قدیم الاسلام فرزندوں حضرات انس اور انیس کا بھی ذکر کیا ہے (۹۶)۔ یہ یقینی ہے کہ ان کے علاوہ بھی اس خاندان کے کچھ اور افراد بھی ابتدائی مسلمینِ مکہ میں شامل تھے۔

بنو حارث بن عبدالمطلب ہاشمی کا گھرانا بنو ہاشم کا پانچواں اہم گھرانا تھا۔ اس کے سربراہ کی وفات غالباً بعثت نبوی سے قبل ہی ہو چکی تھی (۹۷)۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ ان کے ایک فرزند نوفل بن حارث نے بدر کے بعد اسلام قبول کر لیا تھا مگر مدینہ کو ہجرت غزوۂ خندق کے بعد حضرت عباس بن عبدالمطلب ہاشمی کے ساتھ کی تھی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خاندانِ بنی ہاشم کے ان دونوں چچا بھتیجے کے درمیان مواخاۃ قائم کر دی تھی (۹۸)۔ لیکن یہ بیان بھی دوسرے تاریخی بیانات سے متصادم ہے اور صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ یہ ممکن ہے کہ وہ ابتدائی مسلم رہے ہوں لیکن زیادہ امکان اس کا ہے کہ انھوں نے صلح حدیبیہ کے بعد یا فتح مکہ کے زمانے میں اسلام قبول کیا تھا۔ ان کے باقی تین بھائیوں ربیعہ، عبداللہ اور ابوسفیان فرزندانِ حارث بن عبدالمطلب کے بارے میں ماخذ صراحت کرتے ہیں کہ انھوں نے فتح مکہ کے دن حلقہ بگوشِ اسلام بننا پسند کیا تھا (۹۹)۔ حضرت ابوسفیان حارثی ہاشمی کے بارے میں روایات کا اتفاق ہے کہ وہ اپنے وقت کے اچھے شاعر تھے مگر اسلام کے دشمن۔ وہ بیس برس تک اسلام اور اس

کے پیغمبرِ عظیم کی ہجو کرتے رہے تھے لیکن فتح مکہ میں ایسے پکے جاں نثارِ رسول بنے کہ غزوہ حنین کے اولین دہلۂ شکست میں جب اوروں کے پیر اکھڑ گئے تھے تو وہ ناقۂ رسول کی مہار تھامے دلیرانہ جمے رہے تھے۔ اس خاندان کے تین اور افراد حضرات جعفر بن ابی سفیان بن حارث، حارث بن نوفل بن حارث اور عبدالمطلب بن ربیعہ بن حارث نے فتح مکہ کے دن اسلام قبول کیا تھا۔[۱۰۰] اس خاندان کی تمام کتخدا اور ناکتخدا صاحبزادیوں نے غالباً اپنے بزرگوں کے ساتھ اسلام قبول کیا تھا۔ ان میں سے بعض پیدائشی مسلمان بھی تھیں۔[۱۰۱] اولین مکی مسلمانوں میں حضرت ابوسفیان بن حارث بن عبدالمطلب کی زوجہ محترمہ حضرت جمانہ جو ابوطالب کی دختر اور حضرت علی کی بہن تھیں اپنے شوہر سے قبل اسلام لاکر شامل ہو چکی تھیں اور ہجرت کر کے مدینہ آگئی تھیں۔ انہوں نے خیبر کی غنیمت کے خمس سے طعمۂ نبوی پایا تھا۔[۱۰۲]

بنو ہاشم کے بعض اور چھوٹے چھوٹے گھرانے تھے جو عبدالمطلب کے سوا ہاشم کے دوسرے بیٹوں کی نسل میں چلے تھے لیکن یہ گھرانے یا تو بعثتِ نبوی تک نابود ہو چکے تھے یا اتنے غیر اہم کہ ان کی خاندانی حیثیت جاتی رہی تھی اور ان کے صرف افراد رہ گئے تھے۔[۱۰۳]

بنو ہاشم کی متعدد خواتین نے مکہ مکرمہ میں ہی اسلام قبول کر لیا تھا۔ ان میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کئی پھوپھیاں تھیں جن میں حضرت صفیہ بنت عبدالمطلب، حضرت امیمہ بنت عبدالمطلب نمایاں تھیں۔[۱۰۴] باقی خواتین میں سے کافی نے ہجرت کے بعد اسلام قبول کیا تھا۔ جبکہ ام ہانی بنت ابی طالب جیسی خواتین بنی ہاشم نے فتح مکہ کے دن اسلام کے دائرے میں داخل ہونا پسند کیا تھا۔ خواتین کے سلسلے میں ذکر آ چکا ہے کہ ان میں سے کتخدا کو اصولاً ان کے خاوندوں کے خاندانوں کے شمار کیا جانا چاہیے جیسا کہ ہم بعض اوروں کے ضمن میں آگے چل کر دیکھیں گے۔

طبری کی روایت ہے کہ جب قرآن کریم کی آیت وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ (اور آپ اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو دعوتِ حق دیں) نازل ہوئی تو حکمِ الٰہی کی تعمیل میں آپ نے بنو عبدالمطلب کی ضیافت کا اہتمام کیا اور ان کو اسلام کی دعوت دی۔ اس مجلس میں بنو عبدالمطلب کے چالیس یا پینتالیس آزاد اور خود مختار، عاقل و بالغ، تجربہ کار و سن رسیدہ مرد اکٹھے ہوئے تھے۔[۱۰۵] اس روایت سے خاندان بنی عبدالمطلب کی عددی طاقت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے مفروضہ کے مطابق صرف اسی خاندان کے کل افراد کی تعداد ۲۴۰ اور ۲۸۰ یا ۲۷۰ اور ۳۱۵ کے درمیان رہی ہو گی ایک موٹے سے اندازے کے مطابق بنو ہاشم کی کل عددی قوت اس زمانے میں بشمول ان کے حلفاء اور موالی کے ۴۰۰ کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ اگرچہ اس دعوتِ اولین میں صرف ایک کم عمر بچے نے جو کہ میزبان تھا اور مہمانوں یا مدعوئین مجلس میں سے نہ تھا اسلام قبول کرنے کا جراتمندانہ اعلان کیا تھا۔[۱۰۶] مگر باقی نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا بہر حال رفتہ رفتہ ایک ایک دو دو کر کے یا چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں ہاشمی قبولِ اسلام کرتے چلے گئے اور فتح مکہ کے بعد سب ہی اسلامی ریاست کے رکن اور اسلام کے پیرو تھے۔

اس تجزیے سے یہ حقیقت واشگاف طور پر عیاں ہوتی ہے کہ خاندان کی محبت میں کسی ہاشمی نے اسلام قبول نہیں

کیا تھا۔ ایک ہاشمی فرد کی حیثیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ابو طالب اور ان کے خاندان والوں کی حمایت دحفاظت ماحصل عربوں کے قبائلی نظام تحفظ کا اظہار تھا نہ کہ اسلام کی حمایت و دفاع۔ بنو ہاشم نے اسلام کی شدید ترین مخالفت بھی کی تھی اور حمایت بھی۔

(ب) بنو عبد شمس / بنو امیہ

دنیاوی جاہ و حشمت کے اعتبار سے بنو عبد مناف کا سب سے زیادہ طاقت ور، مالدار اور با اثر اور عددی لحاظ سے اہم و اکبر قبیلہ، خاندان یا بطن بنو عبد شمس کا تھا۔ اس کی ایک اہم ترین شاخ بنو امیہ اتنی اہمیت اختیار کر گئی تھی کہ بنو عبد شمس عملاً بنو امیہ ہی سمجھے جانے لگے تھے۔[۱۰۷] عام خیال یہ ہے کہ بنو امیہ / بنو عبد شمس کو یہ سماجی، سیاسی اور اقتصادی بلند مقام ہاشم اور ان کے فرزند عبد المطلب کی وفات کے بعد حاصل ہوا تھا اور مکہ کی زمام سیادت کلی طور پر بنو امیہ کے ہاتھ ابو طالب ہاشمی کی وفات (۶۱۹ء) کے بعد آگئی تھی۔ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ بنو امیہ اور بنو ہاشم ایک دوسرے کے رقیب و حریف تھے۔ یہ[۱۰۸] دونوں خیال خام اور ان پر تعمیر کردہ نتائج کی دنیا محض مفروضہ باطل ہے۔ اس موضوع پر مفصل بحث کہیں اور کی جا چکی ہے۔[۱۰۹] مختصراً یہ کہ دینا یہاں کافی ہو گا کہ عبد شمس کو ہاشم کی مانند اپنے باپ عبد مناف کی زندگی میں ہی برابری کا مقام حاصل تھا اور باپ کے انتقال کے بعد اگر ہاشم کو سقایہ اور رفادہ کے عہدے ملے تھے تو عبد شمس کو قیادہ کا عظیم منصب ملا تھا اور اس طرح دونوں فرزندانِ عبد مناف کی اشرافیہ کے برابر کے رکن اور مکی سماج میں یکساں عزت و توقیر کے حقدار بن گئے تھے۔ ہاشم کی نوعمری میں وفات اور ان کے بیشتر بچوں کے بچپن میں انتقال وغیرہ کے سبب ان کی نسل صرف بنو عبد المطلب میں جاری رہی۔ بقیہ فرزندوں کی نسل جلد ہی منقطع ہو گئی جب کہ عبد شمس کے متعدد فرزندوں سے ان کی نسل خوب خوب چلی اور اس کے نتیجے میں بعثت نبوی تک بنو عبد شمس کے اپنے متعدد بطون وجود میں آچکے تھے۔ کثرت تعداد نے جو قبیلوں کی اس زمانے میں امتیازی خصوصیت تھی بنو عبد شمس کو سیاسی اور سماجی عظمت و توقیر بخشی۔ اس کے علاوہ ان کی اقتصادی صلاحیتوں نے ان کو مکی اقتصادیات میں نمایاں ترین گروہ بنا دیا۔ ان اسباب سے بنو عبد شمس کو مکی سماج میں یہ سیادت و قیادت عہد قدیم سے حاصل تھی اور عہد نبوی میں برابر حاصل رہی۔ اس قیادت کو قائم رکھنے میں بنو عبد شمس کی اپنی صلاحیتوں اور لیاقتوں کے علاوہ کل خاندان بنو عبد مناف کی تائید و تصدیق اور اتحاد کی دولت حاصل تھی۔ گویا کہ بنو عبد شمس کی عظمت و ریاست بنو ہاشم کی عظمت و ریاست تھی۔ یہ دونوں بلکہ چاروں خاندان ایک دوسرے کے دوست، حلیف اور بھائی تھے نہ کہ رقیب، حریف اور مدمقابل۔[۱۱۰]

بعثت نبوی تک بنو عبد شمس کے متعدد خاندان، بطون یا گھرانے بجائے خود ایک سماجی اکائی بن چکے تھے۔ ان میں سب سے بڑا اور اہم ترین گھرانا بنو امیہ اکبر بن عبد شمس کا تھا جو بجائے خود متعدد گھرانوں پر مشتمل تھا۔ اس کی اہم شاخیں حسب ذیل تھیں۔

(۱) بنو ابی العاص بن امیہ اکبر۔ جس کی مزید دو ذیلی شاخیں تھیں (الف) بنو عفان (حضرت عثمان کا خاندان)، (ب) بنو

حکم (حضرت مروان بن حکم کا خاندان)،

(۲) بنو حرب بن امیہ اکبر: اس کی تین اہم ترین شاخیں تھیں (الف) بنو ابو سفیان بن حرب (ب)، بنو عتبہ بن ابی سفیان اور (ج) بنو عنبسہ بن ابی سفیان۔ ان کے علاوہ بھی بعض گھرانے اس میں شامل تھے۔

(۳) بنو ابی العیص ـــ حضرت عتاب بن اسید کا گھرانہ۔

(۴) بنو ابی عمرو بن امیہ اکبر ـــ دشمن رسول عقبہ بن ابی معیط وغیرہ کا خاندان۔

(۵) بنو عاص بن امیہ اکبر ـــ ابو احیحہ سعید بن عاص کا گھرانا۔

ان کے علاوہ بنو امیہ اصغر کا گھرانا تھا جو پہلے کے مقابلہ میں یقیناً کافی چھوٹا تھا لیکن وہ اپنی جگہ خاصا بڑا گھرانا تھا ان دو اہم "اموی" خاندانوں کے بعد عبد شمس کے متعدد بیٹوں کے خاندان تھے جیسے بنو حبیب بن عبد شمس، بنو عبد امیہ بن عبد شمس، بنو نوفل بن عبد شمس، بنو ربیعہ بن عبد شمس اور بنو عبد العزیٰ بن عبد شمس۔ اول الذکر کے تین گھرانے ہو چکے تھے۔ بنو سمرہ بن حبیب، بنو ربیعہ بن حبیب اور بنو کریز بن حبیب، بنو ربیعہ بن عبد شمس کے دو افراد عتبہ بن ربیعہ اور شیبہ بن ربیعہ مکی اشرافیہ کے بعثت نبوی کے اہم ترین ستون تھے جبکہ موخر الذکر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بڑے داماد حضرت ابو العاص بن ربیع کا گھرانا تھا (۱۱۱)

خاندان بنو عبد شمس کی اس صبر آزما تفصیل کے بعد یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے بارے میں ان کا رویہ بنو ہاشم یا کسی دوسرے خاندان مکہ اور بطن قریش کے رویہ سے مختلف نہ تھا۔ ان میں سے بعض نے اسلام کی بھرپور مخالفت کی تھی تو ان کے ہی افراد نے بھرپور حمایت بھی کی تھی۔ مکی عہد میں ان میں سے بعض خاندان اسلام سے بہرہ یاب نہیں ہو سکے تھے جس طرح سے بنو ہاشم کے بعض گھرانے محروم رہے تھے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ بنو ہاشم کے بعض گھرانوں کی مانند بعض اموی / عبد شمسی گھرانوں نے بھی سبقت اسلام کی دولت پائی تھی۔ ان گھرانوں میں امیہ اکبر کے خاندان بنو ابی العاص اور بنو عاص تھے جب کہ عبد شمس کے دوسرے فرزندوں کے خاندانوں میں یہ سعادت بنو ربیعہ بن عبد شمس کے حصہ میں آئی تھی۔

خاندان بنی عاص بن امیہ اکبر میں ابو احیحہ سعید بن عاص کا گھرانا اپنی دولت و ثروت، شرافت و نجابت اور سیادت و ریاست کے لیے مکہ بھر میں ممتاز ترین سمجھا جاتا تھا اور اس کے سربراہ خاندان کو انتہائی عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔[۱۱۲] اسی "خاندان سعیدی" کے ایک فرد حضرت خالد بن سعید اموی غالباً اولین اموی مسلم تھے اور روایات کے مطابق ان کا سلسلہ صحابہ سابقین اولین میں تیسرا یا چوتھا نمبر تھا۔[۱۱۳] یہ صحیح بھی ہو سکتا ہے اور بعض جدید مؤرخین اسی کے حق میں ہیں۔ بہر حال یہ حتمی و یقینی امر ہے کہ وہ اپنے دس مکی مسلمانوں میں شامل تھے۔ ان میں سے ایک بھائی عمرو بن سعید نے غالباً ان کے اثر سے مکی عہد کے نصف اول کے آغاز ہی میں اسلام قبول کر لیا تھا۔[۱۱۴] یہ دونوں بھائی اپنے والد اور دوسرے بھائیوں اور خاندان والوں کے ظلم و ستم کا نشانہ بنے تھے اور ابن اسحاق کے بقول اپنی دونوں بیویوں

بالترتیب امینہ بنت خلف خزاعی اور فاطمہ بنت صفوان مدلجی کنانی کے ہمراہ حبشہ ہجرت کر گئے تھے۔ حضرت خالد بن سعید کی کم از کم دو اولادیں حضرت سعید اور حضرت امہ حبشہ میں پیدا ہوئی تھیں۔[115] غالباً حضرت عمرو بن سعید کی اولادیں بھی مکہ، حبشہ یا مدینہ میں پیدا ہوئی تھیں سربراہ خاندان ابو احیحہ سعید بن عاص کا بدر کے بعد کسی وقت بحالت کفر انتقال ہوا تھا جب کہ ان کے دو فرزندوں ابان بن سعید اور حکم (عبداللہ) بن سعید نے صلح حدیبیہ کے بعد یا فتح مکہ کے زمانے میں اسلام قبول کیا تھا۔ حسن اتفاق سے یہ چاروں بھائی غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے اس لیے انھوں نے اسلامی ریاست کے چار مختلف ولایتوں پر بطور والی (گورنر) حکمرانی عہد نبوی ہی میں کی تھی۔ اگرچہ ہمارے متداول مآخذ اس خاندان کے متعدد دوسرے اراکین خاص کر ان کی عورتوں کے قبول اسلام کا ذکر نہیں کرتے تاہم انساب و سوانح کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ خاندان سعیدی میں اور بھی متعدد ابتدائی مکی عہد کے اور بعد کے زمانے کے تھے۔ ان میں ابو احیحہ سعید کے ایک فرزند سعید غزوۂ طائف میں شہید ہوئے تھے۔[116] اس خاندان کی دختروں میں ایک فاختہ بنت سعید تھیں جو بعد میں رسول اکرم کے بڑے داماد حضرت ابوالعاص بن ربیع کی بیوی بنیں اور انہی سے ان کی نسل چلی۔[117]

خاندان بنی ابی العاص کے قدیم ترین مسلمان حضرت عثمان بن عفان اموی تھے جو دار ارقم میں قیام نبوی سے قبل اسلام لائے تھے اور بقول ابن اسحاق پہلے آٹھ مسلمانوں میں سے تھے۔ وہ اپنے حقیقی چچا حکم بن ابی العاص اموی کے ہاتھوں ستائے گئے تھے اور تنگ آ کر اپنی اہلیہ حضرت رقیہ بنت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ۵ نبوی میں ہجرت حبشہ کے لیے وطن سے نکل گئے مگر پھر کچھ مدت کے بعد مکہ والوں کے قبول اسلام کی خبر سن کر واپس مکہ آ گئے تھے جہاں ہجرت مدینہ تک وہ دونوں مقیم رہے۔[118] حضرت عثمان کے دوسرے بھائی بہنوں کے قبول اسلام کے بارے میں مآخذ خاموش نظر آتے ہیں۔[119] البتہ ان کی والدہ ماجدہ حضرت اروی بنت کریز ابتدائی مکی مسلم تھیں۔[120] اور ان کی ایک اموی اہلیہ حضرت رملہ بنت شیبہ بن ربیعہ ابتدائی مکی مسلمان و مہاجر مدینہ تھیں۔[121] ان کے چچا حکم بن ابی العاص کے خاندان نے فتح مکہ میں اسلام قبول کیا تھا۔ حضرت حکم کے علاوہ ان کے فرزند حضرت مروان بن حکم صحابہ میں شمار ہوتے ہیں۔ عموماً اس خاندان کے انہی دو کے قبول اسلام کا ذکر ملتا ہے۔[122] لیکن یہ یقینی معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں خاندانوں میں مزید مرد اور عورت افراد تھے جو فتح مکہ کے زمانے میں داخل اسلام ہوئے تھے۔[123] البتہ ان کے ایک مولی حضرت بیبح ابتدائی مکی مسلمان تھے جن کا تعلق حضرت خالد بن سعید اموی کے خاندان سے تھا۔[124]

بنو ربیعہ بن عبد شمس کی قسمت میں سبقت اسلام کا شرف لانے والے حضرت ابو حذیفہ بن عتبہ بن ربیعہ تھے۔ وہ تیسرے اہم اموی مکی مسلمان تھے جو نہ صرف آغاز اسلام میں مسلمان ہوئے تھے بلکہ مکہ میں اپنوں ہی کے ہاتھوں ستائے جانے کے سبب اپنی زوجہ محترمہ حضرت سہلہ بنت سہیل عامری کے ساتھ حبشہ ہجرت کر گئے تھے مگر کچھ دنوں بعد مکہ واپس آ گئے تھے اور پھر مدینہ ہجرت کی تھی وہ بدری صحابی تھے۔[125] ان کے خاندان میں ان کی ایک عم زاد بہن کے علاوہ اور کسی کے فتح مکہ سے قبل قبول اسلام کا ذکر نہیں ملتا البتہ ان کے ایک مولی حضرت سالم تھے جو بالکل آغاز میں مسلمان ہوئے تھے اور قدیم مہاجر تھے اور بدری تھے۔[126] غالباً مؤخر الذکر کا اپنا خاندان بھی تھا جو آغاز ہی میں مسلمان ہو گیا تھا۔

مآخذ کا اصرار ہے کہ بنو حرب بن امیہ کا کسی فرد نے مکی عہد میں اسلام قبول نہیں کیا تھا تاہم ان کو اعتراف ہے کہ اس

خاندانِ سفیانی کی ایک خاتون حضرت ام حبیبہ جو ابوسفیان بن حرب کی دختر تھیں ابتدائی مسلمان تھیں اور اپنے شوہر عبیداللہ بن جحش / بنو غنم بن دودان کے ساتھ حبشہ کو ۵ نبوی میں ہجرت کر گئی تھیں۔ حبشہ میں جب ان کے شوہر عیسائی ہو گئے تو وہ اسلام پر ثابت قدم رہیں اور بالآخر غالباً اسی ثبات قدمی کے سبب وہ ۶ھ / ۶۲۹ء میں ام المومنین بن کر مدینہ واپس آئیں۔(۱۲۷) عام عقیدہ یہ ہے کہ اس خاندان کے مردوں نے فتح مکہ کے دن اسلام قبول کیا تھا مگر یہ صحیح نہیں ہے بعض قوی روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ ابوسفیان بن حرب کے دو فرزندوں حضرات یزید اور معاویہ صلح حدیبیہ کے بعد غالباً عمرۃ القضیہ کے موقع پر مسلمان ہو گئے تھے(۱۲۸) اور ان کے ساتھ غالباً ان کے اہلِ خانہ بھی حضرت ابوسفیان بن حرب اپنی زوجہ حضرت ہند بنت عتبہ بن ربیعہ اور دوسرے فرزندان عتبہ اور عتیبہ وغیرہ کے ساتھ فتح مکہ کے زمانے میں اسلام لائے تھے۔(۱۲۹)

یہ حیرت کی بات ہے کہ ابوسفیان بن حرب اور ان کے خاندان کے تمام ارکان مکی عہد میں دائرہ اسلام سے خارج رہے مگر ان کے بنو غنم بن دودان کے تمام حلیف جن کی تعداد چالیس بالغوں پر مشتمل تھی ابتداء کار ہی میں مسلمان ہو گئے۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ ان کے قبولِ اسلام کا زمانہ مکی حیاتِ نبوی کا دورِ آخر ہے۔ بہرحال کوئی زمانہ رہا ہو وہ سابقین اولین میں تھے اور ان میں بعض مہاجرینِ حبشہ میں بھی شریک تھے اور بقیہ مہاجرینِ مدینہ اور بدری صحابہ میں شمار ہوتے ہیں۔ ابنِ اسحاق(۱۳۰) اور ابنِ سعد(۱۳۱) نے ان کے تیئیس مردوں کے نام گنوائے ہیں جو یہ ہیں۔

(۱) عبداللہ بن جحش (۲) ان کے بھائی ابو احمد (۳) عبداللہ کے فرزند محمد (۴) عکاشہ بن محصن (۵) شجاع بن وہب (۶) ان کے بھائی عقبہ (۷) اربد بن حمیرہ (۸) منقذ بن نباتہ (۹) سعید بن رقیش (۱۰) یزید بن رقیش (۱۱) عبدالرحمن بن رقیش (۱۲) محرز بن نضلہ (۱۳) قیس بن جابر (۱۴) عمرو بن محصن (۱۵) مالک بن عمرو (۱۶) صفوان بن عمرو (۱۷) ثقف بن عمرو (۱۸) ربیعہ بن اکثم (۱۹) زبیر بن عبید (۲۰) تمام بن عبیدہ (۲۱) سخبرہ بن عبیدہ (۲۲) ابوسنان بن محصن (۲۳) سنان بن ابی سنان۔

ابنِ اسحاق نے ان کی خواتین کے صرف آٹھ نام گنائے ہیں جو یہ ہیں، (۱) زینب بنتِ جحش (۲) ان کی بہن ام حبیب (۳) جذامہ بنتِ جندل (۴) ام قیس بنتِ محصن (۵) ام حبیب بنتِ ثمامہ (۶) آمنہ بنتِ رقیش (۷) سخبرہ بنتِ تمیم اور (۸) حمنہ بنتِ جحش۔(۱۳۲) اس طرح بنو حرب بن امیہ کے حلفاء بنی غنم بن دودان کے کل ابتدائی مسلمانوں کی تعداد ۳۱ ہوتی ہے۔ اگرچہ یہ بجائے خود اہم تعداد ہے تاہم ماخذ کے مطابق اس میں مزید نو بالغوں کے نام شامل ہونے چاہئیں۔ ان کے بچوں میں سے کسی کا ذکر نہیں کیا گیا ہے اور اس سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن جحش وغیرہ کی والدہ ماجدہ حضرت امیمہ بنتِ عبدالمطلب ہاشمی کا ذکر نہیں کیا گیا ہے جو کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ابتدائی مکی عہد کی مسلم پھوپھی تھیں۔(۱۳۳) اندازہ یہ ہے کہ حلفاء بنی حرب بن امیہ کے ابتدائی مسلمانوں کی تعداد ڈھائی تین سو کے درمیان تھی۔ اسی طرح بنو امیہ کے ایک اور حلیف حضرت معیقیب بن ابی فاطمہ دوسی تھے جو بعض روایات کے مطابق مکہ کے قدیم مسلم تھے اور ہجرت کر کے حبشہ گئے تھے اور بعض دوسری روایات کے مطابق وہ مکہ سے واپس اپنے قبیلہ دوس چلے گئے تھے۔ اور وہاں تبلیغ اسلام کرتے رہے تھے۔(۱۳۴)

خاندان بنی ابی عمرو بن امیہ اکبر کے مکی سردار عقبہ بن ابی معیط اموی نے نہ صرف اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا بلکہ وہ ابولہب ہاشمی اور ابوجہل مخزومی کی مانند اسلام اور پیغمبر اسلام کا غیر اسب سے بڑا دشمن تھا۔ وہ اپنے جنگی جرائم کے سبب غزوۂ بدر میں قتل کر دیا گیا تھا۔(۱۳۵) اسی دشمن اسلام کی جرأتمند اور دلیر دختر حضرت ام کلثوم بنت عقبہ اموی نے بعد ہجرت کسی وقت اسلام قبول کر لیا تھا اور صلح حدیبیہ کے معاہدے کے فوراً بعد دلیرانہ ہجرت کر کے مدینہ پہنچی تھیں عقبہ اموی کے تین صاحبزادوں حضرت ولید، خالد اور عمارہ نے عام روایات کے مطابق فتح مکہ کے دن اسلام قبول کیا تھا لیکن اس امکان سے یکسر انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انھوں نے اپنی بہن کی متابعت میں کچھ پہلے اسلام قبول کر لیا ہو۔(۱۳۶) یہ اس خاندان کے اہم ترین افراد کے قبول اسلام کا ذکر تھا۔ امکان قوی ہے کہ اور دوسروں نے بھی اسلام قبول کیا ہو۔(۱۳۷) بہر حال تاریخی حقیقت ہے کہ عقبہ اموی کا گھرانا ہجرت کر کے مدینہ جا بسا تھا۔

بنو عبدالعزیٰ بن عبد شمس کے ایک اہم رکن حضرت ابوالعاص بن ربیع تھے۔ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد اور دختر رسول حضرت زینب کے شوہر ہونے کے علاوہ حضرت خدیجہ کی بہن کے فرزند بھی تھے۔ روایات کے مطابق انھوں نے سنہ ۶ھ/ ۶۲۸ء میں صلح حدیبیہ سے قبل اسلام قبول کر کے مدینہ کو ہجرت کی تھی۔ ان کی ایک صاحبزادی حضرت امامہ بنت ابی العاص اموی مکی عہد کی پیدائشی مسلمان تھیں۔(۱۳۸) ان کے سوا باقی گھرانا فتح مکہ کے زمانے میں اسلام لایا تھا۔

بنو ابی العیص میں حضرت عتاب بن اسید اموی ممتاز مسلمان تھے جو فتح مکہ کے دن اپنے خاندان والوں کے ساتھ اسلام لائے تھے۔ وہ قبول اسلام کے چند دنوں کے بعد ہی اسلامی ریاست کی طرف سے مکہ کے گورنر مقرر ہوئے تھے۔ اگرچہ وہ نوجوان اور متاخر مسلمان تھے۔(۱۳۹) زبیری نے ان کے ایک بھائی خالد بن اسید کا ذکر کیا ہے جن کا کافی بڑا گھرانا تھا (۱۴۰)

بنو عبد شمس اور بنو امیہ کے باقی گھرانے اور افراد زیادہ تر فتح مکہ کے زمانے میں اسلام میں داخل ہوئے تھے۔(۱۴۱) امکان ہے کہ ان میں سے کچھ حضرات و خواتین کچھ پہلے مشرف بہ اسلام ہوئے ہوں لیکن اس کا ثبوت تلاش کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔ پھر بھی ان میں سے حضرات ابوکبیسہ حارث بن کریز، عامر بن کریز، عبداللہ بن عامر اور عبدالرحمٰن بن سمرہ وغیرہ عظیم صحابہ کا ذکر مل ہی جاتا ہے۔

اگر خاندان بنی ہاشم اور خاندان بنی امیہ کے قبول اسلام کا ایک تقابلی مطالعہ کیا جائے تو اس میں بڑی حیرت انگیز مماثلت نظر آئے گی اور واضح ہو گا کہ "خاندان بنو عبد مناف" کے ان دو برادر گھرانوں اور ان کے افراد نے اسلام اور پیغمبر اسلام کے ساتھ یکساں رویہ اپنایا تھا۔ اگر چند ہاشمیوں نے سبقت اسلام اور حمایت رسول کا شرف حاصل کیا تھا تو بعینہٖ یہی شرف چند امویوں نے بھی حاصل کیا تھا۔ اگر کچھ ہاشمیوں نے مکہ میں راہِ خدا میں تکلیفیں اٹھائی تھیں اور حبشہ ہجرت کی تھی تو امویوں نے بھی یہی قربانیاں دی تھیں۔ اگر ابوسفیان بن حرب اموی اور عقبہ بن ابی معیط اموی نے اسلام کی مخالفت کی تھی تو عناد اسلام و مخالفت رسول میں ابولہب ہاشمی اور ابوسفیان بن حارث ہاشمی کسی سے پیچھے نہیں

رہے تھے۔ دونوں خاندانوں کے کچھ افراد نے مکہ میں سبقتِ اسلام کا شرف حاصل کیا پھر ہجرتِ مدینہ کے بعد ان کے افراد اسلام قبول کرتے رہے تا آنکہ فتح مکہ کے دن وہ سب کے سب اسلام کے علمبردار بن گئے۔ اگرچہ ہمارے پاس آبادی کے اعداد و شمار نہیں ہیں تاہم ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وفاتِ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پچاس سال بعد صرف مدینہ میں امویوں کی تعداد ایک ہزار سے متجاوز تھی۔[۱۴۲] اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ فتح مکہ کے دن خاندانِ بنو عبد شمس / بنو امیہ کے کل افراد کی تعداد ایک ہزار دو ہزار افراد کے درمیان یقیناً تھی۔

(ج) بنو المطلب

بنو عبد مناف میں ہاشم اور عبد شمس کے بعد قریشی سرداروں میں جن کو ممتاز مقام حاصل تھا۔ ان میں مطلب بھی تھے اور روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہاشم کی موت کے بعد بنو ہاشم اور بنو مطلب کی مشترکہ قیادت موخرالذکر کے سربراہ خاندان کے ہاتھ میں رہی تھی کیونکہ ہاشم کے تمام فرزند بہت خورد سال تھے۔[۱۴۳] اسی طرح مطلب کی وفات کے بعد ان کے خاندان میں کوئی ایسی شخصیت نہیں ابھری جو خاندانی قیادت کی ذمہ داری سنبھال سکتی چنانچہ اس بار عبد المطلب ہاشمی نے اپنے خاندان کے علاوہ اپنے عزیز و مشفق چچا کے خاندان کی کفالت و قیادت کی ذمہ داری انجام دی۔[۱۴۴] یہی تاریخی عوامل تھے جنہوں نے ان دونوں خاندانوں کو ایک دوسرے سے قریب تر بلکہ ایک دوسرے کا حلیف، دوست اور برادر بنا دیا تھا اور بنو عبد مناف میں بنو ہاشم اور بنو عبد المطلب دوسروں کی بہ نسبت زیادہ باہمی الفت و یگانگت رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ بنو مطلب اقتصادی لحاظ سے بنو ہاشم اور بنو عبد مناف کے دوسرے گھرانوں کے دست نگر بھی تھے۔[۱۴۵] عددی قوت کے لحاظ سے بنو مطلب کا گھرانا بنو ہاشم سے بھی کافی چھوٹا تھا۔[۱۴۶] اور اس کے فروتر سماجی مقام کا ایک سبب یہ بھی تھا۔

بہرحال مکی سماج و اقتصادیات میں بنو مطلب کو امتیاز و تفوق حاصل رہا ہو یا نہ رہا ہو لیکن قبولِ اسلام میں ان کو شرفِ اولیت اور عظمتِ سبقت ضرور حاصل تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ایک پورا گھرانا بنو حارث بن مطلب آغازِ عہدِ مکہ ہی میں مسلمان ہو گیا تھا چنانچہ اس کے تین اہم ارکان حضرات عبیدہ بن حارث بن مطلب اور ان کے دو بھائیوں طفیل اور حصین کا شمار قدیم ترین مکی مسلمانوں میں ہوتا ہے۔[۱۴۷] حضرت عبیدہ، ان معدودے چند قدیم مسلمانوں میں سے ایک تھے جن کی عمر قبولِ اسلام کے وقت پچاس سے متجاوز تھی۔[۱۴۸] ماخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی دس اولادیں تھیں جن میں سے چھ بیٹے تھے اور وہ سب کے سب مسلمان تھے۔[۱۴۹] ہمارے بعض مورخین کا خیال ہے کہ ان کی تمام اولادیں کم عمر اور نابالغ تھیں مگر یہ صحیح نہیں ہے۔[۱۵۰] پچاس سال کی پختہ عمر کے عرب کی اولادیں خاص کر پہلی اولادیں جوان اور بالغ ہوتی تھیں۔ ان کے دونوں بھائیوں کی اولادیں بھی تھیں اور وہ سب بھی مسلمان تھیں۔ ماخذ سے اگرچہ اس کی مکمل تصریح نہیں ملتی ہے۔[۱۵۱] یہ تینوں بھائی مہاجرین مدینہ میں اولیت رکھتے تھے اور بدری صحابہ ہونے کا شرف بھی۔ قیاس کہتا ہے کہ ان کا پورا خاندان ابتدائی مکی مسلم تھا اور ان کے سب مرد، عورتیں اور بچے ہجرت کر کے مدینہ جا بسے تھے۔[۱۵۲]

اس خاندان کا ایک ذیلی گھرانا عباد بن مطلب کا تھا۔ اس کے اولین مسلم حضرت مسطح بن اثاثہ بن عباد تھے جو زمانۂ مکہ میں اسلام لائے تھے۔ وہ ایک طرف تو حضرت عبیدہ بن حارث مطلبی کے بھتیجے تھے تو دوسری جانب حضرت ابوبکر صدیق تیمی کے خالہ زاد بھائی بھی۔ ان کی معاشی حالت خاصی خراب تھی چنانچہ ان کی کفالت کا بار ان کے خالہ زاد بھائی حضرت ابوبکر صدیق نے اٹھا رکھا تھا اور وہ مدنی عہد میں بھی ان کی کفالت کرتے رہے تھے۔ ان کی والدہ ماجدہ حضرت ام مسطح بھی ابتدائی مکی عہد کی مسلم تھیں اور اپنے فرزند کے ساتھ ہجرت کر کے مدینہ آ بسی تھیں[۱۵۴]۔ خیال یہ ہے کہ حضرت مسطح نے حضرت ابوبکر کے زیر اثر اسلام قبول کیا تھا۔[۱۵۵] ممکن ہے کہ ان پر ان کے چچا کے خاندان کا بھی اثر پڑا ہو۔ ان کے گھرانے کے بارے میں مزید تفصیلات نہیں ملتی ہیں۔[۱۵۳]

بنو مطلب میں بنو مخرمہ بن مطلب کا گھرانا بھی شروع ہی سے اسلام سے متعارف ہُوا تھا۔ ان کے دو فرزند قیس بن مخرمہ اور صلت بن مخرمہ کے علاوہ موخرالذکر کے فرزند جہیم بن صلت اور دو پوتے حکیم بن جہیم اور عمرو بن جہیم ابتدائی مسلم تھے اور مدینہ ہجرت کر کے جا بسے تھے جہاں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو خیبر کی پیداوار کے خمس سے طعمہ (رزق/روزینہ) عطا فرمایا تھا۔[۱۵۶]

ایک اور گھرانا ہاشم بن مطلب کا تھا۔ اس کے مکی عہد کے مسلمانوں میں عبد یزید، رکانہ اور عجیر کے نام ملتے ہیں۔ امکان یہ ہے کہ انھوں نے مکی دور کے نصف آخر میں اسلام قبول کیا تھا۔[۱۵۷]

علقمہ بن مطلب کے گھرانے کے تین بزرگوں ابونبقہ عبداللہ، ندیم اور جنادہ کا شمار صحابہ کرام میں ہوتا ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ ان کا زمانۂ قبولِ اسلام کیا تھا۔[۱۵۸] ممکن ہے کہ وہ مکی دور کے مسلم ہوں اور اس کا بھی امکان ہے کہ انھوں نے بعد میں اسلام قبول کیا ہو۔

امکان ہی نہیں بلکہ تقریباً یقینی ہے کہ بنو مطلب میں اور بھی متعدد مکی اور مدنی عہد کے مسلمان تھے جن کا ذکر ماخذ میں آنے سے رہ گیا ہے۔ لیکن ان کی تعداد کیا تھی یہ کہنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے البتہ اندازہ یہ ہے کہ کل تعداد ڈیڑھ سو افراد پر مشتمل رہی ہوگی۔

(د) بنو نوفل

ہمارے ماخذ عموماً بنو ہاشم اور بنو مطلب کو ایک طبقہ بنا کر پیش کرتے ہیں اور بنو عبد شمس/ بنو امیہ اور بنو نوفل کو دوسرا طبقہ۔[۱۵۹] اور عموماً ان دونوں طبقوں کو زمانۂ جاہلیت سے ایک دوسرے کا حریف اور مدِمقابل بنا کر بھی پیش کرتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ جن اسباب و عوامل کے سبب بنو ہاشم اور بنو مطلب ایک دوسرے کے قریب تر تھے انھی کے سبب بنو امیہ اور بنو نوفل کے درمیان زیادہ ہم آہنگی تھی لیکن ان دونوں مفروضہ یا مبینہ طبقوں کے درمیان کوئی سیاسی یا سماجی رقابت یا عداوت نہیں تھی۔ ان خاندانوں کے درمیان منافرت و مسابقت کے جو بعض واقعات ملتے ہیں وہ عموماً بعد کے گھڑے ہوئے

معلوم ہوتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ ان کو عم زادوں کی چشمک کہا جا سکتا ہے، حریفوں یا دشمنوں کی رقابت نہیں۔[۱۶۰] اس باہمی چپقلش و چشمک کے باوجود مکہ کے دوسرے قریشی خاندانوں یا دوسرے قبائل عرب کے مقابلہ میں یہ چاروں خاندان ایک متحدہ لطن قریش — بنو عبد مناف — کی مانند تھے اور وہ بطور ایک سماجی اور سیاسی اکائی کے کام کرتے تھے۔

لیکن اسلام کے مقابلہ میں ہر قبیلہ اور خاندان نے قبائلی روش سے ہٹ کر الگ وطیرہ اپنایا تھا چنانچہ اس پر ذرا بھی حیرت نہیں ہونی چاہیئے کہ بنو عبد مناف کے اس گھرانے نے اپنے تینوں برادر خاندانوں کی اسلام کے سلسلہ میں ذرا بھی پیروی نہیں کی تھی۔ ابن اسحاق[۱۶۱] اور ابن سعد[۱۶۲] نے اس گھرانے کے کسی ابتدائی مکی عہد کے مسلم کا ذکر نہیں کیا ہے اور اگر کوئی ایسا رکن بنی نوفل ہے تو ان کے ایک حلیف حضرت عتبہ بن غزوان مازنی اور ان کے مولیٰ حضرت خباب، یہ دونوں ابتدائی مسلمانوں میں شامل ہونے کے علاوہ مہاجر حبشہ بھی تھے۔ اور بدری صحابہ بھی۔[۱۶۳] بعض روایات ان کے مولیٰ کو دونوں طبقات میں شمار نہیں کرتیں۔

یہ صحیح ہے کہ بعثت نبوی کے زمانے میں بنو نوفل کو وہ مقام مکی سماج میں حاصل نہیں تھا جو بڑے بطون قریش کو تھا اس کا سب سے بڑا سبب ان کی عددی طاقت کی کمزوری تھی۔ سماجی اور اقتصادی کمزوری اور صلاحیتوں کا فقدان دوسرے اسباب تھے تاہم وہ بالکل ہی فروتر اور بے مایہ نہ تھا کیونکہ اسی زمانے کے لگ بھگ یہ خاندان مکی اشرافیہ کے ایک اہم منصب رفادہ کا حقدار بنا تھا اور غالباً یہ بنو ہاشم سے عہدہ اسے ملا تھا۔[۱۶۴] یہ بھی قابل ذکر حقیقت ہے کہ سفر طائف کے بعد جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھرانے بنو ہاشم کی حمایت و حفاظت سے محروم ہو گئے تھے تو یہی بنو نوفل اور ان کے سردار مطعم بن عدی بن نوفل تھے جنہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جوار (پناہ) دی تھی اور غالباً ہجرت مدینہ تک آپ اسی جوار کے سائے میں مکہ میں رہے تھے۔ اس حسن سلوک اور احسان کو آپ نے ہمیشہ یاد رکھا تھا۔[۱۶۵]

بہر حال ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بنو نوفل کا گھرانا فتح مکہ کے زمانے میں اسلام لایا تھا۔ ممکن ہے کہ ان کے کچھ افراد صلح حدیبیہ یا اس کے معاً بعد کے زمانے میں مشرف بہ اسلام ہوئے ہوں لیکن مآخذ میں ان کے بارے میں سکوت پایا جاتا ہے۔ اس خاندان کے نمائندہ صحابی حضرت جبیر بن مطعم بن عدی تھے اور غالباً وہ فتح مکہ یا اس کے آس پاس کے زمانے میں اسلام لائے تھے۔[۱۶۶] بہر حال انساب کی کتابوں کے مطابق نوفل بن عبد مناف کے پانچ فرزند تھے عدی، عمرو، ابو عمرو عبد عمرو اور عامر تھے اور ان میں سے ہر ایک کی متعدد اولادیں تھیں۔ ظاہر ہے کہ فتح مکہ میں اس خاندان کے تمام باقی افراد نے اسلام قبول کر لیا تھا۔[۱۶۷]

(۲) بنو مخزوم

اگر بنو عبد مناف کا کوئی مد مقابل، حریف اور برابری کا دعویٰ رکھنے والا گروہ تھا تو وہ تھا خاندان بنی مخزوم عام طور سے ہمارے مآخذ بھی اور جدید مورخین بھی بنو مخزوم کو بنو ہاشم کا حریف اور مد مقابل اور بنو امیہ کا حلیف و

دوست بناکر پیش کرتے ہیں۔ یہ صحیح نہیں ہے۔[۱۶۸] بنو مخزوم دراصل بنو عبد مناف کے حریف تھے[۱۶۹] لیکن اسلام کے معاملہ میں ان کی رقابت وعصبیت قبائلی سے زیادہ انفرادی اور مذہبی تھی۔ ابوجہل مخزومی اسلام کے بدترین دشمنوں میں سرفہرست تھا تاہم اس کی عداوت کلیتاً قبائلی حمیت کے سبب نہ تھی۔ اس میں اس کے ذاتی عناد کو بھی کافی دخل تھا۔[۱۷۰] عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ ابوجہل مخزومی بعثت نبوی کے زمانے سے غزوۂ بدر تک سرداران قریش میں عظیم و بلند ترین مقام کا مالک تھا۔[۱۷۱] یہ صحیح نہیں ہے۔ وہ شیوخ و سادات قریش کی دوسری صف کے قائدین میں شمار ہوتا تھا۔[۱۷۲] یہ بات بھی اہم ہے کہ اس کو مکی اشرافیہ میں سے کوئی منصب حاصل نہیں تھا۔ ان سب باتوں کے باوجود وہ بڑی صلاحیتوں کا مالک تھا اور اسی لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے یا حضرت عمر کے قبولِ اسلام کے لیے دعا مانگی تھی تاکہ اس کی ہمت و دلیری، دبنگ فطرت، معاملہ فہمی اور قیادت کی لیاقت سے فائدہ اٹھایا جاسکے مگر دعائے رسول حضرت عمر کے حق میں قبول ہوگئی اور وہ سعادت سے محروم اور شقاوت و بدبختی کا پیکر بن کر رہ گیا۔[۱۷۳]

ابوجہل عمرو بن ہشام مخزومی کی دشمنیٔ اسلام اور مخالفتِ رسول کے پس منظر میں دیکھیے تو یہ حقیقت کتنی حیرت ناک و عجیب معلوم ہوتی ہے کہ اسلام نے اسی کے گھر میں سب سے پہلے قدم جمائے تھے۔ بنو مخزوم کے ابتدائی مکی مسلمانوں میں حضرات ابوسلمہ بن عبدالاسد، ان کی اہلیہ محترمہ حضرت ام سلمہ اور ان کے فرزند سلمہ،[۱۷۴] عیاش بن ابی ربیعہ[۱۷۵] اور ارقم بن ابی ارقم[۱۷۶] ابوجہل کے قریبی عزیز تھے۔ حضرت عیاش تو اس دشمن اسلام کے ماں جائے بھائی تھے جب کہ حضرت ابوسلمہ اور ارقم اس کے دادا مغیرہ کے بھائیوں کی اولاد ہونے کے ناطے اس کے عم زاد بھائی تھے۔ طرفہ ستم یہ کہ ابوجہل کے حقیقی بھائی حضرت سلمہ بن ہشام بھی ان رشتہ داروں کے ساتھ ہی یا ان کے معاً بعد مگر ہجرت حبشہ سے قبل مسلمان ہوگئے تھے۔ ابوجہل کے ظلم و ستم سے جن مخزومیوں نے تنگ آکر حبشہ کو ہجرت کی تھی ان میں حضرت سلمہ بھی شامل تھے۔ ایک سال بعد حبشہ سے واپسی پر وہ ابوجہل کی قیدِ بلا میں گرفتار ہوگئے اور اس ظالم مکہ اور فرعون امت کی غزوۂ بدر میں عبرت ناک موت کے بعد بھی وہ خندق کے زمانے تک محبوس و مقید رہے تھے۔[۱۷۷] اسی طرح ابوجہل حضرت عیاش کو بھی مکر و فریب سے کام لے کر ہجرت مدینہ کے بعد قبا سے بلاکر لایا تھا اور قید کر دیا تھا حضرت ابوسلمہ کو اپنے خاندان سمیت حبشہ ہجرت کرنا پڑی تھی۔

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ارقم بن ارقم مخزومی کا معاملہ نہ صرف مختلف تھا بلکہ وہ ابوجہل کے ہم پلہ بلکہ بعض لحاظ سے بہتر مقابل تھے۔ عام طور سے ماخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ارقم مخزومی قبولِ اسلام کے وقت بہت کم عمر تھے[۱۷۸] لیکن یہ بیان ناقابلِ فہم بن جاتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ انھوں نے اپنا گھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ صرف قیام نبوی کے لیے پیش کیا تھا بلکہ اس کو اسلامی دعوت و تبلیغ کا اولین مرکز بھی بنایا تھا۔ یہ بات بہت اہم ہے کہ بنو مخزوم کے ایک فرد نے ابوجہل مخزومی اور اس کے حامی اراکین خاندان کی اس طرح کھلم کھلا مخالفت کی تھی اور ان کے اقتدار کو للکارا تھا۔ ماخذ کی کسی روایت سے یہ نہیں ثابت ہوتا کہ حضرت ارقم کے اس طرح اسلام قبول کرنے اور اس کی حمایت و

نصرت کرنے کے سلسلہ میں ابوجہل نے ان کے خلاف انگلی بھی اٹھانے کی جرأت کی ہو۔ اس صورت میں یہ نتیجہ نکالنا بعید از حقیقت نہ ہوگا کہ حضرت ارقم بذاتِ خود اتنے طاقتور تھے کہ نوعمری کے باوجود ابوجہل جیسے بااثر شخص کی مخالفت مول لے کر زندہ و توانا رہ سکیں یا ان کو بنو مخزوم کے کسی اہم اور طاقت ور طبقہ کی حمایت و پشت پناہی حاصل تھی جس کی بنا پر ابوجہل ان کے یا ان کے مکان میں جوار لینے والے انسان کامل اور پیغمبر اسلام کے خلاف کچھ کارروائی نہیں کر سکتا تھا۔

ابوجہل مخزومی کی عداوتِ اسلام جتنی بڑھتی جاتی تھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے خاندان اور حلفاء اور موالی میں اسلام اتنی ہی تیز رفتاری سے پھیلتا جا رہا تھا۔ کم از کم چھ حلفاء بنی مخزوم کے ابتدائی مکی عہد میں قبولِ اسلام کا ذکر ملتا ہے۔ ان میں ایک خاندان تو حضرت عمار بن یاسر عنسی مذحجی کا تھا جو ان کے والد یاسر اور والدہ سمیہ پر مشتمل تھا۔ مآخذ عموماً حضرت عمار کے دوسرے بھائی بہنوں کا ذکر اس ضمن میں نہیں کرتے ہیں لیکن دوسرے مقامات پر ان کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے کم از کم ایک بھائی بھی ابتدائی مسلمان تھے۔[179] حضرت معتب بن عوف خزاعی بھی بنو مخزوم کے حلیف اور ابتدائی مسلمان تھے اور ان کے علاوہ دو اور حلیف بھی اسی دورِ اول کے مسلم تھے۔[180] تقریباً یہ یقینی ہے کہ بنو مخزوم کے مزید حلفاء اور موالی نے مکی دور میں اسلام قبول کیا تھا۔

خود خاندانِ بنو مخزوم کے متعدد گھرانوں میں اسلام اسی تیز رفتاری یا مستعدی کے ساتھ پھیل رہا تھا۔ چنانچہ مکی دورِ اول کے مسلمانوں میں ہم کو مختلف گھرانوں کے افراد کے نام ملتے ہیں[181] ان میں حضرات شماس (عثمان) بن عثمان بن شرید ہبار بن سفیان بن عبدالاسد[182] اور ان کے برادرِ حقیقی عبداللہ[183] اور ہشام بن ابی حذیفہ بن مغیرہ[184] کے علاوہ عمر بن سفیان اور عبداللہ بن سفیان اور ان دونوں کے متعدد بھائیوں اور رشتہ داروں اور عزیزوں کے اسمائے گرامی ملتے ہیں۔ مذکورہ بالا مسلمان نہ صرف قدیم الاسلام تھے بلکہ ہجرتِ حبشہ کی سعادت بھی رکھتے تھے جب کہ ان میں سے بعض نے بعد کے زمانے میں کارنامے انجام دیئے تھے اور غزوہ موتہ یا جنگِ یرموک میں شہید ہوئے تھے۔ ہجرتِ حبشہ ظاہر ہے مسلمانوں کی سماجی اور اجتماعی کمزوری اور قریش کے ظالموں کے ظلم و ستم کے سامنے عدم دفاع کے سبب ہوئی تھی مگر ایک دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ جب مہاجرینِ حبشہ میں کچھ حضرات ایک سال بعد مکہ واپس آ گئے تو بنو مخزوم کے بعض افراد کو ان کے ننہالی رشتہ داروں نے اپنی جوار میں لے لیا۔ چنانچہ یہ کتنی حیرت انگیز حقیقت ہے کہ حضرت ابو سلمہ بن عبدالاسد مخزومی کی حفاظت و حمایت کسی اور نے نہیں بلکہ دشمنِ اسلام ابولہب ہاشمی نے کی تھی کیوں کہ صحابی موصوف اس کی بہن کے فرزند تھے[185] جب کہ اسی ظالم نے اپنے حقیقی بھتیجے محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک طوفانِ بلا کھڑا کر دیا تھا۔ اسی طرح مآخذ سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت شماس بن عثمان مخزومی کو بنو عبد شمس کے ایک اہم ترین سردار اور مکہ کے عظیم ترین قائد عتبہ بن ربیعہ کی حمایت و نصرت و محبت حاصل تھی کیونکہ وہ بھی اس کے چہیتے بھانجے تھے۔[186] بہر حال بنو مخزوم کے متعدد خاندانوں/گھرانوں میں اور بھی کئی مسلمان تھے جن کا ذکر صراحتاً سیرت نبوی کے مآخذ میں نہیں ملتا لیکن دوسرے مآخذ میں ان کا ذکر ملتا ہے۔ اندازہ ہے کہ مکی عہد کے دونوں ادوار میں بنو مخزوم کے مسلمانوں کی کافی معتد بہ تعداد تھی جو بعد میں مدینہ ہجرت کر گئی۔[187]

ہجرت نبوی کے بعد بھی بنو مخزوم میں اسلام کی اشاعت جاری رہی۔ ان کے ایک مولیٰ حضرت حکم بن کیسان نے سریہ نخلہ میں اپنی گرفتاری کے بعد اسلام قبول کر لیا تھا اور مدینہ ہی میں بس گئے تھے۔[۱۸۸] قبول و تاثیر اسلام کی ایک درخشاں مثال حضرت ولید بن ولید مخزومی کی ہے۔ وہ حضرت خالد بن ولید مخزومی کے حقیقی بھائی تھے۔ غزوۂ بدر میں کی فوج کی جانب سے مسلمانوں سے لڑے مگر گرفتار ہو کر مدینہ آ گئے جہاں سے کچھ مدت کے بعد ان کے بھائی فدیہ دے کر انھیں چھڑا لے گئے۔ راستے سے بھائیوں کو چکمہ دے کر مدینہ پہونچے اور اسلام قبول کر لیا۔ ان کے بھائیوں نے مکر و فریب سے ان کو مکہ لے جا کر محبوس و مقید کر دیا۔[۱۸۹] خیال یہ ہے کہ بدر اور صلح حدیبیہ کے درمیانی عرصہ میں بھی بنو مخزوم میں اسلام کی اشاعت جاری رہی تھی۔

صلح حدیبیہ کے بعد جب اسلام نے مکہ کے گھر گھر میں ڈیرہ ڈالا تو بنو مخزوم بھی اس کے فیضانِ عام سے نہ بچ سکے۔ اس عہد میں حضرت خالد بن ولید مخزومی کا قبولِ اسلام تاریخ اسلام کا ایک اہم واقعہ ہے۔ مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اسلام قبول کرنے کی تحریک ان کے مسلم و مہاجر بھائی حضرت ولید بن ولید کی جانب سے ہوئی تھی جو اس وقت مدینہ پہنچ چکے تھے۔ اور انھوں نے حضرت خالد تک رحمتِ نبوی کی خوشخبری پہنچائی تھی۔[۱۹۰] قرائن کہتے ہیں کہ اسی زمانے میں متعدد مخزومیوں نے اسلام قبول کیا تھا۔

فتح مکہ اسلام کے ہمہ گیر فیضانِ عام کا دیباچہ تھا چنانچہ اس عظیم دن یا اس کے معاً بعد تمام دوسرے قریشی خاندانوں کی مانند بنو مخزوم نے بھی اسلام قبول کر لیا۔ ان میں ابوجہل کے فرزندِ دلبند حضرت عکرمہ بن ابی جہل بھی شامل تھے جو اپنی مخزومی مسلم اہلیہ حضرت ام حکیم بنتِ حارث کی تحریک و تبلیغ پر ایمان لائے تھے۔[۱۹۱] ان کے علاوہ ابوجہل کی والدہ ماجدہ حضرت اسماء بنت مخربہ دارمی بھی اسی موقع پر اسلام لائی تھیں۔[۱۹۲] حضرات حارث بن ہشام[۱۹۳] اور سعید بن یربوع[۱۹۴] دو اہم مخزومی سردار تھے جن کو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خمس ہوازن میں سے اپنے گراں قدر عطیات سے نوازا تھا۔ ابوجہل کے خاندان کے ایک اور فرد حضرت جویریہ کے قبولِ اسلام کا بھی ذکر ملتا ہے۔[۱۹۵] ام المومنین حضرت ام سلمہ کے دو بھائی حضرات عبداللہ بن ابی امیہ مخزومی اور ان کے مشہور بھائی مہاجر بھی فتح مکہ کے مسلمانوں میں شامل تھے۔[۱۹۶] ان کے علاوہ حضرات عبداللہ بن ابی ربیعہ مخزومی[۱۹۷]، ولید بن عبد شمس بن مغیرہ مخزومی[۱۹۸]، ابو عمرو بن حفص مخزومی[۱۹۹]، عمرو بن عثمان مخزومی[۲۰۰] اور ان کے دو فرزند حریث اور عمرو[۲۰۱] اور ایک پوتے سعید بن حریث[۲۰۲]، عبداللہ بن ابی سائب مخزومی اور ان کے بھائی عبدالرحمٰن و ابصہ بن خالد مخزومی اور سہل بن وہب مخزومی فتح مکہ کے مسلمانوں میں نمایاں ترین تھے۔[۲۰۳]

بہر حال کچھ ایسے بھی بدقسمت تھے جو اسلام کی رحمتِ عام سے محروم اس موقع پر بھی رہے۔ ان میں حضرت ام ہانی بنتِ ابی طالب ہاشمی کا مخزومی شوہر، ہبیرہ بن ابی وہب تھا جو مکہ سے فرار ہوا اور بحالت کفر نجران میں مر گیا۔ مگر یہ بات اس کے لیے کتنی اذیت ناک تھی کہ اس کی اپنی بیوی اور اولادیں عمر، ہانی، یوسف اور جعدہ۔ اسی اسلام کے حلقہ بگوش بن گئے تھے۔[۲۰۴] اسی گھرانے کے بلکہ ہبیرہ کے حقیقی بھائی حضرت سہل بن ابی وہب حزن، مخزومی اور ان کے پانچ فرزند۔ حکیم بن حزن، مسیب، عبدالرحمٰن، سائب اور ابو سعید۔ بھی فتح مکہ کے مسلمانوں میں شامل تھے۔[۲۰۵] عدوی

لحاظ سے بنو مخزوم بنو امیہ/ بنو عبد شمس کے قریب قریب ہم پلہ تھے لہٰذا ان کے کل مسلمانوں کی تعداد دو تین ہزار سے کسی طرح سے کم نہیں تھی (۲۰۶)

(۳) بنو عدی

مکی سماج میں بنو عدی کے خاندان کو عزت و افتخار بھی حاصل تھا اور مکی اشرافیہ میں سفارہ منافرہ کا اہم منصب بھی چھٹی صدی میں اس منصب عظیم پر فائز ہونے والوں میں نفیل بن عدی اور خطاب بن نفیل تھے اور بعثت نبوی کے قریب خطاب کے فرزند حضرت عمر فاروق تھے (۲۰۷)۔ اس خانوادہ کو مکی سماج میں جو مقام حاصل تھا وہ بنو مخزوم کے ہم پلہ تھا چنانچہ بعثت نبوی کے وقت بنو عدی کے عمر بن خطاب اور بنو مخزوم کے ابوجہل کو تقریباً ان کی اپنی صلاحیتوں کے سبب برابر کا مقام حاصل تھا اگرچہ بنو عدی اتنے عددی اعتبار سے طاقتور نہیں تھے جتنے کہ بنو مخزوم لیکن ان کی سماجی منزلت، مذہبی وقار، تہذیبی افتخار اور اقتصادی ثروت کے سبب ان کا مقام بنو مخزوم کے ساتھ یا کچھ بعد میں آتا ہے۔ اس کا ایک ثبوت ان کے حلفاء اور موالی کی کثرت تعداد سے ہوتا ہے۔ بعثت نبوی سے قبل نفیل کے ایک فرزند زید نے بت پرستی اور مکہ کے قدیم جاہلی مذہب کو ترک کر کے اپنے لیے اور اپنے خاندان کے لیے احناف کا افتخار بھی حاصل کر لیا تھا۔ (۲۰۸)

غالباً یہی مذہبیت تھی یا تلاش حق کی لگن جس نے زید بن نفیل کے فرزند حضرت سعید عدوی کو اسلام قبول کر لینے پر آمادہ کر لیا تھا۔ وہ قدیم ترین مکی مسلمان تھے۔ وہ حضرت عمر بن خطاب کے چچازاد بھائی اور بہنوئی بھی تھے۔ ان کی اہلیہ محترمہ حضرت فاطمہ بنت خطاب نے بھی مکی دور اول کے آغاز میں ہی اپنے شوہر کے ساتھ اسلام قبول کر لیا تھا (۲۰۹)۔ حضرت سعید بن زید عدوی کی ایک بہن حضرت عاتکہ بنت زید بھی قدیم مکی مسلمان تھیں اور حضرت ابوبکر تیمی کے مسلمان صاحبزادے حضرت عبداللہ تیمی کو بیاہی تھیں۔ ان دونوں میاں بیوی نے ایک ساتھ ہجرت مدینہ کی سعادت حاصل کی تھی (۲۱۰)۔ حضرت سعید بن زید کے دوسرے اہل خاندان خاص کر ان کے بھائیوں اور فرزندوں کے بارے میں ہمارے ماخذ زیادہ روشنی نہیں ڈالتے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ احناف قدیم کا یہ خاندان پورا مسلمان ہو گیا تھا۔

بنو عدی کے ایک گھرانے کے ایک اولیں مسلم حضرت نعیم بن عبداللہ تھے جو اپنے پیشۂ آہن گری کے سبب النحام کے لقب سے معروف ہیں۔ ہمارے بعض مورخین جدید نے ان کو ان کے پیشے کے سبب ایک کمتر مسلمان سمجھ لیا ہے اور ان کے کئی برس تک مدینہ ہجرت نہ کرنے کے سبب ان کے اسلام کو ضعیف محمول کیا ہے۔ یہ دونوں خیال غلط ہیں وہ پکے مسلمان ہی خاصے مالدار بلکہ بنو عدی کے مالدار ترین افراد میں سے ایک اور اپنے قبیلے اور قریش مکہ کے بااثر سرداروں میں سے تھے (۲۱۱)۔ اس کا ثبوت اس حقیقت سے ظاہر ہے کہ وہ اپنے اہل و عیال اور لواحقین کے علاوہ بنو عدی کے یتیموں، بیواؤں، بے کسوں کی کفالت کرتے تھے اور اپنی اسی فیاضی، سخاوت اور دریا دلی کے لیے اتنے مقبول و بااثر تھے کہ ان کو خود ان کے خاندان والوں نے ہجرت نہیں کرنے دی تھی اور مکہ میں ان کے اسلام پر عامل ہونے کے

باوجود ان کو بصد عزت و احترام رکھا تھا اور قریش مکہ کے ظالموں کو بھی جرأت نہ ہوئی تھی کہ کوئی ان کی طرف انگلی بھی اٹھا سکتا۔ ابن سعد کے مطابق وہ گیارھویں مسلمان تھے اور صلح حدیبیہ کے زمانے میں جب انھوں نے مدینہ ہجرت کی تھی تو ان کے ساتھ ان کے خاندان (اہل) کے چھوٹے بڑے چالیس افراد تھے۔ قیاس یہ ہے کہ ان میں سے اکثر مکی عہد کے دورِ آخر اور مدنی عہد کے آغاز میں مسلمان ہوئے تھے اور کافی لوگ قدیم مکی عہد کے مسلمان بھی تھے۔ اسی سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ ہجرت نبوی کے بعد بھی صلح حدیبیہ تک بنو عدی کے اس خاندان میں کم از کم اسلام کی اشاعت کا سلسلہ جاری رہا تھا۔ حضرت نعیم بن عبداللہ النحام کے خاندان میں ان کے ایک فرزند حضرت ابراھیم، ان کی زوجہ محترمہ حضرت زینب بنت حنظلہ اور موخر الذکر کی ایک پھوپھی حضرت جریار بنت مسامہ اور ایک دختر امت بنت نعیم وغیرہ کا مکی عہد کے مسلمانوں میں شمار کیا گیا ہے۔(۲۱۲)

بنو عدی کی ایک قدیم عہدِ مکہ کی مسلمان تھیں حضرت شفار بنت عبداللہ بن عبد شمس اور دوسرے تھے ان کے صاحبزادے حضرت سلیمان بن ابی خیثمہ عدوی، ابو خیثمہ کا مکی عہد میں انتقال ہو گیا تھا اور ان کے فرزند و زوجہ نے ہجرت نبوی سے کچھ قبل مدینہ ہجرت کی تھی۔(۲۱۳)

مکی عہدِ قدیم کے ابتدائی مسلمانوں میں اس خاندان بنو عدی کے مختلف گھرانوں کے متعدد افراد شامل تھے جن میں حضرات معمر بن عبداللہ،(۲۱۴) عدی بن نضلہ اور ان کے فرزند نعمان بن عدی،(۲۱۵) عروہ بن ابی اثاثہ،(۲۱۶) مسعود بن سوید،(۲۱۷) عبداللہ بن سراقہ اور ان کے بھائی عمرو(۲۱۸) اور حضرت خارجہ بن حذافہ(۲۱۹) کے علاوہ متعدد مرد اور خواتین جیسے حضرت ارنب بنت عفیف وغیرہ(۲۲۰) نمایاں ترین تھے۔

اگرچہ حضرت عمر بن خطاب عدوی مکی دورِ تبلیغ و اشاعتِ اسلام کے نصف ثانی کے آغاز یعنی ۶ نبوی/۶۱۶ء کے لگ بھگ اسلام لائے تھے لیکن ان کے خاندان کے دوسرے افراد ان سے قبل مسلمان ہو چکے تھے۔ ان کی بہن حضرت فاطمہ بنتِ خطاب کے علاوہ ان کے حقیقی بھائی حضرت زید بن خطاب جن سے حضرت عمر کو بے انتہا محبت تھی کافی پہلے غالباً اپنی بہن کے ساتھ اسلام کے حلقہ بگوش ہو چکے تھے۔(۲۲۱) بہرحال حضرت عمر کا قبولِ اسلام درا صل مکہ میں تاریخ اسلام میں مسلمانوں کی قوت و شوکت و حشمت کی تابناک ترین مثال ہے اور کاروانِ اسلام کی ایک اہم ترین منزل۔ مسلمانوں کو پہلی بار اسلام کا باجماعت علانیہ اظہار کرنے کا موقع ملا تھا۔(۲۲۲) دعائے رسول سے حضرت عمر کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے لیکن اسی ضمن میں یہ بھی بیان کر دیا جائے کہ حضرت عمر کے اسلام کی خبر جیسے ہی مکہ میں پھیلی تو بنو سہم کے ایک عظیم ترین سردار اور شیوخ مکہ میں سے اہم ترین فرد عاص بن وائل سہمی نے ان کے بنا طلب کئے ان کو اپنی جوار میں لینے کا اعلان کر دیا تھا۔(۲۲۳) اس کے علاوہ مآخذ میں ایک بھی روایت ایسی نہیں ملتی جس سے یہ معلوم ہو کہ قریش مکہ کے سخت ترین دشمنوں میں سے بھی کسی نے ان کے منہ آنے کی جسارت کی ہو۔(۲۲۴) بہرحال حضرت عمر کے ساتھ ان کا پورا گھرانا مسلمان ہو گیا تھا(۲۲۶) بلکہ بعض افراد تو پہلے ہی مسلمان ہو چکے تھے۔ ان میں حضرت عمر کے فرزند اکبر حضرت عبداللہ(۲۲۵) اور دختر حضرت حفصہ

اور ان دونوں کی والدہ ماجدہ جو بنو جمح کے ایک عظیم و قدیم مسلم حضرت عثمان بن مظعون کی حقیقی بہن تھیں اور جن کا نام حضرت زینب بنت مظعون تھا، شامل تھے۔ حضرت عمر کے دوسرے فرزندان گرامی حضرات عبدالرحمٰن اکبر، زید، عاصم عبیداللہ وغیرہ بھی صحابہ میں شمار ہوتے ہیں۔(۲۲۷) اسی طرح حضرت زید بن خطاب کی اہلیہ اور فرزند بھی قدیم مکی مسلمان تھے(۲۲۸) ممکن ہے کہ ان دونوں گھرانوں کے اور بھی افراد قدیم مسلمانوں میں شامل رہے ہوں۔

ماخذ سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت عمر کو قبول اسلام پر آمادہ کرنے والے عوامل و اسباب میں ان کے بہنوئی اور بہن کا خاصا اثر تھا۔ یہ قیاس بھی صحیح ہے کہ ان کے برادر نسبتی حضرت عثمان بن مظعون جمحی کا اثر پڑا ہو۔ کچھ ان کو مائل کرنے میں ان کے چچا زید بن نفیل کی "حنفیت" کا بھی دخل رہا ہوگا۔ کسی حد تک ان کے حلفاء کے اسلام اور ضعفاء مسلمین خاص کر وہ کمزور مسلمان جن کو حضرت عمر بحالت کفر سخت ترین ایذائیں دیتے تھے کی صلابت اور ثابت قدمی نے بھی ان کو مائل بہ اسلام کیا ہوگا لیکن آخری وار یا ضرب کاری خود کلام ربانی نے لگائی تھی جس نے ان کے جسم و جان کے ریشے ریشے کو ہلا دیا تھا۔(۲۲۹) مونٹگمری واٹ کا یہ قیاس بے جا اور گمراہ کن ہی نہیں بلکہ تاریخی حقیقت کے خلاف ہے کہ اقتصادی بدحالی اور معاشی زوال نے ان کے اسلام قبول کرنے میں کوئی حصہ لیا تھا۔(۲۳۰) ابن اسحاق کی واضح روایت ہے کہ ہجرت مدینہ کے وقت حضرت عمر قریش مکہ کے مالدار ترین شخص تھے۔(۲۳۱) روایت میں مبالغہ بھی سمجھ لیا جائے جس کا بظاہر کوئی امکان نہیں ہے تو بھی وہ قریش کے اس وقت کے متمول ترین افراد میں ضرور تھے۔

بنو عدی خاص کر حضرت عمر کے خاندان کے موالی اور حلفاء بھی قدیم دور کے مسلمان تھے۔ ان میں حضرت عمر کے ایک غلام حضرت مہجع بھی شامل تھے۔(۲۳۲) حلفاء میں بنو بکیر / کنانہ کا گھرانا تھا جس کے چار افراد حضرات عامر، خالد، عاقل اور ایاس، فرزندان بکیر کے نام عموماً گنائے جاتے ہیں۔(۲۳۳) لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کے علاوہ دوسرے متعدد مرد اور عورتیں اور بچے بھی ابتدائی مسلمانوں میں شامل تھے۔ بنو بکیر کے علاوہ دوسرے حلفاء بنی عدی میں قدیم مسلمان تھے۔ حضرات واقد بن عبداللہ تمیمی، خولی بن ابی خولی، ان کے بھائی مالک، عامر بن ربیعہ عنزی اور ان کی اہلیہ گرامی حضرت لیلیٰ بنت ابی حثمہ۔(۲۳۴)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بنی عدی کے بعض گھرانے خصوصاً حضرت عمر کا پورا گھرانا اسلام لا چکا تھا اور مدینہ ہجرت کر کے جا چکا تھا۔ امکان ہے کہ ان کے بعض افراد نے ہجرت نبوی کے بعد اسلام قبول کر کے مکہ چھوڑا ہو۔ یہی سبب ہے کہ صلح حدیبیہ سے پہلے جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر کو اپنا سفیر بنا کر قریش مکہ سے گفتگو کرنے کے لیے شہر بھیجنا چاہا تھا تو انھوں نے یہ کہہ کر معذرت کر لی تھی کہ ان کے گھرانے کا کوئی فرد مکہ میں نہیں بچا ہے جو ان کی حفاظت و حمایت میں قریش سے ٹکر لے سکے۔(۲۳۵)

بہر حال مکہ میں بنو عدی کے بعض گھرانے اب بھی بحالت کفر موجود تھے لیکن یہ دلچسپ و اہم حقیقت ہے کہ وہ اسلام کے زیادہ مخالف نہ تھے چنانچہ غزوہ بدر سے قبل ابو جہل کی دھمکی کے باوجود شام سے لوٹنے والے قریشی کاروان کے محفوظ ہو جانے کی خبر سن کر جنگ میں حصہ لیے بغیر مکہ لوٹ گئے تھے۔(۲۳۶) ظاہر ہے کہ وہ ابو جہل مخزومی اور اس کے حامیوں

کی طاقت سے مرعوب نہ تھے۔ بہرحال بنو عدی کے باقی ماندہ افراد جو بیشتر بنو عویج بن عدی کے گھرانے سے متعلق تھے فتح مکہ میں مسلمان ہوگئے تھے ان میں حضرات ابوجہم بن حذیفہ، ان کے بھائی ابوحشمہ، مطیع (عاصی) بن اسود اور ان کے فرزند عبداللہ بن مطیع وغیرہ شامل تھے (۲۳۷)

(۴) بنو تیم

بنو تیم کا خاندان عددی لحاظ سے کافی چھوٹا ہونے کے باوجود مکی اشرافیہ کا رکن تھا (۲۳۸) اور اس کے بعض صاحب صلاحیت و امتیاز افراد کی موجودگی اور اقتصادی دولت کی فراوانی کے سبب اس کو سماج میں عزت و منزلت حاصل تھی بعثت نبوی سے کچھ پہلے ان کے خاندان کے ایک سربرآوردہ سردار عبداللہ بن جدعان تیمی نے خاندان تیم کو کافی افتخار بخشا تھا اور ۶۰۵ء کے لگ بھگ حلف الفضول کا اہم معاہدہ انہی کے گھر میں عمل میں لایا گیا تھا۔ (۲۳۹) اس کے بعد حضرت ابوبکر عبداللہ بن ابی قحافہ عثمان تیمی اس خاندان کے اہم ترین فرد تھے۔ وہ دولت مند تاجر، ماہر نسب قریش و عرب، معاملہ فہم سردار و سیچے دکھرے آدمی تھے۔ (۲۴۰) ظاہر ہے کہ بنو تیم کو وہ مقام حاصل نہیں تھا جو بنو امیہ، بنو مخزوم یا بنو عدی کو حاصل تھا اور اس کا سب سے بڑا سبب ان کی عددی کمزوری تھی۔

بہرحال مکی سماج میں بنو تیم کو مقام امتیاز حاصل رہا ہو یا نہ رہا ہو سبقت اسلام کے شرف میں قریش مکہ کا کوئی بطن اور خاندان ان کے مساوی نہیں تھا۔ ان کے فرد حضرت ابوبکر صدیق نے نہ صرف سب سے پہلے قبول اسلام کا اظہار کیا تھا بلکہ بلا کسی ریب و تردد، جھجک اور لیں و پیش کے اسلام قبول کیا تھا اور اسی لیے وہ صدیق کے مرتبۂ عظیم پر فائز ہوئے۔ (۲۴۱) ہمارے ماخذ ابتدائی مسلمانوں میں خاندان صدیقی کے دو افراد حضرات اسماء بنت ابی بکر اور ان کی بہن عائشہ کو شمار کرتے ہیں۔ حضرت عائشہ بچپن کی مسلمان تھیں کیوں کہ ان کی پیدائش بعثت نبوی کے بعد ہوئی تھی۔ اس خاندان گرامی کے متعدد افراد ابتدائی مسلمانوں میں شامل تھے۔ ان میں حضرت ابوبکر کی اہلیہ حضرت ام رومان، ان کے ایک جوان دبیاہے فرزند عبداللہ اور بہو عاتکہ بنت زید عدوی، حضرت ابوبکر کی ایک اور کتخدا بہن ام کلثوم جو حضرت طلحہ بن عبیداللہ تیمی کی زوجہ تھیں اور ان سب سے بڑھ کر حضرت ابوبکر کی والدہ ماجدہ حضرت ام الخیر بھی شمار کی جاتی ہیں۔ (۲۴۱/ا) یہ دلچسپ اور قابل غور نکتہ ہے کہ ام الخیر نے اپنے شوہر ابو قحافہ کے کفر پر قائم رہنے کے باوجود اسلام قبول کرلیا تھا اور غالباً ان کی خدمت بھی کرتی رہی تھیں۔ روایات میں حضرت ابوبکر کی ایک کم عمر بہن کا ذکر ملتا ہے جو بوڑھے ابو قحافہ کی دلجوئی کے لیے مکہ ہی میں رہ گئی تھیں۔ (۲۴۳/ا) خاندان صدیقی کے ایک اور حلیف حضرت صہیب بن سنان نمری قاسطی اور ایک مولیٰ حضرت عامر بن فہیرہ بھی قدیم الاسلام تھے۔ (۲۴۴/ا)

بنو تیم کے ایک اور گھرانے کے ابتدائی اور قدیم مسلمان حضرت طلحہ بن عبیداللہ تیمی تھے جو حضرت ابوبکر صدیق کے منبوئی تھے اور انہی کی دعوت پر اسلام لائے تھے۔ ابن اسحاق نے ان کو پہلے آٹھ مسلمانوں میں شمار کیا ہے۔ وہ ایک

مالدار تاجر ہونے کے علاوہ خاصے وقیع گھرانے کے فرد تھے اور ان کا خاندان متعدد افراد پر مشتمل تھا اور وہ سب کے سب مسلمان ہو گئے تھے جن میں ان کی والدہ ماجدہ بھی شامل تھیں (۲۴۵)

بنو تیم کا ایک اور گھرانا اسی ابتدائی مکی عہد میں مسلمان ہوا تھا۔ اس کے نمایاں افراد حضرت حارث بن خالد تیمی اور ان کی اہلیہ حضرت ریطہ بنت حارثہ کے علاوہ حضرت عمرو بن عثمان بھی تھے۔ یہ سب کے سب مہاجرین حبشہ میں شامل تھے حبشہ میں حضرت حارث تیمی کے ایک فرزند موسیٰ اور تین صاحبزادیاں عائشہ، زینب اور فاطمہ پیدا ہوئی تھیں۔ یہ سب حضرات و خواتین کچھ مدت کے بعد مکہ واپس لوٹ آئے تھے اور پھر وہاں سے مدینہ ہجرت کی تھی۔ (۲۴۶)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت نبوی کے بعد مکہ میں جو بنو تیم کے غیر مسلم لوگ مقیم تھے ان میں رفتہ رفتہ اسلام پھیلتا رہا تھا اور فتح مکہ تک یہ سلسلہ کسی نہ کسی طرح سے جاری رہا تھا۔ اس کی ایک واضح مثال حضرت ابوبکر صدیق کے فرزند اکبر حضرت عبدالرحمٰن کے قبول اسلام کا واقعہ ہے۔ غزوۂ بدر تک وہ کافر رہے تھے اور اسی حیثیت میں کی فوج میں شامل ہو کر مسلمانوں اور خاص کر اپنے باپ کے مقابل آئے تھے لیکن انھوں نے صلح حدیبیہ کے بعد کسی وقت اسلام قبول کر لیا تھا۔ ان کے ساتھ ان کے اہل و عیال بھی مسلمان ہو گئے تھے۔ اور وہ سب مدینہ ہجرت کر کے آ بسے تھے (۲۴۷)

بنو تیم کے باقی ماندہ افراد فتح مکہ کے دن اسلام لاتے تھے۔ ان میں حضرت ابوبکر صدیق کے والد بزرگوار حضرت ابو قحافہ بھی شامل تھے۔ (۲۴۸) ان کے علاوہ متعدد دوسرے تیمی افراد بھی اسی دن اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ ہمارے ماخذ نے بنو تیم کے حارث بن حارثہ کے فرزند عبداللہ اور پوتے منکدر کو فتح مکہ کے صحابہ میں شمار کیا ہے جبکہ حضرت امیمہ بنت عبد تیمی کو اس دن کی مبایعات (بیعت کرنے والی عورتوں) میں گردانا جاتا ہے۔ (۲۴۹)

(۵) بنو سہم

قریشی اشرافیہ میں بنو سہم طاقتور ترین لبطون / خاندانوں میں شمار ہوتا تھا۔ اس کی دو اہم ترین وجہیں تھیں: اول یہ کہ وہ عددی اعتبار سے کافی بڑا تھا (۲۵۰) اور دوم یہ کہ اس میں صاحب صلاحیت و لیاقت افراد کی تعداد زیادہ تھی۔ چھٹی صدی عیسوی کے اختتام پر اور بعثت نبوی کے زمانے میں اس خاندان کے بعض شیوخ جیسے عاص بن وائل سہمی اور حارث بن قیس سہمی، منبہ اور نبیہ فرزندان حجاج سہمی وغیرہ اہم ترین رؤسا، قریش میں شمار ہوتے تھے۔ (۲۵۱) دوسرے درجہ کے قائدین اور زعماء کی فہرست میں اس خاندان کے عمرو بن عاص سہمی اور ان کے بھائی ہشام سہمی وغیرہ کا نام بھی شامل تھا۔ اسلام کے معاملے میں دوسرے بطون قریش کی مانند بنو سہم کا بھی رویہ تھا۔ اس کے بعض سرداروں نے جن میں مذکورہ بالا حارث، منبہ اور نبیہ شامل تھے اسلام کی سخت مخالفت کی تھی جبکہ بعض دوسروں کا شمار ہمارے سیرت نگاروں نے دشمنان اسلام کی بجائے مستہزئین (مذاق اڑانے والوں)، یا کم درجہ کے مخالفوں میں کیا ہے۔ عاص بن وائل سہمی کا تعلق دوسرے طبقے سے تھا (۲۵۲)

بہر حال اسلام کے ناوک نے بنو سہم کے بعض افراد و گھرانوں کو بھی نہیں چھوڑا تھا چنانچہ متعدد گھرانے بالکل آغاز میں

انتہائی نامکمل ہے۔ ان سے کئی گنا زیادہ وہ حضرات صحابہ وصحابیات ہوں گی جو گمنام رہ گئیں یا جن کا ذکر نہیں آسکا۔

(۶) بنو زہرہ

مکہ کے سیاسی اور اقتصادی نظام میں بنو زہرہ کا بطن خاندان بنو سہم کا ہم پلہ تھا۔[۲۶۴] اگرچہ زمانۂ بعثت کے قریب اس میں کوئی بڑا قائد یا شیخ نہیں رہا تھا۔ کم از کم ہمارے مآخذ اس خاندان کے کسی بڑے دشمنِ اسلام کا ذکر نہیں کرتے۔ بعض مورخین نے اس سے یہ نتیجہ نکال لیا ہے کہ وہ مکی سیاست میں اتنا اہم نہیں رہ گیا تھا حالانکہ اس کا اصل سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی جانب اس کا رویہ معتدل تھا اور وہ سوچ سمجھ پر مبنی تھا چنانچہ بنو زہرہ اور بنو عدی نے دوسروں کی طرح اندھا دھند اسلام دشمن رویہ نہیں اپنایا تھا اور اس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ بنو زہرہ بھی میدانِ جنگ سے بلا جنگ و جدال کئے مکہ پلٹ گئے تھے۔[۲۶۵] ایک سبب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ بنو زہرہ نسبتاً بنو عبد مناف کے زیادہ قریب تھے۔ ان کے تجارتی اور ازدواجی تعلقات دوسروں کے مقابلہ میں بنو ہاشم اور بنو امیہ سے زیادہ تھے۔[۲۶۶] منٹگمری واٹ کا یہ خیال ہے کہ وہ محض بنو امیہ سے زیادہ قریب تھے آدھا سچ ہے بنو زہرہ کے بعض لوگوں کے تجارتی تعلقات بنو تیم سے بھی تھے۔

بہر حال کی سیاست اور سماج و اقتصاد میں بنو زہرہ کی جو بھی حیثیت رہی ہو۔ اسلام میں ان کے بعض گھرانوں اور افراد کو سبقت کا شرف ضرور حاصل تھا۔ ذکر آچکا ہے کہ بنو زہرہ کے دو گھرانوں بنو عوف بن عبد عوف اور بنو اہیب کے دو اہم افراد حضرات عبدالرحمٰن بن عوف اور سعد بن ابی وقاص حضرت ابوبکر تیمی کے حلقۂ احباب میں شامل تھے اور انہی کے ایما و تبلیغ پر بالکل آغازِ عہدِ اسلامی میں مسلمان ہو چکے تھے۔ ابنِ اسحاق کے مطابق وہ پہلے آٹھ مسلمانوں میں سے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں کے پورے گھرانے ابتدا ہی میں مسلمان ہو گئے تھے چنانچہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی دونوں بیویاں جو عتبہ بن ربیعہ اور اس کے بھائی شیبہ کی بیٹیاں تھیں مسلمان ہو چکی تھیں۔[۲۶۷] ان کے بارے میں عام تاثر یہ ہے کہ وہ مکی دورِ حیات میں نا کتخدا تھے اور تجارت میں ان کی عالمگیر شہرت کی چھاپ ابھی نہیں لگی تھی بلکہ وہ بے نوا اور بے کس شخص تھے۔ حالانکہ یہ غلط ہے۔ ہجرت کے وقت ان کی عمر ۳۴ سال ہو چکی تھی۔ وہ صرف شادی شدہ بلکہ کم از کم دو بیویوں کے شوہر اور غالباً کئی بچوں کے والد ماجد بھی تھے۔ بنتِ شیبہ سے ان کے دو اولادیں ایک فرزند محمد اور ایک دختر ام القاسم تھیں جن کا شمار صحابہ میں ہوتا ہے۔[۲۶۸] ان کے علاوہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی دو بہنوں حضرت عاتکہ اور حضرت شفاء کے بارے میں بھی صراحت ملتی ہے کہ وہ مکی مسلمان تھیں۔ یہ بات اہم ہے کہ ان کی بہن عاتکہ کے شوہر مخرمہ بن نوفل زہری نے مکی عہد میں اسلام قبول نہیں کیا تھا چنانچہ صحابیہ موصوفہ نے اپنے شوہر کو چھوڑ دیا تھا اور اپنے فرزند حضرت مسعود بن مخرمہ کے ساتھ جو مکی مسلمان تھے مدینہ ہجرت کی تھی۔ ان کی دوسری بہن نے بھی مکہ کو چھوڑ مدینہ جا کر گھر بسایا تھا۔[۲۶۹] اس سے زیادہ دلچسپ روایت یہ ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن کی بوڑھی والدہ نے بھی شروع ہی میں اسلام قبول کر لیا تھا اور ہجرت کی تھی۔[۲۷۰]

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف زہری کے چچا کا خاندان بنو ازہر بھی غالباً پورا مسلمان ہو گیا تھا۔ مکی عہدِ قدیم کے

اسلام سے روشناس ہو گئے تھے۔ عہدِ قدیم کے مکی مسلمانوں میں بنو قیس بن عدی کے تین افراد حضرات خنیس بن حذافہ بن قیس بن عدی اور ان کے دو بھائی عبداللہؓ اور قیس ہجرتِ حبشہ سے پہلے مسلمان ہو گئے تھے۔ حضرت خنیس کی زوجہ محترمہ حضرت حفصہ بنت عمر خطاب عدوی بھی مسلمان ہو گئی تھیں۔[۲۵۳] قیاس ہے کہ ان کے دونوں بھائیوں کے اہل و عیال بھی اسلام سے مشرف ہو چکے تھے بہر حال ان تینوں سہمیوں نے اپنے اہل و عیال کے ساتھ ہجرتِ حبشہ کی سعادت بھی حاصل کی تھی۔ بنو سہم کے غالباً اہم ترین گھرانے بنو عاص بن وائل کے ایک فرزند حضرت ہشام بن عاص بھی ابتدائی مکی مسلم تھے اور کاروانِ حبشہ کے ایک رکن رکین[۲۵۴]

ابن اسحاق نے دوسری ہجرتِ حبشہ کے مہاجروں میں تیرہ سہمی حضرات اور ان کے ایک زبیدی حلیف حضرت محمیہ بن جزء زبیدی کا نام گنوایا ہے۔ مذکورہ بالا سہمی مہاجرینِ حبشہ کے علاوہ باقی حضرات تھے عبداللہ بن حارث، ابو قیس بن حارث حارث بن حارث، معمر بن حارث، البشر بن حارثؓ، در موخر الذکر کے ایک ماں جائے بھائی جن کا نام تھا سعید بن عمرو، سعید بن حارث، سائب اور عمیر بن رباب اور عمیر بن رباب بن حذافہ بن محشم۔[۲۵۵] ابن سعد کے یہاں بعض نئے ناموں کا اضافہ ہے اور وہ ہیں حجاج بن حارث تمیم یا نمیر بن حارث اور معبد بن حارث۔ ابن سعد نے موخر الذکر کو صرف ابتدائی عہد کا قدیم مسلم قرار دیا ہے اور بقیہ تفصیلات نہیں دی ہیں[۲۵۶] خیال ہے کہ وہ بھی مہاجرینِ حبشہ میں شامل رہے ہوں گے اور نہ بھی رہے ہوں تو یہ تو مسلم امر ہے کہ وہ قدیم مکی مسلم ضرور تھے۔ یہ نکتہ دلچسپ، حیرت انگیز اور اہم ہے کہ بنو سہم کے شدید ترین دشمنِ اسلام حارث بن قیس سہمی کے آٹھ نو حقیقی اور سوتیلے بیٹوں نے مکی دور کے نصف اول ہی میں اسلام قبول کر لیا تھا۔ اس سے یہ بھی گمان ہوتا ہے کہ حارث سہمی کی عداوتِ اسلام ذاتی وجوہ سے تھی، کسی نصب العین یا قبائلی عصبیت کے سبب نہ تھی۔ منٹگمری واٹ نے اپنی فہرست مسلمینِ مکہ میں ان حارثی فرزندانِ اسلام میں سے صرف چھ کے نام گنائے ہیں۔[۲۵۷] اس سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ ہمارے محقق و حق جو مستشرقین کس طرح مکی مسلمانوں کی تعداد کو کم کر کے پیش کرتے ہیں اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ تبلیغ و اشاعتِ اسلام کو کمیوں کر دھندلا بنا کر دکھاتے ہیں۔ مزید برآں ہمارے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ مکی عہد میں ہی گھرانے کے گھرانے اسلام قبول کر چکے تھے اور اسلام صرف افراد ہی تک محدود نہیں تھا۔

ہجرتِ نبوی کے بعد بھی مکہ کے بنو سہم میں اسلام کی اشاعت جاری رہی تھی اگرچہ اس کی رفتار سست تھی اور مآخذ میں اس کے بارے میں تفصیلات بھی کم ملتی ہیں۔ بہر حال صلح حدیبیہ کے بعد اس خاندان کے غالباً اہم ترین فرد حضرت عمرو بن عاص سہمی کے قبولِ اسلام کے واقعہ سے ہمارے خیال کو کسی قدر تقویت ملتی ہے۔[۲۵۸] مزید تائید ابن سعد کی روایت سے ہوتی ہے جس کے مطابق حضرت عمرو بن عاص سہمی کے صاحبزادہ گرامی حضرت عبداللہ بن عمرو نے اپنے والد سے قبل اسلام قبول کر لیا تھا۔[۲۵۹] عین ممکن ہے کہ ان کے قبولِ اسلام کا تعلق زمانۂ قبل حدیبیہ سے ہو۔

فتح مکہ میں تمام دوسرے بطونِ قریش کی مانند بنو سہم کے باقی ماندہ افراد بھی اسلام کے دائرے میں داخل ہو گئے تھے۔ ان میں نمایاں ترین حضرات تھے حضرت قیس بن عدی[۲۶۰]، حضرت عبداللہ بن زبعری جو اپنے وقت کے مشہور و بلند پایہ شاعر بھی تھے، حضرت ابو وداعہ، حارث بن صبیرہ اور کم از کم ان کے تین جوان سال فرزند حضرات مطلب، ابو سفیان اور سائب۔[۲۶۲] خواتین میں عام طور سے حضرت ریطہ بنتِ منبہ بن حجاج کا نام لیا جاتا ہے۔[۲۶۳] ظاہر ہے کہ سہمی مسلمانوں کی یہ فہرست

مسلمانوں میں اس گھرانے کے تین ارکان حضرات مطلب بن ازہر، طلیب بن ازہر اور عبدالرحمٰن بن ازہر کا نام ملتا ہے۔[271] ان کے ساتھ خواتین میں حضرت مطلب زہری کی زوجہ محترمہ حضرت رملہ بنت ابی عوف سہمی کا نام لیا جاتا ہے۔[272] یہ سب حضرات وخواتین ہجرتِ حبشہ سے پہلے کے مسلمان تھے۔ ان کے علاوہ بھی قیاس کہتا ہے کہ مزید مسلمان اس گھرانے میں عہدِ قدیم کے تھے۔ اگرچہ متداول ماخذ قبول اسلام کے زمانے کے بارے میں صراحت نہیں کرتے مگر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف زہری کے ایک ہم نام بھتیجے کا بھی صحابہ کرام میں شمار کیا گیا ہے اور وہ بھی لقیناً ابتدائی عہد کے مسلمان تھے۔

حضرت سعد بن ابی وقاص (مالک)، زہری کا تعلق بنو وہیب سے تھا اور ان کا پورا گھرانا لگتا ہے کہ شروع ہی میں مسلمان ہو گیا تھا۔ اس خاندان میں حضرت سعد کے سوا ان کے دو بھائیوں عامر زہری اور عمیر زہری کے مکہ میں قبول اسلام کا ذکر ملتا ہے۔ ان کے ایک اور بھائی عتبہ زہری اسلام سے قبل مدینہ جا بسے تھے جہاں وہ آغازِ اسلام ہی میں مسلمان ہو گئے تھے اگرچہ ہمارے ماخذ حضرت سعد اور ان کے بھائیوں کے اہل وعیال کے بارے میں کچھ نہیں کہتے مگر یہ یقینی ہے کہ کم از کم حضرت سعد اور ان کے ایک بھائی عامر شادی شدہ اور صاحبِ اولاد تھے اور ان کے دوسرے بھائی عتبہ بھی صاحبِ اولاد تھے اور ان کی تمام اولادیں نابالغ ہونے کے سبب مسلم تھیں۔ ان کے ایک بھائی عمیر کی عمر ہجرت کے وقت بارہ تیرہ یا چودہ سال کی تھی۔[273] قیاس یہ ہے کہ حضرات سعد و عامر وغیرہ کے گھرانے کی خواتین بھی مسلمان تھیں اور ان میں سرفہرست ان کی والدہ ماجدہ تھیں۔

بنوزہرہ کے ایک اور گھرانے بنو شہاب کے دو رکن حضرات عبداللہ بن شہاب زہری اور ان کے چھوٹے بھائی عبداللہ اصغر بھی عہدِ قدیم کے مسلمان تھے۔ ان میں سے اول الذکر نے ہجرتِ حبشہ سے قبل مکہ میں انتقال کیا تھا جبکہ موخر الذکر نے حبشہ ہجرت کی تھی اور واپس آ کر ایک سال کے عرصہ سے زیادہ گذرا تھا کہ انھوں نے بھی وفات پائی تھی[274] اگرچہ ماخذ کا اتفاق ہے کہ بنوزہرہ نے اجتماعی طور سے غزوۂ بدر میں شرکت نہیں کی تھی مگر ابن سعد کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس خاندان کے رکن اور دونوں مسلمان صحابہ کے بڑے بھائی عبداللہ اکبر بن شہاب زہری نے مکی فوج کی جانب سے شرکت کی تھی اور جنگ میں مارے گئے تھے۔[275] ممکن ہے کہ بنوزہرہ کے اس رکن نے اپنے قبیلہ کو چھوڑ کر اپنی انفرادی حیثیت سے شرکت کی ہو بالکل اسی طرح جس طرح طالب بن ابی طالب ہاشمی نے بنو ہاشم کا ساتھ اس معاملہ میں نہیں دیا تھا اور راستے سے مکہ پلٹ گئے تھے جبکہ ان کے ایک بھائی عقیل اور چچا عباس وغیرہ نے غزوۂ بدر میں بنو ہاشم کی نمائندگی کی تھی۔

بنوزہرہ کے مختلف گھرانوں کے ساتھ ساتھ ان کے متعدد حلفاء اور موالی نے بھی مکی عہدِ اسلام کے دورِ اول کے آغاز میں اسلام قبول کیا تھا۔ ان میں بنو ہذیل کا ایک خاندان تھا جس کے دو مردوں اور ایک خاتون نے کم از کم اسلام قبول کیا تھا وہ تھے حضرت عبداللہ بن مسعود ہذلی اور ان کے بھائی عتبہ اور ان کی والدہ ماجدہ۔[276] غالباً ان کے والد ماجد کا اس وقت تک انتقال ہو چکا تھا۔ اگرچہ ماخذ ان دونوں ہذلی مسلمانوں کے اہل وعیال کا ذکر نہیں کرتے لیکن یہ حتمی ہے کہ ان کے گھرانے کے اور افراد جن میں مرد عورتیں اور بچے شامل تھے اسلام لا چکے تھے کیوں کہ ہجرت کے وقت ان

دونوں بھائیوں کی عمریں ۳۵ - ۳۷ سال کے درمیان تھیں۔ ان کے حلفاء میں ایک مختصر سا کندی گھرانا حضرت شرحبیل بن حسنہ کندی کا تھا۔ وہ اور ان کی والدہ ماجدہ حضرت حسنہ نہ صرف قدیم مسلمان تھے بلکہ مہاجر حبشہ و مدینہ بھی تھے، ان کے اہل و عیال بھی مسلمان ہو چکے تھے۔[۲۷۷] اسی طرح ایک اور حلیف حضرت مقداد بن عمرو بہرانی تھے جو اسود بن عبد یغوث زہری کے حلیف ہی نہیں متبنیٰ بھی تھے۔ ان کا چھوٹا سا کنبہ مکی عہد کا مسلم تھا۔[۲۷۸] ایک خزاعی حلیف حضرت ذوالشمالین بن عمرو خزاعی ابتدائی مکی مسلم اور بدری صحابی تھے۔[۲۷۹] اس خاندان کے ایک مولیٰ حضرت خباب بن ارت تمیمی قدیم ترین مکی مسلمانوں میں شامل تھے جنہوں نے اسلام کی خاطر بے نظیر قربانیاں دی تھیں۔ ایک اور حلیف حضرت مسعود القاری بھی ابتدائی مسلمان تھے۔[۲۸۰]

غالباً مدنی عہد میں اسلام مکہ کے بنو زہرہ میں پھیلتا رہا تھا مگر ہمارے پاس اس کے ثبوت کم ہیں۔ فتح مکہ میں البتہ وہ سب مسلمان ہو گئے تھے۔ اس دور کے ممتاز مسلمانوں میں حضرات مخرمہ بن نوفل، اسید بن حارث، عبداللہ بن ارقم اور عبدالرحمٰن بن ارقم کے علاوہ ان کے ایک حلیف حضرت علا بن جاریہ شامل تھے۔[۲۸۱] یہ بات بلا ریب کہی جا سکتی ہے کہ کیا قدیم اور کیا بعد کے زہری مسلمانوں کی تعداد ہماری فہرست سے کہیں زیادہ تھی۔

(۷) بنو اسد

چھٹی صدی عیسوی کے اواخر میں قریش مکہ کا خاندان بنو اسد اگرچہ مکی اشرافیہ کا رکن تھا اور اقتصادی دولت اور تجارتی مہارت کے لیے خاصا ممتاز تھا تاہم عددی اعتبار سے چھوٹا ہونے کے سبب دوسرے درجہ کے قریشی خاندانوں میں گنا جاتا تھا۔[۲۸۲] بعثت نبوی کے قریبی زمانے میں اس کے متعدد افراد جیسے زمعہ بن اسود، ابوالبختری، نوفل بن خویلد کے علاوہ حضرت خدیجہ بنت خویلد اور ان کے بھتیجے حکیم بن حزام ممتاز و متمول تاجران مکہ میں سمجھے جاتے تھے۔ اگر بنو اسد کے ازدواجی تعلقات بنو مخزوم، بنو عبد شمس اور بنو ہاشم سے تھے تو تجارتی تعلقات بنو تیم وغیرہ سے بھی تھے۔[۲۸۳]

بنو خویلد کے حضرت زبیر بن عوام رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی حضرت صفیہ بنت عبدالمطلب کے فرزند تھے۔ ابن اسحاق نے حضرت زبیر کو پہلے آٹھ مسلمانوں میں شمار کیا ہے۔ وہ حضرت ابوبکر کے حلقۂ احباب میں شامل تھے۔ اور انہی کی تحریک پر اسلام لائے تھے۔[۲۸۴] حضرت صفیہ بنت عبدالمطلب بھی قدیم مکی مسلم تھیں اور غالباً وہ اپنے فرزند کے ساتھ یا ان کے قبول اسلام کے معاً بعد مشرف بہ اسلام ہوئی تھیں۔[۲۸۵] اسی زمانے میں ان کے ایک اور فرزند حضرت صائب بن عوام نے اسلام قبول کیا تھا جبکہ ان کے فرزند اکبر عبدالرحمٰن بن عوام نے فتح مکہ میں یہ شرف حاصل کیا تھا۔[۲۸۶] بنو خویلد کے دوسرے ابتدائی مسلمانوں میں حضرت خدیجہ بنت خویلد[۲۸۸] اور ان کے ایک بھتیجے حضرت خالد بن حزام تھے۔[۲۸۹] حضرت خدیجہ تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد پہلی مسلم تھیں۔ ان کی ایک بہن ہالہ بھی مکی عہد کی مسلم تھیں۔[۲۹۰] وہ رسول کریم کے بڑے داماد کی والدہ ماجدہ تھیں۔ اسی طرح اسود بن نوفل بن خویلد بھی قدیم مکی مسلمان تھے۔[۲۹۱] بنو حارث میں حضرت عمرو بن امیہ اسدی[۲۹۲] اور بنو اسود میں حضرت یزید بن زمعہ اسدی ابتدائی مسلم تھے۔[۲۹۳] یہ نکتہ یا حقیقت کافی اہم ہے

کہ یہ تمام ابتدائی مسلمان سرداران اسد کے اولاد و احفاد تھے اور کسی طرح سے ان کو بنو اسد کے ذیلی یا غیر اہم خاندانوں کے افراد نہیں سمجھا جا سکتا۔ بنو اسد[۲۹۴] کے بعض حلیف اور موالی بھی ابتدائی مسلم تھے جن میں حضرت حاطب بن ابی بلتعہ لخمی اور ان کے مولیٰ حضرت سعد ممتاز افراد تھے۔ یہ دونوں بزرگ بدری صحابی تھے[۲۹۵]

ماخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ بنو اسد میں ہجرت نبوی کے بعد بھی اسلام کی اشاعت جاری رہی۔ اس کی ایک مثال حضرت ہبار بن اسود بنو مطلب/اسد کے قبول اسلام کا واقعہ ہے۔ وہ غزوۂ بدر کے بعد اسلام لائے تھے اور ہجرت کر کے مدینے چلے گئے تھے۔ امکان ہے کہ ایسے اور مسلمان رہے ہوں گے۔[۲۹۶]

بہر حال فتح مکہ میں یہ پورا گھرانا اسلام کے دائرے میں داخل ہو چکا تھا۔ فتح مکہ کے ممتاز مسلمانوں میں حضرت حکیم بن حزام اور غالباً ان کے فرزند ہشام بن حکیم تھے۔[۲۹۷] یہ یقینی ہے کہ خانوادۂ اسد کے متعدد دوسرے حضرات و خواتین بھی اس روز اسلام لائے تھے۔[۲۹۸]

(۸) بنو جمح

بنو جمح مکی اشرافیہ کے رکن ہونے کے علاوہ مکی سماج میں خاصے طاقتور تھے[۲۹۹] لیکن ان کا بھی شمار دوسرے درجہ کے خاندانوں میں ہوتا تھا۔ ان کا سماجی و اقتصادی مقام بنو سہم یا بنو اسد کے مانند تھا۔ مکی دور نبوی میں اسلام کے سخت ترین دشمنوں میں بنو وہب کے دو رکن امیہ بن خلف اور اس کا بھائی ابی بن خلف پیش پیش تھے۔ وہ قریشی سرداروں میں غالباً اسی عداوت اسلام و دشمنی رسول کے سبب گنے جاتے تھے۔[۳۰۰] دراصل خاندان بنو وہب کی دو شاخیں اسلام و کفر کی آویزش کی دو نمایاں شکلیں تھیں۔ ایک بنو خلف بن وہب کا گھرانا تھا جس کے مذکورہ بالا سردار نمائندے تھے اور دوسرا بنو حبیب بن وہب کا گھرانا تھا جس کے ممتاز ترین نمائندے حضرت عثمان بن مظعون بن حبیب بن وہب تھے۔

حضرت عثمان بن مظعون جمحی قدیم ترین مکی مسلمانوں میں تھے۔ ان کو ابن اسحاق نے پہلے چھیالیس یا چھپن مسلمانوں کی فہرست میں شامل کیا ہے۔[۳۰۱] تقریباً یہ یقینی ہے کہ ان کا پورا گھرانا مسلمان ہو گیا تھا کیونکہ فہرست میں ان کے کم از کم تین بھائیوں حضرات سائب، قدامہ اور عبداللہ کے علاوہ ان کے ایک فرزند حضرت سائب بن عثمان کو بھی شمار کیا گیا ہے۔[۳۰۲] ان کی جمحی اہلیہ بھی مسلمان تھیں۔[۳۰۳] ان کی ایک بہن کے قبول اسلام کے بارے میں ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔ ماخذ نے اگرچہ اس موقع پر ان کے اور بھائی بہنوں، فرزندوں اور دختروں اور دوسرے اعزہ جیسے والدہ وغیرہ کا ذکر نہیں کیا ہے تاہم یہ یقینی ہے کہ ان کا پورا گھرانا مشرف بہ اسلام ہو گیا تھا کیونکہ روایات میں ہے کہ جب بنو مظعون نے اپنی تمام عورتوں، مردوں اور بچوں کے ساتھ مدینہ ہجرت کی تو وہ اپنی تمام جائیداد منقولہ و اسباب و دولت اپنے ساتھ مدینہ لے گئے تھے۔ اور مکہ میں اپنے گھروں کو تالا لگا گئے تھے۔[۳۰۴]

بنو جمح کا ایک اور ابتدائی مکی مسلم گھرانا بنو معمر بن حبیب بن جمح کا تھا۔ اس کے کئی افراد کے ناموں کا ذکر ملتا

ہے۔ ان میں حضرات معمر بن حارث، ان کے دو بھائی حطاب بن حارث اور حاطب بن حارث، حاطب کی اہلیہ مکرمہ حضرت فاطمہ بنت مجلل اور ان دونوں میاں بیوی کے دو فرزندان گرامی حضرات محمد اور حارث، حضرت حطاب بن حارث کی زوجہ محترمہ حضرت فکیہہ بنت یسار شامل تھے۔ ممکن ہے کہ کچھ اور افراد بھی مسلمان ہوئے ہوں۔ یہ گھرانا پورا مسلمان ہو گیا تھا۔[۳۰۵] ان کے علاوہ ان کے چچا بنو معمر بن حبیب کے خاندان میں حضرت سفیان بن معمر، ان کی اہلیہ محترمہ حسنیؓ اور دونوں کے دو فرزند حضرات جابر اور جنادہ، حضرت سفیان کے ایک حقیقی بھائی حضرت جمیل بن معمر اور ان کے ایک ماں جائے بھائی حضرت شرحبیل بن عبداللہ غوثی نمایاں ترین مسلمان تھے۔[۳۰۶] یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ بنو جمح کا گھرانا بھی پورا اسلام لے آیا تھا۔ اگرچہ اس کی خواتین اور بچوں کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔

بنو وہب کے ایک ذیلی گھرانے بنو احیان بن وہب کے ایک اہم فرد حضرت نبیہہ بن عثمان بن ربیعہ تھے جنہوں نے ہجرت حبشہ سے پہلے نہ صرف اسلام قبول کیا تھا بلکہ اللہ کی راہ میں وطن بھی چھوڑ دیا تھا۔[۳۰۷] قیاس ہے کہ اس خاندان کے مزید ارکان نے مکی دورِ اول ہی میں یا دورِ ثانی میں اسلام قبول کیا تھا۔

ہجرت نبوی کے بعد بھی اسلام کی اشاعت کا سلسلہ بنو جمح کے مختلف گھرانوں میں جاری رہا تھا۔ اس کی دلچسپ مثال عمیر بن وہب جمحی کے صاحبزادے حضرت وہب کی ہے۔ موصوف اسلام کے نہ صرف دشمن تھے بلکہ غزوہ بدر میں کی لشکر کی شکست پر اتنے برافروختہ ہوئے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے ارادے سے مدینہ چل پڑے مگر وہاں پہنچ کر جمالِ روئے انورِ نبوی اور رحمتِ عام نبوی سے اس قدر متاثر اور مبہوت ہوئے کہ اسلام لائے بغیر نہ بنی گھر بار چھوڑ چھاڑ کر دہ مدینہ ہی میں جوارِ نبوی میں بس گئے (۳۰۸)۔ یہ اور ایسی ہی دوسری مثالیں ثابت کرتی ہیں کہ ہجرت کے بعد بھی مکہ کی سنگلاخ و سنگین زمین میں قبولِ اسلام کی نمو باقی تھی۔ اس کی تائید مزید حضرت سعید بن عامر بن حذیم جمحی کے قبولِ اسلام کے واقعہ سے ہوتی ہے جو صلح حدیبیہ کے فوری بعد اسلام لائے تھے، مدینہ ہجرت کر کے پہنچے اور خیبر کے غزوہ میں شریک جہاد ہوئے (۳۰۹) امکان یہ ہے کہ صلح حدیبیہ کے بعد مسلمان ہونے والے بنو جمح میں حضرت سعید بن عامر تنہا شخص نہیں تھے۔

فتح مکہ کے زمانے میں اسلام قبول کرنے والوں میں بنو جمح کے ممتاز افراد میں حضرات صفوان بن امیہ،[۳۱۰] عمیر بن وہب اول الذکر کے دو فرزند عبدالرحمٰن اکبر اور عبداللہ متکبر اور ان دونوں کی مائیں بالترتیب حضرت ام حبیب بنت ابی سفیان اور حضرت برزہ بنت مسعود بن عمر (۳۱۱) امیہ بن خلف کے فرزندِ گرامی حضرت احیحہ اور پوتے حضرت اسید بن احیحہ کے علاوہ[۳۱۲] حضرت ابو محذورہ اوس بن معیر بن لوذان جمحی بھی شامل تھے۔ موخر الذکر صحابی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نہایت خوش گلو مؤذن کعبہ تھے اور انہی کے خاندان میں یہ شرف ہمیشہ باقی رہا۔[۳۱۳] بلاریب بنو جمح کے کل مسلمانوں کی تعداد اس سے کئی گنا زیادہ تھی جن کے اسمائے گرامی مآخذ میں مذکور ہیں یا پردۂ گمنامی میں پوشیدہ[۳۱۴]

۹۔ بنو عبدالدار

عبدالدار شہر مکہ کے بانی اوّل قصی کے فرزند اکبر اور عبد مناف کے برادر اکبر تھے۔ ہمارے عام مآخذ میں عموماً یہ بیان ملتا ہے کہ قصی نے اپنی زندگی میں اپنے پانچوں مناصب فرزند اکبر کو دے دیئے تھے۔ اور بقیہ فرزندوں کو محروم کر دیا تھا قصی کے بعد یہی بنائے مخاصمت بنی اور عبد مناف اور عبدالدار کے فرزندوں کے درمیان تصادم کی نوبت آ گئی لیکن معاملہ صلح و معاہدہ سے سلجھ گیا اور دونوں خاندانوں میں تقسیم مناصب ہو گئی اور اس کے بعد بنو عبدالدار کی سماجی اور اقتصادی حیثیت وہ نہیں رہی جو تھی۔ یہ بیان یک طرفہ اور غلط ہے۔ ازرقی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ قصی نے اپنے چھ مناصب برابر برابر اپنے دونوں فرزندوں عبدالدار اور عبد مناف میں تقسیم کر دیئے تھے۔ جو ان کے گھرانوں میں بالترتیب چلتے رہے[315] بنو عبدالدار کی سماجی اور مذہبی برتری سے کوئی مؤرخ انکار نہیں کر سکتا کیونکہ وہ اب بھی کعبہ کے متولی اور کلید بردار تھے۔ جو مذہبی لحاظ سے سب سے بڑا عہدہ تھا۔[316] البتہ ان کی عددی طاقت کے کم ہو جانے اور اقتصادی ثروت نہ ہونے کے سبب وہ بنو عبد مناف کے ہم پلہ نہیں رہے تھے اور قریشی بطون کی دوسری صف میں آ گئے تھے۔

بنو عبدالدار کے نسبتاً ایک متمول گھرانے کے دو افراد حضرت مصعب بن عمیر بن ہاشم[317] اور ان کے بھائی حضرت ابوالروم بن عمیر ابتدائی مکی مسلمانوں میں شامل تھے[318]۔ اسلام کی خاطر انہوں نے نہ صرف عیش و عشرت کی زندگی چھوڑی بلکہ قریش کے خاص کر اپنی کافرہ ماں کے ظلم و ستم بھی سہے اور اسی سبب ہی وطن سے ہجرت کر کے حبشہ بھی گئے۔ اس کاروان مجاہدین حبشہ میں بنو عبدالدار کے تین مختلف گھرانوں کے متعدد افراد شامل تھے۔ ابن اسحاق نے حضرت سُوَیبِط بن سعد، حضرت جہم بن قیس اور ان کی زوجہ محترمہ حضرت ام حرملہ بنت عبدالاسد خزاعی اور ان دونوں میاں بیوی کے دو فرزندوں حضرات عمرو اور خزیمہ کے علاوہ حضرت فراس بن نضر بن حارث کو بھی گنایا ہے[319]۔ مؤخر الذکر صحابی خاندان عبدری کے ایک اہم سردار کے فرزند جلیل تھے۔ ابن سعد نے اس میں بنو عبدالدار کے ایک مولیٰ حضرت ابو فکیہہ ازدی کا اضافہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ وہ قدیم الاسلام مکی بھی تھے اور مہاجر حبشہ بھی[320]۔ ابن اسحاق کے مطابق حضرت مصعب بن عمیر اور حضرت سویبط مہاجرین حبشہ کے مکہ لوٹ آنے والے گروہ میں شامل تھے اور بعد میں ان دونوں نے ہجرت نبوی سے ایک سال قبل مدینہ کو ہجرت کی تھی[321]۔ یہ دونوں عبدری صحابی بدری ہونے کی فضیلت بھی رکھتے تھے[322] اسی خاندان کی ایک خاتون حضرت برہ بنت عامر نہ صرف ابتدائی مسلمان تھیں بلکہ مہاجرات مدینہ میں بھی شامل تھیں[323]۔ ایسی خواتین نہ جانے اور کتنی ہوں گی

ہجرت نبوی کے بعد مکہ کے باقی ماندہ عبدریوں میں اسلام کی اشاعت کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ کیونکہ مآخذ عموماً اس موضوع پر صراحت کے ساتھ کچھ نہیں کہتے ہیں۔ البتہ یہ قیاس کرنا بجا معلوم ہوتا ہے کہ سست روی سے سہی اسلام کی تاثیر و کارکردگی کا سلسلہ جاری ہی رہا ہو گا۔ البتہ یہ یقینی ہے کہ صلح حدیبیہ کے بعد بنو عبدالدار کے عاقل و فہیم اشخاص اسلام میں داخل ہونے لگے تھے۔ اس کی سب سے درخشاں مثال بنو عبدالدار کے ممتاز ترین سردار اور کلید بردار و متولی

کعبۃ اللہ الحرام حضرت عثمان بن طلحہ عبدری کے قبول اسلام کا واقعہ ہے۔ ابن سعد نے قریش مکہ کے جن تین عظیم شخصیتوں کے اسلام قبول کرنے کا اس زمانے میں ذکر کیا ہے۔ حضرت عثمان عبدری ان میں سے ایک ہیں[۳۲۴] اگرچہ ابن سعد اور دوسرے سیرت نگاروں نے اس موقعہ پر یہ صراحت نہیں کی ہے کہ ان کے خاندان نے اسلام قبول کیا تھا۔ یا نہیں تاہم دوسرے ذرائع بلکہ انہی مآخذ کے دوسرے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے خاندان والے نہ صرف ان کے ساتھ مسلمان ہوئے تھے۔ بلکہ وہ ہجرت کر کے مدینہ بھی چلے گئے تھے۔ مزید امکان یہ بھی ہے کہ ان کے علاوہ بھی دوسرے عبدریوں نے اسی زمانہ میں اسلام قبول کیا تھا۔ خاص کر حضرت عثمان عبدری کے برادروں اور رشتہ داروں نے

بہر حال فتح مکہ کے دن یا اس کے بعد کے متصل زمانے میں بنو عبد الدار کے دوسرے تمام افراد اسلام کے دائرے میں داخل ہو گئے تھے۔ ان میں حضرت نضیر بن حارث عبدری میں شامل تھے۔ جن کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہوازن کے غنائم کے خمس سے خاص عطیہ نبوی اور سرداروں کا حصہ عطا فرمایا تھا۔ ایک روایت کے مطابق حضرت عثمان بن طلحہ کے ایک فرزند حضرت شیبہ بن عثمان نے فتح مکہ کے زمانے میں اسلام قبول کیا تھا۔[۳۲۵] ظاہر ہے کہ متعدد اور بھی عبدری اس دن مسلمان ہوئے تھے

عبد الدار کے ایک بھائی عبد قصی کی نسل کچھ زیادہ نہیں چلی تھی۔ لہذا وہ کبھی ایک گھرانا نہیں بن سکا۔ اس کے بہت کم افراد میں سے حضرت طلیب بن عمیر مکی عہد کے قدیم مسلمان تھے۔[۳۲۶] ان کے علاوہ دوسروں کے بارے میں ہماری معلومات ناقص ہیں۔ زبیری کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نسل ہی منقطع ہو گئی تھی۔ پھر بھی کچھ مرد عورتیں اور بچے یقینی طور سے عہد نبوی کے مسلم تھے۔

۱۰۔ بنو عامر بن لوی

بنو عامر بن لوی کو مکی اشرافیہ میں کوئی خاص مقام حاصل نہیں تھا، حالانکہ وہ عددی لحاظ سے قریش کے بڑے بطون میں سے ایک تھا۔ اس کا غالباً سبب یہ تھا کہ وہ قریش البطائح کے مقابلے میں قریش الظواہر کے زیادہ قریب تھے۔[۳۲۷] بعثت نبوی کے بعد اس کے بعض سرداروں خاص کر سہیل بن عمرو کی طاقت میں اضافہ ہوا تھا۔ اور صلح حدیبیہ کے زمانے میں وہ مکہ کے اہم ترین رؤسا و اشراف میں شمار ہوتے تھے۔ اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ انہوں نے قریش کے نمائندے کی حیثیت سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے صلح حدیبیہ کا معاہدہ طے کیا تھا۔ اور متن معاہدہ کے مطابق تو فریق ثانی وہی تھے۔[۳۲۸]

بہر حال اسلام نے قریش البطائح اور قریش الظواہر تو درکنار اسود و احمر اور نسل و رنگ و وطن و علاقہ و زبان وغیرہ کسی انسانی یا قدرتی حد بندی کی پروا نہیں کی۔ چنانچہ مکی دور تبلیغ کے نصف اول کے آغاز ہی میں اس نے ابن اسحاق اور ابن سعد کے بقول اس قریشی خاندان کے بعض گھرانوں میں قدم جا لئے تھے۔ اس کے ایک گھرانے بنو عبد شمس کے دو افراد حضرات سلیط بن عمرو بن عبد شمس اور ان کے بھائی سکران قدیم ترین مسلمان تھے۔ ان دونوں کی زوجات محترمات بالترتیب حضرت فاطمہ بنت علقمہ اور حضرت سودہ بنت زمعہ بھی مسلمان ہو گئی تھیں۔ مآخذ کے بیان کے مطابق ان دونوں،

بھائیوں کے گھرانوں نے حبشہ کو ہجرت کی تھی۔ جہاں حضرت سکران کا انتقال ہو گیا تھا اور باقی عامری مہاجرین ایک سال بعد مکہ پلٹ آئے تھے[۲۲۹]۔ حضرت سکران ہی کی بیوہ حضرت سودہ تھیں۔ جن سے حضرت خدیجہ کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شادی کر لی تھی[۲۳۰]۔ اگرچہ مآخذ صراحت نہیں کرتے۔ مگر انساب و سیر کی دوسری کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے متعلقین خاص کر بچے بھی مسلمان تھے یا ہو گئے تھے۔ بنو عامر کے ایک اور گھرانے کے اہم ترین مکی مسلم تھے حضرت ابن ام مکتوم جن کے اصل نام میں اہل علم کا اختلاف ہے۔ علماء مدینہ کے نزدیک ان کا نام عبداللہ بن قیس جبکہ علماء عراق و شام عمرو بن قیس بتاتے ہیں۔[۲۳۱]

ابن اسحاق نے[۲۳۲] اپنی فہرست مہاجرین حبشہ میں بنو عامر کے مختلف گھرانوں کے آٹھ حضرات و خواتین کے اسمائے گرامی بیان کئے ہیں۔ ان میں مذکورہ بالا بزرگوں کے علاوہ (حضرت ابن ام مکتوم کو چھوڑ کر) حضرات ابو سبرہ بن ابی رہم[۲۳۳] اور ان کی زوجہ محترمہ حضرت ام کلثوم بنت سہیل بن عمرو[۲۳۴]، عبداللہ بن مخرمہ[۲۳۵]، عبداللہ بن سہیل بن عمرو[۲۳۶]، مالک بن زمعہ بن قیس[۲۳۷] اور ان کی اہلیہ عمرہ بنت سعدی بن وقدان[۲۳۸] اور حاطب بن عمرو بن عبد شمس[۲۳۹] اور ان کے ایک یمنی حلیف سعد بن خولی کو شمار کیا ہے[۲۴۰]۔ بدری صحابہ کی فہرست میں ابن اسحاق نے ایک نئے عامری نام عمیر بن عوف جو دراصل ان کے مولیٰ تھے، کا اضافہ کیا ہے اور ان کو مکہ کا قدیم مسلم قرار دیا ہے[۲۴۱]۔

"تاریخی عوامل کی ستم ظریفی دیکھئے کہ اسلام نے سہیل بن عمرو عامری جو اسلام و رسول اسلام کے سخت مخالفوں میں تھے کے گھر میں یوں قدم جما لئے کہ ان کے اہل خاندان میں سے ہر فرد رفتہ رفتہ ان کا ساتھ چھوڑتا اور اسلام کا پیرو بنتا گیا۔ اوپر ذکر آ چکا ہے کہ ان کے ایک فرزند عبداللہ اور ایک صاحبزادی ام کلثوم نہ صرف اسلام لا چکے تھے۔ بلکہ مہاجرین حبشہ میں بھی شامل تھے۔ اسی طرح ان کے دونوں بھائیوں سلیط اور سکران اور دونوں بھاوجیں فاطمہ اور سودہ بھی ابتدائی مسلمان تھے ان کی دوسری کتخدا تمام بیٹیاں بھی مسلمان ہو چکی تھیں۔ ان میں ایک حضرت سہیلہ تھیں جو حضرت ابو حذیفہ بن عتبہ اموی کی زوجہ محترمہ تھیں۔ اپنے اقتدار و وقار کی خلاف ورزی نے غالباً ان کی مخالفت اسلام میں شدت پیدا کر دی تھی اور انہوں نے اپنے مسلم فرزندوں پر پابندیاں عائد کر دی تھیں۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن سہیل کی حبشہ سے واپسی پر ان کو اور اسی زمانے میں یا اس سے کچھ پہلے یا بعد میں ان کے ایک اور بھائی حضرت ابو جندل کو مکہ میں محبوس و مقید رکھا تھا[۲۴۲]۔ حضرت عبداللہ خوش نصیب تھے کہ بدر کے موقع پر مکی فوج میں شریک ہو کر مدینہ پہنچے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن رحمت میں پناہ گزیں ہوئے مگر ان کے بھائی ابو جندل کو صلح حدیبیہ کے کچھ بعد تک قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔ ان کے علاوہ اس خاندان کے اور بھی قدیم و متاخر مسلمان تھے[۲۴۳]۔

بنو عامر کے دو اور ابتدائی مسلمان حضرت وہب بن سعد بن ابی سرح اور ان کے بھائی عبداللہ تھے۔ اگرچہ مؤخر الذکر کے بارے میں روایات شاہد ہیں کہ وہ مدینے سے بھاگ کر مرتد ہو گئے تھے۔ تاہم فتح مکہ میں وہ پھر اسلام لے آئے تھے اور مخلص مسلمان بن گئے تھے[۲۴۴]۔ فتح مکہ ہی میں حضرت سہیل بن عمرو عامری بھی مسلمان ہوئے تھے، اور ایسے

پکے اور راسخ العقیدہ کر رہے کہ زمانے میں جب اوروں کے قدم ڈگمگانے لگے تھے وہ نہ صرف چٹان کی طرح ثابت قدم رہے تھے۔ بلکہ انہوں نے دوسروں کے قدم بھی جما دیئے تھے[245] دوسرے مسلمین فتح مکہ میں حضرت حویطب بن عبد العزیٰ[246] اور ہشام بن عمرو[247] اور حضرت سہیل کے ایک فرزند عتبہ کے علاوہ عبد بن زمعہ اور ان کے بھائی عبدالرحمٰن[248] بھی شامل تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کے علاوہ متعدد بلکہ کثیر عامری مسلمان صحابہ ایسے تھے جو اس تذکرہ میں نہیں آسکے ہیں۔[249]

۱۱۔ بنو حارث بن فہر

بنو عامر بن لوی کی مانند یہ خاندان بھی قریش الظواہر میں شمار ہوتا تھا اور کبھی کبھی قریش البطاح میں بھی مگر مکی اشرافیہ میں اس کو کوئی مقام حاصل نہیں تھا۔[250] اور غالباً بعثت نبوی کے زمانے کے قریب یا اس کے بعد عہد اسلامی میں اس "مکہ کے بیرونی خاندان قریش" میں کوئی ایسی عظیم اور طاقت ور شخصیت نہیں پیدا ہو سکی جو اسے مکی سماج و سیاست میں کوئی نمایاں مقام دلا سکتی جیسے کہ حضرت سہیل بن عمرو عامری نے اپنی صلاحیتوں کے سبب خاندان بنو عامر بن لوی کو دلایا تھا۔

بہر حال اس طبقاتی اونچ نیچ اور مکی سماج میں اس کے فروتر مقام سے قطع نظر اسلام نے بالکل شروع سے اس خاندان میں بھی اپنا اثر جما لیا تھا۔ ابن اسحاق نے قدیم ترین آٹھ مسلمانوں کی فہرست کے بعد جو چھیالیس مسلمانان مکہ کی فہرست دی ہے۔ اس میں حضرت ابو عبیدہ بن جراح فہری کو سر فہرست رکھا ہے۔[251] درحقیقت بنو حارث بن فہر میں حضرت ابو عبیدہ کا کوئی کلیدی مقام رہا ہو یا نہ رہا ہو مگر امت اسلامی میں وہ اپنی گوناگوں صلاحیتوں اور قربانیوں کے سبب نمایاں ترین افراد میں شمار کئے جاتے تھے اور عہد نبوی میں ہی وہ حضرات ابوبکر و عمر و عثمان کے پایہ و درجہ کے سمجھے جاتے تھے۔ وہ نہ صرف اسلام کے قدیم ترین ماننے والوں میں تھے۔ بلکہ اس کے کامیاب ترین و پرجوش ترین مبلغوں میں بھی تھے اور ان کے ہاتھ پر متعدد خواتین و حضرات نے اسلام قبول کیا تھا۔[252] مآخذ ان کے اپنے خاندان کے افراد کے قبول اسلام کے بارے میں خاموش ہیں۔ لیکن یہ تقریباً یقینی ہے کہ ان میں سے اکثر عہد مکی قدیم میں ہی مسلمان ہو چکے تھے۔[253]

بنو حارث بن فہر کے ایک اور گھرانے کے ایک اور قدیم مسلم تھے۔ حضرت سہل بن بیضا فہری۔ وہ حضرت ابوبکر کے قدیم و قریبی دوست تھے اور ممکن ہے کہ ان کی دعوت پر اسلام لائے ہوں۔[254] ابن اسحاق نے مہاجرین حبشہ کی فہرست میں جن اور فہری مسلمانوں کے نام گنائے ہیں۔ ان میں مذکورہ بالا دونوں صحابہ کے علاوہ حضرات عمرو بن ابی سرح بن ربیعہ، عیاض بن زہیر، عمرو بن حارث، عثمان بن عبد غنم، سعد بن عبد قیس اور حارث بن عبد قیس کے اسمائے گرامی بیان کئے ہیں۔[255] بدری صحابہ کی فہرست میں اس خاندان کے پانچ افراد کا نام شامل کیا ہے۔ جن میں صفوان بن بیضاء کا نام نیا ہے۔[256] ان کے علاوہ دوسرے ابتدائی مسلمانوں میں حضرت حاطب بن عمرو بن ابی سرح اور حضرت عامر بن عبد غنم کو بھی شمار کرنا چاہیئے۔[257] ہجرت نبوی کے بعد قریش الظواہر میں اسلام کی اشاعت کی رفتار کے بارے میں ہمارے مآخذ عام طور سے خاموش رہتے ہیں۔ قیاس کہتا ہے کہ دوسرے بطون قریش کی مانند ان میں بھی اسلام پھیلنے کا سلسلہ جاری رہا ہوگا اور فتح مکہ میں وہ بھی

اسلامی امت کے جزو بن چکے تھے[۳۶۸] ابن اثیر کے اس بیان سے کہ حضرت کرز بن جابر فہری نے بدر کے بعد کسی وقت اسلام قبول کیا تھا۔ اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے[۳۶۹]

قریش الظواہر

یہ حیرت کی بات ہے کہ ہمارے قدیم مؤلفین سیرت و مؤرخین اسلام عام طور سے اپنی ساری توجہ قریش البطاح کے مختلف بطون اور خاندانوں میں اشاعت و نشر اسلام پر مرکوز رکھتے ہیں اور اس سے زیادہ حیرت ناک و ناقابل فہم رویہ ہمارے جدید مسلم و مستشرق مؤرخین و سیرت نگاروں کا ہے جو تحقیق و تفتیش کے بلند بانگ دعوؤں کے باوجود قدیم ماخذ کے تتبع میں انہیں خطوط پر چلتے ہیں جن پر ان کے پیشرو چل چکے تھے۔ بہرحال قدیم و جدید دونوں مصنفین نے پوری طرح سے قریش الظواہر اور ان کے گھرانوں میں تبلیغ و اشاعت اسلام کی بحث سے صرف نظر کیا ہے۔ لیون کیتانی اور مونٹگمری واٹ وغیرہ جنہوں نے بڑی کدو کاوش سے مکی مسلمانوں کی فہرستیں تیار کی ہیں۔ قریش الظواہر کے مکی و مدنی مسلمانوں کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے اور ان کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہا ہے۔[۳۷۰] حالانکہ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ، دور کے باسی اور مکی سیاست و سماج میں غیر اہم عناصر سہی، قریش الظواہر بھی بہرحال مکہ کے باشندے تھے اور یہ بھی مسلمہ واقعہ ہے کہ وہ بھی مختلف زمانوں اور ادوار میں اسلام میں داخل ہوتے رہے تھے۔ اسلام کی دعوت صرف قریش کے "اندرون مکہ" کے باشندوں کے لئے ہی نہیں تھی بلکہ اس کے مخاطب و مستحق اور علمبردار اس کے بیرونی باشندے بھی تھے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بھی دعوت حق دی تھی اور انہوں نے اسے قبول بھی کیا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ ہمارے مآخذ میں ان کے بارے میں معلومات بہت ناقص ہیں پھر بھی ان میں اسلام کی قبولیت و اشاعت کی رفتار و نہج پر مختصر سا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔

قریش الظواہر میں عام طور سے فہر کی وہ اولاد اور ان کی نسلیں شمار کی جاتی ہیں۔ جو فہر کے پوتے کعب بن غالب کے علاوہ تھیں۔ اس لحاظ سے بنو عامر بن لوی اور بنو حارث بن فہر بھی قریش الظواہر کے خاندان تھے۔ لیکن ان کو بعض اوقات قریش البطاح کا رکن سمجھ لیا جاتا ہے۔ اس لئے ان پر بحث انہی کے دوسرے اراکین بطون کے ساتھ کی جاتی ہے بہرحال ذیل میں قریش الظواہر کے مختلف بطون میں قبول و نشر اسلام کا جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔ ان کے چھ مزید گھرانے تھے۔ چار بنو عامر بن لوی کے ذیلی گھرانے .... سامہ بن لوی، خزیمہ بن لوی، سعد بن لوی، اور حارث بن لوی، جبکہ ایک گھرانہ بنو تیم بن غالب کا تھا اور ایک ہی محارب بن فہر کا۔ ان کا مطالعہ انساب کی کتابوں پر بنیادی طور سے مبنی ہے۔[۳۷۱]

بنو سامہ بن لوی کی اولادوں میں حارث بن سامہ کے فرزند لوی، عبیدہ، سعد، ربیعہ، عبدالبیت، ساعدہ اور حارث رسول کریم کے معاصر تھے۔ اور غالباً وہ کسی وقت اسلام ضرور لائے تھے۔ اسی طرح بنو ربیعہ بن حارث اور لوی بن حارث وغیرہ کے فرزندوں کے بارے میں گمان ہے کہ وہ عہد نبوی میں کسی دور کے مسلمان تھے۔

بنو خزیمہ بن لوی کو عائذۃ قریش بھی کہا جاتا ہے۔ ان میں بنو حارث بن مالک بن جلید بن خزیمہ سے متعدد لوگ عہد نبوی کے معاصر مسلمان تھے۔ جبکہ بنو حرب بن خزیمہ کے متعدد افراد مسلمان ہو کر حضرت ابوبکر و عمر کے زمانے میں شام کے علاقے میں جا بسے تھے۔

بنو سعد بن لوی میں عبد اللہ بن غانم کی اولاد یں یقینی طور پر عہد نبوی کی مسلمان تھیں۔ ان میں سے ابو الدھما حضرت عمر کے عہد میں مدینہ آئے تھے اور حضرت عثمان بن عفان نے ان کے لئے شہادت دی تھی۔

بنو الحارث بن لوی میں حصین بن عقیدہ کی اولاد و اخلاف کے اسلام لانے کا گمان ہوتا ہے۔ اگرچہ تفصیلات نہ ہونے کے سبب یقینی طور سے کچھ کہنا مشکل ہے۔

بنو تیم بن غالب جن کو بنو ادرم بھی کہا جاتا ہے کے بارے میں ہمارے سیرت کے مآخذ بھی روایت کرتے اور شہادت دیتے ہیں کہ اس کے ایک گھرانے بنو کثیر بن تیم الادرم کے ایک فرد عبد اللہ بن خطل نے اسلام قبول کر کے مدینہ ہجرت کی تھی، مگر پھر وہ مرتد ہونے کے علاوہ ایک مسلمان کو قتل کر کے مکہ فرار ہو گیا۔ جہاں فتح مکہ کے دن وہ اپنے جرائم کی پاداش میں قتل کیا گیا تھا۔ امکان ہے بلکہ یقینی ہے کہ اس گھرانے میں مخلص مسلمان بھی تھے اور خاصے تھے۔

بنو محارب بن فہر میں مآخذ نے کئی صحابہ کرام کا نام گنایا ہے۔ ان میں حضرت عمرو بن ابی عامر مکی عہد کے قدیم مسلم تھے۔ جبکہ حضرت ضحاک بن قیس فہری عہد نبوی کے اواخر کے صحابی اور مسلمان تھے۔ ان کے علاوہ حضرت حبیب بن مسلمہ فہری کو بھی صحابہ میں شمار کیا گیا ہے۔ اگرچہ واقدی کا خیال ہے کہ ان کو شرف صحبت نبوی حاصل نہیں تھا۔ اسی طرح حضرت ضرار بن خطاب محاربی فہری بھی عہد نبوی کے اواخر کے مسلمان تھے۔ ایک اور مسلم محاربی تھے۔ حضرت رباح بن عمرو جو سفر کے اچھے گیت لکھتے تھے۔ لیکن بنو محارب کے سب سے نامور صحابی تھے۔ حضرت کرز بن جابر محاربی فہری جو بدر کے بعد کسی وقت اسلام لائے تھے اور فتح مکہ میں چند مسلمان شہداء میں سے ایک تھے۔ ظاہر ہے کہ ان صحابہ کرام کے دوسرے خاندان والوں میں سے سب نہ سہی مگر کچھ یقیناً ابتدائی مسلمان تھے۔ ورنہ یہ تو قیاس کی کسوٹی پر یقینی ہے۔ کہ ان تمام خاندانوں کے تمام افراد فتح مکہ کے زمانے میں اسلام لا چکے تھے [۳۶۲]

انصار مدینہ

ریاست اسلامی کے ارتقاء کے ضمن میں ہم انصار مدینہ کے دونوں قبیلوں اوس و خزرج کے اسلام سے تعارف و تعلقات کا جائزہ لے چکے ہیں۔ دراصل ان کے قبول اسلام کے چار عہد یا زمانے تھے۔ پہلا زمانہ ۶۲۰ء کا برس تھا جب، خزرج کے چھ اشخاص مکہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر مسلمان ہو گئے اور جب وہ اپنے وطن یثرب واپس، لوٹے تو اسلام کے مبلغ و علمبردار بن کر لوٹے اور اپنے اپنے قبیلوں، خاندانوں اور پڑوسیوں میں اسلام پھیلاتے رہے، ان کی دعوت و تبلیغ پر خاصی تعداد میں لوگ مسلمان ہو گئے۔ جن میں سے بارہ مسلمان۔ نو خزرج کے مختلف خاندانوں سے اور

تین اوس کے گھرانوں سے دوسرے برس یعنی ۶۲۱ء میں حج کے موقعہ پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے اور پہلی بیعت عقبہ کی۔ ۶۲۱ء اور ۶۲۲ء کا درمیانی عرصہ دوسرا عہد تبلیغ اسلام ہے جو مدینہ میں شروع ہوا۔ اس زمانے میں مدینہ میں اسلام کی اشاعت میں تیز رفتاری آئی اور کافی لوگ مسلمان ہوئے۔ اس کا ایک سبب حضرت مصعب بن عمیر عبدری کا بطور مبلغ و معلم و امام بن کر مدینہ پہنچنا تھا۔ انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نمائندے اور "خلیفہ" کی حیثیت سے تبلیغ و دعوت میں زبردست کوششیں کیں۔ ان کے دست راست اور تبلیغ اسلام کو مدینہ میں منظم کرنے والے حضرت اسعد بن زرارہ نجاری تھے۔ ان دونوں کی کوششوں، حکمت عملی، اور خلوص و جد و جہد سے قبیلہ اوس کے دو بڑے سردار حضرات سعد بن معاذ اور اسید بن حضیر اسلام لے آئے اور اس کے نتیجہ میں پورا قبیلہ اوس مسلمان ہو گیا۔ یہ دوسرا مرحلہ ۶۲۲ء میں بیعت عقبہ ثانیہ پر ختم ہوا، جب مدینہ کے مسلمانوں کے پچھتر نمائندے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مکہ آ کر ملے اور آپ کو مدینہ آنے کی دعوت دی۔ ۶۲۲ء میں بیعت عقبہ ثانیہ اور ہجرت نبوی کے کچھ بعد تک کا زمانہ مدینہ میں تبلیغ اسلام کا تیسرا مرحلہ تھا، جب پورا مدینہ مسلمان ہو گیا تھا۔ سوائے اوس مناۃ کے تین چھوٹے چھوٹے گھرانوں بنو وائل، بنو واقف اور بنو خطمہ کے علاوہ ایک اور گھرانے بنو امیہ بن زید کے۔ یثرب کی غالب اکثریت بلکہ پچانوے فیصد آبادی کل تین ساڑھے تین برس میں مسلمان ہو گئی تھی۔ لیکن یہ پانچ فیصد عرب آبادی نے اپنے قبول اسلام میں لگ بھگ پانچ برس لگا دیئے اور وہ غزوہ خندق کے بعد اسلام لائے۔ ان کے قبول اسلام میں تاخیر کا سبب یہ تھا کہ ان کے سردار حضرت ابو قیس صیفی بن الاسلت نے اسلام نہیں قبول کیا تھا۔ اور ان کی پیروی میں ان کی قوم بھی قبول اسلام سے رکی رہی تھی۔ اس واقعہ سے مزید ثابت ہوتا ہے کہ سرداروں اور شیوخ قبائل کا اثر ان کے قبیلہ والوں پر کس قدر زیادہ دور رس اور ہمہ گیر ہوتا تھا۔ سرداروں کا قبول اسلام دراصل قبیلوں کا قبول اسلام ہوتا تھا۔ مکہ اور مدینہ میں اسلام کی تبلیغ و دعوت کے تقابلی مطالعہ سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ مکہ میں قبول و اشاعت اسلام میں سب سے بڑی رکاوٹ سرداران قریش کی سرد مہری، مخالفت اور عداوت تھی۔ جبکہ مدینہ کے تمام اہم اوسی اور خزرجی سرداروں نے اسلام قبول کر کے اپنے قبیلوں کے مسلمان ہونے کی راہ ہموار کر دی تھی۔

مدینہ منورہ میں اشاعت اسلام کا سہرا ان حضرات کے سر بندھتا ہے۔ ان میں سرفہرست خزرج کے چھ سابقین اولین ہیں جنہوں نے مکہ میں سب سے پہلے قبول اسلام کیا تھا۔ پھر بیعت عقبہ اولیٰ کے بارہ ارکان کے نام آتے ہیں۔ لیکن اس عظیم کام میں سب سے اہم اور گرانقدر کردار حضرت مصعب بن عمیر عبدری اور ان کے دست راست حضرت ابو امامہ اسعد بن زرارہ نے ادا کیا تھا۔ ان کے بعد باقی کام بارہ نقیبوں نے حضرت مصعب کے ساتھ مل کر انجام دیا تھا۔ لیکن اس موقعہ پر اوس و خزرج کے سرداروں کو نہیں بھولنا چاہیئے کہ ان کے قبیلوں نے دراصل انہی کی تحریک و تقلید پر اسلام قبول کیا تھا۔

انصار مدینہ میں اشاعت اسلام کی بحث میں ان کے اہم خاندانوں اور گھرانوں کا ایک مختصر سا جائزہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ جس سے ان کی تعداد کا اندازہ کیا جا سکے گا۔ اوس و خزرج کے اہم خاندان اور قبیلے یہ تھے: ۳۶۳

۱۔ اوس بن حارثہ بن ثعلبہ بن عمرو مزیقیاء

اوس کا قبیلہ اس کے ایک فرزند مالک کی نسل میں دراصل چلا تھا اور اس کے پانچ اہم خاندان تھے۔ یہ پانچ خاندان اور ان کے ذیلی گھرانے حسب ذیل تھے۔

(ا) بنو عوف بن مالک : (۱) بنو عمرو بن عوف : بنو ضُبَیعہ، بنو امیہ، بنو عبید، بنو جحجبا، بنو ثعلبہ، بنو معاویہ بنو لوذان، بنو غنش، بنو جبیب (بنو عمرو بن عوف قباء میں آباد تھے)

(ب) بنو عمرو بن مالک : (یہ النبیت کہلاتے تھے) : بنو عبد الاشہل، بنو زعوراء بن جشم، بنو حارثہ بن حارث بنو مجدعہ بن حارثہ بن حارث، بنو ظفر (بن خزرج بن عمرو بن مالک)

(ج) بنو مُرّہ بن مالک : (یہ جعادرہ کہلاتے تھے) : بنو وائل، بنو امیہ، بنو عطیہ (اوس مناۃ کے گھرانے بشمول بنو واقف)

(د) بنو جشم بن مالک : بنو خطمہ

(س) بنو امرؤ القیس بن مالک : بنو سلیم، بنو واقف، بنو غنم

(۲) خزرج بن حارثہ بن ثعلبہ بن عمرو مزیقیاء

(ا) بنو النجار : بنو عدیلہ، بنو معاویہ، بنو غنم بن مالک، بنو حزم بن زید بن لوذان، بنو مبذول، بنو دینار بنو مازن، بنو عدی (بنو مغالہ)

(ب) بنو عوف : بنو عمرو بن عوف، بنو سالم، الحبلیٰ، بنو غنم (قواقلہ)

(ج) بنو غنم :

(د) بنو جشم : بنو زریق بن عبد حارثہ، بنو زریق بن عامر، بیاضہ، بنو تزید (ساردہ : بنو سلمہ)

(س) بنو حارث : بنو جشم، بنو زید، بنو عوف، بنو خزرج، بنو مالک بن ثعلبہ، بنو عوف بن حارث، بنو حدارہ، بنو ابجر

(ط) بنو کعب : بنو ساعدہ

انصار کے ان دونوں قبیلوں اور ان کے اہم خاندانوں کی تفصیل سے ایک موٹا سا اندازہ ان کی کل آبادی کا ہوتا ہے۔ ہمارے پاس ان کی آبادی کے کل اعداد و شمار نہیں ہیں لیکن اندازہ ہے کہ فتح مکہ کے دس ہزار کے لشکر میں ان کی سپاہیوں کی تعداد چار اور پانچ ہزار کے درمیان تھی[۲۱۴]۔ اس پر قیاس کر کے یہ کہا جا سکتا ہے کہ انصار کی کل آبادی ہجرت نبوی کے وقت بیس پچیس ہزار کے لگ بھگ تھی جو وفات نبوی کے وقت تقریباً تیس پینتیس ہزار ہو گئی تھی۔ اتنی بڑی آبادی

کی غالب اکثریت کا تین ساڑھے تین برس میں مسلمان ہو جانا یقیناً ایک عظیم کارنامہ تھا۔

اسلام اور بدوی قبائل

مکہ کے قریش اور مدینہ کے اوس و خزرج اسلام کے پہلے دو مرکز اور تبلیغ دین خداوندی کے اولین دو محور تھے۔ ہجرت نبوی سے قبل اسلام کی اشاعت محض قریش کے مختلف بطون اور ان کے گھرانوں یا مکہ کی چار دیواری میں محدود نہیں رہی تھی۔ بالکل اسی طرح ہجرت مدینہ کے بعد اسلام صرف انصار کے مختلف قبیلوں اور ان کے خاندانوں کے بیچ محصور نہیں رہا تھا۔ بلکہ مکہ اور مدینہ اپنے اپنے ادوار میں اسلام اور اسلامی تحریک کے وہ دو بنیادی مرکز تھے۔ جہاں سے اسلام کے نور کی شعاعیں جزیرہ نمائے عرب کے مختلف علاقوں بلکہ گوشے گوشے اور چپے چپے کو روشن کر گئی تھیں یدنی عہد کے ساتویں برس کے آغاز میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شعوری و ارادی طور سے اسلام کو جزیرہ نمائے عرب کے پڑوسی ممالک شام، عراق، فلسطین، مصر اور ایران و حبشہ میں روشناس کرنے کی کوشش کی تھی۔ اور اس کے اچھے نتائج بھی برآمد ہوئے تھے[۳۶۵] جبکہ مکی عہد کے پانچویں برس میں غیر شعوری طور پر بھی اسلام کا تعارف بحر قلزم کے پار حبشہ کی عیسائی سلطنت میں ہو چکا تھا، اور مسلم روایات کے مطابق وہاں کا معاصر بادشاہ مسلمان ہو گیا تھا[۳۶۶]۔ اگرچہ اس کے طبقہ امرا اور رعایا نے اسلام کو یکسر مسترد کر دیا تھا۔ پھر بھی اس امکان سے قطعی اور حتمی طور پر انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حبشی رعایا میں سے گنتی کے چند افراد ہی سہی نے ضرور اسلام قبول کر لیا تھا۔ ٹھوس تاریخی حقائق قرآن کریم کے اس دعوائے ربانی کی تائید کرتے ہیں کہ اسلام ایک عالمگیر مذہب تھا جو روز اول بلکہ روز ازل سے" تمام لوگوں (کافۃ للناس) کے لئے اتارا گیا تھا"[۳۶۷]۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے اس آفاقی نصب العین اور عالمی فریضے کا اس دن سے بخوبی احساس و شعور تھا[۳۶۸] جس دن آپ کو خلق خدا کے سامنے دعوت اسلامی کو واشگاف و علانیہ پیش کرنے کا حکم الٰہی ملا تھا[۳۶۹]۔ ہمارے جدید محققین اور مستشرقین کا یہ نظریہ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم محض ایک عرب پیغمبر تھے اور آپ کا لایا ہوا دین محض آپ کی اپنی قوم یا زیادہ سے زیادہ عربوں کے لئے تھا[۳۷۰] غلط اور گمراہ کن ہی نہیں بلکہ تاریخی حقائق کے بالکل خلاف ہے۔ وہ دراصل ان کے مذہبی اور قومی تعصب کا زائیدہ و پروردہ اور حق کو جان لینے کے باوجود اس کو نہ ماننے کے جہل مرکب کا نتیجہ ہے۔

جہاں تک مکی عہد میں جزیرہ نمائے عرب میں اسلام کے متعارف ہونے کا تعلق ہے۔ یہ ٹھوس تاریخی واقعہ ہے کہ تمام بدوی قبائل پیغمبر اسلام کے ظہور اور اسلام کے بنیادی اصولوں سے واقف ہو چکے تھے۔ ماخذ سے واضح ہوتا ہے کہ آپ نہ صرف مکہ میں تبلیغ کرتے پھرتے تھے بلکہ اردگرد کے علاقوں میں لگنے والے بازاروں اور میلوں ٹھیلوں میں بھی آپ اپنے پیغام صداقت اور دعوت حق کو لیکر پہنچ جاتے تھے۔ چنانچہ عکاظ، ذوالمجاز، ذوالمجنہ وغیرہ بازاروں میں آپ کے خطبات عالیہ کے حوالے سیرت کے ماخذ میں ملتے ہیں۔ خود مکہ میں چونکہ سال بھر کعبہ کا عمرہ کرنے والے عرب قبائل کا تانتا لگا رہتا تھا اور حج کے مواقع خاص پر جزیرہ نما کے گوشے گوشے اور قبیلے قبیلے کے لوگ آتے رہتے تھے۔ اس لئے پورا

عرب آپ کے کام سے واقف ہو چکا تھا۔ مورخین نے جن بدوی قبائل سے آپ کی مکہ میں ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ ان میں بنو عامر بن صعصعہ، بنو محارب، بنو فزارہ، (غطفان)، غسان، بنو مرۃ (غطفان)، بنو حنیفہ، بنو سلیم، بنو عبس بنو نضر، بنو کندہ، بنو کلب، بنو حارث بن کعب، (نجران)، بنو عذرہ، اور حضرموت و یمن کے متعدد قبیلے شامل تھے[۱۱۲] ہمارے تمام مآخذ عموماً یہ بیان کرتے ہیں کہ ان میں سے کسی نے آپ کے پیغام کو قبول نہیں کیا تھا۔ مگر یہ تعمیم صحیح نہیں معلوم ہوتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان قبیلوں نے اجتماعی طور سے دعوت حق مسترد کر دی تھی مگر اس امکان سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بعض افراد نے اس کو نجی طور سے قبول بھی کر لیا ہو۔ بہر حال اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ کسی نے قبول نہیں کیا تھا تو بھی یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ قبائل عرب سے آپ کی ان ملاقاتوں نے نہ صرف اسلام کو ان سے اور ان کے ذریعہ ان کے علاقے کے لوگوں سے متعارف کرا دیا تھا۔ بلکہ ان میں اسلام کے بارے میں جستجو پیدا کر دی تھی اور اسلام کی قبولیت و اشاعت کی راہیں ہموار کر دی تھیں۔ یہی سبب تھا کہ یمن کے دور دراز کے علاقے میں بسنے اشعر قبیلے سے حضرت ابو موسیٰ اشعری، مغربی علاقے کے ابوذر غفاری، ازد کے طفیل بن عمرو دوسی، بحرین کی مشرقی سرحد سے عبد القیس کے اشج اور ازد شنوءہ کے ضماد بن ثعلبہ اور نہ جانے کتنے اور آپ کے بارے میں سن کر پیغام حق کے مشتاق بنے تھے۔ دل کی لگی، حق کی تلاش اور روح کی پیاس ان کو مشتاقانہ دیوانہ وار مکہ لائی تھی۔ اور پھر ان تشنہ کامان عرب نے اپنی پیاس کو ثر و سلسبیل محمدی کے آب خنک سے بجھائی تھی۔

مدنی دور میں قبائل عرب کی تلاش حق اور جستجوئے صدق میں عشق کی گرمی بھی در آئی تھی۔ اسلامی ریاست اور امت الٰہی کے قیام اور ارتقا نے ان کے لئے تازیانہ شوق کا کام کیا تھا۔ مکہ کی طاقت ور ترین اشرافیہ کے خلاف مسلمانوں کی کشمکش اور کامیابی نے ان کے اشتیاق کو اور ہوا دی تھی۔ اور دور دراز کے مقامات سے ان کے افراد و گروہ مدینہ آتے تھے اور رشاد کام واپس جاتے تھے۔ ان میں مدینہ کے نواح مغرب کے قبائل خزاعہ، مزینہ، جہینہ، اسلم، غفار ضمرہ، لیث، مدلج، کنانہ اور ازد شنوءہ بھی تھے اور حرمین کے مشرق کے باسی قبیلے جیسے خزیمہ، طے، ہذیل، محارب، غطفان، سلیم، ہوازن، اور باہلہ وغیرہ بھی تھے۔ شمالی قبائل سعد ہذیم، جذام، قضاعہ، بلی، بہراء، لخم، کلب اور غسان کے افراد بھی کلام ربانی کے اتنے ہی آرزومند تھے۔ جتنے کہ جنوبی قبائل خثعم، مذحج، بجیلہ، ہمدان، حارث بن کعب، نہد، مراد، کندہ، حمیر، حضرموت اور عک و اشعر کے لوگ تھے۔ اسی طرح جزیرہ نمائے عرب میں جا بجا منتشر و آباد قبائل عرب جیسے مہرہ، ازد عمان، عبد القیس، بنو حنیفہ، تمیم، وائل اور تغلب بھی حق و صداقت کے جویا اور پابند تھے۔

اس دہ سالہ عہد تبلیغ میں ایک نئے عنصر کا اضافہ بھی ہوا تھا اور وہ تھا تبلیغی جماعتوں اور مہموں کو منظم کر کے مختلف علاقوں اور قبیلوں میں بھیجنا۔ مکی عہد نبوی میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ممکن نہ تھا کہ اس طرح کی تبلیغی تنظیم کر سکتے۔ مگر مدینہ میں وہ نہ صرف ممکن ہو گئی تھی بلکہ ناگزیر بھی بن گئی تھی۔ چنانچہ آپ کی بیشتر مہمیں جن کو غلطی

سے "فوجی" سمجھ لیا گیا ہے۔ مذہبی اور تبلیغی کوششیں تھیں۔ یہ مہمیں کبھی آپ خود لیکر گئے اور کبھی اپنے صحابہ کرام کی ماتحتی سرکردگی ہی بھیجیں۔ ان مہموں میں غزوات بئر معونہ اور رجیع اور نہ جانے کتنی اور تھیں جن میں مسلم مبلغوں نے اپنے خون کی سرخی سے اسلامی تحریک کی داغ بیل ڈالی تھی۔ زبان و قلم اور تلوار سے تبلیغ اتنی موثر نہیں ہوتی ہے۔ جتنی کہ بہتے ہوئے خون کی لالی سے۔ تاریخ شاہد ہے کہ آپ اور آپ کے جان نثاروں نے خالص عسکری مہموں کے دوران بلکہ تلواروں کی چھاؤں میں اور تختہ دار کی بلندی سے بھی پیغام حق سنانے اور لوگوں کو دعوت دین دینے میں گریز نہیں کیا۔ انہیں قربانیوں، کوششوں اور کاوشوں کا نتیجہ تھا کہ تئیس برس کی مدت میں پورا جزیرہ نمائے عرب اسلام کے پرچم تلے آگیا تھا۔

لیکن یہ کارنامہ یہ معجزہ اور یہ کارعظیم کیونکر اور کیسے وجود میں آیا وہ تاریخ اسلام کا ایک انتہائی تابناک باب ہے۔ اور اس کو سمجھنے کے لئے قبائل عرب میں اشاعت اسلام کی تاریخ، ہنج اور انداز کا ویسے ہی جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ جیسے کہ ہم نے قریش مکہ کے سلسلے میں لیا ہے۔ قبائل عرب کی اس تجزیئے میں جو ترتیب رکھی گئی ہے۔ وہ تاریخی نوعیت کے تقاضوں کے مطابق رکھی گئی ہے اور اس میں ہم نے مونٹگمری واٹ کی تقسیم قبائل کو ملحوظ رکھا ہے۔ اس کے دو سبب ہیں۔ اوّل یہ کہ یہ آسان جغرافیائی ترتیب ہے اور دوم یہ کہ مستشرق موصوف کی تاریخی غلط بیانیوں کا بھی پردہ چاک کیا جاسکتا ہے اور صحیح صورتحال اجاگر کی جاسکتی ہے۔ چنانچہ پہلے ہم نے مدینہ منورہ کے مغرب اور نواح مغرب میں آباد بدوی قبائل عرب سے بحث کی ہے۔ پھر حرمین شریفین کے مشرق میں آباد قبائل عرب میں اسلام کی اشاعت کا جائزہ لیا ہے۔ اس کے بعد بالترتیب شمالی سمت اور جنوبی عرب میں بسے ہوئے قبائل کے اسلام کے ساتھ تعلقات کی نوعیت اجاگر کی ہے۔ اور آخر میں جزیرہ نما کے مختلف علاقوں میں بکھرے قبیلوں میں اسلام کی تبلیغ کی رفتار و ہنج پر نظر ڈالی ہے۔

(۱) مغربی قبائل عرب

مہاجرین مکہ یا قریش کے ابتدائی مسلمانوں اور انصار مدینہ کے بعد اسلامی امت اور اسلامی ریاست کے قیام، ارتقاء اور تکمیل میں جن قبائل عرب نے سب سے زیادہ حصہ لیا تھا۔ وہ مدینہ منورہ کے مغرب میں آباد قبیلے تھے اسلام اور مرکز اسلام مدینہ سے ان کے خصوصی تعلقات کے قیام میں جغرافیائی سیاست کے عوامل سب سے زیادہ کار فرما تھے۔ چونکہ وہ زیادہ تر مدینہ منورہ کے نواح میں آباد تھے۔ اس لئے عمرانیات کے اصول و اسباب کے سبب ان کو مدینہ سے کسی نہ کسی قسم کے تعلقات و روابط استوار کرنے ناگزیر تھے۔ اس میں بعض بدوی قبائل جیسے جہینہ اور مزینہ وغیرہ کے اوس و خزرج سے زمانہ جاہلیت سے قائم تعلقات نے کافی مدد کی تھی۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اوس و خزرج کے مختلف گھرانوں اور افراد سے ان کے حلیفانہ تعلقات اور دوستانہ روابط کیونکر کام آئے تھے۔ اور مختلف و متضاد گروہوں کے حلیفوں کے بجائے وہ کیسے پوری امت اسلامی اور ریاست اسلامی کے حلیف اور دوست بن گئے تھے۔ ان ناگزیر اسباب سے یہ ضروری ہوجاتا ہے کہ بدوی قبائل عرب میں اسلام کی نشر و اشاعت کے تجزیئے کو مغربی قبائل سے شروع کیا جائے۔

ذکر آ چکا ہے کہ ہر علاقے میں مختلف و متعدد قبائل تھے جو نسل و نسب یا خون کے رشتوں پر استوار ہوئے تھے۔ ان میں چھوٹے بڑے اور متوسط درجہ کے قبیلے تھے۔ عموماً ایک چھوٹا قبیلہ پانچ سو سے ایک ہزار افراد پر مشتمل ہوتا تھا۔ جبکہ متوسط قبیلہ اس کا دوگنا ہوتا تھا۔ بڑے قبیلے دو تین ہزار اور پانچ چھ ہزار افراد پر مشتمل ہوتے تھے اور لبا اوقات بعض قبائل اس سے بھی بڑھ جاتے تھے۔ جیسے کہ قریش، غطفان، اور ہوازن و غسان وغیرہ تھے[۴۳]۔ چونکہ ہر قبیلہ چارہ پانی اور کھانے کی کمی اور شاداب جگہ کی قلت کے سبب ایک جگہ نہیں ٹھہر سکتا یا مقیم رہ سکتا تھا۔ اس لئے وہ چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹ جاتا تھا۔ جو بطون/حی (خاندان: CLAN) کہلاتے تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ بطون اتنے بڑے ہو جاتے تھے وہ بجائے خود قبیلے بن جاتے تھے اور اجتماعی اکائی کے طور پر کام نہ کر سکنے کے سبب وہ پھر تقسیم ہونا شروع ہو جاتے تھے اور شکست و ریخت کا یہ عمل اور اسی پر مبنی تعمیر و تشکیل کا ردعمل جاری ہی رہتا تھا۔ انہی اسباب سے عرب میں بشمار قبیلے، بطون اور گھرانے نظر آتے ہیں۔ ہم سارے اہم ترین قبائل اور ان کی خاص شاخوں سے اس تجزیے میں بحث کریں گے بہرحال مغربی قبائل اور ان کی ذیلی شاخیں حسب ذیل تھیں:

(ا) کنانہ: بکر بن عبد مناۃ (۱) بنو ضمرہ (۲) بنو غفار (۳) بنو لیث (۴) بنو دئل (۵) بنو مدلج (۶) بنو خذیمہ

(ب) خزاعہ: (۱) بنو اسلم، (۲) بنو کعب بن عمرو (۳) بنو المصطلق

(ج) جہینہ:

(د) مزینہ:

(س) ازد شنوءہ: بنو سعد بن بکر، بنو دوس۔

(۱) بنو ضمرہ

مغربی قبائل میں بنو ضمرہ غالباً سب سے پہلے تھے۔ جنہوں نے اسلامی ریاست سے دوستانہ تعلقات کی بنیاد ڈالی تھی اور پھر اسلام کے دائرے میں داخل ہو گئے تھے[۴۳]۔ ہمارے ماخذ اس کنانی شاخ کے کئی ابتدائی مدنی عہد کے مسلمانوں کے ناموں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک حضرت جعال بن سراقہ ضمری تھے۔ جو اپنے علاقے سے ہجرت کر کے مدینہ آ بسے تھے اور غزوہ احد میں شریک تھے[۴۴]۔ حضرت عمرو بن امیہ ضمری[۴۵] اور ان کے والد گرامی حضرت امیہ بن خالد ضمری بھی ابتدائی مسلمانوں میں شامل تھے۔ قیاس کہتا ہے کہ ان کے خاندان کے اور لوگ بھی شروع ہی میں یا کچھ مدت بعد مسلمان ہو کر اسلامی امت کے رکن بن چکے تھے۔ ابن اسحاق، واقدی، ابن سعد، ابن اثیر، ابن عبدالبر، اور ابن حزم اندلسی کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ متعدد ضمری اسلام کے دائرے میں اول عہد میں داخل ہو چکے تھے[۴۶]۔ خیال یہ ہے کہ ۷ھ/۶۲۸ء کے وسط تک یہ قبیلہ اکثر و بیشتر اسلامی ریاست کی حکمرانی قبول کر کے اس کا رکن بن چکا تھا۔ ابن اثیر نے کئی کے چند ضمری صحابہ کے نام گنائے ہیں۔ اور ان میں حضرت یزید بن سلمہ ضمری کے نام کا اضافہ کیا ہے۔ مگر ان کے زمانہ قبول اسلام کا ذکر نہیں

کیا ہے[۳۷۸]۔ یہ حیرت کی بات ہے کہ تمام مؤلفین سیر صحابہ نے بنو ضمرہ کے دس سے زیادہ مسلمانوں کے نام نہیں گنائے ہیں۔ مگر اس سے یہ نہیں نتیجہ اخذ کر لینا چاہیئے کہ وہ عہد نبوی میں مسلمان ہی نہیں ہوئے تھے۔ مآخذ کے عمومی بیانات اس پر شاہد ہیں کہ ان میں اسلام پوری طرح سے پھیل چکا تھا۔ اس کے علاوہ بعض تاریخی ثبوت بھی ان کے قبول اسلام کے گواہ ہیں۔ اوّل یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے خلاف کسی قسم کی کوئی مہم نہیں بھیجی۔ دوم یہ کہ اسلامی مہموں اور اسلامی ریاست کے نظم و نسق میں وہ برابر کے شریک تھے۔ اس کے علاوہ مآخذ میں جا بجا بکھرے بیانات سے بھی ان کے قبول اسلام کی تصدیق ہوتی ہے[۳۷۹]۔

(۲) بنو مدلج

بدر سے قبل وہ اسلامی ریاست کے حلیف بن چکے تھے اور ان کے بعض افراد اسلام بھی قبول کر چکے تھے۔ غزوہ بدر اور خندق کے درمیان ان میں اسلام نے اپنے قدم مضبوطی سے جما لئے تھے۔ مؤلفین سیر صحابہ نے بنو ضمرہ کے مانند بنو مدلج کے بھی بہت کم صحابہ کرام کے نام گنائے ہیں۔ بہرحال جو گنتی کے چند نام ملتے ہیں ان میں حضرت علقمہ بن مجزز مدلجی بہت نمایاں صحابی تھے وہ اسلامی حکومت و ریاست کے ایک نمایاں مدبر و سالار تھے۔ ان کا خاندان ابتداء ہی میں مسلمان ہو گیا تھا[۳۸۰]۔ ان کے علاوہ بنو مدلج کے دوسرے متعدد حضرات نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا اور اپنی خدمات سے ریاست اسلامی کو فائدہ پہونچایا تھا۔ مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۸ھ / ۶۳۰ء میں بنو جذیمہ کے ایک گروہ کے خلاف حضرت خالد بن ولید مخزومی جو لشکر لے کر گئے تھے۔ اس میں بنو مدلج کا ایک خاصا بڑا دستہ شریک تھا[۳۸۱]۔

(۳) بنو غفار

بنو غفار دراصل بنو ضمرہ کے ذیلی شاخ یا خاندان تھے۔ تاریخی توقیت کے مطابق بنو غفار اسلام سے غالباً قبائل عرب میں سب سے پہلے متعارف ہوئے تھے۔ اگر اولیت کا شرف ان کو حاصل نہ تھا تو کم از کم سبقت اسلام کے اعتبار سے وہ چند قبائل عرب میں شمار کئے جانے کے قابل ہیں۔ وہ مکہ اور مدینہ کے درمیان مغربی بین الاقوامی شاہراہ تجارت کے آس پاس کے علاقوں میں بستے تھے۔ ان میں اسلام کا تعارف مکی عہد تبلیغ کے خفیہ دور میں ہوا تھا اور اس کا سہرا ان کے سب سے عظیم مسلمان حضرت ابوذر غفاری[۳۸۲] اور ان کے بھائی انیس غفاری[۳۸۳] کے سر بندھتا ہے۔ یہ دونوں بھائی تلاش حق میں مکہ میں آئے تھے اور انہوں نے اس وقت اسلام قبول کیا تھا، جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم دار ارقم میں قیام پذیر تھے حضرت ابوذر غفاری نے مکہ کے سرداروں کے مجمع عظیم میں اپنے قبول اسلام کا جس طرح اعلان و اظہار کیا تھا۔ وہ ان کی جرأت و ہمت اور صلابت ایمانی کی دلیل ہے[۳۸۴]۔ بنو غفار کا یہ پورا خاندان ابتداء ہی میں مسلمان ہو گیا تھا۔ چنانچہ ہم کو ان کے فرزند اور بہو کے قبول اسلام کا ذکر مآخذ میں ملتا ہے[۳۸۵]۔ بنو غفار کے اسلام لانے کا سہرا دراصل حضرت ابوذر غفاری ہی کے سر بندھتا ہے جنہوں نے بے مثال جوش و ولولے اور ہمت و جرأت سے اپنے قبیلے میں اسلام پھیلایا تھا۔ یہی نہیں انہوں نے اپنے پڑوسی قبیلہ اسلم کے کم از کم آدھے حصہ کو

مسلمان کر لیا تھا۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ ہجرت نبوی کے زمانے میں پورا قبیلہ بنی غفار مسلمان ہو چکا تھا۔[۲۸۶] گویا کہ اس قبیلے کے اسلام کا زمانہ ۶۱۴ء سے ۶۲۲ء تک کا کل سات برس کا عرصہ تھا۔

بنو غفار کے اوّلین اور اہم ترین مسلمانوں میں حضرت ابوذر کے بعد حضرت ابو رہم غفاری کا نام آتا ہے۔ وہ اسلامی حکومت و ریاست کے نظم و نسق کے اہم شخص تھے۔[۲۸۷] ابن سعد اور ابن اثیر نے متعدد غفاری صحابہ کرام کا ذکر کیا ہے۔ ان میں حضرت ابو سریحہ حذیفہ بن اسید غفاری تھے جو صلح حدیبیہ میں شریک تھے۔ ان کے علاوہ حضرات ابو بصرہ غفاری، ابو خنیس غفاری، ابو مالک غفاری، ابن مسعود غفاری، رافع بن عمرو غفاری، حکم بن عمرو غفاری، وغیرہ کے نام نامی صحابہ کرام کی فہرست میں ملتے ہیں۔[۲۸۸] ابن سعد کے بیان کے تائید میں ابن اسحاق وغیرہ کے بیانات بھی ملتے ہیں جو ان کے اجتماعی قبول اسلام کی طرف نشاندہی کرتے ہیں۔ ابن اسحاق کا بیان ہے کہ غزوہ خیبر میں بنو غفار کے کافی مرد و عورت افراد شامل جہاد تھے۔[۲۸۹] انہوں نے فتح مکہ کے لیے چار سو غفاری مجاہدین پر مشتمل ایک دستہ بھی اسلامی لشکر کے لئے فراہم کیا تھا۔[۲۹۰] اسی طرح غزوہ تبوک کے عظیم لشکر میں ان کے دستہ کی عددی طاقت خاصی تھی۔[۲۹۱] اس کے علاوہ انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بعد ہجرت نبوی جو معاہدہ کیا تھا۔ اس سے بھی ان کے مکمل طور پر مسلمان ہونے کی تائید ہوتی ہے۔[۲۹۲] بنو غفار کے متعدد حضرات نے اسلامی ریاست کے نظم میں بھرپور حصہ لیا تھا۔ اوپر حضرت ابو رہم غفاری کا ذکر آ چکا ہے۔ ان کے علاوہ حضرات سباع بن عرفطہ غفاری اور کعب بن عمیر غفاری نے عہد نبوی کے نظام حکومت میں خاصے بلند عہدوں پر کام کیا تھا۔[۲۹۳] چنانچہ مونٹگمری واٹ کا یہ نتیجہ کہ بنو غفار کو اسلامی ریاست و حکومت و امت میں کوئی بلند مقام حاصل نہیں تھا۔ اور یہ کہ وہ ایک غیر اہم قبیلہ تھا بالکل صحیح نہیں ہے۔ یہ نتیجہ موصوف نے صرف اس بنیاد پر اخذ کیا ہے کہ حضرت ابوذر غفاری کے صاحبزادے اور بہو مدینہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی چراگاہ کی دیکھ بھال کرتے تھے۔[۲۹۴] حالانکہ وہ محض چرواہے نہیں تھے۔ جیسا کہ ہم بعد میں دیکھیں گے۔

(۴) بنو دئل اور بنو حارث بن عبد مناۃ

اگرچہ ہمارے مآخذ کنانہ کی بعض دوسری شاخوں جیسے بنو دئل اور بنو حارث بن عبد مناۃ کے قبول اسلام کے موضوع پر کچھ زیادہ روشنی نہیں ڈالتے۔ تاہم بعض ایسے قرائن اور شواہد ان میں مل جاتے ہیں جو یہ بتاتے ہیں کہ وہ اسلام کے دائرے سے یکسر باہر نہیں تھے۔ مثال کے طور پر ابن سعد کا بیان ہے کہ بنو بکر بن عبد مناۃ کے ایک شخص الجبیب کے دو فرزندان گرامی حضرات عبد اللہ اور عبد الرحمٰن اس کنانی شاخ کے ابتدائی مسلمان تھے۔ جنہوں نے غزوۂ احد میں حصہ لیا تھا اور جام شہادت نوش کیا تھا۔[۲۹۵] اسی ضمن میں بنو بکر بن عبد مناۃ کے ایک اور گھرانے کا ذکر کرنا چاہیے۔ جس نے نہ صرف اسلام قبول کیا تھا۔ بلکہ اپنا علاقہ چھوڑ کر مکہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ یہ بنو بکیر کا خاندان تھا۔ جس کا ذکر آ چکا ہے کہ ان کے کم از کم چار افراد نے مکی عہد کے آغاز میں ہی اسلام قبول کر لیا تھا۔ لیکن ابن سعد کے بیان سے مزید معلوم ہوتا ہے کہ ان کے خاندان

میں صرف یہی چار افراد نہیں تھے جو مسلمان ہوئے تھے۔ بلکہ ان کے تمام افراد معہ ان کے بچوں اور عورتوں کے اسلام کے حلقہ بگوش بنے تھے[۲۹۹]۔ ابن ہشام اور ابن اثیر نے بنو دئل سے ایک ابتدائی مسلم حضرت عویف بن الاضبط کا ذکر کیا ہے جو غالباً صلح حدیبیہ سے کافی پہلے مسلمان ہو چکے تھے[۲۹۷]۔ اسی طرح بنو دئل کے دو مزید مسلمانوں حضرات ساریہ بن زنیم اور ان کے بھائی انیس بن زنیم کا ذکر ابن حزم نے کیا ہے۔ یہ دونوں بھی ابتدائی مسلمانوں میں شامل تھے[۲۹۸]۔ قیاس یہ ہوتا ہے کہ ان کے خاندان کے اور افراد نے بھی اسلام ضرور قبول کیا تھا۔ بعض بنو دئل کے مسلمانوں کے اسلامی لشکروں اور مہموں میں شرکت کا ذکر واقدی کے یہاں ملتا ہے۔ چنانچہ اس کے مطابق حضرت بجن دئلی نے حسمیٰ کی مہم (۶ھ / ۶۲۸ء) میں حصہ لیا تھا۔ واقدی نے ان کے علاوہ بھی بعض اور مسلمانان بنی دئل کا ذکر کیا ہے[۲۹۹]۔

(۵) بنو جذیمہ

کنانہ کی ایک شاخ بنو جذیمہ تھی۔ جو بجائے خود خاصا بڑا قبیلہ بن گیا تھا اور مدینہ سے کچھ فاصلے پر آباد تھا۔ وہ ۸ھ کے وسط اور ۶۳۰ء کے آغاز تک پورے مسلمان ہو چکے تھے۔ جیسے کہ حضرات خالد بن ولید مخزومی اور علی بن ابی طالب ہاشمی کی ان دو مہموں سے معلوم ہوتا ہے جو ان کے علاقوں میں گئی تھیں۔ ماخذ کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد کو ان کے علاقہ میں ایک لشکر دے کر بھیجا۔ حضرت خالد نے غلطی سے پہنچتے ہی ان پر حملہ کر دیا اور ان کے بعض لوگ مارے گئے اور ان کا مال لوٹ لیا گیا۔ اس میں دراصل حضرت خالد کی غلطی نہیں تھی۔ مسلمان فوج کو بنو جذیمہ کے قبول اسلام کی خبر نہ تھی۔ بہر حال اسی دوران حضرت خالد کے پیچھے پیچھے بنو جذیمہ کے نمائندے مدینہ پہنچے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فریاد کی کہ وہ مسلمان ہیں اور اس کے باوجود ان کے ساتھ یہ سلوک کیا گیا۔ آپ نے حضرت علی کو مال دیکر بھیجا تاکہ ان کے قبیلے میں پہنچ کر ان کے مقتولوں کا خون بہا ادا کر دیں۔ ماخذ کا بیان ہے کہ حضرت علی نے ان کے کتوں تک کا خون بہا ادا کیا جو مسلمانوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ بہر حال فتح مکہ تک یہ قبیلہ اسلام کے دائرے میں داخل ہو چکا تھا[۳۰۰]۔ لیکن ہم کو اس قبیلہ کے ممتاز مسلمانوں کے نام نہیں معلوم ہو سکے ہیں۔ اور نہ ہی اس میں اسلام کی اشاعت کی رفتار اور انداز کا علم ہوتا ہے۔

(۶) بنو لیث

کنانہ کے خاندان بکر بن عبد مناۃ کا ایک بڑا گھرانا تھا۔ بنو لیث۔ ہمارے ماخذ اس گھرانے کے متعدد مسلمانوں کا ذکر کرتے ہیں۔ ان میں حضرت غالب بن عبد اللہ لیثی ممتاز ترین صحابہ کرام میں تھے۔ انہوں نے اسلامی ریاست اور امت کیلئے شاندار خدمات انجام دی تھیں۔ وہ کم از کم دو تین مہموں میں سالار / امیر سریہ رہے تھے[۳۰۱]۔ دوسرے بزرگ حضرت نمیلہ بن عبد اللہ لیثی تھے۔ جن کے بارے میں ابن اسحاق کا خیال ہے کہ وہ ایک یا دو مواقع پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب کی حیثیت

سے مدینہ منورہ میں اسلامی ریاست کے سربراہ بھی رہے تھے۔ اگرچہ واقدی اور دوسرے مؤرخین ابن اسحاق کی اس روایت سے اتفاق نہیں کرتے ہیں[۴۲] ابن حزم نے بنولیث کے مختلف گھرانوں کے کم از کم چودہ ممتاز صحابہ کرام کے اسمائے گرامی کو بیان کیا ہے۔ یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ بنولیث کے ابتدائی مسلمانوں میں سے بیشتر اپنے علاقوں میں سکونت پذیر رہے تھے اور صرف چند حضرات نے ہجرت کر کے مدینہ میں سکونت اختیار کی تھی[۴۳]۔ یہ بات اس پس منظر میں اور اہم ہو جاتی ہے کہ بنولیث کے قبیلے بنو بکر بن عبد مناۃ نے فتح مکہ تک بحیثیت قبیلہ اسلام کی کافی سخت مخالفت کی تھی اور اس کا سبب یہ تھا کہ ان کے قریش مکہ سے قریشی حلیفانہ تعلقات تھے۔ جیسے کہ صلح حدیبیہ کے معاہدہ کی آخری شق سے واضح ہوتا ہے۔

بہر حال ان کا پورا قبیلہ ...... بنو بکر بن عبد مناۃ ...... ۹ھ کے آغاز اور سنہ[۴۳] کے وسط میں اسلام کا حلقہ بگوش بن چکا تھا۔ اس کی تصدیق ان کے وفد کی آمد سے ہوتی ہے۔ جو غزوہ تبوک سے کچھ قبل حضرت واثلہ بن الاسقع لیثی کی زیر قیادت مدینہ منورہ آیا تھا۔ صحابی موصوف کے بارے میں مآخذ صراحت کرتے ہیں کہ انہوں نے غزوہ تبوک میں بھی شرکت کی تھی مگر اندازہ ایسا ہوتا ہے کہ بنولیث کا خاصا بڑا دستہ اور خاص کر ان کے وفد کے تمام ارکان غزوہ میں مجاہدین کی حیثیت سے شریک ہوئے تھے[۴۴]۔

بہر حال ان تمام شواہد اور حقائق کی روشنی میں یہ نتیجہ نکالنا بعید از حقیقت نہ ہوگا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات حسرت آیات کے وقت تک پورا قبیلہ کنانہ معہ اپنی تمام شاخوں اور ذیلی گھرانوں کے اسلام کے دائرے میں داخل ہو چکا تھا۔ اس ضمن میں یہ حقیقت کافی دلچسپ اور اہم معلوم ہوتی ہے کہ ردہ کے پرآشوب زمانے میں کنانہ کے محض ایک معمولی حصہ نے جو بنولیث، بنودئل اور مدلج کے کچھ افراد اور طبقات پر مشتمل تھا، مدینہ منورہ کے خلاف بغاوت و سرکشی میں حصہ لیا تھا[۴۵]۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ کنانہ کے ان خاندانوں نے ارتداد نہیں اختیار کیا تھا بلکہ وہ صرف زکوٰۃ کی ادائیگی سے استثنا چاہتے تھے۔ اور بقیہ دوسرے اسلامی شعائر جیسے نماز وغیرہ کو قائم رکھنے کا وعدہ کیا تھا[۴۶]۔ اس جگہ یہ بھی عرض کر دیا جائے کہ اس وقت کی امت اسلامی کی غالب اکثریت نے مانعین زکوٰۃ کو غیر مسلم یا مرتد نہیں سمجھا تھا۔ یہ صرف حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی عظیم اور دوربین شخصیت تھی۔ جس نے ایک اور صرف ایک شعار اسلامی کو ترک کرنے کے منصوبے کی حوصلہ شکنی کر کے اسلام کے بنیادی اصولوں کی بنیاد استوار رکھی تھی[۴۷]۔

(ب) بنو خزاعہ

خزاعہ ایک اور بڑا بدوی قبیلہ تھا جو حرمین کے مغرب میں آباد تھا۔ اس کے تین بڑے خاندان تھے جو بجائے خود قبیلے بن گئے تھے۔ ان میں اسلم غفار کے پڑوسی اور دوست تھے۔ جبکہ بنو کعب بن عمرو ان سے ذرا فاصلے پر آباد تھے۔ اور بنو مصطلق کے بیشتر گھر اپنے چشمہ مریسیع کے اردگرد کے علاقے میں بسے ہوئے تھے۔ یہ دلچسپ امر ہے کہ بنو خزاعہ کے بہت اچھے تعلقات قریش مکہ سے تھے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے کچھ گھرانے مکہ اور اس کے نواح میں بھی آباد تھے[۴۸]۔

(۱) بنو اسلم

بخاری کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ قبیلہ خزاعہ عام طور سے اور بنو اسلم خاص طور سے اسلام سے مکی عہد تبلیغ کے آغاز ہی میں غالباً ۶۱۵ء میں روشناس و متعارف ہو گئے تھے۔ حضرت ابو ذر غفاری کے قبول و تبلیغ اسلام کا ذکر آچکا ہے کہ انہوں نے اپنے قبیلہ بنو غفار کے علاوہ بنو اسلم کو بھی نہ صرف اسلام سے روشناس کرایا تھا بلکہ ان کا نصف قبیلہ ہجرت مدینہ سے قبل اسلام لا چکا تھا اور بقیہ نصف ہجرت نبوی کے مابعد اسلام کے دائرے میں داخل ہوا تھا[۲۰۹] اس کی تصدیق ابن سعد کی ایک روایت سے ہوتی ہے جو بصراحت کہتی ہے کہ دونوں قبیلوں نے ہجرت نبوی کے فوراً بعد مدینہ حاضر ہو کر اسلام قبول کرنے کا اعلان و اقرار کیا تھا[۲۱۰]۔ ۶۲۲ء کے آخری ربع تک بنو اسلم کا اسلام ایک تاریخی حقیقت بن چکا تھا[۲۱۱]۔ ابن سعد نے اسلم کے ابتدائی مسلمانوں میں سے تقریباً ۲۶ صحابہ کرام کے اسمائے گرامی اپنی طبقات میں بیان کئے ہیں[۲۱۲]۔ اسد الغابہ کے مطابق بنو اسلم کے کئی مسلمان غزوہ احد میں شریک تھے اور انہوں نے بڑی جاں نثاری اور قربانی کے کارنامے انجام دیتے تھے[۲۱۳]۔ ان کے علاوہ ابن سعد، طبری، اور اسد الغابہ بنو اسلم کے بہت سے ایسے مسلمانوں کا ذکر کرتے ہیں جنہوں نے مختلف مہموں کے دوران امت اسلامی کے لئے گرانقدر خدمات انجام دی تھیں[۲۱۴]۔ اس کے ساتھ ساتھ بہت سے اسلمی صحابہ کرام نے عہد نبوی کی اسلامی ریاست کی تعمیر و ترقی میں بھی خاصا بڑا حصہ لیا تھا اور اس کے نظم و نسق میں بھی شامل رہے تھے[۲۱۵]۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد جو معاہدے انفرادی اور اجتماعی طور سے بنو اسلم سے کئے تھے ان میں سے کم از کم تین معاہدوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ سب کے سب اسلام لا چکے تھے ان کی صلابت ایمانی اور غالباً مدینہ سے قربت کے سبب ان کے لئے ہجرت ضروری نہیں سمجھی گئی تھی۔ اور ان کو اپنے گھروں اور علاقوں ہی میں مہاجرین کی عظمت و حیثیت حاصل تھی[۲۱۶]۔ مونٹگمری واٹ نے اسلمی مسلمانوں کی اس مہاجرت کا مفہوم نہ جانے یہ کیونکر نکالا ہے کہ مہاجروں کو امتِ اسلامی یا ریاست اسلامی میں کسی قسم کے مراعات یا امتیازات حاصل تھے۔ ان کا دوسرا نظریہ کہ یہ معاہدے بعد کے کسی زمانے کے ہیں[۲۱۷]۔ قطعی طور پر غلط ہے اول اس وجہ سے کہ فتح مکہ کے بعد ہجرت منسوخ ہو گئی تھی۔ یا اس کی اہمیت نہیں رہ گئی تھی۔ دوم یہ کہ بنو اسلم کے ان معاہدوں میں فریقین کے درمیان باہمی تعاون اور امداد کا ذکر کیا گیا ہے جو کہ ابتدائی عہد کے معاہدات نبوی کی خصوصیت ہیں جیسا کہ ہم نے اسلامی ریاست کے ارتقاء کے باب میں دیکھا ہے۔ بہر حال فتح مکہ کی مہم میں بنو اسلم کے چار سو مجاہدین شامل تھے[۲۱۸] اس سے ان کے کل مسلمانوں کی تعداد کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

(۲) بنو کعب بن عمرو

بنو اسلم کے علاوہ خزاعہ کے بعض دوسرے گھرانوں میں بھی اسلام مکی عہد میں پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ ان میں وہ لوگ خاص طور سے ذکر کے قابل ہیں، جو مکہ ہی میں قیام پذیر تھے۔ ابن سعد نے ایسے خزاعی صحابہ کرام کی فہرست اپنی طبقات میں دی

ہے۔ ابن اسحاق نے کم از کم ایسے دو خزاعی مسلمانوں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے ایک حضرت ایبہ تھے جو بنو مخزوم کے حلیف تھے، جبکہ حضرت ذوالشمالین مہاجر مدینہ اور بدری صحابی تھے۔ مکی خزاعیوں کے ایک اور نمائندے حضرت نافع بن بدیل بن ورقاء خزاعی تھے۔ جو قدیم مسلم، مہاجر مدینہ اور شہید بئر معونہ تھے اسی طرح حضرت معتب بن عوف خزاعی کا ذکر فہرست مہاجرین حبشہ اور مجاہدین بدر کے ذیل میں آتا ہے۔ بلاذری نے قبیلہ خزاعہ کی ایک خاتون حضرت حمیدہ بنت خلف کا جو حضرت خالد بن سعید اموی کی اہلیہ محترمہ تھیں۔ ذکر مہاجرین حبشہ میں کیا ہے ایسی متعدد خزاعی مسلمان خواتین کا ذکر مآخذ میں ملتا ہے[۴۱۹]

بنو اسلم کے علاوہ خزاعہ کے بعض دوسرے گھرانوں کے افراد نے اسلامی ریاست کے مختلف انتظامی شعبوں میں خدمات انجام دی تھیں[۴۲۰]۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ فتح مکہ سے کچھ قبل خزاعہ کے خاندان بنو کعب بن عمرو سے صدقات وصول کرنے کے لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مصدق (ٹیکس افسر، محصل) بھیجا تھا۔ جو ان کے صدقات وصول کرکے لایا تھا[۴۲۱] اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا بیجا نہ ہوگا۔ کہ بنو کعب بن عمرو سب کے سب یا اکثر مسلمان ہو چکے تھے محرم ۹ھ اپریل مئی ۶۳۰ء میں بنو اسلم اور غفار سے صدقات وصول کرنے کے لئے ایک مشترکہ مصدق مقرر کیا گیا تھا۔[۴۲۲] اس خزاعی گھرانے کے مسلمانوں کی تعداد کا اندازہ اس امر سے کیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے فتح مکہ کے لئے اسلامی لشکر میں پانچسو مجاہدین کا دستہ فراہم کیا تھا[۴۲۳]۔

(۳) بنو مصطلق

اسلم اور بنو کعب بن عمرو کے برعکس بنو مصطلق نے اسلامی امت میں شمولیت ۵ھ کے وسط اور ۶۲۷ء کے آغاز میں یعنی مدنی عہد نبوی کے نصف اول کے آخر میں کی۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ غزوہ مریسیع یا غزوہ بنی مصطلق میں خزاعہ کی اس شاخ نے اسلامی ریاست کی مخالفت وعداوت کس طرح ترک کی تھی۔ مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ مریسیع کے علاقے میں آباد اس قبیلے کے دو سو خاندانوں کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قید کر لیا تھا۔ مگر آپ کے نرم رویے، حسن سلوک اور قبیلہ سے ازدواجی تعلقات کے سبب یہ سب لوگ مسلمان ہو گئے تھے اور آزاد کر دیئے گئے تھے۔ اجتماعی تبدیلی مذہب کی یہ ایک شاندار مثال تھی۔ غالباً یہی کل آبادی بنو مصطلق کی تھی۔ ہمارے مفروضہ اصول کے مطابق ان کی کل آبادی کا تخمینہ بارہ اور چودہ سو افراد کے درمیان رہا ہوگا۔ ان کے بعض افراد نے ممکن ہے فوراً اسلام قبول نہ کیا ہو جیسے کہ سردار قبیلہ حضرت حارث بن ابی ضرار خزاعی کے بارے میں مآخذ صراحت کرتے ہیں۔ کہ وہ مسلمانوں کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد فرار ہو گئے تھے اور کچھ دنوں بعد غالباً اپنی بیٹی حضرت جویریہ کی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے شادی اور اپنے پورے قبیلے کے اسلام کی خبر سن کر مدینہ پہنچے تھے اور اسلام قبول کیا تھا۔ بنو مصطلق کے مکمل طور سے اسلام کا حلقہ بگوش ہونے کی تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ ان کے قبول اسلام کے معاً بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ولید بن عقبہ اموی کو ان کا مصدق یا عامل صدقات بنا کر بھیجا تھا[۴۲۴]۔ ہمارے مآخذ اور جدید مؤرخین دونوں نے اس مسئلہ پر شدید الجھنیں پیدا کر دی ہیں۔ عام خیال یہ ہے کہ عامل صدقات کی یہ تقرری

فتح مکہ کے بعد پیش آئی تھی جبکہ انہیں ماٰخذ کا بیان ہے کہ بنو مصطلق کے قبول اسلام کے دو سال بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر مصدق مقرر کیا تھا۔ اسی طرح حضرت ولید بن عقبہ اموی کے بارے میں ماٰخذ نے اور ان سے زیادہ ہمارے جدید مورخین نے بڑی غلط فہمیاں عام کر دی ہیں جن پر کہیں اور بحث کی جا چکی ہے[۴۲۵]۔ بہرحال حضرت ولید بن عقبہ اموی کے بعد بنو مصطلق کی خود اپنی پسند پر حضرت عباد بن بشر الضاری کو عامل بنا کر بھیجا گیا تھا جو ان سے صدقات وصول کر کے مدینہ لاتے تھے[۴۲۶]۔

اس پوری بحث سے یہ واضح ہوتا ہے کہ بنو خزاعہ کے مختلف گھرانوں اور افراد کے بیچ اسلام پھیلنے کا آغاز مکی عہد تبلیغ کے خفیہ دور سے ہوا تھا اور اس کا ایک حصہ ـ بنو اسلم ـ ہجرت تک یعنی ۶۱۵ء اور ۶۲۲ء کے درمیان پورا اسلام لا چکا تھا جبکہ کعب بن عمرو نے مزید پانچ سال اپنے مکمل قبول اسلام میں لئے تھے۔ بہرحال یہ پورا قبیلہ غزوہ خندق کے زمانے میں اسلام کے دائرے میں آ چکا تھا۔ بنو مصطلق کا قبول اسلام فوری تھا۔ اور اس نے زیادہ سے زیادہ چند مہینوں کی مدت لی تھی۔ یہ وہ خزاعی گھرانے تھے جو مدینہ کے مرکز ثقل کے دائرے میں بستے تھے۔

لیکن ابھی خزاعہ کے کچھ گھرانے ایسے بھی تھے جو مکہ کے سیاسی اثر و اقتدار کے دائرے میں آتے تھے اور مکہ کے قرب و جوار کے علاقے میں بستے تھے۔ ان میں سے بعض افراد نے مکی دور میں کسی وقت یا مدنی دور کے ابتدائی حصے میں اسلام قبول کیا تھا۔ جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں۔ لیکن ان کے گھرانے اور خاندان اجتماعی طور سے ابھی تک مسلمان نہیں ہوئے تھے گو کہ وہ اسلامی ریاست کے وفادار اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیف تھے۔ واقدی، ابن سعد اور دوسرے متعدد ماٰخذ سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ بدر سے فتح مکہ تک وہ مکی خزاعی ہی تھے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قریشی منصوبوں اور ارادوں سے باخبر کرتے رہتے تھے[۴۲۷]۔ اور صلح حدیبیہ سے ذرا قبل ان کے ایک اہم ترین سردار بدیل بن ورقاء خزاعی نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ میں مسلمانوں کے داخلے کی اجازت نہ دینے کے قریشی فیصلہ اور ضد سے آگاہ کیا تھا[۴۲۸]۔ اور انہیں کے زیر قیادت خزاعہ نے صلح حدیبیہ کی ایک شق کے مطابق مسلمانوں یا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے حلف کے معاہدے کا اعلان تجدید کر دیا تھا[۴۲۹]۔ اسلامی ریاست اور اسلام سے اتنے بڑے قریبی تعلقات نے بالآخر ان کو اسلام کا حلقہ بگوش بنا ہی دیا اور واقدی کا انتہائی واضح بیان ہے کہ صلح حدیبیہ کے بعد بنو خزاعہ کا آخری آدمی تک مسلمان ہو چکا تھا[۴۳۰]۔ فتح مکہ کی مہم میں ان کی کثیر تعداد کے شریک ہونے سے ان کے مکمل قبول اسلام کی ناقابل تردید تصدیق ہوتی ہے۔ اسی طرح غزوہ تبوک میں ان کی خاصی بڑی تعداد شریک جہاد تھی[۴۳۱]۔

(ج) جہینہ

جہینہ زمانۂ جاہلیت سے مدینہ منورہ کے قبیلۂ خزرج سے حلف اور دوستی کے تعلقات رکھتا تھا اور بعثت نبوی کے قریب واقع ہونے والی جنگ بعاث میں اس نے خزرج کا ساتھ ان کے مدنی حریف اور مد مقابل قبیلہ اوس اور ان کے یہودی اتحادیوں کے خلاف دیا تھا۔ ماٰخذ سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست کے قیام کے بعد بھی جہینہ کے لوگوں نے مدینہ

والوں سے اپنے پرانے روابط قائم رکھے تھے، ذکر آچکا ہے کہ اب ان تعلقات کی نوعیت مختلف تھی کیونکہ اب وہ صرف بنو خزرج کے ہی حلیف اور دوست نہیں تھے۔ بلکہ اوس اور مہاجرین مکہ کے بھی تھے۔ گویا کہ وہ اب اسلامی ریاست کے حلیف اور رکن تھے۔ ماخذ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جہینہ کے قبیلے میں انفرادی اور باجماعت قبول اسلام کے سلسلہ کا آغاز مدنی عہد کی ابتداہی میں ہوچکا تھا۔ کم از کم جہینہ کے ابتدائی مسلمانوں میں سے نو حضرات کا ذکر ان کے ناموں کے ساتھ ملتا ہے[۴۴۲] ابن اسحاق اور ابن سعد نے جہینہ کے پانچ بدری صحابہ کرام کا ذکر کیا ہے۔ ان کے اسمائے گرامی تھے۔ حضرات عدی بن ابی الزعباء، ودیعہ بن عمرو، زیاد بن کعب، ضمرہ بن عمرو، اور بسبس بن عمرو۔ اگر واقدی کی روایت تسلیم کر لی جائے تو ایک اور بدری صحابی تھے حضرت کعب بن جماز[۴۴۳] ابن سعد نے ان صحابہ کرام میں جنہوں نے فتح مکہ سے قبل اسلام قبول کرلیا تھا۔ کم و بیش جہینہ کے بیس مسلمانوں کے نام گنائے ہیں[۴۴۴]۔ اس کے علاوہ ابن سعد کا یہ بھی بیان ہے کہ جہینہ والوں نے اتنی کثرت سے مدینہ ہجرت کی تھی کہ شہر رسول میں ان کا ایک پورا محلہ آباد ہوگیا تھا جہاں انہوں نے اپنی ایک الگ مسجد بھی بنا رکھی تھی[۴۴۵] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جہینہ میں اسلام باجماعت قبول کیا گیا تھا اور ہجرت کے معاً بعد قبول اسلام اور مدینہ ہجرت کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا

لیکن جہینہ کے تمام لوگوں یا مسلمانوں نے مدینہ ہجرت نہیں کی تھی اور غالباً ان کے بیشتر لوگ اپنے علاقوں میں مغربی ساحل کے قریب شاہراہ تجارت کے ارد گرد مقیم رہے تھے اور تعلیم و تربیت، جہاد و غزوات اور ملاقات رسول کیلئے مدینہ آتے رہتے تھے۔ چنانچہ جہینہ کا وفد بھی کسی وقت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں مدینہ حاضر ہوا تھا۔[۴۳۶] بہرحال یہ مورخین کے نزدیک حتمی ہے کہ ہجرت کے دو تین برسوں میں پورا قبیلہ جہینہ مسلمان ہوگیا تھا۔ اور ان کے بہت سے لوگوں نے بدر، احد اور خندق وغیرہ کی جنگوں میں حصہ لیا تھا۔ فتح مکہ کے موقعہ پر اسلامی لشکر میں جہینی مجاہدین کی تعداد آٹھ سو تھی جن میں سے پچاس شہسوار تھے[۴۳۷]۔ واقدی نے غزوہ تبوک کے موقعہ پر ان کے خاصے بڑے دستے کی شرکت کا حوالہ دیا ہے[۴۳۸] ان حقائق کی روشنی میں یہ نتیجہ بلا کسی خوف تردید کے اخذ کیا جاسکتا ہے۔ کہ فتح مکہ سے کافی پہلے جہینہ کا پورا قبیلہ مسلمان ہوگیا تھا۔ اس کے ثبوت میں مزید یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اسلامی ریاست سے ان کا کوئی اختلاف نہیں ہوا تھا۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے خلاف کوئی مہم کبھی نہیں بھیجی تھی۔ بہرحال جہینہ کے لوگ اسلامی امت اور اسلامی ریاست کے رکن اس کے قیام کے ابتدائی زمانے میں بن چکے تھے۔

(د) مزینہ

مزینہ بھی قبیلہ جہینہ کی مانند مدینہ کے قبیلوں سے قدیم اور قریب کے دوستانہ تعلقات رکھتا تھا۔ یہ بات دلچسپ ہے کہ اگر جہینہ کے لوگ خزرج کے حلیف تھے تو مزینہ کا قبیلہ اوس کی دوستی اور حلف کا دم بھرتا تھا۔ اور ان کے حلیف کی حیثیت سے جنگ بعاث میں اپنے پڑوسی بدوی قبیلہ کے خلاف میدان جنگ میں اترا تھا۔ جہینہ اور مزینہ دونوں کے مدینہ والوں سے حلف اور دوستی کے تعلقات کے علاوہ ازدواجی تعلقات بھی تھے۔ زمانہ جاہلیت کے ان تعلقات نے قبیلہ مزینہ

کو اسلام سے روشناس اور اسلامی ریاست کے قریب کیا تھا۔ مآخذ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مزینہ کے لوگوں میں بھی اسلام شروع ہی سے پھیلنا شروع ہو گیا تھا اور ان کے افراد اور گروہوں میں ہجرت کے بعد سے ہی اسلام قبول کرنے کا سلسلہ جاری ہو گیا تھا۔ مزینہ کے قدیم مسلمانوں میں کم از کم پانچ حضرات کے نام مختلف مآخذ میں ملتے ہیں[۴۳۹]۔ ابن سعد نے دو مزید مزنی قدیم مسلمانوں کا ذکر کیا ہے جنہوں نے غزوہ احد میں جہاد میں شرکت کی تھی۔ اور جام شہادت نوش کیا تھا[۴۴۰]۔ ابن درید ازدی نے مزینہ کے حضرات نعمان بن مقرن، عبداللہ بن مغفل، معقل بن یسار، قرہ بن ایاس، بلال بن حارث اور کعب بن زہیر کو قدیم مسلمان بتایا ہے[۴۴۱]۔ ابن اثیر کا بیان ہے کہ حضرت نعمان بن مقرن مزنی نے اپنے لوگوں کو مسلمان بنایا تھا۔ جبکہ ابن سعد کے مطابق حضرت عمرو بن مرہ مزنی نے اپنی قوم کو اسلام کا حلقہ بگوش بنایا تھا[۴۴۲]۔ ابن سعد کا مزید بیان ہے کہ ۵ھ / ۶۲۷ء میں مدینہ آنے والا پہلا وفد عرب قبیلۂ مزینہ کا تھا جو چار سو مسلمانوں پر مشتمل تھا۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ قبیلہ مزینہ ہجرت کے بعد کے زمانے میں یعنی مدنی عہد کے نصف اول میں مسلمان ہو چکا تھا[۴۴۳]۔ اس کے علاوہ اسلامی لشکروں میں ان کے دستوں کی عددی طاقت بھی ان کے اجتماعی طور سے قبول اسلام کی ناقابل تردید شہادت دیتی ہے۔ چنانچہ فتح مکہ کے دس ہزار کے عظیم لشکر میں صرف قبیلہ مزینہ کا حصہ دسواں تھا یعنی ان کے ایک ہزار تین مجاہدین جن میں سے سو شہسوار بھی تھے شریک جہاد تھے[۴۴۴]۔ ابن اسحاق کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ غزوہ حنین میں قبیلۂ مزینہ کے دو غیر معروف خاندان بنو اوس اور بنو عثمان کے مجاہدین اسلامی لشکر کے مقدمہ میں دوسرے مجاہدین کے ساتھ شامل تھے[۴۴۵]۔ غزوہ تبوک میں اس قبیلہ کا اور بڑا دستہ اسلامی لشکر میں شامل تھا[۴۴۶]۔ بہرحال مآخذ سے ثابت ہوتا ہے کہ قبیلہ مزینہ دوسرے مغربی قبائل کی مانند اسلامی امت کا رکن مدنی عہد کے آغاز میں بن چکا تھا۔

(۳) ازد شنوءہ

حرمین شریفین کے مغربی علاقے میں آباد بدوی قبائل میں ازد شنوءہ ایک اہم قبیلہ تھا جو اسلامی تحریک سے اس کے آغاز کار ہی میں روشناس ہو گیا تھا۔ غالباً ۴ نبوی / ۶۱۳ء اور ۶ نبوی / ۶۱۵ء کے درمیان کوئی زمانہ تھا۔ جب اس قبیلہ کے ایک اہم رکن اور اپنی قوم بنو سعد بن بکر کے سردار حضرت ضماد بن ثعلبہ نے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جوانی کے زمانے کے دوست اور تجارت کے شریک رہے تھے، عمرہ کے لئے مکہ پہنچے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات ہوئی اور آپ کا پیغام سنا ہی تھا کہ مسلمان ہو گئے[۴۴۷]۔ ارشاد نبوی کے مطابق وہ اپنے لوگوں میں واپس گئے اور وہاں اسلام کی تبلیغ شروع کر دی۔ صحیح مسلم کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ضماد بن ثعلبہ نے بڑی لگن اور جوش سے لوگوں میں تبلیغ کی اور خاصے کامیاب بھی ہوئے[۴۴۸]۔ چنانچہ ۵ھ / ۶۲۶ء میں وہ ابن سعد کے بقول اپنے قبیلے کے مسلمانوں کی جانب سے ایک وفد لیکر مدینہ پہنچے تھے[۴۴۹]۔ ابن سعد ہی کے بیان سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ۱۰ھ / ۶۳۲ء کے اواخر تک ازد شنوءہ کی غالب اکثریت اسلامی امت اور اسلام کے دائرے میں شامل ہو چکی تھی[۴۵۰]۔

(۱) دوس

ازد شنوءہ کا ایک اہم خاندان دوس تھا جس کا مشہور ترین مسلمان صحابی حضرت ابوہریرہ دوسی ہیں۔ اس ازدی خاندان کا اسلام سے تعارف مکی عہد کی خفیہ تبلیغ کے زمانے میں ہوا تھا۔ جب اس کے تین افراد مسلمان ہوئے تھے۔ ان ابتدائی مسلمانوں میں ایک حضرت معیقب بن ابی فاطمہ دوسی تھے جو قریش مکہ کے خاندان بنو امیہ کے حلیف تھے اور مہاجرین حبشہ میں شمار ہوتے تھے مگر ایک روایت ہم ایسی بھی دیکھ چکے ہیں۔ جس کے مطابق حضرت معیقب دوسی اسلام قبول کرنے کے بعد اپنے علاقے کو لوٹ گئے تھے۔ اور وہاں اسلام کی تبلیغ کرتے رہے تھے۔ وہاں سے وہ ۷ھ/۶۲۸ء میں اپنے مسلمانوں کے ساتھ مدینہ پہنچے تھے[۲۵۱]۔ باقی دو ابتدائی مسلمان تھے۔ حضرت طفیل بن عمرو اور ان کے فرزند حضرت عمرو بن طفیل دوسی۔ اسلام قبول کرنے کے بعد انہوں نے وطن واپس آکر ایک نو مسلم کے جوش و خروش اور ولولے کے ساتھ اسلام کی تبلیغ اپنی قوم میں کی اور ۷ھ/۶۲۸ء تک ان کا پورا قبیلہ دوس اسلام قبول کر چکا تھا[۲۵۲]۔ مختلف روایات کے مطابق حضرت طفیل بن عمرو دوسی اپنے قبیلہ کے شاعر تھے۔ اور عربوں کے سماج میں شعراء کی نہ صرف عزت ہوتی تھی۔ بلکہ ان کا کافی سماجی اور تہذیبی اثر بھی ہوتا تھا قبیلہ دوس کے قبول اسلام کا سہرا در اصل انہیں کے سر ہے[۲۵۳]۔ بہرحال خیبر سے قبل دوس کے اسی افراد۔ دوس پر مشتمل ایک وفد نے نہ صرف خدمت نبوی میں حاضری دی تھی۔ بلکہ غزوہ خیبر میں شریک جہاد بھی رہا تھا[۲۵۴]۔

ابن سعد نے ان صحابہ کرام میں جنہوں نے فتح مکہ سے قبل اسلام قبول کر لیا تھا۔ دوس کے تین مسلمانوں کے نام بھی گنائے ہیں۔ یہ تھے حضرات ابوہریرہ دوسی، ابوالردی دوسی۔ اور سعد بن ابی ذباب۔ مؤخر الذکر صحابی نے اسلامی ریاست و حکومت کی شاندار خدمات انجام دی تھیں۔ اور وہ اس کے نظم و نسق میں بھی شریک رہے تھے[۲۵۵]۔ ابن سعد اور ابن اثیر کا بیان ہے کہ حضرت سعد بن ابی ذباب کو قبیلہ دوس سے صدقات وصول کرنے کا افسر مقرر کیا گیا تھا[۲۵۶]۔ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ دوس کی اکثریت بلکہ غالب اکثریت اسلام لا چکی تھی بہرحال یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ہجرت کے ساتویں برس قبیلہ دوس اسلامی امت و ریاست کا ایک اہم رکن بن چکا تھا۔

ابن سعد نے ان کے علاوہ تین مزید ابتدائی مسلمانوں کا ذکر کیا ہے۔ جن کا تعلق ازد سے تھا۔ ان میں ایک حضرت عبداللہ بن بحینہ تھے۔ جو ہجرت نبوی سے قبل مکی عہد کے مسلمان تھے[۲۵۷]۔ ان کے بھائی حضرت جبیر بن مالک بھی مکی عہد کے ایک قدیم مسلم تھے[۲۵۸]۔ تیسرے ازدی مسلمان تھے حضرت حارث بن عمیر جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سفیر گرامی تھے اور جو آپ کا پیغام امن و اسلام لیکر شاہ بصریٰ کے پاس گئے تھے۔ ان کو واپسی کے سفر کے دوران شرحبیل بن عمرو غسانی نے شہید کر دیا تھا[۲۵۹]۔ تمام واقعات و حقائق کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ازد شنوءہ میں اسلام مکی عہد کے آغاز سے پھیلنا شروع ہوا۔ اور اس کے مختلف خاندانوں اور گھرانوں میں افراد اور گروہ رفتہ رفتہ مسلمان ہوئے۔ تقریباً بیس برس کی انتھک کوششوں کے بعد یہ پورا قبیلہ اسلامی حکومت کا ماتحت، اسلامی ریاست کا شہری اور اسلامی امت کا رکن بن سکا تھا۔

مغربی قبائل میں تبلیغ و اشاعت اسلام کے اس جائزے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ مہاجرین مکہ اور انصار مدینہ کے بعد حرمین شریفین کے مغربی علاقوں میں آباد بدوی قبائل تیسرے اہم ترین عنصر تھے جنہوں نے اسلامی امت اور اسلامی ریاست کے قیام اور ارتقاء میں گرانقدر ترین خدمات انجام دی تھیں۔ مونٹگمری واٹ کا یہ تجزیہ صحیح ہے کہ بنیادی طور سے یہی تینوں اسلامی عناصر اسلامی امت اور اسلامی ریاست کی ریڑھ کی ہڈی تھے۔"[۴۶] اسلام میں ان کا ناقابل شکست ایمان اور غیر متزلزل عقیدہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر کامل بھروسہ اور آپ کی ذات والا صفات سے بے اندازہ محبت و عقیدت اور اسلامی امت کے تحفظ، بقا اور ترقی کے لئے عظیم قربانیاں اور اسلامی ریاست کے لئے ان کی شاندار خدمات ہی ان کے وہ اوصاف حمیدہ اور صفات ستودہ تھے جنہوں نے ان کو اسلامی تاریخ اور اسلامی تہذیب میں ایک نمایاں و درخشندہ مقام عطا کیا ہے۔

(۲) مشرقی قبائل عرب

"تاریخی توقیت کے اعتبار سے اسلامی امت کے تین اہم علاقائی عناصر.... مہاجرین مکہ، انصار مدینہ اور مغربی قبائل عرب.... کے بعد اسلامی ریاست اور اسلامی تحریک کے تعلقات حرمین شریفین کے مشرقی علاقوں میں واقع اور آباد مشرقی قبائل عرب سے اوروں کے بہ نسبت زیادہ قریبی، قدیم اور مضبوط تھے۔ اگرچہ بعض طاقت ور قبائل عرب مشرقی نے اسلامی ریاست کی سب سے زیادہ مخالفت کی تھی۔ لیکن اس سیاسی مخالفت کے باوجود وہ اپنے بعض گھرانوں میں اسلام کی نشر و اشاعت کے مصنوعی اور انسانی و قدرتی حد بندیوں کو توڑ کر سب کو سیراب و فیضیاب کرنے والے فیضان اسلام کو نہیں روک سکے تھے۔

مشرقی علاقوں میں خاص کر نجد و حجاز اور یمامہ کے مرکزی خطوں میں متعدد قبیلے آباد تھے اور غالباً اپنی عددی طاقت کے اعتبار سے وہ دوسرے علاقوں کے قبائل سے زیادہ بڑے اور طاقت ور تھے۔ ان میں بعض قبیلوں کی متعدد شاخیں اور بطون بجائے خود قبیلے بن گئے تھے اور اس طرح مشرقی قبائل کی تعداد بھی نسبتاً زیادہ تھی۔ اس علاقہ میں کثرت آبادی کا سبب زیادہ تر جغرافیائی تھا۔ کیونکہ مدینہ و مکہ کے مشرق میں بحرین و عراق کی سرحدوں تک سینکڑوں بلکہ ہزاروں مربع میل کا علاقہ پھیلا ہوا تھا۔ جہاں قبائیلیوں..... آباد و خانہ بدوش..... دونوں کی اقتصادی ضروریات کی فراہمی کے اسباب موجود تھے مشرقی علاقے میں اہم ترین قبیلے اور ان کے بنیادی خاندان حسب ذیل تھے:

(ا) بنو خزیمہ بن مدرکہ: (۱) اسد بن خزیمہ (۲) بنو غنم بن وودان / اسد بن خزیمہ (۳) بنو ثعلبہ بن دودان / اسد بن خزیمہ (۴) بنو ہون بن خزیمہ (۵) بنو عضل (۶) اور بنو قارہ

(ب) بنو سلیم: (۱) بنو عصیہ (۲) بنو رعل (۳) بنو ذکوان (۴) بنو فالج (۵) بنو شیبان

(ج) بنو غطفان: (۱) اشجع (۲) فزارہ (۳) مرۃ (۴) عبس و ذبیان (۵) ثعلبہ (۶) انمار

(د) بنو محارب بن خصفہ

(س) بنو ہوازن: (۱) بنو عامر بن صعصعہ (۲) بنو ہلال (۳) بنو ربیعہ (۴) بنو البکاء (۵) بنو کلاب (۶) بنو القرطاء (۷) بنو عریبہ

(۸) بنو جشم (۹) بنو نصر (۱۰) بنو سعد بن بکر (۱۱) بنو ثمالہ

(ط) ثقیف : (۱) بنو مالک (۲) الاحلاف (۳) بنو غنی

(ع) باہلہ۔

(ف) بنو ہذیل : (۱) بنو معاویہ بن ہذیل (۲) بنو طابخہ (۳) بنو لحیان

(ک) بنو طے : (۱) بنو معاویہ (۲) بنو جوین (۳) بنو معن (۴) بنو اجا (۵) بنو نبہان [۴۶۱]

مشرقی قبائل عرب کی اسلامی ریاست کی مخالفت و عداوت ۶۲۲ء میں ہجرت نبوی کے کچھ بعد شروع ہوئی تھی۔ جب اسلام ایک سیاسی طاقت اور مرکزیت کے عناصر لیکر ابھرا تھا۔ اور کم از کم وسطی عرب میں فتح کے زمانے یعنی ۶۳۰ء کے ابتدائی دنوں تک جاری رہی تھی۔ اگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام چھوٹے بڑے غزوات و سرایا کا تجزیہ کیا جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ تقریباً ۹۰ مہموں میں سے ۲۸ مہموں کی منزل مقصود مدینہ کے مشرقی علاقوں اور قبیلوں میں تھی [۴۶۲] گویا کہ ایک تہائی مہمیں ان کے خلاف بھیجی گئی تھیں۔ لیکن غالباً یہ قدرت کا قانون ہے کہ بند جتنا مضبوط و مستحکم ہوتا ہے سیلاب اور دریا کی موجیں اتنی ہی تند و تیز ہوتی ہیں۔ تاریخ مذاہب عالم کی یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ مخالفت و عداوت کی ساری انسانی حد بندیاں اور دیواریں مذہب کے جوش و خروش کے سیلاب کے آگے ٹوٹ گئیں۔ خدا کا آخری دین۔۔ اسلام .... جس کی تکمیل مقدر ہو چکی تھی۔ کیونکر ان مصنوعی دیواروں اور رکاوٹوں سے روکا جا سکتا تھا۔ چنانچہ مشرقی قبائل کی مخالفت و عداوت کے باوجود وہ ان کے افراد اور جماعتوں کو اپنا حلقہ بگوش بناتا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شیفتہ و شیدا بناتا رہا۔ جیسے کہ ہم ابھی مشرقی قبائل کے تفصیلی جائزے میں دیکھیں گے۔

(۱) بنو اسد بن خزیمہ

آخذ سے ثابت ہوتا ہے کہ اسد/خزیمہ کے اسلام سے قریبی اور گہرے روابط ابتدائے کار سے ہی قائم ہو گئے تھے [۴۶۳]۔ اس قبیلہ میں متعدد قدیم مسلمان تھے اور غالباً اسلام سے اس ابتدائی تعارف کا ایک سبب وہ قدیم سماجی، اقتصادی اور ازدواجی تعلقات تھے۔ جو قریش کے مختلف بطون سے قائم تھے۔ ابن اسحاق ان کے بیس مردوں اور آٹھ عورتوں کے نام ابتدائی مکی مسلمانوں کی فہرست میں شامل کرتے ہیں اور ان میں سے متعدد کو مہاجرین حبشہ میں بھی شمار کرتے ہیں [۴۶۴] اوپر ذکر آچکا ہے کہ ان کی تعداد چالیس مردوں اور عورتوں کے علاوہ کافی بڑی تعداد میں بچوں پر بھی مشتمل تھی۔ جن کا ذکر آخذ نہیں کرتے ہیں، بہرحال بنو غنم بن دودان کا یہ اسدی خاندان مکہ میں ابتدائے اسلام میں ہی مسلمان ہو گیا تھا۔ عام خیال یہ ہے کہ مکہ کے باسی ان اسدیوں کے قبول اسلام کا اثر ان کے اصل قبیلے پر (جو قبیلہ غطفان کے شمال اور مشرق میں آباد تھا اور قبیلہ طے کا پڑوسی تھا) نہیں پڑا تھا۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے کیونکہ مکہ میں بس جانے والے ان اسدیوں نے اپنے مادر قبیلہ سے تعلقات پوری طرح سے ختم نہیں کئے تھے۔

بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ مآخذ عام طور سے اسد بن خزیمہ کے اصل قبیلے کے قبول اسلام پر زیادہ روشنی نہیں ڈالتے ہیں خاص کر مکہ کی فتح کے قبل کے زمانے میں۔ لیکن شواہد و قرائن بتاتے ہیں کہ ان میں اسلام کی تخم ریزی فتح مکہ سے کافی پہلے ہو چکی تھی۔ کیونکہ ابن اسحاق کے بیان کے مطابق غزوہ حنین میں اسد عبس اور ذبیان کے مجاہدین کے ساتھ ان کی کافی بڑی تعداد اسلامی لشکر میں موجود تھی۔ اور اس موقعہ پر انہوں نے زبردست فوجی کارنامے انجام دیئے تھے[۴۶۵]۔ چند ماہ بعد سنہ ۹ھ کے ابتدائی دنوں اور سنہ ۱۰ھ کے وسط میں اسد بن خزیمہ کا ایک وفد خدمت نبوی میں پہنچا جو دس خاندانوں (رھط) پر مشتمل تھا۔ ان لوگوں نے اپنے مسلمان ہونے کے علاوہ اپنے قبیلہ کے اسلام لانے کا اظہار بھی کیا تھا[۴۶۶]۔ طبری نے اپنی تفسیر میں سورہ حجرات کی آیت نمبر ۱۷ میں روایت بیان کی ہے کہ بعض یا کل ارکان وفد نے فخریہ یہ بات کہی تھی کہ وہ اپنے آپ اسلام لائے تھے اور کسی نے انہیں اس پر آمادہ نہیں کیا تھا[۴۶۷]۔ ان کے مسلمان ہونے کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ غالباً اس کے فوراً بعد ان کے قبیلہ میں ایک عامل صدقات بھیجا گیا تھا اور دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ مرکزی عامل صدقات ان کے پڑوسی قبیلہ بنو طے کے صدقات وصول کرنے کے لئے بھی مشترکہ طور پر بھیجا گیا تھا[۴۶۸]۔

مستشرقین نے طلیحہ بن خویلد اسدی کی مثال کو پیش کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بنو اسد عہد نبوی میں اسلام کے دائرے میں داخل ہی نہیں ہوئے تھے۔ جبکہ مآخذ کا اصرار ہے کہ وہ حیات نبوی میں نہ صرف مسلمان ہو چکے تھے بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں اپنی وفاداری بھی ثابت کر چکے تھے۔ بہر حال ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ طلیحہ بن خویلد اسدی کی اصل طاقت اور قوت کا سرچشمہ اس کا اپنا خاندان یا قبیلہ نہیں تھا۔ بلکہ بنو طے اسد اور غطفان خاص کر مؤخر الذکر کے خاندان بنو فزارہ کا قبائلی اتحاد تھا۔ جس نے وفات نبوی کے بعد طلیحہ کی بغاوت اور ارتداد بلکہ جھوٹے دعوائے نبوت میں امداد کی تھی[۴۶۹]۔ اگرچہ سر دست ہمارے موضوع سے طلیحہ کے ارتداد اور بنو اسد کی سرکشی کا تعلق نہیں ہے۔ تاہم یہ کہہ دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بنو اسد یا طلیحہ کا ارتداد بھی بالواسطہ ہی ان کے "قبول اسلام" کا ثبوت تھا۔ اس کے علاوہ مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عدی بن حاتم طائی جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عظیم صحابی، پکے مسلمان اور بنو طے کے سب سے بڑے سردار تھے نہ صرف اپنے قبیلہ کو طلیحہ کے دام تزویر سے نکال لانے میں کامیاب رہے تھے بلکہ بنو اسد اور غطفان کے مختلف خاندانوں کو ردہ جنگ سے پہلے مرکز اسلام کا مطیع بنانے میں بھی کامیاب رہے تھے یہ دلچسپ بات ہے کہ طلیحہ کے سب سے عظیم اتحادی حضرت عیینہ بن حصن فزاری نے طلیحہ کے فرار ہونے کے بعد دوبارہ اسلام قبول کرتے وقت کہا تھا کہ "ہم اس مذہب خداوندی میں پھر سے داخل ہو رہے ہیں، جس سے ہم نکل گئے تھے" اس ضمن میں یہ بھی عرض کر دیا جائے کہ طلیحہ اسدی کی اصل طاقت فزارہ کی عصبیت سے بھرپور حمایت تھی کیونکہ وہ اس کے قدیم حلیف تھے۔ لیکن جوں ہی حضرت عیینہ فزاری پر طلیحہ کے کذب و افترا کی قلعی کھلی، انہوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا[۴۷۰] اور اسی اعتراف حق کے سبب حضرت ابوبکر صدیق اور ان کے سپہ سالار حضرت خالد بن ولید مخزومی نے ان کو معاف بھی کر دیا تھا۔ بہر حال یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ حیات نبوی میں ہی بنو اسد بن خزیمہ کے اکثر لوگ مسلمان ہو گئے تھے اور ان میں سے بہت سول

نے طلیحہ کا ساتھ اس کی بغاوت میں نہیں دیا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوا ہوتا تو قبیلہ اسد کو اسلام کی طرف اتنی آسانی سے دوبارہ واپسی نہیں ہو سکتی تھی۔

ابن حزم اندلسی کے مطابق بنو اسد عام طور سے اور بنو اسد کی ایک ذیلی شاخ بنو غنم بن دودان خاص طور سے مادر قبیلہ خزیمہ کی اصل شاخ تھی[۴۱]۔ ان کے علاوہ بنو ثعلبہ بن دودان بھی ایک اہم شاخ تھی۔ اور اس میں بھی متعدد مسلمانوں کے نام ملتے ہیں، جیسے حضرات عبید بن ثعلبہ، مالک بن حضرمی بن عامر، ضرار بن الازور اور والصبہ بن مسعود وغیرہ[۴۲]۔ بنو اسد کے علاوہ بہرحال خزیمہ کی دو اہم شاخیں اور بھی تھیں۔ بنو عضل اور بنو قارہ جن کا تعلق بنو ہون بن خزیمہ سے تھا، یعنی جو بنو اسد کا عم زاد خاندان تھا۔ اور اس میں بھی اسلام نے اپنے ماننے والے بنا لیے تھے۔ بنو قارہ کے ایک عظیم ترین صحابی حضرت مسعود بن ربیع تھے۔ جو بدری صحابی ہونے کا شرف رکھتے تھے اور انہوں نے مکہ میں اسلام قبول کیا تھا۔ اور وہاں سے ہجرت کی تھی[۴۳]۔ ان کے علاوہ اسد الغابہ کے مطابق ایک اور قاری صحابی تھے۔ حضرت مسعود بن عمرو، جن کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ حنین کے بعد ہوازن سے حاصل شدہ اموال غنیمت کو جعرانہ کے مقام پر اکٹھا کرنے کے لیے بھیجا تھا[۴۴]۔ مجموعۃ الوثائق میں منقول ایک نامۂ نبوی سے معلوم ہوتا ہے کہ بنو ہون بن خزیمہ کے دو خاندانوں بنو قارہ اور بنو حکم کے لوگ مسلمان ہو گئے تھے اور ان کے ساتھ ساتھ کنانہ اور مزینہ کے کچھ لوگ بھی اسلام لائے تھے[۴۵]۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خزیمہ کے ان خاندانوں نے مدنی عہد کے دور اول میں اسلام قبول کر لیا تھا۔ اس کی تائید مزید عضل اور قارہ کے اس وفد سے بھی ہوتی ہے جو ۳ھ میں خدمت نبوی میں یہ درخواست لیکر آیا تھا کہ ان کے قبیلے کے مسلمانوں کو اسلام کی تعلیم دینے کے لیے کچھ معلمین کو مدینہ سے بھیج دیا جائے۔ درخواست قبول کر لی گئی مگر مسلم جماعت قرا و معلمین کو واقعہ رجیع میں بنو لحیان نے عضل و قارہ کے مشرک و دشمن عناصر کی مدد سے قتل کر دیا تھا[۴۶]۔ ماخذ اور ہمارے جدید مؤرخین عموماً بنو عضل و قارہ کی درخواست کو مسلمانوں سے انتقام لینے کا بہانہ بتلاتے ہیں۔ لیکن بہرحال یہ امکان پھر بھی رہ جاتا ہے کہ ان قبیلوں میں یقیناً کچھ نہ کچھ مسلمان رہے ہوں گے۔ خزیمہ کی دوسری شاخوں میں توسیع و اشاعت اسلام کے بارے میں ہماری معلومات ناقص ہیں۔ لیکن قرآن سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ فتح مکہ تک خزیمہ کے تمام خاندان اور شاخیں اسلام کے سایہ میں آ گئی تھیں۔

(ب) بنو سلیم

مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے مشرقی علاقے میں آباد بنو سلیم کا قبیلہ بڑا اہم اور طاقتور قبیلہ تھا۔ اسلام سے اس کا تعارف مکی عہد میں ہوا تھا۔ جب اس کے بعض افراد نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ بنو سلیم کے ابتدائی مسلمانوں میں ایک تھے حضرت عمرو بن عبسہ جنہوں نے ابن سعد کی ایک روایت کے مطابق حضرات ابوبکر و بلال کے بعد اسلام قبول کیا تھا۔ اور چوتھے یا پانچویں مسلمان تھے[۴۷]۔ قبول اسلام کے بعد وہ حکم نبوی کے مطابق اپنے علاقے میں واپس چلے گئے تھے اور صفنہ اور ہرّہ کے مقامات پر متبادل طریقے سے سکونت پذیر رہے۔ یہ بنو سلیم کا روائتی علاقہ تھا، جہاں وہ مدتوں سے آباد تھے اور بالآخر حضرت

عمرو نے ہجرت نبوی کے بعد مدینہ میں سکونت اختیار کر لی تھی[۴۷۸] ابن حزم کے بیان میں یہ اضافہ ہے۔ جس کی تائید دوسرے مآخذ سے بھی ہوتی ہے کہ حضرت عمرو بن عبسہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی دوست تھے اور ان کے تعلقات ایام جاہلیت سے قائم تھے[۴۷۹] مآخذ سے یہ نہیں معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے قبول اسلام اور ہجرت مدینہ کے درمیان عرصہ میں کیا کیا تھا؟ لیکن غالباً یہ قیاس کرنا بے جا نہ ہوگا۔ خاص کر حضرات ابوذر غفاری، طفیل بن عمرو دوسی وغیرہ کی مثالوں کے بعد کہ انہوں نے بھی اپنے علاقے میں اسلام کی اشاعت کی کوشش کی ہوگی۔ اس میں ان کو کتنی کامیابی ملی۔ اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ دوسرے ابتدائی مسلمان حضرت عتبہ بن غزوان مازنی تھے اور ان کے ایک مولیٰ حضرت خباب نے بھی ان کی اقتدار کی تھی مگر یہ دونوں صحابی مکی تھے۔ کیونکہ وہ مکہ ہی میں سکونت پذیر رہے اور بنو نوفل / قریش کے حلیف بھی تھے۔ ان دونوں صحابیوں نے مہاجرت حبشہ و مدینہ کی سعادت کے علاوہ بدری ہونے کی فضیلت بھی پائی تھی[۴۸۰]

بنو سلیم کے ایک اور ابتدائی مسلم تھے حضرت عروہ بن الصلت جو غزوہ احد میں یا بئر معونہ کے المیہ میں (ربہ اختلاف روایت) شہید ہوئے تھے۔ بہر حال صورت حال جو کچھ بھی رہی ہو ابن اسحاق کے مطابق وہ بہترین مسلمانوں میں سے ایک تھے۔ اگر بئر معونہ میں ان کی شہادت کی روایت قبول کر لی جائے تو یہ بات قابل ذکر ہے کہ انہوں نے بنو سلیم کے ایک ساتھی ہم قبیلہ کی امان یہ کہہ کر قبول کرنے سے انکار کر دی تھی کہ "وہ اسلام لانے کے بعد کسی کافر کی امان (پناہ) نہیں قبول کر سکتے اور ان کو بس خدا کی امان کافی ہے" اور ہنستے مسکراتے راہ خدا میں جان دے دی تھی(۴۸۱) اس سے اہم اور عبرتناک یہ واقعہ ہے کہ بئر معونہ کے المیہ نے بنو سلیم کے مختلف گھرانوں میں کم از کم افراد کی حد تک اسلام کی نشر و اشاعت کی راہ ہموار کر دی۔ حضرت جبار بن سلمیٰ کا بیان ہے کہ "میں نے جب حضرت عامر بن فہیرہ کو قتل کیا اور میرا نیزہ ان کے سینے کے پار ہو گیا تو وہ گرے اور ان کی زبان پر بلیساختہ کلمہ آیا۔ رب کعبہ کی قسم! میں تو کامیاب ہو گیا" میں حیران ہوا کہ ایک شخص جس کی زندگی اس المناک طریقے سے ختم ہوئی وہ کیونکر کامیاب ہوا؟ یہ خلش میرے دل میں پیدا ہوئی اور میں نے اسلام کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور بالآخر مسلمان ہو گیا[۴۸۲] حضرات عروہ بن صلت اور عامر بن فہیرہ کے خون شہادت ہی نے اسلام کے پودے کی اس طرح آبیاری نہیں کی تھی اور نہ جانے کتنے شہیدوں کا لہو رنگ لایا ہوگا۔ اور وہ نہ جانے کتنے دلوں میں اسلام کا بیج بو گیا ہوگا۔ غالباً اسی زمانے سے حضرت صفوان بن معطل کا قبول اسلام بھی تعلق رکھتا ہے۔ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک عظیم صحابی تھے جن کا تعلق بنو سلیم کے گھرانے بنو ذکوان سے تھا۔ تقریباً تمام مآخذ کا اتفاق ہے کہ وہ غزوہ بنی المصطلق میں شریک اور ساقہ لشکر اسلامی کے افسر تھے[۴۸۳]

اگرچہ غزوہ احزاب میں کی اتحاد قبائل میں بنو سلیم کا ایک خاصا بڑا دستہ جو سات سو جنگجوؤں پر مشتمل تھا مسلمانوں کے خلاف لڑنے آیا تھا[۴۸۴] لیکن اس غزوہ کے دوران ہی ان کو اسلام کی مخالفت و عداوت کی بے مائگی اور بے فائدہ ہونے کا احساس ہو گیا تھا چنانچہ اسی سبب سے وہ آہستہ آہستہ اسلامی امت بننے لگے تھے۔ بلکہ اجتماعی طور سے اسلام کے قریب آ رہے تھے[۴۸۵]؟ اس کی تصدیق ابن سعد کے اس بیان سے ہوتی ہے۔ جس کے مطابق بنو سلیم کے کافی لوگوں نے صلح حدیبیہ

اور فتح مکہ کے درمیانی عرصے میں اسلام قبول کیا تھا۔ اور ان میں سے بارہ اہم حضرات کے نام بھی گنائے ہیں جو یہ ہیں۔ حضرات: (۱) الحجاج بن علاط سلمی (۲) عباس بن مرداس (۳) ان کے صاحبزادے جہیمہ بن عباس (۴) یزید بن اخنس (۵) ضحاک بن سفیان بن حارث (۶) عتبہ بن فرقد (۷) خفاف بن عمیر بن حارث (۸) ابن ابی العوجاء (۹) العورد بن خالد بن حذیفہ (۱۰) ہوذہ بن حارث (۱۱) عرباض بن ساریہ اور (۱۲) ابو حصین[۴۸۶] ان کے علاوہ متعدد سلمی صحابہ کے اسمائے گرامی سیرت و تاریخ کی مختلف کتابوں میں ملتے ہیں[۴۸۷] اور اگر سب کا استقصا کیا جائے تو بنو سلیم کے صحابہ کرام کی تعداد اس سے کئی گنا زیادہ ہو گی۔

اس کے علاوہ اس حقیقت سے کہ بنو سلیم نے غزوہ خندق کے بعد اسلامی ریاست کے خلاف کسی مخالفانہ سرگرمی میں حصہ نہیں لیا تھا اور نہ ہی اسلامی حکومت نے ان کے خلاف کوئی فوج کشی یا فوجی کارروائی کی تھی۔ ان کے قبول اسلام یا کم از کم ترکِ عداوت اسلام کے خیال کی تصدیق ہوتی ہے۔ حضرت عباس بن مرداس سلمی کی شاعری سے جو سیرت ابن اسحاق میں محفوظ ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ بنو سلیم کے بیشتر لوگ فتح مکہ سے قبل اسلام لا چکے تھے[۴۸۸]۔ مآخذ عام طور سے اور ابن سعد خاص طور سے صراحت کرتے ہیں کہ بنو سلیم کے سرداروں اور سربرآوردہ حضرات جیسے عباس بن مرداس، جبار بن حکم، حجاج بن علاط اور عرباض بن ساریہ وغیرہ نے بنو سلیم میں اسلام کی نشر و اشاعت میں کلیدی کردار ادا کیا تھا اور ان کو اسلامی امت کا رکن بنا دیا تھا[۴۸۹]۔ بہر حال یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ فتح مکہ سے قبل بنو سلیم اسلام کے مکمل طور سے حلقہ بگوش بن چکے تھے۔

بنو سلیم کے قبول اسلام کی ایک ناقابل تردید شہادت ان کے دستوں کی اسلامی لشکر میں مختلف غزوات کے مواقع پر شمولیت ہے۔ اس سے ان کی عددی طاقت کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مآخذ کا بیان ہے کہ فتح مکہ کے لئے اسلامی لشکر میں بنو سلیم کے دستہ میں ایک ہزار مسلح و کیل کانٹے سے لیس مجاہدین شامل تھے[۴۹۰]۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ بنو سلیم کا دستہ بدوی مسلم قبائل کے فراہم کردہ سب سے بڑے دستوں میں سے ایک تھا اور فوجی لحاظ سے طاقت ور ترین تھا۔ بنو سلیم کے اس دستے نے جنگ حنین اور محاصرہ طائف میں بھی حصہ لیا تھا۔ یہ بھی قابل ذکر بات ہے کہ ان تمام مواقع پر بنو اسلم کا دستہ اسلامی لشکر کے مقدمہ کا ایک حصہ تھا جو بعض دوسرے دستوں کے ساتھ حضرت خالد بن ولید مخزومی کے کمان میں رکھا گیا تھا[۴۹۱]۔ بنو سلیم کے حسنِ اسلام کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ بنو سعد بن بکر کی دردمندانہ درخواستوں پر جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہوازن کے قیدیوں کی رہائی کے احکامات صادر کئے تھے۔ تو اپنے شیخ قبیلہ کے ذہنی تحفظات اور گرانیٔ خاطر کے باوجود بنو سلیم کے تمام لوگوں نے اپنے اپنے حصے کے قیدی فوراً رہا کر دیئے تھے[۴۹۲]۔ حضرت خالد بن ولید مخزومی کی کمان میں جو فوج اس کے بعد بنو جذیمہ کے خلاف بھیجی گئی تھی۔ اس میں مہاجرین اور انصار کے علاوہ بنو سلیم ہی کے مجاہدین کافی بڑی تعداد میں شامل تھے[۴۹۳]۔ اسی طرح انہوں نے غزوہ تبوک کے موقعہ پر اسلامی لشکر کے لئے ایک خاصا بڑا اور طاقت ور دستہ فراہم کیا تھا[۴۹۴]۔ چنانچہ یہ واضح ہوتا ہے کہ غزوہ خیبر کے بعد بنو سلیم کے مخلص اور ثابت قدم مسلمان اسلامی ریاست کی مختلف حیثیتوں میں شاندار خدمات انجام دے رہے تھے اور اسلام کے سچے وفادار اور مخلص ماننے والے

بن گئے تھے۔

ابن سعد کا مزید بیان ہے کہ فتح مکہ کے سال ہی بنو سلیم کا ایک وفد عظیم جو نو سو یا ایک ہزار افراد پر مشتمل تھا۔ اپنے ایک خاص سردار حضرت قیس بن نصیبہ کی تحریک پر مدینہ میں خدمت نبوی میں حاضر ہوا تھا۔ اور اس نے اپنی وفاداری اور صلابت ایمانی کا بےمثال مظاہرہ کیا تھا[۴۹۵] اس زیارت کے دوران بنو سلیم کے متعدد حضرات کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قطائع (قطیعہ : زمین کا ٹکڑا) عطا فرمائے تھے۔ طبقات، اسد الغابہ اور مجموعۃ الوثائق کے متعدد بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم بنو سلیم کے بارہ حضرات کو جزیرہ نمائے عرب کے مختلف مقامات پر قطائع ملے تھے[۴۹۶] سنہ ۹ھ کے آغاز اور سنہ ۶۳۰ء کے پہلے ربع میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو سلیم سے صدقات وصول کرنے کیلئے ایک مرکزی عامل صدقات مقرر کیا تھا اور یہ بنو سلیم کے شرف کی بات ہے کہ پورے قبیلہ نے بلا کسی ردوکد کے اپنے واجب الادا صدقات فوراً ادا کر دیئے تھے[۴۹۷]۔ یہاں یہ بھی ذکر کر دیا جائے کہ عامل صدقات کے پورے گھرانے اور خاندان نے ردہ کے زمانے میں بھی اپنے صدقات پوری دیانت داری سے ادا کئے تھے[۴۹۸]۔ بنو سلیم کے صرف ایک طبقہ نے ردہ میں حصہ لیا تھا اور بیشتر لوگ اسلام اور مرکز اسلام کے وفادار رہے تھے۔ بہرحال یہ ناقابل انکار و تردید حقیقت ہے کہ عہد نبوی میں بنو سلیم کا پورا قبیلہ نہ صرف مسلمان ہو گیا تھا بلکہ مخلص مسلمان تھا۔ جو بعد کے پرآشوب زمانے میں بھی زیادہ تر ثابت قدم رہا تھا[۴۹۹]

(ج) بنو غطفان

بنو غطفان غالباً قریش مکہ کے بعد سب سے زیادہ طاقت ور اور عددی اعتبار سے بڑا بدوی قبیلہ تھا۔ نسب کے لحاظ سے وہ بنو سلیم کے بہت قریب تھا بلکہ کہنا چاہیئے کہ دونوں ایک دوسرے کے عزیز اور رشتہ دار تھے کیونکہ دونوں مضر کے ایک عظیم خاندان یا قبیلے قیس عیلان کی شاخیں تھیں[۵۰۰]۔ سماجی، سیاسی اور نسبی اعتبارات سے قریش مکہ اور قیس عیلان وسطی عرب کے دو سب سے بڑے قبائلی گروہ تھے جو بوجوہ معلوم ایک دوسرے کے حریف اور مقابل تھے۔ اگرچہ اقتصادی اور تجارتی اسباب کے سبب قیس عیلان کے بعض گھرانوں کے ساتھ قریش مکہ کے دوستانہ تعلقات بھی قائم ہو گئے تھے جن میں ازدواجی روابط بھی شامل تھے۔ بہرحال غطفان بعثت نبوی کے زمانے تک بجائے خود قبائل کا ایک مجموعہ بن گیا تھا جس کے اپنے گھرانے اور ان کے ذیلی خاندان تھے اور جو اپنی اپنی جگہ قبیلے بن چکے تھے۔ ان میں سے سب سے زیادہ طاقت ور اور عددی کثرت والے تین اہم ترین بطون تھے : بنو اشجع، بنو فزارہ اور بنو مرہ ان کے علاوہ عبس اور ذبیان کے دو اہم گھرانے تھے جو ولادت نبوی یا اس سے بھی قبل کے زمانے میں بہت اہم تھے۔ لیکن بعثت نبوی کے زمانے میں وہ اپنی سابقہ حیثیت اور مقام کھو چکے تھے اور اتنے اہم نہیں رہ گئے تھے۔ دو اور اہم شاخیں تھیں جو بنو محارب اور بنو ثعلبہ کہلاتی تھیں۔ ان کے علاوہ کچھ اور ذیلی شاخیں بھی تھیں جن میں سے بنو انمار اور بنو عبد العزی خاصی اہم تھیں۔ یہ تمام اہم اور ذیلی خاندان اور بطون ایک دوسرے سے قریبی و اتحادی تعلقات رکھتے تھے اور ان کا سیاسی اور

فوجی اتحاد ہی ان کے طاقت ور ہونے اور قبائلی نظام عرب میں ممتاز ہونے کا سب سے بڑا سبب تھا۔ ان کے نسبی شجرہ پر ایک نظر ان کے قریبی تعلقات کی نوعیت کو واضح کر دے گی ۔ا۵

جہاں تک اسلام اور اسلامی ریاست سے بنو غطفان کے تعلقات کا معاملہ ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ انہوں نے مدتوں تک اجتماعی طور سے دونوں کی مخالفت کی تھی۔ لیکن اسلام نے ان کے بعض افراد کو اپنا حلقہ بگوش آغاز عہد اسلامی ہی میں بنا لیا تھا۔ ذیل میں بنو غطفان کے مختلف قبیلوں اور بطون کے افراد کے انفرادی اور ان کے اجتماعی رویے کا جائزہ لیں گے۔ جس سے بنو غطفان میں اسلام کی اشاعت کا نہج اور رفتار اور طریقہ تاثیر و تسخیر معلوم ہوگا۔

(۱) بنو اشجع

جس طرح قریش مکہ کے بعض خاندانوں نے اسلام کی مخالفت کی تھی۔ یا اس کی دعوت سے اجتماعی طور سے گریز کیا تھا مگر اس کے تقریباً سب ہی گھرانوں کے افراد اسلام قبول کرتے رہے تھے۔ بالکل اسی طرح بنو غطفان بھی مدتوں تک اسلام کا مخالف رہا لیکن اس کے مختلف گھرانوں میں اسلام روشناس ہوتا رہا۔ ان میں سب سے پہلے اور غالباً دوسروں کی بہ نسبت ذرا ابتدائی زمانے میں ان کا گھرانا بنو اشجع اسلام سے متعارف ہوا تھا اور اس کے بعض افراد و ارکان نے اسلام مکی عہد ہی میں قبول کر لیا تھا۔ ابن سعد اور ابن حزم کی روایات کے مطابق حضرت جاریہ بن جمیل ان کے قدیم ترین مسلمانوں میں شامل تھے وہ بدری صحابی بھی تھے ۵۰۲ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بنو غطفان کے مختلف گھرانوں میں اسلام کی باقاعدہ اشاعت جنگ احزاب کے بعد شروع ہوئی تھی اور صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کے دوران وہ تقریباً سب مسلمان ہو چکے تھے۔ ابن سعد نے فتح مکہ سے قبل مسلمان ہونے والے صحابہ کرام کی فہرست میں کم از کم دس بنو اشجع کے مسلمانوں کو شمار کیا ہے ۵۰۳ ان میں سے نصف دوسرے ماخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۵ھ / ۶۲۶ء سے پہلے کے مسلمان تھے اور بعض اہم حضرات تو جنگ خندق ۵ھ / ۶۲۷ء سے قبل اسلام لا چکے تھے۔ ان میں سب سے اہم حضرت نعیم بن مسعود اشجعی تھے۔ جو احزاب سے کچھ پہلے اسلام لا چکے تھے۔ اور ان کے اسلام کو ان کے قبیلہ والے اور اتحادی نہیں جانتے تھے۔ انہوں نے جس مہارت، ہوشیاری اور سیاسی حکمت عملی سے احزاب کے اتحاد کو توڑا تھا وہ ان کے حسن و صلابت اسلام کا بھی ایک بہترین نمونہ تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے ہی بنو قریظہ کو عملی طور سے جنگ احزاب کے دوران اتحادیوں سے ملنے سے روک دیا تھا ۵۰۴ ان کے خاندان بنو اشجع کے دوسرے اہم اور سربرآوردہ مسلمان تھے: حضرات عبداللہ بن نعیم جو غزوہ خیبر میں شریک جہاد تھے ۵۰۵ عوف بن مالک، غزوہ خیبر میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دلیل (راہ بر) ۵۰۶ حسیل بن خارجہ، جو خیبر کے بعد غالباً اسلام لائے تھے ۵۰۷ اور معقل بن سنان جنہوں نے متعدد مواقع پر اسلامی ریاست کی خدمات انجام دی تھیں ۵۰۸۔

ان اہم اور با اثر حضرات کے قبول اسلام کا لازمی طور سے ان کے قبیلے کے دوسرے افراد پر بھی اثر پڑا تھا لیکن سب سے زیادہ توسیع اسلام میں حصہ لیا تھا۔ حضرت مسعود بن رخیلہ اشجعی کے قبول اسلام نے۔ ابن سعد کی روایت ہے کہ انہوں

نے جنگ احزاب کے فوراً یا کچھ مدت کے بعد اسلام قبول کر لیا تھا۔[۵۰۹] ان کے قبول اسلام کی تاثیر کا اندازہ اس پس منظر میں ہوتا ہے کہ انہوں نے جنگ احزاب کے دوران اپنے قبیلہ اشجع کے دستے کی قیادت میدان جنگ میں کی تھی اور وہی قبیلہ کے سب سے بڑے اور مسلمہ سردار تھے۔ چونکہ وہ اپنے قبیلے کے سب سے زیادہ با اثر آدمی تھے۔ اس لئے ان کے قبول اسلام کا اثر ان کے قبیلہ والوں پر عام طور سے اور ان کے اپنے اہل خاندان پر خاص طور سے پڑنا لازمی تھا۔

افراد و شیوخ قبائل کا انفرادی اسلام ہی توسیع و اشاعت اسلام کا واحد سبب نہیں تھا۔ اس سے کہیں زیادہ اہم سبب یا عنصر تھا ان نو مسلموں کا پورے جوش و ولولے کے ساتھ اپنے قبیلوں میں اسلام کی تبلیغ کرنا۔ چنانچہ ابن اسحاق کے بیان سے بصراحت معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نعیم بن مسعود اشجعی نے اپنے قبیلہ کے قبول اسلام میں کافی اہم کردار ادا کیا تھا۔[۵۱۰] کسی حد تک بنو اشجع کے قبول اسلام کی تصدیق ابن سعد کے اس بیان سے ہوتی ہے کہ بنو اشجع کا وفد سو افراد پر مشتمل تھا، لیکن دوسری روایت سے جو زیادہ قرین قیاس ہے معلوم ہوتا ہے کہ وفد کے ارکان کی تعداد سات سو تھی[۵۱۱]۔ یہ دلچسپ اور اہم تاریخی حقیقت ہے کہ بنو اشجع کے اس وفد نے جنگ احزاب میں اتحادیوں کی ناکام پسپائی کے فوراً بعد بارگاہ نبوی میں حاضری دی تھی[۵۱۲]۔ بہر حال فتح مکہ تک یہ پورا قبیلہ اسلامی امت کا ایک مخلص و تابعدار رکن بن چکا تھا، کیونکہ فتح مکہ کے اسلامی لشکر کے لئے بنو اشجع نے تین سو مسلح مجاہدین فراہم کئے تھے[۵۱۳]۔ اسی طرح اس نے غزوہ تبوک کے لئے بھی خاصا بڑا دستہ فراہم کیا تھا۔ اس ضمن میں یہ حقیقت قابل ذکر ہے کہ ان دونوں مواقع پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت نعیم بن مسعود کو بنو اشجع کے مجاہدین کو اکٹھا کرنے کے لئے بھیجا تھا۔[۵۱۴] ان واقعات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ غالباً حضرت نعیم بن مسعود اشجعی یا تو بنو اشجع کے سردار بن گئے تھے اور حضرت مسعود بن رُخیلہ انتقال فرما چکے تھے۔ یا میدان سیاست سے ہٹ گئے تھے یا وہ اس وقت تک اشجع کے سب سے زیادہ اہم اور با اثر شخص بن چکے تھے۔

(۲) بنو فزارہ

بنو غطفان کے دوسرے اہم خاندان خاص طور سے فزارہ اور بہ مجموعی لحاظ سے اسلام کے دائرے سے کافی عرصے تک باہر رہے تھے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غزوہ خیبر کے بعد تو یقیناً اور غزوہ احزاب کے بعد غالباً ان کی اسلام اور اسلامی ریاست سے مخالفت کم ہونے لگی تھی۔ چنانچہ اس زمانے میں دونوں طرف سے ہم کسی جارحانہ اقدام کے بارے میں نہیں سنتے۔ یہ حتمی امر ہے کہ صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کے درمیانی عرصے میں وہ تقریباً سب کے سب مسلمان ہو گئے تھے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ان کا ایک خاصا بڑا فوجی دستہ اسلامی لشکر کا حصہ تھا۔ جس نے مکہ فتح کیا تھا۔[۵۱۵] واقدی کے یہاں متعدد حوالے ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بنو فزارہ عام طور سے اور ان کے سردار خاص طور سے ان سیاسی و فوجی تبدیلیوں سے خوش نہیں تھے، جو غزوہ احزاب کے بعد پیش آ رہی تھیں۔ اور آہستہ آہستہ ان میں اسلامی ریاست سے کوئی سمجھوتہ یا مفاہمت کرنے کا احساس پیدا ہو رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بنو فزارہ اور ان کے سردار عیینہ بن حصن فزاری کو اسلام کا ہمنوا بنانے

میں ان کے حلیف و عزیز بنو مرہ کے سردار حضرت حارث بن عوف مری نے اہم کردار ادا کیا تھا[۵۱۴] صلح حدیبیہ یا غزوۃ القضیہ کے زمانے (۶ھ / ۶۲۸-۲۹ء) تک وہ عجیب کشمکش اور حیص بیص کے عالم میں تھے۔ لیکن مکہ کی گرتی ہوئی ساکھ اور اسلامی ریاست کی روزافزوں طاقت نے ایک طرف تو ان کو اسلامی ریاست کا وفادار بنا دیا اور دوسری طرف اسلام کا پیرو بھی فتح مکہ سے پہلے وہ اسلامی امت کے باقاعدہ رکن بن چکے تھے اور ان میں سے اکثر مخلص مسلمان تھے۔ یہی سبب تھا کہ فتح مکہ کے موقعہ پر اسلامی لشکر میں دوسرے مشرقی قبائل کے دستوں کے علاوہ بنو فزارہ کے لوگ بھی موجود تھے اور انہوں نے فتح مکہ، غزوات حنین و طائف میں شاندار فوجی خدمات انجام دی تھیں۔ اسی طرح ابن اسحاق کے حوالے سے معلوم ہوتا ہے کہ بنو عبس کا ایک اہم دستہ اس موقعہ پر موجود تھا اور یہی فزارہ اور مرہ کا دستہ تھا۔ یہ اسلامی لشکر کے میمنہ دائیں بازو / RIGHT - wing میں شامل تھا اور ان کے علاوہ بنو عبس اور قبیلہ بنو اسد / خزیمہ کے دستے بھی تھے[۵۱۶] بنو فزارہ کے قبول اسلام کا یہ ایک ناقابل تردید ثبوت ہے

بلاریب بنو فزارہ کی سب سے اہم مسلم شخصیت حضرت عیینہ بن حصن فزاری کی تھی۔ جنہوں نے غالباً فتح مکہ سے پہلے قبل اسلام قبول کر لیا تھا۔ اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ وہ دوسرے بدوی قبائل جیسے بنو سلیم، تمیم اور ہوازن وغیرہ کے سرداروں کے ساتھ ان نو مسلموں میں شامل تھے جن کو عام طور سے المؤلفۃ قلوبہم (وہ لوگ جن کی تالیف و تسکین قلب کی گئی تھی) کہا جاتا ہے۔ اور جن کے اطمینان قلب و تسکین انا اور اعزاز و اکرام کے اظہار کے لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہوازن کے خمس میں عطایائے خاص عنایت فرمائے تھے۔ حضرت عیینہ بن فزاری کو ایک سردار کا حصہ ملا تھا جو سو اونٹوں پر مشتمل تھا۔ یہ عطیہ نبوی تھا[۵۱۸] اس کے فوراً بعد ہی ہم ان کو اسلامی ریاست کی جانب سے بنو تمیم کے ایک سرکش خاندان کے خلاف فوجی کارروائی کے قائد کے روپ میں دیکھتے ہیں۔ یہ واقعہ محرم ۹ھ / اپریل ۶۳۰ء کا ہے[۵۱۹] اس سے اہم یہ تاریخی حقیقت ہے کہ اس زمانے میں وہ بنو تمیم کے لئے بطور مرکزی عامل صدقات مقرر کئے گئے[۵۲۰] غالباً یہ عارضی انتظام تھا۔ کیونکہ اس کے بعد ہی ان کو اپنے قبیلہ بنو فزارہ کا محصل یا عامل صدقات مقرر کیا گیا تھا، جیسا کہ بلاذری کا بیان ہے[۵۲۱] ان حقائق سے بنو فزارہ یا ان کے سردار کے قبول اسلام کے بارے میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا ہے۔ مزید تائید ان کے وفد کے مدینہ میں ۹ھ کے آخری زمانے اور ۶۳۱ء کے آغاز میں آنے سے ہوتی ہے۔ ان کا یہ وفد غزوہ تبوک کے بعد حاضر بارگاہ نبوی ہوا تھا ابن حزم نے بنو فزارہ کے متعدد صحابہ کرام کا ذکر کیا ہے جن میں سے اہم ترین تھے۔ حضرات کثیر بن زیاد اور سمرہ بن جندب جن کا تعلق فزارہ کے ایک گھرانے بنو شمخ سے تھا[۵۲۲]

ان حقائق کی روشنی میں یہ نتیجہ نکالنا صحیح ہے کہ بنو فزارہ اور ان کے سردار بلاشک و شبہ حیات نبوی میں اسلام کے حلقہ بگوش بن گئے تھے۔ وہ سب یا ان میں سے اکثر یا بعض عہد نبوی کے بعد مرتد ہو گئے تھے اور طلیحہ اسدی کے جال میں پھنس گئے تھے۔ الگ بات ہے اور ان کا ارتداد بھی ان کے پہلے قبول اسلام کا ثبوت ہے۔ بہرحال جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے کہ وہ حضرت خالد بن ولید مخزومی کے ہاتھوں ۱۱ھ / ۶۳۲ء میں طلیحہ اسدی کی شکست کے بعد پھر مسلمان ہو گئے تھے طبری کے بیان کے مطابق انہوں نے کہا تھا " ہم اس دین میں پھر داخل ہو رہے ہیں، جس سے نکل گئے تھے۔ ہم خدا اور اس کے رسول"

کے سامنے سر اطاعت خم کرتے ہیں اور اپنے اموال اور اپنی جانوں کے بارے میں احکام الٰہی کی تعمیل کرتے ہیں"[۵۱۴]

(۳) بنو مرہ

بنو غطفان کے تیسرے سب سے اہم بطن بنو مرہ کا بنو فزارہ سے قریبی تعلق تھا وہ دونوں نہ صرف ایک دوسرے کے عم زاد خاندان تھے بلکہ ایک دوسرے کے حلیف بھی تھے[۵۲۵] ذکر آچکا ہے کہ ان دونوں خاندانوں میں غزوہ احزاب کے بعد گذشتہ حالات یا دوسرے الفاظ میں اسلامی ریاست اور اسلام کے بارے میں اپنے تعلقات اور حکمت عملی کے لئے تنفر یا بے اطمینانی پیدا ہوگئی تھی۔ اتحاد احزاب کے ناکام ہونے کے بعد بنو مرہ کے سردار حارث بن عوف نے اسلامی ریاست سے مفاہمت کرنے اور دوستی کے تعلقات استوار کرنے کا برملا اظہار بنو فزارہ کے سردار سے کیا تھا۔ اور ان کو بھی یہی مشورہ دیا تھا[۵۲۶] بنو فزارہ کے حیص بیص اور لیس و پیش کے سبب بنو مرہ بھی اسلام اور اسلامی ریاست کے قریب نہیں آسکے کیونکہ وہ بنو فزارہ سے اپنے قدیم برادرانہ اور حلیفانہ تعلقات کے بندھنوں سے مجبور تھے۔ پھر غزوہ خیبر کے موقعہ پر بھی بنو مرہ کے سردار نے انہی جذبات کا اظہار کیا تھا[۵۲۷] اس ضمن میں یہ نکتہ خاصا اہم اور قابل ذکر معلوم ہوتا ہے۔ کہ خیبر کے یہودیوں نے بنو غطفان کو اپنی پیداوار کا نصف حصہ دیکر اسلامی ریاست کے خلاف اور ایک اتحاد بنانا چاہا تھا۔ مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دوربین پالیسی اور عظیم حکمتِ عملی کے سبب یہ بیل سر نہ منڈھ سکی۔ قوی امکان ہے کہ بنو مرہ اور ان کے ہم خیال اتحادیوں نے بھی اسلامی ریاست کے خلاف کسی نئے اتحاد یا گٹھ جوڑ میں شرکت کرنے سے انکار کر دیا تھا اور بنو غطفان کا یہ باہمی سیاسی اختلاف بھی خیبر کے یہودیوں کے منصوبے کی ناکامی کا ایک اہم عنصر یا عامل رہا تھا۔ بہرحال عمرۃ القضیہ کے زمانے تک بنو مرہ اور ان کے سردار قبولِ اسلام کی دہلیز پر کھڑے تھے اور اسی زمانے یا اس کے معاً بعد وہ باب رحمت سے قلعہ اسلامی میں داخل ہوگئے[۵۲۸] غالباً اسد الغابہ کی اس روایت کا اسی زمانہ سے تعلق ہے۔ جس کے مطابق بنو قیس کے ایک صحابی حضرت ساریہ بن اوفیٰ کو جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو مرہ کو اسلام کی دعوت دینے کے لئے بھیجا تھا۔ اور انہوں نے تھوڑی سی مزاحمت کے بعد اسلام قبول کر لیا تھا[۵۲۹]۔ اس سے پہلے مختلف غزوات نبوی میں بنو مرہ کے دستوں کی موجودگی کا ذکر آچکا ہے جو ان کے قبول اسلام کے علاوہ اسلامی ریاست کے نظم و نسق میں ان کی فعال اور باقاعدہ شرکت کا بھی ثبوت ہے[۵۳۰]

بلاذری کا بیان ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حارث بن عوف کو اپنے قبیلہ بنو مرہ کے صدقات وصول کرنے اور مدینہ کے بیت المال میں پہنچانے کا افسر مقرر کیا تھا[۵۳۱] اور یہ انتظام غالباً ۹ھ کے آغاز یا ۶۳۰ء کے وسط میں کیا گیا تھا، جب بہت سے مرکزی اور مقامی عاملین و محصلین صدقات تمام چھوٹے بڑے مسلمان قبیلوں کے لئے مقرر کئے گئے تھے۔ اپنے حلیف اور برادر بنو فزارہ کی مانند بنو مرہ نے بھی اس برس کے آخری زمانے میں یا ۶۳۱ء کے اوائل میں بارگاہِ نبوی میں نذرانہ عقیدت و وفاداری پیش کرنے کے لئے اپنا بھی وفد مدینہ بھیجا تھا جو تیرہ اشخاص پر مشتمل تھا[۵۳۲] بنو مرہ کے عہد نبوی میں قبولِ اسلام اور ریاستِ اسلامی سے وفاداری کا ایک مزید ثبوت یہ بھی ہے کہ وفات نبوی کے بعد ردہ کے زمانے

بلکہ پورے قبیلہ بنو مرہ نے یا اس کے کسی ایک حصہ نے بھی اسلام ترک نہیں کیا تھا۔ انہوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تھا اور اس کے لئے خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ سے جنگ بھی مول لی تھی [523] مگر انہوں نے نہ اس سے پہلے نہ اس کے بعد طلیحہ اسدی یا اس کے سب سے بڑے حلیف بنو فزارہ کا ساتھ دیا تھا۔ جس طرح انہوں نے قبیلہ طے کے خلاف بنو اسد اور بنو فزارہ کے جاہلی اتحاد میں شمولیت سے انکار کر دیا تھا۔ [524]

(۴) بنو عبس

بنو عبس بنو ذبیان کے برعکس غطفان کا وہ گھرانا تھا۔ جو اسلامی عہد کے قریب سیاسی پس منظر میں چلا گیا تھا۔ لیکن وہ عرب دنیا کے معاملات میں اتنے غیر اہم نہیں ہو گئے تھے۔ جتنا کہ وہ اپنی گذشتہ تاریخ سے معلوم ہوتے ہیں اور نہ ہی یہ خیال صحیح ہے کہ عہد نبوی کے واقعات میں ان کا حصہ معمولی تھا۔ [525] وہ اس زمانے میں بھی ایک خاصے اہم قبائلی گروہ کی حیثیت رکھتے تھے اور اسلام کی نشر و اشاعت کی تاریخ میں ان کا حصہ کافی نمایاں نظر آتا ہے۔ ابن حزم نے بنو عبس کے جن متعدد صحابہ کرامؓ کا ذکر کیا ہے ان میں سے حضرات قُرّہ بن حصین، شریح بن اوفیٰ اور ابی بن عمارہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اہم و ممتاز صحابہ میں سے تھے۔ اور انہوں نے اسلام اور اسلامی ریاست کے لئے اہم خدمات انجام دی تھیں۔ [526]

یہ نکتہ خاصا اہم ہے کہ اسلامی ریاست سے ان کا کوئی تصادم عہد نبوی میں نہیں ہوا تھا۔ اور نہ ہی اسلامی ریاست نے ان کے خلاف کسی قسم کی تادیبی یا فوجی کارروائی کی تھی جبکہ وفات نبوی کے فوراً بعد ان کے مرکز اسلام اور خلیفہ اول سے زکوٰۃ کی ادائیگی پر اختلاف و تصادم ہوا تھا۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ عہد نبوی میں کم از کم ان کو اسلامی ریاست سے کوئی اختلاف یا نزاع نہیں تھا اور غالباً وہ اسلام کے حلقہ بگوش صلح حدیبیہ کے بعد بن گئے تھے۔ اس کی تصدیق اسلامی لشکر میں ان کے دستے کی موجودگی سے ہوتی ہے جو فتح مکہ، حنین اور طائف کے غزوات میں برسرکار رہا تھا۔ [527] اس کے علاوہ ابن سعد کا بیان ہے کہ ان کا ایک وفد جو ان کے نو خاندانوں (رهط) پر مشتمل تھا۔ کسی وقت مدینہ میں خدمت نبوی میں حاضر ہوا تھا۔ تاکہ اپنے اور اپنے قبیلہ کے قبول اسلام کا اظہار اور اسلامی ریاست سے وفاداری کا اقرار کرے۔ ابن سعد نے ان کے وفد کے آنے کی تاریخ نہیں بیان کی ہے۔ مگر طبری نے واقدی کی ایک روایت کی بنیاد پر اس کی آمد کی تعیین سنہ ۹ھ / ۶۳۱-۳۲ء میں کی ہے۔ [528]

ان کے قبول اسلام اور ریاست اسلامی کی شہریت کا مزید ثبوت بلاذری کے اس بیان سے ملتا ہے۔ جس کے مطابق حضرت نُعَیم بن مسعود اشجعی بنو غطفان کے تین اہم گھرانوں ..... اشجع، انمار بن بغیض اور بنو عبس بن بغیض ..... کے لئے مرکزی عامل صدقات مقرر کئے گئے تھے [529] بظاہر ماخذ کے کسی بیان سے نہیں معلوم ہوتا کہ بنو عبس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار کیا ہو بلکہ ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے تمام صدقات خوشدلی اور بروقت مدینہ کو ادا کئے تھے۔ لیکن وفات نبوی کے بعد ان کے ایک گروہ نے زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار کر دیا۔ تاہم یہ بھی حقیقت ہے،

کہ انہوں نے دوسرے تمام شعائر اسلام کو ادا کرتے رہنے کا وعدہ کیا تھا۔ یہ بات اہم ہے کہ خود مدینہ کے صحابہ کرام کی غالب اکثریت نے محض زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار کو ارتداد نہیں سمجھا تھا۔ اور اسی وجہ سے ہمارے تمام مآخذ نے ایسے لوگوں کو مانعین زکوٰۃ (زکوٰۃ روکنے والے) طبقہ میں رکھا ہے۔ بہرحال طبری کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ عہد نبوی میں پورے بنو عبس مسلمان ہو گئے تھے [۵۴۰]۔ بعد میں انہوں نے اسلامی حکومت کے خلاف کسی ایک معاملہ پر بغاوت کی تھی وہ دوسری بات تھی۔

(۵) بنو ثعلبہ

مادر قبیلہ غطفان کے دو ذیلی گھرانے بنو ثعلبہ اور انمار تھے، اور وہ دونوں اسلامی ریاست کے کم از کم ۸ھ/ ۶۲۹ء تک مخالف رہے تھے۔ چنانچہ ۳ھ/ ۶۲۴ء سے ان کے خلاف کئی چھوٹی بڑی مہمیں مدینہ منورہ سے بھیجی گئی تھیں اس کے باوجود اسلام نے ان گھرانوں میں اپنے قدم مضبوطی سے جما لئے تھے اور طرفہ ستم یہ کہ ان فوجی مہموں کے دوران ہی ان کے بعض اہم افراد اور سردار اسلام کی حقانیت کے قائل اور اسلامی ریاست کے وفادار بنے تھے بنو ثعلبہ کے خلاف بھیجی گئی پہلی مہم ہی کے دوران ان کا ایک شخص مسلمان ہو گیا تھا۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حضرت بلال حبشی کے دامن تربیت میں دیدیا تھا کہ وہ ان سے دین میں صلابت و ثابت قدمی کا درس لیں [۵۴۱]۔ یہاں یہ بات قابل ذکر معلوم ہوتی ہے کہ بنو ثعلبہ، انمار اور بنو محارب ایک ہی علاقے میں بستے تھے اور اس طرح خون کے رشتوں کے علاوہ ان میں دوستی اور سیاسی ہم آہنگی کے روابط بھی تھے۔ وہ دوسرے قبائل یا جماعتوں کے مقابلے میں عموماً بطور ایک اکائی اور وحدت کے طرز عمل اپناتے تھے۔ اسلام اور اسلامی ریاست کے معاملے میں بھی ان کا یہی وطیرہ تھا۔ چنانچہ ان تینوں قبیلوں نے ساتھ ساتھ اسلام کی مخالفت کی اور اس کے سبب کئی مہمیں جیسے غزوہ ذو امر (ربیع الاول ۳ھ/ ستمبر ۶۲۴ء) ذات الرقاع (محرم ۵ھ/ جون ۶۲۶ء) ذو القصہ (ربیع الثانی ۶ھ/ اگست ستمبر ۶۲۷ء) الطرف (جمادی الآخرہ ۶ھ/ اکتوبر۔ نومبر ۶۲۷ء) اور میفعہ (رمضان ۷ھ/ جنوری ۶۲۹ء) بھیجی گئی تھیں [۵۴۲]۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کے بعد ان کے خلاف کوئی مہم نہیں بھیجی گئی اور وہ غالباً اسلام سے مفاہمت کی راہ پر لگ گئے تھے۔ بہرحال ۸ھ/ ۶۳۰ء میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جعرانہ سے واپسی پر بنو ثعلبہ نے چار آدمیوں پر مشتمل اپنا وفد بھیجا اور اسلامی ریاست سے اپنی وفاداری کا یقین دلایا۔ جس پر وہ آخر تک قائم رہے [۵۴۳]۔ چونکہ محارب انہی مذکورہ بالا مہموں میں سے کسی میں مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔ اس لئے یہ امکان قوی ہے کہ ان کے اسلام کا اثر ان کے پڑوسیوں خصوصاً بنو ثعلبہ پر پڑا تھا۔ اس کے علاوہ ہم ان کے قبیلہ پر عامل صدقات کے مقرر کئے جانے کی شہادت پہلے ہی دیکھ چکے ہیں۔ چنانچہ یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ بنو ثعلبہ ہی نہیں بلکہ پورا قبیلہ غطفان عہد نبوی میں اسلام لا چکا تھا۔

(د) بنو محارب بن خصفہ

بنو محارب بن خصفہ قیس عیلان کا ایک طاقتور اور اہم قبیلہ تھا اور وہ اپنے دو ہمنام مگر سیاسی لحاظ سے گمنام ولے مایہ

قبیلوں سے بالکل الگ اور ممتاز تھا[۵۴۴] واقدی اور ابن سعد کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ بنو محارب بن خصفہ میں اسلام کی نشر و اشاعت کافی ابتدائی زمانے میں شروع ہو گئی تھی۔ چنانچہ اس کے مطابق ۳ھ / ۶۲۴ء کی ایک مہم کے دوران اس قبیلہ کے عظیم ترین سردار حضرت دعثور بن حارث بڑے ڈرامائی طریقے سے مشرف بہ اسلام ہو گئے تھے۔ اپنے قبول اسلام کے بعد انہوں نے اپنے قبیلہ میں دین خداوندی اور کیش احمدی کی نشر و اشاعت بڑی کامیابی سے کی تھی اور مختصر سی مدت میں ان کے قبیلہ والوں نے ان کی مثال کی تقلید کی تھی اور مشرف بہ اسلام ہو گئے تھے[۵۴۵] بہرحال ۱۰ھ / ۶۳۲ء میں بنو محارب کا دس آدمیوں پر مشتمل ایک وفد مکہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملا تھا۔ جہاں آپ اپنے آخری حج کے لیے تشریف لے گئے تھے[۵۴۶] یہ نکتہ اہم ہے کہ بنو محارب نہ صرف عہد نبوی میں بلکہ اس کے بعد بھی اسلام پر عامل رہے تھے۔ جبکہ ان کے بعض خون کے عزیز قبیلے ارتداد کا شکار ہو گئے تھے۔ بنو محارب کے ردہ میں شریک ہونے کی کوئی مثال نہیں ملتی ہے۔ ابن سعد اور ابن اثیر نے متعدد محاربی صحابہ کے نام اپنی اپنی تالیفات میں دیئے ہیں۔ ان کے سوانحی خاکوں سے بھی ان کے قبول و حسن اسلام کی تائید مزید ہوتی ہے۔

(س) ہوازن

قریش مکہ اور بنو غطفان کے بعد شاید ہوازن ہی سب سے بڑا قبیلہ تھا اور غالباً جزیرہ نمائے عرب میں سیادت و قیادت کا دعویدار بھی نسبی لحاظ سے وہ بھی قیس عیلان کی شاخ تھا، لیکن ایسی شاخ جو بجائے خود ایک تناور درخت بن گئی تھی اور جس کی اپنی متعدد شاخیں تھیں۔ وہ اوروں کے بہ نسبت بنو سلیم سے زیادہ قریب تھے، کیونکہ دونوں ہی بنو منصور بن عکرمہ بن خصفہ بن قیس عیلان کی نسل میں سے تھے[۵۴۷] بعثت نبوی تک ان کی شاخیں قبیلے بن چکی تھیں۔ اور ان شاخوں کی بھی مزید شاخیں پھوٹی تھیں۔ اسی لئے وہ اپنی عددی طاقت پر نازاں تھے۔ غزوہ حنین کے موقع پر ان کے جنگجوؤں کی طاقت دس ہزار نفوس پر مشتمل تھی جو میدان جنگ میں اترے تھے۔ جبکہ ان کے متعدد گھرانے اور خاندان جنگ سے الگ اپنے علاقوں میں محدود رہے تھے[۵۴۸] عامر بن صعصعہ ہوازن کا ایک اہم ترین گھرانا تھا جس کی متعدد شاخیں تھیں۔ جیسے بنو ہلال، بنو کلاب، بنو ربیعہ، بنو بکاء اور قرطاء اور عرینہ وغیرہ بھی انہی کے ساتھ وابستہ تھے۔ ہوازن کے دوسرے اہم خاندان تھے بنو نصر، بنو جشم، بنو سعد بن بکر، بنو ثمالہ جبکہ ثقیف بجائے خود ایک ممتاز اور علیحدہ قبیلہ بن گئے تھے، جو دوسروں سے نسبتاً فاصلے پر قلعوں میں رہتے تھے[۵۴۹] اپنی عددی طاقت پر ان کا ناز کچھ بیجا نہیں تھا۔ اس کے سبب وہ جزیرہ نمائے عرب کے طاقتور ترین قبیلوں میں شمار ہوتے تھے۔ اور اسی طاقت کے زعم میں انہوں نے اسلامی ریاست سے ٹکر مول لی تھی خاص طور پر اس وقت جبکہ دوسرے تمام جابرہ عرب مثلاً قریش اور غطفان کا کس بل نکل گیا تھا۔ ان کی عسکری اور تنظیمی طاقت کا ایک ایک سرچشمہ ان کی عظیم قائدانہ صلاحیتیں تھیں اور ان کے سرداروں نے ان کے اعتماد اور اتفاق میں مزید اضافہ کیا تھا۔ ان کے قائدین اور زعماء تجربہ کار منتظم، ماہرین عسکری امور اور عمدہ قائد تھے[۵۵۰] ان میں دُرید بن الصمہ سب سے بڑا اور تجربہ کار سردار تھا

جو ابن اسحاق اور واقدی کے بقول ایک سو ساٹھ سال کی عمر عظیم کو پہنچ جانے کے باوجود اپنی ذہنی اور فکری صلاحیتوں سے اسی طرح بہرہ ور تھا، اگرچہ اس کے قویٰ مضمحل ہو چکے تھے ۵۱ لیکن بعثت نبوی بلکہ ہجرت نبوی کے بعد سب سے زیادہ فعال اور با اثر سردار نسبتاً ایک جوان شخص تھا جو قبیلہ بنو نصر کا سردار تھا ۵۲ چونکہ عوف بن مالک نصری نے ہوازن کے مختلف بطون اور خاندانوں میں سماجی اور فوجی ہم آہنگی اور اتحاد پیدا کر دیا تھا جس کا بے مثال مظاہرہ میدان حنین میں ہوا تھا اس لئے اس کو قبیلہ والوں کی ہر دلعزیزی کے علاوہ ہوازن کے قومی ہیرو کا مقام مل گیا تھا ۵۳ اور اسی غیر متزلزل قبائلی وفاداری کا نتیجہ تھا کہ غزوہ احزاب کے بعد جس میں متعدد قبیلوں کا اتحاد شامل تھا سب سے بڑے لشکر کا سامنا اسلامی ریاست کے لشکر کو کرنا پڑا تھا۔ بہر حال ثقیف کے دو بڑے خاندان تھے: الاحلاف اور بنو مالک۔ اوّل الذکر بھی چھوٹے چھوٹے گروہوں کا مجموعہ تھا جبکہ یہی حال بنو مالک کا بھی تھا۔ احلاف ثقیف کے سردار تھے حضرت قریب بن اسود، اور بنو مالک کے سردار تھے شبیع بن حارث اور ان کے بھائی احمد۔ یہ دونوں بلکہ تینوں سردار بعثت نبوی کے بعد کے زمانے میں ابھرے تھے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معاصر تھے۔

اسلام اور ہوازن کے تعلقات کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ جنگ حنین تک رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اس قبیلہ کے درمیان کوئی تعلق نہیں قائم ہو سکا تھا ۵۴ جہاں تک سیاسی تعلقات اور فوجی دفاعی معاہدوں کا تعلق ہے یہ خیال صحیح بھی ہو سکتا ہے لیکن اسلام سے ان کے تعلقات کے بارے میں یہ قطعی طور پر نہیں کہا جا سکتا ہے۔ مشہور واقعہ ہے کہ مکی عہد کے آخری ربع میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہوازن کے قبیلہ ثقیف کو اسلام کی دعوت دی تھی اور انہوں نے اسے بھی مسترد کر دیا تھا۔ لیکن بعد کے زمانے میں یہ صورتحال برقرار نہیں رہی تھی۔ انفرادی طور سے متعدد گھرانوں کے کافی افراد نے اسلام قبول کر لیا تھا اور وہ اسلامی ریاست کے نظم ونسق میں شریک بھی تھے۔ ذیل کے انفرادی قبائلی تجزیے سے یہ بات زیادہ واضح اور مدلل ہو گی۔

(۱) بنو عامر بن صعصعہ

ہوازن کا یہ معتبر قبیلہ اسلام سے کافی پہلے متعارف ہوا تھا۔ اس کے ذیلی گھرانوں کے متعدد افراد ابتدائی مسلمانوں میں شامل تھے، خاص کر وہ حضرات وخواتین جن کا تعلق کسی نہ کسی لحاظ سے مکہ سے تھا۔ مثال کے طور پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دو زوجات محترمات حضرت زینب بنت خزیمہ اور حضرت میمونہ بنت حارث ابتدائی مسلمان تھیں اور ان کا نسبی تعلق بنو عامر بن صعصعہ کے خاندان بنو ہلال سے تھا ۵۵ ان کے علاوہ دو اور خواتین بھی کافی پہلے زمانے کی مسلمان تھیں۔ ان کے اسمائے گرامی ہیں: حضرت لبابہ صغریٰ جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس بن عبدالمطلب کی اہلیہ محترمہ اور ان کے فرزند حضرت عبداللہ بن عباس کی والدہ ماجدہ تھیں اور حضرت لبابہ کبریٰ جو حضرت خالد بن ولید مخزومی کی والدہ تھیں۔ یہ دونوں فتح مکہ کے پہلے زمانے کی مسلمان تھیں ۵۶

ان خواتین کے علاوہ بنو ہلال / عامر بن صعصعہ کے خاندان کے تین مسلمان حضرات قبیصہ بن مخیرق، نزال بن ساریہ اور حمید بن ثور الارقط کا ذکر ابن حزم نے کیا ہے[554] بنو عامر کے ایک گمنام اور غیر معروف قبیلہ / خاندان بنو سواءہ کے دو مسلمانوں حضرات ابو جحیفہ اور جابر بن سمرہ کا ذکر ملتا ہے[555] اول الذکر اگرچہ گمنام ہیں۔ لیکن مؤخر الذکر مشہور صحابی ہونے کے علاوہ احادیث نبوی کے مشہور راوی ہیں۔ اسی طرح ایک اور غیر معروف اور چھوٹے گھرانے بنو نمیر کے دو مسلمانوں حضرات قیس بن عاصم اور قرۃ بن دعمس کا ذکر ملتا ہے۔ اول الذکر اپنے گھرانے کے وفد کے ساتھ بارگاہ نبوی میں حاضر ہوئے تھے۔ جبکہ مؤخر الذکر غیر معروف صحابی ہیں۔ بنو البکار کے گھرانے میں کم از کم چار خاصے اہم مسلمانوں کے نام ملتے ہیں۔ حضرت معاویہ بن ثور اور ان کے فرزند بشر جو اپنے وفد کے ساتھ مدینہ حاضر ہوئے تھے، فُجیع بن عبداللہ جنہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک کتاب (نامہ مبارک) پایا تھا اور ماعز بن بجالہ۔ اتنے ہی مسلمانوں کا ذکر ایک اور ذیلی گھرانے بنو الضحیا سے بھی ملتا ہے۔ اس کے سوانحی خاکوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سب بعد کے زمانے کے مسلمان نہیں تھے[559]

بنو کلاب کے کم از کم سات ابتدائی مسلمانوں کا ذکر ماخذ میں مل چکا ہے۔ ان کا تعلق اس خاندان کے مختلف ذیلی گھرانوں سے تھا۔ ان میں سے تین کا تعلق بنو کلاب بن ربیعہ سے تھا۔ جن میں سے حضرت ضحاک بن سفیان کلابی عظیم ترین اور مشہور ترین صحابہ میں شمار ہوتے ہیں اور بلا ریب عامر بن صعصعہ کے رجال عظیم میں سے ایک تھے[560]۔ ان کے بارے میں ماخذ کا اتفاق ہے کہ انہوں نے اپنے قبول اسلام کے بعد اپنے گھرانے اور قبیلے میں اسلام کی اشاعت کی کوششیں کی تھیں اور مختصر سی مدت میں پورے قبیلہ کو مسلمان بنا لیا تھا[561] ۹ھ / ۶۳۰ء میں جب مختلف قبائل عرب کے لئے عاملین صدقات مقرر کئے گئے تھے تو حضرت ضحاک بن سفیان کو ان کے قبیلے بنو کلاب کا افسر صدقات مقرر کیا گیا تھا۔ اور انہوں نے ایک روایت کے مطابق جو کافی اہم ہے۔ فتح مکہ سے قبل ہی صدقات جمع کر کے مدینہ کو ادا کئے تھے[562] انہوں نے اسلامی لشکروں میں سے بعض کی قیادت بھی کی تھی[563] بنو کلاب کی مزید ذیلی شاخوں میں سے تین اور مسلمانوں کا ذکر ملتا ہے۔ ان میں سے حضرت عمرو بن بجیر کا تعلق بنو رئاب بن کلاب سے تھا۔ جبکہ مولیٰ اور قدامہ بن عبداللہ کا بنو انضباب بن کلاب سے[564]

بنو ہلال اور بنو کلاب کی مختلف شاخوں کی طرح سے بنو ربیعہ کی بھی شاخیں در شاخیں تھیں اور ہر شاخ میں کچھ نہ کچھ مسلمانوں کا ذکر ملتا ہے۔ بنو کعب بن ربیعہ کے گھرانے میں دو مسلمانوں کا ذکر ملتا ہے حضرات مُطرّف بن عبداللہ اور ان کے والد ماجد عبداللہ بن الشخیر اور بنو جعدہ بن کعب بن ربیعہ کے ایک مسلم کا ذکر کیا گیا ہے۔ بنو قشیر بن کعب بن ربیعہ کے گھرانے کے دو اہم مسلمانوں کا ذکر ملتا ہے۔ ان میں سے ایک حضرت قرۃ بن ہُبیرہ خاصے اہم شخص معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہ اپنے قبیلہ کے عامل صدقات مقرر ہوئے تھے۔ ربیعہ کے آخری اہم گھرانے بنو عقیل بن کعب میں کم از کم تین مسلمانوں کے نام بصراحت مذکور ہیں[565] مذکورہ بالا نسبتاً کافی مفصل بحث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بنو عامر بن ربیعہ کا قبیلہ بحیثیت مجموعی اسلام کا حلقہ بگوش بن چکا تھا اس خیال کی مزید تصدیق اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ ان کے متعدد گھرانے اسلامی ریاست کو صدقات و محاصل ادا کرتے تھے[566] لہٰذا یہ کہنا کسی طرح سے صحیح نہیں ہو گا کہ بنو عامر بن صعصعہ آخری عہد نبوی تک مسلمان نہیں ہوئے تھے اور جو

ہوئے بھی تھے۔ ان کی تعداد بہت مختصر تھی [565] یہ تبصرہ روشن حقیقت اور تاریخی حقائق سے دیدہ و دانستہ صرف نظر کرنے کے مترادف ہے۔

بنو عامر بن صعصعہ کے مکمل قبول اسلام کا مزید ثبوت اس کے مختلف خاندانوں / گھرانوں کے مدینہ منورہ آنے والے وفود سے بھی ہوتا ہے۔ ابن سعد نے بنو عامر اور اس کے ذیلی گھرانوں کے کم و بیش آٹھ وفدوں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں چھ وفود بنو کلاب اور اس کے گھرانوں بنو رواس بن کلاب، بنو عقیل بن کعب، بنو جعدہ بن کعب، بنو قشیر بن کعب اور بنو البکاء سے آئے تھے اور انہوں نے ۹ھ / ۶۳۱ء کے برس مختلف زمانوں میں حاضری دی تھی [566] اگرچہ ابن سعد نے بنو عامر بن صعصعہ اور اس کے گھرانے بنو ہلال کے وفود کی آمد کی تاریخ کا ذکر نہیں کیا ہے تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ۱۰ھ / ۶۳۱-۳۲ء میں کسی وقت بارگاہ نبوی میں حاضری دی تھی۔ کیونکہ طبری نے اوّل الذکر کے وفد کی آمد کو ۱۰ھ کے برس کے واقعات میں شمار کیا ہے [567] طبری ہی کے ایک اور بیان سے واضح ہوتا ہے کہ بنو عامر بن صعصعہ کا تقریباً پورا قبیلہ عہد نبوی میں مسلمان ہو گیا تھا [568] ممکن ہے کہ چند مستثنیات ہوں، لیکن یہ امکان خاصا مدہم ہے۔ اس بحث کے آخر میں ہوازن کے ایک اور خاندان عُرینہ کے ایک اہم مسلمان صحابی حضرت عبداللہ بن عَوْسَجہ عرنی کا ذکر کر دیا جائے جو فتح مکہ کے قریب اسلام لا چکے تھے اور جن کو ۹ھ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو حارثہ بن عمرو بن قریط میں تبلیغ اسلام کے لئے بھیجا تھا۔ اس خاندان کے ایک اور مسلمان حضرت رباح المشمعلی کے سوا اور اس کے بارے میں ہم کچھ نہیں جان سکے ہیں [569]

ہوازن کی دوسری اہم اور غیر اہم شاخوں میں بھی متعدد مسلمان ایسے تھے جو غزوہ حنین میں نبرد آزمائی سے قبل اسلام لا چکے تھے [570] واقدی نے حضرت شجاع بن وہب کے سریہ سی در ربیع الاوّل ۸ھ / جولائی ۶۲۹ء کے اپنے بیان میں ہوازن کے مسلمانوں کے ایک وفد کا حوالہ دیا ہے جو غالباً سب کے سب مسلمان تھے [571] اس حوالہ کی اہمیت اس پس منظر میں بڑھ جاتی ہے یہ غالباً اسلامی ریاست سے ان کی وفاداری کا ایک اہم اظہار تھا۔ ہوازن کے ایک ابتدائی مسلمان حضرت اوس بن حدثان تھے جنہوں نے صلح حدیبیہ سے پہلے اسلام قبول کر لیا تھا [572] اسی طرح ہوازن کے ایک ذیلی گھرانے بنو ثمالہ کے ایک فرد حضرت عمرو ثمالی ابتدائی دور کے مسلم تھے [573] یہ حقیقت ہے کہ بطور ایک قبیلہ ہوازن اسلام کے دائرے سے کافی مدت تک باہر رہے تھے اور صرف غزوہ حنین کے بعد ہی اجتماعی طور سے مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔

مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ غزوہ حنین کے موقعہ پر جو ہوازن کا اتحاد عظیم مسلمانوں کے خلاف قائم ہوا تھا۔ اس میں متعدد خاندان شامل نہیں ہوئے تھے۔ اور وہ اسلامی ریاست سے تصادم مول لینے کے حق میں نہیں تھے صرف چار بڑے خاندان مکمل طور سے شامل تھے اور یہ تھے بنو نصر، بنو جشم، بنو سعد بن بکر اور بنو ثقیف اور کچھ لوگ اور گروہ بنو ہلال / عامر بن صعصعہ کے بھی شامل ہو گئے تھے [574] اس اتحاد عظیم میں شامل نہ ہونے والوں میں کعب اور کلاب کے اہم گھرانے تھے اور جنکی غیر موجودگی کو ہوازن کے دور بین اور تجربہ کار قائدین نے میدان جنگ میں محسوس کیا تھا [575] بہرحال شکست کے بعد یہ پورا عظیم گروہ اسلام کا حلقہ بگوش بن گیا تھا۔ ماخذ کا صریح بیان ہے کہ قبیلہ بنو سعد بن بکر (رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاعی ماں حلیمہ سعدیہ کا گھرانا)

قبول اسلام میں پیش پیش تھا۔ ان کا ایک وفد جو قبیلہ کے تمام مسلمانوں پر مشتمل تھا[۵۷۸] ہوازن کے چھ ہزار قیدیوں کی رہائی کیلئے گفتگو کرنے کی غرض سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں جعرانہ میں حاضر ہوا تھا۔ ان کی دردمند درخواستوں سے تمام قیدیوں کی رہائی حاصل کر لی تھی۔ چنانچہ رحمتِ نبوی کے اس عظیم الشان مظاہرے کا فطری تقاضا اور اثر تھا کہ بنو سعد بن بکر اسلام کے دائرے سے باہر نہیں رہ سکتے تھے۔ اس کے مابعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہوازن کے قومی ہیرو اور سردار اعظم حضرت مالک بن عوف نصری کو اسلامی دعوت کے ساتھ بڑی فیاضانہ اور معقول شرطیں پیش کی تھیں۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ حضرت مالک بن عوف نہ صرف خود مسلمان ہوئے بلکہ ان کے زیر اثر تمام قبیلے خاص کر ثمالہ، سلمہ اور فہم بھی اسی آن اسلام کے حلقہ بگوش بن گئے اور وہ ان قبیلوں کے مسلمانوں کے سردار مقرر کر دیئے گئے[۵۷۹] کچھ مدت کے بعد ہوازن کا پورا قبیلہ اسلامی امت کا رکن رکین بن چکا تھا۔

سنہ ۹ھ کے اواخر اور سنہ ۱۰ھ کے وسط تک ہوازن کے مختلف خاندانوں کے مکمل قبول اسلام کی کچھ دوسری شہادتوں سے بھی تائید ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے بہترین مثال بنو سعد بن بکر کے ایک نفری وفد کی ہے۔ ابن اسحاق کے مطابق حضرت ضمام بن ثعلبہ بارگاہ نبوی میں مدینہ حاضر ہوئے اور اسلام کے بارے میں چند سوالات پوچھے۔ آپ کے جوابات سے اتنے مطمئن ہوئے کہ فوراً اپنے اسلام کا اعلان کر دیا۔ اپنے لوگوں میں واپس پہنچے اور اس زور و شور سے تبلیغ کی کہ "رات ختم ہونے سے قبل قبیلہ میں کوئی ایسا مرد یا عورت نہ تھی جو مسلمان نہ ہو گئی ہو"[۵۸۰] بنو عامر بن صعصعہ کے مختلف وفود کے علاوہ ابن سعد نے ثمالہ اور حدان کے ایک مشترکہ وفد کا بھی ذکر کیا ہے جس نے فتح مکہ کے بعد بارگاہ نبوی میں حاضر ہو کر اسلام سے وفاداری کا اقرار و اظہار کیا تھا[۵۸۱] یہ نکتہ قابل ذکر اور قابل غور ہے کہ اس وفد کی شہادت کی بنا پر ہوازن کے ایک طبقہ کے غزوہ حنین سے قبل قبول اسلام کا ثبوت ملتا ہے۔

ہوازن کے مکمل طور پر قبول اسلام کا ایک اور پکا ثبوت ہے ان کا مدینہ منورہ کی مرکزی حکومت کو پابندی اور خلوص کے ساتھ صدقات و محاصل ادا کرنا۔ ذکر آچکا ہے کہ بنو عامر بن صعصعہ کے مختلف خاندانوں کے لئے عاملین صدقات مقرر کئے گئے تھے۔ اس طرح ہوازن سے بھی صدقات کی وصولیابی کے لئے متعدد افسروں کو بھیجا گیا تھا۔ بلاذری کے بقول حضرت مالک بن عوف نصری کو عجز ہوازن یعنی ترقیمہ قبیلہ ...... بنو جشم، بنو نصر، اور بنو سعد بن بکر ...... کا افسر محاصل مقرر کیا گیا تھا[۵۸۲] جبکہ دوسرے ماخذ کا بیان ہے کہ حضرت عکرمہ بن ابی جہل مخزومی کو پورے ہوازن کا مرکزی عامل صدقات مقرر کیا گیا تھا یہ تقرری سنہ ۹ھ کے آغاز اور سنہ ۱۰ھ کے وسط میں ہوئی تھی[۵۸۳] بلاذری اور ابن اثیر کا یہ بیان خاصا اہم ہے۔ وہ ہوازن کے مجموعی طور سے اسلام کے دائرے میں داخلہ کو پوری طرح سے ثابت کرتا ہے۔

(ط) ثقیف

ہوازن کے عظیم گھرانے کا آخری رکن ثقیف تھا جو اپنی سماجی اور سیاسی برتری کے سبب قدر کی نگاہ سے دیکھا

عرب میں دیکھا جاتا تھا اور قریش مکہ سے ان کے بہت قریبی سماجی، ازدواجی اور اقتصادی تعلقات تھے۔ اسلام سے تعارف تو اس قبیلہ کا مکی عہد ہی میں ہوگیا مگر قبول اسلام کا سلسلہ ان کے بطور اجتماعی اکائی کے انکار کے باوجود شروع ہوگیا تھا اور انفرادی طور سے اس کے افراد نے اسلام قبول کرنا شروع کر دیا تھا۔ ابن حزم کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ۹ھ نبوی میں ثقیف کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیرحمانہ برتاؤ کے باوجود آپ ان سے قطعی مایوس نہیں ہوئے تھے، اور اس کے کچھ دنوں بعد ہی آپ نے حضرت معتب بن مالک ثقفی کو ان میں تبلیغ اسلام کے لئے بھیجا تھا۔ حضرت معتب نے ارشاد نبوی کے تعمیل اور تبلیغ اسلام کی راہ میں اپنی جان قربان کر دی اور اپنے ہی لوگوں کے ہاتھوں شہید ہوئے ۵۸۴ خون شہید کی سرخی رنگ لائی اور ثقیف کے ایک فرد حضرت ابو الملیح نے قبیلہ کے قبول اسلام سے کافی پہلے اسلام قبول کر لیا ۵۸۵ ممکن ہے کہ ان کی شہادت سے متاثر ہو کر اور لوگوں نے بھی اسلام قبول کر لیا ہو۔ مگر تاریخی ماخذ ان کے نام محفوظ رکھنے سے قاصر رہے ہیں۔ ثقیف کے ایک اور ابتدائی مسلمان حضرت معتب شہید کے اپنے بھتیجے حضرت مغیرہ بن شعبہ تھے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اجل اصحاب میں شمار ہوتے ہیں۔ انہوں نے صلح حدیبیہ سے قبل کسی وقت اسلام قبول کر لیا تھا، غالباً جنگ احزاب کے فوراً بعد ۵۸۶ قارب بن الاسود جو حضرت عروہ بن مسعود کے ایک بھتیجے تھے ایک اور ابتدائی مسلمان تھے جنہوں نے حضرت ابو الملیح کے ساتھ اسلام قبول کیا تھا۔ لیکن ثقیف کے سب سے پہلے مسلمان غالباً حضرت عامر بن غیطان اور ان کے والد ماجد تھے اور دونوں مدینہ منورہ ہجرت کر کے چلے گئے تھے۔ یہ بھی اہم بات ہے کہ یہ دونوں مسلمان باپ بیٹے ثقیف کے ابتدائی مسلمان اور مبلغ حضرت معتب شہید کے فرزند ارجمند اور پوتے تھے۔ بعد کے زمانے کے دوسرے مسلمانوں میں حضرات عروہ بن مسعود، عمرو بن امیہ، ان کے عم زاد حکم بن عمرو، ابو عبید بن مسعود اور ان کے بھائی سعد اور آخری حضرت ابو محجن ثقفی تھے جو اپنے وقت کے ایک صف اول کے ثقفی شاعر تھے ۵۸۷ ابن سعد اور طبری کے بیانات کے مطابق غالباً رمضان ۹ھ / دسمبر ۶۳۰ء میں ثقیف کے ایک وفد نے جو دس اشخاص سے کچھ زیادہ پر مشتمل تھا۔ مدینہ پہنچ کر اسلام قبول کر لیا تھا ۵۸۸ اس کے فوراً بعد پورا قبیلہ ثقیف مسلمان ہوگیا تھا ۵۸۹

ان کے اسلام قبول کرنے کی مزید شہادت ثقیف کے لئے مختلف افسران و عمال صدقات کی تقرری سے فراہم ہوتی ہے۔ بلاذری کا بیان ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ثالف بن عثمان بن معتب ثقفی کو طائف اور الاحلاف کے صدقات وصول کرنے کے لئے متعین فرمایا تھا۔ ان تاریخی شہادتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ عہد نبوی میں ثقیف مکمل طور سے اسلامی امت کے رکن، ریاست اسلامی کے شہری اور محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے جان نثار بن چکے تھے۔ یہ بھی قابل ذکر و فخر بات ہے کہ ہوازن اور ثقیف دونوں وفات نبوی کے بعد ردہ کے پر آشوب زمانے میں بھی اسلام کے وفادار رہے تھے اور کسی نے بھی مرکز کے خلاف قبائل عرب کی بغاوت میں حصہ نہیں لیا تھا ۵۹۰

قیس عیلان کے اہم خاندانوں / بطون میں اشاعت و نشر اسلام پر کافی مفصل بحث کے خاتمے پر ایک دو لفظ ان کے ایک خاندان بنو غنی کے بارے میں بھی کہنا ضروری معلوم ہوتے ہیں۔ اگرچہ ان کے قبول اسلام کے سلسلے میں بحث قریشی قبائل کے

ضمن میں آچکی ہے۔ تاہم یہاں بھی اس کا ایک حوالہ ضروری ہو جاتا ہے۔ حضرت ابو مرثد کنازؓ غنوی اور ان کے بنین، چار فرزندوں حضرات مرثد، انس و انیس وغیرہ جو حضرت حمزہ بن عبد المطلب ہاشمی کے حلیف اور دوست تھے۔ مکی عہد کے ابتدائی دور کے مسلمان تھے۔ امکان قوی یہی ہے کہ اس گھرانے کے اور بھی مسلمان تھے جن کا ذکر ہمارے مآخذ میں نہیں آسکا ہے خاص کر ان کے دوسرے مردوں، عورتوں اور بچوں کے نام نہیں مذکور ہوئے ہیں۔ بعد میں حضرت مرداس بن خویلد ایک وفد میں بارگاہ نبوی میں مدینہ پہنچے تھے[۵۹۱] یہ ناقابل یقین نہیں ہے کہ دوسروں نے بھی اسی زمانے میں اسلام قبول کیا تھا۔

اس پوری بحث سے بلاشک وشبہ یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ہوازن کے مختلف قبیلے، خاندان اور گھرانے سب کے سب عہد نبوی میں مخلص، ثابت قدم اور کھرے مسلمان بن چکے تھے۔ اتنے ثابت قدم کہ ارتداد کے سیلاب میں جب اوروں کے پیر اکھڑ گئے تھے تو وہ اسلام کا پرچم بلند کیے ہوئے تھے۔

(ع) باہلہ

بنو باہلہ کا بھی تعلق مضر کے عظیم خاندان قیس عیلان سے تھا اور وہ بنو غنی سے زیادہ قریبی تعلقات رکھتے تھے[۵۹۲] اس کے مسلمانوں میں اہل سیر اور نسب نے جن لوگوں کو گنایا ہے ان میں حضرات اسمع اور ان کے والد ماجد مزہر[۵۹۳] ابو امامہ بن الصداع بن عجلان اور حراس بن زیاد شامل ہیں[۵۹۴] یہ سب غالباً بعد کے زمانے کے مسلمان تھے۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ بنو باہلہ کے دو گروہ حضرت مطرف بن کاہن باہلی اور نہشل بن مالک باہلی کی قیادت میں فتح مکہ کے بعد کسی وقت اپنے وفود میں آئے تھے تاکہ اپنے اسلام کا اظہار و اعلان اور ریاستِ اسلامی سے اپنی وفاداری کا اقرار کریں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک نامۂ مبارک بتاتا ہے کہ بنو باہلہ عہد نبوی میں مسلمان ہو گئے تھے اور انہوں نے اپنے قبائلی عامل صدقات کے ذریعہ جس کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے مقرر فرمایا تھا۔ مرکزی حکومت کو اپنے تمام صدقات ادا کیے تھے[۵۹۵]

(ف) بنو ہذیل

بنو ہذیل بھی مکہ مکرمہ کے مشرق میں آباد بدوی قبائل میں سے ایک تھے[۵۹۶] وہ قریش کے پڑوسی ہونے کے سبب ان کے ساتھ گہرے سماجی اور سیاسی تعلقات رکھتے تھے اور انہی اسباب کی بنا پر وہ اسلام سے مکی عہد قدیم ہی میں متعارف ہو گئے تھے۔ بنو ہذیل کے سب سے قدیم اور عظیم اور مشہور صحابی حضرت عبد اللہ بن مسعود ہذلی تھے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دار ارقم میں قیام سے قبل ۱۴-۱۳ ق ھ/۶۱۳ء میں کسی وقت مسلمان ہوئے تھے[۵۹۷] یہ یقینی امر اور تاریخی حقیقت ہے کہ ان کا پورا گھرانا مسلمان ہو گیا تھا۔ چنانچہ ان کے دو بھائیوں حضرت عتبہ و عمیس، والدہ ماجدہ ام عبد اور ان کے ایک بھتیجے عمرو بن عمیس کو ابن حزم نے ابتدائی مکی مسلمانوں میں شمار کیا ہے۔ غالباً ان کے دو اور بھتیجے حضرات عبد اللہ اور عون، فرزندان عتبہ بھی ابتدائی زمانے کے مسلمان تھے۔ ان سب کا تعلق ہذیل کے خاندان بنو معاویہ سے تھا[۵۹۸] یہ حیرت کی بات ہے

کہ اہل سیر نے خود حضرت عبداللہ بن مسعود کے اہل و عیال کے قبول اسلام کے بارے میں کچھ نہیں کہا ہے حالانکہ تقریباً یہ یقینی ہے کہ ان کی آل و اولاد بھی ابتدائی دور کی مسلمان تھی۔ یہ حقیقت بھی یہاں بیان کرنا ضروری معلوم ہوتی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود کا گھرانا مکہ میں قریش کے ایک خاندان کے حلیف کی حیثیت سے مقیم تھا اور بظاہر ان کا اپنے اصل قبیلہ سے تعلق قائم و استوار نہیں تھا۔ اس لئے ان کے قبول اسلام کا زیادہ اثر ان کے قبیلہ والوں پر شائد نہیں پڑا تھا۔

بہرحال مکہ اور قریش مکہ سے قربت کے سبب ان کے اسلام سے متعارف ہونے کے امکانات تھے اور قیاس کہتا ہے کہ مکی عہد میں بھی کچھ مسلمان بنو ہذیل کے اصل قبیلے اور ان کے بطون میں ہوئے ہوں گے۔ چنانچہ بنو ہذیل کے ایک ذیلی گھرانے بنو طابخہ کے ایک ابتدائی مسلمان حضرت اسامہ بن عمیر کے ذکر سے اس کی تصدیق ہوتی ہے[۵۹۹] مزید واقدی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ابو ملیح ہذلی کے والد ماجد ملیح حدیبیہ کے موقعہ پر موجود اور شریک جہاد تھے[۶۰۰]۔ ان تمام ابتدائی شہادتوں کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ پر ہے کہ بنو ہذیل کے ایک بڑے طبقے نے خاص کر خالد بن سفیان ہذلی کے زیر اثر گروہ نے اسلامی ریاست کی مخالفت جاری رکھی تھی۔ اور وہ فتح مکہ کے بعد اسلامی امت کے دائرے میں شامل ہوئے تھے[۶۰۱]، کیونکہ ہم ان کو طائف کے محاصرہ کے دوران اسلامی لشکر میں موجود پاتے ہیں۔ امکان اور غالب امکان یہ ہے کہ وہ فتح مکہ سے قبل مسلمان ہو گئے تھے۔ اور غزوات فتح مکہ، حنین اور طائف میں ہمرکاب نبی محترم صلی اللہ علیہ وسلم تھے[۶۰۲]

(ک) بنو طے

نسبی اعتبار سے بنو طے کا تعلق بنو کہلان بن سبا سے تھا[۶۰۳] اور وہ اسد/خزیمہ کے پڑوس میں اجاء اور صلمیٰ کے پہاڑوں کے نواحی علاقوں میں آباد تھے، جو مدینہ سے خاصی بڑی مسافت پر واقع تھے[۶۰۴]۔ واقدی کے ایک جملہ سے معلوم ہوتا ہے۔ بنو طے کے تمام بطون اور خاندان ایک دوسرے کے قریب قریب آباد تھے[۶۰۵] لیکن اس مسافت اور دوری کے باوجود بنو طے نے حرمین شریفین کے لوگوں سے سماجی، سیاسی اور اقتصادی روابط استوار کر رکھے تھے۔ اور ان کے کچھ لوگ مکہ مدینہ میں آباد بھی ہو گئے تھے۔ مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ بنو طے کے دو شخصوں نے جو قریشی قبیلہ بنو مخزوم کے حلیف تھے مکی فوج میں شریک ہو کر مسلمانوں کے خلاف غزوہ بدر میں شریک ہونا بھی پسند کیا تھا[۶۰۶] جبکہ حضرت سوید بن مخشی طائی نے جو مکی طائیوں میں مسلمان اور بنو عبد شمس/بنو امیہ کے حلیف تھے۔ مسلمانوں کی جانب سے شرکت کر کے بدری صحابی ہونے کا شرف و انعام پایا تھا[۶۰۷]

بنو طے کے لوگوں نے قریش مکہ اور انصار مدینہ سے ازدواجی تعلقات بھی استوار کر رکھے تھے۔ حضرت طلیب بن عمیر بنو عبد بن قصی/قریش کی اہلیہ ایک طائی عورت تھی جو غالباً حضرت ولید بن زہیر طائی کی صاحبزادی تھیں۔ مؤخر الذکر طائی صحابی نے محرم ۴ھ/جون ۶۲۵ء میں قطن کے سریہ میں حضرت ابو سلمیٰ مخزومی امیر سریہ کی رہنمائی کے فرائض انجام دیئے تھے[۶۰۸] اسی طرح کعب بن اشرف، مشہور یہودی شاعر، کا باپ قبیلہ طے کا تھا[۶۰۹]۔ جبکہ حضرت عبداللہ بن ربیع کی اہلیہ طائی تھیں، اور

ایک ابتدائی مسلمان بھی ؓ"[۱۱]

ان اور ان جیسی دوسری متعدد مثالوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بنو طے کے مختلف افراد کا اسلام سے تعارف کی عہد قدیم سے ہو چکا تھا۔ اصل قبیلہ کے ایک ابتدائی مسلمان تھے۔ حضرت رافع بن ابی رافع طائی جنہوں نے بعد میں حضرت عمرو بن عاص کے زیر کمان سریہ ذات السلاسل میں حصہ لیا تھا"[۱۱] یہ بات اہم ہے کہ ۹ھ / ۶۳۰ء میں حضرت علی بن ابی طالب ہاشمی کی قیادت میں بنو طے کے قومی بت کو توڑنے کے لئے جو مہم انگلس کی گئی تھی۔ وہ ان کے خلاف واحد فوجی کارروائی تھی"[۱۲] اس کے بعد ہی ان میں اسلام سرعت سے پھیلنے لگا تھا۔ اور ان کے کچھ مدت بعد ان کے قومی سردار حضرت عدی بن حاتم طائی کے قبول اسلام نے پورے قبیلے طے کو اسلامی امت کا مخلص و سرگرم و پائیدار رکن بنا دیا تھا"[۱۳] ان میں سے معدودے چند لوگ اپنے پرانے مذہب عیسائیت پر بھی قائم رہے تھے۔ اور ان کو جزیہ کی ادائیگی کے بعد اسلامی ریاست کی جانب سے جان و مال کے مکمل تحفظ کی ضمانت دی گئی تھی۔ ابن حزم نے بنو طے کے ہر گھرانے کے سربرآوردہ مسلمانوں کے نام بیان کئے ہیں"[۱۴] ۹ھ / ۶۳۰ء میں کسی وقت قبیلہ طے کا ایک وفد بھی مدینہ پہنچا تھا۔ جس میں پندرہ افراد شامل تھے۔ اس وفد کے سردار و قائد حضرت زید بن مہلہل تھے جو اپنے باقی غیر مسلم طائیوں کو اسلام کے دائرے میں لانے کے سبب زید الخیر کے نام سے زیادہ معروف ہیں"[۱۵] ان کے علاوہ مجموعۃ الوثائق میں محفوظ متعدد نامہ ہائے نبوی سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ بنو معاویہ، بنو جوین، بنو معن، بنو اجاء کے علاوہ متعدد دوسرے گھرانے بھی ۱۰ھ کے خاتمے سے قبل مسلمان ہو کر اسلامی امت کا جزو بن چکے تھے"[۱۶]

بنو طے کے مکمل قبول اسلام کا ایک اور یقینی ثبوت ہے ان کے مختلف گھرانوں اور خاندانوں کے لئے صدقات کے افسروں کی تقرری۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عدی بن حاتم طائی کو پورے قبیلہ طے کا افسر اعلیٰ اور مصدق اعلیٰ مقرر فرمایا تھا اور وہی تمام قبیلوں اور گھرانوں سے صدقات وصول کر کے مدینہ پہونچاتے تھے"[۱۷] یہ حضرت عدی بن حاتم طائی کی سوجھ بوجھ، لیاقت اور معاملہ فہمی اور صلابت ایمانی تھی جس نے بنو طے کے بعض مذبذب و شک و شبہ میں مبتلا طبقوں کو ردہ میں شریک ہونے سے نہ صرف روک دیا تھا۔ بلکہ حضرت خالد بن ولید مخزومی کی ماتحت اسلامی فوج کی زبردست فوجی خدمت کی تھی"[۱۸] چنانچہ ان شواہد کی روشنی میں یہ یقینی طور سے کہا جا سکتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے آخری لمحات میں قبیلہ طے پورا مسلمان ہو چکا تھا اور اس کے بعض غیر مسلم افراد بھی ریاست اسلامی کے کلی طور پر وفادار تھے اور یہی نہیں بلکہ وہ ردہ کے پرآشوب و پرفتن زمانے میں بھی وفادار رہے تھے۔"[۱۹]

مذکورہ بالا بحث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حرمین شریفین کے مشرق میں واقع و آباد قبائل عرب میں اسلام کی اشاعت، مکمل، ہمہ گیر اور ہمہ جہت تھی۔ کوئی دیانت دار مورخ یہ نہیں کہہ سکتا کہ اسلام کی تاثیر صرف اوپری سطح تک محدود رہی تھی اور دلوں کی گہرائیوں میں اس کا اثر نہیں قائم ہوا تھا۔ مآخذ کا صاف و صریح بیان ہے اور جس کی تائید و شواہد حقائق سے ہوتی ہے کہ ان مشرقی قبائل نے پورے خلوص، ایمانداری، اور صلابت کے ساتھ اسلام قبول کیا تھا، اور

پھر اسلامی ریاست کے لیے شاندار خدمات انجام دی تھیں۔ ان کے پختہ ایمان اور پکے عمل کا ایک اہم ثبوت ارتداد کے زمانے میں اسلام پر مضبوطی سے ان کا قائم رہنا ہے۔ یہ بڑی اہم تاریخی حقیقت ہے کہ بعض مشرقی قبائل جو نسبتاً بعد کے زمانے میں اسلام لائے تھے، ردہ کے زمانے میں ان بعض قبائل کے مقابلے میں زیادہ پختہ ایمان والے ثابت ہوئے تھے جو نسبتاً کچھ پہلے اسلام لا چکے تھے۔ مشرقی قبائل میں اشاعتِ اسلام کی تاریخی توقیت بڑی مختصر ہے۔ مکی عہد میں ان کے بعض افراد نے اسلام قبول کیا تھا۔ اور مدنی عہد میں جب مسلمانوں کے تعلقات ان سے قائم ہوئے تو ان کے گھرانے اور بطون مسلمان ہونے لگے۔ ان کے قبولِ اسلام میں ان کے اپنے دلوں کی خواہش کے علاوہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کی تبلیغی کوششیں بھی کارفرما رہی تھیں۔ بہرحال مہاجرین و انصار اور مغربی قبائل کے بعد مشرقی قبائل ہی چوتھے اہم عنصر تھے جنہوں نے اسلامی ریاست کے ارتقاء تنظیم اور ترقی میں سب سے زیادہ حصہ لیا تھا۔

(۴) شمالی قبائل

شمالی قبائل عرب یا مدینہ منورہ کے شمال میں خاص کر وادی القریٰ اور شامی سرحد کے درمیان واقع علاقوں کے قبائل سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلقات اور ان کے بارے میں اسلام کی پالیسی اور اسلامی ریاست کا رویہ بعینہٖ وہی تھا جو مغربی قبائل یا مشرقی قبائل سے تھا۔ یا جو پالیسی آپ نے قریشی قبائل کے سلسلے میں اپنائی تھی۔ مآخذ سے بیشمار ثبوت اس بات کے ملتے ہیں کہ آپ کی حکمت عملی کی واحد بنیاد اسلام کی اشاعت تھی اور تمام قبائل کو مسلمان بنانا تھا اور اگر قبائل عرب میں سے کوئی گروہ، جماعت یا فرد اسلام قبول کرنا نہیں پسند کرتا تھا تو اس کو اسلامی ریاست کی بالادستی سیاسی بالادستی ..... قبول کرنا اور اس کا ذمی بن کر رہنا ضروری تھا، اور اس اعتراف بالادستی میں مدینہ کو جزیہ ادا کرنا تھا۔ اس کے معاوضے میں اسلامی ریاست ان کو اللہ اور اس کے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذمہ (ذمہ داری، محافظت، ضمانت) عطا کرتی تھی اور ان کے تمام اندرونی سماجی اور مذہبی معاملات میں ان کو خود مختاری اور آزادی فراہم کرتی تھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پالیسی تمام قبائل عرب سے آپ کے تعلقات، معاہدات اور مہموں سے واضح ہوتی ہے شمالی قبائل میں اسلام کی نشر و اشاعت کی تاریخ، نہج اور رفتار سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شمالی قبائل کے بارے میں پالیسی بھی معلوم ہوتی ہے اور شمالی قبائل کا اسلام اور اسلامی ریاست کے ساتھ رویہ اور سلوک بھی۔ ذیل میں شمالی قبائل کا بھی اسی طرح الگ الگ تجزیہ پیش کیا جا رہا ہے۔ جس طرح کہ دوسرے علاقوں کے قبیلوں کے بارے میں پیش کیا گیا ہے

یہ اب کہنے کی ضرورت نہیں رہ جاتی کہ شمالی قبائل بھی متعدد اور مختلف تھے جو خاصے بڑے وسیع علاقے میں آباد تھے اور ان کے بطون اور خاندانوں کے علاوہ ان کی بھی مزید ذیلی شاخیں تھیں۔ البتہ شمالی قبائل خاص کر شامی سرحدوں پر آباد قبیلوں کے بارے میں یہ جان لینا مفید ہوگا کہ وہ رومی سلطنت یا بازنطینی حکومت کے زیر اثر تھے

اوران کے بعض قبائل توان کے سیاسی وفادار ومحکوم اور باجگذار بھی تھے۔ غسان وغیرہ کی حکومتیں ان کی ماتحت (Vassal) حکومتیں تھیں۔ اگرچہ وہ نسلی اور نسبی اعتبار سے عرب تھے، مگر تمدن وتہذیب کے لحاظ سے بازنطینی رنگ میں رنگ گئے تھے۔ ان کا سیاسی نقطہ نظر رومی سلطنت کی پالیسیوں کا آئینہ دار تھا۔ اگرچہ وہ اپنے رومی آقاؤں سے بعض معاملات میں رنجیدہ وناراض بھی تھے۔ مدتوں تک رومی سلطنت سے وابستہ رہنے کے سبب ان کے بعض قبائل پورے کے پورے عیسائی بن گئے تھے اور بعض دوسروں میں بھی عیسائیت نے خاصے مضبوط اثرات قائم کر لئے تھے۔ کچھ عرب قبیلے اور گروہ اپنے پرانے آبائی مذہب پر بھی قائم تھے۔ تیسرا اہم مذہبی عنصر یہودی قبیلوں کا تھا جو عددی اعتبار سے کافی چھوٹے اور سیاسی لحاظ سے غیر اہم تھے۔ سیاسی لحاظ سے ایک اور اہم عنصر یہ تھا کہ شمالی قبائل عموماً متحد ومنظم حکومتوں کے باشندے تھے۔ ان میں بصریٰ کی غسانی سلطنت اور دومۃ الجندل اور ایلہ کی بالترتیب کندی اور یہودی حکومتیں خاصی منظم تھیں۔ اول الذکر سیاسی اعتبار سے ایک قوت تھی اور اس کو رومی سلطنت خاص کر شام کی صوبائی حکومت کی پشت پناہی حاصل تھی۔ شمالی قبائل میں اسلام کی تاریخ اشاعت کے مطالعہ میں ان امور کا مد نظر رکھنا ناگزیر ہے۔

شمالی قبائل میں سے اہم ترین قبائلی وحدتیں اور ان کے ذیلی بطون یہ تھے۔

(ا) بنو قضاعہ : (۱) بہراء (۲) بلی (۳) سعد ہذیم اور موخر الذکر کی شاخیں جیسے عُذرہ، ضنّہ، حارث قین، خُشین اور کلب، سلامان (جہینہ اور مہرہ بھی انہی کی دوسری اہم شاخیں تھیں جو بالترتیب مدینہ کے مغرب اور جنوب میں جا کر آباد ہو گئی تھیں) وغیرہ

(ب) بنو جذام : (۱) بنو ضُبیب

(ج) بنو لخم : (۱) بنو حدس (۲) بنو دار

(د) بنو غسان (۱) بنو ثعلبہ ۶۲۰

اسلامی ریاست کے ارتقاء کے باب میں ہم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی اور فوجی حکمت کا جائزہ لے چکے ہیں اور اس سے ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ ان قبائل شمال سے اسلامی ریاست کے سیاسی تعلقات کس قسم کے تھے، کب سے شروع ہوئے اور کیونکر وہ اسلامی ریاست کے رکن بنے؟ اب ہم اسلام کی ان میں اشاعت کا جائزہ لے رہے ہیں۔

(ا) بنو قضاعہ

قضاعہ اصل میں ایک قبیلہ کے بجائے متعدد قبائل کے مجموعہ کا نام تھا۔ اس میں ابن حزم کے بقول جو قبیلے شامل تھے وہ یہ ہیں: بلی، بہراء، سعد ہذیم اور موخر الذکر کی متعدد ذیلی شاخیں جیسے عُذرہ، ضنّہ، حارث، قین، خشین اور سلامان ان کے علاوہ کلب جو خاصا اہم اور طاقتور قبیلہ تھا۔ نسبی لحاظ سے سعد ہذیم ہی کا ایک بطن تھا۔ مدینہ کے مغرب اور جنوب مشرق میں دو قبیلے بالترتیب جہینہ اور مہرہ آباد تھے۔ ان کا بھی تعلق سعد ہذیم سے تھا۔ ان کے علاوہ بھی متعدد چھوٹے چھوٹے

گھرانے تھے جو نسبتاً غیر معروف ہیں[۶۲۱]۔ بہرحال قضاعہ اتنا بڑا قبیلہ ہو گیا تھا کہ وہ اقتصادی و سیاسی ضروریات کے سبب ایک مقام پر سما نہیں سکتا تھا اور نہ ہی بطور ایک سماجی اور سیاسی وحدت کے کام کر سکتا تھا اس لیے وہ مختلف بطون اور ان کی متعدد شاخوں میں منقسم ہو گیا تھا اور ان کے بڑے بطون بجائے خود قبیلے بن گئے تھے۔ ان میں بعض دوسرے علاقوں میں ضرور منتقل ہو گئے تھے۔ تاہم اصل قبیلہ اپنے روایاتی علاقے میں آباد و مقیم رہا تھا۔ ان قبیلوں میں اشاعت اسلام کی تاریخ کے ضمن میں یہ کہنا شروع ہی میں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ شمالی قبائل خاص کر وہ جو مغربی بین الاقوامی شاہراہ تجارت کے قریب آباد تھے اسلام سے بہت ہی ابتدائی زمانے میں متعارف ہو گئے تھے۔ کیونکہ شام آنے جانے والے تجارتی کارواں اور مکہ کے معبد خانہ کعبہ کو آنے والے حجاج بھی اس زمانہ میں خبروں کی اشاعت کا کام کرتے رہتے تھے[۶۲۲]۔

۱۱۔ بنو بلی

قضاعہ کے اس عظیم بطن کا بہت ہی قریبی سماجی اور ازدواجی تعلق قریش مکہ اور انصار مدینہ سے قدیم زمانے سے قائم تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قریش مکہ کے زیادہ تر تعلقات ازدواجی نوعیت کے تھے جبکہ انصار مدینہ ... اوس و خزرج نے حلف اور دوستی کے تعلقات زیادہ استوار کئے تھے۔ چنانچہ مآخذ سے اس کی تصدیق یوں ہوتی ہے کہ مکی صحابہ کرام میں سے متعدد حضرات کی مائیں اور بیویاں بنو بلی سے تھیں۔ جبکہ انصار کے بلوی حلیف اسلام اور اسلامی ریاست کے حلیف بن گئے تھے[۶۲۳]۔ ایک مطالعہ سے مدینہ کے دونوں انصاری قبیلوں کے کم از کم اٹھارہ بلوی حلفاء کے نام معلوم ہوتے ہیں[۶۲۴]۔ ظاہر ہے کہ یہ بلوی حلیف انصاری قبیلوں کے متعدد و مختلف گھرانوں سے متعلق تھے۔

چنانچہ یہ فطری امر تھا کہ انصاری افراد کے ساتھ ساتھ ان کے بعض بلکہ اکثر حلیف بھی ان کے ساتھ اسلام کے حلقہ بگوش بنے۔ ان میں سے بعض حلیف یقیناً اپنے علاقوں کو چھوڑ کر مدینہ آ بسے تھے۔ مگر ان کی اکثریت اپنے روائتی علاقوں میں آباد و مقیم رہی جو اکثر و بیشتر مدینہ آتی رہتی تھی، جیسا کہ مآخذ سے معلوم ہوتا ہے۔ ذی قعدہ ۴ھ / اپریل ۶۲۶ء میں بدر الموعد کے موقع پر حضرت نعیم بن مسعود اشجعی نے قریشی سالار افواج ابو سفیان بن حرب اموی کو اطلاع دی تھی کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیف بدوی قبائل .... جہینہ اور بلی .... وغیرہ کے سپاہی آپ کی دعوت پر مدینہ پہنچ چکے ہیں اور وہ آپ کے ہمرکاب بدر کی جانب کوچ کرنے والے ہیں۔ اس اطلاع پر قریشی لشکر بڑی سرعت سے پسپا ہو گیا تھا[۶۲۵]۔ اس واقعہ سے یہ صاف ظاہر ہے کہ اسلام نے بنو بلی میں اپنے ماننے والوں کی خاصی بڑی آبادی بنا لی تھی۔ مذکورہ بالا بلوی مسلمانوں کے علاوہ ابن حزم نے اس قبیلہ کے بعض اور مسلمانوں کے نام گنائے ہیں۔ ان میں حضرات کعب بن عجرہ، عبداللہ بن اسلم، سہل بن رافع، ان کے عم زاد طلحہ بن براء، عبداللہ بن زیاد، عبدہ بن مُعَتّب اور ان کے فرزند شریک اور عبدالرحمٰن بن عدیس شامل ہیں[۶۲۶]۔ ظاہر ہے کہ ان مسلمانوں کے لواحقین اور متبعین بھی اسلام لائے تھے۔ اس طرح یہ نتیجہ نکالنا غلط نہیں ہو گا کہ بنو بلی کا معتدبہ حصہ ۶ھ / ۶۲۸ء تک یا اس کے اواخر تک اسلام لا چکا تھا۔

اگرچہ بعد کے زمانے میں بلی کے قبیلہ کے بارے میں مآخذ کا یہ تبصرہ بھی ہم پاتے ہیں کہ وہ اسلامی ریاست کے دشمنوں کی صفوں میں شامل تھا تاہم یہ یقینی ہے کہ پورے قبیلے نے نہیں بلکہ اس کے ایک حصے نے اسلامی ریاست کی مخالفت کی تھی۔ ایک دلچسپ حقیقت غزوہ موتہ کے ضمن میں سامنے آتی ہے۔ اگرچہ مخالف فوج کی کمان بلی کے ایک شخص مالک کے ہاتھوں میں تھی۔ مگر قبیلہ کے مسلمانوں کے خلاف نبرد آزما ہونے کا مآخذ ذکر نہیں کرتے ہیں۔[427] اس کے علاوہ مآخذ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ غزوہ موتہ کے صرف ایک ماہ بعد غزوہ ذات السلاسل میں مسلمانوں کو قبیلہ بلی وغیرہ سے فوجی اور سیاسی امداد کی توقع تھی جو بہرحال پوری ہوئی تھی۔[428] اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بلی کا کم از کم ایک طبقہ مسلمانوں کے ساتھ اور اسلامی ریاست کا حامی تھا۔ اس ضمن میں یہ بات بھی ذہن نشین رکھنی چاہیئے کہ اسلامی ریاست کو شمالی علاقوں کے متعدد قبائل کے خلاف فوجی کارروائی کرنی پڑی تھی۔ مگر قبیلہ بلی کے خلاف ایک بھی مہم مدینہ سے نہیں بھیجی گئی تھی۔ واقدی کا بیان ہے کہ غزوہ تبوک کے دوران بلی کی ایک نیک دل اور غالباً مسلمان خاتون نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پانی فراہم کیا تھا۔[429] بہرحال یہ بھی ناقابل انکار حقیقت ہے کہ بلی کا ایک حصہ شمالی عرب کے اس قبائلی اتحاد میں بھی شریک تھا۔ جس نے غزوہ تبوک کے لیے محرک فراہم کیا تھا۔[430]

سیاسی تعلقات کی نوعیت یہ تھی اور اسلام کی اشاعت کا انداز جداگانہ تھا۔ وہ رفتہ رفتہ بنو بلی میں بھی پھیل رہا تھا اور ان کی صفوں میں خدا اور رسول کے ماننے والے بنا رہا تھا۔ ابن سعد نے بلی کے کم از کم چار مسلمانوں کو اپنی اس فہرست میں شامل کیا ہے۔ جو فتح مکہ سے قبل اسلام لا چکے تھے۔ ان کے اسمائے گرامی تھے۔ حضرت رُوَیفع بن ثابت جو کبھی کبھی آکر جناب میں مقیم ہوتے تھے۔ انہوں نے اسلام قبول کرلیا اور پھر صحبت نبوی سے محروم ہونا پسند نہیں کیا۔ وہ حدیث کے مشہور راوی بھی تھے (۲) حضرت ابوالشموس جو اکثر و بیشتر جق نامی مقام پر سکونت رکھتے تھے (۳) حضرت ابوامامہ بن ثعلبہ جو حضرت ابوبردہ بن نیار مشہور صحابی رسول کے عم زاد تھے۔ (۴) حضرت عبداللہ بن صیفی جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوہ حدیبیہ میں شریک رہے تھے۔[431] ظاہر ہے کہ ان کے علاوہ اور نہ جانے کتنے مسلمان اس عہد کے تھے۔ جن کے نام مآخذ میں آنے سے رہ گئے اس خیال کی تصدیق حضرت ابوبردہ بن نیار کے ضمنی ذکر سے بھی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ غزوہ تبوک کے کوئی تین ماہ پہلے بلی کا ایک وفد حضرت ابوالضباب کی قیادت میں مدینہ پہنچا تھا جس میں قبیلہ کے تقریباً تمام سربرآوردہ مسلمان شامل تھے۔[432]

یہ تمام شواہد غزوہ تبوک سے قبل بلی کے خاصے بڑے حصے کے قبول اسلام کی نشاندہی کرتے ہیں۔

ان کے قبول اسلام کی ایک اور حتمی شہادت اسلامی ریاست کو ان کی صدقات کی ادائیگی ہے۔ مآخذ کے مطابق سنہ ۹ھ / ۶۳۰ء میں مدینہ سے جو عاملین صدقات بھیجے گئے تھے۔ ان میں بلی کے لیے بھی افسر صدقات شامل تھے بلاذری کے مطابق خود قبیلہ بلی کے نمائندے حضرت الاعجم بن سفیان کو ان کا افسر صدقات مقرر کیا گیا تھا۔ صحابی موصوف نہ صرف اپنے قبیلہ والوں سے بلکہ دوسری روایات کے مطابق عذرہ اور سلامان اور بنو کلب کے قبیلوں سے بھی صدقات وصول کرکے مدینہ پہنچاتے تھے۔[433] مآخذ میں ایک نامہ نبوی کا متن محفوظ ہے۔ جس کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بلی

کے ایک خاندان بنی جُعیل کو نہ صرف بعض محاصل کی ادائیگی سے مستثنیٰ کر دیا تھا۔ بلکہ ان کو بنو نصر، بنو سعد بن بکر، بنو ثمالہ اور ہذیل کے سعایہ (محاصل) سے بھی ایک حصہ کا مستحق قرار دیا تھا[۹۳۴] اس کا سبب غالباً یہ تھا کہ بنو جعیل کے اس مختصر سے گھرانے کے افراد نے ان مذکورہ بالا ہوازنی قبائل سے صدقات کی وصولیابی میں مدد کی تھی۔ اس معاہدہ یا نامہ نبوی پر بنو جعیل کے نمائندوں کی حیثیت سے چار مسلمانوں نے بطور گواہ دستخط کئے تھے۔ لیکن اس سے زیادہ اہم یہ حقیقت ہے کہ مذکورہ بالا قبیلہ/ خاندان کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خاندان عبد مناف/ قریش کے ایک گھرانے (رھط) کا مرتبہ عطا فرمایا تھا[۹۳۵] غالباً اس کے دو سبب تھے اول یہ کہ انہوں نے ریاست اسلامی کی بے انتہا خلوص سے مدد کی تھی۔ اور دوم یہ کہ وہ خاندان نبوی/ بنو عبد مناف کے قریبی حلیف اور دوست بھی تھے جس طرح کہ خزاعہ تھے۔ بہر حال کچھ بھی صورت حال رہی ہو۔ یہ حقیقت اپنی جگہ پر اٹل ہے کہ اسلام نے عہد نبوی میں بنو بلی کے مختلف خاندانوں پر اپنی انمٹ چھاپ چھوڑی تھی۔ جو ان کے مکمل قبول اسلام کا سبب اور محرک بنی تھی۔

(۲) بنو بہراء

بنو بہرا بھی بلی کی مانند قریش مکہ اور انصار مدینہ سے قریبی سماجی اور ازدواجی روابط رکھتے تھے[۹۳۶] اگر حضرت مقداد بن عمرو بہرانی قریش کے قبیلہ بنو زہرہ کے حلیف تھے۔ تو حضرت عنبہ بن ربیعہ انصار کے قبیلہ بنو نجار کے خاندان بنو لوذان سے اسی قسم کے تعلقات رکھتے تھے[۹۳۷] ظاہر ہے کہ دونوں اپنے اپنے زمانے کے ابتدائی مسلمان تھے۔ وہ دونوں بدری صحابی تھے۔ انتہائی اہم اور مستحکم قرائن ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف وہ دونوں ابتدائی مسلمان تھے بلکہ ان کے قبول اسلام کا اثر ان کے قبیلہ والوں پر بھی پڑا تھا[۹۳۸] ان کے اثرات کے علاوہ اسلام نے اپنی سادگی اور تعلیمات سے بھی بہرا کے متعدد لوگوں کو ۶ھ / ۲۷-۶۲۸ء تک حلقہ بگوش بنا لیا تھا۔ اس برس حسمی کو جانے والی مہم کے امیر حضرت زید بن حارثہ کے بیان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ کافی پہلے مسلمان ہو گئے تھے[۹۳۹] اس کی مزید تصدیق ان کے وفد سے ہوتی ہے جو تیرہ سربرآوردہ اشخاص پر مشتمل تھا اور ۹ھ کے آغاز میں مدینہ پہنچا تھا۔ تمام اراکین وفد نے نہ صرف اپنے اسلام کا اعتراف و اظہار کیا تھا۔ بلکہ اپنے قبیلہ والوں کی بھی نمائندگی کی تھی[۹۴۰] اگرچہ بہراء کے قبول اسلام کی مکمل تفصیلات حاصل نہیں ہیں تاہم غزوہ تبوک میں مخالف اتحاد میں ان کی عدم موجودگی سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ وہ پورے کے پورے اسلامی امت میں داخل ہو چکے تھے۔ یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ ان کے خلاف کوئی خاص فوجی کارروائی نہیں کی گئی تھی

۳۔ سعد ہذیم

قضاعہ کے عظیم قبیلے کا یہ اہم ترین بطن/ خاندان خود کئی قبیلوں کا مجموعہ بن چکا تھا جن میں عذرہ اور سلامان کے بڑے خاندانوں کے علاوہ دو چھوٹے گھرانے بنو ضنہ اور بنو حارث بھی شامل تھے[۹۴۱] مؤخر الذکر دونوں بنو عذرہ کے حلیف اور دوست تھے۔ سعد ہذیم کے ان خاندانوں پر الگ الگ بحث دلچسپ بھی ہو گی اور مناسب بھی۔

بنو عذرہ ابن حزم کے بقول یہ بطن بجائے خود کئی بطون کا مجموعہ تھا[642] بنو الحارث اس کے حلیف تھے اور وہ بھی اس کے ساتھ اس طرح زیر بحث آتے ہیں کہ دونوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ بہر حال عذرہ بھی بلی اور بہراء کی مانند خاندانی سماجی اور ازدواجی تعلقات مکہ اور مدینہ والوں سے رکھتے تھے[643] متعدد مکی اور مدنی حضرات کے حلف اور دوستی کے تعلقات زمانہ قدیم سے بنو عذرہ کے لوگوں سے تھے[644]

ان قدیم تعلقات کے پیش نظر یہ قیاس بالکل بجا معلوم ہوتا ہے کہ بنو عذرہ بھی اسلام اور اسلامی ریاست سے ابتدائی زمانے میں ہی متعارف ہو گئے تھے۔ ابن سعد نے عذرہ کے تین مسلمانوں ..... حضرات خالد بن عرفطہ، حمزہ/حمزہ بن نعمان اور ابو خزامہ ...... کو فتح مکہ سے قبل اسلام قبول کرنے والے صحابہ کی فہرست میں شامل کیا ہے[645] لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے، کہ عذری مسلمانوں نے اتنی تاخیر سے اور بعد کے زمانے میں اسلام قبول کیا تھا۔ حضرت خالد بن عرفطہ مکی باشندے اور قریش کے خاندان بنو زہرہ کے حلیف تھے۔ اس لئے ان کا اسلام فتح مکہ سے کافی پہلے کا واقعہ ہے۔ دوسرے مآخذ سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ ابن سعد کی فہرست مسلمانان عذرہ میں ابن حزم نے چار مزید مسلمانوں کا نام شامل کرتے ہوئے کہا ہے کہ حضرات ثعلبہ بن ہوذ، زمیل بن عمرو، ثعلبہ بن سعیر اور موخر الذکر کے صاحبزادے عبد اللہ بھی صحابہ کرام میں شامل تھے[646] لیکن عذرہ کے سب سے نمایاں اور ممتاز صحابی حضرت قضاعی بن عمرو تھے۔ جنہوں نے مختلف قبائل عرب سے صدقات کی وصولیابی کی خدمت اسلامی ریاست کے لئے انجام دی تھی۔ اور قبیلہ بنو سعد اور بنو اسد کے علاقوں پر مرکزی منتظم بھی تھے[647] بنو عذرہ کے دوسرے اہم ترین مسلمان حضرت قطبہ بن قتادہ تھے۔ جنہوں نے موتہ کے غزوہ میں مسلمان فوج کے میمنہ (دائیں بازو) کی کمان کی تھی۔[648]

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلامی ریاست سے بنو عذرہ کے تعلقات کا ایک اہم پہلو یہ تھا کہ اسلامی افواج کی رہبری کے لئے جن دلیل (راہبروں) کی خدمات حاصل کی گئی تھیں ان میں سے متعدد حضرات کا تعلق اسی قبیلہ سے تھا۔ ایک مسلمان صحابی حضرت مذکور تھے، جو شہر ربیع الاول[؟] ۵ھ میں غزوہ دومۃ الجندل میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے راہبر تھے۔ انہوں نے بطور طلیعہ بھی اسلامی فوج کے لئے خدمات انجام دی تھیں[649] اسی طرح دو مزید عذری مسلمانوں کا ذکر واقدی نے کیا ہے، جنہوں نے سریہ حسمی اور غزوہ تبوک میں شرکت بھی کی تھی۔ اور راہبری کی سعادت بھی حاصل کی تھی[650] دوسری مہم کے دوران واقدی نے ایک عذری بدو کے قبول اسلام کا بھی حوالہ دیا ہے۔ جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دست حق پرست پر بیعت ہوئے تھے[651] ان تمام شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت نبوی کے بعد ہی سے بنو عذرہ کے متعدد لوگ اسلام کی طرف راغب ہونے لگے تھے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو عذرہ اور سعد ہذیم سے جو معاہدے کئے تھے۔ ان سے بھی ان کے قبول اسلام کی صراحت ہوتی ہے۔ حضرت زمیل بن عمرو عذری کے نام ایک نامۂ رسالت سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابی موصوف کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو عذرہ کے غیر مسلم طبقات کے لئے مبلغ خاص بنا کر بھیجا تھا۔ اس سے مزید یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بنو عذرہ کا ایک معتد بہ حصہ پہلے ہی مسلمان ہو چکا تھا[652] دوسرا نامہ نبوی جو جذام اور سعد ہذیم کے قبیلوں کے نام مشترکہ طور سے بھیجا گیا تھا۔ ان کے قبول اسلام کا واضح ثبوت فراہم کرتا ہے۔ کیونکہ وہ ان کو صدقات سے متعلق فرائض کی تعلیم دیتا ہے۔

اور ان کو صدقہ اور خمس کی دو قاصدان نبوی حضرات ابی بن کعب اور عنبسہ یا ان دونوں کے نمائندوں کو ادائیگی کا حکم دیتا ہے۔[653] یہ امر کہ بنو عذرہ اور سعد ہذیم یا قضاعہ کے دوسرے خاندانوں / بطون نے حقیقتاً اپنے صدقات مدینہ کو ادا کر دیئے تھے۔ متعدد شہادتوں سے ثابت ہوتا ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے حضرت الاجحم بن سفیان بلوی عذرہ، سلامان، بلی اور کلب کے مرکزی عامل صدقات تھے جنہوں نے اپنے قبیلوں سے صدقات وصول کر کے بارگاہ نبوی میں پہنچائے تھے[654] اس کے علاوہ بنو عذرہ کے ایک سردار حضرت حمزہ کے بارے میں ابن سعد وغیرہ کا بیان ہے کہ وہ حجاز سے پہلے مسلمان تھے۔ جو اپنی قوم کے صدقات لیکر مدینہ منورہ پہنچے تھے[655] نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو شاید انہی خدمات جلیلہ کے عوض وادی القریٰ میں ایک عظیم قطعیہ عطا فرمایا تھا۔ جہاں اپنی زندگی بھر سکونت پذیر رہے تھے۔ مزید براں واقدی کا ایک تبصرہ صاف بتاتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تبوک سے واپسی کے بعد سعد ہذیم اکثر و بیشتر مسلمان ہو گئے تھے[656] مزید تصدیق ان وفود کی آمد سے ہوتی ہے جو بنو عذرہ، سلامان، سعد ہذیم اور دوسرے قضاعی خاندانوں اور گھرانوں سے بارگاہ نبوی میں پہنچے تھے۔ سعد ہذیم کا وفد متعدد افراد (نفر) پر مشتمل تھا جبکہ بنو عذرہ کے وفد میں بارہ حضرات شامل تھے اور یہ دونوں وفود ۹ھ کے آغاز میں مدینہ پہنچے تھے ان تینوں میں سلامان کا وفد سب سے آخری تھا۔ جو شوال ۱۰ھ / جنوری ۶۳۲ء میں مدینہ آیا تھا اور جس میں سات حضرات شامل تھے۔ اس وفد کے سربراہ حضرت حبیب سلامانی تھے[657] بہر حال ان شواہد کی روشنی میں یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ سعد ہذیم کے بیشتر لوگ ۱۰ھ کے اواخر تک قطعی طور سے اسلامی امت میں داخل ہو چکے تھے۔

اگرچہ قضاعہ کے چھوٹے ذیلی گھرانوں کے بارے میں معلومات کم ملتی ہیں۔ تاہم اتنے قرائن ضرور ملتے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اہم اور بڑے بطون کی مانند وہ بھی اسلام کے حلقہ میں داخل ہو چکے تھے۔ واقدی کا بیان ہے کہ قضاعہ کے دوسرے بطون کے علاوہ ایک چھوٹے خاندان بلقین سے بھی مسلم فوج کو ذات السلاسل کے دوران مدد کی توقع تھی اور حقیقتاً وہ ملی بھی تھی[658] بہر حال اس قبیلہ کے کسی ابتدائی مسلم کا ذکر عام طور سے نہیں ملتا ہے۔ لیکن ان کے بعد کے زمانے کے کئی مسلمانوں کا تذکرہ مسلمان افواج کے ذیل میں ملتا ہے۔[659] بنو جرم میں کم از کم تین مسلمانوں کا ذکر ابن حزم نے کیا ہے۔ ان میں سے حضرت ہوذہ بن عمرو اور حضرت اسمع بن ربان عاقل و بالغ مرد تھے۔ لیکن حضرت عمرو بن سلمہ سات سالہ نابالغ بچے تھے۔ لیکن دلچسپ بات یہ تھی کہ وہ اپنی کم عمری کے باوجود قرآن مجید کے سب سے بڑے حافظ و عالم تھے۔ اس لئے اپنے قبیلہ کے مسلمانوں کی امامت وہی فرماتے تھے۔[660] اس واقعہ کے ایک ٹکڑے سے یہ حقیقت بھی عیاں ہوتی ہے کہ مردوں اور عورتوں کی خاصی بڑی تعداد اس خاندان کی مسلمان ہو چکی تھی۔ ایک اور چھوٹے گھرانے بنو البرک بن وبرہ کے صرف ایک مسلم کا ذکر مل سکا ہے۔ جو انصار کے حلیف تھے اور مدینہ میں سکونت رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے سرپرست قبیلہ کے لوگوں کے ساتھ بیعت عقبہ ثانیہ میں شرکت کی تھی۔ اور اس لحاظ سے وہ مکی عہد کے ابتدائی مسلم تھے[661] جبکہ بنو خشین کے دو مسلم بھائیوں حضرات ابو ثعلبہ خشنی اور عمرو بن جرہم خشنی کا ذکر ملا ہے لیکن ان کے زمانہ قبول اسلام کے بارے میں کچھ نہیں مذکور رہا ہے۔[662] بہر حال ابن سعد کا بیان ہے کہ اس چھوٹے سے قبیلہ / خاندان کا سات آدمیوں پر مشتمل ایک وفد حضرت ابو ثعلبہ خشنی کی قیادت

میں غزوہ خیبر سے کچھ پہلے یا اس کے فوراً بعد بارگاہ نبوی میں حاضر ہوا تھا[۶۶۳] اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم یہ سات حضرات صلح حدیبیہ کے بعد کسی وقت مسلمان ہو چکے تھے۔ بنو جرم کا دوسرا وفد فتح مکہ کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا تھا۔[۶۶۴]

اس کے علاوہ اسد الغابہ کا واضح بیان ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے آخری برس تک قضاعہ کا پورا قبیلہ حضرت جرثوم بن نصیب جیسے دعاۃ و مبلغین نبوی کی انتھک کوششوں کے نتیجے میں اسلامی امت کا جزو بن چکا تھا[۶۶۵]

بنو کلب

قضاعہ کا آخری بڑا خاندان کلب تھا جو بجائے خود قبیلہ بن چکا تھا۔ اس کے بعض افراد اسلام کے مکی عہد قدیم میں خدا کے پیغام سے متعارف ہو چکے تھے۔ اس کے سب سے بڑے صحابی مسلم حضرت زید بن حارثہ تھے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جاں نثار مولیٰ اور ابتدائی تین چار مسلمانوں میں سے تھے[۶۶۶] ان کے قبول اسلام کے سلسلے میں یہ دلیل دی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے قبیلہ کے نمائندے نہیں تھے کیونکہ وہ اپنے وطن، علاقہ اور قبیلہ سے دور مکہ کے باسی بن چکے تھے۔ یہ صحیح ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کے والد محترم کی مکہ کی ناکام زیارت یا دوسرے زائرین اور تاجروں کی مکہ آمد نے بنو کلب کو اسلام سے آغاز عہد اسلامی ہی میں روشناس کر دیا تھا،[۶۶۷] بہر حال مقامی کلبی مسلمانوں میں حضرت دحیہ بن خلیفہ کلبی کا نام کافی ممتاز اور اہم نظر آتا ہے اور ابن سعد کے ایک فقرے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مکی عہد میں کسی وقت اسلام لا چکے تھے۔ ابن سعد کا ان کو ان صحابہ کرام میں شامل کرنا جو عہد قدیم میں اسلام لا چکے تھے (اسلموا قدیماً) اور پھر یہ اصرار کرنا کہ وہ مسلمان تو ہو چکے تھے، مگر بدر میں شریک نہیں ہو سکے۔ ان کے قدیم مسلم ہونے کا کافی ثبوت ہے۔ واقدی کے ایک بیان سے اس کی مزید تصدیق ہوتی ہے۔[۶۶۸] بنو کلب کے ایک اور ابتدائی مسلمان حضرت نُمیلہ کلبی تھے، جن کا اوّل ذکر عام طور سے مآخذ ان مجاہدین کی فہرست میں کرتے ہیں، جن کو خیبر کی پیداوار سے عطیہ نبوی ملا تھا[۶۶۹] دوسرے مسلمانوں میں جو غالباً بعد کے زمانے سے تھے۔ حضرت عثمان بن عفان کی اہلیہ حضرت نائلہ بنت فرافصہ اور ہمنوا الذکر کے بھائی حضرت ضب تھے۔ ان کے علاوہ قطن بن صغیر بھی بعد کے زمانے کے مسلمان تھے[۶۷۰] بہر حال بنو کلب میں انفرادی قبول اسلام کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں، لیکن یہ قیاس کرنے کی خاصی بنیاد موجود ہے کہ اس قبیلہ کے خاصے لوگ اسلامی امت کے رکن عہد نبوی ہی میں بن چکے تھے۔

بنو کلب کے اسلامی امت میں ادغام و شمولیت کا ایک یقینی ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نمائندے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کے سریہ دومۃ الجندل (شعبان ۶ھ / دسمبر ۶۲۷ء) کے دوران اسلام قبول کر لیا تھا اور ان کے سردار حضرت اصبغ بن عمرو کلبی کا اکثر قبیلہ اسلامی امت کا رکن بن گیا تھا۔ جبکہ باقی ماندہ نے جزیہ کی ادائیگی کا وعدہ کر کے ذمی مقام کو قبول و پسند کیا تھا[۶۷۱] اس کے علاوہ ۹ھ / ۶۳۰ء میں بنو کلب کے مسلمانوں نے مرکزی عامل صدقات کو جو عذرہ بلی، سلامان اور کلب کے لیے مشترکہ طور پر مقرر کیا گیا تھا اپنے اپنے واجب الادا محاصل بھی ادا کئے تھے[۶۷۲] اس

سے پہلے فتح مکہ کے بعد کسی وقت ان کا چار نفری وفد بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں مدینہ حاضر ہوا تھا[۶۷۳] بلاذری نے بنو کلب سے صدقات کی وصولیابی کے لئے ایک دوسری دلچسپ روایت بھی بیان کی ہے۔ اس کے مطابق بنو کلب کا کوئی مناسب شخص کلب سے صدقات کی وصولی کے لئے نہیں مل سکا تھا۔ اس لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف زہری کو غالباً ان کے بنو کلب سے ازدواجی تعلقات کے پیش نظر ان کا افسر صدقات مقرر کر دیا تھا۔ قیاس یہ ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن نے یہ فرض بنو کلب کے اس حصہ کے لئے انجام دیا تھا جو دومۃ الجندل کے پاس آباد تھا[۶۷۴]

آخر میں ان متعدد نامہائے نبوی پر بھی نظر ڈال لی جائے جو مختلف طبقات کلب جیسے باشندگان دومہ اور جناب، عمائر کلب اور ان کے حلفاء معاونین اور عام مسلمان پیروؤں کے نام ہیں۔ ان تمام خطوط گرامی میں مکتوب الیہم کو مسلمانوں کی طرح بیان کیا گیا ہے اور ان سے اوقات مقررہ پر نمازیں پڑھنے اور اس کے تمام حقوق کے ساتھ زکوٰۃ ادا کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے اس سے پہلے اس امر میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا کہ بنو کلب کی غالب اکثریت نے اپنا پرانا مذہب عیسائیت ترک کر دیا تھا اور مخلص و پکے مسلمان بن گئے تھے[۶۷۵] بنو کلب کے ضمن میں اس کا احتمال ہے کہ کچھ افراد یا چھوٹے موٹے گروہ اسلام کے دائرے سے عہد نبوی میں باہر رہ گئے ہوں اور بعد میں کسی وقت مسلمان ہوئے ہوں لیکن یہ حقیقت ہے کہ بنو کلب کا معاملہ اس کے قطعی برعکس معلوم ہوتا ہے جو واٹ نے بڑے جوش و خروش سے ثابت کرنا چاہا ہے[۶۷۶]

(ب) بنو جذام

ماخذ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جذام کا کم از کم ایک طبقہ ذو المروہ اور حسمٰی کے ارد گرد آباد تھا[۶۷۷]۔ یہ دونوں علاقے ابن سعد کے مطابق وادی القریٰ کے پار تھے[۶۷۸] بقیہ حصہ یا حصے شامی سرحدوں کے قریب آباد تھے اور وہ بنو جذام قضاعہ اور اس کے متعدد بطون خاص کر سعد ہذیم اور عذرہ کے پڑوسی تھے۔ ابن حزم مزید صراحت کرتے ہیں کہ وہ حجاز کے بالائی علاقے ایلہ کے نواح میں رہتے تھے۔ نسبی لحاظ سے ان کا تعلق جنوبی عرب کے ایک قدیم قبیلے بنو اُدَد بن زید سے تھا لیکن وہ زمانہ جاہلیت میں کسی وقت شمال میں جنوب سے آکر بس گئے تھے۔ جیسے کہ قضاعہ بھی جنوبی عرب کے باشندے تھے اور نقل مکانی کر کے شمالی علاقے میں سکونت پذیر ہوئے تھے[۶۷۹]

بنو جذام میں غالباً اسلام کا داخلہ مدنی عہد کے دوسرے حصہ میں ہوا تھا۔ جبکہ ان کا ایک ذیلی گھرانا بنو ضبیب ۶ھ کے وسط اور سنہ[۶۸۰] کے اواخر میں اسلام لایا۔ یہ بنی ضبیب ہی تھے۔ جنہوں نے سرکشی اور باغی ھُنید بن عریض اور اس کے فرزند کو سفیر رسول حضرت دحیہ بن خلیفہ کلبی کے سامان کو جن میں قیصر کے دیئے ہوئے تحائف بھی تھے واپس کرنے پر مجبور کیا تھا۔ واقدی کے مطابق اس باغی اور لٹیرے کو سزا دینے والی جماعت میں کم از کم دس آدمی شامل تھے اور ان کے سردار حضرت نعمان بن ابی جعال تھے جو قبیلہ کے ایک عظیم جنگجو اور ماہر تیر انداز تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بنو ضبیب کی کارروائی کی اطلاع نہیں ہوئی تھی۔ چنانچہ آپ نے حضرت زید بن حارثہ کلبی کی قیادت میں ایک تادیبی جماعت بھیجدی۔

جس نے غلطی سے ان مسلمانوں طبقوں پر حملہ کر کے ان کو خاصا جانی اور مالی نقصان پہنچایا، جو اسلام کے وفادار تھے چنانچہ تلافی مداوا میں ستم رسیدہ مسلمان طبقات کا ایک وفد حضرت زید سے ملا جس میں متعدد حضرات جیسے حبان بن مولہ اور ان کے فرزند، ابو زید بن عمرو، ابو اسمع بن عمرو، سوید بن زید اور ان کے بھائی برزہ، اور ثعلبہ بن عدی شامل تھے۔ تحقیق سے ان کا دعویٰ ثابت ہو گیا اور ان کا مداوا کیا گیا۔[۶۸۰]

مجموعۃ الوثائق میں شامل ایک نامہ نبوی سے معلوم ہوتا ہے کہ جذام کا ایک حصہ جو حضرت رفاعہ بن زید کی ماتحتی میں تھا صلح حدیبیہ سے بھی کافی پہلے مسلمان ہو گیا تھا[۶۸۱] ماخذ کا بیان ہے کہ قبیلے کے ان مسلمانوں نے حضرت وحیہ کا سامان واپس دلانے اور لٹیروں کو پکڑنے کی اپنی سی کوشش کی تھی مگر وہ نکل بھاگے تھے۔ بہر حال دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ بنو ضبیب نے ان سے پورا پورا بدلہ لے لیا تھا۔ اس سے بہر صورت یہ ثابت ہوتا ہے کہ بنو ضبیب کے علاوہ جذام کا ایک اور طبقہ مسلمان ہو چکا تھا۔ مزید تصدیق اس ایک نفری وفد سے بھی ہوتی ہے۔ جو غزوہ خیبر سے کچھ پہلے مدینہ پہنچا تھا[۶۸۲] ذکر آچکا ہے کہ ۹ھ میں سعد ہذیم اور جذام کے لئے ایک مشترکہ عامل صدقات مقرر کیا گیا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس نامہ نبوی کے مطابق جذام سے صدقہ کے علاوہ خمس کا بھی مطالبہ کیا گیا تھا[۶۸۳] اس کے علاوہ ایک گرامی نامہ جذام کے ایک غیر معروف گھرانے بنو جعال بن ربیعہ کے نام بھی ہے جس کے مطابق ان کو اپنے علاقہ میں بعض مراعات و حقوق سے نوازا گیا تھا[۶۸۴] دوسری طرف ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ جذام کے ایک حصے نے رومی سلطنت سے غزوہ تبوک کے موقعہ پر ساز باز کی تھی[۶۸۵] ظاہر ہے کہ یہ حصہ یا قبیلہ مسلم طبقات سے الگ تھا۔ اس کا واضح مطلب یہی ہے کہ غزوہ تبوک تک یہ قبیلہ بعض اور شمالی قبائل کی مانند اپنی وفاداریوں کے لحاظ سے منقسم تھا۔ کچھ طبقے مسلمان ہو چکے تھے اور اسلامی ریاست کے وفادار تھے جبکہ اس کے بعض طبقات کی قدیم وفاداری ابھی تک رومی آقاؤں سے استوار و قائم تھی۔ لیکن اس غزوہ کے بعد ان اسلام دشمن طبقات میں بھی اسلام پھیل گیا تھا۔ جیسا کہ مالک بن احمر عوفی کی مثال سے ثابت ہوتا ہے[۶۸۶]

(ج) بنو لخم

بنو لخم نہ صرف خون کے رشتوں کے سبب جذام کے ساتھ قریبی تعلقات رکھتے تھے، بلکہ پڑوسی ہونے کے ناطے بھی ان کے دوست تھے[۶۸۷] اصل قبیلہ شامی سرحدوں کے قریب آباد تھا۔ مگر اس کی کچھ شاخیں مصر اور العریش کے درمیان واقعہ علاقہ میں بھی سکونت پذیر تھیں[۶۸۸] ان کے قریبی تعلقات قضاعہ سے بھی تھے۔ دوسرے شمالی قبائل کے مانند لخم کے حلف و دوستی کے تعلقات قریش مکہ سے بھی تھے۔ اور غالباً سب سے پہلے لخمی مسلمان حضرت حاطب بن ابی بلتعہ تھے جو قریشی خاندان بنو اسد کے حلیف اور مکی باشندے تھے۔ ان کو بدری صحابی ہونے کی فضیلت بھی حاصل تھی[۶۸۹] لیکن اصل قبیلے میں انفرادی اور اجتماعی قبول اسلام کی مثالیں غزوہ تبوک تک نہیں ملتی ہیں۔ اس غزوہ کے دوران حضرت تمیم داری کی قیادت میں ان کے دس آدمیوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تبوک ہی میں ملاقات کی اور اسلام قبول کر کے آپ کے ساتھ مدینہ آکر غالباً آباد ہو گئے

آپ نے ان کو خیبر کی پیداوار سے سو وسق سالانہ کا عطیہ خاص عطا فرمایا تھا ۶۹۰ اسلام سے بنو لخم کے مزید تعلقات و روابط کے بارے میں ہماری معلومات ناقص ہیں۔ ان کے قبیلے کے لئے کسی عامل صدقات کی تقرری کا بھی مآخذ میں حوالہ نہیں ملتا ہے بہر حال بنو لخم کے ایک ذیلی خاندان بنو حدس کے نام ایک گرامی نامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ایک طبقہ کم از کم مسلمان ہو چکا تھا یہ غالباً تبوک کے بعد کا خط ہے ۶۹۱۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بنو لخم اجتماعی طور سے عہد نبوی میں مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ اس کا ایک سبب یہ تھا کہ وہ مدینہ سے خاصی لمبی مسافت پر آباد تھے۔ اور عملاً وہ ایک شامی قبیلہ تھے جس کو جزیرہ نمائے عرب کے معاملات و امور سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ اسلام سے ان کے دور رہنے کا دوسرا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ رومی سلطنت کے پکے وفادار تھے جیسا کہ غزوہ تبوک کے زمانے میں ان کے رویے سے واضح ہوتا ہے۔

(۱۷) بنو غسان

شمال کا آخری اور غالباً سب سے اہم اور طاقت ور قبیلہ غسان تھا جو اسلام کا اور اسلامی ریاست کا سب سے شدید مخالف اور دشمن تھا ۶۹۲ اس کی اسلام دشمنی کا مظاہرہ متعدد مواقع پر ہو چکا تھا۔ لیکن اس دشمنی اور عداوت کے باوجود اسلام کا اثر بعض صالح طبیعتوں پر پڑا تھا اور ان کے بعض افراد و طبقات اسلام کے ہمنوا بن گئے تھے۔ چاہے وہ بجائے خود سیاسی و سماجی لحاظ سے غیر اہم ہی کیوں نہ رہے ہوں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دو گرامی ناموں سے معلوم ہوتا ہے کہ دعوت نبوی پر غسانیوں کے ایک حکمران حضرت جبلہ بن ایہم نے اسلام قبول کر لیا تھا ۶۹۳ اسی طرح غسان کا ایک گھرانا بنو ثعلبہ بھی اسلام کے دائرے میں داخل ہو گیا تھا۔ دوسرے مکتوب نبوی سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت صیفی بن عامر کو ان کے قبیلہ (قوم) والوں کا سردار مقرر کیا گیا تھا اور بظاہر انہوں نے زکوٰۃ، خمس، صفی رسول اور نمازوں کو قائم کرنے سے متعلق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات کو نافذ بھی کیا تھا ۶۹۴ منٹگمری واٹ اور ان کے ہم خیال و ہم فکر مستشرقین کا خیال ہے کہ ان خطوط میں بہت سا مواد مسترد کئے جانے کے قابل ہے۔ لیکن انہوں نے مآخذ کی ان صریح شہادتوں کو رد کرنے کے لئے کوئی خاص دلیل نہیں دی ہے اور جو دلیل دی بھی ہے وہ بے جان ہے اور اس کی بنا پر ان شہادتوں کو مسترد کرنے کا جواز نہیں پیدا ہوتا ۶۹۵ حضرت جبلہ بن ایہم کے قبول اسلام کا پس منظر ہی بتاتا ہے کہ مکتوب ناموں کی اطلاعات قابل اعتماد ہیں۔ ان کی کسی حد تک توثیق غسان کے ایک وفد کی آمد سے ہوتی ہے جو رمضان ۱۰ھ / دسمبر ۶۳۱ء میں کسی وقت مدینہ پہنچا تھا اور اس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام حق کی توثیق و تصدیق کی تھی ۶۹۶

غسان کے قبول اسلام کے بارے میں ایک دلچسپ اور اہم شہادت ابن اسحاق کے ایک حوالے میں ملتی ہے جو عام طور سے مؤرخین کی نگاہوں سے اوجھل رہا ہے۔ اس کے مطابق غزوہ حنین میں غسان کا ایک دستہ بنو سلیم کے ساتھ لشکر اسلامی کے ساتھ مقدمہ میں موجود و شریک جہاد رہا تھا۔ جیسا کہ حضرت عباس بن مرداس سلمی کی شاعری کے دو تین ابیات سے معلوم ہوتا ہے ۶۹۷ بہر حال یہ صحیح معلوم ہوتا ہے اور اس کی تردید کے کافی اسباب بھی نہیں ہیں کہ غسان کا ایک حصہ اسلام کا حلقہ بگوش ہو چکا تھا غسان

کے قبول اسلام یا اسلام اور اسلامی ریاست سے تعلقات کے بارے میں مواد کافی ناقص ہے اور اس کا سبب وہی ہے جو لخم کے بارے میں ہم دیکھ چکے ہیں۔ غسان نہ صرف مدینہ منورہ سے کافی دور آباد تھا، بلکہ اس کو عملی لحاظ سے جزیرہ نمائے عرب کا قبیلہ نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اور یہ حقیقت بھی تھی کہ وہ شامی سرحدوں کے دونوں طرف آباد تھا۔ اور عملاً بازنطینی سلطنت کے ایشیائی صوبے شام اور جزیرہ نمائے عرب کے درمیان ایک فاصل ریاست (BUFFER STATE) قائم کئے ہوئے تھا۔ اس لئے اگر وہ عہد نبوی میں اسلام کے دائرہ اثر و اقتدار سے آزاد تھا، تو کوئی حیرت کی بات نہیں تھی۔

مدینہ منورہ کے شمال میں اسلام کی اشاعت و ترویج کی بحث کے خاتمہ پر یہ تبصرہ ناگزیر معلوم ہوتا ہے کہ شمالی قبائل کے ضمن میں اسلام کی تبلیغ اتنی وسیع، ہمہ گیر اور کامیاب نہیں تھی جتنی کہ مغربی اور مشرقی قبائل یا جنوبی قبائل کے ضمن میں رہی تھی۔ جوں جوں شمال کی جانب بڑھتے گئے اس کی رفتار ہلکی اور اس کو قبول کرنے کی صلاحیت کمزور ہوتی نظر آتی ہے۔ دین خداوندی کے شمالی علاقے میں اتنی سست روی سے سفر کرنے اور بہت زیادہ کامیابی حاصل نہ کر سکنے کے اسباب نہایت واضح ہیں اس کا پہلا اہم ترین سبب وقت کی کمی تھی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ اور مدینہ کے شمال میں خاص کر اور مشرق و مغرب و جنوب میں عام طور سے تبلیغی کارروائی شعوری طور سے باقاعدہ ہجرت مدینہ کے بعد شروع کی تھی۔ فتح مکہ تک آپ کی توجہ پوری طرح سے مدینہ کے اردگرد بسے قبائل اور قریش مکہ کے معاملات پر مرکوز رہی تھی۔ اس زمانے میں آپ نے اگرچہ شمالی طرف بھی موقعہ ملا توجہ دی۔ لیکن وقت کی کمی کے سبب اتنی نہیں عنایت فرما سکے جتنی کہ آپ نے مرکزی علاقہ عرب کے قبائل پر دی تھی۔ فتح مکہ اور وفات نبوی کے درمیان کا ڈھائی سالہ عرصہ اتنے بڑے خطے میں اسلام کی تبلیغ کے لئے ناکافی تھا۔ دوسرے یہ کہ مدینہ سے خاصی طویل مسافت بھی اسلام کی ترقی و تبلیغ کی راہ میں رکاوٹ تھی۔ تیسرے یہ کہ آپ کی نظر میں اگرچہ اسلام ایک عالمگیر مذہب تھا تاہم میدان کار جزیرہ نمائے عرب تک محدود تھا اور غیر ممالک میں آپ نے جو سفارتی مہمیں اور تبلیغی جماعتیں روانہ کی تھیں وہ تعداد میں کم تھیں اور ان کا اثر محدود تھا۔ چوتھا بڑا سبب یہ تھا کہ غسان اور دوسرے عرب قبائل بازنطینی حکومت کے ماتحت، وفادار اور باجگذار تھے اور ان کی غیر ملکی آقاؤں سے وفاداری اسلام سے وفاداری کی راہ میں حائل تھی۔ کیونکہ اسلام کی وفاداری کا لازمی نتیجہ تھا اسلامی ریاست اقتدار اعلیٰ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حاکمیت و نیابت خداوندی کو تسلیم کرنا، جو ان کے لئے بر وقت ممکن نہ تھا۔ اور آخری اہم سبب یہ تھا کہ پوری دنیا کے انسانیت کے لئے آپ رسول و ہادی ضرور بنا کر بھیجے گئے تھے، مگر یہ آپ کا فرائض منصبی نہیں قرار دیا گیا تھا کہ آپ "پوری دنیا یا کائنات" کو مسلمان بنا لیں[۴۹۸] آپ کا کام پیغام الٰہی کو لوگوں تک پہنچانا تھا۔ جو آپ نے بلا کم و کاست پوری ایمانداری و صداقت اور ممکنہ کوشش و جہد کی حد تک پہنچا دیا تھا۔ آپ کا دوسرا کام اس ضمن میں مسلمانوں اور مبلغوں کی ایسی جماعت تیار کر دینا تھا جو "اپنے پیچھے والوں کو یا بعد میں آنے والی نسلوں کو ڈرا سکیں[۴۹۹]"، ان میں تبلیغ کر سکیں اور ان تک پیغام الٰہی پہنچا سکیں۔ اور یہ آپ نے بخوبی بلکہ بہ احسن طریق انجام دیا تھا۔ آپ نے صحابہ کرام کی ایسی جماعت اور مبلغین اسلام کی ایک ایسی امت پیدا کر دی تھی جو اپنے قول و فعل اور کردار سے اسلام کے پیغام کو دنیا کے گوشے گوشے میں پھیلانے کا سبب اور وسیلہ بن گئی۔

ہمارے تمام مستشرقین اور خصوصاً مونٹگمری واٹ شمالی قبائل میں اشاعت اسلام کے بارے میں تعصب سے کام لیتے ہیں اور غیر علمی رویہ اپناتے ہیں۔ ان کے تعصب کا بنیادی سبب وہ چیز ہے جس کو قرآن کریم نے "حمیۃ جاہلیۃ" کہا ہے۔ یہ جاہلی حمیت اس لئے ہے کہ شمالی قبائل میں اکثر و بیشتر عیسائی تھے اور ان کو شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ گوارا نہیں ہوتا ہے کہ عیسائیوں یا عیسائی طبقات کے مسلمان ہونے کی واقعیت کو تسلیم کر لیں۔ ان کو اس میں اپنے مذہب کی توہین اپنی قومی ذلت اور ذاتی سبکی محسوس ہوتی ہے چنانچہ وہ مآخذ کی صریح شہادتوں کو بلاوجہ مسترد کر دیتے ہیں اور تاویلات کا سہارا لیتے ہیں اور اپنی تحقیق و علمیت کی تمام کاوشوں کو اس نکتہ پر مرکوز کر دیتے ہیں کہ تاریخی واقعات و حقائق میں الجھن اور شکوک و شبہات پیدا کئے جائیں۔ اس فرض عظیم کی خاطر مونٹگمری واٹ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شمالی پالیسی کو مبہم غیر واضح اور پر اسرار بلکہ راز سربستہ تک قرار دیا ہے۔ حالانکہ وہ خود بھی جانتے ہیں اور جیسا کہ مذکورہ بالا بحث سے واضح ہو جاتا ہے کہ آپ کی پالیسی میں کوئی ابہام اور پر اسراریت نہیں تھی۔ وہ انتہائی روشن، واضح اور معلوم پالیسی تھی۔ یعنی خدا کے پیغام کو دوسروں کی طرح شمالی قبائل کو بھی پہونچانا اور ان کو اسلامی ریاست کے سایۂ عاطفت میں لانا۔ ہمارے یہ مستشرقین علمی و تحقیقی انداز کی بھول بھلیوں میں قارئین کو گم کر کے ایک اور ستم یہ کرتے ہیں کہ ان کے ذہنوں پر اسلام کی تاثیر کی کمزوری اور دین خداوندی کی اثر و نفوذ کی عدم صلاحیت کو شعوری طور سے مرتسم کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ یہ بتاتے ہیں کہ اسلام کا جب تک بت پرستوں سے مقابلہ رہا وہ تیزی سے پھیلتا رہا۔ لیکن جب اس کا واسطہ عیسائیوں یا یہودیوں سے پڑا تو اس کی تاثیر نہ صرف ماند پڑ گئی بلکہ ختم ہو گئی کیونکہ اسلام کے اصول اصلی یا پر اثر نہ تھے۔ یہ صحیح ہے کہ جن اقوام اور قبائل میں اپنے مذہب سے جذباتی لگاؤ یا مذہبی عصبیت ہوتی ہے ان پر دوسرے مذہب کا اثر مشکل سے اور دیر میں پڑتا ہے لیکن اس میں اسلام کی تاثیر کی کمی سبب نہیں ہوتی بلکہ انکی عصبیت اور جذباتی لگاؤ قبول اسلام کو روک دیتا ہے کیونکہ وہ اسلام کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔ بہرحال جہاں تک شمالی قبائل کا تعلق ہے۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ ان کی غالب اکثریت خلافت راشدہ میں خاص کر عہد صدیقی ہی میں اسلام قبول کر چکی تھی اور اسلامی ریاست اور اسلامی امت کا جزو بن چکی تھی۔ اتنی مختصر سی مدت میں ان میں اسلام کی توسیع و اشاعت محض اس بنا پر ہو سکی تھی، کہ زمین پہلے سے ہموار تھی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ذہن و قلب کو سننے، سمجھنے اور ماننے کے لیے تیار کر دیا تھا اور ان کے فکر و نظر اور عقیدے کے تبدیل کرنے کا فریضہ اس "امت خیر" نے انجام دیا جو لوگوں کے لئے ہی پیدا کی گئی ہیں۔ اور جو ان کو بھلائی کی تعلیم دیتے ہیں۔ برائی سے روکتے ہیں اور اللہ پر ایمان رکھتے ہیں"۔

(۴) جنوبی قبائل

مکہ اور عدن کے درمیان آباد جنوبی قبائل میں اسلام کا تعارف اور داخلہ اسلامی ریاست کی فوجی طاقت اور ہتھیاروں کے داخلے سے کافی مدت پہلے ہوچکا تھا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ جنوبی عرب میں ریاست اسلامی کے فوجی اثرات کا اتنا اثر

تک نہیں ہوا تھا، جتنا دوسرے قبائل کے سلسلے میں ہوا تھا۔ بہرحال مسلم افواج یا ہمیں اس علاقہ میں فتح مکہ سے پہلے نہیں پہنچ سکی تھیں اور نہ ہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی منظم کی ہوئی تبلیغی و اشاعتی جماعتیں۔ کیونکہ مدینہ منورہ اور جنوبی عرب کے درمیان خاص طور سے اور جزیرہ نمائے عرب کے مشرقی علاقوں اور ساحلی خطوں میں عام طور سے قریش مکہ کی طاقتور اور ناقابل تسخیر اشرافیہ کی دیوار حائل تھی۔ یہاں تک وہ ۸ھ/۶۳۰ء کے ابتدائی دنوں میں منہدم ہو گئی۔ مکی عہد میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی اجتماعی منظم سماجی یا سیاسی قوت نہ تھی جس کے بل بوتے پر تبلیغی وفود اور مذہبی کارواں بھیجے جاتے۔ لیکن اسلام کی ہمہ گیر تاثیر و تسخیر کے غیر معلوم و غیر محسوس اندرونی دھاروں نے ان مصنوعی دیواروں اور انسانوں کی عائد کی ہوئی حد بندیوں کی ذرا پروا نہیں کی اور اس نے اپنی اشاعت و تبلیغ کے انوکھے اور شاندار ذرائع حاصل کر لیے۔ جنوب کے بعض تشنگان معرفت الٰہی، حقیقت کے جویا اور زائرین حرم کعبہ مختلف مقاصد سے مکہ آئے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام و کام سے آشنا ہوئے اور ان میں سے متعدد نہ صرف اسلام کے علمبردار بن گئے بلکہ جب وہ اپنے اپنے علاقوں کو لوٹے تو اسلام کے مبلغ و داعی بن کر لوٹے۔ جنوب کے قبائل میں اسلام کے تعارف، تبلیغ اور ترویج کے کام میں حضرات ابوموسیٰ اشعری، طفیل بن عمرو دوسی، ضماد بن ثعلبہ ازدی اور متعدد دوسرے حضرات نے نمایاں حصہ لیا تھا۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری نے ابن سعد کے بقول مکہ کے عہد قدیم میں اسلام قبول کر لیا تھا اور واپس اپنے وطن لوٹ گئے تھے۔ انہوں نے اپنے وطن میں اس تندہی اور جانفشانی سے تبلیغ اسلام کی تھی کہ جب ۷ھ میں غزوہ خیبر سے کچھ پہلے وہ اشعریوں کا وفد لیکر پہنچے تو ان کے ساتھیوں کی تعداد پچاس سے متجاوز تھی، اور نہ جانے کتنے مسلمان وہ اپنے علاقے میں پیچھے چھوڑ آئے تھے۔[۱]

مکہ مکرمہ میں خانہ کعبہ کی موجودگی سے اس کو تمام جزیرہ نمائے عرب میں ایک مذہبی اور سماجی مرکزیت حاصل تھی۔ اور اس کے سبب وہ اقتصادی مرکز اور تجارتی منڈی بھی بن گیا تھا۔ اس میں اس جغرافیائی سبب نے بھی خاصا اہم کردار ادا کیا تھا کہ وہ مغربی ساحل کی بین الاقوامی شاہراہ پر جو یمن سے شام کو جاتی تھی واقع تھا۔ ان اسباب سے زائرین اور تاجرین کا سال بھر تانتا لگا رہتا تھا۔ چنانچہ مکہ میں پیش آنے والے واقعات اور امور مختصر سی مدت میں پورے جزیرہ نمائے عرب میں متعارف ہو جاتے تھے۔ اسلام تو مکہ میں ایک انوکھا اور دلچسپ ترین واقعہ اور تجربہ تھا۔ جس کے ماننے والے آگ کے انگاروں پر جلنا اور تپتی ریگ پر چلنا اور جسم و جان کے ٹکڑے کٹے جانا پسند کر لیتے تھے۔ مگر اس نئے مذہب کو چھوڑنا پسند نہیں کرتے تھے۔ مسلمانان مکہ کی آزمائش و ابتلاء کے واقعات کے علاوہ اسلام کی سیدھی سادی اور سچی تعلیمات نے بھی مکہ کے زائروں کو متاثر کیا تھا چاہے انہوں نے اسلام نہ بھی قبول کیا ہو۔ یہ غیر مسلم زائرین جب اپنے علاقوں کو واپس ہوتے تھے تو وہ بھی غیر شعوری طور پر اسلام کا بالواسطہ اور غیر جانبدار علمبردار بن کر جاتے تھے۔ کیونکہ وہ اپنے تجربات و مشاہدات کو اپنے ہم وطنوں اور ہم قبیلہ والوں سے جا کر سناتے تھے۔ تاریخی روایات شاہد ہیں کہ انہوں نے نہ جانے کتنے ذہنوں کو جگایا اور بیدار کیا تھا، کتنے دماغوں میں ہلچل و اضطراب پیدا کیا تھا اور کتنی روحوں میں حق کی تلاش اور جستجو کی آرزو مضطر کائی تھی۔ اس کے علاوہ دوسرے علاقوں کے مانند جنوبی عرب کے قبائل کے افراد اور گروہوں کے مکہ والوں سے مستقل سیاسی اور سماجی اور اقتصادی تعلقات بھی قائم

تھے اور انہوں نے بھی اسلام کے تعارف اور روشناسی کا کام انجام دیا تھا۔ مگر سب سے بڑا عنصر اپنی تاثیر اور تسخیر قلوب کے لحاظ سے ان نومسلموں کا تھا جو جنوبی عرب کے مختلف خطوں میں چند انفرادی مبلغین اسلام کی کوششوں کے نتیجہ میں اسلام لا چکے تھے۔ یہ نومسلم بجائے خود اسلام کے سب سے بڑے اور مؤثر داعی تھے جنہوں نے اپنے رشتہ داروں، خاندان و قبیلہ والوں اور پڑوسیوں کو متاثر کیا تھا اور بہت سوں کو ہمنوا و ہمخیال بھی بنا لیا تھا۔ اس پورے عمل و نفوذ کا نقطہ عروج وہ تھا جب فتح مکہ کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنوبی عرب کے قبائل میں ترویج اسلام کی شعوری اور منظم کوششیں کیں۔ گویا کہ زمین ہموار ہو چکی تھی۔ بیج بوئے جا چکے تھے۔ پانی دیا جا چکا تھا اور فصل تیار تھی صرف فصل کو کاٹ کر گھر لانے کی دیر تھی۔

اب تک یہ واقعہ اور حقیقت اتنی عیاں ہو چکی ہے۔ کہ زیادہ دہرانے کی ضرورت نہیں کہ جنوبی عرب میں مختلف قبیلے اور ان قبیلوں کے مختلف بطون اور ان بطون کی متعدد ذیلی شاخیں تھیں۔ بہرکیف اہم جنوبی قبائل اور ان کے بطون اور شاخیں حسب ذیل تھیں:

(ا) اشعر:

(ب) بجیلہ: (۱) بنو احمس بن غوث۔ (۲) باشندگان کلاع وظلیم

(ج) خثعم: (۱) بنو معاویہ (بنو رشد

(د) ہمدان: (۱) بنو الحارث (۲) بنو شاکر (۳) بنو ارحب، (۴) بنو ربیعہ بن مالک (۵-۶) باشندگان زبین ومعافر

(۷) باشندگان ہمدان

(س) حمیر: (۱) اہل نجران (۲) اہل زود (۳) اہل مران

ط مذحج: (۱) بنو علس (۲) بنو مراد (۳) بنو سعد العشیرہ، بنو جعفی، بنو عائذ، مران، حریم، کلاب وغیرہ

(۴) بنو زبید (۵) بنو اود (۶) بنو رہاء (۷) بنو صداء (۸) بنو نخع (۹) بنو الحارث بن کعب (بنو عبد المدان بنو ضبب بنو قنان، بنو عبد الغوث اور بنو زیاد وغیرہ) (۱۰) بنو خولان

(ع) نہد: (۱) بنو قرّہ

(ف) ازد یمن: (۱) ازد جرش (۲) بجران (۳) بنو غامد (۴) بنو بارق (۵) بنو غافق۔

(ک) کندہ: (۱) بنو معاویہ (۲) بنو وہب (۳) بنو رُعیش (۴) بنو اشرس (۵) بنو سکون (بنو غوث) (۶) بنو سکاسک

(۷) بنو تجیب

(ل) حضر موت یا حضارمہ: (۱) اقیال حضر موت (۲) بنو صدلیف

(م) الابناء: ایرانی نژاد باشندگان یمن [۲۰۲]

مونٹگمری واٹ کا خیال ہے کہ "فتح مکہ تک اہل جنوب اور مسلمانوں میں کوئی بھی رابطہ و تعلق نہیں تھا" [۲۰۳] اگر یہ کہا جاتا کہ اہل یمن و حضر موت وغیرہ کا تعلق اسلامی ریاست سے نہیں تھا، تو بات صحیح ہوتی لیکن اسلام اور مسلمانوں سے ان کا

تعلق دیرینہ و دیرپا تھا۔ بلکہ خود "مسلمان" ان کے بیچ موجود تھے۔ جیسا کہ ہم ابھی دیکھ چکے ہیں اور آئندہ بھی مزید اس کا مطالعہ کریں گے۔ جنوبی عرب میں اسلام کی ترویج و اشاعت کے مباحث سے پہلے یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ اس کے کسی قبیلے نے اسلام کی مسلح یا فوجی مخالفت نہیں کی تھی اور اسلامی ریاست کے خلاف نہ تلوار اٹھائی تھی، اور نہ ہی سیاسی اور فوجی سازشوں میں حصہ لیا تھا۔ غالباً یہ صاف ذہنی بھی ان کے تیز اور جلد قبولِ اسلام کا سبب بن گئی تھی۔ یہ پہلے ذکر آ چکا ہے کہ قبائلی عصبیت اور رقابت نے اسلام کے قبول و انکار میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ چنانچہ جنوبی و شمالی قبائل کے درمیان موجود قبائلی رقابت بلکہ عداوت اگرچہ پرانی تھی لیکن اس نے اسلام کی ترقی و تبلیغ میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی تھی۔ کیونکہ اسلام نہ جنوبی تھا نہ شمالی مشرقی تھا نہ مغربی وہ تو ایک آفاقی مذہب تھا۔ اور آج بھی اس کی وہی خصوصیت باقی ہے۔ حسب معمول جنوبی عرب کے قبائل میں ترویج اسلام کا مطالعہ توفیقی تقاضوں یا تاریخی ترتیب واقعات کے مطابق بنو اشعر سے کیا جا رہا ہے کہ وہی جنوبی عرب میں اسلام کے اولین پیرو اور علمبردار تھے۔

۱۔ اشعر

حضرت ابوموسیٰ اشعری کے علاوہ ابن سعد نے اشعر کے چھ ابتدائی مسلمانوں کا ذکر کیا ہے۔ ان کے اسمائے گرامی تھے: حضرات ابوبردہ، ابورہم (دونوں حضرت ابوموسیٰ اشعری کے بھائی تھے)، ابو عامر اور ان کے صاحبزادے عامر، ابومالک اور حارث اشعری[۴]۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دوسرے قبیلوں کی طرح اشعر کے لوگ بھی گروہوں میں اسلام لائے تھے۔ دوسرے اشعری صحابہ کرام کے سوانحی خاکوں سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ چھوٹے چھوٹے گھرانے اور مختلف افراد ایک ساتھ اسلام لائے تھے۔ بہرحال اسلام اشعر میں ۶۱۵ء اور ۶۱۹ء کے درمیان روشناس ہوا تھا، اور ۷ھ/ ۶۲۸ء تک قبیلہ کا ایک معتدبہ اور بڑا طبقہ اسلام لے آیا تھا۔ جن میں سے پچاس سے زیادہ لوگ مدینہ حضرت ابوموسیٰ اشعری کے ساتھ پہنچے تھے! اور انہوں نے متعدد مہموں میں شرکت بھی کی تھی[۵]۔ یہ یقینی ہے کہ ان مہاجر اشعریوں کے علاوہ کافی بڑی تعداد میں مسلمان اپنے قبیلہ اور علاقے میں قیام پذیر رہے تھے۔ خاص طور سے ان پچاس مسلمانوں کے اہل خانہ و عزیز رہا ہے مفروضہ کے مطابق ان کی تعداد تین ساڑھے تین سو کے درمیان کہیں رہی ہوگی۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے۔ کہ بنو اشعر کے مزید قبول اسلام کی نہ تو مثالیں ملتی ہیں! اور نہ ہی کوئی اور حوالہ۔ اس کے علاوہ ماخذ سے یہی تاثر ملتا ہے کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری اور ان کے رفقاء کی کوششوں نے پورے قبیلہ کو حلقہ بگوشِ اسلام بنا دیا تھا[۶]۔ بہرصورت ۱۰ھ/ ۶۳۱ء میں جب اشعر کے عاملین صدقات اور مرکزی منتظمین ان کے پاس پہنچے تھے[۷]، اس سے پہلے ہی پورا قبیلہ اسلامی امت کا رکن بن چکا تھا، اور مدینہ کی اسلامی ریاست سے ان کے مذہبی روابط اور تعلقات میں استحکام نے ان میں وہ ایمانی صلابت اور ثابت قدمی پیدا کر دی تھی کہ ردہ کے پر آشوب و پرفتن زمانے میں نہ صرف وہ اسلام پر عامل و قائم رہے تھے۔ بلکہ دوسروں کے ایمان و سلامتی کے محافظ بن گئے تھے۔ بخاری کی ایک روایت کے مطابق اشعریوں کے ایمان کی مضبوطی اور عقیدہ کی پختگی کی

خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شہادت دی تھی [۸]۔ اور صادق وامین کی شہادت سے بڑھ کر اور کس کی گواہی ہو سکتی ہے!

(ب) بجیلہ

بجیلہ کا قریبی تعلق ایک دوسرے جنوبی قبیلے خثعم سے تھا اور وہ غالباً انہی کے پڑوس میں آباد بھی تھے۔ یہ ایک خاصا بڑا قبیلہ تھا جو بعثت نبوی کے زمانے میں اندرونی اختلافات اور باہمی نزاعات میں مبتلا تھا اور مختلف متحارب و متصادم گروہوں میں منقسم تھا، تا آنکہ اس کو ان کے سب سے بڑے سردار حضرت جریر بن عبداللہ بجلی نے متحد و منظم کیا [۹]۔ اسکے متعدد خاندانوں میں بنو احمس بن غوث کے بارے میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ غالباً کچھ پہلے مسلمان ہوا تھا۔ جیسا کہ ابن حزم کا دعویٰ ہے کہا جاتا ہے کہ اس قبیلہ/خاندان کے ایک سو پچاس اشخاص حضرت جریر بن عبداللہ بجلی کے ساتھ ایک دن میں مسلمان ہوئے تھے بعد میں وہ اپنے وفد کے ساتھ مدینہ پہنچے تھے اور بارگاہ نبوی میں اپنے مسلمان ہونے کی انہوں نے پھر تصدیق کی تھی [۱۱]۔ مدینہ میں اپنی آمد کے فوراً بعد ان نو مسلموں نے جہاد میں شرکت کی تھی۔ جب کہ ان کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ بجیلہ کے بتکدے کو توڑنے کے لئے بھیجا تھا، جو ذوالخلصہ نامی مقام پر واقع تھا [۱۲]۔ ابن حزم نے اس کے تین اہم مسلمانوں کے نام بھی بیان کئے ہیں جو یہ تھے: حضرات طارق بن شہاب، ابو حازم الفقیہ اور ان کے صاحبزادے قیس۔ ان کے علاوہ انہوں نے حضرت جریر بن عبداللہ بجلی کے ایک عزیز مسلم حضرت عبداللہ بن ابی عوف کا بھی صحابہ میں شمار کیا ہے [۱۳]۔

کچھ مدت کے بعد رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جریر بن عبداللہ بجلی کو جنوبی عرب کی دو چھوٹی ریاستوں یا مملکتوں کلاع اور ظلیم کے شہزادوں/حاکموں اور ان کی رعایا میں تبلیغ اسلام کے لئے بھیجا تھا، جہاں ان کو صد فی صد اور فوری کامیابی ملی تھی [۱۴]۔ لیکن بجیلہ کے قبول اسلام کا سب سے بڑا ثبوت ان کا دوسرا وفد تھا جو اس کے بعد حضرت قیس بن عذرہ احمسی کی قیادت میں مدینہ پہنچا تھا۔ اس میں دو سو پچاس مسلمان شریک تھے [۱۵]۔ اس حتمی شہادت سے بجیلہ کے پورے قبیلے کے مسلمان ہونے کے بارے میں کسی قسم کا شبہ یا الجھن باقی نہیں رہ جاتی۔ اس کے علاوہ مزید ثبوت یہ ہے کہ مجموعی طور سے بنو بجیلہ ردہ کے زمانے میں اسلامی ریاست کے وفادار اور اسلام پر قائم رہے تھے اس پر آشوب زمانے میں حضرت جریر بن عبداللہ بجلی اور قیس بن عذرہ احمسی وغیرہ نے اسلام کی زبردست اور شاندار خدمات انجام دی تھیں اور طوفان حوادث اور سیلاب بلا کے بیچ اسلام کا علم بلند رکھا تھا۔

(ج) خثعم

خثعم اور بجیلہ کے درمیان خون کی رشتہ داری کے بہت مضبوط تعلقات تھے اور خیال یہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے پڑوسی بھی تھے۔ لیکن اس کا ایک حصہ قحط و قلت آب کی بنا پر اپنے علاقہ کو چھوڑ کر نجد میں تربہ کے مقام پر جا بسا تھا۔ جیسا کہ واقدی کا بیان ہے [۱۶]۔ وہ شاندار تبالہ کے علاقے میں بھی بس گئے تھے۔ جو طائف کے نواح میں تھا۔ بہر حال اصلی قبیلہ جنوب ہی

میں سکونت پذیر رہا تھا۔ اسلام سے اس کے ابتدائی تعلقات کے بارے میں ہمیں زیادہ معلومات نہیں ہیں۔ غالباً فتح مکہ کے بعد ان میں اسلام کی تبلیغ شروع ہوئی تھی، اور ۱۰ھ/ ۶۳۱ء تک ان میں معتد بہ مسلم آبادی ہو گئی تھی ابن سعد کے بیان کے مطابق ان کا ایک وفد جو متعدد اشخاص پر مشتمل تھا ۱۰ھ کے آغاز اور ۶۳۱ء کے وسط میں آیا تھا جنہوں نے اسلام کے قبول کرنے کا اظہار کیا تھا۔[۱۷] اس قبیلہ کے انفرادی اور گروہوں میں قبول اسلام کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں تاہم متعدد خثعمیوں کے مکہ میں مسلمان ہونے کے واقعات ضرور مذکور ہیں۔ خیال یہ ہے کہ یہ قبیلہ بھی جلد ہی مسلمان ہو گیا تھا کیونکہ اس کے ارتداد میں شمولیت و شرکت کے بارے میں بھی ماخذ خاموش ہیں اور یہ اس کے مسلمان ہونے کا ایک بالواسطہ ثبوت ہے

(د) ہمدان

ہمدان بھی ماہرین انساب کے مطابق بجیلہ اور خثعم کے خون کے رشتہ دار اور عزیز تھے۔ لیکن ان دونوں سے ان کے تعلقات کشیدہ اور ناشگفتہ بہ تھے۔[۱۸] اس کے ایک ابتدائی مسلم حضرت قیس بن مالک بن سعد تھے۔ جنہوں نے ہجرت سے کافی پہلے مکی عہد میں اسلام قبول کر لیا تھا۔ روایات کی تواتر کے ساتھ شہادت ہے کہ وہ اپنے قبول اسلام کے بعد واپس اپنے علاقے میں چلے گئے تھے اور انہوں نے ہمدان کے لوگوں میں ایک نومسلم کے جوش و ولولے اور لگن سے تبلیغ کی تھی اور بالآخر اس کے کئی گھرانوں کو مسلمان بنا لیا تھا۔[۱۹] ابن حزم کے مطابق اس کے ایک اور مسلم صحابی حضرت ضمام بن زید تھے جن کا تعلق اس کے ایک گھرانے بنو الحارث سے تھا۔[۲۰] ہمدان کا قبیلہ ۱۰ھ/ ۶۳۱ء کے لگ بھگ پورا مسلمان ہو گیا تھا کیونکہ کم از کم اس کی تین شاخوں کے بارے میں یہ روایت ہے کہ ان میں مسلمانوں کی خاصی بڑی تعداد موجود تھی: بنو الحارث تو تقریباً پورے مسلمان ہو چکے تھے اور حضرت مالک بن نمط کو ان کا مقامی سردار و منتظم مقرر کیا گیا تھا دوسرا گھرانا بنو شاکر کا تھا جس کی ریاست و قیادت حضرت عامر بن شہر کو عطا کی گئی تھی۔ اور تیسری شاخ تھی۔ بنو ارحب کی جس میں کافی مسلمان تھے اور جس کے سردار حضرت قیس بن مالک تھے۔[۲۱]

ابن حزم نے ہمدان کے ایک غیر معروف گھرانے بنو ربیعہ بن مالک کے ایک مسلم کا نام شکل بن حمید بتایا ہے اور بنو ارحب کے ایک اور مسلم کا قیس بن نمط جن کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کتاب (نامۂ مبارک) عطا فرمایا تھا۔[۲۲]
مجموعۃ الوثائق نے ہمدان کے کم از کم پندرہ گھرانوں میں کافی مسلم آبادی کا ذکر کیا ہے[۲۳] رُعین، معافر اور ہمدان کے اقیال (حکمرانِ اوّل) کے نام عام طور سے اور رُعین کے حکمران کے نام خاص طور سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خطوط ارسال فرمائے تھے۔ ان سے ان قبیلوں میں بڑے پیمانے پر قبولِ اسلام کا ثبوت ملتا ہے[۲۴] غالباً سرداروں اور اقیال نے اسلام قبول کرنے میں پہل کی تھی۔ اور ان کی رعایا نے ان کی تقلید کی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو مزید خطوط جو مرّان کے سردار حضرت عمیر اور مسلمانانِ ہمدان کے نام ہیں ثابت کرتے ہیں کہ غزوہ تبوک سے واپسی کے بعد ۹ھ کے اواخر میں ان لوگوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔[۲۵] طبری کا واضح بیان ہے کہ ۱۰ھ/ ۶۳۱ء میں حضرت علی کی مہم کے نتیجہ میں ہمدان کے باقی ماندہ لوگوں

نے ایک ہی دن میں اسلام قبول کر لیا تھا[۲۶]"

(س)، حِمیَر

حمیر کا قبول اسلام ہمدان کے لوگوں کے قبول اسلام کا ایک طرح سے تتمہ و تکملہ تھا۔ مآخذ کا بیان ہے کہ حمیر کے بادشاہوں (ملوک اور اقیال)، حضرت حارث بن عبد کلال، حضرت نعیم بن عبد کلال اور حضرت زرعہ ذو یزن نے متعدد دوسرے اقیال کے علاوہ حضرت مالک بن مرارہ رہاوی کو اپنا سفیر بنا کر خدمت نبوی میں بھیجا۔ موصوف ایک وفد کے ساتھ رمضان ۹ھ دسمبر ۶۳۰ء میں مدینہ منورہ پہنچے اور بارگاہ نبوی میں نہ صرف اقیال اور حکمرانوں بلکہ حمیر کے تمام لوگوں کے قبول اسلام کا اقرار و اعلان کیا[۲۷]" واقدی کے بیان سے بھی اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ متعدد اقیال حمیر نے اپنے اپنے سفیر دربار رسالت میں خود بھیجے تھے۔ اور اپنے لوگوں کے قبول اسلام کا دعویٰ پیش کیا تھا۔ ان کی درخواست پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد بن سعید اموی کو ان کے حلقے کا مرکزی منتظم، مبلغ اور معلم بنا کر بھیجا تھا جنہوں نے صنعا میں رہ کر ان کی تعلیم و تربیت کی تھی[۲۸]" ابن سعد کا بیان ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کم از کم دو دو قاصد اور سفیر و حاکم بھیجے تھے۔ یہ تھے حضرات عیاش بن ربیعہ اور اقرع بن عبد اللہ حمیری[۲۹]۔ موخر الذکر صحابی غالباً قبیلہ حمیر کے ایک ابتدائی مسلمان تھے اور قیاس یہ ہے کہ وہ خود اقیال کے طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان دونوں کو رُدّو اور مراآن کے سرداروں اور حمیر کے عوام کے پاس دو مکتوبوں کے ساتھ بھیجا گیا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خطوط و فرامین میں ان کے غیر مشروط اور پرخلوص اسلام کی تعریف و توصیف فرمائی تھی اور ان کو اسلام کے بنیادی اصول کی تعلیم بھی دی تھی[۳۰]۔ یہ حقیقت بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ ہمدان اور حمیر کے لوگ اور ان کے حکمران اپنی مرضی اور آزادی سے اسلام کے حلقہ بگوش بنے تھے اور ان کو مسلمان بنانے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یا آپ کے فرستادہ مبلغین کو کوئی خاص کوشش نہیں کرنی پڑی تھی۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جنوبی عرب میں خود وہاں کے مبلغین اور مسلمان اپنے مذہب کی تبلیغ و اشاعت کے لئے زمین ہموار کر کے ان کو اسلام کی حقانیت و صداقت کا معترف بنا چکے تھے اور ذرا سی کوشش نے ان کو امت اسلامی کا مخلص اور ثابت قدم رکن بنا دیا تھا۔ اس بنا پر یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ حمیر اور ہمدان کے تمام لوگ ردہ کے زمانے میں اسلام پر ثابت قدم اور اسلامی ریاست کے وفادار رہے تھے۔

(ط) مَذحِج

مذحج جنوبی عرب کا غالباً سب سے بڑا قبیلہ تھا وہ ایک قبیلہ کے بجائے متعدد قبیلوں کا مجموعہ تھا کیونکہ اس کے متعدد و مختلف بطون بجائے خود قبیلے بن گئے تھے۔ ان میں عنس، مراد، سعد العشیرہ، جعفی، زبید اور اود وغیرہ شامل تھے پھر سعد العشیرہ کے خاصے اہم بطون رکھرات سے تھے[۳۱]" ان میں سے کچھ گھرانوں کا اسلام سے تعارف مکی عہد قدیم میں ہی ہو گیا

تھا۔ جبکہ بعض دوسرے فتح مکہ تک منتظر رہے تھے۔ مذحج کے مکہ والوں سے خاصے قریبی تعلقات تھے اور ان کے بہت سے افراد مکہ میں بس گئے تھے۔ ان "مہاجرین" نے اکثر و بیشتر اسلام قبول کر لیا تھا اور وہ بھی آغاز عہد اسلامی میں۔۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد ممتاز صحابہ کرام جیسے حضرات یاسرؓ، ان کی اہلیہ سمیہؓ، ان کے تین فرزند عمارؓ، حُرَیث اور عبد اللہؓ، اس قبیلہ کے گھرانے بنو عنس کے قدیم ترین مسلمان تھے[۴۲]۔ لیکن چونکہ ان لوگوں نے اپنا قبیلہ اور علاقہ چھوڑ کر مکہ میں گھر بنا لیا تھا۔ لہذا ان کے اسلام کا ان کے اصل قبیلہ پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔ اسی طرح زُبَید کے ایک گھرانے کے افراد جن کا تعلق حضرت مَحْمِیَہ بن جزء زبیدی کے خاندان سے تھا۔ مکی عہد قدیم میں مسلمان ہو گئے تھے[۴۳]۔ وہ بھی مکہ کے باسی اور قریش کے خاندان بنو جُمَح کے حلیف تھے۔ جبکہ حضرت عمار بن یاسر عنسی کا گھرانا بنو مخزوم کا حلیف تھا۔

اگر مکہ کے باسی مذحجی باشندوں کے قبول اسلام کا اثر مذحج کے اصل قبیلہ پر نہیں پڑا تھا۔ تو ان کے اپنے نمائندے مکہ سے اسلام کی سوغات لیکر گئے تھے۔ ذکر آ چکا ہے کہ قبائل عرب کے زائرین مکہ میں خانہ کعبہ کی زیارت اور طواف کے لئے سال بھر آتے رہتے تھے۔ ایسی ہی کسی زیارت کے دوران سعد العشیرہ کے ایک شخص مسلمان ہو گئے اور جب مکہ سے وطن لوٹے تو وہ اسلام کے علمبردار و مبلغ تھے۔ ان کی انتھک اور مسلسل کوششوں سے سعد العشیرہ میں اسلام کے قدم جم گئے[۴۴]۔ لیکن ان کوششوں کے باوجود مذحج اور اس کے اہم بطون کافی طویل مدت تک بطور قبیلہ اسلام کے دائرے کے باہر ہی رہے۔ بہر حال وہ ۱۰ھ میں حضرت علی بن ابی طالب ہاشمی اور حضرت خالد بن ولید مخزومی جیسے مبلغین اسلام کی دعوت و تبلیغ کے بعد مسلمان ہوئے تھے[۴۵]۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مذحج کے قبیلوں اور خاندانوں کے قبول اسلام کا جائزہ الگ الگ خاندانوں کے اعتبار سے لیا جائے۔

(۱) بنو عنس

عنس کے کچھ افراد اگرچہ آغاز کار ہی میں اسلام سے مشرف ہو چکے تھے۔ لیکن جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ اصل قبیلہ اسلامی امت کا رکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے آخری برس میں بنا تھا۔ بنو عنس کے انفرادی اور اجتماعی قبول اسلام کی مثالیں کمیاب ہیں۔ لیکن یہ امر کہ ان کا ایک وفد حضرت ربیعہ کی قیادت میں بارگاہ نبوی میں حاضر ہوا تھا اور اپنے اسلام کا اقرار کیا تھا۔ ان کے قبول اسلام کی طرف اشارہ کرتا ہے[۴۶]۔ کچھ مدت کے بعد ایک مرکزی منتظم اور عامل صدقات صنعا بھیجا گیا تھا۔ جہاں بنو عنس آباد تھے[۴۷]۔ یہ ان کے اسلام کا ایک اور ثبوت ہے۔ لیکن بعض جدید مؤرخین عہد نبوی میں عنس اور مذحج کے قبول اسلام کے سرے سے منکر ہیں اور ان کی واحد دلیل یہ ہے کہ اسود عنسی نے حیات نبوی میں ہی نبوت کا دعویٰ کیا تھا اور مدینہ کی اسلامی ریاست کے خلاف مذحج ہی کے ایک طبقہ کے تعاون اور مدد سے بغاوت کر دی تھی[۴۸]۔ لیکن ان کا یہ نظریہ واقعات و حقائق کی روشنی میں ثابت نہیں ہوتا ہے۔ ان مستشرقین اور جدید مؤرخین کو بھی اعتراف ہے کہ اسود عنسی اور اس کی بغاوت کا خاتمہ حیات نبوی ہی میں خود اسی کے لوگوں نے یمن کے ایرانی

باشندوں کی مدد سے کر دیا تھا اور اسلامی ریاست کی حکمرانی پھر سے قائم کر دی تھی۔ اسود عنسی کا خاتمہ کرنیوالے اور مدینہ منورہ کی حکومت کو پھر سے قائم کرنے والے ظاہر ہے کہ مسلمان تھے۔ اس سلسلے میں اہم ترین نکتہ یہ ہے کہ خود اسلامی ریاست و حکومت نے اس بغاوت کو کچلنے کے لیے کوئی فوج نہیں بھیجی تھی۔ مآخذ سے واضح ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد وفادار مسلمانوں کے طبقات اور ان کے سرداروں کو خطوط لکھے تھے اور انکو اسود عنسی کا خاتمہ کرنے اور اس کی مرکز مخالفت تحریک کو کچلنے کا حکم دیا تھا۔ اور انہوں نے اس کی بجان و دل تعمیل کی تھی۔ لہٰذا اطلاعات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مذحج اور عنس میں خاصا طاقتور طبقہ مسلمانوں پر مشتمل تھا۔ جو عارضی طور سے اسود عنسی کی بغاوت اور اقتدار سے معطل ہو گیا تھا۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اس کے حامیوں نے یمن کے مسلمان گورنر حضرت شہر بن باذان کو قتل کر کے حکومت پر قبضہ کر لیا تھا۔ لیکن جونہی مسلم طبقات اس عارضی صدمے سے سنبھلے اور ان کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خطوط و فرامین نے بھی سنبھلنے میں خاصی مدد دی تھی، انہوں نے بیک آن وحملہ اسود عنسی اور اس خطرہ کا خاتمہ کر کے اسلام کی حکمرانی کو پھر سے حیات تازہ عطا کر دی[۹۳]۔

(۲) بنو مراد

مراد کے لوگ بھی مذحج کے دوسرے خاندانوں کی مانند کافی بعد کے زمانے میں غالباً حضرت علی بن ابی طالب ہاشمی کی مذکورہ بالا مہم یمن کے بعد ہی اسلام کے ماننے والے بنے تھے۔ طبری کا یہ بیان خاصا اہم ہے کہ ہمدان کے قبول اسلام کے بعد یمن کے باقی خاندانوں اور قبیلوں نے اسلام قبول کرنے میں خاصی تیزی دکھائی تھی[۹۴]۔ طبری ہی کا دوسرا بیان ہے کہ مراد کے ایک طاقتور ترین سردار حضرت فروہ بن مُسیک مرادی نے ۱۰ھ / ۶۳۱ء میں بارگاہ نبوی میں حاضری دی تھی اور انہوں نے نہ صرف اپنے اسلام کا اعلان و اقرار کیا تھا۔ بلکہ اپنے قبیلہ کی جانب سے بھی ذمہ داری قبول کی تھی یا اس کے قبول اسلام کی یقین دہانی کرائی تھی[۹۵]۔ لیکن ہمارے بعض متشکک پسند جدید مستشرقین کا خیال ہے کہ حضرت فروہ بن مسیک مرادی کا قبول اسلام اپنے ابتدائی زمانے میں محض ایک سیاسی مفاہمت تھی اور مدینہ کی اسلامی ریاست سے صرف ایک سیاسی اتحاد کیونکہ ان کے اپنے حلیف کندی بادشاہوں نے مراد اور ہمدان کے درمیان باہمی خانہ جنگی میں ان کے قبیلہ کی مدد نہیں کی تھی اس لیے وہ ہمدان اور اپنے دوسرے حریفوں کے خلاف اسلامی ریاست کی امداد و اعانت اور سیاسی اتحاد کے ذریعہ اپنی طاقت کو مستحکم کرنا چاہتے تھے[۹۶]۔ اگر یہی سیاسی صورتحال تھی اور ان کا قبول اسلام محض ایک سیاسی اتحاد تھا تو ان کے حریف و رقیب قبیلہ کو تو مخالف گروہ یا اتحاد میں ہونا چاہیئے تھا یا کم از کم وہ خود اپنے دشمن کے سیاسی اتحادیوں سے اتحاد نہ کرتے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے حریف ہمدان بھی ریاست اسلامی کے حلیف، اتحادی اور وفادار بن چکے تھے۔ پھر فروہ بن مُسیک مُرادی کو اس اتحاد سیاسی سے کیا فائدہ پہنچ سکتا تھا، مستشرقین کی دلیلوں اور دعوؤں کا اندرونی تضاد ان کے خیال خام کی تردید کے علاوہ ثابت کرتا ہے کہ دونوں متحارب گروہوں کو پائیدار

امن کی تلاش تھی جوان کو بالآخر اسلام کے سایۂ عاطفت میں ملا اور وہ دونوں ہی اسلام کے حامی و ہمنوا اور ریاست اسلامی کے وفادار و اتحادی بن گئے۔ اس سے نہ صرف حضرت فروہ بن مسیک کے حسن اسلام کی توثیق ہوتی ہے۔ بلکہ ان کے قبیلے کے قبول و اخلاص اسلام کی بھی۔ دوسرے شواہد کے علاوہ [۴۳] اس حقیقت سے بھی مراد کے حسن و قبول اسلام کی تائید ہوتی ہے کہ ردّہ کے زمانے میں حضرت فروہ اور ان کے قبیلہ والے نہ صرف اسلام پر ثابت قدم رہے تھے بلکہ انہوں نے اسود عنسی کی تحریک بغاوت کو کچلنے میں کلیدی کردار ادا کیا تھا [۴۴] انہی مآخذ کا یہ بھی بیان ہے کہ حضرت فروہ بن مسیک مرادی کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے قبیلہ مراد کے علاوہ زبید اور پورے مذحج کا مقامی منتظم اور عامل صدقات مقرر کر دیا تھا اور وہ پوری دیانت داری خلوص اور لگن کے ساتھ صدقات مدینہ بھیجتے رہے تھے اور ان سچے اور پکے مسلمان امراء میں سے تھے جنہوں نے ردّہ کے پرہول زمانے میں بھی اپنے فرائض سے غفلت نہیں برتی تھی، یہ بات قابل ذکر ہے کہ وہ اپنے ان عہدوں پر خلافت فاروقی کے اواخر تک فائز رہے تھے [۴۵]

(۳) سعد العشیرہ

ذکر آچکا ہے کہ سعد العشیرہ اسلام سے مکی عہد قدیم ہی میں متعارف ہو چکے تھے۔ ابن حزم نے ان میں متعدد صحابہ کرام کا ذکر کیا ہے جن کا تعلق ان کے متعدد بطون اور گھرانوں سے تھا۔ حضرت مالک بن مشوف بنو عائذ کے سردار (رئیس) تھے۔ ان کے علاوہ حضرت عبید بن حزن وغیرہ کئی مسلمانوں کا ذکر اس گھرانے میں ملتا ہے [۴۶]

جعفی

سعد العشیرہ کا نسبتاً ایک بڑا گھرانا تھا۔ جن میں اسلام ان کے اصل قبیلہ کے ساتھ ہی آیا تھا۔ ابن حزم نے اس خاندان کے متعدد مسلمانوں کا ذکر کیا ہے جو اپنے علاقہ کے ممتاز و سربرآوردہ حضرات تھے۔ ان میں سے متعدد نسبتاً ابتدائی دور کے مسلمان تھے۔ ان میں حضرت قیس بن سلمہ بن شراحبیل جو جعفی وفد کے ایک رکن تھے اور مدینہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کر چکے تھے۔ ابو سبرہ بن زید اور ان کے دو فرزند گرامی سبرہ اور عبدالرحمٰن ممتاز مقام کے حامل تھے [۴۷] یہ ان جعفی مسلمانوں کے علاوہ تھے جو مدینہ ہجرت کر کے جا چکے تھے اور جنہوں نے غزوہ بدر میں شرکت کی سعادت حاصل کی تھی۔ یہ دراصل قریش مکہ کے حلفاء میں سے تھے۔ ان میں حضرت ابو خولی کے تین فرزند گرامی خولی، ہلال اور عبداللہ بدری صحابی تھے۔ ابن سعد نے اگرچہ بدری صحابہ کی فہرست میں صرف حضرت خولی کو شمار کیا ہے۔ تاہم اس کے بیان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ابو خولی کا پورا گھرانا جو متعدد افراد پر مشتمل تھا ابتداء عہد نبوی ہی میں اسلام لا چکا تھا [۴۸] بہرحال اصل قبیلہ میں فتح مکہ کے بعد ۹ھ / ۶۳۰ء میں یا اس کے بھی کچھ بعد حضرت قیس بن سلمہ جعفی کو مران، حریم اور کلاب کے قبیلوں اور ان کے موالی (حلیفوں) سے صدقات وصول کرنے کا افسر مقرر کیا گیا تھا [۴۹] ظاہر ہے کہ یہ سب لوگ اسلام لا چکے تھے۔

زبید

زبید کا قبول اسلام مذحج کے دوسرے خاندانوں یا مادر قبیلہ کی مانند حضرت علی بن ابی طالب ہاشمی کی مہم یمن کا نتیجہ تھا۔ جیسا کہ واقدی کا خیال ہے۔ اس کے مطابق زبید کا ایک خاصا بڑا حصہ مسلمان ہو گیا تھا اور انہوں نے اپنے ذمہ واجب الادا صدقات ادا کر دیئے تھے۔ اس سے زیادہ واقدی کا یہ جملہ دلچسپ ہے کہ تقریباً تمام کے تمام زبیدی حضرت علی سے قرآن کریم اور دین کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے ان کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تھے۔[۵۰] اپنے قبول اسلام کے بعد انہوں نے ایک وفد جو دس آدمیوں پر مشتمل تھا۔ عمرو بن معدی کرب کی قیادت میں بارگاہ رسالت میں مدینہ بھیجا تھا۔ اس وفد نے اپنے مسلمان ہونے کا اقرار و اعلان کیا تھا اور اسلامی ریاست سے مکمل وفاداری کا حلف اٹھایا تھا۔[۵۱]

زبید کا ایک طبقہ جو قیس بن مکشوح کی قیادت میں تھا۔ بہرحال کافی مدت تک اسلام کے دائرے سے خارج رہا۔[۵۲] یہ بات قابل ذکر ہے کہ عمرو بن معدی کرب کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی عہدہ نہیں عطا فرمایا تھا۔ حالانکہ وہ اپنے قبیلہ کے ایک سردار تھے۔ ذکر آ چکا ہے کہ زبید کے لئے بھی مراد کے ایک شخص کو عامل صدقات مقرر کیا گیا تھا۔ عمرو بن معدی کرب وطن لوٹ آئے تھے اور وفات نبوی کے بعد نہ صرف مرتد ہو گئے تھے۔ بلکہ انہوں نے ردہ تحریک میں خاصا مؤثر اور فعال کردار بھی ادا کیا تھا۔[۵۳] ان کے ارتداد کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ پورا قبیلہ اسلام سے پھر گیا تھا۔ جیسا کہ مستشرقین نے نتیجہ نکالا ہے یہ صحیح ہے کہ ان کے زیر اثر لوگوں نے ارتداد میں حصہ لیا تھا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کے قبیلہ کے زیادہ لوگوں نے ان کی مخالفت کی تھی اور مدینہ کے نمائندے اور منتظم و عامل صدقات حضرت فروہ بن مسیک مرادی کی مدد کی تھی۔ یہ قابل ذکر بات ہے کہ انہوں نے اپنے ہی بھائی بندوں کے خلاف، اسلامی ریاست کی امداد و اعانت کی تھی اور یہ ان کے خلوص اسلام کی ایک عظیم و روشن دلیل تھی اور اس سے زیادہ اہم یہ بات ہے کہ حضرت عمرو بن معدی کرب پھر اسلام لے آئے تھے

رہاء

رہاء مذحج کا ایک اور اہم قبیلہ تھا اور وہ بھی حیات نبوی کے آخری برس میں اسلام کا حلقہ بگوش بنا تھا۔ انہوں نے اسلام اور اسلامی ریاست سے وفاداری کے اظہار کے لئے متعدد آدمیوں (نفر) پر مشتمل ایک وفد بارگاہ نبوی میں بھیجا تھا[۵۴]، ماخذ کے ایک تبصرہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رہا ء کے لوگ اشعر کے پڑوسی تھے۔ اور ان کے اسلام کے زیر اثر کچھ رہاوی افراد بھی مسلمان ہو گئے تھے چنانچہ تین رہاوی صحابیوں کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اشعریوں کے ساتھ خیبر کی پیداوار سے حصہ عنایت فرمایا تھا۔[۵۵] عام خیال ہے کہ یہ حصہ ان کو سنہ ۱ھ میں مدینہ آنے پر دیا گیا تھا۔ لیکن اشعریوں کے ساتھ ان کو شامل کرنے سے یہ خیال زیادہ قوی معلوم ہوتا ہے کہ وہ تینوں ابتدائی مسلم تھے۔ جو حضرت ابو موسیٰ اشعری کی تبلیغ و دعوت پر اسلام لائے تھے اور پھر انہی کے ساتھ مدینہ ہجرت کر گئے تھے۔ بہرحال اس قبیلہ / خاندان کے سب سے نمایاں صحابی بلا شک و شبہہ

حضرت مالک بن مرارہ رہاوی تھے۔ جن کا پہلے ذکر آچکا ہے۔ ابن حزم نے دو اور رہاوی مسلمانوں حضرات عمرو بن سُبَیع اور یزید بن شجرہ کے نام بھی صحابہ کرام میں شمار کئے ہیں۔ ان میں سے اول الذکر اپنے قبیلہ کے وفد میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کے لئے مدینہ گئے تھے۔ جبکہ مؤخر الذکر صحابی کا ذکر حضرت معاویہ کے حامی صحابہ میں کیا گیا ہے۔ جو صفین کی جنگ میں شریک تھے [۵۶]

صُداء

مذحج کا ایک بڑا قبیلہ / بطن صنحم صداء تھا۔ اور ابن سعد کے مطابق اس نے بھی اسلام اپنے مادر قبیلہ کے ساتھ قبول کیا تھا، اگرچہ اس کے کسی مسلمان کا نام مؤرخ موصوف نے نہیں بیان کیا ہے۔ بہر حال اسد الغابہ سے کم از کم ایک صحابی حضرت حِبّان بن بُحّ کا ذکر ملتا ہے جن کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے مقامی قبیلہ کا عامل صدقات مقرر کیا تھا۔ لیکن انہوں نے اس کار منصبی کا اپنے کو اہل نہیں سمجھا تھا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے معذرت کر لی تھی [۵۷]

نخع

نخع بھی مذحج کا ایک کافی بڑا بطن / خاندان تھا۔ وہ اسلام کا حلقہ بگوش اپنے مادر قبیلہ کے ساتھ ۱۰ھ / ۶۳۱ء میں بنا تھا یہ اہم بات ہے کہ مآخذ اس کے وفد کی آمد مدینہ کی بالکل متعین تاریخ بیان کرتے ہیں۔ ان کے مطابق نخعی وفد غالباً سب سے آخری تھا۔ جو مدینہ میں ۱۵ محرم ۱۱ھ / ۱۰ اپریل ۶۳۲ء میں پہنچا تھا۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ حضرت ارطاۃ بن شراحیل اس کے قائد تھے۔ مگر طبری کا خیال ہے کہ حضرت زُرارہ بن عمرو اس کے سربراہ تھے [۵۸]۔ یہ امکان ہے کہ نخع نے دو وفود بارگاہ نبوت میں بھیجے ہوں جیسا کہ بعد کے ایک ماخذ سے محسوس ہوتا ہے [۵۹]۔ یہ بات ذہن نشین کرنے کے قابل ہے کہ نخع کے وفد کے ارکان کی تعداد دو سو نفوس سے زیادہ تھی اور یہ ان کے قبول اسلام بلکہ مکمل قبول اسلام کا ایک بڑا ثبوت ہے۔ اگرچہ نخعی مسلمانوں کے زیادہ نام مآخذ میں مذکور ہیں۔ تاہم ان کے متعدد مسلمانوں کا ذکر ملتا ہے ان میں سے حضرات جُہیش بن یزید، ارقم بن کعب، زرارہ بن قیس اور قیس بن عمرو کافی ممتاز لوگ تھے [۶۰]، مگر مونٹگمری واٹ کو اصرار ہے کہ وہ سب عیسائی تھے۔

بنو الحارث بن کعب

بنو الحارث بن کعب بھی مذحج کے ایک بطن کی حیثیت رکھتے تھے۔ اور خاصے بڑے قبیلے کے لوگ تھے اور ایک آزاد قبیلہ بن گئے تھے۔ ان کا ایک ذیلی خاندان بنو عبد المدان تھا جو بجائے خود قبیلہ تھا۔ جنوبی عرب میں ان دونوں مذحجی گھرانوں کو ممتاز مقام حاصل تھا [۶۱]۔ یہ بات اہم اور دلچسپ بھی ہے کہ بنو مذحج میں بنو الحارث بن کعب عام طور سے اور بنو عبد المدان

خاص طور سے پہلے قبائل یا بطون تھے جنہوں نے اسلام میں سبقت کی تھی۔ دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ ان دونوں خاندانوں نے حضرت خالد بن ولید مخزومی کی دعوت و تبلیغ پر اسلام قبول کیا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد کو حضرت علی بن ابی طالب کی مہم یمن سے کوئی چھ ماہ پہلے بھیجا تھا جو عموماً نجران کی مہم کہلاتی ہے۔ یہ کوئی فوجی مہم نہیں تھی بلکہ مذہبی جماعت تھی جو تبلیغ اسلام کی خاطر بھیجی گئی تھی۔ روایات کا اتفاق ہے کہ پورا قبیلہ بنو الحارث معہ بنو عبد المدان کے حضرت خالد کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوا تھا۔ ہدایات نبوی کے مطابق حضرت خالد نے کافی طویل عرصے تک ان کے بیچ قیام کیا تھا اور ان کو دین کی تعلیم دی تھی اور ان کی پاکیزہ تربیت بھی کی تھی۔ پھر مدینہ سے آنے والی نئی ہدایات کے مطابق حضرت خالد بن ولید مخزومی نے ان کے سربرآوردہ لوگوں پر مشتمل ایک وفد بارگاہ نبوی میں بھیجا تھا جہاں انہوں نے اپنے اسلام کا پھر سے اقرار کیا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد بن ولید مخزومی کی پرخلوص، انتھک اور کامیاب کوششوں کی تعریف و تحسین فرمائی تھی[۶۲]۔ ہمارے مسلم مؤرخین اس روایت کو عموماً نظر انداز کر دیتے ہیں اور حضرت خالد بن ولید پر ناکامی کا الزام بھی اس لئے تھوپ دیتے ہیں کہ وہ یمن میں اشاعتِ اسلام کا سارا شرف حضرت علی بن ابی طالب کو دینا چاہتے ہیں[۶۳]۔ بہرحال کچھ مدت بعد وفد کے ایک ممتاز رکن حضرت قیس بن حصین کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ کا مقامی منتظم اور سردار مقرر کیا تھا[۶۴]۔ یہ بطن یا خاندان خاصا بڑا تھا کیونکہ اس کے متعدد ذیلی گھرانوں جیسے بنو الضب، بنو قنان، بنو عبد یغوث، اور بنو زیاد وغیرہ کے نام ملتے ہیں۔ بہرحال یہ سب گھرانے بھی عہد نبوی ہی میں مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے[۶۵]۔

خولان

خولان کا اگرچہ مذحج سے نسبی تعلق نہیں تھا۔ لیکن وہ دوسرے سماجی اور معاشی اسباب سے مذحج ہی سے وابستہ تھا۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ خولان کا اصلی قبیلہ اور اس کی تمام ذیلی شاخیں ۱۰ھ سے پہلے یعنی ۱۰ھ کے نصف ثانی میں اسلامی امت کی رکن بن گئی تھیں۔ اس سال شعبان میں ان کے دس سربرآوردہ و ممتاز افراد پر مشتمل ایک وفد بارگاہ نبوی میں پہنچا تھا۔ جس نے اپنے اسلام کے اظہار و اقرار کے علاوہ اپنے قبیلہ کی جانب سے بھی دعویٰ کیا تھا[۶۶]۔ یہ بڑی عجیب بات ہے کہ مآخذ اس قبیلہ میں اسلام کی تبلیغ و ترویج کی رفتار، نہج اور انداز وغیرہ سے متعلق تفصیلات کو نہیں بیان کرتے ہیں۔ لیکن ردہ کے زمانے میں ان کے ایمان و عقیدے کی مضبوطی، اسلام سے غیر متزلزل وفاداری اور اسلامی حکومت و ریاست کی بیش بہا خدمات کے لئے "ان کی بے انتہا تعریف و توصیف کرتے ہیں"[۶۷]۔ بہرحال اس سے بالواسطہ اور مضمر انداز میں بھی یہ تو معلوم و ثابت ہو جاتا ہے کہ خولان کے تمام خاندان اور گھرانے عہدِ نبوی ہی میں اسلام کے حلقہ بگوش بن گئے تھے۔ ان کے قبولِ اسلام کی ایک اور دلیل یہ ہے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے متعدد افراد کو خاص کر حضرت معدی کرب بن ابرہہ اور حضرت ابی مکوک بن عبد رضا کو قطائع (اراضی) کے عطیات عطا فرمائے تھے[۶۸]۔

(ع) نہد

نسبی اعتبار سے بنو نہد کا تعلق قبیلہ قضاعہ سے تھا۔ جو زمانہ جاہلیت میں کسی وقت شمالی عرب میں ہجرت کر گئے تھے اور مدینہ منورہ کے شمال میں جا بسے تھے لیکن بنو نہد کا خاندان جنوبی عرب کے اپنے روایتی علاقے میں مقیم رہا تھا وہ یمن میں نجران کے نواح میں آباد تھے اور اس طرح بنو الحارث بن کعب کے پڑوسی تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ نہد خود ایک قبیلہ بن گیا تھا جس کے اپنے متعدد و بطون / خاندان تھے۔[۶۹] نہد کے اصل قبیلے یا اس کے ذیلی خاندانوں کے قبول اسلام کے بارے میں ہمیں براہ راست معلومات نہیں ملتی ہیں۔ مگر جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے ان کے نام بعض خطوط و فرامین سے ان کے قبول اسلام خاص کر ان کے ایک خاندان بنو قُرَّہ کے حلقہ بگوش اسلام ہونے کا علم ہوتا ہے۔ ان خطوط میں نہد کے لوگوں کے لئے وہ تمام فرائض و واجبات بیان کئے گئے ہیں جو مسلمانوں پر ہی عائد ہوتے ہیں۔ مثلاً نماز قائم کرنا، صدقات بشمول زکوٰۃ ادا کرنا وغیرہ لیکن جو جملہ یا حکم نبوی ان کے مسلمان ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے وہ یہ کہ مشرکوں سے وہ کلی طور پر اجتناب کریں اور ان سے کسی قسم کا اختلاط نہ رکھیں۔ اس کے علاوہ مضمراً ہم ان کے بعض مسلمانوں کے نام سے بھی واقف ہوتے ہیں۔ ان کے قبولِ اسلام کا ایک اور ثبوت یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بعض افراد کو ان کے اپنے علاقے میں بعض قطائع عطا فرمائے تھے۔[۷۰]

(ف) ازد

دراصل ازد ایک بہت بڑے اور عددی لحاظ سے طاقتور قبیلہ کا نام تھا۔ جس کی متعدد شاخیں متعدد مقامات پر مختلف زمانوں میں آباد ہوتی رہی تھیں[۷۱] چنانچہ وہ اپنے علاقوں کی نسبت سے پکاری جاتی تھیں جیسے ازد یمن، ازد جُرَش، ازد عمان ازد شنوءہ وغیرہ، ان کی دو تین اہم شاخیں جنوبی عرب میں آباد تھیں۔ ان میں سے ازد جرش نجران کے عیسائیوں کے قریبی پڑوسی تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ موخر الذکر بھی نسبی لحاظ سے ازد ہی کی ایک شاخ تھے۔ ان کے علاوہ ازد یمن کی دوسری اہم شاخیں اور خاندان تھے، بنو غامد، بنو بارق اور بنو غافق وغیرہ

ہمارے مآخذ کا بیان ہے کہ سنہ ۱۰ھ / سنہ ۶۳۱ء تک ازد یمن کا اصل قبیلہ مع اپنی ذیلی شاخوں اور بطون کے اسلام کا حلقہ بگوش ہو گیا تھا۔[۷۲] ان کے سب سے پہلے مسلمان غالباً حضرت صُرَد بن عبداللہ ازدی تھے۔ جنہوں نے اپنے قبیلے کو مسلمان بنانے میں کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ اس کے کچھ مدت بعد وہ اپنے قبیلہ کے اسلام اور اسلامی ریاست سے وفاداری اور شرائط استواری کا اظہار کرنے کے لئے مدینہ منورہ کو ایک وفد لیکر گئے تھے۔ جس میں دس مسلم حضرات شامل تھے۔ انہوں نے صرف اپنے اسلام کا اعلان و اقرار نہیں کیا تھا بلکہ اپنے پورے خاندان کے اسلام کا اعلان و اقرار بھی کیا تھا۔ اسلام کے لئے ان کی شاندار خدمات کے عوض ان کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ کا سردار مقرر کر دیا تھا۔ اس اعترافِ خدمات اور اظہار پسندیدگی رسول نے ان میں

اسلام کی پرجوش تبلیغ کرنے کا ایک نیا ولولہ جوش اور جذبہ پیدا کر دیا تھا اور انہوں نے ازد جُرش کو مسلمان بنانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی، چنانچہ انہوں نے نہ صرف بقیہ ازد جرش کو بلکہ خثعم کے بھی ایک حصہ کو اسلامی امت کا مخلص رکن بنا دیا تھا" کچھ مدت بعد ازد جرش کا ایک اور وفد بارگاہ نبوی میں حاضر ہوا جس نے ان دونوں قبیلوں کے مکمل قبول اسلام کی تصدیق کی تھی۔ بعض اراکین وفد کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قطائع اور اراضی انہی کے علاقوں میں عطا فرمائی تھی۔ مذکورہ بالا تینوں خاندان /بنو غامد، بنو بارق اور بنو غافق...... نے اسلام قبول کر لیا تھا اور مدینہ منورہ کو اپنے وفود بھیجنے میں بڑی تیزی دکھائی تھی۔ ان کے اور بعض دوسرے ازدیوں کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو گرامی نامے عطا کئے تھے۔ ان کے متون سے واضح ہوتا ہے کہ وہ سب مسلمان ہو گئے تھے۔ ازد اور خاص کر اس کے خاندان بنو بارق کے بعض سربرآوردہ لوگ تھے حضرات ضماد، جُنادہ، ابو ذُبیان اور عمرو بن عبداللہ وغیرہ [۵۵]" ان کے نام خطوط نبوی سے ان کے قبول اسلام کے بارے میں کوئی شک و شبہہ نہیں رہ جاتا ہے۔

ازدیمن کے قبول اسلام پر بحث کے ضمن میں یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ اس کے صرف کافر و مشرک طبقات ہی نے اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ بلکہ نجران کے عیسائیوں اور یمن کے یہودیوں نے بھی یہ شرف حاصل کیا تھا، خواہ ان کی تعداد کتنی ہی مختصر کیوں نہ رہی ہو۔ واقدی کا دعویٰ ہے کہ یہود یمن کے عظیم عالم حضرت کعب الاحبار حضرت علی بن ابی طالب کی دوسری مہم کے دوران مسلمان ہو گئے تھے۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ حضرت کعب نے پھر دعوت کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر لے لی تھی۔ اور اپنے متعدد ہم مذہبوں کو مسلمان بنانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔[۵۶]" یہ بھی اہم نکتہ ہے کہ جزیرہ نمائے عرب سے جب یہود جلا وطن کئے گئے تھے، تو ان میں یہود یمن کا ذکر نہیں ملتا ہے، جبکہ نصاریٰ نجران کا واضح حوالہ موجود ہے۔

(ک) کندہ

ازد کی طرح کندہ کی بھی متعدد شاخیں جزیرہ نمائے عرب کے مختلف مقامات پر آباد تھیں۔ ان میں شمالی عرب کی شاخیں بھی تھیں اور جنوبی عرب کی بھی۔ ہم نے اپنے ایک مباحثے میں دومۃ الجندل کی کندی مملکت کے اسلامی ریاست سے مذہبی اور سیاسی تعلقات کا جائزہ پہلے ہی لے لیا ہے۔ بہر حال اصل قبیلہ معہ اپنی اہم شاخوں اور خاندان الزل (لطون) کے جنوب ہی میں آباد تھا جن میں بنو معاویہ، بنو وہب، بنو ربیش، بنو اشرس، بنو سکون اور سکاسک بڑے اور طاقتور خاندان تھے اور وہ یمن اور حضرموت کے متعدد مقامات پر آباد تھے[۵۷]"

جنوبی عرب کے دوسرے مقامات اور قبیلوں کی طرح قبیلہ کندہ میں بھی اسلام کی نشر و اشاعت کا آغاز فتح مکہ کے بعد ہی شروع ہو سکا، اگرچہ اس کے پہلے زمانے میں بعض انفرادی قبول اسلام کی مثالوں کے امکان کو قطعی طور سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے قبول اسلام کا اوّل قرینہ ان کے خاندان بنو سکون کے گھرانے بنو تجیب کے متعدد افراد پر مشتمل ایک وفد کے مدینہ میں آنے سے ملتا ہے۔ جو ۹ھ کے اول دنوں میں یا ۶۳۰ء کے وسط میں آیا تھا۔ ایک قابل ذکر اور اہم بات ان کے سلسلے

میں یہ ہے کہ انہوں نے نہ صرف زبانی طور سے اپنے قبول اسلام اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے وفاداری کا اظہار کیا تھا بلکہ عملاً مظاہرہ یہ کیا تھا کہ اپنی قوم پر واجب صدقات کی رقم اور جانور ساتھ لے کر مدینہ پہنچے تھے۔[۷۸] کچھ مدت کے بعد اصل قبیلہ کا وفد جس میں ساٹھ ستر ارکان تھے۔ اپنے عظیم ترین اور بااقتدار ترین سربراہ و سردار حضرت اشعث بن قیس کندی کی قیادت میں حاضر ہوا تھا۔[۷۹] ان کے قبول اسلام اور وفاداری کا یقین ہو جانے پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے قبیلے بنو کندہ اور صدلیف کے لیے ایک مرکزی سردار و منتظم اور عامل صدقات مقرر فرمایا تھا۔ موخر الذکر قبیلے نے بھی اس زمانے میں اسلام قبول کیا تھا اور اپنا وفد مدینہ بھیجا تھا۔ محمد بن حبیب بغدادی کے مطابق ان پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مہاجر بن امیہ کو عامل و امیر مقرر کیا تھا۔ اور موصوف نے ان کے صدقات وصول کر کے مدینہ پہنچائے بھی تھے۔[۸۰]

ابن حزم نے کندہ کے گھرانے بنو معاویہ کے چھ صحابہ کا ذکر کیا ہے: حضرات اشعث بن قیس، ان کے بھائی سیف بن قیس جو اس وفد کی زیارت کے دوران اپنے قبیلہ کے مؤذن بھی مقرر کئے گئے تھے۔ ابراہیم بن قیس، شرحبیل بن سمط، حجر بن عدی اور شریح بن مرۃ۔ بنو وہب کے صحابہ کرام میں جو بنو معاویہ کی ایک ذیلی شاخ تھی اور حضر موت میں آباد تھی۔ کم از کم دو حضرات یزید اور ان کے والد اسود بن سلمہ کا ذکر ملتا ہے۔ بنو معاویہ ہی کے ایک اور گھرانے بنو شیطان میں، جن کا نام بعد میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو عبد اللہ رکھ دیا تھا۔ کم از کم تین صحابیوں کا ذکر ملتا ہے وہ تھے: حضرات سائب بن یزید، کثیر بن صلت، امرالقیس بن عابس۔ موخر الذکر صحابی کی بے انتہا تعریف و توصیف ان کے ان شاندار کاموں کے لیے کی گئی ہے جو انہوں نے ردہ کے زمانے میں اسلام کے لیے انجام دیے تھے۔ خاندان بنو تجیب کے صرف ایک صحابی حضرت معاویہ بن حدیج کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ بنو تجیب ردہ کے زمانے میں زیادہ تر وفادار مسلمان رہے تھے۔[۸۱]

اگرچہ سکاسک اور سکون کے بعض خاندانوں نے شمال میں نقل وطن کر کے بستیاں بسا لی تھیں۔ تاہم ان کے تمام اہم خاندان اور گھرانے جنوب میں مقیم و آباد رہے تھے اور وہ بھی غالباً فتح مکہ کے بعد کسی وقت مسلمان ہوئے تھے۔ ۹ھ / ۶۳۱ء میں ان کے ایک خاندان بنو غوث کے ایک مسلم حضرت عکاشہ بن ثور کا ذکر ملتا ہے کہ وہ ان پر مقامی منتظم اور عامل صدقات مقرر کئے گئے تھے۔[۸۲]

(ل) حضر موت / حضارمہ

ماہرین انساب کے مطابق حضر موت یقطان کے ایک بیٹے اور قحطان کے ایک بھائی کا نام تھا۔ بنو حضر موت یمن کے جنوب مشرق میں جزیرہ نمائے عرب کے بالکل آخری گوشے میں بستے تھے۔ جو بعد میں انہی کے نام سے منسوب ہو گیا۔[۸۳] اس قبیلہ / علاقہ کے سب سے پہلے مسلمان حضرت علاء بن حضرمی تھے[۸۴] دوسرے شریح حضرمی تھے۔[۸۵] لیکن وہ اپنے علاقہ کو چھوڑ کر مکہ یا مدینہ میں آباد ہو گئے تھے۔ اس لیے بنیادی طور پر ان کا اسلام ان کے قبیلہ کا نہیں تھا۔ اور

نہ ہی ان کے اسلام کا اثر ان کے قبیلے پر پڑا تھا۔ بہر حال اصل قبیلہ میں اسلام کی اشاعت بعد کے زمانے میں ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسلامی امت کے رکن قبیلہ کندہ کے ساتھ بنے تھے کیونکہ وہ ان کے پڑوسی تھے۔ ابن حزم کے مطابق حضرت وائل بن حجر اور حضرت ربیعہ بن حیدان حضر موت کے سر برآوردہ ترین لوگوں میں سے تھے جو اسلام سے مشرف ہوئے تھے[۸۶]۔ تین مزید صحابہ۔ حضرات ربیعہ بن ذی المرحب، ربیعہ بن لہیعہ اور مسعود بن وائل ..... کے نام بھی اسی زمانے کے مسلمانوں میں گنائے جاتے ہیں[۸۷]۔ بہر حال حضرت وائل بن حجر حضر موت کے اقیال (حکمرانوں / شہزادوں) میں سے ایک تھے جن کے قبول اسلام کا اثر ان کے لوگوں پر پڑا تھا اور وہ اپنے مسلمان قبیلہ والوں کا ایک وفد بھی لیکر سنہ ۱۰ھ / ۶۳۱ء میں بارگاہ رسالتمآب میں گئے تھے۔ ابن سعد کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضر موت کے لوگوں کا قبول و اقرار اسلام دراصل ان کے حکمرانوں کے قبول اسلام کا نتیجہ تھا۔ بنو صدیف جو حضر موت کے لوگوں ہی کا ایک حصہ تھے۔ اس زمانے میں ہی مسلمان ہوئے تھے۔ جیسا کہ ان کے وفد کی آمد سے ظاہر ہوتا ہے[۸۸]۔

(۴). الابناء

الابناء کے لفظی معنی فرزندوں / بیٹوں کے آتے ہیں اور یہ لفظ اس ایرانی قوم کے لئے استعمال ہوتا تھا جو یمن میں مدتوں سے آباد تھے اور ایک طرح سے "دھرتی کے لال" تھے۔ حالانکہ وہ عرب قبائلی نظام کا کسی طور حصہ نہ تھے۔ لیکن ان پر بحث کے بغیر جنوبی عرب میں اسلام کی ترویج و اشاعت کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ بہر حال وہ عہد نبوی کے معاصر (لوگ) تھے اور انہوں نے اسلامی ریاست اور اسلام کے لئے شاندار خدمات انجام دی تھیں۔ یہ ایرانی طبقات یمن میں اس وقت سے آباد اور بسنا شروع ہوئے تھے جب جنوبی عرب کا یہ سر سبز و شاداب علاقہ ایران کی ساسانی سلطنت کا ایک ماتحت صوبہ بنا تھا۔ جس پر شہنشاہ ایران ..... کسریٰ ..... اپنا گورنر مقرر کرتا تھا اور ظاہر ہے کہ اس دیار غیر میں اس کی مدد کے لئے ایک ایرانی فوج اور ایرانی عمال و افسروں کی ایک پوری جماعت بھیجی جاتی تھی۔ رفتہ رفتہ بہت سے ایرانی اس علاقے میں اس طرح رچ بس گئے کہ وہ یہیں کے باشندے اور فرزند سمجھے جانے لگے۔ عہد نبوی میں یمن کے ایرانی گورنر کا نام حضرت باذان یا باذام تھا اور وہ ۶۲۸ء میں شہنشاہ خسرو پرویز کے قتل کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر اسلام لے آئے تھے۔ ان کے ساتھ ان کے فرزند رشید حضرت شہر بن باذان کے علاوہ یقینی طور پر کچھ اور ایرانی بھی اسلام کے حلقہ بگوش بن گئے تھے۔ اور کچھ مدت کے بعد تمام ایرانی طبقات اسلام کے مخلص پیرو اور اسلامی ریاست کے وفادار سپاہی بن چکے تھے[۸۹]۔ مونٹگمری واٹ نے حضرت باذان یا ایرانی طبقات کے قبول اسلام اور اسلامی ریاست سے وفاداری کو صرف ایک سیاسی اتحاد قرار دیا ہے اور ان کے خلوص اسلام سے انکار کیا ہے[۹۰]۔ لیکن مستشرق موصوف کا نظریہ و خیال غیر تاریخی اور غیر علمی ہے۔ انہوں نے مآخذ کی کثیر شہادتوں کو مسترد کر کے اپنے نظریہ کی بنیاد محض ظن و قیاس بلکہ کسی حد تک علمی و مذہبی تعصب پر رکھی ہے۔ حالانکہ ان کی تمام دلیلوں کی تردید واقعات سے ہوتی ہے۔

بہرحال قبول اسلام کے نتیجہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت باذان کو ان کے عہدہ پر برقرار رکھا اور پورا یمن ان کے زیر حکومت رہا۔ دو برس بعد ان کے انتقال کے بعد ان کے فرزند حضرت شہر کو ان کا جانشین مقرر کیا گیا تا آنکہ مدنی گورنر وہاں پہنچیں۔ ۱۰ھ میں حجۃ الوداع کے موقعہ پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یمن میں اسود عنسی کے ہاتھوں حضرت شہر کی شہادت کی خبر ملی جبکہ اس دوران رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرستادہ یمن کے مختلف علاقوں کے گورنر پہنچ کر اپنا اپنا کام سنبھال چکے تھے۔ لیکن اسود عنسی کی بغاوت اور ردہ نے یمن میں سیاسی ابتری پیدا کر دی۔ بہرحال یہ ایرانی طبقات کے خلوص اسلام اور وفاداری ومحبت رسول تھی کہ وہ ردّہ کے زمانے میں اسلام پر قائم اور اسلامی ریاست کے وفادار رہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں الابناء سے عام طور پر اور ان کے سب سے بڑے سردار و قائد حضرت فیروز دیلمی سے خاص طور سے اسود عنسی کی بغاوت کچلنے کا مطالبہ کیا تھا۔ اور ان ایرانی ابناء کے شرف کی بات ہے کہ انہوں نے ہی بغاوت کو فرو کر کے پھر سے یمن میں اسلام کی فرمانروائی بحال کی تھی۔ یہ ان کے قبول اسلام کی دلیل ہونے کے علاوہ ان کی ایمانی صلابت، رسول کریم سے محبت وعقیدت اور اسلامی ریاست سے وفاداری کی سب سے روشن تابناک اور درخشندہ مثال ہے۔ جبکی مزید تصدیق وتوثیق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد خطوط و فرامین سے ہوتی ہے۔[91]

جنوبی عرب میں خواہ وہ عرب قبیلے اور خاندان ہوں یا ایرانی ابناء اور ان کے غیر عرب طبقات ہوں۔ اسلام کی نشرواشاعت کے سلسلے میں ایک انتہائی اہم اور دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ جزیرہ نمائے عرب کے دوسرے خطوں اور ان کے قبائل کے مقابلے میں جنوبی عرب میں اسلام کی تبلیغ کی رفتار تیز تھی۔ اور اس نے بہ آسانی اور کم مدت میں ایک بڑے خطے کے لوگوں کو اسلام کا حلقہ بگوش بنا دیا تھا۔ اس کے اسباب وعوامل معلوم ومعروف ہیں۔ دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ جزیرہ نمائے عرب کے دوسرے خطوں اور قبیلوں نے اسلام اور اسلامی ریاست کی کافی مخالفت کی تھی اور اسلامی ریاست کو ان کے خلاف مسلسل فوجی کارروائی بھی کرنی پڑی تھی۔ مگر جنوبی عرب کے قبائل عرب وعجم کے بارے میں فوجی یا سیاسی آویزش کا عنصر نہیں ملتا ہے۔ جنوبی عرب کے سلسلے میں جہاں تک رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پالیسی کا تعلق ہے وہ مآخذ سے اور اوپر کی طویل بحث سے واضح ہے کہ تمام لوگوں کو اسلام کا پیرو بنانے اور اسلامی ریاست کا شہری بنانے کی پالیسی تھی اور وہ کسی لحاظ واعتبار سے دوسرے خطوں، قبیلوں، علاقوں کے سلسلے میں اپنائی گئی پالیسی سے مختلف نہیں تھی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد خطوط و فرامین سے جو مآخذ میں محفوظ ہیں۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ان کے سامنے دو متبادل رکھے تھے۔ یا تو وہ اسلام قبول کر کے اسلامی امت کے ارکان اور اسلامی ریاست کے مکمل شہری بن جائیں یا اپنے مذاہب پر قائم رہیں۔ تو جزیہ ادا کر کے اسلامی ریاست کی سیاسی بالادستی تسلیم کریں اور ذمی بن جائیں۔ تیسرا کوئی متبادل نہیں تھا۔ ابتدائی عہد نبوی میں جب اسلامی ریاست اتنی طاقتور اور مضبوط نہیں تھی۔ یہ تیسرا متبادل بھی تھا کہ وہ صرف اسلامی ریاست کے سیاسی حلیف بن جاتے تھے اور دونوں میں ایک دوسرے کے لیے باہمی تعاون وامداد کا معاہدہ طے پا جاتا تھا۔ لیکن غزوہ احزاب کے بعد یہ تیسرا متبادل ختم کر دیا گیا تھا اور صرف پہلے دو متبادل بچ رہے تھے۔ اسلامی

تاریخ کے مآخذ میں سے ایک بھی شہادت اور مثال اس تیسرے متبادل کی مدنی عہد کے نصف آخر سے نہیں پیش کی جاسکتی جبکہ باقی دونوں متبادل کی متعدد بلکہ کثیر شہادتیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ چنانچہ نصاریٰ، نجران، جنوبی و شمالی عرب کے یہود و امراء ایلہ کی عیسائی مملکتوں، مقناء اذرح اور جرباء کی یہودی بستیوں اور بحرین و عمان اور ہجر وغیرہ کے مجوسی طبقات وغیرہ سے جتنے بھی معاہدات نبوی ہوئے ان سب میں صرف پہلے دو متبادل۔۔۔۔ اسلام یا جزیہ۔۔۔۔ کا ذکر ملتا ہے۔

ہمارے جدید مورخین اور مستشرقین خاص کر مونٹگمری واٹ نے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ تیسرا متبادل۔۔۔۔ باہمی تعاون و امداد کا معاہدہ بغیر کسی مذہبی سمجھوتے کے۔۔۔۔ عہد نبوی میں آخر تک موجود رہا تھا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بقول متعدد غیر مسلم طبقات سے کسی مذہبی سمجھوتے کے بغیر باہمی سیاسی اور فوجی تعاون کے سمجھوتے کئے تھے ان میں بیشتر غیر مسلم طبقات خاص کر عیسائی یہودی اور ایرانی طبقات کے قبول اسلام کو وہ محض "سیاسی اتحاد" قرار دیتے ہیں، لیکن اس سیاسی اتحاد کے لیے، وہ کوئی تاریخی ثبوت نہیں پیش کر سکتے۔ کیونکہ تمام معاصر شہادتوں اور اسلامی تاریخ کی روایتوں کا ان کے برعکس اتفاق ہے۔ وہ محض قیاسات کی بنیاد پر تاریخی شواہد اور مآخذ کی روایتوں کو بڑی دلیری سے مسترد کر دیتے ہیں اور اپنی اس علمی بددیانتی اور تاریخی تحریف کو علمی کاوش اور تحقیق کا نام دیتے ہیں۔

(۵) قبائل پراگندہ عرب

اس عنوان کے تحت ان قبائل کے اسلام کے تعلقات پر بحث کی جائے گی جن کو ہم کسی سمت کے ساتھ مخصوص نہیں کر سکتے اور جو جزیرہ نمائے عرب کے مختلف مقامات پر منتشر و آباد تھے۔ ایک لحاظ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ وہ قبائل تھے، جو جزیرہ نما کے مشرقی خطے بلکہ پٹی پر خلیج فارس سے لیکر عراقی حدود تک بکھرے ہوئے تھے۔ نسبی اعتبار سے یہ بات قابل ذکر ہے کہ مہرہ اور ازد عمان کو چھوڑ کر باقی تمام قبائل کا تعلق ربیعہ کے عظیم و مادر قبیلہ سے تھا[۹۲]۔ جبکہ اول الذکر دونوں کا علاقائی اور نسبی تعلق جنوبی عرب کے بعض قبیلوں سے تھا۔ ان منتشر و پراگندہ قبیلوں میں حسب ذیل اہم ترین تھے:

(ا) ربیعہ : عبدالقیس (۱) بنو عامر بن الاعصر

(ب) بنو حنیفہ : (۱) بنو مرہ (۲) بنو عبداللہ (۳) بنو ذہل (۴) بنو ثعلبہ۔۔۔۔ بنو الدول کے گھرانے (۵) بنو عدی

(ج) ازد عمان : بنو معولہ بن عبد شمس

(د) مہرہ :

(س) تمیم : (۱) بنو اسید بن عمرو (۲) بنو العنبر (۳) بنو مرہ (۴) بنو یربوع (۵) بنو نہشل (۶) بنو مجاشع (۷) بنو عبداللہ بن دارم (۸) بنو جہم (۹) بنو مالک (۱۰) بنو زید مناۃ (۱۱) بنو منقار (۱۲) بنو عوف وغیرہ

(ط) وائل بن ربیعہ : (۱) بنو عنبر (۲) بنو بکر (۳) بنو تغلب (۴) بنو شیبان

ان منتشر و پراگندہ قبائل کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ مختلف علاقوں اور خطوں میں منتشر ہونے کے سبب ان کی کوئی

ایک سیاسی شناخت نہیں تھی اور نہ ہی وہ سب ایک سیاسی دائرہ اثر میں محدود تھے۔ ازد عمان اور مہرہ اگر جنوبی عرب کے قبائل سے متاثر ہوتے تھے۔ تو عبدالقیس اور مجوس بحرین ایرانی دائرہ اثر و نفوذ میں آتے تھے۔ بنو حنیفہ کے کچھ طبقات عیسائی تھے تو باقی عرب دینِ قدیم پر عامل، جبکہ وائل بن ربیعہ کے متعدد خاندانوں میں مذہبی اور سیاسی اختلافات تھے۔ بہرحال ہم اسلام سے ان قبائل کے تعلقات کا آغاز بحرین کے عبدالقیس سے کر رہے ہیں کہ وہی ان قبائل منتشر و پراگندہ میں سب سے پہلے اسلام کے علمبردار بنے تھے۔

(الف) عبدالقیس

عبدالقیس کا قبیلہ علاقائی اعتبار سے بحرین کا باشندہ تھا۔ اور اس کے کچھ لوگ عمان وغیرہ میں بھی آباد تھے۔ جبکہ نسب کے اعتبار سے وہ ربیعہ کے خاندان عظیم سے تھا۔ ذکر آچکا ہے کہ مکہ مکرمہ کی مرکزی سیاسی، سماجی اور مذہبی حیثیت کے سبب تمام قبائل وہاں کے معاملات سے اپنے زائرین، تاجرین اور کاروالوں کے ذریعہ واقف ہوتے رہتے تھے اور یہ قبائل پراگندہ بھی اس اصول سے مستثنیٰ نہیں تھے۔ چنانچہ وہ سب اور خاص کر عبدالقیس کا قبیلہ اسلام سے مکی عہد ہی میں متعارف و روشناس ہو گیا تھا۔ ابن سعد کی روایت ہے۔ جس کی تفصیل ابن قتیبہ سے بھی ہوتی ہے کہ عبدالقیس کے ایک خاندان بنو عامر بن اعصر کے ایک سردار حضرت الاشج، کو جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور و دعوت کی اطلاع ملی تو انہوں نے دریافت حال کے لئے اپنے بھانجے (بہن کے لڑکے) عمرو بن عبدالقیس کو مکہ بھیجا۔ چنانچہ وہ ہجرت کے سال یعنی ۶۲۲ء میں مکہ پہنچے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے اور کلام الٰہی سنتے ہی خود مسلمان ہو گئے۔ کچھ مدت تک قیام کیا اور زبان رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کریم کی پہلی سورہ اقرأ سیکھی اور واپس بحرین پہنچے جبکہ ان کے راہ بر و دلیل اریقط بن عامر بن حارث مکہ ہی میں رہ گئے۔ الاشج نے بھانجے سے اسلام سے آگاہی حاصل کی اور مسلمان ہو گئے۔ اگرچہ اپنے قبول اسلام کو انہوں نے خفیہ رکھا تھا لیکن چپکے چپکے اسلام کی تبلیغ کرتے رہے۔ اور کچھ مدت کے بعد روایات کے بموجب وہ سولہ یا بارہ عبدالقیسی مسلمانوں کے ساتھ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور اپنے اسلام کا اظہار و اقرار کیا۔ یہ بحرین اور خاص کر علاقہ عبدالقیس میں اسلام کا پہلا بیج تھا۔ جو ہجرت نبوی سے قبل لگ چکا تھا اور برگ و بار لانے لگا تھا۔ بحرین واپس آکر ان عبدی نو مسلموں نے اسلام کی تبلیغ اپنے طور سے جاری رکھی اور رفتہ رفتہ ان کی تعداد بڑھتی رہی یہاں تک کہ اتنی ہو گئی کہ جواثی کے مقام پر انہوں نے ایک مسجد جمعہ بنائی اور ہجرت نبوی کے معاً بعد انہوں نے بھی جمعہ کی نماز اپنے یہاں قائم کی۔ سرزمین عرب پر مسجد نبوی کے بعد یہ دوسری مسجد تھی جہاں پہلا جمعہ اس علاقے کے مسلمانوں نے باجماعت ادا کیا تھا[۱۴۳]۔ بہرحال یہ پورا قبیلہ صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کے درمیانی عرصے میں مسلمان ہو گیا تھا اور ان کے محض چند افراد خارج اسلام رہے۔

بحرین میں قبیلہ عبدالقیس ایک ایرانی مجوسی طبقے کے ساتھ آباد تھا۔ اور ان کا پڑوسی بھی تھا۔ بحرین ایران کی ساسانی سلطنت کا ماتحت و باجگذار صوبہ یا مملکت تھی، جہاں خسروئے ایران کی طرف سے ایک حکمران مقرر ہوتا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کا معاصر حکمران منذر بن ساوی تھا جو نسلاً عرب تھا۔ اور قبیلہ عبد القیس کا فرد تھا۔ ۸ھ / ۶۲۹ء میں جب آپ نے مختلف پڑوسی اور عرب حکمرانوں کو اسلام کی دعوت دی تو حضرت منذر بن ساوی کو بھی دی۔ غالباً وہ قبیلہ عبد القیس کے مسلمان طبقات سے متعارف بھی تھے اور متاثر بھی۔ بہرحال وہ صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کے دوران کسی وقت مشرف بہ اسلام ہو گئے[۹۴]۔
عام خیال یہ ہے کہ وہ فتح مکہ کے بعد مسلمان ہوئے تھے جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سفیر حضرت علاء بن حضرمی وہاں پہنچے تھے۔ حالانکہ یہ ان کے قبول اسلام کا زمانہ یا واقعہ نہیں تھا بلکہ بحرین کے صوبے کے اسلامی مملکت و ریاست میں ادغام و ماتحت بننے کا معاملہ تھا۔ بہرحال حضرت منذر بن ساوی عبدی نے اپنی مملکت میں اسلام کی ترویج و اشاعت کی اور تمام عرب طبقات مسلمان ہو گئے۔ ممکن ہے کہ بعض مجوسی افراد و طبقات بھی مشرف بہ اسلام ہوئے ہوں لیکن ان کا کوئی حتمی ذکر نہیں ملتا ہے فتح مکہ کے بعد حضرت علاء بن حضرمی بطور مرکزی منتظم اور عامل صدقات بحرین پہنچے اور وہاں حضرت منذر بن ساوی عبدی کے وصول کردہ صدقات اور جزیہ کی رقم لیکر مدینہ واپس آئے۔ بغدادی کے بقول یہ "مال" پہلا تھا۔ جو کسی صوبے سے مرکز پہنچا تھا۔ اور اس کی مقدار ستر ہزار درہم تھی[۹۵]۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دو خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ بحرین میں اس کے بعد یا اسی سال دو مسلم افسروں کو مدینہ سے بھیجا گیا تھا۔ ایک صدقات اور عشور وغیرہ کے افسر تھے۔ ان محاصل کو حضرت منذر بن ساوی عبدی نے مسلمانان بحرین سے وصول کیا تھا اور دوسرے افسر صرف جزیہ کے لئے تھے۔ جو غیر مسلم مجوسی طبقات سے وصول کیا گیا تھا[۹۶]۔ ان محاصل کے بارے میں مزید تفصیلات ہم اگلے ابواب میں دیکھیں گے۔ بہرحال ان شواہد و حقائق سے یہ بلا ریب ثابت ہوتا ہے کہ بحرین کے بیشتر لوگ جن میں قبیلہ عبد القیس کے افراد و طبقات کے علاوہ دوسرے عرب اور ایرانی طبقات بھی شامل تھے۔ ۸ھ کے اواخر / ۶۳۰ء کے اوائل تک اسلام لا چکے تھے اور اسلامی ریاست کے شہری بن چکے تھے[۹۷]۔

قبیلہ عبد القیس کے قبول اسلام کے بارے میں مزید شہادت ان کے اس وفد سے بھی ہوتی ہے جو حضرت جارود بن معلّی کی قیادت میں فتح مکہ کے فوراً بعد بارگاہ نبوی میں پہنچا تھا[۹۸]۔ تمام اراکین وفد نے اپنے اسلام کا اقرار و اعلان کیا تھا اور ان میں سے کم از کم تین حضرات: شبیب بن قرۃ، صحار بن عباس، اور مشمرج بن خالد سعدی ..... کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اراضی کے عطیات (قطائع) بھی عنایت فرمائے تھے[۹۹]۔ ماخذ کا دعویٰ ہے کہ حضرت جارود بن معلی عبدی نے اپنی قوم / خاندان کو مسلمان کر لیا تھا اور وہ اپنے پورے قبیلے سمیت ردّہ کے زمانے میں اسلام پر قائم رہے تھے۔ حضرت منذر بن ساوی عبدی اور حضرت اشج عبدی کے طبقات و خاندان بھی اسلام اور اسلامی حکومت کے وفادار رہے تھے۔ بہرحال کچھ طبقات عبد القیس نے ارتداد کی راہ اختیار کی تھی۔ جن کی سرکوبی خلافت صدیقی کے سالاروں نے کی تھی[۱۰۰]۔

بحرین میں قبیلہ عبد القیس اور بعض دوسرے طبقات عرب اور مجوسی یا ایرانی آبادی کے علاوہ جو حضرت منذر بن ساوی کی مملکت میں آباد تھے، کچھ دوسرے عناصر بھی اس علاقہ میں اسلام لے آئے تھے۔ ان میں ہجر کے مجوس اور تمیم کے عرب طبقات شامل تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دو خطوط و فرامین ..... ایک ہجر کے حکمران (صاحب)، اسیبخت بن عبد اللہ کا نام تھا اور دوسرا بحرین و عمان کے عوام کے نام ..... ثابت کرتے ہیں کہ دونوں طبقات بھی اسلام میں داخل ہو چکے تھے کیونکہ ان

دونوں خطوط نے ان طبقات کے لئے وہ احکام و فرائض بتائے تھے۔ جن کا مطالبہ صرف مسلمانوں سے کیا جا سکتا ہے[801]۔ ردہ وارتداد کے سیلاب کی تاریخ اور جس آسانی اور سہولت سے بحرین میں اسے کچلا گیا تھا۔ اور اس میں جو کردار حضرات منذر بن ساویٰ عبدی، جارود بن معلیٰ اور ان کے ہمنواؤں نے انجام دیا تھا ثابت کرتے ہیں کہ ایرانی سلطنت کی اس ماتحت و باجگذار مملکت میں اسلام نے اپنے قدم مضبوطی سے جما لیے تھے۔ حیرت کی بات ہے کہ بحرین میں مسلم عناصر اور آبادی کی موجودگی بلکہ اس سے بڑھ کر ان کی سیاسی، مذہبی اور فوجی بالادستی کا اعتراف مونٹگمری واٹ جیسے مستشرقین نے بھی کر لیا ہے[802] حالانکہ یہ ان کی عادت کے خلاف ہے۔

(ب) بنو حنیفہ

بنو حنیفہ کا قبیلہ عددی لحاظ سے بڑا اور فوجی اعتبار سے طاقتور تھا اور وہ یمامہ کے زرخیز و شاداب خطے میں بنیادی طور سے آباد تھا۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعض خاندان یمامہ کے باہر خاص کر عراقی سمت میں بھی آباد تھے ابن ہشام کی ایک روایت سے جس کی تصدیق بخاری کی ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بنو حنیفہ کا ایک طبقہ یا خاندان کم از کم اسلام کے پیغام سے فتح مکہ سے بہت پہلے متاثر ہوا تھا۔ غالباً صلح حدیبیہ کے فوراً بعد اسلام بنو حنیفہ کے قبیلہ میں اپنے قدم جمانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اور اس کا آغاز بنو حنیفہ کے ایک ممتاز سردار حضرت ثمامہ بن اثال حنفی کے قبول اسلام سے ہوا تھا۔ حضرت ثمامہ حنفی کے قبول اسلام کا واقعہ بڑا ڈرامائی اور دلچسپ ہے۔ نجد کی ایک مہم کے دوران، جس کی کوئی تاریخ ماخذ میں نہیں ملتی ہے، وہ مسلمانوں کے ایک شہسوار دستے کے ہاتھوں اس وقت گرفتار ہوئے تھے۔ جب وہ عمرہ کے لئے مکہ جا رہے تھے۔ ان کو مدینہ لایا گیا۔ جہاں تین دن تک وہ قید رہے۔ اور اس کے بعد انکو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے بلا کسی شرط و وعدہ کے رہا کر دیا گیا۔ رحمتِ نبوی کے اس بے مثال مظاہرے سے وہ اتنے متاثر ہوئے کہ فوراً انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔ اس کے بعد وہ پھر اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔ مکہ پہنچے، عمرہ کیا اور واپس اپنے علاقہ کو روانہ ہو گئے۔ مگر مکہ میں ان پر قریش مکہ کے دشمنانِ اسلام نے وہ طنز و تعریض کی بارش کی کہ انہوں نے مکہ والوں کو یمامہ سے ملنے والی گیہوں کی فراہمی کو روک دینے کی دھمکی دی اور وہ محض دھمکی ہی نہیں رہی بلکہ وطن پہنچتے ہی انہوں نے اسکو عملی جامہ بھی پہنا دیا اور مکہ والے بھوکوں مرنے لگے جضرت ثمامہ سے جب اہل مکہ کی تمام عرض و معروض بیکار و بے فائدہ رہی تو بالآخر انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سفارش کرنے کی درخواست کی جو بالآخر بابِ رحمتِ نبوی سے قبول و منظور ہوئی اور ان کی گیہوں کی فراہمی پھر سے جاری ہو گئی[803] بہرحال جن حالات میں حضرت ثمامہ حنفی نے اسلام قبول کیا اور جس طرح انہوں نے مکہ والوں کا غلہ روک لیا۔ اس بات کا قرینہ ہے کہ وہ محرم ۷ھ/مئی، جون ۶۲۸ء یا زیادہ سے زیادہ شعبان ۷ھ/دسمبر ۶۲۸ء میں مسلمان ہوئے ہوں گے[804] اگرچہ یمامہ یا بنو حنیفہ کے قبول اسلام کے بارے میں براہ راست کوئی شہادت نہیں ملتی ہے۔ یہ یقینی ہے کہ انہوں نے اپنے قبیلہ کے لوگوں کو اسلام قبول کرنے پر آمادہ کر لیا ہو گا۔ اگر ایسا نہ ہو

ہوتا تو مکہ کے گیہوں کی فراہمی کو روکنا آسان اور قابل عمل نہیں ہوتا۔

بہر حال مآخذ یہ ضرور بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو حنیفہ کے عوام اور سرداروں کے پاس بھی اپنے سفیر اور مبلغ بھیجے تھے اور ان کو اسلام کی دعوت دی تھی۔ ابن سعد کی ایک روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقعہ پر یا اس کے کچھ بعد حضرت ثمامہ بن اثال حنفی اور بنو حنیفہ کے ایک اور بااثر سردار ہوذہ بن علی کو خطوط بھیجے تھے۔ اور ان کو اسلام کی دعوت دی تھی[۸۰۵] اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ خطوط حضرت ثمامہ کے قبول اسلام سے پہلے لکھے گئے تھے۔ لیکن دوسرے متعدد مآخذ جیسے بلاذری، طبری، ابن خلدون اور محمد بن حبیب بغدادی حضرت ثمامہ حنفی کا نام بنو حنیفہ کے ان سرداروں میں نہیں شامل کرتے جن کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح حدیبیہ کے فوراً بعد خطوط لکھے تھے ان مآخذ کا اس پر اصرار ہے کہ یہ خطوط ان علاقوں کے عام آدمیوں کے نام دعوت عام تھی[۸۰۶] بہر حال بنو حنیفہ اور یمامہ کے لوگوں نے آپ کی دعوت کو ذرا تاخیر سے قبول کیا اور سنہ ۱۰ھ رسنہ ۶۳۱ء میں بقول ابن جریر طبری اپنا وفد بارگاہ نبوی میں بھیجا جو دس پندرہ آدمیوں پر مشتمل تھا اور ان سب لوگوں نے غالباً ایک کے سوا اسلام قبول کرنے کا اعلان و اقرار کیا تھا[۸۰۷] دوسرے مآخذ نے حنفی وفد کی آمد کی تاریخ نہیں بیان کی ہے جبکہ بلاذری کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وفد غالباً رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سفارت اور دعوت کے جواب میں فوراً آیا تھا۔

یہ بات خاصی دلچسپ اور اہم ہے کہ بنو حنیفہ کے اس وفد میں مشہور جھوٹے نبی مسیلمہ کذاب کی بھی شمولیت کا ذکر کیا جاتا ہے۔ بہر حال اس کی وفد میں شمولیت اور اسلام قبول کرنے کا معاملہ دونوں ہی پردہ خفا میں ہیں[۸۰۹] اسی طرح مآخذ بنو حنیفہ کے دوسرے سردار ہوذہ بن علی کے قبول اسلام کا بھی واضح ذکر نہیں کرتے ہیں۔ وہ حنیفہ کے ایک اہم خاندان بنو مرۃ کا سردار تھا[۸۱۰] لیکن اس کے خاندان ہی کے ایک صحابی حضرت طلق بن علی کے قبول اسلام کا ذکر واضح الفاظ میں ملتا ہے[۸۱۱] اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اس کے خاندان یا بنو حنیفہ کے قبیلہ میں انفرادی یا اجتماعی قبول اسلام کے امکان کو یکسر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں تک مسیلمہ کذاب کا تعلق ہے اس کا خاندان بنو عدی بن حنیفہ بہت معمولی اور غیر اہم تھا۔ اور بقول ابن حزم نہ اس میں دولت تھی نہ ریاست و حکومت اور نہ ہی عددی طاقت[۸۱۲] بنو حنیفہ کا سب سے بااثر اور طاقتور قبیلہ بنو الدول بن حنیفہ تھا۔ جو چار بڑے خاندانوں میں منقسم ہو گیا تھا۔ اور وہ تھے: بنو مرۃ، بنو عبد اللہ، بنو ذہل اور بنو ثعلبہ، موخر الذکر قبیلہ رخاندان سے حضرت ثمامہ بن اثال کا تعلق تھا جو یمامہ میں اسلامی ریاست کے سب سے بڑے حامی اور وفادار تھے[۸۱۳] تمام واقعات اور حقائق کو مدنظر رکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ثمامہ کا خاندان اکثر و بیشتر مسلمان ہو گیا تھا۔ اور دوسرے خاندانوں میں کچھ افراد و طبقات مسلمان تھے۔ لیکن اکثر بنو حنیفہ کے لوگ عہد نبوی میں اسلام کے دائرے سے باہر رہے تھے۔ اور انہوں نے ہی مسیلمہ کذاب کا ساتھ ارتداد کے زمانے میں دیا تھا۔ جبکہ دوسری طرف حضرت ثمامہ اور دوسرے حنفی مسلمانوں نے اسلامی ریاست کا بھرپور ساتھ دیا تھا اور اسلام کے لیے شاندار خدمات انجام دی تھیں[۸۱۴]

(ج) ازدِ عمان

ازد یمن کی ایک شاخ عمان میں جا بسی تھی جو ازدِ عمان کہلائی۔ یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہے کہ مدینہ میں دونوں انصاری قبیلوں اوس وخزرج کا نسبی تعلق ازدِ عمان سے تھا۔ عمانی شاخ کی بھی مختلف ذیلی شاخیں تھیں اور عہدِ نبوی میں اس کے ایک اہم خاندان بنو معولہ بن عبد شمس کی عمان پر حکمرانی تھی۔[۸۱۵] اس کے ایک سردار جلندیٰ کے دو بیٹے جیفر اور عبّاد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معاصر حکمران تھے، جو ملک کے دو علاقوں پر الگ الگ اور آزادی سے حکمرانی کرتے تھے۔ بلاذری اور ابن حزم کا بیان ہے کہ اگرچہ عمان کی غالب اکثریت کا تعلق ازد سے تھا تاہم وہاں مختلف عرب اور غیر عرب عناصر بھی موجود تھے جو اس پورے علاقے میں پھیلی مختلف وادیوں میں رہتے تھے۔

اسلام سے ان کے روابط کے آغاز کا ذکر فتح مکہ کے بعد ۸ھ / ۶۳۰ء میں عام طور سے ملتا ہے کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دو سفیر و نمائندے حضرات ابو زید انصاری اور عمرو بن عاص سہمی کو عمان کے حکمرانوں کے پاس بھیجا۔ اور ان کو قبول اسلام کی دعوت دی۔[۸۱۶] یہ قابل ذکر بات ہے کہ دونوں حکمران فوراً مسلمان ہو گئے۔ اور ان کی تقلید و تبلیغ سے عربوں اور غیر عربوں کے خاصے بڑے طبقات بھی اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے۔[۸۱۷] اگرچہ ردہ کی تاریخ کا مطالعہ سر دست ہمارے پیش نظر نہیں ہے تاہم اس ضمن میں اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ عمان میں ارتداد کی وبا جب عام طور سے پھیلی تو بھی وہاں وفادار مخلص مسلمانوں کی خاصی بڑی آبادی موجود تھی جو اسلام کی بحالی کے لیے[۸۱۸] کوشاں تھی۔ وہ نہ صرف اپنے دین و مذہب پر ثابت قدم و برقرار رہی بلکہ اس نے مرتدوں کے خلاف خود بھی جنگ کی۔ اور پھر اسلامی لشکر کے پہنچنے پر اس کی بھرپور مدد کی۔ یہ نکتہ بھی خاصا اہم اور قابل ذکر ہے کہ عمان کے دونوں حکمران حضرت جیفر اور حضرت عباد ثابت قدم و مخلص مسلمان اور مدینہ کے وفادار رہے تھے اور انہوں نے ہی دراصل عمان میں اسلام کا پرچم بلند کئے رکھا تھا۔[۸۱۹]

(د) مہرہ

مہرہ کا اصل قبیلہ یمن کے علاقہ شحر میں آباد تھا۔ اور اس کی کچھ شاخیں علاقہ العنبر کے متصل و متقابل ساحلی علاقوں میں آباد تھیں اگرچہ نسبی لحاظ سے ان کا تعلق قبیلہ قضاعہ سے تھا۔[۸۲۰] ان کی ایک شاخ عمان کے علاقے میں بھی آباد تھی۔[۸۲۱] ابن سعد کے مطابق مہرہ کا ایک وفد حضرت مہری بن الابیض کی قیادت میں فتح مکہ کے بعد کسی وقت مدینہ پہنچا تھا اور اس نے اپنے قبیلہ کے خاصے بڑے حصے کے قبول اسلام کا اعلان و اقرار کیا تھا۔[۸۲۲] وفات نبوی کے بعد بیشتر قبیلہ والے مرتد ہو گئے تھے۔ تاہم حضرت عکرمہ بن ابی جہل مخزومی کی قیادت میں جوں ہی اسلامی لشکر ان کے علاقے میں پہنچا۔ قبیلہ کے تمام مسلمانوں نے اپنے اسلام کی تصدیق کی تھی۔ اور بغیر کسی جنگ و جدال کے صدقات ادا کر دیتے تھے۔[۸۲۳] ہمارے ماخذ میں مہرہ کے انفرادی و اجتماعی قبول اسلام کی مثالیں مفقود ہیں۔

(ص) تمیم

تمیم عددی اعتبار سے جزیرہ نمائے عرب کے بڑے قبائل میں شمار ہوتا تھا۔ اور قبائل پراگندہ میں شائد سب سے طاقتور اور عظیم بھی۔[824] اس کے متعدد بطون بلکہ ان کی ذیلی شاخیں بجائے خود قبیلہ بن گئی تھیں اور خاصی طاقت ور اور آزاد تھیں۔ ان کے متعدد بطون اور ذیلی گھرانے یمامہ، بحرین اور عمان کے درمیان واقع علاقوں میں ایک خاصے بڑے اور وسیع رقبہ پر پسے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ جزیرہ نما کی مشرقی پٹی پر بھی وہ آباد تھے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بحرین کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی معاصر سلطنت وملوکیت میں حکمران طبقہ کا تعلق تمیم ہی کی ایک شاخ سے تھا۔ جبکہ عراق کی ایرانی سلطنت کی باجگذار سلطنت حیرہ کا تعلق بنو تمیم سے بہت قریبی تھا۔ دوسری طرف بنو تمیم کے بعض گھرانوں اور افراد نے مکہ و مدینہ کے لوگوں سے حلف و ازدواج کے ذریعہ قریبی سماجی اور سیاسی تعلقات قائم رکھے تھے۔[825]

مکہ اور قریش سے اپنے ان گوناگوں تعلقات کے سبب اسلام بنو تمیم میں کافی شروع میں متعارف ہو گیا تھا اور اس کے بعض افراد نسبتاً ابتدائی دور میں اسلام سے مشرف ہوئے تھے۔ ان میں قریش مکہ کے تمیمی حلیف نمایاں مقام کے حامل تھے جو مکہ میں بس گئے تھے۔ ان میں سب سے زیادہ معزز و محترم صحابی حضرات خباب بن ارت تمیمی[826] اور واقد بن عبداللہ تمیمی تھے[827] جو بدری صحابہ ہونے کی فضیلت رکھتے تھے ایک اور ابتدائی مکی تمیمی مسلم حضرت سعید بن عمرو تمیمی تھے جو قریش کے خاندان بنو جمح کے حلیف تھے اور مہاجر حبشہ بھی۔[828] ان کے علاوہ ایک پورا تمیمی گھرانا تھا جو اسلام سے پہلے اپنے علاقہ سے ہجرت کر کے مکہ اور پھر مدینہ جا بسا تھا۔ اور اس نے مکہ ہی میں اسلام قبول کیا تھا۔ یہ بنو اُسَید بن عمرو کا گھرانا تھا۔ جس کے نمایاں فرد ابو ہالہ ہند بن زرارہ تھے جو حضرت خدیجہ کے پہلے شوہر اور ان کے بطن سے پیدا ہونے والے دو فرزندوں حضرات ھند اور حارث کے والد ماجد تھے۔ اس خاندان کے تین اور اہم ابتدائی مسلمانوں کا ذکر بھی ملتا ہے وہ تھے: حضرات صفوان بن صفوان اور ان کے بھتیجے صفوان بن مالک اور حنظلہ بن ربیع۔ اوّل الذکر دونوں صحابیوں کے بارے میں مآخذ کا اصرار ہے کہ وہ بہترین مہاجرین میں شمار ہوتے تھے جبکہ مؤخر الذکر کو کاتبین رسول میں شرکت و شمولیت کی سعادت حاصل تھی۔[829]

اصل قبیلہ تمیم اور اس کی شاخوں میں بہرکیف اسلام کا تعارف فتح مکہ سے پہلے شروع ہو گیا تھا اور بعض انفرادی قبولِ اسلام کی مثالیں ملتی ہیں تاہم یہ حقیقت ہے کہ اسلام کی تبلیغ واشاعت فتح مکہ کے بعد ہی ہوئی شروع ہوئی تھی۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت اقرع بن حابس تمیمی کی قیادت میں تمیم کے دس اشخاص نے فتح مکہ سے ذرا پہلے اسلام قبول کر لیا تھا اور انہوں نے فتح مکہ کے علاوہ[830] غزوات حنین و طائف میں بھی حصہ لیا تھا[831] ان مواقع پر ان کی خدمات کے اعتراف میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اقرع بن حابس تمیمی کو بھی ایک سردار کا حصہ یعنی سو اونٹ حنین کے مال غنیمت کے خمس میں سے عطا فرمائے تھے[832] ابن اسحاق کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ تمیم کے خاندان بنو اسید کے کچھ لوگ بھی ان غزوات میں شریک

جہاد تھے[۸۲۲] ۹ھ کے اواخر یعنی ۶۳۱ء کے وسط تک اسلام نے بنو تمیم کے مختلف گھرانوں اور خاندانوں میں کافی مضبوطی سے اپنے قدم جمالیے تھے۔ اس کی ایک تصدیق ان کے قبائلی وفد کی آمد سے ہوتی ہے جو اس برس بارگاہ نبوی میں پہنچا اور جس میں اسی یا نوے مسلمان ارکان شامل تھے[۸۲۳] ابن اسحاق کے بیان سے بصراحت اور دوسرے مآخذ سے مفہوماً معلوم ہوتا ہے کہ وفد کے تمام اراکین مسلمان تھے[۸۲۵] اگرچہ واقدی اور ابن سعد نے ان کے مسلمان ہونے کی وضاحت نہیں کی ہے[۸۲۶]، تاہم وہ ان کے پورے بیانات میں ہر جگہ مضمر ہے خاص کر ان اشعار میں جو وفد کے ایک رکن نے اس موقعہ پر برجستہ کہے تھے۔ طبری نے بھی ابن ہشام و ابن اسحاق کے بیان کی تصدیق کی ہے[۸۲۷] اس طرح تمیم کے قبول اسلام کے بارے میں کوئی شک و شبہ نہیں رہ جاتا۔ مزید برآں تمام مآخذ کا متفقہ بیان ہے کہ تمیم کے مختلف گھرانوں اور خاندانوں کے لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی عاملین صدقات بھی مقرر فرمائے تھے۔ جن میں حضرات قیس بن عاصم، مالک بن نویرہ اور زبرقان بن بدر بہت نمایاں مقام کے حامل تھے۔[۸۲۸]

تمیم کے تمام خاندانوں اور گھرانوں میں مسلمان طبقات اور کثیر افراد کی موجودگی بھی ان کے قبول اسلام کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ ابن حزم نے متعدد گھرانوں کے صحابہ کرام کے نام گنائے ہیں۔ اپنی ایک روایت میں انہوں نے تمیم کے مختلف گھرانوں کے ۲۴ صحابہ کرام کا ذکر کیا ہے ان کی تفصیل یہ ہے۔ نو بنو العنبر بن عمرو سے، چھ بنو اسید سے، اور تین تین بنو مرہ، بنو یربوع اور بنو نہشل سے، اور دو دو بنو مجاشع اور بنو عبداللہ بن دارم سے، اور ایک ایک بنو جہم، بنو مالک، بنو کعب، بنو زید مناۃ، بنو منقار، بنو عوف، بنو قریع، بنو ربیعہ، بنو مالک بن حنظلہ اور بنو جریر بن دارم سے[۸۲۹] یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ان سے کئی گنا زیادہ وہ صحابہ کرام تھے، جن کے اسمائے گرامی تاریخ کے تنگ ظرف میں سما نہیں سکے۔ اور ان سے کہیں زیادہ وہ مسلمان تھے، جن کی ملاقات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں ہو سکی اور شرف صحبت نبوی سے محروم رہنے کے سبب وہ تاریخ کی بھول بھلیوں میں گم ہو کر رہ گئے۔ بہرحال ان ٹھوس ثبوتوں اور مآخذ کی شہادتوں کے بعد یہ کہنا عقلمندی نہیں ہو سکتی کہ "بنو تمیم میں چند ہی لوگ مسلمان ہوئے تھے۔"[۸۳۰] یہ تاریخ کو مسخ کرنے اور بین و ظاہر واقعات کو نظر انداز کرنے کی انتہائی غیر علمی، غیر تاریخی اور غیر دیانت دارانہ حرکت ہے۔ واقعات و شواہد بنو تمیم کے قبول اسلام کے ناقابل تردید ثبوت و شہادتیں فراہم کرتے ہیں۔ وفات نبوی کے بعد ردہ کے زمانے میں جو کچھ پیش آیا۔ وہ مختلف معاملہ ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس پر فتن و پر آشوب زمانے میں بھی تمیم کے متعدد طبقات اسلام پر مضبوطی اور خلوص کے ساتھ قائم رہے تھے۔ ان میں حضرت زبرقان بن بدر تمیمی نمایاں حضرات میں سے ایک تھے۔ جنہوں نے اسلام کی اس زمانے میں شاندار خدمات انجام دی تھیں۔ اور اپنے بہت سے قبیلہ والوں کا رشتہ اللہ اور اس کے رسول سے جوڑے رکھا تھا اور یہی نہیں انہوں نے مسلم طبقات سے صدقات وصول کر کے اس کی خطیر رقم بھی مدینہ اسی زمانہ میں پہنچائی تھی[۸۴۱]

(ط) وائل

جزیرہ نمائے عرب کے افرادی طاقت اور فوجی قوت کے لحاظ سے سب سے بڑے قبیلوں میں وائل کا بھی شمار ہوتا تھا

جس کے متعدد بطون تھے جو بجائے خود قبیلے بن گئے تھے۔ ان میں سے اہم ترین بطون تھے: بنو بکر، بنو عنزہ، بنو ثعلب اور بنو شیبان۔ پھر ان کی اپنی ذیلی شاخیں تھیں۔ اس قبیلے کے لوگ یمن میں واقع جند کے علاقے سے عراقی سرحدوں کے قریب حیرہ تک پھیلے ہوئے تھے اور بہت بڑے علاقے میں آباد تھے۔ ان کا اصل اور مرکزی علاقہ بحرین اور حیرہ کے درمیان واقع تھا۔ جہاں ان کا سب سے بڑا قبیلہ آباد تھا۔ ان کے سیاسی اور سماجی تعلقات حیرہ کی مملکت سے بھی تھے اور دوسری طرف شمال کی غسانی مملکت سے بھی[۸۴۲] مذہبی لحاظ سے یہ اکثر و بیشتر عیسائی تھے۔

(۱) بنو عنزہ بن وائل

یمن کے قریب الجند میں یہ گھرانا آباد تھا اور ان کے بعض افراد مکہ ہجرت کر کے جا بسے تھے اور وہاں قریش کے بعض خاندانوں کے حلیف بن گئے تھے۔ اس بطن کے ابتدائی مسلمانوں میں یہی مہاجر عنزی تھے جو قریش مکہ کے ساتھ اسلام لائے تھے ان کے ایک نمائندے تھے حضرت عامر بن ربیعہ عنزی جو حضرت عمر بن خطاب کے حلیف تھے۔ بہرحال اصل قبیلہ کے بارے میں خیال ہے کہ ان کے کچھ لوگ فتح مکہ اور وفات نبوی کے درمیانی عرصے میں اسلام لائے تھے اور قبیلہ نے اسلامی ریاست کے ساتھ کوئی مفاہمت ضرور کر لی تھی کیونکہ الجند نہ صرف اسلامی ریاست میں شامل ہو گیا تھا بلکہ جنوبی عرب میں اس کا صدر مقام تھا جہاں اس پورے علاقے کے گورنر حضرت معاذ بن جبل رہتے تھے[۸۴۳]

اصل قبیلہ میں انفرادی یا اجتماعی قبول اسلام کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ اسلام کے دائرے سے یکسر باہر نہیں تھے۔ مثال کے طور پر واقدی کا بیان ہے کہ بنو عجل جو بنو بکر بن وائل کی ایک شاخ تھی کہ ایک شخص فرات بن حیان عجلی مسلمان ہو گئے تھے اور انہوں نے اسلامی ریاست کے لئے اچھی خدمات انجام دی تھیں[۸۴۴] اس کے علاوہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک گرامی نامہ ماخذ میں بنو بکر بن وائل کے نام ملتا ہے جس میں آپ نے ان کو اسلام کی دعوت دی تھی۔ آپ کے ایک اور گرامی نامے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص حضرت عدی بن شرحبیل جن کا تعلق بنو عامر بن ذہل سے تھا، بظاہر مسلمان ہو گئے تھے[۸۴۵] بعد میں بنو بکر بن وائل نے اپنا ایک وفد بھی بارگاہ نبوی میں بھیجا تھا۔ جس میں قبیلہ کے سربرآوردہ افراد اور سردار شامل تھے اس وفد نے وفات نبوی سے کچھ عرصہ پہلے مدینہ کا دورہ کیا تھا۔ غالباً وہ مسلمان ہو گئے تھے اور اپنے قبیلہ میں اسلام کے داعی بن کر پہنچے تھے جہاں انہوں نے اسلام کی تبلیغ کی تھی[۸۴۶] بنو بکر بن وائل کے ایک ذیلی مگر اہم خاندان بنو تغلب کے وفد کے بارے میں بھی یہی کہا جا سکتا ہے۔ ابن سعد کا واضح بیان ہے جس پر شبہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ بنو تغلب کے وفد میں مسلمان اور عیسائی دونوں طبقات کے سولہ نمائندے تھے جو اپنے اپنے طبقات کی نمائندگی کرنے مدینہ پہنچے تھے[۸۴۷] بحرین میں ردہ کی تاریخ کے طبری کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ بنو بکر بن وائل اور تمیم کے تمام بڑے خاندانوں میں اسلام عہد نبوی میں پھیل چکا تھا اور ان قبیلوں کے مسلمان سخت آزمائشوں کے باوجود اسلام پر ثابت قدم رہے تھے[۸۴۸] یہ قبائل یا طبقات تھے، حضرات عُتیبہ بن نحاس، عامر بن عبدالاسود، مسمع، مثنیٰ بن حارثہ شیبانی اور حنفہ تمیمی کے جنہوں نے ردہ کے

زمانے میں شاندار کارنامے انجام دیئے تھے۔ یہ متعدد قبیلوں کے سردار تھے۔ جن میں حضرت مثنیٰ ابن حارثہ شیبانی عہد صدیقی میں شہرت کے بام پر پہنچے۔ ان کے علاوہ ابن حزم نے بنو شیبان کے کئی مسلمانوں کے نام بھی گنائے ہیں[۸۴] اور بلا جھجک یہ کہا جا سکتا ہے کہ صرف یہی لوگ مسلمان نہیں تھے۔ بلکہ ان سے کہیں زیادہ کے نام تاریخ محفوظ نہیں رکھ سکی۔

ان حقائق و شواہد کی روشنی میں یہ ثابت ہوتا ہے کہ بنو بکر بن وائل اور بنو تغلب وغیرہ کے معتد بہ لوگ اور طبقات عہد نبوی میں اسلام لا چکے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ بیشتر طبقات اپنے قدیم مذہب پر قائم رہے تھے۔ مگر بعد کے زمانے میں وہ بھی رفتہ رفتہ اسلام میں داخل ہوتے گئے مگر یہ دعویٰ کرنا کہ عہد نبوی میں وائل کے قبیلہ کے کسی اہم طبقہ یا گروہ نے اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ صحیح نہیں ہے[۸۵]

عرب میں جابجا منتشر و پراگندہ قبائل کے اسلام کے ساتھ تعلقات کے مذکورہ بالا جائزے میں یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ان میں سے ہر ایک قبیلہ اور اس کی اہم شاخ میں اسلام متعارف ہو چکا تھا۔ اور ان کے معتد بہ طبقات اسلامی ریاست کے وفادار بن چکے تھے۔ خاص کر عبد القیس، ازد عمان اور تمیم کے قبیلوں میں اسلام مضبوطی سے جم گیا تھا اور ان کے بیشتر خاندان مسلمان تھے۔ جبکہ دوسرے قبائل جیسے بنو حنیفہ، مہرہ اور وائل وغیرہ کے بیشتر طبقات غیر مسلم تھے۔ لیکن ان میں بھی کچھ طبقات اور گروہ مسلمان ہو چکے تھے اور جو طبقات مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ انہوں نے بہر حال اسلامی ریاست کی سیاسی بالادستی قبول کی تھی۔ چنانچہ اس کی تصدیق بنو تغلب کے عیسائی طبقات کے اس معاہدے سے ہوتی ہے جو انہوں نے اسلامی ریاست کے ساتھ کیا تھا۔ اس کے مطابق انہوں نے مدینہ کو جزیہ دینا منظور کیا تھا جو ان کی اپنی شرائط و پسند کے مطابق مسلمانوں کی زکوٰۃ کا دوگنا تھا۔ یعنی ۵ فیصد۔ اس طرح وہ اسلامی ریاست کے ذمی بن گئے تھے۔ بہر حال جزیرہ نمائے عرب میں وفات نبوی کے وقت، کوئی ایسا طبقہ یا قبیلہ نہیں تھا جس نے اسلامی ریاست کی مذہبی یا سیاسی بالادستی قبول نہ کر لی ہو اور اس کا رکن نہ بن گیا ہو۔

خلاصہ بحث

تاریخ اسلام کا یہ عظیم الشان واقعہ ہے کہ ۶۱۰ء میں مکہ کے ایک فرد واحد نے خدا کا فرستادہ و پیغمبر ہونے کا دعویٰ کیا اور سب لوگوں کو خدا کے دین کی طرف بلایا۔ اشراف و اکابر قریش کے لئے یہ نئی آواز تھی مگر اس میں ایک عجیب سی کشش تھی اور اس کے کلام میں ایک مسحور کن صفت وہ کلام انسانی نہیں معلوم ہوتا تھا۔ اور نہ اس کا سنانے والا جھوٹا، کیونکہ وہ چالیس برس سے اس کو صادق اور امین مانتے اور سمجھتے چلے آئے تھے۔ شیوخ و اکابر قریش بڑے ذہین و فطین، تجربہ کار و دوربین عقیل و فہیم تھے وہ کسی بات کو بلا سوچے سمجھے قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ مگر نوجوانان قریش جو زیادہ پختہ ذہنی تحفظات نہیں رکھتے تھے اور کسی بھی قابل فہم بات کو قبول کرنے کا زیادہ فطری رجحان رکھتے تھے اس دعوت کی طرف جھکے، غور سے سنا اور جیسے ہی اسے سمجھا وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خدا اور ان کی رسالت پر ایمان لے آئے۔ مکی عہد میں تبلیغ اسلام کے دو دور تھے: ایک ہجرت حبشہ کے زمانے (۶۱۰ء تا ۶۱۶ء) تک، اور دوسرا ہجرت حبشہ سے لیکر ہجرت مدینہ تک

۶۱۶ء سے ۶۲۲ء تک) ان دونوں ادوار میں اسلام کی تبلیغ برابر جاری رہی۔ خیال عام یہ ہے کہ دور اول میں اسلام سرعت سے پھیلا۔ مگر دور دوم میں اس کی اشاعت رک گئی، یہ صحیح نہیں ہے۔ مکے کے دونوں ادوار میں برابر اسلام کی اشاعت جاری رہی تھی۔ البتہ یہ ضرور تھا کہ دوسرے دور میں اس کی رفتار قریش کے اکابر کی مخالفت اور مسلمانوں کی تعذیب کے سبب کچھ سست ضرور ہو گئی تھی۔

اکابر و شیوخ قریش کی مخالفت کا اصل سبب یہ تھا کہ وہ مکہ کے موجودہ نظام زندگی میں کسی تبدیلی کو خواہ وہ بہتری کے لئے کیوں نہ ہو بدعت تصور کرتے تھے اور اس لئے مردود و مسترد کئے جانے کے قابل۔ کسی حد تک ان کے اپنے بتوں اور خداؤں کی محبت بھی اس کے لئے ذمہ دار تھی۔ پھر اسلام کی تعلیمات کو ماننے کا واضح مطلب تھا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بالادستی اور حاکمیت کو قبول کرنا۔ ظاہر ہے کہ وہ اپنے قدیم اقتدار اور عالمگیر اثر کو یوں ہاتھ سے دینے کے لئے تیار نہ تھے۔ قبائلی رقابت کا عنصر افزاد کی حد تک تو کارفرما نظر آتا ہے مگر قریشی قبیلوں / خاندانوں / گھرانوں نے اسلام کی مخالفت بحیثیت مجموعی نہیں کی تھی۔ قریشی قبائل اور خاندانوں کے اسلام کی جانب رویے سے واضح ہوتا ہے کہ ان میں سے تقریباً ہر خاندان اور گھرانے کے افراد مسلمان ہو گئے تھے۔ بلکہ بعض حالات میں اکثر گھرانے کے گھرانے اسلام لے آئے تھے۔ دراصل عرب قبائلی نظام کا خاصہ یہ تھا کہ سربراہ خاندان / شیخ قبیلہ کا اثر عموماً اس کے خاندان / قبیلہ والوں پر پڑتا تھا اور بقول حضرت عمرو بن عاص سہمی ارکان قبیلہ و خاندان اپنے سربراہ کی اندھا دھند تقلید کرتے تھے۔ لیکن یہ اسلام کا عظیم کارنامہ تھا جس نے نوجوانان قریش کو اکابر قریش کی اندھی تقلید سے آزاد کر کے خود کچھ فیصلے کرنے پر ابھارا تھا۔ ان کو اسلام کی سادگی، سچائی اور گہرائی نے اپنا پیرو بنا لیا تھا۔ اسی بنا پر ایک مصری عالم عبدالمتعال صعیدی نے اسلام کی اولین تحریک کو نوجوانوں کی تحریک قرار دیا ہے۔

مشہور مستشرق مونٹگمری واٹ کا خیال ہے کہ مکہ کے اولین مسلمانوں کو تین طبقات میں منقسم کیا جا سکتا ہے! اوّل طبقہ ان نوجوانان قریش پر مشتمل تھا جو بہترین خاندانوں کے لال تھے۔ یہ ان مکی خاندانوں کے افراد تھے جو مکہ کی سیاست و سماج میں سب سے زیادہ بااثر با اقتدار اور بارسوخ تھے اور عموماً یہ ان کے فرزند یا قریبی عزیز و رشتہ دار تھے۔ دوسرا طبقہ ان نوجوانوں پر مشتمل تھا جو قریش کے اہم ترین اور سربرآوردہ ترین خاندانوں سے نہیں تھے اور تیسرا طبقہ ان مسلمانوں پر مشتمل تھا جو مکہ کے قبائلی نظام میں اپنی ذاتی بنیادیں نہیں رکھتے تھے اور دوسرے قریشی قبیلوں یا خاندانوں پر منحصر تھے۔ ان میں دراصل موالی اور حلفاء شامل تھے۔ یہ تقسیم کسی حد تک صحیح ہے۔ مونٹگمری واٹ نے مسلمانان مکہ میں صرف مردوں کو شامل کیا ہے۔ ان میں عورتوں اور بچوں کو بھی شامل کرنا چاہیئے۔ ان کی شمولیت سے مکی عہد میں مسلمان ہونے والے قریشیوں کی تعداد اس سے کئی گنا زیادہ ہو جاتی ہے۔ جتنی کہ مستشرقین کی فہرستوں میں دکھائی گئی ہے۔ یا جتنی عام طور سے سمجھی جاتی ہے اس کے علاوہ مستشرقین کی فہرستوں میں مکی مسلمانوں کی کثیر تعداد کو چھوڑ دیا گیا ہے۔ مونٹگمری واٹ کی فہرست مسلمین مکہ میں کل سو نام ملتے ہیں جبکہ ان کی تعداد کئی گنا زیادہ تھی۔ اگر ہمارا یہ مفروضہ کہ فی بالغ مسلم چھ یا سات ارکین کو شمار کرنا چاہیئے، صحیح ہے تو مکی عہد میں بالغ و

نابالغ مرد و عورت اور بچیں سمیت کل مسلم آبادی خاص قریشی خاندانوں کی ڈیڑھ دو ہزار سے کسی طرح کم نہیں رہی ہوگی۔ اس کی تائید مآخذ کے اس بیان سے ہوتی ہے کہ فتح مکہ کے لشکر اسلامی میں مہاجر مجاہدین کی تعداد سات سو تھی گویا کہ اس وقت تک مدینہ میں کل قریشی مہاجرین کی تعداد چار پانچ ہزار کے درمیان تھی۔

مکی عہد میں تبلیغ اسلام کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ اسلام صرف مکہ کی حدود یا قبائل قریش تک محدود نہیں رہا تھا۔ وہ نہ صرف جزیرہ نمائے عرب کے مختلف علاقوں میں روشناس ہوا تھا بلکہ جنوب، مغرب اور مشرق کے بعض علاقوں میں پھیل بھی گیا تھا۔ جنوب میں اشعر، رہا وغیرہ قبیلوں نے مکی عہد میں اسلام قبول کیا تھا۔ مغرب میں غفار، اسلم، ازد شنوءہ اور دوس کے قبیلوں میں مسلمانوں کی تعداد معتدبہ ہوگئی تھی۔ بلکہ اوّل الذکر دونوں قبیلے تو تقریباً پورے ہجرت تک اسلام کے پیرو بن چکے تھے۔ اسی طرح مشرق میں قبیلہ عبدالقیس وغیرہ میں اسلام پھیل گیا تھا۔ پھر سنہ ۶۲۰ء تا سنہ ۶۲۲ء میں مدینہ کی تقریباً پچاس فیصد آبادی مسلمان ہو چکی تھی۔ جو تقریباً بیس و پچیس ہزار اشخاص پر مشتمل تھی۔ مدنی مسلمانوں کو چھوڑ کر مکی مسلمانوں اور دوسرے قبائل میں منتشر مسلمانوں کی تعداد ہجرت نبوی کے وقت کسی طور سے پانچ چھ ہزار سے کم نہ تھی۔ تاریخی تناظر میں دیکھنے پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ تیرہ برس کے عرصے میں ایک پیغمبر خدا نے اپنے ماننے والوں کی اتنی بڑی تعداد بنالی تھی۔ بلاریب وہ ایک عظیم کارنامہ تھا۔ یہ صحیح ہے کہ اسلام کی تبلیغ اور نشر و اشاعت کے اس کار عظیم میں آپ کے جاں نثاروں کا لہو۔ قربانیاں اور کوششیں بھی شامل تھیں۔ ان میں جن مبلغین کا نام سنہری حروف سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ وہ ہیں حضرات ابوذر غفاری۔ ابوموسیٰ اشعری، طفیل بن عمرو دوسی، ضماد بن ثعلبہ ازدی اور اشج عبدی وغیرہ۔ اسی کے ساتھ ساتھ قریشی مسلمانوں میں حضرات ابوبکر، عمر، عثمان، ابوعبیدہ، زبیر، سعید بن زید، طلحہ وغیرہ کے ناموں کو بھی شمار کرنا چاہیئے۔ ان اور ان کے بہت سے گمنام اور غیر معروف و غیر مذکور صحابیوں نے اسلام کی مکی عہد میں نشر و اشاعت کا فریضہ انجام دیا تھا۔

مدنی عہد میں بھی تبلیغ اسلام کے دو دور تھے: اوّل ہجرت نبوی سے غزوہ خندق تک (سنہ ۶۲۲ء / سنہ ۵ھ ۶۲۶ء) اور دوسرا غزوہ خندق کے بعد سے وفاتِ نبوی تک (سنہ ۶۲۶ء تا سنہ ۶۳۲ء)۔ اور ان دونوں ادوار میں اسلام اور اسلامی ریاست کے رویّے میں فرق تھا۔ دورِ اول میں اسلامی ریاست نے بعض قبائل عرب سے حلف اور دوستی کے معاہدے کئے تھے۔ ان کو اسلامی امت کا رکن بنائے بغیر۔ لیکن دور دوم میں ایسے دفاعی اور دوستانہ معاہدے ختم ہو گئے تھے۔ اب اسلامی ریاست تمام قبائل عرب سے دو مطالبے کرتی تھی: یا تو اسلام قبول کریں اور امت اسلامی کے مکمل رکن بن جائیں یا اسلامی ریاست کی بالادستی قبول کریں اور جزیہ ادا کریں۔ لیکن اسلام کا وہی ایک رویہ تھا۔ سب کو اپنے پرچم تلے جمع کرنا۔

مدنی عہد کے دورِ اوّل میں سیاسی اور فوجی مصروفیتوں اور مہموں کے سبب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو زیادہ توجہ تبلیغ اسلام پر صرف کرنے کی فرصت نہ ملی۔ تاہم جب بھی آپ کو موقعہ ملا آپ نے تبلیغی جماعتیں اور انفرادی مبلغین بھیجے اور بنفس نفیس تو آپ نے غالباً کسی موقعہ کو اپنے پیغام کی دعوت دینے کے لئے لحاظ سے ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ چنانچہ مہموں اور جنگوں کے دوران آپ نے قبولِ اسلام کے لئے لوگوں کو دعوت دی اور بہت سی مہموں میں لوگ اسلام کے حلقہ بگوش بنے

بھی۔ جہاں تک تبلیغی جماعتوں کا تعلق ہے۔ غزوات بئر معونہ اور رجیع ان کی شاندار مثالیں ہیں۔ اس کے علاوہ بھی آپ نے بعض مہمیں خاص مذہبی اعتبار سے ترتیب دی تھیں۔ آپ کی بعض ابتدائی مہمیں اسی نوعیت کی تھیں۔

اس دورِ حیات کے دوسرے حصے یا نصف میں آپ کی تبلیغی سرگرمیوں میں بہت اضافہ ہوا اور آپ نے متعدد سفارتیں، تبلیغی جماعتیں اور مبلغین کے دستے بھیجے۔ اور صرف عرب کے باشندوں اور حکمرانوں کو دعوت نہیں دی، بلکہ قرب و جوار کے حکمرانوں اور سلاطین کو بھی اسلام کی طرف بلایا۔ غیر ملکی حکمرانوں کی حد تک تو دعوتِ اسلامی زیادہ کامیاب نہیں ہوئی۔ تاہم جہاں تک جزیرہ نمائے عرب کا تعلق ہے۔ آپ کی دعوت پوری طرح سے قبول و منظور کی گئی اور اس کے گوشے گوشے میں اسلام پھیل گیا۔

مدنی دور میں قبائل عرب کا اسلام کی جانب رویے کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ کے مغرب میں آباد قبائل سب سے پہلے اسلام کی جانب متوجہ ہوئے۔ پہلے انہوں نے اسلامی ریاست سے دفاعی اور دوستانہ معاہدے کئے اور پھر اسلام کے پیرو بنتے گئے۔ تا آنکہ ان میں سے کوئی بھی اسلام کے دائرے سے باہر نہیں رہا۔ مغربی قبائل میں کچھ تو ہجرتِ نبوی کے معاً بعد اور زیادہ تر بدر اور غزوہ خندق کے دوران اسلام کے ماننے والے بن چکے تھے۔ مشرقی قبائل نے اسلامی ریاست کی مخالفت زیادہ دنوں تک جاری رکھی اور اس کے سبب اسلام کے ساتھ بھی ان کا رویہ معاندانہ ہی رہا۔ لیکن انفرادی طور سے ان میں اسلام پھیلتا رہا اور ان کے افراد اور بعض بعض حالات میں ان کے گھرانے اور طبقات اسلام قبول کرتے رہے۔ ان قبیلوں کو اسلام کی طرف مائل کرنے میں اسلامی ریاست کی مادی شوکت و حشمت نے بھی خاصا اہم کردار ادا کیا تھا۔ چنانچہ صلح حدیبیہ کے بعد اسلام کی اشاعت ان کے درمیان تیز تر ہو گئی اور فتح مکہ تک وہ اکثر و بیشتر اسلام کے دامنِ عاطفت میں آ چکے تھے اور باقی ماندہ فتح مکہ کے بعد اسلام کے حلقہ بگوش بن گئے۔ شمالی قبائل میں جو مدینہ اور وادی القریٰ کے درمیان آباد تھے وہ اسلام کی طرف زیادہ اور سرعت کے ساتھ مائل ہوئے لیکن جوں جوں مدینہ سے مسافت بڑھتی گئی اسلام کی قبولیت کی رفتار سست ہوتی گئی اور شامی سرحد کے آس پاس بسے قبائل میں سے اکثر مسلمان عہدِ نبوی میں نہیں ہوئے تھے۔ اس کے برخلاف جنوب میں اسلام کی تبلیغ بڑی ہمہ گیر اور تیز رفتار تھی۔ اگرچہ اسلام وہاں مکی عہد میں روشناس ہو چکا تھا۔ اور بعض قبیلے مسلمان ہو چکے تھے تاہم اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا کام فتح مکہ کے بعد شروع ہوا اور دو ڈھائی برس کے عرصے میں پورا جنوبی عرب کلمہ پڑھ چکا تھا۔ مگر منتشر و پراگندہ قبائل میں اسلام کی اشاعت اتنی ہمہ گیر اور تیز نہیں تھی۔ ان میں سے زیادہ تر قبیلے اسلام اور کفر میں منقسم تھے۔ البتہ ان کے بعض بڑے قبیلے پورے مسلمان ہو چکے تھے۔ اسلام کے دائرے سے اکثر و بیشتر وہی باہر تھے۔ جو بالکل سرحدی علاقوں میں آباد تھے۔ بہرحال جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا آخری حج ادا کیا تو آپ کے جلو میں کم و بیش ایک لاکھ ایک لاکھ ۲۴ ہزار مسلمان تھے اور نہ جانے کتنے اپنے گھروں میں رہ گئے تھے۔ اور اللہ کا نام لے رہے تھے۔ ایک اندازہ کے مطابق اس وقت تک مسلمانوں کی کل آبادی پانچ دس لاکھ کے لگ بھگ تھی اور کئی لاکھ مربع کلو میٹر علاقہ اسلامی ریاست کے قبضے میں تھا بلاریب یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ربع صدی سے بھی کم مدت میں عظیم ترین و بے مثل کارنامہ تھا۔ اور اسلام کی روحانی تاثیر اور تسخیر قلوب کا بیّن ثبوت

باب سوم

فوجی تنظیم عہدِ رسالت میں

مدینہ منورہ میں اسلامی ریاست کے قیام کا لازمی تقاضا تھا کہ اس کی ایک فوجی تنظیم بھی ہو۔ ہجرت کے بعد یثرب میں آباد مسلم امت نہ صرف ہر لحاظ سے کمزور اور فرومایہ تھی بلکہ وہ دشمنوں سے گھری ہوئی بھی تھی گویا کہ امت مسلمہ ایک جزیرہ امن و امان میں آباد تھی اور اس کو مخالفت و عداوت کی طاقتیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مہاجرین مکہ کو سب سے زیادہ خطرہ مکہ کی طاقت ور اشرافیہ سے محسوس ہوتا تھا اور یہ خوف بلاوجہ نہیں تھا۔ مدینہ میں اسلامی ریاست کے وجود کو اشراف و فراعین قریش اپنی اقتصادی شہ رگ پر چھری تصور کرتے تھے کیونکہ وہ شام جانے والی بین الاقوامی شاہراہ تجارت کے ناکہ پر واقع تھی وہ بخوبی جانتے تھے کہ اگر اس نوزائیدہ اسلامی ریاست اور غیر منظم اسلامی اُمّت کو پنپنے اور منظم ہونے کا موقع دیا گیا تو وہ ایک دن ان کے اقتدار و بالادستی کو چراغ دکھائے گی۔ مدینہ کی ریاست کی ترقی دراصل مکی اشرافیہ کی موت تھی۔ سیاسی، سماجی، مذہبی اور اقتصادی غرض کہ ہر طرح کی موت۔ مسلمانوں کو قریشی جذبات و خیالات کا بخوبی احساس و ادراک تھا۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نرغۂ اعداء سے یوں بچ نکلنا دراصل جلتی پر تیل کے مترادف تھا۔ لہٰذا قریش مکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جان کے درپے ہو جائیں گے اور اسلامی ریاست کو برباد کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں گے اور حقیقتاً یہی ہوا بھی تھا۔ ہجرت نبوی کے معاً بعد سے انہوں نے بھرپور کوششیں کی تھیں کہ اسلامی ریاست کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں۔

اس عظیم ترین بیرونی خطرہ کے علاوہ مدینہ کی جنت میں بھی کچھ سانپ موجود تھے اور اسلامی ریاست کو اپنے گھر کے بھیدیوں کے خطرات، سازشوں اور کینہ توزیوں کا سامنا تھا۔ مدینہ کے یہودی قبیلے جن کی تعداد بیس سے اوپر تھی، اسلام اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سخت ترین مخالف تھے۔ اور وہ کسی قیمت پر اسلامی ریاست کو موجود اور ترقی کرتے دیکھنا پسند نہیں کر سکتے تھے۔ ان کی مخالفت کے مذہبی اور سیاسی نیز اقتصادی اسباب تھے۔ وہ اپنی مذہبی اور اقتصادی بقا اسلامی ریاست کی بربادی ہی میں دیکھتے تھے اس لئے وہ اس مقصد کے لئے ہر طرح کی ساز باز کر سکتے تھے اور ہر دشمن اسلام کے ساتھ اتحاد و معاہدہ کر سکتے تھے۔ انہوں نے بھی حقیقتاً یہی کیا اور اسلامی ریاست کے سب سے بڑے دشمن۔ قریش۔ کے ساتھ ساز باز بھی کی اور فوجی و سیاسی اتحاد کی کوشش بھی۔

اندرونی مخالفین اور اعداء کا ایک عنصر ان نام نہاد مسلمانوں پر مشتمل تھا۔ جو بظاہر مسلمان تھے لیکن باطن سخت ترین دشمنِ اسلام۔ ان چھپے ہوئے منافقین کی عداوت کہیں زیادہ خطرناک تھی وہ نہ صرف دشمنوں کو اندر کے حالات سے باخبر کرتے تھے بلکہ مسلمانوں کی صفوں میں انتشار پیدا کرتے تھے اور اس طرح امت اسلامی کے تار و پود کو اندر ہی اندر بکھیر دینا چاہتے تھے۔

ایک چوتھا مخالف عنصر بدوی قبائل عرب کا تھا۔ جو مدینہ کے گرد و نواح میں آباد تھا وہ اپنی بدوی روایات کے پیش نظر

اسلامی ریاست کا ممکن دشمن بن سکتا تھا کیونکہ اسلامی ریاست کا مطلب تھا مرکزیت اور اجتماعیت کا مدنی سیاسیات میں پیدا ہونا، اور یہ مرکزیت ان بدو قبائل کو پسند نہیں آسکتی تھی۔ اس کے علاوہ ان میں سے بعض کے حلیفانہ تعلقات قریش مکہ سے تھے، اور وہ ان کی حمایت میں اسلامی ریاست کے مخالف بن سکتے تھے۔ پھر اسلامی ریاست جن مقاصد اور نصب العین کے لیے وجود میں آئی تھی ان کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ اگر یہ بدوی قبائل دوست نہ بنتے تو ان کا دشمن بننا لازمی تھا۔

ان متعدد خطرات اور مختلف دشمنوں کے پیش نظر اسلامی ریاست کے لیے یہ ناگزیر تھا کہ وہ اپنی فوج بنائے اور ایک عسکری تنظیم اپنائے۔ کیونکہ اس کے بغیر اس کا وجود مستقل معرض خطر میں تھا۔ یہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دوربین نگاہ اور حقیقت شناس نظر تھی جس نے ابتدا ئے کار ہی سے اس کارعظیم کی ضرورت کو محسوس کر لیا تھا۔ چونکہ آپ ایک عملی انسان تھے اس لیے آپ نے اسلامی ریاست کے قیام کے معاً بعد اس کی طرف بھر پور توجہ دی اور ایک فوجی و عسکری تنظیم کی کوششیں شروع کر دیں۔ فوجی صلاحیتوں، قائدانہ لیاقتوں، عسکری ہم آہنگی، اخلاقی اور روحانی بلندی، جسمانی خوبیوں اور کسی حد تک مادی وسائل کی کمی نہیں تھی۔ صرف تنظیم اور ترتیب کی ضرورت تھی اور ان مادی اور روحانی صلاحیتوں کو ایک مستعد و منظم و مرتب فوج میں ڈھالنے کی ضرورت تھی۔

عہد نبوی کی ابتدائی مہمیں دراصل اس عسکری تنظیم کی سنگ بنیاد تھیں۔ بنیادی طور سے وہ فوجی مہمیں نہیں تھیں لیکن ساتویں صدی کے نصف اوّل کے عرب میں مذہبی و اقتصادی / تجارتی کاروان بھی تلواروں کی چھاؤں ہی میں سفر کر سکتے تھے وہ دفاعی اور سیاسی جماعتیں ہونے کے باوجود تیر و تفنگ، تلوار و تبر اور نیزوں کی مدد ہی سے اپنا راستہ بنا سکتی تھیں۔ چنانچہ ان مہموں نے نہ صرف عسکری نظام نبوی کی داغ بیل ڈالی۔ بلکہ انہوں نے مسلمانوں کو فوجی تربیت و تنظیم و ترتیب بھی عطا کی خطرات سے مردانہ وار نپٹنا، دلیرانہ دشمنوں کا سامنا کرنا، اجنبی علاقوں اور لوگوں سے ربط و واقفیت حاصل کرنا اور ان سے بڑھ کر ایک منظم عسکری گروہ کی مانند کام کرنا سکھا۔ یہی وہ تربیت و تنظیم تھی جس نے رفتہ رفتہ مسلمانوں کو ایک فوج میں ڈھالنا شروع کر دیا تھا اور جب اچانک بدر کے میدان میں ان کا سامنا اپنے سے تین گنا بڑے لشکر سے ہوا تو نہ صرف یہ کہ انہوں نے ان کا بھر پور مقابلہ کیا بلکہ اسی تنظیم کی بدولت اس کو شکست فاش دی۔ پھر یہی عسکری تنظیم تھی جس نے احد، خندق، خیبر اور نہ جانے اور کتنی مہموں میں ان کو دشمنوں کے مقابلے میں سرخرو کیا تھا۔ اسی فوجی قوت کے سامنے عرب کے سب سے بڑے اور سب سے طاقت ور شہر مکہ نے گھٹنے ٹیک دیئے تھے اسی سے ہوازن اور غطفان کے طاقت ور قبائل نے مات کھائی تھی۔ اسی کے عظیم الشان مظاہرے کے نتیجے میں وقت کی سب سے بڑی طاقت ـــــ رومی سلطنت ـــــ اور اس کے باجگذاروں اور حامیوں کو تبوک کے میدان میں مد مقابل ہونے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ اسی عسکری طاقت نے جزیرہ نمائے عرب کے کونے کونے اور گوشے گوشے میں اسلامی ریاست کے مادی اقتدار کے جھنڈے گاڑ دیئے تھے۔ مادی لحاظ سے یہی قوت تھی جس نے تمام قبائل عرب کو اسلامی ریاست کی بالادستی ماننے پر مجبور کر دیا تھا۔ عہد نبوی میں سرحدوں کی مکمل تسخیر کے بعد اسی فوجی طاقت نے خلافت راشدہ میں عالمگیر فتوحات کا باب کھولا تھا اور اس کو ایک عالمگیر سلطنت میں بدل دیا تھا۔

تاریخی حقائق اور اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ مدینہ کی اسلامی ریاست کی عسکری تنظیم کو ترقی کرنے میں کافی وقت لگا تھا اور وہ

متعدد مرحلوں سے گذری تھی۔ اس کے علاوہ مدنی حیاتِ طیبہ کے دہ سالہ دور میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد و مختلف فوجی افسروں اور کارکنوں کی تقرری وقت اور ضرورت کے تقاضوں کے مطابق کی تھی اور اس طرح رفتہ رفتہ ایک فوجی سلسلۂ افسران و عسکری عمال وجود میں آیا تھا۔ ان فوجی افسروں میں جو لوگ شامل تھے وہ یہ تھے: (۱) امراءِ سرایا (آزاد مہموں کے قائدینِ لشکر) (۲) فوجِ نبوی میں آپ کے ماتحت افسران (جیسے امراءِ میمنہ، میسرہ، مقدمہ اور ساقہ) یا امراءِ مشاۃ (پیدل فوج) امراءِ رماۃ (تیر اندازوں کے افسر) (۳) علمبرداران افواج (صاحب الالویہ والرایات) (۴) اطلاعی گشتی دستے اور ان کے افسر طلیعۃ، طلائع۔ (۵) جاسوس (عیون) (۶) راہ بر (دلیل) اموالِ غنیمت اور قیدیوں کے نگران افسر (صاحب المغانم والاسرٰی) ہتھیاروں اور جنگی گھوڑوں کے افسر (صاحب السلاح والفرس) اور محافظ دستوں کے افسر (اصحاب الحرس) وغیرہ۔ فوجی تنظیم نبوی کے تاریخی ارتقاء کے سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس کا تاریخی توقیت کے مطابق مطالعہ کریں۔ اس لئے آغازِ کلام امراءِ سرایا سے ہوتا ہے کہ یہی فوجی تنظیم کے بانی و مبانی تھے یا اس کا نقطۂ آغاز۔

۱۔ امراءِ سرایا (فوجی مہموں کے قائدین)

اسلامی ریاست... کی عسکری تنظیم میں اعلیٰ اختیارات کس کے ہاتھ میں تھے؟ تاریخِ اسلام کا تھوڑا سا بھی مطالعہ جس کسی کا ہو گا وہ بلا کسی پس و پیش کے یہ جواب دے گا کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ سارے اختیارات حاصل تھے۔ منطق کا بھی یہی تقاضا ہے کہ جس شخصیت کی بالادستی تسلیم کی جا رہی ہے اس کو یہ اختیارات تفویض کیئے جائیں۔ مگر مونٹگمری واٹ کی تحقیق یہ ہے۔ کہ بیعتِ عقبہ ثانیہ میں فوجی قیادت کا مسئلہ طے نہیں کیا گیا تھا اور آپ کے فوجی اختیارات کی نوعیت اجاگر نہیں تھی۔ یہ واضح امر ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مدنی ریاست میں جو بھی اختیار و اقتدار حاصل تھا اس کا سرچشمہ آپ کی رسالت تھی یعنی خدائے قادرِ مطلق کے نبی و رسول کی حیثیت سے اس کے احکام و اوامر کو آپ اس اسلامی ریاست میں نافذ کرنے کے مجاز تھے اور ظاہر ہے کہ آپ سے بڑھ کر اور کون خدائی مرضی اور احکام کو سمجھ اور نافذ کر سکتا تھا لیکن قریشِ مکہ کی مانند اگر مستشرق موصوف بھی آپ کی رسالت اور اس کے عطا کردہ سرچشمۂ اقتدار و اختیار کو نہیں تسلیم کرتے تو تاریخ کی ٹھوس واقعاتی شہادت تو تسلیم کرنا ناگزیر ہے۔ مآخذ کا بیان ہے کہ ہجرت کے چھ ماہ بعد آپ نے پہلی مہم ترتیب دی اور قیادت کا پرچم اپنے ایک صحابی کو عطا کیا۔ پھر اسی ماہ دوسری مہم کی قیادت دوسرے صحابی کو دی اور یہ سلسلہ جاری رہا کبھی خود آپ اپنی قیادت میں مہمیں لیکر گئے اور کبھی اپنے اصحاب کو قیادت کا فریضہ سونپا۔ یہاں تک کہ متعدد جنگوں میں فوجی کمان میدانِ جنگ میں بنفسِ نفیس آپ نے فرمائی۔ آپ کو یہ اختیار کس نے دیا تھا اور اس کو امتِ مسلمہ نے کیونکر قبول و تسلیم کیا تھا؟ لہذا نظریاتی اور واقعاتی دونوں طرح سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی عسکری تنظیم میں سب سے اعلیٰ و ارفع اختیارات آپ کی ذات کو حاصل تھے (۱)۔ اس کے علاوہ مزید شہادت دستورِ مدینہ کی دفعہ نمبر ۳۶ سے فراہم ہوتی ہے جس کے مطابق جنگ میں شریک ہونے یا نکلنے کی اجازت اختیارِ نبوی کے دائرہ میں تھی (۲) گویا کہ آپ اسلامی افواج کے سالارِ اعظم اور قائدِ اعظم تھے اور آپ کو نہ صرف بنفسِ نفیس افواج کی قیادت کا حق و اختیار حاصل تھا بلکہ اپنی

جگہ یا اپنے ماتحت افسرانِ فوج کی تقرری کا اختیار بھی حاصل تھا۔ اس سے یہ بھی ثابت ہے کہ کم از کم عہدِ نبوی میں سربراہ مملکت و ریاست ہی افواج اسلامی کا سربراہ اعظم ہوتا تھا اور وہی یکہ و تنہا مستقل فوجی افسر اور قائد۔ بقیہ امراء سرایا یا قائدین افواج کی تقرری اور حیثیت دونوں عارضی ہوتے تھے۔ جیسا کہ ہم ابھی امراء سرایا کی بحث میں دیکھیں گے۔

اسلامی تاریخ میں سریہ اس مہم کو کہتے ہیں کہ جس کی قیادت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کسی صحابی کو سونپ دی ہو اور غزوہ اس مہم کو جس میں آپ بنفس نفیس سالار فوج کی حیثیت سے موجود ہوں۔ چنانچہ حالات کے مطابق آپ نے متعدد مہموں کی سربراہی اور قیادت اپنے مختلف اصحاب کو عطا فرمائی۔ واقدی کے بقول پہلی مہم ہجرت کے چھ ماہ بعد رمضان سنہ ۱ھ / مارچ سنہ ۶۲۳ء میں ترتیب دی گئی۔ اور پہلا قائد حضرت حمزہ بن عبد المطلب کو مقرر کیا گیا اور آخری مہم حیات نبوی کے آخری ایام میں ربیع الاول سنہ ۱۱ھ / جون سنہ ۶۳۲ء میں ترتیب کی گئی، اور حضرت اسامہ بن زید کلبی کو قائد بنایا گیا۔[۳] درمیانی عرصے میں اس منصب جلیل پر ۴۷ اور تقرریاں کی گئی تھیں۔ جبکہ قائدین کی تعداد کل ۳۴ تھی تقرریوں اور قائدین کے تناسب میں واضح فرق سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ بعض امراء سرایا کو ایک سے زیادہ مرتبہ یہ شرف ملا تھا۔ ان خوش نصیب و معتمد قائدین میں نمایاں حضرات تھے۔ جناب محمد بن مسلمہ اوسی، علی بن ابی طالب ہاشمی، غالب بن عبد اللہ لیثی اور خالد بن ولید مخزومی۔ اوّل الذکر دونوں حضرات نے تین تین مہموں کی قیادت کی تھی۔ جبکہ مؤخر الذکر دو صحابیوں نے چار چار مہموں کی۔[۴] لیکن عہد نبوی میں امراء سرایا یا قائدین نبوی میں سب سے اہم اور نمایاں شخصیت نہ کسی قریشی کی تھی نہ کسی انصاری کی اور نہ ہی قریش و عرب کے کسی طبقۂ اشراف کے کسی فرد کی۔ بلکہ یہ شرف حاصل ہوا تھا خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک مولیٰ (آزاد کردہ غلام) حضرت زید بن حارثہ کلبی کو۔ انہوں نے بہ اختلافِ روایت و شہادت تیرہ یا گیارہ مہموں کی قیادت کی تھی۔ ان کی پہلی تقرری جمادی الآخر سنہ ۲ھ / نومبر سنہ ۶۲۳ء میں ہوئی تھی اور آخری تقرری جمادی الاولیٰ سنہ ۸ھ / ستمبر سنہ ۶۲۹ء میں۔[۵] مآخذ کا تقریباً متفقہ بیان ہے کہ اگر کسی مہم میں زید بن حارثہ کلبی موجود و شریک ہوتے تو لازمی طور سے وہ اس کے قائد مقرر کیے جاتے تھے۔[۶]

ان عظیم ترین صف اول کے قائدین افواج کے علاوہ بعض ایسے امراء سرایا تھے۔ جنہوں نے یہ سعادت دوبارہ حاصل کی تھی ان کی تعداد چھ تھی۔[۷] گویا کہ کل امراء سرایا کی تعداد ۳۴ تھی اور تقرریوں کی تعداد ۴۷۔[۸] اتنی زیادہ تقرریوں اور امراء سرایا کی کثرت تعداد سے یہ بات از خود واضح ہو جاتی ہے کہ جہاں تک عہدہ اور منصب کا تعلق تھا وہ تو مستقل تھا مگر عہدہ دار اور منصب دار مستقل طور سے مقرر نہیں کیے جاتے تھے اور اس کا سبب ظاہر تھا کہ سوائے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کوئی ان کی موجودگی میں مستقل سالارِ لشکر نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ اس صورت میں آپ کے اعلیٰ اختیارات محدود ہو جاتے۔ چنانچہ صورتحال یہ تھی کہ ضرورت اور حالات کے تحت امراء سرایا مقرر کیے جاتے تھے اور مہم کے انجام پاتے ہی ان کی تقرری اور ان کا عہدہ ختم ہو جاتا تھا اور پھر دوسرے مواقع پر دوسرے یا انہی میں سے کسی کا تقرر کیا جاتا تھا۔ امیر سریہ کی تقرری کی یہ عارضیت دراصل دو سبب سے تھی: اوّل یہ کہ اسلامی ریاست کی کوئی مستقل اور باقاعدہ فوج نہیں تھی۔ ضرورت کے وقت مسلم آبادی میں سے بالغ مرد ایک فوج بنا لیتے تھے اور ضرورت ختم ہوتے ہی یہ فوج توڑ دی جاتی تھی۔ لہٰذا اس کے ساتھ ہی سالار فوج کا عہدہ اور تقرری بھی ختم ہو جاتی تھی۔ دوم یہ کہ مستقل سالار فوج رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تھے اور جب آپ چاہتے تھے عارضی طور سے اپنا اختیار اپنے کسی صحابی کو منتقل کر دیتے تھے جو تھوڑی سی مدت کے لئے امیر سریہ بن جاتا تھا۔

امراء سرایا کے بارے میں ایک اہم حقیقت یہ ہے کہ ان کی تقرریاں مختلف قبائل اور بطون میں اچھی طرح سے منقسم تھیں اور تقریباً ہر قبیلہ کو جو اس وقت تک اسلامی ریاست کا ہمنوا بن چکا تھا اور قائدانہ صلاحیتیں رکھتا تھا۔ قیادتِ افواجِ اسلامی کا موقعہ دیا گیا تھا ذیل میں اس نکتہ کو سمجھنے کے لئے ایک شجرہ دیا جا رہا ہے۔ جس سے تمام امراء سرایا کی قبیلہ وار تقسیم کا علم ہو سکے گا۔

نمبر شمار	قبیلہ / خاندان	تقرریوں کی تعداد	عہدوں کی تعداد
(ا)	قریش	۲۵	۱۸
۱	بنو ہاشم	۵	۳
۲	بنو امیہ	۴	۴
۳	بنو سہم	۳	۲
۴	بنو مخزوم	۵	۲
۵	بنو فہر	۳	۲
۶	بنو زہرہ	۲	۲
۷	بنو مطلب	۱	۱
۸	بنو تیم	۱	۱
۹	بنو عدی	۱	۱
(ب)	خزرج	۱۱	۸
(ج)	اوس	۶	۳
(د)	کلب	۱۰	۲
(س)	بلی	۱	۱
(ص)	سلیم	۱	۱
(ط)	غطفان	۱	۱
(ع)	ہوازن	۲	۲
(ف)	قیس عیلان	۲	۲
(ق)	اسد/خزیمہ	۴	۳
(ک)	کنانہ	۷	۴
ل	ازد	۲	۲

(م)	بجیلہ	۱	۱
(ن)	غیر معروف	۱	۱
	کل میزان	۷۴	۴۹

جیسا کہ شجرہ سے واضح ہوتا ہے کہ بیشتر تقرریاں اس حلقۂ افسران میں قبیلۂ قریش کو ملی تھیں اور یہ کوئی حیرت کی بات نہیں تھی کیونکہ قریش نہ صرف پورے عرب میں عددی لحاظ سے سب سے بڑا قبیلہ اور گروہ تھے بلکہ وہ فوجی صلاحیتوں اور لیاقتوں کے لیے بھی پورے عرب میں ممتاز تھے۔ قریش کے ضمن جو نکتہ قابل ذکر ہے وہ یہ کہ امراء سرایائے نبوی میں بنوامیہ کی تعداد کافی اہم تھی۔[۹] جہاں تک ان کے افسروں کی تعداد کا تعلق ہے وہ تمام قبائل عرب میں سب سے زیادہ تھے۔ اگرچہ ان کی تقرریوں کی تعداد کم تھی۔ بہر حال ان کی اتنی بڑی تعداد میں شمولیت سے ایک طرف ان کی قائدانہ لیاقتوں اور عسکری صلاحیتوں کا ثبوت ملتا ہے جن کے لیے وہ زمانہ جاہلیت سے شہرت اور نمایاں مقام رکھتے تھے تو دوسری طرف عہد نبوی میں بنوہاشم اور بنوامیہ کی رقابت کی بالواسطہ تردید بھی ہوتی ہے اور ساتھ ہی یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ عہد نبوی میں بنوامیہ جاں نثاری میں کسی سے پیچھے نہیں تھے۔ یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ فتح مکہ تک قریشی اشرافیہ میں قیادہ (فوجی سالاری) کا منصب بنوامیہ ہی کو حاصل تھا اور بعثت نبوی کے زمانے میں ابوسفیان بن حرب اس کے آخری منصب دار تھے۔

عسکری تنظیم کے اس شعبہ میں دوسرے نمایاں قریشی خاندان یہ تھے۔ بنوسہم، بنومخزوم، بنوفہر اور بنوزہرہ وغیرہ جو قریشی اشراف مکہ کے ستون تھے۔[۱۱] اگرچہ بنومخزوم مکی اشرافیہ میں خاصا بڑا فوجی منصب (قبہ) رکھتے تھے اور اپنی عسکری صلاحیتوں کیلئے ممتاز تھے[۱۲] مگر اسلامی تنظیم میں ان کو دوسرے قریشی سالاروں سے کچھ زیادہ حیثیت حاصل نہیں تھی۔ البتہ یہ امر بدیہی ہے کہ ان کے نمائندے حضرت خالد بن ولید مخزومی نہ صرف عہد نبوی میں بلکہ عہد ما قبل اسلام میں بھی اپنی عسکری قیادت کے لئے ممتاز و نمایاں ترین فرد رہے تھے۔ خلافت راشدہ میں انہوں نے جیسے جوہر دکھائے ان کے سبب آج ان کا شمار دنیا کے عظیم ترین سالاروں اور جرنلوں میں ہوتا ہے۔ عہد نبوی میں بھی ان کی فوجی صلاحیت کے جوہر خوب کھلے تھے۔ اور انہوں نے اپنی تمام جنگوں اور مہموں میں کارہائے نمایاں انجام دیئے تھے۔[۱۳] بقیہ دوسرے قریشی سالار ایک دوسرے کے ہم پلہ تھے اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کن میں فوجی لیاقت اور صلاحیت زیادہ تھی۔ باقی تین امراء قریش کو اس شعبہ میں نمائندگی بہت کم درجہ کی ملی تھی اور انہوں نے عہد نبوی میں اپنی عسکری صلاحیتوں کی کوئی خاص چھاپ نہیں چھوڑی تھی۔ اگرچہ ان کے نمائندے حضرت ابوبکر تیمی[۱۴]، حضرت عمر بن خطاب عدوی[۱۵] اور حضرت ابوعبیدہ بن جراح فہری[۱۶] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امت اسلامی کے سب سے زیادہ محترم و معظم ارکان تھے۔ ان تینوں حضرات کی عسکری سوجھ بوجھ اور قائدانہ لیاقتوں کا اظہار عہد نبوی کے بعد ردّہ کی جنگوں اور عراق و شام و مصر کی فتوحات کے معرکوں کے دوران ہوا تھا۔

دوسرے قبائل عرب میں مدینہ کے دونوں قبیلوں اوس اور خزرج کو مجموعی طور پر قریشی امراء کے بعد نمائندگی حاصل تھی ان دونوں کے گیارہ نمائندوں نے سترہ تقرریاں حاصل کی تھیں۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ خزرج کو اوس پر یک گونہ فضیلت حاصل تھی۔ غالباً اس کا

سبب ان کی عددی طاقت تھی جس کے نتیجہ میں ان میں عسکری صلاحیتیں نسبتاً زیادہ تھیں[۱۸] اس کا ثبوت کسی حد تک ما قبل اسلام کی ان جنگوں کے شواہد سے ملتا ہے جو ان دونوں نے آپس میں لڑی تھیں۔ اور جن میں عموماً خزرج کو برتری حاصل رہی تھی۔ جہاں تک قبیلہ کلب کا تعلق ہے تو حضرت زید بن حارثہ کلبی کے بارے میں مزید یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ عہد نبوی کے سب سے بڑے "قائد" اور امیر سریہ تھے۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ سب سے زیادہ مہموں کی قیادت کی تھی بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے بڑے لشکروں کی کمان بھی ان کو سونپی گئی تھی اس طرح ان کے فرزند دل بند حضرت اسامہ بن زید کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات طیبہ کے آخری دنوں میں سب سے بڑے سریے کی کمان عطا فرمائی تھی۔ ان دونوں کی اس منصب عظیم پر تقرری کی اہمیت اس کے "تاریخی تناظر" میں دیکھنے سے زیادہ واضح ہوتی ہے۔ حضرت زید بن حارثہ مولی تھے اور ان کے فرزند مولی زادہ اور ظاہر ہے کہ اشراف قریش و انصار کے مقابلے میں وہ سماجی اعتبار سے فروتر تھے۔ اس کے علاوہ حضرت اسامہ تو اٹھارہ برس کے نوجوان تھے اور ان کی ماتحتی میں تمام بڑے بڑے شیوخ و اکابر قریش دے دیئے گئے تھے۔[۱۹] ان دو تقرریوں سے دو اہم نکتے روشنی میں آتے ہیں۔ اول یہ کہ اسلام اور اسلامی ریاست اپنے عہدوں پر تقرری کے لیے صلاحیت اور لیاقت دیکھتی تھی اور اسی کو اصل قرار دیتی تھی۔ چنانچہ ان دونوں بزرگوں نے اپنے کارناموں اور کامیابیوں سے ثابت کر دیا کہ وہ جس عہدے پر مقرر کیے گئے تھے۔ اس کے وہ بخوبی اہل تھے۔ دوم یہ کہ اسلامی ریاست سماجی امتیازات اور معاشرتی اونچ۔ نیچ کے فرق کو عہدے اور تقرری کے ذیل میں قائم رکھنے کے حق میں نہیں تھی۔ کیونکہ اس کی بنیاد اسلام پر تھی جو ان امتیازات کو روا نہیں رکھتا۔ دراصل ایک مولی اور مولی زادہ کا تقرر کر کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے اکابر کو خاص کر اور اشراف عرب کو عام طور سے یہ سمجھا دینا چاہتے تھے کہ اسلامی ریاست میں عہدہ حاصل کرنے کی بنیاد صلاحیت اور صرف صلاحیت ہے۔ سماجی و قبائلی عزت اور سیادت کے جھوٹے دعوے نہیں۔

بقیہ قبائل عرب میں اسد اور کنانہ کو دوسرے قبیلوں کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ تقرریاں حاصل ہوئی تھیں اور اسکا سبب یہ تھا کہ ان کے زیادہ افراد اسلام کے حلقہ بگوش بن چکے تھے۔ یہاں اس نکتہ پر توجہ دلانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ قبیلہ اسد سے تعلق رکھنے والے تمام امیران سرایا دراصل قریش کے قبیلہ بنو امیہ کے حلیف تھے اور چونکہ حلفا اپنے سرپرست خاندان کے افراد شمار ہوتے تھے اس لئے ایک طرح سے یہ بنو امیہ کی تقرریاں تھیں۔ اس سے اسوقت کے سماج میں بنو امیہ کے مقام و حیثیت کی تعین کرنے میں مدد ملتی ہیں اور ثابت ہوتا ہے کہ وہ خِيَارُكُمْ فِي الْجَاهِلِيَّةِ خِيَارُكُمْ فِي الْإِسْلَامِ زمانہ جاہلیت میں تمہارے جو لوگ بہتر تھے وہ اسلام میں بھی بہتر ہیں، کی حدیث نبوی کے مطابق کی اشرافیہ اور اسلامی ریاست دونوں میں ایک نمایاں اور محترم مقام کے حامل تھے۔ اور ان کو مکمل اعتماد نبوی حاصل تھا۔ یہ دراصل ان کے خلوص اسلام اور پکے عقیدے کی دربار رسالت سے سند کے مترادف تھا جس پر عموماً ہمارے جدید مؤرخین شک و شبہ کا اظہار کرتے ہیں حالانکہ وہ قطعی بے بنیاد ہیں اور اس لئے بالکل غیر معتبر

اس ذیل میں ایک اہم نکتہ یہ بھی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے امراء سرایا کے شعبہ میں اپنے چار قریبی اعزہ کو بھی مقرر فرمایا تھا۔ ان میں حضرت حمزہ بن عبد المطلب آپ کے حقیقی چچا تھے[۲۰]، حضرت علی[۲۱] اور حضرت جعفر بن ابی طالب[۲۲] آپ کے حقیقی چچازاد بھائی تھے جبکہ حضرت ابو سلمیٰ بن عبد الاسد مخزومی[۲۳] آپ کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ ان کے علاوہ چھ اور امراء بھی تھے جن

سے آپ کے ازدواجی یا حلف کے تعلقات تھے۔ ان میں حضرات ابوبکر و عمر و ابوسفیان بن حرب آپ کے خسر تھے[24] تو حضرت عبداللہ بن حذافہ سہمی آپ کی اہلیہ محترمہ حضرت حفصہ کے سابق شوہر کے بھائی تھے[25] جبکہ حضرات زید بن حارثہ اور ان کے فرزند اسامہ آپ کے حلیف تھے۔ اسوۂ نبوی کی ان مثالوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ رشتہ داری یا قرابت کا تعلق کسی طور سے عہدوں اور تقرریوں کے لیے مانع نہیں ہے بشرطیکہ وہ صلاحیت و لیاقت کی بنیاد پر کیا گیا ہو اور محض اقرباپروری اور اعزہ نوازی کے لیے نہ کیا گیا ہو۔ اور ظاہر ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تمام تقرریاں صلاحیت اور تقاضائے وقت و مہم کی بنیاد پر کی تھیں وہ نہ تو قبائلی اور خاندانی یا اقرباپروری کے اعتبار سے کی گئی تھیں اور نہ ہی کسی اور کا حق مار کے۔ بنیادی طور سے یہ عوامل و عناصر نہ تو آپ کو عہدے دینے اور تقرری کرنے پر آمادہ کرتے تھے اور نہ ہی آپ کو ان سے روکتے تھے۔ اور بلا ریب حکومت و ریاست کے معاملات میں اور خاص کر ایسے سماج میں جہاں سماجی امتیازات بہت ہوں یہی بہترین پالیسی ہے کہ تمام عہدے صلاحیت و لیاقت کی بنیاد پر دیئے جائیں اور کسی کو محض اس ڈر سے محروم نہ کر دیا جائے کہ اقرباپروری کا الزام آئے گا۔ کیونکہ تقویٰ، دیانت، ایمانداری اور انصاف کا یہی تقاضا ہے

امراء سرایا کے مطالعہ میں ایک اہم پہلو یہ ہے کہ ان کی تقرریوں کا تاریخی توقیت کے مطابق مطالعہ کیا جائے۔ اس سے بعض بہت اہم اور دلچسپ نکات ابھرتے ہیں۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ پہلی تین تقرریاں توقیتی لحاظ سے قریش کے تین خاندانوں ہاشم، مطلب اور زہرہ کو بالترتیب[26] ملی تھیں۔ یہ تینوں تقرریاں بالترتیب مارچ، اپریل اور مئی ۶۲۳ء میں کی گئی تھیں یعنی ہجرت کے چھٹے، ساتویں اور آٹھویں مہینے میں۔ پہلے ہاشمی حضرت حمزہ کے لگ بھگ چار سال بعد ایک اور ہاشمی حضرت علی بن ابی طالب نے اسلامی افواج کی کمان دسمبر ۶۲۷ء یا جنوری ۶۲۸ء / شعبان ۶ھ میں کی تھی[27]۔ جبکہ موصوف کو دوبار مزید یہ سعادت، ربیع الثانی ۹ھ / جولائی۔ اگست ۶۳۰ء اور دسمبر ۶۳۱ء / رمضان ۱۰ھ میں ملی تھی[28]۔ تیسرے ہاشمی حضرت جعفر بن ابی طالب نے موتہ کی مہم میں یہ ذمہ داری سنبھالی تھی۔ جبکہ ان کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین امراء سریہ میں ایک نامزد کیا تھا[29]۔

اگرچہ کسی اموی کی پہلی تقرری کافی تاخیر سے یعنی ۵ھ / ۶۲۶ء میں ہوئی تھی جبکہ حضرت ابان بن سعید نے عسکری قیادت کا فریضہ انجام دیا تھا[30]، تاہم امویوں کے ایک حلیف حضرت عبداللہ بن جحش کو یہ سعادت اسلامی ریاست کے قیام کے آغاز ہی میں رجب ۲ھ / جنوری ۶۲۴ء میں سریہ نخلہ میں ملی تھی[31]۔ دو اور اموی حلیف حضرت عکاشہ بن محصن اور شجاع بن وہب نے بالترتیب ۶ھ / ۶۲۷ء اور ۸ھ / ۶۲۹ء میں یہ فریضہ انجام دیا تھا[32]۔ بہرحال اموی خانوادے کے ایک اور فرزند حضرت خالد بن سعید کو، جو اتفاق سے پہلے اموی کمانڈر کے حقیقی بھائی تھے، ۸ھ / ۶۳۰ء میں اسلامی فوج کی کمان کرنے کا موقعہ ملا[33]۔ اسی برس ایک اور اموی حضرت ہشام بن عاص کی بھی اس خدمت پر تقرری ہوئی[34]۔ عہد نبوی کے چوتھے اور آخری کمانڈر حضرت ابوسفیان بن حرب تھے، جنہوں نے مشترکہ طور سے یہ خدمت انجام دی تھی اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ۸ھ / ۶۳۰ء میں اپنے قبول اسلام اور زوال مکہ کے فوراً بعد انہوں نے یہ فریضہ انجام دیا تھا[35]۔

بقیہ قریشی کمانداروں میں حضرت خالد بن ولید مخزومی اور حضرت عمرو بن عاص سہمی نمایاں مقام رکھتے ہیں نہ صرف عہد نبوی میں اپنی جنگی اور فوجی صلاحیتوں اور کارناموں کے لیے بلکہ خلافت راشدہ کے زمانے میں بھی[36]۔ حضرت سعد بن ابی وقاص نے عہد نبوی

میں اپنی اکلوتی مہم کی قیادت ذی قعدہ ۱ھ / مئی ۶۲۳ء میں کی تھی[37]۔ جبکہ حضرت عمرو بن عاص سہمی کو پہلی کمان جمادی الاولیٰ ۸ھ / اکتوبر ۶۲۹ء میں ملی تھی۔ ان کی دوسری تقرری اسی ماہ میں ہوئی تھی جس میں مکہ فتح ہوا تھا[38]۔ حضرت خالد بن ولید مخزومی کے سلسلے میں اب تک جو کچھ کہا جا چکا ہے، اب اسے دہرانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک اور عظیم صحابی حضرت ابوعبیدہ بن جراح کو پہلی اور آخری کمان عہد نبوی میں ۶ھ / ۶۲۷ء میں ملی تھی[39]۔ یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ عظیم ترین قریشی صحابہ کرام کو عسکری تنظیم کے اس شعبہ میں بہت کم نمائندگی ملی تھی اور جن کو قیادت کی سعادت ملی بھی تھی۔ انہیں کافی تاخیر سے ملی تھی اس کے علاوہ دوسروں کے مقابلے میں ان کی مہمیں کافی چھوٹی اور غیر اہم تھیں۔

اوس کو خزرج کے مقابلے میں فوجی قیادت کا موقعہ کچھ پہلے ملا تھا یعنی رمضان ۲ھ / مارچ ۶۲۴ء میں جبکہ خزرج کو اس کے ایک ماہ بعد یہ سعادت ملی تھی[40]۔ اس سال اوس کو عسکری قیادت کا موقعہ بار بار ملا مگر خزرج کے کسی فرد کو یہ منصب ایک سال بعد محرم ۴ھ / جون ۶۲۵ء میں ملا۔ دوسرے برس ان کو تیسری بار یہ منصب ملا[41]۔ دوسری طرف اوس کے ایک نمائندے حضرت محمد بن مسلمہ نے اپنے قبیلے کے لئے یہ اعزاز تین برس کی مدت گذرنے کے بعد حاصل کیا۔ صحابی موصوف کی اس عہدہ عظیم پر دوسری تقرری اس کے دوسرے برس اور آخری بار کسی اوسی کو تقرری کی سعادت مزید تین برس بعد ۸ھ / ۶۳۰ء میں ملی[42]۔ جبکہ خزرج کو مسلسل ۵ھ / ۶۲۶ء سے ۸ھ / ۶۳۰ء تک اسلامی افواج کی کمان کرنے کا موقعہ ملتا رہا۔ سوائے ۷ھ / ۶۲۸ء کے[43]۔ حیات نبوی کے آخری دو برسوں میں نہ کسی اوسی کو اور نہ ہی کسی خزرجی کو فوجی قیادت کا موقعہ ملا[44]۔ غالباً اس کا سبب یہ تھا کہ ان برسوں میں مہموں کی تعداد کافی کم تھی اور دوسرے قبیلے کے مسلمانوں کی تعداد زیادہ۔ بہرحال انصار کے ان دونوں قبیلوں کی مشترکہ تقرریاں جو چھ برس تک مسلسل ہوتی رہیں اس بات کی شاہد ہیں کہ ان کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مکمل اعتماد حاصل تھا اور اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ قریش کے شانہ بشانہ وہ بھی اسلامی ریاست کی تعمیر و ترقی میں برابر کے شریک اور حکومت اسلامی میں برابر کے سہیم تھے۔

عسکری تنظیم کے اس شعبہ سالاران میں آخری اہم عرب قبیلہ کنانہ تھا جس کے نمائندے حضرت عمرو بن امیہ ضمری کو پہلی تقرری ۶ھ / ۶۲۷ء میں ملی[45]۔ اس قبیلے کے دوسرے سالار حضرت غالب بن عبد اللہ لیثی تھے۔ جن کی چار مہموں میں قیادت کا ذکر پہلے آ چکا ہے[46]۔ کنانہ کی آخری کمان ربیع الثانی ۹ھ / جولائی اگست ۶۳۰ء میں رہی تھی۔ دوسرے قبائل اور بطون عرب کو سالاران افواج نبوی کے شعبہ میں بہت کم نمائندگی مل سکی تھی۔ اس کے متعدد اسباب تھے۔ جن میں اہم ترین مہموں کی تعداد کا محدود ہونا، قبائل عرب کا مدینہ سے دور آباد ہونا۔ امت مسلمہ میں ان کی مختصر و محدود نمائندگی وغیرہ تھے[47]۔ بہرحال اس ضمن میں یہ قابل ذکر بات ہے کہ مذکورہ بالا قبیلوں کے علاوہ دوسرے قبائل عرب جیسے ازد، بجیلہ، غطفان اور ہوازن وغیرہ کو سالاران سرایا کے اس شعبہ میں تقرری حیات نبوی کے آخری دو برسوں میں ملی تھی جبکہ قیس عیلان اور بنو سلیم کو بالترتیب یہ سعادت ۳ھ / ۶۲۵ء اور ۸ھ / ۶۲۹ء میں ملی تھی[48]۔ اس عسکری شعبہ میں قبائل عرب کی نمائندگی مندرجہ ذیل شجرے سے واضح ہو گی جو مسلم مہموں کی سالانہ تعداد اور مختلف قبائل کی متناسب نمائندگی کو بھی ظاہر کرتی ہے۔

سنہ عیسوی	۶۲۳	۶۱۴	۶۲۵	۶۲۶	۶۲۷	۶۲۸	۶۲۹	۶۳۰	۶۳۱	۶۳۲
مہموں کی تعداد	۳	۶	۴	۲	۱۲	۹	۱۳	۱۸	۶	۱
(۱) قریش										
(الف) بنو ہاشم	۱	-	-	-	۱	-	۱	۱	۱	-
(ب) بنو امیہ	-	-	-	-	-	۱	-	۳	-	-
(ج) بنو سہم	-	-	-	-	-	-	۱	۱	۱	-
(د) بنو مخزوم	-	-	۱	-	-	-	-	۳	۱	-
(س) بنو فہر	-	-	-	-	۱	۱	۱	-	-	-
(ص) بنو زہرہ	۱	-	-	-	۱	-	-	-	-	-
(ط) بنو مطلب	۱	-	-	-	-	-	-	-	-	-
(ع) بنو تیم	-	-	-	-	-	۱	-	-	-	-
(ف) بنو عدی	-	-	-	-	-	۱	-	-	-	-
میزان قریش	۳	-	۱	-	۳	۴	۳	۸	۳	-
(۲) خزرج	-	۱	۲	۱	-	۲	۴	۱	-	-
(۳) اوس	-	۳	-	-	۲	-	-	۱	-	-
(۴) کلبہ	-	۱	-	-	۵	۲	۱	-	-	۱
(۵) سلیم	-	-	-	-	-	-	۱	-	-	-
(۶) بلی	-	-	-	-	-	-	-	-	۱	-
(۷) غطفان	-	-	-	-	-	-	-	۱	-	-
(۸) ہوازن	-	-	-	-	-	-	-	۲	-	-
(۹) قیس عیلان	-	-	۱	-	۱	-	-	-	-	-
(۱۰) اسد	-	۱	-	-	۱	-	۱	۱	-	-
(۱۱) کنانہ	-	-	-	۱	-	۱	۳	۲	-	-
(۱۲) ازد	-	-	-	-	-	-	-	۲	-	-
(۱۳) بجیلہ	-	-	-	-	-	-	-	-	۱	-
(۱۴) غیر معروف	-	-	-	-	-	-	-	-	۱	-
میزان کل	۳	۶	۴	۲	۱۲	۹	۱۳	۱۸	۶	۱

اس شجرہ سے واضح ہوتا ہے کہ جہاں تک امیران سرایا میں قریش کی تقرری اور نمائندگی کا تعلق ہے پورے مدنی دور میں غیر شعوری طور پر سہی ایک خاص قسم کا توازن برقرار رہا تھا سوائے ۸ھ / ۶۳۰ء کے جب ان کے امیروں کی تعداد میں ایک نمایاں اضافہ نظر آتا ہے اس کا غالباً ایک سبب یہ تھا کہ فتح مکہ کے سال مہموں کی تعداد سب سے زیادہ تھی اور دوسرا یہ کہ صلح حدیبیہ کے بعد قابل ولائق قریشی سالاروں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا تھا۔ دوسرا سبب بقیہ عرب قبائل کے حق میں بھی صحیح تھا[۴۹]۔ قریشی سالاروں میں حضرات خالد بن ولید مخزومی اور عمرو بن عاص سہمی اپنی عسکری قیادت اور فوجی صلاحیتوں کے لئے مشہور تھے[۵۰]۔ یہ نکتہ بھی ذہن نشین رکھنے کے لائق ہے کہ اس برس آٹھ سالاروں کی تقرری ہوئی تھی جن میں سے پانچ وہ سالار تھے جو فتح مکہ سے کچھ قبل یا اسکے دوران مشرف بہ اسلام ہوئے تھے[۵۱]۔ اس تاریخی شہادات سے بعض حلقوں اور طبقوں کے اس مزعومہ اور خیال کی تردید ہوتی ہے۔ کہ صحابہ کرام کے طبقہ سابقین اولین کو محض اپنی سبقت اسلام کے سبب ریاستی، عسکری، یا حکومتی مناصب حاصل کرنے کا زیادہ حق تھا[۵۲]، یہ صحیح ہے کہ اسلام کے قبول کرنے میں پہل ایک انتہائی تحسین آمیز اور ثواب آگیں اقدام تھا تاہم حکومت و ریاست کے عہدے اور مناصب میں ترجیح کا وہ قطعی ذریعہ یا عنصر نہیں تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پورے دس[۱۰] سالہ مدنی دور میں اس کی رعایت حکومتی مناصب کے بارے میں چاہے وہ فوجی ہوں یا غیر فوجی کبھی نہیں کی تھی۔ اس عہد مبارک کا اولین و آخرین سبب محرک یا اساس صرف صلاحیت اور موقعہ کی مناسبت تھی۔ جیسا کہ ہم مسلسل اپنے تجزیوں میں دیکھتے رہیں گے۔

بہر حال تمام سالاران سرایا کے ضمن میں ان کی مذہبی مقام وحیثیت کا تجزیہ ذیل کی مختصر سی لوح یا جدول میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سالاران افواجِ نبوی میں سے بیشتر کا زمانہ قبول اسلام یا تو مکی عہد کا آخری دور ہے یا مدنی دور ہے۔ بہر حال جدول یہ ہے۔

زمانہ قبول اسلام							
مکی عہد	الف	ب	ج	د			
	۱۳	۵	-	۱۵			
مدنی عہد	س	ص	ط	ع	ف	ق	ل
	۲	-	۳	۲	۱	۲	۱
غیر متعین	م						
	۴						

یہ ممکن ہے کہ بعض حالات میں سبقت اسلام تقرری کا ایک محرک رہا ہو۔ لیکن عموماً اس کی بنیاد پر یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ سابقین اولین کو ریاستی مناصب میں ترجیح حاصل ہونی چاہیے یا عہد اسلامی میں واقعتاً وہ کسی وقت موجود رہی تھی۔ اگر ایسا رہا ہوتا تو عہدی نبوی میں یا بعد میں خلافت راشدہ کے عہد زریں میں متاخر مسلمان شائد ہی کوئی منصب یا عہدہ حاصل کر سکتے۔ جبکہ صورت حال یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے انتظام حکومت میں شریک زیادہ تر صحابہ کرام کا تعلق سابقین اولین سے نہیں تھا۔

عہد نبوی کے سالاروں کی قبائلی تقسیم کے بعد عرب کے مختلف خطوں کی نمائندگی کا اس شعبہ میں مطالعہ دلچسپی کا حامل ہوگا۔

جو ذیل کی جدول سے واضح ہوتا ہے۔

علاقہ	قبیلہ/خاندان	نفری	فیصد	منصب دار	فیصد
مرکزی عرب	۱۔ قریش ۲۔ خزرج ۳۔ اوس	۴۲	۵۶٫۷۵	۲۹	۶۴۳
شمالی عرب	۱۔ کلب ۲۔ بلی	۱۱	۱۴٫۸۹	۳	۶٫۲۵
مشرقی عرب	۱۔ سلیم ۲۔ غطفان ۳۔ ہوازن ۴۔ اسد ۵۔ قیس عیلان	۱۰	۱۳٫۵۱	۹	۱۹٫۹۷
مغربی عرب	۱۔ کنانہ ۲۔ ازدشنوءہ	۹	۱۲٫۱۵	۶	۱۲٫۵
جنوبی عرب	۱۔ بجیلہ	۱	۱٫۳	۱	۲٫۰۹
غیر معروف		۱	۱٫۳	۱	۲٫۰۹
میزان		۷۴		۴۹	

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اس شعبہ میں مرکزی عرب کو سب سے زیادہ نمائندگی ملی تھی جو بوجوہ معلوم بالکل فطری بات تھی شمالی قبائل کی کمترین نمائندگی ان کے نمائندوں اور افراد کی کمی کے سبب تھی جیسا کہ بلاذری کے ایک تبصرہ سے معلوم ہوتا ہے[۵۳]۔ جو بات شمالی قبیلوں پر صادق آتی ہے۔ وہی جنوبی عرب کے قبائل کے لئے صحیح ہے[۵۴]۔ جبکہ دلچسپ نکتہ یہ ہے کہ مشرقی اور مغربی قبیلوں کی نمائندگی کم و بیش یکساں ہے۔ اس کا ظاہری سبب ان علاقوں کے قبیلوں میں زیادہ توسیع اسلام اور مدینہ سے قربت تھی، اس وجہ سے ان کے نمائندوں اور افراد کو ریاستِ اسلامی کی خدمت کرنے کا زیادہ موقعہ ملا تھا۔

اسی طرح ایک اہم نکتہ اس ضمن میں یہ ہے کہ اس شعبہ تنظیم عسکری میں کل کتنے عرب قبائل کو نمائندگی ملی تھی۔ شمال کے طور پر آٹھ اہم ترین شمالی قبائل میں سے صرف دو کو نمائندگی ملی تھی جبکہ مشرقی عرب کے سات بڑے قبیلوں میں سے چار قبیلوں کو اور پانچ اہم مغربی قبیلوں میں سے دو کو اور دس جنوبی قبیلوں میں سے محض ایک کو سالاری و قیادت کا شرف ملا تھا اور قبائل پراگندہ میں سے کسی کو کوئی بھی نمائندگی نہیں ملی تھی[۵۵]

سالاران سرایا پر بحث کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ ان کی کمان میں جانے والی چھوٹی اور بڑی مہموں کی عددی طاقت کتنی تھی؟ اگرچہ تمام سالاروں کی مہموں کی قوت کا مفصل ذکر کتاب کے آخر میں درج ضمیمے میں دیا گیا ہے۔ تاہم یہاں اس نقطۂ نظر سے ان کا تجزیہ دلچسپی کا سبب ہوگا۔ اس سے یہ بھی بیک نظر معلوم ہوگا کہ بڑی مہموں کی سالاری کا شرف صحابہ کرام میں سے کن کو ملا تھا۔ چنانچہ مندرجہ ذیل جدول اسی مقصد کو اجاگر کرنے کے لئے دی جا رہی ہے۔

نمبر شمار	مہم کی عددی طاقت	مہموں کی تعداد	منصبدار/سالار کا قبیلہ اور اس کی مہمیں
الف	۱۰۰ سپاہیوں سے کم	۴۴	(۱) ۸ - قریش کے سالاروں کے زیر کمان
			(۲) ۲ - اسد " " " "
			(۳) ۵ - اوس " " " "
			(۴) ۹ - خزرج " " " "
			(۵) ۲ - قیس عیلان " " " "
			(۶) ۳ - کنانہ " " " "
			(۷) ۱ - کلب " " " "
			(۸) ۱ - سلیم " " " "
			(۹) ۱ - بجیلہ " " " "
			(۱۰) ۱ - ہوازن " " " "
			(۱۱) ۱ - غطفان " " " "
(ب)	۱۰۰-۲۰۰ سپاہیوں کے درمیان	۷	(۱) ۲ - زیر کمان حضرت زید بن حارثہ کلبی
			(۲) ۲ - " " علی بن ابی طالب ہاشمی
			(۳) ۲ - " " غالب بن عبداللہ لیثی
			(۴) ۱ - " " ہشام بن عاص اموی
(ج)	۲۰۰-۳۰۰ کے درمیان	۵	(۱) ۱ - " " بشیر بن سعد خزرجی
			(۲) ۱ - " " ابوعبیدہ بن جراح فہری۔ قریشی
			(۳) ۱ - " " خالد بن سعید اموی
			(۴) ۱ - " " علی بن ابی طالب ہاشمی۔
			(۵) ۱ - " " علقمہ بن مجزز کنانی
د	۳۰۰-۴۰۰ کے درمیان	۲	دونوں مہمیں " " خالد بن ولید مخزومی

(س)	۴۰۰ - ۵۰۰ کے درمیان	۳	(۱)	ا - » » زید بن حارثہ کلبی
			(۲)	ا - » » خالد بن ولید مخزومی
			(۳)	ا - » » عمرو بن عاص سہمی
(ص)	۷۰۰ سپاہ پر مشتمل	۱	(۱)	ا - » » عبدالرحمٰن بن عوف زہری قریشی
(ط)	۳۰۰۰ » » »	۲	(۱)	ا - » » زید بن حارثہ کلبی (شریک سالار تھے جعفر بن ابی طالب ہاشمی اور عبداللہ بن رواحہ خزرجی
			(۲)	ا - » » اسامہ بن زید کلبی۔

مذکورہ بالا جدول سے یہ امر بخوبی واضح ہوتا ہے کہ عددی لحاظ سے سب سے بڑی مہمیں یا فوجیں کسی قریشی یا انصاری عرب شرایب کی کمان میں نہیں گئی تھیں بلکہ ایک مولیٰ اور اس کے نوخیز فرزند کی کمان میں بھیجی گئی تھیں۔ ان کی کامیابیوں نے نہ صرف ان کی اپنی تقرریوں کی توثیق کر دی تھی بلکہ اسلامی افواج کے سالار اعظم کی اس پالیسی کی بھی تصدیق کر دی تھی کہ عہدے اور مناصب صلاحیت و لیاقت کی بنیاد پر دیئے جانے چاہییں نہ کہ قبائلی، خاندانی یا کسی دوسری سماجی اساس کے سبب۔ حضرت زید بن حارثہ کلبی کی سالاری اور فوجی قیادت نے ان کی تمام مہموں میں کامیابی حاصل کی تھی۔ اگرچہ یہی بات ہم غزوۂ موتہ کے بارے میں اتنے وثوق سے نہیں کہہ سکتے۔ حالانکہ اس مہم میں ان کی شہادت یا مسلم فوج کی پسپائی قیادت کے فقدان یا کسی خامی کے سبب نہ تھی بلکہ اس کے کچھ اور اسباب تھے۔

عہد نبوی کی دوسری اہم مہموں کے سالاروں میں نمایاں تھے حضرات عبدالرحمٰن بن عوف زہری، عمرو بن عاص سہمی اور خالد بن ولید مخزومی۔ ان کا شمار مہموں کی عددی طاقت کے اعتبار سے حضرات زید اور اسامہ کے بعد آتا ہے۔ ایک لحاظ سے وہ سالاروں کے دوسرے طبقہ میں تھے اور تیسرے طبقہ میں جو شامل تھے۔ ان میں حضرات عَلْقَمہ بن مُجَزِّز مُدلجی کنانی، علی بن ابی طالب ہاشمی۔ خالد بن سعید اموی، ابوعبیدہ بن جراح فہری اور بشیر بن سعد خزرجی نمایاں مقام کے حامل تھے۔ یہاں یہ نکتہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ عہد نبوی کے عظیم ترین سالار اپنے وقت کے اکثر و بیشتر عظیم ترین صحابہ میں شامل نہیں تھے اور نہ ہی ان کو بعد کی نسلوں نے اس حیثیت سے یاد رکھا۔

عسکری تنظیم کے اس شعبہ سے متعلق ایک مطالعاتی پہلو یہ ہے کہ مہموں کی منازل کیا تھیں؟ اس مطالعہ سے ہم کو نہ صرف جزیرہ نمائے عرب کے مختلف علاقوں کی فوجی اہمیت کا حال علم ہوگا بلکہ اس مخالفت کی شدت اور کیفیت و کمیت کا بھی پتہ چلے گا۔ جو انہوں نے اسلامی ریاست کے خلاف کی تھی۔ ذیل کی جدول میں سو یا سو سے اوپر سپاہ پر مشتمل مہموں کا تجزیہ پیش ہے۔

نمبر شمار	قبیلہ / علاقہ	اسلامی مہم کی عددی طاقت
۱	قریش (کا ایک چھوٹا سا حصہ)	۱۰۰ اور ۱۷۰ (دو مہمیں)
۲	بنو سعد	۱۰۰
۳	بنو طے	۱۰۰

نمبر شمار	قبیلہ/علاقہ	اسلامی مہم کی عددی طاقت
۴	بنو ثعلبہ	۱۳۰
۵	بنو اسد	۱۵۰
۶	سُلیم	۲۰۰
۷	عرینہ	۳۰۰
۸	غطفان (کا ایک حصہ)	۲۰۰ اور ۳۰۰ (دو مہمیں)
۹	جہینہ وغیرہ (راہزنوں کا گروہ)	۳۰۰
۱۰	حبشہ (کی ایک راہزن فوج)	۳۰۰
۱۱	مذحج	۳۰۰
۱۲	جذیمہ	۳۵۰
۱۳	کندہ/دومۃ الجندل کی عیسائی مملکت	۴۲۰
۱۴	نجران	۴۰۰
۱۵	جذام	۵۰۰
۱۶	بلی اور قضاعہ وغیرہ	۵۰۰
۱۷	کلب (دومۃ الجندل کا علاقہ)	۷۰۰
۱۸	غسان اور انکے حلفاء اور رومی سرپرست	۳۰۰۰ اور ۳۰۰۰۰ (دو مہمیں)

اکیس بڑی مہموں میں سے پانچ مہمیں شمال کے طاقتور قبائل جیسے کلب، جذام، کندہ اور غسان وغیرہ کے خلاف بھیجی گئی تھیں جبکہ دوسب سے بڑی مہمیں شمال کے قبائل کے اتحاد اور اس سے زیادہ رومی سلطنت کی باجگذار حکومتوں کے خلاف روانہ کی گئی تھیں۔ اسی طرح چار بڑی مہمیں جنوبی عرب کے منظم قبائل کے خلاف ترتیب دی گئی تھیں۔ ان دونوں دور دراز کے مقامات پر بڑی مہموں کی روانگی سے معلوم ہوتا ہے کہ فوجی لحاظ سے یہ دونوں علاقے اہم تھے۔ اس کے علاوہ طویل مسافت کا بھی ایک عنصر ان میں موجود تھا کیونکہ یہ خیال بھی ذہن میں رہا ہوگا کہ فوج اتنی بڑی ہونی چاہیئے کہ ہر قسم کی صورتحال سے بخوبی عہدہ برا ہو سکے۔ اس کے علاوہ یہ دونوں علاقے منظم و مرتب قبیلوں بلکہ منظم حکومتوں کے علاقے تھے جہاں ان کی اپنی عسکری روایات خاصی مضبوط تھیں اور مزید برآں وہ وقت کی دو بڑی سلطنتوں۔ رومی سلطنت۔ اور ایرانی سلطنت۔ کے علاوہ ایک چھوٹی طاقت حبشہ کی مملکت کے زیر اثر علاقے تھے۔ صرف ایک بڑی مہم مدینہ کے مغرب میں رہزنوں کے ایک منظم گروہ کی سرگرمیوں کا خاتمہ کرنے کے لئے بھیجی گئی تھی البتہ مشرق میں آباد قبائل کے خلاف سات بڑی مہمیں بھیجی گئی تھیں۔ اس سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ مشرقی سمت سے اسلامی ریاست کو خطرات زیادہ لاحق تھے۔ مگر ایلکے مطالعہ میں اتنی بحث کافی ہے۔

غزوات نبویؐ

عسکری تنظیم کے ضمن میں غزوات نبوی پر بھی ایک نظر ڈالنا ضروری ہے کہ وہ بھی اسی کا ایک بلکہ اہم تر حصہ ہیں۔ ذیل میں توقیتی اعتبار سے تمام غزوات نبوی کے بارے میں معہ ان کی منازل کے تفصیلات دی جا رہی ہیں۔

نمبر شمار	مہم/غزوہ کی سددی طاقت	نام/منازل غزوات/قبیلے
۱۔	۶۰ سپاہ	الواء/ودان
۲۔	۲۰۰ "	بُواط
۳۔	۲۰۰ "	سفوان
۴۔	۲۰۰-۱۵۰	ذوالعشیرہ
۵۔	۳۱۴	بدر عظیم/قریش
۶۔	(۳۱۴؟)	بنو قینقاع
۷۔	۴۰۰-۲۰۰	سویق/قریش
۸۔	۲۰۰	الکدر/سلیم و غطفان
۹۔	۴۵۰	ذوامر/ثعلبہ، محارب/غطفان
۱۰۔	۳۰۰	بحران/سلیم
۱۱۔	۷۰۰	احد/قریش
۱۲۔	۶۲۳-۹۰۰	حمراء الاسد/قریش
۱۳۔	۱۰۰۰	بنو نضیر/یہود
۱۴۔	۱۵۰۰	بدر الموعد/قریش
۱۵۔	۴۰۰-۸۰۰	ذات الرقاع/انمار، ثعلبہ، غطفان
۱۶۔	۱۰۰۰	دومتہ الجندل
۱۷۔	—	مریسیع/بنو المصطلق
۱۸۔	۳۰۰۰	خندق/احزاب عرب
۱۹۔	۳۰۰۰	بنو قریظہ/یہود
۲۰۔	۲۰۰	عسفان
۲۱۔	۵۰۰-۷۰۰	ذوقرد/غطفان

۲۲-	۱،۶۰۰	حدیبیہ/ قریش
۲۳-	۱،۶۰۰	خیبر/ یہود
۲۴-	۲۰۰۰	عمرۃ القضاء/ مکہ/ قریش
۲۵-	۱۰،۰۰۰	مکہ/ فتح/ قریش
۲۶-	۱۲،۰۰۰	حنین/ ہوازن
۲۷-	۱۲،۰۰۰	طائف، ثقیف اور ہوازن
۲۸-	۳۰،۰۰۰	تبوک/ غسان اور ان کے اتحادی عرب اور رومی

مندرجہ بالا جدول سے واضح ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست کی سب سے بڑی فوجی مہم شمالی قبائل کے خلاف بھیجی گئی تھی۔ غزوات نبوی میں نسبتاً تمام بڑی مہموں کا رخ یا تو اسلامی ریاست کے عظیم ترین دشمن قریش کے خلاف تھا یا مشرق میں آباد طاقت ور بدوی قبائل ہوازن، غطفان اور ثقیف کے خلاف۔ یہودیوں کے خلاف بھیجی گئی چار مہمیں بھی نسبتاً عددی لحاظ سے بڑی تھیں کہ ان میں شریک مجاہدین کی تعداد خاصی تھی۔ بہر حال اسلامی ریاست کی سب سے زیادہ مخالفت اور سب سے زیادہ مزاحمت کرنیوالے چار طبقات تھے: شمالی قبائل، قریش مکہ، یہود مدینہ و خیبر اور مشرقی قبائل۔ لہذا یہ فطری تھا کہ ان کے خلاف کم از کم اتنی بڑی مہم بھیجی جائے جو یا تو ان کی بخوبی سرکوبی کر سکے یا ان کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دے۔

آخر میں سرایا کے امراء کا اسلامی عسکری تنظیم میں مقام اور ان کے اختیارات پر گفتگو مناسب معلوم ہوتی ہے۔ مآخذ کا اتفاق ہے کہ جب بھی مہمیں روانہ کی جاتیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے امیروں کو عام ہدایات اور احکامات دیتے تھے[۵۶] اس کے علاوہ ان کو مکمل آزادی اور اختیار حاصل ہوتا تھا۔ وہ کون سا راستہ اپنائیں، کیا طرز جنگ اختیار کریں، میدان جنگ کہاں بنائیں ؟ خیمہ زن کہاں ہوں، کیا حربی تدابیر اختیار کریں، شکست خوردہ کے ساتھ نرمی اور معافی کا سلوک کیونکر کریں۔ اور اموال غنیمت اور قیدیوں کے لئے کیا انتظامات کریں۔ وغیرہ وغیرہ یہ تمام اور ان سے متعلقہ امور کو ان کی صوابدید پر چھوڑ دیا جاتا تھا۔ بہر حال سالاران فوج حالات و مواقع کے تقاضوں کے مطابق تدابیر اختیار کرتے تھے اور بہت کچھ ان کی صوابدید اور صلاحیت پر چھوڑا جاتا تھا اور یہی قرون وسطیٰ میں بہترین فوجی پالیسی تھی۔ کہ جب مواصلات اور رسل و رسائل کے ذرائع نہ ہونے کے برابر تھے۔ ان حالات میں نہ تو کوئی پکا طریق کار یا طریق جنگ پہلے سے متعین کیا جا سکتا تھا اور نہ ہی اس کی پیش بندی کی جا سکتی تھی۔ چنانچہ مآخذ سے سالاروں کے آزادانہ اقدامات کی جو انہوں نے حالات کے تقاضوں کے مطابق کئے متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً نخلہ کی مہم میں جو کچھ ہوا وہ امیر سریہ اور ان کے رفقاء کا فیصلہ تھا۔ اگرچہ بظاہر وہ ہدایات نبوی کی خلاف ورزی تھی[۵۷]۔ موتہ کی مہم میں حضرت خالد بن ولید مخزومی کا اعلیٰ کمان سنبھالنا اور پسپائی کا فیصلہ کرنا، ان کا نجی فیصلہ تھا۔ جس کی زبان رسالت نے تحسین و توصیف فرمائی[۵۸]۔ اسی طرح بنی جذیمہ کے خلاف مہم کے دوران ان کے آزادانہ فیصلے پر دربار رسالت سے سرزنش بھی ہوئی۔ اس کے علاوہ متعدد دوسری مثالیں ہیں جو مہموں کے بیان میں مآخذ میں محفوظ ہیں[۵۹]۔

عام نتائج

ہجرت کے چھ ماہ کے بعد اسلامی ریاست کی پہلی مہم کا ایک آزاد سالار مقرر کیا گیا۔ جس نے مدینہ کے نواح میں اس کی کمان کی۔ اس دن سے وفات نبوی تک برابر آزاد مہموں کے سالار مقرر کئے جاتے رہے ان کی کل تعداد ۴۹ تھی۔ جبکہ امیر سریہ کے عہدہ پر تقرریوں کی تعداد ۴۷ رہی تھی یعنی کہ بعض سالاروں کو ایک سے زیادہ مرتبہ یہ سعادت حاصل ہوئی تھی۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ عسکری تنظیم کے اس شعبہ میں تقرریاں مستقل نہیں تھیں جبکہ عہدہ مستقل تھا۔ سالار یا امیر سریہ کی تقرری اس لئے عارضی ہوتی تھی کہ خود فوج یا مہم عارضی ہوتی تھی۔ جیسے ہی مہم کا کام ختم ہوتا تھا۔ فوج توڑ دی جاتی تھی اور لازمی طور سے سالار کا عہدہ بھی ختم ہو جاتا تھا۔ دوسرے موقعہ پر پھر موقعہ و محل کی مناسبت سے امیر سریہ کا انتخاب ہوتا تھا۔ ان ادوار جیسی اور مثالوں سے مغربی مورخین نے یہ لازمی اور حتمی نتیجہ نکال لیا ہے۔ کہ عہد نبوی میں نہ عہدے مستقل تھے اور نہ عہدیدار وہ سب کے سب محض عارضی کارکن ہوتے تھے۔ حالانکہ یہ تصور غلط ہے جیسا کہ ہم مسلسل اپنے تجزیوں اور مطالعوں میں دیکھیں گے۔ بہر حال مغربی عام کاری کا سبب اس حقیقت سے صرف نظر کر لینا ہے کہ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اسلامی افواج کے مستقل سالار اعظم تھے اور تمام عسکری اختیارات و اقتدار ان کو حاصل تھے۔ چنانچہ جب کبھی آپ بنفس نفیس تشریف لیجانا ضروری نہیں تصور فرماتے تھے تو آپ اپنی جگہ کسی صحابی کو اپنا جانشین بنا دیتے تھے اور ظاہر کہ اصل و مستقل سالار کی موجودگی میں یہ جانشینی لازمی اور ناگزیر طور سے عارضی ہوتی تھی۔

سالاران سرایا کی تقرریوں میں اس وقت کی امت مسلمہ کے تمام طبقات اور قبائل کو ان کی صلاحیت اور افراد کی تعداد کے مطابق نمائندگی دی گئی تھی۔ زیادہ تر تقرریاں قریشی مہاجرین اور انصار مدینہ کو ملی تھیں اور وہ ہر لحاظ سے بجا تھیں کیونکہ یہی دو طبقات اسلامی ریاست کی اصل تھے۔ اس طرح سے مغربی اور مشرقی قبائل کو بھی برابری سے نمائندگی ملی تھی کیونکہ وہ تیسرے اہم ترین طبقات تھے۔ جبکہ شمالی اور جنوبی قبائل کے افراد کی کمی کے سبب ان کی نمائندگی کم تھی۔ بہر حال حیات نبوی کے آخری دو برسوں میں ان دونوں آخری طبقات کی نمائندگی میں نمایاں اضافہ ہوا تھا۔

تقرری کی اصل بنیاد صلاحیت و لیاقت اور موقعہ و محل کی مناسبت تھی۔ بقیہ دوسرے اسباب جیسے خاندانی یا قبائلی علاقائی یا مذہبی محرکات و عوامل کا کوئی اثر نہیں پڑتا تھا تنقید یا تحسین، اسلام سے پہلے کی مخالفت یا حمیت، علاقائی اور قرابتی دوستی یا محبت یا رشتہ داری کی بنیادوں پر نہ تو عہدے دیئے جاتے تھے نہ ان سے محروم کیا جاتا تھا۔ اگرچہ قبول اسلام میں سبقت ایک تحسین و آفرین آمیز بات تھی تاہم عسکری تنظیم کے کسی عہدے کے لئے تنہا وہی ذریعہ نہیں تھی اور نہ ہی وہ حکومت کے کسی اور منصب کے لئے اساس بن سکتی تھی۔

زیادہ بڑی مہمیں ان صحابہ کرام یا سالاران امت مسلمہ کے سپرد کی گئی تھیں جو عہد نبوی میں اپنی عسکری اور فوجی صلاحیتوں کے لئے ممتاز و معروف تھے۔ یہ حیرت انگیز بات ہے کہ عہد نبوی کے سب سے اہم سالار یا امیر سریہ نہ کوئی قریشی تھا نہ کوئی انصاری بلکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مولی حضرت زید بن حارثہ کلبی تھے۔ جنہوں نے اپنے منفرد و فروتر سماجی مقام کے باوجود رسول کریم

صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے زیادہ مہموں کی کمان کی تھی۔ یہی نہیں بلکہ ان کی مہمیں عددی طاقت کے اعتبار سے بھی غزوات کے بعد سب سے بڑی تھیں۔ دوسرے عظیم ترین سالاروں میں حضرات اسامہ بن زید کلبی، عبدالرحمٰن بن عوف زہری، خالد بن ولید مخزومی، عمرو بن عاص سہمی، علی بن ابی طالب ہاشمی اور علقمہ بن مجزز مدلجی کنانی بالترتیب شمار کئے جانے چاہییں۔ امیران سرایا ہدایات نبوی کے بموجب اپنے عسکری فرائض انجام دیتے تھے۔ لیکن فوجی تدبیروں کے معاملہ میں وہ آزاد و خود مختار ہوتے تھے اور وقت و موقعہ ومحل کی مناسبت سے اپنی صوابدید کے مطابق کام کرتے تھے۔ امراء سرایا اور ان کے سپاہیوں کو کوئی تنخواہ نہیں ملتی تھی، بلکہ اموال غنیمت میں سے حصہ ملتا تھا۔ یہ حصہ امیر کا بھی ایک عام مجاہد کے برابر ہوتا تھا۔ البتہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اموال غنیمت میں سے خمس اور صفی لینے کا حق تھا۔ صفی وہ چیز تھی جسے آپ پسند فرما لیتے تھے اور خمس پورے مال کا پانچواں حصہ ہوتا تھا۔ یہ خمس آپ کا ذاتی اور نجی حصہ یا ملکیت نہیں ہوتی تھی بلکہ پوری امت مسلمہ کی فلاح و بہبود کے لئے آپ کو اسکو خرچ کرنے کا اختیار ہوتا تھا۔ صفی آپ کی نجی ملکیت ہوتی تھی مگر عموماً آپ وہ شے کسی کو بخش دیتے تھے۔ بھلا رحمت للعالمین کو اپنی ہی فلاح کی فکر دوسروں کو چھوڑ کر کیسے ہو سکتی تھی۔

اسلامی فوج کی ساخت اور طریق جنگ

تاریخ اسلام کے فلسفی مورخ ابن خلدون کا بیان ہے کہ جاہلی عربوں میں جنگ کا عام اور معروف طریقہ "الکر والفر" (یعنی حملہ اور پسپائی) تھا۔ لیکن اسلام سے کچھ پہلے انہوں نے "تعبیہ" طریق جنگ اپنایا تھا جو عجم میں استعمال ہوتا تھا۔ تعبیہ کے لغوی معنی صف آرائی اور اقدام کے ہیں۔ اس تبدیلی کے دو سبب تھے: اول یہ کہ عجم کے طریقوں کو انہیں کے جیسے طریقوں سے توڑا جا سکے۔ اور دوم یہ کہ وہ باقاعدہ اور جم کر لڑی جانے والی جنگ (اِمْتِمَاتَہ) کے لئے زیادہ موزوں تھا۔[۴]

یہ طریق جنگ یا فوجی ساخت دراصل خمیس[۶۱] کہلاتی تھی۔ جس کے معنی ہوتے ہیں پانچ حصوں والی۔ اس ساخت کے مطابق اسلامی فوج کو پانچ بڑے حصوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔

۱ - قلب (فوج کا وہ مرکزی حصہ جو درمیان میں ہوتا تھا اور جس میں سالار اعظم موجود ہوتا تھا۔)

۲ - میمنہ (فوج کا دایاں بازو جس کو Right Wing کہتے ہیں یہ قلب کے دائیں ہاتھ پر ہوتا تھا)

۳ - میسرہ (فوج کا بایاں بازو جس کو Left Wing کہا جاتا ہے اور جو قلب کے بائیں جانب ہوتا تھا)

۴ - مقدمہ (فوج کا دستہ اول دستہ جو اصل فوج یعنی مذکورہ بالا تینوں حصوں سے کچھ آگے ہوتا ہے)

۵ - ساقہ[۶۲] (فوج کا وہ عقبی دستہ جو اصل فوج کے کچھ پیچھے رہتا ہے تاکہ عقب پر نظر رکھی جا سکے۔

ابن خلدون تعبیہ طریق جنگ کو "زحف" طریقہ بھی کہتا ہے۔ یہ دراصل صف طریق جنگ کا دوسرا نام ہے جس میں فوج صفوں کی شکل میں میدان جنگ میں آراستہ کی جاتی ہے۔ کیونکہ فلسفی مورخ کے نزدیک یہ طریقہ دشمنوں کے لئے زیادہ پریشان کن اور خوفناک تھا اور یہ نظام جنگ اسلام کے آنے سے پہلے عرب میں معروف و مستعمل ہو چکا تھا[۶۳]۔ آئیے اب ہم اسلام کی

فوجی تنظیم کے اس شعبہ سے متعلق مواد کا تجزیہ کریں اور مختلف مراحل سے اس کے گذرنے کا مطالعہ کریں۔

ایک غلط فہمی یہ عام ہوگئی ہے کہ اسلامی عسکری تنظیم میں فوج کو پانچ حصوں میں تقسیم کرنے کا عمل بعد کے زمانے میں شروع ہوا تھا۔ جب وہ زیادہ منظم اور مستقل ہوگئی تھی اور عہد نبوی میں قبائلی نظام یعنی الکر والفر کا طریقہ جاری و مستقل تھا۔ جس میں یہ نظام ممکن ہی نہیں تھا۔ مگر مآخذ سے واضح ہوتا ہے کہ خمیس نظام عہد جاہلیت میں بھی موجود تھا۔ اور اسلامی عہد کے عہد نبوی سے تو متعدد بلکہ کثیر مثالیں اس کی ملتی ہیں اور ان کی بنیاد پر اس کے ارتقاء کی تاریخ اور اس کے مختلف ارتقائی منازل کی ترتیب و تعین کی جاسکتی ہے۔ زیادہ تر اس کی مثالیں ہم کو غزوات نبوی کے ضمن میں ملتی ہیں اور مختلف مہمات نبوی میں بازوؤں کے افسروں کے حوالے بھی ملتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اتنے بازوؤں کی موجودگی اور ضرورت عددی اعتبار سے ایک بڑی فوج ہی میں ممکن اور موجود ہو سکتی تھی۔ اور چونکہ سرایا چھوٹی فوجوں بلکہ دستوں پر مشتمل ہوتی تھیں۔ اس لئے عموماً ان میں یہ دستے یا بازو غیر ضروری ہوتے تھے۔ البتہ بڑی سرایا میں ان کے حوالے ملتے ہیں۔ جیسا کہ ہم اپنے اگلے تجزیے میں دیکھیں گے۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مدینہ میں اسلامی ریاست کے قیام وارتقاء کے اولین مرحلہ میں اس فوجی بناوٹ کی جانب زیادہ توجہ نہیں دی گئی تھی بلکہ کسی مخصوص فوجی تنظیم کی طرف ہی دھیان نہیں دیا گیا تھا۔ کیونکہ نہ تو کوئی مستقل فوج تھی اور نہ ہی اس کی فوری ضرورت محسوس کی گئی تھی۔ ساری بالغ مرد آبادی فوج تھی[۶۴] جسے بوقت ضرورت اکٹھا کیا جاسکتا تھا۔ مزید یہ کہ چونکہ مسلمانوں کو ابھی تک کسی باقاعدہ جنگ وجدال کا تجربہ نہیں ہوا تھا اس لئے انہوں نے اس قسم کی کسی تنظیم کی ضرورت نہیں محسوس کی تھی۔[۶۵]

بہرحال جلد ہی مسلمانوں کو میدان بدر میں قریشی اشرافیہ کی مسلح اور منظم فوج سے پالا پڑا اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مسلم فوج کو متداول و معروف طریقہ کے مطابق میدان جنگ میں آراستہ کیا گیا۔ مآخذ میں بکثرت حوالے اس کے ملتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذاتی نگرانی میں مسلم فوج کی صف بندی کرائی تھی۔ اگرچہ اس غزوہ کے ضمن میں خمیس کی اصطلاح کا واضح حوالہ نہیں ملتا ہے تاہم اس کا ذکر مضمر طور سے ملتا ہے جو پورے بیان جنگ بدر میں موجود اور جاری و ساری ہے[۶۶] واقدی نے فوج نبوی کے دو بازوؤں میمنہ اور میسرہ کا واضح طور سے ذکر متعدد جگہوں پر کیا ہے۔ یہ بھی معلوم و معروف حقیقت ہے کہ بطور سالار اعظم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم قلب میں موجود تھے اور جنگ کے دوران مسلسل ہدایات جاری فرماتے رہے تھے اس سلسلہ میں یہ غلط فہمی پیدا ہوگئی ہے کہ آپ میدان جنگ سے ہٹ کر ایک جھونپڑی (عریش) میں صرف دعا و سجدہ میں مصروف رہے تھے وہ ایک نازک اور اہم لمحہ تھا جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے امداد الٰہی کی دعا فرمائی تھی ورنہ بقیہ وقت آپ شریک جنگ اور فوج کے درمیان موجود رہے تھے۔ عریش کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ وہ کوئی خانقاہ یا مسجد نہ تھی بلکہ ایک ایسی اونچی چٹان پر ایک فوجی چوکی تھی جہاں سے سالار اعظم پورے میدان جنگ کا معائنہ فرما سکیں[۶۷] بہرحال ایک روایت کے مطابق میمنہ کے سالار حضرت ابوبکر صدیق تھے اور اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ میسرہ بھی کسی افسر کے ماتحت نگرانی میں دیا گیا ہوگا[۶۸] لیکن مآخذ میں ایک روایت یہ بھی ملتی ہے کہ اس غزوہ میں نہ تو مسلم فوج میں دونوں بازوؤں کے افسر مقرر ہوئے تھے اور نہ مکی فوج میں[۶۹]۔ بہرحال اس سے افسران میمنہ اور میسرہ کی تقرری کی تردید تو ہوتی ہے مگر ان دونوں بازوؤں کی غیر موجودگی کی تائید نہیں ہوتی عین ممکن ہے کہ دونوں طرف افسروں کی تقرری نہ ہوئی ہو۔ لیکن مآخذ کی یہ زیادہ قوی روایت پہلی بیان کردہ ضعیف روایت سے زیادہ قوی

نہیں معلوم ہوتی ہے۔ یہ تسلیم کرلیا جائے کہ نوزائیدہ مسلم فوج اپنی ناتجربہ کاری اور قلت وقت کے سبب اپنے بازوؤں کو ترقی نہیں دے سکی تھی اور خمیس طریقے کو نہیں اپنا سکی تھی تو مکی فوج کو کیا ہوا تھا؟ وہ تو تجربہ کار بھی تھی اور وقت کی کمی بھی اس کے پاس نہیں تھی، پھر جنگ فجار میں وہ خمیس نظام اپنا سکتی تھی۔ تو اس کے تیس پینتیس برس بعد بدر کے میدان میں اس کو اپنانے میں کیا چیز مانع تھی؟ اس کے علاوہ اسلامی فوج تین قبائلی دستوں میں بھی منقسم تھی: ایک مہاجرین کا دستہ تھا اور باقی دو دستے مدینہ کے انصاری قبیلوں کے تھے یہ عرب کے قبائلی عسکری نظام کے عین مطابق تھے۔

جنگ احد کے بارے میں ہم کچھ زیادہ یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی فوج خمیس کے اصولوں پر مبنی تھی کیونکہ ماخذ کا اصرار ہے کہ مکی فوج اس نظام پر مرتب کی گئی تھی اس لئے اسلامی فوج کے لئے ضروری ہو گیا تھا کہ ان کی چالوں کی کاٹ کرنے کے لئے وہی نظام اپنائے۔ واقدی کا بیان ہے کہ مکی سالاروں نے خالد بن ولید مخزومی کو اپنی فوج کے میمنہ پر اور عکرمہ بن ابی جہل مخزومی کو اپنے میسرہ پر سالار مقرر کیا تھا۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی فوج میں بھی یہ دونوں بازو بنائے تھے[1] اور ظاہر ہے یہ دونوں بازو اپنے متعلقہ سالاروں کی کمان میں تھے۔ اس کی تصدیق اسد الغابہ کی ایک روایت سے اگرچہ جزوی طور سے ہی ہوتی ہے اس کے مطابق حضرت منذر بن عمرو اس غزوہ میں اسلامی فوج کے میسرہ کے سالار تھے[2]۔ بہر حال اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا لازمی ہو جاتا ہے کہ دائیں بازو کا بھی کوئی سالار ضرور تھا جس کا نام ماخذ محفوظ نہیں رکھ سکے۔ مزید تصدیق طبری کے اس بیان سے ہوتی ہے۔ جس کے مطابق حضرت حمزہ بن عبد المطلب کو اس موقعہ پر مقدمہ کا سالار مقرر کیا گیا تھا[3]۔ اگرچہ بقیہ بازوؤں یا ان کے سالاروں کا ذکر نہیں ملتا ہے۔ تاہم یہ ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ خمیس نظام اسلامی فوج کا بنیادی طور سے جزو بن چکا تھا اس کے علاوہ غزوۂ مریسیع کے ضمن میں ہم ساقہ کا ذکر بھی پاتے ہیں[4]، جبکہ بنو قریظہ کے غزوہ میں ایک بار پھر مقدمہ کا ذکر ملتا ہے۔ مؤخر الذکر کے سالار حضرت علی بن ابی طالب ہاشمی تھے[5]۔

سیرت نبوی میں توقیتی اعتبار سے پہلی بار خمیس کی اصطلاح کا واضح ذکر واقدی کے یہاں خیبر کی مہم کے بیان میں ملتا ہے[6]۔ اس کے بعد اسلامی فوج کا جب بھی ذکر آتا ہے۔ خمیس کا حوالہ وضاحت کے ساتھ یا مضمر طور سے ضرور ملتا ہے۔ چنانچہ غزوات عمرۃ القضیہ، موتہ، فتح مکہ، حنین، اوطاس، طائف اور تبوک کے ضمن میں اس کے حوالے ملتے ہیں۔ عمرۃ القضیہ میں مقدمہ کے سالار حضرت محمد بن مسلمہ اوسی تھے۔ اور ان کے ماتحت سپاہی تھے سب کے سب شہسوار (الخیل) تھے جبکہ ہتھیاروں اور اسلحہ جات کا افسر حضرت بشیر بن سعد خزرجی کو مقرر کیا گیا تھا[7]۔ چھ ماہ بعد حضرت قطبہ بن قتادہ کو غزوہ موتہ کی اسلامی فوج میں میمنہ کا سالار مقرر کیا گیا تھا[8]۔ خمیس نظام کی سب سے اچھی مثال اور ثبوت حضرت خالد بن ولید مخزومی کی اس حربی تدبیر میں ملتا ہے جو انہوں نے اس غزوہ میں اپنائی تھی اس عظیم سالار نے تین نامزد سالاران نبوی کی شہادت کے بعد اپنی فوج کی ترتیب و بناوٹ میں مکمل تبدیلی یوں پیدا کی تھی کہ میمنہ کو میسرہ کی جگہ متعین کیا تھا[9]۔ بازوؤں کی اس نئی ترتیب سے دشمن دھوکہ کھا گیا کہ مسلمانوں کی تازہ کمک آگئی ہے اور اس سبب سے اس نے جنگ سے گریز کیا اور اس طرح مسلمانوں کو باعزت پسپا ہونے کا موقعہ مل گیا۔ فتح مکہ کے غزوہ میں ہم کو یہ یقینی علم ہوتا ہے کہ حضرت خالد بن ولید مخزومی نے مقدمہ کی کمان کی تھی۔ جو نفری بہ (۲۰۰)

دو ہزار شہسواروں پر مشتمل تھا۔ جبکہ باقی دونوں بازو اپنے اپنے سالاروں کی کمان میں تھے اور اصل قیادت فوج کی خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے۔ آپ کے بارے میں مزید شہادت یہ ملتی ہے کہ تمام کتائب (دستوں / بازوؤں) پر آپ کا اختیار تھا اور ان کو ہدایات دے رہے تھے۔ یہ دستے مختلف قبیلوں نے مہیا کئے تھے اور ان کے اپنے اپنے سالار تھے[80] حنین و طائف کی مشترکہ مہم کے ضمن میں بھی خمیس کا ذکر ملتا ہے اور خیل (شہسوار دستہ) کا ذکر اس کے عظیم المرتبت سالار حضرت خالد بن ولید کے نام کے ساتھ کیا جاتا ہے[81] ان کثیر روایتوں اور شہادتوں کی روشنی میں یہ فرض کیا جانا جائز ہوتا ہے کہ غزوۂ تبوک میں بھی اسلامی فوج اس نظام پر مبنی تھی[82] بہرحال ان تاریخی واقعات اور شواہد کی بنیاد پر یہ نتیجہ بخوبی نکالا جا سکتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تعبیہ خمیس نظام کا تجربہ اپنی پہلی عظیم مہم سے کرنا شروع کر دیا تھا اور رفتہ رفتہ یہ نظام مکمل اور پختہ ہو گیا تھا اور اسی کا نتیجہ تھا کہ کچھ مدت کے بعد ہی اسلامی فوج ایک طاقت بن کر ابھری۔ ایک ایسی طاقت جس نے نہ صرف عرب قبائل کی مزاحمت کو توڑا بلکہ عربوں کی سب سے بڑی فوجی قوت قریش مکہ کا سر نگوں کیا اور عہد نبوی کے معاً بعد اسلامی فوج نے نہ صرف وقت کی دو عظیم ترین طاقتوں سے لوہا منوا لیا بلکہ ان میں سے ایک کو مختصر سی مدت میں نیست و نابود کر دیا اور دوسری کو اپاہج بنا دیا۔

عہد نبوی کے عظیم ترین بازوؤں کے سالاروں میں حضرات منذر بن عمرو[83]، اوس بن خولی خزرجی[84]، علی ابن ابی طالب ہاشمی[85] حمزہ بن عبدالمطلب ہاشمی[86] زبیر بن عوام اسدی[87] ابوعبیدہ بن جراح فہری[88] اور خالد بن ولید مخزومی[89] کے علاوہ قطبہ بن قتادہ سعدی[90]، ورد بن خالد سلمی[91] اور ابوعامر اشعری[92] کے اسمائے گرامی نمایاں نظر آتے ہیں جنہوں نے مختلف غزوات و سرایا میں شاندار خدمات انجام دی تھیں۔

الحرس (محافظ فوج)

جنگ کے زمانے میں جب اسلامی فوج دشمنوں سے مقابلے کرنے یا ان کی مزاحمت کو کچلنے کے لئے باہر گئی ہوتی تھی تو ریاست کے پایہ تخت کو بلا کسی محافظ فوج کے نہیں چھوڑا جا سکتا تھا کیونکہ اس صورت میں شہری آبادی اردگرد کے دشمن یا مخالف قبائل کے حملہ کا شکار ہو سکتی تھی۔ اس کے علاوہ شہر کے مسلمان اپنے آپ کو محفوظ تصور نہیں کر سکتے تھے خاص کر اس صورت میں کہ جب اندرونی دشمن جیسے منافقین اور یہود اپنی سازشوں سے باز نہیں آ رہے تھے[93] ان حالات میں صدر مقام کی حفاظت اور دفاع کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی تھی بہرحال یہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دوربینی اور فوجی سوجھ بوجھ تھی کہ آپ نے شہر کے دفاع کے مکمل انتظامات کئے تھے۔ چنانچہ جب کبھی آپ کسی مہم یا سفر پر شہر سے باہر تشریف لیجاتے تو شہر کی حفاظت کے لئے ایک فوج چھوڑ جاتے تھے۔ جو دشمن کے منصوبوں کو خاک میں ملا سکتی تھی یا ان کو شرارت سے باز رکھ سکتی تھی۔ یہ انتظامات صرف اپنی غیر حاضری میں ہی نہیں کرتے تھے۔ بلکہ اپنی موجودگی میں بھی جب حالات غیر معمولی ہوتے تھے۔ ان کی طرف پوری توجہ دیتے تھے۔ اس کے علاوہ آپ اپنا ایک جانشین (خلیفہ ، نائب) بھی چھوڑ کر جاتے تھے۔ جو مسلمانوں اور اسلامی ریاست کے مفادات کی دیکھ بھال آپ کی غیر حاضری میں کرتا تھا۔ ان خلفاء یا نوابوں سے ہم اگلے باب میں بحث کریں گے کیونکہ ان کے فرائض منصبی کسی قدر مختلف تھے۔

تقریباً تمام اہم غزوات کے بیان میں ہم کو ایک محافظ فوج (الحرس) کا ذکر ملتا ہے۔ غزوہ احد کے دوران قبیلہ اوس کے سردار حضرت سعد بن معاذ اوسی کو حرس کا سالار مقرر کیا گیا تھا[94]۔ خندق کی جنگ کے پرآشوب خطرناک موقعہ پر دو سالاران حرس حضرت

زید بن حارثہ کلبی اور حضرت سلمیٰ بن اسلم اوسی کو باری باری سے یہ ذمہ داری سونپی گئی تھی اور وہ بالترتیب ۵۰۰ اور ۲۰۰ شہسواروں پر مشتمل دستوں کے ساتھ شہر کا گشت لگاتے رہتے تھے۔ کیونکہ خدشہ یہ تھا کہ یہود بنی قریظہ کہیں عقب سے حملہ نہ کر دیں[95] اسی طرح ربیع الثانی ۶ھ / اگست ۶۲۷ء میں جب آپ غطفان کے خلاف ایک مہم میں مشغول تھے، حضرت سعد بن عبادہ خزرجی کو تین سو سپاہ پر مشتمل ایک محافظ فوج کا، جو پوری طرح انہی کے قبیلہ والوں کی تھی، سالار مقرر کیا گیا تھا[96]۔ اگرچہ شہر مدینہ کی محافظ فوج کے لئے اس سے زیادہ اطلاعات نہیں ملتی ہیں۔ تاہم اتنی شہادتیں اس بات کے لئے کافی ہیں کہ شہر کے دفاع اور حفاظت کا پورا انتظام کیا جاتا تھا۔ عموماً ایسا محسوس ہوتا ہے کہ محافظ فوج کے سپاہی مدینہ کے انصاری قبیلوں اوس و خزرج ہی سے لئے جاتے تھے۔ جیسا کہ آخری مہم میں خزرجی سپاہیوں کے حوالے سے معلوم ہوتا ہے اس کے علاوہ مزید شہادتیں اس ضمن میں الحرس کی ایک اور قسم کے بارے میں بھی ملیں گی۔

الحرس یا محافظ فوج کی ایک اور قسم تھی جس کو ہم چوکسی کی فوج یا دستہ بھی کہتے ہیں۔ یہ مہموں کے دوران رات میں اسلامی معسکر یا کیمپ کی حفاظت کرتی تھی یا دشمن کی حرکات و سکنات پر نظر رکھتی تھی تاکہ شب خون سے بچا جا سکے[97]۔ بدر کے غزوہ کے دوران اس قسم کا کوئی انتظام کیا گیا تھا یا نہیں ہم نہیں جانتے۔ امکان غالب یہی ہے کہ کچھ نہ کچھ انتظام ضرور کیا گیا ہوگا۔ بہرحال غزوہ احد کے بارے میں ہم یقینی طور سے جانتے ہیں کہ اس قسم کی محافظ یا چوکسی کی فوج اور اس کا سالار مقرر کیا گیا تھا[98] مختلف غزوات و سرایا کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ شب بیدار محافظوں پر مشتمل دستے اپنے سالاروں کے ماتحت مقرر کئے جاتے تھے اور یہ ایک معمول تھا چنانچہ حضرات محمد بن مسلمہ اوسی عباد بن بشر اوسی، اوس بن خولی خزرجی اور عمر بن خطاب عدوی قریشی ایسے شب بیدار محافظوں کے نمایاں سالار رہتے تھے[99] لیکن اعداد و شمار سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قبیلۂ اوس اس فرض منصبی کو ادا کرنے میں پیش پیش تھا۔ دوسرا اہم نکتہ اس ذیل میں یہ بھی ہے کہ اکثر حالات میں یہ شب بیدار محافظ صرف شخص واحد ہوتا تھا۔ بہرحال ۳ھ / ۶۲۵ء سے ۸ھ / ۶۳۰ء تک کے عرصے میں اوس کے دو افراد نے یہ فرض چھ مواقع پر انجام دیا تھا[100] ماخذ کا بیان بھی ہے اور واقعات سے اس کی تصدیق بھی ہوتی ہے کہ اوّل الذکر دو محافظ یعنی حضرات محمد بن مسلمہ اور عباد بن بشر نے اس اہم اور ذمہ دارانہ کام میں مہارت حاصل کر رکھی تھی اور وہ اس کے لئے معروف و مشہور تھے[101] عمرۃ القضیہ کے موقع پر تین حضرات محمد بن مسلمہ، عباد بن بشر اور اوس بن خولی نے باری باری سے پہرہ دیا تھا۔[102]

شب بیدار محافظوں کے علاوہ الحرس میں کیمپ محافظ بھی تھے۔ یہ محافظ اسلامی کیمپ کا گشت لگاتے رہتے تھے اور اپنے ساتھی مجاہدین کی حفاظت کرتے تھے۔ کبھی ایک پورا دستہ اس کام کو انجام دیتا تھا اور کبھی ایک یا دو آدمی کافی سمجھے جاتے تھے[103]۔ ظاہر ہے کہ محافظین کی تعداد حالات اور مواقع کے تقاضوں کے مطابق ہوتی تھی۔ خطرہ کم ہوتا تھا یا مہم چھوٹی ہوتی تھی تو ایک دو آدمی کافی ہو جاتے تھے یا اچانک ضرورت پیش آ جانے پر بھی ایک آدمی کفایت کر جاتا تھا۔ مثال کے طور پر جنگ خندق کے دوران رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر اچانک گشت کرتے ہوئے ایک ایسی جگہ پر پڑی جہاں سے خندق پار کی جا سکتی تھی۔ آپ نے بذات خود اس کی نگرانی فرمائی تا آنکہ حضرت سعد بن ابی وقاص نے آپ کی جگہ سنبھال لی[104]۔ اسی غزوہ میں مکمل محافظ دستہ حضرت عباد بن بشر انصاری کی قیادت میں برابر گشت لگاتا رہا تھا۔ بہرحال ان تمام شواہد سے واضح ہوتا ہے کہ الحرس یا محافظ فوج کا ایک باقاعدہ نظم تھا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تمام مہموں کے دوران اس کے انتظامات کرتے تھے۔ یہ عہد نبوی کی عسکری تنظیم کا ایک شعبہ تھا۔ اگرچہ مختصر سا تھا۔

معسکر سالار

خیمہ گاہ (معسکر) کا سالار عموماً اسلامی فوج کا سالار اعلیٰ ہوا کرتا تھا اور جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم موجود رہتے تھے تو آپ افواج کے ساتھ ساتھ کیمپ کمانڈر بھی ہوتے تھے۔ بہر حال دو واضح مثالیں ملتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اپنی غیر حاضری میں اپنا جانشین سالار معسکر بنایا تھا۔ واقدی کا بیان ہے کہ آپ نے غزوات بنو نضیر اور خیبر کے دوران حضرات علی بن ابی طالب ہاشمی[105] اور عثمان بن عفان اموی[106] کو اپنا جانشین سالار لشکر بنایا تھا۔ آپ کی عارضی غیر حاضری میں یہ دونوں حضرات سالار افواج بھی مقرر کیے گئے تھے (استخلف) خیبر کی مہم کے سلسلہ میں اس عہدہ کی کچھ تفصیلات ملتی ہیں جن کے مطابق آپ کسی ضرورت سے رجیع کے مقام سے ہٹ گئے۔ جہاں اسلامی لشکر خیمہ زن تھا۔ چنانچہ آپ نے اپنی غیر حاضری میں حضرت عثمان بن عفان اموی کو کیمپ اور لشکر دونوں کا سالار مقرر کیا تھا۔ حضرت عثمان اموی کی اس عہدہ پہ تقرری خاصی اہم بات ہے کیونکہ ان کی شہرت عموماً فوجی امور کے لئے نہیں ہے۔

عرض

عہد نبوی کی عسکری تنظیم کا ایک اہم پہلو فوجی معائنہ (عرض) تھا۔ عام طور سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ اہم کام اپنے کسی صحابی کے سپرد کر دیتے تھے جو اس فن میں ماہر ہوتا تھا۔ معمول یہ تھا کہ اسلامی فوج کے سپاہیوں کا معائنہ اس کے اکٹھا ہونے کے بعد ہوتا تھا جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ اسلامی فوج کوئی مستقل فوج نہیں تھی جس کا معائنہ وقتاً فوقتاً ہوتا رہے۔ کبھی کبھی یہ معائنہ فوج کے کوچ سے پہلے یا اسکے دوران یا جنگ شروع ہونے سے کچھ پہلے کیا جاتا تھا۔ بہر حال یہ یقینی ہے کہ معائنہ کا طریقہ پہلی اہم مہم سے شروع ہو گیا تھا[107]۔ واقدی کے مطابق جب اسلامی فوج بدر جانے کے لئے بئر ابی عنبہ نامی مقام تک پہنچی تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک صحابی حضرت قیس بن ابی صَعْصَعَہ کو مجاہدین کے معائنہ کا حکم دیا۔ چنانچہ تعمیل حکم میں انہوں نے سپاہیوں کا شمار لگایا (عَدَّهُمْ) اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو انکی تفصیلات سے آگاہ کیا[108]۔ ابن سعد کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ معائنہ اس وقت ہوا تھا جب اسلامی فوج شہر سے ایک میل دور جا چکی تھی اور معائنہ میں جن مجاہدین کو کم عمر پایا گیا تھا ان کو واپس کر دیا گیا تھا[109]۔ اسی طرح غزوہ احد کے موقعہ پر بھی اسلامی فوج کا معائنہ کیا گیا تھا اور یہ معائنہ شیخین کے مقام پر ہوا تھا۔ واقدی کے مطابق اس بار گیارہ مجاہدین کو ان کی کم عمری کے باعث مسترد کر دیا گیا تھا۔ جب کہ ان میں سے دو حضرات رافع بن خدیج اور سَمُرَہ بن جُنْدَب کو ان کی جسمانی طاقت اور فن جنگ میں مہارت کے سبب کم عمری کے باوجود اجازت دیدی گئی تھی[110]۔ عرض یا معائنہ کی دوسری مثال غزوہ خندق کے زمانے سے تعلق رکھتی ہے۔ غزوہ احد میں مسترد کئے جانے والے متعدد مجاہدین، جیسے حضرات عبداللہ بن عمر، زید بن ثابت اور براء بن عازب وغیرہ کو فوجی عمر تک پہنچ جانے کے سبب اس بار اجازت جہاد دے دی گئی تھی[111]۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہوگی کہ فوجی عمر یا فوجی خدمت کی کم از کم عمر پندرہ سال تھی۔ عام حالات میں اس سے کم عمر کے لڑکوں کو فوج میں شرکت کی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔

اگرچہ غزوہ خیبر کے بیانات میں ابتدائی مآخذ معائنہ (عرض) کا کوئی حوالہ نہیں دیتے ہیں۔ تاہم یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس اہم غزوہ میں بھی

عرض (معائنہ) کیا گیا تھا۔ مآخذ کا یہ متفقہ بیان ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن ثابت خزرجی کو اموال غنیمت میں مجاہدین کے حصے متعین کرنے کی غرض سے مجاہد شماری کا طریقہ سونپا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس بیان میں عرض بھی مضمر ہے۔ بہرحال اس ضمن میں ایک اہم ترین نکتہ یہ بھی قابل ذکر ہے کہ غزوہ خیبر کے بعد حضرت زید بن ثابت کو عرض کا مستقل افسر مقرر کر دیا گیا تھا۔ کیونکہ انہوں نے اپنی کم عمری کے باوجود یہ کام عہد نبوی میں بقیہ تمام مہموں کے زمانے میں انجام دیا تھا اور ان میں فتح مکہ، حنین، طائف اور تبوک جیسی بڑی مہمیں شامل تھیں۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ کم از کم عرض (معاینہ کے افسر) کا عہدہ اور منصب مستقل طور سے ایک عہدہ دار کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ اور حضرت زید بن ثابت اس کے مستقل افسر تھے۔[113]

اسلامی فوج کے ڈویژن

اسلامی فوج نے اپنے پیشرو جاہلی نظام فوج سے بہت سی چیزیں مستعار لی تھیں اور ان میں فوجی ڈویژن یا دستے شامل تھے۔ چنانچہ عرب فوج میں چاہے وہ اسلامی ہو یا غیر اسلامی پانچ اہم ڈویژن ہوتے تھے: پیادہ فوج (المشاۃ) شہسوار فوج (الخیل) تیر اندازوں کا دستہ (الرماۃ) مسلح و کیل کانٹے سے لیس دستہ (اہل السلاح) اور سامان رسد کا نگران دستہ (اصحاب الرحل) اونٹ (بعیر) سواری اور نقل و حمل کے ذرائع تھے اور غالباً ان پر مشتمل کوئی دستہ نہیں ہوتا تھا۔ ان تمام دستوں کے حوالے مختلف مہمات نبوی کے بیانات میں ملتے ہیں۔ بدر کی مہم کے ذیل میں حضرت قیس بن ابی صعصعہ خزرجی کو واقدی[114] اور ابن سعد[115] پیادہ فوج (مشاۃ) کا سالار بتاتے ہیں جبکہ ابن اسحاق[116] اور طبری[117] نے ان کو ساقہ (فوج کے پچھلے حصہ) کا افسر بتایا ہے۔ ممکن ہے کہ ساقہ پیادہ فوج ہونے کے سبب یہ تضاد پیدا ہوا ہو اور چاروں مآخذ کی مراد اس سے ساقہ کے پیدل مجاہدین سے ہو۔ بہرحال یہ تو معلوم ہوتا ہی ہے کہ پوری فوج بدر میں ایک دو کے سوا پیادوں پر مشتمل تھی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کے سالار اعلیٰ تھے[119] اور ساقہ بہرحال اصل فوج سے کچھ پیچھے ہوتا تھا اس لئے اس کا ایک علیحدہ افسر ہونا ضروری تھا۔ خیبر کی مہم میں حضرت اوس بن خولی اہل السلاح کے افسر تھے[120] جبکہ حضرت علی کی مہم فلس میں حضرت عبداللہ بن عتیق خزرجی مشاۃ اور رجالہ کے افسر تھے[121] بہرحال ان مثالوں سے یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ پیادہ فوج عہد نبوی کی عسکری تنظیم کا ایک لازمی حصہ تھا۔ جہاں تک شہسوار فوج کا تعلق ہے تو مختلف غزوات کے بیانات میں اس کے حوالے ملتے ہیں، چونکہ اسلامی فوجی نظام میں اس کا ارتقاء ایک اہم عنصر تھا اس پر الگ سے بحث کرنا مناسب معلوم ہے۔

شہسوار فوج (الخیل) کا ارتقاء

اسلامی فوج میں شہسوار فوج ابتدائی مہموں تک نظر نہیں آتی۔ غزوہ بدر میں مسلمانوں کے تین سو چودہ سپاہیوں میں سے کل دو کے پاس گھوڑے تھے جبکہ ان کے مکی مقابلوں اور حریفوں کے پاس ایک سو شہسوار تھے۔[123] بدر کے مال غنیمت میں مسلمانوں کو دس گھوڑے ملے تھے[124] جس سے ان کی شہسوار فوج کی غالباً بنیاد پڑی تھی۔ اس کے چھ ماہ بعد ذو امر کے غزوہ میں مسلم فوج میں متعدد مجاہد شہسوار تھے۔ لیکن ان کی حتمی تعداد نہیں معلوم ہوتی ہے۔[125] غزوہ احد میں مسلم فوج کے پاس کم از کم پچاس گھوڑے تھے جبکہ سہ ہزاری

مکی فوج کے پاس دو سو گھوڑے، تین ہزار اونٹ اور سات سو زرہ بکتر تھے[126] اس کے علاوہ ان کے پاس ایک سو تیر اندازوں پر مشتمل دستہ تھا جبکہ مسلمانوں کا یہی دستہ کل پچاس تیر اندازوں پر مشتمل تھا اور حضرت عبداللہ بن جبیر خزرجی کی قیادت میں تھا[127] مریسیع کی مہم کے ذیل میں مسلم شہسواروں کی تعداد محض تیس رہ گئی تھی[128] لیکن خندق کی مہم کے دوران مسلم شہسواروں کی تعداد پانچ سو معلوم ہوتی ہے کیونکہ دو شہسوار دستوں کا ذکر ملتا ہے جو بالترتیب تین سو اور دو سو پر مشتمل تھے اور حضرات زید بن حارثہ اور سلمیٰ بن اسلم اوسی کی کمان میں تھے[129] اس سلسلے میں دلچسپ بات یہ ہے کہ واقدی کے بیان میں اس غزوہ کے دوران فریقین کے عسکری اعداد و شمار کا تقابلی مطالعہ ملتا ہے جس سے دونوں کی حربی طاقت کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ چنانچہ مذکورہ بیان اور دوسرے ماخذ کے بیانات کے مطابق یہ کہا جا سکتا ہے کہ جنگ خندق دراصل شہسواروں اور تیر اندازوں کی لڑائی تھی اس کے علاوہ وہ فن حرب کی بعض باریک و پیچیدہ تدابیر کی بھی جنگ تھی۔

اس کے بعد تمام دوسرے غزوات نبوی میں ہم کو شہسوار دستوں کی مسلسل موجودگی کے حوالے ملتے ہیں۔ چنانچہ مہمات عسفان[130]، غابہ[131]، حدیبیہ[132]، خیبر[133]، اور عمرۃ القضاء[134] جو ۶ھ / ۶۲۷ء تا ۷ھ / ۶۲۹ء کے دو برس کی مدت میں بھیجی گئی تھیں شہسواروں (الخیل)، کا ذکر ملتا ہے۔ لیکن ایک حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ان تمام مہموں میں ان کی تعداد کافی کم معلوم ہوتی ہے اس کا ایک ہی سبب ہے اور وہ یہ کہ فوجی نقطۂ نظر سے یہ تمام مہمیں بہت معمولی تھیں۔ بہر حال فتح مکہ کے دوران اسلامی فوج میں شہسواروں کی تعداد ڈھائی ہزار کے قریب تھی[135] ایک سال سے کچھ زیادہ مدت کے بعد غزوہ تبوک میں شہسوار (الخیل) دس ہزار کی عظیم تعداد کو جا پہنچے تھے۔ جبکہ پیادہ سپاہ کی تعداد بیس ہزار تھی[136] اس تجزیہ سے اسلامی عسکری تنظیم بالخصوص اس کے اس شعبے کے ارتقاء کا اندازہ ہوتا ہے کہ آٹھ برس کی مدت میں اسلامی فوج کی کل عددی طاقت تین سو سے کچھ زیادہ سپاہ سے بڑھ کر تیس ہزار ہو گئی اور گھوڑوں کی تعداد دو سے بڑھ کر دس ہزار ہو گئی تھی اور یہ عہد نبوی کی عسکری تنظیم کا ایک شاندار کارنامہ تھا۔

یہاں دو اہم سوال پیدا ہوتے ہیں: اول یہ کہ شہسوار فوج کو ترقی دینے کا کیا کیا محرک یا محرکات تھے؛ اور دوم یہ کہ اسکے لیے کیا ذرائع اختیار کئے گئے تھے؟ جہاں تک محرکات و عوامل کا تعلق ہے تو وہ ظاہر تھے، اول یہ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم دشمنوں کی طاقت کا بھرپور مقابلہ کرنا چاہتے تھے اور چونکہ ان کی افواج میں شہسوار ہوتے تھے اس لئے آپ نے بھی اس کی ترقی پر توجہ دی۔ دوم یہ کہ وقت کے ساتھ ساتھ یہ تجربہ بھی ہوتا گیا کہ گھوڑ سوار فوج میں حملہ اور اقدام کی زیادہ اور کارگر صلاحیت ہوتی ہے۔ سوم یہ کہ ان کی وجہ سے مسافت کا مسئلہ حل کیا جا سکتا ہے اور قلیل عرصے میں صدر مقام سے مقام جنگ یا جائے فتنہ تک پہنچا جا سکتا ہے ان اسباب سے نہ صرف آپ نے بنفس نفیس شہسوار فوج کی ترقی پر توجہ دی بلکہ مسلمانوں کو بھی گھوڑے حاصل کرنے کی پوری ترغیب دی اس میں ترغیب الٰہی بھی شامل تھی[137] اور اس کا یقیناً خاطر خواہ اثر ہوا تھا۔ مسلم فوج میں شہسوار دستوں کی ترقی بلکہ زود و تیز رفتار ترقی کا ایک اہم سبب شہسواروں کا دو گنا حصہ بھی تھا جو ان کو پیادوں کے مقابلے میں اموالِ غنیمت میں سے ملتا تھا۔ بلکہ بعض روایات میں تو شہسواروں کا تین گنا حصہ بتایا گیا ہے۔ لیکن واقدی کے مطابق اوّل الذکر تناسب پہلی مہم سے آخری مہم تک عہدی نبوی میں برابر قائم و جاری رہا تھا[138] ظاہر ہے کہ اس محرک نے مسلمان مجاہدین کو گھوڑے زیادہ سے زیادہ

حاصل کرنے کی عملی ترغیب دی تھی اس کے علاوہ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ضمن میں ایک بڑی اسلامی ریاست کی جانب سے اپنائی تھی اور وہ یہ تھی کہ اموال غنیمت کے خمس کے ایک حصہ کو اور اکثر حالات میں اضافی آمدنی کو گھوڑوں اور اسلحوں کی خرید پر خرچ فرماتے تھے۔ متعدد مثالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اس مقصد کے لئے آپ نے عرب دنیا کے بازاروں سے گھوڑے خریدنے کے لئے اپنے افسر مقرر کئے تھے[۱۳۹] اس پالیسی کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا اور مختصر سی مدت میں اسلامی ریاست کے پاس اتنی بڑی شہسوار فوج ہو گئی کہ پورے عرب میں اس کا کوئی مقابل و حریف نہ تھا۔

عہد نبوی کی فوج میں ڈویژن عموماً قبائلی بنیادوں پر مرتب ہوتے تھے اور یہ ان حالات کے اعتبار سے ناگزیر تھا۔ کیونکہ پورا نظام حیات قبائلی تھا۔ یہ قبائلی فوجی کردار چھوٹی مہموں میں زیادہ واضح نہیں معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ ان کی سپاہ کی تعداد ہی بہت مختصر ہوتی تھی۔ لیکن بڑی مہموں میں وہ پوری طرح سے نمایاں نظر آتا ہے۔ چونکہ اسلامی فوج مستقل اور دوامی نہیں تھی اور وقت ضرورت قبیلوں سے، کہا جاتا تھا اور وہ اپنے قبائلی دستوں کے ساتھ جمع ہو جاتے تھے اور یہی قبائلی دستے اسلامی فوج بناتے تھے عام طور سے کم اہم مواقع پر اسلامی فوج کے تین دستے ہوتے تھے۔ ایک مہاجرین کا اور باقی دو دستے مدینہ کے دو انصاری قبیلوں اوس اور خزرج کے ہوتے تھے لیکن مخصوص حالات اور مواقع پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم قبائل عرب کو بھی اپنے دستوں کے ساتھ طلب فرماتے تھے جیسا کہ فتح مکہ اور تبوک کے غزوہ کے دوران بہت واضح طور سے نظر آتا ہے۔ عام طور سے قبائلی روایات کے مطابق یہ قبائلی دستے اپنے سرداروں کی کمان میں ہوتے تھے۔[۱۴۰] لیکن جب وہ اسلامی فوج میں منقلب ہو جاتے تھے تو ان کے قبائلی سردار ریاستِ اسلامی کے سالار اعلیٰ کے ماتحت ہو جاتے تھے۔ بہر حال یہ قبائلی کردار اول مہم سے آخری مہم تک پورے عہد نبوی میں نظر آتا ہے۔ مثلاً جنگِ بدر میں انصار اور مہاجرین کے بالترتیب دو اور ایک یعنی کل تین دستے تھے۔ خندق سے پہلے تقریباً تمام مہمات نبوی میں یہی صورت حال برقرار رہی تھی، اس کے بعد کی مہموں میں خاص کر غزوہ فتح مکہ اور غزوہ تبوک کے مواقع پر کئی مسلم قبائل عرب جیسے سلیم، اشجع، فزارہ، غفار، اسلم، مُزینہ، جُہینہ، خُزاعہ، اسد اور متعدد اوروں کے دستوں کا حوالہ ملتا ہے۔ یہ قبائلی کردار ان کے سرداروں کی تسکین خاطر اور اعزاز و اکرام کے لئے بھی برقرار رکھنا ضروری تھا کیونکہ وہی قبائلی سپاہیوں کو قابو میں رکھ سکتے تھے۔ لیکن بہر حال آہستہ آہستہ اسلامی فوجی نظام میں مرکزیت پیدا ہونا شروع ہو گئی تھی جس کا بھرپور مظاہرہ خلافت راشدہ میں عموماً اور خلافتِ حضرتِ معاویہ میں خصوصاً ہوا۔

صوبائی فوجی تنظیم

عہد نبوی میں معمول یہ تھا کہ صوبوں جن کو ولایات کہا جاتا تھا میں فوجی تنظیم من جملہ فرائض والی یا گورنر ہوتی تھی لیکن بعض مخصوص حالات میں بعض ولایات میں فوجی انتظامات گورنر یا والی کے دائرہ اختیار سے نکال کر یا اسی کے اندر ایک خاص افسر فوج (جند) کے حوالے کر دیئے جاتے تھے۔ جیسا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن میں وہاں کے مخصوص حالات کے سبب کیا تھا۔ اسد الغابہ کا بیان ہے کہ حضرت عبداللہ بن ربیع مخزومی کو یمن کی مرکزی اسلامی افواج (الجند) کا افسر مقرر کیا گیا تھا۔ یہ تقرری غالباً ۹ھ / ۶۳۰ء اور ۱۱ھ / ۶۳۲ء کے درمیان کسی وقت ہوئی تھی جب حضرت معاذ بن جبل خزرجی وہاں کے گورنر جنرل تھے۔ ماخذ کا مزید بیان ہے کہ حضرت عبداللہ

مخزومی اس عہدے پر مدتوں سرفراز رہے تھے[۴۱]۔ خلافت فاروقی میں ایک مرکزی دیوان الجند (فوجی محکمہ) قائم ہوا تھا۔ جس کے ماتحت صوبائی محکمے یا شعبے ہوتے تھے اور ان کے الگ الگ افسر مقرر کیے جاتے تھے۔

آخر میں ایک دو لفظ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے مقام و اعتبار کے بارے میں کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے جو انکو غزوہ تبوک کے دوران حاصل تھے۔ واقدی کا بیان ہے کہ جب اسلامی فوج کے مختلف دستے کیمپ یا خیمہ گاہ میں اکٹھا ہوگئے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر کو لشکر پر اپنا جانشین مقرر کر دیا۔ (استخلفہ) اور وہاں وہ امام لشکر کی حیثیت سے مجاہدین کی نمازوں کی امامت بھی فرماتے تھے۔ اس کے علاوہ سالار اعظم نے ان کو اپنا سب سے بڑا پرچم (لِوَاءُہ الاعظم) بھی فوج کے کوچ سے ذرا قبل عطا فرمایا تھا[۴۲]۔ کیا اس بیان سے یہ مقصد ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو لشکر کے بڑے ہونے کے سبب اپنا نائب سالار اعظم مقرر فرمایا تھا؟ تمام قرائن اس سوال کا جواب اثبات میں دیتے ہیں۔

افسرانِ افواجِ اسلامی کی قبائلی نمائندگی

عہد نبوی کی فوجی تنظیم کے بیان میں عام طور سے اور افسرانِ افواج رسالت کے بیان میں خاص طور سے ہم پہلے ہی متعدد افسروں کی قبائلی شناخت کو دیکھ چکے ہیں۔ یہاں ان افسروں کی قبائلی شناخت پر جو غزوات نبوی میں بازوؤں، ڈویژنوں، حرس وغیرہ کے افسر ہوتے تھے، مکمل روشنی ڈالنے کے لئے ذیل میں ایک جدول دی جا رہی ہے۔ جو ان افسروں کی سالانہ تقرری بھی ظاہر کرتی ہے۔

نمبر شمار	سن	۶۲۴	۶۲۵	۶۲۶	۶۲۷	۶۲۸	۶۲۹	۶۳۰	-۳۳	۶۳۱
۱	قریش	-	-	-	-	-	-	-	-	-
(الف)	بنو ہاشم	-	۲	-	۱	-	-		-	-
(ب)	بنو اسد	-	۱	-	-	-	-	۲	-	-
(ج)	بنو امیہ		-	-	-	۱	-	-	-	-
(د)	بنو تیم	۱-	-	-	-	-	-	-	-	۱
(س)	بنو عدی	-	-	-	-	۱	-	۱	-	-
(ص)	بنو فہر	-	-	-	-	-	-	۱	-	-
(ط)	بنو مخزوم	-	-	-	-	-	-	۳	-	۱
	میزان	۱	۳	-	۱	۲	-	۷	-	۲
(۲)	خزرج	۱	۱	-	۱	۱	۲	۲		-
(۳)	اوس	-	۴	-	۶	-	۲	۱		-

(۴)	کلب	-	-	-	۱	-	-	-	-
(۵)	سلیم	-	-	-	۱	-	-	۲	-
(۶)	سعد ہذیم	-	-	-	-	-	۱	-	-
(۷)	اشجع	-	-	-	-	-	-	۱	-
	میزان	۲	۸	۷	۱۰	۳	۵	۱۳	۲

جدول سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگرچہ قریش نے بطور ایک قبیلہ سب سے زیادہ تقرریاں یا عہدے حاصل کئے تھے تاہم اوس وخزرج نے مل کر اس سے کہیں زیادہ عہدے حاصل کئے تھے۔ صرف اوس کا تناسب نمائندگی کی مہاجرین کے تناسب کے قریب تھا قریشی سالاروں یا امیروں میں تقریباً سب کے سب مشہور و معروف جنگجو اور ماہر فن حرب اشخاص تھے اور ان میں سے بعض نے ایک سے زیادہ مرتبہ عہدے حاصل کئے تھے۔ مثال کے طور پر حضرات زبیر بن عوام اسدی، خالد بن ولید مخزومی اور عمر بن خطاب عدوی نے اس شعبہ میں دوبار سرفرازی حاصل کی تھی۔ مآخذ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلام لانے کے بعد حضرت خالد بن ولید مخزومی اسلامی فوج میں مقدمہ کے افسر مستقل طور سے ہو گئے تھے اور بعد میں عمرۃ القضاء، فتح مکہ، حنین، طائف اور تبوک وغیرہ تمام غزوات نبوی میں وہ اس کے افسر رہے تھے۔ اس لحاظ سے نہ صرف ان کا عہدہ مستقل تھا بلکہ وہ خود بھی مستقل فوجی سالار تھے۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہو گی کہ حضرت خالد بن ولید مخزومی اسلام سے قبل مکی اشرافیہ کی فوج میں مقدمہ اور خیل ہی کے مستقل افسر تھے اور اس حیثیت سے انہوں نے احد اور خندق میں کارنامے انجام دیئے تھے۔

انصاری افسروں میں حضرت محمد بن مسلمہ اوسی، عباد بن بشر اوسی، اسید بن حضیر اوسی، اور عبداللہ بن جبیر اوسی بہت نمایاں افسر تھے جبکہ حضرات زید بن ثابت، عبداللہ بن عتیک، اوس بن خولی اور سعد بن عبادہ خزرج کے اہم ترین افسر تھے۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ شب بیدار افسروں (الحرس) کا عہدہ تقریباً انہیں دونوں انصاری قبیلوں کی جاگیر بن گیا تھا۔ اور اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ حضرت زید بن ثابت افسر عرض (معائنہ لشکر) مستقل طور سے بن گئے تھے۔ اس کے علاوہ تقسیم اموال غنائم کے بھی وہ مستقل افسر تھے باقی عرب قبائل میں سلیم کے علاوہ بقیہ دوسروں کی نمائندگی نام بھر کی ہے۔ اگرچہ یہ حتمی امر ہے کہ اس قسم کے تمام افسروں کا ذکر ہمارے مآخذ نے محفوظ نہیں رکھا ہے ظاہر ہے کہ تمام غزوات نبوی میں اس قسم کے فوجی انتظامات کئے گئے تھے اور ان کے متعدد افسر بھی تھے۔ لیکن ان کا ذکر محفوظ نہیں رہا ورنہ اس شعبہ کے تمام افسروں کا شمار موجودہ اعداد سے کہیں زیادہ ہوتا۔

جہاں تک ان افسروں کی علاقائی نمائندگی کا تعلق ہے تو مرکزی عرب کے قبیلوں کا تقریباً مکمل قبضہ ان مناصب پر رہا تھا۔ دوسرے علاقوں کو کوئی خاص نمائندگی حاصل نہیں تھی بلکہ بعض علاقوں کی نمائندگی نام بھر کی تھی۔ اس کا اولین سبب تو یہی تھا کہ اسلامی فوج کوئی مستقل فوجی ادارہ نہیں تھی اور کچھ سبب یہ بھی تھا کہ بہت کم مہمیں بڑی تھیں جن میں مستقل دستوں اور ان کے افسروں کی ضرورت پڑتی اور یہ بھی ایک سبب تھا کہ باقاعدہ جم کر لڑی جانے والی مہموں کی تعداد بہت کم تھی۔

ذیل کی جدول سے معاملہ بالکل واضح ہو جائے گا۔

علاقہ	نمبر شمار	قبیلہ	تقرریاں	سالار
مرکزی عرب	۱-	قریش	۱۶	۱۰
	۲-	خزرج	۸	۶
	۳-	اوس	۱۳	۸
شمالی عرب	۱-	کلب	۱	۱
	۲-	سعد ہذیم	۱	۱
مشرقی عرب	۱-	سلیم	۳	۳
جنوبی عرب	۱-	اشعر	۱	۱
میزان		۷ قبیلے	۴۳	۳۰

اگر ہم ان افسروں کے زمانہ قبولِ اسلام کو دیکھیں تو معلوم ہو گا کہ ان کی اکثریت بعد کے مکی اور مدنی زمانے کی مسلمان تھی۔ اس سلسلہ میں یہ نکتہ زیادہ واضح ہوتا ہے کہ جو بھی کوئی قابل قدر شخص اور موزوں افسر مسلمان ہوتا تھا اسے بلا کسی پس و پیش کے عہدہ دیدیا جاتا تھا۔ یہ حضرت خالد بن ولید مخزومی، حضرت عمرو بن خالد سلمی اور حضرت عبد اللہ بن ربیعہ مخزومی کے معاملے میں بالکل واضح نظر آتا ہے جو صلح حدیبیہ کے بعد اسلام لائے تھے۔ مگر فوراً اپنے ان اعلیٰ مناصب پر فائز کر دیئے گئے تھے۔

علمبردار (اصحاب الالویۃ والرایات)[143]

عرب کی فوجی روایات میں مہم کے دوران یا میدان جنگ میں پرچم یا علم کا محافظ ہونا بڑی عزت کی بات تھی[144] اور عام طور سے کسی ایک قبیلہ کے ایک خاص خاندان کو یہ اعزاز حاصل ہوتا تھا ایک مشہور مستشرق ریوبن لیوی (REUBEN LEVY) کا بیان صحیح ہے کہ "مسلم فن جنگ میں پرچم کی ایک اور اہمیت تھی" ہر قبیلہ کا اپنا پرچم ہوتا تھا جو جنگ کے میدان میں اس کا نقطہ اجتماع اور نشان وفاق ہوتا تھا، کیونکہ اسی کے قریب سالار موجود ہوتا تھا"[145] اس کے علاوہ پرچم قبائلی یا قومی آن و عزت کا نشان بھی ہے۔ مکی اشرافیہ میں علمبرداری کا اعزاز قریش کے خاندان بنو عبد الدار کو زمانہ قدیم یعنی قصی بانی شہر مکہ کے زمانے سے موروثی طور سے حاصل تھا اور زمانہ جاہلیت یا عہد نبوی میں جتنی بھی قریش نے جنگیں لڑی تھیں۔ ان سب میں اسی کو قومی پرچم اٹھانے کا افتخار رہا تھا[146] اسلامی ریاست نے بھی اسی عرب روائت قدیم کو اپنایا تھا اور پہلی مہم میں یہ اعزاز سالار سریہ حضرت حمزہ بن عبد المطلب ہاشمی کو ملا تھا[147] چنانچہ عربی میں لواء باندھنا (عقد لواءہ) کا مفہوم ہی مہم بھیجنا ہو گیا تھا۔ بہر حال سرایہ میں یہ اعزاز ہمیشہ سالاران سرایا کو حاصل رہا تھا۔ لیکن غزوات نبوی میں اس کا ایک مخصوص افسر ہوتا تھا۔ جب کبھی اسلامی افواج میں مختلف قبائلی دستے ہوتے تھے تو ان میں سے ہر ایک کا ایک یا کئی پرچم ہوتے تھے اور اتنے ہی اس کے افسر۔ ظاہر ہے کہ اس بنا پر عسکری تنظیم کے اس شعبہ میں بھی قبائلی کردار باقی رہا تھا۔ بہر حال ان قبائلی پرچموں کے علاوہ اسلامی ریاست کی نمائندگی کرنے کے لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا ایک مخصوص علم (رایہ یا لواء) ہوتا تھا جسے آپ اپنے کسی عظیم صحابی کے

سپرد کرتے تھے "۳۹" جیسے کہ بدر اور احد کی جنگوں میں آپ نے یہ خدمت عظیم حضرت مصعب بن عمیر عبدری کے سپرد کی تھی اور اس میں ان کے قبیلہ رخاندان کی رعایت بھی منظور تھی۔ بہر حال ذیل میں ایک جدول دی جا رہی ہے جس سے تمام مذکور علمبرداران نبوی کے بارے میں تفصیلات معلوم ہو جائیں گی۔

نمبر شمار	سنہ	۶۲۳	۶۲۴	۶۲۵	۶۲۶	۶۲۷	۶۲۸	۶۲۹	۶۳۰	۶۳۱	۶۳۲	تقرریاں	علمبردار
(۱)	مہاجرین												
(الف)	قریش	۵	۳	۴	۱	۲	۴	-	۹	۲۰	-	۲۷	۸
(ب)	قیس عیلان	۱	-	-	-	-	-	-	-	-	-	۱	۱
(ج)	قضاعہ	۱	-	-	-	۱	-	-	-	-	-	۲	۱
(د)	کلب	-	-	-	-	۱	-	-	-	-	-	۱	۱
(۲)	خزرج	-	۱	۱	-	۲	۴	-	۱۱	۷	-	۲۶	۱۵
(۳)	اوس	-	۱	۱	-	-	-	-	۷	۱	-	۱۰	۸
(۴)	سلیم	-	-	-	-	-	-	-	۳	-	-	۳	۳
(۵)	غطفان	-	-	-	-	-	-	-	۱	-	-	۱	۱
(۶)	مزینہ	-	-	-	-	-	-	-	۴	-	-	۴	۴
(۷)	جہینہ	-	-	-	-	-	-	-	۴	-	-	۴	۴
(۸)	خزاعہ	-	-	-	-	-	-	-	۳	-	-	۳	۳
۹	اسلم	-	-	-	-	-	-	-	۲	۱	۱	۲	۲
	میزان سالانہ	۷	۵	۶	۱	۶	۸	-	۴۱	۱۱	۱	۸۶	۵۲

یہاں اس اعتراف کا اظہار ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ فہرست بہت ہی نامکمل ہے، کیونکہ متعدد اہم غزوات نبوی جیسے تبوک وغیرہ کے علمبرداروں کے نام نہیں معلوم ہو سکے ہیں۔ اندازہ یہ ہے کہ اس شعبہ کے فوجی افسروں کی تعداد اس سے کئی گنا زیادہ ہو گی لیکن بہر حال موجودہ فہرست سے بھی اس کے افسروں کا کچھ اندازہ ہوتا ہی ہے۔ چنانچہ قریش اور انصار نے سب سے زیادہ عہدے حاصل کئے تھے۔ اس کے دو سبب تھے: اول یہ کہ وہ دس سالہ مدنی دور میں برابر تمام مہمات میں شریک رہے تھے اور دوم یہ کہ ان کی تعداد خاص کر انصار کی تعداد مجاہدین دوسروں کے مقابلے میں زیادہ رہی تھی۔ اگرچہ قریش کی تقرریاں سب سے زیادہ نظر آتی ہیں لیکن ان کے علمبرداران کی تعداد اس تناسب سے نہیں ہے۔ اس اعتبار سے وہ خزرج کے کافی پیچھے ہیں۔ کیونکہ مؤخر الذکر کے افسروں کی تعداد ان کی تقریباً دوگنا ہے۔ اسی طرح انصار کے دوسرے طبقہ کی تقرریاں کم ہیں۔ لیکن ان کے افسروں کی تعداد قریش کے برابر ہے۔ اس سے بالواسطہ طور سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی فوج بنیادی طور سے ان تین مسلم طبقات پر مشتمل ہوتی تھی جہاں تک دوسرے قبائل عرب،

کا تعلق ہے انہوں نے جہاد میں شرکت اور اس کے نتیجہ میں علمبر داری کے عہدے صرف ان مہموں میں حاصل کیے۔ جو بعد میں ہوئیں۔ اور ان کا واضح بیان فتح مکہ کے ضمن میں ملتا ہے۔ خیال یہ ہوتا ہے کہ علموں یا پرچموں کی تعداد کسی قبیلہ / خاندان کو اس کے سپاہیوں کی تعداد کے تناسب سے دی ہوتی تھی۔ اس کا اظہار ایک جدول کی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے جو ذیل میں ہے۔

نمبر شمار	قبیلہ / خاندان	سپاہ کی تعداد	علمبرداروں کی تعداد
(۱)	خزرج		
	بنو ساعدہ		
	بنو سلمیٰ		
	بنو نجار		
	بنو حارث		
	بنو نجار		
(۲)	اوس		
	بنو واقف		
	بنو عبد الله شہل		
	بنو معاویہ		
	بنو ظلمہ		
	بنو ظلمہ		
(۳)	خزرج		
	بنو ساعدہ		
	بنو ظفر		
	بنو حارثہ		
میزان	۱۳ خاندان	۴۰۰۸ سپاہ / ۵۰۰ گھوڑے	۱۲
(۴)	قریش	۷۰۰ سپاہ / ۵۰۰ گھوڑے	۳
(۵)	مزینہ	۱۰۰۰ " / ۱۰۰ "	۳
(۶)	جہنیہ	۸۰۰ " / ۵۰ "	۴
(۷)	اسلم	۴۰۰ " / ۳۰۰ "	۲

(۸) خزاعہ/کعب ۵۰۰ سپاہ / گھوڑے ۳

(۹) اشجع

چونکہ سپاہیوں کی تعداد اور علمبرداروں کی تعداد کا تناسب واضح طور سے مذکور نہیں ملتا ہے۔ اس لئے اندازہ ہی کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ دو سو اور تین سو سپاہ پر ایک علم مل جاتا تھا۔ جیسا کہ اوپر کی جدول سے معلوم ہوتا ہے۔

عسکری تنظیم کے اس شعبہ میں نمایاں ترین افسروں میں شامل تھے حضرت علی بن ابی طالب ہاشمی، جن کو کم از کم دس مواقع پر یہ سعادت و افتخار حاصل ہوا۔ حمزہ بن عبد المطلب ہاشمی، سعد بن ابی وقاص زہری، زبیر بن عوام اسدی، مصعب بن عمیر عبدری، ابوبکر تیمی اور عمر بن خطاب عدوی یہ قریشی علمبردار تھے، خزرج میں حضرات سعد بن عبادہ، حباب بن منذر، زید بن ثابت، عمارہ بن حزم نمایاں تھے۔ جبکہ سعد بن معاذ اور اُسید بن حُضَیر اوس کے عظیم نمائندے تھے۔ بدوی قبائل میں اسلم کے حضرت بُرَیدہ بن حُصَیب بہت اہم شخص تھے۔ بقیہ دوسرے عرب قبائل کے علمبردار دراصل ان کے قبیلوں کے سردار اور سربرآوردہ اشخاص تھے اور اس حیثیت سے ان کو یہ اعزاز عطا ہوتا تھا۔ جہاں تک علاقائی نمائندگی کا سوال ہے تو زیادہ تر عہدے مرکزی عرب کے قبیلوں کو ملے تھے۔ ان کے بعد مغربی قبیلوں کا نمبر تھا جبکہ بقیہ کو کوئی خاص نمائندگی حاصل نہیں تھی صورتحال ذیل کی جدول سے واضح ہو جائے گی۔

علاقہ	قبیلہ	تقرریاں	علمبردار
مرکزی عرب	۱۔ قریش	۲۷	۸
	۲۔ خزرج	۲۹	۱۵
	۳۔ اوس	۱۰	۸
شمالی عرب	۱۔ کلب	۱	۱
	۲۔ قضاعہ	۲	۱
مشرقی عرب	۱۔ سلیم	۳	۳
	۲۔ غطفان	۱	۱
	۳۔ قیس عیلان	۱	۱
مغربی عرب	۱۔ مزینہ	۴	۴
	۲۔ جہینہ	۴	۴
	۳۔ اسلم	۴	۳
	۴۔ خزاعہ	۳	۲
جنوبی عرب	-	-	-
میزان	-	۸۶	۵۲

طلیعہ (گشتی دستے)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عسکری تنظیم میں طلیعہ (گشتی دستے) کے شعبہ کو ضروری اہمیت دی گئی تھی کیونکہ وہ فوج کے لئے بعض اہم کام انجام دیتا تھا۔ اس بحث میں ہم نے بعض ایسے کارکنوں کو بھی شامل کرلیا ہے جو اگرچہ اصطلاحاً طلیعہ نہیں کہے گئے ہیں مگر ان کا کام طلیعہ جیسا تھا اور وہ بھی فوجی نظام کا ایک اٹوٹ حصہ تھے۔ طلیعہ کا کام دشمنوں کے بارے میں اطلاعات فراہم کرنا، ان کے سپاہیوں کو پکڑلانا، خیمہ گاہ کے لئے مناسب جگہ تلاش کرنا، پانی اور چارہ وغیرہ کی جگہوں کا پتہ لگانا وغیرہ تھا۔ چونکہ طلیعہ اور جاسوس (عیون) کے کام میں بہت نازک سافرق ہے۔ غالباً اسی سبب سے ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے طلیعہ کے کام کو بھی فوجی جاسوسی کے شعبہ کا ایک حصّہ سمجھ لیا ہے[۱۴۹]۔ بہرحال جاسوسوں اور طلائع (طلیعہ کی جمع) کے کام اور نوعیت میں خاصا فرق تھا۔ طلیعہ عموماً ایک چھوٹی سی جماعت ہوتی تھی جو دو، تین نفر سے لیکر بیس نفر تک پر مشتمل ہوسکتی تھی جبکہ جاسوس عموماً ایک یا دو کر کے بھیجے جاتے تھے۔ طلیعہ علانیہ کام کرتی تھی جبکہ جاسوسوں کا کام خفیہ تھا۔ پھر طلیعہ فوج کا ایک حصہ ہوتی تھی جو ضرورت کے مطابق آگے یا ادھر ادھر بھیجی جاتی تھی جبکہ جاسوسوں کا فوج کا حصہ ہونا ضروری نہیں تھا۔

بہرحال طلیعہ کی پہلی مثال ہم کو جنگ بدر کے ضمن میں ملتی ہے جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چار نفر حضرت زبیر بن عوام، علی بن ابی طالب، بسبس بن عمرو اور سعد بن ابی وقاص پر مشتمل ایک جماعت جنگ بدر سے ذرا پہلے دشمنوں کے بارے میں پتہ لگانے کے لئے بھیجی تھی[۱۵۰] اگرچہ مآخذ اس جماعت کے لئے لفظ طلیعہ کا استعمال نہیں کرتے۔ تاہم وہ اپنے کام کی نوعیت کے سبب طلیعہ ہی معلوم ہوتی ہے[۱۵۱] طبری کا بیان ہے کہ آپ نے ایک جماعت (عُصْبَہ) حضرت زبیر بن عوام کے ساتھ یا کمان میں بھیجی تھی[۱۵۲] اس سے واضح ہوتا ہے کہ ایک طلیعہ ایک افسر کی ماتحتی میں روانہ کی گئی تھی۔ بہرحال یہ جماعت بدر کے کنوؤں تک پہونچی جہاں اس نے مکی فوج کے پانی پلانے والے بہشتیوں (سقّاء)[۱۵۳] کو پکڑنے میں کامیابی حاصل کی جن سے پہلی بار یہ راز کھلا کہ مکی فوج بدر کے نواح میں پہنچ چکی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ مسلم طلیعہ اور دوسرے مسلم فوجی بھی اس جماعت سقاء کو ابوسفیان بن حرب اموی کی قیادت میں شام سے لوٹنے والے کاروان سے متعلق سمجھتے تھے۔ حالانکہ وہ بیچارے بار بار اعتراف کر چکے تھے کہ ان کا تعلق مکی فوج سے ہے۔ بہرحال جب یہ معاملہ صاف ہوگیا تو اس خبر نے مسلم فوج کو بدر پہنچ کر جنگی اعتبار سے اہم ترین مقامات پر قبضہ کرنے میں مدد دی تھی اور دشمن کو اپنی پسند کے میدان جنگ میں خیمہ زن ہونے اور لڑنے پر مجبور کیا تھا[۱۵۴]

اسد الغابہ کا بیان ہے کہ قبیلہ اسلم کے دو شخص حضرات مالک بن خلف اور ان کے بھائی نعمان بن خلف اس طلیعہ کے رکن تھے جس کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ احد سے کچھ قبل اطلاعات فراہم کرنے کے لئے بھیجا تھا اور وہ دونوں اپنے فرائض انجام دیتے ہوئے شہید ہوگئے تھے[۱۵۵]۔ اس کے بعد حمراء الاسد کی مہم میں اسلم ہی کے تین آدمیوں پر مشتمل ایک طلیعہ مکی فوج کے منصوبوں کے بارے میں معلوم کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا۔ اس مہم میں بھی طلیعہ کے جاں نثاروں نے شہادت پائی تھی[۱۵۶] ربیع الاوّل ۶ھ / جولائی ۶۲۷ء میں جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو لحیان کے خلاف ایک مہم کی قیادت کی تھی تو آپ نے حضرت ابوبکر کو ایک

جماعت کے ساتھ بھیجا تھا تاکہ وہ الغمیم نامی مقام تک جا کر دشمن کے ارادوں کا پتہ لگائیں[۱۵۷]۔ واقدی اور ابن سعد کے مطابق حدیبیہ کی مہم کے دوران مسلم طلیعہ بیس شہسواروں پر مشتمل تھا اور حضرت عباد بن بشر اوسی کے زیر کمان بھیجا گیا تھا[۱۵۸]۔ انہیں حضرت عباد بن بشر کے زیر کمان خیبر کی مہم کے دوران بھی ایک مسلم طلیعہ روانہ کیا گیا تھا جو شہسواروں پر مشتمل تھا۔ انہوں نے یہود خیبر کے ایک جاسوس کو جو قبیلہ اشجع سے تعلق رکھتا تھا پکڑ لیا تھا اور اس نے نہ صرف تمام ضروری معلومات مسلمانوں کو بتا دی تھیں۔ بلکہ خود بھی مسلمان ہو گیا تھا[۱۵۹]۔ اس مہم کے دوران حضرت محمد بن مسلمہ اوسی کے سپرد یہ فریضہ کیا گیا تھا کہ وہ مسلم فوج کے خیمہ زن ہونے کے لئے کوئی عمدہ جگہ تلاش کریں جو انہوں نے کر لی تھی مشہور واقعہ ہے کہ فتح مکہ کے لئے روانہ ہونے سے قبل پہلے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات علی بن ابی طالب اور زبیر بن عوام کو ایک عورت سے ایک خط وصول کرنے کے لئے بھیجا جسے ایک نیک اور متقی مسلم حضرت حاطب بن ابی بلتعہ لخمی نے اپنی سادہ لوحی میں مکہ والوں کے نام لکھا تھا اور مکہ پر مسلمانوں کے حملہ کی خبر کر دی تھی[۱۶۱]۔ تبوک کے غزوہ کے دوران حضرت اسید بن حضیر اوسی کو ایک چشمۂ آب کا پتہ لگانے کی خدمت سپرد کی گئی تھی[۱۶۲]۔ اس طرح یہ واضح ہوتا ہے کہ طلیعہ گوناگوں قسم کے کام انجام دیتا تھا جو نہ صرف مسلم فوج کے لئے ضروری تھے بلکہ ان کے سبب اکثر و بیشتر مسلم فوج کو دشمنوں کے مقابلے میں زیادہ فوجی فوائد حاصل ہوتے تھے اور اس طرح طلیعہ مسلم کامیابیوں کی ایک کلید بن جاتا تھا۔

دوسری قسم کا فوجی کارکنوں میں وہ منادی اور خبر نگار شامل ہوتے تھے جو مسلم فتح کی خبر مدینہ پہنچاتے تھے۔ یا دور دراز کی مہموں کے زمانے میں مسلم آبادی کو تسکین خاطر فراہم کرنے کے لئے ان کی خیر و عافیت کی خبریں لیکر آتے تھے۔ محمد بن حبیب بغدادی نے ایسے خوشخبری دینے والوں کو لبشراء الرسول کی سرخی کے تحت بیان کیا ہے اور اپنی کتاب کا ایک باب ان کے لئے مخصوص کیا ہے[۱۶۳]۔ مثال کے طور پر غزوہ بدر کی فتح کی خبر مدینہ والوں کو پہونچانے کے لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن حارثہ اور عبداللہ بن رواحہ کو بھیجا تھا[۱۶۴]۔ اسی طرح جعال بن سراقہ ضمری کو ذات الرقاع کی مہم کے دوران اپنی اور مسلم فوج کی خیر و عافیت سے مطلع کرنے کے لئے مدینہ روانہ کیا تھا[۱۶۵]۔ ایک اور لبشیر یا خوش خبری دینے والے حضرت سلمہ بن اسلم اشہلی تھے، جنہوں نے صلح حدیبیہ کے کامیاب معاہدے کی خبر مدینہ والوں کو پہنچائی تھی[۱۶۶]۔ جبکہ حضرت نہیک بن اوس خزرجی نے فتح حنین کی خوشخبری اہل مدینہ کو سنائی تھی[۱۶۷]۔

کچھ مختلف النوع کاموں کو جو فوجی مہمات کے دوران لازمی طور سے انجام دینے ہوتے ہیں کرنے کے لئے مختلف و متفرق لوگوں رکار کنوں کو متقرر کیا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر حضرات ابو لیلیٰ خزرجی اور عبداللہ بن سلام کو ایک غزوہ کے دوران کھجور کی ایک خاص قسم کے درختوں کو جن کو قرآن کریم میں لینہ کہا گیا ہے۔ کاٹنے کا حکم دیا گیا تھا تاکہ محصور دشمن کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کیا جائے۔ اسی قسم کے بہت سے کاموں کے لئے مختلف لوگوں کو متقرر کیا جاتا تھا۔

آخر میں یہ نتیجہ اخذ کرنا مناسب ہو گا کہ طلیعہ کو مہموں کے دوران دشمنوں کی خبر لینے کے لئے روانہ کیا جاتا تھا اور ان کی کامیاب کارگذاری سے مسلم فوج کو بے انتہا قیمتی فوائد حاصل ہوتے تھے جو بالآخر کامیابی کی راہ کھولتے تھے اس شعبہ عسکری کے افسروں اور کارکنوں میں جن کا نام مآخذ میں ملتا ہے۔ متعدد قبیلوں اور علاقوں کے لوگ شامل تھے جن کو ذیل کی جدول میں جاگہ دیا گیا ہے۔

علاقہ	قبیلہ	تقرریاں	افسر
مرکزی عرب	۱۔ قریش	۵	۳
	۲۔ خزرج	۴	۴
	۳۔ اوس	۲	۴
	۴۔ قینقاع	۱	۱
شمالی عرب	۱۔ کلب	۱	۱
مغربی عرب	۱۔ جہینہ	۱	۱
	۲۔ اسلم	۵	۵
	۳۔ ضمرہ رکنانہ	۱	۱
جنوبی عرب	۱۔ ازد	۱	۱
قبائل پراگندہ	۱۔ تمیم	۱	۱
میزان	۱۰ قبیلے	۲۶	۲۲

مذکورہ بالا جدول کے مطابق زیادہ تر تقرریاں مرکزی عرب کے قبیلوں کو ملی تھیں اوران کا مجموعی تناسب ۶۵ فیصد تھا، لیکن واضح رہے کہ یہ طلیعہ کے تمام افسروں کی جدول نہیں ہے۔ متعدد بلکہ بہت سے ایسے ہوں گے جن کا ذکر نہیں آسکا۔ بہر حال اس شعبہ کے اہم ترین اشخاص میں حضرات زبیر بن عوام اسدی، علی ابن ابی طالب ہاشمی، عباد بن بشر اوسی، اسید بن حضیر اوسی اور عبداللہ بن سلام قینقاعی تھے ۱۷۱۔ جہاں تک ان کے زمانہ قبول اسلام کا تعلق ہے توان میں سے چند ابتدائی مسلمان تھے۔ بقیہ بعد کے زمانے کے۔

جاسوس (عیون)

موجودہ زمانے میں بھی قرون وسطیٰ کی مانند جنگی چالوں کی کامیابی جاسوسوں کی خبر گیری پر کافی منحصر ہوتی تھی چنانچہ آج کل بھی ہر ملک میں فوجی جاسوسی کا شعبہ الگ اور منظم و فعال ہوتا ہے۔ اسی طرح عہد اوسط میں بھی جاسوسوں کا کام بہت ضروری سمجھا جاتا تھا۔ کیونکہ ان ہی کے ذریعہ دشمنوں کی عددی طاقت، ہتھیاروں کی تعداد، جنگی منصوبوں، راستوں کے انتخاب وغیرہ بہت سے اہم معاملات کی خبر حاصل کی جاسکتی تھی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فوجی تنظیم کے اس شعبہ کی بھی باقاعدہ ترتیب و تنظیم کی تھی اور اپنے دس سالہ دور میں جاسوسوں سے بڑے اہم کام لئے تھے۔ مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اپنی تمام مہموں کے دوران ان کی خدمات سے فائدہ اٹھایا تھا ۱۷۱۔ فوجی جاسوسی کی پہلی دستاویزی مثال کا تعلق غزوہ بدر سے ہے کہ جب آپ نے حضرات طلحہ بن عبیداللہ تیمی اور سعید بن زید عدوی کو بدر کی جنگ سے کچھ پہلے شام سے لوٹنے والے قریشی کاررواں کی خبر حاصل کرنے کے لئے بھیجا تھا ۱۷۲۔ اس مہم کے دوران جب قریشی کارواں

کے نکل جانے کے بعد مسلمانوں کا سابقہ قریشی فوج سے پڑا تھا تو آپ نے بدر پہنچ کر دو اور جاسوسوں حضرات بسبس بن عمرو اور عدی بن ابی الزغبار کو بدر کے کنوؤں کی طرف خبریں حاصل کرنے کے لئے بھیجا تھا جب مسلم طلیعہ کے ذریعہ قریشی سقوں کے پکڑے جانے سے قریشی فوج کی بدر کے نواح میں موجودگی یقینی ہوگئی تھی تو آپ نے دو ابتدائی مکی مسلمانوں حضرات عمار بن یاسر اور عبداللہ بن مسعود کو قریشی سقوں کی خبر کی تصدیق کرنے کی غرض سے روانہ کیا تھا"[۴] غزوہ احد کے دوران دو خزرجی حقیقی بھائی حضرات انس اور مونس فرزندان فضالہ خزرجی کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جاسوس بنا کر بھیجا تھا کہ وہ دشمن کی خبریں لائیں چنانچہ وہ دونوں وادی عقیق تک سفر کر کے پہنچے اور جونہی ان کو موقعہ ملا وہ قریشی سپاہیوں میں اس طرح مل گئے کہ ان کو کوئی پہچان بھی نہ سکا۔ قریشی فوج کے ساتھ انہوں نے الولاء کے مقام تک سفر کیا اور پھر موقع پاتے ہی نکل کر سیدھے بارگاہ نبوی میں ضروری اطلاعات کے ساتھ پہنچے اور آپ کو آگاہ کیا اس وقت تک قریشی لشکر احد نہیں پہنچا تھا"[۵] اس کے وہاں خیمہ زن ہونے کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک عظیم ماہر امور حرب اور عالم فنون جنگ صحابی حضرت حباب بن منذر خزرجی کو جاسوس بنا کر بھیجا کہ وہ دشمن کی طاقت اور ارادوں کا پتہ لگائیں۔ ان کو یہ بھی ہدایت کر دی گئی تھی کہ وہ تخلیہ میں اپنی اطلاعات عرض کریں اور مسلمانوں کے سامنے نہ بیان کرنا شروع کر دیں جس سے ان کے حوصلے پست ہو جائیں۔ بہرحال انہوں نے ارشاد نبوی کے مطابق مکمل اور بالکل صحیح اطلاعات فراہم کی تھیں"[۶] جنگ کے بعد جب دشمن پسپا ہو کر حمراء الاسد کی طرف روانہ ہونے والا تھا تو حضرت علی بن ابی طالب ہاشمی کو ان کے اگلے منصوبوں کے بارے میں پتہ لگانے کا حکم دیا گیا تھا جس کی انہوں نے پرجوش تعمیل کی تھی"[۷]

اسد الغابہ کا بیان ہے کہ واقعہ رجیع کے بعد حضرت امیہ بن خویلد ضمری کو قریش کے منصوبوں کے بارے میں اطلاعات فراہم کرنے کی غرض سے جاسوس بنا کر بھیجا گیا تھا"[۸] اس مقصد سے ان کے بعد ان کے فرزند حضرت عمرو بن امیہ ضمری کو بھیجا گیا تھا"[۹] جب مدینہ منورہ میں بنو مصطلق کے مریسیع کے مقام پر جمع ہونے کی خبر پہنچی تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بریدہ بن حصیب اسلمی کو تحقیق حال کیلئے بھیجا۔ انہوں نے جائے فتنہ و فساد پر پہنچ کر خبروں کی تصدیق کی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو صحیح صورتحال سے باخبر کر دیا"[۱۰] جس کے نتیجے میں مسلمانوں کو غزوہ بنی مصطلق میں فتح حاصل ہوئی۔ لیکن سب سے زیادہ دلچسپ واقعہ مسلم جاسوسوں کے اس کارنامے سے متعلق ہے جو انہوں نے خندق کے غزوہ کے زمانے میں انجام دیا تھا۔ اس زمانہ میں جبکہ محاصرہ کافی طول پکڑ چکا تھا اور مسلمانوں کو احزاب کے صحیح ارادوں کی خبر نہ تھی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خوات بن جبیر کو ان کے منصوبوں کے بارے میں اطلاعات فراہم کرنے کو کہا اور انہوں نے اپنا فریضہ بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا"[۱۱] اس سے کچھ پہلے حضرت زبیر بن عوام نے بنی قریظہ کے احزاب میں شامل ہونے کی خبر کی تصدیق کر دی تھی"[۱۲] محاصرہ کے آخری دنوں میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حذیفہ بن یمان کو قریشی خیمہ گاہ میں خبریں فراہم کرنے کی غرض سے بھیجا۔ وہ قریشی فوج میں مل گئے اور ایک جماعت کے ساتھ جا بیٹھے جو الاؤ کے گرد بیٹھی تھی کسی نے ان کو نہیں پہچانا۔ ابھی وہ بیٹھے ہی تھے کہ قریش کے سالار اعلیٰ ابوسفیان بن حرب اموی آ گئے اور انہوں نے اپنے سپاہیوں کو دشمن کے جاسوسوں سے خبردار رہنے کو کہا اور یہ بھی کہا کہ ہر شخص اپنے ساتھی کے بارے میں واقفیت حاصل کر لے یہ بڑا خطرناک موقعہ تھا لیکن مسلم جاسوس بھی ہوشیار بہت تھا۔ قبل اس کے کہ کوئی ان سے سوال پوچھتا انہوں نے خود ہی اپنے داہنے اور بائیں بیٹھے ہوئے

ساتھیوں کے نام دیتے پوچھنا شروع کر دیئے اس طرح ان کے شبہات کا ازالہ کر دیا۔ آخر وہ دشمن کے پسپائی کے ارادے اور منصوبے سے آگاہ ہوگئے اور انھوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے باخبر کر دیا[۱۸۳] اسی طرح صلح حدیبیہ کے موقعہ پر حضرت بُسر بن سفیان خزاعی مکہ سے خبر لائے تھے کہ قریش مسلمانوں کے شہر میں داخلہ کی سخت مزاحمت کریں گے[۱۸۴] غزوہ حنین کے دوران حضرت عبداللہ بن ابی حدرد اسلمی نے جاسوسی کا کام انجام دیا تھا اور دشمن کے بارے میں ساری ضروری اطلاعات اکٹھا کی تھیں[۱۸۵]

مذکورہ بالا جاسوسوں کے علاوہ متعدد ایسے جاسوس تھے جن کی خدمات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی مہموں کے دوران حاصل کی تھیں۔ مگر ان کے نام مآخذ میں محفوظ نہیں رہ سکے۔ بہرحال انھوں نے مسلم افواج کی کامیابی میں خاصا اہم حصہ لیا تھا اور شاندار خدمات انجام دی تھیں۔ چونکہ جاسوسی کا کام بڑا اہم اور خطرناک تھا اس لئے عموماً کم معروف یا غیر معروف لوگوں کے ذریعہ لیا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ دشمن کی فوجوں میں جا گھستے تھے تو کوئی ان کو پہچان نہیں سکتا تھا۔ جیسا کہ حضرت بریدہ بن حصیب اسلمی اور ان سے بھی بڑھ کر حضرت حذیفہ بن یمان کے واقعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ ذیل میں ان مسلم جاسوسوں کی ایک جدول دی جا رہی ہے جن کے نام مآخذ میں مذکور ہوئے ہیں۔ اس جدول میں ان کی سالانہ تقرری اور علاقائی تعلق کو واضح کیا گیا ہے۔

علاقہ	قبیلہ	تقرریاں باعتبار سنہ	۶۲۴	۶۲۵	۶۲۶	۶۲۷	۶۲۸	۶۳۰	جاسوس
مرکزی عرب	۱۔ قریش	۲	-	۱	-	۱	-	-	۲
	۲۔ خزرج	۳	-	۳	-	-	-	-	۳
مشرقی عرب	۱۔ ہذیل	۱	۱	-	-	-	-	-	۱
	۲۔ قیس عیلان	۱	-	-	-	-	-	۱	۱
	۳۔ غطفان	۱	-	-	-	۱	-	-	۱
مغربی عرب	۱۔ جہینہ	۲	۲	-	-	-	-	-	۲
	۲۔ ضمرہ	۳	-	-	۲	-	-	۱	۲
	۳۔ خزاعہ	۱	-	-	-	-	۱	-	۱
	۴۔ اسلم	۲	-	-	-	۱	-	۱	۲
جنوبی عرب	۱۔ مذحج	۱	۱	-	-	-	-	-	۲
میزان	۱۰ قبیلے	۱۷	۴	۴	۲	۳	۱	۳	۱۶

جیسا کہ جدول سے ظاہر ہوتا ہے کہ سب سے زیادہ تقرریاں اس شعبہ میں مغربی قبیلوں نے حاصل کی تھیں۔ اسکی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ مخالفین میں کم معروف تھے یا بالکل اجنبی تھے اور دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ ان تمام مہموں کے متعلقہ علاقوں سے بخوبی واقف تھے اور ظاہر ہے کہ جاسوسی کے لئے یہ دونوں چیزیں بڑی اہم اور سودمند تھیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ممتاز ترین جاسوسوں

میں حضرات عمرو بن امیہ ضمری، بسبس بن عمرو جہنی، بریدہ بن حصیب اسلمی اور حذیفہ بن یمان مذحجی بہت اہم تھے۔ ان سب نے عظیم ترین خدمات اور شاندار ترین کارنامے انجام دیکر مسلم مہموں کی کامیابی کی راہیں کھولیں۔ جہاں تک ان کے قبول اسلام کے زمانے کا تعلق ہے تو مذکورہ سولہ جاسوسوں میں سے پانچ ابتدائی مسلمان تھے جبکہ پانچ اور آخری مکی عہد کے یا ابتدائی مدنی دور کے مسلمان تھے اور بقیہ چھ حضرات نے صلح حدیبیہ سے قبل اسلام قبول کیا تھا۔ گویا کہ ان کی اکثریت کو ہم سابقین اولین میں نہیں شمار کر سکتے۔

راہبر (دلیل)

جزیرہ نمائے عرب میں بالعموم اور اس کے صحراؤں میں بالخصوص جہاں کوئی راستہ یا پگڈنڈی تک نہیں ہوتی کارواں والوں مسافروں اور فوجوں کے گم ہو جانے کا انتہائی شدید خطرہ رہتا ہے اور وہ اپنی اس گمشدگی کے دوران قعر ہلاکت میں بھی گر سکتی تھیں اس لیے تمام کارواں والوں، مسافروں اور فوجوں کے لئے ضروری تھا کہ وہ ماہر راہبروں (دلیل خبریت) کی رہنمائی حاصل کریں اور یہ حقیقت بھی ہے کہ قرون وسطی میں کوئی بھی شخص راہبر کے بغیر سفر کرنے کی ہمت نہ کرتا تھا۔ کارواں والوں اور مسافروں کو تو صرف حفاظت و سلامتی کی فکر ہوتی ہے مگر فوجوں کے لیے وقت کا مسئلہ بھی ہوتا ہے۔ اگر وہ بروقت جائے واردات پر نہ پہنچیں تو شدید نقصانات کا احتمال رہتا ہے اس کے علاوہ کافی حد تک ان کی تیز رفتاری کی ضمانت بھی راہبر ہی فراہم کر سکتا ہے۔ کیونکہ وہ مختصر راستوں سے واقف ہوتا ہے۔ واقدی کا بیان ہے کہ تمام عرب لوگوں کے لئے راہبروں کی خدمات ازلبس ناگزیر تھیں۔ کیونکہ وہ پیشہ ور ہونے کیساتھ ساتھ راستوں (سنن) اور مختصر راستوں (تنکیب) سے واقف ہوتے تھے۔ فوجوں کے لئے یہ اور بھی ناگزیر تھے۔ کیونکہ اس طرح وہ دشمنوں کے سر پر جا پہنچتے تھے اور ان کو خبر بھی نہ ہوتی تھی[۱۸۶] عام طور پر ان راہبروں (دلیلوں) کا تعلق بدوی عرب قبائل سے ہوتا تھا اور اجرت پر کوئی بھی فریق ان کی خدمات حاصل کر سکتا تھا[۱۸۷]

سیرت نبوی کے ضمن میں چاہے اس کا تعلق سماجی، مذہبی اور معاشرتی زندگی ہو یا سیاسی اقتصادی اور فوجی پہلوؤں سے ہو ہم کو قدم قدم پر راہبروں کے حوالے ملتے ہیں وہ نہ صرف حاجیوں کے کارواں والوں اور زائرین کے قافلوں کی راہنمائی کرتے تھے بلکہ مسافروں کو راہ دکھاتے تھے اور لوگوں کو ان کی منزلوں پر پہنچاتے تھے وہ سیاسی جماعتوں اور فوجی اور تجارتی کارواں والوں کی بھی راہنمائی کرتے تھے۔ اس لئے یہ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ تمام مہمات نبوی کے دوران راہبروں کی خدمات حاصل کی گئی تھیں چاہے ان کا بلا ذکر ملے یا نہ ملے۔ بہرحال یہ مشہور واقعہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ہجرت کا مشہور سفر عبداللہ بن اریقط دئلی کی رہنمائی میں[۱۸۸] عرج کے مقام تک طے کیا تھا اور وہاں سے مدینہ تک حضرت سعد العرجی کی راہ نمائی میں[۱۸۹]

جہاں تک مہمات نبوی کا تعلق ہے یہ مسلم امر ہے کہ ان میں سے ہر ایک میں کوئی نہ کوئی راہبر ضرور ہوتا تھا اگرچہ بدر تک ابتدائی مہموں میں ان کا واضح ذکر نہیں ملتا ہے۔ بہرحال احد کی مہم کے دوران ایک راہبر کا واضح حوالہ ملتا ہے۔ واقدی کی زیادہ مستند روایت کے مطابق اس موقعہ پر حضرت ابوحثمہ حارثی نے راہبری کے فرائض انجام دیئے تھے[۱۹۰] حمراء الاسد کی مہم میں جو دراصل احد کا تکملہ اور تتمہ تھی حضرت ثابت بن ضحاک خزرجی نے جو غالباً حضرت زید بن ثابت خزرجی کے والد تھے[۱۹۱] مسلم فوج کی راہنمائی کی تھی۔

واقدی کا بیان ہے کہ حضرت ابو سلمیٰ بن عبدالاسد مخزومی کے سریہ قطن کے دوران ولید بن زہیر نامی ایک طائی شخص کو بطور راہبر منتخب کیا گیا تھا۔[192] اسی مہم کی واپسی کے سفر کے دوران ایک دوسرا راہبر اجرت پر رکھا گیا تھا۔ جس نے مسلمانوں سے ان کے مال غنیمت کا خمس بطور اجرت مانگا تھا جو اسے دیا گیا تھا کیونکہ وہ مزید اموال غنیمت حاصل کرنے کا سبب بنا تھا۔[193] غزوہ دومۃ الجندل میں بنو عذرہ کے ایک مشہور راہبر حضرت مذکور نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیر کمان فوج کی راہنمائی کی تھی۔ انہوں نے ایک طلیعہ کا کام بھی کیا تھا اور مسلمانوں کے لئے ایک موزوں مقام خیمہ گاہ کے لئے تلاش کیا تھا۔[194] اسی سال غزوہ مریسیع کے لئے حضرت مسعود بن ہنیدہ اسلمی نامی ایک مشہور راہبر نے مسلمانوں کو ان کی منزل تک پہنچایا تھا۔[195] اسد الغابہ کا بیان ہے کہ حضرت ابو حدرد اسلمی نے سنہ ۶ھ میں غطفان کے خلاف ایک غزوہ میں یہی خدمت انجام دی تھی۔[196] پھر اسی برس واقدی کے بیان کے مطابق بنو عذرہ کے ایک گمنام راہبر نے حضرت زید بن حارثہ کی سریہ حسمیٰ کی راہنمائی کی تھی۔[197] حدیبیہ کی طرف سفر نبوی میں اسلم کے ایک راہبر حضرت عمرو بن عبد نہم نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے راہبر ہونے کی سعادت حاصل کی تھی۔[198]

یہ امر دلچسپ بھی ہے اور قابل ذکر بھی کہ خیبر کے مقامی یہودیوں کے تین افراد نے الگ الگ مواقع پر مسلمانوں کی راہ بری کا فرض رضاکارانہ طور سے انجام دیا تھا۔ اسی مہم کے ذیل میں طبری اور ابن اثیر نے ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے۔ ان کے مطابق حضرت حُسَیل بن نُوَیرَہ / خارجہ جو قبیلہ غطفان کے خاندان اشجع سے تھے اور خیبر کے نواح میں رہتے تھے۔ اتفاقاً مدینہ کے بازار میں خرید و فروخت کی خاطر آئے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم خیبر کی مہم کی تیاری کر چکے تھے۔ بازار ہی میں آپ سے انکی ملاقات ہو گئی اور آپ نے ان کو بیس صاع کھجور کی پیشکش کی اگر وہ رہبری کا کام انجام دے سکیں۔ انہوں نے پیشکش قبول کر لی۔ اپنا وعدہ ایفا اور فریضہ انجام دیا اور دلچسپ بات یہ کہ مہم انجام دینے کے بعد وہ بھی مسلمان ہو گئے۔[200] اسد الغابہ کے مطابق اس مہم میں ایک اور رہبر جنکو اجرت پر حاصل کیا گیا تھا۔ حضرت عبداللہ بن نعیم اشجعی تھے۔[201]

غزوہ خیبر کے سات ماہ بعد جناب نامی مقام کی طرف جانے والی حضرت بشیر بن سعد خزرجی کی مہم کے دوران انہیں حضرت حُسیل نے پھر رہنمائی کے فرائض انجام دیئے تھے۔[202] اسد الغابہ کی ایک روایت سے ایک انتہائی اہم واقعہ کی اطلاع ملتی ہے اس کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت غالب بن عبداللہ لیثی سے فتح مکہ سے ذرا پہلے مکہ کے مختصر راستے کی نشاندہی کرنے کی درخواست کی اور پھر مہم کے دوران انہیں نے مسلم فوج کی رہنمائی کی تھی۔[203] رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی آخری عظیم مہم غزوہ تبوک میں حضرت علقمہ بن فغواء خزاعی کو اپنا راہبر بنایا تھا[204] اور آپ کی مقرر کردہ آخری مہم یعنی سریہ اسامہ بن زید کے دوران ایک عذری راہبر نے رہنمائی کی خدمات انجام دی تھیں۔[205] اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اولین مہم سے آخری مہم تک برابر راہبری کی خدمات حاصل کی جاتی رہی تھیں۔ ان متعدد راہبروں میں سے چودہ کے نام بصراحت مذکور ہیں اور یہ یقینی ہے کہ مختلف سرایا اور غزوات میں اس سے کہیں زیادہ راہبروں نے کام کیا ہوگا۔ اگرچہ ان کے نام محفوظ و مذکور نہیں رہ سکے۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ جہاں تک راہبروں کا تعلق ہے۔ مغربی، شمالی، مشرقی اور مرکزی عرب کے قبیلوں نے اسی ترتیب کے ساتھ خدمات انجام دی تھیں۔ ان کو ذیل کی جدول میں اور واضح کر دیا گیا ہے۔

علاقہ	قبیلہ	تقرریاں	راہبر
مغربی عرب	۱۔ اسلم	۴	۴
	۲۔ کنانہ	۱	۱
	۳۔ خزاعہ	۱	۱
شمالی عرب	۱۔ عذرہ	۱	۱
	۲۔ یہود خیبر	۳	۳
مشرقی عرب	۱۔ غطفان	۳	۲
مرکزی عرب	۲۔ خزرج	۱	۱
	۲۔ اوس	۱	۱
میزان	۸۔ قبیلے	۱۵	۱۴

جہاں تک ان راہبروں کی سبقتِ اسلام یا زمانۂ قبول اسلام کا تعلق ہے تو چودہ مذکورہ اور نامزد اشخاص میں سے چار ابتدائی مدنی یا آخری مکی عہد کے مسلم تھے، پانچ دوسرے صلح حدیبیہ کے زمانے سے پہلے کے اور چار ۶۲۸ء اور ۶۳۰ء کے درمیانی عرصہ کے اور باقی ایک حیات نبوی کے آخری دو برسوں میں کسی وقت مسلمان ہوئے تھے ۲۰؎ لیکن اس سلسلہ میں سب سے زیادہ دلچسپ بات غیر مسلم راہبروں کی خدمات حاصل کرنے کی ہے جنہوں نے پوری وفاداری اور ایمانداری سے اپنے فرائض انجام دیئے تھے۔

اموال غنیمت اور قیدیوں کے نگران افسر (اصحاب المغانم)

میدان جنگ میں فتح کے نتیجہ میں مسلمانوں کو اموال غنیمت کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی قیدی بھی ہاتھ لگتے تھے۔ ان قیدیوں کو عموماً زر فدیہ لیکر آزاد کر دیا جاتا تھا۔ کچھ اسلام لانے کے سبب آزاد ہو جاتے تھے اور کچھ کو رحمت نبوی معاف کر دیتی تھی۔ بہرحال قیدی اور اموال دونوں ہی المغانم کی وسیع اصطلاح میں آتے تھے۔ مآخذ کا بیان ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایسے تمام غزوات و سرایا میں جن میں اموال اور قیدی ہاتھ لگیں۔ ان کے لئے مخصوص افسر مقرر کرتے تھے۔ بہرحال ہم ایسے افسروں کی تقرریوں کی متعدد مثالوں کو پہلی جنگ سے لیکر آخری جنگ کے زمانے تک دیکھتے ہیں۔

فطری طور پر اموال غنیمت اور قیدیوں کے افسروں کی تقرری کی پہلی مثال کا تعلق غزوہ بدر سے ہے۔ واقدی کے بیان کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن کعب خزرجی کو تمام مغانم کا افسر مقرر کیا تھا۔ مگر ایک اور روایت کے مطابق اس افسر کا نام حضرت خبّاب بن ارت تمیمیؓ تھا۔ لیکن پہلی روایت لوجوہ معلوم زیادہ صحیح ہے۔ اس غزوہ میں قیدیوں کی افسری خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک مولیٰ (غلام) حضرت صالح شقرانؓ کے سپرد کی گئی تھی ۲۸؎۔ ان کو غلام ہونے کے

سبب اموالِ غنیمت میں سے حصہ نہیں ملا تھا مگر ان کو انعام واکرام سے نوازا گیا تھا[209] جبکہ اول الذکر افسر کو آزاد مسلم ہونے کے سبب پورا حصۂ غنیمت ملا تھا۔ اسد الغابہ کے بیان کے مطابق بدر کے بعد ہونے والے غزوات وسرایا میں سے متعدد میں حضرت عبداللہ بن کعب خزرجی خمس (ریاست اسلامی یا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مال غنیمت میں ۵/۱ حصہ) کے افسر مقرر کیے گئے تھے۔[210]
حضرت صالح شقران کی دوبارہ تقرری کا ذکر غزوہ مریسیع کے ضمن میں ملتا ہے جبکہ انہیں تمام حاصل شدہ مال غنیمت کا افسر مقرر کیا گیا تھا۔ یہ نکتہ قابل ذکر بھی ہے اور دلچسپ بھی کہ اس غزوہ میں تین مزید افسروں کی تقرری کی گئی تھی۔ ان میں سے حضرت بریدہ بن حصیب اسلمی کو جنگی قیدیوں کا افسر مقرر کیا گیا تھا[211] تو حضرت محمیہ بن جزء زبیدی کو مسلم مجاہدین کے حصوں کا[212] جبکہ حضرت مسعود بن ہنیدہ اسلمی کو خمس ریاست اسلامی کا[213]

مگر کبھی کبھی ایک ہی شخص کو اموال غنیمت اور قیدیوں کا افسر مقرر کر دیا جاتا تھا۔ جیسا کہ حضرت محمد بن مسلمہ اوسی کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ ان کو غزوہ بنی قینقاع میں دونوں کا افسر مقرر کیا گیا تھا۔[214] اسی غزوہ میں دو اور افسروں کو دو مختلف النوع کاموں کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ حضرت منذر بن قدامہ کو تمام گرفتار شدہ قیدیوں کو ہتھکڑیاں لگانے کا کام سونپا گیا تھا[215] جبکہ حضرت عبادہ بن صامت خزرجی کے مدینہ کی شہری حدود سے بنو قینقاع کو جلا وطن کرنے کے انتظامات کی نگرانی سپرد کی گئی تھی[216] حضرت محمد بن مسلمہ نے اسی قسم کا کام بنو نضیر کے غزوہ میں انجام دیا تھا، جبکہ دشمن نے غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دیئے تھے[217] اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک اور غلام حضرت ابورافع کو اس موقعہ پر اموال غنیمت پر افسر مقرر کیا گیا تھا۔[218] یہود مدینہ کے خلاف آخری غزوہ میں کئی افسروں کی تقرری کے حوالے ماخذ میں ملتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن سلام قیدیوں کے اعلیٰ افسر تھے[219] تو حضرت محمیہ بن جزء زبیدی خمس کے[220] حضرت محمد بن مسلمہ کے سپرد قیدیوں کو ہتھکڑیاں لگانا تھا[221] تو حضرات زبیر بن عوام اسدی اور علی بن ابی طالب ہاشمی کو (مشہور روایت کے مطابق) بنو قریظہ کے قتل کے مجرم قیدیوں کے قتل کے انتظامات کا نگران مقرر کیا گیا تھا[222] اسد الغابہ کا بیان ہے کہ حضرت مسلم بن بہرہ جو ایک گمنام صحابی ہیں، ان قیدیوں کے افسر مقرر کئے گئے تھے جن کے بارے میں حکم حضرت سعد بن معاذ اوسی نے قتل کا فیصلہ کیا تھا[223] ان کے علاوہ دو مزید افسروں کے نام ملتے ہیں۔ یہ تھے حضرات سعد بن عبادہ[224] اور سعد بن زید[225] جن کے سپرد یہ کام کیا گیا تھا۔ کہ یہودی بچوں اور عورتوں کو جو قیدی بنا لیے گئے تھے۔ شام اور نجد کے بازاروں میں بالترتیب بیچ دیں۔ یہودانِ خیبر کے خلاف کامیاب مہم کے بعد کم از کم تین افسروں کی تقرری کے حوالے ملتے ہیں۔ واقدی اور ان کے شاگرد و کاتب ابن سعد کا بیان ہے کہ حضرت فروہ بن عمرو بیاضی خزرجی کو صاحب المغانم (اموال غنیمت کا افسر) بنایا گیا تھا۔[226] جبکہ ابن اثیر کا دعویٰ ہے کہ حضرت مرداس بن مروان خزرجی کو بھی اس ضمن میں کچھ ذمہ داری سونپی گئی تھی[227] قیاس کیا جا سکتا ہے کہ غالباً موخر الذکر کو خمس یا مسلمانوں کے حصوں کی دیکھ بھال سپرد کی گئی ہوگی۔ اسد الغابہ کے مطابق تیسرے افسر ابوجُہیمہ انصاری تھے جن کے سپرد یہ کام کیا گیا تھا کہ وہ تمام مویشی اور جانور جو اموال غنیمت میں دشمنوں سے حاصل ہوئے ہیں کچھ لوگوں کی مدد سے انکو مدینہ لیکر پہنچیں۔[228]

اگرچہ فتح مکہ کے ضمن میں واقدی نے نہ کسی مال غنیمت کے حصول کا ذکر کیا ہے اور نہ اس کے کسی افسر کی تقرری کا۔ تاہم ابن اثیر کا بیان ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تاریخ ساز دن حضرت خُزاعی بن عَبد نہم کو مال غنیمت کا افسر مقرر کیا تھا[229] ممکن ہے

کہ یہ تقرری اس مال غنیمت کے سلسلے میں ہوئی ہو جو مکّہ کے ان مزاحمین سے حاصل ہوا تھا جو حضرت خالد بن ولید مخزومی کے دستے کے بالمقابل آئے تھے۔ طبری اور ابن خلدون دونوں کا اتفاق ہے کہ حضرت مسعود بن عمرو غفاری کو فتح حنین میں حاصل شدہ اموال غنیمت اور قیدیوں کو جعرانہ میں اکٹھا کرنے کا حکم دیا گیا تھا[۲۲۰] مگر اسد الغابہ کا بیان ہے کہ اس کے افسر حضرت مسعود بن عمرو القاری تھے[۲۲۱]۔ بہرحال یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ جب جعرانہ میں تمام اموال غنیمت کو اکٹھا کر لیا گیا تو اس کے افسر اعلیٰ ایک نو مسلم حضرت بُدَیل بن ورقاء خزاعی کو مقرر کیا گیا[۲۲۲]۔ یہاں رحمت نبوی اور رافت محمدی کے ایک واقعہ کا ذکر بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ جیسے ہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر ہوازن کے قیدیوں کے پھٹے پرانے کپڑوں پر پڑی، آپ کی رحمت جوش میں آئی اور آپ نے حضرت بُسر بن سفیان خزاعی کو ان کے لیے نئے کپڑے خریدنے کا حکم دیا جس کی فوری تعمیل کی گئی[۲۲۳]۔ حضرت زید بن ثابت خزرجی جو عہد نبوی میں فرائض (اموال غنیمت کے حصوں) کے مستقل افسر بن چکے تھے کے سپرد ان قیدیوں کو گننے اور ان کی ایک فہرست تیار کرنے کا حکم دیا گیا[۲۲۴]۔ یہاں اس واقعہ کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہوازن کے قیدیوں کو رہا کرنے کا حکم دیا تو حضرت عمر بن خطاب عدوی، حضرت زید بن ثابت خزرجی اور حضرت ابو جہم غفاری کو مقرر کیا کہ وہ بالترتیب قریش، انصار اور قبائلی عرب کے سپاہیوں کو اپنے حصے کے قیدی آزاد کرنے پر آمادہ کریں[۲۲۵]۔

صرف غزوات ہی میں ان افسروں کی تقرری نہیں کی جاتی تھی بلکہ بعض مثالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے انتظامات سرایا کے لئے بھی کیے جاتے تھے چنانچہ ابن سعد کا بیان ہے کہ حضرت علی کی مہم الفُلس کے دوران ایک صحابی حضرت ابو قتادہ خزرجی کو اموال غنیمت اور قیدیوں کا افسر مقرر کیا گیا تھا[۲۲۶] اگرچہ یہ سرایا کے سلسلے میں خبر واحد ہی ہے لیکن اس سے شہادت ملتی ہے کہ سرایا میں بھی اس قسم کے افسروں کی تقرری کا معمول تھا۔ یہ تاریخی واقعہ ہے کہ بعض سرایا میں کافی مال غنیمت اور بعض قیدی بھی مسلمانوں کو ملے تھے۔ جیسا کہ آگے چل کر ہم اس کو تفصیل سے دیکھیں گے اور ظاہر ہے کہ ان کے سلسلہ میں نگرانوں کا تقرر بھی ہوا ہوگا یہ ممکن ہے کہ اس قسم کے انتظامات یا تقرریاں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر سریہ اور ہر مہم کے لئے بنفس نفیس نہ فرمائی ہوں۔ بلکہ ان کو امیر سریہ کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہو مگر یہ تصور کرنا کہ سرایا میں اموال غنیمت اور قیدیوں کے لئے افسر مقرر کئے ہی نہیں گئے تھے حقیقت کے منافی ہوگا۔

ذیل میں ایک جدول دی جا رہی ہے۔ جس میں اس شعبہ کے تمام مذکور افسروں کا قبائلی اور علاقائی تعلق ظاہر کیا گیا ہے۔

علاقہ	قبیلہ / خاندان سنہ	۶۲۴	۶۲۵	۶۲۷	۶۲۸	۶۳۰	تقرریاں	افسر
مرکزی عرب	۱۔ قریش	-	-	۲	-	۱	۳	۳
	۲۔ خزرج	۲	-	۱	۲	۳	۸	۸
	۳۔ اوس	۲	۱	۲	-	-	۵	۳
	۴۔ انصار (غیر متعین)	-	-	۱	۱	-	۲	۲
	۵۔ قینقاع	-	-	۱	-	-	۱	۱

مشرقی عرب	۱۔ قارہ	-	-	-	-	۱	۱	۱
مغربی عرب	۱۔ اسلم	-	-	۲	-	-	۲	۱
	۲۔ مزینہ	-	-	-	-	۱	۱	۱
	۳۔ غفار	-	-	-	-	۲	۲	۲
	۴۔ خزاعہ	-	-	-	-	۲	۲	۲
جنوبی عرب	۱۔ زبید	-	-	۲	-	-	۲	۱
غیر عرب مسلم	۱۔ حبشی	۱	-	۱	-	-	۲	۲
غیر معروف	۱۔ مولی رسول کریمؐ	-	۱	-	-	-	۱	۱
میزان		۵	۲	۱۲	۳	۱۰	۳۲	۲۸

جیسا کہ جدول سے ظاہر ہوتا ہے کہ زیادہ تر تقرریاں مرکزی عرب کے قبیلوں کو حاصل ہوئی تھیں اور ان میں بھی خزرج کا سب سے زیادہ حصہ تھا اور ان کے بعد اوس کا جبکہ قریش کی نمائندگی بہت کم تھی۔ دوسرے نمبر پر مغربی عرب کے قبیلے تھے اگرچہ ان میں انفرادی طور پر کوئی بھی بہت اہم نہیں تھا۔ حالانکہ ان کو اجتماعی طور سے سات تقرریاں حاصل تھیں۔ بہرحال یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ حقیقتاً جتنے افسر مقرر کیے گئے تھے۔ ان میں سے صرف چند کا ذکر ہے۔ ورنہ اگر تمام غزوات اور سرایا کے تمام افسروں کا ذکر ملتا تو فہرست اس سے کہیں بڑی ہوتی اور ظاہر ہے کہ اس اعتبار سے قبیلوں اور علاقوں کا تناسب بھی ہوتا۔ بہرحال اس شعبہ میں اہم اور نمایاں ترین افسروں میں حضرات محمد بن مسلمہ اوسی، عبداللہ بن کعب خزرجی، زید بن ثابت خزرجی۔ بریدہ بن حصیب اسلمی مسعود بن ہنیدہ اسلمی۔ محمیہ بن جزء زبیدی اور شقران (رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حبشی غلام) تھے۔ ان میں سے کم از کم دو یعنی حضرات عبداللہ بن کعب خزرجی اور محمیہ بن جزء زبیدی بالترتیب اموال غنیمت اور خمس رسول کے مستقل افسر معلوم ہوتے ہیں۔ کہ انہوں نے یہ ذمہ داری کئی سرایا اور غزوات میں انجام دی تھی جہاں تک ان افسروں کے زمانہ اسلام کا تعلق ہے تو ۲۸ میں سے صرف پانچ کو سابقین اولین کے طبقہ میں شمار کیا جا سکتا ہے جبکہ تو دوسرے آخری مکی عہد کے مسلم تھے اور گیارہ مدنی عہد میں اسلام لائے تھے اور بقیہ حیات نبوی کے آخری دو برسوں میں[۲۳۷]

اسلحہ اور گھوڑوں کے افسر (اَصْحَابُ السِّلَاحِ وَالفَرَسِ)

اگرچہ اسلحہ اور گھوڑوں کے افسروں کے بارے میں ہماری معلومات بہت ناقص ہیں تاہم یہ حتمی ہے کہ عسکری تنظیم کے اس شاخہ میں بھی کئی تقرریاں ہوئی تھیں[۲۳۸] کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہتھیاروں اور گھوڑوں کے حصول کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ جیسا کہ ہم کو معلوم ہے کہ ابتداء میں اسلامی ریاست کے پاس بہت کم ہتھیار تھے اور اس سے کم گھوڑے تھے۔ مؤخر الذکر کے ارتقاء کے بارے میں

ہم دیکھ چکے ہیں اور اوّل الذکر کے ذخیرہ یابی کے بارے میں ہم ابھی کچھ دیر میں مطالعہ کریں گے لیکن وقت کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں اور ان سے شدید تر تقاضوں نے اسلامی ریاست کو اسلحہ اور گھوڑوں کی فراہمی کے لیے تمام امکانی کوششیں کرنے پر مجبور کر دیا تھا اس لئے: قیاس اور منطق دونوں کا تقاضا ہے کہ یہ باور کر لیا جائے کہ ان کے افسر بھی مقرر کئے گئے تھے اور یہ قیاس بلا سند شہادت بھی نہیں ہے، اسد الغابہ کا بیان ہے کہ بدر سے پہلے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین گھوڑے حاصل کئے تھے اور ان کو حضرت سعد بن اسعد بن زرارہ خزرجی کی دیکھ بھال کو دیدیا تھا [۲۳۹] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک یا اس کے کچھ مدت بعد تک ہتھیار اور گھوڑے مسلم مجاہدین کی ذاتی ملکیت ہوا کرتے تھے اور اسلامی ریاست کی اپنی فوجی تنظیم کے نہیں ہوتے تھے لیکن جوں جوں جنگی تقاضے بڑھے اور اس کے ساتھ اسلامی نظام عسکری میں تنظیم و تربیت پیدا ہوئی۔ اسلامی ریاست نے اس کے حصول اور ملکیت کے انتظامات کئے۔ غزوہ حنین کے ضمن میں ذکر ملتا ہے کہ حضرت عبد الرحمٰن بن ازہر زہری کو گھوڑوں کا افسر مقرر کیا گیا تھا۔[۲۴۰] ممکن ہے کہ اس قسم کے انتظامات اور دوسرے غزوات میں بھی کئے گئے ہوں۔ اس سلسلہ میں اسلامی ریاست کی روز افزوں ہتھیاروں کی طاقت کا ایک مفصل مطالعہ دلچسپی کا سبب ہوگا۔

اسلامی ریاست کا روز افزوں ذخیرہ حربی

عہد نبوی کی تمام فتوحات اور بیشتر مہموں میں مسلمانوں کو اموال غنیمت میں متعدد چیزوں کے علاوہ تھوڑے بہت ہتھیار بھی ہاتھ لگتے تھے۔ ان کے حصول کی دو صورتیں تھیں۔ اوّل سلب کی صورت میں یعنی جنگ سے پہلے دوران مبارزت یا جنگ کے دوران عام مغلوبہ حملہ میں فاتح مسلم سپاہی اپنے مقتول دشمن کی ذاتی چیزوں کا جن میں ہتھیار بھی شامل ہوتے تھے۔ حقدار ہوتا تھا۔[۲۴۱] دوسری صورت دشمن کی پسپائی یا شکست کی صورت میں جو کچھ مسلمان فاتح کو اجتماعی طور سے حاصل ہو۔ پہلی مہم سریہ نخلہ میں جس میں مسلمانوں کو کچھ مال غنیمت میں ملا تھا غالباً ہتھیار شامل نہیں تھے۔[۲۴۲] البتہ جنگ بدر میں اونٹوں، گھوڑوں، چمڑے کی کھالوں کپڑے کے تھانوں اور روزمرہ کی ضروریات زندگی کے علاوہ کچھ ہتھیار (سلاح)[۲۴۳] بھی ہاتھ لگے تھے جن میں تلواریں (سُیُوف)[۲۴۴] زرہ بکتر (دُرُوع) کپڑے یا چمڑے کے خود (مِغْفَرْ، مَغَافِر) لوہے کے خود (بَیْضَہ: بَیْض)[۲۴۵]، تیر (رُمْحْ: رِمَاح) اور چھوٹے تیر یا حرتی آلے (عَنَزَۃٌ: عَنَز) وغیرہ شامل تھے۔[۲۴۶] اس کے علاوہ مسلمانوں کو اس غزوہ میں دس گھوڑے مال غنیمت کے طور پر ہاتھ لگے تھے۔[۲۴۷] ماخذ میں یہ ذکر نہیں ملتا کہ ان ہتھیاروں کی تعداد کتنی تھی اور نہ ہی یہ ذکر ملتا ہے کہ آیا وہ مسلمانوں میں تقسیم کر دیئے گئے تھے یا ریاست کے خمس میں ان کو مخصوص و محفوظ رکھا گیا تھا۔ بہرحال کوئی بھی صورتحال رہی ہو۔ یہ امر مسلم ہے کہ مسلم مجاہدین کے سلاح خانہ میں خاصا اضافہ ہوا تھا اور اس سے ان کی حملہ کرنے کی طاقت بڑھی تھی۔ قریشی اشرافیہ سے دوسرے تصادم میں مسلمان ہر قسم کے اسلحہ سے لیس نظر آتے ہیں اور کم از کم سو مجاہدین زرہ بکتر پوش (دارع) تھے۔[۲۴۸] اس کے علاوہ ان کے پاس کم از کم پچاس سوار بھی تھے اس غزوہ میں عارضی فتح کے مختصر زمانے میں مسلمانوں کو کچھ غنیمت بھی ملی تھی۔ لیکن وہ طویل افراتفری کے عالم میں کھو گئی تھی۔

بہرحال یہود مدینہ اور خیبر وغیرہ سے مسلمانوں کو تصادم اور غزوات میں کافی ہتھیار مال غنیمت میں ملے تھے اور اس سے

ان کے ذخیرۂ حربی میں خاطر خواہ یا قابل قدر اضافہ ہوا تھا۔ بنو قینقاع کے پہلے تصادم میں یہودی سپاہ کی تعداد سات سو تھی۔ جن میں سے چار سو زرہ بکتر پوش تھے اور باقی تین سو اس کے بغیر (حَاسِر) تھے۔[250] پندرہ دنوں کے محاصرہ کے بعد جب انہوں نے غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈالے تو ان کے غالباً تمام چار سو زرہ بکتر مسلمانوں کے قبضے میں آ گئے تھے کیونکہ معاہدہ کے مطابق یہودیوں کو تمام ہتھیار مسلمانوں کے حوالے کرنے تھے۔[251] اس کے علاوہ مسلمانوں نے ان کے قلعوں یا گڑھیوں (آطَام) میں کافی تعداد میں ہتھیار اور سناری زرگری کے اوزار پائے تھے۔ کیونکہ وہ اس فن کے ماہر کاریگر تھے۔[252] مونٹگمری واٹ کا یہ خیال صحیح معلوم ہوتا ہے کہ غالباً ان کی دکانوں میں مسلمانوں کو اسلحہ سازی کے اوزار بھی ملے تھے۔ کیونکہ وہ ماہر اسلحہ ساز بھی تھے۔[253] مدینہ کے دوسرے یہودی قبیلہ بنو نضیر کے خلاف مہم میں مسلمانوں کو بہت کم حَلَقَۃ یعنی ہتھیار ملے تھے۔ وہ پچاس زرہ بکتروں، اتنے ہی آہنی خودوں اور تین سو چالیس تلواروں پر مشتمل تھے۔ ماخذ کا الزام یہ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ بنو نضیر مدینہ سے جلا وطنی کے سفر کے وقت بہت سے ہتھیار معاہدہ کی خلاف ورزی کر کے اپنے کجاووں میں چھپا کر لے گئے تھے اور اس طرح ان کی کافی بڑی تعداد سے مسلمانوں کو محروم کر دیا تھا۔[254] مشہور عام روایت کے مطابق مدینہ کے آخری یہودی قبیلہ یعنی بنو قریظہ کے خلاف مہم میں مسلمانوں کو ہتھیاروں کی کافی بڑی کھیپ ہاتھ لگی تھی وہ پندرہ سو تلواروں، تین سو زرہ بکتروں، دو ہزار نیزوں اور پندرہ سو لوہے اور چمڑے کی ڈھالوں (تُرْس و حَجَفَۃ) پر مشتمل تھی۔[255] اس کے علاوہ بنو قریظہ کے قتل عام کی کہانی اگر صحیح ہے تو تقریباً ایک ہزار یہودی عورتیں اور بچے بطور غلام ہاتھ لگے تھے جنکو بازار میں بیچ دیا گیا تھا اور ان کی قیمت سے مزید ہتھیار اور گھوڑے (السِلَاحَ وَالْخَیُوْلَ) خریدے گئے تھے۔[256]

ہتھیاروں اور دوسرے آلاتِ حرب پر مشتمل سب سے بڑی تعداد غزوہ خیبر کے نتیجہ میں مسلمانوں کے قبضہ میں آئی تھی، واقدی کا بیان ہے کہ قلعہ نطَاۃ کے زوال کے بعد مسلم ذخیرۂ حربی[257] میں ایک قابل مرمت منجنیق اور دو بالوں دَبَّابَۃ[258] کے علاوہ کافی بڑی تعداد میں زرہ بکتروں، آہنی خودوں اور تلواروں کا اضافہ ہوا تھا۔ منجنیق کی فوراً مرمت کر کے اسے قابل استعمال بنا لیا گیا تھا چنانچہ یہ مقبوضہ ہتھیار خصوصاً منجنیق اور دبابے اگلے قلعوں کو فتح کرنے میں بہت کام آئے تھے۔ انہی کی بدولت قلعہ شق، قلعۂ نزار، قلعۂ قموص[259] اور قلعہ صعب بن معاذ فتح ہوئے تھے۔[260] صرف قلعہ قموص میں اسلامی فوج کو ایک سو زرہ بکتر، چار سو تلواریں ایک ہزار نیزے اور پانچ سو عربی کمانیں معہ اپنے ترکشوں (جِعَابَ) کے حاصل ہوئی تھیں۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دوسرے خیبر کے قلعوں میں اور کتنے ہتھیار ملے ہوں گے۔ بہر حال بطور آخری تجزیہ یہ بات اب زیادہ قطعیت کے ساتھ کہی جا سکتی ہے۔ کہ دوسرے اسباب و سامان جیسے کپڑوں، مویشیوں، چمڑوں، کھانے پینے کے برتنوں اور دوسرے ضروری روزمرہ کے سامان کے ساتھ کافی بڑی تعداد میں اسلحہ بھی خیبر کے مال غنیمت میں شامل تھا۔ جیسا کہ واقدی کا بیان بھی ہے۔[261]

لیکن کیا یہ ہتھیار اور اسلحے مسلم فوج کی روز افزوں ضرورت کے لئے کافی تھے؟ اس سوال کا جواب مفصل طور سے کہیں اور دیا جا چکا ہے۔ مگر یہاں اتنا کہنا کافی ہوگا کہ یہود مدینہ اور یہود خیبر سے حاصل شدہ ہتھیار اتنے زیادہ تھے کہ وہ مسلم فوج کی مکمل ضروریات تو درکنار اس کے ایک تہائی یا چوتھائی کو بھی کافی نہ تھے۔ بلکہ وہ مسلم فوجیں جنہوں نے ان یہودی قبیلوں کے خلاف اقدامات کئے تھے ان کی ضرورت کے لیے بھی کافی نہیں تھے۔ اس کی تصدیق ان تمام ہتھیاروں کی مجموعی تعداد سے ہوتی ہے جو مسلمانوں

نے یہودی قبیلوں سے حاصل کئے تھے۔ ان کا میزان یہ تھا: ۸۵۰ زرہ بکتر، ۵۰ آہنی خود، ۲۲۴۰ تلواریں، ۱۰۰۰ نیزے، ۱۵۰۰ ڈھالیں اور ۵۰۰ عربی کمانیں مع اپنے ترکشوں کے اس کے علاوہ اس میں ایک منجنیق، دو دبابے اور ہتھیاروں کی وہ غیر متعینہ تعداد بھی شامل کر دی جائے۔ جو دوسرے قلعوں سے ملے تھے۔ تب بھی آلات حرب اور ہتھیاروں کا اس سے کافی کم تناسب نکلتا ہے جو مسلم افواج کو چاہیئے تھا۔ بہر حال اس سب کے باوجود یہ تسلیم کرنا، ہر دیانت دار مورخ کا فرض ہے کہ یہودی قبیلوں سے حاصل شدہ ہتھیاروں اور آلات حرب کی تعداد نے مسلم سلاح خانے کی قوت میں کافی اضافہ کیا تھا اور مسلم سپاہیوں کو لیس ہونے میں کافی مدد کی تھی ۲۶۳۔

یہاں ایک ستم ظریفی کے واقعہ کی طرف بھی اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ غزوہ احزاب کے زمانے میں مسلمانوں نے کافی بڑی مقدار میں زمین / خندق کھودنے اور مٹی ہٹانے کے اوزار اور برتن بنو قریظہ کے یہودیوں سے مستعار لئے تھے۔ ان میں آہنی پھاوڑے (مَساحِی)، چمڑے کے تھیلے (کرازین) اور کھجور کی پتیوں کی بنی ہوئی بڑی بڑی تھیلیاں اور چھابیاں جنہیں ۵ اصاع وزن آجاتا تھا۔ (مَکاتِیْل) شامل تھیں ۲۶۴۔ مؤخر الذکر دو چیزیں مٹی ہٹانے کے لئے استعمال کی گئی تھیں۔ خندق کی مٹی سلع کے پہاڑ کے دامن میں جمع کر دی جاتی تھی اور واپسی میں انہیں چھابیوں اور تھیلوں وغیرہ میں پتھر بھر کر لائے گئے تھے۔ جن کو ترتیب کے ساتھ اس طرح پشتہ بنا کر رکھا گیا تھا کہ وہ کھجوروں کے پہاڑ معلوم ہوتے تھے۔ واقدی کے بقول یہ پتھر بعد میں جنگ کے دوران بطور ہتھیار استعمال ہوئے تھے اور روایات کے بموجب مسلمانوں کے سب سے زیادہ کارگر اور مؤثر ہتھیار تھے جن کی مار سے کوئی بچ کر نہیں نکلتا تھا ۲۶۵

بہر حال یہودیوں سے تصادم میں مسلمانوں کو کافی ہتھیار اور اوزار وغیرہ ہاتھ لگے تھے جن سے ان کی جارحانہ قوت میں اضافہ ہوا تھا۔

عہد نبوی کی دوسری مہموں میں مسلم فوج کافی کیل کانٹے سے لیس اور ضروری ساز و سامان سے مسلح نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر ۷ھ / ۶۲۹ء میں عمرۃ القضاء کی مہم کے دوران دو ہزار مسلم مجاہدین پوری طرح سے مسلح اور زرہ بکتر میں غرق تھے اور ہر قسم کے کیل کانٹے سے لیس تھے۔ صلح حدیبیہ کی شرائط کے تحت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام اسلحے اور ہتھیار حرم مکہ کے باہر چھوڑ دیئے تھے ۲۶۶ اور حضرت بشیر بن سعد انصاری کو ان کا نگران افسر مقرر کیا تھا ۲۶۷۔ بعد میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلم سلاح خانہ کی حفاظت کے لئے دو سو سپاہیوں پر مشتمل ایک دستہ حضرت اوس بن خولی کے زیر کمان تعینات کیا تھا ۲۶۸۔ ایک سال بعد جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے ارادے سے کوچ فرمایا تو دس ہزار مسلم فوج پوری طرح سے لیس تھی اگرچہ پوری مسلم فوج کے ہتھیاروں کا صریحی ذکر ماخذ میں نہیں ملتا ہے۔ تاہم مضمراً مقصود یہی ہے۔ اس کے علاوہ واقدی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ بنو سلیم کا آٹھ سو یا ایک ہزار سپاہیوں پر مشتمل دستہ لوہے میں غرق تھا۔ کیونکہ ان کے زرہ بکتر چمک رہے تھے اور ان کے نیزوں کی چھوٹ پڑ رہی تھی ۲۶۹۔ اسی طرح واقدی نے بنو سلیم اور بنو فزارہ کا مسلح ہونے کا حوالہ اس مفاخرت میں دیا ہے جو ان دونوں قبیلوں نے اس موقعہ پر کی تھی ۲۷۰۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زیر کمان اصل فوج لوہے میں اتنی غرق تھی کہ ان کے آخری آدمی تک کی آنکھوں کی صرف پتلیاں (حَدَق) نظر آتی تھیں ۲۷۱۔ ایک روایت کے مطابق صرف آپ کے دستے میں جو انصار اور مہاجرین پر مشتمل تھا۔ ایک ہزار سپاہی زرہ بکتروں سے مسلح تھے۔ مکہ کے عظیم ترین قریشی سردار ابوسفیان بن حرب اموی نے اسلامی فوج کی شان و شوکت دیکھ کر

برجستہ کہا تھا۔ یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں جو دس ہزار لوہے (مسلح) میں غرق سپاہیوں کے ساتھ آرہے ہیں[۲۷۴]

غزوہ حنین کے آغاز سے پہلے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سپاہ کے لئے مکہ کے ایک دولتمند تاجر صفوان بن امیہ جمحی سے ایک ہزار زرہ بکتر مستعار لئے تھے[۵]! اسد الغابہ کا بیان ہے کہ مشہور صحابی رسول حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کے ہم نام بھتیجے حضرت عبدالرحمٰن بن ازہر کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس غزوہ میں گھوڑوں کا افسر مقرر کیا تھا۔[۲۷۶]

طائف کے محاصرہ کے دوران اسلامی فوج کی تعداد میں نہ صرف چار سپاہیوں کا اضافہ ہوا تھا۔ جو حضرت طفیل بن عمرو ازدی اپنے قبیلہ سے لائے تھے بلکہ ایک دبابہ اور ایک منجنیق کا بھی اضافہ ہوا تھا[۲۷۷]، اس اختلاف کے باوجود کہ دبابہ اور منجنیق کون لایا تھا[۲۷۸] واقدی کا یہ بیان بڑا دلچسپ ہے کہ اس زمانے میں دبابہ عام طور سے گائے کی کھالوں سے بنائے جاتے تھے[۲۷۹]۔ اس کے علاوہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعض اور احتیاطی تدابیر اختیار کی تھیں اور دفاع کے لئے قدرتی چیزوں سے فائدہ اٹھایا تھا۔ روایات کے مطابق آپ نے اپنے خیمے کے اردگرد حسک نامی کانٹے دار جھاڑیوں کو پھیلا دیا تھا کہ دشمن اچانک شب خون نہ مار سکے۔[۲۸۰] منجنیق اور دبابہ کو آپ نے محاصرہ ختم کرنے کے لئے استعمال کرانا چاہا تھا۔ مگر بعض اصحاب کے مشورہ پر اس کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ اگرچہ غزوہ تبوک کے ضمن میں اسلامی فوج کے ہتھیاروں کا کوئی حوالہ نہیں ملتا ہے۔ تاہم یہ یقین کرنے کی وجوہ ہیں کہ پوری فوج ہر طرح کے کیل کانٹے سے لیس تھی کیونکہ یہ عہد نبوی کی سب سے بڑی اور سب سے زیادہ طاقت ور فوج تھی۔ اس غزوہ کے دوران حضرت خالد بن ولید مخزومی کی قیادت میں ایک اسلامی مہم نے دومۃ الجندل کے عیسائی بادشاہ سے تلواروں، نیزوں اور زرہ بکتروں پر مشتمل کم از کم آٹھ سو ہتھیار حاصل کئے تھے[۲۸۱]

مذکورہ بالا مفصل بحث سے یہ بخوبی واضح ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست اپنے سلاح خانے کے ذخیرہ کو ترقی دینے کی ہر ممکن کوشش کرتی تھی اور اس کے لئے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتی تھی۔ لیکن اس بحث سے یہ غلط فہمی نہ پیدا ہونی چاہیئے کہ اسلامی ریاست تمام تر ذخیرہ حربی صرف اموال غنیمت کے ذریعہ حاصل ہوا تھا۔[۲۸۲] یقیناً وہ بھی ایک اہم ذریعہ تھا اور اس کے سبب اسلامی ریاست کے سلاح خانے میں خاصا اضافہ ہوا تھا۔ لیکن صرف وہی تنہا ذریعہ نہ تھا۔ اس کے حصول کے متعدد ذرائع تھے۔ کیونکہ اسلامی فوج کے تمام ہتھیاروں کا اگر اموال غنیمت میں ملنے والے ہتھیاروں سے موازنہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ اس کی چوتھائی ضرورت کو بھی کافی نہیں تھے۔ اس کے علاوہ یہ بھی مآخذ سے نہیں معلوم ہوتا کہ دس ہزار گھوڑے صرف جنگوں اور مہموں میں حاصل شدہ مال غنیمت کے نتیجہ میں حاصل ہوئے تھے۔ بلا ریب گھوڑوں اور ہتھیاروں کی زیادہ تر تعداد خرید و فروخت کے ذریعہ حاصل کی گئی تھی۔ مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ خمس کا ایک حصہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہتھیاروں اور گھوڑوں کی خرید پر صرف فرماتے تھے۔ اس کے علاوہ دوسرے آلات حرب بھی بعض صلح پسند قسم کے ذرائع سے حاصل کئے گئے تھے۔ ان میں مسلم امت کے چندوں اور عطیوں کا نمایاں حصہ تھا۔ مسلمانوں میں سے متمول افراد نے ہر اہم موقعہ پر دامے درمے اور قدمے عطیات دیئے تھے اور اسلامی فوج کو مسلح کرنے میں بھرپور مدد کی تھی۔ اس کی تفصیل تو آگے آئے گی۔ یہاں یہ کہنا کافی ہوگا کہ تنہا حضرت عثمان بن عفان نے غزوۂ تبوک کے ایک تہائی لشکر کو اپنی جیب خاص سے مسلح کیا تھا۔[۲۸۳]

بہر حال مذکورہ بالا تجزیے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سات آٹھ سال کے قلیل عرصے میں اسلامی فوج ایک ٹوٹی پھوٹی ہتھیاروں سے تہی اور شہسواروں سے خالی اور غیر تربیت یافتہ و غیر منظم فوج سے ترقی کر کے ایک منظم و مرتب، ہتھیاروں اور اسلحوں سے لیس شہسواروں پر مشتمل اور عظیم جنگی مشین میں ڈھل گئی تھی۔ وہ اپنے وقت کی نہ صرف جزیرہ نمائے عرب میں ایک عظیم ترین فوج بن گئی تھی، بلکہ غالباً پڑوسی ملکوں اور ریاستوں میں بھی کوئی ایسی جنگی قوت نہ تھی جو اس کی طاقت کا مقابلہ کر سکتی۔ اس عظیم فوج نے نہ صرف اس سیاسی نظام کی بنیاد رکھی، جس نے غیر منظم، وحشی اور نظم و نسق کے دشمن عربوں کو مدینہ کی مرکزی اسلامی حکومت کا فرمانبردار شہری بنا دیا بلکہ وقت کے ساتھ ایک ایسی جنگی مشین میں ڈھل گئی، جس نے کچھ مدت کے بعد عالمگیر فتوحات کے جھنڈے گاڑے۔

محافظ جسم فوج یا دستے

عسکری تنظیم کے آخر میں محافظ جسم دستوں (body - guards) کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ ایک اہم ترین کام یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کا انتہائی نازک فریضہ انجام دیتے تھے۔ چنانچہ اس شعبہ میں ان تمام حضرات کو شامل کیا گیا ہے جنہوں نے معمول یا جنگوں کے دوران یا زمانہ جنگ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کی حفاظت کی تھی۔ آپ کی جسمانی حفاظت محض اس لئے ضروری نہیں تھی کہ آپ خدا کے رسول اور مسلمانوں کے محبوب سردار تھے۔ بلکہ اس لئے بھی کہ آپ کی ذات اقدس ہی پر اس وقت اسلامی ریاست منحصر تھی۔ اگر خدانخواستہ آپ کی ذات کو ابتدائی زمانے میں کوئی گزند پہنچ جاتا تو وہ پوری عمارت زمین پر دھڑام سے آگرتی جس کو اتنی جاں فشانیوں اور قربانیوں سے آپ نے اور آپ کے ساتھیوں نے تعمیر کیا تھا۔ زمانہ جنگ میں آپ کی ذات کیلئے خطرات کئی گنا بڑھ جاتے تھے۔ کیونکہ عرب روایات میں قبیلوں کے سرداروں کو اچانک قتل کرا دینے کی اجازت تھی۔ ایسی صورت میں، مسلمانوں کا حوصلہ پست ہو جاتا اور یقینی تھا کہ وہ سارا کام ملیا میٹ ہو جاتا۔ جس کے لئے اتنے پاپڑ بیلے گئے تھے۔ بہر حال اس ذیل میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ آپ کی حفاظت کے انتظامات مسلمانوں نے از خود کئے تھے اور ان کے لئے آپ نے احکامات یا ہدایات نہیں دی تھیں تاہم ان انتظامات کو آپ کی پسندیدگی ضرور حاصل تھی جس کو حدیث کی اصطلاح میں تقریر (تصدیق) کہتے ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیعت عقبہ ثانیہ میں انصار کے دونوں قبیلوں اوس اور خزرج نے جو آپ کی حفاظت کا وعدہ کیا تھا اسے انہوں نے تا زندگی بحسن و خوبی نبھایا۔ لہذا یہ حیرت انگیز بات نہیں معلوم ہونی چاہیے کہ آپ کی ذات کی حفاظت میں پیش پیش یہی دونوں قبیلے تھے۔ اس سلسلہ میں سب سے اہم اور نمایاں ترین حضرات دونوں قبیلوں کے سردار حضرت سعد بن معاذ اوسی اور حضرت سعد بن عبادہ خزرجی تھے۔ بدر کی مہم کے دوران جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم عریش میں تشریف فرما اور سجدہ میں مشغول تھے تو آپ کی محافظت حضرت سعد بن معاذ اوسی نے کی تھی[۲۸۴] غزوہ احد کے بعد جب دشمن حمراء الاسد کی جانب پسپا ہو گیا تو مسلمان مدینہ لوٹ آئے تھے مگر دونوں مدنی سرداروں نے اپنے محبوب اور زخمی رسول کی حفاظت کی طرف سے غفلت نہیں برتی تھی اور رات بھر وہ دونوں اپنی خستہ حالی کے باوجود اپنے ایک اور ساتھی حضرت اُسَید بن حُضَیر کے ساتھ آپ کے مکان کا پہرہ دیتے رہے تھے۔ کیونکہ خطرہ تھا کہ کہیں آپ پر شب خون نہ مارا جائے[۲۸۵] حمراء الاسد کی مہم کے دوران جب آپ وہاں خیمہ زن ہوئے تو اوس و خزرج کے ممتاز

سربرآوردہ اشخاص باری باری آپ کی حفاظت کے لئے پہرہ دیتے رہتے تھے۔ ان میں سے چار حضرات سعد بن معاذ، عباد بن بشر، جبیر بن اوس اور قتادہ بن نعمان کا تعلق اوس سے تھا اور باقی تین حضرات سعد بن عبادہ، حباب بن منذر اور اوس بن خولی کا تعلق خزرج سے تھا[۲۷۸] بعد کی اور مہموں جیسے ذات الرقاع، حدیبیہ، وادی القراء اور متعدد دوسرے غزوات میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے محافظ جم جاں نثاروں کا ذکر مآخذ میں ملتا ہے۔

اس طبقہ جاں نثاراں میں سب سے عظیم شخصیت بلاریب حضرت عباد بن بشر اوسی کی تھی۔ وہ اپنے محبوب رسول کی حفاظت کے لئے ہمیشہ تیار اور پیش پیش رہتے تھے۔ ان کا بار بار ذکر مآخذ میں اس سلسلہ میں ملتا ہے[۲۷۹]! بقیہ دوسرے ممتاز حضرات کا ذکر پہلے ہی آچکا ہے لہٰذا ان کے ناموں کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن یہاں یہ بات کہہ دینے کی ضرورت ہے کہ دوسرے لوگوں نے بھی اپنے محبوب و مکرم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت میں کوئی دقیقہ نہیں فروگذاشت کیا تھا۔ انہوں نے بھی اسی محبت، خلوص اور جاں نثاری کے ساتھ آپ کی حفاظت کی تھی۔ ان کے اسمائے گرامی عموماً مآخذ نے محفوظ نہیں رکھے۔ پھر بھی بعض نام مل ہی جاتے ہیں مثلاً حضرت عمار بن یاسر مذحجی اور حضرت بلال بن رباح حبشی نے آپ کی متعدد مواقع پر محافظت کا خوشگوار فرض انجام دیا تھا[۲۸۰]

بہرحال جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ زیادہ تر محافظین کا تعلق اوس و خزرج کے قبیلوں سے تھا۔ جو نام مذکور ہوئے ہیں۔ ان میں آٹھ اوس کے ہیں اور چار خزرج کے اور ان اوسی اور خزرجی جاں نثاروں نے یہ سعادت مجموعی طور سے پندرہ مواقع پر حاصل کی تھی۔ جہاں تک اس طبقہ کے جاں نثاروں کے زمانۂ اسلام کا تعلق ہے تو یہ ظاہر ہے کہ وہ زیادہ تر ابتدائی مسلمان تھے۔ یا تو وہ ابتدائی مکی عہد کے مسلم تھے یا ابتدائی مدنی عہد کے۔ ذیل میں ایک مختصر سی جدول دی جا رہی ہے تاکہ ان سے متعلق اعداد و شمار واضح ہو سکیں

علاقہ	قبیلہ	تقرریاں	افسر محافظ
مرکزی عرب	۱۔ اوس	۱۰	۶
	۲۔ خزرج	۵	۴
جنوبی عرب	۱۔ مذحج	۱	۱
غیر عرب مسلم	۱۔ حبشی	۱	۱
میزان	۴ طبقات	۱۷	۱۲

خلاصۂ بحث

تاریخی نقطہ نظر سے مدینہ منورہ میں اسلامی ریاست کا قیام و ارتقا ایک عظیم تہذیبی سنگ میل تھا خاص کر اسلامی تاریخ میں۔ اس کے قیام، توسیع اور ارتقا میں خالص انسانی کوششیں اور جدوجہد کی کارفرمائی رہی تھی۔ یہاں مذہبی نقطہ نظر سے اہم عناصر جیسے

نصرت و توفیق الٰہی سے براہ راست ہمیں بحث نہیں ہے۔ تاہم اس ضمن میں یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہیئے کہ نصرت غیبی اور توفیق الٰہی انہی لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو اس کے راستے میں کوشش و جہد کرتے ہیں۔ قرآنی تعلیمات سے معلوم ہوتا ہے کہ نصرت الٰہی جدوجہد کے ساتھ مشروط ہے اور خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی کہ جس کو خود اپنی حالت کے بدلنے کا احساس وخیال نہ رہا ہو۔ تاریخی تناظر میں دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ مٹھی بھر انسانوں نے تیرہ برس تک مسلسل جدوجہد کی تھی۔ بے نظیر قربانیاں دی تھیں۔ بے مثال تگ و دو کی تھی۔ تب جا کر اس ریاست کی اوّل بنیاد فراہم ہوئی تھی اور یہ اولین بنیاد تھی اسلامی امت کی۔ پھر مدینہ منورہ کے دہ سالہ دور میں اسی امت اسلامی نے جدوجہد اور کوشش کی ایک نئی جہت نئی سمت تلاش کی تھی۔ اس دور میں مسلمانوں کی جدوجہد گونا گوں عناصر سے مرتب ہوئی تھی اور ان میں ایک اہم ترین عنصر فوجی تھا۔

بحث گذر چکی ہے کہ جغرافیائی سیاسیات اور سیاسی، سماجی اور اقتصادی حالات نے مدینہ منورہ کے مسلمانوں کو اپنی ایک فوجی تنظیم قائم کرنے پر مجبور کیا تھا۔ کیونکہ اس کے بغیر ان کی زندگی محال اور اسلامی ریاست کا قیام ناممکن تھا۔ یہ اسلامی فوجی تنظیم ایک دن میں یا اچانک ایکدم سے وجود میں نہیں آئی تھی بلکہ حالات و واقعات کے تقاضوں کے تحت رفتہ رفتہ وجود میں آئی اور ارتقاپذیر ہوتی رہی تھی۔ مختلف مرحلوں اور منزلوں سے گذرتی ہوئی وہ عہد نبوی کے آخری برسوں میں پایۂ تکمیل کو پہنچی تھی۔

مدینہ میں مسلمانوں کی ریاست کے قیام کے بعد اردگرد کے قبائل سے تعلقات قائم کرنا ناگزیر ہو گیا تھا۔ اس کے لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیاسی مشن ترتیب دیئے۔ حالات اور حفاظت خود اختیاری کے تحت ان پرامن جماعتوں کی حیثیت فوجی بھی ہو گئی۔ یہ ابتدائی مہمیں تھیں۔ جن میں غزوات و سرایا دونوں شامل تھے۔ بنیادی طور سے ان کی حیثیت عسکری نہیں تھی لیکن مخالف عرب قبائل سے بالعموم اور قریشی اشرافیہ سے بالخصوص مسلح تصادم نے غزوات و سرایا کو صرف فوجی وعسکری نوعیت عطا کر دی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ ایک خالص اسلامی عسکری تنظیم رفتہ رفتہ وجود میں آگئی اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ اس کے مختلف شعبے اور ان میں کام کرنے والے کارکن بھی وجود میں آئے۔

پیغمبر خدا ہونے کے ناطے محمد بن عبداللہ ہاشمی صلی اللہ علیہ وسلم اسلامی امت کے سربراہ تھے اور اس حیثیت سے عسکری تنظیم کے صدر بھی۔ آپ کے تمام اختیارات کا سرچشمہ آپ کی رسالت تھی۔ چنانچہ جنگ وصلح کا کلی اختیار صرف آپ کو حاصل تھا۔ امت مسلمہ آپ کو مشورہ دینے کی مجاز تھی بلکہ اس سے مشورہ کرنا آپ کے لئے ضروری بھی تھا۔ مگر آخری فیصلہ صرف آپ کے ہاتھ میں تھا چنانچہ اس حیثیت سے اسلامی فوج کے واحد مستقل کمانڈر اور جنرل صرف آپ تھے اور تمام امت اسلامیہ کی بالغ مرد آبادی اسلامی فوج تھی جس پر آپ کے احکام کی تعمیل بہرصورت واجب وفرض تھی۔ اپنے انہیں اختیارات کے تحت آپ متعدد افسروں اور کارکنوں (امراء و عمال) کو مقرر فرماتے تھے۔ عسکری تنظیم میں اہم ترین عمال میں سرایا کے امراء ہوتے تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب کبھی کسی مہم کی قیادت کسی سبب سے بنفس نفیس کرنا نہیں پسند کرتے تھے تو اپنی جگہ اپنے کسی صحابی کو اس مہم کا قائد مقرر کر دیتے تھے۔ یہ قائد عارضی ہوتا تھا جس طرح کہ وہ مہم عارضی ہوتی تھی۔ وہ صرف اسی مہم کا قائد مقرر کیا جاتا تھا اور جونہی مہم پوری ہوتی تھی۔ قائد کی تقرری بھی یا عہدہ بھی ختم ہو جاتا تھا۔ اس طرح پورے مدنی دور میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کل ۷۰ مہمیں بھیجی تھیں اور اتنی ہی تقرریاں کی

تھیں۔ مگر قائدین نبوی کی کل تعداد صرف ۹۴ رہی تھی۔ کیونکہ ان میں سے بعض نے ایک سے زیادہ مہموں کی قیادت کی تھی۔ ان میں دو صحابہ نے تین تین اور دو اور صحابہ نے چار چار مہموں کی قیادت کی تھی۔ حضرت زید بن حارثہ کلبی مولائے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آقا و مولا کے بعد سب سے زیادہ یعنی بہ اختلاف روایت تیرہ یا گیارہ مہموں کی کمان کی تھی اور ہر ایک میں سرخرو رہے تھے۔ تقرری کا معیار صلاحیت و لیاقت تھی جس کے لیے حالات و زمانہ کی رعایت بھی کی جاتی تھی عموماً امراء سرایا کی تقرریوں میں تمام مسلم طبقات اور ان کے علاقوں کو مدنظر رکھا گیا تھا۔ لیکن فطری طور سے مرکزی عرب کے قبائل۔ قریش اور انصار۔ کو زیادہ مناصب اور عہدے ملے تھے کہ وہی اسلامی امت کی ریڑھ کی ہڈی تھے۔ جہاں تک ان قائدین نبوی کی مہموں کی عددی طاقت کا تعلق ہے تو وہ مختلف عناصر کی بنیاد پر طے ہوتی تھی۔ ان میں دشمن و مخالف قبیلہ کی طاقت، خطرہ کی نوعیت اور مدینہ سے جائے فتنہ و فساد کی مسافت اہم ترین عناصر تھے۔ متعدد قریشی، انصاری اور بدوی عرب مسلمانوں نے ۱۲ بڑی مہموں کی قیادت کی تھی تاہم عددی لحاظ سے سب سے طاقتور مہموں کی قیادت کی سعادت حضرت زید بن حارثہ اور ان کے فرزند اسامہ یعنی ایک مولیٰ اور مولیٰ زادہ کے نصیب میں آئی تھی۔ یہ اس بات کا مزید ثبوت تھا کہ صلاحیت اور صرف صلاحیت قائد کے منصب پر تقرری کا معیار و کسوٹی تھی، خاندانی شرافت اور نجابت نہیں تھی۔ مہموں کی روانگی سے قبل رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم امراء سرایا کو عام فوجی اور اخلاقی ہدایات دیتے تھے مگر اپنی مہموں کے سلسلے میں امراء سرایا کو مکمل آزادی اور خود مختاری حاصل ہوتی تھی۔ امراء کو یا ان کے سپاہ کو کوئی تنخواہ نہیں ملتی تھی بلکہ وہ مال غنیمت میں برابر کے حصہ دار ہوتے تھے۔ امراء سرایا کی یہ تقرریاں ہجرت نبوی کے چھ ماہ بعد شروع ہوئی تھیں اور حیات نبوی کے آخری لمحہ تک برابر جاری تھیں۔

تمام بڑی اہم مہموں کی قیادت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفس نفیس کی تھی۔ اصطلاح میں ان کو غزوات کہتے ہیں اور روایات کے مطابق ان کی کل تعداد ۲۸ تھی۔ ایک غزوہ کی عددی طاقت ۔ ۴ تھی اور ایک اور کی ایک سو پچاس اور دو سو کے درمیان، پانچ غزوات میں مسلم سپاہ کی تعداد دو سو تھی جبکہ اتنے ہی غزوات میں تین سو سے چار ساڑھے چار سو تک، چار اور غزوات میں چھ، سات سو مسلم سپاہ تھی اور ایک ڈیڑھ ہزار سپاہ پر مشتمل پانچ غزوات تھے۔ باقی غزوات میں مسلم سپاہ کی تعداد تین ہزار سے لیکر تیس ہزار تک تھی غزوات میں کثرت سپاہ کے سبب اور دوسرے فوجی اسباب سے بھی ان کو مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ عرب فوجی روایات کے مطابق ایک مسلم فوج کے پانچ حصے۔ مقدمہ، میمنہ، قلب، میسرہ اور ساقہ۔ ہوتے تھے۔ اس لیے وہ خمیس کہلاتی تھی۔ اپنے نظام و تنظیم کے سبب اسے تعبیہ بھی کہتے تھے۔ مسلم فوج کے ہر بازو یا حصہ کا ایک سالار بھی ہوتا تھا اور وہ سالار اعظم یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ماتحت ہوتا تھا۔ طریق جنگ صف آرائی کے نظام پر مبنی تھا۔ جو عربوں نے اسلام سے کچھ قبل عجم سے مستعار لیا تھا اور عموماً غزوات نبوی اور بالخصوص جم کر لڑی جانے والی جنگوں میں عربوں کا پرانا طریق جنگ الکر و الفر (حملہ کرنا اور پلٹ جانا) ترک کر دیا گیا تھا۔ جم کر لڑنے کو اصطلاحاً زحف بھی کہا جاتا تھا۔ یہ طریق جنگ اور خمیس نظام دونوں لازم و ملزوم تھے اور دونوں ہی شروع سے موجود تھے۔ چنانچہ بدر سے اس کی مثالیں ملنا شروع ہو جاتی ہیں۔ اندازہ یہ ہے کہ رفتہ رفتہ یہ نظام خمیس مکمل و منظم ہو گیا تھا اور بعد کی جنگوں اور غزوات میں مکمل طور سے موجود رہا تھا۔ غزوات کے نتیجہ میں اسلامی ریاست کے حدود اور رقبہ میں

کافی اضافہ ہوا تھا اور وہ ایک شہری ریاست سے ترقی کر کے ملک گیر ریاست بن گئی تھی۔

اسلامی عسکری تنظیم میں محافظ فوج (الحرس) ایک اہم شعبہ تھا۔ یہ محافظ فوج مختلف طرح کی ہوتی تھی۔ ایک قسم وہ تھی، جو جنگی زمانے میں یا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ سے غیر حاضری کے زمانے میں شہری ریاست کے صدر مقام کی حفاظت کے لئے تعینات کی جاتی تھی چنانچہ بدر، احد، حمراء الاسد، خندق وغیرہ متعدد مواقع پر اس محافظ فوج کے حوالے مآخذ میں ملتے ہیں اسکے علاوہ محافظ فوج کی ایک قسم وہ ہوتی تھی جو دوران مہم مسلم فرودگاہ کی حفاظت کرتی تھی۔ ہم اس کو شب بیدار محافظ فوج بھی کہہ سکتے ہیں کیونکہ عموماً اس کی ضرورت رات کی تاریکی میں پڑتی تھی۔ یہ محافظ فوج کبھی ایک پورا دستہ ہوتی تھی اور کبھی چند افراد پر مشتمل ہوتی تھی۔ خطرہ نہ ہونے کی صورت میں ایک دو محافظ کافی سمجھے جاتے تھے۔ عموماً مہم کا سالار مسلم فرودگاہ کا سالار بھی ہوتا تھا لیکن کبھی کبھی سالار اعظم اپنا جانشین بھی مقرر کر دیتے تھے۔ تبوک کے غزوہ کے دوران حضرت ابوبکر صدیقؓ نائب سالار اعظم نظر آتے ہیں

عرض یا لشکر کا معائنہ اسلامی فوجی تنظیم کا ایک اہم پہلو تھا۔ مستقل فوج نہ ہونے کے سبب عرض وقتاً فوقتاً نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس لئے عموماً وہ مجاہدین کے اکٹھا ہونے کے بعد یا کوچ کے دوران یا جنگ شروع ہونے سے پہلے کیا جاتا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس خدمت کے لئے کسی صحابی کو مامور فرما دیتے تھے جو افسر عرض ہوتا تھا۔ متعدد افسروں کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت زید بن ثابت خزرجی جنگ خندق کے بعد سے مستقل افسر عرض مقرر کر دیئے گئے تھے کیونکہ وہ ریاضی و حساب کے ماہر صحابی تھے۔

جہاں تک اسلامی فوج کے دستوں (ڈویژن) کا تعلق ہے وہ بنیادی طور سے پانچ ہوتے تھے۔ پیادہ دستے (المشاۃ) شہسوار دستے (الخیل)، تیراندازوں پر مشتمل دستہ (الرماۃ)، ہتھیاروں سے مسلح دستہ (اھل السلاح) اور سامان رسد و اسباب کا نگران دستہ (اھل الروشۃ) بعد میں منجنیق اور دبابہ کو چلانے والا بھی دستہ خیبر کی مہم سے بڑھ گیا تھا۔ نقل و حمل کے لئے عربوں میں واحد ذریعہ اونٹ تھے۔ ابتداء میں اسلامی فوج صرف پیدل سپاہ پر مشتمل ہوتی تھی اور اس میں شہسوار بالکل نہیں تھے۔ احد کی جنگ سے شہسواروں کی تعداد میں اضافہ نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ جو خندق اور فتح مکہ کی مہم میں کافی تناسب رکھتا تھا۔ خندق میں تین ہزار سپاہ میں سے پانچ سو یعنی ⅙ حصہ اور فتح مکہ میں دس ہزار سپاہ میں سے ڈھائی ہزار یعنی ¼ حصہ شہسوار تھا جو غزوہ تبوک میں بڑھ کر ⅓ یعنی تیس ہزار سپاہ میں سے دس ہزار شہسوار ہو گیا تھا شہسوار فوج کے اس روزافزوں ارتقاء میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی حکمت کا اصل حصہ تھا اور آپ نے ہر ممکن طریقہ سے شہسواروں کی تعداد میں اضافہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اسلامی دستوں کی ایک نمایاں خصوصیت اس دور میں یہ تھی کہ وہ قبائلی خطوط پر مرتب و منظم ہوتے تھے۔ یعنی متعدد مسلم قبائل اپنے دستے جمع کرتے تھے جن سے اسلامی فوج بنتی تھی۔ ہر قبائلی دستہ اپنے قبائلی سردار کی ماتحتی میں ہوتا تھا۔ لیکن یہ تمام سردار اسلامی فوج کے سالار اعظم کے احکامات کے پابند ہوتے تھے۔ ابتداء میں اور چھوٹی مہموں میں صرف تین دستے ہوتے تھے۔ ایک مہاجرین کا اور باقی دو انصار کے دو قبیلوں اوس و خزرج کے۔ لیکن پھر بعد میں اور بڑی مہموں میں عرب قبائل کے دستے بھی شامل ہو گئے تھے۔ اس قسم کی مہمیں عام طور سے خندق، حدیبیہ، خیبر، فتح مکہ اور تبوک تھیں۔ قبائلی کردار کے باوجود اسلامی عسکری تنظیم میں مرکزیت اور اجتماعیت پیدا ہونے لگی تھی کیونکہ سالار اعظم کا حکم سب کے لئے واجب التعمیل تھا۔ فتح مکہ کے بعد صوبائی فوجی تنظیم بھی ابھرنے لگی تھی۔ کیونکہ وقت ضرورت مرکز سے فوجوں کے

آنے میں تاخیر ہونے کے سبب صورت حال بگڑ سکتی تھی۔ چنانچہ یمن وغیرہ دور دراز کے صوبوں میں صوبائی فوج جو مرکزی مسلمانوں کے علاوہ بیشتر علاقائی مجاہدین پر مشتمل ہوتی تھی بنائی گئی تھی اور اس صوبائی فوج کا افسر اعلیٰ عموماً گورنر / والی ہوتا تھا۔ مگر بعض حالات میں ایک خاص فوجی افسر اعلیٰ بھی مقرر کیا جاتا تھا۔ جو گورنر کا ماتحت ہوتا تھا۔

اسلامی عسکری تنظیم نے جاہلیت کے عربوں سے علم / پرچم اور علمبرداروں کی روایت بھی ترکہ میں پائی تھی۔ فوجی پرچم عزت و آبرو کا نشان ہوتا تھا اور مہموں کے دوران اس کا علمبردار ہونا افتخار کا معاملہ تھا۔ عرب روایت کے مطابق پرچم بردار ہونا کسی ایک قبیلہ کا حق ہوتا تھا۔ لیکن اسلام نے اسے کسی طبقہ کا جاگیری حق نہیں بننے دیا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تمام مسلم قبائل دستوں کو پرچم عطا فرماتے تھے اور ایک پرچم اسلامی ریاست کی نمائندگی کے لیے ہوتا تھا۔ جو عموماً کسی عظیم صحابی کو عطا کیا جاتا تھا۔ عام پرچم کو لواء اور خاص پرچم کو رایہ کہتے تھے لیکن لبا اوقات یہ فرق زیادہ ملحوظ نہیں رکھا جاتا تھا۔ سرایا میں عموماً ایک ہی پرچم ہوتا تھا۔ لیکن غزوات میں کم از کم تین یا اس سے زیادہ ہوتے تھے۔ ان پرچموں کے علمبردار افسر ہوتے تھے۔ جو پہلی مہم سے آخری مہم تک برابر مقرر ہوتے رہے تھے ان کا عہدہ عارضی ہوتا تھا اور بعض علمبرداروں کو یہ سعادت بار بار ملی تھی۔ حضرت علی بن ابی طالب ہاشمی کو کم از کم دس مہموں میں علمبرداری کا افتخار ملا تھا۔ اندازہ یہ ہے کہ دو تین سو پر مشتمل دستہ کو ایک علم عطا کیا جاتا تھا۔

ان افسروں کے علاوہ متعدد کارکن بھی اسلامی فوجی تنظیم کا ناگزیر حصہ تھے۔ ان میں طلیعہ (گشتی دستے) کے سپاہی اور افسر ہوتے تھے۔ طلیعہ عموماً ایک جماعت ہوتی تھی جو دو تین افراد سے لیکر بیس سپاہیوں تک مشتمل ہوتی تھی اور ان کا ایک سالار ہوتا تھا طلیعہ فوج کا ایک حصہ ہوتا تھا جو ضروری اطلاعات فراہم کرنے کی غرض سے بھیجا جاتا تھا۔ وہ دن میں کھلم کھلا کام کرتے تھے۔ اس لحاظ سے وہ جاسوسوں (عیون) سے مختلف ہوتے تھے۔ جاسوس عموماً ایک یا دو کر کے بھیجے جاتے تھے اور وہ خفیہ طور سے کام کرتے تھے۔ دونوں کا کام اطلاعات فراہم کرنا اور دشمن کے بارے میں معلومات حاصل کرنا ہوتا تھا۔ تمام مسلم مہموں میں چاہے وہ سرایا ہوں یا غزوات طلیعہ اور جاسوسوں نے کام کیا تھا اور بڑی حد تک ان کی وجہ سے اسلامی افواج کو کامیابی ملی تھی۔ اس طرح تمام مسلم مہموں میں لازمی طور سے راہبر (دلیل) کی خدمات حاصل کی جاتی تھیں کہ ان کے سبب نہ صرف منزل مقصود پر پہنچنا یقینی ہو جاتا تھا۔ بلکہ گمشدگی کا خطرہ جاتا رہتا تھا اور مختصر سے وقت میں مختصر سے راستے کے ذریعہ اچانک دشمن کے سر پر پہنچا جا سکتا تھا۔ راہبروں کا تعلق عام طور سے بدوی قبائل سے ہوتا تھا کیونکہ وہ جغرافیائی حالات سے واقف ہوتے تھے اور ان کی خدمات فریقین میں سے کوئی بھی معاوضہ پر حاصل کر سکتا تھا۔

اسی طرح اسلامی عسکری تنظیم میں افسروں کی ایک قسم وہ ہوتی تھی جو اموال غنیمت اور قیدیوں کے لیے مقرر کئے جاتے تھے کبھی کبھی ان دونوں کے لیے ایک ہی افسر کافی سمجھا جاتا تھا۔ اور کبھی الگ الگ اموال غنیمت اور قیدیوں کے افسر مقرر ہوتے تھے۔ بعض اوقات غنیمت میں خمس کے لیے علیحدہ اور مسلمانوں کے حصوں کے لیے الگ افسر مقرر کیا جاتا تھا۔ یہ ان کی نگرانی کے افسر ہوتے تھے۔ تقسیم اموال غنیمت کے افسر الگ ہوتے تھے۔ خیبر کی مہم کے زمانے سے حضرت زید بن ثابت خزرجی تقسیم اموال غنیمت کے مستقل افسر ہو گئے تھے۔ اس قسم کے افسروں کا تقرر غزوات اور سرایا دونوں کے لیے ہوتا تھا۔ کبھی سرایا کے لیے یہ تقرری خود رسول مقبول

صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے اور کبھی کبھی اس کو امیر سریہ کی صوابدید پر چھوڑ دیتے تھے۔ اسی طرح اسلحوں اور گھوڑوں کے لئے بھی الگ الگ افسر مقرر کئے جاتے تھے لیکن کبھی کبھی اموال غنیمت کا افسر صاحب المغانم ہی ان دونوں کا افسر بھی ہوتا تھا۔ مسلم سلاح خانے یا ذخیرہ حربی کی ترقی کے ایک مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ابتداء میں مسلمان فوج کے پاس ہتھیار خاصے کم تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ ان میں اضافہ ہوتا رہا۔ ان میں کچھ تو اضافہ مال غنیمت میں حاصل شدہ ہتھیاروں کے سبب ہوا تھا لیکن زیادہ تر وہ مسلمانوں کی خرید اور عطایہ کا مرہون منت تھا۔ مسلم عسکری تنظیم کا آخری کارکن محافظ جسم دستہ اور اس کے سپاہی ہوتے تھے جو اپنے سالار اعظم یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جسمانی حفاظت کرتے تھے۔ خاص کر مہموں کے دوران یا زمانہ جنگ میں اس شعبہ میں امتیاز مدینہ کے انصار قبیلوں خاص کر اوس کو حاصل تھا جنہوں نے بیعت عقبہ ثانیہ میں کئے گئے وعدہ کو پوری طرح سے وفا کیا تھا کہ یہی شرط محبت تھی۔

اسلامی عسکری تنظیم کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اس نے مختلف قبیلوں اور علاقوں کے عربوں میں ایک فوجی و عسکری اتحاد پیدا کر دیا تھا اور ان کے اندرونی قبائلی اور علاقائی اختلافات کو بھلا کر ان کو ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی مانند ایک متحد و منظم فوج میں ڈھال دیا تھا جن کا واحد نصب العین اپنی اسلامی ریاست کا دفاع اور ارتقاء تھا۔ مادی لحاظ سے یہی اسلامی عسکری تنظیم تھی جس نے مدینہ کی شہری ریاست کے اندرونی دشمنوں خاص کر مدینہ کے یہودی قبائل کی سرکوبی و بیخ کنی کی تھی اور اس کے نتیجہ میں ریاست کی حدود و رقبہ میں خاصا اضافہ ہوا تھا۔ پھر اسی فوجی تنظیم نے ارد گرد کے قبائل کی طاقت کو توڑا تھا۔ اور ان کو اسلامی ریاست یا اسلامی امت کا رکن بنایا تھا۔ شمال میں یہودی قبیلوں اور عیسائی مملکتوں اور آزاد مگر جنگجو قبیلوں کو اس قدر مرعوب و دہشت زدہ کیا تھا کہ انہوں نے عراق و شام میں متمکن ایرانی اور رومی آقاؤں سے منہ پھیر کر اسلامی ریاست کے ساتھ اپنی قسمت وابستہ کر لی تھی۔ مگر ان سب سے بڑھ کر اسی فوجی طاقت نے عرب کی سب سے بڑی فوجی قوت اور منظم اشرافیہ قریش مکہ کا کس بل نکال دیا تھا اور بالآخر اس کو اسلامی ریاست کا ایک ماتحت و محکوم حصہ بنا دیا تھا۔ فتح مکہ کے بعد پورا جنوبی اور مشرقی عرب اسلام اور اسلامی پرچم کے تلے آ گیا تھا لہٰذا یہ بلاخوف و خطر کہا جا سکتا ہے کہ اگر اسلام نے دلوں کو فتح کر کے اسلامی ریاست و امت کی داغ بیل ڈالی تھی تو اسلام کی عسکری تنظیم نے انسانی جسموں کو فتح کر کے ان کی گردنوں میں اطاعت کے حلقے ڈالے تھے اور اسی کی بدولت شمال میں حدود شام سے، جنوب میں عدن تک اور مغرب میں بحر احمر سے مشرق میں خلیج فارس و حدود ایران و عراق تک پورا کفرستان عرب لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی روح پرور صداؤں سے گونجنے لگا تھا۔

اسلامی ریاست کا شہری نظم و نسق

ایک دہائی کی مدت سے کم عرصے میں مدینہ منورہ کی شہری ریاست ترقی کر کے مسلمانوں کی قومی ریاست بن گئی تھی اگرچہ وہ عربوں کے قبائلی نظام پر استوار ہوئی تھی لیکن جلد ہی وہ ایک مرکزی سلطنت اور حکومت کی شکل میں ارتقاء پذیر ہوئی یہ عربوں کے لیے ایک بالکل نیا سیاسی تجربہ تھا اس سے پہلے پورا جزیرہ نمائے عرب کبھی بھی کسی ایک مرکزی اقتدار کے تابع اور محکوم و مطیع نہیں رہا تھا۔ اگرچہ عربوں کی فطری مرکزیت مخالف فطرت ان کو ہمیشہ کسی غیر کے اقتدار بلکہ مرکزی حکومت کے تصور کے خلاف بھی اکساتی اور بغاوت پر آمادہ کرتی رہتی تھی۔ لیکن نئے دین ——— یعنی اسلام ——— نے ایک سیاسی آئیڈیالوجی کے بطور ان کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مرکزی طاقت و اقتدار کے سامنے اپنے سر خم کرنے کی ضرورت کا قائل بنا دیا تھا۔ دراصل اسلام کی مذہبی اجتماعیت کے تصور نے مسلم قوم ہونے یا اسلامی قومیت کے تصور کو جنم دیا تھا۔ ایک دین سے وابستگی اور اس کے نتیجہ میں برادرانہ اخوت نے علاقہ، قبیلہ، وطن، رنگ، نسل اور زبان وغیرہ کے امتیازات کو مٹا دیا تھا اور پورے جزیرہ نمائے عرب کے مسلمان ایک دوسرے کو اپنا اسلامی بھائی سمجھتے تھے اور اسی احساس و ادراک اخوت نے ان کو ایک قوم بنا دیا تھا۔ عربوں یا دوسری تہذیبوں کے معاشرتی اصولوں اور بنیادوں ——— نسل، وطن، رنگ ——— کی جگہ اسلام نے اپنی معاشرت کی بنیاد مذہب پر رکھی تھی اور خون کے رشتہ کی جگہ مذہبی تعلق نے لے لی تھی۔ اس انقلاب آفریں معاشرتی تصور نے ہی مدینہ کی اسلامی ریاست کو ایک قومی ریاست میں تبدیل کر دیا تھا جس سے تمام مسلمانوں کو جذباتی وابستگی اور روحانی محبت تھی۔ پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات نے دین و دنیا کے فرق کو مٹا کر اسلام اور اسلامی ریاست کو ایک دوسرے کا مترادف بنا دیا تھا۔ اسلامی ریاست کی خدمت دراصل اسلام کی خدمت تھی کیونکہ دین و ریاست دونوں توام تھے، اور ان دونوں کے سربراہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔

اسلامی سیاسی تصور کے مطابق اسلامی ریاست کا حاکم حقیقی اور مقتدر اعلیٰ صرف اللہ تعالیٰ ہیں اور انہی کے احکام و مرضی کے مطابق اسلامی ریاست کو چلایا جاتا تھا۔ یہ احکام و مرضی کچھ تو اس کی نازل کردہ کتاب میں موجود تھی اور کچھ کا مہبط و ماویٰ وامین قلب محمدی تھا جس سے وہ جب عمل میں منتقل ہوتی تو سنت محمدی میں ڈھل جاتی تھی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر مرضیٔ الٰہی اور احکام خداوندی کو اور کون جاننے اور سمجھنے اور تعبیر کرنے والا تھا۔ لہذا فطری بات تھی کہ اس کائنات رنگ و بو میں آپ اللہ تعالیٰ کے خلیفہ اور اس حیثیت سے مملکت اسلامی کے جانشین حاکم خداوندی تھے۔ خلیفۃ اللہ کی حیثیت سے آپ کو تمام مذہبی اور سیاسی اختیارات حاصل تھے۔ سیاسی اختیارات میں قانون سازی، انتظامیہ، عدلیہ اور فوجی اختیارات شامل تھے۔ بشریت کے سبب اور ایک ریاستی نظم و نسق اور انتظامیہ بنانے کی غرض سے بھی آپ اپنے بہت سے اختیارات کو ثانوی طور سے اپنے بہت سے صحابہؓ کو

منتقل کردیتے تھے اور ان کو مختلف عہدوں اور منصبوں پر مقرر کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ کارکن، عارضی ہوں یا مستقل، آپ کی مرضی اور پسندیدگی کی ہی صورت میں اپنے مناصب پر برقرار رہ سکتے تھے اور اس اعتبار سے وہ آپ کے ماتحت و محکوم تھے۔

آپ کے شہری نظم ونسق میں مرکزی، صوبائی یا علاقائی اور مقامی تنظیمی اور انتظامیہ کے کارکن شامل تھے۔ ذیل کے صفحات میں ہم عہد نبوی کے شہری نظم ونسق کے تاریخی ارتقا سے بحث کریں گے۔ لیکن اس سے پہلے یہ نکتہ ذہن نشین رکھنا ضروری ہے کہ عہد نبوی، میں بلکہ قرون وسطیٰ کی تمام سیاسی تنظیموں میں شہری، فوجی، عدلیہ وغیرہ کے شعبوں کی تقسیم نہیں تھی۔ یہ تقسیم ہم اپنی آسانی کے لئے کرتے ہیں۔ تاکہ حکومت کے مختلف شعبوں کے تاریخی ارتقاء اور ان کی کارکردگی کو سمجھا اور اجاگر کیا جا سکے۔ اس لحاظ سے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے مرکزی حکومت کے شہری نظم ونسق سے بحث کی جائے۔

مرکزی شہری نظم ونسق

اگرچہ تمام سیاسی اختیارات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک میں مرکوز تھے، تاہم آپ اپنی مدد، بہتر نظم ونسق اور انتظامیہ کے ارتقاء کے لئے اپنے متعدد صحابہ کو حکومت کے کاروبار میں شریک کرتے تھے۔ اس سلسلے میں جن منتظمین اور کارکنوں، عمال اور افسروں کے حوالے مآخذ میں ملتے ہیں، ان میں خلفاء و نائبین نبوی، مشیروں، سیکریٹریوں (کاتبین)، سفیروں (رسل)، مخصوص کاموں کے افسروں، شاعروں (شُعَرَاء)، خطیبوں (خُطَبَاء) کے علاوہ متعدد کم درجہ کے کارکنوں کا ذکر ملتا ہے۔ ان میں سے وقار و افتخار کے لحاظ سے سب سے ممتاز منصب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلفاء کا تھا۔ لہٰذا اسی سے بحث کا آغاز کیا جاتا ہے۔

۱۔ مدینہ منورہ میں خلفاء (نائبین) رسول

جب کبھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کسی ضرورت سے مدینہ منورہ کے باہر تشریف لیجاتے تھے تو اپنا ایک جانشین شہر میں چھوڑ جاتے تھے۔ اگرچہ عام تصور یہ ہے کہ یہ جانشین رسول نماز کی امامت کے لئے مقرر کیا جاتا تھا۔ کیونکہ عموماً مآخذ اس کے لئے فقرہ علی الصّلٰوۃ (نماز پر کے لئے) استعمال کرتے ہیں۔ اس سے یہ غلط فہمی رائج ہو گئی کہ آپ کی غیر موجودگی میں نائب یا خلیفہ رسول صرف امام نماز ہوتا تھا۔ حالانکہ یہ تصور صحیح نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مآخذ میں ان نوّاب رسول کے فرائض و اختیارات کی صراحت کہیں نہیں ملتی ہے۔ مگر مآخذ اس جانشینی کے جو لفظ استعمال کرتے ہیں وہ بڑا معنی خیز ہے۔ عام طور سے جانشین کے لفظ خلیفہ اور جانشینی کے لئے اِسْتَخْلَفَ (جانشین بنایا) یا اس کا مضارع یَسْتَخْلِفُ (جانشین بناتے ہیں) استعمال کیا جاتا ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ دونوں اصطلاحات ہیں جن کے مخصوص اور وسیع معنی ہیں۔ تاریخی شواہد سے اندازہ یہ ہوتا ہے کہ یہ جانشین رسول محض نماز کے لئے آپ کا نائب نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ آپ کا بحیثیت سربراہ مملکت کے جانشین و خلیفہ ہوتا تھا اور وہ آپ کی غیر موجودگی میں مدینہ میں موجود و مقیم امت مسلمہ کی فلاح و بہبود اور ریاست اسلامی کے مفادات کا نگران ہوتا تھا وہ اصطلاحی معنی، خلیفۃ الرسول یعنی آپ کا سیاسی جانشین ہوتا تھا۔ نماز پر تقرری یا نیابت کی اصطلاح بڑے وسیع معنی اور مفہوم کی حامل تھی اور عہد خلافت،

راشدہ بالخصوص عہد فاروقی میں گورنروں (ولاۃ : والی) کی تقرری کے لیے بھی یہی فقرہ استعمال ہوتا رہا تھا۔ جو دراصل عہد نبوی کی میراث تھی[۲]۔ کیونکہ نماز دین کا اہم ترین ستون اور نماز کی امامت امت مسلمہ کی امامت کے مترادف و ہم معنی تھی۔ اس شعبہ انتظامیہ کے تاریخی ارتقاء سے نائبین رسول کے مقام و مرتبے، اختیارات و فرائض اور کارکردگی کا بخوبی علم ہوگا۔

پہلے دو غزوات 'وَدّان اور بُواط' میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بالترتیب خزرج اور اوس کے قبائلی سرداروں حضرت سعد بن عبادہ[۳] اور سعد بن معاذ[۴] کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔ وہ مقامی سربرآوردہ مسلمانوں اور قبائلی سرداروں کی یکے بعد دیگرے تقرری آپ کی سیاسی دوراندیشی اور انتظامی حکمت عملی کی دلیل تھی۔ اس طرح آپ نے شعوری یا غیر شعوری طور سے نہ صرف مدینہ کے دو اہم ترین اور طاقتور ترین مسلم طبقات کو ریاستی و حکومتی معاملات میں شریک و سہیم ہونے کا احساس دلایا تھا۔ بلکہ ان کی وفاداری اور محبت بھی حاصل کر لی تھی۔ اس منصب جلیل پر تیسری تقرری رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مولا و محبوب صحابی حضرت زید بن حارثہ کلبی کی ہوئی تھی[۵]۔ حضرت زید کی تقرری کو وسیع تر تاریخی تناظر اور پیچیدہ تر سماجی پس منظر میں دیکھنا چاہیے وہ ایک طرف تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی روزافزوں سیاسی طاقت کی دلیل تھی تو دوسری طرف اسلامی امت میں موالی (غیر عرب مسلمانوں) کی سماجی قدر و منزلت بلکہ اسلامی مساوات کی ایک روشن مثال تھی۔ جیسا کہ گزشتہ باب میں حضرت زید اور ان کے فرزند جلیل کے تقرر کے بارے میں تفصیل کے ساتھ کہا جا چکا ہے۔ یہ تقرری یہ بھی ثابت کرتی تھی کہ حکومتی عہدے اور ریاستی مناصب کے لئے صلاحیت و لیاقت ہی واحد بنیاد تھی۔ خاندانی قبائلی یا علاقائی اسباب و عناصر نہیں[۶]۔ بہرحال پہلے قریشی صحابی جنہیں یہ اعزاز حاصل ہوا تھا حضرت ابوسلمہ بن عبدالاسد مخزومی تھے۔ جنہوں نے اسی برس غزوہ ذات العشیرہ کے دوران غیبت نبوی میں آپ کی جانشینی کا شرف حاصل کیا تھا[۷]۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مکہ کے قریش کے درمیان مسلح تصادم کے دوران جانشینان رسول کی تعداد اور طریق تقرری کے بارے میں مآخذ میں اختلاف نظر آتا ہے۔ ابن اسحاق اور ان کے جامع ابن ہشام کا خیال یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابن ام مکتوم کو اس عہدہ پر سرفراز فرمایا تھا لیکن بعد میں کچھ مصالح کے پیش نظر آپ نے ان کی جگہ حضرت ابولبابہ بشیر بن عبدالمنذر خزرجی کی تقرری فرما دی تھی اور ان کو آپ نے بدر کی طرف اپنے کوچ کے دوران روحاء نامی مقام سے واپس بھیجا تھا کہ وہ حضرت ابن ام مکتوم کی جگہ لیں[۸]۔ جبکہ بعض دوسرے مآخذ کا خیال ہے کہ حضرت ابولبابہ نے جس نائب رسول کی جگہ سنبھالی تھی وہ حضرت ابن ام مکتوم نہیں تھے بلکہ حضرت عاصم بن عدی اوسی تھے۔ لیکن ان تمام مآخذ کا اتفاق ہے کہ غزوہ بدر کے دوران دوسرے نائب رسول حضرت حارث بن حاطب تھے۔ جن کو شہر کے بالائی حصے (العالیہ) کے لوگوں کی دیکھ بھال کا فریضہ سپرد کیا گیا تھا[۹]۔ دوسری طرف ابن سعد کی روایت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس موقعہ پر کم از کم تین حضرات کو شہر کے تین مختلف حصوں کی ذمہ داری سونپی گئی تھی: حضرت ابولبابہ کو خاص شہر مدینہ کی، حضرت عاصم بن عدی عجلانی کو شہر کے بالائی علاقے (العالیہ) کی، اور حضرت حارث بن حاطب (بنو عمرو بن عوف) کو اپنے قبیلہ کے علاقے کی" کیونکہ ان کے بارے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ خبریں سننے کو ملی تھیں![۱۰] بہرحال اس کے بعد حضرت ابولبابہ کو اس عہدہ عظیم پر ۶۲۴ء کے وسط (۲ھ کے اواخر) میں "غزوات بنو قینقاع اور سویق" کے دوران دو مزید تقرریوں کی سعادت ملی تھی اور اس طرح ان کو مجموعی طور سے یہ سعادت تین بار حاصل ہوئی تھی۔

امرائے عمال نبوی کے اس شعبہ میں سب سے نمایاں شخصیت بلا ریب حضرت ابن ام مکتوم کی تھی۔ صحابی موصوف کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ وہ نابینا تھے بلکہ اس خلقی کمزوری کے باوجود انہوں نے بارہ یا تیرہ[۱۲] مواقع پر خلافت رسول کی سعادت حاصل کی تھی۔ جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے کہ حضرت ابن ام مکتوم کی پہلی تقرری بدر کے غزوہ کے دوران ہوئی تھی اگرچہ وہ عارضی رہی تھی اور ان کو دوسرے جانشین رسول کے حق میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ بہرحال چار ماہ بعد غزوہ الکدر کے موقع پر ان کی دوسری تقرری عمل میں آئی تھی ربیع الاول ۳ھ/ستمبر ۶۲۴ء میں ایک غزوہ کے سوا جب حضرت عثمان بن عفان اموی کو یہ سعادت ملی تھی[۱۳] حضرت ابن ام مکتوم کی جمادی الاولیٰ ۳ھ/اکتوبر ۶۲۴ء تا شوال ۳ھ/مارچ ۶۲۵ء تک تین متواتر مواقع پر اس عہدہ جلیل پر تقرری ہوتی رہی تھی جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم غزوات بحران، احد اور حمراء الاسد کے زمانے میں شہر سے باہر تشریف لے گئے تھے۔ پھر ایک مختصر سے عرصے کے بعد ان کی چھٹی تقرری غزوہ بنو نضیر کے زمانے میں ہوئی تھی۔ اس کے دوسرے برس کے دوران چار دوسرے صحابہ کرام حضرات عبداللہ بن رواحہ خزرجی[۱۴]، عثمان بن عفان اموی[۱۵]، سباع بن عرفطہ غفاری[۱۶] اور زید بن حارثہ کلبی کی بالترتیب اتنے ہی غزوات کے دوران تقرریاں ہوئی تھیں، ان کے بعد حضرت ام مکتوم کی تقرریوں کا ایک سلسلہ دراز تھا جو ذی قعدہ ۵ھ/اپریل ۶۲۷ء سے محرم ۷ھ/مئی ۶۲۸ء تک وسیع تھا اور جس کے دوران انہوں نے پانچ غزوات۔ خندق۔ بنو قریظہ، لحیان، غابہ اور حدیبیہ کے زمانے میں متواتر نیابت۔ رسول کی تھی۔ صحابی موصوف کی آخری تقرری رمضان ۸ھ/جنوری ۶۳۰ء میں فتح مکہ کے زمانے میں ہوئی تھی[۱۷]۔ مآخذ کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے تیرہ مواقع پر یہ سعادت حاصل کی تھی، مگر تاریخی شواہد صرف بارہ کے لئے ہیں۔ ممکن ہے کہ مآخذ کا دعویٰ کلی طور پر صحیح رہا ہو اور ایک موقع کی شہادت فراہم نہ کی جا سکی ہو۔ بہرحال اس کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ بڑی اہم تھی کہ ان کو اتنے کثیر مواقع پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اعتماد حاصل رہا تھا۔ یہ نکتہ اس حقیقت کے پس منظر میں اور بھی معنی خیز ہو جاتا ہے کہ وہ نہ صرف جسمانی طور سے معذور تھے بلکہ قریش کے ایک غیر اہم خاندان بنو عامر بن لوئی سے متعلق تھے جو سیادت و قیادت کے لحاظ سے دوسرے درجہ کے خاندان بلکہ قریش البطاح کے باہر تصور کیا جاتا تھا۔ یہ بھی بہرحال ایک حقیقت ہے کہ اپنی تمام تر جسمانی اور خاندانی کم مائیگی کے باوجود وہ امت اسلامی کے اہم ترین افراد میں تھے۔ کیونکہ ان کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا غیر متزلزل اعتماد حاصل تھا اور اس سے بڑھ کر ان کی عظمت کا شاہد خود قرآن کریم بھی ہے۔

مرکزی انتظامیہ کے اس شعبہ میں دوسرے اہم اور نمایاں افسروں میں حضرت سباع بن عرفطہ غفاری کا ذکر خصوصی کرنا چاہیئے وہ بعض جدید مورخین کے مطابق اگرچہ ایک نسبتاً چھوٹے قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے تاہم ان کو خلیفہ رسول کے منصب عظیم پر تقرری کی تین بار سعادت ملی تھی۔ ان کی پہلی تقرری ربیع الاول۔ الثانی ۵ھ/اگست ستمبر ۶۲۶ء میں ہوئی تھی اور باقی دو صفر ۷ھ/جون ۶۲۸ء اور ذی الحجہ ۱۰ھ/مارچ ۶۳۲ء میں بالترتیب ہوئی تھیں[۱۹]۔ یہیں غفار کے ایک اور فرد حضرت ابو رہم کلثوم بن حصین غفاری کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے جن کو ذی قعدہ ۷ھ/مارچ ۶۲۹ء میں غزوہ عمرۃ القضیہ کے دوران یہ عہدہ عظیم ملا تھا[۲۰]۔ اس عہدہ پر ایک اموی یعنی حضرت عثمان بن عفان کو دو بار تقرری کی خاص اہمیت ہے[۲۱] بالخصوص اس حقیقت کے پس منظر میں کہ کسی ہاشمی کو یہ عہدہ پورے دور نبوی میں نہیں ملا تھا۔ غزوہ تبوک کے دوران حضرت علی بن ابی طالب ہاشمی کو صرف خاندان رسالت میں آپ کی جانشینی کا شرف ملا تھا[۲۲]

جبکہ ریاست اسلامی کی سربراہی ایک اوسی صحابی حضرت محمد بن مسلمہ کے نصیب میں آئی تھی۔ یہ بھی اہم نکتہ ہے کہ بعض اہم ترین قریشی صحابہ کرام جیسے حضرات ابوبکر، عبدالرحمٰن بن عوف اور طلحہ، زبیر وغیرہ کو بھی اس شعبہ میں کوئی نمائندگی نہیں ملی تھی۔ نواب رسول کی علاقائی اور قبائلی نیز سال بسال تقرری کو بہتر طور سے سمجھنے کے لیے ذیل کی جدول کافی ہوگی۔

علاقہ	قبیلہ / خاندان	٦٢٣	٦٢٤	٦٢٥	٦٢٦	٦٢٧	٦٢٨	٦٢٩	٦٣٠	٦٣١	٦٣٢	تقرریاں	خلفاء
مرکزی عرب	١۔ قریش	١	٥	٤	١	٤	١		١	-	-	١٧	٣
	(الف) بنو امیہ	-	١	-	١	-	-	-	-	-	-	٢	١
	(ب) عامر بن لوی	-	٤	٣	-	٢	١	-	١	-	-	١٣	١
	(ج) مخزوم	١	-	١	-	-	-	-	-	-	-	٢	١
	٢۔ خزرج	١	-	-	١	-	-	-	-	-	-	٢	٢
	٣۔ اوس	١	٥	-	-	-	-	-	١	-	-	٧	٥
شمالی عرب	١۔ کلب	١	-	-	-	١	-	-	-	-	-	٢	١
مغربی عرب	١۔ غفار	-	-	-	١	-	١	١	-	-	١	٤	٢
میزان	٥ قبیلے	٤	١٠	٤	٣	٥	٢	١	٢	-	١	٣٢	١٣

مذکورہ بالا جدول سے تمام حقائق از خود واضح ہو جاتے ہیں نیز گذشتہ باب میں اس موضوع پر خاصا کلام کیا جا چکا ہے لہٰذا اسے دہرانے کی مزید ضرورت نہیں رہتی۔ اس کی روشنی میں مذکورہ بالا جدول کی تشریح و تعبیر کی جا سکتی ہے۔ البتہ جہاں تک اس شعبۂ افسران کے زمانۂ قبول اسلام کا تعلق ہے تو تیرہ صحابہ کرام میں اکثر و بیشتر مکی دور کے سابقین اولین تھے اور باقی مدنی دور کے ابتدائی مسلمان۔ لیکن اس سلسلہ میں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ ان میں ایک دو کے سوا بقیہ سے کہیں زیادہ قدیم مسلم تھے۔ مگر ان کو ریاستی مناصب نہیں ملے تھے۔

٢۔ مشیرانِ نبوی (المشیرون)

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام قسم کے "معاملہ میں مسلمانوں سے مشورہ کرنے" کا حکم دیا ہے مفسرین عظام نے معاملہ (الامر) کی تشریح میں مختلف قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے لیکن حکم خداوندی کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ تمام ایسے امور میں جو امت مسلمہ کے اجتماعی مفادات سے متعلق ہوں، مسلمانوں سے مشورہ لینا ضروری قرار دیا گیا تھا۔ یہ امور سیاسی، سماجی، اقتصادی اور فوجی اور مذہبی تک ہو سکتے تھے۔ جہاں تک مذہبی معاملات کا تعلق ہے تو وحی الٰہی انکو وقتاً فوقتاً

طے کرتی رہتی تھی۔ مگر ایسا بھی ہوا ہے کہ بہت سے مذہبی معاملات خاص دین کے معاملات کے اسلامی امت میں نفاذ کا معاملہ مسلمانوں کے باہمی مشورہ سے بھی طے پایا ہے۔ بہر حال مشورہ لینا اور صلاح کرنا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ضروری ضرور تھا تاہم آخری فیصلہ آپ کے ہاتھ ہی میں ہوتا تھا۔ اور جب آپ عزم مصمم کر لیتے تھے تو پھر اسے امت مسلمہ کا اجتماعی فیصلہ بھی تبدیل نہیں کر سکتا تھا۔ اسی سے یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ اسلامی سیاسیات میں امیر المومنین یا سربراہ مملکت کو وسیع اختیار حاصل ہوتے ہیں اور وہ صرف مشورہ کا پابند ہوتا ہے۔ مگر اسے ماننے یا نہ ماننے کا اختیار حاصل ہوتا ہے اور آخری فیصلہ کا وہ مجاز کل ہوتا ہے۔ بہر حال رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم، جیسا کہ مآخذ ثابت کرتے ہیں۔ تمام اہم اجتماعی امور پر قرآنی ہدایت کے مطابق مسلم صحابہ کرام سے مشورہ کرتے تھے جن میں ریاستی وحکومتی امور بھی شامل تھے۔ یوں تو عام مسلمانوں سے مشورہ کرنے کا حکم تھا۔ جس کے سبب ادنیٰ سے ادنیٰ مسلم مشورہ دینے کا مجاز تھا مگر بوجوہ معلوم ریاستی معاملات میں مشورہ ہر کس و ناکس کی بات نہ تھی۔ اس لئے ان تمام اہم امور پر جن میں سوجھ بوجھ، فہم و فراست اور معاملات کے ادراک کی ضرورت ہوتی تھی صرف عظیم ترین صحابہ کرام سے مشورہ کرتے تھے۔

عہد نبوی میں مسلم امت کے اکابر سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مشورہ و صلاح کرنے کی بیشتر مثالوں کا تعلق فوجی امور سے ہے اور اس طرح واقدی کے اس عام تبصرے کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ جنگ (حرب) کے معاملات میں آپ صحابہ کرام سے اکثر و بیشتر صلاح و مشورہ کرتے تھے۔[۲۵] جہاں تک شہادت مل سکی ہے کسی جنگی معاملہ پر مشورہ کا پہلا ثبوت غزوہ بدر سے ملتا ہے۔ ابن اسحاق، واقدی، بخاری اور طبری وغیرہ متعدد مورخین اور سیرت نگاروں کا بیان ہے کہ جوں ہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مکی فوج کی بدر کی جانب پیشقدمی کی خبر ملی۔ آپ نے اس اہم مسئلہ کو اپنے مشیروں کے حلقہ کے سامنے غور و خوض اور مشورہ کے لئے رکھا۔ مہاجرین میں سے حضرات ابوبکر، عمر اور مقداد بن عمرو خزاعی نے آپ کے منصوبہ کی بھرپور حمایت کی۔ جبکہ انصار میں سے حضرات سعد بن معاذ اوسی، سعد بن عبادہ خزرجی اور حباب بن منذر خزرجی نے انصار کی طرف سے آپ کو مکمل تعاون و حمایت کا یقین دلایا۔[۲۶] یہ بات قابل ذکر ہے کہ اسی متحدہ رائے اور شوریٰ نے جنگ بدر میں قتال کا حتمی فیصلہ کیا تھا۔ جنگ شروع ہونے سے پہلے بدر میں مسلم خیمہ گاہ کے لئے جگہ کا انتخاب اور کنوؤں کے اندھا کئے جانے کا فیصلہ بھی آپ نے مشہور ماہر امور حرب حضرت حباب بن منذر کے مشورہ پر کیا تھا۔[۲۷] مشہور واقعہ ہے کہ جنگ کے خاتمے پر جنگی قیدیوں کے ساتھ رویہ و سلوک پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے مشورہ کیا تھا اور حضرت ابوبکر صدیق کی صلاح کہ ان کو زر فدیہ لے کر رہا کر دیا جائے کو قبول کر لیا تھا۔ جبکہ حضرت عمر فاروق کے قتل کرنے کے مشورہ کو آپ نے مسترد کر دیا تھا کہ یہی رحمت عالم کے لئے مناسب بھی تھا اس میں دوسرے فوائد مضمر تھے۔[۲۸]

اسی طرح غزوہ احد کے موقعہ پر آپ کا مسلمانوں سے مشورہ کرنا مشہور واقعہ ہے۔ آپ کی پختہ رائے تھی کہ دشمن کی کثرت تعداد و بہتر جنگی لیاقت کے پیش نظر شہر میں محصور ہو کر مقابلہ کیا جائے۔ اتفاق دیکھئے کہ اس رائے سے مشہور منافق سردار عبداللہ بن ابی بن سلول کو بھی اتفاق تھا اور بعض دوسرے اہم اور مخلص مسلمان صحابہ کو بھی۔ لیکن اس کے باوجود آپ نے مسلم امت کے اہل رائے سے مشورہ کیا۔ ان میں سے ایک خاصے بڑے طبقہ کی رائے تھی کہ شہر سے باہر نکل کر کھلے میدان میں جنگ کرنا زیادہ سودمند ہو گا۔ اس پرجوش و دلیر طبقہ میں ناتجربہ کار نوجوانوں کے علاوہ متعدد تجربہ کار اور صاحبان فہم و فراست بھی شامل تھے داد ہی

کے مطابق حضرات حمزہ بن المطلب ہاشمی، سعد بن عبادہ خزرجی، نعمان بن مالک، مالک بن سنان، ایاس بن اوس، نعیم بن حارث اور انس بن قتادہ جیسے سربرآوردہ لوگ پیش پیش تھے[۲۹] بالآخر اس طبقہ کی رائے کو ان کی پرجوش وکالت کے سبب آپ نے قبول بھی کرلیا اور کھلے میدان میں جنگ کرنے کا فیصلہ صادر کر دیا۔ مگر جب آپ زرہ بکتروں سے لیس ہو کر میدان جنگ کے لیے گھر سے نکلے تو اس طبقہ کے بعض لوگوں کو ندامت ہوئی کہ انہوں نے آپ کو اپنی رائے کے خلاف اقدام کرنے کے لیے تقریباً مجبور کر دیا ہے اور انہوں نے فیصلہ پر نظر ثانی کی درخواست کی جسے آپ نے عزیمت رسول اور صلابت نبوی کے خلاف قرار دے کر فیصلہ کو بدلنے سے انکار کر دیا۔ اگرچہ آپ کے اس عزم بالجزم سے فوری طور پر مسلم فوج کی تعداد میں منافقین کے تقریباً ڈھائی سو پیادوں کی پسپائی سے کافی کمی واقع ہوتی تھی تاہم اس کے دو فائدے بھی ہوتے تھے: اول یہ کہ مسلم صفوں سے گھر کے بھیدیوں کا اور ان کے ساتھ ان کے مکر و فریب کا خاتمہ ہو گیا تھا اور میدان جنگ میں مسلم فوج میں فوجی ہم آہنگی کے سبب پورا اتحاد و نظم تھا، جس کے سبب شکست کے لمحات میں بھی مسلمانوں میں پژمردگی نہیں پیدا ہوئی تھی۔ بلکہ اسی کی بدولت انہوں نے بالآخر دشمن کی جیت کو پسپائی میں بدل دیا تھا۔ دوم یہ کہ تقریباً ایک چوتھائی مسلم فوج کی اس طرح پسپائی کے اصل راز کو دشمن فوج اور ان کے قائدین نے نہیں سمجھا تھا اور وہ اس کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شہر کے دفاع کی ایک حربی تدبیر سمجھے تھے اور اسی وجہ سے انہوں نے مدینہ پر اپنی فتح کے باوجود حملہ نہیں کیا تھا۔ اس طرح رحمت خداوندی انسانی ابتلا و آزمائش کا بھیس بدل کر آتی تھی۔

اسلامی ریاست کے بعض خطرناک دشمنوں کا قتل بھی باہمی صلاح و مشورے کے بعد ہی کیا گیا تھا۔ ایسے قتل کو حملہ کا جواز عرب کے قبائلی نظام میں فوجی روایات دیتی ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی اس ضمن میں یاد رکھنے کی ہے کہ اسلامی ریاست نے اپنے حلیفوں اور معاہدوں ہی کا اس طرح قتل کیا یا کرایا تھا۔ کیونکہ دراصل یہ اسلامی ریاست کے غداروں اور باغیوں کا قتل تھا۔ بہر حال اس وقت ہم کو اس مسئلہ سے بحث نہیں ہے بلکہ اس کے پہلو سے بحث ہے۔ چنانچہ مآخذ کے مطابق مشہور یہودی شاعر کعب بن اشرف جس نے جنگ بدر پا کرانے میں کلیدی کردار ادا کیا تھا، کا قتل کئی دنوں تک انصار کے سربرآوردہ اشخاص اور سرداروں کے گرماگرم مباحثے اور صلاح و مشورہ کے بعد ہوا تھا[۳۰] اگرچہ اس قسم کے دوسرے واقعات کے بارے میں صلاح و مشورہ کا واضح ذکر نہیں ملتا ہے تاہم قرائن ایسے ہیں کہ دوسرے سیاسی قتل بھی صلاح و مشورے کے بغیر نہیں کئے گئے۔

جنگ احزاب کے موقع پر کثیر تعداد میں دشمن فوج کا مقابلہ کرنے کے ضمن میں شہر کے شمالی حصہ میں ایک عظیم خندق کھودنے کا مشورہ مشہور صحابی حضرت سلمان فارسی نے دیا تھا اور جسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول کر لیا تھا[۳۱] یہ واقعہ اتنا مشہور ہے کہ اس کی تفصیلات کو دہرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تاہم اسی غزوہ کے دوران رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے مشیروں سے صلاح و مشورہ کرنے کا ایک اور واقعہ قابل ذکر ہے۔ جب محاصرہ زیادہ طول کھینچ گیا اور مسلمانوں کو اس کے سبب شدید زحمتوں کا سامنا ہوا تو آپ نے احزاب کے ایک اہم رکن قبیلہ غطفان کو متحدہ محاذ سے واپسی کے لیے سال بھر تک مدینہ کی پیداوار کا ایک تہائی حصہ دینے کی پیشکش کی اور اس سلسلے میں گفت و شنید شروع ہوئی۔ لیکن آخری فیصلہ سے قبل آپ نے مدینہ کے سرداروں حضرات سعد بن معاذ اوسی، سعد بن عبادہ خزرجی اور اسید بن حضیر اوسی سے مشورہ کیا جنہوں نے ایسے کسی

ذلت آمیز معاہدہ کو قبول کرنے کی شدید مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ جاہلیت کے زمانے میں بھی کوئی دشمن مدینہ سے خراج وصول نہیں کر سکا تو اب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں وہ ایسے کسی معاہدے کو قبول کرنے کے بجائے لڑ کر مرجانا پسند کریں گے۔ آپ نے ان کی صلابت ایمانی اور عزم بالجزم دیکھ کر گفت و شنید منقطع کر دی۔[۴۲] یہاں اس امر کی طرف توجہ دلانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بنو غطفان سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صلح کی گفتگو صرف ایک حربی تدبیر معلوم ہوتی ہے جس کا مقصد متحدہ محاذ کے اراکین میں پھوٹ ڈالنا تھا۔ وہ مقصد پوری طرح سے حاصل ہوا تھا کیونکہ ماخذ کے مطابق بنو غطفان پہلے لوگ تھے جو میدان جنگ سے پسپا ہوئے تھے۔

تقریباً تمام ماخذ کا اس پر اتفاق ہے کہ صلح حدیبیہ کے زمانے میں اشراف مکہ سے صلح کی اور مکہ میں عمرہ کے لئے مسلمانوں کے داخلہ کی بات چیت کرنے کے لئے حضرت عثمان بن عفان کی بحیثیت مسلم سفیر اور نمائندے کے تقرری حضرت عمر بن خطاب کے مشورے پر ہوئی تھی۔[۴۳] اس طرح غزوہ خیبر کے دوران رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں کے باغوں میں کھجوروں کے بعض درختوں کو کاٹنے کی حضرت حباب بن منذر کی تجویز قبول کر لی تھی لیکن بعد میں حضرت ابوبکر صدیق کے مشورے پر اس کی ممانعت کے احکام صادر فرمائے تھے۔ انہیں[۴۴] دونوں مشوروں اور حکمت عملی کے مظاہروں کی افادیت اور صحت کی طرف قرآن کریم کی ایک آیت کریمہ میں اشارہ کیا گیا ہے۔[۴۵]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنگی امور میں حضرت حباب بن منذر خزرجی کی رائے ہمیشہ دربار رسالت میں منظور و قبول ہوتی تھی۔ چنانچہ متعدد غزوات جیسے بدر، خندق، خیبر، طائف وغیرہ میں ان کی آرا کو خاص کر مسلم فرودگاہ کے لئے جگہ کے انتخاب کے ضمن میں دوسروں پر ہمیشہ ترجیح ملتی تھی۔[۴۶] اسی طرح غزوہ خیبر کے موقعہ پر بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود خیبر کے اتحادی عرب قبیلہ غطفان کو ان کا اتحاد سے واپسی یا غیر جانبداری کے لئے وہی شرائط پیش کی تھیں جو اس سے قبل ان کے اتحادی یہودیوں نے ان کو دی تھیں لیکن بعد میں آپ نے حضرت سعد بن عبادہ جیسے مشیروں کی رائے پر اپنی پیشکش واپس لے لی تھی۔[۴۷]

شوال ۷ھ/فروری ۶۲۹ء میں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے شمال میں خیبر کے مقام کی طرف ایک مہم بھیجنے کا قصد کیا مگر آپ اس کی قیادت کے مسئلہ کو طے نہیں کر سکے۔ چنانچہ آپ نے ماخذ کے مطابق حضرت ابوبکر صدیق اور عمر فاروق کو مشورے کے لئے بلایا حسن اتفاق دیکھئے کہ دونوں مشیران نبوی نے حضرت بشیر بن سعد خزرجی کو قائد مقرر کرنے کا مشورہ دیا۔ جسے آپ نے فوراً اور بخوشی قبول فرمالیا۔[۴۸] اگرچہ امرائے سرایا یا عمال نبوی کی تقرری کے سلسلے میں تقریباً یہ خبر واحد اور اکلوتی شہادت ہے تاہم اس سے اس خیال و نظریہ کو تقویت ملتی ہے کہ حکومت کے دوسرے عہدیداروں خاص کر بڑے افسروں کا تقرری صلاح و مشورے کے بعد ہی ہوتی تھی۔

طریق جنگ اور حربی تدابیر کے اختیار کرنے کے سلسلہ میں بھی مشورہ کے بعض واقعات ملتے ہیں۔ چنانچہ ماخذ کا بیان ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ حنین کے دوران طریق جنگ کے بارے میں حضرت عمر فاروق سے مشورہ کیا تھا اور غالباً ان کے مشورے کو قبول کیا تھا۔[۴۹] اسی طرح طائف کے محاصرہ کے دوران آپ نے محصورین کے خلاف حضرت سلمان فارسی کی منجنیق استعمال

کہ نیک رائے کو نہ صرف قبول کر لیا تھا۔ بلکہ ان کو ایک منجنیق بنانے کا حکم بھی دے دیا تھا۔ لعد میں آپ نے غالباً کسی اور صحابی کے مشورے پر یا اپنی رائے سے منجنیق استعمال نہیں کی تھی[۴۰]۔ اسی طرح بالآخر آپ نے شہر کا محاصرہ حضرت نوفل بن معاویہ دیلی جو عرب قبائل کے عادات و اطوار کے ماہر تھے کے مشورے پر اٹھا لیا تھا[۴۱]۔ اس ضمن کا آخری واقعہ یہ ہے کہ غزوہ تبوک کے زمانے میں جب تبوک میں مسلمانوں کا قیام کافی طویل ہو چکا اور دشمن نظر نہ آیا تو آپ نے آئندہ اقدام کے بارے میں حضرت عمر فاروق سے مشورہ کیا جنہوں نے مدینہ واپسی کا مشورہ دیا اور دوسرے دن ہی مسلم فوج اپنی واپسی کے سفر پر مدینہ کی جانب گامزن تھی[۴۲]۔

حربی امور و معاملات کے علاوہ دوسرے مذہبی، سماجی اور سیاسی معاملات پر بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مسلمانوں سے مشورہ کرنے کی مثالیں ملتی ہیں، چند مثالیں کافی ہوں گی۔ جیسا کہ معلوم ہے کہ اذان ایک مذہبی شعار ہے اور نماز باجماعت کا ایک لازمی جز۔ مدینہ میں مسجد نبوی کی تعمیر کے بعد یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ مسلمانوں کو نماز کے لئے مسجد میں کیسے اکٹھا کیا جائے مختلف تجاویز کے بعد آخر کار ایک صحابی کے مشورے پر اذان کی تجویز قبول کر لی گئی تھی[۴۳]۔ اسی طرح مدینہ منورہ میں مسجد نبوی کی جگہ کا انتخاب صلاح و مشورہ کے بعد ہی کیا گیا تھا[۴۴] اور اس کے بعد مواخاۃ کا نظام بھی مسلمانوں کی پسندیدگی اور مرضی سے قائم کیا گیا تھا۔ خاص طور سے دو مسلمانوں کے باہمی رشتۂ اخوت و محبت میں ان کے مزاج و طبیعت کی ہم آہنگی کے علاوہ ان کی رائے کو بھی مدنظر رکھا گیا تھا[۴۵]۔ مدینہ کے یہودی قبیلوں سے مال غنیمت میں حاصل شدہ اراضی کی غریب مہاجرین اور بعض غریب انصار میں بھی تقسیم انصار کے سربرآوردہ لوگوں کے صلاح و مشورے اور مرضی کے بعد ہی عمل میں آئی تھی[۴۶]۔ اسی طرح جب بحرین اسلامی ریاست کا حصہ بن گیا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں انصار کے لوگوں کو کچھ اراضی اور قطائع دینے چاہے تو انصار نے بےمثال جذبۂ اخوت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس وقت تک قطائع لینے سے انکار کیا۔ جب تک اتنے ہی ان کے مہاجر بھائیوں کو نہ دیئے جائیں[۴۷]۔

غزوہ بدر میں گرفتار ہونے والے قریشی قیدیوں کے ساتھ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سلوک کا ذکر آ چکا ہے۔ اسی قبیل کے بعض اور واقعات کا ذکر یہاں کیا جا سکتا ہے۔ اس کا قوی امکان ہے کہ بدر کے قیدیوں کے رہا ہونے کے لئے زر فدیہ کی مختلف شرحیں اور غریب مگر پڑھے لکھے قیدیوں کے لئے مدینہ کے دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھانے کی زر فدیہ کی جگہ شرط رہائی غالباً صلاح و مشورے کے بعد ہی طے کی گئی تھیں[۴۸]۔ اس سے زیادہ دلچسپ اور اہم واقعہ یہ ہے کہ اسی موقعہ پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دختر نیک اختر حضرت زینب نے اپنے کافر و قیدی شوہر ابو العاص بن ربیع کی رہائی کے لئے مکہ سے بطور زر فدیہ اپنا گلوبند بھیجا تھا۔ جو ان کی مرحومہ والدہ حضرت خدیجہ نے ان کی شادی کے موقعہ پر بطور تحفہ دیا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی محبوب و مرحوم بیوی کی آخری یادگار کو دیکھ کر آبدیدہ ہو گئے اور اس کو واپس کرنا چاہتے تھے مگر مسلمانوں کی مرضی کے بغیر آپ نے ایسا نہیں کیا تھا[۴۹]۔ اسی طرح جب کچھ سال بعد ابو العاص بن ربیع ایک مسلم مہم کے دوران قریشی سامان تجارت سمیت

پکڑے گئے نوران کا ساز و سامان اور سامان تجارت مسلمانوں کے صلاح و مشورے کے بعد ہی واپس کیا گیا تھا۔ اور جس کا یہ خوشگوار نتیجہ نکلا تھا کہ حضرت ابوالعاص بن ربیع اموی امت مسلمہ کے ایک فرد فرید بن گئے تھے[۵۰]۔ واقعہ افک کے دوران

جو غزوہ مریسیع کے دوران پیش آیا تھا اور جس نے پچاس دن تک مسلم مدنی سماج کو زیر و زبر رکھا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قریبی صحابہ کرام سے متعدد مواقع پر صلاح و مشورہ کیا تھا۔ اگرچہ آپ نے اپنے مشیروں میں سے کسی کا مشورہ قبول نہیں کیا تھا۔ اور فیصلہ کو خداوند قدوس پر چھوڑ دیا تھا اور شان کریمی کے صدقے جایئے کہ اس نے معصوم ملزمہ کے حق میں اپنے کلام پاک میں برأت کی آیات اتاری تھیں۔ جو تا قیام قیامت بلکہ تا ابد اس عظیم شخصیت کی پاکیزگی اور تقدس کی ربانی شہادت بن گئیں۔

عہد نبوی کے مختلف برسوں میں بعض سماجی معاملات سے متعلق قوانین نافذ کئے گئے تھے۔ اگرچہ ان میں سے بیشتر کا نفاذ وحی الٰہی کے نزول کے بعد ہوا تھا۔ تاہم ان میں متعدد کا مشورہ صحابہ کرام نے اس سے پہلے ہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا تھا اس سلسلہ میں حضرت عمر بن خطاب کا نام نامی و اسم گرامی مآخذ میں نمایاں طور سے نظر آتا ہے۔ حدیث نبوی ہے کہ "حق عمر کی زبان سے بولتا ہے۔ اور ان کی رائے وحی و کتاب سے متفق ہوتی تھی"۔ مثال کے طور پر عورتوں کے پردے اور عوام یا بازار میں ان کے طرز عمل کے سلسلہ میں جو احکام نافذ کئے گئے۔ ان کا مشورہ حضرت عمر نے ہی دیا تھا[۵۳]۔ اس ضمن میں صلح حدیبیہ کے موقع پر ام المؤمنین حضرت ام سلمٰی کا ذکر کیا جانا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ صلح حدیبیہ کی تکمیل کے بعد مسلمانوں پر پژمردگی اور احساس شکست طاری تھا اور اتنا شدید کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے احرام کھولنے اور قربانی کرنے کو کہا تو مارے غم کے کوئی نہیں اٹھا۔ آپ نے حضرت ام سلمٰی سے ان کی سرد مہری کی شکایت کی تو انہوں نے مشورہ دیا کہ آپ خود قربانی کریں اور مسلمان آپ کی مثال کی تقلید کریں گے اور ان کی رائے کس قدر صحیح ثابت ہوئی[۵۴]۔ خیبر کی مہم میں چند عورتیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بلا اجازت و مرضی شریک ہو گئی تھیں۔ دوران سفر جب آپکو ان کی موجودگی کا علم ہوا تو آپ نے ناراضگی کا اظہار کیا۔ مگر بالآخر ان کی دردمندانہ درخواستوں پر ان کو شرکت کی اجازت دیدی[۵۵]۔ فتح مکہ کے موقع پر اسلام کے بعض مخالفین بالخصوص حضرت ابوسفیان بن حرب، حضرت عکرمہ بن ابی جہل وغیرہ کو امان عطا کرنا اور پھر ابوسفیان کے گھر کو دار الامان قرار دینا دراصل بعض مسلمانوں کے مشورے ہی پر روبہ عمل آیا تھا[۵۶]۔ ۹ھ / ۶۳۱ء میں ایلاء (ازواج مطہرات سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عارضی جدائی) کے واقعہ کے دوران حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مشورہ کیا تھا[(۵۷)]۔

اگرچہ معاہدات امن و صلح اور سیاسی اتحادوں کے سلسلہ میں شوریٰ کی واضح مثالیں نہیں ملتی ہیں تاہم یہ فرض کرنا جائز ہوگا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض مشیروں کو ضرور اپنے اعتماد میں لیا ہوگا۔ جیسا کہ حضرت علی بن ابی طالب ہاشمی کی صلح حدیبیہ کے لئے بطور فرستادہ و نمائندہ رسول تقرری سے ظاہر ہوتا ہے[۵۸]۔ اس کی مزید تصدیق خندق اور خیبر کے غزوات کے دوران بنو غطفان کے معاملہ میں انصار کے سرداروں سے مشورہ کی دو مثالوں سے ہوتی ہے۔

ان واقعات کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کرنا جائز ہو گا کہ دوسرے معاملات میں شوریٰ سے کام لیا جاتا تھا۔ اور خاص کر ریاستی و حکومتی امور میں بلا صلاح و مشورہ کے کوئی فیصلہ نہیں کیا جاتا تھا۔ اس حقیقت کے باوجود کہ آخری فیصلہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اختیار و اقتدار خصوصی تھا جس پر کوئی قدغن نہیں لگا سکتا تھا۔

مشیران نبوی میں جن صحابہ کرام کے اسمائے گرامی نمایاں نظر آتے ہیں ان میں حضرات ابوبکر و عمر سرفہرست تھے۔ ان کے علاوہ حضرات عثمان، علی، حباب بن منذر، سعد بن عبادہ، سعد بن معاذ، طلحہ، زبیر وغیرہ متعدد دوسرے صحابہ کرام بھی شامل تھے [۶۰] شوریٰ کا رکن بننے کے لئے کسی رسمی طریقہ کار کی ضرورت نہ تھی، البتہ صلاحیت و لیاقت ناگزیر تھی اور وہی کسی شخص کو اہل الرای کے طبقہ میں شامل کرتی تھی اور اسی کی بنیاد پر وہ شوریٰ کا رکن بنتا تھا، اگرچہ رکن شوریٰ کسی تنخواہ کا حقدار نہیں ہوتا تھا مگر اس کو اسلامی امت میں کافی قدر و منزلت حاصل ہوتی تھی۔

۲۔ سکریٹری (کاتبین)

کاتب کے لغوی معنی لکھنے والے، نویسندہ اور ناقل کے ہیں۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ لفظ اصطلاح بنتا گیا۔ اور حکومتی تنظیم میں سکریٹری کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ یہ لفظ بطور اصطلاح اسلامی عہد سے قبل عرب میں مستعمل تھا۔ کیونکہ لکھنے کا رواج بہت کم تھا حتیٰ کہ مکہ میں جو عرب کا ہر لحاظ سے عظیم ترین شہر تھا، چند ہی لوگ لکھنے کا فن جانتے تھے۔ جو لوگ لکھنا (کتابت) جانتے تھے۔ ان کو سماج میں بڑی قدر و منزلت حاصل تھی اور احتراماً ان کے نام کے ساتھ الکاتب (لکھنے والا) لگایا جاتا تھا [۶۱]۔ اسلام کی آمد کے بعد کتابت کے فن کو خاص طور سے اور دوسرے علوم و فنون کو عام طور سے ترقی ملی۔ کیونکہ حضور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکی دورِ حیات ہی میں وحی الٰہی اور سیاسی دستاویزات کی کتابت کے لئے متعدد کاتبوں کی خدمات حاصل کی تھیں۔ ایک روایت کے مطابق مکہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اہم ترین کاتبوں میں حضرت شرحبیل بن حسنہ کندی شامل تھے جو ابتدائی مسلمان ہونے کے علاوہ اس فن کے ماہر تھے [۶۲] مجموعۃ الوثائق میں منقول ایک دستاویز نبوی سے اس کی تصدیق ہوتی ہے جس کے مطابق انہوں نے داریین الخم کے کچھ لوگوں کے لئے جنہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مکہ میں ملاقات کی تھی، ایک خط امان لکھ کر دیا تھا [۶۳] مکی عہد میں اور جن صحابہ کرام نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے لکھا تھا۔ ان میں حضرات عبداللہ بن سعد بن ابی سرح عامری، ابوبکر تیمی، عمر بن خطاب عدوی، عثمان بن عفان اموی اور علی بن ابی طالب ہاشمی کے علاوہ متعدد دوسرے بھی غالباً شامل تھے۔

مدینہ منورہ میں اسلامی ریاست کے قیام کے بعد کاتبوں کے کام کی نوعیت مذہبی ہونے کے ساتھ سیاسی رنگ بھی اختیار کر گئی تھی۔ چودھویں صدی کا ایک متاخر مصنف القلقشندی اپنے زمانے کے ریاستی شعبہ دیوان الانشاء (شعبہ مراسلات و رسل و رسائل) کے نقطۂ آغاز سے بحث کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ پہلا دیوان تھا جو اسلام میں پہلی بار اس وقت متعارف ہوا تھا۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بنیاد ڈالی تھی [۶۴]۔ اگرچہ اس زمانے میں وہ اس نام سے نہیں جانا جاتا

تھا۔ بہرحال یہ ناقابل انکار و تردید تاریخی حقیقت ہے کہ اسلامی ریاست کے سربراہ کی حیثیت سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے فوجی افسروں، امرائے سرایا، سالاروں، گورنروں اور صوبائی و مقامی منتظموں، قبائلی سرداروں، ملک و بیرون ملک کے حکمرانوں اور مسلم عوام کے نام خطوط و فرامین لکھنے پڑتے تھے۔ ان کے علاوہ آپ نے متعدد عرب، عیسائی اور یہودی قبیلوں سے صلح و باہمی تعاون کے معاہدے کئے تھے۔ بعد کے زمانے میں غیر مسلم طبقات کے نام فرامین صادر کئے تھے۔ متعدد افراد اور گروہوں کو خط امان و آزادی عطا فرمائے تھے اور بہت سے لوگوں کو قطائع عطا کئے تھے تو ان کے پروانے بھی لکھوائے تھے۔ ان تمام اور ان جیسے دوسرے متعدد مقاصد کے لئے کاتبوں کے ایک پورے شعبہ کی ضرورت تھی اور رفتہ رفتہ یہی شعبہ پہلے دیوان رسالت اور پھر دیوان الانشاء کہلایا تھا۔

ان کاتبوں کی تعداد جنہوں نے عہد نبوی میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے لکھنے کی سعادت حاصل کی تھی مختلف مصنفین کے نزدیک مختلف ہے۔ ابن اسحاق اور ان کے جامع ابن ہشام نے اپنی سیرت میں ان میں سے محض چند کے نام گنائے ہیں[۲۵] جبکہ واقدی نے متعدد کاتبوں کا ذکر کیا ہے[۲۶]۔ ابتدائی مصنفین میں ابن سعد نے صرف سولہ کاتبین رسول کا حوالہ دیا ہے[۲۷] جبکہ بلاذری اور طبری نے صرف دس نام گنائے ہیں[۲۸]۔ بہرحال یہ متاخر مصنفین اور سیرت نگاروں کی کاوشیں تھیں۔ جنہوں نے تمام کاتبین رسول کا استقصا کرنے کی کوشش کی اور اپنے بس بھر ان کی تعداد بتائی۔ ابن عساکر نے اپنی تصانیف تاریخ دمشق اور بہجۃ المحافل میں بالترتیب ۲۳ اور ۲۵ کاتبین نبوی کا ذکر کیا ہے[۲۹]۔ ان میں سے بیشتر کا ذکر ابن سعد کی طبقات میں ملتا ہے[۳۰]۔ اتنی ہی تعداد کا ذکر ابن عبدالبر نے اپنی کتاب الاستیعاب میں کیا ہے[۳۱]۔ قرطبی کی تفسیر قرآن میں ۲۶ کاتبوں کا ذکر ملتا ہے۔ جبکہ شبر المسی کی فہرست میں پورے چالیس کاتبوں کا حوالہ ملتا ہے۔ حافظ زین الدین عراقی کی منظوم سیرۃ میں اس سے زیادہ ۴۲ کاتبوں کے نام ملتے ہیں۔ جبکہ سب سے زیادہ نام گنانے کا شرف برہان حلبی کی کتاب حواشی الشفاء کو حاصل ہے۔ جس کے مطابق ان کی کل تعداد ۴۳ تھی[۳۲]۔ بہرحال اس تمام تر تحقیق و تفتیش کے باوجود یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ یہی آخری فہرست یا مکمل حقیقی تعداد تھی۔ کیونکہ اس کا امکان بہرحال موجود ہے کہ متعدد دوسرے صحابہ نے بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے لکھا ہو۔ اور ان کے ناموں کو مآخذ میں سے کسی نے محفوظ نہ رکھا ہو۔

بہرحال سردست ہماری گفتگو کا موضوع رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتبوں کی تقرری اور انکی کارکردگی ہے۔ یہ نکتہ شروع میں ذکر کرنے کے قابل ہے کہ اس زمرہ کارکنان ریاست اسلامی میں مستقل کاتبوں سے لے کر نیم مستقل اور عارضی یا جز وقتی کارکنوں تک کا ذکر ملتا ہے۔ ذیل میں ہم ان کاتبوں کی کارکردگی کا مطالعہ کریں گے۔

اسلام کی اہم ترین کتاب قرآن پاک ہے۔ جس کی بنیاد وحی الٰہی پر ہے۔ روایات کے مطابق اس کی کتابت اہم ترین اہمیت کی حامل تھی اور چونکہ وہ ایک انتہائی ذمہ داری کا کام تھا جس میں محض فن کتابت کی مہارت کے علاوہ خلوص و ایمان اور ایمانداری بھی ضروری تھی۔ اس لئے اس کی کتابت کی ذمہ داری صرف چند مخلص و دیندار صحابہ کرام کے سپرد کی جاتی تھی مکی عہد میں اس کی سعادت حضرات شرحبیل بن حسنہ کندی، ابوبکر تیمی، عمر عدوی، عثمان اموی اور علی ہاشمی کے علاوہ ایک روایت کے مطابق

عبداللہ بن سعد بن ابی سرح عامری کو بھی ملی تھی ۲۳۔ لیکن مآخذ سے ثابت ہوتا ہے کہ وحی الٰہی زیادہ تر اس زمانے میں حضرات عثمان اموی اور علی ہاشمی لکھا کرتے تھے۔ جبکہ مدینہ منورہ میں یہ سعادت بیشتر حضرات ابی بن کعب خزرجی اور زید بن ثابت خزرجی کے نصیب میں آئی تھی۔ بعد میں یہ سعادت حضرت معاویہ بن ابی سفیان اموی کے نصیب کا مستقل و لازمی حصہ بن گئی تھی"۔ بلا ریب موخر الذکر تینوں صحابہ کرام وحی الٰہی کے مستقل کاتب تھے۔ ان میں سے روایات کے مطابق حضرت ابی بن کعب کاتب اکبر تھے کہ ان کی موجودگی میں کسی اور کو یہ سعادت نہیں ملتی تھی ۲۵، روایت ہے کہ ان کی غیر حاضری میں حضرت زید بن ثابت کتابت وحی الٰہی کیا کرتے تھے ۲۶۔ متعدد و مستند مصنفین و محدثین جیسے ابن عبدالبر، بخاری، نووی، اور عراقی وغیرہ کا اتفاق ہے کہ ہجرت کے بعد حضرت زید بن ثابت مستقل خدمت نبوی میں حاضر رہتے تھے۔ اس لئے ان کو خطوط و فرامین نبوی اور وحی الٰہی لکھنے کی جس قدر سعادت ملی کسی اور کے نصیب میں نہیں آئی۔ لیکن فتح مکہ (یا عمرۃ القضاء) کے بعد حضرت معاویہ بن ابی سفیان اموی نے کچھ اس عزیمت و محبت، پابندی و دلجمعی اور استقلال کے ساتھ صحبت نبوی اختیار کی کہ کوئی ان کا اُس معاملہ میں ثانی نہیں رہا۔ چنانچہ روایات کے مطابق انہوں نے بقیہ عہد نبوی میں مسلسل کلام الٰہی کی کتابت کی سعادت حاصل کی تھی"

اس شعبہ ریاست اسلامی کے مطالعہ میں ایک دلچسپ پہلو ان دستاویزات و معاہدات نبوی کا تجزیہ بھی ہیں جو مجموعۃ الوثائق میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے جمع کر دیئے ہیں۔ اس کے تجزیئے سے بعض بہت اہم اور دلچسپ نکات سامنے آتے ہیں۔ اس میں منقول کل دستاویزات کی تعداد ۲۴۶ ہے۔ جن کا تعلق عہد نبوی سے ہے۔ ان میں سے متعدد خطوط مختلف عرب حکمرانوں، قبائلی سرداروں اور غیر ملکی بادشاہوں یا مسلم گورنروں اور افسروں کے ہیں۔ جو انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں بھیجے تھے۔ ان کے علاوہ کچھ ایسی بھی دستاویزیں ہیں جن کا متن نادارد ہے۔ لہٰذا ان کی حیثیت محض حوالوں کی سی ہے۔ جن سے کچھ بھی نہیں معلوم ہوتا۔ سوا اس کے کہ آپ نے یہ خطوط و معاہدات لکھوائے تھے۔ بہر حال کم از کم ۹۴، دستاویزیں ایسی ہیں جو اپنے کاتبوں کے نام بھی رکھتی ہیں ۲۸۔ ان کا تجزیہ ذیل میں پیش ہے۔

نمبر شمار	کاتب کا اسم گرامی	تعداد دستاویزات مکتوبہ
۱	حضرت علی بن ابی طالب ہاشمی	۱۲
۲	حضرت ابی بن کعب خزرجی	۱۱
۳	حضرت معاویہ بن ابی سفیان اموی	۱۱
۴	حضرت خالد بن سعید اموی	۹
۵	حضرت مغیرہ بن شعبہ ثقفی	۷
۶	حضرت علاء بن عقبہ	۴
۷	حضرت ارقم بن ارقم مخزومی	۴
۸	حضرت ثابت بن قیس بن شماس خزرجی	۴
۹	حضرت عثمان بن عفان اموی	۲
۱۰	حضرت شرحبیل بن حسنہ کندی	۲

۱۱	حضرت جہیم بن صلت	۲
۱۲	حضرت علاء بن حضرمی	۲
۱۳	حضرت عبداللہ بن زید	۱
۱۴	حضرت عبداللہ بن ابی بکر تیمی	۱
۱۵	حضرت محمد بن مسلمہ اوسی	۱
۱۶	حضرت زبیر بن عوام اسدی	۱

اس واقعاتی تجزیے سے مذکورہ بالا مصنفین کے بیانات کی کسی حد تک تصدیق ہوتی ہے[۷۹] اس فہرست سے سب سے اہم استثنا حضرت زید بن ثابت خزرجی کا ہے جن کا نام کسی ایک بھی دستاویز میں نہیں ملا۔ حالانکہ مآخذ کا دعویٰ ہے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مستقل کاتبوں میں سے ایک تھے۔ اس کی یہی توجیہہ کی جا سکتی ہے کہ صحابی موصوف زیادہ تر وحی الٰہی، فرائض (صدقات و ترکہ کے متعلق امور) اور سہمان (مال غنیمت کے حصص) کی کتابت کیا کرتے تھے[۸۰] جبکہ مذکورہ بالا تجزیے میں جن دستاویزات کا ذکر کیا گیا ہے ان کا تعلق سیاسی و انتظامی قسم کے معاملات و امور سے تھا۔

دوسری قسم کی دستاویزات میں صلح کے معاہدوں اور پروانہ ہائے امان و تحفظ کو اہم مقام حاصل تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی بن ابی طالب ہاشمی زیادہ تر صلح و باہمی تعاون کے معاہدوں کی کتابت کیا کرتے تھے۔ جیسا کہ بعض ابتدائی مصنفین کا دعویٰ بھی ہے[۸۱] دلچسپ بات یہ ہے کہ مذکورہ بالا معاہدات و دستاویزات نبوی کا تجزیہ بھی اس کی پوری طرح سے تصدیق کرتا ہے۔ مثال کے طور پر قریش کے ساتھ معاہدہ (صلح حدیبیہ)[۸۲] کے علاوہ انہوں نے مقنا، بنو زیاد، بن الحارث بن کعب کے لوگوں[۸۳] ہمدان کے ایک سردار عمیر[۸۴]، احمر بن معاویہ تمیمی[۸۵] اور نعیم بن مسعود اشجعی[۸۶] وغیرہ سے جو معاہدے مذکور ہیں۔ وہ سب حضرت علی ہاشمی نے ہی تحریر کئے تھے۔ مذکورہ بالا تمام سولہ کاتبوں کو اس شعبہ میں بھی شمار کرنا چاہیئے۔ کیونکہ انہوں نے ایک یا دو خط اس زمرہ میں بھی لکھے تھے۔ اس فہرست میں حضرت ابوبکر صدیق کے مولیٰ حضرت عامر بن فہیرہ کا ذکر نہیں آیا ہے۔ جنہوں نے سفر ہجرت نبوی کے دوران سراقہ بن مالک مدلجی کو پروانہ امان لکھ کر عطا کیا تھا[۸۷]

کتانی کا دعویٰ ہے کہ حضرات عبداللہ بن ارقم اور زید بن ثابت وہ خطوط و فرامین نبوی لکھا کرتے تھے۔ جو غیر ملکی حکمرانوں، اسلامی ریاست کے مختلف گورنروں اور اسلامی لشکروں کے سالاروں کے نام ہوتے تھے[۸۸] یہ بات دلچسپ ہے کہ غیر ملکی حکمرانوں کے نام لکھے گئے خطوط نبوی ہیں جن کے متن دستیاب ہوئے ہیں۔ ان میں سے کسی کے کاتب کا نام نہیں مذکور ہوا ہے۔ دوسری جانب مدائنی کے اس دعوے کی کہ حضرت معاویہ اموی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور عرب قبائل کے درمیان معاہدے لکھا کرتے تھے[۸۹] تصدیق متعدد حقائق سے ہوتی ہے۔ نہد کے ایک خاندان بنو قرہ، نجران کے عیسائی طبقات، ربیعہ بن ذی المرحب اور حضرموت کے قیل (حکمراں)، حضرت وائل بن حجر کے نام تحریر کردہ تمام فرامین حضرت معاویہ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں۔[۹۰] ممکن ہی نہیں یقینی ہے کہ بہت سے ایسے خطوط و دستاویزات ہوں گی جو ان کے قلم کی رہین منت رہی ہوں گی

مجموعۃ الوثائق میں منقول متعدد قطائع کے فرامین مختلف کاتبوں جیسے حضرات علی، معاویہ، خالد بن سعید، الارقم، علاء بن عقبہ، یزید بن ابی سفیان، مغیرہ بن شعبہ، جہیم بن صلت، قیس بن ثابت اور ابی بن کعب وغیرہ کے تحریر کردہ تھے[۹۱]۔ ماخذ کا یہ بھی بیان ہے کہ دو صحابی حضرات حصین بن نمیر اور مغیرہ بن شعبہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بعض خاص معاملات اور خفیہ امور کے بارے میں لکھا کرتے تھے۔ جبکہ حضرات زبیر بن عوام اور جہیم بن صلت صدقات و محاصل سے متعلق امور کی تحریر و کتابت کے ذمہ دار تھے۔ حضرت حذیفہ بن یمان اراضی کی پیداوار کے معاملات تحریر کرتے تھے۔ جبکہ حضرت شرحبیل بن حسنہ کندی بادشاہوں اور حکمرانوں کے نام خطوط نبوی تحریر کیا کرتے تھے[۹۲]۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مختلف کاتبوں کو مختلف کام انکی صلاحیتوں اور فنی مہارتوں کے سبب عطا کئے گئے تھے۔

اس بحث میں عہد نبوی کے طریق کتابت اور طرز تحریر کا مطالعہ بھی دلچسپی کا باعث ہوگا۔ جب کبھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی تحریر لکھوانے کی ضرورت پیش آتی تھی تو آپ کاتب کو طلب فرماتے تھے۔ کاتب لکھنے کے تمام ساز و سامان جیسے قلم، روشنائی، کاغذ یا چمڑے یا چھال کی تختیوں یا اوراق کے ساتھ حاضر ہوتا تھا اور خدمت نبوی میں دو زانو بیٹھ کر آپ سے املا لیتا تھا[۹۳]۔ نامۂ مبارک کی ابتدا بسم اللہ[۹۴] سے ہوتی تھی جو بالکل اوپر لکھا جاتا تھا۔ اس کے بعد لکھنے والے یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نامی اسم گرامی لکھا جاتا تھا اور اس کے بعد مکتوب الیہ کا نام[۹۵]۔ ان دونوں ناموں کے ساتھ مناسب خطابات یا القابات ہوتے تھے۔ مختصر سے تمہیدی یا دعائیہ کلمات کے بعد اما بعد کا سکہ بند فقرہ آتا تھا۔ جس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ اب اصل متن شروع ہو رہا ہے۔ اصل متن کے بعد عام طور سے خط کا خاتمہ والسلام کے فقرہ سے ختم ہوتا تھا۔ اور اس کے بعد کبھی کبھی کاتب خط کا نام بھی ضبط تحریر میں آجاتا تھا۔ معاہدے کی زبان تھوڑی سی مختلف ہوتی تھی اور اس کے آخر میں اکثر و بیشتر گواہوں کے نام بھی مذکور ہوتے تھے[۹۶]۔ خط کے آخر میں مہر رسالت لگائی جاتی تھی۔ یہ مہر دراصل رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خاتم (انگوٹھی) تھی جو چاندی کی تھی اور جسے روایات کے مطابق آپ نے پہلی بار صلح حدیبیہ کے بعد اس وقت بعض صحابہ کرام کے مشورے پر بنوایا تھا۔ جب آپ نے غیر ملکی پڑوسی حکمرانوں کو خطوط بھیجنے کا ارادہ کیا تھا[۹۷]۔ اس مہر میں کلمہ طیبہ کا آخری جملہ (محمد رسول اللہ) محمد اللہ کے رسول ہیں، کندہ تھا اور الفاظ کی ترتیب یہ تھی کہ آپ کا نام سب سے نیچے اور اللہ کا نام سب سے اوپر کندہ تھا اور درمیان میں لفظ رسول محمد رسول اللہ[۹۸]

ماخذ کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مہر مبارک کا ایک محافظ بھی تھا۔ بخاری کی تاریخ میں ایک روایت ہے[۹۹] جس کی تائید اسد الغابہ سے بھی ہوتی ہے[۱۰۰] کہ حضرت معیقب بن ابی فاطمہ دوسی، جو خاندان سعیدی / بنو امیہ کے ایک حلیف اور قدیم کی مسلم تھے، صاحب خاتم الرسول تھے اور جب کبھی آپ انگوٹھی کو اپنی انگلی میں پہننا پسند نہیں فرماتے تھے۔ آپ اس کو ان کی حفاظت میں دے دیتے تھے اور وقت ضرورت طلب کر کے استعمال فرماتے تھے۔ العقد الفرید کے مصنف نے اس سلسلہ میں دو روایتیں بیان کیں ہیں۔ ایک مذکورہ بالا روایت کی مکمل تصدیق کرتی ہے۔ مگر دوسری خاتم رسول کے محافظ صحابی کا نام حضرت حنظلہ بن ربیع اسدی بتاتی ہے[۱۰۱]۔ اگرچہ امکان کم ہے تاہم اس سے قطعی طور پر انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس سعادت کو حاصل

کرنے والے دونوں ہی صحابی ہیں ہوں اور پہلے ایک کو یہ سعادت حاصل رہی ہو اور بعد میں دوسرے کے حصہ میں آئی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک ہی زمانے میں باری باری سے دونوں کو یہ خدمت سونپی جاتی رہی ہو۔

اس بحث کے خاتمہ پر ذیل میں تمام کاتبوں کی ایک جدول دی جا رہی ہے، جس میں ان کے قبائلی تعلق، علاقہ اور ہر قبیلہ کے مجموعی کاتبوں کی تعداد ظاہر کی گئی ہے۔

علاقہ		قبیلہ / خاندان	کاتبوں کی تعداد
مرکزی عرب	۱۔	قریش	۲۲
	(الف)	ہاشم	۱
	(ب)	امیہ	۷
	(ج)	مطلب	۱
	(د)	مخزوم	۳
	(س)	زہرہ	۲
	(ص)	تیم	۳
	(ط)	عدی	۱
	(ع)	سہم	۱
	(ف)	عامر بن لوی	۲
	(ق)	اورم	۱
	۲۔	خزرج	۲
	۳۔	اوس	۲
	۴۔	انصاری (بلا تعیین)	۱
مشرقی عرب	۱۔	ثقیف	۱
مغربی عرب	۱۔	اسلم	۱
	۲۔	دوس	۱
شمالی عرب	۱۔	عذرہ	۱
جنوبی عرب	۱۔	کندہ	۱
	۲۔	عیسائی نومسلم	۱
	۳۔	حضرموت	۱

قبائل پراگندہ	۱۔ تمیم	۱
غیر معروف	—	۵
میزان	۱۳۔ قبیلے	۴۴

حضرت بلال حبشی کا مقام

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سیکریٹریوں پر بحث کے اختتام پر حضرت بلال حبشی کے مقام و مرتبے پر گفتگو ضروری معلوم ہوتی ہے۔ غالباً وہ کبھی اسلامی ریاست کے شعبہ کاتبین میں شامل نہیں رہے لیکن جہاں تک لفظ سیکریٹری کا تعلق ہے، وہ صحیح معنوں میں اس کے حقدار تھے وہ سفر و حضر، دکھ و سکھ، امن و جنگ کسی بھی عالم میں صحبت نبوی سے دور نہیں رہتے تھے۔ تعلق خاطر ان کو کہیں اور چین نہیں لینے دیتا تھا۔ اور خود رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ مآخذ کا بیان ہے کہ وہ آپ کے بیشتر ذاتی اور سرکاری کاموں اور ضروریات (حوائج) کی تکمیل کرتے تھے۔ چند مثالیں اس بیان کی تصدیق کے لئے کافی ہوں گی۔

جہاں تک رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی اور نجی ضروریات کا تعلق ہے تو حضرت بلال حبشی آپ کے تمام گھریلو کاموں جیسے بازار سے روزمرہ کا سودا سلف خریدنا، قرضوں کی فراہمی اور ادائیگی کے انتظامات کرنا، آپ کے مہمانوں کے آرام و آسائش کا خیال رکھنا۔ اور اس جیسے متعدد کاموں کی دیکھ بھال کرتے تھے[۱۰۲] وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نمازوں کے اوقات اور جماعت کی تیاری کی اطلاع بھی کرتے تھے۔ جیسا کہ واقدی اور بلاذری کا بیان ہے[۱۰۳]۔ بلاذری کے ایک بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت بلال حبشی آپ کے وضو کے پانی کے انتظام کے بھی نگران تھے اور نمازوں میں آپ آگے سترہ کے لئے نیزہ رکھا کرتے تھے[۱۰۵] اور خاص خاص مواقع پر وہ نیزہ لیکر آپ کے آگے آگے چلا کرتے تھے۔

اسد الغابہ کا بیان ہے کہ حضرت بلال حبشی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خازن (خزانچی) بھی تھے[۱۰۶] اور وہ اپنے کپڑے یا جیب میں چاندی رکھا کرتے تھے[۱۰۷] یہ خام چاندی بھی ہوتی تھی جو وزن کے اعتبار سے سکوں کی جگہ استعمال ہوتی تھی یا ڈھلے ہوئے سکے بھی ہوتے تھے۔ اس بیان کی تصدیق ابن اسحاق جیسے متعدد ابتدائی مآخذ سے ہوتی ہے۔ چنانچہ غزوہ ذات الرقاع کے دوران جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی سے ایک اونٹ ایک اوقیہ چاندی (چالیس درہم) میں خریدا تھا تو اس کی ادائیگی حضرت بلال ہی نے ہدایت نبوی کے بموجب کچھ اضافہ و انعام کے ساتھ کی تھی[۱۰۸] اس کے علاوہ بعض اور خریداری کی رقم بھی حضرت بلال نے ادا کی تھی۔ جس کے حوالے مآخذ میں جا بجا ملتے ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت سربراہ مملکت جن لوگوں کو انعامات سے نوازتے تھے۔ ان کی ادائیگی حضرت بلال ہی کے ہاتھوں سے ہوتی تھی۔ مثال کے طور پر جعرانہ میں اموال غنیمت کی تقسیم کے وقت جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سرداران قریش و عرب قبائل کو انعامات سے مشرف کیا تھا، تو حضرت معاویہ اور یزید فرزندان ابوسفیان اموی کو فی کس چالیس اوقیہ چاندی

حضرت بلال حبشی ہی نے اپنے دست مبارک سے عطا کی تھی [۱۰۹]۔ امکان ہے کہ اس موقعہ پر دوسرے سرداروں کو جو چاندی کی رقم ملی تھی وہ ان ہی کے توسط سے ملی تھی۔ اس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اسلامی مساوات کے مظاہرہ کی پالیسی بھی کارفرما تھی کہ ایک حبشی مولیٰ کے ہاتھوں اشراف قریش و عرب کو انعامات دلوائے تھے۔ واقدی کا بیان ہے کہ حضرت بلال ہمیشہ اپنے ساتھ چاندی رکھا کرتے تھے اور جب اور جہاں کہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کو عطایا دینا چاہتے تھے وہ حضرت بلال کو اشارہ کرتے تھے اور اس کی وہ فوری تعمیل کرتے تھے [۱۱۰]۔ اسی طرح متعدد حوالے ان انعامات کے بھی ملتے ہیں جو بحکم نبوی حضرت بلال حبشی نے عرب وفود کے بعض ارکان کو عطا فرمائے تھے۔ ان میں بنو تمیم کے وفد کا ذکر صریحاً ملتا ہے [۱۱۱]۔ غالباً وہ خراج اور صدقات کی شکل میں آنے والی سرکاری رقوم کے مصارف کے بھی نگران تھے۔ جیسا کہ فدک اور بحرین کے صدقات و خراج کے بارے میں معلوم ہوتا ہے [۱۱۲]۔

ماخذ سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت بلال حبشی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مستقل منادی (اعلان کرنے والے) تھے۔ غزوات حمراء الاسد اور بنو قریظہ کے زمانے حضرت بلال حبشی ہی نے مسلم مجاہدین کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حکم سے باخبر کیا تھا کہ وہ دشمنوں سے آخری وقت تک جنگ کریں [۱۱۳]۔ غزوہ خیبر میں انہوں نے ہی اپنے اعلان کے ذریعہ محصور دشمنوں کے باغات میں کھجور کے درختوں کے کاٹنے کی ممانعت کر دی تھی اور اس طرح پہلے حکم نبوی کو منسوخ کیا تھا [۱۱۴]۔ غزوہ حنین میں بھی انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک حکم کو مسلم مجاہدین تک پہنچایا تھا [۱۱۵]۔ ان وقتی اعلانات کے علاوہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مستقل منادی تھے کہ مسلمانوں کو مسجد نبوی میں حکم و اذان نبوی پر جمع کیا کرتے تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب کبھی مسلمانوں سے کوئی عام یا خاص خطاب کرنا چاہتے تھے تو کبھی حضرت بلال مسجد نبوی سے اذان دیتے تھے اور کبھی مدینہ کی گلیوں میں الصلوٰۃ جامعۃ (نماز جمع کرنے والی ہے) کی صدائیں دیتے گذرتے اور مسلمانان شہر کو دعوت نبوی پہنچاتے تھے [۱۱۶]۔

ان کے علاوہ حضرت بلال حبشی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد دوسرے متفرق کام بھی انجام دیتے تھے مثال کے طور پر غزوہ ذو امر میں ایک نومسلم کی مذہبی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری نبھائی تھی [۱۱۷]۔ وہ مہمانان رسول کی مستقل طور سے ضیافت کے انتظامات کے نگران تھے۔ چنانچہ متعدد وفود کی ضیافت انہوں نے ہی کی تھی۔ اس سلسلے میں تمیم اور ثقیف کے ارکان وفود کی ضیافت کے صریح حوالے ملتے ہیں [۱۱۸]۔ خیبر کی مہم کے دوران حضرت بلال نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نئی بیوی حضرت صفیہ کو خیمہ نبوی میں پہنچانے کا نازک کام انجام دیا تھا [۱۱۹]۔ سریہ دومۃ الجندل کی روانگی سے قبل حضرت بلال ہی نے امیر سریہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف زہری کو علم (لواء) عطاء فرمایا تھا [۱۲۰]۔ فتح مکہ کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال کو حضرت طلحہ بن عثمان عبدری متولی کعبہ سے بیت اللہ کے دروازے کی چابی لانے کو کہا تھا۔ جس کی انہوں نے تعمیل کی تھی [۱۲۱]۔ اور یہ بھی قابل ذکر بات ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خانہ کعبہ میں داخل ہونے والے دو صحابہ میں متولی کعبہ کے علاوہ حضرت بلال حبشی ہی تھے یہ تمام اور ان جیسے دوسرے متعدد امور اور واقعات اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ حضرت بلال حبشی کو نہ صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نجی ضروریات کی نگرانی حاصل تھی بلکہ وہ ریاست اسلامی میں حکومتی شعبہ میں سلسلہ افسران میں بھی تھے اور کافی اہم اور محبوب مقام رکھتے تھے۔

۴ سفیرانِ نبوی (رُسل)

سفارہ کا ادارہ یا عہدہ اسلام سے قبل جزیرہ نمائے عرب میں یا کم از کم مکہ میں معروف تھا۔ کیونکہ قریشی اشرافیہ میں وہ موجود تھا[۱۲۲]۔ روایتی لحاظ سے خاندان بنو عدی مدت مدید سے اس کا منصب دار تھا۔ اور اسی کے اراکین اس اہم عہدے پر فائز ہوتے چلے آئے تھے۔ بعثت نبوی کے زمانے میں حضرت عمر بن خطاب عدوی اس کے منصب دار تھے۔ جنہوں نے غالباً اپنے باپ خطاب سے یہ عہدہ پایا تھا۔ ان کے دادا نفیل کے بارے میں صراحت کے ساتھ ذکر ملتا ہے۔ کہ وہ اس منصب کے منصبدار ہونے کے علاوہ قریشی رؤسا و شیوخ میں شمار ہونے تھے۔ بہرحال حضرت عمر اسلام سے قبل کے سیاسی نظام قریش میں اس کے آخری عہدیدار تھے اور اس حیثیت سے وہ عرب قبائل اور قریش کے درمیان تعلقات کے ضمن میں قریش کی نمائندگی کرتے تھے۔ اس سے زیادہ ہم اس عہدے کی کارکردگی کے بارے میں اور کچھ نہیں جانتے کیونکہ تفصیلات معدوم ہیں[۱۲۳]۔

بہرکیف مآخذ سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست نے جاہلی عربوں کے ادارۂ سفارہ کو ترکہ میں پایا تھا اور پھر اپنی ضروریات اور عصری تقاضوں کے تحت اس میں نئی جہتوں کا اضافہ کیا تھا اور اس کو ایک مخصوص شکل میں ترقی و وسعت دی تھی۔ قدیم جاہلی عہدہ سفارہ اسلامی ریاست کے انتظامیہ میں رسالۃ اور سفیر رسول کہلانے لگا تھا۔ اس کے علاوہ ایک اور امتیاز یہ پیدا ہوا تھا کہ جاہلی نظام میں سفیر مستقل منصبدار ہوتا تھا۔ جو تازندگی اپنے عہدے پر فائز رہتا تھا۔ اور اس کے بعد وہ عہدہ اسی کے خاندان کے افراد کو ملتا تھا۔ اس طرح سے یہ منصب موروثی بھی تھا۔ مگر اسلامی سیاسی نظام میں موروثی عہدوں کی اصولاً گنجائش نہیں تھی اور نہ ہی تازندگی منصبداری کے حق کی ضمانت، کیونکہ عہدے دار کے لئے اہلیت و لیاقت کے سوا حسن عمل اور بہتر کارکردگی اور خوشنودی سربراہ مملکت بھی لازمی تھی، جو حالات کے تحت بدل سکتی تھی۔ بہرحال اسلامی ریاست میں رسالہ کا عہدہ تو مستقل تھا۔ مگر رسول کے عہدے دار عارضی ہوتے تھے اور ان کو وقت و ضرورت کے مطابق مقرر و مبدل کیا جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلامی ریاست میں متعدد بلکہ بہت سے لوگ اس عہدۂ جلیل پر سرفراز ہوئے۔

ایک اچھے سفیر یا رسول کے لئے ضروری اوصاف اور خوبیوں کا ذکر صراحت کے ساتھ مآخذ میں کہیں نہیں ملتا۔ تاہم ان سے ان کو مستنبط کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں۔ کتانی نے اس موضوع پر پوری ایک فصل باندھی ہے اور اس کے مطابق ایک عمدہ سفیر کے لئے کم از کم چار اوصاف لازمی و ناگزیر تھے۔ اعلیٰ فراست و ذہانت، عمدہ زبان و طرز ادا، جاذب نظر شخصیت اور علاقہ تقرری و ادائیگی فرائض کی زبان پر قدرت۔ یہ وہ اوصاف تھے، جو ایک اچھا سفیر بناتے تھے[۱۲۴]۔ اس کے علاوہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم موقعہ محل کی مناسبت سے مخصوص و موزوں شخص کا انتخاب کرتے تھے اور اس کی روانگی سے قبل حسب معمول اس کو ہدایات دیتے تھے کہ نرم اور اچھی گفتگو کریں، رحمت و نرم دلی کا مظاہرہ کریں، سختی اور سخت روی سے پرہیز کریں، آسانی پیدا کریں اور اختلاف و تصادم سے گریز کریں، خوشخبری سنائیں۔ نفرت و عداوت سے اجتناب کریں؛ اور رحمت و اتفاق کا رویہ اپنائیں[۱۲۵]۔

عہدِ نبوی میں مقرر ہونے والے تمام سفیروں (رسل) کو کتانی نے مختلف طبقات میں تقسیم کیا ہے اور ہر ایک طبقہ سے الگ فصل میں گفتگو کی ہے۔ اس کے مطابق کچھ سفیر تبلیغ اسلام کے لئے بھیجے گئے تھے تو کچھ دوسرے صلح کے معاہدے کرنے کے لئے۔ کچھ نے دوسروں کو امان دی تھی تو کچھ اور نے بادشاہوں سے مسلم طبقات کی واپسی کی درخواست اور اپنے علاقہ یا ملک میں مقیم ایک مسلمان عورت سے امام کی شادی کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔ بعض سفیروں نے امام کی جانب سے دوسروں کو تحائف پہنچائے تھے اور بعض دوسروں نے کافروں کو ان کے کفر کے برے نتائج سے آگاہ کیا تھا[126]۔ ظاہر ہے کہ یہ تقسیم و تعیین کار نہ تو مکمل و ہمہ گیر ہے اور نہ ہی ضروری ہے۔ ذیل میں عہدِ نبوی کے انتظامیہ کے اس شعبہ کی تاریخی ارتقا سے بحث کی جا رہی ہے۔

جہاں تک واقعات شہادت دیتے ہیں۔ اسلامی ریاست میں کسی سفیر کی پہلی تقرری عسکری یا نیم عسکری مہموں کے دوران ہوئی تھی۔ اگرچہ ان کارکنوں یا افسروں کے لئے بسا اوقات مآخذ رسول کی اصطلاح نہیں استعمال کرتے ہیں مگر ان کے کام کی نوعیت ان کو اسی شعبۂ افسران میں شامل کرنے کا تقاضا کرتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ پہلے بھی بعض سفیروں کا تقرر ہوا ہو، مگر مآخذ میں پہلی مثال یا شہادت کا تعلق ۳ھ / ۶۲۵ء سے ہے، جب بنو نضیر کے غزوہ کے دوران رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت محمد بن مسلمہ اوسی کو سفیر بنا کر بنو نضیر کے یہودیوں کے پاس اس غرض سے بھیجا تھا کہ وہ ان کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان کے معاملہ میں آخری فیصلے سے آگاہ کر دیں[127]۔ دو برس بعد جب مدینہ احزاب کے محاصرہ میں گھر چکا تھا تو تین مسلم سفیروں کی تقرری ہوئی تھی۔ ان کے نام تھے حضرات سعد بن معاذ اوسی، سعد بن عبادہ خزرجی اور عبد اللہ بن رواحہ خزرجی[128]۔ ان کو بنو قریظہ کے پاس بھیجا گیا تھا تاکہ ان کو ان کا عہد و معاہدہ یاد دلائیں جو انہوں نے اسلامی ریاست کے دفاع کے لئے کیا تھا اور ان کو احزاب میں شامل ہونے سے روکیں[129]۔ صلح حدیبیہ کے دوران کم از کم تین مسلم سفارتیں یکے بعد دیگرے مکہ بھیجی گئی تھیں۔ مسلم جماعت زائرین کے حدیبیہ میں قیام کے معاً بعد حضرت خراش بن امیہ خزاعی کو مکہ کے اشراف و روٴساء کے پاس بھیجا گیا تھا تاکہ وہ حرم مکہ میں مسلمانوں کے داخلے اور عمرہ کرنے کی اجازت حاصل کریں۔ لیکن ان کی یہ سفارت ناکام رہی[130]۔ چنانچہ کچھ دنوں بعد حضرت عثمان بن عفان اموی کو حضرت عمر کے مشورہ پر اسی غرض سے بھیجا گیا تھا[131]۔ بہر حال اس پوری مدت میں قریش کی جانب سے بھی متعدد سفیر آئے تھے اور آخر کار ان کی آخری سفارت قریش کے شاعر و خطیب سہیل بن عمرو[132] اور حویطب کی سرکردگی میں آئی تھی جس نے معاہدہ حدیبیہ لکھا تھا۔ مسلم جماعت کی نمائندگی اس موقعہ پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا حضرت علی بن ابی طالب ہاشمی نے کی تھی اور انہوں نے ہی صلح کے معاہدہ کی تحریر بھی لکھی تھی۔ صلح حدیبیہ دراصل انہی تمام گفت و شنید کا نتیجہ تھی[133]۔

عام طور پر خیال یہ ہے کہ اسلامی ریاست نے پہلی بار محرم ۷ھ / مئی - جون ۶۲۸ء میں سفیروں کی تقرری کی تھی اور متعدد سفیروں کو جزیرہ نمائے عرب کے مختلف حصوں کے علاوہ بعض پڑوسی ملکوں کے حکمرانوں کے پاس بھی بھیجا تھا۔ ان تمام کی[134] روایت ہے کہ حسبِ ذیل سفیروں کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی دعوت دینے کیلئے مختلف ملکوں میں روانہ کیا تھا:

۱ :	حضرت دحیہ بن خلیفہ کلبی کو	رومی شہنشاہ ہرقل کے پاس
۲ :	حضرت عبد اللہ بن حذافہ سہمی کو	خسرو ایران پرویز کے پاس
۳ :	حضرت عمرو بن امیہ ضمری کو	نجاشی حبش اصحمہ کے پاس

۴ : حضرت حاطب بن ابی بلتعہ لخمی کو	مقوقس مصر کے پاس
۵ : حضرت شجاع بن وہب اسدی کو	ملک تخوم شام کے پاس

ابن سعد[۱۳۵] نے مذکورہ بالا سفیروں میں ایک چھٹے سفیر کا اضافہ کیا ہے کہ اسی دن حضرت سلیط بن عمرو عامری کو شاہان یمامہ کے پاس بھیجا گیا تھا۔ نامہ نبوی کے متون[۱۳۶] کے علاوہ ماخذ[۱۳۷] سے بھی یہ واضح ہوتا ہے کہ ان سفیران حرم کو تبلیغ اسلام کے لئے بھیجا گیا تھا۔ دوسرے الفاظ میں سیاسی طور سے ان سفارتوں کا مقصد یہ تھا کہ پڑوسی شاہان وقت کو اسلامی دعوت کے ساتھ ساتھ اسلامی ریاست کے ساتھ کسی قسم کی مفاہمت اور صلح کے لئے آمادہ کیا جائے تاکہ ایک طرف تو اسلام کی عالمگیر تبلیغ کا دروازہ کھلے تو دوسری طرف تصادم و جارحیت کے امکانات یا خطرات میں کمی پیدا ہو۔ سوائے ایک سفارت کے یہ تمام سفارتیں اپنی مہموں میں کافی کامیاب رہیں، اور انہوں نے اپنے اپنے علاقہ کے حکمرانوں میں خیر سگالی اور دوستی کے جذبات پروان چڑھانے میں کافی مؤثر کردار ادا کیا۔ ماخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ رومی شہنشاہ نے نبوت محمدی کی نہ صرف تصدیق کی بلکہ اپنے عوام کو اسلام کے لئے آمادہ بھی کیا۔ اگرچہ وہ سیاست دربار و امراء سے ڈر گیا۔ تاہم اس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تحائف بھیجے۔ اسی طرح مقوقس مصر اور نجاشی حبش نے نذرانے بھیجے تھے اور سفیران نبوی کا خیر مقدم کیا تھا۔ اور اسلامی ریاست سے دوستی کا دم بھرا تھا۔ ان کے علاوہ دوسرے علاقوں کے سفراء بھی شاداں و فرحاں لوٹے تھے۔ صرف کسرائے ایران خسرو پرویز نے نخوت بادشاہت و غرور طاقت میں دعوت نبوی کو علانیہ ٹھکرا دیا اور یہی نہیں بلکہ نامہ نبوی کو نہ صرف پھاڑ کر پھینک دیا تھا بلکہ اس نے گورنر یمن کے ذریعہ اسلامی ریاست کے خلاف کسی فوجی اقدام کا منصوبہ بھی بنایا تھا۔ لیکن قدرت کا فیصلہ کچھ اور تھا۔ وہ خود ہی اپنے لخت جگر کے ہاتھوں مارا گیا اور اس طرح اپنے انجام کو پہنچا[۱۳۸]

ان سفارتوں کے علاوہ متعدد دوسری سفارتوں کے حوالے ماخذ میں ملتے ہیں۔ ان کے مطابق حضرت علاء بن حضرمی حضرت عمرو بن عاص سہمی اور حضرت مہاجر بن ابی امیہ مخزومی کو بالترتیب بحرین، عمان اور حمیر (یمن) کے بادشاہوں کے پاس بھیجا گیا تھا۔[۱۳۹] ابن سعد کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اول الذکر دونوں سفیروں کو ۸ھ / ۶۳۰ء میں کسی وقت غالباً فتح مکہ کے فوراً بعد بھیجا گیا تھا۔ جبکہ مؤخر الذکر کو کچھ تاخیر سے روانہ کیا گیا تھا:[۱۴۰]

یہ غلط فہمی عام ہوگئی ہے کہ صرف یہی سفارتیں عہد نبوی میں بھیجی گئی تھیں۔ حالانکہ ماخذ سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کے علاوہ متعدد اور سفارتیں ملکی حکمرانوں کے درباروں اور علاقوں میں روانہ کی گئی تھیں۔ ۹ھ / ۶۳۰-۳۱ء میں کم از کم سات سفیروں کو جزیرہ نمائے عرب کے مختلف حکمرانوں اور قبیلوں کے پاس بھیجا گیا تھا۔ ذیل میں ان سفراء نبوی کے اسمائے گرامی اور ان کے علاقوں کے نام دیئے جا رہے ہیں۔

سفراء نبوی کے نام	علاقے یا قبیلے / حکمران
۱۔ حضرت نمیر بن خرشہ ثقفی	طائف کے قبیلوں کے پاس
۲۔ حضرت ظبیان بن مرثد سدوسی	قبیلہ بکر بن وائل 〃

۳۔	حضرت حارث بن عمیر ازدی	شاہ بصریٰ حارث بن عمیر غسانی کے پاس
۴۔	حضرت عیاش بن ابی ربیعہ مخزومی	حمیر کے پاس
۵۔	حضرت وحیہ بن خلیفہ کلبی	اسقف نجران ضغاطر الاسقف کے پاس
۶۔	حضرت علقمہ بن فغواء خزاعی	حضرت ابوسفیان بن حرب اموی کے پاس
۷۔	حضرت عمرو بن فغواء خزاعی	

ابن سعد[141] نے ان میں پہلے پانچ سفراء کا ذکر کیا ہے۔ جبکہ باقی دو کا ذکر ابن اثیر نے کیا ہے[142]۔ پہلی پانچ سفارتیں کلی طور پر سیاسی تھیں یا مذہبی یا دونوں مقاصد پیش نظر تھے جبکہ آخری دو سفیروں کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ رقم دے کر مکہ بھیجا تھا کہ غریب قریشیوں میں اس کو تقسیم کر دیا جائے۔ اسی طرح حضرت عمرو بن امیہ ضمری کے بارے میں بھی ذکر ملتا ہے کہ ان کو بھی کسی وقت اسی مقصد سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوسفیان اموی کے پاس بھیجا تھا[143]۔

حیات نبوی کے آخری برس یعنی ۱۱-۱۰ھ / ۶۳۲-۶۳۱ء میں کسی ایک سال میں سب سے زیادہ سفارتوں کا مشاہدہ کیا جن کی کل تعداد سولہ تھی۔ ان سب کا ذکر اسد الغابہ کے مختلف تراجم میں ملتا ہے۔ مگر ان میں سے بعض کی تصدیق دوسرے ماخذ سے بھی ہو جاتی ہے۔ ابن سعد نے ان میں سے دو کا ذکر کیا ہے[144]۔ یہ تھیں حضرات عمرو بن امیہ ضمری اور جریر بن عبداللہ بجلی کی سفارتیں جو بالترتیب قبیلہ بنو حنیفہ کے جھوٹے نبی مسیلمہ کذاب اور کلاع اور ظلیم کے حکمرانوں کے پاس بھیجی گئی تھیں۔ طبری نے ان میں سے آٹھ کا ذکر کیا ہے[145]۔ ان کا بیان ہے کہ جریر بن عبداللہ کی روانگی کے بعد سات سفراء کو جزیرہ نمائے عرب کے مختلف علاقوں میں بھیجا گیا تھا جو حسب ذیل تھے۔

۱۔	حضرت وبر بن یُحَنِّس خزاعی کو	ابناء یمن اور ان کے سرداروں کے پاس
۲۔	حضرت فرات بن حیّان عجلی کو	بنو حنیفہ کے ایک مسلم سردار حضرت ثمامہ بن اثال کے پاس
۳۔	حضرت اقرع بن عبداللہ حمیری	ذوِد اور مرّان کے حکمرانوں کے پاس
۴۔	حضرت صلصل بن شرحبیل کو	قبیلہ بنی عامر کے پاس
۵۔	حضرت ضرار بن الازور اسدی کو	قبیلہ بنو اسد کے خاندان بنو صیدا اور قبیلہ بنو دیل کے پاس
۶۔	حضرت زیاد بن حنظلہ تمیمی کو	بنو تمیم کے پاس
۷۔	حضرت نعیم بن مسعود اشجعی کو	بنو غطفان یا بنو اشجع کے پاس

بقیہ سفیروں کے اسمائے گرامی اور ان کے علاقوں کے ناموں کے لئے جن کا ذکر صرف اسد الغابہ میں ملتا ہے۔ کتاب کے آخر میں متعلقہ ضمیمہ دیکھنا مفید ہو گا[146]۔ جہاں تک ان سفارتوں کا تعلق ہے تو یہ واضح ہے کہ ان کا سیاسی اور مذہبی دونوں مقصد تھے غیر مسلم حکمرانوں اور قبیلوں کے پاس جو سفارتیں گئی تھیں ان کا مطلوب تھا۔ ان کا اسلام اور اسلام قبول کرنے ہی سیاسی مقصد حاصل ہو جاتا کہ وہ از خود اسلامی ریاست کے مطیع و فرمانبردار بن جاتے۔ مسلم سرداروں کے پاس یا تو اس غرض

سے سفیر بھیجے گئے تھے کہ ان سے ان کے اپنے قبیلہ یا پڑوس کے قبیلہ میں تبلیغ اسلام کا کام لیا جائے۔ یا ان کے قبیلہ کے باغیوں کی سرکوبی کے لیے ان کے مسلم طبقات کی حمایت اور مدد حاصل کی جائے جیسا کہ ابناء یمن اور حضرت ثمامہ حنفی کے نام سفارتوں سے معلوم ہوتا ہے۔ ان میں سے بعض سفارتیں انتظامی مقاصد کے لئے بھیجی گئی تھیں اور قبیلوں یا حکمرانوں سے صدقات و جزیہ کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ عموماً یہ تمام سفارتیں کامیابی سے ہمکنار ہوئی تھیں۔ سوائے مسیلمہ کذاب اور شاہ بصریٰ کے نام کی سفارت کے۔ اوّل الذکر کے بارے میں ہم ابھی مزید دیکھیں گے۔ جبکہ شاہ بصریٰ حارث بن عمیر غسانی نے سفیر نبوی حضرت حارث بن عمیر ازدی کو قتل کر دیا تھا۔ جس کے نتیجے میں اسلامی ریاست کو فوج کشی کرنی پڑی تھی جس کا مطالعہ ہم پہلے کر چکے ہیں۔

یہاں مسیلمہ کذاب کے پاس مختلف نبوی سفارتوں کی روداد کا مطالعہ بڑا دلچسپ ہوگا۔ اس سے ایک طرف تو ان مدعیانِ نبوت کے اصل عزائم پر روشنی پڑے گی تو دوسری طرف ان سرکشوں کے بارے میں اسلامی ریاست کی پالیسی واضح ہوگی۔ مزید یہ کہ قبائل عرب کے بارے میں اسلامی ریاست کے رویہ پر بھی روشنی پڑے گی۔ اس ضمن میں پہلی سفارت حضرت عمرو بن امیہ ضمری کی معلوم ہوتی ہے۔ جو غالباً سنہ ھ / ۶۳۱ء میں بھیجی گئی تھی۔ اس نامہ مبارک سے جو سفیر موصوف لیکر مدعی نبوت کے پاس گئے تھے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ جوابی سفارت تھی۔ اس سے پہلے مسیلمہ کذاب نے خدمت نبوی میں ایک عریضہ بھیجا تھا۔ جس میں اس نے یہ تجویز رکھی تھی کہ وہ تعاون کے لیے تیار ہے۔ بشرطیکہ جزیرہ نمائے عرب کو دو آزاد و خودمختار مملکتوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ جس میں سے ایک اس کے زیر اقتدار ہو۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف اس کی تجویز کو مسترد کر دیا تھا۔ بلکہ اس کو مخالفانہ و معاندانہ رویہ سے باز رہنے کی بھی تلقین کی تھی[۱۴۷]۔ بظاہر یہ سفارت پوری طرح ناکام رہی تھی۔ کیونکہ وہ مسیلمہ کو اس کے ارادوں سے باز نہیں رکھ سکی تھی۔ چنانچہ بلاذری[۱۴۸] کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد دو مزید سفارتیں حضرات حبیب بن زید خزرجی اور عبداللہ بن وہب اسلمی کی سرکردگی میں بھیجی گئی تھیں۔ بظاہر ان کا بھی مقصد یہی تھا کہ مسیلمہ کذاب کو مخالفت کی راہ اپنانے سے روکا جائے[۱۴۹]۔ لیکن اس کا انجام برا نکلا کہ مسیلمہ کذاب نے حضرت حبیب بن زید کو اتنا ستایا کہ ان کو مار ڈالا مگر کسی نہ کسی طرح سے حضرت عبداللہ اسلمی بچ کر نکل آئے اور سارا قصہ خدمت نبوی میں جا کہہ سنایا[۱۵۰]۔ طبری کے بیان سے ایسا[۱۵۱] معلوم ہوتا ہے کہ اس المناک حادثہ کے بعد ہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فرات بن حیان عجلی کی سفارت بنو حنیفہ کے سردار حضرت ثمامہ بن اثال کے پاس بھیجی تھی جس میں ان سے مسیلمہ کذاب کے شر کا انسداد کرنے کی ہدایت تھی[۱۵۲]۔ اگرچہ یہ آخری سفارت مسیلمہ کذاب کے فتنہ کو مکمل طور سے ختم کرنے میں کامیاب نہیں ہوئی تاہم بنو حنیفہ کے بڑے خاصے طبقہ کو اس کے جال سے آزاد کرنے اور اسلامی ریاست کا ہمنوا بنانے میں یقیناً کامیاب ہوئی تھی۔ اس ضمن میں ابناء یمن کے نام حضرت وبر بن یحنس کی سفارت آتی ہے۔ جس نے یمن کے ایرانی اشراف و حکمرانوں سے وہاں کے مدعی نبوت ذوالخمار لغاوت اسود عنسی کے فتنہ و فساد کا خاتمہ کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔ یہ سفارت مکمل کامیاب رہی تھی۔ کیونکہ ابناء یمن نے ایک متحدہ محاذ بنا کر اسود عنسی کا خاتمہ کر دیا تھا۔[۱۵۳]

کتانی[۱۵۴] نے فتح مکہ کے بعد اس کے مفرورین کو تحفظ و ضمانت عطا کرنے والے سفراء نبوی کے ذیل میں دو سفیروں کا

ذکر کیا ہے جن کے نام تھے، حضرات عمیر بن وھب جمحی اور ام حکیم بنت ہشام مخزومی۔ ان دونوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے بالترتیب صفوان بن امیہ جمحی اور عکرمہ بن ابی جہل مخزومی کو تحفظ کی ضمانت دی تھی اور بالآخر ان کو دربار رسالت میں لاکر انہیں ایمان کی دولت سے سرفراز کرنے کا سبب بنے تھے۔ سفراء نبوی کی جو فہرست حافظ زین الدین عراقی نے تیار کی ہے اس میں ان دونوں سفیروں کا ذکر نہیں ہے[۱۵۵]۔ اس فہرست میں کل سترہ سفراء نبوی کے نام شامل ہیں۔ ان مذکورہ بالا تمام سفیروں کے علاوہ مآخذ سے متعدد اور سفیران نبوی کے حوالے ملتے ہیں، مگر ان کے نام نہیں مذکور ہوئے ہیں۔ جیسے فروہ بن عمرو جذامی بنو عمرو/حمیر، عدس/لخم کے مسلمانوں، خالد بن ضماد ازدی، عمرو بن حزم، تمیم اوس، یزید بن طفیل اور بنو زیاد بن الحارث کے پاس متعدد سفیر بھیجے گئے تھے۔ امکان ہے کہ ان کے علاوہ بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد سفیر عرب اور بیرون عرب بھیجے ہوں جن کے نام اور کام محفوظ نہیں رہ سکے بہر حال تمام سفیران نبوی جن کے نام مآخذ میں مذکور ہوئے ہیں کی کل تعداد میری تحقیق کے مطابق ۳۸ ہے۔ جبکہ اس شعبہ میں کل تقرریوں کی تعداد ۴۲ ہے۔ ذیل کی جدول میں ان کا قبائل اور علاقائی تجزیہ پیش کیا جارہا ہے۔

علاقہ	قبیلہ/خاندان	تقرریاں	سفراء
مرکزی عرب	۱۔ قریش	۷	۷
	(الف) بنو ہاشم	۱	۱
	(ب) بنو امیہ	۱	۱
	(ج) بنو سہم	۲	۲
	(د) بنو عامر بن لوی	۱	۱
	(س) بنو مخزوم	۲	۲
	۲۔ خزرج	۳	۲
	۳۔ اوس	۲	۲
شمالی عرب	۱۔ کلب	۳	۲
	۲۔ لخم	۱	۱
مشرقی عرب	۱۔ غطفان	۱	۱
	۲۔ ہوازن	۳	۳
	۳ خزیمہ	۲	۲
مغربی عرب	۱ خزاعہ	۷	۷

	۲۔ کنانہ	۳	۱
	۳۔ ازد شنوءہ	۱	۱
جنوبی عرب	۱۔ بجیلہ	۲	۲
	۲۔ حضرموت	۱	۱
	۳۔ حمیر	۱	۱
	۴۔ سدوس	۲	۲
قبائل پراگندہ	۱۔ تمیم	۱	۱
غیر معروف	-	۲	۲
میزان	۱۶ قبیلے	۴۲	۳۸

۵. مخصوص افسران نبوی (کمشنر)

مرکز میں جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ تمام انتظامی امور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس انجام دیتے تھے لیکن بعض معاملات میں آپ اپنے اختیارات اپنے صحابہ کو منتقل کر دیتے تھے اور ان کے سپرد بعض معاملات کا نفاذ بھی کر دیتے تھے۔ مذکورہ بالا افسران حکومت کے علاوہ آپ نے بعض ایسے افسروں کو بھی مقرر کیا تھا جن کو ہم کسی خاص خانے میں نہیں رکھ سکتے۔ اور نہ ہی مآخذ ان کے لیے کسی مخصوص اصطلاح کا ذکر کرتے ہیں کہ افسران نبوی کا ایک نیا طبقہ بنا دیا جاتا۔ اس کے باوجود بھی یہ طبقہ افسران حکومت نبوی بالکل جدا تھا۔ اور اس کا تعین ہم نے ان کے کاموں کی نوعیت کے لحاظ سے کیا ہے۔ بعض مواقع پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض صحابہ کرام کو مخصوص قسم کے کام سونپے تھے۔ یہ کام بھی عارضی تھے اور ان کے افسر اور عہدے بھی عارضی۔ اس لیے ہم ان کو افسران بکار خاص یا کمشنر بھی کہہ سکتے ہیں۔ ان خصوصی افسروں اور عاملوں کے کاموں کی نوعیت جداگانہ تھی۔ ان میں سے بعض کو اہم ترین کام اور فرائض سونپے گئے تھے۔ جبکہ بعض دوسروں کے کام معمولی نوعیت کے تھے۔ مشہور واقعہ ہے اگرچہ اب جدید مؤرخین نے اس کی صحت پر شک کا اظہار کیا ہے کہ حضرت سعد بن معاذ اوسی کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو قریظہ کے یہودیوں کی غداری کے سلسلہ میں فیصلہ کا مجاز یا حکم مقرر کیا تھا اور پھر ان کے فیصلے کو نافذ بھی کیا تھا۔[157]

ایک خصوصی افسر نبوی حضرت علی بن ابی طالب ہاشمی تھے جن کو تین مواقع پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر کیا تھا ان میں سے دو بار وہ بنو جذیمہ کے قبیلہ کے مسلمانوں کا خون بہا اور دیت ادا کرنے گئے تھے۔ جن کو مسلمان سپاہیوں اور سالاروں نے غلطی سے قتل کر دیا تھا یہ تقرری شوال ۸ھ / فروری ۶۳۰ء میں ہوئی تھی۔ اس سے ایک ماہ قبل حضرت علی کو فتح مکہ کے دوران اسی مقصد سے ہی مقرر کیا گیا تھا جس میں کچھ مسلمانوں نے جوش میں غلطی کی تھی۔[158] اس سے قبل حضرت علی کی اس شعبہ خاص میں تقرری جذام کے قیدیوں اور مال غنیمت کی واپسی کے سلسلے ہوئی تھی۔ جن کو مسلمان فوج نے غلطی سے پکڑ لیا تھا[159] دوسرے

دو معاملات میں ہم کو اسلامی ریاست، کی سازشوں کے بارے میں پالیسی اور طرز عمل کا علم ہوتا ہے۔ دونوں واقعات کا تعلق اس زمانے سے ہے جبکہ اسلامی ریاست اپنے اوج و کمال پر تھی۔ یہ غزوہ تبوک کے ذرا قبل اور ذرا بعد کے زمانے کا واقعہ ہے کہ حضرت طلحہ بن عبید اللہ تیمی کو مدینہ میں منافقوں اور سازشیوں کے اس گھر کو منہدم کرنے کا حکم ملا تھا جہاں وہ بیٹھ کر اسلامی ریاست کے خلاف سازشیں کرتے تھے۔ انہوں نے حکم نبوی کی پوری طرح سے تعمیل کی تھی[۱۶۰]۔ اسی طرح غزوہ تبوک کے بعد بحکم نبوی حضرات مالک بن الدخشم اور معن بن عدی اوسی کو منافقوں کے اس مرکز سازش و جائے فتنہ و فساد کو گرانے کا حکم دیا گیا تھا[۱۶۱] جس کو انہوں نے مسجد کا نام دے رکھا تھا۔ مگر جسے قرآن کریم نے مسجد ضرار (تکلیف و لبغاوت کی مسجد) کا نام دیا ہے[۱۶۲]۔ ماخذ نے ان مراکز فتنہ و فساد کے انہدام کا ذکر تو کیا ہے۔ لیکن ان کے مجرموں کے بارے میں کچھ نہیں کہا ہے۔ اس لئے کچھ حتمی طور پر کہنا مشکل ہے۔ غالباً رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی لبغاوت اور فتنہ جوئی کا سدباب کرنا کافی سمجھا تھا اور ان کو عذاب آخرت کے لئے چھوڑ دیا تھا۔

ان سیاسی نوعیت کے مخصوص کاموں کے علاوہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لبعض اخلاقی جرائم کی سزاؤں کے نفاذ کے لئے بھی چند افسروں کو مقرر کیا تھا۔ ابن اثیر کا بیان ہے کہ حضرت انیس بن ضحاک اسلمی کو ان کے قبیلہ کی ایک زانی عورت کو رجم (سنگسار) کرنے کے لئے مامور کیا تھا اور انہوں نے اس کی تعمیل کی تھی[۱۶۳]۔ یہاں حضرت عمر بن خطاب عدوی کی تقرری کا بھی ذکر کرنا چاہیئے جن کو اسد الغابہ کے مطابق ایک عیسائی کی آدھی دولت ضبط کرنے کا حکم دیا گیا تھا جس نے اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا[۱۶۴]۔ ماخذ کا آخری جملہ ناقابل قبول ہے۔ کیونکہ قبول اسلام سے انکار اسلامی قانون میں تعزیری جرم نہیں ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ وہ عیسائی محاصل کی عدم ادائیگی کا مجرم تھا یا اس نے کسی اور تعزیری جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ ایک روایت میں ہم کو دو حقیقی بھائیوں کے درمیان جائیداد کے معاملہ پر اختلاف کا علم ہوتا ہے۔ جس کو طے کرنے کے لئے حضرت حنظلہ بن یمان کو مامور کیا گیا تھا اور انہوں نے بطریق احسن اسے سلجھا دیا تھا[۱۶۵]۔ کتانی نے حضرات علاء بن عقبہ اور ارقم کو اسی قسم کے مخصوص افسروں کے طبقہ میں شمار کیا ہے[۱۶۶]۔ اگرچہ ان کے طبقہ کی یہ نشاندہی نہیں کی ہے اصابہ کے مطابق حضرت ابو امامہ باہلی کو خون کھانے کی تحریم کا اعلان کرنے کے لئے مختلف علاقوں میں بھیجا گیا تھا[۱۶۷]۔ تحریم ماکولات کے ذیل میں لبعض افسروں کی تقرری کے امکانات ہیں۔ اسی طرح حضرت علی کی ۹ھ میں سورہ توبہ کی چند آیات جن کا تعلق مکہ میں کافروں کے قیام و داخلہ سے تھا کے اعلان کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ جس کی انہوں نے تعمیل کی تھی[۱۶۸]۔ بہر حال امکان ہی نہیں یقین ہے کہ مذکورہ بالا افسروں کے علاوہ بہت سے اور بھی افسر تھے جو بکار خاص مقرر کئے گئے تھے ذیل میں ایک جدول دی جا رہی ہے جو مذکورہ بالا افسروں پر مبنی ہے اس سے ان کے علاقائی اور قبائلی تعلق کا علم ہوتا ہے۔

علاقہ	قبیلہ / خاندان	سنہ تقرری ۶۲۷	۶۳۰	۶۳۱	۶۲۲ - ۳۲	میزان
مرکزی عرب	۱۔ قریش	۱	۲	۲	۲ -	۷

	(الف)	بنو ہاشم	۱	۲	۱	-	
	(ب)	بنو عدی	-	-	-	۱	
	(ج)	بنو تیم	-	-	۱	-	
	(د)	بنو مخزوم	-	-	-	۱	
	۲۔	اوس	۱	-	۲	-	۳
مغربی عرب	۱۔	اسلم	-	-	-	۱	۱
	۲۔	باہلہ	-	-	-	۱	۱
مشرقی عرب	۱۔	غطفان	-	-	-	۱	۱
غیر معروف		-	-	-	-	۱	۱
میزان	۵	قبیلے	۲	۲	۴	۶	۱۴

۶۔ شعراء و خطباءؑ (شاعر اور خطیب)

آج کے زمانے میں شعراء اور خطباء کو سرکاری یا ریاستی افسروں میں شمار کرنا مضحکہ خیز سمجھا جائے گا مگر قرون وسطیٰ میں ان کی ایک سرکاری اہمیت ہوتی تھی اور عرب میں تو ان کو ایک بے مثال اور عدیم النظیر حیثیت اور مقام حاصل تھا ایک جدید مورخ و مستشرق نے "شعراء کو اپنی قوم کے قلب، و ضمیر کا محافظ" بجا طور سے کہا ہے چونکہ عرب اہل زبان تھے اور اس پر فخر کرتے تھے، اس لئے ان کو اپنے شاعروں اور خطیبوں پر بہت ناز تھا۔ دوسری طرف شاعر و خطیب نہ صرف اپنے قبیلہ اور لوگوں کی آواز تھے اور ان کے جذبات و خیالات کی وہ ترجمانی کرتے تھے بلکہ وہ آراء و خیالات کو بنانے بگاڑنے بھی تھے۔ وہ جذبات برانگیختہ کرتے، اپنی قوم یا قبیلہ کو اکساتے اور ان کی ذہنی نشو و نما کرتے تھے، عرب شاعری میں اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں کہ انہیں شاعروں اور خطیبوں نے جذبات میں ہیجان برپا کر کے جنگ تک بھڑکائی۔ اس کے علاوہ خیالات، نظریات اور آراء کے رسل و رسائل کا بھی ایک اہم ذریعہ تھے۔ بہرحال عرب سماج میں ان کا اہم مقام تھا اور اس سے کوئی عرب حکومت صرف نظر نہیں کر سکتی تھی۔

اگرچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شاعرانہ مبالغہ آرائی اور فاحش نگاری اور فحش سخنی کو کبھی پسند نہیں کیا بلکہ ان کی سختی سے مخالفت کی لیکن اس کے باوجود آپ نے شاعری کے خوبصورت و دلآویز پہلوؤں کو ہمیشہ بنظر تحسین دیکھا اور بہتر شاعری کی ہمیشہ تعریف فرمائی اور اس کو پسند کیا آپ اس کے غیر معمولی سماجی اثرات سے واقف تھے۔ لہذا اسکو آپ نے اسلامی امت اور اسلامی ریاست کے مفاد میں بہتر سے بہتر طریقے پر استعمال بھی کیا۔ اگر اسلام اور اس کے رسول عظیم صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہو گا کہ جسمانی تہذیب کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو عام طور سے اور

آپ کو خاص طور سے اپنی پوری عوامی زندگی کے دوران سخت ترین عقلی و ذہنی تنقید کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ اسلام اور اسلامی اصولوں کا اسی شاعری و خطابت کے ذریعہ مذاق اڑایا گیا تھا، مسلمانوں خاص کر مسلمان عورتوں کی عزت و آبرو سے کھیلا گیا تھا، ان کے نسب و حسب پر کیچڑ اچھالی گئی تھی۔ مختلف مسلم طبقات کے درمیان نسلی اور علاقائی منافرت اور دشمنی پھیلانے کی کوشش کی گئی تھی۔ ان کے ذاتی مصائب پر پھبتیاں کسی گئی تھیں۔ اسلامی ریاست کے خلاف اس کے دشمنوں کو آمادہ پیکار کیا گیا تھا اور وہ ساری کوششیں کی گئی تھیں جن سے مسلمانوں کی سبکی ہو، آپ کی مخالفت ہو اور اسلامی ریاست کی بیخ کنی ہو۔ اینٹ کا جواب اینٹ سے دینے کے لئے ضروری تھا کہ اسلامی ریاست بھی شاعری اور خطابت کو اپنے دفاع اور مسلمانوں کی عزت و وقار کے تحفظ کی خاطر استعمال کرے۔ چنانچہ مآخذ کا بیان ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین اہم شاعروں کی خدمات حاصل کی تھیں۔ جو آپ کا اور اسلامی ریاست کا دفاع کرتے تھے۔ ان میں سے حضرت حسان بن ثابت خزرجی عظیم ترین شاعر دربار رسالت تھے۔ جو عرب کی اسلامی شاعری میں ایک خاص ممتاز مقام کے مالک ہیں۔ اسد الغابہ کا بیان ہے کہ حضرت حسان عربوں کے حسب نسب (انساب) پر تنقید کیا کرتے تھے، جبکہ حضرت کعب بن مالک ان کو جنگ کے مہلک اثرات و نتائج سے آگاہ کرتے رہتے تھے، اور تیسرے شاعر حضرت عبداللہ بن رواحہ خزرجی ان کو ان کے کفر پر عار دلاتے رہتے تھے"[۹۹] ابن اثیر نے اس بیان میں ان شعراء نبوی کی اہم ترین خصوصیات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ورنہ صحیح بات تو یہ ہے کہ یہ تینوں شاعر ناموس رسول کے محافظ اور اسلامی ریاست کے ترجمان تھے جو ہر موضوع اور سخن کے ماہر تھے۔ آیئے ابن اسحاق کی سیرت نبوی اور دوسرے مآخذ کے اوراق الٹیں اور دیکھیں کہ اسلامی ریاست کو جاہل شعراء اور خطباء سے کس قسم کی تنقید کا سامنا تھا اور اس کے جواب میں مسلمانوں اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا طریقے اختیار کئے اور ان کے ان تینوں شعراء نے کس طرح سے اپنے رسول اور اپنے اسلامی بھائیوں کا دفاع کیا۔ اس سے ہم کو ان کے عرب سماج میں تاثیر اور تسخیر کی قوت کا اندازہ بھی ہو سکے گا۔

پہلے ہم حضرت حسان بن ثابت خزرجی کی کاوشوں کا مطالعہ کریں گے۔ انہوں نے ہجرت سے پہلے جن موضوعات کو اپنی شاعری کی اساس بنایا تھا۔ ان میں بنو ہاشم کے قریشی اشرافیہ کے ہاتھوں سماجی مقاطعہ[۱] اور اس کی منسوخی اور ہجرت نبوی پر ان کی تنقید[۲] وغیرہ کا جواب شامل تھا۔ ابن اسحاق کی سیرت رسول اللہ ان کی شاعری کے نمونوں سے بھری ہوئی ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے، کہ اسلام و رسول دشمنی میں یہودی کسی سے پیچھے نہیں تھے۔ اور انصار کے اوس و خزرج کی صفوں میں منافقین کی صورت میں ان کے ہمدردوں اور خیر خواہوں کی بھی کمی نہیں تھی۔ حضرت حسان بن ثابت نے ایک موقعہ پر بنو کعب کے ایک شخص ضحاک بن ثابت کو منافقت اور یہودیوں سے اسلام کے خلاف ساز باز کے لئے سخت تنقید کا نشانہ بنایا تھا[۳]۔ جنگ بدر میں قریشی فوج کی شکست پر ان کی زبردست تنقید نے اہل مکہ کے سر شرم سے جھکا دیئے تھے[۴]۔ مشہور یہودی شاعر کعب بن اشرف کے خلاف جو مکہ والوں کو بدر کا انتقام لینے پر اکسانے کی خاطر مکہ گیا ہوا تھا۔ حضرت حسان بن ثابت کی شاعرانہ تنقید اور اس کے مکی میزبانوں پر چوٹ اتنی گہری تھی کہ کعب بن اشرف کو مکہ سے بھاگنا پڑا تھا[۵]۔ مگر یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اپنے فرار سے قبل وہ مکہ میں بدر کے انتقام کے لئے آگ بھڑکا چکا تھا اور اس نے ایک طرح احد کی جنگ کے برانگیختہ کرنے میں کلیدی کردار ادا

کیا تھا۔ حضرت حسان بن ثابت نے جنگ احد کے دوران بعض سرداران قریش کے غیر انسانی رویہ اور غیر معیاری سلوک کیخلاف شدید تنقید کی تھی"[۷۶] واقعہ رجیع کے ذمہ دار بنو ہذیل کے خلاف حضرت حسان کی تنقید اتنی شدید اور گہری تھی کہ اس کا خاطر خواہ اثر ہوا تھا۔ اس کا نتیجہ تھا کہ اس قبیلے نے اپنے قاتل کے خلاف اقدام کر کے اس کو شدید زخمی کر دیا تھا۔ اور اس طرح مسلمانوں کے ساتھ کیے گئے ظلم کی تلافی کرنی چاہی تھی"[۷۷] اسی طرح بئر معونہ کے واقعہ کے بعد حضرت حسان بن ثابت نے ابو البراء اور ان کے خاندان والوں کو اپنے عہد کا تحفظ نہ کر سکنے پر اتنی عار دلائی تھی کہ انہوں نے واقعہ کے ذمہ دار عامر بن طفیل کو جان سے مار ڈالنے کی کوشش کی تھی"[۷۸] مختصر طور سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ حضرت حسان کی شاعری کے نمونے ابن اسحاق کی سیرت میں تقریباً ہر موضوع پر مل جاتے ہیں اور ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اور اسلامی ریاست کے دفاع میں ان کی کسقدر زبردست افادیت تھی"[۷۹] یہی بات حضرات کعب بن مالک اور عبداللہ بن رواحہ باقی دو شاعران دربار رسالت کے بارے میں بھی صحیح ہے"[۸۰]

مذکورہ بالا شعراء کے علاوہ عہد نبوی میں بہت سے شاعر تھے۔ جن میں سے بعض عرب شاعری اور ادب کی آبرو ہیں ان میں سے بھی بعض نے اپنے نجی مقام اور حیثیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محافظت لسانی کی تھی اور ریاست اسلامی کی ہر طرح سے خدمت کی تھی۔ مشہور سیرت نگار رسول ابن سید الناس (م ۷۳۴ھ / ۱۳۳۳-۳۴ء) نے اپنی تصنیف "منح المدح" میں عہد نبوی کے دو سو شعراء کو شمار کیا ہے۔ ان میں اہم ترین تھے: حضرات کعب بن زہیر، لبید، خنساء، علی بن ابی طالب عامر بن اکوع اور عباس بن مرداس سلمی وغیرہ۔[۸۱]

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سرکاری خطیبوں میں صرف ایک حضرت ثابت بن قیس بن شماس خزرجی کا ذکر ملتا ہے جو انصار کے قومی خطیب تھے۔ ان کی خدمات کا ذکر بنو تمیم کے اس وفد کی آمد اور اس کے شاعروں اور خطیبوں کی مفاخرت کے ضمن میں ملتا ہے جس میں حضرت زبرقان بن بدر وغیرہ شامل تھے۔ اس موقعہ پر انہوں نے تمیمی مفاخر پسندوں سے اپنی برتری منوائی تھی"[۸۲] ان کے علاوہ متعدد صحابہ کرام وقت کے شعلہ نوا خطیب تھے۔ ان میں حضرات ابوبکر صدیق، عمر فاروق علی بن ابی طالب، جعفر بن ابی طالب، سہیل بن عمرو، عامری وغیرہ بہت ممتاز مقام کے مالک تھے۔ ان کے جواہر پارے آج بھی دلوں کو گرماتے ہیں۔ لیکن یہ کتنی خوشگوار حیرت کی بات ہے کہ اس زمانے کے سب سے بڑے اور پرشکوہ خطیب خود جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ جن کے کلمات طیبات عربی ادب کی آبرو اور عربی خطابت کی شان ہیں اور جن کا ادبیت کے لحاظ سے مرتبہ صرف کلام اللہ کے بعد ہے۔

۱۔ متفرق ماتحت اور چھوٹے کارکن

ماخذ ایک ایسے دلچسپ طبقہ کارکنان کا حوالہ دیتے ہیں جو عہد نبوی میں چھوٹے موٹے کام انجام دیتا تھا اور جنکو مختلف ناموں آذن (اجازت دینے والا) بوّاب (چوکیدار، دروازہ کا نگران) حاجب (دروازہ پر پوچھ گچھ، روک ٹوک کرنے والا)

سے پکارا جاتا تھا۔ مختلف ناموں کے سبب بعض متاخر مصنفین کو یہ غلط فہمی ہو گئی ہے کہ یہ تینوں مختلف افسر تھے اور اسی لحاظ سے ان پر بحث کی ہے۔ حالانکہ ان تینوں کارکنوں کے فرائض کی نوعیت سے معلوم ہوتا ہے کہ کارکن صرف ایک تھا جس کے لئے مختلف اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں۔ وہ دراصل مترادفات ہیں اور ان کا مفہوم یہ تھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کے لئے اجازت کی ضرورت ہوتی تھی جو یہ کارکن ملاقاتی کے لئے فراہم کرتے تھے۔ لیکن یہاں یہ بات واضح کر دی جائے، کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم، کیا بحیثیت رسول خدا اور کیا بحیثیت سربراہ ریاست وحکومت، ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان بلکہ ہر شہری کی پہنچ کے اندر تھے، اور ہر شخص آپ سے ہر وقت ملاقات بلا کسی روک ٹوک کے کر سکتا تھا جیسا کہ بخاری کی ایک روایت سے واضح ہوتا ہے[۱۸۳]۔ تاہم بعض اوقات سیاسی تقاضے اور وقتی ضرورت اس بات کا مطالبہ کرتی تھی کہ خدمت نبوی میں آنے والوں پر پابندی لگائی جائے۔ یہ اہم مواقع ہوتے تھے جب اس قسم کی روک ٹوک کے لئے کسی چوکیدار یا بواب کی ضرورت پڑتی تھی۔ ایسے مواقع پر بلا اجازت نبوی بڑے سے بڑے صحابہ کو بھی داخلہ کی اجازت نہیں ملتی تھی۔ جیسا کہ ہم اپنے اس بیان میں دیکھیں گے۔

ایسے کسی کارکن کی پہلی تقرری کی شہادت ہم کو ۲ھ / ۶۲۴ء میں غزوہ بنو قینقاع کے بیان کے ضمن میں ملتی ہے واقدی کا بیان ہے کہ جب یہود بنی قینقاع کے اخراج مدینہ کا فیصلہ نبوی لوگوں کو معلوم ہوا تو منافقوں کے سردار عبداللہ بن ابی بن سلول نے، جو ان کا قدیم حلیف تھا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس موضوع پر بات کرنی چاہی مگر اسے در نبوی پر حضرت عویم بن ساعدہ نے جو اس دن بواب کے فرائض انجام دے رہے تھے روک دیا اور بلا اجازت داخل نہیں ہونے دیا۔ عبداللہ بن ابی نے حضرت عویم کو دھکا دے کر زبردستی داخل ہونے کی کوشش کی، مگر دربار نبوی کے محافظ نے اس کے چہرے پر اس زور کا ہاتھ مارا کہ وہ لہولہان ہو گیا بعد میں جب رئیس المنافقین نے حضرت عویم کی شکایت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کی تو آپ نے اس کو مورد الزام ٹھہرایا کیونکہ اس نے کارکن نبوی کی حکم عدولی کی تھی اور غلط طور سے خدمت نبوی میں داخل ہونا چاہا تھا[۱۸۴]۔ یہ واقعہ کچھ تفصیل سے اس لئے بیان کیا گیا ہے کہ اس عامل نبوی کے کام کی نوعیت کے ساتھ ساتھ اس کے مقام و مرتبہ کی حیثیت بھی اجاگر ہو جائے۔

دوسری متعین شہادت کا تعلق واقعہ ایلاء[۱۸۵] سے ہے جو ۹ھ میں پیش آیا تھا اور جس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عارضی طور سے اپنی ازواج مطہرات سے جدائی اختیار کر لی تھی اور مشربہ ام ابراہیم یا مشربہ عائشہ میں رہائش اختیار کر لی تھی[۱۸۶] اسی اثناء میں یہ افواہ بازاروں میں گشت کرنے لگی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام ازواج مطہرات کو طلاق دیدی ہے ہر شخص مضطرب اور بے چین تھا۔ چنانچہ حضرت عمر بن خطاب اصل واقعہ معلوم کرنے کے لئے آپ کے دولت کدے پر پہنچے مگر آپ کے دروازے پر متعین چوکیدار (آذن) حضرت رباح حبشی نے دوسری بار اجازت مانگنے سے صاف انکار کر دیا کیونکہ پہلی بار اجازت طلبی پر آپ نے سکوت اختیار فرمایا تھا۔ بہر حال بعد میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر کو اجازت عطا کر دی تھی اور حضرت رباح حبشی نے ان کو داخل ہونے دیا تھا[۱۸۷]۔

بلاذری اور طبری کا بیان ہے کہ حضرت رباح حبشی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مستقل دربان (آذن) تھے[۱۸۸]۔ یہی دونوں

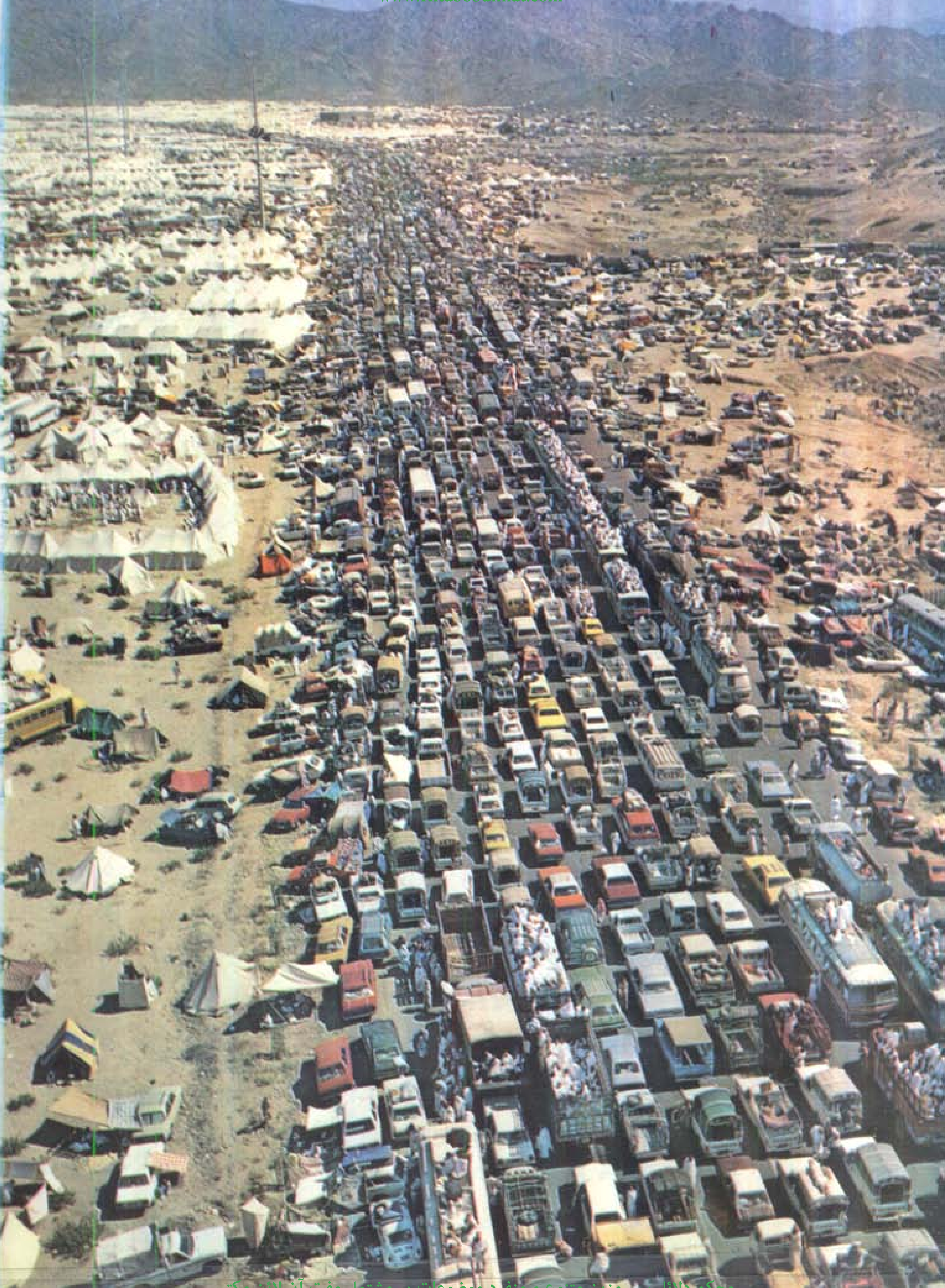
مؤرخین رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک اور مولیٰ حضرت انسہ کو بھی دربانوں میں شمار کرتے ہیں[۱۸۹] جبکہ محمد بن حبیب بغدادی نے ان کو حاجبوں میں شمار کیا ہے۔ حالانکہ ان کے لئے لفظ آذن ہی استعمال کیا ہے۔ بخاری اور مسلم کی ایک روایت حضرت ابو موسیٰ اشعری کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک موقعہ پر دربان بتاتی ہے۔ جب انہوں نے حضرات ابوبکر و عمر و عثمان کے لئے خدمت نبوی میں داخلہ کی اجازت حاصل کی تھی اور دوسروں کو آنے سے روک دیا تھا[۱۹۰]۔ اسی طرح قضاعی اپنی کتاب انباء الانبیاءؑ اور ابن العربی اپنی تصنیف "الاحکام" میں کہتے ہیں کہ حضرت انس بن مالک بھی یہ خدمت انجام دیا کرتے تھے[۱۹۱]۔

اسد الغابہ کی ایک روایت کا بیان ہے کہ حضرت عبداللہ بن زمعہ اسدی اپنے اسلام کے بعد زندگی بھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دربانی کرتے رہے اور اس طرح سے دربار نبوی میں آنے والوں کی آمد کو منظم کرتے رہے[۱۹۲]۔ اس روایت سے ایک مستقل دربان کی موجودگی کا علم ہوتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ مستقل تقرری اگرچہ رضاکارانہ تھی، تاہم اس کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت حاصل تھی۔ مگر اس دربان کی تقرری کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ شرف ملاقات حاصل کرنے میں کسی قسم کی قدغن لگ گئی تھی۔ تمام مسلمان بلا کسی روک ٹوک کے اب بھی آپ سے مل سکتے تھے۔ یہ صرف ان مواقع کے لئے مخصوص تھی کہ جب حکومت و ریاست کے اہم معاملات پر غور و خوض کر رہے ہوتے تھے یا اپنے مشیروں سے گفتگو اور صلاح مشورے میں مشغول ہوتے تھے۔ کیونکہ فتح مکہ کے بعد ریاستی اور حکومتی امور خاصے پیچیدہ اور اہم ہو گئے تھے۔ جن کو بھرپور توجہ کی ضرورت تھی۔ قسطلانی اور ان کے شارح زرقانی کے مطابق دربان نبوی کا عہدہ خالصتاً اعزازی تھا اور اس کو کوئی تنخواہ نہیں ملتی تھی[۱۹۳]۔

آخر میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ عہد نبوی میں سرکاری دربان کا عہدہ اموی اور عباسی عہد کے عہدے حاجب یا بواب سے قطعی مختلف تھا[۱۹۴]۔ بعد کے زمانے میں خلیفہ اور عوام کے درمیان ایک مستقل حد فاصل قائم کرنا مقصود تھا جبکہ عہد نبوی میں مخصوص مواقع پر غیر ضروری آمد پر قدغن لگانا تھا۔

(ب) صوبائی انتظامیہ / شہری نظم و نسق

اسلامی فتوحات کے بعد خاص کر فتح مکہ کے بعد اسلامی ریاست کا رقبہ بہت وسیع ہو گیا تھا اور مختلف خطے مدینہ کی ریاست و حکومت کی ماتحتی میں آ گئے تھے۔ ان میں سے کچھ ایسے علاقے تھے جن کی اپنی منظم حکومتیں تھیں اور باقاعدہ نظام حکومت تھا۔ جیسے یمن، بحرین، حضرموت، عمان، ایلہ، کندہ وغیرہ کے علاقے۔ بقیہ علاقوں میں قبائلی سیاسی نظام قائم و جاری تھا۔ مدینہ کی نبوی حکومت سے ان تمام مفتوحہ و مقبوضہ و ملحقہ علاقوں کو کسی نہ کسی قسم کا تعلق قائم کرنا تھا۔ ذکر آ چکا ہے کہ ابتدائی زمانے میں اسلامی ریاست نے پڑوسی قبائل اور علاقوں سے باہمی تعاون اور دوستی و حلف کے تعلقات استوار کئے تھے[۱۹۵]۔ چنانچہ آغاز ۶۲۳ء (وسط ۱ھ) سے اواخر ۶۲۷ء (اواخر ۵ھ) تک رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے نواح میں آباد مختلف قبائل سے دوستی کے معاہدے کر لئے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ علاقے اسلامی ریاست کے سیاسی اثر و نفوذ میں آتے گئے اور بالآخر اس میں ضم ہو گئے۔ اسی طرح یہود مدینہ کے مفتوحہ علاقے بھی اسلامی ریاست کے حصے بن گئے۔ چونکہ یہ مرکز اسلامی سے



قریب تھے۔ لہٰذا ان کے انتظام و انصرام کا کوئی مسئلہ نہیں تھا وہ از خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مرکزی انتظامیہ کے ماتحت آ گئے۔ مگر جب مرکز سے دور کچھ علاقے فتح ہوئے یا انہوں نے اپنی مرضی سے اسلامی ریاست کا حصہ بننا پسند کیا، تو ان کے انتظام و انصرام کا مسئلہ پیدا ہوا۔ اسی دوران ریاست اسلامی کی قبائل عرب کے بارے میں پالیسی میں تبدیلی ہوئی اور اب باہمی تعاون اور حلف کے معاہدوں کے لئے کوئی جگہ نہیں رہی تھی۔ کیونکہ وہ ایک طرح سے سیاسی افتراق و انتظامی انتشار کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ جبکہ اسلام کا مقصود مذہبی اتحاد کے ساتھ ساتھ سیاسی اور سماجی اتحاد بھی تھا۔ اسی پالیسی کے تحت مختلف علاقوں یا ولایتوں کے لیے مرکزی منتظم، والی یا گورنر مقرر کئے گئے، تاکہ جزیرہ نمائے عرب کے مختلف علاقوں کو مرکز حکومت سے وابستہ کیا جائے۔

۱۔ والی / ولاۃ گورنر

عام خیال ہے کہ عہد نبوی میں اسلامی ریاست کو صوبوں یا انتظامی اکائیوں میں تقسیم کیا نہیں گیا تھا۔ مگر یہ خیال غلط ہے۔ مآخذ سے عام طور سے اور طبری کے بیان[۱۹۶] سے خاص طور سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ اسلامی ریاست کو مختلف اور باقاعدہ ولایات میں تقسیم کیا گیا تھا۔ اور یمن بلکہ جنوبی عرب کے بارے میں تو یہ حتمی طور پر بیان ملتا ہے۔ کہ وہ مختلف ولایات میں نہ صرف تقسیم کیا گیا تھا۔ بلکہ ان کی باقاعدہ سرحدیں یا حدود (حیّز) تھے۔ ممکن ہے کہ باقاعدہ جغرافیائی تقسیم اتنی پختہ اور حتمی نہ ہو۔ جیسے کہ موجودہ زمانے میں ہوتی ہے۔ تاہم یہ یقینی ہے کہ ہر والی کو اپنے علاقہ اور ولایت کے حدود کا بخوبی علم تھا۔ بہرحال اندازہ یہ ہوتا ہے کہ عہد نبوی میں اسلامی ریاست ۲۷ ولائتوں میں تقسیم کی گئی تھی۔ اور ان میں سے ہر ایک پر ایک والی مقرر کیا گیا تھا۔ جو اپنے علاقہ کے نظم و نسق میں خود مختار ہوتا تھا۔

غالباً وادی القری[۱۹۷] پہلا علاقہ تھا جو کسی والی کی ماتحتی میں دیا گیا تھا۔ یہ والی بعض تاریخی قرائن کے مطابق ۷ھ/ ۶۲۸ء میں کسی وقت مقرر کیا تھا اور ان کا نام حضرت عمرو بن سعید اموی تھا جو بنو امیہ کے سعیدی خاندان کے ایک معزز فرد ہونے کے علاوہ قدیم مسلم تھے[۱۹۸]۔ ان کا مرکز حکومت یا صدر مقام وادی ہی میں تھا۔ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو ایک خاصے وسیع اور بڑے خطے کا گورنر مقرر کیا گیا تھا اور اس عہدہ عظیم پر وفات نبوی کے وقت تک فائز رہے تھے[۱۹۹] اس کا مطلب ہے کہ وہ خاصے طویل عرصے یعنی ساڑھے تین چار سال تک گورنر رہے تھے۔ یہ عہد نبوی کی حکومت میں مرکزیت اور طبقہ افسران و عمال کے استقلال کی واضح علامت اور بین شہادت تھی۔ حضرت عمرو اموی کے بھائی حضرت عبداللہ (حکم) بن سعید اموی کو محمد بن حبیب بغدادی[۲۰۰] کے بقول "قری عربیہ[۲۰۱]" کا والی غالباً اسی زمانے میں مقرر کیا گیا تھا[۲۰۲]۔ ایک اور گورنر جن کی تقرری اس زمانے میں ہوئی تھی۔ حضرت یزید بن ابی سفیان اموی تھے۔ جن کو تیماء کی ولایت سونپی گئی تھی[۲۰۳]۔ یہاں اس نکتہ کی طرف توجہ دلانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پہلے تین گورنروں کا تعلق بنو امیہ کے دو اہم ترین خاندانوں سے تھا۔ یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ بنو امیہ لیاقت و صلاحیت کے اعتبار سے ممتاز و فائق تھے۔ اسی زمانے میں غالباً چوتھے گورنر کی اسی علاقے میں تقرری

ہوئی تھی جن کا نام سواد بن غزیہ تھا اور جو بنو نجار / خزرج کے ایک اہم فرد تھے۔ ان کو خیبر کے علاقے کی گورنری تفویض ہوئی تھی[۲۰۴] یہ محض اتفاق تھا یا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سوچی سمجھی پالیسی تھی کہ اسلامی ریاست کی مرکزی حکومت کے دائرے کو سب سے پہلے مرکزِ اسلام کے شمال میں وسعت دی گئی تھی اور بعض اہم شمالی علاقوں کو مرکزی حکومت کے ماتحت اور اقتدار کے تحت لایا گیا تھا[۲۰۵] تمام تاریخی شواہد دوسرے متبادل کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ یہ بات کوئی ڈھکی چھپی نہیں تھی کہ شمالی علاقے سیاسی اور فوجی لحاظ سے بہت اہم تھے۔ جزیرہ نمائے عرب کی شمالی سرحدوں پر وقت کی دو عظیم طاقتوں کی باجگذار اور ماتحت حکومتیں / سلطنتیں موجود تھیں اور ان کے پرے ان کے سیاسی و فوجی آقا اپنی پوری طاقت کے ساتھ موجود تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حکومت ان خطرات کی طرف سے آنکھیں نہیں موند سکتی تھی۔ جو ان طاقت ور حکومتوں کی موجودگی سے اس کو لاحق تھے چنانچہ آپ نے شمالی علاقے میں اپنی طاقت کو شروع سے مستحکم اور پائیدار کرنا شروع کیا تھا۔ اور اپنی سیاسی بالادستی کو ہر طرح سے قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔ چنانچہ شمال کے غیر مسلم قبائل سے خراج اور جزیہ کی وصولیابی جو اسلامی تاریخ میں اس کی پہلی مثالیں تھیں۔ اسی سیاسی بالادستی کی ایک علامت اور ان شمالی علاقوں کی محکومیت اور زیر دستی کی شہادت تھی۔ اور ان علاقوں پر مرکزی والیوں کی تقرری مرکز کے مکمل اقتدار و انتظام کی ایک مزید علامت۔ صحیح تاریخی اور واقعاتی تناظر میں دیکھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ فتح مکہ سے قبل اس اہم ترین شمالی علاقے میں چار والیوں کی مستقل تقرری دراصل سیاسی اور انتظامی مرکزیت کی تمہید تھی۔ جس کے نتیجہ میں پورا عرب ایک مرکز کے تحت مجتمع ہونے والا تھا[۲۰۶]

فتح مکہ کے بعد کا متصل زمانہ جزیرہ نمائے عرب کے تمام علاقوں اور خطوں کے ایک انتظامی مرکز سے وابستہ ہونے کا زمانہ تھا۔ دوسرے الفاظ میں اسلامی ریاست اور حکومت کی مرکزیت و اجتماعیت اب پورے عرب پر محیط ہو گئی تھی۔ مدینہ میں مقیم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا سیاسی اور انتظامی اقتدار و اختیار عرب کے ہر قبیلہ، خطہ بلکہ ہر فرد کے لئے ماننا ناگزیر تھا اور اس بالادستی کو تسلیم کرنے کی علامت محض بعض صدقات اور محاصل کی ادائیگی ہی نہیں تھی بلکہ ہر قبیلہ اور خطہ کے درمیان والیٔ رسول کی موجودگی و حکمرانی بھی تھی۔ یہاں تک عرب کا سب سے اہم اور طاقت ور شہر مکہ بھی اسلامی ریاست کا ایک ماتحت علاقہ / ولایت بن گیا تھا جو سیاسی اور انتظامی اعتبار سے مدینہ کا ماتحت و محکوم تھا۔ ایک روایت کے مطابق حضرت ہبیرہ بن شبل ثقفی کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ حنین کے لئے روانہ ہونے سے قبل مکہ کا گورنر / والی مقرر کیا تھا[۲۰۷] مگر جلد ہی کو ان کو تبدیل کر دیا گیا اور ان کی جگہ مکہ ہی کے ایک باشندے اور قریشی خانوادے بنو امیہ کے ایک نمایاں فرد حضرت عتاب بن اسید اموی کو جو صرف ۱۸ سال کے نوجوان تھے اور فتح مکہ کے بعد ہی اسلام لائے تھے مکہ اور اس کے ماتحت علاقوں کا گورنر / والی مقرر کر دیا گیا تھا[۲۰۸] نوجوانی کی ناتجربہ کاری اور تاخیر سے اسلام قبول کرنے کی مفضولیت کے ساتھ ساتھ حضرت عتاب بن اسید کی تقرری کی اہمیت اس حقیقت کے پس منظر میں اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ ان کو اس منصب جلیل کے لئے کثیر تعداد میں موجود اشراف مکہ اور اکابر قریش پر ترجیح دی گئی تھی[۲۰۹] یہ حقیقت ان کی انتظامی صلاحیت و حسن تدبیر کی شہادت فراہم کرتی ہے۔ بہر حال معلوم یہ ہوتا ہے کہ ان کی تقرری شوال ۸ھ / فروری ۶۳۰ء میں کسی وقت عمل میں آئی تھی۔ اور وہ پورے عہد نبوی میں اپنے اس عہدہ پر برقرار رہے تھے، بلکہ خلافت صدیقی میں بھی اس عہدہ کو انہوں نے سرفراز کیا تھا[۲۱۰] گویا کہ وہ کل ملا کر پانچ چھ برس اس منصب پر فائز رہے تھے: تقریباً تین برس عہد نبوی میں اور اتنی ہی مدت تک خلافت صدیقی میں۔ کیا یہ عہد نبوی کے انتظامیہ میں مرکزیت اور استقلال

کے پیدا ہونے کی ایک واقعاتی شہادت نہیں ہے ؛ حضرت عتاب بن اسید ہی کے معاملہ میں ہم کو مزید شہادت اس امر کی ملتی ہے کہ گورنروں/والیوں کو ان کی خدمات کے لئے باقاعدہ تنخواہ ملتی تھی۔ مآخذ کے مطابق حضرت عتاب کو چالیس اوقیہ چاندی ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔ اور غالباً وہ ان کو ان کی تقرری کے آخری دن تک ملتی رہی تھی [۲۱۱]

دوسرے برس طائف از خود مدینہ کی سیاسی بالادستی اور انتظامی اقتدار کی چھتری تلے آگیا اور اس کو بھی نتیجتاً ایک گورنر/والی کی ماتحتی میں دے دیا گیا۔ طائف کے گورنر حضرت عثمان بن ابی العاص ثقفی اٹھارہ برس کے نوجوان تھے اور مآخذ کے مطابق وہ اس وفد کے اراکین میں سے ایک تھے۔ جس نے مدینہ پہنچ کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری دی تھی اور طائف کے قبول اسلام و تسلیم اقتدار مدینہ کا اعتراف و معاہدہ کیا تھا۔ حضرت عثمان ثقفی حضرت عتاب اموی گورنر مکہ سے بھی زیادہ مدت تک اپنے عہدے پر برقرار رہے تھے۔ مآخذ کے مطابق وہ حضرت عمر فاروق کی خلافت کے ابتدائی زمانے تک وہاں کے گورنر رہے تھے [۲۱۲] ابن اسحاق کا ایک تبصرہ ان کی اس عہدہ عظیم پر تقرری کے سبب واساس کو ظاہر کرتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان بن ابی العاص کو ان پر ان کی نوعمری کے باوجود اس لئے مقرر کیا تھا کہ وہ اسلام اور قرآن سیکھنے کے معاملے میں سب سے زیادہ پرجوش تھے [۲۱۳] اس تبصرہ سے ان کی مذہبی معلومات کا علم ہوتا ہے۔ مگر اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ وہی ان کی تقرری کی اصل یا واحد بنیاد تھی۔ یہ ان کی تقرری کی مزید بنیاد یا استحقاق تھا۔ ورنہ اصل سبب انتظامی اور تنظیمی لیاقت تھی۔ اس کی ایک شہادت تو ان کی وفد ثقیف میں شمولیت تھی اور دوسری شہادت اتنی مدت تک اس اہم عہدہ پر ان کا فائز رہنا تھا۔ اس کے علاوہ اسلام اور قرآن میں تفقہ کا مطلب محض مذہبی معلومات نہیں تھیں بلکہ اسلامی قوانین سے واقفیت بھی تھی۔

ایک اور گورنر حضرت حذیفہ بن یمان ازدی تھے۔ جن کو طائف کے قریب واقع دبا نامی ولایت سونپی گئی تھی اور انہوں نے حیات نبوی کے اواخر تک اس کے انتظام و انصرام کو سنبھالا تھا [۲۱۴] اسی زمانے میں ایک اور گورنر کی تقرری جدہ کے لئے ہوئی تھی۔ اسد الغابہ کے مطابق حضرت حارث بن نوفل ہاشمی کو غالباً ۹ھ کے آغاز اور ۶۳۰ء کے وسط میں اس منصب پر مقرر کیا گیا تھا [۲۱۵] ان کی تقرری کے سلسلہ میں دو تین نکات کو مدنظر رکھنا ضروری ہے اول یہ کہ وہ واحد ہاشمی تھے جن کو یہ منصب عظیم عطا کیا گیا تھا۔ دوم یہ کہ وہ مدتوں تک اسلام اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دشمن رہے تھے۔ سوم یہ کہ انہوں نے کافی تاخیر سے اسلام قبول کیا تھا۔ اور چہارم یہ کہ وہ حیات نبوی کے آخر تک اس عہدہ پر برقرار رہے تھے اور خلافت راشدہ میں بھی اس عہدہ پر اسلامی ریاست کی خدمت کی تھی [۲۱۶]

کہ فتح مکہ کے بعد اسلامی ریاست کی قبائلی عرب کے بارے میں پالیسی بدلی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ جنوب، مشرق اور جنوب مشرق میں اسلام اور اسلامی ریاست کے اقتدار کے داخلہ کا دروازہ بھی کھل گیا تھا چنانچہ وہ تمام علاقے جو طاقت کے ذریعہ فتح کئے گئے ہوں (عنوۃً) یا صلح کے ذریعہ (صلحاً) اسلامی اقتدار کی ماتحتی میں آئے ہوں یکے بعد دیگرے گورنروں/والیوں کی ماتحتی میں دیدیئے گئے تھے۔ ان علاقوں میں ایک طرح سے دہرا انتظام حکومت قائم کیا گیا تھا۔ جن مملکتوں اور خطوں کے حکمرانوں اور بادشاہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ ان کو ان کے مقام پر برقرار رکھا گیا تھا مگر

اب ان کی حیثیت آزاد و خود مختار حکمرانوں کی بجائے ماتحت گورنروں کی تھی جن کو مدینہ کی مرکزی حکومت کا اقتدار تسلیم اور اس کی ہدایات و احکام کی تعمیل کرنا ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ ان علاقوں میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرستادہ نمائندوں کو بھی نگرانی یا مرکزی حکومت کے مفادات کے تحفظ کی خاطر تعینات کیا گیا تھا اور جن کی اطاعت دراصل مرکزی حکومت یا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمانبرداری سمجھی جاتی تھی۔

اس پورے خطے میں سب سے پہلے مشرقی خطوں کے علاقوں میں گورنر یا والی مقرر کئے گئے تھے اور ان کی یہ تقرری فتح مکہ کے مابعد ہوئی تھی۔ حضرت عمرو بن عاص سہمی کو مملکت عمان پر مرکزی منتظم کی حیثیت سے مقرر کیا گیا تھا۔ جہاں کے مقامی حکمران حضرات عبد و جیفر فرزندان جلندی نے اسلام قبول کر لیا تھا اور اسلامی ریاست کے وفادار بن گئے تھے[۲۱۷] اسی طرح بحرین کے بادشاہ حضرت منذر بن ساوی نے اسلام قبول کر کے اپنی مملکت کو اسلامی ریاست میں ضم کر دیا تھا اور ان کے علاقے کے لئے حضرت علاء بن حضرمی کو مرکزی منتظم بنایا گیا تھا۔ لیکن محمد بن حبیب بغدادی کا خیال ہے کہ مملکت بحرین کیلئے دو گورنروں یا مرکزی منتظموں کی تقرری ہوئی تھی: حضرت علاء بن حضرمی کو قطیف کا علاقہ تفویض کیا گیا جبکہ حضرت ابان بن سعید اموی کو جو بنوامیہ کے خاندان سعیدی کے ایک ممتاز فرد اور متاخر مسلم تھے۔ الخط کے علاقے پر مقرر کیا گیا تھا[۲۱۸] بلاذری نے اس سلسلے میں بالکل دوسری بات کہی ہے وہ اس روایت کو بیان ضرور کرتے ہیں، مگر اس کی تردید کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اصل معاملہ یہ تھا کہ حضرت علاء بن حضرمی کو معزول کر کے ان کی جگہ حضرت ابان بن سعید اموی کو بحرین کا گورنر یا منتظم مقرر کیا گیا تھا[۲۱۹] حضرت علاء بن حضرمی کی تقرری اور معزولی کے بارے میں خاصا اختلاف و تناقض ہے جو کسی حتمی فیصلے اور قطعی رائے پر پہنچنے میں حارج ہے اندازہ یہی ہوتا ہے کہ مملکت بحرین کے دو مختلف حصوں کیلئے دو مختلف مرکزی منتظم مقرر کئے گئے تھے۔ کیوں کہ تمام اختلاف و تناقض کے باوجود حضرت علاء بن حضرمی کی مسلسل و متواتر موجودگی اس علاقے میں ملتی ہے۔

مدینہ منورہ کے شمال قریب کی چار ولائتوں کے علاوہ شمال بعید میں وادی القریٰ اور شمالی حدود شام کے درمیان خاصا بڑا خطہ تھا جہاں متعدد عرب، عیسائی اور یہودی بستیاں، قبیلے اور مملکتیں تھیں۔ ان کے حکمران سروات (اشراف) کہلاتے تھے۔ فتح مکہ اور غزوہ تبوک کے زمانے میں ان سروات نے اسلامی ریاست کے صلح کے معاہدوں یا مہمات نبوی کے نتیجہ میں تسلیم کر لیا تھا۔ ان میں کندہ کی مملکت دومۃ الجندل بھی شامل تھی۔ جس کا حکمران ملک (بادشاہ) کہلاتا تھا۔ اور جس نے اسلامی ریاست کو جزیہ ادا کرنا منظور کیا تھا۔ ان تمام طاقت کے علاقوں یا خطوں میں مرکزی منتظمین یا گورنر مقرر کئے گئے تھے اگرچہ ان منتظمین کے نام واضح طور سے مآخذ میں نہیں ملتے ہیں تاہم ان علاقوں سے کئے گئے معاہدات نبوی میں خاص کر صلحناموں میں ان کے حوالے بکثرت ملتے ہیں۔ ان مرکزی منتظمین میں عاملین صدقات و جزیہ (ٹیکس و محاصل کے افسروں) کا خاص طور سے ذکر ملتا ہے[۲۲۰]

بہرحال مملکت ایلہ کے ضمن میں اسلامی مرکزی منتظمین کے نام بھی بصراحت ملتے ہیں۔ جس سے اس علاقہ کی انتظامی مشنری کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ابن سعد وغیرہ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ایلہ کے مختلف علاقوں پر کم از کم

پانچ مرکزی منتظمین مقرر کیے گئے تھے۔ ان کے نام تھے: حضرات شرحبیل بن حسنہ کندی[221]، اُبَی بن کعب خزرجی[222]، حوثکہ[223] حریث بن زید طائی[224] اور جہم بن صلت[225]۔ غالباً ان سب کی تقرری ۹ھ کے آغاز یا اواخر میں ہوئی تھی۔ ایلہ اور دوسرے علاقوں کے سردارت کے نام ایک فرمانِ نبوی سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ آپ کے فرستادوں (رسل) کی مکمل اطاعت کریں[226]۔ اگرچہ دوسرے علاقوں جیسے جرباء، مقنا، اذرح، ودومہ وغیرہ کے لیے مرکزی منتظمین یا عاملین صدقات کا صریح ذکر نہیں ملتا ہے تاہم یہ یقینی ہے کہ ان علاقوں کے لئے بھی کچھ منتظمین ضرور مقرر کئے گئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شرحبیل بن حسنہ کندی کو اس پورے شمالی خطے کا گورنر جنرل یا منتظم اعلیٰ مقرر کیا گیا تھا اور ان کا صدر مقام ایلہ کو بنایا گیا تھا۔ بقیہ مرکزی منتظمین ان کے ماتحت اور تابع تھے۔ غالباً یہ انتظام مدینہ سے طویل مسافت کے سبب کیا گیا تھا تاکہ اس دور دراز کے علاقے میں انتظامی وحدت، اور سیاسی مرکزیت پیدا کی جا سکے۔

یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ سب سے زیادہ تعداد میں مرکزی منتظمین اور گورنر جنوبی عرب کے مختلف خطوں میں بھیجے گئے تھے اس کے بہت ہی ظاہری اور نمایاں اسباب تھے۔ اوّل یہ کہ جغرافیائی لحاظ سے یہ بہت بڑا رقبہ تھا۔ جس پر ایک فرد کا حکومتی اداروں کی نگرانی کرنا ناممکن تھا۔ دوم یہ کہ سیاسی لحاظ سے یہ پورا علاقہ متعدد متمدن اور منظم حکومتوں کا گہوارہ رہ چکا تھا۔ سوم یہ کہ تہذیب و تمدن کے بلند معیار کے سبب یہاں کا سیاسی نظام خاصا پیچیدہ تھا اور چہارم یہ کہ مدینہ سے طویل مسافت کے سبب ہر علاقہ پر زیادہ قریبی نگرانی کی ضرورت تھی اور پنجم یہ کہ پورا علاقہ اسلام سے کافی دیر میں روشناس ہوا تھا اس لئے اس علاقے میں ابھی تبلیغ اسلام اور اس سے زیادہ تعلیم اسلام کی زیادہ ضرورت تھی۔

اس علاقہ میں پہلا خطہ جو اسلامی ریاست کی انتظامی ماتحتی میں آیا وہ نجران تھا۔ جہاں کے عیسائی طبقات نے نہ صرف از خود مدینہ پہنچ کر جزیہ ادا کرنے پر صلح کر لی تھی[227]۔ بلکہ ایک عامل اور منتظم کو اپنے علاقہ میں مقرر کرنے کی بھی درخواست کی تھی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی خواہش پر حضرت ابوعبیدہ بن جراح فہری کو ان کے وفد کے ساتھ ۹ھ میں ان کے علاقہ کا منتظم و عامل بنا کر بھیجا تھا[228]۔ مآخذ کے مختلف بیانات سے ثابت ہوتا ہے کہ صحابی موصوف کو نجران کا محض عامل یا مذہبی مبلغ و منتظم بنا کر نہیں بھیجا گیا تھا۔ بلکہ ان کو مکمل انتظامی اختیارات بھی حاصل تھے۔ روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حکم دیا تھا کہ وہ ان کے ساتھ جائیں اور ان کے اختلافی معاملات میں ایمانداری سے فیصلے کیا کریں[229]۔ ابن اسحاق ان کی تقرری کو ایک "عہدہ" قرار دیتے ہیں جبکہ ابن خلدون اس عہدہ دار کو "والی" بتاتے ہیں[230]۔ اس کے علاوہ ابن سعد کا یہ بیان بڑا اہم اور دلچسپ ہے کہ حضرت ابوعبیدہ بن جراح فہری کی ایک اپنی مہر تھی جس کو وہ کاغذات پر لگایا کرتے تھے۔ اس مہر پر نقش تھا یہ کہ اَلْخُمُسُ لِلّٰہِ "خمس یعنی ۵/۱ اللہ کے لئے ہے"۔ یہ گویا ان کی ولایت کی ایک قطعی دلیل تھی۔

۹ھ / ۶۳۱ء میں جب حضرت خالد بن ولید مخزومی نے نجران کے علاقے میں بنو الحارث بن کعب کے لوگوں کو مشرف بہ اسلام کر کے ابتدائی کام کر لیا تھا تو ذی قعدہ ۱۰ھ / فروری ۶۳۲ء میں خزرج کے خاندان بنو نجار کے ایک نوجوان صحابی حضرت عمرو بن حزم کو اس علاقہ کا گورنر مقرر کیا گیا[232]۔ اس بات کے پختہ قرائن ہیں کہ انہوں نے حضرت ابوعبیدہ بن جراح فہری کی جگہ لی تھی، تو

سبکدوش ہو کر واپس مدینہ چلے گئے تھے۔ مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ پانچ ماہ بعد جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات حسرتناک کا واقعہ پیش آیا تھا تو حضرت ابو عبیدہ مدینہ میں موجود تھے۔ جبکہ حضرت عمرو بن حزم نجران میں اپنے فرائض منصبی انجام دے رہے تھے

مآخذ میں دراصل نجران اور جرش کی ولایات پر تقرریوں کے بارے میں متنازع فیہ اور مختلف روایات ہیں جو ان علاقوں کے انتظامی تبدیلیوں یا تقرریوں ہی کے بارے میں کسی صحیح یا قطعی نتیجہ پر پہنچنے میں رکاوٹ ڈالتی ہیں۔ لیکن اس اختلاف و تصادم کے باوجود جو صورت حال ابھرتی معلوم ہوتی ہے۔ وہ نجران کے سلسلہ میں اوپر پیش کی گئی۔ جہاں تک جرش کا تعلق ہے تو فتوح البلدان کی ایک روایت کے مطابق حضرت ابوسفیان بن حرب اموی کو نجران کی ولایت میں حضرت عمرو بن حزم کی جانشینی میں مقرر کیا گیا تھا۔[۲۳۳] مگر یہ روایت واضح طور سے غلط ہے کیونکہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ نجران کے دو والی عہد نبوی میں یکے بعد دیگرے حضرت ابو عبیدہ فہری اور حضرت عمرو بن حزم رہے تھے۔ اور مؤخر الذکر نے وفات نبوی تک اپنے فرائض وہاں انجام دیئے تھے۔ ایک اور روایت سے وضاحت ہوتی ہے کہ خود بلاذری کا پختہ خیال یہ تھا کہ حضرت ابوسفیان اموی کی تقرری جرش کے علاقے پر ہوئی تھی[۲۳۴]۔ عہد نبوی کے اواخر یا خلافت صدیقی کے اوائل میں جب حضرت ابوسفیان اموی نے سبکدوشی حاصل کی تو ان کی جگہ پر بنو امیہ کے ایک حلیف حضرت سعید بن قُشَیب ازدی کو جرش کی ولایت سونپی گئی تھی[۲۳۵]۔ مؤخر الذکر صحابی کے بارے میں ہماری معلومات کافی ناقص ہیں۔ لیکن یہ روایت صحیح معلوم ہوتی ہے کیونکہ تو قیتی ترتیب کے عین مطابق ہے۔

یمن کے ایرانی گورنر حضرت باذان یا باذام کے قبول اسلام اور اس کے نتیجے میں ان کی اور ان کے ہم وطن الابناء کی سیاسی وفاداری نے جزیرہ نمائے عرب کی جغرافیائی سیاسیات میں ایک تاریخ ساز سنگ میل قائم کیا تھا۔ ہمارے مآخذ عموماً ان کے قبول اسلام کے زمانے کے مسئلہ پر زیادہ روشنی نہیں ڈالتے ہیں[۲۳۶]۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ۹ھ / ۶۳۰ء میں کسی وقت غالباً اس کے آغاز میں اسلام قبول کر لیا تھا کیونکہ ایرانی روایات کے مطابق شہنشاہ ایران خسرو پرویز ۶۲۸ء میں اپنے بیٹے کے ہاتھوں قتل ہو گیا تھا اور اس کے بعد ایرانی سلطنت ابتری اور افراتفری کا شکار ہو گئی تھی۔ صوبائی گورنر یا تو خود مختار ہو گئے تھے یا انہوں نے اپنی سیاسی وفاداریوں کا رخ بدل دیا تھا۔ حضرت باذان کو اسلامی ریاست کے بڑھتے ہوئے اقتدار اور طاقت کا بخوبی احساس و ادراک تھا چنانچہ انہوں نے اپنی قسمت مدینہ سے وابستہ کر لی اور اس میں وہ پوری طرح سے مخلص تھے[۲۳۷]۔ بہرحال اس خوش آئند اور تاریخی موڑ کے سبب یمن کا صوبہ جو وقت کی تمام بڑی طاقتوں کے سیاسی کھیل کا اکھاڑہ بن کر رہ گیا تھا، اسلامی ریاست کا ایک اٹوٹ حصہ بن گیا۔ جب تک حضرت باذان زندہ رہے وہ بلا شرکت غیرے اس کے گورنر رہے[۲۳۸]۔ ان کی وفات کے بعد ان کے فرزند حضرت شہر بن باذان نے عارضی طور سے اقتدار سنبھال لیا۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سارے حالات مدینہ لکھ بھیجے آپ نے ان کی وفاداری اور خلوص کی توصیف و تحسین کی اور متبادل انتظامات ہونے تک ان سے کام کرتے رہنے کو کہا[۲۳۹]۔ اس کے بعد ہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ سے جنوبی عرب یعنی یمن، عدن اور حضر موت کے پورے علاقے کے لئے مرکزی منتظم روانہ کئے[۲۴۰]۔ جن کے سربراہ، منتظم اعلیٰ اور گورنر جنرل حضرت معاذ بن جبل خزرجی تھے۔

حضرت معاذ بن جبل کے مقام اور مرتبے کو جدید مؤرخوں نے عام طور سے غلط سمجھا ہے[۲۴۱]۔ جنوبی عرب کے انتظامیہ میں انکو

ایک مذہبی مبلغ و معلم یا زیادہ سے زیادہ عامل صدقات کا درجہ دیا جاتا ہے۔ دراصل ان کے بارے میں متعدد روایات مآخذ میں ملتی ہیں جن میں سے ہر ایک میں ان کے کسی ایک پہلو کو اجاگر کیا گیا ہے اور مؤرخین نے ان کو الگ الگ سمجھ کر ان کے بارے میں رائے قائم کی ہے حالانکہ اگر تمام روایات کو جمع کر کے تجزیہ و تحلیل کی جاتی تو ان کے صحیح مقام کا عرفان کچھ زیادہ مشکل نہیں تھا۔ بہرحال تمام روایات کی روشنی میں یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ان کی حیثیت منتظم اعلیٰ اور گورنر جنرل کی تھی اور ان کے اختیارات واقتدار اس علاقہ کے تمام والیوں، عاملین صدقات اور مقامی منتظمین پر قائم و حاوی تھا۔ ابن اسحاق نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک نامۂ مبارک کا متن نقل کیا ہے۔ جس میں آپ نے حضرت زرعہ ذی یزن (علاقہ یزن کے حکمران) کو ہدایت کی تھی کہ وہ فرستادگان رسول کی نہ صرف اطاعت و فرمانبرداری کریں بلکہ اپنے علاقے کے تمام صدقات اور جزیہ کی رقوم کو جمع کر کے ان کے حوالے کریں۔

اس نامۂ گرامی کا اس ضمن میں سب سے اہم فقرہ یہ تھا کہ ان فرستادگان (رُسُل) کے سردار و قائد حضرت معاذ بن جبل ہیں[242]؛ بلاذری کی روایت ہے کہ ان کو الجند پر گورنر (والی) مقرر کیا گیا تھا۔ اور ان کو یمن میں قضا (تمام مقدمات کے فیصلے کا اختیار) اور تمام صدقات وصول کرنے کا مجاز قرار دیا گیا تھا[243] بلاذری نے اپنی دوسری تصنیف میں حضرت معاذ بن جبل کے اختیارات و فرائض کی تفصیل و تشریح کرتے ہوئے کہا ہے کہ یمن کے تمام لوگوں کو اسلامی اصولوں، قوانین اور قرآن کریم کی تعلیم دینے کے علاوہ عدل و انصاف کرنے اور تمام صدقات وصول کرنے کا حکم دیا گیا تھا[244]۔ اسی طرح دوسرے مآخذ جیسے ابن ہشام[245]، ابن سعد[246]، بخاری[247] اور ابن اثیر[248] اور ابن خلدون[249] کے بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ ان کو تمام والیان جنوبی عرب پر ایک امتیازی تفوق و برتری حاصل تھی اور وہ پورے علاقے کے منتظم اعلیٰ تھے۔ طبری کی ایک روایت سے اس کی مزید تصدیق ہوتی ہے جو حضرت معاذ کو معلم قرار دیتی ہے[250]۔ معلم کے ایک عام معنی استاد کے ہیں لیکن لغوی اعتبار سے یہاں اس کے دوسرے معنی آقا اور مالک کے مراد ہیں[251]۔ اس روایت کے مطابق حضرت معاذ کا صدر مقام الجند تھا، مگر وہ مستقل طور سے یمن اور حضر موت کے ہر عامل یا گورنر کے علاقے (عمالہ) میں دورہ کرتے رہتے تھے۔ اور ان کے کاموں کی نگرانی کرتے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ جنوبی عرب میں ردہ تحریک کے خاتمے کے بعد جب تمام ولاۃ یمن و حضر موت ایک جگہ جمع ہوئے تو انہوں نے صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد حضرت معاذ بن جبل ہی کو اپنا سربراہ تسلیم کیا تھا[252] اس سے بڑھ کر ان کے مقام و مرتبے کی اور کیا شہادت ہو سکتی ہے۔

حضرت معاذ بن جبل کے جنوبی عرب کے انتظامیہ میں مقام و مرتبے کی مانند ان کی تاریخ تقرری بھی کافی مختلف فیہ ہے۔ ابن سعد کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ربیع الثانی سنہ ۹ھ / جولائی۔ اگست ۶۳۰ء میں جنوبی عرب کیلئے روانہ ہوئے تھے[253] جبکہ دوسرے مآخذ سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ان کی تقرری کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حجۃ الوداع کے بعد کا واقعہ سمجھتے ہیں[254]۔ لیکن متعدد وجوہ سے ابن سعد کی تاریخ زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ اسود عنسی کی بغاوت کے بارے میں طبری کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ وہ سنہ ۱۱ھ کے وسط یا اوائل میں پیش آئی تھی جب اس نے حضرت شہر بن باذان کو قتل کر کے صنعاء کی حکومت پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس سلسلہ میں دو اہم نکات پر توجہ رکھنا ضروری ہے۔ اوّل یہ کہ تمام مآخذ حضرت شہر کو صنعا کا گورنر قرار دیتے ہیں۔ صحابی موصوف کی یہ تقرری مدینہ سے مرکزی منتظمین کے آنے کے بعد ہوئی تھی جبکہ وہ ان کی آمد

سے قبل پورے یمن کے عارضی گورنر تھے ۔ دوم یہ کہ مآخذ کا واضح بیان ہے کہ اسود عنسی کی بغاوت کے زمانے میں تمام مرکزی منتظمین اپنے اپنے علاقوں میں پہنچ کر اپنے فرائض منصبی سنبھال چکے تھے[۲۵۵] اور پھر جب اس بغاوت کے نتیجہ میں افراتفری اور سیاسی انارکی پھیلی تو وہ سب نجران کے علاقے میں جمع ہو گئے تھے اور بالآخر بغاوت کے استیصال کے بعد حضرت معاذ بن جبل کی امارت اعلیٰ پر اتفاق کیا تھا ۔ اور اپنے اپنے علاقوں کے لئے پھر روانہ ہو گئے تھے ۔ ان شہادتوں سے یہ حتمی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ حضرت معاذ بن جبل اور ان کے ماتحت گورنروں / والیوں اور طبقہ افسران کی تقرری ۹ھ کے آغاز میں یا وسط میں ہوئی تھی اور وہ اسی برس کے اواخر سے پہلے یمن پہنچ کر اپنے فرائض انجام دے رہے تھے[۲۵۶]

حضرت معاذ بن جبل خزرجی کے ماتحت گورنروں کی کل تعداد دس معلوم ہوتی ہے ۔ جن کو طبری کے مطابق[۲۵۷] مخصوص علاقوں میں جن کی حدود معلوم و متعین تھیں اور جن کے صدر مقامات کی بھی نشاندہی کر دی گئی تھی تعینات کیا گیا تھا ان گورنروں اور ان کے علاقوں کی تفصیل ذیل میں دی جا رہی ہے ۔

۱۔ حضرت شہر بن باذان	صنعاء اور اس کے ماتحت علاقے ۔
۲۔ حضرت عامر بن شہر ہمدانی[۲۵۸]	علاقہ ہمدان
۳۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری	مارب کا علاقہ یا رمع ، زبید ، عدن اور سواحل کے علاقے[۲۵۹]
۴۔ حضرت خالد بن سعید اموی	نجران رمع اور زبید کے درمیانی علاقے[۲۶۰]
۵۔ حضرت طاہر بن ابی ہالہ	عک و اشعر کے علاقے ۔ [۲۶۱]
۶۔ حضرت یعلیٰ ابن امیہ	الجند کا علاقہ [۲۶۲]
۷۔ حضرت عمرو بن حزم خزرجی	نجران
۸۔ حضرت زیاد بن لبید	حضر موت [۲۶۳]
۹۔ حضرت مہاجر بن ابی امیہ مخزومی	بنو معاویہ / کندہ کا علاقہ [۲۶۴]
۱۰۔ حضرت عکاشہ بن ثور غوثی	سکاسک اور سکون کے علاقے [۲۶۵]

ان ماتحت گورنروں میں سے حضرت مہاجر بن ابی امیہ مخزومی کے بارے میں روایت ہے کہ وہ اپنی تقرری کے بعد بیمار ہو گئے تھے ۔ اس لئے ان کی روانگی میں تاخیر ہوئی تھی اور ان کی غیر حاضری میں ان کے فرائض کی انجام دہی حضرت زیاد بن لبید خزرجی کرتے تھے ۔ ان کو غالباً اس لئے ان کے فرائض سونپے گئے تھے کہ ان کا علاقہ غیر حاضر گورنر کے علاقے سے متصل تھا ۔ بہر حال ان میں سے تین مؤخر الذکر گورنر حضر موت کے مختلف علاقوں یا ولایات کے حکمران تھے ۔ جبکہ بقیہ سات یمن کے مختلف علاقوں پر مقرر کئے گئے تھے[۲۶۶]

ان تمام ماتحت گورنروں کے علاوہ جو اپنے اپنے علاقہ کے خود مختار و آزاد حکمران تھے ۔ متعدد مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت معاذ بن جبل کے ساتھ متعدد افسر اور مددگار کارکن بھی بھیجے گئے تھے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنوبی عرب کے انتظامیہ

میں ایک طبقہ افسران یا سکریٹریٹ بھی قائم کی گئی تھی جو مختلف انتظامی امور کے نفاذ کا کام دیکھتی تھی۔ اس کی سب سے بڑی شہادت حضرت زرعہ والی یمن کے نام مذکورہ بالا نامہ نبوی سے ہوتی ہے۔ جس کے مطابق حضرت معاذ بن جبل کے ساتھ متعدد افسر و کارکن (عمال) بھیجے گئے تھے۔ ابن اسحاق، طبری اور دوسرے مآخذ سے ان میں سے صرف چار افسروں کے نام معلوم ہو سکے ہیں۔ یہ تھے: حضرات عبداللہ بن زید، مالک بن عبادہ، عقبہ بن نمر، اور مالک بن مرّہ۔ ان کے علاوہ بھی متعدد تھے جن کو مذکورہ بالا چاروں اصحاب کے ساتھی کہہ کر بیان کیا گیا ہے[۲۶۷]۔ مزید تصدیق اسد الغابہ کی ایک روایت سے ہوتی ہے۔ جس کے مطابق حضرت عبید بن صخر بن لوذان انصاری بھی حضرت معاذ بن جبل خزرجی کے "اصحاب" میں سے ایک تھے[۲۶۸]۔ ان شہادتوں کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط نہ ہوگا کہ یمن و حضرموت کے تمام گورنروں کی ماتحتی میں مرکزی کارکنوں کا ایک طبقہ بھی کام کرتا تھا جو ان کے کاموں میں ان کی مدد کرتا اور صوبائی انتظام و انصرام کو چلانے میں تعاون دیتا تھا۔ اس ضمن میں اسد الغابہ کی ایک اور روایت کا حوالہ پھر دینا مناسب ہوگا۔ جس کے مطابق حضرت عبداللہ بن ابی ربیعہ مخزومی کو یمن اور اس کے ماتحت علاقوں کی صوبائی فوج کا امیر مقرر کیا گیا تھا[۲۶۹]۔ اس سے یہ تصدیق ہوتی ہے کہ گورنروں / والیوں کے لئے کچھ فوجی افسر بھی مقرر کئے گئے تھے۔ اس بات کے کہنے کی کوئی ضرورت نہیں رہتی کہ اس وسیع خطہ سے صدقات کی وصولی کے لئے بھی بہت سے افسر مقرر کئے گئے تھے۔ مؤخر الذکر کے بارے میں ہم اگلے باب میں تفصیل سے پڑھیں گے۔

مرکزی منتظمین اور والیوں کے سلسلے میں ایک اہم نکتہ ان کے مدت عہدہ کا تھا۔ مختلف گورنروں / والیوں کے سلسلہ میں ان کی مدتِ ملازمت و عہدہ کا ذکر بھی آچکا ہے۔ یہاں اس سلسلے میں چند اہم نکات پر توجہ دلانا مقصود ہے۔ اوّل یہ کہ تمام گورنر مستقل عہدے دار تھے۔ جو کافی مدت کے لئے مقرر کئے جاتے تھے۔ دوسرے مرکزی افسروں کی مانند وہ عارضی افسر نہیں ہوتے تھے۔ دوم یہ کہ بیشتر گورنر پوری حیات نبوی کے دوران اپنے عہدوں پر برقرار و سرفراز رہے تھے اور صرف چند ہی کو ان کے عہدوں سے معزول یا تبدیل کیا گیا تھا۔ سوم یہ کہ ان میں سے بعض گورنر تو خلافت صدیقی کے پورے زمانے میں بھی برقرار رہے تھے۔ مکہ، نجران، بحرین اور جرش کے چار گورنروں کے بارے میں معلوم ہوتا ہے۔ کہ انہوں نے مختصر مدت کے لئے عہدہ سنبھالا تھا اور ان کی جگہ دوسروں نے سنبھالی تھی۔ دو گورنروں حضرات باذان اور ان کے فرزند شہر نے اپنے عہدوں کے زمانے ہی میں وفات پائی تھی جبکہ باقی پچیس گورنروں نے اسلامی ریاست کی حیات نبوی کے آخر تک خدمت کی تھی۔

ذیل میں ان تمام ولاۃ نبوی کے قبائل اور علاقائی تعلق کو ظاہر کرنے کے ایک جدول دی جا رہی ہے۔ اس جدول سے ان کی سال بسال تقرری کا بھی علم ہوتا ہے۔ جس سے صوبائی انتظامیہ کے ارتقاء کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

سنہ تقرری

علاقہ	قبیلہ / خاندان	۶۲۸ / ۷	۶۳۰ /	۹/۶۳۱ - ۳۱۸	۹/۶۳۱	تعداد ولاۃ
مرکزی عرب	۱۔ قریش	۳	۲	۵	۲	۱۲
	(الف) ہاشم	-	-	۱	-	۱

	(ب) امیہ	۳	۱	۲	۱	۷
	(ج) مخزوم	-	-	-	۱	۱
	(د) فہر	-	-	۱	-	۱
	(س) مطلب	-	-	۱	-	۱
	(ص) سہم	-	۱	-	-	۱
	۲۔ خزرج	۱	-	۲	۳	۶
مشرقی عرب	(۱) ثقیف	-	۱	۱	-	۲
	(۲) طے	-	-	۱	-	۱
شمالی عرب	۱۔ ازد	-	-	۱	۱	۲
	۲۔ اشعر	-	-	-	۱	۱
	۳۔ غوث بن مر	-	-	۱	۱	۲
	۴۔ حضرموت	-	۱	-	-	۱
	۵۔ ہمدان	-	-	-	۱	۱
	۶۔ الابناء ایرانی	-	-	۱	۱	۲
قبائل پراگندہ	۱۔ تمیم	-	-	-	۲	۲
میزان	۱۱۔ قبیلے	۴	۴	۱۲	۱۲	۳۲

اس جدول سے بعض دلچسپ نکات سامنے آتے ہیں۔ والیوں یا مرکزی منتظمین کی کل تعداد عہد نبوی میں ۳۲ تھی جن میں سے حصۂ غالب یعنی ۱۲ والیوں کو قریش کے مختلف خاندانوں سے بالکل فطری طور پر منتخب کیا گیا تھا۔ اس سلسلہ میں ایک دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ بنوامیہ کے سات افراد کو یہ منصب جلیل حاصل ہوا تھا جو ایک لحاظ سے کارنامہ تھا۔ ان میں سے چار گورنروں کا تعلق بنوامیہ کے ایک خاندان بنوسعید بن العاص سے تھا اور وہ سب کے سب حقیقی بھائی تھے۔ اس سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان میں سے تین بھائی بیک وقت گورنروں کے عہدے پر سرفراز تھے، چوتھے کے بارے میں اختلاف ہے اور امکان ہے کہ وہ بھی اپنے بقیہ تین ممتاز و سربرآوردہ بھائیوں کے ساتھ ساتھ اس عظیم عہدے پر فائز رہے ہوں۔ یہ چاروں بھائی تھے۔ عبداللہ بن سعید، عمرو بن سعید، ابان بن سعید، اور خالد بن سعید جنہوں نے بالترتیب قری عربیہ، وادی القریٰ، بحرین اور صنعا کے اہم ترین ولایات سنبھال رکھی تھیں۔ دو دوسرا اموی گورنر ول حضرات ابوسفیان بن حرب اور ان کے فرزند یزید کا تعلق بھی مکہ کے ایک اہم و ممتاز ترین خاندان سے تھا جو اپنی انتظامی، فوجی اور سیاسی لیاقت کے علاوہ

اپنی اقتصادی دولت کے لیے بھی مشہور و معروف تھا اور آخری اموی گورنر حضرت عتاب بن اسید تھے۔ جنہوں نے سب سے پروقار و پر افتخار عہدہ ولایت مکہ کو حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی تھی۔ سوائے ابوسفیان بن حرب اموی کے جنکو اپنے عہدے سے معزول کر دیا گیا تھا یا جنہوں نے از خود سبکدوشی حاصل کر لی تھی باقی تمام اموی گورنر کافی دنوں تک اپنے عہدوں اپنی سرفراز رہے تھے۔ ان میں سے عبداللہ بن سعید کا جلد ہی انتقال ہو گیا تھا جبکہ پانچ اموی گورنر حیات نبوی کے اواخر تک اپنے اپنے علاقوں کے گورنر رہے تھے۔ بلاذری نے اپنی متعدد روایات میں سے ایک میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ وفات نبوی کے وقت صرف چار اموی گورنر اپنے عہدوں پر برقرار تھے لیکن مورخ موصوف نے حضرت یزید بن ابی سفیان اموی گورنر تیما کا نام اس فہرست میں نہیں گنایا ہے ورنہ تعداد پانچ ہوتی۔ بہرحال اتنی بھی تعداد میں عہد نبوی کے انتظامیہ میں اموی گورنروں کی شمولیت کی اہمیت اس پس منظر میں اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ حضرت ابوسفیان بن حرب اور سعید بن العاص نے مدتوں تک اسلام اور اسلامی ریاست کی مخالفت کی تھی۔ سعید کا تو کفر ہی پر جنگ بدر کے بعد انتقال ہو گیا تھا جبکہ حضرت ابوسفیان نے فتح مکہ کے زمانے میں اسلام قبول کیا تھا۔ ان کے فرزند یزید بھی کافی متاخر مسلمان تھے کہ انہوں نے عمرۃ القضیہ کے زمانے میں اسلام قبول کیا تا۔ صرف خاندان سعیدی کے دو گورنر حضرات خالد و عمرو ابتدائی مسلم تھے اور باقی دو سعیدی افراد نیز حضرت عتاب گورنر مکہ بھی فتح مکہ کے آس پاس کے زمانے کے مسلمان تھے۔ بہرحال اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ امویوں نے اسلام اور اسلامی ریاست کی بحیثیت قبیلہ یا خاندان کے مخالفت کی تھی۔ اس موضوع پر باب دوم میں مکمل و مدلل بحث کی جا چکی ہے جسے اب یہاں دہرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اس سلسلہ میں اہم ترین نکتہ یہ ہے کہ عہد نبوی کی ۲۷ ولایات میں سے ۷ پر کسی نہ کسی وقت اموی گورنر فائز رہے تھے اور ۵ ولایات پر تو بیک وقت انہوں نے حکمرانی کی تھی یہاں اس نکتہ کیطرف بھی اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ دو گورنروں حضرات علاء بن حضرمی گورنر بحرین اور سعید بن قشیب ازدی گورنر جرش کا تعلق بھی بنو امیہ کے خاندان سے تھا۔ کہ وہ دونوں ان کے حلیف تھے۔ اس لحاظ سے عہد نبوی کے اس شعبۂ عمال و امراء میں امویوں کی کل تعداد ۹ ہو جاتی ہے۔ جو گورنروں کی کل تعداد کی ایک چوتھائی سے بھی کچھ زیادہ یا ایک تہائی سے کچھ کم ہے۔ باقی قریشی گورنروں میں سے ایک ایک بنو ہاشم، بنو فہر، بنو مطلب، بنو سہم اور بنو مخزوم میں سے تھا اور آخری خاندان سے یمن میں اسلامی فوج کے صوبائی کمانڈر کا بھی تعلق تھا۔

امت اسلامی کا دوسرا اہم سماجی طبقہ خزرج کا تھا جن کے چھ ارکان نے ریاست اسلامی کی متعدد اہم ولایات پر گورنری کی تھی۔ ان میں سے سب سے نمایاں اور اہم مقام کے مالک حضرت معاذ بن جبل خزرجی تھے۔ جنہوں نے وسیع و عریض جنوبی عرب کے خطے کی تمام ولایات کے گورنر جنرل کی حیثیت سے تاریخ اسلامی میں اپنی انمٹ چھاپ چھوڑی ہے۔ باقی خزرجی گورنروں نے خیبر، ایلہ، نجران اور حضرموت کے علاقوں کی ولایات پر حکمرانی کی تھی۔ اس طبقہ عمال نبوی میں مدینہ کے ایک اور اہم ترین قبیلہ اوس کی عدم شمولیت خاصی اہم اور حیرت انگیز ہے۔

دوسرے قبائل عرب بنی ثقیف، غوث بن مراد اور تمیم ایک دوسرے کے ہم پلہ تھے۔ کیونکہ ان کے دو دو نمائندے اس

طبقۂ افسران نبوی میں شامل تھے۔ اس سلسلہ میں یہ دلچسپ بات قابل ذکر ہے کہ دونوں تمیمی گورنروں نے اپنے علاقوں کو چھوڑ کر مکہ میں سکونت اختیار کر لی تھی اور قریش کے خاندانوں میں کسی نہ کسی کے حلیف بن گئے تھے۔ اس لحاظ سے ان کی تقرریاں در اصل قریش کی تقرریاں شمار ہونی چاہئیں۔

ولاۃ نبوی کے بارے میں ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ ان میں سے غالب اکثریت کا تقرر ان کے اپنے علاقے یا آبائی وطن میں نہیں ہوا تھا۔ صرف مکہ اور طائف کے گورنر اور کسی حد تک ہمدان کے گورنر اپنے اپنے علاقہ کے لوگ تھے ورنہ بیشتر گورنروں کا تعلق ان علاقوں یا قبائل سے نہیں تھا۔ جن پر ان کو حکمرانی کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا۔ یہ عہد نبوی کے انتظامیہ یا حکومت کی مرکزیت کی ایک اہم علامت تھی کیونکہ عرب قبائل اپنے مزاج کے سبب جس کو قبائلی روایات نے بنایا تھا کسی "غیر" کی حکومت و حکمرانی کو کبھی برداشت نہیں کرتے تھے اور مجبوراً کبھی ایسا ہو جاتا تھا تو اس کی حکومت کے خلاف ہر موقع کی تاک میں رہتے تھے۔ بہر حال ان میں مدینہ کی مرکزی حکومت کی اطاعت کا جذبہ در اصل اسلام کی ایک دین تھی۔

جہاں تک ان گورنروں کے زمانہ قبول اسلام کا تعلق ہے تو ۳۲ اشخاص میں سے صرف پانچ کو سابقین اولین کے زمرہ میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ جبکہ آٹھ دوسروں نے ہجرت سے ذرا قبل یا کچھ بعد اسلام قبول کیا تھا۔ بقیہ نے جواب بھی اکثریت میں ہیں کافی تاخیر سے اسلام قبول کیا تھا۔ ان میں سے سات نے صلح حدیبیہ سے کچھ پہلے یا اس کے بعد متاً جبکہ باقی نے فتح مکہ کے زمانے میں یا اس کے بعد اسلام میں داخل ہونا پسند کیا تھا۔

والیوں / گورنروں کے اختیارات

اس بحث کے آخر میں چند الفاظ والیوں کے اختیارات کے ضمن میں کہنے ضروری معلوم ہوتے ہیں۔ پہلے مختصر طور سے سہی مگر ذکر آ چکا ہے کہ گورنر / والی اپنی ولایت کے نظم ونسق میں بالکل آزاد و خود مختار ہوتے تھے اور اس لحاظ سے ان کو کافی بلکہ غیر محدود اختیارات حاصل تھے۔ وہ نہ صرف شہری نظم ونسق کے ذمہ دار ہوتے تھے بلکہ وہ اپنے علاقہ کے فوجی سالار، قاضی اور عامل صدقات بھی ہوتے تھے۔ ان کو سیاسی و عسکری تقاضوں کے مطابق قوانین وضع کرنے اور نافذ کرنے کے بھی اختیارات ہوتے تھے۔ ان پر صرف کتاب و سنت کی پابندی تھی یا وقتاً فوقتاً رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کو جو ہدایات و احکام بھیجتے رہتے تھے۔ ان کی تعمیل لازمی تھی اور یہ آخری پابندی در اصل سنت میں ہی شامل ہے۔ اس سلسلہ میں ابن سعد اور ترمذی کی روایت کردہ حدیث اکثر نقل کی جاتی ہے جس کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل خزرجی سے ان کی یمن کو بطور گورنر جنرل روانگی سے قبل پوچھا تھا کہ وہ کس بنیاد پر فیصلے کیا کریں گے۔ حضرت معاذ نے پہلے کتاب کی روشنی میں اور اس میں اگر ہدایت نہ ملے تو سنت کی روشنی میں فیصلہ کرنے کا خیال ظاہر کیا تھا۔ پھر سوال نبوی پر کہ اگر دونوں میں کوئی ہدایت نہ ملے تو وہ کیا کریں گے۔ اس پر انہوں نے اپنی رائے پر فیصلہ کرنے کا خیال ظاہر کیا تھا۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تعریف و تحسین فرمائی تھی[۱۶]۔ اس حدیث سے یہ نکتہ مزید واضح ہوتا ہے کہ کتاب و سنت کی حد بندی کے اندر اندر

تمام گورنر بلکہ افسران و عمال نبوی اپنے اپنے علاقوں میں انتظام و انصرام چلانے میں پوری طرح آزاد تھے۔ ایک طرح سے صوبائی نظم و نسق مرکزی انتظامیہ کی بالکل نقل تھی۔

بہر حال یہ معمول نبوی تھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ اپنے تمام افسروں، عاملوں اور گورنروں کو ان کی روانگی سے قبل ہدایات دیتے تھے۔ جیسا کہ حضرات معاذ بن جبل اور عمرو بن حزم وغیرہ گورنروں کے معاملہ سے معلوم ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر آپ نے حضرت معاذ بن جبل کو حکم دیا تھا کہ وہ اپنے علاقہ کے لوگوں کو، جو اتفاق سے "اہل کتاب" تھے۔ اسلام کی دعوت دیں نمازوں کا حکم کریں، اور زکوٰۃ کی ادائیگی کی ہدایت دیں۔ آپ نے ان کو یہ بھی ہدایت دی تھی کہ وہ ان کی دولت کی بہترین چیز بطور صدقات ہیں لینے سے احتراز کریں۔ اور مظلوم و بیکس کی بددعا سے بچیں [۲۰۱] ایک اور روایت کے مطابق آپ نے ان کو لوگوں کے لئے دشواری کی جگہ آسانی پیدا کرنے کی ہدایت کی۔ اختلاف بجائے تعاون کو بڑھاوا دیں اور نفرت کی جگہ محبت پیدا کریں [۲۰۲] آپ نے ان کو لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے اور نرم رویہ اپنانے کی بھی ہدایت کی تھی [۲۰۳]

اگرچہ ایک جدید مؤرخ نے شکوک و شبہات کا اظہار کیا ہے [۲۰۴] تاہم اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ حضرت عمرو بن حزم کو جو ہدایات نبوی دی تھیں وہ مفصل بھی ہیں اور جامع بھی۔ آپ نے ان کو ہدایت دی تھی کہ وہ ہر حال میں خدا کا خوف و تقویٰ اختیار کریں، سچائی و صداقت کا معاملہ کریں۔ لوگوں کو خوشخبری سنائیں۔ ان کو قرآن کریم کی تعلیم دیں، غلط کام کرنے سے روکیں ان کے اختیارات، حقوق اور فرائض سے آگاہ کریں، لوگوں کے صحیح طرز عمل اختیار کرنے کی صورت میں ان کے ساتھ نرمی اختیار کریں، اور غلط کام کرنے کی صورت میں ان کو سزا دیں۔ انہیں جنت کی بشارت دیں اور اس کو حاصل کرنے کا طریقہ بتائیں اور جہنم سے ڈرائیں۔ لوگوں کے ساتھ دوستی قائم کریں۔ تاکہ ان کو آسانی سے دین کی تعلیم دے سکیں اور ان کو حج کے مراسم کی تعلیم دیں۔ ان کو ایک کپڑے میں جس کے دونوں سرے ان کے شانوں پر دھرے ہوں نماز ادا کرنے سے منع کریں۔ اسی طرح ان کو ایسا لباس پہن کر بیٹھنے سے روکیں۔ جس سے ان کا جسم کھل جائے۔ اگر ان کے بال لمبے اور شانہ پر پڑے ہوں تو ان کو چوٹی گوندھنے سے روکیں، لڑائی جھگڑے کی صورت میں ان کو قبیلے اور خاندان کی دہائی دینے سے روکیں بلکہ خدا سے استمداد کی ہدایت کریں اور جو لوگ خدا کی طرف رجوع نہ کریں بلکہ اپنے قبائل اور خاندانوں ہی کی دہائی دیتے رہیں۔ ان کو تلواروں سے ٹھیک کریں حتیٰ کہ وہ خدا کی طرف رجوع ہو جائیں۔ لوگوں کو وضو اور پاکی کا حکم دیں، وقت پر نمازوں کا حکم دیں، ان کو جب بلایا جائے وہ مسجدوں میں جمع ہو جایا کریں، اور جانے سے پہلے وہ پاکی اختیار کریں۔ ان کو حکم دیں کہ وہ مال غنیمت سے خدا کا خمس نکالیں اور اپنے اموال سے وہ صدقات ادا کریں جو تمام مسلمانوں کے لئے ان کی اراضی پر واجب ہوتے ہیں۔ یعنی چشمہ اور بارش کے پانی سے سیراب ہونے والی اراضی کی پیداوار میں عشر ۱/۱۰ اور بالٹیوں سے سینچی جانے والی آراضی کی پیداوار میں سے نصف العشر ۱/۲۰۔ اور ان کے ہر دس اونٹوں پر دو بھیڑ یا بکری اور ہر بیس اونٹوں پر چار بھیڑ یا بکری لیں جبکہ ہر چالیس گائے پر ایک گائے اور ہر تیس گائے پر ایک بیل یا بچھڑا لیں اور ہر چالیس بکریوں / بھیڑوں پر ایک بکری / بھیڑ وصول کریں۔ ایک یہودی یا عیسائی اگر خلوص کے ساتھ اپنے آپ اسلام قبول کرے اور دین اسلام کی مخلصانہ پیروی کرے،

تو اسے ایک مسلمان کے سارے حقوق اور فرائض حاصل ہوں گے۔ اگر ان میں سے کوئی اپنے مذہب پر قائم رہنا چاہے تو اسکو زبردستی اس سے ہٹایا نہیں جائے گا، ہر بالغ مرد، عورت، آزاد اور غلام (غیر مسلم) کو ایک دینار طلائی یا اس کی قیمت کا کپڑا (جزیہ میں) دینا ہوگا، جو کوئی اس کی پابندی و تعمیل کرے گا۔ اس کو خدا اور اس کے رسول کا ذمہ حاصل ہوگا۔ اور جو کوئی اس کی مخالفت کرے گا وہ خدا، اس کے رسول اور تمام مسلمانوں کا دشمن تصور ہوگا[۲۶۶]

یہ ہدایات نبوی ظاہر ہے کہ مختلف النوع ہیں۔ ان میں انتظامی احکام کے علاوہ مذہبی اور سماجی ہدایات بھی شامل ہیں۔ سیاسی نقطہ نظر سے قبائلی عصبیت کے رجحانات کو ختم کرنے کی ہدایات اور ان لوگوں کے خلاف جو قبائلی عصبیتوں کو بھڑکائیں اور اس طرح معاشرے میں ابتری پھیلائیں، تلوار اٹھانے کی اجازت بہت اہمیت کی حامل ہے۔ اس سے ایک طرف تو قبائلی عصبیت کو ختم کرنے میں مدد ملتی اور دوسری طرف اسلامی بلکہ عرب معاشرے میں مرکزیت و اجتماعیت کی سعادت پیدا ہوتی۔ جہاں تک مالی معاملات و امور کے بارے میں ہدایات نبوی کا تعلق ہے تو ہم ان پر بحث اگلے باب میں کریں گے۔ بہرحال مجموعی طور سے یہ ائمہ نبوی ولایات کے گورنروں کے نبوی انتظامیہ میں مقام و مرتبہ کے علاوہ ان کے اختیارات و فرائض کی واضح نشاندہی کرتا ہے۔ اصولی طور سے تمام گورنر مرکزی حکومت کے پابند بھی تھے اور اس کے سامنے جوابدہ بھی۔ لیکن اپنے اندرونی نظم و نسق کے معاملہ میں وہ قطعی آزاد اور خود مختار تھے۔ انکو کافی وسیع سیاسی، انتظامی، فوجی اور مالی اختیارات حاصل تھے۔ کتانی نے ان کے اختیارات کی وضاحت کے لئے ایک مشہور مصنف کا قول نقل کیا ہے۔ کہ ولاۃ / والی وہ عمال تھے۔ جن کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے علاقوں (البلاد) القضاء (القضاء) صدقات و محاصل (الصدقات) اور حج کا امیر مقرر کیا تھا[۲۶۸]۔ اس کی تصدیق مزید بلاذری کے بیان سے ہوتی ہے۔ جس کے مطابق کہ امیر وہ شخص ہوتا تھا جو کسی علاقہ کا حکمران ہوتا اور وہاں سے صدقات وصول کرتا تھا ارزاقی کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ۸ھ / ۶۳۰ء میں حضرت عتاب بن اسید اموی نے حج اپنی امارت میں انجام دیا تھا کیونکہ وہ علاقہ کے گورنر امیر البلد تھے۔ حالانکہ اس روایت کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انکو اس فریضہ کی ادائیگی کا صریحی حکم نہیں دیا تھا[۲۶۹]۔ بہرحال تمام تاریخی شواہد اور قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست کے صوبوں / ولایتوں کی حکومت کا نظام مرکزی انتظامیہ کے مثل ہوتا تھا اور اسی کی مانند ان کے مختلف مالی، انتظامی اور فوجی شعبے ہوتے تھے جن میں متعدد افسر اور عمال کام کرتے تھے۔ یہ عربوں کے لئے ایک نیا سیاسی تجربہ تھا جس میں اختیار و اقتدار کا سرچشمہ مرکز میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات تھی اور بقیہ تمام مرکزی اور صوبائی عمال و افسر آپ کے ماتحت اور آپ کے سامنے جوابدہ تھے۔

۲۔ مقامی منتظمین

دوسرے معلوم اسباب و وجوہ کے علاوہ عرب کا قبائلی نظام بھی اس امر کا ذمہ دار تھا۔ کہ مرکزی منتظمین، والی اور گورنر اور صوبائی افسر نہ تو مقامی معاملات و مسائل کو پوری طرح سمجھتے تھے اور نہ ہی ان کو سلجھانے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ اس کے

علاوہ وہ مقامی لوگوں کی تسکین اور اطمینان کے مطابق بھی کام نہیں کر سکتے تھے۔ ہر زمانے میں اور ہر علاقے میں ایسے لوگوں کی ہمیشہ ضرورت رہی ہے جو مقامی مسائل کو سمجھ اور حل کر سکیں اور ساتھ ہی اپنے لوگوں میں خود اعتمادی اور اعتماد بھی پیدا کر سکیں چنانچہ ان اسباب و وجوہ سے مقامی منتظمین کی تقرری ناگزیر ہو گئی تھی۔ عام طور سے یہ مقامی منتظمین اپنے اپنے علاقوں کے قبائلی سردار ہوتے تھے۔ لیکن بعض علاقوں میں جہاں شیوخ قبائل نے اسلام نہیں قبول کیا۔ اور ان کی معتدبہ تعداد نے اس شرف کو حاصل کر لیا ہو تو اس علاقے کے مسلمانوں کا ایک مقامی سردار مقرر کر دیا جاتا تھا۔ اور اس تقرری میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کلی اختیار حاصل ہوتا تھا۔ لیکن اس اختیار کے باوجود آپ ہمیشہ اس "قوم" یا "قبیلہ" کے لوگوں کے خواہشات و جذبات کا احترام کرتے تھے، اور انہیں کے پسندیدہ اور سربرآوردہ شخص کو سردار مقرر فرماتے تھے۔ بعض مسلم قبیلوں کے شیوخ و سادات کی تقرری اور تبدیلی بھی آپ کے حکم و مرضی سے ہوئی تھی۔ اور یہ آپ کی عظیم سیاسی طاقت اور اقتدار مطلق و حاوی کی ایک علامت تھی۔ یہ نکتہ ذہن نشین رکھنے کے قابل ہے کہ یہ تمام مقامی منتظمین بلا استثنا عاملین صدقات بھی ہوتے تھے۔ لہذا عاملین صدقات اور مقامی منتظمین دونوں ایک دوسرے کے مترادف تھے۔ مگر اس بحث میں ہم نے تکرار سے بچنے کی خاطر عاملین صدقات کو شامل نہیں کیا ہے اور صرف انہی سرداروں اور شیوخ (رؤس = راس) کو شامل کیا ہے جن کو ماخذ میں صرف اس حیثیت سے ذکر کیا گیا ہے۔ یہ بات یہاں واضح کر دی ضروری ہے کہ مذکورہ بالا بحث میں تمام مقامی منتظمین یا قبائلی سرداروں کو شامل نہیں کیا جا سکا اور ہماری فہرست بہت ہی ناقص اور نا تمام ہے کیونکہ ان سب کا نام بنام ذکر نہیں ملتا ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مقامی منتظمین یا قبائلی سرداروں کی حقیقی اور اصل تعداد ان کے قبائل کی تعداد کے تناسب سے تھی۔ بلکہ ایک طرح ان سے کئی گنا زیادہ تھی کیونکہ ہر قبیلہ کی متعدد اہم شاخیں (بطون) ہوتے تھے اور ان بطون کی بھی ذیلی شاخیں ہوتی تھیں۔ جیسا کہ ہم باب دوم میں دیکھ چکے ہیں۔ اور ان تمام مادر قبیلوں کا اہم بطون اور ان کی ذیلی شاخوں کے سردار الگ الگ ہوتے تھے۔ اگرچہ ایک متاخر مصنف کا قبائل عرب پر تبصرہ کہ "ان کی تعداد اتنی تھی جتنی کہ آسمان پر ستارے" مبالغہ آمیز ہے لیکن وہ درحقیقت صورتحال کی صحیح عکاسی کرتا ہے۔ مونٹگمری واٹ کا یہ خیال کہ بعثت نبوی کی جگہ قبائل کی جگہ بطون ہر لحاظ سے عرب سماج میں اہمیت اختیار کر چکے تھے صحیح ہے اور اس کے ساتھ اس میں یہ اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ قبائلی سرداروں کی جگہ اب بطون کے سرداروں نے لے لی تھی۔ اور ان کا اختیار اور اقتدار زیادہ مؤثر اور فعال تھا۔

مقامی منتظمین اور قبائلی سرداروں کے بارے میں کافی حوالے اور معلومات پہلے دو ابواب میں آ چکی ہیں۔ لہذا ان کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس بحث میں صرف چند اہم نکات اٹھائے جائیں گے تاکہ اس تاریخی عمل کو سمجھا جا سکے جس کے نتیجہ میں اسلامی حکومت جزیرہ نمائے عرب کے اندرونی، سرحدی اور دور دراز کے علاقوں میں قائم و مستحکم ہو سکی تھی۔

خیال یہ ہے کہ ۹ھ / ۶۳۰-۳۱ء جس کو عام طور سے ماخذ میں عام الوفود (وفود کا سال) کہا جاتا ہے اندرون عرب اور دور دراز کے مقامات میں اسلامی حکومت بلکہ اسلام کے نفوذ کا نقطہ آغاز تھا، جب کہ تقریباً تمام قبائل عرب نے اپنے

اپنے وفود نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جناب میں مدینہ بھیجے تھے۔ لیکن صحیح تاریخی تناظر میں دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ہجرت کا نواں سال دراصل اس تاریخی عمل کا نقطۂ عروج تھا جو مدینہ میں اسلامی ریاست کے قیام کے بعد شروع ہوا تھا۔ بلکہ اسلام کی حد تک تو اس کا نقطہ آغاز مزید تیرہ سال قبل مکہ میں ہوا تھا۔ جیسا کہ ہم اشعر، عبدالقیس، غفار، اسلم، جہینہ، مزینہ، مدلج، ضمرہ اور متعدد دوسرے قبائل کے ضمن میں دیکھ چکے ہیں۔ قبائل عرب کے وفود کی آمد مدینہ پر ابن سعد کی بحث سے یہ حقیقت روشن ہوتی ہے کہ ۹ھ / ۶۳۰ء سے کہیں پہلے عربوں کے وفود بارگاہ نبوی میں آنے شروع ہو گئے تھے۔ بہرحال انہیں زیارتوں کے دوران رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو عربوں کے مختلف قبیلوں کے نمائندوں سے ملاقات کا موقعہ ملتا تھا اور آپ حالات کے مطابق ان کے سرداروں کو برقرار رکھتے تھے۔ یا از سر نو مقرر فرماتے تھے۔ چونکہ بیشتر وفود عرب ۹ھ ہی میں مدینہ آئے تھے۔ اس لیے قبائلی سرداروں یا مقامی منتظمین کی یہ تقرری زیادہ تر اسی برس ہوئی تھی جس برس انہوں نے اسلامی ریاست کے سیاسی اقتدار کو تسلیم کیا تھا۔

اکثر حالات میں فطری طور سے کسی رکن وفد کو اس قبیلہ یا خاندان (بطن) کے مسلمانوں کا سردار اور مقامی منتظم مقرر کر دیا جاتا تھا۔ اگر اس وفد میں سردار قبیلہ خود موجود ہوتا تھا تو عام طور سے اس کو بحال رکھا جاتا تھا۔ از سر نو تقرری کی صورت میں دو اہم نکات سامنے آتے ہیں۔ اول یہ کہ اس کی تقرری قبیلہ والوں کی بجائے خود رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں عمل میں آتی تھی اور دوم یہ کہ منتخب سردار لازمی طور سے وفد کے سب سے زیادہ معمر یا تجربہ کار اشخاص میں سے نہیں ہوتا تھا، جیسا کہ حضرت عثمان بن ابی العاص ثقفی کے معاملہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ عام طور سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مقامی منتظم کا انتخاب دو بنیادوں پر کیا جاتا تھا۔ ایک یہ کہ وہ مقامی انتظام و انصرام کی صلاحیت سے متصف ہو اور دوسرے یہ کہ اس کو اسلام کی کافی معلومات اور دین کا تفقہ ہو۔ دوسری بنیاد یا سبب بعض حالات میں دوسرے اسباب پر فوقیت رکھتا تھا۔ کیونکہ مقامی منتظم یا سردار قبیلہ سے تبلیغ اسلام کا کام بھی لینا ہوتا تھا۔ جو سردار زیادہ آسانی اور موثر طور سے انجام دے سکتا تھا۔

جہاں تک اسلام کے سیاسی اور انتظامی نظام میں مقامی منتظم یا مقامی سردار کے مرتبے کا تعلق ہے تو وہ خاصا دلچسپ اور ایک طرح سے بالکل نیا تھا۔ قدیم جاہلی نظام میں مقامی سردار، مقامی مسائل کا ذمہ دار ہوتا تھا اور غالباً وہ قبائل سردار کے سامنے جوابدہ اور ماتحت بھی ہوتا تھا۔ اب اسکی نوعیت ذرا مختلف نظر آتی ہے۔ وہ قبائلی سردار کی بالادستی کے تحت ہونے کے ساتھ ساتھ مدینہ کی مرکزی حکومت کے سامنے بھی جوابدہ سمجھا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ صوبائی اور مرکزی منتظمین اور مقامی مسلمانوں یا اسلامی ریاست کے شہریوں کے درمیان ایک رابطہ اور کڑی کا کام بھی کرتا تھا۔ بسا اوقات اس کو اختیار اور اجازت حاصل ہوتی تھی کہ وہ براہ راست مدینہ کی مرکزی حکومت سے رابطہ و تعلق قائم کرے ورنہ عموماً اور اصولاً اس کو اپنے علاقے کے مرکزی منتظمین کی اطاعت کرنی ہوتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرکزی علاقوں کے مقامی منتظمین کا تعلق براہ راست مدینہ سے بھی ہو سکتا تھا۔ جبکہ سرحدی مقامات یا دور دراز کے علاقوں کے منتظمین اور سرداروں کو لازمی طور سے اپنے اپنے علاقوں کے گورنروں / یا والیوں کی اطاعت کرنی پڑتی تھی۔ آیئے اس ضمن میں چند مثالیں دیکھیں۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ سرحدی مقامات پر چند مملکتیں اور حکومتیں قائم تھیں جن کے حکمران ماضی میں وقت کی بڑی سلطنتوں میں سے کسی نہ کسی کے باجگذار رہ چکے تھے۔ مشرقی علاقے میں ایسی دو مملکتیں بحرین اور عمان کی تھیں جن پر بالترتیب حضرات منذر بن ساوی اور جیفر و عبد حکومت کرتے تھے۔ ان حکمرانوں نے جب اسلامی ریاست کی سیاسی و انتظامی بالادستی قبول کی تو انہوں نے اپنے علاقوں میں مرکزی منتظمین یا نمائندگان رسول کے قیام و سکونت کی بھی شرط قبول کی تھی۔ چنانچہ بحرین میں حضرت علاء بن حضرمی اور ان کے سابق یا ان کے بعد حضرت ابان بن سعید اموی مدینہ کے نمائندے کی حیثیت سے مقیم تھے جبکہ اسی حیثیت سے حضرت عمرو بن عاص بھی عمان میں قیام پذیر رہے تھے۔ اپنے علاقوں کے اندرونی نظم و نسق میں خود مختار ہونے کے باوجود وہ ان مرکزی نمائندوں کی نگرانی اور ہدایت کے پابند تھے۔ اور ان کی اطاعت ان پر لازمی تھی[۲۸۰] اور ایسے معاملات میں جن کا تعلق مرکزی حکومت کے مفادات سے ہو یہ مقامی حکمران پوری طرح سے ان نمائندگان رسول کے تابع و محکوم تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضرات منذر بن ساوی اور فرزندان جلندی کے نام فرامین سے اسکی مکمل شہادت ملتی ہے۔ اسی طرح ایران کے کسریٰ کے ایک اور باجگذار مقامی حکمران حضرت سیبخت کو ایک نامۂ گرامی میں عمال نبوی کی فرمانبرداری کی ہدایت کی گئی تھی[۲۸۱] بحرین کے طاقتور قبیلہ عبدالقیس کے سردار کو بھی حضرت علاء بن حضرمی کی اطاعت کی ہدایت کی گئی تھی[۲۸۲] نجران میں انتظامی معاملات کے ضمن میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ امین امت، حضرت ابوعبیدہ بن جراح فہری کی سیاسی بالادستی کو نجران کے سرداروں نے قبول کیا تھا۔ اور ان کے فیصلوں کو علاقہ کے حاکم اعلیٰ کی مانند تسلیم کیا تھا[۲۸۳] اسی طرح حضرت زرعہ ذی یزن کے نام نامہ مبارک جس کا ذکر کئی بار آچکا ہے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی مرکزی منتظمین کی بالادستی کے تحت تھے[۲۸۴] مختصر طور سے یہ کہا جاتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد خطوط و فرامین موجود ہیں۔ جن میں مقامی حکمرانوں، بادشاہوں، قبائلی سرداروں سے فرستادگان مدینہ اور عمال نبوی کے احکام و ہدایات کی تابعداری کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ جس کو انہوں نے بخوبی قبول و منظور کیا تھا۔ اس ضمن میں ہمدان[۲۸۵]، حضرموت[۲۸۶]، مہرہ[۲۸۷]، جذام اور قضاعہ[۲۸۸]، باہلہ[۲۸۹]، دومۃ الجندل[۲۹۰]، بنو اسد[۲۹۱] اور متعدد دوسروں کے نام فرامین نبوی کے متون سے اس امر کی مزید تصدیق ہوتی ہے۔

جزیرہ نمائے عرب میں اور شمالی عرب میں بھی بہت سے مقامی سردار اور منتظم تھے۔ جن میں سے کچھ کا ذکر مآخذ میں ملتا ہے۔ ان کے بارے میں دستیاب تمام مکمل معلومات تو اس کتاب کے آخر میں متعلقہ ضمیمہ میں ملیں گی یہاں اس بارے میں چند اہم نکات کی طرف توجہ دلانا کافی ہوگا۔ مرکزی اور شمالی دونوں علاقوں کے سرداروں اور مقامی منتظمین کی تقرری یا بحالی اسلامی حکومت ہی نے کی تھی۔ ان میں ایک اہم قبائلی سردار حضرت امرؤ القیس تھے جو ابن الاصبغ کے نام سے مشہور تھے اور وہ قبیلہ بنو کلب کی دومۃ الجندل کے علاقے کی شاخ کے سردار تھے۔ وہ قضاعہ کے متعدد سرداروں کے ساتھ اسلامی ریاست کے ہمیشہ فرمانبردار رہے تھے۔ حتیٰ کہ ردہ کے زمانے میں بھی وہ وفاداری کی صراط مستقیم سے نہیں ہٹے تھے[۲۹۲] اسد الغابہ نے اس علاقے کے دو اور سرداروں کا بھی ذکر کیا ہے جو بنو زہل اور بنو غوث بن وائل کے تھے[۲۹۳]۔ مشرقی خطوں کے

قبائلی سرداروں میں جو دو اہم سرداروں حضرت مالک بن عوف نصری اور حضرت عدی بن حاتم طائیؓ کا بہت نمایاں ذکر ملتا ہے ان میں سے اول الذکر کو ہوازن کے خاندانوں ثمالہ، سلمہ اور فہم وغیرہ[۲۹۴] پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر کیا تھا جبکہ موخر الذکر کو ان کے قبیلہ کے عہدہ پر برقرار رکھا تھا[۲۹۵]۔ جنوبی عرب کے قبائل میں سے تقریباً ایک درجن مقامی سرداروں کے ناموں کا ذکر ملتا ہے۔ جن کا تعلق خولان، ازد جرش، بنو حارث/ہمدان، مراد، زبید، مذحج، کلاب، مریم، ہزار حب/ہمدان صدار، کندہ اور متعدد دوسروں سے تھا[۲۹۶]۔ اسی طرح حضرات جارود بن معلی اور زبرقان بن بدر بالترتیب قبائل پراگندہ عرب میں سے قبیلہ عبد القیس اور بنو اوس/تمیم کے بہت اہم سردار تھے[۲۹۷]۔ اس قسم کی بہت سی دوسری معلومات ہمارے مقامی عاملین صدقات کے مباحثہ میں بھی آئیں گی۔ جس سے ان کے بارے میں ہمیں اور بھی معلوم ہوگا۔ آخر میں ایک جدول دی جا رہی ہے۔ جس میں تمام نامزد مقامی منتظمین کی سال بسال تقرری کو دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ بہرحال یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ یہ فہرست مکمل تو کیا تکمیل کے قریب بھی نہیں پہنچی ہے۔ اصل منتظمین کی فہرست اس سے کم از کم دس گنا بڑی ہوتی۔ لیکن ماخذ سے ان سب کے نام نہیں معلوم ہوتے ہیں۔ بہرحال اس جدول سے مذکورہ بالا نکات کو سمجھنے میں مزید مدد ملے گی۔ اور عہد نبوی کے انتظامیہ میں ان کے مقام و مرتبے کی تعیین میں سہولت ہوگی۔

علاقہ	قبیلہ/خاندان	سنین تقرری ۶۲۷	۶۳۰	۶۳۱	۶۳۱-۲	غیر مورخ	مقامی منتظمین
شمالی عرب	۱۔ کلب	-	-	-	-	۲	۲
	۲۔ بنو عذرہ بن وائل		-	-	-	۱	۱
	۳۔ ہرآن/جذام	۱	-	-	-	-	۱
مغربی عرب	۱۔ ادس	۱	-	-	-	-	۱
مشرقی عرب	۱۔ ہوازن	-	۱	-	-	-	۱
	۲۔ بنو عامر	-	-	۱	-	-	۱
	۳۔ ذہل/اسد	-	-	-	-	۱	۱
	۴۔ طے اور اسد	-	-	۱	-	-	۱
جنوبی عرب	۱۔ ازد جرش	-	-	۱	-		۱
	۲۔ ہمدان	-	-	۱	۱	۱	۳
	۳۔ مراد	-	-	-	۱	-	۱
	۴۔ جرش	-	-	-	-	۱	۱
	۵۔ مذحج	-	-	-	۱	-	۱

	۶۔ جعفی	-	-	-	۱	-	۱
	۷۔ رہاء	-	-	-	۱	-	۱
	۸۔ حضرموت	-	-	-	۱	-	۱
	۹۔ صداء	-	-	-	۱	-	۱
	۱۰۔ کندہ	-	-	-	۱	-	۱
قبائل پراگندہ	۱۔ تمیم	-	-	۱	-	-	۱
	۲۔ عبدالقیس	-	۱	-	-	-	۱
غیر معروف	-	-	-	۲	-	-	۲
میزان	۲۰ قبیلے	۲	۲	۴	۸	۹	۲۵

۳۔ نقیب

نقیب (یعنی قبیلہ یا خاندان کا سردار، نمائندہ قوم) بہت قدیم ادارہ ہے جس کے آثار و شواہد یہودی اور عیسائی روایات میں پائے جاتے ہیں۔ مصر سے اخراج کے بعد جزیرہ نمائے سینائی میں یہود کے بارہ قبائل میں بطور مختلف قوموں کے [۲۹۸] تقسیم ہونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کریم کہتا ہے کہ پھر خدا نے ان میں سے بارہ نقیب (سردار) بنائے۔" [۲۹۹] اس نقیب کے ادارہ کی مکمل تصدیق اور مزید تشریح انجیل مقدس کی آیات میں ملتی ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیتی ہیں کہ وہ تمام بنو اسرائیل کی جماعتوں اور طبقوں کو شمار کریں اور تمہارے ساتھ ہر قبیلہ کا ایک شخص ہو، ہر وہ شخص جو اپنے آباؤ اجداد کے گھرانے کا سربراہ ہو۔" [۳۰۰] ان نقیبوں کی تقرری کا مقصد یہ تھا کہ وہ خدا کی طرف سے ودیعت کئے گئے 'الہامی فرائض کی ادائیگی میں حضرت موسیٰ کی مدد کریں اور اس بات پر بھی نظر رکھیں کہ ان کے اپنے متعلقہ قبیلے صراط مستقیم سے نہ بھٹک جائیں۔ یا خداوند قدوس سے کئے گئے اپنے معاہدہ کو نہ توڑ ڈالیں۔ یہودی سواد اعظم میں ان کے مقام و مرتبے کی مزید تشریح انجیل کی آیت نمبر ۱۹ کرتی ہے۔ کہ یہ "نقیب" سواد اعظم کے سربرآوردہ لوگ، اپنے آباء کے قبائل کے بادشاہ و شہزادے اور مملکت اسرائیل کے ہزاروں اشخاص کے سربراہ و سردار تھے۔" [۳۰۱] مولانا اشرف علی تھانوی اور رچرڈ بیل (RECHARD BELL) نے متعلقہ آیت قرآنی میں لفظ نقیب کے معنی سردار LEADER کے دیئے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ ان سربرآوردہ (ELDERS) کا انتخاب اس لئے کیا گیا تھا کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے (فرائض منصبی کے) بوجھ کو ہلکا کریں۔" [۳۰۲]

یہودی روایت کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی قبول و شائع کیا اور اس کی اتباع میں بھی انہوں نے بارہ نقیب (شاگرد

حواری، سردار (APOSTLES DISCIPLES) مقرر کئے[۲۰۴] تاکہ کلام مقدس کی وہ بنو اسرائیل میں تبلیغ و اشاعت کرسکیں۔ انجیل کے عہد نامہ جدید، باب دہم کی آیات نمبر ۱-۵ کا بیان ہے کہ ان بارہ (نقیبوں) کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے روانہ کیا اور ان کو حکم دیا کہ وہ دشمنوں GENTILES کے راستے پر نہ جائیں اور نہ ہی سامریوں (SAMARITANS) کے کسی شہر میں داخل ہوں۔ بلکہ بنو اسرائیل کی گمشدہ بھیڑوں کے پاس جائیں اور جب تم پہنچو تو یہ کہہ کر نصیحت و تبلیغ کرو کہ جنت کی بادشاہت قریب ہے..."[۲۰۵]

نقیب کی اس یہودی اور نصرانی روایت کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ۶۲۲ء میں بیعت عقبہ ثانیہ کے موقع پر اسلامی تہذیب و دین میں جذب کر لیا اور اس کے اتباع میں آپ نے مدینہ کے دو قبیلوں اوس و خزرج سے بارہ نقیب منتخب کئے، جن میں سے تین اول الذکر کے تھے اور نو مؤخر الذکر کے۔ ابن اسحاق[۲۰۶]، ابن سعد[۲۰۷]، بلاذری[۲۰۸]، بغدادی[۲۰۹] اور طبری[۲۱۰] کے علاوہ متعدد دوسرے ماخذ میں مذکورہ متعدد روایات یہودیوں اور عیسائیوں کی روایت نقیب کے مستعار ہونے کی وافر شہادت دیتی ہیں۔ جیسا کہ ہم ابھی اپنے مباحثہ میں دیکھیں گے۔

اسلام میں نقیب کا تصور اور ادارہ تقریباً انہی خطوط پر قائم ہوا تھا جن پر یہودی مذہبی نظام میں ماضی میں قائم تھا۔ عیسائی تصور نقیب نسبتاً کچھ مختلف معلوم ہوتا ہے۔ مگر سچ یہ ہے کہ ان تینوں الہامی مذاہب میں کم و بیش یکساں ہے۔ بلاذری رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث نقل کرتے ہوئے کہتا ہے۔ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنو اسرائیل سے بارہ نقیب منتخب کئے تھے۔ اسی طرح سے میں بھی بارہ نقیب منتخب کروں گا....."[۲۱۱] اس کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عقبہ میں اکٹھا ہونے والے مدنی زائر مسلمین سے کہا تھا کہ "میرے پاس اپنے بارہ سرداروں کو لاؤ جو اپنے اپنے لوگوں یا قوم کے کفیل اور ذمہ دار ہوسکیں"۔ یہ بات بہت اہم ہے کہ اس ارشاد نبوی کے بعد انصاری مسلمانوں اور قبیلہ والوں نے خود اپنے سرداروں کو منتخب کیا تھا اور "نو خزرج سے اور تین اوس سے" منتخب کرکے آپ کے سامنے پیش کیا تھا۔ اور آپ نے ان کی بحیثیت نقیب تقرری کی توثیق کر دی تھی[۲۱۲]۔ یعنی مدینہ کے سرداروں کا انتخاب آپ نے بنفس نفیس نہیں فرمایا تھا۔ جیسا کہ عام خیال ہے۔ پھر آپ نے "سرداروں سے فرمایا تھا: "تم اپنے اپنے لوگوں (قوم) کے اسی طرح ذمہ دار (کفیل) ہو جس طرح عیسیٰ ابن مریم کے حواری (شاگرد) ان کے سامنے جوابدہ تھے۔ جبکہ میں اپنی قوم کے لئے ذمہ دار ہوں"[۲۱۳] بلاذری اور ابن سعد کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو نجار، خزرج کے ایک معزز فرد حضرت ابو امامہ اسعد بن زرارہ کو ان سب کا نقیب اعظم (نقیب النقباء) اور سردار (رأس) مقرر کیا تھا۔ بلاذری کا مزید بیان ہے کہ اس انتخاب و تصدیق انتخاب کے بعد تمام نقیبوں نے یکے بعد دیگرے کھڑے ہو کر بعد حمد و ثنائے رب جلیل اپنے مکمل تعاون کا یقین دلایا تھا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کئے گئے معاہدہ و عہد کے ایفا کا حلف اٹھایا تھا[۲۱۴]۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ نقیب کا مقام و مرتبہ مدینہ کی شہری ریاست کے سربرآوردہ ترین اشخاص اور مقامی منتظمین کے مقام و مرتبہ کے بہت مشابہ تھا جو اوس و خزرج کے مختلف خاندانوں کے لوگوں کے طرز عمل اور معاملات کے کفیل اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جوابدہ تھے۔

بلاریب یہ تسلیم شدہ امر ہے کہ نقیب کے عہدہ وادارہ میں مذہبی روح کارفرما تھی اور بنیادی طور پر وہ مذہبی اور صرف اس کے نتیجے میں سیاسی اور معاشرتی ادارہ بنا تھا۔ جیسا کہ تینوں الہامی مذاہب کی تاریخ سے ثابت ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی تسلیم کیا جانا چاہیے کہ نقیب کا تصور اور عہدہ پوری طرح سے قبائلی بنیادوں پر مبنی نہیں تھا یا قبائلی کردار نہیں رکھتا تھا اگرچہ نقیبوں کا انتخاب و تعلق بلاریب انصار کے مختلف خاندانوں اور قبیلوں سے تھا۔ بظاہر یہ بات متضاد نظر آتی ہے مگر دراصل ایسا ہے نہیں۔ چنانچہ اس کی وضاحت ایک دوسری دلیل سے بھی کی جا سکتی ہے۔ جو زیادہ جاندار اور واضح ہے۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ بنیادی طور سے نقیبوں کی تعداد بارہ تھی اور جہاں تک ہماری معلومات ہیں وہ ہمیشہ اور ہر سہ مذاہب میں بارہ ہی رہی نہ کبھی گھٹی اور نہ کبھی بڑھی جبکہ اوس وخزرج کے خاندانوں کی تعداد بارہ نہیں تھی۔ خاص کر اول الذکر کے تین نقیب اس کے محض تین خاندانوں سے تھے اور بقیہ خاندانوں میں ایک بھی نقیب نہیں تھا۔ اسی طرح خزرج کے معاملے میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے بعض خاندانوں کو بالکل نمائندگی نہیں ملی تھی، پھر بعض طاقتور قبائل کے خاندانوں میں دو دو نقیب تھے۔ جبکہ دوسرے اہم خاندانوں میں صرف ایک ایک نقیب تھا۔ کتاب کے آخر میں نقیبوں کی فہرست میں ان کے قبائلی اور خاندانی تعلق کو واضح کیا گیا ہے[۲۱۷] جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اوس کے نقیبوں کا تعلق ان کے تین خاندانوں بنو عبد الاشہل، بنو غنم، اور بنو عمرو بن عوف سے تھا۔ جبکہ خزرجی نقیبوں میں ایک ایک کا بنو النجار، بنو قواقلہ، بنو زریق سے اور دو دو کا بنو الحارث، بنو ساعدہ اور بنو سلمہ سے تھا۔ اگر یہ قبائلی بنیادوں پر انتخاب ہوا ہوتا تو عقبہ میں موجود دوسرے خاندانوں کو بھی نمائندگی ملی ہوتی اور کسی بھی انصاری خاندان کو اس سعادت سے محروم نہ ہونا پڑا ہوتا۔ بیعت عقبہ ثانیہ میں موجود و شریک حضرات وخواتین کی فہرست پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بنو بیاضہ میں ایک بھی نقیب نہیں تھا اور اسی طرح بنو النجار اور غنم کو جو کافی بڑے خاندان بلکہ قبیلہ بن گئے تھے۔ اور ان کی متعدد شاخیں تھیں متناسب نمائندگی نہیں ملی تھی۔[۲۱۸]

اس بحث سے بعض جدید مؤرخین کے اس نظریہ کی تردید ہوتی ہے کہ نمائندوں (REPRESENTATIVES) یعنی نقیبوں کی خاندانوں میں تقسیم عقبہ میں موجود اس خاندان کے ارکان کی تعداد اور صلاحیت پر مبنی تھی[۲۱۹] اگر ایسا ہوتا تو بنو النجار کا خاندان جو عدد کی اور صلاحیت کے اعتبار سے سب سے بڑا تھا اور جس کی اس موقعہ انتخاب پر کافی نمائندگی بھی تھی۔ ایک سے زیادہ نقیبوں کی سعادت کا حقدار بنتا۔ حقیقت یہ تھی کہ نقیبوں کا انتخاب منتخب افراد کی ذاتی صلاحیتوں، لیاقتوں اور اوصاف کے علاوہ مدینہ کے سماج وسیاست میں ان کے مقام ومرتبے پر مبنی تھا اور بلاریب اس وقت کے نظام میں یہی لوگ سب سے زیادہ اہم تھے

اسی طرح نقیبوں کی کارکردگی اور افادیت کے بارے میں بعض مؤرخین نے شبہات وشکوک کا اظہار کیا ہے[۲۲۰] اور یہ فیصلہ صادر کیا ہے کہ عہد نبوی میں ان عہدہ داروں نے کوئی کام نہیں کیا اور یہ ادارۂ نقیب بے سود تھا[۲۲۱] لیکن مآخذ میں جو بھی تھوڑی بہت معلومات اس کے بارے میں ملتی ہیں۔ وہ اس نظریہ وخیال کی تردید کرتی ہیں اور ثابت کرتی ہیں کہ نقیبوں کا یہ ادارہ تا اواخر عہد نبوی کام کرتا رہا تھا اور اس کے نمائندے اپنے فرائض برابر انجام دیتے رہے تھے۔ تقریباً تمام مآخذ کا اتفاق ہے کہ نقیب النقباء حضرت اسعد بن زرارہ کے شوال ۱ھ/مارچ ۶۲۳ء میں انتقال کے بعد بنو النجار کے لوگوں نے،

جن کے وہ خاندانی نقیب بھی تھے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی تھی کہ ان کے لئے کسی نئے نقیب کی تقرری فرما دیں۔ آپ نے بجائے کسی نئے نقیب کو مقرر کرنے کے خود یہ ذمہ داری سنبھال لی تھی[۴۲۱]۔ اس سے کم از کم مدینہ کے ابتدائی عہد نبوی میں نقیبوں کے ادارے کا کام کرنے کا ثبوت ملتا ہے۔ یہاں اس نکتہ کی طرف توجہ دلانا ضروری معلوم ہے کہ حضرت اسعد بن زرارہ کی جگہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فریضہ سنبھالنا محض اس سبب سے نہ تھا کہ آپ اپنی پردادی کے ذریعہ بنو النجار کے رشتہ دار اور عزیز تھے بلکہ اس بنا پر بھی تھا کہ آپ اب تمام مسلمانوں کے سردار کی حیثیت سے نقیب النقباء بھی بن گئے تھے۔ بہرحال اس کے علاوہ دوسرے واقعات اور حقائق بھی اس ادارہ کی کارکردگی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ایک اور نقیب حضرت براء بن معرور جن کا تعلق بنو سلمہ کے گھرانے سے تھا صفر سلہ اگست ۶۲۲ء میں انتقال کر گئے[۴۲۲] یعنی انکا انتقال ہجرت نبوی سے ایک ماہ قبل ہو گیا تھا۔ بہرحال آپ کی آمد مدینہ کے بعد ہی کسی وقت، حضرت براء کی جگہ ان کے فرزند حضرت بشر کو ان کے خاندان کا نقیب مقرر کیا گیا جیسا کہ اسد الغابہ کا خیال ہے[۴۲۳]۔ افسوس یہ کہ اس تقرری کے زمانے کی تصریح و تعیین نہیں کی گئی ہے۔ مذکورہ بالا ماخذ تین مزید انصاریوں کا ذکر کرتا ہے جن کو عہد نبوی میں نقیب مقرر کیا گیا تھا۔ یہ تھے حضرات عمرو بن جموح جو خزرج کے خاندان بنو سلمہ کے نقیب تھے[۴۲۴]، رافع بن خدیج جو اوس کے خاندان عمرو بن مالک کے نقیب مقرر ہوئے تھے[۴۲۵] اور مسیب بن عمرو جن کے خاندان اور میدان کار کا ذکر نہیں ملتا[۴۲۶]۔ ان تینوں کے معاملے میں بھی زمانۂ تقرری کی تصریح نہیں ملتی مگر حضرت رافع بن خدیج کے معاملے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تقرری کم از کم غزوہ احد کے بعد ہوئی ہو گی کیونکہ وہ اس وقت تک نہ صرف نابالغ تھے بلکہ اس عہدہ کے لائق نہ تھے۔ بہرحال یہ حقیقت ہے کہ یہ نقیب کس طرح کام کرتے تھے اور کیا کام کرتے تھے ہم نہیں جانتے البتہ بعد میں اموی اور عباسی ادوار میں عباسی اور علوی نقیبوں[۴۲۷] کے کارناموں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ منظم جماعت کا کام کرتے تھے اور ان کا مقصود و مطلوب اپنے حامیوں اور ہمنواؤں کی صفوں میں اتحاد، سماجی، ذہنی اور سیاسی ہم آہنگی اور اجتماعیت پیدا کرنا ہوتا تھا۔ ان کے کام کرنے کا طریقہ یہ ہوتا تھا کہ ہر نقیب اپنے اپنے علاقہ میں ایک تنظیمی مرکز قائم کرتا تھا۔ اور اپنے حامیوں خاص کر داعیوں (دعاۃ) کو جن کی کل تعداد ستر تھی مبلغین و معلمین و منتظمین کی حیثیت سے مختلف علاقوں میں بھیجتا تھا اور ان کے ذریعہ سے دعوت پھیلایا کرتا تھا۔ آٹھویں صدی عیسوی کے آغاز میں اس نہج پر اموی دور میں عباسی دعاۃ اور نقیبوں نے عباسی انقلاب کے لئے کامیاب کوششیں کی تھیں[۴۲۸]۔ جبکہ عباسی دور میں اسی طرح علوی نقیبوں اور داعیوں نے کام کیا تھا مگر وہ اپنی تنظیمی خامیوں کے سبب کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوتے تھے۔ چونکہ یہ عباسی اور علوی نقیب ان کے سرداروں کے دعوؤں کے مطابق اسوۂ نبوی پر منظم و مرتب کئے گئے تھے۔ اس لئے یہ خیال ہوتا ہے کہ عہد نبوی میں بھی اولین اسلامی نقیبوں نے اس طرح اپنے مراکز قائم کر کے اپنے نمائندوں / داعیوں اور مددگاروں کے ذریعہ اسلامی جماعت کی شیرازہ بندی کی تھی۔ اور مقامی نظم و نسق میں ہاتھ بٹا کر اسلامی ریاست کی بیش بہا خدمت انجام دی تھی۔ دونوں میں فرق یہ تھا کہ نبوی نقیب حکومت و ریاست کے وفادار اور حامی تھے تو عباسی اور علوی نقیب حکومت وقت کے مخالف اور باغی تھے۔

۴۔ قضاۃ (قاضی)

یہ غلط فہمی عام ہوگئی ہے اور کم از کم جدید مؤرخین اور مستشرقین کی حد تک راسخ بھی ہوگئی ہے کہ قضاء (عدل و انصاف) کا ادارہ عہد نبوی میں ارتقاء پذیر نہیں ہو سکا تھا۔ اس غلطی اور غلط فہمی کے شائع ہونے کا اصل سبب مستشرقین اور جدید مؤرخین کی وہ طاقتور تحریریں ہیں جو انہوں نے اس موضوع پر سپرد قلم کی ہیں اور جو عموماً جدید نظام عدلیہ کی روشنی میں اسلام کے کلاسیکی زمانے کے نظام عدل و انصاف کا مطالعہ کرتے ہیں۔ بہر حال مآخذ پر ایک نظر ڈالنے سے ہی اس نظام کے فعال و موجود ہونے کے وافر ثبوت اس عہد مبارک میں ملتے ہیں اور متاخر مسلمان مصنفین نے تو اس موضوع پر بڑا وسیع اور قیمتی ذخیرہ چھوڑا ہے[۳۲۹]۔ بہر حال قرآن کریم کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو عدل و انصاف کا نہ صرف سرچشمہ قرار دیا گیا ہے بلکہ آپ کے فیصلوں کو واجب التعمیل اور حکم ناطق ہونے کے علاوہ مسلمانوں کو ان کو بلا کسی جھجک اور دل کی کھٹک کے قبول کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ سیاسی طور پر بھی یہ انصاف کا تقاضا ہے کہ اسلامی ریاست کی عدلیہ کے سربراہ ہونے کا منصب آپ ہی کو عطا کیا جاتا۔

مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ عدل و انصاف کے سب سے بڑے قاضی یا حاکم کی حیثیت سے یا بطور عدالت عالیہ و مطلقہ کے آپ نے مدنی دور میں متعدد مقدمات کا فیصلہ فرمایا تھا۔ جن میں سے بعض کا حوالہ مذکورہ بالا ابواب میں آچکا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک یہودی، زانی، ایک یہودی چور اور ایک مسلم زانی مرد اور چور عورت کے مقدمات میں آپ کے فیصلے بڑے اہم تھے۔ آپ کے نظم و نسق کے اس پہلو کی حیثیت کا اندازہ اس امر سے ہوتا ہے کہ متعدد مسلم مصنفین نے آپ کے مقدمات اور فیصلوں پر بڑی ضخیم کتابیں لکھی ہیں اور چن چن کر ان کو جمع کر دیا ہے[۳۳۰]۔ کتانی نے ان کو مختلف فصول اور ذیلی فصول میں تقسیم کیا ہے اور ان میں سے ہر ایک پہ خاصی مفصل بحث کی ہے[۳۳۱]۔ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مرکزی اور صوبائی قاضیوں پر بھی ایک علیحدہ فصل میں بحث کی ہے[۳۳۲]۔ کثیر قضاۃ نبوی میں سے آٹھ حضرات کا نام بنام ذکر ملتا ہے۔ یہ تھے حضرات عمر، علی، معاذ بن جبل، عبداللہ بن مسعود، ابی بن کعب، زید بن ثابت، ابوموسیٰ اشعری، عقبہ اور معقل بن یسار[۳۳۳]۔

یہاں یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ عہد نبوی کے تمام قاضی چاہے وہ مرکز اسلام مدینہ میں مقرر ہوئے ہوں یا صوبوں اور ولایتوں میں ان کی حیثیت مقامی افسران قضاء و انصاف کی تھی۔ یعنی ان کے اختیار اور اقتدار کی وسعت و احاطہ دوسرے قاضیوں پر نہیں تھی اور صوبائی یا مقامی قاضی ان کے ماتحت نہیں تھے۔ یہ اختیار تنہا ذات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھا۔ جو قاضی القضاۃ یا پوری اسلامی مملکت کے قاضی تھے۔ جن کا اختیار نہ صرف دوسرے قضاۃ پر حاوی و جاری تھا بلکہ وہ ان کے فیصلوں کو کالعدم قرار دے سکتے تھے۔ بہر حال کچھ مدینہ کے مرکز میں قاضی مقرر کئے گئے تھے اور کچھ کو ولایات میں۔ موخر الذکر میں قضاء کے فرائض عموماً گورنر یا والی انجام دیتا تھا۔ جیسا کہ حضرات معاذ بن جبل، ابوموسیٰ اشعری اور ابوعبیدہ بن جراح فہری وغیرہ کے بارے میں صراحتاً معلوم ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں والیوں کے فرائض و اختیارات پر گذشتہ بحث کی طرف حوالہ دیا جاتا ہے، اور ان کو اب دہرانے کی ضرورت نہیں کہ تکرار اور تحصیل حاصل ہو گی۔ گورنر اور والیوں کے علاوہ یہ اختیار کسی حد تک امراء

سالاران مہم اور عاملین صدقات کو بھی مخصوص حالات میں حاصل ہوتا تھا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں مآخذ، امیر، قاضی، جابی (محصل) اور عامل (کارکن)، وغیرہ اصطلاحات کا استعمال مترادفات کے طور پر کرتے ہیں[۳۳۴]۔ بہر حال معلوم یہ ہوتا ہے کہ تمام مرکزی، صوبائی اور مقامی منتظموں کو قضاء (فیصلہ کرنے) اور عدل و انصاف کے اختیارات حاصل تھے۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ عہد نبوی میں تقسیم فرائض کا جدید سیاسی نظریہ موجود نہیں تھا جس کے مطابق عدلیہ، مقننہ اور عاملہ کو تین ناقابل اشتراک اور شدید شعبوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے اس زمانے میں عدل و انصاف کا فریضہ اور کام دراصل عام نظم و نسق کا حصہ تھا۔ اور کوئی افسر و عامل نبوی اسکی انجام دہی کا مجاز تھا

بہر حال عہد نبوی میں قضا کے اس مستقل بندوبست کے علاوہ مآخذ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض مواقع پر اپنی موجودگی ہی میں بعض اصحاب سے مقدمات فیصل کرائے تھے۔ ترمذی، احمد بن حنبل اور حاکم کی بعض روایات سے معلوم ہے کہ تین مختلف مواقع پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے متصادم و متخاصم فریقین (خصمان) کے درمیان جو خدمت نبوی میں اپنے مقدمات لیکر آئے تھے، حضرات عمر بن خطاب، معقل بن یسار اور عقبہ سے فیصلے کرائے تھے۔ اور انکے فیصلوں کو پسند بھی کیا تھا[۳۳۵]۔ ظاہر ہے کہ اس سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد یہ تھا کہ اسلامی ریاست کے ان افسروں کو اپنی موجودگی میں تربیت دیں! اور وقت کے روز افزوں مسائل کے حل کے لئے ایک عدلیہ کا نظام بھی مرتب کریں جو آپ کی موجودگی کا محتاج نہ ہو۔ اس نبوی نقطہ نظر کا بہترین اظہار آپ کے حضرت معاذ بن جبل کے درمیان اس گفتگو سے ہوتا ہے جو مؤخر الذکر کے بطور گورنر جنرل یمن جانے سے پہلے ہوئی تھی۔ اسی طرح یہ بھی نتیجہ نکالنا جائز ہے کہ عہد نبوی میں مختلف اصحاب قضاء اور عدل و انصاف کا کام مستقل طور سے آزادانہ کیا کرتے تھے اور اختلاف کی صورت میں یا فریقین میں سے کسی کی بے اطمینانی کی صورت میں مقدمات آپ کی عدالت میں بھی لائے جاتے ہوں گے۔ جہاں آپ ان کی توثیق یا تردید کرتے تھے۔ اس کی مزید تصدیق متاخر مصنفین کے اس بیان سے ہوتی ہے کہ آپ نے صرف اکا دکا اصحاب سے ہی مقدمات فیصل نہیں کرائے تھے بلکہ مستقل طور سے ایک پورے گروہ (جماعت) کو اس کے لئے مقرر کر دیا تھا[۳۳۶]۔ صبح الاعشیٰ کے مطابق عہد نبوی میں اور بعد کے زمانے میں بھی قاضی کا کام یہ تھا کہ وہ شریعت کے تمام امور کے سلسلہ میں فریقین کے اختلافات اور جھگڑوں کو طے کیا کرے[۳۳۷]۔ اس میں دیوانی اور فوجداری دونوں کے مقدمات شامل تھے۔ بہر حال جب بھی قاضی مناسب سمجھتے تھے تو وہ بعض پیچیدہ مقدمات اور معاملات میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے لے لیتے تھے۔ کیونکہ دراصل آپ ہی اسلامی ریاست کی عدالت اعلیٰ تھے۔

۵۔ بازار کا انتظام اور اس کے افسر

چودھویں صدی عیسوی کے ایک عظیم ہندوستانی مؤرخ ضیاء الدین برنی کے مطابق بازاروں کا نظم و نسق ہمیشہ قرون وسطیٰ کی حکومتوں کے لئے دردسر رہا ہے۔ کیونکہ تاجر و سوداگر اور دوسرے بازار کے لوگ انتہائی شاطر، فریبندہ صفت اور عیار و مکار رہے ہیں۔ ان پر قابو پانا ایک امر محال رہا ہے[۳۳۸]۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اسلام نے جو سماج کے تمام طبقات

کے عمل و کردار کی پاکیزگی کا علمبردار ہے۔ تاجروں اور بازار کے لوگوں کے عمل و کردار کی بھی صحیح تعبیر و تشکیل کرنا چاہتا تھا چنانچہ قرآن کریم اور احادیث نبوی میں اس قسم کی بہت سی ہدایات اور احکام ملتے ہیں۔ انتظامی طور سے یہ اسلامی ریاست کے سربراہ کی ذمہ داری تھی کہ وہ شرعی حدود کے اندر بازاروں کے نظم و نسق کے لئے اقدامات کرے کیونکہ محض اخلاقی و روحانی تعلیمات کسی نظام کی بقا اور اثر کے لئے کافی نہیں ہوا کرتیں۔ چنانچہ احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس بازاروں کا چکر لگاتے اور دورہ کرتے تھے اور تاجروں اور خریداروں دونوں کے اعمال و اخلاق کی درستگی کے لئے برابر احکام و ہدایات جاری کیا کرتے تھے۔ ترمذی کی روایت ہے کہ آپ ایک دفعہ آپ کا گذر ایک بازار سے ہوا اور آپ نے وہاں ایک شخص کے پاس گیہوں کا ڈھیر دیکھا جو وہ فروخت کے لئے لایا تھا۔ آپ نے اس ڈھیر میں اپنا ہاتھ ڈال دیا تو دیکھا کہ وہ اندر سے نم ہے۔ آپ نے تاجر کو سرزنش کی اور دھوکہ دینے سے منع کیا[۲۳۹]۔ اسی طرح بخاری کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ غلہ و اناج کی ایک جگہ خرید و فروخت کو بھی آپ نے ممنوع قرار دیا تھا[۲۴۰]۔ آپ نے اناج کے تاجروں کو جو مجازفہ[۲۴۱] طریق تجارت سے خرید و فروخت کرتے تھے، دہری تجارت کرنے کی ممانعت کی تھی تاآنکہ وہ اپنے علاقہ یا قیام گاہوں (رحال) تک پہنچ جائیں[۲۴۲]۔ اناج کی خرید و فروخت صرف بازاروں میں یا ان مقامات پر جائز قرار دی گئی تھی جہاں وہ عام طور سے ہوا کرتی تھی[۲۴۳]۔ اس قسم کی تمام ہدایات کا مقصود یہ تھا کہ اناج کے تاجروں کی باقاعدہ نگرانی کی جا سکے اور ان کے پُر فریب طریقوں کا انسداد کیا جا سکے۔

اس مقصد کے لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بازار کے مختلف افسروں کی تقرری بھی کی تھی۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ فتح مکہ کے فوراً بعد آپ نے بنو امیہ کے خاندان سعیدی کے ایک فرد حضرت سعید بن سعید بن العاص کو مکہ کے بازار کا افسر (السوق) مقرر کیا تھا[۲۴۴]۔ مکہ کی اقتصادی دولت اور اس کی تجارت پر کلی انحصار کی حقیقت کے پس منظر میں یہ تقرری بہت اہم تھی۔ اسی طرح حضرت عمر بن خطاب کو آپ نے مدینہ کے بازار کا افسر مقرر کیا تھا[۲۴۵]۔ اور یہ ظاہر و بین حقیقت ہے کہ مدینہ کا بازار خاصی بڑی تجارتی اہمیت کا حامل تھا۔ اس لئے یہ تقرری بھی خاصی اہم تھی۔ مگر اس تقرری کا زمانہ نہیں معلوم ہو سکا۔ اندازہ یہ ہے کہ یہ تقرری شروع ہی میں عمل میں آگئی تھی کیونکہ مدینہ کے یہودی تاجروں کے علاوہ جو اپنے پر فریب اقتصادی اور تجارتی معاملات کے لئے مشہور ہے۔ کچھ انصاری اور تمام تر مہاجرین بھی تجارت میں لگ گئے تھے[۲۴۶]۔ اس کے علاوہ قرب و جوار کے تاجران عرب اور شام جیسے دور دراز علاقوں کے نبطی تاجر بھی وہاں آتے تھے[۲۴۷]۔ گویا کہ وہ ایک بین الاقوامی تجارتی منڈی تھی اور ایسے اہم تجارتی مرکز کے نظم و انتظام کے لئے حضرت عمر فاروق جیسے عظیم و دور بین منتظم ہی کی ضرورت تھی۔ اس سلسلے میں یہ نکتہ بھی ذہن نشین کرنے کے قابل ہے کہ یہ دونوں افسران و عمال بازار نبوی مستقل افسر تھے۔ اگرچہ حضرت سعید بن سعید اموی جلد ہی ایک مہم میں شہید ہو گئے تھے۔ نگران کی جگہ قیاس کے مطابق کسی اور افسر کا تقرر ضرور عمل میں آیا ہو گا۔ بہرحال قرائن کہتے ہیں کہ تمام بڑے بازاروں اور تجارتی مراکز کے لئے اس قسم کے افسر مقرر کئے جاتے تھے۔ اگرچہ ان کے بارے میں تاریخی شواہد کم ملتے ہیں اور جہاں اس قسم کے مخصوص افسر نہیں تھے۔ وہاں بازاروں کی نگرانی اور ان کا نظم و نسق، مرکزی منتظمین، گورنروں اور مقامی منتظموں کے فرائض و اختیارات میں شامل تھا کہ یہ بھی عام نظم و نسق کے شعبے کے دائرہ کار میں آتا تھا۔

خلاصہ بحث

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ریاست اسلامی کے سربراہ کی حیثیت سے جس قسم کے نظام حکومت کی بنیاد ہجرت کے بعد ڈالی تھی وہ رفتہ رفتہ دس سال کی مدت میں ترقی کے مختلف مراحل سے گذرتا ہوا نقطۂ کمال کو پہنچا تھا۔ عربوں میں ایک تو قبائلی سیاسی نظام تھا جس میں ہر قبیلہ آزاد و خود مختار ہوتا تھا اور جس کا نظام حکومت اگر کوئی تھا تو وہ باہمی تعاون یا اشرافیہ کے اصولوں پر چلایا جاتا تھا۔ اس قدیم قبائلی نظام میں شراکت کا اصول کارفرما تھا، کہ ایک قبیلہ کے تمام خاندانوں کے سارے سربرآوردہ اور شیوخ کی ایک مجلس بنتی تھی جو مکی اشرافیہ میں ملاء کہلاتی تھی اور یہی تمام قریشی معاملات کی دیکھ بھال کرتی تھی اس نظام میں مرکزیت نہیں تھی۔ لیکن دوسرا نظام جو عربوں میں معروف اور جزیرہ نمائے عرب کے سرحدی علاقوں میں رائج تھا۔ بادشاہت (ملوکیت) کا تھا اور وہ کلی طور سے مرکزیت کا حامل تھا۔ مگر جہاں دوسری خرابیاں تھیں، عربوں کو جب یہی خیال آیا تو انہوں نے مرکزیت کی خاطر اسی نظام بادشاہی کو اختیار کرنا چاہا۔ جیسا کہ علامہ وقت سید سلیمان ندوی نے واضح کیا ہے۔ کہ یہ غلط فہمی عام ہوگئی کہ عربوں کے نزدیک بادشاہت یا ملوکیت ناپسندیدہ طرز حکومت تھی۔ دراصل عربوں کو جو چیز اس نظام کی ناگوار تھی وہ اس کی حد سے بڑھی ہوئی مرکزیت تھی جس میں ان کی آزادروی کی گنجائش نہیں تھی۔ بہرحال رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں نظاموں سے مختلف اسلامی نظام حکومت قائم کیا تھا جس میں افراد اور شخصی آزادی کی فطری رعائت بھی رکھی گئی تھی اور اجتماعیت اور مرکزیت کے اصولوں کو بھی پوری طرح سے بروئے کار لایا گیا تھا۔ اس نظام نبوی میں انفرادی آزادی اور خودمختاری اجتماعیت اور مرکزیت کی دشمن اور متصادم نہیں بلکہ اس کی مددومعاون اور تصدیق کرنے والی تھی۔

عصری ضرورتوں اور نئے حالات کے تقاضوں کے تحت حکومت اور انتظامیہ کے شعبے بھی وجود میں آتے گئے اور آپ نے ان میں مختلف سیاسی و انتظامی تجربات کئے اور ان کو رفتہ رفتہ ارتقائی شکل دیتے گئے چنانچہ تاریخی توقیت کے مطابق سب سے پہلے نائبین رسول یا خلفاء رسول کا طبقہ انتظامیہ وجود میں آیا۔ ہجرت کے پہلے سال ہی آپ کو مدینہ سے باہر جانے کی ضرورت پیش آئی اور اس غیر حاضری میں آپ نے مدینہ کی نوزائیدہ ریاست کے معاملات کی دیکھ بھال اور اسلامی امت کے مفادات کی نگرانی کی خاطر شہر میں اپنا ایک خلیفہ/نائب چھوڑا تھا۔ چنانچہ اس کے بعد معمول ہوگیا کہ آپ جب کبھی باہر تشریف لیجاتے اپنے پیچھے ایک جانشین چھوڑ جاتے جو عموماً نماز کا امام یا امیر کہلاتا تھا مگر وہ آپ کا سیاسی و انتظامی جانشین ہوتا تھا اور آپ کی غیر حاضری میں سربراہ مملکت کا قائم مقام بھی اس طرح پورے عہد نبوی میں کل ۴۲ تقرریاں اس شعبہ افسران میں ہوئی تھیں مگر نواب رسول کی کل تعداد صرف ۱۳ تھی۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے متعدد کی تقرری ایک سے زیادہ مرتبہ ہوئی تھی، اور سب سے اہم شخصیت حضرت ابن ام مکتوم عامری کی تھی جو اس منصب جلیل پر تیرہ بار فائز ہوئے تھے۔ اسی سے یہ نکتہ بھی آشکارا ہوتا ہے کہ نائبین رسول کا عہدہ تو مستقل تھا اور مستقبل میں منارۂ نور بننے والا تھا۔ مگر عہد نبوی میں اس کے عہدیدار عارضی ہوتے تھے کیونکہ مستقل سربراہ مملکت موجود و باحیات تھے۔ دوسرے شعبوں میں تقرری کی بنیادوں کی طرح اس شعبہ میں بھی وہ صرف

لیاقت اور موزونیت تھی مگر یہ عہدہ اعزازی تھا کہ عہدیدار کو کوئی تنخواہ یا مالی منفعت نہیں حاصل ہوتی تھی۔

اسلام کے سیاسی نظام میں سربراہ ریاست کے لیے مشورہ کرنا، امت کے افراد سے رائے لینا اور مباحثہ کرنا تو ضروری ہے لیکن کم از کم عملاً مشیروں کا مشورہ مان لینا عہد اسلامی کے زریں عہد میں کبھی کبھی لازمی اور ناگزیر نہیں رہا۔ بہر حال اس حکم الٰہی کے بموجب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کے تمام اجتماعی معاملات چاہے وہ سیاسی ہوں، انتظامی ہوں، سماجی یا اقتصادی اور حتیٰ کہ مذہبی ہوں، آپ مسلمانوں کے اہل رائے سے مشورہ ضرور کرتے تھے اور اکثر و بیشتر ان پر عمل بھی کرتے تھے۔ لیکن یہ آپ کا اختیار تھا کہ انہیں تسلیم کریں یا مسترد کریں۔ اس عہد میں مجلس شوریٰ کی کوئی خاص شکل نہیں تھی اور نہ ہی مشیران حکومت کے لئے کسی قسم کی شرائط متعین تھیں۔ اصولاً ہر مسلم مشورہ دے سکتا تھا لیکن آپ عملاً مسلمانوں کے مرکز کے سربرآوردہ اور اہل رائے کے ایک مخصوص طبقے سے ہی رائے لیتے تھے۔ کبھی کبھی آپ پوری امت اسلامی کے مرکزی نمائندوں کو بھی جمع کر لیتے تھے۔ جنگی معاملات میں آپ کے مشورہ لینے کے بہت کثیر حوالے ملتے ہیں اور اس ضمن میں سب سے بڑے مشیر نبوی حباب بن منذر خزرجی تھے۔ اگرچہ دوسرے شعبہ ہائے حیات میں مشورہ لینے کی اتنی شہادتیں نہیں ملتی تاہم یہ نتیجہ نکالنے کے لئے کافی ہیں کہ آپ کی حکومت شوریٰ کے نظام پر قائم تھی کہ یہی صفت جماعت مؤمنین تھی۔ آپ کے دوسرے مستقل مشیروں میں حضرات ابوبکر صدیق اور عمر فاروق کا درجہ سب سے بلند تھا اور تمام مشیران نبوی فی سبیل اللہ یہ کام انجام دیتے تھے۔

حکومت کا کام جوں جوں پھیلتا گیا اور اسلام کی جوں جوں تکمیل ہوتی گئی توں توں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مددگاروں اور سیکریٹریوں کی ضرورت اور دستاویزات وغیرہ لکھوانے کی حاجت بڑھتی گئی۔ جاہلی عربوں میں لکھنا پڑھنا اگرچہ وصف محمود تھا تاہم عملاً اس کے جاننے والے لوگ کم تھے خاص کر بدوی اور نیم متمدن علاقوں میں۔ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک عظیم صفت آپ کا امی ہونا تھا۔ لیکن آپ نے "کتابت" کی فن کی بڑی حوصلہ افزائی کی کہ یہی اسلام کا تقاضا بھی تھا۔ مسلمانوں کے لئے مذہبی اور سیاسی دونوں لحاظ سے قرآن کریم کی حفاظت سب سے بڑا کام تھا جو کتابت کے ذریعے حاصل کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ مکی عہد سے آپ نے قرآن کی نازل شدہ آیات کا اہتمام و انتظام کیا تھا۔ اس ابتدائی دور میں اس کے کاتبین میں حضرات شرحبیل بن حسنہ کندی، عثمان بن عفان اموی اور علی بن ابی طالب ہاشمی سرفہرست تھے۔ مدنی دور میں یہ سعادت مستقل طور سے حضرات ابی بن کعب خزرجی، زید بن ثابت خزرجی اور معاویہ بن ابی سفیان اموی کو حاصل ہو گئی تھی۔ قرآن کریم کے علاوہ سیاسی دستاویزات جیسے قبیلوں سے معاہدے، افراد و قبائل کو خط ضمانت اور پروانۂ قطائع آراضی، گورنروں اور عاملوں یا عوام الناس کے نام فرامین و سرکاری خطوط اور غیر ملکی یا ملکی حکمرانوں کے نام خطوط وغیرہ بھی لکھوائے جاتے تھے اور ان کی کتابت کے کبھی کبھی الگ اور مخصوص افسران کتابت ہوتے تھے۔ اسی طرح انتظامی معاملات جیسے اموال غنیمت میں مسلمانوں اور ریاست کے حصص، صدقات و عشور و جزیہ وغیرہ کی رقوم اور پیداوار اراضی کے اعداد و شمار رکھنے کی غرض سے مستقل افسران کتابت یا کاتبین مقرر کئے گئے تھے۔ یہ اسلامی ریاست کا دراصل دیوان رسالت تھا جو عہد نبوی میں شروع ہو کر بعد میں خلافت راشدہ اور اموی و عباسی عہد میں ارتقاپذیر ہوا تھا۔ عہد نبوی میں کاتبین مستقل، نیم مستقل اور عارضی اور جز وقتی ہوتے تھے جو اپنے اپنے فرائض اللہ کے لئے انجام دیتے تھے۔ نامہائے گرامی کا طرز تحریر سادہ، مبالغہ و غلو سے

پاک اور مختصر ہوتا تھا۔ عموماً نامہ مبارک کا آغاز اللہ کے نام سے ہوتا تھا اور کاتب اور مکتوب الیہ کے ناموں کے بعد دعائیہ کلمات ہوتے تھے۔ جن کے بعد اصل متن ہوتا تھا۔ نامہ کا خاتمہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مہر مبارک پر ہوتا تھا۔ جو اصل میں آپ کی انگوٹھی تھی اور اس پر محمد رسول اللہ کندہ تھا۔ مآخذ کے مطابق جب کبھی آپ اسے استعمال نہیں فرماتے تھے تو ایک افسر خاتم کے سپرد کر دیتے تھے جو اس کی حفاظت کرتا اور بوقت ضرورت خدمت اقدس میں پیش کر دیتا تھا۔ اب تک کل کاتبوں کی تعداد ۴۴ مل سکی ہے، اور امکان ہے کہ کچھ اور بھی تھے جن کے نام محفوظ نہیں رہ سکے۔

لیکن اصل سیکرٹری کا مقام حضرت بلال حبشی کو حاصل تھا جو اس عہدہ کے صحیح معنوں میں مصداق تھے وہ آپ کے گھریلو اور نجی کے کاموں (حوائج) کی انجام دہی کے ساتھ ساتھ متعدد سرکاری کام انجام دیتے تھے۔ ان میں سرکاری مہمانوں کی میزبانی، سرکاری رقوم کی ارشاد نبوی کے مطابق تقسیم جن میں عطایا اور انعامات بھی شامل تھے۔ وغیرہ شمار کئے جاتے ہیں۔ غرض کہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کے منتظم، خازن، منادی، میزبان، محافظ اور نہ جانے کیا کیا تھے۔

اسلامی ریاست کی توسیع کے ساتھ ساتھ غیر مسلم طبقات، قبائل، اقوام اور حکمرانوں سے تعلقات و روابط کی بھی ضرورت پڑی تھی اور ان سے مختلف مواقع پر گفت و شنید کی حاجت ہوتی تھی اس کام کے لئے مکہ کے جاہلی عرب نظام میں سفارہ کا عہدہ تھا جس کے آخری عہدیدار حضرت عمر فاروق تھے۔ عہد نبوی میں یہ عہدہ رسالۃ اور اس کے منصبدار رسول = رسل کہلائے اور وہ جاہلی سفیروں کے مقابلے میں عارضی ہوتے تھے۔ جبکہ ان کا عہدہ مستقل تھا۔ عام خیال ہے کہ عہد نبوی میں پہلی بار سفراء کا تقرر ۶ھ / ۶۲۸ء میں صلح حدیبیہ کے معاً بعد ہوا تھا۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چھ سات ملکی اور غیر ملکی حکمرانوں کو دعوت اسلام دینے کے لئے اپنے سفیروں کو بھیجا تھا۔ لیکن یہ اس شعبہ کے ارتقاء کا ایک اہم موڑ تھا۔ "رسالۃ کا عہدہ" اور "رسول" کا تقرر پہلی بار غالباً غزوہ بنو قینقاع کے زمانے میں ۲ھ / ۶۲۴ء میں ہوا تھا اور حیرت و دلچسپی کی بات ہے کہ اولین سفراء نبوی کا تقرر فوجی اور نیم فوجی مہموں کے دوران فریق مخالف سے گفتگو کے لئے کیا گیا تھا۔ رفتہ رفتہ سفیروں کی تعداد میں اضافہ ہوا اور بعد کے زمانے میں متعدد قبائل کے شیوخ اور غیر ملکی حکمرانوں سے گفت و شنید کے لئے بہت سے سفیر بھیجے گئے۔ عہد نبوی کے اس انتظامی شعبہ میں کل ۳۸ سفیروں کے نام ملے ہیں۔ جن کو ۴۲ بار تقرریاں ملی تھیں یعنی بعض کو ایک سے زیادہ مرتبہ یہ سعادت ملی تھی۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ ان کو کسی قسم کی تنخواہ ملتی تھی یا نہیں تاہم یہ حتمی ہے کہ تمام سفیروں کے سفر کے اخراجات کی کفالت کی ذمہ داری اسلامی ریاست کی تھی۔

عہد نبوی کے انتظامیہ میں ایک شعبہ افسران بکار خاص کا ہوتا تھا۔ جو مختلف قسم کے کام ارشاد نبوی کے بموجب انجام دیتے تھے۔ یہ کام اہم بھی ہوتے تھے اور معمولی نوعیت کے بھی۔ بنو قریظہ کے معاملہ میں حضرت سعد بن معاذ اوسی کی تحکیم، تین مواقع پر حضرت علی ہاشمی کا دیت ادا کرنا، منافقوں کے ایک گھر اور مسجد ضرار کو منہدم کرنا، سزاؤں اور حدود کو نافذ کرنا۔ اسلامی قوانین کے نفاذ کا اعلان کرنا وغیرہ کو ان افسروں کا کام شمار کیا گیا۔ یہ طبقہ ہم نے اپنی آسانی کے لئے بنا لیا ہے۔ ورنہ حقیقتاً ایسا کوئی طبقہ اس زمانے میں موجود نہیں تھا۔ کیونکہ مآخذ اس کے لئے کسی خاص اصطلاح کا ذکر نہیں کرتے۔ یہ افسر و عمال بھی عارضی ہوتے

تھے۔ کیونکہ ان کا کام بھی عارضی ہوتا تھا۔ ایسے افسروں کی کل تعداد محض ۱۴ تک مل سکی ہے اور ظاہر ہے کہ اور بھی بہت سے ہونگے۔

عربوں میں شاعری، زباندانی اور زبان آوری ــــــ کے سمجھی جاتی تھی کہ وہ ان کے جذبات کی ترجمان تھی اور وہ اس کو جذبات و خیالات کے رسل و رسائل اور ابلاغ کے ایک مؤثر ذریعہ کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ چنانچہ شعراء اور خطباء کو سماج میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور بقول ایک جدید مؤرخ "وہ قوم کے قلب و ضمیر کے محافظ تھے"۔ اسلامی ریاست نے بھی شعراء اور خطباء کی خدمات سے فائدہ اٹھایا تھا اور ان کو سیاسی و سماجی مقاصد کے لئے استعمال کیا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تین شاعر حضرات حسان بن ثابت، کعب بن مالک اور عبداللہ بن رواحہ مدینہ کے قبیلے خزرج کے افراد اور اسلامی ریاست کے ترجمان تھے۔ وہ دشمنوں کے عقلی اور ذہنی حملوں کا جواب دیتے اور مسلمانوں، اسلام اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت و ناموس کا دفاع کرتے تھے۔ ابن اسحاق کی سیرۃ اور دوسرے مآخذ ان کی شاعری کے نمونوں سے بھرے پڑے ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے شعراء وقت انفرادی حیثیت میں اپنے فرائض انجام دیتے تھے۔ عہد نبوی میں یوں تو متعدد خطیب تھے۔ لیکن "سرکاری حیثیت میں" صرف حضرت ثابت بن قیس شماس خزرجی نظر آتے ہیں۔ وقت کے سب سے بڑے خطیب خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تھے جن کے کلمات طیبات عربی ادب میں نثر کی آبرو ہیں۔

بخاری کی روایت صحیح ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دولت کدہ و بارگاہ نبوی پر کوئی مستقل دربان تعینات نہیں تھا مگر مآخذ سیرت سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض خاص مواقع پر جب تخلیہ چاہتے تھے یا اصلاح و مشورہ کر رہے ہوتے تھے تو کسی صحابی کو دربانی کی یہ سعادت سونپ دیتے تھے۔ یہ عارضی اور مخصوص مواقع کے لئے انتظام ہوتا تھا۔ ورنہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی رسول خدا اور سربراہ ریاست و حکومت دونوں حیثیتوں میں ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان بلکہ ارذل ترین شہری کی پہنچ میں تھے اور ہر شخص آپ سے ہر مناسب وقت پر مل سکتا تھا۔

فتوحات اور معاہدات صلح کے نتیجہ میں جب مرکز اسلام سے خاصی دور واقع علاقے اسلامی ریاست کی سیاسی بالادستی کے پرچم تلے آ گئے تو ان کو مرکزی انتظامیہ سے وابستہ کرنا بھی ضروری ہو گیا تھا کہ اس کے بغیر مرکزیت نہیں پیدا ہو سکتی تھی جو اسلامی سیاسی نظام کی ایک نمایاں خصوصیت تھی چنانچہ جوں جوں علاقے جنگ کے ذریعہ (عنوۃً) یا صلح کے ذریعہ (صلحاً) اسلامی ریاست کا حصہ بنتے گئے توں توں ان کے لئے مرکزی منتظم رگورنر روالی مقرر ہوتے گئے۔ یہ انتظامی علاقے ولایات کہلاتے تھے اور طبری کے بقول ان کے جغرافیائی حدود تھے۔ عہد نبوی کے اواخر تک الیسی ۲۷ ولایات تھیں۔ ان کے والی مستقل عہدیدار تھے۔ جن کی تقرری خوشنودی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دوران قائم رہتی تھی۔ اور عملاً ان کی غالب اکثریت اپنی تقرری کے زمانے سے وفات نبوی کے زمانے تک اپنے عہدوں پر قائم و برقرار رہی تھیں۔۔ صرف تین والیوں کو معزول کیا گیا تھا۔ جبکہ دو اور کا اپنے عہدے کے دوران ہی انتقال ہو گیا تھا۔ اس طرح کل ولاۃ نبوی کی تعداد ۳۲ تھی۔ والیوں کو ان کی خدمات کے لئے ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔ لیکن اس کی حتمی مقدار نہیں معلوم ہو سکی البتہ والی مکہ کے ضمن میں وہ سولہ سو درہم معلوم ہوتی ہے اور وہ بھی مختلف فیہ ہے۔ والیوں کو وسیع اختیارات حاصل تھے۔ جن میں سیاسی، انتظامی، فوجی، مالی اور عدل و انصاف وغیرہ کے اختیارات شامل

تھے۔ ان کے ماتحت مختلف افسروں کا ایک عملہ ہوتا تھا۔ جو ایک طرح سے صوبائی یا علاقائی مجسٹریٹ کا کام کرتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شمالی علاقوں اور جنوبی عرب کو دو بڑے انتظامی حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا جن پر ایک ایک منتظم اعلیٰ یا گورنر جنرل ہوتا تھا اور اس کی ماتحتی میں مختلف ولایتوں کے والی اپنے اپنے علاقوں کا نظم ونسق چلاتے تھے۔ شمال میں حضرت شرحبیل بن حسنہ کندی اور جنوب میں حضرت معاذ بن جبل خزرجی گورنر جنرل تھے اور ان کو وسیع اختیارات حاصل تھے۔ مدینہ کے شمال میں ولایتوں کی کل تعداد آٹھ تھی۔ جبکہ جنوب میں دس تھی۔ اور باقی مرکزی اور مشرقی عرب میں واقع تھیں۔ عملاً گورنر آزاد و خود مختار ہوتا تھا۔ صرف اس کو ہدایات نبوی یا سنت اور کتاب کی پابندی کرنی لازمی ہوتی تھی۔ نئی صورتحال میں وہ اپنی رائے سے کام لینے کا مجاز تھا۔ قریش کے بطور قبیلہ ۱۲ والی تھے جن میں سات اموی افراد تھے اور دو ان کے حلیف۔ مدنی قبیلوں میں خزرج کے چھ والی مقرر ہوئے تھے۔ بلتیہ قبائل کی نمائندگی معمولی تھی۔ بلکہ مغربی قبائل تو اس سے بالکل محروم رہے تھے۔

مدینہ کی مرکزی حکومت اور ولایتوں کی صوبائی حکومتوں کے عوام الناس سے رابطہ کا کام مقامی منتظمین کرتے تھے۔ جو عموماً قبائل اور ان کے اہم بطون کے شیوخ اور سردار تھے۔ اس لحاظ سے ان کی تعداد بہت تھی۔ ماخذ میں ان کی بہت تھوڑی تعداد کے ناموں کا ذکر ملتا ہے۔ بہرحال ان شیوخ و سادات قبائل کو ان کے قبول اسلام کے بعد اسلامی ریاست ان کے عہدوں پر عموماً برقرار رکھتی تھی۔ شاذ و نادر ہی ان کو ہٹایا جاتا تھا۔ البتہ جن قبیلوں کے سردار اسلام قبول نہیں کرتے تھے اور ان کے خاصے افراد مسلمان ہو چکے تھے۔ اسلامی ریاست ان مسلمانوں کا سردار اپنی طرف سے مقرر کر دیتی تھی۔ مرکزی حکومت کا یہ اختیار اس کے روز افزوں اقتدار کا اور ساتھ ساتھ مرکزیت کی اندرون ملک میں توسیع کا بین ثبوت تھا۔ کیونکہ قبیلہ کی سرداری طے کرنا قبیلہ کا اندرونی معاملہ تھا جس میں کوئی خارجی عنصر دخل نہیں دے سکتا تھا۔ ان مقامی منتظمین کے عموماً انتظامی اور مالی اختیارات و فرائض تھے۔ امن و امان قائم رکھنا اور صدقات وصول کر کے مرکزی حکومت، صوبائی حکومت یا اس کے عاملین تک پہونچانا ان کا بنیادی فرض تھا۔ جہاں تک مدینہ منورہ کا تعلق تھا۔ اس کے دونوں قبیلوں کے بارہ سردار جو نقیب کہلاتے تھے۔ اپنے اپنے لوگوں اور علاقوں کے معاملات کے ذمہ دار تھے۔ نقیب ایک مذہبی اور انتظامی یا تنظیمی ادارہ تھا۔ جو یہودی اور عیسائی شریعتوں میں بھی موجود تھا۔ اور انہیں سے اسلام میں آیا تھا۔ یہ ادارہ پورے عہد نبوی میں موجود اور کام کرتا رہا تھا۔

عدل و انصاف اور قضا کے سب سے بڑے افسر خود جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ مگر آپ نے متعدد اصحاب سے خود اپنی موجودگی میں مقدمات فیصل کرائے تھے۔ اور ان کو پسند کیا تھا۔ خود مدینہ میں بعض مستقل قاضی تھے جو مقدمات فیصل کرتے تھے۔ ولایتوں میں یہ اختیار عموماً گورنروں اور والیوں کو حاصل ہوتا تھا۔ جیسا کہ حضرات معاذ بن جبل، ابو موسیٰ اشعری اور ابو عبیدہ بن جراح فہری کے معاملہ سے واضح ہوتا ہے۔ اندازہ یہ ہوتا ہے کہ مقامی منتظمین کو بھی یہ اختیار محدود طور سے حاصل تھا۔ باقاعدہ قاضیوں کا تقرر بعد کے زمانے میں شروع ہوا تھا۔

اقتصادی معاملات میں بازاروں کا نظام خاصی اہمیت کا حامل تھا اور اخلاق اور اعمال کی درستگی کا بڑی حد تک انحصار اس کا صحیح کارکردگی پر تھا۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس اور دوسرے کاموں کی طرح بازاروں کی معاملات کی

دیکھ بھال کرتے رہتے تھے اور اقتصادی و تجارتی معاملات سے متعلق وقتاً فوقتاً احکام و فرامین جاری کرتے رہتے تھے اس کے علاوہ آپ نے مکہ اور مدینہ کے بازاروں کے دو مستقل افسر مقرر فرمائے تھے۔ جو بالترتیب حضرات سعید بن سعید اموی اور عمر بن خطاب عدوی تھے۔ دوسرے بازاروں یا تجارتی مراکز کے بارے میں اس قسم کی تقرریوں کا اگرچہ ثبوت نہیں ملتا۔ مگر یہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے افسر ضرور مقرر کئے گئے تھے اور جہاں اس قسم کے افسر نہیں تھے۔ وہاں مقامی اور صوبائی منتظموں خاصکر والیوں کا یہ فریضہ تھا کہ وہ بازاروں کے معاملات کی دیکھ بھال کریں۔

عہد نبوی کے شہری نظم و نسق میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام مسلم طبقات اور علاقوں کو نمائندگی ضرور دی تھی۔ تاہم صرف یہی سیاسی عنصر تقرریوں کی اساس نہیں تھا اور نہ ہی قبائلی یا سماجی اسباب و عوامل اس کی اساس بنے تھے۔ بنیادی طور سے حکومتی مناصب کے لئے بنیاد و اساس صرف صلاحیت و لیاقت تھی۔ باقی دوسرے عوامل ضمنی یا ثانوی تھے۔ چنانچہ سبقت اسلام ایک صفت حمیدہ تھی۔ تاہم وہ بھی انتظامی یا حکومتی مناصب میں ترجیح و تقرر کا ذریعہ نہیں بن سکی تھی۔ عہد نبوی کے نظام حکومت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے بیشتر عمال و افسران حکومت نسبتاً نوجوان اور متاخر مسلمان تھے اور ان کو سابقین، اولین پر ترجیح دی گئی تھی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام میں سبقت نہ وجہ تقرر تھی نہ وجہ ترجیح۔

اسلامی تعلیمات نے مذہبی اور سماجی اجتماعیت و مرکزیت کی مانند سیاسی مرکزیت کی بھی تبلیغ کی تھی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یا مدینہ کی مرکزی حکومت کے اقتدار اعلیٰ کو پورے جزیرہ نمائے عرب میں تسلیم کیا جائے۔ آپ کے نظام حکومت نے عملاً اس مرکزیت کو شمال سے جنوب اور مغرب سے مشرق تک جاری و ساری کر دیا تھا۔ متعدد مرکزی، صوبائی اور مقامی افسران و عمال کے ذریعہ تمام علاقوں کو مدینہ منورہ کے مرکز سے جوڑ دیا گیا تھا اور ہر ایک علاقہ اور اس کے قبیلے اور ان کے لوگ اور افسر مرکزی حکومت کے ماتحت و تابع تھے۔ سیاسی مرکزیت کا یہ تصور و عمل اگرچہ عربوں کے لئے نیا تھا تاہم اسلام اور اسلامی ریاست کی قوت نے اس کو ذہنی اور عملی طور سے سب سے منوا لیا تھا اور اس طرح اس نظام حکومت کی بدولت اسلامی حکومت میں وہ سیاسی استحکام پیدا ہوا تھا۔ جس نے مسلمانوں کو ایک قوت بنا دیا تھا۔ جس سے عصری طاقتیں صرف نظر نہیں کر سکتی تھیں۔ اور تاریخ نے ثابت کر دیا کہ جلد ہی وقت کی عظیم ترین سلطنتوں نے بھی اسلام کی سیاسی قوت و حشمت کے سامنے اپنا سر جھکا دیا۔

باب پنجم

اسلامی ریاست کا مالی نظام

اب یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہو چکی ہے کہ عہدِ نبوی میں اسلامی ریاست اپنے آغاز سے اوجِ کمال تک ارتقائی مراحل سے گزری تھی۔ اس عرصے میں اسلامی ریاست نے اپنے مخالفوں اور دشمنوں کے خلاف متعدد عسکری اور نیم عسکری مہمیں ترتیب دی تھیں۔ ان کے نتیجے میں رفتہ رفتہ اس کا ایک عسکری نظام وجود میں آیا تھا۔ ایک اُمت اور اجتماعی اکائی کے طور پر زندہ رہنے کے لیے مسلمانوں نے شہری نظم و نسق یا انتظامیہ کا ایک ڈھانچہ بھی کھڑا کیا تھا جو بعد میں اسلامی ریاست کی کارکردگی کا عملی پیکر بن گیا۔ انھوں نے پہلے اپنے تمام ہم وطنوں یعنی باشندگانِ عرب کو، اور پھر ساری دنیا کے لوگوں کو اسلامی اُمت کا رکن بنانا چاہا اور اس کے لیے پورا ایک مذہبی نظام وجود میں آیا۔ ان تمام حکومتی شعبوں اور ریاستی معاملات کے لیے اسلامی ریاست نے ایک مالی نظام بھی قائم کیا جو دوسرے شعبوں کی طرح اسلام کے معاشی و اقتصادی نظریات پر مبنی اور اس کا نمائندہ تھا۔ اب تک اسلام کے معاشی نظریات اور مالی اصولوں پر بہت کچھ وقیع اور علمی انداز میں لکھا جا چکا ہے اور خاصی بحث اسلام کے زرعی، تجارتی، مالی اور دوسرے اقتصادی پہلوؤں سے متعلق نظام پر بھی کی جا چکی ہے لیکن وہ نظریاتی زیادہ ہے اور تاریخی کم۔[1] کم از کم اس میں تاریخی عوامل کا تجزیہ نہیں کیا گیا ہے۔ اس بحث میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ اسلام کے عملی اور حقیقی نظامِ مالیات سے اس طور سے بحث کی جائے کہ اس کے ہر پہلو کا تاریخی ارتقا واضح طور سے اُجاگر و نمایاں ہو سکے۔

۱۔ مسلمانوں کی اقتصادی حالت

تاریخی توقیت کا تقاضا ہے کہ اس بحث کا آغاز مسلمانوں کی عمومی اقتصادی حالت سے کیا جائے۔ اگرچہ اسلامی ریاست کے مالی نظام کا تعلق عہدِ نبوی کے زمانے سے ہے لیکن اس کا خاصا اہم تعلق مکی دور سے بھی ہے کہ مسلمانوں کا ایک خاصا بڑا طبقہ مکہ سے مہاجرت کر کے مدینہ پہنچا تھا۔ مکی مسلمانوں کی معیشت و اقتصادی حالت کے بارے میں قدیم و جدید، مسلم و غیر مسلم مورخین و سیرت نگاروں کا اتفاق ہے کہ ان میں مالدار و متمول بھی تھے اور غریب و نادار بھی۔[2] مسلم مورخین اور علماء کا عموماً رجحان دولت کے جمع کرنے کے خلاف ہے اس لیے وہ نہ صرف فقر و فاقہ کی افضلیت کا دعویٰ کرتے ہیں بلکہ یہ ثابت کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں کہ اولین مسلمانوں کا تعلق زیادہ تر ناداروں اور معاشرتی اور اقتصادی لحاظ سے کمزوروں یا کمزور طبقات سے تھا۔[3] حالانکہ یہ قطعی صحیح نہیں ہے۔ تاریخی حقائق شہادت دیتے ہیں کہ مکی مسلمانوں کے اقتصادی لحاظ سے تین طبقے تھے۔ پہلا طبقہ خاصے متمول اور مالدار مسلمانوں پر مشتمل تھا۔ اگرچہ یہ طبقہ مکی معیشت کے پس منظر میں تاجرانِ مکہ کی صفِ دوم میں آتا تھا تاہم وہ خاصا مالدار تھا۔ ان میں

حضرات عثمان بن عفان، زبیر بن عوام، طلحہ بن عبید اللہ، عبد الرحمٰن بن عوف، خدیجہ بنت خویلد، ابوبکر بن ابی قحافہ، عمر بن خطاب، عبد اللہ نحام وغیرہ شامل تھے یہ وہ لوگ تھے جو مکّی اقتصاد اور معیشت میں اپنی تجارتی حیثیت بنا چکے تھے اور آزاد و خود مختار تاجر کی حیثیت سے اپنی چھاپ قائم کر چکے تھے۔(۴) مکّی مسلمانوں کے دوم طبقہ میں قریشی اشراف کے خاندانوں کے نوجوان فرزندانِ دل بند شامل تھے جو اپنی اقتصادی و تجارتی حیثیت کے لیے اپنے خاندانوں پر منحصر تھے اور ابھی تک اپنی آزاد تجارتی حیثیت نہیں قائم کر سکے تھے۔ وہ ابھی ابھرتے ہُوئے تاجر تھے جو دُنیائے تجارت میں اپنی پہچان قائم کرنے کی تگ و دَو میں لگے ہُوئے تھے۔ اقتصادی لحاظ سے اسی طبقہ میں وہ مکّی مسلمان بھی شامل تھے جو اگرچہ آزاد حرفت والے اور دستکار تھے۔ لیکن ان کی آمدنی اوسط درجہ کی تھی۔ مسلمانوں کے وُہ نوجوان تاجر بھی اسی طبقہ میں شمار کیے جانے چاہئیں جو درجہ اول کے مسلم تاجروں کے ساتھ شراکت کی بنیاد پر مکّی تجارت میں اپنی جگہ بنا رہے تھے۔(۵) اور تیسرا مسلم طبقہ ان اللہ والوں پر مشتمل تھا جو غلام تھے یا اجیر، یا ایسے لوگ جن کی آمدنی ان کے مصارف کی کفالت معمولی درجہ میں یا بقدرِ کفاف کر پاتی تھی۔(۶) یہی وہ نادار و مفلس مسلمان تھے جن کو سماجی لحاظ سے ضعفائے المسلمین میں سب سے اونچا مقام حاصل تھا۔

ظاہر ہے کہ مکّی سماج میں مسلم اجتماعی معیشت کی آزادی کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ مسلمانوں کا نہ کوئی مالی نظام تھا نہ کوئی اجتماعی اقتصادی تنظیم۔ لیکن سماجی اور مذہبی اجتماعیت اور اُمتِ مسلمہ واحدہ سے یکساں تعلق کے احساس نے مسلمانوں میں اقتصاد و معیشت کے میدان میں یہ شعور پیدا کر دیا تھا کہ ان کے مالداروں نے اپنے اقتصادی طور سے کمزور دینی بھائیوں کے لیے اپنے مال میں ان کا "حق" تسلیم کر لیا تھا اور حضرات ابوبکر و عثمان جیسے مسلمان اپنی دولت کا خاصا بڑا حصّہ اپنے دینی رفقا کی اقتصادی و معاشی ضروریات پر خرچ کیا کرتے تھے۔ مشہور واقعہ ہے کہ بوقتِ اسلام حضرت ابوبکر صدیق کے پاس چالیس ہزار درہم نقد تھے لیکن تیرہ برس کے بعد یہ "اصل مال" گھٹ کر صرف چار ہزار درہم یا اس کے لگ بھگ رہ گیا تھا۔(۷) اور بیشتر مال مسلمانوں کی ضروریات پر صرف ہو چکا تھا۔ حضرت عثمان غنی مکّہ کے مالدار ترین مسلمانوں میں بلکہ ایک حد تک مالدار ترین مکیوں میں شمار ہونے لگے تھے مگر ہجرتِ مدینہ کے وقت ان کے پاس صرف سات ہزار یا اس کے مساوی رقم رہ گئی تھی۔(۸) مکّہ میں مسلمانوں کا اجتماعی اقتصادی نظام اگر کوئی تھا تو وہ امداد باہمی کے اصولوں یا طریقوں پر مبنی تھا۔

عہدِ نبوی کے مدنی دور میں مسلمانوں کی اقتصادی حالت کے بارے میں سخت غلط فہمی عام ہو گئی ہے۔ مسلم مورخین نے اکثر و بیشتر یہ فرض کر لیا کہ قریشی اشراف و رؤسائے مکّہ کی روک ٹوک کے سبب مکّہ کے مسلمان ہجرت کے وقت مکّہ سے کچھ بھی ساتھ نہیں لے جا سکے تھے اور بالکل "بکھرے" مدینہ پہنچے تھے اس لئے ان کی معاشی ضروریات کی تکمیل و تسکین کلی طور سے انصارِ مدینہ ——— اوس و خزرج ——— کے مسلمانوں کی فیاضی و سخاوت، مہمان نوازی و میزبانی اور مالی و اخلاقی نصرت و امداد کی مرہونِ منت تھی۔ ان مورخین کا یہ بھی خیال ہے کہ اسی فیاضی و سخاوت بلکہ دولت و جائداد میں شراکت کے سبب مکّی مسلمانوں کو اقتصادی طور سے اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کا موقعہ ملا اور بعد میں اموالِ غنیمت میں حاصل شدہ جائدادوں نے اور ان کی اپنی تجارت و زراعت نے نہ صرف مکّی مسلمانوں کی اقتصادی حالت بہتر بنائی بلکہ مدینہ کی مسلم معیشت کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ دوسری طرف مستشرقین کا خیال ہے کہ نادار و مفلس مکّی مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد جب مدینہ پہنچی تو وہ مقامی معیشت کے لیے بوجھ بن گئی اور انصارِ مدینہ کی پہلے سے دگرگوں

معیشت نے بالآخر کچھ دنوں تک لڑکھڑانے کے بعد بالکل ہی دم توڑ دیا۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں رہ گیا کہ وہ جاہلی عرب کے مسلّمہ دستور کے مطابق مدینہ کے قریب سے گزرنے والے کاروانوں کی لوٹ مار کریں۔ مالا مال مکی تجارتی کاروانوں نے جو مکہ سے شام جاتے ہوئے مدینہ کے قریب سے گزرتے تھے "رزیہ" کی ترغیب دی اور بالآخر معاشی دباؤ اور اقتصادی مجبوریوں نے چھین جھپٹ کے تصور کو عملی جامہ پہنا دیا اور بدر سے پہلے کی تمام ابتدائی مہیں اسی مقصد کے لیے وجود میں آئی تھیں۔ گویا کہ تمام غزوات و سرایائے نبوی عموماً اور ابتدائی مہیں خصوصاً اسی لوٹ مار کا نتیجہ یا شاخسانہ قرار پائیں۔[۹]

بوقتِ مہاجرت مسلم معاشی حالت اور مسلم معیشت میں اموالِ غنیمت کے تناسب پر مکمل بحث تو کہیں اور کی جا چکی ہے[۱۰] جسے یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تاہم یہاں توضیحی و تاریخی تقاضوں کی تسکین کی خاطر یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ نہ مسلم مہاجرینِ مکہ بالکل نادار و مفلس اور خالی ہاتھ مدینہ پہنچے تھے اور نہ ہی مدنی مسلم معیشت اتنی دگرگوں تھی کہ مسلمانوں کو روزی روٹی چلانے کے لیے لوٹ مار کی حاجت ہوتی۔ مہاجرینِ مکہ میں متمول بھی تھے اور اوسط درجہ کے مالدار بھی اور نادار و مفلس بھی۔ دراصل مکی مسلم معیشت کے تینوں طبقات اپنی مکمل معاشی حالت کے ساتھ مدینہ پہنچے تھے۔ ان میں حضرات عمر فاروق، ابوبکر صدیق، عثمان غنی، زبیر بن عوام، طلحہ بن عبید اللہ، عبدالرحمٰن بن عوف اور سعد بن ابی وقاص جیسے مالدار اشخاص کے علاوہ بنو مظعون، بنو غنم بن دودان اور بنو بکیر/کنانہ جیسے متمول خاندان بھی شامل تھے جو اپنی تمام منقولہ جائداد ——— نقد و اسباب ——— کے ساتھ مدینہ پہنچے تھے۔ بہت سے درجہ دوم کے مسلمانوں کو بھی اپنی دولت کا خاصا حصہ نئے وطن میں لانے کا موقعہ مل گیا تھا۔ انھیں میں سے کچھ بلکہ معدودے چند ایسے تھے جو سیاسی یا سماجی مجبوریوں کے تحت اپنی دولت یا تو بالکل نہیں لا سکے تھے یا اس کا محض ایک معمولی حصہ لائے تھے۔ اور ظاہر ہے کہ جو مکہ میں نادار و مفلس تھے وہ مدینہ بھی نادار و مفلس پہنچے تھے لیکن وہ وہاں سب کے سب نادار و مفلس نہیں رہے تھے جیسا کہ غلط خیال لوگوں کے دماغ میں راسخ ہو گیا ہے۔ کچھ مدت کے بعد وہ نہ صرف اپنے پیروں پر کھڑے ہو گئے تھے بلکہ مدنی مسلم معیشت کے ارتقاء کا سبب بھی بنے تھے۔[۱۱] البتہ ایک خاصا بڑا طبقہ مسلمانوں کا ایسا ہمیشہ رہا جو اقتصادی لحاظ سے نہ صرف کمزور رہا تھا بلکہ وہ مسلمانوں کا محتاج اور ان کی دولت پر منحصر تھا۔ یہ وہ طبقہ تھا جو کسی سبب سے اپنا کوئی ذریعۂ آمدنی مستقل طور سے نہیں رکھتا تھا۔ ان میں اہلِ صُفّہ کے علاوہ بعض اجیر و مزدور بھی شامل تھے جو وقت کی آندھیوں میں پیٹ کا چراغ جلانے کی کوشش میں ہمہ تن مصروف رہتے تھے۔

ہجرتِ نبوی کے بعد جب مدینہ منورہ میں اسلامی ریاست کا قیام عمل میں آیا تو اس وقت مسلمانوں کے دو سماجی طبقے ——— مہاجرین اور انصار ——— کے علاوہ یہودیوں پر مشتمل ایک اہم طبقہ بھی مدینہ کی آبادی کا ایک حصہ تھا۔ ان کے سوا چوتھا مختصر سا طبقہ اوس مناۃ کے غیر مسلموں کا تھا جو شروع تک اپنا آزاد وجود قائم رکھنے میں کامیاب رہا تھا اور بالآخر وہ مسلم طبقۂ انصار میں ضم ہو گیا تھا۔ جہاں تک اس طبقہ کی اقتصادی حالت کا تعلق تھا تو وہ انصار کے کسی خاندان کی مانند تھی البتہ یہودیوں کا طبقہ جو بیس سے اُوپر چھوٹے بڑے قبیلوں پر مشتمل تھا اقتصادی لحاظ سے نہ صرف خوشحال تھا بلکہ مدنی معیشت کی باگ ڈور اسی کے ہاتھ میں تھی۔ ان میں بنو قینقاع اور کچھ دوسرے خاندان اور قبیلے تاجر اور دستکار تھے۔ وہ خاصے دولتمند لوگ تھے اور ان کا اپنا خاص بازار تھا جو غالباً شہر کا سب سے اہم بازار تھا۔ بلکہ مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خاصی بڑی تجارتی منڈی تھی۔[۱۲] ان کے علاوہ بنو نضیر[۱۳] اور

بنو قریظہ وغیرہ[۱۴] متعدد دوسرے یہودی قبیلے زراعت پیشہ تھے۔ اور ان کے مدینہ اور حوالی مدینہ میں کھجوروں اور پھلوں کے باغات اور کھیت تھے۔ ان کے یہاں دولت کی ریل پیل تھی۔ چنانچہ وہ بڑی بڑی گڑھیوں میں جو قلعہ نما تھیں رہا کرتے تھے اور نقد و جنس ہر طرح کی جائداد کے مالک تھے۔ تجارت، زراعت اور دستکاری کے علاوہ مدنی یہودی خاصے بڑے مہاجن بھی تھے جو سُودی کاروبار کے ذریعے بے اندازہ دولت کماتے تھے۔[۱۵] ایک مثال سے معلوم ہوتا ہے کہ وُہ پچاس فیصد سالانہ پر سُودی کاروبار کرتے تھے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ مدنی معیشت پر چھائے ہُوئے تھے اور اپنے بدنام زمانہ مہاجنی طور طریقوں کے سبب مدینہ کے انصار کے ایک خاصے بڑے طبقے کو اپنا دست نگر بنائے ہوئے تھے تاہم ایسا نہیں تھا کہ انصار پوری طرح سے اپنی معیشت کے لیے ان پر منحصر ہوں۔ تاریخی واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہود و انصار کے مخلوط طبقات سیاسی و سماجی اسباب کے علاوہ اقتصادی اسباب سے بھی ایام جاہلیت میں باہم دست بگریباں رہے تھے بہر حال عہد نبوی میں مہاجرین مکہ کی مانند انصار مدینہ کے بھی اقتصادی لحاظ سے تین طبقے تھے۔ دونوں مسلم طبقات میں اگر کوئی اہم فرق تھا تو بس یہ کہ مکی مسلمان زیادہ تر تجارتی پس منظر رکھتے تھے جبکہ ان کے مدنی بھائی زیادہ تر زراعت پیشہ تھے اور اس فرق کا بڑی حد تک ذمہ دار ان دونوں طبقات کا جغرافیائی پس منظر تھا۔[۱۶]

مہاجرین مکہ میں سے اکثر نے اپنے وطن ثانی میں قیام کے فوراً بعد اپنا آبائی پیشہ ـــــ تجارت ـــــ شروع کر دیا تھا جبکہ ان کے کچھ لوگ زراعت میں بھی لگ گئے تھے۔ مدینہ اور حوالی مدینہ میں افتادہ زمینوں کی کمی نہیں تھی۔ ان میں بعض اراضی انصار کی تھی جو انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے کر دی تھی اور کچھ اراضی بلا ملکیت تھی۔ چنانچہ ان تمام فاضل زمینوں کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سکونت و زراعت کے لیے مہاجرین کو تقسیم کر دیا تھا۔ بعد میں کچھ اراضی مدینہ اور اس کے اطراف میں عسکری مہموں کے نتیجہ میں بطور اموال غنیمت ہاتھ آئی تھی اور وہ بھی زیادہ تر مہاجرین کے حصے میں آئی تھی اور اس طرح مکی مہاجرین کے لیے نہ صرف سکونت کا مسئلہ حل ہو گیا تھا بلکہ زرعی زمینوں کی بدولت اقتصادی مسئلہ بھی کافی حد تک طے ہو اتھا۔ مہاجرین میں سے حضرات زبیر بن عوام، ابوبکر صدیق، عمر فاروق، سعد بن ابی وقاص وغیرہ متعدد اکابر صحابہ کا شمار ان لوگوں میں کیا جاتا ہے جو زرعی جائدادوں اور کاروبار کے مالک تھے۔[۱۷] اسی طرح مذکورہ بالا اکابر مہاجرین کے علاوہ حضرات عبدالرحمٰن بن عوف، طلحہ بن عبیداللہ، عثمان بن عفان وغیرہ متعدد بلکہ بیشتر مکی مسلمانوں نے تجارتی کاروبار بھی شروع کر دیا تھا۔[۱۸] یہ بڑی دلچسپ حقیقت ہے کہ بہت سے مکی مسلمانوں نے بیک وقت زراعت اور تجارت دونوں میں دلچسپی لی تھی اور اس طرح انہوں نے مدنی اقتصاد و معیشت کے ارتقا میں دوہرا حصہ لیا تھا۔

مدینہ منورہ کی مسلم معیشت کے مطالعے کے ضمن میں بعض ٹھوس تاریخی حقائق کا مطالعہ بڑا دلچسپ ہوگا۔ ان سے نہ صرف مسلمانوں کی انفرادی دولت مندی اور تمول کا علم ہوگا بلکہ اجتماعی مسلم دولت کا بھی اندازہ لگ سکے گا۔ اگرچہ انصار و مہاجرین دونوں مسلم طبقات کی نقد و جنس دولت کے حوالے ماخذ میں بہت کم ہیں تاہم وہ عہد نبوی کی معاشی حالت کا ایک موٹا سا اندازہ دینے کے لیے کافی ہیں۔ قبیلہ خزرج کے سردار حضرت سعد بن عبادہ خاصے دولتمند آدمی تھے اور وُہ کافی باغات اور زرعی زمینوں کے مالک تھے۔ ان کی دولتمندی کا اندازہ اسلامی ریاست کے لیے ان کے عطیات سے ہوتا ہے۔[۱۹] اسی طرح اوس کے سردار حضرت سعد بن معاذ مدینہ کے متمول ترین لوگوں میں سے تھے اور کافی جائداد کے مالک تھے۔[۲۰] میزبان رسول کریم

حضرت ابو ایوب انصاری نہ صرف دو منزلہ پختہ مکان کے مالک تھے جو بذاتِ خود تموّل کی ایک نشانی تھی بلکہ متعدد کھجور کے باغات اور زرعی اراضی کے مالک تھے۔[21] انصار میں حضرت عمارہ بن حزم کا شمار متمول لوگوں میں ہوتا تھا جبکہ حضرت سعد بن ربیع کافی بڑی جائدادوں کے مالک تھے۔[22] ایک روایت کے مطابق ایک انصاری نے ایک موقعہ پر ریاستِ اسلامی کے ہنگامی مصارف کے لئے طلائی سکوں ——— دینار ——— کی اتنی بڑی اور بھاری تھیلی عطیہ میں دی تھی جس کو وہ بمشکل اٹھا پا رہے تھے۔[23] بخاری کی ایک روایت کے مطابق حضرت جابر بن عبداللہ انصاری کا مدینہ میں کھجور کا ایک بڑا باغ تھا جس سے کافی آمدنی ہوتی تھی۔[24] اس کے علاوہ متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ اور حوالی مدینہ میں انصار کے بڑے بڑے کھیت تھے جہاں کافی غلہ پیدا ہوتا تھا۔[25] زرعی جائدادوں کے علاوہ انصار میں مویشی خاص کر دودھاری جانور پالنے کا عام رواج تھا کیونکہ دودھ عربوں کا محبوب کھاجا تھا۔[26] انصار کی دولتمندی کی اور بہت سی مثالیں ہیں جن سے ان کی معیشت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کا ذکر ہمارے اگلے مباحث میں آتا رہے گا۔

جہاں تک مہاجرین کا تعلق ہے تو ذکر آ چکا ہے کہ ان میں سے بہت سے لوگ نقد و جنس میں نہ صرف دولت ساتھ لائے تھے بلکہ انھوں نے تجارت کا بازار گرم کر دیا تھا۔ ان میں سے کچھ ایسے بھی صحابہ تھے جو زراعت میں بھی لگ گئے تھے اور بعض غیر معمولی صلاحیتوں کے لوگوں نے دونوں پیشوں میں دلچسپی لی تھی۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف جلد ہی مدینہ میں مالدار ترین تاجروں میں شمار ہونے لگے تھے کیونکہ انھوں نے مختلف اشیاء کی تجارت کا خداداد ملکہ پایا تھا۔[27] اس طرح حضرت ابو بکر صدیقؓ نے مدینہ کے اطراف میں سنح کے مقام پر کپڑے سازی کا ایک چھوٹا موٹا کارخانہ لگا لیا تھا اور غالباً دوسرے اجیروں کی مدد سے وہ پیداوار کے ساتھ ساتھ تجارت بھی کرتے تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ مقامی تجارت سے بڑھ کر بین الاقوامی تجارت میں حصہ لینے لگے تھے اور ان کی تجارت ایران، شام تک وسیع ہو گئی تھی۔ حضرت عثمان غنیؓ شروع میں بنو قینقاع کے بازار میں کھجوروں کا کاروبار کرتے تھے۔ بعد میں وہ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف غلاموں کی تجارت میں دولت کمانے لگے تھے۔ اس کے علاوہ یہ دونوں مہاجر تاجر کپڑے، غلّے وغیرہ دوسری اشیاء کی تجارت بھی کرتے تھے اور اپنے مکی عہد کے شراکت کے طریقے کو بھی جاری رکھے ہوئے تھے۔ یعنی وہ دوسروں کو اپنا مال تجارت کے لیے پچاس فیصدی نفع کی شرکت پر اُدھار دیتے تھے۔ اندازہ یہ ہے کہ مسلمان جزیرہ نمائے عرب کے تمام بازاروں میں اپنا سامانِ تجارت لے کر پہنچتے تھے۔[28]

مسند احمد بن حنبل میں مدینہ اور اطراف مدینہ کے مختلف روزانہ اور ہفتہ واری بازاروں کا ذکر ملتا ہے جہاں مسلمانانِ مدینہ مختلف اشیاء کی تجارت کرتے تھے۔[29] محمد بن حبیب بغدادی نے جزیرہ نمائے عرب کے تمام بازاروں کا ذکر کیا ہے جو سال بھر مختلف مقامات پر یکے بعد دیگرے اس طرح لگتے تھے کہ ان کا سلسلہ ٹوٹنے نہیں پاتا تھا۔ ان میں سے عکاظ، مجنہ، ذوالمجاز، حباشہ، مشقر، دومۃ الجندل، ہجر وغیرہ اہم ترین تھے۔ ان میں سے سرحدی علاقوں کے بازار بین الاقوامی تجارت کی منڈیاں تھے جہاں شام، عراق، ایران حتیٰ کہ ہندوستان اور چین کے تاجر اپنے اسباب تجارت کے ساتھ پہنچتے تھے۔[30] ان کے علاوہ حج کے زمانے میں لگنے والے مکہ، منیٰ اور عرفات وغیرہ کے بازار بھی تھے۔[31] پھر وہ مقامی تجارت کے بازار تھے جہاں مسلمان اور دوسرے لوگ باقاعدہ پہنچا کرتے تھے۔ ان مقامی بازاروں میں مسلم تجارت خوب پھلی پھولی تھی۔ مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ ذی قعدہ ۴ھ/

اپریل ۶۲۶ء میں غزوہ بدر الموعد کے موقعہ پر مسلمان تاجر اور مجاہد اپنا تجارتی سامان بدر کے مقامی بازار میں لے کر گئے تھے جو اس ماہ کی پہلی تاریخ سے آٹھ تاریخ تک لگتا تھا۔ مسلمانوں نے اس موقعہ پر خوب نفع کمایا تھا اور حضرت عثمان بن عفان کے بارے میں تو آتا ہے کہ انھوں نے ایک دینار کے عوض ایک دینار یعنی سو فیصد نفع کمایا تھا۔[۴۲] یہ حقیقت بڑی اہم ہے کہ کیا مسلم اور کیا غیر مسلم عرب مثالی تاجر تھے اور وہ ہر موقع سے فائدہ اٹھاتے تھے۔[۴۳] چنانچہ عسکری مہموں کے دوران بھی ان کا معمول تھا کہ وہ اپنا تجارتی سامان ساتھ لاتے تھے اور موقعہ ملنے پر تجارت کا بازار بھی گرم کرتے تھے۔ غزوہ بدر عظیم کے موقعہ پر کی فوج میں وہ عظیم وماہر تاجرین مکہ شامل تھے جو کھالوں (ادم) وغیرہ پر مشتمل خاصا اسباب تجارت ساتھ لائے تھے۔[۴۴] اسی طرح مسلم تاجروں کے بارے میں معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے خیبر کے غزوہ کے دوران تجارت کی تھی اور بڑا نفع کمایا تھا۔[۴۵] غالباً انھوں نے دوسری مہموں کے دوران بھی اپنے اس معمول کو ترک نہیں کیا تھا۔

مدنی مسلمانوں نے دُور دراز کے مقامات کو بھی تجارتی کارواں بھیجے تھے۔ ۶ھ / ۶۲۸ء میں حضرت زید بن حارثہ کی قیادت میں ایک ایسا ہی تجارتی کارواں اصحاب رسولؐ کا سامان تجارت لے کر شام کے لیے گیا تھا مگر بدقسمتی سے وہ وادی القریٰ کے علاقے میں بنو فزارہ کے ہاتھوں لُوٹا گیا۔[۳۶] اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ مدنی مسلمانوں کا یہ اکلوتا تجارتی کارواں تھا جو شام بھیجا گیا تھا اس قسم کے تجارتی کاروانوں کے متعدد حوالے مآخذ میں خاص کر حضرات عبدالرحمٰن بن عوف، عثمان بن عفان، طلحہ بن عبید اللہ، زبیر بن عوام وغیرہ جیسے تاجر صحابہ کرام کے تراجم میں ملتے ہیں۔[۳۷]

۲۔ اسلامی ریاست کی آمدنی کے ذرائع اور وسائل

اُمتِ مسلمہ کی عمومی اقتصادی حالت کے مختصر سے تجزیے کے بعد اسلامی ریاست کے مالی نظم و نسق کا مطالعہ زیادہ قابلِ فہم بھی ہوگا اور آسان بھی۔ گزشتہ مختلف ابواب میں ہم اسلامی ریاست کے بعض ذرائع آمدنی پر ضمناً اور مختصراً نظر ڈال چکے ہیں۔ ان میں نقد و جنس کی صورت میں اموال غنیمت، خمس، جزیہ اور صدقات کے کثیر حوالے آچکے ہیں۔ اس کے علاوہ عطیات اور چندوں کا ذکر اشارۃً آیا ہے۔ اس بحث کا آغاز ہم اُمت اسلامی کے انفرادی اور اجتماعی عطیات سے کر رہے ہیں کہ تاریخی ترتیبِ واقعات کے لحاظ سے اسی ذریعۂ آمدنی کو اولیت کی فضیلت حاصل ہے۔

(ا) عطیات

انصارِ مدینہ کی مستقل سخاوت و فیاضی کے سوا وقتی اور ہنگامی انفرادی اور اجتماعی عطیات ہی مدینہ کی نوزائیدہ و نوخیز ریاست کے آمدنی کے ذرائع میں سب سے زیادہ اہمیت کے حامل تھے خاص کر اس کے ابتدائی اور مشکل زمانۂ ارتقاء میں اور بعد میں بھی جب اسلامی ریاست اپنے سیاسی اوجِ کمال کو پہنچ گئی تھی عطیات کی اہمیت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ مآخذ میں جابجا بکھرے واقعات و شواہد عطیات پر ایک نظر سے اس تبصرہ کی صحت کی شہادت بخوبی مل جائے گی۔ ایک بار ایک بھُو کا شخص خدمتِ نبویؐ

میں حاضر ہُوا۔ آپ نے حضرت ابوطلحہ کے سپرد ان کی میزبانی کر دی۔ انھوں نے جس مثالی انداز میں اپنے مہمان کی مہمان داری کی اس کی تحسین قرآن کریم نے کی۔ (۳۸) اس قسم کی سخاوت و فیاضی کی متعدد مثالیں اصحابِ صُفّہ کے بیان کے ضمن میں ہمارے تمام مآخذ میں بھری پڑی ہیں۔ (۳۹) ایک بار مسلم کی روایت کے مطابق ایک نومسلم قبیلہ کی مالی ضروریات کے لیے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو عطیات کا حکم دیا۔ ہر شخص اس کارِ خیر کے لیے دوڑ پڑا اور ذرا ہی دیر میں خدمتِ نبویؐ میں کھانے، کپڑے اور اسباب کا ڈھیر لگ گیا۔ ایک انصاری نے اس موقعہ پر تو کافی بڑی رقم عطیہ میں دی۔ (۴۰) یہ مشہور واقعہ ہے کہ اسیرانِ بدر کے قیام و طعام اور دوسری ضروریات کی تکمیل کلیتاً مسلمانوں کی دریادلی کی مرہونِ منت تھی۔ (۴۱) اسی طرح ہوازن کے چھ ہزار قیدیوں کے لیے کپڑے مسلمانوں کے عطیات ہی کے ذریعہ فراہم کیے گئے تھے۔ (۴۲)

مہموں سے قبل یا ان کے دوران مخیر مسلمان بڑی فیاضی سے اجتماعی اخراجات کے لیے عطیات دیتے تھے۔ خندق کی مہم کے دوران حضرات سعد بن عبادہ، جابر بن عبداللہ اور متعدد دوسرے مالدار انصاریوں اور مہاجروں نے مسلم فوج کے لیے کھانے پینے کا سامان خاص کر کھجوریں فراہم کی تھیں۔ (۴۳) بنو قریظہ کی مہم کے دوران حضرت سعد بن عبادہ نے مسلم سپاہ کے لیے کھجوروں کے ڈھیر کے ڈھیر بھیجے تھے۔ (۴۴) اسی طرح صحابی موصوف نے ذی قرد کی مہم کے دوران اپنے صاحبزادے حضرت قیس بن سعد کے ہمراہ کھجوروں کے متعدد ڈھیروں کے علاوہ دس اونٹ (جزور) بطور غذا بھیجے تھے۔ (۴۵) حضرت سعد بن عبادہ خزرجی کی اس قسم کی سخاوت کے متعدد واقعات کا ذکر مآخذ میں ملتا ہے۔ رجب ۸ھ / نومبر ۶۲۹ء میں سیف البحر کی مہم کے زمانے میں قیس بن عبادہ خزرجی نے، جو مدینہ کے متمول ترین صحابہ میں شمار ہوتے تھے، مسلم سپاہیوں کے لیے تین دن متواتر اونٹ ذبح کیے تھے اور واپسی پر ان کے والدِ مکرم و مخیر نے ان کے اقدام کی زبردست تحسین و تعریف کی تھی۔ (۴۶) صرف حضرت سعد بن عبادہ یا ان کے فرزند گرامی ہی نے اس قسم کی سخاوت و عطیات کا مظاہرہ نہیں کیا تھا بلکہ متعدد صحابہ کرام نے مہموں کے دوران مسلم سپاہ کے لیے سامانِ رسد اور دُوسرے اسباب کی فراہمی میں حصہ لیا تھا۔ ابوداؤد کی روایت ہے کہ غزوۂ خیبر کے دوران مسلم ضعیف عورتوں نے، جن کا کوئی خاص ذریعۂ آمدنی نہیں تھا، سُوت کات اور بیچ کر رقم جمع کی تھی اور سخت محنت سے حاصل شدہ یہ رقم عطیہ میں دی تھی۔ (۴۷) ایک موقعہ پر عورتوں نے اپنے زیورات تک عطیہ میں نذر کر دئیے تھے۔

جنگی اور فوجی ضروریات کے لیے مسلم عطیات کی بہترین مثال کا تعلق غزوۂ تبوک سے ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا عطیات کے لیے اعلان کرنا تھا کہ چند گھنٹوں کے اندر آپ کے سامنے ہر قسم کے سامان اور نقد کے انبار لگ گئے۔ حضرت ابوبکر نے اپنی کل دولت جو روایات کے مطابق چار ہزار درہم پر مشتمل تھی نذرِ رسول کر دی۔ حضرت عمر فاروق نے اپنی آدھی دولت جو کافی خطیر رقم تھی عطیہ میں دی تھی۔ دوسرے صحابہ کرام میں جنھوں نے "مال" (خطیر رقم) عطیہ میں دی تھی حضرات عباس بن عبدالمطلب، طلحہ بن عبید اللہ تیمی، سعد بن عبادہ، محمد بن مسلمہ وغیرہ متعدد لوگ شامل تھے۔ روایت ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کا "مال" دو سو اوقیہ چاندی (آٹھ ہزار درہم) پر مشتمل تھا جبکہ حضرت عاصم بن عدی نے ۹۰ وسق (تقریباً ۹۰ کوئنٹل) کھجوریں فراہم کی تھیں۔ لیکن سب سے بڑا عطیہ حضرت عثمان بن عفان اُموی کا تھا جنھوں نے روایات کے مطابق

مسلم فوج کے ایک تہائی حصہ کی ضروریات کے لیے سامان فراہم کیا تھا۔[۴۸] بلاذری کے مطابق رقم میں عثمانی عطیہ ستر ہزار درہم یا اس سے زیادہ کی خطیر رقم پر مشتمل تھا۔[۴۹] بہرحال اصل بات یہ ہے کہ جب کبھی رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ریاست یا امت کیلیے کسی قسم کی مالی ضرورت پیش آتی تھی آپ مسلمانوں سے عطیات کے لیے فرما دیتے تھے اور مسلمان اپنے محبوب رسول کے حکم کو اپنا فرض سمجھ کر دل کھول عطیے اور چندے دیتے تھے۔ یہ نفل صدقات تھے لیکن اجتماعی ضرورت نے ان کو مسلم عوام خاص کر دولتمند طبقہ کے لیے لازمی اور ناگزیر بنا دیا تھا۔ اس سلسلہ میں اسد الغابہ نے ایک دلچسپ تجزیہ کیا ہے جس کے مطابق حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کے ان عطیات کی فہرست مرتب کی گئی ہے جو انھوں نے مختلف مہموں کے مواقع پر عہدِ نبویؐ میں نذرِ رسول کیے تھے۔[۵۰] مذکورہ بالا مثالوں کا تعلق در اصل نقد و جنس اور اسباب کی شکل میں مسلم عطیات سے تھا۔

اُمتِ اسلامی کے مختلف افراد نے جن میں انصار اور مہاجرین دونوں شامل تھے اراضی اور جائداد پختہ و خام کی شکل میں بھی عطیات دیئے تھے جن کی مثالیں مآخذ میں کافی ملتی ہیں۔ ذکر آچکا ہے کہ انصار نے مدینہ اور حوالیِ مدینہ میں اپنی افتادہ زمینوں کے علاوہ باغات اور اراضی بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اجتماعی مقاصد کے لیے پیش کر دئے تھے اور آپ نے انہیں میں سے متعدد مسلمانوں کو قطائع عطا فرمائے تھے۔ اس پر بحث تفصیل کے ساتھ ذرا بعد میں کی جائے گی۔ ہجرت کے معاً بعد قبا کے زمانہ قیام میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس اوّلین مسجدِ اسلام کی تعمیر کی تھی اس کے لیے زمین حضرت کلثوم بن ہدم نے فراہم کی تھی اور سامان تعمیر متعدد انصاری مسلمانوں نے مہیا کیا تھا۔[۵۱] اس طرح مدینہ کی مسجد نبوی کی تعمیر کے لیے زمین کی قیمت حضرت ابو ایوب انصاری نے ادا کی تھی[۵۲] اور سامان غالباً اور لوگوں نے بھی فراہم کیا تھا۔ ایک انصاری خاتون حضرت ام انس نے اپنی کچھ جائداد رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہبہ کی تھی جو آپ نے اپنی انا حضرت اُمّ ایمن کو بخش دی تھی۔[۵۳] حضرت حارثہ بن نعمان انصاری ایک مالدار ترین اور صاحبِ جائداد شخص تھے۔ انہوں نے متعدد مکانات، باغات اور کھیت خدمتِ نبوی میں نذر کیے تھے جن میں سے ایک آپ نے اپنی محبوب دختر حضرت فاطمہ کو ان کی شادی کے موقعہ پر ۲ھ/ ۶۲۴ء میں عطا کیا تھا۔[۵۴] بنو نجار کے ایک گمنام مخیر انصاری نے ایک محل یا گڑھی (قصر) رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں غالباً اجتماعی معاملات کے لیے پیش کیا تھا۔[۵۵]

یہاں ایک نومسلم یہودی حضرت مخیرق نضری کے جائداد کے عطیات کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ مآخذ کے مطابق وہ ایک مخلص نومسلم تھے اور بنو نضیر کے ایک متمول فرد۔ اُحد سے کچھ قبل اُنھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا اور جہاد میں حصہ لیا تھا۔ انھوں نے وصیّت کر دی تھی کہ ان کی شہادت کی صورت میں تمام جائداد غیر منقولہ و منقولہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ملکیت ہوگی۔ چنانچہ ان کی وفات کے بعد ان کی کھجوروں کے باغات پر مشتمل کافی جائداد آپ کو ملی جو ایک روایت کے مطابق سات باغوں (حوائط) پر مشتمل تھی۔ ابنِ اسحاق کا بیان ہے کہ "رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں جتنے بھی صدقات تقسیم فرماتے تھے، وہ سب اسی موہوبہ جائداد سے آتے تھے"۔[۵۶] اسی طرح بعض دوسرے مدنی مسلمانوں اور مہاجرین کے اراضی کے صدقات کی بڑی دلچسپ مثالیں ملتی ہیں۔ ان میں کنوؤں (بئر) کے صدقات بہت اہم تھے جو پیاسے عربوں کے لئے نعمتِ غیر مترقبہ

سے کم نہ تھے۔ حضرت عثمان بن عفان اموی کے بارے میں روایت ہے کہ انھوں نے متعدد دوسرے کنوؤں کے علاوہ بئر رومہ جو مدینہ کے کنووں میں سب سے میٹھا پانی رکھتا تھا مسلمانوں کے لیے خرید کر وقف کر دیا تھا۔[۵۷] یہ امر قابلِ تصور اور قرینِ قیاس ہے کہ دوسرے مالدار اور مخیر مسلمانوں نے اس قسم کی جائدادوں کو عوامی ضرورت کے لیے ضرور وقف کیا تھا۔

(ب) اموالِ غنیمت : نقد و جنس

مہموں اور غزوات کے نتیجے میں ملنے والی غنیمت پر بہت زور دیا گیا ہے مگر ابھی تک مدنی مسلمانوں کی معیشت میں اس کے تناسب کا مکمل تجزیہ نہیں کیا گیا تھا۔ بہرحال اس کا سردست ہم سے تعلق نہیں تاہم بالواسطہ تعلق یوں ہے کہ وہ کسی نہ کسی حد تک مسلم اقتصادی خوشحالی کا سبب بنی تھی جس سے مسلمانوں کو عطیات اور صدقات دینے کی صلاحیت ملی تھی اس لیے اس کا ایک تجزیہ ضروری ہے۔ مزید یہ کہ اس غنیمت کا خمس (۱/۵) اسلامی ریاست کا ایک اہم ذریعہ آمدنی تھا۔ اس کی تعیین و تشخیص و تخمینہ اس تجزیہ کے بغیر ناممکن ہے۔ تیسرے باب میں ہم مسلم ذخیرۂ حربی کے افزوں ارتقاء کے ضمن میں مہمات میں حاصل شدہ اسلحوں اور شہسوار فوج کے ارتقاء کے ضمن میں گھوڑوں کا جائزہ لے چکے ہیں جسے دُہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں ہم دوسرے سامان اور نقد کا جائزہ لیں گے جو مختلف غزوات، سرایا اور مہموں کے نتیجے میں مسلمانوں کو ملا تھا۔

یہ حقیقت اب روشن ہو چکی ہے کہ بدر سے قبل کی تمام ابتدائی مہموں میں سوائے سریہ نخلہ کے مسلمانوں کو کوئی مالِ غنیمت نہیں ملا تھا۔ سریہ نخلہ میں مسلمانوں کو جس قریشی کارواں کی صورت میں جو مالِ غنیمت ملا تھا وہ شراب کے مشکیزوں، کھالوں (ادم) خشک کھجوروں (زبیب) اور بعض سامانِ تجارت کے علاوہ دو قیدیوں پر مشتمل تھا۔[۵۸] ان میں سے ایک قیدی مسلمان ہو گیا تھا،[۵۹] اس لیے بلا زرِ فدیہ رہا کر دیا گیا تھا جبکہ دوسرے قیدی نے چالیس اوقیہ چاندی (سولہ سو درہم) ادا کر کے رہائی پائی تھی۔[۶۰] اسلامی ریاست کو اس مالِ غنیمت میں سے خمس ملا تھا۔ سرایا کی مانند ابتدائی غزوات میں بھی کوئی مالِ غنیمت نہیں ملا تھا ــــ غزوۂ بدر پہلا تھا جس میں مسلمانوں کو کافی مالِ غنیمت ملا تھا۔ ہتھیاروں اور گھوڑوں کے سوا مسلمانوں کو خاصا مالِ غنیمت حاصل ہوا تھا جو اسبابِ روزمرہ (متاع) چرمی چٹائیوں (انطاع) کپڑوں (ثیاب) اور کھالوں (ادم) پر مشتمل تھا۔ موخرالذکر کافی تعداد میں تھیں کیونکہ وہ تجارت کی غرض سے ساتھ لائی گئی تھیں۔ ان کے علاوہ ایک سو پچاس اونٹ بھی ملے تھے۔[۶۱] رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس مال میں سے خمس[۶۲] کے علاوہ صفی بھی ملی تھی۔[۶۳] جبکہ مسلم سپاہ میں سے کچھ کو ایک اونٹ اور کچھ سامان (رِثّہ) اور کچھ کو دو اونٹ حصہ میں ملے تھے جبکہ باقی سپاہیوں کو صرف کھالیں ملی تھیں۔[۶۴] کل تین سو سترہ حصے لگے تھے، ۳۱۳ حصے مسلم سپاہیوں کے اور چار حصے دو گھوڑوں کے لیے۔ واقدی کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان مجاہدین کی توقع سے مالِ غنیمت کافی کم تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مالِ غنیمت قیمت و کمیت کے لحاظ سے بھی کافی کم تھا۔[۶۵]

بہرحال اسیرانِ بدر سے مسلمانوں کو زرِ فدیہ کی شکل میں خاصی خطیر رقم ملی تھی۔ اس ذریعہ آمدنی کا مفصل تجزیہ دلچسپی کا سبب ہوگا۔ ابنِ اسحاق، ابنِ ہشام، واقدی، بلاذری اور طبری کے بیانات کا ایک جامع تجزیہ بتاتا ہے کہ بیس قیدیوں نے پچھتر ہزار

درہم کی رقم مجموعی طور سے ادا کی تھی ، اٹھارہ قیدیوں نے فی کس چار ہزار درہم جبکہ باقی دو نے دو ہزار اور ایک ہزار درہم ادا کیے تھے۔ یہ اعداد و شماران اسیرانِ جنگ کے بارے میں ہیں جن کے سلسلہ میں مآخذ نے زرِفدیہ کی صراحت کی ہے۔ دس اور قیدیوں کے بارے میں ذکر آیا ہے کہ انہوں نے زرِفدیہ ادا کر کے رہائی پائی تھی۔ لیکن ان کے فدیہ کی رقم کی تعیین نہیں کی گئی ہے۔ اگر ان کے زرِفدیہ کو بھی گراں ترین شرح یعنی چار ہزار درہم فی کس[66] فرض کر لیا جائے تو ان کے زرفدیہ کی مجموعی رقم چالیس ہزار درہم اور مسلمانوں کو ملنے والی کل رقم ایک لاکھ پندرہ ہزار درہم ہوگی، جو خاصی بڑی رقم تھی۔ باقی اسیرانِ جنگ میں سے کچھ تو بلا فدیہ رہا کر دئے گئے تھے، کچھ جنگی جرائم کی پاداشں میں مقتول ہوئے تھے اور کچھ مسلمان ہو گئے تھے باقی کے بارے میں مآخذ خاموش ہیں۔

مشہور روایات کے مطابق اسیرانِ جنگِ بدر کی مجموعی تعداد ستر تھی۔ کچھ دُوسری روایات میں ان کی تعداد کچھ کم بیان کی گئی ہے۔ بہرحال جن قیدیوں کے نام بنام ذکر مآخذ میں ملتا ہے ان کی تعداد واقدی کے مطابق صرف ۴۹ ہے۔[67] بہرحال مآخذ سے یہ صراحت تو ہوتی ہے کہ زرفدیہ قیدی کو گرفتار کرنے والے مسلمان مجاہد کو ملتا تھا۔[68] لیکن اس کی وضاحت نہیں ہوتی کہ ریاست اسلامی کو اس میں سے خمس ملتا تھا یا نہیں۔ قیاس یہی کہتا ہے کہ خمس بھی نکالا جاتا تھا جیسا کہ بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے۔ اس صورت میں مسلم سپاہ کا ½ یا زیادہ سے زیادہ ¼ حصہ اوسط درجہ میں فدیہ کی رقم کے ذریعہ مالدار ہوا تھا۔ جبکہ بدر کے دُوسرے مجاہدین کو کافی کم مالِ غنیمت حاصل ہوا تھا۔ البتہ اسلامی ریاست کو اچھی خاصی رقم خمس کی صورت میں مل گئی تھی جو اس زمانۂ فقر میں کافی معاون ثابت ہوئی ہوگی۔

دوسری مہم جس میں مسلمانوں کو کچھ مالِ غنیمت ملا تھا مدینہ کے یہودی قبیلے بنو قینقاع کے خلاف غزوہ تھا۔ اس میں زیادہ تر غنیمت اسلحہ اور اوزاروں پر مشتمل تھی۔[69] یہ عجیب بات ہے کہ نہ تو مالِ غنیمت کی تقسیم کا ذکر ملتا ہے اور نہ خمس کا۔ صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفی کا ذکر ملتا ہے۔[70] مشہور روایات کے مطابق مسلمانوں کو یہودی جائدادوں اور اراضی پر بھی قبضہ مل گیا تھا لیکن برکات احمد کی تحقیق کے مطابق مالِ غنیمت صرف ہتھیاروں اور زیادہ سے زیادہ اوزاروں پر مشتمل رہا تھا۔[71] نقد و جنس، میں سے کچھ بھی ہاتھ نہیں لگا تھا۔ غزوۂ سویق میں مسلمانوں کو سویق (ستو) کی چند بوریاں ملی تھیں جو دو سو افراد پر مشتمل، مکی فوج بھاگتے وقت اپنے اونٹوں کے کجاووں کو ہلکا کرنے کی خاطر پھینکتی گئی تھی۔[72] کدر کی مہم میں ایک روایت کے مطابق، مالِ غنیمت پانچ سو اونٹوں (بعیر) پر مشتمل تھا جن میں سے خمس سو اونٹوں کا تھا جو اسلامی ریاست کی ملکیت میں آیا تھا۔ جبکہ بقایا چار سو اونٹ مسلمان مجاہدین میں تقسیم کر دیئے گئے تھے۔ دوسری روایت کے مطابق مالِ غنیمت کے اونٹوں کی تعداد سولہ سو اسی (۱۶۸۰) تھی کیونکہ ہر مجاہد کو سات اونٹ ملے تھے اور خمس کے اونٹوں کی تعداد صرف دو سو اسی (۲۸۰) تھی۔ لیکن مورخین کا اصرار ہے کہ پہلی روایت زیادہ صحیح ہے۔[73] بہرحال دونوں صورتوں میں ہم کو یقینی طور سے خمس اور مسلمان مجاہدین کے حصوں کے بارے میں علم ہوتا ہے۔

سریہ قردہ میں، جو حضرت زید بن حارثہ کی ماتحتی میں بھیجا گیا تھا اور جس نے ایک مکی کاروانِ تجارت پر کامیاب چھاپہ مارا تھا کافی مالِ غنیمت نقد ملا تھا۔ اس کی کل مالیت ایک لاکھ درہم تھی "کیونکہ خمس کی ہی مالیت بیس ہزار درہم تھی"۔[74] جنگِ اُحد میں،

مسلم مجاہدین کو فتح کے لمحات میں کافی مالِ غنیمت ہاتھ لگا تھا لیکن وہ سارے کا سارا عالمِ شکست میں کھو یا گیا۔ ممکن ہے کہ بعض مجاہدین کے ہاتھ میں کچھ باقی رہ گیا ہو لیکن اس کی مالیت ناقابلِ توجہ تھی۔ بہر حال مسلمانوں کے اس "ممکنہ مالِ غنیمت" سے اسلامی ریاست کو کچھ بھی خمس نہیں ملا تھا۔[۷۵] حضرت ابوسلمہ کے سریہ قطن میں جو ایک سو پچاس سپاہیوں پر مشتمل تھی فی کس سات اونٹ مالِ غنیمت میں ملے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کل غنیمت بارہ سو ساٹھ اونٹوں پر مشتمل تھی اور خمس ریاست میں دو سو دس اونٹ پڑے تھے۔ چونکہ صفی کا ذکر نہیں مل سکا اس لئے امکان ہے کہ کل غنیمت کے اونٹوں کی تعداد کچھ زیادہ رہی ہو۔ یہودی قبیلہ بنو نضیر کے خلاف فوجی کارروائی کے نتیجے میں نقد و جنس کی صورت میں ہتھیاروں کے سوا اور کوئی مالِ غنیمت نہیں ملا تھا۔[۷۶] ربیع الاول ۵ھ / اگست، ستمبر ۶۲۶ء میں دومۃ الجندل کی مہم کے دوران جو دراصل عرب رہزنوں کی لوٹ مار سے تجارتی کاروانوں کو بچانے کے لیے بھیجی گئی تھی مسلمانوں کو مویشیوں کی صورت میں کچھ غنیمت ملی تھی جس کی مالیت و مقدار کا اندازہ لگانا مشکل ہے کیونکہ مآخذ اس کے بارے میں بالکل خاموش ہیں۔[۷۷]

مریسیع کی مہم کے دوران بنو مصطلق سے مسلمانوں کو مویشیوں، قیدیوں اور شاید دوسرے اسباب اور نقد کی شکل میں خاصی غنیمت ملی تھی۔ اسلحہ اور سامان (رثہ و متاع) کے علاوہ جو ان کے کجاووں (رحال) میں پایا گیا تھا مالِ غنیمت دو ہزار اونٹوں (بعیر) اور پانچ ہزار بھیڑ بکریوں (شاۃ) پر مشتمل تھا۔ قیدیوں کی تعداد دو سو خاندانوں (رھط) پر مشتمل تھی۔ ان میں سے نصف قیدیوں کو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ان کے سردار کی دختر حضرت جویریہ بنت حارث خزاعی سے شادی کے سبب[۷۸] بلا زر فدیہ آزاد کر دیا گیا تھا جبکہ باقی کو ان کے اعزہ نے فدیہ ادا کر کے رہا کرا لیا تھا۔[۷۹] ایک عورت اور اس کے بچوں پر مشتمل خاندان کے بارے میں ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ان کا فدیہ چھ فرائض (اونٹ) تھے۔[۸۰] خود حضرت جویریہ کا معاملہ بڑا دلچسپ ہے۔ ان کی شادی سے قبل وہ قیدی کے بطور دو صحابیوں حضرت ثابت بن قیس اور ان کے عم زاد بھائی کے حصہ میں مشترکہ طور سے آئی تھیں۔ حضرت ثابت نے اپنے عم زاد کا حصہ مدینہ میں واقع ایک چھوٹے سے کھجوروں کے باغ (نخلہ) کے عوض خرید لیا تھا۔ بعد میں حضرت جویریہ نے حضرت ثابت کو ۹ اوقیہ سونے (تقریباً چار ہزار درہم) کے عوض اپنی رہائی کے لیے راضی کر لیا تھا۔ اسی رقمِ مکاتبت کا سوال لے کر وہ درِ نبویؐ پر پہنچی تھیں اور نبی رحمت نے ان کی مطلوبہ رقم ادا کر کے ان سے نکاح کر لیا تھا۔[۸۱] مویشیوں کو مسلمانوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا اور پورے مالِ غنیمت کا خمس اور اپنی صفی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے قبل وصول کر لی تھی۔[۸۲]

مدینہ منورہ کے آخری دشمن یہودی قبیلہ کے خلاف مہم میں مسلمانوں کو مشہور روایات کے مطابق ہتھیاروں کے علاوہ کافی مقدار میں اسباب (اثاث)، برتن (آنیہ)، کپڑے (ثیاب) اور کافی تعداد میں عمدہ اونٹ اور مویشی ملے تھے۔ مسلمانوں کے حصوں کے نکالنے کے بعد ریاست کو اس کا خمس ملا تھا۔ اگرچہ کافی بڑی تعداد میں شراب کے مٹکے بھی ملے تھے لیکن وہ توڑ دیے گئے تھے اور شراب بہا دی گئی تھی۔[۸۳] عورتوں اور بچوں پر مشتمل یہودی قیدیوں کو مختلف بازاروں میں بیچ دیا گیا تھا اور اس سے حاصل شدہ رقم کو گھوڑوں اور اسلحوں کی خرید پر صرف کیا گیا تھا۔[۸۴] لیکن بنو قریظہ کے تمام قیدیوں کو جن کی تعداد ایک ہزار کے قریب بتائی جاتی ہے فروخت نہیں کیا گیا تھا۔ ان میں سے بہت سوں کو بلا شرط رہا کر دیا گیا تھا اور ان کی جائداد منقولہ اور غیر منقولہ ان کو واپس کر دی گئی تھی۔ دلچسپ بات ہے کہ ایسا بعض مسلمانوں جیسے حضرت ثابت بن قیس[۸۵] اور حضرت ام منذر[۸۶] وغیرہ کے

مشورہ اور سفارش پر کیا گیا تھا۔ اسی طرح خمس کے حصہ میں پڑنے والے قیدیوں کو بھی بلا شرط رہا کر دیا گیا تھا۔ حضرت محمد بن مسلمہ اوسی کے سند پر مروی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک شہسوار مجاہد کا حصہ ۵۴ دینار تھا۔[۸۷] اس رقم میں ان کا سامان، نقد، غلام اور اراضی سب کا حصہ شامل تھا۔ گویا کہ یہ کل معیاری حصہ تھا۔[۸۸] اس شرح کے مطابق حساب لگانے سے معلوم ہوتا ہے کہ کل غنیمت کی مالیت تقریباً ۵۷،۶۰۰ دینار ہوتی ہے جو تین ہزار مجاہدین اور ۳۶ گھوڑوں کے حصوں کے شمول تھی۔ اس میں خمس بھی شامل تھا۔ بہرحال کل غنیمت کی مالیت کسی طور ساٹھ ہزار دینار سے زیادہ نہ تھی۔

ہجرت کا چھٹا برس (جون ۶۲۷ء تا مئی ۶۲۸ء) سرایا کا سال تھا۔ جہاں تک غنائم کا تعلق ہے اس برس کے ۲۱ غزوات و سرایا میں سے صرف سات سرایا میں تھوڑی بہت غنیمت ملی تھی۔ محرم میں حضرت محمد بن مسلمہ کی مہم قرطاء کے نتیجہ میں ایک سو پچاس اونٹ اور تین ہزار بھیڑ بکریاں حاصل ہوئی تھیں۔[۸۹] تین ماہ بعد حضرت عکاشہ بن محصن کے سریہ غمر کے دوران مالِ غنیمت صرف دو سو اونٹوں پر مشتمل تھا۔[۹۰] جبکہ حضرت ابو عبیدہ کے سریہ ذو القصہ کے نتیجہ میں کچھ مویشی اور مال ملا تھا جس کی مقدار و تعداد کی مآخذ میں صراحت نہیں کی گئی ہے۔[۹۱] البتہ حضرت زید بن حارثہ کی مہم العیص کے نتیجے میں مسلمانوں کو قریشی کاروان سے کافی مقدار میں خام چاندی اور کچھ اور اسباب تجارت کے علاوہ دو قیدی بھی ملے تھے لیکن ان میں حضرت ابو العاص بن ربیع کو جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بڑے داماد تھے۔ ان کی اہلیہ کی سفارش پر مع ان کے سامان کے رہا کر دیا گیا تھا۔[۹۲] غالباً دوسرے قیدی نے زرِ فدیہ ادا کر کے رہائی پائی تھی اور یہی کل غنیمت اس مہم کی تھی۔ اس کے دوسرے ماہ میں حضرت زید نے اپنے سریہ طرف میں بیس اونٹ اور تقریباً ایک سو ستر بھیڑ بکریاں حاصل کی تھیں[۹۳] جبکہ ایک اور سریہ میں جو حسمی کے علاقے میں گیا تھا انھوں نے تمام حاصل شدہ کثیر مالِ غنیمت واپس کر دیا تھا۔[۹۴] اس کے بعد حضرت علی کی مہم فدک میں پانچ سو اونٹوں اور دو ہزار بھیڑ بکریوں پر مشتمل غنیمت ملی تھی۔[۹۵] اس برس کی آخری مہم میں حضرت زید کو بنو فزارہ کی ایک باندی ام قرفہ حاصل ہوئی تھی جس کی ایک مسلمان سے شادی کر دی گئی تھی۔[۹۶]

ہجرت کے ساتویں برس کی اولین مہم غزوۂ خیبر تھا جس میں مسلمانوں کو کافی غنائم ملے تھے اور جو اموال منقولہ اور غیر منقولہ دونوں پر مشتمل تھے۔ اسلحہ کے علاوہ اموالِ غنیمت ہر طرح کے کھانے کی اشیاء (طعام) گھریلو اسباب (اثاث) سونے چاندی وغیرہ دھات کے برتنوں (اوانی) کپڑوں خاص کر اعلیٰ سوتی اور ریشمی چادروں (بزو قطائف) کے علاوہ مویشیوں (گائے، بکری، اونٹ وغیرہ) چمڑے کی چٹائیوں، زیورات اور خزانوں پر مشتمل تھے۔ کھانے کی اشیاء، چمڑے کی کھالوں اور چارہ (علف) کو تقسیم نہیں کیا گیا بلکہ اجتماعی ضرورت کے لیے عام کر دیا گیا تھا جس کو جتنی ضرورت ہوتی وہ آ کر لے لیتا تھا۔[۹۷] بعد میں مالِ غنیمت کو اسلامی قانون کے مطابق تقسیم کیا گیا تھا۔ پورے مالِ غنیمت کی مالیت کا صحیح تخمینہ لگانا مشکل ہے تاہم کچھ اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ یہودی محصورین نے اپنے دس ہزار سپاہیوں سمیت کل یہودی آبادی کے لیے سال بھر کا سامان رسد جمع کر لیا تھا۔ بہرحال واقدی کے ایک حوالہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مسلم شہسوار کا حصۂ غنیمت ۱۱½ دینار تھا جبکہ پیادہ کو اس کا ایک تہائی یا نصف ملا تھا۔[۹۸] اس بنیاد پر کل مالیت صرف ۹،۵۰۰ دینار یا زیادہ سے زیادہ پندرہ ہزار دینار تھی جو خاصی کم تھی۔ بہرحال اس سے زیادہ قیمتی اموال یا جائدادوں پر مشتمل اراضی تھی جس پر بحث ہم کچھ دیر بعد کریں گے۔ فدک سے حاصل شدہ غنیمت بھی زمین پر مشتمل تھی۔[۹۹] وادی القریٰ کی مہم میں البتہ مسلمانوں کو کچھ سامان (اثاث، متاع) پر مشتمل غنیمت

ملی تھی لیکن اس کی صراحت نہیں کی گئی ہے۔(۱۰۰) وادی القریٰ اور تیماء کے یہودیوں نے بھی اپنی پیداوار کے نصف پر صلح کر لی تھی اگرچہ تیماء کے ضمن میں لفظ جزیہ ذکر کیا گیا ہے۔(۱۰۱)

اس برس کی دُوسری مہموں میں حضرت ابو بکر کے سریہ نجد میں معمولی سا مالِ غنیمت ملا تھا۔(۱۰۲) حضرت غالب بن عبداللہ لیثی کے سریہ فدک کے نتیجے میں جو حضرت بشیر بن سعد خزرجی کے سریہ پر حملہ کا انتقام لینے کے لیے ترتیب دیا گیا تھا مسلمانوں کو مویشیوں کی شکل میں خاصا مالِ غنیمت ہاتھ لگا تھا۔ روایت کے مطابق اس فوج کے دو سو مجاہدین میں سے ہر شخص کو ۷ اُونٹ یا اس کے مساوی بھیڑ بکری ملے تھے۔ گویا کہ کل مالِ غنیمت بشمول خمسِ رسول سترہ سو پچاس اونٹوں پر مشتمل تھا۔ حضرات غالب بن عبداللہ اور بشیر بن سعد کی باقی دو مہموں میں جو بالترتیب مَیفعہ اور جِناب کے علاقوں میں بھیجی گئی تھیں کافی مالِ غنیمت مویشیوں میں ملا تھا لیکن اس کی صحیح مالیت کا اندازہ لگانا مشکل ہے کیونکہ مآخذ میں اس کا کوئی قرینہ نہیں ملتا۔(۱۰۳)

۸ھ / ۶۳۰-۶۲۹ء میں تقریباً بیس مہمیں پیش آئیں۔ صفر / جون میں حضرت غالب بن عبداللہ کی مہم کدید میں قیدیوں اور مویشیوں پر مشتمل تھوڑا سا مالِ غنیمت ملا تھا۔(۱۰۴) دُوسرے ماہ حضرت شجاع بن وہب کے سریہ سی نے روایت کے مطابق اتنے مویشی مالِ غنیمت کے بطور حاصل کیے تھے کہ ۲۴ مجاہدین پر مشتمل مسلم دستہ کو فی کس ۱۵ اُونٹ حصہ میں پڑے تھے یا ان کے مساوی بھیڑ بکری ملے تھے (ایک اونٹ کے عوض دس بھیڑ بکریوں کی شرح تبادلہ معیاری سمجھی جاتی تھی)(۱۰۵) جنگِ موتہ اگرچہ کسی طور فتح کا عنوان نہ تھی تاہم بعض مجاہدین کو دشمنوں سے غنیمت حاصل کرنے میں کامیابی ملی تھی۔ غالباً یہ سلب کے بطور حاصل ہوئی تھی۔ اب تک معلوم شہادتوں کے مطابق ایک مجاہد کو ایک انگوٹھی اور دوسرے مجاہد کو ایک ہیرا (یاقوتہ) ملا تھا جو ایک دشمن سپاہی کے خَود میں جڑا ہوا تھا اور جس کی قیمت عہدِ فاروقی میں سَو دینا یا ہزار بارہ سو درہم آنکی گئی تھی۔(۱۰۶) حضرت عمرو بن عاص کی مہم ذات السلاسل میں کچھ بھی مالِ غنیمت نہیں ملا تھا سوائے ان گنتی کے بھیڑ بکریوں اور اونٹوں کے جو مسلم فوج کی لذتِ کام و دہن کے کام آئے تھے۔(۱۰۷) حضرت ابو قتادہ بن ربعی کی مہم خَضِرہ کے نتیجے میں جو مالِ غنیمت ملا تھا دو سو اونٹوں اور ایک ہزار بھیڑ بکریوں پر مشتمل ہونے کے علاوہ کافی تعداد میں جنگی قیدیوں پر بھی مشتمل تھا مگر ان کی تعداد کا کوئی ذکر نہیں مل سکا ہے۔(۱۰۸) لیکن اس برس کے سب سے زیادہ مالیت کے غنائم غزوہ حُنین میں حاصل ہوئے تھے۔ ان میں چھ ہزار جنگی قیدی، چوبیس ہزار اونٹ، چالیس ہزار سے زیادہ بھیڑ بکریاں (شاۃ) اور چار ہزار اوقیہ چاندی تھی۔ اموالِ غنیمت کی تقسیم اور عرضِ سپاہ کے افسر حضرت زید بن ثابت کے مطابق ہر پیادہ سپاہی کو چار اونٹ یا چالیس بھیڑ بکریاں حصہ میں پڑی تھیں جبکہ ہر شہسوار مجاہد کا حصہ اس کا تین گنا تھا۔(۱۰۹) ظاہر ہے کہ کچھ کے حصّے میں چاندی یا دوسری اشیائے غنیمت (اگر کچھ تھیں) ملی تھیں جو مالیت میں اپنے اپنے طبقہ کے مجاہدین کے حصّہ کے مساوی تھیں۔ جیسا کہ معلوم و معروف ہے تمام جنگی قیدیوں کو ہوازن کے مسلم اور غالباً غیر مسلم سرداروں کی دردمندانہ درخواستوں پر بلا شرط رہا کر دیا گیا تھا۔(۱۱۰)

اگلے برس یعنی ۹ھ / ۶۳۱-۶۳۰ء کی کل نو مہموں میں ایک دو کے سوا سب میں مالِ غنیمت کم یا بیش مسلمان مجاہدین کے ہاتھ لگا تھا۔ تمیم کے خاندان بنو العنبار کے خلاف حضرت عُیینہ بن حصن فزاری کی تعزیری مہم کے نتیجہ میں کچھ قیدی پکڑے گئے تھے اور

امکان ہے کہ کچھ سامان بھی ملا ہو لیکن اس کا صریحی ذکر مآخذ میں نہیں ملتا ہے۔ بہرحال کچھ قیدیوں کو از راہِ ترحم رہا کر دیا گیا تھا جبکہ بعض دوسروں نے فدیہ ادا کر کے رہائی پائی تھی۔(۱۱۱) دوسرے مہینے قبیلہ خثعم کے ایک خاندان کے خلاف تعزیری مہم کے دوران حضرت قطبہ بن عامر کے ۲۰ مجاہدوں پر مشتمل دستے میں سے فی کس چار اونٹ یا اس کے مساوی بھیڑ بکریوں پر مشتمل مالِ غنیمت ملا تھا۔ اس سے قبل اس کا خمس نکال لیا گیا تھا۔(۱۱۲) اس برس کی پانچویں مہم حضرت علی بن ابی طالب کا سریہ فلس تھا جس میں مسلمانوں کو کافی تعداد میں مویشی، قیدی اور کچھ ہتھیار ملے تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ ہتھیار قبیلہ طے کے صنم کدہ میں ملے تھے۔ اگرچہ خمس کے نکالنے اور صفی کے علیحدہ کرنے کا ذکر مآخذ میں ملتا ہے مگر ان کی تعداد یا مقدار یا مالیت کا کوئی حوالہ نہیں ملتا ہے۔(۱۱۳) غزوۂ تبوک کے دوران حضرت خالد بن ولید مخزومی دومۃ الجندل کی مملکت کے خلاف ایک مہم لے کر گئے تھے۔ اس کے عیسائی حکمران اُکیدر بن عبد الملک کندی نے حضرت خالد کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد ایک معاہدۂ صلح کیا تھا جس کی رُو سے اس نے دو ہزار اونٹ، آٹھ سو گھوڑے (راس)، چار سو ڈھالیں اور زرہ بکتر اور اتنے ہی نیزے ادا کیے تھے۔ بعد میں اکیدر نے خدمتِ نبوی میں حاضر ہو کر مستقل سالانہ جزیہ ادا کرنے کا وعدہ کیا تھا۔(۱۱۴) حضرت خالد بن ولید کو جو "اموال" اکیدر نے ادا کئے تھے وہ تکنیکی لحاظ سے مالِ غنیمت میں نہیں آتے کیونکہ وہ صلح کے ایک معاہدہ کے نتیجے میں اسلامی ریاست کی سیاسی بالا دستی کو قبول کرنے کی ایک علامت کے طور پر دئے گئے تھے۔

ہجرت کے دسویں برس یعنی ۱۰ھ/۶۳۱-۳۲ء میں صرف ایک مہم یعنی سریہ علی جانب یمن میں کچھ مال ملا تھا جو قیدیوں، مویشیوں اور کپڑوں پر مشتمل تھا۔ اس کا خمس یمنی کپڑوں اور مویشیوں پر مشتمل تھا۔ حضرت علی اس موقع پر مذحج وغیرہ کے مسلمانوں کے صدقات بھی اپنے ساتھ لائے تھے۔(۱۱۵)

عہدِ نبوی کی کل یہی مہمیں تھیں جن میں مسلمانوں کو مذکورہ بالا مالِ غنیمت ملا تھا۔ اس بحث کو ہم نے نقد و جنس پر مشتمل مالِ غنیمت تک محدود رکھا ہے۔ اگر ان تمام مہموں کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ تمام غزوات و سرایا میں سے صرف ایک تہائی سے کچھ زیادہ میں مالِ غنیمت دستیاب ہوا تھا اور اکثر مہموں میں وہ کافی حقیر تھا تاہم یہ حقیقت ہے کہ اموالِ غنیمت نے عام مسلمان مجاہدین کو اور ان کے ذریعہ مسلم اُمت کے مختلف طبقات کو کسی نہ کسی حد تک "مالدار" بنایا تھا جبکہ خمس اور صفی نے اسلامی ریاست کی ضروریات کی کفالت کی تھی۔ لیکن یہ "مالداری" اور "کفالت" کتنی تھی اس پر کہیں اور مفصل بحث کی جا چکی ہے اور وہ سردست ہمارے موضوع سے باہر ہے۔ لیکن نقد و جنس میں حاصل شدہ اموالِ غنیمت مسلم معیشت اور اسلامی ریاست کے لیے اتنے اہم نہ تھے جتنے کہ جائدادوں اور اراضی پر مشتمل اموالِ غنیمت جن کو کبھی کبھی اصطلاح میں "فے" کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ اگرچہ فے اموالِ غنیمت میں حاصل ہونے والی جائدادوں کی ایک مخصوص شکل کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ بہرحال فی الحال ہماری اس سے کوئی بحث نہیں۔ ذیل میں ہم اموالِ غنیمت میں یا مہموں کے نتیجے میں حاصل ہونے والی اراضی سے بحث کر رہے ہیں کہ وہ مسلم معیشت کے لیے زیادہ مفید تھی۔

(ج) اموالِ غنیمت: جائداد مشتمل بہ اراضی

اگر محمد بن حبیب بغدادی کی روایت صحیح ہے تو پہلی اراضی (اموال) جو بطور مالِ غنیمت مسلمانوں کو حاصل ہوئی ہوگی وہ مدینہ سے جلاوطن کیے جانے والے پہلے یہودی قبیلہ/ خاندان بنوقطیون کی تھی۔[۱۱۶] مگر اس روایت کے سلسلے میں کئی اشکال ہیں:

اوّل یہ کہ بغدادی نے ان کے اخراج کا تو ذکر کیا ہے مگر دوسری تمام تفصیلات سے گریز کیا ہے۔ دوم یہ کہ ان کی جائداد رہائشی تھی یا پیداواری یا دونوں، یہ کہنا مشکل ہے کیونکہ ہم کو بنوقطیون کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ہیں۔ اسی طرح بنوقینقاع کا معاملہ ہے۔ اگر مشہور روایات صحیح ہیں تو ان کے مدینہ سے جلاوطنی کے بعد ان کی جائدادیں ——— بازار، دکانیں، مکانات ——— مسلمانوں یا اسلامی ریاست کی ملکیت میں آگئی تھیں لیکن اگر حمید اللہ کی رائے اور برکات احمد کی مدلل بحث صحیح ہے تو ان کو ان کی جائدادوں اور اراضی پر بحال رکھا گیا تھا۔[۱۱۷] بہرحال ماخذ کا یہ بیان ہے کہ ان کا بازار مدینہ کا سب سے بڑا تجارتی مرکز تھا[۱۱۸] جہاں ان کی مسقف و پختہ دکانیں تھیں۔[۱۱۹] وہ اپنے رہائشی مکانات گڑھیوں (آطام) میں بناتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کی زرعی جائدادیں یعنی باغات و کھیت وغیرہ نہیں تھے[۱۲۰] کیونکہ وہ تجارت پیشہ اور دستکار تھے۔[۱۲۱] ان کی جائدادوں کی مالیت کا اندازہ مشکل ہے مگر محال نہیں۔ روایات کے مطابق ان کے بالغ و جنگ کے قابل مردوں کی تعداد سات سو افراد پر مشتمل تھی[۱۲۲] اور ان کی کل آبادی انھیں کے خاندانوں کی تھی جو ہمارے اندازے کے مطابق تقریباً چار پانچ ہزار افراد کے درمیان تھی۔ اسی سے ان کی جائدادوں کی مالیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

بہرحال حتمی طور پر جو جائداد و اراضی ——— رہائشی و پیداواری دونوں ——— پہلی بار مسلمانوں کے قبضۂ تصرف میں بطور مالِ غنیمت آئی تھی وہ مدینہ کے مالدار یہودی قبیلہ بنونضیر کی تھی جن کو معاہدہ توڑنے اور فساد فی الارض پھیلانے کے جرم میں مدینہ سے جلاوطن کردیا گیا تھا۔ ان کی اراضی و جائداد (اموال) ان کے رہائشی مکانات جو گڑھیوں اور قلعوں (آطام) میں واقع تھے کے علاوہ باغات اور کھیتوں پر مشتمل تھی کیونکہ وہ زراعت پیشہ تھے۔[۱۲۳] واقدی اور دوسرے متعدد مستند مصنفین کا بیان ہے کہ ان کے اموال میں کھجور کے باغات میں ہی اناج و سبزی وغیرہ کے کھیت ہوتے تھے جہاں خاصی بڑی مقدار میں (زرع کثیر) ہوتی تھی۔[۱۲۴] بنونضیر کا قبیلہ کم و بیش بنوقینقاع کی مانند یا اس سے بھی بڑا تھا لیکن ان کی جائداوں کی مالیت کا صحیح تخمینہ کافی مشکل ہے۔ بہرحال کچھ اندازہ بعض قرینوں سے ہوتا ہے۔ روایت ہے کہ اموالِ بنی نضیر کو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غریب مہاجرین اور دو انصاریوں حضرات سہل بن حُنیف اور ابودجانہ کے درمیان تقسیم کردیا تھا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ کتنے مہاجرین کو اس سے فیض پہنچا تھا کیونکہ ماخذ اس نکتہ پر خاموش ہیں۔ بہرحال اس زرعی اراضی کی پیداواری صلاحیت کے بارے میں بعض بڑی دلچسپ روایات ملتی ہیں جن کا مطالعہ ہمارے لیے مفید ہوگا۔ واقدی اور ابنِ سعد وغیرہ نے حضرت عمر بن خطاب کی سند پر روایت بیان کی ہے کہ اموال بنی نضیر، فدک اور خیبر کے بعض اراضی رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفی/ صفایا میں شامل تھی[۱۲۵] جس کو تکنیکی لحاظ سے فقہ میں فے بھی کہا جاتا ہے۔[۱۲۶] بہرحال وہ مسلمانوں میں تقسیم کی گئی ہو یا اسلامی ریاست کی ملکیت میں بطور فے رہی ہو یہ حتمی و ناقابلِ تردید

امر ہے کہ اس سے تمام اُمتِ مسلمہ یعنی مسلمانانِ مدینہ فیض یاب ہُوئے تھے۔ روایات کے مطابق رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سال بھر اموال بنی نضیر اور عطایائے حضرت مخیریق نضری کی پیداوار میں سے صدقات تقسیم کیا کرتے تھے۔(۱۲۷) ان کے علاوہ آپ اپنے خاندان بنی عبدالمطلب کے متعدد افراد اور اپنی تمام ازواجِ مطہرات کو بھی انھیں جائدادوں سے اتنی پیداوار جو کھجور اور جَو پر عموماً مشتمل ہوتی تھی عطا فرمایا کرتے تھے جو ان کی ضروریات کے لیے سال بھر کافی ہوتی تھی۔ اور اس سے جو کچھ بچ رہتا تھا اس کو اسلحوں اور گھوڑوں کی خریداری پر خرچ کیا کرتے تھے۔(۱۲۸) روایات کے مطابق آپ کے غلام حضرت ابو رافع اموالِ بنی نضیر کے مہتمم و نگراں افسر تھے جو اس کے باغوں اور کھیتوں میں پیدا ہونے والی کھجور، اناج اور سبزیوں کی پہلی کھیپ (اُثبکرہ) آپ کی خدمت میں پیش کیا کرتے تھے۔(۱۲۹)

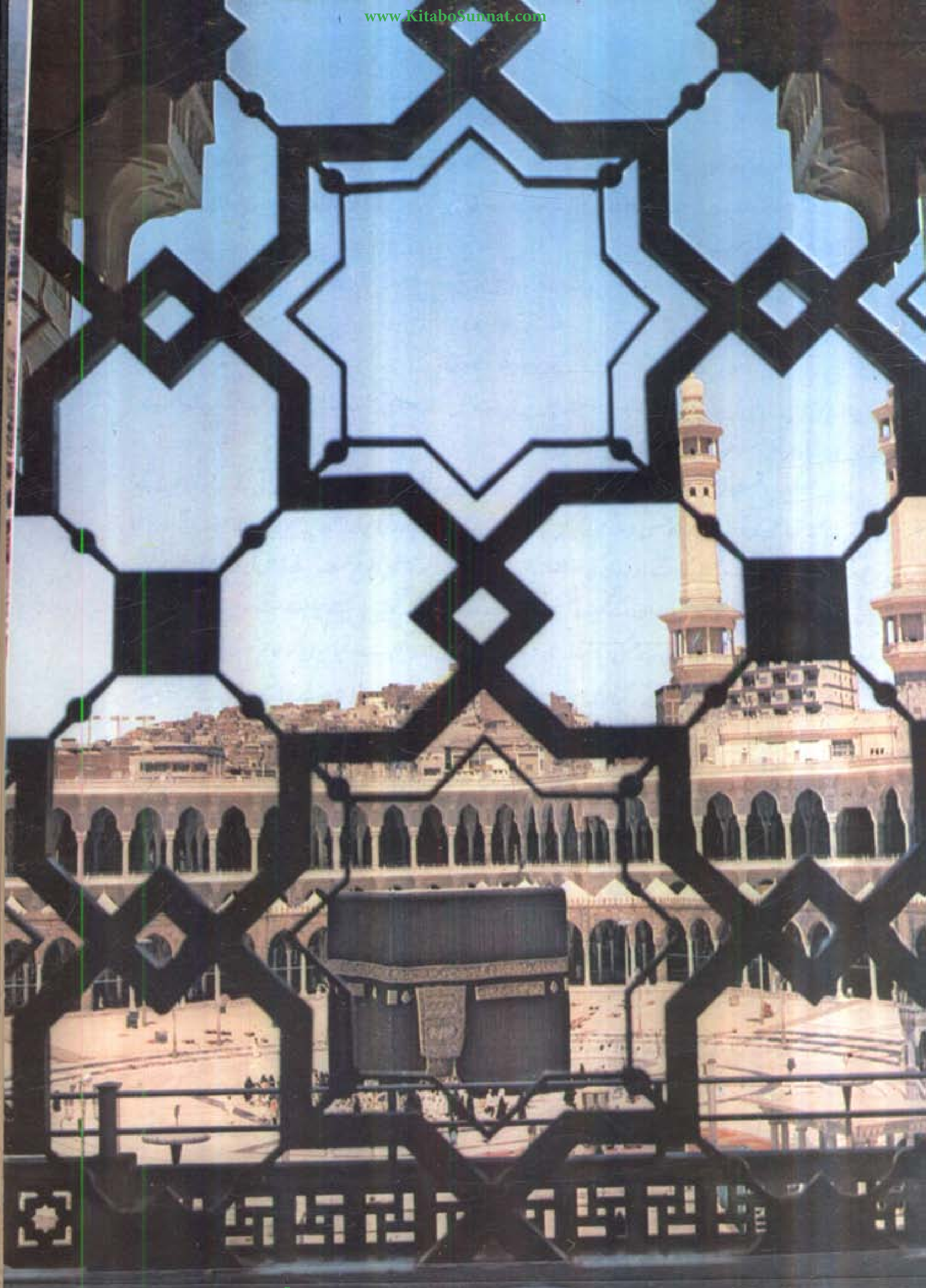
اموالِ بنی نضیر کی مالیت کا مزید اندازہ ان کی بعض جائدادوں کے تذکرہ سے بھی ہوتا ہے جو مسلم مجاہدین یا ارکینِ امت کو ملی تھی۔ یحییٰ بن آدم کا بیان ہے کہ سات باغوں (حوائط) کے علاوہ تمام اموالِ بنی نضیر کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں میں تقسیم کر دیا تھا۔(۱۳۰) واضح رہے کہ یہ سات باغ جو صفیِ رسول یا فے کے ضمرہ میں تھے ان باغات و کھیتوں کے علاوہ تھے جو بنو نضیر کے ایک مالدار مسلم حضرت مخیریق نے آپ کو ہبہ کیے تھے۔ واقدی نے اموالِ بنی نضیر کے بعض عطایائے نبوی کا ذکر بطورِ خاص کیا ہے۔ چنانچہ اس کے مطابق حضرت ابوبکر صدیق کو بئر حجر ملا تھا جبکہ حضرت عمر فاروق کے حصے میں بئر جرم آیا تھا۔ یہ دلچسپ بات ہے کہ دونوں بزرگوں کو دو کنوؤں کا عطیہ ملا تھا۔ یہ ممکن ہے کہ ان کنوؤں کے ساتھ ان دونوں سابقین اولین کو ان کی ملحقہ اراضی بھی ملی ہو کیونکہ عرب میں اراضی عام طور سے اپنے علاقے میں واقع کنوؤں کے نام سے بھی موسوم ہو جاتی تھی۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف زہری کو "سُعالہ" نامی جائداد ملی تھی جو بعد میں "مال سُلیم" کے نام سے مشہور ہوئی تھی۔ حضرت صہیب بن سنان نمری کو "الضرطہ" نامی جائداد بلا شرکتِ غیرے عطا ہوئی تھی جبکہ حضرات زبیر بن عوام اور ابو سلمہ بن عبدالاسد کو "البویلہ" نامی جائداد مشترکہ طور پر ملی تھی حضرات ابو دجانہ اور سہل بن حُنَیف کو بھی مشترکہ جائداد ملی تھی جو عام طور سے "مال ابن خرشہ" کے نام سے مشہور تھی۔(۱۳۱) واقدی کا بیان ہے کہ ان کے زمانے تک یہ تمام جائدادیں معلوم و معروف تھیں۔ لیکن بعد کے زمانے میں ان پہ وقت کی گرد جم گئی اور وہ تاریخ کی بھول بھلیوں میں گم ہو گئیں۔ ابنِ سعد نے اپنے استاد کی روایت پر یہ اضافہ کیا ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کو اموال بنی نضیر سے "کیدمہ" نامی ایک جائداد ملی تھی جو بعد میں انہوں نے خلیفۂ وقت حضرت عثمان کے ہاتھوں چالیس ہزار دینار میں فروخت کر دی تھی۔(۱۳۲)

مدینہ کے چوتھے یہودی قبیلہ بنو قریظہ سے جو جائداد مسلمانوں کو ملی تھی اس کے بارے میں ہماری معلومات بہت ہی ناقص ہیں اور سوائے اس کے کہ وہ "آطام" میں رہتے تھے اور کھجوروں کے باغات اور اناج و سبزی کے کھیتوں کے مالک تھے،(۱۳۳) ہم بہت کم جانتے ہیں۔ یحییٰ بن آدم کی کتاب الخراج میں ایک وادیٔ مہزور کے بارے میں حوالہ ملتا ہے کہ وہ حرّہ (لاوا کے علاقے) میں واقع تھی جہاں اناج کے بڑے بڑے کھیت اور باغات تھے۔(۱۳۴) قاضی ابو یوسف کا بیان ہے کہ بنو قریظہ کی اراضی مسلم مجاہدین میں نہیں تقسیم کی گئی تھی جبکہ واقدی اس کی تقسیم کے قائل ہیں۔(۱۳۵) قاضی موصوف کے مطابق وہ فے تھی، اور اسلامی ریاست کی ملکیت تھی جبکہ واقدی نے کہا کہ وہ مالِ غنیمت کی مانند پانچ حصوں میں تقسیم کی گئی تھی اور صرف خمس اسلامی،

ریاست کو ملا تھا اور چار حصّے مسلم مجاہدین میں تقسیم کر دئے گئے تھے۔ پیادوں سے شہسواروں کو دوگنا حصّہ ملا تھا۔ واقدی کے مطابق بنو عبد الاشہل، بنو ظفر، بنو حارثہ اور بنو معاویہ کے انصاری خاندانوں کو (جن کو عام طور سے بنو نابت کہا جاتا ہے) ایک خاص اراضی سے حصّہ ملا تھا جبکہ بنو عمرو بن عوف اور بقیہ دُوسرے اوسی خاندانوں کو دوسرا حصّہ ملا تھا۔ اسی طرح خزرج کے خاندان بنو نجار، بنو مازن، بنو مالک، بنو دینار اور بنو عدی کو ایک جائداد میں حصّہ دار بنایا گیا تھا تو بنو سلمہ، بنو زریق اور بنو حارث کو دوسرے میں۔[۱۳۶] دل چسپ بات ہے کہ اموالِ بنی قریظہ میں سے کسی کا نام نہیں مذکور رہا ہے سوائے وادی مہروز کے جس کا ایک کافی وسیع حصہ حضرت زبیر بن عوام اسدی کو اور ان کے ایک گمنام پڑوسی کو جن کا تعلق انصار کے خاندان بنی امیہ سے تھا عطا کیا گیا تھا۔[۱۳۷] پہلے کسی باب میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ بعض قُرظی خاندانوں اور افراد کو نہ صرف معاف کر دیا گیا تھا بلکہ ان کی جائدادیں بھی ان کو واپس کر دی گئی تھیں۔ متعدد قرائن ایسے ہیں جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ بنو قریظہ کے صرف مقتولین اور جلا وطن ہونے والوں کی جائدادیں جو کافی کم تھیں مسلمانوں میں تقسیم کی گئی تھیں۔

اگرچہ "اموالِ خیبر" کے بارے میں کافی معلومات ملتی ہیں تاہم ان کی نوعیت اور مالیت کا صحیح تخمینہ لگانے کے لیے وہ ناکافی ہیں۔[۱۳۸] دُوسری پیداواری اراضی کی مانند یہودی اراضی بھی کھجوروں کے باغات اور اناج وسبزیوں کے کھیتوں پر مشتمل تھی۔ عرب دستور کے مطابق سبزیوں کے کھیت عموماً کھجوروں کے باغات میں ہی واقع ہوتے تھے جہاں ان کے زیر سایہ کاشت کی جاتی تھی۔[۱۳۹] بعض مآخذ کا دعوٰی ہے کہ اگرچہ خیبر کو مسلمانوں نے طاقت کے بل پر (عنوۃً) فتح کیا تھا اور اس لحاظ سے وہ مالِ غنیمت تھا اور اس کو دوسرے غنائم کے مانند اسلامی قانون کے مطابق مسلم مجاہدین میں تقسیم کر دینا تھا لیکن اس کو فے یا صفی رسول قرار دیا گیا اور ان کے قلعوں، باغوں اور کھیتوں کو یہودی کاشت کاروں کے قبضہ میں چھوڑ دیا گیا اور صلح اس شرط پر کر لی گئی کہ مسلمان اور یہود خیبر ان زرعی زمینوں کی پیداوار کے نصف نصف کے مالک ہوں گے۔[۱۴۰] مآخذ میں اس طرح کی تقسیم پیداوار کو مُساقہ (بٹائی کا متناسب طریقہ) کہا جاتا ہے۔[۱۴۱] دوسری طرف قاضی ابو یوسف اور ان کے ہم خیال فقہا کا خیال ہے کہ امام کو اموالِ مفتوحہ کو تقسیم کرنے یا نہ کرنے کا اختیار ہے۔ وہ اگر چاہے تو اسلامی اُمت و ریاست کے وسیع تر مفادات میں مفتوحہ اراضی کو مسلم مجاہدین میں تقسیم نہ کرے اور پُوری اُمت کے لیے وقف کر کے اس کی ملکیت اور پیداوار اپنے قبضۂ تصرف میں رکھے۔ چنانچہ انھیں اسباب سے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو نضیر، بنو قریظہ کے علاوہ دُوسرے عرب قبائل کے مفتوحہ علاقوں کو فے یا صفی رسول قرار دے کر تقسیم نہیں کیا تھا جبکہ اموالِ خیبر کو تقسیم کر دیا گیا تھا۔[۱۴۲] ابن واقد کا خیال ہے کہ اموالِ خیبر کو غنیمہ شمار کیا گیا تھا اور اس لحاظ سے مسلمانوں میں اس کو تقسیم کر دیا گیا تھا اور صرف خیبر کے خمس کو جو قلعہ کتیبہ پر مشتمل تھا اسلامی ریاست کا حق قرار دیا گیا تھا[۱۴۳] اور اسی سے آپ صدقات وعطایا دیا کرتے تھے۔[۱۴۴]

اس نظریہ کے مطابق قلعۂ کتیبہ کی کھجور کی کل پیداوار آٹھ ہزار وسق (تقریباً آٹھ ہزار کوئنٹل) سالانہ تھی جس میں سے نصف یہودیوں کو اور نصف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ملتی تھی۔ کتیبہ کی جَو[۱۴۵] کی پیداوار تین ہزار صاع (تقریباً ساڑھے چار ہزار کلو) تھی۔ وہ بھی فریقین میں نصف نصف تقسیم ہو جاتی تھی۔ اس کی نوٰی (گٹھلی لغوی معنیٰ) کی پیداوار عام طور سے ایک ہزار



صاع تھی اور اس کا نصف حصہ رسولِ کریم کا تھا۔ اسی سے اس نظریہ کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کو کھجور، اناج اور نوی کے صدقات وعطیات مسلمانوں کو عطا کرتے رہتے تھے۔ واقدی کے بیان کردہ اعداد و شمار کے مطابق خیبر کی کل زرعی پیداوار میں مسلم حصہ حسب ذیل تھا:

۱۔ کھجور	۴۰،۰۰۰ وسق
۲۔ جَو	۱۵،۰۰۰ صاع
۳۔ نوی	۵،۰۰۰ صاع

اس کی مزید تصدیق واقدی ہی کی بیان کردہ ایک اور روایت میں ہوتی ہے جس کے مطابق ایک سال حضرت عبد اللہ بن رواحہ نے خیبر کی کل کھجور کی پیداوار میں مسلم حصہ چالیس ہزار وسق آنکا تھا۔[۱۴۶]

سہمان المسلمین (مسلمانوں کے حصص) میں آنے والی زمینیں اور خمس کی اراضی کے انتظامات اور نگرانی کے لیے دو طرح کے افسروں کو مقرر کیا گیا تھا جن کو مآخذ میں رؤوس (رأس کی جمع بمعنی سردار) کہا گیا ہے۔ تمام اراضی پر یہودیوں کا قبضہ برقرار رہا تھا جو ان کو جوتتے، بوتے، سینچتے، فصل کاٹتے اور ان کی حفاظت کرتے تھے جیسا کہ قاضی ابو یوسف نے اس کی توضیح کی ہے۔[۱۴۷] جب فصلیں پکنے کے قریب ہوتیں تو مدینہ سے ان کے تخمینہ وتقسیم کے لیے خارص (افسرِ تخمینہ) بھیجے جاتے تھے۔ ابتدا میں یہ کارِ منصبی حضرت عبد اللہ بن رواحہ خزرجی نے کچھ ایسی بے مثل دیانتداری، فرض شناسی اور لگن سے انجام دیا کہ عام تاثر یہ بن گیا کہ وہ تمام پیداوار خیبر کے تخمینہ وتقسیم کے افسر تھے[۱۴۸] حالانکہ ابن اسحاق اور واقدی وغیرہ کے بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن رواحہ خزرجی صرف ریاست اسلامی کے خمس کے افسر تھے یا مجموعی طور سے من جملہ اٹھارہ افسروں میں سے ایک تھے جو مسلم حصوں کی دیکھ بھال کیا کرتے تھے۔ کتیبہ کی خمس اراضی کی پیداوار کے تخمینے کے بعد حضرت عبد اللہ بن رواحہ (اور بعد میں ان کے جانشین بھی) اس کو دو برابر برابر ڈھیروں میں بانٹ دیتے تھے اور یہودی کاشتکاروں کو اختیار دیتے تھے کہ وہ جو چاہیں وہ ڈھیر لے لیں۔[۱۴۹] قاضی ابو یوسف کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات حضرت عبد اللہ کھجوروں کی قیمت نقد طلب کرتے تھے اور اسے یہودی بخوشی قبول کر لیتے تھے۔[۱۵۰] بدقسمتی سے ہم اس نرخ سے واقف نہیں ہو سکے جس پر کھجوروں کی پیداوار کی قیمت کو جنس سے نقد میں بدلا جاتا تھا اور نہ مسلم حصہ کی مالیت اور اس کی بنا پر مسلم معیشت میں اس کی اصل حیثیت کو متعین کر لیا جاتا۔ بہر حال یہ اندازہ ہے کہ نقد میں جنس کی شرح تبادلہ یقینی طور سے رائج قیمتوں کی بنیاد پر رہی ہوگی اور جس سے یہودی کاشتکاروں کو فائدہ رہا ہوگا کہ انھوں نے زیادہ بہتر قیمت پر دوسرے صارفین کے ہاتھ اس کو بیچا ہوگا۔

جیسا کہ حوالہ آ چکا ہے کہ مسلمانوں کے حصوں کی نگرانی، تخمینے اور تقسیم وغیرہ کے معاملات اٹھارہ افسروں کے سپرد کر دیے گئے تھے۔ ہر افسر کل سو حصوں (سہمان) کا ذمہ دار تھا۔[۱۵۱] ہم جانتے ہیں کہ مسلمانوں کے کل اٹھارہ سو حصے لگائے گئے تھے اور ان کی حصہ میں آنے والی اراضی نطاۃ اور شق نامی قلعوں کے مجموعہ میں واقع تھی۔ ابنِ اسحاق کا بیان ہے کہ نطاۃ میں کل پانچ مجموعی حصے (پانچ سو حصے) تھے جبکہ شق میں تیرہ مجموعی حصے (تیرہ سو حصے) تھے۔ غالباً یہ کہنے کی ضرورت نہیں

رہ جاتی کہ نطاۃ میں پانچ افسر تھے اور شق کے تیرہ افسر۔ یہ حقیقت ذہن نشین رہنی چاہیے کہ ابنِ اسحاق اور واقدی وغیرہ نے جن اٹھارہ یا کچھ کم و بیش حصّوں کا ذکر کیا ہے وُہ دراصل انھیں صحابہ کے حصّے (سہمان) نہیں تھے جن کے نام سے وُہ موسوم ہیں دراصل یہ اٹھارہ مجموعی حصّے اپنے مشہور ترین حصّہ دار کے نام سے موسوم ہو گئے تھے۔[۱۵۲] ورنہ ان میں سے ہر ایک میں ننانوے اور حصّہ دار تھے۔ واقدی کا بیان مزید تشریح کرتا ہے کہ ہر سو آدمیوں / حصّہ داروں کا ایک رأس (سردار) ہوتا تھا جو ایک معروف شخصیت ہوتا تھا (یُعرَفُ) اور وہی اپنے تمام شرکاء کو "غلّہ" (پیداوار / اناج) تقسیم کیا کرتا تھا جو اس کے مجموعۂ حصص سے حاصل ہوتا تھا۔ واقدی نے رؤس (سردارانِ حصص) میں سے صرف گیارہ کے نام گنائے ہیں۔ یہ تھے حضرات:

۱۔ عاصم بن عدی
۲۔ علی بن ابی طالب
۳۔ عبدالرحمٰن بن عوف
۴۔ طلحہ بن عبیداللہ
۵۔ معاذ بن جبل
۶۔ اسید بن حضیر
۷۔ عبداللہ بن رواحہ
۸۔ فروہ بن عمرو
۹۔ عمر بن خطاب
۱۰۔ سعد بن عبادہ
۱۱۔ بریدہ بن حصیب

روایت کے بموجب موخرالذکر صحابی نے اوس کے ایک حصّہ کو خرید لیا تھا جس کو "سہم اللفیف" کہا جاتا تھا اور غالباً اسی بنا پر وہ "پیچھے از افسرانِ انتظام" بن گئے تھے۔[۱۵۳] ابنِ اسحاق نے اپنی فہرست میں حضرت زبیر بن عوام کو بھی "ایک افسرِ انتظامِ مال" بتایا ہے۔[۱۵۴] اس طرح کل بارہ حضرات کے نام معلوم ہو سکے ہیں۔ بقیہ چھ افسروں کے نام پردۂ خفا میں ہیں۔ بہرحال موجودہ حقیقت کے مطابق چار افسروں کا تعلق قریش سے تھا، اتنے ہی افسروں کا تعلق خزرج سے تھا اور تین اوس سے متعلق تھے، جبکہ ایک بدوی قبیلہ اسلم کے ممتاز فرد تھے۔ یہ تقریباً یقینی ہے کہ ان افسروں کا تناسب حصّہ داروں کے تناسب کے مطابق تھا۔ یہاں اس امر کی طرف توجہ دلانا ازبس ضروری ہے کہ ابنِ اسحاق کے انگریزی مترجم مشہور مستشرق الفرڈ گلیوم نے اموالِ خیبر کے تقسیمِ حصص کے معاملہ کو بالکل نہیں سمجھا ہے اور ترجمہ میں خاصا خلط مبحث کیا ہے جس کے سبب ان کو پورا "بیان غیر منظم اور پیچیدہ" نظر آیا ہے۔[۱۵۵]

تقسیم اموالِ خیبر کے سلسلہ میں ایک روایت کا ذکر یہاں قابلِ توجہ معلوم ہوتا ہے جس سے مسلم مجاہدین کے ضبطِ نفس، ایمانداری، اتباعِ رسولؐ کے علاوہ اسلامی ریاست کی پالیسی بھی واضح ہوتی ہے۔ خیبر کی فتح اور یہودی کاشتکاروں سے نصف پیداوار کے بٹوارے (مساقہ) کے معاہدے کی انجام دہی کے معاً بعد بعض فتح سے سرشار مسلمان سپاہیوں نے ان کے کھیتوں میں اُگی فصلوں (الحرث) اور سبزیوں (البقل) کو لوٹنا شروع کر دیا۔ یہودیوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مسلمان کے طرزِ عمل کی شکایت کی اور آپ نے مسلمانوں کو سختی سے منع فرماتے ہُوئے کہا کہ "یہودیوں نے مجھ سے شکایت کی ہے کہ تم نے ان کے کھیتوں (حضیر) کو تاراج کر دیا ہے۔ ہم نے ان کے خون، اموال اور ان کی تمام

اراضی کی جو ان کے قبضہ میں ہے حفاظت کی ضمانت دی ہے اور ہم نے ان سے ایک معاہدہ کیا ہے۔ بلاریب مُعَاہِدِین (عہد والے لوگوں) کے اموال میں سے صرف حق کے ساتھ کچھ لینے کی اجازت ہے"۔ راوی کا تبصرہ ہے کہ اس تقریر نبوی کے بعد مسلمانوں نے یہودیوں سے سبزی وغیرہ ہمیشہ پیسے/قیمت (ثمن) دے کر خریدی۔[156] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلم فاتحین نے، جو لُوٹ مار کی تھی وہ اس غلط تصور کے نتیجہ میں کی تھی کہ وہ معاہدے کے مطابق بھی نصف کے حقدار ہیں۔

تقریباً تمام مآخذ کا اتفاق ہے کہ خیبر کے اموال سے حاصل شدہ خمس کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تین مصارف میں صرف کرتے تھے:

اوّل اپنے خاندان بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب کو ایک حصّہ عطا کرتے تھے،

دوسرا اپنے خاندان یعنی ازواجِ مطہرات پر صرف کرتے تھے،

اور تیسرا غریب مسلمانوں پر خرچ کرتے تھے۔[157]

ابنِ اسحاق اور واقدی وغیرہ مستند مورخین نے ان تمام حضرات و خواتین کا خصوصی ذکر کیا ہے جن کو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خمسِ خیبر میں سے کچھ بھی عطیہ دیا تھا۔[158] عطایا میں تقسیم کردہ ایسے حصّوں کا میزان تین ہزار وسق بنتا تھا جیسا کہ ابنِ اسحاق نے بیان کیا ہے۔[159] ان میں سے ازواجِ مطہرات کو فی کس اسّی یا سو وسق سالانہ عطیہ کی شرح سے کل عطیہ سات سو وسق تھا۔[160]

فتح خیبر اور نصف پیداوار کے مساقہ (بٹوارے) کے معاہدہ کے بعد خیبر کی زرعی حالت انتظام کے بارے میں ایک دلچسپ اور اہم روایت ملی ہے جو ایک طرف مفتوح قوموں کی عمومی ذہنیت کی طرف عام طور سے اور یہودی مزاجِ شر و فساد کی طرف خاص طور سے اشارہ کرتی ہے۔ واقدی کا بیان ہے کہ اس معاہدہ کے بعد ہی پیداوار میں کافی گراوٹ آئی اور اس سال اتنی کم پیداوار ہوئی کہ خیبر کی زرعی دولت اور خوشحالی جس کے لیے وہ پُورے جزیرہ نمائے عرب میں معلوم و مشہور تھا، ماضی کی کہانی بن گئی۔[161] مسلمان مورخین نے اس زرعی پیداوار کی کمی کا سبب تین چیزوں کو قرار دیا ہے۔ اوّل یہ کہ خیبر کے دولت مند اور صاحبِ ثروت کاشتکار لوگ جو دراصل مقامی طبقہ اشراف بھی تھا جلد ہی فنا ہو گیا اور وہ جو مال و دولت کاشتکاری میں لگاتے تھے وہ دستیاب نہ رہا۔ دوم یہ کہ باقی رہ جانے والے یہودی محض کاشتکار اور مزدور (عُمّال ایدیھم) رہ گئے جن کے پاس سرمایہ کاری کے ذرائع نہیں تھے۔ اور سوم یہ کہ یہودی کاشتکاروں نے عمداً مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی خاطر اپنی پیداواری صلاحیت کو مسلسل گھٹایا۔[162] یہ مسلم تبصرہ حقیقت پر مبنی ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلم اُمت اور ریاست کو خیبر کی اصل پیداوار کا نصف ان مذکورہ بالا اسباب سے کبھی نہیں ملا۔ مذکورہ بالا پیداوار کے اعداد و شمار فتح خیبر کے سال کے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد پیداوار کی شرح میں مسلسل کمی ہوتی رہی تھی۔

خیبر سے ملحق دُوسری یہودی بستی فدک بھی صلح کے ذریعہ مسلمانوں کے قبضہ میں آئی تھی اور اسی بنا پر اس کو بھی فئے قرار دیا گیا تھا۔[163] روایات کے مطابق حضرت محیصہ بن مسعود نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نمائندے اور سفیر کے فرائض انجام دئے تھے اور انہوں نے خیبر کی شرائط پر صُلح کا معاہدہ کر لیا تھا۔ یعنی ان کو بھی اپنی تمام پیداوار کا نصف (نصف

الارض) مسلمانوں کو یا اسلامی ریاست کو سالانہ یا فصل کے موقع پر ادا کرتے رہنا تھا، جبکہ تمام اراضی ان کے قبضے ہی میں رہنے دی گئی تھی۔[۱۶۴] البتہ ملکیت ارض اسلامی ریاست کو منتقل ہو گئی تھی۔ فدک کے بارے میں ہماری معلومات بہت ہی ناقص ہیں نہ ہم ان کی اراضی کے بارے میں کچھ جانتے ہیں نہ کل پیداوار یا اس میں مسلم حصّہ کے بارے میں۔ البتہ یہ یقینی طور پر ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ فدک کی زمین بہت ہی زرخیز تھی اس کا ایک سبب یہ تھا کہ وہاں آبپاشی کا بہت اچھا نظام تھا۔[۱۶۵] عہدِ فاروقی میں کل اراضی کی مالیت ایک لاکھ درہم آنکی گئی تھی چنانچہ یہود حجاز کے جزیرہ نمائے عرب سے اخراج کے وقت یہود فدک کو ان کے نصف حصّہ کی قیمت پچاس ہزار درہم ادا کی گئی تھی۔[۱۶۶] یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ دس بارہ سال میں قیمتوں میں کافی فرق آ گیا تھا اور عہد نبوی کے مقابلے میں عہدِ فاروقی یا عہدِ عثمانی میں اشیائے صرف یا جائدادوں کی قیمتیں کافی چڑھ گئی تھیں۔ اس کا ایک سبب غالباً افراطِ زر تھا جو عالمگیر فتوحات اور بین الاقوامی مسلم تجارت کے ضمن میں وقوع پذیر ہوا تھا۔ خیال یہ ہوتا ہے کہ غالباً یہ علاقہ قرٰی عربیہ کے انتظامی علاقے (عمالۃ) میں شامل رہا تھا[۱۶۷] اور وہاں کے گورنر حضرت عبداللہ بن سعید اموی فدک کی زمینوں کے انتظامات اور وہاں کے محاصل کی وصولیابی کے ذمہ دار رہے تھے۔ یہاں سے حاصل شدہ محاصل کے مصارف روایات کے مطابق رفاہ عام کے کام تھے خاص کر مسافروں (ابن السبیل) کی ضروریات پر ان کو خرچ کیا جاتا تھا۔[۱۶۸] کیونکہ روایات کے مطابق فدک فے اراضی تھی جس کے انتظام و انصرام کی کل ذمہ داری اسلامی ریاست کی تھی۔

اگرچہ اخراجِ یہود کا تعلق ہمارے موضوع سے نہیں ہے تاہم یہاں یہود حجاز کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے معاہدہ کی شرائط کا ذکر کرنا کافی اہم بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ اس سے ایک طرف تو ہم کو یہودیوں سے مسلم معاہدہ کی صحیح نوعیت سمجھنے میں مدد ملے گی تو دوسری طرف عہدِ فاروقی میں جزیرہ نمائے عرب سے ان کے اخراج پر روشنی بھی پڑے گی۔ ابنِ اسحاق اور طبری کے مطابق معاہدۂ نبوی کی من جملہ شرائط میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ "اگر ہم تم لوگوں کو جلا وطن کرنا چاہیں تو ہم ایسا کر سکیں گے"۔[۱۶۹] چنانچہ اس شرط کی روشنی میں حضرت عمر فاروق کا اقدام سنّتِ نبوی کے خلاف یا معاہدہ شکنی کے مترادف نہیں تھا جیسا کہ مستشرقین اور بعض جدید مورخین دعوٰی کرتے ہیں۔ یہودیوں کی جلا وطنی کے اور بھی اسباب تھے لیکن معاہدہ نبوی کی اس شرط نے اس کی راہ ہموار کی تھی۔ خیال یہ ہے کہ خیبر کے یہود کے اخراج میں ان کی سازشی فطرت کے علاوہ ان کی زراعت کو عمداً نقصان پہنچانے کی مذموم حرکت نے بھی کافی اہم حصّہ لیا تھا۔ یہاں یہ بھی ذکر کرنا ناگزیر ہے کہ تیما اور وادی القرٰی کے یہود کو ان کے وطن سے اس عہد میں بھی جلا وطن نہیں کیا گیا تھا کیونکہ وہ حجاز کے یہود میں شمار نہیں ہوتے تھے جیسا کہ واقدی کا خیال ہے۔[۱۷۰] ممکن ہے کہ ان علاقوں نے معاہدہ شکنی کا اور ریاست اسلامی کے مفادات کے خلاف کوئی ایسا اقدام نہ کیا ہو جو ان کے اخراج کا تقاضا کرتا لہٰذا وہ اپنے علاقوں میں حسبِ دستور سابق برقرار و بحال رکھے گئے۔

وادی القرٰی کی اراضی تھوڑے سے تصادم اور مزاحمت کے بعد (عنوۃً) فتح ہوئی تھی لہٰذا اس کو مالِ غنیمت تصوّر کیا گیا اور اسی لحاظ سے مسلمان مجاہدین میں اس کو تقسیم کر دیا گیا۔ اسلامی ریاست کے حصہ میں اس کا خمس آیا لیکن بعد میں اس علاقے کے یہودیوں نے خیبر اور فدک جیسی شرائط پر صلح کر لی لہٰذا ان کی اراضی ان کے قبضہ میں چھوڑ دی گئی اور اسلامی ریاست کو حقِ ملکیت

کے عوض اس کی نصف پیداوار بطور خراج ہر فصل پر مستقل ملتی رہی۔[171] وادی القریٰ کی اراضی کی نوعیت، پیداوار، زرخیزی وغیرہ کی تمام تفصیلات مآخذ میں کہیں بھی مذکور نہیں ہیں۔

تیما کے یہودیوں نے جب خیبر، فدک اور وادی القریٰ کے زوال کی خبریں سنیں تو انھوں نے از خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے صلح کر لی اور جزیہ ادا کرنے پر رضامندی ظاہر کی۔[172] عہد نبوی میں زمین پر محصول کے لیے جزیہ کی اصطلاح کا استعمال پہلی بار تیما کے ہی معاملہ میں ہوا ہے۔ یہ امر بحث طلب ہے کہ یہ جزیہ محصول ذات (علی الرقاب، علیٰ انفسھم) تھا یا محصول زمین (علی الارض)۔[173] ذات پر محصول کی مثالیں یعنی جزیہ کی صحیح ٹیکنیکی نوعیت کی مثالیں ہم بنو کلب وغیرہ کے معاملہ میں دیکھ چکے ہیں۔ لیکن تیما کے ضمن میں قرائن یہ کہتے ہیں کہ محصول بر ذات نہیں تھا بلکہ محصول بر زمین تھا۔ کیونکہ جزیہ کی کسی شرح کا اول تو ذکر نہیں، دوسرے خیبر، فدک اور وادی القریٰ کے پس منظر میں یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ اس علاقہ کا بھی معاملہ دوسری پڑوسی یہودی بستیوں سے مختلف نہیں تھا۔ واقدی کی مذکورہ بالا روایت جس میں یہودِ حجاز کے اخراج اور یہودِ وادی القریٰ اور تیما کے عدم اخراج کا ذکر ہے بالواسطہ طور پر تصدیق کرتی ہے کہ ان کی زمینیں ان کے قبضۂ تصرف میں رہنے دی گئی تھیں اور وہ بھی دوسری یہودی بستیوں کی مانند اپنی پیداوار پر پچاس فیصد "جزیہ" ادا کرتے تھے جو دراصل "جزیہ علی الارض" یا "خراج" تھا۔ تیما کے سلسلے میں بھی وادی القریٰ اور فدک کی مانند ہم کو نہ تو خارص (تخمینہ لگانے والے افسر) کا ذکر ملتا ہے نہ ہی دوسرے زرعی اور مالی افسران و عمال کا۔ لیکن اس کے گورنر (والی) کا صریح ذکر ملتا ہے۔[174] اس کا قوی امکان ہے کہ محاصل کی وصولیابی اور دوسرے مالی معاملات کی آخری ذمہ داری بہرحال گورنر کی تھی۔ جہشیاری کے اس تبصرہ سے کہ حجاز کی پیداوار کا حساب کتاب رکھنے کے لیے مرکز میں ایک افسر ہوتا تھا[175] اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ حجاز سے پرے واقع علاقوں کے محاصل کے انتظامات بھی کیے گئے ہوں گے اور بلا ریب تیما اور وادی القریٰ کے لیے عمالِ صدقات مقرر کیے گئے تھے خواہ ان کا تذکرہ مآخذ میں ملے یا نہ ملے۔

یہ بڑی دلچسپ اور اہم حقیقت ہے کہ مکہ مکرمہ کے سوا اور کسی عرب علاقے کو بزورِ شمشیر (عنوۃ) فتح نہیں کیا گیا تھا۔ تمام عرب علاقے جو اس کے بعد اسلامی ریاست کا حصہ بنے تھے وہ یا تو بلا استثناً صلح کر کے داخلِ ریاست اسلامی ہوئے تھے اور انھوں نے جزیہ ادا کرنے کا معاہدہ کیا تھا اور یا وہ اسلام قبول کر کے اسلامی امت میں ضم ہو گئے تھے اور اس حیثیت سے انھوں نے وہ صدقات ادا کیے تھے جو صرف مسلمانوں پر عائد ہوتے تھے۔

اس بحث کے آخر میں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست کے اس ذریعۂ آمدنی ——— خمس ——— کے افسر جو "صاحب الخمس" کہلاتا تھا کے بارے میں بھی مختصراً مطالعہ کر لیں۔ گزشتہ اوراق میں اور بعض دوسرے مقامات پر بھی ہم نے غنیمت منقولہ اور غیر منقولہ دونوں کے بارے میں انتظامی افسروں کا مطالعہ ہم نے کر لیا ہے اور یہ دیکھ چکے ہیں کہ کبھی کبھی صاحب المغانم خمس کے معاملات کو بھی دیکھتا تھا لیکن اکثر و بیشتر خمس کے لیے ایک خاص افسر متعین کیا جاتا تھا۔ مآخذ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت محمیہ بن جزء زبیدی عہد نبوی میں خمس کے مستقل افسر تھے۔ واقدی، ابن سعد اور ابن اثیر وغیرہ جیسے مستند مورخین کے متعدد بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ہمیشہ خمس کے معاملات و انتظامات سنبھالے تھے۔ دلچسپ

امر یہ ہے کہ وُہ نہ صرف زمانۂ جنگ میں تقسیمِ اموالِ غنیمت کے وقت خمس کے نگراں ہوتے تھے بلکہ زمانۂ امن میں بھی اس مد میں جمع شدہ رقوم کے، خرچ وغیرہ کے انتظامات کے ذمہ دار ہوتے تھے۔[۱۷۶]

(د) جزیہ[۱۷۷]

اسلامی ریاست کے کسی غیر مسلم طبقہ سے جزیہ وصول کرنے کی ایک مثال ہم تیماً کے یہود کے معاملے میں دیکھ چکے ہیں لیکن وہ نہ تو پہلی مثال تھی اور نہ ہی اصطلاحی جزیہ کی حقیقی وصولیابی۔ عہد نبوی میں اب تک جو ثبوت اور شہادتیں ملی ہیں ان کے مطابق جزیہ کی پہلی مثال کا تعلق حضرت عبدالرحمٰن بن عوف زہری کی مہم دومۃ الجندل سے ہے جو شعبان ۶ھ / دسمبر ۶۲۷ء میں پیش آئی تھی۔ گویا کہ تیماً کے بنو عادیا یہودیوں کے معاہدہ سے تقریباً چھ ماہ قبل دومۃ الجندل کے بنو کلب کے غیر مسلم طبقات نے جزیہ ادا کرنا شروع کر دیا تھا۔ مآخذ میں دومہ کے جزیہ کی رقم کی مقدار اور ادا کرنے والوں کی تعداد کا کوئی ذکر نہیں ہے اور نہ ہی اور دوسری تفصیلات مل سکی ہیں۔ قیاس ہے جو صحیح ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف ہی کلب کے غیر مسلموں سے جزیہ کی پہلی قسط وصول کر کے مدینہ لائے ہوں گے اور بعد میں اس کی وصولیابی کے دوسرے انتظامات کیے گئے ہوں گے۔ بہرحال عہد نبوی میں جزیہ کا لفظ دُوسری بار بنو عادیا کے لیے استعمال ہوا ہے۔ وہ جزیہ بھی ہو سکتا ہے اور خراج بھی۔ جیسا کہ ہم اوپر بحث کر چکے ہیں۔

جزیہ کی پہلی واضح مثال جو توقیتی لحاظ سے تیسری ہے اور جس کا تعلق ۸ھ / ۶۳۰ء سے ہے بحرین کے مجوسی طبقات سے متعلق ہے۔ وہاں کے مسلم مقامی منتظم اور سابق بادشاہ حضرت منذر بن ساویٰ نے اپنے مکتوب میں بحرین میں آباد مجوسی رعایا کے مقام و حیثیت و ذمہ داری کے بارے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے استفسار کیا تھا اور آپ نے بشرط عہد شناسی و وفاداری فی کس ایک دینار معافری مقرر فرمایا تھا۔[۱۷۸] یہی جزیہ بحرین کے دوسرے غیر مسلم طبقات خاص کر یہودیوں پر بھی عائد کیا گیا تھا۔ ایک اور گرامی نامۂ نبوت میں جو مجموعۃ الوثائق میں محفوظ ہے حضرت منذر بن ساویٰ کو حکم دیتا ہے کہ وہ ہجر کے علاقے میں آباد مجوسیوں کے بے زمین بے مِلک افراد سے فی کس چار درہم اور ایک قبا (عباءۃ) سالانہ وصول کریں۔[۱۷۹] ایک اور مکتوب نبوی میں غیر مسلم طبقات پر جزیہ کی شرط عائد کرنے کا ذکر ضرور ہے مگر اس کی تفصیلات نہیں دی گئی ہیں البتہ ان کے پڑوس میں آباد مسلم طبقات پر بعض پابندیاں عائد کی گئی ہیں۔ مثال کے طور پر ان مسلمانوں کے لیے غیر مسلم طبقات کا ذبیحہ اور ان کی عورتوں سے شادی کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔[۱۸۰] یہ بات بیان ہو چکی ہے اور یہاں پھر ذکر کے قابل ہے کہ حضرت منذر بن ساویٰ کی عملداری سے جزیہ کی رقوم وصول کر کے مدینہ پہنچانے کے لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو مخصوص عمّال حضرات ابوہریرہ دوسی اور قدامہ کو روانہ فرمایا تھا اور انھوں نے حکم نبوی کی بخوبی تعمیل کی تھی۔ اس سلسلہ میں یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ مرکزی ہدایات کی تعمیل میں مقامی منتظم حضرت منذر بن ساویٰ اور مرکزی منتظم حضرت علاء بن حضرمی نے اپنا بھرپور تعاون دیا تھا۔[۱۸۱]

جزیہ کی ایک اہم ترین مثال کا تعلق نجران کے عیسائیوں سے ہے۔ یہ دراصل اس معاہدہ کا نتیجہ تھا جو انھوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ۹ھ / ۶۳۱ء میں کیا تھا۔ خوش قسمتی سے اس معاہدہ کا مکمل متن محفوظ رہ گیا ہے اور اس سے نہ صرف

جزیہ کی ایک مخصوص نوعیت کا علم ہوتا ہے بلکہ اسلامی ریاست میں غیر مسلم طبقات کے مقام و مرتبے کا بھی صحیح تعین ہوتا ہے۔ چنانچہ معاہدہ نبوی کے متن کا ترجمہ ذیل میں دیا جا رہا ہے:

"یہ پیغمبرِ خدا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معاہدہ ہے جو انھوں نے اہلِ نجران سے کیا۔ آپ ہی کو ان کے تمام پھلوں اور زرد، سفید اور سیاہ تمام غلاموں پر اختیار و اقتدار حاصل ہے لیکن آپ نے از راہِ کرم یہ سب ان کے (اہلِ نجران کے) قبضہ میں اس شرط پر بحال رکھا کہ وہ دو سو جوڑے کپڑے (حُلّے) سالانہ آپ کو ادا کیا کریں گے۔ یہ حُلّے اواقی کے ہوں گے (یعنی ہر حلّہ ایک اوقیہ چاندی یا ۴۰ درہم کا ہوگا) اور وہ ہر سال رجب میں ایک ہزار اور صفر میں ایک ہزار (یعنی دو قسطوں میں) ادا کیے جائیں گے۔ اگر ان حُلّوں میں سے کسی کی مالیت ایک اوقیہ سے کم یا بیش ہوگی تو اس کا باقاعدہ حساب کر لیا جائے گا۔ اسی طرح ان سے جو بھی زرہ بکتر، گھوڑے، سواری کے اونٹ اور دوسرا سامان مستعار لیا جائے گا اس کا بھی حساب رکھا جائے گا۔ نجران کے لوگوں پر فرض ہوگا کہ وہ میرے فرستادوں (رسل) کی بیس دن یا اس سے کم دنوں کی مہمانی کریں گے لیکن ان کو (فرستادوں کو) کسی حال میں ایک ماہ سے زیادہ نہیں روکیں گے۔ یہ ان پر لازم قرار دیا گیا ہے کہ وہ میرے فرستادوں یا نمائندوں کو یمن میں جنگ یا ہنگامہ (کید) ہونے کی صورت میں ۳۰ زرہ بکتر، ۳۰ گھوڑے اور ۳۰ اونٹ فراہم کریں گے۔ ان مستعار زرہ بکتروں، گھوڑوں اور اونٹوں میں سے جو کچھ بھی ضائع ہوگا میرے فرستادے ان کی قیمت ادا کر دیں گے۔ اہلِ نجران اور ان کے لواحقین کو اپنے نفوس کے لیے، اپنی زمین، سامان جو موجود ہے یا آئندہ حاصل ہو، گرجا گھروں اور ملازمتوں یا مذہبی عبادتوں کی آزادی حاصل ہوگی اور اس کے لیے ان کو خدا اور اس کے رسول محمد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ذمہ حاصل ہے اور اس کے علاوہ ان کی تمام مملوکہ چھوٹی بڑی چیزوں کی حفاظت کی ضمانت دی جاتی ہے۔ کسی پادری کو اس کے عہدے سے معزول نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی کسی راہب کو اس کی خانقاہ سے اور نہ کسی افسرِ گرجا گھر کو اس کے منصب سے ہٹایا جائے گا۔ اہلِ نجران نہ تو سودی کاروبار لیں گے اور نہ ہی عہدِ جاہلیت کے انتقام لیں گے (لا دم الجاھلیۃ)۔ اگر ان میں سے کوئی صحیح راہ پر چلے گا تو اسے انصاف ملے گا۔ ان کا یہ بھی فرض ہوگا کہ وہ اپنے افراد کو غلط کاری سے روکیں۔ ان میں سے کسی پر نہ کوئی ظلم ہوگا اور نہ زیادتی۔ اگر اس کے بعد بھی ان میں سے کوئی سُود لے گا تو اسے میری ضمانت و حفاظت حاصل نہ ہوگی۔ ان میں سے کسی پر دوسرے کے جُرم و غلط کاری کا کوئی مواخذہ نہ ہوگا۔ ان شرائط پر جو اس صحیفہ میں بیان ہوئی ہیں خدا کی حفاظت (جوار) اور اس کے رسول کا "ذمہ" اہلِ نجران کو وفادار رہنے کی صورت میں برابر حاصل رہے گا بشرطیکہ وہ اپنے فرائض بھی برابر انجام دیتے رہیں اور کوئی غلط کام نہ کریں تاآنکہ خدا کا کوئی اور حکم آجائے۔"(۱۸۲)

اس صحیفہ نبوی کی مزید تشریح و تعبیر کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ معاہدہ و مکتوب نبوی نہ صرف اہلِ نجران پر عائد کردہ

جزیہ کی رقم کو بیان کرتا ہے بلکہ ریاست اسلامی میں غیر مسلموں کے فرائض اور ان کے مرتبہ کو بھی واضح کرتا ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ نجران کے عیسائیوں سے نقد جزیہ کی رقم وصول کرنے کے بجائے ان سے جنس میں کپڑوں کا مطالبہ کیا گیا ہے اور شرط رکھی گئی ہے کہ ہر حُلّہ کی قیمت ایک اوقیہ چاندی سے کم نہ ہو۔ اس کے علاوہ اسلامی لشکر کی مادی و فوجی معاونت اور فرستادگان نبوی کی میزبانی بھی ضروری قرار دی گئی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ان پہ سود نہ لینے اور عہد جاہلیت کے انتقام نہ لینے کی بھی شرط عائد کی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے دل چسپ نکتہ یہ ہے کہ نجران سے کل جزیہ کی رقم کا بھی علم ہوتا ہے جو اسّی ہزار درہم سالانہ یا دو ہزار اوقیہ چاندی بنتی ہے۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ نجران کی محصول ادا کرنے کے لائق کل آبادی لگ بھگ دو تین ہزار افراد رہی ہوگی۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں رہ جاتی کہ جزیہ کی یہ مثال اجتماعی محصول کی تھی اور اندرونی طور پر اس کو جمع کرنے کی ذمہ داری اہلِ نجران کی اپنی تھی۔[۱۸۳] اسلامی ریاست کو کل جمع شدہ رقم یا اس کے مساوی کپڑوں کی ادائیگی سے غرض تھی۔

حضرت عمرو بن حزم کی بطور والیِ نجران روانگی سے قبل رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ان کو نامۂ مبارک عطا فرمایا تھا اس میں بھی اس علاقہ کے عیسائیوں اور یہودیوں پر عائد کردہ جزیہ کا حوالہ موجود ہے۔ اس نامہ گرامی کے مطابق یہ بات قابل توجہ ہے کہ اس خطہ کے ہر فرد بشر کو خواہ وہ آزاد ہو یا غلام، مرد ہو یا عورت ایک دینار یا اس کی قیمت کے مساوی کپڑا بطور جزیہ اسلامی ریاست کو ادا کرنا تھا۔ تمام جزیہ ادا کرنے والوں کو اللہ اور اس کے رسول عظیم کے ذمہ و حفاظت کی ضمانت دی گئی تھی بشرطیکہ وہ پابندی سے جزیہ ادا کرتے رہیں اور مرکز سے جاری ہونے والے احکام و ہدایات کی تعمیل میں کوتاہی نہ کریں۔[۱۸۴]

یمن کی تین چھوٹی چھوٹی مملکتوں رُعَین، مُعافر اور ہمدان کے حکمرانوں حضرات حارث بن عبد کُلال، نُعَیم بن عبد کلال اور نعمان بن عبد کلال کے خطوط و استفسارات کے جواب میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان علاقوں کے تمام غیر مسلم طبقات کے لیے بلا امتیاز فی کس ایک دینار مُعافری سالانہ یا اس کی قیمت کا مساوی کپڑا جزیہ میں مقرر کیا تھا۔[۱۸۵] یَزَن کے حکمران حضرت زرعہ کے نام مکتوب نبوی کا ذکر اوپر بار بار آ چکا ہے۔ اس کے مطابق حضرت زرعہ کو اپنی عمالہ یا مملکت سے تمام صدقات اور جزیہ اکٹھا کر کے مرکزی نمائندوں کے حوالے کرنے تھے جو ان کو مدینہ پہنچاتے۔[۱۸۶] مذکورہ بالا تاریخی شواہد سے ثابت ہوتا ہے کہ جزیہ نمائے عرب کے جنوبی اور مشرقی خطوں میں آباد تمام غیر مسلموں کے لیے جزیہ کی شرح الگ الگ مقرر کی گئی تھی تاہم ایک دینار مُعافری عہدِ نبوی میں اس علاقہ کے لیے معیاری شرح معلوم ہوتی ہے۔

جنوبی اور مشرقی عرب کے علاوہ شمالی عرب میں بعض یہودی اور عیسائی قبائل اور طبقات بستے تھے جنھوں نے تاریخ کے مختلف ادوار میں اسلامی ریاست کی سیاسی بالادستی قبول کی تھی۔ خیبر، فدک، تیماء، وادی القریٰ کے غیر مسلم طبقات کے اسلامی مملکت کے ساتھ معاہدات اور ان کے نتیجے میں ان کے تعلقات کی نوعیت پر ہم پہلے ہی بحث کر چکے ہیں۔ اسی دومۃ الجندل کے قبیلہ بنو کلب کے ۶ھ / ۶۲۷ء میں جزیہ ادا کرنے کا بھی حوالہ آ چکا ہے۔ بہرحال یہاں دومۃ الجندل کی عیسائی مملکت کے حکمران اکیدر بن عبد الملک کندی کا اس عہد کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے جس کے مطابق اس نے اپنے غیر مسلم طبقات کی جانب سے جزیہ ادا کرنے کا اقرار کیا تھا۔[۱۸۷] یہ معاہدہ غزوۂ تبوک کے تتمہ کے طور پر انجام پذیر ہوا تھا۔ اسی زمانے میں شمال بعید کی چار غیر مسلم بستیوں ایلہ، جرباء، مقنا اور اذرح نے بھی اپنے حکمرانوں کے ذریعہ جزیہ کی ادائیگی پر صلح کر لی تھی کیونکہ ان کو فوجی کارروائی کا خدشہ تھا

جس سے دومہ کے لوگ دوچار ہوئے تھے۔ ایلہ کے بارے میں واضح طور سے ذکر آتا ہے کہ اس کے تین سو بالغ و توانا مردوں نے سالانہ تین سو دینار جزیہ دینا شروع کیا تھا۔ واقدی کے مطابق یہی ایلہ کی کل مردانہ (سجل) آبادی تھی۔[188] گویا کہ فی کس ایک دینار جزیہ مقرر رہا تھا۔ جرباؔ اور اذرح کے لوگوں کو ہر سال رجب میں سو سو دینار ادا کرنے ہوتے تھے اور اس کے بدلہ میں ان کو خداوند کریم اور رسولِ عظیم کی امان حاصل تھی۔[189] لیکن مقناؔ اور اس علاقہ کے ایک قبیلہ بنو جنبہ کا معاملہ ذرا مختلف تھا۔ ان کو اپنی پھلوں اور کپڑوں (غزول) کی پیداوار کا ایک چوتھائی حصہ (ربع) بطور جزیہ ادا کرنا پڑتا تھا۔[190] اس کے بعد مکتوب نبویؐ نے ان کو ضمانت فراہم کی تھی کہ وہ "تمام قسم کے جزیہ اور سخرہ (بیگار) سے آزاد ہوں گے اور ان پر سوائے ان کے اپنے لوگوں کے یا خاندانِ رسولِ عظیمؐ کے افراد کے اور کسی کو "امیر" مقرر نہیں کیا جائے گا"۔[191]

ماٰخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی مملکت کے مرکزی علاقوں میں یعنی حرمین شریفین کے ارد گرد کے علاقوں میں جو حجاز و نجد کے وسیع خطوں پر محیط تھے متعدد غیر مسلم طبقات خاص کر یہودی اور عیسائی آباد تھے۔ ان کے مقام و مرتبے نیز جزیہ وغیرہ کے بارے میں ہم کچھ بھی نہیں جانتے سوائے متفرق معلومات کے۔ مثلاً یحییٰ بن آدم نے بیان کیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں رہنے والے ایک عیسائی سے ایک دینار سالانہ جزیہ وصول کیا تھا۔[192] ابن اثیر کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ کے باسی ایک عیسائی کی نصف دولت کسی جرم کی پاداش میں ضبط کر لی گئی تھی۔ ان کے علاوہ ہماری معلومات غیر مسلم طبقات کے بارے میں ناقص ہیں۔ ہم ان یہودی قبیلوں اور طبقات کے بارے میں بھی کچھ نہیں جانتے جو بنو قریظہ کے واقعہ کے بعد مدینہ میں سکونت پذیر رہے تھے۔ لیکن گزشتہ شواہد کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کرنا جائز معلوم ہوتا ہے کہ فتح مکہ کے بعد جب اسلامی مملکت نے ملک گیر اور مرکزی مالی پالیسی اپنائی تھی تو مرکزی عرب کے تمام غیر مسلم طبقات کو بھی جزیہ ادا کرنا پڑا ہوگا اور یحییٰ بن آدم کے حوالے سے اس خیال کو تقویت پہنچتی ہے کہ ان علاقوں کے لیے بھی ایک دینار فی کس سالانہ جزیہ کی معیاری شرح رہی ہوگی۔ ممکن ہے کہ بعض دستکار یا زراعت پیشہ طبقات سے نقد کے بجائے کسی جنس میں جزیہ وصول کیا گیا ہو۔ جنس کی صورت میں جزیہ کی شرح معیاری ربع یا ½ معلوم ہوتی ہے۔ بعض حالات میں جزیہ کی رقم نقد اور جنس دونوں صورتوں میں لی جاسکتی تھی اور اس کی اقساط بھی کی جاسکتی تھیں اگر جزیہ اجتماعی طور سے وصول کیا جائے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست کا مالی سال چھ چھ ماہ کے دو وقفوں میں منقسم تھا۔ پہلا وقفہ صفر اور رجب کے درمیان تھا اور دوسرا رجب تا محرم۔ رجب مالی سال کا آغاز معلوم ہوتا ہے جزیہ کی بروقت ادائیگی وفاداری کی علامت اور عدم ادائیگی یا کوتاہی عہد شکنی کے مترادف تھی۔ جزیہ ادا کرنے والوں کو اصطلاحاً ذمی یا اہل الذمہ کہا جاتا تھا کہ ان کی جانوں اور مالوں کی حفاظت کی ضمانت اسلامی ریاست کی ذمہ داری متصور ہوتی تھی۔

جہاں تک غیر مسلم طبقات سے جزیہ وصول کرنے کے مسئلہ کا تعلق ہے مذکورہ بالا بیان و مباحثہ کی بنیاد پر ہم ذرا قطعیت کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ مقامی سردار و شیوخ یا حکمران اور بادشاہ جیسا بھی علاقائی نظم و نسق ہوا اپنے علاقے کے ذمیوں سے اس کی وصولیابی کے ذمہ دار ہوتے تھے اور جمع شدہ رقوم کو وہ اپنے علاقے میں تعینات مرکزی محصلین و عاملینِ صدقات یا مرکزی منتظمین کے حوالے کر دیتے تھے جو ان کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں پہنچاتے تھے۔ ہم گزشتہ بحث

میں حضرات منذر بن ساوی اور جیفر و عبد کے بحرین و عمان کے علاقوں کے ضمن میں دیکھ چکے ہیں۔ اسی طرح ہم نجران کے عیسائیوں، یمن کے حکمران حضرت زرعہ، حضرموت کے اقیال، یوحنا اور دوسرے سرواتِ ایلہ، دومہ کے اکیدر وغیرہ متعدد دوسرے مقامی حکمرانوں، شاہوں اور مقامی شیوخ کے اپنے غیر مسلم اور ذمی طبقاتِ رعایا سے جزیہ کی وصولیابی اور پھر اس کی رقوم کی مرکزی منتظمین کے سپردگی کی تاریخی اور واقعاتی شہادتیں بھی دیکھ چکے ہیں۔ کتانی کا یہ بیان کہ حضرات معاذ بن جبل اور ابو عبیدہ بن جراح جزیہ کی وصولیابی کے ذمہ دار تھے جامع و مکمل نہیں ہے[۱۹۳]۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اپنے اپنے علاقوں میں یہ دونوں افسرانِ حکومتِ نبوی مقامی منتظمین کی جمع کردہ رقوم کو وصول کر کے مدینہ روانہ کرتے تھے۔ ورنہ یہ حقیقت ظاہر و باہر ہے کہ صرف یہی دونوں مرکزی منتظمین نہیں تھے بلکہ ان کے علاوہ متعدد اور بھی تھے جو جزیرہ نمائے عرب کے مختلف خطوں میں بکھرے ہوئے اپنے فرائضِ منصبی خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دے رہے تھے۔ ہم ان افسران و عمال حکومت الٰہی پر بحث کچھ دیر بعد ایک الگ فصل میں کریں گے۔

(س) صدقات

صدقات دراصل ایک وسیع تر عمومی اصطلاح ہے جو متعدد محاصلِ مذہبی کے مجموعہ کو محیط ہے۔ یہ تمام محاصل جیسے زکوٰۃ، عشر، نصف العشر، عشور وغیرہ مسلمان بطور ایک مذہبی فریضہ کے ادا کرتے تھے۔ صدقہ/صدقات میں لازمی اور نفلی دونوں طرح کے عطیات شامل تھے۔ قرآن کریم میں متعدد ایسی آیات ہیں جو صدقات اور زکوٰۃ کو بالترتیب مذہبی تقرب و مرضیِ الٰہی اور فریضۂ خداوندی کے بطور بیان کرتی ہیں۔ زکوٰۃ یعنی لازمی مالی فریضہ کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ قرآن کریم کی آیات عموماً نماز (صلوٰۃ) کے ساتھ زکوٰۃ کے حکم کو بھی حاوی ہیں[۱۹۴]۔ پھر اسلامی تعلیمات محض مالی فریضہ کی ادائیگی پر ہی بس نہیں کرتیں بلکہ نفل صدقات پر بھی ابھارتی ہیں۔ اللہ کے راستے میں خرچ کرنا جو دراصل امتِ اسلامی کے مفاد میں اصلاً اور انسانیت کے مفاد میں ضمناً خرچ کرنا تھا اسلام میں ایک انتہائی پسندیدہ فعل ہے جس پر آخرت کے اجر و ثواب کے علاوہ دنیاوی فلاح و بہبود کا بھی وعدہ ہے۔ مسلم فقیہوں نے حدیث و تاریخ کی شہادتوں[۱۹۵] کی اساس پر بیان کیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر مرد و عورت مسلم پر جو آزاد، عاقل و بالغ اور مالکِ نصاب ہو اور جس کے مال پر سال گزر جائے زکوٰۃ کو بطور مالی فریضہ کے روشناس کیا تھا جس کی ادائیگی نماز یعنی بدنی عبادت فریضہ کی مانند لازمی و ضروری تھی۔ زکوٰۃ نقد، زیور، مویشیوں اور پیداوارِ زمین پر مختلف شرحوں میں لی جاتی تھی۔ نقد بچت پر زکوٰۃ ۲ ۱/۲ فیصد یا چالیسواں حصہ (۱/۴۰) ہے۔ جبکہ سونے اور چاندی پر مثقال کے اعتبار سے لی جانی چاہیے جو کہ عملاً اور شرح کے اعتبار سے نقد کے مانند ہے۔ البتہ مویشیوں پر زکوٰۃ ان کی جنس کے اعتبار سے مختلف ہے۔ ذیل میں پالتو مویشیوں پر زکوٰۃ کی مختلف شرحیں دی جا رہی ہیں جس سے یہ مسئلہ واضح ہو جائے گا۔

(۱) بھیڑ/ بکری

نصاب		زکوٰۃ
۴۰ – ۱۲۰		ایک عدد بھیڑ / بکری
۱۲۱ – ۲۰۰	۲	" "
۲۰۱ – ۳۰۰	۳	" "
۳۰۰ کے بعد ہر سیکڑہ پر	۱	" "

(۲) اونٹ

۵ – ۱۰	۱	بھیڑ / بکری
۵ – ۱۵	۲	" "
۱۵ – ۲۰	۳	" "
۲۰ – ۲۴	۴	" "
۲۵ – ۳۵	۱	نبت مخاض
۳۶ – ۴۵	۱	نبت لبون
۴۶ – ۶۰	۱	حقہ
۶۱ – ۷۵	۱	جزعہ
۷۶ – ۹۰	۲	نبت لبون
۹۱ – ۱۰۰	۲	حقہ
۱۲۰ کے بعد ہر ۵۰ پر	۱	حقہ
اور ہر ۴۰ پر	۱	نبت لبون

(۳) گائے

۳۰ گائیں	۱	جزع / جزعہ
۴۰ "	۱	مُسِنّہ (۱۹۶)

ظاہر ہے کہ مویشی پر یہ زکوٰۃ صرف ان جانوروں پر لگائی گئی تھی جو "تجارتی مقاصد" سے پالے جاتے تھے۔

زمین کی پیداوار پر زکوٰۃ بیان کرتے ہوئے واقدی کہتے ہیں کہ وہ اراضی جس کی آب پاشی بہتے پانی (الغیل) سے کی جاتی تھی اس پر زکوٰۃ پیداوار کا دسواں حصہ ہوتا تھا جو اصطلاحاً "عُشر" کہلاتا تھا جبکہ ڈول / بالٹی (الغرب) سے سینچی جانے والی اراضی پر زکوٰۃ پانچ فیصد ($\frac{1}{20}$) ہوتی تھی جو "نصف العشر" کہلاتی تھی۔[196] پیداوار کا نصاب کم از کم ۵ وسق ہوتا ہے جیسا کہ اکثر فقہاء کا خیال ہے۔[198]

مذکورہ بالا پیداواری شرح زکوٰۃ نظریاتی یا اصولی ہے۔ واقدی کے بیان سے اس کی واقعاتی تصدیق بھی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ یحییٰ بن آدم کی بیان کردہ دو روایتوں سے کسی حد تک مزید ثبوت ملتا ہے کہ عہدِ نبوی میں زکوٰۃ کی وصولیابی کا ایک باقاعدہ نظام تھا۔ ایک روایت کے مطابق حضرت معاذ بن جبل کو جب یمن اور حضرموت وغیرہ کے شمالی خطوں کا گورنر جنرل مقرر کیا گیا تھا تو ان کو ہدایت نبوی تھی کہ وہ گیہوں (الحنطۃ)، جَو (الشعیر)، کھجور (النخل) اور انگور (العنب) کی پیداوار سے "صدقہ" وصول کریں۔[199] ایک دُوسری روایت کے مطابق (جو اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ وہ عہدِ نبویؐ کے ایک اہم واقعہ پر روشنی ڈالتی ہے اور جس کو عام طور سے شہرت حاصل نہیں ہے) حضرت معاذ بن جبل کو "قرٰی عربیہ" کے علاقے سے زمین کی پیداوار پر زکوٰۃ (حظ الارض) وصول کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔[200] بلاذری اور ابو داؤد کا متفقہ بیان ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عتاب بن اسید اُموی کو مکہ پر گورنر (والی) مقرر کرنے کے علاوہ ثقیف کے علاقوں سے ان کی (کرم والوں کی) کھجور اور انگور کی پیداوار کے تخمینہ اور صدقات کا بھی عامل مقرر کیا تھا۔[201] بلاذری کا مزید بیان ہے کہ مشہور مؤذنِ رسولؐ حضرت بلال حبشی پھلوں کی پیداوار پر وصول کئے گئے صدقات کے افسر تھے۔[202] یہ چند مثالیں ہیں ان محاصل کے مجموعہ کی جو "صدقات" کی وسیع تر اصطلاح سے معروف تھے۔ ان کے علاوہ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد گرامی ناموں میں زکوٰۃ، صدقہ / صدقات، عشر، عشور، نصف العشر وغیرہ کے حوالے بکثرت ملتے ہیں[203] جیسا کہ ہم ابھی مطالعہ کریں گے۔

مستشرقین کے تصور و نظریۂ زکوٰۃ[204] کے برخلاف ہم کو عہدِ نبویؐ میں زکوٰۃ کے ارتقاء اور تکمیل کے متعدد ثبوت متواتر مآخذ میں ملتے ہیں۔ دوسرے شواہد کے علاوہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گرامی نامے بلاشک وشبہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ زکوٰۃ عہدِ نبویؐ میں ایک "قانونی مذہبی محصول" بن چکا تھا جو مالدار مسلمانوں کے لیے لازمی تھا۔ مکتوباتِ نبوی میں صرف زکوٰۃ کے لازمی ہونے کی شہادت نہیں ملتی بلکہ مسلم طبقات کے ایمان کی شہادت زکوٰۃ کی ادائیگی کو قرار دیا گیا ہے۔ اس قسم کے حوالے اور ہدایات حسب ذیل حکمرانوں اور منتظمین کے نام مکتوباتِ رسولؐ میں ملتے ہیں:

۱۔ حضرت فروہ بن عمرو، عامل معن

۲۔ حضرت صیفی بن عامر، سردار بنی ثعلبہ / غسان

۳۔ مسلمانانِ قبیلۂ بنی حدس / لخم

۴۔ مسلمانان و سرداران بنو الحارث / بنو نہد

۵۔ حضرات حارث، نُعیم اور نعمان جو یمن کی تین چھوٹی چھوٹی مملکتوں کے حکمران اور مقامی ناظم تھے۔

۶۔ قبیلۂ ازد کے متعدد و مختلف طبقات

۷۔ قبیلۂ اسلم

۸۔ قبیلہ طے وغیرہ۔(۲۰۵)

مستشرقین کے خیالِ خام کی تردید کے لیے وہ مکتوباتِ نبویؐ بڑے اہم ہیں جو نہ صرف زکوٰۃ کا لازمی فریضہ ہونا ثابت کرتے ہیں، بلکہ زکوٰۃ، صدقہ، عشر اور نصف العشر کی مقررکردہ شرحوں اور تناسب کا بھی برملا ذکر کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر مذکورہ بالا تین شاہانِ یمن کے خطوط کے جواب میں جو گرامی نامہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھا تھا اس میں زمین کی پیداوار پر عشر اور نصف العشر کے علاوہ مویشیوں کی شرحیں بھی بیان کی گئی ہیں۔ اس ضمن میں حضرت زرعہ والیِ یزن کے نام مکتوب نبوی زیادہ اہم ہے کیونکہ وہ زکوٰۃ اور صدقے سے متعلق بعض امور پر کافی تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالتا ہے۔ پہلے وہ حضرت زرعہ سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ تمام جمع شدہ رقوم کو مدینہ بھیج دیں۔ پھر یہ بیان کرتا ہے کہ "صدقہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے خاندان والوں (اھل البیت) کے لیے جائز نہیں ہے۔ زکوٰۃ کو غریب مسلمانوں اور مسافروں میں تقسیم کرنا چاہیے۔"(۲۰۶) خثعم کے مسلمانوں کے نام مکتوب نبوی میں تحریر ہے کہ ان کے تمام مسلمان کاشتکاروں کو خواہ وہ نرم زمین (جناب) پر کاشت کرتے ہوں یا سخت زمین (عزاز) پر، اپنی ان تمام فصلوں پر ۱/۱۰ (عشر) دینا ہے جو آبِ رواں (سیح) سے سیراب کی گئی ہوں اور نصف العشر (۱/۲۰) دینا ہے جو ڈول / بالٹی (غراب) سے سینچی گئی ہوں۔(۲۰۷) اسی طرح عمان کے قبائل ثمالہ اور حدّان سے بھی ان کی پیداوار پر عشر کا مطالبہ کیا گیا تھا۔(۲۰۸) ان کے معاملہ میں یہ امر بڑا اہم ہے کہ ان کو اپنی پیداوارِ زمین کو دس وسق پر ایک وسق دینے کا حکم دیا گیا تھا۔ اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں رہتی کہ یہ زکوٰۃِ ارض کا مقررہ تناسب تھا جو "قانونی زکوٰۃ" یا "لازمی مذہبی محصول" کا واضح ترین ثبوت تھا۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ زمین کی پیداوار پر زکوٰۃ کا جو نصاب بعد کے فقہائے نے مقرر کیا تھا اس کی بنیاد بعد کے مسلم حکمرانوں کے عمل پر نہیں تھی بلکہ اس کی اساس سنتِ نبوی تھی۔ صدقہ اور عشور کے بارے میں حضرت منذر بن ساوی کے حوالے پہلے گزر چکے ہیں۔ یہاں اس مکتوب نبوی کا ذکر البتہ مناسب معلوم ہوتا ہے جس کے مطابق رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عمان اور بحرین کے مسلمانوں سے ان کی کھجور کی پیداوار پر زکوٰۃ یعنی عشر اور ان کے اناج کی پیداوار پر نصف العشر کا مطالبہ کیا گیا تھا۔(۲۰۹) ایک اور گرامی نامہ میں بحرین کے طاقتور قبیلہ عبد القیس کو ممانعت کی گئی تھی کہ وہ اپنے پھلوں کی پیداوار (حریم الثمار) کو پک جانے کے بعد رد کا کریں۔(۲۱۰) اسی طرح حضرموت کے اقیال کو ان کی اراضی کی پیداوار پر عشر کی بلا تاخیر ادائیگی کا حکم دیا گیا تھا۔(۲۱۱)

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مختلف گرامی ناموں، مراسلات اور معاہدات سے مسلمان طبقات پر ان کے مویشیوں میں تناسب قانونی محصول یا قانونی مذہبی زکوٰۃ کی فرضیت و ادائیگی کا ثبوت ملتا ہے۔ مذکورہ بالا معاہدات و رسالات نبوی کے علاوہ جن میں ضمناً مویشیوں پر "صدقہ" یا "زکوٰۃ" کا ذکر آیا ہے۔ ذیل میں ہم ان مکتوبات نبویؐ کا ذکر کرتے ہیں جن میں مویشیوں پر زکوٰۃ کی تفصیلات باقاعدہ ملتی ہیں۔ قبیلہ اسلم کے علاوہ متعدد دوسرے بدوی قبیلوں کے پاس جو ساحلی مقامات پر آباد تھے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خطوط موجود تھے جن میں ان کے "مواشی" پر "صدقہ" یا "فرائض" (حصوں) کا ذکر تھا۔(۲۱۲) قبیلہ باہلہ اور ان تمام لوگوں کو جو بیشہ نامی

علاقے میں آباد تھے حسب ذیل شرح سے جانوروں کی زکوٰۃ ادا کرتی تھی:

مویشیوں کی تعداد/نصاب	زکوٰۃ
۳۰ گائیں	ایک فارض (کافی عمر کی گائے)
۴۰ بھیڑ/بکری (الغنم)	ایک عتود (ایک عمر دراز بکری/بھیڑ)
۵ اونٹ	ایک ساغیہ مسنہ (ایک معمر اونٹ)(۲۱۳)

دومۃ اور کلب کے لوگوں کو اپنے مویشیوں پر یہی زکوٰۃ ادا کرنی تھی۔ اس کے علاوہ عُشر اور نصف عشر بھی اپنی پیداوار پر ادا کرنا تھا۔(۲۱۴) حضرت عمرو بن حزم کے نامۂ تقرر میں نجران کے قبیلہ بنو الحارث بن کعب کے مویشیوں اور اراضی کی پیداوار پر حسب ذیل قانونی واجب زکوٰۃ بیان کی گئی ہے:

۱۔ پیداوار (العقار) پر عشر بشرطیکہ چشموں اور بارش کے پانی (العین والسماء) سے سینچائی کی گئی ہو۔

۲۔ پیداوار پر نصف العشر بشرطیکہ بالٹیوں یا ڈولوں سے آبپاشی کی گئی ہو۔

۳۔ ہر دس اونٹوں پر ۲ بھیڑ/بکری، اور ہر بیس اونٹوں پر چار بھیڑ/بکری زکوٰۃ۔

۴۔ ہر چالیس سے زیادہ گایوں پر ایک گائے، جبکہ ہر تیس گایوں پر ایک تبیع/تبیعہ یا جزعہ۔

۵۔ ہر چالیس بھیڑ/بکریوں (الغنم) پر ایک بھیڑ/بکری۔(۲۱۵)

"یہ تمام صدقہ ان کے (مسلمانوں کے) مالوں پر خدا کی جانب سے فرض قرار دیا گیا ہے" جیسا کہ مکتوب نبوی میں آخر میں بیان ہے۔(۲۱۶) یہ اور ان جیسے متعدد دستاویزات سے جو مآخذ میں پائی جاتی ہیں یہ حتمی شہادت ملتی ہے کہ عہدِ نبویؐ ہی میں "صدقہ" یا "زکوٰۃ" کا تناسب اور شرح مقرر ہو چکی تھی اور اس کو ریاست اسلامی کے تمام مسلمانوں سے وصول بھی کیا جاتا تھا۔

عمال الصدقات (افسرانِ محصول)

صدقات اور جزیہ کی فرضیت کے بارے میں عام طور سے مسلم فقہاء اور علماء کا یہ خیال ہے کہ وہ فتح مکہ کے بعد کسی وقت رو بہ عمل ہوئی تھی جب قرآن کریم کی متعلقہ آیت کریمہ کا نزول ہوا تھا جس کے مطابق خدائے ذوالجلال نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا تھا کہ "ان کے مالوں سے صدقہ لیجئے اور ان کو اس کے ذریعہ پاک وصاف کیجئے ......"۔(۲۱۷) طبری کا بیان ہے کہ یہ آیت کریمہ ۹ھ/۶۳۰-۳۱ء میں کسی وقت نازل ہوئی تھی اور اسی بناء پر صدقہ "اس برس" فرض ہوا تھا۔(۲۱۸) تقریباً یہی دعویٰ جزیہ کی فرضیت کے بارے میں کیا جاتا ہے۔

لیکن تاریخی حقائق سے معلوم ہوتا ہے کہ محاصل کی فرضیت اور وصولیابی دونوں اس سے کئی برس قبل شروع ہو چکی تھیں۔ دومۃ الجندل کے علاقے میں آباد بنو کلب کے عیسائیوں نے ۶ھ/۶۲۷ء میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کو جزیہ ادا کیا تھا۔

۵ھ کے آغاز اور ۶۲۶ء کے وسط میں تیما کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کے یہودی کاشتکاروں نے "جزیہ" اسلامی ریاست کو دینا شروع کیا تھا جبکہ خیبر، فدک اور وادی القریٰ کے یہودی مزارعین نے اپنی پیداوار کا نصف جو اصطلاحاً اور معناً "خراج" تھا ادا کیا تھا۔ البتہ زکوٰۃ کی وصولیابی کی تاریخ مآخذ سے عملاً ثابت نہیں ہوتی اس لیے اس باب میں حتمی طور سے ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ البتہ قرینہ یہی ہے کہ "صدقات" بھی لازمی طور سے فتح مکہ سے قبل وصول کیے جانے لگے تھے۔ اس سلسلہ میں چند مثالیں کافی ہوں گی۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ خیبر، فدک، وادی القریٰ اور تیما کے علاوہ "قریٰ عربیہ" کے والی ۷ھ / ۶۲۹ء میں مقرر ہو چکے تھے، ان کے من جملہ فرائض میں سے صدقات کی وصولیابی بھی تھی۔ حضرت ولید بن عقبہ اموی کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ بنو مصطلق کے قبول اسلام کے "دو برس بعد" ان کو اس قبیلہ کا عامل صدقات مقرر کیا گیا تھا۔ مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ بنو مصطلق کا خاصا بڑا طبقہ (اگر اکثریت نہیں) ۵ھ میں اسلام قبول کر چکا تھا۔ اس لحاظ سے حضرت ولید اموی کی تقرری کا زمانہ ۷ھ / ۶۲۹ء بنتا ہے قریٰ عربیہ کے سلسلہ میں دل چسپ روایت یہ ہے کہ یمن جانے سے قبل حضرت معاذ بن جبل وہاں کے عامل صدقات مقرر کئے گئے تھے اور وہ حقیقتاً وہاں سے زمین کی پیداوار کی زکوٰۃ وصول کر کے لائے تھے اور یہ غالباً ۹ھ سے قبل کا واقعہ ہے۔ طبری کا حتمی بیان ہے کہ حضرت عمرو بن عاص سہمی کی عمان کو بطور عامل صدقات (مرکزی منتظم) روانگی ۸ھ / ۶۳۰ء میں فتح مکہ کے معاً بعد ہوئی تھی۔[۲۱۹] ان شواہد کی بنیاد پر یہ کہنا مناسب و جائز معلوم ہوتا ہے کہ صدقات کی بالعموم اور جزیہ و خراج کی بالخصوص وصولیابی ۵ھ کے آغاز / وسط ۶۲۶ء میں شروع ہو چکی تھی۔ اور اس طرح اسلامی ریاست نے اپنے باشندوں سے اپنے مصارف کے لیے محاصل وصول کرنے کی پالیسی کا آغاز کر دیا تھا۔

صدقات و محاصل کی وصولیابی کا گہرا تعلق وصولیابی کے افسروں کی تقرری کے نظام سے تھا۔ اگرچہ "ولایات" کے والی ان کی وصولیابی اور صدر مقام ریاستِ اسلامی کو روانگی کے ذمہ دار تھے تاہم ان کے جمع و وصول کا ایک الگ، مکمل اور جامع نظام تھا جو عہدِ نبوی میں وقوع پذیر ہوا اور رفتہ رفتہ تکمیل کے مدارج طے کرتا ہوا کمال کو پہنچا۔ محاصل ادا کرنے والوں سے صدقات اور جزیہ وصول کرنے کے لیے خاص افسر مقرر کیے جاتے تھے جن کے مختلف نام تھے۔ سب سے زیادہ معروف و عام لفظ "عامل" ہے اور قرآن کریم نے یہی لفظ استعمال کیا ہے۔ کبھی کبھی شبہ کے ازالہ اور مزید توضیح کے لیے مآخذ "عامل صدقات" یا "عمال الصدقات" یا "عاملین صدقات" یعنی صدقات کی اضافہ و اضافت کے ساتھ بھی استعمال کرتے ہیں کیونکہ لفظ عامل وسیع تر عمومی معنی میں استعمال ہوتا ہے جس سے مراد محاصل وصول کنندہ کے علاوہ گورنر، والی، منتظم، سرکاری افسر وغیرہ سبھی کچھ ہو سکتا ہے۔ تاریخی مآخذ میں مختلف اصطلاحیں اور الفاظ استعمال ہوتے ہیں جیسے مُصَدِّق (مُصَدِّقِین)، سَاعِیْ (سُعَاۃ)، جَابِیْ (جُبَاۃ)، مُحَصِّل (محصلین) وغیرہ۔ ان کے علاوہ مخصوص اصطلاحات کا استعمال بھی مآخذ میں مفقود نہیں ہے جیسے صاحب العشور (عشر کا افسر)، ولاۃ علی الجزیۃ (جزیہ کے افسر)، صاحب الخراج (خراج کا افسر) وغیرہ۔[۲۲۰]

مآخذ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محاصل و صدقات کی وصولیابی کا نظام درجہ بندی پر مشتمل اور دُہرا تھا۔ ہر علاقے (ولایت یا قبیلہ) میں کچھ مقامی محصلین ہوتے تھے جو محاصل دہندوں سے براہِ راست صدقات و جزیہ وصول کرتے تھے۔

یہ مقامی افسرانِ صدقات ہوتے تھے۔ مرکزی سطح پر ریاستِ اسلامی کی نمائندگی کرنے والے افسرانِ صدقات ان مقامی افسروں سے جمع شدہ رقوم وصول کر کے مرکز پہنچاتے یا اس کی ہدایات کے مطابق صرف کرتے تھے۔ پہلے ہم مرکزی افسرانِ صدقات کے نظام سے بحث کریں گے۔

(۱) مرکزی عاملینِ صدقات

ایسے تمام عاملینِ صدقات جن کو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم براہِ راست اس عہدہ پر مقرر کر کے مدینہ سے بھیجتے تھے اور ان کو مختلف علاقوں اور قبیلوں میں تعینات کرتے تھے اس زمرے میں آتے ہیں۔ عام طور سے ان مرکزی افسروں کا علاقائی یا قبائلی تعلق اپنی تقرری کے علاقوں سے نہیں ہوتا تھا۔ ان میں اور مقامی عاملینِ صدقات میں واضح امتیاز موجود ہوتا تھا۔ یہ مرکزی افسر اپنے اپنے علاقوں یا قبیلوں کے صدر مقام پر قیام پذیر رہتے تھے اور براہِ راست صدقات دہندوں سے رابطہ نہیں رکھتے تھے۔ وہ صرف مقامی افسرانِ صدقات سے تعلق رکھتے تھے۔ دوسری جانب مقامی صدقات کے عاملین اپنے لوگوں سے صدقات وصول کرتے تھے اور ان کی مجموعی رقوم اپنے متعلقہ مرکزی افسروں کے حوالے کر دیتے تھے۔ کبھی کبھی مقامی عاملینِ صدقات مرکزی افسروں کا کام کرتے تھے اور جمع شدہ رقوم خود لے کر مدینہ منورہ پہنچ جاتے تھے۔

تمام مرکزی عاملینِ صدقات کو (اور مقامی افسروں کو بھی) عام طور سے ایک پروانۂ تقرری ملتا تھا جس میں نہ صرف عاملین کے لیے ہدایات و احکام درج ہوتے تھے بلکہ ان لوگوں کے لیے بھی ہدایات ہوتی تھیں جن کے پاس وہ بھیجے جاتے تھے۔ ابنِ سعد کا بیان ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مکتوب مشترکہ طور پر قضاعہ کے سعد ہذیم اور جذام کو عطا فرمایا تھا جس میں "صدقہ" کے فرائض بیان کیے گئے تھے اور ان سے یہ بھی مطالبہ کیا گیا تھا کہ وہ اپنے تمام "صدقہ اور خمس" دو سفیران و افسرانِ نبوی حضرات ابی بن کعب اور عنبسہ کو ادا کر دیں۔[۲۲۱] اسی طرح کی ہدایات حضرات عمرو بن حزم اور وائل بن حجر حضرمی کے پروانوں میں تحریر تھیں۔ واضح رہے کہ یہ دونوں مذکورہ بالا افسر بالترتیب نجران اور حضرموت کے مرکزی اور مقامی عاملین بھی تھے۔ اسی طرح کی ہدایات نبوی متعدد دوسرے مراسلاتِ نبوی میں بھی مندرج تھیں جن میں کچھ کا مطالعہ ہم پہلے ہی کر چکے ہیں۔ ان کے علاوہ عاملینِ صدقات کو کچھ اخلاقی ہدایات بھی دی جاتی تھیں جو اسلامی مزاجِ حکومت کی بہتر نمائندگی کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر صدقات کے افسروں کو حکم تھا کہ وہ لوگوں کی دولت کا خواہ وہ مویشیوں کی شکل میں ہو یا نقد و جنس کی صورت میں، کا بہترین حصہ (کرائم اموالہم) صدقہ و جزیہ میں وصول نہ کیا کریں، ان پر ظلم و ستم نہ کریں، ان کا استحصال نہ کریں، واجب صدقہ / رقم / تعداد و مقدار سے زیادہ وصول نہ کریں یا ناجائز طریقے نہ اختیار کریں۔[۲۲۲] اسی طرح ان کو یہ بھی حکم تھا کہ وہ لوگوں کے چراگاہوں (مراعی) (اور گھروں سے) صدقہ وصول کریں۔[۲۲۳] اس کا مطلب یہ تھا کہ عاملینِ صدقات خود محاصل دہندوں کے پاس جایا کریں اور ان کو اپنے پاس اپنے پڑاؤ پر آنے کی زحمت نہ دیا کریں۔ یہ اور ایسی دوسری ہدایات نے فرض شناسی اور ایمانِ قلب کے جوہر کے ساتھ مل کر صدقات و جزیہ کی ادائیگی کو عوام کے لئے ایک خوشگوار فرض بنا دیا تھا جس میں تلخی سے زیادہ خوشدلی، بوجھ سے زیادہ تعاون اور کدورت سے زیادہ مسرت کا احساس

شامل تھا۔

یہ امر کہ عاملینِ صدقاتِ نبوی رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی مکمل تعمیل کرتے تھے حدیث وسنت کے متعدد مآخذ کی روایات سے ثابت ہوتا ہے۔ نسائی نے حضرت سُوید بن غفلہ کی روایت بیان کی ہے کہ ایک بار ان کے پاس ایک مصدق آیا اور اس نے مویشیوں کی ان تمام اقسام کو بالتصریح بیان کیا جن کا صدقہ میں لینا ممنوع تھا۔ اسی موقعہ پر ایک صدقہ دہندہ ایک بہت عمدہ قسم کی اونٹنی صدقہ میں دینے کے لیے لایا مگر مصدق نے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کے بہترین "اموال" وصول کرنے سے احتراز کی ہدایت دی تھی۔ چنانچہ اس نے ایک اوسط درجہ کا جانور قبول کیا۔(۲۲۴) اسی قسم کا ایک اور واقعہ یہ ہے کہ ایک بار دو عاملینِ صدقات ایک مسلمان کے پاس پہنچے جو اپنے جانور ایک چراگاہ میں چرا رہا تھا اور اس کے مویشیوں کا صدقہ اس سے طلب کیا۔ اس مسلمان نے ایک عمدہ دُودھاری بکری پیش کی مگر دونوں نے اس کو قبول کرنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ وہ اعلیٰ نسل کی تھی۔ چنانچہ وہ ایک عام قسم کی بکری صدقہ میں لے کر چلے گئے۔(۲۲۵)

مآخذ سے واضح ہوتا ہے کہ مرکزی عاملینِ صدقات اکثر و بیشتر مستقل عہدہ دار ہوتے تھے۔ عام طور سے وہ ایک متعین علاقے میں یا متعین قبیلے کے افسرِ صدقات ہوتے تھے اور بعض حالات میں ان کے کام وکارکردگی کے علاقے بدل سکتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ اور منفرد معاملہ حضرت عمرو بن عاص سہمی کا ہے۔ فتح مکہ کے بعد ان کو عمان کا عاملِ صدقات بنا کر بھیجا گیا تھا (اور وہ مرکزی منتظم بھی تھے)۔ سنہ ۹ھ / ۶۳۰-۳۱ء میں ہم ان کو ہوازن کے علاقے سے صدقات وصول کرتے ہوئے پاتے ہیں۔ اسی زمانے میں ایک اور روایت کے مطابق انہوں نے بنو فزارہ / غطفان کے صدقات بھی وصول کئے تھے۔ اس کے بعد ان کو قضاعہ کا عامل صدقات مقرر کیا گیا تھا۔ مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کافی عرصے تک اس علاقے میں مقیم اپنے فرائض انجام دیتے رہے تھے۔ پھر سنہ ۱۰ھ / ۶۳۱ء میں حجۃ الوداع کے بعد طبری کے بقول رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ایک بار پھر عمان روانہ کیا تھا اور وعدہ کیا تھا کہ فرائض کی انجام دہی کے بعد ان کو پھر ان کے پُرانے عہدے یعنی صدقاتِ قضاعہ کی افسری پر واپس بحال کر دیا جائے گا۔ اگرچہ عہدِ نبویؐ میں ان کی واپسی مدینہ منورہ نہیں ہو سکی تھی تاہم خلافتِ صدیقی کے اوائل میں وہ "صدقات عمان" لے کر مرکز پہنچے تھے اور خلیفۂ اوّل نے اپنے محبوب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے وعدہ کو شرطِ ایمان سمجھ کر وفا کیا تھا اور ان کو ان کے عہدۂ موعود پر بحال کر دیا تھا۔(۲۲۶) حضرت عمرو بن عاص سہمی کی مانند حضرات: عنبسہ، عبّاد بن بشر، بُریدہ بن حصیب، رافع بن مکیث، ضحّاک بن سفیان، عکرمہ بن ابی جہل، حُذیفہ بن یمان، قُضاعی بن عمرو اور متعدد دوسرے ممتاز مرکزی عاملینِ صدقات تھے اور یہ تمام اپنے عہدوں پر مستقل طور سے وفاتِ نبویؐ کے وقت تک فائز رہے تھے۔(۲۲۷)

بعض مرکزی عاملوں کے معاملات میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے عارضی طور سے اسلامی ریاست کے شعبۂ مالیات میں کام کیا تھا۔ روایات سے یہ تاثر ملتا ہے کہ انھوں نے ایک بار ہی صدقات کی وصولیابی کا کام کیا تھا۔ مثلاً حضرت معاویہ بن ابی سفیان اموی کو حضرموت کے قیل (شہزادے، حکمران) حضرت وائل بن حُجر کے ساتھ ان کی مملکت میں بھیجا گیا تھا اور وہ وہاں کے صدقات وصول کر کے مدینہ واپس آ گئے تھے۔(۲۲۸) کسی بھی روایت سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اُنھوں نے اس نوع کی اور کوئی خدمت کبھی اور انجام دی تھی۔

تاریخی مآخذ کا دعوٰی ہے کہ یمن کے قبیلۂ ازد کی ایک شاخ سے حضرت علی بن ابی طالب ہاشمی نے صدقہ اور جزیہ وصول کر کے خدمت نبوی میں مکہ مکرمہ پہنچایا تھا جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے آخری حج کے لیے وہاں تشریف فرما تھے۔ فقہا و مورخین نے ایک "ہاشمی" کے صدقہ وصول کرنے کے "جواز" یا "صحت" پر کلام کیا ہے اور طرح طرح کی تاویلیں کی ہیں۔[۲۳۹] حالانکہ حدیث و حکم نبوی کا منشا یہ ہے کہ کوئی ہاشمی "صدقہ" خود کھا نہیں سکتا مگر اس کی صرف وصولیابی میں کوئی قباحت نہیں۔ مزید برآں حضرت علی ہاشمی بطور مصدق بنیادی لحاظ سے یمن نہیں گئے تھے بلکہ وہ اصلاً معلّم و مبلّغ کی حیثیت سے گئے تھے اور واپسی میں ضمناً انھوں نے "صدقات" کے مرکز پہنچانے کا کام بھی انجام دے دیا تھا۔ جب تمیم کی ایک دشمن مدینہ شاخ نے خزاعہ کے خاندان بنو کعب سے صدقات وصول کرنے کی راہ میں حضرت بُسر بن سفیان کے لیے روڑے اٹکائے تھے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عُیینہ بن حصن فزاری کو مقرر کیا تھا اور انھوں نے نہ صرف "مانعین" کو سزا دی تھی بلکہ وفادار و مسلم خزاعیوں سے صدقات بھی وصول کر کے لائے تھے۔[۲۴۰] ان مثالوں سے یہ بخوبی واضح ہوتا ہے کہ عہدِ نبویؐ میں مرکزی عاملین صدقات کے دو طبقے تھے: ان میں سے اکثر و بیشتر مستقل عہدہ دار تھے جو برابر اپنے کام انجام دیتے رہتے تھے اور کچھ ایسے بھی تھے جو عارضی طور سے صدقات کی وصولی کا کام بعض مخصوص سیاسی یا معاشی اسباب کی وجہ سے انجام دیتے تھے۔

مصدق یا عامل صدقات کے عہدہ پر تقرری کے لیے کچھ اوصاف درکار تھے اور کچھ شرائط کو پورا کرنا لازمی تھا۔ سب سے بڑا وصف تو بلا ریب صلاحیت و لیاقت تھی۔ علاقۂ تقرر کے جغرافیائی اور قبائلی حالات سے واقفیت بھی ایک اہم شرط ہو سکتی تھی اس کے علاوہ کسی حد تک اس علاقے کے لوگوں سے دوستی، تعارف اور قربت یا قرابت بھی اس عہدے پر تقرری کی سفارش کر سکتی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ سب سے اہم شرط یہ تھی کہ کردار بیداغ، اخلاق بلند، حرص و طمع سے دور اور عہدے کے لالچ سے آزاد ہو۔ عاملِ صدقات ہونے کی ایک اہم شرط یہ بھی تھی کہ رسول کریم صلّی اللہ علیہ وسلم کے خاندان بنی ہاشم سے عہدہ دار یا امیدوار کا تعلق نہ ہو۔ چند مثالوں سے ان شرائط و اوصاف کا تاریخی ثبوت بھی مل جائے گا۔ ایک بار حضرت ابوموسٰی اشعری کے ساتھ دو شخص خدمتِ نبویؐ میں حاضر ہوئے اور اُنھوں نے آپ سے مصدق کے عہدے پر تقرری کی درخواست کی۔ رسولِ کریم صلّی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوموسٰی اشعری کی اس باب میں رائے مانگی تو انھوں نے عرض کیا کہ وُہ نہیں جانتے تھے کہ وُہ دونوں حضرات اس نیت سے آپ کے پاس آئے ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں امیدواروں کی درخواست تقرری رد کر دی اور فرمایا کہ "ہم ان لوگوں کو عُہدے نہیں دیتے جو ان کے طالب ہوتے ہیں۔" اس روایت کا دلچسپ حصّہ یہ ہے کہ کچھ مدّت کے بعد حضرت ابوموسٰی اشعری کو بلا طلب یمن کے ایک بڑے علاقے کا والی مقرر کر دیا گیا جس کے فرائض میں صدقات کی وصولیابی بھی شامل تھی۔[۲۴۱] ذکر آچکا ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رشتہ داروں کو مصدق کے عہدے پر مقرر کرنے کو غیر قانونی اور ناجائز قرار دے دیا تھا اور اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ یہ پرمنفعت یا باتنخواہ عہدہ تھا اور اس کی تنخواہ دراصل صدقات ہی کا ایک حصّہ ہوتی تھی۔ رسولِ کریم صلّی اللہ علیہ وسلم نے صدقات کی رقم سے حاصل ہونے والی تنخواہ کو "دَنَس" (گندگی) اپنے خاندان والوں کے لیے اس لیے قرار نہیں دیا تھا کہ آپ ان کے لیے کسی امتیازی سماجی سلوک کے قائل تھے بلکہ اس کی اصل

حکمت یہ تھی کہ آپ اس " پرمنفعت عہدے " کا دروازہ اپنے خاندان والوں پر بند کرنا چاہتے تھے تاکہ آئندہ کی حکومتوں کو کان ہو جائیں اور دُوسری جانب آپ کے خاندان والے (اھل البیت) مادی فوائد کے حصول کی خاطر حکومتی عہدوں کے پیچھے نہ بھاگیں۔ چنانچہ خیبر کی مہم کے دوران یا اس کے کچھ بعد واقدی کے بقول جب حضرات عبدالمطلب بن ربیعہ ہاشمی اور فضل بن عباس ہاشمی نے اپنے والدین کی خواہش و ہمت افزائی پر مصدق یا عامل صدقات کا عہدہ چاہا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی درخواست کو اس بنا پر ٹھکرا دیا کہ وہ " اہل بیت " میں سے تھے۔[۲۳۲] جہاں تک تقرری کے لیے دوسری صلاحیتوں، اوصاف اور شرائط کا تعلق تھا ان کا تصریحاً یا ضمناً ذکر پہلے بھی آچکا ہے اور بعد میں بھی مختلف مصدقین کے ذکر میں آتا رہے گا۔

عام طور پر مآخذ کا رجحان یہ ہے کہ وہ عہد نبوی میں عاملینِ صدقات کی تقرری کا زمانہ اور تاریخ یکم محرم ۹ھ / ۲۰ اپریل ۶۳۰ء بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس روزِ سعید کو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جعرانہ سے اپنی واپسی کے بعد جزیرہ نمائے عرب کے مختلف علاقوں اور قبیلوں کے لیے متعدد مرکزی عاملین صدقات روانہ فرمائے تھے۔[۲۳۳] لیکن جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ عاملین صدقات کی یہ " پہلی تقرری " یا پہلی روانگی نہیں تھی۔ اور ظاہر ہے کہ وہ آخری تقرری بھی نہ تھی۔ مورخین نے اس سے عموماً یہ تاثر لیا ہے کہ محصلین کی یہ پہلی تقرری تھی ظاہر ہے کہ تاریخی اعتبار سے یہ تاثر یا دعویٰ غلط ہے کیونکہ اس تاریخ سے بہت پہلے صدقات کے افسر مقرر ہو چکے تھے۔ اس ضمن میں یہ تاریخی حقیقت ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ مدنی حیات طیبہ کے دورِ دوم میں جب جب کوئی علاقہ یا قبیلہ اسلامی اُمت یا اسلامی ریاست کا حصہ بنا تب تب مرکزی اور مقامی عاملین صدقات کا تقرر عمل میں آیا تھا۔

اس خیال و حقیقت کی تصدیق طبری کے ایک بیان سے ہوتی ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے امیروں اور صدقات کے عاملوں کو ان تمام علاقوں (البُلدان) میں سے ہر ایک پر مقرر کیا تھا جو اسلام کے دائرۂ کار و حلقۂ اثر میں آگئے تھے (اَوْطاء الاسلام)۔[۲۳۴] ابن سعد اور ان کے استاد واقدی کی مرتب کردہ اس فہرستِ عاملینِ صدقات سے بھی اس کی ضمناً تائید ہوتی ہے جس کے مطابق محرم ۹ھ / اپریل ۶۳۰ء میں وہ بھیجے گئے تھے۔ واقدی کی روایت کے مطابق افسرانِ صدقات اور ان کے علاقے حسب ذیل تھے :[۲۳۵]

۱ - حضرت بریدہ بن حصیب اسلمی	بنو اسلم اور بنو غفار
۲ - حضرت عباد بن بشر اشہلی	سلیم اور مزینہ
۳ - حضرت رافع بن مکیث جہنی	جہینہ
۴ - حضرت عمرو بن عاص سہمی	فزارہ
۵ - حضرت ضحاک بن سفیان کلابی	بنو کلاب وغیرہ
۶ - حضرت بسر بن سفیان کعبی	بنو کعب / خزاعہ
۷ - حضرت ابن اللتبیہ ازدی	بنو ذبیان
۸ - ایک نامعلوم صحابی (بنو سعد بن ہذیم کے فرد)	بنو سعد بن ہذیم

ابنِ سعد نے اپنے استاد کی مذکورہ بالا فہرست کی تائید کرتے ہوئے صرف ایک اور مصدق کا اضافہ کیا ہے۔ چنانچہ ان کے مطابق حضرت عُیینہ بن حصن فزاری کو بنو تمیم کے لیے اسی زمانہ بلکہ اسی دن روانہ کیا گیا تھا۔[۲۳۶] اس فہرست عاملین صدقات سے بعض بڑے دل چسپ نکات روشنی میں آتے ہیں۔ یہ کس قدر دلچسپ اور اہم حقیقت ہے کہ مذکورہ بالا تمام صدقات دہندہ قبیلوں کا تعلق اسلامی ریاست کے مرکزی علاقوں سے تھا۔ ان میں سے غالب اکثریت ان کی تھی جو قدیم مدنی دور کے مسلم تھے۔ اس کے علاوہ بیشتر عاملین صدقات کا تعلق انھیں صدقات دہندہ قبیلوں سے تھا، اگرچہ کچھ "آفاقی" یا "غیر ملکی" بھی تھے۔

طبری کی فہرستِ امیران و عاملینِ صدقاتِ عہدِ نبوی میں جن افسروں کے نام شامل تھے وہ اور ان کے علاقے حسب ذیل ہیں:

۱ - حضرت مہاجر بن ابی امیہ مخزومی	صنعاء
۲ - حضرت زیاد بن لبید بیاضی	حضرموت
۳ - حضرت عدی بن حاتم طائی	طے اور اسد
۴ - حضرت مالک بن نویرہ تمیمی	بنو یربوع / تمیم
۵ - حضرت علاءؓ بن حضرمی	بحرین
۶ - حضرت علی بن ابی طالب ہاشمی	نجران
۷، ۸ - دو گمنام صحابہ کرام	بنو سعد[۲۳۷]

یہ فہرست نہ صرف یہ کہ بہت مختصر ہے بلکہ بعد کے زمانے کی ہے۔ اس کے علاوہ اس میں گورنروں اور مبلغوں کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔

عاملِ صدقات کی حیثیت سے حضرت ولید بن عقبہ اموی کے کردار، کارکردگی اور اسلام پر مآخذ میں بڑی بحث ملتی ہے اور اس کے نتیجے میں قدیم و جدید دونوں مورخین نے کافی غلطیاں کی ہیں۔ مفصل بحث تو کہیں اور کی جا چکی ہے،[۲۳۸] مگر یہاں عاملینِ صدقاتِ نبویؐ کے بیان کے ضمن میں ان کے صحیح تاریخی تناظر میں تقرری اور کارکردگی کا جائزہ لینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ مآخذ کی روایات کا لبِ لباب یہ ہے کہ بنو مصطلق کے اسلام قبول کرنے کے دو سال بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ولید بن عقبہ اموی کو ان پر عاملِ صدقات مقرر کیا۔ ان کی آمد کی خبر جب بنو مصطلق نے سُنی تو وہ ان کے استقبال کے لیے اپنے علاقہ سے باہر نکلے لیکن حضرت ولید ان کو دیکھ کر خوف زدہ ہو گئے اور واپس خدمت نبوی میں سارا ماجرا کہہ سنایا۔ اُنھوں نے غالباً بنو مصطلق کے صدقات روک لینے کا خیال بھی ظاہر کیا تھا۔ ان کی خبر پر اعتماد کر کے مسلمانانِ مدینہ نے بنو مصطلق کے خلاف فوجی کارروائی کرنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ بنو مصطلق کا وفد اپنی معروضات کے ساتھ مدینہ جا پہنچا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فریقین کے بیانات اور معروضات کو بالآخر قبول کر لیا اور پھر بنو مصطلق کی خواہش پر حضرت بشر بن عباد اوسی کو ان کا عاملِ صدقات مقرر کیا جو ان سے صدقات وصول کر کے لائے بھی۔[۲۳۹] روایات میں حضرت ولید پر عمداً "کذب و افتراء" کا الزام لگایا گیا ہے اور سورۂ حجرات کی آیت ۶ میں لفظ فاسق کا مصداق بھی بنایا گیا ہے۔ بنیادی طور سے یہ تمام الزامات تنقید و نقد کے معیار پر کھرے نہیں اُترتے۔ وہ سراسر بعد کی جھوٹی

افواہوں اور اموی دشمن رجحانات کے آئینہ دار ہیں۔[۲۴۰] حضرت ولید بن عقبہ اموی عہد نبوی کے ایک معتمد، پاکردار اور عظیم صحابیِ رسول ہونے کے علاوہ ایماندار عامل صدقات تھے اور ان کی صداقت و بلندیِ کردار کے لئے یہی ثبوت کافی ہے کہ انہوں نے اس واقعہ کے بعد عہد نبوی ہی میں "قضاعہ کے ایک نصف" پر عاملِ صدقات کے فرائض انجام دئے تھے اور بعد میں خلافتِ صدیقی اور عہدِ فاروقی میں اسی نوعیت کے عہدوں پر مسلسل کام کیا تھا۔[۲۴۱]

دوسرے ابتدائی مورخین و سیرت نگاروں میں بلاذری نے عہدِ نبوی کے عاملینِ صدقات کی جو فہرست دی ہے وہ کافی جامع ہے اگرچہ اس کو بھی کسی طرح سے مکمل نہیں کہا جا سکتا۔ بہر حال بلاذری کی روایت کے مطابق مصدقینِ رسول اور ان کے علاقے حسب ذیل تھے:[۲۴۲]

۱۔ حضرت بلال حبشی	مدینہ/اسلامی ریاست کے پھلوں کے صدقات
۲۔ حضرت عباد بن بشر اشہلی	بنو مصطلق/خزاعہ
۳۔ حضرت اقرع بن حابس تمیمی	بنو دارم بن مالک/تمیم
۴۔ حضرت زبرقان بن بدر تمیمی	عوف بن کعب، مقاعس بن عمرو بن کعب، اور الابناء (بنو سعد بن زید مناۃ) نیز کعب بن سعد اور بنو عمرو بن سعد۔
۵۔ حضرت مالک بن نویرہ یربوعی	بنو یربوع بن حنظلہ
۶۔ حضرت عدی بن حاتم طائی	طے اور اسد
۷۔ حضرت عیینہ بن حصن فزاری	فزارہ/غطفان
۸۔ حضرت حارث بن عوف مری	مرہ/غطفان
۹۔ حضرت نعیم بن مسعود اشجعی	اشجع/غطفان، انمار بن بغیض، عبس بن بغیض/غطفان
۱۰۔ حضرت مالک بن عوف نصری	عجز ہوازن (جشم، نصر، سعد بن بکر اور ثقیف بن منبہ)
۱۱۔ حضرت عباس بن مرداس سلمی	بنو سلیم اور بنو مازن
۱۲۔ حضرت عامر بن مالک بن جعفر	بنو عامر
۱۳۔ حضرت الاعجم بن سفیان بلوی	عذرہ، سلامان، بلی اور کلب (حدود شام کے قریب آباد قبیلہ)
۱۴۔ حضرت عبد الرحمٰن بن عوف زہری قریشی	بنو کلب (دومۃ الجندل کے قریب آباد شاخ)
۱۵۔ حضرت بریدہ بن حصیب اسلمی	اسلم، غفار اور جہینہ
۱۶۔ حضرت رافع بن مکیث جہنی	جہینہ
۱۷۔ حضرت ابو عبیدہ بن جراح فہری قریشی	مزینہ، ہذیل اور کنانہ
۱۸۔ حضرت ضحاک بن سفیان کلابی	بنو کلاب

۱۹ - حضرت قُرّہ بن ہبیرہ قشیری — بنو قُشیر اور بنو جعدہ / عامر بن صعصعہ
۲۰ - حضرت سالف بن عثمان بن معتب ثقفی — طائف اور احلاف (ثقیف کے دونوں گروہ)
۲۱ - حضرت علی بن ابی طالب ہاشمی — یمن کے علاقے میں (بطور امیر)

دوسرے مورخین کی فہرستوں کی مانند بلاذری کی فہرست بھی مرکزی اور مقامی عاملین کی مخلوط فہرست ہے صرف حضرت علی کے نام نامی کی شمولیت دُوسری نوعیت کی ہے۔ البتہ یہ نکتہ اہم ہے کہ بلاذری نے اس فہرست میں والیوں یا گورنروں کو شامل نہیں کیا ہے۔ صرف حقیقی عاملینِ صدقات کو ہی شامل کیا ہے۔

بہر حال مذکورہ بالا فہرستہائے عاملینِ صدقات کے علاوہ مآخذ کے صفحات میں دوسرے متعدد مرکزی مصدقینِ رسول کا ذکر جا بجا بکھرا ہوا ہے۔ ابنِ سعد دو عمالِ صدقات کا ذکر کرتے ہیں جن کی تقرری ۱۰ھ / ۶۳۱ء میں کسی وقت ہوئی تھی۔ ان کے نام تھے قضاعی بن عمرو عذری اور عکرمہ بن حفصہ۔ اول الذکر بنو الحارث کے صدقات وصول کرتے تھے اور مؤخر الذکر بُدیل، بُسر اور ان کے حلیفوں کے لیے عاملِ صدقات تھے۔[۲۴۳] طبری کے مطابق حضرت عمرو بن عاص سہمی نے ۹ھ / ۶۳۰ء کے زمانے میں حنین کے علاقوں سے صدقات وصول کئے تھے اور اس کے بعد وُہ قضاعہ کے عاملِ صدقات مقرر ہوئے جو ان کی مستقل تقرری کا علاقہ تھا اور پھر اس کے بعد وہ عارضی طور سے عمان بھی بھیجے گئے تھے۔[۲۴۴] ان کے علاوہ حضرت سنان بن ابی سنان کو ۱۰ھ / ۶۳۱ء میں کسی وقت بنو مالک کا عاملِ صدقات بھی مقرر کیا گیا تھا۔[۲۴۵]

مذکورہ بالا مصدقین کے علاوہ متعدد عاملینِ صدقات کا ذکر صرف اسد الغابہ میں ملتا ہے۔ ان میں سے کچھ کا ذکر ان کے اسمائے گرامی اور منازلِ تقرری کے ساتھ ملتا ہے۔ چنانچہ حضرت کلاب بن امیہ لیثی کو ثقیف کے لوگوں سے ان کے اونٹوں کے عشور کی وصولیابی کے لیے بھیجا گیا تھا۔[۲۴۶] جبکہ حضرت عکرمہ بن ابی جہل مخزومی نے ہوازن کے مالوں پر قانونی ولازمی صدقات کی وصولیابی کی تھی۔[۲۴۷] حضرت ارقم بن ابی ارقم بھی رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک مصدق تھے لیکن ان کے میدانِ عمل کا ذکر مآخذ میں نہیں کیا گیا ہے۔[۲۴۸] حضرت معاویہ بن ابی سفیان اموی کے بارے میں ابنِ اثیر کا اضافہ یہ ہے کہ صحابیِ موصوف نے نہ صرف حضرت وائل بن حجر سے بلکہ تمام اقیالِ حضرموت نے جو رقوم صدقات کی مد میں اپنے لوگوں سے جمع کی تھیں ان کے لانے کے لیے بھیجا گیا تھا۔[۲۴۹] حضرات عبادہ بن صامت اور زیاد بن حنظلہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دو اور عاملینِ صدقات تھے مگر ان کے بھی میدانِ عمل کا کوئی ذکر یا حوالہ نہیں ہے۔[۲۵۰] ان کے علاوہ مآخذ میں دو ایسے افسرانِ صدقات کا بھی ذکر ملتا ہے جنہوں نے اسلامی ریاست کو اپنے ارتداد اور فرائض سے لاپروائی کر کے دھوکا دیا تھا اور بالآخر فتح مکہ کے دن اپنے کیفرِ کردار کو پہنچے تھے۔[۲۵۱]

اسد الغابہ کی مانند اصابہ نے بھی بعض مرکزی اور مقامی عاملینِ صدقات کا ذکر کیا ہے۔ حضرت حنظلہ بن یمان غالباً مرکزی افسرِ صدقات تھے جن کو اپنے قبیلہ ـــ ازد ـــ سے صدقات وصول کرنے پر مامور کیا گیا تھا۔[۲۵۲] کتانی نے کلاعی کی سیرۃ کی بنیاد پر دعویٰ کیا ہے کہ مدینہ منورہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مصدق حضرت عمر بن خطاب عدوی تھے۔ محدث ابو داؤد کا خیال ہے کہ ان کو ان کی خدمات کے عوض کچھ تنخواہ یا معاوضہ (عمالۃ) ملتا تھا۔[۲۵۳] یہ تقریباً یقینی ہے کہ مذکورہ بالا

عاملینِ صدقات کے علاوہ اور بھی کافی تعداد میں مرکزی افسرانِ مالیات تھے کیونکہ مذکورہ بالا تعداد عرب کے قبائل/خاندانوں کی تعداد سے، کہیں کم ہے۔ ابنِ قیم کا یہ تبصرہ دلچسپ بھی ہے اور اہم بھی کہ ہر ایک خاندان/قبیلہ کے لیے ایک مصدق/گورنر/والی تھا۔ اس لحاظ سے یہ موٹی سی حقیقت ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ عہدِ نبوی میں عاملینِ صدقات کی تعداد اتنی تھی جتنی کہ عرب کے مسلم قبائل اور ان کے اہم خاندانوں کی تعداد تھی۔

جب عاملینِ صدقات اپنے اپنے علاقوں سے صدقات لے کر مدینہ منورہ پہنچتے تھے تو ان کا باقاعدہ "محاسبہ" ہوتا تھا۔ اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان سے پورا حساب کتاب لیتے تھے۔ مسلم کی ایک حدیث کے مطابق حضرت ابن اللتبیہ ازدی کو بنو سلیم کا عامل مقرر کیا گیا تھا۔ جب وہ اپنے علاقہ کے صدقات لے کر مدینہ پہنچے تو انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: "یہ آپ کے لیے ہے اور یہ مجھے تحفہ میں دیا گیا ہے۔" آپ نے ان کو سخت سرزنش کی اور فرمایا کہ "اگر تم ایمانداری سے کہو تو تم اپنے باپ کے گھر میں قیام پذیر رہتے اور تمہارا تحفہ تم تک از خود پہنچ جاتا۔" آپ کا مطلب صاف تھا کہ عامل موصوف کو جو کچھ "تحفہ" میں حاصل ہوا تھا وہ دراصل ان کے عہدے کے سبب تھا۔ اس موقع پر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام مسلمانوں کو جمع کر کے ایک خطبہ دیا تھا جس میں آپ نے تمام عاملینِ صدقات کو خاص کر اور دوسرے افسرانِ حکومت کو عام طور سے دورانِ تقرری یا عہدہ نوازی لوگوں سے تحائف وصول و قبول کرنے سے منع فرمایا تھا[۲۵۴] کہ اس سے رشوت کی بو آتی تھی۔ اسی بنا پر حافظ ابن قیم اور دوسرے فقہائے نے یہ نتیجہ بجا طور سے اخذ کیا ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے تمام عاملوں اور افسروں کی آمدنی اور مصارف کا باقاعدہ محاسبہ فرمایا کرتے تھے۔[۲۵۵]

عاملینِ صدقات کی بحث کے اس موڑ پر ان کی تنخواہ کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے جس کو "عمالہ" یا "رزق" کہا گیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بطور مصدق تنخواہ کا ذکر آ چکا ہے اگرچہ اس کی مقدار کا کوئی حوالہ نہیں ملتا ہے۔ محدثین و مورخین نے اس موضوع پر پوری پوری فصلیں مخصوص کی ہیں۔ بہرحال اصولِ اسلامی یہ تھا کہ "جو کوئی ہمارے عامل کے بطور کام کرے اس کو اجازت ہے کہ وہ اپنے اور اپنی بیوی کے مصارف کے لیے ضروری اور روا جب رقم لے لے اور اگر وہ کوئی نوکر یا غلام رکھتا ہے تو اس کے اخراجات کے لیے بھی ضروری رقم لے سکتا ہے۔ اگر کسی کے پاس مکان نہ ہو تو اس کے مصارف کے لیے بھی وہ رقم لے سکتا ہے۔ مگر جو کوئی اپنی جائز ضروریات سے زیادہ رقم لیتا ہے وہ غبن (غل) کا مرتکب ہوتا ہے۔"[۲۵۶] ذکر آ چکا ہے کہ قرآنِ کریم کی آیت کے مطابق عاملینِ صدقات کی تنخواہ کی ادائیگی صدقات کی جمع شدہ رقوم ہی سے کی جاتی تھی۔[۲۵۷] بہرحال مآخذ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عمال کی تنخواہ کے دو طریقے تھے، اول یہ کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس کسی عامل کو اس کی تنخواہ عطا فرماتے تھے جیسا کہ حضرت عمر کے معاملہ میں ہوتا ہے۔ اور دوسرے یہ کہ عاملینِ صدقات کو اختیار تھا کہ وہ اپنی ضروریات کے لیے رقم خود لے لیں اور پھر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حساب پیش کر دیں۔ آپ اکثر تمام عاملین کے جائز اخراجات کی تصدیق و توثیق کر دیتے تھے مگر بعض معاملات میں جہاں آپ کو گمان ہوتا تھا کہ زاید از ضرورت صرف کیا گیا ہے ان کے مصارف کو صحیح تسلیم کرنے سے انکار کر دیتے تھے جیسا کہ حضرت ابن اللتبیہ ازدی کے معاملہ سے واضح ہوتا ہے۔ ابنِ سعد نے بعض

منافی منتظمین اور عاملینِ صدقات کے سلسلہ میں بیان کیا ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو جوائز (انعامات) عطا فرمائے تھے۔ غالباً یہ انعامات ان کی خدمات کے عوضانہ تھے۔ اگر یہ خیال صحیح ہے تو عاملینِ صدقات کی تنخواہوں کا ایک موٹا سا اندازہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت قیس بن حصین مذحجی کو ½ ۱۲ اوقیہ چاندی عطا کی گئی تھی[۲۵۸] جبکہ ایک دوسرے عامل کو جو نجران کے علاقے سے آئے تھے دس اوقیہ چاندی کا انعام ملا تھا۔ موصوف نے حضرت خالد بن ولید مخزومی کی یمن میں کافی معاونت کی تھی اور انھیں کے ساتھ مدینہ آنے پر ان کو انعام سے نوازا گیا تھا۔[۲۵۹] جنوبی عرب کے ایک اور عاملِ صدقات حضرت فروہ بن مسیک مرادی کو جنہوں نے مراد، زبید بلکہ پورے قبیلہ مذحج سے صدقات وصول کرنے میں حضرت خالد بن سعید اموی کی مدد کی تھی بارہ اوقیہ چاندی کے علاوہ ایک عمدہ اونٹ اور ایک شاندار قبا بھی عطا کی گئی تھی۔[۲۶۰] ان ٹھوس مثالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ مصدقین و عاملینِ صدقات کو ان کی خدمات کے عوض کافی انعام و اکرام اور تنخواہ سے نوازا جاتا تھا۔ بہرحال اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ وہ ریاست اسلامی کے باتنخواہ افسر تھے۔

معلوم و معروف مرکزی عاملینِ صدقات کے قبائلی تجزیے سے بعض اہم نکات روشنی میں آتے ہیں۔ ضمیمہ میں مذکورہ ۲۸ مرکزی عاملین صدقات میں سے ایک تہائی کا تعلق قریش کے مختلف خاندانوں سے تھا۔ ان قریشی عمالِ صدقات میں بلاریب حضرت عمرو بن عاص سہمی سب سے اہم اور ممتاز اور صاحبِ لیاقت و صلاحیت نظر آتے ہیں کہ انھوں نے ابتدائے تقرری سے وفات نبویؐ تک نہ صرف یہ کہ مستقل طور پر اس عہدے پر کام کیا تھا بلکہ مختلف علاقوں اور قبیلوں میں بڑی کامیابی سے صدقات وصول کئے تھے۔ قریش کے بعد خزرج کا درجہ ہے جس کے تین عاملین نے کارنامے انجام دئے تھے اور امتیاز حاصل کیا تھا۔ اگرچہ اوس کے صرف ایک مصدق حضرت عباد بن بشر کا نام نظر آتا ہے انہوں نے خاصے طویل عرصہ تک اور مختلف علاقوں میں اس عہدے پر کام کیا تھا۔ ازد کے سوا جس کے دو عاملوں کا ذکر ملا ہے باقی تمام قبائل میں سے صرف ایک ایک عامل تھا اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ مرکزی عاملینِ صدقات میں سے اکثریت کا تعلق مرکزِ اسلام یعنی مدینہ منورہ سے تھا جو قطعی فطری تھا۔ جہاں تک علاقائی نمائندگی کا تعلق ہے تو ظاہر ہے کہ سب سے زیادہ نمائندگی مرکزی عرب کے علاقوں کو حاصل تھی ان کے بعد بالترتیب مشرقی اور مغربی قبائل کا درجہ تھا جو اتفاق سے مساوی تھا دوسرے علاقوں کے قبائل کی نمائندگی اس طبقۂ افسرانِ حکومتِ نبوی میں خاصی کم تھی۔ جہاں تک مرکزی عاملینِ صدقات کی سبقتِ اسلام کا تعلق ہے تو بیس فیصد اولین مسلم تھے، دوسرے بیس فیصد کے اسلام کا تعلق آخری مکی عہد یا ابتدائی مدنی زمانہ سے تھا جبکہ باقی ساٹھ فیصد عاملین کے اسلام کا زمانہ صلح حدیبیہ کے آس پاس کا ہے۔ ان تمام نکات کی مزید اور مکمل وضاحت کے لیے آخر میں ایک جدول دی جا رہی ہے:

علاقہ	قبیلہ/خاندان	تقرریاں	عاملین صدقات
مرکزی عرب	۱۔ قریش	۱۰	۹
	(ل) ہاشم	۱	۱
	(ب) امیہ	۲	۲

	(ج) مخزوم	۲	۲
	(د) عدی	۲	۲
	(ہ) سہم	۲	۱
	(و) ادرم	۱	۱
	۲۔ خزرج	۳	۳
	۳۔ اوس	۲	۱
شمالی عرب	۴۔ عذرہ	۱	۱
مشرقی عرب	۵۔ فزارہ/غطفان	۱	۱
	۶۔ کلاب	۱	۱
	۷۔ اسد	۱	۱
	۸۔ قیس عیلان	۱	۱
	۹۔ ثقیف	۱	۱
مغربی عرب	۱۰۔ کنانہ	۱	۱
	۱۱۔ خزاعہ	۱	۱
	۱۲۔ جُہَینہ	۱	۱
جنوبی عرب	۱۳۔ ازد	۲	۲
	۱۴۔ تمیم	۱	۱
میزان	۱۴ قبیلے/خاندان	۲۰	۲۵

(۲) مقامی عاملینِ صدقات

اس طبقے میں صرف ان عاملینِ صدقات کو شامل کیا گیا ہے جن کا میدانِ عمل اور دائرۂ کار ان کے اپنے قبیلوں تک محدود تھا عموماً یہ افسرانِ صدقات اپنے قبیلہ والوں سے خود صدقات وصول کر کے مرکزی عاملین صدقات کے حوالے کرتے تھے۔ لیکن اس امکان سے بھی قطعی طور پر قطع نظر نہیں کیا جا سکتا کہ وہ مرکزی عمال کی صدقات کی براہِ راست وصولیابی میں مدد کرتے ہوں۔ مآخذ عموماً ان مقامی عاملین کے فرائض کی انجام دہی اور عہدے کے بیان کے لیے سکہ بند فقرہ علیٰ صدقاتِ قومہ (اپنی قوم کے صدقات پر مقرر کیے گئے تھے) استعمال کرتے ہیں۔ یہ حقیقت ذہن نشین رکھنے کی ہے کہ ان مقامی عاملین میں سے اکثر و بیشتر اپنے اپنے قبیلوں/خاندانوں کے سرداروشیوخ ہوتے تھے یا اپنے قبیلوں کے مسلمانوں کے مرکزی جانب سے مقرر کردہ سردار

ہوتے تھے۔ اس حقیقت کے پیش نظر ان تمام افسروں کو بھی مقامی عاملین صدقات کے طبقہ میں شمار کرنا چاہیے جن کا ذکر ہم نے مقامی منتظمین میں کیا ہے کیونکہ ان کے من جملہ فرائض میں صدقات کی وصولیابی اور مرکز ریاست اسلامی کو ان کی ادائیگی بھی تھی۔ مرکزی منتظمین کی مانند مقامی عاملین صدقات بھی مستقل عہدہ داران حکومت تھے۔ ان کی مدت عہدہ تاحیات ہوتی تھی یا دوسرے الفاظ میں اس وقت تک ہوتی تھی جب تک ان کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی و اعتماد حاصل رہے۔ شاذ و نادر ہی کسی مصدق کو آپ نے اس کے عہدے سے برطرف کیا تھا۔

مآخذ تمام مقامی عاملین صدقات کا صریح ذکر نہیں کرتے ہیں تاہم ان میں اتنا اس موضوع پر مواد مل ہی جاتا ہے جس سے بہ بخوبی واضح ہوتا ہے کہ صدقات و محاصل کی وصولیابی کے ضمن میں درجہ بند نظام موجود تھا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مطالعہ کو ہم علاقائی ترتیب سے کریں تاکہ ایک طرف تو ہم کو مقامی عاملین صدقات کی کارکردگی کا بھی بخوبی علم ہو تو دوسری جانب یہ حقیقت بھی اُجاگر ہو سکے کہ کس طرح تمام عرب قبائل اور خاندان اسلام اور اسلامی ریاست کے انتظامی اور مالی نظام کے دائرۂ کار میں لائے گئے تھے اگرچہ اس مطالعہ میں بعض مباحث کی تکرار اور بعض معاملات میں تبادل کا خطرہ بھی پایا جاتا ہے۔

خزاعہ کے تین قبیلے یا خاندان اپنے صدقات اپنے مرکزی اور مقامی عاملین کے توسط سے ادا کرتے تھے۔ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ حضرت بریدہ بن حصیب اسلمی اسلم اور غفار کے قبیلوں کے صدقات وصول کرکے مدینہ پہنچاتے تھے۔ یہ حقیقت دلچسپ ہے کہ اسلم اگرچہ خزاعہ کا ایک حصہ تھا مگر غفار کا تعلق کنانہ سے تھا۔ ان دونوں کو ایک مالی نظام میں یا ایک مرکزی عامل صدقات کے دائرہ کار میں اس لیے شامل کیا گیا تھا کہ وہ دونوں نہ صرف یہ کہ اچھے اور قریبی پڑوسی تھے بلکہ حلف کے تعلقات زمانہ قدیم سے رکھتے تھے۔ واقدی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلم کے ایک سربرآوردہ شخص نے غزوۂ حنین (بلکہ فتح مکہ) سے قبل اپنے تمام واجب الادا صدقات حضرت بریدہ بن حصیب اسلمی کے حوالے کر دئے تھے۔ اور یہی اس کے ایمان کی دلیل ٹھہری تھی[۲۶۱]۔ جہاں تک ٹھوس تاریخی مثال کا تعلق ہے تو اسلم کے صدقات ادا کرنے کی یہ اکلوتی مثال ہے جو اب تک دستیاب ہو سکی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ حضرت بریدہ بذاتِ خود یا اسلم کا کوئی اور شخص مقامی عامل بھی رہا ہو۔ اسی طرح بنو کعب کے مقامی عامل کا واضح ذکر نہیں ملتا حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ قریش / عدی نے حضرت بُسر بن سفیان ان کے صدقات بطور مرکزی عامل کے وصول کرتے تھے۔ خوش قسمتی سے بنو مصطلق کے بارے میں ہم مرکزی اور مقامی دونوں مصدقین کا واضح حوالہ پاتے ہیں۔ مآخذ کے مطابق حضرت عباد بن بشر ان کے مرکزی مصدق تھے اور حضرت حارث بن ضرار جو ان کے قبائلی سردار تھے ان کے مقامی عامل صدقات تھے اور وہ اپنے قبیلہ والوں سے صدقات وصول کرکے مرکزی عامل کے حوالے کرتے تھے۔ اسد الغابہ کا بیان ہے کہ حضرت حارث خزاعی نے زکوٰۃ سمیت تمام صدقات اپنے قبیلہ والوں سے وصول کرکے اپنے قبیلہ کے پہلے مرکزی عامل صدقات کے حوالے کرنے کی ذمہ داری لی تھی[۲۶۲]۔ لیکن جب پہلے مصدق حضرت ولید بن عقبہ اموی مذکورہ بالا اسباب سے ان کے قبیلے تک نہیں پہنچ سکے تو حضرت عباد بن بشر نے ان سے صدقات وصول کئے تھے۔

جہاں تک معلومات ہو سکی ہیں کنانہ کے قبیلہ کے مقامی عاملین صدقات کا ذکر نہیں مل سکا ہے اگرچہ ہم کنانہ اور غفار دونوں

سے ایک مرکزی مصدّق کے صدقات وصول کرنے سے واقف ہیں۔ بہرحال یہ فرض کرنا حقیقت کے خلاف ہرگز نہ ہوگا کہ کنانہ کے مختلف خاندان جیسے ضمرہ، لیث، دئل، مدلج، بکر بن عبد مناۃ اور حارث بن عبد مناۃ کے مقامی عاملین تھے جن کے ذریعہ وہ صدقات مرکزی عاملین کے حوالے کرتے تھے جیسا کہ حضرت عثمان بن عمرو دئلی کے واقعہ سے ثابت بھی ہوتا ہے۔(۲۶۳)

جُہینہ کے بارے میں ہم ذرا قطعیت کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ان میں مرکزی اور مقامی دونوں عاملین صدقات تھے۔ روایات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دو حقیقی بھائی حضرات رافع بن مکیث اور جندب بن مکیث بالترتیب مرکزی اور مقامی عامل تھے۔(۲۶۴) قبیلۂ مزینہ کے بارے میں روایت یہ ملتی ہے کہ وہ اپنے تمام صدقات مدینہ منورہ سے بھیجے گئے عاملِ صدقات کو ادا کرتا تھا۔ اس کے مقامی مصدقین کا کوئی ذکر نہیں ملتا ہے۔ مآخذ قبیلہ ازد کے دو عاملینِ صدقات کا ذکر کرتے ہیں مگر یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ان کا تعلق ازدِ شنوءہ سے تھا یا ازدِ یمن سے۔ بہرحال یہ قطعیت کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت سعد بن ابی ذباب دوسی (جن کا تعلق حجاز کے دوسی بطن سے تھا) ایک مقامی مصدّق تھے جو اپنے قبیلہ والوں کے صدقات وصول کرتے تھے اور ریاست اسلامی کے مرکز کو برابر پہنچاتے تھے انھوں نے یہ خدمت صرف عہدِ نبوی ہی میں نہیں انجام دی بلکہ حضرات ابوبکر صدیق اور عمر فاروق کے زمانۂ خلافت میں بھی انجام دی تھی۔(۲۶۵)

طے کے مقامی عاملِ صدقات حضرت عدی بن حاتم طائی رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اہم اور ممتاز عمال میں سے تھے۔ حضرت عدی اپنے اسلمی ہم عہدہ کی مانند اپنی قوم طے کے صدقات کے علاوہ اپنے قریبی پڑوسیوں بنو اسد/ خزیمہ کے صدقات کے بھی عامل تھے۔(۲۶۶) اس لحاظ سے وہ مرکزی عاملِ صدقات بھی تھے۔ ابن اثیر کے مطابق انھوں نے خلافتِ فاروقی کے زمانے تک یہ خدمت شاندار طریقے سے انجام دی تھی۔ بنواسد کے ایک اور عامل صدقات حضرت قضاعی بن عمرو تھے جو نہ صرف ان کے صدقات وصول کرتے تھے بلکہ ان کے علاقے میں مرکزی منتظم بھی تھے۔(۲۶۷) مآخذ کی ان شہادتوں سے معلوم یہ ہوتا ہے کہ حضرت قضاعی بن عمرو مرکزی عامل تھے جبکہ حضرت عدی بن حاتم طائی مقامی مصدّق تھے۔ کتانی نے ایک روایت بیان کی ہے کہ حضرت کافر بن سبیع الاسدی اپنی قوم کے صدقات پر مقرر کیے گئے تھے۔(۲۶۸) مجموعۃ الوثائق میں ایک دستاویز ہے جس کے مطابق بلی کا ایک خاندان بنی جُعیل متعدد مشرقی قبیلوں جیسے نصر، سعد بن بکر، ثمالہ اور ہذیل کے سِعَایۃ (صدقات کی وصولیابی) کا ذمہ دار بنایا گیا تھا۔ وہ حضرات جو ان کی وصولیابی اور اس کے نتیجہ میں اس سے مالی فائدہ کے مستحق تھے حسب ذیل تھے:

حضرات عاصم بن ابی صیفی، عمرو بن ابی صیفی، الاعجم بن سفیان اور علی بن سعد۔(۲۶۹)

ان میں سے حضرت الاعجم بن سفیان کے بارے میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ وہ یکے از عمالِ رسول تھے۔ کتانی نے ایک اور روایت اصابہ کی سند پر بیان کی ہے کہ حضرت کہل بن مالک ہذلی اپنے قبیلہ ہذیل کے صدقات کے عامل تھے۔(۲۷۰)

مشرقی قبیلوں میں ہوازن کی بعض اہم شاخوں جیسے فہم، ثمالہ، سلمہ وغیرہ جن کو عجز ہوازن بھی کہا جاتا تھا کے عامل صدقات حضرت مالک بن عوف نصری تھے جو ہوازن کے عظیم سرداروں میں سے ایک تھے۔ جہاں تک ہوازن کے اور بطون اور خاندانوں کا تعلق ہے تو ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں کہ متعدد قبیلوں جیسے کلاب، عامر بن صعصعہ، ثقیف اور احلاف پر مرکزی عاملین صدقات

مقرر کئے گئے تھے اور قیاس یہ کہتا ہے کہ ان کے مقامی عاملین بھی تھے۔ کتانی کا بیان ہے کہ حضرات مرداس بن مالک اور خزیمہ بن ناصم کو بنوغنی/ قیس عیلان اور الاحلاف کا مقامی عامل مقرر کیا گیا تھا۔[۲۷۱] حضرت عباس بن مرداس سلمی کے علاوہ جو کہ مرکزی مصدق تھے حضرت ہیثم اسدالغابہ کے بیان کے مطابق سلیم کے مقامی مصدق تھے۔[۲۷۲] قبیلۂ غطفان جو عددی لحاظ سے کافی بڑا اور طاقتور قبیلہ تھا اپنے مختلف بطون اور خاندانوں کے لیے عمالِ صدقات کی ایک پُوری جماعت رکھتا تھا چنانچہ اشجع، فزارہ، مُرّہ، ثعلبہ، انمار اور عبس و ذبیان وغیرہ کے متعدد مقامی عاملین صدقات تھے۔

شمالی قبائل عذرہ، سلامان، بلی اور کلب کے بارے میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ وُہ اپنے صدقات مرکزی عاملین صدقات کو ادا کرتے تھے۔ یہی حال سعد ہذیم کا بھی تھا۔ جہاں تک ان کے مقامی مصدقین کا تعلق ہے تو ذکر ملتا ہے کہ عذرہ کے عامل حضرت ہوذہ بن نعمان اپنے قبیلہ کے مقامی افسر تھے اور ایک بار خود رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنے قبیلہ کے صدقات لے کر مدینہ پہنچے تھے۔[۲۷۳] سعد ہذیم کے دو مرکزی عاملین صدقات حضرات ابی بن کعب اور عنبسہ کا ذکر پہلے ہی آ چکا ہے۔ یہ بھی ہم دیکھ چکے ہیں کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف زہری دومہ کے بنوکلب کے مرکزی عامل تھے تو ان کے شیخ قبیلہ حضرت امرؤ القیس جو ابن الاصبغ کلبی کے نام سے زیادہ معروف ہیں مقامی محصل تھے۔ موخر الذکر کے شرف کی بات ہے کہ انہوں نے نہ صرف عہدِ نبوی میں یہ خدمتِ عظیم انجام دی تھی بلکہ رِدّہ کے پُر آشوب دا ابتلا کے زمانے میں بھی پُوری ایمان داری سے صدقات وصول کر کے مدینہ منورہ پہنچاتے رہے تھے۔[۲۷۴] اسدالغابہ کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ متعدد قبیلوں کے گروہِ قضاعہ کے لئے متعدد عمالِ صدقات کا تقرر کیا گیا تھا۔[۲۷۵] اس خیال کی تائید اس امر سے ہوتی ہے کہ قضاعہ کے ایک خاندان بنوقین کا مصدق حضرت عمرو بن حکم کو بتایا گیا ہے۔[۲۷۶] مجموعۃ الوثائق کی ایک دستاویز کے مطابق لخم کے ایک خاندان حدس کو اپنی زکوٰۃ اور دوسرے محاصل کی رقوم کی ادائیگی کی ہدایت کی گئی تھی۔[۲۷۷] ظاہر ہے کہ یہ ادائیگی ایک مقامی عاملِ صدقات کے ذریعہ ہوئی تھی۔ اسی طرح کا معاملہ غسان کے ایک خاندان بنوثعلبہ کے ساتھ کیا گیا تھا جب ان کو زکوٰۃ اور خمس وغیرہ کی ادائیگی کا حکم دیا گیا تھا۔[۲۷۸] ان شہادتوں سے صراحتاً نہ سہی تو مضمراً یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان قبیلوں میں مقامی عاملینِ صدقات موجود تھے۔

جیسا کہ ہم گزشتہ بحث میں دیکھ چکے ہیں کہ جنوبی عرب کے لیے متعدد مرکزی عاملینِ صدقات مقرر کئے گئے تھے۔ عام طور سے وُہ سب کے سب مختلف علاقوں اور ولایات کے والی اور مرکزی منتظمین تھے جن کے فرائض منصبی میں صدقات کی وصولیابی بھی شامل تھی۔ چنانچہ الجند، صنعا، عک، اشعر، کندہ (سکاسک، سکون، معاویہ) نجران، جرش، بنوحارث، زبید، رمع، عدن، ساحل مغرب اور حضرموت اور ان کے ماتحت علاقے اپنے اپنے مرکزی عاملین کو بالآخر صدقات ادا کرتے تھے لیکن یہ ادائیگی ان کے مقامی عاملوں کے ذریعہ ہوتی تھی اگرچہ زیادہ تر معاملات میں اس کا صریح ذکر نہیں ملتا ہے۔

دراصل تمام مقامی منتظمین اور قبائلی سردار مقامی مصدقین بھی ہوتے تھے جو اپنے لوگوں سے صدقات وصول کر کے مرکزی عاملین تک پہنچاتے تھے۔ جنوبی عرب کے ضمن میں یہ بیان اور بھی بجا طور پر منطبق ہوتا ہے۔ چنانچہ مقامی منتظمین پر گزشتہ بحث سے یہ امر کہ ان مقامی سرداروں کا سب سے اہم فریضہ صدقات کی اپنے علاقوں سے وصولیابی اور مرکزی نمائندوں کی ان کی

حوالگی تھا پوری طرح سے ثابت ہوتا ہے۔ یہاں صرف ان قبائل اور "اقوام" کے نام گنا دینا کافی ہوگا جن کے سرداروں کا ذکر صراحتاً ملتا ہے جو حسب ذیل تھے :

خولان، ازد جرش، بنو خارف/ ہمدان، بنو بجیلہ/ ہمدان (اس بطن کو بنو ناعز بھی کہا جاتا تھا)، مراد، جرش بنو حارث بن کعب/ مذحج، مرّان، حریم اور کلاب اور ان کے "موالی"، بنو ارحب/ ہمدان، رُہا، صُداء، کندہ اور حضر موت۔

مجموعۃ الوثائق میں بعض بڑے دلچسپ خطوط و دستاویزات ہیں جو جنوبی عرب میں مقامی عاملینِ صدقات کی موجودگی پر کافی اہم روشنی ڈالتی ہیں۔ ایک دستاویز کے مطابق حضرت مطرف بن کاہن باہلی کو ان کے قبیلہ کی اس شاخ کا عامل مقرر کیا گیا تھا جو بیشہ نامی مقام پر آباد تھی۔[۲۷۹] ان کے لوگوں کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ مذکورہ بالا مصدق کو اپنے مویشیوں کی زکوٰۃ ادا کریں۔ حضرت نہشل بن مالک باہلی کے نام گرامی نامۂ نبوت میں صاف تصریح کی گئی ہے کہ ان کے قبیلہ والے اپنی زکوٰۃ اور خمس وغیرہ اپنے قبائلی عامل کے سپرد کر دیں۔[۲۸۰] بنو حارث اور بنو نہد کے لوگوں کو حضرت قیس بن حصین کے ذریعہ تحفظ کی ضمانت دی گئی تھی بشرطیکہ وہ اپنے اموال میں زکوٰۃ وغیرہ صدقات وقت پر ادا کر دیا کریں۔[۲۸۱] اسی طرح حضرت طہفہ اور ان کی قوم کو جن کا تعلق نہد سے تھا زکوٰۃ اور دوسرے صدقات ادا کرنے کی ہدایت کی گئی تھی[۲۸۲] اور تمام معاملات میں مقامی مصدقین کی موجودگی اور کارکردگی سامنے کی بات ہے۔

خثعم کے بارے پہلے ہی یہ ذکر آچکا ہے کہ وہ عشر اور نصف العشر ادا کیا کرتے تھے۔[۲۸۳] لیکن اس سے زیادہ نمائندہ اور دلچسپ معاملہ حضرت وائل بن حجر حضرمی کا ہے جو حضر موت کے اقیال (شہزادوں اور حکمرانوں) میں سے ایک تھے۔ مرکزی منتظم اور والی حضرت مہاجر بن ابی امیہ مخزومی کے نام رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک گرامی نامہ میں حضرت وائل کی دوسرے اقیالِ حضر موت کے مقابلے میں حیثیت و مرتبہ کا تعین ملتا ہے۔ چنانچہ ان کو ہدایت دی گئی تھی کہ وہ دوسرے اقیال سے تمام صدقات وصول کر کے مرکزی منتظم کے حوالے کر دیں۔[۲۸۴] اس کی مزید تصدیق دوسرے دو خطوط نبوی سے ہوتی ہے جن میں ان کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ اقیال سے زکوٰۃ، مویشیوں پر صدقہ، پیداوار پر عشر اور سیوب (پانی بہنے کی جگہیں) پر خمس (نصف العشر) وصول کر کے ایک اور مرکزی عامل حضرت معاویہ بن ابی سفیان اموی کے حوالے کریں جن کو خاص اسی مقصد سے مدینہ منورہ سے ان کے ساتھ بھیجا گیا تھا۔[۲۸۵]

قبائل پراگندہ عرب میں تمیم کا معاملہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے منفرد بھی ہے اور نمائندہ بھی۔ اس کے کم از کم سات مختلف بطون/ خاندانوں کے مقامی عاملین صدقات کا ذکر ہم مآخذ میں پاتے ہیں۔ ان عاملین صدقات کے اسمائے گرامی مع ان کے میدان ہائے عمل کے یہ ہیں :

(۱) حضرت قیس بن عاصم بنو سعد/ تمیم کے لیے

(۲) حضرت زبرقان بن بدر بنو سعد کے ایک اور خاندان کے لیے

(۳) حضرت مالک بن نویرہ بنو حنظلہ کے لیے

(۴) حضرت سہل بن منجاب (۵) حضرت صفوان بن صفوان (۶) متمم بن نویرہ اور (۷) حضرت غاضرہ بن سمرہ بنو تمیم کے مختلف خاندانوں (اپنے اپنے بطون) کے لیے تھے۔[۲۸۶]
ایک اور مقامی عامل صدقات حضرت خزیمہ بن عاصم تھے جو اپنے قبیلہ بنو عوف / وائل بن بکر سے صدقات وصول کرتے تھے۔[۲۸۷]
مجموعۃ الوثائق میں شامل ایک دستاویز سے معلوم ہوتا ہے کہ قبیلہ عبدالقیس کے ایک سردار حضرت اکبر بن عبدالقیس اپنے قبیلہ کے علاوہ ازدِ عمان سے صدقات وصول کر کے مرکزی منتظم حضرت علاؑ بن حضرمی کے حوالے کرتے تھے۔[۲۸۸] اگرچہ مہرہ کے قبیلہ میں مقامی عاملین کا ذکر واضح طور سے نہیں ملتا ہے لیکن ان کی موجودگی کا پکا قرینہ اس ہدایت نبوی میں ملتا ہے جس نے اس قبیلہ کے لوگوں کو اسلام کے شرائع (قوانین) کی پابندی بشمول زکوٰۃ و صدقہ عمال کو ادائیگی کی تاکید کی تھی۔[۲۸۹] حضرت ثمامہ بن اثال حنفی کے زیر اقتدار بنو حنیفہ کے طبقات نے ان کے ذریعہ اپنے صدقات ادا کیے تھے جبکہ تغلب / بکر بن وائل کا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے زکوٰۃ (در اصل جزیہ) کا معاہدہ ایک معروف و مشہور حقیقت ہے۔
صدقات و محاصل کی وصولیابی کے نظام کی بحث کے آخر میں یہ جاننا دلچسپی اور اہمیت کا حامل ہوگا کہ اسلامی ریاست کو مختلف ولایات، علاقوں اور قبیلوں سے کس قدر صدقات نقد یا جنس میں حاصل ہوتے تھے۔ بدقسمتی سے اکثر معاملات میں نقد یا جنس کی مجموعی رقم کا کوئی ذکر نہیں ملتا تاہم بعض معاملات میں صراحتاً اور کہیں کہیں مضمراً صدقات کی مالیت کا ذکر آیا ہے۔ بحرین کے بارے میں ذکر آیا ہے کہ اس کے مرکزی منتظم حضرت علاؑ بن حضرمی ایک سال یا ایک بار ستر ہزار درہم کی رقم لے کر مدینہ پہنچے تھے جو اہل بحرین کہا گیا ہے۔[۲۹۰] دوسری صریح مثال تمیم کے قبیلہ بنو سعد کے نصف کے عامل حضرت زبرقان بن بدر کی ہے جو اپنی قوم کے صدقہ کے سات سو اونٹ لے کر ایک بار خدمتِ نبوی میں حاضر ہوئے تھے۔[۲۹۱] نجران کے عیسائیوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو معاہدۂ صلح کیا تھا اس کی رُو سے ان کے جزیہ کی تخمینی رقم / مالیت تقریباً اسی ہزار درہم تھی۔ بظاہر اور اپنی جگہ یہ تمام خاصی خطیر رقمیں معلوم ہوتی ہیں لیکن جب ان کا موازنہ مسلمانوں کے عطیات سے کیا جاتا ہے جو در اصل مسلم معیشت کی پیمائش کا ایک پیمانہ بھی ہے تو ان کی اصل مالیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ صرف ایک مثال کافی ہوگی۔ غزوۂ تبوک کے موقعہ پر حضرت عثمان غنی نے تنہا ستر ہزار درہم کی رقم عطیہ میں دی تھی جو حسنِ اتفاق سے بحرین کے وسیع صوبے اور مملکت کے صدقات کی رقم کے برابر تھی۔ اس موقعہ پر مسلمانوں کے عطیات کی کل رقم بلاذری کی روایت کے مطابق دو لاکھ دس ہزار درہم تھی کیونکہ حضرت عثمان کے عطیہ کو ثلث (⅓) کہا گیا ہے۔ اس موازنہ سے صدقاتِ ولایات کی مالیت کا مکمل نہ سہی ایک موٹا سا اندازہ ضرور ہو جاتا ہے۔

(۳) صدقات کے کاتبین

ابن حزم کی جوامع السیرہ کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حکومت میں دُوسرے شعبوں کی مانند مالی نظام کے مختلف محکموں کا حساب کتاب باقاعدہ رکھا جاتا تھا۔ چنانچہ حضرت زبیر بن عوام اسلامی ریاست کے صدقات کے کاتب تھے اور وہی سارا حساب کتاب رکھا کرتے تھے۔ ان کی عدم موجودگی میں حضرات جہیم بن صلت اور حذیفہ بن الیمان صدقات کی آمدنی کو

"ان کے رجسٹروں میں لکھا کرتے تھے۔" لیکن قضاعی کی روایت سے انتظامی امور کچھ مختلف معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان کی روایت کے مطابق حضرات زبیر بن عوام اور جہیم بن صلت صدقات کی آمدنی کے کاتب تھے جبکہ حضرت حذیفہ بن الیمان کھجور کی پیداوار کے تخمینے سے متعلق امور کی کتابت و اندراج کیا کرتے تھے۔ ان روایات کو بیان کرنے کے بعد کتانی کا تبصرہ یہ ہے کہ اگر یہ روایات صحیح ہیں اور بظاہر ان کی صحت میں کوئی احتمال وکلام نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ دونوں دیوان (شعبے) عہدِ نبوی ہی میں قائم ہو چکے تھے۔(۲۹۲)

بہر حال سیرت نبوی کے مختلف مآخذ سے یہ قطعی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ انتظامی امور سے تمام معاملات و امور کا خواہ ان کا تعلق فوجی، انتظامیہ سے ہو یا شہری نظم ونسق سے، مالی معاملات سے یا مذہبی امور کے نظام سے، ایک باقاعدہ تحریری ریکارڈ رکھا جاتا تھا۔ اس کی متعدد مثالیں گزشتہ مباحث میں گزر چکی ہیں اور کئی اور کا مطالعہ ہم آگے بھی کریں گے۔

(۴) خرص اور خارص (پیداوار کا تخمینہ اور اس کے افسر)

زمین کی پیداوار پر ہماری بحث میں ان افسرانِ حکومتِ نبوی کا حوالہ آچکا ہے جو خیبر اور دُوسری یہودی بستیوں کے باغات اور کھیتوں کی پیداوار کا تخمینہ لگاتے اور اس کو یہودی کاشتکاروں اور مسلم حصّہ داروں کے درمیان برابر برابر تقسیم کیا کرتے تھے۔ چونکہ عشر، نصف العشر، خراج اور جزیہ (جنس میں) وغیرہ تمام صدقات متناسب محاصل اور صدقات تھے، اس لیے تخمینہ (ASSESSMENT) ناگزیر ہو گیا تھا۔ ایسے پیداواری تخمینے کو مآخذ کی اصطلاح میں "خَرَص" کہا جاتا ہے اور اس کے افسر کو "خارص"۔ کتانی کی خرص کی بیان کردہ تعریف کہ اس سے مراد صرف کھجور کے باغوں (النخل) میں پختہ کھجور (الرُطب) یا تخفظ یا اندازہ (حضر) تھا(۲۹۳) جزوی طور سے صحیح ہے کیونکہ وہ اس کے زمرے سے تمام دُوسری فصلوں کو نکال باہر کرتی ہے۔ دوسری طرف خزاعی کا بیان ہے کہ عہدِ نبوی میں خرص کا تعلق صرف کھجوروں، انگوروں اور اناج کے دانوں (الحبوب) سے تھا اور انھیں پر تخمینہ کے اصول کا اطلاق ہوتا تھا۔(۲۹۴) لیکن یہ تعریف بھی مکمل طور سے صحیح نہیں ہے کیونکہ وہ پیداوار کی تمام قسموں کا احاطہ نہیں کرتی ہے جبکہ عہدِ نبوی میں ہر وہ پیداوار جو ایک خاص نصاب کو پہنچ جائے پیداواری زکوٰۃ یا محصول کے دائرہ میں آجاتی تھی اور اس لحاظ سے وہ خرص کے اصول اور خارص کے میدانِ عمل کی چیز تھی۔

صحیح مسلم کی ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک بار جناب رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفسِ نفیس ایک کھجور کے باغ کی پیداوار کا تخمینہ لگایا تھا۔ اس کا تعلق غزوۂ تبوک کے زمانے سے ہے۔ روایت کے مطابق جب آپ اپنے لشکر کے ساتھ وادی القریٰ کے علاقے میں پہنچے تو آپ کا گزر ایک مسلمان عورت کے ایک کھجور کے باغ پر ہوا۔ آپ نے اپنے بعض اصحاب سے اس کی پیداوار کا تخمینہ لگانے کو کہا اور خود آپ نے اس کا تخمینہ دس وسق لگایا جو بالکل صحیح تھا۔ بعد میں آپ نے اس کے مالکوں کو کھجور کے خوشوں کو شمار کرنے اور محفوظ رکھنے کی اپنی واپسی تک ہدایت دی۔(۲۹۵) روایت یہاں ختم ہو جاتی ہے لیکن اس کے بعد کے واقعات کو قیاس سے بخوبی معلوم کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ قیاس یہ ہے کہ بعد میں ماہرین تخمینہ نے اس کی پیداوار کا اصلی تخمینہ لگایا ہو گا اور اس کی بنیاد پر اس کی زکوٰۃ وصول کی ہو گی۔ چنانچہ اس روایت کی بنیاد پر یہ دعویٰ بھی کیا جا سکتا ہے کہ اسلامی مملکت کے

تمام مسلم اور غیر مسلم باشندوں کی قابلِ کاشت یا زیرِ کاشت اراضی خواہ باغ کی شکل میں ہو یا کھیت کی خرص کے اصول کے ماتحت تھی۔ اور اسی اعتبار سے خارص کے دائرۂ کار اور محاصل کے حلقہ میں بھی تھی۔

ہر معیار اور اصول کے اعتبار سے حضرت عبداللہ بن رواحہ خزرجی ایک عظیم تخمینہ کار افسر (الخرّاص) تھے۔ وہ ہر فصل پر خیبر کی پیداوار کا تخمینہ لگایا کرتے تھے اور اپنے اس عہدۂ عظیم پر وہ غزوۂ موتہ میں اپنی شہادت تک فائز رہے تھے۔ ہمارے مستند مورخین کا اس بات پر اختلاف ہے کہ ان کا جانشین کون ہُوا تھا؟ کچھ کا خیال ہے کہ ان کے بعد خیبر کے خارص کے عہدہ پر حضرت ابوالہیثم بن التیہان اوسی کا تقرر ہوا تھا،[۲۹۶] جبکہ دُوسروں کا خیال ہے کہ حضرت جبّار بن صخر حضرت عبداللہ بن رواحہ کے جانشین بنے تھے۔[۲۹۷] دُوسرے نقطۂ نظر کے مطابق حضرت جبّار بن صخر کے ساتھ خیبر کی پیداواروں کے تخمینے کے کام میں حضرت زید بن سلمہ خزرجی کو بھی کسی اعتبار سے شریک کیا گیا تھا۔[۲۹۸] اسد الغابہ کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرو بن سعید اموی کو خیبر کی پھلوں کی پیداوار کا "خارص" مقرر کیا گیا تھا۔[۲۹۹] اس علاقے کے لیے ایک اور تخمینہ کے افسر (خراص) کا ذکر مآخذ میں ملتا ہے۔ وُہ حضرت ابوحثمہ عامر بن ساعدہ خزرجی تھے جن کو عہدِ نبوی کے آخری زمانے میں اس منصب عظیم پر مقرر کیا گیا تھا اور ان کے سلسلے میں دلچسپ اور اہم امر یہ ہے کہ وہ اس عہدہ پر نہ صرف عہدِ نبوی ہی میں فائز رہے بلکہ پُوری خلافتِ راشدہ میں بھی اس پر قایم و دایم رہے اور حضرت علی کی خلافت کے اواخر میں غالباً اپنے انتقال کے سبب اس سے الگ ہوئے تھے۔[۳۰۰] ریاستی ملازمت میں مدت کے اعتبار سے یہ تقرری طویل ترین مثالوں میں سے ایک ہے جو تیس سال سے زیادہ مدت پر محیط ہے اور یقیناً وہ ایک عظیم انتظامی کارنامہ ہے۔ اس سے صحابی موصوف کی عظیم صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔

اسلامی ریاست کے دُوسرے خطوں میں مدینہ منورہ کی زمین کی پیداوار کا حوالہ بھی مآخذ میں ملتا ہے جو ہمارے مطالعہ میں ایک دلچسپ عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسد الغابہ اور کتانی کے مطابق حضرت فروہ بن عمرو بیاضی خزرجی مدینہ منورہ کی پیداوار کا تخمینہ لگایا کرتے تھے۔ ان کا خاص میدان عمل کھجوروں کے باغ تھے اور دلچسپ امر یہ ہے کہ وُہ اس کے خوشوں کو گن کر پورے باغ کی پیداوار کا تخمینہ لگا لیتے تھے جو حقیقتاً بالکل صحیح ہوتا تھا۔ مآخذ کا دعوٰی ہے کہ وُہ اپنے کام میں اس قدر ماہر تھے کہ ان کا تخمینہ یا اندازہ (حساب) کبھی غلط نہیں ہوا۔[۳۰۱] اس تبصرہ سے مزید یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ عہدِ نبوی میں مدینہ کی پیداوار کے ایک مستقل خراص تھے۔ ایک اور روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سہل بن حثمہ بھی عہدِ نبوی کے خارصوں میں سے ایک تھے مگر ان کے بارے میں یہ ذکر نہیں مل سکا ہے کہ وُہ کہاں اور کیسے اپنے فرائض کو انجام دیتے تھے۔[۳۰۲]

محدث ابو داوٗد نے اپنی ایک حدیث میں بیان کیا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عتاب بن اسید اموی کو مسلمانوں کی انگور کی پیداوار کے تخمینہ کا افسر مقرر کیا تھا۔ وہ کھجوروں کی پیداوار کو بھی ماپتے تھے اور ایک ہی اصول و ضابطہ کے مطابق انگوروں اور کھجوروں کی پیداوار کی زکوٰۃ وصول کرتے تھے۔[۳۰۳] اس روایت کی مزید تشریح بلاذری کی ایک روایت سے ہوتی ہے جس کا بیان ہے کہ صحابی موصوف طائف کے علاقے میں واقع بنو ثقیف کے انگور وغیرہ کے باغوں کی پیداوار کا تخمینہ لگاتے اور ان سے زکوٰۃ وصول کرتے تھے۔[۳۰۴] اس روایت کے مطابق یہ دلچسپ حقیقت ذہن نشین کرنے کے قابل ہے کہ

حضرت عتاب اموی مکہ کے والی تھے لیکن وُہ اپنے پڑوسی علاقے کے خارص (افسرِ پیداوار و مصدق) بھی تھے۔ گویا کہ وہ اسلامی ریاست کے لیے بیک وقت دُہرا کام انجام دیتے تھے۔ لیکن تاریخی تنقید کی کسوٹی پر پرکھنے سے معلوم یہ ہوتا ہے کہ بلاذری کو کچھ تسامح ہوا ہے۔ حضرت عتاب اموی یقیناً طائف اور اس کے مضافات میں واقع باغوں اور کھیتوں وغیرہ کی پیداوار کے افسر تھے مگر یہ پیداوار بنو ثقیف کی نہیں تھی بلکہ مکہ مکرمہ کے مالدار تاجر قریشیوں کی تھی جو اس علاقے میں بہت سی پیداواری زمین رکھتے تھے دراصل حضرت عتاب کا دائرۂ کار مکہ مکرمہ اور اس کے باشندوں کی جائدادیں تھیں خواہ وہ مکہ کے حدود میں واقع ہوں یا طائف اور دُوسرے مضافات کے علاقے میں۔

مآخذ میں دو اور "خارصوں" کا ذکر ملتا ہے۔ ان کے اسمائے گرامی تھے حضرات ابوزید بن الصلت اور الصلت بن معدی کرب۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ دونوں کا تعلق جنوبی عرب کے قبیلہ کندہ سے تھا۔(۳۰۵) غالباً دونوں اپنے اپنے مقامی علاقوں یا قبیلوں میں کام کرتے تھے کیونکہ مآخذ میں ان کے دائرۂ کار کے بارے میں کوئی ذکر نہیں ہے۔ جنوبی عرب میں زمین کی پیداوار کے تخمینہ اور اس کے افسروں (خارصوں) کے بارے میں ہماری معلومات کافی تشنہ ہیں لیکن مذکورہ بالا حقائق و شواہد اس نظریۂ خیال کے ثبوت کے لیے کافی ہیں کہ اسلامی مملکت کے دوسرے خطوں کی مانند جنوبی عرب میں بھی تمام قابلِ کاشت یا زیرِ کاشت اراضی کا تخمینہ لگایا جاتا تھا اور اس تخمینہ کی بنیاد پر پیداواری صدقات مقرر کیے جاتے تھے۔ اس فرض کی انجام دہی کے لیے یا تو مدینہ منوّرہ سے مرکزی افسرانِ خرص و تخمینہ روانہ کیے جاتے تھے یا مقامی "خارصین" کی تقرری کی جاتی تھی۔ قیاس یہ کہتا ہے کہ جنوبی عرب کے مختلف علاقوں کے والی اپنے اپنے علاقوں کے لیے مقامی خارصین مقرر کرتے تھے اور انھیں کے ذریعہ پیداوار کا تخمینہ لگایا جاتا تھا اور پھر اس کی بنیاد پر صدقات وصول کیے جاتے تھے۔

مذکورہ بالا دس "خارصین" کی علاقائی و قبائلی تحلیل سے واضح ہوتا ہے کہ ان کی غالب اکثریت یعنی تقریباً ساٹھ فیصد کا تعلق مدینہ کے انصاری قبیلہ خزرج سے تھا۔ اس سے یہ قیاس کرنا جائز ہو جاتا ہے کہ اس انصاری قبیلے کے لوگ اچھے کاشتکار اور ماہر تخمینہ کار تھے باقی پانچ میں سے دو کا تعلق قریش کے تاجر قبیلے سے تھا۔ اس حقیقت سے صحیح بخاری کی اس روایت کی مزید تصدیق ہوتی ہے جس کے مطابق مہاجرینِ مکہ یعنی قریشِ مکہ میں سے کافی تعداد میں لوگ زراعت میں لگ گئے تھے۔ دو اور کا تعلق قبیلہ کندہ سے تھا جو یمن کے زرخیز علاقہ میں آباد تھا جبکہ آخری خارص کا تعلق قبیلہ اوس سے تھا۔ حضرت عمرو بن سعید اموی کے سوا جو ابتدائی مکی مسلم تھے باقی خارصین کا تعلقِ اسلام مکہ کے آخری زمانے یا مدینہ کے زمانے سے تھا۔ آخر میں یہ اعتراف لازمی معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست کے عہدِ نبوی میں خارصین کی جتنی حقیقی تعداد تھی اس کا عشرِ عشیر بھی مآخذ میں مذکور نہیں ہوا ہے۔ لہٰذا خارصین کی مذکورہ بالا تعداد کو ہی مکمل نہ سمجھا جائے۔ ان کی اصل تعداد بلا ریب اس سے کئی گنا زیادہ تھی۔

(۵) حمیٰ (چراگاہ) کا نظام اور اس کے افسر

زرعی نظام میں آخری طبقۂ عمالِ حکومتِ نبوی ان افسروں پر مشتمل تھا جو ریاستی چراگاہوں کے محافظ تھے۔ "حمیٰ" کے لفظی معنی محافظت، دفاع یا محفوظ علاقہ کے ہیں لیکن اصطلاحی معنی محفوظ چراگاہ کے آتے ہیں۔ غالباً یہ معنی اس سبب سے اس کے ہوئے کہ ہر قبیلہ / خاندان کی چراگاہ زمانۂ ماقبل اسلام میں محفوظ و مخصوص متصور رہوتی تھی۔ اس میں کسی "غیر" کا بلا اجازت داخلہ یا اس سے متعلق جاہلی روایات سے انحراف عام طور سے ایک جرم عظیم سمجھا جاتا تھا جو بسا اوقات متحارب و متخاصم فریقوں کے بیچ مسلح ٹکراؤ کی صورت میں منتج ہوتا تھا اور اگر کبھی ایسا نہ ہُوا تو جنگ و جدال کا خدشہ ہمیشہ برقرار رہتا تھا۔ دراصل اس کے بعض اہم معاشی اسباب تھے۔ ریگستان میں سبزہ عارضی اور معمولی ہوتا تھا جو ایک قبیلہ / خاندان کی ضروریات کے لیے بھی کافی نہیں ہوتا تھا۔ نخلستان میں اگرچہ سبزہ مستقل ہوتا تھا اور نسبتاً زیادہ بھی۔ لیکن وُہ بھی مطلوبہ مقدار کی کفایت نہیں کرتا تھا۔ لہٰذا یہ عربوں کے لیے فطری امر تھا کہ وہ اپنے اپنے سبزہ کی حفاظت کریں کہ ان کی زندگی کا بڑی حد تک انحصار اسی پر تھا۔ چنانچہ ہر قبیلہ اور خاندان خواہ وہ بدوی ہو یا شہری اپنے سبزہ اور چراگاہ کی زندگی کی مانند قدر کرتا تھا۔ جاہلی روایات نے تمام چراگاہوں کو چاہے وہ ریگستان میں ہوں یا نخلستان میں ان کے مخصوص قبیلوں اور خاندانوں کے لیے مخصوص کر دیا تھا اور یہ روایات" اوّل قبضہ و تصرف اور اول و آخر مالک و حقدار" کے اصول پر مبنی تھیں۔ جاہلی عرب بھی ان روایات کا احترام عام طور سے کرتے تھے اور کبھی کبھی معاشی دباؤ سے تنگ آکر ان چراگاہوں (حمیٰ) پر حملہ کرنے کے مرتکب بھی ہوتے تھے۔ عموماً یہ چراگاہیں واضح و صاف حدود رکھتی تھیں تاکہ غیروں کو اپنی آزادی کی حدود معلوم رہیں۔

اسلامی ریاست کے قیام سے پہلے مدینہ والوں کی اپنی چراگاہیں مدینہ کے مضافات میں تھیں اور ہجرت نبوی کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبائلی روایات کے مطابق اسلامی ریاست کی مخصوص چراگاہیں بھی قایم کیں۔ مسلمانانِ مدینہ کی قبائلی یا اجتماعی چراگاہیں از خود ریاستی چراگاہوں میں تبدیل ہوگئیں جہاں مسلمانوں اور ریاست کے جانور چرا کرتے تھے بعد میں اسلامی ریاست کی خاص اپنی چراگاہیں بھی قائم کی گئیں جو مختلف علاقوں میں پھیلی ہُوئی تھیں۔ ان چراگاہوں کی حفاظت، وہاں چرنے والے مویشیوں کے تحفظ و نگرانی اور غیروں اور غارتگروں کے بلا اجازت داخلہ و غارتگری سے بچانے کی خاطر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم محافظوں کو باقاعدہ مقرر فرماتے تھے۔ مونٹگمری واٹ اور ان جیسے دوسرے مورخین نے اسلامی ریاست کے ان کارکنوں کو سماجی اور اقتصادی لحاظ سے کمزور اور فروتر اور ان کے کام کو "ادنیٰ و ذلیل" قرار دیا ہے۔ یہ دراصل عرب کے راعیانہ (PASTORAL) نظامِ معیشت سے نابلد ہونے کی دلیل ہے۔ عرب میں" راعی" (چرواہا) ہونا" ادنیٰ یا ذلیل" کام نہیں تھا۔ تاریخی شواہد اس کے بہت ہیں کہ قریش مکّہ کے ممتاز خاندانوں کے نوجوان لڑکے لڑکیاں یہ کام بلا کسی عار و ننگ کے انجام دیا کرتے تھے کہ یہ ان کی معیشت کا ایک حصہ تھا۔ اسی طرح دُوسرے لوگ جو آمدنی کے ذرائع محدود رکھتے تھے اس پیشہ کو بلا تردّد اپنا لیتے تھے اور محض اس پیشے کے سبب وہ عرب سماج میں حقارت کی نگاہ سے

نہیں دیکھے جاتے تھے۔ سماج میں اس پیشہ کے مقام و مرتبے کی مزید شہادتیں ہم کو اپنی اس موجودہ بحث میں آگے ملیں گی جن سے مستشرقین وجدید مورخین کے خیال کی خام کاری واضح ہو جائے گی۔

ماخذ کا بیان ہے کہ مدینہ منورہ کی چراگاہ (حمٰی) جس مقام پر واقع تھی وہ "الجمّع" کہا جاتا تھا۔ شہر رسول اکرم سے تین میل کے فاصلہ پر ایک مضافاتی خطّہ تھا جو خاصا وسیع بھی تھا اور سرسبز و شاداب بھی۔ ہجرت نبوی کے محض ایک برس کے بعد ربیع الاول ۲ھ/ستمبر ۶۲۳ء میں مکّہ کے ایک سردار کرز بن جابر فہری نے اس پر حملہ کیا اور اسلامی ریاست کے کچھ جانوروں پر قبضہ کر کے ساتھ لے گئے۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جُوں ہی اس حملہ کی خبر ملی آپ نے حملہ آوروں کا تعاقب کیا لیکن وہ مسلمانوں کے کچھ مویشیوں کے ساتھ نکل بھاگنے میں کامیاب رہے۔[۳۰۶] رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک اور چراگاہ (حمٰی) ایک مضافاتی مقام پر واقع تھی جس کو "ذوالجدر" کہا جاتا تھا اور وہاں آپ کے اونٹ بلکہ اونٹنیاں بھی (لقاح) چرا کرتی تھیں۔ واقدی کے مطابق یہ چراگاہ مدینے سے آٹھ میل دور واقع تھی جبکہ ابنِ سعد کا خیال ہے کہ وہ قبا کے نواح میں شہرِ نبی سے صرف چھ میل دُور تھی۔[۳۰۷] اس چراگاہ کے افسر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک مولیٰ حضرت یسار تھے جو اپنے اصحاب کے ساتھ اس کی نگرانی کرتے تھے۔ شوال ۶ھ/فروری، مارچ ۶۲۸ء میں قبیلہ عُرینہ کے کچھ شرپسندوں نے دھوکا سے حضرت یسار کو قتل کر دیا اور ان کے زیرِ نگرانی مسلمانوں کے اونٹ (سرح) پکڑ لے گئے مگر رسولِ کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے بروقت اقدام نے حملہ آوروں اور غارت گروں کو ان کے انجام تک پہنچا دیا۔[۳۰۸]

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک اور چراگاہ جس کا ذکر ماخذ میں ملتا ہے الغابہ تھی۔ یہ دراصل ایک سرسبز و شاداب وادی تھی جو مدینہ اور مکّہ کے درمیان تجارتی شاہراہ کے قریب عسفان سے آٹھ میل پرے واقع تھی۔[۳۰۹] یہاں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کچھ دُودھاری اونٹنیاں اور مسلمانوں کے جانور چرتے تھے۔ واقدی نے غزوۂ ذی قرد کے بیان میں ربذہ کی حمٰی اور اس کے مضافاتی علاقہ البیضاء کا ذکر بھی کیا ہے۔ اس چراگاہ میں اسلامی ریاست کے جانوروں کی چرائی وغیرہ کے انتظامات کی ذمہ داری حضرت ابو ذر غفاری کے ایک صاحبزادے جن کا نام "ذر" تھا اور جن کے نام صحابی موصوف کی کنیت بھی تھی۔ اور کتانی کے بقول ایک اور صحابی حضرت عُریب المالکی جو ایک گمنام مسلم صحابی ہیں بھی ریاستی کارکن راعی تھے۔ بہرحال واقدی کے بیان سے مزید معلوم ہوتا ہے کہ تمام مسلم مالکان نے اپنے اپنے مویشیوں کی دیکھ بھال کے لیے بھی اپنے آدمی رکھ چھوڑے تھے جو عام طور سے ان کے غلام تھے۔ ان میں حضرات مقداد بن عمرو، محمد بن مسلمہ اور عبدالرحمٰن بن عوف کے غلاموں کا ذکر صراحتاً کیا گیا ہے جو اپنے آقاؤں کے جانوروں کو وہاں چراتے تھے۔[۳۱۰] عام طور سے ہمارے سیرت نبوی کے ماخذ میں انھیں چراگاہوں کو اسلامی یا مسلم چراگاہوں کا درجہ دیا جاتا ہے اور بقیہ کا ذکر چھوڑ دیا جاتا ہے مگر ماخذ کے متفرق شواہد اور حوالوں سے بعض اور حمٰی کا بھی ذکر ملتا ہے جو اسلامی ریاست نے جزیرہ نما کے مختلف علاقوں میں قائم کی تھیں۔

ایک بہت اہم شہادت واقدی کے بیان میں ملتی ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی قطعۂ زمین کو کس طرح حمٰی (چراگاہ) بنایا جاتا تھا اور کس طرح اس کی حد بندی کی جاتی تھی اور کیا اس کی حدود ہوتی تھیں۔ مورخ کا بیان ہے کہ

مریسیع کی مہم سے واپسی پر مسلم فوج کا گزر نقیع نامی ایک مقام سے ہوا جہاں متعدد تالاب (غدر) اور گھاس و سبزے (کلاء) کے خوب صورت قطعے تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کی خوب صورتی، وسعت اور سرسبزی سے بہت متاثر ہوئے۔ آپ نے وہاں قیام کیا اور اس علاقے کی آب و ہوا اور پانی کی فراہمی کے بارے میں معلومات و پُوچھ تاچھ کی۔ آپ کو بتایا گیا کہ موسم گرما میں پانی کم ہو جاتا ہے کیونکہ تالاب سُوکھ جاتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے ایک مشہور صحابی حاطب بن ابی بلتعہ کو وہاں ایک کُنواں کھودنے کا حکم دیا جو ظاہر ہے کہ متعدد مسلمانوں کی مدد سے کھودا گیا۔ آپ نے پُورے علاقہ نقیع کو محفوظ کرنے (یُحمٰی) کا حکم دیا اور اعلان کیا کہ وہ پُورا علاقہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی "حمیٰ" میں شامل کر لیا گیا ہے۔ پھر آپ نے مشہور صحابی اور قبیلہ مزینہ کے ایک سردار حضرت بلال بن حارث مزنی کو اس کا افسر مقرر کیا اور اس کی نگاہ و پرداخت کے لیے واضح ہدایات و احکام دیے۔ حضرت بلال مزنی نے دریافت کیا کہ اس کی حدودِ حفاظت و نگرانی کیا ہوں گی اور اس کی حفاظت و حد بندی کیونکر کی جائے؛ آپ نے حضرت بلال کو ہدایت کی کہ "ایک بلند آواز شخص سے کہو کہ صبح تڑکے ایک پہاڑی پر چڑھ کر اپنی آواز کی انتہائی قوت کے ساتھ پکارے اور وہ چاروں کونے جہاں تک اس کی آواز سنی جائے اِس حمیٰ کی حدیں ہوں گی۔ اور یہ چراگاہ مسلمانوں اور اسلامی ریاست کے جنگی گھوڑوں اور اُونٹوں کے لیے محفوظ ہو گی۔" ایک اہم اور دل چسپ بات اس چراگاہ کے ضمن میں یہ بھی ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو اپنے جانوروں (صوائم) کی آزادی سے چرنے کی اس چراگاہ میں ممانعت کر دی تھی سوائے کسی مسلمان عورت یا کمزور و غریب مسلمانوں کے جانوروں کے اور ان کو بھی صرف اس صورت میں مستثنیٰ کیا گیا تھا کہ بشرطیکہ ان کے جانور بھٹک کر وہاں پہنچ گئے ہوں۔ روایت کا مزید بیان ہے کہ یہ چراگاہ ریاست کی ملکیت اور اس کے لیے مخصوص تھی اور عہدِ عثمانی تک اس کی یہی حالت رہی تھی۔[۳۱۱] نقیع کی ریاستی چراگاہ کے ایک اور افسرِ نگراں کا نام تھا حضرت عبید بن مُروّج مزنی جو غالباً حضرت بلال مزنی کے جانشین یا ساتھی تھے۔[۳۱۲] یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ریاستی مویشیوں کی دیکھ بھال کے لیے مددگاروں کی ایک جماعت ان کارکنوں کے ساتھ رہتی تھی۔ مآخذ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ علاقہ قبیلۂ مزینہ کے علاقے میں واقع تھا اور ان کے لوگوں سے اس کی حمایت و حفاظت کرائی جاتی تھی۔

طائف کے لوگوں کے قبولِ اسلام کے بعد رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ثقیف کے لوگوں کو جو نامۂ تحفظ دیا تھا اس میں یہ حکم بھی تھا کہ "وج"[۳۱۳] کا علاقہ ریاستی حمیٰ ہو گا۔ یاقوت حموی کا خیال ہے کہ یہ طائف کا دوسرا نام تھا۔[۳۱۴] لیکن یہ کلی طور پر صحیح نہیں معلوم ہوتا کیونکہ پورے طائف کو حمیٰ بنانا ناممکن تھا البتہ یہ ممکن ہے کہ وہ طائف کے کسی مضافاتی علاقہ کا نام ہو۔ بہرحال یہ حمیٰ خالصتاً ریاستی مقاصد کے لیے مخصوص تھی اور اس کی لمبی خاردار جھاڑیوں (اضاح) اور شکار (صید) کو کاٹنا اور مارنا ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ حکم عدولی کرنے والوں کو کوڑوں کی سزا دی جا سکتی تھی یا ان کے کپڑوں سے ان کو محروم کیا جا سکتا تھا۔ اس سلسلہ میں سب سے دل چسپ حقیقت یہ ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حمیٰ کا افسر مشہور صحابیِ رسول اور قریش کے ایک سربرآوردہ رکن حضرت سعد بن ابی وقاص زہری کو مقرر کیا تھا۔ حضرت سعد قریشی اور دو سربرآوردہ مزنی صحابہ کی اس عہدہ پر تقرری سے ثابت ہوتا ہے کہ وُہ ایک اہم عہدہ تھا اور اس سے محض "چرواہا" مراد لینا

غلط ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس عہدہ پر فائز ہونا کسی طرح سے "غربت و فروتر سماجی مقام" کی کسی طور علامت نہیں تھی، جیسا کہ ہمارے بعض جدید مورخوں نے سمجھا ہے۔ (۳۱۵)

۶) عہدِ نبوی میں نظامِ قطائع

اراضی پر مشتمل جائدادوں کی تقسیم ریاستوں اور مملکتوں کی ایک رسمِ قدیم ہے اور حکمراں و محکوم دونوں طبقات اس کو ریاستوں کا ایک قانونی اور دستوری حق تسلیم کرتے آئے ہیں۔ معاشرتی سطح پر حکمرانوں نے زمین کے چھوٹے بڑے ٹکڑے اپنی غریب اور ضرورت مند رعایا کے علاوہ مذہبی طبقات اور اداروں اور اپنے سیاسی وفاداروں کے درمیان ہمیشہ تقسیم کیا ہے۔ حکمرانی کے اس قدیم دستور کے مطابق اسلامی ریاست کے قیام کے بعد رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے سیرت نگاروں اور مورخینِ اسلام کے بیان کے مطابق زمین کے چھوٹے بڑے ٹکڑے اور قطعے صحابہ کرام کے درمیان، خواہ وہ مہاجرین رہے ہوں یا انصار یا بدوی عرب قبائلی مسلمان، بانٹے تھے۔ تاریخِ اسلام میں ان موہوبہ اراضی کے قطعوں کو قطائع (واحد قطیعہ) کہا جاتا ہے جس کے لغوی معنے کاٹے ہوئے حصہ یا قطعہ کے ہوتے ہیں۔ بعد کی اسلامی حکومتوں کے زمانے میں یہ نظام "قطائع" اقطاع کے نام سے زیادہ مشہور ہوا اور مختلف اسلامی ممالک میں عمل پذیر بھی ہوا۔

اسلامی تاریخ میں اراضی پر مشتمل جائدادوں کی تقسیم بڑی دلچسپ اور اہم ہے۔ یہ اب ایک مسلّم حقیقت ہے کہ ہجرت کے معاً بعد رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو شہرِ رسول کا واحد حکمراں تسلیم کر لیا گیا تھا جس کو حکمرانی کے تمام اختیارات اور اقتدار کے سارے ذرائع حاصل تھے اور ان میں سے ایک قطائع تقسیم کرنے کا حق و اختیار بھی تھا۔ ابنِ سعد نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مختلف اصحاب کے تراجم و سوانحی خاکوں میں عام طور سے ان قطائع کا بھی ذکر کیا ہے جو ان کو دربارِ رسالت سے ملے تھے۔ ان بیانات سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ انصارِ مدینہ نے شہر اور اس کے مضافات کی تمام افتادہ زمینوں پر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم یا دوسرے الفاظ میں اسلامی ریاست کا حقِ ملکیت تسلیم کر لیا تھا۔ بلکہ فیاض انصار نے تو اپنی مملوکہ جائدادیں بھی آپ کے قدموں پر نچھاور کر دی تھیں۔ بہرحال ہجرت کے بعد مہاجرین کی سب سے بڑی ضرورت رہائش کی تھی۔ شروع کے زمانے میں وہ وسیع دل، کشادہ چشم اور سخی انصار کے گھروں میں ان کی بے مثل فیاضی و سخاوت و ضیافت کے مزے لوٹتے رہے۔ لیکن کچھ مدت بعد وہ اپنے مکانوں اور جھونپڑوں میں منتقل ہو گئے۔ یہ مکانات اور جھونپڑے ان قطائع پر بنائے گئے تھے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انصارِ مدینہ کی موہوبہ اراضی یا افتادہ زمینوں سے عطا کیے تھے۔ جن صحابہ کرام کے بارے میں صراحتاً ذکر آتا ہے کہ ان کو رہائشی مکانات بنانے کے لیے قطائع نبوی ملے تھے ان کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں: حضرات عبیدہ بن حارث مُطّلبی اور ان کے دو بھائی طفیل اور حصین مُطّلبی، (۳۱۶) عثمان بن عفان اموی، (۳۱۷) زبیر بن عوام اسدی، (۳۱۸) عبداللہ بن مسعود ہذلی، (۳۱۹) سعد بن ابی وقاص، زہری اور ان کے بھائی، (۳۲۰) مقداد بن عمرو قضاعی، (۳۲۱) ابوبکر تیمی، (۳۲۲) طلحہ بن عبداللہ تیمی، (۳۲۳) ابو سلمہ بن عبد الاسد مخزومی، (۳۲۴) ارقم بن ابی ارقم مخزومی، (۳۲۵) عمار بن یاسر عنسی مذحجی، (۳۲۶) عمر بن خطاب عدوی، (۳۲۷) عثمان بن مظعون جمحی اور ان کے متعدد بھائی، (۳۲۸) اور بہت سے دوسرے،

و مہاجرین ۔ اس سلسلہ میں یہ حقیقت ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ تمام بے گھر مہاجرین کو آباد کاری کے لیے رہائشی قطائع ملے تھے خواہ ان کے نام مآخذ میں مذکور ہوں یا نہ ہوں ۔ کچھ ایسے بھی مکی مسلمان تھے جو اسلام سے قبل مکہ کی سکونت ترک کر کے مدینہ آ بسے تھے اور وہاں انھوں نے جائدادیں بنالی تھیں ۔ ان میں حضرت سعد بن ابی وقاص کے ایک بھائی حضرت عتبہ جیسے لوگ شامل تھے ۔

بعد میں جوں جوں مسلمان مکہ یا دوسرے علاقے سے آتے گئے ان کو رہائشی مکانات کے لیے قطائع ملتے گئے جیسا کہ حضرات خالد بن ولید مخزومی (۳۲۹)، عباس بن عبد المطلب ہاشمی (۳۳۰) اور نوفل بن حارث ہاشمی (۳۳۱) وغیرہ متعدد مہاجرین کے معاملات سے واضح ہوتا ہے ۔ اسلامی ریاست کے سیاسی اثر و نفوذ کے دائرہ میں وسعت و توسیع اور پھر بعد میں علاقائی مقبوضات کے حصول حق ملکیت ارض کے اصول کے تسلیم کرنے کے بعد رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قطائع تقسیم کرنے کے حق کو شہر مدینہ کی حدود کے باہر بھی تسلیم کر لیا گیا ۔ چنانچہ روایت ہے کہ رمضان ۳ھ / مارچ ۶۲۴ء میں حضرت کشد جہنی کے ایک بھانجے کو ینبوع کے علاقے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک وسیع قطیعہ عطا فرمایا تھا ۔ یہ واضح رہے کہ یہ قطیعہ اصلاً حضرت کشد جہنی کو ان کی خدمات کے عوض عطا کیا جا رہا تھا ۔ لیکن بوڑھے چچا نے اپنی درازعمری کے سبب اپنے بھانجے کو دلوا دیا تھا (۳۳۲)۔ بعض دوسری روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت زبیر بن عوام اسدی اور حضرت خالد بن ولید مخزومی کو بالترتیب مدینہ کے یہودی قبیلہ بنو نضیر اور یہود خیبر کی اراضی سے قطائع عطا کئے گئے تھے (۳۳۳)۔

رہائشی مکانات کے لیے قطائع کے علاوہ متعدد قطائع زرعی اور تجارتی مقاصد سے بھی دئے گئے تھے ۔ حضرت زبیر بن عوام کا بنو نضیر کی زمین کا قطیعہ جس کا ابھی ذکر ہوا اس قسم اور زمرے میں بھی آتا ہے کیونکہ وہ ایک "بقیع" پر مشتمل تھا ۔ "بقیع" اصطلاحی طور پر اس اراضی کو کہتے تھے جس میں کافی درخت ہوتے تھے ۔ دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قطیعہ کھجوروں اور دوسرے درختوں کے باغ پر بھی مشتمل تھا ۔ اسی طرح حضرات ابوبکر اور ربیعہ بن اسلمی کو جو قطائع ملے تھے ان میں کھجور کے درخت بھی تھے (۳۳۴)۔ حضرت عبد اللہ بن جحش اسدی کے ایک صاحبزادے حضرت محمد بن عبد اللہ اسدی کو جو قطیعہ عطا ہوا تھا وہ سوق الدقیق (آٹے کا بازار) میں واقع تھا (۳۳۵) اور غالباً کسی دکان وغیرہ پر مشتمل تھا ۔ اور اگر نہیں بھی تھا تو اس کی تجارتی اہمیت سے کسی طرح انکار نہیں کیا جا سکتا ۔ اگر برکات احمد وغیرہ کی دلیل کے مطابق بنو قینقاع کی اراضی اور بازار مسلمان مجاہدین میں تقسیم نہیں ہوا تھا تو کم از کم بنو نضیر کے باغات اور کھیت نیز بنو قریظہ کے مجرمین کی ضبط شدہ اراضی بھی زرعی مقاصد سے مسلمان مہاجرین اور انصار میں تقسیم کی گئی تھی ۔ ہم پہلے ہی ان جائدادوں کی تقسیم پر بحث کر چکے ہیں اس لیے اسے دُہرانے کی ضرورت نہیں ہے ۔ وہ تمام مفتوحہ اراضی جو خیبر یا دوسرے شمالی علاقوں میں حاصل کی گئی تھی عام طور سے ان کے پرانے مالکوں کے قبضہ میں دی گئی تھی ۔ لیکن ان میں سے بھی بعض قطائع دئے گئے تھے ۔ عام طور سے یہ قطائع ان زمینوں میں سے عطا کیے گئے تھے جو اسلامی ریاست کے حصہ — خمس — میں پڑی تھیں جیسا کہ حضرت ہذیم بن ماکولا جن کا تعلق بنو عبد مناف سے تھا کے معاملہ سے ظاہر ہوتا ہے (۳۳۶)۔

مدنی لوگوں کے علاوہ جن لوگوں کو ابتدائی زمانے میں قطائع ملے تھے ان کا تعلق ان دو بدوی قبیلوں سے تھا جو

شہرِ رسول کے مغرب میں آباد تھے یعنی جہینہ اور مزینہ سے۔[۳۳۷] موخر الذکر کے ایک اہم فرد حضرت بلال بن حارث مزنی کے قطیعہ کا اکثر حوالہ دیا جاتا ہے۔ مآخذ کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو فُرع کے علاقے میں اَلقِبْلِیَّۃ کی کانیں نیز قُدس کے علاقے کی قابلِ کاشت اراضی قطیعہ میں دی تھی۔ ان کا قطیعہ کافی وسیع رقبہ پر پھیلا ہوا تھا جس میں کھجور کے باغ، پیداواری کھیت اور درخت تھے جن پر شہد کی مکھیوں کے چھتے بھی لگے تھے۔[۳۳۸] یحییٰ بن آدم کا خیال ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یہ قطیعہ ان کی درخواست پر دیا تھا۔[۳۳۹] دوسرے مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ بلا مشروط تملیک ارض کا قطیعہ نہیں تھا بلکہ اس کے ساتھ یہ شرط بھی عاید کر دی گئی تھی کہ وہ کاشت کرتے رہیں گے۔ دُوسرے مزنی صحابی جن کے قطیعہ کا مآخذ میں صریح ذکر ملتا ہے حضرت معقل بن سنان ہیں۔[۳۴۰] لیکن اس کی نوعیت، مقام اور حدود وغیرہ کے بارے میں تفصیلات کا کوئی ذکر نہیں ملتا ہے اس لیے کچھ مزید کہنا مشکل ہے۔

قبیلہ جہینہ کے لوگوں کو اجتماعی طور سے بڑے بڑے قطائع دئے گئے تھے جو وسیع اراضی اور عریض وادیوں پر مشتمل تھے مگر ان پر یہ شرط عائد کر دی گئی تھی کہ اپنی زمینوں کی پیداوار پر خمس (⅕) ادا کرتے رہیں گے۔ اس کے بعد ان کو ان کے سبزہ اور پانی وغیرہ سے فائدہ اٹھانے کا پورا حق حاصل ہوگا۔[۳۴۱] رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک گرامی نامے کے مطابق جہینہ کے ایک خاندان بنو شمخ کو سُفینہ نامی زمین میں سے وہ اراضی قطیعہ میں دے دی گئی تھی جس کو وہ زیر کاشت لے آئیں۔[۳۴۲] اسی طرح ایک جہنی سردار حضرت عوسجہ بن حرملہ کو ذی المروہ کے علاقے میں ایک وسیع قطیعہ عطا کیا گیا تھا اور اس کی حدود کو صاف صاف واضح کر دیا گیا تھا۔[۳۴۳]

دو غفاری صحابہ کرام حضرات نضلہ بن عمرو اور عُمیر کو بالترتیب الصفراء اور وادی القریٰ کے علاقوں میں کچھ زمین بطور قطیعہ دی گئی تھی جہاں وُہ دونوں رہتے بھی تھے،[۳۴۴] جبکہ قبیلہ اسلم کے ایک فرد حضرت حصین بن اوس کو اَلفرغَین اور ذات اَعشاح کے علاقے میں اراضی کا قطیعہ دیا گیا تھا۔[۳۴۵] غالباً یہ دونوں گاؤں تھے۔ روایت ہے کہ قبیلہ عُقیل بن کعب کے تین افراد کو وادی عقیق کا غالباً کچھ حصہ قطیعہ کے طور پر عطا کیا گیا تھا۔ ان کے قطائع میں چشمے اور کھجور کے باغات تھے۔ ان پر یہ شرط عائد کی گئی تھی کہ وہ اسلامی ریاست کے ہمیشہ وفادار رہیں گے اور وقت پر نمازیں پڑھیں گے اور باقاعدہ زکوٰۃ ادا کیا کریں گے۔[۳۴۶]

قبیلہ بنو سلیم کے متعدد صحابہ کا ذکر ملتا ہے جن کو اسلامی ریاست کی جانب سے قطائع عطا کئے گئے تھے۔ سب سے اہم اور دلچسپ قطیعہ حضرت ہوذہ بن نبیشہ کا تھا جن کا قبائلی تعلق عُصیہ کے خاندان سے تھا۔ ان کو اتنی اراضی دی گئی تھی جو الجفر سے محیط تھی۔[۳۴۷] اسی طرح خاندانِ رِعل کے ایک صحابی حضرت سعید بن سفیان کو سوارقیہ کے علاقے میں کھجوروں کا ایک باغ مع ایک محل (قصر) کے عطا ہوا تھا۔[۳۴۸] اسی طرح حضرت سلیمہ بن مالک، وقاص بن قدامہ اور ان کے بھائی عبداللہ، عباس بن مرداس سلمی، الاجب، رشید بن عبدالرب اور ہرمی بن عوف کو بھی ایسے قطائع عطا کیے گئے تھے جن کے حدود پوری طرح واضح کر دیئے گئے تھے۔[۳۴۹] غالباً ان تمام حضرات کے قطائع ان کے روائتی علاقوں میں تھے جہاں بنو سلیم آباد تھے۔ لیکن حضرت سراج بن مجاعہ سلمی کو یمن کے ایک علاقے میں قطیعہ عطا ہوا تھا جس کا نام الغورہ تھا۔[۳۵۰] یہ حقیقت بھی دلچسپ ہے کہ حضرت عتبہ بن فرقد سلمی کو اپنا مکان بنانے کے لیے ذی المروہ کے قریب مکہ میں اراضی عطا کی گئی تھی۔[۳۵۱] اسی طرح حضرات ابو ہوذہ عرض اور عمرو بن عامر بن

ربیعہ کو اپنے رہائشی مکانات بنانے کے لیے بعض مقامات پر اراضی کے قطیعے ملے تھے۔ (۳۵۲)

ہوازن کے متعدد اشخاص کو بھی اپنے وطن کے قریبی علاقوں میں قطائع ملے تھے۔ مثال کے طور پر حضرت ثور بن عروہ قشیری کو وادی عقیق میں دو قطیعے ملے تھے جن کا نام جمّام اور السدّ تھے۔ (۳۵۳) حضرت الرفاد بن ربیعہ کو جو قطیعہ ملا تھا اس کی تفصیلات مذکور نہیں ہیں۔ (۳۵۴) حضرت ثمن بن عمرو بن حجر کا قطیعہ الرسلین اور الدرکار نامی علاقوں کے بیچ میں آباد تھا۔ (۳۵۵) حضرت حصین بن نضلہ، جن کا تعلق بنو اسد/خزیمہ سے تھا، کو جو قطیعہ ملا تھا اس کا نام ترمذ تھا، (۳۵۶) جبکہ حضرت عداؓ بن خالد بن عمرو بن عکرمہ کو خرار نامی علاقے سے ایک وسیع اراضی بطور قطیعہ ملی تھی۔ (۳۵۷)

ذکر آچکا ہے کہ بنو عذرہ کے ایک مسلم حضرت حمزہ بن نعمان جب اپنے لوگوں کے صدقات لے کر خدمتِ نبوی میں حاضر ہوئے تو غالباً ان کی شاندار خدمات اور اسلامی ریاست سے غیر متزلزل وفاداری کے سبب ان کو وادی القریٰ میں ایک وسیع رقبۂ اراضی پر مشتمل قطیعہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عطا فرمایا تھا۔ ان کا قطیعہ اتنا وسیع و طویل تھا کہ جہاں ان کا گھوڑا دوڑ سکتا تھا اور وہ خود تیر اندازی کی مشق کر سکتے تھے۔ (۳۵۸) عام طور پر یہ مبالغہ کیا جاتا ہے کہ جہاں تک صحابیِ موصوف کا گھوڑا دوڑ سکا تھا وہاں تک کی زمین ان کو بطور قطیعہ عطا کر دی گئی تھی حالانکہ یہ تعبیر قیاس کے بھی خلاف ہے اور روایت کی منشا کے بھی۔ پھر ان کی تیر اندازی کی مشق کے لیے کافی زمین کا فقرہ بھی اس کی مناسب حد بندی کرتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ ان کو میلوں زمین عطا کر دی گئی تھی صحیح نہیں۔ البتہ وہ اتنی وسیع و عریض ضرور تھی جہاں وہ تیر اندازی اور گھوڑ سواری کی مشق کر سکیں۔ بنو عذرہ کے ایک اور صحابی حضرت جمیل بن رزام کو زمین کا ایک قطعہ عطا کیا گیا تھا جو رمدہ کہلاتا تھا۔ (۳۵۹) قبیلہ جذام کے ایک خاندان بنو جعفل بن ربیعہ کو اجتماعی طور سے جو قطیعہ دیا گیا تھا وہ اران کہلاتا تھا۔ (۳۶۰) ان روایتوں کو جن کے مطابق قبیلہ لخم کے داری لوگوں کو عہدِ نبوی میں فتوحات سے قبل شام میں قطائع دئے جانے کا ذکر کیا گیا ہے قرونِ وسطیٰ کے مسلمان فقہا اور جدید مورخوں اور مستشرقین نے یکساں طور سے غیر صحیح قرار دے کر مسترد کر دیا ہے اگرچہ دونوں کے دلائل الگ الگ ہیں۔ (۳۶۱)

شمالی قبائل میں بنو الحارث کے متعدد لوگوں کو بھی باقاعدہ حد بند قطائع عطا کئے گئے تھے۔ یہ تمام قطائع مشروط تھے کیونکہ ان کے مالکوں سے نماز قایم کرنے کے علاوہ زکوٰۃ ادا کرنے، جہاد میں حصّہ لینے، مشرکوں سے قطع تعلق کرنے اور تمام معاملات میں خدا اور اس کے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام و امور کو بلا کسی پس و پیش کے قبول کرنے کی شرائط عاید کی گئی تھیں۔ (۳۶۲)

یہاں یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ نہد کے خاندان بنو قرہ کو المظلہ نامی علاقہ بطور حمیٰ عطا کیا گیا تھا تاکہ وہ وہاں اپنے مویشی چرا سکیں۔ (۳۶۳) اسی طرح بنو سمعان کے ایک شخص حضرت ہلال کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ثعلبہ نامی وادی بطور چراگاہ دی تھی۔ (۳۶۴) دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ عطیہ صحابیِ موصوف کی درخواست پر دیا گیا تھا، جبکہ حضرت قرہ بن ربیعہ کو حضرموت کے علاقے میں ایک قطیعہ ملا تھا۔ (۳۶۵)

مآخذ میں یمامہ کے بعض لوگوں کے قطائع دئے جانے کا ذکر ملتا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت مجاعہ بن مرارہ کو الغورہ، الغربہ اور الحبل نامی تین اراضی عطا کی گئی تھیں۔ (۳۶۶) اسد الغابہ میں حضرت حصین بن مشمت تمیمی کو ایک قطیعہ عطا کرنے کا دلچسپ

بیان ملتا ہے۔اس کے مطابق ان کو ایک وسیع رقبہ عطا گیا تھا جس میں متعدد چشمے (میاہ) تھے۔ ان کے علاوہ گھاس کے تختے اور درخت بھی کافی تعداد میں تھے۔ ان پر یہ شرط بھی عائد کی گئی تھی کہ وُہ نہ تو اس کے پانی سے کسی کو محروم کریں گے اور نہ ہی اس کی گھاس اور درختوں کو کاٹیں یا ضائع کریں گے۔[۳۶۷] حضرت مشمرج بن خالد سعدی کو جو قبیلہ عبدالقیس کے وفد میں آئے تھے ان کے وطن کے میدانی علاقوں میں واقع ایک چشمہ بطور قطیعہ عطا گیا تھا۔[۳۶۸] غالباً اس چشمہ کے ساتھ کچھ اراضی بھی ملی تھی۔ دہنا کے علاقے میں حضرت قتادہ بن اعور تمیمی کو ایک گاؤں بطور قطیعہ ملا تھا جس کا نام شبکہ تھا۔[۳۶۹] اصابہ کے مطابق مشہور صحابیِ رسول حضرت فرات بن حیان عجلی کو یمامہ کے علاقے میں ایک اراضی پر مشتمل جائداد بطور قطیعہ عطا ہوئی تھی اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کی سالانہ آمدنی بیالیس ہزار درہم تھی۔[۳۷۰] غالباً یہ واحد قطیعہ ہے جس کی بالکل صحیح مالیت کا اندازہ ملتا ہے۔ اور اس لحاظ سے وہ نہ صرف منفرد بھی ہے بلکہ بے انتہا اہم تاریخی شہادت بھی۔

مذکورہ بالا قطائع کے علاوہ جو غالباً سب کے سب قابلِ کاشت اراضی پر مشتمل تھے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ مردہ زمینوں (ارض موات) بھی مختلف لوگوں کو بطور قطائع عطا فرمائی تھیں تاکہ ان پر کاشت کی جائے اور زراعت کو اس طرح ترقی دی جائے۔ اصطلاح میں ایسی زمین کو ارضِ احیاء کہا جاتا ہے جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ مُردہ اور بے کاشت زمینوں کو زراعت کے قابل بنایا جائے۔ اس کا واضح سبب یہ تھا کہ زراعت کو ترقی دی جائے اور زمین کی پیداوار کو بڑھایا جائے جو عرب میں کافی کم تھی مگر حیاتِ انسانی کے لیے انتہائی ضروری اور مفید تھی۔ بیشہ کے باہلی باشندوں کو ایسی ہی زمین عطا کی گئی تھی۔[۳۷۱] دوسری زمین یا قطیعہ جو اس زمرہ میں آتا ہے پہلی کی مانند ذکر کی جا چکی ہے یعنی وہ سفینہ نامی زمین تھی جو جہینہ کے خاندان بنو شمخ کو عطا کی گئی تھی۔ اسی طرح ذکر آچکا ہے کہ حضرت بلال مزنی کو بھی قطیعہ اسی شرط پر دیا گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت عمرؓ نے اپنی خلافت کے زمانے میں صحابیِ موصوف کے قطیعہ کا بیشتر حصّہ واپس لے لیا تھا کیونکہ وہ اس پُورے علاقہ یا رقبے کو زیرِ کاشت رکھنے میں ناکام رہے تھے۔[۳۷۲] یہی معاملہ جہینہ یا مزینہ کے لوگوں کے قطائع کے ساتھ ہُوا تھا جنھوں نے اپنی زمینوں کو مدتوں بلا کاشت کیے بیکار چھوڑے رکھا تھا۔[۳۷۳] اس کا مطلب یہ ہُوا کہ بلا کاشت اراضی عام طور سے اور قابلِ کاشت زمینیں خاص طور سے اس وقت قطائع پانے والوں کے قبضہ و تصرف میں رہ سکتی تھیں جب تک وُہ ان پر کاشت کرتے رہیں۔ کافی مدت تک ان کو بلا کاشت چھوڑنا دراصل ان پر اپنا حقِ ملکیت یا حقِ تصرف کھو دینے کے مترادف تھا۔

(ب) طُعمہ / طُعَم

قطائع کے علاوہ جن میں اراضی پر ملکیت حاصل ہو جاتی تھی اور اس کے نتیجے میں صاحبانِ قطائع اس کی پیداوار وغیرہ سے مستفید ہو سکتے تھے عطیہ کی ایک اور قسم کا بھی مآخذ میں ذکر ملتا ہے اس کو طُعمہ کہا جاتا ہے اس میں صاحبِ طعمہ کو زمین کی پیداوار کے ایک حصہ سے مستفید ہونے کا حق مستقل یا عارضی طور پر مل جاتا تھا مگر ملکیت کے حقوق نہیں ملتے تھے۔ ایک لحاظ سے یہ بھی اقطاع یا قطائع کی ایک قسم تھی۔ اس قسم کے عطیہ کے لیے جو الفاظ استعمال ہوتے ہیں وہ طُعمہ اور عطاءٌ ہیں اور عطاءً

کرنے کے فعل کے لیے لفظ اَطْعَمَ (کھلایا) آتا ہے۔[۳۷۴] طُعمَہ کی اولین عطیات کا تعلق غالباً خیبر اور اس کی نواحی یہودی بستیوں کی زمینوں سے ہے جن سے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے متعدد اصحاب کو طُعَم (جمع طُعمہ) عطا فرمائے تھے۔ واقدی کے مطابق یہ عطایا حسبِ ذیل تھے:

نمبر شمار	صاحبِ طعمہ	کھجوریں		جَو (شعیر)
۱	نو ازواج مطہرات میں سے ہر ایک	۸۰ وسق	+	۲۰ وسق
		کل ۷۲۰ وسق	+	۱۸۰ وسق
۲	حضرت عباس بن عبدالمطلب ہاشمی	۲۰۰ وسق		۰
۳	حضرات علیؓ و فاطمہ ہاشمی	۲۱۵ وسق	+	۸۵ وسق[۳۷۵]
۴	حضرت اسامہ بن زید[۳۷۶]	۱۱۰ وسق	+	۴۰ وسق
۵	حضرت ام رمثہ بنت عمر بن ہاشم بن عبدالمطلب	۰		۵ وسق
۶	حضرت مقداد بن عمرو	۰		۱۵ وسق
	میزان	۱۳۲۵ وسق	+	۳۲۵ وسق

واقدی کے بیان کے مطابق موخرالذکر صحابی نے اپنا حصہ خلافت راشدہ میں کسی وقت ایک لاکھ درہم میں بیچ دیا تھا۔[۳۷۷] روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابی موصوف کے وارثوں نے حضرت معاویہ بن ابی سفیان کے ہاتھ ان کی خلافت کے زمانے میں یہ سودا کیا تھا۔ یہاں یہ کہہ دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ عہدِ خلافتِ راشدہ معاویہ میں قیمتوں میں خاصا اضافہ ہو چکا تھا اور ان پر عہدِ نبوی کی قیمتوں کو قیاس کرنا صحیح نہیں ہوگا۔ اس بنا پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ صحابی موصوف کے حصہ کی اصل مالیت کیا تھی۔

واقدی کی ایک اور مفصل روایت کے مطابق حسب ذیل حضرات کو یہ حصے ملے تھے:

نمبر شمار	صاحبانِ طُعَم	کھجور / جَو وغیرہ
۱	حضرت ابوبکر بن ابی قحافہ تیمی	۱۰۰ وسق
۲	حضرت عقیل بن ابی طالب ہاشمی	۱۴۰ وسق
۳	حضرت جعفر بن ابی طالب ہاشمی	۵۰ وسق
۴	حضرت ربیعہ بن حارث ہاشمی	۱۰۰ وسق
۵	حضرت ابوسفیان بن حارث بن عبدالمطلب ہاشمی	۱۰۰ وسق
۶	حضرت صلت بن مخرمہ بن مطلب مطلبی	۳۰ وسق

۷	حضرت ابو نبقہ	۵۰ وسق
۸	حضرت رکانہ بن عبد یزید	۵۰ وسق
۹	حضرت قاسم بن مخرمہ مطلبی	۵۰ وسق
۱۰	حضرت مسطح بن اثاثہ بن عباد اور ان کی بہن ہند	۳۰ وسق
۱۱	حضرت صفیہ بنت عبد المطلب ہاشمی	۴۰ وسق
۱۲	حضرت بحینہ بنت حارث بن مطلب	۳۰ وسق
۱۳	حضرت ضُباعہ بنت زبیر بن مطلب	۴۰ وسق
۱۴	حضرت حصین، خدیجہ اور ہند اولاد حضرت عبیدہ بن حارث	۱۰۰ وسق
۱۵	حضرت ام حکیم بنت زبیر بن عبد المطلب ہاشمی	۳۰ وسق
۱۶	حضرت ام ہانی بنت ابی طالب ہاشمی	۴۰ وسق
۱۷	حضرت جمانہ بنت ابی طالب ہاشمی	۳۰ وسق
۱۸	حضرت ام طالب بنت ابی طالب ہاشمی	۳۰ وسق
۱۹	حضرت قیس بن مخرمہ بن مطلب	۵۰ وسق
۲۰	حضرت ابو ارقم	۵۰ وسق
۲۱	حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر صدیق	۴۰ وسق
۲۲	حضرت ابو سبرہ	۴۰ وسق
۲۳	حضرت ابن ابی حبیش	۳۰ وسق
۲۴	حضرت عبداللہ بن وہب اور ان کے دو فرزند (۳۷۸)	۵۰ وسق
۲۵	حضرت نمیلہ کلبی	۵۰ وسق
۲۶	حضرت ملکان بن عبدہ	۳۰ وسق
۲۷	حضرت ام حبیبہ بنت جحش	۳۰ وسق
۲۸	حضرت محیصہ بن مسعود	۳۰ وسق
۲۹	رہا ویون (قبیلہ رُہاء کے لوگ)	۱۰۰ وسق
۳۰	داریون (لخم کے خاندان کے لوگ جو دس تھے) (۳۷۹)	۱۰۰ وسق
۳۱	اشعریون (اشعر کے لوگ)	۱۰۰ وسق
	میزان	۱۷۴۰ وسق

ابنِ اسحاق کے بیان میں طعمہ پانے والوں کے نام اور ان کے حصے بھی کچھ مختلف ہیں۔ ان کے بیان کے مطابق کل عطایا کا میزان ۲۰۸۳۰ وسق کھجور اور ۳۲۵ وسق گیہوں (حنطہ) ہے، جبکہ واقدی کے یہاں وُہ ۲۹۹۵ وسق کھجور ہے البتہ گیہوں کا میزان دونوں کا ایک ہے۔ یہاں ایک تبصرہ مناسب معلوم ہوتا ہے اور وُہ یہ کہ طعمہ پانے والوں میں سے کچھ حضرات اور طبقات نے غزوۂ خیبر کے فوراً بعد ہی اپنا حصہ نہیں پایا تھا بلکہ اسلام لانے کے بعد جب وُہ ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تھے تو ان کو عطایائے نبوی حاصل ہوئے تھے۔ مثال کے طور پر افراد میں حضرت عقیل بن ابی طالب ہاشمی فتح مکہ کے مسلمان تھے اور اس کے بعد ہی ان کو طعمہ ملا تھا۔ طبقات میں اشعری تو خیبر کے زمانے میں ہی مدینہ پہنچ گئے تھے البتہ داری اور رہا وی حضرات تبوک کے زمانے میں یا اس کے بھی بعد آئے تھے۔ یہ لوگ جیسا کہ اُوپر ذکر آچکا ہے وفد کی صورت میں خدمتِ نبوی میں حاضر ہوئے تھے اور بعد میں مدینہ اور اس کے مضافات میں ہی بس گئے تھے۔

دوسرے مسلمانوں میں جن کو اسلامی ریاست کے کسی اور علاقے کی زمین کی پیداوار سے طُعمہ عطا ہُوا تھا حضرت قیس الھانی نامی ایک جنوبی عرب کے مسلم کا ذکر مل سکا ہے جن کو ایک روایت کے مطابق تین سو فَرَق کا طُعمہ عطا ہوا۔ اس میں خیوان کی دوسو وسق زبیب (سوکھی کھجور) اور ذرہ شطران (شطران کا باجرا) اور سو فَرق عمران الجوف کے علاقے کا گیہوں (بُرّ) شامل تھا لیکن دوسری روایت کے مطابق ان کا طُعمہ یا قطیعہ نصر کے علاقہ کے دوسو صاع باجرے (ذرہ نصر) اور دوسو صاع زبیب خیوان (خیوان کی سُوکھی کھجوروں) پر مشتمل تھا۔[۳۸۰] اس اختلاف روایت کو حل کرنا ناممکن نظر آتا ہے کیونکہ قرائن و شواہد کچھ بھی نہیں ہیں۔ محض قیاس کیا جا سکتا ہے کہ دُوسری روایت زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے کیونکہ پہلی روایت کے مطابق طعمہ مقدار کے اعتبار سے بہت زیادہ تھا۔

لیکن سب سے دلچسپ اور ایک لحاظ سے اہم تر وُہ طعمہ تھا جو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے وادی القرٰی کے ایک یہودی خاندان بنو عُریض کو عطا کیا تھا۔ یہ دس وسق گیہوں (قمح)، دس وسق جَو (شعیر) فی فصل (حصد) اور پچاس وسق کھجور (تمر) فی سال مقرر ہوا تھا۔[۳۸۱] واقدی کی ایک روایت ہے کہ جب رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تبوک جاتے ہوئے وادی القرٰی میں خیمہ زن ہُوئے اور عُریض یہودی کے فرزندوں نے آپ کی خدمتِ گرامی میں ہَریس (ایک میٹھا پکوان' جو میدے، مکھن اور شکر سے تیار کیا جاتا ہے) پیش کیا اور آپ نے اس کو نوش فرمایا۔ اس مہمان نوازی اور اخلاق کے عوض رسول کریم صلّی اللہ علیہ وسلم نے ان کو چالیس وسق کا طُعمہ عطا فرمایا (اطعمھم)۔[۳۸۲] یہ عطیہ نبوی مستقل (جاریہ) تھا جو عباسیوں کے عہد تک جاری رہا۔[۳۸۳]

بہرحال یہ حقیقت ہے کہ طُعمہ تمام معاملات میں ایک مستقل اور دوامی عطیہ تھا بالکل اُسی طرح جس طرح قطیعہ ہوتا تھا۔ قطیعہ بعد میں اقطاع تملیک کہا جانے لگا کیونکہ اس میں صاحبِ قطیعہ کو مالکانہ حقوق بھی حاصل ہوتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ قطیعہ اور طُعمہ دونوں عملی لحاظ سے مِلک (مملوکہ جائداد/حق) سمجھے جاتے تھے۔ اس کو منتقل کیا جا سکتا تھا، فروخت کیا جا سکتا تھا اور ترکہ میں دیا جا سکتا تھا جیسا کہ متعدد مثالوں سے ثابت ہوتا ہے۔ چند مثالیں کافی ہوں گی۔ حضرت مقداد

بن عمرو کے ورثہ کے اپنے جد امجد کے طُعمہ کو حضرت معاویہ کے ہاتھوں فروخت کیے جانے کا ذکر آچکا ہے۔ پھر واقدی کا واضح بیان ہے کہ طُعمہ پانے والوں (المُطْعَمِیْن) میں سے جو کوئی عہدِ نبوی اور خلافتِ صدیقی میں وفات پا جاتا تھا اس کا طعمہ ان کے ورثہ پاتے تھے[۳۴۴] لیکن بعد میں خلیفہ اول نے اسلامی ریاست کے حق میں تمام طُعَم سوائے ازواجِ مطہرات کے واپس لے لیے۔ تھے اور ان کی منتقلی، وراثت اور فروخت ممنوع قرار دے دی تھی۔[۳۴۵] لیکن یہ غالباً غیر مستقل طُعَم کے بارے میں پالیسی تھی بہرحال خلافتِ راشدہ کی پالیسی سے سرِدست ہمیں بحث نہیں۔

باب ششم

عہدِ نبویؐ کا مذہبی نظام

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا عہد میمون و مبارک الفاظِ نبویؐ میں خیر القرون (بہترین زمانہ) تھا جب دین و ریاست، مذہب و حکومت اور اسلام و مملکت دو ایسے لازم و ملزوم توام تھے جن کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں ایک پیغمبر و مذہبی مصلح کی صفات اور ایک سربراہِ مملکت و ریاست کے اختیارات کا وہ پاکیزہ اجتماع تھا جس کی مثال انسانی تاریخ میں ملنی مشکل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام بنیادی طور سے مذہب اور حکومت میں کوئی خط تفریق یا حدِ فاصل نہیں کھینچتا اور نہ ہی ان دونوں کو ایک دوسرے کا متضاد و مخالف قرار دیتا ہے جیسا کہ جدید زمانے میں کلیسا اور حکومت کے درمیان قرون وسطیٰ میں ابھرنے والی چپقلش اور تصادم کے نتیجہ میں سیاسی نظریہ ابھرا ہے اور مختلف سیاسی اور اقتصادی وجوہ سے جس کی عام طور سے حمایت و تائید کی جاتی ہے۔ اسلام و اسلامی مفکرین کا روزِ اوّل سے دعویٰ ہے کہ وہ انسانی زندگی کے ہر پہلو کو خواہ وہ سیاسی ہو یا سماجی یا اقتصادی، محیط و حاوی ہے اور اس کی گرفت سے انسان کا کوئی کام باہر نہیں ہے۔ یہی تصوّر و نظریہ تھا جس کے تحت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ کیا وہ مذہب اسلام کا ایک حصہ بن گیا۔ آپؐ کے ارشادات (قول) اور اعمال ہی نہیں بلکہ آپؐ کی موجودگی میں کوئی بات کہی گئی یا کوئی عمل کیا گیا اور آپ نے اس پر سکوت فرمایا (جس کو اصطلاح میں "تقریر" کہتے ہیں) تو یہ خاموش رضامندی بھی "سنّت نبویؐ" بن کر اسلام کا حصہ بن گئی۔ چنانچہ فقہاء اور محدثین کے نزدیک قرآن حکیم اور سنّتِ نبویؐ اسلام کی دو بنیادی اور الہامی یا ربّانی اساس ہیں۔ اور عہد نبویؐ میں انھیں دونوں پہ اسلام کی پوری عمارت قائم و استوار ہوئی تھی۔ اس لحاظ سے حکومتِ نبویؐ کی خدمت دراصل اسلام کی خدمت تھی۔

لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے جیسا کہ جدید زمانے میں بعض افراد اور جماعتوں نے سمجھ لیا ہے کہ اسلام کا بنیادی مقصد سیاسی اقتدار حاصل کرنا اور پھر حکومت قائم کرنا ہے اور اسلام بغیر حکومت کے پوری طرح سے نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ دراصل حکومت کا قیام اور سیاسی اقتدار کا حصول اسلام کے استحکام کا نتیجہ ہوتا ہے نہ کہ عامل و سبب۔ یہ عہد نبویؐ میں اسلام اور اسلامی ریاست کے ارتقاء و استحکام کی تاریخ سے پوری طرح واضح ہوتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل مقصد اور اوّلین و آخرین عشق اسلام کو قائم و مستحکم کرنا تھا اور اس کے قیام و استحکام کے نتیجے میں حکومت و ریاست از خود قائم و دائم ہوتی ہے۔ مدینہ منورہ میں اسلامی ریاست کا قیام کسی سوچی سمجھی سیاسی پالیسی کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ ہجرت کے بعد پیش آنے والے واقعات و حقائق کا ایک فطری نتیجہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کردار اور کارناموں کا مطالعہ کرتے ہیں تو آپ کی شخصیت بنیادی طور سے ایک پیغمبر، مصلح اور فرستادۂ ربانی کی نظر آتی ہے اور باقی تمام دوسری حیثیتیں یا پہلو اس "نبوی شخصیت"

کے پرتو اور مظہر معلوم ہوتے ہیں۔ آپ کے تمام کام خواہ وہ سیاسی ہوں یا سماجی، اقتصادی ہوں یا فوجی، صرف مذہبی اسباب و عوامل کے نتیجہ میں ظہور میں آئے تھے۔ گویا کہ آپ کی اصل طاقت اور قوت مذہبی تھی جو دوسرے تمام کارناموں کو متعین و منتظم کرتی تھی۔ ظاہر ہے کہ پھر آپ اپنے بنیادی کام یعنی تبلیغِ اسلام اور تعلیم مذہبِ ربانی کے فرض کو کیونکر چھوڑ سکتے یا اس کی جانب سے ذرا بھی صرفِ نظر کر سکتے تھے۔ سیرت نبویؐ کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اشاعتِ اسلام اور تبلیغ دین کا آپ کو اتنا خیال و فکر تھا کہ ہر لمحہ و ہر آن اسی کی دھن میں رہتے تھے، یہاں تک کہ جب آپ میدانِ جنگ میں دشمنوں کے سامنے صف آرا اور تلواروں کی چھاؤں میں معرکہ آرا تھے، یا اسلامی ریاست کی تعمیر و ترقی کے کام میں تن من سے مصروف تھے یا امت اسلامی کی تشکیل و تنظیم کے عمل میں ہمہ تن مصروف تھے غرض کہ کسی حال میں آپ نے تبلیغ و تعلیم سے صرفِ نظر نہیں کیا۔ صرف یہی نہیں کہ آپ نے ان لوگوں کو دعوتِ دین دی جو آپ کے رابطہ و تعلق میں ارادتاً یا غیر ارادی طور سے آ گئے، بلکہ آپ نے اشاعتِ دین اور دعوتِ حق کی خاطر تبلیغی جماعتیں منظم کیں اور ان کو مختلف علاقوں میں بھیجا۔ یہ جماعتیں کبھی دوسروں کی درخواست و مطالبہ پر بھیجی گئیں اور کبھی آپ نے از خود ان کی ضرورت محسوس کی۔ تاریخ شاہد ہے کہ بسا اوقات ان تبلیغی کاوشوں کا زمانہ سراسر پُر از خطر تھا اور کبھی کبھی تو مبلغین کے سر سے جوئے خون گذر گئی جیسے کہ واقعاتِ بئرِ معونہ اور رجیع کے بارے میں سب کو علم ہے۔ ان کے علاوہ متعدد تبلیغی جماعتیں ایسی ہیں جن کو بدقسمتی سے جدید و قدیم مورخین نے "فوجی مہم" بنا دیا ہے۔ پھر خالص فوجی مہموں کے دوران بھی آپ نے اور آپ کے صحابہ نے دعوتِ دین کے فرض کو نہیں بھلایا۔ گذشتہ اوراق میں متعدد ایسے واقعاتِ قبول اسلام کا ذکر آ چکا ہے جو مہموں کے دوران ہی پیش آئے تھے۔ جنوبی عرب کو بھیجی گئی تقریباً تمام مہمیں (سرایا) مذہبی اور دعوتی مشن تھے جن کا اولین مقصد تبلیغِ دینِ حق تھا۔

ان تبلیغی کوششوں اور کاوشوں کے علاوہ تمام صحابہ کرام خاص کر اور دوسرے معاصر مسلمان عام طور سے اپنی اپنی جگہ مبلغِ دین تھے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے افسروں اور حکومتی کارکنوں کے دل و دماغ میں یہ بات اچھی طرح بٹھا دی تھی، کہ اسلام یا دین سب سے اہم و افضل چیز ہے جس کی لوگوں کو ہر آن دعوت دینی ہے چنانچہ سالاران و سپاہِ فوج ہوں یا شہرِ نظم و نسق کے افسر، یا صدقات کے وصول کرنے والے عاملین ہوں سب کا اولین فرض تھا کہ وہ غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت، اور مسلمانوں کو دین کی تعلیم دیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حکومتی کارکنوں کو اس کی صرف زبانی ہدایت ہی نہیں فرمائی بلکہ مسلسل اپنے خطوط و فرامین میں بھی اس کی طرف توجہ دلاتے رہے چنانچہ متعدد افسرانِ حکومتِ نبویؐ جیسے حضرات معاذ بن جبلؓ، عمرو بن حزمؓ، علی بن ابی طالبؓ، خالد بن ولیدؓ اور بہت سے دوسروں کے نام آپ کے گرامی ناموں میں اس کے ناقابلِ تردید ثبوت موجود ہیں۔ ان کو واضح اور غیر مبہم الفاظ میں یہ بتا دیا گیا تھا کہ ان کو لوگوں پہ حاکم بنا کر نہیں بنا کر بھیجا جا رہا ہے بلکہ اس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ وہ سیاست کے دروازے سے لوگوں کو دین میں داخل کریں۔ یہاں سیاست دین کی خادم تھی نہ کہ دین کی حاکم۔ اور تاریخِ اسلامی شاہد ہے کہ حکومتِ نبویؐ کے تمام افسروں، سالاروں اور عاملوں نے تبلیغِ دین اور تعلیمِ اسلام کا فریضہ مثالی انداز سے انجام دیا تھا اور جس نے اس میں نادانستگی یا دانستگی میں ذرا بھی کوتاہی کی تھی اس کو سخت سرزنش کی گئی تھی۔ بہرحال اس لحاظ سے تمام مرکزی اور مقامی منتظمین اور دوسرے تمام سیاسی، انتظامی اور فوجی افسران و کارکنانِ حکومت کو بھی مبلغین و معلمینِ اسلام میں

شمار کرنا چاہیے اور تاریخی واقعات اس کے شاہد ہیں کہ جزیرہ نمائے عرب کے مختلف خطوں کے لوگ چاہے وہ دور کے باسی ہوں یا گھر کے پچھواڑے آباد ہوں انہیں افسران و منتظمین حکومت کی تبلیغی کوششوں کے سبب دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تھے اور انہیں کی تعلیمی کاوشوں کے نتیجے میں پکے اور راسخ العقیدہ مسلمان بنے تھے۔

دوسرا باب قبائلِ عرب کے اسلام قبول کرنے کے نہج، رفتار اور انداز سے بحث کرتا ہے اور اس کے ضمن میں بالواسطہ ہی مبلغین اور معلمین پر بھی بحث آ چکی ہے جس سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرامؓ کی تبلیغی اور تعلیمی سرگرمیوں پر روشنی پڑتی ہے تاہم یہاں ایک مختلف زاویہ سے اس موضوع پر ایک طائرانہ نظر ڈالنا ضروری معلوم ہوتا ہے کیونکہ بعض جدید مورخین نے دانستہ یا نادانستہ طور سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مدنی دور میں تبلیغی کارناموں کو گھٹا کر بیان کیا ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ آپؐ کی سیرت اور کردار کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا کی ہیں۔

۱۔ دعوت اور دُعاۃ

مکی اور مدنی دونوں عہد میں تبلیغِ دین کے دو منبع تھے۔ ایک تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ انور تھی اور دوسرے صحابہ کرام کی مقدس ہستیاں تھیں۔ ان دونوں سطحوں پر دعوت کا کام ہوتا تھا۔ ایک طرح سے ہم ان کو مرکزی اور علاقائی تبلیغ و دعوت کی سطحیں کہہ سکتے ہیں۔ جہاں تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات کا تعلق تھا آپ ہر لمحہ، ہر مقام اور ہر موقع پر دعوت کا کام کرتے رہتے تھے۔ جب بھی اور جہاں بھی لوگوں سے رابطہ میں آتے سب سے پہلے ان کو اسلام کی دعوت دیتے تھے۔ ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں جیسا کہ ذکر آ چکا ہے ابھی تک کچھ افراد و طبقات دائرہ اسلام سے خارج تھے اور اپنے پرانے ادیان شرک یہودیت یا عیسائیت پر قائم تھے۔ آپ نے پہلے موقعہ پر ہی ان کو اسلام کی دعوت دی اور آپ کی دعوت پر کچھ یہودی اور غیر مسلم عرب جلد ہی اسلام لے آئے اور کچھ نے دو چار برس کے بعد دعوت قبول کی۔ دراصل مدنی لوگوں کی غالب اکثریت کے قبولِ اسلام کا شرف حضرت مصعب بن عمیرؓ کو جاتا ہے جن کو ہجرت سے کچھ قبل رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مبلغ، معلم اور مقری (استاد) بنا کر مدینہ بھیجا تھا۔[1] ان کے دعوتی کام میں حضرات اسعد بن زرارہ اور ان کے دوسرے مدنی ساتھیوں نے بھرپور مدد کی تھی۔[2]

بہرحال اس دوران رسول اکرمؐ نے اپنی ذاتی حیثیت اور مرکزی سطح پر دعوتی کام برابر جاری رکھا اور ہر اس فرد بشر کو اسلام کی دعوت دی جو آپؐ کے رابطہ میں آیا۔ چنانچہ مہم نخلہ کے نتیجے میں جب ایک مکی قیدی الحکم بن کیسان مدینہ لائے گئے تو آپؐ نے ان کو اسلام کی دعوت دی جو انہوں نے بڑی دلچسپی سے قبول کر لی۔[3] اسی طرح بدر کے اسیروں کو بھی آپؐ نے اسلام قبول کرنے کی دعوت دی تھی اور ان میں سے کسی نے اسے قبول بھی کر لیا تھا جس کے نتیجے میں ان کو بلا فدیہ رہائی ملی تھی۔[4]

یہ معمول نبوی ہی بلکہ آپؐ کی سرکاری حکمتِ عملی بھی تھی کہ آپؐ اپنے مخالفوں اور دشمنوں کے سامنے جنگ شروع ہونے سے قبل میدانِ جنگ میں یا مہموں کے دوران حملہ سے قبل اسلام کی دعوت سب سے پہلے دیتے تھے۔ اور اسی طرح

سے قیدیوں اور اسیروں کو بھی دعوت دیا کرتے تھے۔(۵)

آپ نے ان دشمنوں اور مخالفوں کو بھی ہمیشہ دعوت حق پہلے دی جن کا مقصد حیات ہی اسلام اور اسلامی ریاست کی مخالفت کرنا تھا حتیٰ کہ مختلف سیاسی اور مذہبی جرائم کے مرتکب مجرمین اور مخالفین کا اسلام بھی آپ نے قبول کر لیا جیسا کہ فتح مکہ کے بعد اس شہر معزور کے عظیم قریشی سرداروں کے قبول اسلام کے واقعہ سے معلوم ہوتا ہے۔(۶) اس کے بعد جب عام الوفود کے دوران تمام قبائل عرب کے نمائندے مدینہ پہونچ رہے تھے آپ نے ان کے سامنے سب سے پہلے اسلام ہی پیش کیا تھا۔(۷) حیات ارضی کے آخری دنوں میں جب آپ اپنے آخری حج پر گئے، تو آپ کو سب سے زیادہ فکر کتاب و سنہ کے ساتھ وابستگی (تمسک) کے ساتھ تبلیغ اسلام ہی کی تھی(۸) اور بالکل آخری لمحات میں اسلام ہی کا نام لب مبارک پر تھا۔

ہمارے مستند مؤرخین میں سے ایک سے زیادہ کا بیان ہے کہ آپ اپنے تمام سالاران سرایا اور امراء فوج کو ہدایت کرتے تھے کہ وہ لوگوں کو سب سے پہلے اسلام کی دعوت دیں اور اگر وہ اسے قبول نہ کریں تو ان سے صلح و دوستی کا معاہدہ کریں اور ان کو اسلامی ریاست کا ذمی بنائیں۔ تلوار تو فتنہ و فساد کچلنے کا آخری حربہ تھا ہدایت نبوی کے مطابق مسلم فوجی مہمیں ہمیشہ رات کو سفر کرتی اور صبح سویرے منزل پر پہونچتی تھیں تاکہ فجر کی اذان سے معلوم ہو جائے کہ اسلام اس مقام تک پہونچ چکا ہے یا نہیں۔(۹) یہ یقین ہو جانے کے بعد کہ اسلام ابھی تک وہاں سعادت اخروی کے برگ و بار نہیں لایا ہے مسلمان امیر و سالار لازمی طور سے اس علاقے کے لوگوں کو اسلام کی دعوت دیا کرتا تھا اور اس وقت تلوار سے کام نہیں لیا جاتا تھا جب تک زبان کے ذریعہ قبول اسلام یا قبول صلح کا اقرار نہ ہو جاتا۔(۱۰) اسی حقیقت کا صریحی بیان حضرات عبدالرحمٰن بن عوف، خالد بن ولید، علی ابن ابی طالب اور اسامہ بن زید وغیرہ کی مہموں کے ضمن میں ملتا ہے اور دلچسپ بات ہے کہ اس حکمت عملی کے نتیجے میں متعدد قبائل عرب پورے کے پورے اور بعض کے متعدبہ لوگ یا اکثریت نے اسلام قبول کر لیا تھا۔(۱۱)

مکی دور حیات نبوی کے بارے میں عام تاثر یہ ہے کہ آپ نے تبلیغی جماعتیں اور وفود نہیں بھیجے تھے مگر یہ تاثر غلط ہے متعدد صحابہ کرام کی کاوشوں کا دائرہ کار محض مکہ کی حدود تک محدود نہیں تھا۔ پھر حدود حرم میں بھی صحابہ کرام کی تبلیغی کوششوں کو کسی طرح تبلیغی اور مذہبی جماعتوں سے کم نہیں سمجھا جا سکتا۔ جہاں تک بیرون حرم مکہ کی تبلیغی جماعتوں کا تعلق ہے تو وہ حضرات معتب ثقفی، ابو موسیٰ اشعری، طفیل بن عمرو دوسی ابو ذر غفاری وغیرہ متعدد صحابہ کرامؓ کی مذہبی سرگرمیوں سے ظاہر ہوتا ہے۔(۱۲)

مختلف قبائل عرب کے نمائندہ مسلمانوں کو اپنے اپنے علاقے اور قبیلے میں واپس بھیجنے کی حکمت یہی تھی کہ وہ وہاں جا کر دعوت کا کام کریں گے۔ اور یہی تبلیغی جماعتیں تھیں اور انھیں مبلغین کی کوششیں تھیں جنھوں نے چار دانگ عرب میں اسلام کے پودے کی آبیاری کی تھی۔ مکی دور حیات کی مانند مدنی دور حیات میں بھی رسول اکرم ﷺ نے متعدد تبلیغی جماعتیں منظم کی تھیں اور ان جماعتوں یا انفرادی مبلغوں کو جزیرہ نمائے عرب کے مختلف علاقوں بلکہ اس کے باہر دوسرے ملکوں میں بھی بھیجا تھا۔ توقیتی اعتبار سے ایسی پہلی جماعت جس کا باقاعدہ واضح ذکر ماخذ میں آتا ہے صفر ۴ھ / جولائی ۶۲۵ء میں منظم کی گئی تھی۔

"ابو براء عامر بن مالک کلابی مدینہ میں خدمت نبوی میں حاضر ہوا اور آپ سے درخواست کی کہ آپ اپنے صحابہ میں سے کچھ لوگوں کو بھیج دیں تاکہ وہ نجد کے لوگوں کو اسلام کی دعوت دیں۔"

چنانچہ آپؐ نے حضرت منذر بن عمرو ساعدی کے ساتھ چالیس مبلغین پر مشتمل ایک جماعت بھیجی جو آپؐ کے بہترین مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ لیکن ان سب کو بئر معونہ کے مقام پر بے رحمی سے قتل کر ڈالا گیا۔[۱۳] اسی قسم کے ایک اور المیہ میں مسلم مبلغین کی ایک اور جماعت کو رجیع کے مقام پر اسی زمانے میں شہید کیا گیا تھا۔ موخر الذکر جماعت عضل اور قارہ کے لوگوں کی درخواست پر بھیجی گئی تھی۔[۱۴] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان دو المناک واقعات کے بعد رسول اکرمؐ نے اپنے صحابہؓ کو باہر بھیجنا پسند نہیں کیا تھا تاآنکہ آپ کو ان کی حفاظت کا مکمل یقین نہ ہو جاتا۔ دوسری مذہبی جماعتوں کے عدم ذکر اور واقعاتِ بئر معونہ اور رجیع کے مفصل ذکر کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بعد تبلیغی جماعتیں نہیں بھیجی تھیں یا صرف یہی دو تبلیغی جماعتیں بھیجی گئی تھیں جو ناکام رہیں۔ متعدد مذہبی مہمیں اور تبلیغی جماعتیں اس کے بعد بھی گئی تھیں ان میں بیشتر سرایا اور غزوات شامل تھے۔ ۶ھ کے اوائل میں آپ نے متعدد غیر ملکی حکمرانوں جیسے شاہانِ روم، ایران، مصر، عراق، شام اور حبشہ وغیرہ کے پاس مبلغین بھیجے تھے اور پھر متعدد و مختلف اوقات میں جزیرہ نمائے عرب کے مختلف علاقوں اور مملکتوں میں بھی تبلیغی مہمیں بھیجی تھیں۔ تفصیل کے لیے باب اول و دوم خاص کر اور باب چہارم میں سفیرانِ نبویؐ پر بحث کے مطالعہ کی سفارش کی جاتی ہے۔ یہاں ایک نکتہ کی طرف توجہ دلانا ضروری معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اس زمانے کی تبلیغی جماعتوں میں مبلغین کی تعداد بہت کافی نظر آتی ہے۔ اس کے دو سبب معلوم ہوتے ہیں: اول یہ کہ مبلغین کی جسمانی حفاظت مقصود تھی کہ اگر اچانک کوئی غیر معمولی صورت پیدا ہو جائے تو وہ اپنی حفاظت کر سکیں اور فتنہ جو اور مخالف لوگوں کو کسی قسم کی جرأت بے جا کی اجازت نہ دیں۔ دوم یہ کہ ابتدائی زمانے میں مسلم مبلغین کو کافی بڑے دائرۂ کار میں کام کرنا تھا جس کے لئے زیادہ افراد کی ضرورت تھی۔

فتح مکہ کے بعد رسول اکرمؐ اور صحابہ کرامؓ دونوں کی تبلیغی سرگرمیوں میں زبردست اضافہ ہوا اور تقریباً جزیرہ نما عرب کے ہر کونے اور گوشے میں مبلغین پہونچے۔ اس زمانے میں چونکہ اسلامی ریاست ایک ایسی سیاسی اور فوجی طاقت بن چکی تھی جس کی مخالفت یقینی نقصان کا موجب اور موافقت عملی فوائد کا باعث بن سکتی تھی اس لیے اشاعت اسلام کی رفتار میں تیزی بھی آئی اور ساتھ ہی مسلم جماعتوں اور مبلغوں کے لئے کوئی خاص خطرہ بھی نہیں رہا۔ چنانچہ بعض اوقات بہت مختصر جماعتیں بھی بھیجی گئیں جو بئر معونہ اور رجیع کے صدمات سے محفوظ رہیں۔ خاص طور سے مختلف قبائل عرب کے اصنام شکنی کی مہمیں جو محض ایک دو نفروں یا زیادہ سے زیادہ چند افراد پر مشتمل تھیں۔[۱۵] اس دور کی اہم ترین پہلی دو مہمیں یا تبلیغی جماعتیں حضرات علاء بن حضرمی اور عمرو بن عاص سہمی کی تھیں جو بالترتیب بحرین اور عمان کی مملکتوں میں بھیجی گئی تھیں اور مکمل طور سے کامیاب رہی تھیں۔[۱۶] حضرت خالد بن ولید مخزومی نے بنو الحارث بن کعب کے لوگوں میں اشاعت دین کا کام پوری کامیابی کے ساتھ کیا تھا۔[۱۷] اس سے قبل انہوں نے بنو جذیمہ کے لوگوں کے درمیان دعوت کا کام کیا تھا۔ اسی طرح حضرت علی بن ابی طالب نے رسول اللہ کے ارشاد گرامی کے مطابق ہمدان اور مذحج کے لوگوں کو مشرف بہ اسلام کیا تھا۔[۱۸] طبری کا بیان ہے کہ حیاتِ طیبہ کے آخری دنوں میں رسول اکرمؐ نے جزیرہ نما کے مختلف علاقوں میں کم و بیش آٹھ مبلغوں کو اشاعت دین کی خاطر بھیجا تھا۔ ان کے علاوہ متعدد اور مبلغین اور داعی تھے جو تبلیغ و دعوت کا کام مختلف علاقوں میں پوری تندہی اور جوش کے ساتھ کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں رسول اللہ کے ان سفیروں کا ذکر کرنا

ضروری معلوم ہوتا ہے جن کو آپ نے مختلف مقامی سرداروں اور منتظمین کے پاس بھیجا تھا۔

جیسا کہ کہیں اور مفصل ذکر کیا جا چکا ہے[۲۰] رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سفیر (رسل) دو قسم کے تھے۔ ایک تو وہ سفراء تھے، جن کو غیر ملکی حکمرانوں اور شہزادوں کے درباروں میں بھیجا گیا تھا اور دوسرے وہ تھے جن کو مقامی سرداروں اور عرب قبائل کے شیوخ کے پاس روانہ کیا گیا تھا۔ ان میں سے اکثر سفارتوں کے پس پشت جو حکمت عملی کارفرما تھی وہ اصلاً مذہبی تھی کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جتنے گرامی ناموں کے متون دستیاب ہوئے ہیں ان میں علانیہ اور غیر مبہم انداز میں مکتوب الیہم کو اسلام کی دعوت دی گئی ہے۔ مثال کے طور پر تمام غیر ملکی حکمرانوں جیسے حبشہ کے نجاشی، بازنطین کے ہرقل، غسان کے حارث بن شمر، مصر کے مقوقس، ایران کے کسریٰ اور اس کے ایک ماتحت حکمران ہرمزان وغیرہ کو اسلامی امت کا رکن بننے کی دعوت دی ہے۔[۲۱] اسی طرح ملکی حکمرانوں میں بحرین کے منذر بن ساویٰ، عمان کے جیفر و عبد اور یمن و حضرموت کے متعدد حکمرانوں کے نام خطوط نبوی کا معاملہ ہے۔ دوسرے قبائل عرب کا سرداروں مثلاً یمامہ کے ہوذہ بن علی، نجران کے بشپ ضغاطر، ایلہ کے بشپ حکمران، مقنا وغیرہ شمالی بستیوں کے فرمانرواؤں، بنو حنیفہ اور یمامہ کے سرداروں مسیلمہ اور ثمامہ بن اثال اور جنوبی عرب کے متعدد دوسروں کے نام خطوط نبوی میں اسلام کی دعوت ہی کا مضمون ملتا ہے۔[۲۲]

اس لحاظ سے ان تمام خطوط کے حاملین اور سفارتوں کے سفراء کرام بھی مذہبی مبلغین اور داعی تھے جنہوں نے صرف خطوط نبوی اور پیغام الٰہی کو پہونچانے کا ہی کام نہیں کیا تھا بلکہ اپنے ایمان، کردار و عمل کے ذریعے اسلام کی سچی تصویر کشی بھی کی تھی اور کم از کم ملکی حکمرانوں اور سرداروں کی حد تک وہ مکمل طور سے کامیاب رہے تھے جبکہ غیر ملکی حکمرانوں کے درباروں میں جزوی کامیابی کے علاوہ انہوں نے اسلام کے اچھے اور دل نشین نقوش چھوڑے تھے۔

جہاں تک مقامی سرداروں اور انتظامیہ کے افسروں کے تبلیغ و اشاعتِ دین میں حصہ لینے کا معاملہ ہے تو کسی حد تک اس کا ذکر یا کم از کم اشارہ باب دوم اور چہارم میں آچکا ہے۔ یہاں ان کے مذہبی فرائض کی انجام دہی کی جانب مختصر سا اشارہ کافی ہوگا۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ مختلف اوقات میں مختلف سرداروں نے اسلام قبول کر لیا تھا اور پھر خود بھی اسلام کے مبلغ بن گئے تھے اور انہوں نے اپنے علاقوں یا پڑوسیوں میں بھی تبلیغ کی تھی۔ مثال کے طور پر حضرات جرثوم بن ناشب خشنی / قضاعہ، عبادہ بن اشیب عنزی / بنو وائل، عمرو بن مرہ جہنی وغیرہ کے علاوہ بہت سے شیوخ قبیلہ تھے جنہوں نے اپنے قبیلوں کے لوگوں کو اسلام کے دائرہ میں داخل کیا تھا۔ اسد الغابہ کے مطابق ان سب کو دعوت دین کا کام کرنے کا حکم رسول کریم نے دیا تھا۔[۲۳]

اسی طرح مرکزی منتظمین کو بھی اپنے اپنے علاقوں میں اسلامی دعوت پھیلانے اور لوگوں کو اسلام سکھانے کا ذمہ دار بنایا گیا تھا۔ حضرت معاذ بن جبل کے بارے میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ وہ جنوبی عرب کے وسیع خطے کے گورنر جنرل ہونے کے علاوہ معلم اور مبلغ بھی تھے اور بقول طبری "ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ میں جاتے رہتے تھے اور خلقِ خدا میں پیغام ربانی کو پھیلاتے رہتے تھے۔"[۲۴] حضرت عمرو بن حزم کو بطورِ گورنر نجران مفصل ہدایات ملی تھیں لیکن ان میں سب سے زیادہ زور خدا کے دین کو اس کی

مخلوق تک پہونچانے پر تھا۔(۲۵) تبلیغ و اشاعت دین پر اسی قسم کی تاکید دوسرے گورنروں، عاملوں اور افسروں کے نام خطوط نبویؐ میں ملتی ہے۔(۲۶) حکمت نبویؐ کی بنیاد دراصل اس عقیدے پر تھی کہ محض اشاعتِ دین ہی اسلامی ریاست کی بقا اور استحکام کی ضمانت دے سکتی ہے۔ مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ نہ صرف اسلامی ریاست کے کارکن بلکہ ہر مسلمان اپنی جگہ ایک اعلیٰ ایک مبلغ تھا۔ اس کے سوا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی لوگوں کو دعوتِ حق دی تھی اور مبلغین اور دعاۃ کی جماعتیں بھی جزیرہ نما عرب کے مختلف علاقوں میں بھیجی تھیں اور اس طرح اسلام کے مبلغوں اور داعیوں کا اسلامی ریاست کی توسیع اور استحکام میں خاصا مثبت اور عملی حصہ تھا۔(۲۷)

۲ - معلّمین

محض اسلام کی تبلیغ سے نہ تو سرزمین عرب پر ریاست اسلامی کی توسیع و استحکام کا عمل پورا ہوسکتا تھا اور نہ ہی خارجی دنیا میں اس کی طاقت کو محسوس کیا جاسکتا تھا جب تک کہ نومسلموں کے دلوں کی گہرائیوں میں اسلامی تعلیمات اور قرآنی احکام کو جاگزیں نہ کردیا جاتا۔ اسی بنا پر قرآن کریم کا حکم ہے کہ:

"اور ایسے تو نہیں مسلمان کہ سارے کوچ میں نکلیں، سو کیوں نہ نکلے ہر فرقے میں سے ان کے ایک حصہ، تا سمجھ پیدا کریں دین میں اور تا خبر پہونچاویں اپنی قوم کو جب پھر آویں ان کی طرف ....." (۲۸)

تعلیمِ دین و اسلام کی اہمیت کا احساس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ابتدا ً کار سے تھا چنانچہ آپ نے نومسلموں کی تعلیم کا اہتمام بڑی محنت و عنایت سے کیا تھا۔ اس تعلیم کے حصول کے بعد ایمان میں پختگی اور مذہب کی سمجھ آتی تھی جس کو اسلامی اصطلاح میں "تفقہ فی الدین" کہا جاتا ہے اور دراصل اسلام اور ایمان میں جو فرق قرآن کریم نے کیا ہے(۲۹) وہ ایک لحاظ سے تبلیغ و تعلیم کا فرق ہے اور یہ دونوں سچے مسلمان کے لازم و ملزوم ہیں۔

عہد نبوی میں نومسلموں میں تعلیم کی متعدد مثالیں ہم گذشتہ ابواب میں خاص کر باب دوم میں دیکھ چکے ہیں۔ مگر اس بحث میں ان پر ایک نئے زاویہ سے مجموعی طور پر دیکھنا مفید ہوگا کیوں کہ اس سے رسول کریمؐ کے نظامِ تعلیم و تربیت کا صحیح علم ہوسکے گا۔ یہ نکتہ ذہن نشین رکھنے کا ہے کہ ہر اصلاحی تحریک اور مذہب کی مانند رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سب سے عظیم اور اوّل معلم تھے اور ابتدا ً میں آپ نے ہی تمام مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کا فریضہ انجام دیا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ آپ نے ابتدا ہی سے اپنے قابل اصحاب کو اس طرح سے تعلیم و تربیت دی تھی کہ وہ دوسروں کے لیے معلم اور مشعل راہ بن سکیں تاکہ چراغ سے چراغ جلتے رہیں۔ مکی عہد میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن لوگوں کو براہ راست تعلیم دی تھی ان میں عبدالقیس کے سردار الاشج کے بھتیجے کی تعلیم کا واقعہ دلچسپ ہے جو ہم دیکھ چکے ہیں۔ آپ کے اجل اصحاب نے اس دور میں معلم ثانی کا فریضہ انجام دیا تھا اور واقعہ یہ ہے کہ نومسلموں کی تعلیم و تربیت کا فریضہ آپ اپنے اصحاب میں سے کسی کے سپرد کردیتے تھے۔ ہجرت کے زمانے تک قابل معلمین کی تعداد معتدبہ ہوچکی تھی۔ بلکہ کہنا یہ چاہیے کہ مکی عہد میں جن صحابہ کرام نے بھی آپ کی صحبت کا فیض کچھ مدت تک اٹھا لیا تھا وہ کندن بن گیا تھا۔

چنانچہ ہجرت مدینہ سے ذرا قبل جب اہلِ مدینہ کی تعلیم و تربیت کے لئے کسی معلم کی ضرورت پڑی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظرِ انتخاب عبدالدار / قریش کے ایک نوجوان، صالح و قابل صحابی حضرت مصعب بن عمیرؓ پر پڑی اور آپ نے ان کو مدینہ بھیج دیا۔ اس سے قبل اہلِ مدینہ کی تعلیم کا فریضہ حضرت اسعد بن زرارہؓ، نقیب النقباء کیا کرتے تھے۔ مآخذ کا بیان ہے کہ تمام مدنی مسلمان ان کے گھر یا اس کے پہلو میں آباد مسجد خانہ میں جمع ہو جاتے تھے اور حضرت اسعد بن زرارہؓ ان کو مذہبی تعلیم دیا کرتے تھے۔(۳۰) یہاں یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مصعب بن عمیرؓ کی مدینہ آمد سے قبل خدا نخواستہ مدنی مسلمانوں کی تعلیم کا انتظام ناقص تھا یا حضرت اسعدؓ اچھے معلم نہ تھے۔ بلکہ اصل بات یہ تھی کہ مسلمانانِ مدینہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض یافتہ و تربیت کردہ صحابی سے تعلیم و تربیت کی سعادت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ دوسرا نکتہ یہ بھی ہے کہ اکثر و بیشتر مبلغین ہی معلمین کے فرائض انجام دیتے تھے کیونکہ معلم کی صلاحیتوں سے مالا مال ہوتے تھے۔ لیکن مخصوص حالات میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم خاص کر نئے مسلمانوں کے لئے "معلّمین" کا تقرر فرماتے تھے۔ اس بحث میں ہم ایسے ہی معلمین کا ذکر بطورِ خاص کریں گے۔

صحیح بخاری کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے کے ایک اور معلم حضرت ابن ام مکتومؓ بھی تھے۔ حضرت براء بن عازبؓ کی روایت ہے کہ ہجرت سے قبل حضرت مصعب بن عمیرؓ اور حضرت ابن ام مکتومؓ لوگوں کو قرآنِ کریم پڑھاتے تھے اور خود راوئ حدیث نے جو اس وقت چھوٹی عمر کے تھے مفصل سورتوں میں سورہ الاعلیٰ حضرت ابن ام مکتومؓ سے سیکھی تھی بلاشبہ ہجرت کے بعد بھی حضرت ابن ام مکتومؓ معلم کے فرائض بدستور سابق انجام دیتے رہے تھے کیونکہ وہ حضرت مصعبؓ کے بعد ہی مدینہ پہونچے تھے۔(۳۱) عین ممکن ہے کہ ان کی ہجرت میں سبقت کے پیچھے اشارۂ نبویؐ رہا ہو۔ بہرحال یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہجرت کے بعد رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم معلمِ اوّل رہے تھے اور تمام مسلمانوں کی تعلیم و تربیت فرماتے تھے۔ لیکن آپ کے علاوہ اب پوری پوری جماعتیں معلمین کی بن گئی تھیں۔ ان میں سے ایک غریب مسلمانوں کی جماعت تھی جو کہ عام طور سے "اہل الصفّہ" کے نام سے مشہور رہے۔ وہ مستقل خدمتِ نبویؐ میں حاضر رہتے تھے اور رات دن اسلام اور دین کے احکام و اصول و حقائق سیکھتے رہتے تھے، جبکہ دوسرے مسلمان دنیاوی مشاغل جیسے کھیتی باڑی، تجارت یا محنت مزدوری میں مشغول رہتے تھے اور بوقت ضرورت ہی حاضر ہو جاتے تھے۔ ایسا نہیں گمان کرنا چاہیے کہ صرف اصحابِ صفہ ہی معلم و حامل علم تھے۔

اجل اصحاب نبیؐ میں سے بہت سے ایسے تھے جن کا درجہ و معیار و مبلغِ علم صرف معلم اول کے بعد ہی تھا اور ان میں سے متعدد تو ان اصحاب صفہ کے بھی استاد تھے۔ چنانچہ ابو داؤد کی ایک روایت کے مطابق حضرت عبادہ بن صامتؓ بہت سے اصحابِ صفہ کو قرآن حکیم اور لکھنے پڑھنے کی تعلیم اپنے گھر پر دیا کرتے تھے۔(۳۲)

ابن حنبل نے حضرت انس رضی بن مالک کی سند پر روایت بیان کی ہے کہ "اصحابِ صفہ میں سے ستر اشخاص مدینہ کے ایک معلّم کے گھر رات کو پڑھنے جاتے تھے اور وہاں فجر تک علم کا بازار گرم رکھتے تھے۔"(۳۳) اس "مرکزِ علم و دانش" سے بہرہ ور ہونے والے

طالبانِ علم ایک دن خود بھی مسندِ تعلیم و معلم پر فائز ہو گئے تھے۔ تقریباً (۳۳) اسی مبلغین و معلمین جو بئر معونہ اور رجیع کے المیوں میں شہادت کے درجہ پر فائز ہوتے اسی مدرسہ علم کے فارغین اور اسی دانشکدہ کے معلمین تھے (۳۴) بعد کے زمانے میں احادیث نبویؐ کے ایک بڑے راوی اور عالم حضرت ابوہریرہ خود بھی معلمین کے اسی طبقہ ممتاز سے تعلق رکھتے تھے۔(۳۵)

اصحابِ صفہ کے علاوہ متعدد دوسرے اساتذہ و معلمین کا ذکر ماخذ میں ملتا ہے۔ ان میں سے وہ ممتاز ترین تھے جن سے قرآن حکیم وغیرہ کا علم حاصل کرنے کا حکم خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا تھا۔ چنانچہ بخاری کی ایک روایت ہے کہ آپ مسلمانوں کو اپنے چار اصحاب حضرات عبداللہ بن مسعودؓ، سالم مولیٰ ابی حذیفہؓ، ابی بن کعبؓ اور معاذ بن جبلؓ سے قرآن کریم پڑھنے اور اسلام سیکھنے کا حکم دیا کرتے تھے (۳۶)۔ اصابہ کا بیان ہے کہ ایک نومسلم حضرت وردانؓ جو بعد کی ایک مشہور شخصیت فرات بن یزید کے دادا تھے قرآن حکیم کی تعلیم کے لیے حضرت ابان بن سعید اموی رضی اللہ عنہ کے حوالے کئے گئے تھے اور یہ کام کسی اور نے نہیں بلکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفس نفیس کیا تھا۔(۳۷) اسی طرح "کنز العمال" کی ایک روایت کے مطابق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نومسلم حضرت ابو ثعلبہ خشنیؓ کو حضرت ابوعبیدہ بن جراح فہریؓ کے دامن تربیت میں دیا تھا اور فرمایا تھا کہ "میں نے تم کو ایک ایسے شخص کے حوالے کیا ہے جو تم کو اچھی تربیت دے گا اور ادب سکھائے گا۔"(۳۸)

قریش کے خاندان سعیدی کے حضرت عبداللہ بن سعیدؓ اموی اسلام لائے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مسلمانانِ مدینہ کے لیے معلم مقرر کیا تاکہ وہ ان کو قرآن حکیم اور لکھنے پڑھنے کی تعلیم دیں۔(۳۹) عہد نبویؐ میں قرآن حکیم کو جمع کرنے والے صحابہ کرام (جماع القرآن) کے بارے میں محمد بن حبیب بغدادیؒ نے ایک علٰحدہ اور مکمل فصل باندھی ہے جس میں انہوں نے چھ (۶) اصحاب کو جامع و حافظ قرآن بتایا ہے۔ ان کے اسمائے گرامی یہ تھے:

۱۔ سعد بن عبیدؓ، بنو عمرو بن عوف / اوس
۲۔ ابوالدرداء عویمر بن زیدؓ بنو عدی بن کعب / خزرج
۳۔ معاذ بن جبل، بنو جشم / خزرج
۴۔ ثابت بن زید، بنو ثعلبہ بن کعب / خزرج
۵۔ ابی بن کعب
۶۔ زید بن ثابت / بنو مالک بن نجار / خزرج۔(۴۰)

ابن سعد نے ایک اور انصاری صحابی کا نام قرآن مجید کے جامعین میں شمار کیا ہے۔ وہ حضرت قیس بن سکنؓ تھے جو بدری صحابی تھے اور خزرج کے خاندان نجار کے بطن بنو غنم بن عدی سے تعلق رکھتے تھے۔(۴۱) اس ضمن میں یہ بات یاد رکھنی چاہیے جیسا کہ کتانی نے بھی اس نوع کی حدیثوں اور روایتوں کی تشریح میں واضح کیا ہے کہ صرف مذکورہ بالا اصحاب ہی قرآن کریم کے جامع اور حافظ نہیں تھے۔ ان کے علاوہ اور بہت سے تھے۔ مثال کے طور پر اوپر حضرات عبداللہ بن مسعودؓ اور سالم مولیٰ ابی حذیفہؓ کا ذکر نہیں آیا ہے۔ حالانکہ ان سے قرآن سیکھنے کی ہدایت خود زبانِ رسالتؐ اور حامل وحی سے ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ مذکورہ بالا چھ سات جماع القرآن میں سب کے سب انصاری صحابہ ہیں اور مہاجرین میں سے کسی کا نام نہیں لیا گیا ہے جبکہ یہ ناقابل یقین امر ہے کہ موخر الذکر طبقہ میں کوئی حافظ و جامع قرآن عہد نبوی میں تھا ہی نہیں۔ دراصل اس قسم کی روایات مختلف طبقاتِ حفاظ و جماع کو بیان کرتی ہیں نہ کہ ان کی تحدید و تحصیر کرتی ہیں۔

دوسرے ماخذ سے ثابت ہوتا ہے کہ تمام اکابر صحابہ قرآن کریم کے جمع و حفظ کرنے والے تھے اور بہت سے ایسے بھی تھے جو نسبتاً آج کم معروف ہیں اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ان میں خواتین کی بھی ایک معتدبہ تعداد شامل تھی جن کو عام طور سے ہمارے ماخذ اور مورخین دونوں نظر انداز کر دیتے ہیں۔ چنانچہ اس طبقہ حفاظ میں حسب ذیل اصحاب کو بھی شامل کرنا چاہئے:

"حضرات ابوبکر صدیقؓ، عمر فاروقؓ، عثمان غنیؓ، علی مرتضیٰؓ، طلحہ بن عبیداللہ تیمیؓ، سعد بن ابی وقاصؓ، حذیفہ اموئیؓ، سالمؓ ابوہریرہؓ، عبداللہ بن سائبؓ، عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ، معاویہ بن ابی سفیانؓ، ابو زید انصاریؓ، تمیم داری، عبادہ بن صامتؓ، ابوایوب انصاریؓ" ان کے علاوہ خواتین میں حضرت ام ورقہ بنت عبداللہ بن حارث انصاریہؓ کا نام نامی قرآن کے حافظوں میں بیان ہوا ہے۔(۴۲) بیشتر ازواج مطہرات خاص کر حضرت عائشہ صدیقہؓ کو اسی زمرہ میں شمار کیا جانا چاہئے۔

بہر حال یہ یقینی ہے کہ ان مذکورہ بالا حضرات و خواتین کی تعداد سے کئی گنا زیادہ حفاظ قرآن عہد نبوی میں تھے اور یہ سب کے سب معلم بھی تھے جو دوسروں تک علم و دانش کی روشنی پہونچاتے تھے۔ اس طرح ماخذ سے کافی شہادت اس بات کی ملتی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں جو اسلام اور اسلامی ریاست کا مرکز تھا مسلمانوں کی دینی تعلیم و تربیت کے لیے خاص انتظامات فرمائے تھے۔

مدینہ کے دانشکدۂ علم و عرفان سے صرف مسلمانان شہر ہی مستفیض نہیں ہوتے تھے بلکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کو آنے والے دوسرے طالبان حق بھی فیضیاب ہوتے تھے لیکن اس سلسلے میں دو مشکلیں تھیں اول یہ کہ باہر سے آنے والے خاص کر دور دراز کے مسلمان مدینہ میں زیادہ قیام نہیں کر سکتے تھے اور دوم یہ کہ تمام مسلمانان عرب مرکز ابھی نہیں سکتے تھے۔ نہ ہی سب کے سب ہجرت کر کے مدینہ منورہ میں مستقل سکونت اختیار کر سکتے تھے۔ اسلئے جزیرہ نما کے مختلف علاقوں کی مذہبی تعلیم و تربیت کے لیے ان کے اپنے وطن میں مقامی سطح پر انتظامات ناگزیر تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی ضرورتوں کو مدنظر رکھا تھا اور ان پر پورا دھیان بھی دیا تھا۔ اس سلسلے میں یہ بات جاننی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ نومسلموں کے چھوٹے بڑے گروہ مدینہ منورہ زیارت رسول کریم کے لیے آتے تھے اور مختصر سے عرصے کیلئے وہاں قیام بھی کرتے تھے۔ آپ نے اسی مختصر مدت میں ان کی بنیادی تعلیم کا انتظام بھی کر دیا تھا تاکہ وہ اسلام کی بنیادی تعلیمات سے واقف ہو جائیں۔ تفسیر خازن میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی سند پر ایک روایت یہ بیان ہوئی ہے کہ تمام مسلم قبائل عرب میں سے ہر ایک سے ایک نمائندہ گروہ (عصبہ) خدمت نبویؐ میں حاضر ہوتا تھا اور آپ سے لیتے دین و مذہب کے بارے میں جو چاہتا تھا پوچھتا تھا اور اس طرح دین کی سمجھ اور اس سے واقفیت پیدا کرتا تھا۔"(۴۳) اس روایت یا عمومی تبصرہ کی تصدیق تاریخی واقعات سے بھی ہوتی ہے۔ بخاری کی روایت ہے کہ حضرت مالک بن حُویرث اپنی قوم کے وفد میں مدینہ منورہ آئے جہاں وہ بیس دن تک مقیم رہے اور اس دوران وہ اسلام کی بنیادی تعلیمات حاصل کرتے رہے۔ اپنے وطن کو جب وہ جانے لگے تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابی موصوف اور ان کے ساتھیوں کو یاد دہانی اور تاکید کی کہ جو کچھ انہوں نے اپنے مدینہ کے قیام میں سیکھا ہے اسے جا کر اپنی قوم کو سکھائیں اور اس میں ذرا کوتاہی نہ کریں۔(۴۴) اس طرح قبیلہ عبدالقیس کے حضرت عمرو بن عبد قیس نے جو تعلیم مکہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم

سے حاصل کی تھی اس کو اپنی واپسی پر اپنی قوم میں پھیلایا تھا۔"(۴۵) اس لحاظ سے وفودِ عرب میں جو مسلمان مدینہ آئے یا جہاد میں شرکت کے لئے پہونچے یا حج و زیارت کے سلسلہ میں حاضر خدمت اقدس ہوئے غرضکہ کسی سبب سے وہ مدینہ پہونچے وہ سب کے سب مدینہ علم سے دینی تعلیم و تربیت لے کر نکلے اور اپنی قوم اور اپنے علاقے کے لئے معلم و مربی بن کر لوٹے۔(۴۶)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے "بیعت ہجرت" اور "بیعت عربیت" میں جو فرق روا رکھا تھا، اس کا مقصد یہ تھا کہ نومسلم بدوی عربوں کو مناسب تعلیم و تربیت کے ذریعے اسلامی امت کا ایک پکا رکن اور اسلام کا صحیح علمبردار بنا دیا جائے کیونکہ انھیں بدو اور گنوار عربوں کو ایک دن دنیا کی امامت و سیادت کرنی تھی۔ جو لوگ بیعت ہجرت کو ترجیح دیتے تھے وہ ترک سکونت وطن کر کے مدینہ آ بستے تھے اور اسلامی امت کے "طبقہ خیر" میں ضم ہو جاتے تھے اور ہمہ وقت وہ اسلامی ریاست اور اسلام کی گوناگوں خدمات کے لئے دستیاب ہوتے تھے، جبکہ وہ لوگ جو "بیعت عربیت" کو پسند کرتے تھے وہ مختصر مدت کے لئے مدینہ آتے، اسلامی تعلیمات حاصل کرتے، دین میں تفقہ حاصل کرتے اور اپنے گھروں کو مبلغ اور معلم بن کر لوٹتے تھے۔ یہاں اس امر کی طرف اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بیعت ہجرت ان کمزور عرب قبیلوں کے نومسلموں سے طلب کی جاتی تھی جن کے اسلام کے لیے اندرونی یا بیرونی خطرات ہو سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ فتح مکہ کے بعد بیعت ہجرت باقی نہیں رہی تھی کیونکہ اب یا دِمخالفت اتنی طاقت ور نہیں رہ گئی تھی کہ نومسلموں پر وہ کسی قسم کا منفی دباؤ ڈال سکتی۔ بعض بدوی قبائل جیسے خزاعہ، اسلم اور مزینہ (اور غالباً متعدد دوسروں) کو "مہاجر" کا مرتبہ و مقام ترک سکونت وطن اور قیام مدینہ کے بغیر بھی عطا کیا جاتا اس سبب سے نہیں تھا کہ اسلامی امت میں مہاجرین کو کوئی خاص مراعات اور حقوق حاصل تھے جو دوسرے مسلم طبقات کو نہیں ملتے تھے جیسا کہ بعض مستشرقین نے ثابت کرنے کی سعی لاحاصل کی ہے۔(۴۷) بلکہ اس بنا پر تھا کہ وہ اپنے ایمان میں پختہ تھے اور دین کی سمجھ رکھتے تھے۔ بہرحال ان تمام شواہد سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان قبیلوں کی دینی تعلیم تربیت کے لئے ان کے اپنے علاقوں میں موزوں انتظامات کئے گئے تھے۔

اب ہمارے لیے اس مسئلہ کا مطالعہ کرنا باقی رہ جاتا ہے کہ جو عرب قبائل مدینہ نہیں آ سکتے تھے اُن کی مذہبی تعلیم و تربیت کے لیے عہد نبویؐ میں کیا انتظام تھا؟ ایک روایت کا حوالہ گذر چکا ہے کہ قبائل عرب کے لوگ مدینہ آتے تھے اور اسلامی تعلیمات سیکھ کر اپنے لوگوں کو جا کر سکھاتے تھے۔ اس کی مزید تائید بخاری کی ایک اور روایت سے ہوتی ہے جو عمرو بن سلمہ کی سند پر بیان ہوئی ہے۔ اس کے مطابق مدینہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی خبر سے قبائل عرب میں خاصی ہلچل پیدا ہوئی تھی اور ان کے قافلے (رُکبَان) جوق در جوق اور شوق بر شوق خدمت اقدس میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ اس حدیث کے راوی کا بیان ہے کہ ان کا قبیلہ بنو جرم قافلوں کی آمد و رفت کے راستے پر واقع تھا اور وہ آنے جانے والوں سے آپؐ کے اور آپؐ کے صحابہؓ کرام کے بارے میں پوچھا کرتے تھے۔ حضرت عمرو بن سلمہ ان قافلہ والوں سے قرآن سن سن کر یاد کر لیا کرتے تھے حالانکہ وہ خاصے کمسن تھے اور مکہ کی فتح کے زمانے تک ان کو اتنا قرآن یاد ہو گیا تھا کہ وہ اپنے قبیلہ کے سب سے بڑے حافظ سمجھے جانے لگے۔ یہ سارا قرآن انہوں نے اسی طرح پوچھ پوچھ کر یاد کیا تھا۔"(۴۸)

طبری کا بیان ہے کہ بنو حنیفہ کے ایک نو مسلم نے خدمت نبوی میں حاضری دی، کچھ مدت تک رہ کر دین کی سمجھ پیدا کی اور اپنے وطن یمامہ کو جب ان کی واپسی ہوئی تو وہ معلم بن چکے تھے اور وہاں پہنچ کر انہوں نے اپنی قوم میں تبلیغ و تعلیم پھیلائی۔(۴۹)

جب کہ فتح ہوا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے وطن مالوف کے لوگوں کی دینی تعلیم و تربیت کی فکر دامنگیر ہوئی۔ تمام مآخذ کا متفقہ بیان ہے کہ آپ نے مکہ کے نو مسلموں کو قرآن حکیم سکھانے اور اسلام کی بنیادی تعلیمات بتانے کی خاطر اپنے دو عظیم صحابیوں حضرات معاذ بن جبل خزرجی اور ابو موسیٰ اشعری کو بطور معلم وہاں چھوڑا تھا اور انہوں نے خاصی مدت تک یہ فرض خوش گوار انجام دیا تھا۔(۵۰)

اسی طرح طائف کے محاصرے کے دوران ثقیف کے جن غلاموں نے اپنے آقاؤں کا ساتھ چھوڑ کر اسلام کے دامن میں پناہ لی تھی آپ نے ان کو مختلف صحابہ کرام کے دامن تربیت سے وابستہ کر دیا تھا تاکہ ان کی صحیح اور مناسب دینی تعلیم و مذہبی تربیت ہو سکے۔ اس ضمن میں جن معلمین کے نام نامی مذکور ہوتے ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ حضرت عمرو بن سعید اموی رضی اللہ عنہ ۲۔ حضرت خالد بن سعید اموی رضی اللہ عنہ ۳۔ حضرت ابان بن سعید اموی رضی اللہ عنہ
۴۔ حضرت عثمان بن عفان اموی رضی اللہ عنہ ۵۔ حضرت سعد بن عبادہ خزرجی رضی اللہ عنہ ۶۔ حضرت اسید بن حضیر اوسی رضی اللہ عنہ۔(۵۱)

یہ دلچسپ اور اہم حقیقت ہے کہ مہاجرین میں سب کا تعلق بنو امیہ کے دو خاندانوں سے تھا اور حضرت عثمان کے سوا بقیہ کا سعیدی گھرانے سے جبکہ انصاری معلمین میں سے ایک ایک کا تعلق مدینہ کے دونوں قبیلوں سے تھا۔ بالواسطہ سہی، لیکن اس سے، عہد نبوی میں بنو امیہ کے علم و فضل اور اسلام میں پختگی کا پورا ثبوت ملتا ہے جو اموی مخالف نگاہوں کو نہیں دکھائی دیتا۔

اسلامی ریاست کے دوسرے علاقوں میں والی / گورنر، مرکزی اور مقامی منتظمین حتیٰ کہ فوجی سالار اور صدقات کے عاملین بھی اپنے اپنے علاقہ کے مذہبی اور دینی تقاضوں کی تسکین کے ذمہ دار تھے۔ جنوبی عرب کے گورنر جنرل حضرت معاذ بن جبل، زبید، رمع، عدن اور سواحل کے گورنر حضرت ابو موسیٰ اشعری، نجران کے گورنر حضرت عمرو بن حزم عمان کے گورنر حضرت عمرو بن عاص، بحرین کے گورنر حضرت علاء بن حضرمی اور صنعاء کے گورنر حضرت خالد بن سعید کے بارے میں واضح طور سے ذکر ملتا ہے کہ وہ اپنے علاقوں کے لوگوں کی دینی اور مذہبی تربیت بھی کرتے تھے۔ ان کے علاوہ دوسرے متعدد گورنروں اور والیوں کے بارے میں مضمراً بیان ملتا ہے۔(۵۲) حضرت معاذ بن جبل کے بارے میں لفظ "معلم" کا اطلاق طبری نے بار بار کیا ہے۔ سالاران فوج میں حضرت خالد بن ولید مخزومی کی تعلیمی اور تربیتی کارناموں کا ذکر کئی مقام پر ملتا ہے۔(۵۳) اسی طرح حضرت علی بن ابی طالب کے قبیلہ ہمدان میں تعلیم قرآن و اسلام کا حوالہ وضاحت سے آتا ہے۔(۵۴)

دوسرے سالاروں میں حضرات عبدالرحمٰن بن عوف، عمرو بن عاص، وغیرہ کے بارے میں مضمراً اور سب سے بڑھ کر سالار اعظم حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں صراحتاً متعدد بیانات ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام سالاران فوج اور ان کے اہل علم سپاہی بھی تلوار و تبر کے علاوہ تعلیم و تربیت کے ذریعہ بھی اسلامی ریاست کی خدمت انجام دیا کرتے تھے۔

جہاں تک عاملین صدقات کے اشاعت علم و تبلیغ تربیت میں حصہ لینے کا تعلق ہے تو حضرت عباد بن بشر انصاری کے بارے میں تمام ماخذ نے دلچسپ بیان کیا ہے۔ اس کے مطابق صدقات کی وصولی کے بعد بھی حضرت عباد بنو مصطلق میں دس دنوں تک مقیم رہے تھے اور اس دوران ان کو اسلام کی بنیادی باتوں کی تعلیم دیتے رہے تھے اور تربیت کے ذریعہ ان کو پاکیزگی بخشتے رہے تھے۔ (۵۵) ان کے علاوہ تقریباً تمام عاملین صدقات کو بھی معلمین وقت میں شمار کرنا چاہیے کیونکہ وہ اپنے قول و فعل سے ہی نہیں بلکہ باقاعدہ لوگوں کو اسلام کے مبادی سے روشناس کراتے تھے۔ ذکر آچکا ہے کہ کس طرح دو گمنام عاملوں نے صدقات میں بہترین جانور قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا اور صدقات ادا کرنے والوں کو ان کے حقوق اور صدقات کے جانوروں کے بارے میں بتایا تھا۔ (۵۶) اس بحث کے آخر میں بہرحال ان دو مثالوں کی طرف توجہ دلانا ضروری معلوم ہوتا ہے جن سے ایک طرف تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر ذریعے اور درسگاہ سے علم حاصل کرنے کی فکر و احساس کا پتہ چلتا ہے تو دوسری طرف مذہب کے دفاع کے عظیم احساس و طاقت کا ادراک کیا جا سکتا ہے۔ پہلی مثال کا تعلق اس نادر مگر مشہور واقعہ سے ہے جس کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسیران بدر میں سے اہل علم کو صرف اس شرط پر رہا کر دیا تھا کہ وہ فی کس مدینہ کے دس مسلم بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں۔ (۵۷)

دوسری مثال کا تعلق ۴ھ / ۶۲۶ء سے ہے جب آپؐ نے حضرت زید بن ثابت انصاری کو عبرانی زبان اور سابق سماوی کتب کا علم حاصل کرنے کا حکم دیا تھا اور بعض روایات کے مطابق حضرت زید نے اور کئی زبانیں بھی سیکھی تھیں۔ (۵۸) ظاہر ہے کہ کتب سماوی کا یہ علم یا مختلف زبانوں سے واقفیت حضرت زید بن ثابتؓ تک ہی محدود نہیں رہی ہوگی۔ بہرحال یہ محض مفروضہ و قیاس نہیں ہے بلکہ تاریخی شہادت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے معاصر مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کے لیے بہترین انتظامات کئے تھے اور بہترین معلمین کو اس خدمت کے لئے مقرر کیا تھا۔ اس سے بڑھ کر اور کیا واقعاتی شہادت ہو سکتی ہے کہ عہد نبوی میں بھی اور اس کے معاً بعد خاص کر یہی صحبت نبوی کے فیض یافتہ عرب معلمین پوری دنیا کو دین، اسلام، اخلاق اور پاکیزگی کا سبق سکھانے نکلے تھے اور اقوام عالم کے اولین مسلم اساتذہ تھے۔

۳۔ افتاء اور مفتی

ایک لحاظ سے عہد نبوی کے مفتیانِ دین متین اساتذہ اور معلمین ہی کی فہرست میں آتے ہیں کیونکہ وہ بھی بنیادی طور سے مسلمانوں کو اسرار و رموزِ دین و ایمان سے آگہی بخشتے تھے۔ بہرحال متعدد ماخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد نبوی میں کم از کم مدینہ میں متعدد مفتی تھے جو دین سے متعلق امور پر اپنی رائے دیتے تھے یا اسلامی احکام کی صحیح تعبیر و تشریح کرتے تھے۔ (۵۹) یہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک انتہائی دوراندیشی پر مبنی اور عملی حکمت تھی کہ آپ نے اپنی موجودگی ہی میں کتاب سنت کے ایسے عالم و شارح پیدا کر دیئے تھے جو آپ کے بعد بھی اسلام کی امامت و سیادت کا کام بخوبی کر سکتے تھے۔ خاص طور پر دوسرے ملکوں اور بدلے ہوئے حالات میں دین کی نئی اور مناسب تشریح ضروری تھی اور اس کے لیے "تفقہ فی الدین" لازمی

مشروط تھی اور آپؐ نے اسی تقاضے کے تحت اپنے بعض صحابہ کی جن میں جوہر قابل تھا خصوصی تربیت فرمائی تھی تاکہ چراغ سے چراغ جلتے رہیں اور پورا عالم انسانی اسلام کے نور سے مستفیض ہو سکے۔ یہ خیال کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف ملکوں اور کرۂ ارض کے متعدد خطوں میں اسلام کی اشاعت و استحکام کا اپنی حیات طیبہ ہی میں ادراک کر لیا تھا محض ایک مفروضہ در اصل نہیں بلکہ ایک ٹھوس حقیقت ہے جس پر سب سے بڑی شہادت قرآن کریم کی ہے کہ اسلام ایک عالمی مذہب ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے آخری رسولؐ ہیں۔ چنانچہ آپؐ نے اپنے صحابہ کو نئے حالات میں اور نئے لوگوں کی ضرورتوں کے مطابق دین کی تشریح و تعبیر کا کام کرنے کے قابل بنانے کے لیے متعدد صحابہ کی ٹھوس تربیت کی۔ حضرت معاذ بن جبلؓ کی وہ حدیث جس میں انہوں نے قرآن حکیم اور سنت نبویؐ کے بعد اپنی رائے پر عمل کرنے کا اظہار کیا تھا اس تربیت نبویؐ کے فیضان کا اظہار تھا (۶۰)

اسی طرح آپؐ نے اپنی موجودگی میں بعض صحابہ کرام سے دینی امور اور مذہبی مسائل پر فیصلے کرائے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس عہد مبارک و میمون میں تین اصول پوری طرح ظہور و عمل میں آچکے تھے اول یہ کہ معاملات زیر بحث کو قرآن حکیم کی روشنی میں حل کیا جائے اور وہاں کوئی ہدایت نہ مل سکے تو سنت کی روشنی میں فیصلہ کیا جائے لیکن ان دونوں سے بھی اگر کسی خاص معاملہ پر روشنی نہ مل سکے تو اس "رائے" اور "خیال" پر اعتماد کیا جائے جو کتاب و سنت کی فہم کا زائیدہ و پابیدہ ہے۔ حضرت معاذ بن جبلؓ کا واقعہ تنہا نہیں ہے۔ بلکہ وہ نمائندگی کرتا ہے اس امر واقعی کی کہ تمام مرکزی منتظمین اور ان کے ماتحت عالم کارکنان مذہبی و دینی معاملات کی تشریح و تعبیر کرنے کی نہ صرف پوری صلاحیت رکھتے تھے بلکہ عملاً انہوں نے ایسا کیا بھی تھا۔ اگر کسی معاملہ پر ان کو پورا شرح صدر نہیں ہوتا تھا تو وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے رجوع کر لیتے تھے کہ آپؐ ہی شارع اول و مفتی اعظم تھے۔ بہرحال آپؐ کے بعد عموماً صحابہؓ کرام اپنی ذاتی آراء و خیالات پر اعتماد کرتے تھے۔ البتہ بعض امور میں وہ خلیفۂ وقت سے بھی مشورہ کر لیا کرتے تھے کہ وہ ان سے زیادہ اہلِ علم اور تجربہ کار تھے۔

بہرحال ابن سعد نے اپنی مختلف روایتوں میں عہد نبوی کے مدینہ منورہ کے کم از کم آٹھ صحابہ کرام کو مفتیان وقت میں شمار کیا ہے۔ ان میں سے پانچ کا تعلق مہاجرین قریش سے تھا اور باقی تین کا انصار کے قبیلہ خزرج سے۔ ان کے اسمائے گرامی یہ تھے:

۱۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ ۲۔ حضرت عمر فاروقؓ ۳۔ حضرت عثمان بن عفانؓ ۴۔ حضرت علی بن ابی طالبؓ

۵۔ حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ ۶۔ حضرت معاذ بن جبلؓ ۷۔ حضرت ابی بن کعبؓ اور ۸۔ حضرت زید بن ثابتؓ۔ (۶۱)

ابن جوزی نے عہد نبویؐ کے مفتیوں کی تعداد تیرہ بتائی ہے اور مذکورہ بالا صحابہ کرام کے علاوہ حضرات عبداللہ بن مسعودؓ، حذیفہ بن یمانؓ ابوالدرداءؓ، ابوموسیٰ اشعریؓ اور سلمان فارسیؓ کے اسمائے گرامی کا اضافہ کیا ہے (۶۲) ایک اور ماخذ کے مطابق کم از کم چودہ پندرہ صحابہ کرام فتویٰ دینے کے مجاز تھے۔ ان میں سے نئے نام یہ ہیں: حضرات عبداللہ بن عباسؓ، ابوہریرہؓ، انس بن مالک اور زوجہ مطہرہ حضرت عائشہ صدیقہؓ ایک اور ماخذ میں حضرت عمار بن یاسرؓ کا نام بھی افقہ اہلِ علم میں شمار کیا گیا ہے۔ (۶۳)

جلال الدین سیوطیؒ نے جو فہرست دی ہے اس میں پچیس صحابہ کے نام گنائے گئے ہیں اور دعویٰ کیا ہے کہ ان میں بعض کے

فتاوی کو متعدد ضخیم جلدوں میں مدون کیا جاسکتا ہے۔ اس فہرست میں جو نئے نام ہیں وہ یہ ہیں: حضرات عبداللہ بن عمر، سعد بن ابی وقاص، عبداللہ بن عمرو بن عاص، جابر بن عبداللہ، ابوسعید خدری، زبیر بن عوام، عمران بن حصین، ابوبکرہ، عبادہ بن صامت، معاویہ بن ابی سفیان، عبداللہ بن زبیر اور زوجہ مطہرہ حضرت ام سلمہ[۶۴]۔ یہ یقینی ہے کہ عہد نبوی میں مفتی بننے کے اہل صحابہ کی تعداد اس سے کہیں زیادہ تھی اور ایک روایت جو ان کی تعداد ایک سو بیس بتاتی ہے بالکل قرین قیاس ہے۔[۶۵] اس سلسلہ میں یہ حقیقت یاد رکھنے کے لائق ہے، کہ تمام صحابہ کرام جو اہلِ علم تھے اور کچھ مدت تک صحبت نبوی سے فیضیاب بھی ہوئے تھے "افتا" کے اہل تھے اور "حقیقتاً" فتاوی دیتے بھی تھے۔ لیکن عہد نبوی کے مفتیوں میں ایسے صحابہ کرام کو جو اس وقت محض خورد سال تھے جیسے حضرات عبداللہ بن عباس عبداللہ بن زبیر اور انس بن مالک وغیرہ شمار نہیں کرنا چاہئے۔ ان حضرات نے عہد نبوی کے بعد یہ خدمت انجام دی تھی اور خوب خوب انجام دی تھی۔

۴۔ ائمہ مساجد

اللہ تعالیٰ کے آخری رسول و پیغمبر ہونے کی وجہ سے جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باجماعت نمازوں کی امامت فرماتے تھے اور آپ کی موجودگی میں اصولی یا عملی طور سے کوئی اور نہ صرف یہ کہ نمازوں میں امامت نہیں کر سکتا تھا بلکہ زندگی کے دوسرے پہلوؤں میں بھی کسی طرح کی قیادت کا حق دار نہیں بن سکتا تھا "تاآنکہ آپ اس کو اپنا اختیار عارضی یا مستقل طور سے منتقل نہ کر دیں۔ چنانچہ مکی دورِ حیات میں صرف آپ ہی کی امامت کی مثالیں ملتی ہیں البتہ آپ کی غیر حاضری میں کوئی صالح مسلمان امامت کے فرائض انجام دے سکتا تھا۔ اور عموماً آپ خود ایسے اماموں کا تقرر فرما دیتے تھے۔ مدینہ منورہ میں آپ کی آمد سے قبل مختلف مواقع پر مختلف اماموں کا ذکر ملتا ہے۔ چنانچہ ابن سعد کا بیان ہے کہ انصار مدینہ کے نقیب النقباء حضرت اسعد بن زرارہ نمازوں میں مسلمانان مدینہ کی امامت کیا کرتے تھے۔[۶۶] اور کچھ مدت بعد جب حضرت مصعب بن عمیر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ سفر سادہ کی حیثیت سے آ گئے تھے تو وہ ان کی جگہ مدینہ کے امام نماز بن گئے تھے۔[۶۷] پھر جب حضرت مصعب ملاقات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مکہ گئے تو ان کی جگہ امامت کا فریضہ حضرت اسعد بن زرارہ انجام دینے لگے تھے۔[۶۸] اسد الغابہ کا بیان ہے کہ قبا کی مسجد میں جو اسلام میں پہلی مسجد تھی حضرت حنظلہ بن ابی حنظلہ امامت کیا کرتے تھے۔[۶۹]

بخاری، ابوداؤد، ابن اسحاق اور ابن ہشام وغیرہ کی متعدد روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت سے پہلے مدینہ کے مسلمانوں کے دو امام نماز ہوا کرتے تھے: ایک حضرت مصعب بن عمیر عبدری تھے جو انصار کے امام تھے اور دوسرے حضرت سالم مولی ابی حذیفہ تھے جو مہاجرین کی امامت کیا کرتے تھے۔[۷۰] اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مدینہ میں دو مسجدیں تھیں اور ان کے علاوہ قبا کی مسجد تیسری تھی۔ ہجرت نبوی کے بعد مدنی مسلمانوں کے امام خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہو گئے تھے۔

جوں جوں اسلام کی اشاعت اور اسلامی ریاست کے اثر و نفوذ کا دائرہ وسیع ہوا توں توں مسجدوں کی تعداد میں اضافہ ہوا گیا اور جزیرہ نمائے عرب کے تقریباً تمام قبیلوں اور ان کے خاندانوں میں مسجدیں تعمیر ہو گئیں۔ کیونکہ نماز (الصلوۃ) دین کا سب سے اہم رکن

ہے۔ دراصل یہ مسجدیں محض عبادت گاہیں نہیں تھیں بلکہ مقامی مسلمانوں کے سیاسی، سماجی، تنظیمی اور تہذیبی مراکز تھے جہاں امت اسلامیہ کا شیرازہ مجتمع کیا جاتا تھا۔ خود اسلامی ریاست کے صدر مقام مدینہ منورہ میں متعدد مسجدیں بن گئی تھیں کیونکہ وہاں مسلم آبادی اتنی زیادہ تھی کہ مسجد نبویؐ تمام مدنی مسلمانوں کے لیے کفایت نہیں کر سکتی تھی۔ صحیح بخاری کی متعدد روایات مدینہ منورہ کی مختلف مساجد کی طرف اشارہ کرتی ہیں جہاں پابندی کے ساتھ نماز باجماعت ادا کی جایا کرتی تھی۔ مدینہ اور قبا کی دو مسجدوں کے علاوہ جو عام طور پر معروف ہیں امام بخاری نے دو اور مسجدوں کا ذکر کیا ہے جو دو انصاری خاندانوں بنو زریق[۱] اور بنو عمرو بن عوف کی مسجدوں[۲] کے نام سے مشہور تھیں۔ ظاہر ہے کہ ان تمام مساجد میں نمازوں کے امام مقرر تھے اور جن کی تقرری رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ہوئی تھی[۳]۔

ایک اور روایت کا بیان ہے کہ حضرت عتبان بن مالک انصاری اپنی قوم کے امام تھے اور ان کی باجماعت نمازوں میں امامت کیا کرتے تھے اگرچہ اس روایت سے ان کے قبیلہ یا خاندان کا نام نہیں معلوم ہوتا ہے[۴]۔ بہر حال اسد الغابہ کی روایت سے اس کی وضاحت ہوتی ہے کہ وہ خاندان بنی سالم کے جو خزرج کا ایک اہم بطن تھا امام تھے اور انہوں نے اپنے نابینا ہونے تک امامت کا فریضہ انجام دیا تھا اور اس کے بعد انہوں نے ایک خانہ مسجد بنائی تھی جہاں یاد خدا کیا کرتے تھے[۵]۔ اسی ماخذ کا بیان ہے کہ انصار کے قبیلہ اوس کے ایک خاندان بنو خطمہ نے بھی اپنی ایک مسجد بنائی تھی جس کے امام حضرت عبداللہ بن عمیر خطمی تھے[۶]۔ حضرت معاذ بن جبل کے بارے میں روایت آتی ہے کہ وہ اپنی قوم یعنی بنو جشم خزرج کے امام تھے۔ اور مسجد نبویؐ میں نماز عشا پڑھنے کے باوجود اپنی قوم کی مسجد میں لوگوں کی امامت کیا کرتے تھے[۷]۔

سنن ابی داؤد کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اوس کے خاندان بنو عبد الاشہل کے ممتاز صحابی اور سردار حضرت اسید بن حضیر اپنی قوم کے امام مسجد تھے[۸]۔

محدث ابو داؤد نے اپنی سنن ہی کے ایک الگ باب میں جس کو انہوں نے "کتاب المراسیل" کا عنوان دیا ہے مدینہ کی کم از کم نو مسجدوں کا ذکر کیا ہے جن میں عہد نبوی ہی میں باقاعدہ جماعت کے ساتھ نمازیں ان کے اپنے اماموں کی امامت میں ادا کی جاتی تھیں۔ یہ تمام مسجدیں مختلف انصاری اور بدوی مہاجر قبیلوں کے نام سے منسوب تھیں۔ چنانچہ بنو عمرو، بنو ساعدہ، بنو عبید، بنو سلمہ، بنو رباح، بنو زریق، بنو غفار، بنو اسلم اور بنو جہینہ کی مساجد کا ذکر ملتا ہے[۹]۔ موخر الذکر مسجد کا حوالہ ابن سعد نے بھی دیا ہے[۱۰]۔

صحیح بخاری کی شرح عینی کے ایک موضوع پر بحث سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا نو مسجدوں کے علاوہ مدینہ منورہ اور اس کے نواحی علاقوں میں کم از کم بیس بائیس[۱۱] اور مسجدیں تھیں جہاں پابندی کے ساتھ جماعت پنجگانہ ادا کی جاتی تھی۔ ظاہر ہے کہ ان نمازوں کی امامت کے لئے مستقل امام مقرر کئے گئے تھے۔ ان مساجد کے نام تھے:

مسجد بنو خدرہ، مسجد بنو امیہ، مسجد بنو بیاضہ، مسجد بنو حبلی، مسجد بنو عصیہ، مسجد بنو ابی فیصلہ، مسجد بنو دینار، مسجد ابی بن کعب، مسجد نابغہ، مسجد ابن عدی، مسجد بنی الحارث (خزرج)، مسجد بنی خطمہ، مسجد الفضیح، مسجد بنی حارثہ،

مسجد بنی ظفر، مسجد بنی عبد الاشہل، مسجد وقیم، مسجد بنی معاویہ، مسجد عاتکہ، مسجد بنی قریظہ، مسجد بنی وائل اور مسجد الشجرہ[۸۱]۔ یہ تمام مساجد یا تو انصار کے خاندانوں کی طرف منسوب تھیں یا ان کے بعض اہم افراد کی طرف۔ ایک دو کا انتساب مقامات کی طرف بھی تھا۔ بہرحال اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ان میں ایک مسجد مشہور یہودی قبیلہ بنی قریظہ کے نام سے بھی موسوم تھی۔ اگرچہ اس کی تاریخی اور سماجی اہمیت پر بحث کا یہ موزوں مقام نہیں ہے تاہم یہ عرفات اور برکات احمد کی تحقیقات کی بالواسطہ تصدیق کرتی ہے کہ بنی قریظہ کا قتل عام نہیں کیا گیا تھا۔

مذکورہ بالا بحث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ منورہ ایک خاصی بڑی بستی تھی جہاں کافی مسلم آبادی تھی اور تقریباً اوس و خزرج کے تمام بڑے بڑے خاندانوں کی اپنی مسجدیں تھیں۔ اس کے علاوہ بعض دوسرے مہاجر یا مقامی باشندوں کے طبقات کی بھی مساجد تھیں اور ان کی تعداد کافی تھی۔ ان تمام مساجد میں مستقل امام تھے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر کردہ تھے۔

اسلامی ریاست کے صدر مقام مدینہ منورہ کے باہر جزیرہ نمائے عرب کے ہر گوشے میں جہاں مسلمان بستے تھے بلکہ ہر قبیلہ اور ہر خاندان (بطن) کے بیچ ایک یا اس سے زیادہ مساجد موجود تھیں[۸۲]۔ اوپر حوالہ آچکا ہے کہ بحرین کے قبیلہ عبد القیس کی ایک مسجد جواثی نامی مقام پر تھی جہاں مسجد نبوی کے بعد پورے عرب میں سب سے پہلا جمعہ قائم کیا گیا تھا[۸۳]۔ ظاہر ہے کہ بحرین میں صرف یہی ایک مسجد نہ تھی، روایات میں آتا ہے کہ اس کے علاوہ بھی وہاں متعدد مسجدیں تھیں۔ خانہ کعبہ اور اس کے گرد مسجد حرام مکہ مکرمہ کی مسجد جامع تھی جس کے امام وہاں کے گورنر حضرت عتاب بن اسید اموی تھے[۸۴]۔

اگرچہ مکہ کی اور کسی مسجد کا ذکر نہیں ملتا لیکن یہ قرین قیاس ہی نہیں بلکہ یقینی امر ہے کہ اس کے علاوہ بھی وہاں متعدد مساجد تھیں۔ مکہ کی قریبی بستی طائف میں اس کے گورنر حضرت عثمان بن ابی العاص ثقفی نمازوں کے امام بھی تھے[۸۵] اور ظاہر ہے کہ دوسری مساجد بھی طائف اور ثقیف کے علاقے میں تھیں جہاں مستقل ائمہ کام کرتے تھے۔ جب حضرت عمرو بن العاص سہمی کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عمان کا گورنر بنا کر بھیجا تھا تو ان کے ساتھ حضرت ابو زید انصاری کو اس علاقے کا پیش امام[۸۶] مقرر فرما کر ساتھ روانہ کیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمان کے لیے ایک مخصوص انتظام تھا ورنہ عام طور سے علاقوں اور ولایات کے مرکزی منتظمین یا والی ہی ان کے امام بھی ہوتے تھے۔ جیسا کہ مکہ، طائف، جنوبی عرب، اور اس کے ماتحت مختلف ولایات سے معلوم ہوتا ہے[۸۷]۔

مرکزی منتظمین یا والی تو عام طور سے ولایات کے صدر مقام پر سکونت پذیر رہتے تھے اس لیے وہ وہاں کی جامع مسجد ہی کے امام ہو سکتے تھے اور ظاہر ہے کہ پورے شہر میں صرف ایک ہی مسجد نہیں ہوتی تھی بلکہ محلہ محلہ میں مسجدیں ہوتی تھیں جیسی کہ آج کل ہوتی ہیں اور ان مسجدوں میں مقامی لوگ ہی خاص کر مقامی سربرآوردہ لوگ یا منتظمین ہی امام ہوتے تھے بشرطیکہ ان کو قرآن کریم کا مناسب علم ہو اور مسائل سے ضروری واقفیت ہو۔ چنانچہ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شداد بن ثمامہ کو جو بنو کعب بن اوس کے سردار تھے اپنی قوم کا امام مقرر کیا گیا تھا کیونکہ وہ اس منصب کے پوری طرح اہل تھے[۸۸]۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے امام نماز کے لیے اوصاف اور شرائط مقرر کر دی تھیں چنانچہ صحیح مسلم کی ایک روایت کے مطابق "جو لوگ قرآن کے سب سے زیادہ حافظ (اور عالم) ہوں وہ امامت کے سب سے زیادہ اہل ہیں۔ اگر تمام نمازی اس میں مساوی ہوں تو وہ شخص جو سنت کا سب سے

زیادہ علم رکھتا ہے۔ اگر اس میں بھی سب برابر ہوں تو سب سے قدیم مہاجر اور اگر اس میں بھی سب مساوی ہوں تو سب سے زیادہ معمر آدمی امام بنے گا۔" (۸۹)

حضرت عثمان بن ابی العاص اور عمرو بن سلمہ کا بنو ثقیف اور بنو جرما کا امام مقرر کیا جانا اسی اصول کی بنا پر تھا حالانکہ یہ دونوں نسبتاً بہت کمسن تھے۔ مگر چونکہ وہ اپنے قبیلوں میں سب سے زیادہ قرآن جانتے تھے اس لئے ان کو دوسروں پر ترجیح دی گئی تھی۔

واقدی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ کثیر آبادی والے عرب قبیلوں اور خاندانوں کی اپنے اپنے علاقوں میں متعدد مسجدیں ہوتی تھیں۔ مثال کے طور پر بنو جذیلہ کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ ان کے کھیتوں، میدانوں یا صحنوں (ساحاتہم) میں متعدد مسجدیں تھیں۔(۹۰) اسی طرح بنو مصطلق نے اپنے کھلے میدانوں میں کئی مسجدیں (مساجد) بنالی تھیں۔(۹۱) یہاں عہد نبوی کے تمام اماموں یا ان کی مسجدوں کا ذکر مقصود نہیں ہے بلکہ یہ ثابت کرنا مطلوب ہے کہ جہاں جہاں معتدبہ مسلم آبادی تھی وہاں ان کی تعداد کی مناسبت سے مسجدیں آباد ہو گئی تھیں اور جہاں پنج وقتہ نمازیں ادا کی جاتی تھیں وہاں امام نماز تھے۔ ان ائمہ مساجد کا تقرر یا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے از خود فرمایا تھا یا قبیلہ / خاندان کے مسلمانوں نے منتخب کر لیا تھا اور ان کی تقرری کو خاموش اجازت نبوی حاصل تھی۔

غیر معمولی حالات میں مسجد نبوی میں یا کسی دوسری جگہ صحابہ کرام میں کوئی بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جگہ مسلمانوں کی نماز میں امامت کر سکتا تھا۔ چنانچہ ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ مدینہ منورہ سے آپؐ کی غیر حاضری کے زمانے میں نائبین رسولؐ مسجد نبوی میں مسلمانان مدینہ کی امت کیا کرتے تھے۔ یہ بھی حوالہ گذر چکا ہے جیسا کہ واقدی اور ابن سعد کے متفقہ بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ غزوۂ تبوک کے زمانے میں جب عظیم اسلامی لشکر شمالی سرحدوں کی طرف رواں دواں تھا تو اس کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ ایک حصہ کی امامت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے اور دوسرے کی حضرت ابوبکر صدیقؓ (۹۲)۔ یہاں یہ بھی بیان کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے کارکنان ریاست جیسے والی، گورنر اور سالار وغیرہ بھی مستقل امام نماز ہوا کرتے تھے، سالاروں کے سلسلہ میں حضرت عمرو بن عاص سہمی کی امامت نماز کا واقعہ بڑا دلچسپ بھی ہے اور اہم (۹۳) بھی۔ غزوۂ تبوک کے دوران ایک موقعہ پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک اور صحابی حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے امامت کی تھی۔ یہ واقعہ ماخذ میں بڑے دلچسپ انداز سے بیان ہوا ہے:

روایت کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کسی ضرورت سے تھوڑی دیر کے لئے لشکر گاہ سے کہیں چلے گئے۔ اسی دوران نماز کا وقت آ گیا (بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وقت تنگ ہونے لگا اور خدشہ پیدا ہوا کہ نماز قضا نہ ہو جاتے)۔ چنانچہ صحابہ کرامؓ نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ سے نماز پڑھانے کو کہا۔ ان کو تردد تھا لیکن قضا ہونے کے خوف سے انہوں نے نماز شروع کر دی۔ ایک رکعت ہو چکی تھی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لے آئے۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ نے آپ کو دیکھ کر پیچھے ہٹنا چاہا مگر آپ نے ان کو اشارہ سے نماز مکمل کرنے کی ہدایت کی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف یہ کہ اپنی نماز ان کی امامت میں پوری کی بلکہ بعد میں ان کے اقدام کی تعریف و تحسین فرمائی کہ "تم نے خوب کیا۔ کسی نبی نے اس وقت تک وفات نہیں پائی

جب تک کہ اس کے صحابہ میں سے کسی نیک آدمی کی امامت میں اس نے نماز نہ پڑھ لی۔
یہ واقعہ تو بہت مشہور ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض الموت میں روایات کے مطابق حضرت ابو بکر صدیق نے سترہ نمازیں پڑھائی تھیں اور ایک بار آپ خود بھی اس میں شریک ہوئے تھے۔(۹۵) علماء و فقہاء کا خیال ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضؓ اس وقت امام نہیں رہے تھے بلکہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا کرتے تھے اور ان کی اقتدا تمام مسلمان کرتے تھے۔ مگر یہ دور کی اور غیر معقول دلیل اور تاویل ہے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی امامت میں آپ کے نماز پڑھنے کی روایت اگر صحیح ہے (اور اس کے صحیح ہونے میں کوئی کلام نہیں)، تو پھر حضرت ابو بکر صدیق رضؓ کی امامت میں آپ کا نماز پڑھنا کیوں مشتبہ سمجھا جاتا ہے۔ بہرحال مذکورہ بالا بحث سے یہ بخوبی واضح ہوتا ہے کہ اسلام کے اس اولین رکن کی ادائیگی کے لیے آپ نے مستقل ائمہ مساجد کا تقرر کیا تھا جو دن رات پانچ وقت اللہ کی عظمت کے گن گاتے تھے۔

۵۔ مؤذنین رسولؐ

اذان نماز کو قائم کرنے کی ایک لازمی اور منطقی شرط ہے کہ مسلمانوں کو باقاعدہ اعلان کر کے نماز کے لیے جمع کرنا مختلف وجوہ سے ناممکن تھا۔ ہجرت نبوی کے بعد یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ مسلمانوں کو جماعت پنجگانہ کے لئے کیونکر اکٹھا کیا جائے۔ اس سے پہلے مدنی مسلمان ایک مقررہ وقت پر جمع ہو جایا کرتے تھے۔ صحیح بخاری میں اذان کی ابتدا کا دلچسپ واقعہ نقل ہوا ہے۔ اس کے مطابق تمام مسلمان مسجد میں جمع ہوئے اور یہ بحث ہوئی کہ نماز کے لیے مسلمانوں کو اکٹھا کرنے کا بہتر طریقہ کیا ہے۔ مختلف تجاویز پیش کی گئیں مگر ان میں سے کوئی بھی باب رسالت سے منظور نہ ہوئی۔ بالآخر حضرت عمر بن خطابؓ نے(۹۶) "اذان" کا طریقہ تجویز کیا جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت پسند آیا۔ بہرحال اسی پر عمل درآمد شروع ہوا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال حبشیؓ کو اسلام میں پہلا مؤذن مقرر فرمایا۔(۹۷) وہ جماعت پنجگانہ کے لیے مسجد نبوی سے مسلمانوں کو خدا کی بارگاہ میں حاضری کے لیے بلاتے تھے۔(۹۸) روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بعد میں روزوں کی فرضیت کے بعد رمضان میں وقت سحری کے شروع ہونے کا اعلان اپنی اذان سے کرتے تھے۔(۹۹) آخذ کے متفقہ بیانات کے مطابق حضرت بلال حبشیؓ نے حیات نبوی کے آخری لمحہ تک خواہ آپ سفر میں ہوں یا حضر میں مؤذن رسولؐ ہونے کی سعادت پائی تھی اور بلا ریب اس میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا، نہ شریک و سہیم۔(۱۰۰)
ابن سعد کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تین مؤذن تھے: حضرت بلال حبشیؓ، حضرت ابو محذورہؓ جن کا اصلی نام اوس بن معیر جمحی تھا اور حضرت عمرو بن ام مکتوم عامریؓ۔ اس روایت کے مطابق حضرت بلالؓ کی غیر حاضری میں حضرت ابو محذورہ اذان دیتے تھے اور حضرت ابو محذورہ کی عدم موجودگی میں حضرت ابن ام مکتومؓ۔(۱۰۱)
لیکن ابن سعد کی اس روایت کا آخری حصہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ بلاشبہ یہ تینوں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مؤذن تھے مگر حضرت ابن ام مکتوم کے بارے میں اب تک جتنی روایات مل سکی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ رمضان میں سحری کے ختم ہونے کے اعلان کی اذان دیتے تھے۔(۱۰۲) اور غیبت نبوی میں امام نماز ہوتے تھے نہ کہ مؤذن۔ جہاں تک حضرت ابو محذورہ کا تعلق ہے

انہوں نے عہد نبوی میں ہمیشہ مکہ مکرمہ کے خانہ کعبہ میں اذان دی۔ انہوں نے مدینہ میں کبھی اذان نہیں دی۔ روایات کا تقریباً اس پر اتفاق ہے کہ حضرت ابو محذورہ بھی فتح مکہ کے دن اسلام لائے تھے اور ان کی شیریں آواز اور دل سوز انداز کی بنا پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو خانہ کعبہ یا حرم مکہ کا مؤذن مقرر کر دیا تھا۔[۱۰۳] یہ خدمتِ نبوی ان کو ایسی راس آئی کہ ان کی حیات کے بعد حرم کعبہ میں اذان کی سعادت ان ہی کے خاندان میں نسل در نسل منتقل ہوتی رہی تھی۔[۱۰۴]

اسد الغابہ کا بیان ہے کہ حضرت سعد بن عائذ کو جو سعد القرظ کے نام سے زیادہ مشہور رہیں، مسجدِ قبا کا مؤذن مقرر کیا گیا تھا لیکن اس روایت کے مطابق وہ حضرت بلال حبشی کی عدم موجودگی میں مدینہ میں بھی اذان دیتے تھے۔[۱۰۵] اس روایت کا بھی آخری حصہ صحیح نہیں ہے۔ ابن قتیبہ دینوری کا واضح اور صریح بیان ہے کہ صحابی موصوف حضرت ابو بکر صدیق رضؓ کی خلافت کے آخر تک مسجد قبا ہی کے مؤذن رہے تھے، جب حضرت عمر بن خطابؓ خلیفہ ہوئے اور حضرت بلالؓ حبشی ان کی اجازت سے شام چلے گئے تو خلیفہ دوم ان کو مدینہ کی مسجد نبوی میں لے آئے تھے۔[۱۰۶]

بہر حال صحابی موصوف عہد صدیقیؓ میں مدینہ آئے ہوں یا عہد فاروقیؓ میں یہ امر اپنی جگہ مسلم ہے کہ وہ عہد نبوی میں مسجد قباء ہی کے مؤذن رہے تھے۔ اور ابن قتیبہ کے مطابق حضرت سعد القرظ کے جانشین مؤذنین ان کے اپنے خاندان والے تھے جو ابنِ قتیبہ کے زمانے میں بھی اپنے عہدے پر برقرار رہے تھے۔

اسد الغابہ کے ایک بیان کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک اور مؤذن کا نام حضرت عبدالعزیز ابن اصم تھا۔ اس روایت میں اس کے علاوہ اور کچھ مذکور نہیں ہے۔[۱۰۷] بہر حال کتانی کا خیال ہے کہ صحابی موصوف نے صرف ایک بار عہد نبوی میں اذان دی تھی۔[۱۰۸] مؤخر الذکر مصنف کا مزید بیان ہے کہ حضرت زیاد بن حارث الصدائی بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک مؤذن تھے۔[۱۰۹] مصنف عبدالرزاق کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک اور مؤذن کا نام حضرت ثوبان تھا جو آپ کے مولی تھے اور جنہوں نے صرف ایک بار یہ خدمت انجام دی تھی۔[۱۱۰] مقریزی کی خطط کی بنیاد پر کتانی کا مزید بیان ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آٹھویں مؤذن اور کوئی نہیں جناب عثمان بن عفان اموی تھے جو منبر رسولؐ کے پاس اذان دیا کرتے تھے۔[۱۱۱] غالباً اس سے مراد جمعہ کی دوسری اذان ہے جو خطبہ کے شروع ہونے سے قبل امام کے سامنے دی جاتی ہے۔ مآخذ میں عام طور سے مؤذنین رسولؐ کے بارے میں یہ سکہ بند فقرہ ملتا ہے کہ "وہ حضرت بلالؓ کے جانشین مؤذن تھے"۔ عموماً اس تبصرہ کا سبب مورخین یا راویوں کی یہ غلط فہمی معلوم ہوتی ہے کہ وہ مسجد نبوی کو جہاں حضرت بلالؓ اذان دیتے تھے مدینہ کی صرف ایک مسجد تصور کر لیتے ہیں۔ بہر حال دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ کبھی کبھی حضرت بلال حبشی کی غیر حاضری میں کسی اور نے بھی ضرور اذان دی ہوگی

اسد الغابہ میں ایک خبر واحد سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض اوقات مختلف قبائل عرب کے لیے بھی ائمہ کی مانند مؤذنوں کا بھی تقرر کیا تھا۔ روایت کے مطابق حضرت سفیان بن قیسؓ کندی کو جو کندہ کے وفد میں حضرت اشعث بن قیسؓ کے ساتھ آئے تھے اور ان کے حقیقی بھائی بھی تھے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنے قبیلہ کے لیے مؤذن مقرر کیا تھا۔[۱۱۲]

بہر حال یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ جزیرہ نمائے عرب کے مختلف خطوں میں بکھری ہوئی مسجدوں میں مؤذنین بھی تھے۔ خواہ ان کی تقرری رسول کریم

صلی اللہ علیہ وسلم نے براہ راست کی ہو یا بالواسطہ۔ دونوں صورتوں میں وہ عہدِ نبوی کے مذہبی نظام کا ایک حصہ تھے۔ کیونکہ اذان نماز کے قائم کرنے کے لیے ایک ضروری بلکہ ناگزیر شرط بن گئی تھی۔

بعض اوقات جیسا کہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اذان کو بعض اہم سیاسی اور سماجی امور پر بحث کرنے کی خاطر مسلمانوں کو اکٹھا کرنے کے لیے بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ جب کبھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کسی اہم اور غیر معمولی مسئلہ پر بحث مباحثہ کے لیے مسلمانوں کو جمع کرنا چاہتے تھے تو حضرت بلال حبشی یا اور کوئی موذن اذان دیتا تھا یا مدینہ کی گلیوں میں الصلوٰۃ جامعۃ (نماز جمع کرنے والی ہے) کی صدائیں دیتا گذرتا تھا اور لوگ مسجد میں جمع ہو جاتے تھے۔ لیکن اس کام کے لیے بھی اکثر اذان کا ہی استعمال کیا جاتا تھا۔

۶۔ امورِ حج کی تنظیم

حج اسلام کا چوتھا رکن ہے اور ان تمام مسلمانوں پر جو اس کے اخراجات برداشت کر سکتے ہوں فرض ہے۔ اسلامی اصولوں کے مطابق حج کا قیام اور ادائیگی صرف اسلامی حکومت کی نگرانی میں ہو سکتی ہے۔ اسی بنا پر مسلمانوں نے فتح مکہ سے قبل خانہ کعبہ کا حج نہیں کیا تھا، حالانکہ صلح حدیبیہ کے بعد وہ عمرہ کے لیے انفرادی طور سے اور باجماعت جاتے رہے تھے۔ اسی بنا پر اسلام میں پہلے حج کے سوال پر مؤرخین اور محدثین کے نزدیک اختلاف بھی ہے کہ وہ کب اور کس کی زیرِ نگرانی ہوا تھا۔ مورخین کا بیان ہے کہ فتح مکہ کے تقریباً تین ماہ بعد مسلمانوں نے پہلی بار حج مکہ کے اموی گورنر حضرت عتاب بن اسیدؓ کی نگرانی وامارت میں ادا کیا تھا۔ بعض علماً کا خیال ہے کہ اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابی موصوف کو امیر حج مقرر نہیں کیا تھا تاہم انہوں نے یہ فریضہ اپنی امارتِ بلد (شہر کے گورنر ہونے کے سبب ادا کرایا تھا۔[۱۱۳] لیکن دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ دربارِ رسالتؐ سے ان کو باقاعدہ امیر حج مقرر کیا گیا تھا۔[۱۱۴] بہرحال اس اختلاف روایات سے قطع نظر کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اس حیثیت سے تقرری صراحتاً کی تھی یا محض آپ کی خاموش رضا حاصل تھی یہ امر مسلم ہے کہ اسلام میں اول حج ان کی امارت میں ادا ہوا تھا۔

بہرحال دوسرے برس جیسا کہ تمام روایات کا اتفاق ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سب سے عظیم صحابی حضرت ابوبکر صدیقؓ کو باقاعدہ "امیر حج" مقرر کر کے مدینہ سے روانہ کیا تھا۔[۱۱۵] یہ تقرری اس حقیقت کی علامت تھی کہ آئندہ سے حج کے فریضہ کی ادائیگی اسلامی ریاست کی زیرِ نگرانی ہوا کرے گی بہرحال اس برس غیر مسلم عربوں کو بھی حج میں شرکت کی اجازت دے دی گئی تھی لیکن اسی موقعہ پر یہ اعلان بھی کر دیا گیا تھا کہ اگلے برس سے غیر مسلموں کو نہ تو حج میں شرکت کی اجازت ہو گی اور نہ مکہ مکرمہ میں داخلے کی۔ اس اہم اعلان کے لئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کو اپنا خصوصی ایلچی بنا کر حضرت ابوبکر صدیق کی روانگی کے بعد مکہ بھیجا تھا۔[۱۱۶] جہاں انہوں نے سورہ توبہ کی متعلقہ آیات[۱۱۷] لوگوں تک پہونچائی تھیں۔ عہد نبوی کا آخری حج جنابِ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی امارتِ خاص میں ادا کیا گیا تھا۔[۱۱۸] حقیقت میں یہ آپ کی عوامی زندگی اور عہدۂ رسالت کا نقطۂ عروج تھا کہ جب آپ نے انسانوں کے ٹھاٹھیں مارتے سمندر کے سامنے جن کی تعداد ایک لاکھ ساٹھ ہزار بتائی جاتی ہے۔[۱۱۹] اللہ تبارک تعالیٰ کا آخری پیغام پہنچایا تھا اور اسلام کی تکمیل کی تھی۔ اسی مبارک موقع پر آپ نے مسلمانوں کو ہدایت کی تھی کہ ان کے حاضر (شاہد) لوگ اپنے پیچھے رہ جانے والے بھائیوں (غائب) کو اللہ کا پیغام پہونچا دیں۔ گویا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات کا اعلان

تھی اور مسلمانوں کو "کارِ نبوی" کا حامل ہونے کا اظہار برملا کر دیا تھا۔[120]

ابنِ اسحاق اور طبری کے بیانات کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقعہ پر اپنی آواز دوسروں تک پہونچانے کے لئے حضرت ربیعہ بن امیہ بن خلف کو اپنا منادی اور اعلان کو دہرانے والا (الذی یصرخ فی الناس) مقرر کیا تھا۔ چنانچہ وہ آپ کے فقرے اور جملے اپنی غیر معمولی بلند آواز میں دہراتے رہتے تھے۔[121] اسی طرح بخاری اور مسلم کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آخری حج کے دوران متعدد مواقع پر ایک اور صحابی حضرت جریر بن عبداللہ بجلی نے بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے منادی کا کام کیا تھا۔[122]

یہ عین ممکن اور قرین قیاس ہے کہ اس عظیم اجتماع کے موقع پر جب قرونِ وسطیٰ کے معیار کے مطابق بہت بڑا مجمع تھا متعدد صحابہ مختلف مواقع پر آپ کے فقروں، جملوں اور خطبات کو دہراتے رہے ہوں تاکہ تمام سننے والوں تک آپ کا پیغام پہنچ جائے۔ اسی ضمن میں یہ بھی بیان کر دیا جائے کہ ۹ھ / ۶۳۱ء کے حج کے موقعہ پر حضرت اوس بن حدثان کو جن کا تعلق قبیلہ ہوازن سے تھا منیٰ میں ایک مذہبی اعلان کرنے کے لئے مدینہ سے روانہ کیا گیا تھا۔[123]

عہدِ نبوی کے مذہبی نظام میں حج کے سلسلہ میں جن افسروں اور کارکنوں کو مقرر کیا گیا تھا ان میں ایک اہم افسر وہ ہوتا تھا جو عمرہ یا حج کے مواقع پر قربانی کے جانوروں کا نگراں ہوتا تھا۔ ایسے جانوروں کو ھَدْی کہا جاتا ہے اور افسر کو صاحِبُ الْھَدْیِ۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم ۶ھ / ۶۲۸ء سے جب آپ پہلی بار عمرہ کے لیے تشریف لے گئے تھے اور جس موقع پر صلح حدیبیہ ہوئی تھی آخری حج کے زمانے تک یا تو بنفسِ نفیس قربانی کے جانور ساتھ لے جاتے تھے یا ان کو کسی صحابی کے ساتھ روانہ فرماتے تھے۔ صلح حدیبیہ کے زمانے میں آپ کی ھدی کے نگراں افسر حضرت ناجیہ بن جندب اسلمی تھے۔[124]

مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس "منصب" پر مستقل طور سے فائز تھے کیونکہ وہ اس کے بعد تمام مواقع حج اور عمرہ پر "ھدی رسول" لے کر مکہ جاتے رہے تھے۔ چنانچہ صلح حدیبیہ، عمرۃ القضیہ، حج ابی بکر اور حجۃ الوداع کے دوران ان کے اس فریضہ کا ذکر ملتا ہے۔[125]

بخاری کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک بار حضرت علی بن ابی طالبؓ بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ھدی لے کر مکہ گئے تھے[126] لیکن یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ صحابی موصوف نے کس موقع پر یہ فریضہ انجام دیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی عمرہ کے سفر کے دوران یہ ھدی رسول لے کر گئے تھے۔ اسی طرح اسد الغابہ کی دو روایات دو اور صحابیوں حضرات زؤیب بن طلحہ کعبی خزاعیؓ اور عمرو بن ثمالی / ہوازنی کا بھی بطور صاحبانِ ھدی رسول ذکر کرتی ہیں لیکن وہ بھی مواقع یا زمانے کا کوئی حوالہ نہیں دیتی ہیں۔[127] قیاس یہی ہوتا ہے کہ مختلف عمروں کے زمانے میں یہ تقرری ہوئی ہوگی۔ اس کے علاوہ ابن حزم نے بھی ایک جگہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صاحب الھدی کا ذکر کیا ہے جن کا اسم گرامی خالد بن سیار غفاریؓ تھا۔[128] یہ ممکن ہے کہ بعض دوسرے صحابہ کرام نے بھی وقتاً فوقتاً رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یا اسلامی ریاست کے لیے یہ فریضہ انجام دیا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک یا دو مواقع پر ہی متعدد لوگوں نے یہ خدمت انجام دی ہو۔

خانہ کعبہ کی دیکھ بھال اور تولیت ایک اہم مذہبی ذمہ داری تھی۔ اسی طرح حرم مکہ کے حدود کی تعیین کی بھی دینی اہمیت تھی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کے لیے مناسب انتظامات فرماتے تھے۔ یہ مشہور حقیقت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے چچا حضرت عباس بن عبدالمطلب کو قدیم کی عہدۂ سقایہ (حجاج کو پانی پلانے کی ذمہ داری) پر بحال کیا تھا۔[129] جو انھیں بہ اختلاف روایت ان کے والد ماجد عبدالمطلب یا بھائی ابوطالب سے زمانۂ جاہلیت میں ملا تھا۔[130] اسی موقعہ پر آپ نے تولیت کعبہ کے عہدے پر جس کو قدیم زمانے سے حجابہ کہا جاتا تھا حضرت عثمان بن طلحہ عبدری کو بدستور سابق بحال رکھا تھا۔[131] جن کے خاندان میں یہ منصب بانی شہر مکہ قصی بن کلاب کے زمانے سے چلا آ رہا تھا۔[132] روایت ہے کہ اسی موقع پر آپ نے حضرت تمیم بن اسید خزاعی سے حرم مکہ کے حدود کی از سر نو تنصیب اور تعیین کے لیے مامور کیا تھا۔[133] قبیلہ خزاعہ کے ایک شخص کو اس خدمت کے لئے غالباً اس لئے منتخب کیا گیا تھا کہ یہ قبیلہ حرم اور کعبہ کے معاملات کا آشنا و عارف تھا اور مدتوں ان سے وابستہ رہا تھا۔[134]

صلی اللہ علیہ وسلم

رسول نمبر

نقوش

۶

رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۱۲ ٹیلی فون نمبر ۵۲۵۲۵

زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمائندہ

نقوش

رسول نمبر

جلد ششم

شمارہ نمبر ۱۳۰

دسمبر ۱۹۸۳ء

مُدیر:

محمد طفیل

ادارۂ فروغِ اُردو ۔ لاہور

قیمت لائبریری ایڈیشن : ۱۲۵ روپے

ترتیب

فنِ حدیث

اقوالِ رسولؐ

اعتقادات

عبادات

کتاب الجہاد

کتاب التفسیر

معاملات

اخلاقیات

نظامات

سیرت و مناقب

○

محمد طفیل پرنٹر، پبلشر و ایڈیٹر نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر ادارۂ فروغِ اُردو لاہور سے شائع کیا۔

طلوع

وُہ تین تھے، چار تھے، پانچ تھے، چھ تھے کہ سات تھے اور آٹھواں اُن کا کُتّا۔ یہ کوئی نہیں جانتا سوائے خدا کے!

وُہ زمانہ کی چیرہ دستیوں سے تنگ آ کر غار میں جا کر چھُپ گئے۔ پھر انھیں نیند آ گئی جب وُہ جاگے تو صدیاں بیت چکی تھیں۔

قرآن میں اُن کا ذکر یُوں آیا ہے:

اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا ○ اِذْ اَوَى الْفِتْيَةُ اِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوْا رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا ○ فَضَرَبْنَا عَلٰٓى اٰذَانِهِمْ فِى الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا ○ ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَىُّ الْحِزْبَيْنِ اَحْصٰى لِمَا لَبِثُوْٓا اَمَدًا ○ (الکہف)

(کیا آپ خیال کرتے ہیں کہ غار والے اور کتبہ والے ہماری نشانیوں میں کچھ تعجب کی چیز تھے؟ (وہ وقت قابلِ ذکر ہے) جب اُن نوجوانوں نے غار میں جا کر پناہ لی۔ پھر بولے اے ہمارے پروردگار! ہمیں اپنے پاس سے رحمت (وفضل) عطا کر اور ہمارے لئے (اس) کام میں درستی کا سامان کردے۔ سو ہم نے غار میں ان کے کانوں پر سالہا سال تک (نیند کا) پردہ ڈالے رکھا۔ پھر ہم نے انھیں اٹھایا تاکہ ہم معلوم کریں کہ (ان) دونوں گروہوں میں سے کون گروہ (اس حالت میں) رہنے کی مدت سے زیادہ واقف ہے)

میں بھی جب غار میں جا کر چھُپ جاؤں گا اور صدیاں بیت جائیں گی۔ جاگوں گا تو بیشک میرے بال سفید ہو چکے ہوں گے، مگر میرے پیش کردہ وہ سچے الفاظ جو میرے رسولؐ کی زبان سے نکلے ہوں گے جُوں کے تُوں ہوں گے۔

سچے الفاظ کبھی بُوڑھے نہیں ہوتے!

محمد طفیل

اِس شمارے میں

بچپن کی بات کہ جب میرے دینیات کے اُستاد نے کہا : "ہمارے رسولؐ دنیا کی ایسی ہستی تھے کہ اُن میں ہر خوبی موجود تھی"
یہ بات ذہن میں جم کر رہ گئی تھی، بارہا خود سے سوال کرتا رہا "میرے رسولؐ کیسی باتیں کرتے تھے؛ کیا باتیں کرتے تھے؛ کیا سوچتے تھے؛ کیسا برتاؤ کرتے تھے؟"

بچپن کی اس بات نے، میرا پیچھا زندگی بھر نہ چھوڑا، تحت الشعور کی بات رسولؐ نمبر میں جھلک پڑی۔ میں نے طے کیا کہ رسولِ اکرمؐ کی زبانِ مبارک سے جو کچھ ادا ہُوا اس کا غالب حصہ ان نمبروں میں یکجا کر دُوں!

آپ نے ملاحظہ فرمایا ہو گا کہ جلد دوم میں حضورؐ کے خطوط کو جمع کیا گیا۔ اِس جلد میں حضورؐ کے اقوال کو جمع کیا گیا ہے۔ دیکھ لیجئے کہ وہ شخص جو اُمّی تھا ان کے اقوال میں کیا کیا حکمتیں ہیں، کیا کیا معرفت کے خزینے ہیں۔ دنیا کا کوئی بقراط، کوئی سقراط ایسی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ ایسا کچھ وہی دے سکتا تھا جس کا براہِ راست تعلق خدا سے ہو۔ ساری انسانی معجز بیانیاں فرموداتِ رسولؐ کے سامنے ہیچ ہیں۔

رسول اللہؐ نے جو کچھ کہا اُس کا کچھ حصہ آپ کو اس جلد میں ملے گا۔ جو کچھ کیا وہ باقی جلدوں میں، یہ دُنیا کی اکیلی ہستی ہیں کہ جو کہا وہی کیا، جو کیا وہی کچھ کہا۔

احادیث کے سلسلے میں علماؑ میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ پیمانہ ایک ہے کہ جو حدیث قرآن کے مزاج کے خلاف ہو اُسے قبول نہ کیا جائے۔ ایسی حدیث منسوب ہو گی، حقیقی نہ ہو گی، اس لیے کہ رسولؐ کی زندگی قرآن کی عملی تفسیر تھی۔

اقوال کو درج کرنے سے پہلے ہم نے علمِ حدیث اور تدوینِ حدیث پر فنّی نوعیت کے مضامین پیش کیے ہیں تاکہ احتیاط کی تمام نزاکتوں کو پیشِ نظر رکھا جا سکے۔ ایسا اہتمام احادیث کی اور کسی کتاب میں یکجا نہ ملے گا۔

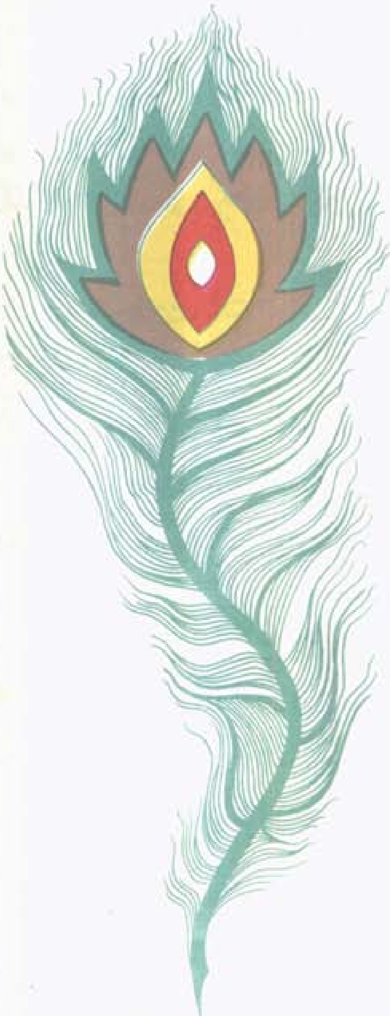
محمد نقوش

مقالات

(فنِ حدیث)

وَمَا اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ

اور رسُول جو کچھ تمھیں دیں اُسے لے لو، اور جس سے روکیں اُس سے رُک جاؤ۔
(الحشر: ۷)



علمِ حدیث

سنة ستين ومايۃ (ج ۷ ق ۲ ص ۳۶) ہوئے۔

ہندوستان میں ایک تابعی ہندوستان میں ایک تابعی کا نام حباب بن فضالہ ملتا ہے، انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خادمِ خاص حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے دیدار سے آنکھیں روشن کی تھیں، ہندوستان آنے والی فوج میں اُن کا نام لکھا گیا تھا، انہوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے جا کر فتویٰ پوچھا تھا کہ والدین کی اجازت کے بغیر جہاد کے لئے جا سکتا ہوں یا نہیں، انہوں نے واپس جانے کا مشورہ دیا معلوم نہیں واپس گئے یا ہندوستان آئے[1]

ہندوستان کے ایک تاجر تبع تابعی اسرائیل بن موسیٰ حضرت امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے۔ یہ ہندوستان بکثرت آتے جاتے رہتے تھے، اسی لیے نزیلِ ہند اُن کا لقب ہی ہو گیا تھا، ابنِ حبان نے ثقات میں لکھا ہے کان یسافر الی الھند، یہ ہندوستان کا (تجارتی) سفر کیا کرتے تھے[2]

دو نو مسلم سندھی محدث ان لوگوں میں جو دوسری صدی ہجری میں حدیث و سیر کے امام تھے، ابو معشر نجیح سندھی بھی ہیں، یہ مدینہ جا کر رہے، اس لیے مدنی کہلانے لگے، یہ اپنے وقت میں فن مغازی و سیر کے امام تھے، بلکہ ان کا نام اس مختصر فہرست میں داخل ہے، جو مغازی و سیر کے واقعات کو سب سے پہلے قید تحریر میں لائے[3] سنہ ۱۷۰ھ میں وفات پائی، مرتے دم تک زبان میں سندھیت کا اثر باقی تھا، عربی حروف کے مخارج ٹھیک نہیں ادا کر سکتے تھے، تاہم شاگردوں کا ٹھٹھ کا ٹھٹھ لگا رہتا تھا، جب انھوں نے وفات پائی تو خود خلیفہ ہارون رشید نو مسلم ہندی محدث کی نمازِ جنازہ کا امام تھا۔

دوسرے بزرگ رجاء السندھی ہیں، جو ایران پہونچ کر اسفرائنی کہلائے، فنِ حدیث میں یہ کمال پیدا کیا کہ مشہور محدث حاکم اُن کے حال میں لکھتے ہیں، رکن من ارکان الحدیث (یہ حدیث کے ارکان میں سے ایک رکن ہیں) وہ نہ صرف خود محدث تھے بلکہ اُن کے خاندان میں اور بہت سے حفاظِ حدیث پیدا ہوئے۔

سنہ ۲۲۱ھ میں وفات پائی۔

درۂ خیبر کے راستہ سے پہلا محدث درۂ خیبر کے راستہ سے یہاں مسلمان پانچویں صدی ہجری کی ابتداء میں داخل ہوئے، سلطان محمود غزنوی نے سنہ ۴۱۲ھ میں لاہور فتح کیا۔

سلطان مسعود کے عہد میں ایک بزرگ شیخ اسماعیل لاہور سے ہندوستان وارد ہوئے، حدیث و تفسیر کے جامع البحرین اور بڑے موثر البیان تھے، بے شمار آدمی یہاں اُن کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے۔

سنہ ۴۴۸ھ میں لاہور میں وفات پائی[4] تاریخ علمائے ہند میں ہے۔

---

[1] میزان الاعتدال ذھبی - ج ۱ ص ۲۰۸ [2] تہذیب التہذیب ابن حجر جلد اوّل ص ۲۶۱

[3] تاریخ علمائے ہند ص ۲۳، ص ۱۷۹ نولکشور [4] تہذیب التہذیب ج ۳ - ص ۲۶۷

[5] فہرست ابنِ ندیم ص ۱۳۶ -

"از عظمائے محدثین و مفسرین بود و اوّل کسے است کہ علمِ حدیث و تفسیر بہ لاہور آورد۔"

دوسرا محدّث صغانی

شیخ موصوف کے بعد یہاں ڈیڑھ سو برس تک اندھیرا گھپ چھایا رہتا ہے۔ بالآخر ساتویں صدی کے شروع میں مشارق الانوار کے مصنف صغانی نے یہاں علمِ حدیث کی روشنی پھیلائی، مگر یہ روشنی گھر میں کم اور گھر سے باہر زیادہ پھیلی۔

ان کا نام حسن بن محمد صاغانی ہے، گو اُن کا خاندان ماوراء النہر اور پھر غزنین سے تعلق رکھتا تھا، مگر ان کے پدر بزرگوار نے ہندوستان میں سکونت اختیار کر لی تھی، وہ ۵۷۰ھ میں لاہور میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی، پھر یمن و حجاز و عراق میں جا کر علم کی تکمیل کی اور لغت و حدیث کے امام قرار پائے اور بغداد میں بیٹھ کر خلیفہ مستنصر باللہ عباسی کے نام سے مشارق الانوار نام حدیث کی کتاب تصنیف کی۔ اور بھی اس فن کی دوسری کتابیں لکھیں۔ ۶۱۵ھ میں بغداد گئے، اور خلیفۂ بغداد اور سلطان غزنین و ہند کے درمیان سفارت کا فرض انجام دیا، ۶۵۰ھ میں وفات پائی۔

"مشارق الانوار" مشکوٰۃ کی طرح حدیث کی مختلف کتابوں کا مجموعہ ہے، فرق یہ ہے کہ مشکوٰۃ کی ترتیب فقہی ابواب پر ہے، اور مشارق الانوار کی ترتیب احادیث کے ابتدائی الفاظ پر ہے، یعنی شُلّٰمن سے شروع ہونے والی 'اذا' سے شروع ہونے والی صیغۂ ماضی سے شروع ہونے والی حدیثیں وغیرہ، علمائے محدثین نے اس کتاب کی بڑی قدر کی اور بے شمار لوگوں نے اس کی شرحیں لکھیں اور خود یہ کتاب مدارس کے نصاب میں داخل ہو گئی۔

الغرض امام صغانی غزنوی لاہوری تنہا محدث ہیں اور مشارق الانوار اس دیار کی تنہا خدمت حدیث ہے، جو اس عرصۂ دراز میں انجام کو پہنچی، لیکن چونکہ امام ممدوح کا تعلق زیادہ تر ملک عرب و عراق سے رہا، اس لیے اُن کا اثر اس ملک کے علماء پر بہت کم پڑا، اور اگر پڑا بھی تو صرف اسی قدر کہ ان کو اپنے نصابِ تعلیم کے لیے حدیث میں ایک اپنے ہم وطن کی کتاب مل گئی، اور وہ بدستور اپنے علم دانش مندی علم دانائی میں مصروف رہے، منطق و فلسفہ اور علم کلام کے بعد فقہ اور اصول فقہ کی تعلیم حاصل کرتے تھے، اور وہ بھی عقلی طریق سے یہی سبب ہے کہ اصولِ فقہ جیسا ضروری علم بھی معقولات اور کلامیات کا ایک ضمیمہ ہو کر رہ گیا[1]

علمِ دانائی اور دانشمندی اور حدیث سے بے توجہی

واقعہ یہ ہے کہ درۂ خیبر سے جو مسلمان قومیں وارد ہوئیں۔ وہ ترکستان، خراسان اور افغانستان سے آئی تھیں، گو کہ ترکستان، خراسان تیسری صدی میں علم حدیث کا گہوارہ تھے، اور امام بخاری، امام مسلم نیشاپوری، امام ترمذی، امام نسائی، ابو داؤد سجستانی، ابنِ ماجہ قزوینی، انہی اطراف و دیار کی سرزمین کی خاک سے پیدا ہوئے تھے، مگر عباسی سلطنت کی کمزوری کے بعد جب ان ممالک میں خود مختار غیر عربی حکومتیں قائم ہوئیں، تو یہ ذوق گھٹتا گیا، اور آخر تاتاریوں کے سیلاب بلا کے بعد تو ہر جگہ سناٹا چھا گیا، مذہبی علوم کی ضرورت تو صرف اس لیے پیش آتی تھی کہ عہدۂ قضا کے ممتاز منصب کو حاصل کیا جائے اور اس کے لئے صرف فقہ دانی کی ضرورت تھی، فقہ کو فارسی میں دانش کہہ سکتے ہیں اس لئے علم فقہ کا نام علم دانائی اور فقیہ کا دانا اور دانشمند قرار پایا چنانچہ اس عہد سے لے کر آج تک ان اطراف میں

---

[1] امام صغانی کے حالات طبقات و تراجم کی تمام کتابوں میں ہیں۔

حدیث و تفسیر کا نہیں، بلکہ علم دانائی کا رواج ہے، چنانچہ آج بھی ترکستان و خراسان و سرحد سے جو طلبہ علم دین کی طلب کے لیے ہندوستان آتے ہیں، وہ صرف و نحو کے بعد صرف فقہ کے بھوکے ہوتے ہیں، یہی سبب ہے کہ ان ممالک میں فقہ اور فتاویٰ کی بیشمار کتابیں لکھی گئیں، اور حدیث کی طرف اعتنا اور التفات نہ ہوا۔

بہر حال ہندوستان میں درۂ خیبر کے راستہ سے جو علما وارد ہوئے، وہ اپنے ساتھ جو علم دین یہاں لائے وہ صرف فقہ و دانائی کی کتابوں کا پشتارہ تھا کہ اسی پر حکومت کے نظام کا مدار اور وہ ملک کا قانون اور سلاطین کے تقرب کا ذریعہ تھا، چنانچہ شروع عہد سے اخیر تیموری عہد تک ہندوستان میں فتاویٰ اور قانون کے مختلف مجموعے تیار ہوئے اور جن میں سب سے زیادہ شہرت اور مقبولیت فتاویٰ عالمگیری کو حاصل ہوئی۔

عہد تیموری سے پہلے تک یہاں حدیث کا رواج مطلق نہ تھا، چنانچہ تغلق کے عہد تک حدیث میں صرف مشارق الانوار طلبہ کے زیر درس تھی اور جن خوش نصیب کو مصابیح ہاتھ آجاتی تھی، وہ امام الحدیث سمجھا جاتا تھا، حضرت نظام الدین اولیاؒ نے اسی مشارق کا درس مولانا کمال الدین زاہدؒ دہلوی سے لیا تھا، اور انہوں نے مولانا برہان الدین بلخیؒ سے لیا[1] اور انہوں نے خود مصنف سے۔

اس عہد میں اس ملک میں علم حدیث کے ساتھ لوگوں کو جو بے اعتنائی تھی، اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ سلطان غیاث الدین تغلق کے زمانہ میں مسئلہ سماع کی تحقیق کے لیے علما کی ایک مجلس منعقد ہوئی، مناظرہ کے ایک فریق شیخ نظام الدین سلطان الاولیاؒ تھے، اور دوسری طرف تمام علما تھے، شیخ رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ جب میں کوئی حدیث بیان کرتا تھا، تو علما بڑی جرات اور بے باکی سے کہتے تھے کہ اس ملک میں حدیث پر فقہی روایت مقدم سمجھی جاتی ہے، اور کبھی یہ کہتے تھے کہ چونکہ اس حدیث سے شافعی نے استدلال کیا ہے اور وہ ہمارا مخالف ہے، اس لئے ہم اس کو نہیں مان سکتے۔

لیکن یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ اس عظیم الشان مناظرہ میں کون سی حدیث صحیح پیش ہوئی تھی، تاکہ اس عہد کی حدیث دانی کا صحیح اندازہ ہو سکے، مورخ فرشتہ شیخ کے حال میں لکھتا ہے۔

> "قاضی رکن الدین ..... بشیخ کرده گفت اے درویش! در بابِ سرود و سماع چہ حجت داری، شیخ بحدیث نبویؐ "السماع مباح لاهله متمسك"[2] گشت قاضی گفت ترا بہ حدیث چہ کار تو مرد مقلدی، روایتے از ابو حنیفہ بیار تا بعرض قبول افتد، شیخ گفت سبحان اللہ من حدیث صحیح مصطفوی نقل می کنم، و تو از من روایت ابو حنیفہ می خواہی، شاید کہ ترا عزت حکومت بریں می دارد، زود ازیں عہدہ معزول می شوی ...... پادشاہ چوں حدیث پیغمبر شنید، متفکر شده، ہیچ نہ گفت"

---

[1] تاریخ علمائے ہند نولکشور ص ۱۷۳

[2] اس فقرہ کو حدیث کہنا شاید فرشتہ کی غلطی ہو، یہ فقرہ امام غزالی نے احیاء العلوم میں بطور فتوی نقل کیا ہے۔

سلطان علاؤالدین خلجی کے عہد حکومت میں مولانا شمس الدین ترک ایک محدث مصر سے ملتان اس غرض سے آئے تھے کہ ہندوستان میں علم حدیث کو رواج دیں، حدیث اور متعلقات حدیث کی چار سو کتابیں ساتھ لائے تھے، اور حدیث کی ایک شرح لکھ کر بادشاہ کے نام پیش کرنا چاہتے تھے، مگر جب ملتان تک پہونچے تو اُن کو معلوم ہوا کہ بادشاہ نماز کا پابند نہیں، اور جمعہ میں نہیں آتا، اُن کو اس قدر صدمہ ہوا کہ وہیں سے واپس چلے گئے، اور بادشاہ کو ایک رسالہ لکھ کر بھیجا، جس میں لکھا تھا۔

"من از مصر خدمت بادشاہ شہر دہلی کردہ بودم و تا از برائے خدا تعالیٰ و مصطفیٰؐ را مذہب علم حدیث در دہلی ثابت کنم و مسلمانان را از عمل کردن روایت دانشمندان بے دیانت بجز ہانم۔"[1]

غرض عام طور سے دہلی کے مرکز سے سلطنت کا جتنا حصہ متعلق رہا، وہاں نویں صدی ہجری کے بیچ تک علم حدیث سے عموماً بے خبری رہی، اس کی وجہ درحقیقت خدانخواستہ مسلمانوں کی اس سے بے اعتنائی نہ تھی، بلکہ تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ مصر و عرب اور حج کے سفر کے لیے ان دنوں خشکی کا راستہ مستعمل تھا، اور لوگ یہاں سے افغانستان، ترکستان و ایران و عراق ہو کر حدود عرب میں داخل ہوتے تھے، یہ راستہ اس قدر دور دراز اور پرخطر تھا، کہ مشکل ہی آمد و رفت ممکن تھی، شاہانِ دہلی نے اس وقت تک سمندر کے سواحل تک دخل نہیں پایا تھا، اس لئے دہلی کا مرکز علم حدیث کے سرچشمہ سے بے تعلق تھا۔

بہمنیہ اور علم حدیث

بہمنیوں نے سب سے پہلے دکن میں اپنی حکومت قائم کی، اور سواحل تک ان کا کہیں کہیں گذر ہو گیا، تو اس فیض کی کچھ چنگاریاں نظر آنے لگیں، بہمنیوں میں سلطان محمود بہمن، علم کا بڑا قدرداں گذرا ہے، سلاطین ہند میں سب سے پہلے اُس نے علم حدیث کی اشاعت کی طرف توجہ کی ۷۸۰ھ سے ۷۹۹ھ تک اس کا زمانہ ہے، فرشتہ سلطان کے حال میں لکھتا ہے:

"وجہت محدثان اخبار حضرت نبوی صلعم در شہر ہائے کلاں وظائف مقرر کردہ در تنظیم ایشاں می کوشید۔"

سلاطینِ گجرات اور علم حدیث

مگر درحقیقت عرب اور ہندوستان کو ایک کرنے کی سعادت سلاطین گجرات کی قسمت میں تھی۔ مسلمان اس پر پہلی صدی سے لے کر آٹھویں صدی کے وسط تک کئی ناکام حملے کر چکے تھے، آخر علاؤالدین خلجی نے ان تمام ناکامیوں کو اپنی کامیابی سے بدل دیا۔ اور اسی کے ساتھ محمد شاہ تغلق کے عہد میں دوسرا ہی گورنر ظفر خاں جب وہاں پہونچا تو اُس نے مرکز کی کمزوری کو دیکھ کر گجرات کی خود مختاری کا منصوبہ کر لیا، اور آخر فیروز شاہ تغلق کے زمانہ میں ظفر خاں نے مظفر شاہ کا خطاب اختیار کر کے گجرات کی مستقل حکومت ۸۱۰ھ میں قائم کرلی، اور ۸۱۳ھ میں وفات پاکر اپنے سعادت مند بیٹے احمد شاہ اوّل کے لئے جگہ خالی کر دی، یہی وہ خوش نصیب سلطان ہے، جس نے گجرات کو عرب اور ہندوستان کے بیچ میں سلسلۃ الذہب بنا دیا، اور اس طرح بحرِ عرب کے دونوں کنارے مل گئے اور بحری راستہ کی آمد و رفت سنّے سالوں کا راستہ مہینوں میں طے کر دیا، اور انتظام اور پابندی کے ساتھ جہازات آنے جانے لگے، حاجیوں کے قافلے سال بسال سلاطین بیجاپور و گجرات کی نگرانی میں سمندر کے راستہ سے جانے لگے اور اسی راستہ سے علم کے مشتاق عرب کے

---

[1] تاریخ فیروز شاہی برنی صـ ۲۹۷،

دیار کا بھی رُخ کرنے لگے، اور اس طرح علم حدیث کا تخم عرب سے ہندوستان کو منتقل ہونے لگا اور ہندوستان کے مختلف شہروں میں زمین اور آب و ہوا کی موافقت سے اس نے برگ و بار پیدا کرنا شروع کیا۔ بالآخر اکبر نے ان اسلامی حکومتوں کا فصل بھی بیچ سے نکال دیا اور گجرات فتح کر کے دہلی کو سورت اور کھمبایت کے راستہ سے سیدھے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ سے ملا دیا۔

الغرض سفر کی آسانی اور آمد و رفت کی کثرت نے علمائے ہند کو حجازی علوم سے آشنا ہونے کا موقع بہم پہنچایا، اس وقت دہلی اور سمندر کے بیچ میں گجرات، بیجاپور اور مالوہ (منڈو) تین اسلامی ریاستیں حائل تھیں، اس کے بعد دکن پڑتی تھی۔ چنانچہ بحر عرب کے اس کنارے کی علمی موجیں بھی اسی ترتیب سے بحر ہند کے اس جانب سے ساحل تک بہ ترتیب آتی تھیں۔

ایران میں صفویوں کے تعصب کا اثر

خوش قسمتی یا بدقسمتی سے ایک قومی و مذہبی سانحہ نے کم از کم ہندوستان کے بیشتر خیر و سعادت کا سامان پیدا کر دیا، اس زمانہ میں ایران میں صفویوں نے عروج حاصل کر کے شیعیت کو اپنا سرکاری مذہب قرار دیا، اور قزلباشوں کے تعصب سے ایران کے سبزہ زار کو علمائے سنت کے لیے گرم تنور بنا دیا، اس لئے اُن کے بڑے بڑے علمائے ملک کو خیر باد کہہ کر عرب اور ہندوستان کی راہ لی۔

سب سے پہلے بزرگ جو باہر سے اس تبرک کو سینہ سے لگا کر ہندوستان وارد ہوئے، وہ مولانا نورالدین احمد شیرازی تھے، یہ غالباً وہ زمانہ تھا، جب گجرات میں اسلام کی نئی نئی سلطنت قائم ہوئی تھی اور احمد شاہ اول (۸۱۳ھ ۸۴۶ھ) تخت نشین تھا، مولانا نورالدین میر سید شریف جرجانی کے شاگرد تھے۔

"صحیح بخاری کی سند اُن کی اتنی عالی تھی کہ وہ حجاز میں پہنچے تو بڑے بڑے محدثین نے اس کو شوق و ذوق اور فخر کے ساتھ حاصل کیا[1]"

ہندوستان میں علم حدیث کا آغاز

علم حدیث کے ہندوستان میں فروغ کا حقیقی زمانہ نویں صدی ہجری کا خاتمہ اور دسویں صدی کا آغاز ہے، یہ وہ عہد تھا، جب مصر و شام و حجاز امام الحدیث حافظ محمد بن عبدالرحمٰن سخاوی (المتوفی ۹۰۲ھ) کے فضل و کمال کا آفتاب نصف النہار پر تھا اور حافظ موصوف کے فیض و افادہ کی کرنیں دنیائے اسلام کے ہر گوشہ میں پڑ رہی تھیں، مدینہ منورہ میں آکر اُن کے کمال نے نور علیٰ نور کا مرتبہ حاصل کیا،

حافظ سخاوی کے تلامذہ

ہندوستان کے مختلف صوبوں میں سب سے پہلے گجرات نے اپنا طبعی حق پایا، یعنی بحر عرب کے اس پار کی شعاعیں سب سے پہلے یہیں آکر پڑیں اور یہاں سے وہ آگرہ کی مسجدوں اور مدرسوں کے مناروں پر جاکر عکس انداز ہوئیں۔

حافظ سخاوی کے تلامذہ میں سب سے پہلے غالباً مولانا راجح بن داؤد گجراتی ہیں، ۸۹۴ھ میں وہ حافظ موصوف کے حلقہ میں داخل ہوئے، اور الفیہ حدیث کی سند حاصل کی، اس کے بعد وہ گجرات وارد ہوئے، لوگوں نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا، ۹۰۴ھ میں احمد آباد

---

[1] النور السافر بحوالہ یاد ایام مولانا سید عبدالحئی مرحوم،

میں وفات پائی [1]

اس کے بعد مولانا وجیہ الدین محمد مالکی آئے، اُن کی بڑی قدر ہوئی، سلطان گجرات نے اُن کو ملک المحدثین کا خطاب دیا، وہ یہیں کے ہو رہے، ۹۲۹ھ میں وفات پائی [2]

انہی کے ہم عصر مولانا علاء الدین احمد نہروالی (گجرات) ہیں، عرب جاکر حافظ ابن فہد اور نور الدین شیرازی سے حدیث کی سند حاصل کی آخر عمر مکہ معظمہ میں گذار دی اور وہیں اپنا سلسلۂ درس جاری رکھا، ۹۴۹ھ میں وفات پائی [3] ان ہی قریب العہد حافظ سخاوی کے دوسرے شاگرد جمال الدین محمد بن عمر حضرمی، مظفر شاہ حلیم سلطان گجرات کے زمانہ میں آئے، سلطان نے خود زانوے ادب اُن کے سامنے تہ کیا اور اپنا استاد بنایا، احمد آباد گجرات میں ۹۳۱ھ میں وفات پائی۔ [4]

دہلی کے مرکز میں پہلا محدّث

وہ اصلی شخصیت جس کے پَرتو سے اس سرزمین کے شمالی وجنوبی دونوں گوشوں کا منور ہونا مقدر تھا، وہ سید رفیع الدین صفوی شیرازی کی ذاتِ والا صفات تھی، یہ معقولات میں محقق دوانی کے شاگرد تھے۔ عرب پہنچے، اور حدیث کا فیض حافظ سخاوی سے حاصل کیا، اور شرفِ سعادت کا یہ سرمایہ لے کر وہ گجرات وارد ہوئے، یہ زمانہ دلی میں سلطان سکندر لودی کا تھا، اس قدر دانِ علم کے شہرہ نے سید موصوف کو بھی گجرات سے دلی کھینچا، سلطان نے حسنِ عقیدت کے ساتھ محدث موصوف کا خیر مقدم کیا، اور سلطان کی اجازت سے ممدوح نے آگرہ میں سکونت اختیار کی، اور درس وتدریس کا بازار گرم کیا۔ مشتاق دور دور سے آئے اور اپنی اپنی قسمت کے مطابق متاعِ خیر و برکت حاصل کرتے رہے۔ [5]

غالباً خالص ہندوستان کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روح پرور نغموں سے اُس کے محراب ودر گونج اٹھے، سید موصوف نے ۹۵۴ھ میں وفات پائی گو انہوں نے بقول مولانا عبدالحق محدث دہلوی — (اخبار الاخیار) لائق اولاد نہیں پائی، تاہم بدایونی کی تصریح کے مطابق اپنی چند روحانی اولاد یادگار چھوڑی، جن میں قابلِ ذکر شیخ ابوالفتح تھانیسری ہیں، یہ غالباً سب سے پہلے ہندوستانی ہیں، جو محدث کے لقب سے سرفراز ہوئے۔ ملا بدایونی لکھتے ہیں:-

"علمِ حدیث در ملازمت سید رفیع الدین محدث درست گردانیدہ" (ج ۳-ص ۱۲۹)

شیخ ابوالفتح نے پچاس برس تک آگرہ میں اپنے استاد ہی کے حلقہ میں بیٹھ کر علومِ عقلی ونقلی کا درس دیا اور بے شمار اشخاص اُن کے دامنِ تربیت میں پل کر شہرۂ آفاق ہوئے، جن میں ایک خود ملا بدایونی، نیز مولانا کمال الدین حسین اور ملا علیلی (شیخ کے فرزند) نامور ہوئے [6] ملا علیلی اکبر کے زمانہ میں آگرہ کے مفتی ہوئے اور ملا بدایونی اکبر کے امام مقرر ہوئے، مولانا کمال الدین حسین دراصل شیرازی تھے، ان کے باپ مولانا حسن شیرازی صفویوں کی دار وگیر سے بھاگ کر شیراز سے مکہ معظمہ چلے گئے تھے اور وہاں سے

---

[1] الضوء اللامع جلد ۳ ص ۲۲۲
[2] یادِ ایام ص ۴۴
[3] یادِ ایام ص ۵۴
[4] یاد ایام ص ۴۴
[5] اخبار الاخیار ص ۲۲۶
[6] بدایونی سوم ص ۱۲۹

سید رفیع الدین محدث کے قافلہ کے ساتھ سکندر لودی کے عہد میں ہندوستان آئے تھے۔ مولانا کمال الدین حسین نے بادشاہی تعلق گوارا نہ کیا، اور زہد و عبادت کے سجادہ سے باہر قدم نہیں اٹھایا[1]۔ سید موصوف کے ایک اور شاگرد سید جلال تھے اور سید جلال کے شاگرد میر سید محمد شیرازی تھے، جو اکبر کے عہد میں ہندوستان کے میر عدل تھے۔

پہلا شارح بخاری

سید ابو الفتح کے ایک دوسرے معاصر جو ہندوستان زاد تھے، سید عبدالاوّل حسینی تھے، اُن کے باپ جونپور کے قصبہ زید پور کے رہنے والے تھے، یہاں سے دکن چلے گئے تھے، وہیں یہ پیدا ہوئے، وہاں سے گجرات پہونچے، اور گجرات سے عرب گئے اور وہاں کے خزانہ سے علم حدیث کے زر و جواہر سینہ میں بھر کر لائے، یہ سب سے پہلے ہندوستانی عالم ہیں جنھوں نے صحیح بخاری کی شرح لکھنے کی عزت حاصل کی، فیض الباری کے نام سے صحیح بخاری کی شرح لکھی اور فیروز آبادی کی سفر السعادۃ کا خلاصہ کیا[2]۔

بخاری کا حافظ

مولانا عبدالمالک عباسی گجرات کے باشندے تھے، ایک واسطہ سے حافظ سخاوی کے شاگرد تھے، تقریباً ۹۷۰ھ میں وفات پائی، اُن کو صحیح بخاری پوری زبانی یاد تھی، اور اس کے معانی و مطالب کے پورے حافظ تھے، اور اسی طرح زبانی یہ صحیح بخاری کا درس دیا کرتے تھے[3]۔

حافظ ابن حجر کے تلامذہ

اب وہ زمانہ آیا، جب مادی و روحانی دونوں سلطنتوں میں انقلاب رونما ہو چکا تھا۔ ہندوستان کے افق پر اب مغل اعظم کے اقبال کا ستارہ چمک رہا تھا، اور عرب میں حافظ سخاوی کے بجائے جن کی وفات کو پچاس برس گذر چکے تھے اور جن کے تلامذۂ خاص بھی دنیا سے رخصت ہو چکے تھے، اب حافظ ابن حجر مکی (صواعق محرقہ کے مصنف) کا شہرہ تھا جو زکریا انصاری بلقینی، سمہودی اور ابوالحسن بکری کے شاگرد تھے، ۹۷۳ھ میں وفات پائی۔

عہد اکبری

بادشاہ اکبر کے ابتدائی عہد میں جب بیرم خانخاناں امور سلطنت کا متکفل تھا اُس نے علوم و فنون کے دوسرے مشاہیر کے ساتھ حضرات محدثین کو بھی گجرات سے دلی، اور آگرہ آنے کی دعوت دی، ان میں سب سے پہلے گھر کی "دولت" یاد آئی، یعنی میر سید عبدالاوّل جونپوری کو باصرار تمام گجرات سے دلی بلوایا، ۹۶۸ھ میں یہیں وفات پائی[4]۔

میر کے تلامذہ میں ایک شیخ طیب محدث سندھی تھے، جنھوں نے گجرات کے قیام کے زمانہ میں شیخ سے حدیث پڑھی تھی اور تقریباً پچاس برس تک ایلچ پور اور برہان پور میں بیٹھ کر اس فن شریف کی خدمت کی[5]۔

اسی عہد میں شیخ عبدالمعطی مکی، جو شیخ الاسلام زین الدین زکریا انصاری کے شاگرد تھے، یہاں آئے، اور ۹۸۳ھ میں وفات پائی۔ شیخ الاسلام انصاری کے دوسرے شاگرد جو مصری تھے، شہاب الدین احمد عباسی وہ بھی گجرات آئے، اور ۹۹۲ھ میں وفات پائی ابوالحسن بکری اور ابن حجر کے تلامذہ شیخ محمد بن عبداللہ فاکہی المتوفی ۹۹۲ھ، سید عبداللہ عیدروس المتوفی ۹۹۰ھ، شیخ سعید شافعی حبشی المتوفی ۹۹۱ھ

۱؎ بدایونی سوم ص ۱۲۶۔ ۲؎ تاریخ علمائے ہند ص ۸۳ نولکشور۔ ۳؎ یاد ایام مولانا سید عبدالحئی مرحوم ناظم ندوۃ العلماء و تاریخ علمائے ہند ص ۲۲۸
۴؎ ایضاً۔ ۵؎ اخبار الاخیار ص ۲۲۷ و ۲۳۳ و ۲۳۵۔ ۶؎ یاد ایام ص ۳۴، ۳۵، ۳۶۔

گجرات وارد ہوئے[1]

ابنِ حجر مکی کے ایک اور شاگرد شیخ یعقوب صرفی کشمیری ہیں، ۹۰۸ھ میں پیدا ہوئے، علوم عقلی کا درس مولانا جامی کے شاگرد مولا محمد شاہ آنی سے لیا اور حدیث کی سند حافظ ابن حجر مکی سے حاصل کی، عین عالم شباب میں ۲۶ برس کی عمر میں ۱۰۰۳ھ میں وفات پائی تفسیرِ قرآن مجید (نا تمام) کے علاوہ شرح صحیح بخاری اور مغازی النبوۃ دو کتابیں لکھیں، شیخ احمد مجدد الف ثانی نے حدیث کا فیض انہی سے پایا۔

اس زمانہ میں کشمیر ایک اور محدث کے وجود سے مفتخر ہوا، ملا محمد شگرف محدث کشمیری حرمین جاکر ابنِ حجر مکی کے شاگرد ہوئے اور واپس آکر اپنے وطن میں طلبہ کو درس دیا[2]

کشمیر کے ایک اور نامور محدث کا نام حاجی (شاید حاجی محمد) ہے اُن کے بزرگ ہمدان کے تھے اور سید علی ہمدانی کے ساتھ کشمیر آئے تھے، حاجی کی ایک فارسی تصنیف شرح شمائل ترمذی ہے، اس کتاب سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ چند بار مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی زیارت سے مشرف ہوئے، اور ابنِ حجر مکی اور میر جمال الدین محدث صاحب روضۃ الاحباب کے شاگرد مولانا صادق محدث کے تلمذ سے فیض یاب ہوئے، ۱۰۰۶ھ میں وفات پائی، ان کی شرح شمائل کا نسخہ پٹنہ کے کتب خانہ میں ہے[3]

محدّث سرہندی اس عہد کے ایک نامور مولانا عبد الرحمٰن محدث سرہندی کا نام ملتا ہے، جن کے لیے سب سے بڑا فخر یہ ہے کہ وہ حضرت مجدد الف ثانی کے استاذ الحدیث تھے، اس سے زیادہ کچھ اور حال معلوم نہ ہوا[4]۔

ابو الحسن بکری کے تلامذہ اسی عہد میں ایک ذاتِ گرامی مکہ معظمہ میں درس وارشاد کی مسند پر جلوہ گر نظر آتی ہے اور جس کے فیوض کی بارش ہندوستان میں مسلسل معلوم ہوتی ہے، اُن کا نام نامی کتابوں میں ابو الحسن بکری مرقوم ملتا ہے، یہ مصر کے رہنے والے شافعی المذہب اور ابوبکر صدیق رضؓ کی نسل میں تھے، مکہ معظمہ میں سکونت پذیر تھے[5]

حضرت ابو الحسن بکری اور علامہ ابن حجر ہیثمی مکی دونوں معاصر ہیں، اس لئے آیندہ سلسلۂ تلمذ ان بزرگوں کے دوہرے تعلقات سے مضبوط و مستحکم نظر آتا ہے۔

ابھی تک ہندوستان میں علم نبوی کی روشنی چمک چمک کر بجھ بجھ جاتی تھی۔

شیخ علی متقی لیکن دسویں صدی کے بیچ میں یک بیک ہندوستان کی قسمت چمکتی ہے اور اُس کے اقبال کا ستارہ پورب کے اس شہر میں طلوع ہوتا ہے جس کو شاہجہان کی قدرسوانی نے "شیراز ماست" کا خطاب دیا تھا لیکن شاید اس لئے کہ اس کی نسبت کا فخر ملک کے صرف ایک ہی حصہ کو حاصل نہ ہو، بلکہ ہندوستان کے تینوں خطّے پورب پچھم (پنجاب) اور دکن کو برابر حاصل رہے، ان کو تینوں خطوں سے برابر کی نسبت عطا کی گئی، ہندوستان کی یہ قسمت بیدار اور ستارۂ درخشان شیخ علی متقی کی ذات تھی، شیخ کا اصلی اور خاندانی وطن جونپور تھا۔

---

[1] تحفۃ الفضلاء معروف بہ تاریخ علمائے ہند ص ۲۵ و بدایونی جلد سوم [2] تاریخ علمائے ہند ص ۱۰۹، [3] فہرست حدیث فارسی کتب خانہ پٹنہ جلد ہم فارسی ص ۱۸، [4] تاریخ علما ہند ص ۱۰۰۔ [5] ابجد العلوم نواب صدیق حسن خاں۔

برہان پور دکن میں ۸۸۵ھ میں پیدا ہوئے، اور وہیں شیخ باجن برہان پوری نے بچپن میں بیعت کی، جوانی میں ملتان جا کر شیخ حسام الدین متقی سے علم ظاہر و باطن کی تکمیل کی، ایک عجیب اتفاق یہ ہے کہ شیخ کے جسمانی باپ (والد) کا نام بھی حسام الدین تھا اور روحانی باپ (استاذ و مرشد) کا نام بھی حسام الدین ہی تھا، اور یہ متقی کا مشہور لقب بھی شاید انہی استاد و مرشد کی نسبت سے حاصل ہوا، یہاں سے جاذبۂ توفیق نے مرکز کی طرف کھینچا، گجرات ہو کر ۹۵۲ھ میں دیارِ عرب کی طرف تنگ اٹھایا، اس وقت عمر شریف ۶۷ سڑسٹھ برس کی تھی، آج مسلمانوں کو اپنے اسلاف کے اس علمی ولولہ و شوق سے عبرت حاصل کرنی چاہیے کہ سڑسٹھ برس کا بڈھا جوانوں کا شوق لے کر خشکی و تری کی مصیبتوں کو برداشت کر کے علم کی تکمیل کے لیے ملک عرب کا رُخ کرتا ہے۔

شیخ علی متقی نے عرب پہونچ کر حجاز کے مشہور و معروف اساتذہ اور شیوخ سے چند سال علم ظاہر و باطن کی تحصیل کی، ان شیوخ میں شیخ ابن حجر مکی، (صواعق محرقہ کے مصنف) شیخ ابوالحسن بکری اور محمد بن محمد سخاوی ہیں) محمد بن عبدالرحمٰن مشہور سخاوی نہیں، جو اس سے پچاس برس پہلے ۹۰۲ھ میں مدینہ منورہ میں وفات پا چکے تھے) شیخ نے چند ہی سال میں اپنی فطری استعداد، روحانی ذوق اور ربانی توفیق سے یہ مرتبہ حاصل کر لیا کہ استاد و شاگرد اور شاگرد استاد کے مرتبہ میں آگئے، اور ۹۵۷ھ سے ۹۷۱ھ تک حدیث شریف کی وہ دائرۃ المعارف ترتیب دی، جو کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال کے نام سے مشہور رہے اور ساتھ ہی ایک مختصر مجموعہ منتخب العمال کے نام سے بھی لکھا، یہ وہ کتابیں ہیں جنہوں نے امام زین اور حافظ سیوطی کے مجموعوں پر خطِ نسخ پھیر دیا۔

شیخ اس درمیان میں (۹۶۱ھ تک) دو دفعہ ہندوستان (گجرات) آئے، اور سلطان محمود گجراتی نے یہ قدردانی کی کہ حقیقت میں اپنی سلطنت لا کر، آپ کے قدموں میں ڈال دی[1] اور آپ کے اور آپ کے مدرسہ اور طلبہ کے لئے وظائف کی بہت بڑی رقم مقرر کر دی۔ ۹۷۵ھ میں شیخ نے ۹۵ برس کے سن میں وفات پائی، لیکن اس حالت میں بھی کہ بدن میں جنبش کی قوت تک نہ تھی، علمی شوق و ذوق کی جو کیفیت تھی، ان کے فرزند معنوی اور شاگرد کے شاگرد شیخ عبدالحق محدث کے الفاظ میں پڑھو۔

"و اشتغال وے بہ تتبع سنن و احادیث نبوی صلعم چناں تا آخر حیات بود کہ دراں وقت بمقتضائے عادت بشری جنبیدن ممکن نباشد، شب و روز بہ تالیف کتب احادیث و تصحیح و مقابلہ آں مشغول بودے"[2]

شیخ کے آغوشِ تربیت میں ہندوستان کے متعدد باکمال پل کر جوان ہوئے، شیخ عبدالوہاب متقی منڈوی برہان پوری، شیخ محمد طاہر پٹنی (احمد آباد گجرات) شاہ محمد بن فضل اللہ برہان پوری شیخ عبداللہ و شیخ رحمت اللہ سندھی و شیخ برخوردار سندھی،

عبدالوہاب متقی

شیخ عبدالوہاب متقی منڈو (مالوہ) کے رہنے والے تھے، برہان پور میں پیدا ہوئے۔ بیس ۲۰ برس تک گجرات و دکن کی سیر کی اور یہاں کے علمائے سے استفادہ کر کے عرب گئے، ۹۶۳ھ میں شیخ علی متقی کے حلقۂ صحبت میں داخل ہوئے، اور شیخ کی وفات (۹۷۵ھ) تک بارہ برس متصل جلوت و خلوت میں شیخ کے ہمراہ رہے۔ شیخ کی تصنیفات

---

[1] اس کا تفصیلی حال ظفر الوالہ بمظفر و آلہ ص ۲۱۵ مطبوعہ لندن اور مرآۃ احمدی ج دوم ص ۶ میں پڑھو۔

[2] اخبار الاخیار ص ۲۴۲ طبع ہاشمی میرٹھ ۱۲۷۸ھ۔

کا مسودہ لکھنا اور اُن کو صاف کرنا شاگرد کا کام تھا۔ آخر کامل صحبت نے اُن کو بھی کامل کر دیا، یہاں تک کہ اُن کی وفات کے بعد حرمین محترمین اور مصر و شام و یمن کے علمائے اُن کو شیخ کا جانشین تسلیم کیا اور شیخ عبد الوہاب، شیخ عبد الوہاب متقی ہو کر مشہور ہوئے۔[1]

شیخ عبد الوہاب صرف ایک دفعہ ۹۷۰ھ میں ہندوستان آئے، اور پھر اسی سال واپس گئے ۱۰۰۱ھ میں وفات پائی تلامذہ اور مستفیدین کا انبوہ کثیر اپنے پیچھے چھوڑا، صحاح ستہ کا درس اُن کے حلقہ میں ہوتا تھا اور بعد ترتیب حدیث کی تدریس یا نادر کتابوں کی تصحیح و نقل و مقابلہ کے سوا کوئی کام نہ تھا۔[2]

محمد طاہر فتنی

ملا محمد بن طاہر پٹنی کے رہنے والے تھے، جو احمد آباد (گجرات) کے پاس اب تک آباد ہے اسی پٹن کو معرب کر کے فتن کہتے ہیں، جس کی نسبت سے وہ محمد بن طاہر فتنی کہلاتے ہیں، بوہرہ تھے، شیخ علی متقی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے مکہ معظمہ جا کر فیض حاصل کیا اور استاد کی زندگی ہی میں دو کتابیں تصنیف کیں، مجمع البحار لغت حدیث میں اور مغنی اسماء الرجال میں، ان دونوں کتابوں میں اپنے استاد کا جس ولولۂ شوق اور غلبۂ محبت کے ساتھ ذکر کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاگرد کے دل میں استاد کی کتنی قدر و منزلت تھی، مجمع البحار گو بظاہر حدیث کا لغت ہے مگر علمائے محدثین کے اعتراف کے مطابق وہ درحقیقت صحاح کی شرح ہے، علاوہ ازیں تذکرۃ الموضوعات و قانون الموضوعات وغیرہ کتابیں اُن کی تالیف ہیں۔

ہندوستان واپس آ کر بوہرہ قوم کو اہلِ سنت بنانے کے لیے یہ کوشش بلیغ کی، کہ اسی راہ میں ۹۸۶ھ میں اجین کے قریب قصبہ سارنگ پور میں شہادت پائی، (مرآۃ احمدی ج ۲ ص ۷۷)

متقی کے تلامذہ

شیخ عبد اللہ بن سعد الدین اور شیخ رحمت اللہ بن عبد اللہ یہ دونوں بزرگوار سندھ کے تھے۔ اُن کے والد مدینہ منورہ ہجرت کر کے گئے تھے، شیخ علی متقی کے شاگردانِ خاص اور خلفاء میں تھے، ۹۷۰ھ کے پس و پیش میں ہندوستان وارد ہوئے اور احمد آباد گجرات میں قیام پذیر ہوئے اور مشتاقانِ حدیث کو اپنے درس و افادہ سے سیراب کیا، لیکن اخیر عمر میں دونوں بزرگ چند سال کے فصل سے اسی ضعف اور پیری کے عالم میں حجاز واپس گئے اور وہیں وفات پائی[3] شیخ رحمت اللہ کے بھائی شیخ حمید سندھی تھے، جو تفسیر و حدیث میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ خان اعظم کوکہ کے ساتھ عرب گئے اور وہاں مقتدائے اہلِ حدیث ہوئے۔[4]

شیخ برخوردار سندھی نے حجاز ہی میں اپنی مسند درس قائم کی، چنانچہ شیخ محمد بن طاہر پٹنی نے اُن سے بھی فائدہ اٹھایا تھا۔[5]

شاہ محمد بن فضل اللہ کا آبائی وطن جونپور تھا، احمد آباد گجرات میں پیدا ہوئے، جوان ہو کر مکہ معظمہ چلے گئے اور تقریباً ۱۲ برس تک شیخ علی متقی کے حلقۂ درس میں داخل رہے، پھر ہندوستان واپس آ کر برہان پور میں سکونت اختیار کی اور درس و تدریس کی محفل گرم کی، مسئلہ وحدت الوجود میں التحفۃ المرسلہ الی النبی ایسی اہم کتاب تصنیف کی کہ عرب و شام کے بڑے بڑے

---

[1] تفصیلی حالات کے لئے دیکھو اخبار الاخیار ص ۲۴۳، و ما بعد و مرآۃ احمدی ج ۲ ص ۵۷،

[2] اخبار الاخیار ص ۲۶۴، [3] ایضاً ص ۲۶۴، [4] اتحاف النبلاء نواب صدیق حسن خاں مرحوم ص ۳۹۸۔

علمائے شیخ عبدالغنی نابلسی اور شیخ ابراہیم کردی نے اُس کی شرحیں لکھیں، اتباع سنت میں ایسے کامل تھے، کہ "نائب رسول اللہ" کے لقب سے مشہور ہوئے، برہان پور میں مدرسہ قائم کیا، جس میں ہمیشہ فقہ و تفسیر و حدیث کا درس دیا کرتے تھے۔

۱۰۰۵ھ میں وفات پائی۔

اسی عہد کے چند اور بزرگوار ذکر کے لائق ہیں، ایک سید یٰسین گجراتی جنھوں نے ہندوستان کے بعد عرب جا کر اس فیض کو حاصل کیا، بدایونی دورِ اکبری کے علما کے حالات میں لکھتے ہیں:-

"بشرف زیارت حج اسلام مشرف گشتہ و علم حدیث آں جا حاصل کردہ اجازت یافت و بازگشتہ بہند آمد"[۱]

سید ممدوح نے پنجاب کا خطہ پسند فرمایا، اور لاہور میں اپنے درس کی مسند بچھائی، اس کے بعد سرہند آ کر درویش مجرد ہو گئے۔

شیخ بہلول دہلوی | شیخ عبداللہ اور شیخ رحمت اللہ جو گجرات آ گئے تھے، شیخ بہلول دہلوی نے گجرات جا کر ان کا دامن تھاما، اور حدیث کا درس لیا اور دلی واپس آ کر اس فنِ شریف کی تعلیم و تدریس میں عمر بسر کر دی؛

ملا بدایونی لکھتے ہیں:-

"علمِ حدیث را خوب ورزیدہ . . . . . با اہلِ دنیا کارے ندارد و بافادۂ و اضافۂ طلاب مشغول است"[۲]۔

اس عہد کے دوسرے بزرگ حاجی ابراہیم محدث ہیں، عرب جا کر فیوض و برکات سے مالا مال واپس آئے اور آگرہ میں زہد و ورع کے ساتھ علم حدیث کا درس دیتے تھے۔

بدایونی میں ہے:

"در آگرہ بزہد و ورع درس علوم دینی خصوصاً علم حدیث قیام داشت"

اس فیض و برکت کا اثر یہ تھا، کہ وہ اکبر کے عہدِ حکومت میں دار السلطنت میں بیٹھ کر امرِ معروف اور نہی عن المنکر کا فرض انجام دیتے تھے کوئی شاہی منصب قبول نہیں کیا، دربار میں جب جاتے تھے، آدابِ شاہی کے مقررہ مراسم و سجدہ اور کورنش اور تکلفات سے آزاد رہتے تھے اور وعظ و پند فرماتے تھے[۳]

شیخ عبدالنبی گنگوہی | شیخ عبدالنبی گنگوہی بھی اسی دور کے اہلِ کمال میں ہیں، یہ بزرگ دادا یعنی حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے پوتے تھے، اکبر کے زمانہ میں پورے ہندوستان کے صدر الصدور (شیخ الاسلام) تھے، پہلے تصوفِ زمانہ کا رنگ غالب تھا، سماع و غنا سے ذوق تھا، پھر مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی حاضری کا کئی دفعہ اتفاق ہوا، اور وہاں علم حدیث کا درس حاصل کیا، لوٹ کر آئے، تو وہ کچھ اور ہی چیز ہو گئے، بدایونی میں ہے۔

"چند مرتبہ در مکہ معظمہ و مدینہ طیبہ رفتہ علم حدیث را خواندہ و بعد ازاں کہ بازگشتہ آمد از روش

---

[۱] بدایونی ج ۳ ص ۱۱۲، [۲] ایضاً ص ۱۱۳،

[۳] بدایونی ج ۳ ص ۱۳۵۔

آبا و اجداد کرام و سماع و غنا را منکر بود و بر روش محدثین سلوک می نمود، و بتقوی و طہارت و نزاہت و عبادت ظاہری اشتغال داشت ؎"

اکبر ان کا اس درجہ ادب کرتا تھا کہ اپنے ہاتھ سے اُن کے سامنے اُن کی جوتیاں سیدھی کرتا تھا، دربار کے جاہ پرست فقہا کے رشک و حسد نے شیخ کی مخالفت شروع کی اور نتیجہ یہ ہوا کہ دربارِ شاہی سے پوری جماعت کا اثر جاتا رہا۔ اور اُن کی جگہ مُلّا مبارک ناگوری اور فیضی اور ابوالفضل نے لے لی۔

مُلّا قاری اور اُن کے اُستاد اکبری دور کے ایک اور فاضل محدث مولانا میرکلاں محدث اکبر آبادی ہیں، اُن کا سلسلہ سند عرب کے بجائے عجم سے ہے، یہ میرک شاہ شیرازی کے شاگرد تھے، اور وہ اپنے باپ سید جمال الدین محدث مصنف روضۃ الاحباب کے شاگرد تھے، اور عرب جا کر اپنے فضل و کمال کی تکمیل کی تھی، اور جمال الدین کو اپنے چچا سید اصیل الدین شیرازی سے تلمذ تھا، یہ جہانگیر کے استاد مقرر ہوئے تھے، ۹۸۳ھ میں وفات پائی ؎ بدایونی لکھتے ہیں۔

"در حدیث آیۂ روزگار بود ؎"

مولانا میرکلاں کے شاگرد وہ فاضل یگانہ تھے، جو ملا علی قاری کے نام سے مشہور ہیں۔ مُلّا علی قاری گو رہنے والے ہرات کے تھے، مگر اس زمانہ میں ہرات تیموری ہی سلطنت کا ایک جزء تھا، اور اُن کا فضل و کمال بھی تمام تر اساتذۂ ہند کا ممنون احسان ہے اور اُن کی تصنیفات نے بھی یہیں زیادہ تر شہرت حاصل کی، اس لئے یہ محدثین ہند کی فہرست سے خارج نہیں ہو سکتے۔

ملا علی قاری کے والد کا نام سلطان محمد تھا، ابتدائی تعلیم وطن میں حاصل کی، مشکوٰۃ مولانا میرکلاں سے پڑھی یہاں سے یہ مکہ معظمہ گئے اور ابوالحسن بکری، سید زکریا حسینی، ابن حجر مکی، ہیثمی، شیخ عبداللہ سندھی، قطب الدین نہروالی (نہروالہ گجرات) مکی سے علوم حدیث کی تکمیل کی، ۱۰۱۴ھ میں مکہ معظمہ میں وفات پائی، مرقاۃ شرح مشکوٰۃ شرح شفائے قاضی عیاض، شرح شمائل ترمذی شرح نخبۃ الفکر (اصول حدیث) شرح ثلاثیات بخاری، تخریج احادیث، شرح عقائد نسفی، نور القاری شرح صحیح بخاری، شرح صحیح مسلم، شرح حصن حصین، شرح اربعین نووی، شرح موطا امام محمد، مسند الانام شرح مسند الامام (ابی حنیفہ) المصنوع فی معرفۃ الموضوع تذکرۃ الموضوعات وغیرہ بے شمار کتابیں اور رسالے یادگار چھوڑے۔

درس بخاری لاہور میں تاریخ میں پہلی دفعہ صحیح بخاری کے داخلِ درس ہونے کا ذکر اسی عہد میں ملتا ہے، مولانا محمد لاہور کے مفتی تھے اور وہ حدیث شریف کا لاہور میں درس دیتے تھے اور تقریباً نوّے (۹۰) برس کے سن تک اس بابرکت شغل میں وہ مصروف رہے، جب صحیح بخاری اور مشکوٰۃ کا دورہ تمام ہوتا تو اس خوشی میں وہ بہت دھوم دھام سے لوگوں کی دعوت کرتے تھے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی: اکبر کے آخری عہد میں وہ بزرگ ہستی نمایاں ہوئی جس نے عہد جہانگیری میں اپنی جہانگیری کا

؎ بدایونی ج ۳ ص ۸۰ ۔ ؎ علمائے ہند ص ۲۳۰ و مآثر الکرام آزاد ص ۲۰۰ ۔ ؎ بدایونی ج ۳ ص ۱۵۱ ۔

سکہ بٹھادیا، اور جس نے دہلی کے شاہی دار السلطنت کو ہمیشہ کے لئے علوم دین کا دار السلطنت بنادیا، جس کی نسبت اہلِ علم کا اعتراف ہے۔

"اول کسے کہ تخم حدیث در ہند کشت او بود۔"

گو نئی تاریخ کی روشنی میں بزرگوں کا یہ پرانا مقولہ صحیح نہیں، تاہم معنوی حیثیت سے اس کی سچائی میں کوئی شک نہیں، مولانا عبدالحق محدث دہلوی کی ذات وہ ذات ہے جس نے ہندوستان میں رہ کر حدیث کے سربمہر خزانہ کو وقفِ عام کیا اور دل پسند محققانہ تصنیفات کے ذریعے سے علمائے ظاہر و باطن دونوں کی محفلوں سے تحسین و آفرین کی داد وصول کی۔

شیخ عبدالحق دہلوی نسلاً ترک تھے، ۹۵۸ھ میں دہلی میں پیدائش ہوئی، اپنے والد ماجد سے علوم کی تحصیل کی، پھر مکہ معظمہ جاکر شیخ عبدالوہاب متقی کے حلقہ درس میں بیٹھے اور ان سے صحاح ستہ کا درس حاصل کیا اور ان کے مرید بھی ہوئے، شیخ کو اپنے استاد اور پیر سے جو عقیدت تھی، اس کا اندازہ اخبار الاخیار کے صفحات سے ہوسکتا ہے، شیخ نے ہندوستان آکر دہلی میں اقامت اختیار کی اور تقریباً سو سے زیادہ کتابیں تصنیف کیں، جن میں سے مشکوٰۃ کی مشہور عربی شرح لمعات اور فارسی شرح اشعۃ اللمعات ہے، نیز سیرۃ نبویؐ میں مدارج النبوۃ تصنیف کی اور فیروز آبادی کی فارسی سفر السعادۃ کی فارسی شرح ایسی لکھی، جو حافظ ابن القیم کی زاد المعاد کے لگ بھگ ہے، ۱۰۵۲ھ میں وفات پائی۔

جوہر ناتھ کشمیری شیخ کے معاصر کشمیر کے ایک نومسلم ہندو محدث جوہر ناتھ کاشمیری ہیں، سلطان قطب الدین کے مدرسہ میں علوم عقلیہ کی تکمیل کے بعد عرب کی طرف رُخ کیا، اور وہاں پہنچ کر ابن حجر مکی اور ملا علی قاری ہروی سے حدیث کی سند حاصل کی، دوشالہ بنتے تھے، اور علوم دینیہ کا درس دیتے تھے کئی نامور شاگرد پیدا ہوئے، ۱۰۲۶ھ میں وفات پائی[1]

شیخ محمد قاسم شیخ محمد قاسم سندھی، سندھ کے رہنے والے تھے، عرب جاکر اس فن میں ایسا کمال پیدا کیا کہ رئیس المحدثین کہلائے، وہیں انتقال کیا، ان کی اولاد برہان پور میں آباد ہوئی، اُن کے بیٹے شاہ محمد علیمی جنداللہ اور اُن کے بیٹے بابا فتح محمد برہان پوری، تین نسل تک علوم دینیہ اور علم حدیث کے وارث رہے[2]۔

شیخ عبدالحق دہلوی کا سلسلہ عالمگیر کے زمانہ میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے لائق فرزندوں اور شاگردوں کا ایک بابرکت سلسلہ پیدا ہوا، جس نے اس فیض کو جاری کیا۔ شیخ کے فرزند مولانا نورالحق محدث دہلوی نے باپ کی علمی وراثت حاصل کی، باپ ہی سے حدیث کا درس حاصل کیا اور تمام عمر اس فیض کو عام کرنے میں صرف کی، حضرت خواجہ محمد معصوم سے بیعت کی، صحیح بخاری کی فارسی میں تیسیر القاری کے نام سے کئی جلدوں میں شرح لکھی، جو ۱۳۰۲ھ میں مطبع علوی لکھنؤ میں ایک والئ ٹونک کے شوق سے چھپ چکی ہے۔ انہوں نے امام مالک کی موطا کی بھی شرح لکھی ہے جو پٹنہ کے مشرقی کتب خانہ میں میری نظر سے گزر چکی ہے، صحیح مسلم کی بھی شرح بنام منبع العلم لکھنی شروع کی تھی، مگر ناتمام رہی، شاہجہاں کے زمانہ میں آگرہ کے قاضی

---

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۴۸ و اسرار الابرار۔

[2] ایضاً ص ۱۶۰ و اسرار الابرار ملا داؤد مشکواتی قلمی۔

تھے، ۱۰۷۳ھ میں وفات پائی،

شیخ نور الحق دہلوی کے ایک صاحبزادے حافظ فخر الدین ہیں، یہ بھی اپنے باپ کی متروکہ علمی دولت کے وارث ہوئے، انہوں نے فارسی میں اپنے والد کی ناتمام شرح صحیح مسلم موسوم بہ منبع العلم کی تکمیل کی، یہ شرح کتب خانہ پٹنہ میں موجود ہے، نیز حصن حصین کی بھی شرح لکھی[1]

حافظ فخر الدین کے فرزند شیخ الاسلام ہیں، جو محمد شاہ کے زمانہ میں تھے صحیح بخاری کی فارسی شرح لکھی، اور دو رسالے طرد الاوہام عن اثر الامام الہمام اور کشف الغطا عما لزم للموتی عن الاحیاء لکھے حدیث اپنے باپ سے پڑھی یہ شرح بخاری تیسیر القاری کے حاشیہ پر شرح شیخ الاسلام کے نام سے چھپی ہے۔

شیخ الاسلام کے صاحبزادے سلام اللہ ہیں انہوں نے بھی اپنے باپ ہی کی وراثت علمی پائی، یہ دہلی چھوڑ کر رام پور چلے آئے تھے اور محدث رام پوری کے نام سے مشہور ہیں، انہوں نے موطا کی شرح محلی ۱۲۱۵ھ میں لکھی، نیز صحیح بخاری اور شمائل ترمذی کا فارسی میں ترجمہ کیا اور اصولِ حدیث پر عربی میں ایک رسالہ لکھا ۱۲۲۹ھ میں وفات پائی[2] شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا یہ سلسلہ فیض وہ ہے جو سلسلۂ نسب کے ساتھ ساتھ چلا ہے، لیکن ایک دوسرا سلسلہ یہ ہے جو صرف روحانی فیض تک محدود ہے۔

شیخ دہلوی کے ایک نامور شاگرد اسی سلسلۂ نقشبندیہ کے ایک اور بزرگ زادہ خواجہ خاوند معین الدین ہیں جو خواجہ خاوند محمود المعروف بحضرت ایشان المتوفی ۱۰۵۲ھ کے فرزند تھے، جنہوں نے علوم حدیث و تفسیر و فقہ و اصول میں شیخ سے کسب کمال کیا اور اپنے والد بزرگوار سے خرقۂ خلافت پایا، کتاب رضوانی اُن کی تصنیف ہے[3]۔

شیخ دہلوی کے ایک اور نامور شاگرد ملا حیدر کشمیری ہیں، اپنے وطن کے علما ملا جوہر ناتھ اور بابا قطب الدین سے علوم کی تحصیل کی، پھر دلی آکر شیخ کے حلقۂ درس میں داخل ہوئے، اور حدیث و تفسیر و فقہ کی تکمیل کی اور واپس جا کر درس و تدریس اور ہدایت و ارشاد میں مصروف ہوئے، والی کشمیر نے ہر چند چاہا کہ وہ قضا کا عہدہ قبول کریں مگر وہ راضی نہ ہوئے، ۱۰۵۶ھ میں وفات پائی[4]

ملا حیدر کے شاگرد بابا داؤد مشکوٰتی کشمیری ہیں[5] علوم عقلیہ کے ساتھ فقہ و حدیث و تفسیر کی تعلیم اُن سے حاصل کی، حدیث دانی میں یہ کمال پیدا کیا کہ مشکوٰۃ بزبان یاد کھی، اور اسی مناسبت سے مشکوٰتی کے لقب سے مشہور ہوئے، اسرار الابرار کشمیر کے مشائخ اور علماء کے حالات اور ملفوظات میں اُن کی ایک تصنیف ہے، اُس کا ایک قلمی نسخہ دار المصنفین کے کتب خانہ میں ہے، اس میں کہیں کہیں، صحیح بخاری اور احادیث کے حوالے نظر آتے ہیں ۱۰۹۷ھ میں وفات پائی[6]

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے فرزند ملا نور الحق دہلوی کے حلقۂ درس کے ایک نامور فاضل میر سید مبارک محدث بلگرامی،

---

[1] حدائق الحنفیہ۔ [2] خزینۃ الاصفیاء مفتی سرور لاہوری ص ۶۲۶ [3] خزینۃ الاصفیاء ص ۶۴۳

[4] تاریخ علمائے ہند ص ۴۵ و اسرار الابرار ملا داؤد مشکوانی۔ [5] تاریخ علمائے ہند ص ۴۵ و اسرار الابرار ملا داؤد مشکواتی۔

[6] تاریخ علمائے ہند ص ۶۰۔

ہیں، میر موصوف نے شیخ کے گھر میں رہ کر اور اُن کے حلقۂ درس میں بیٹھ کر علم حدیث میں وہ کمال پیدا کیا کہ آزاد بلگرامی نے اُن کو قطب المحدثین قرار دیا مآثر الکرام میں ہے :۔

" واز اوّل تا آخر ایام اقامت دہلی در خانۂ شیخ نور الحق بن شیخ عبدالحق قدس اللہ اسرارہما سکونت ورزیدہ علم حدیث از اں جناب اخذ کردہ و دریں فن اشرف مہارتے تامے بہم رساند و تمام عمر در خدمت کلام نبوی فنا ساخت و بہ لقب محدث بلند آوازہ گشت و لہذا او را دریں کتاب بہ قطب المحدثین یاد کردہ "

۱۰۶۴ھ میں سند فراغ حاصل کی اور بقیہ عمر عام علوم اور خصوصاً علم حدیث کی درس و تدریس میں بسر کی، امر معروف اور نہی عن المنکر میں ایسے سخت تھے کہ بڑے بڑے امراء ان کی ڈانٹ سے دب جاتے تھے، ۱۱۱۵ھ میں وفات پائی۔[1]

میر سید مبارک کے تلامذہ میں میر عبدالجلیل بلگرامی سب سے نامور ہوئے۔ علم حدیث کا نور اس خانوادہ میں میر سید مبارک ہی کے مبارک قدم سے جلوہ افروز ہوا۔ آزاد لکھتے ہیں :۔

" علم حدیث از قطب المحدثین میر سید مبارک بلگرامی سند نمود "

میر عبدالجلیل کے فضل و کمال کا ستارہ عالمگیر کے عہد میں طلوع ہوا، اور محمد شاہ کے زمانہ تک درخشاں رہا، آخر میں بھکر واقع سندھ میں وقائع نویس تھے، وہاں صحیح بخاری کا ایک نسخہ ہاتھ آیا، عہدہ سے برطرفی کے بعد بھی محض اس کی نقل کی خاطر چھ مہینے اور وہاں گذارے، ۱۰۷۱ھ میں پیدا ہوئے۔ اور ۱۱۳۸ھ میں وفات پائی۔

علامہ میر عبدالجلیل کے آغوشِ تربیت میں علامہ غلام علی آزاد بلگرامی نے پرورش پائی، حدیث و سیر اپنے نانا میر عبدالجلیل سے حاصل کی، لکھتے ہیں :۔

" ولغت و حدیث و سیر نبوی و فنون ادب از خدمت قدسی منزلت جدّی و استاذی حضرت علامی میر سید عبدالجلیل بلگرامی اخذ نمودہ "

۱۱۵۱ھ میں عرب جاکر اس تخم بارآور کی مزید سیرابی کی اور مولانا حیات سندھی سے صحیح بخاری پڑھی، اور صحاح ستہ کی اجازت حاصل کی[2] صحیح بخاری کی ایک ناتمام شرح ضوء الدّاری کے نام سے لکھی[3]

ضوءالدراری مصنف کے قلم کا اصلی نسخہ نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے دیکھا تھا، اس کے مقدمہ کی چند سطریں نواب صاحب نے اپنی تالیف الحطہ فی اخبار الصحاح الستہ میں نقل کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا آزاد نے ۱۱۵۱ھ میں جب مدینہ منورہ کا سفر کیا اور صحیح بخاری کا درس لیا۔ اور ساتھ ہی علامہ قسطلانی کی شرح ارشاد الساری

---

[1] مآثر الکرام جلد اوّل صـ ۹۴ [2] مآثر الکرام جلد اوّل صـ ۱۶۲ [3] ابجد العلوم نواب صدیق حسن خاں ص ۹۴
[4] الحطہ فی اخبار الصحاح الستہ نواب صدیق حسن خاں، ص ۹۷۔

نظر سے گذری تو روزانہ سبق کے برابر وہ قسطلانی کی تلخیص کرتے چلے گئے، لیکن اس طرح وہ کتاب الزکوٰۃ سے آگے نہ بڑھ سکے[1]

استدراک و اضافہ

شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی سہروردیؒ

مضمون کے پہلے حصہ میں ایک نہایت اہم شخصیت نظر انداز ہو گئی اور وہ شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا ملتانی ہیں، جن سے ہندوستان میں سلسلۂ سہروردیہ کا آغاز ہوتا ہے عام تذکروں میں یہ لکھا ہے کہ شیخ بہاء الدین کے دادا کمال الدین علی شاہ قریشی مکہ معظمہ سے خوارزم گئے تھے، اور وہاں سے ملتان آ کر آباد ہوئے، شیخ عین الدین بیجاپوری نے اپنے تذکرۃ الاولیاء میں لکھا ہے کہ شیخ بہاء الدین ہبار (صحیح ہبار) ابن اسود بن مطلب بن اسد قریشی کی اولاد سے تھے[2] قلعہ کوٹ کرور (متصل ملتان) میں ۵۷۸ھ میں پیدا ہوئے، بارہ برس کے ہوئے، تو علم کی تحصیل کے لیے خراسان و بخارا کا سفر کیا، پندرہ برس کے سن میں علوم ظاہری کی تکمیل کی اور درس و افادہ کی مجلس گرم کی، پھر جاذبۂ شوق نے حرمین کی طرف کھینچا، اور عراق ہو کر مکہ معظمہ گئے، حج ادا کیا۔ پھر مدینہ منورہ جا کر شیخ کمال الدین محمد محدث یمنی سے حدیث کا درس لیا اور مدت مدید تک (فرشتہ نے ۵۲ برس تک لکھا ہے) مدینہ منورہ میں حدیث کا درس و شغل رکھا، الفاظ یہ ہیں:

"نزد شیخ کمال الدین کہ از محدثین کبار بودہ پنجاہ و سہ سال در مدینہ منورہ بگفتن درس حدیث اشتغال داشت، کتب حدیث خواندہ و اجازت حاصل نمودہ"

یہاں سے بیت المقدس ہو کر وہ بغداد پہنچے، اس وقت بغداد میں مدرسہ نظامیہ زندہ تھا اور شیخ شہاب الدین سہروردی جو اسی مدرسہ کے فاضل تھے اور ان کے عم محترم شیخ ابوالنجیب عبدالقاہر سہروردی دو برس تک ۵۴۵ھ سے ۵۴۷ھ تک اس کے مدرس اعلیٰ رہ چکے تھے، اور شیخ شہاب الدین نے اپنے چچا سے کسب کمال کیا تھا، شیخ بہاء الدین زکریا جب بغداد پہنچے ہیں، تو شیخ ابوالنجیب کا ۵۶۳ھ میں وصال ہو چکا تھا اور ان کی جگہ پر شیخ شہاب الدین سہروردی مسند آرا تھے شیخ بہاء الدین نے شیخ شہاب الدین سہروردی سے بیعت کی اور ان کے فیضِ صحبت سے مستفید ہو کے اور ظاہر و باطن سے آراستہ ہو کر ہندوستان واپس آئے اور ملتان میں سکونت اختیار کی، یہ وہ وقت تھا، جب سلطان قطب الدین ایبک کی حکومت تھی، سلطان قطب الدین نے ملتان اور اوچہ ناصر الدین قباچہ کو، اور دہلی کا تخت شمس الدین التمش کو سپرد کیا تھا قطب الدین کی وفات کے بعد ناصر الدین قباچہ نے شریعت کی ترویج اور احکام دین کے اجرا میں نہایت سستی اور بے پروائی برتی تو شیخ الاسلام نے یہ حال سلطان التمش کو اس کی اطلاع دی اور جب ناصر الدین قباچہ نے باز پرس کی، تو فرمایا میں نے جو کچھ کیا، خدا کے حکم سے کیا۔ تم سے جو کچھ ہو سکے، وہ کر گذرو، یہ کلمۂ حق سن کر ناصر الدین کانپ اٹھا۔[3]

شیخ نے ۶۶۶ھ میں وفات پائی۔

---

[1] الحطۃ فی اخبار الصحاح الستہ نواب صدیق حسن خان ص ۹۷

[2] فرشتہ جلد دوم ص ۴۰۴، نولکشور۔ [3] اخبار الاخیار ص ۴۵۔

پچھلے صفحات میں حسب ذیل تین بزرگوں کے تذکرے صرف دو سطروں میں تھے، یہاں تفصیل سے لکھے جاتے ہیں۔

مولانا برہان الدین محمود

امام صغانی کے شاگرد مولانا برہان الدین محمود دہلوی تھے، وہ امام مرغینانی صاحب ہدایہ کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے تھے، سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد حکومت میں ہندوستان آئے، اور مشارق الانوار کا درس دینا شروع کیا۔ ۶۸۷ھ میں وفات پائی، اور دہلی حوض شمسی کے پورب میں دفن ہوئے، اُن کے خاص شاگرد مولانا کمال الدین زاہد دہلوی تھے۔

مولانا کمال الدین زاہد دہلوی

انہوں نے مشارق الانوار کی سند مولانا برہان الدین محمود سے حاصل کی اور علم حدیث میں یگانۂ روزگار تھے، اور دہلی میں اس کا درس دیتے تھے۔ بڑے متقی اور پرہیزگار تھے، سلطان غیاث الدین بلبن نے چاہا کہ ان کو اپنا امام مقرر کرے، مگر انہوں نے قبول نہیں کیا۔ حضرت نظام الدین سلطان الاولیاءؒ نے حدیث ان ہی سے پڑھی تھی [۱]

حضرت نظام الدین سلطان الاولیاءؒ

حضرت نظام الدین سلطان الاولیاءؒ اس عہد کے مشہور فاضل و ادیب و محدث تھے، ادب میں مقامات حریری زبانی یاد کی تھی اور اس کے کفارہ کے طور پر دہلی آ کر مولانا کمال الدین زاہد دہلوی سے مشارق الانوار کا درس حاصل کیا، اور اس کو زبانی یاد کیا، حضرت نظام الدین سلطان الاولیاءؒ کے حالات میں سب سے قدیم تذکرہ سیر الاولیاء ہے۔ جو حضرت میر خورد دہلوی کی تصنیف ہے اور مصنف صرف ایک دو واسطہ سے حضرت کے حالات بیان کرتا ہے اور اُن کی بہت سی تحریری یادداشتیں اس کی نظر سے گذری ہیں، میر خورد دہلوی نے اس اصل سند کی پوری عبارت سیر الاولیاء میں نقل کی ہے، جو مولانا کمال الدین نے حضرت نظام الدین کو لکھ کر دی تھی۔

حضرت سلطان الاولیاءؒ نہایت متبع سنت تھے، اُن کے یہاں سماع کی مجلس میں جیسا کہ سیر الاولیاء اور فوائد الفواد میں ہے کہ مزامیر اور تالیاں نہیں بجائی جاتی تھیں، صرف غزلیں گائی جاتی تھیں، فقہائے احناف کے نزدیک محض گانا بھی مکروہ تھا، اور فقہائے شوافع اس کو جائز کہتے تھے، حضرت سلطان الاولیاءؒ بھی اس مسئلہ میں شافعی مسلک کو درست سمجھتے تھے، اس بنا پر اُن کے عہد کے جاہ طلب علماء نے اُن کے خلاف شورش برپا کی اور آخر دربارِ شاہی کے اہتمام سے مجلسِ مناظرہ کی نوبت آئی، حضرت سلطان الاولیاءؒ نے نفس غنا کے جواز کی جب حدیثیں پیش کیں تو علمائے احناف نے کہا کہ تم مقلد ہو تم کو حدیث سے کیا مطلب؟ اگر فقہ حنفی کی کوئی روایت ہو تو پیش کرو، حضرت سلطان الاولیاءؒ افسوس کے ساتھ فرماتے تھے کہ وہ ملک کیونکر آباد رہے گا۔ جس میں لوگوں کی رایوں کو احادیث نبوی پر ترجیح دی جاتی ہو،

میر خورد دہلوی نے سیر الاولیاء میں اس مناظرہ کی پوری تفصیل نقل کی ہے۔ مگر کہیں اس فقرہ کا حوالہ نہیں ہے جس کو فرشتہ نے حضرت کی زبانِ مبارک سے حدیث کہہ کر لکھا ہے، اور اس سے میرا وہ شک یقین سے بدل جاتا ہے، جو فرشتہ کی اس روایت پر میں نے اوپر کسی صفحہ کے حاشیہ میں کیا تھا۔

حضرت سلطان الاولیاءؒ کے ملفوظات مثلاً فوائد الفواد مصنفہ حسن دہلوی اور افضل الفوائد مصنفہ امیر خسرو دہلوی میں بکثرت حدیثیں آپ کی زبان سے مذکور ہیں اور اُن کے رموز و نکات آپ نے بیان فرمائے ہیں، آپ کے خلفاء بھی اس فن کے کاملین گذرے ہیں۔

۱؎ اخبار الاخیار ص ۶۸۔

نصیر الدین محمود چراغ دہلوی فقہ و اصول مولانا عبدالکریم شروانی اور افتخار الدین گیلانی سے پڑھا، علم حدیث کی نسبت نہیں معلوم کہ کس سے پڑھا، مگر اُن کے ملفوظات میں حدیثیں بکثرت ملتی ہیں۔ حضرت سلطان الاولیا کے خلیفہ تھے۔ وہ غنا بھی نہیں سنتے تھے، ایک دفعہ اُن کے چند رفقا غنا سُن رہے تھے، حضرت نصیر الدین محمود چراغ دہلوی مجلس سے اُٹھ گئے۔ لوگوں نے بیٹھنے پر اصرار کیا۔

فرمایا: "یہ خلافِ سنت ہے۔"

لوگوں نے کہا: "اپنے پیر کے مسلک سے تم ہٹ گئے۔"

فرمایا پیر کا عمل حجت نہیں ہو سکتا، کتاب و سنت سے کوئی دلیل لاؤ، بعض اصحابِ غرض نے یہ فقرہ حضرت سلطان الاولیا تک پہونچایا، فرمایا:۔

"راست می گوید[۱]"

مولانا شمس الدین یحییٰ اودھی حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی کی طرح یہ بھی اودھ کے تھے، اور حضرت سلطان الاولیا کے مرید تھے، فرید الدین شافعی شیخ الاسلام اودھ کے شاگرد تھے۔ حدیث میں مشارق الانوار کی شرح لکھی تھی، اور دہلی میں درس دیتے تھے۔ سلطان محمد تغلق نے اُن کو کشمیر میں اشاعتِ اسلام کے لئے نامزد کیا تھا۔ مگر سلطان کی وفات سے تجویز ناقص رہ گئی، ۷۴۷ھ میں وفات پائی۔

مولانا فخر الدین زرادی یہ بھی دہلی کے علمائے مشاہیر اور حضرت سلطان الاولیا کے جان نثار مریدوں میں ہیں۔ دہلی کے بڑے محدثین میں تھے، جب ہدایہ پڑھاتے تھے، تو اس کی حدیثوں کے مقابلہ میں صحیحین کی حدیثیں پیش کرتے تھے۔ اور اُن کو ترجیح دیتے تھے، مرید ہونے کے بعد درس و تدریس چھوڑ دیا تھا۔ سلطان محمد تغلق نے جب دکن فتح کیا تو وہاں گئے اور وہاں سے حج کے لئے عرب گئے۔ عرب سے بغداد گئے اور وہاں سے علم حدیث کی تکمیل کی واپسی میں جہاز تباہ ہو گیا، اور وہ درخوش آب پانی کی تہ میں چلا گیا[۲]

شیخ شرف الدین یحییٰ منیری بہاری شیخ شرف الدین احمد بن یحییٰ منیری بہاری کی تعلیم کا زمانہ دہلی میں گذرا دہلی وہ اس وقت پہونچے، جب حضرت سلطان الاولیا رحلت فرما چکے تھے، یہ نہیں معلوم کہ انہوں نے حدیث کی کون سی کتاب پڑھی اور کس سے پڑھی۔ مگر اتنا یقینی ہے کہ وہ احادیثِ نبوی کے کسی مجموعہ سے مشرف تھے اور زیادہ قرینہ یہی ہے کہ مجموعہ مشارق الانوار ہو، اُن کے مکتوبات و تالیفات میں احادیثِ نبوی کے بکثرت حوالے اور روایتیں ہیں، کبھی اصل عبارت لکھتے ہیں، زیادہ تر فارسی ترجمہ فوائد المریدین جو شیخ کا ایک مختصر رسالہ ہے، وہ تمام تر احادیثِ نبوی کے حوالوں سے لبریز ہے، اس کے شروع میں ایک جگہ امام ابو یعلیٰ کا حوالہ ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسند ابو یعلیٰ کی حدیثیں بھی نظر سے گذری تھیں، مکتوبات میں ایک جگہ ایک حدیث،

---

[۱] اخبار الاخیار ص ۸۰ ۔ [۲] ایضاً ص ۹۱، ۹۲ ۔ [۳] ایضاً ص ۶۸ ۔

کی نسبت لکھتے ہیں کہ " حدیث برادرم فخرالدین نوشتہ بود"[1]۔
اس فخرالدین سے میرے گمان میں مولانا فخرالدین زرادی مراد ہیں اس سے قیاس ہوتا ہے کہ شیخ کو حدیث کا فیض اسی نظامی جماعت سے پہنچا ہے۔

مجھ سے میرے ایک معتبر بزرگ نے بیان فرمایا ہے کہ حضرت حسین نوشۂ توحید بہاری جو حضرت شیخ شرف الدین کے معتقد اور شیخ کے مرید و جانشین امام مظفر بلخی بہاری کے مرید تھے اور سفرِ حجاز میں ان کے رفیق تھے، معدن المعانی میں لکھا ہے کہ امام نووی المتوفی ۶۷۶ھ کی شرح صحیح مسلم شیخ کے مطالعہ میں تھی۔

مکتوبات دوصدی کے جامع نے جس نے ۷۶۹ھ میں اس کو جمع کیا۔ دیباچہ میں آپ کی نسبت لکھا ہے:۔
" محی سنن نبوی مظہر آثار مصطفوی قامع دین اہل البدع، بانی دین اہل الورع"[2]

شیخ نے ۷۸۲ھ میں وفات پائی۔

شیخ بھکاری کاکوروی کاکوری لکھنؤ کے ضلع میں ایک مشہور قصبہ ہے۔ یہ بزرگ یہیں کے رہنے والے تھے ۸۹۰ھ میں ولادت ہوئی، مولانا ضیاء الدین مدنی محدث اور قاضی عبداللطیف ہراتی کے شاگرد تھے۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے پوتے شیخ عبدالرزاق کے مرید تھے، ۹۱ سال کی عمر میں ۹۸۱ھ میں وفات پائی، کاکوری کے تمام مخدوم زادے انھی کی اولاد میں ہیں، حضرت شیخ اپنے وقت کے بڑے محدث تھے۔ ان کی حدیث کی سندیں اب تک موجود ہیں۔ اصولِ حدیث میں منہج نام ایک کتاب بھی اُن کی تصنیف ہے[3]۔

کشمیر میں سلسلہ حق مضمون کے شروع کے صفحات میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے سلسلۂ تلمذ کا ذکر تھا، کشمیر میں ملا حیدر شیخ کے شاگرد تھے۔ جن کا ذکر اوپر گذر چکا ہے۔ ملا حیدر نے اس سلسلہ کو اور پھیلایا۔ جن میں سے بابا داؤد مشکاتی کا حال تم پڑھ چکے ملا کے صاحبزادوں کا ذکر نہیں آیا ہے۔ ان میں سے ایک خواجہ محمد فاضل تھے، جو بابا داؤد مشکاتی کے ہم سبق تھے[4]۔ ملا عنایت اللہ سال محدث کشمیری ملا حیدر کے صاحبزادوں کے شاگرد ہوئے اور اس درجہ اس فن میں انہماک اور ذوق و شوق پیدا کیا کہ تمام عمر اسی کی خدمت میں صرف کر دی، بخاری شریف کا شروع سے آخر تک ۳۶ دفعہ درس دیا تھا، ۶۸ برس کے سن میں ۱۱۲۵ھ میں وفات پائی[5]۔

صوبہ بہار میں علم حدیث اور سلسلۂ حق اوپر دورِ اکبری کے محدثین میں ایک نام سید یٰسین گجراتی کا گذرا ہے، جو عرب جا کر اس سرچشمہ سے بہرہ مند ہوئے تھے، واپس آئے تو پہلے پانچ دریاؤں والی زمین (پنجاب) کو سیراب کیا، پھر تذکروں میں لکھا ہے کہ وہ اس کے بعد بنگالہ کے ملک کو چلے گئے۔ اس کے بعد اُن کا پتہ نہیں چلتا، لیکن خوش قسمتی

---

[1] مکتوب ہفتدہم بنام امام مظفر۔ [2] مکتوبات دوصدی ص ۳۲۲۔ [3] تذکرہ علمائے ہند ص ۳۲۔
[4] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۵۲۔ [5] اسرار الابرار قلمی

سے پھلواری شریف سے سندِ حدیث کا ایک قلمی نسخہ ہاتھ آیا ہے [1] جس سے ثابت ہوتا ہے کہ سید موصوف یہاں سے بہار گئے اور وہاں بھی اس فیض کو جاری کیا، غالباً یہ پہلا موقع ہے کہ بہار کی خانقاہ سے قال اللہ وقال الرسول کا ترانہ سمع نواز ہوا، اس سلسلۂ سند سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ المحدثین مولانا سید یٰسین کے درس سے وہاں "حافظ الوقت" مولانا شیخ عبدالرزاق نامی ایک بزرگ نے فائدہ اٹھایا اور ان سے "شیخ الوقت" مولانا عبدالغنی نے اور ان سے اُن کے صاحبزادے مولانا عبدالمقتدر محدّث نے اور اُن سے اُن کے بھتیجے اور شاگرد محمد عتیق بن عبدالسمیع بہاری نے اور ان ہی کی دی ہوئی یہ سند ہے، جو پھلواری میں محفوظ ہے۔

مولانا عتیق بہاری نے اس گجراتی فیض کے ساتھ دہلوی سلسبیل کو ملا کر دو آتشہ بنا لیا تھا، مولانا دورِ عالمگیری کے علما میں ہیں اس عہد میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے صاحبزادہ مولانا نور الحق محدث دہلوی اور ان کے شاگرد مولانا جلال الدین تھے۔ مولانا محمد عتیق بہاری نے سلسلۂ حق کی ان دونوں کڑیوں کو بھی ملا لیا تھا۔

مولانا محمد عتیق محدث بہاری کے تلامذہ میں شیخ محمد وجیہ بن شیخ امان اللہ جعفری پھلواروی ہیں، انہی کو یہ سند دی گئی تھی۔ اس سند میں ان کتابوں کا بھی ذکر ہے جن کی اجازت شیخ نے اپنے شاگرد کو دی تھی، ان میں حسبِ ذیل کتابوں کے نام ہیں، مشکوٰۃ، صحیح بخاری صحیح مسلم، مصابیح، مشارق الانوار صغانی، شمائل ترمذی، حصن حصین جزری، کتاب الاذکار نووی، مسند امام اعظم ابوحنیفہؒ، مسند احمد بن حنبلؒ موطا امام مالک، مسند امام شافعی، جامع ترمذی، سنن ابی داؤد، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ، لطائف ابن حبان، جامع المسانید ابن جوزی، ان میں سے تین پہلی کتابیں یعنی مشکوٰۃ، بخاری شریف اور مسلم شریف کے سبقاً پڑھے جانے کا اور بقیہ کتب کی اجازت کا ذکر ہے۔

شیخ محمد وجیہ کے شاگرد، اُن کے صاحبزادہ ملا وحید الحق محدث پھلواروی ہیں۔ انہوں نے درس و تدریس اور تحریر و تالیف سے اس فن کی اشاعت کی، لیکن وہ تمام تر شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی تصنیفات کے خوشہ چیں تھے، اس کے بعد ایک سو برس تک پھلواری میں معقولات کا زور شور رہا، آخر مولانا آلِ احمد صاحب نے عرب سے آکر اس فیض کو یہاں پھر جاری کیا۔

یہ سب کچھ ہو چکا تھا، لیکن ہندوستان میں علمِ حدیث کی اصلی شوکت و رونق دو فاروقی خانوادوں کے ذریعے سے حاصل ہوئی، جن میں سے ایک حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی فاروقی ہیں، مجددی خانوادہ کا پہلا علمی اتصال شیخ عبدالحق دہلوی کے سلسلہ سے ہوا مگر بہت جلد شیخ دہلوی کی جگہ شاہ ولی اللہ کے گھرانے نے لے لی اور دونوں سرچشموں سے مل کر ہندوستان میں جو فیض پھیلا، اُس نے ملک کے چپہ چپہ کو سیراب کر دیا۔

شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی

شیخ احمد سرہندی نے معقولات مولانا کمال الدین کشمیری سیالکوٹی اور علمِ حدیث مولانا عبدالرحمٰن سرہندی اور مولانا یعقوب کشمیری سے حاصل کیا یاد ہوگا کہ مولانا یعقوب صرفی کشمیری، شیخ ابن حجر مکی کے شاگرد تھے۔ اور وہ یہ فیض عرب سے ہندوستان لائے تھے، اس کے بعد وہ حرمین تشریف لے گئے۔ اور وہاں کے بڑے بڑے

---

[1] اس سلسلۂ سند کی دستیابی کے لیے ہم اپنے محترم مخدوم حضرت مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی قادری چشتی کے ممنون ہیں، یہ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ حضرت شاہ صاحب کو علما اور مشائخ کی تاریخ سے پوری واقفیت اور دلچسپی ہے۔

محدثین کرام کی صحبت اٹھائی۔ شیخ عبدالرحمٰن بن فہد سے جو اُن کے زمانہ کے ایک بڑے محدث تھے، حدیثِ مسلسل سنی اور صحاحِ ستہ کا اجازہ حاصل کیا[1] ولادت سنہ ۹۷۱ھ میں اور وفات سنہ ۱۰۳۴ھ میں ہوئی۔

متن حدیث میں ایک اربعین یعنی چالیس منتخب حدیثوں کا مجموعہ آپ کی تالیف ہے جو عام طور سے چھپا ہوا ملتا ہے، اس کے علاوہ جس نے آپ کے مکتوبات کا مطالعہ کیا ہے وہ شہادت دے گا کہ آپ کا پایۂ علمِ حدیث میں کتنا بلند تھا، لیکن حضرت مجدد الف ثانی کا اصلی کارنامہ یہ نہیں ہے کہ وہ درسِ حدیث کی مسند بچھا کر بیٹھے، بلکہ یہ ہے کہ انہوں نے علی الاعلان دربارِ شاہی کے بدعات و منکرات کے خلاف بغاوت کی، اور اس کی سزا (قید) خوشی خوشی برداشت کی، اہلِ سُنّت جو شاہی اثر سے شیعیت میں جذب ہو رہے تھے، اُن کو دلائل کے زور اور دلی ہمت کی قوت سے باہر نکالا، عامیانہ تصوّف جو سنّت کے مسلک سے کوسوں دور ہو گیا تھا، اس کو جادۂ شریعت کے قریب لائے اور شریعت و طریقت کی قلمی و لسانی جنگ جو پانچویں صدی کے شروع سے اب تک قائم تھی۔ اس کو مصالحت سے بدل دیا اور صوفیہ اور فقہاء کی چھ سو برس کی باہمی دست و گریبانی کا خاتمہ ہوا، اور مدرسہ و خانقاہ کی باہمی آویزش انجام کو پہنچی، علماء کو صحیح تصوف سے اور صوفیہ کو مسلکِ سنّت سے آشنا کیا اور ہر ایک فرقہ نے دوسرے کو نویدِ بشارت دی کہ

للہ الحمد میانِ من و او صلح فتاد

حضرت مجدد نے اپنی تعلیم کی بنیاد اتباعِ سنّت پر رکھی، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ علمِ حدیث اور شمائل کی طرف لوگوں کی توجہ زیادہ مبذول ہو گئی، اور اُن کے بعد صوفی محدثوں کا ایک عظیم الشان سلسلہ ہندوستان میں قائم ہو گیا۔

حضرت مجدد الف ثانی اور حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی معاصر تھے، پہلے اس معاصرت نے منافرت کی صورت پیدا کی، مگر دونوں بزرگوں کی اخلاص پسندی نے ایک کو دوسرے سے آشنا کر دیا اور دلوں میں یہ اتحاد پیدا کر دیا کہ ائمہ اسلام کی علمی و روحانی خدمت کے لیے یہ دونوں خانوادے متحد ہو گئے۔

سلسلۂ مجددیہ

حضرت مجدد الف ثانی کی متعدد اولادوں میں سے صرف دو آپ کی وفات کے بعد آپ کے جانشین ہوئے، ایک عروۃ الوثقیٰ حضرت محمد معصوم اور دوسرے خازن الرحمۃ شیخ محمد سعید۔ حضرت محمد معصوم سنہ ۱۰۰۹ھ میں پیدا ہوئے، اور سنہ ۱۰۷۹ھ میں وفات پائی، تذکروں میں ہے کہ ۹ لاکھ آدمیوں نے آپ کے دستِ مبارک پر بیعت توبہ کی۔ اور سات ہزار خلفاء مدارجِ علیا تک پہنچے، ان ہی میں ایک مولانا نورالحق محدث دہلوی خلف مولانا عبدالحق محدث دہلوی ہیں۔

حضرت محمد معصوم رحمۃ اللہ علیہ نے گو اپنا درس ۱۸ برس کے سن میں خود اپنے والد بزرگوار کی خدمت میں ختم کر لیا تھا، مگر عین اُس وقت جب دارا شکوہ اور عالمگیر تاج و تخت کے حصول کے لئے دست و گریبان تھے، حضرت مدینہ منورہ میں تشریف فرما تھے، وہاں کے علماء سے علومِ حدیث کی سند لے رہے تھے اور خود اُن کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سند تقسیم فرما رہے تھے۔

---

[1] ابجد العلوم نواب صدیق حسن خان و تاریخ علمائے ہند،

دوسرے صاحبزادہ شیخ محمد سعید سرہندی بھی متبحر فقیہ و محدث تھے، اپنے والد ماجد سے فیض حاصل کیا اور ۱۰۷۰ھ میں وفات پائی علم حدیث میں مشکوٰۃ المصابیح پر ایک حاشیہ آپ کی یادگار ہے[1]

حضرت محمد معصوم کے صاحبزادے شیخ محمد افضل سرہندی ہیں، حرمین کی زیارت سے ممتاز تھے، کتابوں کے اتنے شائق تھے، کہ جو کچھ ملتا تھا، اس سے کتابیں خرید لیتے تھے، شاہ ولی اللہ دہلوی نے اُن سے حدیث کی سند حاصل کی تھی، ۱۱۴۶ھ میں وفات پائی[2]

اب گیارہویں صدی کا خاتمہ ہے، اتنے دنوں میں زمانہ نے ایک عظیم الشان پلٹا کھایا، ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی حکومت بد سے بدتر ہوتی گئی، اور عالمگیر کے جانشین اب ایک سے ایک کمزور تر ہو رہے تھے، اور ادھر حرمین میں درسِ حدیث کی مسند پہ ابن حجر مکی اور اُن کے تلامذہ در تلامذہ کے بجائے کچھ اور نئے خانوادوں کے ارکان متمکن تھے جن میں ہر ایک دوسرے سے بڑھ کر پیدا ہو رہا تھا۔

اس عہد میں حرمین میں دو ہندوستانی محدث مسند نشین ملتے ہیں، عبداللہ لاہوری مکہ معظمہ میں اور ابوالحسن سندھی مدینہ منورہ میں افسوس ہے کہ پیش نظر دفاتر میں ان بزرگوں کے مزید حالات معلوم نہیں ہوتے، ان کے علاوہ دنیائے اسلام کے چند اور اعیانِ حدیث جلوہ افروز نظر آتے ہیں جن میں محمد بن سلیمان مغربی (مراکش) حسن عجمی (عجم) شیخ عبداللہ بن سالم البصری (عراق) احمد نخلی، تاج الدین حنفی، شیخ احمد بن سالم بصری، محمد بن علاؤالدین بابلی، شیخ ابراہیم کردی،

شیخ ابراہیم کردی۔ کردستان کے رہنے والے تھے، بغداد، شام، مصر اور حرمین کے شیوخ سے فیض حاصل کیا تھا، اور اس عہد میں اگلے زمانہ کے بزرگوں کی سی ہمت کا نمونہ دکھایا تھا، کردی۔ فارسی، ترکی اور عربی چار زبانوں میں گفتگو کرتے تھے، ۱۱۰۱ھ میں وفات پائی ——— "اِنّا علیٰ فراقک یا ابراھیم لمحزونون" تاریخ وفات ہے۔

شیخ ابراہیم کردی کے صاحبزدے شیخ ابوطاہر محمد بن ابراہیم کردی مدنی ہیں، اپنے والد کے علاوہ محمد بن سلیمان مغربی حسن عجمی، احمد نخلی، شیخ عبداللہ بن سالم بصری، شیخ عبداللہ لاہوری، شیخ تاج الدین حنفی سے اجازے اور سندیں حاصل کیں، یہی وہ بزرگ ہیں۔ جن کے حلقۂ درس میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی جا کر شریک ہوئے تھے۔

شیخ سالم بصری کے دو صاحبزادے عبداللہ بن سالم او احمد بن سالم نے نہایت شہرت اور حسنِ قبول پایا اور حقیقت یہ ہے کہ اس عہد میں علمِ حدیث کا فروغ اور حدیث کی کتابوں کی تصحیح و اشاعت کا اہم فرض انہی دو بھائیوں کی ہمتِ مردانہ سے ادا ہوا، شیخ عبداللہ ابن سالم بصری نے بھی شیخ ابراہیم کردی سے اجازہ پایا تھا اور اُن کے علاوہ دوسرے شیوخ سے بھی فائدہ اٹھایا تھا، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اُن کے حلقۂ درس میں بھی چند روز بیٹھے تھے، جیسا کہ انہوں نے اپنے رسالہ انسان العین میں اس کی تصریح کی ہے۔

شیخ احمد بن سالم بصری کعبہ کے اندر بیٹھ کر بخاری شریف پڑھتے تھے۔ بخاری کی شرح ضیاء الساری انہوں نے لکھی ہے، لیکن ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے صحاح ستہ کے ۹ نسخے جمع کئے اور نہایت محنت شاقہ اٹھا کر اُن کی ایسی تصحیح کی کہ اُن کے نسخے اُمہات

---

[1] تاریخ علمائے ہند ص ۱۹۰ — [2] ایضاً ص ۱۸۲ —

اور اصول بن گئے، سب سے زیادہ صحیح بخاری کی تصحیح میں کوشش بلیغ کی، چنانچہ پورے بیس برس میں بخاری کی تصحیح انجام کو پہنچی، مسند ابنِ حنبل کی جلدیں جو منتشر تھیں، ان کو مختلف مقامات سے یکجا کرکے ان کی تصحیح کی اُنکے یہ مصحح نسخے ہی وہ نسخے تھے، جن کی نقلیں اطراف و دیار میں پھیلیں، ۱۱۳۴ھ میں وفات پائی،

عبداللہ لاہوری

اوپر کے سلسلہ میں ایک بزرگ کا نام عبداللہ لاہوری محدث گذرا ہے، جو اس زمانہ میں حرمین میں حدیث کا درس دیتے تھے، چنانچہ شیخ ابوطاہر مدنی اُن سے مستفید تھے، اس کے علاوہ اُن کا کچھ اور حال نہیں معلوم ہوتا۔

ابوالحسن سندھی

اسی عہد کے ایک اور ہندوستانی محدث جو عرب کی سرزمین میں ایک پورے حلقۂ درس کے مرکز تھے، شیخ ابوالحسن سندھی ہیں، مدینہ منورہ میں ایک مدرسہ دار الشفاء کے نام سے تھا، اور جواب تک کسی نہ کسی حال میں باقی ہے، میں نے اس کی زیارت کی ہے، دار الشفاء کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اُس کے واقف نے یہ شرط کی ہے کہ اس میں قاضی عیاض کی کتاب الشفاء فی حقوق المصطفےٰ کا روزانہ درس دیا جائے۔ شیخ ابوالحسن سندھی گیارہویں صدی ہجری کے وسط میں اس میں مدرس تھے، ۱۱۳۹ھ میں وفات پائی، حرم نبوی میں بیٹھ کر حدیث کی متعدد کتابوں پر شروح اور تعلیقات لکھیں، چنانچہ جامع ترمذی، سنن ابی داؤد، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ کی شرح لکھی، موصوف کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ مسند ابن حنبل جو آٹھ جلدوں میں ہے اور جس کی کسی نے اب تک شرح نہیں لکھی تھی۔ انہوں نے پچاس جزء میں اس کی شرح لکھی[1] شیخ کے لائق تلامذہ میں سے دو کا تعلق ہندوستان سے ہے۔ حاجی عبدالولی طرخانی کشمیری اور شیخ محمد حیات سندھی۔

حاجی عبدالولی طرخانی کشمیری

وہ اصل میں طرخاں واقع ترکستان کے رہنے والے تھے، وطن سے نکل کر حرمین تشریف لے گئے اور وہاں مدرسہ دار الشفاء میں حدیث کی سند شیخ ابوالحسن سندھی سے حاصل کی اور واپس آکر کشمیر میں شیخ الاسلام مولانا قوام الدین محمد کے یہاں قیام کیا اور ان کو اپنی سند حدیث سے ممتاز کیا، ۱۱۷۱ھ میں چند شریروں کے ہاتھوں شہادت پائی[2]

شیخ محمد حیات سندھی

شیخ محمد حیات کا وطن سندھ میں عادل پور اور کوٹ سید مولیٰ قادری کے اطراف میں ہے، جاچڑ قبیلہ کا نام ہے، شباب کا آغاز تھا کہ جاذبۂ شوق نے دامنِ دل کھینچا، حرمین کی راہ کی، بالآخر مدینہ منورہ میں سکونت اختیار کی اور وہیں شادی بھی کر لی زیادہ تر شیخ ابوالحسن سندھی مدنی سے اور کسی قدر عبداللہ بن سالم مصری مکی سے علم حدیث کی تحصیل و تکمیل کی اور تمام عمر اس فنِ شریف کی خدمت میں صرف کر دی، مصر و روم و شام و ہند ہر جگہ اُن کے فضل و کمال کا غلغلہ بلند ہوا، اور ہر طرف سے طالب و مشتاق کا ہجوم ہوا، ۱۱۶۳ھ میں وفات پائی، ہندوستان کے اہلِ علم میں سے جن کو شیخ کے تلمذ کا شرف حاصل ہوا، اُن میں حسبِ ذیل اصحاب قابلِ ذکر ہیں

علامہ غلام علی آزاد بلگرامی

علامہ آزاد گو ہندوستان ہی میں اپنے نانا میر عبدالجلیل بلگرامی کے واسطہ سے شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے سلسلہ میں داخل ہو کر حدیث کی بعض کتابیں پڑھ چکے تھے، مگر ۱۱۵۱ھ میں وہ جب عرب گئے، تو مدینہ منورہ پہونچ کر شیخ محمد حیات سندھی کے حلقۂ درس میں داخل ہوئے اور صحیح بخاری سبقاً سبقاً پڑھی اور حدیث کی دوسری کتابوں کی سند لی، صحیح بخاری اس اہتمام سے پڑھی کہ روزانہ جس قدر بخاری پڑھتے تھے، اسی قدر قسطلانی شرح بخاری کی تلخیص کرتے جاتے تھے۔ انکا ذکر پہلے گزر چکا ہے، علامہ ممدوح شیخ کے بے حد معترف تھے، ماثر الکرام فی تاریخ بلگرام میں ان کا حال لکھا ہے[3]

علامہ غلام علی آزاد بلگرامی

الہ آباد کے اس خانوادۂ علم و تصوف کا آغاز شاہ محمد افضل الہ آبادی سے ہوتا ہے، یہ اصل میں پھلواری

---

[1] الحطہ فی اخبار الصحاح الستہ میں ہر کتاب کے تحت میں ان شروح کا ذکر نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے کیا ہے۔

[2] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۲۷ ۔ [3] مآثر الکرام جلد اول صـ ۱۶۴

کے جو غازی پور کے مشہور قصبوں میں ہے، رہنے والے تھے، جونپور میں علوم ظاہری کی اور کالپی میں علوم باطنی کی تعلیم پائی، نقشبندی طریقہ کے بزرگ اور سنت کے متبع تھے، ۱۰۳۰ھ میں پیدا ہوئے، اور ۱۱۴۲ھ میں وفات پائی، تصوف اور فارسی ادبیات کی متعدد کتابوں کے شارح ہیں، ان کے جانشین ان کے بھتیجے، اور داماد شاہ خوب اللہ ہوئے، جو اپنے عہد کے مشہور عالم وصوفی و مورخ تھے فقہ و تصوف کے علاوہ وفیات الاعلام ان کی سب سے اہم تصنیف ہے، جس میں علما اور مشائخ کے تذکرے ہیں۔ ۱۱۴۴ھ سالِ وفات ہے، ان کے صاحبزادے شاہ محمد فاخر الہ آبادی ہیں، شاعر بھی تھے، زائر تخلص تھا، اپنے بڑے بھائی شیخ محمد طاہر سے تعلیم پائی، اکیس برس کے سن میں اپنے پدر بزرگوار کی جگہ پر بیٹھے، اٹھائیس[۲] برس کے سن میں حج کے لئے گئے، اور مدینہ منورہ پہنچ کر شیخ محمد حیات سندھی سے حدیث کی تحصیل کی، دو حج کئے تھے، تیسرے حج کا ارادہ تھا کہ راہ میں برہان پور میں وفات پائی، ۱۱۶۴ھ تاریخ وفات ہے قرۃ العینین فی رفع الیدین، نور السنہ اور درۃ التحقیق، ان کے مشہور رسالے ہیں، شاہ صاحب ممدوح غالباً اپنے ساتھ عرب سے صحیح مسلم کا ایک نسخہ لائے تھے، جو ان کے مدرسہ میں موجود تھا، اس نسخہ کی نقل کتب خانۂ حبیب گنج میں ہے، شاہ محمد فاخر اور آزاد بلگرامی نے شیخ محمد حیات سندھی سے مدینہ منورہ میں ایک ساتھ، استفادہ کیا تھا، اس لیے مآثر الکرام میں ان کا حال لکھا ہے[۱]۔

مدراس میں علم حدیث

مدراس اور کرناٹک کا علاقہ اسلامی علم کے زیر سایہ بہت اخیر زمانہ میں یعنی عالمگیر کے عہد میں آیا، تاہم اس کا ساحلی حصہ مدت دراز سے عرب تاجروں کا جولانگاہ تھا، ملیبار میں ان کی بڑی آبادی تھی، مصر اور عرب سے ان کے براہِ راست بحری تعلقات تھے، اس بنا پر یہ بآسانی قیاس میں آسکتا ہے کہ یہاں علم حدیث مصر اور عرب کے راستہ سے براہِ راست داخل ہوا ہوگا، لیکن چونکہ اس دیار کی کوئی تاریخ موجود نہیں ہے، یا میرے پیش نظر نہیں ہے اس لئے کوئی تصریحی بات نہیں کہی جاسکتی، بہرحال عالمگیر کے بعد بارھویں صدی کے بیچ میں جب نظام دکن کی ملکی دست کے اندر کرناٹک کا علاقہ آیا اور ارکاٹ میں ایک اسلامی ریاست قائم ہوئی، تو اہلِ علم نے بھی ادھر کا رُخ کیا، اس عہد کے لوگوں میں شیخ محمد اسعد حنفی مکی قابلِ ذکر ہیں، شیخ مذکور شیخ تاج الدین مکی کے شاگرد تھے، شیخ عبداللہ ابن سالم مصری مکی نے ضیاء الساری کے نام سے صحیح بخاری کی جو شرح لکھی تھی، اس کا اصلی نسخہ شیخ اسعد نے اُن کے لڑکے سے خرید لیا تھا، اور اس کو لے کر وہ مدراس آئے تھے، علامہ غلام علی آزاد بلگرامی نے ارکاٹ میں وہ نسخہ اُن کے پاس دیکھا تھا، اس گرانقدر نسخہ کو ہندوستان آنے پر علامۂ موصوف نے شیخ کو ملامت کی اور کہا کہ اس گرانقدر خزانہ کو اسلامی مرکز سے اتنی دور سفر میں لے آنا مناسب نہ تھا، انہوں نے کہا کہ میری محبت نے گوارا نہ کیا کہ میں تھوڑی دیر کے لیے بھی اس کو اپنے سے جدا رکھوں یہ وہ زمانہ تھا جب نظام الدولہ ناصر جنگ (والیِ حیدر آباد دکن) اور فوج کے افغانوں کے درمیان کشمکش جاری تھی اور ارکاٹ میں فتنوں کا طوفان برپا تھا، اس بنا پر شیخ نے شرح بخاری کا یہ نسخہ اورنگ آباد دکن میں بھجوا دیا، اور وہ خود ناصر جنگ کی شہادت کے بعد مظفر جنگ کے ساتھ ۱۱۶۶ھ میں شہید ہوئے، میر آزاد لکھتے ہیں کہ وہ نسخہ اس وقت تک اورنگ آباد میں محفوظ ہے[۲]، اب خدا جانے وہ کہاں ہو۔

---

[۱] تفصیل حالات کے لئے دیکھو مآثر الکرام ج دوم ص ۲۱۱، وما بعد۔

[۲] الحطہ فی اخبار الصحاح الستہ نواب صدیق حسن خان مرحوم ص ۹۸۔

شیخ محمد اسعد کے متعلق میر آزاد لکھتے ہیں:

"در منقولات خصوص حدیث و فقہ بے نظیر بود۔"[1]

آخر زمانہ میں شاہ محی الدین دہلوی المتوفی ۱۲۴۲ھ کے دم سے یہاں علم حدیث کی رونق ہوئی

شیخ نور الدین احمد آبادی گجراتی

اسی عہد کے ایک اور قابلِ ذکر بزرگ شیخ نور الدین احمد آبادی گجراتی ہیں، ۱۰۶۳ھ میں پیدا ہوئے، فارسی اپنی ماں سے پڑھی، عقلیات اخوند احمد سے حاصل کیں اور علوم نقلی اور حدیث سید محمد ابو المجید محبوب عالم سے پڑھیں، مولانا کے علم و فضل کا شہرہ اطراف ملک میں پھیلا تو طلبہ جوق در جوق آنے لگے، یہ دیکھ کر شیخ الاسلام خان صدر صوبہ گجرات نے بھی ایک لاکھ سے زیادہ کے صرف سے ہدایت بخش نام ایک مدرسہ قائم کیا، ۱۱۰۲ھ میں مدرسہ کی بنیاد پڑی ۱۱۰۹ھ میں وہ پورا ہوا۔ ۱۱۴۳ھ میں مولانا نے حج ادا کیا۔ واپس آکر ۱۱۵۵ھ میں وفات پائی۔

تفسیر، علم کلام، منطق وغیرہ کی تصنیفات کے علاوہ نور القاری کے نام سے صحیح بخاری کی شرح لکھی۔[2]

شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی

ہندوستان کی یہ کیفیت تھی جب اسلام کا وہ اختر تاباں نمودار ہوا جس کو دنیا شاہ ولی اللہ دہلوی کے نام سے جانتی ہے، مغلیہ سلطنت کا آفتاب لبِ بام تھا، مسلمانوں میں رسوم و بدعات کا زور تھا، جھوٹے فقرا اور مشائخ جابجا اپنے بزرگوں کی خانقاہوں میں مسندیں بچھائے اور اپنے بزرگوں کے مزاروں پر چراغ جلائے بیٹھے تھے، مدرسوں کا گوشہ گوشہ منطق و حکمت کے ہنگاموں سے پُرشور تھا، فقہ و فتاویٰ کی لفظی پرستش ہر مفتی کے پیشِ نظر تھی، مسائلِ فقہ میں تحقیق و تدقیق سب سے بڑا مذہبی جرم تھا، عوام تو عوام خواص تک قرآن پاک کے معانی و مطالب اور احادیث کے احکام و ارشادات اور فقہ کے اسرار و مصالح سے بے خبر تھے۔

شاہ صاحب کا وجود اس عہد میں اہلِ ہند کے لئے ایک موہبتِ عظمیٰ اور عطیہ کبریٰ تھا، شاہ صاحب کے والد ماجد شاہ عبد الرحیم صاحب ایک عالم کامل تھے، معقولات میں میر زاہد کے بے واسطہ شاگرد تھے، شاہ صاحب نے علوم رسمیہ کا درس اپنے والد سے لیا، اور پندرہ برس کے سن میں تعلیم سے فراغت پائی، یہی وقت صبح سعادت کے ظہور کا تھا، مجددی نسبت اب تک ایک "مرد کامل" کی تلاش میں بے قرار تھی۔ شیخ افضل سرہندی مجددی دولت کے اس عہد میں وارث تھے، شاہ صاحب نے اُن سے حدیث پڑھی، ہندوستان میں جیسا کہ شاہ صاحب نے جزء لطیف میں لکھا ہے، مشکوٰۃ کا ایک حصہ اور صحیح بخاری اور شمائل ترمذی پڑھی، ابھی تک بطحا اور یثرب کے چشموں سے سیرابی باقی تھی تیس برس کی عمر میں ۱۱۴۳ھ میں سرزمین عرب کی راہ لی، اور دو برس وہاں رہ کر شیخ ابو طاہر مدنی سے کتب حدیث کا درس لیا، اس وقت شیخ کی مجلس میں صحیح بخاری کا درس ہو رہا تھا۔ اس میں شریک ہوئے، صحاح ستہ اور موطا امام مالک، مسند دارمی اور کتاب الآثار امام محمد کے اطراف ان کو سنائے، اور بقیہ کتابوں کی سند اُن سے حاصل کی[3]، دو برس کے بعد ۱۱۴۵ھ میں ہندوستان واپس آئے اور پورے تیس برس تک فیض و برکات کا بادل اس علامۂ روزگار کے زبان اور قلم سے ہندوستان کی زمین پر برستا رہا، ۱۱۷۶ھ میں وفات پائی۔

---

[1] مآثر الکرام آزاد جلد دوم ص ۱۹۰ — [2] تاریخ علمائے ہند ص ۲۴۸ —
[3] ابجد العلوم نواب صدیق حسن خان بحوالہ انسان العین مؤلفہ شاہ ولی اللہ دہلوی۔



حضرت شاہ صاحب کے کارناموں کی تفصیل کے لیے ایک مستقل دفتر کی ضرورت ہے، لیکن ہم نہایت اختصار کے ساتھ اہلِ ہند پر اُن کے علمی و دینی احسانات کا ذکر کرتے ہیں :۔

۱۔ مغلیہ دربار پر ہمایوں سے لے کر اب تک تشیع کا رنگ غالب تھا، دربار میں ایرانی امرا کی کثرت ہمیشہ رہی، اور اس کا اثر نیچے تک رچہ بدرجہ نمایاں تھا اور شاہ صاحب کے عہد میں تو لکھنؤ کی نوابی کے سبب سے مسلمانوں پر اور زیادہ اثر پڑ رہا تھا، علمائے اہلِ سنت میں اس اثر کے روکنے کی ہمت اور جرأت نہ تھی، حضرت مجدد الف ثانی جو اکبر اور جہانگیر کے عہد میں تھے، اُن کے مکتوبات اس غم و ماتم سے لبریز ہیں۔ حضرت شاہ صاحب پہلے شخص ہیں، جنھوں نے نہایت تحقیق، کدوکاوش اور نہایت سنجیدگی اور متانت سے اس کام کو انجام دیا اور ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء جیسی عالمانہ اور محققانہ کتاب تالیف کی، جس میں سیکڑوں، ہزاروں حدیثوں کے ذریعے سے خلفائے راشدین کے مناقب و فضائل کے وہ رموز و نکات کھولے جو اب تک نہیں کھلے تھے۔

۲۔ عقائد و کلام کی بے سروپا لغو تلقینات کا جن پر اب تک علمِ دین کا گویا مدار سمجھا جاتا تھا، بھرم کھول کر رکھ دیا اور اُن کے مقابلہ میں کتاب و سنت کے اسرار و مصالح منظرِ عام پر لائے اور ہندوستان کے علماء کو اُن کی سات سو برس کی غلط کاریوں پر متنبہ کیا۔

۳۔ قرآن پاک جو اصل میں اسلام کا مرکز و محور ہے اور جو ہندوستان میں اب تک صرف تبرکِ تلاوت کے لئے مخصوص تھا، اس کے فہم و تعلیم کی طرف لوگوں کو دعوت دی، تفسیر کے اصول لکھے، قرآن کا فارسی میں مختصر لغت لکھا۔ قرآن پاک کے درس کا حلقہ قائم کیا اور اس کو پڑھنے اور سمجھنے کی کتاب بنایا۔

۴۔ عربی زبان کی واقفیت، قرآن و حدیث کے سمجھنے میں عام لوگوں کے لئے عائق تھی، اس کو دور کرنے کے لئے اپنے عہد کی علمی زبان فارسی میں قرآن پاک کا ترجمہ کیا اور موطا کی فارسی میں شرح لکھی۔

۵۔ اب تک ہندوستان میں جو فقہ حنفی مروج تھی، وہ تمام تر فتاوی کی نقل در نقل کورانہ تقلید تھی، اور ہر وہ کتاب جس کو کسی حنفی عالم نے پہلے لکھ دیا ہو، وہ استناد کے قابل سمجھی جاتی تھی اور خاص امام ابوحنیفہ کا مسلک بن جاتی تھی، شاہ صاحب نے اس تقلیدی فقہ کی جگہ تحقیقی فقہ کا رواج دیا، ہر مسئلہ میں وہ ہر امام و مجتہد کی مختلف رایوں اور اجتہادوں اور ان کی دلیلوں اور سندوں سے واقف تھے، وہ اُن میں باہم تطبیق یا ترجیح دیتے تھے، مجتہدین کے اختلافات کے اسباب بتائے، اجتہاد و تقلید کی تشریح کی اور کتاب و سنت کی اتباع و پیروی کی دعوتِ عام دی۔

۶۔ شاہ عبدالحقؒ کی کوششوں کی تکمیل کی، تالیف و تحریر کے ذریعہ کتبِ حدیث کو عام کیا، حدیث کی اولین اور صحیح ترین کتاب موطا امام مالک کی فارسی اور عربی میں مجتہدانہ دو شرحیں لکھیں، صحیح بخاری کے تراجم کی شرح کی اور "الفضل المبین فی المسلسل من حدیث النبی الامین" ایک رسالہ لکھا، فقہ و اسرارِ حدیث میں حجۃ اللہ البالغہ لکھی۔

۷۔ خود ہندوستان میں حدیث کے درس و تدریس کے باقاعدہ حلقے قائم کئے اور اُن کے بعد اُن کے تلامذہ نے تمام ملک میں پھیل کر اس فیض کو عام کیا۔

۸۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کے حسنِ نیت کا ثمرہ اُن کو یہ دیا کہ ان کو ایسی لائق اولادیں عطا کیں، جنھوں نے اپنے والدِ بزرگوار کے

ناتمام کاموں کی پوری تکمیل کی، اور ہندوستان کے گوشہ گوشہ کو پیغام نبوی کے آوازہ سے معمور کر دیا، آج ہندوستان میں جہاں کہیں قال قال رسول اللہ کی آواز سنائی دیتی ہے، وہ اسی خانوادہ فضل و کمال کی خیر و برکت کی صدائے بازگشت ہے۔

شاہ صاحب کی اولاد امجاد

شاہ صاحب کی چار اولادیں تھیں۔ شاہ عبدالعزیزؒ۔ شاہ رفیع الدینؒ، شاہ عبدالقادرؒ۔ اور شاہ عبدالغنیؒ، اُن میں سے شاہ عبدالغنیؒ نے بہت پہلے انتقال کیا، اور انہی کے صاحبزادے شاہ اسمٰعیل شہیدؒ ہیں، ان بزرگوں نے اپنے والد بزرگوار کی وفات کے بعد اپنا الگ الگ حلقۂ درس قائم کیا، ان میں سے ہر ایک کے حلقۂ درس سے بے شمار علما کامل ہو کر اُٹھے، جن کی تفصیل اس مضمون میں مشکل ہے، تاہم صرف مشاہیر اور اکابر علما کی مختصر فہرست دے دیتے ہیں۔

شاہ عبدالعزیز صاحبؒ

شاہ عبدالعزیزؒ نامور باپ کے نامور فرزند تھے۔ ۱۱۵۶ھ میں پیدائش ہوئی، پندرہ سال کی عمر میں تعلیم سے فراغت پائی اور تمام علوم اپنے پدر بزرگوار سے پڑھے، اور اُن کے شروع کئے ہوئے کاموں کو آگے بڑھایا، درس و تدریس کا ہنگامہ برپا کیا، علم حدیث و سنت کو فروغ دیا۔ اور اہلِ تشیع کے رد میں تحفۂ اثنا عشریہ لکھی، قرآن کی فارسی میں تفسیر[1] لکھی، محدثین اور کتبِ حدیث کے حال میں بستان المحدثین تالیف کی، اصولِ حدیث میں عجالہ نافعہ نام چھوٹا سا رسالہ لکھا ۱۲۳۹ھ میں وفات پائی، اپنے بعد مشہور تلامذہ کا بڑا مجمع یادگار چھوڑا۔

شاہ رفیع الدینؒ

شاہ رفیع الدین صاحب نے اپنے پدر بزرگوار سے علم کی تحصیل کی، علم حدیث کا درس دیا، متعدد رسالے لکھے اور سب سے بڑا کام یہ کیا کہ اب جبکہ فارسی کے بجائے اُردو زبان ملک کی زبان ہو رہی تھی، قرآن پاک کا تحت اللفظ ترجمہ اس خوبی سے کیا کہ آج بھی اس سے بہتر اور صحیح تر ترجمہ مشکل ہے، اس کارنامہ کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوگا کہ اگر شاہ صاحب جیسے مقدس عالم اس کام کو اپنے وقت میں نہ کر گئے ہوتے، تو آج ہندوستان کے علما ترکی و مصر کے علما کی طرح وہم کی اس قید و بند میں گرفتار ہوتے، کہ آیا قرآن پاک کا دوسری زبان میں ترجمہ جائز بھی ہے یا نہیں، مگر بحمد اللہ کہ شاہ صاحب کے اس عمل خیر نے اس ہنگامہ کو ہندوستان میں ہمیشہ کے لئے فرو کر دیا، شاہ صاحب کے اس ترجمہ نے لاکھوں اور کروڑوں مسلمانوں کو دین و ایمان کی راہ بتائی، ۱۲۴۹ھ میں یہ شمع ربانی گل ہوئی۔

شاہ عبدالقادرؒ

شاہ عبدالقادر صاحبؒ کو فقہ و تفسیر و حدیث میں ید طولیٰ حاصل تھا، قرآن کی اُردو میں موضح القرآن[2] کے نام سے تفسیر لکھی اور قرآن پاک کا ترجمہ کیا، حدیث کا درس جاری کیا، ۱۲۴۲ھ میں وفات پائی۔

شاہ ولی اللہؒ صاحب کے تلامذہ

ان تینوں صاحبزادوں کے علاوہ شاہ صاحب کے فیض درس میں جو لوگ بیٹھے، اُن کے ناموں کو یک جا کرنا بہت مشکل ہے۔ تاہم چند نام تلاش سے ملتے ہیں۔ پٹنہ کے مشرقی کتب خانہ میں صحیح بخاری کا ایک نہایت اہم نسخہ ہے، جو شاہ صاحب کی درس گاہ میں زیر درس رہا ہے اور اس پر شاہ صاحب کے دست خاص سے ایک تحریر ہے۔ اور ایک تحریر شاہ صاحب کے اس شاگرد کی ہے، جس نے ان سے یہ نسخہ پڑھا، اس شاگرد کا نام محمد ابن پیر محمد بن شیخ ابوالفتح بلگرامی الہ آبادی ہے، اس پر مولانا پیر محمد کے ہاتھ سے جو عربی عبارت ہے۔ اس کا اُردو ترجمہ یہ ہے:-

---

۱؎ تفسیر صرف سورۂ بقرہ کی آیت ۱۲۵ تک اور پارہ ۲۹، ۳۰ پر مشتمل ہے (ادارہ) ۲؎ موضح قرآن تاریخی نام ہے۔ جس سے سالِ تصنیف ۱۲۰۵ھ برآمد ہوتا ہے لہٰذا موضح القرآن لکھنا درست نہیں (ادارہ)

"دلی میں جمنا کے کنارے جامع فیروزی میں چہارشنبہ کے دن بتاریخ ۶ شوال ۱۱۵۹ھ جامع صحیح امام بخاری شیخ محمد بن شیخ پیر محمد بن شیخ ابوالفتح عمری بلگرامی ثم الالہ آبادی کے ہاتھ سے تمام ہوئی، ساتھ ہی شروع سے آخر تک اس کی قرأت بھی شیخ ولی اللہ عمری کے درس میں تمام ہوئی۔"

پھر اس پر شاہ صاحب کے دست مبارک سے عربی میں بخاری تک، ان کی اپنی سند اور اجازت درج ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کے درس میں کیا کیا کتابیں پڑھائی جاتی تھیں، فرماتے ہیں:-

"شیخ محمد بن شیخ پیر محمد بن شیخ ابوالفتح عمری نسباً بلگرامی اصلاً، الہ آبادی مولداً نے صحیح بخاری مجھ سے پڑھی، خواجہ محمد امین پڑھتے تھے۔ اور وہ سنتے تھے، نیز بقیہ کتب صحاح ستہ کے اطراف مجھ سے پڑھے۔ اور موطا امام مالک اور مسند دارمی اور مشکوٰۃ کے کچھ حصے پڑھے، اور میں نے ان کو، ان کی اجازت دی، میں نے یہ اجازت و سند شیخ ابوطاہر محمد بن ابراہیم کردی مدنی سے حاصل کی۔ اس کو ولی اللہ احمد بن عبدالرحیم بن وجیہ الدین بن معظم بن منصور ابن احمد بن محمود نے اپنے ہاتھ سے لکھا، جو نسباً عمری وطناً دہلوی، عقیدۃً اشعری، طریقۃً صوفی، عملاً حنفی اور تدریساً حنفی و شافعی اور تفسیر و حدیث و فقہ و عربیت اور کلام کا خادم ہے۔ سہ شنبہ ۲۲ شوال ۱۱۵۹ھ"

اس تحریر کے نیچے شاہ رفیع الدین صاحب کی یہ عبارت ہے:-

"ایں خط والد بزرگوار است بے شبہ کتبہ الفقیر محمد رفیع"

اس نسخہ پر ایک اور عبارت ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ شاہ عالم بادشاہ کے حکم سے ۱۱۸۴ھ میں محمد نامی کسی عالم نے اس میں شروع سے آخر تک اعراب لگائے اور کسی صحیح نسخہ سے اس کا مقابلہ کیا[1]

خواجہ محمد امین جن کا شاہ صاحب کی اس تحریر میں ذکر ہے۔ شاہ صاحب کے مخصوص شاگردوں اور مریدوں میں ہیں، شاہ صاحب کے تلامذہ میں ایک بزرگ مولانا رفیع الدین مراد آبادی ہیں، مولانا رفیع الدین نے شاہ صاحب کے علاوہ شیخ محمد حیات سندھی کے شاگرد مولانا خیرالدین سورتی سے بھی حدیث پڑھی، امام نووی کی اربعین کی شرح لکھی اور اپنے سفر حج کے حالات میں فارسی میں ایک رسالہ لکھا ہے[2]

کشمیر کے ایک اور بزرگ شاہ محمد عاشق پھلتی معروف بہ بابا محمد عثمان کشمیری ابن شیخ محمد فاروق شاہ صاحب کے تلامذہ میں ہیں، حدیث اور فقہ کا درس شاہ صاحب سے حاصل کیا تھا۔

شاہ عبدالعزیز کے تلامذہ

شاہ ولی اللہ صاحب کے فیض کو اللہ تعالیٰ نے سب سے زیادہ اُن کے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز صاحب کے ذریعہ عام کیا، بہت سے مشاہیر علما اور علم حدیث کے ماہر ان کے حلقۂ درس سے پیدا ہوئے، جن میں قابلِ ذکر خود شاہ صاحب

---

[1] مولانا رفیع الدین صاحب کے حال کے لیے دیکھو تذکرہ علمائے ہند، ص ۶۶۔

[2] ایضاً۔

کے داماد مولانا عبدالحئی اور بھتیجے مولانا اسماعیل شہید اور نواسے شاہ محمد یعقوب اور شاہ محمد اسحاق صاحب اور اُن کے علاوہ حسبِ ذیل اصحاب ہیں:

مرزا حسن علی محدث لکھنوی، مولانا حسین احمد محدث ملیح آبادی، مولانا سلامت اللہ بدایونی کانپوری، مولانا روف احمد مجددی مصطفیٰ آبادی، مفتی صدرالدین خان دہلوی، سید قطب الہدیٰ رائے بریلوی، مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مراد آبادی، قاضی ثناء اللہ پانی پتی، مولانا خرم علی صاحب بلہوری وغیرہ۔

پھران میں سے ہر ایک کے سیکڑوں شاگرد پیدا ہوئے۔

شاہ رفیع الدین کے تلامذہ ایک تو خود شاہ رفیع الدین صاحب کے صاحبزادہ شاہ مخصوص اللہ المتوفی ۱۲۷۳ھ ہیں، دوسرے مولانا رشید الدین خان دہلوی المتوفی ۱۲۴۹ھ۔ اور تیسرے شاہ ابوسعید صاحب عمری، مجددی دہلوی المتوفی ۱۲۴۹ھ

شاہ عبدالقادر صاحب کے تلامذہ مفتی صدرالدین خان اور مولانا فضل حق خیر آبادی۔

دلی کے دو چراغ شاہ عبدالعزیز صاحب کے بعد علمِ حدیث کے دو چراغ روشن ہوئے، ایک شاہ صاحب کے نواسہ مولانا شاہ اسحاق صاحب اور دوسرے شاہ ابوسعید صاحب کے صاحبزادہ شاہ عبدالغنی صاحب مجددی۔

اس موقع پر ایک فرق سمجھ لیجئے، یہ شاہ عبدالغنی صاحب مجددی اور اُن کے والد شاہ ابوسعید صاحب مجددی حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں ہیں، شاہ ولی اللہ صاحب کے خاندان سے ان کا کوئی نسلی اتصال نہیں ہے۔

اس خاندان کے تلامذہ ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئے، لکھنؤ میں علمِ حدیث کا جو فیض پہنچا وہ بھی اس خانوادہ علم وکمال کا مرہونِ منت ہے۔

مرزا حسن علی محدث لکھنوی سب سے زیادہ لکھنؤ میں جن بزرگ نے اس فیض کو عام کیا اور خود فرنگی محل تک نے اُن سے رجوع کیا، وہ مرزا حسن علی محدث لکھنوی ہیں، اس نام کے اس وقت لکھنؤ میں دو بزرگ تھے، ایک محلہ یحییٰ گنج میں رہتے تھے اور دوسرے محمود نگر میں رہتے تھے، پہلے صغیر اور دوسرے کبیر کہلاتے تھے۔ یہاں مقصود یحییٰ گنج کے مرزا حسن علی صغیر محدث لکھنوی ہیں۔ مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب کے شاگرد تھے اور لکھنؤ آکر علمِ حدیث کی ترویج و تدلیل میں کوشاں رہے اور سیکڑوں آدمیوں نے اُن سے حدیث کی کتابیں پڑھیں، علمائے فرنگی محل نے بھی اُن سے علمِ حدیث کا فیض حاصل کیا، اور اسی وقت سے لکھنؤ کی درسگاہوں میں علمِ حدیث کا رواج ہوا، نصیرالدین حیدر کی سلطنت میں ۱۲۲۶ھ میں وفات پائی[1] ان کے ایک شاگرد مولانا محمد علی صدر پوری ملیح آبادی ہیں، جو اخیر میں نواب ٹونک کے ملازم ہوگئے تھے، توحید و سنّت کی اشاعت اور رسوم و بدعات کے ابطال میں بڑی کوشش کی۔

مولانا حسین احمد ملیح آبادی ان کے والد سرہند سے لکھنؤ اور لکھنؤ سے ملیح آباد جاکر آباد ہوتے، مولانا کی پیدائش یہیں ہوئی، مرزا حسن علی لکھنوی۔ مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی اور شیخ عمر محدث مکی سے حدیث کی کتابیں پڑھیں، اُن کا ایک سالہ جواز قرأت خلف الامام مشہور ہے، مولانا شاہ عبدالرزاق فرنگی محلی نے اُن سے حدیث پڑھی تھی، ۱۲۷۵ھ میں وفات پائی[2]

---

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۴۸[illegible]

شاہ محمد اسحاق

اللہ تعالیٰ نے آپ کے درس میں بڑی برکت عطا فرمائی، تمام بڑے بڑے علما اُن کے شاگرد تھے چند رسالے بھی اُن کی تصنیف ہیں، غدر کے بعد مکہ معظمہ ہجرت کرکے چلے گئے تھے، اور وہاں بھی یہ سلسلۂ فیض جاری رہا، آخر وہیں ۱۲۶۲ھ میں وفات پائی، اُن کے تلامذہ میں مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری، نواب صدر الدین خاں دہلوی نواب قطب الدین خاں جنہوں نے کتب حدیث کا اردو میں ترجمہ کیا ہے، مولانا سید نذیر حسین صاحب (بہاری) دہلوی مولانا عالم علی صاحب مراد آبادی، شیخ محمد صاحب تھانوی، مولانا شاہ فضل رحمٰن صاحب گنج مراد آبادی، مولانا قاری عبدالرحمٰن صاحب پانی پتی ہیں۔

شاہ عبدالغنی صاحب مجددی

شاہ صاحب نے موطا اپنے والد مولانا شاہ ابوسعید صاحب سے پڑھی، مشکوٰۃ شاہ رفیع الدین صاحب کے صاحبزادے شاہ مخصوص اللہ صاحب سے، اور بقیہ کتابیں شاہ عبدالعزیز صاحب سے پڑھیں، شاہ صاحب کی مجلس درس میں وہی پڑھتے تھے، سنن ابن ماجہ پر اُن کا حاشیہ ہے، جس کا نام انجاح الحاجہ ہے، چھپ چکا ہے، انگریزی تسلط کے بعد انہوں نے بھی ہجرت کی تھی، پہلے مکہ معظمہ میں رہے، پھر مدینہ منورہ میں سکونت اختیار کرلی، اللہ تعالیٰ نے اُن دونوں بزرگوں پر یہ برکت عطا فرمائی کہ تمام دنیائے اسلام اُن کی زیر بار احسان ہوگئی، اور جہاں بھی کوئی قال قال رسول اللہ کہتا ہے، ان دونوں بزرگوں میں سے ایک کا واسطہ ضرور ہوتا ہے، حرمین کے تمام علما نے ان کے حلقۂ درس سے فیض پایا، اور آج مدینہ منورہ میں جو سلسلہ سب سے زیادہ قلیل الوسائط لیکن کثیر البرکت ہے۔ وہ انہی دونوں بزرگوں خصوصاً حضرت شاہ عبدالغنی صاحب کا ہے۔

حضرت شاہ صاحب کے اسناد و اثبات الیانع الجنی فی اسناد الشاہ عبدالغنی چھپ گئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا کتنا شکر ادا کیا جائے کہ پچھلے سفر حج (۱۳۴۴ھ) میں شیخ عمری مغربی کے واسطہ سے اس سلسلہ کی سند اس گنہگار کو بھی عطا ہوئی۔

شاہ عبدالغنی صاحب کے تلامذہ

شاہ عبدالغنی صاحب کے تلامذہ اور مستفیدین کی فہرست حد شمار سے باہر ہے لیکن ان میں سے دو صاحب سلسلہ بزرگ سب سے زیادہ مشہور و معروف ہیں، مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی ان دونوں بزرگوں کے فیوض و برکات عالم آشکارا ہیں، اور آج بھی ہمارے سامنے ہیں، ان کا تفصیلی ذکر آگے آئے گا۔

مولانا عبدالحیٔ بڈھانوی اور مولانا اسمٰعیل شہید کے تلامذہ

مولانا عبدالحیٔ شاہ عبدالعزیز صاحب کے داماد اور شاگرد خاص اور مولانا شاہ اسمٰعیل شہید شاہ صاحب کے بھتیجے اور مولانا شاہ ولی اللہ صاحب کے پوتے تھے، ان دونوں بزرگوں نے بھی درس و تدریس کی خدمت انجام دی لیکن زبان و قلم سے آگے بڑھ کر اپنے زور بازو سے بھی کتاب و سنت کی اشاعت اور شرک و بدعت کے روکنے کی کوشش کی، بنگال سے لے کر افغانستان کی سرحد تک کا دورہ کیا، وعظ و نصیحت کی، مناظرے کئے، جمعہ و جماعت کا اہتمام کیا، رسوم کا ابطال کیا، لوگوں کو جہاد کی دعوت دی، اور ان مہمات کے ساتھ ساتھ درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری رہا مولانا سخاوت علی صاحب جونپوری (جد بزرگوار مولانا ابوبکر محمد شیث صاحب جونپوری) نے انہی دونوں بزرگوں کے آغوش درس میں تعلیم پائی۔

مولانا سخاوت علی صاحب جونپوری

مولانا سخاوت علی کچھ دنوں نواب ذوالفقار خاں رئیس باندہ کے مدرسہ میں مدرس تھے، جونپور آکر درس و تدریس کا سلسلہ جاری کیا، بہار و جونپور و اعظم گڈھ و بنارس سے بکثرت

وللبہ اُن کے حلقۂ درس میں شریک ہوئے اور اُن کے ذریعے سے قدیم جاہلانہ رسوم کے ابطال اور مذہبی شعائر کے اجرا میں بڑی مدد ملی۔ مشکوٰۃ کے طرز پر مولانا نے القویم فی احادیث النبی الکریم ایک مفید کتاب لکھی، جو یمین الدولہ وزیر الملک نواب محمد علی خاں (ٹونک) کے ایما سے ۱۳۱۱ھ میں مطبع صدیقی بنارس میں چھپی، حج کے لیے مکہ معظمہ تشریف لے گئے تھے، اور وہیں ۱۲۷۴ھ میں وفات پائی۔ اُن کے مشہور شاگردوں کے نام یہ ہیں۔ مولانا کرامت علی جونپوری، خواجہ احمد نصیر آبادی، مولانا رجب علی جونپوری، مولانا محمد شریف جونپوری، ملا غلام محمد جگدیش پوری۔ مولوی شیخ محمد محبلی شہری، مولانا محمد عمر غازی پوری، مولانا غلام جیلانی غازی پوری، مولانا فیض اللہ مئوی اعظم گڈھی، مولوی رحیم اللہ صاحب ساکن بستی۔ مولانا سید یعقوب صاحب دیسنوی بہاری اور مولانا سید مصطفےٰ بشیر صاحب دیسنوی بہاری مدرس مدرسہ خانقاہ[1] (سہسرام)

فرنگی محل اور علم حدیث

لکھنؤ میں فرنگی محل کا علمی مرکز عالمگیر کے عہد میں قائم ہوا، ملا قطب الدین اور ملا نظام الدین رحمہما اللہ کے عہد سے لے کر مولانا عبدالحلیم رحمۃ اللہ علیہ تک اس خانوادۂ فضل وکمال کی علمی کوششوں کا جولانگاہ منطق اور اصول کی کتابیں رہیں اور تعجب ہے کہ اس قدر طویل زمانہ تک ہندوستان کی یہ مشرقی درس گاہ حدیث کے ترانۂ قدس سے ناآشنا رہی بزرگوں سے جو کچھ سنا ہے، وہ یہ ہے کہ درس نظامی میں صرف مشکوٰۃ داخل تھی، اور وہی پڑھائی جاتی تھی۔ یہ بھی سُنا ہے کہ فرنگی محل میں صحیح بخاری کے پندرہ پارے موجود تھے، مگر وہ صرف تبرکاً رکھے رہتے تھے

ملا نظام الدین بہر حال فرنگی محل کی درس گاہ ایک مدت تک کتب صحاح کے درس سے خالی رہی اور صرف کسی مختصر مجموعۂ حدیث پر قناعت کی گئی، حضرت ملا نظام الدین کی ایک تصنیف اُن کے پیر و مرشد حضرت سید عبدالرزاق بانسوی رحمۃ اللہ علیہ کے حال میں مناقب رزاقیہ کے نام سے ہے، اس میں ایک موقع پر یہ واقعہ درج ہے کہ ایک دفعہ سید صاحب نے جو اتی تھے۔ پوچھا کہ تیمم کا طریقہ کیا ہے، لوگوں نے حنفی طریقے سے بتایا، اس پر سید صاحب نے فرمایا مجھے معلوم ہوتا ہے۔ (کشف سے) کہ اگر صرف منہ اور گٹوں تک ہاتھوں کا مسح کر لیا جائے، تو کافی ہے۔ حاضرین نے انکار کیا۔ ملا صاحب اس موقع پر فرماتے ہیں:-

"اختلاف است فقہا را کہ در تیمم استیعاب ذراع یا بہ بند دست کفایت دارد حضرت امام اعظم و صاحبیہ رحمہم اللہ برادل است، و امام شافعی بقول قدیم و جماعتہ بر ثانی و اکثر احادیث صحاح مؤید قول امام شافعی وغیرہ است (ص ۱۹)

مولانا بحرالعلوم علمائے فرنگی محل میں سب سے پہلی ہستی جس کی تصنیفات کتب حدیث کے حوالوں سے بریز ہیں، وہ مولانا عبدالعلی بحرالعلوم خلف الصدق ملا نظام الدین کی ذات ہے، مگر یہ بتحقیق معلوم ہوا ہے کہ اُن کو حدیث کی کتابوں کی باقاعدہ سند حاصل نہ تھی اور اس کا کہیں ذکر ان کے حالات و تصنیفات میں نہیں ملتا، بلکہ علوم کی فراغت کے بعد انھوں نے محدثین کی کتابیں پڑھ کر اس فیض

---

[1] تذکرہ علمائے ہند صفحہ ۶۹، ۷۰۔

کو از خود حاصل کیا تھا۔

متعدد طریقوں سے یہ روایت سنی ہے کہ مولانا عبدالعلی (بحرالعلوم) کی جب عقلی تصنیفات دلّی میں مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب کی خدمت میں پہونچیں، تو حضرت شاہ صاحب نے دیکھ کر فرمایا کہ دینیات سے کورے ہیں، یہ سن کر مولانا عبدالعلی نے فقہ میں ارکانِ اربعہ لکھ کر بھیجی جس میں محققانہ مسائل پر بحث اور احادیث کے حوالے ہیں، اس کو دیکھ کر شاہ صاحب نے فرمایا کہ اخاہ! ملّا عبدالعلی تو بحرالعلوم ہیں، ایک کاملِ دقت کی زبان سے جو لفظ نکلا، وہ چاروانگِ عالم میں پھیل گیا، اور اتنا مقبول ہوا کہ لوگ بحرالعلوم کی شہرت کے مقابلہ میں عبدالعلی نام تو بھول گئے اور زبانوں پر بحرالعلوم رہ گیا۔[1]

مولانا بحرالعلوم کی دو تصنیفات ارکانِ اربعہ فقہ میں اور فواتح الرحموت شرح مسلم الثبوت اصول میں ایسی کتابیں ہیں جن میں احادیث اور کتبِ احادیث کے حوالے بکثرت ہیں، یہاں پر دو باتیں قابلِ بحث ہیں۔ مولانا کو یہ کتابیں کہاں ملیں اور ان میں سے اصلاً کون کون کتابیں ملیں۔

پہلی بات کے متعلق یقینی ہے کہ لکھنو کے قیام کے زمانہ میں یعنی ۱۱۷۲ھ یا ۱۱۷۳ھ تک جب مولانا کی عمر ستائیس اٹھائیس سال کی تھی، یہ کتابیں نہیں لکھی گئیں اور نہ لکھنؤ میں تالیف پائیں۔ فواتح الرحموت کا نام تو تاریخی ہے۔ جس سے ۱۱۸۰ھ نکلتے ہیں، یہ زمانہ غالباً مولانا کے شاہجہانپور یا رامپور کے قیام کا ہے، کیونکہ بوہار (بنگال) کا مدرسہ اور کتب خانہ بہت بعد یعنی ۱۲۸۹ھ میں قائم ہوا، اور مولانا کا قیام یہاں ۱۲۸۹ھ کے بعد ہی سے ہوا، اغصانِ اربعہ وغیرہ میں لکھا ہے کہ مولانا کی اکثر تصنیفات شاہجہان پور ہی کے زمانۂ قیام میں تالیف پائی ہیں، اور یہ بھی سنا گیا ہے کہ نواب شاہجہان پور حافظ الملک رحمت خان نے ایک بڑا کتب خانہ بھی فراہم کیا تھا اور یہ سرمایہ بعد کو رام پور میں منتقل ہوا، ان وجوہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا بحرالعلوم کو اسی کتب خانہ میں کتابیں ملیں۔

دوسرے سوال کا جواب کچھ زیادہ اہم نہیں، ارکانِ اربعہ میں جو کچھ ہے اُس کا ماخذ دو کتابیں ہیں۔ اس کی اصل بنیاد تو علامہ ابن ہمام کی فتح القدیر (شرح ہدایہ) پر ہے۔ فتح القدیر میں تمام کتبِ حدیث کے اقتباسات اور حوالے موجود ہیں اور انہی کے مباحث اور حوالوں کا خلاصہ ارکانِ اربعہ ہے، اس کے علاوہ دوسرا ماخذ مختلف احادیث کا ایک مشہور مجموعہ جامع الاصول ہے، جس کا مولانا نے بارہا اس میں حوالہ دیا ہے اور اسی سے حدیثیں نقل کی ہیں۔

فواتح الرحموت کی تصنیف کے وقت مولانا کے سرمایہ میں اور زیادہ اضافہ ہو گیا ہے۔ اس وقت ابن ہمام کی فتح القدیر اور تحریر فی الاصول کے علاوہ ابن حجر اور سیوطی کی کتابیں بھی اُن کو مل گئی تھیں، چنانچہ ابن حجر عسقلانی کی فتح الباری شرح صحیح بخاری اور جلال الدین سیوطی کی تفسیر درمنثور اور الاتقان فی علوم القرآن کے حوالے بکثرت ان کی اس کتاب میں ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ سیوطی کی یہ دونوں کتابیں ہندوستان اس زمانہ میں پہنچ چکی تھیں، میر غلام علی آزاد کی تالیفات میں بھی ان دونوں کتابوں کے حوالے ہیں۔

تفسیر دُرمنثور اور اتقان گو قرآن پاک سے متعلق ہیں۔ مگر اُن کی تمام تر بنیاد احادیث اور روایات پر ہے، اور ان میں نہ صرف

---

[1] یہ واقعہ تھوڑے تغیر کے ساتھ تذکرہ علمائے فرنگی محل میں موجود ہے، ص ۱۴۰، ۱۴۱۔

صحاح ستہ کی حدیثیں بلکہ دوسری نادر کتب حدیث کی روایتیں بھی ہیں، اس بنا پر ان دونوں کتابوں میں حدیث کی تمام کتابوں سے روایتیں آ گئی ہیں، مولینا بحر العلوم ان ضمنی روایتوں کو نہایت خوبی کے ساتھ اپنے کام میں لاتے ہیں، اس طریقہ سے اُن کی تصنیف فواتح الرحموت میں حسب ذیل کتب حدیث کے نام اور حوالے ملتے ہیں اور اُن کی روایتیں بعینہٖ درج ہیں صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، سنن نسائی سنن ابی داؤد، موطائے امام مالک، حاکم، بزار، ابن حبان، ابن ابی شیبہ، عبدالرزاق، بیہقی، رسالہ سیوطی فی احادیث روایا الصحابۃ عن التابعین، شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی شرح مشکوٰۃ فارسی بھی اُن کے مطالعہ میں تھی۔ جس کا ذکر اسی کتاب میں جرح و تعدیل کے مسئلہ کے ضمن میں ہے اور خبر واحد کے مسئلہ میں بھی شیخ کا حوالہ دیا ہے، ان کے علاوہ تفاسیر بالروایۃ اور شروح حدیث میں سے حسب ذیل کتابوں کے حوالے ہیں، معالم التنزیل بغوی، دُر منثور سیوطی، فتح الباری، حافظ ابن حجر، متاخر محدثین میں ابن ہمام (صاحب فتح القدیر والتحریر) اور ابن تیمیہ کے نام بھی آئے ہیں۔

کتب حدیث اور ان کی روایتوں کے حوالے جس طرح فواتح الرحموت میں آئے ہیں، اُن سے بالیقین معلوم ہوتا ہے کہ صحیح بخاری و مسلم مولانا کے مطالعہ میں تھی اور دیگر کتب حدیث کی روایتیں بالواسطہ اور زیادہ تر درمنثور اور اتقان سے ماخوذ ہیں اور مولانا نے اکثر خود اس واسطہ کا ذکر کر دیا ہے۔

مُلّا مبین | مولانا بحر العلوم کے علاوہ فرنگی محل کے علمائے متقدمین میں دو بزرگوں کے نام ہم کو اور ملے ہیں ایک مُلّا مبین ہیں، جن کے حال میں اغصان اربعہ کے مصنف نے لکھا ہے۔

"واحادیث بسیار حفظ داشت چنانچہ ہنگام وعظ، ترجمۂ ہزاراں احادیث بر زبان می آورد" (ص ۱۸)

اہل بیت کے مناقب اور اسمائے الٰہی کی شرح میں اُن کے دو رسالے ہیں ۱۲۲۵ھ میں وفات پائی۔

مُلّا حیدر | مُلّا مبین کے بڑے صاحبزادے مولانا محمد حیدر صاحب غالباً اس خاندان میں پہلے شخص ہیں، جنھوں نے عرب جا کر اس فن کی سند حاصل کی، ۱۲۴۰ھ میں وہ حج کے لئے روانہ ہوئے، دو مہینے مکہ معظمہ میں اور کچھ مہینے مدینہ منورہ میں رہے، مکہ معظمہ میں سید یوسف بطاح یمنی اور شیخ مُلّا عمر مکی سے صحیحین کی تحصیل کی اور مدینہ منورہ جا کر، وہاں کے شیوخ سے تکمیل کی اور بعد کو پھر مکہ معظمہ میں آ کر قیام کیا، عرب سے واپس آ کر حیدر آباد گئے اور وہیں رہ گئے [1]

مولانا عبدالرزاق | تیسرے بزرگ مولانا شاہ عبدالرزاق ہیں، حدیث کی کتابیں انھوں نے اپنے خاندان سے باہر مولانا حسین احمد محدث ملیح آبادی اور مرزا حسن علی مرحوم محدث لکھنوی (تلامذۂ مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی) سے پڑھیں، اور پھر اپنے استاد کے ساتھ مل کر حدیث کی تمام کتابیں شیخ محمد محسن مدنی سے اس طرح پڑھیں کہ وہ قرأت کرتے تھے اور بہت سے علما سماعت کرتے تھے، ۱۲۵۴ھ میں فراغت حاصل کی۔

مولانا شاہ عبدالرزاق مرحوم کے دونوں صاحبزادوں، مولانا عبدالباسط اور مولانا حافظ عبدالوہاب نے اپنے والد ماجد سے

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھو اغصان اربعہ ص ۱۸ و مابعد

حدیث پڑھی[1]

مولانا عبدالحلیم علمائے فرنگی محل میں علمِ حدیث کے درس و تدریس کا باقاعدہ نظام مولانا عبدالحلیم (والد بزرگوار مولانا عبدالحئی) کے زمانہ سے شروع ہوا، مولانا عبدالحلیم نے مفتی محمد یوسف مرحوم اور دیگر علمائے فرنگی محل سے علوم درسیہ کی تکمیل کی ۱۲۶۱ھ میں نواب ذوالفقار بہادر رئیس باندا (بندیل کھنڈ) کے مدرسہ میں مدرس ہوئے، پھر اپنے استاد مفتی محمد یوسف صاحب مرحوم فرنگی محل کی جگہ پر جونپور کے مدرسہ امامیہ حنفیہ کے مدرس ہوئے، ۱۲۷۷ھ میں نواب سالار جنگ کی طلب پر حیدر آباد گئے اور وہاں کے مدرسہ نظامیہ کے مدرس ہوئے۔ ۱۲۷۹ھ میں حرمین محترمین کی زیارت کے لیے گئے، اور وہاں کے علماء اور شیوخ سے کتب حدیث کی سند حاصل کی، جن میں سب سے پہلے نام احمد بن زینی دحلان شافعی کا ہے۔ نیز شیخ محمد جمالی حنفی، محمد بن محمد العرب الشافعی مدرس مسجد نبوی اور مولانا شاہ عبدالغنی مجددی وغیرہ سے فیوض و برکات اور اجازت و سند حاصل کی۔ منطق و فلسفہ و کلام و اصول کے علاوہ حدیث و سیر و فقہ کے مسائل پر رسالے لکھے، مثلاً نور الایمان فی آثار حبیب الرحمٰن، برکات الحرمین، خیر الکلام فی مسائل الصیام، القاد المصابیح فی صلوٰۃ التراویح، الاسانی فی تحقیق الدعا غایۃ الکلام فی بیان الحلال والحرام القول الحسن فیما یتعلق بالنوافل والسنن، عمدۃ التحریر فی مسائل اللون واللباس والحریر۔

۱۲۸۵ھ میں وفات پائی[2]

مولانا محمد نعیم صاحب یہ مولانا بحر العلوم کے پوتے اور مولانا عبدالحلیم صاحب کے صاحبزادے تھے، اپنے والد ہی سے تعلیم پائی، نہایت متقی اور زاہد تھے اور بزرگان سلف کی زندہ یادگار تھے، تعلیم سے فراغت پاکر عرب گئے اور وہاں سے سند پائی، حدیث و فقہ کی کتابوں کا درس دیتے تھے، تیرھویں صدی کے اخیر اور چودھویں صدی کے شروع میں درس و افادہ میں مشغول تھے، بہت سے علمائے ظاہر و باطن میں آپ سے استفادہ کیا، منجملہ اوروں کے مولانا سید عبدالحئی صاحب مرحوم سابق ناظم ندوۃ العلماء بھی تھے۔

مولانا سید عبدالحئی صاحب مرحوم مجھ سے بیان فرماتے تھے کہ مولانا محمد نعیم صاحب کو حدیث کی کتابوں کا اتنا شوق تھا کہ جب امام طحاوی کی شرح معانی الآثار شروع شروع چھپ کر آئی ہے تو اس کے دام زیادہ تھے اور مولانا کے پاس روپے نہ تھے، تو انہوں نے اپنا ایک مملوکہ مکان خاص اس کام کے لئے بیچا اور اس کی قیمت میں سے یہ کتاب خرید کر منگوائی رحمہ اللہ تعالیٰ۔

مولانا عبدالحئی فرنگی محل میں علم حدیث کی معراج کمال مولانا عبدالحئی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے عہد میں ہوئی، تعلیم اپنے والد مولانا عبدالحلیم سے پائی تھی، ساتھ ہی دو مرتبہ حجاز جاکر وہاں کے علماء اور شیوخ سے سندیں حاصل کیں، پہلی مرتبہ اپنے والد ماجد کے ساتھ ۱۲۷۹ھ میں اور دوسری مرتبہ ۱۲۹۲ھ میں سید احمد دحلان اور شیخ عبدالغنی مجددی دہلوی مہاجر مدینہ سے حاصل کیں، مرحوم نے گو عمر بہت کم پائی۔ ۱۲۶۴ھ میں پیدا ہوئے ۲۲ سال کی عمر میں علوم کی تکمیل کی، اور ۱۳۰۴ھ میں وفات پائی۔ کل چالیس برس کی عمر ملی۔ مگر اسی مختصر زمانہ میں مرحوم کے درس و تدریس، تالیف و تصنیف اور تحقیق و تدقیق کے آوازہ سے نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام دنیائے اسلام گونج اٹھی۔ اطراف و دیار سے علم کے طالب آپ کے آستانہ پر جمع ہوئے، معقول و منقول کا یہ مجمع البحرین زندگی کے آخری لمحہ

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھو اعضان اربعہ ص ۱۰۷۔ [2] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۱۲، ۱۱۳۔

تک موجیں مارتا رہا، دوسرے علوم وفنون کے ساتھ تمام کتبِ حدیث کا درس بکمالِ تحقیق آپ کی درس گاہ میں ہوتا تھا، پورب اور بہار کے طلبہ زیادہ تر اس فیض سے سیراب ہوئے، حدیث اور متعلقاتِ حدیث کی متعدد نادر کتابیں اپنے مقدمہ اور تحشیہ کے ساتھ شائع کیں۔ حدیث اور فقہ حنفی کی جامعیت کے ساتھ بیسیوں رسالے لکھے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ہر طرف ملک میں ایک نئے مسلک عدم تقلید کا چرچا تھا اور ملک میں جگہ جگہ علم حدیث کے حلقہ ہائے درس قائم تھے بھوپال اور دہلی میں علمائے اہل حدیث کا مجمع تھا، رسالوں پر رسالے نکل رہے تھے، ادھر لکھنؤ میں اُن کے مقابلہ میں مولانا عبدالحیٔ کی ہستی تھی، نواب صدیق حسن خاں مرحوم اس زمانہ میں اہل حدیث کے امام اور مولانا عبدالحیٔ احناف کے سرگردہ تھے، طرفین نے خوب خوب دادِ تحقیق دی،

متونِ کتب میں سے مولانا نے مسند امام ابوحنیفہ، موطا امام محمد، کتاب الآثار امام محمد پر مقدمہ اور حاشیہ لکھا، اور ان کو چھپوا کر شائع کیا، متعلقات حدیث میں سے موضوعات سیوطی المقاصد الحسنہ امام سخاوی اور فتح المغیث فی اصول الحدیث اور میزان الاعتدال وغیرہ کتابیں اُن کے اشارہ سے اُن کے متوسلین اور تلامذہ نے شائع کیں۔

کتابوں کے تحشیہ اور اشاعت میں مولانا کو جو اہتمام تھا، اس میں دو باتیں خاص طور سے ذکر کے قابل ہیں، سب سے پہلی بات مقدمہ نگاری کی ایجاد ہے، مولانا سے پہلے کسی شارح یا محشی نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی، یورپ میں قلمی کتابوں کو اڈٹ کرنے کی جو اہمیت حاصل ہے اور جس طرح وہ مختلف نسخوں کی فراہمی، مقابلہ اور تصحیح اور ساتھ ہی مصنف اور تصنیف کے متعلق ہر قسم کے معلومات مقدمہ میں فراہم کرتے ہیں، مولانا نے علمائے یورپ کے طریق کار کے علم سے پہلے ہی اس اہم کام کی طرف توجہ کی، اور بالکل اسی طریق پر، بلکہ اس سے بہتر طریقہ پر اس کام کو انجام دیا، جس کتاب کو شائع کیا، اس کے مختلف نسخوں کو فراہم اور ان کا مقابلہ کرکے ایک صحیح نسخہ ترتیب دیا، پھر اس پر حواشی لکھے، شروع میں ایک مقدمہ لکھا، جس میں ماتن، شارح اور اس کے دیگر شارحین کے حالات لکھے، اس کی کتاب اور اس فن کی دوسری کتابوں کے حالات ذکر کئے، اور اُس فن کی جس میں یہ کتاب تھی تاریخ لکھی۔

دوسری قابلِ ذکر بات کتابوں کی صحت ہے، حیرت ہوتی ہے کہ عربی کی ضخیم کتابیں اور اُن پر باریک حاشیے اور اُن کی تصحیح اس طرح کی جاتی تھی کہ اگر یہ دعوٰی کیا جائے، تو شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ اُن کی خاص شائع کردہ کتابوں میں ایک نقطہ کی بھی غلطی نہیں ہے، آج جب کہ مطابع اور کتابوں کی چھپائی اور اشاعت کا یہ عالم اور اس قدر اہتمام ہے۔ تاہم وہ صحت اردو کی کتابوں میں بھی نہیں ہوتی،

صحت کے معاملہ میں مولانا کے ساتھ غالباً اُن کے معتقد مولانا خادم حسین صاحب عظیم آبادی اور مولانا عبدالعلی آسی مدراسی کے اہتمام کو بھی دخل تھا۔

مولانا کے تلامذہ میں اس فن کے بڑے بڑے ماہرین پیدا ہوئے، جن میں قابلِ ذکر مولانا ظہیر احسن، شوق نیموی صاحب آثار السنن، مولوی حکیم عبدالباری صاحب عظیم آبادی، مولانا محمد حسین صاحب الٰہ آبادی، مولانا قادر بخش سہسرامی، حافظ الحدیث مولانا عبدالغفور رمضان پوری بہاری، مولانا عبدالکریم پنجابی، مولانا سید ظہور الاسلام صاحب فتح پوری وغیرہ وہ علمائے کبار ہیں، جنہوں نے

ملک کے ہر گوشہ میں پہونچ کر علم و فن کی خدمت کی، میرے علم میں اس وقت مولانا کے وسیع حلقۂ تلامذہ سے صرف دو بزرگوار پچھلی بزم کی شمع یادگار ہیں، مولانا ابو الفضل محمد حفیظ اللہ صاحب مدرس اعلیٰ دار العلوم ندوۃ العلماء اور مولانا شاہ محمد سلیمان صاحب ... چشتی پھلواروی اور کیونکر کہوں کہ اس سرگشتۂ وادی جہالت کو بھی بیک واسطہ (استاذنا مولانا محمد حفیظ اللہ صاحب کے واسطے ... اس بزم اقدس کی صفِ نعال میں جگہ حاصل ہے۔

مولانا عبدالباری صاحب مرحوم

سب سے آخر میں فرنگی محل کے علم و فضل کا دائرہ جناب مولانا عبدالباری کے نقطۂ کمال میں سمٹ کر آ گیا تھا، مرحوم نے فرنگی محل میں جناب مولانا عین القضاۃ صاحب شاگرد مولانا عبدالحیٔ صاحب فرنگی محلی سے کتابیں پڑھیں اور اس کے بعد عرب جا کر علم حدیث کی تکمیل کی اور مدینہ منورہ میں قیام فرما کر شاہ عبدالغنی مجددی کے تلامذہ میں سید محمد علی اثری اور شیخ رحمت اللہ سے سندیں حاصل کیں مرحوم کو دراصل فقہ حنفی کے ساتھ والہانہ شغف تھا اور اس کی نادر اور حنفی اماموں کی اصل کتابوں کا بڑا شوق تھا، اور ساتھ ہی ایسی حدیثوں کی بھی اُن کو بڑی تلاش رہتی تھی، جن سے کسی حنفی مسلک کی تائید ہوتی ہو، مولانا کے یہاں جب جانا ہوتا، اور ملنا ہوتا تو ان عنوانات پر گفتگو ضرور ہوتی، حدیث و فقہ کی نادر قلمی کتابوں کی بہم رسانی کا بھی انھیں شوق تھا، امام محمد کی سیر کبیر کا نسخہ جمع کرایا تھا، آثار امام محمد کے رجال کی تحقیق پر رسالہ لکھا، احادیثِ متواترہ یک جا کئے ایک دن کی سینہ بسینہ روایات کا خاندانی مجموعہ بھی چھاپا۔ امام ابن ابی شیبہ نے مصنف میں ایک خاص باب امام ابو حنیفہ کے رد میں لکھا ہے، جو ایک رسالہ کی صورت میں چھپ بھی گیا ہے۔ مولانا نے ابن ابی شیبہ کے اس رد کا جواب لکھا، جو چھپ گیا ہے۔ اور بھی چند چھوٹے چھوٹے مختصر رسالے اس فن میں انہوں نے لکھے ... جن میں سے ایک مجموعہ گیا ... رسالوں پر مشتمل ہے۔

۱۳۴۵ھ میں وفات پائی۔

برصغیر میں علم حدیث کی تاریخ

سید سلیمان ندوی

معارف میں "ہندوستان میں علم حدیث" کے عنوان سے مضامین کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا، الحمد للہ کہ اس سے توقع سے زیادہ لوگوں نے دلچسپی لی، علماء اور تعلیم یافتہ دونوں جماعتوں نے اس کو پسند کیا اور اس کی تکمیل و تصحیح میں حصہ لیا، بیرون ہندوستان تک سے اس کی مزید تکمیل کی فرمائش جاری ہے۔

چونکہ یہ ایسا مضمون تھا جس کے معلومات اب تک کہیں یکجا نہ تھے، اور نہ کسی مصنف و مؤرخ نے اس کی طرف توجہ کی تھی، مجھے خود اس کی وسعت کا اتنا علم نہ تھا، مگر جیسے جیسے آگے بڑھتا گیا، راستہ اور کشادہ اور فراخ معلوم ہوتا گیا، تاہم چونکہ راستہ دیکھا نہ تھا، اور نہ کسی اگلے رہرو کے نقش قدم کے وہاں نشان تھے، اس لئے ادھر اُدھر بھٹکنا ناگزیر تھا، سلسلۂ مضمون میں قدم قدم پر تحقیق کی لغزشیں تھیں، مگر خوشی کی بات ہے کہ چند اور اہلِ ذوق بھی ہم سفر مل گئے، اور اُن کے ٹوکنے سے غلط روی کی اصلاح ہوتی گئی۔

ہندوستان میں علم حدیث کی ابتدائی تاریخ کے سراغ لگانے میں جو کوششیں آغاز مضمون میں کی گئی تھیں، مزید تلاش سے اس کے چند نئے اوراق بھی ہاتھ آئے۔

ناظرین کو یاد ہوگا کہ اس سلسلہ میں یہ خصوصیت کے ساتھ دکھایا گیا ہے کہ اہلِ عرب کو علم حدیث اور اس کی اشاعت کے ساتھ خاص شغف رہا ہے۔ اس لئے جہاں ان کے فتوحات کا قدم پہنچا، وہیں قرآن پاک کے بعد علم حدیث کی درس گاہ بھی قائم ہوگئی، ہندوستان کا سب سے پہلا حصہ جو عرب فتوحات کے دائرہ میں داخل ہوا، وہ سندھ تھا جس کا ۹۶ھ سے تقریباً ۲۵۰ھ تک براہِ راست دمشق و بغداد کی خلافت سے تعلق قائم رہا، اور پھر وہاں کے دو شہروں منصورہ اور دیبل میں دو مقامی اسلامی ریاستیں قائم ہوئیں، منصورہ کی اسلامی ریاست محمود غزنوی کے حملہ سندھ تک (۴۱۶ھ تک) قائم رہی، اور اس کے بعد دیبل کی اسلامی ریاست ۷۵۲ھ تک یعنی فیروز شاہ خلجی کے زمانہ تک باقی رہی، گو اس کے بعد بھی وہ ۹۲۷ھ تک قائم رہی مگر خود مختار نہ رہی، بہرحال اس سے اندازہ ہوگا کہ پہلی صدی ہجری کے آخر سے اس وقت تک جب کہ درہ خیبر سے آنے والی قوموں نے آکر اُن کو بیدخل نہیں کردیا، وہ اس سرزمین میں اسلام اور اسلامی علوم کے حافظ و محافظ رہے۔

قاضی ابوسعد عبد الکریم سمعانی ۵۰۲ھ میں مرو (ترکستان) میں پیدا ہوئے، اور وہیں ۵۶۲ھ میں وفات پائی، علم حدیث کی طلب میں تمام دنیائے اسلام کی خاک چھانی اور ہر جگہ جاکر چار ہزار استادوں سے اس فن کو حاصل کیا اور ماوراء النہر اور خراسان سے بارہا گزرے اور ان کے علاوہ عراق، شام اور عرب تک چکر لگایا اور ہر گوشہ سے فیوض و برکات کا سرچشمہ جمع کیا۔ ان کی مشہور کتاب کتاب الانساب ہے۔ جو ۱۹۱۲ء میں گب میموریل سیریز کے سلسلہ میں عکس سے چھاپی گئی ہے۔ اس کتاب میں شہروں، قبیلوں اور پیشوں کی نسبتوں سے جو لوگ مشہور ہوئے

اُن کے حالات ہیں، اس ضمن میں چھٹی صدی ہجری تک کے اکثر شہروں کے باکمالوں کے تذکرے ہیں، منجملہ ان کے ہندوستان بھی ہے۔

ہندوستان کے شہروں میں سے سندھ، منصورہ، دیبل اور لاہور کے نام اس میں ملتے ہیں۔ دہلی کا نام اس لئے نظر نہیں آتا کہ اس زمانہ تک (۵۶۲ھ) دہلی اسلام کے دائرہ حکومت میں نہیں آئی تھی۔

سندھی اس نسبت سے جن دو ابتدائی بزرگوں کے نام اس میں لکھے ہیں، یعنی ابو معشر نجیح المتوفی سنہ ۱۷۰ھ اور رجا سندھی المتوفی سنہ ۲۲۱ھ کے نام پہلے گذر چکے ہیں، البتہ رجا سندھی کی اولادوں کا ذکر رہ گیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس خاندان میں مدت تک علم حدیث کا چرچا رہا۔ ابو عبداللہ محمد بن رجا اور ابو بکر محمد بن محمد بن رجا مشہور گزرے ہیں، ابو عبداللہ نضر بن شمیل، مکی ابن ابراہیم بن علی دبلی، اور محمد بن اسحاق بن خزیمہ کے اور ابو بکر ابراہیم بن محمد شافعی، اسحاق بن راہویہ کے شاگرد تھے، بغداد اور مکہ میں درس دیتے تھے۔

۲۔ ابو نصر فتح بن عبداللہ سندھی فقیہ، متکلم اور محدث تھے، حسن بن سفیان وغیرہ کے حلقوں میں بیٹھے تھے، ہمدان اور قزوین میں قاضی رہے۔

۳۔ احمد بن سندھی بن فروخ بغداد جا کر رہے۔ ابراہیم دورقی سے روایت کی۔

۴۔ احمد بن سندھی بن حسن بھی بغداد ہی میں سکونت پذیر تھے۔ ثقہ، صدوق اور فاضل تھے[1]

۳۷۵ھ یعنی سلطان محمود کے فتوحات سے بیس پچیس برس پہلے یہاں بیت المقدس کا عرب سیاح عالم ابوالقاسم مقدسی آیا تھا۔ آپ تعجب سے سنیں گے کہ وہ سندھ کے اسلامی فرقوں کے ذکر میں کہتا ہے۔

واکثرھم اصحاب حدیث[2] اور اُن میں زیادہ تر اہلِ حدیث ہیں،

پھر کہتا ہے کہ یہاں کے بڑے شہر (قصبات) حنفی فقہا سے خالی نہیں ہیں، لیکن کوئی مالکی یا حنبلی نہیں ہے[3]

منصوری یہ منصورہ کی طرف نسبت ہے، عربوں کے زمانہ میں یہ دوسری صدی ہجری کے شروع میں آباد ہوا، اہلِ ہند اس کو بھکر کہتے ہیں اور اسی نام سے ہندوستان کی تاریخوں میں اس کی شہرت ہے۔ ۴۱۶ھ تک یہ عرب ریاست تھی اس کے بعد سلطان محمود نے اس کو فتح کیا، عرب ریاست کے زمانہ میں یہاں علم حدیث کا خاصہ چرچا تھا۔

اہل حدیث میں ایک فرقہ ظاہریہ کہلاتا ہے، اس کے بانی امام داؤد بن علی اصفہانی المتوفی سنہ ۲۷۰ھ ہیں، یہ ہر قسم کے قیاس کے قطعاً منکر تھے، اور آیات واحادیث کے صرف ظاہری معنی پر اکتفا کرتے تھے، اس لئے ظاہری کہلائے، داؤد ظاہری کے انتقال کے سو برس بعد ابوالقاسم مقدسی سندھ آیا تھا، وہ کہتا ہے کہ "یہاں داؤدی مذہب کے محدثین موجود ہیں، منجملہ اُن کے وہ منصورہ کے قاضی ابو محمد کا ذکر کرتا ہے، جن سے وہ ملا تھا، وہ داؤدی تھے، اور اپنے مذہب کے امام تھے، ان کا درس قائم تھا اور اُن کی چند عمدہ تصنیفات تھیں[4] اس لحاظ سے قاضی صاحب کا زمانہ چوتھی صدی کا آخر ہوگا۔

منصورہ میں ایک دوسرے محدث قاضی ابوالعباس احمد بن محمد منصوری کا ذکر سمعانی نے کیا ہے، یہ بھی داؤدی مذہب کے

---

[1] کتاب الانساب سمعانی ص ۳۱۴۔ [2] احسن التقاسیم ص ۴۸۱۔ [3] ایضاً [4] ایضاً۔

امام تھے، عراق و فارس میں رہے تھے، مشہور محدث اثرم کے درس میں بیٹھے تھے، اور ابو عبداللہ حاکم المتوفی ۴۰۵ھ ان کے شاگرد تھے[1]
اس حساب سے یہ بھی چوتھی صدی کے آخر کے ہوں گے۔

ابو محمد عبداللہ بن جعفر بن منصوری، حسن بن مکرم سے انہوں نے اور ان سے حاکم نے روایتیں کی ہیں[2] ان کا زمانہ بھی چوتھی صدی کا آخر سمجھنا چاہیئے۔

قاضی ابوالعباس احمد بن محمد بن صالح تمیمی منصوری کا ذکر بھی سمعانی نے کیا ہے، یہ عراق جاکر رہے تھے، انہوں نے ظاہیں بابل ابوالعباس بن اثرم سے اور بصرہ میں ابوروق ہزانی سے حدیثیں سنی تھیں، حافظ سمعانی کہتے ہیں کہ "میں نے فارس میں ان سے زیادہ لطیف مزاج کسی کو نہیں دیکھا"۔ تو وہ گویا سمعانی کے ہمعصر تھے، یعنی چھٹی صدی ہجری کے بیچ میں تھے[3]

دیبل | یہ سندھ کا مشہور بندرگاہ تھا، یہاں سے عراق کو جہازات آیا جایا کرتے تھے، اسی شہر کا نام بعد کو ٹھٹھہ مشہور ہوا یہاں بھی جیسا کہ پہلے گذرا، ایک اسلامی ریاست قائم تھی، یہاں بڑے بڑے محدثین پیدا ہوئے، جن میں سے سمعانی نے ان چند لوگوں کے نام لئے ہیں۔

۱۔ ابو جعفر محمد بن ابراہیم بن عبداللہ دیبلی یہ مکہ معظمہ جاکر رہے تھے، یہ امام ابن عیینہ کی کتاب التفسیر کے ابو عبداللہ سعید بن عبدالرحمان مخزومی کے واسطے سے اور امام عبداللہ بن مبارک کی کتاب البر والصلہ کے ابو عبداللہ حسین بن حسن مروزی کے واسطہ سے راوی ہیں اور عبدالحمید ابن صبیح سے بھی یہ روایت کرتے ہیں اور ان سے ابوالحسن احمد بن ابراہیم بن فراس مکی اور ابوبکر محمد بن ابراہیم بن علی روایت کرتے ہیں[4]

۲۔ ابراہیم بن محمد ابراہیم دیبلی، یہ ابو جعفر محمد دیبلی کے جن کا نام اوپر گذرا، بیٹے تھے، یہ موسیٰ بن ہارون اور محمد بن علی الصائغ سے روایت کیا کرتے ہیں[5]

۳۔ ابوالقاسم شعیب بن محمد بن احمد دیبلی، ابو قطعان دیبلی کے نام سے ان کو شہرت ہے، یہ مصر گئے تھے اور وہیں حدیث کا حلقۂ درس قائم کیا تھا۔ ابوسعید بن یونس ان کے شاگرد تھے[6]

۴۔ علی بن موسیٰ دیبلی محدّث تھے۔

۵۔ حلف بن محمد دیبلی، یہ علی بن موسیٰ دیبلی کے شاگرد تھے، بغداد جاکر رہے[7]۔ اور بہت سے شاگرد پیدا کئے۔

۶۔ ابوالعباس احمد بن عبداللہ بن سعید دیبلی اپنے زمانہ میں مشہور محدّث تھے، محمد بن ابراہیم دیبلی کے شاگرد تھے، اس کے علاوہ نیشاپور میں محمد بن اسحاق ابن خزیمہ سے، بصرہ میں قاضی ابوخلیفہ سے، بغداد میں جعفر بن محمد فریانی سے اور مکہ میں مفضل بن محمد جندی اور محمد بن ابراہیم دیبلی سے اور مصر میں علی بن عبدالرحمٰن سے اور دمشق میں ابوالحسن احمد بن عمیر سے اور بیروت میں ابو عبدالرحمٰن مکحول

---

[1] کتاب الانساب ورق ۵۴۳-۵۴۴ [2] ایضاً ورق ۵۴۴ - [3] ایضاً -
[4] کتاب الانساب ورق ۲۳۷- [5] ایضاً ۲۳۷ - [6] ایضاً ورق ۲۳۷ [7] ایضاً

سے اور نجران میں ابو عمرو حسین بن ابی معشر سے[1] اور تستر میں احمد بن زہیر تستری اور عسکر مکرم میں عبدان بن احمد سے اور نیشاپور میں ابو بکر محمد بن اسحاق بن خزیمہ سے حدیثیں سنیں[2]۔ غور کرو کہ کبھی ہندوستانی تحدث کا یہ ذوق و شوق تھا کہ طلب علم کی راہ میں نیشاپور، تستر، عسکر، مکرم، بصرہ، بغداد، دمشق، بیروت اور مکہ معظمہ کی خاک چھانتے پھرتے تھے۔

یہ ابو العباس احمد دیبلی، اس شان کے بزرگ تھے کہ امام حاکم نے ان کے آگے زانوے ادب تہ کیا۔ سمعانی نے حاکم سے اُن کی وفات کا سال ۳۴۳ھ نقل کیا ہے[3] اور اسی سے دوسرے بزرگوں کے سنین بھی معلوم ہوتے ہیں، محمد بن ابراہیم دیبلی اُن کے استاد تھے، اس لئے ان کا زمانہ چوتھی صدی ہجری کا اوائل ہوگا، اور ابراہیم بن محمد دیبلی چونکہ اُن کے بیٹے تھے، اس لئے یہ چوتھی صدی صدی کے بیچ میں ہوں گے بقیہ بزرگوار بھی چوتھی اور پانچویں صدی ہجری کے معلوم ہوتے ہیں:۔

لاہور | لاہور کو سلطان محمود غزنوی نے ۴۱۸ھ میں فتح کیا، سمعانی کہتے ہیں کہ "ہندوستان کے شہروں میں ایک بابرکت (کثیرۃ الخیر) شہر ہے، اس کو لوہور اور لاہور کہتے ہیں، یہاں بہت سے علما پیدا ہوئے"[4] یہ شہادت ایک ایسے شخص کی ہے جو ۵۶۲ھ میں وفات پا چکا تھا، یعنی یہ وہ زمانہ ہے جب غزنوی سلطنت کا خاتمہ ہو رہا تھا اور غوریوں کی حکومت کا آفتاب طلوع ہو رہا تھا۔

سمعانی نے علمائے لاہور میں سے حسب ذیل بزرگوں کے نام لئے ہیں۔

۱۔ ابو الحسن علی بن عمر بن حکم لاہوری، ادیب شاعر ہوتے کے ساتھ محدث تھے بہت سی حدیثیں زبانی یاد تھیں، حافظ ابو علی مظفر بن الیاس بن سعید سعیدی کے شاگرد تھے اور بغداد تک اُن کا فیض عام تھا، امام سمعانی نے لکھا ہے کہ میں خود اُن سے نہیں ملا، مگر حافظ ابو الفضل محمد بن ناصر سلامی بغدادی کے واسطہ سے اُن کا شاگرد ہوں، ۵۲۹ھ میں لاہور میں وفات پائی[4]

۲۔ ابو الفتوح عبد الصمد بن عبد الرحمٰن الاشعثی لاہوری، یہ شیخ ابو الحسن علی لاہوری کے شاگرد تھے، سمرقند میں یہ درس دیتے تھے اور وہیں امام سمعانی نے ان سے شیخ ابو الحسن علی کی روایتیں سنیں[5] اس لئے اُن کا زمانہ چھٹی صدی کا بیچ سمجھنا چاہئے

۳۔ ابو القاسم محمود بن خلف لاہوری فقیہ و مناظر و محدث تھے، امام ابو سعید عبد الکریم (صاحب کتاب الانساب) کے دادا امام ابو المظفر سمعانی کے شاگرد تھے، اور امام ابو سعید سمعانی نے اُن سے اسفرائن میں کچھ روایتیں سُنی تھیں، وہیں انہوں نے سکونت اختیار کر لی تھی، ۵۴۰ھ کے قریب وفات پائی[1]

ہندی | یعنی کسی خاص شہر کی نسبت کے بغیر نفس ہندوستان کی نسبت سے چھٹی صدی ہجری کے وسط تک بہت سے اہل علم ہوئے، سمعانی کہتے ہیں، منسوب الی بلاد الھند وفیھم کثرۃ و شھرۃ ان میں سے صرف دو نام جو اس کے ذکر کیا ہے، جن کے نام ایک ہی صرف کنیتیں دو ہیں (اور یہ دونوں ہندی غلام بن کر امام بنے تھے، دونوں عبدالکریم سمعانی کے

---

[1] کتاب الانساب ورق ایضاً، [2] ایضاً ، [3] کتاب الانساب ورق ۲۴۷ ۔ [4] ایضاً ۔ [5] ایضاً ۔
[6] کتاب الانساب ورق ۴۹۷ ۔

اُستاد اور شیخ تھے۔

۱۔ ابو الحسن بختیار بن عبداللہ محدث اور صوفی تھے، قاضی محمد بن اسمٰعیل یعقوبی (باشندۂ بوشنگ) کے یہ آزاد کردہ غلام تھے۔ اپنے آقا کے ساتھ عراق، حجاز، اھواز، بغداد، بصرہ، اصبہان، کوہستان اور خوزستان کا سفر کیا تھا، اور اُن میں سے ہر جگہ کے محدثین سے فیض پایا تھا، سمعانی نے توشیخ اور ہرات میں اُن سے حدیث پڑھی ۵۴۳ھ میں وفات پائی[1]

۲۔ ابو محمد بختیار بن عبداللہ، یہ سمعانی کے والد ابوبکر محمد سمعانی کے آزاد کردہ ہندی غلام تھے، اپنے آقا کے ساتھ عراق و حجاز کا سفر کیا تھا، اور خود اپنے آقا سے بہت سی حدیثیں سنی تھیں، اُن کے علاوہ بغداد میں بڑے بڑے محدثین سے علم کا فیض پایا تھا، مرو میں سکونت اختیار کرلی تھی اور یہیں صفر ۵۴۲ھ میں وفات پائی[2]

اللہ اکبر! کیا زمانہ تھا کہ جہاز اور ریل کے بغیر ہندوستان سے ترکستان، ایران، خراسان، عراق، حجاز، شام اور مصر تک کی خاک علم کی تلاش و جستجو میں چھانتے پھرتے تھے، پھر تو مسلم غلاموں کی قسمت پر آج کے خاندانی مسلمان آقا رشک کریں کہ اسلام کے غلام بن کر وہ کیا رتبہ پاتے تھے۔

---

[1] کتاب الانساب ورق ۹۳ د۔

[2] 〃 〃 〃 ۔

برصغیر میں کُتبِ حدیث کی نایابی

سیّد سلیمان ندوی

ہندوستان میں حدیث کی کتابوں کی جو نایابی تھی اس کا اندازہ گزشتہ واقعات سے کسی قدر ہوا ہوگا، نویں صدی ہجری تک صرف مشارق الانوار کا نسخہ ہندوستان میں نظر آتا ہے، سب سے پہلی دفعہ محمد تغلق کے عہد میں ہم کو یہ آواز سُنائی دیتی ہے کہ شمس الدین ترک مصر سے حدیث کی تین سو کتابیں لے کر ملتان تک اس غرض سے آئے تھے کہ ہندوستان میں مذہب حدیث رائج کریں، مگر بادشاہ کا حال سن کر وہ ملتان ہی سے واپس چلے گئے، معلوم نہیں حدیث کی یہ تین سو کتابیں کیا تھیں، اس واقعہ کا راوی ضیاء برنی ہے، جو اس عہد کا مشہور مؤرخ ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ متن حدیث کی اتنی کتابیں تو نہیں ہوسکتیں، شروحِ حدیث اور رجال کی کتابیں ملا کر بھی یہ تعداد پوری ہونی مشکل ہے، بہرحال جو بھی ہو، اس واقعہ کا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ اتنا بیش قیمت سرمایہ اگر ہندوستان سے واپس چلا گیا۔

محمد تغلق المتوفی ۷۵۲ھ جس کے براہِ راست تعلقات مصر کی عباسی خلافت سے تھے، اور اس کی طرف سے اس کو حکومت کا فرمان اور خلعت اور علم بھی ملا تھا اور خلیفہ عباسی سے اس نے بیعت بھی کی تھی، اس کا قاعدہ تھا کہ جب لوگوں سے بیعت لیتا تھا تو مصر کے خلیفۂ عباسی کے فرمان کے ساتھ ساتھ قرآن پاک اور مشارق الانوار کا نسخہ سامنے رکھ لیتا تھا[1] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ تک ہندوستان میں قرآن پاک کے بعد احادیث میں صرف مشارق الانوار کا وجود تھا، جب شاہی کتب خانہ کا یہ حال تھا تو عام لوگوں کی دسترس کا کیا پوچھنا ہے۔

الغرض، شیخ عبدالحق محدث سے پہلے صرف مشارق الانوار للصاغانی اللاہوری المتوفی ۶۵۰ھ کے نسخے اور کہیں کہیں مصابیح (اصل مشکوٰۃ) للبغوی المتوفی ۵۱۶ھ کے نسخے دستیاب ہوتے تھے اور یہی دو کتابیں ان کے علماء کے درس میں تھیں، شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ وہ عرب سے کم سے کم مشکوٰۃ مؤطا امام مالک، صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے نسخے لائے اور ان کو درس میں داخل کیا، اس کے بعد ان کا اور ان کے سلسلہ کا دوسرا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ان کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کیا، اور فارسی میں ان کی شرحیں لکھیں۔

بہرحال شیخ عبدالحق کے ذریعے مشکوٰۃ کے نسخے حجم کے کم ہونے کی وجہ سے عام ہوگئے اور بخاری کا نام اور حوالہ بھی کتابوں میں آنے لگا، تاہم مخصوص خاندانوں کے سوا صحیح بخاری کا نسخہ عام طور سے نہیں ملتا تھا۔

---

[1] تاریخ فرشتہ ذکر محمد تغلق

سلاطین تیموریہ کے کتب خانے اپنی کتابوں کی تعداد، ندرت اور جامعیت کے لحاظ سے عجائب روزگار تھے، اُن کی تباہی کے بعد اُن کی کتابیں ہندوستان اور یورپ میں منتشر اور پراگندہ ہوگئیں، اور آج بھی کثرت کے ساتھ یہ کتابیں کتب خانوں اور کتب فروشوں کے پاس ملتی ہیں، ان میں تفسیر، فقہ، اصول، تصوف، کلام، فلسفہ، ریاضیات، ادب، دواوین، تاریخ ہر فن کی کتابیں ملتی ہیں۔ مگر حدیث کا کوئی نسخہ ان میں سے برآمد نہیں ہوا، میں نے اس نظر سے خاص طور سے یورپ اور ہندوستان کی مطبوعہ فہرستیں دیکھی ہیں۔

لیکن ایک عجیب بات یہ ہے کہ دہلی کے حدود سلطنت سے باہر جو مستقل اسلامی حکومتیں اطراف ہند میں قائم تھیں ان میں جن کا تعلق عرب سے تھا، وہاں کچھ نہ کچھ سراغ کتب حدیث کا ملتا ہے، اس سلسلہ میں صحیح بخاری کا وہ نسخہ ہے جو بنگال کی سلطنت سادات کی تنہا یادگار ہے، دسویں صدی ہجری کے شروع میں بنگال میں عرب سادات کی حکومت قائم تھی، جس کا ایک مربرآرا علاء الدین شاہ حسین بن سید اشرف الحسینی تھا، اس کا زمانہ ۹۰۵ھ سے ۹۲۷ھ تک ہے، محمد بن یزدان بخش معروف بہ خواجگی شروانی ایک عالم تھے، انہوں نے اپنے ہاتھ سے صحیح بخاری کا ایک نہایت عمدہ نسخہ تین جلدوں میں تیار کیا تھا اور اس کو سلطان مذکور کی خدمت میں پیش کیا تھا، یہ مکمل نسخہ بانکی پور پٹنہ کے مشرقی کتب خانہ میں موجود ہے، اس نسخہ کی تیسری جلد کے اخیر میں خواجگی شروانی کے ہاتھ کی ایک تحریر ہے، جس میں اس نسخہ کا پورا حال لکھا ہے، اور سلطان مذکور کے سامنے اُس کے پیش کرنے کا ذکر کیا ہے، یہ واقعات عربی میں ایسی عمدہ اور فصیح و بلیغ عبارت میں لکھے ہیں کہ یقین ہوتا ہے کہ وہ عربی کے بہت بڑے ادیب تھے، یہ عبارت کتب خانہ مذکور کی فہرست کی پانچویں جلد کے ص ۱۸ میں نقل کردی گئی ہے۔

یہ نسخہ یکدالہ میں لکھا گیا تھا، جو اس زمانہ میں بنگال کا دارالسلطنت تھا۔

اسی طرح فتح الباری شرح صحیح بخاری کا نسخہ کم از کم احمد آباد گجرات میں بہت پہلے پہنچ گیا تھا، حافظ ابن حجر نے اپنی یہ تالیف ۸۴۲ھ میں ختم کی، اور ۸۵۲ھ میں وفات پائی، پٹنہ کے مشرقی کتب خانہ میں فتح الباری کی تیسری جلد کا ایک ایسا نسخہ ہے، جس پر سلطان ابراہیم والیٔ بیجاپور کی مہر ہے، سلطان ابراہیم کا زمانہ ۹۸۷ھ سے ۱۰۳۵ھ تک ہے یعنی حافظ ابن حجر کی وفات کے سو ڈیڑھ سو برس بعد یہ نسخہ ہندوستان پہونچ گیا تھا۔ اس پر بعد کے زمانہ میں عالمگیر کے ایک امیر قابل خاں کی مہر ہے۔

کتب حدیث میں سے شمائل ترمذی کا نسخہ اکبری دور میں غالباً ہندوستان پہونچ چکا ہے ملّا عبدالنبی صدر الصدور اور ملا یعقوب صرفی کشمیری عرب سے حدیث پڑھ کر آئے تھے، شاید یہی دونوں اس کو لائے ہوں گے، کیونکہ ملّا عبدالنبی نے اس شمائل کا گویا ایک خلاصہ کیا ہے، جس کا ایک قلمی نسخہ دار المصنفین میں ہے، نیز ملا یعقوب صرفی کے بیٹے ملا کبیر حسن کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ ہمارے فاضل دوست مولوی حکیم حبیب الرحمٰن صاحب (ڈھاکہ) کے پاس ہے، یہ ۱۰۵۵ھ کا لکھا ہوا ہے، اور جابجا اس پر کاتب کے حواشی ہیں۔ حکیم صاحب ممدوح کے پاس ایک اور عجیب نادر چیز ہے، آج تک شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے علمی خانوادہ کا آغاز انہی کی ذات سے کیا جاتا تھا، مگر حکیم صاحب کے پاس ایک دستاویز ایسی ہے جو اس آغاز کو ایک پشت اوپر تک لے جاتی ہے یعنی علامہ ذہبی کی الکاشف جو اسماء الرجال کی ایک کتاب ہے، اس کا ایک نسخہ حکیم صاحب کی ملکیت میں ہے جس کے پہلے صفحہ پر

مولانا عبدالحق محدث دہلوی کے والد ماجد مولانا سیف الدین ترک کے قلم کی عبارت تحریر ہے۔

غازی پور کے شرفاء کے ایک پرانے قصبہ سے چند سال ہوئے کہ میرے پاس وہاں کے ایک علمی خاندان کے چند متروکہ تبرکات کی فہرست آئی تھی، اس میں دوسری علمی کتابوں کے ساتھ احادیث کی بھی چند علمی کتابوں کی فہرست تھی، جس میں ہر کتاب کے سامنے اس کی خصوصیات بھی درج تھیں، اس میں صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، ابن ماجہ، شمائل ترمذی، مشکوٰۃ المصابیح، کرمانی شرح بخاری، جمع بین الصحیحین حمیدی، حاشیہ مشکوٰۃ شریف علامہ سید شریف جرجانی، شرح حصن حصین ملا علی قاری تیسیر الوصول فی احادیث الرسول مؤطا امام مالک کے نام لکھے تھے۔

صحیح بخاری کی پہلی جلد کے متعلق لکھا تھا۔ نہایت خوشخط با اعراب، مدینہ منورہ کے چند علماء کی سندیں اس میں چسپاں ہیں اور مولانا عبدالباسط قنوجی ؒ کے قلم کا حاشیہ ہے، تاریخ درج نہیں لیکن دوسری جلد کی تاریخ کتابت ۸۷۰ھ لکھی ہوئی ہے اور اُس کی خصوصیت یہ تھی کہ اس پر مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، شام، خوارزم، اصفہان اور ماوراالنہر کے علماء اور محدثین کے درس وسماعت میں رہ چکنے کی سندیں تحریر ہیں۔

صحیح مسلم کی نسبت لکھا تھا کہ وہ ۸۶۱ھ کی تحریر ہے نسخہ نہایت پرانا اور خوشخط، شاہی کتب خانہ (کس بادشاہ کے؟) کا ہے۔

ترمذی پر تاریخ نہیں دی ہے، مگر لکھا ہے کہ یہ نسخہ نہایت پرانا لکھا ہوا ہے۔

ابن ماجہ کے نسخہ کی نسبت بھی یہی تحریر ہے۔

شمائل ترمذی کا نسخہ ۸۶۷ھ کا ہے۔

مشکوٰۃ المصابیح کا نسخہ ۱۰۴۰ھ کا ہے۔

کرمانی شرح بخاری کی تاریخ ۸۰۷ھ بتائی گئی ہے، اور لکھا ہے کہ یہ نسخہ مدینہ منورہ میں سنہ تالیف سے صرف پچیس[25] برس بعد کا لکھا ہوا ہے، خوشخط ہے۔

جمع بین الصحیحین حمیدی کی کتابت کا سال ۱۰۹۲ھ ہے۔

حاشیہ مشکوٰۃ، میر سید شریف جرجانی کا زمانہ ۱۰۸۱ھ لکھا تھا۔

حصن حصین خوشخط و مطلا ۱۰۰۲ھ کا لکھا ہوا اور اس کی شرح درالثمین ملا علی قاری کا زمانہ ۱۰۱۳ھ مکہ معظمہ کا نسخہ۔

تیسیر الوصول کا نسخہ ۱۰۹۱ھ کا بتایا گیا ہے، موطا کا کوئی سنہ نہ تھا۔

بہر حال رفتہ رفتہ عرب سے کتابیں ہندوستان آنے لگیں اور اس بارۂ خاص میں سب سے پہلے شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور ان کے بعد مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی فیوض حرمین کا ممنون ہونا چاہیے۔ مگر اس عہد میں بھی کتب حدیث کی جو ندرت تھی، اس کا اندازہ ذیل کے واقعات سے ہو سکتا ہے۔

میر عبدالجلیل بلگرامی جو عالمگیر سے محمد شاہ کے عہد تک زندہ تھے، اور ایک زمانہ میں بھکر واقع سندھ میں سرکاری عہدہ دار تھے:

وہ اپنے عہدہ سے برطرفی کے بعد بھی چھ مہینے تک وہاں اس لیے پڑے رہے کہ صحیح بخاری کا ایک اچھا سا نسخہ وہاں اُن کو ہاتھ آ گیا تھا اور وہ اس کی نقل لے رہے تھے[1]

میر ممدوح کے ایک ہم وطن اور ہمعصر روح الامین خاں بلگرامی پنجاب میں شاہی عہدہ دار تھے، انہوں نے اپنے ہاتھ سے صحیح بخاری اور صحیح مسلم نقل کی[2]

مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے ایک بلگرامی شاگرد شیخ پیر محمد نے اپنے لیے مولانائے ممدوح سے درس لینے کے لئے ۱۱۵۹ھ میں جامع فیروزی میں بیٹھ کر جو نسخہ نقل کیا تھا وہی نسخہ ۱۱۸۳ھ میں شاہ عالم بادشاہ کے حکم سے اعراب اور مقابلہ اور تصحیح کے بعد خزانۂ شاہی میں داخل کیا گیا۔ یہ متبرک نسخہ بھی پٹنہ کے مشرقی کتب خانہ کی عزت ہے، اس نسخہ کے خاتمہ پر یہ تمام واقعات مولانا پیر محمد بلگرامی کے قلم سے لکھے ہیں، پھر حضرت شاہ ولی اللہ کے دستِ خاص سے اجازہ اور سند مکتوب ہے، اس کے بعد کوئی محمد ناصح نام عالم ہیں۔ اُن کے ہاتھ کی تحریر ہے۔

بحمد اللہ وسبحانہ تصحیح واعراب صحیح بخاری بحکم اقدس حضرت شاہ عالم بادشاہ خلد اللہ ملکہ وسلطانہ و افاض علی العالمین برہ واحسانہ در سنہ یک ہزار و یک صد و ہشتاد و چہار ہجری فقیر محمد ناصح عفی (؟) اللہ انہ اول کتاب "تا آخر از نسخہ مصححہ باتمام رسانید۔"

۱۹۲۴ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کا جو اجلاس[3] علی گڑھ میں ہوا تھا، اس میں قلمی کتابوں کی نمائش کا بھی انتظام کیا گیا تھا۔ اس نمائش میں حدیث کے بعض نادر نسخے فراہم ہوئے تھے، اسلامیہ اسکول اٹاوہ کے کتب خانہ سے مشکوٰۃ کا ایک نسخہ آیا تھا، جو بادشاہ عالمگیر کے مطالعہ میں رہتا تھا، اور ایک نسخہ شمائل ترمذی کا آیا تھا، جس کو افراسیاب خاں نے عالمگیر کی خدمت میں بھیجا تھا، بخاری کا ایک پرانا نسخہ ایڈیٹر صاحب پیسہ اخبار لاہور نے بھیجا تھا۔ جس پر اس کے ایک مالک نے خریداری کا سال ۱۰۴۲ھ لکھا تھا۔

---

[1] مآثر الکرام آزاد بلگرامی ج اول ص ۲۶۵، [2] ایضاً۔ [3] رپورٹ اجلاس مذکور جلد دوم ص ۱۰ ۱۹۲۴ء۔

تدوینِ حدیث

سید مناظر احسن گیلانی

موضوعِ بحث کی تشریح

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

علم حدیث پر بحث کرنے کے لئے ہمیں اپنے سامنے ان چند سوالات کو رکھ لینا چاہیئے۔

۱۔ حدیث کی حقیقت کیا ہے؟

۲۔ اس علم کی تدوین کب، کس طریقہ سے، کس زمانے میں شروع ہوئی، اور ان طریقوں کا اس علم کے وثوق و اعتماد پر کیا اثر مرتب ہوا یا ہو سکتا ہے۔

۳۔ ابتدا سے اس وقت تک اس فن کی ممتاز خدمتیں جن بزرگوں نے انجام دیں خود ان کی اور ان کے کارناموں کی تفصیل۔

۴۔ اس فن سے متعلق کن جدید تکمیلی کوششوں کی ضرورت باقی ہے۔

۵۔ حدیث کے بعد فن حدیث کے دوسرے متعلقات یعنی فن اسماء الرجال اور اصولِ حدیث کی حقیقت، ان کی تاریخ، موجودہ حیثیت، ان میں آئندہ ترقیوں کے امکانات۔

حدیث کی حقیقت

سب سے پہلے میں پہلے سوال کو لیتا ہوں یعنی حدیث کی حقیقت کیا ہے؟ بات یہ ہے کہ عموماً دنیا میں دو طرح کی قومیں پائی جاتی ہیں، بعض بلکہ شاید زیادہ تر قومیں ایسی ہیں، جنہوں نے اپنے حال کو ماضی سے وابستہ رکھنے کی کوشش نہیں کی۔ اگرچہ واقعہ تو یہی ہے کہ کسی قوم کا کوئی حال ماضی سے الگ ہو کر تعمیر پذیر نہیں ہو سکتا۔ لیکن باوجود اس واقعہ کے جیسے جیسے وہ آئندہ کی طرف بڑھتی رہیں اپنے ماضی کو بھلاتی چلی آئیں۔ ان کے پاس اپنے موجودہ حالات پر غور و فکر کرنے کے لئے گزشتہ حالات و واقعات تجربات و مشاہدات کا کوئی سرمایہ نہیں ہے گویا جس طرح جنگل کی زندگی گزاری جاتی ہے، یہ بھی گزارتے ہیں۔ آخر ریچھوں اور بندروں کو کیا معلوم کہ ان کے جدِ اعلیٰ کون تھے کن کن جنگلوں اور وادیوں، پہاڑوں سے چھلانگیں مارتے ہوئے ان کے آباؤ اجداد موجودہ مقام تک پہنچے۔ کن کن حالات سے ان کو دوچار ہونا پڑا۔

لیکن ان کے مقابلے میں انسانوں ہی کا ایک طبقہ ان قوموں کا بھی ہے۔ جنہوں نے حتی الوسع اس کی کوشش کی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو حال کی تعمیر میں ماضی کے تجربات اور واقعات سے نفع اٹھایا جائے اور اس کے لیے ان کو ضرورت محسوس ہوئی کہ گزرے ہوئے واقعات کو کسی نہ کسی طرح محفوظ کر لیا جائے۔ انسانیت کے اس گروہ کی اسی کوشش کا نام تاریخ ہے۔ ابتداً میں تاریخ کی حفاظت و بقا کا شوق قوموں میں کم رہا ہے لیکن اب تو یہ ایک ایسی ناگزیر ضرورت بن گئی ہے کہ اپنی توانائیوں کا ایک بڑا حصہ ہر قوم اس پر خرچ کر رہی ہے جس سے ہم اور آپ سب واقف ہیں جنگل کی زندگی بسر کرنے والے بھی اب اپنے اجداد و اسلاف کے کارناموں کی جستجو

گڑی ہوئی ہڈیوں اور پرانے مقبروں اور مرگھٹوں میں کر رہے ہیں۔ کونے کونے سے قدیم سکے برآمد کئے جا رہے ہیں، کہنہ قبروں کے کتبوں کے حروف پڑھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ پرانے کھنڈروں کی ایک ایک ٹھیکری چنی جا رہی ہے۔ ان ہی پر واقعی کچے یا خیالی بلند و بالا عمارتیں تعمیر ہو رہی ہیں، گویا اس علم کی ناگزیر ضرورت کو دنیا کی اکثر قوموں نے اب تسلیم کر لیا ہے اور بجز چند ردیابی الطبع شکی مزاج خشک دماغ فلسفیوں کے عام دنیا کا شدید رجحان بھی ان چیزوں کے جاننے کی طرف ہے۔

عام تاریخ اور فنِ حدیث

دنیا کی اسی تاریخ کے ایک عظیم الشان، حیرت انگیز انقلابی حصہ کا نام سچ پوچھئے تو حدیث ہے میرا مطلب یہ ہے کہ جن انقلابات و حوادث سے گزر کر نسلِ انسانی موجودہ حالت تک پہنچی ہے۔ ان میں ایک ایسا واقعہ جس نے کسی خاص شعبۂ حیات ہی میں نہیں بلکہ مذہبی، سیاسی، معاشرتی، اخلاقی تمام شعبوں میں انسانیت کا رُخ پلٹ دیا، جس سے زمین کا کوئی خاص حصہ نہیں بلکہ بلا مبالغہ مشرق و مغرب دونوں متاثر ہوئے، ہو رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ ماضی کے اس عجیب حیرت انگیز واقعہ کی تاریخ یا تفصیلی بیان کا نام حدیث ہے۔ اگرچہ عام طور پر مسلمانوں کی ابتدائی تاریخ سے حدیث کا تعلق قرار دیا جاتا ہے لیکن جہاں تک واقعات و حالات کا تعلق ہے میں حدیث کو انسانیت کی تاریخ کا ایک حصہ اور ایسا حصہ قرار دیتا ہوں جس کی صرف یہی خصوصیت نہیں ہے کہ ایک بے نظیر عدیم المثال عالمگیر انقلابی عہد سے اس کا تعلق ہے، بلکہ سچ پوچھئے تو آج جس کسی کے پاس یا جس قوم و امت کے ذخیرہ میں بھی ماضی بلکہ حال کی تاریخ کا جو حصہ ہے وہ وثوق و اعتماد میں تاریخ کے اس "محفوظ حصہ" یعنی حدیث کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ میں ان آزردہ فطرت شکیوں میں نہیں ہوں جو تاریخ کو جھوٹ کا جنگل قرار دے کر ماضی کا انکار کرتے ہیں اور "جو کچھ محسوس ہو رہا ہے یہ نہیں محسوس ہو رہا ہے۔" اس سوفسطائی نظریہ پر زور دے کر حال کے وجود کو بھی شک کے دانتوں سے چبا کر ختم کرنا چاہتے ہیں بلکہ تاریخ کے مقررہ معیار پر ماضی کے جن واقعات کی اب تصحیح ہو چکی ہے اس کی قدر کرتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ آئندہ کی راہ درست کرنے کے لیے ہمیں ہمیشہ ماضی کی روشنی سے نفع اٹھانا چاہیے۔

فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝

لوگوں سے پچھلے قصّے بیان کیا کرو تاکہ وہ سوچیں۔

لیکن اگر یہ صحیح ہے جیسا کہ ایک بڑے مشہور مسلم الثبوت مؤرخ کا بیان ہے کہ:

> "کسی زمانے کے حالات جب قلمبند کئے جاتے ہیں تو یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے کہ ہر قسم کی بازاری افواہیں قلمبند کر لی جاتی ہیں جن کے راویوں کا نام و نشان تک معلوم نہیں ہوتا۔ ان افواہوں سے وہ واقعات انتخاب کر لئے جاتے ہیں جو قرائن و قیاسات کے مطابق ہوتے ہیں۔ تھوڑے زمانے کے بعد (یعنی کتابی شکل اختیار کرنے کے بعد) یہی ایک دلچسپ تاریخ بن جاتی ہے۔ یورپ کی اکثر تصنیفیں اسی اصول پر لکھی گئی ہیں۔"

اور اس وقت ہمارے پاس ماضی کی تاریخوں کا جو ذخیرہ ہے خواہ وہ روم ہو یا یونان، چین ہو یا ایران ان قدیم اقوام کی تاریخ جن ذرائع سے مرتب ہوئی ہے، اگر ان کے اساسی سرچشموں کی جانچ کی جائے گی تو جو کچھ اس فاضل مؤرخ نے بیان کیا ہے بہت کچھ اس کی توثیق کرنی پڑے گی۔ مشکل ہی سے انسانوں کے پاس اس وقت کوئی ایسی تاریخی یادداشت مل سکتی ہے جسے واقعہ کے عینی شاہدوں

نے خود مرتب کیا ہو، یا ان کے براہِ راست بیانوں کو خود ان ہی سے سن کر کتابوں میں درج کیا ہو۔ اتفاقاً اگر کوئی ایسی چیز مل بھی جائے تو اس کا پتہ چلانا قطعاً دشوار بلکہ شاید ناممکن ہے کہ ضبط و اتقان، بصیرت دیگر کیرکٹر کے لحاظ سے ان کا کیا درجہ تھا۔ معتبر سے معتبر ترین کسی تاریخی ذخیرہ کے وثوق کے متعلق اگر کوئی بات پیش کی جا سکتی ہے تو یہی ہے کہ جس زمانہ میں واقعہ گزرا ہے مورخ خود ہی اس زمانے میں موجود تھا۔ اتفاق سے کسی واقعہ کے متعلق اگر ایسی شہادت میسر آ جاتی ہے تو تاریخ کا یہ حصہ زریں شاہکاروں میں شریک کر دیا جاتا ہے۔ لیکن خود اس معاصرت کا یہ حال ہے کہ قدیم ماضی کے تاریک زمانے کو تو جانے دیجئے آج جبکہ جدید صناعات و ایجادات نے زمین کی طنابیں کھینچ کر ایک ملک کو دوسرے ملک سے ملا دیا ہے۔ تعلیم عام ہو چکی ہے، کم از کم یورپ کے مکتبوں اور اسکولوں میں روئے زمین کے اطلسوں کا مطالعہ ہر ایک کو کرا دیا جاتا ہے۔ لیکن ایک واقعہ نہیں، آئے دن ایسی ایسی جہالتوں اور غلط فہمیوں کے شکار غریب جاہل مشرقی ہی نہیں بلکہ فرزانہ و دانا فرنگ کے ارباب خبر و علم ہوتے رہتے ہیں کہ بعض دفعہ آدمی کو حیرت ہو جاتی ہے اور تاریخ جھوٹ کا جنگل ہے۔ دماغ سوچنے لگتا ہے کہ کیا اس دعوی میں کچھ واقعہ کا عنصر بھی شریک ہے؟ بہت پرانے زمانے کی بات نہیں ہے کہ گزشتہ ۱۹۰۵ء میں کانگڑہ (پنجاب) کا مشہور زلزلہ ہندوستان میں آیا تھا۔ ایک نہیں بلکہ متعدد انگریزی اخباروں میں اس زلزلہ کے متعلق یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ کانگڑہ جو بمبئی کے قریب ایک جزیرہ ہے وہاں ایک سخت زلزلہ آیا۔" اور بے چارے اخبار والے تو شہر خبروں کی جماعت ہے۔ عام طور پر گپ نویسی میں یہ بدنام ہے، لیکن مشہور ریفرنس بک بیزل کی اینویل جو مشہور کتاب ہے اور ہر قسم کے حوالہ جات کے لیے ایک مستند کتاب سمجھی جاتی ہے اس میں اسی زلزلے کے متعلق یہ عبارت اس وقت تک موجود ہے۔ "ایک سخت زلزلے نے ایک وسیع ضلع میں جو آگرہ اور شملہ کے درمیان واقع ہے عام تباہی اور سخت نقصان برپا کیا۔"

نقصان کی تفصیل بتاتے ہوئے صرف اسی مورخ نے نہیں بلکہ دوسروں نے بھی یہ ارقام فرمایا ہے کہ" اس سے کئی سو آدمی ہلاک ہوئے۔" حالانکہ پنجاب گورنمنٹ کی رپورٹ کے مطابق اس زلزلے میں بیس ہزار سے کم آدمی ہلاک نہیں ہوئے تھے۔ معاصر مورخین کی کتابوں میں اگر اس قسم کی طرفگیوں اور بوالعجبیوں کو تلاش کیا جائے تو ایک اچھی خاصی کتاب تیار ہو سکتی ہے۔

سیاحوں کی یادداشتوں کو بھی تاریخی وقائع کے ثبوت میں بہت اہمیت دی جاتی ہے اور اس سے بے پروا ہو کر دی جاتی ہے کہ خود اس سیاح کا اپنے ذاتی رجحانات، سمجھ بوجھ، سچائی، راست بازی، میں کیا حال تھا۔ لیکن ان سیاحوں کی بدولت واقعات کی صورت کبھی کبھی کتنی مسخ ہو جاتی ہے اس کا ایک سرسری اندازہ ہمارے موجودہ میر شعبۂ دینیات (نواب ناظر یار جنگ جسٹس حیدر آباد ہائی کورٹ) کے ڈرائنگ روم کی ایک تصویر سے ہو سکتا ہے جو انگلستان کے ایک معتبر اخبار سے الگ کر کے محفوظ کی گئی ہے۔ یہ ہندوستان کے ایک موقع کی تصویر ہے اور اس کے نیچے چوب خط حروف میں یہ لکھا ہوا ہے کہ" بودھ مذہب کے لوگ اپنی ایک مشہور مذہبی رسم جو ادیا کے نام سے موسوم ہے ادا کر رہے ہیں۔"

میں نے اس تصویر کے نیچے جب اس فقرہ کو پڑھا تو بار بار حیرت ہوتی تھی کہ آخر یہ کیا ہے۔ تصویر سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ ہندوستانی مسلمانوں کی ایک جماعت نماز پڑھ رہی ہے۔ ان کی شکل و صورت، لباس، وضع قطع طریقہ، نشست، ہر چیز ہندی مسلمانوں کی تھی لیکن معتبر سیاح نے جس وقت یہ فوٹو لیا تھا اس کے نیچے اس نے یہی عبارت درج کی تھی۔ آخر جب میر شعبہ صاحب باہر

تشریف لائے تو اُن سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ آپ نے قصداً اس تصویر کو اسی لئے محفوظ کیا ہے تاکہ یورپین سیاحوں کی تاریخی شہادت کی ایک گواہی مہیا ہو۔ آپ نے فرمایا کہ یہ دہلی میں نمازِ عید کے موقع کی تصویر ہے، ایک مغربی سیاح نے اس عید کو اُدیا بنایا، اور اُدیا کو خدا جانے کس طرح اس نے بودھ مذہب والوں کی رسم قرار دے کر اخبار میں اپنے اس جدید انکشاف کا اعلان کیا۔

اِن چند تشکیکی مثالوں کے پیش کرنے سے میری یہ غرض نہیں ہے کہ واقعی میں دنیا کے موجودہ تاریخی ذخیروں کو بالکلیہ غیر معتبر اور ناقابلِ لحاظ قرار دینا چاہتا ہوں بلکہ مقصد صرف اس قدر ہے کہ ان کمزوریوں کے باوجود بھی آج جب علمی دنیا میں "فنِ تاریخ" ہر قسم کے احترام و اعزاز کا مستحق ہے تو "حدیث" جو صرف مسلمانوں ہی کی تاریخ نہیں ہے بلکہ جیسا کہ میں نے عرض کیا، تمام دنیا کی انسانیت کے ایک عظیم انقلابی عہد آفرین دور کا ایک ایسا مکمل تاریخی مرقع ہے جسے ٹھیک حقیقی اور اصلی شکل و صورت بلکہ ہر خط و خال کی حفاظت میں لاکھوں ہی نہیں بلکہ کروڑوں انسانوں کی وہ ساری کوششیں اور تدبیریں صرف ہوئی ہیں، جو کسی واقعہ کی حفاظت کے متعلق آدمی کا دماغ سوچ سکتا ہے بلکہ اس کی حفاظت و صیانت میں بعض ایسے قدرتی عوامل نے بھی کام کیا ہے (جیسا کہ ابھی آپ کو معلوم ہوگا) جو دُنیا کے کسی تاریخی واقعہ کو نہ اُس وقت تک میسر آئے اور نہ آئندہ آسکتے ہیں۔ کس احترام و اعزاز کی مستحق ہونی چاہیے۔

حدیث کی مدرسی تعریف

لیکن قبل اس کے کہ میں کچھ اور کہوں اس پر بھی متنبہ کر دینا چاہتا ہوں کہ حدیث جس کے متعلق نہ جاننے والوں کا تو صرف یہ خیال ہے کہ وہ دینیاتی طرز کی کوئی چیز ہے اور دینیات کے لفظ کے ساتھ ہی ان کا دماغ فوراً دورِ وحشت کے ان قدیم خرافات کی طرف منتقل ہوجاتا ہے جسے بدقسمتی سے اس زمانہ میں مذہب یا مذہب کی ایک قسم خیال کیا جاتا ہے۔ گویا دینیات کے معنی چند وہمی رسومات و عادات یا چند رٹے ہوئے الفاظ منتر جنتر، جادو، ٹوٹکے وغیرہ کے ہیں، جن میں صحرائی باشندے کسی زمانے میں کیا اب تک مبتلا ہیں مذہب کے متعلق جن کے دماغوں میں اس قسم کے خیالات ہیں، حدیث جو مسلمانوں کے مذہبی علوم کا ایک جزو ہے، اس کے متعلق میرے ان دعووں کو سن کر ممکن ہے کہ انہیں حیرت ہو۔ اور ان کی حیرت تو چنداں محلِ تعجب نہیں۔ اس لیے کہ "جہل" ان مسکینوں کے لیے بڑا عذر ہے لیکن جاننے والوں کو بھی شاید شبہ ہوتا ہو گا کہ مدرسہ میں جس فن کی یہ تعریف کی جاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال اور ایسے واقعات جو ان کے سامنے پیش آئے لیکن ان میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی (جسے اصطلاحاً تقریر کہتے ہیں) غرض پیغمبرؐ کے اقوال و افعال و تقریر کا نام حدیث ہے اور بعضوں نے اس کو آگے بڑھا کر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ اور بعضوں نے صحابہؓ کے شاگردوں یعنی تابعین کے اقوال و افعال کو بھی اس فن کے ذیل میں شریک کر لیا ہے۔

کہاں حدیث کی یہ مدرسی اور مذہبی تعبیر اور کہاں میرا یہ دعویٰ کہ حدیث مسلمانوں ہی کی نہیں۔ بلکہ انسانیت کے اہم ترین انقلابی عہد کی تاریخ کا معتبر ترین ذخیرہ ہے۔ ان دونوں میں کیا نسبت ہے۔ شاید یہ خیال کیا جاتا ہو کہ زمانہ کے حالات سے متاثر ہو کر میں نے اپنی تعبیر بدلی ہے لیکن یہ واقعہ نہیں ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہر چیز کے سمجھانے کے لئے اسی زبان میں گفتگو کی جاتی ہے جسے مخاطب سمجھ سکتے ہوں۔ مجھے اس سے انکار نہیں ہے کہ میں نے اس فن کی تعریف کرتے ہوئے کچھ الفاظ ضرور بدلے ہیں لیکن الفاظ کے بدلنے سے واقعات نہیں بدلتے۔ جو نہیں جانتے ہیں انھیں تو آئندہ بتایا جائے گا لیکن جو جانتے ہیں کہ حدیث کا تعلق کس ذات گرامی (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ہے، کیا وہ اس کا انکار کر سکتے ہیں کہ جن الفاظ میں اس فن کی میں نے تعبیر پیش کی ہے، کیا یہی اصل

واقعہ نہیں ہے؟ اسلامی تحریک نے اپنے زمانۂ آغاز سے اس وقت تک مشرق و مغرب کے باشندوں کی مذہبی، سیاسی، معاشرتی اخلاقی، پہلوؤں کے انقلاب میں جو کام کیا ہے اور کر رہا ہے ان کو پیشِ نظر رکھنے کے بعد مسلمان ہی نہیں کوئی نامسلمان بھی کیا حدیث کی اس تاریخی تعبیر کا انکار کر سکتا ہے جسے میں نے پیش کیا ہے؟

ماسوا اس کے سچ یہ ہے کہ بالکلیہ یہ میری تعبیر ہے بھی نہیں، فنِ حدیث کے سب سے بڑے امام امام الائمہ حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب کا جو نام رکھا ہے اگر اسی پہ غور کر لیا جائے تو بآسانی سمجھا جا سکتا ہے کہ میں نے جو کچھ کہا ہے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ سمجھنے والوں نے ہمیشہ اس فن کو اسی نگاہ سے دیکھا ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب آج تو صرف "بخاری شریف" کے نام سے مشہور ہے، لیکن یہ اس کتاب کا اصلی نام نہیں ہے بلکہ خود حضرت امام رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب کا نام "اَلْجَامِعُ الصَّحِیْحُ الْمُسْنَدُ الْمُخْتَصَرُ مِنْ" اُمُوْرِ" رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَاَیَّامِہٖ" رکھا ہے۔ اس میں امور اور ایام کے الفاظ قابلِ غور ہیں۔ جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کی صحیح تعریف امام بخاری کے نزدیک ان تمام امور کو حاوی ہے جن کا کسی نہ کسی حیثیت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق ہو۔ آگے ایام کے لفظ نے تو اس کی تعریف کو اور بھی وسیع کر دیا۔ یعنی وہی بات جو میں نے عرض کی تھی کہ فنِ حدیث دراصل اس عہد اور زمانہ کی تاریخ ہے جس میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جیسی ہمہ گیر، عالم پر اثر انداز ہونے والی ہستی انسانیت کو قدرت کی جانب سے عطا ہوئی۔ بہرکیف اگر اصطلاحی جھگڑوں سے الگ ہو کر پھل سے درخت کے پہچاننے کے اصول کو مدِنظر رکھا جائے تو حدیث کے موجودہ ذخیرہ پر سرسری نظر ڈالنے کے بعد بھی ایک معمولی آدمی اس کا اندازہ کر سکتا ہے کہ حدیث کی صحیح حقیقت اور اس کی واقعی تعریف وہی ہو سکتی ہے جس کی طرف حضرت امام بخاری نے اپنی کتاب کے نام میں اشارہ فرمایا ہے اور میں نے جس کی تشریح کی ہے۔

غالباً حدیث کی حقیقت یا تعریف کے لئے میرا یہ مختصر بیان کافی ہو سکتا ہے۔ درسی کتابوں میں جیسا کہ ہر تعریف کے قیود و شرائط پر بحث کر کے بات کو بتنگڑ بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ میں ان دور از کار لفظی گورکھ دھندوں میں آپ لوگوں کو الجھا کر وقت نہیں ضائع کرنا چاہتا اس لئے اس بحث کو اسی نقطہ پر ختم کر کے اب میں دوسرے ضروری سوالات کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ ہمارے سامنے دوسرا سوال یہ تھا کہ تاریخ کے اس حصہ کی تدوین کس طرح اور کس زمانہ میں عمل میں آئی؟ اسی سوال کے جواب میں آپ کے سامنے وہ امتیازات اور خصوصیات بھی آجائیں گے جو تاریخ کے اس حصہ کو دنیا کے دوسرے تاریخی ذخیروں سے ممتاز کرتے ہیں۔

عام تاریخی ذخیروں سے حدیث کے امتیازات

عام تاریخوں سے تاریخ کے اس حصہ کو جو پہلا امتیاز حاصل ہے وہ اس امر کی بساطت ہے جس سے اس کا تعلق ہے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارے پاس اس وقت تاریخ کے جو عام ذخیرے ہیں عموماً ان کا تعلق کسی قوم کی حکومت، کسی عظیم الشان جنگ، الغرض اسی قسم کی منتشر اور پراگندہ گوناگوں چیزوں سے ہے جن کا احاطہ آسان نہیں ہے۔ بخلاف اس کے حدیث اس تاریخ کا نام ہے جس کا تعلق براہِ راست ایک خاص شخصی وجود، یعنی سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس سے ہے۔ ایک قوم ایک ملک، ایک حکومت ایک جنگ کے تمام اطراف و جوانب کو صحیح طور پر سمیٹ کر بیان کرنا ایک طرف ہے اور دوسری طرف ملک نہیں، ملک کی کوئی خاص قوم نہیں

کسی قوم کا کوئی قبیلہ نہیں، کسی قبیلہ کا کوئی خانوادہ نہیں بلکہ صرف ایک واحد بسیط شخص کی زندگی کے واقعات کا بیان کرنا ہے۔ خود اندازہ کیجیے کہ احاطہ و تدوین کے اعتبار سے دونوں کی آسانی و دشواری میں کوئی نسبت ہے؟ پہلی صورت میں کوتاہیوں غلط فہمیوں کے جتنے قوی اندیشے ہیں یقیناً اسی نسبت سے دوسری صورت میں صحت و واقعیت کی اسی قدر عقلاً توقع کی جا سکتی ہے۔

دوسرا امتیاز جو پہلے امتیاز سے بہت زیادہ اہم ہے وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے مورخوں یعنی صحابہ کرام کا باہمی تعلق ہے۔ بلاشبہ اس وقت ہمارے سامنے مختلف اقوام و ممالک، سلاطین اور حکومتوں کی تاریخیں ہیں لیکن جن مورخوں کے ذریعہ سے یہ تاریخیں ہم تک پہنچی ہیں، کیا ان میں کسی تاریخ کا اپنے مورخ یا مورخین سے وہ تعلق تھا جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ کرام کے ساتھ تھا؟ سب سے پہلی بات تو یہی ہے کہ مشکل ہی سے آج کوئی ایسا تاریخی حصہ ہمارے پاس نکل سکتا ہے جس کے مورخین خود ان واقعات کے عینی شاہد ہوں بلکہ جیسا کہ پہلے بھی میں نے ذکر کیا ہے عموماً ان تاریخوں کی تدوین یوں ہی ہوئی ہے کہ ابتداً میں مبہم مجہول الحال افواہوں کی صورت میں واقعات اِدھر اُدھر بکھرے رہے۔ پھر ان میں سے جب کسی کو شوق ہوا تو اس نے ان ہی افواہوں کو قلمبند کرنا شروع کیا خود اس مورخ ہی نے یا اس کے بعد والوں نے قرائن و قیاسات سے جہاں تک ممکن ہوا جس حصہ کو جا با باقی رکھا جسے چاہا قلمزد کر دیا۔ یہ تو شروع میں ہوا بعد کو جوں جوں ان قلمبند شدہ واقعات پر زمانہ گزرتا گیا اوراق میں زیادہ بوسیدگی پیدا ہوئی کیڑوں کی خوراک سے بچ کر جو حصہ باقی رہا پچھلی نسلوں کے لیے وہی تاریخی و ثیقہ بن گیا۔ آج اسی ذہنیت کا نتیجہ ہے کہ مطبوعہ کتابوں سے زیادہ بھروسہ قلمی کتابوں پر ہے اور قلمی کتابوں میں بھی سب سے زیادہ قیمتی وہ مسودات ہیں جو بوسیدہ اور کرم خوردہ ہو چکے ہوں اور سنگی، برنجی، یا آہنی تختیوں کا کوئی ذخیرہ اگر کسی مورخ کو مل گیا تو وہی چیز جو ہمارے ہی جیسے انسان نے کسی زمانہ میں لکھ کر زمین میں گاڑ دی تھی بلکہ ہم تو اپنے معاصرین کو ایک حد تک جانتے بھی ہیں لیکن ان کے لکھنے والوں[1] کا تو کچھ پتہ نہیں ہوتا۔ مگر کیا کیجیے کہ بایں ہمہ وہ معصوم فرشتوں کے بیان کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ مجھے اس کا بھی اعتراف کرنا چاہیے کہ مذکورۂ بالا کلیہ سے تاریخ کے بعض حصے مستثنیٰ بھی ہیں۔ خصوصاً اسلامی دور میں مسلمان بادشاہوں کے حکم سے جب تاریخوں کی تدوین کا سلسلہ شروع ہوا اور باضابطہ شاہی وسائل و ذرائع کے ذریعے سے مورخوں کو واقعات کے فراہم کرنے میں امداد دی گئی، یقیناً ان کتابوں کی نوعیت قدیم تاریخوں سے بالکل جداگانہ ہے۔ اسی طرح

---

[1] بلکہ اگر بعض ثقہ راویوں کا یہ بیان صحیح ہے کہ ہندوستان کے بعض قوموں کے علمی مرکزوں میں "قدیم ہند" کے لیے تاریخی مواد فراہم کرنے کی ایک صورت یہ بھی نکالی گئی ہے کہ آہنی اور برنجی پتروں یا تختیوں پر پرانی زبانوں اور پرانے حروف میں اپنے مطلب کے موافق عبارتیں کندہ کر لی جاتی ہیں اور کسی مشہور آثاری کھنڈر میں ان ہی کو دفن کر دیا جاتا ہے۔ پھر کچھ دنوں کے بعد ان ہی کو نکال کر علمی ذخیرہ میں جدید اکتشاف کی حیثیت سے ان کا اور ان سے جو نتائج نکلتے ہیں اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو علم پر جاہلوں کا یہ کتنا بڑا ظلم ہے اور اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہم جن قدیم کتبوں پر اندھا دھند ایمان لا رہے ہیں ان میں بھی اشتباہ کی کس حد تک گنجائش ہے بلکہ سکندر کی لانبی مدفون زرہوں کا افسانہ اگر صحیح ہے۔ تو صرف کتاب ہی سے نہیں بلکہ ان کھنڈروں سے جو چیزیں نکل رہی ہیں اور ان سے جو نتائج نکالے جا رہے ہیں وہ بھی محل غور و فکر بن جاتے ہیں۔

مسلمان مورخوں کی بنائی ہوئی راہوں پر اس زمانے میں خصوصاً مغربی قومیں نسبتاً زیادہ حزم و احتیاط سے کام لے رہی ہیں۔ لیکن کچھ بھی ہو کسی کی تاریخ ہو، ان کے مورخوں کو ان واقعات سے یا صاحب واقعات سے قطعاً وہ تعلق نہ تھا اور نہ ہو سکتا ہے جو صحابہ کرامؓ کو ذات قدسی صفات سے تھا۔ یہی نہیں کہ ان بزرگوں نے حضورؐ کے ہاتھ پر ایمان و اسلام کی بیعت کی تھی، آپ کی نبوت پہ وہ ایمان لائے تھے۔ آپ سے ان کو وہ تعلق تھا جو ایک امتی کو اپنے پیغمبر سے ہونا چاہیے بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر جیسا کہ واقعات سے پتہ چلتا ہے وہ اپنے ماں باپ، بیوی بچوں بلکہ اپنی جانوں سے بھی زیادہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی زندگی کو عزیز رکھتے تھے وہ سب کچھ حضورؐ پر قربان کرنے کے لئے تیار رہتے گویا ایک قسم کے عشق و سرمستی کے نشہ میں مخمور تھے۔ یقیناً یہ ایسا امتیاز ہے جو کسی تاریخی واقعہ کو اپنے مورخین کے ساتھ حاصل نہیں، آخر دنیا کی ایسی کونسی تاریخ ہے جس کے بیان کرنے والے مورخین اس تاریخ سے ایسا والہانہ تعلق رکھتے ہوں کہ بیان کرتے جاتے ہیں اور روتے جاتے ہیں، کانپتے جاتے ہیں عبداللہ بن مسعودؓ کے متعلق ان کے دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے بہت کم حدیثیں بیان کرتے تھے لیکن اگر کبھی زبان پہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام آ گیا، راوی کا بیان ہے کہ اس کے بعد اُرْتَعَدَ وَارْتَعَدَتْ ثِيَابُهُ، تَنفَخُ اَوْدَاجُهُ اِغْرَوْرَقَتْ عَيْنَاهُ کانپنے لگتے اور ان کے کپڑوں میں تھرتھری پیدا ہو جاتی گردن کی رگیں پھول جاتی تھیں، آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتیں (مستدرک حاکم) ایک عبداللہ بن مسعودؓ ہی نہیں بلکہ ان اصحاب کی ایک فہرست تیار ہو سکتی ہے جن پہ آنحضرتؐ کے ذکر مبارک کے وقت ایک خاص قسم کی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی۔ حضرت ابوذرؓ کبھی کبھی کوئی حدیث بیان کرنا چاہتے مگر منہ سے اوصانی حبی ابوالقاسم اوصانی خلیلی صلی اللہ علیہ وسلم الفاظ نکلتے اور چیخ مار مار کر بیہوش ہو جاتے تھے۔ اسی قسم کے واقعات حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ذکر میں بھی ملتے ہیں۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جس تاریخ کو اس کے مورخوں میں محبوبیت کا یہ مقام عالی حاصل ہو قدرتی طور پر ان کے دل و دماغ، ان کے حافظے اس سے کس حد تک متاثر ہو سکتے ہیں۔

تیسری خصوصیت اس تاریخ اور اس کے راویوں کی یہ ہے کہ علاوہ مذکورۂ بالا تعلقات کے ان براہِ راست مورخوں یا چشم دید راویوں اور گواہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پہ بیعت ہی اس بات پہ کی تھی کہ تاریخ کے اس عجیب و غریب واقعہ کے ہر ہر جزو، ایک ایک خط و خال کے زندہ نقوش اپنے اندر پیدا کریں گے۔ انہوں نے جس قرآن کو خدا کی شریعت اور قدرت کا قانون یقین کر کے مانا تھا اس میں بار بار مطالبہ کیا گیا تھا کہ تم میں سے ہر ایک کی زندگی کا نصب العین صرف یہی ہونا چاہئے کہ جو کچھ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اُسے سو فیصد یاد رکھو اور اس پر ایمان لاؤ، یقین کرو، محمد رسول اللہ صلی اللہ وآلہ وسلم جو کچھ کرتے ہیں ان کی ہر ہر ادا پہ نگاہ رکھو اور ٹھیک من و عن جس طرح ان کو جو کچھ کرتے ہوئے دیکھتے ہو۔ تم بھی اس کام کو اسی طرح انجام دینے کی کوشش کرو۔

مَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ ‏ رسول نے جو کچھ تمہیں دیا ہے اسے پکڑے رہو اور جس سے

فَانْتَهُوْا۔ — انہوں نے روکا ہے اس سے رک جاؤ۔

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ — ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا لیکن صرف اس لئے کہ اسکی پیروی اور اطاعت خدا کے حکم سے کی جائے۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ۔ — کہہ دو اگر تم اللہ کو چاہتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ بھی تمہیں چاہنے لگے گا۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ — تمہارے لیے اللہ کے رسول میں اچھا نمونہ ہے۔

سمع وطاعت، اطاعت واتباع کے ان پرجلال مطالبوں سے قرآن گونج رہا تھا اور ان لوگوں کے سامنے گونج رہا تھا جو ہر چیز سے دست بردار ہو کر صرف اس کی آواز میں گم ہونے کا آخری اور قطعی فیصلہ کر چکے تھے۔ ان کا یہ فیصلہ غلط تھا یا صحیح، مجھے اس وقت اس سے بحث نہیں لیکن حضرات صحابہ کرام کے اس فیصلہ کا علم مسلم اور غیر مسلم ہر طبقہ کو ہے۔ بتایا جائے کہ دنیا کے کس تاریخی واقعہ سے اس کے مؤرخین اور راویوں کا یہ تعلق ہے۔ عجیب بات ہے کہ جن بزرگوں سے کسی زمانے میں انسانوں کے کسی گروہ کو اگر یہ تعلق پیدا بھی ہوا تھا تو ان کی تاریخ ہی آج ناپید ہے اور تاریخ کا جو سرمایہ آج ہمارے پاس ہے اس کے مورخوں کو ان تعلقات کی ہوا بھی نہ لگی تھی۔ کہاں پچھلوں کی مجلسوں کی گرم بازاری کے لئے مورخین کے بیانات اور کہاں ان سوختہ سامانوں کی تاریخی شہادتیں۔

اسی کے ساتھ ہمیں اس کا بھی اضافہ کرنا چاہئے کہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و اعمال کی اطاعت و اتباع ہی ان بزرگوں کے لیے ضروری نہ تھی بلکہ جس قرآن اور جس فرمان نے ان پر یہ فریضہ عائد کیا تھا اسی نے ان کو اس کا بھی ذمہ دار بنایا تھا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو کچھ کہتے ہوئے انہوں نے سنا ہے اور جو کچھ کرتے ہوئے انہوں نے دیکھا ہے وہ دوسروں تک مسلسل پہنچاتے چلے جائیں۔ ہر حاضر غائب کو اور ہر پہلا پچھلوں کو ان کی طرف بلاتا جائے۔ قرآنی آیتوں

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ — تم ایک بہترین امت ہو انسانوں کی رہنمائی کے لیے تم ظاہر کیے گئے ہو۔ تاکہ اچھی باتوں کا لوگوں کو حکم دو اور بری باتوں سے ان کو روکو

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ — چاہئے کہ تم میں سے ایک گروہ ہو جو نیکی اور بھلائی کی طرف لوگوں کو بلائے، اچھی باتوں کا حکم دے اور بری باتوں سے روکے

ہی کی یہ تفسیر تھی جو مختلف پیرایوں میں صحابہ کرام کو مخاطب کر کے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرمایا کرتے۔ منیٰ کا میدان ہے۔ خیف کی مسجد ہے، ایک لاکھ سے اوپر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والوں کا مجمع ہے۔ سب کو مخاطب کر کے فرمایا جاتا ہے

نَضَّرَ اللّٰهُ عَبْدًا سَمِعَ مَقَالَتِيْ فَوَعَاهَا ثُمَّ اَدَّاهَا اِلٰى مَنْ لَمْ يَسْمَعْهَا (صحاح) — تر و تازہ رکھے اللہ اس بندے کو جس نے میری بات سنی پھر اسے یاد رکھا اور جس نے نہیں سنا ہے اس تک انہیں پہنچا دیا۔

یہی منیٰ کا میدان ہے۔ حجۃ الوداع کے تاریخی خطبہ میں اعلان فرمایا جاتا ہے۔

تركت فيكم شيئين لن تضلوا بعدهما — میں تم میں دو چیزیں چھوڑتا ہوں جن کے بعد تم پھر گمراہ

كتاب الله و سنتي ولن يتفرقا حتى يردا على الحوض۔ (صحاح)	نہیں ہو سکتے (ایک تو) اللہ کی کتاب اور دوسری میری سنّت یہ دونوں باہم ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے جب تک کہ حوض (کوثر) پر میرے سامنے آجائیں۔

مجمع سے یہ دریافت فرمانے کے بعد کہ کیا میں نے پہنچا دیا، آسمان کی طرف انگلیاں اٹھا کر، اَللّٰھُمَّ ھَلْ بَلَّغْتُ اَللّٰھُمَّ ھَلْ بَلَّغْتُ اَللّٰھُمَّ ھَلْ بَلَّغْتُ[1] کے ارشاد فرمانے کے بعد آخری رخصت کے اس خطبہ کو اس مشہور متواتر فقرہ پر ختم فرمایا جاتا ہے۔

اَلَا فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ (صحاح)	چاہئے کہ جو حاضر ہے وہ غائب کو پہنچا تا جائے۔

جس دردناک اثر انگیز ماحول میں اس خاتمہ کا اعلان ہوا ہے، اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جن جذبات و ہیجانات سے مخاطب مجمع بھرا ہوا تھا اس پر کیا اثر ہوا ہوگا۔ اسی اثر کا آپ کو یقین تھا کہ صحابہ کی جماعت کو خطاب کر کے بطور پیش گوئی آپ فرماتے:

تَسْمَعُوْنَ، وَيُسْمَعُ مِنْكُمْ وَيُسْمَعُ مِمَّنْ الَّذِيْنَ يَسْمَعُوْنَ مِنْكُمْ	تم مجھ سے سن رہے ہو، تم سے بھی سنا جائے گا اور جن لوگوں نے تم سے سنا ہے، ان سے بھی لوگ سنیں گے۔

(ابوداؤد، مستدرک)

نہ صرف عام مجامع میں یہ اعلان کیا جاتا تھا بلکہ ملک کے مختلف اطراف سے وقتاً فوقتاً وفود کے جو سلسلے دربار نبوت میں حاضر ہوا کرتے تھے عموماً ان کو ایسی جگہ ٹھہرایا جاتا تھا جہاں سے اس واقعہ کے معائنہ اور مشاہدہ کا ان کو کافی موقع مل سکتا ہو جس کے وہ مورخ بنائے جاتے تھے، پھر جو کچھ سنانا اور دکھانا مقصود ہوتا وہ سنایا اور دکھایا جاتا تھا۔ آخر میں رخصت کرتے ہوئے حکم دیا جاتا جیسا کہ بخاری میں ہے۔

اِحْفَظُوْهُنَّ وَاَخْبِرُوْهُنَّ مَنْ وَّرَاءَكُمْ۔	ان باتوں کو یاد رکھو اور جو لوگ تمہارے پیچھے ہیں انھیں ان سے مطلع کرتے رہنا۔

حافظ ابن حجر اس فقرہ کی شرح میں لکھتے ہیں:۔

يَشْمَلُ مَنْ جَاؤُا مِنْ عِنْدِهِمْ وَهٰذَا بِاعْتِبَارِ الْمَكَانِ وَيَشْمَلُ مَنْ يَحْدُثُ لَهُمْ مِنَ الْاَوْلَادِ وَغَيْرِهِمْ وَهٰذَا بِاعْتِبَارِ الزَّمَانِ۔ (فتح الباری)	یہ ان لوگوں کو بھی شامل ہے جن کے پاس سے یہ لوگ آئے تھے اور یہ بات مکان کے لحاظ سے ہے اور ان آئندہ نسلوں کو بھی شامل ہے جو بعد کو پیدا ہونے والی ہیں اور یہ بات زمانے کے حساب سے ہوگی۔

اور یہ بات تو سب ہی جانتے ہیں کہ اسلام کے دائرہ میں جو قبائل داخل ہوتے جاتے تھے، دربار رسالت سے ان کی تعلیم و تلقین کے لئے دم بدم صحاب کو بھیجا جاتا تھا حکم دیا جاتا تھا کہ جو کچھ تم نے ہم سے سیکھا ہے، وہ انھیں بھی جا کر سکھاؤ۔ صرف استحبابی احکام ہی نہیں بلکہ قرآن کی اس آیت

---

[1] یعنی اے اللہ کیا میں نے پہنچا دیا، کیا میں نے پہنچا دیا۔ کیا میں نے پہنچا دیا تین دفعہ ارشاد فرمایا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِى الْكِتٰبِ اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ

جو لوگ چھپاتے ہیں اس چیز کو جسے ہم نے اتارا ہے اور جو کھلی کھلی باتوں اور سوجھ بوجھ (ہدایت) کی باتوں پر مشتمل ہے اور اس کے بعد چھپاتے ہیں جبکہ انسانوں کیلئے کتاب میں ہم نے اسے بیان کر دیا ہے یہی لوگ ہیں جن پر خدا بھی لعنت کرتا ہے اور لعنت کرنے والے بھی لعنت کرتے ہیں ۔

کی بنیاد پر صحابہ کرام جس تاریخ کی نشر و اشاعت کے ذمہ دار ٹھہرائے گئے تھے اس کا چھپانا گناہ خیال کرتے تھے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث بھی روایت کرتے تھے ۔

مَنْ سُئِلَ عَنْ عِلْمٍ ثُمَّ كَتَمَهٗ اُلْجِمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِلِجَامٍ مِّنْ نَّارٍ (ابوداؤد و ترمذی)

جس کسی سے علم کی کوئی بات پوچھی جاتے اور اسے وہ چھپائے تو قیامت کے دن آگ کی لگام اسے پہنائی جائے گی ۔

اور اسی کا نتیجہ تھا کہ سکرات میں مبتلا ہیں، لیکن بعض صحابہ سے یہ مروی ہے اس وقت بھی محض اس خیال سے کہ "علم کے چھپانے" کا الزام ان پر نہ رہ جائے حدیث بیان کرتے جاتے تھے (بخاری و مسلم و عام صحاح)

ان تمام امور کے ساتھ اس کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ جس ذاتِ گرامی کے ہر قول کو وہ خدا کی بات اور خدا کا حکم سمجھتے تھے، اسی نے بار بار بکثرت ان کی فطرت میں مشہور حدیث مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ (جو مجھ پر قصداً جھوٹ باندھے گا چاہیے کہ اپنا ٹھکانہ آگ میں تیار کرلے) کے تہدیدی خوف کو اس طرح راسخ کرنے کی کوشش کی تھی کہ جتنے صحابیوں سے یہ حدیث مروی ہے مشکل ہی سے چند حدیثیں اس قدر کثیر تعداد صحابہ سے مروی ہوں گی اور یوں بھی قرآن کی رو سے یہ نہایت بدیہی بات تھی جس قسم کے ایمان و یقین کی دولت سے یہ لوگ سرفراز تھے اس فعل کی جرأت کس کو ہوسکتی تھی؟ جس اعلیٰ کردار کے وہ مالک تھے پھر بھی ان سے غلط بیانی کی توقع کون کرسکتا ہے۔ ماسوا اس کے جب وہ جانتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کسی امر کا انتساب درحقیقت اس چیز کو خدا کی طرف منسوب کرنا ہے اور ایک جگہ نہیں، بےشمار آیتوں میں قرآن نے مفتری علی اللہ (خدا پر جھوٹ باندھنے والے) کو سب سے بڑا ظالم قرار دیا ہے۔ کیا قرآن پر تازہ ایمان رکھنے والوں کے لیے اس کے بعد اس کی کوئی گنجائش ہوسکتی تھی کہ وہ قصداً العیاذ باللہ اپنے محبوب رسول پر جھوٹ باندھیں؟ یہی وجہ ہے کہ بعض صحابہ تو جس وقت "حدیث" بیان کرنے کے لیے بیٹھتے قبل کچھ بیان کرنے کے مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا والی حدیث کو ضرور پڑھ لیتے تھے، تاکہ ان میں اپنی نازک تاریخی ذمہ داری کا احساس بیدار اور تازہ ہوجائے ۔ امام احمد بن حنبل اپنی مسند میں راوی ہیں کہ خصوصیت کے ساتھ ذخیرۂ حدیث کے سب سے بڑے راوی یعنی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ دوامی قاعدہ تھا کہ

يَبْتَدِئُ حَدِيْثَهٗ بِاَنْ يَقُوْلَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ الصَّادِقُ الْمَصْدُوْقُ اَبُو الْقَاسِمِ

اپنی حدیث جس وقت بیان کرنی شروع کرتے تو کہتے: فرمایا رسول اللہ صادق و مصدوق ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم

صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ کَذَبَ عَلَیَّ مُتَعَمِّدًا فَلْیَتَبَوَّاْ مَقْعَدَہٗ مِنَ النَّارِ (اصابہ ج ع) نے جس نے مجھ پر قصداً جھوٹ باندھا چاہیے کہ اپنا ٹھکانہ آگ میں تیار کرے۔

اس کے بعد جو کچھ بیان کرنا چاہتے تھے، بیان فرماتے۔

اسی کے ساتھ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ صحابہؓ کو سناتے تھے یا کر کے دکھلاتے تھے اس کے متعلق صرف یہ حکم دے کر نہ رہ جاتے کہ تم بھی ان کو یاد رکھنا یا کرنا بلکہ اس کی باضابطہ نگرانی فرماتے تھے کہ اس حکم کی کس حد تک تعمیل کی جاتی ہے۔ مہات شریعت اور اساسی امور کے متعلق آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نگرانی کا کیا حال تھا، اس کا اندازہ آپ کو اس سے ہو سکتا ہے کہ ایک معمولی بات یعنی ایک صحابی کو یہ بتاتے ہوئے کہ جب سونے لگو تو یہ دعا پڑھ کر سویا کرو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بتانے کے بعد فرمایا کہ اچھا میں نے کیا کہا اسے دہراؤ۔ صحابی نے آخری فقرہ اٰمَنْتُ بِکِتَابِکَ الَّذِیْ اَنْزَلْتَ وَنَبِیِّکَ الَّذِیْ اَرْسَلْتَ (ایمان لایا میں اس کتاب پر جو تو نے اتاری اور اس نبی پر جسے تو نے بھیجا) میں نَبِیِّکَ کے لفظ کو رَسُوْلِکَ کے لفظ سے بدل دیا جو تقریباً ہم معنیٰ الفاظ ہیں یعنی بجائے نبی کے رسول کا لفظ استعمال کیا۔ لیکن آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چونکہ اپنی زبانِ مبارک سے نَبِیِّکَ کا لفظ ادا فرمایا تھا حکم ہوا کہ میں نے یہ نہیں کہا، وہی کہو جو میں نے بتایا۔ ظاہر ہے کہ قانونی طور پر سونے کی دعا کی حیثیت ان شرعی حقائق کی نہیں ہے جنہیں فرض و واجب کے ذیل میں شمار کیا جاتا ہے لیکن باوجود اس کے ایک ایک لفظ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی سخت نگرانی تھی۔ بخاری میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عام گفتگو کے متعلق یہ دوامی عادت بیان کی جاتی ہے کہ اَنَّہٗ کَانَ اِذَا تَکَلَّمَ بِکَلِمَۃٍ اَعَادَھَا ثَلٰثًا (جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کوئی بات کرتے تو اس کو تین دفعہ دہراتے) غالباً اس میں بھی زیادہ تر دخل اسی مقصد کو تھا۔ فعل کے متعلق مشہور حدیث ہے کہ ایک صاحب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے نماز پڑھ رہے تھے نماز کے تمام ارکان یعنی قیام، رکوع و سجود میں کوئی کمی نہیں کی تھی، صرف ذرا عجلت اور جلد بازی سے کام لے رہے تھے، مگر نماز سے جب وہ فارغ ہوتے تو وہ یہ سن رہے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صَلِّ فَاِنَّکَ لَمْ تُصَلِّ (پھر نماز پڑھو تم نے نماز نہیں پڑھی) ارشاد فرما رہے ہیں۔ انہوں نے پھر نماز دہرائی لیکن اب بھی اس میں وہ وقار اور طمانیت نہیں پیدا ہوئی تھی جس سے صَلُّوْا کَمَا رَاَیْتُمُوْنِیْ اُصَلِّیْ (ٹھیک اسی طرح نماز پڑھو جس طرح مجھے پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو) کے حکم کی تعمیل ہوتی۔ الغرض تیسری بار سمجھانے کے بعد انہوں نے اپنی نماز جیسی کہ چاہیے ادا کی۔ نماز میں سکینت و اطمینان کی حیثیت اکثر فقہاء امصار کے نزدیک فرض و واجب کی نہیں ہے لیکن جن لوگوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی پوری زندگی اس کے ہر پہلو ظاہر و باطن اندر و باہر کا مورخ بنانا چاہتے تھے، ان پر آپ ان معاملات کے متعلق بھی پوری نگرانی رکھتے تھے۔ کیا دنیا میں کوئی ایسی "تاریخ" بھی موجود ہے جس نے اپنے مورخین کی اور راویوں کے بیان و ادا کی خود نگرانی کی ہو، اور ایسی کڑی نگرانی؟

تدوینِ حدیث کے قدرتی عوامل

تدوینِ حدیث کے سلسلے میں جن امور کی تعبیر میں نے غیر معمولی خاص قدرتی عوامل سے کی ہے اور عام تاریخی سرمایہ سے تاریخ کے اس حصہ کے لیے جن بنیادوں پر میں امتیاز کا مدعی ہوں، اس کے ٹھوس اور خصوصی اسباب تو یہ تھے لیکن خصوصیتوں کا یہ قصہ ان ہی پر ختم نہیں ہو جاتا۔ جن لوگوں کے ہاتھوں علم کے

اس حیرت انگیز ایوان کی تعمیر ہوئی، ابھی، ان کی اور بھی چند باتیں قابلِ لحاظ ہیں۔ میرا مقصد یہ ہے کہ ان تمام ذمہ داریوں کے ساتھ جن کا ذکر آپ سُن چکے، قرآن اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ دعوت جو شاعرانہ زبان میں بلکہ فی الحقیقت مولانا حالی مرحوم کی اس بلیغ تعبیر کی صحیح تصویر تھی ؎

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوت ہادی　　عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی
ایک آواز میں سوتی بستی جگا دی　　نئی اک لگن سب کے دل میں لگا دی

اس نے صحابہ کرام کی ذہنی قوتوں اور عملی توانائیوں میں نئی زندگی کی روح بھر کر ان میں ایسی ہلچل پیدا کر دی تھی کہ بقول گاڈ فرے ہگنس "عیسائی اس کو یاد رکھیں تو اچھا ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام نے وہ نشہ آپ کے پیروؤں میں پیدا کر دیا تھا جس کو عیسیٰؑ کے ابتدائی پیروؤں میں تلاش کرنا بے سود ہے اور میں تو کہتا ہوں کہ عیسائی ہی نہیں بلکہ دنیا کو چاہیے کہ یہ یاد رکھے کہ اس نشہ کی نظیر نہ اس سے پہلے دیکھی گئی اور نہ اس کے بعد دیکھی جا سکتی ہے۔" عروہ بن مسعود ثقفی نے جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے صلح حدیبیہ کے موقع پر قریش کو صحابہ کرام کے اس نشہ کی خبر کتنے صحیح الفاظ میں دی تھی:

أَيْ قَوْمِ وَاللّٰهِ لَقَدْ وَفَدْتُ عَلَى الْمُلُوكِ وَوَفَدْتُ عَلَى قَيْصَرَ وَكِسْرٰى وَالنَّجَاشِيِّ وَاللّٰهِ مَا رَأَيْتُ مَلِكًا قَطُّ يُعَظِّمُهُ أَصْحَابُهُ مَا يُعَظِّمُ أَصْحَابُ مُحَمَّدٍ مُحَمَّدًا وَاللّٰهِ إِنْ تَنَخَّمَ نُخَامَةً إِلَّا وَقَعَتْ فِي كَفِّ رَجُلٍ مِنْهُمْ فَدَلَكَ بِهَا وَجْهَهُ وَجِلْدَهُ وَإِذَا أَمَرَهُمُ ابْتَدَرُوا أَمْرَهُ وَإِذَا تَوَضَّأَ كَادُوا يَقْتَتِلُونَ عَلَى وَضُوئِهِ وَإِذَا تَكَلَّمَ خَفَضُوا أَصْوَاتَهُمْ عِنْدَهُ وَمَا يُحِدُّونَ إِلَيْهِ النَّظَرَ تَعْظِيمًا لَهُ۔ (بخاری)

لوگو! خدا کی قسم مجھے بادشاہوں کے دربار میں بھی باریابی کا موقعہ ملا ہے قیصر (روم) کسریٰ (ایران) نجاشی (ابی سینیا) کے سامنے حاضر ہوا ہوں قسم خدا کی میں نے کسی بادشاہ کو نہیں دیکھا جس کے لوگ اتنی عظمت کرتے ہوں جتنی محمدؐ کے ساتھی محمدؐ کی کرتے ہیں قسم خدا کی جب وہ بلغم تھوکتے ہیں تو نہیں گرتا ہے وہ لیکن ان کے ساتھیوں میں سے کسی آدمی کے ہاتھ میں پھر وہ اپنے چہرہ اور اپنے بدن پر اسے مل لیتا ہے (محمدؐ) جب کسی بات کا انھیں حکم دیتے ہیں اس کی تعمیل کی طرف وہ جھپٹ پڑتے ہیں جب محمدؐ وضو کرتے ہیں تو اس وقت ان کے وضو کے پانی پر آپس میں الجھ پڑتے ہیں جب محمدؐ بات کرتے ہیں تو ان کی آوازیں پست ہو جاتی ہیں، محمدؐ کو نگاہ بھر کر ان کی عظمت کی وجہ سے وہ نہیں دیکھ سکتے۔

یہ دوست کی نہیں بلکہ ایک دانا دشمن کی شہادت ہے۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جس جماعت کے نشہ کا یہ حال ہو، جو احکام و اوامر تو بڑی چیزیں ہیں تھوک اور وضو کے غسالہ تک کو اپنے اندر پیوست کرتے تھے اور ایک دوسرے پر سبقت کرنے میں گویا باہم الجھ پڑتے تھے، ایک ایک موئے مبارک کے متعلق یہ حال تھا کہ بخاری میں ہے کہ حضرت عبیدہ تابعی جنہیں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ خادمِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک موئے مبارک ہاتھ آ گیا تھا فرماتے:

لَأَنْ تَكُوْنَ عِنْدِیْ شَعْرَةٌ مِنْهَا أَحَبَّ إِلَیَّ مِنَ الدُّنْیَا وَمَا فِیْهَا ۔

میرے پاس کسی بال کا ہونا، اس سے زیادہ محبوب ہے کہ دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے وہ سب کچھ میرے یہاں ہو۔

جن لوگوں کا تعلق آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس قسم کا ہو، انھوں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی "زندگی" جس کے لیے خدا کی طرف سے بھی وہ محافظ اور مبلغ قرار دیے گئے تھے، سوچنا چاہیے کہ ان ہی لوگوں نے اس "زندگی" کی نگہداشت میں کس اہتمام کس انہماک اور توجہ سے کام لیا ہو گا، ایک ایک موئے مبارک بھی جن کے نزدیک دنیا و ما فیہا سے زیادہ محبوب تھا ان ہی کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کی، غور کرنا چاہیے کہ کیا قیمت تھی۔

اب ایک طرف حضرات صحابہ کرام کے ان جذباتی طوفانوں کو اپنے سامنے رکھئے اور اسی کے ساتھ اس پر بھی غور کیجیے کہ جس عہد میں اس "تاریخ" کی حفاظت و اشاعت کی ذمہ داری قدرت کی جانب سے انھیں سپرد ہوئی تھی اس زمانہ میں ان کے پاس کسی قسم کا کوئی دماغی مشغلہ قرآن مجید کے سوا موجود نہ تھا، عرب جاہلیت کی تاریخ ہم سب کے سامنے ہے۔ کون نہیں جانتا کہ اس حیرت انگیز منش اچانک دماغی بیداری کے زمانہ سے پہلے وہ اور ان کا ملک تقریباً ان عام علمی اور ذہنی مشغلوں سے مفلس تھا جن کا چرچا عموماً حضارت و تمدن کے ساتھ وابستہ ہے۔ اگرچہ میں اس کا تو قائل نہیں جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ عرب کے ایام جاہلیت کا یہ مطلب ہے کہ ان کی حالت ہندوستان کے بھیلوں اور گونڈوں کی تھی نہ صرف قریش بلکہ اور بھی دوسرے قبائل کے صحیح حالات سے جو واقف ہیں وہ ایک سیکنڈ کے لئے یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتے بلکہ جیسا کہ عنقریب آپ کے سامنے اس کی تفصیل آئے گی۔ "جاہلیت" کا یہ ترجمہ کہ وہ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ عربی زبان اور قرآن مجید کے عام محاوروں کے خلاف ہے جو عربوں کی جہالت کا یہ مطلب سمجھتا ہے، وہ دراصل واقعات سے جاہل ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ لکھنے پڑھنے کے سلسلے میں عرب کا بھی تقریباً وہی حال تھا جو عموماً اس زمانہ میں اگر کامل متمدن ممالک نہیں تو نیم متمدن ممالک کا تھا یعنی جس طرح قدیم زمانے میں تقریباً ہر ملک اور قوم میں لکھنے پڑھنے والوں کا ایک خاص پیشہ ور طبقہ ہوتا تھا اور عام پبلک کو اس سے چنداں تعلق نہیں تھا، نہ اس کی اتنی اہمیت تھی، کسی ملک میں پادریوں، کسی میں موبدوں، کسی میں برہمنوں۔ الغرض اسی قسم کے لوگوں کے ساتھ یہ کام مخصوص تھا، اگر بالکلیہ نہیں تو قریب قریب عرب کا بھی یہی حال تھا۔ آئندہ یہ بتایا جائے گا کہ عرب میں بھی ایک خاصی تعداد خواندوں اور نویسندوں کی تھی۔ نہ صرف مرد بلکہ ایام جاہلیت میں بعض لکھی پڑھی عورتیں پائی جاتی تھیں۔ شرفا ہی نہیں بلکہ غلاموں میں بھی ایسے افراد موجود تھے۔ میں اپنے اس دعوے کی تھوڑی بہت تفصیل آگے بھی کر دوں گا لیکن بایں ہمہ یہ بھی صحیح ہے کہ معمولی نوشت و خواند جو چند گنے چنے لوگوں تک محدود تھی، اس سے آگے عربوں کی ذہنی اور دماغی قوتوں کے لئے اس زمانہ میں کوئی خاص اہم خوراک موجود نہ تھی، اور تھوڑی بہت اگر کچھ تھی بھی تو وہ بہت ادنیٰ درجہ کی تھی۔ ان کا سب سے بڑا دماغی مشغلہ شعر و شاعری کا تھا، یا باہم ایک دوسرے پر تفاخر یا توہین کے لیے۔ وہ انساب کے علم سے دلچسپی رکھتے تھے اور بھی ابتدائی نوعیت کی کچھ فنی چیزیں محدود دے چند افراد کے پاس تھیں لیکن اسلام نے شریفانہ کردار کا جو معیار مقرر کیا تھا اس میں گانے بجانے، رقص و سرود، مے نوشی، مفاخرت یا مشاجرت وغیرہ کی کوئی گنجائش نہیں رکھی تھی، ان کی خمری و مخمری

فحش و مبالغہ والی شاعری کی بھی اس نے کوئی حوصلہ افزائی نہیں کی تھی۔ ایک طرف عربوں کی ذہنی و علمی بھوک کی وہ شدت اور دوسری طرف یونہی اُن کے ملک کا دماغی مشغلوں سے خالی ہونا، چند بچی کھچی ادنیٰ درجہ کی غذائیں جو ان کے پاس موجود تھیں ان کا بھی سامنے سے ہٹ جانا اور سب کو ہٹا کر اس شدید دماغی تشنگی کے وقت میں ان کے سامنے صرف قرآن اور مبلغ قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا علم و فن کے رنگ میں پیش ہونا اور اسی کی کمی و بیشی پر سوسائٹی میں افراد کے مدارج کا قدرتاً مقرر ہو جانا، غور کرنے کی بات ہے کہ ایسے ماحول میں ہر چیز سے ٹوٹ کر ہمہ تن ان ہی دو چیزوں میں اگر وہ ڈوب گئے تھے تو آپ ہی اندازہ کیجئے کہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔ ایسی حالت میں یقیناً یہی ہو سکتا تھا اور یہی ہو کر رہا۔

بلکہ اسی کے ساتھ ہم جب اس واقعہ کو بھی ملا لیتے ہیں کہ فاقہ کش غریب اور مفلس عرب جو اپنے ملک کے خاص حالات کے لحاظ سے ایام جاہلیت میں معاشی حیثیت سے انتہائی سخت کوشیوں کا شکار بنا ہوا تھا۔ تعیش و رفاہیت کی زندگی کا تو ذکر کیا ہے۔ ضروری معاشی رسد کی تکمیل میں بھی ان کو آسمان و زمین کے قلابے ملانے پڑتے تھے، ساری عمر عرب کے چٹیل ریگستانی اور سنگستانی صحراؤں میں بیچارے صرف اس لیے دوڑتے پھرتے تھے کہ دو وقت کی خشک روٹی خواہ کسی شکل میں ہو مل جائے اور وہ بھی بہ مشکل میسر آتی تھی، لیکن اسلام نے ایک طرف ان کے باطنی قویٰ اور ذہنی طلب میں یہ طوفان برپا کیا، دوسری طرف پندرہ بیس سال کی مدت میں جسمانی اور معاشی مطالبوں کے لیے رسد کا ایک ایسا بے تھاہ سمندر ان کے اس غیر آباد قلیل التعداد ملک میں ٹھاٹھیں مارنے لگا کہ سچ یہ ہے کہ اس کی نظیر بھی عرب کے باشندوں نے نہ اس سے پہلے دیکھی تھی اور نہ آج تک پھر وہ تماشا دیکھنا اسے نصیب ہوا، ان خزائن اور دفائن، غنائم اور نفل کے سوا جو قرنہا قرن سے کسریٰ کے خزانے میں جمع ہو رہے تھے یا وہ دولت جو زمین فرعون (مصر) سے یا ارض شام سے آئی تھی ستون فی ستین (یعنی ساٹھ گز چوڑا) والا جو ہر نگار بہار نامی ایرانی غالیچہ جس کے تمام نقش و نگار جن کا تعلق مختلف مناظر اور موسموں سے تھا انمول جواہرات کے ذریعہ سے کاڑھے گئے تھے، کسریٰ کا وہ مرصع تاج جو اپنے قیمتی اور وزنی پتھروں کی وجہ سے بجائے سر پر رکھنے کے سونے کی زنجیر سے لٹکا دیا جاتا تھا اور کج کلاہ ایران اسی میں اپنا سر داخل کر دیتا تھا، کھجوروں کے تنوں پر مدینہ میں جو مسجد کھڑی تھی اس میں یکے بعد دیگرے یہ سب کچھ ہر طرف سے چلا آ رہا تھا۔ خوراکی رسد کا یہ حال تھا کہ عام رمادہ کے قحط میں حضرت عمرؓ نے مصر کے والی عمرو بن عاص کو غلہ کے لئے جب لکھا تو انہوں نے جواب دیا کہ اونٹوں کی ایسی قطار غلہ سے لاد کر پایۂ تخت خلافت میں بھیجتا ہوں جس کا پہلا اونٹ مدینہ میں ہوگا اور آخری اونٹ کی دم میرے ہاتھ میں ہوگی۔ یہ سب تو وقتی دولت تھی اصل چیز دیکھنے کی یہ ہے کہ دس پندرہ سال کے عرصے میں حجاز، یمن، یمامہ، بحرین، عراق، شام اور مصر کے لاکھوں مربع میل کے جو علاقے فتح ہوئے جن میں بجز حجاز کے تقریباً اکثر حصہ حصرت ثروت و دولت کا بے پناہ سرچشمہ تھا، مصر سے پہلا خط عمرو بن العاصؓ کا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نام آیا تھا کہ ایک ایسی زمین پر خدا نے قبضہ دلایا ہے جو اچانک موتی کی طرح سفید اور پھر عنبر کی مانند سیاہ اور اسی کے بعد ہیرے کی مانند سرسبز ہو جاتی ہے۔ ان سارے علاقوں کا ایک بڑا حصہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جاگیروں پر تقسیم کر دیا گیا تھا، کون اندازہ کر سکتا ہے کہ ان اموالِ غنیمت کے

حصوں کے ساتھ ساتھ ہر صحابی کے گھر میں سالانہ کتنی دولت ان جاگیروں سے آتی تھی، تاریخوں میں اس کی تفصیل موجود ہے۔ ذہبی نے لکھا ہے کہ عہد فاروقی تک پہنچتے پہنچتے مدینہ کے بازار کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ عہد نبوت میں جس گدھے کی قیمت پندرہ درہم تھی اب وہ پندرہ سو میں ملتا تھا۔ بخاری کی مشہور روایت ہے کہ حضرت زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے غابہ کی زمین جو مدینہ کے پاس ہے کل ایک لاکھ ستر ہزار درہم میں مول لی تھی لیکن ان کے بیٹے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے اسے جب فروخت فرمایا تو اس کی قیمت سولہ لاکھ ملی تھی۔ حضرت زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو اپنی داد و دہش کی وجہ سے مرنے کے وقت ایک پیسہ نہ چھوڑ سکے لیکن مکانات اور زمین کی شکل میں جو ان کی جائداد تھی اس کی قیمت جیسا کہ بخاری میں ہے پچاس کروڑ دو لاکھ لگائی گئی تھی۔ حضرت عبدالرحمن بن عوف نے انتقال کے وقت ترکہ چھوڑا اس کا حساب تو بہت طویل ہے لیکن فراخی و فراغبالی کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اپنے ثلث مال سے انہوں نے وصیت کی تھی کہ ہر بدری صحابی کو (جن کی تعداد اس وقت تقریباً ایک سو کے قریب رہ گئی تھی) چار چار سو دینار دیے جائیں۔ صحابہ اور صحابہ کی اولاد جو ہی عرب تھے جن کے پاس ہزار کے اوپر عدد کے لیے کوئی لفظ ہی نہ تھا، لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں ایک ایک وقت میں صرف خیرات کرتی تھی یا اپنے ملنے جلنے والے احباب اعزہ کو دے ڈالتی تھی۔ عام تاریخی کتابوں میں بکثرت ان کی داد و دہش کے واقعات کا ذکر ہے بخوف طوالت ان کی تفصیل ترک کی جاتی ہے

بہر حال مجھے حدیث کے ابتدائی رواۃ یا اس تاریخ کے ابتدائی مورخین کی دولت و آمدنی کی تفصیل بتانا مقصود نہیں ہے بلکہ صرف یہ دکھانا ہے کہ گزشتہ بالا حالات کے ساتھ جب ان کی معاشی فراغبالی کو بھی پیش نظر رکھا جائے اور پھر سوچا جائے کہ علم کی پیاس کی جو آگ ان کے دل میں لگائی گئی تھی اس کی تسکین کے لیے ان کے پاس کتنے وسیع مواقع قدرت نے مہیا کر دیئے تھے۔ ہو سکتا تھا اور تھوڑے دنوں بعد ہو بھی گیا کہ مال و دولت کی اس فراوانی نے ان ہی صحابیوں کی دوسری اور تیسری پشت میں ان امیرانہ مشاغل کو پیدا کر دیا جو اس کے لازمی نتائج ہیں۔ لیکن ہم جن لوگوں سے بحث کر رہے ہیں ان میں ایک ایسا روحانی اور اخلاقی انقلاب پیدا ہو چکا تھا کہ وہ اتنی آسانی کے ساتھ کردار کے اس بلند اسلامی معیار کو نہیں چھوڑ سکتے تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت نے ان میں پیدا کر دیا تھا اور اس کی شہادت ان کی زندگی سے ملتی ہے بجائے رنگ رلیوں کے ان کے مصارف وہی تھے جو اسلام نے ان کے لئے مقرر کئے تھے۔ ہر ایک نیکی کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت کرتا تھا۔ وہی عبدالرحمن بن عوفؓ جن کا ذکر ابھی گزرا، مشہور بات ہے کہ اپنے ذاتی روپے سے خرید خرید کر انہوں نے تقریباً تیس ہزار غلاموں کو آزاد کیا تھا، اور از یں قبیل سب کا یہی حال تھا صرف یہی نہیں

۱؎ قاضی ابو یوسف نے کتاب الخراج میں روایت درج کی ہے کہ فارس کے غنائم جن میں الجواہر، اللؤلؤ، والذہب والفضۃ کی کثیر مقدار تھی۔ حضرت عمرؓ کے سامنے جب ان کا ڈھیر لگایا گیا تو رونے لگے اور فرمایا کہ جس قوم کو یہ چیزیں ملیں بالآخر ان میں بغض و عداوت کا پیدا ہونا ضروری ہے۔

بلکہ ان میں اکثر خصوصاً جن کا زیادہ میلان تعلیم قرآن اور تدوین حدیث کی طرف تھا ان کی تمام جائداد وں اور مالی ذرائع کی نگرانی بھی قہرمانوں اور قیموں کے سپرد تھی، وہی وصول کرتے تھے اور وہی اس کا حساب کتاب رکھتے تھے۔ ان بزرگوں کو اپنے کام کے سوا اور کسی بات سے کوئی سروکار نہ تھا۔ حضرت ابن عباسؓ جو ترجمان القرآن حبرالامۃ وغیرہ عالمانہ القاب سے ملقب ہیں اور تدوین حدیث میں ان کا بڑا حصہ ہے، ان کے ایک بھائی عبیداللہ کی طبیعت کا میلان تو جود و سخا کی طرف تھا کہا جاتا ہے کہ معمولی معمولی باتوں پر ہزار دل روپے لوگوں کو دے دیتے تھے۔ ایک شخص نے ان سے آکر کہا کہ تم پر میرا حق ہے۔ بولے کیا؟ اس نے کہا کہ تم چاہ زمزم پر پانی پی رہے تھے، چہرہ پر دھوپ پڑ رہی تھی، میں نے اپنی چادر سے سایہ کر دیا تھا! بولے ہاں تیرا احسان یاد ہے۔ قیم (داروغہ) کو آواز دی پوچھا تیری تحویل میں اس وقت کتنی رقم ہے؟ دس ہزار درہم نقرئی اور دو سو طلائی دینار ہیں! اس نے جواب دیا۔ حضرت عبیداللہ نے حکم دیا سب اس شخص کو دے دو اور یہ ان کا عام حال تھا۔ لیکن وہی دولت جسے عبیداللہ اس طریقہ سے خرچ کرتے تھے ان کے بڑے بھائی حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ علم کی نشر و اشاعت پر صرف فرماتے تھے۔ بخاری میں ان کے مشہور شاگرد ابوجمرہ سے مروی ہے کہ صرف اس لئے تاکہ ابن عباسؓ کی آواز[1] دوسرے دور تک وہ پہنچایا کریں، حضرت نے اپنی آمدنی کا ایک حصہ ابوجمرہ کے لیے مخصوص فرما دیا تھا، اور یہ حال تو اس وقت کا ہے جب مسند درس پر جلوہ فرما ہو چکے تھے، لیکن یہی ابن عباسؓ باوجود اس ثروت و دولت کے اپنے طلب حدیث کے دنوں کو یاد کر کے فرماتے:

كُنْتُ لَآتِي الرَّجُلَ فِي الْحَدِيثِ يَبْلُغُنِي أَنَّهُ سَمِعَهُ مِنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأَجِدُهُ قَائِلًا فَأَتَوَسَّدُ رِدَائِي عَلَى بَابِهِ تَسْفِي الرِّيحُ التُّرَابَ عَلَى وَجْهِي حَتَّى يَخْرُجَ فَإِذَا خَرَجَ قَالَ يَا ابْنَ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا لَكَ؟ فَأَقُولُ بَلَغَنِي حَدِيثٌ عَنْكَ أَنَّكَ تُحَدِّثُهُ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأَحْبَبْتُ أَنْ أَسْمَعَهُ مِنْكَ فَيَقُولُ هَلَّا بَعَثْتَ إِلَيَّ حَتَّى آتِيَكَ فَأَقُولُ أَنَا أَحَقُّ أَنْ آتِيَكَ (دارمی)

حدیث کی طلب میں میں کسی ایسے آدمی کے پاس جاتا جن کے متعلق مجھے خبر ملتی کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ سنا ہے اور پاتا کہ وہ دوپہر میں آرام کر رہے ہیں تو اپنی چادر کو تکیہ بنا کر ان کے دروازے پر پڑ جاتا، ہوائیں دھول اڑا اڑا کر میرے چہرے پہ ڈالتیں اور یونہی اسی حال میں پڑا رہتا تا آنکہ خود وہ صاحب باہر نکل آتے۔ باہر نکل کر (جب مجھے دیکھتے) تو کہتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے آپ کیسے تشریف لائے ہیں۔ میں کہتا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تم کوئی حدیث روایت کرتے ہو، میں نے چاہا کہ اس حدیث کو تم سے سنوں۔ جواب میں وہ صاحب کہتے: آپ کسی کو بھیج دیئے ہوتے میں خود حاضر ہو جاتا، میں کہتا کہ تمہارے پاس حاضر ہونے کا مستحق میں ہوں

---

[1] بعضوں کا خیال یہ بھی ہے کہ ابوجمرہ چونکہ فارسی جانتے تھے اس لئے حضرت ابن عباس کی باتوں کا ترجمہ عربی نہ جاننے والوں کو سنا دیا کرتے تھے۔ ممکن ہے کہ دونوں کام کرتے ہوں

صحابہ کرام اور ان کے تلامذہ تابعین، تبع تابعین نیز دوسرے ائمہ اور بزرگوں نے اس فن کی تدوین میں کیا کیا مشقتیں برداشت کی ہیں ان کا تفصیلی ذکر آگے آرہا ہے۔ اس مثال کے پیش کرنے کی غرض اس وقت صرف یہ تھی کہ دولت و امارت نے ان کو امیرانہ چونچلوں میں الجھا نہیں دیا تھا بلکہ ان میں کتنے ایسے تھے جن کی آمدنی کا اکثر حصہ اسی علم کی خدمت میں صرف ہوتا تھا۔ مردوں ہی میں نہیں بلکہ عورتوں میں بھی اس علمی ولولہ کی کیفیت یہ تھی کہ معمولی معمولی عورتیں محض اس لئے کہ ان کا بچہ فن حدیث کا عالم ہو جائے ہزار ہا روپے خرچ کر ڈالتی تھیں۔ اس موقعہ پر عہد صحابہ کا قصہ یاد آیا کہ فروخ نامی ایک معمولی آدمی تھے، آزاد شدہ غلاموں کے طبقہ سے اُن کا تعلق تھا۔ غالباً فوج میں ملازم تھے۔ لیکن اس وقت مدینہ کی دولت کا یہ حال تھا کہ ادنیٰ ادنیٰ غلام سپاہی بھی تیس تیس چالیس چالیس ہزار دینار طلائی سکہ پس انداز کر سکتا تھا۔ تقریباً سیر کی اکثر کتابوں میں یہ واقعہ درج ہے کہ اپنا سارا اندوختہ بیوی کو سپرد کر کے وہ کسی نوکری پر طویل مدت کے لیے باہر چلے گئے۔ پندرہ بیس سال کے بعد واپسی ہوئی جس وقت جا رہے تھے ان کی بیوی حاملہ تھی پیچھے لڑکا پیدا ہوا، نام ربیعہ رکھا گیا۔ اس نیک دل خاتون کے علمی ذوق کا حال سنئے کہ انہوں نے شوہر کے سارے اندوختہ کو بچے کی تعلیم و تربیت پر ختم کر دیا اور اس زمانہ کی تعلیم کیا تھی؟ یہی قرآن و حدیث کی خدمت۔ فروخ جب گھر واپس ہوئے تو لڑکا جوان ہو کر نہ صرف عالم بلکہ مسجد نبوی کے حلقہائے درس کے ایک ممتاز ترین معلم کی حیثیت حاصل کر چکا تھا۔ امام مالک، امام اوزاعی، سفیان ثوری جیسے لوگ جنھیں بعد کو امت میں امامت کا منصب عطا ہوا، وہ ان کے شاگردوں میں شریک تھے۔ فروخ باہر سے بھی چار پانچ ہزار روپیہ کما کر لائے تھے۔ وہ تیسرے دن کے بعد بیوی سے اپنے گزشتہ پس انداز کا حساب دریافت کیا، بولیں کہ سب کو میں نے گاڑ رکھا ہے، کچھ دم لے لو تو انھیں نکالوں، لیکن ذرا کل تم صبح کی نماز کے بعد مسجد نبوی کے حلقہائے درس میں گشت تو لگانا۔ دوسرے دن انہوں نے یہی کیا، ایک حلقہ میں پہنچے تو خدا کی قدرت نظر آئی کہ ان کے لڑکے کو چاروں طرف سے شاگردوں کا حلقہ گھیرے ہوئے ہے۔ خوشی کے مارے پھولے نہ سماتے۔ گھر پہنچے اور بیوی سے حال بیان کیا۔ بیوی نے کہا کہو روپیہ لینا چاہتے ہو یا ایسا عالم لڑکا؟ میں نے تمہارے روپے اس کی تعلیم پر خرچ کر دیئے۔ فروخ نے اپنی بیوی کے فعل کی تحسین کی

علم حدیث کی تفصیل و تدوین و اشاعت و نشر میں عہد صحابہ اور اس کے بعد لوگوں نے کتنی حیرت انگیز مالی قربانیاں کی ہیں اس کے لیے ایک مستقل مقالہ کی ضرورت ہے میں اس وقت صرف دماغوں کو ادھر متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ منجملہ دیگر اسباب کے عہد صحابہ کی معاشی فراغبالی کو بھی دنیا کی تاریخ کے اس عجیب حصہ کی حفاظت میں غیر معمولی دخل ہے اور یہ سچ بھی ہے کہ جو کام ؎

دو یار زیرک و از بادۂ کہن دو منے
فراغتے و کتابے و گوشۂ چمنے

کے ماحول میں انجام پا سکتا ہے چہ خورد بامداد فرزندم کے سوال کے ہتھوڑوں سے چور دلوں میں بجز خاص استثنائی صورتوں کے عموماً ایسے پراگندہ روزوں سے پراگندہ دماغی ہی کی توقع کی جا سکتی ہے۔

خصوصاً جو واقعہ خاص اس علم کے ساتھ پیش آیا ہے اس کے لیے تو یہ ہونا زیادہ ضروری تھا کیونکہ چند گنے گنائے آدمیوں سے اس کا تعلق نہیں ہے اگر ایسا ہوتا، تو استثنائی قانون کا ممکن تھا کہ ظہور ہوتا لیکن آپ کو آئندہ معلوم ہوگا کہ تاریخ کے اس بسیط اور مختصر حصے کے بیان کرنے والوں کی

تعداد لاکھ سے متجاوز ہے۔ میرا مقصد یہ ہے کہ اب تک حدیث کے ابتدائی راویوں یعنی صحابۂ کرام کے کیفی حالات وخصوصیات سے میں بحث کر رہا تھا لیکن اس تاریخ کے مورخوں کا جو مقداری امتیاز ہے میرے خیال میں تدریج کے "قدرتی عوامل" میں غور وفکر کے لیے ان کو بھی کچھ کم اہمیت حاصل نہیں ہے۔ بلکہ ایک لحاظ سے تو یہ اس فن کی ایک ایسی امتیازی شان ہے جس کی نظیر فن تاریخ ہی میں نہیں دوسرے علوم میں بھی بمشکل مل سکتی ہے ڈاکٹر اشپرنگر کا یہ مشہور فقرہ کہ "کوئی قوم نہ دنیا میں ایسی گزری نہ آج موجود ہے جس نے مسلمانوں کی طرح "اسماء الرجال" کا سا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو جس کی بدولت آج پانچ لاکھ شخصوں کا حال معلوم ہو سکتا ہے۔

اسماء الرجال اور اس کی ضرورت کی تفصیل تو آگے آئے گی میں اس وقت آپ کی توجہ اس تاریخ کے اساسی مورخوں کی تعداد اور ان کی مختلف نوعیتوں کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔

حدیث کے ابتدائی راویوں کی تعداد

غور کیجیے، انصاف سے کہنا چاہیے کہ علمی دنیا کے ہاتھ میں آج تاریخ کا جتنا کچھ بھی سرمایہ ہے، وہی جس کی تعلیم وتعلم پر جامعات اور یونیورسٹیوں میں اور نشر واشاعت وتدوین وترتیب پر تصنیف گاہوں اور مطابع واشاعتی اداروں میں، حکومتوں اور عام پبلک کی جانب سے بلامبالغہ ہر سال کروڑہا کروڑ روپے صرف ہو رہے ہیں اور ان تمام مصارف کا شمار بہترین علمی خدمتوں میں ہے اور بلاشبہ یہ بہت بڑی علمی خدمت ہے لیکن تھوڑی دیر کے لیے اپنے اس علمی وفنی سرمایہ کا جائزہ لیجیے، قدیم ہو یا جدید، تاریخ کے کسی حصہ پر نظر ڈالیے کہ ابتداً میں ان واقعات کے بیان کرنے والوں یا ان کو ریکارڈ کرنے والوں کی تعداد کیا تھی؟ قطع نظر اس سے جیسا کہ میں نے شروع میں کہا تھا کہ واقعات کے عینی شاہدوں کا ان تاریخوں میں بجائے خود ایک پیچیدہ ترین سوال ہے۔ بالغرض اگر خوش قسمتی سے تاریخ کا کوئی حصہ ایسا مل بھی جائے جسے ہم خود چشم دید گواہوں کا بیان قرار دے سکتے ہوں اور اسی کے ساتھ یہ بھی مان لیا جائے کہ ہمیں ان کی دماغی اور اخلاقی منزلت کا بھی کسی نہ کسی ذریعہ سے علم حاصل ہو گیا ہو، اگرچہ جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ کوئی آسان مرحلہ نہیں ہے تاہم مان لیجیے کہ اس میں کامیابی ہو بھی جائے پھر بھی جہاں تک میرے معلومات ہیں اور میرا اندازہ ہے، ان تاریخوں کے ابتدائی راویوں کی تعداد بمشکل ایک دو سے متجاوز ہو سکتی ہے۔ آخر ہماری تاریخوں کی آج جو کچھ بھی بنیاد ہے وہ کوئی پرانے زمانے کی کسی پرانے مصنف کی کوئی یادگار، پرانی قبروں کا کوئی کتبہ پرانے سکوں کے ٹھپے، پرانے کھنڈروں کی کوئی سنگی یا برنجی تختی، یا ازیں قبیل کوئی اور چیز ہے یقینی سے یقینی تر چیز کسی شخص کی ذاتی خود نوشت سوانح عمری ہو سکتی ہے۔ اس احتمال کے سوا کہ اس قسم کی بیوگرافیاں کیا موجودہ زمانہ کے مینوفسٹی بیانات نہیں ہو سکتیں اور مان لیا جائے کہ ان میں گفتنی کے ساتھ تمام گفتنیوں کے اندراج کا بھی التزام کیا گیا ہو یا یوں کہیے کہ صاحب شعر و دیوان ہونے کی حیثیت کے ساتھ محلہ والوں[۱] کے معلومات بھی اس میں بیان کئے گئے ہوں لیکن ان سب کو بھی اگر قطع نظر کر دیا جائے تو جب بھی اس یقینی ترین تاریخی سرمایہ (خود نوشت سوانح عمری) کی حیثیت ایک شخصی بیان ہی کی ہو سکتی ہے اخلاقی اطمینان کے باوجود ایک شخصی دماغ پر نسل

۱؎ یہ اکبر مرحوم کے مشہور شعر ؎
اکبر کی حقیقت کو تم کچھ پوچھو محلے والوں سے،
ہاں خسرو اچھا کہتے ہیں، دیوان تو اُن کا دیکھا ہے
کی طرف تلمیح ہے۔

وزہوں، بھول چوک کی راہیں جتنی کھلی ہوئی ہیں ظاہر ہے لیکن اب آپ بتائیے تاریخ کے ایک اس نادرۂ روزگار حصہ پر نظر ڈالئے جس کا نام "حدیث" ہے جن چشم دید گواہوں اور عینی شاہدوں کے بیانات سے یہ واقعات حاصل کئے گئے ہیں ان کی تعداد کیا تھی؟ ابھی اس سلسلۂ روایت کی بعد کی کڑیوں سے بحث نہیں بلکہ آپ کے سامنے اس کا صرف پہلا حلقہ یعنی ان لوگوں کا سوال ہے جو خود اس واقعہ میں شریک تھے انہوں نے اس کو دیکھا اور اس نظر سے دیکھا جس سے ہر معمولی واقعہ نہیں دیکھا جاتا، بلکہ ایک امتی جس نظر سے اپنے پیغمبر کو، یا ایک مرید اپنے پیر کو یا صاف لفظوں میں کہیے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عجیب غریب صحابیوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ دیکھنے کے بھی وہ ذمہ دار تھے اور بیان کرنے کے بھی ذمہ دار تھے۔ جانتے ہیں کہ ان کی تعداد کیا تھی؟ علی بن ابی زرعہ جو فن رجال کے بڑے مشہور ائمہ میں ہیں، ان سے یہی سوال پوچھا گیا، جواب میں انہوں نے فرمایا

تُوُفِّيَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَنْ رَاٰهُ وَسَمِعَ مِنْهُ زِيَادَةٌ عَلٰى مِائَةِ اَلْفِ اِنْسَانٍ مِّنْ رَّجُلٍ وَّامْرَأَةٍ كُلُّهُمْ قَدْ رَوٰى عَنْهُ سَمَاعًا وَّرُؤْيَةً (اصابہ جلد ا ص ۳)	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی، اس وقت ان لوگوں کی تعداد جنہوں نے حضورؐ کو دیکھا اور آپ سے سنا تھا ایک لاکھ سے زیادہ تھی ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔ سب حضورؐ سے سن کر اور دیکھ کر روایت کرتے تھے۔

یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ابن ابی زرعہ نے یہ صحابیوں کی تعداد نہیں بتائی ہے بلکہ ان خاص اصحاب کی تعداد ہے جنہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا اور دیکھنے کے بعد آپ کے متعلق کوئی نہ کوئی بات روایت کی ہے۔ حدیث تاریخ کے جس حصہ کی تعبیر ہے اس کے ابتدائی رواۃ کی یہ تعداد کیا کوئی معمولی بات ہے؟ عموماً اس کو سن لیا جاتا ہے اور لوگ گزر جاتے ہیں لیکن تدبر سے بات سمجھ میں آتی ہے۔ ایک طرف آپ کے سامنے تاریخ کا وہ ذخیرہ ہے جس کے ابتدائی راویوں کا حال اگر معلوم بھی ہو سکتا ہے تو ان کی تعداد دو تین سے آگے بمشکل متجاوز ہو سکتی ہے اور بیچاری ایک تاریخ کیا بڑے بڑے مذہبی مستندات جن کے بھروسا پر آج کروڑہا کروڑ انسان ایمانی زندگی بسر کر رہے ہیں زیادہ تر ان کا بھی یہی حال ہے۔ خیال تو کیجیے کہ کہاں ایک لوقاؔ ایک مرقسؔ یا ایک سنجےؔ گاڑی بان کا بیان اور کہاں یہ ایک لاکھ سے اوپر چشم دید گواہوں کی شہادتیں۔ پھر یہ بھی تو دیکھنا چاہیے کہ عام تاریخی واقعات جیسا کہ پہلے بھی کہہ چکا ہوں، پراگندہ اور منتشر کثرتوں کا مجموعہ ہے اور ان بکھری ہوئی کثرتوں کے دیکھنے والے صرف ایک دو ہیں۔ ادھر ایک شخصی ذات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے اور ان کی سچی اور ہو بہو جیسے کہ وہ تھے، تصویر اتارنے کے لئے اردگرد لاکھوں زندہ آنکھوں کے کیمرے قدرت کی جانب سے کھڑے کئے گئے ہیں۔

چہ نسبت خاک را بعالم پاک

راویوں کی تعدادی مقدار کے روایت پر کیا کیا اثرات مرتب ہو سکتے ہیں، بادنیٰ تامل ہم اسے سمجھ سکتے ہیں۔

کثرتِ تعداد کا روایتوں کی وثاقت پر اثر

سب سے پہلی بات تو یہی ہے، ایک یا دو آدمی سے ظاہر ہے کہ اتنے واقعات کا احاطہ یقیناً ناممکن ہے، جو مشاہدہ کرنے والوں کی کثرت کی صورت میں

ل مختلف انجیلوں کے مختلف ابتدائی راویوں کے نام ہیں اور سنجے اس گاڑی بان کا نام ہے جو ہندوؤں کی مشہور کتاب گیتا کا سری کرشن سے تنہا راوی ہے۔ محض اس کی روایت کی بنیاد پر ہندو گیتا کو گویا ایک قسم کی آسمانی کتاب سمجھتے ہیں۔

ممکن ہے، پھر اسی کے ساتھ جب ہم اس کو بھی ملا لیتے ہیں کہ ان راویوں میں صرف مرد ہی نہیں بلکہ عورتوں کی بھی ایک بڑی جماعت شریک ہے تو احاطہ کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو جاتا ہے۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے مورخین صرف مرد ہوتے تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ ہم تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کے محض وہی واقعات پہنچے ہیں جن کا تعلق گھر کے باہر کی زندگی سے ہے لیکن بجائے جلوت کے خلوت یا گھریلو زندگی کے حالات پر یقیناً پردہ پڑا رہتا اور ایسے بہت سے مسائل جن کا خصوصی تعلق صرف عورتوں سے ہے ان کے متعلق کوئی واضح ہدایت نامہ ہمارے پاس نہ ہوتا۔ لیکن کون نہیں جانتا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ہر پہلو جلوت کا ہو یا خلوت کا کسی کو راز میں نہیں رکھا گیا۔ راویوں کی کثرت اور ان کی مختلف نوعیتوں ہی کا نتیجہ ہے کہ دوست ہی نہیں آج دشمن بھی اس کے اعتراف پر مجبور ہیں کہ "یہاں پورے دن کی روشنی ہے جو ہر چیز پر پڑ رہی ہے اور ہر ایک تک وہ پہنچ سکتی ہے۔" یہ باسورتھ کی شہادت ہے جس کا اظہار اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت (ص۱۵) میں کیا ہے اور اسی کے ساتھ یہ نکتہ بھی اگر ملحوظ رکھا جائے کہ باہر ہیں ہو یا اندر ہیں، قدرت نے ایسے اسباب فراہم کر دیئے تھے کہ صحرائے عرب کے ایک دور افتادہ نخلستانی قصبہ میں تقریباً دنیا کے بڑے بڑے قابلِ ذکر مذاہب یعنی بت پرستی، یہودیت، عیسائیت، مجوسیت کے ماننے والوں کو مسلمان کر کے حق تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت مبارک میں پہنچا دیا تھا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اصلاحی و تکمیلی زد ہیں دنیا کے تمام مذاہب پر جو پڑ رہی تھیں اس کے سمجھنے کے لیے خود ان مذاہب کے جاننے والوں کی ضرورت تھی، اور قدرت نے اس کا بھی سامان کر دیا تھا باہر میں بھی اور اندر بھی جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے اور عام طور پر لوگ اس سے واقف بھی ہیں۔ عملی طور پر ان عینی شاہدوں کی کثرت کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی تھا کہ قطع نظر اس سے کہ ایک واقعہ کے جب بہت سے دیکھنے والے ہوتے ہیں تو ہر ایک دوسرے کی تکذیب کے خیال سے عموماً غلط بیانی کرنے میں ہچکچاتا ہے۔ اگر صحابہ کرام کے جن خصوصیات کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے ان کی بنا پر یوں بھی ان سے قصداً کسی غلط بیانی کی کون توقع کر سکتا ہے لیکن جیسا کہ قرآن میں قانون شہادت کے ذکر کے سلسلے میں بیان کیا ہے، ایک گواہ کے سمجھنے یا یاد رکھنے میں اگر کوئی غلطی ہوئی ہو تو دوسرا اس کی اصلاح کر سکتا ہے۔ حدیث کے پڑھنے والے جانتے ہیں کہ ایک موقعہ پر نہیں بلکہ متعدد مواقع اس قسم کے پیش آئے ہیں جہاں راویوں کی کثرت تعداد کی وجہ سے غلط فہمیوں کی اصلاح ہوئی ہے۔ میرا مضمون بہت طویل ہو جائے گا ورنہ ان کے نظائر جن سے معمولی طلبہ تک واقف ہیں، یہاں پیش کرتا۔

ماسوا اس کے صحابی راویوں کی جو تعداد ابن ابی زرعہ کے حوالے سے میں نے اوپر نقل کی ہے ظاہر ہے کہ صحبت مبارک میں ان سب کا اجتماع ایک وقت میں نہیں ہوا تھا اور نہ یہ ممکن تھا کہ ہر لمحہ یا ہر جگہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ساتھ یہ سارا مجمع رہتا، اگرچہ حجۃ الوداع کے موقعہ پر تقریباً ایک لاکھ سے اوپر صحابیوں کا مجمع جمع ہو گیا تھا لیکن یہ ایک دفعہ کا واقعہ ہے ورنہ عموماً مدینہ منورہ میں جو تعداد صحابہؓ کی رہتی تھی یا غزوات و اسفار میں جو لوگ آپ کے ساتھ ہوتے تھے ان کی ظاہر ہے کہ اتنی تعداد کبھی اکٹھی نہیں ہوئی، بیس ہزار، دس ہزار، پانچ ہزار، تین ہزار، چار ہزار یا اس سے نیچے کی تعداد فوجی مہموں میں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عموماً رہی ہے۔ اگرچہ مدینہ منورہ میں ابتداً انصار کے ساتھ مہاجرین کا ایک خاص گروہ آپ کے ساتھ تھا لیکن جس وقت غزوۂ تبوک کا واقعہ پیش آیا ہے۔ کعب بن مالکؓ جو اس سفر میں رفاقت سے محروم

رہے تھے اور اس کا ایک دلچسپ واقعہ بخاری میں ان ہی کی زبانی منقول ہے۔ اس میں مدینہ کے اصحاب کا ذکر فرماتے ہوئے آپ نے یہ جملہ فرمایا تھا۔

وَالنَّاسُ كَثِيرٌ لَا يُحْصِيهِ دِيوَانٌ — لوگ بکثرت تھے، کسی دفتر میں ان کی تعداد منضبط نہ تھی۔

بہر حال مدینہ منورہ میں بالآخر اچھی خاصی جماعت باہر کے مہاجرین کی بھی جمع ہوگئی لیکن ظاہر ہے کہ ان سب کو ہر وقت اپنے مختلف مشاغل کی وجہ سے مجلس مبارک میں حاضری میسر نہیں آتی تھی کسی وقت کوئی رہتا تھا، کسی وقت کوئی۔ اب اگر راویوں کی تعداد دو چار پر ختم ہوجاتی تو وہ ذخیرہ جمع ہوسکتا تھا جو آج جمع ہوا ہے؟ یہ واقعہ ہے کہ گرد و پیش میں ان ہزاروں مردوں اور عورتوں کے رہنے، آنے جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر ایک کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے کسی نہ کسی واقعہ یا کسی قول کے محفوظ کرنے کا موقعہ ملا اور اپنی مذکورہ بالا ذمہ داریوں کی بنیاد پر بعض لوگوں نے تو یہ عام قاعدہ مقرر کر لیا تھا کہ اپنی حاضری کے دنوں میں اس عجیب و غریب شخصی تاریخ کے متعلق جن واقعات کا علم حاصل ہوتا تھا دوسرے دن اپنے غائب رفیق کو من و عن سنا دیا کرتے تھے بخاری میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

كُنْتُ أَنَا وَجَارٌ لِي مِنَ الْأَنْصَارِ فِي بَنِي أُمَيَّةَ بْنِ زَيْدٍ وَهِيَ مِنْ عَوَالِي الْمَدِينَةِ وَكُنَّا نَتَنَاوَبُ النُّزُولَ عَلَى رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَنْزِلُ يَوْمًا وَأَنْزِلُ يَوْمًا فَإِذَا أَنْزَلْتُ جِئْتُهُ بِخَبَرِ ذٰلِكَ الْيَوْمِ مِنَ الْوَحْيِ وَغَيْرِهِ وَإِذَا نَزَلَ فَعَلَ مِثْلَ ذٰلِكَ۔

میں اور میرا ایک انصاری پڑوسی ہم دونوں امیہ بن زید والوں کی بستی میں رہتے تھے جو مدینہ کے عوالی کی بستیوں میں سے ہے۔ ہم دونوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں باری باری سے حاضر ہوتے تھے۔ ایک دن وہ حاضر ہوتے، ایک دن میں حاضری دیتا۔ میں جس دن حاضر ہوتا اس دن کے حالات اور خبریں وحی وغیرہ کی ان کو سناتا اور جب وہ حاضر ہوتے تو وہ بھی یہی کرتے۔

ابتداءً اسلام میں محدود معاشی ذرائع ہونے کا یہ لازمی نتیجہ تھا۔ مہاجرین بیچاروں کو اپنے اپنے اہل و عیال کی پرورش کے لیے عموماً بیوپار یا صنعتی کاروبار میں مشغول ہونا پڑتا تھا۔ جس گاؤں کا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ذکر کیا، یہاں آپ کی نگرانی میں کپڑے بننے کی کارگاہیں تھیں۔ سنخ نامی گاؤں میں حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا کارخانہ تھا۔ انصار عموماً اپنے باغوں اور کھیتوں پر کام کرتے تھے لیکن با ایں ہمہ ایک جماعت ان لوگوں کی بھی تھی جو اپنے در گھر سے جدا ہو کر نومسلموں کے لیے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبوی میں صُفّہ نامی جو مدرسہ قائم فرمایا تھا اُس میں داخل ہوجاتے تھے، ان کے قیام و طعام کا نظام خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا مدینہ کے خوش باش لوگ کیا کرتے تھے۔ اس لیے معاشی افکار سے الگ ہو کر ان کا زیادہ کام یہی تھا کہ قرآن سیکھیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و سنن یاد کریں۔ اسی جماعت کے سرکردہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں جو ذخیرۂ حدیث کے سب سے بڑے راوی ہیں۔ لوگوں کو ان کی کثرتِ روایت پر کبھی

تعجب ہوتا تو خود ہی فرماتے:

اِنَّکُمْ تَزْعُمُوْنَ اَنَّ اَبَا هُرَیْرَةَ یُکْثِرُ الْحَدِیْثَ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَاللّٰهُ الْمَوْعِدُ اِنِّیْ کُنْتُ امْرَءً مِسْکِیْنًا اَصْحَبُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللّٰه علیه وَسَلَّمَ عَلٰی مِلْءِ بَطْنِیْ وَکَانَ الْمُهَاجِرُوْنَ یُشْغِلُهُمُ الصَّفْقُ بِالْاَسْوَاقِ وَکَانَتِ الْاَنْصَارُ یُشْغِلُهُمُ الْقِیَامُ عَلٰی اَمْوَالِهِمْ۔

(بخاری)

تم لوگ خیال کرتے ہو کہ ابو ہریرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ حدیثیں بیان کیا کرتا ہے مگر قسم ہے خدا کی کہ میں ایک غریب مسکین آدمی تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس صرف پیٹ پر پڑا رہتا تھا، درآں حالیکہ مہاجرین بازاروں کے کاروبار میں مشغول رہتے اور انصار اپنے اموال (باغ اور کھیت) میں الجھے رہتے۔

ایک، دوسرے موقع پر یہ بیان کرتے ہوئے کہ اس سلسلے میں وہ کیا کرتے تھے، خود تفصیل فرماتے ہیں:

قَدِمْتُ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بِخَیْبَرَ اَنَا یَوْمَئِذٍ قَدْ زِدْتُ عَلَی الثَّلٰثِیْنَ فَاَقَمْتُ مَعَهٗ حَتّٰی مَاتَ وَاَدُوْرُ مَعَهٗ بِیُوْتِ نِسَائِهٖ وَاَخْدِمُهٗ وَاَغْزُوْ مَعَهٗ وَاَحُجُّ۔

(ابن سعد)

میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں خیبر کے مقام پر حاضر ہوا، اس وقت میری عمر تیس سال سے اوپر ہو چکی تھی، پھر میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس قیام کر لیا، یہاں تک کہ آپ کی وفات ہو گئی۔ میں آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ لگا رہتا، آپ اپنی بیویوں کے مکانوں پر جاتے تو میں آپ کے ساتھ جاتا، ہر وقت آپ کی خدمت کرتا، حج میں اور جہاد کے سفروں میں آپ کے ساتھ جاتا۔

طالب العلمی کے ان دنوں میں ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر کیا کیا گزری، بعد کو مزے سے لے کر بیان کرتے۔ کبھی کہتے جیسا کہ امام بخاری راوی ہیں:

وَاللّٰهِ الَّذِیْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اِنْ کُنْتُ لَاَعْتَمِدُ عَلَی الْاَرْضِ بِکَبِدِیْ مِنَ الْجُوْعِ وَاَشُدُّ الْحَجَرَ عَلٰی بَطْنِیْ۔

اس خدا کی قسم جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے کہ بھوک کی وجہ سے میں جگر تھام کر زمین پر ٹیک لگا لیتا اور اپنے پیٹ پر پتھر باندھتا۔

کبھی فرماتے:

رَاَیْتُنِیْ اُصْرَعُ بَیْنَ مِنْبَرِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَحُجْرَةِ عَائِشَةَ

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے حجرہ کے درمیان میں چکرا

فَيَقَالُ مَجْنُونٌ وَمَا بِي جُنُونٌ إِنْ هُوَ إِلَّا الْجُوعُ ۔ (صحاح)

کر گر پڑتا، خیال کیا جاتا کہ میں پاگل ہوں حالانکہ مجھے جنون سے کیا تعلق، وہ تو صرف بھوک کا اثر تھا۔

مگر یہ سب کچھ گزر رہا تھا، دوسرے ساتھیوں کو یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ کاروبار کر کے آرام اٹھا رہے ہیں، مگر تیس بتیس سال کا یہ دوسی یمنی نوجوان ؎

موجِ خون سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے
آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا

کہ کر بیٹھ گیا تھا، اور اس وقت تک بیٹھا رہا جب تک کہ حتی توفی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ اور اس قسم کے یہ ایک آدمی نہیں ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جن کا خطاب ہی صحابہ کی جماعت میں صاحب النعلین والسواک والوسادۃ تھا حضرت ابو موسیٰ اشعری کہتے ہیں کہ ہم جب یمن سے آئے تو ابن مسعودؓ کے متعلق مدت تک ہم سمجھتے رہے کہ:

أَنَّهُ رَجُلٌ مِنْ أَهْلِ بَيْتِ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِمَا نَرَى مِنْ دُخُولِهِ وَدُخُولِ أُمِّهِ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (اصابہ)

وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کے کوئی آدمی ہیں جس کی وجہ ان کی اور ان کی ماں کی آمد و رفت تھی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتی رہتی تھی۔

ان کو دربارِ رسالت سے یہ حکم ملا ہوا تھا کہ

علی ترفع الحجاب وتسمع سوادی (اصابہ)

ابن مسعود! تم پردہ کو اٹھا کر میرے حجرہ میں آ سکتے ہو اور تنہائی کی گفتگو سن سکتے ہو۔

اسی طرح حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں، جو نو سال تک مسلسل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خانگی خدمت میں رہے اور ان کے سوا بھی حضورؐ کے موالی مثلاً رافع، بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہم ہیں جو بہت کم مجلس رسالت کی حاضری سے محروم رہتے تھے۔ یہ تو مردوں میں اور عورتوں میں یہی حال امہات المومنین کا تھا، جن میں کوئی نہ کوئی خلوت کی زندگی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہتی تھیں۔ ان ہی باتوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ صحابہ میں جن لوگوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جن امور کا علم براہِ راست حاصل نہ ہوتا تھا ان کو وہ اپنے دوسرے بھائیوں اور ساتھیوں کے ذریعہ سے معلوم کر لیا کرتے تھے اور اس میں بڑے اور چھوٹے کی بحث نہیں تھی۔ خود حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے کہ:

كَانُوا يَعْرِفُونَ لُزُومِي فَيَسْأَلُونِي عَنْ حَدِيثِهِ مِنْهُمْ عُمَرُ وَعُثْمَانُ وَعَلِيٌّ وَطَلْحَةُ وَالزُّبَيْرُ ۔ (ابن سعد)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ میری وابستگی کا حال لوگوں کو چونکہ معلوم تھا اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں مجھ سے پوچھا کرتے، ان کے پوچھنے والوں میں عمرؓ بھی ہیں اور عثمانؓ بھی علیؓ بھی طلحہؓ بھی زبیرؓ بھی۔

حدیث کی کتابوں میں اس کا ایک ذخیرہ موجود ہے جس میں خلفائے راشدین اور دوسرے جلیل القدر اصحاب نے باہم ایک دوسرے

سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پوچھی ہے ۔ مردوں میں اگر پتہ نہیں چلتا تو امہات المومنین کے پاس آدمی بھیجا جاتا کہ اگر ان کو کوئی علم ہو تو بیان کریں، ایک دن حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ جن کا ابھی ذکر گزرا، حالانکہ نو سال تک صحبت نبوی میں ان کو ہمہ وقتی رفاقت کا موقعہ ملا ہے لیکن ایک حدیث بیان کر رہے تھے کہ حلقہ کے لوگوں میں سے کسی نے پوچھا،

اَنْتَ سَمِعْتَهٗ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ۔	کیا آپ نے اس حدیث کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے؟

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب میں فرمایا :

مَا كُلُّ مَا نُحَدِّثُكُمْ بِهٖ سَمِعْنَاهُ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلٰكِنْ كَانَ يُحَدِّثُ بَعْضُنَا بَعْضًا ۔ (مستدرک حاکم)	ہم تم سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جو باتیں بیان کرتے ہیں، سب خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے ہم نے نہیں سنا ہے بلکہ ہم میں بعضوں نے بعض سے بھی سنا ہے (یعنی ایک صحابی نے دوسرے صحابی سے سنا ہے)

ورنہ یہ بھی تھا بہت بڑا عظیم نفع حضرات صحابہ کی کثرت تعداد کا۔ ہر ایک اپنی کمی دوسرے کے علم سے پوری کرتا تھا۔ اپنے علم کی تکمیل کے شوق ہی کا نتیجہ یہ تھا کہ تابعین یا اصاغر صحابہ ہی کے زمانے میں نہیں بلکہ خود باہم ایک صحابی سے اپنے علمی نقص کی تکمیل کے لیے کبھی کبھی لمبے لمبے سفر کئے ہیں اور قرآن نے اسوۂ حسنہ کی کامل اتباع اور پیروی کا ان سے جو مطالبہ کیا تھا اس کا لازمی نتیجہ یہی ہونا بھی چاہیے تھا۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جن کا گھر مدینہ ہی میں تھا اور خاص طور پر حدیث کے مشہور سرمایہ داروں میں ان کا شمار ہے جیسا کہ آگے بیان ہوگا۔ خود بیان کرتے ہیں ۔

بَلَغَنِيْ حَدِيْثٌ عَنْ رَّجُلٍ مِّنْ اَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَابْتَعْتُ بَعِيْرًا فَشَدَدْتُ عَلَيْهِ رَحْلِيْ ثُمَّ سِرْتُ اِلَيْهِ شَهْرًا حَتّٰى قَدِمْتُ الشَّامَ فَاِذَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ اُنَيْسٍ الْاَنْصَارِيُّ فَاَتَيْتُ مَنْزِلَهٗ وَاَرْسَلْتُ اِلَيْهِ اَنَّ جَابِرًا عَلَى الْبَابِ فَرَجَعَ اِلَيَّ الرَّسُوْلُ فَقَالَ جَابِرُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ فَقُلْتُ نَعَمْ فَخَرَجَ اِلَيَّ فَاعْتَنَقْتُهٗ وَاعْتَنَقَنِيْ قَالَ قُلْتُ حَدِيْثٌ بَلَغَنِيْ عَنْكَ اَنَّكَ سَمِعْتَهٗ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْمَظَالِمِ لَمْ اَسْمَعْهُ اَنَا مِنْهُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ	آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں میں سے ایک صاحب کے واسطے سے مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث پہنچی میں نے اسی وقت ایک اونٹ خریدا اور اس پر اپنا کجاوہ کس کر ایک ماہ تک چلتا رہا یہاں تک کہ شام پہنچا اور عبداللہ بن انیس انصاری (جن سے حدیث پہنچی تھی، ان) کے گھر پہنچا اور اندر آدمی بھیجا کہ دروازہ پر جابر کھڑا ہوا ہے آدمی نے واپس آکر پوچھا کہ کیا جابر بن عبداللہ ہیں؟ میں نے کہا ہاں! عبداللہ بن انیس باہر نکل پڑے، دونوں ایک دوسرے کے گلے سے لپٹ گئے۔ پھر میں نے پوچھا کہ مجھے آپ کے ذریعہ سے ایک حدیث پہنچی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مظالم کے متعلق آپ نے سنی ہے

اللہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ الْحَدِیْث
(جامع بیان العلم ابن عبد البر ص ۹۳)

اور میں نہیں سن سکا ہوں۔ عبداللہ بن انیس نے جواب میں فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ فرماتے تھے (پھر عبداللہ نے پوری حدیث

اس سے بھی زیادہ دلچسپ واقعہ مشہور صحابی حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ مدفونِ قسطنطنیہ[ل] کا ہے کہ ایک حدیث انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست خود سنی تھی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کچھ شک پیدا ہوا۔ آپ کے ساتھ اس حدیث کے سننے کے وقت عقبۃ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ صحابی بھی دربارِ رسالتؐ میں موجود تھے لیکن وہ مصر میں قیام پذیر ہو گئے تھے۔ سن کر حیرت ہوگی کہ صرف ایک حدیث میں معمولی شک مٹانے کے لیے حضرت ابو ایوب رضی اللہ تعالیٰ عنہ مدینہ منورہ سے مصر روانہ ہوتے ہیں، اور حضرت عقبہ بن عامرؓ کے پاس حاضر ہو کر فرماتے ہیں:

حَدِّثْنَا مَا سَمِعْتَہٗ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْ سَتْرِ الْمُسْلِمِ لَمْ یَبْقَ اَحَدٌ سَمِعَہٗ غَیْرِیْ وَغَیْرُکَ۔

مجھ سے اس حدیث کو بیان کرو جسے تم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مسلمانوں کی عیب پوشی کے متعلق سنا ہے اب اس حدیث کے سننے والوں میں میرے اور تمہارے سوا کوئی باقی نہیں رہا ہے۔

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کے سامنے اس حدیث کو دہراتے ہیں، حدیث یہ تھی، مَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا اَخْزَیَہٗ سَتَرَہُ اللّٰہُ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ۔ وہ سنتے ہیں۔ اس کے بعد کیا ہوتا ہے، وہ اس سے بھی عجیب تر ہے کہ

فَاَتٰی اَبُوْ اَیُّوْبَ رَاحِلَتَہٗ فَرَکِبَھَا وَانْصَرَفَ اِلَی الْمَدِیْنَۃِ وَمَا حَلَّ رَحْلَہٗ
(۹۴۔ جامع)

حضرت ابو ایوب رضی اللہ تعالیٰ عنہ حدیث سنتے ہی اپنی سواری کی طرف پلٹے، سوار ہوئے اور مدینہ کی طرف روانہ ہوگئے، آپ نے (مصر میں) اپنا کجاوہ بھی نہ کھولا۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ جن کے نام نامی سے حدیث کا ابتدائی طالب علم بھی واقف ہے۔ ان کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ ان ابا سعید رحل فی حرف یعنی حدیث کے ایک حرف کی تصحیح کے لیے ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے باضابطہ کوچ کیا۔ دارمی میں ایک اور صحابی کے متعلق ہے۔

[ل] قسطنطنیہ میں آپ کے دفن کا واقعہ بڑا عبرت انگیز ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مسلمان قسطنطنیہ کا محاصرہ کئے پڑے تھے جس میں حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی تھے۔ اتفاق سے بیمار ہوئے اور یقین ہوگیا کہ آخری وقت ہے وصیت فرمائی کہ میری وفات کے بعد جنازہ کو لے کر مسلمان حملہ کریں اور دشمن کی زمین میں جہاں تک گھس سکتے ہوں گھستے چلے جائیں آخری نقطہ جہاں تک تمہاری رسائی ہو، اسی جگہ مجھے دفن کر دینا۔ جنازہ لے کر مسلمانوں نے حملہ کیا اور غنیم کو پسپا کرتے ہوئے فصیل کی دیوار تک پہنچ گئے، وہیں قبر کھود کر حضرت کو دفن کر دیا گیا۔ محمد فاتح نے جب صدیوں بعد قسطنطنیہ فتح کیا تو خواب میں آپ نے اپنی قبر کا نشان دیا اسی پر جامع ابی ایوب تیار ہوئی۔

اَنَّ رَجُلاً مِّنْ اَصْحَابِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ رَحَلَ اِلٰی فُضَالَۃَ بْنِ عَبْدِ اللّٰہِ وَھُوَ بِمِصْرَ فَقَدِمَ عَلَیْہِ وَھُوَ یَمُدُّ لِنَاقَۃٍ لَّہٗ فَقَالَ مَرْحَبًا قَالَ اَمَا اِنِّیْ لَمْ اٰتِکَ زَائِرًا وَلٰکِنْ سَمِعْتُ اَنَا وَاَنْتَ حَدِیْثًا مِّنْ رَّسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ رَجَوْتُ اَنْ یَّکُوْنَ عِنْدَکَ مِنْہُ عِلْمٌ۔ (دارمی)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں میں سے ایک صحابی فضالہ بن عبداللہ کے پاس مصر پہنچے۔ فضالہ اس وقت اپنی اونٹنی کا چارہ تیار کر رہے تھے۔ انہوں نے خوش آمدید کہا۔ صحابی نے جواب میں فرمایا کہ میں تمہاری ملاقات کو نہیں آیا ہوں بلکہ ہم نے اور تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث سنی تھی۔ میں یہ امید کر کے آیا ہوں کہ وہ تمہیں یاد ہو گی۔

یہ تو بڑے بڑے صحابیوں کا حال تھا۔ باقی ایسے کم سن اصحاب جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت مبارک سے اتنا فائدہ نہ اٹھا سکے تھے یا ان کے معاصر یا تلامذہ جنھیں تابعین کہتے ہیں، اس باب میں تو ان کے کارناموں کا کوئی ٹھکانا ہی نہیں ہے۔ میں نے ذکر کیا تھا کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہا باوجود قرابتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کے صحابہ کے دروازوں پر تلاشِ حدیث میں گرد کھاتے پھرتے تھے۔ حضرت ابن عباسؓ نے صحابہ کی کثرتِ تعداد کے اس فائدے کو محسوس کر لیا تھا کہ ان کے ذریعہ سے اپنی تاریخ کے تمام خط و خال کی تکمیل میں پوری مدد مل سکتی ہے۔ اس سلسلے میں اپنے ایام طلب کے قصے بیان کرتے ہوتے ہوئے فرماتے کہ میں نے اپنے ایک رفیق سے کہا کہ:

ھَلُمَّ فَلْنَسْاَلْ اَصْحَابَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَاِنَّھُمُ الْیَوْمَ کَثِیْرٌ۔

چلو بھائی! ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں سے چل کر دریافت کریں کیونکہ ابھی ان کی بڑی تعداد موجود ہے۔

لیکن ان کے رفیق بخت کے چھوٹے تھے، بولے:

یَا ابْنَ عَبَّاسٍ اَتَرَی النَّاسَ یَحْتَاجُوْنَ اِلَیْکَ وَفِی النَّاسِ مِنْ اَصْحَابِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ۔ (دارمی)

ابن عباس کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ لوگ تمہارے بھی محتاج ہوں گے حالانکہ ابھی تو لوگوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے صحابی موجود ہیں۔

لیکن اس بیچارے کو کیا معلوم تھا کہ یوں ہی چھوٹے بڑوں کے گزرنے کے بعد بڑے بنتے ہیں۔ بعد کو اپنے علمی سرمایہ کی بدولت جب ابن عباسؓ مرجع انام بن گئے تو وہ بیچارے پچھتاتے تھے اور کہتے تھے، کَانَ ھٰذَا الْفَتٰی اَعْقَلَ مِنِّیْ (یہ نوجوان مجھ سے زیادہ دانشمند تھا)۔ تابعین میں سعید بن المسیب، مسروق وغیرہ، جن کے حالات آگے آ رہے ہیں، ان کے بیانوں میں اس قسم کے واقعات بکثرت ملتے ہیں۔ حضرت سعید بن المسیب سے امام مالکؒ راوی ہیں:

اِنِّیْ کُنْتُ لَاَسِیْرُ اللَّیَالِیَ وَالْاَیَّامَ فِیْ طَلَبِ الْحَدِیْثِ۔ (جامع)

میں حدیث کی تلاش میں کئی کئی دن اور کئی کئی راتیں مسلسل چلتا رہا ہوں۔

حضرت مسروق کے متعلق بھی بیان کیا جاتا ہے کہ رحل فی حرف (یعنی صرف ایک لفظ کی تحقیق کے لیے کوچ کیا) ان تابعیوں کی نزاکتِ ذوق کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ بسا اوقات کوئی حدیث ان کو ایسے آدمی سے پہنچتی جو شرفِ صحبت سے فیض یاب نہ ہوتے، حالانکہ اس حدیث کا علم ان کو حاصل ہوچکا ہوتا، لیکن اگر یہ معلوم ہوجاتا کہ جس صحابی سے یہ روایت بیان کی جاتی ہے وہ زندہ ہیں تو خواہ وہ کسی مقام پر ہوتے، ان تک پہنچ کر کوشش کرتے کہ براہِ راست بھی اس روایت کو صحابی سے خود سن لیں۔ دارمی نے ابوالعالیہ سے یہ روایت درج کی ہے:

كُنَّا نَسْمَعُ الرِّوَايَةَ بِالْبَصْرَةِ عَنْ أَصْحَابِ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ وَسَلَّمَ فَلَمْ نَرْضَ حَتَّى رَكِبْنَا إِلَى الْمَدِينَةِ فَسَمِعْنَاهَا مِنْ أَفْوَاهِهِمْ۔ (دارمی)

ہم لوگ بصرہ میں ایک روایت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں کے حوالے سے سنتے تھے مگر ہم صرف اسی پر قناعت نہیں کرلیتے تھے جب تک سوار ہوکر مدینہ پہنچ کر خود ان صحابیوں کی زبانی بھی اس روایت کو نہ سن لیتے۔

یہ کسی خاص شخص کا حال نہیں ہے بلکہ عام تابعین کے طرزِ عمل کا بیان ہے۔ طلبِ حدیث کے لیے رحلت کا ایسا عام مذاق پھیل گیا تھا کہ بطورِ امورِ عامہ کے بعض بعض تابعین کی زبان پر یہ لطیفہ جاری ہوگیا یعنی شاگردوں سے حدیث بیان کرتے اور آخر میں انھیں مخاطب کرکے بطورِ طیب کے فرماتے:

خُذْهَا بِغَيْرِ شَيْءٍ قَدْ كَانَ الرَّجُلُ يَرْحَلُ فِيمَا دُونَهَا إِلَى الْمَدِينَةِ (ابن سعد)

بغیر کسی معاوضہ کے (مفت) یہ حدیث لیلو ورنہ حال یہ تھا کہ اس سے بھی کم چیز کے لیے لوگ مدینہ تک سفر کرتے تھے۔

یہ حضرت شعبی کا قول ہے جو کوفہ میں اپنے طلبہ سے مزاحاً کبھی کبھی کہا کرتے تھے۔ مذکورۂ بالا عوامل و موثرات سچ پوچھئے تو بجائے خود ان میں ہر ایک حدیث یعنی تاریخ کے اس عجیب و غریب سرمایہ کی حفاظت کی کافی ضمانت ہے، لیکن جہاں یہ سارے اسباب اکٹھے ہوگئے ہوں؟ اور اب اسی کے ساتھ آپ اس عام تاریخی دعوے کو بھی اپنے سامنے رکھیے کہ:

مَذْهَبُ الْعَرَبِ أَنَّهُمْ كَانُوا مَطْبُوعِينَ عَلَى الْحِفْظِ مَخْصُوصِينَ بِذٰلِكَ۔ (جامع)

عرب کا عام طریقہ تھا کہ زبانی یاد رکھنے کی گویا ان کی فطری عادت سی تھی، اس بات میں ان کو خاص خصوصیت حاصل تھی۔

عرب کا بدو کتابوں کے طومار کو دیکھ کر مذاق اڑاتا تھا۔ بدوؤں کا یہ عام چلتا ہوا فقرہ تھا۔ "حَرْفٌ فِي تَامُورِكَ خَيْرٌ مِنْ عَشَرَةٍ فِي كُتُبِكَ" (دل میں ایک حرف کا محفوظ رہنا، کتابوں کی دس باتوں سے بہتر ہے)

عرب کا مشہور شاعر کہتا ہے ؎

لَيْسَ بِعِلْمٍ مَا حَوَى الْقِمَطْرُ — مَا الْعِلْمُ إِلَّا مَا حَوَى الصَّدْرُ

علم وہ نہیں ہے جو کتابوں میں درج ہے — نہیں ہے علم لیکن صرف وہی جو سینہ میں محفوظ ہو،

دوسرا کہتا ہے ؎

اِسْتَوْدَعَ الْعِلْمَ قِرْطَاسًا فَضَيَّعَهُ   وَبِئْسَ مُسْتَوْدَعُ الْعِلْمِ قَرَاطِيْسُ

جس نے علم کو کاغذ کے سپرد کیا اس نے اُسے ضائع کیا۔ علم کے بدترین مدفن کاغذ ہیں۔

تیسرے کا شعر ہے ؎

عِلْمِیْ مَعِیْ حَیْثُ مَا یَمَّمْتُ اَحْمِلُهٗ   بَطْنِیْ وِعَاءٌ لَّهٗ لَا بَطْنُ صُنْدُوْقٍ

میرا علم میرے ساتھ ہے جہاں جاتا ہوں اُٹھائے لئے جاتا ہوں، میرا باطن اس علم کا محافظ ہے نہ کہ شکم صندوق۔

اِنْ کُنْتُ فِی الْبَیْتِ کَانَ الْعِلْمُ فِیْهِ مَعِیْ   اِذَا کُنْتُ فِی السُّوْقِ کَانَ الْعِلْمُ فِی السُّوْقِ

اگر گھر میں رہتا ہوں تو علم میرے ساتھ رہتا ہے، جب بازار میں ہوتا ہوں تو میرا علم بھی بازار میں ہوتا ہے۔

کم از کم ان اشعار سے اس قوم کے خاص رجحان کا پتہ چلتا ہے۔ لکھنے اور کتابت کے متعلق شاید ہی کسی زبان میں اس قسم کے اشعار مل سکتے ہیں۔ سوسائٹی کے اس خاص مذاق کا یہ نتیجہ تھا کہ قدرتی طور پر ان کو اپنے حافظہ پر بھروسا کرنا پڑتا تھا۔ قاعدہ ہے کہ انسان اپنی جس قوت کو زیادہ استعمال کرتا ہے۔ اس میں جلا پیدا ہو جاتی ہے۔ مختلف اقوام کی مختلف چیزوں کے ساتھ خاص مناسبت کی یہی وجہ ہے۔ اسی لئے یہ مسلّم ہے، اِنَّ الْعَرَبَ قَدْ خُصَّتْ بِالْحِفْظِ (عرب حافظہ کی قوت میں خصوصیت رکھتے تھے) ان کے حافظہ کی قوت کے جو واقعات کتابوں میں درج ہیں کتابی قوموں کے لیے حقیقت یہ ہے کہ ان کا باور کرنا دشوار ہے۔ حافظ عمر بن عبد البر لکھتے ہیں:

کَانَ اَحَدُهُمْ یَحْفَظُ اَشْعَارَ بَعْضٍ فِیْ سَمْعَةٍ وَّاحِدَةٍ

ان میں بعض لوگ صرف ایک دفعہ سن کر لوگوں کے اشعار یاد کر لیا کرتے تھے۔

ابن عباسؓ کے متعلق مشہور ہے کہ ان کے سامنے عمر بن ابی ربیعہ شاعر آیا اور ستر شعر کا ایک طویل قصیدہ پڑھ گیا۔ شاعر کے جانے کے بعد ایک شعر کے متعلق گفتگو چلی، ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ مصرعہ اس نے یوں پڑھا تھا۔ جو مخاطب تھا اس نے پوچھا کہ تم کو پہلی دفعہ میں کیا پورا مصرعہ یاد رہ گیا؟ بولے کہو تو پورے ستر شعر سنا دوں اور سنا دیا۔ حدیث کے مشہور راوی امام زہری کا بیان لوگ نقل کرتے ہیں کہ:

اِنِّیْ لَاَمُرُّ بِالْبَقِیْعِ فَاَسُدُّ اُذُنَیَّ مَخَافَةَ اَنْ یَّدْخُلَ فِیْهَا شَیْءٌ مِّنَ الْخَنَا فَوَاللّٰهِ مَا دَخَلَ اُذُنَیَّ شَیْءٌ قَطُّ فَنَسِیْتُهٗ۔

(ابن عبدالبر)

میں "بقیع" کی طرف گزرتا ہوں تو اپنے کانوں کو بند کر لیتا ہوں اس اندیشے کہ ان میں کوئی فحش بات داخل ہو جائے، کیونکہ قسم خدا کی میرے کان میں کوئی بات اب تک ایسی داخل نہیں ہوئی ہے۔ جسے میں بھول گیا ہوں۔

شعبی بھی یہی کہتے تھے:

مَا کَتَبْتُ سَوْدَاءَ فِیْ بَیْضَاءَ وَمَا اسْتَعَدْتُ حَدِیْثًا

میں نے کبھی سیاہی سے سفیدی پر کچھ نہیں لکھا اور نہ کسی شخص

مِنَ النِّسْیَانِ۔ (ابن سعد) کی گفتگو میں نے کبھی بھولنے کے باعث دہرائی۔

غیروں پر تو حجت نہیں ہو سکتی، لیکن علمائے اسلام کا خیال ہے کہ علاوہ اس کے کہ عرب کا حافظہ قدرتی طور پر غیر معمولی تھا، یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ قرآن مجید کے متعلق جس نے انا لہ لحافظون کا اعلان کیا تھا۔ اسی نے قرآن کی عملی شکل یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی حفاظت جن کے سپرد کی تھی ان کے حافظوں کو غیبی تائیدوں کے ذریعے سے بھی کچھ غیر معمولی طور پر قوی تر کر دیا تھا اور یہ تو بخاری میں ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دربارِ رسالت میں نسیان کی جب شکایت کی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص توجہ اور دعا کے ذریعے سے ان کا حافظہ ایسا ہو گیا کہ پھر وہ کوئی چیز بھول نہیں سکتے تھے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ روایت تمام صحاح کی کتابوں میں مروی ہے۔ تقریباً شہرت کے انتہائی درجہ پر پہنچی ہوئی ہے۔

صحابۂ کرام حدیث کے زندہ نسخے تھے

بہر حال صحابہ کا ذوقِ اتباع میں حتی الوسع ممکنہ حد تک اپنے کو بھی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قریب تر کرنے کی کوشش اور اسی رنگ میں دوسروں کو رنگنے کا ان میں بے پناہ جذبہ، ان تمام خصوصیات کے ساتھ جن کا میں نے ذکر کیا، اس کے بعد میں دعویٰ کر دوں کہ جن واقعات اور حالات اور جن اقوال و ملفوظات کا ظہور آنحضرتؐ سے ہوا تھا صحابۂ کرام اپنے اپنے علم کی حد تک آنحضرتؐ کے زندہ مثنی بنے ہوئے تھے اور اس طرح تاریخ کی وہ کتاب یعنی حضورؐ کی زندگی عہدِ صحابہ میں بجائے ایک نسخہ کے ہزاروں نسخوں کی صورت میں موجود ہو چکی تھی تو کیا میرے اس دعوے کو کوئی غلط ثابت کر سکتا ہے؟ پس تدوینِ حدیث کی پہلی صورت تو خود صحابۂ کرام کی زندگی تھی اور یہی تھی حفاظتِ حدیث یا اس تاریخ کے محفوظ کرنے اور رہونے کی پہلی صورت۔ میرا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ ہر صحابی اپنی زندگی میں بالکلیہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہو بہو نقل تھے۔ اگرچہ خلفائے راشدین ہی نہیں بلکہ درجہ میں ان سے بھی جو فروتر اصحاب ہیں ہم کتابوں میں یہ الفاظ ان کے متعلق پاتے ہیں۔ عبدالرحمٰن بن زید سے ترمذی میں مروی ہے کہ میں نے حضرت حذیفہؓ صحابی رسول اللہ علیہ وسلم سے پوچھا:

حَدِّثْنَا بِاَقْرَبِ النَّاسِ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ھَدْیًا وَّ دَلًّا نَتَلَقَّاہُ فَنَاْخُذُ عَنْہُ وَنَسْمَعُ مِنْہُ۔

مجھے بتائیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے طرز و روش چال ڈھال میں جو آدمی سب سے زیادہ قریب ہو وہ کون ہے؟ تاکہ میں ان سے ملوں ان سے علم حاصل کروں حدیثیں سنوں۔

ایک معاصر دوسرے معاصر کے متعلق یہ شہادت ادا کرتا ہے[1]، یعنی حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

اَقْرَبُ النَّاسِ ھَدْیًا وَّ دَلًّا وَّ سَمْتًا بِرَسُوْلِ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے طرز و روش چال ڈھال وضع

---

[1] فنِ تنقیدِ رجال میں انسانی فطرت کی اس کمزوری کا خیال کیا گیا ہے، جس کی تعبیر "المعاصرۃ اصل المنافرۃ" (ہم عصری باہمی نفرت کی بنیاد ہے) کے مشہور فقرہ سے کی گئی ہے، اس لئے معاصر کے متعلق تعریف بہت اہم سمجھی جاتی ہے۔

اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ابْنُ مَسْعُوْدٍؓ — (انداز میں سب سے زیادہ قریب ترین آدمی ابن مسعودؓ ہیں۔)

صرف ان ہی باتوں میں نہیں جن کا تعلق شریعت و قانون سے ہے بلکہ بعض صحابہ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی ہوبہو تصویر اتارنے کے لیے یہاں تک کرتے تھے کہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق عام طور پر مشہور ہے:

کَانَ یَتَبِعُ اٰثَارَہٗ فِیْ کُلِّ مَسْجِدٍ صَلّٰی فِیْہِ وَکَانَ یَعْتَرِضُ بِرَاحِلَتِہٖ فِیْ طَرِیْقٍ رَاٰی رَسُوْلَ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَرَضَ نَاقَتَہٗ۔ (اصابہ)

جن جن مقامات پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے (راستوں) میں نمازیں پڑھی تھیں، ابن عمرؓ ان مقامات کو تلاش کرتے تھے اور نمازیں پڑھتے تھے۔ راہ میں جہاں کہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اونٹنی کا رُخ پھیرا تھا۔ ابن عمرؓ بھی قصداً اس مقام پر یہی کام کرتے تھے۔

یہاں تک بیان کیا گیا ہے کہ سفر کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اگر استنجا کے لیے اونٹ سے کہیں اتر کے بیٹھے تھے تو باوجود عدم ضرورت کے استنجا کرنے والوں کی شکل بنا کر ابن عمرؓ اونٹ سے اتر کر وہاں بیٹھا کرتے۔ اسی سلسلہ میں ان کی یہ عام عادت بیان کی جاتی ہے۔

یَسْاَلُ مَنْ حَضَرَ اِذَا غَابَ عَنْ قَوْلِہٖ وَفِعْلِہٖ۔ (اصابہ)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جس قول و فعل سے یہ غائب رہتے تو جو لوگ اس وقت حاضر ہوتے ان سے پوچھ لیتے۔

امام مالکؒ سے ان کے شاگرد یحییٰ نے ایک دن پوچھا کہ:

اَسَمِعْتَ الْمَشَائِخَ یَقُوْلُوْنَ، مَنْ اَخَذَ بِقَوْلِ ابْنِ عُمَرَ لَمْ یَدَعِ الْاِسْتِقْصَاءَ قَالَ نَعَمْ۔ (اصابہ)

کیا آپ نے بزرگوں سے یہ سنا ہے کہ ان کا خیال تھا جس نے ابن عمرؓ کے قول کو اختیار کیا، اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کی تکمیل میں کوئی چیز نہیں چھوڑی؟ بولے ہاں!

یہ استقصا یا سیرتِ طیبہ کی کامل "تصویر کشی" یا "ہو بہو نقل" اتارنا، نصب العین تو سب ہی کا تھا لیکن ہر شخص کے لیے اس کا میسر آنا آسان نہیں ہے۔ تاہم اسی کے ساتھ جتنے بھی صحابی تھے ان کی زندگی کا ایک بڑا حصہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے قالب میں ڈھلا ہوا تھا اور اسی بنیاد پر میں ہر صحابی کو در اصل حدیث کا ایک نسخہ یا موجودہ اصطلاح میں اجازت دیجئے تو اڈیشن قرار دیتا ہوں۔ یہ اور بات ہے کہ ان میں بعض اڈیشن بہت زیادہ کامل اور حاوی تھے اور بعض میں وہ کاملیت نہیں پائی جاتی تھی اور اگر صحابہ کی جو تعداد اوپر بیان کی گئی ہے صحیح ہے تو ایمان و اسلام اور جوشِ عمل کی ان میں جو سینہ زوریاں تھیں، ان کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہنا یقیناً مبالغہ نہ ہوگا کہ عہدِ نبوت میں ہی ہماری وہ تاریخ جس کا نام حدیث ہے۔ اس کے کامل و ناقص زندہ نسخوں اور اڈیشنوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچ چکی تھی۔ کیا دنیا میں کوئی تاریخ یا کسی تاریخ کا کوئی حصہ ایسا موجود ہے جس کے عینی شاہد اپنی تعداد میں خود اس واقعہ کے مجسم آئینے بن کر دنیا کے سامنے پیش ہوئے ہوں؟ اور کیا آئندہ ان نسخوں کی تعداد میں کوئی کمی ہوئی؟ کاملیت کے

اعتبار سے جتنی بھی کمی ہوئی ہو لیکن کیت اور مقدار کے لحاظ سے ہر شخص جانتا ہے کہ ان تیرہ ساڑھے تیرہ صدیوں میں ہر سال اس کی تعداد میں اضعافاً مضاعفۃً اضافہ ہی ہوتا رہا اور ہو رہا ہے۔ ہر مسلمان خواہ وہ دنیا کے کسی حصہ میں آباد ہو، آج اپنی زندگی میں جتنے صحیح مذہبی اور اخلاقی عناصر شریک ہیں، کیا یہ اسی تاریخ کے کسی حصہ کا عکس نہیں ہے؟ آج بھی کوئی مسلمان ہندوستان کے کسی کور دہ دیہات میں جو نمازیں پڑھتا ہے، قسم کھا کر کہہ سکتا ہے اور یقیناً وہ اپنی اس قسم میں سچا ہے کہ وہ اسی طرح ہاتھ اٹھاتا ہے، جس طرح آں حضرتؐ اٹھاتے تھے، وہی کہتا ہے جو حضورؐ کہتے تھے۔ وہی پڑھتا ہے، جو حضورؐ پڑھتے تھے اسی طرح وہ جھکتا ہے جس طرح حضورؐ جھکتے تھے۔ اسی طرح زمین پر سر رکھتا ہے جس طرح حضور رکھتے تھے، اسی پر مسلمانوں کے دوسرے مذہبی اور دینی اعمال و عقائد کو قیاس کر لیجئے، کچھ نہیں تو کم از کم اس تاریخ کی کوئی ایک آدھی بات کلمہ شہادت ہی سہی، اس تاریخ کا یہ جز تو ہر ایک مسلمان کے اندر اب تک محفوظ ہے۔

حدیث کا بہت بڑا حصہ متواتر ہے

اور اسی بنیاد پر کل کے متعلق لیکن تاریخ کے اس عظیم الشان ذخیرے کے ایک بڑے حصہ کو میں متواتر خیال کرتا ہوں یعنی کسی انقطاع کے نسلاً بعد نسلٍ لاکھوں اور لاکھوں کے بعد کروڑ ہا کروڑ انسانوں کے ذریعے سے مشرق و مغرب میں یہ حصہ منتقل ہوتا ہوا دنیا کے موجودہ دور تک پہنچا ہے اور ان شاء اللہ تعالیٰ قیامت تک پہنچتا رہے گا۔ ان کی مقدار کیا ہوگی؟ اس کے لیے صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ امت اسلامیہ کے تمام فرقے جن مسائل پر متفق ہیں۔ تقریباً سب کا یہی حال ہے۔ عقائد و ایمانیات کے سوا طہارت، غسل، وضو، عبادات، نماز، روزہ حج، زکوٰۃ، معاملات، عقوبات، سیاسیات، مباحات و محذورات وغیرہ وغیرہ مختلف ابواب سے ان اتفاقی مسائل کا اگر انتخاب کیا جائے جو عہد نبوت سے اس وقت تک ہر ملک اور ہر فرقہ کے مسلمانوں میں طبقۃً بعد طبقۃٍ خلفاً عن سلفٍ تواتر کے ساتھ اس حیثیت سے مسلّم ہیں کہ یہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم اور طرز عمل تھا تو کون کہہ سکتا ہے کہ ان کی تعداد ہزاروں سے متجاوز نہ ہوگی اور ان کا شمار کرنا زیادہ دشوار بھی نہیں ہے۔

گویا قرآن کے بعد ہم جس چیز کو بغیر کسی تذبذب و دغدغہ کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارک کے ساتھ منسوب کر سکتے ہیں، وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال و اقوال و تقریرات کا یہی حصہ ہے جو ہم تک تعامل و توارث کے ذریعے پہنچا ہے، لیکن اس مسئلہ میں صرف اسی پر قناعت نہیں کی گئی ہے بلکہ اسی کے ساتھ ان معلومات کے ہر ہر جز کو مسلسل روایت کے ذریعے سے فن حدیث میں محفوظ کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور یوں باہم ایک کی دوسرے سے توثیق ہوتی ہے۔ ایں روایتوں کے ذریعہ سے یہ چیزیں جس طرح مروی ہیں ان کو اور مسلمانوں نے تعامل کے ذریعے سے ان چیزوں کو جس طرح ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل کیا ہے، دونوں کو سامنے رکھئے، ہر ایک کی تصدیق دوسرے سے ہوگی، البتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا وہ حصہ جس کی نقل اس اتفاقی تعامل کے ذریعہ سے عمل میں نہیں آئی ہے۔ اس کے لئے سب سے پہلے تو ہمارے پاس وہی روایت کا ذریعہ ہے۔ روایت کے اس سلسلہ کی آئندہ کڑیوں پر تو آگے بحث آئے گی، عہد صحابہ میں جس حزم و احتیاط کے ساتھ ان چیزوں کو اپنی اصلی حالت پر محفوظ رکھنے کی کوشش کی گئی ہے، اس کی داستان آپ سن چکے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر ہر لفظ اور ہر ہر فعل کی نگرانی، صحابہ کرام کا ایک ایک لفظ کے شک مٹانے کے لئے سینکڑوں میل کا سفر طے،

کرنا، اس کا ذکر بھی آپ سن چکے ہیں، لیکن بات اسی پر ختم نہیں ہو گئی بلکہ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں خود صحابہ بھی ایک دوسرے سے اس معاملہ میں پوچھ گچھ کا سلسلہ جاری رکھتے تھے، ہر ایک اپنے علم کو دوسرے کے علم پر پیش کرتا تھا۔ ان کے اس طرز عمل ہی سے روایت کی قوت بڑھتی چلی جاتی تھی۔

(۲)

قرآن کی طرح حدیث کے بھی حفظ کا اہتمام تھا

بلکہ روایات سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ حفظ کرنے والے بچوں کو شروع ہی سے جیسے قرآن کے حفظ میں لگا دیا جاتا ہے اسی طرح قرآن کے ساتھ حدیث بھی بچوں کو زبانی یاد کرائی جاتی تھی اور صحابہ ہی کے عہد میں اس کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ ابن عباسؓ کے غلام عکرمہ جن کی تعلیم پر ابن عباسؓ نے خاص توجہ کی تھی اور اسی کا نتیجہ تھا کہ تابعین کے عہد میں چند ممتاز ائمہ میں ایک بہت بڑے امام کی حیثیت عکرمہ کی ہو گئی تھی۔ اپنی تعلیمی سرگزشت بیان کرتے ہوئے عکرمہ یہ بھی بیان کرتے تھے کہ

كَانَ ابْنُ عَبَّاسٍ يَضَعُ الْكَبْلَ فِيْ رِجْلِيْ عَلٰى تَعْلِيْمِ الْقُرْاٰنِ وَالسُّنَنِ (تذکرہ صفحہ ۹۰)

ابن عباسؓ میرے پاؤں میں قرآن اور حدیثوں کی تعلیم دینے کے لیے بیڑی ڈال دیتے تھے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں اپنے بچوں کو بعض لوگ بچپن ہی سے حدیث یاد کرنے کے لئے بھیج دیا کرتے تھے۔ ابن سیرین بھی ان ہی لوگوں میں ہیں جن کے والد نے بچپن ہی سے ابوہریرہؓ کے سپرد کر دیا تھا۔ لکھا ہے کہ ابن سیرین کے ایک بھائی یحییٰ نامی بھی تھے، دونوں بچوں کی قوت یادداشت اور حدیثوں کے زبانی یاد کرنے کی صلاحیت کا اندازہ ابوہریرہؓ نے کیا تو یحییٰ میں زیادہ صلاحیت نظر آئی، کہتے ہیں کہ:

فَكَنَّاهُ اَبُوْ هُرَيْرَةَ لِحِفْظِهٖ (ابن سعد ج ۷ ص ۱۵)

ابوہریرہؓ نے یحییٰ کی یادداشت دیکھ کر ان کی کنیت رکھی

جیسے قرآن کے حفظ میں سمجھا جاتا ہے کہ بچپن میں حفظ کا کام جتنا استوار اور مضبوط ہوتا ہے عمر ہونے کے بعد یہ بات حاصل نہیں ہو سکتی۔ حسن بصری فرماتے ہیں کہ:

طَلَبُ الْحَدِيْثِ فِي الصِّغَرِ كَالنَّقْشِ فِي الْحَجَرِ (جامع ص ۶۴ ج ۱)

بچپن میں حدیث کی تعلیم حاصل کرنا ایسا ہے جیسے پتھر میں نقش کرنا ہے۔

عبداللہ بن مسعودؓ کے خلیفہ اور شاگرد رشید علقمہ خود اپنے متعلق فرماتے:

مَا حَفِظْتُ وَاَنَا شَابٌّ فَكَاَنِّيْ اَنْظُرُ اِلَيْهِ فِيْ قِرْطَاسٍ اَوْ وَرَقَةٍ (جامع ج ۱ ص ۶۴)

اپنے نوجوانی کے زمانہ میں جو چیزیں میں نے زبانی یاد کر لی تھیں ان کی حالت ایسی ہے کہ کاغذ یا ورق میں رکھے ہوئے گویا وہ میرے سامنے ہیں۔

اور صرف یاد کر لینا ہی کافی نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ یاد کرنے کے بعد بار بار ان ہی کی یاد کی ہوئی حدیثوں کو دہراتے رہنا یہ بھی ایسا مسئلہ تھا جس کی ہر استاذ اپنے شاگردوں کو تاکید کرتے ہوئے اصرار کرتا تھا۔ صحابۂ کرامؓ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے،

فرمایا کرتے تھے:

اَکْثِرُوا ذِکْرَ الْحَدِیْثِ فَاِنَّکُمْ اِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا یَنْدَرِسْ عِلْمُکُمْ (جامع جلد ا ص۱۰۱)	حدیث کو بار بار دہراتے رہو اگر ایسا نہ کروگے تو تمہارا علم فرسودہ ہو کر مٹ جائے گا۔

عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے:

تَذَاکَرُوا الْحَدِیْثَ فَاِنَّ حَیَاتَہٗ مُذَاکَرَتُہٗ (معرفۃ علوم الحدیث للحاکم، صفحہ ۱۴۱)	بار بار حدیث کو دہراتے رہو کیونکہ اس کو زندہ رکھنے کی یہی شکل ہے۔

ابو سعید الخدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

تَذَاکَرُوا الْحَدِیْثَ	بار بار حدیث کو دہراتے رہو۔

حسن بصری اپنے شاگردوں کو فرماتے کہ یاد رکھو:

غَائِلَۃُ الْعِلْمِ النِّسْیَانُ وَتَرْکُ الْمُذَاکَرَۃِ (جامع ص۱۴۱)	علم کی آفت اس کا بھول جانا ہے اور دہرانے کو چھوڑ دینا۔

عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ بھی اپنے تلامذہ سے کہتے:

اِنَّ اِحْیَاءَ الْحَدِیْثِ مُذَاکَرَتُہٗ فَتَذَاکَرُوا (جامع، صفحہ ۱۱۱)	حدیث کو زندہ رکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو بار بار دہرایا جائے پس چاہیے کہ تم لوگ دہراتے رہو۔

جس کا مطلب یہی ہوا کہ یاد کی ہوئی حدیثوں کو بار بار دہراتا یہ بھی حدیث کے پڑھنے پڑھانے والوں کے فرائض میں داخل تھا کہ درس کے رفقاً باہم مل جل کر یاد کی ہوئی حدیثوں کا اعادہ کریں ایک سے غلطی ہو تو دوسرا اس کی اصلاح کر دے۔ باہمی مذاکرے کے اس طریقے کا صحابہ ہی کے زمانے میں رواج پڑ گیا تھا۔ حضرت جابر بن عبداللہ کا حلقہ درسِ حدیث جو مسجد نبوی میں قائم تھا اس کا ذکر کرتے ہوئے عطار کہتے ہیں کہ

کُنَّا نَکُوْنُ عِنْدَ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰہِ فَیُحَدِّثُنَا فَاِذَا خَرَجْنَا مِنْ عِنْدِہٖ تَذَاکَرْنَا حَدِیْثَہٗ (ابن سعد، جلد ۵، صفحہ ۳۵۴)	ہم لوگ جابر بن عبداللہ کے پاس ہوتے (یعنی ان سے حدیثیں سنتے) پھر جب ان کے حلقے سے باہر نکل آتے تو ان کی بیان کی ہوئی حدیثوں کو باہم مل کر ہم لوگ دہراتے۔

استاد کے پاس سے اٹھ جانے کے بعد باہم ایک دوسرے کے ساتھ حدیثوں کا جو مذاکرہ کرتے تھے اس مذاکرے کی نوعیت کیا ہوتی تھی۔ سعید بن جبیر سے کسی نے پوچھا کہ ابن عباسؓ سے جتنی باتیں روایت کرتے ہو کیا سب براہ راست ان سے پوچھ کر تم نے سیکھی ہیں؟ بولے کہ نہیں ایسا بھی ہوتا تھا کہ ان کی مجلس میں حدیثیں بیان کی جاتیں میں خاموش بیٹھا سنتا رہتا۔ جب لوگ حلقہ سے اٹھ کر چلے جاتے اور یُحَدِّثُوْنَ فَاَحْفَظُ (ابن سعد جلد ۱ صفحہ ۱۷۹) اور باہم ان ہی حدیثوں کا جب لوگ مذاکرہ کرتے تو میں ان حدیثوں کو یاد کر لیتا جس سے بظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ بار بار اپنی پڑھی ہوئی حدیثوں کو لوگ اتنا دہراتے تھے کہ دوسروں کو بھی وہ حدیثیں محض ان کے یاد کرنے اور دہرانے کی وجہ سے یاد ہو جاتی تھیں۔

تقریباً سارے محدثین بے مزد خدمتِ حدیث میں مشغول رہے

اس میں شک نہیں کہ اس راہ میں انتہائی بلند نظری اور علو ہمتی کی یہ مثالیں ہیں۔ قدرتاً اس قسم کے افراد کم ہی تھے مگر ایسے لوگ جو پیغمبر کی حدیثوں کی اشاعت و تبلیغ بغیر کسی اجر و مزد کے زندگی بھر کرتے رہے بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ معاوضہ اور اجرت لینے والوں کی چند مثالوں کے سوا تقریباً اس زمانے کے سارے محدثین اور حفاظ حدیث کا یہ عام رویہ تھا۔ ان ہی بزرگوں کی کثرت کی وجہ سے ان چند لوگوں کو بدنام ہونا پڑا اور نہ تعلیم و تعلم کا موجودہ متاجرانہ طریقہ اگر اس زمانہ میں بھی اسی طرح عام ہوتا جیسے آج کل ہے تو شاید ان بے چاروں کا کوئی نام بھی نہ لیتا مشہور ہے کہ "حمام میں بھی کیا کسی کے ننگے ہونے کی شکایت بھی کی گئی ہے"؟ اس سلسلے میں بزرگوں نے جو نمونے چھوڑے ہیں حقیقت یہ ہے کہ آج مشکل ہی سے کوئی ان قصوں کو صحیح باور کر سکتا ہے۔ خیال تو کیجئے ذوق کی اس صفائی کا خطیب نے کفایہ میں نقل کیا ہے کہ مشہور حافظِ حدیث حماد بن سلمہ کا ایک شاگرد بحرِ چین کی تجارتی مہم پر روانہ ہوا اور وہاں سے کافی روپیہ کما کر واپس ہوا۔ حماد استاد تھے بطور تحفہ کے بعض چیزیں ان کی خدمت میں لے کر وہ حاضر ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ اس تحفہ سے خوش ہو کر آئندہ استاذ کی توجہ میری طرف زیادہ ہو جائے گی۔ لیکن سنتے ہیں وہ بے چارہ اپنے تحائف کے لئے کھڑا تھا اور سن رہا تھا۔ حماد فرما رہے ہیں:

اِخْتَرْ اِنْ شِئْتَ قَبِلْتُهَا وَلَمْ اُحَدِّثْكَ	ان دو باتوں میں سے کسی ایک شق کو قبول کر لو چاہو
اَبَدًا وَاِنْ شِئْتَ حَدَّثْتُكَ وَلَمْ اَقْبَلِ	تو تمہارے تحائف قبول کر لیتا ہوں لیکن پھر حدیث تمہیں
الْهَدِيَّةَ -	کبھی نہیں پڑھاؤں گا اور چاہتے ہو کہ حدیث تمہیں پڑھاؤں
(کفایہ، صفحہ ۱۵۳)	تو پھر تحفہ قبول نہیں کروں گا۔

لکھا ہے کہ اس بے چارے نے معذرت کی اور عرض کیا، میں حدیث ہی سنوں گا اور اپنے تحفوں کو واپس لیتا ہوں اور اس قسم کے قصے کہ مثلاً عیسیٰ بن یونس جو رواۃِ حدیث میں بڑے ممتاز مقام کے مالک ہیں، ذہبی نے الامام کے لفظ کے ساتھ ان کو ملقب کیا ہے۔ تین پشتوں سے مسلسل ان کے خاندان میں حفاظِ حدیث پیدا ہوتے چلے آ رہے تھے۔ ہارون الرشید کا مشہور وزیر جعفر برمکی خود بیان کرتا تھا کہ میں نے ایک لاکھ درہم اس شخص کی خدمت میں پیش کئے۔ لیکن قطعی طور پر اس نے یہ کہتے ہوئے واپس کر دیا کہ میں نہیں چاہتا کہ دنیا میں یہ مشہور ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کی قیمت میں نے کھائی (تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ صفحہ ۲۵۸) ان ہی عیسیٰ بن یونس کی خدمت میں مامون نے حدیث سننے کے بعد کافی رقم پیش کی لیکن صاف انکار کرتے ہوئے فرمایا:

وَلَا شُرْبَةَ مَاءٍ (تذکرہ جلد ۱ صفحہ ۲۵۹) ہرگز نہیں پانی کا ایک گھونٹ بھی نہیں

الذہبی نے زکریا بن عدی جو صحاح کے راویوں میں ہیں۔ ان کے تذکرے میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ ان کی آنکھیں دکھنے آئیں ایک شخص سرمہ لے کر حاضر ہوا، پوچھا کہ کیا تم بھی ان لوگوں میں ہو جو مجھ سے حدیث سنتے ہیں؟ اس نے کہا جی ہاں۔ زکریا نے کہا تب میں تم سے سرمہ کیسے لے سکتا ہوں۔ کیوں کہ حدیث سنانے کا معاوضہ ہو جائے گا۔ (دیکھو تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ صفحہ ۳۵۸)

ابراہیم الحربی جن کا ذکر ابھی گزرا باوجودیکہ فقر و فاقے میں زندگی بسر ہوتی تھی۔ معتضد باللہ خلیفۂ وقت نے متعدد بار ان کے پاس بڑی بڑی رقمیں بھیجیں ہمیشہ شکریہ کے ساتھ واپس کرتے رہے ایک دفعہ خلیفہ نے کہلا بھیجا کہ خود اگر نہیں لیتے ہیں

تو اپنے پڑوسیوں میں تقسیم کر دیجیے۔ ابراہیم نے کہا کہ خلیفہ سے عرض کرنا کہ جس چیز کے جمع کرنے کی مصیبت میں نے برداشت نہیں کی تو اس کے خرچ کرنے کی مصیبت میں اپنے آپ کو کیوں مبتلا کروں اور آخر میں خلیفہ کے قاصد کو کہا کہ بار بار امیرالمومنین بھیجنے کی زحمت برداشت کر رہے ہیں اور مجھے ہر دفعہ واپس کرنے کی تکلیف اٹھانی پڑتی ہے۔ ان سے کہہ دیجیو کہ :

اَنْ تَتْرُكَنَا وَاِلَّا تَحَوَّلْنَا مِنْ جَوَارِكَ (ص ۲۱) یا تو اس طریقے کو وہ ترک فرمائیں ورنہ آپ کی پڑوس سے میں منتقل ہو جاؤں گا۔

اس سلسلہ میں ابراہیم ایک بخیل آدمی کا ایک پر لطف قصہ بیان کیا کرتے تھے یعنی یہ کہتے ہوئے کہ علم کے معاوضہ میں بحمد اللہ میں نے کبھی کوئی چیز آج تک نہیں لی۔ صرف ایک دفعہ مجھے لینا پڑا۔ پھر اس قصے کو بیان کرتے جو کافی طویل ہے۔ حاصل یہ ہے کہ کسی بنیئے سے ابراہیم نے کوئی چیز خریدی جس کی قیمت کچھ آنے اور ایک پیسہ طے ہوئی، ابراہیم نے آنے تو ادا کر دیئے پیسہ باقی تھا اتنے میں بنیئے کو کچھ خیال آیا بولا کہ ابراہیم بزرگوں کا کوئی ایسا قصہ سناؤ جس سے میرا دل کچھ نرم پڑے۔ ابراہیم نے ایک دلچسپ قصہ سنایا[1]۔ بنیا سن کر بہت متاثر ہوا اور اپنے آدمی سے کہا کہ ابراہیم سے اب ایک پیسہ جو باقی ہے وہ نہ لینا اور نہ ان کی چیز کم کرنا۔ ابراہیم فرماتے تھے کہ بس اسی دن ایک پیسہ کی یہ آمدنی علم کے معاوضہ میں مجھے ہوئی۔

ان بزرگوں کی سیر چشمی اور بے نیازی کے قصے کتابوں میں اتنے بیان کئے گئے ہیں کہ ایک مستقل کتاب ان سے تیار ہو سکتی ہے۔ ایوب سختیانی جن کا بکثرت حدیثوں کی سندوں میں ذکر آتا ہے اور حفاظِ حدیث کے مشاہیر میں ہیں۔ ذہبی نے لکھا ہے کہ بنی امیہ کا خلیفہ یزید ابن الولید جس زمانے میں خلیفہ نہ تھا، ایوب میں اور اس میں گہرے دوستانہ مراسم تھے۔ جس دن خلافت کے لیے اس کا انتخاب ہوا تو لکھا ہے کہ ہاتھ اٹھا کر ایوب یہ دعا کر رہے تھے :

---

[1] خطیب نے اس قصے کو بھی بیان کیا ہے، امام حسن علیہ السلام کی سخاوت سے اس کا تعلق تھا۔ حاصل یہ ہے کہ حضرت امام ایک دن کسی باغ میں پہنچے جس کا محافظ ایک سیاہ حبشی تھا۔ ہاتھ میں اس کے ایک روٹی تھی، سامنے کتا بیٹھا تھا حبشی کو حضرت نے دیکھا کہ روٹی کا ایک ٹکڑا توڑتا ہے، خود کھاتا ہے اور دوسرا ٹکڑا کتے کو دیتا ہے مسلسل وہ یہی کر رہا ہے آپ نے پوچھا کہ تم اس التزام کے ساتھ جو کتے کے سامنے ٹکڑا ڈالتے جا رہے ہو گویا اس کو برابر کا حصہ دار بنا لیا ہے اس کی وجہ کیا ہے؟ حبشی نے کہا کہ حضرت کتے کی آنکھ لقمے پر لگی ہوئی ہے، دل گوارا نہیں کرتا کہ اس پر اپنے کو ترجیح دوں۔ حضرت امام حسن کو اس غلام کی یہ ادا ایسی بھا گئی کہ اسی وقت آپ نے اس کا نام اس کے آقا کا نام دریافت کیا اور غلام کے ساتھ باغ کو بھی آپ نے خرید لیا۔ پھر اس حبشی کے پاس آئے اور فرمایا کہ میں نے تجھے بھی خرید لیا ہے اور اس باغ کو بھی حبشی خوش ہوا۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے تجھے آزاد کر دیا اور باغ بھی تجھے بخش دیا۔ حبشی نے سن کر کہا تو حضرت آپ نے جس کی راہ میں یہ باغ مجھے عطا فرمایا اسی کی راہ میں اس باغ کو میں نے بھی دے دیا یعنی خیرات کر دیا۔ بخیل بنیا اس قصے کو سن کر اچھل پڑا اور احسنت یا ابا اسحاق کہتے ہوئے اپنے آدمی سے یہی بات کہی کہ اب ابراہیم سے مزید ایک پیسہ نہ لینا اور نہ ان کی چیز کو کم کرنا (تاریخ بغداد ج ۵ ص ۳۴) شاید اس بخیل کی بخالت پر اس پیسے کی بھی کافی چوٹ پڑی ہو گی۔ اس لئے ابراہیم نے اس پیسے کا واپس کرنا مناسب نہ خیال کیا۔

اَللّٰهُمَّ اَنْسِهٖ ذِكْرِیْ (ص ۱۲۳) پروردگار! میری یاد اس شخص (یعنی خلیفہ) کے دل سے بھلا دے۔

ذرا وارستہ مزاجیوں کا اس گروہ کے اندازہ تو کیجئے دوست اپنے وقت کی سب سے بڑی طاقت و سلطنت کا بادشاہ منتخب ہوتا ہے۔ بجائے اس کے کہ اس کی دوستی سے استفادے کی توقعات قائم کرتے، دعا کرتے ہیں تو یہ کرتے ہیں کہ "پروردگار اس شخص کے دل سے میری یاد بھلا دیجئے۔"

اسی قسم کے ایک واقعہ کا نصر بن علی محدث کے تذکرے میں ذہبی نے ذکر کیا ہے، یہ سفیان بن عیینہ وغیرہ کے شاگرد ہیں اور صحاح ستہ کے راویوں میں ہیں۔ لکھا ہے کہ خلیفہ مستعین باللہ نے ان کے پاس آدمی بھیجا تاکہ قاضی بنانے کے لئے ان کو مستعین کے پاس حاضر کرے۔ ان کو خبر ہوئی، بولے، استخارہ کر لوں تب جواب دوں گا۔ گھر آئے دو رکعت نماز پڑھی، سنا گیا کہ دعا کر رہے ہیں:

"پروردگار! خیر اور بھلائی اگر تیرے ہی پاس ہے تو مجھے اٹھا لے۔"

دعا کر کے سو گئے، جگانے والا جب جگانے کے لیے آیا تو دیکھا کہ واقعی وہ اٹھا لئے گئے۔ یعنی وفات ہو چکی تھی۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۹۲)

غور کرنے کا مقام ہے، ہمتوں کی بلندیاں جن لوگوں میں عروج و ارتقاء کے اس مقام تک پہنچ چکی تھیں، کیا کوئی دشواری ایسوں کے لیے بھی دشواری باقی رہتی ہے۔ جن کی رات بھی اپنی رات ہو اور دن بھی اپنا دن ہو۔ ظاہر ہے کہ وہ کیا کچھ نہیں کر سکتے ہیں۔

سفیان ثوری اور شعبہ وغیرہ کے تلامذۂ حدیث میں ایک بزرگ قبیصہ بن عقبہ بھی ہیں۔ ذہبی نے "الحافظ الثقة المكثر" کے الفاظ سے ان کے خصوصیات کا اظہار کیا ہے۔ ان ہی کے حال میں لکھا ہے کہ عباسیوں کے عہد کے امراء میں ابو دلف نامی جو بڑے امیر کبیر تھے۔ ان ہی ابو دلف کے صاحبزادے دلف اپنے خدم و حشم کے ساتھ ایک دن قبیصہ کے مکان پر حاضر ہوئے۔ اندر تھے۔ اطلاع دی گئی کہ فلاں امیر آپ سے ملنے آیا ہے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ دلف کے نام کو سنتے ہی گھر سے نکل پڑیں گے[1] لیکن خلاف

---

[1] شیر کو شیر پر قیاس کرنے والے عموماً اس قسم کی غلطیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں لیکن حقیقت جب سامنے آتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ سمجھنے والے جسے بسا اوقات کاخ سمجھتے ہیں ان ہی کو اس دنیا میں خاک بلکہ خاک سے بھی بدتر سمجھنے والا ایک گروہ موجود تھا۔ اسلام کی تاریخ ان واقعات سے لبریز ہے۔

عہد نبوت کے قریب سے جو متاثر تھے وہ تو خیر، لیکن جو اس شرف سے محروم تھے ان میں بھی ان مثالوں کی کمی نہیں ہے ہندوستان ہی میں اورنگ زیب کے عہد کا قصہ بیان کیا جاتا ہے کہ لاہور کے مشہور بزرگ "میاں میر" سے ملنے کے لیے اورنگ زیب حضرت کی خانقاہ میں حاضر ہوئے۔ میاں میر اپنے مریدوں کے ساتھ خانقاہ کے اندر دھوپ میں بیٹھے ہوئے کپڑوں سے جوں نکال رہے تھے اچانک کسی نے اندر خبر پہنچائی کہ شہنشاہ عالمگیر تشریف لا رہے ہیں لوگوں میں کھلبلی مچ گئی۔ میاں صاحب نے اس کھلبلی کو محسوس کر کے پوچھا، خیر ہے۔ لوگوں نے خبر دی کہ شہنشاہ آ رہے ہیں، مسکرا کر فرمانے لگے لاحول ولا قوۃ میں سمجھا کہ شاید کوئی فربہ جوں دھری گئی اس پر گڑ بڑ مچی ہے، عالمگیر کے آنے پر اس ہنگامہ کی کیا ضرورت تھی۔ ملنے کے بعد عالمگیر جب واپس ہوئے تو کسی نے میاں میر کے اس لطیفہ کا بادشاہ سے ذکر کیا، سن کر کہا کہ ہاں بھائی! ان لوگوں کی نظر میں ایک موٹی جوں ...

توقع دیر تک انتظار کیا گیا وہ باہر نہ آئے۔ آخر لوگوں نے قریب جاکر کہنا شروع کیا :

اِبنُ مَلِكِ الْجَبَلِ عَلَى الْبَابِ وَاَنْتَ لَا تَخْرُجُ ۔ — جبل (نام صوبہ) کے بادشاہ کا بیٹا دروازہ پر کھڑا ہے اور تم باہر نہیں نکل رہے ہو۔

بہر حال جب لوگوں نے زیادہ ہنگامہ مچایا تو دیکھا گیا کہ گھر سے بایں شان نکل رہے ہیں کہ "چادر میں روٹی کا ایک ٹکڑا بندھا ہوا ہے" دلف سامنے کھڑا تھا اس کے ارد گرد حواشی کے لوگ تھے، سن رہے تھے کہ شعبہ کہہ رہے ہیں :۔

مَنْ رَضِيَ مِنَ الدُّنْيَا بِهٰذَا اَمَا يَقْنَعُ يَابْنَ مَلِكِ الْجَبَلِ وَاللّٰهِ لَا اُحَدِّثُهٗ ۔ — جو اس دنیا میں اس (ٹکڑے کی طرف اشارہ تھا) سے راضی ہوگیا۔ جبل کے بادشاہ کے بیٹے کیا اسے کیا پروا، خدا کی قسم، میں اس شخص کے آگے حدیث بیان نہیں کروں گا۔

(ج ۱ ص ۲۴۰)

اور یہی واقعہ بھی ہے، مسعر بن کدام بھی کہا کرتے تھے کہ :

مَنْ صَبَرَ عَلَى الْخَلِّ وَالْبَقْلِ لَمْ يُسْتَعْبَدْ (تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۷۸) — سرکہ اور بھاجی پر جس نے صبر کر لیا وہ کبھی غلام بنایا نہیں جا سکتا۔

ہم جیسے لوگ جن کی ایک ایک سانس اور زندگی کا ایک ایک لمحہ دوسروں کے ہاتھ بکا ہوا ہے ان پر احرار کے اس طبقہ کو قیاس کرنا قطعاً صحیح نہ ہوگا۔

جب روزمرہ کا یہ مشاہدہ ہے کہ یاد کرنے والے چند سال میں قرآن مجید حفظ کر لیتے ہیں تو جنہوں نے اپنے سارے وقت کو صرف اپنے ہی قبضے میں رکھا تھا۔ ان کے متعلق کیوں تعجب کیا جاتا ہے، جب کہا جاتا ہے کہ ان کو اتنی حدیثیں زبانی یاد تھیں۔ آپ دیکھ چکے کہ حدیثوں کا بجائے سفینوں کے سینوں ہی کی حد تک محدود رہنے کا دعوٰی جس زمانہ کے متعلق کیا جاتا ہے کلیتہً یہ دعوٰی ہی صحیح نہیں ہے اور کچھ دن حدیثوں پر ایسے گزرے بھی ہیں تو ان کی مدت ہی کتنی تھی۔ آپ تو حدیثوں کے متعلق بھی بے اطمینانی میں مبتلا کئے جا رہے ہیں پھر جن مذاہب و ادیان کی بنیادی کتابیں یعنی دین اسلامی جو حقیقت قرآن کی ہے، یہی حقیقت ان کے ہاں جن کتابوں کی ہے وہ صدیوں ہی نہیں ہزاروں سال تک بجائے سفینوں کے سینوں ہی میں حفاظت ان بنیادی کتابوں کے لیے کافی ہے۔

احتیاط کا حال

یہی امیر المومنین فی الحدیث شعبہ جن کے سجدوں اور رکوع کی کیفیت معلوم ہے۔ ان ہی کے متعلق اگر یہ بھی سنایا جاتا کہ :

كَانَ لَا يَرْضٰى اِلَّا اَنْ يَّسْمَعَ الْحَدِيْثَ عِشْرِيْنَ مَرَّةً ۔ — جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی حدیث کو شعبہ بیس مرتبہ نہیں سن لیتے تھے انھیں چین نہیں آتا تھا۔

جس کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ یعنی ایک ہی استاد کی بیان کی ہوئی حدیثوں کو اسی استاد سے بیس دفعہ جب تک نہیں سن لیتے تھے ان کی تشفی نہیں ہوتی تھی اور محدثین یہ بھی کرتے تھے۔ ہشیم کے حالات میں خطیب نے لکھا ہے کہ ان کے شاگرد ابراہیم بن عبداللہ ہروی

کہا کرتے تھے:

مَامِنْ حَدِيْثِ هُشَيْمٍ اِلَّا وَسَمِعْتُهٗ مَابَيْنَ عِشْرِيْنَ مَرَّةً اِلٰی ثَلَاثِيْنَ مَرَّةً — ہشیم سے جو حدیثیں میں روایت کرتا ہوں، ان سے حدیثوں کو کم و بیش بیس سے تیس مرتبہ میں نے سنا ہے۔

(تاریخ بغداد ج ۵ ص ۱۱۹)

اسی طرح معن بن عیسیٰ کا بھی دعویٰ تھا کہ امام مالک سے جتنی حدیثیں روایت کرتے تھے ان کے متعلق کہتے تھے کہ

قَدْ سَمِعْتُهٗ مِنْهُ نَحْوًا اَوْ اَكْثَرَ مِنْ ثَلَاثِيْنَ مَرَّةً — میں نے امام مالک سے یہ حدیثیں تیس مرتبہ سنی ہیں یا اسی کے قریب قریب۔ (حلیۃ الاولیاء ج ۱ ص ۳۲۱)

اور دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک ہی حدیث کو شعبہ جب تک کم از کم دس استاذوں سے نہیں سن لیتے تھے ان کو اطمینان نہیں ہوتا تھا، جیسا کہ معلوم ہے یہی محدثین کا عام مذاق تھا۔

یحییٰ بن معین کو تو اس پر اتنا اصرار تھا کہ لوگوں سے وہ کہا کرتے تھے:

لَوْلَمْ نَكْتُبِ الْحَدِيْثَ مِنْ ثَلَاثِيْنَ وَجْهًا مَاعَقَلْنَاهُ۔ (ص ۶) — جب تک کسی حدیث کو تیس ذریعوں سے ہم لوگ نہیں لکھتے اس وقت تک اس حدیث کا صحیح مطلب سمجھ میں نہیں آتا۔

اس زمانے کے حساب سے ٹھیک اس کی مثال یہ ہو سکتی ہے کہ ایک ہی واقعہ ہوتا ہے مختلف نیوز ایجنسیاں اپنے اپنے الفاظ اور اپنی اپنی تعبیر میں اس واقعہ کی خبر اخباروں کو بھیجتی ہیں۔ جو لوگ سیاسی کاروبار میں مشغول ہوتے ہیں یا تحقیقی اخبار نویسی کا کام کرتے ہیں یا صحیح واقعات کے علم کا جن لوگوں کو ذوق ہوتا ہے وہ بجنسہ ایک واقعہ کی خبر کو مختلف اخباروں میں پڑھتے ہیں اور نیوز ایجنسی کی تعبیروں کو ملانے کے بعد واقعہ کی اصل نوعیت تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں، یہ لوگ اخباروں کا مطالعہ ان ہی التزام کے ساتھ کرتے ہیں، ظاہر ہے کہ ان کے علم اور ان کے فیصلوں کی نوعیت عام اخبار بینوں سے بھلا کوئی نسبت رکھتی ہے[1]۔

جیسا کہ میں پہلے بھی کہیں بیان کر چکا ہوں کہ حدیثوں کی تعداد بتاتے ہوئے عام کتابوں میں لاکھوں لاکھوں تک ان کے شمار کو پہنچا دیا گیا ہے۔ جو نہیں جانتے ہیں وہ شاید باور کر لیتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جن اقوال و افعال کو یا تقریرات

---

[1] مثلاً بہت سی باتیں کسی ایجنسی کی خبر میں مجمل رہ جاتی ہیں، دوسری نیوز ایجنسی کی خبر میں اسی اجمال کی تفصیل ہوتی ہے بعض دفعہ نامہ نگار میں سلیقہ اس کا نہیں ہوتا کہ گُر کی بات اور عام باتوں میں تمیز کر سکے لیکن ہوشیار نامہ نگار چھپی ہوئی خبروں میں اسی کا انتخاب کرتا ہے یا اسی پر زیادہ زور اپنے بیان میں خرچ کر دیتا ہے بعض دفعہ خبر کی نوعیت کا اظہار ایک ایجنسی کا نامہ نگار کرتا ہے اور دوسرا چھوڑ دیتا ہے۔ جن کی نظر سب پر ہوتی ہے وہ جانتے ہیں کہ کس حد تک خبر قابلِ اعتماد ہو سکتی ہے بلکہ مختلف اخباروں کے پڑھنے سے ان لوگوں کو اس کا بھی فائدہ ہو جاتا ہے کہ بعض بالکل بے بنیاد جھوٹی خبریں اخباروں میں کسی خاص غرض سے جو شائع ہو جاتی ہیں، محتاط اخبار یا ایجنسیاں ان کے ذکر سے پرہیز کرتی ہیں لیکن بعض اخباروں یا ایجنسیوں کو اسی میں مزہ آتا ہے۔

کو منسوب کیا گیا ہے ان کی تعداد لاکھوں لاکھ تک پہنچتی ہے، حالانکہ یہ قطعاً غلط ہے[۱] میں بتا چکا ہوں الحاکم صاحب مستدرک کی یہ شہادت پیش کر چکا ہوں کہ اعلیٰ درجہ کی معیاری حدیثوں کی تعداد۔

لَا يَبْلُغُ عَدَدُهَا عَشَرَةَ اٰلَافِ حَدِيْثٍ   دس ہزار تک نہیں پہنچتی۔

(مدخل ص ۷)

اور قوی و ضعیف، صحیح و حسن، معیاری غیر معیاری حدیثوں کی تعداد مکررات کو الگ کر لینے کے بعد میرے خیال میں تیس تیس ہزار سے زیادہ نہیں،

---

[۱] ابن جوزی سے بڑھ کر اس باب میں خود خیال کیجئے کس کا بیان قابل اعتماد ہو سکتا ہے، انہوں نے اپنی کتاب "صید الخواطر" فصل ۱۷۵ میں حدیثوں سے متعلق اس عددی مغالطہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اَنَّهُ لَوْ جُمِعَ الصَّحِيْحُ وَالْمُحَالُ الْمَوْضُوْعُ مِمَّا كُلُّ مَنْقُوْلٍ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا بَلَغَ خَمْسِيْنَ اَلْفًا (یعنی صحیح حدیثوں کے ساتھ ان ساری بے بنیاد جھوٹی اور گھڑی ہوئی جعلی حدیثوں کو بھی جمع کر لیا جائے جو کتابوں میں پائی جاتی ہیں تو وہ بھی پچاس ہزار تک نہیں پہنچ سکتی ہیں) انہوں نے لکھا ہے اور بالکل صحیح لکھا ہے کہ امام احمد بن حنبل نے سارے اسلامی ممالک کا دو دفعہ دورہ ان ہی حدیثوں کے جمع کرنے کے لیے کیا لیکن ان کی مسند میں بھی چالیس ہزار حدیثیں پائی جاتی ہیں جن میں دس ہزار مکرر ہیں، بلکہ ابن عساکر سے تو ان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ مکررات کو حذف کرنے کے بعد مسند احمد کی قوی و ضعیف حدیثوں کی تعداد تیس ہزار تک بہ مشکل پہنچ سکتی ہے۔ (دیکھو الکتانی ج ۲ ص ۲۰۷) دراصل معنوی اور لفظی تکرار کے لحاظ سے شاید گننے میں یہ اختلاف پیدا ہو گیا ہے، معناً یا مآلاً جن دو حدیثوں کا مطلب ایک ہی ہے، ابن عساکر نے ان کو بھی مکررات میں غالباً شمار کر لیا ہے اور ابن جوزی نے ان ہی حدیثوں کو مکرر خیال کیا ہے جن کے الفاظ بھی ایک ہی ہیں اور ابن جوزی کا شمار تو خیر تشدد پسندوں میں ہے لیکن ان کے مقابلہ میں جلال الدین سیوطی جیسے سہولت پسند بزرگ نے جمع الجوامع کے نام سے حدیثوں کے جمع کرنے کا جو آخری کام کیا ہے اور اسی کتاب کی فقہی ترتیب مشہور ہندی محدث، علی متقی نے کنز العمال میں کی ہے، دیباچہ میں شیخ علی متقی نے لکھا ہے اس کتاب یعنی کنز العمال کے پڑھنے والوں کے سامنے نہ صرف جمع الجوامع ہی کی کل حدیثیں آ جائیں گی بلکہ ایک حصہ ان حدیثوں کا بھی ان کو ملے گا جو جمع الجوامع میں نہیں پائی جاتیں۔ اب دیکھئے کنز العمال کی حدیثوں کے گننے والوں نے بتایا ہے کہ یہ کتاب چالیس ہزار نو سو انسٹھ (۴۰۹۵۹) حدیثوں پر مشتمل ہے۔ میں کہتا ہوں کہ کنز العمال کا مطالعہ جن لوگوں نے کیا ہے ان کو اندازہ ہوا ہو گا کہ اس میں اب بھی کتنی حدیثیں مکرر ہیں۔ میرا تو خیال ہے کہ ان مکررات کو اگر حذف کر دیا جائے تو چالیس ہزار کی یہ تعداد گھٹ کر قریب قریب تیس ہزار تک پہنچ جائے تو تعجب نہ کرنا چاہیے۔ کنز العمال کا خلاصہ بحذف مکررات خود علی متقی نے کیا ہے جو مسند احمد کے حاشیہ پر چھپ بھی چکا ہے۔ شمار کرنے سے ثابت ہوا ہے کہ اس میں کل تیس ہزار اور دو حدیثیں درج ہوئی ہیں اور کون نہیں جانتا کہ حدیث کے ان مجامیع یا دائرۃ المعارف میں رطب و یابس ہر طرح کی حدیثیں لے لی گئی ہیں، اسی لیے میرا خیال ہے کہ صحیح اعلیٰ معیاری حدیثوں کی تعداد اگر دس ہزار تک بھی نہیں پہنچتی تو ضعیف و حسن و صحاح سب کو ملانے کے بعد تیس تیس ہزار سے آگے ان کی تعداد کا بڑھنا مشکل ہے۔ ۱۲

02066

ٹھہر سکتی۔ مگر ایک ایک حدیث کو مختلف راویوں سے سننے کا دستور را ور یہ کہ جتنے راویوں سے حدیث سنی جاتی تھی، ایک اصطلاح بنالی گئی تھی کہ حدیث کی تعداد بھی وہی قرار پاتی تھی یعنی دس راویوں سے اگر سنی گئی ہے تو وہی ایک حدیث دس حدیث بن جاتی تھی۔ الذہبی وغیرہ نے اس سلسلہ میں ایک دلچسپ لطیفہ ابراہیم بن سعید الجوہری کے تذکرے میں نقل کیا ہے کہ ایک صاحب جن کا نام جعفر بن خاقان تھا۔ انہوں نے ابراہیم سے حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کی روایت کی ہوئی ایک حدیث کے متعلق کچھ دریافت کیا۔ ابراہیم نے اپنی لونڈی (جاریہ) کو بلایا اور کہا کہ:

اَخْرِجِیْ لِی الْجُزْءَ الثَّالِثَ وَالْعِشْرِیْنَ مِنْ مُسْنَدِ اَبِیْ بَکْرٍ رضؓ — حضرت ابوبکرؓ کی روایت کردہ حدیثوں کی تیئسویں جلد نکال کر لا۔

جعفر نے ابراہیم کے ان الفاظ کو سن کر حیرت سے کہا کہ ابوبکر صدیقؓ سے تو پچاس حدیثوں کا صحیح ثابت ہونا بھی مشکل ہے، یہ آپ نے ان کی حدیثوں کا اتنا بڑا مجموعہ کہاں سے جمع کر لیا جس کی اتنی جلدیں ہیں؟ یہ سن کر ابراہیم نے حقیقت کو ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ:

کُلُّ حَدِیْثٍ لَا یَکُوْنُ عِنْدِیْ مِنْ مِائَۃِ وَجْہٍ فَاَنَا فِیْہِ یَتِیْمٌ، (تذکرہ ج ۲ ص ۸۹) — ایک ایک حدیث جب تک سو سو طریقوں سے مجھے نہیں ملتی تو اس حدیث کے متعلق میں اپنے آپ کو یتیم خیال کرتا ہوں۔

مطلب ابراہیم کا وہی تھا کہ ایک ایک حدیث سو سو طریقوں سے جب تک مجھے نہیں ملتی اس وقت تک تو اپنے آپ کو اس حدیث کے متعلق لاوارث یتیم آدمی خیال کرتا ہوں اور یوں ایک حدیث کو بجائے ایک کے وہ سو حدیث بنا لیتے تھے۔

ظاہر ہے کہ اس طریقے سے ابوبکر صدیقؓ کی حدیثوں سے مجلدات ابراہیم نے اگر بنا لئے تھے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ میں نے کہیں ذکر کیا ہے کہ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ والی حدیث واقع میں ظاہر ہے کہ ایک ہی حدیث ہے لیکن راویوں کے تعدد کی بنیاد پر محدثین نے بجائے ایک کے اس کی تعداد پانسو تک پہنچا دی ہے، میں نے پہلے بھی بتایا ہے کہ "محدثین" کا یہ خاص کارنامہ ہے۔ حدیثوں کی صحت و سقم کے پتہ چلانے کا یہ بہترین طریقہ تھا جسے انہوں نے ایجاد کیا تھا۔

اس زمانے میں پروپاگنڈے کے لئے یا صرف اس لئے کہ خبر میں سنسنی پیدا کرنے کی صلاحیت ہے بے بنیاد جھوٹی خبروں کے پھیلانے کا جو عام رواج ہے، ان خبروں کے متعلق بھی صحیح رائے وہی لوگ قائم کر سکتے ہیں جو مختلف نیوز ایجنسیوں کی خبروں اور مختلف اخباروں میں شائع ہونے والی اطلاعوں سے باخبر رہتے ہیں، وہی جانتے ہیں اور ان ہی کو یہ جاننے کا موقعہ ہے کہ کن کن ایجنسیوں کی روش معتاد ہے، ان میں کس کس کی کیا کیا خصوصیت ہے، ان میں بھروسا اور اعتماد کے قابل خبریں کون مہیا کرتا ہے، کچھ اسی طرح سمجھنا چاہئے کہ اس زمانے کے محدثین کا حال تھا۔ سفیان ثوری کا ایک قول حاکم نے معرفۃ علوم الحدیث میں نقل کیا ہے، اس کا حاصل بھی یہی ہے کہ حدیثوں کے سننے کی غرض ایک ہی نہیں ہوتی، کہا کرتے تھے کہ:

"ہم بعضوں سے اس لیے حدیث سنتے ہیں کہ اس کو اپنے دین میں شریک کریں اور کبھی کسی حدیث کی صحت اور عدم صحت کے متعلق فیصلہ کو ملتوی کرنے کے لیے بھی ہم بعضوں سے اس حدیث کو سنتے ہیں، بعضوں کی بیان کی ہوئی

حدیث کو ہم جانتے ہیں کہ مستحق توجہ نہیں ہے لیکن پھر بھی بیان کرنے والے کی روش اور مذہب کا پتہ چلانے کے لئے ہم اس سے حدیث سنتے ہیں۔" (معرفۃ علوم الحدیث، حاکم ص ۱۳۵)

حاکم نے احمد بن حنبل کی زبانی ایک قصہ نقل کیا ہے کہ ہم جس زمانے میں صنعاً (یمن) میں حدیث پڑھنے کے لیے مقیم تھے اور میرے ساتھ علاوہ دوسرے رفقائے یحیٰی بن معین بھی تھے، ایک دن میں نے یحیٰی کو دیکھا کہ گوشہ میں بیٹھے ہوئے کچھ لکھ رہے ہیں اور کوئی آدمی جب سامنے آجاتا ہے تو اسے چھپا دیتے ہیں، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ حضرت انسؓ کے نام جعلی حدیثوں کا ایک مجموعہ ابان کی روایت سے جو پایا جاتا ہے اسی کو یحیٰی نقل کر رہے ہیں، میں نے کہا کہ تم ان غلط اور جھوٹی روایتوں کو نقل کر رہے ہو۔ اس وقت یحیٰی بن معین نے کہا کہ

"بھائی! اسی لئے تو اس کو لکھ رہا ہوں کہ ان ساری روایتوں کو لکھنے کے بعد زبانی یاد کر لوں، میں یہ جانتا ہوں کہ یہ ساری روایتیں جعلی ہیں، غرض میری یہ ہے کہ ابان کی جگہ کسی معتبر راوی کا نام داخل کر کے غلط فہمی میں لوگوں کو اگر کوئی مبتلا کرنا چاہے گا تو میں اس غلط فہمی کا ازالہ اصل واقعہ کو ظاہر کر کے کر سکوں گا یعنی بتا سکوں گا کہ جس جگہ پر ثقہ راوی کا نام رکھا گیا ہے یہ غلط ہے درحقیقت ان روایتوں کا بنانے والا "ابان" ہے۔" (معرفۃ علوم الحدیث ص ۶۰)

"یحیٰی بن معین نے اسی غرض سے موضوع حدیثوں کا بھی ایک طومار نقل کیا تھا، کہا کرتے تھے کہ دروغ بافوں سے میں نے بڑا ذخیرہ روایتوں کا لکھا جس سے بعد کو میں نے اپنے تنور کو گرم کیا اور نہایت عمدہ پکی ہوئی روٹیاں اس سے تیار ہوئیں۔" (معرفۃ علوم الحدیث ص ۶۰)

خلاصہ یہ ہے کہ صحیح واقعات سے واقفیت کے لئے جیسے اس زمانے میں ہر قسم کی نیوز ایجنسیوں اور ہر طرح کے اخباروں کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ محدثین بھی یہی سمجھتے تھے کہ سچی روایتوں کو جھوٹی روایتوں سے جدا کرنے کے دوسرے ذرائع کے ساتھ ایک ذریعہ یہ بھی ہے کہ ہر طرح کے راویوں سے حدیثوں کو سننے کی کوشش کی جائے۔ حافظ ابو عمر بن عبدالبر نے ایوب سختیانی کے حوالہ سے یہ تجربہ کی بات نقل کی ہے کہا کرتے تھے۔

"اپنے استاذ کی غلطیوں سے تم اس وقت تک واقف نہیں ہو سکتے جب تک کہ دوسروں کے پاس بھی جا کر نہ بیٹھو۔" (ص ۹۹ جامع)

بہر حال حدیثوں کی تعداد میں اضافہ کی وجہ بھی اور ایک ایک محدث کے سینکڑوں اساتذہ کا نام کتابوں میں جو لیا جاتا ہے، اسکی وجہ بھی محدثین کا یہی مذاق تھا یعنی جب تک سو سو طریقوں سے حدیث ان تک نہ پہنچی ہو، اس وقت تک اس حدیث میں اپنے آپ کو یتیم قرار دیتے ان کے اساتذہ کی کثرت کا اندازہ اسی سے کیجئے کہ شعبہ جو اپنی تسلی کے لیے ہر حدیث کا بیس دفعہ سننا ضروری قرار دیتے تھے، ان کے کل اساتذہ نہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کی صحبت یافتہ بزرگوں یعنی تابعین میں ان کے استاذوں کی تعداد جیسا کہ ذہبی نے لکھا ہے

سَمِعَ مِنْ اَرْبَعِ مِائَةٍ مِّنَ التَّابِعِيْنَ	تابعین میں سے جن جن استاذوں سے شعبہ نے
(تذکرہ ج ۱ ص ۱۸۲)	حدیث سنی تھی، ان کی تعداد چار سو ہے۔

محدثین کے زہد و تقویٰ کی چند مثالیں

مقصود اس طول طویل گفتگو سے یہ ہے کہ جن لوگوں نے اپنے تن من دھن سب کو دین کے لیے مختص کر دیا تھا، یہی شعبہ نماز میں جن کے سجدوں اور رکوع کی وہ کیفیت تھی۔ ذہبی ہی نے لکھا ہے کہ باوجود اس جفاکشی کے صائم الدہر رہتے تھے، یعنی ہمیشہ روزے رکھتے تھے، دیکھ کر لوگوں کو رحم آتا، جلد بدن کی خشک نظر آتی تھی۔ بھلا سوچئے تو جن لوگوں کا یہ حال ہو کر پوچھنے والے نے پوچھا۔ اب پیرانہ سالی میں آپ کے مشاغل کی نوعیت کیا رہ گئی ہے تو جواب میں بولے کہ بھائی صرف ایک رکعت میں سورۂ بقرہ پڑھ لیتا ہوں اور مہینے میں اب تین روزوں یعنی ایام بیض کے، روزوں سے زیادہ رکھا نہیں جاتا۔ ابو اسحاق السبیعی کے حال میں ذہبی نے اس کا تذکرہ کیا ہے جن کے اساتذہ میں اڑتیس تو صرف صحابی ہیں (ج ۱ ص ۱۰۸) آخر اسی عہد کے محدثین میں جب ایسے لوگ بھی تھے، مثلاً ثابت البنانی کے متعلق لکھا ہے کہ:

"دن رات کے چوبیس گھنٹوں کے اندر معمول تھا کہ قرآن ختم کر لیتے تھے اور ہمیشہ صائم الدہر رہتے۔
(جلد ۱ ص ۱۱۸)

سلیمان تیمی بھی صائم الدہر تھے، عموماً صبح کی نماز عشا کے وضو سے پڑھتے تھے، نفل کی نمازوں میں ان کا بھی حال یہی تھا کہ ستر دفعہ سے کم سجدے میں تسبیح نہ پڑھتے تھے۔ (تذکرہ ج ۱ ص ۱۴۲) اس عہد کے بزرگوں کے عبادات و ریاضات کی تفصیل کے لیے حلیۃ الاولیاء اور صفوۃ الصفوہ وغیرہ پڑھنی چاہیئے۔ نسبتاً ان میں جن لوگوں کو عافیت پسند اور آسائش و آرام، فراغت و رفاہیت کی زندگی بسر کرنے والوں میں شمار کیا جاتا ہے، کہا جاتا ہے کہ بڑے خوش خوراک خوش پوشاک تھے لیکن ان کا حال یہ تھا، مثلاً امام نسائیؒ کے متعلق ذہبی نے اس کا ذکر کرتے ہوئے کہ بڑے وجیہ و شکیل آدمی تھے، برود نوبیہ (ایک قسم کی قیمتی چادر تھی) اور سبز دو شالے کو پسند کرتے تھے، لکھا ہے کہ۔

"کھانے میں نسائی زیادہ تر بڑے قد والے مرغ کو پسند کرتے تھے، جو خاص کر ان کے لیے خریدے جاتے تھے اور ران کو خصی کر کے خوب فربہ کر لیا جاتا تھا۔" (ص ۲۴۱)

لیکن باوجود ان تمام باتوں کے محمد بن مظفر بیان کرتے تھے کہ:

"میں نے مصر (جہاں امام نسائیؒ نے قیام اختیار کر لیا تھا) وہاں کے سارے علما اور مشائخ کو پایا کہ وہ امام نسائیؒ کی عبادت و ریاضت جس کا سلسلہ شب و روز جاری رہتا تھا۔ تعریف کرتے تھے۔"
(ص ۲۴۲)

ان کے دینی تصلب کے سلسلے یہی کیا کم ہے کہ محض حق گوئی کی وجہ سے گویا ان کو شہید ہونا پڑا[1]۔ کہتے ہیں کہ خواجہ حسن بصری بھی لطیف

---

[1] امینی لکھا ہے کہ مصر سے مکہ معظمہ جاتے ہوئے امام دمشق میں ٹھہرے، عام طور پر خوارج کا اس زمانہ میں شام کے علاقوں میں زور تھا، جامع مسجد میں کسی نے پوچھ لیا کہ آپ بڑے محدث ہیں امیر معاویہؓ کی تعریف میں بھی تو کچھ حدیثیں بیان کیجئے، باوجودیکہ شام والوں کے عقائد

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

غذاؤں کا خاص ذوق رکھتے تھے۔ ابن سعد نے حمید کا قول نقل کیا ہے، کہتے تھے کہ

مَا شَمَمْتُ مُرْقَةً قَطُّ اَطْيَبَ مِنْ مَرْقَةِ الْحَسَنِ (ابن سعد ج، ص ۱۲۱) — حسن بصری کے شوربے سے زیادہ خوشگوار خوشبو میں نے کسی دوسرے آدمی کے شوربے میں نہیں سونگھی۔

یہ بھی اسی میں ہے کہ گوشت کا روزانہ آپ کے دستر خوان پر رہنا ضروری تھا، لیکن زہد و تقویٰ، عبادت و ریاضت مجاہدہ میں جو ان کا حال تھا اس سے کون ناواقف ہے، ابن جوزی نے بیس جزوں میں ان کے حالات لکھے ہیں، اسی سے اندازہ کیجیے۔ یوسف بن اسباط جیسے آدمی کا بیان ہے کہ :

"تیس سال سے یہ شخص ہنسا نہیں ہے اور چالیس سال اس حال میں گزارا کہ اس عرصے میں کسی سے مذاق نہ کر سکے۔" (صفوہ ج ۳ ص ۱۵۶)

روتے رہتے تھے، لوگ پوچھتے تو کہتے کہ معاملہ ایسے سے آپڑا ہے جسے کسی کی کوئی پروا نہیں ہے، کون جانتے کہ کل میں آگ میں نہ جھونکا جاؤں گا (صفوہ ج ۳ ص ۱۵۶)

حسن بصری اور عمر بن عبدالعزیز کے خوف کو دیکھ کر یزید بن حوشب کہا کرتے تھے کہ :

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جہنم کے لئے حسن بصری اور عمر بن عبدالعزیز کے سوا اور کوئی پیدا ہی نہیں ہوا ہے۔"

یا امام مالک ہی ہیں کھانے پینے، رہنے سہنے میں ان کا نقطۂ نظر عام طور پر مشہور ہے۔ ہمیشہ قیمتی لباس زیب تن فرماتے عطر اور خوشبو میں ڈوبے رہتے، ان کے دربار کے رعب اور وقار کو دیکھ کر لوگ کہا کرتے تھے كَانَهٗ بَابُ اَمِيْرٍ (کسی امیر آدمی کی ڈیوڑھی ہے) آپ کا بھی معمول تھا کہ گوشت کے بغیر کھانا تناول نہیں فرماتے تھے اور اپنے اس ذوق پر اتنا اصرار تھا کہ کسی دن اگر گوشت کے لئے پیسے نہ ہوتے اور اس کے لئے گھر کی کوئی چیز بیچنی پڑتی تو لکھا ہے کہ يَفْعَلُ (وہ چیز بیچ کر گوشت خریدتے۔) (الدیباج المذہب ص ۱۹) ہر جمعہ کو دستور تھا۔

كَانَ يَاْمُرُ خَبَّازَهٗ سَلَمَةَ اَنْ يَّعْمَلَ لَهٗ وَلِعِيَالِهٖ طَعَامًا كَثِيْرًا (ص ۱۹) — سلمہ نامی باورچی جو آپ کا تھا اس کو حکم دے رکھا تھا کہ امام اور امام کے گھر والوں کے لیے بہت زیادہ کھانا تیار کرے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) سے امام نسائی واقف تھے، اس باب میں ان کا جو علم تھا اس کو چھپانا راست بازی اور تدین کے خلاف معلوم ہوا، بھری مجلس میں کہہ دیا کہ امیر معاویہؓ کے فضائل کیا پوچھتے ہو؟ معاملہ ان کا برابر سرابر بھی ہو جائے تو کیا تمہارے خوش ہونے کے لیے یہی کافی نہیں ہے نتیجہ جو ہو سکتا تھا وہی ہوا کہ خوارج جن سے مسجد بھری پڑی تھی، ان پر ٹوٹ پڑے اور بے تحاشا مارنا شروع کیا۔ لکھا ہے کہ خصوصیت کے ساتھ شرمگاہ اور رانڈ دنی بیضہ کو لاتوں سے لوگوں نے اتنا کچلا کہ اس کی تکلیف سے جانبر نہ ہو سکے۔ دمشق سے کسی طرح مکہ تو ان کو پہنچا دیا گیا لیکن مکہ پہنچ کر وفات ہو گئی۔

(ذہبی ج ۲ ص ۲۴۲)

مگر باوجود ان تمام باتوں کے ان کے علم و عمل تقویٰ و دیانت کے جو گہرے نقوش امت کے قلوب پر قائم ہیں کیا وہ قیامت تک مٹ سکتے ہیں۔ اللہ اللہ بارگاہِ رسالت پناہی ؐ کے ساتھ جس کی نیاز مندیوں اور ادب شناسیوں کا یہ حال ہو، عبداللہ بن مبارک کی یہ چشم دید شہادت ہے۔ فرماتے ہیں کہ:

"امام مالک ہم لوگوں کو حدیث پڑھا رہے تھے، بچھو (جو اُن کے کپڑوں میں کسی طرح گھس گیا تھا) نے سولہ دفعہ ڈنک مارے، امام مالک کا چہرہ ہر نیش پر متغیر ہو کر زرد پڑ جاتا تھا لیکن حدیث جس طرح بیان کر رہے تھے بیان کرتے رہے، درمیان میں اس کے سلسلہ کو نہ توڑا۔ جب درس ختم ہو گیا اور لوگ اِدھر اُدھر ہو گئے تب میں نے عرض کیا آج آپ کا یہ کیا حال ہو رہا تھا تب وجہ بیان کی اور فرمایا کہ اِنَّمَا صَبَرْتُ اِجْلَالًا لِحَدِیْثِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے احترام کی وجہ سے میں صبر کئے بیٹھا رہا)"

(دیباچ ص ۲۲)

دوسری کتابوں میں ہے کہ درس سے فارغ ہونے کے بعد اندر تشریف لے گئے، کپڑے اتارے تب بچھو نکالا گیا۔ باہر آ کر ابن مبارک سے چہرے کے تغیر کی وجہ بیان کی۔ یہ اور اسی قسم کے بیسیوں واقعات کا تذکرہ اس طبقہ کے متعلق کیا جاتا ہے جو حدیثوں کی حفاظت و اشاعت کا صحابہ کے بعد ذمہ دار بن گیا تھا، کیا یہ صرف گزر جانے کی بات ہے؟ پیغمبر اور پیغمبر کی حدیثوں کا جس کے دل میں اتنا احترام ہو کہ بچھو ڈنک پر ڈنگ مارتا چلا جا رہا ہے لیکن چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سنا رہا ہوں، سنانے والا صرف اس خیال سے اپنی جگہ سے ہلتا بھی نہیں

حفاظِ حدیث کے اس گروہ میں جنہیں وسعت عطا کی گئی تھی خود امام بخاری بھی ہیں۔ بخارا میں ان کی کافی جائداد تھی اور متعدد پن چکیاں ان کی چلتی تھیں، وسیع پیمانے پر تجارتی کاروبار بھی کرتے تھے جس میں ایک ایک دفعہ میں دس دس ہزار کا نفع ہوتا تھا لیکن بایں ہمہ صرف رمضان میں ان کے مجاہدے کا یہ حال تھا کہ علاوہ تراویح کے پچھلی رات کو نصف یا ایک تہائی قرآن تہجد میں ختم کرتے گویا ہر دوسرے یا تیسرے دن قرآن ختم ہو جاتا تھا، اور یہ اس تلاوت کے سوا تھا جو دن کو روزہ کی حالت میں کرتے تھے۔ دستور تھا کہ دن کو قرآن کو شروع کرتے اور افطار کے وقت تک ختم ہو جاتا تھا۔ امام بخاری کے ساتھ بھی کہتے ہیں امام مالک ہی کے قریب قریب حادثہ پیش آیا، امام مالک تو حدیث پڑھا رہے تھے اس وقت بچھو نے کاٹا تھا۔ امام بخاری کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کے شاگردوں میں سے کسی نے باغ میں حضرت کی دعوت کی تھی۔ اتنے میں ظہر کا وقت آ گیا، فرض سے فارغ ہو کر نفل میں مشغول ہوئے کہ عین نماز میں بھڑ نے کاٹنا شروع کیا لیکن نماز نہ توڑی۔ جب سلام پھیرا تو لوگوں سے کہا کہ دیکھو میرے کرتے میں کوئی چیز تو نہیں ہے۔ دیکھا گیا تو بھڑ برآمد ہوئی۔ کئی جگہ اس کاٹنے کی وجہ سے ورم ہو گیا تھا۔ پوچھا گیا کہ نماز آپ نے توڑی کیوں نہیں؟ فرمایا کہ

كُنْتُ فِيْ سُوْرَةٍ فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُتِمَّهَا — میں ایک سورہ کی تلاوت میں مشغول تھا۔ جی یہی چاہا کہ اس کو ختم کر لوں۔

(تاریخ بغداد ج ۲ ص ۱۳)

اور میں ان قصول کو کہاں تک بیان کروں، ان کی کوئی حد و انتہا بھی ہو۔ میرا تو خیال ہے کہ جن بزرگوں کے متعلق سمجھا گیا ہے کہ وہ

کچھ غیر معمولی طور پر خوش خوراک خوش پوشاک تھے۔ ان کی غرض بھی یہی تھی کہ اس ذریعہ سے کام زیادہ قوت اور زیادہ بشاشت کے ساتھ انجام پا سکتا ہے۔ خیال تو کیجیے کہ راتیں جن لوگوں کی اس طرح گزرتی تھیں جیسا کہ امام بخاری ہی کے متعلق ان کے اوراق (مسودہ) نویس محمد بن ابی حاتم کا بیان ہے کہ:

"سفر میں امام بخاری کے ساتھ میرا قیام اسی کمرے میں عموماً ہوتا تھا جس میں امام آرام فرماتے تھے، دیکھا کرتا تھا کہ رات کو جب ہم لوگ سو رہتے تو امام بخاری بار بار اُٹھ اُٹھ کر چقماق سے چراغ جلاتے اور لکھی ہوئی حدیثوں پر کچھ علامت بناتے پھر سو رہتے۔ ایک ایک رات میں پندرہ سے بیس دفعہ تک میں نے دیکھا ہے کہ اٹھتے ہیں اور لیٹتے ہیں، پھر اُٹھتے ہیں اور لیٹتے ہیں، میں عرض کرتا کہ جس وقت آپ اُٹھتے ہیں مجھے اٹھا لیا کیجئے تو فرماتے کہ میاں تم جوان آدمی ہو، تمہاری نیند کو میں خراب کرنا نہیں چاہتا۔" (ص ۱۴۳)

اس قسم کی محنت اور جفاکشی کے لیے خود ہی سوچنا چاہئے کہ کتنی غیر معمولی توانائی کی ضرورت ہے، ایک دلچسپ لیکن غیر معمولی نتائج کا حامل اسی سلسلے کے بزرگوں میں وکیع بن الجراح کا وہ وقت نامہ ہے جسے خطیب نے وکیع کے صاحبزادے سفیان بن وکیع کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔ یہ وکیع صرف حدیث ہی کے نہیں بلکہ فقہ کے بھی امام ہیں، حنفیوں کو اس پر فخر ہے کہ وکیع زیادہ تر امام ابوحنیفہ کے نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر فتوی دیا کرتے تھے، سفیان ثوری کے تلمیذ خاص سمجھے جاتے ہیں عبداللہ بن مبارک، احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین، علی بن مدینی وغیرہم اکابر کے وکیع استاذ ہیں، امیر گھرانے کے آدمی تھے، صرف والدہ سے لکھا ہے کہ دس لاکھ درہم وراثت میں ان کو ملے تھے۔ بہرحال چوبیس گھنٹے کا نظام اوقات آخر زمانے میں ان کا کیا تھا وہ سنئے، ان کے صاحبزادے کہتے تھے:

میرے والد صاحب الدہر تھے، قاعدہ ان کا یہ تھا کہ صبح سویرے (نمازِ صبح سے فارغ ہونے کے بعد) درس حدیث کے حلقہ میں تشریف لاتے، حدیث کے طلبہ کو پڑھاتے رہتے تا آں کہ دن کافی چڑھ جاتا، حلقہ سے اٹھ کر گھر تشریف لاتے اور سو جاتے، ظہر کے وقت تک سوتے اس کے بعد ظہر کی نماز کے لئے اٹھتے، نماز سے فارغ ہو کر اس سڑک کی طرف چلے جاتے جدہر پانی بھرنے والے بہشتے پکھالیں بھر بھر کر شہر کی طرف لاتے تھے اور ہر ایک سے دریافت کرتے کہ قرآن اس کو کتنا یاد ہے، جسے یاد نہ ہوتا اس کو قرآن کی اتنی سورتیں یاد کراتے جو نماز پڑھنے کے لیے کافی ہوں، یہ کام عصر کے وقت تک کرتے، عصر کی نماز اپنی مسجد میں ادا فرماتے اور نماز کے بعد وہیں بیٹھ کر قرآن کا درس دیتے، کچھ وقت بچتا اسے اللہ کی یاد میں گزارتے۔ مغرب کی نماز پڑھ کر گھر تشریف لاتے تب افطار کا کھانا آپ کے آگے رکھا جاتا۔ قریب دس رطل (گویا) پانچ سیر سے کم مقدار مجموعی طور پر کھانے کی نہ ہوتی۔ کھانے کے بعد آپ کے سامنے نبیذ کا قرابہ پیش ہوتا۔ دس رطل کے قریب نبیذ[1] جس میں ہوتی کھانے کے بعد اس قرابہ سے جتنا ان کا جی چاہتا

---

[1] نبیذ کیا چیز ہے؟ جو نہیں جانتے ہیں یا نہیں جاننا چاہتے ہیں انھوں نے طرح طرح کی باتیں اس کے متعلق مشہور کر رکھی ہیں حالانکہ اس

(باقی صفحہ آئندہ)

پیتے رہتے اور جو بچ جاتا اس کو سامنے رکھ لیتے"۔
اس کے بعد کیا کرتے تھے، اسی کو میں پیش کرنا چاہتا تھا۔ سفیان بن وکیع کہتے ہیں کہ

وَيَقُوْمُ فَيُصَلِّيْ وِرْدَهٗ مِنَ اللَّيْلِ وَكُلَّمَا صَلّٰى رَكْعَتَيْنِ اَوْ اَكْثَرَ مِنْ شَفْعٍ اَوْ وِتْرٍ شَرِبَ مِنْهَا حَتّٰى يَنْفَدَ هَا ثُمَّ يَنَامُ۔ (تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۴۷)	پھر کھڑے ہو جاتے اور رات میں نمازوں کا ان کا جو ورد تھا اُسے پورا کرتے اور دو رکعتوں یا ان سے زیادہ رکعتوں کے بعد خواہ طاق ہوں یا جفت (سلام پھیر کر) اسی قرابہ سے پیتے رہتے تا آں کہ ختم ہو جاتا پھر سو رہتے۔

ظاہر ہے کہ دن بھر روزہ رکھنے کی وجہ سے جو ضعف پیدا ہو جاتا تھا اسی کی تلافی رات کو نبیذ سے فرماتے تھے، کیونکہ نبیذ کو نشہ آور عرق قرار دینا تو تجربہ سے پہلے خواہ مخواہ بدگمانی میں مبتلا ہو کر ایک دعویٰ کر بیٹھنا ہے، لیکن اس میں شک نہیں کہ کھجور اور انگور سے جو عرق نبیذ کی شکل میں حاصل کیا جاتا تھا اس سے کافی قوت پیدا ہوتی تھی اسی لئے تو وکیع نبیذ کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کو یوں سمجھنا چاہیے کہ اطبا جس دوا کو خیسانده کہتے ہیں یعنی رات کو پانی میں عناب، گاؤزبان، سپستان وغیرہ اسی قسم کی نباتاتی دوائیں ڈال دی جاتی ہیں اور صبح کو بقول ان ہی اطبا "مالیدہ صاف نمودہ بنوشند" نبیذ بھی یہی چیز تھی، فرق صرف اتنا تھا کہ بجائے نباتاتی دواؤں عناب، سپستان وغیرہ کے کھجور، یا کشمش، منقیٰ کو پانی میں رات کو ڈال دیتے تھے جیسے "مالیدہ صاف نمودہ" صبح کو پیتے تھے اور صبح کو ڈالی ہوئی نبیذ رات کو استعمال کرتے تھے۔ میں پوچھتا ہوں کہ دوائی خیساندہ کے استعمال کا موقع کسے نہ ملا ہوگا۔ پھر کیا اس میں نشہ یا سکر پیدا ہو جاتا ہے حالانکہ نباتاتی اشیاء ہونے کی وجہ سے اس میں بھی الکحل پیدا ہو سکتا ہے، جیسے کھجور، کشمش، منقیٰ کے خیساندہ کو دھوپ میں رکھ دیجئے تو یقیناً اس عمل کے بعد اس میں جوش پیدا ہونے کف پھینک دینے کے بعد نشہ پیدا ہو جاتا ہے، لیکن نبیذ اس کے بعد تو شراب بن جاتی ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ نبیذ کے نام سے ناجائز نفع اٹھاتے ہوئے بعض لوگوں نے شراب بنام نبیذ استعمال کیا ہو لیکن ائمہ کوفہ نے نبیذ کی حلت کا جو فتویٰ دیا ہے میرے خیال میں اس کی حرمت پر اصرار کرنا ایسا ہی ہے کہ کسی حلال چیز کو خواہ مخواہ حرام ثابت کرنے کی کوشش کی جائے۔ بلکہ دوائی خیساندے کو بعض دفعہ آگ پر جوش دے کر بھی استعمال کرتے ہیں اس میں بھی نشہ پیدا نہیں ہوتا۔ اسی طرح کھجور یا کشمش کے خیساندہ کو آگ پر اگر جوش دے دیا جائے تو گاڑھا ضرور ہو جائے گا لیکن نشہ اس میں پیدا ہوگا قطعاً یہ تجربہ کے خلاف ہے اگر اس میں نشہ کا پیدا ہونا ضرور ہے تو چاہیے کہ سارے دوائی خیساندے میں پیدا ہو جائے۔ امام ابو حنیفہؒ کو لوگوں نے اس معاملہ میں بہت بدنام کیا ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا وکیع امام ہی کے مسلک کی اتباع فقہ میں کرتے تھے اس لئے وہ خود بھی پیتے تھے اور دوسروں کو بھی پینے کا حکم دیتے تھے۔ ایک دفعہ کسی نے وکیع سے کہا کہ حضور میں نے نبیذ پی تو رات کو خواب دیکھا، کہنے والا کہتا ہے کہ تو نے شراب پی۔ وکیع نے سن کر فرمایا کہ شیطان ہوگا جس نے تجھ سے یہ کہا۔ کہتے تھے کہ فرات کے پانی اور نبیذ میں میرے نزدیک قطعاً فرق نہیں ہے۔ ۱۲۔

(خطیب ج ۱۳ ص ۴۷۱)

قرابے کو سامنے رکھ کر رات کی نماز پڑھا کرتے تھے، جہاں کچھ سستی محسوس ہوتی ایک پیالہ چڑھا لیتے تھے، جب وہ ختم ہو جاتا تو سو رہتے تھے۔

میں تو سمجھتا ہوں کہ وکیع ہی کے متعلق الذہبی نے جس واقعہ کا ذکر بطور ایک ظریفانہ لطیفہ کے کیا ہے مجھے تو ظرافت سے زیادہ اس میں حقیقت کی جھلک نظر آتی ہے، لکھا ہے کہ وکیع ذرا لحیم شحیم بھاری بدن کے آدمی تھے، جب کہ پہنچے اور سرخیل صوفیہ فضیل بن عیاض سے ملاقات ہوئی تو ان کی فربہی کو دیکھ کر فضیل نے کہا کہ میں نے تو سنا ہے کہ تم راہب العراق ہو پھر یہ فربہی کیسی؟ جواب میں وکیع نے فرمایا:

هٰذَا مِنْ فَرَحِيْ بِالْاِسْلَامِ۔ اسلام کی وجہ سے جو نشاط کی جس کیفیت میں رہتا ہوں، یہ اس کا نتیجہ ہے۔

(تذکرہ ج ۱ ص ۲۸۲)

واللہ اعلم کہ ان کا واقعی مطلب کیا تھا لیکن میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ آدمی اپنے جسم کی بھی اگر نگرانی سے غفلت نہ اختیار کرے اور محنت و مشقت کا جو بار اس پر ڈالا جائے اس کی تلافی عمدہ اور لطیف غذاؤں سے کرتا رہے تو جن ذہنی بےچینیوں اور دماغی الجھنوں سے اسلام آدمی کو نجات عطا کر کے روحانی سکون بخشتا ہے ان دونوں باتوں کا مجموعی اثر وہی ہونا چاہئے جس کا وکیع کے وجود میں مشاہدہ کیا گیا تھا۔

خیر یہ تو ایک ضمنی بات تھی، میں نے جیسا کہ عرض کیا، وکیع کے وقت نامے سے اور بہت سی باتیں معلوم ہوتی ہیں، ایک تو اسی کا پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے کے بزرگوں کی ساری زندگی مقررہ اوقات کے ساتھ بندھی ہوئی تھی۔ یہ ان کے ضبط اوقات ہی کا نتیجہ تھا کہ ان علمی مشاغل اور مجاہدات کے ساتھ جو بجائے خود حیرت انگیز ہیں وہ علم کا کام اور کیسا کام؟ انجام دے سکتے تھے۔ بعض لوگوں کو حیرت ہوتی ہے کہ جن لوگوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اتنی نمازیں پڑھتے تھے اور اتنی مختصر مدت میں قرآن ختم کرتے تھے، آخر ان کو ہزارہا ہزار حدیثوں کے یاد کرنے کا موقع کیسے مل جاتا تھا؟ لیکن سمجھا نہیں گیا، پہلی بات تو یہی ہے کہ اپنے اوقات عزیز کو لایعنی مشاغل میں جو صرف کرنے کے عادی ہیں وہ ان لوگوں کے اوقات کی برکتوں کا اندازہ ہی نہیں کر سکتے تھے جو اپنی ایک ایک سانس کی قیمت حاصل کرنے کے درپے ہوتے ہیں۔ آخر عام لوگوں کا کیا حال ہے۔ تھوڑا وقت معاشی کاروبار میں وہ ضرور لگاتے ہیں لیکن اس کے بعد کھیل تماشوں، سینما بینی، تاش بازی اور اسی قسم کی مختلف بازیوں میں جتنا وقت بیکار وہ خرچ کر دیتے ہیں اگر اسی میں وہ کام کرنے کا تجربہ کریں تو خود ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ جو کچھ ان بزرگوں کی طرف منسوب کیا جاتا ہے یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جو سمجھ میں نہ آئے۔ ماسوا اس کے محدثین کی زندگی کے دو مستقل دور تھے، ایک زمانہ ان کا طلب حدیث کا ہوتا تھا، گزر چکا کہ اس زمانہ میں عہد صحابہ اور اس کے بعد بھی سمجھا جاتا تھا کہ نفلی عبادات پر علمی اشتغال کو ترجیح دینا چاہیئے۔ اس سلسلے میں متعدد شہادتوں کا تذکرہ کر چکا ہوں، اسی کا نتیجہ تھا کہ جن سے نفلی عبادات کا ترک بالکلیہ ممکن نہ ہو سکتا تھا وہ اپنے اوقات خصوصاً اپنی راتوں کو چند حصوں پر تقسیم کر دیتے تھے۔ عمرو بن دینار جو سفیان و شعبہ وغیرہ کے استاذ اور ابن عباس رضی و ابن عمر رضی کے شاگرد ہیں، ان کے حال میں لکھا ہے کہ:

"رات کو انہوں نے چند حصوں میں تقسیم کر دیا تھا، ایک ثلث تو نیند کے لیے تھا دوسرے ثلث میں وہ حدیثیں یاد کرتے تھے اور تیسرے ثلث میں نمازیں پڑھتے تھے"

(جامع ص ۱۰۷)

اور طلبِ حدیث کا دَور جب گزر جاتا تھا تو ظاہر ہے کہ حدیث کے ان حافظوں کو اب حدیث کے یاد کرنے کے لیے وقت دینے کی ضرورت نہیں رہتی تھی۔ رات ان کی فارغ ہو جاتی تھی، البتہ دن کو شاگردوں کے سامنے اپنی یاد کی ہوئی حدیثوں کو دہراتے تھے اور اسی سے ان کی یاد تازہ رہتی تھی۔ بڑے بڑے حفاظ کا تو یہ حال تھا کہ ان کا حافظہ بھی غیر معمولی طور پر قوی تھا، اسی لئے اس قسم کے حضرات درسِ حدیث کے وقت اپنے ہاتھ میں کتاب کبھی نہیں رکھتے۔ کتابوں میں پڑھئے اس قسم کے فقرے مثلاً:

لَمْ يُرَ فِي يَدِ سُفْيَانَ بْنِ عُيَيْنَةَ وَالثَّوْرِي وَشُعْبَةَ وَوَكِيعٍ كِتَابٌ قَطُّ۔ — سفیان بن عیینہ اور سفیان ثوری اور شعبہ و وکیع کے ہاتھوں میں کتاب کبھی نہیں دیکھی گئی۔

اور

مَا رُؤِيَ لِوَكِيعٍ كِتَابٌ قَطُّ وَلَا لِهُشَيْمٍ وَلَا لِحَمَّادٍ وَلَا لِمَعْمَرٍ (خطیب ج ۱۳ ص ۴۷۵) — نہ وکیع ہی کے ہاتھ میں کبھی کتاب دیکھی گئی اور نہ ہشیم کے ہاتھ میں نہ حماد کے ہاتھ میں اور نہ معمر کے ہاتھ میں۔

یہ تو غیر معمولی حافظہ رکھنے والے بزرگوں کی عادت تھی، باقی جن لوگوں کی قوت یاد داشت ایسی نہ تھی پڑھانے کے وقت اپنے ہاتھوں میں وہ کتاب رکھتے تھے اور جن بیچاروں کو درس کا موقعہ میسر نہ آتا تو گزر چکا کہ مکتب خانوں کے بچوں کے سامنے یا عام غربا کے مجمع میں جا کر اپنی حدیثوں کو دہراتے تھے۔ بہر حال وکیع کے نظام الاوقات کا سب سے زیادہ عبرت انگیز جزو وہ ہے کہ سقوں کی گزرگاہ میں پہنچ کر ان کو قرآنی سورتیں یاد کراتے تھے۔ آج کسی مولوی کو کسی قصبہ یا شہر میں معمولی سا امتیاز بھی حاصل ہو جاتا ہے تو وہ بیچارہ خدا جانے اپنے آپ کو کیا سمجھنے لگتا ہے۔ لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے راست باز خادموں کو آپ دیکھ رہے ہیں۔ یہ وکیع ہیں وہی وکیع، امامِ فنِ رجال یحییٰ بن معین جن کے متعلق کہتے تھے کہ میری آنکھوں نے ان سے بڑا آدمی نہیں دیکھا۔ یہی دعویٰ امام احمد بن حنبل کا بھی تھا کہ علم میں وکیع جیسا آدمی میری نظر سے نہیں گزرا۔ امام احمد کی طرف یہ قول بھی منسوب کیا گیا ہے:۔

مَا رَأَتْ عَيْنِي مِثْلَهُ قَطُّ يَحْفَظُ الْحَدِيثَ جَيِّدًا وَيُذَاكِرُ بِالْفِقْهِ فَيُحْسِنُ مَعَ وَرَعٍ وَاجْتِهَادٍ وَلَا يَتَكَلَّمُ فِي أَحَدٍ۔

(خطیب ص ۴۷۴)

وکیع جیسے آدمی کو میری آنکھوں نے کبھی نہیں دیکھا۔ حدیثیں بھی ان کو خوب یاد تھیں اور فقہی مسائل پر خوبی کے ساتھ بحث کرتے تھے۔ (ان علمی فضائل کے ساتھ) ان میں پارسائی اور عبادت میں جد و جہد کی خصوصیت بھی پائی جاتی تھی، وہ کسی پر اعتراض اور نکتہ چینی بھی نہیں کرتے تھے۔

لیکن جو اپنے وقت کا سب سے بڑا امام فقہ میں بھی تھا اور حدیث میں بھی وہ بہشتیوں کو قرآن کی ابتدائی سورتوں کے سکھانے کو بھی اپنی زندگی کا ایک فرض قرار دیئے ہوئے تھا، ایسے ہی آدمی کے گھر میں یہ ہو سکتا تھا جیسا کہ ان کے صاحبزادے ابراہیم کا بیان ہے :

"میرے والد تہجد کی نماز کے لئے جس وقت اٹھتے تھے تو ان کے ساتھ سارا گھر اس نماز کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا۔ حتیٰ کہ گھر میں جبشن چھوکری تک تہجد پڑھتی تھی"

(خطیب جلد ۱۳ ص ۴۷۱)

بہرحال ان چیزوں کو کہاں تک لکھوں۔ غرض یہ تھی کہ صحاح ستہ کے مصنفین سے پہلے اور عہدِ صحابہؓ کے بعد حدیث کی حفاظت و اشاعت کا کام ڈیڑھ سو سال کے اس درمیانی وقفہ میں جن لوگوں کے سپرد رہا خود ان کا اور جس ماحول کا ایک سرسری اجمالی خاکہ بقدرِ ضرورت لوگوں کے سامنے آجائے اور میں سمجھتا ہوں کہ جو کچھ آپ کے سامنے اس وقت تک پیش کیا جا چکا ہے انشاء اللہ اس مقصد کے لیے وہ کافی ہے، اب اسی کے ساتھ اور بھی چند چیزوں کو اپنے سامنے رکھ لیجیے، اگرچہ ضمناً ان کی طرف بھی اشارہ کرتا چلا آیا ہوں۔

حفظ اور کتابت

اب ان سارے معلومات اور مقدمات کو سامنے رکھ کر سوچئے کہ مصنفین صحاح اور عہدِ صحابہؓ کے اس درمیانی وقفہ میں مان بھی لیا جائے کہ حدیثوں کی حفاظت کی ایک ہی شکل یعنی کتابت نہیں صرف حفظ ہی تھی تو جو ان کا ماحول تھا اور جس قسم کے ظاہری باطنی خصوصیات میں از سرتاقدم وہ ڈوبے ہوئے تھے ان کے لحاظ سے حدیثوں کو زبانی یاد کر لینا یہ کام ان کے لیے کچھ بھی دشوار تھا؟ ایک ایسے بدترین ناموافق حالات جن میں پچھلی صدی ڈیڑھ صدی سے مسلمان گزر رہے ہیں، ان کی زندگی کا سارا نظام الٹ پلٹ ہو چکا ہے، قلوب پر دین کی گرفت روز بروز ڈھیلی پڑتی چلی جا رہی ہے لیکن بایں ہمہ حفظ بے تکلف کے عام قانون کے تحت ہمارے اور آپ کے سامنے دس بیس ورق ہی نہیں بلکہ اول سے آخر تک الحمد سے والناس تک کے حافظِ قرآن ہزارہا ہزار کی تعداد میں جب پیدا ہو رہے ہیں تو جس زمانہ کا نقشہ صفحات بالا میں آپ کے آگے رکھا گیا ہے، حدیثوں کے حفظ کا مسئلہ کیا کوئی بڑی بات تھی؟ جس کی دشواریوں کو محسوس کر کے یا کرا کے آج حدیثوں کے متعلق بدگمانیاں پھیلائی جا رہی ہیں، خصوصاً جب اسی کے ساتھ ان نکات کو بھی پیشِ نظر رکھ لیا جائے کہ ان محفوظ حدیثوں میں ملفوظاتِ نبویہ کے ساتھ ایک بڑا حصہ واقعات (یعنی افعال اور تقریرات) کا بھی شریک تھا اور میرا تخمینہ یہ ہے کہ حدیث کے ان تینوں اجزا میں دو تہائی حصہ ان ہی واقعات کا ہے بلکہ صحیح جستجو سے اگر کام لیا جائے تو شاید اس تخمینہ سے زیادہ بھی ہو، عرض کر چکا ہوں کہ واقعات کا یاد رکھنا آدمی کی قوتِ یادداشت کے لیے اتنا دشوار نہیں ہے، جتنا کہ ملفوظات اور اقوال کے یاد کرنے میں حافظہ پر بار پڑتا ہے، پھر اسی کے ساتھ جب اس کو بھی سوچا جائے کہ سو ڈیڑھ سو سال کے اس درمیانی وقفہ کے ابتدائی ایام میں عموماً حدیث کا سرمایہ بکھری ہوئی شکل میں تھا۔ اجتماع اور تمرکز کی کیفیت اس میں بعد کو پیدا ہوئی، ظاہر ہے کہ اجتماع و تمرکز کی اس کیفیت سے پہلے ہر ایک پر حدیثوں کی محدود تعداد کے حفظ کی چونکہ ذمہ داری عائد ہوتی تھی اس لئے سمجھنا چاہئے کہ ایک خاص وقت تک اس سہولت سے بھی لوگ مستفید ہوتے رہے لیکن جیسے جیسے یہ سرمایہ مخصوص دماغوں میں

ہونے لگا تو اس کو بھولنا نہ چاہیے کہ حدیثوں کے سیکھنے سکھانے پڑھنے پڑھانے کے نظام کا استحکام اور اس کی استواری بھی بڑھتی چلی گئی اور گو عددی لحاظ سے آخر زمانہ میں حدیثوں کی تعداد میں بظاہر مہیب اضافہ نظر آتا ہے لیکن پہلی بات تو اس سلسلہ کی وہی ہے کہ غیر معمولی اضافہ و تغیر کی اس درمیانی مدت کے بعد ہوا ہے نیز حدیثوں کے عددی اضافہ کا راز جب معلوم ہو چکا کہ وہ خود حدیثوں کا اضافہ نہ تھا بلکہ زیادہ تر سند یا متن میں لفظ دو لفظ کے اضافہ سے حدیثوں کے عدد میں اضافہ ہو جاتا تھا تو پھر اس کی بھی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی۔ ایک بمبئی عالم نے اپنی کتاب "اَلْعِلْمُ الشَّامِخ" نامی میں جلال الدین سیوطی کے اس دعوے کا تذکرہ کرتے ہوئے کہ مجھے دو لاکھ حدیثیں زبانی یاد ہیں، بڑے مزے سے لکھا ہے کہ لوگوں کو سیوطی کے اس دعویٰ سے دھوکہ نہ کھانا چاہیے اور نہ یہ سمجھنا چاہیے کہ واقعی ان حضرات کو دو لاکھ حدیثیں یاد تھیں بلکہ ان کا یہ دعویٰ محدثین کی اسی اصطلاح پر مبنی ہے اور اسی کا نتیجہ ہے :

قَدْ یَکُوْنُ الْوَاحِدُ فِیْ کِتَابِ السُّیُوْطِیِّ
اَرْبَعَۃً اَوْ عَشْرًا اَوْ سِتِّیْنَ حَدِیْثًا
بِاِعْتِبَارِهِمْ (العلم الشامخ ص ۲۹۹)

کہ ایک حدیث مذکورہ بالا حساب سے سیوطی کی کتاب میں چار یا دس یا ساٹھ تک کی تعداد تک پہنچ جاتی ہے۔

گویا سمجھنا چاہیے کہ حافظ پر تو کل ساٹھ الفاظ کے یاد کرنے کا بار پڑا لیکن کہنے کے لئے ہو گیا کہ میں نے ساٹھ حدیثیں یاد کر لیں۔ ہوتا یہ تھا کہ مثلاً ایک ہی حدیث ہے، حضرت ابوہریرہؓ بھی اس کے راوی ہیں اور عائشہ صدیقہؓ بھی، ابن عمرؓ بھی، آپ کے نزدیک تو وہ ایک ہی حدیث ہے لیکن محدث بیان کرے گا کہ مجھے تین حدیثیں یاد ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایک نام ابوہریرہؓ کے ساتھ عائشہؓ اور ابن عمرؓ ان دو ناموں کے یاد کر لینے سے ایک حدیث تین حدیث بن گئی۔ عوام جو فن اور اس کی اصطلاحات سے ناواقف ہیں ان کو حیرت ہوتی ہے لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ خود ان ناموں کے یاد رکھنے میں حافظہ کو دوسری بہت سی چیزوں سے مدد ملتی ہے۔ فن کار ہی اس نکتہ کو سمجھ سکتے ہیں، مثلاً یوں سمجھئے کہ جیسے آپ کو معلوم ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں میں فلاں فلاں صحابی سے حدیثیں زیادہ مروی ہیں، اسی طرح علم حدیث اور اسماء الرجال سے جو اشتغال رکھتے ہیں وہ صحابیوں کے متعلق بھی جانتے ہیں کہ تابعین میں فلاں فلاں صحابی سے زیادہ خصوصیت تھی، اسی طرح درجہ بدرجہ نیچے اترتے ہوئے اساتذہ اور تلامذہ کے خصوصی تعلقات کا عام علم فن کے جاننے والوں کو پہلے ہی سے ہوتا ہے، پس اسماء تو یونہی یاد رہتے ہیں، حافظ کو ہر حدیث کے متعلق اتنا کام کرنا پڑتا ہے کہ ان ناموں میں سے کس نام کا کس حدیث کی سند سے تعلق ہے، پس اس کو مستحضر رکھنا چاہیے۔ سچ پوچھئے تو اس کی وجہ سے ناموں کے یاد کرنے میں بھی حافظ کا کام آدھا رہ جاتا ہے۔ اسی طرح متونِ حدیث کا حال ہے کہ اصل حدیث تو ایک ہی ہے، دوسرے طرق میں لفظ دو لفظ کا اضافہ ہوتا ہے اور اسی اضافہ کی وجہ سے حدیث کے نمبروں میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہاں بھی حافظ پر جو کچھ بار پڑتا ہے وہ لفظ دو لفظ ہی کے یاد کرنے کا پڑتا ہے۔ بہر حال اکثر ابواب کی حدیثوں کا یہی حال ہے کہ سند یا متن میں لفظ دو لفظ کو بدلتے چلے جائیے۔ حدیثوں کی تعداد بڑھتی چلی جائے گی۔ اسی مسئلہ کے متعلق ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں ابن راہویہ کے حالات

کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک بڑے پتہ کی بات لکھی ہے، بیان یہ کیا ہے کہ مشہور امام فن علل ابوحاتم رازی کی مجلس میں ابن راہویہ اور ان کی غیر معمولی قوت یادداشت کا ذکر ہو رہا تھا، ایک صاحب جن کا نام احمد بن سلمہ تھا، انہوں نے ابوحاتم سے کہا کہ ابن راہویہ صرف عام ابواب ہی کی حدیثیں نہیں بلکہ تفسیری روایتیں بھی شاگردوں کی زبانی بغیر کتاب سامنے رکھنے کے لکھوایا کرتے ہیں۔ ابوحاتم جو فن کے گُرُ سے واقف تھے۔ احمد سے یہ سن کر سنبھل گئے اور تعجب کے ساتھ کہنے لگے کہ:

هٰذَا اَعْجَبُ لِاَنَّ ضَبْطَ الْاَحَادِيْثِ الْمُسْنَدَةِ اَسْهَلُ وَاَهْوَنُ مِنْ ضَبْطِ اَسَانِيْدِ التَّفَاسِيْرِ وَاَلْفَاظِهَا۔ (ج ۲ ص ۴۱۳)	(تفسیری روایات کا زبانی لکھوانا، بلاشبہ بہت زیادہ عجیب ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہونے والی حدیثوں کا یاد رکھنا تفسیری روایتوں کی سندوں اور ان کے الفاظ کے یاد کرنے کے حساب سے بہت زیادہ آسان اور سہل ہے۔

سمجھا آپ نے ابوحاتم کیا کہہ رہے ہیں، قصہ یہ ہے کہ تفسیری روایات کے ذخیرے میں براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات گرامی کا سرمایہ بہت کم پایا جاتا ہے بلکہ زیادہ تر دہ صحابہ اور صحابہ سے بھی زیادہ بہت زیادہ ان لوگوں کے اقوال اس ذخیرے میں شامل ہیں جو صحابہ کے بعد تھے۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ صحابہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کے زیادہ روایت کرنے والوں کی تعداد بھی محدود ہے۔ زیادہ تر روایتیں عموماً مکثرین صحابہ (ابوہریرہؓ، عائشہ صدیقہؓ، ابن عباسؓ، ابن عمرؓ وغیرہم) حضرات سے مروی ہیں اکثر حدیثوں کے لیے صحابہ کے طبقہ میں ان چند ناموں کا یاد کر لینا کافی ہے۔ پھر ان بزرگوں کے تلامذہ اور تلامذہ کے تلامذہ یعنی حدیث کی سندوں کی آخری کڑیوں میں زیادہ تر وہی لوگ ہیں جو اپنے اپنے استاذوں کے ساتھ خصوصی تعلقات کے لحاظ سے مشہور ہیں۔ حدیث کا ابتدائی طالب العلم ان محدود شخصیتوں سے واقف ہوتا ہے۔ سمجھنا چاہیے کہ ہزارہا ہزار حدیثوں کی سندوں کے لیے چند محدود اسمائے کی تعداد دو تین سو سے زیادہ نہ ہوگی، ان کو یاد رکھنا ان ساری سندوں کے رجال کا یاد رکھنا ہے اور متون میں بھی اختلاف زیادہ تر لفظ دو لفظ ہی کے حساب سے ہوتا ہے مگر تفسیری روایات کی سندیں بھی لامحدود اور ان کے متون کے الفاظ بھی زیادہ تر ایک دوسرے سے کم ملتے جلتے ہیں، اسی لئے تفسیری روایتوں کے یاد رکھنے اور زبانی بیان کرنے پر ابوحاتم کو تعجب ہوا اور یہی میں کہنا چاہتا تھا کہ حدیثوں کی عددی کثرت کو دیکھ کر بھڑکنے اور بدکنے کی ضرورت نہیں، ان کا معاملہ اتنا دشوار نہیں ہے جتنا کہ ان مہیب اور مدہش اعداد و شمار کو سن کر بظاہر فن کے نہ جاننے والے باور کئے بیٹھے ہیں، آدمی کی قوت یادداشت اس قسم کے مؤثرات سے شعوری اور زیادہ تر غیر شعوری طور پر امداد حاصل کرتی رہتی ہے۔

بات بہت طویل ہو گئی، حالانکہ کہنا صرف یہ چاہتا تھا کہ سو ڈیڑھ سو سال، تقریباً یہی درمیانی مدت ہے اس میں اگر حدیثوں کے

قلم بند کرنے کا جیسا کہ عام طور پر پھیلا دیا گیا ہے رواج نہ بھی ہوا ہو اور یاد کرنے والوں کی یادہی پر اس زمانے میں حدیثوں کے محفوظ رکھنے کا دارومدار رہا ہو تو واقعات اور حالات سے جو واقف ہیں، ان کے نزدیک ہلکی سے ہلکی بے اعتمادی کی وجہ محض یہ واقعہ نہیں ہو سکتا ہے بلکہ سچی اور ٹھوس بات یہ ہے کہ کتابت ہو یا حفظ، معلومات کے محفوظ کرنے کے یہ دونوں قدرتی ذرائع ہیں۔ تجربہ اور مشاہدہ بتا رہا ہے کہ جیسے لکھ کر معلومات کو محفوظ کیا جاتا ہے اسی طرح یاد کر کے بھی چیزوں کو محفوظ رکھا جا سکتا ہے اور رکھا جاتا ہے۔ عرض کر چکا ہوں کہ اس وقت اس کی زندہ مثال آپ کے سامنے قرآن ہی موجود ہے۔ مکتوبہ قرآن میں قرآن کی کسی آیت یا سورت کو پڑھئے یا کسی حافظ سے اسی آیت یا سورت کو سنئے، کیا دونوں کے اعتماد میں کسی قسم کا فرق آپ پا سکتے ہیں؟

پس مسئلہ یہ نہیں ہے کہ ان میں کون معلومات کے محفوظ کرنے کا ذریعہ بن سکتا ہے اور کون نہیں بن سکتا ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ کتابت ہو یا حفظ و یادداشت دونوں میں سے جس کسی سے بھی کام لیا جائے، کام لینے والے پر کچھ ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں، ان ذمہ داریوں کی جیسا کہ چاہیے اگر تکمیل کی گئی ہے اور حزم و احتیاط کے لحاظ سے جن باتوں کی نگرانی کی ضرورت ہے ان سے لاپرواہی نہیں اختیار کی گئی ہے تو ان میں جس ذریعہ سے بھی کام لیا جائے گا قدرتاً انسانی فطرت اس ذریعہ سے محفوظ کی ہوئی چیزوں کے متعلق اپنے اندر اعتماد کی کیفیت کو محسوس کرتی ہے خواہ یہ کتابت کا ذریعہ ہو یا یاد کرنے کا طریقہ، لیکن ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں اگر غفلت اور لاپرواہی برتی گئی ہو تو خود بخود اعتماد کی ضمانت مشتبہ ہو جاتی ہے۔ خواہ لکھنے سے کام لیا گیا ہو یا یاد کرنے سے، جو واقعہ ہے وہ یہی اور صرف یہی ہے۔ نہ سوچنے والوں نے ایک شور برپا کر رکھا ہے کہ ان حدیثوں کا کیا اعتبار جو کئی سو سال بعد قلمبند ہوئیں۔ اس عامیانہ غوغا میں اور جو غلطیاں ہیں ان کو تو جانے دیجئے، میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ انہوں نے یہ کیسے یاد کر لیا ہے کہ قید کتابت میں آ جانے کے بعد اشتباہات و شکوک کے سارے دروازے بند ہو جاتے ہیں؟ کیسی عجیب بات ہے، ایک طرف اس کا ہنگامہ مچایا جاتا ہے کہ عالم معنی پر مظالم کے جو پہاڑ کاتبوں کے ہاتھوں سے ٹوٹے ہیں، عالم صورت پر یہ ظلم چنگیز خاں کے ہاتھوں بھی نہ ہوا تھا۔ عصر حاضر میں طباعت اور ٹائپ کی بھی بوقلموں اقسام کے باوجود معمولی سی بے احتیاطیاں عبارتوں کو کیا سے کیا بنا دیتی ہیں، منفی کی جگہ مثبت اور مثبت کی جگہ منفی بن جانا معمولی بات ہے، روزمرہ کا یہ مشاہدہ ہے۔ ہندوستان کا مشہور مطبع نولکشور تقریباً ایک صدی سے اس کی شہادتیں فراہم کر رہا ہے اور فرض کیجیے کہ بے چارہ کاتب کتابت کی ذمہ داریوں کو نباہ بھی لے گیا ہو لیکن اس کے بعد بھی پڑھنے والوں کی نگاہیں ٹھوکر دن سے کیا بالکلیہ

محفوظ ہو جاتی ہیں، بیسیوں لطائف اس سلسلہ کے عوام میں مشہور ہیں - اور ان لطائف کے متعلق تو نہیں کہا جا سکتا کہ آیا "تراشیدہ اور خود آفریدہ ہیں یا واقعی پڑھنے والوں نے وہی پڑھا تھا جو مشہور ہو گیا ہے لیکن خود "تدوین حدیث کی تاریخ ہی میں جن لطائف کا ذکر مسلسل سند کے ساتھ محدثین نے کیا ہے وہی کیا کم تعجب انگیز ہیں - اصل فہرست تو ان لطائف کی بہت طویل ہے بطور ردل جسپی اور عبرت کے لیے چند نمونے نقل کئے جاتے ہیں - حاکم نے اپنی کتاب معرفۃ علوم الحدیث میں نقل کیا ہے کہ علی نامی کسی صاحب کے متعلق لکھا ہوا تھا کہ "عَلِیٌّ رَجُلٌ غَبِیٌّ" (یعنی علی کم عقل آدمی تھے) پڑھنے والے صاحب نے پڑھا کہ "عَلِیٌّ رَجُلٌ عِنِّیْنٌ" (یعنی علی نامرد آدمی تھے) - حاکم نے حافظ ابو زرعہ کے حوالہ سے یہ قصہ نقل کیا ہے کہ ایک شخص جس نے استادوں سے حدیث پڑھی نہ تھی، کتاب کھول کر حدیث پڑھانے بیٹھ گیا، مشہور حدیث آئی یعنی حضرت انس رضؓ کے بھائی جن کا نام ابو عمیر تھا، بچے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے بطور طیبت (خوش مزاجی) کے فرمایا تھا "یَا اَبَا عُمَیْر مَافَعَلَ النُّغَیْر" (ابو عمیر نغیر نے کیا کیا) نغیر[1] ایک چڑیا کا نام ہے جسے ابو عمیر ہاتھ میں لئے پھرتے تھے، غالباً اڑ گئی یا مر گئی تھی، حضورؐ نے ان کے ہاتھ میں چڑیا کو نہ دیکھا تو یہ فرمایا - حدیث پڑھانے والے صاحب ان تفصیلات سے ناواقف تھے اور "نغیر" کا لفظ بھی کچھ غیر مشہور ہے اس لئے آپ نے بجائے نغیر کے یہ قرار دیا کہ یہ لفظ "بعیر" کا ہے، اور شاگردوں کو مطلب یہ سمجھایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابو عمیر سے پوچھ رہے تھے کہ اونٹ کیا ہوا؟ ان ہی صاحب کے متعلق لکھا ہے کہ دوسری حدیث جس میں ہے کہ لَا تَصْحَبُ الْمَلَائِكَةُ رُفْقَةً فِيْهَا جَرَسٌ جس کا مطلب یہ تھا کہ اونٹوں کے گلے میں گھنٹیاں ڈال دینے کی جو عادت عرب میں تھی اس سے منع کرتے ہوئے فرمایا گیا تھا کہ ملائکہ کی پسندیدگی سے وہ قافلہ محروم رہ جاتا ہے جس کے جانوروں کے گلے میں گھنٹی (جرس) ہو - محدث صاحب نے "جرس" کو "خرس" پڑھا اور فرمایا کہ ریچھ کو جو لوگ قافلہ کے ساتھ رکھتے ہیں ان کو مطلع کیا گیا ہے کہ ملائکہ کی پسندیدگی سے محروم ہو جاتے ہیں - یا جس حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے "البزاق" یعنی تھوک کو مسجد کی دیوار پہ دیکھا، محدث صاحب نے فرمایا کہ "البراق" کو دیکھا - اور سب سے زیادہ عجیب لطیفہ الحاکم نے اس سلسلہ میں مشہور محدث ابن خزیمہ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق یہ اثر جو کتابوں میں منقول ہے کہ تَوَضَّأَ فِيْ جَرِّ نَصْرَانِيَّةٍ (یعنی حضرت عمرؓ نے ایک عیسائی عورت کے گھڑے کے پانی سے وضو کیا) پڑھنے والے صاحب نے جَرّ کے لفظ کو حر پڑھا - اب کیا بتاؤں کہ انہوں نے کیا پڑھا، لغت میں دیکھ لیجئے۔

---

[1] کہتے ہیں کہ "بلبل" کو نغیر کہتے تھے، یہ روایت بخاری و مسلم دونوں میں ہے - آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں سے مسائل اور احکام کے پیدا کرنے میں علمائے اسلام نے جو کوششیں کیں ان کی ایک مثال یہ روایت بھی ہو سکتی ہے ظاہر ہے کہ ایک بچے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ الفاظ فرمائے تھے - الکتانی نے لکھا ہے کہ ابو العباس بن القاص نے صرف اس حدیث سے سو مسئلے پیدا کئے تھے - اسی طرح ابن صباغ نامی ایک مراکشی عالم کے متعلق لکھا ہے کہ چار سو فوائد اس حدیث سے انہوں نے پیدا کئے - دیکھئے الکتانی ج ا ص ۱۵۰ اور نفح الطیب ج ۴ ترجمہ ابن صباغ ۱۲۰ -

حرٍ کے کیا معنی ہیں[1] ؟ دیکھا آپ نے بات کہاں سے کہاں پہنچی ۔ یہ ہے حال اس کتابت کا جس کے متعلق لوگوں نے غلط توقعات قائم کر لئے ہیں ۔

لطف تو اس وقت آتا ہے جب پڑھنے والے اپنی غلط بینی یا غلط فہمی کی تصحیح و توجیہ شروع کر دیتے ہیں ۔ ایک صاحب جن کا نام محمد بن علی المذکر تھا ، غالباً وعظ گوئی کا پیشہ کرتے تھے ، ایک حدیث پڑھی :

" قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ زَرَعْنَا تَرْ دَادُ حِنًّا "

لوگ حیران ہوئے کہ مطلب کیا ہوا ؟ الحاکم نے لکھا ہے کہ تب محدث صاحب نے " فقص قصۃً طویلۃً " یعنی ایک طویل قصہ بیان کرنا شروع کیا کہ کسی علاقے کے لوگ تھے اپنی زرعی پیداواروں کا عشر اور صدقہ ادا نہیں کرتے تھے ، نتیجہ یہ ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس شکایت کرتے ہوئے پہنچے کہ ہم لوگوں نے کھیتی کی لیکن سب کی سب " حنا " یعنی " مہندی " کا درخت بن گئی ، اسی قول کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گویا نقل کیا ہے سیوطی نے تدریب[۱۹۶] میں لکھا ہے کہ یہ در اصل مشہور حدیث :

زُرْ غِبًّا تَزْدَدْ حُبًّا ۔ ناغہ کر کر کے ملاقات کیا کرو اس سے محبت بڑھتی ہے

کی خرابی تھی

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس قسم کی غلطیاں ان ہی لوگوں سے صادر ہوئی ہیں یا آئندہ صادر ہو سکتی ہیں جن کے متعلق حضرت عبداللہ بن المبارک نے فرمایا ہے کہ

لَمْ یَکُنِ الْحَدِیْثُ بِشَغْلِھِمْ حدیث کا فن ان کا پیشہ نہ تھا ۔

(معرفۃ علوم الحدیث للحاکم ص ۱۴۹)

لیکن بعض دفعہ تو حیرت ہوتی ہے کہ ایسے لوگ جو فن کے ساتھ خاص تعلق رکھتے تھے مثلاً مصر کے قاضی ابن لہیعہ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ مشہور حدیث :

اِحْتَجَرَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِی الْمَسْجِدِ ۔

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چٹائی وغیرہ سے مسجد میں ایک جگہ گھیر لی تھی ابن لہیعہ نے بجائے اِحْتَجَرَ کے اس کو اِحْتَجَمَ پڑھا یعنی مسجد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پچھنا لگوایا ۔ ابن صلاح نے لکھا ہے کہ اس غلطی کی وجہ یہ تھی کہ :

اَخَذَہٗ مِنْ کِتَابٍ بِغَیْرِ سِمَاعٍ ۔ ابن لہیعہ نے (استاذ سے سنے بغیر اس حدیث کو کتاب میں دیکھ کر) روایت کرنا شروع کیا تھا ۔

(مقدمہ ص ۱۱۴)

آپ دیکھ رہے ہیں کہ حدیث مکتوبہ شکل میں ابن لہیعہ کے سامنے پیش ہوئی لیکن زبانی استاذ سے حدیث کے الفاظ ابن لہیعہ نے چونکہ نہیں سنے تھے اس لیے کتابت ان کو غلطی سے نہ بچا سکی ، اور اس کی ایک نہیں بیسیوں مثالیں محدثین نے جمع کی ہیں ۔

---

[1] عورت کی شرمگاہ ۱۲

بعض لوگوں نے اسی قسم کی غلطیوں کے متعلق مستقل کتابیں لکھی ہیں، جن میں امام مسلم کی کتاب التمییز اور دارقطنی و ابواحمد عسکری کی کتابوں کا لوگوں نے خاص طور پر تذکرہ کیا ہے۔ ایک پر لطف قصہ اسی سلسلہ کا یہ بھی ہے کہ ایک محدث صاحب نے عام مجمع میں حدیث بیان کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلَّذِيْنَ يُشَقِّقُوْنَ الْخَطَبَ۔ دراصل الحطب جس کے معنی لکڑی ہیں اس کی جگہ حدیث میں "اَلْخُطَبَ" کا لفظ تھا، درحقیقت تقریر اور وعظ میں لفاظی سے کام لینے والوں کو خدا کی نگاہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مردود ٹھہرایا تھا لیکن محدث صاحب نے گویا یہ پڑھا کہ لکڑی چیرنے والوں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت کی ہے۔ لکھا ہے کہ وعظ سننے والوں میں ملاحوں کا بھی ایک گروہ تھا ان میں سے کچھ لوگ آگے بڑھے اور بولے کہ:

فَكَيْفَ نَعْمَلُ وَالْحَاجَةُ مَاسَّةٌ — آخر ہم لوگ کیا کریں؟ ضرورت تو لکڑی چیرنے کی بہر حال ہوتی ہے۔

(تدریب ص ۱۱۵)

یعنی بے چاروں کا روزگار ہی کشتی چلانے پر موقوف تھا اور کشتی ظاہر ہے کہ لکڑی چیرے بغیر کیسے بن سکتی ہے۔ لوگوں نے یہ نہیں لکھا کہ پھر محدث بیچارے نے اس کا کیا جواب دیا۔ تعجب ہے کہ ابن صلاح نے اس قصہ کو ابن شاہین جیسے آدمی کی طرف منسوب کیا ہے اور صحیح بات بھی یہی ہے کہ وہ بیچارے کیا، اس قسم کی غلطیوں کا تجربہ اکثروں کو کرنا پڑتا ہے، امام احمد بن حنبل کا قول سیوطی نے نقل کیا ہے کہ

وَمَنْ يَعْرِىْ عَنِ الْخَطَاءِ وَالتَّصْحِيْفِ — عام غلطی یا غلط خوانی سے کون محفوظ رہ سکتا ہے۔

(تدریب ص۱۹۶)

اسی لیے میری غرض ان تصحیفی غلطیوں کے ذکر سے خود ان غلطیوں کا ذکر نہیں ہے بلکہ ان حضرات سے میرا خطاب ہے جنھوں نے اس زمانے میں حفظ اور یادداشت کی تحقیر کرتے ہوئے "کتابت" "کتابت" کا اتنا ہنگامہ مچا رکھا ہے کہ میں نے جیسا کہ عرض کیا ان کے طرز عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ مکتوب ہو جانے کے بعد پھر شکوک و شبہات کی گویا گنجائش باقی ہی نہیں رہتی۔ حالانکہ دونوں باتیں غلط ہیں اور صحیح بات وہی ہے کہ چیزوں کے محفوظ کرنے کے یہ دونوں قدرتی ذرائع ہیں، کام لیتے ہوئے جن احتیاطوں کی ضرورت ہے اگر ان کی پابندی کی جائے گی تو دونوں ہی ذرائع قابلِ اعتماد ہیں اور ان احتیاطوں سے جب لاپروائی برتی جائے گی تو شک و شبہ کی گنجائش دونوں میں پیدا ہو سکتی ہے، محدثین اس کو خوب سمجھتے تھے کہ محض کسی چیز کا قیدِ کتابت میں آجانا، اس کو قابلِ اعتماد بنا دینے کے لیے قطعاً کافی نہیں ہے لکھنے کے بعد اسی لئے ہمیشہ اپنے شاگردوں کو شدید تاکید کیا کرتے تھے کہ اصل صحیح نسخے سے اس کو ملا لیا کریں، اس سلسلہ میں ان کے شدید تاکیدی الفاظ کتابوں میں منقول ہیں، پچھلے زمانے ہی میں نہیں بلکہ لکھا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کی بہن اسما بنت ابی بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے صاحبزادے عروۃ بن الزبیرؓ نے اپنے لڑکے ہشام بن عروہؒ سے پوچھا کہ جو حدیثیں میں نے بیان کیں تم نے ان کو لکھ لیا؟ ہشام کہتے کہ جی ہاں لکھ لیا۔ عروہ نے کہا اس کا اصل سے مقابلہ بھی کر لیا؟ ہشام نے کہا جی نہیں۔ یہ سن کر عروہ نے کہا کہ:

لَمْ تَكْتُبْ (الکفایہ ص ۲۳۷) تم نے پھر گویا لکھا ہی نہیں۔

قریب قریب اسی کے دوسرے محدثین سے الفاظ اس باب میں منقول ہیں اور یحیی بن ابی کثیر تو عموماً اپنے تلامذہ سے فرماتے کہ:

مَنْ كَتَبَ وَلَمْ يُعَارِضْ كَمَنْ دَخَلَ الْخَلَاءَ وَلَمْ يَسْتَنْجِ (کفایہ ص ۲۳۷) جس نے لکھا لیکن اصل سے اس کا مقابلہ نہ کیا تو اس کی حالت اس شخص کے مانند ہے جو بیت الخلاء گیا اور استنجا کئے بغیر نکل آیا۔

کتابت حدیث کی روایات و دلائل

یہ کتنی بڑی علمی خیانت ہے کہ حدیثوں کو مضمحل کرنے کے لئے تو اس زمانے کے بے باکوں کا طبقہ انتہائی فراخ دلی سے کام لیتا ہے، کمزور سی کمزور روایت سے ان کا کام چلتا ہو تو اس کے پیش کرنے سے وہ نہیں چوکتا اور طرفہ تماشا یہ ہے کہ روایتوں کے متعلق بے اعتباری پھیلانے کے لیے لوگوں سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ ان کی پیش کردہ روایتوں پر جو بہرحال روایتیں ہی ہیں ان پر اعتماد کیا جائے اس غیر منطق طرز عمل کی وہی بتائیں کہ کیا توجیہ کر سکتے ہیں۔ حالانکہ دیانت و امانت کا اقتضا تو یہ تھا کہ جب روایتوں ہی سے کام لیا جا رہا ہے تو ساری روایتوں کو پیش نظر رکھ کر نتیجے تک پہنچنے کی کوشش کی جاتی آخر یہ بھی کوئی صحیح تحقیق و تلاش کا طریقہ ہوا کہ پہلے ایک نصب العین طے کر لیا جاتا ہے اور اس کے بعد روایتوں کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ اس مفروضہ نصب العین کی تائید جن روایتوں سے ہوتی ہو ان کو تو اچھال اچھال کر آسمان تک پہنچا دیا جاتا ہے اور جن سے اس طے شدہ نصب العین پر زد پڑتی ہو ان سے گزرنے والے آنکھیں میچ میچ کر گزر جاتے ہیں آخر اسی قصہ میں دیکھئے حدیثوں کے لکھنے کی پیغمبر نے ممانعت کر دی تھی۔ اس کا ذکر تو بڑے زور و شور سے کیا جاتا ہے لیکن جن روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ پیغمبر ہی نے حدیثوں کے لکھنے کی اجازت مرحمت فرمائی ان کے ذکر سے خاموشی اختیار کر لی جاتی ہے حالانکہ سنداً دونوں قسم کی روایتوں میں کسی قسم کا کوئی تفاوت نہیں ہے بلکہ اگر اسناد کا صحیح علم ان مسکینوں کو ہوتا تو شاید وہ اجازت والی روایتوں کو ممانعت کی روایتوں سے زیادہ قوی پا سکتے تھے۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ پہلے اجازت دی گئی اور بعد کو ممانعت کی گئی کیوں کہ اجازت کی روایتوں میں بعض روایتوں کا تعلق حجۃ الوداع سے ہے، یعنی آخری حج جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اور اس میں جو خطبہ ارشاد ہوا گزر چکا کہ ابو شاہ یمنی کی درخواست پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اُكْتُبُوْا لِأَبِيْ شَاهٍ — ابو شاہ کے لئے خطبہ کو لکھ دو

بہرحال ساری روایتوں کے جمع کرنے سے واقعہ کی صحیح شکل میرے سامنے تو یہی آتی ہے کہ ابتداً میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کو لکھنا شروع کیا، اور لکھنے میں اتنے مبالغہ سے کام لینا شروع کیا کہ جو کچھ سنتے تھے سب ہی کو لکھ لیا کرتے تھے۔ عبداللہ بن عمرو بن عاص نے اس وقت جب ان کا شمار اصغر القوم میں تھا یعنی صحابیوں میں سب سے چھوٹے تھے انہوں نے صحابیوں کو اسی حال میں پایا تھا جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ یہ صورت حال ایسی تھی کہ اس کی اگر خبر نہ لی جاتی

تو جن روایتوں میں عمومیت اور استفاضہ کا رنگ پیدا کرنا مقصود نہ تھا ان میں یقیناً یہی غیر مطلوبہ کیفیت پیدا ہو جاتی - لازمی نتیجہ جس کا یہ تھا کہ آئندہ دین کے ان دونوں سرچشموں میں کوئی فرق باقی نہ رہتا جن میں چاہا جاتا تھا اور یہی چاہیے بھی تھا کہ فرق باقی رہے، اسی لیے فرمایا گیا کہ اَکِتَابٌ مَعَ کِتَابِ اللّٰہِ یعنی اللہ کی کتاب کے ساتھ ایک اور کتاب کو بھی کیا وہی اہمیت دینا چاہتے ہو؟ عام صحابہ ان نتائج کا اندازہ نہ کر سکتے تھے جن پر نبوت ہی کی نظر پہنچ سکتی تھی - اس کے بعد مَنْ کَتَبَ عَنِّیْ غَیْرَ الْقُرْاٰنِ فَلْیَمْحُہٗ (جس نے قرآن کے سوا مجھ سے کچھ لکھا ہے اس کو محو کر دے یعنی مٹا دے) کا اعلان کیا گیا اور اگر وہ روایت صحیح ہے کہ صحابہ نے اپنے مکتوبہ مجموعوں کو ایک میدان میں جمع کر کے سب کو نذر آتش کر دیا تو سمجھا جائے گا کہ اسی محو کرنے کے حکم کی یہ تعمیلی شکل تھی اور اس تدبیر سے اس خطرے کا ازالہ ہو گیا جو عہد نبوت میں حدیثوں کی مختلف کتابوں اور مجموعوں کے تیار ہونے سے پیدا ہو سکتا تھا اور یوں عمومی طور پر حدیثوں کے لکھنے کا رواج صحابہ میں جو پھیل گیا تھا وہ مسدود ہو گیا۔

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کتابتِ حدیث کی ممانعت کے اس عام اعلان سے اس خطرے کا تو دروازہ بند ہو گیا مگر احساسات کے جن نازک تاثرات کا تجربہ آدمی کی فطرت کے متعلق ہوتا رہتا ہے پھر وہی تجربہ سامنے آیا - گویا خطرے کے ازالہ کی اسی شکل نے ایک دوسرے خطرے کے سوراخ کو پیدا کر دیا - تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ وہی عبداللہ بن عمرو بن عاص صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جنھوں نے بیان کیا تھا کہ ان صحابیوں نے جن میں سب سے میں چھوٹا اور کم سن تھا انھوں نے مجھ سے بیان کیا کہ میرے بھائی کے بچے! ہم جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کرتے ہیں وہ سب ہمارے پاس لکھا ہوا ہے۔" میں نے عرض کیا تھا کہ یہی صورت حال اس زمانہ میں پیدا ہو گئی تھی جس کا انسداد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتابت حدیث کی ممانعت سے فرمانا چاہا تھا - اب یہ نہیں کہا جا سکتا کہ عبداللہ بن عمرو بن عاص کو اپنے بڑوں سے جہاں یہ معلوم ہوا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کو لوگ لکھا کرتے ہیں، وہیں کم عمری اور کم سنی کی وجہ سے وہ ممانعت کے حکم سے واقف نہ ہو سکے کیونکہ جہاں تک قرائن و قیاسات سے معلوم ہوتا ہے مدینہ منورہ میں ممانعت کے حکم کا اعلان جس وقت کیا گیا تھا عبداللہ ابن عمرو اس وقت بہت چھوٹے تھے - اسی سے اندازہ کیجیے کہ ہجرت کے وقت بعض روایتوں سے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ تین ہی سال کے تھے لیکن مان لیجیے کہ وہی روایت صحیح ہو جس سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ سے ہجرت کر کے جس سال مدینہ تشریف لائے ہیں عبداللہ کی عمر سات سال کی تھی، ہجرت کے کچھ ہی دن بعد یہ اپنے والد عمرو بن عاص سے پہلے ہی مدینہ منورہ آکر مسلمان ہو گئے تھے شاید اس وقت یہ آٹھ نو سال کے ہوں گے اس عمر کے بچوں کا ایسے اعلانوں سے ناواقف رہ جانا کچھ تعجب نہیں ہے، یا مان لیجیے کہ ان کو بھی کتابت حدیث کی ممانعت کا علم ہو چکا تھا - مگر انھوں نے خود سمجھ لیا، یا جیسا کہ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کرنے پر ان کو معلوم ہوا کہ ممانعت کا تعلق عمومی رواج سے ہے یہ مقصد نہیں ہے کہ بالکلیہ قطعی طور پر حدیثوں کا لکھنا گناہ ٹھہرا دیا گیا ہے - کچھ بھی ہوا ہو، ہوا یہ کہ جب عبداللہ سن رشد کو پہنچے اور نوعمری میں مدینہ منورہ آجانے کی وجہ سے ان کو نوشت و خواند میں مہارت حاصل کرنے کا کافی موقعہ مل گیا، کیونکہ یہی وہ

زمانہ تھا جس میں مسلمان بچوں کی نوشت وخواند کی طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص توجہ تھی۔ قیدیوں تک کا فدیہ یہ مقرر کر دیا تھا کہ مدینہ کے دس بچوں کو جو لکھنا سکھا دے گا، آزاد کر دیا جائے گا۔ بہرحال حضرت عبداللہ بن عمرو نے صرف یہی نہیں کہ عربی خط میں کمال پیدا کیا بلکہ مدینہ منورہ کے یہودیوں سے سریانی اور عبرانی زبان اور ان زبانوں کے خطوط کے سیکھ لینے کا جو موقعہ میسر آ گیا تھا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ ایک سے زائد آدمیوں سے ابن سعد وغیرہ نے نقل کیا ہے کہ عبداللہ بن عمرو سریانی زبان جانتے تھے اور اس زبان کی کتابیں پڑھا کرتے تھے۔ حافظ ابن حجر نے اصابہ میں ان کے ایک خواب کا ذکر کیا ہے یعنی انہوں نے دیکھا کہ میرے ایک ہاتھ میں شہد ہے اور دوسرے میں گھی ہے کبھی میں اس ہاتھ کو چاٹتا ہوں اور کبھی اس کو۔ اس خواب کا وہی کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا تو تعبیر بتاتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

تَقْرَأُ الْكِتَابَيْنِ التَّوْرَاةَ وَالْقُرْآنَ — تم دونوں کتابیں یعنی تورات و قرآن کو پڑھو گے۔

(ج ۱۳ ص ۱۱۲)

راوی نے اس کے بعد بیان کیا ہے کہ وَكَانَ يَقْرَأُهُمَا (یعنی یہ واقعہ بھی تھا کہ عبداللہ دونوں کتابیں پڑھا کرتے تھے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں تورات وغیرہ کے پڑھنے کی صلاحیت وہ اپنے اندر پیدا کر چکے تھے[1]

[1] بعضوں کا خیال ہے کہ عہد فاروقی کے فتوحات کے بعد شام و مصر پہنچنے کے بعد عبداللہ بن عمرو نے سریانی وعبرانی زبانیں سیکھی تھیں، لیکن میں اس کو صحیح نہیں سمجھتا۔ مدینہ منورہ ہی میں ان چیزوں کا سیکھ لینا کوئی تعجب کی بات بھی نہیں ہے آخر حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہودیوں کے بیت المدارس میں ان کے خط اور زبان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت سے کیا نہیں سیکھا تھا؟ پھر حضرت عبداللہ کے لیے کیا چیز مانع ہو سکتی تھی، باقی توراۃ و قرآن دونوں کا پڑھنا یہ بھی ان کے ساتھ مخصوص نہیں ہے حضرت عبداللہ بن سلام بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے ایک دن تورات اور ایک دن قرآن کی تلاوت کیا کرتے تھے (دیکھو ذہبی تذکرۃ الحفاظ) طبقات ابن سعد میں ابوالجلد الجونی کا تذکرہ کرتے ہوئے یہی لکھا ہے کہ سات دن میں قرآن اور چھ دن میں تورات کو ختم کرنے کا قاعدہ انہوں نے مقرر کر لیا تھا اور لوگوں کو ختم کے دن جمع کیا کرتے تھے، کہتے تھے کہ اس دن رحمت نازل ہوتی ہے، ابن سعد ج، قسم ا ص ۱۶۲۔ باقی طبرانی وغیرہ کے حوالہ سے حضرت عمرؓ کے متعلق جو یہ روایت منسوب کی گئی ہے کہ تورات کا ایک مجموعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لائے اور عرض کرنے لگے کہ بنی زریق میں مجھے اپنے ایک بھائی سے یہ مجموعہ ملا ہے کہتے ہیں کہ اس حال کو دیکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ غضبناک ہو گیا، حضرت عمرؓ کو جب اس کا احساس ہوا تو معافی مانگنے لگے۔ آں حضرتؐ نے فرمایا کہ اس وقت موسیٰ علیہ السلام بھی زندہ رہتے تو بجز میری پیروی کے ان کے لیے بھی کوئی گنجائش نہ ہوتی۔ جمع الفوائد میں اس روایت کو نقل کر کے لکھا ہے کہ اسکی سند میں ابو عامر قاسم بن محمد الاسدی ایک شخص ہے دراصل یہ مجہول راوی ہے اس لئے روایت خود بھی مشتبہ ہے نیز یہ ممکن ہے اس یہودی کو بھائی قرار دینے پر عتاب کیا گیا ہو نیز اور بھی اسباب اس کے ہو سکتے ہیں۔ بہرحال یہ جانتے ہوئے کہ تورات کا نسخہ بہت کچھ محرف ہو چکا ہے پھر قرآن پڑھنے والے کو اسی محرف تورات کی تلاوت کی جو اجازت دی گئی تو اس کی وجہ ظاہر ہے کہ محرف تورات کا مصحح تو اس کے پاس موجود ہی تھا یعنی قرآن اور قرآن کو مصحح بنا کر جو بھی تورات کو پڑھے گا کوئی وجہ نہیں ہو سکتی کہ گمراہی میں مبتلا ہو بلکہ کچھ فائدہ ہی حاصل کرے گا ۱۲

اسی کے ساتھ جیسا کہ بخاری وغیرہ میں ہے کہ نوجوانی کے زمانہ میں تدین، عبادات و مجاہدہ کا جوش ان کا اتنا بڑھا ہوا تھا کہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فہمائش کرنی پڑی لیکن آپ کے سمجھانے کے باوجود وہ یہی کہتے جاتے تھے کہ جی نہیں میں اس سے زیادہ برداشت کر سکتا ہوں بعض روایتوں میں ان ہی سے یہ الفاظ منقول ہیں کہ

فَمَا زِلْتُ اُنَاقِصُهُ وَيُنَاقِصُنِي ۔ (ابن سعد ج ۴ ق ۲ ص ۱۰)

یعنی مجھ میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں مسلسل ردّوکد ہوتی رہی (آنحضرت نرمی پر اصرار کرتے تھے اور یہ اپنے اوپر زیادہ بار ڈالنا چاہتے تھے)

اگرچہ آخر عمر میں پچھتاتے تھے اور کہتے تھے کہ بڑھاپے میں اب پتہ چلا کہ میرے لیے کیا اچھا ہوتا اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مشورے کو مان لیتا، خیر یہ تو تمہیدی قصہ تھا، اب اصل واقعہ کو سنیئے ۔

اصل واقعہ تو صرف اتنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کو یہ لکھا کرتے تھے ان کے اس لکھنے کا ذکر بخاری میں بھی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالے سے کیا گیا ہے جس کا تذکرہ گزر چکا ہے یعنی ابوہریرہ کہا کرتے تھے۔

كَانَ يَكْتُبُ وَلَا اَكْتُبُ

(عبداللہ بن عمرو بن عاص صحابی) لکھا کرتے تھے اور میں لکھتا نہ تھا ۔

مگر پیش نظر اس وقت صرف ان کے لکھنے کا تذکرہ نہیں ہے بلکہ اسی قصہ سے ایک اور بات جو معلوم ہوتی ہے زیادہ تر میں لوگوں کی توجہ اس کی طرف منعطف کرانا چاہتا ہوں، واقعہ یہ ہے کہ ان کے لکھنے کے اس قصے کا ذکر علاوہ بخاری کے مختلف کتابوں میں خود ان کے حوالے سے بھی اور دوسروں کے حوالے سے پایا جاتا ہے اس وقت آپ کے سامنے ان تمام روایتوں میں سے سنن ابوداؤد جو ظاہر ہے صحاح میں شمار ہوتی ہے اور ابن سعد یا جامع ابن عبدالبر وغیرہ کی روایتوں پر اس روایت کو ترجیح حاصل ہونی چاہیے ۔ بہر حال ابوداؤد کی روایت کا حاصل یہ ہے کہ خود عبداللہ بن عمرو بیان کرتے تھے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ بھی سنا کرتا تھا اسے لکھتا جاتا تھا، کہتے ہیں میرے اس طرزِ عمل کی خبر جب قریش کو ہوئی، لفظ بظاہر اس لفظ سے اشارہ انہوں نے اپنے بزرگوں کی طرف کیا، کیونکہ وہ خود قریشی تھے، یہ پتہ نہ چلا کہ یہ کون صاحب تھے، کوئی بھی ہوں لیکن تھے قریشی، عبداللہ کہتے ہیں کہ جب ان کو اس کی خبر ہوئی کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہوئی ہر بات کو لکھ لیا کرتا ہوں تو انہوں نے مجھے منع کیا بس ان ہی الفاظ کی طرف میں توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ عبداللہ کہتے ہیں کہ منع کرتے ہوئے ان ہی صاحب نے مجھ سے کہا کہ :

تَكْتُبُ كُلَّ شَيْءٍ وَرَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَشَرٌ يَتَكَلَّمُ فِي الرِّضَاءِ وَالْغَضَبِ ۔

تم ہر چیز کو (جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنتے ہو) لکھ لیا کرتے ہو، رسول اللہؐ آدمی ہیں آپ غصہ کی حالت میں بھی بولتے ہیں اور خوشی کی حالت میں بھی ۔

گو حضرت عبداللہ بن عمرو کی یہ حدیث اور اس حدیث کے الفاظ عام طور پر مشہور ہیں، عموماً لوگ سنتے پڑھتے ہیں اور گزر جاتے ہیں لیکن جہاں تک میں خیال کرتا ہوں یہ ذرا ٹھہرنے اور سوچنے کا مقام تھا۔

پہلا سوال تو یہی ہوتا ہے کہ جن قریشی صاحب نے عبداللہ کو ٹوکا تھا اگر حضرت عبداللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت حاصل کرنے کے بعد لکھ رہے تھے تو ان کے ٹوکنے پر بآسانی جواب دے سکتے تھے کہ مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دی ہے بجائے اس کے ان کا خاموش ہو جانا، بلکہ آگے جو الفاظ ہیں ان میں یہ بھی ہے کہ فامسکت (یعنی ٹوکنے پر عبداللہ کہتے ہیں کہ میں لکھنے سے رک گیا) اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جا کر عرض کیا حالانکہ اگر پہلے سے اجازت یافتہ ہوتے تو اس کی بھی ضرورت نہ تھی اسی لئے میں سمجھتا ہوں کہ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک کسی وجہ سے کتابتِ حدیث کی ممانعت کی خبر نہ پہنچ سکی تھی۔ اب اس میں ان کی کمسنی کو دخل ہو یا کوئی اور وجہ ہو، اور معلوم ہوتا ہے کہ اس کمسنی کے زمانہ میں جب وہ اصغر القوم تھے، اپنے سے بڑی عمر والے صحابیوں سے ان کو یہ خبر ملی تھی کہ جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ لوگ سنتے ہیں اُسے لکھ لیتے ہیں۔ خود اسی خیال میں رہے بلکہ ان کی طبیعت کا جو انداز تھا خصوصاً عنفوانِ شباب میں دین کا نشہ ان پر جو چڑھ گیا تھا جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے اتارنے سے بھی جو نہیں اترتا تھا[1] میں جب اس کو سوچتا ہوں تو خیال گزرتا ہے کہ ان کے لکھنے پڑھنے کے جوش میں بھی کہیں اس خبر کو دخل نہ ہو، جو اپنے بڑوں سے انہوں نے سنی تھی، یعنی ان کو یہی خیال آیا ہو کہ جب لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں لکھا کرتے ہیں تو میں بھی کیوں لکھنا سیکھ کر اس سعادت کا حصہ دار نہ بن جاؤں۔ بلکہ اسی روایت کے بعض طریقوں میں یہ لفظ بھی پڑھا ہوا جو ملتا ہے یعنی عبداللہ کہتے تھے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں اس لیے لکھا کرتا تھا تاکہ ان کو زبانی یاد کر دں یعنی کہتے تھے کہ "ادید حفظہ" (مسند احمد ج ۲ ص ۱۶۲) اس سے ان کی بلند ہمتی اور شدتِ ذوق و شوق کا اندازہ ہوتا ہے، کیونکہ ان بزرگوں میں یہ کسی نے نہیں کہا تھا کہ ہم لوگ جو کچھ لکھتے ہیں اسے زبانی یاد کرتے ہیں، کچھ بھی ہو ان ہی وجوہ کی بنیاد پر میں سمجھتا ہوں کہ بعض روایتوں میں اس قصہ کے بغیر صرف اتنا جو کہا گیا ہے کہ عبداللہ کہتے تھے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیثوں کے لکھنے کی اجازت حاصل کر لی تھی اور رضاؤ غضب ہر حال کی گفتگو کے قلمبند کرنے کی مجھے اجازت تھی، وہ دراصل ان کی پوری گفتگو کا اختصار ہے

---

[1] عام کتابوں میں تو صرف اسی قدر ہے کہ رات کی شب بیداری، دن کے روزوں اور تلاوت قرآن ہی کے سلسلے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان سے کہتے تھے کہ اتنا زیادہ بار اپنے اوپر نہ ڈالا کرو، تمہارے بدن کا بھی تم پر حق ہے لیکن وہ یہی کہتے جاتے کہ یا رسول اللہ میری جوانی کا زمانہ ہے شباب کی قوت ہے میں سب برداشت کر لوں گا۔ لیکن بعض روایتوں میں خصوصاً مسند احمد میں یہ بھی ہے کہ مدینہ پہنچ کر جب یہ جوان ہوئے تو ان کے والد عمرو بن عاص نے ایک اونچے گھرانے کی خاتون جو قریش خاندان کی تھیں ان سے نکاح کر دیا۔ تین چار دن بعد عمرو بن عاص ان کے والد دلہن کے کمرے میں گئے پوچھا کہ اپنے دولہے کو تم نے کیسا پایا۔ ممکن ہے عمرو بن عاص کو بیٹے کے طرزِ عمل سے شبہ ہوا ہو اسی لیے خود دلہن سے جا کر پوچھا بے چاری نے کہا کہ بڑے اچھے شوہر ہیں۔ آج تک اس کی خبر نہ لی کہ میں کہاں رہتی ہوں اور کس بستر پر سوتی ہوں۔ عمرو بن عاص کو بھی بیٹے سے یہی توقع تھی۔ باہر نکل کر جتنا کوئی باپ کسی جوان بیٹے کو کہہ سکتا ہے سب کچھ کہہ ڈالا لیکن دیکھا کہ یوں یہ لڑکا نہ مانے گا اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ان کا حال عمرو بن عاص نے پہنچایا۔ آپ نے بلا کر ان کو سمجھانا شروع کیا۔

جو راویوں نے کر لیا ہے اور ایسا روایتوں میں بکثرت ہوتا ہے، خیر یہ سوال تو چنداں اہم نہ تھا۔ دوسرا سوال جو بہت زیادہ مستحق توجہ اور محلِ غور ہے، وہ ان کے بیان کا یہ حصہ ہے یعنی قریش کے بزرگ نے کتابتِ حدیث سے منع کرتے ہوئے آگے جو یہ الفاظ بڑھائے کہ

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آدمی ہیں آپ غصہ کی حالت میں بھی بولتے ہیں اور خوشی کی حالت میں بھی بولتے ہیں۔"

ان الفاظ سے بزرگ قریش کی غرض کیا تھی؟

حکم تحریرِ حدیث اور عصمتِ نبوی

پس عام حدیثوں کی کتابت ہو یا روایت، ان کے متعلق تحدیدی روایتوں کا اصل مقصد یہ تھا کہ ان کے مطالبوں کی گرفت میں اتنی سختی نہ پیدا ہو، جو صرف ان ہی مطالبوں کی خصوصیت ہو سکتی ہے جن کا انتساب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم تک ہر قسم کے شکوک و شبہات سے قطعاً پاک ہے۔ لیکن سمجھنے والوں نے ان روایتوں سے یہ سمجھ لیا کہ خدا کی کتاب کے سوا ان ساری چیزوں کا مسترد کرنا مقصود ہے جو پیغمبر کی طرف منسوب ہیں اور جب عہدِ نبوت میں بعضوں کو یہ غلط فہمی لگ گئی کہ رضا کے حال کی چیزیں تو صحیح ہیں لیکن غصہ کے وقت کی جو باتیں پیغمبر کے منہ سے نکلتی ہیں ان کا غلطیوں سے پاک ہونا ضروری نہیں اور اپنے اسی غلط خیال میں مبتلا ہونے کے ساتھ یہ بھی چاہا کہ دوسروں کو بھی اسی غلط خیال میں مبتلا کر دیں یعنی عبداللہ بن عمرو کو یہی سمجھاتے ہوئے حدیث کے لکھنے سے منع کر دیا۔ حضرت عبداللہ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ بزرگ قریش کی بزرگی اور اپنی خوردی کا خیال کر کے اس وقت تو قلم ہاتھ سے انہوں نے رکھ دیا لیکن اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اس واقعہ کا اظہار کیا۔ کتنی شدید بنیادی غلطی میں ٹوکنے والے یہ صحابی مبتلا تھے۔ ہم کو اور آپ کو اس کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے، لیکن جو دنیا کے اغلاط ہی کی تصحیح کے لیے بھیجا گیا تھا صلوات اللہ علیہ وسلامہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سننے کے ساتھ ہی آپ کا چہرہ متغیر ہو گیا جس کی زندگی کا ایک ایک پہلو رہتی دنیا تک پیدا ہونے والے انسانوں مردوں اور عورتوں سب ہی کے لیے اسوۂ حسنہ بنایا گیا ہے، اگر اس کی زندگی کے کسی پہلو میں ایک غلطی بھی رہ جائے گی تو وہ ایک غلطی نہ ہو گی۔ کروڑہا کروڑ بے شمار انسانوں کی غلطی بن جائے گی۔ ان صحابی صاحب کو اس کا اندازہ نہ ہوا۔

لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ" تمہارے لئے رسول اللہ میں بہت اچھا نمونہ ہے

کا اعلان جس ذاتِ گرامی کے متعلق قرآن میں کیا گیا ہو، کیا یہ ممکن ہے کہ قدرت اس کی زندگی کے کسی پہلو میں کسی غلطی کو باقی رکھ سکتی ہے[1]۔ اسی لیے تو یہ طے شدہ فیصلہ سلف سے لے کر خلف تک کا ہے کہ پیغمبر کی ذات معصوم ہوتی ہے۔

---

[1] حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس اللہ سرہ العزیز بانی دارالعلوم دیوبند نے اس کی کتنی اچھی مثال دی ہے کہ سلوانے والا، درزی سے مثلاً قمیص سلوانا چاہتا ہے، نمونہ کے لئے تمام قمیصوں میں جو بہتر قمیص ہوتی ہے۔ اس کو درزی کے حوالے کر کے ہدایت کرتا ہے کہ بس اسی نمونے پر ساری قمیصوں کو تراش کر کے سی دو۔ اب اگر فرض کیجیے کہ نمونے ہی کی اس قمیص میں کوئی سقم یا خرابی ہو گی تو اس کا مطلب یہی

بہر حال حضرت عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ سمع مبارک میں جس وقت میرے الفاظ پہنچے اور معلوم ہوا کہ کتابت حدیث سے روکتے ہوئے ایسی بات مجھ سے کہی گئی ہے جس کا حاصل یہی ہے کہ پیغمبر غصہ میں جو کچھ بولتے یا کرتے ہیں ان کا صحیح ہونا ضروری نہیں ہے، میں نے دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی انگلیاں اٹھیں جن کا رُخ دہن مبارک کی طرف تھا۔ عبداللہ بن عمرو کے اپنے الفاظ یہ ہیں کہ :

فَاَوْمَا بِاِصْبَعِہٖ اِلٰی فِیْہِ — پس اشارہ کیا اپنی انگلی سے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے) اپنے دہن مبارک کی طرف۔

اور وہی پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) جن کی طرف سے اس خطرے کے انسداد کے لئے کہ عام حدیثوں کے مطالبہ کی قوت قرآنی مطالبہ کی قوت کے برابر نہ ہو جائے چند دن پہلے یہ منادی کرائی گئی تھی کہ قرآن کے سوا جس کسی نے مجھ سے (یعنی میری طرف منسوب کرکے) جو کچھ لکھا ہے چاہیے کہ اسے محو کر دے، اسی پیغمبر کو دیکھا جا رہا ہے کہ ایک دوسرے خطرے کے انسداد کے لئے عبداللہ بن عمرو کو فرما رہے ہیں۔

اُکْتُبْ — تم (قرآن کے سوا بھی میری باتیں) لکھا کرو۔

اور جس خطرے کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا اور اندیشہ کیا بلکہ مبتلا ہونے والے اس خطرے میں کلی طور پر نہیں تو کم از کم غصہ کی حالت کی باتوں کے متعلق اس غلط فہمی کے شکار ہو چکے تھے کہ ان کا غلطیوں سے پاک ہونا ضروری نہیں ہے، اس خطرے کا ازالہ کرتے ہوئے یہ بھی ارشاد ہو رہا ہے اور کتنے تاکیدی الفاظ میں ارشاد ہو رہا ہے، پہلے قسم کھائی جاتی ہے یعنی فَوَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ (قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے) فرماتے ہوئے اصل غلطی کا ازالہ ان الفاظ میں فرمایا جاتا ہے یعنی دہن مبارک کی طرف انگلیاں اٹھی ہوئی ہیں اور کہا جا رہا ہے:

لَا یَخْرُجُ مِنْہُ اِلَّا حَقٌّ — نہیں نکلتا ہے اس سے (یعنی دہن مبارک سے) مگر صرف سچی بات

(ابوداؤد وغیرہ)

نبوت کے جو مذاق شناس نہ تھے ان کو پہلے حکم میں جس کی عام منادی کی گئی تھی یعنی حدیثوں کی کتابت کی ممانعت والے حکم میں، اور آج جو عبداللہ بن عمرو کو اُکْتُبْ (لکھا کرو) کے لفظ سے ان ہی حدیثوں کے لکھنے کی جو اجازت مرحمت فرمائی جا رہی ہے دونوں میں وہی منفی و مثبت حکم والا تضاد نظر آیا حالانکہ بات بالکل واضح تھی۔ ممانعت کے جس حکم کی منادی کی گئی تھی اس کا بالکلیۃً حدیث نبوی کی عام کتابت کے رواج کے انسداد کی طرف تھا اور لکھنے والوں نے ایک جگہ ان میں جمع ہو کر سب کو آگ میں جو جھونک دیا تھا اس سے اسی رواج کے دروازے پر قفل چڑھ چکا تھا اور بجائے عمومی اجازت کے ایک خاص آدمی کو رضا و غضب ہر حال کی باتوں

(بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ) ہوگا کہ ساری قمیصیں جو اس نمونے پر تراشی جائیں گی خراب ہو کر رہ جائیں گی۔ پیغمبر کو بھی خدا نمونہ بنا کر پیدا کرتا ہے۔ بندوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ اپنی اپنی زندگیوں کو اسی نمونے پر ڈھالتے چلے جائیں جو جس قدر اس نمونے سے قریب تر ہوگا خدا کے نزدیک وہی سب سے زیادہ پسندیدہ قرار پائے گا۔ پھر کیا یہ غیر ممکن ہے کہ غیر محدود طاقت و قدرت رکھتے ہوئے خدا کسی ایسے نمونے کو پیدا نہیں کر سکتا جس میں غلطی کا کوئی شائبہ نہ ہو۔ ۱۲

کے لکھنے کی جو اجازت دی گئی تھی اس سے اس خطرناک غلطی پر زد لگانی مدنظر تھی جو کتابت حدیث کی ممانعت کے عام حکم کی وجہ سے بعض دلوں میں پیدا ہو گئی تھی یعنی باور کر لیا گیا تھا کہ بشر ہونے کی وجہ سے نبی کی ہر گفتگو کا ورنہ کم از کم غصہ کی حالت میں جو کچھ وہ بولتے ہیں اس کا خطاؤں سے پاک ہونا ضروری نہیں ہے۔ ممانعت کے حکم سے بھی آئندہ پیدا ہونے والی غلطی کا انسداد ہی مقصود تھا اور اب اجازت جو دی گئی اس کی غرض بھی اسی غلطی کا ازالہ تھا جس کے پیدا ہونے کا صرف اندیشہ ہی آئندہ زمانہ میں نہ تھا بلکہ عبداللہ بن عمرو کی رپورٹ سے تو آپ کو یہ معلوم ہوا کہ بعض لوگ اس غلطی میں مبتلا بھی ہو چکے ہیں، اس کے سوا کہ رضا و غضب دونوں حال کی گفتگو کے لکھنے کی اجازت ان کو دے دی جائے۔ خود ہی سوچا جائے کہ اس غلطی کے ازالہ کی عملی شکل اور کیا ہو سکتی تھی، چونکہ ایک واحد شخص کو انفرادی طور پر لکھنے کی یہ اجازت دی گئی تھی اس لئے اس سے اس کا اندیشہ بھی نہ تھا کہ ان مکتوبہ حدیثوں میں وہی عمومی رنگ پیدا ہو جائے گا، جسے آپ صرف ان چیزوں تک محدود رکھنا چاہتے تھے جن کا ہر مسلمان تک پہنچانا فرائض رسالت میں داخل تھا۔

یہ تھی پیغمبرانہ تدبیروں کی وہ داستان جن کی بدولت تیرہ سو سال سے یہ عجیب و غریب صورت مسلمانوں میں قائم ہے کہ ان میں ایسا کوئی نہیں ہے جو احاد یا خبر الواحد یا خبر الخاصہ عن الخاصہ کی راہوں سے منتقل ہونے والی نبوی حدیثوں کے متعلق اور ان سے پیدا ہونے والے احکام و نتائج کے متعلق یہ خیال رکھتا ہو کہ گرفت اور مطالبہ میں ان کی قوت قرآنی مطالبوں اور دین کے ان مطالبوں کی قوت کے مساوی ہے جو قرآن ہی کی طرح نسلاً بعد نسلٍ جیلاً بعد جیلٍ عمومیت کی راہوں سے منتقل ہوتی چلی آ رہی ہیں، اس سلسلہ میں علمائے مذہب کے جو فیصلے ہیں ان کا ذکر کر چکا ہوں مگر اس کے ساتھ ہر زمانہ میں ان بلند نظروں، عالی حوصلہ رکھنے والوں کے لیے بھی ہمیشہ اس کی راہ کھلی رہی اور اس وقت تک کھلی ہوئی ہے، انشاء اللہ قیامت تک کھلی رہے گی جو چاہتے ہیں کہ ممکنہ حد تک پیغمبر کی زندگی اور اس زندگی کے نمونوں کے مطابق جینے کا اگر موقعہ ملے تو اس میں کوشش کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا جائے[1]

یہی "کج دار و مریز" ہی کی تو پیغمبرانہ حکمت عملی تھی اور جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا، آپ کے خلفاء برحق نے بھی اسی حکمت کی نگہداشت میں پورا زور صرف کر دیا اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ جہاں ان شاہبازوں کی بلند پروازیوں کے لیے جہاں تک وہ پہنچ سکتے تھے کہیں رکاوٹ پیدا نہیں ہوئی۔ یُحْبِبْکُمُ اللہُ (خدا تم کو اپنا محبوب بنا لے گا) کا اعلان قرآن میں ہر اس شخص کے لیے کر دیا گیا تھا جو پیغمبر کے نقش قدم پر قدم رکھتا ہوا جہاں تک بڑھ سکتا ہو، بڑھتا چلا جائے پھر بڑھنے والے بڑھتے چلے گئے اور جن حدیثوں کا ہر شخص تک پہنچانا مقصود نہ تھا، ان کی روشنی ان لوگوں تک پہنچتی رہی جو دین کے اسی نفلی[2] حصہ سے اس مقام تک پہنچتے رہے جس کے متعلق یہ بشارت سنائی گئی ہے کہ پہنچنے کے بعد جو بندہ اور مخلوق ہے وہ عروج اور ارتقاء کی اس کیفیت کو پاتا ہے جس کی تعبیر

---

[1] حضرت بایزید بسطامیؒ کا مشہور واقعہ ہے کہ عمر بھر خربزہ آپ نے اس لئے نہیں کھایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح اس کو کھاتے تھے اس کی ان کو تحقیق نہ ہو سکی۔ ۱۲

[2] میرا اشارہ اس مشہور روایت کی طرف ہے جس میں آیا ہے کہ خدا فرماتا ہے کہ "بندہ نوافل کے ذریعہ مجھ سے قریب ہوتا چلا جاتا ہے تاآنکہ میں اس بندے کو چاہنے لگتا ہوں"۔ اسی کے بعد اس حدیث قدسی میں وہ بشارت سنائی گئی ہے جسے میں نے بجنسہ عربی الفاظ میں درج کر دیا ہے ۱۲

خالق ہی کے الفاظ میں یہ سنائی گئی ہے کہ

كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِيْ يَسْمَعُ بِهٖ وَبَصَرَهُ الَّذِيْ يُبْصِرُ بِهٖ وَيَدَهُ الَّتِيْ يَبْطِشُ بِهَا وَرِجْلَهُ الَّتِيْ يَمْشِيْ بِهَا۔ (صحاح بخاری وغیرہ)	میں اس بندے کی شنوائی بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی بینائی جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کے ہاتھ جن سے وہ پکڑتا ہے اور اس کے پاؤں جن سے وہ چلتا ہے۔

لیکن اسی کے ساتھ جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کہ "طبیعت ہی جن کی ادھر نہیں آتی" یہ خیر بجائے خود ان غریبوں کی مستقل بدبختی ہے مگر سوچئے تو یہی کہ ان حدیثوں کی اشاعت و تبلیغ میں عمومیت کی کیفیت پیدا کر کے اگر ان کے مطالبوں کو بھی ہر قسم کے شک و شبہ سے پاک کر کے اسی طرح قطعی اور یقینی بن جانے کا موقعہ دے دیا جاتا، جیسے دین ہی کے ایک شعبہ میں اسی رنگ کو پیدا کیا گیا ہے تو ع

"پر طبیعت ادھر نہیں آتی"

کی معذرت کو معصیت بلکہ تمرد و بغاوت بن جانے سے کون روک سکتا تھا، آج تو ان کی یہ معذرت اسی لئے معذرت ہے کہ جن چیزوں کی طرف ان کی طبیعت نہیں جاتی، ان کے مطالبہ میں اتنی قوت ہی نہیں ہے جو معذرت کو معصیت اور بغاوت بنا دیتی ہے اور کیا اس طول کلامی کے بعد بھی مزید ضرورت اس کی باقی رہ گئی ہے کہ میں لوگوں کو پھر یہ سمجھاؤں کہ یہ سارا کرشمہ اسی "کج دار و مریز" کی حکمت عملی اور ان نازک تدبیروں کا نتیجہ ہے جن کے حدود کی پوری پوری نگرانی خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے جانشینوں نے فرمائی۔

بہر حال عبداللہ بن عمروؓ ایک خوش قسمت آدمی تھے، اگر ٹوکنے والے صاحب ان کو مذکورہ بالا الفاظ کے ساتھ نہ ٹوکتے، بلکہ صرف اتنا کہہ دیتے کہ میاں! تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کو لکھتے ہو، کیا اس کا علم تمہیں نہیں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے حدیثوں کے لکھنے کی ممانعت کر دی گئی ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اگر اتنی سی سیدھی سادی صاف بات وہ کہہ دیتے اور ان کے دماغ نے پیغمبر کے حکم کا جو فلسفہ پیدا کیا تھا یعنی بشری اغلاط کی گنجائش، انہوں نے یہ باور کر لیا تھا کہ اس حکم کے دینے کی یہی وجہ ہے۔ قریشی صاحب اپنے اس خود تراشیدہ فلسفہ کا اگر ذکر نہ کرتے تو عبداللہ کو اتفاقاً جس سعادت سے بہرہ اندوزی کا موقعہ مل گیا، شاید نہ ملتا۔ گویا اس فلسفہ کے شر سے خیر کا ایک پہلو یہ پیدا ہو گیا اور یہی کیا اگر اس زمانہ میں پیدا ہو کر اس فلسفہ کی بنیاد ہی کے کھود دینے کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو موقعہ نہ مل جاتا تو صرف قرآن کی ایسی آیتوں سے مثلاً:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى۔	پیغمبر نہیں بولتے "الہوٰی" (یعنی اپنی ذاتی خواہش سے)۔ نہیں ہے وہ (یعنی پیغمبرؐ کا بول) مگر وحی، جس کی وحی ان پر کی جاتی ہے۔

وغیرہا سے مغالطہ کی ان گتھیوں کا سلجھانا کیا آسان تھا، جن میں دعوئ اسلام کے باوجود اس زمانے میں حدیثوں کی ان ہی تحدیدی روایتوں کی بنیاد پر لوگ الجھ الجھ کر پھڑ پھڑا رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ مذکورہ بالا آیت کا تعلق بھی صرف قرآن سے ہے اسی لیے وہ پیغمبر کو صرف قرآن کی حد تک پیغمبر مانتے ہیں۔ قرآن سے الگ کر لینے کے بعد العیاذ باللہ پیغمبر کی زندگی میں اور جو پیغمبر نہیں ہیں ان کی زندگی میں ان برگزیدہ یاد

آنکھوں کے نزدیک کوئی فرق باقی نہیں رہا ہے، مگر بحمد اللہ اس فلسفہ کے شر نے ایک ایسے خیر کو پیدا کیا جس نے ثابت کر دیا کہ مذکورہ بالا قرآنی آیت کا واقعی مطلب بھی وہی ہے جو اس کے ظاہر الفاظ سے سمجھا جا رہا ہے یعنی قرآن ہی نہیں بلکہ مطلقاً نطق اور گفتگو جو بھی پیغمبر کی زبان سے نکلتی ہے اس کا قطعاً الھوٰی (پیغمبرؐ کی ذاتی خواہش) سے تعلق نہیں ہے بلکہ قرآنی نطق ہو یا غیر قرآنی نطق، پیغمبر کا ہر نطق اور ان کی ہر گفتگو وحی ہے جو ان پر خدا کی طرف سے کی جاتی ہے۔ آیت کے الفاظ سے بھی یہی سمجھ میں آتا ہے اور حضرت عبد اللہ کو سمجھاتے ہوئے قسم کھا کر دہن مبارک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا اس سے بھی اسی مفہوم کی مزید تائید اور تاکید ہو گئی، اور محقق ہو گیا کہ پیغمبر کی زندگی ہر حال میں اسوہ اور نمونہ ہے اور ان کی زبان کا ہر بول ذاتی فکر و نظر یا خواہش کا نتیجہ نہیں ہوتا بلکہ سب وحی ہے خواہ خوشی کے حال میں بات کی گئی ہو یا غصہ کی حالت میں۔ سچ پوچھئے تو اس قرآنی نص کی بنیاد پر پیغمبر کی معصوم زندگی کا ہر پہلو مسلمانوں کی دینی زندگی کے لئے روشنی کا مینار ہے، فرق آئندہ صرف ان ذرائع کی قوت و ضعف سے پیدا ہوتا ہے جن کی راہ سے امت میں پیغمبر کی زندگی، زندگی کے آثار گفتار و رفتار کے متعلق معلومات پہنچی ہیں، ان ہی کی قوت و ضعف کے ساتھ ان احکام و نتائج کی گرفت اور مطالبوں کی قوت و ضعف کا مسئلہ وابستہ ہے جو ان معلومات سے نکلتے ہیں یا نکل سکتے ہیں۔

حجیت حدیث کے چند قرآنی دلائل

فلسفہ کے اس شر سے خیر کا یہ پہلو جو پیدا ہوا وہ تو اتنا اہم ہے کہ رہتی دنیا تک اسی سے قرآن کے اجمالی آیات کا مطلب معین کیا جائے گا، یعنی مذکورہ بالا آیات مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى یا مَا اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا کے سوا قرآن ہی میں بار بار پلٹ پلٹ کر اسی قسم کی آیتوں کا جو اعادہ کیا گیا ہے مثلاً قطعی فیصلہ کر دیا گیا ہے کہ

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔ (النساء)	پس کچھ بھی نہیں تیرے رب کی قسم ہے وہ ہرگز ایمان نہ لائیں گے جب تک تجھے (اے پیغمبرؐ) ان تمام باتوں میں حکم اور فیصلہ کرنے والا نہ بنالیں جو ان کے باہمی جھگڑوں میں پیدا ہوئی ہیں، پھر اپنے اندر کسی قسم کی تنگی اس فیصلہ کے متعلق نہ پائیں جو تم نے کر دیا ہو، اور کلیتہً اس فیصلہ کے آگے جھک جائیں۔

یا ارشاد ہوا ہے:

مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ	نہیں بھیجا ہم نے کسی رسول کو مگر اسی لیے کہ اس کی فرمانبرداری کی جائے۔

یا دھمکایا گیا ہے:

فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۔ (نور)	پس چاہیے کہ جو پیغمبر کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہیں وہ ڈریں اس بات سے کہ کسی آزمائش اور فتنہ میں نہ وہ مبتلا ہو جائیں یا ان کو دکھ بھرا عذاب پکڑے۔

یا صلائے عام دیا گیا ہے کہ:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِمَنْ كَانَ يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا ۝	تمہارے لیے اللہ کے رسولؐ میں بہت اچھا نمونہ ہے، جو اللہ کی اور پچھلے دن کی اُمید رکھتے ہیں اور اللہ کو بہت زیادہ یاد کرتے ہیں۔

یہ یا اسی نوعیت کی دوسری آیتیں جن سے خواص کیا عوام مسلمین بھی شاید نا واقف نہیں ہیں، اب ان اطلاقی آیات پر تحدید عائد کرنے کی راہ ہی کیا باقی رہی، صاف معلوم ہو گیا کہ پیغمبرؐ کی زندگی کے مثبت و منفی، ایجابی و سلبی، غرض ہر پہلو میں مسلمانوں کے لیے نمونہ ہے، رضا اور غضب کی تقسیم کرنے والے دراصل اپنے ایمان کے ٹکڑے کرنا چاہتے ہیں۔

أَعَاذَنَا اللَّهُ وَالْمُسْلِمِينَ مِنْ هٰذِهِ الْهَفَوَاتِ۔

(۳)

تاریخ تدوین حدیث

آنحضرت کے دور میں تدوین حدیث

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ معلومات کے حفظ و نگہداشت اور ان پر اعتماد کے لئے خواہ مخواہ نہ سوچنے والوں نے کتابت کے طریقہ کو غیر معمولی جو اہمیت دے رکھی ہے اور اس کے مقابلہ میں زبانی یاد کرنے کے طریقہ کو اس سلسلہ میں بے قیمت ٹھہرانے پر غل غپاڑہ مچایا جا رہا ہے۔ یہ دونوں نا سمجھی کی باتیں ہیں۔ علم کی حفاظت کے یہ دونوں قدرتی ذرائع ہیں، ہر ذریعہ اعتماد کے لیے ذمہ داریوں کو ان لوگوں پر عائد کرتا ہے جو اس سے کام لینا چاہتے ہیں اور ان ذمہ داریوں کی تکمیل خود بخود آدمی کی فطرت کو اعتماد پر مجبور کر دیتی ہے اور جیسے یہ انسانی فطرت کا ایک طبعی قانون ہے، اسی طرح ان ذمہ داریوں سے لاپروائی ہر حال میں اشتباہ اور بدگمانیوں کی گنجائش پیدا کر دیتی ہے، خواہ کتابت کے ذریعے کو اختیار کیا جائے، یا زبانی یادداشت کے طریقے کو، تاہم عصرِ حاضر کے نابالغ عقول کے طفلانہ تقاضوں کی تسکین کا ایک ذریعہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی کتاب بھی بن گئی ہے آج کل کے متکلمین اسلام نے اس سے فائدہ اٹھایا ہے، کچھ بھی ہو ایک پہلو نفع کا اس واقعہ میں یہ بھی نکل آیا ہے، بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ بعض کتابوں مثلاً مستدرک حاکم اور البغوی کی کتاب میں یہ روایت جو پائی جاتی ہے کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کا لکھا ہوا ایک مجموعہ تھا جس کے متعلق وہ بیان کرتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ پیش کی ہوئی کتاب ہے، اس روایت کا ذکر کر چکا ہوں، ہو سکتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی اسی اجازت کو دیکھ کر حضرت انسؓ کے دل میں بھی ان کی ریس کا جذبہ پیدا ہوا ہو۔ بہر حال حضرت انسؓ کے حالات میں لکھا ہے کہ دس سال کی عمر میں ان کی والدہ ام سلیم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مبارک میں یہ کہتے ہوئے پیش کیا تھا کہ

هٰذَا ابْنِي وَهُوَ غُلَامٌ كَاتِبٌ (ابن سعد ج ۷، قسم اول)	یہ میرا لڑکا ہے اور ایسا لڑکا ہے جو کاتب ہے یعنی لکھنے سے واقف ہے۔

حضرت انسؓ چونکہ آخر وقت تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہے، خود فرماتے تھے، نو سال تک حضورؐ کی خدمت میں رہا گویا وہ اور عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ ہمجولی تھے لکھنا بھی آتا ہی تھا اور پھر بارگاہِ نبوت میں رسوخ کا حال یہ تھا کہ بسا اوقات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو یا بُنَیَّ (میرے بیٹے) کے لفظ سے پکارتے تھے، ایسے چہیتے خادم کی بات کا ٹال دینا اور وہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بامروت طبیعت سے آسان نہ تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ کچھ ان ہی وجوہ سے ان کو بھی حدیثوں کے قلمبند کرنے کی اجازت مل گئی کیونکہ وہ آدمی کے لکھنے سے ظاہر ہے کہ عمومیت کا وہ رنگ کیسے پیدا ہو سکتا تھا جو قرآن کے صحیفوں کی عام اشاعت سے پیدا ہو چکا تھا، کچھ ایسا خیال بھی ہوتا ہے کہ گو حضرت انسؓ بچپن ہی سے لکھنا جانتے تھے اور کاتب ہو چکے تھے، مگر ظاہر ہے کہ کہاں عبداللہ بن عمروؓ کی مہارت و حذاقت، بھلا جس شخص نے عربی چھوڑ سریانی اور عبرانی خطوط اور زبان کو بھی سیکھ لیا ہو، ان کا مقابلہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کیا کر سکتے تھے، حضرت انسؓ جو یہ کہتے تھے کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اس نسخہ کو پیش بھی کر دیا تھا اسکی وجہ دہی معلوم ہوتی ہے کہ آنحضرتؐ نے خود ان کو غالباً مشورہ دیا ہوگا کہ جو کچھ تم نے لکھا ہے مجھے سنا بھی دو، عبداللہ بن عمروؓ کے نسخے کے متعلق پیش کرنے کا ذکر کسی روایت میں نہیں آیا ہے، شاید ان کی تحریری حذاقت پر اعتماد تھا اور ان پر اعتماد نہ کیا جاتا تو کس پر کیا جاتا۔ آئندہ یعنی عہدِ نبوت کے بعد ان دونوں کتابوں کی حیثیت کیا رہی، اس تفصیل کا ذکر انشاء اللہ اپنے مقام پر کیا جائے گا۔ اس وقت تو عہدِ نبوت تک کے واقعات کا صرف ذکر مقصود ہے۔

بہرحال عام حدیثوں کے متعلق "کج دار و مریز" کی مذکورہ بالا حکمتِ عملی یعنی جو پانا چاہیں، ان تک پہنچ بھی جائے لیکن اس طور پر نہ پہنچے کہ ان حدیثوں کے مطالبات کی قوت عمومی راہ سے منتقل ہونے والے دینی عناصر کے برابر ہو جائے انتہائی نزاکتوں کے ساتھ اس حکمتِ عملی کی نگرانی کرتے ہوئے ایک خاص حال میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ان حدیثوں کو چھوڑ کر دنیا سے تشریف لے گئے جو آج خبر آحاد کی شکلوں میں پائی جاتی ہیں۔ گویا سمجھنا چاہیے کہ علاوہ ان خطوط، معاہدے نامے یا مختلف اقوام افراد کے نام ہدایت نامے یا صدقات وغیرہ کے تحریری ضابطے جن کے چند نسخوں کا اب تک پتہ چلا ہے یا حجۃ الوداع کے خطبہ کو ابوشاہ یمنی کے لئے لکھوا کر عطا فرمانے کا جو حکم دیا گیا تھا جن کا تفصیلی ذکر کر چکا ہوں، ان متفرق چیزوں کے سوا حدیث کی یہی دو کتابیں (یعنی عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ والا نسخہ اور دوسری کتاب حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ والی ان دو کتابوں کے سوا اب تک اس کا کوئی ثبوت نہیں ملا ہے کہ واقعۂ تحریق (جلانے) کے بعد صحابۂ کرام نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں آپ کی حدیثوں کو کتابی شکل دی ہو یا ان کو قلمبند کیا ہو ممکن ہے کہ ڈھونڈھنے والوں کو آئندہ شاید اس سلسلہ میں کوئی اور نئی چیز ہاتھ آسکے۔ کچھ بھی ہو، حدیثوں کے ان انفرادی نسخوں سے وہ حکمتِ عملی متاثر نہیں ہو سکتی تھی جو اپنی عام حدیثوں کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار فرمائی تھی جیسے ان مکتوبہ خطوط و معاہدات وغیرہ میں بھی محض قلمبند ہو جانے کی وجہ سے وہ کیفیت نہ پیدا ہوئی اور نہ پیدا ہو سکتی تھی جو مثلاً قرآن میں پیدا ہو چکی تھی، کیونکہ عمومیت یا استفاضۂ عام شہرت بین الانام کا تعلق کتابت سے نہیں بلکہ تعدد و کثرت سے ہے، ایک خط اگر لکھا گیا تو ظاہر ہے کہ وہ ایک ہی خط کی شکل میں رہ گیا بھلا وہ قرآن کے ان نسخوں کا کیا مقابلہ کر سکتا تھا جو گھر گھر میں پھیلا ہوا تھا۔ مشہور حدیث جس میں بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن فرما رہے تھے کہ مسلمانوں سے آخر یہ علم اٹھ جائے گا یعنی پیغمبرؐ سے جو جدید علم مسلمانوں کو میسر آیا ہے اس کا چرچا باقی نہ رہے گا۔ کہتے ہیں کہ ایک

صحابی جن کا نام زیاد بن لبید انصاریؓ تھا، انہوں نے عرض کیا کہ اب یہ علم کیسے مٹ سکتا ہے، قرآن کی اشاعت جس وسیع پیمانے پر اس وقت تک ہو چکی تھی اس کا ذکر کرتے ہوئے زیاد نے اس وقت عرض کیا تھا کہ

كَيْفَ يُرْفَعُ الْعِلْمُ مِنَّا وَبَيْنَ اَظْهُرِنَا كِتَابُ اللهِ وَقَدْ تَعَلَّمْنَا مَا فِيْهِ وَ عَلَّمْنَاهُ نِسَاءَنَا وَ ذُرِّيَّاتِنَا وَخَدَمَنَا۔ (مجمع الزوائد ج ۱ ص ۲۰۰)	ہم لوگوں میں سے علم کیسے اٹھ جائے گا بحالیکہ ہمارے درمیان اللہ کی کتاب موجود ہے، اس کتاب میں جو کچھ ہے اسے ہم نے خود سیکھا ہے اور اپنی عورتوں اور اپنے بچوں کو، اپنے خادموں کو سکھایا ہے۔

الفاظ کے تھوڑے ردّ و بدل سے ترمذی وغیرہ صحاح کی کتابوں میں بھی یہ روایت پائی جاتی ہے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ عورتوں، بچوں، حتیٰ کہ خادم و ملازمین تک کو اس زمانے میں جب یہ کتاب پڑھائی جا چکی تھی تو اس عمومیت و استفاضہ کا مقابلہ بھلا وہ مکتوبہ سرمائے کیا کر سکتے تھے جو اکّے دُکّے گنتی کے چند آدمیوں کے پاس موجود تھے۔

سچی بات تو یہ ہے کہ دین کے جس حصہ کی تبلیغ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عمومی رنگ میں فرمائی تھی، جس کی بدولت آئندہ ہر زمانے میں ان کی حیثیت ان امور کی ہو گئی جن کا علم تواتر و توارث و تعامل کی شکل میں اس وقت تک منتقل ہوتا ہوا مسلمانوں کی اگلی نسلوں سے پچھلی نسلوں تک پہنچ رہا ہے، اسلامی دین کے ان قطعی اور یقینی عناصر و اجزا کے متعلق علم و یقین کی جو کیفیت خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دیکھنے والے صحابیوں کی تھی۔ قطعاً یہی کیفیت اس علم کی بھی ہے جو ان ہی امور کے متعلق مسلمانوں کی آئندہ نسلوں میں پایا جاتا ہے، کیونکہ یہ ایک مسلمہ بات ہے کہ تواتر کی راہ سے پیدا ہونے والے علم میں اور وہ علم جو مشاہدے سے حاصل ہوتا ہے، دونوں میں قطعیت اور یقین کے لحاظ سے کسی قسم کا فرق نہیں ہوتا، میں پوچھتا ہوں جن لوگوں نے مثلاً لندن کو دیکھا ہے اور اس شہر کے متعلق مشاہدے نے جس یقین کو پیدا کیا ہے، اس یقین میں اور ان لوگوں کے یقین میں جنہوں نے لندن کو خود نہیں دیکھا ہے مگر تواتر کی راہ سے اس بات کا یقین ان میں پیدا ہوا ہے کہ دنیا کے شہروں میں ایک شہر لندن بھی ہے، اس حد تک یعنی لندن کا وجود یقینی ہے، کیا ان دونوں یقینوں میں کسی قسم کا فرق پیدا کیا جا سکتا ہے؟ بلاشبہ جن لوگوں نے لندن کو نہیں دیکھا ہے، محض اس لئے ان کے یقین میں شک اور احتمال اسی قسم کا شک اور احتمال ہو گا جیسے ان لوگوں کے متعلق جو لندن جا چکے ہیں وہاں رہ چکے ہیں، ان کے متعلق شبہ پیدا کرنے والا یہ شبہ پیدا کرے کہ انہوں نے جو کچھ دیکھا، سب خواب کی حالت میں دیکھا تھا، یا آنکھ کا دھوکہ تھا جو لندن کی شکل میں ان کے سامنے آیا تھا واقع میں کچھ نہ تھا ظاہر ہے کہ اس قسم کے احتمالات وہی لوگ پیدا کر سکتے ہیں جن کی عقل کسی بیماری کی وجہ سے اپنے فطری حدود سے ہٹ گئی ہو۔ فخر الاسلام بزدوی نے اسی لئے شریعت کے اس حصہ کا تذکرہ کرتے ہوئے جو تواتر کی راہ سے مسلمانوں میں منتقل ہوتا ہوا چلا آ رہا ہے، یہ الفاظ لکھے ہیں کہ

حَتّٰى صَارَ كَالْمُعَايَنِ الْمَسْمُوْعِ (ج ۲ ص ۳۶۰)	ان کی حالت ایسی ہے جیسے خود کسی معائنہ کی ہوئی یا براہ راست سنی ہوئی شے کی ہو سکتی ہے۔

ان کا دعویٰ ہے کہ یہ حال صرف قرآن ہی کا نہیں ہے بلکہ قرآن کے ساتھ انہوں نے اسی راہ سے منتقل ہونے والی بہت سی چیزوں کو گنواتے ہوئے اپنے مافی الضمیر کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے

مِثْلَ نَقْلِ الْقُرْاٰنِ وَالصَّلَوَاتِ الْخَمْسِ وَاَعْدَادِ الرَّكَعَاتِ وَمَقَادِيْرِ الزَّكٰوةِ وَمَا اَشْبَهَ ذٰلِكَ ۔ (ج ۲ ص ۳۶۱)

جیسے قرآن کے منتقل ہونے کا حال ہے اور یہی حال پانچوں وقتوں کی نمازوں کا، نمازوں کی رکعتوں کا، زکوٰۃ کی مقررہ مقداروں کا اور ان ساری چیزوں کا ہے جو اسی راہ سے منتقل ہوتی چلی آ رہی ہیں۔

جس کا مطلب یہی ہوا کہ صحابہ جو عہدِ نبوت میں موجود تھے، شریعت کے اس حصہ کے متعلق ان کے یقین کی جو نوعیت تھی، یہی نوعیت اس یقین کی مسلسل باقی رہی ہے، اسی لئے ان امور کے لحاظ سے سارے مسلمان برابر ہیں خواہ وہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھے، یا اس کے بعد پیدا ہوئے، علامہ ابو زید دبوسی نے بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تقویم میں لکھا ہے:

وَمَتٰى ارْتَفَعَتِ الشُّبْهَةُ صَارَ الْمُتَّصِلُ مِنْهُ بِكَ الْحَاسَّةَ سَمِعَكَ ۔ (کشف ج ۲ ص ۳۶۲)

(تواتر کی وجہ سے) جب شبہ باقی نہ رہا تو اس راہ سے جتنی چیزیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منتقل ہو کر تم تک پہنچی ہیں ان کی حالت ایسی ہو گئی کہ براہِ راست اپنے کان سے تم نے ان کو سنا ہو۔

اسی طرح صاحبِ مسلّم کے ان الفاظ کے تحت یعنی:

اِنَّ التَّوَاتُرَ لَيْسَ مِنْ مَبَاحِثِ عِلْمِ الْاِسْنَادِ ۔

تواتر کا تعلق ان مباحث سے نہیں ہے جن میں روایت کی سند سے بحث کی جاتی ہے۔

حضرت مولانا عبد العلی بحر العلوم نے بھی لکھا ہے کہ

بَلِ التَّوَاتُرُ كَالْمُشَافَهَةِ فِيْ اِفَادَةِ الْعِلْمِ (فواتح الرحموت ج ۲ ص ۱۱۹ مطبوعہ مصر)

یقین آفرینی میں تواتر کا حال وہی ہے جو حال مشاہدہ کا اس سلسلہ میں ہے۔

پھر مولانا نے ایک دلچسپ مثال سے اس کو سمجھانا چاہا ہے یعنی بخاری میں بعض روایتوں کو ثلاثیاتِ بخاری کہتے ہیں، یہ ان روایتوں کا نام ہے جن میں امام بخاری اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کل تین آدمی کا واسطہ واقع ہوتا ہے۔ مولانا بحر العلوم نے ان ہی ثلاثیات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ بخاری کے بعد تو ان کی کتاب متواتر ہو گئی اس لیے بخاری کے بعد آئندہ صحیح بخاری کے ان سارے ثلاثیات کی حیثیت ہر مسلمان کے لئے رباعیات کی ہو گئی ہے۔ مولانا کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

وَمِنْ ثَمَّةَ كَانَ ثُلَاثِيَّاتُ الْبُخَارِيِّ رُبَاعِيَّاتٍ لَنَا لِاَنَّ صَحِيْحَهُ مُتَوَاتِرٌ عَنْهُ فَكَاَنَّا سَمِعْنَا مِنْ

اسی بنیاد پر سمجھنا چاہیے کہ بخاری کے ثلاثیات (یعنی تین واسطوں والی روایتیں) ہمارے لئے رباعیات کی حیثیت رکھتی ہیں (یعنی چار واسطوں والی روایتوں کی حیثیت ان کی ہو گئی) وجہ

اَلْبُخَارِیْ فَلَمْ یَزِدْ اِلَّا وَاسِطَةً وَّهِیَ نَفْسُهٗ ۔
(فواتح ج ۲ ص ۱۱۹)

یہ ہے کہ امام بخاری کی کتاب (صحیح بخاری) امام بخاری کے لحاظ سے تو متواترہ ہو چکی ہے پس گویا یہ سمجھنا چاہئے کہ ہم نے اس کتاب کو براہِ راست امام بخاری ہی سے سنا ہے اس لئے (ثلاثیات کے متعلق) صرف ایک ہی واسطہ کا تو اضافہ ہوا یعنی خود امام بخاری کی ذات نے چوتھے واسطے کی حیثیت اختیار کر لی ۔

بہر حال شروع ہی سے اس کا باضابطہ نظم کر دیا گیا تھا کہ دین کے ایک حصہ کی حیثیت تو ایسی ہو جائے جس کے علم میں قیامت تک پیدا ہونے والے مسلمانوں کے اعتماد کا حال قدرتی طور پر ایک ہو جائے ۔ قرآن اور ایسی ساری چیزیں جو اسی راہ سے مسلمانوں میں پیغمبرؐ کے زمانے سے چلی آ رہی ہیں ۔ جس رنگ میں قرآن منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے ان کی یہی کیفیت ہے ۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم دین کے اس حصہ کو اسی حال میں چھوڑ کر رفیق اعلیٰ کی طرف تشریف لے گئے اور بحمد اللہ اس وقت دین کا یہ حصہ اسی رنگ میں مسلمانوں میں منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے ۔ آئندہ بھی خدا سے اُمید ہے کہ اس کی اس کیفیت کی حفاظت فرماتا رہے گا ۔ دین کے اس حصہ کے علم و یقین میں اشتباہ و اضمحلال کے پیدا ہونے کی وہی صورت باقی رہ گئی ہے کہ خدانخواستہ مسلمانوں کو تاریخ کے آئندہ زمانہ میں محکومیت کی کسی ایسی ملعون کیفیت میں اپنے کرتوتوں کی بدولت مبتلا ہونا پڑے ، جیسے یہود وغیرہ گزشتہ ملعون قوموں کے ساتھ یہ صورت پیش آئی کہ غیر قوموں کو ان پر مسلط کیا گیا اور یہ تسلط اتنا سخت تھا کہ اپنے دین کے نام لینے کی بھی اجازت محکومیت کی حالت میں ان کو نہیں دی جاتی تھی ، ان کی کتابیں غائب ہو گئیں ، ان کے علماء چن چن کر قتل کر دیئے گئے ، کوشش کی گئی کہ آئندہ ان کی پیدا ہونے والی نسلوں کے کانوں میں دینِ موسیٰ اور اس کی کسی بات کی کوئی بھنک بھی نہ پڑنے پائے ، صدیاں اسی حال پر گزر گئیں ، جو جانتے تھے وہ مر گئے اور جو زندہ رہے انھیں کچھ خبر نہ تھی کہ ان کے آباؤ اجداد کا کوئی دین بھی تھا یا اللہ کے کسی برگزیدہ رسول کی وہ بھی اُمت ہیں ، ان کے رسول کی بھی کوئی کتاب تھی ؟ یہودیوں کی تاریخ کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے واقعات سے ان کو تاریخ کے طویل ادوار میں دوچار ہونا پڑا ۔ ظاہر ہے کہ یہ ایسی جگر خراش روح فرسا شکل حق تعالیٰ کے عتاب کی ہے کہ خدا کے غصہ کی اس آگ میں جو کچھ بھی جل جائے اس پر متعجب نہ ہونا چاہیے ، تاہم بے چارے یہودیوں کو جب کبھی سر اٹھانے کا موقعہ ملا ، ادھر اُدھر سے ڈھونڈھ ڈھانڈھ کر پھر اپنے گمشدہ دین کو کسی راہ سے جیسا کہ ان کا خیال ہے پا لینے میں وہ کامیاب ہوئے لیکن پھر بھی درمیان میں ایسی تاریکیوں میں ان کو گھرنا پڑا ہے کہ مشکل ہی سے یہ کہا جا سکتا ہے ، جو دین ان کے پاس اس وقت جس شکل میں پایا جاتا ہے وہ واقعی حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دیا ہوا اور پہنچایا ہوا صحیح دین ہے ۔

برخلاف اس کے مسلمانوں کے دین کی ابتدا ہی سلطنت سے ہوئی اور گو پچھلی چند صدیوں سے دنیا کی سیاسی امامت کی باگ ان کے ہاتھوں سے نکل گئی ہے لیکن دین کی حد تک بحمد اللہ کوئی ایسا واقعہ ان کے ساتھ اب تک پیش نہیں آیا ہے کہ درمیان میں صدی دو صدی تو بڑی بات ہے گھنٹے دو گھنٹے کے لئے بھی اس دین سے وہ جدا نہیں ہوئے ہیں جسے وراثت میں ان کے

تپچھلے اگلوں سے پاتے چلے آ رہے ہیں۔ اگرچہ حالات بد سے بدتر ہوتے چلے جا رہے ہیں اور مہیب خطرات آنکھیں دکھا رہے ہیں لیکن اسی کے ساتھ اس واقعہ کو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیئے کہ گزشتہ زمانے کے معلومات کی حفاظت کے اتنے بیشمار اسباب و ذرائع قدرتی طور پر اس عہد میں پیدا ہو چکے ہیں اور پریس و طباعت وغیرہ کے رواج کی بدولت ایک ایسی حالت پیدا ہو گئی ہے کہ اس زمانے میں معمولی چیزوں کا مٹنا یا مٹانا آسان نہیں ہے۔ پھر اسلامی بینات جو اس وقت دنیا کے اکثر حصے کے کروڑہا کروڑ باشندوں میں کتابی و عملی شکل میں پھیلے ہوئے ہیں ان کے یقین میں اضمحلال پیدا کرنے کی کوشش بظاہر مشکل ہی سے کامیاب ہو سکتی ہے۔ کچھ اس کا خیال بھی آتا ہے کہ "اسلام کی محمدی شکل" جب انسانی زندگی کے اس دستور العمل کی جس پر پیدا کرنے والا اپنے بندوں کو چلانا چاہتا ہے اسی کی جب یہ آخری شکل ہے تو ارحم الراحمین کی رحمت سے یہ بعید ہے کہ نہ چلنے والے باغیوں کی وجہ سے دین پر چلنے کی راہ ان لوگوں کے لیے بھی بند کر دے گا۔ جو بہر حال اسی راہ پر چلتے ہوئے جینا اور مرنا چاہتے ہیں، امید تو اسی کی ہے کہ ان کے لیے سچے دین پر چلنے کا امکان بہر حال باقی رکھا جائے گا جیسا کہ عرض کیا گیا حالت ناگفتہ بہ حدود تک بگڑتے ہوئے پہنچ چکی ہے جس کے بدلنے کے لئے دوسری عام تدبیروں کے ساتھ ساتھ زیادہ ضرورت اس کی ہے کہ خود مسلمان دین پر چلنے کے جذبہ کو نئے سرے سے زندہ کریں ورنہ قدرت ہی کا ایک قانون ہے کہ طلب کسی چیز کی جب باقی نہیں رہتی تو رسد بھی بند کر دی جاتی ہے پچھلے دنوں کے سارے جاں گداز حالات سچ پوچھئے تو ان کے ذکر سے بھی شرم آتی ہے لیکن واقعہ کا اظہار کیسے نہ کروں بہ نسبت دوسروں کے یہ حال زیادہ تر اکتا جانے کی اسی کیفیت سے پیدا ہوا ہے جو دین کے متعلق خود مسلمانوں میں شعوری یا غیر شعوری طور پر بد قسمتی سے پیدا ہو گیا ہے اور آہ! کہ اس وقت تک بجائے گھٹنے کے عملی طور پر[1] اس کیفیت میں کمی تو کیا پیدا ہوتی بظاہر شدت ہی پیدا ہوتی چلی جا رہی ہے۔

خیر میں کدھر نکل گیا، آئندہ کیا ہونے والا ہے، علیم و خبیر ہی اسے جان سکتا ہے اور اس وقت مستقبل کے متعلق مجھے کچھ لکھنا بھی نہیں ہے بلکہ اس وقت تک جن حالات سے گزرتے ہوئے موجودہ نسلوں تک دین پہنچا ہے میری بحث کا دائرہ اسی حد تک محدود ہے۔ عرض یہ کر رہا تھا کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم امت میں دین کو جس حال میں چھوڑ کر تشریف لے گئے تھے، اس وقت ایک حصہ

---

[1] "عملی طور پر" کا اضافہ میں نے جس لئے کیا ہے، ہر مسلمان جو اپنے حال سے واقف ہے غالباً اس اضافہ کی ضرورت تسلیم کرے گا بعض علاقوں میں جہاں غیر قوموں سے مسلمانوں کو کشمکش کرنے کی ضرورت پیش آ گئی ہے، وہاں دیکھا جا رہا ہے کہ دین کی طرف واپسی کا چرچا زبانوں پر کچھ دنوں سے ذرا زیادہ چڑھ گیا ہے لیکن جس سے معاملہ ہے کاش! بجائے "سمیع و علیم" ہونے کے وہ صرف "سمیع" ہی ہوتا تو امید کی جا سکتی تھی کہ صرف سنا کر اس کو منا لینے میں ہم کامیاب ہو جائیں گے۔ لیکن سننے کے ساتھ جو دیکھتا بھی ہے اور ہر چیز جس حال میں ہے اس کو جانتا بھی ہے اس کے سامنے اس قسم کے حربے اس کے سوا اور کچھ نہیں ہیں کہ ہم اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ رَبَّنَا تُبْ عَلَيْنَا وَارْحَمْنَا وَلَا تُسَلِّطْ عَلَيْنَا مَنْ لَّمْ يَرْحَمْنَا رَبَّنَا وَلَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۱۲

کی حاجت تو وہی تھی جسے تبلیغ عام کی راہ سے ایک ایسا قالب عطا کر دیا گیا تھا کہ اس کی یافت میں اگلوں پچھلوں کی حالت کا ایک ہو جانا ناگزیر تھا۔ بحمد اللہ ہزار سال کے بعد بھی چند صدیاں گزر چکی ہیں، اس وقت تک دین کا یہ حصہ اسی حال میں موجود ہے۔ اور دوسرا حصہ دین ہی کا تھا جس کے متعلق اگلوں اور پچھلوں کو تو کیا برابر کیا جاتا خود عہدِ نبوت میں جو موجود تھے ان لوگوں میں بھی اس کی اشاعت عمومی شکل میں اسی لئے نہیں کی گئی تھی کہ اس میں قصداً و ارادۃً اس رنگ کو چاہا جاتا تھا کہ نہ پیدا ہو، جو دین کے پہلے حصہ میں اور اس حصہ کے مطالبہ میں یا اس کی خلاف ورزی کرنے والوں کے لئے پیدا کیا گیا تھا۔

آنحضرتؐ سے روایت کرنے والوں کی تعداد

جس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے ہیں کا یہ ثانی الذکر حصہ کچھ تو مذکورہ بالا کتابی شکل میں افراد کے پاس تھا لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا اس کی تعداد بہت محدود تھی اور زیادہ تر یہ ان لوگوں کے سینوں میں محفوظ تھا جن کے دل و دماغ کی تربیت دنیا کے سب سے بڑے معلم اخلاق صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبتِ طیبہ میں ہوئی تھی اور جن واقعات کے تجربے و مشاہدہ کا موقعہ صحبتِ نبوت میں ان کو ملا تھا ان ہی کا تذکرہ دوسروں سے وہ کرتے تھے بعض لکھنے والوں نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ دین کا یہ حصہ جن لوگوں میں چھوڑ کر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے تشریف لے گئے تھے ان کی تعداد ایک لاکھ سے اوپر تھی۔ اصابہ میں علی بن ابی زرعۃ الرازی کے حوالہ سے یہ مشہور قول منقول ہے کہ:

تُوُفِّیَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَمَنْ رَآہُ وَسَمِعَ مِنْہُ زِیَادَۃٌ عَلٰی مِائَۃِ اَلْفِ اِنْسَانٍ مِّنْ رَّجُلٍ وَّامْرَءَۃٍ کُلُّھُمْ قَدْ رَوٰی عَنْہُ سِمَاعًا اَوْ رُؤْیَۃً۔

(اصابہ ج ۶ ص ۳۰)

وفات پا گئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس حال میں کہ جن لوگوں نے آپ کو دیکھا تھا اور آپ سے آپ کی باتیں سنی تھیں ان کی تعداد ایک لاکھ انسانوں سے زیادہ تھی جن میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی تھیں یہ ایک لاکھ سے زیادہ تعداد والی جماعت وہ ہے جس نے سن کر یا دیکھ کر آپ سے ان میں ہر ایک نے روایت کی ہے۔

۱؎ یہی نہیں الخطیب نے خود ابو زرعہ رازی سے اپنی متصل سند کے ساتھ اس قول کو جو نقل کیا ہے اس میں بجائے ایک لاکھ کے ایک لاکھ چودہ ہزار ان صحابیوں کی تعداد بتائی گئی ہے جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتار یا رفتار کے متعلق کسی قسم کا علم لوگوں تک پہنچایا ہے۔ ابو زرعہ سے پوچھا بھی گیا تھا کہ اتنی بڑی تعداد ان صحابیوں کی کیسے ہو سکتی ہے۔ آخر اتنے آدمیوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں کیسے سنیں اور آپ کو کہاں دیکھا۔ اس کے جواب میں ابو زرعہ نے کہا کہ مدینہ والے کے والے اور ان دو شہروں کے بیچ میں جو لوگ آباد تھے اسی طرح عام اعراب و صحرا کے باشندے جو خدمت مبارک میں حاضر ہوتے رہتے تھے۔ نیز حجۃ الوداع میں آپ کے ساتھ جو شریک تھے اور عرفات کے میدان میں جن لوگوں نے آپؐ کی باتیں سنیں یا آپؐ کو کچھ کرتے دیکھا (تدریب الراوی ص ۲۰۶)۔ اسی کتاب میں سیوطی نے رافعی کا قول نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت ساٹھ ہزار مسلمان (باقی بر صفحہ آئندہ)

لیکن اس سلسلہ میں جن بزرگوں کے معلومات حدیث کی کتابوں میں جمع ہو سکے ہیں یا اس وقت جن کے معلومات تک رسائی ممکن ہے، غالباً ان کی تعداد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے الحاکم نے لکھا ہے کہ :

قَدْ رَوٰی عَنْهُ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الصَّحَابَةِ اَرْبَعَةُ اٰلَافِ رَجُلٍ وَّامْرَاَةٍ (مدخل ص ۷)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ کی جماعت میں روایت کرنے والوں کی تعداد چار ہزار ہے جن میں مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روپوشی یعنی وفات کے بعد دین کا یہی حال تھا اس کے بعد کیا ہوا؟ اب کچھ قصہ اس کا سنئے :

عہدِ صدیقی اور تدوین حدیث

ابوبکر صدیقؓ کی خلافت کا زمانہ اگرچہ مدتاً ایک مختصر زمانہ ہے، کُل ڈھائی سال حکمرانی کا ان کو ملا اور وہ بھی ایسے حال میں کہ اچانک مختلف قسم کے فتنے اور فساد خود عرب میں بھی پھوٹ پڑے اور عرب سے باہر بھی ایسی تیاریاں تھیں جن کی طرف توجہ ضروری تھی، تاہم ان ہی حالات میں حدیث کے سلسلہ میں حضرت ابوبکرؓ کے تین اصولی اقدامات کا کتابوں میں تذکرہ کیا جاتا ہے جس کی تفصیل یہ ہے :-

حضرت ابوبکرؓ نے پانسو حدیثیں قلمبند کیں

جیسا کہ واقعات سے معلوم ہوتا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر اگرچہ بظاہر ابوبکر صدیقؓ نے بہت زیادہ تجلد اور صبر و ثبات استقلال و استقامت کا اظہار کیا لیکن درحقیقت یہ ان کا ظاہر حال تھا ورنہ واقعہ یہ ہے کہ حضورؐ کے بعد ابوبکرؓ پر ان کی زندگی دوبھر ہو گئی تھی، عبید اللہ بن عمر اور زیاد بن حنظلہ کے حوالہ سے ابن اثیر وغیرہ نے یہ قول نقل کیا ہے کہ

کَانَ سَبَبُ مَوْتِ اَبِیْ بَکْرٍ الْکَمَدُ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (اسد الغابہ ج ۳ صفحہ ۲۲۴)

ابوبکرؓ کی موت کی وجہ وہ اندرونی سوز و غم تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے ان میں پیدا ہو گیا تھا۔

ایک ایسا جان لیوا اور جاں گداز غم جو آخر موت ہی پر منتج ہوا، شاید اسی اندرونی خلش اور سوزش کی تسکین کی یہ تدبیر تھ

(باقی صفحہ گذشتہ) آپ کے بعد عرب میں موجود تھے جن میں تیس ہزار مدینہ میں اور تیس ہزار مختلف عربی قبائل میں پھیلے ہوئے تھے مگر خود اس تخمینہ کی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ بخاری کی اس روایت کا لوگ اکثر تذکرہ کرتے ہیں جس میں کعب بن مالک جن کے ساتھ تبوک کی مہم میں پیچھے رہ جانے کی وجہ سے بڑا قصہ پیش آیا۔ وہ اپنا قصہ بیان کرتے ہوئے کہتے کہ لوگوں کی اتنی کثرت تھی کہ ایک دیوان (دفتر) میں ان کے نام کا احاطہ نہیں کیا گیا تھا یا نہیں کیا جا سکتا تھا یعنی فرمایا کہ وَاَصْحَابُ رَسُوْلِ اللّٰهِ کَثِیْرٌ لَا یَجْمَعُهُمْ کِتَابُ حَافِظٍ یُعْنِی الدِّیْوَانَ ۔ یہ حضرت کعب کے اصلی الفاظ ہیں لیکن اس سے بھی کوئی خاص بات معلوم نہیں ہوتی۔ سیوطی وغیرہ نے لکھا ہے کہ صحابہ کے حالات پر اب تک جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں دس ہزار سے زیادہ تعداد نہیں پائی جاتی، حالانکہ لکھنے والوں نے سب ہی کا تذکرہ کیا ہے یعنی جن لوگوں کا انتقال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہو گیا تھا یا جو آپ کے سامنے پیدا ہو چکے تھے لیکن کم اور چھوٹے تھے۔

ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سمجھ میں آئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو معلومات ان کے دماغ میں تھے ان کو قلم بند کر کے اپنا جی بہلائیں مشاغل کے اس ہجوم اور کثرت کے باوجود جن میں خلافت کے بعد وہ گھر گئے تھے، اتنا وقت انہوں نے نکال لیا کہ دس بیس نہیں بلکہ پانسو حدیثوں کا ایک مجموعہ جو قریب قریب موطا امام مالک کی مرفوع حدیثوں کی تعداد کے مساوی[1] ہے۔ اپنے قلم سے لکھ کر حضرت ابوبکر رضؓ نے تیار کر لیا۔ الذہبی نے ام المؤمنین صدیقہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے حوالہ سے یہ فقرہ نقل کیا ہے کہ

جَمَعَ أَبِي الْحَدِيْثَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَانَتْ خَمْسَ مِائَةِ حَدِيْثٍ	جمع کیا میرے والد ابوبکر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کو اور یہ پانسو حدیثیں تھیں ۔

جس کے معنی یہی ہوئے کہ جس کام کو سو سال بعد حضرت امام مالکؒ نے موطا کی شکل میں انجام دیا۔ یہی کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ہی ایک ایسی صورت میں انجام پا چکا تھا جس سے زیادہ بہتر صورت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تدوین حدیث کے سلسلہ میں سوچی نہیں جا سکتی جو کہتے ہیں کہ ابتداً اسلام میں حدیثوں کو قلم بند نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں کاغذ دستیاب نہیں ہوتا تھا، یا لکھنے والے میسر نہیں آتے تھے یا جہاد وغیرہ کے مشاغل کی وجہ سے اس قسم کے علمی کام کے لیے مواقع نہیں تھے، ان سارے احتمالات کا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف سے عملی جواب دیا جا چکا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ کف افسوس ملنے والے آج تدوین حدیث کی عام تاریخ پڑھ کر جو کف افسوس مل رہے ہیں ان کی آرزو ایسی شکل میں پوری ہو چکی تھی جس سے بہتر شکل سوچی نہیں جا سکتی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے پہلے دینی اور سیاسی جانشین کے براہِ راست قلم کا لکھا ہوا حدیثوں کا یہ نسخہ حکومت کی طرف سے مسلمانوں میں اگر شائع ہو جاتا تو خیال کیجئے کہ آج پیغمبر کی ان حدیثوں کے متعلق کیا کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی رہ سکتی تھی، الغرض آرزو کرنے والے حدیثوں کے متعلق جو کچھ آرزو اس زمانے میں کر رہے ہیں، ان کی وہی آرزو واقعہ کا قالب اختیار کر چکی تھی ۔

جنھوں نے پیغمبر کے دین کے مصالح کو نہیں سمجھا ہے ان کے لیے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا یہ اقدام کتنا بڑا مبارک اور ضروری اقدام قرار دیا جا سکتا ہے لیکن خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے جن مصلحتوں کے پیش نظر دین کے اس حصہ کی اشاعت میں پوری کوشش اس پہلو پر صرف فرمائی تھی کہ عمومیت کا رنگ اس میں نہ پیدا ہو کیا ان پیغمبرانہ مصلحتوں پر پانی نہ پھر جاتا، اگر لکھنے کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضؓ اپنی حکومت کی طرف سے عام مسلمانوں میں اس کو شائع بھی فرما دیتے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ؎

---

[1] موطا کے مختلف نسخے پائے جاتے ہیں جو حدیثوں کے تعداد کی کمی وبیشی کے لحاظ سے باہم مختلف ہیں۔ شاہ ولی اللہ نے مسوّی شرح موطا میں ابوبکر ابہری کے حوالہ سے جو قول نقل کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موطا میں مسند مرفوع حدیثیں چھ سو ہیں لیکن ابن حزم کا قول شاہ صاحب ہی نے نقل کیا ہے کہ شمار کردم آنچہ در موطا است پس یافتم از مسند پانصد و چند حدیث صنا مسوّی شرح موطا ۔

ذکرِ حبیب کم نہیں وصلِ حبیب سے

اس جذبہ کی تائید تھوڑی دیر کے لئے ان کو عقل سے مل گئی۔ خیال آیا ہوگا کہ پیغمبر نے بھی تو اپنی زندگی کے آخری دنوں میں بعض لوگوں کو حدیثوں کے لکھنے کی اجازت دے دی تھی پھر میں بھی اگر کچھ لکھ رہا ہوں تو اجازت کے اس دائرے سے باہر تو میرا یہ کام نہیں ہے لیکن اسی کے ساتھ اپنے اس جذباتی فیصلہ کے وقت شاید ادھر ان کا دھیان نہ گیا کہ جن کو کتابت حدیث کی انفرادی اجازت بارگاہِ نبوت سے ملی تھی ان میں کوئی ابوبکر بھی نہ تھا اور نہ ان میں نبی کا کوئی جانشین اور مسلمانوں کا دینی و سیاسی امیر تھا اور نہ ان میں کوئی ایسی ہستی تھی جس کا کام حکومت کا کام سمجھا جا سکتا تھا۔

اسی روایت میں صدیقہؓ کے بعض الفاظ جن کا ابھی ذکر آ رہا ہے، ان سے جو یہ معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے کے بعد بجائے عام اشاعت کے اس نسخہ کو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے عائشہ صدیقہؓ کو رکھنے کے لئے دے دیا تھا، میں تو ان الفاظ سے یہ سمجھتا ہوں کہ کسی فوری جذبہ سے مغلوب ہو کر اس کام کو گو ابوبکر صدیقؓ کر گزرے تھے لیکن ظاہر ہے کہ وہ ابوبکر صدیقؓ ہی کیوں ہوتے اور نبی کی جانشینی کے لیے ان کا انتخاب ہی کیوں ہوتا اگر اس مصلحت سے وہ قطعی طور پر خالی الذہن ہو کر اپنے اس کام کو اسی طرح بڑا کام تصور فرما لیتے جیسے اس زمانے کے آرزو کرنے والے سوچ رہے ہیں ان کا تو یہ حال ہے کہ آج یورپ یا امریکہ میں ابوبکر صدیقؓ کے اس نسخہ کا اگر پتہ چل جائے تو اس کو اپنی ایک بڑی کامیابی قرار دے کر شاید آسمانوں کو سر پر اٹھا لیں۔

تحقیق حدیث کے لئے اصولِ شہادت کی بنیاد حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رکھی

پس اصلی کام دین کے اس حصے کے متعلق وہی "کج دار و مریز" کے اصول کی نگرانی تھی ایک طرف تو حضرت ابوبکرؓ نے اس خطرے کے انسداد کے لئے کہ دین کے اس حصے میں عمومیت کا رنگ نہ پیدا ہو جائے جس کی عمومی اشاعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں فرمائی تھی اپنے لکھے ہوئے مجموعہ کو ضائع بھی فرما دیا، لیکن اسی کے ساتھ آپ نے خبروں کی تحقیق و تنقید کے عام اصول کے سوا حضرت مغیرہ کے بیان کرنے پر جو یہ فرمایا کہ هل معك غيرك (کیا تمہارے ساتھ اس خبر میں کوئی دوسرا آدمی بھی شریک ہے) اگرچہ اس سے یہ نتیجہ نکالنا تو صحیح نہ ہوگا کہ جیسے فصلِ خصومات کے لئے کم از کم شہادت کا نصاب دو ہے، اسی طرح اس نوعیت کی حدیثوں پر اعتماد کرنے کے لیے کم از کم دو راویوں کا ہونا ضروری ہے کیونکہ دین کے اس حصہ پر اعتماد کرنے کے لیے اس کو قانونی نصاب کی شکل اگر دے دی جائے گی تو ثابت کرنا پڑے گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس نوعیت کی حدیثوں کی تبلیغ کم از کم دو آدمیوں کو ضرور فرماتے تھے حالانکہ یہ قطعاً غیر ضروری ہے، ایک ذخیرہ روایات کا پایا جاتا ہے جن کے متعلق خود صحابی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے سوا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کا ذکر اور کسی سے نہ کیا تھا۔ نیز دنیا کے عام کاروبار میں جیسے اس وقت تک دیکھا جا رہا ہے عہد نبوت میں بھی بقول حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ یہی دستور تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عموماً ضرورتوں کے لیے ایک ہی آدمی کو روانہ فرمایا کرتے تھے لیکن یہ کبھی نہیں سنا گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بھیجے ہوئے اس آدمی پر لوگوں نے یہ اعتراض کیا ہو کہ:

اَنْتَ وَاحِدٌ وَلَيْسَ لَكَ اَنْ تَاْخُذَ — تم تنہا اکیلے آدمی ہو اس لیے تمہیں اس کا حق نہیں ہے کہ ہم سے

مِنَّا مَا لَمْ نَسْمَعْ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّهٗ بَعَثَكُمْ عَلَيْنَا ۔ (الرسالہ ص ۱۱۰)	کچھ اس وقت تک وصول کر و جب تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم یہ سن لیں کہ ہم لوگوں سے (صدقہ وغیرہ) وصول کرنے کے لئے اتم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیجا ہے۔

خود ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے متعدد روایتیں ایسی مروی ہیں جن کے تنہا وہی راوی ہیں خصوصاً و راثتِ انبیاً والی روایت ؟ اور پیغمبر کے مدفون ہونے کی جگہ وہی ہوتی ہے جہاں ان کی وفات واقع ہو" ان دونوں حدیثوں کے وہ تنہا راوی ہیں، اور ایک وہی کیا آپ کے بعد خلفا اور دوسرے صحابہ صرف ایک صحابی کے بیان پر بھروسا کر کے حدیثوں کو عموماً مانتے رہے ہیں اس کے متعلق واقعات کی اتنی کثرت ہے کہ ان کو ایک جگہ اگر جمع کیا جائے تو ایک مستقل کتاب ان سے تیار ہو سکتی ہے۔ الخطیب نے اپنی کتاب کفایہ میں لکھا ہے کہ ان روایتوں کو مستقل کتاب کی شکل میں انہوں نے جمع کر دیا ہے۔

بہر حال جیسے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قسم لینا مزید اطمینان کی ایک تدبیر تھی نہ کہ اعتماد کی شرط تھی، بجنسہ یہی حال حضرت ابوبکرؓ کے اس طرزِ عمل کا ہے کہ اعتماد میں زیادہ قوت پیدا ہو جائے اس لیے آپ نے چاہا کہ کوئی اور صاحب بھی جانتے ہوں تو بیان کریں، اتفاقاً محمد بن مسلمہ بھی اس روایت کے جاننے والے نکل آئے۔ میں تو نہیں سمجھتا کہ اگر محمد بن مسلمہ کی تائید نہ ملتی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت مغیرہ کے بیان کو مسترد فرما دیتے۔

تاہم ان کے اس طرزِ عمل سے یہ سبق مسلمانوں کو ضرور ملا کہ دین کا یہی حصہ کیوں نہ ہو یعنی خبر الخاصہ بالواحد بعد الواحد کی راہ سے، جو پہنچایا گیا ہے اس کے رد و قبول میں لاپروائی سے کام نہ لینا چاہیے۔ آخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی کے بیان کرنے کے بعد بھی مزید تائید کا انہوں نے مطالبہ کیا تو جو صحابی نہیں ہیں خود سمجھنا چاہیے کہ ان کی روایتوں کے قبول کرنے میں مسلمانوں کو کس درجہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے اور غالباً وہ مزید اطمینان کے لیے شاید یہ سبق بھی اپنے اس طریقۂ کار سے وہ دینا چاہتے تھے کیونکہ ان کے بعد ہم حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ کو دیکھتے ہیں کہ اسی سنّتِ صدیقی کی پیروی کرتے ہوئے بعض صحابیوں کی روایت پر مزید تائید کا آپ نے بھی مطالبہ فرمایا بلکہ اپنی خاص فطرت کے لحاظ سے اس مطالبہ میں کچھ شدت کی راہ بھی اختیار کی لہ

لہ، میرا اشارہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس مشہور دلچسپ روایت کی طرف ہے۔ جو نسائی کے سوا صحاح ستہ کی ہر کتاب میں پائی جاتی ہے حاصل جس کا یہی ہے کہ ابوموسیٰ اشعری حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملنے کے لیے حاضر ہوئے۔ آپ اندر تھے۔ جیسا کہ اسلامی دستور رہا ہے کہ اجازت کے بغیر کسی کے گھر میں کوئی داخل نہیں ہو سکتا۔ ابوموسیٰ اشعریؓ نے اجازت حاصل کرنے کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ باہر ہی سے حضرت عمرؓ کو سلام کیا لیکن جواب نہ آیا۔ دوسری دفعہ تیسری دفعہ بھی جب ان کو جواب نہ ملا تو لوٹ گئے۔ ان کا لوٹنا تھا کہ حضرت عمرؓ نے پیچھے سے اپنا آدمی یہ ہدایت کر کے روانہ کیا کہ ابوموسیٰ کو بلا کر لے آؤ۔ جب وہ آئے تو فرمایا تم نے جو کچھ آج کیا ہے کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی تعلیم تم نے پائی ہے؟ حضرت ابوموسیٰؓ نے کہا ہاں! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یہ بتایا تھا کہ اجازت تین دفعہ لی جائے نہ ملے تو آدمی واپس لوٹ جائے اسی پر میں نے عمل کیا (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ)

اس طرح سچ پوچھئے تو خبر آحاد کے متعلق اس طرزِ عمل کی بنیاد سب سے پہلے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس دن رکھ دی تھی جس دن مغیرہ کی روایت کو سن کر آپ نے مزید شہادت کا مطالبہ فرمایا پھر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے عہدِ خلافت

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ) حضرت عمرؓ نے ذرا آنکھ نکالتے ہوئے فرمایا لتقیمن علیہ بینۃ (تم کو اس پر شہادت پیش کرنی پڑے گی) بعض روایتوں میں ہے کہ اسی کے ساتھ یہ بھی فرمایا کہ لا فعلن (میں تمہارے ساتھ کچھ کروں گا) گویا دھمکی کی ایک شکل تھی، بعضوں میں ہے کہ حضرت نے فرمایا کہ

اِنْ كَانَ هٰذَا شَيْئًا حَفِظْتَهُ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَبِهَا وَاِلَّا لَاَجْعَلَنَّكَ عِظَةً۔ (جمع الفوائد بحوالہ خمسہ ص ۱۴۴)

اگر یہ کوئی ایسی بات ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر تم نے یاد کر لیا ہے تو خیر ورنہ تم کو میں دوسروں کے لئے باعث عبرت بناؤں گا۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے طریقۂ گفتگو کے اس خاص انداز سے ابوموسیٰ کچھ گھبرا سے گئے۔ انصار کا ایک مجمع کہیں قریب میں تھا اسی مجمع میں پریشان حال پہنچے۔ سید القرا حضرت ابی بن کعب اس جماعت میں سب سے بڑے تھے۔ ان ہی سے یہ دریافت کرتے ہوئے کہ آپ لوگوں میں کوئی صاحب ہیں جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کو سنا ہو اور حضرت عمرؓ نے جو برتاؤ ان کے ساتھ کیا تھا اس کا بھی اظہار کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کے جو مذاق شناس تھے وہ ان کے اس طرزِ عمل کو سن کر ہنس پڑے لیکن حضرت اُبیؓ نے ان لوگوں کو جھڑکتے ہوئے کہا کہ یہ بیچارے تو پریشان ہیں اور تم لوگ ہنستے ہو۔ پھر کہا کہ اس حدیث سے تو غالباً ہم (انصار) میں جو سب سے عمر میں چھوٹا ہے وہ بھی واقف ہوگا۔ ابوسعید خدریؓ سب سے عمر میں چھوٹے تھے۔ ان ہی کو حکم دیا گیا، ابوموسیٰؓ کے ساتھ گئے اور ان کے بیان کی حضرت عمرؓ کے سامنے توثیق کی۔ بہر حال یہ قصہ تو ختم ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابوموسیٰؓ کو خوف زدہ پا کر کچھ حضرت ابی بن کعبؓ کو خیال آیا۔ اسی وقت یا اس کے کچھ دیر کے بعد وہ حضرت عمرؓ کے پاس حاضر ہوئے اور کہا:۔

يَا ابْنَ الْخَطَّابِ فَلَا تَكُوْنَنَّ عَذَابًا عَلٰى اَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔

یعنی اے ابن الخطاب (خدا نے تم کو مسلمانوں کا اگر امیر بنا دیا ہے) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں کے لئے تم عذاب نہ بنو۔

ابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس شکایت کو سن کر جو واقعہ تھا اس کا اظہار کرتے ہوئے حضرت عمرؓ نے کہا کہ

سُبْحَانَ اللّٰهِ سُبْحَانَ اللّٰهِ اِنَّمَا سَمِعْتُ شَيْئًا فَاَحْبَبْتُ اَنْ اَتَثَبَّتَ

سبحان اللہ سبحان اللہ میں نے ایک بات سنی میں نے یہ چاہا کہ پایۂ ثبوت تک وہی بات پہنچائی جائے۔

بعض روایتوں میں اتنا اور اضافہ ہے کہ اسی کے ساتھ حضرت عمرؓ نے ابوسعید خدری کی مزید تائید کے بعد ابوموسیٰ کو خطاب کر کے فرمایا تھا کہ

اَمَا اِنِّيْ لَمْ اَتَّهِمْكَ وَلٰكِنْ خَشِيْتُ

تم کو معلوم ہونا چاہئے کہ غلط بیانی کے ساتھ تم کو میں متہم نہیں

بیں وقتاً فوقتاً اس بنیاد کو زیادہ مستحکم کرنے کی کوشش کرتے رہے، ابو موسیٰ کے ساتھ نہیں بلکہ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اوروں کے ساتھ بھی حضرت عمرؓ نے کئی دفعہ اسی طرزِ عمل کو دہرایا۔ ؎

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ) اَنْ یَّتَقَوَّلَ النَّاسُ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ کرنا لیکن مجھے اس کا اندیشہ پیدا ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جھوٹی باتیں لوگ نہ منسوب کرنے لگیں۔

اور بات درحقیقت یہی تھی یہ نہ تھا کہ تنہا ابو موسیٰؓ کی روایت پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اعتماد نہ تھا ان کے حالات پڑھئے خدا جانے اس نوعیت کی حدیثوں میں یعنی صرف ایک صاحب کے بیان پر ان ہی حضرت عمرؓ نے کتنی دفعہ اعتماد کیا ہے لیکن اس وقت ذرا سختی دکھا کر جہاں تک میرا خیال ہے وہ یہ بتانا چاہتے تھے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسے صحابی جیسے ابو موسیٰ تھے ان کے ساتھ یہ سب کچھ کیا جا سکتا ہے تو جو صحابی نہیں ہیں، ان کو سمجھ لینا چاہئے کہ پیغمبر کی طرف لا پروائی کے ساتھ باتوں کے منسوب کرنے کا انجام کیا ہو سکتا ہے اور میں تو سمجھتا ہوں کہ محدثین میں بعد کو "شواہد و متابعات" کا جو ذوق پیدا ہوا یعنی ایک ہی حدیث ممکنہ حد تک جتنے زیادہ طریقوں سے مل سکتی ہو ان طریقوں کے تلاش کرنے اور جمع کرنے میں عجیب و غریب والہانہ جذبات کا ظہور ان سے جو ہوا ہے کچھ تفصیل اس کی بھی گزر چکی ہے اور آئندہ بھی اپنے اپنے موقعہ پر ان کوششوں کا ذکر انشاء اللہ آئے گا۔ خصوصاً امام بخاری اور امام مسلم کی کتابوں کی روایتوں کا جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا۔ منجملہ دوسرے امتیازات کے ایک بڑا امتیاز یہ بھی ہے یعنی شاہ ولی اللہ کے الفاظ میں عموماً ان دونوں کتابوں کی روایتوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ

"طرق متعددہ دارد کہ یکے گواہ دیگر تواند بود و ہر یکے متماسک بود۔" (مکتوبات شاہ ولی اللہؒ ص ۲۱)

اور اسی چیز نے منجملہ دوسری خصوصیتوں کے ان دونوں کتابوں کے درجہ کو اتنا بلند کر دیا ہے کہ حدیثوں کا کوئی مجموعہ ان کے ہم پلہ باقی نہیں رہا ہے۔ [۱۲]

؎ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ پُر لطف قصہ حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس مکان کا ہے جو مسجد نبوی سے متصل تھا بیان یہ کیا جاتا ہے کہ مدینہ کی آبادی عہدِ فاروقی میں جب بہت زیادہ بڑھ گئی اور مسجد نبویؐ میں تنگی محسوس ہونے لگی تو اطراف و جوانب کے مکانات کو حضرت عمرؓ نے بیت المال سے خرید خرید کر مسجد کے ساتھ ملانا شروع کیا۔ آخر میں حضرت عباسؓ کا مکان رہ گیا تھا۔ حضرت عمرؓ نے ان کو بھی حکم دیا کہ فروخت کر دیجئے لیکن وہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا تھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکم کی وجہ سے وہ اڑ گئے گو حضرت عمرؓ مختلف قسم کی رعایتوں کا ان کے ساتھ وعدے کرتے رہے لیکن وہ آمادہ نہ ہوئے۔ آخر ایک دن طے ہوا کہ اس قصے کو پنچایت میں دے دیا جائے۔ ابی بن کعب سید القراء صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دونوں نے حَکَم تسلیم کر لیا۔ قصہ ان کے پاس پیش ہوا۔ اُبیؓ نے دونوں کے بیانات کو سن کر کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث سنی ہے کہ بیت المقدس کی تعمیر کا حکم داؤد علیہ السلام کو جب ہوا اور تعمیر میں جب وہ مشغول ہوئے تو کسی آدمی کا مکان درمیان میں کچھ ایسا حائل ہوا کہ اس مکان کا نقشہ اس سے بگڑتا تھا (یعنی تربیع یا چاروں سمت برابر ہو) اس میں نقص پیدا ہوتا تھا۔ اس شخص سے حضرت داؤدؑ نے کہا کہ فروخت کر دو مگر وہ راضی نہ ہوا آخر حضرت داؤدؑ نے دل میں طے کیا کہ (بزورِ حکومت) اس پر قبضہ کروں گا۔ حق تعالیٰ کو ان کا یہ ارادہ ناگوار گزرا۔ وحی ہوئی کہ داؤد میں نے تم کو حکم دیا کہ میری یاد کے لئے گھر بناؤ سو تم نے ارادہ کیا کہ غصب اور زبردستی چھینی ہوئی زمین کو اس مکان میں شریک کرو، یہ میری شان نہیں ہے کہ میں غصب ... (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ)

الغرض تدوینِ حدیث کی تاریخ میں "شواہد و متابعات" کا جو دیوانِ رفیع بعد کو قائم ہوا سچ پوچھیے تو وہ اسی صدیقی بنیاد پر اس کی تعمیر کھڑی کی گئی۔ الذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں حضرت ابوموسیٰ اشعری کے مذکورہ بالا قصہ کو درج کرنے کے بعد بالکل صحیح لکھا ہے کہ :

وَفِيْ ذٰلِكَ حَضٌّ عَلٰى تَكْثِيْرِ طُرُقِ الْحَدِيْثِ۔ ص۷

یعنی حدیثوں کے طرق میں بعد کو جس کثرت کا خیال لوگوں کو ہوا اس پر لوگوں کو (حضرت عمرؓ) ہی کے طرزِ عمل نے آمادہ کیا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) جاتی ہے کہ اس کی تعمیر تم پوری نہ کر سکو گے تب داؤدؑ نے کہا کہ پروردگار! میں نہیں تو اس کی تکمیل میرے فرزند کے ہاتھوں کرا دی جائے۔ ارشاد ہوا کہ ہاں! یہ ہوگا۔ حضرت اُبَیؓ نے یہ حدیث جو سنائی تو حضرت عمرؓ بے اختیار ہو گئے اور اُبَیؓ کے دامن کو پکڑ کر فرمانے لگے کہ میں تو تمہارے پاس اس لئے آیا تھا کہ سہولت پیدا کرو گے تم نے تو اور بھی زیادہ سخت بات پیش کر دی اور کہا کہ تم کو اپنے اس بیان کی تائید میں شہادت پیش کرنی پڑے گی۔ دونوں مسجد آئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں کا ایک مجمع مسجد میں بیٹھا ہوا تھا جس میں حضرت ابوذرؓ بھی تھے۔ اُبیؓ نے مجمع کی طرف خطاب کر کے کہا کہ میں خدا کی قسم دے کر کہتا ہوں کہ بیت المقدس کی تعمیر کے اس قصہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے اگر سنا ہو تو بیان کرے۔ حضرت ابوذرؓ کھڑے ہو گئے اور فرمایا کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کو سنا ہے تب حضرت اُبیؓ نے کہا کہ عمرؓ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں مجھے متہم کرتے ہو۔ حضرت عمرؓ نے کہا خدا کی قسم میں نے تم کو متہم نہیں ٹھہرایا لیکن میں اس کو پسند نہیں کرتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں عام طور پر پھیل جائیں یعنی وہی مطلب کہ اسلام کے ابتدائی ایام میں عمومیت کا رنگ اگر ان حدیثوں میں پیدا کر دیا جائے گا جنھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خصوصی اور انفرادی راہوں سے پہنچائی ہیں تو آنحضرتؐ کا جو منشائے مبارک ہے وہ جاتا رہے گا۔ حضرت اُبی یہ سن کر مطمئن ہو گئے اور جب حضرت عباسؓ کو بھی محسوس ہوا کہ حکم کی راہ سے میرے گھر پر قبضہ کرنے سے عمرؓ مایوس ہو چکے تو حاضر ہو کر فرمایا کہ عمرو! اب اس مکان کو مسلمانوں کے لئے میں خیرات کرتا ہوں اور ان کی مسجد میں اس کا اضافہ کر کے گنجائش پیدا کرتا ہوں (ابن سعد ج ۴ ص ۱۴)

مسجد نبوی کے پاس حضرت عباسؓ کے اسی مکان کا ایک اور دلچسپ قصہ ہے۔ بے اختیار جی چاہ رہا ہے کہ اس کا ذکر کر دوں۔ ابن سعد ہی میں ہے کہ اسی مکان کے چھت میں ایک پرنالہ تھا۔ جمعہ کی نماز کے لئے کپڑے بدل کر حضرت عمرؓ خلافت کے زمانہ میں مسجد جا رہے تھے اس دن مرغی بچے حضرت عباسؓ کے لئے ذبح کئے گئے تھے اس بچے کے گوشت وغیرہ کے دھونے کا خون اور آلائش چھت سے کسی نے بہا دیا۔ اسی وقت حضرت عمرؓ پرنالے کے پاس سے گذر رہے تھے، سارا پانی ان کے جسم پر گرا، اس وقت ایسا جذب طاری ہوا کہ آدمی بلوا کر خود اپنے ہاتھ سے اس پرنالے کو آپ نے اکھڑوا دیا۔ حضرت عباسؓ کو جب خبر ہوئی تو اور کچھ نہ بولے صرف اتنا فرمایا کہ اس پرنالے کو براہِ راست خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جگہ نصب کیا تھا۔ یہ سننا تھا کہ عمرؓ بے چین ہو گئے اور قسم دے کر حضرت عباسؓ کو آمادہ کیا کہ عمرؓ کے کندھے پر چڑھ کر اس نالی کو اسی جگہ پر نصب کر دیں جہاں پر رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دستِ مبارک سے اس کو نصب کیا تھا۔ آخر یہی کیا گیا۔ (ابن سعد ج ۴ ص ۱۴) ۱۲

لیکن میں کہتا ہوں کہ بنیاد اس کی تو ابوبکر صدیق رکھ چکے تھے۔ حضرت عمرؓ کی طرف سے اس بنیاد کے استحکام و استواری میں مدد ملی۔

خلاصہ یہ ہے کہ آج دین کے اس حصہ کی کیفیت تیرہ سو سال بعد تک مسلمانوں میں اپنی خاص خصوصیتوں کے ساتھ جو موجود ہے یعنی ایک طرف مسلمانوں نے اس حصہ کو دین کے بنیادی حصہ کے برابر نہیں سمجھا بلکہ ہمیشہ مدارج و مراتب کے اس فرق کو باقی رکھنے کی کوشش کی گئی، جیسے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے قصداً و ارادۃً اس حصہ میں پیدا کرنا چاہا تھا۔ اسی طرح ہر زمانے میں اس کا بھی خیال کیا گیا کہ ہر وہ بات جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دی جائے محض منسوب ہو جانے کی وجہ سے قابل قبول نہیں ہو جاتی بلکہ چھان بین، تحقیق و تلاش، تنقید و تجسس کی کوششوں میں مسلمان ابتداء اسلام سے اس وقت تک مشغول ہیں، یہ الگ بات ہے کہ کسی خاص علاقہ یا ملک میں جہل کے پھیل جانے کی وجہ سے کچھ دن کے لیے بے تمیزیاں پھیل گئی ہوں۔

تدوینِ حدیث کی تاریخ میں حضرت ابوبکرؓ کی ایک اور اہم خدمت

لیکن حضرت ابوبکرؓ کا کام تدوینِ حدیث کے سلسلے میں صرف ان ہی دو خدمات تک محدود نہیں ہے افسوس ہے کہ کتابوں میں ان کی اس خدمت کا تذکرہ کیا گیا تھا لیکن شاید اس کی اہمیت کا اندازہ جیسا کہ چاہیے تھا لوگوں کو نہ ہُوا۔ بات میں ممکن ہو کچھ طوالت پیدا ہو، لیکن کیا کیا جائے مجھ سے پہلے کام لینے والوں نے اختصار سے کام لیا میں تو سمجھتا ہوں کہ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ جس اہمیت کے مستحق تاریخ کے یہ وثائق تھے ان کی اہمیت کا اندازہ اچھے اچھوں کو نہ ہو سکا۔

کہنا یہ چاہتا ہوں کہ بجائے عمومی اشاعت کے دین کے اس حصہ کے متعلق یہ طریقہ جو اختیار کیا گیا کہ پہنچانے کی حد تک تو وہ پہنچا دیا جاتا لیکن عموماً ہر شخص تک پہنچ جائے اس کی کوشش نہیں کی جاتی تھی۔ جیسا کہ بتایا گیا اسی سے مسلمانوں کی دینی زندگی میں اس حصہ کے لحاظ سے سہولتیں پیدا ہوئیں جو ان سے استفادہ کرنا چاہتے ہیں ان کے لیے بھی راہ کھلی ہوئی ہے لیکن محروموں کی محرومی میں اس لئے اضافہ نہیں ہوتا کہ اس حصہ کے مطالبہ و گرفت میں وہ نوعیت نہیں پیدا ہوتی جو بنیادی حصہ کی خصوصیت ہے۔ مگر اسی کے ساتھ ایک دوسرا نتیجہ یعنی ان روایتوں کے جاننے والوں اور جو ان سے ناواقف تھے ان دونوں طبقوں میں اختلاف کا پیدا ہو جانا واقفیت اور عدم واقفیت کی وجہ سے ناگزیر تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے حضرت عمرؓ ہی کے متعلق دو قصے اس سلسلہ میں گذر چکے، معمولی آدمی نہیں حضرت عمرؓ جیسی شخصیت تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دو حدیثوں یعنی استیذان (اجازت) کے خاص طریقے اور بیت المقدس والی مسجد کے اس قصے سے جس کا ذکر میں نے حاشیہ میں کیا ہے آپ سن چکے وہ ناواقف تھے حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا ذکر دوسرے صحابیوں سے فرمایا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ دین کے اس حصہ کو جس طریقہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہنچایا تھا ایسی صورت میں بعضوں کا اس سے واقف ہونا اور بعضوں کا ناواقف رہ جانا کوئی تعجب کی بات نہیں ہو سکتی، خصوصاً جن لوگوں کو معاشی یا اسی قسم کے دوسرے کاروبار کی وجہ سے چوبیس گھنٹہ کی حاضر باشی کا دربارِ نبوت میں موقعہ میسر نہ تھا۔

استیذان والی روایت میں خود حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اعتراف کرنا پڑا:

خَفِيَ عَلَيَّ هٰذَا مِنْ اَمْرِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى یعنی یہ روایت مجھ سے جو مخفی رہی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ

اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَلْهَانِیْ عَنْهُ الصَّفْقُ فِی الْاَسْوَاقِ (جمع الفوائد ج ۲ ص ۱۴۴)

بازاروں کے کاروبار کی مشغولیت نے اس کا موقعہ میرے لیے نہیں رکھا تھا۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی کثرت روایت کی وجہ بیان کرتے ہوئے بھی یہی کہتے تھے کہ:

اِنَّ اِخْوَانِیْ مِنَ الْمُهَاجِرِیْنَ کَانَ یَشْغَلُهُمُ الصَّفْقُ فِی الْاَسْوَاقِ وَکُنْتُ اَلْزَمُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عَلٰی مِلَاءِ بَطْنِیْ

میرے دوسرے مہاجر بھائیوں کو بازار کے کاروبار نے اپنے ساتھ مشغول رکھا مگر میں تو صرف پیٹ پر رسول اللہ کے آستانے پر پڑا ہوا تھا۔

غالباً ابوہریرہؓ کی اس پوری روایت کا ذکر کہیں پہلے بھی آچکا ہے حاصل اس کا وہی تھا کہ مہاجرین تو بازار کے کاروبار میں عموماً مشغول رہتے تھے اور انصار کو اپنے باغوں اور کھیتوں کی وجہ سے زیادہ فرصت میسر نہیں آتی تھی البتہ یہ فقیر ابوہریرہ صرف پیٹ پر پیغمبر کے آستانے پر پڑا ہوا تھا اسی کا نتیجہ یہ ہوا جیسا کہ خود ان کا بیان ہے کہ فَاَشْهَدُ اِذَا غَابُوْا وَاحْفَظُ اِذَا نَسُوْا میں اس وقت حاضر رہتا تھا جس وقت یہ لوگ غائب رہتے تھے اور جن باتوں کو دوسرے بھول جاتے تھے مجھے حاضر باشی کی وجہ سے یاد رہ جاتی تھیں، کیونکہ بار بار سننے کا موقعہ ملتا تھا۔

اگرچہ یہ باتیں کس نوعیت کی ہوتی تھیں اس کا اندازہ حضرت عمرؓ والی ان ہی دو روایتوں سے ہو سکتا ہے۔ استیذان اصولی طور پر ایک قرآنی قانون ہے، قرآن ہی میں حکم دیا گیا ہے کہ کسی دوسرے گھر میں بے دھڑک بغیر اجازت مسلمانوں کو گھسنا نہ چاہیے بلکہ صاحب خانہ کو مانوس بنا کر اور سلام کلام کر کے داخل ہونا چاہیے قرآنی قانون ہونے کی وجہ سے اس کی تبلیغ عام ہو چکی تھی، باقی سلام کتنی دفعہ کرنا چاہیے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر عمومی طریقہ سے لوگوں کو تعلیم دی تھی کہ تین دفعہ سلام کرنے کے بعد بھی جواب نہ ملے تو لوٹ جانا چاہیے۔ پس یہی تین دفعہ سلام کرنا اس کی عمومی اشاعت مسلمانوں میں ضروری نہ تھی۔ پس استیذان یعنی کسی گھر میں داخل ہونے کے لئے اجازت طلبی کے وقت سلام کرنے کا جو قرآنی حکم ہے اسی حکم کی یہ تفصیل کہ تین دفعہ سلام کیا جائے یہ ایسا مسئلہ تھا جو عمومی اشاعت پانے والے مسائل کی حیثیت نہیں رکھتا تھا اسی طرح بیت المقدس کے متعلق حضرت داؤدؑ کا قصہ۔ سو ظاہر ہے کہ ایک تاریخی واقعہ تھا۔ ہر تاریخی واقعہ کی تبلیغ ہر شخص تک کھلی ہوئی بات ہے کہ فرائض نبوت میں داخل نہیں ہے بقول ابوبکر الجصاص:

لَیْسَ عَلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ تَوْقِیْفُهُمْ عَلَی الْاَفْضَلِ مِمَّا خَیَّرَهُمْ فِیْهِ۔ (تفسیر جصاص ج ۱ ص ۲۰۴)

یعنی جن امور میں مسلمانوں کو اختیار دیا گیا ہے ان کے اس پہلو سے امت کے ہر فرد کو آگاہ کرنا جو بہتر اور افضل ہو، یہ پیغمبر کے لیے ضروری نہیں ہے۔

اسی لیے بعضوں تک پیغمبر کی اس قسم کی باتیں پہنچیں اور بعضوں تک نہ پہنچیں۔ یہ ایک ایسی صورت حال تھی کہ مسلمانوں کی سہولت اور آسانی کے لحاظ سے اس کی جو بھی قیمت ہو لیکن جاننے والوں اور نہ جاننے والوں کے درمیان اختلاف کا پیدا ہو جانا اس کا ایک

لازمی و ناگزیر نتیجہ تھا۔ اسی کے ساتھ شرعی قوانینِ منصوصہ کی محدودیت اور قیامت تک پیدا ہونے والے انسانوں کے ساتھ پیش آنے والے حوادث و واقعات کی لامحدودیت نے اس ضرورت کو جو پیدا کیا تھا کہ شرعی کلیات کو پیشِ نظر رکھ کر شریعت کے ان ہی محدود قوانین کی روشنی میں نت نئی پیش آنے والی صورتوں کے لئے احکام پیدا کئے جائیں جس کا اصطلاحی نام تفقہ ہے۔ دین اور وہ بھی دینِ اسلامی جو مدعی ہے کہ ہر وہ شخص جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوئی نبوت و رسالت کے بعد انسان بن کر زمین کے کُرے پر قیامت تک پیدا ہوتا رہے گا اس کے لئے یہ آخری قانون ہے، ایک ایسے عالمگیر وسیع دینی آئین کے لیے تفقہ کے اس باب کا کھلا رکھنا کس حد تک ضروری ہے اس کا اندازہ آپ کو عام دنیاوی قوانین کے ماہرین کے بیانوں سے ہو سکتا ہے۔ حالانکہ کسی محدود علاقے کے لئے محدود زمانے میں حکومتیں ان قوانین کو بناتی ہیں، لیکن باوجود اس کے جیسا کہ سر سائمنڈ نے اپنی مشہور کتاب "اصولِ قانون" میں لکھا ہے:۔

> "بہر حال کسی ملک کے ججوں کے اختیارِ تمیزی کے بغیر صرف قانون سے انفصالِ مقدمات ناممکن ہے۔"
> (مترجمہ دار الترجمہ سرکار عالی ص۲۲)

تفصیل کے لیے تو دیکھئے میری کتاب "تدوینِ فقہ" یہاں صرف اس قدر کہنا ہے کہ "تفقہ" کی اسی ناگزیر صورتِ حال سے اختلافات کا پیدا ہو جانا لابدی تھا اور وہ پیدا ہوا۔ مسلمانوں میں مذہبی اختلافات کا ایک بڑا حصہ عموماً ان ہی دو توں باتوں یعنی آحاد خبروں کی واقفیت و عدم واقفیت پر مبنی ہے یا اس کا تعلق اجتہادی نقاطِ نظر سے ہے جن کا پیدا ہو جانا اجتہادی کوششوں میں قدرتی امر ہے اور خواہ ان اختلافات کے متعلق نہ جاننے والوں میں جس قسم کے خیالات بھی پھیلے ہوئے ہوں[1]۔ مگر جاننے والے جانتے

---

[1] میرا اشارہ اس عام چرچے کی طرف ہے جو مسلمانوں کے متعلق پھیلا ہوا ہے کہ بدترین قسم کی فرقہ بندیوں میں یہ قوم مبتلا ہے غیر تو غیر اپنوں کو بھی اس پر بسا اوقات چھاتی پیٹتے دیکھا گیا ہے لیکن جو اصل واقعہ ہے اسے اپنی مختلف کتابوں مقالات و مضامین میں بہ تفصیل بیان کر چکا ہوں۔ مکتبہ ندوۃ المصنفین نے "مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ" کے نام سے خاکسار کا اسی سلسلہ میں ایک رسالہ بھی الگ شائع کر دیا ہے۔ حاصل یہی ہے کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں فوج در فوج دنیا کی قومیں دائرۂ اسلام میں داخل ہوئیں تو اس میں شک نہیں کچھ دن کے لیے جیسا کہ کتابوں سے معلوم ہوتا ہے نت نئے خیالات و عقائد کے رکھنے والے فرقے پیدا ہو گئے تھے ان میں بعض فرقوں کی بنیاد تو سیاسی اختلافات پر مبنی تھی اور ایسے فرقے بھی تھے جو درحقیقت اپنے قدیم موروثی دین اور دھرم کے جراثیم کو بھی اپنے ساتھ لائے شعوری یا غیر شعوری طور پر شروع میں یہ چاہا گیا کہ اسلامی تعلیمات اور ان کے موروثی خیالات میں تطابق و مصالحت پیدا کی جائے اسی غیر محمود کوشش نے جہاں تک میرے معلومات کا اقتضا ہے ان مختلف فرقوں کو اسلام میں پیدا کر دیا تھا لیکن جوں جوں آئندہ نسلوں کے قدم حقیقی اسلام میں راسخ ہوتے چلے گئے آبائی موثرات کا دباؤ ڈھیلا پڑتا گیا، صحیح اسلام جوں جوں نو مسلموں کے سامنے بے نقاب ہوتا چلا گیا، اپنے آبائی خیالات سے ان کا تعلق کمزور ہوتا رہا تا آں کہ چوتھی یا پانچویں صدی ہجری تک پہنچتے ہوئے بتدریج یہ رنگ اتنا مٹا کہ یہ سارے فرقے خود بخود مضمحل ہو کر ناپید ہو گئے صرف مسلمانوں کی مذہبی تاریخوں میں لوگ ان فرقوں کا نام لکھتے ہیں لیکن دنیا سے ان (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ)

ہیں کہ ان ہی اختلافات کے سلسلے میں یہ عجیب و غریب صورتِ حال جو نظر آ رہی ہے کہ مسلمانوں کی قوم حالانکہ دنیا کے مختلف اقالیم و ممالک میں کروڑہا کروڑ کی تعداد میں پھیلی ہوئی ہے تخمینہ کرنے والے افراد کے نزدیک چالیس سے ستر کروڑ افرادِ انسانی پر یہ قوم مشتمل ہے جن میں مختلف زبانوں کے بولنے والی سینکڑوں نسلیں بنی آدم کی شریک ہیں۔ ان میں گورے، کالے زرد، گندمی الغرض ہر رنگ اور ہر شکل کے لوگ ہیں لیکن بایں ہمہ بجز شیعہ و خوارج جن کی اقلیت اتنی ناقابلِ لحاظ اقلیت ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت کے مقابلہ میں گویا ان کا وجود عدم سمجھنا چاہئے کے برابر ہے۔ بہر حال یہ ساری عظیم اکثریت اہلِ سنت والجماعت کے ایک ہی فرقہ کی شکل میں جو پائی جاتی ہے، لوگ اس کو کیوں نہیں سوچتے کہ اختلافات کے ان دو مستقل آتش فشاں پہاڑوں پر جس قوم کی دینی زندگی کی تعمیر کھڑی کی گئی ہے، اسی دین میں وحدت و یگانگت کا یہ حیرت انگیز مدہش مگر ساتھ ہی دلکش روح پرور رنگ کیسے پیدا ہو گیا؟ کیا یہ کوئی اتفاقی واقعہ ہے لوگوں کا مطالعہ اگر صحیح ہوتا تو ان کے سامنے ان سارے انتظامات اور انسدادی و احتیاطی تدبیروں کا نقشہ آ جاتا جو شروع ہی سے اس راہ میں اختیار کئے گئے۔ عہدِ نبوت میں تو اختلافات کے پیدا ہونے کی گنجائش ہی کیا تھی پیغمبر کا وجود قولِ فیصل تھا جو براہِ راست خدا سے علم پا رہے تھے، ہر اختلاف کا فیصلہ پیغمبر کی طرف رجوع کرنے کے ساتھ ہی ہو جاتا تھا۔ قرآن ہی میں بار بار مسلمانوں کو اس کا حکم دیا گیا کہ ہر اختلاف میں اللہ اور اس کے رسول کی طرف رجوع کرو۔ تاہم ایک چیز اس زمانے میں بھی پیدا ہو چکی تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں تک میں سمجھتا ہوں اسی کو اصلاح کا ذریعہ بنایا تھا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کا وجود معدوم ہو چکا ہے معمولی چھوٹے نا پرسانِ حال فرقوں ہی کا یہ انجام نہیں ہوا بلکہ بعض بڑے منہ زور صاحب السیف والقلم فرقے مثلاً معتزلہ تک کا یہ حال ہے کہ اس وقت اس فرقے کے کسی آدمی کا ملنا تو دور کی بات ہے، کتب خانوں میں اس مذہب کے عقائد و خیالات کی کوئی خالص کتاب بھی نہیں پائی جاتی لغت یا تفسیر وغیرہ کے سلسلے میں گنتی کی چند کتابیں ہیں ان میں کچھ ان کے خیالات ملتے ہیں یا اہلِ سنت نے تردید کے لئے ان کے مسلمات کا اپنی کتابوں میں جو ذکر کیا ہے اس سے کچھ ان کے خصوصیات کا علم حاصل ہوتا ہے۔ میں نے لکھا ہے کہ باقی حنفی، شافعی، مالکی و حنبلی فقہ کے یہ چار مکاتبِ خیال بلاشبہ مسلمانوں میں پائے جاتے ہیں لیکن ان لوگوں کے اختلافات پر فرقہ بندی کے اختلافات کا اطلاق قطعاً غلط ہے آخر جب ان میں ہر مکتبِ خیال کے لوگ دوسرے مکتبِ خیال کے ائمہ و اکابر کا اسی قدر احترام کرتے ہیں جتنا اپنے بزرگوں کا تو پھر ان میں کسی ایک جماعت کے دین کو دوسری جماعت کے دین سے جدا کیسے قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہی نہیں کہ ہر ایک دوسرے کے پیچھے نمازیں پڑھتے ہیں، ازدواجی تعلقات رکھتے ہیں۔ بلکہ حد یہ ہے کہ ایک جماعت کے لوگ دوسری جماعت کے پیروں کے ہاتھ پر بیعت تک کرتے ہیں۔ حضرت غوث پاک شیخ عبدالقادر کا وجود اس کی سب سے بڑی تاریخی مثال ہے فقہاً حضرت ولا حنبلی مسلک کے پابند تھے لیکن ایسا کون سا مسلمان ہے جو آپ کو سید الاولیا نہیں مانتا۔ واقعی فرقہ کا اطلاق صرف شیعوں پر یا خوارج پر ہو سکتا ہے سو خوارج کا وجود گویا رہا کے مقابلہ میں کسی حیثیت سے قابلِ ذکر نہیں ہے۔ شیعہ فرقے کے مسلمانوں کی تعداد اس میں شک نہیں کہ خوارج سے زیادہ ہے لیکن اہلِ سنت کی اکثریت کثیرہ عظیمہ کے مقابلہ میں سچ پوچھئے تو ان کی تعداد بھی سمندر میں چند تنکوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔

میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اختلافات باہمی سے مسلمانوں کو جو منع کیا گیا ہے، ہمیں سوچنا چاہیے کہ واقعی اس کا مطلب کیا ہے؟ کیا ہر مسلمان کو اس کا حکم دیا گیا ہے کہ وہی معلومات اپنے پاس رکھے جو دوسرے رکھتے ہیں، یا یہ کہ ہر مسلمان وہی بات سوچے جو دوسرے سوچتے ہیں، مگر غور کرنا چاہئے کہ کیا یہ ممکن بھی ہے؟ خصوصاً دین کے اس ثانوی حصہ کو جب پیغمبر اس طریقے سے پہنچا رہے تھے کہ اور تو اور ابوبکرؓ و عمرؓ جیسے مقربین بارگاہ کو بھی بسا اوقات اس سلسلے میں اپنی ناواقفیت کا اعتراف کرنا پڑتا تھا ایسی صورت میں یہ خیال کہ معلومات کے اختلاف سے جو اختلاف قدرتاً پیدا ہوتا یا ہوسکتا تھا اس سے مسلمانوں کو منع کیا گیا ہے خود ہی سوچئے کہ اس کا مطلب کیا ہوگا؟ اس طرح جب تفقہ کا باب کھولا گیا تھا اور عرض کرچکا کہ عملی طور پر کوئی دنیوی قانون بھی اس کے بغیر چل نہیں سکتا تو قیامت تک کے لئے ساری دنیا کے لئے جو دینی دستور دیا گیا تھا وہ اس دروازے کے بند کرنے کے بعد نت نئی رونما پیش آنے والی صورتوں اور ضرورتوں کی تکمیل کی ضمانت کیسے رکھ سکتا تھا اور "تفقہ" کے دروازے کو کھلا رکھنے کے بعد یہ توقع کیا پوری ہونے والی توقع ہوسکتی ہے کہ شرعی کلیات اور نصوص کو پیش نظر رکھ کرنئے پیش آنے والے حوادث کے متعلق حکم پیدا کرنے والے ہمیشہ ایک ہی نتیجہ تک پہنچیں گے۔

میرے نزدیک تو اختلاف سے ممانعت کا اگر یہی مطلب لیا جائے گا تو دوسرے الفاظ میں اس کے یہ معنی ہوں گے کہ سارے انسانوں کو حکم دیا جائے کہ اپنے چہروں کے رنگ کو ایک کردو اپنے قدوں کو برابر کرلو، ہر شخص ایک ہی قسم کی آواز منہ سے نکالے، الغرض جو کچھ ایک کے پاس ہے ضروری قرار دیا جائے کہ وہی سب کچھ دوسرے کے پاس بھی ہو اور وجہ یہ بیان کی جائے ان ہی چیزوں کے اختلاف سے لوگوں میں اختلاف پیدا ہوتا ہے۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ حکم ہمیشہ ان ہی چیزوں کا دیا جاسکتا ہے جو آدمی کے اختیاری حدود میں ہوں۔ بھلا غریب آدمی کے بس میں ہے کہ اپنے چہروں کے رنگ و روغن، شکل و صورت، قد و قامت، چال ڈھال وغیرہ قدرتی اختلافات اور انفرادی خصوصیتوں کو مٹا کر ایک کردے اور جیسے یہ اس کے بس کی بات نہیں یقین کیجئے کہ ذہنی اور دماغی یا باطنی خصائل وغیرہ کے فطری اختلافات جن کی وجہ سے فکری اختلافات پیدا ہوتے ہیں، ان اختلافات کو بھی آدمی اپنی قدرت اور اپنے ارادے سے مٹا نہیں سکتا۔ پس یہ کہنا کہ تفقہ میں ہر مسلمان فقیہ کو اس کا پابند بنایا گیا ہے کہ جس نتیجہ تک شرعی قوانین کی روشنی میں دوسرے پہنچیں اسی نتیجہ تک وہ بھی پہنچے اور یہ باور کیا جائے یا کرایا جائے کہ اس حکم کی تعمیل سے قاصر رہنے والے قرآن کے ان مطالبوں کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوئے ہیں جن میں مسلمانوں کو تفرق و اختلاف سے بچنے کی شدید تاکیدیں کی گئی ہیں اور عذاب عظیم کی دھمکیاں دی گئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ دعویٰ کوئی معمولی دعویٰ نہ ہوگا مسلمانوں کی تاریخ کے سارے روشن اوراق یقیناً اس کے بعد اچانک سیاہ پڑجائیں گے۔ میں اوروں کے متعلق تو نہیں کہتا کہ اس سلسلے میں ان کے خیالات کیا ہیں لیکن جہاں تک اپنی ناقص غور و فکر سے کام لینے کے بعد جس نتیجہ تک پہنچا ہوں اسے پیش کردیتا ہوں۔

میں تو یہی سمجھتا ہوں اختلاف و تفرق سے جن آیتوں میں مسلمانوں کو منع کیا گیا ہے اگر ان کا مطلب یہی لیا جائے گا تو جیسا کہ میں نے عرض کیا یہ اسی قسم کا مطالبہ ہوگا کہ کالے رنگ والوں کو حکم دیا جائے کہ اپنے چہروں کو گورا بنالیں ورنہ عذاب عظیم کے وہ مستحق ہوں گے میرے نزدیک تو دونوں مطالبوں میں اصولاً کسی قسم کا فرق نہیں ہے پس سوچنے کی بات یہی ہے کہ قرآن جس اختلاف

سے منع کر رہا ہے وہ ہے کیا؟ یقیناً یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہو سکتی جس کی تعمیل انسانی دسترس سے باہر ہو آخر لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا یعنی وسعت اور گنجائش ہی کو دیکھ کر مطالبہ کیا جاتا ہے یہ بھی تو قرآن ہی کا کلی قانون ہے جب ہر باب میں اس قانون کی ہمہ گیری مسلم ہے تو اختلاف کا مسئلہ اس کے دائرے سے کیسے باہر ہو سکتا ہے اس معیار پر اس مسئلہ کی جو واقعی حقیقت ہو سکتی ہے اسے متعین کیجیے میں ایک مثال پیش کرتا ہوں یعنی وہی گورے اور کالے کے اختلاف کو دیکھئے، چہروں کے رنگ کے اس اختلاف کو یہ تو ظاہر ہے کہ آدمی ختم نہیں کر سکتا، گوروں کو کالا اور کالوں کو گورا یا رنگینوں کو پھیکا اور پھیکوں کے چہروں پر وہ رنگ نہیں بھرے جا سکتے جو رنگین چہروں والے کی خصوصیت ہے لیکن اسی کے ساتھ اگر چاہا جائے تو چہروں کے رنگ کے ان قدرتی اختلافات کو مخالفت کا ذریعہ بنا کر بنی آدم کو مختلف ٹولیوں میں یقیناً بانٹا جا سکتا ہے اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ آئے دن یہ کیا جا رہا ہے کتنی بے دردی کے ساتھ رنگ کے اسی قدرتی اختلاف کو خونریز مخالفتوں کا ذریعہ بنایا گیا ہے پس اختلاف تو ایک قدرتی بات ہے لیکن اس قدرتی اختلاف کو ارادی مخالفتوں کا ذریعہ بنانا یہ قطعاً انسان کی ایک مصنوعی حرکت ہے، قدرتی اختلافات کی راہوں کو بند کرنا اور کلیتہً ان کا استیصال یہ تو ہمارے بس کی بات نہیں ہے مگر ان ہی قدرتی اختلافات کو ذریعہ بنا کر ارادی مخالفتوں کی آگ بھڑکانی یقطعی طور پر آدمی کی اختیاری چیز ہے۔ میرا خیال ہے کہ مسلمانوں کو جس چیز سے منع کیا گیا ہے وہ اس مسئلہ کا یہی اختیاری پہلو ہے، بالفاظِ دیگر مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس سے منع کیا گیا ہے کہ معلومات یا افکار و خیالات یا اجتہادی نتائج کے اختلاف کو چاہیے کہ باہمی مخالفتوں کا ذریعہ نہ بنائیں یعنی ان ناگزیر قدرتی اختلافات کو بنیاد بنا کر ایک طبقہ کے دین کو دوسرے طبقے کے دین سے جدا کرنے کے جرم کے مرتکب نہ ہوں قرآن اسی جرم سے مسلمانوں کو روکنا چاہتا ہے حاصل یہ ہے کہ جن اختلافات کا مٹانا آدمی کے بس میں نہیں ہے ——— ان کے مٹانے یا ختم کرنے کا مطالبہ نہیں کیا گیا ہے اور نہ کیا جا سکتا ہے، بلکہ ان اختلافات کو ارادی مخالفتوں اور مخاصمتوں کا یعنی ایک کے دین کو دوسرے کے دین سے جدا کرنے کا ذریعہ بنانا یہ فعل چونکہ ہمارے اختیاری حدود میں داخل ہے، اس لیے درحقیقت اسی سے مسلمانوں کو منع کیا گیا ہے اور منع کرنے کی یہی بنیاد ہو بھی سکتی ہے۔ قرآن نے اس باب میں جو حکم دیا ہے وہ بالکل واضح اور بین ہے مثلاً ارشاد ہے:

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ (آل عمران)

اور نہ بن جانا ان لوگوں کی طرح جو ایک دوسرے سے جدا ہوئے اور مختلف ہوئے بعد اس کے کہ ان کے پاس "بینات" آچکے تھے وہی لوگ ہیں جن کے لیے بڑا عذاب ہے

آپ دیکھ رہے ہیں اِخْتَلَفُوا سے پہلے "تَفَرَّقُوا" کا لفظ ہے جس سے اشارہ جیسا کہ میں سمجھتا ہوں کیا ہے اسی طرف کیا گیا ہے کہ لوگ دراصل تفرق کو پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ یعنی ایک ٹولی کو دوسری ٹولی سے جدا کرنا چاہتے ہیں تب اس جدائی کا ذریعہ مذہب کے اختلاف کو بنا لیتے ہیں حالانکہ "البینات" ان کے پاس موجود رہتا ہے

اسی آیت کو پیش نظر رکھ کر اسلام کا نقطہ نظر یہ سمجھ میں آتا ہے کہ دین کے جس حصہ کی حیثیت "بینات" کی ہو یعنی دین سے جس کا تعلق بالکل واضح اور روشن ہو، مثلاً وہ ساری چیزیں جو عمومیت کی راہ سے منتقل ہوتی ہوئی مسلمانوں میں چلی آ رہی ہیں اسلام کے ساتھ ان کا تعلق اتنا واضح اتنا بین اور کھلا ہوا ہے کہ جو اسلام اور ان چیزوں کو جانتا ہے خواہ مسلمان ہو یا نہ ہو شاید اسلام کا ان کے بغیر وہ تصور ہی نہیں کر سکتا مثلاً قرآن یا حج یا نماز، رمضان کے روزے وغیرہ ان کا یہی حال ہے

بہر حال ان ہی "البینات" پر متفق و متحد ہو جانے کے بعد ہدایت کی گئی ہے کہ دین کے "غیر بیناتی" حصہ کو ذریعہ بنا کر مسلمانوں کی ایک ٹولی کو دوسری ٹولی سے جدا کرنے کی حرکت جدا کرنے والوں کو عذابِ عظیم کی مستحق بنا دیتی ہے۔ حاصل یہی ہوا کہ قدرتی طور پر جن اختلافات کا پیدا ہو جانا ناگزیر ہے ان سے نہیں منع کیا گیا ہے اور نہ ان سے منع کیا جا سکتا ہے کہ اختیاری حدود میں وہ داخل ہی نہیں ہیں بلکہ ان ناگزیر قدرتی اختلافات کو چاہیے کہ باہم ایک کو دوسرے سے جُدا کرنے کا ذریعہ نہ بنایا جائے ممانعت کا حقیقی رُخ انسان کے اسی ارادی فعل کی طرف ہو سکتا ہے اور اسی طرف اس کا رخ ہے بھی۔

میں نے جیسا کہ عرض کیا تھا کہ عہدِ نبوت میں ان قدرتی اختلافات کے پیدا ہونے کی گنجائش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود مبارکہ کی وجہ سے تھی ہی نہیں، تاہم اس وقت بھی اختلاف کی ایک صورت سامنے آ ہی گئی یعنی زبانوں کا دستور ہے کہ ایک ہی زبان کے بولنے والے کیوں نہ ہوں لیکن ان لوگوں میں بھی تھوڑا بہت لہجہ، طریقہ ادا، تلفظ وغیرہ کے اختلافات پیدا ہی ہو جاتے ہیں کہنے والوں نے یہاں تک کہا ہے کہ ہر بارہ میل پر زبانوں کے ان اختلافات کا تجربہ کیا گیا ہے ممکن ہے کہ اس میں کچھ مبالغہ سے کام لیا گیا ہو، لیکن اس مشاہدے کا کیسے انکار کیا جا سکتا ہے کہ ایک ہی زبان کے بولنے والوں میں مذکورہ بالا اختلافات کو ہر جگہ لوگوں نے پایا ہے، ہماری اردو زبان ہی کو دیکھ لیجئے، شمال و جنوب و مشرق و مغرب کے اکثر ہندوستانی علاقوں میں یہ بولی جاتی ہے، لیکن باوجود ایک زبان ہونے کے کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ جنوبی ہند کے اردو بولنے والے ایک ہی لفظ کو اس طریقہ سے ادا کرتے ہیں کہ شمالی ہند والے اگر چاہیں بھی تو اس طریقے سے لفظ کا تلفظ نہیں کر سکتے اور یہی حال مختلف صوبجاتی مقامی اختلافات کا ہے۔ عربی زبان جس میں قرآن مجید نازل ہوا تھا یہ زبان سارے عرب کی تھی۔ لیکن عرب کے مختلف علاقوں کے باشندوں کی زبان میں بھی وہ سارے اختلافات پائے جاتے تھے، جن سے کوئی زبان بچی ہوئی نہیں ہے۔ حجاز، یمن، نجد یا مختلف قبائل قریش، بنی تمیم، قحطانی، غیر قحطانی قبائل کے اندر اس قسم کے کافی لسانی اختلافات پائے جاتے تھے۔ اسی سے اندازہ کیجئے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود جیسی جلیل ہستی جن کی ساری زندگی قریش ہی بلکہ براہِ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبتِ مبارک میں گزری۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ان کو قرآن پڑھایا تھا، لیکن نسلاً و اصلاً یہ ذہلی تھے اس لئے حتّی کا تلفظ آخر عمر تک وہ عتّی کرتے رہے۔ مسند احمد میں ہے کہ مشہور حدیث جس میں ہے کہ تورات میں آنحضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جو صفات بیان کئے گئے ہیں، ان میں یہ بھی ہے کہ آپ دنیا سے اس وقت تک تشریف نہ لے جائیں گے جب تک ملت عوجاء (ٹیڑھی ملت) سیدھی نہ ہو جائے۔ جس کی تفسیر یہ کی گئی ہے کہ لوگ لا الٰہ الا اللہ کے قائل ہو جائیں گے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اندھی آنکھوں اور بہرے کانوں اور جن قلوب پر غلاف چڑھے ہوئے ہیں ان کو اسی کلمہ لا الٰہ الا اللہ سے کھول دیں گے۔ عربی میں اس مفہوم کو ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے کہ حَتّٰی یُقِیْمَ بِہِ الْمِلَّۃَ الْعَوْجَاءَ بِاَنْ یَّقُوْلُوْا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ فَیَفْتَحُ بِہَا اَعْیُنًا عُمْیًا وَاٰذَانًا صُمًّا وَقُلُوْبًا غُلْفًا۔ حضرت عطاؒ فرماتے تھے کہ میں نے کعب احبار سے جو تورات کے مستند عالم اس زمانے میں سمجھے جاتے تھے ان سے پوچھا کہ آپ کا علم ان الفاظ کے متعلق کیا ہے یعنی تورات میں الفاظ کیا پائے جاتے ہیں؟ کہتے ہیں کہ کعب نے اس کی تصدیق کی صرف فرق یہ نظر آیا کہ

اَنَّ کَعْبًا یَقُوْلُ بِلُغَتِہٖ اَعْیُنًا عُمُوْمٰی وَاٰذَانًا صُمُوْمٰی وَقُلُوْبًا غُلُوْفٰی

کعب بجائے اعینا عمیا کے اعینا عمومی اور اذانا صما کے اذانا صمومی اور قلوبا غلفا کے قلوبا غلوفی کے ساتھ ان الفاظ کا اپنی

درحقیقت یہ زبان کا اختلاف نہیں ہے بلکہ لہجہ کا اختلاف ہے جس کی تعبیر عطائنے "لغت" کے لفظ سے کی ہے۔ کعب یمن کے رہنے والے تھے۔ حجازی لہجہ اور یمنی لہجہ کے فرق کا اس سے کچھ اندازہ ہوتا ہے "عما" کو کھینچ کر یمنی "عموما" اور "صما" کو "صموما" "غلقا" کو "غلوقا" بنا دیتے تھے۔

بہرحال میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ قرآن حجاز سے نکل کر جب عرب کے دوسرے علاقے اور قبائل میں پہنچا تو تلفظ و لہجہ اور اسی قسم کے لسانی اختلافات جن کا پیدا ہو جانا ناگزیر تھا، نمودار ہوتے۔ غیر اصولی اختلافات کے متعلق چاہیئے کہ باہمی رواداری اور ان اختلافات کے برداشت کرنے کی صلاحیت مسلمان اپنے اندر پیدا کریں۔ لب و لہجہ کے ان ہی اختلافات کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے عہدِ مبارک ہی میں عملی طور پر مسلمانوں کی تربیت کا موقعہ مل گیا، بڑے عجیب و غریب دلچسپ اور سبق آموز واقعات اس سلسلہ میں پیش آئے۔ قدرتی ناگزیر اختلافات کو ارادی مخالفت و مخاصمت اور تفرق و جدائی کا ذریعہ بنا لینا اس بدعادت کے جاہل عرب میں عموماً عادی تھے، معمولی ناقابلِ لحاظ اسی نوعیت کے غیر اہم اختلاف کی بدولت خدا جانے کتنی خونریزیاں ان میں ہو چکی تھیں، کسی قسم کا اختلاف ہو ان کے لیے ناقابلِ برداشت تھا بلکہ ان میں جو زیادہ ذکی الحس صاحبِ عزم و ارادہ ہوتے تھے وہی ان اختلافات کے قصوں کو آگے بڑھانے اور ان کی آگ کو ہوا دینے میں سب سے آگے آگے نظر آتے تھے۔ آج کل بھی جیسے دیکھا جاتا ہے کہ اسی قسم کے قدرتی اختلافات مثلاً رنگ و نسل کے اختلافات یا وہمی و فرضی بنیادوں پر جو اختلافات مبنی ہیں مثلاً وطن[1] اور زبان کے اختلافات ان میں سب سے زیادہ حصہ لینے والے اور فتنہ و فساد کی آگ کا ایندھن ان ہی معصوم اختلافات کی لکڑیوں کو بنانے والے زیادہ تر وہی ہوتے ہیں جن کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ ان کے قومی احساسات زیادہ بیدار اور زندہ ہیں وہی قوم کے لیڈر بن کر قوم کو جنگ و جدال قتل و قتال کی جہنم میں جھونکتے رہتے ہیں۔

---

[1] ظاہر ہے کہ چہروں پر مڑھی ہوئی کھال کا رنگین یا بے رنگ ہونا یا کسی شخص کا بجائے زید کے مثلاً بکر کے خاندان میں پیدا ہو جانا یہ اس کے اختیار کی بات نہیں ہوتی۔ اسی طرح زمین کا کرہ جو واقعی میں مٹی کا ایک واحد بسیط کرہ ہے ملکوں اور اقلیموں میں اسی خاکی کرے کی تقسیم ظاہر ہے کہ ایک فرضی اور وہمی تقسیم ہے۔ کسی دریا یا پہاڑ یا اسی قسم کی چیز کو سرحد قرار دے کر فرض کر لیا جاتا ہے کہ زمین کا جو حصہ اس پہاڑ یا دریا کے اس پار ہے وہ اس حصہ سے جدا ہو گیا جو اس پار ہے، پہاڑ یا دریا کا وجود تو واقعی ہوتا ہے لیکن یہ کہنا کہ اسی پر فلاں ملک ختم ہو جاتا ہے ایک فرضی بات کے سوا اور کیا ہے۔ اسی طرح الفاظ اور معانی میں کھلی ہوئی بات ہے کہ کوئی واقعی تعلق نہیں ہوتا یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ پانی کو پانی کہا جائے گا۔ فرض کیجئے کہ اسی پانی کا نام کوئی آگ رکھ دے تو واقعہ پر اس کا کیا اثر پڑتا ہے۔ آخر کہنے والے اسی ٹھنڈک پہنچانے والے پانی کو جل بھی تو کہتے ہیں مگر لوگوں نے ان ہی مفروضہ اصطلاحات کو اس زمانہ میں شدید قومی کینوں اور عداوتوں کی بنیاد بنا کر جو کچھ کیا اور اس وقت تک کر رہے ہیں وہ ہمارے اور آپ کے سامنے ہے۔

خیر اس عام قصہ کو چھوڑیئے میں عرب کا ذکر کر رہا تھا۔ ہوا یہ کہ جب قرآن کے پڑھنے میں اس قسم کے اختلافات عہدِ نبوت میں رونما ہونے شروع ہوئے تو بڑی گڑبڑ پیدا ہوئی۔ اسی سلسلے میں خود حضرت عمرؓ بعد کو اپنا یہ قصہ سنایا کرتے تھے کہ

"ہشام بن حکیم نماز میں سورۂ فرقان پڑھ رہے تھے میں نے جو کان لگایا تو سنا کہ بہت سے حروف کو وہ اس طریقہ سے ادا کر رہے ہیں جس طریقہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے نہیں پڑھایا تھا۔ اس حال کو دیکھ کر میرا جی تو چاہا کہ نماز ہی میں اچھل کر اس شخص کو دبوچ لوں لیکن پھر ٹھہر گیا (یعنی نماز میں مشغولیت کی وجہ سے اتنی دیر کے لیے ٹھہر گیا) جب ہشام نے سلام پھیرا تو میں نے معاً اپنی چادر اس کے گلے میں ڈالی اور پوچھنے لگا کہ تجھے اس طریقہ سے قرآن کس نے پڑھایا ہے جو اس وقت تم کو میں نے پڑھتے سنا۔ ہشام نے جواب میں کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے پڑھایا ہے۔"

میں نے ہشام سے کہا کہ تم جھوٹ بولتے ہو کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے بھی یہی سورۃ پڑھی ہے آپؐ نے قطعاً اس طریقہ سے مجھے نہیں پڑھایا جس طرح تم پڑھ رہے تھے۔ یہ گفتگو تو ان دونوں کے درمیان ہوئی۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد میں نے اس حال میں کھینچتے ہوئے اس شخص کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے حاضر کیا اور عرض کرنے لگا کہ یا رسول اللہ میں نے سورۂ فرقان پڑھتے ہوئے اس شخص کو پایا، ایسے حروف کے ساتھ یہ پڑھ رہا تھا جن کے ساتھ آپ نے یہی سورہ مجھے نہیں پڑھائی ہے

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میری گفتگو سن کر پہلے تو مجھے حکم دیا کہ اَرْسِلْہُ (تم اس کو یعنی ہشام کو چھوڑ دو) اس کے بعد ہشام کی طرف خطاب کر کے فرمانے لگے کہ

"ہشام تم سناؤ کیا پڑھ رہے تھے۔"

حضرت عمرؓ کا بیان ہے کہ جس طریقہ سے نماز میں ہشام اس سورہ کو پڑھ رہے تھے، ان ہی حروف کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سنانا شروع کیا۔ جب ان کا پڑھنا ختم ہو گیا تو میں نے دیکھا کہ رسول اللہ ہشام کی طرف اشارہ کر کے فرما رہے ہیں۔

ھٰکَذَا اُنْزِلَتْ اسی طرح یہ سورۃ نازل ہوئی ہے۔

پھر میری طرف (یعنی حضرت عمرؓ) کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مخاطب ہوئے اور فرمایا کہ

"عمر اب تم پڑھو۔"

حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ حسب ارشاد میں نے بھی ان ہی حروف کے ساتھ جن کے ساتھ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھایا تھا پڑھنا شروع کیا جب میرا پڑھنا ختم ہو گیا تو دیکھا کہ میری قرأۃ کی طرف بھی اشارہ کر کے فرما رہے ہیں:

---

[1] میں نے یہ ترجمہ حضرت عمرؓ کے الفاظ "فَکِدْتُ اَنْ اُسَاوِرَہٗ" کا کیا ہے۔ (دیکھو جمع الفوائد ج ۲ ص ۱۳۴)

هٰكَذَا اُنْزِلَتْ — اسی طرح یہ سورۃ نازل ہوئی ہے

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بعد فرمایا کہ

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ اُنْزِلَ عَلٰی سَبْعَةِ اَحْرُفٍ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ۔ — یہ قرآن سات حروف پر نازل ہوا ہے تو چاہیے کہ تمہارے لیے جو آسان ہو ان ہی حروف کے ساتھ اس کو پڑھو۔

یہ روایت صحاح ستہ کی کل کتابوں میں پائی جاتی ہے۔ شارحین حدیث نے "سبعہ احرف" کی شرح میں بہت کچھ لکھا ہے حالانکہ میرے خیال میں بات وہی تھی کہ ایک ہی زبان کے بولنے والے اس زبان کے الفاظ کو مختلف لہجوں میں ادا کرتے ہیں اور بھی کچھ اسی نوعیت کے اختلافات ہر زبان میں عموماً ہوتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد یہ تھا کہ جس کی زبان جس تلفظ اور جس طریقہ کی عادی ہے، اسی کے ساتھ قرآن کو پڑھے۔ میرے نزدیک ان بزرگوں کی رائے اس باب میں بالکل صحیح ہے کہ "سبعہ" (سات) کے عربی لفظ سے خاص سات کا عدد مقصود نہیں ہے بلکہ عربی محاورے میں "تعدد" کے اظہار کا یہ عام طریقہ تھا جیسے اردو میں "بیسیوں" وغیرہ کے الفاظ سے بیس کا خاص عدد بولنے والے کا مقصود نہیں ہوتا، بلکہ کثرت کا اظہار اس سے کیا جاتا ہے، اور عربی زبان کا یہ ایک عام محاورہ ہے۔ خیر اس وقت میرے سامنے اس حدیث کی شرح ہے بھی نہیں بلکہ دکھانا یہ چاہتا تھا کہ عرب جو اس قسم کے اختلافات کو برداشت نہیں کر سکتے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان ہی کے برداشت کی صلاحیت پیدا کرنے کا موقعہ قرآن کے ان ہی قرآنی اختلافات کی وجہ سے مل گیا، کبھی کبھی یہ دکھانے کے لئے قریشی لہجہ کے سوا دوسرے لہجہ اور الفاظ کے تلفظ کے دوسرے طریقے اسی طرح صحیح ہیں جیسے قریشی لہجہ وتلفظ صحیح ہے، باوجود قریشی ہونے کے کبھی کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی قرآن کو دوسرے قبائل کے لہجہ میں پڑھ دیا کرتے تھے مثلاً روایتوں میں آیا ہے کہ سورۂ رحمٰن کی آیت "عَلٰى رَفْرَفٍ خُضْرٍ وَّعَبْقَرِيٍّ حِسَانٍ" کی جو آیت ہے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سنا گیا کہ اسی کو "عَلٰى رَفَارَفٍ خُضْرٍ وَّعَبَاقِرِيِّ حِسَانٍ" کی شکل میں ادا کر رہے ہیں، یہ وہی صورت ہے کہ "عمیا" کو کعب احبار "عموما" اور "صما" کو "صموما"، "غلفا" کو "غلوفا" کے لہجہ میں ادا کرتے تھے۔

بہرحال حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مذکورہ بالا قصہ اگرچہ ایک شخصی واقعہ ہے لیکن قدرتی غیر ارادی اختلافات کو ارادی و اختیاری مخالفت ومخاصمت کے قالب میں ڈھال دینے کی علامت عربوں میں کتنی راسخ تھی اسی عام عادت، کی یہ کتنی اچھی مثال ہے خیال تو کیجیے کہ نماز ہی میں اچھل کر دبوچ لینے کا ارادہ کرنا اور نماز کے بعد گردن میں ہشام بیچارے کے چادر ڈال کر کھینچتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لانا اور سب سے زیادہ بڑی بات یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی[1] کو محض اس اختلاف کی وجہ سے بے دھڑک كَذَبْتَ (تم جھوٹ بولتے ہو) کہہ دیا اس سے کچھ

---

[1] چونکہ ام المومنین خدیجہ رضی ہشام کے والد حکیم بن حزام کی حقیقی پھوپھی بھی تھیں تو اس کی وجہ سے ان کی ہستی صحابہ میں ممتاز تھی ماسوا اس کے قریش کے بھی ممتاز گھرانے سے ان کا تعلق تھا لیکن حضرت عمر رضی میں اس وقت تک اختلافات کے برداشت کرنے کی اتنی صلاحیت نہیں پیدا ہوئی تھی کہ اتنے معزز قریشی آدمی کے ساتھ کسی قسم کی رد رعایت روا رکھیں ۔۱۲

اندازہ ہوتا ہے کہ ان اختلافات کے باب میں عرب کے جذبات کس حد تک نازک تھے مگر پیغمبر کی تربیت نے ان ہی عربوں میں پھر کس رنگ کو پیدا کر دیا؟ یہی حضرت ہشام بن حکیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں، کتابوں میں لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ کو ان پر اتنا اعتماد تھا کہ جب کسی ناگوار اور بری بات کی خبر آپ کو ملتی تو فرماتے کہ

مَا بَقِيتُ أَنَا وَ هِشَامٌ فَلَا يَكُونُ ذٰلِكَ — جب تک میں اور ہشام دونوں آدمی باقی یعنی زندہ رہیں اس وقت تک تو ایسا نہ ہوگا۔

(اسد الغابہ ج ۵ ص ۶۱)

جس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اس طریقہ کار کا اعلان ہوا کہ باوجود اختلاف رہنے کے آپس میں ایک کا دوسرے سے جدا ہو جانا یا مخالف ہو جانا غیر ضروری ہے بلکہ اختلاف کے ساتھ اتفاق کو بہر حال باقی رکھنا چاہیے جیسے قرآنی آیات کے ذریعے آپؐ نے صحابہ کی عملی تربیت اس سلسلہ میں شروع کی تو ابتداً میں بعض خطرناک واقعات بھی پیش آئے جن میں سب سے زیادہ اہم حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ ہے، صحابہ میں ان کی سب سے بڑی خصوصیت سمجھی جاتی تھی کہ ان ہی وہ اَقْرَءُهُمْ تھے یعنی قرآن کے پڑھنے والوں میں یہ سب سے اچھے تھے، اَقْرَءُهُمْ یعنی سب سے اچھا قرآن پڑھنے والے صحابہ میں وہی ہیں اسی کی سند بارگاہِ نبوت سے ان کو ملی تھی۔ قرآن کے ساتھ ان کی خصوصیت کا ذکر مختلف طریقوں سے کتابوں میں کیا گیا ہے۔ بہر حال ان کے ساتھ بھی ایک دفعہ یہی صورت پیش آئی کہ مسجد نبوی میں دو صاحبوں کو نماز میں قرآن کو اس طریقے سے پڑھتے انہوں نے سنا جو ان کی قرأت کے مطابق نہ تھا اور خود ان دونوں کی قرأتوں میں بھی اختلاف تھا۔ حضرت اُبیؓ ان دونوں کو ساتھ لیے ہوئے دربارِ رسالت پناہی میں حاضر ہوئے اور جو واقعہ تھا اس کا اظہار حضرت ابی نے کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کو حکم دیا کہ جو کچھ تم نے پڑھا تھا مجھے سناؤ۔ جب دونوں سنا چکے تو حضرت اُبیؓ کہتے ہیں کہ فَحَسَّنَ شَأْنَهُمَا (دونوں ہی کی قرأۃ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سراہا اور کہا کہ خوب پڑھتے ہو) حضرت ابی جن کا خیال تھا کہ قرأۃ قرآن میں تمام صحابہ میں سند سمجھا جاتا ہوں ایسی صورت میں ان کے اس احساس پر متعجب نہ ہونا چاہیے کہ جس قرأۃ کو میں نے ناپسند کیا ہے آنحضرتؐ بھی اس کو ناپسند کریں گے لیکن ناپسند تو کیا کرتے پڑھنے والوں کی تعریف کی گئی اور پھر ایسی دو قرأتوں کو آپ نے سراہا جن میں خود بھی ہر ایک کی قرأت دوسرے کی قرأت سے مختلف تھی۔ یہ حالات تھے ہی ایسے کہ اُبی جیسے راسخ الاعتقاد مومن کا بیان ہے کہ (العیاذ باللہ) فَسَقَطَ فِي نَفْسِي مِنَ التَّكْذِيبِ وَلَا إِذْ كُنْتُ فِي الْجَاهِلِيَّةِ

سمجھا آپ نے کیا مطلب؟ حضرت اُبیؓ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ قرأۃ کے ان قدرتی اختلافات میں سے ہر ایک کے لیے گنجائش پیدا کرنا بلکہ دو مختلف باتوں کی تحسین و تعریف ان کی اس فطرت کے لیے جس میں سرے سے اختلافات ہی کی برداشت کی صلاحیت نہ تھی اسی فطرت کو قرآن کے متعلق تین تین اختلافی شکلوں کے برداشت کر لینے پر آمادہ کرنا ایک ایسی بات تھی کہ مسلمان ہونے کے باوجود پیغمبرؐ کی نبوت اور رسالت ہی کے متعلق شک نہیں بلکہ جیسا کہ وہی کہتے ہیں کہ تکذیب کا شعلہ (العیاذ باللہ) ان کے اندر بھڑک اٹھا اور کیسا شعلہ؟ کہتے ہیں کہ ایامِ جاہلیت یعنی اسلام لانے سے پہلے تکذیب کی جو کیفیت قلب میں تھی اس کو اس تکذیب سے کیا نسبتؐ؟ گویا ایمان و اسلام کا سارا سرمایہ

... مطلب میں نے معانی حدیث کے سب سے بڑے مستند شارح علامہ طیبی کے خیال کے مطابق بیان کیا ہے۔ (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ ملاحظہ فرمائیں)

اسی حسی ذکاوت پر قریب تھا کہ قربان ہو جائے جو موروثی طور پر ان میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت سے پہلے پائی جاتی تھی اور قریب تھا کیا معنی؟ وہ تو کہتے ہیں کہ سب کچھ کھو چکا تھا سارا سرمایہ ایمان کا اسی آگ کے شعلوں میں بھسم ہو چکا تھا وہ تو خدا کی مہربانی تھی کہ یہ فوری کیفیت ان میں اس وقت پیدا ہوئی جب العالمین کی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے وہ کھڑے ہوئے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت اُبی کا قصہ گویا یوں سمجھئے کہ اسی وقت ختم ہو چکا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اس کیفیت کو تاڑ لیا یا کشفاً آپ پر اُن کے قلب کی حالت کھل گئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بجائے کسی فہمائش کے جو آپ کا عام قاعدہ تھا محسوس فرمایا کہ اس وقت اس بیچارے کا کام فہمائش سے نہ چلے گا اور آخری اقتداری تدبیر جو پیغمبروں کو قدرت کی طرف سے مرحمت ہوتی ہے اسی اقتداری تدبیر سے آپ نے کام لینا ضروری خیال کیا۔ حضرت اُبیؓ کہتے ہیں کہ میرے اس حال کو محسوس کر کے :

ضَرَبَ فِیْ صَدْرِیْ — (دو تھپڑ میرے سینہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مارا۔)

یہ روحانی تربیت کے سلسلہ میں توجہ کی ایک شکل ہے، توجہ اور وہ بھی خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ کارگر نہ ہوتی تو اور ہوتا کیا۔ اُبیؓ کہتے ہیں :

خففتُ عِرْقاً وَکَاَنَّمَا اَنْظُرُ اِلَی اللّٰہِ تَعَالٰی فَرَقاً (مشکوٰۃ بحوالہ مسلم وغیرہ) — (میں اس توجہ کے بعد پسینے سے شرابور ہو گیا اور گویا ایسا معلوم ہوا کہ خوف سے میں خدا کو دیکھ رہا ہوں۔)

ایک سِرّ تھا جس سے حضرت اُبیؓ کے لئے ایک ایسا خیر پیدا ہوا کہ شاید اگر یہ حالت ان پر طاری نہ ہوتی تو اس؎ کا موقعہ ان کو مشکل ہی سے میسر آ سکتا تھا، پیغمبر کی توجہ نے خدا کو ان کے سامنے بے حجاب کر دیا، سارے مقامات طے ہو گئے۔

کچھ بھی ہو میں تو یہ دکھانا چاہتا تھا کہ قرآن میں مسلمانوں کو باہمی اختلاف سے جو منع کیا گیا ہے اس کا یہ مطلب سمجھ لینا کہ جو اختلافات قدرتی واقعات کے لازمی نتائج ہیں ان اختلافات سے مسلمانوں کو روکا گیا ہے صحیح نہیں ہے بلکہ جیسا کہ عرض کرتا چلا آ رہا ہوں کہ ایک

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) بعض لوگ جو عربی محاوروں سے ناواقف ہیں زبردستی ان الفاظ کے معانی کو توڑنے مروڑنے کی غیر ضروری کوشش اس لئے کرتے ہیں تاکہ حضرت اُبیؓ کا دامن ایسے سخت الزام سے پاک رہے اولاً وہ عربی محاورے کی رو سے درست نہیں ہے نیز اس قصے سے جو نتیجہ پیدا ہوتا ہے اس کو بھی ان کا پیدا کیا ہوا مطلب مضمحل کر دیتا ہے۔ حضرت ابی کا جب وہ حال باقی نہ رہا تو اب ان پر الزام ہی کیا رہ جاتا ہے کتنے صحابہ ہیں جو کفر کی بدترین حالتوں سے نجات یاب ہوئے کیا اس لئے کہ وہ صحابی ہیں ان واقعات کا انکار کر دیا جائے۔

؎ فتوحات مکیہ میں شیخ اکبر رحمۃ اللہ علیہ نے "توجہ" کی مختلف قسموں کو بتاتے ہوئے "توجہ بالید" یعنی ہاتھ سے توجہ دینا اس کو بھی توجہ کی ایک قسم قرار دی ہے، ابی بن کعب کی اس روایت کے سوا حضرت جریر بن عبداللہ البجلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس واقعہ کو بھی حدیثوں میں ذکر کیا گیا ہے کہ گھوڑے کی پیٹھ پر جم کر وہ بیٹھ نہیں سکتے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی اس کمزوری کا اظہار کیا۔ کہتے ہیں کہ اس وقت بھی آنحضرت نے توجہ بالید ہی سے کام لیا یعنی ان کی پیٹھ کو دونوں ہاتھوں سے آپ نے ٹھونک دیا۔ اب جیسے وہ بیان کیا ہے کہ اس توجہ کے بعد گھوڑے پر سوار ہونے کے ساتھ ہی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی پیٹھ پر کوئی میخ ٹھونک دی گئی ہے۔

کو دوسرے سے جدا کرنے کا ذریعہ ان اختلافات کو بنانا اسی عادتِ بد کا انسداد مقصود ہے، مطالبہ کی کوئی بات اگر ہو سکتی ہے تو یہی ہو بھی سکتی ہے کہ یہی چیز آدمی کے اختیار کی ہے ورنہ غیر اختیاری امور کے مطالبہ کے معنی ہی کیا ہو سکتے ہیں اور اگر یہ مطلب نہیں ہے تو قرآن کی ان آیتوں کے پڑھنے والے اس کا کیا جواب سوچا کرتے ہیں جب ان کے سامنے ابتدا سے آخر تک مسلمانوں کی ساری تاریخ جس میں عہدِ صحابہ بھی شریک ہے اور اختلافات سے معمور اور بھری نظر آتی ہے کیا یہ ہو سکتا ہے کہ اول سے آخر تک بہرے اور اندھے بن کر سارے مسلمان قرآن کے ایک ایسے قانون کو مسلسل انتہائی لاپروائیوں کے ساتھ توڑتے رہے جس کا بار بار مختلف الفاظ میں اس کتاب میں اعادہ کیا گیا ہے ما لکم کیف تحکمون۔

بہر حال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک ہی میں قرآنی قرأت کے اختلافات کی ایک ایسی قدرتی صورت سامنے آگئی کہ مسئلہ اختلاف میں جو مطلوب تھا اس کو غیر مطلوب سے الگ کر کے دکھانے کا موقعہ عملاً آپ کو مل گیا جس کا عملی درس مختلف شکلوں میں صحابہ کو آپ دیتے رہے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی کہتے ہیں کہ میرے ساتھ بھی ایک دفعہ یہی صورت پیش آئی ایک شخص کو میں نے دیکھا کہ وہ قرآن کو کچھ ایسے طریقے سے پڑھ رہا ہے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو میں نے پڑھتے ہوئے نہیں سنا تھا، میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے جو کچھ اس سے میں نے سنا تھا بیان کیا۔ ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ جس وقت اس قصہ کو خدمت مبارک میں عرض کر رہا تھا، میں نے آنحضرتؐ کے چہرہ مبارک پہ ناگواری کے آثار محسوس کئے اسی مکدر چہرے کے ساتھ آپ نے ہم دونوں کو خطاب کر کے فرمایا ہے کہ

اِقْرَأ فَکِلَا کُمَا مُحْسِنٌ

دونوں جس طرح پڑھتے ہو پڑھتے رہو، تم دونوں ٹھیک پڑھتے ہو۔

ابن مسعودؓ کی اس روایت کے آخر میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ

وَلَا تَخْتَلِفُوْا فَاِنَّ مَنْ کَانَ قَبْلَکُمْ اخْتَلَفُوْا فَهَلَکُوْا۔ (جمع الفوائد)

آپس میں ایک دوسرے سے اختلاف مت کیا کرو تم سے پہلے بھی لوگوں نے اختلاف کیا تب وہ تباہ ہو گئے۔

آپ دیکھ رہے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرزِ عمل کو، دیکھ رہے ہیں، دونوں کی قرأتوں میں جو اختلافات تھے ان کو باقی رکھتے ہوئے، دونوں کو سراہتے ہوئے ہر ایک کی تحسین کرتے ہوئے یہ بھی فرماتے ہیں کہ "آپس میں اختلاف نہ کیا کرو" کیا یہ سوچنے کی بات، نہ تھی کہ اختلاف کو باقی رکھتے ہوئے اس حکم کی تعمیل کی یعنی لَا تَخْتَلِفُوْا (آپس میں اختلاف نہ کیا کرو) کی تعمیل کی ممکنہ شکل کیا ہو سکتی ہے؟ ممکن ہے کہ لکھنے والوں نے نہ لکھا ہو لیکن بحمد اللہ عملاً پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے منشاءِ مبارک کو مسلمان ہمیشہ سمجھتے چلے آئے ہیں اور سمجھانے والے مسلمانوں کو اس سلسلہ میں یہ اصل واقعہ ہے اس کو سمجھاتے رہے ہیں۔

میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق یہ ذکر کر رہا تھا کہ "تدوینِ حدیث" کی تاریخ میں ان کی تیسری اہم خدمت یہی تھی کہ اختصاصی راہوں سے حدیثوں کا جو ذخیرہ مختلف افراد میں پھیلا ہوا تھا جس کی وجہ سے علم و عدم علم کے اختلاف کا جو ایک بڑا خطرناک پہلو پیدا ہو سکتا تھا حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے عہدِ خلافت میں جہاں تک میرا خیال ہے قرآنی اختلافات کے سلسلے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جو عملی نمونے ان کے سامنے پیش ہوئے تھے ان ہی کو پیشِ نظر رکھ کر اختلاف کے اس خطرے کے انسداد کی پوری کوشش کی۔

حدیث سے متعلق عہدِ صدیقی کا ایک اہم وثیقہ اور اس پر مبسوط بحث

ہوا یہ جیسا کہ ہونا چاہیے تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ان دونوں راہوں سے یعنی خبرِ آحاد کے معلومات میں کمی و بیشی یا ان کے متعلق علم و عدمِ علم کی وجہ سے نیز رہتی دنیا تک تفقہ کی راہ دینی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے جو کھولی گئی تھی اس راہ میں نتائج و نظریات کے اختلاف کی وجہ سے قدرتی اختلاف کی جن شکلوں کا پیدا ہونا ناگزیر تھا، ان کی پیدائش کا سلسلہ ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی کے زمانے میں شروع ہو گیا۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ ابن ابی ملیکہ کے حوالہ سے الذہبی نے جو یہ روایت نقل کی ہے کہ

اِنَّ الصِّدِّيْقَ جَمَعَ النَّاسَ بَعْدَ وَفَاتِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنَّكُمْ تُحَدِّثُوْنَ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَحَادِيْثَ تَخْتَلِفُوْنَ فِيْهَا وَالنَّاسُ بَعْدَكُمْ اَشَدُّ اخْتِلَافًا فَلَا تُحَدِّثُوْا عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ شَيْئًا فَمَنْ سَأَلَكُمْ فَقُوْلُوْا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ كِتَابُ اللّٰهِ فَاسْتَحِلُّوْا حَلَالَهٗ وَحَرِّمُوْا حَرَامَهٗ۔

(تذکرۃ الحفاظ الذہبی ا)

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد لوگوں کو جمع کیا اور فرمایا کہ تم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی حدیثیں روایت کیا کرتے ہو، جن میں باہم اختلاف کرتے ہو اور تمہارے بعد کے لوگ اختلاف میں زیادہ سخت ہو جائیں گے پس چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے کوئی بات نہ بیان کیا کرو پھر تم سے اگر کوئی کچھ پوچھے تو کہہ دیا کرو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان اشتراک کا نقطہ اللہ کی کتاب ہے پس چاہیے کہ اس کتاب نے جن چیزوں کو حلال کیا ان کو حلال قرار دو اور جن باتوں کو حرام ٹھہرایا ان کو حرام ٹھہراؤ۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ "تدوینِ حدیث" کی تاریخ میں عہدِ صدیقی کا یہ وثیقہ بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے خصوصاً اس کی اہمیت اس سے بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے کہ یہ حکم کسی وقتی تاثر کا نتیجہ نہیں معلوم ہوتا بلکہ روایت کے الفاظ سے جیسا کہ معلوم ہو رہا ہے صدیق اکبر نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں کی باضابطہ ایک مجلس منعقد کی اور اس مجلس میں انہوں نے اپنی اس تجویز کو پیش کیا ہے لیکن اس کا کیا مطلب ہے؟

مجھے اس کا اعتراف کرنا چاہئے کہ تجویز کے واقعی اگر یہی الفاظ تھے جو اس وقت ہمارے سامنے ہیں تو ہر پڑھنے والا ان سے اسی نتیجہ تک پہنچے گا کہ حدیثوں کی روایت کے سلسلے کو حضرت ابوبکرؓ چاہتے تھے کہ آئندہ ہمیشہ کیلئے روک دیا جائے۔

فَلَا تُحَدِّثُوْا عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ شَيْئًا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے کسی قسم کی کوئی بات نہ بیان کیا کرو

سے زیادہ واضح تعبیر اس مقصد کی اور کیا ہو سکتی ہے؟

مگر سوال یہ ہے کہ واقعی ان کا اگر یہی مطلب تھا تو اس کے یہ معنی ہیں کہ ان کی اس تجویز کو مسلمانوں نے قطعی طور پر متروک کر دیا

نہ صرف پچھلے ہی زمانے میں بلکہ صحابہ بھی ہمیشہ حدیثوں کی روایت میں مشغول رہے اور دوسروں کو کہا کہا جائے اس تجویز کا علم تو ہم تک ایک ہی ۔ روایت اور سند کی راہ سے پہنچا ہے لیکن بیسیوں روایتیں دلالت کرتی ہیں کہ ابوبکر صدیقؓ خود اپنی تجویز کی مخالفت کرتے رہے ازالۃ الخفاء میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا تخمینہ ہے کہ

نزدیک بصد و پنجاہ حدیث از مرویات او در دست محدثین باقی ماندہ است (ج ۲ ص ۲۴) — تقریباً ایک سو پچاس حدیثیں حضرت ابوبکر کی روایت کی ہوئیں محدثین کے ہاتھوں میں باقی رہ گئی ہیں۔

ابن جوزی نے ایک سو بیالیس[۱۴۲] حدیثوں کا ذکر بقی بن مخلد کی مسند کے حوالہ سے کیا ہے (دیکھو تلقیح ص ۱۶۵) کچھ بھی ہو مذکورہ بالا تجویز والی ایک روایت کے مقابلہ میں سو ڈیڑھ سو روایتیں اس پر دلالت کرتی ہیں کہ خود حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں بیان کیا کرتے تھے ۔ بلکہ متعدد روایتوں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ دوسروں سے صدیق اکبرؓ پوچھتے تھے کہ کوئی حدیث پیش آنے والے واقعہ کے متعلق ان کو معلوم ہو تو بیان کریں ۔ مجھ ہی سے کچھ دیر پہلے یہ سن چکے کہ میراث جدہ میں حضرت ابوبکرؓ نے صحابیوں سے پوچھا کہ اس مسئلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل کا علم کسی کے پاس ہو تو بیان کرے ۔

سوال یہی ہے کہ پھر آخر ان کی اس تجویز کا واقعی مقصد کیا تھا ۔ قطع نظر ان باتوں کے کہ نہ عام مسلمانوں ہی نے ان کی اس تجویز پر عمل کیا اور نہ صحابہ نے ان کے اس حکم کی پروا کی بلکہ خود ان کا طرز عمل ان کی اس تجویز کے خلاف ہی نظر آتا ہے ۔ اصولی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس چیز سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو منع نہیں کیا تھا بلکہ گزر چکا کہ تکثیر سے روکتے ہوئے لوگوں کو اس کے عمل پر آمادہ فرمایا تھا یعنی کثرت اشاعت سے روکتے ہوئے حدیثوں کی روایت کرنے والوں کی ہمت افزائیاں کی گئی ہیں جن پر تفصیلی بحث گزر چکی ۔

بہر حال میرا مطلب یہ ہے کہ کسی روایت کے چند الفاظ کو لے کر اس پر اس لئے اصرار کرنا کہ اپنی خواہش کی ان سے تائید

لہ شاہ صاحب قدس اللہ سرہ نے یہ سوال اٹھا کر کہ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طویل صحبت پیغمبر کے ساتھ ان کے گونا گوں تعلقات وغیرہ امور کے لحاظ سے مذکورہ بالا تعداد حدیثوں کی بہت تھوڑی معلوم ہوتی ہے اس کی وجہ کیا ہے؟ خود ہی جواب دیا ہے کہ حدیثوں کی روایت کا زیادہ تر موقعہ صحابیوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ملا ۔ بیچارے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو چونکہ آنحضرتؐ کے بعد دنیا میں رہنے ہی کا زیادہ موقعہ نہ ملا اور جو ملا بھی سو خلافت اور اس زمانے کی سیاسی پیچیدگیوں کے نذر ہو گیا نیز ان کے زمانے میں ایسے لوگ جن کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت مبارک میں حاضری کی سعادت میسر نہیں آئی تھی بہت کم مدینہ پہنچے تھے، صحابہ زیادہ تر ان ہی لوگوں سے حدیثیں بیان کیا کرتے تھے ۔ ورنہ جو خود شرف صحبت سے فیض یاب تھے یہ محتاج نشاندہی بسیاسے از احادیث توسط لے بلکہ اکثر آں حدیث از زبان آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم شنیدہ بودند" (ج ۲ ص ۲۴) نیز ایک بڑی وجہ یہ ہوئی کہ حدیثوں کے بیان کرنے کی ضرورت واقعات و حوادث کے پیش آنے کے وقت ہوئی تھی ابوبکر صدیق رضؓ کو اتنی تھوڑی مدت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ملی کہ وقائع ان کے سامنے کم پیش آئے ۔

ہوتی ہے، نہ یہ دین ہی کا اقتضا ہے، اور نہ علمی دیانت داری میں اس قسم کی خیانتوں کی گنجائش ہے حقیقت جوئی یا واقعہ کی تحقیق کا طریقہ یہ نہیں ہے بلکہ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اپنے خود تراشیدہ اوہام یا من مانے خیالات کو دوسروں پر خواہ مخواہ مسلط کرنے کی یہ ایک غلط اور مجرمانہ تدبیر ہے۔

آئیے اب اس روایت کے سارے الفاظ کا مطالعہ دوسرے واقعات کی روشنی میں کیجئے پہلے اس کو دیکھئے کہ مجلس میں اپنی تجویز کو رکھنے سے پہلے تمہیدی تقریر حضرت ابوبکرؓ نے جو فرمائی تھی اس کے الفاظ کیا تھے:۔

اِنَّکُمْ تُحَدِّثُوْنَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَحَادِیْثَ تَخْتَلِفُوْنَ فِیْھَا وَالنَّاسُ بَعْدَکُمْ اَشَدُّ اخْتِلَافًا۔	تم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی حدیثیں روایت کیا کرتے ہو، جن میں باہم اختلاف کرتے ہو اور تمہارے بعد لوگ اختلاف میں زیادہ سخت ہو جائیں گے۔

میرے خیال میں حضرت ابوبکرؓ کے یہ الفاظ معمولی الفاظ نہیں ہیں بلکہ ناگزیر قدرتی اختلافات کو ذریعہ بنا کر مسلمانوں میں ارادی و اختیاری مخالفتوں کے طوفان جو اٹھائے گئے ان ہی اختلافات کی طویل تاریخ میں یوں سمجھنا چاہیے کہ یہ دوسرا حادثہ تھا جس سے مسلمان دوچار ہوئے تھے۔

میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ پہلا حادثہ تو اس سلسلہ کا وہی تھا جو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہی قرآن کے قرأتی اختلافات سے قریب تھا کہ پھوٹ پڑے اور قریب تھا کیا معنی؟ جن واقعات کا ذکر کر چکا ہوں، ان کو دیکھتے ہوئے تو کہا جا سکتا ہے کہ فتنہ کی آگ بھڑک چکی تھی اور آپ نے دیکھا کتنی بڑی بڑی ہستیاں اس مغالطہ کی شکار ہو چکی تھیں، بلکہ بعضوں کا تو ایمان ہی خطرے میں آچکا تھا وہ تو نبوت کا مبارک عہد تھا، سر اٹھانے کے ساتھ ہی نبوت کی طاقت سے فساد کے شعلوں کو دبا دیا گیا میں تو سمجھتا ہوں کہ:

اُنْزِلَ الْقُرْاٰنُ عَلٰی سَبْعَۃِ اَحْرُفٍ لَیْسَ مِنْھَا اِلَّا شَافٍ کَافٍ	اتارا گیا ہے قرآن سات حرفوں پر نہیں ہے ان حروف میں کوئی حرف مگر سب کے سب شفا بخش اور کافی ہیں۔

(مشکوٰۃ بحوالہ ابوداؤد و مسند و النسائی)

کے مسلسل اعلانات کے ساتھ ساتھ عملی طور پر آں حضرتؐ قرأت قرآن کے قدرتی اختلافات کی برداشت کرنے کی صلاحیت و عادت صحابہ میں اگر پیدا نہ کر دیتے، تو مسلمانوں کی ارادی مخالفتوں کی تاریخ میں سب سے زیادہ اہمیت شاید یہی اختلاف حاصل کر لیتا کیونکہ براہ راست اس کا تعلق قرآن سے تھا، اختلاف پسند جھگڑالو طبائع کے لئے قرآن کا لفظ ایک ایسی طاقت کی حیثیت رکھتا تھا کہ چاہنے والے جتنا چاہتے اسے بڑھا سکتے تھے لیکن فتنہ کی اس آگ کو چونکہ ابتدا ہی میں نبوت کی قوت بجھا چکی تھی، کریدنے والوں نے گو پچھلی صدیوں میں کرید کرید کر اس کو بھڑکانے کی کوششیں کیں لیکن رائے عامہ نے ان اغوائی کوششوں کی طرف کبھی توجہ نہ کی۔ کم از کم میں نہیں جانتا کہ قرأت قرآن کے قدرتی اختلافات نے کسی اسلامی ملک میں کسی زمانے میں کسی اجتماعی فتنہ کی شکل اختیار کی ہوؔ[1] بظاہر ایسا معلوم

---

[1] اور چاہنے والوں نے اس سلسلہ میں کمی کیا کی؟ جن لوگوں نے قرآنی الفاظ کے خاص تلفظ اور خاص لہجوں کی مشق کو اپنا پیشہ بنا دیا ہے اور "القرا" کا لفظ جو اسلام کی ابتدائی صدیوں میں عام علماء کے مفہوم کو ادا کرتا تھا بتدریج عام علماء سے ہٹتے ہوئے خاص ان ہی پیشہ ور(ل)
(بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ)

ہوتا ہے کہ اس قرآنی اختلاف کے مذکورہ بالا حادثہ کے بعد مسلمانوں کی ارادی مخالفتوں کی تاریخ میں یہ دوسرا حادثہ تھا، جو

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

کے لیے مختص ہو گیا، یعنی خاص تلفظ اور خاص لہجہ میں قرآن پڑھنے کی مشق جن لوگوں نے حاصل کی ہے ان ہی کا نام "قراء" ہو گیا خواہ اس مشق کے سوا اسلامی علوم میں سے کسی علم کا ایک حرف بھی ان کو نہ آتا ہو۔ اس میں شک نہیں کہ عرب جس طریقہ سے عربی الفاظ کا تلفظ کرتے ہیں، اسی تلفظ کے ساتھ قرآنی الفاظ کو ادا کرنا ایک اچھی بات ہے اور میرے نزدیک تو ایسے لہجہ میں قرآن کا پڑھنا جس سے اس کی تاثیری کیفیت میں اضافہ بھی ہو، یہ بھی کوئی بری بات نہیں ہے اگرچہ بعض لوگوں کو اس سے اختلاف ہے، بہرحال بجائے خود تلفظ اور لہجہ کے متعلق "القرأة" کی کوششیں محمود کوششیں ہیں۔ لیکن یہ کتنی بڑی دیدہ دلیری ہے کہ جس پر قرآن نازل ہوا اس نے تو قولاً و فعلاً بار بار اس اس، یہ اصرار کیا کہ تلفظ کے قدرتی اختلافات کو ارادی مخالفتوں کا ذریعہ نہ بنایا جائے اور جس سے جس طرح بن آئے اسی طرح قرآن پڑھنے کی اسے اجازت دی جائے۔ عربی لہجہ یا تلفظ میں قرآن پڑھنے والوں کو ان بیچاروں کے تلفظ اور لہجہ کو برداشت کرنا چاہیے جو خالص عربی تلفظ کے ساتھ قرآنی الفاظ کو ادا نہیں کر سکتے ہیں۔ حضرت جابر بن عبداللہ سے ابوداؤد وغیرہ صحاح کی کتابوں میں یہ حدیث نقل کی گئی ہے کہ ہم لوگ قرآن پڑھ رہے تھے وَفِينَا الْأَعْرَابِيُّ وَالْأَعْجَمِيُّ یعنی ہم میں بعض لوگ عربی (عرب کے باشندے) تھے اور بعض عجمی (غیر عربی ممالک) کے بھی لوگ تھے۔ آگے ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کو خطاب کر کے فرمایا "اِقْرَءُوْا فَكُلٌّ حَسَنٌ" یعنی "پڑھے جاؤ سب ٹھیک ہے"۔ صحاح ہی کی مختلف کتابوں مثلاً ترمذی میں ہے کہ اس کی بشارت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کی طرف سے جو ملی کہ قرآن سات حرفوں میں نازل ہوا ہے اور سب کافی اور شفا بخش ہے تو بارگاہِ الٰہی میں یہ اس درخواست کے جواب میں بشارت ملی تھی جو حضور نے یہ کہتے ہوئے پیش کی کہ میری امت میں بوڑھے مرد بھی ہیں بوڑھی عورتیں بھی ہیں، جوان لڑکے اور لڑکیاں بھی ہیں اور ایسے لوگ بھی ہیں کہ لَمْ يَقْرَءُوْا كِتَابًا (جس نے کوئی کتاب نہیں پڑھی) یعنی ناخواندہ لوگ بھی ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ ایسی صورت میں ایک عجمی مسلمان پر اس لئے طعن کرنا کہ وہ بیچارا ضاد کے حرف کو اس مخرج سے ادا کرنے پر قادر نہیں ہے جس سے عرب اس لفظ کو نکالتے ہیں، کس حد تک صحیح ہو سکتا ہے۔ السیوطی نے اتقان میں امام ابوشامہ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ بعض کم علم لوگوں نے پھیلا دیا ہے کہ حدیث میں "سبعۃ احرف" کے الفاظ جو آئے ہیں ان سے مراد قراءت کے مشہور سات مکاتب ہیں، ان لوگوں کی اس جراءتِ بے جا کی بھی انہوں نے شکایت کی ہے جو کہتے ہیں کہ قراءت کے مقررہ طریقوں سے جو قرآن نہیں پڑھتا وہ خطا کار ہے بلکہ بعضوں نے تو کفر تک کا فتویٰ صادر کر دیا دیکھو اتقان ج ۱ ص ۱۱۵۔ کچھ بھی ہو اجمالی طور پر بحمد اللہ مسلمانوں پر پیغمبر کی تعلیم ہی کا اثر ہے کہ ان پیشہ ور قاریوں نے جیسا کہ آپ نے دیکھا کفر تک بات پہنچائی ہے لیکن محض اس لئے کہ ان قاریوں کے طریقے سے قرآن پڑھنا چونکہ نہیں آتا اس لئے قرآن کی تلاوت کسی نے ترک نہیں کی۔ میرا خیال ہے کہ وقت اور موقع ہو تو پیشہ ور قاریوں سے آدمی ضرور مشورہ لے لے لیکن قرآن کی تلاوت کو ان کے مشورہ پر موقوف نہ رکھے۔

اِقْرَءُوْا فَكُلٌّ حَسَنٌ (پڑھے جاؤ سب ٹھیک ہے)

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حکم کی تعمیل کی سعادت حاصل کرتے چلے جانا چاہیے ۱۲

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد خلافتِ صدیقی کے زمانہ میں رونما ہوا جیسا کہ صدیقِ اکبرؓ کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ باہمی مخالفت کی اس شکل نے ان ہی حدیثوں کی راہ سے سر اٹھایا تھا جن کا علم کئی ہزار صحابہ میں بکھرا ہوا تھا اور جیسا کہ عرض کیا گیا کہ ان حدیثوں کے پہنچانے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خاص طریقہ اختیار کیا تھا، یہ اس کا لازمی نتیجہ تھا یعنی عام طور پر ان حدیثوں کے متعلقہ معلومات کے علم میں لوگوں کی حالت متفاوت اور مختلف تھی اختیار تو کیا گیا تھا یہ طریقہ اس لئے کہ مسلمانوں کی زندگی میں اس سے سہولت پیدا ہو گی بڑھنے والوں کے لیے بڑھنے کی راہیں کھلی رکھی گئی تھیں لیکن اسی کے ساتھ مجرم ہونے سے ان لوگوں کو بچا لینا مقصود تھا جو آگے بڑھنے کی ہمت اور حوصلہ نہیں رکھتے۔

مگر جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ اس قسم کی حدیثوں کا یہ اختلاف اور تفقہ کے جس دروازے کو قیامت تک پیش آنے والی دینی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے کھلا رکھا گیا تھا جس کی وجہ سے ظاہر ہے کہ ہر شخص کا شرعی کلیات و نصوص کی روشنی میں ایک ہی نتیجہ تک پہنچنا ضرور نہ تھا۔ ناگزیر اختلافات کی یہ دونوں شکلیں ایسی تھیں کہ ہلکی سی لغزش سے یہ آتش فشاں پہاڑوں کی شکل اختیار کر سکتے تھے ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان اس کی ایک تاریخی شہادت ہے کہ سابق الذکر یعنی حدیثوں والے اختلاف سے آزادی مخالفت کی پیدائش کا سلسلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ہی ان کے زمانے میں شروع ہو چکا تھا۔ اسی لیے "تدوین حدیث" کی تاریخ میں ان کی تمہیدی تقریر کے ان الفاظ کو ایک خطرناک منزل کا نشان سمجھتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبتِ طیبہ میں جن بزرگوں کی تربیت ہوئی تھی خصوصاً قرآنی قرأت کے اختلافات کے ذریعہ سے اس قسم کے اختلافات کی برداشت کرنے کی صلاحیت جن لوگوں میں آپ پیدا کر چکے تھے جب ان ہی میں حدیثوں کے اس اختلاف نے یہ رنگ، اختیار کرنا شروع کیا تھا تو آئندہ اختلاف کی اس شکل میں کتنی شدت پیدا ہو جائے گی۔ حضرت ابوبکرؓ سے زیادہ اس کی پیش بینی اور کون کر سکتا تھا انہوں نے اس کی اہمیت کا اندازہ کیا اسی لئے باضابطہ صحابہ کی ایک مجلس کو انہوں نے مدعو کیا ان کی پیش بینی نے جس خطرے، کو ان کے سامنے بے نقاب کیا تھا مجلس کے سامنے اسی کو واضح کرتے ہوئے اس خطرے کے انسداد کی جو تدبیر ان کی سمجھ میں آئی تھی، اسی کو ایک تجویز کی شکل میں ان لوگوں کے سامنے آپ نے رکھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کی تمہیدی تقریر کے مطلب کو سمجھ لینے کے بعد ان کی انسدادی تدابیر کے سمجھنے میں کوئی دشواری باقی نہیں رہتی کیونکہ جس خطرے کے پیش آجانے کی اطلاع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکرؓ دے رہے ہیں۔ اس خطرے سے تاریخ کے مختلف ادوار میں مسلمانوں کو وقتاً فوقتاً دوچار ہونا پڑا ہے حتیٰ کہ ابھی کچھ دن پہلے اسی سرزمینِ ہند میں مسلمانوں کی حکومت کا اقتدار جس وقت ختم ہوا خواہ بجائے خود اسلام اور اسلامی قوانین سے اس حکومت کے تعلق کی نوعیت کچھ بھی ہو لیکن اتنا تو بہرحال ہر شخص محسوس کرتا تھا کہ کسی نئی بات کو چھیڑ کر مسلمانوں میں اختلاف و افتراق کی آگ بھڑکانا آسان نہیں ہے لیکن حکومت کے اس دباؤ کے ختم ہونے کے ساتھ ہی جائز یا ناجائز مزاحمتوں کا اندیشہ دلوں سے نکل گیا۔ اور خواہ نیک نیتی سے ہو یا بدنیتی سے طرح طرح کے مشورے مسلمانوں کو ملنے لگے۔ اسی سلسلے میں جو کچھ ہوا یا ہو رہا ہے یہاں سے مجھے بحث نہیں ہے، بلکہ ان احباب سے معافی چاہتے ہوئے جن کے دل کے آبگینوں کو ٹھیس لگاتے ہوئے مجھے خود بھی تکلیف محسوس ہو رہی ہے مگر کیا کروں، واقعہ کے اظہار کے بغیر شاید صحیح طور پر میں اس چیز کے سمجھانے میں کامیاب بھی نہیں ہو سکتا جس کے سمجھانے کے لئے

اس تازہ تاریخی مثال کا میں نے انتخاب کیا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اس تاریخی مثال کے جو اعاظم رجال و اکابر ابطال تھے اب وہ بیچارے تو دنیا میں موجود بھی نہیں ہیں پھر بھی نپے کھچے ان کے نام لیواؤں کا خیال آ ہی جاتا ہے جو اپنے گزرے ہوئے ان ہی بزرگوں کے نشان مہر مزار کی حیثیت سے اس طویل و عریض ملک کے بعض گوشوں میں زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں، اب کچھ بھی ہو کہنا یہ چاہتا ہوں کہ احیاء سنت و قمع بدعت اور خدا جانے کن کن الفاظ، کن کن ارادوں، کن کن نیتوں کے ساتھ کچھ دن پہلے اسی ملک ہندوستان میں اٹھنے والے یہ کہتے ہوئے جو اٹھے تھے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی دینی زندگی جس کے صدیوں سے وہ پابند چلے آ رہے ہیں غیر مسنون زندگی ہے، پھر اس غیر مسنون زندگی کو مسنون زندگی بنانے کے لئے اسی خبر الخاصہ یا خبر الاحاد یا الاحاد والی حدیثوں کے ذخیروں سے ان بزرگوں نے جن جن کمان ہی حدیثوں کا انتخاب کیا جو ابتداً اسلام ہی سے ناگزیر قدرتی اختلافات کے رنگ سے رنگین تھے، وہ خود بھی جانتے تھے۔ یا ان کو جاننا چاہئے تھا کہ اختلافات کی یہ صورت کوئی نئی بات نہیں ہے نیز آگاہ کرنے والے ہر زمانہ میں جیسے مسلمانوں کو آگاہ کرتے چلے آئے تھے ہندوستان کے مسلمانوں پر بھی جہاں تک میں جانتا ہوں کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا تھا جس میں ان کو چونکانے والے یہ کہہ کہہ کر نہ چونکاتے رہے ہوں کہ ان اختلافات کی حیثیت وہ حیثیت نہیں ہے جو کفر و اسلام بلکہ طاعت و عصیان کے اختلافات کی ہوتی ہے۔ خود حضرت شاہ ولی اللہ نور اللہ ضریحہ، جن کی طرف منسوب کرنے والے یہ چاہتے ہیں کہ اسی غلط تحریک کی قیادت اور اولیت کو منسوب کر دیں وہی ایک جگہ نہیں بلکہ اپنی مختلف کتابوں میں صاف صاف لفظوں میں یہ اعلان کر چکے تھے کہ ان اختلافات کی ہر صورت اور ہر شکل صحیح اور درست ہے صرف ان ہی مسائل اور نتائج کی حد تک شاہ صاحب کا یہ فیصلہ محدود نہ تھا، جن کا تعلق تفقہ اور اجتہاد سے تھا۔ میں نے اپنی کتاب "تدوین فقہ" میں فقہی و اجتہادی اختلافات کے متعلق شاہ صاحب کے اقوال مختلف کتابوں سے نقل کر کے ایک جگہ جمع کر دیئے ہیں اور صحیح محل ان کے ذکر کا وہی کتاب تھی بھی، بہر حال ان ہی اجتہادی مسائل کی حد تک نہیں بلکہ خبر آحاد والی حدیثوں کی بنیاد پر جو اختلافات پیدا ہو گئے ہیں، ان کے متعلق بھی شاہ ولی اللہ؟ اس قسم کی عبارتیں چھوڑ کر دنیا سے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے کہ روانہ ہوئے تھے مجھے خیال آتا ہے کہ اسی مضمون میں کسی موقعہ پر شاہ صاحب کے اس قول کو ان کی کتاب انصاف سے میں نقل کر چکا ہوں جس کا حاصل یہ ہے کہ

"ایسے اختلافی مسائل جن میں صحابہ کے اقوال ہر پہلو کی تائید میں ملتے ہیں مثلاً عیدین و تشریق کی تکبیریں، محرم کا (بحالت احرام حج) نکاح کرنے کا حکم، یا تشہد (التحیات) کے کلمات جو ابن مسعودؓ اور ابن عباسؓ کی طرف منسوب ہیں یا آمین یا بسم اللہ کو آہستہ یا زور سے پکار کر کہنا یا نماز کی اقامت میں بجائے دو دو دفعہ کے ایک ایک دفعہ اقامت کے کلمات کو ادا کرنا یہ اور اس قسم کی ساری باتوں میں اختلاف کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان میں سے کوئی صورت یہ سمجھی جاتی ہے کہ شریعت کے مطابق ہے اور اس کی مخالف شکل غیر شرعی شکل ہے بلکہ سلف کا اختلاف اگر تھا بھی تو اس میں تھا کہ ان دو مختلف صورتوں میں اولیٰ اور بہتر شکل کیا ہے ورنہ دونوں شکلوں کو شرعی شکل قرار دینے پر سب ہی متفق تھے۔"

(انصاف ص ۸۶)

اسی موقعہ پر شاہ صاحب نے یہ بھی لکھا تھا کہ یہی وجہ تو ہے کہ ہر مسلک کے فقیہوں کے فتووں اور ہر مسلک کے قاضیوں کے فیصلوں کی سب ہی تصحیح کرتے ہیں، بضرورت ایک امام کے مسلک کو ترک کر کے دوسرے امام کے مسلک کے اختیار کرنے کی مسلمانوں کو جو اجازت

دی گئی ہے تو اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ فقہ کے سارے اختلافی مسائل کے متعلق یہ سمجھا جاتا ہے کہ شریعت کے دائرہ سے کوئی باہر نہیں ہے۔

اور ایک شاہ ولی اللہ صاحب کیا؟ اسلام کے جلیل القدر ائمہ ابوحنیفہؒ، مالکؒ، شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ، ان سارے بزرگوں کے اقوال اسی نقطۂ نظر کی تائید میں کتابوں میں موجود ہیں، ان ائمہ سے پہلے تبع تابعین بھی ہمیشہ مسلمانوں کو یہی سمجھاتے رہے۔ چونکہ زیادہ تر ان اقوال کا تعلق ان اختلافات سے ہے جن کا اجتہاد و تفقہ کے نتائج سے تعلق ہے اس لیے بجائے تدوین حدیث کے جیسا کہ میں نے عرض کیا ان کے ذکر کا موزوں مقام وہی کتاب تھی۔ لیکن خبر آحاد کی حدیثوں سے اختلافات کے متعلق یہی شاہ ولی اللہ تنہا آدمی نہیں ہیں ان سے پہلے بھی علما اور ائمہ نے اسی نقطۂ نظر کا اظہار ان اختلافات کے متعلق بھی کیا ہے یعنی زیادہ سے زیادہ ان کا مطلب یہ ہے کہ ان مسائل میں بہتر شکل کیا ہے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے زیادہ مطابق صورت اس مسئلہ میں کیا ہو سکتی ہے؟

ابوبکر الجصاص نے خبر الواحد بعد الواحد کے اختلافات کا تذکرہ کر کے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ:

"ان حدیثوں کی بنیاد پر مسائل کی جتنی شکلیں پیدا ہوتی ہیں مسلمانوں کو اختیار دیا گیا ہے کہ ان میں جس شکل کو چاہیں اختیار کریں فقہاء اور ائمہ میں یہ اختلاف صرف اس میں ہے کہ ان شکلوں میں افضل و بہتر شکل کیا ہے"۔

(تفسیر جصاص ج ۱ ص ۲۰۴)

بلکہ الجصاص اور ان کے سوا معتبر علما کا ایک گروہ وہ بھی ہے جو خبر احاد کی ان اختلافی روایتوں کے متعلق ایک خیال یہ بھی رکھتا ہے کہ

"مختلف روایتوں کا یہ مطلب سمجھا جائے گا کہ یہ بتانے کے لئے کہ مسلمان ان شکلوں اور پہلوؤں میں سے جس شکل اور جس پہلو کو چاہیں اختیار کریں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سب ہی کر کے دکھایا ہو تاکہ معلوم رہے کہ ساری صورتیں جائز ہیں"۔ (تفسیر جصاص ج ۱ ص ۲۰۴)

ائمہ میں امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا رجحان ان اختلافی آثار و روایات کے متعلق زیادہ تر یہی تھا (جس کی تفصیل تدوین فقہ میں ملے گی کیونکہ امام کی اہمیت فقہ کے باب میں زیادہ تر ان کے اسی رجحان کی وجہ سے ہے)۔

یہی نہیں بلکہ براہ راست جن لوگوں کی دینی و علمی تربیت صحابۂ کرام کے زیر سایہ ہوئی تھی اپنے زمانے میں ان کی طرف سے بھی بار بار اسی نقطۂ نظر کا اعلان ہوتا رہا۔ ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بھائی محمد بن ابی بکر کے صاحبزادے قاسم بن محمد کا شمار مدینہ منورہ کے فقہاء سبعہ میں ہے وہ بچپن ہی میں اپنی پھوپھی ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے آغوش تربیت میں یتیم ہو جانے کی وجہ سے آ گئے تھے۔ اجتہادی مسائل کے اختلافات کے متعلق ان کے اور عمر بن عبدالعزیزؒ کے جو اقوال کتابوں میں پائے جاتے ہیں ان دونوں حضرات میں جو گفتگو ان اختلافات کے متعلق ہوئی اور آخر میں دونوں نے ان اختلافات کے ہر پہلو کے جواز پر جو اتفاق فرمایا، بقدر ضرورت ان سارے قصوں کو اپنی کتاب "تدوین فقہ" میں نسبتاً زیادہ تفصیل سے میں نے بیان کیا ہے[1] یہی نہیں کہ

---

[1] حافظ ابو عمر بن عبدالبر نے اپنی متصل سند کے ساتھ رجاء بن جمیل کے حوالہ سے یہ قصہ نقل کیا ہے کہ عمر بن عبدالعزیز خلیفہ (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ)

صرف اجتہادی و فقہی نتائج ہی کی حد تک ان بزرگوں کا یہی نقطۂ نظر تھا بلکہ خبر احاد والی حدیثوں سے جو اختلافات پیدا ہوئے ہیں ان کے متعلق بھی اس کا اندازہ حافظ ابو عمرو بن عبد البر کی اس روایت سے ہو سکتا ہے جس کا ذکر اپنی کتاب جامع بیان العلم میں متصل سند کے ساتھ انہوں نے کیا ہے یعنی اسامہ بن زید کہتے ہیں:-

سَأَلْتُ الْقَاسِمَ بْنَ مُحَمَّدٍ عَنِ الْقِرَاءَةِ خَلْفَ الْإِمَامِ فِيمَا لَمْ يَجْهَرْ فِيهِ فَقَالَ إِنْ قَرَأْتَ فَلَكَ فِي رِجَالٍ مِنْ أَصْحَابِ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أُسْوَةٌ وَإِذَا لَمْ تَقْرَأْ فَلَكَ فِي رِجَالٍ مِنْ أَصْحَابِ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أُسْوَةٌ۔

(جامع ج ۲ ص ۸۰)

میں نے قاسم بن محمد سے پوچھا کہ جن فرض نمازوں میں زور سے قرأت نہیں کی جاتی ان میں امام کے پیچھے پڑھنے (یعنی سورۂ فاتحہ کے پڑھنے) کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ اس پر قاسم بن محمد نے فرمایا کہ اگر تم پڑھو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں میں تمہارے لیے نمونہ ہے اور نہ پڑھو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں ہی میں اس کا نمونہ تمہارے لیے موجود ہے۔

جاننے والے جانتے ہیں کہ امام کے پیچھے مقتدیوں کی قرأۃ کے مسئلہ میں جو اختلافات ہیں ان اختلافات کا تعلق تفقہ و اجتہاد

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اور قاسم بن محمد دونوں حضرات جمع ہوئے اور حدیثوں کا تذکرہ شروع ہوا۔ عمر بن عبد العزیز کو دیکھا جا رہا تھا کہ قاسم جس حدیث کا تذکرہ کرتے عمر بن عبد العزیز اس کے مقابلہ میں ایسی روایت پیش کر دیتے جس کا مفہوم قاسم کی پیش کردہ روایت کے مخالف ہوتا آخر دیر تک جب گفتگو اسی رنگ میں ہوتی رہی تو عمر بن عبد العزیز نے محسوس کیا کہ قاسم بن محمد ان کے طریقۂ کار سے کچھ گرانی محسوس کر رہے ہیں، یہ دیکھ کر عمر بن عبد العزیز نے قاسم سے کہنا شروع کیا، آپ اس کی گرانی کیوں محسوس کر رہے ہیں۔ آخر میں عمر بن عبد العزیز کا اس باب میں جو خیال تھا اسی کو ان الفاظ میں ظاہر فرمانے لگے:

"صحابہ کی روایتوں میں جو اختلافات پائے جا رہے ہیں میں سچ کہتا ہوں کہ ان اختلافات کے معاوضہ میں سرخ اونٹوں سے میں اتنا خوش نہیں ہو سکتا جتنا کہ ان اختلافی روایات سے خوش ہوں"

"سرخ اونٹ" ایک عربی محاورہ تھا انہوں جس کی قیمت کا مقابلہ کوئی دوسری چیز نہ کر سکے اسے عرب "سرخ اونٹ" کہتے تھے کیوں کہ سرخ اونٹ سے زیادہ قیمتی چیز عربوں کی نگاہ میں کوئی دوسری چیز نہ تھی۔ بہر حال میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ عمر بن عبد العزیزؒ کی اسی گفتگو ہی کا شاید یہ اثر تھا کہ بعد کو قاسم بن محمد مختلف جلسوں میں فرمایا کرتے تھے کہ عمر بن عبد العزیزؒ کی یہ بات مجھے بہت پسند آئی کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں میں روایات کا اختلاف اگر نہ ہوتا تو میرے نزدیک یہ کوئی خوشگوار بات نہ ہوتی"۔ آج ان ہی اختلافات کا نتیجہ ہے کہ لوگ اس تنگی میں نہیں ہیں جو ایک ہی قول یا روایت کی وجہ سے پیدا ہو جاتی۔ اب تو آزادی سے ان بزرگوں کے مختلف اقوال میں سے جس قول پر بھی عمل میسر آجائے وہ کامیاب ہے۔ (جامع بیان العلم ج ۲ ص ۸۰)

سے نہیں بلکہ خبر احاد کی حدیثوں کے اسی ذخیرے سے ہے جس میں امام کے پیچھے پڑھنے اور نہ پڑھنے دونوں طرح کی ایسی حدیثیں ملتی ہیں جنھیں روایت کرنے والوں نے قولاً و فعلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا ہے، بلکہ اگر میں یہ دعویٰ کروں تو اس کی مشکل ہی سے تردید ہو سکتی ہے کہ خبر احاد کی روایتوں سے جتنے اختلافات پیدا ہوئے ہیں، ان میں قرأت خلف الامام کا مسئلہ غالباً سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے نہ صرف پچھلی صدیوں میں بلکہ عہد صحابہ میں بھی معلوم ہوتا ہے کہ خصوصی طور پر بحث و تمحیص کا مرکز یہ مسئلہ بنا ہوا تھا مگر اس سلسلہ میں ایسے شدید "خلافیہ" کے متعلق بھی ہمارے پاس اسناداً صحیح اور صاف تاریخی فیصلہ جب موجود ہے تو نسبتاً ان ہی حدیثوں کی بنیاد پر جن اختلافات کی اہمیت بہت کم ہے ان کے متعلق کون کہہ سکتا ہے کہ حدیثوں ہی کی بنیاد پر بھی، جو اختلافات پائے جاتے ہیں ان کی نوعیت ایسے حلال و حرام امور کی ہے جن پر حرمت و حلت کا حکم شریعت کے اس حصہ کے نصوص پر مبنی ہے جس کی تعبیر قرآن نے "البینات" سے کی ہے۔ امام مصر لیث بن سعد جن کے حالات کا تذکرہ کسی موقعہ پر گزر چکا ہے، ان کے حوالہ سے یحییٰ بن سعید القطان نے یہ کتنی پختہ بات نقل کی ہے یعنی لیث کہا کرتے تھے:

مَا بَرِحَ أُولُو الْفَتْوٰى يُفْتُوْنَ فَيُحِلُّ هٰذَا وَيُحَرِّمُ هٰذَا فَلَا يَرَى الْمُحَرِّمُ أَنَّ الْمُحِلَّ هَلَكَ لِتَحْلِيْلِهٖ وَلَا يَرَى الْمُحِلُّ أَنَّ الْمُحَرِّمَ هَلَكَ لِتَحْرِيْمِهٖ۔

(جامع بیان العلم ج ۲ ص ۸۰)

فتویٰ دینے والے لوگ ہمیشہ سے فتویٰ دیتے ہوئے اگرچہ کسی چیز کو حلال اور کسی چیز کو حرام ٹھہراتے چلے آرہے ہیں لیکن ان فتوی دینے والوں میں سے کسی کو نہیں پایا گیا کہ حرام قرار دینے والے یہ سمجھتے ہوں کہ حلال ٹھہرانے والے تباہ ہو گئے یعنی دین سے خارج ہو کر نجات سے محروم ہو گئے اسی طرح حلال ٹھہرانے والوں نے کبھی یہ نہ سمجھا کہ اسی مسئلہ کے متعلق حرمت کا فتویٰ دینے والے ہلاک و تباہ ہو گئے۔

اور سچ پوچھئے تو کتابوں میں اگرچہ اس قسم کے اختلافی نتائج پر بھی حلال و حرام کے الفاظ کا اطلاق کر دیا جاتا ہے لیکن یہ صرف خطرناک قسم کی غلطی ہی نہیں بلکہ میرے نزدیک تو بڑی جسارت ہوگی، اگر حرام و حلال کے الفاظ کا وہی مطلب یہاں بھی سمجھا جائے جو شریعت کے "بیناتی" حصہ میں حلال و حرام کے الفاظ کا مطلب ہوتا ہے، آخر اتنی بات تو تقریباً ہر عامی مسلمان بھی جانتا ہوگا کہ جس چیز کو "البینات" کے نصوص صریحہ میں مثلاً حرام قرار دیا گیا ہے اس کی حرمت کا انکار کرے جو اس کے حلال ہونے کا فتویٰ دے گا، یا برعکس اس کے "البینات" میں جو چیزیں حلال ٹھہرائی گئی ہیں ان کو حرام قرار دینے والا دونوں کا اسلام سے کوئی تعلق باقی نہیں رہتا وہ گناہ کے نہیں بلکہ جرم بغاوت کے مجرم بن جاتے ہیں۔ اللہ اور اس کے رسول کے منکر کا جو انجام ہوگا وہی انجام اس قسم کے باغیوں کے سامنے بھی آئیگا۔

پھر کیا کسی حدیث کی بنیاد پر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اگر کسی چیز کے حلال ہونے کا فتویٰ دیا ہے، اور حنفی مذہب میں بجائے حلت کے اسی چیز کی حرمت کے پہلو کو ترجیح دی گئی ہو، کیا حلت و حرمت کے یہ اختلافات جو خبر احاد کی حدیثوں پر مبنی ہیں، محض ان کی بنیاد پر مجال ہے کسی حنفی کی جو امام شافعی رح کے متعلق اس کا بھی اندیشہ کر سکتا ہے کہ اس فتوے کی وجہ سے فضل و قرب کے مدارج و مراتب میں ان کے کسی قسم کی کوئی کمی ہوگئی ہے، یقیناً نہ کوئی حنفی یہ تصور کر سکتا ہے اور نہ کرتا ہے اسی طرح میں نہیں جانتا کہ باوجود ان تمام اختلافات

کے حضرت امام ابوحنیفہؒ کے لئے رحمۃ اللہ علیہ یا دعائے خیر کرنے سے کسی شافعیؒ کے دل میں تنگی پیدا ہوتی ہو۔ فقہی مسائل کے اختلافات کی کیا نوعیت ہے اور خود ائمہ اجتہاد و تفقہ سے ان اختلافات کے متعلق جو باتیں کتابوں میں ملتی ہیں میں نے کتاب "تدوین فقہ" میں سب کو سمیٹ کر ایک ہی جگہ پر جمع کر دیا ہے یہاں ان کے دہرانے کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی معلومات کے تازہ کرنے کے لئے اس کا مشورہ ضرور دوں گا کہ ناظرین "تدوین فقہ" کے اس حصہ کا اس موقعہ پر مطالعہ کر لیں[1]

میں ذکر مسلمانانِ ہند کی تاریخ کے اس حادثہ کا کر رہا تھا جس میں زوالِ حکومت کے بعد اچانک اس ملک کے مسلمان مبتلا ہو گئے تھے وہی حادثہ جس میں دیکھا گیا تھا کہ مسلمانوں کی عبادت گاہوں نے رزمگاہوں کا قالب اختیار کر لیا، نماز کی صفیں نماز کی صفیں نہیں بلکہ باضابطہ جنگ کی صفیں بن گئی تھیں جو نماز نہیں پڑھتے تھے ان کو نہیں بلکہ نماز پڑھنے والوں کو نمازوں ہی کے پڑھنے والے اٹھا اٹھا کر زمین پر پٹک رہے تھے۔ آپس میں لاٹھیاں اور جوتے صرف اس لئے چل رہے تھے کہ رکوع سے سر اٹھاتے ہوئے ہاتھ بھی تم نے کیوں نہیں اٹھایا، یا امام ولا الضالین پر جب پہنچا تو اس پر نہیں کہ تم نے آمین کیوں نہ کہی کیوں کہ آمین تو سب ہی کہتے ہیں جھگڑا اس پر تھا کہ صرف خدا ہی کو تم نے آمین کا یہ لفظ کیوں سنایا، خدا کے بندے جو تمہارے دائیں بائیں کھڑے تھے ان کو بھی اس لفظ کے سننے کا موقعہ کیوں نہ دیا مسلمانوں ہی کا ایک گروہ دوسرے گروہ کو مسلمانوں ہی کی مسجدوں سے نکال رہا تھا، اس لئے نکال

---

[1] "تدوین فقہ" میں علاوہ ائمہ اربعہ دوسرے ائمہ اجتہاد کے اقوال بھی آپ کو ملیں گے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ کہنے والے یہ جو کہتے ہیں کہ ائمہ نے یا علماء نے اختلاف کیا بجائے اس کے یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ علماء نے وسعتِ نظر سے کام لیا۔ امت کے لئے سہولت بہم پہنچائی ہے امام احمد بن حنبل سے پوچھنے والے نے جب پوچھا اور کہا کہ کیا آپ ایسے شخص کے پیچھے نماز پڑھ سکتے ہیں جس کا وضو آپ کے فتویٰ کی رو سے باقی نہیں رہا ہے اگرچہ دوسرے ائمہ کے قول کے مطابق اس کا وضو نہ ٹوٹا ہو، اسی طرح کے بعض دوسرے جزئیات کا بھی اس نے ذکر کیا تو جواب میں فرمانے لگے کہ اے شخص تو کیا کہتا ہے میں سعید بن المسیب (جو افضل التابعین سمجھے جاتے ہیں) ان کے پیچھے نماز نہ پڑھوں گا کیونکہ اس مسئلہ میں سعید کا مذہب بھی یہی تھا کہ وضو نہیں ٹوٹتا۔ اسی موقعہ پر میں نے یہ بھی نقل کیا ہے اور تقریباً یہ روایت درجۂ شہرت تک پہنچی ہوئی ہے کہ امام مالک سے عباسی خلیفہ ابوجعفر منصور نے باصرار بلیغ کہا کہ آپ کے فقہی اجتہادات کو میں بزورِ شمشیر مسلمانوں میں چاہتا ہوں کہ نافذ کرا دوں اس پر امام مالک نے شدت سے اس کو منع کیا اور کہا کہ جس علاقہ کے مسلمان جن امور کے پابند ہو چکے ہیں ان کو اسی حال میں چھوڑ دو۔ میں پوچھتا ہوں کہ امام مالک اگر ان مسائل کو جو ان کے اجتہادی مسائل سے مخالف تھے قطعی طور پر خلاف شرع سمجھتے تھے تو کوئی وجہ ہو سکتی تھی، کہ جن کے نفاذ کا ایک بہترین ذریعہ ان کو مل گیا تھا اس سے نفع نہ اٹھاتے اور مسلمانوں کو غلط مسائل پر قائم رکھنے کا مشورہ دیتے؟ الغرض اسی قسم کی باتیں تقریباً تمام ائمہ کے حوالہ سے اس کتاب میں نقل کی گئی ہیں، کتاب "تدوین فقہ" جو ابھی غیر مطبوع ناکمل حال میں ہے اس کا یہ حصہ جس میں فقہی اختلافات کے اس پہلو کا ذکر آیا ہے مجلہ تحقیقاتِ علمیہ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن میں شائع ہو چکا ہے جامعہ کے تحقیقاتی شعبہ سے، غالباً یہ مل سکتا ہے۔ نیز برہان وغیرہ شہری مجلات میں بھی قسط وار یہ سلسلہ شائع ہو چکا ہے۔ ناشرین چاہیں تو صرف اسی مطبوعہ حصہ کو بھی شائع کر کے دین کی خدمت انجام دے سکتے ہیں۔ بڑی تقطیع کے سو صفحات پڑائیکے حروف میں یہ مقالہ شائع ہوا ہے

رہا تھا کہ امام نماز میں قرآن کے جس حصہ کو پڑھتا ہے تم نے اُسے سُنا کیوں؟ بجائے سننے کے تم بھی اسی کے دہرانے میں کیوں مشغول نہ ہو گئے جسے امام اپنی طرف سے اور تمہاری طرف سے پڑھ رہا تھا اور بات اسی تک ختم ہو جاتی تو سمجھا جا سکتا تھا کہ خیر ایک حد پر پہنچ کر وہ ختم ہو گئی لیکن قصہ تو یہاں تک دراز ہوا کہ مسلمانوں کی دنیا جن لوگوں نے جبراً ان سے چھینی تھی ان ہی کے سامنے بخوشی و رضا یہ اپنے دین کو لے کر بھی پہنچے جن کی عدالتوں میں پیٹ کے جھگڑوں کے لے جانے پر تو سمجھا جاتا تھا کہ مسلمان مجبور ہیں ان ہی عدالتوں کے حکام کے پاس وہ اللہ کی کتاب اور جن کتابوں میں انکے رسولؐ کی حدیثیں تھیں ان سب کتابوں کو لے کر حاضر ہوئے یہ کہتے ہوئے حاضر ہوئے کہ آپ ہی بتائیے کہ ہم دونوں فریقوں میں ان کتابوں کی رُو سے واقعی مسلمان کون ہے اور مسلمانوں کی مسجدوں کے استعمال کا قانونی حق کسے حاصل ہے۔ طیش کی آگ اور غصہ کے شعلوں میں ایمانی غیرت اور اسلامی حمیت کا سارا سرمایہ جل کر بھسم ہو چکا تھا ان فیصلوں پر خوشی کے شادیانے بجائے جاتے تھے جو اللہ اور رسول کے جھٹلانے والوں کی طرف سے کوئی فریق حاصل کرتا تھا اور ان ہی فیصلوں کی آڑ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رسولؐ ماننے والی امت کی ایک جماعت عبادت گاہوں سے ڈھکیلی جا رہی تھی جو نہ عیسائیوں کے گرجے تھے اور نہ یہودیوں کی سنی گاگ، بلکہ یہ کیسا دل خراش منظر تھا کہ مسلمانوں کی مسجدوں سے مسلمانوں ہی کو نکالا جا رہا تھا کہ جو مسلمان نہیں تھے ان ہی حکام سے ان کے نکالنے کا فیصلہ خود مسلمانوں نے مسلمانوں کے لیے حاصل کیا تھا ۔

سوال یہی ہے کہ زیادہ دن نہیں آج سے تیس چالیس سال پہلے غیروں کی تالیوں اور اپنوں کی گالیوں کے درمیان رسوائیاں اور برسرِ بازار فضیحتوں کے مذکورہ بالا قصے جن کی آگ نصف صدی کے قریب قریب ہندوستان کے مختلف گوشوں کے تقریباً ہر اس گھر میں بھڑکی ہوئی تھی جس میں قرآن کی پڑھنے والی اور رسول کو ماننے والی امت آباد تھی۔ یہی میں پوچھتا ہوں کہ ارادی مخالفتوں کی اس آگ کے سلگانے میں کام لینے والوں نے کس چیز سے کام لیا تھا؟ ان اختلافات کے سوا آپ ہی بتائیے اور بھی کوئی چیز تھی جن کا ان حدیثوں کے علم و عدم کی وجہ سے پیدا ہو جانا ایک قدرتی بات تھی جو پیغمبر کی ہی طرف سے عمومی رنگ میں اس لئے نہیں پھیلائی گئی تھیں کہ ان کے مطالبہ اور گرفت میں نرمی اسی تدبیر سے پیدا ہو سکتی تھی اور اب میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے فَلَا تُحَدِّثُوْا عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ شَيْئًا (رسول اللہؐ کی طرف منسوب کر کے کوئی بات نہ بیان کرو) اس کا مطلب بھی مذکورہ بالا تفصیلات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کے سوا اور کیا سمجھا جائے کہ ارادی مخالفتوں کو پیدا کرنے کے لئے حدیثوں کے بیان کرنے سے وہ منع فرما رہے ہیں، ورنہ جیسا کہ گزر چکا روایتِ حدیث سے مطلقاً ممانعت کی تجویز اگر ہم اس کو قرار دیں گے تو خود ان کے طرزِ عمل، صحابہ کے طرزِ عمل بلکہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ عمل کے خلاف العیاذ باللہ یہ تجویز ہو گی، بلکہ آگے انہوں نے جو یہ فرمایا کہ

"جب تم سے کوئی بات پوچھے تو کہہ دیا کرو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان اللہ کی کتاب ہے۔"

اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کی اس تجویز کا تعلق ان ہی لوگوں سے ہے جو ارادی مخالفتوں کی آگ بھڑکانے کے لیے حدیثوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالتے اور پھیلاتے ہیں انہوں نے اسی لئے قاعدہ ہی بتا دیا کہ جب کبھی اختلافی اغراض کے لیے حدیثوں کے متعلق کوئی پوچھ گچھ، کنج وکاؤ شروع کرے تو اعلان کر دینا چاہئے کہ مسلمانوں کو اتفاقی نقطہ پر سمٹے رہنے کے لئے وہی باتیں کافی ہیں جنھیں

"البینات" کی شکل میں قرآن میں محفوظ کر دیا گیا ہے۔ حاصل یہی ہوا کہ قرآن کے "البینات" پر متحد ہو جانے کے بعد ضرورت نہیں ہے کہ غیر بیناتی مسائل بھی ایک ہی نقطہ پر مسلمانوں کو جمع کرنے کی فضول کوشش کی جائے کہ اس کوشش سے بجائے ختم ہونے کے اختلاف بڑھے گا۔ بڑھتا ہی چلا جائیگا۔ جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ مسلمانوں کی آئندہ نسلیں تم سے زیادہ اختلاف میں سخت ہو جائیں گی۔ بہر حال دین کے غیر بیناتی حصے کے متعلق صحیح مسلک یہی ہے اور اسی کو ہونا چاہئیے کہ باہم مسلمان اس سلسلہ میں ایک دوسرے کے اختلاف کے برداشت کرنے کی صلاحیت اور گنجائش اپنے اندر پیدا کریں، قرآن کے قرأتی اختلاف کو ذریعہ بنا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عہد میں اسی گنجائش کے پیدا کرنے کی مشق صحابہ سے کرائی اور ابوبکر صدیق رضؓ نے اپنی مذکورہ بالا تجویز کو پیش کرتے ہوئے میرا خیال یہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی مبارک منشا کی تعمیل پہ ان مسلمانوں کو آمادہ کرنا چاہا تھا جو ان کے زمانہ میں موجود تھے اپنے عہد کے لوگوں کو بھی انھوں نے اسی حکم کی تعمیل کی طرف توجہ دلائی۔ خبر احاد والی روایتوں کی بنیاد پر اختلاف پیدا ہونے کی صورت میں فساد اور فتنے سے بچنے کی ایک دوامی تدبیر یہ بتادی کہ جب وہ پیدا ہو یا اس کے پیدا کرنے کی کوشش کی جائے تو اس زہر کے ازالہ کی یہی صورت ہے کہ قرآن کے "البینات" پر سمٹ جانے اور جمع ہونے کی دعوت مسلمانوں کو دی جائے، دین کے غیر بیناتی مسائل کے ناگزیر قدرتی اختلافات ارادی واختیاری جنگ وجدال کی شکل اختیار نہ کرنے پائیں، اس خطرے کے انسداد کی واحد تدبیر یہی ہے ورنہ "البینات" سے ہٹ کر "غیر بیناتی" مسائل میں بھی ایک ہی مسلک کا پابند مسلمانوں کو بنانے کا ارادہ جب کبھی کیا جائے گا درحقیقت یہ اجتماع واتفاق کی دعوت نہ ہوگی بلکہ مسلمانوں کو مختلف ٹکڑیوں میں بانٹنے کی طرف خطرناک اقدام ہوگا، پس سیدھا، صاف، روشن راستہ "لَیۡلُھَا وَنَھَارُھَا سَوَاءٌ" کا یہی ہے کہ "البینات" میں جو ایک ہیں وہ بہر حال ایک ہیں خواہ "غیر بیناتی مسائل" میں وہ جس حد تک مختلف ہوں۔ اس اختلاف سے ان کا اتحاد قطعاً متاثر نہیں ہوتا۔ اختلاف کے ساتھ اتحاد، اور اتحاد کے ساتھ اختلاف کی یہی حکیمانہ درمیانی راہ تھی، جس کی عملی مشق کا موقعہ مسلمانوں کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں بھی ملا اور ابوبکر صدیق رضؓ کے زمانے میں قریب تھا کہ راہ سے مسلمان ہٹ جائیں لیکن یہ ہوتے سے پہلے فتنے کے اس سرچشمہ پر ہمیشہ کے لئے آپ نے ایک ایسی ڈاٹ لگادی کہ وقت پر اگر اس کی خبر نہ لی جاتی تو بقول سعدیؒ ہاتھیوں سے بھی اس سیلاب کا روکنا ناممکن تھا۔[1] صدیق اکبرؓ نے اپنے زمانے میں بھی لوگوں کو اسی مسلک پر قائم رکھنے کی کوشش کی اور آئندہ رہتی دنیا تک کے لئے آپ نے اختلاف کے ساتھ اتحاد کو باقی رکھنے کا یہ کارگر بے خطا نسخہ مسلمانوں کے حوالہ فرما دیا کہ اتحاد کا معیار ہمیشہ دین کے بیناتی حصہ کو رکھا جائے جس کی تعبیر حضرت والا نے "کتاب اللہ" کے لفظ سے فرمائی۔

جیسا کہ شروع میں میں نے عرض کیا تھا کہ اپنی تیرہ ساڑھے تیرہ سو سال کی طویل تاریخ میں مسلمانوں کی وسیع وعریض امت جو کروڑہا کروڑ کی تعداد میں دنیا کے اکثر حصوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ دین کے غیر بیناتی حصہ میں اختلافات رکھتے ہوئے بھی ان کی اکثریت عظیمہ اہل السنت والجماعت کی ایک ہی جماعت کی شکل میں جو پائی جارہی ہے تو یہ اسی حکیمانہ تدبیر کا نتیجہ ہے اور جب کبھی غیر دینی یا اندرونی یا بیرونی مؤثرات کے دباؤ نے مسلمانوں کو اس راہ سے منحرف کیا ہے تو وہی صدیقی دعوت جس کا حاصل یہی ہے کہ :

---

[1] گلستان سعدی کے مشہور گلستی شعر ؎

سرچشمہ شاید گرفتن بہ بیل ۔۔۔ چو پر شد نہ شاید گرفتن بہ پیل

کی طرف اشارہ ہے۔

"ہمارے اور تمہارے درمیان (اشتراک کا نقطہ) اللہ کی کتاب ہے آؤ ہم سب اس کی حلال کی ہوئی باتوں کے حلال ہونے پر اور حرام کی ہوئی باتوں کے حرام ہونے پر جمع ہو جائیں۔"

ہمیشہ کام آئی، اور مسلمانوں کی دینی وحدت کی محافظ بن گئی۔ پچھلے دنوں ہندوستان کے مسلمانوں میں بھی غیر بنیادی مسائل کے اختلافات شروع ہوئے اور بعض لوگوں میں اس کا جوش پیدا ہوا کہ اختلافی حدیثوں سے پیدا ہونے والے نتائج میں جن پہلوؤں کو اپنے معلومات کی بنا پر وہ زیادہ بہتر اور اولیٰ سمجھتے تھے ان ہی پہلوؤں کا پابند ہندوستان کے ہر مسلمان کو بنا دیں لیکن پوری صدی بھی گزرنے نہ پائی تھی کہ ان کا سارا جوش ٹھنڈا پڑ گیا اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں کہ "البینات" پر متحد ہو جانے کے بعد غیر بنیادی مسائل کے اختلافات کے برداشت کرنے کی گنجائش اب ان میں بھی پیدا ہو چکی ہے اب وہ بھی کسی ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھنے میں کوئی مضائقہ نہیں محسوس کرتے جو آمین زور سے نہیں کہتا یا رکوع میں جاتے اور سر اٹھاتے ہوئے ہاتھ نہیں اٹھاتا۔ حقیقت ان پر واضح ہو چکی ہے بطور نام نہاد کے اپنے مسلک کو ایک خاص نام سے موسوم کر چکے رہے ہیں۔ شاید یہ نام بھی زیادہ دن تک باقی نہ رہے گا[1]

---

[1] پچھلے چند دنوں سے دیکھا جا رہا ہے کہ نام پر بھی اتفاق ان میں باقی نہیں رہا ہے، بعض اپنے آپ کو بجائے اہل حدیث یا عامل بالحدیث یا محمدی وغیرہ الفاظ کے کبھی "شافعی" کبھی "حنبلی" وغیرہ بھی کہنے لگے ہیں۔ "حنبلی" ہو جانے کے بعد وہی بات سامنے آ جائے گی جو پہلے سے چلی آ رہی تھی، میں عرض کر چکا ہوں کہ لفظ "حنبلی" کے ساتھ حنفی یا شافعی وغیرہ الفاظ کے ساتھ مسلمانوں کے تعلق کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ سارے حنفی و شافعی وغیرہ مسلمانوں میں جس کی شخصیت قدسیہ "غوثیت کبریٰ" کے مقام سے سرفراز سمجھی جاتی ہے اور مانا جاتا ہے کہ جن کا قدم مبارک "علی رقبۃ کل ولی" ہے یعنی سیدنا الشیخ عبدالقادر الجیلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ وہ "حنبلی" ہیں۔ اس موقعہ پر ایک لطیفہ کا بار بار خیال آ رہا ہے میں نے براہ راست بانی ندوۃ العلماء حضرت مولانا محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ سے یہ روایت سنی ہے کہ حضرت کے پیر و مرشد مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی تغمدہ اللہ بغفرانہ کی خدمت میں فرقہ اہل حدیث کے ایک ممتاز و نمایاں عالم وہیں حاضر ہوئے۔ مولانا ابراہیم سے جب ملاقات ہوئی تو حضرت گنج مرادآبادیؒ نے پوچھا کہ مولوی صاحب آپ عامل بالحدیث ہیں۔ بولے جی ہاں الحمد للہ۔ مولانا نے پوچھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سونے کے وقت کونسی دعا پڑھتے تھے۔ مولوی صاحب نے کہا کہ اس وقت یاد نہیں ہے پوچھا کہ گھر سے نکلتے وقت کیا پڑھتے تھے بولے وہ بھی یاد نہیں ہے۔ الغرض یوں ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مختلف اوقات اور مقامات میں جو دعائیں پڑھا کرتے تھے جیسے اکثر مولویوں کو عموماً یاد نہیں ہوتیں، مولوی صاحب بیچارے کو بھی یاد نہ تھیں۔ تب مولانا نے ان ہی اہل حدیث مولوی صاحب کو خطاب کر کے کہنا شروع کیا کیوں مولانا! آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف اختلافی حدیثوں کو یاد کیا ہے لیکن جن حدیثوں کے متعلق کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے ان کے یاد کرنے کی ضرورت کو عمل بالحدیث کے لیے آپ نے ضروری خیال نہ کیا۔ کیا اسی کا نام "عمل بالحدیث" ہے۔ کہتے ہیں کہ مولوی ابراہیم جھینپ سے گئے۔ مولانا محمد علی مرحوم یہ بھی بیان فرماتے تھے کہ مدینہ منورہ کی حاضری کے زمانہ میں مولوی ابراہیم نے ایک خواب دیکھا اور اسی خواب کے بعد حنفی مسلک پر واپس ہو گئے تھے۔ شاید اس مضمون کا ایک مکتوب بھی مولوی ابراہیم کا لکھا ہوا حضرت مولانا محمد علیؒ کے پاس موجود تھا۔

اس میں شک نہیں کہ ایک مختصر سی بات کے لئے غیر معمولی طور پر مجھے طولِ کلامی سے کام لینا پڑا لیکن سچ پوچھئے تو دیکھنے کی حد تک ابوبکر صدیق رضؓ کے مذکورہ بالا الفاظ مختصر نظر آتے ہیں لیکن سمجھنے والے سمجھ سکتے ہیں کہ "تدوینِ حدیث" کی تاریخ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ خدمت ایک مستقل باب کی حیثیت رکھتی ہے عہدِ صدیقی سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کے متعلق صرف دو مسئلے اہمیت رکھتے تھے یعنی ایک تو یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کوئی غلط بات منسوب نہ ہو جائے۔ یہ تو پہلی خدمت تھی جس کی نگرانی ہر مسلمان کے فرائض میں داخل تھی اس کے ساتھ دوسری اہم خدمت جیسا کہ بہ تفصیل بیان کر چکا ہوں یہ تھی کہ ان حدیثوں کی اشاعت میں چاہا جاتا تھا کہ عمومیت کا ایسا رنگ نہ پیدا ہونے پائے جس کے بعد نرمی اور مسامحت کی وہ کیفیت ان میں باقی نہیں رہ سکتی تھی جسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان حدیثوں کے مطالبہ اور گرفت میں بہر حال باقی رکھنا چاہتے تھے۔ ہر شخص تک ان حدیثوں کو نہ پہنچانا، مکتوبہ مجموعے جو آپ کے زمانے میں لکھے جا چکے تھے ان کا ضائع کرا دینا عمومی طور پر آئندہ ان حدیثوں کے لکھنے سے لوگوں کو منع کر دینا سا ابوبکر صدیق رضؓ کا اپنے ہاتھ سے جمع کی ہوئی حدیثوں کو نذرِ آتش کر دینا یہ اور اس کے سوا اس سلسلہ میں جن دوسرے واقعات کا ذکر کیا گیا ہے، بتا چکا ہوں کہ غرض و غایت سب کی یہی تھی اور عہدِ صدیقی سے ان ہی حدیثوں کے متعلق مسلمانوں کے ذمہ یہ تیسری خدمت سپرد ہوئی کہ مسلمانوں کو لڑانے بھڑانے، ان کی ایک ٹولی کو دوسری ٹولی سے جدا کرنے کا ذریعہ ان حدیثوں کو نہ بنایا جائے۔ بالفاظِ دیگر گویا سمجھنا چاہیئے کہ حضرت صدیق اکبر رضؓ نے مسلمانوں کو اس کا ذمہ دار بنایا کہ خبرِ احاد کی حدیثوں میں انفرادی معلومات کے لحاظ سے قدرتاً جو اختلافات رہ گئے ہیں ان کو ارادی و اختیاری مخالفتوں کی آگ بھڑکانے کا ایندھن اگر کوئی بنانا چاہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کے اس غلط استعمال سے اس کو روکا جائے اس میں شک نہیں عملی طور پر تدوینِ حدیث کی تاریخ میں حضرت ابوبکر رضؓ کی اس خدمت کا اور اس کی قدر و قیمت کا لوگوں نے بہت کم تذکرہ کیا ہے بلکہ جہاں تک میں سمجھتا ہوں ابوبکر صدیق رضؓ کی طرف مذکورہ بالا روایت جو منسوب کی گئی ہے گزرنے کی حد تک تو تاریخ حدیث کے پڑھنے والوں کے سامنے دوسری روایتوں کے ساتھ یہ روایت بھی گزرتی ہی ہوگی لیکن اس کا واقعی کیا مطلب ہے، ٹھہر کر سوچنے کی ضرورت شاید ہی کسی نے محسوس کی ہو لیکن میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ عملاً ابوبکر صدیق رضؓ کی عائد کی ہوئی اس ذمہ داری کو صحابہؓ نے قبول کیا اور بعد کو بھی تقریباً ہر زمانہ میں مسلمانوں کو اس باب میں ہم صحابہ کرام کی اس روش کا پابند پاتے ہیں۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ صحابہ کے جو مختلف معلومات ان حدیثوں کے متعلق تھے، اور ان میں ہر ایک اسی پر عامل تھا جو وہ جانتا تھا، لیکن عملی اختلاف کے باوجود آج تک کوئی ایسا واقعہ منقول نہیں ہے کہ ان اختلافات کی وجہ سے کسی صحابی نے دوسرے صحابی کے پیچھے نماز پڑھنے سے انکار کیا ہو یا ان اختلافات کی بنیاد پر اپنے دین کو کسی صحابی نے دوسرے کے دین سے الگ قرار دیا ہو، بلکہ جہاں تک میں جانتا ہوں شاید ہی کسی صحابی نے اپنی دینی زندگی کو دوسرے صحابی کی دینی زندگی سے افضل و برتر خیال کیا ہو، کم از کم کوئی روایت مجھ تک تو ایسی نہیں پہنچی ہے، صحابہ کا بھی طرزِ عمل یہی تھا، جسے ان کے فیض یافتوں یعنی تابعین نے دیکھا تھا کچھ دیر پہلے حضرت قاسم بن محمد کا یہ فتویٰ جو میں نے نقل کیا تھا کہ پوچھنے والے نے امام کے پیچھے قرأت کے متعلق جب حضرت سے سوال کیا تو آپ نے جواب میں فرمایا :

"کہ اگر پڑھو گے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں میں اس کا نمونہ موجود ہے اور نہ پڑھو گے تو اس کا نمونہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں میں تم کو ملے گا۔"

اپنی حکمرانی کے زمانے میں سلف صالح کے جن بزرگوں اور ان بزرگوں کے علم و تحقیق پر بھروسا کر کے دین کے غیر بنیاتی شعبہ میں جن پہلوؤں کو ہندوستان کے مسلمانوں نے افضل و اولیٰ قرار دے کر غیروں کے سامنے اس کفرستان میں اپنے مذہبی نظام کی وحدت و یک رنگی کے دل آویز سماں کو سیکڑوں سال محفوظ اور قائم رکھا تھا مگر زوالِ حکومت کے ساتھ ہی نہ معلوم کن اسباب و مؤثرات کے تحت اچانک بعضوں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ان کا علم اور ان کی تحقیق سلف کے ان بزرگوں کے علم و تحقیق سے زیادہ بہتر اور صحیح ہے جن پر مسلمانانِ ہند نسلاً بعد نسل بھروسا کرتے چلے آتے تھے اس خیال کے زیرِ اثر عام مسلمانوں سے پھٹ کر اگر اپنے علم اور اپنی تحقیق کے وہ صرف پیرو بن جاتے تو شاید شکایت کرنے والوں کو ان سے کوئی شکایت نہ ہوتی لیکن وہ آگے بڑھے اور عہدِ صحابہ و تابعین کے تربیت یافتہ دماغوں، اسی عہد کے تقویٰ و طہارت سے منور قلوب کے فیصلوں سے بدکا بدکا اور بھڑکا بھڑکا کر دہ اپنے دماغوں کے پیدا کیے ہوئے نتائج کی تقلید کی دعوت احیاءِ سنت یا اتباعِ سنت کے نام سے اس ملک میں مسلمانوں کو دینے لگے، قرآن جس فعل کو جرم ٹھہرا چکا تھا اور مختلف الفاظ میں اس کے حرام ہونے کا قطعی اعلان کر رہا تھا تفریق بین المسلمین کا یہ فعل ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کے نزدیک نہ جرم ہے اور نہ کوئی ایسا کام ہے جو نصِ قطعی کے رُو سے حرام قرار پا چکا تھا، وہ بدترین جرم کا ارتکاب صرف اسی لیے کر رہے تھے کہ مسلمانوں کو ایسی باتوں کے پابند بنانے میں شاید وہ کامیاب ہو جائیں جن کی پابندی سے انحراف خود ان کے نزدیک بھی نہ جرم تھا اور نہ گناہ۔ ان جائز پہلوؤں میں جن کا ہر پہلو شرعی حدود سے باہر نہ تھا زیادہ سے زیادہ وہ پہلو بہتر اور افضل تھا جس کے لیے وہ یہ سب کچھ کر رہے تھے۔

اللہ اللہ خبرِ احاد کی حدیثوں کے اختلاف کا قصہ جو نرم تھا، موم سے بھی زیادہ نرم تھا، اس میں سختی اور شدت بھری گئی ایسی سختی اور ایسی شدت کہ پتھر اور لوہا بھی اس کے سامنے شاید پانی نظر آتا تھا، اختلافی حدیثوں کا یہی سرمایہ ان کا گویا اسلحہ خانہ تھا۔ پیغمبر کی ایک ایک حدیث، حدیث نہیں بلکہ حرب کا آلہ اور ضرب کے اوزار بن چکی تھی وہ اس پر ان ہی حدیثوں میں سے کسی حدیث کو "السکین" (چھری) بنا کر وار کرتا تھا اور یہ اس پر حبل (ڈوری) کی شکل میں حدیثوں ہی کی کمند پھینکتا تھا اور اپنی اسی جنگ میں کبھی اس صف سے "ظفر مبین" کا شادیانہ بجایا جاتا تھا[1] اور کبھی اس صف سے "فتح مبین" کا نرسنگھا پھونکا جاتا تھا، تحقیق کے بعد ہمیشہ یہی ثابت ہوتا تھا کہ ہر فریق جنگ کے پہلے گھنٹے پر جس مقام پر تھا وہاں سے نہ ایک قدم آگے بڑھا ہے اور نہ پیچھے ہٹا ہے، بلکہ نہ آگے بڑھ سکتا ہے، اور نہ پیچھے ہٹ سکتا ہے کہ ہر ایک ہتھیاروں کے نہ ختم ہونے والے لامحدود ذخیرے پر قابض تھا۔

بہرحال کچھ بھی ہوا اس سارے طول و طویل قصے کے ذکر سے میری غرض یہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کے ساتھ ان گستاخانہ بازی گریوں کو دیکھتے ہوئے اللہ کا کوئی بندہ جھگڑنے والوں کے اس گروہ کو اگر یہ مشورہ دے کہ جب تمہارا یہی حال ہے تو ایسی صورت میں حدیثوں کا بیان کرنا ہی ترک کر دو، تو کیا مشورے کے ان الفاظ کا یہ مطلب لینا صحیح ہو گا کہ شورہ دینے والا رسول اللہ صلی اللہ

---

[1] پچھلی صدی میں جو رسالے اور کتابیں اس سلسلہ میں شائع ہوتی رہی ہیں ان ہی کے ناموں کی طرف تلمیح کی گئی ہے۔ یہ مبالغہ نہیں ہے بلکہ واقعتاً ان رسالوں میں ایک رسالے کا نام "السکین" (چھری) تھا جو مسئلہ اس کے متعلق لکھا گیا تھا اسی مسئلہ میں دوسرا رسالہ حبل المتین تھا، باقی الظفر المبین، اور الفتح المبین تو اس سلسلے کی مشہور کتابیں ہیں۔ بہرحال یہ ایک بڑی طویل تاریخی داستان ہے۔ ۱۲

علیہ وسلم کی حدیثوں کو دنیا سے ناپید کرنا چاہتا ہے، یا پیغمبر نے اپنی جن حدیثوں سے استفادے کی راہیں امت پر کھلی رکھی ہیں ان کے فوائد سے امت کو محروم کرنا چاہتا ہے۔

کن لوگوں سے کہہ رہا ہے، کیوں کہہ رہا ہے، کن حالات میں کہہ رہا ہے، گفتگو کی ان تمام ماحولی خصوصیتوں سے قطع نظر کر کے مذکورہ بالا دعویٰ گفتگو کے الفاظ، صرف الفاظ سے تہمت تراشی کی میرے خیال میں بدترین مثال ہوگی۔

پس حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے صحابہ کرامؓ کو اس واقعہ سے مطلع کرنے کے بعد یعنی تم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیثیں بیان کرتے ہو، اور باہم ایک دوسرے سے اختلاف کر رہے ہو، تمہارے بعد جو لوگ آئیں گے وہ ان اختلافات میں اور زیادہ سخت ہو جائیں گے، ان الفاظ کے ساتھ جو مشورہ دیا تھا کہ

فَلَا تُحَدِّثُوْا مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ شَيْئًا۔ تم لوگ رسول اللہ کی طرف منسوب کر کے کوئی بات نہ بیان کیا کرو۔

تو صرف ان الفاظ سے یہ نتیجہ نکالنا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کلیتہً حدیثوں کے بیان کرنے سے صحابہ کو روک دینا چاہا خود ہی سوچئے کہ بہتان و افترا کے سوا اور بھی کچھ ہے، صاف اور واضح مطلب اس کا وہی ہے اور وہی ہو سکتا ہے کہ مخالفانہ اغراض کو ہوا دینے کے لیے حدیثوں کے بیان کرنے سے لوگوں کو وہ روکنا چاہتے تھے[1] غرض حضرت کی یہی معلوم ہوتی ہے کہ ان حدیثوں کا صحیح استعمال یہ نہیں ہے کہ ان کے متعلق جس شخص کے جو معلومات و تاثرات ہیں خواہ مخواہ ان کی پابندی کا مطالبہ اپنے معلومات کے زور پر دوسروں سے کرے بلکہ صحیح مسلک ان اختلافات کے متعلق جو اس قسم کی حدیثوں میں پائے جاتے ہیں یا تفقہ کے سلسلے میں اجتہادی نتائج کے اندر جو اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں مسلمانوں کو اس قسم کے اختلافات کے متعلق چاہیے کہ ایک دوسرے کے اختلافات کی برداشت کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کریں دین کے اس غیر بیناتی حصّہ کے اختلافات کے بارے میں مسلمانوں کو ایک ہی نقطہ پر جمع کرنے کی کوشش غلط کوشش ہے اس کوشش کے لئے ہمارے پاس" البینات" کے احکام و مسائل ہیں ان کے متعلق کسی مسلمان میں خدانخواستہ کسی قسم کا انحراف اگر محسوس ہو تو بلاشبہ اس وقت فرض ہو جاتا ہے کہ اس کے سامنے قرآن کی آیتیں تلاوت کی جائیں نصوص صریحہ کو پیش کر کے اس انحراف اور اختلاف سے اس کو روکا جائے کہ ان میں اختلاف کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی گئی ہے ۔ دین کا یہی وہ حصہ ہے قرآن میں جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خبر دی گئی ہے کہ" بینات" کے ہوتے ہوئے گزشتہ قومیں جدا جدا ہو کر آپس میں مختلف ہو گئی ہیں جس کا حاصل یہی معلوم ہوتا ہے کہ دین کے اس حصّہ کو اتنا واضح اور روشن شکل میں رکھا گیا ہے کہ عام و خاص اعلیٰ و ادنیٰ، عالم و جاہل سب ہی اس پر متفق ہو کر

---

[1] فلا تحدثوا کی ابتدا میں جو ف کا حرف ہے عربی زبان کی معمولی واقفیت رکھنے والوں سے یہ بات پوشیدہ نہ ہوگی کہ یہ ترتیب پر دلالت کرتا ہے یعنی اس سے پہلے جو بات بیان کی جاتی ہے اسی کے نتیجہ کا اظہار جب کرنا چاہتے ہیں تو اس کے شروع میں ف کے حرف کا اضافہ کرتے ہیں پس صاف مطلب اس کا یہی ہے کہ ان کا یہ حکم اسی واقعہ کے ساتھ مربوط ہے جس سے لوگوں کو آپ نے مطلع کیا تھا اور وہ واقعہ کیا تھا؟ یہی تو کہ حدیثوں کو ارادی مخالفتوں کا ذریعہ بنانے والے بنانے لگے ہیں، اگر آج ہی اس کی روک تھام نہ کی گئی تو آئندہ اس کے نتائج زیادہ سخت اور زیادہ ہولناک شکلوں میں سامنے آئیں گے ۱۲۔



ایک ہو سکتے ہیں" البینات" کے ہوتے ہوئے یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ دین میں ایسی کوئی چیز تھی ہی کب جس پر ہم سب اپنے اختلافات کو ختم کر کے سمٹ جاتے ہیں تو سمجھتا ہوں کہ یہی مطلب حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ان الفاظ کا بھی ہے جو آخر میں فرمایا کہ یعنی

فَمَنْ سَأَلَكُمْ فَقُوْلُوْا بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ كِتَابُ اللهِ فَاَحِلُّوْا حَلَالَهٗ وَحَرِّمُوْا حَرَامَهٗ۔ (تذکرة الحفاظ ج ۱ ص ۲)	پھر تم سے اگر کوئی پوچھے تو کہہ دیا کرو، کہ ہمارے تمہارے درمیان (اشتراک کا نقطہ) اللہ کی کتاب ہے پس چاہئے کہ اس کتاب نے جن چیزوں کو حلال کیا ان کو حلال قرار دو اور جن باتوں کو حرام ٹھہرایا ان کو حرام ٹھہراؤ۔

"تابعین کے بعد بھی مسلمانوں کو ہم اسی مسلک کا پابند پاتے ہیں معلومات کا اختلاف صرف علم تک محدود تھا لیکن "عمل" میں اختلاف کا کوئی اثر نظر نہیں آتا۔ البتہ دوسری صدی ہجری کے وسط میں حضرت امام شافعی رح کے بعض اہم اصلاحی اقدامات کے بعد ان کے ماننے والوں میں سے بعضوں کے اندر پھر ان اختلافات کی کچھ لہریں اٹھی تھیں لیکن زہر کے ساتھ ساتھ سیدنا امام احمد بن حنبلؒ کی شکل میں ایک تریاق وجود اسلام کو عطا ہوا، آپ نے اپنی بے لاگ صداقت بے پناہ علم، مستحکم تقوے کے زور سے ان اٹھنے والی لہروں کو اتنی قوت سے دبا دیا کہ پھر صحیح معنوں میں ان اختلافات کو پھلنے پھولنے کا موقعہ مسلمانوں کی عمومیت میں کبھی نہ ملا۔ بعض پیشہ ور مولوی ان میں ارادی مخالفتوں اور مخاصمتوں کا رنگ اپنے خاص اغراض کے تحت بھرنا بھی چاہتے تھے تو ان کے خاص تعلیمی حلقوں سے آگے اس کا اثر عام مسلمانوں تک بحمد اللہ کبھی نہیں پہنچا۔ ممکن ہے کہ میرے اس خیال سے بعضوں کو اختلاف ہو لیکن میرا یہ ذاتی خیال ہے کہ طبقۂ صوفیہ سے لوگوں کو اور جتنی بھی شکایتیں ہوں اس وقت ان سے بحث نہیں ہے لیکن انصاف کی یہ بات ہے کہ غیر بنیادی مسائل کے اختلافات کے جس رنگ کو مولویوں کا ایک گروہ پختہ کرنا چاہتا تھا صوفیہ کا عام گروہ اس کے مقابلہ میں ہمیشہ اس رنگ کو دھیما اور پھیکا کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ کچھ نہیں تو صوفیہ کے گروہ کا مسلمانوں پر یہی ایک احسان کیا کم ہے۔ بہر حال یہ ایک بڑی مفصل اور مبسوط بحث ہے۔ اہل علم کے لئے تو شاید یہ چند اشارے بھی کافی ہو سکتے ہیں۔ لیکن جن کے لئے اتنے اشارے ناکافی ہیں ان کو میری کتاب "تدوین فقہ" کا انتظار کرنا چاہئے کہ ان مسائل کی تفصیل کے لیے وہی کتاب موزوں ہو سکتی ہے امام شافعی کے اصلاحی اقدامات کیا تھے، ان سے بعضوں کو کیا غلط فہمیاں ہوئیں، حضرت امام احمد بن حنبلؒ نے ان غلط فہمیوں کا ازالہ کن تدبیروں سے کیا، ظاہر ہے کہ فقہ اور ائمہ فقہ کے حالات سے ان سوالوں کا حقیقی تعلق ہے ضمناً و ذیلاً تدوین حدیث کے سلسلہ میں بھی ان کا ذکر کر دیا گیا[1]

---

[1] مختصر یہ ہے کہ امام شافعیؒ حجاز سے تعلیم پا کر جب دار الخلافت بغداد پہنچے تو خود ان کا بیان ہے کہ جامع مسجد میں درس کے چالیس حلقوں میں بیٹھنے کے بعد مجھ پر ظاہر ہوا کہ ہر پڑھانے والا نہ اللہ کا نام لیتا ہے اور نہ رسول کا۔ یعنی نہ کوئی قال اللہ کہتا ہے اور نہ قال الرسول بلکہ ہر ایک قال اصحابنا یعنی میرے استادوں نے یہ کہا۔ بس یہی سناتا ہے صرف ڈیڑھ سو سال کے اندر دین کے اصل سرچشمے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے علماء اسلام کی اس بے تعلقی کو دیکھ کر قدرتاً امام میں برہمی پیدا ہوئی اور اعلان کیا کہ علماء جن کا حوالہ دیا جاتا ہے ان میں ہر ایک کے تشریحات اور اجتہادی فیصلوں کو میں پھر کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ پر پیش کر کے جانچوں گا۔ آپ نے بغداد میں بیٹھ کر حنفی مذہب پر تنقید کی اور مصر جہاں ان کے استاد امام مالک کا مذہب زیادہ عروج پر تھا وہاں پہنچ کر مالکی مذہب پر تنقید فرمائی۔ امام شافعیؒ کو (باقی حاشیہ صد آئندہ)

بہرحال حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہدِ خلافت میں حدیث کے متعلق جو اہم خدمت انجام پائی وہ یہی تھی اسی حال میں پیغمبر کے دین اور پیغمبر کی امت کو چھوڑ کر آپ اپنے محبوب نبیؐ کے بازو میں جا کر سو گئے۔ آپ کے بعد حضرت عمر فاروقؓ کا زمانہ آتا ہے

(اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی نَبِیِّكَ وَحَبِیْبِكَ وَعَلٰی اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَخُلَفَائِهٖ اَجْمَعِیْنَ ۔)

عہدِ فاروقی اور تدوینِ حدیث

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کوئی غلط بات منسوب نہ ہونے پائے، اس باب میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعض احتیاطی طریقۂ عمل کا ذکر عہدِ صدیقی کے واقعات کی ذیل میں کر چکا ہوں اور کوئی وجہ بھی نہیں ہو سکتی تھی کہ اَشَدُّھُمْ فِیْ اَمْرِ اللّٰہِ کی اشدیت دین کے دوسرے شعبوں میں جیسے نمایاں ہے، حدیث کا شعبہ بھی اس سے کیوں مستفید نہ ہوتا۔ عدل و انصاف، سیاست و حکومت اور از ایں قبیل دوسرے معاملات میں فاروقِ اعظمؓ کے بے لاگ فیصلوں کا جیسے لوگ آج تک ذکر کرتے ہیں ہم دیکھتے ہیں کہ حدیث کی تاریخ کا بھی حضرت عمرؓ کے رعب داب کا وہی اثر ہے ان کے بہت بعد یعنی تقریباً اس وقت جب دوسری صدی ہجری گزر رہی تھی مشہور محدث حضرت سفیان عیینہ کے حالات میں لکھا ہے کہ حدیث کے طلباء ان کے حلقہ میں جب آتے تو ان کی طرف خطاب کر کے کہتے کہ:۔

لَوْ اَدْرَکْنَا وَ اِیَّاکُمْ عُمَرُ لَاَوْجَعَنَا ضَرْبًا	اگر پا لیتے ہمیں اور تمہیں عمرؓ تو مار کر دکھ پہنچاتے (جامع ج ۲ صفحہ ۱۲۱)

دراصل سفیان کا اشارہ اشدیت کے ان ہی واقعات کی طرف ہے جن کا روایتِ حدیث کے سلسلہ میں حضرت عمرؓ کی طرف انتساب کیا گیا ہے۔ اس زمانے میں بعض فاسد اغراض کے تحت اسی نوعیت کی فاروقی روایات کی کافی تشہیر کی گئی ہے مثلاً حضرت ابوہریرہؓ کے شاگرد ابوسلمہ راوی ہیں کہ میں نے ابوہریرہؓ سے کہا کہ جس آزادی کے ساتھ آج کل آپ حدیثیں بیان کیا کرتے ہیں کیا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں بھی ایسا کر سکتے تھے۔ جواب میں ابوہریرہؓ نے جو بات کہی تھی یعنی

لَوْ کُنْتُ اُحَدِّثُ فِیْ زَمَانِ عُمَرَ مِثْلَ مَا اُحَدِّثُکُمْ لَضَرَبَنِیْ بِمِخْفَقَتِهٖ	اگر عمرؓ کے زمانے میں اسی طرح میں حدیثیں بیان کرتا جیسے تم سے بیان کرتا ہوں تو اپنے کوڑے سے عمر مجھے مارتے (الذہبی ج ا ص ۷)

اور ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تو صرف اندیشہ ظاہر کیا تھا سعید بن ابراہیم کے حوالہ سے الذہبی ہی نے یہ دوسری روایت درج کی ہے کہ ان کے والد ابراہیم کہتے تھے کہ :

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اس کا اجر ملتا رہے گا کہ ہٹنے کے بعد دین کے حقیقی سرچشموں کتاب اللہ اور سنت کی طرف مسلمان ان ہی کے طرزِ عمل کی وجہ سے لوٹتے رہے ہیں مگر فروعی اختلافات کو امام شافعی کی وجہ سے غیر معمولی اہمیت جب حاصل ہو گئی تو امام احمد نے مفاہمت و مصالحت کی راہ کھول ان کی طرف ایک ہی مسئلہ کے مختلف پہلو کے جواز و عدمِ جواز کا عموماً انتساب کتابوں میں جو کیا جاتا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ ہر پہلو اس مسئلہ کا ان کے نزدیک شرعی حدود سے باہر نہیں سمجھا جاتا ہے۔

إِنَّ عُمَرَ حَبَسَ ثَلَاثَةً اِبْنَ مَسْعُوْدٍ وَاَبَا الدَّرْدَاءِ وَاَبَا مَسْعُوْدِ الْاَنْصَارِیَّ فَقَالَ اِنَّكُمْ قَدْ اَكْثَرْتُمُ الْحَدِيْثَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔

حضرت عمرؓ نے تین آدمیوں کو روک[1] دیا تھا، ابن مسعودؓ کو ابو درداؓ کو اور ابو مسعود انصاری کو اور ان سے کہا کہ تم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کر کے بہت زیادہ حدیثیں روایت کیا کرتے ہو۔

(الذہبی ج ۱ ص ۷)

اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اندیشہ واقعہ کی صورت بھی بعض لوگوں کے ساتھ اختیار کر چکا تھا، یہ اور اسی قسم کی بعض دوسری روایتوں کو درج کر کے حافظ ابن عبدالبر نے اپنی کتاب جامع بیان العلم میں لکھا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ

"جن لوگوں کو واقعات کا صحیح علم نہیں تھا اور بدعات (نئی باتوں) کے پیدا کرنے کا جن میں زیادہ شوق پایا جاتا تھا سنت (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں) سے جن کے قلوب میں گرانیاں تھیں انہوں نے مذکورہ بالا روایتوں سے جو حضرت عمرؓ کی طرف منسوب ہیں، یہ نتیجہ پیدا کرنا چاہا ہے کہ حضرت عمرؓ مسلمانوں کے دین سے حدیثوں کو بالکلیہ خارج کر دینا چاہتے تھے۔"

(جامع ج ۲ ص ۱۲۱)

پھر اس غلط نتیجہ کی تردید میں حافظ نے ایک طویل بحث کی ہے اور آخر میں انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ بعض لوگوں کو ان روایتوں کی صحت میں بھی شبہ ہے، ابن حزم نے بھی کتاب الاحکام میں حضرت عمرؓ کی طرف اس سلسلہ کی منسوبہ روایات کے راویوں پر جرح کر کے ان روایتوں کو مشتبہ و مشکوک قرار دیا ہے۔

حضرت عمرؓ کی روایات کی تعداد

مگر میں کہتا ہوں اور پہلے بھی کہا ہے کہ باوجود روایت ہونے کے اعتماد کرنے والوں نے ان ہی روایتوں پر جب اعتماد کیا ہے تو انصاف کی بات یہی ہے کہ ان حدیثوں کو بھی چاہئے تھا کہ یہ لوگ نہ بھولتے جو روایات ہی والی کتابوں میں خود حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہیں بلکہ یہ واقعہ ہے کہ جن روایتوں سے یہ گروہ فائدہ اٹھانا چاہتا ہے ان کے اسناد کو یعنی جن راویوں سے یہ روایتیں مروی ہیں اور حضرت عمرؓ سے جو حدیثیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جن راویوں کے توسط سے مروی ہیں دونوں میں کوئی نسبت نہیں ہے۔ حضرت عمرؓ کی یہ حدیثیں عموماً صحاح ستہ بلکہ بخاری اور مسلم میں پائی جاتی ہیں اور جن روایتوں کو مخالفت حدیث میں یہ لوگ پیش کرتے ہیں کم ازکم صحاح کی کتابوں میں ان کا تذکرہ نہیں کیا گیا ہے۔ ابن جوزی نے تلقیح میں ان حدیثوں کی تعداد جو حضرت عمرؓ سے مروی ہیں پانسو سینتیس بتائی ہے۔ فرض کیجئے کہ متون کے ساتھ طرق کو بھی اس میں شمار کر لیا گیا ہو لیکن ابو نعیم اصفہانی کے اس بیان میں تو اس شبہ کی بھی گنجائش نہیں ہے ابو نعیم حافظ کے اپنے الفاظ یہ ہیں کہ

اَسْنَدَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ — یعنی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] بعض لوگوں نے حبس کا ترجمہ قید بھی کیا ہے یعنی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان تینوں صحابیوں کو قید کر دیا تھا۔

وَسَلَّمَ مِنَ الْمُتُوْنِ سِوَى الطُّرُقِ مِائَتَيْ حَدِیْثًا وَّنَیِّفًا (تلقیح ص ۱۸۴) | کی دو سو سے کچھ اوپر حدیثیں مروی ہیں اس تعداد میں صرف متون کو شمار کیا گیا ہے طرق کی کثرت کا لحاظ نہیں کیا گیا ہے

مان لیجئے کہ دو سو حدیثیں سہی۔ خیال تو کیجئے کہ جس شخص کا مسلک یہ قرار دیا جاتا ہو کہ وہ دنیا سے حدیثوں کے قصے ہی کو ختم کر دینا چاہتا تھا، وہی کیا دو ایک نہیں دو دو سو حدیثوں کا خود راوی بن سکتا ہے؟

اور تعداد کا یہ قصہ تو محدثین کی خاص اصطلاح کی بنیاد پر ہے ورنہ شاہ ولی اللہ نے ازالۃ الخفا میں فن حدیث کے بعض نکات کا ذکر کر کے دعویٰ کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کی روایت کرنے والوں میں حضرت عمرؓ کا شمار صحابہ کے اس طبقہ میں کرنا چاہئے جنہیں مکثرین کہتے ہیں۔ جن کی حدیثوں کی تعداد ہزار یا ہزار سے بالا ہو۔ شاہ صاحب کے الفاظ یہ ہیں:۔

"پس ایں عزیزانؔ از مکثرین باشند و شواہد ایں مقدمہ بسیار است لکن بسط مقال در آں باب فرصتے می طلبد" (ازالہ ج ۲ ص ۲۱۴)

یعنی ان بزرگوں کو چاہئے کہ طبقہ مکثرین (ہزار یا ہزار سے بالا حدیثوں کی روایت کرنے والوں) میں ان کو شمار کیا جائے۔ اس دعویٰ کی تائید میں بہت سی شہادتیں پیش ہو سکتی ہیں مگر اس کی تفصیل کے لئے فرصت کی ضرورت ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جن روایتوں کو حضرت عمرؓ کی طرف منسوب کر کے یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ حدیثوں کی روایت کے قصے ہی کو ختم کر دینا چاہتے تھے قطع نظر ان کمزوریوں کے جو ان روایتوں کی سندوں میں پائی جاتی ہیں میں پوچھتا ہوں کہ ان کے مقابلہ میں صحاح کی ان حدیثوں کو کیسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے جن کی اتنی بڑی تعداد حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالہ سے کتابوں میں ملتی ہیں، اور یہ بحثیں تو اس وقت پیدا ہوتی ہیں جب خواہ مخواہ یہ مان لیا جائے کہ حضرت عمرؓ کی طرف یہ روایتیں جو منسوب کی گئی ہیں ان کا مقصد وہی ہے جو حدیث کے مخالفین ان سے سمجھنا سمجھانا چاہتے ہیں۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ معمولی تامل سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ لوگوں کو روایتوں کے اکثار سے منع فرماتے تھے یعنی چاہتے تھے کہ کمًّا وَّ کیفًا حدیثوں کے بیان کرنے میں کثرت کی راہ لوگ نہ اختیار کریں۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ جن صحابیوں کو آپ نے روکا تھا، ان پر الزام حضرت کا یہی تھا کہ تم لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کے بیان کرنے میں اکثار کی راہ اختیار کی آپ کے الفاظ اِکْثَرْتُمُ الْحَدِیْثَ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے، کہ بہ کثرت حدیثوں کی روایت کو وہ روکنا چاہتے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کے کس لفظ سے یہ سمجھ لیا گیا کہ سرے سے کلیتہً روایتِ حدیث کے رواج ہی کو وہ مسدود کرنا چاہتے تھے بلکہ اسی سلسلہ میں قرظہ بن کعب صحابی سے شعبی نے یہ قصہ جو نقل کیا ہے اور مخالفین حدیث اس کو بھی عموماً اپنے خیال کی تائید میں پیش کرنے کے عادی ہیں۔ یعنی شعبی کہتے تھے کہ حضرت قرظہ بن کعب نے مجھ سے یہ بیان کیا کہ:

۱؎ شاہ صاحب نے اس سلسلہ میں چند اور صحابیوں کو بھی شمار کیا ہے "عزیزاں" کے لفظ سے سب ہی کی طرف اشارہ فرمایا ہے جن میں حضرت عمرؓ بھی شریک ہیں ۱۲

خَرَجْنَا فَشَيَّعَنَا عُمَرُ إِلَىٰ صِرَارٍ ثُمَّ دَعَا بِمَاءٍ فَتَوَضَّأَ ثُمَّ قَالَ أَتَدْرُونَ لِمَ خَرَجْتُ مَعَكُمْ قُلْنَا أَرَدْتَ أَنْ تُشَيِّعَنَا وَتُكْرِمَنَا قَالَ إِنَّ مَعَ ذٰلِكَ لِحَاجَةٍ خَرَجْتُ إِنَّكُمْ تَأْتُونَ بَلْدَةً لَأَهْلِهَا دَوِيٌّ بِالْقُرْآنِ كَدَوِيِّ النَّحْلِ فَلَا تَصُدُّوهُمْ بِالْأَحَادِيثِ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَتَشْغَلُوهُمْ جَرِّدُوا الْقُرْآنَ وَأَقِلُّوا الرِّوَايَةَ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ امْضُوا وَأَنَا شَرِيكُكُمْ۔

(جامع ج ۲ ص ۱۲۰ و تذکرۃ الحفاظ)

ہم (مدینہ سے) نکلے تو میری شائعت میں حضرت عمرؓ صرار نامی مقام تک آئے پھر آپ نے پانی طلب کیا اور وضو کیا، پھر فرمایا تم لوگوں نے سمجھا بھی کہ تمہارے ساتھ میں بھی (مدینہ سے نکل کر یہاں تک) کیوں آیا، ہم نے عرض کیا ہم لوگوں کی مشایعت کے لیے آپ تشریف لائے اور ہماری عزت افزائی فرمائی حضرت عمرؓ نے تب کہا کہ اس کے سوا ایک اور ضرورت بھی تھی جس کے لئے میں مدینہ سے نکل کر تمہارے ساتھ یہاں تک آیا ہوں اور وہ یہ ہے کہ تم ایک ایسے شہر میں پہنچو گے جس کے باشندوں میں قرآن کی تلاوت اس طرح گونجتی ہے جیسے شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ سے گونج پیدا ہوتی ہے، تو دیکھنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کو بیان کر کر کے تم لوگ ان لوگوں کو (قرآن کی مشغولیت سے) روک نہ دینا قرآن کو استوار کرتے چلے جائیو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے حدیثوں کے بیان کرنے میں کمی کیجیو۔ اب جاؤ میں تمہارا ساتھی ہوں۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ ان تین صحابیوں والی روایت میں حضرت عمرؓ نے حدیثوں کے اکثار کی جہاں شکایت کی وہیں قرظہ کی اس روایت میں اپنے منشا کو ظاہر کرتے ہوئے قطعی طور پر حدیثوں کی روایت سے لوگوں کو منع نہیں کیا۔ بلکہ فرمایا کہ

أَقِلُّوا الرِّوَايَةَ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے حدیثوں کے بیان کرنے میں کمی کیجیو۔

ممانعت تو خیر دور کی بات ہے، میں تو حضرت عمرؓ کے ان الفاظ کو روایت حدیث کا حکم سمجھتا ہوں، البتہ یہ حکم ایک شرط کے ساتھ مشروط ہے یعنی کثرت کی راہ نہ اختیار کی جائے ورنہ اقلال اور کمی کی شرط کی تکمیل کرتے ہوئے اپنے مذکورہ بالا الفاظ کے ساتھ حضرت عمرؓ حدیثوں کی روایت کا یقیناً حکم دے رہے ہیں، حافظ ابن عبدالبر نے بھی ان روایتوں کا تذکرہ کر کے یہی لکھا ہے کہ

هٰذَا يَدُلُّ عَلَىٰ نَهْيِهِ عَنِ الْإِكْثَارِ وَأَمْرِهِ بِالْإِقْلَالِ مِنَ الرِّوَايَةِ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (ص ۱۲۱)

حضرت عمرؓ کے مذکورہ بالا الفاظ یہ بتاتے ہیں کہ روایت حدیث میں کثرت اور زیادتی کو وہ روکنا چاہتے تھے اور اس کا حکم دے رہے ہیں کہ روایت حدیث میں کمی کی راہ اختیار کی جائے۔

پھر آگے چل کر وہ جو کہتے ہیں اور بالکل سچ کہتے ہیں کہ:

وَلَوْ كُرِهَ الرِّوَايَةَ وَذَمَّهَا لَنَهٰى عَنِ الْاِقْلَالِ وَالْاِكْثَارِ۔

اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کی روایت مطلقاً ان کے نزدیک ناپسند ہوتی تو چاہیے تھا کہ روایتوں کے بیان کرنے میں کثرت وزیادتی اور قلت وکمی دونوں ہی سے لوگوں کو روک دیتے۔

تدوین حدیث کا خیال لیکن پھر بربنائے مصلحت تامل

بہرحال طاعون زدہ علاقوں میں رہنے نہ رہنے کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث جیسے حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے پیش کیا یا وجوب غسل کے مسئلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل کے متعلق صدیقہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا جو علم تھا یا اسی قسم کے متعدد ایسے واقعات حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں پیش آتے رہے ہیں جن سے ایک طرف تو اس نظریہ کی تصدیق ہوتی ہے کہ دین کے اس حصہ کی تبلیغ ایسے ڈھنگ میں کی گئی تھی کہ مہاجرین وانصار صحابہ کا عام گروہ بسا اوقات اس سلسلہ کی حدیثوں سے ناواقف نظر آتا ہے اور کتنا ناواقف کہ ہزار ہا ہزار صحابیوں کے درمیان ایک دو صاحب تک ان حدیثوں کا علم محدود تھا اور دوسری طرف جہاں تک میں سمجھتا ہوں غالباً ان ہی تجربات کے تسلسل نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ان حدیثوں کے متعلق طرز عمل کے بدلنے پر شاید آمادہ کیا، میرا مطلب یہ ہے کہ بیہقی نے مدخل میں اور ابن عبدالبر نے جامع بیان العلم میں زہری کے حوالے سے حضرت عروہ بن زبیرؓ کے اس بیان کو جو نقل کیا ہے کہ

اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ اَرَادَ اَنْ يَّكْتُبَ السُّنَنَ فَاسْتَفْتٰى اَصْحَابَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ ذٰلِكَ فَاَشَارُوْا عَلَيْهِ اَنْ يَّكْتُبَهَا۔

عمر بن خطابؓ نے چاہا کہ سنن یعنی حدیثوں کو لکھوا لیا جائے تب انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں سے فتویٰ طلب کیا تو لوگوں نے یہی کہا کہ حدیثیں لکھوالی جائیں۔

(جامع بیان العلم ج ۱ ص ۶۴)

صحابہ سے فتویٰ لینے کے لئے ان کی مجلس شوریٰ میں حضرت عمرؓ کا اپنی تجویز کو رکھنا۔ بظاہر اس کی وجہ وہی معلوم ہوتی ہے کہ ان حدیثوں کی تبلیغ میں بجائے عمومیت کے خاص خاص افراد تک ان کے علم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس مصلحت کے پیش نظر پہنچایا تھا اور ایک زمانہ تک خود حضرت عمرؓ بھی اسی مصلحت کی بنیاد پر ان حدیثوں کے بیان کرنے میں اقلال پر جو اصرار کرتے رہے تھے یہی دریافت کرنا چاہتے تھے کہ کیا اس مصلحت کی رعایت کی ضرورت اب بھی باقی ہے؟ کیونکہ پہلے بھی میں کہہ چکا ہوں کہ اس خدمت کی نوعیت ایک وقتی خدمت کی تھی، نبوت اور نبوت سے قریب تر زمانوں میں عمومیت کا رنگ ان حدیثوں میں اگر پیدا ہو جاتا تو یقیناً آئندہ زمانے میں ان کے مطالبات میں زیادہ سختی پیدا ہو جاتی جو شارع علیہ السلام کا مقصود نہ تھا، سوال یہی تھا کہ وہ زمانہ گزر گیا یا ابھی ان اسباب کی مزاحمت کے سلسلے کو جاری رکھنے کی ضرورت ہے جن سے ان حدیثوں کے مطالبات میں شدت کے پیدا ہونے کا خطرہ پیش آسکتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کی اس مجلس شوریٰ نے یہی طے کیا کہ وہ وقت گزر گیا اور اب قلم بند ہو کر مسلمانوں کی ایک نسل سے دوسری نسل تک اگر حدیثیں منتقل بھی ہوتی رہیں گی تو لوگ ان کے مطالبات کو اسلام کے بنیادی مطالبات کے برابر نہ قرار دیں گے۔

لیکن مجلس شوریٰ کے اس فیصلہ سے حضرت عمرؓ کا قلب مطمئن نہیں ہوا، لکھا ہے کہ استشارہ کے بعد حضرت عمرؓ نے دوسرے مسنون طریقہ یعنی استخارہ سے بھی فیصلہ کی یکسوئی میں مدد حاصل کرنی چاہی، فاروقی احتیاط اور اس کی نزاکتوں کی یہ انتہا ہے کہ بجائے ایک دو دفعہ کے عروہ کا بیان ہے کہ :

فَطَفِقَ عُمَرُ يَسْتَخِيرُ اللهَ فِيهَا شَهْراً - (ص ۶۴)

کامل ایک مہینے تک حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس معاملہ میں استخارہ کرتے رہے (یعنی جو پہلو خیر کا ہو اسی پر عمل کی توفیق عطا ہو، اس کی دعا کرتے رہے)

ایک ماہ تک استخارہ کی نماز اور وہ دُعا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لئے سکھائی ہے حضرت عمرؓ نے اس کو جاری رکھا آخر ایک ماہ کے بعد جس فیصلہ کو اپنے قلب مبارک میں آپ نے پایا عروہ نے اس کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔

ثُمَّ اَصْبَحَ يَوْمًا وَقَدْ عَزَمَ اللهُ لَهُ فَقَالَ اِنِّي كُنْتُ اُرِيْدُ اَنْ اَكْتُبَ السُّنَنَ وَ اِنِّي ذَكَرْتُ قَوْمًا كَانُوْا قَبْلَكُمْ كَتَبُوْا كِتَابًا فَاَكَبُّوْا عَلَيْهَا وَتَرَكُوْا كِتَابَ اللهِ وَاِنِّي لَا اُشَوِّبُ كِتَابَ اللهِ بِشَيْءٍ اَبَدًا - (ج ۱ ص ۶۴)

پھر ایک دن جب صبح ہوئی اور اس وقت حق تعالیٰ نے فیصلہ میں یک سوئی کی کیفیت ان کے قلب میں پیدا کر دی تھی۔ حضرت عمرؓ نے لوگوں سے کہا کہ میں نے حدیثوں کو قلمبند کرانے کا ارادہ کیا تھا پھر مجھے ان قوموں کا خیال آیا جو تم سے پہلے گزری ہیں کہ انھوں نے کتابیں لکھیں اور ان ہی پر ٹوٹ پڑیں اور اللہ کی کتاب کو چھوڑ بیٹھیں اور قسم ہے اللہ کی کہ میں اللہ کی کتاب کو کسی دوسری چیز کے ساتھ مخلوط کرنا نہیں چاہتا۔

بیہقی کے مدخل سے صاحب فتح الملہم نے اسی روایت کو درج کیا اس میں بجائے "لَا اُشَوِّبُ"

لَا اُلْبِسُ كِتَابَ اللهِ بِشَيْءٍ (یعنی اللہ کی کتاب کو کسی دوسری چیز کے ساتھ مشتبہ ہونے نہ دوں گا۔)

کے الفاظ ہیں۔

معنی "اشوب" اور "البس" دونوں کے قریب قریب ایک ہی ہیں اور یہی چیز دراصل دریافت طلب تھی یعنی کتاب اللہ کے طالبوں کی جو کیفیت ہے آیا وہی کیفیت ان حدیثوں میں بھی تو نہیں پیدا ہو جائے گی اگر اسی زمانہ میں ان کو قلمبند کر دیا گیا؟ استخارے نے حضرت عمرؓ میں اسی احساس کو استوار اور مستحکم کیا کہ ابھی اس کا خطرہ باقی ہے۔

اور واقعہ بھی یہی تھا کیونکہ گو نبوت کا زمانہ گزر چکا تھا، نبوت کے بعد خلافت کا ایک دور بھی ختم ہو چکا تھا اور دوسری خلافت پر بھی کافی عرصہ گزر چکا تھا، لیکن میں پوچھتا ہوں کہ خلافت اور حکومت کی جانب سے حضرت عمرؓ کی مدون و مرتب کی ہوئی یا کرائی ہوئی حدیثوں کی کوئی کتاب دنیا میں اس وقت اگر موجود ہوتی تو کیا نفسیاتی طور پر مسلمانوں کے قابو کی یہ بات تھی کہ ان حدیثوں کے ساتھ اور ان سے پیدا ہونے والے احکام و مطالبات کے ساتھ تعلق کی اسی کیفیت کو کیا باقی رکھ سکتے تھے جو آج خبر آحاد کی روایتوں کے ساتھ ان کے دلوں میں پائی جاتی ہے، چونکہ واقعہ سامنے نہیں ہے اس لئے کہنے والے جو کچھ چاہیں کہہ سکتے ہیں لیکن میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ حضرت عمرؓ کو اپنے

استخارے کی دعاؤں میں جس خطرے کا احساس ہوا تھا یعنی اللہ کی کتاب کے ساتھ خلط و ملط لبس اور گڈمڈ ہو جانے کا خطرہ جس کا اظہار

فَوَاللّٰہِ لَا اُلْبِسُ کِتَابَ اللّٰہِ بِشَیْءٍ — خدا کی قسم اللہ کی کتاب کو کسی دوسری چیز کے ساتھ مشتبہ ہونے نہ دوں گا۔

کے الفاظ میں انہوں نے فرمایا ہے۔ یقیناً یہ اندیشہ واقعہ کی شکل اختیار کر لیتا آخر مسلمان بھی انسان ہی ہیں ان کے عواطف و جذبات، احساسات و تاثرات بھی وہی ہیں جو دوسرے انسانوں کے ہیں ان ہی بے احتیاطیوں اور مراتب کے فرق کو ملحوظ نہ رکھنے کا نتیجہ دوسری قوموں میں بایں شکل ظاہر ہو چکا تھا جس کی طرف حضرت عمرؓ نے ان الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے کہ میں نے تم سے پہلے کی قوموں کو دیکھا کہ انہوں نے ایسی کتابیں لکھیں جن پر وہ اس طرح ٹوٹ کر گریں کہ اللہ کی کتاب چھوڑ دی گئی بظاہر ان کا اشارہ یہود و نصاریٰ کی طرف تھا لیکن سچی بات یہ ہے کہ دنیا کے سارے مذاہب و ادیان میں یہی خلط مبحث پیدا ہوا یعنی ان کے یہاں دین کے میثاقی اور غیر میثاقی حصہ کی کوئی تقسیم باقی نہ رہی۔ مذہب کی طرف کسی چیز کا انتساب اس طاقت کو پیدا کر دینے کے لئے کافی ہے جس قوت کو صرف ان مطالبات ہی کی حد تک محدود رہنا چاہیے جن کی براہ راست حق تعالیٰ کی طرف سے ذمہ داری بندوں پر عائد کی گئی ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ صرف اسلام کی خصوصیت ہے کہ کتاب و سنت و قیاس سے پیدا ہونے والے نتائج کی گرفت اور لزوم کی قوت میں فرق کیا جاتا ہے[1]

بہر حال کچھ بھی ہو، عروہ کی مذکورہ بالا روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے حضرت ابو بکرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد یہ خیال کر کے کہ اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کے جمع کرنے میں کوئی حرج نہیں اور یہی سوچ کر پانسو حدیثوں کا مجموعہ تیار بھی کر لیا تھا لیکن بعد کو اپنے خیال کی غلطی آپ پر واضح ہوئی اور اسی وقت اس مجموعہ کو نذر آتش

---

[1] یہ واقعہ ہے کہ آج بائیبل کے نام سے کتابوں کا جو مجموعہ پایا جاتا ہے، ان کے متعلق اس کا پتہ چلانا کہ براہ راست موسیٰ علیہ السلام کو حق تعالیٰ کی طرف سے جو چیزیں عطا کی گئی تھیں پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام مشکوٰت نبوت کی روشنی میں جو باتیں فرماتے تھے اور بعد کو موسیٰ علیہ السلام کے جانشینوں نیز احبار و فقہار یہود نے دین موسوی میں جن اجتہادی امور کا اضافہ کیا ان سب سے پیدا ہونے والے نتائج کے مطالبات میں کسی قسم کا کوئی فرق پایا نہیں جاتا۔ پھر خدا کی طرف سے موسیٰ علیہ السلام کو جو کچھ دیا گیا تھا اس کی تشریح و توضیح و تفسیر بعد کو جو لوگوں نے کی اصل متن توراۃ کے ساتھ سب مخلوط ہو چکے ہیں، ایک کو دوسرے سے جدا کرنا ناخن سے گوشت کو جدا کرنے کے مرادف ہے اور یہود کا دین تو خیر کسی نہ کسی شکل میں پایا بھی جاتا ہے، کچھ نہیں تو دوسری چیزوں کے ساتھ موسیٰؑ کی کچھ باتیں ان میں ابھی باقی ہیں دوسرے مذاہب کا حال تو یہ ہے کہ کتابوں پر کتابوں کا اضافہ ہوتا چلا گیا، تا آنکہ آخر میں چند رزمی افسانوں پر ان کے دین کی بنیاد آج قائم ہے۔ ہندوستان میں جس دین کا رواج تھا کہنے کو تو اس میں آسمانی کتاب کا بھی پتہ دیا جاتا ہے، تصوف و کلام (اپنشد) اور فقہ (شاستر) کا بھی نام لیا جاتا ہے لیکن پرانوں کے مروج ہونے کے بعد عملی طور پر کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہر چیز کو چھوڑ کر ایک سچا مخلص ہندو صرف بالمیکی کی رزمیہ نظم رامائن اور مہا بھارت کو رد پانڈو کے جنگ نامے کو بڑی حد تک کافی سمجھتا ہے یقینی طور پر اس کتاب کو لوگوں نے چھوڑ دیا ہے جس کے متعلق ان کا دعویٰ ہے کہ "برہما" پر وہ نازل ہوئی تھی ۱۲

فرمادیا۔ اسی طرح حضرت عمرؓ اپنی خلافت کے ابتدائی سالوں میں تو اسی پر مصر رہے کہ حدیثوں کی اشاعت میں عمومیت کی کیفیت کو پیدا ہونے نہ دیا جائے لیکن جیسا کہ میرا خیال ہے خلافت کے آخری سالوں میں ان تجربات سے متاثر ہو کر جس کی چند مثالیں میں نے درج کی ہیں، آپ کے ارادے میں بھی تذبذب پیدا ہوا اور جو صورت حال بھی تھی اسی کو دیکھتے ہوئے اس کیفیت کا پیدا ہونا بعید بھی نہ تھا۔ خیال تو کیجیے کہ مہاجرین اولین بلائے جاتے ہیں اور طاعون زدہ علاقہ کے متعلق کوئی علم ان کے پاس نہیں ہوتا، انصار آتے ہیں ان سے بھی دریافت کیا جاتا ہے ان کے پاس بھی قطعاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی روایت اس باب میں نہیں ملتی۔ فتح مکہ کے قریش سرداروں کو بلایا جاتا ہے وہ اس علم سے خالی نظر آتے ہیں آخر میں ایک آدمی عبدالرحمن بن عوفؓ کے پاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث ملتی ہے اور ایک مسئلہ جس میں مہاجرین میں بھی انصار میں بھی شدید اختلاف پیدا ہو گیا تھا خود حضرت عمرؓ کے پاس بھی کوئی علم اس باب میں پیغمبر کا عطا کیا ہوا موجود نہ تھا اپنی بصیرت سے وہ ایک رائے کو ترجیح دیتے ہیں، لیکن بعض جلیل القدر صحابی کا حضرت عمرؓ کے اس اجتہادی فیصلہ پر اعتراض باقی رہتا ہے، مسلمانوں میں خلفشار مچا ہوا ہے کہ اچانک ایک جاننے والا ان کے سامنے اس علم کو پیش کرتا ہے جس سے مسئلہ صاف ہو جاتا ہے ہر ایک اپنی اپنی جگہ پر مطمئن ہو کر بیٹھ جاتا ہے جس علم کے نتائج اتنے قیمتی ہوں جس وقت خیال حضرت عمرؓ کو آتا ہو گا کہ یہی علم افراد میں منتشر بکھرا ہوا ہے۔ مرنے والے مر رہے ہیں جس کے پاس جو علم ہے اپنے ساتھ لئے چلا جا رہا ہے اگر اس حال کو دیکھ کر حضرت عمرؓ کے خیال میں تبدیلی پیدا ہوئی تو یقیناً یہ چیز ہی ایسی تھی کہ اس مقام پر جو بھی ہوتا اس کی بھی یہی کوشش ہوتی کہ علم کے اس قیمتی ذخیرے کو ضائع ہونے سے بچا لیا جائے مگر دوسری طرف خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا منشائے مبارک تھا کہ معلومات کے اس ذخیرے کو اتنی اہمیت نہ دی جائے کہ آئندہ مسلمانوں کی بدبختیوں میں بدبختیوں کے اضافہ کا ذریعہ وہ بن جائے اور یہ چیز بھی ایسی نہ تھی کہ اس سے قطع نظر کر کے کوئی اقدام کر دیا جاتا، آج لوگوں کے سامنے اس قسم کی روایتیں گزرتی ہیں پڑھنے والے ان کو پڑھ کر گزر جاتے ہیں، ٹھہر کر ذرا کوئی نہیں سوچتا کہ پیغمبر کی حدیثوں کے قلم بند کرانے کا مسئلہ بھی کیا کسی مشورے کا محتاج تھا۔ نیکی کے کام میں بھی کیا پوچھنے کی ضرورت ہوتی ہے پھر حضرت عمرؓ صحابہ کے مجلسِ شوریٰ میں اسی نیکی کے کام کو آخر کیوں پیش کرتے ہیں اور پیش کرنے کے بعد مجلس کی رائے ان کو مطمئن کیوں نہیں کرتی، کام بھی نیک مشورہ دینے والوں کی جماعت بھی نیک، اس میں فکر و تامل کی کیا ضرورت تھی لوگ اپنا فیصلہ دے چکے تھے۔ چاہئے تھا کہ اسی کے مطابق جیسے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے قرآن کی تدوین کا ایک دفتر خلافت کی طرف سے قائم کر کے قرآنی سورتوں کو ایک ہی جلد میں مجلد کرانے کا کام انجام دلا دیا تھا۔ حضرت عمرؓ بھی "تدوینِ حدیث" کا ایک دفتر قائم کر دیتے، چند ہی دنوں میں "قرآن" کے ساتھ اس زمانہ میں حدیثوں کا بھی ایک مجموعہ حکومت کی طرف سے مدون کرایا ہوا مسلمانوں کو مل جاتا۔ اس سے بہتر تجویز اور کیا ہو سکتی تھی۔ لیکن عمرؓ یہی نہیں کہ صرف تامل سے کام لیتے ہیں بلکہ مخلوق سے ہٹ کر مسئلہ کی اہمیت ہی کا تو تقاضا تھا کہ خالق کے آستانہ پر اپنے آپ کو گرا دیتے ہیں اور کامل ایک مہینے تک خدا کی چوکھٹ پر ان کی جبینِ نیاز جھک جھک کر "جو خیر ہو، اسی کی توفیق عطا کی جائے" کی مسلسل درخواست میں مصروف رہتی ہے۔

آخر بات اگر اتنی ہی آسان تھی تو ان طول طویل قصوں کی ضرورت ہی کیا تھی؟ مگر سچ یہ ہے کہ جس دین کے بعد قدرت

طے کر چکی تھی کہ نسلِ انسانی کو کوئی دین نہیں دیا جائے گا، اگر شروع ہی سے اس کے ہر ہر پہلو کی نگرانیوں میں ان نزاکتوں سے کام نہ لیا جاتا تو آج جس روزِ روشن کی شکل میں اس دین کے سارے عناصر ہر عامی و خاصی کے سامنے واضح ہیں، کیا یہ کیفیت ان کوششوں کے بغیر یوں ہی پیدا ہو جاتی۔

بلاشبہ حضرت عمرؓ کا یہ فیصلہ الہامی فیصلہ تھا کہ اپنی خلافت و حکومت کی جانب سے حدیثوں کے قلم بند کرانے کا خیال جو ان کے اندر حالات نے پیدا کر دیا تھا، اس خیال کو آپ نے دماغ سے باہر نکال دیا بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس استشارہ و استخارہ نے مسئلہ کے تمام پہلوؤں کو اور جن خطرات کا اندیشہ تھا ان کے تمام گوشوں کو نئے سرے سے تازہ کر کے آپ کے سامنے پیش کیا بظاہر اسی کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف حکومت ہی کی طرف سے "تدوینِ حدیث" کے کام کو اپنے زمانہ میں ایک خطرناک اقدام آپ نے قرار دیا بلکہ آپ کے عہدِ خلافت تک تقریباً ایک قرن یا جگ (بارہ سال) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جو گزر چکا تھا، اس عرصہ میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انفرادی طور پر لوگ حدیثوں کو پھر قلم بند کرنے لگے تھے۔ ابنِ سعد نے قاسم بن محمدؒ کے حوالہ سے جو روایت طبقات میں درج کی ہے اس کے ان الفاظ سے یعنی:

اِنَّ الْاَحَادِيْثَ قَدْ كَثُرَتْ عَلٰى عَهْدِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فَاَنْشَدَ النَّاسَ اَنْ يَّاْتُوْهُ بِهَا۔	عمر بن الخطابؓ کے زمانے میں حدیثوں کی پھر کثرت ہو گئی تب حضرت عمرؓ نے لوگوں کو قسمیں دے دے کر حکم دیا کہ ان حدیثوں کو ان کے پاس پیش کریں۔

سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس بارہ سال کے عرصہ میں پھر حدیثوں کے کافی مجموعے لکھے جا چکے تھے۔ شاید اس عرصہ میں حضرت عمرؓ کی طرف سے کچھ ڈھیل بھی لوگوں کو مل گئی ہو کیونکہ جب خود ان ہی کے دل میں حدیثوں کے لکھوانے اور مدون کرانے کا خیال پیدا ہو چکا تھا، تو ایسے زمانے میں دوسروں کو روکنے کی کیا وجہ ہو سکتی تھی مگر استخارہ نے آپ کے اندر جس عزمِ راسخ کو پیدا کیا اس کے بعد خود تو خیر آپ اس ارادے سے ہٹ ہی گئے لیکن اسی کو کافی خیال نہ کیا۔ آپ کو محسوس ہوا ہوگا کہ حکومت کی طرف سے نہ سہی لیکن عمر فاروق کے زمانے کی مدون کی ہوئی حدیث کی کتاب بھی عہدِ فاروقی ہی کی تدوین یافتہ قرار پائے گی۔ بہر حال قاسم بن محمد کا بیان ہے۔

فَلَمَّا اَتَوْهُ بِهَا اَمَرَ بِتَحْرِيْقِهَا۔ (طبقات ج ۵ ص ۱۴۱)	جب الحکم حضرت عمرؓ کے پاس اپنے اپنے مجموعہ کو لوگوں نے پیش کر دیا تب آپ نے ان کو جلانے کا حکم دیا۔

گویا سمجھنا چاہئے کہ حدیثوں کے نذرِ آتش کرنے کا یہ تیسرا تاریخی واقعہ ہے جو حضرت عمرؓ کے زمانے تک پیش آتا رہا ہے۔ پہلی دفعہ تو خود آنحضرتؐ نے اپنے صحابیوں سے لے کر اس کو ختم کیا پھر ابوبکر صدیقؓ نے اپنے مدونہ مجموعہ کے ساتھ یہی کارروائی کی اور تیسرا واقعہ "تدوینِ حدیث" کی تاریخ میں یہ پیش آیا کہ بکثرت حدیثوں کے مجموعے تیار ہوئے لیکن سب کو قسمیں دے دے کر حضرت عمرؓ نے منگوا لیا پھر سب کو تیسری دفعہ آپ نے نذرِ آتش فرما دیا[1]۔

---

[1] اور ان لوگوں کو جنھوں نے مشہور کر رکھا ہے کہ سامانِ کتابت کی کمی یا جہالت وغیرہ کی وجہ سے ڈھائی تین سو سال تک (باقی صفحہ آئندہ پر)

اور یہ کام تو پایۂ تختِ خلافت میں کیا گیا، باقی فتوحاتِ فاروقی نے اسلامی علاقوں کے طول و عرض کو جتنا پھیلا دیا تھا اور ان علاقوں کی حفاظت و صیانت کے لئے "الامصار" یعنی مسلمانوں کی جو چھاؤنیاں قائم کی گئی تھیں اور صحابہ کی بہت بڑی تعداد ان ہی "الامصار" میں جا جا کر جو آباد ہو گئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان امصار میں ہر مصر اور چھاؤنی میں بھی حضرت عمرؓ نے گشتی فرمان جاری کیا۔ حافظ ابوعمرو بن عبدالبر نے جامع بیان العلم میں یحییٰ بن جعدہ کے حوالہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ

اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ اَرَادَ اَنْ یَّکْتُبَ السُّنَّۃَ ثُمَّ بَدَا لَہٗ اَنْ لَّا یَکْتُبَہَا ثُمَّ کَتَبَ فِی الْاَمْصَارِ مَنْ کَانَ عِنْدَہٗ شَیْءٌ فَلْیَمْحُہٗ۔

عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے (پہلے تو) چاہا کہ حدیثوں کو قلمبند کر لیا جائے مگر پھر ان پر واضح ہوا کہ قلم بند کرانا ان کا مناسب نہ ہوگا تب الامصار (یعنی چھاؤنیوں اور دوسرے اضلاعی شہروں) میں یہ لکھ کر بھیجا کہ جس کے پاس (حدیثوں کے سلسلے کی) کوئی چیز ہو چاہیے کہ اسے محو کر دے یعنی ضائع کر دے۔

(جامع بیان العلم ج ۱ ص ۶۵)

اس روایت سے بھی حضرت عروہ کے اس بیان کی تائید ہوتی ہے کہ ارادہ کرنے کے بعد حدیثوں کے لکھوانے کے خیال سے حضرت عمرؓ دست بردار ہو گئے۔ اور دوسرے مسلمانوں سے بھی آپ نے مطالبہ کیا کہ قرآن کے سوا ان کے زمانے کا لکھا ہوا کوئی دوسرا نوشتہ آئندہ پیدا ہونے والے مسلمانوں میں نہ پہنچنے پائے اس میں ان کی مدد کریں۔ یہ مسئلہ کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس گشتی فرمان کی تعمیل میں کتنی سرگرمی دکھائی گئی۔ اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا کہ بجز دو تین مکتوبہ سرمایہ کے حدیثوں کے متعلق ایسا کوئی نوشتہ سرمایہ مسلمانوں میں باقی نہ رہا جس کے متعلق قطعیت کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہو کہ عہدِ فاروقی سے پہلے وہ کتابی شکل اختیار کر چکا تھا۔

بحث کے ختم کرنے سے پہلے ایک شبہ کا ازالہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے یعنی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق مذکورہ بالا روایتوں میں عموماً "السنن" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ میں نے کسی موقعہ پر دعویٰ کیا ہے کہ عام حالات میں "السنن" کا لفظ جب "الفرائض" کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے تو عموماً اس سے مراد قرآنی مطالبات یعنی الفرائض کے عملی تشکیلات ہی ہوتے ہیں، اس بنیاد پر سوال ہو سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے کیا قرآنی مطالبات کے عملی تشکیلات کو لکھوانے کا ارادہ کیا تھا، یا ان کے سوا عام خبرِ آحاد کی ان حدیثوں کو قلم بند کرا لینا چاہتے تھے جن کا علم انفرادی طور پر صحابہ میں پھیلا ہوا تھا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) حدیثوں کو قلمبند ہونے کا موقع نہ ملا۔ سوچنا چاہئے کہ واقعات سے وہ کس درجہ جاہل ہیں۔ حضرت عمرؓ ہی کے عہد تک آپ دیکھ رہے ہیں کہ تین تین دفعہ قلم بند ہونے کے بعد حدیثیں نذرِ آتش کی گئی ہیں۔ عہدِ فاروقی میں قاسم بن محمد کا یہ کہنا کہ قَدْ کَثُرَتِ الْاَحَادِیْثُ عَلٰی عَہْدِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ کیا اس سے نہیں معلوم ہوتا کہ حدیثوں کے بکثرت مجموعے ان کے زمانے میں لکھے جا چکے تھے مگر مطالعہ کے بغیر رائے قائم کرنے والوں کو اس زمانہ میں کون روک سکتا ہے ۱۲

جہاں تک میرا خیال ہے ان روایتوں میں چونکہ "السنن" کا استعمال "الفرائض" کے مقابلہ میں نہیں کیا گیا ہے اس لئے اس کو صرف قرآنی مطالبات کے عملی تشکیلات تک محدود کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی، اگر مان بھی لیا جائے کہ یہاں بھی "السنن" سے مراد قرآنی مطالبات کے عملی تشکیلات ہی تھے تو مسئلہ اور زیادہ واضح ہو جاتا ہے آخر قرآن کے سوا جب قرآنی مطالبات کی عملی شکلوں کو بھی مکتوبہ شکل میں آئندہ نسلوں تک منتقل کرنے پر حضرت عمرؓ آمادہ نہ ہوئے تو عام انفرادی حدیثوں کے متعلق اس باب میں جو منشا ہو گا وہ ظاہر ہے۔

بہرحال حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہی طے کیا کہ قرآن کے سوا جو چیز بھی ان کے زمانہ تک نوشتہ شکل میں آئندہ نسلوں میں پہنچے گی وہ تورات کے مثناۃ[1] کی حیثیت اختیار کرے گی اسی لئے نہ خود اپنی حکومت کی جانب سے اس کام کے انجام دلانے پر آمادہ ہوئے اور جہاں تک ان کے بس میں تھا دوسروں سے بھی انہوں نے یہی چاہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن باتوں کی تبلیغ میں عمومیت کا طریقہ اختیار نہیں فرمایا تھا ان کو ایسے زمانے میں قلمبند نہ کریں جس کے بعد اس مصلحت کے متاثر ہونے کا اندیشہ پیدا ہو سکتا تھا جسے پیشِ نظر رکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ انتظام کیا تھا۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس اندیشے کی تصدیق اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے جو بعد کو پیش آیا تفصیل اس اجمال کی یہ ہے، کہ حدیثوں کے نہ لکھوانے کے اس ارادے کو طے کرنے کے بعد بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی بعض علمی و عملی چیزیں جن کا قرآن میں کم از کم صراحتہً ذکر نہ تھا یعنی چاہنے والا چاہے تو یہ کہہ سکتا ہے کہ قرآن کے رو سے ان کا ماننا ضروری نہیں ہے اپنے اس فیصلہ کے بعد

---

[1] مثناۃ کا یہ لفظ خود حضرت عمرؓ کا ہے جس کا ذکر ابن سعد نے طبقات میں اور دوسری کتابوں میں بھی لوگوں نے کیا ہے کہ اپنے زمانے میں حدیثوں کے قلم بند کرانے کے متعلق حضرت عمرؓ کا خیال تھا کہ یہودیوں کے ہاں توراۃ کے ساتھ جو مثناۃ کی حیثیت ہے وہی حیثیت قرآن کے ساتھ حدیثوں کی اسلام میں ہو جائے گی۔ یہ مثناۃ کیا چیز ہے؟ یہودیوں کا خیال ہے کہ تورات کے ساتھ موسیٰؑ کو زبانی روایات کا بھی ایک ذخیرہ دیا گیا تھا تقریباً ڈیڑھ ہزار سال تک زبانی روایتوں کا یہ سلسلہ یہودیوں کے ہاں قلم بند نہ ہوا، دوسری صدی عیسوی یعنی حضرت موسیٰؑ سے ایک ہزار سات سو سال بعد ابی یہودا حق دوش نے پہلی دفعہ ان کو قلم بند کیا۔ یہی کتاب مثناۃ کے نام سے مشہور ہوئی پھر ایک شرح اس کی یروشلم میں ہوئی اور دوسری بابل میں اسی شرح کو گمرا کہتے ہیں جس کے معنی کمال ہیں مثناۃ اور گمرا کو ملا کر تالمود کہتے ہیں آدم کلارک اور ہارن وغیرہ مفسرین توراۃ نے لکھا ہے کہ پچھلے زمانے میں یہودیوں کے ہاں مثناۃ اور تالمود کی اہمیت تورات سے بہت زیادہ بڑھ گئی۔ توراۃ کو علمائے یہود ناقص، مغلق غیر مفہوم قرار دیتے تھے اور دین کی حقیقی بنا انہوں نے بجائے تورات کے مثناۃ پر آخر زمانہ میں قائم کر دی تھی جیوفس اور دوسری انسائیکلوپیڈیاؤں میں تفصیلات پڑھئے انگریزی نہ جاننے والوں کو مولانا رحمۃ اللہ الہندی کی کتاب اظہار الحق عربی ایڈیشن مطبوعہ مصر ۱۳۱۵ھ ج ۲ ص ۵۶ میں اس سلسلہ میں معلومات مل سکتی ہیں ۱۲

یعنی قرآن کے سوا نوشتہ کی شکل میں کوئی چیز باقی نہ رہے۔ حضرت عمرؓ کو ایک دوسرا خطرہ ستانے لگا یعنی ایسا نہ ہو کہ آئندہ کسی زمانہ میں انکار کرنے والے ان چیزوں کا انکار کر بیٹھیں اور دلیل میں اسی واقعہ کو پیش کریں کہ قرآن میں اس کا ذکر نہیں ہے خصوصاً شادی شدہ

زانی مردوں اور زانیہ عورتوں کے متعلق رجم (سنگسار) کرنے کی جو سزا ہے اس کے متعلق تو یہی نہیں کہ قرآن اس کے ذکر سے ساکت ہے بلکہ سورۃ النور میں زانی اور زانیہ کی سزا جلد (تازیانہ) جو بیان کی گئی ہے یعنی فرمایا گیا ہے۔

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ	زنا کرنے والی عورت اور زنا کرنے والے مرد ہر ایک
مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۔ رکوع ۱، پ ۱۸	کے سو سو کوڑے مارو۔

اس کو پیش کر کے یہ غلط فہمی بھی پھیلائی جا سکتی ہے کہ "رجم" کے قانون کی قرآن سے تو نفی ثابت ہوتی ہے، حالانکہ ایک بے بنیاد غلط فہمی کے سوا یہ اور کچھ نہیں ہے۔ [1]

بہرحال قانونِ رجم کے انکار کے اس خطرے سے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس درجہ متاثر تھے کہ قرآن کے سوا حالانکہ طے کر چکے تھے کہ اپنے زمانہ کی کسی نوشتہ چیز کو مسلمانوں میں منتقل ہونے نہ دوں گا، لیکن اس انکار کے خطرے کی شدت کا احساس کبھی کبھی اتنا بڑھ جاتا تھا کہ اپنے خطبوں میں آپ فرماتے:

لَوْلَا اَنْ يَّقُوْلَ قَائِلُوْنَ زَادَ عُمَرُ فِيْ	اگر اس کا اندیشہ نہ ہوتا کہ کہنے والے یہ کہنے لگیں گے کہ عمرؓ نے
كِتَابِ اللّٰهِ مَا لَيْسَ مِنْهُ لَكَتَبْتُ فِيْ	اللہ کی کتاب میں اس چیز کا اضافہ کر دیا جو قرآن کا جزء نہ تھا تو
نَاحِيَةِ الْمُصْحَفِ (بخاری مـ۱۰۱۳ صحاح)	قرآن کے حاشیہ پر اس کو (یعنی رجم کے قانون کو) لکھ دیتا۔

لیکن مصحف کے حاشیہ پر لکھنے کی جرأت تو وہ کیا کرتے یوں بھی آپ نے اس قانون کو قلم بند کر دینے کی ہمت نہ فرمائی۔ کبھی کبھی "رجم" کے اس قانون کے ساتھ ساتھ ان چیزوں کا بھی ذکر ان الفاظ میں فرماتے کہ:

اِنَّهٗ سَيَكُوْنُ مِنْ بَعْدِكُمْ قَوْمٌ يُّكَذِّبُوْنَ	کچھ لوگ عنقریب آئندہ زمانے میں ایسے بھی آنے والے
بِالرَّجْمِ وَبِالدَّجَّالِ وَبِالشَّفَاعَةِ وَبِعَذَابِ	ہیں جو رجم کے قانون کا اور دجال کے ظہور کا، واقعہ شفاعت
الْقَبْرِ وَبِقَوْمٍ يُخْرَجُوْنَ مِنَ النَّارِ بَعْدَ	کا، عذاب قبر کا اور اس بات کا کہ جلنے کے بعد جہنم سے
مَا امْتَحَشُوْا [2]	بعض لوگ نجات یاب ہوں گے ان ساری باتوں کا انکار
(ازالۃ الخفاء ج ۲ ص ۱۳۶)	کریں گے۔

کیونکہ بظاہر قرآنی آیات سے ان چیزوں کا استنباط بھی ہر شخص کے لئے آسان نہ تھا اسی لئے ان کو خطرہ گزرتا تھا کہ لوگ ان

---

[1] معتزلہ وغیرہ فرقوں نے اس کا دعویٰ کیا بھی ہے حالانکہ رجم کے متعلق زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ قرآن میں تو صرف جلد (تازیانہ) کی سزا کا ذکر ہے لیکن زانی کو رجم کی سزا نہ دی جائے یقیناً قرآن سے یہ سمجھ میں نہیں آتا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے حوالہ سے بخاری میں ان کا یہ قول جو نقل کیا گیا ہے کہ رَجَمْتُهَا بِسُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ (اس عورت کو رجم کی سزا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی بنیاد پر میں نے دی ہے) اس میں تصریح کر دی گئی ہے کہ قرآن پر نہیں بلکہ سنت پر اس قانون کی بنیاد قائم ہے۔ یوں بھی کنوارے اور محصن (شادی شدہ) زانیوں کی سزا میں فرق ایک قدرتی امر ہے ۱۲۔

[2] جن امور کا ذکر حضرت عمرؓ کے اس بیان میں کیا گیا ہے ان میں عذاب قبر کا مسئلہ ایسا ہے جس کے (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ)

باتوں کا کسی زمانہ میں انکار نہ کر بیٹھیں، بظاہر اسی خطرے کے انسداد کی یہ تدبیر حضرت عمرؓ نے نکالی کہ اقلال یعنی جہاں تک ممکن ہو روایتیں کم بیان کی جائیں بجائے اس اقلال کے ان خاص امور کے متعلق اکثار یعنی کثرتِ ذکر کا طریقہ اختیار فرمایا، خصوصاً اپنے خطبوں میں چرچا کر کے ان باتوں کو آپ نے اتنا مشہور کر دیا کہ خبر احاد کی حیثیت باقی نہ رہی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آئندہ علما کو آنحضرتؐ کی حدیثوں کے متعلق مزید ایک اور قسم کا اضافہ کرنا پڑا یعنی متواتر اور خبر آحاد کے بیچ میں مشہور حدیثوں کی ایک اصطلاح مقرر کی گئی جن کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ ان کی حیثیت نہ تو دین کے ان قطعی عناصر اور یقینی اجزا کی ہے جن کا انکار آدمی کو دائرۂ اسلام سے خارج کر دیتا ہے یعنی تواتر کی راہ سے مسلمانوں کی ہر اگلی نسل سے پچھلی نسلوں میں جو چیزیں منتقل ہوتی چلی آ رہی ہیں یہ حیثیت بھی مشہور روایتوں کی نہیں ہے اور نہ ان کی حیثیت خبر آحاد کی ہے۔ لوگوں کا خیال یہ بھی ہے کہ بوجہ شہرت کو طے کر کے مسلمانوں تک جو باتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہو کر پہنچی ہیں ان کا انکار بھی دین سے انکار کرنے والوں کو خارج کر دیتا ہے کہتے ہیں کہ مشہور حنفی امام ابوبکر جصاص کا یہی خیال تھا لیکن عام طور پر علما اس کے قائل نہیں ہیں، میں نے شاید پہلے بھی شمس الائمہ سرخسی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ قانونِ رجم اور مسح خفین جیسے مسائل کے منکر کے متعلق ان کا خیال تھا کہ:

لٰکِنْ یُخْشٰی عَلَیْہِ الْاِثْمُ — گناہ کا اندیشہ کیا جاتا ہے۔

بعضوں نے ان مشہور روایات کو بھی مختلف مدارج میں تقسیم کیا ہے، رجم والے قانون کی مثال دے کر لکھا ہے کہ اس قسم کی مشہور روایتوں کے منکر کو گمراہ قرار دیا جائے گا۔ صاحب کشف بزدوی نے عیسیٰ بن ابان حنفی امام کا قول نقل کیا ہے کہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) اشارات قرآن میں بھی ملتے ہیں، آل فرعون والی آیت اور یُثَبِّتُ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَ فِی الْاٰخِرَۃِ میں بھی لوگوں نے ان اشاروں کو پایا ہے موت کے وقت مرنے والوں کے سامنے جن غیبی حقائق کا ظہور ہوتا ہے ان کا ذکر بھی ایک سے زائد جگہ پر قرآن میں کیا گیا ہے ماسوا اس کے سورۃ النبا کی آخری آیتیں یعنی اِنَّآ اَنْذَرْنٰکُمْ عَذَابًا قَرِیْبًا یَّوْمَ یَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ یَدٰہُ وَیَقُوْلُ الْکٰفِرُ یٰلَیْتَنِیْ کُنْتُ تُرٰبًا (ہم نے دھمکایا تم کو قریب والے عذاب سے جس دن دیکھے گا آدمی ان چیزوں کو جنھیں اس نے اپنے آگے روانہ کیا تھا، اور کہے گا منکر کہ کاش ہم ہوتے خاک) اس آیت میں "عذاب قریب" میں قریب کا لفظ بتاتا ہے کہ کسی بعید عذاب کے مقابلہ میں آدمی قریبی زمانے میں اس سے دوچار ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جہنم کے عذاب بعید کے مقابلہ میں یہ قبری کا عذاب عذاب قریب ہونے کا مستحق ہو سکتا ہے۔ آگے جو یہ کہا گیا کہ بھیجے ہوئے اعمال کو دیکھے گا یہ بھی برزخی عذاب ہی کی خاصیت ہے کہ بجائے بدلہ بھگتنے کے آدمی کے اعمال مختلف شکلوں میں اس کے آگے پیش ہوں گے جن کو دیکھ دیکھ کر گھبرائے گا اور اذیت محسوس کرے گا اور یہی وہ وقت ہے جب آدمی تمنا کرے گا کہ موت کے متعلق اس کا جو یہ خیال تھا کہ ازالہ احساس کی یہ تعبیر ہے یعنی مر کر آدمی مٹی میں مل جاتا ہے خاک دھول بن کر اڑ جاتا ہے کاش وہی واقعہ ہوتا، لیکن صورتِ حال اس سے بالکل مختلف نظر آئے گی یہ ہے وہ مطلب جو ان آیتوں سے میری سمجھ میں آیا ہے۔ اسی بنیاد پر برزخی عذاب کو قرآنی عذاب قرار دیتا ہوں یعنی عذاب قریب میرے نزدیک عذاب قبر ہی کی تعبیر ہے نیز سورۃ الانعام میں اور سورۃ الواقعہ کی بعض آیتوں سے عذاب قبر کی طرف اشارے ملتے ہیں جس کی تفصیل کا یہاں موقعہ نہیں ہے۔ اسی طرح دجال کے شخصی وجود کے سوا شفاعت اور اہل ایمان کا آخری انجام نجات پر ہوگا۔ ان مسائل کو قرآن سے چاہا جائے تو تفکر و تامل کے بعد مستنبط کیا جا سکتا ہے ۱۲

قِسْمٌ يُضَلَّلُ جَاحِدُهٗ وَلَا يُكَفَّرُ مِثْلَ خَبَرِ الرَّجْمِ ۔
(کشف ج ۲ ص ۳۶۹)

ایک قسم مشہور روایتوں کی ایسی بھی ہے کہ اس کے منکر پر کفر کا فتویٰ تو نہیں لگایا جائے گا مگر اس کو گمراہ ٹھہرایا جائے گا مثلاً رجم کی روایت کا یہی حال ہے ۔

بہرحال ان مسائل کی تفصیل میرے سامنے نہیں ہے، بلکہ کہنا یہ ہے کہ مشہور روایتوں کے متعلق یہ مانتے ہوئے کہ

هُوَ اسْمٌ لِخَبَرٍ كَانَ مِنَ الْآحَادِ فِي الْأَصْلِ اَيْ فِي الْاِبْتِدَاءِ (کشف ص ۳۶۸)

کہ خبر مشہور درحقیقت ان ہی خبروں کو کہتے ہیں جو ابتدا میں آحاد ہونے کی حیثیت رکھتی تھیں ۔

لیکن محض اس لیے یعنی

لِاتِّفَاقِ الْعُلَمَاءِ مِنَ الصَّدْرِ الْاَوَّلِ وَالثَّانِيْ عَلٰى قُبُوْلِهٖ ۔ (ص ۳۶۹)

صدر اول (عہد صحابہ) اور دوم (یعنی عہد تابعین) کے علمائے چونکہ ان کے ماننے پر اتفاق کر لیا تھا ۔

اسی لئے کہتے ہیں کہ خبر آحاد کی جو نوعیت ہوتی ہے وہ ان کی باقی نہ رہی بلکہ "صدر اول" میں نہ سہی اس کے بعد بھی یعنی قرن ثانی وثالث تک کے متعلق یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ اس زمانے تک جن خبروں میں شہرت کا رنگ پیدا ہو گیا تھا، ان کا شمار بجائے خبر آحاد کے خبر مشہور میں کیا جائے گا۔ صاحب کشف نے لکھا ہے کہ:

وَالْاِعْتِبَارُ لِلْاِشْتِهَارِ فِي الْقَرْنِ الثَّانِيْ وَالثَّالِثِ وَلَا عِبْرَةَ لِلْاِشْتِهَارِ فِي الْقُرُوْنِ الَّتِيْ بَعْدَ الْقُرُوْنِ الثَّلٰثَةِ [1]
(کشف ص ۳۶۹)

بہرحال قرن دوم وسوم (تابعین و تبع تابعین) کے عہد میں جو چیزیں شہرت کے درجہ تک پہنچ گئی تھیں (ان کی شہرت کا تو اعتبار کیا جائے گا) مگر ان تینوں قرون کے بعد کی شہرت ناقابلِ لحاظ غیر مؤثر قرار پائے گی ۔

جس کا مطلب یہی ہوا کہ "خبر آحاد" والی حدیثوں کے ذخیرہ سے جن روایتوں میں شہرت کی کیفیت عہد صحابہ ہی میں نہیں بلکہ عہد تابعین و تبع تابعین میں پیدا ہو گئی ہو، ان کو بھی مشہور خبروں میں شمار کر لیا گیا ہے [2]

اور یہی میں کہنا چاہتا ہوں کہ قلم بند ہوئے بغیر صرف زبانی چرچے کی زیادتی کی وجہ سے عہد صحابہ ہی نہیں بلکہ اس کے بعد والے دو قرنوں میں بھی جن معدودے چند روایتوں میں شہرت کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی، جب ان کو "خبر آحاد" کے زمرے سے علمائے نے خارج کر دیا تو اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خلافت و حکومت کی طرف سے لکھوایا ہوا حدیثوں کا کوئی مجموعہ مسلمانوں کی پچھلی نسلوں تک منتقل ہوتا ہوا اگر پہنچتا تو اس کے ساتھ لوگوں کے قلبی تعلقات کی جو کیفیت ہو سکتی تھی وہ ظاہر ہے ۔

---

[1] لکھا ہے کہ قرون ثلثہ کے بعد تو تقریباً ساری آحاد خبریں چونکہ مشہور ہو گئیں اس لیے پچھلے قرون کی شہرت کا اعتبار نہ کیا جائے گا ۔ ۱۲

[2] اگرچہ ان مشہور روایتوں میں ایسی روایتیں جن میں شہرت کا رنگ عہد صحابہ میں پیدا ہو چکا تھا اس کو مشہور روایتوں کی ان قسموں پر ترجیح دی جاتی ہے جن میں یہی کیفیت بعد والے قرون میں پیدا ہوئی، تاہم اجمالی طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ شہرت کے درجہ تک ان تینوں قرون میں سے کسی قرن کے اندر جو روایتیں پہنچ گئی تھیں ان کو خبر آحاد کی مد سے نکال کر مشہور روایتوں میں داخل کر دیا جائے گا تفصیل کے لیے اصولِ فقہ کی کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیے ۱۲

رہا یہ مسئلہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن چیزوں کو احادِ خبروں کی شکل میں چھوڑا تھا ان میں سے بعض چیزوں میں حضرت عمرؓ نے خواہ زبانی تذکروں کے ذریعے سے شہرت کا رنگ کیوں پیدا کیا؟ یا حضرت عمرؓ کے بعد قرن ثانی و ثالث والوں نے ان روایتوں کو کیوں مشہور کر دیا یہ ایک جداگانہ بحث ہے اور "علاوہ" مصالح مرسلہ" کے جیسے خلفاء راشدین کے خصوصی اختیارات میں شمار کیا جاتا ہے قرون مشہود لھا بالخیر کے فیصلوں کے متعلق بھی یہ مانا گیا ہے کہ خاص دینی بصیرت ہی کے تحت ان کو بھی مناسب نظر آیا کہ بجائے خبرِ آحاد کی شکل میں باقی رکھنے کے ان میں شہرت کی کیفیت پیدا کر دی جائے۔

کچھ بھی ہو مجھے اس سے بحث بھی نہیں اور علماء نے لکھا بھی ہے کہ صحابہ کے بعد والے قرون میں جو روایتیں مشہور ہوئی ہیں، ان کے انکار کرنے والوں کو زیادہ سے زیادہ خطاکار قرار دیا جا سکتا ہے، لیکن کفر ہی نہیں بلکہ گمراہی کا انتساب بھی انکار کرنے والے کی طرف مشکل ہے جیسے خلفاء راشدین کے عہد میں مشہور ہونے والی روایتوں کے منکروں کی تضلیل کا فیصلہ کیا گیا ہے یعنی ان لوگوں کو گمراہ سمجھا جائے گا جو خلفائے راشدین کے زمانہ میں مشہور ہو جانے والی روایتوں کے نتائج کا انکار کرتے ہیں اور میرے نزدیک مومن کے ایمان کا اقتضاء بھی یہی ہے۔

یہ تھی روداد ان خدمات کی جو عہدِ فاروقی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کے متعلق انجام دی گئی جن کا حاصل یہی ہے کہ بجز چند خاص روایتوں کے خبرِ آحاد کے سارے ذخیرے کو خبرِ آحاد ہی کی شکل میں باقی رکھنے کی جو ممکنہ تدبیریں ہو سکتی تھیں حضرت عمرؓ نے ان کے اختیار کرنے میں پوری مستعدی اور بیدار مغزی سے کام لیا۔ کوشش کا کوئی دقیقہ اس راہ میں اٹھا نہ رکھا، اور ان چند روایتوں کو شہرت کے درجہ تک پہنچانے کی کوشش آپ نے جو کی اس کی وجہ یا تو یہی ہو سکتی ہے کہ ان کی بصیرت کو اسی میں مصلحت نظر آئی، یا ممکن ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص منشار کا علم ان امور کے متعلق کچھ ہو جس سے نبوت کے خصوصی مذاق شناس حضرات ہی واقف ہو سکتے تھے۔

یہاں ایک بات یاد رکھنے کی یہ بھی ہے کہ "مشہور حدیث" کا مطلب چونکہ یہ ہے کہ ابتداءً میں خبرِ احاد کی شکل میں رہنے کے بعد صحابہ اور تابعین و تبع تابعین کے زمانہ میں عام طور پر اتنی مشہور ہو گئی کہ

رَوَتْهُ جَمَاعَةٌ لَا يُتَصَوَّرُ تَوَاطُؤُهُمْ عَلَى الْكِذْبِ۔ (کشف ج ۲ ص ۳۶۷)

اتنے آدمیوں نے ان کو بیان اور روایت کیا ہے جن کے متعلق یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ خواہ مخواہ وہ جھوٹ پر متفق ہو گئے تھے۔

جس کا حاصل یہ ہوا کہ متواتر اور مشہور میں فرق صرف اس قدر ہے کہ متواتر روایات میں تو ضروری ہے کہ ابتداء سے آخر تک ایسی جماعت اس کو بیان کرتی ہو جس کے متعلق غلط بیانی کا احتمال باقی نہ رہے، عقل کے لئے ناممکن ہو جائے کہ اس کو جھوٹ قرار دے اور مشہور روایتوں میں بھی گو یہی کیفیت پائی جاتی ہے الا یہ کہ ابتداءً میں اس کی حیثیت چونکہ خبرِ آحاد کی تھی اس لئے متواتر روایتوں کی قوت کا مقابلہ نہیں کر سکتی، اس معیار پر عہدِ فاروقی میں مشہور ہو جانے والی روایتوں کی تعداد بہت تھوڑی نکلے گی، شاید وہی چند باتیں جن کا تذکرہ حضرت عمرؓ اپنے خطبات میں کرتے تھے اور ان کو خطرہ تھا کہ آئندہ انکار کرنے والے کہیں ان کے انکار پر جری نہ ہو جائیں، ان کے سوا مشکل ہی سے کسی چیز کا ان پر اضافہ ہو سکتا ہے۔

ؔ تفصیلات اصولِ فقہ کی کتابوں خصوصاً کشف بزدوی میں پڑھیے ۱۲

اسی کے ساتھ ہمیں یہ بھی بھولنا نہ چاہیئے کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں جیسے مشہور روایتوں کی شکل ان چند چیزوں نے اختیار کی، وہیں آپ ہی کے زمانے میں یہ بھی طے کیا گیا کہ کسی واحد خبر کا مفاد اگر قرآنی نص کے خلاف ہو تو ترجیح ہمیشہ قرآن ہی کو دی جائے گی۔ غیر حاملہ یعنی حائل عورت کو جب ایسی طلاق دی جائے جس کے بعد نکاح جدید کے بغیر پھر اس عورت کو طلاق دینے والا زن وشوہر کے تعلقات کو جاری نہیں رکھ سکتا۔ اس کے نان ونفقہ اور سکنیٰ (جائے سکونت) کے متعلق یہ سوال جب اٹھا کہ عدت کے زمانے میں طلاق دینے والے شوہر پر یہ چیزیں یعنی نان ونفقہ وغیرہ واجب ہے یا نہیں اور ایک خاتون صاحبہ فاطمہ بنت قیس نامی جن کے ساتھ طلاق کی یہی صورت پیش آئی تھی انہوں نے یہ بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نفقہ اور سکنیٰ کو شوہر پر عائد نہیں کیا تھا، تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نزدیک چونکہ فاطمہ بنت قیس کی یہ روایت کتاب یعنی قرآنی نص کے خلاف تھی آپ نے اعلان کیا کہ

لَا نَتْرُكُ كِتَابَ اللّٰهِ وَسُنَّةَ نَبِيِّهٖ
بِقَوْلِ امْرَأَةٍ حَفِظَتْ اَمْ نَسِيَتْ۔
(صحاح)

ہم اللہ کی کتاب اور اللہ کے نبی کے طریقہ کو کسی ایسی عورت کے کہنے سے چھوڑ نہیں سکتے جس کے متعلق نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے یاد رکھا یا بھول گئی۔

عہدِ عثمانی اور تدوینِ حدیث

بہر حال عہدِ فاروقی ان ہی حالات میں ختم ہوا آپ کے بعد حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کی خلافت کا زمانہ آیا، علمی خدمات کے لحاظ سے عثمانی عہدِ خلافت کا سب سے بڑا کارنامہ وہ ہے جس کی وجہ سے آج تیرہ ساڑھے تیرہ سو سال تک سارے جہاں کے مسلمانوں میں قرآن مجید کا ایک ہی نسخہ مروج ہے۔ "تدوینِ قرآن" نامی کتاب میں اس مسئلہ کی پوری تفصیل بیان کی گئی ہے۔[2]

حدیث کے سلسلے میں حضرت عثمانؓ سے تدوینِ حدیث کی تاریخوں میں لوگوں نے کسی خاص واقعہ کا ذکر اگرچہ نہیں کیا ہے لیکن حضرت عثمانؓ سے جو روایتیں کتابوں میں نقل کی گئی ہیں ہم ان ہی میں ایک اس روایت کو بھی پاتے ہیں۔ مسند احمد میں ہے کہ آپ فرمایا کرتے تھے۔

مَا يَمْنَعُنِيْ اَنْ اُحَدِّثَ عَنْ
رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
اَنْ لَّا اَكُوْنَ اَوْعٰى اَصْحَابِهٖ عَنْهُ
وَلٰكِنِّيْ اَشْهَدُ لَسَمِعْتُهٗ يَقُوْلُ مَنْ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کے بیان کرنے میں مجھے یہ چیز نہیں روکتی کہ دوسرے صحابیوں سے حدیثوں کے یاد رکھنے میں کچھ کم ہوں مگر بات یہ ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جس نے میری طرف

---

[1] یہ مسئلہ کہ قرآن کی کس آیت کے خلاف حضرت عمرؓ نے فاطمہ والی روایت کو قرار دیا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کس سنت کا حضرت کو علم تھا فاطمہ کی روایت اس کے مخالف تھی یہ بڑا تفصیلی مسئلہ ہے حدیث وشروح حدیث کی کتابوں میں اس کی تفصیل ملے گی۔۱۲

[2] اسی کتاب کا جوہری خلاصہ ہمارے عزیز شاگرد مولوی غلام ربانی ایم اے حیدرآبادی نے کیا، ندوۃ المصنفین دہلی کے مکتبہ نے اس کو شائع بھی کر دیا ہے اس خلاصہ کے بعد یہ واقعہ ہے کہ میری اصل کتاب بھی شائع نہ ہو تو اس کی ضرورت باقی بھی نہیں رہتی ہے ۱۲۔

قَالَ عَلَيَّ مَا لَمْ اَقُلْ فَلْيَتَبَوَّاْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ۔ (ص ۶۵)

کوئی ایسی بات منسوب کی ہے جو میں نے نہ کہی ہو تو چاہیے کہ اپنا ٹھکانا وہ دوزخ میں بنالے

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کافی حدیثیں حضرت عثمان رض کو بھی یاد تھیں، لیکن ان کی عمومی اشاعت سے آپ بھی پرہیز کرتے تھے، کیوں کرتے تھے؟ ممکن ہے کہ مذکورہ الفاظ سے یہ نتیجہ بھی نکالا جائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کسی غلط بات کے منسوب ہو جانے کا اندیشہ حضرت عثمان رض کو تھا۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ جب دوسرے صحابیوں کے مقابلہ میں خود ان کا دعویٰ تھا کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کم حدیثیں محفوظ نہیں ہیں۔ تو حفظ و یاد کے اس دعوے کے بعد ان کے کلام کو اس پر محمول کرنا کہ اپنی یاد پر حضرت رض کو کامل بھروسا نہ تھا اس لئے روایت سے پرہیز کرتے تھے، کچھ بے جوڑ سی بات معلوم ہوتی ہے۔

میرا تو خیال یہی ہے کہ وہی بات یعنی خلیفہ ہونے کی حیثیت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کی اشاعتِ عام کا طریقہ اگر وہ اختیار کرتے تو ظاہر ہے کہ ہر طرح کے لوگ ان سے سنی ہوئی روایت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنے کی جرأت کرتے۔ حضرت عثمان رض کو زیادہ سے زیادہ اعتماد اپنے حافظہ اور اپنی یاد پر ہو سکتا تھا لیکن ان سے سن کر روایت کرنے والے بھی صحیح طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اسی بات کو منسوب کریں گے، جو کچھ انہوں نے سنا ہے حضرت عثمان رض کو چونکہ اس پر بھروسا نہ تھا اندیشہ تھا کہ اس راہ سے پیغمبر کی طرف غلط بات منسوب نہ ہو جائے اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو حدیثیں آپ نے سنی تھیں ان کی اشاعت عام نہیں فرماتے تھے اور اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ خبر آحاد کی ان روایتوں کو جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عام مسلمانوں میں اشاعت ضروری خیال نہ فرمائی، اسی طرح آپ کے خلفاء نے بھی یہی طرزِ عمل دین کے اس غیر بنیاتی حصہ کے متعلق اپنے اپنے زمانہ میں اختیار فرمایا۔ اسی سے اندازہ کیجئے کہ ایک دفعہ برسرِ منبر حضرت عثمان رض لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمانے لگے، مسند احمد ہی میں ہے:۔

عَنْ اَبِيْ صَالِحٍ مَوْلٰى عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ سَمِعْتُ عُثْمَانَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ يَقُوْلُ اَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ كَتَمْتُكُمْ حَدِيْثًا سَمِعْتُهٗ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَرَاهِيَةَ تُفَرِّقُكُمْ عَنِّيْ۔

حضرت عثمان رض کے غلام ابو صالح سے مروی ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عثمان رض کو یہ فرماتے ہوئے سنا وہ کہہ رہے تھے لوگو! ایک حدیث جسے میں نے رسول اللہ ص سے سنا ہے اسے تم لوگوں سے اب تک اس لئے چھپاتا رہا کہ تم کو یہ حدیث مجھ سے جدا کر دے گی۔

(ص ۶۵)

پھر آپ نے فرمایا کہ:

ثُمَّ بَدَا لِيْ اَنْ اُحَدِّثَكُمُوْهُ لِيَخْتَارَ امْرُءٌ لِنَفْسِهٖ مَا بَدَا لَهٗ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ رِبَاطُ

مگر مجھے یہی محسوس ہوا کہ میں اس حدیث کو تم سے بیان ہی کر دوں، پھر اس حدیث کے سننے کے بعد جو اپنے لئے جس پہلو کو چاہے آدمی اختیار کرے میں نے رسول اللہ

يَوْمٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ تَعَالٰى خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ فِيْمَا سِوَاهُ مِنَ الْمَنَازِلِ۔

صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ اللہ کی راہ میں ایک دن کا رباط (یعنی اسلامی سرحدوں کی چھاؤنیوں میں بہ نیت جہاد قیام) دوسری جگہوں میں ہزار دن گزارنے سے بہتر ہے۔

اور یہی خبر آحاد کی حدیثوں کے استعمال کا صحیح مقام ہے جس کی طرف حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اشارہ فرمایا کہ ان سے عمل کی محرومی عام دینی ثمرات سے گو آدمی کو محروم نہیں کرتی لیکن دین میں جو آگے بڑھنا چاہتے ہیں وہ چاہیں تو ان حدیثوں سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

لیکن بایں ہمہ حضرت عثمان رضؓ ہی کو ہم دیکھتے ہیں کہ الواحد بعد الواحد ہی کی راہ سے سہی، جب کبھی ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منشا مبارک کی خبر ہو جاتی تھی تو بجائے اپنی رائے کے اسی خبر واحد کی تعمیل کو اپنی سعادت خیال فرماتے تھے۔ اسی سلسلہ میں ایک دلچسپ قصہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت عثمان رضؓ حج کے ارادے سے مکہ معظمہ تشریف لے جا رہے تھے جب قدید نامی مقام پر پہنچے تو آپ کے باورچی خانے میں چند چکور گاؤں والوں نے شکار کر کے پہنچا دیئے، چکوروں کو بھون کر اور کھانوں کے ساتھ طشت میں مرتب کر کے حضرت عثمان رضؓ کے دسترخوان پر لوگوں نے چن دیا، راوی کا بیان ہے کہ:

كَاَنِّيْ اَنْظُرُ اِلَى الْحَجَلِ حَوَالِي الْجِفَانِ

ہم ان بھنے ہوئے چکوروں کو گویا طشت کے کنارے چنا ہوا دیکھ رہے ہیں۔

حضرت عثمان رضؓ اپنے رفقاء کے ساتھ جب دسترخوان پر بیٹھے تو دیکھا کہ بعض لوگ کھانے سے رک رہے ہیں وجہ دریافت کی تو لوگوں نے کہا کہ قافلہ میں حضرت علی رضؓ بھی ہیں، ان کا بیان ہے کہ حج کے احرام کی حالت میں شکار کے گوشت کا کھانا جائز نہ ہوگا، سننے کے ساتھ ہی حضرت علیؓ کو حضرت عثمان رضؓ نے بلا بھیجا، دونوں میں گفتگو ہوئی، حضرت عثمان رضؓ نے فرمایا کہ:

"یہ شکار ہے جسے نہ میں نے شکار کیا ہے، اور نہ اس کے شکار کرنے کا حکم میں نے دیا تھا۔ گاؤں والے جو احرام کی حالت میں نہ تھے یہ ان کا شکار کیا ہوا ہے اور میرے پاس ان ہی لوگوں نے کھانے کے لئے بھیجا ہے، پھر اس کے کھانے میں کیا مضائقہ ہے۔"

علی کرم اللہ وجہہ نے یہ سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل کا تذکرہ فرماتے ہوئے کہا کہ:

احرام ہی کی حالت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک گورخر کی ران تحفہ میں ایک شخص نے پیش کی تھی لیکن رسول اللہؐ نے فرمایا کہ ہم لوگ احرام کی حالت میں ہیں، پس چاہئے کہ یہ ران ان لوگوں کو کھلا دی جائے جو احرام کی حالت میں نہیں ہیں۔

بعض دوسرے صحابی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس سفر میں ساتھ تھے، انہوں نے بھی اس کی تصدیق کی۔ بہرحال کہنا یہ ہے کہ جوں ہی حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کی یہ روایت حضرت عثمان رضؓ کو پہنچی لکھا ہے کہ دسترخوان سے اٹھ گئے اور

فَدَخَلَ رَحْلَهٗ وَاَكَلَ ذٰلِكَ الطَّعَامَ

اپنے خیمے میں چلے گئے اور گاؤں والوں نے

اَھْلُ النِّمَاءِ[۱] ۔ (مسند احمد ص ۱۰۰) اس کھانے کو کھا لیا ۔

اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اپنے اجتہاد و تفقہ کی روشنی میں حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ جس نتیجہ تک پہنچے تھے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سن کر اس سے دست بردار ہو گئے حالانکہ چاہتے تو گفتگو کر سکتے تھے اور بعد کو جیسا کہ حاشیہ کے تفصیلات سے معلوم ہوا ہوگا ائمہ اجتہاد کی اکثریت نے حضرت علیؓ کی بیان کی ہوئی اس روایت کے مقابلہ میں ابو قتادہؓ[۲] کی روایت کو ترجیح دی حنفیوں اور مالکیوں کا یہی مذہب

---

[۱] اس مسئلہ میں کہ خشکی کے شکار کو بحالتِ احرام کسی نے خود شکار نہ کیا ہو بلکہ جو حالتِ احرام میں نہ ہو اسی کا شکار کیا ہوا ہو، محرم یعنی جو احرام باندھے ہوئے ہو کیا اس شکار کے گوشت کو استعمال کر سکتے ہیں۔ امام ابو حنیفہ کا مذہب یہی نقل کیا جاتا ہے کہ کھا سکتے ہیں لیکن شوافع حضرت علیؓ کی اسی روایت کی بنیاد پر کھانے کی اجازت نہیں دیتے مسئلہ میں ہر فریق کے دلائل فقہ و حدیث کی شروح میں تلاش کیجئے۔ حنفیہ کا خیال ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ران اس لئے واپس نہ کی تھی کہ اس کا کھانا بحالتِ احرام ناجائز تھا کیونکہ دوسری روایت صحاح ہی کی حضرت ابو قتادہ والی سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت نے خود بھی احرام کی حالت میں اس قسم کے شکار کے گوشت کو استعمال فرمایا اور دوسروں کو بھی اجازت دی۔ پس ران کے واپس کرنے کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ احرام کی حالت میں شکار کرنے کی ہمت افزائی نہ ہو یعنی ممانعت سد الذریعہ کے تحت کی گئی تھی ۱۲

[۲] یہ روایت صحاح ستہ کی ہر کتاب میں مل سکتی ہے، روایت چونکہ ذرا دلچسپ ہے جی چاہتا ہے ۔ کہ اس کا تذکرہ کر دوں، ابو قتادہ صحابیؓ کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم احرام باندھ کر صحابیوں کے ساتھ مکہ معظمہ کے قصد سے تشریف لے جا رہے تھے، یہ صلح حدیبیہ والے سفر کا واقعہ ہے، ابو قتادہ کہتے ہیں کہ میں نے احرام نہیں باندھا تھا لیکن احرام بند لوگوں کے ساتھ ساتھ جا رہا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم لوگوں سے آگے تشریف لے جا رہے تھے بہر حال میں ان ہی احرام بند لوگوں کے قافلہ میں تھا میری چپل ٹوٹ گئی تھی اُسے درست کر رہا تھا۔ اچانک ان ہی لوگوں کی جو احرام کی حالت میں تھے ایک گورخر پر نظر پڑی، میں تو چپل کے سینے میں مشغول تھا گورخر کے دیکھنے والے چونکہ حالتِ احرام میں تھے اور قاعدہ ہے کہ احرام کی حالت میں شکار کرنے کی بھی ممانعت ہے اور شکار کی طرف اشارہ کرنے کی بھی، گورخر کے دیکھنے والے سخت کش مکش میں تھے مجھ سے وہ کچھ کہہ بھی نہیں سکتے تھے، لیکن دل سب کا چاہتا تھا کہ میں چونکہ احرام کی حالت میں نہیں ہوں کاش میری نظر اس گورخر پر پڑ جاتی۔ ابو قتادہؓ سے بعض روایتوں میں یہ بھی مروی ہے کہ گورخر کے دیکھنے والی جماعت میں بعض لوگوں نے بعض کو دیکھ کر آپس میں ہنسنا شروع کیا۔ شاید ان کے ہنسنے پر ان کی نظر اٹھی، سامنے دامنِ کوہ میں گورخر کھڑا ہوا تھا، اس پر نظر پڑ گئی، ابو قتادہ بڑے مشتاق شکاری تھے۔ نظر پڑنے کے ساتھ گھوڑے پر سوار ہو کر چاہا کہ گورخر پر حملہ کریں لیکن جلدی میں نہ کوڑا ہی لے سکتے تھے اور نہ نیزہ تب ان احرام بند لوگوں سے کہا کہ میرا کوڑا اور نیزہ تو دے دو لیکن سبھوں نے شکار کرنے کے اس فعل میں امداد دینے سے انکار کیا۔ حضرت ابو قتادہ کہتے ہیں کہ مجھے ان کے انکار پر غصہ بھی آیا مگر کرتا کیا گھوڑے سے اترا، کوڑے اور نیزے کو لے کر میں نے گھوڑے کو گورخر پر ڈال دیا بہت جلد وہ میری زد میں آگیا نیزے سے میں نے اس کو گرا لیا، جب شکار ہو چکا تو ان احرام بندوں نے گوشت کے کھانے میں شرکت کی مگر بعد کو لوگ شک میں مبتلا ہوئے۔ ابو قتادہؓ کہتے ہیں کہ اس گورخر کی ایک ران میں نے چھپالی تھی ۔ اسی حال میں قافلہ آگے روانہ ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مل گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے قصہ پیش کیا گیا۔ یہ سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کچھ گوشت باقی بھی رہ گیا ہے۔ (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ)

ہے جسے حضرت عثمان رضؓ نے ان الفاظ میں پیش کیا تھا۔

صَيْدٌ لَمْ نَصْطَدْهُ وَلَمْ نَامُرْ بِصَيْدِهٖ اِصْطَادَهٗ قَوْمٌ حِلٌّ فَاَطْعَمُوْنَاهُ فَمَا بَاْسٌ۔

شکار ہے جسے نہ ہم نے خود شکار کرنے کا اس کے حکم دیا، یہ ان لوگوں نے شکار کیا ہے جو احرام بند نہ تھے انہوں نے میرے پاس کھانے کے لیے بھیجا تو اس کے کھانے میں کیا مضائقہ ہے۔

لیکن سچی بات یہ ہے کہ فطرۃً وہ بڑے نرم دل آدمی تھے، اختلاف اور مقابلہ پر ڈٹنے سے ان کی طبیعت کو دور کا لگاؤ بھی نہ تھا۔ حدیث پیش کی گئی، خاموش ہوگئے اور اسی پر عمل کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔

مگر اسی کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ آپ کی اسی فطری نرم مزاجی اور شرمیلی طبیعت نے لوگوں کی ہمتیں بلند کر دیں گو اپنی حد تک پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی خدمت کے متعلق جو کچھ وہ کر سکتے تھے کرتے رہے لیکن عنقریب معلوم ہوگا کہ "حدیث" میں فتنے کی ابتدا جن لوگوں کی راہ سے ہوئی یہ وہی تھے جن کے لیے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نرم حکومت نے بدبختانہ جسارتوں کے ارتکاب کے مواقع فراہم کر دیئے تھے۔

عہدِ مرتضوی اور تدوینِ حدیث

میں نے پہلے بھی کہیں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی عام عادت تھی کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے کوئی بات آپ کے سامنے اگر کوئی بیان کرتا تو آپ اس سے قسم لیتے تھے شاید اس کی ایک وجہ عہدِ عثمانی کے وہ فتنے اور فساد بھی ہوں جو مسلمانوں میں پھوٹ پڑے تھے، یوں بھی اسلام کا دائرہ بہت زیادہ وسیع ہو چکا تھا نہ صرف مقبوضات کا بلکہ مختلف اقوام اور طبقات کے لوگ مسلمان ہو ہو کر اسلامی جماعت میں فوج در فوج شریک ہوتے چلے جاتے تھے اور جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا ان میں طرح طرح کے لوگ تھے، سب کے ایمان و اسلام کی وہی حالت نہ تھی جو صحابۂ کرام کی تھی۔ ان ہی امور کے احساس کا غالباً یہ نتیجہ بھی تھا کہ حضرت علیؓ عموماً منبر سے اس حدیث کا اعلان فرمایا کرتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :۔

لَا تَكْذِبُوْا عَلَيَّ فَاِنَّهٗ مَنْ يَّكْذِبْ عَلَيَّ يَلِجُ فِي النَّارِ۔

میری طرف جھوٹی بات ہرگز منسوب نہ کیا کرو جو میری طرف منسوب کر کے جھوٹی بات بیان کرے گا وہ آگ میں جھونکا جائے گا۔

(مسند احمد ج ۱ ص ۸۳)

نہ صرف دوسروں ہی کے متعلق یہ فرماتے تھے بلکہ خود اپنی طرف اشارہ کر کے آپ نے متعدد موقعوں پر اس فقرے کو دہرایا ہے کہ :

(باقی حاشیہ صہ گزشتہ) ان جسے میں نے چھپا رکھی تھی رسول اللہؐ کی خدمت میں اس کو پیش کر دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کا گوشت تناول فرمایا حالانکہ آپ بھی احرام ہی کی حالت میں تھے بعض روایتوں میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے دریافت کیا کہ احرام بندوں سے کسی نے شکار کی طرف اشارہ تو نہیں کیا تھا ۱۲

لَاَنْ اَخِرَّ مِنَ السَّمَاءِ اَحَبُّ اِلَیَّ مِنْ اَنْ اَکْذِبَ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صلی اللہ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ۔ (مسند احمد ج ۱ ص ۸۱)

آسمان سے میں گر پڑوں یہ میرے لیے زیادہ آسان ہے اس بات سے کہ رسول اللہ کی طرف غلط بات کو منسوب کرکے بیان کروں۔

اور جیسے دوسروں سے آپ قسم لیتے تھے اسی طرح یہ بھی ہم دیکھتے ہیں کہ پوچھنے والا حضرت علیؓ کی کسی حدیث کے بیان کرنے کے بعد اگر یہ پوچھتا کہ کیا واقعی آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث سنی ہے تو جواب میں خود بھی قسم کھاتے ہوئے فرماتے:

اِیْ وَرَبِّ الْکَعْبَۃِ (مسند احمد ج ۱ ص ۱۲۱) ہاں! (آنحضرتؐ نے فرمایا) قسم ہے کعبہ کے رب کی۔

حالانکہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے عہدِ خلافت تک نبوت سے زمانہ کا فاصلہ کافی دور ہو چکا تھا لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو باتیں آحاد کی شکل میں حضرت علیؓ تک پہنچی تھیں، میں نے پہلے بھی کہیں لکھا ہے کہ خود ذاتی طور پر ان کا ایک حصہ حضرت علیؓ کے پاس مکتوبہ شکل میں بھی تھا جس کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان حدیثوں کو آپ نے کس زمانہ میں قلمبند فرمایا تھا تاہم لکھی ہوئی شکل میں ان کے پاس کچھ حدیثیں ضرور تھیں۔ لوگوں کے دریافت کرنے پر جن کے متعلق آپ یہ اقرار بھی فرماتے تھے کہ میری تلوار کی نیام میں وہ نوشتہ رکھا ہوا ہے لیکن اس کی اشاعتِ عام نہ ابوبکر صدیقؓ کے زمانہ میں آپ نے کی اور نہ عمرؓ کے عہد میں اور نہ عثمانؓ کے عہد میں حتی کہ خود آپ کے خلافت کے زمانہ میں بھی لوگوں نے چاہا کہ عام لوگوں میں ان حدیثوں کی اشاعت کر دی جائے مگر جہاں تک روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس سے انکار ہی کرتے رہے، لیکن جب اصرار حد سے زیادہ لوگوں کا گزر گیا۔ نیز خیال بعضوں کا یہ ہونے لگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو کچھ خاص باتوں کی وصیت کی ہے اور اس سے مختلف قسم کے خود آفریدہ مغالطوں میں مبتلا کرنے کا موقعہ ان لوگوں کو مل رہا تھا جنھوں نے حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں فساد اور فتنے کا ایک باضابطہ پروگرام تیار کیا تھا تو جیسا کہ مسندِ احمد میں ہے کہ آخر ایک دن آپ نے کہا کہ

مَا عَهِدَ اِلَیَّ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ شَیْئًا خَاصَّۃً دُوْنَ النَّاسِ اِلَّا شَیْءٌ سَمِعْتُہٗ مِنْہُ فَھُوَ فِیْ صَحِیْفَۃٍ فِیْ قِرَابِ سَیْفِیْ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عام لوگوں سے الگ مجھ سے کوئی ایسی بات بطور عہد کے نہیں فرمائی ہے بجز اس کے کہ میں نے آپ سے چند باتیں سنی ہیں وہ اس صحیفہ میں لکھی ہوئی ہیں جو میری تلوار کی نیام میں رکھا ہوا ہے۔

آگے راوی کا بیان ہے کہ

فَلَمْ یَزَالُوْا بِہٖ حَتّٰی اَخْرَجَ الصَّحِیْفَۃَ ۔ (مسند احمد ص ۱۱۹)

لوگ اس (صحیفہ کے دکھلانے) پر مُصر ہوئے یہاں تک کہ آپ نے اس صحیفہ کو (نیام سے) نکالا۔

ظاہر ہے کہ اس کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ آپ کی خواہش تو یہی تھی کہ ان حدیثوں کی اشاعت میں جنھیں آپ نے اپنی یادداشت کے لئے قلم بند فرمایا تھا، عمومیت کا رنگ پیدا نہ ہو، لیکن لوگوں کی طرف سے اصرار میں شدت بڑھتی چلی گئی۔ نیز خطرہ اس کا ہوا کہ خدا جانے لوگ کیا سمجھ بیٹھیں، آپ نے لوگوں کو دکھا دیا کہ اس میں معمولی دینی مسائل ہیں، اس قسم کے شکوک کا اس سے ازالہ بھی ہو گیا کہ آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم نے صیغۂ راز میں ان کو کچھ خاص رموز و اسرار کی نوعیت کی چیزیں وصیت فرمائی تھیں جنھیں مختلف طریقوں سے لوگوں نے پھیلانا شروع کیا تھا، خود ان ہی روایتوں سے جن میں حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کے اس صحیفہ کا ذکر ہے، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ کے متعلق اس قسم کی باتیں لوگوں میں پھیلنی شروع ہو گئی تھیں، مثلاً قتادہ ابوحسان کے حوالے سے اسی صحیفۂ علی کے قصے کو جب بیان کیا کرتے تھے تو شروع میں کہتے کہ ابوحسان کا بیان ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قاعدہ تھا کہ جب کسی کام کے کرنے کا حکم دیتے اور لوگ آ کر عرض کرتے کہ جو حکم دیا گیا تھا اس کی تعمیل ہو گئی تو زبانِ مبارک پر بے ساختہ صَدَقَ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ (اللہ اور اللہ کے رسول نے سچ کہا) کے الفاظ جاری ہو جاتے الاشتر النخعی نے ایک دن حضرت سے آ کر کہا کہ آپ کے اس طریقہ کا یعنی اس قسم کے مواقع میں صدق اللہ ورسولہ عام طور پر جو آپ فرما دیتے ہیں اسی لوگوں میں آپ کے متعلق یہ بات پھیل گئی ہے اشتر نے اس کے بعد کہا کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ خاص باتیں آپ سے کہی ہیں؟ اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ کچھ غلط فہمیاں ضرور پھیلی ہوئی تھیں، مسند احمد ہی کی روایت میں یہ بھی ہے کہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا

یَرْحَمُ اللّٰہُ عَلِیًّا رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ اَنَّہٗ کَانَ مِنْ کَلَامِہٖ لَا یَرٰی شَیْئًا یُعْجِبُہٗ اِلَّا قَالَ صَدَقَ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ فَیَذْھَبُ اَھْلُ الْعِرَاقِ یَکْذِبُوْنَ عَلَیْہِ وَیَزِیْدُوْنَ عَلَیْہِ فِی الْحَدِیْثِ۔ (ج ۱ ص ۸۶)

علیؓ پر خدا رحم کرے بات کرنے میں ان کی عادت تھی جب کوئی حسب دلخواہ بات دیکھتے تو کہتے کہ سچ کہا اللہ اور اس کے رسول نے، عراق والے (ان کے اسی عام فقرے کی بنیاد پر) ان کی طرف جھوٹی باتیں منسوب کرنے لگے اور بڑھا چڑھا کر ان کی طرف باتوں کو منسوب کرنے لگے۔

بلکہ مسند احمد ہی میں طارق بن شہاب کے حوالہ سے جو روایت نقل کی گئی ہے، یعنی طارق کہتے تھے:

رَاَیْتُ عَلِیًّا رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ عَلَی الْمِنْبَرِ یَخْطُبُ وَعَلَیْہِ سَیْفٌ حلیتہ مِنْ حَدِیْدٍ فَسَمِعْتُہٗ یَقُوْلُ وَاللّٰہِ مَا عِنْدَنَا کِتَابٌ نَقْرَءُہٗ عَلَیْکُمْ اِلَّا کِتَابُ اللّٰہِ وَھٰذِہِ الصَّحِیْفَۃُ اَعْطَانِیْھَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْھَا فَرَائِضُ الصَّدَقَۃِ (ج ۱ ص ۱۱۹)

میں نے منبر پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو خطبہ دیتے ہوئے دیکھا ان کی کمر میں تلوار تھی جس کے (قبضے کی) زینت لوہے سے کی گئی تھی میں نے اس وقت سنا وہ فرما رہے تھے کہ اللہ کی قسم ہے ہمارے پاس اللہ کی کتاب (قرآن) اور اس صحیفہ کے سوا کوئی ایسی کتاب نہیں ہے جسے تم لوگوں کے آگے پڑھوں اور یہ صحیفہ جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے عطا فرمایا ہے اس میں صدقہ کے حصول کی تفصیل ہے۔ (یعنی قانونِ زکوٰۃ کی تفصیل)

اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ آخر میں حضرت والا نے ضرورت محسوس فرمائی کہ برسر منبر ان غلط فہمیوں کا ازالہ کیا جائے جو آپ کے متعلق پھیل گئی تھیں یا پھیلائی جا رہی تھیں عنقریب جس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

لیکن کچھ بھی ہو، باوجود ان تمام باتوں کے کسی روایت سے یہ ثابت نہیں ہے کہ اپنے "نیامی صحیفہ" کی نقل لینے کی عام اجازت

مسلمانوں کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے دی ہو، بلکہ یہ واقعہ یعنی "صحیفہ علی" کے مضامین جن متعدد راویوں سے حدیث کی کتابوں میں منقول ہیں، ان میں یہ بات جو پائی جاتی ہے کہ ایک راوی جن اجزا کا ذکر کرتا ہے دوسرا ان کے ذکر سے خاموش ہے بلکہ بجائے اس کے وہ دوسرے اجزا کا تذکرہ کرتا ہے، اگرچہ بعض اجزا ساری روایتوں میں مشترک ہیں، میرے نزدیک تو یہ بھی اسی کی دلیل ہے کہ ان راویوں میں سے کسی راوی کے پاس اس صحیفہ کی نقل موجود نہ تھی، بلکہ سن سنا کر جو باتیں جسے یاد رہ گئی تھیں ان ہی کو وہ بیان کرتا تھا[1]

خلاصہ یہ ہے کہ لوگوں سے دریافت کرنے سے پہلے اس صحیفہ کے مضامین کو اپنی ذات ہی کی حد تک محدود رکھنا پھر ان لوگوں کے اصرار پر ان کو بتانا، بتانے کے بعد بھی عام نقل اس صحیفہ کی لوگوں میں جو نہ پھیلی تو اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ جیسے آپ کے پیش رو خلفائے راشدین نے یہ خیال کیا تھا کہ ان کے زمانہ میں عمومیت کا رنگ اختیار کر کے آئندہ نسلوں تک جو چیزیں پہنچیں گی ان میں شریعت کے ان عناصر اور اجزا کی وہی کیفیت پیدا ہو جائے گی جسے شارع علیہ السلام نے صرف "البینات" کی حد تک محدود رکھنا چاہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے سامنے بھی اپنے عہدِ خلافت تک یہ خیال باقی رہا تھا، جہاں تک ممکن تھا اس کی نگرانی میں آپ نے بھی کمی نہیں فرمائی۔

لیکن پھر بھی اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس مسئلہ میں حزم و احتیاط اور اس کے متعلق دار و گیر میں جس تشدد اور سختی سے حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ نے کام لیا تھا، حضرت علیؓ کے طرزِ عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ اتنی شدت اور کڑی نگرانی آپ کے نزدیک ضروری نہ رہی تھی، آخر سوچنا چاہیے کہ اسی خبر آحاد کے مجموعہ کو لکھ لینے کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے جلا دیا تھا یا استشارہ و استخارہ کے بعد حضرت عمرؓ کا یہ فیصلہ کہ ان کے عہدِ خلافت میں حدیثوں کا جو مجموعہ حکومت کی طرف سے مدون کرا دیا جائے گا آئندہ چل کر قرآن کی ہمدوش و ہم سطح کتاب (یعنی مثناۃ کمثناۃ تورات) کی شکل اختیار کرے گا اور اسی فیصلہ کی بنیاد پر صرف یہی نہیں کہ اس خیال سے خود ہی دست بردار ہوئے بلکہ گزر چکا کہ آپ کے زمانہ میں جس کسی کے پاس لکھی ہوئی حدیثیں تھیں جہاں تک آپ کے امکان میں تھا سب کو ضائع کر دینے کا جو حکم آپ نے دیا تھا ان بزرگوں کے اس عمل کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اس طریقہ سے کیا نسبت ہے اپنی ذاتی یادداشت ہی کے لئے سہی، لیکن بہر حال آپ نے، چند خاص حدیثوں کو قلم بند تو فرمایا اور اپنی تلوار کی نیام میں ان کو محفوظ کر دیا تھا۔

سوال یہی پیدا ہوتا ہے کہ طرزِ عمل کے اس اختلاف کے اسباب کیا تھے؟ اتنی بات تو ظاہر ہے کہ ابوبکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ

---

[1] مسند احمد میں پانچ راویوں سے "صحیفۂ علی" کے مضامین منقول ہیں یعنی ابو حسان، یزید[2] بن شریک (ابراہیم تیمی کے والد) طارق[3] بن شہاب، قیس بن عباد[4]، حارث[5] بن سوید، سبعوں نے بیان کیا ہے کہ صحیفہ علی میں فلاں فلاں مسائل تھے بعض مسائل تو سب کے بیان میں مشترک ہیں لیکن بعض چیزیں ایسی ہیں جو ایک کی روایت میں ہیں اور دوسرے کے یہاں بجائے ان کے دوسرے مسائل کا تذکرہ پایا جاتا ہے اسی حال کو دیکھ کر علماء نے لکھا ہے کہ صحیفہ علی میں کافی مسائل تھے بظاہر طامار کی شکل میں یہ صحیفہ تھا اسی لئے تلوار کی نیام میں لپیٹ کر رکھ دیا جاتا تھا۔ حضرت علیؓ کے فتووں کی ایک کتاب کا ذکر آگے آ رہا ہے جس کی بہت سی چیزوں کو ابن عباس نے قلم زد کر دیا تھا۔ لکھا ہے کہ وہ بھی "طامار" ہی کی شکل میں تھا ۱۲۔

عنہا کی خلافت کا جو زمانہ تھا، عہد نبوت کے قرب کی وجہ سے قدرتاً خود اس زمانے کے متعلق اور اس زمانے کی چیزوں کے متعلق مسلمانوں کے قلوب میں احترام و تقدس کے جو جذبات تھے جیسے جیسے دن گزرتے جاتے تھے احترام و تقدس کی اس کیفیت میں اضمحلال کا پیدا ہونا ایک قدرتی بات تھی ہو سکتا ہے، کہ حضرت علیؓ کے طرز عمل کی تبدیلی میں کچھ اس کو بھی دخل ہو، ماسوا اس کے سیاسی حالات کے پیش رفت نے مدینہ منورہ چھوڑ کر حضرتؓ کو اپنی خلافت کے زمانہ میں کوفہ کو پایۂ تخت خلافت جو قرار دینا پڑا اور اس کی وجہ سے کوفہ میں آپ کو قیام کرنا پڑا

جیسا کہ معلوم ہے یہاں مسلمانوں کی بہت بڑی فوجی چھاؤنی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں قائم ہو گئی تھی اور اس میں کوئی شبہ نہیں جیسا کہ ابن سعد وغیرہ نے لکھا ہے کہ

هَبَطَ الْكُوفَةَ ثَلَاثُمِائَةٍ مِّنْ اَصْحَابِ الشَّجَرَةِ وَ سَبْعُوْنَ مِنْ اَهْلِ بَدْرٍ (ابن سعد ج ۶ ص ۴)

کوفہ کو وطن بنا کر رہنے والوں میں تین سو تو ایسے صحابی تھے جنہوں نے الشجرہ (درخت کے نیچے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر موت کی بیعت کی تھی) اور ستر صحابی وہ تھے جو میدان بدر میں (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے) ساتھ جنگ میں شریک تھے

لیکن جس کوفہ کا حال یہ ہو جیسا کہ طبقات ہی میں ہے کہ

بِهَا بُيُوْتَاتُ الْعَرَبِ (ص ۶)

اس میں عرب کے تمام قبیلوں اور خاندانوں کے لوگ تھے۔

اور بقول ابن خلدون عرب کے ان بیوتات کا حال یہ تھا کہ اس میں۔

سَائِرُ الْعَرَبِ مِنْ بَنِيْ بَكْرِ بْنِ وَائِلٍ وَعَبْدِ الْقَيْسِ وَ سَائِرُ رَبِيْعَةَ وَالْاَزْدُ وَكِنْدَةُ وَ تَمِيْمٌ وَ قُضَاعَةُ وَغَيْرُهُمْ فَلَمْ يَكُوْنُوْا مِنْ تِلْكَ الصُّحْبَةِ بِمَكَانٍ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ۔ (ج ۲ ص ۱۲۸)

سارے عرب قبائل کے لوگ آکر آباد ہو گئے تھے (یعنی) بنو بکر بن وائل والے عبدالقیس والے اور ربیعہ قبیلہ کی تمام شاخوں کے لوگ اور قبیلہ ازد کے کندہ والے تمیم والے قضاعہ والے اور ان کے سوا بھی ان لوگوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے استفادہ کرنے والے بہت کم تھے۔

جس کا مطلب یہی ہے کہ ان میں زیادہ تر وہی لوگ تھے جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی دولت سے تو سرفراز ہوئے تھے لیکن ان بیچاروں کو جمال جہاں آرائے محمدی سے اپنی مشتاق آنکھوں کو روشن کرنے کی سعادت میسر نہ آئی تھی۔ حضرت عمرؓ نے قرظہ بن کعب الانصاری کو رخصت کرتے ہوئے جو یہ فرمایا تھا:

اِذَا رَءَوْكُمْ مَدُّوْا اِلَيْكُمْ اَعْنَاقَهُمْ وَ قَالُوْا اَصْحَابُ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ۔ (جمع الفوائد ص ۲۸ بحوالہ دارمی)

جب تمہیں وہ دیکھیں گے تو اپنی گردنیں تمہاری طرف دراز کریں گے اور کہا کریں گے کہ دیکھو یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب ہیں۔

یہ فاروقی بصیرت تھی جس نے اندازہ کر لیا تھا کہ صحبت نبوت سے محروم رہ جانے والے مسلمانوں کے قلوب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں کے جاننے کا ولولہ اور شوق کس طرح بھڑک اٹھے گا اور رسول اللہؐ کے صحابیوں کو دیکھ کر اپنے پیغمبر کے حالات کے جاننے کے لئے بیتابانہ کس طرح دوڑ پڑیں گے۔ حضرت عمرؓ کی یہ پیش گوئی کتنی سچی نکلی اس کا اندازہ اسی سے کیجئے کہ صحابہ نہیں بلکہ صحابہ

کے دیکھنے والوں کے ساتھ زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ ان ہی چھاؤنیوں میں رہنے والے مسلمانوں کے تعلقات کی نوعیت یہ ہوگئی تھی۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کے مشہور شاگرد ثابت البنانی ان لوگوں سے جو اُن سے حدیث سننے کے لیے آیا کرتے تھے، کہتے۔

لَوْلَا تَصْنَعُوْا بِیْ مَا صَنَعْتُمْ بِالْحَسَنِ لَحَدَّثْتُکُمْ اَحَادِیْثَ مُؤنِقَةً۔

اس کا اندیشہ نہ ہوتا کہ میرے ساتھ بھی وہی معاملہ تم لوگ نہ کرنے لگوگے جو (خواجہ) حسن بصری کے ساتھ تم ہی لوگوں نے کیا تو میں تم ہی لوگوں کو بہت اچھی اچھی حدیثیں سناتا۔

پھر حسن بصری کے متعلق اپنی چشم دید شہادت یہ بیان کیا کرتے تھے کہ۔

مَمْنُوْعُ الْقَائِلَةِ وَ مَمْنُوْعُ النَّوْمِ۔

(طبقات ابن سعد حصہ دوم ج، ۳)

بے چارے کو لوگ نہ دن ہی کو لیٹنے کا موقعہ دیتے اور نہ سونے کا۔

حسن بصریؒ جو تابعی یعنی صحابہ کرام کے شاگردوں میں شمار ہوتے ہیں ان کا یہ حال، پھر عبداللہ بن عون جو تابعی نہیں بلکہ تبع تابعین کے طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں اپنی داستان سناتے ہوئے اسی سلسلہ میں وہ کہا کرتے تھے کہ

قَدْ قَطَعُوْا عَلَیَّ الطَّرِیْقَ مَا اَقْدِرُ اَنْ اَخْرُجَ لِحَاجَتِیْ یَعْنِیْ مِمَّا یَسْئَلُوْنَہٗ عَنِ الْحَدِیْثِ۔

(ابن سعد حصہ دوم ج ۷ ص ۲۵)

لوگوں نے میرا راستہ روک رکھا ہے۔ کسی ضرورت سے بھی میں نہیں نکل سکتا یعنی لوگ مجھ سے حدیث پوچھنا شروع کر دیتے ہیں۔

سمجھا آپ نے ابن عون کیا کہہ رہے ہیں؟ اپنے پیغمبر کے حالات کے دریافت کرنے والوں کا حال ان کے ساتھ یہ ہو گیا تھا کہ راستہ چلنا ان کیلئے دشوار ہو گیا تھا، پوچھنے والوں کے ڈر کے مارے گھر سے نکلنا ہی چھوڑ دیا تھا۔

خیال تو کیجیے کہ جب حسن بصری جو خود صحابی نہیں ہیں بلکہ صحابیوں کے دیکھنے والے اور ان سے استفادہ کرنے والوں یعنی تابعین میں شمار کئے جاتے ہیں، اور ابن عون تو تابعی بھی نہیں، تبع تابعین کے طبقہ سے ان کا تعلق ہے یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں کی صحبت میں رہنے والے بزرگوں سے فیض حاصل کیا تھا۔ جب تابعین اور تبع تابعین کی یہ حالت تھی، تو خود اپنی آنکھوں سے جن لوگوں نے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا تھا اور براہِ راست مجلسِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں حضوری کی سعادت جنھیں میسر آئی تھی اُن کو دیکھ کر ان مسلمانوں کا کیا حال ہو جاتا ہوگا جنھوں نے صرف سنا تھا، لیکن اپنے محبوب پیغمبر (صلوات اللہ علیہ وسلامہ) کو دیکھا نہیں تھا۔

میرا خیال ہے کہ کوفہ آجانے کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو بھی اسی قسم کے حالات سے سابقہ پڑا، مدینہ منورہ میں جب تک تھے تو وہاں ان کے زمانے تک صحابیوں ہی کی کثرت تھی جس کا مطلب یہی ہوا کہ نہ پوچھنے والوں ہی کی وہاں اتنی کثرت تھی اور نہ بتانے والوں کی اتنی کمی تھی جو کیفیت مدینہ منورہ کے سوا دوسرے مقامات کی پائی جاتی تھی یا اس کو پایا جانا چاہیے تھا ماسوا اس کے، بارگاہِ نبوت میں قرب و نزدیکی کے جو مواقع مختلف وجوہ سے مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو حاصل تھے ظاہر ہے کہ یہ ان ہی کی خصوصیت تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں تقلیل فی الروایۃ یعنی حدیثوں کے بیان کرنے میں زیادتی سے پرہیز اسی اصول کی آپ نے

بھی پابندی کی لیکن زیادہ دن یہ چیز آپ کے عہد میں معلوم ہوتا ہے کہ نبھ نہ سکی۔ آخر میں پوچھتا ہوں کہ ایک طرف آپ ہی کے متعلق یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ تلوار کے نیام والے صحیفہ کی حدیثوں کے دکھانے پر بھی آمادہ نہ تھے لیکن اصرار لوگوں کا حد سے زیادہ گزر گیا، نیز غلط فہمیوں کے پھیلنے کا اندیشہ ہوا، تب آپ نے لوگوں کو اس صحیفہ کی حدیثوں سے مطلع فرمایا۔ اب ایک طرف کتابوں سے حضرت علیؓ کے طرزِ عمل کے متعلق یہ معلومات بھی ملتے ہیں اور دوسری طرف ان ہی جیسی کتابوں میں حضرت ہی کے متعلق ہمیں ایسی چیزیں بھی ملتی ہیں، ابنِ سعد نے طبقات میں نقل کیا ہے کہ

اَنَّ عَلِیَّ ابْنَ اَبِیْ طَالِبٍ خَطَبَ النَّاسَ فَقَالَ مَنْ یَّشْتَرِیْ عِلْمًا بِدِرْهَمٍ فَاشْتَرَی الْحَارِثُ الْاَعْوَرُ صُحُفًا بِدِرْهَمٍ ثُمَّ جَاءَ بِهَا عَلِیًّا فَكَتَبَ لَهٗ عِلْمًا كَثِیْرًا (ج ۶ ص ۱۱۶)	ایک دن (کوفہ) میں حضرت علی خطبہ دے رہے تھے اسی خطبہ میں فرمایا کہ ایک درم میں کون علم خریدنا چاہتا ہے، حارث اعور ایک درم میں کچھ کاغذ خرید کر لائے اور ان کاغذوں کو لیے ہوئے حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے حضرت والا نے حارثؓ کے لائے ہوئے اوراق میں بہت سا علم لکھ دیا۔

اس میں شک نہیں کہ مذکورہ بالا روایت میں صراحۃً اس کا ذکر نہیں کیا گیا ہے کہ حضرت علیؓ نے حارث کو حدیثیں لکھ کر دی تھیں لیکن میں نے پہلے بھی کہیں ذکر کیا ہے اور یوں بھی جاننے والے جانتے ہیں۔ اس زمانہ کی اصطلاح ہی یہ تھی کہ "علم" کے لفظ کا زیادہ تر اطلاق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں ہی پر کیا جاتا تھا، اگر کل نہیں تو اس اصطلاح کی بنیاد پر اتنا تو تسلیم ہی کرنا پڑے گا کہ اس میں کچھ حصہ حدیثوں کا بھی چاہئے کہ شریک ہو اور بات کیا صرف اسی حد تک محدود رہی۔ حجر بن عدی جن کی شہادت[1] کا قصہ اسلام کی ابتدائی تاریخ کے واقعات میں خاص اہمیت رکھتا ہے، ابنِ سعد نے ان ہی کے متعلق یہ لکھتے ہوئے کہ

كَانَ ثِقَةً مَّعْرُوْفًا وَّلَمْ یَرْوِ عَنْ غَیْرِ عَلِیٍّ شَیْئًا (ج ۶ ص ۱۵۴)	وہ بڑے معتبر مشہور آدمی تھے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے سوا اور کسی سے کوئی روایت انہوں نے نہیں کی ہے۔

ان ہی کے متعلق یہ روایت بھی درج کی ہے کہ پانی سے استنجا کرنے کا ذکر ان کے سامنے ہوا تو حجر نے کہا کہ:

---

[1] امیر معاویہ کے زمانہ میں زیاد بن ابیہ جب عراق کا گورنر تھا حجر پر حکومتِ قائمہ کے خلاف بغاوت کا مقدمہ قائم ہوا خود کوفہ کے لوگوں نے ان کے خلاف شہادتیں دیں زیاد نے ایک جماعت کے ساتھ جن پر بغاوت میں حجر کی رفاقت کا الزام تھا۔ امیر معاویہؓ کے پاس شام بھیج دیا، فیصلہ ان سب کے قتل کا امیر معاویہ نے صادر کیا مشکیں کسے ہوئے مقتل میں سب لائے گئے۔ حجر نے نماز پڑھنے کی اجازت چاہی۔ لوگوں نے الزام لگایا کہ نماز میں قصداً دیر لگائی تاکہ جتنی دیر قتل سے بچ سکوں۔ قسم کھا کر بولے کہ آج تک وضو کرنے کے بعد اس سے زیادہ خفیف نماز میں نے کبھی نہیں پڑھی۔ جلاد نے کہا کہ گردن بڑھاؤ۔ بولے کہ اپنے قتل پر اعانت نہیں کر سکتا، آخر شہید کر دیئے گئے۔ حجر بن عدی کی جلالتِ شان کا اسی سے اندازہ کیجئے کہ کوفہ سے شام گرفتار کر کے بھیجے گئے اور یہ خبر مدینہ پہنچی تو عائشہ صدیقہؓ نے اسی وقت امیر معاویہؓ کے پاس قاصد دوڑایا کہ حجر کو ہرگز ہرگز قتل نہ کرنا لیکن قاصد اس وقت پہنچا جب وہ شہید ہو چکے تھے۔ (طبقات ج ۶ ص ۱۵۲)

نَاوِلْنِي الصَّحِيْفَةَ مِنَ الْكُوَّةِ فَقَرَأَ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ هٰذَا مَا سَمِعْتُ عَلِيَّ بْنَ اَبِيْ طَالِبٍ يَذْكُرُ اَنَّ الطُّهُوْرَ نِصْفُ الْاِيْمَانِ ۔ (ص۱۵۴)

طاق میں جو صحیفہ (نسخہ) رکھا ہوا ہے ذرا اسے لا کر مجھے دو، (جب لا کر دیا گیا) تو ابن عدی یہ پڑھنے لگے بسم اللہ الرحمن الرحیم یہ وہ روایتیں ہیں جنھیں میں نے علی بن ابی طالبؓ سے سنا ہے وہ یہ بھی فرماتے تھے کہ طہور ایمان کا نصف ہے۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ سے سنی ہوئی حدیثوں کا کوئی لکھا ہوا مجموعہ حجر بن عدی کے پاس بھی تھا اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ حضرت علیؓ کے صاحبزادے محمد بن الحنیفیہ کے پاس بھی حضرت علیؓ کی حدیثوں کا کوئی مکتوبہ مجموعہ تھا عبدالاعلیٰ بن عامر کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ،

كُلُّ شَيْءٍ رَوٰى عَبْدُ الْاَعْلٰى عَنِ ابْنِ الْحَنِيْفِيَّةِ اِنَّمَا هُوَ كِتَابٌ اَخَذَهٗ وَلَمْ يَسْمَعْهُ[1] (ص۹۴)

عبدالاعلیٰ محمد بن حنیفیہ سے جو کچھ روایت کرتے ہیں وہ دراصل ایک کتاب تھی اور عبدالاعلیٰ نے براہ راست محمد بن حنیفیہ سے ان روایتوں کو نہیں سنا تھا۔

امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کے حالات جو رجال کی کتابوں میں ملتے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے پاس بھی حدیثوں کا کوئی مکتوبہ مجموعہ تھا، فرمایا کرتے تھے کہ تم لوگوں سے جو حدیثیں بیان کیا کرتا ہوں یہ

رِوَايَةٌ رَوَيْنَاهَا عَنْ اٰبَائِنَا ۔ (تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۱۰۳)

یہ وہ روایتیں ہیں جو اپنے باپ دادوں سے ہم لوگ روایت کرتے ہیں۔

اور فرماتے کہ اپنے والد امام باقرؒ کے حوالہ سے جن حدیثوں کو میں بیان کرتا ہوں۔

اِنَّمَا وَجَدْتُّهَا فِيْ كُتُبِهٖ ۔ (تہذیب ج ۲ ص ۱۰۴)

میں نے ان سب کو ان کے (امام باقرؒ کی) کتابوں میں پایا۔

اگر مذکورہ بالا روایات پر اعتماد کیا جائے تو حاصل یہ نکلتا ہے کہ حضرت علیؓ کی حدیثوں کے تین چار مجموعے لوگوں میں پھیلے ہوئے تھے جن میں حارث اعور والا نسخہ تو براہ راست حضرت والا کے دست مبارک ہی کا لکھا ہوا تھا۔ کچھ بھی ہو اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کوفہ پہنچنے کے بعد "تقلیل فی الروایۃ" کے اصول پر حضرت علیؓ زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکے اور روایتوں کی عمومیت کے جس دروازے کو ابوبکرؓ و عمرؓ کے عہد میں شدت کے ساتھ بند رکھنے کی کوشش کی گئی تھی وہ دروازہ کھل گیا، آخر حارث والی روایت اگر صحیح ہے تو اس کے معنی بجز اس کے اور کیا ہیں کہ خود کاغذ منگوا کر آپ نے لکھا۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ ان دو صحابیوں یعنی عبداللہ بن عمرو بن عاص اور انس بن مالک رضی اللہ عنہم کے سوا حضرات صحابہ میں سے جن جن بزرگوں کی طرف یہ بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے بھی رسول اللہ ﷺ کی حدیثیں قلم بند کی تھیں یہ سارے قصے حضرت علیؓ کے طرز عمل کی تبدیلی ہی کے بعد کے واقعات ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے جس زمانے میں یہ حکم دیا تھا کہ جس کسی کے پاس حدیثوں کا مکتوبہ مجموعہ ہو، اس کو وہ

---

[1] بعضوں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ عامر بن جہنی نامی شخص نے ابن الحنیفیہ کی ان حدیثوں کو قلمبند کیا تھا۔ عامر کو اگرچہ ابن حبان نے "ثقات" میں شمار کیا ہے لیکن عام طور پر محدثین کو اس شخص پر اعتماد نہیں ہے دیکھو میزان، لسان المیزان وغیرہ۔

ضائع کر دے ان دونوں بزرگوں یعنی عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ اور حضرت انسؓ نے اس حکم کی تعمیل اپنے لیے ضروری خیال نہ کی، ان کا عذر غالباً یہی ہو گا کہ براہِ راست رسالت مآبؐ سے اجازت حاصل کرنے کے بعد انہوں نے لکھا تھا۔ بلکہ انس بن مالک کا بیان جیسا کہ گزر چکا یہ تھا کہ لکھنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ملاحظہ میں اس کو پیش بھی کر چکا ہوں۔ بہرحال ان دو استثنائی خاص واقعے کے اور جن جن صحابیوں کی طرف یہ منسوب کیا گیا ہے کہ ان کی زندگی ہی میں ان کی روایتیں قلم بند ہو چکی تھیں جن کا تفصیلی ذکر ابتدائے کتاب میں گزر چکا ہے۔ میرا خیال یہی ہے کہ حضرت علیؓ کے طرزِ عمل کی تبدیلی سے ان صحابیوں میں اس کی جرأت پیدا ہوئی اور کیسی ہمت افزائی؟ کسی اور موقعہ پر بھی میں نے تذکرہ کیا ہے یعنی کوفہ میں خلیفہ ہونے کے بعد حضرت علیؓ کے دست راست آپ کے چچازاد بھائی عبداللہ بن عباسؓ کے متعلق مغازی کے امام موسیٰ بن عقبہ کہتے تھے کہ:

وَضَعَ عِنْدَنَا كُرَيْبٌ (مَوْلَى عَبْدِ اللهِ بْنِ الْعَبَّاسِ) حِمْلَ بَعِيْرٍ اَوْ عِدْلَ بَعِيْرٍ مِّنْ كُتُبِ ابْنِ عَبَّاسٍ۔ (ج ۵ ص ۲۱۶)

میرے پاس عبداللہ بن عباسؓ کے غلام کریب نے ابن عباسؓ کی کتابیں رکھوائی تھیں جو ایک یا نصف بار شتر تھیں

"حمل بعیر او عدل بعیر" (یعنی ایک بار شتر یا نصف بار شتر) یہ شک کس کی طرف سے ہے ابن سعد نے اس کو واضح نہیں کیا ہے، شک کسی کی طرف سے ہو، مگر مان لیا جائے کہ کتب ابن عباس ایک بار شتر نہ سہی، اس کا نصف ہی سہی ان کی آنکھوں کے کھولنے کے لیے کیا کم ہے جو کہتے ہیں کہ سب سے پہلے زہری نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں قلم بند کیں۔ ہیں یہ مانتا ہوں کہ کتب ابن عباس کے اس ذخیرے میں اس کی تصریح نہیں کی گئی ہے کہ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کا بھی کوئی مجموعہ تھا لیکن اس روایت کے آخر میں جب یہ الفاظ بھی پائے جاتے ہیں:

كَانَ عَلِيُّ بْنُ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَبَّاسٍ إِذَا أَرَادَ الْكِتَابَ كَتَبَ إِلَيْهِ ابْعَثْ إِلَيَّ الصَّحِيْفَةَ كَذَا وَكَذَا فَيَنْسَخُهَا فَيَبْعَثُ إِلَيْهِ بِاَحَدِهِمَا۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے صاحبزادے علی کو (ابن عباس) کی ان کتابوں میں سے کسی کتاب کی ضرورت ہوتی تو لکھ بھیجتے کہ فلاں فلاں صحیفہ بھیج دو تو اس صحیفہ کی کریب نقل کرتے پھر نقل یا اصل کو علی بن عبداللہ بن عباسؓ کے پاس بھیج دیتے۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف عنوانوں اور مختلف مضامین پر مشتمل الگ الگ صحیفے "کتب ابن عباس" کے اس ذخیرے میں تھے پس اس میں اور کچھ ہو یا نہ ہو لیکن جب ہمیں معلوم ہے کہ ابن عباسؓ ان صحابیوں کے پاس جا جا کر جو ان سے بڑے تھے رسول اللہؐ کی حدیثیں دریافت کرتے تھے اور صرف دریافت ہی نہیں کرتے تھے بلکہ الکتانی نے رویانی کی مسند سے بسندِ متصل یہ روایت ابن عباسؓ ہی کے متعلق جو نقل کی ہے کہ:

كَانَ ابْنُ عَبَّاسٍؓ يَاْتِيْ اَبَا رَافِعٍ فَيَقُوْلُ مَا صَنَعَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ كَذَا مَعَ ابْنِ عَبَّاسٍ مَنْ يَكْتُبُ مَا يَقُوْلُ (ج ۲ ص ۲۴۷)

ابن عباس کا حال یہ تھا کہ ابو رافع (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کے مولیٰ و صحابی کے پاس آتے اور کہتے کہ فلاں دن رسول اللہ نے کیا کیا اور ابن عباسؓ کے ساتھ ایک شخص ہوتا جو ان ساری باتوں کو جنھیں ابو رافع بیان کرتے وہ

شخص لکھتا جاتا۔

اور اس میں تو خیر اسی قدر ہے کہ ابن عباسؓ کا منشی حدیثوں کو لکھتا جاتا تھا، الکتانی ہی نے بحوالہ طبقات ابن سعد ابو رافع کی بیوی سلمیٰ[1] کی یہ روایت جو نقل کی ہے کہ۔

رَأَيْتُ ابْنَ عَبَّاسٍ مَعَهُ أَلْوَاحٌ يَكْتُبُ عَلَيْهَا عَنْ أَبِي رَافِعٍ شَيْئًا مِنْ فِعْلِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ (الکتانی فی التراتیب الاداریہ ص ۲۴۷)

میں نے ابن عباسؓ کو دیکھا کہ ان کے پاس تختیاں ہیں جن پر وہ ابو رافع کی بیان کی ہوئی ان روایتوں کو لکھا کرتے تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال کے متعلق ابو رافع بیان کرتے تھے۔

ظاہر ہے کہ کتب ابن عباس میں اور کچھ ہو یا نہ ہو لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جن حدیثوں کو انہوں نے خود قلم بند فرمایا تھا یا اپنے کاتب سے لکھوایا تھا ان کا ابن عباسؓ کی ان کتابوں میں نہ رہنے کے معنی ہی کیا ہو سکتے ہیں۔

بہر حال کتب ابن عباس کا یہ ذخیرہ ہو یا حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق میں نے جو نقل کیا تھا کہ حسن ابن عمرو بن امیہ الضمری کو اپنے گھر لے گئے اور لکھی ہوئی حدیثوں کا جو سرمایہ ان کے پاس تھا اسے جب دکھایا تو حسن ابن عمرو کہتے تھے کہ

فَأَرَانَا كُتُبًا كَثِيْرَةً مِّنْ حَدِيْثِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔

مجھے ابوہریرہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کی بہت سی لکھی ہوئی کتابیں دکھائیں۔

اور پھر ابوہریرہؓ کا یہ فرمانا کہ:

قَدْ أَخْبَرْتُكَ إِنِّيْ إِنْ كُنْتُ حَدَّثْتُكَ بِهٖ

میں نے تم کو مطلع کیا تھا کہ تم سے جو کچھ بھی حدیثیں میں نے

---

[1] سلمیٰ آنحضرتؐ کی لونڈی تھیں، ابن سعد وغیرہ نے لکھا ہے کہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ کے جتنے بچے پیدا ہوئے قابلہ کا کام سلمیٰ ہی نے انجام دیا تھا اور ابراہیمؑ ماریہ قبطیہ کے بطن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے جب پیدا ہوئے تھے تو اس وقت بھی قابلہ سلمیٰ ہی تھیں، ابو رافع جو دراصل حضرت عباس کے غلام تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عباس نے ہبہ کر دیا تھا ان کی شادی سلمیٰ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کر دی تھی اور ابو رافع کو آزاد کر دیا تھا ان کے لڑکے جن کا نام عبید اللہ بن ابی رافع تھا۔ حضرت علی علیہ السلام کے کاتب (سکریٹری) تھے غلاموں کو یہ بلندیاں اسلام نے عطا کی تھیں اس موقعہ پر بیساختہ سلمیٰ اور ابو رافع کا قصہ جس کا مسند احمد میں تذکرہ کیا گیا ہے یاد آ گیا۔ سلمیٰ ایک دن روتی ہوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور شکایت کی کہ ابو رافع نے بلا وجہ مجھے آج مارا ہے۔ ابو رافع بلائے گئے۔ آنحضرتؐ نے پوچھا کہ بھائی تم نے اس بے چاری کو کیوں مارا۔ ابو رافع نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ مجھے یہ ستاتی ہے۔ تب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سلمیٰ سے دریافت کیا کہ تم نے ابو رافع کو کیا تکلیف پہنچائی۔ سلمیٰ نے کہا کہ یا رسول اللہ یہ شخص نماز پڑھ رہا تھا اسی حال میں اس کا وضو ٹوٹ گیا اس پر میں نے کہا کہ مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ ریاح اگر خارج ہو جائے تو وضو کر لیا کریں۔ بس اسی پر یہ شخص مجھے مارنے لگا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میاں بیوی کے اس قصے کو سن کر ہنسنے لگے اور ابو رافع سے کہا کہ اس بیچاری نے تم سے اچھی بات تو کہی تھی۔ (مسند احمد ج ۲ ص ۲۷۲)

فَهُوَ مَكْتُوبٌ عِنْدِيْ۔ (مقدمہ فتح الباری) بیان کی ہیں وہ سب میرے پاس لکھی ہوئی ہیں۔

جس کے معنی یہی ہوئے کہ ابوہریرہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جن حدیثوں کو بیان کیا کرتے تھے جن کی تعداد پانچ ہزار سے اوپر بتائی جاتی ہے یہ سب ان کے پاس لکھی ہوئی تھیں۔

اس کے سوا اور بھی جن جن صحابیوں کے متعلق ذکر کر چکا ہوں کہ ان کی زندگی ہی میں ان کی روایتیں قلم بند ہو چکی تھیں، میرا خیال ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے طرزِ عمل کی تبدیلی کے بعد ہی کے یہ واقعات ہیں، آخر جب خود رسول کا خلیفۂ راشد اپنے دستِ مبارک سے لکھ لکھ کر لوگوں کو دینے لگا ہو تو دوسروں کو اس سے روکنے والی اور کون سی چیز ہو سکتی تھی، رہی وہ مصلحت جس کی وجہ سے عہدِ نبوت اور ابوبکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے زمانے میں حدیثوں کی کتابت اور عام اشاعت میں مزاحمت کی جاتی تھی اور خود حضرت علیؓ کو بھی اسی مسلک کی رعایت کرتے ہوئے شروع میں پایا جاتا ہے پھر کتابت و اشاعت کی اس عام اجازت اور اس کی ہمت افزائی کے بعد اسی خطرے کے پیدا ہونے کا اندیشہ کیا باقی نہیں رہا تھا؟ مانا کہ حضرت علیؓ کی خلافت کے زمانے میں اور عہدِ نبوت میں نسبتاً کافی فاصلہ پیدا ہو چکا تھا، لیکن کتنا فاصلہ؟ پچیس سے تیس سال ہی تک کا تو فاصلہ؟ پھر کیا یہ بڑا فاصلہ تھا؟ آخر کچھ بھی ہو اس پر تو امت کا اتفاق ہے کہ حضرت علیؓ کی خلافت کا زمانہ خلافتِ راشدہ ہی کا زمانہ تھا۔ ابوبکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے زمانہ کی مکتوبہ چیزوں کے متعلق یہ خطرہ کہ آئندہ نسلوں میں غیر معمولی اہمیت ان روایتوں کو حاصل ہو جائے گی، اسی وجہ سے تو تھا کہ خلافتِ راشدہ کا وہ زمانہ تھا پس اسی خلافتِ راشدہ کا عہد جب حضرت علیؓ کے زمانہ تک موجود تھا تو اس خطرے کا احساس علی کرم اللہ وجہہ کو کیوں نہیں ہوا؟

بلاشبہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے اور اس کو پیدا کرنا چاہئے، میں تو سمجھتا ہوں کہ اسی سوال کے اٹھانے سے بعض ایسے واقعات و حقائق لوگوں کے سامنے آجائیں گے جن کی طرف اس وقت تک بہت کم توجہ کی گئی ہے

اجمالی جواب تو اس سوال کا یہی ہو سکتا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خلافت کے زمانہ میں یا اس کے بعد جو چیزیں لکھی گئیں پچھلی نسلوں میں ان کو وہ اہمیت جو نہیں حاصل ہوئی جس کا اندیشہ کیا جا سکتا تھا، آخر یہ تو ایک واقعہ ہے پھر وقوع سے پیشتر حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اسی پیش آنے والے واقعہ کو اگر سمجھ لیا تو تاریخی رفتار نے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کو جن نقاط تک پہنچا دیا تھا ان کو سامنے رکھتے ہوئے حضرت علیؓ تو خیر حضرت علیؓ ہی تھے میں تو سمجھتا ہوں کہ معمولی فہم و فراست رکھنے والے آدمی کے لیے بھی اس کا اندازہ چنداں دشوار نہ تھا، میں کیا کہنا چاہتا ہوں تفصیل اس کی یہ ہے، میرے نزدیک تدوینِ حدیث کی تاریخ کی چند اہم منزلوں میں ایک بڑی اہم منزل یہی ہے پڑھنے والوں سے امید کرتا ہوں کہ ذرا زیادہ سنبھل کر اس تفصیل کا مطالعہ کریں گے۔

تدوینِ سنّت

عبدالغفار حسن

تحریف دین کی ایک صورت انکار سنت کی شکل میں آج کل منظر عام پر آرہی ہے۔ اس گروہ کے سرخیل سنت کی عظمت و اہمیت کم کرنے کے لئے مختلف نوع کے شبہات لوگوں کے دلوں میں پیدا کرتے رہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ:

ا۔ سنت کا کیا اعتبار۔ یہ تو دوسری تیسری صدی ہجری میں تحریری شکل میں مرتب ہوئی تھی۔

ب۔ سنت اگر واقعی اسلامی شریعت کا ماخذ اور سرچشمہ ہوتی تو کیوں نہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی ہی میں اسے کتابی شکل میں مدون اور مرتب فرما دیا۔

ج۔ بلکہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری شدت کے ساتھ حدیث کو قلمبند کرنے سے روک دیا تھا۔

ذیل کے مضمون میں محولہ بالا حدیث کے صحیح مفہوم کو متعین کرتے ہوئے اس سلسلے کی غلط فہمیوں یا مغالطوں کو دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور ساتھ ہی تدوین سنت کی مختصر تاریخ بھی پیش کر دی گئی ہے۔

عن ابی سعید الخدری قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تکتبوا عنی غیر القرآن ومن کتب عنی غیر القرآن فلیمحہ (باب التثبت فی الحدیث صحیح مسلم۔ ج ۲ ص۴۱۴)

ابو سعید خدری سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مجھ سے سوائے قرآن کے اور کچھ نہ لکھو اور جس نے قرآن کے سوا کچھ لکھا ہو تو اسے مٹا دے۔

عام طور پر منکرین سنت اس حدیث کے صرف مذکورہ بالا الفاظ ہی بیان کرتے ہیں۔ پوری حدیث نقل نہیں کرتے۔ آخر یہ کونسی دیانت اور قرآنی اتباع ہے کہ ایک ہی روایت میں سے اپنے مطلب کے الفاظ لوگوں کے سامنے انتہائی زور و شور سے پیش کئے جائیں، اور باقی اجزا کو نظر انداز کر دیا جائے۔

اسی روایت میں مزید یہ الفاظ ملتے ہیں:

وحدثوا عنی ولا حرج، ومن کذب علی متعمدا فلیتبوأ مقعدہ من النار

اور مجھ سے حدیثیں بیان کرو اس میں کوئی حرج نہیں۔ اور جس نے مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ باندھا، وہ اپنا ٹھکانہ دوزخ میں بنائے۔

حدیث کے ان دونوں آخری جملوں سے صاف واضح ہو رہا ہے کہ غیر قرآن کے لکھنے کی ممانعت اس بنا پر نہ تھی کہ دین میں حدیث کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔ اگر یہی منشا ہوتا، تو آپ حدیثوں کو بیان کرنے کا حکم کیوں دیتے۔ اور جھوٹی من گھڑت کے نقل در روایت پر

وعید کیوں سناتے۔

اس سے واضح ہوا کہ صحیح روایات کے سنانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ بلکہ دوسری حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے احادیث یاد کرنے والے اور دوسروں تک پہنچانے والے کے لئے دُعا فرمائی ہے۔

عن ابن مسعودؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نضر اللہ امرأً سمع مقالتی فحفظھا ووعاھا واداھا

(مشکوٰۃ صـ۳۵ بحوالہ ابو داؤد، ترمذی)

حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس بندے کو تروتازہ اور خوش و خرم رکھے، جس نے میری بات سنی اور اسے خوب محفوظ رکھا اور دوسروں تک اسے پہنچایا۔

یہ تاکید و ترغیب اسی لئے دی جا رہی ہے کہ سنت اسلامی شریعت کا دوسرا ماخذ ہے۔ اس کے بغیر قرآن کا فہم ہی ناممکن ہے۔ جیسا کہ امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا ہے:

لولا السنۃ ما فھم احد منا القرآن

(قواعد الحدیث صـ۲۱)

اگر سنت نہ ہوتی، تو ہم میں سے کوئی بھی قرآن کا فہم حاصل نہ کر سکتا[۱]

سنت کی تفصیلات کو قلم بند کرنے کا حکم نہ صرف یہ کہ حدیث سے ملتا ہے، بلکہ خود قرآن بھی اس کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

قرآن اور کتابتِ حدیث:۔ قرآن میں ارشاد ہے:

ولا تسئموا ان تکتبوہ صغیراً اوکبیراً الیٰ اجلہ ذالکم اقسط عند اللہ واقوم للشھادۃ و ادنیٰ الا ترتابوا۔

(پ۳۔ البقرہ)

یعنی قرض تھوڑا ہو یا زیادہ اس کے لکھنے میں سستی نہ کرو اس کو مدت کے تعین کے ساتھ لکھو۔ یہ لکھنا خدا کے ہاں انصاف کی بات ہے اور شہادت کو ٹھیک رکھنے والا ہے اور یہ طرزِ عمل اس امر کے زیادہ قریب ہے کہ تم شک و شبہ سے بالا تر رہو گے۔

امام ابوحنیفہؒ اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

لما امر اللہ بکتابۃ الدین خوف الریب کان العلم الذی حفظہ اصعب من حفظ الدین احریٰ ان یباح کتابتہ خوف الریب والشک فیہ۔

(شرح معانی الآثار طحاوی ج ۲ صـ۳۸۴)

جب اللہ تعالیٰ نے شک و شبہ سے بچنے کے لئے قرض کے لکھنے کا حکم دیا ہے، تو علم (حدیث) کا یاد رکھنا قرض کے یاد رکھنے سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ اسی بنا پر علم حدیث میں شک و شبہ سے محفوظ رکھنے کے لئے اس کے لکھنے کی اجازت ضروری ہے۔

---

[۱] یہ قول خاص طور پر یہاں اس لئے نقل کیا گیا ہے کہ منکرین سنت امام ابوحنیفہ کو اپنے گروہ میں شمار کرتے ہیں۔
(مقام حدیث شائع کردہ ادارہ طلوع اسلام)

دوسرا استدلال :۔ کتابت حدیث کے لئے علامہ ابو الملیح نے دوسری آیت سے استدلال کیا ہے ۔ وہ کہتے ہیں :

یعیبون علینا الکتاب وقد قال اللہ تعالیٰ علمها عند ربی فی کتاب (جامع بیان العلم ج ۱ ص۷۳)

لوگ ہم محدثین کو حدیث لکھنے کا طعنہ دیتے ہیں ، حالانکہ پہلی قوموں کا حال خود اللہ تعالیٰ کے پاس لکھا ہوا موجود ہے ۔ جس کی شان یہ ہے کہ نہ وہ بھٹکتا ہے اور نہ بھولتا ہے ، تو انسان جو سراپا نسیان ہے آخر وہ کیسے کتابت (لکھنے) سے بے نیاز رہ سکتا ہے ۔

واضح رہے کہ محدثین میں کتابتِ حدیث کے بارے میں دو رائیں پائی جاتی ہیں :

۱۔ صحابہ کا ایک گروہ اس کا قائل اور حامی تھا ۔

۲۔ بعض صحابہ اس بنا پر اس کے مخالف تھے کہ اس طرح اہل علم حافظہ سے کام لینے کے بجائے سارا اعتماد اپنے نوشتوں پر کریں گے ۔ (مقدمہ ابن الصلاح ص۱۷۱)

لیکن بعد کے دور میں کتابتِ حدیث کے جواز پر اجماع ہو گیا ۔ (مقدمہ ابن الصلاح ص۱۷۱)

اس تصریح سے واضح ہو گیا کہ بعض اہل علم کے نزدیک سرمایہ سنت قلم بند کرنے سے اختلاف اس بنا پر نہ تھا کہ ان کے نزدیک حدیث شرعی حجت نہ تھی ۔ بلکہ اس کی اصل وجہ وہی ہے جس کی وضاحت سطور بالا میں کی گئی ہے ۔

کتابتِ حدیث کی ممانعت کیوں :۔ زیر تشریح حدیث غیر قرآن لکھنے کی ممانعت دائمی اور قیامت تک کے لئے نہیں تھی ، بلکہ یہ ایک وقتی اور ابتدائی دور میں حکم دیا گیا تھا تاکہ کہیں روایات اور قرآنی آیات کے اختلاط سے قرآن کی امتیازی شان ختم نہ ہو جائے ۔

علماء حدیث نے اس روایت کا یہی مفہوم متعین کیا ہے :

۱۔ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں :

النهی متقدم والاذن ناسخ له (فتح الباری ص۱۸۵ پ۱)

۲۔ ابن الجوزی کا بیان ہے :

نهی فی اول الامر ثم اجاز الکتابة (رسالہ الناسخ والمنسوخ ص۱۳)

۳۔ ابن قتیبہ لکھتے ہیں :

نهی فی اول الامر عن ان یکتب ثم رای ان تکتب وتقید (تاویل مختلف الحدیث ص۳۶۵)

ان سب عبارات کا ماحصل یہ ہے کہ پہلے آپ نے لکھنے کی ممانعت کی تھی ، بعد میں اس کی اجازت دے دی ۔

کتابتِ حدیث کی اجازت :۔ کتابتِ حدیث کی اجازت پر مشتمل احادیث قولی بھی ہیں اور فعلی بھی ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی کے آخری لمحات میں مرض الموت کی حالت میں صحابہ کرامؓ کو مخاطب کرتے ہوئے حکم دیا تھا :

ائتونی بکتاب اکتب لکم (صحیح بخاری مصری جلد ۱ ص۳۹) میرے پاس لکھنے کا سامان لاؤ میں تمہیں کچھ لکھوا دوں ۔

ظاہر ہے کہ یہاں "کچھ لکھوا دوں" سے مراد قرآن تو ہو نہیں سکتا کیونکہ قرآن کا نزول مکمل ہو چکا تھا اور آیت

"الیوم اکملت لکم دینکم" نازل ہو چکی تھی۔ اس لئے قرآن کے سوا کچھ اور باتیں آپؐ لکھوانا چاہتے تھے۔

اس موقع پر حضرت عمرؓ کا یہ قول بھی منقول ہے:

حسبنا کتاب اللہ۔ ہمیں اللہ کی کتاب کافی ہے۔

منکرین سنت نے حضرت عمرؓ کے اس قول کو تو خوب اچھالا لیکن ارشاد نبویؐ ائتونی بکتاب اکتب لکم کو بالکل پی گئے، حالانکہ اس سے کتابت حدیث کا جواز واضح طور پر سامنے آتا ہے۔ (حضرت عمرؓ کے اس قول کا صحیح مطلب بعد میں عرض کیا جائے گا۔ ان شاء اللہ)

کتابت حدیث کے بارے میں آنحضورؐ کی فعلی احادیث کی وضاحت سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ منکرین سنت کے اس شبہ کو صاف کر دیا جائے کہ اگر حدیث شرعی حجت ہوتی تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی زندگی میں اسے کتابی شکل میں مدون کروا دیتے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر قرآن کی کون سی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جو چیز دین میں حجت ہو، اس کا کتابی شکل میں ہونا بھی ضروری ہے۔ یہ تو اسی قسم کا مغالطہ یا مطالبہ ہے جو قرآن کے مقابلہ میں قریش مکہ کی طرف سے پیش کیا گیا تھا۔ وہ کہا کرتے تھے:

او ترقیٰ فی السماء ولن نؤمن لرقیک حتیٰ تنزل علینا کتابا نقرؤہ (پ: ۱۵، سورہ بنی اسرائیل)

یا تو آسمان پر چڑھ جائے اور ہم تیرے چڑھنے پر یقین نہیں کرینگے۔ تا وقتیکہ تو ہم پر ایسی کتاب اتار کر نہ لائے جسے خود ہم پڑھ سکیں۔

اسی طرح اہل کتاب نے مطالبہ کیا تھا:

یسئلک اهل الکتاب ان تنزل علیهم کتابا من السماء

اہل کتاب سوال کرتے ہیں کہ آپ آسمان سے کتاب اتار کر لائیں۔

یعنی جب تک قرآن کتابی شکل میں لکھا لکھایا ان کے سامنے نہ آجائے، وہ ایمان لانے کے لئے تیار نہ تھے۔ قرآن نے ان کے اس مطالبے کے جواب میں کہا:

ولو نزلنا علیک کتابًا فی قرطاس فلمسوہ بایدیهم لقال الذین کفروا ان هذا الا سحرٌ مبین۔ (پ سورہ انعام)

اور اگر ہم آپ پر کاغذ پر لکھی لکھائی کتاب بھی نازل کر دیتے، جس کو وہ اپنے ہاتھوں سے مس بھی کر لیتے، تب بھی یہ لوگ کہتے کہ نہیں ہے یہ مگر کھلا ہوا جادو۔

قرآن نے ان کے اس مطالبہ کو تسلیم کرنے کے بجائے، قرآنی عظمت کی نشانی یہ قرار دی کہ وہ اہل علم کے سینوں میں محفوظ ہے۔ بل هو آیات بینات فی صدور الذین اوتوا العلم (سورہ عنکبوت پ۲۱) ٹھیک اسی طرح سنت کے ذخائر بھی شروع شروع سینوں میں محفوظ رہے اور پھر آہستہ آہستہ سفینوں میں منتقل ہوتے چلے گئے۔

یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ سنت نام ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قول، فعل اور تقریر[۱] کا۔ اور آپؐ کے قول، فعل اور تقریر کا سلسلہ آپؐ کی زندگی کے آخری سانس تک جاری رہا تو یہ کیسے ممکن تھا کہ سنت کا سارا ذخیرہ آپؐ کی زندگی ہی میں کتابی شکل میں

---

[۱] تقریر کے معنی ہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کوئی کام کیا گیا ہو اور اس پر آپؐ نے انکار نہ فرمایا ہو۔

مدون ہو جاتا پھر یہ امر بھی قابل غور ہے کہ سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حافظ عہد نبویؐ ہی میں مختلف علاقوں میں منتشر ہو گئے تھے۔ ان کو یکجا کئے بغیر کسی وسیع اور جامع مجموعہ حدیث کی تدوین کیسے ہو سکتی تھی، ظاہر ہے کہ ان حالات میں اس قسم کا اہتمام قطعاً ناممکن تھا۔ پھر یہاں یہ بات بھی مخفی نہ رہے کہ سنت کے وسیع سرمایہ کو قلم بند کرنے کے لئے ضرورت تھی کہ بہت سے کاتبوں کو یکجا کیا جائے اور ان کو دوسرے کاموں سے فارغ کر کے صرف اسی کام پر لگا دیا جائے۔ یہ شکل بھی اس وقت ناممکن تھی۔ مسلمانوں میں کاتبین کی تعداد انتہائی قلیل تھی۔ اسی بنا پر آپ نے بدر کے قیدیوں کی رہائی کے لئے کتابت کی تعلیم کو زرِ فدیہ کے ہم پلہ قرار دے دیا تھا۔

(مسند احمد، جلد ۱، صفحہ ۲۴۶)

ویسے عقلی طور پر بھی یہ اعتراض غلط ہے کہ چونکہ عہد نبویؐ میں حدیثیں کتابی شکل میں مدون نہیں ہوئی تھیں، اس لئے ان کو حجت تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

آج کے "ترقی یافتہ" دور میں بھی متعدد ملکوں کا کاروبار مملکت غیر مدون دساتیر پر چل رہا ہے۔ اس کی واضح مثال انگلستان کا روایاتی، غیر تحریری دستور ہے۔ مذکورہ بالا تمام مشکلات اور مجبوریوں کے باوجود سنت کا ایک بہت بڑا ذخیرہ عہد نبویؐ اور عہد صحابہؓ میں قلم بند کر لیا گیا تھا۔ اس بارے میں مستند اور قابل اعتماد شواہد و نظائر ملتے ہیں۔ اس لئے یہ کہنا انتہائی غلط ہے کہ سنت کی کتابت و تدوین کا آغاز دوسری یا تیسری صدی ہجری میں ہوا۔

سنت کا تحریری سرمایہ: احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہم تک تین قابل اعتماد ذرائع سے پہنچی ہیں:

۱۔ تعامل امت،

۲۔ تحریری یادداشتیں اور صحیفے،

۳۔ حافظہ کی مدد سے روایت یعنی سلسلۂ درس و تدریس،

اس لحاظ سے جمع و ترتیب اور تصنیف و تالیف کے پورے زمانے کو چار امور میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱۔ عہد نبویؐ سے پہلی صدی ہجری کے خاتمہ تک: اس دور کے جامعین حدیث اور قلم بند کی ہوئی یادداشتوں اور مجموعوں کی تفصیل یہ ہے:

مشہور حافظین حدیث

۱۔ حضرت ابوہریرہؓ (عبدالرحمٰن) وفات ۵۹ھ ہجری بعمر ۷۸ سال، تعداد روایات ۵۳۷۴۔ ان کے شاگردوں کی تعداد ۸۰۰ تک پہنچتی ہے۔

۲۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عباسؓ۔ وفات ۶۸ھ ہجری بعمر ۷۱ سال۔ تعداد روایات (۲۶۶۰)

۳۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ۔ وفات ۵۸ھ ہجری بعمر ۶۷ سال۔ تعداد روایات (۲۲۱۰)

۴۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ۔ وفات ۷۳ھ ہجری بعمر ۸۴ سال۔ تعداد روایات (۱۶۳۰)

۵۔ حضرت جابر بن عبداللہ۔ وفات ۷۸ھ ہجری بعمر ۹۴ سال تعداد روایات (۱۵۶۰)

۶۔ حضرت انس بن مالکؓ۔ وفات ۹۳ھ ہجری بعمر ۱۰۳ سال۔ تعداد روایات (۱۲۸۶)
۷۔ حضرت ابو سعید خدریؓ۔ وفات ۷۴ھ ہجری بعمر ۸۴ سال۔ تعداد روایات (۱۱۷۰)

یہ وہ جلیل القدر صحابہؓ ہیں، جن کو ہزار سے زیادہ احادیث حفظ تھیں۔ ان کے علاوہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ وفات ۶۳ھ ہجری، حضرت علیؓ وفات ۴۰ھ ہجری، حضرت عمرؓ وفات ۲۳ھ ہجری کا شمار ان صحابہ میں ہوتا ہے جن کی روایات کی تعداد پانسو اور ہزار کے درمیان ہے۔

اسی طرح حضرت ابوبکر صدیقؓ وفات ۱۳ھ ہجری، حضرت عثمانؓ وفات ۳۶ھ ہجری، حضرت ام سلمہؓ وفات ۵۹ھ ہجری، حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ وفات ۵۲ھ ہجری، حضرت ابوذر غفاریؓ وفات ۳۲ھ ہجری، حضرت ابوایوب انصاریؓ وفات ۵۱ھ ہجری، حضرت ابی بن کعبؓ وفات ۱۹ھ ہجری اور حضرت معاذ بن جبلؓ وفات ۱۸ھ ہجری سے سو سے زیادہ اور پانسو سے کم روایات منقول ہیں۔

ان کے ماسوا اس دور کے ان کبار تابعین کو بھی نہیں بھلایا جا سکتا جن کی سرفروشانہ اور پُر خلوص کوششوں کی بدولت سنت کے خزانوں سے اُمتِ محمدیہؐ قیامت تک مالا مال ہوتی رہے گی۔

چند بزرگوں کا تعارف درج ذیل ہے:

۱۔ سعید بن مسیبؒ:۔ عہدِ فاروقی کے دوسرے سال مدینہ میں ان کی ولادت ہوئی اور ۱۰۵ھ میں وفات پائی۔ حضرت عثمانؓ حضرت عائشہؓ حضرت ابوہریرہؓ، حضرت زید بن ثابتؓ سے انہوں نے علم حدیث حاصل کیا۔

۲۔ عروہ بن زبیرؒ:۔ آپ کا شمار مدینہ کے ممتاز اہلِ علم میں ہوتا ہے۔ حضرت عائشہؓ کے خواہر زادے ہیں۔ زیادہ تر انہوں نے اپنی خالہ محترمہ سے احادیث روایت کی ہیں۔ نیز حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت زید بن ثابتؓ سے بھی شرف تلمذ حاصل ہے۔ صالح بن کیسانؒ اور امام زہری جیسے اہلِ علم ان کے تلامذہ میں شامل ہیں۔ آپ کی وفات ۹۴ھ میں ہوئی۔

۳۔ سالم بن عبداللہ بن عمرؓ:۔ مدینہ کے فقہا میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ آپ نے اپنے والد محترم اور دوسرے صحابہ سے علمِ حدیث حاصل کیا۔ نافع، زہری اور دوسرے مشہور تابعین آپ کے شاگرد ہیں۔ ۱۰۶ھ میں رحلت فرمائی۔

۴۔ نافع مولیٰ عبداللہ بن عمرؓ:۔ یہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے خاص شاگرد اور امام مالک کے استاد ہیں۔ محدثین کے نزدیک یہ سند (مالک عن نافع عبداللہ بن عمرؓ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) سلسلۃ الذہب (طلائی زنجیر) شمار ہوتی ہے ۱۱۷ھ میں وفات پائی۔

دورِ اوّل کا تحریری سرمایہ:۔ ۱۔ صحیفہ صادقہ: یہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ (وفات ۶۳ھ بعمر ۷۷ سال) کا مرتب کیا ہوا ہے۔ آپ کو تصنیف و تالیف کا خاص ذوق تھا۔ یہ جو کچھ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا کرتے اسے قلم بند کر لیا کرتے تھے۔ اس بارے میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اجازت دی ہوئی تھی۔[1] یہ مجموعہ تقریباً ایک ہزار احادیث پر مشتمل تھا۔ عرصہ تک ان کے خاندان میں محفوظ رہا۔ اب یہ مسند امام احمد میں بہ تمام و کمال مل سکتا ہے۔

---

[1] مختصر جامع البیان العلم صـ ۳۶، ۳۷۔

۲۔ صحیفہ صحیحہ :۔ مرتبہ ہمام بن منبہ (وفات ۱۰۱ھ) یہ حضرت ابوہریرہؓ کے مشہور تلامذہ میں سے ہیں۔ انہوں نے اپنے استادِ محترم کی روایات کو یکجا قلمبند کرلیا تھا۔ اس کے قلمی نسخے برلن اور دمشق کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ نیز امام احمد بن حنبلؒ نے اپنی مشہور مسند میں ابوہریرہؓ کے زیرِ عنوان یہ پورا صحیفہ بجنسہٖ سمو دیا ہے[1] (ملاحظہ ہو مسند احمد ج ۲ ص ۳۱۲ تا ص ۳۱۸) یہ مجموعہ کچھ عرصہ قبل ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی کوششوں سے طبع ہوکر حیدر آباد دکن سے شائع ہوچکا ہے۔ اس میں ۱۳۸ روایات ہیں۔ واضح رہے کہ صحیفہ صحیحہ کے قلمی نسخے اور امام احمد بن حنبلؒ کی روایت کردہ احادیث دونوں کے الفاظ اگرچہ یکساں ہیں لیکن سلسلہ اسناد مختلف ہے۔ راویوں کے اختلاف کے باوجود متن حدیث میں اختلاف نہ ہونا اس امر کی واضح شہادت ہے کہ محدثین نے کتنی محنت و جانفشانی سے علم حدیث کی حفاظت کی ہے۔

۳۔ حضرت ابوہریرہؓ کے دوسرے شاگرد بشیر بن نہیک نے بھی ایک مجموعہ مرتب کیا تھا جس کی انہوں نے رخصت ہوتے وقت حضرت ابوہریرہؓ کو سنا کر تصدیق کرالی تھی[2]

۴۔ مسند ابوہریرہؓ :۔ اس کے نسخے عہدِ صحابہ ہی میں لکھے گئے تھے۔ اس کی ایک نقل حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے والد عبدالعزیز بن مروان (گورنر مصر وفات ۸۶ھ) کے پاس بھی تھی۔

انہوں نے کثیر بن مرہ کو لکھا تھا کہ تمہارے پاس صحابہ کرامؓ کی جو حدیثیں ہوں، ان کو لکھ کر بھیج دو۔ لیکن حضرت ابوہریرہؓ کی روایات بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ وہ ہمارے پاس موجود ہیں[3]

مسند ابوہریرہؓ کا ایک نسخہ امام ابن تیمیہؒ کے ہاتھ کا لکھا ہوا جرمنی کے کتب خانے میں موجود ہے[4]

۵۔ صحیفہ حضرت علیؓ : امام بخاری کی تصریح سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مجموعہ کافی ضخیم تھا[5] اس میں زکوٰۃ، حرمتِ مدینہ، خطبہ حجۃ الوداع اور اسلامی دستور کے نکات موجود تھے۔

۶۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تحریری خطبہ : فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوشاہ یمنی کی درخواست پر اپنا مفصل خطبہ قلم بند کرنے کا حکم دیا تھا[6] یہ خطبہ حقوق انسانی کی اہم تفصیلات پر مشتمل ہے۔

۷۔ صحیفہ حضرت جابرؓ : حضرت جابر بن عبداللہ کی روایات کو ان کے تلامذہ وہب بن منبہؒ (وفات ۱۱۰ھ) اور سلیمان[7] بن قیس لشکری نے تحریری طور پر مرتب کرلیا تھا۔ یہ مجموعہ مناسک حج، خطبہ حجۃ الوداع پر مشتمل تھا۔

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، دیباچہ صحیفہ ہمام مرتبہ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب۔

[2] جامع العلم۔ ج ۱ ص ۷۲۔ تہذیب التہذیب۔ ج ۱۔ ص ۴۷۰

[3] دیباچہ صحیفہ ہمام ص ۵۰ بحوالہ طبقات ابن سعد ج ۷ ص ۱۵۷

[4] مقدمہ تحفۃ الاحوذی شرح ترمذی ص ۱۶۵

[5] صحیح بخاری۔ کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ ج ۱، ص ۵۱۴

[6] صحیح بخاری، مطبع احمدی ج ۱۔ ص ۲۰۔ مختصر جامع العلم ص ۳۶۔ صحیح مسلم ج ۱ ص ۴۳۹۔ [7] تہذیب التہذیب ج ۴۔ ص ۲۱۵

۸۔ روایات حضرت عائشہ صدیقہؓ : حضرت عائشہؓ کی احادیث ان کے شاگرد عروہ بن زبیر نے قلمبند کر لی تھیں۔[۱]

۹۔ احادیث ابن عباسؓ : حضرت عبداللہ بن عباس کی روایات کے متعدد مجموعے تھے۔ حضرت سعید بن جبیر تابعی بھی ان کی روایات تحریری طور پر مرتب کرتے تھے۔

۱۰۔ انس بن مالکؓ کے صحیفے : سعید بن ہلال کہتے ہیں کہ حضرت انس اپنی قلمی یادداشتیں نکال کر ہمیں دکھاتے اور فرماتے یہ روایات میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہیں اور قلم بند کرانے کے بعد آپؐ کو سنا کر تصدیق بھی کرا لی ہے۔[۲]

۱۱۔ عمرو بن حزمؓ : جن کو یمن کا گورنر بنا کر بھیجتے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تحریری ہدایت نامہ دیا تھا انہوں نے نہ صرف یہ کہ اس ہدایت نامہ کو محفوظ رکھا بلکہ اسکے ساتھ اکیس دوسرے فرامین نبویؐ بھی شامل کر کے ایک اچھی خاصی کتاب مرتب کر لی۔[۳]

۱۲۔ رسالہ سمرہ بن جندب : یہ ان کے صاجزادے کو وراثت میں ملا۔ یہ روایات کے ایک بہت بڑے ذخیرے پر مشتمل تھا۔[۴]

۱۳۔ صحیفہ سعد بن عبادہؓ : حضرت سعد بن عبادہ صحابی، دورِ جاہلیت سے ہی لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔

۱۴۔ مکتوبات حضرت نافعؓ : سلیمان بن موسیٰ کی روایت ہے کہ عبداللہ بن عمر املا کرا رہے تھے اور نافع لکھتے جاتے تھے۔[۵]

۱۵۔ معن سے روایت ہے کہ عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن مسعود نے میرے سامنے کتاب نکالی اور حلف اٹھاتے ہوئے کہا کہ یہ میرے والد عبداللہ بن مسعود کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔[۶] اگر تحقیق و تفتیش کا یہ سلسلہ جاری رکھا جائے تو ان کے علاوہ بہت سی مزید مثالیں اور واقعات مل سکتے ہیں۔

اسی دور میں صحابہ کرام اور کبار تابعین نے زیادہ تر اپنی ذاتی یادداشتوں کو قلم بند کرنے پر توجہ دی۔ لیکن دوسرے دور میں جمع و تدوین کا کام مزید وسعت اختیار کر گیا۔ جامعین حدیث نے اپنی ذاتی معلومات کے ساتھ ساتھ اپنے شہر یا علاقہ کے اہل علم سے مل کر ان کی روایات بھی منضبط کریں۔

دوسرا دور : یہ دوسرا دور تقریباً دوسری صدی ہجری کے نصف پر منتہی ہوتا ہے۔ اس دور میں تابعین کی ایک بڑی جماعت تیار ہو گئی۔ جس نے دورِ اول کے تحریری سرمایہ کو وسیع تر تالیفات میں سمیٹ لیا۔

جامعین حدیث : ۱۔ محمد بن شہاب زہری (وفات ۱۲۴ھ)۔ یہ اپنے زمانے کے ممتاز محدثین میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ نے

۱؎ تہذیب التہذیب۔ ج ۷۔ ص ۱۸۳

۲؎ دیباچہ صحیفہ ہمام ص ۳۴۔ بحوالہ الخطیب البغدادی۔ نیز مستدرک حاکم۔ ج ۳۔ ص ۵۷۴

۳؎ الوثائق السیاسیہ ص ۱۰۵۔ از ڈاکٹر حمید اللہ بحوالہ طبری ص ۱۰۴۔

۴؎ تہذیب التہذیب۔ ابن حجر۔ ج ۴۔ ص ۲۳۶۔

۵؎ دارمی ص ۶۹۔ نیز دیباچہ صحیفہ ہمام ص ۴۵ بحوالہ طبقات ابن سعد۔

۶؎ مختصر جامع العلم ص ۳۷

علم حدیث مندرجہ ذیل جلیل القدر شخصیتوں سے حاصل کیا ہے :

صحابہ میں سے : عبداللہ بن عمرؓ، انس بن مالکؓ، سہل بن سعد

تابعین میں سے : سعد بن مسیب، محمود بن ربیع وغیرہ ۔

آپ کے تلامذہ میں امام اوزاعی، امام مالک اور سفیان بن عیینہ جیسے ائمہ حدیث کا شمار ہوتا ہے۔ ان کو حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ۱۰۱ھ میں احادیث جمع کرنے کا حکم دیا تھا۔ ان کے علاوہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے مدینہ کے گورنر ابوبکر محمد بن عمرو بن حزم کو ہدایت بھیجی تھی کہ عمرہ بنت عبدالرحمٰن اور قاسم بن محمد کے پاس جو احادیث کا ذخیرہ ہے اسے قلم بند کرلیں۔

یہ عمرہ حضرت عائشہؓ کے خاص شاگردوں میں سے ہیں اور قاسم بن محمد ان کے برادر زادے ہیں۔ حضرت عائشہ نے اپنی نگرانی میں ان کی تربیت و تعلیم کا اہتمام کیا تھا۔ (تہذیب التہذیب ج ۷، ص ۱۶۲)

صرف اتنا ہی نہیں بلکہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے مملکت اسلامی کے تمام ذمہ داروں کو ذخائر حدیث کے جمع و تدوین کرنے کا تاکیدی فرمان جاری کردیا تھا۔ جس کے نتیجہ میں احادیث کے دفتر کے دفتر دارالخلافہ دمشق پہنچ گئے۔ خلیفۂ وقت نے ان کی نقلیں مملکت کے گوشے گوشے میں پھیلا دیں۔[1]

امام زہری کے مجموعہ حدیث مرتب کرنے کے بعد اس دور کے دوسرے اہل علم نے بھی تدوین و تالیف کا کام شروع کردیا۔
عبدالملک بن جریج (۱۵۰ھ) نے مکہ میں، امام اوزاعی (ف ۱۵۶ھ) نے شام میں، معمر بن راشد (ف ۱۵۳ھ) نے یمن میں، امام سفیان ثوری (ف ۱۶۱ھ) نے کوفہ میں، امام حماد بن سلمہ (ف ۱۶۷ھ) نے بصرہ میں اور امام عبداللہ بن المبارک (۱۸۱ھ) نے خراسان میں احادیث کے جمع و تدوین کے کام میں سبقت کا شرف حاصل کیا۔

۱۔ امام مالک بن انس (ولادت ۹۳ھ وفات ۱۷۹ھ): امام زہری کے بعد مدینہ میں حدیث نبویؐ کی تدوین کا شرف آپ ہی کو حاصل ہوا ہے۔ آپ نے نافع، زہری اور دوسرے ممتاز اہل علم سے استفادہ کیا۔ آپ کے اساتذہ کی تعداد نو سو تک پہنچتی ہے۔ آپ کے چشمۂ فیض سے براہِ راست حجاز، شام، عراق، فلسطین، مصر، افریقہ اور اندلس کے ہزاروں تشنگانِ سنت سیراب ہوئے۔ آپ کے تلامذہ میں لیث بن سعد (ف ۱۷۵ھ)، ابن مبارک (ف ۱۸۱ھ)، امام شافعی (ف ۲۰۴ھ)، امام محمد بن حسن الشیبانی (ف ۱۸۹ھ) جیسے مشاہیر شامل ہیں۔

اس دور میں حدیث کے بہت سے مجموعے مرتب ہوئے۔ جن میں امام مالک کی مؤطا کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ اس کا زمانہ تالیف ۱۳۰ھ کے درمیان ہے۔ کل روایات کی تعداد ۱۷۰۰ ہے، جن میں سے مرفوع ۶۰۰، مرسل ۲۲۸، موقوف ۶۱۳، اور اقوال تابعین ۲۸۵ ہیں۔ اس دور کی چند دوسری تالیفات کے نام یہ ہیں۔

جامع سفیان ثوری (ف ۱۶۱ھ)، جامع ابن المبارک (ف ۱۸۱ھ)، جامع امام اوزاعی (ف ۱۵۶ھ)، جامع ابن جریج (ف ۱۵۰ھ)

۱؎ تذکرۃ الحفاظ۔ ج ۱، ص ۱۰۶۔ مختصر جامع العلم ص ۳۸

کتاب الخراج۔ قاضی ابویوسف (ف ۱۸۲ھ)، کتاب الآثار۔ امام محمد (ف ۱۸۹ھ) اس دور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث، آثار صحابہ اور فتاویٰ تابعین کو ایک ہی مجموعہ میں مرتب کر لیا جاتا تھا۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی وضاحت ہو جاتی تھی کہ یہ صحابی یا تابعی کا قول ہے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث۔

تیسرا دَور :۔ یہ دور تقریباً دوسری صدی ہجری کے نصف آخر سے چوتھی صدی ہجری کے خاتمہ تک پھیلا ہوا ہے۔ اس دَور کی خصوصیات یہ ہیں۔

۱۔ احادیث نبویؐ کو آثار صحابہ اور اقوال تابعین سے الگ کر کے مرتب کیا گیا۔

۲۔ قابل اعتماد روایات کے علیحدہ مجموعے تیار کئے گئے اور اس طرح چھان بین اور تفتیش کے بعد دوسرے دور کی تصانیف تیسرے دور کی ضخیم کتابوں میں سما گئیں۔

اس دور میں نہ صرف یہ کہ روایات جمع کی گئیں، بلکہ علم حدیث کی حفاظت کے لئے محدثین کرام نے سو سے زیادہ علوم کی بنیاد ڈالی، جن پر اب تک ہزاروں کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ شکر الله سعیهم وجزاهم عنا احسن الجزاء

مختصر طور پر چند علوم کا تعارف یہاں کرایا جاتا ہے۔

۱۔ **علم اسماء الرجال :** اس علم میں راویوں کے حالات، پیدائش وفات، اساتذہ، تلامذہ کی تفصیل۔ طلب علم کے لئے سفر اور ثقہ۔ غیر ثقہ ہونے کے بارے میں ماہرین علم حدیث کے فیصلے درج ہیں۔ یہ علم بہت ہی وسیع، مفید اور دلچسپ ہے۔

بعض متعصب مستشرقین بھی یہ اعتراف کئے بغیر نہ رہ سکے کہ اس فن کی بدولت پانچ لاکھ راویوں کے حالات محفوظ ہو گئے۔ یہ وہ خصوصیت ہے، جس میں مسلمان قوم کی نظیر ملنا مشکل ہے[1]۔ اس علم میں سینکڑوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ چند کے نام یہ ہیں۔

۱۔ (ا) تہذیب الکمال : مولفہ امام یوسف مزّی (وفات ۷۴۲ھ) اس علم میں یہ سب سے زیادہ اہم اور مستند کتاب ہے۔

(ب) تہذیب التہذیب : مولفہ حافظ ابن حجر۔ شارح بخاری۔ یہ بارہ جلدوں میں ہے۔ حیدر آباد دکن سے شائع ہو چکی ہے۔

(ج) تذکرۃ الحفاظ : مرتبہ علامہ ذہبی (وفات ۷۴۸ھ)

۲۔ **علم مصطلح الحدیث** (اصول حدیث) اس علم کی روشنی میں حدیث کی صحت وضعف کے قواعد وضوابط معلوم ہوتے ہیں۔

اس علم کی مشہور کتاب علوم الحدیث معروف بہ مقدمہ ابن الصلاح ہے۔ مولفہ ابوعمرو عثمان ابن الصلاح (وفات ۵۷۷ھ)

ماضی قریب میں اصول حدیث پر دو کتابیں شائع ہوئی ہیں :

(ا) توجیہ النظر : مولفہ علامہ طاہر بن صالح الجزائری (ف ۱۳۳۸ھ)

(ب) قواعد التحدیث : مرتبہ علامہ سید جمال الدین قاسمی (وفات ۱۳۳۲ھ)

اوّل الذکر وسعتِ معلومات اور آخر الذکر حسن ترتیب میں ممتاز ہیں۔

---

[1] مقدمہ الاصابہ انگریزی شائع شدہ ۱۸۶۴ء۔ از کلکتہ مرتبہ مستشرق اسپرنگر

۳۔ **علم غریب الحدیث** : اس علم میں حدیث کے مشکل الفاظ کی لغوی تحقیق کی گئی ہے۔ اس علم میں علامہ زمخشری (وفات ۵۳۹ھ) کی الفائق اور ابن الاثیر (ف ۶۰۶ھ) کی نہایہ مشہور ہیں۔

۴۔ **علم تخریج الاحادیث** : اس علم کے ذریعہ معلوم ہوتا ہے کہ مشہور کتب تفسیر، فقہ، تصوف اور عقائد میں جو روایات درج ہیں، ان کا اصل ماخذ اور سرچشمہ کیا ہے مثلاً ہدایہ از برہان الدین علی بن ابی بکر المرغینانی (ف ۵۹۲ھ) اور احیاء العلوم از امام غزالی ف ۵۰۵ھ) میں بہت سی روایات بلا سند اور بلا حوالہ مذکور ہیں۔

اب اگر کسی کو یہ معلوم کرنا ہو کہ یہ روایات کس پایہ کی ہیں اور کون کون سی حدیث کی اہم کتابوں میں ان کا ذکر ہے تو اول الذکر کے لئے حافظ زیلعی (وفات ۷۹۳ھ) کی نصب الرایہ اور حافظ ابن حجر عسقلانی (وفات ۸۵۶ھ) کی طرف رجوع کرنا چاہیئے اور آخر الذکر کے لیے حافظ زین الدین عراقی (ف ۸۰۶ھ) کی تالیف المغنی عن حمل الاسفار موزوں رہے گی۔

۵۔ **علم الاحادیث الموضوعہ** : اس فن میں اہلِ علم نے مستقل کتابیں تصنیف کی ہیں۔ موضوع (من گھڑت) روایات کو الگ چھانٹ دیا گیا ہے۔ اس بارے میں قاضی شوکانی (ف ۱۲۵۵ھ) کی الفوائد المجموعہ اور حافظ جلال الدین سیوطی (ف ۹۱۱ھ) کی اللآلی المصنوعہ زیادہ نمایاں ہیں۔

۶۔ **علم الناسخ والمنسوخ** : اس فن میں امام محمد بن موسیٰ حازمی (ف ۵۸۴ھ بعمر ۳۵ سال) کی تصنیف کتاب الاعتبار زیادہ مستند اور مشہور ہے۔

۷۔ **علم التوفیق بین الاحادیث** : اس علم میں ان روایات کی صحیح توجیہہ بیان کی گئی ہے جن میں بظاہر تعارض اور ٹکراؤ معلوم ہوتا ہے۔ سب سے پہلے امام شافعی (ف ۲۰۴ھ) نے اس موضوع پر گفتگو کی ہے۔ ان کا رسالہ مختلف الحدیث کے نام سے مشہور ہے۔ امام طحاوی (ف ۳۲۱ھ) کی مشکل الآثار بھی اس فن کی مفید کتاب ہے۔

۸۔ **علم مختلف والموتلف** : اس علم میں خاص طور پر ان راویوں کا ذکر کیا گیا ہے، جن کے اپنے نام کنیت، لقب، آباؤ اجداد کے نام یا اساتذہ کے نام ملتے جلتے ہیں اور اس اشتباہ کی بنا پر ایک ناواقف انسان مغالطہ میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ اس فن میں حافظ ابن حجر کی تبصیر المنتبہ زیادہ جامع کتاب ہے۔

۹۔ **علم اطراف الحدیث** : اس علم کے ذریعہ معلوم ہو سکتا ہے کہ فلاں روایت کس کتاب میں ہے اور اس کے راوی کون کون سے ہیں مثلاً آپ کو " انما الاعمال بالنیات " حدیث کا ایک جملہ یاد ہے۔ آپ چاہتے ہیں کہ اس کے تمام مآخذ روایت کے پورے الفاظ اور راوی معلوم ہو جائیں تو آپ کو اس علم کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ اس عنوان پر حافظ مزی (ف ۷۴۲ھ) کی کتاب تحفۃ الاشراف بمعرفۃ الاطراف زیادہ مفصل ہے۔ اس میں صحاح ستہ کی روایات کی پوری فہرست آ گئی ہے۔ اس کتاب کی ترتیب میں حافظ یوسف مزی کے ۲۶ سال صرف ہوئے ہیں۔ انتہائی محنت شاقہ کے بعد یہ کتاب مکمل ہوئی ہے

آج کے مستشرقین نے ایسی ہی کتابوں سے خوشہ چینی کر کے ذرا نئے ڈھب سے احادیث کی فہرست مرتب کی ہے۔ مثلاً مفتاح کنوز السنہ انگریزی میں شائع ہوئی تھی۔ جس کا عربی میں ترجمہ ۱۹۳۴ء میں مصر سے شائع ہوا ہے اور اب ایک وسیع فہرست

المعجم المفہرس کے نام سے زیر ترتیب ہے۔ جس کے کم و بیش بیس اجزاء شائع ہو چکے ہیں۔

۱۰۔ **فقہ الحدیث**: اس علم میں احکام پر مشتمل احادیث کے اسرار اور حکمتیں بے نقاب کی گئی ہیں۔ اس موضوع پر حافظ ابن قیم (ف ۷۵۱ھ) کی کتاب اعلام الموقعین اور شاہ ولی اللہ کی حجۃ اللہ البالغہ سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اہل علم نے زندگی کے مختلف مسائل پر الگ الگ تصانیف بھی مرتب کی ہیں۔ مثلاً مالی معاملات میں ابو عبید قاسم بن سلام (ف ۲۲۴ھ) کی تالیف کتاب الاموال مشہور ہے اور زمین کے مسائل عشر اخراج وغیرہ پر قاضی ابو یوسف کی کتاب الخراج بہترین تصنیف ہے۔ نیز سنت کے ماخذ شریعت ہونے اور منکرین حدیث کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کا پردہ چاک کرنے کے لئے مندرجہ ذیل تصانیف کا مطالعہ مفید ہو سکتا ہے۔

کتاب الام جلد ۷۔ الرسالہ امام شافعی۔ الموافقات جلد چہارم مؤلفہ ابو اسحاق شاطبی (ف ۷۹۰ھ)، صواعق مرسلہ جلد ۲۔ ابن قیم۔ الاحکام ابن حزم الاندلسی (ف ۴۵۶ھ)۔ مقدمہ ترجمان السنہ اردو از مولانا بدر عالم میرٹھی۔ اثبات الخبر مؤلفہ والد محترم مولانا حافظ عبد الستار حسن عمر پوری (وفات ۱۹۱۶ء مطابق ۱۳۲۴ھ بعمر ۴۴ سال) حدیث اور قرآن مرتبہ مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی۔

نیز انکار حدیث کا منظر اور پس منظر کے نام سے جناب افتخار احمد بلخی کی تصنیف بھی دلچسپ اور معلومات افزا ہے۔ اب تک اس کے دو حصے شائع ہو چکے ہیں۔ کچھ عرصہ قبل علامہ مصطفےٰ سباعی نے احادیث کے حجت ہونے پر رسالہ المسلمون (دمشق) میں نہایت ہی مفید سلسلہ مضامین شائع کیا تھا۔ جس کا اردو ترجمہ محترم رفیق ملک غلام علی صاحب نے کیا ہے۔ سنتِ رسول کے نام سے یہ کتابچہ شائع ہو چکا ہے۔

تاریخ علم حدیث اور متعلقہ مباحث پر مندرجہ ذیل تصانیف اپنے اندر جامعیت اور افادیت کا پہلو رکھتی ہیں۔

مقدمہ فتح الباری، حافظ ابن حجر۔ جامع بیان العلم (از حافظ ابن عبد البر اندلسی وفات ۴۶۳ھ) معرفت علوم الحدیث۔ امام حاکم (وفات ۴۰۵ھ)۔ مقدمہ تحفۃ الاحوذی، مؤلفہ عبد الرحمٰن صاحب محدث مبارک پوری (ف ۱۳۵۳ھ مطابق ۱۹۳۵ء) ماضی قریب کی تصانیف میں یہ کتاب اپنی جامعیت اور افادیت کے لحاظ سے ایک شاہکار ہے۔ اسی طرح مقدمہ فتح الملہم مرتبہ مولانا شبیر احمد عثمانی اور اردو میں تدوین حدیث مرتبہ مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم وسیع معلومات کا گنجینہ ہیں۔

تیسرے دور کے جامعین حدیث: اس دور کے ممتاز اور مشہور جامعین حدیث اور مستند تالیفات کا تعارف ذیل میں کرایا جاتا ہے۔

۱۔ امام احمد بن حنبل (ولادت ۱۶۴ھ وفات ۲۴۱ھ) آپ کی اہم تالیف مسند احمد کے نام سے مشہور ہے۔ یہ تیس ہزار روایات پر مشتمل ہے۔ اس کی چوبیس جلدیں ہیں۔ قابلِ ذکر احادیث سب اس میں آگئی ہیں۔ اس میں عنوان کے لحاظ سے ترتیب کے بجائے ہر صحابی کی تمام روایات یکجا مرتب کر دی گئی ہیں۔ اس کتاب کی تبویب یعنی عنوان وار ترتیب حسن البنا شہید کے والد محترم احمد عبد الرحمٰن ساعاتی نے شروع کی تھی۔ اس وقت تک ۱۴ جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔

۲۔ امام محمد بن اسماعیل البخاری (ولادت ۱۹۴ھ وفات ۲۵۶ھ) آپ کی تاریخ ولادت "صدق" اور تاریخ وفات "نور" سے نکلتی ہے۔ امام بخاری کی تصانیف میں سے سب سے اہم اور مستند کتاب صحیح بخاری ہے۔ جس کا پورا نام یہ ہے "الجامع الصحیح المسند

المختصر من امور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وایامہ"۔

اس کتاب کی تالیف میں ۱۶ سال صرف ہوئے۔ آپ سے براہ راست صحیح بخاری پڑھنے والے تلامذہ کی تعداد نوے ہزار تک پہنچتی ہے۔ بعض دفعہ ایک ہی مجلس میں حاضرین کی تعداد تیس ہزار تک پہنچ جایا کرتی تھی۔ اس قسم کے اجتماعات میں املا کرانے والوں کا شمار ۳۰۰ سے متجاوز ہو جاتا تھا۔ کل تعداد روایات مع تعلیقات ۹۰۸۲، مرفوع مسند روایات ۷۲۷۵، غیر مکرر روایات ۴۰۰۰۔ امام بخاری نے دوسرے محدثین کی بہ نسبت راویوں کے پرکھنے کا معیار زیادہ بلند رکھا ہے۔

۳۔ امام مسلم ابن حجاج قشیری: (ولادت ۲۰۲ھ، وفات ۲۶۱ھ) امام بخاری، امام احمد بن حنبل ان کے اساتذہ میں شامل ہیں اور امام ترمذی، ابوحاتم رازی، ابوبکر بن خزیمہ کا شمار ان کے تلامذہ میں ہوتا ہے۔ اس کی کتاب صحیح مسلم حسن ترتیب کے لحاظ سے زیادہ ممتاز مانی جاتی ہے۔

۴۔ امام ابوداؤد اشعث بن سلیمان سجستانی (ولادت ۲۰۲ھ وفات ۲۷۵ھ) ان کی اہم تالیف سنن ابوداؤد کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں زیادہ تر احکام پر مشتمل روایات کو پوری جامعیت کے ساتھ یکجا کر دیا گیا ہے۔ فقہی اور قانونی مسائل کا یہ بہترین ماخذ ہے۔ یہ چار ہزار آٹھ سو احادیث پر مشتمل ہے۔

۵۔ امام ابوعیسیٰ ترمذی (ولادت ۲۰۹ھ وفات ۲۷۹ھ) ان کی کتاب میں فقہی مسالک کی تفصیل وضاحت سے کی گئی ہے۔

۶۔ امام احمد بن شعیب نسائی (وفات ۳۰۳ھ) ان کی تصنیف کا نام السنن المجتبیٰ ہے۔

۷۔ امام محمد بن یزید ابن ماجہ قزوینی: (وفات ۲۷۳ھ) ان کی کتاب سنن ابن ماجہ کے نام سے مشہور ہے۔ مسند احمد کے علاوہ ان چھ کتابوں کو محدثین کی اصطلاح میں صحاح ستہ کہا جاتا ہے۔ بعض اہل علم نے بجائے ابن ماجہ کے موطا امام مالک کو صحاح ستہ میں شمار کیا ہے۔

ان کے علاوہ اس دور میں اور بھی بہت سی مفید اور جامع تالیفات شائع ہوئی ہیں۔ جن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔
بخاری، مسلم، ترمذی جامع کہلاتی ہیں۔ یعنی عقائد، عبادات، اخلاق اور معاملات وغیرہ تمام عنوانات پر ان میں احادیث موجود ہیں اور ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ سنن کہلاتی ہیں۔ یعنی ان میں زیادہ تر عملی زندگی سے متعلق روایات درج ہیں۔

طبقات کتب حدیث: محدثین نے روایات کی صحت و قوت کے لحاظ سے تمام کتب حدیث کو چار طبقات پر تقسیم کیا ہے۔

۱۔ موطا امام مالکؒ، صحیح بخاریؒ، صحیح مسلمؒ۔ یہ تینوں کتابیں صحت، سند اور راویوں کی ثقاہت کے اعتبار سے اعلیٰ مقام رکھتی ہیں۔

۲۔ ابوداؤدؒ، ترمذیؒ، نسائیؒ۔ ان کتابوں کے بعض راوی ثقاہت کے اعتبار سے طبقۂ اول سے فروتر ہیں۔ لیکن ان کو بہرحال قابل اعتماد مانا جاتا ہے۔ مسند احمد کا شمار شاہ ولی اللہ کی تحقیق کے مطابق طبقہ (۲) اور (۳) کے درمیان ہوتا ہے۔

۳۔ دارمی (وفات ۲۵۵ھ)، ابن ماجہ، بیہقی، دارقطنی (ف ۳۸۵ھ) کتب طبرانی (ف ۳۶۰ھ) تصانیف طحاوی (ف ۳۲۱ھ) مسند شافعی، مستدرک حاکم (ف ۴۰۵ھ) ان کتابوں میں صحیح، ضعیف ہر قسم کی روایات موجود ہیں۔ لیکن قابل اعتماد روایات کا عنصر غالب ہے۔

۴۔ تصانیف ابن جریر طبری (ف ۳۱۰ھ)، کتب خطیب بغدادی (ف ۴۶۳ھ)، ابونعیم (ف ۴۳۰ھ)، ابن عساکر (ف ۵۷۱ھ)، دیلمی صاحب فردوس (ف ۵۰۹ھ)، کامل ابن عدی (ف ۳۶۵ھ)، تالیفات ابن مردویہ (ف ۴۱۰ھ)، واقدی (ف ۲۰۷ھ) اور اسی نوع کے دوسرے مصنفین کی کتابیں اسی طبقہ میں شمار ہوتی ہیں۔ یہ تالیفات رطب ویابس کا مجموعہ ہیں۔ موضوع (من گھڑت) روایات تک بھی ان میں بکثرت موجود ہیں۔ زیادہ تر عام واعظین، مورخین اور اصحاب تصوف کا سہارا یہی کتابیں ہیں لیکن اگر چھان بین سے کام لیا جائے تو ان تالیفات میں سے بھی بیش بہا جواہر ریزے نکالے جا سکتے ہیں۔

چوتھا دور:۔ تقریباً پانچویں صدی ہجری سے شروع ہوتا ہے اور اس کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ اس عرصہ میں تیسرے دور کا اندازِ تدوین اختتام کو پہنچ گیا تھا۔ اس طویل مدت میں جو کام ہوا ہے اس کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ حدیث کی اہم کتابوں کی شرحیں، حواشی اور دوسری زبانوں میں تراجم لکھے گئے۔

۲۔ جن علوم حدیث کا ذکر اوپر آیا ہے، ان پر بہت سی تصانیف اسی دور میں وجود میں آئی ہیں اور ان کی شرحیں اور خلاصے لکھے گئے ہیں۔

۳۔ اہل علم نے اپنے ذوق یا ضرورت کے مطابق تیسرے دور کی تالیفات سے احادیث منتخب کرکے مفید کتابیں مرتب کی ہیں۔ ان میں سے چند کے نام یہ ہیں۔

ا۔ مشکوٰۃ المصابیح: مؤلفہ ولی الدین خطیب۔ اس میں عقائد، عبادات، معاملات، اخلاق، آداب اور حشر و نشر سے متعلق روایات جمع کر دی گئی ہیں۔

ب۔ ریاض الصالحین: مرتبہ امام ابو ذکریا یحییٰ بن شرف نووی شارح مسلم (ف ۶۷۶ھ)، یہ زیادہ تر اخلاق و آداب پر مشتمل احادیث کا انتخاب ہے۔ ہر باب کے شروع میں عنوان کے مطابق قرآنی آیات بھی ذکر کی گئی ہیں۔ یہ اس کتاب کی اہم خصوصیت ہے صحیح بخاری کا بھی اندازِ تالیف و ترتیب یہی ہے۔

ج۔ منتقی الاخبار مؤلفہ مجد الدین ابو البرکات عبدالسلام بن تیمیہ (ف ۶۵۲ھ): یہ مشہور شیخ الاسلام تقی الدین احمد بن تیمیہ (ف ۷۲۸ھ) کے جدِ امجد ہیں۔ اس کتاب کی شرح آٹھ جلدوں میں قاضی شوکانی نے نیل الاوطار کے نام سے مرتب کی ہے۔

د۔ بلوغ المرام: مرتبہ حافظ ابن حجر شارح بخاری (ف ۸۵۲ھ) اس میں زیادہ تر عبادات اور معاملات سے متعلق احادیث جمع کی گئی ہیں۔ اس کی شرح سبل السلام عربی میں محمد بن اسماعیل صنعانی (وفات ۱۱۸۲ھ) کے قلم سے شائع ہوئی ہے۔ اور دوسری مسک الختام کے نام سے فارسی میں نواب صدیق حسن خان (ف ۱۳۰۷ھ) نے ترتیب دی ہے۔ ان میں سے اکثر کے تراجم عرصہ ہوا، اردو میں شائع ہو چکے ہیں۔

غیر منقسم ہندوستان میں سب سے پہلے شیخ عبدالحق محدث دہلوی بن سیف الدین ترک (وفات ۱۰۵۲ھ) نے علم حدیث کی شمع روشن کی۔ اس کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ (وفات ۱۱۷۶ھ) اور ان کی اولاد، احفاد اور ارشد تلامذہ کی جانفشانیوں اور جگر کاویوں سے اس ملک کی سرزمین نورِ سنت سے جگمگا اٹھی۔ واشرقت الارض بنور ربھا۔

شاہ ولی اللہؒ کے بعد سے اس ملک میں تراجم شروح اور منتخب احادیث کے مجموعوں کی ترتیب و اشاعت کا مقدس سلسلہ اب تک جاری ہے۔

اس پوری تفصیل کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ عہدِ نبویؐ سے لے کر اب تک کوئی دور بھی ایسا نہیں گزرا ہے جس میں حدیث کے لکھنے اور روایت کرنے کا سلسلہ منقطع ہوگیا ہو۔ یہ وہ سلسلۂ علم ہے، جس کا دن بھی روشن ہے اور جس کی رات کا دامن بھی درخشانیوں اور تابنائیوں سے بھرپور ہے۔ لیلھا کنھارھا

سنتِ نبویؐ اور خلفائے راشدین : ذیل میں ان روایات کی تشریح کی گئی ہے جن کی بناء پر عام طور پر منکرین حدیث و سنت، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو اپنا ہم نوا اور ہم مسلک قرار دیتے ہیں ضمنی طور پر بعض دوسرے مباحث بھی آگئے ہیں۔

عن ابن عباسؓ لما اشتد بالنبی صلی اللہ علیہ وسلم وجعہ قال ائتونی بکتاب اکتب لکم کتابا لا تضلوا بعدہ قال عمرؓ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم غلبہ الوجع وعندنا کتاب اللہ حسبنا فاختلفوا وکثر اللغط' قال قوموا عنی ولا ینبغی عندی التنازع

(صحیح بخاری مصری باب کتابۃ العلم ج ۱، صـ ۲۲)

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا درد جب شدت اختیار کرگیا تو آپ نے ارشاد فرمایا، میرے پاس لکھنے کا سامان لاؤ میں کچھ لکھوا دوں، تاکہ بعد میں تم گمراہی میں مبتلا نہ ہونے پاؤ، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تکلیف کی شدت کا غلبہ ہوگیا ہے اور ہمارے پاس اللہ کی کتاب موجود ہے۔ وہ کافی ہے صحابہ میں اختلاف پیدا ہوا اور شور بڑھ گیا تو آپ نے فرمایا۔ میرے پاس سے اٹھ کھڑے ہو میرے پاس نزاع مناسب نہیں ہے۔

صحیح مسلم کی روایت میں مزید یہ الفاظ ملتے ہیں:

وقالوا ماشانہ اھجر استفھموہ، قال قال دعونی فالذی انا فیہ خیر اوصیکم بثلاث اخرجوا المشرکین من جزیرۃ العرب واجیزوا الوفد لنحو ماکنت اجیزھم قال و سکت عن الثالثۃ اوقال فانسیتھا۔

(ج ۲۔ صـ ۴۲۔ باب ترک الوصیۃ)

حاضرین نے کہا: کیا آپؐ (دنیا کو) چھوڑ چلے ہیں۔ دریافت تو کرلو (بعض روایات میں یہ الفاظ حضرت عمرؓ کی طرف منسوب ہیں) راوی کا بیان ہے کہ آپ نے فرمایا مجھے چھوڑ دو۔ میں جس حال میں ہوں وہ بہتر ہے۔ میں تمہیں تین باتوں کی وصیت کرتا ہوں۔ (۱) مشرکین کو جزیرۂ عرب سے نکال باہر کرو (۲) غیر ملکی یا قبائلی وفود (مہمانوں) کی اسی طرح عزت کرو جس طرح میں کرتا رہا ہوں، حضرت ابن عباسؓ کے شاگرد سعید بن جبیر کا بیان ہے کہ تیسری بات کے ظاہر کرنے یا تو حضرت ابن عباس خاموش رہے یا مجھے یاد نہ رہی۔

ایک اور روایت میں یہ الفاظ منقول ہیں:

ائتونی بالکتف والدواۃ او اللوح والدواۃ۔

یعنی شانے کی ہڈی اور دوات یا تختی اور دوات (لکھنے کا سامان) لے کر آؤ تاکہ میں کچھ لکھوا دوں۔

اس حدیث کے مطالعہ کے وقت مختلف قسم کے سوالات ذہن میں پیدا ہو سکتے ہیں۔

۱۔ آپؐ کیا لکھوانا چاہتے تھے کہ جس کی بنا پر گمراہی کا امکان باقی نہ رہتا۔

۲۔ ضلالت سے کیا مراد ہے؟ کیا حاضرین کے اختلاف و نزاع کی وجہ سے پیغمبر کے لئے جائز ہے کہ وہ ایسی بات کو ظاہر نہ کرے، جس کی بنا پر امت ضلالت سے بچ سکے۔

۳۔ بعض صحابہ خصوصاً حضرت عمرؓ نے آپؐ کے حکم کی تعمیل کیوں نہ کی؟

۴۔ اس موقع پر صحابہ کے اختلاف کی نوعیت کیا تھی؟

۵۔ ھَجَرَ کے معنی عام طور پر ہذیان کے لئے جاتے ہیں۔ کیا اس میں گستاخی اور سوءِ ادبی کا پہلو نہیں پایا جاتا۔ کیا اس قسم کے کلمات صحابہ خصوصاً حضرت عمرؓ کی زبان سے نکلنے کسی درجہ میں بھی مناسب تھے؟

۶۔ حضرت عمرؓ کے قول حسبنا کتاب اللہ سے کیا مراد ہے؟ کیا ان کا یہ ارشاد مسلک انکار سنت کی تائید نہیں کر رہا ہے؟

سوال نمبر ۱، ۲، ۳ کا جواب یہ ہے کہ حضرت عمرؓ آپؐ کے فرمان "لا تضلوا بعدہ" سے یہی سمجھے تھے کہ لا تجمعون علی الضلالۃ ولا تسری الضلالۃ الی کلکم یعنی جو چیز میں لکھوانا چاہتا ہوں۔ اس کی بنا پر پوری امت اجتماعی طور پر ضلالت سے محفوظ رہے گی نہ کہ ہر ہر فرد گمراہی سے امن میں رہے گا۔ کیونکہ انفرادی طور پر ضلالت کے بارے میں خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسرے ارشادات موجود ہیں، جن کی بنا پر افراد کی گمراہی کی نفی نہیں کی جا سکتی۔ مثلاً روایات میں ملتا ہے کہ: ستفترق الامۃ کہ امت کئی فرقوں میں بٹ جائے گی یا مثلاً آپ نے فرمایا: "ملت کے مجموعی نظم میں سے لوگ خروج کریں گے اور قسم قسم کے فتنے ظہور میں آئیں گے۔"

باقی رہا پوری امت کا ضلالت پر مجتمع اور متفق ہو جانا، تو اس کی نفی پر کتاب اللہ و سنت کی واضح نصوص موجود ہیں:

۱۔ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ (سورہ نور پارہ ۱۸)	تم میں سے جو لوگ ایمان اور عمل صالح سے آراستہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ ضرور ہی ان کو زمین میں منصب خلافت عطا فرمائے گا۔
۲۔ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (سورۃ آل عمران)	تم بہترین امت ہو، جو لوگوں کے لئے برپا کی گئی ہے بھلائی کا حکم دو اور برائی سے روکو۔
۳۔ لا تجتمع امتی علی الضلالۃ	میری امت گمراہی پر متفق نہیں ہو سکتی۔ (ترمذی مشکوٰۃ صفحہ ۳۰)
۴۔ لاتزال طائفۃ من امتی ظاھرین علی الحق اوکما قال (بخاری، مسلم مشکوٰۃ صفحہ ۵۱۳)	میری امت میں سے ایک گروہ ہمیشہ ایسا رہے گا جس کو راہ حق پر استقامت حاصل ہوگی۔

ان واضح شواہد و دلائل کے ہوتے ہوئے حضرت عمرؓ یہ کیسے سمجھ سکتے تھے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس آخری

مرض میں جس تحریر کے لکھوانے کا ارادہ فرمایا ہے، اگر اسے قلم بند نہ کیا گیا تو امت گمراہ ہو جائے گی۔ بلکہ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انتہائی احتیاط اور امت پر کمال شفقت و رحمت کی وجہ سے کچھ نصائح لکھوانا چاہتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے اس چیز کو بھانپ لیا اور معاملہ کی اصل حقیقت تک پہنچ گئے۔ اسی بنا پر آنحضورؐ کے درد کی شدت کو دیکھتے ہوئے رائے ظاہر کی کہ اس وقت دوات قلم لا کر آپؐ کی تکلیف میں اضافہ کرنا مناسب نہیں ہے۔ ان کو یہ یقین تھا کہ اللہ کی کتاب جب تک ہمارے درمیان موجود ہے امت مجموعی طور پر گمراہ نہیں ہو سکتی۔ یہ عدول حکمی یا ارشادِ نبویؐ سے سرتابی نہ تھی۔ بلکہ آپؐ کو زحمت سے بچانے کے لئے اپنی خیر خواہی اور مخلصانہ محبت کا اظہار تھا۔

اس صورت حال سے ملتا جلتا واقعہ صلح حدیبیہ کے موقع پر ملتا ہے، جب کہ مشرکین کے اعتراض کی بنا پر آپ نے حضرت علیؓ کو حکم دیا تھا کہ محمد رسول اللہ کی بجائے محمد بن عبداللہ لکھ دیں لیکن انہوں نے لفظ رسول اللہ کے مٹانے سے انکار کر دیا تھا۔ یہ نافرمانی نہ تھی بلکہ ادب و احترام اور اخلاص و محبت کا پہلو غالب تھا۔ (صحیح بخاری کتاب المغازی باب عمرۃ القضاء)

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اگرچہ یہ یقین تھا کہ امت مجموعی طور پر گمراہ نہ ہو گی، اس کے باوجود آپؐ کا یہ فرمانا کہ "کچھ لکھوا دوں تاکہ تم گمراہ نہ ہو"۔ اس فرمان کی جو توجیہہ و تشریح کی گئی ہے، یہ کوئی انوکھی نہیں ہے۔ سیرت میں اسی قسم کے دوسرے واقعات بھی ملتے ہیں۔

اسی نوعیت کا ایک نمونہ غزوہ بدر کے موقع پر ملتا ہے۔ جنگ بدر میں فتح و کامرانی کا وعدہ خدا کی طرف سے ہو چکا تھا۔ اس غزوہ میں مارے جانے والے مشرکین کے گرنے کی جگہیں بھی آپؐ کو بتا دی گئی تھیں۔ لیکن اس کے باوجود آپؐ نے انتہائی الحاح و تضرع سے (گڑگڑا کر) دعا کی اور یہ سلسلہ دیر تک جاری رہا حتیٰ کہ حضرت ابوبکرؓ آپؐ کی اس مشقت اور آہ و زاری پر صبر نہ کر سکے اور ان کی زبان سے بے ساختہ یہ کلمات نکل گئے۔ "آپ کب تک یہ مشقت برداشت کریں گے اب اس الحاح و تضرع کو ختم فرمائیں۔ اللہ تعالےٰ اپنا وعدہ ضرور پورا فرمائے گا"۔

جس طرح یہاں حضرت ابوبکرؓ نے کمال محبت اور انتہائی وفادارانہ جذبہ کی بنا پر طویل مناجات کے سلسلے کے ختم کرنے کی درخواست کی، اسی طرح حضرت عمرؓ کو بھی اسی جذبہ نے مجبور کیا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم شدید مرض کی حالت لکھنے، لکھوانے اور املا کرانے کی زحمت سے بہرحال محفوظ رہیں۔

نیز جس غزوہ بدر کے موقع پر کمال فتح و نصرت کے الٰہی وعدے کے باوجود آپ نے طویل عرصہ تک سلسلہ دعا و مناجات جاری رکھا اور اس بنا پر انتہائی مشقت برداشت کی۔ ٹھیک اسی طرح مرض الموت میں اس علم کے باوجود کہ امت ضلالت پر مجتمع نہیں ہو سکتی، آپ نے سامانِ کتابت لانے کا حکم صادر فرمایا۔ (مستفاد از تعلیقات السندیؒ علی البخاری)

مذکورہ بالا تفصیلات کی تائید میں یہ بات بھی کہی جا سکتی ہے کہ اس واقعہ کے بعد آپؐ کے مرض میں تخفیف ہوئی اور کئی دن تک آپؐ بقید حیات رہے۔ اس کے باوجود آپؐ نے دوبارہ قلم دوات طلب نہ کی۔ اگر واقعی کوئی ضروری وصیت پیش نظر تھی تو ان ایام میں اس کا اظہار ہو سکتا تھا۔ انبیاء کرام کی شان سے یہ بات بعید ہے کہ محض چند افراد کے اختلاف و نزاع کی بنا پر

فریضۂ تبلیغ کی ادائیگی میں کوتاہی کریں۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو فتح الباری مصری جلد ۱ صـ۱۶۹)

سوال ۳ کے جواب میں یہ ہے کہ دین کے بارے میں اختلاف تین قسم کا ہوسکتا ہے:

۱۔ وجود خالق اور اس کی وحدانیت کے بارے میں اختلاف، یہ صریح کفر ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کی صفات کے بارے میں اختلاف، یہ بدعت ہے۔

۳۔ ایسے فروعی مسائل میں اختلاف، جن کے بارے میں ایک سے زیادہ کا احتمال خود کتاب وسنت کے الفاظ میں موجود ہے۔ یہ اختلاف امت کے لئے زحمت کی بجائے رحمت کا باعث ہے۔ اس قسم کے اختلاف کو حدیث میں اختلاف امتی رحمۃٌ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو نووی شرح مسلم ج ۲ صـ۴۳ کلام خطابیؒ)

امام قرطبی لکھتے ہیں کہ یہ اختلاف ایسا ہی تھا جیسا کہ حدیث لا یصلین احدکم صلوٰۃ العصر الا فی بنی قریظۃ کے مہم میں ہوگیا تھا۔ (یعنی تم میں سے کوئی عصر کی نماز نہ پڑھے، مگر بنو قریظہ کے علاقے میں) واقعہ یہ ہے کہ صحابہ جب اس ارشاد کو سن کر مدینہ سے روانہ ہوئے تو راستہ ہی میں عصر کا وقت ہوگیا۔ اس موقع پر ایک گروہ نے حدیث کے ظاہری الفاظ پر غور کرتے ہوئے بنی قریظہ کے علاقے میں پہنچ کر ہی نماز قضا کی۔ یہ لوگ عشاء کے بعد ہی مقررہ مقام پر پہنچ سکے (زاد المعاد۔ ج ۱ صـ۳۲۸) دوسرے گروہ نے حدیث کے اصل منشا کو پیش نظر رکھتے ہوئے راستہ ہی میں بروقت نماز ادا کی۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جب یہ سارا معاملہ پیش ہوا، تو آپؐ نے کسی کو بھی ملامت نہ کی۔

اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ فہم واجتہاد کے اختلاف کی بنا پر کسی کو بھی زجر وتوبیخ اور طعن وتشنیع کا نشانہ نہیں بنایا جاسکتا بشرطیکہ نیت خالص اور مقصد صالح پیش نظر ہو۔ (فتح الباری ج ۱ صـ۱۶۹)

سوال نمبر ۵ کا جواب "ھجر" کے کئی معنی آتے ہیں۔ اگر اسے ہُجر سے مشتق مانا جائے، تو اس کے معنی ہذیان کے ہوں گے اور اگر ہجرت ہجراں سے ماخوذ ہو، تو اس کے معنی مفارقت اور ترک وطن کے ہوں گے۔ اس حدیث میں دوسرے معنی مراد لینا صحابہ کے زیادہ شایانِ شان ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب ایک لفظ کے صحیح معنی بن سکتے ہیں، تو بلاوجہ ایسے معنی مراد لینا جس سے بے ادبی کا پہلو نکلے مناسب نہیں ہے۔ ظن المؤمنون والمؤمنات بانفسھم خیرًا۔ یہ ربانی ہدایت اس موقع پر نگاہوں سے اوجھل نہیں رہنی چاہیئے۔

اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ کیا واقعی آپ دُنیا کو چھوڑ چلے ہیں؟ اور کیا یہ آپ کی زندگی کے آخری لمحات ہیں؟ آپؐ سے دریافت کر لیا جائے۔ اگر واقعی صورتِ حال یہی ہے، تب تو تعمیل ارشاد فوراً ضروری ہے، ورنہ درد کی شدت کا خیال کرتے ہوئے مرض میں تخفیف کا انتظار کرنا مناسب ہوگا۔ اس تشریح سے حضرت عمرؓ اور دوسرے صحابہؓ کی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قلبی وابستگی اور انتہائی مخلصانہ محبت ظاہر ہوتی ہے نہ کہ گستاخی اور سوء ادبی کا پہلو۔

سوال نمبر ۶ کا جواب: حسبنا کتاب اللہ حضرت عمرؓ کا یہ جملہ عام طور پر منکرین سنت کی زبان پر چڑھا ہوا ہے۔ وہ اسے اپنے مسلک کی حمایت میں زور شور سے پیش کرتے ہیں۔ لیکن یہاں یہ بات واضح ہے کہ حضرت عمرؓ ہوں یا دوسرے خلفائے راشدینؓ ان کے مسلک کو متعین کرنے کے لئے ایک دو مبہم اقوال سے استناد کرنے کے بجائے ضروری ہے کہ ان کی زندگی کے مجموعی طرز عمل کو

دیکھتے ہوئے اصل حقیقت کا سراغ لگایا جائے۔ حسبنا کتاب اللہ کا مطلب یہ ہے کہ جہاں تک شریعت کے بنیادی اصول کا تعلق ہے، وہ سب قرآن مجید میں موجود ہیں۔ باقی رہا جزئیات اور تفصیلات کے تعین اور وضاحت کے لئے سنت کی طرف رجوع کرنا تو یہ ایک ایسا اصول ہے کہ اس پر خود حضرت عمرؓ شدت کے ساتھ کاربند تھے۔ چند اقوال و آثار ملاحظہ ہوں۔ حضرت عمر بن خطاب نے فرمایا:

۱۔ قال عمر بن الخطابؓ سیأتی قوم یجادلونکم بشبهات القرآن فخذوهم بالسنن فان اصحاب السنن اعلم بکتاب الله

(مقدمہ المیزان للشعرانی مطبوعہ قاہرہ ص۶۲)

تمہارے پاس کچھ لوگ ایسے آئیں گے، جو قرآن کے بارے میں شبہات پیدا کر کے تم سے بحث و مناظرہ کریں گے۔ ان لوگوں پر روایات کے ذریعہ گرفت کرو۔ کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ علماء سنت قرآن مجید سے زیادہ باخبر ہیں۔

(۲) حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کا سنت کے بارے میں کیا موقف تھا۔ اس کی وضاحت میمون بن مہران کے اس بیان سے ہوتی ہے:

"حضرت ابوبکرؓ کا معمول تھا کہ جب ان کے پاس کوئی فیصلہ طلب معاملہ آتا، تو پہلے کتاب اللہ میں غور فرماتے۔ اگر اس میں حکم مل جاتا، تو اس کے مطابق فیصلہ کرتے، ورنہ سنت نبویؐ کی طرف رجوع کرتے۔ اگر یہاں بھی ناکامی ہوتی تو صحابہ کرامؓ کو جمع کر کے ان سے دریافت فرماتے۔ حضرت عمرؓ کا طریق کار بھی اسی سے ملتا جلتا تھا۔" (اعلام الموقعین امام ابن قیم۔ ج ۱ ص۲۲)

حضرت ابوبکرؓ نے اپنے پہلے خطبہ میں ارشاد فرمایا تھا:

اطیعونی ما اطعت الله ورسوله فاذا عصیت الله ورسوله فلا طاعة لی علیکم

(البدایہ والنہایہ ابن کثیر۔ ج ۶ ص۳۰۱)

میری اطاعت کرو جب تک کہ میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی سنت پر کاربند رہوں۔ اور جب میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کروں، تو تم پر میری اطاعت لازم نہ ہوگی۔

اس خطبہ میں اطاعت رسولؐ سے سنت ہی مراد ہو سکتی ہے۔ کیونکہ قرآن کی اطاعت کا ذکر تو پہلے ہی "ما اطعت اللہ" میں مذکور رہے۔

حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ رُواۃ کے لحاظ سے یہ خطبہ قابل اعتماد ہے۔ اس کی سند صحیح ہے۔ اس خطبہ کے الفاظ سے اس وہم کا بھی ازالہ ہو جاتا ہے کہ اطاعت کا لفظ صرف زندہ شخصیت ہی کے لئے استعمال ہو سکتا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ جیسے اہل زبان اطاعت کا لفظ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آپ کے لئے بول رہے ہیں۔ عمر بن خطاب فرمایا کرتے تھے:

۳۔ ان عمر بن الخطاب کان یقول اصحاب الرأی اعداء السنن اعیتهم الاحادیث ان یعوها واستحیوا حین سئلوا ان یقولوا لا نعلم فعارضوا السنن برأیهم فایاکم وایاهم

(اعلام الموقعین۔ ج ۱ ص۵۴)

رائے اور قیاس کے دلدادہ سنت کے دشمن ہیں۔ احادیث کا یاد رکھنا ان کیلئے دشوار ہو گیا ہے۔ جب کوئی ان سے مسئلہ دریافت کیا جاتا ہے تو ان کو "لا نعلم" (ہم نہیں جانتے) کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ یہ لوگ اپنی ذاتی آراء اور دماغی اختراعات کو سنت کے مقابلہ میں لے آئے ان سے دُور رہو۔

(۴) قال عمرؓ ردّوا الجهالات الى سنة — حضرت عمرؓ نے فرمایا جن باتوں کا علم نہ ہو ان کو سنت کی طرف لوٹاؤ
(جامع بیان العلم۔ ج ۲۔ ص ۱۴۷)

(۵) قال عمرؓ تعلموا الفرائض والسنة کما تتعلموا القرآن۔ — حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ احکام وراثت اور سنت اس طرح سیکھو جس طرح قرآن سیکھتے ہو۔
(جامع بیان العلم ابن عبدالبر۔ ج ۲۔ ص ۱۲۳)

عملی نمونے: اب تک حضرات شیخین (ابوبکرؓ، عمرؓ) کے چند اقوال پیش کئے گئے ہیں۔ جو قابلِ اعتماد راویوں کے ذریعے ہم تک پہنچے ہیں۔ اب ذیل میں چند عملی مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

۱۔ امام بخاری کہتے ہیں کہ، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفائے اسلام مباح امور میں قابلِ اعتماد اہلِ علم سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ تاکہ سہل ترین راہ اختیار کر سکیں۔ جب کتاب وسنت کا واضح حکم سامنے آجاتا تو پھر دوسری چیز کی طرف رُخ نہ کرتے، اور یہ محض اس بناء پر کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دائرہ اقتداء سے باہر نہ ہونے پائیں۔ جب حضرت ابوبکرؓ نے مانعین زکوٰۃ سے جہاد کا ارادہ کیا تو حضرت عمرؓ نے (حدیث رسول پیش کرتے ہوئے) ٹوکا کہ آپ ان پر کیسے فوج کشی کر سکتے ہیں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تو ارشاد ہے، مجھے حکم ملا ہے کہ میں لوگوں سے جہاد کروں یہاں تک کہ وہ کلمہ پڑھ لیں۔ اسی طرح مجھ سے وہ اپنی جانیں اور مال محفوظ کر لیں گے مگر یہ کہ اسلام کا کوئی حق ان سے وابستہ ہو۔

حضرت ابوبکرؓ نے ان کے مشورہ کی پرواہ نہ کی، کیونکہ ان کے پاس نماز اور زکوٰۃ کے درمیان تفریق کے قائلین کے بارے میں حکم رسول موجود تھا، یہ لوگ دین کے احکام بدلنا چاہتے تھے۔ آپ کا فرمان ہے۔ "من بدل دینه فاقتلوا" (جو اپنا دین تبدیل کر لے، اسے قتل کر ڈالو)۔ (بخاری مصری۔ ج ۴۔ ص ۱۹۴)

اس سلسلے میں غور طلب معاملہ یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کو مانعین زکوٰۃ سے جہاد و قتال کرنے سے حدیث کی بناء پر روکا تھا۔ اب اگر حضرت ابوبکرؓ حدیث کو تاریخ دین سمجھتے تھے تو صاف طور پر کہنا چاہیئے تھا، کہ یہ کیا تم حدیث پیش کر رہے ہو، قرآن لاؤ۔ اس کے بجائے انہوں نے حدیث کا ایسا مطلب بیان کیا، جس سے حضرت عمرؓ کی غلط فہمی بھی رفع ہو گئی اور ان کی پیش کردہ روایت کا مفہوم سامنے آگیا۔

۲۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد جب دورِ صدیقی میں حضرت فاطمہؓ اور حضرت عباسؓ نے اپنے اپنے حصّہ کا مطالبہ کیا اور ازواج مطہرات نے حضرت عثمانؓ کے ذریعہ اپنا حق وراثت طلب کیا (بخاری، مسلم)، تو ابوبکرؓ نے سب کو ایک ہی حدیث سُنا کر مطمئن کر دیا۔ یعنی لا نورث ماترکنا صدقة۔ انبیاء کرام کا متروکہ مال میراث کے طور پر تقسیم نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ امت کے غربا و مساکین کا حق ہے۔ (بخاری، مسلم، مشکوٰۃ ص ۵۵۰) حضرت فاطمہؓ نے ابتداً اس پر اصرار کیا تھا، لیکن بعد میں وہ بھی راضی ہو گئیں۔ (بیہقی۔ ج ۶۔ ص ۳۰۱)

حضرت ابوبکرؓ کے اس طرزِ عمل پر نہ حضرت عمرؓ نے انکار فرمایا اور نہ دوسرے صحابہ نے کسی قسم کے اختلاف کا اظہار کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پاکیزہ دور میں سنت کے شرعی ماخذ ہونے پر سب کا اتفاق و اجماع تھا اور سب کے نزدیک

یہ طریقہ "سبیل المومنین" کی حیثیت رکھتا تھا۔

۳۔ حضرت عمرؓ سے دریافت کیا جاتا ہے کہ مقتول شوہر کی دیت سے اس کی بیوی حصہ پائے گی یا نہیں؟ حضرت عمرؓ اس کا جواب نفی میں دیتے ہیں۔ اس موقعہ پر ضحاک بن سفیانؓ حضرت عمرؓ سے کہتے ہیں کہ میرے پاس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نوشتہ موجود ہے کہ آپ نے اشیم ضبابی کی بیوی کو اپنے شوہر کی دیت میں حصہ دار ٹھہرایا تھا۔ یہ سُن کر حضرت عمرؓ نے اپنے فیصلہ سے رجوع کر لیا، اور حدیث کے مطابق حکم صادر فرمایا۔ (ابوداؤد، مؤطا امام مالک ص۲۴۹ باب میراث العقل)

۴۔ حضرت ابوبکرؓ سے جب دادی کے حقِ وراثت کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے صحابہ سے دریافت کیا، تو اس موقع پر محمد بن مسلمؓ اور مغیرہ بن شعبہؓ نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دادی کو چھٹا حصہ دلایا ہے۔ (مؤطا امام مالک ص۳۲۵)

۵۔ اسی طرح جنین کی دیت کے بارے میں حضرت عمرؓ حمل بن مالک کی روایت قبول کر لیتے ہیں۔ اس موقع پر حضرت عمرؓ نہ تو ضحاک بن سفیان سے کہتے ہیں کہ بھائی تم نجد کے رہنے والے ہو، تمہیں ان روایات کا کیا علم اور نہ آپ حمل بن مالک سے فرماتے ہیں کہ تم تہامہ کے باشندے ہو، تم کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت کا بہت کم موقعہ ملا۔ لیکن یہ کیا بات ہے کہ تمہاری یہ روائتیں مہاجرینؓ اور انصار کے علم میں نہ آئیں اور تمہیں یہ شرف حاصل ہو گیا۔

ایک شخص کی روایت کے بارے میں بھول چوک کا احتمال بھی ہو سکتا ہے، بیان کرنے میں غلطی بھی ہو سکتی ہے۔ اس کے باوجود حضرت عمرؓ نے ان دونوں حضرات کی روایت کو بغیر کسی ردّ و قدح کے قبول فرما لیا۔

زیرِ عنوان حدیث کی مناسبت سے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے اقوال و آثار کی تفصیل تو کافی حد تک ناظرین کے سامنے آچکی ہے۔ لگے ہاتھوں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کا موقف بھی سنت کے بارے میں واضح کر دیا جائے۔

حضرت عثمانؓ اور حدیثِ نبویؐ : ۶۔ حضرت عثمان کا خیال تھا کہ جس عورت کا شوہر مر جائے، وہ جہاں چاہے عدت گزار سکتی ہے۔ لیکن جب ابو سعید خدریؓ کی بہن فریعہ بنت مالک نے اپنا واقعہ پیش کیا کہ میرے شوہر کے قتل ہونے پر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اپنے شوہر کے مکان پر عدت گزارنے کا حکم دیا، تو حضرت عثمانؓ نے اس حدیث کے مطابق اپنی رائے کو بدل لیا۔ (موطا امام مالکؒ۔ باب مقام المتوفی عنہا زوجہا)

حضرت علیؓ اور سنتِ نبویؐ : ۷۔ حضرت علیؓ کے پاس چند مرتد افراد لائے گئے۔ آپ نے ان کو آگ میں جلا ڈالنے کا حکم صادر فرمایا۔ اس موقع پر حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے حدیث پیش کی کہ :

من بدل دینه فاقتلوه یعنی "جو اپنا دین بدل ڈالے، اسے قتل کر دو۔" یہاں قتل کا حکم ہے نہ کہ جلا ڈالنے کا۔ حضرت علیؓ نے یہ حدیث سن کر فرمایا صدق ابن عباس (ابن عباسؓ نے سچ کہا ہے)۔ (ترمذی ابواب الحدود ص۱۶۹ مجتبائی دہلی)

احادیث جلانے کا واقعہ : حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی طرف یہ بات بھی منسوب کی جاتی ہے کہ انہوں نے اپنے دورِ خلافت میں احادیث کے مجموعے جلا ڈالے تھے لیکن یہ دونوں واقعات سند کے لحاظ سے انتہائی ناقابلِ اعتماد ہیں۔

حضرت ابوبکرؓ والی روایت میں ایک راوی علی بن صالح مدنی ہے، جس کو محدثین نے مستور الحال قرار دیا ہے۔ یعنی اس کے احوال و کوائف

معلوم نہیں ہو سکے۔ اس لئے ان پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ (تقریب التہذیب)

حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ۔ صہ پر اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد اس کی سند پر جرح بھی کردی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ انکار سنت کے حامی اس روایت کو تو بڑے زور شور سے نقل کر جاتے ہیں، لیکن مصنف کتاب نے اس پر جو جرح کی ہے، اس کا نام تک نہیں لیتے۔ آخر یہ کونسی دیانت اور کہاں کا انصاف ہے؟

اگر بالفرض اس روایت کو درست بھی مان لیا جائے، تب بھی یہ لازم نہیں آتا کہ حضرت ابو بکرؓ حدیث کو حجت تسلیم نہیں کرتے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی کوئی دوسری وجہ ہو، جیسا کہ قرآن مجید کے بارے میں مستند روایات میں ملتا ہے:

وقال عثمان للرهط القرشيين الثلاثة اذا اختلفتم انتم و زيد بن ثابت في شيئ من القرآن فاكتبوه بلسان قريش، فانما نزل بلسانهم ففعلوا حتیٰ اذا نسخوا الصحف فی المصاحف ردّ عثمان الصحف الی حفصة وارسل الی كل افق مصحف مما نسخوا وامر بما سواه من القرآن فی كل صحيفة او مصحف ان يحرق.

حضرت عثمانؓ نے (اپنے دورِ خلافت میں مسلمانوں کو اختلافِ قرأت سے بچانے کے لئے) تین قریشی صحابہ (عبداللہ بن زبیرؓ، سعید بن العاصؓ اور عبداللہ بن الحارثؓ) سے فرمایا کہ اگر تمہارے اور زید بن ثابتؓ کے درمیان اختلاف ہو جائے تو قرآن کو قریش کی زبان میں لکھو۔ اس لئے کہ قرآن ان ہی کی زبان میں نازل ہوا ہے۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ جب وہ قرآن کے اجزاء کو مصاحف میں لکھ چکے تو حضرت عثمانؓ نے اصل قرآنی اجزاء حضرت حفصہؓ کے پاس واپس بھجوا دیئے اور ان کی نقلیں تمام اسلامی صوبوں میں بھجوا دیں۔ ان کے علاوہ جو مصاحف بچے، ان کے جلانے کا حکم دے دیا۔

(بخاری مصری مع حاشیہ السندی۔ ج ۳۔ صہ ۲۲۶ باب جمع القرآن)

اس روایت کے مضمون کو منکرین حدیث کے مشہور رہنما حافظ محمد اسلم صاحب جیراج پوری نے بھی تسلیم کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"بیان کیا جاتا ہے کہ مصحف اصلی کی نقل لینے کے بعد حضرت عثمانؓ نے متفرق صحیفوں کو، جو لوگوں کے پاس تھے اور صحیح قرأت کے مطابق نہ تھے جلا ڈالنے کا حکم دے دیا۔ بعض فرقے اس کو حضرت عثمانؓ کے مصائب میں بڑے شد و مد کے ساتھ بیان کرتے ہیں اور ان پر تحریق کا الزام لگاتے ہیں، لیکن عقل کے نزدیک اگر انہوں نے ایسا کیا، تو ان کا یہ فعل مستحسن تھا، کیونکہ ان اجزاء سے اختلافِ قرأت کا اندیشہ تھا جس سے وہ امت کو بچانا چاہتے تھے۔ اس لئے ایسی حالت میں جب کہ باتفاق صحابہؓ قرأت صحیحہ کے مطابق قرآن لکھ لیا گیا۔ ان اختلافی مواد کا جلا دینا امت پر بہت بڑا احسان تھا۔"

(تاریخ القرآن صہ ۶۰)

اس اقتباس میں خط کشیدہ الفاظ انتہائی غور طلب ہیں۔ کیا جس طرح قرأت صحیحہ پر صحابہ کرامؓ نے اتفاق کیا اور اس کو منکرین سنت نے بھی حجت تسلیم کیا، تو کیا ٹھیک اسی طرح کا اتفاق سنت کے حجت ماننے پر صحابہ کرام کے درمیان نہیں پایا جاتا؟ کیا اس کی مخالفت میں کسی ایک صحابی کا قول پیش کیا جاسکتا ہے؟ پھر لطف یہ ہے کہ قرآن کی قرأت صحیحہ پر اتفاق کا علم ہمیں کس طرح ہوا۔ اسی روایت در روایت کے ذریعہ جس پر منکرین سنت ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔

اسی قسم کا ایک واقعہ حضرت عمرؓ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ ابن سعد نے طبقات ج۔۵ میں نقل کیا ہے۔

الاحادیث کثرت علیٰ عھد عمرؓ فانشد الناس ان یأتوہ بھا فلما اتوہ بھا امر بتحریقھا

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں احادیث کثرت سے پھیل گئی تھیں۔ حضرت عمرؓ نے لوگوں کو قسم دے کر کہا وہ احادیث ان کے پاس لائیں۔ جب لوگ ان کے پاس احادیث لے کر پہنچے، تو وہ ان کو جلا ڈالتے۔

یہ واقعہ بھی سند کے لحاظ سے ناقابلِ اعتبار ہے۔ یہ روایت منقطع ہے۔ حضرت عمرؓ سے اس واقعہ کے راوی حضرت ابوبکرؓ کے پوتے قاسم بن محمد ہیں۔ انہوں نے حضرت عمرؓ کا زمانہ ہی نہیں پایا۔ قاسم کی ولادت ۳۶ھ میں ہوئی ہے، یعنی حضرت عمرؓ کی شہادت کے تیرہ سال بعد۔ اس روایت کی سند میں ایک کڑی غائب ہے۔ جب تک اس کا علم نہ ہو اور اس کی ثقاہت قابلِ اعتماد نہ ہو، یہ روایت بھی ناقابلِ قبول ہے۔ اگر کسی درجہ میں اس روایت کو قبول کر بھی لیا جائے، تو بھی حضرت عمرؓ کے طرزِ عمل کو سامنے رکھتے ہوئے ان کے اس اقدام کو احتیاط پر محمول کیا جائے گا۔ یعنی ان کو یہ بات پسند نہ تھی کہ لوگ بے احتیاطی کے ساتھ حدیثِ رسول بیان کرنے میں بیباک ہو جائیں۔ جیسا کہ دوسرے موقع پر آپ نے فرمایا:

"اقلوا الروایۃ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" یعنی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایات کم بیان کرو۔

(تذکرۃ الحفاظ۔ ج۔۱۔ ص۷)

اس قسم کی ضعیف اور ناقابلِ اعتماد روایات و آثار اور بھی ہیں، جن کو پیش کر کے عام طور پر منکرینِ سنت کی طرف سے مغالطہ دیا جاتا ہے۔ ان کی تفصیل کسی دوسرے موقع پر عرض کی جائے گی۔ ان شاء اللہ!

اس حدیث زیرِ عنوان سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ کتابتِ حدیث کی ممانعت کا حکم عارضی تھا۔ اس روایت سے غیر قرآن لکھنے کا ثبوت ملتا ہے۔ یہ واقعہ آپ کی زندگی کے آخری دور میں پیش آیا۔ اس لئے علماءِ امّت کے نزدیک اس کو سابقہ ممانعت کا ناسخ قرار دیا گیا ہے۔ فللہ الحمد

حدیثوں کی جمع وتدوین

ضیاء الدین اصلاحی

حدیثوں کے معتبر و مستند ہونے کا ایک بڑا ثبوت وہ سعی وکاوش اور اہتمام بلیغ ہے، جو ان کے نقل و روایت میں پیش نظر رہا ہے۔ ذیل میں اس پہلو کی وضاحت کی جاتی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کے رہنما اور قائد ہیں، اور وہ آپؐ کی اتباع واطاعت کو عین دین و ایمان سمجھتے ہیں۔ صحابۂ کرام رضؓ کی زندگی میں آپؐ کی اطاعت و پیروی سے ایک بہت بڑی تبدیلی واقع ہوگئی تھی۔ اس لیے جب وہ اپنی گذشتہ زندگی کا اس موجودہ زندگی سے، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت اور تعلیم و تربیت کا ثمرہ تھی، مقابلہ کرتے، تو خدا کا شکر بجالاتے۔ خدا نے بھی اپنے اس احسان و انعام کا ذکر اس طرح کیا ہے:

لقد من اللہ علی المؤمنین اذ بعث فیھم رسولاً من انفسھم یتلوا علیھم آیٰتہٖ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ وان کانوا من قبل لفی ضلال مبین (آل عمران ۱۶۴)

اللہ نے مسلمانوں پر احسان کیا، جب ان میں ان ہی کے اندر سے ایک رسول بھیجا، جو ان پر اس کی آیتیں پڑھتا اور ان کا تزکیہ کرتا اور انہیں کتاب و حکمت سکھاتا ہے۔ اس سے پہلے وہ کھلی گمراہی میں تھے

دوسری جگہ فرمایا۔

واذکروا نعمۃ اللہ علیکم اذ کنتم اعداءً فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہ اخوانا وکنتم علی شفا حفرۃ من النار فانقذکم منھا۔ (آل عمران)

اور اپنے اوپر اللہ کا احسان یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ پس اللہ نے تمہارے دلوں میں الفت پیدا کردی اور تم اس کی نعمت سے بھائی بھائی بن گئے اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے تھے، لیکن اللہ نے تمہیں بچالیا۔

اس لیے وہ کامل ذوق و شوق اور پوری توجہ و کاوش سے دین کو سیکھتے اور رسولؐ کی ہر بات معلوم کرتے۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ ان کو عزت و وقار کی زندگی اسی سے ملی ہے، اور یہ بھی جانتے تھے کہ دین اس سانچے اور رنگ میں ڈھل اور رنگ جانے کا نام ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ڈھالنا اور رنگنا چاہتے تھے۔

ایک طرف صحابۂ کرام رضؓ کے یہ احساسات کہ دین ہی کی بدولت ان کو ہدایت و سعادت ملی ہے اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے مذہبی قائد و رہنما ہیں، اس لیے فطری طور پر ان میں آپؐ کی ہر ہر بات معلوم کرنے کی خواہش تھی۔ دوسری طرف قرآن اور حدیث نے دین سیکھنے کی ترغیب اور احکام و مسائل دین کی تفصیل کو ضروری قرار دیا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

وما کان المؤمنون لینفروا کافۃ فلولا نفر من

سارے مسلمانوں کے لیے کوچ کرنا ممکن نہیں، تو کیوں نہ ہر فرقہ کا ایک

کلِّ فرقۃٍ طائفۃ منھم لیتفقھوا فی الدّین ولینذروا قومھم اذا رجعوا الیھم لعلھم یحذرون — حصّہ نکلے، تاکہ دین میں سمجھ پیدا کریں اور تاکہ خبر پہنچا دیں اپنی قوم کو جب وہ لوٹ کے آئیں، اُن کی طرف تاکہ وہ بچتے رہیں۔

(توبہ ۱۲۳)

اس آیت میں اعراب کو جو مدینہ سے دور دیہاتوں میں رہتے تھے، ہدایت دی گئی ہے کہ اگر سارے لوگ دربارِ نبویؐ میں جاکر دینی بصیرت نہیں حاصل کر سکتے، تو ہر طبقہ و جماعت سے کچھ افراد اور لوگوں کو توضرور ہی اس کام کے لیے مدینہ جانا چاہیے، تاکہ جب وہ وہاں سے واپس ہوں تو اپنی پوری بستی اور جماعت کے لوگوں کو رسولؐ کی باتوں سے واقف کرادیں۔ یہی وجہ تھی کہ صحابۂ کرامؓ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی موجودگی کو نہایت غنیمت جانتے تھے۔ اور آپؐ سے سب کچھ جان اور سیکھ لینا چاہتے تھے۔ ہر شخص کی خواہش ہوتی تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ وقت آپ کی خدمت میں گزارے تاکہ دین کو حاصل کر سکے۔ معاش اور اہل وعیال کی ضرورتیں اگر اس راہ میں رکاوٹ بنتیں، تو وہ بقدرِ استطاعت اس کے لیے قربانی دیتے۔ دو آدمیوں کی باری بن جاتی کہ ایک دن ایک آدمی دربارِ نبویؐ میں جائے اور دوسرا اپنی روزی کا انتظام کرے اور دوسرے دن دوسرا جائے اور پہلا بال بچوں کے لیے کمائے۔ تاکہ ہر ایک کو وہ ساری باتیں، جو آپؐ کے یہاں ہوتی ہیں، معلوم ہو جائیں اور بال بچوں کے گزر بسر کا بھی سامان ہو جائے۔ صحیح بخاری میں حضرت عمرؓ اور اُن کے ایک پڑوسی کا ایسا ہی واقعہ مذکور ہے۔

یہ تو دین و شریعت معلوم کرنے میں ان کے جوش و سرگرمی کا حال تھا۔ لیکن وہ جس سرگرمی سے دین سیکھتے تھے، اسی مستعدی سے دوسرں کو سکھاتے اور بتاتے بھی تھے اور اسے اپنا فریضہ مذہبی سمجھتے تھے۔

احادیث میں بھی علم دین کی نشر و اشاعت کی تلقین کی گئی ہے، فرمایا:

نضر اللہ امرأ سمع منا شیئاً فبلغہ کما سمعہ فرب مبلغ اوعیٰ من سامع — اللہ اس شخص کو شاداب کرے، جس نے ہم سے کوئی چیز سنی اور اسے ویسے ہی دوسروں تک پہنچا دیا۔ جیسے اس نے سُنی تھی۔ بعض لوگ جن تک کوئی بات پہنچائی جاتی ہے، وہ سُننے والے سے زیادہ محفوظ رکھتے ہیں۔

حجۃ الوداع کے موقعہ پر آپ نے بار بار بتاکید فرمایا کہ جو باتیں میں تم کو بتلا رہا ہوں، وہ دوسرے لوگوں کو بھی ذمہ داری کے ساتھ بتا دینا۔

فلیبلغ الشاھد الغائب۔ — موجود غیر موجود تک (میرے احکام) پہنچا دے۔

ان احکام و تعلیمات کا نتیجہ یہ ہُوا کہ صحابۂ کرامؓ جو کچھ جانتے تھے، اسے دوسروں تک پہنچاتے تھے اور یہی ذوق و جذبہ اُن کے بعد تابعین، تبع تابعین اور آئندہ نسلوں میں منتقل ہوتا رہا۔

یہ ذوق و جذبہ اس قدر بڑھا ہُوا تھا کہ اگر کوئی بزرگ کسی روایت کے متعلق یہ سن لیتے کہ فلاں مقام پر فلاں بزرگ سے معلوم ہو سکتی ہے، تو وہ سخت مشقت جھیل کر سفر کرتے اور اسے معلوم کر کے ہی چین لیتے۔ مسلمانوں نے اس سلسلہ میں اس قدر غیر معمولی جد و جہد کی ہے کہ آنحضورؐ کی سیرت مبارکہ اور حیاتِ طیبہ کا کوئی گوشہ اور پہلو مخفی نہ رہنے دیا۔ اس سلسلے میں ان کو بڑی آسانی اس سبب سے رہی کہ رسول کریم

صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ لوگوں کے ساتھ رہتے تھے۔ اُن ہی کے ساتھ آپؐ کا کھانا پینا، اُٹھنا بیٹھنا سب کچھ ہوتا تھا۔ لوگ آپ کی خلوت وجلوت ہر ایک میں شریک ہوتے تھے۔ آپؐ کی حیثیت بادشاہوں اور بڑے آدمیوں جیسی نہ تھی، جو اپنے کو بالکل الگ تھلگ رکھتے ہیں اور جنہیں لوگوں سے ملنا جلنا بھی گوارا نہیں ہوتا، بلکہ آپؐ سب کو اللہ تعالیٰ کا پیغام بتاتے اور سکھاتے تھے۔ ہر ایک کے دکھ درد میں شریک ہوتے تھے۔ کوئی بیمار ہوتا، تو اس کے گھر جا کر اس کی عیادت کرتے۔ جنازوں میں شریک ہوتے اور ہر شخص کے معاملات اور جھگڑوں کا تصفیہ کرتے۔ اس طرح آپؐ کی زندگی ایک کھلی ہوئی کتاب تھی۔ جسے ہر شخص پڑھتا اور دیکھتا تھا اور بقدر حوصلہ ظرف اس سے استفادہ کرتا تھا۔

اس سلسلہ میں ایک خاص قابل لحاظ بات یہ بھی ہے کہ عربوں کا حافظہ نہایت قوی تھا، اس لیے وہ جو بات بھی سنتے تھے، اسے محفوظ کر لیتے تھے۔ سینکڑوں طویل قصائد اور ہزاروں اشعار ان کی زبان پر رہتے تھے۔ قدیم وقائع و ایام کے متعلق اُن کے سینوں میں جو کچھ ازبر اور محفوظ تھا بمشکل سفینوں میں وہ محفوظ رہ سکتا تھا۔ اپنا، اپنے قبیلہ کا اور دوسروں کے پشتہا پشت بلکہ اصیل گھوڑوں تک کے نسب نامے اُن کے حافظہ میں ہوتے تھے، اور فطرت کا یہ عام قاعدہ ہے کہ جس قوت سے جس درجہ زیادہ کام لیا جائے، اُسے اسی قدر زیادہ ترقی ہوتی ہے، اور جب اُن کے حافظہ کا یہ عالم رہا ہو، تو پھر نبیؐ کے اعمال و اشغال جنہیں وہ اپنا دین و ایمان اور جن کی تحصیل کو وہ دین و دُنیا دونوں کی سعادت و برکت کا ذریعہ سمجھتے تھے، کیوں نہ پوری مستعدی اور ذمہ داری سے محفوظ کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ حدیثیں محفوظ اور اس درجہ مستند شکل میں آج موجود ہیں۔

اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ صحابہؓ کے حافظے نے وہ کام کیا جو تحریری یادداشتیں بھی نہیں کر سکتی تھیں، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتدا میں حدیثوں کی تحریر و کتابت سے جو منع کیا تھا، اس کی وجہ علاوہ قرآن میں التباس و اختلاط کے یہ بھی تھی کہ یہ چیز ان کی ذہانت اور حافظہ پر اثر انداز ہوتی ہے، تاہم یہ ممانعت آخر میں ختم ہو گئی تھی اور بعض صحابۂ کرامؓ نے آپؐ کے احکام و ہدایات نقل بھی کر لیے تھے۔ کیونکہ انہیں اپنی یادداشت پر زیادہ اعتماد نہ تھا۔

اُن وجوہ و اسباب کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ حدیثوں کی نشر و اشاعت میں صحابہ کرامؓ نے پورے شوق، دلچسپی اور توجہ سے حصہ لیا اور اُن کے حافظے نے اس شوق کے لیے مہمیز کا کام کیا، اس درجہ کامل انہماک و اشتغال کے بعد یہ ناممکن ہے کہ آنحضورؐ کے اعمال و اشغال کا معتدبہ حصہ محفوظ ہونے سے رہ گیا ہو۔

ایک طرف اگر اس درجہ جوش و ولولہ تھا کہ رسول اللہؐ کی کوئی بات مخفی نہ رہ جائے اور جو کچھ بھی آپؐ نے فرمایا ہے، اُسے جان لیا جائے اور دوسروں کو بھی بتا دیا جائے، تو دوسری طرف ہوش سے بھی کام لیا گیا۔ یعنی یہ بات ہمیشہ مدِّنظر رکھی گئی کہ جو کچھ بھی آپؐ سے بیان کیا جائے، وہ پورے وثوق و احتیاط اور کامل اطمینان کے بعد ہی بیان کیا جائے۔ صحابۂ کرامؓ جوشِ عقیدت میں سرشار ضرور تھے، لیکن اس جوش نے غلط و صحیح میں امتیاز کی قوت و صلاحیت کو ختم نہیں کر دیا تھا کہ غلط سلط سب کچھ وہ نقل و بیان کر دیتے۔ اس احتیاط کا اندازہ درج ذیل باتوں سے کیا جا سکتا ہے۔

قرآن و حدیث نے جس طرح کتمان علم کی مذمت کی ہے، اسی طرح روایت حدیث میں تحقیق و تفتیش اور چھان پھٹک کو بھی ضروری قرار دیا ہے۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنْ جَاءَکُمْ فَاسِقٌ   مسلمانو! اگر تمہارے پاس کوئی فاسق خبر لائے، تو تم اچھی طرح

بنباءٍ فتبینوا (حجرات ۵) تحقیق کرلو

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مختلف مواقع پر اس سلسلہ میں نہایت ضروری ہدایات دیں۔ اس قسم کی چند روایتیں مسلم شریف کے مقدمہ سے نقل کی جاتی ہیں:۔

حضرت ابوہریرہ رضؓ، جو مخالفین حدیث کے طبقہ میں کثرتِ روایت کی وجہ سے خاص طور پر مطعون ہیں، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

من کذب علیّ متعمداً فلیتبوأ مقعدہ من النار۔ — جس نے مجھ پر قصداً جھوٹ گھڑا، تو اسے چاہیے کہ اپنا ٹھکانا جہنم کو بنائے۔

انہی سے ایک اور روایت ہے کہ آنحضورؐ نے فرمایا:

کفیٰ بالمرءِ کذباً ان یحدث بکلِ ما سمع۔ — آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہ کافی ہے کہ جو کچھ بھی سنے، اُسے وہ (بے تحقیق) بیان کرنے لگے۔

حضرت علیؓ اپنے خطبوں میں کہا کرتے تھے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا ہے۔

لا تکذبوا علیّ فانّہ من یکذب علیّ یلج النّار۔ — مجھ پر جھوٹ مت گھڑو، کیونکہ جو مجھ پر جھوٹ گھڑے گا، وہ جہنم میں داخل ہوگا۔

ایک اور روایت میں ہے کہ:

من حدث عنی بحدیثٍ یریٰ انّہ کذب فہو احد الکاذبین — جس نے میری طرف سے کوئی ایسی حدیث بیان کی، جسے وہ جھوٹ سمجھ رہا ہے تو ایسا شخص بھی جھوٹوں میں سے ایک ہے۔

غور فرمائیے کہ صحابہ کرامؓ جن کا مقصد زندگی ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال و اقوال اور طرز و ادا کی تقلید تھا اور جنہوں نے پورے ذوق و شوق اور مستعدی سے آپؐ کے اقوال و اعمال اس لیے سیکھے اور رکھائے ہوں کہ آپؐ کے سانچے میں تو وہ ڈھلیں اور دوسروں کو ڈھال دیں، کیا یہ غلط سلط روایتیں بیان کر سکتے تھے۔ غلط سلط روایتیں بیان کرنا یوں ہی کیا کم قابلِ مذمت فعل ہے لیکن جب معاملہ دین کا ہو اور غلط سلط روایتیں بیان کرنے پر ایسی سخت اور شدید وعیدیں بھی ہوں، تو اس کا کوئی ادنیٰ سا احتمال بھی کہاں رہ جاتا ہے۔

اب صحابہؓ کی احتیاط پسندی کی مختصر کیفیت بیان کی جاتی ہے۔

بعض صحابہ کے طرزِ عمل سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تکثیر روایت کو پسند نہیں کرتے تھے، لیکن اس کا یہ سبب ہرگز نہ تھا کہ وہ حدیثوں کو معتبر نہیں خیال کرتے تھے، بلکہ اس لیے کہ آپؐ کی جانب کوئی غلط بات نہ منسوب ہو جائے، چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ، جو کثیر الروایت ہیں، حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اس قدر آزادی سے حدیثیں نہیں بیان کرتے تھے۔ حضرت ابوہریرہؓ کے متعلق یاد رکھنا چاہیے کہ وہ آنحضورؐ کی وفات کے بعد ایک عرصہ تک دُنیا میں رہے۔ ان کے سامنے متعدد واقعات پیش آتے رہے۔ اُن کا خود بیان ہے کہ: "اگر قرآن مجید میں دو آیتیں اِنّ الّذین یکتمون ما انزلنا الی قولہ انا التواب الرحیم۔ نہ ہوتیں، تو میں ایک حدیث بھی بیان نہ کرتا۔ ہمارے

مہاجر بھائی بازاروں میں اپنی روزی روزگار میں لگے رہتے تھے اور انصار اپنی کھیتوں کی دیکھ بھال میں مصروف رہتے تھے اور میں برابر خدمتِ نبویؐ میں حاضر اور آپ کے ارشادات سنتا رہتا تھا۔

حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ اپنے والد حضرت زبیرؓ سے عرض کرتے ہیں کہ آپ فلاں فلاں بزرگوں کی طرح روایتیں کیوں نہیں بیان کرتے؟ وہ جواب دیتے ہیں کہ مجھے آپؐ کی صحبت میں رہنے کا شرف برابر ملا ہے، لیکن میں نے آپؐ سے سنا ہے۔ من کذب علی فلیتبوأ مقعدہ من النار ———

حضرت زید بن ارقمؓ سے حدیثیں بیان کرنے کے لئے کہا گیا، تو ارشاد فرمایا کہ ہم بوڑھے ہو چکے ہیں اور ہمارا حافظہ کمزور ہو گیا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرنے کا معاملہ نہایت اہم ہے۔

سائب بن زید فرماتے ہیں کہ میں سعد بن مالک کے ساتھ مدینہ سے مکہ گیا، لیکن میں نے ان سے کوئی حدیث نہ سنی۔

شعبی کا بیان ہے کہ میں ایک برس تک حضرت عبداللہ بن عمر کی خدمت میں رہا لیکن ان کو آنحضرتؐ کی طرف کوئی بات منسوب کر کے بیان کرتے ہوئے نہ سنا۔

حضرت انس بن مالکؓ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی بات بیان کرتے، تو اس خوف سے کہ آپؐ کی جانب کوئی غلط بات منسوب ہو جائے اوکما قال بھی کہہ دیا کرتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ آنحضورؐ کے متعلق جب کوئی بات بیان کرتے تھے، تو کانپ اٹھتے اور لرز جاتے تھے۔ اور یہ کہتے تھے کہ یہ یا اسی طرح کی بات آپؐ نے بیان کی ہے۔

حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی احتیاط پسندی تو مشہور ہی ہے۔ وہ بسا اوقات ایک شخص سے کوئی روایت سنتے تھے، تو مزید اطمینان کے لئے کسی اور شخص کو بھی ثبوت و شہادت کے لئے طلب کرتے تاکہ وہ بھی اس روایت کی تائید کر دے۔

حضرت علیؓ کا طریقہ یہ تھا کہ وہ روایت بیان کرنے والے سے قسم لے کر اطمینان حاصل کرتے تھے۔

جرح و تعدیل کا اصطلاحی فن گو محدثین کی ایجاد ہے، لیکن عہد صحابہؓ ہی میں اس کی بنیاد پڑ چکی تھی اور وہ باقاعدہ روایتوں اور راویوں پر نقد کرتے تھے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

حضرت عائشہؓ سے جب رویتِ الٰہی کے متعلق روایتیں بیان کی گئیں تو انہیں ان کے قبول میں تامل ہوا اور قرآن مجید کی یہ آیت تلاوت کی: لاتدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار۔

حضرت عبداللہ بن عمر کی اس روایت کو کہ مردہ پر اگر نوحہ کیا جائے تو اسے قبر میں عذاب ہوتا ہے۔ یہ کہہ کر رد فرمایا کہ لا تزر وازرۃ وزر اخری۔ حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ "من حمل جنازۃ فلیتوضاء" جس نے جنازہ اٹھایا اسے وضو کر لینا چاہیے۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ خشک لکڑیوں کے چھونے یا اٹھانے سے وضو لازمی نہیں ہے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت ابوہریرہ نے حضرت ابن عباس سے یہ حدیث بیان کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ آگ سے پکی چیز کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ حضرت ابن عباس نے کہا: "تب تو گرم پانی کے استعمال سے بھی وضو لازمی ہے۔" حضرت ابوہریرہ نے کہا: "بھتیجے جب تم آنحضورؐ کی کوئی حدیث سنو تو کہاوتیں نہ کہا کرو۔"

ام المومنین حضرت عائشہؓ تو راویوں کے حفظ و ضبط کا امتحان بھی لیتی رہتی تھیں۔ چنانچہ اپنے بھتیجے حضرت عروہ بن زبیر سے ایک مرتبہ کہا کہ ہمارے اس سفر حج میں عبداللہ بن عمر بھی شریک ہیں۔ اُن کے پاس علم حدیث کا وسیع ذخیرہ ہے اس لئے ان کی ملاقات کر کے کچھ روایتیں سنو۔ چنانچہ اُنہوں نے ایسا کیا اور منجملہ متعدد روایات کے اُنہوں نے عبداللہ بن عمر سے یہ حدیث بھی سنی کہ: اِنّ اللّٰہ لا ینزع العلم من الناس انتزاعا ولکن یقبض العلماء فیرفع العلم معھم ویبقی فی الناس رؤس جہال یفتونھم بغیر علم فیضلون ویضلون۔ حضرت عروہ نے جب اس روایت کا ام المومنین سے ذکر کیا تو اُنہوں نے ناگواری ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ کیا اُنہوں نے تم سے ایسے بیان کیا اور یہ کہا ہے کہ اُنہوں نے اس کو رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔ عروہ نے اثبات میں جواب دیا۔ دوسرے سال پھر حج کے موقع پر حضرت عائشہؓ نے عروہ سے کہا ابن عمر کے پاس جا کر پھر علم والی حدیث معلوم کرو۔ چنانچہ حضرت ابن عمر نے اسے بعینہٖ اسی طرح بیان کیا۔ جس طرح گزشتہ سال بیان کیا تھا تو ام المومنین نے فرمایا کہ بے شک ابن عمر صحیح بیان کرتے ہیں کیونکہ اُنہوں نے روایت میں کوئی کمی بیشی نہیں کی ہے۔

صحابہ کرام کے زمانہ سے یہ احتیاط بھی چلی آ رہی ہے کہ جن روایتوں کے عام لوگ متحمل نہ ہو سکیں اور وہ ان کی فہم سے بالاتر ہوں، اُنہیں نہ بیان کیا جائے۔ اس سلسلہ میں آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بھی ایک مشہور واقعہ ہے، جس کو امام بخاری نے کتاب العلم میں نقل کیا ہے، حضرت معاذ بن جبلؓ سے آنحضرتؐ نے فرمایا کہ صدق قلب سے اگر کسی نے لا الٰہ الا اللہ کہہ دیا تو اللہ تعالےٰ اس پر جہنم کو حرام قرار دے گا۔ حضرت معاذ نے عرض کیا یا رسول اللہؐ! کیا میں یہ بشارت لوگوں کو بھی سنا دوں؟ آپ نے فرمایا: نہیں! ایسا نہ کرو۔ ورنہ لوگ اسی پر اکتفا کریں گے حضرت معاذ نے اپنی وفات کے وقت یہ روایت اس لئے بیان کی کہ وہ کتمان علم کے گناہ کے مرتکب نہ ہوں۔

اسی طرح کی ایک روایت امام مسلم نے کتاب الایمان میں نقل کی ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے جب آنحضورؐ سے یہ بشارت سنی کہ من قال لآ الٰہ الا اللہ صادقا من قلبہ دخل الجنۃ تو اس کا اعلان کرنا شروع کر دیا۔ حضرت عمرؓ نے سنا تو اُنہیں زدو کوب کیا اور آنحضورؐ کے پاس تشریف لائے اور عرض کیا کہ کیا آپؐ نے ابو ہریرہؓ سے اس طرح کی بات کہی ہے؟ آپ نے جواب دیا۔ ہاں حضرت عمرؓ نے کہا کہ ایسا نہ کیجئے، اس لئے کہ اندیشہ ہے کہ لوگ اسی پر تکیہ کر لیں اور عمل سے باز آ جائیں اُنہیں ان کے حال پر چھوڑ دیجئے کہ وہ عمل کرتے رہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ تم کسی جماعت سے اگر ایسی بات کی روایت کرو گے جو اس کی عقل و فہم سے ماوراء اور بالاتر ہو تو وہ اس کے لئے باعث فتنہ ہو گی۔

حضرت ابو ہریرہؓ کا بیان ہے کہ میں نے رسُول کریمؐ سے دو طرح کی باتیں سیکھی ہیں۔ ایک طرح کی باتیں تو میں نے لوگوں سے بیان کر دیں۔ لیکن اگر دوسری قسم کی باتیں بھی ان سے بیان کر دوں تو یہ گردن کٹ جائے گی۔

اس قسم کی روایتیں بیان کرنے میں متعدد مفسدے ہو سکتے ہیں:

پہلی بات تو یہ ہے کہ چونکہ اس نوعیت کی احادیث لوگوں کی فہم سے بالاتر ہوتی ہیں اس لئے وہ راوی ہی کو جھوٹا سمجھنے لگتے ہیں جس سے ثقہ و ضابط لوگوں کی ثقاہت و ضبط پر اثر پڑتا ہے اس لئے ایک روایت میں کہا گیا ہے کہ آدمی کے جھوٹا ہونے کے لئے اتنی بات کافی ہے کہ وہ جو کچھ سُنے اُسے بیان بھی کر دے۔

دوسرے ان روایتوں کا کچھ سے کچھ مطلب نکال کر لوگ احکام شرع کے تارک و مخالف ہو جائیں گے۔

تیسرے لوگوں کو دین کے متعلق شکوک و شبہات پیدا ہوں گے اور وہ خدا اور رسولؐ کی تکذیب و تردید پر آمادہ ہوں گے۔ اسی لئے حضرت علیؓ اور عبداللہ ابن عباسؓ سے منقول ہے۔

حدثوا الناس بما يعرفون اتريدون ان يكذب الله ورسوله

لوگوں کو وہی باتیں بیان کرو، جن کو وہ جانتے ہوں۔ (جو ان کی فہم سے ماوراء اور جو ان کے نزدیک مستعد نہ ہو) کیا تم پسند کرتے ہو کہ لوگوں کی سمجھ سے بالاتر روایتیں بیان کرنے کی وجہ سے خدا اور رسولؐ کی تکذیب کی جائے۔

غرضیکہ صحابہ کرام نے احادیث کے نقل و روایت میں نہ تو کسی طرح کی کوئی کوتاہی کی اور نہ اُن کی صحت کی چھان بین اور احتیاط میں کوئی دقیقہ فروگزاشت رکھا۔

ان کے بعد تابعین، تبع تابعین، فقہاء محدثین اور علمائے اسلام نے بھی روایات کے نقل کرنے میں اسی طرح کاوش وسعی اور تحقیق و احتیاط سے کام لیا ہے اور یہ بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں نے حدیثوں کے ضبط و روایت میں جس قدر تحقیق و کاوش، چھان بین اور احتیاط سے کام لیا ہے، اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ سید سلیمان ندوی مرحوم فرماتے ہیں:۔

"اس باب میں تمام دنیا متفق ہے کہ اس حیثیت سے اسلام نے اپنے پیغمبرؐ کی اور نہ صرف پیغمبر کی بلکہ ہر اس چیز کی، جس کا ادنیٰ سا تعلق بھی حضرتؐ کی ذات مبارک سے تھا، جس طرح حفاظت کی ہے، وہ عالم کے لئے مایہ حیرت ہے، ان لوگوں کو جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال، افعال اور متعلقات زندگی کی روایت، تحریر اور تدوین کا فرض انجام دیتے تھے، راویان حدیث و روایت یا محدثین اور ارباب سیر کہتے ہیں، جن میں صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور بعد کے چوتھی صدی ہجری تک کے اشخاص داخل ہیں۔ جب تمام سرمایہ روایت تحریری صورت میں آ گیا تو ان تمام راویوں کے نام و نشان، تاریخ زندگی، اخلاق و عادات کو بھی قید تحریر میں لایا گیا، جن کی تعداد ایک لاکھ کے قریب ہے اور ان سب کے مجموعہ اقوال کا نام اسماء الرجال ہے۔" (خطبات مدراس طبع سوم ۴۴)

علامہ شبلی دوسری قوموں اور مسلمانوں کے اصول سیرت اور تحریر واقعات کا فرق بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

"اس قسم (زبانی روایتوں کے قلمبند کرنے) کا موقع جب دوسری قوموں کو پیش آتا ہے، یعنی کسی زمانہ کے حالات مدت کے بعد قلمبند کئے جاتے ہیں، تو یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے کہ ہر قسم کی بازاری افواہیں قلمبند کر لی جاتی ہیں، جن کے راویوں کا نام و نشان تک معلوم نہیں ہوتا۔ ان افواہوں میں سے وہ واقعات انتخاب کر لئے جاتے ہیں، جو قرائن اور قیاسات کے مطابق ہوتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد یہی خرافات ایک دلچسپ تاریخی کتاب بن جاتے ہیں۔ یورپ کی تاریخی تصنیفات اسی اصول پر لکھی گئی ہیں۔

لیکن مسلمانوں نے اس فن سیرت کا جو معیار قائم کیا، وہ اس سے بہت زیادہ بلند تھا۔ اس کا پہلا اصول یہ تھا۔ کہ جو واقعہ بیان کیا جائے، اس شخص کی زبان سے بیان کیا جائے جو خود شریک واقعہ تھا اور اگر خود نہ تھا تو شریک واقعہ تک تمام راویوں کا نام بترتیب بتایا جائے۔ اس کے ساتھ یہ بھی تحقیق کیا جائے کہ جو اشخاص سلسلۂ روایت میں آئے۔ کون لوگ تھے ہ کیسے تھے؟ اُن کے کیا مشاغل تھے؟ چال چلن کیسا تھا؟ حافظہ کیسا تھا؟ سمجھ کیسی تھی؟ ثقہ تھے یا غیر ثقہ؟ سطحی الذہن تھے یا دقیقہ رس؟ عالم تھے یا جاہل؟ ان جزئی باتوں کا پتا

رکھنا سخت مشکل بلکہ تقریباً ناممکن تھا۔ سینکڑوں ہزاروں محدثین نے اپنی عمریں اس کام میں صرف کر دیں۔ ایک ایک شہر میں گئے۔ راویوں سے ملے ان کے متعلق ہر قسم کی معلومات بہم پہنچائیں۔ جو لوگ ان کے زمانہ میں موجود نہ تھے۔ ان کے دیکھنے والوں سے حالات دریافت کیے۔ ان تحقیقات کے ذریعہ اسماء الرجال (بیوگرافی) کا وہ عظیم الشان فن تیار ہو گیا جس کی بدولت کم از کم لاکھ شخصوں کے حالات معلوم ہو سکتے ہیں۔ محدثین نے حالات کے بہم پہنچانے میں کسی شخص کے رتبہ اور حیثیت کی پروا نہ کی۔ بادشاہوں سے لے کر بڑے بڑے مقتداؤں تک کی اخلاقی سُراغ رسانیاں کیں اور ایک ایک کی پردہ دری کی۔"

(سیرت النبیؐ جلد اوّل ص ۳۸، ۳۹۔ طبع چہارم)

پھر یہ نہیں کہ راویانِ حدیث کے متعلق ہی اس قدر چھان بین کی گئی۔ بلکہ نفس روایت کی تحقیق و صحت کے لیے بھی جس حد تک احتیاط و تحقیق ممکن تھی، وہ سب کی گئی۔ مثلاً روایت کے متن کو پرکھا گیا۔ اس کے متعلق صحیح، حسن، ضعیف، متصل، مرسل، مرفوع، منقطع، منفصل، مقلوب، مشہور، غریب، متواتر، آحاد، افراد، معروف، شاذ، منکر، معلل، موضوع، مدرج، ناسخ، منسوخ، خاص، عام، مجمل، مبین اور دوسرے مختلف و متعدد انواع کی معلومات حاصل کی گئیں اور یہی امور علم حدیث کا اصل موضوع ہیں، علامہ نووی فرماتے ہیں۔

ان المراد من علم الحديث تحقيق معانى المتون وتحقيق علم الاسناد والمعلل - والعلة عبارة عن معنى فى الحديث خفى يقتضى ضعف الحديث مع ان ظاهره السلامة منها وتكون العلة تارة فى المتن وتارة فى الاسناد وليس المراد من هذا العلم مجرد السماع ولا الاسماع ولا الكتابة بل الاعتناء بتحقيقه والبحث من خفى معانى المتون والاسانيد والفكر فى ذالك ودوام الاعتناء به ومراجعة اهل المعرفة به ومطالعة كتب اهل التحقيق فيه وتقييد ما حصل من نفائسه وغيرها فيحفظها الطالب بقلبه ويقيدها بالكتابة ثم يديم مطالعة ماكتبه ويتحرى التحقيق فيهما يكتبه ويثبت فيه فانه فيما بعد ذالك يصير معتمدا عليه ويذاكر بمحفوظاته من ذلك من يشتغل بهذا الفن سواء كان مثله فى المرتبة اوفوقه اوتحته فان بالمذاكرة يثبت المحفوظ ويتحرر ويتاكد ويتقرر ويزداد بحسب كثرة

علم حدیث کا مقصد معانی متون، علم اسناد اور معلل کی تحقیق ہے۔ حدیث کے اندر علت اس معنی خفی کو کہتے ہیں، جو اس کے ضعف کے متقاضی ہو، لیکن بظاہر حدیث اس عیب سے پاک معلوم ہوتی ہو۔ یہ علت کبھی متن میں اور کبھی اسناد کے اندر ہوتی ہے۔ علم حدیث کا مقصد محض سُننا سنانا اور کتابت نہیں بلکہ تحقیق حدیث میں اعتناء، متون و اسانید میں بحث و تفتیش، اس میں غور و فکر اور ہمیشہ اس کی جانب توجہ و انہماک اور اس فن کے واقف کاروں سے مراجعت، ماہرین و محققینِ فن کی کتابوں کے مطالعہ اور اس کا عمدہ انتخاب کرنا وغیرہ سب علم حدیث کے مقصود میں داخل ہے تاکہ طالب حدیث اسے یاد کرے اور قید تحریر میں لائے۔ نیز جو کچھ اس نے لکھا اس کا بار بار مطالعہ اور اس میں غور و فکر اور تحقیق و جستجو کرے کیونکہ اس کے بعد وہ خود معتمد مرجع بنے گا۔ طالب حدیث کا یہ بھی کام ہے کہ اس فن میں اشتغال رکھنے والوں سے اپنے محفوظات کے متعلق مذاکرہ کرے۔ خواہ اس طرح کے لوگ اس کے ہمسر ہوں یا بلند تر اور کمتر ہوں۔ کیونکہ مذاکرہ سے اس کی یاد کی ہوئی چیز اور زیادہ ثاقب و پختہ ہو گی اور کثرت مذاکرہ سے اس کے علم میں خود بھی اضافہ ہو گا اور کسی حاذق و ماہر سے ایک گھنٹہ کا مذاکرہ کئی گھنٹوں بلکہ کئی دنوں کے مطالعہ و حفظ سے

المذاکرة و مذاکرة حاذق فی الفن ساعة انفع من المطالعة والحفظ ساعات بل ایاما ولیکن فی مذاکرته متحریا الانصاف قاصد الاستفادة او الافادة غیر مترفع علی صاحبه بقلبه ولا بکلام ولا بغیر ذٰلک من حاله مخاطباله بالعبارة الجمیلة اللینة فبهذا ینمو علمه وتزکو محفوظاته واللّٰہ اعلم۔

زیادہ مفید ہے لیکن مذاکرہ میں انصاف، استفادہ یا افادہ کا قصد ہونا چاہیے اور افادہ کی صورت میں جس سے مذاکرہ کیا جائے۔ اس پر اپنی برتری اور ترفع کا اظہار نہیں کرنا چاہیے، نہ دل سے، نہ بات سے اور نہ کسی اور ادا سے بلکہ نہایت نرم و خوبصورت انداز میں گفتگو کرنی چاہیے۔ اس طرح سے اس کے علم میں اضافہ اور یادداشتوں میں زیادتی ہوگی۔

شرح نووی بر حاشیہ مسلم۔ جلد اول صفحہ ۴۷، ۴۸

مطبع مصریہ ازہر سنہ ۱۳۴۷ھ / ۱۹۲۹ء

امام مسلم بھی اس کے متعلق نہایت اہم اور قابل غور حقیقت کی طرف اشارہ فرماتے ہیں:

واعلم وفقک اللّٰہ تعالیٰ ان الواجب علی کل احد عرف التمییز بین صحیح الروایات وسقیمها وثقات الناقلین لها من المتهمین ان لا یروی منها الا ما عرف صحة مخارجه والستارة فی ناقلیه وان یتقی منها ما کان منها عن اهل التهم والمعاندین من اهل البدع والدلیل علی ان الذی قلنا من هذا هو لازم دون ما خالفه قول اللّٰہ جل ذکره (یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْٓا اَنْ تُصِیْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰی مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِیْنَ) وقال جل ثناءه (ممن ترضون من الشهداء) وقال عزوجل (واشهدوا ذوی عدل منکم) فدل بما ذکرنا من هذه الآی ان خبر الفاسق ساقط غیر مقبول وان شهادة غیر العدل مردودة والخبر وان فارق معناه معنی الشهادة فی بعض الوجوه فقد یجتمعان فی اعظم معانیهما اذ کان خبر الفاسق غیر مقبول عند اهل العلم کما ان شهادته مردودة

جس شخص کو صحیح و سقیم روایات اور ثقہ و متہم راویوں کی تمیز اور پرکھ ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ صرف ایسی روایتیں بیان کرے، جن کے صحت مخارج اور ناقلین کی ثقاہت کے متعلق اسے واقفیت ہو اور ان روایتوں کے نقل و بیان سے احتراز کرنا چاہیے جو متہم اور اہل بدع معاندین سے مروی ہوں۔ اس بات کے لازمی اور ضروری ہونے کی دلیل اللہ تعالیٰ کا ارشاد: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْٓا اَنْ تُصِیْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰی مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِیْنَ (اے ایمان والو! اگر تمہارے پاس کوئی فاسق خبر لائے تو تم اچھی طرح تحقیق کر لو ورنہ کہیں نادانی سے کسی قوم پر جا پڑو۔ اور پھر اپنے کیے پر پچھتانے لگو) نیز خدا نے فرمایا "ممن ترضون من الشهداء" (ان لوگوں میں سے جن کو پسند کرتے ہو گواہوں میں) اور یہ بھی فرمایا کہ "واشهدوا ذوی عدل منکم" (اور گواہ بناؤ اپنے اندر سے دو معتبر شخصوں کو) ان آیتوں سے ثابت ہو گیا کہ فاسق کی خبر ساقط اور غیر مقبول ہے اور غیر عادل شخص کی شہادت مردود ہے شہادت اور خبر کے مفہوم میں گو بعض اعتبار سے فرق ضرور ہے لیکن اہم اور عظیم مفہوم میں دونوں یکساں ہیں۔ اس لئے کہ جس طرح

عند جمیعھم ودلت السنة علی نفی روایة المنکر من الاخبار کنحو دلالة القرآن علی نفی خبر الفاسق وھو الاثر المشھور عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

فاسق کی خبر تمام اہلِ علم کے نزدیک غیر مقبول ہوتی ہے اسی طرح اس کی شہادت بھی سب کے نزدیک قابلِ رد ہے اور حدیث و سنت سے منکر روایت کا عدم قبول و نفی اسی طرح ثابت ہے، جس طرح قرآن مجید سے خبر فاسق کا عدم قبول ثابت ہوتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مشہور روایت ہے کہ:۔

من حدث عنی بحدیث یری انہ کذب فھو احد الکاذبین -

من حدث عنی بحدیث یری انہ کذب فھو احد الکاذبین (جس نے مجھ سے کوئی ایسی حدیث بیان کی جس کو وہ جانتا تھا کہ یہ غلط اور جھوٹی ہے، تو وہ بھی ایک جھوٹا ہے۔) (مسلم ص ۶۱-۶۲ مطبع مصریہ ازہریہ ۱۳۴۷ھ / ۱۹۲۹ء)

احادیث کے متعلق اس درجہ احتیاط سے کام لیا گیا کہ محدثین نے کتب حدیث کے جو مجموعے مرتب و مدون کیے اور جو اس زمانہ میں متداول ہیں وہ بار بار کی حک واصلاح اور انتخاب کا نتیجہ ہیں۔ امام احمد اپنی مسند کے متعلق فرماتے ہیں۔

ھذا الکتاب جمعتہ وانتقیتہ من اکثر من سبعمائة الف حدیث وخمسین الفاً (الحدیث والمحدثون ص ۳۷۱)

یہ مجموعہ میں نے سات لاکھ پچاس ہزار حدیثوں سے منتخب کیا ہے

امام بخاری کی صحیح میں مکررات کو شامل کر کے سات ہزار سے کچھ زیادہ حدیثیں ہیں لیکن علماء کا بیان ہے۔

انہ اختارھا وصحت عندہ من ستمائة الف حدیث کانت متداولة فی عصرہ (فجر الاسلام ص ۲۵۳)

اس کو انہوں نے چھ لاکھ حدیثوں سے منتخب کیا جو خود ان کے نزدیک صحیح اور اس زمانہ میں متداول تھیں۔

امام ابوداؤد نے ۵ لاکھ حدیثوں سے صرف ۴ ہزار آٹھ سو منتخب حدیثیں اپنی سنن میں شامل کیں

امام نسائی نے پہلے سنن کبریٰ مرتب کی تھی، لیکن پھر اس میں انتخاب سے کام لے کر سنن صغریٰ الموسوم بہ المجتبیٰ مرتب کی۔

امام ترمذی نے اپنی جامع کے متعلق جب پورا اطمینان کر لیا اور عام علماء نے اس کی توثیق و تحسین کر دی تب اسے منظر عام پر لائے۔

عرضت ھذا الکتاب علی علماء الحجاز والعراق وخراسان فرضوا بہ واستحسنوہ (الحطہ ص ۱۰۳)

میں نے اس کتاب کو حجاز، عراق اور خراسان کے علماء کے سامنے پیش کیا اور انہوں نے اس پر رضامندی اور پسندیدگی کا اظہار کیا

یہی حال حدیث کی دوسری کتابوں کا بھی ہے اس موقع پر یہ نکتہ چینی بھی فراموش نہیں کرنا چاہئیے کہ ائمہ فن نے جن حدیثوں کو نظر انداز کر دیا اور انہیں اپنی کتابوں میں شامل نہیں کیا، وہ سب غلط نہ تھیں بلکہ ان کے خاص معیار و اصول اور سخت شرائط پر وہ پوری نہیں اترتی تھیں۔

اس تفصیل سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ حدیثوں کی روایت اور تحریر میں جس طرح جوش و خروش اور غیر معمولی سرگرمیوں سے کام لیا گیا اور اس کی کوشش کی گئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہر حدیث ضبط تحریر میں آجائے اور آپ کا کوئی فعل و عمل عام نگاہوں سے مستور نہ رہ جائے اسی طرح ان کے نقل و بیان میں مکمل ہوش و احتیاط کو بھی پیش نظر رکھا گیا اور اس بات کی سعی و کاوش میں کوئی دقیقہ باقی نہ رکھا گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب کوئی غلط اور جھوٹی بات منسوب نہ ہو جائے۔

کیا اس قدر سعی و کاوش اور انتہائی احتیاط و ضبط کے بعد بھی حدیثوں کو ناقابلِ تسلیم و حجت اور غیر مستند کہنے کے لئے کوئی گنجائش اور وجہ جواز باقی رہ جاتی ہے۔

یہ بات اگر کہی جائے تو کچھ قرین قیاس بھی ہے کہ یہ تمام کاوش و احتیاط انسان کی ہے اور انسانی کاوش و احتیاط میں غلطیوں کا امکان ہوتا ہے لیکن ذرا ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اس امکان کی بھی تو ایک حد ہوگی۔ ایسا تو ناممکن ہے کہ ساری کاوشیں لاحاصل اور تمام کوششیں ہی بے سود ہوں اور جملہ احتیاط کے بعد بھی سارا ذخیرۂ احادیث باطل اور دفتر بے معنی رہے۔

غالباً اسی امکان کی بنار پر علمار نے اخبار آحاد کو موجب علم و یقین کہنے میں تامل اور احتراز کیا ہے اور اسی بنار پر نقلی حیثیت سے متعدد حدیثوں کی قطعیت اور صحت پر خود محدثین و فقہا کے زمانے میں کافی بحث ہو چکی ہے اور عقلی پہلو سے بھی بعض احادیث پر اعتراضات کئے گئے ہیں قرآن مجید کو بھی احادیث کی صحت کا معیار قرار دیا گیا ہے اور جو حدیثیں اس کے مخالف نظر آئی ہیں، ان کو خود صحابہ نے بھی ناقابلِ تسلیم قرار دیا ہے لیکن بایں ہمہ اصولی حیثیت سے اتنا سب نے تسلیم کیا ہے کہ حدیث ایک حجت شرعی اور اس کا ایک معتد بہ حصہ عقلی و نقلی اعتراضات سے محفوظ ہے باقی حدیثوں کو سرے سے لائقِ اعتنار و قابلِ تسلیم و حجت نہ سمجھنا تو ہمارے زمانے کے بعض ذہین اور جدت و اختراع پسند لوگوں کا کام ہے اور ان لوگوں کا سب سے بڑا سہارا محدثین کا وہ اصول ہے کہ حدیثیں اگر قرآن و عقل صریح کے خلاف ہوں تو ناقابلِ قبول ہیں، لیکن قرآن سے ان لوگوں کی واقفیت کا حال بڑا ہی دردناک ہے اپنی طبیعت و مزاج سے، یہ اس کی جیسی غلط سلط تعبیریں چاہتے ہیں کر لیتے ہیں۔ اور ان تاویلات بارد اور دور از کار تعبیروں کو بنیاد بنا کر حدیثوں کو رد کر دیتے ہیں۔ اقبال نے ایسے ہی "متجددین" کے متعلق کہا تھا۔

قرآن کو بازیچۂ تاویل بنا کر
چاہے تو خود اک تازہ شریعت کرے ایجاد

رہا عقل کا معاملہ تو اس کا ہرگز یہ معاملہ نہیں ہے کہ عقل عمومی کے بجائے محض انفرادی عقول کو معیار بنا لیا جائے کسی حدیث کے کسی خاص انسان کی عقل کے نزدیک خلاف عقل ہونے اور واقعۃً خلاف ہونے میں بڑا فرق ہے۔ پھر ان حضرات کے نزدیک وہی عقل قابلِ معیار ہے جسے یورپ نے پیش کیا ہے لیکن اپنی گرہ کی عقل، اپنے مذاق، اپنی روایات اور اپنی خصوصیات کو سامنے رکھنا تو ان کے نزدیک رجعت پسندی اور بے عقلی ہے کیا اس سے بڑھ کر بھی فکر و نظر کا کوئی فساد اور بگاڑ ہو سکتا ہے کہ اختراع و اکتشاف پسندی کے مدعی لوگ یورپ کی اندھی تقلید کو تو اپنے لئے قابلِ فخر تصور کرتے ہیں لیکن اس ذات گرامی کی اتباع و تقلید نہ تو خود کرتے ہیں اور نہ دوسروں کو کرتے دیکھ سکتے ہیں۔ جس کی آمد سے دنیا سے ظلمت و جہالت کی بنیادیں ڈھے گئیں غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ آج کل مذہب کے خلاف اس کی اصلاح کے پردہ میں جو آوازیں بلند کی جا رہی ہیں، وہ سب یورپ ہی کی صدائے باز گشت ہیں اور اس میں صرف یہ جذبہ کام کر رہا ہے کہ دینی حدود و قیود سے آزادی حاصل کی جائے اور یورپ کی غلامی و تقلید کے مضبوط بندھنوں میں اپنے کو جکڑ دیا جائے اور لطف و حیرت کی بات یہ ہے کہ اس اندھی تقلید و غلامی کو آزادی فکر و اجتہاد کا نام دیا جاتا ہے۔

صدر اسلام میں حدیث کی کتابت و تدوین

از محمد عجاج الخطیب ، ترجمہ : احمد خان ایم اے

یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ بعض صحابہؓ نے جیسے عبداللہ بن عمرو الانصاری جو حدیث کو یاد نہیں رکھ سکتے تھے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے خصوصی اجازت کے تحت کچھ احادیث لکھ رکھی تھیں۔ ان کے علاوہ اور صحابہؓ نے بھی کچھ حدیثیں تحریر کر رکھی تھیں۔ ہمارے پاس اس امر کا ثبوت موجود ہے کہ کئی صحابہؓ نے صحیفے لکھ رکھے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم سمی طور پر یہ نہیں بتا سکتے کہ وہ صحیفے کن کن احادیث پر مشتمل تھے۔ اس لیے کہ بعض صحابہؓ اپنی وفات سے قبل ان صحیفوں کو نذرِ آتش کر دیتے تھے یا انہیں دھو ڈالتے تھے۔ ایسا فعل بعض تابعین نے بھی کیا ہے۔ مگر بعض مرتے وقت اس کی وصیت کر جاتے تھے کہ ان کا صحیفہ کسی کو نہ دیا جائے۔ یہ وصیت اس خدشہ کے تحت کرتے تھے کہ مبادا وہ صحیفہ کسی غیر اہل کے پاس نہ پہنچ جائے[1]۔ یہ بات بلاشک وشبہ کہی جا سکتی ہے کہ صحابہؓ کے اکثر صحیفے رسول مقبولؐ کی حیات ہی میں احاطۂ تحریر میں آ چکے تھے اور اکثر صحیفوں کی نقول صحابہؓ کی عین حیات ہی میں لے لی گئی تھیں، یا پھر ان کے انتقال کے بعد ان کے بیٹوں، پوتوں اور دیگر رشتہ داروں کے توسط سے حاصل کی گئی تھیں، ابن عبدالبر نے ابوجعفر محمد علی کی سند سے بیان کیا ہے کہ:

"رسول مقبولؐ کی تلوار کے قبضے میں ایک صحیفہ موجود پایا گیا جس میں تحریر تھا:

ملعونٌ من سرق تخوم الارض ملعون من تولی غیر موالیہ او قال

ملعون من جحد نعمۃ من انعم علیہ[2]

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ایک عظیم الشان صحیفے کو بہت شہرت حاصل ہو چکی تھی، جو آنحضورؐ نے مہاجرین، انصار، اہل یثرب اور یہود کے حقوق کی تعیین کے سلسلے میں سن ہجری کے پہلے سال میں تحریر کروایا تھا۔ اس صحیفہ میں "اصل الصحیفہ" کا لفظ پانچ مرتبہ آیا ہے۔ وہ صحیفہ یوں شروع ہوتا ہے۔

"ھذا کتاب محمد النبی رسول اللہ بین المؤمنین والمسلمین من قریش واھل یثرب ومن تبعھم فلحق بھم وجاھد معھم، انھم امۃ واحدۃ من دون الناس ...... الخ[3]

یہ صحیفہ اس امر کی بین دلیل ہے کہ اس نوخیز مملکت سلامیہ کا یہ دستور نہ صرف احاطۂ تحریر میں آ چکا تھا، بلکہ بہت شہرت بھی پا چکا تھا، اور پھر متواتر اس کی نقول بھی ہو چکی تھیں۔

اپنے عمال کی طرف آنحضورؐ نے بعض احکام تحریری شکل میں ارسال فرمائے تھے۔ ابن ابی لیلیٰ، عبداللہ بن حکیم سے روایت کرتے ہیں کہ ہمارے سامنے آنحضورؐ کا خط پڑھ کر سنایا گیا جس میں لکھا تھا: ان لا تنتفعوا من المیتۃ باھاب ولا عصب[4]

حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت مالک بن انسؓ کو ایک خط لکھا تھا، جس میں زکوٰۃ وصدقات کے بارے میں آنحضورؐ کے

تفصیلی احکامات تھے۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ اس خط پر آنحضورؐ کی خاتم مبارک بھی ثبت تھی ۵ے

عبداللہ بن عمرؓ سے نافع روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر بن الخطابؓ کی تلوار کے قبضے میں چوپایوں کی زکوٰۃ کے احکام کے بارے میں ایک تحریر دیکھی تھی ۶ے یہ تحریر سالم بن عبداللہ ابن عمر نے وراثت میں پائی تھی اور اس کو امام ابن شہاب الزہری نے ان کے سامنے بھی پڑھا تھا۔ ۷ے اس امر کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے، جو محمد بن عبدالرحمٰن الانصاری نے کی ہے۔

لما استخلف عمر بن عبد العزیز ارسل الی المدینة یلتمس کتاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی الصدقات وکتاب عمر بن الخطاب ..... ووجد عند آل عمر کتاب فی الصدقات مثل کتاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، قال: فنسخناہ ۸ے

امیر المومنین حضرت علیؓ بن ابی طالب کی ایک تحریر کو بڑی شہرت حاصل ہے، جسے وہ اپنی تلوار کی نیام میں رکھتے تھے۔ اس تحریر میں اونٹوں کی زکوٰۃ کا نصاب، کسی کو زخمی کرنے کی پاداش کا ذکر، مدینہ کے حرم ہونے کا حکم اور کوئی مسلم کافر کے قصاص میں قتل نہیں کیا جائے گا، تحریر تھا۔ ۹ے

ابن الحنفیہ محمد بن علی بن ابی طالب (م ۸۱ھ) فرماتے ہیں کہ میرے باپ نے مجھے حضرت عثمانؓ کے پاس بھیجا اور کہا: یہ لیجیے خط اور اسے حضرت عثمانؓ کے پاس لے جائیے۔ اس کے اندر آنحضورؐ کے زکوٰۃ کے بارے میں احکام درج ہیں ۱۰ے

حضرت مسعر، حضرت معن سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا: عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن مسعودؓ نے مجھے ایک تحریر نکال کر دی اور قسم کھائی کہ اسے میرے باپ نے اپنے ہاتھ سے لکھا ہے ۱۱ے

سعد بن عبادۃ الانصاری (م ۱۵ھ) کے پاس ایک تحریر یا چند تحریریں تھیں، جن میں کچھ احادیثِ رسولؐ لکھی ہوئی تھیں۔ سعد بن عبادہ کے بیٹے نے اپنے والد کی تحریرات سے آنحضورؐ کے چند اعمال کی روایت کی ہے ۱۲ے امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ یہ تحریر عبداللہ بن ادنی کے صحیفے کی نقل تھی، جس میں وہ اپنے ہاتھ سے حدیثیں لکھا کرتے تھے اور لوگ ان کے اس مجموعے کو انھی کے سامنے پڑھا کرتے تھے۔ ۱۳ے

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام ابو رافع (م ۳۵ھ) کے پاس ایک تحریر تھی، جس میں نماز کے ابتدائی جملے تحریر تھے۔ انھوں نے یہ اوراق سات عظیم فقہائے ملت میں سے ایک حضرت ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن الحارث (م ۹۴ھ) کو دے دیے تھے ۱۴ے

حضرت اسماءؓ بنت عمیس (م ۳۸ھ) کے پاس ایک تحریر تھی، جس میں انھوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کچھ احادیث جمع کر رکھی تھیں ۱۵ے

محمد بن سعد سے روایت ہے کہ جب محمد بن سلمہ انصاری ۱۶ے (م ۴۲ھ) نے وفات پائی، تو ہم نے ان کی تلوار کی پیٹی میں ایک تحریر پائی، جس میں لکھا تھا: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول: ان لربکم فی بقیة دھرکم نفحات فتعرضوا لہ ۱۷ے

سبیعۃ الاسلمیہ نے عبداللہ بن عتبہ کو لکھا تھا کہ حضرت رسول اکرمؐ نے ان کو خاوند کی وفات کے کچھ عرصہ بعد جب انھیں بچہ ہو چکا تھا، تو نکاح کا حکم دیا تھا ۱۸ے

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وائل بن حجر کو ان کے قبیلے کے لیے، جو حضرموت میں مقیم تھا، ایک تحریر عطا کی تھی، جس میں اسلام کی بنیادی باتیں، زکوٰۃ کے بعض نصاب، زنا کی حد، تحریم خمر اور ہر مسکر کے حرام ہونے کے بارے میں تحریر تھا۔[19]

رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرو بن حزام (م ۵۳ھ) کو یمن کا والی بنا کر بھیجا، تو انہیں ایک خط دیا جس میں فرائض، سنن، دیت اور دیگر امور کے بارے میں ہدایات درج تھیں۔[20]

حضرت ابوہریرہؓ (م ۵۹ھ) کے پاس کئی تحریریں محفوظ تھیں۔ جن میں آنحضورؐ کی حدیثیں لکھی ہوئی تھیں۔

الفضل بن حسن بن عمرو بن امیہ الضمری اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا ہے: "میں نے حضرت ابوہریرہؓ (م ۵۹ھ) کے سامنے ایک حدیث کا تذکرہ کیا۔ انہوں نے اس حدیث کے بارے میں لاعلمی کا اظہار فرمایا۔ میں نے عرض کیا کہ یہ حدیث میں نے آپ ہی سے سنی ہے، تو حضرت ابوہریرہؓ فرمانے لگے: اگر تو نے مجھ سے یہ حدیث سنی ہے، تو میرے ہاں لکھی ہوئی ہوگی۔ پھر وہ میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر لے گئے۔ وہاں انہوں نے آنحضورؐ کی احادیث پر مشتمل بہت سی تحریریں ہمیں دکھائیں۔ چنانچہ وہ حدیث بھی ان میں مل گئی۔ تب فرمانے لگے، میں نے تمہیں کہا تھا نا کہ اگر تو نے یہ حدیث مجھ سے سنی ہے، تو میرے ہاں تحریر ہوگی۔[21] مجھ سے قبل جو تحریر بشیر بن نہیک نے حضرت ابوہریرہؓ سے لکھ رکھی تھی، میرے سامنے پڑھ کر سنائی۔[22]

سمرہ بن جندب (م ۶۰ھ) نے احادیث کا ایک ضخیم مجموعہ جمع کر رکھا تھا، جو ان کے بیٹے سلیمان نے ان سے روایت کیا ہے۔[23] اور بعید نہیں کہ یہی وہ تحریریں ہوں، جو سمرہ بن جندب نے اپنے بیٹوں کو لکھ کر بھیجی تھیں۔ اس مجموعے کے بارے میں محمد بن سیرین کہتے ہیں۔ فی رسالۃ سمرۃ الی بنیہ علم کثیر۔[24]

عبداللہ بن عمرو بن العاص (م ۶۵ھ) کا صحیفہ صادقہ

حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عمرو کو احادیث کی کتابت کی اجازت دے رکھی تھی۔ وہ بہت اچھے خوشنویس تھے، انہوں نے آنحضورؐ کی بہت سی حدیثیں لکھ رکھی تھیں۔ عبداللہ ابن عمرو کا صحیفہ کاتب کی مرضی کے مطابق "صحیفہ صادقہ" کے نام سے مشہور تھا۔ اس لیے کہ وہ آنحضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم سے براہِ راست لکھا گیا تھا۔ اس صحیفے کو مجاہد بن جبیر (۲۱، ۱۰۴ھ) نے عبداللہ بن عمرو کے ہاں دیکھا تھا۔ مجاہد اس صحیفے کے حصول کے لیے ان کے پاس گئے، تو حضرت عبداللہ نے فرمایا: بنو مخزوم کے لڑکے رہنے دو! مجاہد نے کہا: کیا آپ نے کچھ نہیں لکھا ہے؟ حضرت عبداللہ فرمانے لگے: ھذہ الصادقۃ فیہا ما سمعتہ من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولیس بینی وبینہ احد۔[25] یہ صحیفہ عبداللہ کو بہت ہی عزیز تھا، وہ کہا کرتے تھے: ما یرغبنی فی الحیوۃ الا الصادقۃ والوھط۔[26] وہ اس صحیفہ کو ضائع ہونے کے ڈر سے ایک مضبوط صندوق میں رکھا کرتے تھے۔[27] بعد میں ان کی اولاد نے اس صحیفے کو محفوظ کیا۔ غالب قیاس یہ ہے کہ ان کے پوتے عمرو بن شعیب اسی صحیفہ سے حدیث کی روایت کرتے تھے۔[28] ابن اثیر کے قول کے مطابق یہ صحیفہ عبداللہ ایک ہزار احادیث پر مشتمل تھا۔[29] مگر جن احادیث کو عمرو بن شعیب نے عن ابیہ عن جدہ روایت کی ہے، ان کی تعداد پانچ سو تک نہیں پہنچتی۔[30] اگر صحیفہ صادقہ بجنسہٖ عبداللہ بن عمرو سے ہم تک نہیں پہنچا، مگر امام احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں اس کے مشتملات کو نقل کر دیا ہے۔[31] اسی طرح حدیث کی دیگر کتب میں بھی اس کا بہت سا حصہ نقل ہو گیا ہے۔[32]

بحیثیت ایک تاریخی اور علمی وثیقہ کے اس صحیفہ کی اہمیت غیر معمولی ہو گئی ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ یہ صحیفہ باجازت رسول مقبول صلی اللہ

علیہ وسلم انہیں کے سامنے احادیث نبوی کی کتابت کا ثبوت بہم پہنچاتا ہے۔[۳۳]

حضرت عبداللہ اپنے شاگردوں کو حدیث لکھوایا کرتے تھے۔[۳۴] ان کے شاگرد حسین بن شفی ابن ماتع الاصبحی نے مصر میں دو کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں سے ایک میں یہ تھا: قضی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی کذا، وقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کذا: اور دوسری کتاب میں تھا: ما یکون من الاحداث الی یوم القیامۃ۔[۳۵]

اگرچہ ہم یہاں صحیفہ صادقہ پر بحث کر رہے ہیں، مگر ضمناً عرض کر دیتے ہیں کہ ابن عمرو کے پاس اہل کتاب کے علم پر مشتمل بھی کئی کتابیں تھیں، یہ کتابیں انہیں جنگ یرموک میں دو اونٹوں پر لدی ہوئی ملی تھیں۔[۳۶] بشر المریسی کا خیال ہے کہ عبداللہ بن عمرو ان تمام کتب کو آنحضورؐ سے روایت کیا کرتے تھے۔ ان سے کہا جاتا تھا کہ اونٹوں والی کتب سے ہمیں حدیث نہ سنائیں مگر ان کا یہ گمان غلط ہے، اس لیے کہ عبداللہ بن عمرو کی روایت

حدیث اور اس کی

نقل میں امانت مسلمہ امر ہے۔ وہ ان روایات کو کبھی کبھی توڑتے یا موڑتے نہ تھے۔ جو حضورؐ نے اہل کتاب کے خلاف کہی ہیں اور اس طرح نہ وہ ان روایات کو خلط ملط کرتے، جو اہل کتاب نے آنحضورؐ کے خلاف کہی ہیں۔[۳۷]

حضرت عبداللہ بن عمرو کے لیے یہ فخر کچھ کم نہیں ہے کہ انہوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہی ان کی مختلف حالتوں یعنی غضب اور رضا دونوں میں خود آنحضورؐ کی اجازت سے احادیث کو لکھا ہے۔

ابن عباس کی تحریریں

حضرت ابن عباسؓ حدیثوں کی طلب اور ان کے حصول کی جد و جہد کے لیے مشہور رہیں۔ وہ آنحضورؐ کی وفات کے بعد صحابہ کرام سے پوچھ پوچھ کر لکھ لیا کرتے تھے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے دعا فرمائی تھی: اللھم الھمہ الحکمۃ وعلمہ التاویل۔[۳۸] ابن عباس کی وفات کے وقت ان کی کتابیں ایک اونٹ کے بوجھ کے برابر تھیں۔[۳۹]

روایات میں آیا ہے کہ عبداللہ بن عمر (۱۰ ق - ۷۳ ھ) جب بازار کی طرف نکلتے تھے، تو اپنی کتابوں پر نگاہ ڈالتے نکلتے تھے راوی نے تیقن سے کہا ہے کہ یہ کتابیں حدیث رسولؐ پر مشتمل تھیں۔[۴۰]

صحیفہ جابر بن عبداللہ الانصاری (۱۶ ق - ۷۸ ھ)

اس امر کا احتمال ہے کہ یہ صحیفہ اس چھوٹے سے ہدایت نامہ حج کے علاوہ ہو، جسے امام مسلم بن الحجاج نے اپنی کتاب الجامع الصحیح کے باب الحج میں نقل کیا ہے۔[۴۱] ابن سعد نے اس امر کے بارے میں مجاہد کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جابر اس صحیفے سے حدیث بیان کیا کرتے تھے۔[۴۲] جلیل القدر تابعی قتادہ بن دعامہ السدوسی (م ۱۱۸ ھ) اس صحیفہ کی قدر و منزلت کے بارے میں کہا کرتے تھے۔ لأنا بصحیفۃ جابر بن عبداللہ احفظ منی لسورۃ البقرۃ۔[۴۳] ایک دوسری روایت میں آیا ہے کہ قتادہ، سلیمان الیشکری کے صحیفے سے حدیث بیان کرتے تھے اور سلیمان کے پاس جابر بن عبداللہ کا صحیفہ تھا۔[۴۴] یہ بعید نہیں کہ سلیمان الیشکری نے یہ صحیفہ جابر سے نقل کیا ہو کیونکہ سلیمان ان کے شاگرد تھے۔ ابن حجر عسقلانی کہتے ہیں کہ سلیمان، جابر کے ہاں بیٹھتے تھے اور ان کے صحیفے نقل کیا کرتے تھے۔[۴۵] غالباً قتادہ نے جابر بن عبداللہ کے صحیفے کی روایت سلیمان الیشکری سے کی ہے۔ سلیمان کی والدہ ایک صحیفے کو لائیں اور وہ صحیفہ ثابت، قتادہ اور ابو البشر کے سامنے پڑھا گیا۔ انہوں نے ان احادیث کی روایت کی ہے۔ مگر ثابت نے صرف ایک حدیث اس واسطے

سے بیان کی ہے[۴۶] جابر بن عبداللہ کا صحیفہ کافی مشہور و معروف تھا۔ اسی طرح اس سے ملی ہوئی وہ نقل بھی شہرت پاچکی تھی، جو سلیمان الیشکری نے حاصل کی تھی اس امر کی تائید کئی روایات سے ملتی ہے۔ من جملہ ان کے ایک یہ ہے۔ شعبہ کا خیال تھا کہ ابوسفیان طلحہ بن نافع نے حضرت جابر بن عبداللہ سے جو روایتیں کی ہیں، وہ سلیمان الیشکری کے صحیفے کی ہیں[۴۷] حضرت جابر بن عبداللہ کے شاگردوں کا ایک حلقہ تھا، جنھیں وہ مسجد نبویؐ میں بیٹھ کر احادیث لکھوایا کرتے۔ ان سے کئی لوگوں نے حدیثیں لکھی ہیں، جن میں سے ایک وہب بن منبہ (م ۱۱۴ھ) بھی ہیں[۴۸] ابوالزبیر، ابوسفیان اور الشعبی نے جابر سے روایت کی ہے، انہوں نے حضرت جابر سے یہ احادیث سُن رکھی تھیں، جن میں سے اکثر اس صحیفے میں مرقوم تھیں[۴۹] عروہ بن الزبیر (۲۲-۹۲ھ) کہتے ہیں کہ، کنت الحدیث ثم محولہ فوددت انی فدیتہ بالی ودلدی وانی لم امحہ[۵۰]۔ غالباً انہوں نے اس کے علاوہ بھی احادیث لکھی تھیں۔ مگر وہ سب الحرہ کی جنگ میں جل کر خاکستر ہوگئی تھیں جس پر انہیں بہت ہی ملال تھا۔ وہ کہا کرتے تھے۔ وددت لوان عندی کتبی باھلی ومالی[۵۱]

خالد بن معدان الکلاعی الحمصی (م ۱۰۴ھ) کے پاس ایک صحیفہ تھا جس میں گھنڈیاں لگی ہوئی تھیں اور کیڑے پڑے ہوئے تھے۔ اس میں انہوں نے علم (یعنی احادیث) جمع کر رکھا تھا[۵۲] اس کی ایک نقل جبیر بن سعید کے پاس بھی تھی۔[۵۳]

ابوقلابہ عبداللہ بن زید الجرمی (م ۱۰۴ھ) نے اپنے نوشتوں کو ایوب سختیانی کے حوالے کرنے کی وصیت کی تھی۔ وہ نوشتے ایک اونٹنی کے کجاوے میں لائے گئے[۵۴] اور ایوب نے اس کام کی اُجرت کچھ اوپر دس درہم دی تھی[۵۵]

الحسن البصری سے الاعمش روایت کرتے ہیں کہ: ہمارے پاس لکھے ہوئے کتابچے تھے، جو ہم آپس میں دہرایا کرتے تھے[۵۶]

محمد الباقر بن علی بن الحسین (۵۶-۱۱۴ھ) کے پاس بہت سی تحریرات تھیں، اُن کے بیٹے جعفر الصادق نے ان سے کچھ تو سُن رکھی تھیں اور کچھ پڑھ لی تھیں[۵۷]

مکحول الشامی[۵۸] اور الحکم بن عتیبہ کے پاس بھی کتابچے تھے۔[۵۹] بکیر بن عبداللہ بن الاشج (م ۱۱۷ھ) جو مدینہ منورہ کے جید عالم تھے، اپنے پاس کئی کتابچے رکھتے تھے، جو بعد میں اُن کے بیٹے مخرمہ کے پاس منتقل ہوگئے۔[۶۰]

قیس بن سعد المکی (م ۱۱۷ھ) کے پاس ایک نوشتہ تھا، جو حماد بن سلمہ (م ۱۶۷ھ) کے پاس پہنچا[۶۱]

یہ بات بلا شبہ کہی جاسکتی ہے کہ دوسری صدی ہجری کے اوائل میں علماء نے کئی کتابیں تالیف کی تھیں۔ ان کے سامنے ہی ان کتابوں کی تعداد بے شمار ہوگئی۔ امام زہریؒ کی کتابوں کا کافی بڑا مجموعہ تھا۔ الولید بن یزید بن عبدالملک بن مروان (۸۸-۱۲۶ھ) کے قتل کے بعد وہ کتابیں امام زہریؒ کے کتب خانے سے کئی اونٹوں پر لاد کر دوسری جگہ منتقل کی گئیں[۶۲]

دوسری صدی ہجری کے اوائل میں حدیث کے عام ہونے اور اس میدان میں علماء کی خدمات کے ذکر سے قبل ہم صحیفہ ہمام بن منبہ کی تدوین اور اس کی تاریخی اور علمی حیثیت کو واضح کر دینا ضروری خیال کرتے ہیں۔

صحیفہ ہمام بن منبہ (۴۰-۱۳۱ھ)[۶۳]

ہمام بن منبہ کو جو ایک ممتاز تابعی تھے، حضرت ابوہریرہؓ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے۔ انہوں نے حضرت ابوہریرہؓ سے بہت سی احادیث لکھیں۔ اُنہیں ایک صحیفہ یا کئی صحیفوں میں جمع کیا اور ان کا نام: الصحیفۃ الصحیحہ رکھا[۶۴] ممکن ہے، اُنہوں نے ان تحریرات کا نام عبداللہ بن عمرو کے صحیفہ صادقہ کی طرز پہ

رکھا ہو۔ وہ اپنے صحیفے کا نام صحیحہ رکھنے کے مجاز بھی تھے۔ اس لیے کہ جس صحابیؓ سے وہ نقل کرتے ہیں، وہ آنحضورؐ کے ساتھ چار سال تک متواتر رہے اور ان سے بہت سی احادیث کی روایت کی۔

یہ ہماری خوبئ قسمت ہے کہ ہمام بن منبہ کا صحیفہ بعینہٖ ہم تک پہنچا جس طرح کہ انہوں نے حضرت ابو ہریرہؓ سے لکھ کر روایت کی ہے۔ اس صحیفے کو ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے دمشق اور برلن کے دو مخطوطوں کے مطابق اپنی تحقیق اور مقدمہ کے ساتھ المجمع العلمی العربی دمشق کی وساطت سے ۱۹۵۳ء میں چھاپ دیا ہے۔[65]

اس صحیفے کی حفاظت کا ثبوت اس طرح بھی ملتا ہے کہ امام احمد بن حنبلؒ نے اپنی مسند میں تمام کا تمام نقل کر دیا ہے۔ اسی طرح امام بخاریؒ نے اس صحیفے کی بہت سی احادیث اپنی کتاب کے کئی ابواب میں درج فرمائی ہیں۔[66]

تدوین حدیث کے ضمن میں اس صحیفے کی اہمیت غیر معمولی ہے۔ یہ ایک قطعی دلیل اور حجت ہے کہ حدیث نبویؐ ابتدائے عہد میں مدّون ہو چکی تھی۔ یہ اس غلط نظریے کو رفع کرتی ہے کہ حدیث دوسری صدی ہجری کے اوائل میں مدّون ہوئی تھی۔[67] یہ حقیقت ہے کہ ہمام بن منبہ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے ملاقات کے دوران یہ حدیثیں لکھیں اور حضرت ابو ہریرہ کی وفات کا سن ۵۹ھ ہے، تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ یہ صحیفہ اس سن سے قبل یعنی پہلی صدی ہجری کے وسط میں لکھا گیا۔ یہ معلوم ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ نے آنحضورؐ کے عہد ہی میں صحیفہ لکھ لیا تھا، اور یہ صحیفہ ہمام بتاتا ہے کہ پہلی صدی ہجری کے وسط میں لکھا گیا۔ یہ اس امر کا بیّن ثبوت ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے حکم کتابت حدیث سے پہلے ہی علمائے حدیث کی تدوین عملاً شروع کر دی تھی۔ ہم اس صحیفے کا تذکرہ حضرت ابو ہریرہؓ کے کتابچوں میں بھی کر سکتے تھے۔ کیونکہ یہ صحیفہ انہی کی املا ہے۔ مگر یہ چونکہ صحیفہ ہمام بن منبہ کے نام سے مشہور ہے، اس لیے ہم نے انہی کے ساتھ ذکر کیا۔ ہمام سے ان کے شاگرد معمر بن راشد پھر ان سے عبدالرزاق پھر ان سے دیگر حضرات نے روایت کی ہے۔[68]

ابن حجر عسقلانی نے ذکر کیا ہے کہ ہمام بن منبہ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے ایک ہی سند کے ساتھ کوئی ایک سو چالیس احادیث سنی تھیں۔[69] مگر اس وقت صحیفہ ایک سو اڑتیس احادیث پر مشتمل ہے۔ یہ امر بھی اس صحیفہ کی صداقت پر عین دلیل ہے کہ جو کچھ تعداد علمائے نے بتائی تھی، تقریباً وہی تعداد اس وقت صحیفے میں موجود ہے۔

دوسری صدی ہجری کے وسط میں تدوین حدیث اس قدر عام ہو چکی تھی کہ حدیث کی ایسی کوئی کتاب نظر نہ آتی تھی۔ جس میں باقاعدہ ابواب نہ ہوں، بلادِ اسلامیہ کے مختلف علاقوں میں جو کچھ اس میدان میں تالیف ہوا، اس کا تفصیلی تذکرہ اوپر کیا گیا ہے، اس عرصے میں جن حضرات کے ہاں اس قسم کی کتابیں پائی گئی ہیں، وہ ان حضرات کی اپنی تالیفات تھیں یا غیروں کی، اُن کے اسماء ذیل میں دیے جا رہے ہیں:

یحییٰ بن ابی کثیر (م ۱۲۹ھ) امام زہریؒ کے معاصر تھے۔[70] محمد بن سوقہ (م ۱۳۵ھ)[71] زید بن اسلم (م ۱۳۶ھ) کے پاس ایک تفسیر کی کتاب تھی، جس میں زیادہ حصّہ احادیث پر مشتمل تھا۔[72] موسیٰ بن عقبہ (م ۱۴۱ھ) کے پاس عبداللہ بن عمرؓ کے غلام نافع کی حدیثوں کا ایک مجموعہ تھا۔[73] الاشعث بن عبدالملک الحمرانی (م ۱۴۲ھ) کے پاس ایک کتابچہ تھا، جو بعد میں سلیمان بصری کو ملا۔[74] عقیل بن خالد بن عقیل (م ۱۴۲ھ) نے امام زہری سے بہت سی احادیث لکھی تھیں، بلکہ یہ شخص امام زہری کی احادیث سے باقی تمام لوگوں کی نسبت زیادہ واقف تھا۔[75] یحییٰ بن سعید الانصاری (م ۱۴۳ھ) کے ہاں ایک نوشتہ تھا، جو بعد میں حماد بن زید کے پاس پہنچا۔[76]

عوف بن ابی جمیلہ العبدی (م ۱۴۶ھ) نے حسن بصری سے کچھ اطراف احادیث نبویؐ لکھی تھیں[77] یہ اطراف بعد میں یحییٰ بن سعید القطان (۱۲۰-۱۹۸ھ) کے پاس ستھے[78] جعفر صادق بن محمد الباقر (۸۰-۱۴۸ھ) کے پاس، جو ایک ثقہ محدث تھے، احادیث کے کئی کتابچے اور دیگر تحریریں پائی گئیں۔[79] یونس بن یزید ابی النجار (م ۱۵۲ھ) کے پاس ایک کتاب تھی، جس کی صحت کی شہادت ابن المبارک نے دی ہے[80]

عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن عتبہ مسعودی (م ۱۶۰ھ) کے پاس کئی کتابچے تھے، جن کو شعبہ بغداد سے لائے تھے۔[81] زائدہ بن قدامہ (م ۱۶۱ھ) کے ہاں کچھ کتابچے تھے، جو انہوں نے سُفیان ثوری کو دکھائے تھے[82] زائد بن قدامہ اور شعبہ ابن الحجاج ہمسر تھے[83] حضرت سفیان ثوری نے بہت سی کتب لکھی تھیں، جن میں سے حدیث پر الجامع الکبیر اور الجامع الصغیر تھیں[84]

ابن المبارک کا قول ہے کہ ابراہیم بن طہمان (م ۱۶۳ھ) اور ابوحمزہ السکری (م ۱۶۷ھ) کی کتابیں بالکل صحیح تھیں[85]

شعبہ بن الحجاج (م ۱۶۰ھ) کی غرائب الحدیث میں ایک کتاب تھی[86] عبدالعزیز ابن عبداللہ ماجشون (م ۱۶۴ھ) نے بہت سی کتب، تالیف کیں، جو انہوں نے ابن وہب سے روایت کی ہیں[87] عبداللہ بن عبداللہ بن اُدیس (م ۱۶۹ھ) جو مالک کے چچیرے بھائی اور اُن کے بہنوئی تھے۔ ان کے پاس کئی کتابچے تھے، جو اُن کے اسماعیل تک پہنچے[88]

سلیمان بن بلال (م ۱۷۲ھ) نے اپنی کتابوں کے بارے میں وصیت کی تھی کہ وہ عبدالعزیز بن ابی حازم کو دے دی جائیں[89] یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مصر کے محدّث علی بن لہیعہ (م ۱۷۴ھ) کے پاس بہت سی کتب تھیں۔ یہ سب کتابیں صحیح السند تھیں، مگر افسوس کہ سن ۱۶۹ھ میں جل کر راکھ ہوگئیں[90] علی بن لہیعہ نے حدیث میں ایک مجموعہ مرتب کیا تھا، جو قدیم مجموعات میں شامل ہوتا ہے، یہ مجموعہ اوراق بردی کے مجموعات میں محفوظ ہے جو ہائیڈل برگ (جرمنی) میں محفوظ ہیں۔[91] دیارِ مصر کے شیخ لیث بن سعد کی بہت سی تصانیف تھیں[92]

اس میدان میں علماء کی بے شمار تالیفات کی ہمیں خبر ہے، مگر ان کے ذکر کی یہاں گنجائش نہیں، مذکورہ بالا کتب ہی اس ثبوت کے لیے کافی ہیں کہ دوسری صدی ہجری کے اواخر میں لاتعداد کتب موجود تھیں۔ کیا علی بن عبداللہ المدینی (۱۶۱-۲۳۴ھ) نے حدیث کے مختلف ابواب، رجال حدیث، غریب حدیث اور حدیثوں کے علل پر کچھ زیادہ سو کتابیں نہیں لکھی تھیں؟ ان میں سے کچھ اوپر چھبیس کا ذکر تو محمد بن صالح الہاشمی نے کیا ہے ان میں سے ہر کتاب کئی اجزاء پر مشتمل تھی اور بعض تو تیس اجزاء تک پہنچتی ہیں[93]

یوں علمائے ملت نے اپنے سینوں اور کتابوں میں حدیثِ نبویؐ کی حفاظت کی ہے، علی بن عبداللہ المدینی کا یہ قول سچ ہے کہ میں نے جب غور کیا، تو معلوم ہوا کہ ساری اسناد ان چھ اشخاص کے گرد گھومتی ہیں، اہلِ مدینہ کے لیے یہ مرکز مسلم بن شہاب زہری (م ۱۲۴ھ) اور اہلِ مکہ کے لیے عمرو بن دینار (م ۱۲۶ھ)[94] اہلِ بصرہ کے لیے قتادہ بن دعامۃ السدوسی (م ۱۱۷ھ) اور یحییٰ بن ابی کثیر (م ۱۲۹ھ)[95] اور اہلِ کوفہ کے لیے ابواسحٰق عمرو بن عبداللہ السبیعی[96] (م ۱۲۷ھ) اور سلیمان بن مہران الاعمش (م ۱۴۸ھ) مرکزی حیثیت رکھتے ہیں، اس کے بعد علی بن عبداللہ المدینی نے یہ بھی کہا ہے کہ ان چھ بزرگوں کی جمع کردہ احادیث بعد کے مؤلفین تک پہنچیں[97]

حوالہ جات و حواشی

[1] حضرت ابوبکرؓ کے پاس جو تحریرات تھیں، اُن کے دھونے اور جلانے کے بارے میں ملاحظہ ہو شمس الدین ذہبی، تذکرۃ الحفاظ، ط

حیدرآباد دکن، ۱۳۴۴ھ : ۱/۵، اس کے علاوہ باقی دیکھیے : خطیب بغدادی، تقیید العلم ط دمشق ۱۹۴۹ء : ۵۹-۶۲، زہیر بن حرب : کتاب العلم (مخطوطہ) المکتبۃ الظاہریۃ، دمشق : ۱۹۲، خطیب بغدادی : الجامع الاخلاق الراوی تصویر دار الکتب المصریۃ : ۴۴

[2] ابن عبدالبر : جامع بیان العلم وفضلہ ط المطبعۃ المنیریۃ : ۱/۷۱

[3] ابن ہشام : سیرۃ النبیؐ بتحقیق محی الدین ط قاہرہ ۱۳۵۶ : ۲/۱۱۹، قاسم بن سلام : کتاب الاموال ط مصر ۱۳۵۳ھ : ۲۰۲، ڈاکٹر حمید اللہ مجموعۃ الوثائق السیاسیۃ ط قاہرہ، ۱۹۵۸ء : ۱۵-

[4] تقی الدین الشہزوری علوم الحدیث ط مصر ۱۳۲۶ھ، ۸۶، الحاکم نے کہا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس کی اس حدیث سے یہ حدیث منسوخ ہو جاتی ہے، جس میں ہے ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مر بشاۃ میتۃ فقال : ھلا استمتعتم بجلدھا قالوا یا رسول اللہ انھا میتۃ فقال ، انما حرم اکلھا - ملاحظہ فرمائیں : اخبار اھل الرسوخ فی الفقہ والتحدیث : از ابو الفرج عبدالرحمٰن بن علی بن الجوزی ط مصر ۱۳۲۲ھ : ۲۷-

[5] عثمان بن سعید الدارمی : الرد علی الجہمیۃ (رد الدارمی علی بشر المریسی) ط قاہرہ، ۱۳۵۸ : ۱۳۱، امام احمد بن حنبل نے اس خط کا ذکر اپنی مسند میں کیا ہے، دیکھیے : مسند احمد بن حنبل ط دار المعارف مصر : ۱/۱۸۳-۱۸۴-

[6] خطیب بغدادی : الکفایۃ فی علم الروایۃ ط ہند، ۱۳۵۷ھ : ۳۵۲، ۳۵۴، طاہر الجزائری : توجیہ النظر الی اصول الاثر ط مصر ۱۹۱۰ء : ۳۴۸،

[7] الاموال : ۳۶۰، رد الدارمی علی بشر : ۱۳۱-

[8] الاموال : ۳۵۸، ۳۵۹، کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطاب کے پاس عہدنامہ جات اور مواثیق کے نسخے ایک صندوق میں محفوظ تھے، مگر وہ جنگِ الجماجم (۸۳ھ) کے موقع پر جل گئے - ان میں جو بچ رہے، وہ دستبردِ زمانہ کی نذر ہو گئے، یا پھر تاتاری حملہ کی بھینٹ چڑھ گئے - الوثائق السیاسیۃ کے مقدمہ میں ہے کہ آنحضورؐ کے کچھ خطوط نویں صدی ہجری تک محفوظ رہے مثلاً وہ خط جو آپؐ نے تمیم الداری کی زمینوں کے بارے میں لکھا تھا - دیکھیے : ابن فضل اللہ العمری : مسالک الابصار دار الکتب المصریہ : ۱۸۳، ۱۷۵

[9] مسند امام احمد : ۲/۲۵۴، ۴۴، ۱۲۱، ۱۳۱، ابن حجر عسقلانی، فتح الباری ط قاہرہ ۱۹۵۹ : ۷۰/۸۳، رد الدارمی علی بشر المریسی ۱۳۰-

[10] رد الدارمی علی بشر ص ۱۳۰، ابن حجر العسقلانی، فتح الباری، ج ۲ ص ۲۳،

[11] جامع بیان العلم وفضلہ ج ۱، ص ۷۲ -

[12] جامع بیان العلم وفضلہ ج ا ص ۷۲ - ڈاکٹر علی حسین عبدالقادر نظرۃ عامۃ تاریخ الفقہ الاسلامی ط مصر ۱۹۵۶ء ص ۱۱۸، ڈاکٹر حمید اللہ : صحیفہ ہمام بن منبہ ط المجمع العلمی العربی دمشق ۱۹۵۳ء ص ۱۶

[13] صبحی الصالح ، علوم الحدیث ومصطلحہ ، ط دمشق ۱۹۵۹ء ص ۱۳، اور حاشیہ بھی جس میں ہے ۔عبداللہ بن ادنی مگر یہ طباعت کی غلطی ہے اور صحیح ہے عبداللہ بن ابی اوفی ملاحظہ ہو : محمد بن عبدالہادی السندی : صحیح البخاری ط دار احیاء الکتب العربیۃ قاہرہ : باب الصبر عند القتال ج ۲ ص ۱۴۳ - عبداللہ بن ابی اوفی صحابی ہیں، رسولِ مقبولؐ کی وفات کے بعد بھی زندہ رہے - بالآخر ۸۷ ہجری میں وفات پائی

آپ کوفہ میں مرنے والے آخری صحابی تھے۔ دیکھیے : ابن حجر العسقلانی : تہذیب التہذیب ط حیدر آباد دکن ۱۳۲۵ھ ج ا ص ۴۰۲

۱۴ الکفایہ ص ۳۰۳، کہتے ہیں کہ ابو رافع کی وفات شہادت عثمان رضؓ کے بعد ہے اور بعض کا خیال ہے کہ خلافت علی رضؓ میں انتقال فرمایا :

۱۵ نظرۃ عامہ فی تاریخ الفقہ الاسلامی، ص ۱۱۸

۱۶ محمد بن مسلمہ صحابہ کبار میں سے تھے۔ یہ ان تینوں میں سے ایک ہیں جنہوں نے کعب بن الاشرف کو قتل کیا تھا بعض غزوات میں آنحضورؐ نے انہیں مدینہ ہی میں رہنے دیا۔ فسادات کے زمانے میں گوشہ نشین رہے۔ اس لیے جنگ جمل اور صفین میں شریک نہیں ہوئے ۷۷ سال کی عمر میں وفات پائی۔ دیکھیے : تہذیب التہذیب جلد ۹ ص ۴۵۴۔

۱۷ الحسن بن عبدالرحمٰن بن خلاد الرامہرمزی : المحدث الفاصل بین الراوی والواعی (مخطوطہ) دار الکتب المصریہ ص ۱۱۲۔

۱۸ الکفایۃ ص ۳۳۲، یہ سبیعۃ الحارث کی بیٹی اور سعد بن خولہ کی بیوی تھیں، ملاحظہ فرمائیں : تہذیب التہذیب ج ۱۲ ص ۴۲۳

۱۹ ابن حجر العسقلانی : الاصابہ فی تمییز الصحابہ ط ۱۳۲۳ھ ج ۶ ص ۳۱۲، اس کی تفصیل کیلیے ملاحظہ ہو : المصباح المضئ از محمد بن علی الانصاری (مخطوطہ) مکتبہ الاوقاف حلب ورق ۱۱۲)

۲۰ الاصابہ ج ۴ ص ۲۹۳ - ابوداؤد، النسائی، ابن حبان اور دارمی وغیرہ نے بھی اس خط کا ذکر کیا ہے، دیکھیے : رد الدارمی علی بشر ص ۱۳۱ فتوح البلدان، از البلاذری ط قاہرہ ۱۹۵۹ء ص ۸۱- پھر اس کا مقابلہ کتاب الاموال (۳۵۹ - ۲۵۵) کے ساتھ کیجیے۔

۲۱ دیکھیے جامع بیان العلم ج ا ص ۷۴ ۔ اس اطلاع کے بعد عبدالبر کہتے ہیں کہ جو پہلے باب میں ابوہریرہ رضؓ کے بارے میں گزرا ہے کہ انہوں نے حدیث نہیں لکھی، یہ امر اس کے خلاف ہے۔ اور عبداللہ بن عمرو نے حدیثیں لکھی ہیں۔ اس لئے عبداللہ بن عمرو کی احادیث نقل ہیں حضرت ابوہریرہ سے صحیح ہیں اس لئے بھی کہ حضرت عبداللہ نے اسناد بھی ساتھ دی ہیں' ابن حجر نے ان سے زیادہ مضبوط جواب دیا ہے اور کہا ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضؓ کے ہاں لکھی ہوئی احادیث کا ہونا یہ لازمی قرار نہیں دیتا کہ وہ انہوں نے اپنے ہاتھ سے لکھی تھیں، ممکن ہے کسی اور سے لکھوا کر رکھی ہوئی ہوں۔ دیکھیے فتح الباری ج ا ص ۲۱۸ - میں کہتا ہوں کہ ابوہریرہ کا حدیث نہ لکھنا ان کے ہاں لکھی ہوئی حدیث کے وجود کی نفی نہیں کرسکتا۔ یہ بعید نہیں کہ جو لوگ لکھ سکتے تھے' ان سے لکھوالی ہو۔

۲۲ محمد بن سعد : الطبقات الکبریٰ ط بریل لیڈن ۱۳۲۲ھ ج ۷ ص ۱۶۲، زہیر بن حرب : کتاب العلم ؛ ۱۹۳ ب ' جامع الاخلاق الراوی : ص ۱۴۷ ب' المحدث الفاصل ص ۱۲۸ و

۲۳ تہذیب التہذیب : ج ۴ ص ۱۹۸

۲۴ تہذیب التہذیب : ج ۴ ص ۲۳۶' امام بخاری نے سمرۃ بن جندب کے بیٹوں کے نام پہلے خط کا ذکر محمد بن ابراہیم بن خبیب کے تذکرے میں کیا ہے اس میں ہے : بسم اللہ الرحمٰن الرحیم - من سمرۃ بن جندب الی بنیہ : ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یأمرنا ان نصلی کل لیلۃ من المکتوبۃ ما قل او کثر و نجعلہا وترا -

اس کے لئے دیکھیے : التاریخ الکبیر از امام بخاریؒ (جلد اول) ط ہند ۱۳۶۱ھ : ص ۲۶

۲۵ المحدث الفاصل (مخطوطہ) دمشق ج ۴ ص ۲ ب، طبقات ابن سعد ج ۷، حصّہ دوم ص ۱۸۹، اسی طرح تقیید العلم ص ۸۴ پر ہے۔

۲۶ ابو محمد عبداللہ بن عبدالرحمٰن الدارمی: سنن ط دمشق ۱۳۴۹ھ ج ۱ ص ۱۲۷، اور الوہط عمرو بن العاص کی زمین تھی، جس کی یہ خبرگیری کرتے تھے۔

۲۷ مسند امام احمد: ص ۱۷۱ ج ۱ : عبدالغنی بن عبدالواحد المقدسی۔ کتاب العلم (مخطوطہ) دار الکتبۃ الظاہریۃ دمشق: ص ۳۰

۲۸ تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۴۸-۴۹۔

۲۹ اسد الغابۃ ج ۳۔ ص ۲۳۳

۳۰ ملاحظہ ہو: مسند عبداللہ بن عمرو و صحیفۃ الصادقۃ: از محمد سیف الدین علیش۔
(یہ ایم۔ اے کا مقالہ ہے، جو کلیۃ دارالعلوم قاہرہ میں ہے) صفحہ ۱۷۰، اس میں صحیفہ صادقہ کی احادیث کی یوں تفصیل ہے۔
اصل ۶۲۲ حدیثوں سے ۲۰۲ حدیثیں امام احمد نے اپنی مسند میں عبداللہ بن عمرو سے روایت کی ہیں۔
" ۲۲۲ " " ۸۱ " داود نے اپنی سنن میں " " " " " "
" ۱۲۸ " " ۵۲ " النسائی " " " " " " " "
" ۱۱۷ " " ۶۵ " ابن ماجہ " " " " " " "
" ۸۹ " " ۳۵ " الترمذی " " " " " " " "
صحیفہ صادقہ کی حدیثوں کی تعداد تقریباً ۴۳۶ ہوتی ہے۔ مسند امام احمد اور دوسری سنن میں کئی احادیث مکرر بھی ذکر ہوئی ہیں

۳۱ مسند امام احمد ج ۹ ص ۲۳۵، حدیث نمبر ۶۴۷۷ سے لے کر ج ۱۰ ص ۵۰، حدیث نمبر ۷۱۰۳ تک۔

۳۲ مسند عبداللہ بن عمرو و صحیفۃ الصادقۃ ص ۱۷۱۔

۳۳ اہل علم میں سے المغیرہ بن مقسم الضبی جیسے لوگوں نے صحیفہ صادقہ پر شک و شبہ کا اظہار کیا ہے، جیسے تاویل مختلف الحدیث از ابن قتیبہ ط مصر ۱۳۲۶ھ ص ۹۳ و میزان الاعتدال ج ۲ ص ۲۹۰۔ اگر مغیرہ کی روایت درست ہے، تو اس کا اخذ و قبول جائز نہیں ہے، اس لیے جس سیاق میں وہ اس بات کو کہہ رہے ہیں، وہ مسئلہ ضعیف روایات کا ہے۔ اور اگر یہ صحیفہ بھی ضعیف قرار دیتے ہیں، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ صحیفہ اُن تک وجادہ کے ذریعے پہنچا ہے، تو اس صورت میں وہ اس صحیفے کو کوئی اہمیت نہیں دیتے، اس لیے کہ وجادہ اخذ حدیث میں کمزور ترین ذریعہ ہے، وہ لوگ صحیفوں سے روایت کو پسند نہیں کرتے تھے، بالمشافہ شیوخ سے اخذ مقبول ترین طریقہ تھا، اس کے سوا کوئی ایسی تاویل نہیں ہے، جس سے اس صحیفے کا دفاع کیا جا سکے، کیونکہ بالفعل یہ صحیفہ آنحضور ﷺ کے سامنے لکھا گیا۔ اس ضمن میں دوسرے علماء کے اقوال کی طرف بھی رجوع کیا جا سکتا ہے، چنانچہ دیکھیے: میزان الاعتدال ج ۲، ص ۲۸۹، تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۴۸-۵۵، فتح المغیث ج ۴، ص ۶۸، ۶۹۔ ان کتب میں صحیفے کی صحیح قدر و قیمت بتائی گئی ہے اور ساتھ ہی اس کے راوی عمرو بن شعیب کی ثقاہت کے ثبوت مہیا کیے گئے ہیں۔

امام تقی الدین ابن تیمیہ نے اس صحیفے کے دفاع میں بہت کچھ کہا ہے۔ دیکھیے: قواعد التحدیث از جمال الدین قاسمی ط دمشق ۱۹۲۵ء ص ۳۱، ۴۷۔

۳۴؎ تاریخ دمشق از علی بن حسن ہبتہ اللہ (مخطوطہ) دار الکتب المصریہ ج ۷، ص ۴۹۔

۳۵؎ المقریزی: خطط المقریزی، ط مصر ۱۸۵۳ء ج ۲، ص ۲۲۲، ۳۳۲۔

۳۶؎ زاملتہ: اُونٹ جس پر کھانے پینے کی اشیاء لادی جاتی ہیں، لسان العرب مادہ زمل۔

۳۷؎ رد الدارمی علی بشر ص ۱۳۶۔ ابوریتہ صاحب کتاب اضواء علی السنۃ المحمدیہ نے ص ۱۲۶ کے حاشیہ نمبر ۲ پر عبداللہ بن عمرو کے بارے میں بتایا کہ وہ ان سب کتابوں کو نبی اکرمؐ سے روایت کرتے تھے۔ مگر یہ درست نہیں ہے، اس لیے کہ ابوریتہ کی بدنیتی کا اظہار کئی مقامات پر ہو چکا ہے۔

۳۸؎ الکفایہ ص ۲۱۳، تقیید العلم ص ۹۱-۹۳، ۱۰۹۔

۳۹؎ طبقات ابن سعد ج ۵، ص ۲۱۶۔

۴۰؎ الجامع الاخلاق اسرادی، ص ۱۰۰ ا؛ طبقات ابن سعد ج ۶، ص ۱۶۹۔

۴۱؎ تذکرۃ الحفاظ ج ۱، ص ۴۱۔

۴۲؎ طبقات ابن سعد ج ۵، ص ۴۲۳۔

۴۳؎ ایضاً ج ۷، حصہ دوم ص ۲۰۱۔

۴۴؎ القیاس از ابن قیم الجوزیہ، ص ۱۰۸

۴۵؎ تہذیب التہذیب ج ۴، ص ۲۱۴، تقیید العلم ص ۱۰۸

۴۶؎ الکفایۃ، ص ۳۵۴

۴۷؎ عبدالرحمٰن بن ابی حاتم الرازی: تقدمۃ المعرفۃ لکتاب الجرح والتعدیل ط ہند ۱۹۵۲ء

۴۸؎ صحیفہ ہمام بن منبہ ص ۱۴، تقیید العلم ص ۱۰۴، تہذیب التہذیب، ج ۹، ص ۴۴۰-۴۴۱۔

۴۹؎ تہذیب التہذیب، ج ۴، ص ۲۱۴، المحدث الفاصل، ص ۹۱ ب۔

۵۰؎ تقیید العلم ص ۹۰، المحدث الفاصل نسخہ دمشق ج ۴، ص ۴ ب

۵۱؎ جامع بیان العلم وفضلہ ج ۱، ص ۷۱، طبقات ابن سعد ج ۵، ص ۱۳۲۔

۵۲؎ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۸۸

۵۳؎ تذکرۃ الحفاظ ج ۱، ص ۱۶۶

۵۴؎ طبقات ابن سعد ج ۵، تذکرۃ الحفاظ ج ۱، ص ۸۸

۵۵؎ طبقات ابن سعد ج ۷ حصہ دوم، ص ۲۱۷

۵۶ المحدث الفاصل نسخہ دمشق ج ۴، ص ۲ ب، طبقات ابن سعد ج ۷، حصہ دوم ص ۱۷

۵۷ تہذیب التہذیب جلد ۲ ص ۱۰۴، محمد الباقر اثنا عشریہ کا ایک عبد امام ہے۔ ملاحظہ ہو: تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۳۵۰۔
وشذرات الذہب از ابن العماد الحنبلی ط قاہرہ ۱۳۵۰ھ ج ۱ ص ۴۹۔

۵۸ الفہرست از ابن الندیم ط قاہرہ ص ۳۱۸

۵۹ تقدمۃ الجرح والتعدیل ص ۱۳۰۔

۶۰ تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۷۰۔ ۷۱، علوم الحدیث ص ۱۱۰۔

۶۱ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۹۰

۶۲ تاریخ الاسلام از ذہبی ط قاہرہ ۱۹۴۷ء ج ۵ ص ۱۴۱

۶۳ ڈاکٹر صبحی الصالح نے ہمام کی وفات ۱۰۱ھ لکھی ہے مگر میرے نزدیک ۱۳۱ھ صحیح ہے۔ دیکھیے: تہذیب التہذیب ج
۱۱ ص ۶۷ جس میں ہے کہ معمر بن راشد ہمام سے ملے ہیں۔

۶۴ صحیفہ ہمام بن منبہ ص ۲۰

۶۵ ایضاً ص ۲۱۔ ۲۳

۶۶ ایضاً ص ۲۰

۶۷ ڈاکٹر صبحی الصالح: علوم الحدیث ومصطلحہ ص ۲۷۔

۶۸ صحیفہ ہمام بن منبہ، ص ۲۰

۶۹ تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۶۷

۷۰ معرفۃ علوم الحدیث، ص ۱۱۰، المحدث الفاصل ص ۹۴، ایک روایت میں ہے کہ وہ ۱۳۲ھ میں یمامہ میں مرے، دیکھیے
المحدث کاہی ص ۱۵۶۔

۷۱ تقدمۃ الجرح والتعدیل ص ۷۵، تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۲۱۰

۷۲ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲۴، تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۲۹۵۔

۷۳ الکفایہ: ص ۲۶۶۔

۷۴ المحدث الفاصل ص ۱۳۶ ب

۷۵ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۵۲

۷۶ تقدمۃ الجرح والتعدیل ص ۱۷۸

۷۷ تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۱۶۷

۷۸ تقدمۃ الجرح والتعدیل ص ۲۳۶۔

۴۹؎ تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۱۰۴،
۵۰؎ تہذیب التہذیب، ج ۱۱ ص ۴۵۰، تقدمۃ الجرح والتعدیل ص ۲۰۲، یونس امام زہری سے نقل کیا کرتے تھے۔ دیکھیے تقدمۃ الجرح والتعدیل ص ۲۰۵
۵۱؎ تقدمۃ الجرح والتعدیل ص ۱۴۵
۵۲؎ ایضاً ص ۸۰
۵۳؎ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۰۰
۵۴؎ الفہرست ص ۳۱۵
۵۵؎ تقدمۃ الجرح والتعدیل، ص ۲۷۰
۵۶؎ الرسالۃ المستطرفۃ از محمد بن جعفر الکتانی، ط بیروت ۱۳۳۲ھ ص ۵۸۔
۵۷؎ تہذیب التہذیب، ج ۲ ص ۳۴۴
۵۸؎ تہذیب التہذیب، ج ۵، ص ۲۸۰
۵۹؎ الاصابہ، ج ۷، ص ۱۹۹، تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۲۷۔
۹۰؎ تذکرۃ الحفاظ، ج ۱ ص ۲۲۰
۹۱؎ نظرۃ عامۃ فی تاریخ الفقہ الاسلامی، ص ۱۱۸
۹۲؎ تذکرۃ الحفاظ، ج ۱ ص ۲۰۹
۹۳؎ الجامع لاخلاق امرؤدی ص ۱۹۴۔ تقدمۃ الجرح والتعدیل، ص ۳۱۹
۹۴؎ تاریخ الاسلام از ذہبی، ج ۵، ص ۱۱۴، تہذیب التہذیب، ج ۸، ص ۳۰
۹۵؎ رامہرمزی نے ان کی وفات یمامہ میں ۱۳۲ھ بتائی ہے مگر مجھے اس کی صحت نہیں مل سکی۔ دیکھیے: تذکرۃ الحفاظ، ج ۱ ص ۱۲۱، تہذیب التہذیب، ج ۱۱ ص ۲۶۸۔
۹۶؎ یہ ثقہ تابعین میں سے تھے۔ کوفہ کے شیخ و امام تھے۔ ان کی حضرت علیؓ سے ملاقات ہوئی۔ کہتے ہیں کہ انہوں نے ۲۸ صحابہ سے حدیث سنی ہے، تاریخ الاسلام از ذہبی، ج ۵، ص ۱۱۶، تہذیب التہذیب، ج ۸، ص ۶۳
۹۷؎ المحدث الفاصل، ص ۱۵۶ و۔ ب، تقدمۃ الجرح والتعدیل، ص ۲۴، ۱۲۹۔

کتابتِ احادیث عہدِ نبویؐ میں

خلیق نقوی

ذیل کا مضمون ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی صاحب کے ایک مضمون کا ترجمہ ہے۔ اصل مضمون انگریزی زبان میں ہے۔ اور "روئداد ادارۂ معارف اسلامیہ" ۱۹۳۱ء میں شائع ہوا ہے۔ مضمون صاحبِ مضمون کی محنت اور کد و کاوش کا نتیجہ ہے۔ بعض مقامات پر البتہ قلم کی تیز روی سلامتیِ طبع پر کچھ گراں گزرتی ہے۔ مثلاً اگناتس گولڈ سیہر کے تبحر علمی و سلامتِ فکر اور بالخصوص اس کی غیر جانبدارانہ علمی تحقیقات کی مدح سرائی میں موصوف حقیقت سے دور ہو گئے ہیں۔ اس کی کتاب (MOHAMMDISCHE STUDIEN") جس کا انہوں نے بار بار حوالہ دیا ہے تعصب کی آلودگیوں سے پاک نہیں۔ مشارقہ و مغاربہ میں وہ کونسا مردِ صالح ہے، جس نے اسلام سے بیگانگی کے ساتھ اپنی تصنیف و تالیف میں کج نظری و تعصبات کے رنگ نہ بھرے ہوں۔

ترجمہ کرتے وقت خیال آیا کہ جمع و تدوین احادیث کے موضوع پر دوسرے فضلائے وقت نے جو کچھ لکھا ہے، اس کی بھی ایک مختصر فہرست دے دی جائے تاکہ ان ناظرین کو جو اس موضوع سے دلچسپی رکھتے ہیں، نہ صرف تلاش و تحقیق میں آسانی ہو، بلکہ وہ راہ یقین و استقامت سے بھٹکنے والوں کی گمراہیوں اور ضلالتوں کا معاملہ بھی سمجھ لیں۔ ہم اپنے وقت کے علمائے محققین سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس موضوع کی جانب زیادہ سے زیادہ توجہ فرمائیں کہ انکارِ حدیث کی ضلالتیں ہر طرف گھر رہی ہیں، گمراہیوں کے افسون پھونکے جا رہے ہیں، جا و بے توفیق مٹایا جا رہا ہے، اُن کے دلوں کو شک و ظن، انکار و جحود سے زخمی رکھنے کے لیے طرح طرح کی بے سر و پا باتیں بنائی جا رہی ہیں، جھوٹے سچے ثبوت فراہم کیے جا رہے ہیں اور پوری امکانی کوشش سے آثارِ رسولؐ کی عظمت کو جہالت و نامرادی کے زعم میں مٹایا جا رہا ہے۔

اب ہم ذیل میں ناظرین کی سہولت کے لیے چند محققانہ و فاضلانہ مقالات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

۱۔ خطباتِ مدراس ــــ علامہ سید سلیمان ندوی

۲۔ سیرت النبیؐ ــــ شبلی نعمانی (جلد اوّل)

۳۔ تدوین احادیث از مولانا مناظر احسن گیلانی (مجموعہ تحقیقاتِ علمیہ جامعہ عثمانیہ۔ اس مقالہ کی بعض قسطیں تشنۂ تکمیل ہیں)

۴۔ تدوین احادیث کی ابتدائی تاریخ، از ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب، اسلامک ریویو ووکنگ، مورخہ جولائی ۱۹۴۴ء

۵۔ عظمتِ حدیث۔ از مولانا ضیا احمد صاحب بدایونی (استاذ شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

۶۔ تاریخ تدوین حدیث۔ مولانا عبد السلام قدوائی ندوی

(خلیق نقوی)

علم حدیث کا شمار اہم ترین اسلامی علوم میں ہے اور یہ اسلامی الٰہیات اور قانون کے اہم ترین ماخذوں میں بھی ہے، اور بڑی حد تک اس کا اثر عقائد پر بھی رہا ہے۔ حدیث کے مطالعہ ہی سے بہت سے علوم عربیہ کی بنیاد پڑی اور ان کو عروج حاصل ہوا۔ مثلاً تاریخ تذکرہ نگاری، جغرافیہ، لغت اور قدیم عربی اشعار کی تدوین و تالیف وغیرہ، اسی کے ساتھ بہت سے بیرونی علوم طب اور فلسفہ وغیرہ بھی حدیث کے اثرات قبول کیے بغیر نہ رہ سکے۔ وسٹن فیلڈ (WASTEN FELD) کے قول کے مطابق دورِ عباسیہ میں مسلمانوں کی ساری علمی سرگرمیوں کا سرچشمہ دراصل قرآن و حدیث ہی رہے ہیں۔[1]

جہاں تک علم حدیث کا تعلق ہے، کتابت احادیث کے نقطۂ آغاز کا تعین ایک اہم ترین مسئلہ ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا احادیث کا معتدبہ حصہ دورِ نبوت ہی میں قلمبند کر لیا گیا تھا، یا کل کا کل مجموعہ احادیث ایک سو سال تک سفینوں کے بجائے سینوں میں محفوظ رہا اور عہدِ نبویؐ میں اگر کچھ حصہ قلمبند بھی کیا گیا، تو وہ بہت ہی خفیف تھا؟

بڑی حد تک اس مسئلہ کے حل پر احادیث کی ایک کثیر تعداد کا قابلِ اعتماد ہونا اور اسلام کے متعدد اہم الٰہیاتی، قانونی، معاشرتی اور سیاسی اصول کا مستند ہونا موقوف ہے۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ احادیث کا یہ مجموعہ پہلی صدی ہجری تک محض مسلمانوں کی قوتِ حافظہ کے سہارے زندہ رہا، تو یقیناً ان علوم اسلامیہ کا کافی حصہ جن کی بنا احادیث پر ہے، کالعدم ہو جائے گا۔

حقیقتہً اس کا فیصلہ بہت دشوار ہے۔ کیونکہ وہ احادیث جن کا موضوع زیرِ بحث سے تعلق ہے، ایک دوسرے سے متضاد پائی جاتی ہیں۔ متقدمین میں صاحبِ سنن دارمی،[2] خطیب بغدادی،[3] ابن عبدالبر[4] اور دوسرے علما و محدثین جنھوں نے اس موضوع پر کافی مواد جمع کیا ہے، کوئی آخری و قطعی حکم نہ لگا سکے، اور بعد کے علما محققین کا حال یہ ہے کہ وہ جمع و ترقیم احادیث میں کوئی امتیاز ہی نہیں سمجھتے۔

یورپ کے محققین میں اسپرنگر (SPRENGER) کا جو اپنے اس دعویٰ میں حق بجانب ہے کہ موجودہ زمانہ میں وہ پہلا شخص ہے، جس نے احادیث کے مطالعہ میں نقد و نظر سے کام لیا ہے، خیال ہے کہ احادیث کی کتابت و تحریر عہد نبوت ہی میں ہوئی۔ اسپرنگر کے بعد گولڈ سیہر (GOLD ZIHER) نے بھی، جو وسیع علم کا مالک کہا جاتا ہے، مدلل طریق سے یہ ثابت کیا ہے کہ احادیث عہد نبویؐ ہی میں قلمبند کی گئی تھیں۔

اگر کتب احادیث اور ان کے موضوعات کو امعان نظر سے دیکھا جائے، تو صاف طور پر یہ پتا چلتا ہے کہ صحابہؓ میں سے اکثر کے پاس صحیفے تھے، جن میں اقوال و اعمال کو جمع کیا کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص نے جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، اس کو ساتھ ہی قلمبند بھی کر لیا[5] اور ایک ہزار حدیثیں اپنے صحیفہ میں رقم کیں، جس کو وہ الصادقہ[6] سے موسوم کرتے تھے۔ مجاہدؒ نے یہ صحیفہ اُن کے پاس دیکھا تھا اور ان کی وفات کے بعد یہ صحیفہ شعیب کے قبضہ و تصرف میں آیا، جو حضرت عبداللہ کے پوتے تھے[7] اسی طرح

---

[1] عرابشس اکاڈمے میین [2] جرنل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال ج ۲۵ ص ۳۰۲ تا ۳۲۹، ۳۷۵ تا ۳۸۶۔ [3] جامع بیان العلم حصۂ اوّل ص ۶۳ تا ۷۶ [4] طبقات ابن سعد جلد چہارم حصہ دوم صفحہ ۷، بخاری، علم کتابت، ترمذی باب العلم، مسند امام احمد بن حنبل، جلد دوم صفحات ۱۶۴، ۲۰۷، ۲۱۵، ۲۴۸، [5] اسد الغابۃ تذکرہ عمرو بن العاص [6] طبقات ابن سعد جلد چہارم حصہ دوم صفحہ ۸

[7] MUHST دعربن کتاب "تحقیقات اسلامیہ" جلد دوم ص ۱۰۰

حضرت ابوبکرؓ خلیفہ اوّل کے پاس پانسو احادیث کا مجموعہ تھا، لیکن انہوں نے یہ مقدس بیاض اس خیال سے تلف کر دی کہ ممکن ہے کہ بعض احادیث ان تک غیر معتبر رواۃ سے پہنچی ہوں[1] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد یعنی حضرت علیؓ کے پاس بھی ایک صحیفہ تھا، جس میں کچھ قوانین درج تھے۔[2] ایک دوسرے صحیفہ کے متعلق روایت ہے کہ سمرہ بن جندبؓ کے پاس تھا۔ گولڈ سیہر کے قول کے مطابق یہ وہی رسالہ ہے، جو انہوں نے اپنے بیٹے کے لیے لکھا تھا۔ اس میں بہت سی احادیث درج تھیں[3]۔ جابر بن عبداللہؓ کے پاس بھی ایک صحیفہ تھا، جس کی محتویات کے حوالہ سے قتادہ بعد کے زمانہ میں حدیثیں روایت کیا کرتے تھے[4]۔ عبادہ بن سعیدؓ کے پاس بھی ایک صحیفہ تھا، جس کے حوالہ سے ان کے صاحبزادہ نے بعض اعمال رسولؐ بیان فرمائے ہیں۔[5] امام بخاری نے اپنی "صحیح" میں ایک حدیث بیان کی ہے، جو ان کے نزدیک دراصل عبداللہ بن ابی ادفی کی کسی کتاب سے لی گئی تھی[6]۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے ایک سے زیادہ کتابوں میں احادیث جمع کی تھیں۔ کیونکہ امام ترمذی اپنی "سنن" میں بیان فرماتے ہیں کہ ایک شخص شہر طائف سے ان ہی کتابوں سے کوئی کتاب ان کے پاس لایا اور وہ ان کو پڑھ کر سنائی۔ گویا سند و اجازت حاصل کی[7]۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے متعلق ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ انہوں نے اپنی وفات کے وقت اس قدر کتابیں چھوڑیں کہ ایک بار شتر کے مساوی ہوئیں[8]۔ بعد کو ان ہی کتابوں سے اُن کے بیٹے علی نے استفادہ کیا[9]۔ اور یہی وہ کتابیں ہیں، جن سے کچھ مواد واقدی نے بھی جمع کیا تھا، جیسا کہ ایک عبارت سے جو مواہب میں منقول ہے، مستبادر ہوتا ہے[10]۔ حضرت ابوہریرہؓ کے متعلق غالب خیال یہ ہے کہ بعض احادیث انہوں نے اپنی زندگی کے آخر زمانہ میں قلمبند فرمائیں اور ان قلمبند شدہ احادیث کو انہوں نے ابن وہب[11] اور امیہ الضمری[12] کو دکھایا تھا۔ صحیفہ ہمام جو حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کردہ احادیث پر مبنی ہے، کافی مشہور ہے[13]۔

بہت سی روایات سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ان صحائف و کتب کے علاوہ اصحاب رسولؐ اور ان کے تلامذہ نے بعض جستہ جستہ احادیث بھی قلمبند کیں۔ سنن ترمذی کی ایک روایت کے مطابق انصار میں سے کسی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی کمزوری حافظہ کی شکایت کی۔ ارشاد ہوا کہ اپنے دستِ راست کو کام میں لاؤ یعنی لکھ لیا کرو[14]۔ حضرت ابو رافعؓ نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے احادیث لکھنے کی اجازت مانگ لی تھی۔[15] حضرت ابوشاہؓ نے سال فتح میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبات عالیہ سُن کر التجا کی کہ یہ خطبات ان کے لیے قلمبند کرا دیے جائیں۔ چنانچہ ان کی درخواست منظور ہوئی[16]۔ حضرت عتبان بن مالک انصاری نے ایک حدیث کو اس درجہ پسند فرمایا کہ انہوں نے وہ حدیث لکھ لی[17]۔

ان صحائف و کتب کے علاوہ جن کی تعداد میں مزید تحقیق و تلاش کے بعد مزید اضافہ ممکن ہے اور نیز ان متفرق احادیث کے علاوہ

---

[1] طبقات الحفاظ جلد ۲ صفحہ ۵، [2] بخاری، دیت عاقلہ [3] MUHST [4] ایضاً [5] ترمذی باب الیمین مع الشاہد [6] باب الصبر علی القتال [7] علل ترمذی [8] جامع البیان العلم حصۂ اوّل [9] طبقات ابن سعد جلد ۵ صفحہ ۲۱۶ [10] جرنل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال جلد ۲۵ صفحہ ۲۰ [11] فتح الباری جلد اصفحہ ۱۸۴ [12] جامع البیان العلم حصۂ اوّل [13] تہذیب التہذیب جلد اوّل شمارہ ۵۷۴۔ نیز دیکھو مسند ابن حنبل جلد ۲ صفحہ ۳۱۲ تا ۳۱۸ [14] سنن ترمذی [15] تہذیب التہذیب جلد ۳ صفحہ ۱۴۴ [16] بخاری باب العلم [17] جرنل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال جلد ۲۵۔

جن کو صحابۂ کرام رضؓ نے اپنی اپنی پسند سے نقل کیا تھا، جن میں ممکن ہے کہ بعض صحیح نہ ہوں یا بعض مکرر ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود زکوٰۃ [1] صوم [2] و صلوٰۃ [3] اور صدقہ و دیت [4] کے متعلق قوانین املا فرمائے۔ ایک فرمان، جس میں صدقات کے متعلق احکام درج تھے، جو ابھی عمّال کے ہاتھوں تک نہیں پہنچا تھا۔ آپؐ کی وفات پر آپؐ کی تلوار سے لپٹا ہوا پایا گیا، جو بعد کو خلفائے راشدین کے قبضہ میں آیا [5]

بعض احادیث ایسی بھی ملتی ہیں، جن میں قرآن کے علاوہ کسی دوسری چیز خصوصاً احادیث کو نقل کرنے کی مخالفت آئی ہے۔

چنانچہ ابوسعید سعد بن مالک الخدری، حضرت زید بن ثابت رضؓ (کاتبِ رسولؐ) اور حضرت ابوہریرہؓ سے ایسی احادیث مروی ہیں [6] صحابہ میں تابعین میں سے بھی بعض بزرگوں نے احادیث کو قلمبند کرنا ناپسند فرمایا ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت عمر رضؓ، حضرت علی رضؓ، حضرت عبداللہ ابن مسعود رضؓ حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن عمر رضؓ، حضرت ابوموسیٰ رضؓ، ابن سیرین، ضحاک، عبیدہ، ابراہیم ابن المعتمر، اوزاعی، علقمہ، عبیداللہ بن عبداللہ، ابن عیینہ کے نام خاص طور پر بیان کیے جاتے ہیں [7]

ان میں سے بعض مثلاً حضرت علی رضؓ اور حضرت ابن عباسؓ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے خود بھی احادیث قلمبند فرمائیں اور ان کے پاس اپنی کتابیں اور صحیفے بھی موجود تھے۔ جیسا کہ ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں، ان میں سے بعض مثلاً ضحاک، ابراہیم اور علقمہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ احادیث کو بصورتِ کتاب مرتب کرنے کے خلاف تھے مگر بطور یادداشت قلمبند کرنے کے مخالف نہ تھے کہ جس سے حافظہ کو مدد مل سکے۔ مگر ان میں سے بعض مثلاً حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور ابن سیرین کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ کتابت احادیث کی ہر شکل کو ناپسندیدہ خیال کرتے تھے [8]

علمائے اسلام نے اس ظاہری تضاد و تخالف کی، جو کتابت احادیث کے بارہ میں پایا جاتا ہے، مختلف توجیہات کی ہیں، ابن قتیبہ "تاویل مختلف الحدیث" (صفحہ ۳۶۵ تا ۳۶۶) میں فرماتے ہیں کہ یا تو یہ امتناعی احادیث (جن میں تحریر حدیث سے روکا گیا ہے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے ابتدائی دور سے تعلق رکھتی ہیں اور بعد کی احادیث سے، جو ان کی متضاد ہیں منسوخ قرار پاتی ہیں، یا یہ ممانعت محض ان صحابہ رضؓ کے لیے تھی، جو فنِ تحریر سے واقف نہ تھے۔ اس کے برعکس جن صحابہ رضؓ کے متعلق یہ یقین تھا کہ وہ صحیح طور پر لکھنا جانتے ہیں کتابتِ احادیث کی اجازت تھی۔ امام نووی نے شرح صحیح مسلم (کتاب الزہد) میں اس ظاہری تضاد کی اور بھی متعدد توجیہات کی ہیں۔

اگرچہ عرب میں فنِ تحریر کا رواج بعثت نبویؐ سے کچھ عرصہ پہلے ہی ہو چکا تھا اور نثریات سے بھی اہلِ عرب بالکل ناآشنا نہ تھے۔ [9] لیکن قبل از اسلام نہ تو فنِ تحریر ہی عرب میں عام تھا اور نہ عربی میں نثر کی کتابیں۔ پورے شہر مکہ میں، جو جزیرۂ عرب میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ شہر تھا، کل سترہ آدمی لکھنا جانتے تھے [10] مدینہ میں جہاں یہودیوں کا اثر تھا اور جن کے متعلق شہرت ہے کہ وہ فنِ تحریر میں عربوں کے استاد تھے۔ اس فن کے واقف کاروں کی تعداد ایک درجن سے بھی کم تھی۔ طبقات ابن سعد میں اس زمرہ کے صرف ۹

---

[1] دارقطنی صفحہ ۲۰۴، ۲۰۹، ۴۸۵، [2] طبرانی ص۲۱۔ [3] کنز العمال جلد ۳ صفحہ ۱۸۶ تا ۱۸۷، طبقات ابن سعد جلد اول حصہ دوم صفحہ ۱۹، دارمی صفحہ ۲۹۳، [4] ابوداؤد زکوٰۃ السائمہ [5] مسند ابن حنبل ج ۲ ص ۴۰۳، ج ۳ ص ۱۲، ج ۵ ص ۱۸۳، دارمی ص ۶۴، مسلم باب الزہد [6] جامع بیان العلم ص۶۳ تا ۶۴، جرنل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال ج ۲۵۔ [7] دارمی ص۶۴ [8] (MUHST) ج ۲ ص ۲۰۴ تا ۲۰۵۔ جرنل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال جلد ۲۵ ص ۳۷۵ وغیرہ، [9] فتوح البلدان ص ۴۷۷ تا ۴۸۰ [10] ان ۹ شخصوں کے نام یہ ہیں: ابوعبس، ابی بن کعب، عبداللہ بن رواحہ، اوس بن خولی، منذر بن عمرؓ، اسید بن حضیر اور ان کا باپ، سعد بن عبادہ، رافع بن مالک

آدمیوں کا ذکر آیا ہے۔ ابن سعد کا بھی یہ بیان ہے کہ قبل از اسلام فنِ تحریر سے شاذ ہی کام لیا جاتا تھا اور اس کا جاننا عربوں میں بڑا کمال سمجھا جاتا تھا۔ جو شخص فنِ تحریر، شناوری، تیر اندازی تین فن جانتا تھا، اس کو الکامل[۱] کے لقب سے پکارتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی روایت ہے کہ ذوالرمہ نے جو عرب کا آخری خضرمی شاعر تھا۔ تحریر سے واقفیت کے باوجود اس نے محض اس لیے کام نہیں لیا تھا کہ علمۃ الناس اسے نظرِ حقارت سے نہ دیکھیں[۲]

گولڈ سیہر کہتا ہے کہ: "بدو لوگ آج بھی لکھنے پڑھنے کو حقیر خیال کرتے ہیں[۳]"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عربوں میں اس فن کو فروغ دینے کے لیے کافی کوشش فرمائی۔ آپ کی توجہات کے بغیر یہ ناممکن تھا کہ جن مسلمانوں کو نبوت کے ابتدائی دور میں آپؐ کی سرپرستی کا شرف حاصل ہوا۔ مثلاً حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص، حضرت عبداللہ بن عباسؓ وہ اس فن سے محروم رہتے۔ آپؐ نے حضرت عبداللہ بن سعید بن العاص مکی سے ارشاد فرمایا: کہ وہ اہلِ مدینہ کو فنِ تحریر سکھائیں[۴] شفاء بنت عبداللہ کو حکم دیا کہ وہ ام المومنین حضرت حفصہؓ کو تحریر کی تعلیم دیں[۵] غزوہ بدر کے بعد آپؐ نے فرمایا کہ اسیرانِ جنگ میں سے جو مفلس و نادار فدیہ ادا کرنے سے قاصر ہوں اور فنِ تحریر سے واقف ہوں، وہ دس مسلمان بچوں کو یہ فن سکھائیں، اس کے بدلہ میں ان کو رہا کر دیا جائے[۶]۔ ان ہی اسیرانِ جنگ میں کسی شخص سے حضرت زید بن ثابتؓ نے یہ فن حاصل کیا۔ آپ کی رضامندی کے بغیر یہ ناممکن تھا کہ حضرت عبادہ بن الصامت۔ بعض اصحابِ صفہ کو قرآن اور فنِ تحریر کی تعلیم دیتے۔ ان ہی اصحابِ الصفہ میں سے کسی نے حضرت عبادہ کو ایک کمان بھی نذر کی تھی[۷]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عربوں میں فنِ تحریر کی بالواسطہ بھی ترویج و اشاعت فرمائی۔ ایک باضابطہ مملکت کے قیام کے لیے یہ ضروری تھا کہ دوسرے قبیلوں سے تحریری معاہدے کیے جائیں، مختلف فرمانرواؤں کو خطوط اور عمالِ مملکت کو احکام لکھے جائیں اور ... مملکت کے لیے قوانین قلمبند کیے جائیں۔ اس لیے تاریخ کے صفحات ہمیں یہ بھی بتلاتے ہیں کہ آپؐ کے بعد آپؐ کے خلفا نے فنِ تحریر کو تمام ان ... میں جو انہوں نے قائم کیے، لازمی قرار دے دیا تھا۔

اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ کہنا کہ آپؐ کو کاتبین سے نفرت تھی۔ لغو سی بات ہے بعض وہ احادیث ... حدیث کا بالخصوص اور قرآن کے علاوہ کسی اور چیز کا بالعموم ضبطِ تحریر میں لانا ممنوع قرار دیا ہے، ان احادیث کے مقابلہ میں جو کتابت احادیث کی تائید میں ہیں ضعیف بھی ہیں اور تعداد میں بھی کم ہیں۔ ان احادیث کی بنا یقیناً یا تو اس فن سے بیزاری و ناپسندیدگی ہوگی، جو نبوت کے ابتدائی دور میں عربوں میں عام تھی یا اس کا محرک یہ خوف و خطرہ ہوگا کہ کہیں حدیثیں متنِ قرآن میں خلط ملط نہ ہو جائیں، جس کی تقدیس رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بے حد عزیز تھی۔ جب آپؐ نے یہ محسوس فرمایا کہ اب اس کا کوئی امکان نہیں ہے، تو حکم دے دیا کہ احادیث اور نسخہ آن کے علاوہ دوسری چیزیں بھی تحریر میں لائی جا سکتی ہیں۔ بخاری کی ایک حدیث سے بھی، جس میں فتح مکہ میں حضرت ابوشاہؓ کے لیے رسول اللہ ...

۱؎ طبقات ابن سعد جلد ۳ حصہ ۲ ۲؎ کتاب الاغانی جلد ۱۶ ص ۱۲۱ ۳؎ MUH. ST. جلد اول ص ۱۱۲ ۴؎ اسد الغابہ عبداللہ ... العاص ج ۳ ص ۱۷۵ ۵؎ فتوح البلدان ص ۴۷۷، ۶؎ طبقات ابن سعد جلد ۲ حصہ اول صفحہ ۱۴ ۷؎ ابوداؤد۔ کتاب العلم

صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبات کی تحریر وتہذیب کی اجازت کا ذکر ہے' اس خیال کی تائید وتصدیق ہوتی ہے جن احادیث میں رقم وتحریر احادیث کی اجازت ہے' وہ ان احادیث کے مقابلہ میں جن میں اس کی ممانعت ہے بعد کی ہیں' اس لیے وہ پہلی احادیث کی ناسخ ہیں' خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قوانین تحریر کرانے سے اس خیال کی مزید توثیق ہوتی ہے۔ حضرت عمرؓ خلیفہ ثانی کا جمع تالیف احادیث کے بارہ میں جو عمل تھا۔ اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ جو احکام مانع تحریر حدیث تھے' اس وقت منسوخ ہو چکے تھے۔ چنانچہ جب حضرت عمرؓ نے جمع احادیث کا قصد فرمایا' تو دوسرے صحابہؓ سے بھی مشورہ لیا۔ سب نے بالاتفاق اُن کے خیال کی تائید کی۔ حضرت عمرؓ نے پورے ایک ماہ تک اس پر غور فرمایا اور استخارہ کرکے اس مصلحت کی بنا پر فی الحال اس کام کو ملتوی کر دیا کہ مسلمان کہیں احادیث کے شغف میں قرآن سے بے پروا اور غافل نہ ہو جائیں یہ کسی طرح عقل وقیاس میں نہیں آسکتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منع فرمانے کے باوجود حضرت عمرؓ اس مسئلہ پر پورے ایک ماہ تک سنجیدگی سے غور فرماتے اور دوسرے تمام صحابہ کرام بالاتفاق جمع احادیث کی صلاح دیتے۔ پھر حضرات صحابہ کرامؓ کی متفقہ رائے کے خلاف اس کام کو ملتوی رکھنے کے بارے میں قولِ رسولؐ نقل کرنے کے بجائے یہ عذر پیش کرتے کہ ڈر ہے کہ جمع وتدوین احادیث کے بعد مسلمان قرآن سے غفلت وبے اعتنائی نہ برتنے لگیں۔

یورپ کے ان مستشرقین کا جنھوں نے اس موضوع کا مطالعہ ناقدانہ نظر سے کیا ہے' خیال ہے کہ بعض احادیث ایسی بھی ہیں' جو زمانۂ رسالت میں لکھی جا چکی تھیں' چنانچہ ڈاکٹر اے سپرنگر (سابق پرنسپل مدرسہ عالیہ کلکتہ) لکھتا ہے۔

"عام طور پر یہی خیال کیا جاتا ہے کہ پہلی صدی ہجری تک احادیث کی حفظ وصیانت کا طریقہ محض زبانی یادداشت تھا۔ یورپ کے محققین ایک غلط تخیل کے تحت (جس کا سبب لفظ "حدثنا" ہے۔ عموماً روایت احادیث ان ہی الفاظ سے شروع ہوتی ہے) یہ سمجھتے ہیں کہ امام بخاری نے جو احادیث نقل کی ہیں' ان میں سے ایک حدیث بھی ان سے قبل نہیں لکھی گئی۔ یہ ایک غلط خیال ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو اور بعض دوسرے صحابہؓ نے خود اقوالِ رسولؐ قلم بند کیے تھے اور ساتھ ہی بہت سے تابعین نے بھی ان حضرات کی پیروی کی۔" [1]

یہ محقق اور فاضل مستشرق اپنے پُر از معلومات مقالہ "تاریخ نویسی کا آغاز وارتقاء" جو ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے مجلہ جلد [2] ۲۵ میں شائع ہوا ہے) اس مسئلہ کے مالہ وما علیہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"تاہم متکلمین ومحدثین میں سے بعض بالکل ابتدائی دور ہی سے جو چیز محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ اس کو قلمبند کر لیا کرتے تھے۔ ان میں سب سے نمایاں شخصیت عبداللہ بن عمرؓ' انس بن مالکؓ اور ابن عباسؓ کی ہے' جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی تھے اور دوسروں کی بہ نسبت ان بزرگوں نے اخبار وآثار رسول اللہؐ کو سب سے زیادہ تعداد میں محفوظ کیا۔ ان بزرگوں کے ہاتھ کی لکھی ہوئی احادیث اُن کے بعد اُن کے خاندانوں میں محفوظ رہیں۔"

اگناتس گولڈ سیہر جو ایک بڑا فاضل مستشرق اور علم الحدیث کا مبصر سمجھا جاتا ہے' اپنی کتاب "MOHAMMADISCHE STUDIEN"

---

[1] LIFE OF MOHAMMAD (حیاتِ محمد) ص ۶۶ تا ۶۷ [2] ص ۳۸۰

میں جو اس کی دوسری تصانیف کی طرح ضخیم معلومات اور تنقید و تاریخ حدیث کی ایک مستند کتاب ہے، لکھتا ہے۔

"حدیث کی کسی عبارت کے لیے لفظ "متن" کا استعمال، جو لفظ "اسناد" یعنی سلسلۂ رواۃ سے الگ چیز ہے، خود اس خیال کی تردید کے لیے کافی ہے کہ مسلمانوں میں احادیث کا لکھا جانا ممنوع و ناجائز تھا اور وہ صرف زبانی یاد کی جاتی تھیں۔ یہ بات ماننا پڑے گی کہ حدیثوں کا لکھنا حفظ و صیانت احادیث کا بہت پرانا طریقہ ہے۔ دراصل تحریر حدیث سے کراہت کا نتیجہ ہے، ان خیالات کا جو بعد میں پیدا ہوئے۔ ان احادیث کو جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ پہلی صدی ہی میں لکھ کر محفوظ کر لی گئی تھیں، متن حدیث کا قدیم ترین عنصر خیال کرنا چاہیے۔ اس خیال میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ صحابۂ کرام اور ان کے تلامذہ سہو و نسیان کے خوف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات و احکام لکھ کر محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک ایسے معاشرہ میں جہاں معمولی انسانوں کے حکیمانہ اقوال تک تحریراً محفوظ کر لیے جاتے تھے، پیغمبر خدا کے اقوال و ارشادات کو محض زبانی یاد داشت پر چھوڑ دیا گیا ہوگا۔ بہت سے صحابہ اپنے ساتھ صحیفے رکھا کرتے تھے۔ ان صحیفوں کی مدد سے اپنے تلامذہ کو تعلیم و تربیت دیتے تھے اور ان صحیفوں کی محتویات "متن الحدیث" کہلاتی تھیں۔ یہی مصنف اپنی تصنیف کے باب ہفتم (صفحہ ۱۹۵) میں لکھتا ہے:

"ان روایات سے پتا چلتا ہے کہ اصحاب الحدیث اس نظریہ کی تردید نہیں کرتے کہ احادیث رسولؐ بالکل ابتدائی زمانہ ہی میں قلمبند کر لی گئی تھیں۔ درحقیقت تحریر حدیث کی قدامت کے بارے میں ہمیں بہت سے ثبوت ملتے ہیں، مثلاً بعض صحابہ رض کے صحیفے۔"

عربی کی بعض قدیم اور مستند کتابوں اور یورپ کے بعض ممتاز ترین علم الحدیث کے مبصرین کے مذکورہ بالا بیانات ان لوگوں کو بھی، جو حدیث کی جانب سے شک و شبہ میں گرفتار ہیں، اس امر کا یقین دلانے کے لیے کافی ہیں کہ درحقیقت احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات ہی میں سپرد قلم کی گئی تھیں اور اس زمانہ کے حدیث کے صحیفے بھی اس امر کا ثبوت ہیں کہ تاریخ اسلام کے بالکل ابتدائی دور میں کثیر التعداد احادیث ضبط تحریر میں لائی جا چکی ہوں گی۔

لہ MUH. ST جلد نمبر ۲ صفحہ ۸ تا ۹

حدیث کے ظنی ہونے کا ثبوت

عبدالغفار حسن

حدیث کی عظمت و اہمیت گھٹانے اور انکارِ سنت کی راہ ہموار کرنے کے لیے عموماً اُن آیات و روایات کا سہارا لیا جاتا ہے، جن میں "ظن" کی مذمت اور اس سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے۔ ذیل کے مضمون میں "ظن" کی اصلی حقیقت قرآن و سنت اور لغتِ عرب سے واضح کرتے ہوئے یقین و ظن کے لحاظ سے سنت و حدیث کا جو مقام ہے، اس کو بھی متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے:

"ظن" کی مذمت میں مندرجہ ذیل آیات پیش کی جاتی ہیں۔

۱۔ یاایھا الذین آمنوا اجتنبوا کثیراً من الظن۔ (حجرات ۱۲)
اے ایمان والو! گمان کی بہت سی قسموں سے بچو۔

۲۔ ان یتبعون الا الظن وماتھوی الانفس ولقد جاءھم من ربھم الھدی۔ (النجم ۲۳)
وہ مشرکین صرف ظن اور اپنی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں، حالانکہ اُن کے پاس ان کے رب کی جانب سے ہدایت آچکی ہے۔

۳۔ ان یتبعون الا الظن وان ھم الا یخرصون (یونس ۱۱۶)
وہ نہیں پیروی کرتے، مگر گمان کی، وہ تو صرف اٹکل سے کام لیتے ہیں۔

۴۔ وما یتبع اکثرھم الا ظنا، ان الظن لا یغنی من الحق شیئا (یونس ۳۶)
ان میں سے اکثر صرف ظن کی پیروی کرتے ہیں، بلاشبہ ظن حق سے کچھ بھی بے نیاز نہیں کرتا۔

۵۔ وقالوا ماھی الا حیاتنا الدنیا نموت و نحیٰ وما یھلکنا الا الدھر ومالھم بذالک من علم۔ ان ھم الا یظنون (جاثیہ ۲۴)
اور کہا انہوں نے نہیں وہ مگر دنیاوی زندگی۔ ہم مرتے ہیں اور زندہ ہوتے ہیں اور ہمیں ہلاک نہیں کرتا، مگر زمانہ اور ان کو اس کا کچھ بھی علم نہیں۔ وہ تو صرف ظن و تخمین میں مبتلا ہیں۔

۶۔ ان نظن الا ظنا وما نحن بمستیقنین (جاثیہ ۳۲)
ہم صرف گمان ہی کرتے ہیں اور ہم یقین نہیں رکھتے۔

۷۔ ولا تقف ما لیس لک بہ علم (بنی اسرائیل ۳۶)
جس بات کا تمہیں علم نہیں، اس کے پیچھے مت پڑو۔

ان آیات کے علاوہ بخاری و مسلم کی مندرجہ ذیل حدیث کا حوالہ بھی دیا جاتا ہے:

ایاکم والظن فان الظن اکذب (الحدیث)
ظن سے بچو۔ بیشک "ظن" سب سے بڑا جھوٹ ہے۔

''ظن'' کی اصل حقیقت

مذکورہ بالا آیات اور حدیث میں ''ظن'' کے مفہوم کو متعین کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی اصل حقیقت کو لغت عرب اور قرآن حکیم کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

امام راغب کہتے ہیں:

الظن اسم لما یحصل عن امارة ومتی قویت ادت الی العلم ومتی ضعفت جدًّا لم یتجاوز حد التوھم۔ (مفردات راغب ص ۳۱۹)

علامات و قرائن سے جو شے حاصل ہو اُسے ظن کہا جاتا ہے۔ اگر یہ علامات و قرائن قوی ہوتے ہیں، تو ظن کی سرحد علم و یقین سے مل جاتی ہے اور اگر یہ قرائن بہت ہی زیادہ کمزور ہوں، تو پھر انتہائی درجہ وہم ہے۔

یعنی علامات و قرائن کی قوت و ضعف کے لحاظ سے ظن کے درجات و مراتب مختلف ہیں۔

ظن کے مراتب و اقسام

۱۔ کسی شے کے وجود یا عدم پر قرائن و علامات انتہائی قوی اور شکوک و شبہات سے بالاتر ہوں، تو ظن کی یہ شکل یقین کے ہم معنی ہے۔ قرآن مجید میں ظن بمعنی یقین متعدد جگہ استعمال ہوا ہے۔

ا۔ الذین یظنون انھم ملاقوا ربھم و انھم الیہ راجعون (بقرہ ۴۶)

جو لوگ یقین رکھتے ہیں کہ وہ اپنے رب سے ملنے والے ہیں، اور یہ کہ وہ اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔

ب۔ قال الذین یظنون انھم ملاقوا اللہ کم من فئة قلیلة غلبت فئة کثیرة باذن اللہ۔ (بقرہ۔ ۲۴۹)

ان لوگوں نے، جو اس بات کا یقین رکھتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ملنے والے ہیں، کہا کہ: ایسے گروہ تھے جو قلت تعداد کے باوجود کثیر التعداد گروہ پر اللہ کے حکم سے غالب آگئے۔

ان آیات میں ''ظن'' بمعنی یقین یا قریب بہ یقین مراد لینے کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ قرآن مجید نے مومنوں کی ایک نمایاں صفت یہ بھی بیان کی ہے کہ وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ جیسا کہ فرمایا وہ بالاخرة ھم یوقنون۔ واضح رہے کہ آخرت اور لقاء رب کا مفہوم ایک ہی ہے۔

۲۔ ظن کا دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ کسی شے کے وجود یا عدم پر سو فی صدی قرائن موجود نہ ہوں بلکہ اس سے کم ہوں، مثلاً ۹۰ فی صدی اور اس سے بھی زیادہ۔ اس کو اردو میں گمان غالب سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس قسم کے ظن پر اعتماد و اعتبار نہ صرف یہ کہ پسندیدہ ہے بلکہ بعض حالات میں ضروری اور واجب ہے۔ ظن کا یہ مفہوم مندرجہ ذیل آیات میں ملتا ہے:

ا۔ لولا اذ سمعتموہ ظن المؤمنون والمؤمنات بانفسھم خیرًا (نور)

کیوں نہ ایسا ہوا کہ جب تم نے اس (بہتان) کو سنا، مومن عورتوں اور مومن مردوں کے بارے میں اچھا گمان کرتے۔

اس آیت میں مسلمانوں کو تلقین کی جارہی ہے کہ انہوں نے حضرت عائشہ رضؓ کے بارے میں حسن ظن (خوش گمانی) سے کیوں نہ کام لیا کیونکہ زیادہ قرائن و علامات اسی بات کے حق میں تھے کہ حضرت عائشہ رضؓ کا دامن اس قسم کی تہمت سے پاک ہے۔

ب۔ فلاجناح علیھما ان یتراجعا ان ظنا ان یقیما

دونوں میاں بیوی پر کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ آپس میں رجوع کر لیں،

حدود اللہ - (بقرۃ ۲۳۰) اگر ان کو یہ گمان ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کی حدود کو قائم کر سکیں گے۔

طلاق رجعی کی شکل میں میاں بیوی سے کہا جا رہا ہے کہ اگر دونوں اپنے حالات اور قرائن کی بنا پر اللہ تعالیٰ کی حدوں کو قائم کرنے پر آمادہ ہوں اور اس کے لیے گمان غالب کی حد تک روشن امکانات موجود ہوں، تو میاں بیوی اپنا گھر آباد کر سکتے ہیں۔

۳- ظن بمعنی شک، یعنی کسی چیز کے وجود اور عدم پر یکساں قرائن وعلامات موجود ہوں، دونوں میں سے کسی ایک کے قرائن کو ترجیح دینا ناممکن ہو۔ مثلاً ارشاد ربانی ہے۔

وان الذین اختلفوا فیہ لفی شک منہ مالھم بہ من علم الا اتباع الظن وما قتلوہ یقیناً۔ (نساء)

اور بلاشبہ جن لوگوں نے اس (عیسیٰ علیہ السلام) کے بارے میں اختلاف کیا ہے، وہ اس کی جانب سے شک میں ہیں، ان کے پاس اس کے بارے میں کوئی علم ویقین نہیں ہے۔ سوائے ظن کی پیروی کے اور انہوں نے یقیناً قتل نہیں کیا۔

اس آیت میں یہود کے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کے سلسلے میں ان کے اقوال و آراء کی بنیاد شک پر ہے علم ویقین پر نہیں ہے۔ اسی شک اور عدم علم ویقین کو اتباع ظن سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس تفصیل سے واضح ہوا کہ اس آیت میں ظن بمعنی شک استعمال ہوا ہے۔

* شک کے مفہوم کی وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو، مفردات راغب ص۲۶۶۔

الشک اعتدال النقیضین عند الانسان وتساویھما وذالک قد یکون لوجود امارتین متساویتین عند النقیضین او العدم الامارۃ منھما۔

۴- "ظن" بمعنی وہم یعنی ایسا خیال وگمان، جس کی بنیاد کسی دلیل پر نہ ہو بلکہ واضح نص اس کے خلاف موجود ہو۔

مضمون کے شروع میں جن آیات کو نقل کیا گیا ہے، ان میں اس قسم کے بے بنیاد وہم وخیال کی مذمت کی گئی ہے اور حدیث میں اس سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے۔

۵- "ظن" بمعنی تہمت، جیسا کہ ایک قرأت میں ہے: وما ھو علی الغیب بظنین (سورہ تکویر ۲۴) یہاں ظنین تہمت کے معنی میں ہے۔ قرآن وسنت کی روشنی میں ظن کی تیسری، چوتھی اور پانچویں قسم مذموم اور قابل اجتناب ہیں اور اپنی اصل حقیقت کے لحاظ سے ملتی جلتی ہیں۔ مذکورہ بالا زیر بحث آیات پر غور کیا جائے، تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ آیت نمبر ۱ میں فرمایا گیا ہے کہ گمان کی بہت سی قسموں سے بچو۔ معلوم ہوا کہ گمان "ظن" کی ہر شکل قابل مذمت نہیں ہے، اس لیے بعد میں ارشاد ہوا:

ان بعض الظن اثم — بلاشبہ گمان کی بعض صورتیں گناہ ہیں۔

آیات (۲، ۳، ۴) میں مشرکین کے عقیدہ شرک اور ان کے مشرکانہ اقوال اور رسم ورواج کو بیان کیا گیا ہے، اور آخر میں ان کے عقائد کی بنیاد ظن وتخمین کو قرار دیا گیا ہے۔ یعنی ان کے ان عقائد ورسوم کی پشت پر کوئی قابل اعتماد دلیل موجود نہیں ہے، حالانکہ اس کے برعکس شرک کی تردید اور توحید کے اثبات میں نہایت قوی عقلی اور کائناتی دلائل وقرائن موجود ہیں۔

آیت (۵) میں حشر و نشر کے انکار کو "ظن" یعنی بے بنیاد وہم قرار دیا گیا ہے، کیونکہ حشر و نشر (زندگی بعد موت) کا ثبوت متعدد عقلی اور نقلی دلائل و براہین سے واضح ہو چکا ہے۔ اس کا انکار کسی یقین اور علمی استدلال پر مبنی نہیں ہے۔

آیت (۶) میں مشرکین کا مقولہ نقل کیا گیا ہے، جو انہوں نے قیامت کا انکار کرتے ہوئے کہا تھا۔

آیت (۷) میں ان باتوں کے پیچھے پڑنے اور اُن کے بارے میں زبان کھولنے سے منع کیا گیا ہے جن کی بنیاد وہم و خیال پر ہو، اس لحاظ سے یہ آیت، آیت ۱ کے ہم معنی ہے۔ اسی طرح حدیث "وایاکم والظن" میں اس ظن سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے جو شکی اور وہمی مزاج کی پیداوار ہو۔

"ظن" کے یہ مراتب و اقسام اسی طرح ہیں، جس طرح کہ "یقین" کے متعدد مراتب و اقسام قرآن مجید سے معلوم ہوتے ہیں۔

مراتب یقین

قرآن مجید میں یقین کے تین مراتب و منازل بیان کیے گئے ہیں، علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین۔ امام ابن تیمیہ نے ان تینوں مراتب کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "علم الیقین" علم کے اس درجہ کا نام ہے، جو کسی شخص کو کسی بات سننے، کسی دوسرے شخص کے بتلانے اور کسی امر میں قیاس اور غور و فکر کرنے سے حاصل ہو پھر جب اُسے آنکھوں سے مشاہدہ اور معائنہ کرے گا، تو اسے "عین الیقین" کا مرتبہ حاصل ہو جائے گا، اور جب دیکھنے کے بعد اسے چھوئے گا محسوس کرے گا، اُسے چکھے گا اور اس کی حقیقت کو پہچان لے گا، تو اُسے "حق الیقین" کا مقام حاصل ہو جائے گا۔ علم الیقین کی مثال یہ ہے کہ کسی شخص نے خبر دی کہ فلاں مقام پر شہد ہے۔ اب راوی پر اعتماد کرتے ہوئے اس کی تصدیق کرنا علم الیقین ہے، دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ خود آنکھوں سے شہد کے چھتے کا مشاہدہ کر لیا جائے یہ عین الیقین کا مرتبہ ہے۔ یہ درجہ پہلے مرتبہ کی بہ نسبت اعلیٰ اور یقین و اذعان کے لحاظ سے اونچا مقام رکھتا ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے ولیس الخبر کالمعاینۃ یعنی جو کان سے سُن لے، وہ اس کے برابر نہیں ہو سکتا جو آنکھ سے دیکھ لے۔ حق الیقین کی مثال یہ ہے کہ کسی نے شہد کو چکھ کر اس کا مزہ اور اس کی مٹھاس محسوس کر لی یہ تیسرا درجہ دوسرے درجہ کی نسبت اعلیٰ و ارفع ہے۔

اب یوں سمجھنا چاہیئے کہ جہاں سے یقین کا ابتدائی درجہ شروع ہوتا ہے، وہاں ظن کی اعلیٰ ترین قسم کی سرحد ختم ہوتی ہے یقین کے یہ تینوں مراتب درجہ بدرجہ شریعت اسلامیہ میں مطلوب ہیں۔ لیکن "ظن" کی مذکورہ بالا پانچ اقسام میں سے دو (یعنی ظن بمعنی یقین اور ظن یعنی گمان غالب مستحسن ہیں، بلکہ بعض حالات میں ان پر اعتماد کرنا واجب ہے باقی رہیں آخری تین قسمیں، تو ان سے احتراز و اجتناب ضروری ہے اصولِ حدیث کی کتابوں میں حدیث کو ظنی یا مفید کہا گیا ہے۔ اس سے مُراد ظن کے پہلے یا دوسرے معنی ہو سکتے ہیں نہ کہ تیسرے اور چوتھے معنی!

واضح رہے کہ گمان غالب کے لحاظ سے مفید ظن روایات کو اخبار آحاد کہا جاتا ہے۔ یعنی ایسی حدیث جس کے راوی تعداد کے اعتبار سے حد تواتر کو نہ پہنچے ہوں۔

خبر متواتر اس حدیث کو کہتے ہیں، جس کے راوی ہر دور میں اتنے زیادہ رہے ہوں کہ عادۃً ان کا جھوٹ پر متفق ہو جانا ناممکن ہو۔

اب یقین کے مختلف مراتب اور ظن کی متعدد صورتوں کے اعتبار سے حدیث کی حسب ذیل اقسام ہیں۔

۱۔ ایسے عملی مسائل پر مشتمل احادیث، جوامت میں شروع سے اب تک بغیر کسی اختلاف کے ایک دَور سے دوسرے دَور میں منتقل ہوتی رہی ہیں۔ مثلاً اذان واقامت کے کلمات، صبح کی دو رکعتیں، مغرب کی تین رکعتیں، رکوع وسجود کی تعداد۔ اس قسم کے بیسیوں وہ امور ہیں، جو حدیث کی مستند کتابوں میں درج نہیں اور ان کی تائید میں پوری امت کا تعامل (عملدرآمد) بغیر کسی شائبۂ اختلاف کے موجود ہے۔ سُنت وحدیث کا یہ وہ سرمایہ ہے، جس کا یقینی پہلو قرآن مجید کے کلام الٰہی ہونے کی طرح محکم اور مضبوط ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کے کاتبوں اور حافظوں کی تعداد اگر ہر دَور میں لاکھوں رہی ہوگی، تو نمازیوں اور روزہ رکھنے والوں کی گنتی کروڑوں سے کم نہ ہوگی۔ تواتر اور راویوں کی ان گنت تعداد کے لحاظ سے حدیث کا یہ سرمایہ قرآن ہی کی طرح یقینی ہے، اس کا انکار خود قرآن کے انکار کے ہم معنی ہے۔

حدیث کا یہ سرمایہ شک وشبہ سے بالاتر ہونے کے اعتبار سے حق الیقین کا مقام رکھتا ہے۔

۲۔ تواتر کی دوسری قسم علم کی اصطلاح میں تواتر طبقہ عن الطبقہ کہلاتی ہے یعنی ایک دور کے ان گنت افراد اور دوسرے اور بے شمار لوگوں کی طرف کامل اتفاق کے ساتھ کسی بات کو منتقل کرتے ہیں۔ اس کی واضح مثال قرآن مجید کا ایک دَور سے دوسرے دَور کی طرف تواتر کے ساتھ منتقل ہونا ہے۔ یہ قسم بھی حق الیقین کے درجہ میں ہے۔

۳۔ تواتر اسناد: یعنی حدیث کا ایک متن متعدد سندوں سے مروی ہو۔ یہ تعداد بھی اتنی ہو کہ حدِ تواتر تک پہنچ جائے۔ مثلاً حدیث من کذب علی متعمداً فلیتبوأ مقعدہ من النار (یعنی جس نے جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ باندھا، وہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں بنالے۔)

یہ روایت ۶۲ صحابہ سے منقول ہے، جن میں عشرہ مبشرہ بھی شامل ہیں۔ ایک دوسری تحقیق کے مطابق صحابہ کی تعداد سو سے بھی متجاوز ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مقدمہ ابن اصلاح صـ ۱۳۵

اسی طرح ختم نبوت پر احادیث ۱۵۰ اصحابہ سے مَروی ہیں، جن میں سے تینتیس ۳۳ صحابہؓ کے اسمائے گرامی صحاح ستہ میں ملتے ہیں۔

مقدمہ فتح الملہم شرح مُسلم صـ۶

۴۔ تواتر قدر مشترک یا تواتر معنوی: یعنی کسی واقعہ کے بارے میں منقول تمام جزئیات وتفصیلات تو حدِ تواتر کو نہیں پہنچتیں، لیکن مختلف روایات میں جو قدر مشترک پایا جاتا ہے، اس کے متواتر ہونے سے کبھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ مثلاً حاتم طائی کی سخاوت کے بارے میں جو تفصیلات زبان زد خواص ہیں، وہ سب کی سب متواتر نہیں ہیں لیکن ان سب حکایات وواقعات میں ایک بات قدر مشترک کی حیثیت سے پائی جاتی ہے اور وہ یہ ہے حاتم کی بے پناہ جود وسخا۔ اس کا انکار بداہت کے انکار کا ہم معنی ہے۔ سُنت کے مستند ذخیرے میں اس تواتر کی نمایاں مثال احادیث معجزات ہیں۔ یہ روایات اپنی سند اور راویوں کی تعداد کے لحاظ سے متواتر کی حد سے کم ہیں لیکن ان میں جو قدر مشترک پایا جاتا ہے، اس کے متواتر ہونے سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ان احادیث میں یہ بات قدر مشترک کے طور پر پائی جاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بعض ایسے افعال کا صدور ہوا ہے جو خارق عادت اور سلسلہ اسباب سے ماوراء ہیں۔

حدیث کی اقسام (۳، ۴) سے یقین واطمینان کی وہی کیفیت حاصل ہوتی ہے، جو "عین الیقین" سے حاصل ہوسکتی ہے۔

حدیث متواتر کی ان اقسام کے بعد خبرِ واحد کا نمبر آتا ہے۔ راویوں کی تعداد اور ان کی ثقاہت کے لحاظ سے اس کی بھی بہت سی قسمیں ہیں ان میں سے بعض اقسام مفید یقین ہیں۔ (یعنی ان سے علم الیقین کی سی اطمینانی کیفیت حاصل ہوتی ہے) اور بعض انواع مفید ظن ہیں یعنی گمان غالب کی حد تک انسان ان سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

ایسی روایات، جو راویوں کی تعداد کے لحاظ سے حدِ تواتر کو نہ پہنچ سکیں۔ ان کو اخبار آحاد (خبر واحد) شمار کیا جاتا ہے۔ خبر واحد کی راویوں کی تعداد کے اعتبار سے چند قسمیں ہیں۔

۱۔ مشہور۔ ایسی روایت جس کے سلسلہ سند میں شروع سے آخر تک (یعنی ہر دور میں) راویوں کی تعداد دو سے زیادہ ہو

۲۔ عزیز۔ ایسی حدیث جس کی تعداد رواۃ ہر دور میں دو سے کم نہ ہو۔

۳۔ غریب۔ ایسی روایت جس کی سند کسی دور میں یا تمام ادوار میں ایک راوی پر مشتمل ہو۔

واضح رہے کہ محدثین کے نزدیک اگر کسی روایت کی سند کے اکثر ادوار میں راویوں کی تعداد ہزاروں سے بھی متجاوز ہو لیکن کسی ایک دور میں ایک ہی راوی ہو تو اس روایت پر "غریب" ہی کا اطلاق ہوگا۔ یہی حال خبرِ واحد کی دوسری انواع کا بھی ہے مثلاً بعض محدثین کی بعض روایات کی سند اس طرح پر ہے: عن احمد بن حنبل عن الشافعی عن مالک عن نافع عن ابن عمر عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ اس سند میں مولف کتاب اور حضرت عبداللہ بن عمر کے درمیان چار واسطے پائے جاتے ہیں۔ اب اگر تین واسطوں کے ساتھ بہت سے راوی موجود ہوں لیکن ایک واسطہ بھی اپنی جگہ منفرد رہ جائے، تو یہ حدیث غرابت سے خالی نہ ہوگی اس قسم کی احادیث کے راوی اگر ثقہ اور قابلِ اعتماد ہوں، تو یہ محدثین کے نزدیک قابلِ قبول ہوتی ہیں لیکن خبر واحد کی ان انواع کو ظنی (مفید ظن) قرار دیا گیا ہے یہاں ظن سے مراد گمان غالب ہے، جس کی سرحدیں علم لیقین سے انتہائی قریب ہوتی ہیں۔

شریعت اسلامیہ میں ان تمام ذرائع پر اعتماد کیا گیا، جن کی بنیاد گمان غالب پر ہوتی ہے۔ مثلاً قرآن مجید کی آیت: واشہدوا ذوی عدل منکم کی روشنی میں دو عادل گواہوں کی شہادت پر اعتماد کیا گیا ہے اور اس شہادت کی بنا پر قتل جیسے فوجداری معاملات کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے حالانکہ اس شہادت کا درجہ سو فی صدی یقینی نہیں ہے، بلکہ جو کچھ بھی ہے، وہ ظن (گمان غالب) ہی ہے یہاں یہ امر بھی قابل غور ہے کہ جس مسلمان کی جان کا تحفظ (عصمت) قرآن اور سنت متواترہ کے ذریعہ ثابت ہے، اسی کو دو عادل گواہوں کی شہادت کی بنا پر قتل کا مجرم قرار دیتے ہوئے قصاص میں پھانسی پر لٹکایا جا سکتا ہے۔

خبر واحد کا یقینی پہلو

محدثین کرام نے جہاں خبر واحد کو مفید ظن کہا ہے، وہاں یہ بھی وضاحت کر دی ہے کہ اگر خبر واحد کے ساتھ دوسرے قرائن و شواہد وابستہ ہوں، تو یقین کا پہلو نکل آتا ہے۔ یعنی خبر واحد مشتمل بر قرائن و شواہد علم الیقین کا فائدہ دیتی ہے۔

اصولِ حدیث کی کتابوں میں ان قرائن و شواہد کی تین مثالیں دی گئی ہیں۔

۱۔ بخاری و مسلم کی وہ تمام روایات، جو محدثین کے نقد و تبصرے سے بالاتر رہی ہیں صحت و قوت اور قبولیتِ عام کے لحاظ سے ان کا درجہ ان روایات سے کہیں زیادہ بلند ہے، جو صرف راویوں کی ثقاہت کی بنا پر قابل اعتماد ٹھہرائی گئی ہیں۔ ان دونوں کتابوں کو تلقی

بالقبول (قبولیتِ عام) کا مقام حاصل ہونا اور ان کی صحت قابلِ اعتماد ہونے پر اُمت کا اجماع (اتفاق) ہونا، ایسے مضبوط قرائن و شواہد ہیں کہ جن کی بنا پر یہ احادیث مفید علم یقین قرار پاتی ہیں۔

حدیثِ مشہور بھی مفید علم یقین ہے جب کہ وہ متعدد الگ الگ سندوں سے مروی ہو۔ اور ہر قسم کی فنی خامی اور راویوں کے سنعنعنہ سے پاک ہو۔

۳۔ حدیثِ مسلسل بالائمۃ: یعنی ایسی حدیث جس کے راوی ہر دور میں مشہور اہلِ علم میں سے ہوں، بشرطیکہ وہ اس حدیث کے بیان کرنے میں منفرد نہ ہوں، بلکہ علم و تقویٰ کے لحاظ سے اُن کے ہم پایہ کوئی دوسری شخصیت بھی ان کی ہم نوا ہو۔ مثلاً امام احمد بن حنبل، امام شافعی سے روایت کریں اور وہ بھی امام مالک سے۔ ظاہر ہے کہ ان تینوں بزرگوں کی ثقاہت اور علمی جلالت و عظمت سے کسی کو انکار ہو سکتا ہے۔ اب اگر ان میں سے ہر امام کے ساتھ ایک دوسرا جلیل القدر عالم بھی شریکِ روایت ہو، تو سہو و نسیان کا امکان انتہائی کم سے کم رہ جاتا ہے اور اگر مذکورہ بالا تینوں شکلیں کسی ایک ہی حدیث میں یکجا ہو جائیں، تو اس صورت میں قطعیت اور یقین کا پہلو اور بھی زیادہ ہو جاتا ہے یعنی جب ایک روایت صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں درج ہو۔ راویوں کی تعداد کے لحاظ سے مشہور ہو، اور راوی بھی اکابر ائمہ دین میں سے ہوں۔

ان کے علاوہ اور بھی قرائن و شواہد ہو سکتے ہیں جن کی تفصیل کی اس وقت ضرورت نہیں ہے۔ اس تفصیل سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ خبرِ آحاد کی بھی متعدد انواع مفید علم الیقین ہیں، اب صرف وہ اخبار آحاد رہ جاتی ہیں جن کے راوی تقویٰ اور حافظہ کے لحاظ سے تو قابلِ اعتماد ہیں، لیکن دوسرے قرائن و شواہد سے ان کو تقویت اور تائید حاصل نہیں ہو سکی ہے، ان روایات کو بھی صحت و قوت کے لحاظ سے مختلف مراتب میں تقسیم کیا گیا ہے مثلاً صحیح لذاتہٖ، حسن لذاتہٖ، صحیح لغیرہٖ، حسن لغیرہٖ۔

۱۔ صحیح لذاتہٖ سے مراد وہ روایت ہے، جس کے راوی عدالت (تقویٰ) اور قوتِ حافظہ کے لحاظ سے قابلِ اعتماد ہوں، سند کی تمام کڑیاں باہم متصل و مربوط ہوں، انقطاع کے نقص سے پاک ہوں، اور ہر قسم کی ان فنی خامیوں سے مبرا ہوں، جن کو فن حدیث کے ماہرین ہی جان سکتے ہیں۔ اسی طرح وہ روایت ہر قسم کے شذوذ سے پاک ہو۔ (شذوذ کا مطلب محدثین کی اصطلاح میں یہ ہے کہ ثقہ راوی اپنے سے زیادہ قابلِ اعتماد راوی سے حدیث میں دو یا تین ثقہ راویوں سے سند یا متن حدیث کے بیان میں اختلاف کرے) یہ پانچ شرطیں جس حدیث میں پورے کمال کے ساتھ پائی جائیں، وہ "صحیح لذاتہٖ" شمار ہوگی۔

۲۔ اگر تمام شرائط کے باوجود حافظہ کے لحاظ سے کچھ کمی پائی جاتی ہے، تو اس روایت کو "حسن لذاتہٖ" کہا جاتا ہے۔

۳۔ اگر کسی روایت میں ضعف کے متعدد وجوہ موجود ہوں، لیکن اس ضعف کی تلافی اس بنا پر ہو گئی ہو، کہ وہ روایت کئی سندوں سے مروی ہے، تو ایسی حدیث کو "حسن لغیرہٖ" کہا جاتا ہے۔ محدثین کرام نے کسی روایت کو غرابت یا ضعف سے پاک کرنے کے لیے توابع و شواہد کی جستجو کا بھی اہتمام کیا ہے۔

۴۔ "صحیح لغیرہٖ" اگر کئی طرق (سندوں) سے مروی ہو، تو اس کا نام "صحیح لغیرہٖ" ہے۔

مثلاً ایک شخص مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اور اُن کے اساتذہ کے واسطے سے ایک قول شاہ ولی اللہؒ کی طرف منسوب کرتا ہے۔ اب اگر تلاش و جستجو سے مولانا مرحوم کا کوئی دوسرا شاگرد بھی اس قول کا راوی نکل آتا ہے، تو اُسے محدثین کی اصطلاح میں تابع کہتے ہیں، لیکن اگر کسی دوسری

سند مثلاً مولانا سید نذیر حسین رحمۃ اللہ علیہ کے واسطے سے اس قول کی تائید ہو جاتی ہے، تو اسے شاہد کہتے ہیں، اصول حدیث میں توابع و شواہد کی جستجو کا نام اعتبار ہے۔ محدثین کے ہاں اس "اعتبار" کی بڑی قدر و قیمت ہے، انہوں نے انتہائی کوشش اور جانفشانی سے ہزاروں روایات کے شواہد و توابع کو ڈھونڈ نکالا ہے، اس لیے پورے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ احکام و مسائل کے بارے میں شاید ہی ایسی کوئی منفرد روایت ہو جس کے توابع و شواہد کا کھوج محدثین نے نہ لگا لیا ہو، واللہ درھم جزاھم اللہ عنا وعن سائر المسلمین خیرا۔

ان شواہد و توابع کی بنا پر بہت سی غریب یا حسن روایات گمان غالب سے بڑھ کر یقین کے درجہ تک پہنچ گئی ہیں۔

چند شبہات

علم حدیث پر جو مسلمانوں کو وثوق و اعتماد ہے، اس کو متزلزل کرنے اور ذخیرۂ روایات کو مشکوک ٹھہرانے کے لیے منکرین سنت کی طرف سے متعدد شبہات پھیلائے گئے ہیں۔

ایک لاکھ روایات

کہا جاتا ہے کہ امام بخاری نے اپنی کتاب (صحیح بخاری جو سات ہزار روایات پر مشتمل ہے) کا انتخاب ایک لاکھ احادیث میں سے کیا ہے، امام بخاری کا اتنی بڑی تعداد کو نظر انداز کر دینے کے معنی یہ ہیں کہ تیسری صدی ہجری تک احادیث کے نام سے بہت سی رطب و یابس روایات کا اضافہ کر دیا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اتنے بڑے انبار میں سے اصل حقیقت کا سراغ لگانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ایک لاکھ کا عدد پیش کرتے ہوئے جو مغالطہ دیا جاتا ہے، اس کی اصلیت معلوم کرنے کے لیے مندرجہ ذیل حقائق پیش نظر رہنے چاہئیں۔

۱۔ محدثین کی اصطلاح میں اگر ایک متن حدیث متعدد سندوں سے آیا ہے، تو یہ متن اپنی ہر سند کے لحاظ سے ایک حدیث شمار ہوتا ہے مثلاً مشہور حدیث انما الاعمال بالنیات سات سو سندوں سے مروی ہے یعنی ایک حدیث کے سینکڑوں توابع و شواہد ہیں، فن حدیث میں یہ ایک حدیث نہیں بلکہ سات سو حدیثیں شمار ہوتی ہیں، ظاہر ہے کہ جب امام بخاری کی ایک ہی حدیث کی سندیں سینکڑوں تک پہنچتی ہیں، تو باقی روایات کے توابع و شواہد کی تعداد کہاں تک پہنچے گی۔ اس کا اندازہ بآسانی کیا جا سکتا ہے:۔

قیاس کن ز گلستانِ من بہار مرا

(تلقیح ابن جوزی مقدمہ ابن الصلاح صلا)

واضح رہے کہ محدثین کی تحقیق کے مطابق تمام رطب و یابس روایات پچاس ہزار سے زیادہ نہیں ہیں، امام حاکم کا قول ہے کہ صحت و قوت کے لحاظ سے اعلیٰ درجہ کی احادیث کی تعداد دس ہزار کے قریب ہے۔

۲۔ محدثین "حدیث" کا وسیع مفہوم لیتے ہوئے اس کا اطلاق صحابہ اور تابعین کے آثار و اقوال پر بھی کر دیتے ہیں مطلب یہ ہوا کہ امام بخاری نے ایک لاکھ میں سے خالص مرفوع احادیث یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین اور اسوۂ حسنہ پر مشتمل روایات کو چھانٹ لیا۔ ظاہر ہے کہ امام محترم کا یہ طرز عمل امت اسلامیہ پر ایک بہت بڑا احسان ہے نہ کہ حدیث کے بارے میں دیدہ دلیری اندازی کا موجب۔

۳۔ قرآنی کلمات "ساھون" کی تفسیر میں صحابہ اور تابعین سے سات قول اور نعیم (سورہ تکاثر) کے بارے میں دس قول منقول ہیں، اہل علم کے ان ہر قول پر لفظ حدیث کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ (مقدمہ فتح الملہم ص۲)

اس ساری تفصیل سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ایک لاکھ کے عدد کو ہوا بنا کر پیش کرنا کس قدر مغالطہ انگیز ہے۔

روایت بالمعنیٰ

دوسرا شبہ روایت بالمعنیٰ کی بنیاد پر پیش کیا جاتا ہے۔ یعنی استاذ اپنے شاگرد کی طرف سے ان الفاظ کو منتقل نہیں کرتا، جو اس نے اپنے استاذ سے سُنے ہیں بلکہ اُن کے مفہوم کو اپنے الفاظ میں پیش کرتا ہے، اس طرح بہت سے معانی اداء مطالب میں تبدیلی واقع ہو سکتی ہے۔

۱۔ روایت بالمعنیٰ فی نفسہٖ ناجائز یا ناقابل نفرت نہیں ہے۔ خود قرآن مجید میں متعدد مقامات پر ایک ہی قصہ کو اور ایک ہی شخص یا گروہ کی گفتگو کو مختلف پیرایوں میں بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سرگزشت بیان کرتے ہوئے ایک جگہ ارشاد ہوا۔ ھل اتاک حدیث موسیٰ اذ رای نارا فقال لاھلہ امکثوا انی انست نارا لعلی اتیکم منھا بقبس او اجد علی النار ھدی (پ ۱۶ سورہ طہٰ ع ۱)

دوسری جگہ فرمایا: فقال لاھلہ امکثوا انی انست نارا لعلی آتیکم منھا بخبر او جذوۃ من النار لعلکم تصطلون (پ ۲۰ سورہ قصص ع ۳)

تیسرے مقام پر ارشاد ہوا: اذ قال موسیٰ لاھلہ انی انست نارا ساتیکم منھا بخبر او اتیکم بشھاب قبس لعلکم تصطلون (پ ۱۹ سورہ النمل ع ۱)

اسی طرح موسیٰ علیہ السلام کی سرگزشت میں ایمان لانے والے جادوگروں کی گفتگو متعدد مقامات پر مختلف الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔ اصل مفہوم سب جگہ ایک ہے، لیکن الفاظ میں تفاوت پایا جاتا ہے۔

۲۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کا بہت بڑا حصہ بعینہٖ الفاظِ نبویؐ کے ساتھ منقول ہے۔ مثلاً اذان و اقامت کے کلمات، اذکار و ادعیہ کے الفاظ اور احادیثِ قدسیہ۔

ان کے علاوہ احکام و اخلاق کے متعلق احادیث کا دو تہائی حصہ فعلی اور تقریری روایات پر مشتمل ہے (تقریر کے معنی ہیں کہ آپؐ کے سامنے کوئی کام کیا گیا ہو اور اس پر آپؐ نے انکار نہ فرمایا ہو۔) روایت بالمعنیٰ کا اگر سوال پیدا ہو سکتا ہے، تو وہ صرف قولی احادیث کے بارے میں ممکن ہے۔ اس طرح پورے ذخیرہ روایات پر غور کرنے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جن احادیث میں روایت بالمعنیٰ کا احتمال ممکن ہے وہ ایک ثلث سے زیادہ نہیں ہیں۔ روایت بالمعنیٰ کو جائز قرار دیا گیا ہے، تو اس کے لیے محدثین نے بڑی شرطیں لگائی ہیں۔ یعنی یہ طریق کار وہی لوگ اختیار کر سکتے ہیں، جو زبان کے ماہر اور لغت کی وسعتوں پر پوری طرح قابو پا سکتے ہوں۔

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

ولا یجوز تعمد تغییر المتن مطلقاً ولا الاختصار منہ بالنقص ولا ابدال اللفظ المرادف باللفظ المرادف الا لعالم بمدلولات الالفاظ

متن حدیث کے الفاظ میں عمداً تبدیلی کرنا یا اختصار کرنا جائز نہیں ہے اور نہ ایک ہم معنی لفظ کو دوسرے ہم معنی لفظ سے بدلنا جائز ہے، ہاں یہ کام اس کے لیے جائز ہو سکتا ہے، جو الفاظ کے معانی و مطالب سے بخوبی واقف اور باخبر ہو (شرح نخبۃ الفکر)

نیز تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو شرح صحیح مسلم مقدمہ امام نووی و فتح المغیث شرح الحدیث العراقی ص ۵۷۶

۳۔ اگر اہل علم اور ماہرین لغت کے لیے بھی روایت بالمعنیٰ کی اجازت نہ ہو، تو ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ بھی حرام قرار پاتا ہے اور ترجمانی بھی ناجائز ٹھہرتی ہے، حالانکہ اس بارے میں اہل علم کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔ صحابہ کرامؓ نے متعدد مواقع پر غیر عربی لوگوں سے ترجمانی کے واسطے سے گفتگو کی ہے اور اسلام کا پیغام پہنچایا ہے، سردست انہی دو شبہات کے جوابات پر اکتفا کی جاتی ہے۔

احادیث میں تمثیلات

مولانا جعفر شاہ پھلواروی

ہر قسم کی مادی تعلیم اور روحانی تربیت کی تکمیل تمثیل و تشبیہہ ہی سے ہوتی ہے اور دنیا کا کوئی لٹریچر خواہ وہ انسانی ہو، یا آسمانی اس سے خالی نہ رہ سکا اور نہ یہ ہونا ممکن تھا۔ کلام الٰہی کے بعد سب سے زیادہ اہم کلام رسولؐ ہے۔ ہم اس مضمون میں احادیثِ نبویؐ سے صرف چند تمثیلاتی نمونے پیش کر رہے ہیں۔

مقام نبوت کی تمثیل

اہلِ مکہ کا یہ دستور تھا کہ جب کسی اہم معاملے کی اطلاع دینی ہوتی، وہ کوہِ صفا پر چڑھ جاتا اور جس جس فردیا خاندان کو بلانا ہوتا، آواز دے کر بلاتا۔ جب سب جمع ہو جاتے، تو ان کو اس معاملے سے آگاہ کر دیتا۔ نبوت کا تیسرا سال تھا اور ابھی چھپ چھپ کر تبلیغ ہوتی تھی۔ جب آیت "فاصدع بما تؤمر" نازل ہوئی، تو اہل مکہ کے رواج کے مطابق حضورؐ صفا کی پہاڑی پر چڑھ گئے اور قریش کے مختلف خاندانوں کو آواز دے کر بلایا۔ حسبِ دستور لوگ جمع ہو گئے، تو حضورؐ نے ان لوگوں سے پوچھا:

ارئیتکم لواخبرتکم ان خیلا بالوادی تریدان تغیر علیکم کنتم مصدقی	دیکھو اگر میں تم سے کہوں کہ شہسواروں کا ایک دستہ دوسری طرف کے دامنِ کوہ سے تم پر حملہ آور ہونا چاہتا ہے تو کیا تم مجھے سچا سمجھو گے۔

سب نے یک زبان ہو کر کہا:

نعم ما جربنا علیک الا صدقا	ہاں ہمارا ہمیشہ کا تجربہ یہ ہے کہ تم سچ ہی بولتے ہو۔

اپنی صداقت پر حاضرین کی زبان سے مہرِ تصدیق ثبت کرانے کے بعد حضورؐ نے موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فرمایا:۔

فانی نذیر لکم بین یدی عذاب شدید۔	(اچھا تو مجھے سچا سمجھتے ہو، تو ایک سچی حقیقت اور بھی سنو کہ) میں تم سب کے لیے ایک بڑے سخت عذاب کی وارننگ دیتا ہوں۔

(رواہ الشیخان والترمذی عن ابن عباس)

اس واقعے میں تشبیہہ و تمثیل کا کوئی لفظ موجود نہیں۔ لیکن یہ پورا واقعہ ہمہ تن تشبیہہ و تمثیل ہے۔ مقامِ نبوت کی اور اس سے بہتر تشبیہہ ممکن نہیں۔

حضورؐ پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے ہیں اور سامنے ایک طرف دامنِ کوہ میں سب لوگ کھڑے ہیں، وہ سب حاضرین صرف پہاڑ کے اسی ایک طرف کا حال دیکھ رہے ہیں، جس طرف وہ خود کھڑے ہیں۔ پہاڑ کی پشت پر اس طرف کیا کچھ ہے، اس کا انہیں کوئی علم نہیں۔ اس لئے کہ بیچ میں پہاڑ کی

حائل ہے ۔ مگر حضورؐ کی حیثیت یہ ہے کہ پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے ہیں اور دونوں طرف دیکھ رہے ہیں ۔ حضورؐ کی نظر ادھر حاضرین پر بھی ہے اور پہاڑ کے پس پشت کو بھی دیکھ رہے ہیں ۔ نیچے کھڑے ہونے والے لوگوں کو اس طرف پس پشت کی کوئی خبر نہیں ہو سکتی ۔ ان کو اس طرف کی اگر کوئی اطلاع مل سکتی، تو صرف اس شخص کے اطلاع دینے سے جو اوپر کھڑا پہاڑ کے دونوں رخوں کو یکساں دیکھ رہا ہے ۔ بالکل یہی مثال ہے مقامِ نبوت کی ۔ پیغمبر حال کے اعمال کو بھی دیکھتا ہے اور مستقبل کے نتائج پر بھی اس کی نظر جمی رہتی ہے ۔ وہ دنیا کو بھی دیکھتا ہے اور آخرت کو بھی ۔ اس کا تعلق خدا سے بھی ہوتا ہے اور خدا کے بندوں سے بھی ۔ ادھر سے لیتا ہے ادھر پہنچا دیتا ہے ۔ وہ آغاز کو بھی دیکھتا ہے اور اس طرح اسے انجام بھی نظر آتا ہے ۔ بندوں کے سامنے ایک ہی رُخ ہوتا ہے ۔ پیغمبر کی نگاہیں آخرت پر، انجام پر، غیوب پر، دماغِ انسانی سے ورا اور حقائق پر بھی ہوتی ہیں اور یہ حقائق انسانوں پر منکشف ہی نہیں ہو سکتے تاآنکہ انھیں پیغمبر نہ بتائے ۔ عام انسانوں کی نگاہ اور نبوی بصیرت میں جو فرق ہے، اس کی تشبیہہ و تمثیل اس سے بہتر اور کیا ہو سکتی ہے، جو حضورؐ نے عملی طور پر پیش فرما دی ۔

خاتم النبیین کا صحیح مقام

اپنی مدح میں مبالغہ اور دوسروں کے فضل کے اعتراف میں تنگ دلی کا مظاہرہ عام انسانی فطرت میں داخل ہے ۔ لیکن پیغمبر اس قسم کی انسانی کمزوریوں سے ارفع ہوتا ہے اور وہ ہر بات کو اتنا ہی بیان کرتا ہے، جتنی وہ حقیقت کے مطابق ہو ۔ عدل کا تقاضا بھی یہی ہے ۔ حضورؐ اپنی اور پیشرو انبیاؑ کی مثال دیتے ہوئے فرماتے ہیں :

ان مثلی و مثل الانبیاء من قبلی کرجل	میری اور جو انبیاءؑ مجھ سے پہلے گزرے ہیں، ان کی مثال
بنی بیتا فاحسنه واجمله الاموضع	یوں ہے، جیسے کسی نے ایک بڑی خوبصورت اور عمدہ عمارت بنائی
لبنة من زاویة من زوایاہ	ہو اور اس کے کسی کونے میں ایک اینٹ کی جگہ خالی چھوڑ
فجعل الناس یطوفون به و یعجبون	دی ہو ۔ لوگ اس عمارت کے گرد گھوم گھوم کر حیرت زدہ
له ویقولون هلا وضعت هذه فانا	ہو رہے ہیں اور یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ اینٹ کیوں نہیں لگائی گئی ۔
تلک اللبنه وانا خاتم النبیین ۔	پس سمجھ لو کہ وہ اینٹ میں ہی ہوں اور میں خاتم النبیین ہوں

(رواہ الشیخان عن ابی ہریرہ)

اس حدیث میں ایک بڑی حقیقت یہ پوشیدہ ہے کہ تکمیلِ دین میں بھی ارتقائی منازل طے ہوتی رہی ہیں ۔ عقل انسانی کے ساتھ ساتھ دینی تصورات میں بھی ارتقا ہوتا رہتا ہے ۔ جب ایک عمارت بنتی ہے تو بنیاد کھودنے سے لے کر تکمیل عمارت تک ہر قدم ارتقائی ہی قدم ہوتا ہے ۔ دین کی عمارت میں بھی یہی صورت رہی ہے ۔ ہر پیغمبر نے ایک اینٹ رکھ کر اس مقصد کو آگے بڑھایا ہے اور عمارت کو قریب تر کر دیا ۔ لیکن تکمیل خاتم النبیین کے ہاتھوں ہوئی :

الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت	آج ہم نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنا انعام
علیکم نعمتی ..... الخ	پورا کر دیا ۔

یہ اسلام ایک دین اور نظامِ زندگی کی حیثیت سے تمام انبیاؑ کا واحد اور مشترک دین تھا ۔ یعنی سب کا دین اسلام ہی تھا، اور سب نے اس عمارت کو پروان چڑھانے میں اپنی استطاعت بھر حصہ لیا مگر تکمیل و اختتام اور اس نعمت کا اتمام محمد عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے

ہاتھوں ہوا اور نبوت کا مقصد پورا ہو گیا۔ اسی لیے نبوت بھی ختم ہو گئی۔ گویا معمارِ دین تو سبھی پیغمبر ہیں لیکن آخری معمار خاتم النبیین ہیں۔ اس سے یہ شبہ نہ ہونا چاہیے کہ حضورؐ کی مقدارِ خدمت بس اتنی ہی نسبت رکھتی ہے جتنی پوری عمارت میں ایک اینٹ۔ یہ نسبت پوری عمارت کے مقابلے میں رکھ کر نہ دیکھیے۔ الگ الگ اینٹوں کے مقابلے میں رکھ کر دیکھیے، جو ایک ایک پیغمبر نے رکھی۔ یہ ساری اینٹیں الگ الگ بھی قابلِ قدر ہیں لیکن سب مل کر بھی عمارت کی تکمیل نہیں کرتیں۔ صرف حضورؐ کی رکھی ہوئی آخری اور کامل اینٹ نے تکمیلِ عمارت کی۔ اس لحاظ سے اظہارِ حقیقت کی جو مثال اس تشبیہ میں دی گئی ہے۔ اس سے بہتر تمثیل نہیں ہو سکتی۔

صدیقؓ و فاروقؓ کی تمثیل

جنگِ بدر میں ستر افراد قید ہو کر آئے تھے۔ ان قیدیوں کے متعلق جب حضورؐ نے مشورہ فرمایا، تو حضرت ابوبکرؓ نے رائے دی کہ فدیہ لے کر ان کو رہا کر دیا جائے۔ شاید اللہ تعالیٰ انھیں توبہ کی توفیق دے۔ حضرت عمرؓ بولے کہ ان لوگوں نے حضورؐ کو بے وطن کیا اور جھٹلایا، اس لیے سب کی گردنیں اڑا دی جائیں۔ حضورؐ نے فرمایا:

مثلك یا ابابکر کمثل ابراهیم قال فمن تبعنی فانه منی ومن عصانی فانك غفور رحیم وکمثل عیسٰی قال ان تعذبهم فانهم عبادك وان تغفرلهم فانك انت العزیز الحکیم ومثلك یا عمر کمثل نوح قال رب لا تذر علی الارض من الکافرین دیارا وکمثل موسٰی قال واشدد علی قلوبهم فلا یؤمنوا حتی یروا العذاب الالیم۔

(رواہ ابوداؤد عن ابن مسعود)

اے ابوبکر! تمہاری مثال تو حضرت ابراہیمؑ اور حضرت عیسٰیؑ جیسی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا تھا کہ (ترجمہ) جو میری پیروی کرے، میرا ہے اور جو نافرمانی کرے تو اللہ غفور رحیم ہے۔ اور عیسٰیؑ نے فرمایا کہ (ترجمہ) اگر تو انھیں سزا دے تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر ان کی مغفرت فرمائے، تو عزیز و حکیم ہے اور اے عمر! تمہاری مثال نوحؑ اور موسٰیؑ جیسی ہے۔ نوحؑ نے یہ دعا کی تھی کہ (ترجمہ) ان کافروں میں کسی کو بھی زمین پر زندہ نہ چھوڑ اور موسٰیؑ نے دعا کی کہ (ترجمہ) ان کے دلوں میں اور سختی پیدا کر دے تاکہ عذاب الیم کو دیکھے بغیر یہ ایمان ہی نہ لا سکیں۔

ابوبکرؓ و عمرؓ کی سیرتوں کے ساتھ سیدنا ابراہیمؑ و عیسٰیؑ اور سیدنا نوحؑ و موسٰیؑ کی سیرتوں سے جو واقف ہو گا، وہ یہ اقرار کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ان دونوں بزرگوں کے لیے اس سے بہتر تشبیہ و تمثیل ممکن نہیں۔

صراطِ مستقیم

صراطِ مستقیم اور اس کے ساتھ کئی متعلقہ چیزوں کی تشبیہ حضورؐ نے یوں دی ہے:

ضرب اللہ مثلا صراطا مستقیما وعن جنبتی الصراط سوران فیهما ابواب مفتحة وعلی الابواب ستور مرخاة وعند راس الصراط داع یقول استقیموا علی الصراط ولا تعوجوا وفوق ذالك داع یدعو كلما هم عبد ان یفتح شیئا من تلك الابواب قال ویحك لا تفتحه فانك ان تفتحه تلجه ثم فسره فاخبر ان الصراط هو الاسلام وان الابواب المفتحة محارم اللہ وان الستور المرخاة حدود اللہ والداعی علی راس الصراط هو القرآن والداعی فوقه هو واعظ اللہ فی قلب كل مومن

اللہ تعالیٰ نے (قرآن حکیم میں) صراطِ مستقیم کا جو تذکرہ فرمایا، اس کی مثال یہ ہے، جیسے ایک سیدھا راستہ ہو، جس کے دونوں طرف دیواریں ہوں اور ان میں جا بجا دروازے کھلے ہوئے ہوں جن پر پردے آویزاں ہوں اور سرِ راہ ایک نقیب پکار رہا ہو کہ دیکھ بھال کر چلنا اور ادھر اُدھر نہ مڑنا۔ اس کے آگے دوسرا نقیب ہے جس کا کام یہ ہے کہ اگر کسی نے دروازہ کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور وہ چلا اٹھا کہ ارے بدنصیب اسے نہ کھول ورنہ اندر چلا جائے گا۔ پھر آنحضرتؐ نے اس کی تفسیر میں فرمایا۔ صراط اسلام ہے۔ دروازے خدا کی طرف سے حرام کردہ اشیا، پردے حدود اللہ، پہلا نقیب قرآن حکیم اور دوسرا مومن کا نفس لوامہ ہے۔

واعظِ بے عمل اس کے متعلق حضورؐ نے نہایت لطیف مثال دی ہے۔ فرمایا:
مثل الذی یعلم الناس الخیر جو شخص دوسروں کو نیکی کی تعلیم دے اور خود اس پر عمل نہ کرے۔
وینسی نفسه کمثل السراج یضئ ۔ اس کی مثال چراغ کی سی ہے، جو اوروں کو تو روشنی دے
الناس و یحرق نفسه اور اپنے آپ کو جلاتا رہے۔

نماز اور مغفرت گناہ ارأیتم لوان نهراً بباب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر تمہارے گھر کے سامنے نہر بہ رہی ہو
احدکم یغتسل فیه کل یوم خمس مرات اور ہر روز اس میں پانچ مرتبہ غسل کیا جائے تو جسم پر
ما تقولون ذالک یبقی من درنه ذرہ برابر میل رہ سکتا ہے، لوگوں نے کہا، ہرگز نہیں رہ سکتا۔ فرمایا یہی
یبقی من درنه شیئاً قال فذالک مثل مثال نماز پنجگانہ کی ہے، جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ گناہوں کو دھو
الصلوات الخمس یمحوا اللہ بها الخطایا۔ دیتا ہے۔ (رواہ الشیخان وموطا و نسائی)

یہ تمثیل بہت اعلیٰ ہے، مگر یہ صرف ان کے لیے ہے، جو حقیقت صلوٰۃ سے واقف ہوں۔ نماز ہوتی ہی ہے تطہیر قلب و نگاہ کے لیے، اخلاق و سیرت کی بلندی کے لیے۔ نفس امارہ کے تزکیے کے لیے جو دن رات میں کئی بار خدا کے سامنے حاضر ہو کر اپنی بندگی و عبدیت کا اقرار کرے اور اس کے تقاضوں کو سمجھے، اس کے گناہ دھل جانے میں کیا شک و شبہ ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر اس کے تقاضوں کو غلط طریقے سے سمجھا جائے، تو پھر یہ ہوگا کہ نمازی دل کھول کر ارتکاب گناہ کرتا جائے گا اور دل میں یہ خیال کرے گا کہ جہاں نمازیں پڑھ لیں گناہ معاف ہو گئے۔ یہ زاویہ نگاہ ایسا ہے، جو بجائے پاک کرنے کے اور زیادہ ناپاک کرتا جاتا ہے اور نمازی مستحق رحمت ہونے کے بجائے وعید کا مستحق ہو جاتا ہے۔ قصور نماز کا نہیں، نمازی کی فطرت و استعداد کا ہے۔ کھانا تو توانائی کے لیے کھایا جاتا ہے، لیکن اگر معدے کی استعداد ہی صحیح نہ ہو، تو وہی کھانا زہر بن جاتا ہے۔ قصور کھانے کا نہیں کھانے والے کی صلاحیت و استعداد کا ہوتا ہے۔

مجمعے کو چیرنا مجلس کے آداب یہ ہیں کہ جو پہلے آئے، وہ آگے بیٹھے اور جو پیچھے آئے وہ پیچھے جہاں جگہ ملے بیٹھ جائے۔ یہی صورت جمعے میں بھی ہونی چاہیے۔ لیکن بعض لوگوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ آئیں گے تو سب کے بعد لیکن بیٹھنے کی کوشش کریں گے سب سے اگلی صف میں۔ اس کا مقصد ہوتا ہے اپنے آپ کو ممتاز و نمایاں رکھنا یا یہ فقہی خیال کہ آگے ہونے سے ثواب زیادہ ملے گا۔ پھر ہوتا یہ ہے کہ ایسے لوگ مجمعے کو چیر کر لوگوں کو دھکے دیتے ہوئے مجمعے کے سروں پر سے گزر جاتے ہیں اور کچھ خیال نہیں کرتے کہ ان کی اس حرکت سے کسی کو کیا تکلیف ہوگی۔ حضورؐ کو آداب مجلس کے علاوہ یہ بھی انتہائی خیال رہتا تھا کہ کسی سے دوسرے کو کوئی اذیت نہ پہنچے۔ اس لیے فرمایا: من تخطی رقاب الناس یوم الجمعة جو شخص جمعے میں حاضرین کو پھاندتا ہوا آگے جاتا ہے،
اتخذ جسراً الی جهنم اپنے لیے جہنم کا پل بناتا ہے۔
(رواہ الترمذی عن معاذ بن انس الجہنی)

فی الواقع لوگوں کے سروں اور گردنوں کو اپنا راستہ بنانے کے لیے اس سے بہتر تہدیدی مثال اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ ایک پل سے گزر رہا ہے، جو سیدھا جہنم کی طرف جاتا ہے۔

جان و مال کا احترام

بعض حقایق ایسے ہوتے ہیں، جو عام حالات میں مؤثر نہیں ہوتے، لیکن ایک خاص موقع پر ان کی تاثیر بے پناہ ہو جاتی ہے۔ بلاغت کا مطلب بھی یہی ہے کہ بات ٹھیک موقع محل پر کہی جائے۔ مثلاً ایک مومن کی جان و مال کے متعلق سب جانتے ہیں کہ یہ حرام اور قابلِ احترام ہے۔ اس بات کو آپ جس موقعے پر بھی کہیں ٹھیک ہوگی۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ یہ مؤثر بھی ہو۔ لیکن دیکھیے حضورؐ اس بات کو کس زمان و مکان کا لحاظ کرتے ہوئے کتنے ٹھیک موقع پر فرماتے ہیں۔ لاکھ سوا لاکھ پروانہ ہائے شمع رسالت حضورؐ کے ساتھ حج کرتے ہیں۔ ایسا حج جو حکمِ فرضیت کے بعد پہلا حج اور آخری حج ہے، جو حضورؐ کے ساتھ ادا کرنے کا شرف حاصل کیا جا رہا ہے۔ زمانہ حج کا ہے، جسے شہر حرام کہتے ہیں۔ جگہ وہ پاک سرزمین ہے، جسے مسجد حرام کہتے ہیں۔ ان دونوں چیزوں کا احترام اس حد تک ہے کہ ایک جانور مارنا اور ایک پتا توڑنا بھی حرام ہے اور یہ ایسی رسمِ کہن ہے، جو قدیم الایام سے دلوں میں راسخ بھی ہے اور اسلام بھی اسے باقی رکھتا ہے۔ ایسے موقعے پر حضورؐ ایک بلیغ خطبہ دیتے ہیں، جس کا ایک ایک لفظ دلوں میں گھر کیے لیتا ہے۔ اشاروں میں یہ بھی بتا دیتے ہیں کہ اس کے بعد آئندہ میری تمہاری یکجائی اس جگہ نہ ہوگی۔ اور سمجھنے والے اسے رخصتی کا پیغام سمجھ کر رونے بھی لگتے ہیں۔ تکمیلِ دین کی آیت بھی نازل ہو جاتی ہے۔ کتنا روح پرور، کس درجے مؤثر اور کس قدر دلگدازانہ منظر ہے۔ ٹھیک اس موقعے پر حضورؐ لوگوں سے دریافت فرماتے ہیں کہ یہ کونسا مقام ہے؟ یہ کونسا مہینہ ہے؟ جواب دیتے ہیں اللہ اور اس کا رسولؐ بہتر جانتا ہے۔ حضورؐ پوچھتے ہیں کہ کیا یہ مسجد حرام اور ماہِ حرام نہیں؟ سب اثبات میں جواب دیتے ہیں اور دل ان دونوں زمان و مکان کی حرمت کے جذبات سے بھرپور ہو جاتے ہیں۔ لوہا گرم ہو گیا اور حکیم الامت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بلیغ برمحل موقع پر ایک چوٹ لگائی اور یوں گویا ہوئے:

ان دماءکم و اموالکم حرام علیکم	اچھا تو سن لو کہ تمہارا خون اور تمہارے مال تم پر
کحرمة یومکم هذا فی شهرکم هذا	اس طرح حرام اور واجب الاحترام ہیں، جس طرح آج
فی بلادکم هذا (رواہ مسلم، ابوداؤد عن جعفر بن محمد بن علی)	کا دن، اس مہینے میں اور اس شہر مکہ میں حرام اور واجب الاحترام ہے۔

اس تشبیہ کو دیکھیے اور موقع و محل کو دیکھیے۔ اس کے بعد فیصلہ کیجیے کہ دنیا میں اس سے بہتر کوئی اور تشبیہ بھی ممکن ہے؟

اقامت حدود اللہ

کسی تعزیر یا حدود یا سزا کا تصور سلیم طبائع کے لئے خوشگوار نہیں ہوتا۔ سزا بہرحال ایک سخت دلی کا مظاہرہ نظر آتا ہے۔ لیکن اگر اسے بالکل ترک کر دیا جائے، تو دنیا سے امن و امان اٹھ جائے۔ کیونکہ بعض طبائع ایسی ہوتی ہیں کہ اگر سزا کا خوف نہ ہو، تو وہ ہر بدی کے ارتکاب پر جری ہو جائیں۔ یہ صرف تصورِ سزا ہے، جو بے شمار انسانوں کو فساد فی الارض سے روکے ہوئے ہے۔ اس کے لیے حضورؐ نے جو مثال دی ہے، وہ یہ ہے:

مثل القائم فی حدود اللہ والواقع فیها کمثل قوم استهموا	حدود اللہ کو جو نافذ کرتا ہے اور جس پر وہ نافذ ہوتی ہیں، ان دونوں

اعلیٰ سفینۃ فاصاب بعضھم اعلاھا وبعضھم اسفلھا اذا استقوا من الماء مروا علی من فوقھم فقالوا لوانا خرقنا فی نصیبنا ولم نوذ من فوقنا فان وما ارادوا ھلکوا جمیعا وان اخذوا علی ایدیھم نجوا جمیعاً ۔

(رواہ البخاری والترمذی عن نعمان بن بشیر)

کی مثال ایسی ہے جیسے کچھ لوگ ایک کشتی میں اپنی اپنی جگہیں تقسیم کر کے بیٹھ گئے ہوں۔ بعض اوپر کی منزل میں ہوں اور بعض نیچے کی منزل میں پھر نیچے والوں کو پانی کی ضرورت محسوس ہو اور اوپر والوں سے جا کر کہیں کہ اپنے والے حصے میں پانی لینے کے لیے ایک سوراخ کرنا چاہتے ہیں اور آپ کو ہم کوئی تکلیف نہیں پہنچائیں گے ایسی حالت میں اگر اوپر والے ان کو اپنا ارادہ پورا کرنے کے لئے آزادی دے دیں، تو نتیجے میں سب کے سب ہلاک ہوں گے اور اگر وہ ان کے ہاتھ پکڑ لیں، تو وہ بھی اور یہ بھی سب بچ جائیں گے۔

تلاوتِ قرآن اور اثرِ صحبت

تلاوت کرنے والوں کی قسموں کو یوں سمجھیے کہ قرآن مجید کی تلاوت کوئی کرتا ہے، کوئی نہیں کرتا۔ تلاوت کرنے والے اور نہ کرنے والے دونوں مومن متقی بھی ہو سکتے ہیں اور مومن فاسق بھی۔ ان میں سے ہر ایک کے لئے حضورؐ نے الگ الگ تشبیہیں دی ہیں۔ گویا چار تمثیلیں ہیں۔ ایک مومن قاری کی، دوسری غیر مومن قاری کی، تیسری فاسق قاری کی اور چوتھی فاسق غیر قاری کی ——— اس کے ساتھ ساتھ حضورؐ نے نیک و بد کی صحبت کے اثر کی بھی تمثیلیں بیان فرمائی ہیں۔ ارشاد ہوا :۔

مثل المومن الذی یقرأ القرآن مثل الاترج ریحھا طیب وطعمھا طیب ومثل المومن الذی لا یقرأ القرآن کمثل التمرۃ طعمھا طیب ولا ریح لھا ومثل الفاجر الذی یقرأ القرآن کمثل الریحانۃ ریحھا طیب وطعمھا مرٌ ومثل الفاجر الذی لا یقرأ القرآن کمثل الحنظلۃ طعمھا مرٌ ولا ریح لھا ومثل الجلیس الصالح کمثل صاحب المسک ان لم یصبک منہ شیء اصابک من ریحہ ومثل جلیس السوء کمثل صاحب الکیر ان لم یصبک من سوادہ اصابک من دخانہ (رواہ ابو داؤد عن انس)

جو مومن قرآن حکیم پڑھتا ہو، اس کی مثال ترنج (لیموں یا نارنگی) جیسی ہے جس کا مزہ بھی اچھا اور خوشبو بھی اچھی۔ جو مومن تلاوت قرآن پاک نہ کرتا ہو، وہ گویا چھوہارا ہے جس کا مزہ تو اچھا ہے لیکن خوشبو کوئی نہیں۔ لیکن وہ فاجر جو قرآن پڑھتا ہو، ایسا ہے جیسا ریحان (خوشبو دار پودا) جس کی مہک اچھی اور مزہ کڑوا اور جو فاجر تلاوت قرآن پاک نہ کرتا ہو، اس کی مثال حنظلہ (اندرائن) جیسی ہے جس کا مزہ کڑوا اور بو کوئی نہیں اور صالح کا ہم نشین جیسے مشک پاس رکھنے والا یعنی اگر مشک میسر نہ آئے تو بو تو آ ہی جائے گی اور بُری صحبت میں رہنے والا ایسا ہے جیسے بھٹی والا کہ اگر سیاہی سے بچ

ورنہ دھوئیں اور بو سے تو بچ سکتا ہی نہیں

حُبِ جاہ و مال

دنیا میں کون انسان ہے جسے عزت اور دولت مرغوب و محبوب نہ ہو۔ یہ چیزیں صرف مرغوب ہی نہیں بلکہ انسان ہر روز ان میں اضافہ چاہتا ہے اور کوئی مقام ایسا نہیں، جہاں یہ ہوس جا کر رک جائے۔ جب یہ محبت روح میں پیوست ہو جاتی ہے، تو زندگی کا نصب العین بن جاتی ہے اور پھر ہر فتنہ و فساد اسی سے پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انسان سیاست و مذہب کے نئے نئے روپ دھارتا ہے اور ہر راہ سے اپنا یہ مقصد حاصل کرنے کی فکر میں لگا رہتا ہے۔ ہوسِ زر ہو یا ہوسِ اقتدار دونوں انسانیت اور دین کے لیے زہر ہیں۔ اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تمثیل یوں فرمائی :۔

ما ذئبان ضاریان فی حظیرۃ یا کلان ویفسدان باضرفیھا من حب الشرف وحب المال فی دین المرء المسلم

(رواہ بزار عن ابن عمر)

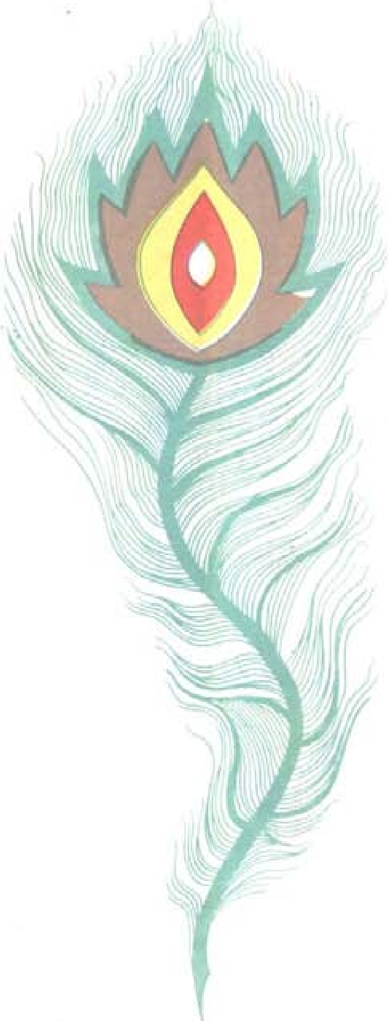
دو خونخوار بھیڑیوں کا کسی زخم کو چاٹ چاٹ کر خراب کرنا زخم کے لیے اتنا مضر نہیں جتنی مضر ایک مسلمان کے دین کے لیے حُبِ جاہ و مال ہے۔

———

وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ۝

اور نہ وہ اپنی خواہش نفسانی سے باتیں بناتے ہیں، اُن کا کلام تو تمام تر وحی ہی ہے۔

(النجم: ۴



اقوالِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم [احادیث]

اقوالِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

مرتبہ

مولانا سید محمد متین ہاشمی

سنت وحدیث اور ان کی تشریعی حیثیت

سید محمد متین ہاشمی، ڈائیکٹر مرکز تحقیق دیال سنگھ لائبریری، لاہور

لغوی معنیٰ ۔ لغت میں سنت طریق مستقیم، سیرت مستمرہ (خواہ وہ حسنہ ہو یا سیئہ) کو کہتے ہیں۔ یہ لفظ اہل عرب کے قول سنّ الماءُ سے ماخوذ ہے[1] یعنی آہستہ آہستہ اگر کسی چیز پر پانی بہایا جائے تو اس موقع پر یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ جب ایک اعرابی نے مسجد نبوی میں پیشاب کر دیا تھا، تو آپ نے اس پر ایک ڈول پانی بہایا۔ اس موقع پر حدیث میں جو جملہ استعمال ہوا ہے، وہ اس طرح ہے "فدعا بدلو من ماء فسنّه علیه" ترجمہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ڈول پانی کا منگوایا اور اس جگہ پر بہادیا۔ چونکہ چشمے اور دریا کا پانی مسلسل ایک ہی نہج پر بہتا رہتا ہے۔ اس لیے اگر کوئی عمل انسان مواظبت کے ساتھ کرتا رہے، تو اسے "اس مشابہت کی بناء پر "سنت" کہنے لگے۔

قرآن کریم میں "سنة الاولین" انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ایک مقام پر ارشاد ہوا۔

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِنَا تَبْدِيلًا[2]

ترجمہ: اور تم ہماری سُنت (طریق مستمرہ) میں کوئی تبدیلی ہرگز نہیں پاؤ گے۔

اصطلاحی معنیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے بعد علمائے اسلام نے اس لفظ کو صرف رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق اور سیرت کے لیے مخصوص کر دیا۔

آگے چل کر یہ لفظ "طریقہ محمودہ و مستقیمہ" کے معنوں میں استعمال ہونے لگا چنانچہ "اہل طریقہ محمودہ و مستقیمہ" کو "اہل السنۃ" کہنے لگے[3]

یہی سنت ہے جس کی اتباع کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مندرجہ ذیل حدیث میں حکم فرمایا ہے۔

ترکت فیکم امرین لن تضلوا ما تمسکتم بهما کتاب الله وسنة رسوله[4]

ترجمہ: میں تمہارے درمیان دو اہم چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں۔ اگر تم ان دونوں کو پکڑے رہو گے، تو ہرگز کبھی گمراہ نہ ہو گے۔ ایک تو اللہ کی کتاب اور دوسری اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنت۔

سنت اصطلاح فقہا میں فقہا کی اصطلاح میں سنت اس عمل کو کہتے ہیں جس کا جانب وجود جانب عدم کے مقابلے میں قابل ترجیح ہو اور اس کا کرنے والا مستحق ثواب ہوتا ہے۔ گو کہ سنت فرض یا واجب کے درجے میں نہیں ہوتی تاہم چونکہ سرکار صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل ہوتی ہے، اس لیے لائق اتباع اور قابل ترجیح ضرور ہو گی۔

---

[1] ابن منظور الافریقی: لسان العرب: ۱۷: ۹۲ طبع مصر ۱۳۰۳ھ [2] الکہف: ۵۵ [3] الفتح ۲۳ [4] لسان العرب: ۱۷: ۶۰

[5] ابن عبدالبر: جامع بیان العلم: ۲: ۱۱۰ طبع مصر ۱۳۴۶ھ

سنّت اصطلاحِ محدثین میں محدثین کے نزدیک سُنّت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، افعال، تقریرات، آپ کی ہیئت، صفات خَلقیہ، صفات خُلقیہ، شمائل اور ان تمام امور کو کہتے ہیں جو قبل رسالت یا بعد بعثت آپ کی طرف منسوب ہوں، خواہ ان سے کوئی حکم شرعی ثابت ہوتا ہو یا نہ ہوتا ہو۔

محدثین یہ تعریف اس لیے کرتے ہیں کہ ان کے علم کا موضوع ہر اس امر کا اثبات ہے، جو آپ سے تعلق رکھتا ہو۔[1]

سنّت اور حدیث حدیث کا لفظ بھی "السنّۃ" ہی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

علومُ الحدیث علوم الحدیث دو علوم پر مشتمل ہیں۔

(۱) علم الراویہ جس میں سلسلۂ روایت، ضبط اور ابلاغ سے بحث کی جاتی ہے۔

(۲) علم الدرایہ۔ جس میں مفہوم حدیث زیر بحث آتا ہے۔

ان دونوں سے مندرجہ ذیل شاخیں نکلی ہیں۔

(الف) علم اسماء الرجال۔ اس میں راویوں کے حالات۔ مزاج اور ان کے درجۂ ثقاہت سے بحث کی جاتی ہے۔

(ب) علم النظر فی الاسناد۔ اس میں حدیث کی سند سے بحث کی جاتی ہے۔

(ج) علم طبقات الحدیث۔ یعنی حدیث کس درجہ کی ہے اور راوی کا رتبہ کیا ہے۔

(د) علم تدوین حدیث۔ اس میں حدیثوں کے جمع کرنے کے نظام سے متعلق بحث کی جاتی ہے۔

(ہ) علم کیفیتہ الروایتہ راویوں نے کس کیفیت میں یہ حدیث روایت کی آیا اس روایت میں راوی کے جذبات کا بھی دخل ہے؟ اس علم میں اس سے بحث کی جاتی ہے۔

(و) علم الناسخ والمنسوخ۔ اس کا موضوع حدیث کی تاریخی حیثیت کا تعین اور معلوم کرنا ہے کہ کون کون سی احادیث منسوخ ہیں؟ اور کیوں منسوخ ہیں۔

(ز) علم الفاظ الحدیث اس کا موضوع محدثین کی اصطلاحات اور روایت بالمعنی کی تنقیح ہے۔

(ح) علم غریب الحدیث حدیث میں جو نامانوس الفاظ کہیں کہیں استعمال ہوئے ہیں، اُن کا صحیح محل تلاش کرنا اور یہ معلوم کرنا کہ وہ الفاظ کیوں استعمال ہوئے؟

یہ اس علم کا موضوع ہے۔

(ط) علم المؤتلف والمختلف: ایک ہی واقعہ کے سلسلے میں دو آدمیوں کو دو مختلف قسم کے احکام حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیوں دیئے؟ اس راز سے جس علم میں بحث کی جائے۔

---

[1] عباس متولی حمادہ: السنتہ النبویتہ: ۲۳: طبع مصر

(ی) علم طرق الاحادیث : اس علم کا موضوع حدیث کی روایت کے متعدد طریقوں کا پتہ چلانا اور ان میں رُونما ہونے والے جسندوی اختلافات کا تعین ہے۔

(ک) علم الجرح والتعدیل : کوئی راوی کیوں ضعیف ہے؟ اس کے اسباب کا پتہ چلانا اس علم کا موضوع ہے۔

(ل) علم الموضوعات : موضوع حدیثوں پر تنقید۔

اقسام حدیث

ذیل میں حدیث کی مختلف قسموں کا تذکرہ کیا جارہا ہے۔

صحیح : وہ حدیث ہے جس کی سند راوی سے لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک مُسلسل و متصل ہو اور کوئی راوی درمیان میں چھوٹ نہ گیا ہو۔ اس حدیث کے سب راوی سچے، یاد کے پکے اور روایت کے خلاف اسباب طعن واعتراض ہرگز نہ رکھتے ہوں۔

حسن : وہ حدیث ہے جس کے راویوں میں کسی پر جھوٹ کی تہمت نہ لگی ہو اور نہ کہیں روایت کا خلاف ہو۔ یعنی کسی دوسرے راوی نے اس سے دوسری طرح، جو خلاف اوّل ہے۔ روایت نہ کیا ہو اور حدیث حسن کی یہ بھی شرط ہے کہ اس کے راوی یاد کے پختہ ہونے میں حدیث صحیح کے راویوں سے کمتر ہوں۔ اسی بناء پر حدیث حسن کا رُتبہ حدیث صحیح کے رُتبے سے کم ہے۔

مرفوع : وہ حدیث ہے جو خاص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قول یا فعل ہو یا جسے تقریر میں آپؐ نے مقرر رکھا ہو

متصل : وہ حدیث ہے جس کی روایت و سند برابر ملی ہوئی ہو، کوئی راوی چھوٹا نہ ہو۔

مُسند : وہ حدیث ہے جس کے راویوں کے نام مذکور ہوں۔

مشہور : وہ حدیث ہے کہ محدثین کے نزدیک شائع ہو، یعنی ہر زمانے میں بہت سے راویوں نے اس کو روایت کیا ہو۔

ضعیف : وہ حدیث ہے جس کے راویوں میں سے کوئی دروغ گو یا فاسق یا کسی اور طرح سے مطعون ہو۔

موقوف : آنحضرتؐ کا وہ قول یا فعل ہے، جو کسی صحابی سے روایت کیا جائے۔ (یعنی صرف صحابی کی طرف منسوب ہو آنحضرتؐ کا اسم گرامی نہ لیا گیا ہو)

مُرسل : وہ حدیث ہے جسے کوئی تابعی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرے کہ آپؐ نے ایسا کہا یا ایسا کیا اور صحابی کا ذکر نہ کرے

منقطع : وہ حدیث ہے جس کی سند برابر متصل نہ ہو۔ شروع سے، درمیان سے یا اخیر سے کوئی راوی چھوٹ گیا ہو۔ مگر منقطع اکثر اس روایت کو کہا جاتا ہے، جسے کوئی تبع تابعی صحابی سے روایت کرے اور تابعی کا ذکر نہ کرے۔

معضل : وہ حدیث ہے جس کی سند میں سے دو یا زیادہ راوی چھوٹ گئے ہوں۔

مضطرب : وہ حدیث ہے جس میں روایات مختلف ہوں۔ کوئی کسی طرح روایت کرے اور کوئی کسی طرح۔ سب کے الفاظ یکساں اور متحد نہ ہوں

غریب : وہ حدیث ہے جس کی روایت میں کسی جگہ ایک راوی اکیلا ہو اور اگر ہر زمانے میں اکیلا ہو گا، تو وہ "فرد" کہلاتی ہے۔

متواتر : وہ حدیث ہے کہ اس کے راوی ہر زمانے میں کثرت سے موجود ہوں اور ان کا اتفاق جھوٹ پر عادۃً محال ہو۔

مُنکر: اس حدیث کو کہتے ہیں جسے کوئی شخص دیگر لوگوں کی روایت کے خلاف بیان کرے۔ اس کو "شاذ" بھی کہتے ہیں۔

معلق: اس حدیث کو کہتے ہیں جس کی سند کے شروع میں سے ایک یا زیادہ راوی چھوڑ دیے جائیں۔ اس فعل کو "تعلیق" کہتے ہیں۔

تدلیس، "مدلّس": علم حدیث میں اس فعل کو کہتے ہیں کہ راوی جس شخص سے روایت کرے، اس سے ملاقات کی ہو یا وہ اس کا ہم عصر ہو مگر اس سے اس روایت کو سُنا نہ ہو اور ایسے الفاظ بیان کرے جن سے یہ وہم ہوتا ہو کہ سُنا ہوا بیان کرتا ہے۔ ایسی حدیث کو "مدلّس" کہتے ہیں۔

معلل: وہ حدیث ہے کہ بظاہر تو عیب سے پاک معلوم ہو مگر اس میں طعن و اعتراض کے پوشیدہ اسباب پائے جاتے ہوں۔

مُدرج: وہ حدیث ہے جس میں کسی راوی کا اپنا کلام بھی درج ہو جائے اور گمان ہو کہ یہ کلام بھی حدیث ہی ہے یا دو حدیثوں کے دو متن جو دو اسناد سے مروی ہوں، انہیں ایک ہی سند سے روایت کیا جائے۔

موضوع: وہ مصنوعی حدیث ہے جو کسی نے خود بنا کر آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی طرف یا صحابہ کی طرف سے منسوب کر دی ہو کہ یہ فلاں صحابی سے مروی ہے۔

مختصر تاریخ حدیث

حدیث کی حفاظت اور تدوین کا کام آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے دور ہی میں شروع ہو گیا تھا، لہٰذا جن لوگوں نے کہا ہے کہ "تدوین حدیث کا کام ایک سو سال کے بعد شروع ہوا" وہ غلط کہتے ہیں۔ صحیح بخاری شریف میں حضرت ابوہریرہؓ کا قول موجود ہے۔ عبداللہ بن عمرو بن العاص کے سوا مجھ سے زیادہ کسی کو حدیث یاد نہیں ہے کیونکہ وہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم سے جو کچھ سنتے تھے لکھ لیتے تھے، اور میں لکھتا نہیں تھا۔[1]

ابوداؤد شریف میں ہے۔

> بعض لوگوں نے حضرت عبداللہؓ سے کہا کہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کبھی غصہ میں ہوتے اور کبھی خوشی میں اور تم سب کچھ لکھتے جاتے ہو، تو انہوں نے لکھنا چھوڑ دیا اور اس بات کا ذکر حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم سے بھی کر دیا، تو آپ نے ارشاد فرمایا: "تم لکھ لیا کرو" اور زبان مبارک کی طرف اشارہ فرما کر فرمایا: "اس سے جو کچھ نکلتا ہے، حق نکلتا ہے۔"[2]

حضرت عبداللہؓ بن عمروؓ نے اپنے تحریر کردہ مجموعۂ احادیث کا نام "صادقہ" رکھا تھا۔[3]

فتح مکہ کے موقع پر اپنے خطبہ میں حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے دیگر اہم ترین امور کے بیان کے ساتھ ساتھ احکام بھی ذکر فرمائے،

---

[1] بخاری: ۱ : ۷ ۹ حدیث نمبر ۱۰۷۔ طبع قاہرہ ۱۳۸۶ھ / دارمی ۱ : ۱۲۵ طبع دمشق ۱۳۴۹ھ [2] سلیمان بن اشعث ابوداود: سنن ابی داود: ۲ : ۵۱۳، ۵۱۴ طبع کانپور / دارمی: ۱ : ۱۲۵ طبع دمشق ۱۳۴۹ھ [3] ابن سعد: ۲ : ۳۷۲ طبع بیروت ۱۹۵۷ء

تو ابوشاہ یمنی نے درخواست کی کہ یہ احکام لکھوا کر مجھے دیے جائیں، تو آپ نے لکھوا کر عنایت فرمائے [۱]
ابوبکر صدیقؓ نے زکوٰۃ کے احکام لکھوا کر آپ نے خود عاملوں کو بھجوائے تھے [۲]
حضرت عمرو بن حزمؓ کو جب آپ نے یمن کا حاکم بنا کر بھیجا، تو صدقات، دیات اور فرائض سے متعلق احکام لکھوا کر ان کے حوالہ فرمائے [۳]

ان روایات سے کم از کم یہ بات تو ثابت ہو گئی کہ تحریری صورت میں جمع و تدوین کا کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک ہی میں شروع ہو چکا تھا، البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ باقاعدہ تالیفی صورت میں یہ کام نہیں ہوا تھا۔
تالیفات کی ابتداء ابن جریج سے ہوئی۔ پھر امام مالکؒ نے موطا لکھی۔ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز (م ۱۰۱ھ) نے اپنے دور خلافت میں سرکاری طور پر باقاعدہ حدیث لکھنے کے احکام جاری کیے۔ کتب عمر بن عبد العزیز الی ابی بکر بن حزم انظر ما کان من حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاکتبہ فانی خفت دروس العلم وذھاب العلماء ولا تقبل الا حدیث النبی صلی اللہ علیہ وسلم ولیفشوا العلم ولیجلسوا حتی تعلم من لا یعلم فان العلم لا یھلک حتی یکون سراً [۴]

ترجمہ: حضرت عمر بن عبدالعزیز نے (عامل مدینہ) ابوبکر بن حزم کو لکھا۔ دیکھو! حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جو حدیثیں تمہیں ملیں، انہیں لکھ لو۔ کیونکہ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں علم دین مٹ نہ جائے اور عالم چل بسیں اور ہاں! صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں لکھنا اور عالموں کو چاہیے کہ علم پھیلائیں اور تعلیم دینے کے لیے بیٹھا کریں، تاکہ جاہل لوگ ان سے علم حاصل کریں کیونکہ علم اگر پوشیدہ رہ جائے تو رفتہ رفتہ مٹ جاتا ہے
سعید بن ابراہیم روایت کرتے ہیں کہ:
امرنا عمر بن عبد العزیز بجمع السنن فکتبناھا دفتراً دفتراً فبعث الی کل ارض لہ دفتراً [۵]
ترجمہ: ہمیں عمر بن عبدالعزیز نے احادیث جمع کرنے کا حکم دیا اور ہم نے دفتر دفتر حدیثیں لکھیں۔ انہوں نے ان دفاتر کو تمام ممالک محروسہ میں بصورت مجموعہ بھیجا۔

دورِ تابعین
صحابہؓ کے دور میں بہت سے تابعین تھے جو صحابہؓ سے حدیثیں سن کر لکھ لیا کرتے تھے۔
حضرت سعید بن جبیر حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عبداللہ بن عباس سے حدیثیں سن کر لکھتے تھے [۶]
حضرت نافع حضرت ابن عمرؓ کے غلام تھے اور ان سے روایت نقل کرتے تھے۔
حضرت ابن مسعودؓ کے صاحبزادے حضرت عبدالرحمن ایک کتاب نکال کر لائے اور انہوں نے قسم کھا کر کہا کہ یہ انہی کی لکھی ہوئی احادیث ہیں۔ مشہور تابعی محدث یہ ہیں:

---

[۱] بخاری: ۱: ۹۶ حدیث ۱۰۳ طبع قاہرہ ۱۳۸۶ھ [۲] دار قطنی: ۱: ۲۰۸، ۲۰۹ طبع دہلی۔
[۳] علی متقی ہندی: کنز العمال: ۳۔ [۴] بخاری: ۱: حدیث ۹۵ طبع قاہرہ ۱۳۸۶ھ
[۵] ذہبی: تذکرۃ الحفاظ: ۱: ۱۰۶ بحوالہ علم الحدیث العملی [۶] سنن دارمی: ۱: ۱۲۷، طبع دمشق ۱۳۴۹ھ

سعید بن جبیر، ہشام بن عروہ۔ محمد بن شہاب زہری، عطا ابن ربا؟ ابوالزناد، طاؤس، مکحول مجاہد۔ قیس بن ابی حازم۔ اسود رحمہم اللہ اجمعین۔

دورِ تبع تابعین یوں تو تابعین کے دور ہی سے حدیث کی کتابوں کی تالیف شروع ہوگئی تھی۔ چنانچہ ابن جبیر اور زہری نے کتابیں لکھنا شروع کر دیا تھا، تاہم تبع تابعین کے دور میں یہ شوق بہت بڑھ گیا اور بعض نے مسانید کے انداز میں، بعض نے حروفِ تہجی کے اعتبار سے بعض نے فقہی طرز پر اور بعض نے صرف عبادات پر کتابیں لکھیں۔ اس دور کے بعد تو یہ صورت ہوگئی کہ ایک ایک محدث کے درس میں ایک ایک لاکھ طالبانِ علمِ حدیث کا مجمع ہوتا۔ مسند امام احمد۔ مسند ابن ابی شیبہ اور مسند امام شافعی اسی دور کی یادگار کتابیں ہیں۔

اس کے بعد صحاح ستہ کا دور آیا، اور صحیح بخاری شریف و صحیح مسلم شریف جیسی کتابیں تالیف ہوئیں۔

حدیث کی چند مستند اور مشہور کتابیں موطا، بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ، نسائی، مستدرک حاکم، دارمی، مسند احمد، دارقطنی، بیہقی، رزین، صحیح ابن حبان، صحیح ابن خزیمہ، صحیح ابن عوانہ، منتقی ابن جارود مختارہ ابن ضیاء الدین المقدسی، طحاوی، مسند امام شافعی مصنف ابن ابی شیبہ۔ مصنف عبدالرزاق، جامع سفیان ثوری، جامع ابن المبارک، جامع جریر ابن عبدالحمید، جامع معمر، جامع حماد بن مسلم، جامع اوزاعی جامع ابن جریج، مسند حمیدی، مسند ابن ابی عاصم، مسند اسحاق ابن راہویہ، مسند علی بن المدینی، مسند دارمی، مسند ابی لیلیٰ، مسند کبیر بخاری، معجم کبیر، صحیح ابن ابی حاتم، معجم اوسط، موطا امام محمد، معجم صغیر، وغیرہ

نامقبول رواۃ مندرجہ ذیل قسم کے راویوں کی روایت رد کر دی جائے گی۔

(۱) جو شخص جھوٹ بولتا ہو (۲) وضع حدیث کا اس پر شبہ ہو (۳) اس کے مزاج پر وہم غالب ہو (۴) حدیث کا مطلب سمجھنے میں غلطی کرتا ہو (۵) بدعتی ہو (۶) روایت کے معنی یا الفاظ میں تحریف کرتا ہو (۷) غیر معروف ہو۔

راوی کے امتیازات و خصائص (۱) بیان کرنے والا معتمد علیہ ہو (۲) جو واقعہ بیان کرے وہ ممکن الوقوع ہو (۳) مبالغہ کرنے کی عادت نہ ہو (۴) رفتار اور گفتار قابلِ اعتراض نہ ہو (۵) حافظہ اور فہم میں فرق نہ آیا ہو۔ (۶) جاہل نہ ہو (۷) محتاط ہو اور سند متصل سے روایت کرے (۸) جس آخری شخص سے روایت کرے وہ خود واقعہ میں شریک رہا ہو (۹) اس میں آخری شخص کے مقصود کو سمجھنے کی صلاحیت ہو (۱۰) کسی خاص اثر یا تعصب کے تحت روایت نہ کرتا ہو (۱۱) تنقیح روایت میں سہل انگاری سے کام نہ لیتا ہو[۱]

مشتبہ احادیث مندرجہ ذیل احادیث مشتبہ قرار دی جائیں گی۔

۱۔ وہ حدیث جو عقل رشید کے خلاف ہو۔

۲۔ مشاہدہ کے خلاف ہو۔

۳۔ قرآن کے خلاف ہو۔

---

[۱] مقدمہ نووی، ص ۱۷، طبع دہلی

۴ - حدیث متواتر کے خلاف ہو
۵ - اجماعِ قطعی کے خلاف ہو
۶ - جو اصول سے موافقت نہ رکھتی ہو۔
۷ - جس میں معمولی سے گناہ پر سخت عذاب کی خبر دی گئی ہو۔
۸ - معمولی سے کارِ خیر پر بڑے بڑے انعام کا وعدہ کیا گیا ہو۔
۹ - سلسلہ روایت یا مضمون حدیث قابلِ اعتراض ہو۔
۱۰ - اکیلا ایک شخص کسی ایسے راوی سے روایت بیان کر رہا ہو جس سے اس کا لقاء ثابت نہ ہو۔
۱۱ - روایت میں کوئی ایسی بات ہو جس کے جھوٹ ہونے کی ایک ایسی بڑی جماعت تصریح کر رہی ہو جس کا جھوٹ پر متفق ہونا ممتنع ہو۔
۱۲ - سلسلہ سند میں کوئی ایک راوی بھی ایسا ہو جس کا مدت العمر میں ایک مرتبہ بھی جھوٹ ثابت ہو گیا ہو۔ اس کی کوئی بھی روایت باجماع محدثین معتبر نہیں ہوگی۔
۱۳ - جس زمانے کی روایت بیان کرے وہ تاریخی شہادت کے صریح خلاف ہو، مثلاً حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا جنگِ صفین میں شریک ہونا، کیونکہ اُن کی وفات حضرت عثمانؓ ہی کے زمانۂ خلافت میں ہو چکی تھی۔
۱۴ - حدیث کسی ایسے معروف و مشاہد واقعہ کو بیان کر رہی ہو، جو وقوع پذیر ہوتا، تو ہزاروں اس کے روایت کرنے والے ہوتے، مگر روایت صرف ایک شخص کرے۔
۱۵ - واضع حدیث خود وضع حدیث کا اعتراف کرے جیسا کہ نوح بن عصم نے اقرار کیا کہ "میں نے ایک ایک سورت کی فضیلت میں حدیثیں وضع کی ہیں"۔[۲]

سُنّت کی تشریعی حیثیت

جس طرح ایمان باللہ فرض ہے، اسی طرح ایمان بالرسول بھی فرض ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ کا ہر حکم (جو قرآن میں مذکور ہے) واجب العمل ہے، اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر حکم (جو صحیح حدیث سے ثابت ہے) واجب العمل ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی نبوی حیثیت میں مطاع مطلق ہیں، اس بات پر اولین و آخرین کا اجماع ہے۔

ارشاداتِ ربانی

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ [۳]

ترجمہ: اور ہم نے کسی رسول کو نہیں بھیجا مگر اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔

۲ - فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا [۱]

---

[۱] ابن الجوزی: فتح المغیث (ملخصاً)، ۱۱۴ طبع لکھنؤ [۲] مولانا ادریس کاندھلوی: حجیتِ حدیث: ۹۲-۹۳

[۳] النساء - ۶۴

ترجمہ: پس قسم ہے آپ کے رب کی وہ لوگ ہرگز ایماندار نہ ہوں گے جب تک اپنے معاملات میں آپ کو فیصلہ کن نہ بنالیں، پھر آپ کے فیصلوں سے دلوں میں کوئی تنگی نہ محسوس کریں اور اچھی طرح سرِ تسلیم خم کر دیں۔

۳۔ لقد کان لکم فی رسول اللّٰہ اسوۃ حسنۃ لمن کان یرجوا اللّٰہ والیوم الآخر و ذکر اللّٰہ کثیرا [۲]

ترجمہ: تمہارے لیے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں بہترین نمونۂ عمل ہے۔ یہ اس کے لیے ہے جو اللہ اور یوم آخرت سے ڈرتا ہے اور اللہ کو بہت زیادہ یاد کرتا ہے۔

۴۔ وما کان لمومن ولا مومنۃ اذا قضی اللّٰہ ورسولہ امرا ان یکون لھم الخیرۃ من امرھم ومن یعص اللّٰہ ورسولہ فقد ضل ضلالا بعیدا [۳]

ترجمہ: کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو یہ حق نہیں کہ جب اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کسی معاملے میں کوئی فیصلہ کر دیں، تو وہ اس میں چون و چرا کر سکیں اور جس نے اللہ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی، تو وہ کھلا گمراہ ہو گیا۔

۵۔ اطیعوا اللّٰہ واطیعوا الرسول [۴]

ترجمہ: اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی۔

۶۔ ومن یطع اللّٰہ ورسولہ فقد فاز فوزا عظیما [۵]

ترجمہ: اور جو اطاعت کرے اللہ کی اور اس کی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی۔ اس نے بہت بڑی کامیابی حاصل کر لی۔

۷۔ مومنوں کی پہچان بتلاتے ہوئے ارشاد ہوا۔

ویطیعون اللّٰہ ورسولہ [۶]

ترجمہ: وہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تابعداری کرتے ہیں۔

۸۔ حکم دیا گیا: یاایھا الذین آمنوا اطیعوا اللّٰہ ورسولہ

اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی۔

۹۔ ومن یطع الرسول فقد اطاع اللّٰہ [۱]

اور جس نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

۱۰۔ آپؐ قرآن کے مبین، شارح اور معلم ہیں، لہٰذا آپ کا فرمان درحقیقت شرح و بیان قرآن ہے۔

وما انزلنا علیک الکتاب الا لتبین لھم [۲]

ترجمہ: اور ہم نے صرف اس لیے آپ پر قرآن کو اتارا ہے کہ آپ لوگوں کے سامنے اسے کھول کھول کر بیان کریں۔

---

[۱] النساء۔ ۶۵ [۲] الاحزاب: ۲۱۔

[۳] الاحزاب: ۳۶ [۴] النساء: ۵۹

[۵] الاحزاب: ۷۱ [۶] التوبہ: ۷۱

۱۱- قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰهُ وَیَغْفِرْلَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ [۳]

ترجمہ: آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو، تو میری اتباع کرو۔ اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہوں کو بخش دے گا۔

یہ اور اس طرح کی سینکڑوں آیات قرآن کریم میں موجود ہیں جن سے صریحاً نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مطاع ہونے کا ثبوت ملتا ہے، لہٰذا آپ کے اقوال و افعال و تقریرات کو تشریع اسلامی میں قرآن کریم کے بعد اولین حیثیت حاصل ہے۔ مذکورہ بالا آیات سے واضح ہو چکا ہوگا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد یہی تھا کہ آیات کی تلاوت فرمائیں۔ پھر ان کی اپنے عمل و قول سے توضیح فرمائیں، حدیث درحقیقت آپ کی اسی توضیح و تشریح کا نام ہے۔ کسی صحابی نے حضرت عائشہ صدیقہؓ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کے بارے میں دریافت کیا، تو آپ نے فرمایا کہ کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا ہے؟ کان خلقه القرآن یعنی قرآن ہی آپ کا اخلاق تھا۔

پوری حیات طیبہ میں آپؐ کا ایک لمحہ بھی خلاف قرآن نہیں گزرا۔ قرآن میں وہی ہے جو آپ کا عمل تھا اور آپ کا عمل وہی تھا، جو قرآن میں ہے، اس لیے اگر میں یہ کہہ دوں کہ قرآن دو نازل ہوئے، ایک وہ قرآن جو بین الدفتین ہمارے ہاتھوں میں موجود و مکتوب ہے، دوسرا وہ جو وادی ام القریٰ میں ۱۲ ربیع الاوّل کو بطن آمنہ سے ہویدا ہوا تریسٹھ سال زندگی گزاری اور آج گنبد خضراء کے سایے تلے آرام فرما ہے، تو غلط نہ ہوگا۔

اسلامی تشریع کے کسی بھی مرحلے میں اگر سنت مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے ادنیٰ سا بھی اغماض برتا گیا، تو ہم ضلالت و ذلت کے ایسے گورکھ دھندے میں پھنس کر رہ جائیں گے کہ پھر قیامت تک اس سے نہ نکل سکیں گے۔ انکارِ حدیث کا فتنہ کوئی نیا فتنہ نہیں ہے۔ خود مخبر صدق مجسم صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی پیش گوئی فرما دی تھی۔ اسے پڑھیے اور لفظ لفظ پر اپنے آقا و مولا (صلی اللہ علیہ وسلم) کی صداقت پر گواہی دیجئے۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّآلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِیْن

عن المقدام بن معدیکرب قال قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم الا انی اوتیت القرآن ومثله معه الا یوشک رجل شبعان علی اریکته یقول علیکم بهذا القرآن فما وجدتم فیه من حلال فاحلوه وما وجدتم فیه من حرام فحرموه وان ما حرم رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم کما حرم اللّٰه - الخ [۴]

حضرت مقدام بن معدیکرب روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

سن لو! مجھے قرآن مجید دیا گیا اور اس کے ساتھ اس کی مثل (حدیث)، عنقریب ایک پیٹ بھرا آدمی اپنے نرم بستر پر بیٹھا کہے گا:

تمہارے اوپر بس یہی قرآن لازم ہے۔ اس میں جو چیز حلال پاؤ، اسے حلال سمجھو اور جو حرام پاؤ اسے حرام سمجھو۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی (بعض چیزوں کو) حرام قرار دیا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا۔

---

[۱] النساء: ۸۰ [۲] النحل: ۴۴ [۳] آل عمران: ۳۱

[۴] ولی الدین محمد بن عبد اللہ، مشکوٰۃ المصابیح ص ۲۹ طبع ایچ ایم سعید کمپنی کراچی ۱۳۹۹ھ

اِعتقادات

نیّت :

۱ - إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَا نَوٰى فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى اللّٰهِ وَرَسُولِهِ فَهِجْرَتُهُ إِلَى اللّٰهِ وَرَسُولِهِ وَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى الدُّنْيَا يُصِيبُهَا أَوْ امْرَأَةٍ يَنْكِحُهَا فَهِجْرَتُهُ إِلَى مَا هَاجَرَ إِلَيْهِ ۔ (الخمسة)

اعمال کے نتیجے نیت پر منحصر ہیں، اور ہر ایک مرد کے واسطے وہی ہے جو اس نے نیت کی۔ پس جس نے اللہ اور اس کے رسولؐ کے واسطے ہجرت کی پس اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسولؐ کے لیے ہوگی اور جس نے دنیا کے فائدے ہی کی خاطر ہجرت کی کہ اسے وہ میسر ہو یا کسی عورت سے نکاح کرنے کی غرض سے۔ پس اس کی ہجرت اسی کے واسطے ہوئی جس کے واسطے اس نے کی۔

ایمان ۔ اسلام ۔ اعتصام (مضبوط پکڑنا) اقتصاد (میانہ روی) :

۲ - يُخْرَجُ مِنَ النَّارِ مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنْ إِيمَانٍ ۔ (الترمذی)

وہ شخص جس کے دل میں ذرہ بھر ایمان ہوگا۔ دوزخ سے نکالا جائے گا۔

۳ - عَجَبًا لِأَمْرِ الْمُؤْمِنِ إِنَّ أَمْرَهُ كُلَّهُ لَهُ خَيْرٌ وَلَيْسَ ذٰلِكَ لِأَحَدٍ إِلَّا لِلْمُؤْمِنِ إِنْ أَصَابَتْهُ سَرَّاءُ شَكَرَ فَكَانَ خَيْرًا وَإِنْ أَصَابَتْهُ ضَرَّاءُ صَبَرَ فَكَانَ خَيْرًا ۔ (مسلم)

ایمان دار آدمی کا معاملہ بھی عجیب ہے کہ اس کا ہر ایک کام اچھا ہے۔ اور یہ بات سوائے ایمان دار آدمی کے اور کسی کو میسر نہیں۔ اُسے جب خوشی حاصل ہوتی ہے تو وہ شکر کرتا ہے اور شکر کرنا خیر ہے اور اگر اُسے دُکھ پہنچتا ہے، تو صبر کرتا ہے اور یہ بھی خیر ہے۔

۴ - إِنَّ فِيكَ خَصْلَتَيْنِ يُحِبُّهُمَا اللّٰهُ تَعَالَى الْحِلْمُ وَالْأَنَاةُ ۔ (الخمسة)

تیری دو خصلتیں ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے، ایک حلم اور دوسرا وقار (یعنی جلد باز نہ ہونا، اور آہستگی اختیار کرنا)۔

۵۔ خدا اور بندے کا ایک دوسرے پر کیا حق ہے؟

(معاذؓ بن جبل) کنت ردف رسول الله صلی الله علیه وسلم علی حمار یقال له عفیر فقال یا معاذ هل تدری ما حق الله علی عباده وما حق العباد علی الله؟ قلت: الله ورسوله اعلم قال فان حق الله علی العباد ان یعبدوه ولا یشرکوا به شیئا وحق العباد علی الله ان لا یعذب من لا یشرک به شیئًا فقلت: یا رسول الله افلا ابشر الناس؟ قال لا تبشرهم فیتکلوا (شیخین، ترمذی الا التبشیر)

معاذ بن جبل فرماتے ہیں کہ رسول خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی سواری (عفیر نامی) پر مجھے اپنے ہمراہ بٹھا کر فرمایا: معاذ تم جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ اور بندے کا ایک دوسرے پر کیا حق ہے؟ میں نے عرض کیا: اس کا علم تو اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو زیادہ ہے! فرمایا: اللہ کا حق بندوں پر ایسی عبادت ہے جس کے ساتھ شرک کی آمیزش نہ ہو۔ اور بندے کا حق اللہ تعالیٰ پر یہ ہے کہ اگر بندہ شرک سے پاک ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر عذاب نہ کرے۔ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) لوگوں کو میں یہ بشارت نہ پہنچا دوں؟ فرمایا: ایسا نہ کرو، ورنہ وہ اسی پر بھروسہ کر بیٹھیں گے۔

۶۔ شفاعت کا سب سے زیادہ حق دار:

(ابو ھریرۃؓ) قلت: یا رسول الله من اسعد الناس بشفاعتک یوم القیامة؟ قال لقد ظننت ان لا یسألنی عن هذا احد اول منک لما رأیتک من حرصک علی الحدیث اسعد الناس بشفاعتی یوم القیامة من قال لا اله الا الله خالصًا مخلصا من قلبه۔ (البخاری)

ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)! قیامت کے روز آپ کی شفاعت کا سب سے زیادہ مستحق کون ہوگا؟

فرمایا: ابوہریرہ! حدیث سے جس طرح کا شغف تمہیں ہے۔ اس کے پیشِ نظر یہی گمان تھا کہ تم سے پہلے کوئی دوسرا یہ سوال نہ کرے گا۔ اِس روز میری شفاعت کا سب سے زیادہ حق دار شخص وہ ہوگا جس نے صدقِ دل سے "لا الٰہ الا اللہ" کا اقرار کیا ہو۔

۷۔ سچے اور جھوٹے کلمہ گو کا صلہ:

(عیاضؓ الانصاری) رفعه: ان

اللہ تعالیٰ کے نزدیک لا الٰہ الا اللہ بہت مؤقر کلمہ ہے

لا الٰہ الا اللہ کلمۃ علی اللہ کریمۃ لھا عند اللہ مکان من قالھا صادقا ادخلہ اللہ بھا الجنۃ ومن قالھا کاذبا حقنت دمہ واحرزت مالہ ولقی اللہ غدا فحاسبہ۔ (میزان)

جس کا اللہ تعالیٰ کے ہاں خاص مقام ہے اسے سچے دل سے کہنے والے پر جنت واجب ہے اور جھوٹے دل سے اس کا اقرار کرے گا۔ اُسے صرف یہ فائدہ پہنچے گا کہ اُس کا خون حرام ہوگا، اور اس کا مال محفوظ رہے گا، اور کل قیامت کے دن جب وہ اللہ تعالیٰ سے ملے گا تو وہ اس کا حساب کتاب فرمائے گا۔

۸ ۔ کلماتِ زبان کا انجام :

(معاذؓ)...... الا اخبرک برأس الامر کلہ وعمودہ وذروۃ سنامہ؟ قلت: بلی یا رسول اللہ قال رأس الامر الاسلام وعمودہ الصلوٰۃ وذروۃ سنامہ الجھاد ثم قال الا اخبرک بملاک ذلک کلہ؟

اے معاذؓ......... میں تمہیں بتا نہ دوں کہ: چوٹی کی بات کیا ہے اور اس کا ستون کیا اور کوہان؟ عرض کیا، یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ضرور۔ فرمایا: چوٹی کی بات تو ہے اسلام، اس کا ستون ہے نماز، اور (اس کی) کوہان ہے جہاد۔

قلت: بلی یا رسول اللہ قال کف علیک ھذا واشار الی لسانہ قلت: یا نبی اللہ وانا لمؤاخذون بما نتکلم بہ؟ قال ثکلتک امک یا معاذ وھل یکب الناس فی النار علی وجوھھم او قال الی مناخرھم الا حصائد السنتھم۔ (ترمذی)

پھر فرمایا کہ: ان تمام باتوں کا نچوڑ نہ بتا دوں؟ میں نے عرض کیا ضرور،

حضور پُر نور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان مبارک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

اے معاذؓ......... اس پر قابو رکھو۔ عرض کیا: اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کیا ہماری گفتگو پر بھی مواخذہ ہوگا۔؟

فرمایا:

تیری عقل پر پتھر پڑیں۔ لوگوں کو صرف کلماتِ زبان ہی کی وجہ سے تو آگ میں منہ کے بل جھونکا جائے گا۔

جنتی اور جہنمی فرقہ

۹ - عَنْ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيَاْتِيَنَّ عَلٰى اُمَّتِيْ كَمَا اَتٰى عَلٰى بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ حَتّٰى اِنْ كَانَ مِنْهُمْ مَنْ اَتٰى اُمَّهٗ عَلَانِيَةً لَكَانَ فِيْ اُمَّتِيْ مَنْ يَصْنَعُ ذٰلِكَ وَاِنَّ بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ تَفَرَّقَتْ عَلٰى ثِنْتَيْنِ وَسَبْعِيْنَ مِلَّةً وَتَفْتَرِقُ اُمَّتِيْ عَلٰى ثَلٰثٍ وَسَبْعِيْنَ مِلَّةً كُلُّهُمْ فِي النَّارِ اِلَّا مِلَّةً وَاحِدَةً قَالُوْا مَنْ هِيَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ مَا اَنَا عَلَيْهِ وَاَصْحَابِيْ -

(ترمذی - مشکوٰۃ)

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا کہ میری اُمت پر ایک زمانہ ضرور ایسا آئے گا جیسا کہ بنی اسرائیل پر آیا تھا۔ بالکل ہو بہو ایک دوسرے کے مطابق یہاں تک کہ بنی اسرائیل میں سے اگر کسی نے اپنی ماں سے علانیہ بدفعلی کی ہوگی تو میری اُمت میں ضرور کوئی ہوگا جو ایسا کرے گا اور بنی اسرائیل بہتر مذہبوں میں بٹ گئے تھے۔ اور میری اُمت تہتر مذہبوں میں بٹ جائے گی۔ ان میں ایک مذہب والوں کے سوا باقی تمام مذاہب والے ناری اور جہنمی ہوں گے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) وہ ایک مذہب والے کون ہیں؟ (یعنی ان کی پہچان کیا ہے؟) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ لوگ اسی مذہب و ملت پر قائم رہیں گے جس پر میں ہوں، اور میرے صحابہ ہیں۔

۱۰ - عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ خَطَّ لَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ قَالَ هٰذَا سَبِيْلُ اللّٰهِ ثُمَّ خَطَّ خُطُوْطًا عَنْ يَمِيْنِهٖ وَعَنْ شِمَالِهٖ وَقَالَ هٰذِهٖ سُبُلٌ عَلٰى كُلِّ سَبِيْلٍ مِنْهَا شَيْطَانٌ يَدْعُوْا اِلَيْهِ وَقَرَاَ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ -

(- الآیۃ)

(احمد، نسائی، دارمی، مشکوٰۃ)

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ سرکارِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں سمجھانے کے لیے ایک (سیدھی) لکیر کھینچی پھر فرمایا کہ یہ اللہ کا راستہ ہے۔ پھر اس سیدھے خط کے دائیں بائیں اور چند لکیریں کھینچ کر فرمایا کہ یہ بھی راستے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک راستہ پر شیطان بیٹھا ہوا ہے جو اپنی طرف بلاتا ہے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی۔ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ۔ (پارہ ۸۔ رکوع ۶) یعنی یہ میرا سیدھا راستہ ہے تو اسی پر چلو اور دوسری راہوں پر نہ چلو کہ وہ تمہیں اس

سیدھی راہ سے جدا کر دیں گی۔

۱۱۔ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَكُوْنُ فِیْ اٰخِرِ الزَّمَانِ دَجَّالُوْنَ كَذَّابُوْنَ یَاْتُوْنَكُمْ مِنَ الْاَحَادِیْثِ بِمَا لَمْ تَسْمَعُوْا اَنْتُمْ وَلَا اٰبَاؤُكُمْ فَاِیَّاكُمْ وَاِیَّاهُمْ لَا یُضِلُّوْنَكُمْ وَلَا یَفْتِنُوْنَكُمْ۔ (مسلم، مشکوٰۃ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا کہ آخری زمانہ میں (ایک گروہ) فریب دینے والوں اور جھوٹ بولنے والوں کا ہوگا۔ وہ تمھارے سامنے ایسی باتیں لائیں گے جن کو تم نے کبھی سنا ہوگا نہ تمھارے باپ دادا نے۔ تو ایسے لوگوں سے بچو اور انھیں اپنے قریب نہ آنے دو تاکہ وہ تمھیں گمراہ نہ کریں اور نہ فتنہ میں ڈالیں۔

بدمذہب

۱۲۔ عَنْ اِبْرَاهِیْمَ بْنِ مَیْسَرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ وَقَّرَ صَاحِبَ بِدْعَةٍ فَقَدْ اَعَانَ عَلٰى هَدْمِ الْاِسْلَامِ۔ (مشکوٰۃ)

حضرت ابراہیم بن میسرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا کہ جس نے بدعتی کی تعظیم و توقیر کی تو اس نے اسلام کے ڈھانے پر مدد دی۔

۱۳۔ عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا رَاَیْتُمْ صَاحِبَ بِدْعَةٍ فَاكْفَهِرُّوْا فِیْ وَجْهِهٖ فَاِنَّ اللّٰهَ یُبْغِضُ كُلَّ مُبْتَدِعٍ۔ (ابن عساکر)

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا کہ سرکارِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم کسی بدعتی کو دیکھو تو اس کے سامنے ترشروئی سے پیش آؤ اس لیے کہ خدا تعالیٰ ہر بدعتی کو دشمن رکھتا ہے۔

۱۴۔ ثَلٰثٌ مَنْ فَعَلَهُنَّ فَقَدْ طَعِمَ طَعْمَ الْاِیْمَانِ مَنْ عَبَدَ اللّٰهَ تَعَالٰى وَحْدَهٗ وَعَلِمَ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَعْطٰى زَكٰوةَ مَالِهٖ طَیِّبَةً بِهَا نَفْسُهٗ رَافِدَةً عَلَیْهَا كُلَّ عَامٍ وَلَمْ یُعْطِ الْهَرِمَةَ وَلَا الدَّرِنَةَ وَلَا الْمَرِیْضَةَ

تین کام ایسے ہیں کہ جس نے وہ کیے اس نے ضرور ایمان کا مزہ چکھا (۱) صرف خدا ہی کی عبادت کی (۲) خدا کے سوا کسی کو معبود نہ سمجھا۔ (۳) اور ہر سال اپنے مال کی مقررہ زکوٰۃ رضا و رغبت سے ادا کی اور بوڑھا، بیمار، نکمّا یا چھوٹا جانور (اپنے ریوڑ یا گلّے میں سے) نہیں بلکہ اوسط درجے کا مال زکوٰۃ میں دیا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ یہ نہیں چاہتا

وَلَا الشَّرَطَ اللَّئِيْمَةَ وَلٰكِنْ مِنْ وَسَطِ اَمْوَالِكُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَمْ يَسْأَلْكُمْ خَيْرَهٗ وَلَمْ يَاْمُرْكُمْ بِشَرِّهٖ۔ (ابوداؤد)

کہ تم اپنا اچھا مال دے ڈالو، مگر ناقص دینے کا بھی حکم نہیں دیتا۔

۱۵۔ عَنْ سُفْيَانَ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ الثَّقَفِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قُلْ لِّيْ فِي الْاِسْلَامِ قَوْلًا لَا اَسْاَلُ عَنْهُ اَحَدًا بَعْدَكَ قَالَ قُلْ اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ ثُمَّ اسْتَقِمْ (مسلم)

سفیانؓ بن عبداللہ ثقفی روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی کہ اسلام (یعنی مسلمان ہونے) کی بابت مجھے ایسی بات بتلا دیجئے کہ اس کے متعلق پھر آپ کے بعد کسی اور سے پوچھنے کی ضرورت نہ رہے۔ آپؐ نے فرمایا۔ کہو کہ میں خدا پر ایمان لایا اور پھر اُسی پر قائم رہو۔

۱۶۔ لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ (الشیخان والنسائی) وَفِيْ اُخْرٰى لِلنَّسَائِيِّ رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ مَّالِهٖ وَاَهْلِهٖ۔

تم میں سے کوئی شخص ایمان دار نہیں ہو سکتا جب تک میں اُسے باپ بیٹے اور سب لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہوں۔ نسائی سے دوسری روایت میں مذکور ہے کہ مال اور عیال سے زیادہ محبوب نہ ہوں۔

۱۷۔ لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يُحِبَّ لِاَخِيْهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهٖ۔ (الخمسۃ الا ابوداؤد)

کوئی شخص تم میں سے ایمان والا نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے بھائی کے لیے وہی چیز پسند نہ کرے جو وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے۔

۱۸۔ مَنْ اَحَبَّ لِلّٰهِ وَاَبْغَضَ لِلّٰهِ وَاَعْطٰى لِلّٰهِ وَمَنَعَ لِلّٰهِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الْاِيْمَانَ۔ (ابوداؤد)

جس شخص نے کسی سے دوستی یا دشمنی پیدا کرنے میں، یا اپنے مال کے خرچ کرنے یا نہ کرنے میں رضائے الٰہی ہی کو مدّنظر رکھا۔ اس نے اپنے ایمان کو کامل کر لیا۔

۱۹۔ سَاَلُوْهُ اِنَّا نَجِدُ فِيْ اَنْفُسِنَا مَا يَتَعَاظَمُ اَحَدُنَا اَنْ يَّتَكَلَّمَ بِهٖ قَالَ اَوَقَدْ وَجَدْتُمُوْهُ قَالُوْا نَعَمْ قَالَ ذَاكَ صَرِيْحُ الْاِيْمَانِ۔ (مسلم وابوداؤد)

چند لوگوں نے آپؐ سے دریافت کیا کہ ہم اپنے دلوں میں (ایسے بُرے خیالات) پاتے ہیں کہ ان کا زبان پر لانا بڑی (معیوب) بات ہے۔ فرمایا کیا یہ تحقیق ہے کہ تمھارے دلوں میں ایسا آتا ہے؟ کہا کہاں۔ فرمایا یہ عین ایمان ہے۔

۲۰۔ قَالَ كُنَّا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ مَجْلِسٍ فَقَالَ تُبَايِعُوْنِيْ

ایک صحابی کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ ایک مجلس میں بیٹھے تھے۔ آپؐ نے فرمایا کیا تم

عَلٰٓى اَنْ لَّا تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ شَيْـًٔا وَّلَا تَسْرِقُوْا وَلَا تَزْنُوْا وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِىْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ (وَفِىْ اُخْرٰى وَلَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَكُمْ) وَلَا تَاْتُوْا بِبُهْتَانٍ تَفْتَرُوْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْكُمْ وَاَرْجُلِكُمْ وَلَا تَعْصُوْنِىْ فِىْ مَعْرُوْفٍ فَمَنْ وَفٰى مِنْكُمْ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ تَعَالٰى وَمَنْ اَصَابَ مِنْ ذٰلِكَ اَىْ غَيْرِ الشِّرْكِ شَيْـًٔا فَسَتَرَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى فَاَمْرُهٗ اِلَى اللّٰهِ تَعَالٰى اِنْ شَآءَ عَفَا عَنْهُ وَاِنْ شَآءَ عَذَّبَهٗ فَبَايَعْنَاهُ عَلٰى ذٰلِكَ (الخمسة الا ابوداود) بَايَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِى الْعُسْرِ وَالْيُسْرِ وَالْمَنْشَطِ وَالْمَكْرَهِ وَعَلٰٓى اَثَرَةٍ عَلَيْنَا وَعَلٰٓى اَنْ لَّا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَهْلَهٗ وَعَلٰٓى اَثَرَةٍ عَلَيْنَا وَعَلٰٓى اَنْ نَّقُوْلَ بِالْحَقِّ اَيْنَمَا كُنَّا لَا نَخَافُ فِى اللّٰهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ وَفِىْ اُخْرٰى اَنْ لَّا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَهْلَهٗ اِلَّآ اَنْ تَرَوْا كُفْرًا بَوَاحًا عِنْدَكُمْ فِيْهِ مِنَ اللّٰهِ بُرْهَانٌ۔

(الثلاثة والنسائى)

سے اس بات پر بیعت (یعنی تابعداری کا عہد) کرتے ہو کہ خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو گے، چوری نہ کرو گے، زنا نہ کرو گے اور کسی ایسی جان کو جس کا قتل خدا نے حرام کیا ہے۔ ناحق قتل نہ کرو گے؟ دوسری روایت میں ہے۔ اپنی اولاد کو قتل نہ کرو گے اور کسی پر تہمت نہ لگاؤ گے جس کا مخرج وہ شے ہے جو تمہارے ہاتھوں اور پاؤں کے درمیان ہے (یعنی دل) اور اچھی بات میں میری نافرمانی نہ کرو گے۔ پس تم میں سے جس شخص نے اس عہد کو پورا کیا۔ اس کا اجر خدا کے پاس ہے اور جو شخص شرک کے سوائے ان میں سے کسی فعل کا مرتکب ہوا اور اللہ نے اس کا پردہ رکھا تو اس کا فیصلہ اللہ پر ہے چاہے اُسے معاف کرے چاہے اُسے سزا دے۔ پس ہم نے اس عہد پر بیعت کی۔

(ایک دوسری روایت میں راوی کہتا ہے) کہ ہم نے اس بات پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی کہ ہم (جو ارشاد ہوگا) سنیں گے۔ اور اس کی تعمیل کریں گے۔ خواہ تنگی ہو خواہ فراخی، خواہ راحت ہو، خواہ رنج، اور خواہ اس کا بُرا اثر ہم پر پڑے۔ اور ہم ایسے شخص کے سردار ہونے میں جو اس کے لائق ہو نہیں جھگڑیں گے۔ ہر حالت میں سچ کہیں گے۔ خدا کی راہ میں کسی کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔ اور دوسری روایت میں ہے کہ ایسے شخص کے خلیفہ ہونے میں جو اس کے لائق ہو نہیں جھگڑیں گے مگر اس وقت کہ صریحاً کفر دیکھنے میں آئے یعنی اس میں تاویل کی گنجائش نہ ہو۔

۲۱ - عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِىَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ كُنَّا اِذَا بَايَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ يَقُوْلُ لَنَا فِيْمَا اسْتَطَعْتُمْ۔

(ستة)

ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ جب ہم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سماعت اور اطاعت پر بیعت کرتے تو آپؐ فرماتے اس حد تک کہ تمہارے احاطہ قدرت میں ہے۔

ایمان کی خصلتیں

۲۲ - ایمان کا سب سے اعلیٰ اور سب سے ادنیٰ عمل :

(ابوھریرۃؓ) رفعہ : الایمان بضع وسبعون اوستون شعبۃ والحیاء شعبۃ من الایمان وفی روایۃ : و افضلھا قول لا الٰہ الا اللہ وادناھا اماطۃ الاذی عن الطریق ۔
(للستۃ الا الموطأ)

ایمان کی کچھ اُوپر ستر یا ساٹھ شاخیں ہیں۔ یہ حیا بھی ایمان ہی کی ایک شاخ ہے ان میں سب سے چوٹی کی چیز لا الٰہ الا اللہ کا قائل ہونا ہے۔
اور معمولی درجے کی چیز راستے سے ایذا رسان اشیاء کا مٹا دینا ہے۔

۲۳ - تین چار قسمیہ کا بیان :

(عائشۃؓ) رفعتہ ثلاث احلف علیھن لا یجعل اللہ من لہ سھم الاسلام کمن لا سھم لہ واسھم الاسلام الثلاثۃ الصلوٰۃ والصوم والزکوٰۃ ولا یتولی اللہ عبدا فی الدنیا فیولیہ غیرہ یوم القیامۃ ولا یحب رجل قوما الا جعلہ معھم والرابعۃ لو حلفت علیھا رجوت ان لا آثم لا یستر اللہ عبدا فی الدنیا الا سترہ یوم القیامۃ
(احمد، موصلی)

میں تین باتوں پر قسم کھاتا ہوں : ایک یہ کہ اللہ اسلام کے حصے دار کو محروم الاسلام کے برابر نہ کرے گا۔ اسلام کے بڑے حصے تین ہیں : (۱) نماز (۲) روزہ (۳) زکوٰۃ
دوسرے یہ کہ : جس کا اللہ دُنیا میں دوست ہو بروز قیامت بھی اُسے دوسروں کی سپردگی میں نہ دے گا۔
تیسری یہ کہ دنیا میں جس نے جن لوگوں سے محبت کی، اُس کا حشر بھی انہی لوگوں کے ساتھ ہوگا۔
حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں اگر میں چوتھی بات بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے قسم کھا کر کر دوں تو مجھ پر گناہ عائد نہ ہوگا۔ یعنی اللہ جس کی ستر پوشی دنیا میں کرتا ہے اس کی ستر پوشی آخرت میں بھی کرے گا۔

۲۴ - حلاوتِ ایمان کن کو حاصل ہوتی ہے ؟

(انسؓ) رفعہ : ثلاث من کن فیہ

ان تین شخصوں کو ایمان کا لطف حاصل ہوگا :

وجد بهن طعم الایمان من کان الله و رسوله احب الیه مما سواهما ومن احب عبدا لا یحبه الا لله ومن یکره ان یعود فی الکفر بعد ان انقذه الله منه کما یکره ان یلقی فی النار۔
(شیخین، ترمذی، نسائی)

۱۔ جو شخص سارے جہان سے زیادہ اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سے محبت کرتا ہے۔
۲۔ اور جو شخص دوسرے بندے سے بھی اللہ ہی کے لیے محبت کرتا ہے۔
۳۔ جس کو کفر سے اللہ تعالیٰ نے نکال لیا ہو اس میں واپس جانا اسے ایسا ہی ناگوار ہو جیسا آگ میں ڈالا جانا۔

۲۵۔ تکمیلِ ایمان کے ذریعے:

(ابوامامہؓ) رفعہ: من احب لله و ابغض لله واعطی لله ومنع لله فقد استکمل الایمان (ابوداؤد)

جس شخص کی محبت اور بغض، عطا اور ترک عطا سب کچھ اللہ تعالیٰ کے لیے ہو۔ وہ اپنے ایمان کو مکمل کر لیتا ہے۔

۲۶۔ مسلم اور مومن کی صحیح تعریف:

(ابوہریرہؓ) رفعہ: المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویده والمؤمن من امنه الناس علی دمائهم واموالهم
(ترمذی، نسائی، بخاری)

مسلم وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔
اور مومن وہ ہے جس کی ذات سے لوگوں کی جان و مال کو کوئی خطرہ نہ ہو۔

۲۷۔ ایمان کی تین بنیادیں:

(انسؓ) رفعہ: ثلاث من اصل الایمان الکف عمن قال لا اله الا الله ولا یکفره بذنب ولا یخرجه من الاسلام بعمل (ابوداؤد)

تین چیزیں بنیاد اسلام ہیں:
۱۔ کلمہ گو سے ہاتھ روک لینا
۲۔ اور اس کی کسی لغزش پر اس کی تکفیر نہ کرنا اور
۳۔ اس کے کسی عمل کی وجہ سے اُسے خارج از اسلام نہ کرنا۔

۲۸۔ اقرار توحید کا اثر دنیا میں:

(طارق الاشجعی) رفعہ: من قال لا اله

جو لا اله الا الله کا قائل ہو اور غیر اللہ کی عبادت،

الا اللہ و کفر بما یعبد من دون اللہ حرم اللہ مالہ و دمہ و حسابہ علی اللہ (مسلم)

کا منکر، اس کی جان و مال کو اللہ نے حرام کیا ہے اور اس کا حساب کتاب اللہ کے ہاں ہوگا۔

۲۹ - مغز اسلام (سات سوالوں کا جواب):

(عمرو بن عبسہ) قلت : یا رسول اللہ من معک علی ھذا الامر؟ قال حر و عبد قلت : ما الاسلام ؟ قال طیب الکلام و اطعام الطعام قلت : ما الایمان؟ قال الصبر و السماحۃ قلت : ای الاسلام افضل؟ قال من سلم المسلمون من لسانہ و یدہ قلت : ای الایمان افضل ؟ قال خلق حسن قلت : ای الصلوٰۃ افضل؟ قال طول القنوت قلت : ای الھجرۃ افضل؟ قال ان تھجر ما کرہ ربک (الکبیر واحمد بلفظہ)

میرے سات سوالات اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب یوں ہیں :

۱ - ابتداء میں تبلیغ میں کون لوگ آپ کے ساتھ ہوئے؟ فرمایا : آزاد اور غلام دونوں! (۲) اسلام کیا ہے ؟ فرمایا : خوش کلامی اور کھانا کھلانا۔

(۳) ایمان کیا چیز ہے ؟ فرمایا صبر اور فیاضی (۴) سب سے اچھی اسلامی صفت کیا ہے؟ فرمایا : جس کی زبان اور ہاتھ سے سب مسلمان محفوظ رہیں۔

۵ - سب سے افضل ایمان کیا ہے؟ فرمایا : اچھے اخلاق۔

۶ - سب سے بہتر نماز کونسی ہے؟ فرمایا : جس میں قیام زیادہ ہو۔

۷ - سب سے افضل ہجرت کیا ہے؟ فرمایا : جو خدا کو ناپسند ہو وہ چھوڑ دیا جائے۔

تفسیر اور متفرق!

۳۰ - اِتَّقُوا الْحَدِيثَ عَنِّي اِلَّا مَا عَلِمْتُمْ فَمَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ۔ (الترمذی)

جب تک تمہیں یقین نہ ہو کسی حدیث کو میری طرف منسوب کرنے سے بہت پرہیز کیا کرو، اور جو شخص جان بوجھ کر دروغ گوئی کر کے کسی قول کو میرے ذمے لگائے وہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں بنائے گا۔

۳۱ - اِنَّ لِلشَّيْطَانِ لَمَّةً بِابْنِ اٰدَمَ وَلِلْمَلَكِ لَمَّةً فَاَمَّا لَمَّةُ الشَّيْطَانِ فَاِيْعَادٌ بِالشَّرِّ وَتَكْذِيْبٌ بِالْحَقِّ وَاَمَّا لَمَّةُ الْمَلَكِ

قرآن مجید کی ایک آیت کی تفسیر کرتے وقت فرمایا کہ بنی آدم (کے دل) میں ایک میلان شیطانی ہے اور ایک ملکی شیطانی میلان تو بدی کرنے اور حق کو جھٹلانے کے لیے آمادہ کرتا ہے؛

فَاِيْعَادٌ بِالْخَيْرِ وَتَصْدِيْقٌ بِالْحَقِّ فَمَنْ وَجَدَ مِنْ ذٰلِكَ شَيْئًا فَلْيَعْلَمْ اَنَّهٗ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى فَلْيَحْمَدِ اللّٰهَ تَعَالٰى وَمَنْ وَجَدَ الْاُخْرٰى فَلْيَتَعَوَّذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ ۔

(الترمذی)

ملکی میلان نیکی کرنے اور حق کی تصدیق کے لیے آمادہ کرتا ہے ۔ پس جب کوئی شخص اپنے دل میں یہ (ملکی) کیفیت دیکھے تو اسے سمجھنا چاہیئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے (عنایت) ہے اور اس کا شکر کرے ۔ اور اگر دوسری کیفیت دیکھے تو اُسے شیطان کے شر سے بچنے کے لیے خدا سے دعا کرنی چاہیئے ۔

۳۲ ۔ اَفْضَلُهٗ لِسَانٌ ذَاكِرٌ وَّ قَلْبٌ شَاكِرٌ وَّ زَوْجَةٌ صَالِحَةٌ تُعِيْنُ الْمُؤْمِنَ عَلٰى اِيْمَانِهٖ ۔ (الترمذی)

یہ معلوم ہوجاتا کہ کونسا مال اچھا ہے کہ ہم اُسے حاصل کرتے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سب سے اچھا مال یہ ہے کہ زبان خدا کا ذکر کرنے والی ہو ۔ دل خدا کا شکر گزار ہو ۔ اور بیوی نیک ہو ۔ جو مومن کی اس کا ایمان (قائم) رکھنے میں اعانت کرے ۔

۳۳ ۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ فِیْ قَوْلِهٖ تَعَالٰى اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ قَالَ الصَّبْرُ عِنْدَ الْغَضَبِ وَالْعَفْوُ عِنْدَ الْاِسَاءَةِ فَاِذَا فَعَلُوْهُ عَصَمَهُمُ اللّٰهُ تَعَالٰى وَخَضَعَ لَهُمْ عَدُوُّهُمْ ۔

(البخاری معلقاً)

حضرت ابن عباس رضؓ نے اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ آیت کی تفسیر میں فرمایا : کسی کے غضب پر صبر کرنا اور دُکھ دینے والے سے درگزر کرنا ۔ جب اس رویہ کو لوگ اختیار کریں گے تو خدا انھیں محفوظ رکھے گا ۔ اور ان کے مخالف ان سے عاجزی کریں گے ۔

۳۴ ۔ اِنَّ الْمُؤْمِنَ يَرٰى ذُنُوْبَهٗ كَاَنَّهٗ قَاعِدٌ تَحْتَ جَبَلٍ يَخَافُ اَنْ يَّقَعَ عَلَيْهِ وَاِنَّ الْفَاجِرَ يَرٰى ذُنُوْبَهٗ كَذُبَابٍ مَرَّ عَلٰى اَنْفِهٖ فَقَالَ بِهٖ هٰكَذَا بِيَدِهٖ فَذَبَّهٗ عَنْهُ ۔

(الشیخان والترمذی)

ایمان دار بندہ اپنے گناہ کو اس طرح محسوس کرتا ہے گویا وہ ایک پہاڑ کے نیچے بیٹھا ہے ۔ جو اس پر گرتا معلوم ہوتا ہے اور بدکار شخص اپنے گناہ کو اس طرح سمجھتا ہے جیسے ایک مکھی اس کی ناک پر بیٹھی اور ہاتھ ہلانے سے اُڑ گئی ۔

۳۵ ۔ لَا يَتَمَنَّيَنَّ اَحَدُكُمُ الْمَوْتَ مِنْ ضُرٍّ اَصَابَهٗ فَاِنْ كَانَ لَا بُدَّ فَاعِلًا فَلْيَقُلِ اللّٰهُمَّ اَحْيِنِیْ مَا كَانَتِ الْحَيٰوةُ خَيْرًا لِّیْ وَتَوَفَّنِیْ اِذَا كَانَتِ الْوَفَاةُ خَيْرًا لِّیْ ۔ (الخمسة)

کسی تکلیف کی وجہ سے کوئی شخص ہرگز موت کی خواہش نہ کرے ، اور اگر کوئی ایسا کرنے سے باز نہیں آسکتا تو اسے یہ دعا کرنی چاہیئے کہ اے خدا مجھے اس وقت تک زندہ رکھ جب تک میری حیات میرے لیے مفید ہو اور مجھے موت دے جب میرے لیے موت بہتر ہو ۔

۲۶ ۔ وَمَنْ تَحَلّٰى بِمَا لَمْ يُعْطَ كَانَ كَلَابِسِ ثَوْبَيْ زُوْرٍ ۔

(الترمذی)

جس شخص نے دکھاوے کے واسطے ایسی وضع بنائی جو اُس کی اصلی نہیں ہے (یعنی حاجیوں یا علماء کا لباس پہن لیا حالانکہ نہ وہ حاجی ہے نہ عالم) تو گویا اس نے فریب کے وہ کپڑے پہن لیے۔

۲۷ ۔ مذمتِ دنیا :

حُبُّ الدُّنْيَا رَأْسُ كُلِّ خَطِيْئَةٍ وَحُبُّكَ الشَّيْءَ يُعْمِيْ وَيُصِمُّ ۔

(ابوداؤد)

دنیا کی محبت سب گناہوں کی سردار ہے اور ایک (ہی) چیز کی محبت تمہیں اندھا اور بہرا کر دیتی ہے۔ ؎

دنیا نے دوں کی دے نہ محبت خدا ظفر
انساں کو پھینک دے ہے یہ ایمان و دیں سے دور

سُنّت اور بدعت

۲۸ ۔ عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ تَمَسَّكَ بِسُنَّتِيْ عِنْدَ فَسَادِ اُمَّتِيْ فَلَهٗ اَجْرُ مِائَةِ شَهِيْدٍ ۔

(مشکوٰۃ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا کہ جو شخص میری اُمت میں (عملی یا اعتقادی) خرابی پیدا ہونے کے وقت میری سنت پر عمل کرے گا اس کو سو شہیدوں کا ثواب ملے گا۔

۲۹ ۔ عَنْ بِلَالِ بْنِ حَارِثِ الْمُزَنِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَحْيٰى سُنَّةً مِنْ سُنَّتِيْ قَدْ اُمِيْتَتْ بَعْدِيْ فَاِنَّ لَهٗ مِنَ الْاَجْرِ مِثْلَ اُجُوْرِ مَنْ عَمِلَ بِهَا مِنْ غَيْرِ اَنْ يَنْقُصَ مِنْ اُجُوْرِهِمْ شَيْئًا وَمَنِ ابْتَدَعَ بِدْعَةً ضَلَالَةً لَا يَرْضَاهُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ كَانَ عَلَيْهِ مِنَ الْاِثْمِ مِثْلُ آثَامِ مَنْ عَمِلَ بِهَا لَا يَنْقُصُ ذٰلِكَ

حضرت بلال بن حارث مزنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے انھوں نے کہا کہ سرکار اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے میری کسی ایسی سنت کو (لوگوں میں) رائج کیا جس کا چلن ختم ہو گیا ہو تو جتنے لوگ اس پر عمل کریں گے، ان سب کے برابر رائج کرنے والے کو ثواب ملے گا اور عمل کرنے والوں کے ثواب میں کچھ کمی نہ ہوگی اور جس نے کوئی ایسی نئی بات نکالی جو سیئہ ہے جسے اللہ و رسول (جل جلالہٗ وصلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) پسند نہیں فرماتے تو جتنے لوگ اس پر عمل کریں گے ان سب کے برابر نکالنے والے پر

مِنْ اَوْزَارِهِمْ شَيْئًا۔

(ترمذی ۔ مشکوٰۃ)

گناہ ہوگا اور عمل کرنے والوں کے گناہوں میں کچھ کمی نہ ہوگی۔

۴۰ ۔ عَنْ جَرِيْرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ سَنَّ فِى الْاِسْلَامِ سُنَّةً حَسَنَةً فَلَهٗ اَجْرُهَا وَاَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا مِنْ بَعْدِهٖ مِنْ غَيْرِ اَنْ يَّنْقُصَ مِنْ اُجُوْرِهِمْ شَيْئٌ ۔ وَمَنْ سَنَّ فِى الْاِسْلَامِ سُنَّةً سَيِّئَةً كَانَ عَلَيْهِ وِزْرُهَا وَوِزْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا مِنْ بَعْدِهٖ مِنْ غَيْرِ اَنْ يَّنْقُصَ مِنْ اَوْزَارِهِمْ شَيْئٌ ۔ (مسلم، مشکوٰۃ)

حضرت جریر رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے کہا کہ رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا: جو اسلام میں کسی اچھے طریقہ کو رائج کرے گا تو اس کو اپنے رائج کرنے کا بھی ثواب ملے گا۔ اور ان لوگوں کے عمل کرنے کا بھی جو اس کے بعد اس طریقہ پر عمل کرتے رہیں گے اور عمل کرنے والوں کے ثواب میں کوئی کمی بھی نہ ہوگی اور جو مذہب اسلام میں کسی بُرے طریقہ کو رائج کرے گا تو اُس شخص کو اس کے رائج کرنے کا بھی گناہ ملے گا اور ان لوگوں کے عمل کرنے کا بھی گناہ ہوگا جو اس کے بعد اس طریقہ پر عمل کرتے رہیں گے اور عمل کرنے والوں کے گناہ میں کوئی کمی نہ ہوگی۔

۴۱ ۔ عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَمَّا بَعْدُ فَاِنَّ خَيْرَ الْحَدِيْثِ كِتَابُ اللّٰهِ وَخَيْرَ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ وَشَرَّ الْاُمُوْرِ مُحْدَثَاتُهَا وَكُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ ۔

(مسلم، مشکوٰۃ)

حضرت جابر رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے کہا کہ سرکار اقدس صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے (غالباً ایک خطبہ میں) فرمایا۔ بعد حمد الٰہی کے معلوم ہونا چاہیئے کہ سب سے بہتر کلام کتاب اللہ ہے اور بہترین راستہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا راستہ ہے اور بدترین چیزوں میں وہ ہے جسے نیا نکالا گیا اور ہر بدعت گمراہی ہے۔

احکامِ ایمان اور بیعتِ ایمان

۴۲ ۔ عورتوں کے اسلام کا امتحان :

(ابن عباسؓ) سئل كيف كان صلى الله عليه وسلم يمتحن النساء قال اذا اتته المرأة لتسلم احلفها بالله

(حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالےٰ عنہ) سے پوچھا گیا کہ جب کوئی عورت اسلام لانے کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتی تو حضورؐ اس کا امتحان کس طرح فرماتے؟

ما خرجت لبغض زوجها و باللہ ماخرجت لا کتساب دنیا و باللہ ماخرجت من ارض الی ارض و باللہ ماخرجت الاحبا للہ و لرسولہ۔

(کبیر ملین)

جواب دیا کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) اس بات پر حلف لیتے کہ بخدا میں شوہر سے ناراض ہو کر نہیں آئی! بخدا مجھے دنیا حاصل کرنا مقصود نہیں! بخدا ایک خطہ چھوڑ کر دوسری زمین پر بسنے کے شوق میں نہیں آئی بلکہ صرف اللہ اور اس کے رسولؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی محبت میرے آنے کا سبب ہوئی!

۴۳ - انسان فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے:

(ابوھریرہ) رفعہ: مامن مولود الا یولد علی الفطرۃ ثم یقول اقرؤا فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیھا فابوا یھودانہ او ینصرانہ او یمجانہ کما تنتج البھیمۃ بھیمۃ جماء ھل تحسون فیھا من جدعاء قالوا یا رسول اللہ افرأیت من یموت صغیرا؟ قال اللہ اعلم بما کانوا عاملین

(للشیخین ونحوہ للباقین الا النسائی)

تمام بچے فطرت (اسلام) پر پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے بعد فرمایا:

فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیھا پر غور کرو۔ لیکن ان کے ماں باپ انھیں یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔ چوپائے کا بچہ بھی مکمل پیدا ہوتا ہے، کیا تم ان بچوں میں کسی کو کن کٹا دیکھتے ہو؟ لوگوں نے عرض کیا کہ: یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) جو بچہ کم سنی میں مر جائے اس کا حشر؟ فرمایا: یہ علم خدا تعالےٰ ہی کو ہے کہ وہ بڑا ہو کر کیا عمل کرتا۔

۴۴ - ایمان اور عمل کا گہرا تعلق:

(ابن عمرؓ) رفعہ: لا یقبل ایمان بلا عمل ولا عمل بلا ایمان (کبیر ملین)

ایمان عمل کے بغیر اور عمل ایمان کے بغیر مقبول نہیں۔

۴۵ - دین صحیح کیا ہے؟:

(ابن عباسؓ) قال ای الا دیان احب الی اللہ یا رسول اللہ؟ قال الحنیفیۃ السمحۃ (احمد، کبیر، اوسط، بزار)

ابن عباس (رضی اللہ عنہ) نے پوچھا کہ: اے رسول خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) کون سا دین اللہ کے ہاں مقبول ہے؟ فرمایا: ایسی یکسوئی جس میں فراخ دلی و توسع ہو۔

۴۶ - عجیب و لطیف تمثیل :

(ابن مسعودؓ) ضرب اللہ مثلا صراطا مستقیما وعن جنبتی الصراط سوران فیہما ابواب مفتحۃ وعلی الابواب ستور مرخاۃ وعند رأس الصراط داع یقول استقیموا علی الصراط ولا تعوجوا وفوق ذلک داع یدعو کلما ہم عبد ان یفتح شیئا من تلک الابواب قال ویحک لا تفتحہ فانک ان فتحتہ تلجہ ثم فسرہ بان الصراط ہو الاسلام وان الابواب المفتحۃ محارم اللہ وان الستور المرخاۃ حدود اللہ والداعی علی رأس الصراط ہو القرآن والداعی فوقہ ہو واعظ اللہ فی قلب کل مؤمن ۔ (رزین)

اللہ تعالیٰ نے (قرآن حکیم میں) جس "صراطِ مستقیم" کا تذکرہ فرمایا، اس کی مثال یہ ہے جیسے ایک سیدھا راستہ ہو جس کے دونوں طرف دیواریں ہوں اور ان میں جابجا دروازے کھلے ہوئے ہوں جن پر پردے آویزاں ہوں اور سرِراہ ایک نقیب پکار رہا ہو کہ دیکھ بھال کر چلنا اور اِدھر اُدھر نہ مڑنا۔ اس کے آگے دوسرا نقیب ہے جس کا کام یہ ہے کہ: اگر کسی نے دروازہ کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور وہ چلا اٹھا کہ! ارے بدنصیب! اسے نہ کھولنا ورنہ اندر چلا جائے گا۔ پھر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس کی تفسیر میں فرمایا:

(۱) یہ صراط اسلام ہے (۲) دروازے خدا کی طرف سے حرام کردہ امور (۳) پردے حدود اللہ (۴) پہلا نقیب قرآن حکیم اور (۵) دوسرا مومن کا نفس لوّامہ ہے۔

۴۷ - پانچ باتیں :

(ابوموسیٰؓ) قام فینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بخمس کلمات فقال ان اللہ لا ینام ولا ینبغی لہ ان ینام یخفض القسط ویرفعہ یرفع الیہ عمل اللیل قبل عمل النہار وعمل النہار قبل عمل اللیل حجابہ النور (مسلم)

ایک خطبے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پانچ امور کا ذکر فرمایا:

۱ - اللہ تعالیٰ پر نیند وارد نہیں ہوتی، اور نہ یہ اس کے شایانِ شان ہے۔

۲ - عدل کی ترازو اس کے ہاتھ میں ہے جسے وہ اٹھاتا اور جھکاتا رہتا ہے۔

۳ - بندوں کے دن کے اعمال اس کے حضور شب سے قبل اور رات کے اعمال دن سے پہلے پیش ہوتے ہیں۔

۴ - اس کی ذات نور کے پردوں میں نہاں ہے۔

جنّت کی کیفیت

۴۸۔ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی اَعْدَدْتُ لِعِبَادِیَ الصَّالِحِیْنَ مَا لَا عَیْنٌ رَأَتْ وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰی قَلْبِ بَشَرٍ قَالَ اَبُوْ ھُرَیْرَۃَ رضی اللہ عنہ اِقْرَءُوْا اِنْ شِئْتُمْ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَھُمْ مِّنْ قُرَّۃِ اَعْیُنٍ۔ (الشیخان والترمذی)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے وہ چیز تیار کر رکھی ہے جس کی کیفیت کسی آنکھ نے دیکھی نہیں، کسی کے کان نے سنی نہیں، اور نہ کسی انسان کے دل میں اس کا خیال گزرا ہے اور ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، نے کہا۔ اگر تم چاہو تو یہ آیت پڑھو (اور تسلی کر لو) کوئی شخص نہیں جانتا کہ اس کے واسطے کس قسم کی آنکھ کی ٹھنڈک مخفی ہے۔

وعظ!

۴۹۔ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْمَا یَرْوِیْ عَنْ رَّبِّہٖ عَزَّ وَجَلَّ اِنَّہٗ قَالَ یَا عِبَادِیْ اِنِّیْ حَرَّمْتُ الظُّلْمَ عَلٰی نَفْسِیْ وَجَعَلْتُہٗ بَیْنَکُمْ مُحَرَّمًا فَلَا تَظَالَمُوْا یَا عِبَادِیْ کُلُّکُمْ ضَالٌّ اِلَّا مَنْ ھَدَیْتُہٗ فَاسْتَھْدُوْنِیْ اَھْدِکُمْ یَا عِبَادِیْ کُلُّکُمْ جَائِعٌ اِلَّا مَنْ اَطْعَمْتُہٗ فَاسْتَطْعِمُوْنِیْ اُطْعِمْکُمْ یَا عِبَادِیْ کُلُّکُمْ عَارٍ اِلَّا مَنْ کَسَوْتُہٗ فَاسْتَکْسُوْنِیْ اَکْسُکُمْ یَا عِبَادِیْ اِنَّکُمْ تُخْطِئُوْنَ بِاللَّیْلِ وَالنَّھَارِ وَاَنَا اَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا فَاسْتَغْفِرُوْنِیْ اَغْفِرْ لَکُمْ یَا عِبَادِیْ اِنَّکُمْ لَنْ تَبْلُغُوْا ضَرِّیْ فَتَضُرُّوْنِیْ وَلَنْ تَبْلُغُوْا نَفْعِیْ فَتَنْفَعُوْنِیْ

یہ حدیث ان حدیثوں میں سے ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالےٰ کی طرف سے روایت کرتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: اللہ تعالےٰ فرماتا ہے "اے میرے بندو میں نے اپنے اُوپر ظلم کو حرام کر رکھا ہے، اور تمھارے واسطے بھی ایک دوسرے پر اسے حرام کر دیا ہے۔ پس ظلم مت کیا کرو۔ اے بندو، تم سب بے راہ ہو۔ سوائے اس کے جسے میں نے ہدایت کی۔ پس مجھ سے ہدایت طلب کرو۔ کہ میں تمھیں ہدایت کروں۔ اے میرے بندو! تم سب بھوکے ہو۔ سوائے اس کے جسے میں نے کھانا کھلایا۔ پس مجھ سے کھانا مانگو۔ کہ میں تمھیں کھانا دوں۔ اے میرے بندو۔ تم سب ننگے ہو۔ سوائے اس کے کہ جسے میں نے کپڑا پہنایا۔ پس مجھ سے کپڑا مانگو۔ کہ میں تمھیں دوں۔ اے میرے بندو تم دن رات خطا کرتے رہتے ہو اور میں سب گناہوں کا بخشنہار ہوں۔ پس مجھ سے بخشش کی طلب کرو کہ میں تمھارے خطا بخش

يَا عِبَادِي لَوْ أَنَّ أَوَّلَكُمْ وَآخِرَكُمْ وَإِنْسَكُمْ وَجِنَّكُمْ كَانُوا عَلَى أَتْقَى قَلْبِ رَجُلٍ وَاحِدٍ مِنْكُمْ مَا زَادَ ذٰلِكَ فِي مُلْكِي شَيْئًا يَا عِبَادِي لَوْ أَنَّ أَوَّلَكُمْ وَآخِرَكُمْ وَإِنْسَكُمْ وَجِنَّكُمْ كَانُوا عَلَى أَفْجَرِ قَلْبِ رَجُلٍ وَاحِدٍ مِنْكُمْ مَا نَقَصَ ذٰلِكَ مِنْ مُلْكِي شَيْئًا يَا عِبَادِي لَوْ أَنَّ أَوَّلَكُمْ وَآخِرَكُمْ وَإِنْسَكُمْ قَامُوا فِي صَعِيدٍ وَاحِدٍ فَسَأَلُونِي فَأَعْطَيْتُ كُلَّ إِنْسَانٍ مَسْأَلَتَهُ مَا نَقَصَ ذٰلِكَ مِمَّا عِنْدِي إِلَّا كَمَا يَنْقُصُ الْمِخْيَطُ إِذَا أُدْخِلَ فِي الْبَحْرِ يَا عِبَادِي إِنَّمَا هِيَ أَعْمَالُكُمْ أُحْصِيهَا لَكُمْ ثُمَّ أُوَفِّيكُمْ إِيَّاهَا فَمَنْ وَجَدَ خَيْرًا فَلْيَحْمَدِ اللّٰهَ تَعَالَى وَمَنْ وَجَدَ غَيْرَ ذٰلِكَ فَلَا يَلُومَنَّ إِلَّا نَفْسَهُ - (مسلم والترمذی)

دوں۔ اور میرے بندو تم مجھے کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتے ہو۔ نہ نفع پہنچا سکتے ہو۔ کہ ایسا کرنے کی کوشش کرو۔ اے میرے بندو اگر تمھارے اگلوں اور پچھلوں کا سب جن اور انس کا اور (خود) تم میں سے ہر ایک کا دل ایک بڑے پرہیزگار شخص کے دل کی طرح ہو جائے تو میری بادشاہی میں کچھ بیشی نہیں ہو سکتی، اور نہ کچھ کمی ہو سکتی ہے۔ اگر تم سب کے دل ایک بڑے گناہگار کی طرح ہو جائیں اور تم سب جو اوپر مذکور ہوئے ہو۔ اگر روئے زمین پر کھڑے ہو کر مجھ سے کچھ مانگو اور میں ہر ایک انسان کو وہ چیز عطا کروں جو وہ مانگے تو اس سے میرے خزانے میں اتنی کمی نہیں ہو سکتی جتنی کہ سمندر میں (کسی ذخیرہ سے) ایک سوئی کے گر جانے سے ہوتی ہے۔ اے میرے بندو یہ تمھارے ہی اعمال ہیں جنھیں میں تمھارے واسطے گنتا رہتا ہوں۔ پھر تمھیں ان کا پورا بدلہ دوں گا۔ پس جسے نیک بدلہ ملے اُسے چاہیئے کہ خدا کا شکر کرے اور جسے نیکی کے سوائے (یعنی بُرا) بدلہ ملے وہ کسی کو ملامت نہ کرے، سوائے اپنے آپ کے۔

۵۰ - مَنْ كَانَتِ الْآخِرَةُ هَمَّهُ جَعَلَ اللّٰهُ غِنَاهُ فِي قَلْبِهِ وَجَمَعَ عَلَيْهِ شَمْلَهُ وَأَتَتْهُ الدُّنْيَا وَهِيَ رَاغِمَةٌ وَمَنْ كَانَتِ الدُّنْيَا هَمَّهُ جَعَلَ اللّٰهُ فَقْرَهُ بَيْنَ عَيْنَيْهِ وَفَرَّقَ عَلَيْهِ شَمْلَهُ وَلَمْ يَأْتِهِ مِنَ الدُّنْيَا إِلَّا مَا قُدِّرَ لَهُ فَلَا يُمْسِي إِلَّا فَقِيرًا وَلَا يُصْبِحُ إِلَّا فَقِيرًا وَمَا أَقْبَلَ عَبْدٌ عَلَى اللّٰهِ بِقَلْبِهِ إِلَّا جَعَلَ اللّٰهُ قُلُوبَ الْمُؤْمِنِينَ تَنْقَادُ إِلَيْهِ بِالْوُدِّ وَالرَّحْمَةِ وَكَانَ اللّٰهُ تَعَالَى

جس شخص کو آخرت کا غم ہو اللہ تعالیٰ اس کے دل کو غنی یعنی بے پروا کر دیتا ہے اور اس کی پریشانی اس کے واسطے جمعیت خاطر ہوتی ہے اور دُنیا اسے حقیر دکھائی دیتی ہے اور جس شخص کو دنیا کا غم ہو۔ اللہ تعالیٰ محتاجی کو اس کی دونوں آنکھوں کے سامنے رکھتا ہے۔ اور اس کے کام اس پر پریشانی طاری کر دیتے ہیں۔ اور دنیا کی کوئی چیز اُسے نہیں ملتی۔ سوائے اس کے جو اس کے مقدر میں ہے۔ شام ہو تب وہ محتاج، صبح ہو تب محتاج۔ اور ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ کسی شخص نے اللہ کی طرف اپنا دل لگایا ہو، تو ایماندار لوگوں کے دل محبت اور رحمت کے ساتھ اس کی طرف نہ پھرے ہوں۔

بِكُلِّ خَيْرٍ اِلَيْهِ اَسْرَعُ۔ (الترمذی)

اور اللہ تعالیٰ ہر نیکی اس کی طرف جلد بھیجتا ہے۔

۵۱۔ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رض قَالَ قُلْنَا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا لَنَا اِذَا كُنَّا عِنْدَكَ رَقَّتْ قُلُوْبُنَا وَ زَاهَدْنَا فِی الدُّنْیَا وَ كَانَتِ الْاٰخِرَةُ كَاَنَّهَا رَأْیُ عَیْنٍ وَ اِذَا خَرَجْنَا مِنْ عِنْدِكَ وَ اَنِسْنَا فِیْ اَهَالِیْنَا وَ شَمَمْنَا اَوْلَادَنَا اَنْكَرْنَا اَنْفُسَنَا فَقَالَ عَلَیْهِ السَّلَامُ لَوْ تَدُوْمُوْنَ عَلٰی حَالِكُمْ مِنْدِیْ لَزَارَتْكُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ عَلَیْهِمُ السَّلَامُ فِیْ بُیُوْتِكُمْ وَ لَصَافَحَتْكُمْ فِیْ طُرُقِكُمْ وَ لَوْ لَمْ تُذْنِبُوْا لَذَهَبَ اللّٰهُ تَعَالٰی بِكُمْ وَ لَجَآءَ بِخَلْقٍ جَدِیْدٍ لِیُذْنِبُوْنَ وَ یَسْتَغْفِرُوْنَ فَیَغْفِرُ لَهُمْ۔ (الترمذی)

ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ ہم نے عرض کیا یا رسولؐ اللہ ہمیں کیا ہے؟ کہ ہم آپؐ کی خدمت میں ہوتے ہیں۔ ہمارے دل نرم ہوتے ہیں اور ہم دنیا سے بے رغبت ہوتے ہیں۔ اور آخرت گویا آنکھ کے سامنے دکھائی دیتی ہے اور جب ہم آپؐ کے پاس سے چلے جاتے ہیں اور گھر والوں کی طرف رغبت کرتے ہیں اور اپنی اولاد سے ملتے ہیں تو ہمارے دل پلٹ جاتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اگر تم اسی حال پر رہتے۔ جو حال تمھارا میری صحبت میں ہوتا ہے تو فرشتے (خدا کا ان پر سلام ہو) تمھارے گھروں میں جا کر تمھاری ملاقات کرتے، اور رستوں میں تم سے ہاتھ ملاتے۔ اور اگر تم گناہ نہ کرتے تو خدا تمھیں اٹھالیتا اور اور خلقت پیدا کرتا۔ جو گناہ کرتی۔ اور تمھارا مخول کرتی اور معافی اور بخشش مانگتی۔ پس اللہ تعالیٰ اس کو بخش دیتا۔

۵۲۔ اَلْكَیِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهٗ وَ عَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ وَ الْعَاجِزُ مَنْ اَتْبَعَ نَفْسَهٗ هَوَاهَا وَ تَمَنّٰی عَلَی اللّٰهِ تَعَالٰی اَمَانِیَّ۔ (الترمذی)

دانا وہ ہے جس نے اپنے نفس کا اندازہ کیا اور اس (جزا) کے واسطے جو مرنے کے بعد (ملنے والی) ہے نیک عمل کیے اور نادان وہ شخص ہے جس نے نفس کی (بُری) خواہشوں کی پیروی کی اور اللہ تعالیٰ سے (بخشش کی) آرزو رکھی۔

۵۳۔ اِذَا مَاتَ الْاِنْسَانُ اِنْقَطَعَ عَمَلُهٗ اِلَّا ثَلٰثَةٌ: صَدَقَةٌ جَارِیَةٌ اَوْ عِلْمٌ یُنْتَفَعُ بِهٖ اَوْ وَلَدٌ صَالِحٌ یَدْعُوْا لَهٗ۔

(الخمسۃ الا البخاری)

جب انسان مرجاتا ہے تو اس کے اعمال کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ سوائے تین (عملوں) کے کہ وہ جاری رہتے ہیں۔ (۱) صدقہ جاری (مثلاً تعمیر پل، مسجد، چاہ اور مہمان سرائے) (۲) علم جس سے خلق کو فائدہ پہنچے (جیسے شاگرد لائق یا کسی مفید کتاب کی تصنیف) (۳) نیک بخت بیٹا، جو اس کے واسطے دعا کرے۔

علم اور علمائے کرام!

۵۴ ـ عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ وَوَاضِعُ الْعِلْمِ عِنْدَ غَيْرِ اَهْلِهٖ كَمُقَلِّدِ الْخَنَازِيْرِ الْجَوَاهِرَ وَاللُّؤْلُؤَ وَالذَّهَبَ ـ (ابن ماجه ـ مشكوٰة)

حضرت انس رضی اللہ تعالٰے عنہ نے فرمایا کہ رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا کہ علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان (مرد و عورت) پر فرض ہے اور نا اہل کو علم سکھانے والا ایسا ہے جیسے خنزیر یعنی سور کے گلے میں جواہرات، موتی اور سونے کا ہار پہنا دیا ہو۔

۵۵ ـ عَنِ ابْنِ سِيْرِيْنَ قَالَ اِنَّ هٰذَا الْعِلْمَ دِيْنٌ فَانْظُرُوْا عَمَّنْ تَاْخُذُوْنَ دِيْنَكُمْ ـ (مسلم ـ مشكوٰة)

حضرت محمد بن سیرین رضی اللہ تعالٰے عنہ سے روایت ہے انھوں نے فرمایا کہ یہ علم (یعنی قرآن و حدیث کو جاننا) دین ہے۔ لہٰذا تم دیکھ لو کہ اپنا دین کس سے حاصل کر رہے ہو۔

۵۶ ـ عَنْ كَثِيْرِ بْنِ قَيْسٍ قَالَ كُنْتُ جَالِسًا مَعَ اَبِي الدَّرْدَاءِ فِيْ مَسْجِدِ دِمَشْقَ فَجَاءَهٗ رَجُلٌ فَقَالَ يَا اَبَا الدَّرْدَاءِ اِنِّيْ جِئْتُكَ مِنْ مَدِيْنَةِ الرَّسُوْلِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِحَدِيْثٍ بَلَغَنِيْ اَنَّكَ تُحَدِّثُهٗ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا جِئْتُ لِحَاجَةٍ قَالَ فَاِنِّيْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ سَلَكَ طَرِيْقًا يَطْلُبُ فِيْهِ عِلْمًا سَلَكَ اللّٰهُ بِهٖ طَرِيْقًا مِنْ طُرُقِ الْجَنَّةِ وَاِنَّ الْمَلٰٓئِكَةَ لَتَضَعُ اَجْنِحَتَهَا رِضًا

حضرت کثیر بن قیس رضی اللہ تعالٰے عنہ نے فرمایا کہ میں حضرت ابوالدرداء رضی اللہ تعالٰے عنہ کے ساتھ دمشق کی مسجد میں بیٹھا تھا تو ایک آدمی نے آکر کہا کہ اے ابوالدرداء بے شک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شہر مدینہ طیبہ سے یہ سن کر آیا ہوں کہ آپ کے پاس کوئی حدیث ہے جسے آپ رسول اللہ صلی اللہ تعالٰے علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں اور میں کسی دوسرے کام کے لیے نہیں آیا ہوں۔ حضرت ابوالدرداء نے کہا کہ میں نے رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو شخص علم (دین) حاصل کرنے کے لیے سفر کرتا ہے تو خدا تعالٰے اسے جنت کے راستوں میں سے ایک راستہ پر چلاتا ہے اور طالب علم کی رضا حاصل کرنے کے لیے فرشتے اپنے پروں کو بچھا دیتے ہیں اور ہر وہ چیز جو آسمان و زمین

بِطَالِبِ الْعِلْمِ وَإِنَّ الْعَالِمَ يَسْتَغْفِرُ لَهُ مَنْ فِي السَّمٰوَاتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ وَالْحِيْتَانُ فِي جَوْفِ الْمَاءِ وَإِنَّ فَضْلَ الْعَالِمِ عَلَى الْعَابِدِ كَفَضْلِ الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ عَلٰى سَائِرِ الْكَوَاكِبِ وَإِنَّ الْعُلَمَاءَ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ وَإِنَّ الْأَنْبِيَاءَ لَمْ يُوَرِّثُوْا دِيْنَارًا وَلَا دِرْهَمًا وَإِنَّمَا وَرَّثُوا الْعِلْمَ فَمَنْ أَخَذَهُ أَخَذَ بِحَظٍّ وَافِرٍ۔

(ترمذی، ابوداؤد، مشکوٰۃ)

میں ہے۔ یہاں تک کہ مچھلیاں پانی کے اندر عالم کے لیے دعائے استغفار کرتی ہیں، اور عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہے جیسی چودھویں رات کے چاند کی فضیلت ستاروں پر۔ اور علماء انبیائے کرام کے وارث و جانشین ہیں۔ انبیائے کرام کا ترکہ دینار و درہم نہیں ہیں۔ انھوں نے وراثت میں صرف علم چھوڑا ہے تو جس نے اسے حاصل کیا، اس نے پورا حصہ پایا۔

۵۷۔ عَنْ مُعَاوِيَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُّفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ وَإِنَّمَا أَنَا قَاسِمٌ وَاللّٰهُ يُعْطِيْ۔

(بخاری، مسلم، مشکوٰۃ)

حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا کہ خدائے تعالیٰ جس شخص کے ساتھ بھلائی چاہتا ہے تو اُسے دین کی سمجھ عطا فرماتا ہے۔ اور خدا دیتا ہے اور میں تقسیم کرتا ہوں۔

۵۸۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ تَدَارُسُ الْعِلْمِ سَاعَةً مِّنَ اللَّيْلِ خَيْرٌ مِّنْ إِحْيَائِهَا۔

(دارمی، مشکوٰۃ)

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے اُنھوں نے فرمایا کہ رات میں ایک گھڑی علم دین کا پڑھنا پڑھانا رات بھر کی عبادت سے بہتر ہے۔

۵۹۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقِيْهٌ وَّاحِدٌ أَشَدُّ عَلَى الشَّيْطَانِ مِنْ أَلْفِ عَابِدٍ۔ (ترمذی، مشکوٰۃ)

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے کہا، کہ رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا کہ ایک فقیہ یعنی ایک عالم دین شیطان پر ہزار عابدوں سے زیادہ بھاری ہے۔

۶۰۔ عَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ قَالَ سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا حَدُّ الْعِلْمِ الَّذِيْ إِذَا بَلَغَهُ الرَّجُلُ

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے انھوں نے کہا کہ رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم سے دریافت کیا گیا کہ اس علم کی حد کیا ہے کہ جسے آدمی حاصل کرے تو

كَانَ فَقِيْهًا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ حَفِظَ عَلٰى اُمَّتِیْ اَرْبَعِيْنَ حَدِيْثًا فِیْ اَمْرِ دِيْنِهَا بَعَثَهُ اللّٰهُ فَقِيْهًا وَكُنْتُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ شَافِعًا وَّ شَهِيْدًا۔
(مشکوٰۃ)

فقیہ یعنی عالم دین ہو جائے تو سرکار اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص میری اُمت تک پہنچانے کے لیے دینی اُمور کی چالیس حدیثیں یاد کرے گا تو خدائے تعالیٰ اسے قیامت کے دن عالم دین کی حیثیت سے اُٹھائے گا اور قیامت کے دن میں اس کی شفاعت کروں گا اور اس کے حق میں گواہ رہوں گا۔

۶۱۔ عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ تَعَلَّمَ عِلْمًا مِّمَّا يُبْتَغٰى بِهٖ وَجْهُ اللّٰهِ لَا يَتَعَلَّمُهٗ اِلَّا لِيُصِيْبَ بِهٖ عَرَضًا مِّنَ الدُّنْيَا لَمْ يَجِدْ عَرْفَ الْجَنَّةِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَعْنِیْ رِيْحَهَا۔
(ابوداؤد، مشکوٰۃ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ سرکار اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے ایسے علم کو سیکھا جس کے ذریعے خدائے تعالیٰ کی خوشنودی طلب کی جاتی ہے۔ (مگر) اس نے صرف اس لیے سیکھا کہ اس علم سے متاع دنیا حاصل کرے تو قیامت کے دن اس کو جنّت کی خوشبو تک میسر نہ ہوگی۔

۶۲۔ عَنْ سُفْيَانَ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ قَالَ لِكَعْبٍ مَنْ اَرْبَابُ الْعِلْمِ قَالَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ بِمَا يَعْلَمُوْنَ قَالَ فَمَا اَخْرَجَ الْعِلْمَ مِنْ قُلُوْبِ الْعُلَمَاءِ قَالَ الطَّمَعُ۔
(دارمی، مشکوٰۃ)

حضرت سفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے دریافت فرمایا کہ اہل علم کون لوگ ہیں؟ انھوں نے جواب دیا کہ جو اپنے علم کے موافق عمل کریں۔ پھر آپ نے پوچھا کہ عالموں کے دلوں سے کون سی چیز علم (کے انوار و برکات) کو نکال لیتی ہے؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ لالچ۔

۶۳۔ عَنِ الْاَحْوَصِ بْنِ حَكِيْمٍ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلَا اِنَّ شَرَّ الشَّرِّ شِرَارُ الْعُلَمَاءِ وَاِنَّ خَيْرَ الْخَيْرِ خِيَارُ الْعُلَمَاءِ۔
(دارمی، مشکوٰۃ)

حضرت احوص بن حکیم اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آگاہ ہو جاؤ کہ بُروں میں سب سے بدترین علمائے سوء ہیں اور اچھوں میں سب سے بہتر علمائے حق ہیں۔

۶۴۔ عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ سرکار اقدس

صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ أُفْتِیَ بِغَیْرِ عِلْمٍ کَانَ إِثْمُهُ عَلٰی مَنْ أَفْتَاهُ وَمَنْ أَشَارَ عَلٰی أَخِیْهِ بِأَمْرٍ یَعْلَمُ أَنَّ الرُّشْدَ فِیْ غَیْرِهٖ فَقَدْ خَانَهُ۔ (ابوداؤد، مشکوٰۃ)

صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جسے بغیر علم کے کوئی فتویٰ دیا گیا تو اس کا گناہ فتوےٰ دینے والے پر ہوگا اور جس نے جان بوجھ کر اپنے بھائی کو غلط مشورہ دیا، تو اس نے اس کے ساتھ خیانت کی۔

کتاب و سُنّت سے وابستگی

۶۵۔ کتاب و سُنّت سے وابستگی :

(مالکؒ) بلغنی ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال ترکت فیکم امرین لن تضلوا ما تمسکتم بھما کتاب اللہ وسنۃ رسولہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ (ترمذی)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: میں اپنے بعد دو چیزیں چھوڑے جاتا ہوں جب تک ان سے وابستہ رہو گے گمراہ نہ ہوگے۔ (۱) کتاب اللہ (۲) اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت۔

۶۶۔ چند وصایائے نبویؐ :

(۱) (عرباضؓ بن الساریۃ) ..... فقال صلی بنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ذات یوم ثم اقبل علینا بوجھہ فوعظنا موعظۃ بلیغۃ ذرفت منھا العیون ووجلت منھا القلوب فقال رجل یارسول اللہ کان ھذہ موعظۃ مودع فماذا تعھد الینا؟ قال اوصیکم بتقوی اللہ والسمع والطاعۃ وان عبداً حبشیا فانہ من یعش منکم

ایک مرتبہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں نماز کے بعد مقتدیوں کی طرف متوجہ ہو کر وعظ فرمایا اور وعظ ایسا تھا کہ سننے والوں کی آنکھیں بہہ گئیں۔ اور دل خشیت میں ڈوب گئے۔ ایک شخص نے عرض کیا: یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اگویا کہ یہ آخری وعظ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں کیا وصیت فرماتے ہیں؟ فرمایا:

میں تمہیں اللہ سے ڈرنے کی وصیت کرتا ہوں اور یہ کہ اپنے امیر کی اطاعت کرتے رہو اگرچہ وہ حبشی

بعدی فسیری اختلافا کثیرا فعلیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین المھدیین تمسکوا بھا وعضوا علیھا بالنواجذ وایاکم ومحدثات الامور فان کل محدثۃ بدعۃ وکل بدعۃ ضلالۃ (ترمذی، ابوداؤد، بلفظہ)

غلام ہی کیوں نہ ہو کیونکہ عنقریب جو شخص میرے بعد زندہ رہا وہ کئی قسم کے اختلاف دیکھے گا۔ اس وقت میری اور میرے ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی سنت پر اس مضبوطی سے چلنا کہ گویا تم نے سنت کی رسی کو اپنی ڈاڑھوں سے دبا رکھا ہے۔ اور دین میں نئے اختراعات سے بچنا کیونکہ ہر اختراع بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی۔

۶۷۔ ہر کلمۂ خیر کا سرچشمہ زبانِ رسالت ہے:

(ابوھریرۃؓ) ما جاءکم عنی من خیر قلتہ اولم اقلہ فانا اقولہ وما اتاکم من شر فانی لا اقول الشر (احمد، بزار بلین)

تمھارے پاس میرے نام سے خیر کی کوئی بات آئے تو خواہ میں نے وہ کہی ہو یا نہ کہی ہو (تم سمجھ لو کہ) وہ بات میری ہی زبان سے نکلی ہے اور اگر کوئی شر کی بات ہو تو (سمجھ لینا چاہیئے کہ) میں شر کی بات کہتا ہی نہیں۔

۶۸۔ بہترین کلام اور بہترین سیرت:

(ابن مسعودؓ) احسن الحدیث کتاب اللہ واحسن الھدی ھدی محمد صلی اللہ علیہ وسلم وشر الامور محدثاتھا وان ما توعدون لآت وما انتم بمعجزین۔ (بخاری)

سب سے بہتر کلام قرآن مجید ہے، سب سے بہتر سیرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ہے اور بری چیزوں میں سے بدعات سب سے بدتر ہیں۔ جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے، وہ آکر رہے گی اور تم اسے روک نہ سکو گے۔

۶۹۔ اقتدائے قرآن کا صلہ:

(ابن عباسؓ) من اقتدی بکتاب اللہ لا یضل فی الدنیا ولا یشقی فی الآخرۃ ثم تلا فمن اتبع ھدای فلا یضل ولا یشقی (رزین)

متبع قرآن دنیا میں گمراہی اور عقبیٰ کی بدبختی سے محفوظ رہے گا۔ پھر آپؐ نے یہ آیت پڑھی: فمن اتبع ھدای فلا یضل ولا یشقی (جس نے میری ہدایت قبول کر لی، وہ گمراہ اور بدبخت نہیں ہو گا)۔

۷۰ - احیائے سنت نبویؐ کا انعام:

(علیؓ) رفعہ: من احیی سنۃ من سنتی امیتت بعدی فقد احبنی ومن احبنی کان معی (رزین)

جس نے میری ایک سنّت کو بھی جو میرے بعد ختم ہو چکی ہو زندہ کیا وہ میرا محب ہے اور جو میرا محب ہے وہ میرے ساتھ ہوگا۔

۷۱ : قرآن اور دیگر صحف انبیاؑ پر ایمان:

(معقلؓ بن یسارؓ) رفعہ: اعملوا بالقرآن واحلوا حلالہ وحرموا حرامہ واقتدوا بہ ولا تکفروا بشیءٍ منہ وما تشابہ علیکم فردوہ الی اللہ والی اولی الامر من بعدی کیما یخبرکم وآمنوا بالتوراۃ والانجیل والزبور وما اوتی النبیون من ربہم (کبیر)

قرآن حکیم پر عمل کرو اس کے حلال کو حلال اور اس کے حرام کو حرام قرار دو۔ اس کی پیروی کرو۔ اس کے کسی ادنیٰ جزء سے بھی انکار نہ کرو۔ اگر کسی جگہ اشتباہ پیدا ہو تو میرے بعد کے اولی الامر سے دریافت کر لو وہ تمہیں صحیح بات بتا دیں گے۔ اور توریت، انجیل، زبور، بلکہ تمام صحف انبیاء پر بھی ایمان رکھو۔

۷۲ - تھوڑی نیکی نئی بدی سے بہتر ہے:

(ابن مسعودؓ) قال اقتصاد فی سنۃ خیر من اجتہاد فی بدعۃ (کبیر بنعمت)

کسی سنّت میں تھوڑے پر قناعت کیے رہنا بدعت میں اجتہاد کرنے سے بہتر ہے۔

۷۳ - بدعت پر وعید:

(حذیفۃؓ) رفعہ: لایقبل اللہ لصاحب بدعۃ صوماً ولا صلوٰۃً ولا صدقۃ ولا حجۃ ولا عمرۃ ولا جہاداً ولا صرفاً ولا عدلاً یخرج من الاسلام کما تخرج الشعرۃ من العجین (تزیینی بنتم)

بدعتی کا روزہ، نماز، زکوٰۃ، حج، عمرہ، جہاد، بدلہ، معاوضہ کچھ بھی اللہ تعالیٰ قبول نہ فرمائے گا، وہ اسلام سے اس طرح خارج ہو جاتا ہے، جس طرح گندھے ہوئے آٹے سے بال نکال دیا جاتا ہے۔

۷۴ - فرقے بندی کی لعنت اور انتباہ :

(ابن عمرو بن العاص) رفعہ : لیأتین علی امتی ما اتی علی بنی اسرائیل حذو النعل بالنعل وان بنی اسرائیل تفرقت علی ثنتین وسبعین ملۃ وستفترق امتی علی ثلثۃ وسبعین ملۃ کلہا فی النار الا ملۃ واحدۃ قالوا من ھی یا رسول اللہ ؟ قال من کان علی ما انا علیہ واصحابی (ترمذی)

میری اُمت پر بھی ویسا ہی دور آئے گا، جیسا کہ بنی اسرائیل پر آیا۔ یہ بھی ان کے قدم بقدم چلے گی۔ اگر ان میں بہتر (۷۲) فرقے بن گئے، تو یہ تہتر (۷۳) گروہ میں منقسم ہو کر رہیں گے، مگر ان میں ایک فرقے کے سوا بقیہ تمام گروہ آگ میں جانے والے ہوں گے۔ لوگوں نے پوچھا : یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) وہ کونسا گروہ ہوگا ؟ فرمایا : جو میرے اور میرے اصحاب کے طریقے پر رہے۔

تقدیر کا بیان

۷۵ - عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَتَبَ اللّٰهُ مَقَادِيْرَ الْخَلَائِقِ قَبْلَ اَنْ يَّخْلُقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِخَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ۔ (مسلم، مشکوٰۃ)

حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ تعالٰی عنہما نے کہا کہ رسول کریم علیہ الصلوٰۃ و التسلیم نے فرمایا کہ خدائے تعالٰی نے آسمان و زمین کی پیدائش سے پچاس ہزار برس قبل مخلوقات کی تقدیروں کو لکھا۔ (لوحِ محفوظ میں ثبت فرما دیا۔)

۷۶ - عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَوَّلَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ الْقَلَمُ فَقَالَ لَهٗ اُكْتُبْ قَالَ مَا اَكْتُبُ قَالَ اُكْتُبِ الْقَدَرَ فَكَتَبَ مَا كَانَ وَمَا هُوَ كَائِنٌ اِلَى الْاَبَدِ۔ (ترمذی، مشکوٰۃ)

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالٰی عنہ سے کہا کہ سرکارِ اقدس صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم نے فرمایا کہ (حقیقت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیۃ کے بعد) سب سے پہلے جو چیز خدا نے پیدا کی وہ قلم ہے۔ خدا تعالٰی نے اس سے فرمایا لکھ۔ قلم نے عرض کیا، کیا لکھوں ؟ فرمایا تقدیر۔ تو قلم نے لکھا جو کچھ ہو چکا تھا اور جو اب تک ہونے والا تھا۔

۷۷ - عَنْ مُطَرِ بْنِ عُکَامِسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا قَضَی اللّٰہُ لِعَبْدٍ اَنْ یَّمُوْتَ بِاَرْضٍ جَعَلَ لَہٗ اِلَیْھَا حَاجَۃً۔

(ترمذی، مشکوٰۃ)

حضرت مطر بن عُکامس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ رسول علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا کہ جب خدا تعالیٰ کسی شخص کی موت کسی زمین پر مقدر کر دیتا ہے تو اس زمین کی طرف اس کی حاجت پیدا کر دیتا ہے۔

۷۸ - آخری بازگشت رحمت الٰہی سے ہے نہ کہ عمل :

(عائشۃ رضی) رفعتہ : سددوا وقاربوا واعلموا انہ لن یدخل احد کم عملہ الجنۃ قالوا ولا انت یا رسول اللہ؟ قال ولا انا الا ان یتغمدنی اللہ بمغفرۃ ورحمۃ۔ (بخاری)

میانہ روی اختیار کرو! اور خوب سمجھ لو کہ کسی کے اعمال اسے جنت میں نہ لے جائیں گے۔ عرض کیا گیا : یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ کا عمل بھی آپ کو جنت میں نہ لے جائے گا؟ فرمایا : ہاں! میرا بھی یہی حال ہے مجھے بھی خدا تعالیٰ کی رحمت ہی اپنے دامنِ رحمت میں چھپائے گی۔

۷۹ - دینِ اسلام میں سہولتیں ہیں نہ کہ سختیاں :

(ابو ھریرۃ رضی) رفعہ : ان ھذا الدین یسر ولن یشاد الدین احد الا غلبہ۔ (شیخین)

دین سہل چیز ہے۔ جو شخص اس میں سختی پیدا کرے گا اسی پر وہی سختی مسلط رہے گی۔

۸۰ - تبلیغ کی رُوح :

(انس رضی) رفعہ : یسروا ولا تعسروا وبشروا ولا تنفروا۔ (شیخین)

سہولت پیدا کرو، دشواری پیدا نہ کرو۔ خوشخبری سناؤ۔ نفرت نہ دلاؤ۔

قبر کا عذاب حق ہے

۸۱ - عَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ

حضرت براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا کہ مُردے

يَاْتِيْهِ مَلَكَانِ فَيُجْلِسَانِهٖ فَيَقُوْلَانِ
لَهٗ مَنْ رَّبُّكَ فَيَقُوْلُ رَبِّيَ اللّٰهُ
فَيَقُوْلَانِ لَهٗ مَا دِيْنُكَ فَيَقُوْلُ دِيْنِيَ
الْاِسْلَامُ فَيَقُوْلَانِ مَا هٰذَا الرَّجُلُ
الَّذِيْ بُعِثَ فِيْكُمْ فَيَقُوْلُ هُوَ
رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ
وَسَلَّمَ فَيَقُوْلَانِ لَهٗ وَمَا يُدْرِيْكَ
فَيَقُوْلُ قَرَأْتُ كِتَابَ اللّٰهِ فَاٰمَنْتُ
بِهٖ وَصَدَّقْتُ فَذٰلِكَ قَوْلُهٗ
يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ
الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي
الْاٰخِرَةِ الْاٰيَةَ قَالَ فَيُنَادِيْ مُنَادٍ
مِّنَ السَّمَآءِ اَنْ صَدَقَ عَبْدِيْ
فَاَفْرِشُوْهُ مِنَ الْجَنَّةِ وَاَلْبِسُوْهُ
مِنَ الْجَنَّةِ وَافْتَحُوْا لَهٗ
بَابًا اِلَى الْجَنَّةِ فَيُفْتَحُ
قَالَ فَيَاْتِيْهِ مِنْ رَّوْحِهَا وَطِيْبِهَا
وَيُفْسَحُ لَهٗ فِيْهَا مَدَّ بَصَرِهٖ وَاَمَّا
الْكَافِرُ فَذَكَرَ مَوْتَهٗ قَالَ وَيُعَادُ
رُوْحُهٗ فِيْ جَسَدِهٖ وَيَاْتِيْهِ مَلَكَانِ
فَيُجْلِسَانِهٖ فَيَقُوْلَانِ مَنْ رَّبُّكَ
فَيَقُوْلُ هَاهْ هَاهْ لَا اَدْرِيْ فَيَقُوْلَانِ
لَهٗ مَا دِيْنُكَ فَيَقُوْلُ هَاهْ هَاهْ
لَا اَدْرِيْ فَيَقُوْلَانِ مَا هٰذَا الرَّجُلُ
الَّذِيْ بُعِثَ فِيْكُمْ فَيَقُوْلُ هَاهْ هَاهْ
لَا اَدْرِيْ فَيُنَادِيْ مُنَادٍ مِّنَ السَّمَآءِ

کے پاس دو فرشتے آتے ہیں، تو اس کو بٹھا کر پوچھتے ہیں کہ تیرا رب کون ہے؟ تو مُردہ کہتا ہے میرا رب اللہ ہے۔ تو فرشتے کہتے ہیں تیرا دین کیا ہے؟ وہ کہتا ہے میرا دین اسلام ہے۔ پھر فرشتے پوچھتے ہیں کون نبی ہے جو تم میں مبعوث فرمائے گئے تھے۔؟ تو مُردہ کہتا ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہیں۔ پھر فرشتے دریافت کرتے ہیں کہ تمہیں کس نے بتایا (کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہیں) تو مُردہ کہتا ہے میں نے خدائے تعالیٰ کی کتاب کو پڑھا تو ان پر ایمان لایا اور ان کی تصدیق کی (حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا) تو خدائے تعالیٰ کے اس قول يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ کا یہی مطلب ہے (یعنی مومن خدائے تعالیٰ کے فضل سے فرشتوں کو جواب دینے میں ثابت رہتا ہے) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پھر ایک پکارنے والا آسمان سے پکار کر کہتا ہے کہ میرے بندے نے سچ کہا تو اس کے لیے جنت کا بچھونا بچھاؤ اور اس کو جنت کا کپڑا پہناؤ اور اس کے لیے جنت کی طرف ایک دروازہ کھول دو۔ تو دروازہ کھول دیا جاتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو اس کے پاس جنت کی ہوا، اور خوشبو آتی ہے۔ اور حدِ نگاہ تک اس کی قبر کشادہ کر دی جاتی ہے (یہ حال تو مومن کا ہے) اور اب رہ گیا کافر تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی موت کا ذکر کیا اور فرمایا کہ اس کی روح اس کے جسم میں واپس کر دی جاتی ہے، اور اس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں تو اسے بٹھا کر پوچھتے ہیں کہ تیرا رب کون ہے؟ تو کافر مُردہ کہتا ہے ہاہ ہاہ میں نہیں جانتا۔ پھر فرشتے دریافت کرتے ہیں تیرا دین کیا ہے؟ وہ کہتا ہے

اَنْ كَذَبَ فَافْرِشُوْهُ مِنَ النَّارِ وَاَلْبِسُوْهُ مِنَ النَّارِ وَافْتَحُوْا لَهٗ بَابًا اِلَى النَّارِ قَالَ فَيَاْتِيْهِ مِنْ حَرِّهَا وَسَمُوْمِهَا قَالَ وَيُضَيَّقُ عَلَيْهِ قَبْرُهٗ حَتّٰى تَخْتَلِفَ فِيْهِ اَضْلَاعُهٗ ثُمَّ يُقَيَّضُ لَهٗ اَعْمٰى وَاَصَمُّ مَعَهٗ مِرْزَبَّةٌ مِّنْ حَدِيْدٍ لَوْ ضُرِبَ بِهَا جَبَلٌ لَصَارَ تُرَابًا فَيَضْرِبُهٗ بِهَا ضَرْبَةً يَسْمَعُهَا مَا بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ اِلَّا الثَّقَلَيْنِ فَيَصِيْرُ تُرَابًا ثُمَّ يُعَادُ فِيْهِ الرُّوْحُ۔

(ابو داؤد، مشکوٰۃ)

ہاہا میں نہیں جانتا۔ پھر فرشتے پوچھتے ہیں کون ہے جو تم میں مبعوث کیے گئے تھے تو وہ کہتا ہے ہاہا میں نہیں جانتا۔ تو آسمان سے ایک ندا دینے والا پکار کر کہتا ہے کہ وہ جھوٹا ہے اس کے لیے آگ کا بچھونا بچھاؤ اور آگ کا کپڑا پہناؤ اور اس کے لیے دوزخ کی طرف سے ایک دروازہ کھول دو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو اس کے پاس جہنم کی گرمی اور لپٹ آتی ہے اور کافر کی قبر اس پر تنگ کی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کی پسلیاں اِدھر کی اُدھر ہو جاتی ہیں۔ پھر اس پر ایک اندھا اور بہرا فرشتہ مقرر کیا جاتا ہے جس کے پاس لوہے کا ایک گرز ہوتا ہے کہ اگر اس کو پہاڑ پر مارا جائے تو مٹی ہو جائے۔ فرشتہ اس گرز سے کافر کو ایسا مارتا ہے کہ اس کی آواز مشرق سے مغرب تک تمام مخلوقات سنتی ہے۔ مگر انسان اور جن نہیں سنتے ہیں تو وہ مٹی ہو جاتا ہے۔ پھر اس کے اندر روح لوٹائی جاتی ہے۔

۸۱۴۔ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا قُبِرَ الْمَيِّتُ اَتَاهُ مَلَكَانِ اَسْوَدَانِ اَزْرَقَانِ يُقَالُ لِاَحَدِهِمَا الْمُنْكَرُ وَلِلْاٰخَرِ النَّكِيْرُ فَيَقُوْلَانِ مَا كُنْتَ تَقُوْلُ فِيْ هٰذَا الرَّجُلِ فَيَقُوْلُ هُوَ عَبْدُ اللّٰهِ وَرَسُوْلُهٗ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ فَيَقُوْلَانِ قَدْ كُنَّا نَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْلُ هٰذَا ثُمَّ يُفْسَحُ لَهٗ فِيْ قَبْرِهٖ سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فِيْ سَبْعِيْنَ ثُمَّ يُنَوَّرُ لَهٗ فِيْهِ ثُمَّ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ سرکارِ اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب قبر میں مُردہ کو رکھ دیا جاتا ہے تو اس کے پاس دو کالے فرشتے نیلی آنکھوں والے آتے ہیں، جن میں سے ایک کا نام منکر ہے اور دوسرے کا نکیر۔ دونوں فرشتے اس مُردہ سے پوچھتے ہیں کہ تو اس ذاتِ گرامی کے بارے میں کیا کہتا تھا تو مردہ کہتا ہے کہ وہ خدائے تعالیٰ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) خدائے تعالیٰ کے بندے اور اس کے رسول ہیں (یہ سُن کر) وہ دونوں فرشتے کہتے ہیں کہ ہم پہلے سے جانتے تھے کہ تو یہی کہے گا۔ پھر اس کی

يُقَالُ لَهُ نَمْ فَيَقُولُ أَرْجِعُ إِلَى أَهْلِي فَأُخْبِرَهُمْ فَيَقُولَانِ نَمْ كَنَوْمَةِ الْعَرُوسِ الَّذِي لَا يُوقِظُهُ إِلَّا أَحَبُّ أَهْلِهِ إِلَيْهِ حَتَّى يَبْعَثَهُ اللهُ مِنْ مَضْجَعِهِ ذَلِكَ. وَإِنْ كَانَ مُنَافِقًا قَالَ سَمِعْتُ النَّاسَ يَقُولُونَ فَقُلْتُ مِثْلَهُ لَا أَدْرِي فَيَقُولَانِ قَدْ كُنَّا نَعْلَمُ أَنَّكَ تَقُولُ ذَلِكَ فَيُقَالُ لِلْأَرْضِ الْتَئِمِي عَلَيْهِ فَتَلْتَئِمُ عَلَيْهِ فَتَخْتَلِفُ أَضْلَاعُهُ فَلَا يَزَالُ فِيهَا مُعَذَّبًا حَتَّى يَبْعَثَهُ اللهُ مِنْ مَضْجَعِهِ۔

(ترمذی بمشکوٰۃ)

قبر ۷۰ گز لمبی اور ۷۰ گز چوڑی کر دی جاتی ہے ۔ اس کے بعد قبر میں روشنی کی جاتی ہے ۔ پھر اس سے کہا جاتا ہے "سو جا" تو مُردہ کہتا ہے کہ میں اپنے اہل و عیال میں جا کر اس حال سے اُن کو آگاہ کر دوں ۔ تو فرشتے کہتے ہیں "تو سو جیسے دولہا سوتا ہے" جس کو صرف وہی جگا سکتا ہے کہ جو اس کے اہل میں سب سے زیادہ محبوب ہو (تو وہ سو جاتا ہے) یہاں تک کہ خدا تعالےٰ اسے (قیامت کے دن) اس کی قبر سے اُٹھائے گا ۔ (یہ حال تو مومن کا ہے) اور اگر مُردہ منافق ہوتا ہے تو فرشتوں کے جواب میں کہتا ہے کہ میں نے لوگوں کو جو کہتے ہوئے سُنا تھا، اسی کے مثل میں بھی کہتا تھا، خود میں کچھ جانتا نہیں تھا، تو فرشتے کہتے ہیں کہ ہم لوگ جانتے تھے کہ تو ایسا ہی کہے گا ۔ پھر زمین کو حکم دیا جائے گا کہ اس کو دبا تو وہ دبائے گی ۔ یہاں تک کہ اس کی پسلیاں اِدھر کی اُدھر ہو جائیں گی تو اسی طرح وہ ہمیشہ عذاب میں مبتلا رہے گا ۔ یہاں تک خدائے تعالےٰ اس کو اس جگہ سے اُٹھائے ۔

مصائب میں رحمت کا پہلو

۸۳ - اسقاط شدہ بچہ شفیع ہوگا :

(علیؓ) رفعه : ان السقط ليراغم ربه اذا دخل ابويه النار فيقال ايها السقط المراغم ربه ادخل ابويك الجنة فيجرهما بسرره حتى يدخلهما الجنة ۔

(قزوینی بضعف)

اسقاط شدہ بچّے کے والدین کو جب خدا آگ میں داخل کرنے لگے گا تو وہ (بچّہ) اپنے رَبّ کے سامنے مچل جائے گا پھر آواز آئے گی کہ اے اپنے رَبّ کے آگے مچلنے والے بچّے اپنے والدین کو جنّت میں لے جا ۔ چنانچہ وہ دونوں کو اپنی ناف سے کھینچتا ہوا جنّت میں لے جائے گا ۔

۸۴۔ کمسن مرنے والا بھی والدین کا شفیع ہوگا :

(ابن عباسؓ) رفعه: من كان له فرطان من امتي دخل الجنة بهما قالت عائشة فمن كان له فرط من امتك؟ قال ومن كان له فرط يا موفقة قالت فمن لم يكن له فرط من امتك؟ قال انا فرط امتي لم يصابوا بمثلي (ترمذی)

میری اُمت میں جس کے دو پیش رو (مرنے والے نابالغ بچے) ہوں وہ جنتی ہے۔ حضرت عائشہ رض نے پوچھا کہ: جس اُمتی کا ایک ہی پیش رَو ہو؟ فرمایا: وہ بھی جنتی ہے جس کا ایک پیش رَو ہو۔ عرض کیا کہ: جس اُمتی کا کوئی پیش رَو نہ ہو؟ فرمایا:
میں اپنی ساری اُمت کا پیش رَو ہوں۔ ان پر میری جیسی مصیبت نہیں آئی۔

۸۵۔ رقوب اور عدیم کا صحیح مفہوم :

(انسؓ) وقف النبي صلى الله عليه وسلم على مجلس من بني سلمة فقال يا بني سلمة ما الرقوب فيكم؟ قالوا الذي لا ولد له قال بل هو الذي لا فرط له قال فما العديم فيكم؟ قالوا الذي لا مال له۔ قال بل هو الذي يقدم وليس له عند الله خير۔
(موصلی والبزار)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار بنی سلمہ کے مجمع میں ٹھہر گئے اور پوچھا کہ: اے بنی سلمہ! تم لوگ رقوب کسے کہتے ہو؟ کہا: جس کے کوئی اولاد نہ ہو۔ فرمایا: نہیں بلکہ رقوب وہ ہے جس کا کوئی پیش رَو نہ ہو۔ پھر پوچھا کہ: تم میں عدیم (مفلس) کون ہوتا ہے؟ عرض کیا: جو بے مال ہو۔ فرمایا: نہیں بلکہ عدیم وہ ہے جو اللہ کے آگے پیش ہو، لیکن اس کے پاس کوئی نیکی نہ ہو۔

۸۶۔ مدینے کے لیے بخار کا انتخاب :

(ابو عسیبؓ مولی رسول الله صلى الله عليه وسلم) رفعه: اتاني جبريلؑ بالحمى والطاعون فامسكت الحمى بالمدينة وارسلت الطاعون الى الشام فالطاعون شهادة لامتي

میرے پاس (حضرت) جبریل (علیہ السلام) بخار اور طاعون کو لے کر آئے، تو میں نے مدینے کے لیے تو بخار کو روک لیا، اور طاعون کو شام کی طرف جانے دیا۔ پس طاعون میری اُمت کے لیے موتِ شہادت اور رحمت ہے اور اہل کفر

رحمة لهم ورجز على الكافر (احمد۔ کبیر) — کے لیے عذاب۔

تقدیر و تدبیر

۸۷۔ تقدیر کی صحیح حقیقت:

(ابن عباسؓ) رفعه ...... فقال ابوعبیدةؓ افرارًا من قدر الله؟ فقال عمرؓ لو غيرك قالها يا ابا عبيدة وكان عمر يكره خلافه نعم نفر من قدر الله الى قدر الله أرأيت لو كان لك ابل فهبطت واديًا له عدوتان احداهما خصبة والاخرى جدبة أليس ان رعيت الخصبة رعيتها بقدر الله وان رعيت الجدبة رعيتها بقدر الله فجاء عبد الرحمن بن عوف وكان متغيبا فى بعض حاجاته فقال ان عندى من هذا علمًا سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول اذا سمعتم به بارض فلا تقدموا عليه واذا وقع بارض وانتم بها فلا تخرجوا فرارًا منه فحمد الله عمرؓ ثم انصرف (شیخین، موطأ، ابو داؤد)

(شام میں ایک بار وبائے طاعون پھیلی۔ مشورے کے بعد حضرت عمرؓ نے یہ طے کیا کہ مقامِ وبا کی طرف لوگ نہ جائیں اس موقع پر) حضرت ابوعبیدہؓ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ: کیا خدا کی تقدیر سے بھاگنا چاہتے ہو؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا: کہ کاش اے ابوعبیدہؓ! یہ بات تمھارے سوا کوئی اور کہتا۔ (حضرت عمرؓ ان کے اس اختلاف کو پسند نہ فرماتے تھے)۔ بھئی ہم قضائے الٰہی سے قضائے الٰہی کی طرف جا رہے ہیں۔ دیکھیے اگر آپ کی ایک اونٹنی ہو اور وہ ایک ایسے میدان میں نازل ہو جس کے دو حصے ہوں، ایک سرسبز اور ایک خشک تو اگر آپ اسے شاداب حصے میں چرائیں تو وہ بھی تقدیر الٰہی ہے اور اگر خشک حصے میں چرائیں تو وہ بھی تقدیر الٰہی ہو گی۔ اتنے میں (حضرت) عبدالرحمٰن بن عوف (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) جو اپنی کسی ضرورت سے اس وقت غیر حاضر تھے آگئے، انھوں نے کہا کہ: مجھے اس معاملے کے متعلق کچھ معلومات ہیں۔ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے سنا ہے کہ جب تم یہ سنو کہ فلاں جگہ وبا پھیل گئی ہے تو وہاں نہ جاؤ اور اگر کسی جگہ تم موجود ہو اور وہاں وبا پھیل جائے تو وہاں سے فرار اختیار نہ کرو۔ حضرت عمر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے یہ سن کر خدا تعالیٰ کا شکریہ ادا کیا اور واپس ہو گئے۔

گریہ وغم

۸۸۔ چند اور رسوم جاہلیت اور اُن کی سزا :

(ابومالک الاشعری) رفعہ: اربع فی امتی من امر الجاھلیة لا یترکونھن الفخر فی الاحساب والطعن فی الانساب والاستسقاء بالنجوم والنیاحة وقال النائحة اذا لم تتب قبل موتھا تقام یوم القیامة وعلیھا سربال من قطران ودرع من جرب (مسلم)

میری اُمت میں چار باتیں جاہلیت کی ہیں جن سے لوگ باز نہیں آتے :

(۱) اپنے خاندان پر فخر (۲) دوسروں کے خاندان پر طعن (۳) ستاروں کے وسیلے سے پانی (بارش) مانگنا اور (۴) نوحہ کرنا۔ پھر فرمایا کہ : اگر نوحہ کرنے والی نے مرنے سے پہلے توبہ نہ کی تو بروز قیامت وہ اس حال میں کھڑی کی جائے گی کہ اس کے جسم پر تارکول کا پاجامہ اور زنگ آلود زرہ ہوگی۔

حوضِ کوثر اور شفاعت

۸۹۔ عَنْ عَوْفِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَتَانِىْ اٰتٍ مِّنْ عِنْدِ رَبِّىْ فَخَيَّرَنِىْ بَيْنَ اَنْ يَّدْخُلَ نِصْفُ اُمَّتِىْ الْجَنَّةَ وَبَيْنَ الشَّفَاعَةِ فَاخْتَرْتُ الشَّفَاعَةَ وَهِىَ لِمَنْ مَّاتَ لَا يُشْرِكُ بِاللّٰهِ شَيْئًا۔ (ترمذی ، مشکوٰۃ)

حضرت عوف بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا کہ میرے پاس خدائے تعالےٰ کی طرف سے ایک فرشتہ آیا تو اس نے مجھے اختیار دیا کہ یا تو میری آدھی امت جنّت میں داخل ہو یا میں شفاعت کو اختیار کروں تو میں نے شفاعت کو منظور کیا۔ میری شفاعت ہر اس شخص کے لیے ہوگی کہ جو اس حال میں مرے کہ اس نے کسی کو خدائے تعالیٰ کا شریک نہ مانا ہو۔

۹۰ - عَنْ عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَشْفَعُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ثَلٰثَةٌ اَلْاَنْبِيَاءُ ثُمَّ الْعُلَمَاءُ ثُمَّ الشُّهَدَاءُ - (ابن ماجہ، مشکوٰۃ)

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے کہا کہ رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا کہ قیامت کے دن تین قسم کے لوگ شفاعت کریں گے۔ پہلے انبیائے کرام علیہم السلام، پھر علمائے دین، پھر شہدائے اسلام۔

جنّت کا بیان

۹۱ - عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى اَعْدَدْتُ لِعِبَادِیَ الصَّالِحِيْنَ مَا لَا عَيْنٌ رَأَتْ وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰى قَلْبِ بَشَرٍ - (بخاری، مسلم)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا ہے کہ خدائے تعالےٰ نے فرمایا ہے کہ میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے ایسی چیز تیار کر رکھی ہے کہ جس کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ اس کی خوبیوں کو کسی کان نے سُنا اور نہ کسی انسان کے دل پر اُس کی ماہیّت کا خیال گزرا۔

دوزخ کا بیان

۹۲ - عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اُوْقِدَ عَلَى النَّارِ اَلْفَ سَنَةٍ حَتّٰى احْمَرَّتْ ثُمَّ اُوْقِدَ عَلَيْهَا اَلْفَ سَنَةٍ حَتّٰى ابْيَضَّتْ ثُمَّ اُوْقِدَ عَلَيْهَا اَلْفَ سَنَةٍ حَتّٰى اسْوَدَّتْ فَهِیَ سَوْدَاءُ مُظْلِمَةٌ -

(ترمذی، مشکوٰۃ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا کہ جہنم کی آگ کو ایک ہزار برس جلایا گیا یہاں تک کہ وہ سُرخ ہوگئی۔ پھر اس کو ایک ہزار برس تک جلایا گیا یہاں تک کہ وہ سفید ہوگئی۔ پھر اسے ایک ہزار برس اور جلایا گیا، یہاں تک کہ وہ کالی سیاہ ہوگئی۔ اب وہ سیاہ و تاریک ہے۔

۹۳- عَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدَبٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مِنْهُمْ مَنْ تَاْخُذُهُ النَّارُ اِلٰى كَعْبَيْهِ وَاِلٰى رُكْبَتَيْهِ وَمِنْهُمْ مَنْ تَاْخُذُهُ النَّارُ اِلٰى حُجْزَتِهٖ وَمِنْهُمْ مَنْ تَاْخُذُهُ النَّارُ اِلٰى تَرْقُوَتِهٖ - (مسلم، مشکوٰۃ)

حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے کہا کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا کہ دوزخیوں میں بعض لوگ وہ ہوں گے جن کے ٹخنوں تک آگ ہوگی، اور بعض لوگ وہ ہوں گے جن کے زانوؤں تک آگ کے شعلے پہنچیں گے اور بعض وہ ہوں گے جن کے کمر تک ہوگی اور بعض لوگ وہ ہوں گے جن کے گلے تک آگ کے شعلے ہوں گے۔

۹۴- عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَدْخُلُ النَّارَ اِلَّا شَقِيٌّ قِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَنِ الشَّقِيُّ قَالَ مَنْ لَّمْ يَعْمَلْ لِلّٰهِ بِطَاعَتِهٖ وَلَمْ يَتْرُكْ لَهٗ بِمَعْصِيَةٍ (ابن ماجه، مشکوٰۃ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا کہ دوزخ میں صرف بدنصیب داخل ہوگا۔ پوچھا گیا یا رسول اللہ! بدنصیب کون ہے؟ فرمایا بدنصیب وہ شخص ہے کہ جس نے خدائے تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اس کی اطاعت نہیں کی اور اللہ تعالیٰ کے لیے گناہ کو نہیں چھوڑا۔

کتاب الزکوٰۃ

۹۵- تبلیغ میں حکمت تدریج اور زکوٰۃ کا مصرف:

(ابن عباسؓ) ان رسول الله صلى الله عليه وسلم لما بعث معاذا الى اليمن قال انك تقدم على قوم اهل كتاب فليكن اوّل ما تدعوهم اليه عبادة الله فاذا عرفوا فاخبرهم ان الله فرض عليهم خمس صلوات في يومهم وليلتهم فاذا فعلوا فاخبرهم ان الله فرض عليهم زكوٰة تؤخذ من اموالهم

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذؓ کو یمن کی طرف بھیجا تو فرمایا کہ: تم اہل کتاب کی طرف تبلیغ کے لیے جا رہے ہو۔ لہٰذا پہلی چیز جس کی طرف دعوت دی جائے وہ خدا کی بندگی ہونی چاہیئے۔ جب وہ اسے سمجھ لیں تو اُنھیں بتاؤ کہ اللہ نے دن رات میں پانچ نمازیں بھی فرض کی ہیں جب وہ یہ کرنے لگیں تو پھر بتاؤ کہ: اللہ تعالےٰ نے ان پر زکوٰۃ بھی فرض کی ہے جو ان (ذی حیثیت لوگوں) کے مال سے

وترد علیٰ فقراءھم فاذا اطاعوابھا فخذ منھم وتوقّ کرائم اموالھم واتق دعوۃ المظلوم فانہ لیس بینہ وبین اللہ حجاب (للستۃ الا مالکا)

یے کر ان ہی کے محتاجوں پر لوٹا دی جائے گی۔ جب وہ اُسے مان کر اطاعت کرلیں تو ان سے زکوٰۃ وصول کرو، مگر عمدہ سے عمدہ مال چھانٹ کر لینے سے بچو، اور مظلوم کی فریاد سے بھی ڈرتے رہو۔ کیونکہ اس کے اور اللہ کے درمیان کوئی روک نہیں۔

قسم

۹۶۔ غیر اللہ کی قسم کھانا :

(ابن عمرؓ) رفعہ : من حلف بغیر اللہ فقد کفر واشرک (ترمذی)

جو شخص غیر اللہ کی قسم کھاتا ہے وہ ایک طرح کے کفر و شرک کا مرتکب ہوتا ہے۔

تصاویر

۹۷۔ تصاویر کی خاص نوعیت :

(عائشۃ رضؓ) لما اشتکی النبی صلی اللہ علیہ وسلم ذکر بعض نسائہ کنیسۃ یقال لھا ماریۃ وکانت ام سلمۃ وام حبیبۃ اتتا ارض الحبشۃ فذکرتا من حسنھا وتصاویر فیھا فرفع رأسہ فقال اولئک اذا مات فیھم الرجل الصالح بنوا علی قبرہ مسجداً ثم صوروا فیہ تلک الصورا ولئک شرار خلق اللہ۔ (شیخین، نسائی)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب بیمار ہوئے، تو آپ کی کسی بیوی نے "ماریہ" نامی ایک کنشت کا ذکر کیا۔ اُم سلمہ اور اُم حبیبہ نے جو ملک حبشہ کو دیکھ چکی تھیں، وہاں کی خوبصورتی اور تصویروں کا ذکر کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا سر اُٹھا کر فرمایا کہ ان لوگوں میں جب کوئی صالح آدمی مرتا ہے تو اُس کی قبر پر مسجد بنا لیتے ہیں، اور اس میں اس قسم کی تصویریں بناتے ہیں۔ یہ لوگ بدتر خلائق ہیں۔

کتاب التفسیر

۹۸ - رائے کو پابندِ قرآن ہونا چاہیئے نہ کہ قرآن کو پابندِ رائے :

ابن عباس رضؓ رفعہ : من قال فی القرآن بغیر علم وفی روایۃ برأیہ فلیتبوأ مقعدہ فی النار۔

(ترمذی)

جو قرآن (حکیم) میں جہالت سے اپنی رائے کو داخل کرے وہ اپنا ٹھکانا جہنّم میں بنا لے ۔

۹۹ - حقیقتِ قرآن بزبانِ رسالتؐ :

(الحارث الاعور) : مررت فی المسجد فاذا الناس یخوضون فی الاحادیث فدخلت علی علیؓ فاخبرتہ فقال أوقد فعلوھا؟ قلت نعم قال اما انی سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول الا انھا ستکون فتنۃ قلت فما المخرج منھا یا رسول اللہ؟ قال کتاب اللہ فیہ نبأ ما قبلکم وخبر ما بعدکم وحکم ما بینکم ھو الفصل لیس بالھزل من ترکہ من جبار قصمہ اللہ ومن ابتغی الھدی فی غیرہ اضلہ اللہ وھو حبل اللہ المتین وھو الذکر الحکیم وھو الصراط المستقیم وھو الذی لا تزیغ بہ الاھواء ولا تلتبس بہ الالسنۃ ولا تشبع منہ العلماء ولا یخلق علی کثرۃ الرد

میں ایک بار مسجد نبویؐ میں گیا تو دیکھا کہ لوگ احادیث (گفتگو) میں لگے ہیں۔ میں حضرت علی (کرم اللہ وجہہ) کے پاس گیا اور ان کو یہ بات بتائی ۔ آپ نے پوچھا کہ : کیا واقعی وہ ایسا ہی کر رہے ہیں ؟ میں نے کہا کہ : جی ہاں ! فرمایا میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سُنا ہے کہ عنقریب اس قسم کا فتنہ ظہور میں آئے گا ، اس وقت میں نے دریافت کیا کہ : یا رسول اللہ ! اس سے چھٹکارے کی کیا سبیل ہے ؟ فرمایا : کتاب اللہ۔ اس میں گزشتہ اُمتوں کے واقعات ہیں۔ آئندہ آنے والوں کی خبریں ہیں۔ تمہارے باہمی اختلافات کا فیصلہ ہے ، یہ ایک محکم حقیقت ہے ، کوئی بے تُکی بات نہیں۔ جو اُسے عبث سمجھ کر چھوڑ بیٹھے گا ، اُسے اللہ تعالیٰ ہلاک کرے گا ۔ اور جو اس کے علاوہ کسی اور جگہ ہدایت تلاش کرے گا ، اُسے اللہ گمراہی میں ڈال دے گا۔ یہ اللہ کی مضبوط رسّی ہے اور پُر حکمت ذکر اور صراطِ مستقیم ہے ، اس سے نہ خواہشوں میں کجی آتی ہے نہ زبان

ولا تنقضی عجائبہ وھو الذی لم تنتہ الجن اذ سمعتہ حتی قالوا انا سمعنا قرآنا عجبا یھدی الی الرشد فامنا بہ من قال بہ صدق ومن عمل بہ اجر ومن حکم بہ عدل ومن دعا الیہ ھدی الی صراط مستقیم خذھا الیك یا اعور (ترمذی)

میں لغزش۔ اہل علم اس سے کبھی سیر نہیں ہوتے اور بار بار دہرانے سے اس میں کوئی کہنگی نہیں آتی اور اس کے عجائب کبھی ختم نہیں ہوتے۔ یہی وہ کلام ہے، جس کی انتہا کو جن بھی نہ پا سکے۔ اور اسے سن کر انھیں کہنا پڑا کہ: (انا سمعنا قرآنا عجبا ۔ الآیۃ)

ہم نے ایک عجیب کلام سنا ہے جو رشد کی طرف لے جاتا ہے۔ اور ہم تو اس پر ایمان لے آئے جس کا قول قرآن کے مطابق ہوگا وہ سچا ہوگا۔ جو اس پر عامل ہوگا مستحق اجر ہوگا۔ جو اس کے مطابق فیصلہ دے گا عادل ہوگا اور جو اس کی طرف دعوت دے گا وہ صراطِ مستقیم پا لے گا۔ اے حارث اعور! ان باتوں کو پلے باندھ لو۔

انبیائے کرام زندہ ہیں

۱۰۰۔ عَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰہَ حَرَّمَ عَلَی الْاَرْضِ اَنْ تَاْکُلَ اَجْسَادَ الْاَنْبِیَاءِ فَنَبِیُّ اللّٰہِ حَیٌّ یُّرْزَقُ۔

(رواہ ابن ماجہ، مشکوٰۃ ص۱۲۱)

حضرت ابو درداء رضی اللہ تعالٰی عنہ نے کہا کہ رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا، کہ خدائے تعالٰی نے زمین پر انبیائے کرام علیہم السلام کے جسموں کو کھانا حرام فرما دیا ہے۔ لہٰذا اللہ کے نبی زندہ ہیں۔ رزق دیئے جاتے ہیں۔

۱۰۱۔ عَنْ اَوْسِ بْنِ اَوْسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰہَ حَرَّمَ عَلَی الْاَرْضِ اَجْسَادَ الْاَنْبِیَاءِ۔ (رواہ ابوداؤد، والنسائی والدارمی والبیہقی وابن ماجہ کلھم عن اوس بن اوس رضی اللہ تعالٰی عنہ، مشکوٰۃ ص۱۲۰۔)

حضرت اوس بن اوس رضی اللہ تعالٰی عنہ نے کہا کہ سرکار اقدس صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم نے فرمایا کہ خدائے تعالٰی نے انبیائے کرام علیہم السلام کے جسموں کو زمین پر (کھانا) حرام فرما دیا ہے۔

براءت

۱۰۲۔ کسی کو ربّ بنانے کا مطلب:

(عدی بن حاتم) اتیت النبی صلی اللہ علیہ وسلم وفی عنقی صلیب من ذھب فقال یاعدی اطرح عنک ھٰذا الوثن وسمعتہ یقول اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ قال انھم لم یکونوا یعبدونھم ولکنھم کانوا اذا احلوالھم شیئا استحلوہ واذا حرموا علیھم شیئا حرموہ۔

(ترمذی)

میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، تو میرے گلے میں سونے کی ایک صلیب آویزاں تھی۔ حضورؐ نے فرمایا کہ اس بُت کو اُتار پھینکو۔ پھر میں نے حضورؐ کو یہ آیت پڑھتے سُنا کہ: اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ (ان لوگوں نے اپنے علماء و مشائخ کو اللہ تعالےٰ کے مقابلے میں ربّ بنا لیا ہے) پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تشریح یوں فرمائی کہ: یہ لوگ ان مشائخ و علماء کی پوجا نہیں کرتے، بلکہ جس چیز کو وہ حلال کرتے یہ بھی اُسے حلال سمجھتے اور جسے وہ حرام کرتے یہ بھی حرام قرار دے لیتے (یعنی یہ تحلیل و تحریم ہی ربّ بنا لینا ہے۔

حجر

۱۰۳۔ فراستِ مومن سے ہوشیار رہو:

(ابوسعیدؓ) رفعہ: اتقوا فراسۃ المؤمن فانہ ینظر بنور اللہ ثم قرأان فی ذلک لآیات للمتوسمین۔

(ترمذی)

مومن کی فراست سے ہوشیار رہو، کیونکہ وہ نورِالٰہی کی وساطت سے دیکھتا ہے۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی کہ: ان فی ذلك لآیات للمتوسمین (یعنی اس میں نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو اپنی فراست سے بات کی تہہ تک پہنچ جاتے ہیں)۔

فرقان

۱۰۴ - رحمتِ الٰہی اور تکفیر سیئات :

(ابن عباسؓ) ان قوما قتلوا فاکثروا وزنوا فاکثروا وانتھکوا فاتوا النبی صلی اللہ علیہ وسلم قالوا یا محمدؐ ان الذی تقول و تدعوالیہ لحسن لو تخبرنا ان لما عملنا کفارۃ فنزلت والذین لا یدعون مع اللہ الھا اخرالی حسنات قال یبدل اللہ شرکھم ایمانا وزناھم احصانا ونزلت یا عبادی الذین اسرفوا علی انفسھم لا تقنطوا من رحمۃ اللہ (نسائی)

کچھ لوگ جنھوں نے قتل، زنا اور بے آبروئی وغیرہ کا بکثرت ارتکاب کیا تھا۔ یہ لوگ حضورؐ کے پاس آئے اور کہا کہ : اے محمدؐ! بلاشبہ آپ جو کچھ فرماتے ہیں اور جس چیز کی طرف دعوت دیتے ہیں وہ بہت صحیح ہے لیکن اے کاش! یہ بھی بتائیں کہ ہماری بداعمالیوں کا کوئی کفارہ بھی موجود ہے۔ اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی : والذین لا یدعون مع اللہ الھا اخر ــ حسنات تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ : اللہ تعالیٰ ان کے شرک کو ایمان سے اور زنا کو پاک دامنی سے بدل دے گا۔ نیز یہ آیت بھی اسی سلسلے میں نازل ہوئی کہ : یا عبادی الذین اسرفوا علی انفسھم لا تقنطوا من رحمۃ اللہ (اے میرے مسرف بندو! اللہ تعالیٰ کی رحمت سے کبھی مایوس نہ ہو)

تقدیر

۱۰۵ - نفع و نقصان اور مشیت الٰہی :

(ابن عباسؓ) کنت خلف النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال لی یا غلام انی اعلمك کلمات احفظ اللہ یحفظك

میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے پیچھے تھا کہ حضورؐ نے فرمایا کہ : صاحبزادے! میں تمھیں چند کلمے بتاتا ہوں سنو! تم اللہ تعالیٰ کے احکام کی حفاظت کرو وہ تمھاری حفاظت

احفظ اللہ تجدہ تجاھک اذا سألت فاسأل اللہ و اذا استعنت فاستعن باللہ واعلم ان الامۃ لواجتمعت علی ان ینفعوک بشیٔ لم ینفعوک الا بشیٔ قد کتبہ اللہ لک وان اجتمعوا علی ان یضروک بشیٔ لم یضروک الا بشیٔ قد کتبہ اللہ علیک رفعت الاقلام و جفت الصحف۔ (ترمذی)

فرمائے گا۔ تم اس کا لحاظ رکھو تو اُسے اپنے سامنے پاؤ گے۔ اور کچھ مانگنا ہو تو اللہ ہی سے مانگو جب مدد چاہو تو اُسی سے چاہو اور یہ خوب یاد رکھو کہ اگر ساری امت بھی تمھیں کوئی نفع پہنچانے پر متفق ہو جائے تو فقط تمھیں اتنا ہی نفع پہنچا سکتی ہے جتنا اللہ نے تمھارے لیے لکھا ہے اور سب لوگ تمھیں نقصان پہنچانے پر متحد ہو جائیں تو تمھیں صرف اتنا ہی نقصان پہنچا سکتے ہیں، جتنا اللہ نے تمھارے لیے لکھ دیا ہے۔ تقدیر کے قلم اٹھائے جاچکے ہیں اور صحیفے خشک ہو چکے ہیں۔

۱۰۶۔ تقدیر و تدبیر کا ملاپ :

(علیؓ) رفعہ : مامنکم من احد الا قد کتب مقعدہ من النار ومقعدہ من الجنۃ۔ قالوا یا رسول اللہ نتوکل علی کتابنا ؟ فقال اعملوا فکل میسر لما خلق لہ اما من کان من اھل السعادۃ فسیصیر لعمل السعادۃ واما من کان من اھل الشقاء فسیصیر لعمل الشقاء ثم قرأ فاما من اعطی واتقی و صدق بالحسنی فسنیسرہ للیسری۔ الآیۃ۔ (شیخین، ابوداؤد، ترمذی)

ہر ایک شخص کا ٹھکانا لکھا جا چکا ہے، خواہ وہ جنت میں ہو یا دوزخ میں۔ لوگوں نے عرض کیا کہ : یا رسول اللہ ! پھر ہم لوگ اپنی تقدیر ہی پر بھروسہ کرکے نہ بیٹھ رہیں ؟ فرمایا کہ : ہر ایک کو اسی راہ پر لگا دیا جاتا ہے جس کے لیے وہ پیدا ہوا ہے۔ صاحبِ سعادت، عملِ سعادت کی راہ پر لگا دیا جاتا ہے اور اہلِ شقاوت راہ شقاوت پر پھر حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ آیت پڑھی :

"فاما من اعطی واتقی وصدق بالحسنی فسنیسرہ للیسری" (الآیۃ)

۱۰۷۔ قضا و قدر پر بے اطمینانی :

(ابن مسعودؓ) قال لان یقبض احدکم علی جمرۃ حتی یبرد خیرلہ من ان یقول لامر قضاہ اللہ لیتہ لم یکن (کبیر)

ایک آدمی کا انگارے کو ہاتھ سے سرد ہونے تک پکڑے رہنا اس سے بہتر ہے کہ کسی معاملے میں یوں کہے کہ : یہ قضائے الٰہی تھی مگر کاش ایسا نہ ہوتا۔

۱۰۸۔ توفیقِ الٰہی :

(انسؓ) رفعہ : اذا اراد اللّٰہ بعبد خیرًا استعملہ فقیل لہ کیف یستعملہ یارسول اللّٰہ ؟ قال لیوفقہ لعمل صالح قبل الموت (ترمذی)

اللہ تعالیٰ جب کسی بندے کے ساتھ خیر چاہتا ہے تو اس سے ویسا ہی کام لیتا ہے۔ لوگوں نے پوچھا کہ : اس کی کیا صورت ہوتی ہے ؟ فرمایا : مرنے سے پہلے اُسے عمل خیر کی توفیق بخش دیتا ہے۔

۱۰۹۔ اگر مگر کا غلط استعمال :

(ابوھریرۃؓ) رفعہ : المؤمن القوی خیر واحب الی اللّٰہ من المؤمن الضعیف وفی کل خیر احرص علی ما ینفعک واستعن باللّٰہ ولا تعجزوان اصابک شئ فلا تقل لو انی فعلت لکان کذا وکذا ولکن قل قدر اللّٰہ وماشاء فعل فان "لو" تفتح عمل الشیطان (مسلم)

قوی مومن اللہ تعالیٰ کو ضعیف مومن سے زیادہ محبوب ہے۔ ہاں خیر ہر ایک اہلِ ایمان کے اندر ہے۔ نفع رساں چیزوں کی طلب رکھا کرو اور اس کے حصول میں اللہ سے مدد مانگو۔ عاجز بن کر مت رہو اور اگر اس (راہ میں) تم پر کوئی آفت آجائے تو یہ نہ کہو کہ : اگر میں یوں کرتا تو یوں ہو جاتا بلکہ اس طرح کہو کہ : تقدیر الٰہی ہے، وہ جو چاہتا ہے، کرتا ہے، "اگر" کا یہ استعمال شیطانی فعل ہے۔

۱۱۰۔ تقدیر کی جزئیات میں پڑنے کی ضرورت ہی نہیں :

(ابن عباسؓ) لما بعث موسیٰ وانزل التورٰۃ قال اللھم انک رب عظیم ولوشئت ان تطاع لاطعت ولو شئت ان لا تعصیٰ ما عصیت وانت تحب ان تطاع وانت فی ذلک تعصیٰ فکیف ھذا یارب ؟ فنادی اللّٰہ الیہ انی لا اسئل عما افعل وھم یسئلون فلما بعث عزیرا وانزل علیہ التورٰۃ بعد ما کان رفعھا

اللہ تعالیٰ نے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھیجا اور ان پر تورات نازل فرمائی تو آپ نے عرض کیا کہ : اے مولا ! تو ربِّ عظیم ہے اگر تیری مشیت ہو کہ تیری اطاعت کی جائے تو تیری اطاعت ہی ہو گی اور اگر تو چاہے کہ تیری نافرمانی نہ ہو تو نہ ہو گی۔ اب یہ کیا معاملہ ہے کہ تیری پسند تو یہ ہے کہ تیری اطاعت کی جائے مگر ہوتی ہے تیری نافرمانی۔ آخر یہ کیا قصہ ؟ اس کا جواب بذریعہ وحی دیا گیا کہ : میں جو کچھ کرتا ہوں اس کی کوئی بازپرس نہیں اور انسانوں کی بازپرس ہو گی .... پھر جب حضرت عزیر علیہ السلام

عن بنی اسرائیل حتی قال من قال منهم ابن الله فقال اللهم انک رب عظیم مثل ذلک فاوحی الله الیه انی لا اسئل عما افعل وهم یسئلون فابت نفسه حتی سأل ایضاً فقال افتستطیع ان تصر صرة من الشمس؟ قال لا قال افتستطیع ان تجیئ بمکیال من ریح؟ قال لا قال افتستطیع ان تجیئ بمثقال من نور؟ قال لا قال فهکذا لا تقدر علی الذی سألت عنه انی لا اسئل عما افعل وهم یسئلون اما انی لا اجعل عقوبتك الا ان امحو اسمك من الانبیاء فلا تذکرنیهم فمحا اسمه من الانبیاء فلیس یذکر فیهم وهو نبی فلما بعث الله عیسیٰ ورأی منزلته من ربه وعلمه الکتاب الحکمة والتوراة والانجیل ویبرئ الاکمه والابرص ویحیی الموتی وینبئهم بما یأکلون وما یدخرون فی بیوتهم قال اللهم انک رب عظیم مثله فاوحی الیه انی لا اسئل عما افعل وهم یسئلون وانت عبدی ورسولی وکلمتی القیتک الی مریم و

مبعوث ہوئے اور بنی اسرائیل کے پاس سے تورات مفقود ہونے کے بعد دوبارہ آپ (عزیر) کو وہ دی گئی تو آپ نے بھی وہی سوال کیا (جو حضرت موسیٰ نے کیا تھا) اور آپ کو بھی وہی جواب ملا (جو حضرت موسیٰ کو ملا تھا) لیکن آپکے دل نے اس جواب کو قبول نہ کیا اور آپ نے دوبارہ یہی سوال فرمایا۔ اس کے جواب میں یہ پوچھا گیا کہ: کیا تم دھوپ کی کوئی تھیلی بنا سکتے ہو؟ کہا: نہیں۔ پھر پوچھا: کیا تم ہوا کو مخصوص وزن میں تول سکتے ہو؟ جواب دیا: نہیں! پھر پوچھا: کیا تم ایک مثقال روشنی لا سکتے ہو؟ جواب دیا: نہیں! ارشاد ہوا کہ: بس اسی طرح سمجھو کہ تم نے جو سوال کیا ہے اس کا جواب سمجھنے کی تم قدرت ہی نہیں رکھتے۔ بس اتنا ذہن نشین کر لو، کہ میں جو کچھ کروں اس کے متعلق کوئی باز پرس نہیں اور انسان جو کچھ کرے گا اس کی باز پرس ہوگی۔ میں تمھاری بس اتنی ہی گرفت کروں گا کہ تم نبی تو رہوگے مگر انبیاء کی فہرست میں تمھارا نام نہ ہوگا۔ اس کے بعد جب حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) مبعوث ہوئے اور انھوں نے ربوبیت کے مقابلے میں اپنی ہستی کو پہچانا تو اللہ تعالیٰ نے انھیں کتاب و حکمت اور تورات و انجیل کی تعلیم دی۔ وہ نابینا اور مبروص کو اچھا کرنے لگے اور مُردوں کو زندگی بخشنے لگے، نیز وہ لوگ جو کچھ کھاتے اور اپنے گھروں میں ذخیرہ جمع کرتے اُسے بتانے لگے تو آپ نے بھی اللہ تعالیٰ سے یہی سوال فرمایا اور وہی جواب ملا، اور یہ بھی فرمایا گیا کہ: تم میرے بندے ہو، میرا کلمہ ہو جو میں نے مریمؑ کی طرف القا کیا، میری رُوح ہو۔ میں نے تمھیں مٹی سے پیدا کر کے کُن کہا اور تم ہو گئے۔ دیکھو اگر تم باز نہ آئے

روح منہ خلقتک من تراب ثم قلت لک کن فکنت لئن لم تنتہ لا فعلن بک کما فعلت بصاحبک بین یدیک انی لا اسئل عما افعل وھم یسئلون فجمع عیسیٰؑ من یتبعہ فقال القدر سر اللہ فلا تتکلفوہ۔ (کبیر بلبن)

(اور پھر یہی سوال کیا) تو تمھارے ساتھ بھی وہی ہوگا، جو تمھارے ایک ساتھی (عزیرؑ) کے ساتھ ہو چکا ہے۔ بس اتنا ہی یاد رکھو کہ میں جو بھی کروں مجھ سے کوئی باز پُرس کرنے والا نہیں اور دوسروں کی باز پُرس ہوگی اس کے بعد حضرت عیسیٰؑ نے اپنے پیروؤں کو جمع کرکے فرمایا کہ: تقدیر اللہ کا ایک بھید ہے۔ لہٰذا اسے معلوم کرنے کی مُصیبت میں نہ پڑو۔

۱۱۱ - سعادت و شقاوتِ انسانی:

(سعدؓ) رفعہ: من سعادۃ ابن اٰدم رضاہ بما قضی اللہ لہ ومن شقاوۃ ابن اٰدم ترکہ استخارۃ اللہ ومن شقاوۃ ابن اٰدم سخطہ بما قضی اللہ لہ (ترمذی)

قضائے الٰہی پر راضی رہنا انسان کی بڑی سعادت ہے، لیکن اللہ تعالےٰ سے خیر کی طلب چھوڑ دینا بدبختی ہے، اور قضائے الٰہی پر ناراض ہونا بھی بدبختی ہے۔

۱۱۲ - جفّ القلم:

(ابن عمرو بن العاصؓ) رفعہ: ان اللہ تعالیٰ خلق خلقہ فی ظلمۃ فالقی علیھم من نورہ فمن اصابہ من ذلک النور اھتدی ومن اخطأہ ضل فلذلک اقول جف القلم علی علم اللہ تعالیٰ (ترمذی)

اللہ تعالےٰ نے اپنی مخلوق کو اندھیرے میں پیدا کیا۔ پھر ان پر اپنا نُور ڈالا۔ جس پر یہ نُور پڑا ہدایت یافتہ ہوگیا اور جو اُسے قبول نہ کر سکا وہ گمراہ ہوگیا یہی ہے وہ حقیقت جس کی وجہ سے میں کہتا ہوں کہ علمِ الٰہی کے متعلق قلم خشک ہو چکا ہے۔

۱۱۳ - تقدیریات پر بحث نہ کرو:

(ابوھریرۃؓ) خرج علینا النبی صلی اللہ علیہ وسلم ونحن نتنازع فی القدر فغضب حتی احمر وجھہ حتّٰی کانما فقیٔ فی وجنتیہ حبّ الرمان

ہم لوگ تقدیر پر بحث کر رہے تھے کہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم باہر آئے اور غصّے سے چہرۂ مُبارک اس قدر سُرخ ہوگیا جیسے انار کے دانے ہوں۔ پھر فرمایا کہ: کیا تمھیں اس چیز کا

فقال ابھذا امرتم ام بھذا ارسلت الیکم؟ انما ھلک من کان قبلکم حین تنازعوا فی ھذا الامر عزمت علیکم ان لا تنازعوا فیہ (ترمذی)

حکم دیا گیا ہے اور کیا مجھے اس غرض کے لیے بھیجا گیا ہے؟ تم سے پہلے لوگ اسی موضوع پر جھگڑا کرنے کی وجہ سے ہلاک ہو گئے جبرداً اس مسئلے میں کوئی مباحثہ نہ کیا کرو۔

۱۱۴ - توحید کی نزاکت :

(عائشۃ رضؓ) رفعتہ : لاتقولوا ماشاء اللہ وماشاء محمّد وقولوا ماشاء اللہ وحدہ - (موصلی)

ماشاء اللہ و ماشاء محمدؐ (جو اللہ اور محمدؐ کی مشیّت ہو) مت کہا کرو۔ صرف ماشاء اللہ (جو اللہ کی مشیّت ہو) کہا کرو۔

۱۱۵ - جنّت میں نیند نہیں :

(جابرؓ) سئل النبی صلّی اللہ علیہ وسلّم أینام اھل الجنّۃ؟ فقال النوم اخو الموت واھل الجنّۃ لاینامون (اوسط، بزار)

حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم سے سوال کیا گیا کہ: اہلِ جنّت کو نیند بھی آئے گی؟ حضورؐ نے فرمایا: نیند تو موت کی (چھوٹی) بہن ہے اس لیے اہلِ جنّت سویا نہیں کریں گے۔

۱۱۶ - دیدارِ الٰہی :

(جریرؓ) کنّا عند رسول اللہ صلّی علیہ وسلّم فنظر الی القمر لیلۃ البدر وقال انکم سترون ربکم عیانا کما ترون ھذا القمر لا تضامّون فی رؤیتہ ....

(شیخین، ابوداؤد، ترمذی)

ہم لوگ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں حاضر تھے کہ حضورؐ نے چودھویں کے چاند کی طرف دیکھا اور فرمایا کہ: تم اپنے ربّ کو اسی طرح اپنی آنکھوں سے دیکھو گے، جس طرح تم اس چاند کو دیکھ رہے ہو اور اس دیدار میں تمہیں کوئی کمی بیشی کی شکایت نہیں ہوگی ....

عبادات

۱۔ وضو:

عَنْ اَبِیْ مَالِکِ الْاَشْعَرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلطُّہُوْرُ شَطْرُ الْاِیْمَانِ۔ (مسلم شریف)

ابومالک اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پاکیزگی نصف ایمان ہے۔

۲۔ عَنْ عُثْمَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ تَوَضَّأَ فَاَحْسَنَ الْوُضُوْءَ خَرَجَتْ خَطَایَاہُ مِنْ جَسَدِہٖ حَتّٰی تَخْرُجَ مِنْ تَحْتِ اَظْفَارِہٖ (بخاری، مسلم)

حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ سرکارِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص وضو کرے اور اچھا وضو کرے، تو اُس کے گناہ اس کے جسم سے نکل جاتے ہیں یہاں تک کہ اس کے ناخنوں کے نیچے سے بھی نکل جاتے ہیں۔

۳۔ عَنْ سَعِیْدِ بْنِ زَیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا وُضُوْءَ لِمَنْ لَّمْ یَذْکُرِ اسْمَ اللّٰہِ عَلَیْہِ۔ (ترمذی، ابن ماجہ)

حضرت سعید بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا کہ جس نے وضو کے شروع میں بِسْمِ اللّٰہ نہ پڑھی اس کا وضو (کامل) نہیں۔

۴۔ عَنْ عُثْمَانَ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ تَوَضَّأَ ثَلٰثًا ثَلٰثًا وَقَالَ ھٰذَا وُضُوْئِیْ وَوُضُوْءُ الْاَنْبِیَاءِ قَبْلِیْ۔ (مشکوٰۃ)

حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے تین تین مرتبہ وضو فرمایا اور فرمایا کہ یہ میرا اور مجھ سے پہلے جو انبیائے کرام علیہم السلام تھے ان کا وضو ہے۔

۵۔ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلسِّوَاكُ مَطْهَرَةٌ لِّلْفَمِ مَرْضَاةٌ لِّلرَّبِّ ۔

(احمد ، دارمی)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ سرکارِ دو عالم صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسواک منہ کو پاک کرنے والی اور پروردگار کو راضی کرنے والی چیز ہے۔

حجّ

۶۔ قَالَتْ عَائِشَةُ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ تَرَى الْجِهَادَ اَفْضَلَ الْاَعْمَالِ اَفَلَا نُجَاهِدُ قَالَ لٰكِنَّ اَفْضَلَ الْجِهَادِ وَاَجْمَلَهٗ حَجٌّ مَبْرُوْرٌ ثُمَّ لُزُوْمُ الْحُصُرِ۔ البخاری وَلِلنَّسَائِيِّ جِهَادُ الصَّغِيْرِ وَالْكَبِيْرِ وَالضَّعِيْفِ وَالْمَرْاَةِ الْحَجُّ وَالْعُمْرَةُ۔

حضرت عائشہ رضؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم جہاد کو سب سے بہتر عمل سمجھتے ہیں۔ کیا ہم جہاد نہ کریں؟ آپؐ نے فرمایا لیکن بہترین جہاد حج ہے۔ اور خوب تر ہے۔ اگر اس میں کوئی گناہ نہ کیا جائے۔ پھر گھر میں بیٹھے رہنا چاہیئے۔ ایک دوسری حدیث میں ہے کہ بچے بوڑھے، کمزور آدمی اور عورت کے واسطے حج ہی جہاد ہے۔

۷۔ سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْحَاجِّ قَالَ الشَّعِثُ التَّفِلُ ۔ (الترمذی)

حاجی کی بابت آپؐ سے پوچھا گیا کہ اس کی کونسی ظاہری حالت بہتر ہے۔؟ فرمایا بکھرے بال اور خوشبو کا نہ لگانا۔

دُعا

۸۔ اَلَا اُخْبِرُكُمْ خَيْرَ اَعْمَالِكُمْ وَاَرْفَعِهَا فِيْ دَرَجَاتِكُمْ وَاَزْكَاهَا عِنْدَ مَلِيْكِكُمْ وَخَيْرٌ لَّكُمْ مِنْ اِعْطَاءِ الْوَرِقِ وَالذَّهَبِ وَخَيْرٌ لَّكُمْ مِنْ اَنْ تَلْقَوْا عَدُوَّكُمْ فَتَضْرِبُوْا اَعْنَاقَهُمْ وَيَضْرِبُوْا اَعْنَاقَكُمْ

کیا میں تمھارا سب سے بہتر عمل نہ تمھیں بتلا دوں جس سے تمھارے مرتبے بلند ہو جائیں۔ وہ تمھارے مالک کے نزدیک بہت پاکیزہ چیز ہے۔ سونے چاندی کی خیرات سے بھی بہتر ہے۔ اور اس سے بھی بہتر ہے کہ اگر دشمن سے تمھارا مقابلہ ہو جائے اور تم ان کی گردن مارو اور وہ تمھاری گردن ماریں؟ لوگوں نے کہا ہاں فرمائیے۔

قَالُوْا بَلٰی یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ ذِکْرُ اللّٰہِ تَعَالٰی ۔ (مالک والترمذی)

یا رسول اللہ ۔ فرمایا وہ اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے ۔

۹ ۔ یَقُوْلُ اللّٰہُ عَزَّ وَجَلَّ اَخْرِجُوْا مِنَ النَّارِ مَنْ ذَکَرَنِیْ یَوْمًا اَوْ خَافَنِیْ فِیْ مَقَامٍ ۔ (الترمذی)

اللہ تعالیٰ (حشر کے دن) فرمائے گا اُس شخص کو جس نے ایک دن بھی میرا ذکر کیا ہو یا میرا خوف کیا ہو (دوزخ) کی آگ سے نکال دو ۔

۱۰ ۔ ثَلٰثُ دَعَوَاتٍ مُسْتَجَابَاتٌ لَا شَکَّ فِیْ اِجَابَتِھِنَّ دَعْوَۃُ الْمَظْلُوْمِ وَ دَعْوَۃُ الْمُسَافِرِ اِلَی الْوَالِدِ عَلٰی وَلَدِہٖ ۔ (ابوداؤد والترمذی) ۔ وَاتَّقِ دَعْوَۃَ الْمَظْلُوْمِ فَاِنَّہٗ لَیْسَ بَیْنَہٗ وَ بَیْنَ اللّٰہِ حِجَابٌ (الخمسۃ)

تین دُعائیں مستجاب ہیں ۔ کہ ان کی قبولیت میں کوئی شک نہیں ہے ۔ مظلوم کی دعا ، مسافر کی دُعا اور باپ کی بددُعا اپنی اولاد کے حق میں ۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ مظلوم کی دُعا سے ڈرو ۔ کیونکہ اس کے اور خدا کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہے ۔

۱۱ ۔ مَا مِنْ دَعْوَۃٍ اَسْرَعُ اِجَابَۃً مِّنْ دَعْوَۃِ غَائِبٍ لِغَائِبٍ ۔ (ابوداؤد والترمذی)

کوئی دُعا ایسی جلد تر قبول نہیں ہوتی ، جیسے غیر حاضر شخص کی غیر حاضر شخص کے واسطے ۔

۱۲ ۔ اِنَّ رَبَّکُمْ حَیِیٌّ کَرِیْمٌ یَسْتَحْیِیْ مِنْ عَبْدِہٖ اِذَا رَفَعَ یَدَیْہِ اِلَیْہِ اَنْ یَرُدَّھُمَا صِفْرًا اَیْ خَالِیًا ۔ (ابوداؤد ، ترمذی)

تمہارا پروردگار حیا والا اور بخشش والا ہے اور اپنے بندے سے جب وہ اس کی طرف ہاتھ اُٹھاتا ہے ، حیا کرتا ہے کہ اُسے خالی ہاتھ پھیرے ۔

۱۳ ۔ اُدْعُوا اللّٰہَ وَاَنْتُمْ مُوْقِنُوْنَ بِالْاِجَابَۃِ وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی لَا یَسْتَجِیْبُ دُعَاءً مِنْ قَلْبٍ غَافِلٍ لَاہٍ ۔ (الترمذی)

اللہ تعالیٰ سے اس حالت میں دُعا کرو کہ جب تمہیں یقین ہو کہ تمہاری دُعا قبول ہو جائے گی اور یہ سمجھ رکھو ، کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کی دُعا قبول نہیں کرتا جس کا دل اس سے غافل ہو ۔

۱۴ ۔ اِذَا دَعَا اَحَدُکُمْ فَلَا یَقُلْ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِیْ اِنْ شِئْتَ اَللّٰھُمَّ ارْحَمْنِیْ اِنْ شِئْتَ وَلٰکِنْ لِیَعْزِمِ الْمَسْئَلَۃَ فَاِنَّ اللّٰہَ

جب تم میں سے کوئی دُعا کرے تو یہ نہ کہے کہ اے خدا اگر تو چاہے تو مجھے بخش دے اور اگر تو چاہے تو مجھ پر رحم کر ۔ بلکہ قطعی اور یقینی درخواست کرنی چاہیے ۔ کیونکہ اللہ پر کوئی

تَعَالٰى لَا مُسْتَكْرِهَ لَهٗ ۔
(السنۃ الا النسائی)

روک ڈالنے والا نہیں ہے ۔

۱۵۔ فَجَعَلَ النَّاسُ يَجْهَرُوْنَ بِالتَّكْبِيْرِ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِرْبَعُوْا عَلٰى اَنْفُسِكُمْ اِنَّكُمْ لَا تَدْعُوْنَ اَصَمَّ وَلَا غَائِبًا اِنَّكُمْ تَدْعُوْنَ سَمِيْعًا بَصِيْرًا وَّهُوَ مَعَكُمْ وَالَّذِيْ تَدْعُوْنَهٗ اَقْرَبُ اِلٰى اَحَدِكُمْ مِنْ عُنُقِ رَاحِلَتِهٖ ۔ (الخمسۃ الا النسائی)

لوگ اُونچی آواز سے تکبیر پڑھ رہے تھے ۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ادھر سے گزرے ۔ سُنا اور فرمایا۔ آہستہ بولو کیونکہ تم کسی بہرے یا غیر حاضر شخص کو نہیں پکار رہے ۔ تم تو اُس کو پکار رہے ہو۔ جو سنتا ہے اور دیکھتا ہے، اور وہ تمھارے ساتھ ہے۔ اور تم سے تمھاری سواری کے اُونٹ کی گردن سے بھی زیادہ نزدیک ہے ۔

۱۶۔ اِعْتَكَفَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْمَسْجِدِ فَسَمِعَهُمْ يَجْهَرُوْنَ بِالْقُرْاٰنِ فَكَشَفَ السِّتْرَ فَقَالَ اَلَا اِنَّ كُلَّكُمْ مُنَاجٍ رَبَّهٗ فَلَا يُؤْذِيَنَّ بَعْضُكُمْ بَعْضًا وَلَا يَرْفَعْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الْقِرَاءَةِ اَوْ قَالَ فِي الصَّلٰوةِ ۔ (ابوداؤد)

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں معتکف تھے۔ آپ نے سنا کہ لوگ اونچی آواز سے قرآن پڑھ رہے ہیں ۔ آپ نے پردہ اٹھایا ، اور فرمایا دیکھو تم خدا کی درگاہ میں دُعا کرتے ہو۔ پس ایک دوسرے کو ایذا نہ دیا کرو، اور نہ قرآن پڑھنے میں یا نماز پڑھنے میں ایک دوسرے کی نسبت بلند آواز میں بولا کرو۔

۱۷۔ يُسْتَجَابُ لِاَحَدِكُمْ مَالَمْ يَعْجَلْ يَقُوْلُ قَدْ دَعَوْتُ رَبِّيْ فَلَمْ يَسْتَجِبْ لِيْ ۔ (السنۃ الا النسائی ۔ وَفِي اُخْرٰى لِمُسْلِمٍ لَا يَزَالُ يُسْتَجَابُ لِلْعَبْدِ مَالَمْ يَدْعُ بِاِثْمٍ اَوْ قَطِيْعَةِ رَحِمٍ ۔

تم میں سے ہر ایک کی دُعا قبول ہو جاتی ہے ۔ اگر کوئی جلدی کر کے یہ نہ کہے کہ میں نے خدا سے دعا کی ۔ مگر قبول نہ ہوئی اور دوسری روایت میں ہے کہ بندہ کی دُعا قبول ہو جاتی ہے، اِلّا (اس صورت میں کہ مقصد) گناہ کی بات ہو ۔ یا رشتے کا توڑنا ہو (کہ اس وقت قبول نہیں ہوتی)

۱۸۔ لَا تَدْعُوْا عَلٰى اَنْفُسِكُمْ وَلَا تَدْعُوْا عَلٰى اَوْلَادِكُمْ وَلَا تَدْعُوْا عَلٰى خَدَمِكُمْ وَلَا تَدْعُوْا عَلٰى اَمْوَالِكُمْ لَا تُوَافِقُوْا مِنَ اللهِ سَاعَةً نَيْلٍ فِيْهَا عَطَاءٌ فَيَسْتَجِيْبُ لَكُمْ ۔ (ابوداؤد)

اپنی جانوں ۔ اپنی اولاد ۔ اپنے خدام اور اپنے مال کے حق میں بددُعا نہ کیا کرو ۔ ایسا اتفاق نہ ہو جائے کہ وہ گھڑی اجابت کی بخشش کی ہو ۔ اور تمھاری بددعا قبول ہو جائے ۔

۱۹۔ من دعا على من ظلمه فقد انتصر۔ (الترمذی)

جس شخص نے اپنے ظلم کرنے والے کے واسطے بد دعا کی اُس نے ضرور اپنا بدلہ لے لیا۔

۲۰۔ سلوا الله تعالى من فضله فان الله تعالى يحب ان يسأل وافضل العبادة انتظار الفرج۔ (الترمذی)

اللہ تعالیٰ سے اس کا فضل طلب کیا کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ کو یہ پسند ہے کہ (اسی سے) مانگا جائے اور غم کے دُور ہونے اور آسائش کے حاصل ہونے کا انتظار کرنا بہت اچھی عبادت ہے۔

۲۱۔ ليسأل احدكم ربه حاجته كلها حتى يسأل شسع نعله اذا انقطع۔ (الترمذی)

تم میں سے ہر ایک کو اپنی ساری حاجتیں اپنے ربّ سے مانگنی چاہئیں۔ یہاں تک کہ چپل کا تسمہ بھی ٹوٹ جائے تو اُسی سے مانگنا چاہیئے۔

۲۲۔ من لم يسأل الله يغضب عليه۔ (الترمذی)

جو خدا سے نہیں مانگتا۔ خدا اس سے ناراض ہوتا ہے۔

۲۳۔ اذا اوى الى فراشه قال الحمد لله الذى اطعمنا وسقانا وكفانا واوانا فكم ممن لا كافى له ولا مؤوى۔ مسلم، ابو داؤد، الترمذی۔ وفى اخرى باسمك اللهم احيى واموت۔ الحمد لله الذى احيانا بعد ما اماتنا واليه النشور۔ (الستة الا مالک والمسلم)

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کو جب بستر پر آتے تو فرماتے شکر ہے اللہ کا۔ جس نے ہمیں کھانے کو دیا۔ پینے کو دیا اور ہماری سب ضرورتیں پوری کیں اور ہمیں ٹھکانا دیا۔ بہتیرے ایسے ہیں۔ جن کی نہ ضروریات پوری ہوتی ہیں۔ نہ کوئی ان کے لیے ٹھکانا ہے۔ ایک دوسری حدیث میں ہے کہ آپؐ سونے کے وقت یہ دُعا کرتے۔ یا خدا میں تیرے ہی نام سے جیتا ہوں اور مرتا ہوں (اور صبح بستر پر سے اُٹھتے تو یہ دُعا کرتے) اللہ کا شکر ہے جس نے ہمیں مرنے کے بعد زندہ کیا اور اسی کی طرف پھر جانا بھی ہے۔

۲۴۔ اذا خرج من بيته قال بسم الله توكلت على الله اللهم انا نعوذ بك من ان نزل او نضل او نظلم او نظلم او نجهل او يجهل علينا۔ (ترمذی، نسائی، ابو داؤد)

جب رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھر سے باہر نکلتے تو یہ دُعا پڑھتے۔ شروع کرتا ہوں میں اللہ کے نام سے اللہ ہی پر بھروسہ کرتا ہوں۔ یا اللہ تجھ سے ہی ہم پناہ مانگتے ہیں اس بات سے کہ ہمارا پاؤں پھسل جائے یا ہم گمراہ ہو جائیں یا ہم کسی پر ظلم کریں، یا ہم پر کوئی ظلم کرے یا ہم کسی سے جہالت سے پیش آئیں یا کوئی ہمارے ساتھ جہالت سے پیش آئے۔

۲۵۔ اِذَا خَرَجَ مِنْ بَیْتِہٖ یَقُوْلُ بِسْمِ اللّٰہِ تَوَکَّلْتُ عَلَی اللّٰہِ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ۔ (ابوداؤد والترمذی)

جب گھر سے کوئی نکلے۔ تو یہ دُعا پڑھے۔ شروع کرتا ہوں۔ اللہ کے نام سے۔ اللہ ہی پر بھروسہ کرتا ہوں۔ اور اللہ کے سوا کسی میں طاقت اور قوّت (میرے نیک و بد کی) نہیں ہے۔

۲۶۔ اِذَا وَلَجَ الرَّجُلُ اِلٰی بَیْتِہٖ فَلْیَقُلْ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ خَیْرَ الْمَوْلِجِ وَخَیْرَ الْمَخْرَجِ بِسْمِ اللّٰہِ وَلَجْنَا وَبِسْمِ اللّٰہِ خَرَجْنَا وَعَلَی اللّٰہِ رَبِّنَا تَوَکَّلْنَا ثُمَّ لِیُسَلِّمْ عَلٰی اَھْلِہٖ۔ (ابوداؤد)

جب کوئی آدمی اپنے گھر میں داخل ہو تو اُسے یہ کہنا چاہیئے۔ یا اللہ میں تجھ سے ہی اندر آنے اور باہر جانے میں بھلائی مانگتا ہوں۔ اللہ کے نام سے ہی ہم اندر آتے ہیں اور اللہ کے نام سے ہی ہم باہر جاتے ہیں۔ اللہ پر جو ہمارا پروردگار ہے۔ ہم بھروسہ کرتے ہیں پھر اپنے گھر والوں کو سلام کرے۔

۲۷۔ اَللّٰھُمَّ اقْسِمْ لَنَا مِنْ خَشْیَتِکَ مَا تَحُوْلُ بِہٖ بَیْنَنَا وَبَیْنَ مَعَاصِیْکَ وَمِنْ طَاعَتِکَ مَا تُبَلِّغُنَا بِہٖ جَنَّتَکَ وَمِنَ الْیَقِیْنِ مَا تُھَوِّنُ بِہٖ عَلَیْنَا مَصَائِبَ الدُّنْیَا اَللّٰھُمَّ مَتِّعْنَا بِاَسْمَاعِنَا وَاَبْصَارِنَا وَقُوَّتِنَا مَا اَحْیَیْتَنَا وَاجْعَلْہُ الْوَارِثَ مِنَّا وَاجْعَلْ ثَارَنَا عَلٰی مَنْ ظَلَمَنَا وَانْصُرْنَا عَلٰی مَنْ عَادَانَا وَلَا تَجْعَلْ مُصِیْبَتَنَا فِیْ دِیْنِنَا وَلَا تَجْعَلِ الدُّنْیَا اَکْبَرَ ھَمِّنَا وَلَا مَبْلَغَ عِلْمِنَا وَلَا تُسَلِّطْ عَلَیْنَا مَنْ لَا یَرْحَمُنَا۔ (الترمذی)

یا اللہ اپنا خوف ہمارے (دلوں میں) اتنا ڈال دے کہ وہ ہم میں اور ہمارے گناہوں میں حائل ہو جائے، اور اپنی فرمانبرداری اتنی دے کہ وہ ہمیں جنّت میں پہنچا دے۔ اور اتنا یقین عطا کر کہ ہماری دنیاوی مصیبتیں اس سے آسان ہو جائیں۔ اے خدا ہمارے کانوں، آنکھوں اور قوّت سے اس وقت تک ہمیں بہرہ مند رکھ جب تک کہ ہم جیتے رہیں، اور ہم میں سے ہمارے وارث بنا۔ اور ہمارا انتقام اس شخص سے لے جو ہم پر ظلم کرے۔ اور اس شخص کے مقابلہ میں جو ہم پر زیادتی کرے ہماری مدد کر اور ہمارے دین میں مصیبت نہ پڑنے دے اور دنیا کو نہ ہمارا بڑا مقصود اور نہ ہمارے علم کی انتہا بنا اور ہمارے اُوپر ایسے شخص کو مسلط نہ کر جو ہم پر رحم نہ کرے۔

سفر شروع کرنے کے وقت آپ یہ دُعا پڑھتے:۔

۲۸۔ بِسْمِ اللّٰہِ اَللّٰھُمَّ اَنْتَ الصَّاحِبُ فِی السَّفَرِ وَالْخَلِیْفَۃُ فِی الْاَھْلِ

شروع کرتا ہوں۔ میں اللہ کے نام سے اے خدا تو ہی سفر میں ساتھی ہے اور (میری غیر حاضری میں) عیال میں میرا

اَللّٰھُمَّ اَزْدِلَنَا الْاَرْضَ وَھَوِّنْ عَلَیْنَا السَّفَرَ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنْ وَعْثَاءِ السَّفَرِ۔ (مالک)

قائم مقام، اے خدا زمین کو ہمارے واسطے لپیٹ دے (یعنی مسافت کم معلوم ہو) اور سفر کو ہمارے واسطے آسان کر دے۔ اے خدا سفر کی تکلیفوں، رنج دینے والی واپسی اور (اپنے) مال اور عیال میں بُری نظر پڑنے سے ہم پناہ مانگتے ہیں۔

۲۹۔ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنْ قَلْبٍ لَّا یَخْشَعُ وَمِنْ دُعَاءٍ لَا یُسْمَعُ وَمِنْ نَفْسٍ لَّا تَشْبَعُ وَمِنْ عِلْمٍ لَّا یَنْفَعُ وَاَعُوْذُبِکَ مِنْ ھٰؤُلَاءِ الْاَرْبَعِ۔ (الترمذی والنسائی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دُعا کیا کرتے تھے یا اللہ میں تیری پناہ مانگتا ہوں۔ ایسے دل سے جس میں عاجزی نہ ہو، ایسی دُعا سے جو سُنی نہ جائے۔ ایسے نفس سے جو سیر نہ ہو، اور ایسے علم سے جس سے نفع نہ ہو۔ ان چاروں سے مجھے بچائے رکھ۔

اعمال میں میانہ روی

۳۰۔ سُنّت نبوی کی توضیح اور عبادت کے غلط تصوّر کی اصلاح:

(انسؓ) جاء ثلاثة رهط الی بیوت ازواج رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم یسألون عن عبادته فلما اخبروا کانّهم تقالّوها قالوا این نحن من رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم وقد غفر له ما تقدم من ذنبه وما تأخّر قال احدهم اما انا فاصلی اللیل ابدا وقال الآخر وانا اصوم الدهر ولا افطر وقال الآخر و انا اعتزل النساء ولا اتزوج ابدا فجاء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم الیهم فقال

تین صحابہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی ازواج کے پاس آکر آپؐ کی عبادت کا حال پوچھا اور معلوم ہونے پر اپنی عبادت کو بہت کم خیال کیا۔ تینوں کہہ اُٹھے کہ: "کہاں ہم اور کہاں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اگلے پچھلے سب گناہ معاف ہو چکے ہیں" ان میں ایک صاحب نے شب بھر تہجّد و نوافل، دوسرے نے ہمیشہ روزہ داری اور تیسرے نے تا زیست مجرّد رہنے کا عہد کر لیا۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلّم) نے سُنا تو ان کے پاس آکر فرمایا:

انتم الذین قلتم کذا و کذا اما واللہ انی لاخشاکم للہ واتقاکم لہ ولکنی اصوم وافطر واصلی وارقد واتزوج النساء فمن رغب عن سنتی فلیس منی (للشیخین وللنسائی نحوہ)

"تم لوگوں نے یہ یہ عہد کیے ہیں؟ بخدا! میں تم سب سے زیادہ اللہ تعالٰے سے ڈرتا ہوں، مگر میں روزے رکھتا بھی ہوں اور چھوڑ بھی دیتا ہوں، نمازِ شب بھی پڑھتا ہوں اور آرام بھی کرتا ہوں اور نکاح بھی کرتا ہوں، جس نے میری سنت ترک کی وہ میری اُمت سے نہیں۔"

۴۱۔ سُنّت کے معنی تقشف کے نہیں:

(عائشۃ رض) بعث رسول اللہ الی عثمان بن مظعون أرغبۃ عن سنتی؟ فقال لا واللہ یارسول اللہ ولکن سنتک اطلب قال فانی انام واصلی واصوم وافطر وانکح النساء فاتق اللہ یا عثمان فان لاھلک علیک حقا وان لضیفک علیک حقا وان لنفسک علیک حقا فصم وافطر وصل ونم۔ (ابوداؤد)

(حضرت عثمان بن مظعون) نے ان تین کاموں پہ حلف اُٹھا لیا: (۱) شب بھر قیام (۲) صائم الدہر رہنے کا اور (۳) تجرّد کا (رسول اللہ نے سنا تو) پیغام بھیجا کہ: تم میری سنّت سے منحرف ہو گئے؟ عثمان رض نے حاضر ہو کر عرض کیا: یا رسول اللہ! خدا کی قسم! آپ ہی کی سنّت سمجھ کر تو یہ حلف اٹھایا ہے۔ فرمایا: مگر میں تو شب کو سوتا بھی ہوں اور قیام بھی کرتا ہوں۔ (نفلی) روزہ کے ساتھ ناغہ بھی کرتا ہوں، مناکحت پر بھی میرا عمل ہے۔ اے عثمان رض اللہ سے ڈرو! تم پر تمھارے بال بچوں کا، مہمان کا اور اپنی ذات کا بھی کچھ حق ہے، لہٰذا روزہ بھی رکھو اور ناغہ بھی کرو، نماز ادا کرو اور آرام بھی کرو۔

۴۲۔ صائم الدھر رہنا کوئی روزہ نہیں:

(ابن عمرو رض بن العاص) انک لتصوم النہار وتقوم اللیل؟ قلت: نعم قال اذا فعلت ذلک ہجمت لہ العین ونفہت لہ النفس لا صام من صام الابد (للستۃ)

رسولِ خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مجھ سے فرمایا: واقعی تم مسلسل نفلی روزے اور ساری رات تہجد ادا کرتے ہو؟ میں نے عرض کیا: جی ہاں، فرمایا: اس طرح تو آنکھیں دھنس جائیں گی اور بدن تھک جائے گا، مسلسل نفلی روزے کوئی روزہ ہی نہیں۔؟

۳۳۔ تھوڑے عمل میں مداومت :

(عائشۃؓ) فقال ایھا الناس خذوا من الاعمال ما تطیقون فان اللہ لا یمل حتّٰی تملوا وان احبّ الاعمال الی اللہ ما دام وان قلّ (للستۃ)

لوگو! اعمال میں اپنی برداشت کا خیال رکھو۔ ورنہ تم ہی اُکتا جاؤ گے نہ کہ خداوند کریم! اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ عمل وہ ہے، جس میں مداومت ہو سکے اگرچہ مختصر ہو۔

۳۴۔ اسلام میں تقشف نہیں :

(انسؓ) قال دخل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم المسجد فاذا حبل ممدود بین الساریتین فقال ما ھذا؟ قالوا حبل لزینبؓ اذا فترت تعلقت بہ قال لا حلوہ لیصلّ احدکم نشاطہ فاذا فتر فلیقعد۔ (بخاری ونسائی، ابوداؤد ولہ ایضا حمنۃ بدل زینب)

ایک روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لائے تو دو ستونوں کے درمیان رسی تنی ہوئی تھی پوچھا: یہ کیا ہے؟ عرض کیا گیا کہ: یہ بی بی زینبؓ کا انتظام ہے۔ وہ طول قیام سے تھک کر اس کا سہارا لیتی ہیں؟ فرمایا: نہیں! اسے کھول دو جب تک بار نہ ہو نماز پڑھتے رہو۔ تھک جاؤ تو بیٹھ کر دم لو۔

۳۵۔ پتے کی بات :

(ابوھریرۃؓ) رفعہ: ان لکل شیء شرّۃ ولکل شرۃ فترۃ فان صاحبھا سدد وقارب فارجوہ وان اشیر الیہ بالاصابع فلا تعدّوہ (ترمذی)

ہر شے میں ایک دلچسپی ہوتی ہے اور ہر دلچسپی کی ایک حد۔ اگر کوئی شخص اپنے عبادات کی دلچسپی میں اعتدال کو قائم رکھے اور غلو سے بچتا رہے تو اس کے متعلق اچھی اُمیدیں رکھو اور (کثرت عبادت کی وجہ سے) اس کی طرف اُنگلیاں اُٹھنے لگیں تو اُسے کسی شمار میں نہ لاؤ۔

۳۶۔ ہر شے میں اعتدال :

(ابوھریرۃؓ) رفعہ: خیر الامور اوسطھا (رزین)

بہترین بات وہ ہے جس میں اعتدال قائم رہے۔

۳۷۔ منازلِ دین طے کرنے میں خوش اسلوبی :

جابرؓ) رفعه : ان هذا الدين متين فاوغلوا فيه برفق۔
(بزار بلین احمد وله عن انسؓ)

یہ دین ایک بڑی سنجیدہ چیز ہے۔ اس پر چلنے میں بڑی خوش اسلوبی سے کام لو۔

۳۸ : ریاضتِ شاقہ کی ممانعت :

(سہلؓ بن حنیفؓ) رفعه : لاتشددوا على انفسكم فانما هلك من كان قبلكم بتشديدهم على انفسهم ستجدون بقايا هم فى الصوامع والديارات۔ (للكبير اوسط، ابوداؤد عن انس بقصة)

(کثرتِ عبادت سے) اپنے اوپر مشقت نہ ڈالو۔ اسی شوق میں پہلی امتیں تباہ ہو گئیں۔ جن کی اولاد آج گرجاؤں اور بت خانوں میں راہب بنی بیٹھی ہے۔

استنجاء

۳۹۔ عَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا دَخَلَ الْخَلَاءَ يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اِنِّىْ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم جب استنجا خانہ میں داخل ہوتے تو فرماتے اَللّٰهُمَّ اِنِّىْ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ یعنی اے اللہ! میں پلیدی اور شیاطین سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔

۴۰۔ عَنْ اَبِىْ اَيُّوْبَ الْاَنْصَارِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَتَيْتُمُ الْغَائِطَ فَلَا تَسْتَقْبِلُوا الْقِبْلَةَ وَلَا تَسْتَدْبِرُوْهَا۔ (بخاری، مسلم)

حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ رسول کریم علیہ الصلاۃ والتسلیم نے فرمایا کہ جب تم قضائے حاجت کے لیے جاؤ تو قبلہ کی طرف منہ نہ کرو، اور نہ اس کی جانب پیٹھ کرو۔

۴۱ - عَنْ عُمَرَ قَالَ رَاٰنِی النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَ اَنَا اَبُوْلُ قَائِمًا فَقَالَ یَا عُمَرُ لَا تَبُلْ قَائِمًا فَمَا بُلْتُ قَائِمًا بَعْدُ۔ (ترمذی، ابن ماجہ)

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے مجھے اس حال میں دیکھا کہ میں کھڑے ہو کر پیشاب کر رہا تھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے عمر! کھڑے ہو کر پیشاب نہ کرو۔ اس کے بعد میں نے کھڑے ہو کر کبھی پیشاب نہ کیا۔

غسل

۴۲ - عَنْ عَائِشَۃَ قَالَتْ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا اغْتَسَلَ مِنَ الْجَنَابَۃِ بَدَءَ فَغَسَلَ یَدَیْہِ ثُمَّ یَتَوَضَّأُ کَمَا یَتَوَضَّأُ ثُمَّ یُدْخِلُ اَصَابِعَہٗ فِی الْمَاءِ فَیُخَلِّلُ اُصُوْلَ شَعْرِہٖ ثُمَّ یَصُبُّ عَلٰی رَاْسِہٖ ثَلٰثَ غُرَفَاتٍ بِیَدَیْہِ ثُمَّ یُفِیْضُ الْمَاءَ عَلٰی جِلْدِہٖ کُلِّہٖ وَفِیْ رِوَایَۃِ الْمُسْلِمِ یَبْتَدِءُ فَیَغْسِلُ یَدَیْہِ قَبْلَ اَنْ یُدْخِلَھُمَا الْاِنَاءَ ثُمَّ یُفْرِغُ بِیَمِیْنِہٖ عَلٰی شِمَالِہٖ فَیَغْسِلُ فَرْجَہٗ ثُمَّ یَتَوَضَّأُ۔ (بخاری، مسلم)

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا کہ رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم جب جنابت کا غسل فرماتے تو ابتداء یوں کرتے کہ پہلے ہاتھ دھوتے پھر نماز کے جیسا وضو کرتے پھر انگلیاں پانی میں ڈال کر ان سے بالوں کی جڑیں تر فرماتے۔ پھر سر پر دونوں ہاتھ سے تین چلو پانی ڈالتے۔ پھر تمام بدن پر پانی بہاتے اور امام مسلم کی روایت میں ہے کہ حضور (جب غسل) شروع فرماتے تو ہاتھوں کو برتن میں داخل کرنے سے پہلے دھو لیتے پھر داہنے ہاتھ سے بائیں ہاتھ پر پانی ڈالتے۔ لہٰذا اپنی شرمگاہ دھوتے پھر وضو فرماتے۔

ذکر

۴۳ - لَا یَقْعُدُ قَوْمٌ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ اِلَّا

جب لوگ بیٹھ کر اللہ کی یاد کرتے ہیں تو فرشتے ان

حَفَّتْهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَغَشِيَتْهُمُ الرَّحْمَةُ وَنَزَلَتْ عَلَيْهِمُ السَّكِيْنَةُ وَذَكَرَهُمُ اللّٰهُ تَعَالٰى فِيْمَنْ عِنْدَهٗ۔
(مسلم والترمذی)

کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ ان پر رحمت چھا جاتی ہے۔ اور ان کے دلوں میں تسلی اور اطمینان ہو جاتا ہے۔ اور اللہ اپنے پاس والوں سے ان کا ذکر کرتا ہے۔

۴۴۔ مَثَلُ الْبَيْتِ الَّذِيْ يُذْكَرُ اللّٰهُ فِيْهِ وَالْبَيْتُ الَّذِيْ لَا يُذْكَرُ اللّٰهُ فِيْهِ مَثَلُ الْحَيِّ وَالْمَيِّتِ۔ الشیخان۔ وَفِيْ رِوَايَةٍ يَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰى اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِيْ بِيْ وَاَنَا مَعَهٗ اِذَا ذَكَرَنِيْ فَاِذَا ذَكَرَنِيْ فِيْ نَفْسِهٖ ذَكَرْتُهٗ فِيْ نَفْسِيْ وَاِنْ ذَكَرَنِيْ فِيْ مَلَاٍ ذَكَرْتُهٗ فِيْ مَلَاٍ خَيْرٍ مِّنْهُمْ وَاِنْ تَقَرَّبَ اِلَيَّ شِبْرًا تَقَرَّبْتُ اِلَيْهِ ذِرَاعًا وَاِنْ تَقَرَّبَ اِلَيَّ ذِرَاعًا تَقَرَّبْتُ اِلَيْهِ بَاعًا وَاِنْ اَتَانِيْ يَمْشِيْ اَتَيْتُهٗ هَرْوَلَةً۔
(الشیخان والترمذی)

اس گھر کی مثال جس میں اللہ کا ذکر کیا جائے اور اس گھر کی جس میں اللہ کا ذکر نہ کیا جائے۔ زندہ اور مردہ کی ہے اور ایک روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں اپنے بندے کے گمان کے نزدیک ہوں اور میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں۔ جب وہ مجھے یاد کرتا ہے اور جب وہ میری یاد دل میں کرتا ہے میں بھی اس کی یاد دل میں کرتا ہوں اور جب وہ میری یاد جماعت میں کرتا ہے تو میں بھی اس کی یاد جماعت میں کرتا ہوں۔ جو اس سے بہتر ہے۔ اگر وہ میری طرف ایک بالشت بڑھتا ہے تو میں اُس کی طرف ہاتھ بھر بڑھتا ہوں اگر وہ ہاتھ بھر آئے۔ تو میں دو ہاتھ اس کی طرف جاتا ہوں۔ اگر وہ چل کر آئے تو میں دوڑ کر اس کے پاس جاتا ہوں۔

۴۵۔ مَنْ اَوٰى اِلٰى فِرَاشِهٖ طَاهِرًا يَذْكُرُ اللّٰهَ تَعَالٰى حَتّٰى يُدْرِكَهُ النُّعَاسُ لَمْ يَتَقَلَّبْ سَاعَةً مِّنَ اللَّيْلِ يَسْاَلُ اللّٰهَ تَعَالٰى مِنْ خَيْرِ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ اَعْطَاهُ اللّٰهُ اِيَّاهُ۔
(ترمذی)

جب کوئی شخص اپنے بستر پر پاک اور صاف ہو کر لیٹے اور پھر خدا کی یاد شروع کرے اور یاد کرتا کرتا سو جائے۔ تو رات کو جب کروٹ بدلے گا۔ اس وقت جو بہتری دنیا اور آخرت کی اپنے لیے مانگے گا۔ خدا اُسے عطا فرمائے گا۔

۴۶۔ مَا عَمِلَ الْعَبْدُ عَمَلًا اَنْجٰى لَهٗ مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ ذِكْرِ اللّٰهِ تَعَالٰى۔
(مالک)

اللہ کے عذاب سے بچانے والا۔ خدا کے ذکر سے بڑھ کر اور کوئی عمل نہیں ہے۔

کتاب طہارت و پاکیزگی

۴۷۔ کھڑے پانی کے اندر پیشاب کرنا:

(ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ) رفعہ: لا یبولن احدکم فی الماء الذی لا یجری ثم یغتسل فیہ (للستۃ الا الموطأ)

جو پانی کھڑا ہوا اس میں پیشاب کر کے غسل نہ کرو۔

۴۸۔ کتے کا جھوٹا برتن:

(ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ) رفعہ: اذا شرب الکلب فی اناء احدکم فیغسلہ سبع مرات (شیخین، موطأ، نسائی)

جب کتا کسی برتن میں پینے کے لیے منہ ڈال دے تو اس برتن کو سات بار دھویا کرو۔

۴۹۔ تین جگہوں پر رفع حاجت:

(معاذ رضی اللہ عنہ) اتقوا الملاعن الثلاث البراز فی الموارد وقارعۃ الطریق والظل (ابوداؤد)

گھاٹ، سڑک اور سایہ یہ تین جگہیں ایسی ہیں جہاں رفعِ حاجت کی قابلِ ملامت عادت سے پرہیز رکھو۔

۵۰۔ رفعِ حاجت کے بعد ذکر الٰہی:

(عائشۃ رضی اللہ عنہا) کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا خرج من الخلاء قال غفرانک (ترمذی، ابوداؤد)

رفع حاجت سے واپس آتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے: غفرانک (اے اللہ! میں تیری مغفرت کا طلب گار ہوں)۔

۵۱۔ ایضاً:

(ابوذر رضی اللہ عنہ) کان یقول اذا خرج من الخلاء الحمد للہ الذی اذھب عنی الاذیٰ

رفع حاجت سے واپسی پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم یوں فرماتے: (ترجمہ) اس اللہ کا شکر ہے کہ میری تکلیف دور کر دی۔

دعا مانی (رزین) | کو دُور کر کے مجھے عافیت بخشی۔

۵۲۔ سیدھے اور اُلٹے ہاتھ میں تقسیم کار :

(عائشہؓ) کانت ید رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم الیمنی لطھورہ وطعامہ وکانت یدہ الیسریٰ لخلائہ وماکان من اذی (ابوداؤد)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دایاں ہاتھ پاکیزہ کاموں کے لیے تھا یا کھانے کے لیے اور بایاں ہاتھ استنجے کے لیے تھا یا دُوسری گندگی دُور کرنے کے لیے۔

نماز

۵۳۔ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَرَاَیْتُمْ لَوْ اَنَّ نَهْرًا بِبَابِ اَحَدِکُمْ یَغْتَسِلُ فِیْهِ کُلَّ یَوْمٍ خَمْسًا هَلْ یَبْقٰی مِنْ دَرَنِهٖ شَیْءٌ قَالُوْا لَا یَبْقٰی مِنْ دَرَنِهٖ شَیْءٌ قَالَ کَذٰلِکَ مَثَلُ الصَّلَوَاتِ الْخَمْسِ یَمْحُو اللّٰهُ بِهِنَّ الْخَطَایَا۔ (بخاری، مسلم)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ رسولِ کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بتاؤ اگر تم لوگوں میں کسی کے دروازے پر نہر ہو اور وہ اس میں روزانہ پانچ مرتبہ غسل کرتا ہو تو کیا اس کے بدن پر کچھ میل باقی رہ جائے گا؟ صحابہ کرام نے عرض کیا۔ ایسی حالت میں اس کے بدن پر کچھ بھی میل باقی نہ رہے گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بس یہی کیفیت ہے، پانچوں نمازوں کی۔ اللہ تعالےٰ ان کے سبب گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔

۵۴۔ عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ خَرَجَ زَمَنَ الشِّتَاءِ وَالْوَرَقُ یَتَهَافَتُ فَاَخَذَ بِغُصْنَیْنِ مِنْ شَجَرَةٍ فَجَعَلَ ذٰلِکَ الْوَرَقُ یَتَهَافَتُ قَالَ فَقَالَ یَا اَبَا ذَرٍّ قُلْتُ لَبَّیْکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ اِنَّ الْعَبْدَ الْمُسْلِمَ لَیُصَلِّی الصَّلٰوةَ

حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ ایک روز سردی کے موسم میں جب کہ درختوں کے پتے گر رہے تھے، (یعنی پت جھڑ کا موسم تھا) حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم باہر تشریف لے گئے تو آپ نے ایک درخت کی دو ٹہنیاں پکڑیں (اور انھیں ہلایا) تو ان شاخوں سے پتے گرنے لگے۔ آپ نے فرمایا، اے ابوذر! حضرت ابوذر رضی اللہ تعالےٰ عنہ، نے عرض کیا حاضر ہوں

يُرِيْدُ بِهَا وَجْهَ اللهِ فَتَهَافَتَتْ ذُنُوْبُهُ كَمَا يَتَهَافَتُ هٰذَا الْوَرَقُ عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ ۔ (احمد)

یا رسول اللہ! آپؐ نے فرمایا جب مسلمان بندہ خالص اللہ تعالیٰ کے لیے نماز پڑھتا ہے تو اس کے گناہ اس طرح جھڑ جاتے ہیں جیسے کہ یہ پتے درخت سے جھڑ رہے ہیں۔

۵۵۔ عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهُ ذَكَرَ الصَّلٰوةَ يَوْمًا فَقَالَ مَنْ حَافَظَ عَلَيْهَا كَانَتْ لَهُ نُوْرًا وَّبُرْهَانًا وَّ نَجَاةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَمَنْ لَّمْ يُحَافِظْ عَلَيْهَا لَمْ تَكُنْ لَّهُ نُوْرًا وَّ لَا بُرْهَانًا وَّلَا نَجَاةً وَكَانَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مَعَ قَارُوْنَ وَفِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَاُبَيِّ بْنِ خَلَفٍ ۔ (احمد، دارمی، بیہقی)

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایک روز نماز کا ذکر کیا تو فرمایا کہ جو شخص نماز کی پابندی کرے گا تو نماز اس کے لیے نور کا سبب ہوگی، کمالِ ایمان کی دلیل ہوگی اور قیامت کے دن بخشش کا ذریعہ بنے گی۔ اور جو نماز کی پابندی نہیں کرے گا اس کے لیے نہ تو نور کا سبب ہوگی نہ کمالِ ایمان کی دلیل ہوگی، اور نہ بخشش کا ذریعہ۔ اور وہ قیامت کے دن قارون، فرعون، ہامان اور اُبیّ بن خلف کے ہمراہ ہوگا۔

۵۶۔ عَنْ عَلِيٍّ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَا عَلِيُّ ثَلٰثٌ لَا تُؤَخِّرْهَا الصَّلٰوةُ اِذَا اَتَتْ وَالْجَنَازَةُ اِذَا حَضَرَتْ وَالْاَيِّمُ اِذَا وَجَدْتَّ لَهَا كُفُوًا ۔ (ترمذی)

حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ نے کہا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مجھ سے فرمایا کہ اے علی! تین کاموں میں دیر نہ کرنا۔ ایک تو نماز ادا کرنے میں جب وقت ہو جائے، دوسرے جنازہ میں جب کہ وہ تیار ہو جائے، تیسرے بیوہ کے نکاح میں جب کہ اس کا کفو مل جائے۔

۵۷۔ عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تِلْكَ صَلٰوةُ الْمُنَافِقِ يَجْلِسُ يَرْقُبُ الشَّمْسَ حَتّٰى اِذَا اصْفَرَّتْ وَكَانَتْ بَيْنَ قَرْنَيِ الشَّيْطٰنِ قَامَ فَنَقَرَ اَرْبَعًا لَا يَذْكُرُ اللهَ اِلَّا قَلِيْلًا ۔ (مسلم)

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ یہ منافق کی نماز ہے کہ بیٹھے ہوئے سورج کا انتظار کرتا ہے یہاں تک کہ جب سورج پیلا پڑ جاتا ہے اور شیطان کی دونوں سینگوں کے بیچ آجاتا ہے تو کھڑا ہو کر چار چونچ مار لیتا ہے۔ نہیں ذکر کرتا اس (تنگ وقت) میں اللہ تعالیٰ کا مگر بہت تھوڑا۔

۵۸۔ عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى

حضرت عمرو بن شعیب رضی اللہ تعالیٰ عنہما اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُرُوا أَوْلَادَكُمْ بِالصَّلَاةِ وَهُمْ أَبْنَاءُ سَبْعِ سِنِينَ وَاضْرِبُوهُمْ عَلَيْهَا وَهُمْ أَبْنَاءُ عَشْرِ سِنِينَ وَفَرِّقُوا بَيْنَهُمْ فِي الْمَضَاجِعِ ۔
(ابوداؤد)

نے فرمایا کہ جب تمھارے بچے سات سال کے ہو جائیں تو اُن کو نماز پڑھنے کا حکم دو اور جب دس سال کے ہو جائیں تو ان کو مار کر نماز پڑھاؤ اور ان کے سونے کی جگہیں علیحدہ کر دو۔

زکوٰۃ

۵۹۔ قَدْ عَفَوْتُ لَكُمْ عَنِ الْخَيْلِ وَالرَّقِيقِ فَهَاتُوا صَدَقَةَ الرِّقَةِ مِنْ كُلِّ أَرْبَعِينَ دِرْهَمًا دِرْهَمٌ وَلَيْسَ فِي تِسْعِينَ وَمِائَةٍ شَيْءٌ فَإِذَا بَلَغَتْ مِائَتَيْنِ فَفِيهَا خَمْسَةُ دَرَاهِمَ ۔
(الترمذی، ابوداؤد والنسائی)

گھوڑے اور غلام میں نے معاف کر دیئے (کہ ان پر زکوٰۃ مت دیا کرو) مگر ہر چالیس مضروب (چاندی کے) درہموں پر ایک درہم صدقہ دیا کرو۔ پر ایک سو نوّے درہموں تک کچھ زکوٰۃ نہیں۔ البتہ جب دو سو درہم ہو جائیں تو ان پر پانچ درہم ہیں)

۶۰۔ أَلَا مَنْ وَلِيَ يَتِيمًا لَهُ مَالٌ فَلْيَتَّجِرْ فِيهِ وَلَا يَتْرُكْهُ حَتَّى تَأْكُلَهُ الصَّدَقَةُ ۔ (الترمذی)

آگاہ رہو۔ کہ جو شخص کسی مالدار یتیم کا ولی ہو۔ اُسے چاہیے کہ اس کے مال کو تجارت میں لگاتے۔ ایسا نہ ہو کہ اُسے کسی کام پہ نہ لگایا جائے اور اُسے زکوٰۃ ہی کھا جائے۔

۶۱۔ الْمُعْتَدِي فِي الصَّدَقَةِ كَمَانِعِهَا ۔
(ابوداؤد۔ والترمذی)

صدقہ میں حد سے زیادہ زیادتی کرنے والا ویسا ہی ہے جیسا کہ اس سے روکنے والا۔

۶۲۔ أَخَذَ الْحَسَنُ بْنُ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا تَمْرَةً مِنْ تَمْرِ الصَّدَقَةِ فَجَعَلَ فِي فِيهِ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَخْ كَخْ اِرْمِ بِهَا أَمَا عَلِمْتَ أَنَّا لَا نَأْكُلُ الصَّدَقَةَ أَوْ أَنَّا لَا تَحِلُّ لَنَا الصَّدَقَةُ (الشیخان)

حسنؓ بن علیؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے نے صدقہ کی آئی کھجوروں میں سے ایک کھجور اُٹھائی اور منہ میں ڈال لی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ چھی چھی پھینک دو۔ کیا تمھیں معلوم نہیں کہ ہم خیرات نہیں کھاتے؟ یعنی ہمارے واسطے خیرات حلال نہیں[1]۔

---

[1] کھجور ناپاک نہیں تھی، کہ اُسے منہ سے نکلوایا گیا۔ غرض یہ تھی کہ وہ لوگ اگرچہ مالی حیثیت سے غنی اور (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

۶۳۔ لَا تَحِلُّ الصَّدَقَةُ لِغَنِيٍّ اِلَّا لِخَمْسَةٍ لِغَازٍ اَوْ عَامِلٍ عَلَيْهَا اَوْ غَارِمٍ اَوْ رَجُلٍ اشْتَرَاهَا بِمَالِهٖ اَوْ رَجُلٍ كَانَ لَهٗ جَارٌ مِسْكِيْنٌ تَصَدَّقَ عَلَى الْمِسْكِيْنِ فَاَهْدَى الْمِسْكِيْنُ لِلْغَنِيِّ۔ (ابوداؤد والترمذی)

صدقہ غنی کے واسطے حلال نہیں ہے سوائے پانچ (شخصوں) کے (۱) غازی (۲) صدقہ وصول کرنے والا ملازم (۳) قرض دار (۴) وہ شخص جس نے صدقہ کا مال خرید لیا ہو، (۵) وہ شخص جسے کسی مسکین ہمسائے نے صدقہ کا مال (جو کسی سے ملا، بطور تحفہ دیا ہو)۔

وضو اور اُس کے متعلّقات

۶۴۔ گندگی بھی گناہ ہے:

(ابوھریرہؓ) رفعه: اذا توضأ العبد المسلم او المؤمن فغسل وجهه خرج من وجهه كل خطيئة نظر اليها بعينيه مع الماء او مع آخر قطر الماء فاذا غسل يديه خرج من يديه كل خطيئة بطشتها يداه مع الماء

جب مسلم یا مومن وضو کرنے کے لیے منہ دھوتا ہے، تو پانی (یا پانی کے آخری قطرے) سے اس کی خطائیں دھل جاتی ہیں۔ اسی طرح ہاتھ دھونے سے ہاتھ کے اور پاؤں دھونے سے پیروں کے گناہ دھل جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ گناہوں سے پاک صاف ہو جاتا ہے۔

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ سے آگے) مالدار نہیں لیکن کسی قسم کی شرافت عزّت وجاہت رکھتے ہیں۔ ان کو اس سے احتراز کرنا چاہیئے۔ کیونکہ ان کی یہ عزّت وشرافت دینی یا دنیوی بھی ان کے حق میں مالداری کا درجہ رکھتی ہے اور اس قسم کے مال لینے سے وہ ضائع ہو جائے گی، خیرات کے مال کی ذات میں خواہ وہ نقد ہو یا جنس۔ کوئی ایسی چیز نہیں ہوتی۔ جو ناپاک، مضر صحت یا فاسد خیالات پیدا کرنے والی ہو۔ البتہ جس شخص کو وہ مال بیٹھے بٹھائے بغیر مشقت ملتا رہے۔ وہ ناکارہ ہو جاتا ہے۔ محتاجوں کی مدد کرنا تو در کنار اپنے واسطے بھی ہاتھ نہیں ہلاتا۔ کیونکہ ایسا کرنے سے اُسے ضرورت نہیں پڑتی۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اس قسم کا مال کھانے والے نہ صرف سوسائٹی پر ایک بارِ گراں ہوتے ہیں بلکہ ان کے لیے مار آستین بن جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اور اپنی اولاد کے لیے خیرات کا کھانا ناروا کر دیا۔ اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ خیرات کا مال کسی کو کھانا ہی نہیں چاہیئے۔ نہیں وہ جو محتاج اور مجبور ہیں۔ یعنی محنت کرتے ہیں۔ پھر بھی گذارہ نہیں چلتا، یا بوڑھے ہیں یا بیمار ہیں، وہ اپنی معذوری کے زمانہ میں اسے کھا سکتے ہیں۔ بشرطیکہ خیرات حاصل کرنے کو پیشہ بنانا ان کی نیت نہ ہو۔

او مع آخر قطر الماء حتی یخرج نقیا من الذنوب۔ (مالک، ترمذی، مسلم بلفظہ)

۶۵۔ وضو اور مسواک :

(ابو ہریرۃؓ) رفعہ : لو کان ان اشق علی امتی لامرتھم عند کل صلوٰۃ بوضوء ومع کل وضوء بسواک (احمد)

اگر مجھے اُمّت پر بار ہونے کا خیال نہ ہوتا تو میں ہر نماز کے لیے وضو کا اور ہر وضو کے وقت مسواک کا حکم دے دیتا۔

۶۶۔ سو کر اُٹھنے کے بعد مسواک :

(عائشۃؓ) ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان لا یرقد من لیل ولا نھار فیستیقظ الا تسوک قبل ان یتوضاء۔ (مسلم، نسائی)

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم رات اور دن میں جب بھی سو کر اُٹھتے وضو سے قبل مسواک فرما لیتے۔

۶۷۔ مسواک کی فضیلت :

(عائشۃؓ) السواک مطھرۃ للفم مرضات للرب (نسائی)

مسواک منہ کے لیے صفائی بھی ہے اور رضائے الٰہی کا سبب بھی۔

ایضاً :

(عائشۃؓ) رفعتہ : فضل الصلوٰۃ بسواک علی الصلوٰۃ بغیر سواک سبعون صلاۃ۔

(احمد، موصلی، بزار)

وضوئے نماز میں مسواک کر لینے سے نماز کا اجر ستّر گنا بڑھ جاتا ہے۔

۶۸۔ سو کر اُٹھنے کے بعد ہاتھ دھونا :

(ابو ھریرۃ) رفعہ : اذا استیقظ احدکم من نومہ فلا یغمس یدہ فی الاناء حتی

جو شخص سو کر اُٹھے، وہ پہلے ہاتھ دھولے، پھر اُسے برتن میں ڈالے، اُسے کیا معلوم کہ سوتے

يغسلها ثلاثا فانه لا يدرى اين باتت يده (للستة)

میں اس کا ہاتھ کہاں کہاں لگا ہے۔

۶۹۔ وضو میں پانی کا اسراف :

(ابن عمروؓ بن العاصؓ) ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم مر بسعد وھو یتوضأ فقال ما ھذا السرف؟ فقال أفی الوضوء سرف؟ قال نعم وان کنت علی نھر جار (قزوینی)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار سعدؓ کے پاس سے گذرے، سعد اس وقت (خوب پانی بہا بہا کر) وضو کر رہے تھے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ: یہ اسراف کیسا ہے؟ عرض کیا کہ: کیا وضو میں بھی اسراف ہوتا ہے؟ فرمایا: بے شک، خواہ تم بہتی ہوئی نہر پر کیوں نہ ہو۔

۷۰۔ وضو کے بعد اعضاء کو پونچھنا :

(عائشہؓ) کان لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خرقۃ ینشف بھا بعد الوضوء (ترمذی)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک کپڑا تھا جس سے وضو کے بعد نمی کو پونچھ لیا کرتے تھے۔

۷۱۔ مسح :

(المغیرۃؓ) توضأ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ومسح علی الجوربین والنعلین (ترمذی)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کرنے میں جراب اور جوتے پر بھی مسح فرمایا ہے۔

۷۲۔ دونوں نیکو کار ہیں :

(ابو سعیدؓ) خرج رجلان فی سفر فحضرت الصلوۃ ولیس معھما ماء فتیمما صعیدا طیبا فصلیا ثم وجدا الماء فی الوقت فاعاد احدھما الصلوۃ والوضوء ولم یعد الآخر ثم اتیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

دو مسلمانوں کو ایک سفر میں وقت نماز آ گیا۔ دونوں نے تیمم سے نماز پڑھ لی۔ بعد میں پانی مل جانے پر ایک نے وضو کر کے نماز دُہرا لی۔ اور دوسرے نے یہ نہ کیا۔ اب وہ دونوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور پہنچے، اپنا اپنا ماجرا عرض کیا۔ جس نے نماز

فذكرا ذلك فقال للذی لم يعد اصبت السنة واجزأتك صلاتك وقال للذی توضأ واعاد لك الاجر مرتين (نسائی، ابوداؤد)

نہ دہرائی تھی، اس سے فرمایا: "تم نے سنت پر عمل کیا اور تمھاری نماز مکمل ہوگئی۔ دوسرے سے فرمایا: تمھارے لیے دوچند اجر ہے۔

جماعت

۷۳۔ عَنْ اِبْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ تَعَالٰی عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلَاةُ الْجَمَاعَةِ تَفْضُلُ صَلٰوةَ الْفَذِّ بِسَبْعٍ وَّعِشْرِيْنَ دَرَجَةً۔ (بخاری، مسلم)

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا کہ نماز باجماعت کا ثواب تنہا پڑھنے کے مقابلے میں ستائیس درجہ زیادہ ہے۔

۷۴۔ عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْسَ صَلَاةٌ اَثْقَلَ عَلَى الْمُنَافِقِيْنَ مِنَ الْفَجْرِ وَالْعِشَاءِ وَلَوْ يَعْلَمُوْنَ مَا فِيْهِمَا لَاَتَوْهُمَا وَلَوْ حَبْوًا۔ (بخاری، مسلم)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا کہ منافقوں پر فجر اور عشاء کی نمازوں سے زیادہ کوئی نماز بھاری نہیں۔ اگر لوگ جانتے کہ ان دونوں نمازوں میں کیا اجر وثواب ہے تو گھسٹتے ہوئے چل کر ان میں شریک ہوتے۔

۷۵۔ عَنْ عُثْمَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ صَلَّى الْعِشَاءَ فِیْ جَمَاعَةٍ فَكَاَنَّمَا قَامَ نِصْفَ اللَّيْلِ وَمَنْ صَلَّى الصُّبْحَ فِیْ جَمَاعَةٍ فَكَاَنَّمَا صَلَّى اللَّيْلَ كُلَّهُ۔ (مسلم)

حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا کہ جس نے عشاء کی نماز جماعت سے پڑھی تو گویا وہ آدھی رات تک عبادت میں کھڑا رہا اور جس نے فجر کی نماز جماعت سے ادا کی تو گویا اُس نے ساری رات نماز پڑھی۔

۷۶۔ عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا، کہ سرکار اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قسم ہے

وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَقَدْ ھَمَمْتُ اَنْ اٰمُرَ بِحَطَبٍ فَیُحْطَبُ ثُمَّ اٰمُرَ بِالصَّلٰوۃِ فَیُؤَذَّنُ لَھَا ثُمَّ اٰمُرَ رَجُلًا فَیَؤُمَّ النَّاسَ ثُمَّ اُخَالِفَ اِلٰی رِجَالٍ وَفِیْ رِوَایَۃٍ لَا یَشْھَدُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَاُحَرِّقَ عَلَیْھِمْ بُیُوْتَھُمْ۔

(بخاری، مسلم)

اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے کہ میرا جی چاہتا ہے کہ میں لکڑیاں جمع کرنے کا حکم دوں جب لکڑیاں جمع ہو جائیں تو نماز کا حکم دوں کہ اس کی اذان دی جائے پھر کسی کو حکم دوں کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائے۔ پھر میں اُن لوگوں کی طرف جاؤں جو نماز میں حاضر نہیں ہوتے، یہاں تک کہ ان کے گھروں کو جلا دوں۔

۷۷۔ عَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ ثَلٰثَۃٍ فِیْ قَرْیَۃٍ وَّلَا بَدْوٍ لَا تُقَامُ فِیْھِمُ الصَّلٰوۃُ اِلَّا قَدِ اسْتَحْوَذَ عَلَیْھِمُ الشَّیْطٰنُ فَعَلَیْکَ بِالْجَمَاعَۃِ۔

(احمد، ابوداؤد)

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا کہ جس آبادی یا جنگل میں تین آدمی ہوں اور ان میں نماز جماعت سے قائم نہ کی جائے تو شیطان اُن پر غالب آ جاتا ہے، لہٰذا جماعت کو لازم جانو۔

صلوٰۃ

۷۸۔ اَرَاَیْتُمْ لَوْ اَنَّ نَھَرًا بِبَابِ اَحَدِکُمْ یَغْتَسِلُ فِیْہِ کُلَّ یَوْمٍ خَمْسَ مَرَّاتٍ مَا تَقُوْلُوْنَ اَیُبْقِیْ ذٰلِکَ مِنْ دَرَنِہٖ شَیْئًا قَالُوْا لَا یُبْقِیْ ذٰلِکَ مِنْ دَرَنِہٖ شَیْئًا قَالَ فَذٰلِکَ مَثَلُ الصَّلَوَاتِ الْخَمْسِ یَمْحُو اللّٰہُ بِھِنَّ الْخَطَایَا۔

(الخمسۃ الا ابا داؤد)

دیکھو اگر تم میں سے کسی کے دروازے پر نہر ہو اور وہ اس میں ہر روز پانچ دفعہ نہائے تو تمہاری رائے میں اُس کے بدن پر کچھ میل رہ جائے گا؟ پاس بیٹھنے والوں نے عرض کیا۔ اس طرح تو کوئی میل نہیں رہتا۔ فرمایا یہی مثال پانچوں وقت نماز کی ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔

۷۹۔ اِذَا حَزَنَہٗ اَمْرٌ صَلّٰی۔ (ابوداؤد)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کوئی غمناک واقعہ پیش آتا تو آپ نماز پڑھتے

۸۰۔ مُرُوا الصَّبِیَّ بِالصَّلٰوۃِ اِذَا بَلَغَ سَبْعَ سِنِیْنَ فَاِذَا بَلَغَ عَشَرَ سِنِیْنَ

لڑکا جب سات سال کا ہو جائے تو اسے نماز پڑھنے کا حکم دو اور جب دس سال کا ہو جائے اور نماز نہ پڑھے تو

فَاضْرِبُوْهُ عَلَيْهَا (ابوداؤد والترمذی)

اُسے بدنی سزا دو۔

۸۱۔ يَا عَلِيُّ ثَلٰثًا لَا تُؤَخِّرْهُنَّ اَلصَّلٰوةُ إِذَا دَخَلَ وَقْتُهَا وَالْجِنَازَةُ إِذَا حَضَرَتْ وَالْاَيِّمُ إِذَا وَجَدْتَ لَهَا كُفُوًا۔

(الترمذی)

اے علی تین باتوں میں توقف مت کرو۔ نماز (کے ادا کرنے میں) جب اس کا وقت ہو جائے۔ جنازہ (پڑھنے) میں جب تیار ہو اور بیوہ کے نکاح (کرانے) میں جب اس کا جوڑ مل جائے۔

۸۲۔ لَا يَقْبَلُ اللّٰهُ صَلٰوةً بِغَيْرِ طُهُوْرٍ وَلَا صَدَقَةً مِّنْ غُلُوْلٍ۔

(مسلم، والترمذی)

اللہ تعالیٰ وہ نماز قبول نہیں فرماتا جو بغیر پاک ہونے کے پڑھی جائے۔ نہ وہ صدقہ قبول فرماتا ہے جو غنیمت کے مال میں خیانت یا چوری کرکے دیا جائے۔

۸۳۔ لَا يَقْبَلُ اللّٰهُ صَلٰوةَ اَحَدِكُمْ إِذَا اَحْدَثَ حَتّٰى يَتَوَضَّاَ (ابوداؤد وترمذی)

اللہ تعالیٰ تم میں سے کسی کی وہ نماز قبول نہیں فرماتا جو بے وضو پڑھے۔

۸۴۔ لَا يُصَلِّ اَحَدُكُمْ فِي الثَّوْبِ الْوَاحِدِ لَيْسَ عَلٰى عَاتِقِهٖ اَوْ قَالَ عَلٰى عَاتِقَيْهِ مِنْهُ شَيْءٌ۔ (الخمسة الا الترمذی)

کوئی شخص تم میں سے ایک ہی کپڑا پہن کر (مثلاً صرف تہ بند) جو کندھے پر نہ ہو۔ یا یہ فرمایا کہ اس کے کندھوں تک نہ ہو نماز نہ پڑھے۔

۸۵۔ لَا يَقْبَلُ اللّٰهُ تَعَالٰى صَلٰوةَ الْحَائِضِ إِلَّا بِخِمَارٍ۔

(ابوداؤد۔ والترمذی)

اللہ تعالیٰ بالغ عورت کی نماز قبول نہیں فرماتا اگر اس کے سر پر اوڑھنی نہ ہو (اس لیے کہ وہ عورت کے ضروری اور پورے لباس میں ملبوس نہیں ہے)۔

کتاب الصلوٰة

۸۶۔ نماز سے گناہ دھلنے کی تمثیل:

(ابوہریرہؓ) رفعة: ارأيتم لو ان نهراً بباب احدكم يغتسل فيه كل يوم خمس مرات ماتقولون ذلك يبقي من درنه؟ قالوا لا يبقي من درنه شيأ قال فذلك مثل الصلوات الخمس يمحوالله بها الخطايا۔ (شیخین، موطا، نسائی)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر تمہارے گھر کے سامنے نہر بہہ رہی ہو اور ہر روز اس میں پانچ مرتبہ غسل کیا جائے تو جسم پر ذرہ برابر میل رہ سکتا ہے؟ عرض کیا: ہرگز نہیں رہ سکتا! فرمایا: یہی مثال نماز پنجگانہ کی ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ گناہوں کو دھو دیتا ہے۔

۸۷۔ دو وقت کی نماز بھی دوزخ سے بچا لیتی ہے:

(عمارۃ بن رویبۃ) رفعه : لن یلج النار احد صلّی قبل طلوع الشمس وقبل غروبها یعنی الفجر والعصر فقال رجل من اهل البصرة انت سمعت هذا من رسول الله صلّی الله علیه وسلّم؟ قال نعم فقال الرجل وانا اشهد انی سمعته صلّی الله علیه وسلّم۔
(مسلم، ابوداؤد، نسائی)

وہ لوگ ہرگز دوزخ میں نہ ڈالے جائیں گے، جو طلوع آفتاب سے پہلے اور غروب آفتاب سے پہلے یعنی فجر اور عصر کی نماز ادا کر لیا کریں۔ ایک بصری نے حضرت عمارہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا کہ: یہ خود آپ نے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے؟ عمارہ نے جواب دیا: ہاں! بصری رضؓ نے کہا: میں بھی شاہد ہوں کہ میں نے رسول (صلّی اللہ علیہ وسلّم) خُدا سے ایسا ہی سُنا۔

نماز میں پابندیٔ وقت

۸۸۔ نماز وقت پر ادا ہونی چاہیئے:

(ابن مسعودؓ) سألت النبی صلّی الله علیه وسلّم ای العمل احبّ الی الله؟ قال الصّلوٰة لمیقاتها۔ قلت ثم ای؟ قال برالوالدین قلت ثم ای؟ قال الجهاد فی سبیل الله۔ قال حدثنی بهن ولو استزدته لزادنی۔
(شیخین، ترمذی، نسائی)

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ امور دریافت کیے (۱) کونسا عمل اللہ تعالےٰ کو پسند ہے؟ فرمایا: نماز بر وقت ادا کرنا! پوچھا اس کے بعد؟ فرمایا: والدین سے نیک سلوک۔ پوچھا۔ اس کے بعد؟ فرمایا: جہاد فی سبیل اللہ! ان کے سوا اگر میں کچھ اور دریافت کرتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اضافہ فرما دیتے۔

۸۹۔ تین قسم کی تاخیر سے بچو:

(علیؓ) رفعه : یا علی ثلاثا لاتؤخرها الصّلوٰة اذا دخل وقتها والجنازة اذا حضرت

اے علی رضؓ! تین کاموں میں تاخیر نہ کرو۔ ادائیگی میں جب وقت نماز آجائے (۱) دفن میں جب میت مرجائے (۲) نکاح میں

ولا یتروا اذا وجدت لها کفوًا (ترمذی) — جب برابر کا کفو مل جائے۔

مسجد

۹۰۔ عَنْ عُثْمَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ بَنٰی لِلّٰہِ مَسْجِدًا بَنَی اللّٰہُ لَہٗ بَیْتًا فِی الْجَنَّۃِ۔ (بخاری، مسلم)

حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا کہ جو شخص خدائے تعالیٰ (کی خوشنودی) کے لیے مسجد بنائے گا تو خدائے تعالیٰ اس کے صلے میں جنت میں گھر بنائے گا۔

۹۱۔ عَنْ اَبِیْ ہُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَحَبُّ الْبِلَادِ اِلَی اللّٰہِ مَسَاجِدُھَا وَاَبْغَضُ الْبِلَادِ اِلَی اللّٰہِ اَسْوَاقُھَا۔ (مسلم)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ خدائے تعالیٰ کے نزدیک تمام آبادیوں میں محبوب ترین جگہیں اس کی مسجدیں ہیں اور بدترین مقامات بازار ہیں۔

۹۲۔ عَنْ عُثْمَانَ بْنِ مَظْعُوْنٍ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِئْذَنْ لَنَا فِی التَّرَھُّبِ فَقَالَ اِنَّ تَرَھُّبَ اُمَّتِی الْجُلُوْسُ فِی الْمَسَاجِدِ اِنْتِظَارَ الصَّلٰوۃِ۔ (شرح السنۃ، مشکوٰۃ)

حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے عرض کیا یا رسول اللہ! مجھے تارک الدنیا ہونے کی اجازت مرحمت فرمائیے۔ حضورؐ نے فرمایا میری اُمت کے لیے ترکِ دنیا یہی ہے کہ وہ مسجدوں میں بیٹھ کر نماز کا انتظار کرے۔

۹۳۔ عَنْ مُعَاوِیَۃَ بْنِ قُرَّۃَ عَنْ اَبِیْہِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نَھٰی عَنْ ھَاتَیْنِ الشَّجَرَتَیْنِ یَعْنِی الْبَصَلَ وَالثُّوْمَ وَقَالَ مَنْ اَکَلَھُمَا فَلَا یَقْرَبَنَّ مَسْجِدَنَا وَقَالَ اِنْ کُنْتُمْ لَا بُدَّ اٰکِلِیْھِمَا فَاَمِیْتُوْھُمَا طَبْخًا۔ (ابوداؤد)

حضرت معاویہ بن قرّہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے ان دو سبزیوں کے کھانے سے منع فرمایا یعنی پیاز اور لہسن سے اور فرمایا کہ انھیں کھا کر کوئی شخص ہماری مسجدوں کے قریب ہرگز نہ آئے۔ اور فرمایا کہ اگر کھانا ہی چاہتے ہو تو پکا کر ان کی بُو دُور کر لیا کرو۔

۹۴۔ عَنِ الْحَسَنِ مُرْسَلًا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَاْتِیْ عَلَی النَّاسِ زَمَانٌ یَکُوْنُ حَدِیْثُھُمْ فِیْ مَسَاجِدِھِمْ فِیْ اَمْرِ دُنْیَاھُمْ فَلَا تُجَالِسُوْھُمْ فَلَیْسَ لِلّٰہِ فِیْھِمْ حَاجَۃٌ۔ (بیہقی)

حضرت حسن بصری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بطریق مرسل روایت ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ لوگ مسجدوں کے اندر دنیا کی باتیں کریں گے تو اُس وقت تم ان لوگوں کے پاس نہ بیٹھنا خدائے تعالیٰ کو ان لوگوں کی کچھ پروا نہیں[1]

مقامِ ستر کا پردہ کرنا!

۹۵۔ قُلْتُ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ عَوْرَاتُنَا مَا نَأْتِیْ مِنْھَا وَمَا نَذَرُ قَالَ احْفَظْ عَوْرَتَکَ اِلَّا مِنْ زَوْجَتِکَ اَوْمَامَلَکَتْ یَمِیْنُکَ قُلْتُ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ فَالرَّجُلُ یَکُوْنُ مَعَ الرَّجُلِ قَالَ اِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ لَّا یَرَاھَا اَحَدٌ فَافْعَلْ قُلْتُ اَلرَّجُلُ یَکُوْنُ خَالِیًا قَالَ اَللّٰہُ اَحَقُّ اَنْ یُّسْتَحْیٰی مِنْہُ مِنَ النَّاسِ۔ (ابوداؤد، والترمذی)

ایک صحابی بیان کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یارسول اللہ ہم اپنے مقامِ ستر کا کس سے پردہ کریں اور کس سے نہ کریں، فرمایا اپنی بیوی یا گھر میں داخل کی ہوئی لونڈی کے سوا سب سے اپنے مقام کا ستر کا پردہ کرو۔ میں نے عرض کیا (اکثر ایسا ہوتا ہے کہ) ایک آدمی دوسرے آدمی کے ساتھ مل کر رہتا ہے فرمایا۔ حتی الامکان کوشش کرو کہ تمہارا مقام ستر کوئی دیکھ نہ سکے۔ میں نے پھر عرض کیا کہ آدمی (کبھی) خالی مقام پر بھی ہوتا ہے۔ فرمایا اللہ کا حق زیادہ ہے کہ تم اس سے آدمیوں کی نسبت زیادہ حیا کرو۔

۹۶۔ عَدَّ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلْفَخِذَ عَوْرَۃً۔ (الترمذی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسان کی ران کو مقام ستر یعنی پردہ میں رہنے والے حصہ میں شمار فرمایا۔

نماز کے مقام!

۹۷۔ اَللّٰھُمَّ لَا تَجْعَلْ قَبْرِیْ وَثَنًا یُّعْبَدُ

یا اللہ میری قبر کو بُت نہ بنائیو۔ کہ پوجی جائے۔ اللہ کا

---

[1] حضرت شیخ محقق رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اس حدیث کے تحت فرماتے ہیں کہ کنایت است از بیزاری حق از ایشاں (اشعۃ اللمعات جلد اوّل صـ۳۳۹) یعنی مطلب یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ ان لوگوں سے بیزار ہے۔

إِشْتَدَّ غَضَبُ اللهِ عَلَىٰ قَوْمٍ اِتَّخَذُوْا قُبُوْرَ أَنْبِيَآئِهِمْ مَسَاجِدَ ۔ (مالك)

غضب ان لوگوں پر بہت سخت ہوگا ۔ جو اپنے نبیوں کی قبروں کو مسجد بنائیں گے ۔ یعنی ان کی پرستش کریں گے ۔

۹۸ ۔ جُعِلَتْ لِيَ الْاَرْضُ مَسْجِدًا وَطَهُوْرًا اَيُّمَا اَدْرَكَ رَجُلٌ مِنْ اُمَّتِي الصَّلٰوةَ صَلّٰی ۔ (النسائی)

میرے واسطے (ساری) زمین مسجد اور پاک قرار دی گئی ہے ۔ جہاں کہیں میری اُمت کے کسی آدمی کو نماز کا وقت آ جائے پڑھ لے ۔

نماز میں مصالح کا لحاظ

۹۹ ۔ ایک رکعت سے چار رکعات تک :

(ابن عباسؓ) فرض الله الصّلٰوة علی لسان نبیکم فی الحضر اربعا وفی السفر رکعتین وفی الخوف رکعة (مسلم، ابوداؤد، نسائی)

اللہ تعالیٰ نے تمہارے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبانی جو نمازیں فرض کی ہیں اُن کی ترتیب یوں ہے کہ حضر میں چار رکعتیں ہیں، سفر میں دو رکعتیں ہیں اور خوف میں ایک ۔

۱۰۰ ۔ اوقات نماز میں موسمی لحاظ رکھنا چاہیئے :

(ابوھریرۃؓ) رفعه : اذا اشتد الحر فابردوا بالصّلٰوة فان شدة الحر من فیح جھنم (للستة)

گرمی شدت کی ہو تو نماز ٹھنڈی کر کے (یعنی تاخیر سے) ادا کرو ۔ کیونکہ گرمی کی شدت جہنم ہی کی ایک بھبکا رہے ۔

۱۰۱ ۔ اوّل طعام بعدہ کلام :

(ابن عمرؓ) رفعه : اذا وضع عشاء احدکم واقیمت الصلٰوة فابدءوا بالعشاء ولا تعجل حتی تفرغ ۔ منه کان ابن عمرؓ یوضع له الطعام وتقام الصّلٰوة فلا یاتیها حتی یفرغ وانه لیسمع قراءة الامام (للستة الا النسائی)

جب کھانا سامنے آ جائے اور ادھر اقامتِ (صلوٰۃ) ہونے لگے تو پہلے کھانا شروع کر دو اور کھانے میں عجلت نہ کرو ۔ ابن عمر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کے سامنے جب کھانا آتا اور اُدھر اقامت شروع ہو جاتی تو وہ کھانا چھوڑ کر نماز میں شریک نہ ہوتے اور امام کی قرأت سُنتے رہتے ۔ !

سحر خیزی

۱۰۲ - سحر خیزی اور قربِ الٰہی:

(عمروؓ بن عبسہؓ) قلت یا رسول اللہ هل من ساعة اقرب من اللہ تعالیٰ من الاخریٰ؟ قال نعم ان اقرب ما یکون الرب من العبد جوف اللیل الآخر فان استطعت ان تکون ممن یذکر اللہ فی تلک الساعة فکن فان الصلوٰة محضورة (للستة الا مالکا)

میں عرض گزار ہوا کہ: اے رسولِ خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) قربِ خداوندی کے لیے سب سے بہتر ساعت کونسی ہے؟ فرمایا: رات کے نصف آخر کا وسط، اگر تم اس ساعت میں ذکرِ الٰہی کر سکو تو ضرور کرو، اس نماز کے وقت فرشتے حاضر ہوتے ہیں۔

۱۰۳ - امام اور مؤذن کا مقام:

(ابوھریرۃؓ) رفعه: الامام ضامن و المؤذن مؤتمن اللّٰهم ارشد الائمة واغفر للمؤذنین قالوا یا رسول اللہ لقد ترکتنا نتنافس فی الاذان بعدک فقال انه یکون بعدی او بعدکم قوم سفلتهم مؤذنوهم (بزار، ابوداؤد، ترمذی الی واغفر للمؤذنین)

امام ذمے دار اور مؤذن امین ہوتا ہے۔ اے اللہ! اماموں کو ہدایت و رشد پر قائم رکھ اور مؤذنوں کی بخشش فرما۔ لوگوں نے عرض کیا کہ: یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ تو ہمیں ایسی حالت میں چھوڑ رہے ہیں کہ ہم حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد اذان کا شرف حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کریں گے۔ فرمایا: ہاں میرے بعد (یا تم لوگوں کے بعد) قوم کی یہ حالت ہو گی کہ مؤذن ذلیل قسم کے لوگ ہوں گے۔

جمعہ

عَنْ سَلْمَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى
۱۰۴- اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَغْتَسِلُ
رَجُلٌ يَوْمَ الْجُمُعَةِ وَيَتَطَهَّرُ مَا اسْتَطَاعَ
مِنْ طُهْرٍ وَيَدَّهِنُ مِنْ دُهْنِهٖ
اَوْ يَمَسُّ مِنْ طِيْبِ بَيْتِهٖ ثُمَّ
يَخْرُجُ فَلَا يُفَرِّقُ بَيْنَ اثْنَيْنِ
ثُمَّ يُصَلِّيْ مَا كُتِبَ ثُمَّ يُنْصِتُ
اِذَا تَكَلَّمَ الْاِمَامُ اِلَّا غُفِرَ لَهٗ مَا بَيْنَهٗ
وَبَيْنَ الْجُمُعَةِ الْاُخْرٰى ۔ (بخاری)

حضرت سلمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ سرکار اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص جمعہ کے دن نہائے اور جس قدر ممکن ہو سکے طہارت نظافت کرے اور تیل لگائے یا خوشبو ملے جو گھر میں میسر ہو۔ پھر گھر سے نماز کے لیے نکلے اور دو آدمیوں کے درمیان (اپنے بیٹھنے یا آگے گزرنے کے لیے) تفرقہ نہ ڈالے۔ پھر نماز پڑھے جو مقرر کر دی گئی ہے پھر جب امام خطبہ پڑھے تو خاموش بیٹھا رہے تو اس کے وہ تمام گناہ جو ایک جمعے سے دوسرے جمعہ تک اس نے کئے ہیں معاف کر دیئے جائیں گے۔

۱۰۵- عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ
صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا كَانَ
يَوْمُ الْجُمُعَةِ وَقَفَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ
عَلٰى بَابِ الْمَسْجِدِ يَكْتُبُوْنَ الْاَوَّلَ
فَالْاَوَّلَ وَمَثَلُ الْمُهَجِّرِ كَمَثَلِ الَّذِيْ
يُهْدِيْ بَدَنَةً ثُمَّ كَالَّذِيْ
بَقَرَةً ثُمَّ كَبْشًا ثُمَّ دَجَاجَةً
ثُمَّ بَيْضَةً فَاِذَا خَرَجَ الْاِمَامُ
طَوَوْا صُحُفَهُمْ وَيَسْتَمِعُوْنَ الذِّكْرَ۔
(بخاری، مسلم)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا کہ جمعہ کے دن فرشتے مسجد کے دروازہ پر کھڑے ہو کر مسجد میں آنے والوں کی حاضری لکھتے ہیں۔ جو لوگ پہلے آتے ہیں اُن کو پہلے اور جو بعد میں آتے ہیں اُن کو بعد میں اور جو شخص جمعہ کی نماز کو پہلے گیا اس کی مثال اُس شخص کی طرح ہے جس نے مکہ شریف میں قربانی کے لیے اُونٹ بھیجا۔ پھر جو دوسرے نمبر آیا اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے گائے بھیجی، پھر اس کے بعد جو آئے وہ اس شخص کے مانند ہے جس نے دنبہ بھیجا، پھر جو اس کے بعد آئے وہ اس شخص کے مانند ہے جس نے مرغی بھیجی اور جو اس کے بعد آئے، وہ اس شخص کے مانند ہے جس نے انڈا بھیجا۔ پھر جب امام خطبہ کے لیے اُٹھتا ہے تو فرشتے اپنے کاغذات لپیٹ لیتے ہیں اور خطبہ سننے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔

نماز میں بات نہیں کرنی چاہیئے!

۱۰۶۔ مُعَاوِيَةَ بْنِ الْحَكَمِ السُّلَمِي قَالَ بَيْنَا أَنَا أُصَلِّي مَعَ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذْ عَطَسَ رَجُلٌ مِّنَ الْقَوْمِ فَقُلْتُ يَرْحَمُكَ اللهُ فَلَمَّا قَضَى صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الصَّلٰوةَ قَالَ إِنَّ هٰذِهِ الصَّلٰوةَ لَا يَصْلُحُ فِيهَا شَيْءٌ مِّنْ كَلَامِ النَّاسِ وَإِنَّ مِنَّا رِجَالًا يَأْتُونَ الْكُهَّانَ قَالَ فَلَا تَأْتِهِمْ قُلْتُ وَمِنَّا رِجَالٌ يَتَطَيَّرُونَ قَالَ ذٰلِكَ شَيْءٌ يَجِدُونَهُ فِي صُدُورِهِمْ فَلَا يَصُدَّهُمْ۔

(مسلم، ابوداؤد، والنسائی)

معاویہ بن حکم سلمی بیان کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھ رہا تھا کہ جماعت میں سے ایک شخص نے چھینکا۔ میں نے کہا یرحمك الله (خدا تجھ پر رحم کرے) پس جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہوئے۔ فرمایا نماز میں بات چیت کرنا درست نہیں۔ اس کے بعد راوی نے اپنے ہاں کی بعض اور رسمیں بیان کیں، چنانچہ کہا۔ کہ ہم میں سے (بعض) لوگ نجومیوں کے پاس جاتے۔ فرمایا تم مت جایا کرو (ریہر) عرض کیا کہ ہم میں سے (بعض) آدمی بدشگونی لیتے ہیں۔ فرمایا یہ ان کے توہمات ہیں۔ اس (بدشگونی) سے انھیں کام کرنے سے رُکنا نہیں چاہیئے۔

۱۰۷۔ اُقْتُلُوا الْأَسْوَدَيْنِ فِي الصَّلٰوةِ الْحَيَّةَ وَالْعَقْرَبَ۔ (ابوداؤد، ترمذی، نسائی)

اثنائے نماز میں اگر (اتفاق ہوجائے کہ) سانپ اور بچھو نکل آئیں۔ تو ان کو مار ڈالو۔

۱۰۸۔ لَا صَلٰوةَ بِحَضْرَةِ الطَّعَامِ وَلَا هُوَ يُدَافِعُهُ الْأَخْبَثَانِ۔ (مسلم، ابوداؤد)

کھانا سامنے ہو تو نماز نہیں پڑھنی چاہیئے اور نہ اس وقت جبکہ پیشاب پاخانہ کی حاجت ہو۔

مسجد

۱۰۹۔ حلال کمائی سے تعمیر مسجد کا انعام:

(ابو ھریرۃ) رفعه: من بنی بیتا یعبد

جو شخص خدا تعالیٰ کی عبادت کے لیے مالِ حلال

الله فيه من مال حلال بنى الله له بيتا فى الجنة (بزار، اوسط بضعت)

سے مسجد بنائے ، اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنّت میں گھر بناتا ہے ۔

۱۱۰ ۔ مسجدوں کو صاف اور معطّر رکھو :

(عائشہؓ) امر رسول الله صلّى الله عليه وسلم ببناء المسجد فى الدوران ينظف ويطيب (ابوداؤد، ترمذی)

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے گھروں یا محلوں میں بھی مسجدوں کی تعمیر کرنے اور صفائی رکھنے اور خوشبو سے بسائے رکھنے کا حکم دیا ۔

۱۱۱ ۔ عورت کے لیے سب سے بہتر مقام نماز :

(احمدؒ) ان ام حميد امرأة ابى حميد الساعدى قالت يارسول الله انّى احب الصلوة معك قال قد علمت انك تحبين الصلوة معى وصلوتك وبيتك خير من صلوتك فى حجرتك وصلوتك فى حجرتك خير من صلاتك فى دارك وصلاتك فى مسجد قومك خير من صلاتك فى مسجدى (شیخین، موطاء ، ابوداؤد)

ام حمید (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) زوجۂ ابو حمید ساعدی) نے رسولِ خدا صلّی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا :

میں نماز آپ کی اقتداء میں پسند کرتی ہوں ۔

فرمایا : میں تمھاری یہ رغبت دیکھ رہا ہوں ، مگر تمھاری نماز کوٹھڑی میں دالان سے ، اور دالان میں صحن سے اور صحن میں مسجد محلہ سے اور مسجد محلّہ میں میری اس مسجد سے زیادہ بہتر ہے ۔

۱۱۲ ۔ بدبودار چیز کھا کر مسجد میں نہ آؤ :

(حذیفہؓ) .... ومن اكل من هذه البقلة الخبيثة فلا يقربن مسجدنا ثلاثا ۔

اور جو شخص کچّا لہسن یا مولی وغیرہ کھائے وہ ہماری مسجدوں میں نہ آئے ۔

عن ابن عمرؓ : فلا يقربن المساجد حتى يذهب ريحها ۔

(ابوداؤد ، شیخین)

ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں ہے کہ جب تک اس کی بدبو نہ چلی جائے ایسا شخص مسجدوں میں نہ جائے ۔

استقبال قبلہ

۱۱۳ - سمت قبلہ کی وسعت :

(ابوھریرۃؓ) رفعه : ما بین المشرق و المغرب قبلة" (ترمذی، رزین)

قبلے کی حدود مشرق و مغرب میں پھیلی ہوئی ہیں -

۱۱۴ - کشتی میں نماز کس طرح ادا کی جائے :

(جعفرؓ) ان النبی صلی اللہ علیه وسلم امرہ ان یصلی فی السفینة قائما الا ان یخشی الغرق -

(بزار برجل لم یسم)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جعفرؓ کو حکم دیا کہ اگر ڈوبنے کا اندیشہ نہ ہو تو کشتی میں کھڑے کھڑے نماز ادا کرلو -

۱۱۵ - بیتی مسجد :

(ابن عمرؓ) رفعه : اجعلوا فی بیوتکم من صلوتکم ولا تتخذوھا قبورا -

(للستة الا مالکا)

اپنے گھروں میں بھی نماز گاہ بناؤ - گھروں کو بالکل قبرستان ہی نہ بنا دو (یعنی سنتیں اور نوافل گھر میں بھی پڑھا کرو)

۱۱۶ - ایک کپڑے میں نماز :

(ابوھریرۃؓ) انه صلی اللہ علیه وسلم سئل عن الصلوۃ فی ثوب واحد فقال اولکلکم ثوبان -

(الستة الا النسائی)

ایک کپڑے میں نماز ادا کرنے کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا تو فرمایا کہ کیا تم میں سے ہر ایک کے پاس دو دو کپڑے موجود ہیں؟ (یعنی اگر ایک ہی کپڑا میسّر ہے تو اسی میں نماز پڑھ لو)

عید اور بقر عید

۱۱۷ - عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَدِمَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ الْمَدِیْنَةَ وَلَهُمْ يَوْمَانِ يَلْعَبُوْنَ فِيْهِمَا فَقَالَ مَا هٰذَانِ الْيَوْمَانِ قَالَ كُنَّا نَلْعَبُ فِيْهِمَا فِي الْجَاهِلِيَّةِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَدْ اَبْدَلَكُمُ اللّٰہُ بِهِمَا خَيْرًا مِّنْهُمَا يَوْمَ الْاَضْحٰى وَيَوْمَ الْفِطْرِ۔ (ابوداؤد، مشکوٰۃ)

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم جب ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لائے تو حضورؐ کو معلوم ہوا کہ یہاں کے لوگ سال میں دو دن کھیل کود کرتے ہیں خوشی مناتے ہیں۔ اس پر حضورؐ نے لوگوں سے پوچھا کہ یہ دو دن کیسے ہیں؟ لوگوں نے عرض کیا ان دنوں میں ہم لوگ زمانۂ جاہلیت کے اندر خوشیاں مناتے اور کھیل کود کرتے تھے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسّلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے ان دو دنوں کو ان سے بہتر دنوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ ان میں سے ایک دن عید الفطر اور دوسرا دن عید الاضحیٰ ہے۔

۱۱۸ - عَنْ اَبِی الْحُوَیْرِثِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَتَبَ اِلٰی عَمْرِو بْنِ حَزْمٍ وَّهُوَ بِنَجْرَانَ عَجِّلِ الْاَضْحٰى وَاَخِّرِ الْفِطْرَ وَذَكِّرِ النَّاسَ (مشکوٰۃ)

حضرت ابوالحویرث رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے عمرو بن حزم کو جبکہ وہ نجران میں تھے لکھا کہ بقرعید کی نماز جلد پڑھو اور عید الفطر کی نماز دیر سے پڑھو، اور لوگوں کو وعظ سناؤ۔

۱۱۹ - عَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ صَلَّيْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْعِيْدَيْنِ غَيْرَ مَرَّةٍ وَّلَا مَرَّتَيْنِ بِغَيْرِ اَذَانٍ وَّلَا اِقَامَةٍ۔ (مسلم)

حضرت جابر بن سمرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ میں نے رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے ساتھ عیدین کی نماز بغیر اذان و اقامت کے پڑھی ہے۔ ایک بار نہیں بلکہ کئی بار۔

۱۲۰ - عَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَغْدُوْ يَوْمَ الْفِطْرِ حَتّٰى يَاْكُلَ تَمَرَاتٍ وَّيَاْكُلُهُنَّ وِتْرًا۔ (بخاری)

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ عید الفطر کے دن جب تک حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم چند کھجوریں نہ کھا لیتے عیدگاہ کو تشریف نہ لے جاتے اور آپ طاق کھجوریں تناول فرماتے۔

۱۲۱۔ عَنْ بُرَيْدَةَ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَخْرُجُ يَوْمَ الْفِطْرِ حَتّٰى يَطْعَمَ وَلَا يَطْعَمُ يَوْمَ الْاَضْحٰى حَتّٰى يُصَلِّيَ۔
(ترمذی۔ ابن ماجہ)

حضرت بریدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ عید الفطر کے دن جب تک حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کچھ کھا نہ لیتے عیدگاہ کو تشریف نہ لے جاتے اور عید الاضحیٰ کے دن اس وقت تک کچھ نہ کھاتے جب تک کہ نماز نہ پڑھ لیتے۔

۱۲۲۔ عَنْ جَابِرٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا كَانَ يَوْمُ عِيْدٍ خَالَفَ الطَّرِيْقَ۔ (بخاری)

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم عید کے دن دو مختلف راستوں سے آتے جاتے تھے۔

امام کے اوصاف

۱۲۳۔ يَؤُمُّ الْقَوْمَ اَقْرَاُهُمْ بِكِتَابِ اللّٰهِ تَعَالٰى فَاِنْ كَانُوْا فِي الْقِرَاءَةِ سَوَاءً فَاَعْلَمُهُمْ بِالسُّنَّةِ فَاِنْ كَانُوْا فِي السُّنَّةِ سَوَاءً فَاَقْدَمُهُمْ هِجْرَةً فَاِنْ كَانُوْا فِي الْهِجْرَةِ سَوَاءً فَاَقْدَمُهُمْ سِنًّا وَلَا يَؤُمَّنَّ الرَّجُلُ الرَّجُلَ فِيْ سُلْطَانِهٖ وَلَا يَجْلِسْ عَلٰى تَكْرِمَتِهٖ اِلَّا بِاِذْنِهٖ۔
(الخمسة الا البخاری)

لوگوں کا امام وہ ہونا چاہیے جو ان میں سے سب سے اچھا قرآن پڑھتا ہو۔ اگر (کئی آدمی) قرآن خوانی میں مساوی ہوں تو وہ جو حدیث سے زیادہ واقف ہو، اور اگر حدیث میں ہم پلّہ ہوں تو وہ جو عمر میں بڑا ہو۔ اور کوئی شخص کسی اور کے علاقہ میں امامت نہ کرے۔ اور اس کی مسند پر بغیر اس کی اجازت کے نہ بیٹھے۔

۱۲۴۔ ثَلٰثَةٌ لَا يَقْبَلُ اللّٰهُ صَلٰوتَهُمْ مَنْ تَقَدَّمَ قَوْمًا وَّهُمْ لَهٗ كَارِهُوْنَ وَرَجُلٌ اَتَى الصَّلٰوةَ دِبَارًا وَالدِّبَارُ اَنْ يَّاْتِيَهَا بَعْدَ اَنْ تَفُوْتَهٗ وَمَنِ اعْتَبَدَ مُحَرَّرَةً اَيْ اِسْتَرَقَّهٗ بَعْدَ اَنْ حَرَّرَهٗ۔
(ابو داؤد)

تین شخص ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی نماز قبول نہیں کرتا، اوّل وہ جو قوم کا امام ہو اور لوگ اس کی امامت سے ناراض ہوں، دوسرا وہ جو نماز کے واسطے وقت گذرنے کے پیچھے آئے اور تیسرا وہ جو اپنے آزاد کیے ہوئے غلام کو پھر غلام بنا لے۔

۱۲۵۔ ثَلٰثَةٌ لَا تُجَاوِزُ صَلٰوتُهُمْ اٰذَانَهُمُ الْعَبْدُ الْاٰبِقُ حَتّٰى يَرْجِعَ وَامْرَاَۃٌ بَاتَتْ وَزَوْجُهَا عَلَيْهَا سَاخِطٌ وَّاِمَامُ قَوْمٍ وَّهُمْ لَهٗ كَارِهُوْنَ۔ (الترمذی)

تین شخص ہیں۔ جن کی نماز ان کے کانوں سے آگے نہیں بڑھتی۔ اوّل وہ بھاگا ہوا غلام جو واپس نہ آئے، دوسری وہ عورت جس نے ایسی رات گذار دی ہو کہ اس کا خاوند اس سے ناراض ہو۔ تیسرا وہ امام جس کے پیرو اُسے ناپسند کرتے ہوں۔

۱۲۶۔ اِذَا صَلّٰى اَحَدُكُمْ لِلنَّاسِ فَلْيُخَفِّفْ فَاِنَّ فِيْهِمُ الضَّعِيْفَ وَالسَّقِيْمَ وَالْمَرِيْضَ وَ ذَاالْحَاجَةِ وَاِذَا صَلّٰى لِنَفْسِهٖ فَلْيُطِلْ مَاشَآءَ۔ (الستة)

جب تم میں سے کوئی نماز کی جماعت کا امام ہو، تو اُسے تھوڑا پڑھنا چاہیئے۔ کیونکہ جماعت میں ضعیف، بیمار اور کام کاج والے ہوں گے اور جب اکیلے پڑھو تو بے شک جتنا جی چاہے۔ طویل پڑھو۔

۱۲۷۔ ثَلٰثٌ لَّا يَحِلُّ لِاَحَدٍ اَنْ يَّفْعَلَهُنَّ لَا يَؤُمُّ الرَّجُلُ قَوْمًا فَيَخُصُّ نَفْسَهٗ بِالدُّعَآءِ دُوْنَهُمْ فَاِنْ فَعَلَ فَقَدْ خَانَهُمْ وَلَا يَنْظُرُ فِيْ قَعْرِ بَيْتٍ قَبْلَ اَنْ يَّسْتَاْذِنَ فَاِنْ فَعَلَ فَقَدْ خَانَهُمْ وَلَا يُصَلِّيْ وَهُوَ حَقِنٌ حَتّٰى يَتَخَفَّفَ۔ (ابوداؤد والترمذی)

تین کام ہیں کہ ان کا کرنا کسی کے لیے جائز نہیں۔ (۱) کوئی شخص کسی جماعت کی امامت نہ کرائے جس میں کہ وہ اپنے پیروؤں کو چھوڑ کر اپنے ہی لیے دعا کرے اور اگر وہ ایسا کرے تو ان کی خیانت کرتا ہے۔ (۲) کسی گھر میں اندر جانے کی اجازت حاصل کرنے سے پہلے اس میں نہ جھانکے اور اگر اس نے ایسا کیا تو گھر والوں کی خیانت کی۔ نماز نہ پڑھے جب اُسے پیشاب کی حاجت ہو۔

مریض کی نماز

۱۲۸۔ ادائے نماز استطاعت کے اندر ہونی چاہیئے:

(عمرانؓ بن حصین) كانت بی بواسیر فسألت النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن الصلوٰۃ فقال صل قائما فان لم تستطع فقاعداً فان لم تستطع فعلی جنب۔

مجھے بواسیر ہو گئی۔ تو میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز کے متعلق دریافت کیا۔ فرمایا کہ: (حتی الامکان) کھڑے ہو کر نماز پڑھو۔ اگر یہ نہ کر سکو تو بیٹھ کر پڑھو۔ یہ بھی نہ ہو سکے تو کسی کروٹ ادا کر لو۔

وفی روایۃ : قال لہ فی الجواب من صلی قائما فھو افضل ومن صلی قاعداً فلہ مثل نصف اجر القائم ومن صلی نائما فلہ نصف اجر القاعد

(بخاری اصحاب السنن)

اور ایک دوسری روایت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب یوں منقول ہے کہ: اگر کھڑے ہو کر نماز ادا کی جائے تو وہ بہتر و افضل ہے اور جو بیٹھ کر نماز ادا کرے اس کا اجر کھڑے ہو کر ادا کرنے والے سے آدھا ہوگا اور جو لیٹ کر ادا کرے اس کا ثواب بیٹھ کر ادا کرنے والے سے نصف ہوگا۔ (یہ حکم صرف نوافل میں ہے۔ فرائض اگر بغیر عذر شرعی بیٹھ کر ادا کیے جائیں تو نماز نہیں ہوگی)

۱۲۹۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نفل نمازیں :

(ام سلمۃ رضی اللہ عنہا) قالت ما قبض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حتی کان اکثر صلاتہ جالسا الا المکتوبۃ وکان احب العمل الیہ ادومہ وان قل

(نسائی)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات اس وقت ہوئی جب آپ کی بیشتر نمازیں بجز فرض کے بیٹھ کر ہی ادا ہوتی تھیں۔ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کو زیادہ پسندیدہ عمل تھا جس پر مداومت زیادہ ہو اور خواہ وہ تھوڑا ہی کیوں نہ ہو۔

۱۳۰۔ نماز کے اندر عبد و معبود کے حصے :

(ابو ھریرۃ رضی اللہ عنہ) رفعہ : ..... قال اللہ تعالیٰ عز وجل قسمت الصلوۃ بینی وبین عبدی نصفین ولعبدی ما سأل فاذا قال الحمد للہ رب العلمین قال اللہ حمدنی عبدی واذا قال الرحمن الرحیم قال اللہ اثنیٰ علیّ عبدی واذا قال مالک یوم الدین قال مجدنی عبدی واذا قال ایاک نعبد وایاک نستعین قال ھذا بینی وبین عبدی ولعبدی ما سأل

اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ میرے اور میرے بندے کے درمیان نماز دو حصوں میں منقسم ہو جاتی ہے اور وہ بندہ جو کچھ مانگتا ہے وہ اسے ملتا ہے۔ جب وہ الحمد للہ رب العلمین کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری حمد کی ہے۔ جب وہ کہتا ہے الرحمن الرحیم تو وہ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری ثنا کی ہے اور جب وہ کہتا ہے، مالک یوم الدین، تو وہ فرماتا ہے: میرے بندے نے میری تمجید کی۔ پھر جب وہ ایاک نعبد وایاک نستعین کہتا ہے، تو وہ فرماتا ہے کہ: یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان ہے اور میرا یہ بندہ جو مانگے گا، اسے

فاذا قال اهدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضالین قال ھذا بینی وبین عبدی ولعبدی ما سأل - (مسلم، موطا، ترمذی، نسائی)

ملے گا - اور جب اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیہم غیر المغضوب علیہم ولا الضالین کہتا ہے، تو وہ فرماتا ہے کہ یہ بھی میرے اور میرے بندے کے درمیان ہے اور میرے بندے نے جو مانگا وہ اُسے مل گیا۔

نماز میں جائز و ممنوع افعال

۱۳۱۔ نماز میں سُترہ :

(ابو ھریرۃؓ) رفعہ : اذا صلی احدکم فلیجعل تلقاء وجھہ شیئاً فان لم یجد فلینصب عصاۃ فان لم یجد فلیخطط خطا ثم لا یضرّہ ما مرّ امامہ (ابوداؤد)

جب تم میں کوئی نماز پڑھے (اور سامنے گزرگاہ ہو) تو اپنے سامنے کوئی چیز (سُترہ) رکھ لے، یہ نہ ہو تو کوئی لکڑی گاڑ دے۔ یہ بھی میسر نہ ہو تو ایک لکیر ڈال دے۔ پھر سامنے سے کوئی چیز گزرے تو کوئی حرج نہ ہوگا۔

۱۳۲۔ اُونگھتے ہوئے نماز ادا کرنا :

(عائشۃؓ) اذا نعس احدکم وھو یصلی فلیرقد حتّٰی یذھب عنہ النوم فان احدکم اذا صلی وھو ناعس لا یدری لعلّہ یذھب یستغفر فیسب نفسہ (للستۃ)

جب کوئی نماز میں اُونگھنے لگے تو جا کر آرام کرے یہاں تک کہ نیند پوری ہو جائے، اس لیے کہ جو اونگھ اونگھ کر نماز پڑھتا ہے وہ یہ نہیں جانتا کہ شاید وہ استغفار کرتے کرتے اپنے آپ کو کوسنے لگے۔

۱۳۳۔ اجتماعیت کی اہمیّت :

(ابن عباسؓ)، سئل عن رجل یصوم النھار ویقوم اللیل ولا یشھد الجماعۃ ولا الجمعۃ قال ھٰذا

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک شخص کے بارے میں سوال کیا گیا جو دن کو روزہ رکھتا ہے اور رات کو نماز (تہجد) پڑھتا ہے لیکن نہ جماعت میں شریک ہوتا ہے نہ جمعہ

فِی النَّارِ ۔ (للترمذی)

فرمایا: ایسا شخص جہنّم میں جائے گا ۔

غُسل و کفن

۱۳۴ ۔ عَنْ اُمِّ عَطِيَّةَ قَالَتْ دَخَلَ عَلَيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَنَحْنُ نَغْسِلُ ابْنَتَهٗ فَقَالَ اِغْسِلْنَهَا وِتْرًا ثَلٰثًا اَوْ خَمْسًا اَوْ سَبْعًا وَابْدَأْنَ بِمَيَامِنِهَا وَمَوَاضِعِ الْوُضُوْءِ مِنْهَا ۔ (بخاری)

حضرت اُمِّ عطیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کہتی ہیں، کہ رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم ہمارے پاس تشریف لائے جب کہ ہم حضور کی صاحبزادی (حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا) کو غسل دے رہے تھے تو حضور نے فرمایا اسے غسل دو طاق ۔ یعنی تین یا پانچ یا سات بار، اور غسل کا سلسلہ داہنی جانب سے اور وضو کے اعضاء سے شروع کریں ۔

۱۳۵ ۔ عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا كَفَّنَ اَحَدُكُمْ اَخَاهُ فَلْيُحْسِنْ كَفَنَهٗ ۔ (مسلم شریف)

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ جب کوئی اپنے بھائی کو کفن دے تو چاہیے کہ اچھا کفن دے ۔

۱۳۶ ۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلْبَسُوْا مِنْ ثِيَابِكُمُ الْبَيَاضَ فَاِنَّهَا مِنْ خَيْرِ ثِيَابِكُمْ وَكَفِّنُوْا فِيْهَا مَوْتَاكُمْ ۔ (ابوداؤد، ترمذی)

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے کہا کہ رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا کہ تم لوگ سفید کپڑے پہنا کرو اس لیے کہ وہ عمدہ قسم کے کپڑے ہیں، اور سفید کپڑوں میں اپنے مردوں کو کفنایا کرو ۔

صفوں کی ترتیب

۱۳۷ ۔ يَمْسَحُ مَنَاكِبَنَا فِي الصَّلٰوةِ يَقُوْلُ اسْتَوُوْا وَلَا تَخْتَلِفُوْا فَتَخْتَلِفَ قُلُوْبُكُمْ لِيَلِيَنِيْ مِنْكُمْ اُولُوا الْاَحْلَامِ

ایک صحابی روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز (کی جماعت کھڑے ہونے) کے وقت ہمارے کندھوں پر ہاتھ پھیرتے اور فرماتے سیدھے

وَالنُّهٰى ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ۔

(مسلم، ابوداؤد، والنسائی)

ہو جاؤ اور آگے پیچھے مت رہو کہ تمہارے دلوں کا اختلاف جاتا رہے۔ میرے نزدیک وہ لوگ کھڑے ہوں جو بہت ہی سمجھ دار اور عقل مند ہوں۔ پھر وہ جو اُن سے قریب ہوں، اور پھر وہ جو اُن سے قریب ہوں۔ وعلیٰ ہذا القیاس)

وَفِيْ اُخْرٰى لِيَلِيَنِيْ فِيْ اٰخِرِهٖ ٭

اور دوسری حدیث میں "مجھ سے قریب وہ لوگ ہوں" آخر میں آیا ہے۔

وَاِيَّاكُمْ وَهَيْشَاتِ الْاَسْوَاقِ۔

(مسلم، ابوداؤد، والترمذی)

(ایک اور حدیث میں فرمایا ہے) کہ محفل میں بازاری یعنی کاروبار کی باتوں سے پرہیز کرو۔

جماعت کے بعض احکام

۱۴۸۔ دوسری جگہوں میں جا کر امامت کا شوق نہ کرو:

مالک بن الحویرث) رفعه: اذا زار احدکم قوما فلا یصلین بهم۔

(اصحاب سنن)

جب تم میں کوئی شخص کسی قبیلے میں ملنے جائے تو اُن کو نماز نہ پڑھائے۔ (یعنی امامت کا شوق نہ کرے کیونکہ اس میں اپنی تعلّی اور اس محلے یا بستی کے امام کی سُبکی سی ہوتی ہے)

۱۴۹۔ کس قسم کے لوگوں کی نماز قبول نہیں؟:

(ابن عمروؓ بن العاص) رفعه: ثلاثة لا تقبل منهم صلوة من تقدم قوما وهم له كارهون ورجل اتى الصلوة دبارا والدبار ان يأتيها بعد ان تفوته ومن اعتبد محررة۔

(ابوداؤد)

تین قسم کے آدمی ایسے ہیں جن کی کوئی نماز قبول نہیں ہوتی۔ ایک وہ شخص جو لوگوں کی امامت کرائے مگر لوگ (مقتدین) اس سے متنفر ہوں۔ دوسرے وہ جو نماز کا وقت فوت ہو جانے کے بعد پڑھے، اور تیسرے وہ جو کسی آزاد کو غلام بنا لے۔

۱۴۰۔ مقتدی اُکتا نہ جائیں (اقتدا کے بعد امامت):

(جابرؓ) كان معاذؓ يصلي مع النبي صلى الله عليه وسلّم ثم يرجع فيصلي بقومه فاخّر النبي صلى الله عليه وسلّم ليلة العشاء فصلّى معاذ معه ثم جاء ليؤمّ قومه فقراء البقرة فاعتزل رجل من القوم فصلى فقيل له نافقت يافلان فقال ما نافقت واتى النبي صلّى الله عليه وسلم فقال ان معاذا يصلّى ثم يرجع فيؤمّنا فقرأ بسورة البقرة فقال يامعاذؓ افتّان انت؟ اقرأ بكذا اقراء بكذا قال ابوالذبير بسبح اسم ربك الاعلى والليل اذا يغشى۔

معاذؓ، آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ نماز ادا کر کے واپس آتے تھے اور اپنی قوم میں امامت کرتے تھے۔ ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز عشاء میں تاخیر فرمائی۔ معاذؓ نے آپ کے ساتھ نماز پڑھی اور پھر اپنی قوم میں آ کر نماز پڑھائی اور سورۃ بقرۃ پڑھنے لگے۔ ان میں سے ایک شخص نے جماعت سے الگ ہو کر اپنی نماز پڑھ لی۔ لوگوں نے اس سے کہا کہ: تو منافق ہو گیا۔ اس نے کہا: میں منافق نہیں ہوا۔ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہنے لگا، کہ معاذؓ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھ کر واپس آتے ہیں اور ہم لوگوں کو نماز پڑھاتے ہیں۔ وہ آج سورۃ بقرہ پڑھنے لگے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے معاذؓ! کیا تم فتنہ پیدا کرنا چاہتے ہو۔ یہ یہ سورتیں یعنی سبّح اسم ربك الاعلى اور والليل اذا يغشى پڑھا کرو۔

۱۴۱۔ مقتدیوں کی رعایت ضروری ہے:

(ابوھریرۃؓ) رفعه: اذا صلى احدكم للناس فليخفف فان فيهم الضعيف والسقيم والكبير (للستة)۔

جب تم میں کوئی امامت کرائے، تو تخفیف سے کام لے، کیونکہ مقتدیوں میں کمزور، بیمار اور بوڑھے سبھی ہوتے ہیں۔

۱۴۲۔ عورت کی رعایت سے نماز میں اختصار:

(انسؓ) رفعه: انى لادخل فى الصلوٰة اريدان اطيلها فاسمع بكاء الصبى

جب میں نماز شروع کر دیتا ہوں تو نماز طویل کرنے کو دل چاہتا ہے۔ پھر جب بچے کے رونے کی آواز سنتا ہوں تو

فاتجوز فی صلوتی لما اعلم من وجد امه من بکائه ۔ (شیخین، ترمذی، نسائی)

میں نماز سے جلدی گزر جاتا ہوں، کیونکہ ماں کو اس کے رونے سے جو تکلیف ہوتی ہے اُسے میں سمجھتا ہوں۔

۱۴۳۔ تین باتوں کا لحاظ ضروری ہے:

(ثوبانؓ) رفعہ: ثلاث لا یحل لاحد ان یفعلھن لا یؤمّنّ رجل قوما فیخص نفسہ بالدعاء دونھم فان فعل فقد خانھم ولا ینظر فی قعر بیت قبل ان یستأذن فان فعل فقد خانھم ولا یصلی وھو حقن حتی یتخفف (ترمذی، ابوداؤد ملفظہ)

تین باتیں ایسی ہیں جن کو کرنا کسی کے لیے جائز نہیں۔ اوّل یہ کہ کوئی آدمی کسی جماعت کی امامت اس طرح نہ کرے کہ دُعا صرف اپنے لیے مانگے اور دوسروں کو چھوڑ دے۔ اگر ایسا کرے گا، تو خائن ہوگا (دوم یہ کہ) کسی گھر کے اندرونی حصے میں بلا اجازت نہ جھانکے ورنہ خائن ہوگا (سوم یہ کہ) پیشاب کو روک کر نماز نہ پڑھے، بلکہ پیشاب کرکے ہلکا ہو جائے۔

۱۴۴۔ ہر عمل میں حضورِ قلب ضروری ہے (رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کو لُقمہ دینا):

(مالکؓ بلغنی: ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم صلی بالناس صلوۃ یجھر فیھا فاسقط اٰیۃ فقال یا فلان ھل اسقطت فی ھذہ السورۃ من شیٔ؟ قال لا ادری ثم سأل اثنین او ثلاثۃ کلھم یقول لا ادری فقال ھل فیکم اُبَیّ؟ قالوا نعم قال فھو لھا اذاً قال یا اُبَیّ ھل اسقطت فی ھذہ السورۃ من شیٔ؟ قال نعم اٰیۃ کذا قال مامنعک ان تفتحھا علی قال ظننت انھا نسخت اور فعت ثم قال صلی اللہ علیہ وسلم ما بال اقوام تتلی علیھم کتاب اللہ فلا یدرون ما تلی علیھم منہ مما ترک ھکذا اخرجت عظمۃ اللہ من قلوب بنی اسرائیل تشھدت ابدانھم وغابت قلوبھم ولا یقبل اللہ من عبد عملا حتی یشھد بقلبہ مع بدنہ ۔ (رزین)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جہری نماز پڑھائی اور ایک آیت چھوڑ گئے بعد نماز فرمایا کہ: اے فلاں کیا میں نے اس سورۃ میں کوئی آیت چھوڑ دی ہے؟ اس نے کہا، میں نے خیال نہیں کیا۔ پھر دوسرے سے یہی سوال کیا؟ دو یا تین آدمیوں سے یہی سوال کیا اور سب نے یہی کہا کہ میں نے خیال نہیں کیا۔ پھر فرمایا کہ: یہاں اُبی موجود ہیں؟ عرض کیا گیا: ہاں۔ فرمایا: وہ اُسے بتا سکیں گے پھر فرمایا کہ: اے اُبی اس سورۃ میں کچھ چھوڑ دیا گیا ہے؟ عرض کیا: ہاں فلاں آیت رہ گئی ہے فرمایا کہ تمھیں مجھے لقمہ دینے میں کیا چیز مانع ہوئی؟ عرض کیا مجھے خیال ہوا کہ شاید یہ آیت منسوخ ہو گئی ہو، یا اُٹھا لی گئی ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ان لوگوں کا کیا حال ہے جن کے سامنے کتاب اللہ تلاوت کی جاتی ہے اور انھیں یہ پتا نہیں چلتا کہ کیا پڑھا گیا اور کیا چھوٹ گیا؟ بنی اسرائیل کے دلوں سے اسی طرح اللہ کی عظمت جاتی رہی تھی یعنی ان کے جسم تو موجود رہتے تھے اور دل غیر حاضر رہتے۔ اللہ تعالیٰ کسی بندے کا کوئی عمل اس وقت تک قبول نہیں فرماتا جب تک جسم کے ساتھ دل بھی حاضر نہ ہو۔

جنازہ

۱۴۵۔ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَسْرِعُوْا بِالْجَنَازَةِ فَاِنْ تَكُ صَالِحَةً فَخَيْرٌ تُقَدِّمُوْنَهَا اِلَيْهِ وَاِنْ تَكُ سِوٰى ذٰلِكَ فَشَرٌّ تَضَعُوْنَهٗ عَنْ رِقَابِكُمْ۔

(بخاری، مسلم)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا کہ جنازہ کے لیے جانے میں جلدی کرو۔ اس لیے کہ اگر وہ نیک آدمی کا جنازہ ہے تو اسے خیر کی (منزل) کی طرف جلد پہنچانا چاہیئے اور اگر بدکار کا جنازہ ہے تو بُرے کو اپنی گردنوں سے جلد اُتار دینا چاہیئے۔

۱۴۶۔ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنِ اتَّبَعَ جَنَازَةَ مُسْلِمٍ اِيْمَانًا وَّاحْتِسَابًا وَكَانَ مَعَهٗ حَتّٰى يُصَلّٰى عَلَيْهَا وَيَفْرُغَ مِنْ دَفْنِهَا فَاِنَّهٗ يَرْجِعُ مِنَ الْاَجْرِ بِقِيْرَاطَيْنِ كُلُّ قِيْرَاطٍ مِثْلُ اُحُدٍ وَمَنْ صَلّٰى عَلَيْهَا ثُمَّ رَجَعَ قَبْلَ اَنْ تُدْفَنَ فَاِنَّهٗ يَرْجِعُ بِقِيْرَاطٍ۔

(بخاری۔ مسلم)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ جو شخص ایمان کا تقاضا سمجھ کر اور حصولِ ثواب کی نیت سے کسی مسلمان کے جنازہ کے ساتھ ساتھ چلے، یہاں تک کہ اس کی نماز پڑھے اور اس کے دفن سے فارغ ہو تو وہ دو قیراط ثواب لے کر واپس لوٹتا ہے۔ جس میں سے ہر قیراط اُحد (پہاڑ) کے برابر ہے اور (جو شخص) صرف جنازہ کی نماز پڑھ کر واپس آجائے اور دفن میں شریک نہ ہو تو وہ ایک قیراط کا ثواب لے کر واپس ہوتا ہے۔

۱۴۷۔ عَنْ اَنَسٍ قَالَ مَرُّوْا بِجَنَازَةٍ فَاَثْنَوْا عَلَيْهَا خَيْرًا فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَجَبَتْ ثُمَّ مَرُّوْا بِاُخْرٰى فَاَثْنَوْا عَلَيْهَا شَرًّا فَقَالَ وَجَبَتْ فَقَالَ عُمَرُ مَا وَجَبَتْ فَقَالَ هٰذَا اَثْنَيْتُمْ خَيْرًا فَوَجَبَتْ لَهُ الْجَنَّةُ وَهٰذَا اَثْنَيْتُمْ عَلَيْهِ شَرًّا فَوَجَبَتْ لَهُ النَّارُ اَنْتُمْ شُهَدَاءُ اللّٰهِ

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ چند صحابہ کرام ایک جنازہ کے قریب سے گذرے تو خیر کے ساتھ اس کا ذکر کیا۔ اس پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا کہ واجب ہو گئی، پھر لوگوں کا دوسرے جنازہ پر گذر ہوا تو بُرائی کے ساتھ اس کا ذکر کیا۔ اس پر حضورؐ نے ارشاد فرمایا۔ واجب ہو گئی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا (یا رسول اللہ) کیا چیز واجب ہو گئی! فرمایا میت کا تم لوگوں نے بھلائی کے ساتھ ذکر کیا اس کے لیے

فِي الْأَرْضِ۔

(بخاری، مسلم)

جنّت واجب ہوگئی اور جس کی تم لوگوں نے برائی کی اس کے لیے دوزخ واجب ہوگئی۔ تم لوگ زمین پر خدائے تعالیٰ کے گواہ ہو۔

۱۴۸۔ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَسُبُّوا الْأَمْوَاتَ۔

(بخاری شریف)

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے کہا کہ: رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا کہ مُردوں کو گالی نہ دو۔

۱۴۹۔ عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُذْكُرُوْا مَحَاسِنَ مَوْتَاكُمْ وَكُفُّوْا عَنْ مَسَاوِيْهِمْ۔ (ابوداؤد، ترمذی)

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے کہا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ اپنے مُردوں کی نیکیوں کا چرچا کرو اور ان کی برائیوں سے چشم پوشی کرو۔

جمعہ کی نماز

۱۵۰۔ مَنْ غَسَّلَ وَاغْتَسَلَ وَبَكَّرَ وَابْتَكَرَ وَمَشٰى وَلَمْ يَرْكَبْ وَدَنَا مِنَ الْإِمَامِ وَلَمْ يَلْغُ وَاسْتَمَعَ كَانَ لَهٗ بِكُلِّ خُطْوَةٍ اَجْرُ عَمَلِ سَنَةٍ صِيَامِهَا وَقِيَامِهَا۔ (الترمذی، النسائی، ابوداؤد)

جو شخص (جمعہ کے دن) نہائے۔ اور (کسی کو) نہلائے۔ (مسجد میں) سویرے چلا جائے۔ اور سویرے (کسی کو) پہنچائے، پیدل چلے اور سوار نہ ہو۔ امام کے قریب بیٹھے۔ لغو اس نہ کرے اور (خطبہ) سُنتا رہے۔ اس کے ہر ایک قدم کا (جو وہ چل کر آیا ہے) سال بھر کے روزے اور نماز کا اجر ہے۔

۱۵۱۔ اَلْجُمُعَةُ حَقٌّ وَاجِبٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ فِيْ جَمَاعَةٍ اِلَّا عَلٰى اَرْبَعَةٍ عَبْدٍ مَمْلُوْكٍ اَوِ امْرَاَةٍ اَوْ صَبِيٍّ اَوْ مَرِيْضٍ۔ (ابوداؤد)

جمعہ کی نماز ہر مسلمان پر جماعت کے ساتھ پڑھنا لازمی ہے۔ سوائے (مفصلہ ذیل) چار شخصوں کے (۱) غلام جو کسی کی ملکیت میں ہو (۲) عورت (۳) لڑکا (۴) بیمار۔

۱۵۲۔ عَلٰى كُلِّ مُحْتَلِمٍ رَوَاحٌ اِلَى الْجُمُعَةِ وَعَلٰى مَنْ رَاحَ اِلَى الْجُمُعَةِ الْغُسْلُ۔ (ابوداؤد، النسائی۔ وزاد الشیخان ومالک وَاَنْ يَسْتَنَّ وَاَنْ يَمَسَّ طِيْبًا اِنْ وَجَدَ)

ہر بالغ مرد کو جمعہ (کی نماز) کے واسطے جانا لازمی ہے اور جو جائے اس کے لیے نہانا بھی لازمی ہے اور دوسرے محدثوں نے مسواک کرنا اور میسر آسکے تو خوشبو لگانا بھی لکھا ہے۔

۱۵۳ - مَا عَلٰی اَحَدِکُمْ لَوِ اتَّخَذَ ثَوْبَیْنِ لِجُمُعَةٍ سِوٰی ثَوْبَیْ مِهْنَتِهٖ - (مالک، ابوداؤد، هٰذا اللفظ مالک)

تم میں سے کسی کے واسطے کچھ (حرج) نہیں - اگر روزمرہ کام کاج کے کپڑوں کے علاوہ جمعہ کے واسطے دو کپڑے الگ بنوا رکھے۔

۱۵۴ - مَنْ تَرَکَ ثَلٰثَ جُمَعٍ تَهَاوُنًا بِهَا طَبَعَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَلٰی قَلْبِهٖ - (ابوداؤد، الترمذی، النسائی)

جو شخص متواتر تین جمعہ (کی نماز) سستی سے چھوڑدے، اللہ تعالےٰ اس کے دل پر (سیاہی کی) مہر کر دیتا ہے۔

۱۵۵ - مَنْ تَرَکَ الْجُمُعَةَ مِنْ غَیْرِ عُذْرٍ فَلْیَتَصَدَّقْ بِدِیْنَارٍ فَاِنْ لَّمْ یَجِدْ فَبِنِصْفِ دِیْنَارٍ - (ابوداؤد والنسائی)

جو شخص جمعہ کی نماز عذر کے بغیر چھوڑدے، اُسے ایک دینار (خیرات کرنا چاہیئے، اور اگر سارے دینار کا مقدور نہ ہو تو آدھا دینار (ضرور) خیرات کرے۔

۱۵۶ - اِجْتَمَعَ فِیْ یَوْمِکُمْ هٰذَا عِیْدَانِ فَمَنْ شَاءَ اَجْزَاهُ مِنَ الْجُمُعَةِ وَاِنَّا مُجَمِّعُوْنَ - (ابوداؤد)

(ایک عید جمعہ کے دن واقع ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا) آج کے دن دو عیدیں جمع ہو گئی ہیں۔ یعنی (عید اور جمعہ) پس جو چاہے اس کے لیے (عید کی نماز ہی) جمعہ کی نماز کے واسطے بھی کافی ہے اور ہم تو جمعہ کی نماز (بھی) پڑھیں گے۔

۱۵۷ - کَانَتْ صَلٰوةُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَصْدًا وَّخُطْبَتُهٗ قَصْدًا - (الخمسة الا البخاری)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز اوسط درجہ کی ہوتی (اور خطبہ بھی اوسط درجہ کا، یعنی ہر دو لمبے نہ ہوتے۔

۱۵۸ - اِنَّ طُوْلَ صَلٰوةِ الرَّجُلِ وَقِصَرَ خُطْبَتِهٖ مَئِنَّةٌ - (مسلم، ابوداؤد)

آدمی کا لمبی نماز پڑھنا، اور مختصر خطبہ پڑھنا اس کے سمجھدار ہونے کی علامت ہے۔

۱۵۹ - اِذَا قُلْتَ لِصَاحِبِکَ یَوْمَ الْجُمُعَةِ وَالْاِمَامُ یَخْطُبُ اَنْصِتْ فَقَدْ لَغَوْتَ - (السنة)

جمعہ کے دن جب امام پڑھ رہا ہو، تمہارا اپنے پڑوسی کو کہنا کہ چپ رہو، ایک لغو قول ہے۔

۱۶۰ - لَاَنْ یُّصَلِّیَ اَحَدُکُمْ بِظَهْرِ الْحَرَّةِ خَیْرٌ لَّهٗ مِنْ اَنْ یَّقْعُدَ حَتّٰی اِذَا قَامَ الْاِمَامُ یَخْطُبُ تَخَطّٰی

اگر تم میں سے کوئی تپی ہوئی پتھریلی زمین پر نماز پڑھے تو اس سے بہتر ہے کہ وہ جمعہ کے دن اپنے گھر میں بیٹھا، اور جب امام خطبہ کے واسطے

رِقَابَ النَّاسِ يَوْمَ الْجُمُعَةِ ۔ (مالك)

کھڑا ہو، تو ان کی گردنیں لتاڑتا اندر آئے ۔

۱۶۱۔ إِذَا نَعَسَ أَحَدُكُمْ يَوْمَ الْجُمُعَةِ فَلْيَتَحَوَّلْ مِنْ مَجْلِسِهِ ذٰلِكَ ۔ (الترمذی)

جمعہ کے دن (خطبہ میں) اگر تم میں سے کسی کو اُونگھ آ جاتے، تو وہ اپنی جگہ بدل ڈالے ۔

نماز جمعہ

۱۶۲۔ قربانی چھوٹی سے چھوٹی چیز کی بھی ہو سکتی ہے :

(ابوھریرۃ) رفعه : من اغتسل يوم الجمعة غسل الجنابة ثم راح فكأنما قرب بدنة ومن راح فى الساعة الثانية فكأنما قرب بقرة ومن راح فى الساعة الثالثة فكأنما قرب كبشا اقرن ومن راح فى الساعة الرابعة فكأنما قرب دجاجة ومن راح فى الساعة الخامسة فكأنما قرب بيضة فاذا خرج الامام حضرت الملائكة يستمعون الذكر (للستة)

جو شخص جمعہ کے دن غسلِ جنابت کی طرح کا (یعنی مکمّل غسل) کرے اور فی الفور مسجد روانہ ہو جائے وہ گویا ایک اُونٹ کی قربانی دیتا ہے اور جو ذرا ٹھہر کر جائے وہ گویا ایک گائے دے کر تقرّب حاصل کرتا ہے ۔ جو اور زیادہ ٹھہر کر جائے وہ گویا ایک مینڈھا دے کر قرب حاصل کرتا ہے اور جو اس کے بھی بعد جائے وہ گویا ایک مرغی دے کر قرب حاصل کرتا ہے اور جو سب سے آخر میں جائے وہ گویا ایک انڈے کو قربان کر کے تقرّب حاصل کرتا ہے ۔ پھر جب امام نکلتا ہے تو فرشتے بھی ذکرِ الٰہی سُننے کو آموجود ہوتے ہیں ۔

۱۶۳۔ جمعے کو حاضر ہونے کا طریقہ :

(ابن عمرو بن العاص) رفعه : يحضر الجمعة ثلاث نفر فرجل حضرها يلغو فذلك حظه منها ورجل حضرها بدعاء فهو رجل دعا ان شاء الله

... جمعہ میں تین قسم کے لوگ آتے ہیں ۔ ایک وہ ہوتا ہے جو محض کھیل کے لیے آتا ہے وہ اپنا ہی حصہ لے کر جاتا ہے ۔ دوسرا وہ ہے جو کوئی دعائیہ مقصد لے کر آتا ہے اور دُعا کرتا ہے ۔ اُسے اللہ تعالیٰ چاہے تو

اعطاه وان شاء منعه ورجل حضرها بانصات وسکوت ولم یتخط رقبة مسلم ولم یوذ احداً فھی کفارة الی الجمعة التی تلیھا وزیادة ثلاثة ایام وذلک ان اللہ تعالیٰ یقول من جاء بالحسنة فله عشر امثالھا ۔ (ابوداؤد)

دے اور چاہے تو نہ دے۔ تیسرا وہ ہوتا ہے، جو خاموشی و وقار کے ساتھ حاضر ہوتا ہے اور لوگوں کے سروں پر سے گذر کر کسی کو ایذا نہیں پہنچاتا۔ ایسے آدمی کا جمعہ دوسرے جمعہ تک بلکہ تین مزید دنوں تک کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے اور یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ: "جو ایک نیکی کرے گا، اُس کے لیے دس گناہ اجر ہوگا۔"

۱۶۴۔ جمعے میں کسی کو "چپ رہو" کہنا بھی بولنا ہے:

(ابوھریرةؓ) رفعه اذا قلت لصاحبک یوم الجمعة انصت والامام یخطب فقد لغوت۔ (للستة)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر تم نے خطبہ جمعہ کے دوران میں دوسرے شخص سے کہا "چپ ہو جاؤ" تو تم نے بھی ایک لغو حرکت کی۔

۱۶۵۔ نہایت لطیف تشبیہ (مجمع کو چیرنے والوں کے لیے):

(معاذ بن انسؓ الجھنی) رفعه: من تخطی رقاب الناس یوم الجمعة اتخذ جسراً الی جھنم۔ (ترمذی)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص خطبہ جمعہ میں سامعین کو پھاندتا ہوا آگے جاتا ہے اپنے لیے جہنم کا پل بناتا ہے۔

۱۶۶۔ دورانِ خطبہ میں نماز یا گفتگو نہ ہونی چاہیے:

(ابن عمرؓ) اذا دخل احدکم المسجد والامام علی المنبر فلا صلوٰة ولا کلام حتی یفرغ الامام۔ (کبیر بضعف)

تم میں سے جب کوئی مسجد میں داخل ہو، اور امام (خطیب) منبر پر ہو تو اس وقت تک کوئی نماز اور کوئی گفتگو نہ ہو، جب تک وہ (خطبہ سے) فارغ نہ ہو جائے۔

نماز سفر

۱۶۷۔ تین فرسخ پر قصر نماز:

(انسؓ) کان رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب تین میل یا تین فرسخ

وسلّم اذا اخرج مسیرة ثلاثة امیال او ثلاثة فراسخ شک شعبة صلی رکعتین (مسلم، ابوداؤد)

(انس رضی اللہ عنہ) نے تین میل تیا یا تین فرسخ، شعبہ کو (اس میں شک ہو گیا) کی مسافت پر نکلتے تو دو رکعت (یعنی قصر) ادا فرماتے۔

۱۶۸۔ مسافرت میں نوافل نہ ادا کیے جائیں:

(ابن عمرؓ) سافرت مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم و ابی بکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ نکالوا یصلون الظھر والعصر رکعتین لا یصلون قبلھا ولا بعدھا و لو کنت مصلیا قبلھا او بعدھا لا تممتھا۔ (ترمذی)

میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ کے ساتھ سفر کیا ہے۔ یہ سب حضرات ظہر و عصر کی صرف دو دو رکعتیں (فرض) ادا فرماتے تھے، نہ اس سے پہلے کوئی نماز (سنت و نفل) ادا کرتے تھے نہ اس کے بعد۔ اگر میں پہلے یا بعد میں کچھ ادا کرنا ضروری سمجھتا، تو ضرور اس کی تکمیل کرتا۔

شہید

۱۶۹ عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اَلْقَتْلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ یُکَفِّرُ کُلَّ شَیْئٍ اِلَّا الدَّیْنَ۔ (مسلم شریف)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم علیہ الصلاۃ والسلام نے فرمایا کہ خدائے تعالیٰ کی راہ میں قتل کیا جانا قرض کے سوا ہر گناہ کو مٹا دیتا ہے۔

۱۷۰۔ عَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ جَاھِدُوا الْمُشْرِکِیْنَ بِاَمْوَالِکُمْ وَاَنْفُسِکُمْ وَاَلْسِنَتِکُمْ۔ (ابوداؤد، نسائی)

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا کہ اپنی جان و مال اور زبانوں کے ذریعہ مشرکین سے جہاد کرو۔

۱۷۱۔ عَنْ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ جَاءَ رَجُلٌ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ ایک شخص نے حضورؐ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر کہا کہ کوئی مالِ غنیمت

فَقَالَ الرَّجُلُ يُقَاتِلُ لِلْمَغْنَمِ وَالرَّجُلُ يُقَاتِلُ لِلذِّكْرِ وَالرَّجُلُ يُقَاتِلُ لِيُرٰى مَكَانُهُ، فَمَنْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قَالَ مَنْ قَاتَلَ لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا فَهُوَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ (بخاری، مسلم)

کے لیے لڑتا ہے، کوئی شہرت و ناموری کے لیے لڑتا ہے اور کوئی اپنی بہادری و شجاعت کھانے کے لیے لڑتا ہے تو ان میں سے راہ حق میں لڑنے والا کون ہے۔؟ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا جو اس کے لیے لڑتا ہے کہ اللہ کے دین کا بول بالا ہو تو وہ مجاہد فی سبیل اللہ ہے۔

قبروں کی زیارت

۱۷۲۔ عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ كُنْتُ نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُوْرِ فَزُوْرُوْهَا فَاِنَّهَا تُزَهِّدُ فِي الدُّنْيَا وَ تُذَكِّرُ الْاٰخِرَةَ۔ (ابن ماجہ)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ میں نے تم لوگوں کو قبروں کی زیارت سے روکا تھا تو اب میں تمھیں اجازت دیتا ہوں کہ ان کی زیارت کرو، اس لیے کہ قبروں کی زیارت کرنا دنیا سے بیزار کرتا ہے اور آخرت کی یاد دلاتا ہے۔

نماز میں کمی کرنا

۱۷۳۔ صَلَّيْنَا الظُّهْرَ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْمَدِيْنَةِ اَرْبَعًا وَ خَرَجَ يُرِيْدُ مَكَّةَ فَصَلّٰى بِذِي الْحُلَيْفَةِ الْعَصْرَ رَكْعَتَيْنِ۔ الخمسة۔ يَجْمَعُ بَيْنَ صَلٰوةِ الظُّهْرِ وَالْعَصْرِ اِذَا كَانَ عَلٰى ظَهْرِ سَيْرٍ وَ يَجْمَعُ بَيْنَ الْمَغْرِبِ وَالْعِشَاءِ (الشیخان)

ایک صحابی روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدینہ میں ظہر کی نماز ہم نے چار رکعت پڑھی اور جب آپ مکہ جانے کے واسطے روانہ ہوئے تو (مقام) ذی الحلیفہ میں آپ نے عصر کی نماز (بجائے چار کے) دو رکعت پڑھی اور جب سفر میں ہوتے تو ظہر اور عصر اور مغرب اور عشا کی نمازیں ملا کر پڑھتے (یعنی ظہر اور عصر دونوں ایک دفعہ اور اسی طرح دوسری دونوں)۔

رات کی نماز

۱۷۴۔ عَلَيْكُمْ بِقِيَامِ اللَّيْلِ فَإِنَّهُ دَأْبُ الصَّالِحِينَ قَبْلَكُمْ وَقُرْبَةٌ إِلَى رَبِّكُمْ وَمَنْهَاةٌ عَنِ الْإِثْمِ وَتَكْفِيرٌ لِلسَّيِّئَاتِ وَمَطْرَدَةٌ لِلدَّاءِ عَنِ الْجَسَدِ۔ (الترمذی)

رات کو اُٹھنا نیک بخت لوگوں کا طریقہ تھا۔ جو تم سے پہلے گذرے ہیں۔ اس سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے اور آدمی گناہوں سے رُکتا ہے۔ یہ بداعمالیوں کا کفارہ ہے اور جسم کے دُکھ درد دُور کرتا ہے۔

نماز خوف

۱۷۵۔ صلوٰۃ الخوف کا ایک طریقہ:

(سهل بن ابی حثمۃؓ) ان رسول الله صلی الله علیه وسلم صلی باصحابه فی الخوف فصفهم خلفه صفین فصلی بالذین یلونه رکعة ثم قام فلم یزل قائما حتی صلی الذین خلفه رکعة ثم تقدموا وتأخر الذین کانوا قدامهم فصلی بهم رکعة ثم قعد حتی صلی الذین تخلفوا رکعة ثم سلم (شیخین، مالک، ترمذی، ابوداؤد)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کے ساتھ بحالت خوف یوں نماز پڑھی کہ سب کو اپنی پشت پر دو صفوں میں بانٹ دیا۔ پھر قریب تر صف نے آپ کے پیچھے ایک رکعت ادا کی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوگئے اور اس وقت تک کھڑے رہے کہ اس صف نے ایک رکعت اور ادا کر لی۔ اس کے بعد یہ لوگ جو اگلی صف میں تھے پیچھے چلے گئے اور پچھلی صف آگے چلی آئی اور ان کو بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک رکعت پڑھائی اور قعدے میں اتنی دیر رہے کہ انھوں نے ایک رکعت اور ادا کر لی۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام پھیرا۔

لہ پچھلی رات کو سناٹا ہوتا ہے۔ کوئی آہٹ اور آواز نہیں ہوتی جس سے توجہ منتشر ہو۔ آدمی کا دل سونے سے گذشتہ دن کی تھکاوٹ اور تفکرات دُور کر کے جمع اور آسودہ ہوتا ہے۔ اس واسطے اس وقت عبادت کرنے سے تزکیہ نفس بہت ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے اور طبیعت بشاش ہو کر صحت پر اچھا اثر ڈالتی ہے۔

۱۷۶۔ صلوٰۃ الخوف کا دوسرا طریقہ :

(جابرؓ) کنّا مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بذات الرقاع فاذا اتینا علی شجرۃ ظلیلۃ ترکناھا للنبی صلّی اللہ علیہ وسلم فجاء رجل من المشرکین وسیف رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم معلّق بالشجرۃ فاخترطہ فقال تخافنی فقال لا فقال فمن یمنعک منی؟ قال اللہ فتھددہ الصحابۃ واقیمت الصلوٰۃ فصلی بطائفۃ رکعتین ثم تاخروا وصلّی بالطائفۃ الاخری رکعتین فکان للنبی صلّی اللہ علیہ وسلم اربع وللقوم رکعتان۔ (شیخین، نسائی)

ہم لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مقام ذات الرقاع میں تھے کہ ایک سائے دار درخت کے پاس پہنچے اور اسے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لیے مخصوص کر دیا۔ اتنے میں ایک مشرک آیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار لٹک رہی تھی۔ اس نے تلوار سونت لی اور کہنے لگا، کہ: ڈرتے ہو مجھ سے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں تو۔ بولا کہ: پھر تمھیں مجھ سے کون بچا سکتا ہے۔ فرمایا: اللہ۔ اس واقعے سے صحابہ کرامؓ کو خطرہ پیدا ہوا، اور نماز (صلوٰۃ الخوف) یوں ادا کی گئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک گروہ کو دو رکعت نماز پڑھائی اور وہ پیچھے چلا گیا۔

پھر دوسرے گروہ کو دو رکعت نماز پڑھائی۔ اس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی چار اور لوگوں کی دو رکعتیں ہوئیں۔

نمازِ عید

۱۷۷۔ عورتوں میں خطبۂ عید :

(جابرؓ) شھدت مع النبیّ صلی اللہ علیہ وسلم العید فبدا بالصلوٰۃ قبل الخطبۃ بلا اذان ولا اقامۃ ثم قام متوکئا علی بلال فامر بتقوی اللہ تعالٰی وحث علی طاعتہ ووعظ الناس وذکرھم ثم مضی

میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نمازِ عید ادا کی ہے۔ آپؐ نے خطبے سے پہلے بلا اذان واقامت نماز ادا فرمائی۔ پھر بلال رضی اللہ عنہ پر ٹیک لگا کر کھڑے رہے اور تقوٰی اللہ کا حکم دیا اور طاعت الٰہی کی ترغیب دی۔ لوگوں کو نصیحت و وعظ کیا۔ پھر عورتوں کی طرف تشریف

حتی اتی النساء فوعظهن وذکرهن۔ (شیخین، ابو داؤد، نسائی)

لے گئے، اور ان کو بھی پند و نصائح فرمائے۔

۱۷۸۔ اگر جمعہ کے دن عید ہو تو جمعہ ضروری نہیں:

(ابو هریرةؓ) رفعه: اجتمع فی یومکم هذا عیدان فمن شاء اجزأه من الجمعة وانا مجمعون (ابو داؤد)

آج دو عیدیں اکٹھی ہو گئی ہیں (یعنی عید بھی اور جمعہ بھی) جو چاہے وہ عید کو جمعے سے چھٹی سمجھ لے۔ ہم تو دونوں ہی ادا کریں گے۔

۱۷۹۔ ہتھیار بند ہو کر عید کے لیے نکلنا:

(ابن عمرؓ) کان النبی صلی الله علیه وسلم یخرج الی العیدین ومعه حربة وترس (اوسط بضعف)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عیدین کے لیے ہتھیار اور ڈھال ساتھ لے کر نکلتے تھے۔

نماز کسوف

۱۸۰۔ چھ رکعتوں میں صرف چار سجدے:

(جابرؓ) انکسفت الشمس یوم مات ابراهیم ابن النبی صلی الله علیه وسلم فقال الناس انما انکسف لموت ابراهیم فقام صلی الله علیه وسلم فصلی بالناس ست رکعات باربع سجدات لیس منها رکعة الا التی قبلها اطول من التی بعدها ورکوعه نحو من سجوده۔ (مسلم، ابو داؤد، نسائی)

جس دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے (حضرت) ابراہیم کی وفات ہوئی، اسی دن سورج گرہن ہوا۔ لوگ یہ کہنے لگے کہ: وفات ابراہیم کی وجہ سے یہ گہن لگا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم (یہ سن کر) کھڑے ہو گئے اور لوگوں کو چار سجدوں کے ساتھ چھ رکعتیں پڑھائیں۔ اس کی ہر پہلی رکعت بعد والی رکعت سے زیادہ لمبی تھی اور رکوع (کا وقفہ) سجدے کے برابر تھا۔

کتاب الزّکاۃ

۱۸۱ - عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ صَاحِبِ ذَهَبٍ وَّلَا فِضَّةٍ لَا یُؤَدِّیْ مِنْهَا حَقَّهَا اِلَّا اِذَا کَانَ یَوْمُ الْقِیٰمَةِ صُفِّحَتْ لَهٗ صَفَائِحَ مِنْ نَّارٍ فَاُحْمِیَ عَلَیْهَا فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ فَیُکْوٰی بِهَا جَنْبُهٗ وَجَبِیْنُهٗ وَظَهْرُهٗ کُلَّمَا رُدَّتْ اُعِیْدَتْ لَهٗ۔ (مسلم)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ جو شخص سونے یا چاندی کے شرعی نصاب کا مالک ہو اور وہ اس کا حق یعنی زکاۃ نہ ادا کرے تو قیامت کے دن اُس کے لیے اس سونے اور چاندی کی سلیں بنائی جائیں گی اور انھیں آگ میں تپایا جائے گا۔ پھر آتشیں سلوں سے اس کے پہلو، پیشانی اور پیٹھ کو داغا جائے گا اور جب وہ ٹھنڈی ہو جائے گی تو پھر دوزخ کی آگ تپا کر داغا جائے گا اور ہمیشہ اسی طرح ہوتا رہے گا۔

۱۸۲ - عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اٰتَاهُ اللّٰهُ مَالًا فَلَمْ یُؤَدِّ زَکٰوتَهٗ مُثِّلَ لَهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ شُجَاعًا اَقْرَعَ لَهٗ زَبِیْبَتَانِ یُطَوَّقُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ثُمَّ یَاْخُذُ بِلِهْزِمَتَیْهِ یَعْنِیْ شِدْقَیْهِ ثُمَّ یَقُوْلُ اَنَا مَالُكَ اَنَا کَنْزُكَ ثُمَّ تَلَا وَلَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ بِمَا اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَیْرًا لَّهُمْ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ سَیُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ۔ (بخاری)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ سرکار اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کو خدائے تعالیٰ نے مال عطا کیا تو اس نے اس کی زکوٰۃ ادا نہیں کی تو اس کے مال کو قیامت کے دن گنجے سانپ کی شکل میں تبدیل کر دیا جائے گا جس کے سر پر دو چتیاں ہوں گی، وہ سانپ اس کے گلے میں طوق بنا کر ڈال دیا جائے گا، پھر وہ سانپ اس کی باچھیں پکڑے گا اور کہے گا کہ میں تیرا مال ہوں، میں تیرا خزانہ ہوں، اس کے بعد حضور نے (پارہ ۴ رکوع ۹ کی) آیت کریمہ تلاوت کی ولا یحسبن الذین الخ یعنی اور جو لوگ بخل کرتے ہیں اس چیز میں جسے خدائے تعالیٰ نے انھیں اپنے فضل سے عطا کی، (تو انجام کار) ہرگز اُسے اپنے لیے اچھا نہ سمجھیں، بلکہ وہ ان کے لیے بُرا ہے۔ عنقریب وہ مال کہ جس میں بخل کیا تھا، قیامت کے دن ان کے گلے کا طوق ہوگا۔

۱۸۳ - عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ أَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ أَنَّ امْرَأَتَيْنِ أَتَتَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَفِيْ أَيْدِيْهِمَا سِوَارَانِ مِنْ ذَهَبٍ فَقَالَ لَهُمَا أَتُؤَدِّيَانِ زَكٰوتَهٗ قَالَتَا لَا فَقَالَ لَهُمَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَتُحِبَّانِ أَنْ يُّسَوِّرَكُمَا اللّٰهُ بِسِوَارَيْنِ مِنْ نَّارٍ قَالَتَا لَا قَالَ فَأَدِّيَا زَكٰوتَهٗ - (ترمذی)

حضرت عمرو بن شعیب رضی اللہ تعالیٰ عنہما اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ دو عورتیں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ اور ان کے ہاتھوں میں سونے کے دو کنگن تھے۔ آپؐ نے ان سے پوچھا کیا تم ان کی زکوٰۃ دیتی ہو؟ انھوں نے عرض کیا نہیں۔ آپؐ نے ان سے فرمایا کیا تم اس بات کو پسند کرتی ہو کہ خدائے تعالےٰ تم کو آگ کے دو کنگن پہنائے۔؟ انھوں نے عرض کیا نہیں۔ آپؐ نے فرمایا تو پھر ان کی زکوٰۃ ادا کرو۔

۱۸۴ - عَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَأْمُرُنَا أَنْ نُّخْرِجَ الصَّدَقَةَ مِنَ الَّذِيْ نُعِدُّ لِلْبَيْعِ - (ابوداؤد)

حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ہم کو حکم فرمایا کرتے تھے کہ ہم تجارت کے لیے تیار کی جانے والی چیزوں کی زکوٰۃ نکالا کریں۔

۱۸۵ - عَنْ مُوْسٰى بْنِ طَلْحَةَ قَالَ عِنْدَنَا كِتَابُ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِنَّمَا أَمَرَهٗ أَنْ يَّأْخُذَ الصَّدَقَةَ مِنَ الْحِنْطَةِ وَالشَّعِيْرِ وَالزَّبِيْبِ وَالتَّمْرِ - (شرح السنۃ - مشکوٰۃ)

حضرت موسیٰ بن طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا، کہ ہمارے پاس حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا وہ خط موجود ہے جسے حضورؐ نے انھیں بھیجا تھا۔ راوی نے کہا کہ حضورؐ نے معاذؓ بن جبل کو حکم فرمایا تھا کہ وہ گیہوں، جَو، انگور اور کھجور کی پیداوار میں (مسلمانوں سے) زکوٰۃ وصول کریں۔

روزہ

۱۸۶ - كُلُّ عَمَلِ ابْنِ اٰدَمَ يُضَاعَفُ الْحَسَنَةُ عَشْرُ أَمْثَالِهَا إِلٰى سَبْعِ مِائَةِ ضِعْفٍ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى إِلَّا الصَّوْمَ فَإِنَّهٗ لِيْ وَأَنَا أَجْزِيْ بِهٖ يَدَعُ شَهْوَتَهٗ وَ

انسان کے ہر عمل کی نیکی (حسب اس کی خوبی کے) اس جیسے دس ۱۰ سے سات سو تک عملوں کی نیکی کے برابر ہوتی ہے۔ خدا فرماتا ہے کہ روزہ میرے واسطے (رکھا جاتا) ہے اور میں اس کا اجر دوں گا۔ انسان میرے ہی (خوش کرنے کے) واسطے

طَعَامَهٗ مِنْ اَجْلِيْ لِلصَّائِمِ فَرْحَتَانِ فَرْحَةٌ عِنْدَ فِطْرِهٖ وَفَرْحَةٌ عِنْدَ لِقَاءِ رَبِّهٖ وَلَخُلُوْفُ فَمِ الصَّائِمِ اَطْيَبُ عِنْدَ اللّٰهِ مِنْ رِيْحِ الْمِسْكِ۔

وَفِيْ رِوَايَةٍ اَلصِّيَامُ جُنَّةٌ فَاِذَا كَانَ يَوْمُ صَوْمِ اَحَدِكُمْ فَلَا يَرْفُثْ وَلَا يَصْخَبْ فَاِنْ شَاتَمَهٗ اَحَدٌ وَّقَاتَلَهٗ فَلْيَقُلْ اِنِّيْ صَائِمٌ اِنِّيْ صَائِمٌ۔ (الستة)

۱۸۷ - مَنْ فَطَّرَ صَائِمًا كَانَ لَهٗ مِثْلُ اَجْرِهٖ غَيْرَ اَنَّهٗ لَا يَنْقُصُ مِنْ اَجْرِ الصَّائِمِ شَيْئًا۔ ۱ (ترمذی)

نفسانی خواہش اور کھانے سے باز رہتا ہے۔ روزے دار کے واسطے دو خوشیاں ہیں۔ ایک روزہ کھولنے کے وقت کی، اور ایک اپنے خدا کو ملنے کے وقت کی۔ روزہ دار کے منہ کی بو (جو روزہ رکھنے سے اکثر پیدا ہو جاتی ہے کہ مسواک عموماً دن میں نہیں کی جاتی) خدا کے نزدیک مشک کی خوشبو سے بہتر ہے۔

اور ایک روایت میں ہے کہ فرمایا روزہ ڈھال ہے۔ پس جب کسی کا روزہ ہو تو نہ وہ عورتوں کے ساتھ صحبت کرنے کا تذکرہ کرے اور نہ غل کرے اور اگر کوئی اسے گالی دے یا اس کے ساتھ لڑائی جھگڑا کرے تو کہہ دے کہ میں روزے سے ہوں (میں نہیں بولونگا جنگ کرو)۔

جو شخص روزہ دار کا روزہ کھلوائے گا، اُسے ایسا ہی اجر ملے گا، جیسے روزہ دار کو۔ مگر یہ اجر علیٰحدہ ہے اور اس کے عطیے سے روزے والے کے اجر میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔

---

۱ اس حدیث کی تعمیل میں جو رسم مسلمانوں میں عام طور پر مروّج ہے۔ وہ یہ ہے کہ رمضان کے مہینے میں صاحبِ توفیق لوگ اس حدیث پر عمل کرنے کی نیت سے یا کبھی ہر دلعزیزی یا نیک شہرت حاصل کرنے کی غرض سے۔ یا ایک دوسرے کی ریس سے مغرب کی نماز یعنی روزہ کھولنے کے وقت کچھ مقدار اچھے کھانے کی یا کچھ پھل، اور اگر گرمی کا موسم ہو تو شربت محلے کی مسجد میں روزہ کھولنے کے واسطے بھیج دیتے ہیں۔ وہاں وہ کھانا یا شربت سب حاضرین میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ اور ایسا اتفاق بھی ہو جاتا ہے کہ بانٹنے والے کی طرف سے ہاتھا پائی تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ اور طرفہ یہ ہے کہ عموماً ہر ایک شخص خواہ تونگر ہو۔ خواہ غریب ہو۔ اُسے اپنی میراث بلکہ غنیمت کا مال سمجھ کر جس قدر زیادہ حصہ میسر ہو سکے یہ لینے کی خواہش و کوشش کرتا ہے۔ گرمی میں شربت کا ایک گلاس تو روزہ دار کو شاید کچھ نہ کچھ آسائش افطار کے وقت دے دے۔ مگر ایک آدھ کھجور یا ایک دو لقمے چاول سے سوائے اس کے کہ شرعی شرط پوری ہو گئی اور روزہ کھل گیا اور کچھ آسائش نہیں ہوتی۔ روزہ داروں میں جن کا روزہ کھلوایا جاتا ہے۔ زیادہ تر تعداد ان لوگوں کی ہوتی ہے جو اپنے گھر سے شربت یا چاول یا کھجور بہت آسانی سے اپنے لیے۔ بلکہ بعض اوروں کے لیے بھی بہم پہنچا سکتے ہیں۔ مگر وہ سب کے سب خیرات کا مال کھا جاتے ہیں اور اس طرح وہ حقیقی مستحقوں کو نہیں پہنچتا۔ روزہ کھلوانے کے معنی فاقہ کش کو پیٹ بھر کر کھانا کھلانا ہے۔ نہ اسے یا بیدرہ بیس تونگر لوگوں کو ایک دانہ کھجور کا یا ایک ایک لقمہ چاولوں کا کھلانا یا ایک ایک گلاس شربت کا پلانا۔ افسوس ہے کہ یہ عمل روزِ روشن میں مسجدوں کے اندر علماء کی عین آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے مگر کوئی توجہ اس پر نہیں ہوتی کہ یہ خیرات اپنے اصل مصرف پر خرچ ہو۔

۱۸۸۔ مَنْ لَمْ يَدَعْ قَوْلَ الزُّوْرِ وَالْعَمَلَ بِهٖ فَلَيْسَ لِلّٰهِ تَعَالٰى حَاجَةٌ فِيْ اَنْ يَّدَعَ طَعَامَهٗ وَشَرَابَهٗ۔

(البخاری، ابوداؤد، والترمذی)

جس (روزہ دار) نے جھوٹ کہنا اور اس پر عمل کرنا نہ چھوڑا (اس کا روزہ ایک فعل عبث ہے کیونکہ) خدا کو اس بات کی کوئی ضرورت نہیں کہ وہ بھوکا پیاسا رہے۔

۱۸۹۔ اُمِّ عُمَارَةَ بِنْتِ كَعْبٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَخَلَ عَلَيْهَا فَقَدَّمَتْ لَهٗ طَعَامًا فَقَالَ لَهَا كُلِيْ فَقَالَتْ اِنِّيْ صَائِمَةٌ فَقَالَ اِنَّ الصَّائِمَ اِذَا اُكِلَ طَعَامُهٗ صَلَّتْ عَلَيْهِ الْمَلٰئِكَةُ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ حَتّٰى يَفْرَغُوْا۔ (الترمذی)

کعبؓ کی بیٹی امِ عمارہ روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے ہاں آئے اور میں نے کھانا پیش کیا۔ فرمایا: تو (بھی) کھا۔ میں نے کہا میں روزے سے ہوں۔ آپؐ نے فرمایا روزے دار کا جب کوئی کھانا کھائے۔ جب تک وہ کھاتا رہے۔ فرشتے اس (روزہ دار) کے واسطے رحمت کی دُعا کرتے رہتے ہیں۔

۱۹۰۔ لَا تَصُوْمُ الْمَرْاَةُ وَبَعْلُهَا شَاهِدٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ۔ الخمسة الا النسائی وَزَادَ اَبُوْدَاؤدَ فِيْ غَيْرِ رَمَضَانَ۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ۔

کوئی عورت اپنے خاوند کی موجودگی میں اس کی اجازت کے بغیر روزہ نہ رکھے۔ اس حدیث کو امام بخاری، امام مسلم اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ابوداؤد نے اس قدر زیادہ کیا ہے کہ روزہ سے مراد رمضان کے روزے کے سوا ہے۔ (واللہ اعلم)

۱۹۱۔ خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَامَ الْفَتْحِ اِلٰى مَكَّةَ فِيْ رَمَضَانَ فَصَامَ حَتّٰى بَلَغَ كُرَاعَ الْغَمِيْمِ فَصَامَ النَّاسُ ثُمَّ دَعَا بِقَدَحٍ مِّنْ مَّآءٍ فَرَفَعَهٗ حَتّٰى نَظَرَ النَّاسُ۔

مکہ کی فتح کے سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکے کی طرف روانہ ہوئے۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ آپؐ کا روزہ تھا۔ کراع الغمیم کے مقام پر پہنچے۔ اور لوگوں کا بھی روزہ تھا۔ آپؐ نے ایک پیالہ پانی کا منگوایا، اُسے اٹھایا۔ جب لوگوں نے پیالے کی طرف دیکھا۔ آپؐ نے پانی پی لیا۔ بعد اس کے آپؐ کے گوش گذار کیا گیا کہ بعض لوگوں کا (ابھی) روزہ ہے۔ فرمایا: وہ گنہگار ہیں — گناہگار ہیں۔

۱۹۲۔ اَنَسٌ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ كُنَّا نُسَافِرُ فِيْ سَفَرٍ مَعَ النَّبِيِّ

انس روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ ایک سفر میں تھے۔ ہم میں سے روزے دار بھی تھے۔

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَمِنَّا الصَّائِمُ وَمِنَّا الْمُفْطِرُ فَنَزَلْنَا مَنْزِلًا فِيْ يَوْمٍ حَارٍّ اَكْثَرُنَا ظِلًّا صَاحِبُ الْكِسَاءِ فَمِنَّا مَنْ يَتَّقِي الشَّمْسَ بِيَدِهٖ فَسَقَطَ الصُّوَّامُ وَقَامَ الْمُفْطِرُوْنَ فَضَرَبُوا الْاَبْنِيَةَ وَسَقَوا الرِّكَابَ فَقَالَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَهَبَ الْمُفْطِرُوْنَ الْيَوْمَ بِالْاَجْرِ۔ (الشیخان والنسائی)

اور بے روزہ بھی۔ ایک دن کہ بہت گرمی تھی۔ ہم منزل پر پہنچے۔ اکثر لوگوں نے جن کے پاس چادر تھی، اپنے اُوپر سایہ کر رکھا تھا۔ بعض نے دھوپ سے بچنے کے لیے سروں پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔ روزے دار تو بیٹھ گئے اور بے روزہ کھڑے ہو گئے۔ اُنھوں نے خیمے لگائے اور سواری کے جانوروں کو پانی پلایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بے روزہ آج کے دن ثواب میں بازی لے گئے۔

۱۹۳۔ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ سَفَرٍ فَرَاٰى رَجُلًا قَدِ اجْتَمَعَ عَلَيْهِ النَّاسُ وَقَدْ ظُلِّلَ عَلَيْهِ فَقَالَ مَا لَهٗ قَالُوْا رَجُلٌ صَائِمٌ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تَصُوْمُوْا فِي السَّفَرِ۔

(الخمسۃ الا الترمذی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک سفر میں تھے۔ ایک آدمی کو دیکھا کہ لوگ اس کے گرد جمع تھے۔ اور اس پر سایہ کر رکھا تھا۔ آپؐ نے پوچھا اسے کیا ہُوا ہے؟ لوگوں نے کہا اس نے روزہ رکھا ہے (اور اس سے بے قرار ہو گیا ہے) آپؐ نے فرمایا یہ کوئی نیکی نہیں کہ تم سفر میں روزہ رکھو۔

۱۹۴۔ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى وَضَعَ شَطْرَ الصَّلٰوةِ عَنِ الْمُسَافِرِ وَاَرْخَصَ لَهٗ فِي الْاِفْطَارِ وَاَرْخَصَ فِيْهِ لِلْمُرْضِعِ وَالْحُبْلٰى اِذَا خَافَتَا عَلٰى وَلَدَيْهِمَا۔

(الترمذی، ابوداؤد، النسائی)

خدا تعالیٰ نے مسافر کے واسطے نماز آدھی کر دی ہے اور اسے روزہ معاف کر دیا ہے اور ایسے ہی دُودھ پلانے والی اور حاملہ عورت کو جب اُنھیں اپنے بچے (کی تکلیف) کا اندیشہ ہو، روزہ معاف کر دیا ہے۔

نمازِ استسقاء

۱۹۵۔ توسّل:

(انسؓ) ان عمر کان اذا قحطوا استسقی

(عہدِ فاروقی میں) جب قحط پڑا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ

بالعباس فقال اللّٰھم انا کنا نتوسل الیک بنبیّك فتسقینا فانا نتوسل الیک بعم نبیّك فاسقنا فیسقون۔ (بخاری)

نے حضرت عباس رضؓ کے وسیلے سے یوں بارش کی دُعا کی کہ: "اے اللہ! ہم پہلے تیرے پیغمبر (علیہ الصّلوٰۃ والسلام) کو تیری بارگاہ میں وسیلہ بناتے تھے اور اب تیرے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے چچا کو تیرے حضور وسیلہ بناتے ہیں لہٰذا بارانِ رحمت نازل فرما" بس بارش ہونے لگی۔

چاشت واستخارہ

۱۹۶۔ "صدقے" کا وسیع مفہوم :

(ابوذرؓ) یصبح علی کل سلامی من احدکم صدقة فکل تسبیحة صدقة وکل تحمیدة صدقة وکل تهلیلة صدقة وکل تکبیرة صدقة وامر بالمعروف صدقة ونهی عن منکر صدقة ویجزئ من ذلك رکعتان یرکعهما من الضحیٰ۔

(مسلم، ابوداؤد)

بعض لوگوں کے ہر ہر جوڑ سے صدقہ ظاہر ہوتا ہے۔ یعنی ہر تسبیح صدقہ ہوتی ہے۔ ہر تحمید اور ہر تہلیل اور ہر تکبیر صدقہ ہوتی ہے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی صدقہ ہے اور چاشت کی دو رکعتیں ادا کر لینا ان سب صدقات کا جامع ہے۔

۱۹۷۔ تین عمل کے خوش گوار نتائج :

(انسؓ) رفعه: ماخاب من استخار ولا ندم من استشار ولا عال من اقتصد۔ (اوسط صغیر)

جو استخارہ (یعنی اللہ سے خیر کی طلب) کرے وہ نامراد نہیں رہتا اور جو مشورہ کر لیا کرے وہ نادم نہیں ہوتا اور جو میانہ روی اختیار کرے وہ محتاج نہیں ہوتا۔

قیام لیل

۱۹۸۔ شب زندہ داری کی برکتیں :

(بلالؓ و ابوامامہؓ) رفعه: علیکم بقیام

قیام لیل (شب زندہ داری) کا التزام رکھو، کیونکہ

اللیل فانه من دأب الصالحین قبلکم وان قیام اللیل قربة الی الله تعالیٰ و منهاة عن الآثام وتکفیر السیّآت ومطردة الداء عن الجسد۔ (ترمذی)

تم سے پہلے کے صالحین کا یہ طریقہ رہا ہے اور قیام لیل قربِ خداوندی کا ذریعہ، گناہوں سے بچاؤ، بُرائیوں کا کفارہ اور جسمانی بیماری دُور کرنے والی چیز ہے۔

۱۹۹ ۔ نمازِ شب کی تاکید :

(جابرؓ) رفعه : لا تدعن صلوٰة اللیل ولو حلب شاة ۔ (اوسط)

رات کی نماز کو نہ چھوڑو اگرچہ بکری دوہنے کی مقدار کے برابر ہی کیوں نہ ہو۔

۲۰۰ ۔ مومن کا عزّ و شرف کس بات میں ہے :

(سهلؓ بن سعد) قال جاء جبریل الی النبیّ صلّی الله علیه وسلم فقال یا محمّد عش ما شئت فانك میت واعمل ما شئت فانك مجزیّ به واحبب من شئت فانك مفارقة واعلموا ان شرف المؤمن قیام اللیل وعزّه استغناءه عن النّاس ۔ (اوسط)

ایک بار جبریل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا کہ : آپؐ جب تک چاہیں زندہ رہیں لیکن آخر ایک دن مرنا ہے اور جو جی چاہے کریں، عمل کی جزا بہرحال ملے گی، جس سے چاہیں آپؐ محبّت کریں، لیکن آخر اس سے آپؐ کو جُدا ہونا ہے ۔ یہ یاد رکھیے کہ مومن کا شرف قیام لیل میں ہے ۔ اور اس کی عزّت لوگوں سے بے نیاز رہنے میں ہے۔

۲۰۱ ۔ طاعت و معصیت کا مقابلہ :

(ابو هریرةؓ) جاء رجل الی النبیّ صلّی الله علیه وسلم فقال ان فلانا یصلی باللیل فاذا اصبح سرق قال سینهاه ما یقول ۔

(احمد، بزار)

حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے پاس ایک شخص آکر کہنے لگا کہ فلاں آدمی شب کو نماز پڑھتا ہے اور دن کو چوری کرتا ہے ۔ فرمایا کہ : اس کا قیام لیل اُسے چوری سے روک دے گا۔

صدقۂ فطر

۲۰۲۔ عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ فَرَضَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ زَکٰوۃَ الْفِطْرِ صَاعًا مِّنْ تَمْرٍ اَوْ صَاعًا مِّنْ شَعِیْرٍ عَلَی الْعَبْدِ وَالْحُرِّ وَالذَّکَرِ وَالْاُنْثٰی وَالصَّغِیْرِ وَالْکَبِیْرِ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ وَاَمَرَ بِھَا اَنْ تُؤَدّٰی قَبْلَ خُرُوْجِ النَّاسِ اِلَی الصَّلٰوۃِ۔ (بخاری، مسلم)

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے کہا کہ رسول کریم علیہ الصلاۃ والسلام نے واجب ٹھہرایا صدقہ فطر کو غلام، آزاد، مرد، عورت، بچے اور بوڑھے ہر مسلمان پر، ایک صاع جَو یا کھجور اور حکم فرمایا کہ نماز (عید) کے لیے نکلنے سے پہلے اس کو ادا کیا جائے۔

۲۰۳۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ فِیْ اٰخِرِ رَمَضَانَ اَخْرِجُوْا صَدَقَۃَ صَوْمِکُمْ فَرَضَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ھٰذِہِ الصَّدَقَۃَ صَاعًا مِنْ تَمْرٍ اَوْ شَعِیْرٍ اَوْ نِصْفَ صَاعٍ مِّنْ قَمْحٍ عَلٰی کُلِّ حُرٍّ اَوْ مَمْلُوْکٍ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی صَغِیْرٍ اَوْ کَبِیْرٍ۔ (ابوداؤد، نسائی)

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے رمضان کے آخر میں لوگوں سے فرمایا کہ تم لوگ اپنے روزوں کا صدقہ ادا کرو۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس صدقہ کو ہر مسلمان پر مقرر فرمایا ہے۔ خواہ وہ آزاد ہو یا غلام، مرد ہو یا عورت، چھوٹا ہو یا بڑا۔ ہر ایک کی طرف سے ایک صاع کھجور یا جَو یا نصف صاع گیہوں۔

۲۰۴۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ فَرَضَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ زَکٰوۃَ الْفِطْرِ طُھْرَ الصِّیَامِ مِنَ اللَّغْوِ وَالرَّفَثِ وَطُعْمَۃً لِّلْمَسَاکِیْنِ۔ (ابوداؤد)

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے کہا کہ: رسول کریم علیہ الصلاۃ والتسلیم نے صدقہ فطر اس لیے مقرر فرمایا کہ تا لغو اور بے ہودہ کلام سے روزہ کی طہارت ہو جائے اور دوسری طرف مساکین کے لیے خوراک ہو جائے۔

۲۰۵۔ عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَیْبٍ عَنْ اَبِیْہِ عَنْ جَدِّہٖ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَعَثَ مُنَادِیًا فِیْ فِجَاجِ مَکَّۃَ اَلَا اِنَّ صَدَقَۃَ الْفِطْرِ وَاجِبَۃٌ

حضرت عمرو بن شعیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے باپ اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے ایک شخص کو بھیجا کہ مکہ شریف کی گلیوں میں اعلان کر دے کہ صدقہ فطر ہر مسلمان پر واجب

عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ ذَکَرًا اَوْ اُنْثٰی حُرٍّ اَوْ عَبْدٍ صَغِیْرًا اَوْ کَبِیْرٍ۔ (ترمذی)

ہے خواہ وہ مرد ہو یا عورت، آزاد ہو یا غلام، نابالغ ہو یا بالغ۔

اہل وعیال کا خرچ، صدقہ کی فضیلت

۲۰۶۔ مَا تَصَدَّقَ اَحَدٌ بِصَدَقَةٍ مِنْ طَیِّبٍ وَلَا یَقْبَلُ اللّٰہُ اِلَّا الطَّیِّبَ اِلَّا اَخَذَھَا الرَّحْمٰنُ بِیَمِیْنِہٖ وَاِنْ کَانَتْ تَمْرَةً فَتَرْبُوْا فِیْ کَفِّ الرَّحْمٰنِ حَتّٰی تَکُوْنَ اَعْظَمَ مِنَ الْجَبَلِ کَمَا یُرَبِّیْ اَحَدُکُمْ فَلُوَّہٗ اَوْ فَصِیْلَہٗ۔ (الستة الا ابا داؤد)

جب کوئی شخص ایک اچھی چیز صدقہ کر دیتا ہے اور خدا تعالےٰ اچھی چیزوں کا ہی صدقہ قبول کرتا ہے تو خدا تعالیٰ اُسے اپنے دائیں ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ خواہ وہ ایک دانہ کھجور ہی ہو۔ جیسے کوئی بچھڑے اور اُونٹ کے بچے کو پالتا ہے۔ وہ کھجور خدا کے ہاتھ میں بڑی ہوتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ پہاڑ سے بڑی ہو جاتی ہے۔

۲۰۷۔ سَبَقَ دِرْھَمٌ مِائَةَ اَلْفِ دِرْھَمٍ قِیْلَ وَکَیْفَ ذٰلِکَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ کَانَ لِرَجُلٍ دِرْھَمَانِ وَتَصَدَّقَ بِاَجْوَدِھِمَا وَانْطَلَقَ اٰخَرُ اِلٰی عُرْضِ مَالِہٖ فَاَخْرَجَ عَنْہُ مِائَةَ اَلْفِ دِرْھَمٍ فَتَصَدَّقَ بِھَا۔ (النسائی)

ایک درہم ایک لاکھ درہم سے سبقت لے گیا۔ لوگوں نے پوچھا یا رسول اللہ یہ کس طرح؟ فرمایا ایک شخص کے پاس (صرف) دو درہم تھے۔ اس نے جو ان میں سے اچھا تھا (یعنی گھسا ہُوا نہ تھا) وہ صدقہ کر دیا۔ ایک اور آدمی اپنے مال کے ایک کونے کی طرف گیا (اور اس میں سے ایک لاکھ درہم نکال کر اس نے صدقہ کر دیا۔ (پس اس صورت میں پہلا ایک درہم پچھلے ایک لاکھ سے سبقت لے گیا)۔

۲۰۸۔ اَنَّ اَعْرَابِیًّا قَالَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ اَخْبِرْنِیْ عَنْ ھِجْرَةٍ فَقَالَ وَیْحَکَ اِنَّ شَانَھَا شَدِیْدٌ فَھَلْ لَکَ مِنْ اِبِلٍ قَالَ نَعَمْ قَالَ فَتُعْطِیْ صَدَقَتَھَا قَالَ نَعَمْ قَالَ فَھَلْ تَمْنَحُ مِنْھَا قَالَ نَعَمْ قَالَ فَتَحْلُبُھَا یَوْمَ وِرْدِھَا قَالَ نَعَمْ قَالَ فَاعْمَلْ مِنْ وَرَاءِ الْبِحَارِ فَاِنَّ اللّٰہَ

ایک اعرابی نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ مجھے ہجرت کے مسئلہ سے آگاہ فرمایئے۔ آپؐ نے فرمایا تیرا بھلا ہو وہ تو بہت دشوار کام ہے۔ کیا تیرے پاس کوئی اُونٹ نہیں؟ عرض کیا۔ ہاں (ہیں) فرمایا کیا تو ان میں سے صدقہ یعنی زکوٰۃ دیتا ہے؟ کہا ہاں (دیتا ہوں) کیا ان کے ذریعہ عطیات بھی کرتا ہے۔ کہا ہاں۔ فرمایا کیا گھاٹ پر جانے کے دن مسکینوں کو دودھ بانٹتا ہے؟ عرض کیا۔

لَنْ يَّتِرَكَ مِنْ عَمَلِكَ شَيْئًا ۔
(الخمسة الا الترمذی)

ہاں رہا کرتا ہوں) فرمایا سمندر کے اس پار میں (اپنے نیک) عمل کئے جا۔ خدا تعالیٰ تیرے عمل میں سے کوئی چیز ضائع نہیں ہونے دے گا۔

۱۶۰۔ اَلصَّدَقَةُ تُطْفِئُ غَضَبَ الرَّبِّ وَتَدْفَعُ مِيْتَةَ السُّوْءِ ۔ (الترمذی)

صدقہ خدا کے غضب کو بجھا دیتا ہے اور بُری طرح کی موت کو ٹال دیتا ہے۔

۱۶۱۔ مَا مِنْ يَّوْمٍ يُصْبِحُ فِيْهِ الْعِبَادُ اِلَّا وَمَلَكَانِ يَنْزِلَانِ مِنَ السَّمَآءِ يَقُوْلُ اَحَدُهُمَا اَللّٰهُمَّ اَعْطِ مُنْفِقًا خَلَفًا وَّيَقُوْلُ الْاٰخَرُ اَللّٰهُمَّ اَعْطِ مُمْسِكًا تَلَفًا ۔ (الشیخان) وَفِىْ اُخْرٰى يَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰى يَا ابْنَ اٰدَمَ اَنْفِقْ اُنْفِقْ عَلَيْكَ ۔ (الشیخان)

ہر روز صبح کو دو فرشتے آسمان سے اُترتے ہیں۔ ایک ان میں سے کہتا ہے۔ اے خدا (نیک کاموں پر) خرچ کرنے والے کو بدلا عطا کر اور دوسرا کہتا ہے اے خدا کنجوس کا مال برباد کر۔ ایک اور روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے ابن آدمؑ تو خرچ کر۔ میں تجھے بہم پہنچائے جاؤں گا۔

۱۶۲۔ دِيْنَارٌ اَنْفَقْتَهٗ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَدِيْنَارٌ اَنْفَقْتَهٗ فِىْ رَقَبَةٍ وَّدِيْنَارٌ تَصَدَّقْتَ بِهٖ عَلٰى مِسْكِيْنٍ وَّدِيْنَارٌ اَنْفَقْتَهٗ عَلٰى اَهْلِكَ اَعْظَمُهَا اَجْرًا الَّذِىْ اَنْفَقْتَهٗ عَلٰى اَهْلِكَ ۔ (مسلم)

ایک دینار کسی نے خدا کی راہ (یعنی جہاد) میں خرچ کیا۔ ایک دینار کسی غلام کو آزاد کرانے میں صرف کیا۔ ایک دینار کسی مسکین کو دیا۔ اور ایک دینار اپنے عیال کے گزارے پر خرچ کیا۔ تو سب سے بڑا اجر اس کا ہے جو اپنے عیال پر صرف کیا۔

۱۶۳۔ لَمَّا خَلَقَ اللّٰهُ الْاَرْضَ جَعَلَتْ تَمِيْدُ وَتَكَفَّأُ فَاَرْسَاهَا بِالْجِبَالِ فَاسْتَقَرَّتْ فَتَعَجَّبَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ مِنْ شِدَّةِ الْجِبَالِ فَقَالَتْ يَا رَبَّنَا هَلْ خَلَقْتَ خَلْقًا اَشَدَّ مِنَ الْجِبَالِ قَالَ نَعَمْ الْحَدِيْدُ فَقَالُوْا هَلْ خَلَقْتَ خَلْقًا اَشَدَّ مِنَ الْحَدِيْدِ قَالَ نَعَمْ النَّارُ فَقَالُوْا فَهَلْ خَلَقْتَ خَلْقًا اَشَدَّ مِنَ النَّارِ قَالَ نَعَمْ الْمَآءُ قَالُوْا فَهَلْ خَلَقْتَ اَشَدَّ مِنَ الْمَآءِ قَالَ نَعَمْ الرِّيْحُ قَالُوْا فَهَلْ خَلَقْتَ اَشَدَّ مِنَ الرِّيْحِ قَالَ نَعَمْ ابْنُ اٰدَمَ اِذَا تَصَدَّقَ

جب خدا نے زمین کو بنایا تو وہ ہلتی اور کانپتی تھی، پس اس پر خدا نے پہاڑ گاڑ دیئے اور وہ قرار پکڑ گئی۔ فرشتے ان پر سلام ہو۔ پہاڑوں کی طاقت سے متعجب ہوئے اور کہا اے خدا کیا کوئی چیز تو نے پہاڑ سے زیادہ طاقتور بھی بنائی ہے؟ فرمایا۔ ہاں۔ لوہا۔ انہوں نے عرض کیا۔ کیا کوئی چیز لوہے سے بھی زیادہ سخت ہے؟ فرمایا۔ ہاں۔ آگ۔ انھوں نے کہا۔ کیا کوئی آگ سے بھی زیادہ سخت ہے؟ فرمایا ہاں۔ پانی۔ عرض کیا کیا کوئی چیز پانی سے بھی زیادہ سخت ہے؟ فرمایا۔ ہاں۔ ہوا۔ کہا کوئی ہوا سے بھی زیادہ سخت ہے؟ فرمایا۔ ہاں۔ انسان جب

بِصَدَقَةٍ بِيَمِيْنِهٖ فَاَخْفَاهَا عَنْ شِمَالِهٖ۔ (ترمذی)

جب اپنے دائیں ہاتھ سے صدقہ دے اور بائیں کو خبر نہ ہونے دے۔

۱۶۴- مَا نَقَصَ مَالٌ مِّنْ صَدَقَةٍ وَّمَا زَادَ اللّٰهُ عَبْدًا بِعَفْوٍ اِلَّا عِزًّا وَّلَا تَوَاضَعَ عَبْدٌ لِلّٰهِ اِلَّا رَفَعَهٗ۔

(مسلم، مالك، والترمذی)

خیرات دینے سے مال کم نہیں ہوتا، اور جو آدمی درگزر کرتا ہے۔ خدا اس کی عزت میں افزونی کرتا ہے، اور جو آدمی محض خدا کی خوشنودی کے لیے تواضع کرتا ہے خدا اس کا رتبہ بڑھاتا ہے۔

۱۶۵- خَيْرُ الصَّدَقَةِ مَا كَانَ عَنْ ظَهْرِ غِنًى وَّابْدَأْ بِمَنْ تَعُوْلُ ۔

(بخاری، ابوداؤد و نسائی)

بہتر صدقہ وہ ہے جو صاحب توفیق دے اور اپنے عیال سے شروع کرے۔

۱۶۶- اَمَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمًا بِالصَّدَقَةِ فَقَالَ رَجُلٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ عِنْدِيْ دِيْنَارٌ قَالَ تَصَدَّقْ بِهٖ عَلٰى نَفْسِكَ قَالَ عِنْدِيْ اٰخَرُ قَالَ تَصَدَّقْ بِهٖ عَلٰى زَوْجِكَ قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ عِنْدِيْ اٰخَرُ قَالَ تَصَدَّقْ بِهٖ عَلٰى خَادِمِكَ قَالَ عِنْدِيْ اٰخَرُ قَالَ اَنْتَ الْبَصِيْرُ بِهٖ۔

(ابو داؤد و نسائی)

ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقے کا حکم دیا۔ ایک شخص نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ میرے پاس ایک دینار ہے۔ آپ نے فرمایا۔ اس کو اپنی جان پر صدقہ کرو (یعنی اپنی ذات پر خرچ کر) اس نے کہا میرے پاس ایک اور بھی ہے۔ فرمایا اس کو اپنی اولاد پر صدقہ کر۔ اس نے عرض کیا۔ میرے پاس ایک اور بھی ہے۔ فرمایا اسے اپنی بیوی پر صدقہ کر۔ پھر کہا میرے پاس ایک اور بھی ہے فرمایا اُسے جہاں تو مناسب سمجھے صرف کر۔

۱۶۷- جَاءَ رَجُلٌ بِمِثْلِ بَيْضَةٍ مِّنْ ذَهَبٍ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَصَبْتُ هٰذَا مِنْ مَّعْدِنٍ فَخُذْهَا فَهِيَ صَدَقَةٌ مَا اَمْلِكُ غَيْرَهَا فَاَعْرَضَ عَنْهُ فَاَتَاهُ مِنْ قِبَلِ رُكْنِهِ الْاَيْمَنِ فَقَالَ مِثْلَ ذٰلِكَ فَاَعْرَضَ عَنْهُ فَاَتَاهُ مِنْ قِبَلِ رُكْنِهِ الْاَيْسَرِ فَقَالَ مِثْلَ ذٰلِكَ فَاَعْرَضَ عَنْهُ ثُمَّ اَتَاهُ مِنْ خَلْفِهٖ فَقَالَ مِثْلَ

ایک شخص ایک انڈا اتنا سونے کا گلا لایا، اور کہا یا رسول اللہ یہ مجھے ایک دکان سے ملا ہے اسے لے لیجئے۔ یہ صدقہ ہے اور میرے پاس یہی کچھ ہے۔ آپ نے اس کی طرف سے رُخ ہٹا لیا۔ وہ داسی طرف (یعنی آپ کے دائیں کو آیا اور اپنی بات دہرائی۔ آپ نے پھر رُخ بدل لیا۔ تب وہ بائیں کو آیا اور وہی کہا جو پہلے کہا تھا۔ آپ نے پھر بھی رُخ ادھر سے ہٹا لیا۔ پھر وہ پیچھے کی طرف سے آیا اور اپنی بات دہرائی۔ رسول اللہ صلی اللہ

ذٰلِكَ فَاَخَذَهَا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَحَذَفَهُ بِهَا فَلَوْ اَصَابَتْهُ لَاَوْجَعَتْهُ وَقَالَ يَاْتِيْ اَحَدُكُمْ بِجَمِيْعِ مَا يَمْلِكُ فَيَقُوْلُ هٰذِهٖ صَدَقَةٌ ثُمَّ يَقْعُدُ يَتَكَفَّفُ النَّاسَ خَيْرُ الصَّدَقَةِ مَا كَانَ عَنْ ظَهْرِ غِنًى ۔ (ابوداؤد)

علیہ وسلم نے وہ ڈلا لے لیا اور اسے ایسا مارا، کہ اگر اسے لگ جاتا تو اُسے درد ہوتا۔ اور فرمایا تم میں سے کوئی اپنا سارا مال لے کر آتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ صدقہ ہے (کیا وہ یہ چاہتا ہے) کہ پھر آپ بیٹھ جائے اور لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلائے بہتر صدقہ وہ ہے، جو مقدور موافق ہو۔

تراویح

۱۶۸ - نفل گھر پر ادا کرنا افضل ہے:

(زید بن ثابت) احتجر النبی صلی اللہ علیہ وسلم حجیرۃ بخصفۃ قال عفان فی المسجد وقال عبد الاعلی فی رمضان فخرج یصلی فیھا فتتبع الیہ رجال وجاءوا یصلون بصلوتہ ثم جاءوا الیہ فحضروا وابطاء فرفعوا اصواتھم وحصبوا الباب فخرج مغضبا فقال مازال بکم صنیعکم حتی ظننت انہ ستکتب علیکم فعلیکم بالصلوۃ فی بیوتکم فان خیر صلوۃ المرء فی بیتہ الا الصلوۃ المکتوبۃ۔

(ابوداؤد، نسائی، شیخین، بلفظھما)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار کمبل کا ایک مختصر سا حجرہ بنا لیا (یعنی بقول عفان مسجد میں اور بقول عبد الاعلیٰ یہ رمضان کا موقع تھا) حضور صلی اللہ علیہ وسلم اسی میں (نفلی) نمازیں ادا فرماتے پھر بہت سے آدمی ادھر ہی رُخ کرنے لگے اور آکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح نماز ادا کرنے لگے، پھر ایسا ہوا کہ لوگ اکٹھے ہوگئے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے باہر آنے میں دیر کر دی۔ لوگ آوازیں بلند کرنے لگے اور دروازہ پیٹنے لگے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم غضب ناک ہو کر باہر آئے اور فرمایا کہ: تمھاری اس مسلسل حرکت سے مجھے اندیشہ ہوتا ہے کہ یہ نماز (تراویح) تم پر کہیں فرض نہ ہو جائے۔ لہٰذا تم یہ نماز اپنے گھروں میں پڑھو کیونکہ آدمی کی بہترین نماز وہی ہے جو گھر پر ادا ہو بجز فرض نمازوں کے۔

۱۶۹ - نماز عشاء کے بعد بے ضرورت گفتگو:

(ابوبرزۃؓ) کان النبی صلی اللہ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم قبل از عشاء سونے سے

علیہ وسلّم ینھی عن النوم قبل العشاء والحدیث بعد ھا۔
(ابوداؤد، ترمذی، شیخین بلفظہ)

اور بعد از عشاء بے کار باتیں کرنے سے منع فرماتے تھے۔

۱۷۰۔ نماز عشاء کے بعد مفید باتیں :

(عمرؓ) کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم یسمر مع ابی بکر فی الامر من امر المسلمین وانا معھما۔ (ترمذی)

حضور صلی اللہ علیہ وسلّم، جناب ابوبکرؓ کے ساتھ اہل اسلام کے معاملات پر شب کو گفتگو فرماتے تھے اور میں بھی ان دونوں بزرگواروں کے ساتھ ہوتا تھا۔

۱۷۱۔ فنا فی اللہ ہونے کا مطلب اور ذریعہ :

(ابوھریرۃؓ) رفعہ: قال اللہ تعالیٰ من عادی لی ولیًا فقد اذنتہ بحرب وما تقرب الیّ عبدی بشئی احب الیّ من اداء ما افترضت علیہ ولا یزال عبدی یتقرب الی بالنوافل حتی احبہ فاذا احببتہ کنت سمعہ الذی یسمع بہ و بصرہ الذی یبصر بہ ویدہ التی یبطش بھا ورجلہ التی یمشی بھا وان سألنی اعطیتہ وان استعاذ بی اعذتہ وما ترددت عن شئی انا فاعلہ ترددی عن نفس المؤمن من یکرہ الموت وانا اکرہ مساءتہ۔
(بخاری)

اللہ تعالیٰ تو کہتا ہے کہ جو میرے کسی دوست سے دشمنی رکھے اس کے جنگ کے چیلنج کو میں قبول کرتا ہوں میرا بندہ جن چیزوں سے میرا تقرب حاصل کرتا ہے ان میں سب سے زیادہ محبوب چیز وہ فرض ہے جو وہ ادا کرتا ہے اور نوافل سے میرا قرب اتنا حاصل کرتا جاتا ہے کہ میں اس سے محبّت کرنے لگتا ہوں اور جب میں اس سے محبّت کر لیتا ہوں میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کا پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔ وہ جو مانگتا ہے وہ اُسے دیتا ہوں میری پناہ چاہتا ہے تو اُسے پناہ میں لے لیتا ہوں اور جو کام مجھے کرنا ہی ہوتا ہے اس میں سب سے زیادہ تامل اس مومن کی جان لینے وقت ہوتا ہے جو کبھی مرنا پسند نہیں کرتا اِدھر اسے موت ناپسند ہوتی ہے اور اُدھر مجھے اس کی ناپسندیدگی ناپسند ہوتی ہے۔

۱۷۱۔ چند افضل عبادات :

(عبد اللہ بن حبشی الخثعمی)
سئل النبی صلی اللہ علیہ وسلم
ای الاعمال افضل؟ قال طول القیام
قال ای الصدقۃ افضل؟ قال جہد
المقل قیل فای الھجرۃ افضل؟
قال من ھجر ما حرم اللہ علیہ
قیل فای الجہاد افضل؟ قال من جاھد
المشرکین بمالہ و نفسہ قال فای
القتل افضل؟ قال من اھریق دمہ
وعقر جوادہ۔
(نسائی، ابو داؤد بلفظہ)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ: بہترین عمل کیا ہے؟ فرمایا: طول قیام۔ پھر پوچھا: افضل ترین صدقہ کیا ہے؟ فرمایا: کم مایہ کی کوشش۔ پھر پوچھا: سب سے بہتر ہجرت کون سی ہے؟ فرمایا: اللہ تعالیٰ کی حرام باتوں کو ترک کر دینا۔ پھر پوچھا: بہترین جہاد کیا ہے؟
فرمایا: مشرکوں کے مقابلے میں اپنے مال و جان کی بازی لگا دینا۔
پھر پوچھا: بہترین قتل کیا ہے؟
فرمایا: یہ کہ مجاہد کا خون بہے اور ساتھ ہی اُس کا تیز رفتار گھوڑا بھی مارا جائے۔

روزہ

۱۷۲۔ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا دَخَلَ رَمَضَانُ فُتِحَتْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَفِیْ رِوَایَۃٍ فُتِحَتْ اَبْوَابُ الْجَنَّۃِ وَغُلِّقَتْ اَبْوَابُ جَھَنَّمَ وَسُلْسِلَتِ الشَّیَاطِیْنُ وَفِیْ رِوَایَۃٍ فُتِحَتْ اَبْوَابُ الرَّحْمَۃِ۔
(بخاری، مسلم)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب ماہِ رمضان شروع ہوتا ہے تو آسمان کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور ایک روایت میں ہے کہ جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور دوزخ کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں اور شیاطین زنجیروں میں جکڑ دیئے جاتے ہیں، اور ایک روایت میں ہے کہ رحمت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔

۱۷۳۔ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ صَامَ رَمَضَانَ اِیْمَانًا وَّاِحْتِسَابًا غُفِرَلَہٗ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص ایمان کے ساتھ ثواب کی اُمید سے روزہ رکھے گا تو اس کے اگلے گناہ بخش دیئے

مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ وَمَنْ قَامَ رَمَضَانَ اِيْمَانًا وَّ اِحْتِسَابًا غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ وَمَنْ قَامَ لَيْلَةَ الْقَدْرِ اِيْمَانًا وَّ اِحْتِسَابًا غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ۔

(بخاری، مسلم)

جائیں گے جو ایمان کے ساتھ ثواب کی نیت سے رمضان کی راتوں میں قیام یعنی عبادت کرے گا تو اُس کے اگلے گناہ بخش دیئے جائیں گے اور جو ایمان کے ساتھ ثواب حاصل کرنے کی غرض سے شب قدر میں قیام کرے گا، اُس کے اگلے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔

۱۷۴۔ عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا كَانَ اَوَّلُ لَيْلَةٍ مِّنْ شَهْرِ رَمَضَانَ صُفِّدَتِ الشَّيَاطِيْنُ وَمَرَدَةُ الْجِنِّ وَغُلِّقَتْ اَبْوَابُ النَّارِ فَلَمْ يُفْتَحْ مِنْهَا بَابٌ وَّفُتِّحَتْ اَبْوَابُ الْجَنَّةِ فَلَمْ يُغْلَقْ مِنْهَا بَابٌ وَّيُنَادِیْ مُنَادٍ يَّا بَاغِیَ الْخَيْرِ اَقْبِلْ وَيَا بَاغِیَ الشَّرِّ اَقْصِرْ وَلِلّٰهِ عُتَقَاءُ مِنَ النَّارِ وَذٰلِكَ كُلَّ لَيْلَةٍ۔

(ترمذی، ابن ماجہ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ جب ماہِ رمضان کی پہلی رات ہوتی ہے تو شیاطین اور سرکش جنّ قید کر لیے جاتے ہیں۔ اور جہنم کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں۔ (پھر رمضان بھر) ان میں سے کوئی دروازہ کھولا نہیں جاتا اور جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں تو ان میں کوئی دروازہ بند نہیں کیا جاتا۔ اور منادی پکارتا ہے کہ اے خیر کے طلب کرنے والے، متوجہ ہو اور اے بُرائی کا ارادہ رکھنے والے! بُرائی سے باز رہ۔ اور اللہ بہت سے لوگوں کو دوزخ سے آزاد کرتا ہے اور ہر رات ایسا ہوتا ہے۔

۱۷۵۔ عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَتَاكُمْ رَمَضَانُ شَهْرٌ مُّبَارَكٌ فَرَضَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ صِيَامَهٗ تُفْتَحُ فِيْهِ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَتُغْلَقُ فِيْهِ اَبْوَابُ الْجَحِيْمِ وَتُغَلُّ فِيْهِ مَرَدَةُ الشَّيَاطِيْنِ لِلّٰهِ فِيْهِ لَيْلَةٌ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ مَنْ حُرِمَ خَيْرَهَا فَقَدْ حُرِمَ۔ (احمد، نسائی، مشکوٰۃ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ رمضان آیا یہ برکت کا مہینہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے روزے تم پر فرض کیے ہیں۔ اس میں آسمان کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور دوزخ کے دروازے بند کر دیئے جاتے اور سرکش شیاطین کو طوق پہنائے جاتے ہیں اور اس میں ایک رات ایسی ہے جو ہزار مہینوں سے افضل ہے۔ جو اس کی برکتوں سے محروم رہا۔ وہ بے شک محروم ہے۔

۱۷۶- عَنْ سَلْمَانَ الْفَارِسِيِّ قَالَ خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ اٰخِرِ يَوْمٍ مِنْ شَعْبَانَ فَقَالَ يَا اَيُّهَا النَّاسُ قَدْ اَظَلَّكُمْ شَهْرٌ عَظِيْمٌ شَهْرٌ مُبَارَكٌ شَهْرٌ فِيْهِ لَيْلَةٌ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ جَعَلَ اللّٰهُ صِيَامَهٗ فَرِيْضَةً وَقِيَامَ لَيْلِهٖ تَطَوُّعًا مَنْ تَقَرَّبَ فِيْهِ بِخَصْلَةٍ مِّنَ الْخَيْرِ كَانَ كَمَنْ اَدّٰى فَرِيْضَةً فِيْمَا سِوَاهُ وَمَنْ اَدّٰى فَرِيْضَةً فِيْهِ كَانَ كَمَنْ اَدّٰى سَبْعِيْنَ فَرِيْضَةً فِيْمَا سِوَاهُ وَهُوَ شَهْرُ الصَّبْرِ وَالصَّبْرُ ثَوَابُهُ الْجَنَّةُ وَشَهْرُ الْمُوَاسَاةِ وَشَهْرٌ يُزَادُ فِيْهِ رِزْقُ الْمُؤْمِنِ مَنْ فَطَّرَ فِيْهِ صَائِمًا كَانَ لَهٗ مَغْفِرَةً لِذُنُوْبِهٖ وَعِتْقَ رَقَبَتِهٖ مِنَ النَّارِ وَكَانَ لَهٗ مِثْلُ اَجْرِهٖ مِنْ غَيْرِ اَنْ يَنْتَقِصَ مِنْ اَجْرِهٖ شَيْءٌ قُلْنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ لَيْسَ كُلُّنَا نَجِدُ مَا نُفَطِّرُ بِهِ الصَّائِمَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُعْطِى اللّٰهُ هٰذَا الثَّوَابَ مَنْ فَطَّرَ صَائِمًا عَلٰى مَذْقَةِ لَبَنٍ اَوْ تَمْرَةٍ اَوْ شَرْبَةٍ مِّنْ مَّاءٍ وَّمَنْ اَشْبَعَ صَائِمًا سَقَاهُ اللّٰهُ مِنْ حَوْضِيْ شَرْبَةً لَا يَظْمَأُ حَتّٰى يَدْخُلَ الْجَنَّةَ وَهُوَ شَهْرٌ اَوَّلُهٗ

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ:

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے شعبان کے آخر میں وعظ فرمایا۔ اے لوگو! تمہارے پاس عظمت والا برکت والا مہینہ آیا۔ وہ مہینہ جس میں ایک رات ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ اس کے روزے اللہ تعالیٰ نے فرض کیے اور اس کی رات میں قیام کرنا (نماز پڑھنا) تطوع یعنی نفل قرار دیا ہے۔ جو اس میں نیکی کا کوئی کام یعنی نفل عبادت کرے تو ایسا ہے جیسے اور دنوں میں فرض ادا کیے۔ یہ صبر کا مہینہ ہے اور صبر کا ثواب جنت ہے اور یہ غم خواری کا مہینہ ہے اور اس مہینہ میں مومن کا رزق بڑھایا جاتا ہے جو اس میں روزہ دار کو افطار کرائے اس کے گناہوں کے لیے مغفرت ہے اور اس کی گردن دوزخ سے آزاد کر دی جائے گی۔ اور اس میں افطار کرانے والے کو ویسا ہی ثواب ملے گا جیسا روزہ رکھنے والے کو ملے گا۔ بغیر اس کے کہ اس کے ثواب میں کچھ کمی واقع ہو۔ ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم میں کا ہر شخص وہ چیز نہیں پاتا جس سے روزہ افطار کرائے۔ حضورؐ نے فرمایا اللہ تعالیٰ یہ ثواب اس شخص کو بھی دے گا، جو ایک گھونٹ دودھ یا ایک کھجور یا ایک گھونٹ پانی سے افطار کرا دے اور جس نے روزہ دار کو پیٹ بھر کر کھانا کھلایا، اس کو اللہ تعالیٰ میرے حوض سے سیراب کرے گا کبھی پیاسا نہ ہو گا۔ یہاں تک کہ جنت میں داخل ہو جائے گا۔ یہ وہ مہینہ ہے کہ اس کا ابتدائی حصہ رحمت ہے اور اس کا درمیانی حصہ مغفرت ہے اور اس کا آخری حصہ جہنم سے آزادی ہے اور جو اپنے غلام پر اس مہینہ میں تخفیف کرے

رَحْمَةٌ وَّ اَوْسَطُهٗ مَغْفِرَةٌ وَّ اٰخِرُهٗ عِتْقٌ مِّنَ النَّارِ وَمَنْ خَفَّفَ عَنْ مَمْلُوْكِهٖ فِيْهِ غَفَرَ اللّٰهُ لَهٗ وَاَعْتَقَهٗ مِنَ النَّارِ۔ (بیہقی)

یعنی کام لینے میں کمی کرے تو اللہ تعالیٰ اسے بخش دے گا۔ اور جہنم سے آزاد فرمائے گا۔

۱۷۷۔ عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ قَالَ يُغْفَرُ لِاُمَّتِهٖ فِیْ اٰخِرِ لَيْلَةٍ فِیْ رَمَضَانَ قِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَهِیَ لَيْلَةُ الْقَدْرِ قَالَ لَا وَلٰكِنَّ الْعَامِلَ اِنَّمَا يُوَفّٰى اَجْرَهٗ اِذَا قَضٰى عَمَلَهٗ۔ (احمد)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا کہ رمضان کی آخری رات میں اس اُمّت کی مغفرت ہوتی ہے عرض کیا گیا کیا وہ شبِ قدر ہے؟ فرمایا نہیں۔ لیکن کام کرنے والوں کو اس وقت مزدوری پوری دی جاتی ہے جب وہ کام پورا کرے۔

۱۷۸۔ عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ لَّمْ يَدَعْ قَوْلَ الزُّوْرِ وَالْعَمَلَ بِهٖ فَلَيْسَ لِلّٰهِ حَاجَةٌ فِیْ اَنْ يَّدَعَ طَعَامَهٗ وَشَرَابَهٗ۔ (بخاری)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے کہا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ جو شخص (روزہ رکھ کر) بُری بات کہنا اور اس پر عمل کرنا ترک نہ کرے تو خدائے تعالےٰ کو اس کی پروا نہیں کہ اس نے کھانا پینا چھوڑ دیا ہے۔

۱۷۹۔ عَنْ سَلَمَةَ بْنِ الْمُحَبَّقِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ كَانَ لَهٗ حَمُوْلَةٌ تَأْوِیْ اِلٰی شِبَعٍ فَلْيَصُمْ رَمَضَانَ حَيْثُ اَدْرَكَهٗ۔ (ابوداؤد)

حضرت سلمہ بن محبق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا حضور علیہ الصلوٰۃ والسّلام نے فرمایا کہ جس شخص کے پاس ایسی سواری ہو جو آرام سے منزل تک پہنچا دے تو اس کو چاہیئے کہ روزہ رکھے جہاں بھی رمضان آجائے۔

۱۸۰۔ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ الْكَعْبِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ وَضَعَ عَنِ الْمُسَافِرِ شَطْرَ الصَّلٰوةِ وَالصَّوْمَ عَنِ الْمُسَافِرِ وَعَنِ الْمُرْضِعِ وَالْحُبْلٰی۔ (ابوداؤد، ترمذی)

حضرت انس بن مالک کعبی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے (شرعی) مسافر سے آدھی نماز معاف فرما دی (یعنی مسافر چار رکعت والی فرض نماز دو پڑھے۔) اور مسافر، دودھ پلانے والی اور حاملہ عورت سے روزہ معاف کر دیا۔ (یعنی ان لوگوں کو جائز ہے کہ اس وقت روزہ نہ رکھیں بعد میں قضا کر لیں)

۱۸۱ ۔ عَنْ اَبِیْ اَیُّوْبَ الْاَنْصَارِیِّ اَنَّہٗ حَدَّثَہٗ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ صَامَ رَمَضَانَ ثُمَّ اَتْبَعَہٗ سِتًّا مِّنْ شَوَّالٍ کَانَ کَصِیَامِ الدَّھْرِ۔ (مسلم)

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ جس نے رمضان کا روزہ رکھا پھر اس کے بعد چھ روزے شوال کے رکھے، تو اس نے گویا ہمیشہ روزہ رکھا۔

۱۸۲ ۔ عَنْ حَفْصَۃَ قَالَتْ اَرْبَعٌ لَمْ تَکُنْ یَدَعُھُنَّ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ صِیَامُ عَاشُوْرَاءَ وَالْعَشْرِ وَثَلٰثَۃِ اَیَّامٍ مِنْ کُلِّ شَھْرٍ وَرَکْعَتَانِ قَبْلَ الْفَجْرِ۔ (نسائی)

حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا کہ چار چیزیں ہیں جنھیں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نہیں چھوڑتے تھے۔ عاشورہ کا روزہ۔ ذی الحجہ کے روزے (ایک سے نو تک) ہر مہینہ کے تین روزے۔ دو رکعتیں فجر کی فرض سے پہلے۔

۱۸۳ ۔ عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَا اَبَا ذَرٍّ اِذَا صُمْتَ مِنَ الشَّھْرِ ثَلٰثَۃَ اَیَّامٍ فَصُمْ ثَلٰثَ عَشَرَۃَ وَخَمْسَ عَشَرَۃَ۔ (ترمذی، نسائی)

حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ اے ابوذر! جب (کسی) مہینہ میں تین دن روزہ رکھنا ہو تو تیرہ ۱۳، چودہ ۱۴ اور پندرہ ۱۵ تاریخ کو (روزہ) رکھو۔

صلۂ رحم!

۱۸۴ ۔ اَلرَّحِمُ مُعَلَّقَۃٌ بِالْعَرْشِ تَقُوْلُ مَنْ وَّصَلَنِیْ وَصَلَہُ اللّٰہُ وَمَنْ قَطَعَنِیْ قَطَعَہُ اللّٰہُ۔ (الشیخان)

رشتہ عرش سے لٹکا ہوا ہے اور کہتا ہے جس نے مجھے جوڑا۔ اسے اللہ جوڑے گا اور جس نے مجھے قطع کیا۔ اُسے اللہ قطع کرے گا۔

۱۸۵ مَنْ سَرَّہٗ اَنْ یَّبْسُطَ اللّٰہُ تَعَالٰی لَہٗ فِیْ رِزْقِہٖ وَاَنْ یَّنْسَاَلَہٗ فِیْ اَثَرِہٖ فَلْیَصِلْ رَحِمَہٗ۔ (البخاری)

جو شخص چاہے کہ اس کا رزق خدا وافر کرے اور اس کی عمر لمبی کرے تو اُسے چاہیئے کہ رشتے داروں سے محبت رکھے۔

۱۸۶ ۔ اَلصَّدَقَۃُ عَلَی الْمِسْکِیْنِ صَدَقَۃٌ وَّعَلٰی ذِی الرَّحِمِ اِثْنَتَانِ صَدَقَۃٌ وَّصِلَۃٌ۔ (النسائی)

مسکین کو صدقہ دینا ایک صدقہ ہے اور قرابتی کو صدقہ دینا دو صدقے ہیں۔ ایک تو اصل صدقہ (کا) اور دوسرا رشتہ داری کی نگہداشت کا (ثواب)

نمازِ جنازہ

۱۸۷۔ غائبانہ نمازِ جنازہ :

(ابن المسیب) ان امّ سعد ماتت و النبی صلّی اللہ علیہ وسلّم غائب۔ فلما قدم صلی علیہا وقد مضی لذلك شهر۔ (ترمذی)

حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی غیر موجودگی میں اُمِ سعدؓ نے انتقال کیا۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لائے تو ان کی نمازِ جنازہ ادا فرمائی، حالانکہ ان کو مرے ہوئے ایک ماہ گزر چکا تھا۔

۱۸۸۔ خودکُش کی نمازِ جنازہ نہ پڑھی جائے :

جابرؓ بن سمرۃ، اتی النبی صلی اللہ علیہ وسلّم برجل قتل نفسہ بمشاقص فلم یصل علیہ (مسلم، ترمذی، نسائی)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص لایا گیا جس نے تیر سے خودکشی کر لی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی۔ (مسئلہ یہ ہے کہ عالم مقتدا کو ایسے جنازے کی نماز نہ پڑھنی چاہیے۔ البتہ عام لوگ ضرور نماز ادا کریں۔ چونکہ آپؐ مقتدا تھے اس لیے آپؐ نے نماز نہیں پڑھی)۔

۱۸۹۔ غیر مسلم کا جنازہ دیکھ کر کھڑے ہونا :

(جابرؓ) مرت جنازۃ فقام لها رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم وقمنا معہ فقلنا یا رسول اللہ انّها یهودیّۃ فقال ان للموت فزعا فاذا رأیتم الجنازۃ فقوموا۔ (شیخین، ابوداؤد)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سے ایک جنازہ گزرا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو گئے اور ہم لوگ بھی کھڑے ہو گئے اور عرض کیا کہ: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! یہ تو یہودیہ کا جنازہ ہے فرمایا کہ: موت ایک دہشت ناک شے ہے۔ لہٰذا جب کوئی جنازہ دیکھو تو کھڑے ہو جاؤ۔

(نوٹ) یہ حکم بعد میں منسوخ ہو گیا۔

۱۹۰ - خونِ شہیداں راز آب اولیٰ ترست :

(ابن عباسؓ) امر رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم بقتلی احد ان ینزع عنھم الحدید والجلود وان یدفنوا بثیابھم و دمائھم (ابو داؤد)

شُہدائے اُحد کے متعلق حضور صلی اللّٰہ علیہ وسلّم نے حکم دیا کہ ان کے ہتھیار اُتار لیے جائیں اور ان کو ان ہی کے کپڑوں میں اور خون کے دھبّوں کے ساتھ دفن کیا جائے ۔

۱۹۱ - ایک کفن میں کئی مُردے :

(انسؓ) .... وقلّت الثیاب وکثرت القتلیٰ فکان الرجل والرجلان والثلاثة یلفّون فی الثوب الواحد ثم یدفنون فی قبر واحد وکان صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم ایھم اکثر قرآنا یقدمه الی القبلة (ابو داؤد، ترمذی)

(غزوۂ احد کے موقعے پر) کپڑے کم اور شہداء زیادہ تھے۔ چنانچہ ایک ایک کپڑے میں نہ فقط ایک ایک بلکہ دو دو اور تین تین شہداء لپیٹے جاتے تھے اور پھر ایک ہی قبر میں دفن کئے جاتے تھے اور جو قرآن سے زیادہ واقف ہوتا۔ اُسے حضور صلی اللّٰہ علیہ وسلم پہلے قبلے کی سمت رکھتے تھے۔

کتابُ الزکوٰۃ

۱۹۲ - جس کا سب کچھ اللہ کے لیے وقف ہو اُس پر زکوٰۃ نہیں :

(ابو ھریرۃؓ) امر رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلّم بصدقة فقیل منع ابن جمیل وخالد ابن الولید والعباس فقال..... اما خالد فانکم تظلمون خالدًا قد احتبس

آنحضرت صلی اللّٰہ علیہ وسلم نے جب صدقے (زکوٰۃ) کا حکم دیا تو کہا گیا کہ : ابن جمیل اور خالد بن ولید اور عباس نے صدقے کو روک رکھا ہے حضور صلی اللّٰہ علیہ وسلم نے فرمایا ...... رہے خالد تو تم لوگ اس سے صدقہ طلب کرکے اس پر ظلم کرتے ہو، اس کے تو

ادراعہ[1] و اعتدہ فی سبیل اللہ والعباس عم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فھی علیہ صدقۃ ومثلھا معھا وفی روایۃ: ھی علیّ ومثلھا معھا۔

(شیخین، ابوداؤد، نسائی)

تو بدن کے کپڑے بھی فی سبیل اللہ وقف ہیں اور خود خالد کو میں (ہمہ تن) فی سبیل اللہ شمار کرتا ہوں اور عباس رضی اللہ عنہ تمہارے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا چچا ہے جس پر دوگنا صدقہ واجب ہے۔ دوسری روایت میں ہے کہ اس کی زکوٰۃ بلکہ اتنی ہی مزید میرے ذمے ہے۔

۱۹۳۔ وقت سے پہلے بھی زکوٰۃ ادا کی جا سکتی ہے:

(علیؓ) ان العباسؓ سأل رسول اللہ علیہ وسلّم فی تعجیل زکوٰتہ قبل ان یحول الحول مسارعۃ الی الخیر فاذن لہ فی ذلک۔ (ابوداؤد، ترمذی)

حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ: خیر کی طرف عجلت کرنے کی غرض سے سال تمام گزرنے سے پہلے ہی زکوٰۃ ادا کر دی جائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں اس کی اجازت دے دی۔

۱۹۴۔ زکوٰۃ وصول کرنے میں آسانی کا حکم:

(عمرانؓ بن حصینؓ) رفعہ: لاجلب[2] ولا جنب[3] ولا شغار فی الاسلام ومن انتھب نھبۃ فلیس منا (نسائی)

اسلام میں نہ جلب ہے نہ جنب اور نہ شغار اور جو لوٹ کھسوٹ کرتا ہے۔ وہ ہماری جماعت سے الگ ہے۔

---

[1] درع کے معنے زرہ کے ہیں جس کی جمع درع، دراع اور ادرُع ہے اور معنی چھوٹی قمیص بھی ہے۔ اس کی جمع ادراع ہے۔ اسی وجہ سے ہم نے اس کا ترجمہ کپڑے کیا ہے۔

[2] جلب کے معنی ہیں مالک مواشی کو اس بات پر مجبور کرنا کہ وہ مُصدِّق (یعنی زکوٰۃ وصول کرنے والے عامل) کے پاس ادائے زکوٰۃ کے لیے اپنے جانور لائے۔ جنب کے معنی ہیں جانوروں کو میدانوں سے چراگاہ کی طرف ہانکا کر لانا تاکہ یہاں آکر زکوٰۃ وصول کرلے۔ ان دونوں باتوں میں مالکِ مواشی کو دِقت و دشواری ہے اس لیے حکم ہے کہ مُصدِّق گھاٹ ہی پر میدانوں میں جاکر مواشی کا اندازہ کرکے اس کے مطابق زکوٰۃ وصول کرے۔ شغار کے معنی ہیں کسی سے یہ طے کرنا کہ ایک لڑکی (خواہ وہ دُختر ہو یا ہمشیرہ یا اور کوئی جس کا یہ ولی ہو) میں تمہارے نکاح میں دیتا ہوں اور اس کے عوض تم ایک لڑکی میرے نکاح میں دے دو اور مہر نہ میں دوں اور نہ تم بلکہ دونوں لڑکیاں ہی گویا ایک دوسری کا مہر بن جائیں۔ اسلام نے عورتوں کی اس حق تلفی کو بھی روک دیا ہے۔

رُویتِ ہلال

۱۹۵ - عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا تَصُوْمُوْا حَتّٰی تَرَوُا الْھِلَالَ وَلَا تُفْطِرُوْا حَتّٰی تَرَوْہُ فَاِنْ غُمَّ عَلَیْکُمْ فَاقْدُرُوْا لَہٗ وَفِیْ رِوَایَۃٍ قَالَ الشَّھْرُ تِسْعٌ وَّعِشْرُوْنَ لَیْلَۃً فَلَا تَصُوْمُوْا حَتّٰی تَرَوْہُ فَاِنْ غُمَّ عَلَیْکُمْ فَاَکْمِلُوا الْعِدَّۃَ ثَلٰثِیْنَ ۔ (بخاری، مسلم)

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے کہا کہ : رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ جب تک چاند نہ دیکھ لو افطار نہ کرو، اور اگر ابر یا غبار ہونے کی وجہ سے چاند نظر نہ آئے تو تیس دن کی مقدار پوری کر لو، اور ایک روایت میں ہے کہ مہینہ کبھی انتیس[۲۹] دن کا ہوتا ہے پس تم جب تک چاند نہ دیکھ لو روزہ نہ رکھو اور اگر تمھارے سامنے ابر یا غبار ہو جائے تو تیس[۳۰] دن کی گنتی پوری کر لو۔

۱۹۶ - عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ صُوْمُوْا لِرُؤْیَتِہٖ وَاَفْطِرُوْا لِرُؤْیَتِہٖ فَاِنْ غُمَّ عَلَیْکُمْ فَاَکْمِلُوْا عِدَّۃَ شَعْبَانَ ثَلٰثِیْنَ ۔ (بخاری، مسلم)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ چاند دیکھ کر افطار کرو اور اگر ابر ہو تو شعبان کی گنتی تیس پوری کر لو۔

نجاست رفع کرنا اور پاک ہونا

۱۹۷ - اِنَّ تَحْتَ کُلِّ شَعْرَۃٍ جَنَابَۃٌ فَاغْسِلُوا الشَّعْرَ وَاَنْقُوا الْبَشَرَۃَ ۔ (ابوداؤد، والترمذی)

ہر ایک بال کے نیچے جنابت (یعنی ہم بستر ہونے) کا اثر ہے (پس اس کے بعد) اپنے بالوں کو دھو ڈالو۔ اور بدن کو صاف کرو۔

۱۹۸ - رَاٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ رَجُلًا یَغْتَسِلُ بِالْبَرَازِ فَصَعِدَ الْمِنْبَرَ فَحَمِدَ اللّٰہَ وَاَثْنٰی عَلَیْہِ ثُمَّ قَالَ اِنَّ اللّٰہَ حَیِیٌّ سِتِّیْرٌ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو ننگے نہاتے ہوئے دیکھا۔ آپ منبر پر چڑھے اور حمد و ثنا کے بعد فرمایا۔ خدا حیادار ہے اور پردے والا ہے اور حیا اور پردے کو پسند کرتا ہے۔ پس جب تم میں سے کوئی نہائے

يُحِبُّ الْحَيَاءَ وَالتَّسَتُّرَ فَإِذَا اغْتَسَلَ أَحَدُكُمْ فَلْيَسْتَتِرْ۔ (ابوداؤد، والنسائی)

تو پردہ کرے۔

۱۹۹۔ مَنْ غَسَلَ الْمَيِّتَ فَلْيَغْتَسِلْ (ابوداؤد والترمذی وزاد) وَمَنْ حَمَلَهُ فَلْيَتَوَضَّأْ۔

جو شخص مُردے کو نہلاتے اُسے چاہیئے کہ بعد میں آپ بھی نہالے اور جو میّت کو اُٹھائے وہ بعد میں وضو ضرور کرے (اور نہائے تو اور اچھا ہے)۔

زکوٰۃ کہاں فرض ہے؟

۲۰۰۔ زیوروں پر زکوٰۃ :

(عمرو بن شعیب) عن ابیہ عن جدہ: ان امرأۃ اتت النبی صلی اللہ علیہ وسلم بابنۃ لہا فی ید ابنتہا مسکتان غلیظتان من ذہب فقال اتعطین زکوٰۃ ہذا؟ قالت لا قال ایسرک ان یسورک اللہ بہما یوم القیمۃ سوارین من نار؟ فخلعتہما فالقتہما الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم وقالت ہما للہ ولرسولہ۔ (اصحاب سنن۔)

ایک عورت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنی بیٹی کو لے کر آئی جس کے ہاتھوں میں بھاری سونے کے کنگن تھے۔ فرمایا کہ: کیا تم اس زیور کی زکوٰۃ ادا کرتی ہو۔؟ عرض کیا: نہیں۔ فرمایا: کیا تجھے اس بات سے خوشی ہوگی کہ اللہ تعالیٰ قیامت میں تجھے ان کے عوض آگ کے دو کنگن پہنا دے۔؟ یہ سن کر اس عورت نے دونوں کنگن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے ڈال دیئے اور یہ کہا: یہ اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لیے ہیں۔

۲۰۱۔ مالِ یتیم کو تجارت میں لگانے کا حکم اور اس کی مصلحت :

(عمرو بن شعیب) عن ابیہ عن جدہ: ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم خطب الناس فقال الا من ولی یتیما لہ مال فلیتجر فیہ ولا یترکہ حتی تأکلہ الصدقۃ۔ (ترمذی)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خطبے میں ارشاد فرمایا کہ: جو کسی یتیم کا ولی ہو، وہ اس کے مال کو تجارت میں لگائے۔ ایسا نہ ہو کہ زکوٰۃ ادا کرتے کرتے وہ مال ہی ختم ہو جائے۔

۲۰۲- ہر مالِ تجارت پر زکوٰۃ ہے:

(سمرۃ بن جندبؓ) ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یأمرنا ان نخرج من الذی نعدہ للبیع (ابو داؤد)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہم لوگوں کو ہر اُس مال کی زکوٰۃ نکالنے کا حکم دیتے تھے جسے ہم مالِ تجارت شمار کرتے تھے۔

۲۰۳- صدقۂ فطر نمازِ عید سے پہلے ادا کرنا چاہیئے:

(ابن عباسؓ) فرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زکوۃ الفطر طھرۃ للصیام من اللغو والرفث وطعمۃ للمساکین من اداھا قبل الصلوۃ فھی زکوٰۃ مقبولۃ ومن اداھا بعد الصلوٰۃ فھی صدقۃ من الصدقات۔ (نسائی)

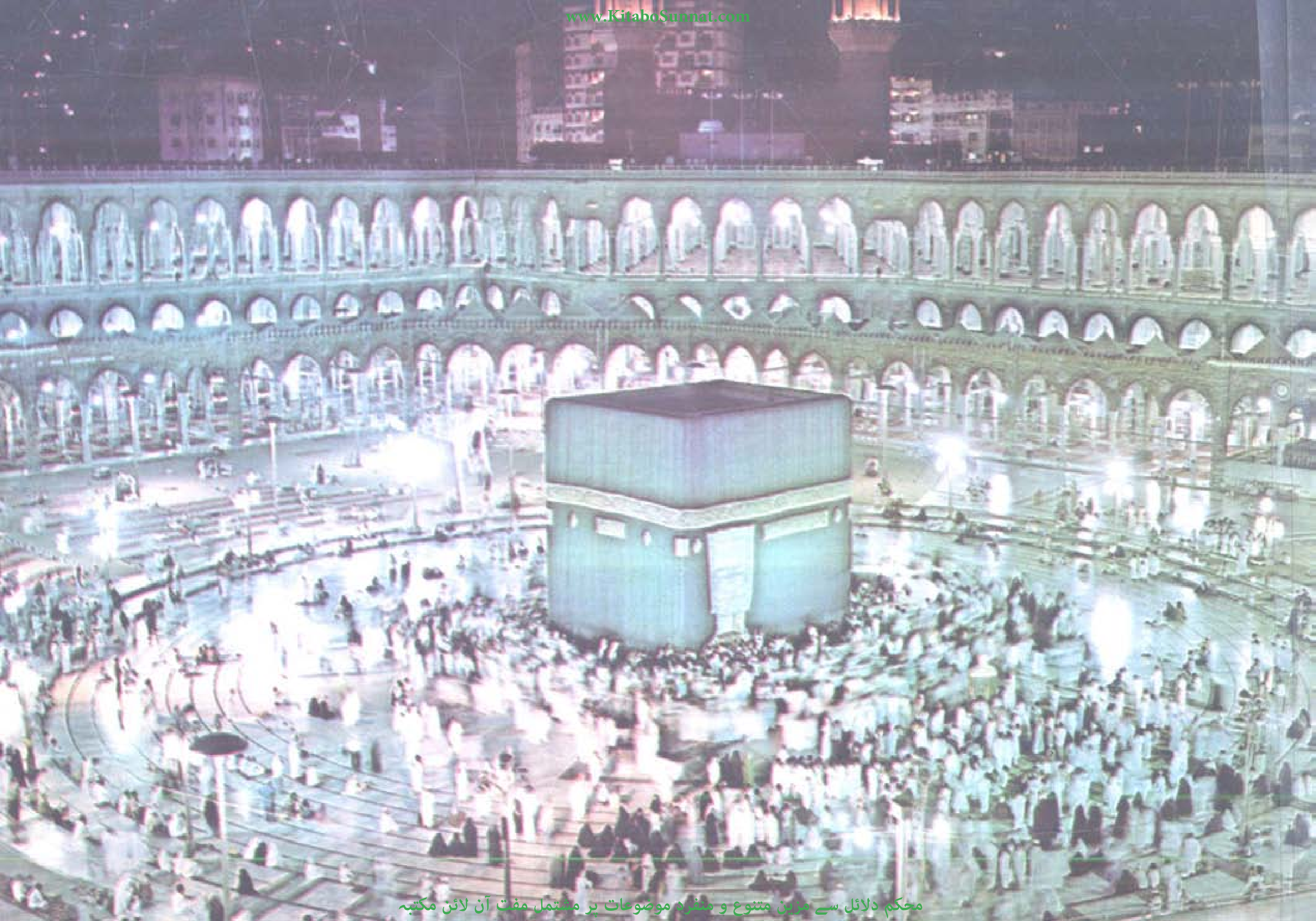
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زکوٰۃ فطر کو اس لیے واجب کیا ہے کہ روزوں میں جو فضول اور بیہودہ باتیں ہو جاتی ہیں۔ ان کے اثر سے یہ پاک کر دیتی ہے اور مساکین کے لیے کھانے کا سہارا ہو جاتی ہے جو اُسے نمازِ عید سے پہلے ادا کرے تو فطرانہ قبول ہوتا ہے اور جو اس کے بعد ادا کرے تو یہ بھی دوسرے صدقات کی طرح ایک صدقہ ہوگا (اگرچہ صدقہ فطر نہ ہوگا)۔

زکوٰۃ کس کو دینا جائز نہیں

۲۰۴- ابنائے ہاشم کے لیے صدقہ جائز نہیں:

(ابو ہریرۃؓ) اخذ الحسن بن علی تمرۃ من تمر الصدقۃ فجعلھا فی فیہ فقال صلی اللہ علیہ وسلم کخ ارم بھا اما علمت انا لا نا کل الصدقۃ۔ (شیخین)

حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما نے ایک بار صدقے کی کھجوروں میں سے ایک کھجور اُٹھا کر اپنے منہ میں ڈال لی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آخ تھو! اسے تھوک دو۔ تمہیں نہیں معلوم کہ ہم (ابنائے ہاشم) صدقہ نہیں کھایا کرتے۔



شبِ قدر

۲۰۵۔ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ دَخَلَ رَمَضَانُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ هٰذَا الشَّهْرَ قَدْ حَضَرَكُمْ وَفِيْهِ لَيْلَةٌ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ مَنْ حُرِمَهَا فَقَدْ حُرِمَ الْخَيْرَ كُلَّهٗ وَلَا يُحْرَمُ خَيْرَهَا اِلَّا كُلُّ مَحْرُوْمٍ۔ (ابن ماجہ)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ جب رمضان کا مہینہ شروع ہوا تو حضور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا کہ یہ مہینہ تم میں آیا ہے اور اس میں ایک رات ایسی ہے جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے تو جو شخص اس کی برکتوں سے محروم رہا وہ تمام بھلائیوں سے محروم رہا اور نہیں محروم رکھا جاتا اس کی بھلائیوں سے مگر وہ جو بالکل بے نصیب ہو۔

۲۰۶۔ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَحَرَّوْا لَيْلَةَ الْقَدْرِ فِى الْوِتْرِ مِنَ الْعَشْرِ الْاَوَاخِرِ مِنْ رَمَضَانَ۔ (بخاری)

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے کہا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ رمضان کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں شب قدر کو تلاش کرو۔

۲۰۷۔ عَنْ عَائِشَةَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَرَاَيْتَ اِنْ عَلِمْتُ اَىَّ لَيْلَةٍ لَيْلَةُ الْقَدْرِ مَا اَقُوْلُ فِيْهَا قَالَ قُوْلِىْ اَللّٰهُمَّ اِنَّكَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّىْ۔ (ترمذی)

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا کہ میں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! اگر مجھ کو شب قدر معلوم ہو جائے تو اس میں کیا کروں؟ آپؐ نے فرمایا کہ یہ دعا پڑھو۔ اَللّٰهُمَّ اِنَّكَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّىْ (یعنی اے اللہ! تو معاف فرمانے والا ہے معاف کرنا تجھے پسند ہے تو مجھے معاف فرما دے)۔

موت!

۲۰۸۔ مَنْ شَهِدَ الْجَنَازَةَ حَتّٰى يُصَلِّىْ عَلَيْهَا فَلَهٗ قِيْرَاطٌ وَمَنْ شَهِدَهَا

جو شخص جنازے کے ہمراہ ہوا، اور اس نے اس کے لیے دعا کی، نماز بھی پڑھی! اس کے

حَتّٰى تُدْفَنَ فَلَهٗ قِيْرَاطَانِ وَقِيْرَاطٌ مِّثْلُ الْاُحُدِ۔ (الخمسۃ)

واسطے ایک قیراط کے برابر ثواب ہے اور جو اس کے دفن کرنے تک ساتھ رہا اُسے دو قیراط کے برابر ثواب ہے اور قیراط گویا احد (پہاڑ) ہے۔

۲۰۹۔ مَنْ شَيَّعَ جَنَازَةً وَحَمَلَهَا ثَلٰثَ مَرَّاتٍ فَقَدْ قَضٰى مَا عَلَيْهِ مِنْ حَقِّهَا۔ (الترمذی)

جو شخص جنازے کے ساتھ گیا، اُسے تین بار کندھا دیا۔ اُس نے جنازے کا حق جس قدر کہ اس پر تھا ادا کر دیا۔

۲۱۰۔ عَنْ ثَوْبَانَ قَالَ خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ جَنَازَةٍ فَرَاٰى نَاسًا رُكْبَانًا فَقَالَ اَلَا تَسْتَحْيُوْنَ اِنَّ مَلٰٓئِكَةَ اللّٰهِ تَعَالٰى عَلٰى اَقْدَامِهِمْ وَاَنْتُمْ عَلٰى ظُهُوْرِ الدَّوَآبِّ۔ ابوداؤد والترمذی وَفِيْ اُخْرٰى۔ اَلرَّاكِبُ يَمْشِيْ خَلْفَ الْجَنَازَةِ وَالْمَاشِيْ كَيْفَ شَآءَ مِنْهَا الترمذی وَفِيْ اُخْرٰى اِتَّبَعَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَنَازَةَ اَبِي الدَّحْدَاحِ مَاشِيًا وَرَجَعَ عَلٰى فَرَسٍ۔ (الخمسۃ الا البخاری)

ثوبان سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک جنازے کے ساتھ ہوئے اور چند آدمیوں کو سوار دیکھا۔ آپؐ نے فرمایا، تم شرم نہیں کرتے کہ خدا کے فرشتے پیدل ہیں اور تم جانوروں کی پیٹھ پر (سوار ہو) اور دوسری روایت میں ہے کہ سوار جنازے کے پیچھے چلے اور پیدل جس طرح چاہے۔ آگے یا پیچھے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابو دحداح کے جنازے کے ساتھ پیدل گئے اور گھوڑے پر واپس آئے۔

۲۱۱۔ اَسْرِعُوْا بِالْجَنَازَةِ فَاِنْ تَكُ صَالِحَةً فَخَيْرٌ تُقَدِّمُوْنَهَا عَلَيْهِ وَاِنْ تَكُ سِوٰى ذٰلِكَ فَشَرٌّ تَضَعُوْنَهٗ عَنْ رِقَابِكُمْ۔ (الستۃ)

جنازے کو جلدی لے جایا کرو۔ کیونکہ اگر وہ نیک ہے تو تم اُسے اگلے جہان کی بہتری جلد تر حاصل کراتے ہو۔ اگر وہ نیک کار نہیں ہے، تو بُرے کو گردن سے اتارتے ہو۔

۲۱۲۔ اِذَا رَاٰى اَحَدُكُمْ جَنَازَةً فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ مَاشِيًا مَعَهَا فَلْيَقُمْ حَتّٰى يُخَلِّفَهَا اَوْ تُخَلِّفَهٗ اَوْ تُوْضَعَ قَبْلَ اَنْ تُخَلِّفَهٗ۔ (الخمسۃ)

جب تم میں سے کوئی جنازہ دیکھے اور اس کے ساتھ نہ چلے۔ تو چاہیئے کہ ٹھیر جائے۔ یہاں تک کہ جنازہ آگے نکل جائے یا وہ خود آگے نکل جائے۔

۲۱۳۔ عن جابرؓ قال لما كان يوم أحد جاءت عمتي بأبي لتدفنه في مقابرنا فنادى منادي رسول الله صلى الله عليه وسلم ردوا القتلى إلى مضاجعهم۔ (الترمذی)

جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ اُحد کی جنگ میں میری پھوپھی میرے باپ کو لائی کہ اُسے اپنی قبروں میں دفن کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منادی نے پکارا کہ مقتولوں کو ان کی قتل گاہ میں واپس پھیر دو۔

۲۱۴۔ أمر رسول الله صلى الله عليه وسلم بقتلى أحد أن ينزع عنهم الحديد والجلود وأن يدفنوا في ثيابهم ودمائهم۔ (ابوداؤد)

جنگِ احد کے مقتولوں کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لوہے اور چمڑے کا سامان ان کے بدن سے اتار کر انھیں کپڑوں سمیت خون آلودہ دفن کر دیا جائے۔

۲۱۵۔ زجر رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم أن يقبر الرجل بالليل حتى يصلى عليه إلا أن يضطر إنسان إلى ذلك وقال إذا كفن أحدكم أخاه فليحسن كفنه۔

(مسلم، ابوداؤد، والنسائی)

(ایک صحابی شام کے وقت یا اس سے پیچھے فوت ہو گیا لوگوں نے اسے ناقص کپڑے کا کفن دے کر رات رہی) کو دفن کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کی خبر ہوئی) آپؐ نے تنبیہ کی کہ رات کے وقت کسی کو دفن نہ کیا جائے۔ مگر مجبوری کی صورت میں۔ پھر بھی نماز پڑھ لی جائے اور فرمایا کہ جب تم اپنے بھائی کو کفن دو تو اچھا کفن دو۔

۲۱۶۔ نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم أن يجصص القبور وأن يبنى عليه وأن يقعد عليه وأن يكتب عليه وأن يوطأ۔

(الخمسۃ الا البخاری)

قبر گچ کرنے اور اس پر عمارت بنانے بیٹھنے اور لکھنے کو۔ اور اُسے پامال کرنے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا۔

۲۱۷۔ مر رسول الله صلى الله عليه وسلم بقبور أهل المدينة فأقبل عليهم بوجهه فقال السلام عليكم يا أهل القبور ويغفر الله لنا ولكم أنتم لنا سلف ونحن بالأثر۔ (الترمذی)

مدینے والوں کی قبروں کے پاس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گذر ہوا۔ آپؐ نے ان کی طرف اپنا رُخ کیا اور کہا اے قبروں والو۔ تم پر امن ہو۔ خدا تمھیں بخشے اور ہمیں بھی۔ تم ہمارے آگے گئے اور ہم پیچھے آئیں گے۔

صدقے کا وسیع مفہوم

۲۱۸ - ردی کھجوروں کا صدقہ:

(عوف بن مالکؓ) خرج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وبیدہ عصا وقد علق رجل قنوحشف فجعل یطعن فی ذلک القنو فقال لو شاء رب ھذہ الصدقۃ تصدق اطیب من ھذا ان رب ھذہ الصدقۃ یاکل حشفا یوم القیٰمۃ (ابوداؤد، نسائی۔)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہاتھ میں لاٹھی لیے ہوئے نکلے، کیا دیکھتے ہیں کہ ایک آدمی نے خرمے کا خشک گچھا غربا کے لیے لٹکا رکھا ہے۔ آپ اس پر لاٹھی مارتے جاتے تھے۔ اور فرماتے جاتے تھے کہ: اگر یہ صدقہ دینے والا چاہتا تو اس سے عمدہ صدقہ دے سکتا تھا۔ یہ صدقہ دینے والا قیامت کے روز خشک خرما ہی کھائے گا۔

اعتکاف

۲۱۹۔ عَنْ عَائِشَةَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالیٰ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ کَانَ یَعْتَکِفُ الْعَشْرَ الْاَوَاخِرَ مِنْ رَمَضَانَ حَتّٰی تَوَفَّاهُ اللّٰهُ۔ (بخاری، مسلم)

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف کیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ (اسی طریقے پر) وصال فرمایا۔

۲۲۰۔ عَنْ اَنَسٍ قَالَ کَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالیٰ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَعْتَکِفُ فِی الْعَشْرِ الْاَوَاخِرِ مِنْ رَمَضَانَ وَلَمْ یَعْتَکِفْ عَامًا فَلَمَّا کَانَ الْعَامُ الْمُقْبِلُ اِعْتَکَفَ عِشْرِیْنَ۔

(ترمذی، ابوداؤد)

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ: حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف فرمایا کرتے تھے اور ایک سال اعتکاف نہیں فرمایا تو دوسرے سال بیس دن اعتکاف فرمایا۔

فضائل نماز، روزہ، زکوٰۃ وغیرہ

۲۲۱۔ لَنْ یَّلِجَ النَّارَ اَحَدٌ صَلّٰی قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا یَعْنِی الْفَجْرَ وَالْعَصْرَ۔ (مسلم، ابو داؤد، والنسائی)

کوئی شخص جس نے سورج نکلنے اور ڈوبنے سے پہلے یعنی فجر اور عصر کی نماز پڑھی آگ میں نہیں دھکیلا جائے گا۔

۲۲۲۔ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی مَنْ عَادٰی لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ اٰذَنْتُهٗ بِحَرْبٍ وَمَا تَقَرَّبَ اِلَیَّ عَبْدِیْ بِشَیْءٍ اَحَبَّ اِلَیَّ مِنْ اَدَاءِ مَا افْتَرَضْتُ عَلَیْهِ۔ وَلَا یَزَالُ عَبْدِیْ یَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰی اُحِبَّهٗ فَاِذَا اَحْبَبْتُهٗ کُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِیْ یَسْمَعُ بِهٖ وَبَصَرَهُ الَّذِیْ یُبْصِرُ بِهٖ وَیَدَهُ الَّتِیْ یَبْطِشُ بِهَا وَرِجْلَهُ الَّتِیْ یَمْشِیْ بِهَا وَاِنْ سَاَلَنِیْ اَعْطَیْتُهٗ وَاِنِ اسْتَعَاذَنِیْ اَعَذْتُهٗ مَا تَرَدَّدْتُ عَنْ شَیْءٍ تَرَدُّدِیْ عَنْ نَفْسِ الْمُؤْمِنِ مَا یَکْرَهُ الْمَوْتَ وَاَنَا اَکْرَهُ مَسَاءَتَهٗ۔

(بخاری)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ جس نے میرے ولی (دوست) کے ساتھ دشمنی کی۔ تو (سمجھو کہ) میں نے اسے لڑائی کا اعلان دے دیا اور میرا بندہ اگر کوئی ایسا کام کرے جس سے وہ محض میرا قرب حاصل کرنے کی غرض رکھتا ہو تو وہ مجھے اُس وقت پیارا لگتا ہے۔ بہ نسبت اس کے کہ وہ کوئی کام کرے (اس خیال سے کہ وہ) میں نے اس پر فرض کر رکھا ہے اور میرا بندہ ہمیشہ نفل عبادت سے میرا تقرب حاصل کرتا ہے۔ یہاں تک کہ میں اُسے پیار کرنے لگ جاتا ہوں۔ پس جب میں اسے پیار کرنے لگ جاتا ہوں تو میں اس کا کان ہو جاتا ہوں کہ وہ اس کے ذریعے سے سُنتا ہے۔ اور اس کی آنکھ بن جاتا ہوں کہ وہ اس سے دیکھتا ہے اور اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں کہ وہ اس سے پکڑتا ہے، اور اس کا پاؤں بن جاتا ہوں کہ وہ اس سے چلتا ہے اور اگر وہ مجھ سے کچھ مانگتا ہے تو میں اُسے دیتا ہوں اور اگر پناہ طلب کرتا ہے تو اُسے پناہ دیتا ہوں اور مجھے کسی چیز میں تردد نہیں ہوتا۔ جیسے مومن کی جان سے۔ وہ موت کو بُرا جانتا ہے اور میں اس کے دل گیر ہونے کو بُرا سمجھتا ہوں۔

۲۲۳۔ یَقُوْلُ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِیْ بِیْ وَاَنَا مَعَهٗ حِیْنَ یَذْکُرُنِیْ فَاِذَا ذَکَرَنِیْ فِیْ نَفْسِهٖ ذَکَرْتُهٗ فِیْ نَفْسِیْ وَاِنْ

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں اپنے بندے کے گمان کے پاس ہوں (جیسا سے میری نسبت ہے) اور میں اس کے ساتھ ہوں جب وہ مجھے یاد کرتا ہے جب دل میں یاد کرتا ہے تو میں بھی اُسے دل ہی دل میں

ذَكَرَنِي فِي مَلَاءٍ ذَكَرْتُهُ فِي مَلَاءٍ خَيْرٍ مِّنْهُمْ فَاِنِ اقْتَرَبَ اِلَيَّ شِبْرًا اِقْتَرَبْتُ اِلَيْهِ ذِرَاعًا وَاِنِ اقْتَرَبَ اِلَيَّ ذِرَاعًا اِقْتَرَبْتُ مِنْهُ بَاعًا وَ اِنْ اَتَانِي مَاشِيًا اَتَيْتُهُ هَرْوَلَةً۔

(الشیخان)

یاد کرتا ہوں جب وہ مجلس میں میرا ذکر کرتا ہے تو میں بھی مجلس میں اس کا ذکر کرتا ہوں، جو اس کی مجلس سے بہتر ہوتی ہے۔ اور اگر وہ بالشت بھر میرے نزدیک آتا ہے تو میں ہاتھ بھر اس کی طرف بڑھتا ہوں اور اگر وہ ہاتھ بھر میرے قریب آتا ہے تو میں قلابچ بھر آگے ہوتا ہوں۔ اور اگر وہ میری طرف چل کر آتا ہے تو میں اُس کی طرف دوڑا آتا ہوں۔

متعلقاتِ صدقہ

۲۲۴۔ متاعِ عزیز کی مثال:

(انسؓ) كان ابوطلحة اكثر انصار بالمدينة مالاً من نخل وكان احب امواله اليه بيرحاء وكانت مستقبلة المسجد وكان يدخلها رسول الله صلى الله عليه وسلم ويشرب من ماء فيها طيب فلما نزل "لن تنالوا البر حتى تنفقوا مما تحبون" قال ابوطلحة يارسول الله ان الله يقول لن تنالوا البر حتى تنفقوا مما تحبون وان احب مالى الى بيرحاء وانها صدقة لله ارجو برها و ذخرها عند الله فضعها حيث اراك الله فقال صلى الله عليه وسلم بخ ذلك مال رابح وقد سمعت

ابوطلحہ رضی اللہ عنہ خرما کے باغات کے لحاظ سے انصار مدینہ میں سب سے زیادہ مالدار تھے۔ لیکن ان کو اموال میں سے بیرحا (ایک میٹھا کنواں) زیادہ عزیز تھا۔ جو مسجد نبوی کے بالکل سامنے تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کے پاس ہو کر گزرتے اور اس کا پانی پیتے جس میں خوش گواری اور مٹھاس ہوتی۔ پھر جب یہ آیت نازل ہوئی: لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون (ترجمہ: تم اس وقت تک پوری نیکی کو نہیں پا سکتے جب تک کہ اپنی عزیز ترین چیزیں اس کی راہ میں خرچ نہ کرو)۔ تو ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے کہا: یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ تعالیٰ یہ فرماتا ہے کہ: اپنی محبوب تر اشیاء اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرو۔ اور یہ باغ مجھے بہت عزیز ہے، اس لیے اس کو میں بطور صدقے کے دیتا ہوں۔ اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو نیکی اور ذخیرۂ آخرت

ما قلت: وانی اری ان تجعلها فی الاقربین فقال ابوطلحة: افعل یا رسول اللہ فقسمها ابوطلحة فی اقاربه وبنی عمه۔
(للستہ)

کا سامان ٹھہرائے گا۔ آپؐ اسے خدا کی مرضی کے مطابق جہاں چاہیں خرچ کریں۔ آپؐ نے فرمایا: خوب! پھر یہ تو آمدنی کا اچھا خاصا ذریعہ ہے۔ میں نے تمھاری تجویز سُن لی میری رائے میں بہتر یہ ہے کہ اسے اپنے اقربا میں تقسیم کر دو۔ ابوطلحہ (رضی اللہ عنہ) نے کہا کہ: یا رسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وسلم) میں ایسا ہی کروں گا۔ چنانچہ اُنھوں نے اپنے اقربا اور بنی عم میں اُسے تقسیم کر دیا۔

۲۲۵۔ شوہر اور سوتیلے یتیم فرزند کو صدقہ دینا:

(زینب امرأة بن مسعود) ...... فخرج علینا بلال فقلنا له ائت رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم فاخبرہ ان امرأتین بالباب تسألانك اتجزئ الصدقة عنهما علی ازواجهما وعلی ایتام فی حجورهما؟ ولا تخبرہ من نحن فسأله بلال فقال له رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم من هما؟ فقال امرأة من الانصار وزینب فقال له ای الزیانب؟ قال امرأة عبد اللہ فقال لهما اجران اجر القرابة واجر الصدقة
(شیخین، نسائی)

.... اتنے میں بلال رضی اللہ عنہ ہماری طرف آنکلے۔ ہم نے کہا کہ: آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جائیے اور اُن سے کہیے کہ دو عورتیں دروازے پر کھڑی ہوئی یہ پوچھ رہی ہیں کہ اگر وہ اپنے غریب شوہروں پر بطور صدقے کے کچھ خرچ کریں، یا ان یتیم بچوں پر خرچ کریں جو اُن کی گود میں پل رہے ہیں تو کیا یہ صدقہ صحیح ہوگا؟ لیکن یہ نہ بتانا کہ ہم کون ہیں۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھ ہی لیا کہ: یہ دو عورتیں کون ہیں؟ بلال رضی اللہ عنہ نے کہا: ایک تو ان میں انصاریہ ہے اور دوسری زینبؓ ہے۔ آپؐ نے دریافت فرمایا: کونسی زینب؟ بلال رضؓ نے جواب میں کہا: عبد اللہ کی بیوی۔ آپؐ نے فرمایا: ان کو دہرا اجر ملے گا، ایک قرابت کا ایک صدقے کا۔

۲۲۶۔ شوہر کے مال میں سے صدقہ کرنا:

(اسماءؓ) قلت یا رسول اللہ مالی مال

میں نے عرض کی: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میرا مال

اما ادخل علیّ الزبیر فاتصدق ؟ قال تصدقی ولا توعی فیوعی اللہ علیک (للسنۃ الاسالکا)

تو وہی ہے جو مجھے زبیرؓ نے دیا، کیا میں اس میں سے بطور خیرات کسی کو دے سکتی ہوں ؟ فرمایا: کیوں نہیں! دو۔ مال کو بند کر کے نہ رکھو۔ مبادا خدا بھی اس کے دروازوں کو تم پر بند کر دے۔

اعمال اور اقوال کے فضائل متفرق حدیثیں

۲۲۷۔ مَنْ اَصْبَحَ الْیَوْمَ مِنْکُمْ صَائِمًا قَالَ اَبُوْبَکْرٍؓ اَنَا قَالَ فَمَنْ تَبِعَ الْیَوْمَ مِنْکُمْ جَنَازَۃً قَالَ اَبُوْبَکْرٍؓ اَنَا قَالَ فَمَنْ اَطْعَمَ مِنْکُمُ الْیَوْمَ مِسْکِیْنًا قَالَ اَبُوْبَکْرٍؓ اَنَا قَالَ فَمَنْ عَادَ مِنْکُمُ الْیَوْمَ مَرِیْضًا قَالَ اَبُوْبَکْرٍؓ اَنَا قَالَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَا اجْتَمَعْنَ فِیْ رَجُلٍ اِلَّا دَخَلَ الْجَنَّۃَ۔ (مسلم)

تم میں سے آج کس نے روزہ رکھا ؟ ابوبکر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے عرض کیا۔ میں نے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آج جنازے کے ساتھ تم میں سے کون گیا ہے ؟ ابوبکرؓ نے عرض کیا۔ میں (گیا تھا) پھر فرمایا آج تم میں سے مسکین کو کھانا کس نے کھلایا ہے ؟ ابوبکرؓ نے کہا۔ (یا رسول اللہ) میں نے (کھلایا ہے) آج تم میں سے مریض کی بیمار پرسی کس نے کی ہے ؟ ابوبکرؓ نے عرض کیا (حضرت) میں نے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (جس شخص میں یہ خوبیاں ایک ہی دن میں) جمع ہوں۔ سوائے اس کے (اس کا اجر) نہیں کہ وہ جنت میں داخل ہو۔

۲۲۸۔ قَالُوْا یَارَسُوْلَ اللّٰہِ ذَھَبَ اَھْلُ الدُّثُوْرِ بِالْاُجُوْرِ یُصَلُّوْنَ کَمَا نُصَلِّیْ وَیَصُوْمُوْنَ کَمَا نَصُوْمُ وَیَتَصَدَّقُوْنَ بِفُضُوْلِ اَمْوَالِھِمْ قَالَ اَوَلَیْسَ قَدْ جَعَلَ اللّٰہُ لَکُمْ مَا تَتَصَدَّقُوْنَ بِہٖ اِنَّ بِکُلِّ تَسْبِیْحَۃٍ صَدَقَۃً وَّبِکُلِّ تَکْبِیْرَۃٍ صَدَقَۃٌ وَّبِکُلِّ تَحْمِیْدَۃٍ صَدَقَۃٌ وَّبِکُلِّ تَھْلِیْلَۃٍ صَدَقَۃٌ وَّاَمْرٌ بِالْمَعْرُوْفِ صَدَقَۃٌ وَّنَھْیٌ

بعض لوگوں نے کہا یا رسول اللہ دولت مند ثواب (لوٹ) لے گئے۔ وہ نماز پڑھتے ہیں جیسے ہم پڑھتے ہیں اور روزہ رکھتے ہیں جیسے ہم رکھتے ہیں اور اپنے فالتو مال میں سے صدقہ دیتے ہیں (وہ علاوہ)۔ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے) فرمایا۔ کیا تمھارے لیے خدا نے کوئی چیز میسر نہیں کی، جسے تم صدقہ کرو ؟ بے شک ہر ایک دفعہ تسبیح (سُبْحَانَ اللّٰہِ) پڑھنا صدقہ ہے اور ہر ایک بار (اَللّٰہُ اَکْبَرُ) کہنا صدقہ ہے اور ہر ایک بار حمد (اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ) پڑھنا صدقہ ہے اور ہر ایک بار خدا کی وحدانیت کا (لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہہ کر)

عَنْ مُّنْكَرٍ صَدَقَةٌ وَّفِيْ بُضْعِ اَحَدِكُمْ صَدَقَةٌ۔ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَيَاْتِيْ اَحَدُنَا شَهْوَتَهٗ وَيَكُوْنُ لَهٗ فِيْهَا اَجْرٌ قَالَ اَرَءَيْتُمْ لَوْ وَضَعَهَا فِيْ حَرَامٍ اَكَانَ عَلَيْهِ وِزْرٌ قَالُوْا نَعَمْ قَالَ كَذٰلِكَ اِذَا وَضَعَهَا فِي الْحَلَالِ كَانَ لَهٗ اَجْرٌ۔ (مسلم والترمذی) وَفِيْ رِوَايَةٍ تَبَسُّمُكَ فِيْ وَجْهِ اَخِيْكَ لَكَ صَدَقَةٌ وَاِرْشَادُ الرَّجُلِ الطَّرِيْقَ لَكَ صَدَقَةٌ وَاِمَاطَتُكَ الْحَجَرَ وَالشَّوْكَ وَالْعَظْمَ عَنِ الطَّرِيْقِ لَكَ صَدَقَةٌ وَاِفْرَاغُكَ مِنْ دَلْوِكَ فِيْ دَلْوِ اَخِيْكَ لَكَ صَدَقَةٌ۔

اقرار کرنا صدقہ ہے اور نیک کام کے لیے رہنمائی کرنا صدقہ ہے اور بُرے کام سے منع کرنا صدقہ ہے اور (اپنی بیوی سے) ہمبستر ہونا صدقہ ہے۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ اگر کوئی اپنی نفسانی ہوس کو پورا کرے تو وہ اُس کے لیے (کیونکر اجر کا موجب) ہو جاتا ہے؟ فرمایا تم دیکھتے نہیں۔ اگر وہ حرام کاری کرے تو اس پر اس کا عذاب ہوتا ہے۔ صحابہ نے کہا۔ بے شک۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ پس اگر اس نے حلال کارروائی کی۔ تو اس کے لیے وہ اجر کا موجب ہوئی۔ اور ایک روایت میں ہے کہ اپنے بھائی سے ہنس کر بولنا صدقہ ہے اور کسی کو راستہ بتانا صدقہ ہے اور رستے میں سے (اینٹ) پتھر، کانٹا اور ہڈی کو ہٹا دینا صدقہ ہے اور اپنے ڈول سے اپنے بھائی کے ڈول میں پانی ڈالنا صدقہ ہے۔

فتنہ و اختلاف وغیرہ

۲۲۹۔ اَلْعِبَادَةُ فِي الْهَرْجِ كَهِجْرَةٍ اِلَيَّ۔ (مسلم والترمذی)

فتنے اور اختلاف کے وقت عبادت کرنا ایسا ہے جیسے میری طرف ہجرت کرنا۔

۲۳۰۔ اِنَّ السَّعِيْدَ مَنْ جُنِّبَ الْفِتَنَ وَلَمَنِ ابْتُلِيَ فَصَبَرَ فَوَاهًا۔ (ابوداؤد)

نیک بخت وہ شخص ہے جو فتنے سے الگ رہے۔ اور جب مصیبت میں گرفتار آئے تو صبر کرے۔ واہ واہ۔

تلاوتِ قرآن مجید

۲۳۱۔ عَنْ عُثْمَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ

حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ حضور صلعم

صَلَّى اللهُ تَعَالَى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ ۔

(بخاری)

علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ تم میں بہترین شخص وہ ہے جس نے قرآن کو سیکھا اور دوسروں کو سکھایا۔

۲۳۲۔ عَنْ مَعَاذٍ الْجُهَنِيِّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالَى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ قَرَأَ الْقُرْآنَ وَعَمِلَ بِمَا فِيهِ أُلْبِسَ وَالِدَاهُ تَاجًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ ضَوْءُهُ أَحْسَنُ مِنْ ضَوْءِ الشَّمْسِ فِي بُيُوتِ الدُّنْيَا لَوْ كَانَتْ فِيكُمْ فَمَا ظَنُّكُمْ بِالَّذِي عَمِلَ بِهٰذَا ۔ (احمد)

حضرت معاذ جہنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ جو شخص قرآن کو پڑھے اور اس پر عمل کرے تو قیامت کے دن اس کے ماں اور باپ کو ایسا تاج پہنایا جائے گا کہ اس کی روشنی دنیا کے سورج کی روشنی سے بڑھ کر ہوگی جب کہ سورج کو اتنا قریب فرض کر لیا جائے کہ گویا تمھارے گھروں میں اُتر آیا ہے۔ پھر تم سمجھ سکتے ہو کہ جب ماں باپ کا یہ مرتبہ ہوگا تو اس شخص کا کیا درجہ ہوگا جس نے قرآن کریم پر عمل کیا۔

۲۳۳۔ عَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالَى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ قَرَأَ حَرْفًا مِنْ كِتَابِ اللهِ فَلَهُ بِهِ حَسَنَةٌ وَالْحَسَنَةُ بِعَشْرِ أَمْثَالِهَا لَا أَقُولُ الٓمٓ حَرْفٌ أَلِفٌ حَرْفٌ وَلَامٌ حَرْفٌ وَمِيمٌ حَرْفٌ ۔

(ترمذی، دارمی)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ جو شخص کتاب اللہ میں سے ایک حرف پڑھے تو اس کو ایک حرف کے بدلے ایک نیکی ملے گی اور ہر نیکی دس نیکیوں کے برابر ہوگی۔ میں الٓمٓ کو ایک حرف نہیں کہتا۔ بلکہ الف ایک حرف ہے اور لام ایک حرف ہے۔ اور میم ایک حرف ہے۔

۲۳۴۔ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالَى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِأُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ كَيْفَ تَقْرَأُ فِي الصَّلَاةِ فَقَرَأَ أُمَّ الْقُرْآنِ فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالَى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ مَا أُنْزِلَتْ فِي التَّوْرَاةِ وَلَا فِي الْإِنْجِيلِ وَلَا فِي الزَّبُورِ وَلَا فِي الْقُرْآنِ مِثْلُهَا ۔

(ترمذی)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ رسول کریم علیہ الصلوٰۃ نے حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے دریافت فرمایا کہ تم نماز میں کیا پڑھتے ہو تو انھوں نے سورۂ فاتحہ کی تلاوت کی تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے کہ تورات، انجیل اور زبور (یہاں تک کہ) قرآن میں اس کے مثل (کوئی دوسری سورت) نہیں نازل ہوئی۔

۲۳۵۔ عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ لِکُلِّ شَیْءٍ قَلْبًا وَقَلْبُ الْقُرْاٰنِ یٰسٓ وَمَنْ قَرَأَ یٰسٓ کَتَبَ اللّٰہُ لَہٗ بِقِرَاءَ تِہَا قِرَاءَۃَ الْقُرْاٰنِ عَشَرَ مَرَّاتٍ۔ (ترمذی، دارمی)

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ ہر چیز کا دل ہے اور قرآن کا دل سورۂ یٰسین ہے پس جو شخص سورۂ یٰسٓ کو پڑھے اس کے لیے دس قرآن پڑھنے کا ثواب لکھا جاتا ہے۔

۲۳۶ عَنْ عَطَاءِ بْنِ رِبَاحٍ قَالَ بَلَغَنِیْ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ قَرَأَ یٰسٓ فِیْ صَدْرِ النَّہَارِ قُضِیَتْ حَوَائِجُہٗ۔ (دارمی)

حضرت عطاء بن رباح رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ مجھ کو معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا دن کے شروع حصہ میں جو شخص سورۂ یٰسٓ کو پڑھے تو اس کی حاجتیں پوری کردی جاتی ہیں۔

۲۳۷۔ عَنْ عَلِیٍّ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ لِکُلِّ شَیْءٍ عُرُوْسٌ وَ عُرُوْسُ الْقُرْاٰنِ الرَّحْمٰنُ۔ (بیہقی)

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ میں نے حضور علیہ الصلاۃ والسلام کو یہ فرماتے ہوئے سُنا کہ ہر چیز کی ایک زینت ہے اور قرآن پاک کی زینت سورۂ رحمٰن ہے۔

۲۳۸۔ عَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَیَعْجِزُ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّقْرَأَ فِیْ لَیْلَۃٍ ثُلُثَ الْقُرْاٰنِ قَالُوْا وَکَیْفَ یَقْرَأُ ثُلُثَ الْقُرْاٰنِ قَالَ قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ یَعْدِلُ ثُلُثَ الْقُرْاٰنِ۔ (مسلم بخاری عن ابی سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

حضرت ابو درداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص رات کے وقت تہائی قرآن نہیں پڑھ سکتا۔ صحابہ رضی نے عرض کیا یا رسول اللہ! تہائی قرآن کیسے پڑھا جائے؟ آپ نے فرمایا (پوری سورہ) قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ تہائی قرآن کے برابر ہے۔

۲۳۹۔ عَنْ اَبِیْ مُوْسَی الْاَشْعَرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ تَعَاھَدُوا الْقُرْاٰنَ فَوَ الَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَھُوَ اَشَدُّ تَفَصِّیًا مِنَ الْاِبِلِ فِیْ عُقُلِہَا۔ (بخاری، مسلم)

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا، کہ رسول کریم علیہ الصلاۃ والتسلیم نے فرمایا کہ قرآن کے ساتھ اعتناء کرو۔ قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے اپنی رسی سے اونٹ نکل جانے کی بہ نسبت قرآن سینہ سے جلد نکل جاتا ہے۔

۲۴۰ - عَنْ سَعِيدِ بْنِ عُبَادَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالَى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ اِمْرِیءٍ يَقْرَأُ الْقُرْاٰنَ ثُمَّ يَنْسَاهُ اِلَّا لَقِيَ اللهَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اَجْذَمَ۔ (ابوداؤد، دارمی)

حضرت سعید بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہانے کہا کہ حضور علیہ الصلاۃ والسلام نے فرمایا کہ جو شخص قرآن مجید پڑھے اور پھر اس کو بھول جائے۔ وہ قیامت کے دن خدا سے اس حال میں ملے گا کہ اس کے اعضا جذام کے سبب گل گئے ہوں گے۔

کتابُ الصَّوم

فضائِلِ صوم

۲۴۱ - صوم کا لاانتہا اجر اور اُس کی فرحتیں :

(ابوھریرۃؓ) رفعہ : کل عمل ابن آدم یضاعف الحسنۃ عشر امثالھا الی سبعمائۃ ضعف قال اللہ تعالیٰ الا الصوم فانہ لی وانا اجزی بہ یدع شھوتہ وطعامہ من اجلی للصائم فرحتان فرحۃ عند فطرہ وفرحۃ عند لقاء ربہ ولخلوف فیہ اطیب عند اللہ من ریح المسک۔ (للستۃ)

ابن آدم کی ہر ہر نیکی دس گنا بڑھا دی جاتی ہے اور سات سو گنے تک اضافہ جاری رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا کہنا ہے کہ اس کلیے سے روزہ مستثنیٰ ہے۔ کیونکہ یہ خالص میرے لیے ہوتا ہے اور میں ہی اس کا صلہ دیتا ہوں، کیونکہ روزے دار محض میری خاطر اپنی خواہشات کو ترک کرتا ہے، کھانا پینا چھوڑتا ہے۔ روزے دار کے لیے دو فرحتیں ہیں، ایک جب وہ روزہ افطار کرتا ہے اور ایک سے اس وقت بہرہ مند ہوگا۔ جب اپنے رب کے حضور پیش ہوگا، اور اس کے منہ کی بُو، اللہ کے نزدیک مشک سے بھی زیادہ پاکیزہ ہے۔

۲۴۲ - صوم سپر بھی ہے بشرطیکہ شگاف نہ ڈالا جائے :

(ابوعبیدہؓ) رفعہ : الصوم جُنَّۃٌ مَالَمْ یَخْرِقْھَا وَزَادَ فِی الاوسط قیل بِمَ یخرقھا؟ قال بکذب اوغیبۃ۔

روزہ اُس وقت تک سپر ہے جب تک کہ کوئی اس میں شگاف نہ پیدا کرے (اوسط میں اس کے بعد ہے کہ) دریافت کیا گیا۔ اس میں شگاف کیسے پڑتا ہے: فرمایا، جھوٹ اور غیبت سے۔

۲۴۳ - باب الریّان :

(سہل بن سعدؓ) رفعہ : فی الجنۃ باب یدعی الریان یدعی لہ الصائمون فمن کان من الصائمین دخلہ ومن دخلہ لم یظمأ ابداً۔ (شیخین)

جنت میں ایک دروازہ ہے ، جس کا نام باب الریّان (ریان کے معنی سیراب) ہے ۔ اس سے صرف روزے دار ہی بلائے جائیں گے ۔ جو روزے دار ہوگا وہی اس دروازے سے داخل ہوگا اور جو اس میں داخل ہوگا اُسے کبھی تشنگی نہ ہوگی

۲۴۴ - روزہ کھلوانے کا اجر :

(ابوہریرہؓ) رفعہ : من فطّر صائماً کان لہ مثل اجرہ غیر انہ لا ینقص من اجر الصائم شیئاً ۔ (ترمذی)

جو کسی صائم کا روزہ کھلوائے گا اس کے لیے روزے ہی جیسا اجر ہوگا اور روزے دار (جس کا روزہ کھلوایا ہے) کے اجر میں کوئی کمی نہ آئے گی ۔

۲۴۵ - روزہ جسم کی زکوٰۃ ہے اور نصف صبر :

(ابوہریرہؓ) لکل شئی زکوٰۃ وزکوٰۃ الجسد الصوم والصیام نصف الصبر (قزوینی)

ہر شے کی زکوٰۃ ہوتی ہے اور جسم کی زکوٰۃ روزہ ہے اور روزے نصف صبر ہیں ۔

۲۴۶ - طاعم شاکر اور صائم صابر یکساں ہیں :

(سنانؓ بن سنۃ الاسلمی) رفعہ : الطاعم الشاکر لہ مثل اجر الصائم الصابر۔ (قزوینی)

کھا کر شکر کرنے والا بھی ایسا ہی ہے جیسے روزہ رکھ کر صبر کرنے والا ۔

مساجد

۲۴۷ - من بَنٰی مَسْجِدًا یَبْتَغِیْ بِہٖ وَجْہَ اللّٰہِ تَعَالٰی بَنَی اللّٰہُ تَعَالٰی لَہٗ بَیْتًا فِی الْجَنَّۃِ ۔ (شیخان وترمذی)

جس نے مسجد تعمیر کی اس غرض سے کہ اللہ کی خوشنودی حاصل کرے اس کے واسطے اللہ تعالیٰ جنت میں گھر بنا دیتا ہے ۔

۲۴۸۔ عُرِضَتْ عَلَيَّ اُجُوْرُ اُمَّتِيْ حَتّٰى الْقَذَاةُ يُخْرِجُهَا الرَّجُلُ مِنَ الْمَسْجِدِ۔ (ابوداؤد والترمذی)

میری اُمت کے ثواب مجھے دکھائے گئے۔ ان میں سے خس و خاشاک (کا) بھی تھا۔ جو آدمی مسجد سے نکالتا ہے۔

ہبہ و وصیّت!

۲۴۹۔ قِيْلَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ اَيُّ الصَّدَقَةِ اَفْضَلُ قَالَ اَنْ تَصَدَّقَ وَاَنْتَ صَحِيْحٌ شَحِيْحٌ تَاْمَلُ الْغِنٰى وَتَخْشَى الْفَقْرَ وَلَا تَدَعْ حَتّٰى اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ قُلْتَ لِفُلَانٍ كَذَا وَقَدْ كَانَ لِفُلَانٍ۔ (الخمسة الا الترمذی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے پوچھا۔ کونسا صدقہ سب سے اچھا ہے؟ فرمایا۔ وہ صدقہ جو تو اس وقت دے کہ تو تندرست ہو اور مالدار رہنے کی خواہش رکھتا ہو۔ اور مفلسی سے ڈرتا ہو اور صدقہ دینے میں توقف نہ کر۔ ایسا نہ ہو کہ تیرا دم حلق میں آ جائے، اور تو کہے فلانے کو اتنا دینا۔ حالانکہ وہ فلانے (وارث) کا ہو چکا۔

کتاب الحج

۲۵۰۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ عَلَيْكُمُ الْحَجَّ فَقَامَ الْاَقْرَعُ بْنُ حَابِسٍ اَفِيْ كُلِّ عَامٍ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ لَوْ قُلْتُهَا نَعَمْ لَوَجَبَتْ وَلَوْ وَجَبَتْ لَمْ تَعْمَلُوْا بِهَا وَلَمْ تَسْتَطِيْعُوْا وَالْحَجُّ مَرَّةٌ فَمَنْ زَادَ فَتَطَوُّعٌ۔

(احمد، نسائی، دارمی، مشکوٰۃ)

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے کہا کہ رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا کہ اے لوگو! خدا نے تم پر حج فرض کیا ہے۔ اقرع بن حابس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کھڑے ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ! کیا ہر سال حج فرض ہے؟ فرمایا اگر میں ہاں کہہ دوں تو ہر سال حج فرض ہو جائے اور اگر ہر سال فرض ہو جائے تو تم اسے ادا کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ اس لیے حج پوری زندگی میں صرف ایک مرتبہ فرض ہے اور جو شخص اس سے زیادہ کرے وہ نفل ہے۔

۲۵۱۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے کہا کہ رسول کریم

صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ أَرَادَ الْحَجَّ فَلْيُعَجِّلْ۔ (ابوداؤد، دارمی)

علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ جو شخص حج کا ارادہ کرے تو پھر جلد اس کو پورا کرے۔

۲۵۲۔ عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَابِعُوْا بَيْنَ الْحَجِّ وَالْعُمْرَةِ فَإِنَّهُمَا يَنْفِيَانِ الْفَقْرَ وَالذُّنُوْبَ كَمَا يَنْفِي الْكِيْرُ خَبَثَ الْحَدِيْدِ وَالذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَلَيْسَ لِلْحَجَّةِ الْمَبْرُوْرَةِ ثَوَابٌ إِلَّا الْجَنَّةُ۔ (ترمذی، نسائی)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ نبی کریم علیہ الصلاۃ والسلام نے فرمایا کہ حج اور عمرہ کو یکے بعد دیگرے ادا کرو (یعنی قران کا احرام باندھو یا بالفعل دونوں کو متصلاً کرو) اس لیے کہ یہ دونوں افلاس اور گناہوں کو اس طرح دُور کر دیتے ہیں جس طرح بھٹی لوہے، چاندی اور سونے کی میل کو دُور کر دیتی ہے اور حج مقبول کا بدلہ صرف جنّت ہے۔

۲۵۳۔ عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ خَرَجَ حَاجًّا أَوْ مُعْتَمِرًا أَوْ غَازِيًا ثُمَّ مَاتَ فِيْ طَرِيْقِهٖ كَتَبَ اللّٰهُ لَهٗ أَجْرَ الْغَازِيْ وَالْحَاجِّ وَالْمُعْتَمِرِ۔

(بیہقی، مشکوٰۃ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ جو شخص حج یا عمرہ یا جہاد کے ارادہ سے نکلا اور پھر راستہ ہی میں مر گیا تو اللہ تعالیٰ اس کے حق میں ہمیشہ کے لیے مجاہد، حاجی اور عمرہ کرنے والے کا ثواب لکھ دیتا ہے۔

۲۵۴۔ عَنْ أَبِيْ رَزِيْنٍ الْعُقَيْلِيِّ أَنَّهٗ أَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ إِنَّ أَبِيْ شَيْخٌ كَبِيْرٌ لَا يَسْتَطِيْعُ الْحَجَّ وَلَا الْعُمْرَةَ وَلَا الظَّعْنَ قَالَ حُجَّ عَنْ أَبِيْكَ وَاعْتَمِرْ۔ (ترمذی، ابوداؤد)

حضرت ابو رزین عقیلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ! میرا بوڑھا باپ اتنا کمزور ہے کہ حج و عمرہ کی طاقت نہیں رکھتا اور نہ سواری پر سفر کرنے کی اس میں قوت ہے، تو آپ نے فرمایا۔ تُو اپنے باپ کی طرف سے حج و عمرہ کر لے۔

۲۵۵۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ أَتَى رَجُلٌ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ إِنَّ أُخْتِيْ نَذَرَتْ أَنْ تَحُجَّ وَإِنَّهَا مَاتَتْ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْ كَانَ عَلَيْهَا

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ حضور علیہ الصلاۃ والسلام کی خدمت میں ایک شخص نے حاضر ہو کر عرض کیا کہ میری بہن نے حج کی نذر مانی تھی (اور نذر پوری کرنے سے پہلے) وہ مر گئی۔ آپ نے فرمایا کہ اگر اس پر قرض ہوتا تو کیا اس کو ادا کرتا؟

دَیْنٌ اَکُنْتَ قَاضِیَہٗ قَالَ نَعَمْ قَالَ فَاقْضِ دَیْنَ اللّٰہِ فَھُوَ اَحَقُّ بِالْقَضَاءِ۔ (بخاری، مسلم)

اس نے عرض کیا ہاں۔ آپ نے فرمایا تو پھر خدائے تعالیٰ کا فرض بھی ادا کر کہ اس کا ادا کرنا زیادہ ضروری ہے۔

۲۵۶۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَاتُسَافِرَنَّ اِمْرَاءَۃٌ اِلَّا وَمَعَھَا مَحْرَمٌ۔ (بخاری، مسلم)

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے کہا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ عورت بغیر محرم کے ہرگز سفر نہ کرے (چاہے وہ حج ہی کا سفر کیوں نہ ہو)۔

۲۵۷۔ عَنْ عَلِیٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ مَلَکَ زَادًا وَّرَاحِلَۃً تُبَلِّغُہٗ اِلٰی بَیْتِ اللّٰہِ وَلَمْ یَحُجَّ فَلَا عَلَیْہِ اَنْ یَّمُوْتَ یَھُوْدِیًّا اَوْ نَصْرَانِیًّا وَذٰلِکَ اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی یَقُوْلُ وَلِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْہِ سَبِیْلًا۔ (پارہ ۴۔ رکوع ۱)

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا کہ جو شخص زاد و راہ اور بیت اللہ شریف تک پہنچا دینے والی سواری کے مصارف کا مالک ہو اور پھر اس نے حج نہیں کیا تو اس کے یہودی یا نصرانی ہو کر مرنے میں کوئی فرق نہیں اور یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَلِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْہِ سَبِیْلًا۔ یعنی خدا تعالیٰ کے لیے بیت اللہ کا حج کرنا لوگوں پر فرض ہے جب کہ حج کے تمام ضروری مصارف کا مالک ہو۔

روزے کے متعلق چند خاص باتیں

۲۵۸۔ ایک ہی فتویٰ سب کے لیے نہیں ہوتا۔ احوال و ظروف کا فرق ملحوظ رہنا چاہیے:

(ابوھریرہؓ) ان رجلا سأل رسول اللّٰہ صَلَّی اللّٰہ علیہ وسلم عن المباشرۃ للصائم فرخص لہ واتاہ اٰخر فسألہ فنھاہ فاذا الذی رخص لہ شیخ واذا الذی نھاہ شاب۔ (ابوداؤد)

ایک شخص نے روزے میں بیوی کو چمٹانے کے متعلق دریافت کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اجازت دی۔ دوسرے نے یہی سوال کیا تو اسے منع فرما دیا۔ بات یہ تھی کہ جسے اجازت دی وہ بوڑھا تھا اور اس سے مواصلت کا خطرہ نہ تھا اور جسے روکا وہ جوان تھا اور اس سے اندیشہ تھا کہ اس آغاز کا انجام فساد صوم ہو)۔

۲۵۹۔ صورتِ افطار کی مگر روحِ صوم کی ہو سکتی ہے:

(ابو ھریرۃؓ) رفعہ: من نسی وھو صائم فاکل او شرب فلیتم صومہ فانما اطعمہ اللہ وسقاہ۔ (شیخین، ابو داؤد، ترمذی)

جو شخص روزے میں بھولے سے کھا پی لے وہ اپنے روزے کو (اس دن) پورا کرلے۔ اسے تو اللہ ہی نے کھلا پلا دیا (یعنی ایسی غلطی سے روزہ نہیں ٹوٹتا)

۲۶۰۔ معنیٰ افطار اور صورۃ صوم:

(ابن عمرؓ) رفعہ: ربّ صائم حظہ من صیامہ الجوع والعطش وربّ قائم حظہ من قیامہ السھر (کبیر)

بہتیرے روزے دار ایسے ہیں جن کے روزے کا ماحصل صرف بھوک پیاس ہوتی ہے اور بہتیرے شب بیدار ایسے ہیں جن کی شب بیداری کا حاصل فقط رت جگا ہوتا ہے۔

۲۶۱۔ دوسرے کو تکلیف دے کر روزہ نہ رکھا جائے:

(عائشہؓ) رفعتہ: من نزل بقوم فلا یصوم الا باذنھم (ترمذی واتکو)

جو شخص کسی کے گھر میں ٹھہرے تو ان کی اجازت کے بغیر روزہ نہ رکھے۔ (یہ حکم نفل روزوں کے بارے میں ہے)

۲۶۲۔ "یوم عاشوراء کا روزہ":

(ابن عباسؓ) قدم النبی صلّی اللہ علیہ وسلّم المدینۃ فرأی الیھود تصوم عاشوراء فقال ما ھذا؟ قالوا یوم صالح نجی اللہ فیہ موسیٰ وبنی اسرائیل من عدوھم فصامہ فقال انا احق بموسیٰ منکم فصامہ وامر بصیامہ۔ (شیخین، ابوداؤد)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینے میں تشریف لائے، تو دیکھا کہ یہود عاشورے کا روزہ رکھتے ہیں۔ فرمایا: یہ کیسا روزہ ہے؟ کہنے لگے: یہ مبارک دن ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو دشمن (آلِ فرعون) سے نجات دی تھی اور جناب موسیٰ نے روزہ رکھا تھا۔ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کہ ہم موسیٰؑ کے حق دار تم سے زیادہ ہیں، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے روزہ رکھا اور دوسروں کو بھی اس کا حکم دیا۔

۲۶۳۔ ظاہراً افطار اور حکماً روزہ: (روزے داروں کا احترام):

(سلمۃ بن الاکوع) ان رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم امر رجلا من اسلم ان اذن فی الناس من کان اکل فلیصم فان الیوم یوم عاشوراء۔ (شیخین، نسائی)

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک اسلمی شخص کو حکم دیا کہ منادی کر دو کہ جس شخص نے کچھ کھا لیا ہے، وہ بقیہ دن روزے میں گزارے اور جس نے نہیں کھایا ہے وہ پورا روزہ رکھے کیونکہ آج عاشورے کا دن ہے۔ (آپ کا یہ حکم استحبابی ہے وجوبی نہیں)

۲۶۴۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے پورے مہینے کے روزے صرف رمضان میں رکھے:

(ابن عباسؓ) ما صام رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم شہرًا کاملا قط غیر رمضان وکان یصوم حتی یقول القائل لا واللہ ما یفطر ویفطر حتی یقول القائل لا واللہ ما یصوم۔ (شیخین، نسائی)

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم نے بجز رمضان کے پورے مہینے کے روزے کبھی نہیں رکھے۔ جب روزے رکھنا شروع کرتے تو دیکھنے والا یہ کہنے لگتا کہ: بخدا اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم افطار (ترک صوم) نہیں فرمائیں گے۔ اور جب افطار فرماتے تو دیکھنے والا یہ کہنے لگتا کہ بخدا اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم روزہ رکھنا نہیں شروع کریں گے۔

۲۶۵۔ صائم الدھر ہونے سے بچو:

(مسلم القرشی) سألت او سئل رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم عن صیام الدھر فقال ان لاھلك علیك حقًا فصم رمضان والذی یلیہ وکل اربعاء وخمیس فاذاً انت قد صمت الدھر کلہ (ترمذی)

حضور صلی اللہ علیہ وسلّم سے صوم دہر (ساری عمر روزہ رکھنا) کے متعلق سوال کیا گیا تو فرمایا کہ: تمہارے اُوپر تمہارے بال بچوں وغیرہ کا بھی حق ہے۔ بس رمضان کے روزے رکھو اور جو اس سے متصل ہوں۔ (یعنی شش عید) نیز ہر چہار شنبہ اور جمعرات کو روزہ رکھ لو، تو یہ صوم الدھر کے برابر ہو جائے گا۔

۲۶۶۔ جنگ کے موقعے پر روزۂ رمضان رکھنا چاہیے:

(ابو سعیدؓ) بلغ النبي صلى الله عليه وسلم عام الفتح مر الظهران فآذنا بلقاء العدو فامرنا بالفطر فافطرنا اجمعين - (ترمذی)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سال فتح (جس میں مکہ فتح ہوا) مر الظہران پہنچے، تو ہم لوگوں کو دشمن سے مڈبھیڑ کرنے کا حکم دیا، نیز روزہ چھوڑ دینے کا بھی حکم دیا چنانچہ ہم سب نے روزہ چھوڑ دیا۔

۲۶۷۔ خدمتِ خلق، روزہ رکھنے سے زیادہ ثواب ہے:

(انسؓ) كنا مع رسول الله صلى الله عليه وسلم في السفر فمنا الصائم ومنا المفطر فنزلنا منزلاً في يوم حار اكثرنا ظللا صاحب الكساء فمنا من يتقي الشمس بيده فسقط الصوام وقام المفطرون فضربوا الابنية وسقوا الركاب فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم ذهب المفطرون اليوم بالاجر - (شیخین، نسائی)

ہم لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سفر میں تھے، ہم میں کچھ روزے سے تھے اور کچھ افطار سے۔ ہم لوگوں نے بڑے گرم دن میں ایک جگہ پڑاؤ کیا۔ زیادہ سائے میں وہ لوگ تھے جن کے پاس کپڑا تھا، اور کچھ ایسے تھے جو دھوپ سے بچاؤ کے لیے اپنا ہاتھ استعمال کر رہے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ روزے دار (غش کھاکر) گرنے لگے اور بے روزہ لوگوں نے اٹھ کر سائبان وغیرہ کھڑے کیے اور اونٹوں کو باندھ دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: آج کا ثواب بے روزہ لوگوں نے لوٹ لیا۔

۲۶۸۔ سفر میں روزہ چھوڑ دینے کی اجازت ہے:

(جابرؓ) كان النبي صلى الله عليه وسلم في سفر فرأى رجلا قد اجتمع الناس عليه وقد ظلل عليه فقال ماله؟ فقالوا رجل صائم فقال ليس البر ان تصوموا في السفر (شیخین، ابو داؤد، نسائی)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی سفر میں ایک شخص کو دیکھا کہ لوگ اُس کے گرد جمع ہیں اور اس پر سایہ کیا جا رہا ہے۔ پوچھا: اسے کیا ہو گیا ہے؟ بولے: ایک روزہ دار آدمی ہے۔ فرمایا کہ سفر میں روزہ رکھنے میں نیکی نہیں۔

(تاہم اگر کسی تکلیف کا اندیشہ نہ ہو تو روزہ رکھ لینا بہتر ہے)

۲۶۹۔ کسی جان کا خیال روزے سے زیادہ ضروری ہے :

(انس بن مالکؓ) من بنی عبداللہ بن کعب رفعہ : ان اللہ وضع شطر الصلوٰۃ عن المسافر وارخص لہ فی الافطار وارخص فیہ للمرضع والحبلیٰ اذا خافتا علی ولدیھما۔ (اصحاب سنن)

اللہ تعالیٰ نے مسافر پر آدھی نماز (کی رکعتیں) معاف فرما دی ہیں اور روزہ کھولنے کی اجازت دی ہے نیز بچے کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو تو دُودھ پلانے والی اور حاملہ کو بھی روزے کی رخصت دی ہے۔

۲۷۰۔ روزے میں قوّتِ برداشت کا لحاظ ضروری ہے :

(ابو سعیدؓ) کنا نسافر مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فمنا الصائم ومنا المفطر فلا یجد المفطر علی الصائم ولا الصائم علی المفطر وکانوا یرون انہ من وجد قوۃ فصام فحسن ومن وجد ضعفا فافطر فحسن۔

(مسلم، اصحاب سنن)

ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر کرتے تو ہم میں روزے دار بھی ہوتے اور مفطر (بے روزہ) بھی۔ لیکن نہ مفطر روزہ دار سے ناخوش ہوتا تھا اور نہ روزہ دار مفطر سے۔

۲۷۱۔ میّت کی طرف سے ولی بھی روزے رکھ سکتا ہے :

(عائشہؓ) رفعتہ : من مات وعلیہ صوم صام عنہ ولیہ۔

(شیخین، ابو داؤد)

جو شخص مرجائے اور اس کے ذمے روزہ ہو تو اس کی طرف سے اُس کا ولی روزہ رکھ لے۔

۲۷۲۔ ولی صومِ نذر کو میّت کی طرف سے ادا کرے :

(ابن عباسؓ) قالت امرأۃ یارسول اللہ ان امی ماتت وعلیھا صوم نذرًا فاصوم عنھا ؟ قال ارأیت لوکان علی امک

ایک عورت نے کہا کہ : یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میری ماں مرگئی اور اس کے ذمّے منّت کا روزہ تھا، تو کیا میں اس کی طرف سے روزہ رکھ لوں ؟ فرمایا کہ : اگر تیری

دین فقضیته أكان يؤدی ذلك عنها؟ قالت نعم قال فصومی عن امك (للستة الا مالكا)

ماں پر قرض ہوتا اور تو اسے ادا کر دیتی تو یہ اس کی طرف سے ادا ہو جاتا یا نہیں؟ عرض کیا: ہاں ہو جاتا۔ فرمایا، پھر اپنی ماں کی طرف سے روزہ بھی رکھ لے۔

مدینہ طیبہ کی حاضری

۲۷۳۔ عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ زَارَ قَبْرِیْ وَجَبَتْ لَهٗ شَفَاعَتِیْ۔ (دارقطنی، بیہقی)

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے کہا کہ رسول کریم علیہ الصلاۃ والسلام نے فرمایا کہ جو شخص میری قبر کی زیارت کرے اس کے لیے میری شفاعت واجب ہے۔

۲۷۴۔ عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ جَآءَنِیْ زَائِرًا لَا تَحْمِلُهٗ حَاجَةٌ اِلَّا زِيَارَتِیْ كَانَ حَقًّا عَلَیَّ اَنْ اَكُوْنَ لَهٗ شَفِيْعًا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ۔ (دارقطنی۔ طبرانی)

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے کہا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ جو میری زیارت کے لیے آیا سوائے میری زیارت کے اور کسی حاجت کے لیے نہ آیا تو مجھ پر حق ہے کہ قیامت کے دن اس کا شفیع بنوں۔

۲۷۵۔ عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ حَجَّ فَزَارَ قَبْرِیْ بَعْدَ وَفَاتِیْ كَانَ كَمَنْ زَارَنِیْ فِیْ حَيَاتِیْ (دارقطنی، طبرانی)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا کہ رسول کریم علیہ الصلاۃ والسلام نے فرمایا کہ جس نے حج کیا اور میری وفات کے بعد میری قبر کی زیارت کی تو ایسا ہے جیسے میری حیات (دنیوی) میں زیارت سے مشرف ہوا۔

کتاب الحج

۲۷۶۔ پاکیزہ حج کب ہوتا ہے؟:

(ابوهريرةؓ) رفعه: من حج لله فلم يرفث ولم يفسق رجع كيوم

جو شخص حج کرے اور اس میں کوئی شہوانی اور فسق کی بات نہ کرے تو وہ اس طرح لوٹ کر آتا ہے جیسے

ولدته امه۔ (للستة الا ابا داؤد)

آج ہی اُس کی ماں نے جنا ہو۔

۲۷۷: آغاز کار کے بعد موت مانع اجر نہیں:

(ابو ھریرۃؓ) رفعه: من خرج حاجًا فمات كتب له اجر الحاج الى يوم القيامة ومن خرج غازيا فمات كتب له اجر الغازي۔ (اوسط)

جو شخص حج کے لیے نکلے اور راستے میں مر جائے اُس کے لیے حج کا ثواب لکھا جائے گا اور جو غازی بن کر نکلے اور راستے میں مر جائے اس کے لیے غازی ہی کا اجر لکھا جائے گا۔

۲۷۸۔ حائض کا حج کس طرح ہو؟:

(ابن عمرؓ) قال الحائض تهل بالحج والعمرة وتشهد المناسك كلها غير انها لا تطوف بالبيت ولا بين الصفا والمروة ولا تقرب المسجد حتى تطهر۔ (مالك)

حائض عورت حج کا اہلال کر کے تمام مناسک ادا کر سکتی ہے، بجز اس کے کہ طواف کعبہ اور سعی بین الصفا و المروہ نہ کرے اور مسجد میں پاک ہوئے بغیر نہ جائے۔

خطبۂ حج

۲۷۹۔ دوسروں کو دھکا دے کر حجرِ اسود کو چومنا:

(ابن عوفؓ) سمعت رجلا يقول قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لعمر يا ابا حفص انك فيك فضل قوة فلا تؤذ الضعيف اذا رأيت الركن خلوا فاستلمه والا فكبر وامض قال سمعت عن الرجل لا تؤذ الناس بفضل قوتك۔ (رزين)

میں نے ایک شخص کو یہ کہتے سُنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ: اے ابو حفص! تمہارے اندر کچھ قوت و زور زیادہ ہے۔ اس لیے کمزوروں کو ایذا نہ دینا، بلکہ جب رکن خالی دیکھو، تو حجرِ اسود کو بوسہ دو۔ ورنہ تکبیر کہہ کے گزر جاؤ۔ راوی کہتا ہے کہ میں نے حضرت عمرؓ کو ایک شخص سے یہ کہتے سنا کہ دیکھو اپنے زائد زور کی وجہ سے دوسروں کو اذیت نہ پہنچاؤ۔

۲۸۰۔ طواف بھی نماز ہی کی ایک شکل ہے:

(ابن عباس رضؓ) رفعہ: الطواف حول البیت مثل الصلوٰۃ الا انکم تتکلمون فیہ فمن تکلم فیہ فلا یتکلم الا بخیر۔ (ترمذی)

بیت اللہ کے گرد طواف کرنا بھی نماز ہی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ طواف میں گفتگو بھی کر سکتے ہو۔ لہٰذا جو بھی گفتگو کرے وہ کلمہ خیر ہی کہے۔

۲۸۱۔ کنکریاں چننے میں بھی غلو سے بچو:

(ابن عباس رضؓ) قال لی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غداۃ العقبۃ وھو علی راحلتہ ھات القط لی فلقطت لہ حصیات من حصی الخذف فلما وضعتھن فی یدہ قال بامثال ھٰؤلاء وایاکم والغلو فی الدین فانما ھلک من کان قبلکم بالغلو فی الدین۔ (نسائی)

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے (بموقعہ حج) عقبہ کی صبح کو مجھ سے فرمایا کہ: آؤ میرے لیے بھی کنکریاں چُن لو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت سواری پر تھے۔ میں نے چند کنکر کے روڑے چُن لیے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں رکھ دیئے تو فرمایا: اتنے بڑے بڑے نہیں بلکہ ان جیسے (یعنی چھوٹے چھوٹے) پھر فرمایا کہ: دین میں غلو سے بچو! گزشتہ اُمتیں غلو فی الدین ہی کی وجہ سے ہلاک ہوئیں۔

۲۸۲۔ رسم حج کی اصلی رُوح:

(ابن عباس رضؓ) ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال للفضل ابن اخی ان ھذا الیوم من ملک فیہ سمعہ وبصرہ ولسانہ غفر لہ۔ (شیخین، نسائی)

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فضل سے (بموقعہ حج) فرمایا: اے برادر زادے! آج وہ دن ہے کہ جو شخص اپنے کان، آنکھ اور زبان پر قابو پالے اس کی مغفرت ہو جائے گی۔

قربانی

۲۸۳۔ صلہ رحمی عید الاضحیٰ کی قربانی سے زیادہ افضل ہے:

(ابن عباس رضؓ) رفعہ: فی یوم اضحیٰ ما عمل

قربانی کے دن قربانی سے زیادہ افضل انسان کا

آدمی فی ھذا الیوم افضل من دم یھراق الا ان یکون رحما یوصل۔ (کبیر بلین)

اور کوئی کام نہیں، لیکن صلۂ رحمی اس سے بھی افضل ہے۔

حلال و حرام جانور

۲۸۴۔ حرام جانوروں کے لیے قاعدۂ کلیہ:

(خالد بن ولیدؓ) رفعہ: حرام علیکم حمر الاھلیۃ دخلیھا وبغالھا وکل ذی ناب من السباع وکل ذی مخلب من الطیر۔ (نسائی، ابوداؤد)

تم پر پالتو گدھا حرام ہے خواہ وہ اصلی ہو یا خچر۔ نیز ہر ذی ناب (سامنے کے چار دانتوں کے ادھر اُدھر جو نوکیلے دانت ہوتے ہیں۔ اُنھیں ناب کہتے ہیں۔ یہ اُوپر نیچے کے چار دانت صرف گوشت خور جانوروں کے ہوتے ہیں۔) زندہ اور ہر ذی مخلب (مخلب اس چنگل کو کہتے ہیں جس سے پرندہ اپنے شکار کو پکڑتا ہے) پرندہ بھی حرام ہے۔

قربانی

۲۸۵۔ عَنْ زَيْدِ بْنِ اَرْقَمَ قَالَ قَالَ اَصْحَابُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا هٰذِهِ الْاَضَاحِيُّ قَالَ سُنَّةُ اَبِيْكُمْ اِبْرَاهِيْمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ قَالُوْا فَمَا لَنَا فِيْهَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ بِكُلِّ شَعْرَةٍ حَسَنَةٌ قَالُوْا فَالصُّوْفُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ بِكُلِّ شَعْرَةٍ مِنَ الصُّوْفِ حَسَنَةٌ۔ (احمد، ابن ماجہ)

حضرت زید بن ارقم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ: حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے صحابہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ یہ قربانیاں کیا ہیں؟ آپؐ نے فرمایا یہ تمھارے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے۔ صحابہ نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! کیا اس سے ہم کو ثواب ملے گا؟ فرمایا ہر بال کے بدلے ایک نیکی ہے۔ عرض کیا اور اون یا رسول اللہ! تو آپؐ نے فرمایا کہ اون کے ہر بال میں بھی ایک نیکی ملے گی۔

۲۸۶۔ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا عَمِلَ ابْنُ اٰدَمَ مِنْ عَمَلٍ يَوْمَ النَّحْرِ اَحَبَّ اِلَى اللّٰهِ مِنْ اِهْرَاقِ الدَّمِ وَاِنَّهُ لَيَاْتِيْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِقُرُوْنِهَا وَاَشْعَارِهَا وَاَظْلَافِهَا وَاِنَّ الدَّمَ لَيَقَعُ مِنَ اللّٰهِ بِمَكَانٍ قَبْلَ اَنْ يَقَعَ بِالْاَرْضِ۔ (ترمذی، ابن ماجہ)

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے کہا کہ رسول کریم علیہ الصلاۃ والسلام نے فرمایا کہ قربانی کے ایام میں ابن آدمؑ کا کوئی عمل خدا تعالیٰ کے نزدیک خون بہانے (یعنی قربانی کرنے) سے زیادہ پیارا نہیں۔ اور وہ جانور قیامت کے دن اپنے سینگوں، بالوں اور کھروں کے ساتھ آئے گا اور قربانی کا خون زمین پر گرنے سے قبل خدا تعالیٰ کے نزدیک مقام قبول میں پہنچ جاتا ہے۔

۲۸۷۔ عَنْ حَنَشٍ قَالَ رَاَيْتُ عَلِيًّا يُضَحِّيْ بِكَبْشَيْنِ فَقُلْتُ لَهُ مَا هٰذَا؟ فَقَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَوْصَانِيْ اَنْ اُضَحِّيَ عَنْهُ فَاَنَا اُضَحِّيْ عَنْهُ۔ (ابوداؤد)

حضرت حنش رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ میں نے حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ کو دو دنبے ذبح کرتے ہوئے دیکھا۔ میں نے پوچھا یہ کیا ہے؟ انھوں نے فرمایا کہ حضور علیہ الصلاۃ والسلام نے مجھے وصیت فرمائی ہے کہ میں حضورؐ کی جانب سے قربانی کروں۔ تو میں (دوسرا دنبہ حضورؐ کی جانب سے) قربانی کر رہا ہوں۔

۲۸۸۔ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ وَّجَدَ سَعَةً وَّلَمْ يُضَحِّ فَلَا يَقْرَبَنَّ مُصَلَّانَا۔ (ابن ماجہ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ حضور علیہ الصلاۃ والسلام نے فرمایا کہ جس میں وسعت ہو اور قربانی نہ کرے تو وہ ہماری عید گاہ کے قریب ہرگز نہ آئے۔

۲۸۹۔ عَنْ اُمِّ سَلَمَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا رَاَيْتُمْ هِلَالَ ذِي الْحِجَّةِ وَاَرَادَ اَحَدُكُمْ اَنْ يُّضَحِّيَ فَلْيُمْسِكْ عَنْ شَعْرِهٖ وَاَظْفَارِهٖ۔ (مسلم)

حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم علیہ الصلاۃ والتسلیم نے فرمایا کہ جب تم لوگ بقرعید کا چاند دیکھو اور تم میں کا کوئی قربانی کرنا چاہے تو اس کو چاہیے کہ بال منڈانے ترشوانے اور ناخن کٹوانے سے رُکا رہے۔

قسم

۲۹۰۔ مضر قسم کو توڑ کر کفارہ ادا کرنا چاہیے:

(عبد الرحمٰن بن سمرہؓ) رفعہ: اذا

اگر کوئی شخص کسی غلط بات پر قسم کھا لے اور بہتری اسے

حلف احدکم علی یمین فرأی غیرھا خیرا منھا فلیکفر عن یمینہ ولیفعل الذی ھو خیر (للستۃ الا مالکا، بلفظ نسائی)

ختم کر دینے میں ہو تو وہ اپنی قسم کا کفارہ ادا کر دے اور وہی کام کرے جو بہتر ہو۔

منّت

۲۹۱۔ منّت ماننے کے دو پہلو :

(ابوھریرۃؓ) رفعہ: لا تنذروا فان النذر لا یغنی من القدر شیئًا وانّما یستخرج بہ من البخیل (للستۃ الا مالکا بلفظ مسلم)

(ہر ذرا سی بات پر) منّت ماننے کی ضرورت نہیں کیونکہ منّت تقدیر کو نہیں بدلتی، البتہ بخیل کی جیب سے کچھ نکلوا لیتی ہے۔

۲۹۲۔ لایعنی منّت کو پورا نہ کرنا چاہیئے :

(ابن عباسؓ) بینما النبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم یخطب اذھو برجل قائم فسأل عنہ فقال ھذا ابو اسرائیل نذر ان یقوم فی الشمس ولا یقعد ویصوم ولا یفطر نہارہ ولا یستظل ولا یتکلم فقال مروہ فلیستظل ولیقعد ولیتکلم ولیتم صومہ۔ (بخاری، ابوداؤد)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم خطبہ دے رہے تھے کہ ایک آدمی پر نظر پڑی جو کھڑا تھا۔ پوچھا: کیا بات ہے؟ عرض کیا: یہ ہے ابو اسرائیل، اس نے منّت مانی ہے کہ دھوپ میں کھڑا رہے گا اور بیٹھے گا بھی نہیں اور سارا دن روزہ رکھ کر بھی افطار نہیں کرے گا اور سائے میں نہیں آئے گا اور کوئی گفتگو نہیں کرے گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ: اس سے کہو کہ سائے میں آجائے اور بیٹھے اور گفتگو کرے اور روزہ پورا کرلے۔

۲۹۳۔ ناقابلِ برداشت منّت میں ترمیم :

(عقبۃ بن عامرؓ) نذرت اختی ان

میری بہن نے یہ منّت مانی کہ پیدل ہی بیت اللہ کا

تمشی الی بیت اللہ حافیۃ فامرتنی ان استفتی لھا النبی صلی اللہ علیہ وسلم فاستفتیتہ فقال لتمش ولترکب۔ (للسنۃ)

سفر کرے گی۔ اس نے مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں دریافت کرنے کو کہا۔ میں نے دریافت کیا، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اسے پیدل بھی چلنا چاہیے اور سواری پر بھی۔

۲۹۴۔ قسم اور نذر کہاں کہاں غلط ہے:

(ابن المسیبؒ) ان اخوین من الانصار کان بینھما میراث فسأل احدھما اخاہ القسمۃ فقال لہ الأخر ان عدت تسألنی القسمۃ فکل مالی فی رتاج الکعبۃ ولا اکلمک فعاد یسألہ فاتی عمر فقال لہ ان الکعبۃ لغنیۃ عن مالک کفّر عن یمینک وکلم اخاک سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول لا یمین علیک ولا نذر فی معصیۃ الرب ولا فی قطیعۃ الرحم ولا فیما لا تملک۔ (ابوداؤد)

دو انصاری بھائی تھے جن کی میراث مشترک تھی۔ ایک نے کہا کہ میرا حصّہ الگ کر دو، اس نے جواب میں کہا: اگر تم نے دوبارہ یہ مطالبہ کیا، تو میرا یہ سارا مال کعبے کی ملکیت ہو جائے گا اور میں تجھ سے کبھی گفتگو نہ کروں گا۔ اُس نے دوبارہ پھر اپنا مطالبہ پیش کیا اور معاملہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس آیا تو آپ نے فرمایا کہ: کعبہ تمھارے مال سے بے نیاز ہے۔ تم اپنی قسم کا کفّارہ ادا کرو اور اپنے بھائی سے گفتگو کرو۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ معصیت الٰہی میں اور قطع رحمی میں اور غیر مملوکہ چیز میں تم پر نہ کوئی قسم ہے اور نہ کوئی نذر۔

(یعنی ایسی چیزوں پر نہ قسم صحیح ہے نہ ایسی چیزوں کے متعلق کوئی منّت ماننا)

۲۹۵۔ کسی کا دل رکھنے کے لیے ایفائے نذر کی اجازت:

(عمرو بن شعیبؒ) عن ابیہ عن جدہ [illegible] قالت یارسول اللہ انی نذرت [illegible]

ایک عورت نے عرض کیا کہ: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں نے منّت مانی تھی کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس غزوے سے صحیح سلامت واپس تشریف

من غنم وتلك هذه سالمًا غانمًا ان اضرب علی رأسك بالدف فقال ان كنت نذرت فاوفی بنذرك والا فلا ۔ (ابوداؤد)

لے آئیں گے تو میں آپ کے سر پر کھڑے ہو کر دف بجاؤں گی۔

فرمایا: اگر تو نے یہ منت مانی ہے تو آ پوری کر لے ورنہ رہنے دے۔

عقیقہ

۲۹۶۔ عَنْ سَلْمَانَ بْنِ عَامِرٍ الضَّبِّیِّ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ مَعَ الْغُلَامِ عَقِیْقَۃٌ فَاھْرِقُوْا عَنْہُ دَمًا۔

(بخاری شریف)

حضرت سلمان بن عامر ضبی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ میں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو فرماتے ہوئے سُنا کہ لڑکے (کی پیدائش) کے ساتھ عقیقہ ہے۔ لہٰذا اس کی جانب سے جانور ذبح کرو۔

۲۹۷۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَقَّ عَنِ الْحَسَنِ وَالْحُسَیْنِ کَبْشًا کَبْشًا رَوَاہُ اَبُوْدَاوٗدَ وَعِنْدَ النَّسَائِیِّ کَبْشَیْنِ کَبْشَیْنِ۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے حضرت امام حسن امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا عقیقہ ایک ایک مینڈھے سے کیا۔ (ابوداؤد) اور امام نسائی کی روایت میں دو دو مینڈھے کا ذکر ہے۔

۲۹۸۔ عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَیْبٍ عَنْ اَبِیْہِ عَنْ جَدِّہٖ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ وُّلِدَ لَہٗ وَلَدٌ فَاَحَبَّ اَنْ یَّنْسُکَ عَنْہُ فَلْیَنْسُکْ عَنِ الْغُلَامِ شَاتَیْنِ وَعَنِ الْجَارِیَۃِ شَاۃً۔

(ابوداؤد)

حضرت عمرو بن شعیب رضی اللہ تعالیٰ عنہما اپنے باپ سے اور وہ اپنے دادا (حضرت عبداللہ) سے روایت کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ جس شخص کے کوئی اولاد پیدا ہوئی، پھر اس نے اس کی طرف سے جانور ذبح کرنا چاہا تو وہ لڑکے کی جانب سے دو بکری اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری ذبح کرے۔

کتاب الجہاد

سرحد کی حفاظت!

۲۹۹۔ حفاظت سرحد کی فضیلت:

(عثمانؓ) رباط یوم فی سبیل اللہ خیر من الف یوم فیما سواہ من المنازل۔ (نسائی، ترمذی بلفظہ)

..... سرحد پر فی سبیل اللہ ایک دن گزارنا دوسری جگہوں پر ہزار دن گزارنے سے بہتر ہے۔

ایضاً:

(سلمانؓ) رفعہ: رباط یوم فی سبیل اللہ خیر من صیام شھر وقیامہ ومن مات مرابطا وقی من فتنۃ القبر ونمالہ عملہ الی یوم القیامۃ۔ (مسلم، نسائی، ترمذی بلفظہ)

سرحد پر فی سبیل اللہ ایک دن گزارنا پورے مہینے کی روزہ داری و شب بیداری سے افضل ہے۔ جو شخص حفاظتِ سرحد کی حالت میں مرجائے وہ آزمائش قبر سے بچا رہے گا اور اس کا یہ عمل تا قیامت پھلتا پھولتا رہے گا۔

۳۰۰۔ سمندری سرحد کا پہرہ:

(انسؓ) رفعہ: من حرس لیلۃ علی ساحل البحر کان افضل من عبادتہ فی اھلہ الف سنۃ۔ (موصلی مبلین)

جو ساحل بحر پر ایک رات پہرہ دے وہ (پہرہ) اہل و عیال میں رہ کر ہزار سال عبادت کرنے سے بہتر ہے۔

۳۰۱۔ جہاد سے واپسی:

(ابن عمرو بن العاصؓ) رفعہ، قفلۃ

فی سبیل اللہ جہاد سے واپس آنا بھی

فی سبیل اللہ کغزوۃ ۔ (ابو داؤد)

جہاد ہی ہے ۔

تساہل

۲۰۲ ۔ غزوے میں تساہل کرنے کا اثر :

(معاذ بن انس) ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم بعث غزوًا فتأخر رجل حتی صلی مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم واتاہ یودعہ ویدعو لہ فقال لہ تدری بکم سبقک اصحابک؟ قال نعم سبقونی الیوم بغدوتھم فقال والذی نفسی بیدہ لقد سبقوک بابعد ما بین المشرقین والمغربین فی الفضیلۃ۔

(احمد بلین)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لشکر روانہ فرمایا۔ ایک شخص پیچھے رہ گیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز ادا کر کے رخصت ہونے اور دعا لینے کے لیے آیا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: تمھیں علم ہے کہ تمھارے ساتھی تم سے کتنا آگے نکل گئے؟ عرض کیا: ہاں آج صبح ہی تو وہ گئے ہیں۔ فرمایا: قسم ہے اُس ذات کی کہ جس کے قبضے میں میری جان ہے جتنا فرق مشرقین اور مغربین میں ہے اس سے بھی زیادہ فرق کے ساتھ فضیلت میں وہ تم سے آگے نکل گئے ہیں۔

مرنا یا زخمی ہونا

۲۰۳ ۔ راہِ خدا میں مرنے اور زخمی ہونے کی قیمت :

(معاذ بن جبل) رفعہ: من قاتل فی سبیل اللہ فواق ناقۃ وجبت لہ الجنۃ ومن سأل اللہ القتل فی سبیل اللہ صادقًا من نفسہ ثم مات او قتل فان لہ اجر شہید ومن جُرح جرحا فی سبیل اللہ او نکب نکبۃ فانہا تجیئ

جو فی سبیل اللہ تھوڑی سی دیر بھی جنگ کرے اس کے لیے جنت ضروری ہے اور جو صدقِ دل سے راہِ خدا میں شہادت کی دُعا کرے اُس کے بعد خواہ وہ اپنی موت سے مرے یا قتل کیا جائے اس کے لیے شہید ہی کا اجر ہوگا۔

اور جو راہِ خدا میں ہتھیار یا پتھر سے زخمی ہوگا، تو اُس

یوم القیامۃ کھا غزر ما کانت لونھا لون الزعفران وریحھا ریح المسک ومن خرج بہ خراج فی سبیل اللہ فان علیہ طابع الشہداء۔ (اصحاب سنن)

کا زخم بروزِ حشر زعفرانی رنگ سے زیادہ شوخ ہوگا۔ اس کی خوشبو مشک جیسی ہوگی۔ اور جسے راہِ خدا میں پھوڑا نکل آئے اس پر شہید کی مہر لگ گئی۔

۳۰۴۔ جہاد کی بنیاد اور تمنائے نبوی (علیہ الصلوٰۃ والسلام):

(ابوھریرۃؓ) رفعہ: تضمن اللہ لمن خرج فی سبیلہ لا یخرجہ الا جہاد فی سبیلی وایمان بی وتصدیق برسلی فھو علی ضامن ان ادخلہ الجنۃ او ارجعہ الی مسکنہ الذی خرج منہ ما نال ما نال من اجر او غنیمۃ والذی نفس محمد بیدہ ما من کلم یکلم فی سبیل اللہ الا جاء یوم القیمۃ کھیئتہ یوم کلم لونہ لون دم وریحہ ریح مسک والذی نفس محمد بیدہ لولا ان یشق علی المسلمین ما قعدت خلاف سریۃ تغزو فی سبیل اللہ ابدا ولکن لا اجد سعۃ فاحملھم ولا یجدون سعۃ ویشق علیھم ان یتخلفوا عنی والذی نفس محمد بیدہ لوددت ان اغزو فی سبیل اللہ فاقتل ثم اغزو فاقتل ثم اغزو فاقتل۔ (شیخین، موطأ، نسائی)

جو شخص فی سبیل اللہ جہاد کے لیے نکلے اور اُسے باہر نکالنے والی چیز صرف جہاد فی سبیل اللہ، ایمان باللہ اور تصدیق بالرسل ہو، اس کا اللہ تعالیٰ ضامن ہو جاتا ہے۔ یا تو اُسے جنّت میں داخل کرے یا اُسے وہاں واپس لے آئے جہاں سے وہ نکلا تھا۔ خواہ وہ اجر لے کر لوٹے یا حصّہ غنیمت لے کر۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں محمدؐ کی جان ہے جس شخص کو راہِ خدا میں کوئی زخم لگے گا وہ، قیامت کے دن اُسی زخمی حالت میں حاضر ہوگا۔ اس کا رنگ تو خون کی طرح سرخ ہوگا، لیکن خوشبو مشک جیسی ہوگی، اور قسم ہے اُس کی جس کے ہاتھ میں محمدؐ کی جان ہے۔ اگر مسلمانوں پر شاق نہ ہوتا تو میں کسی جہاد فی سبیل اللہ کرنے والی جماعت کے پیچھے نہ رہتا۔ لیکن اس کے سوا چارہ کار نہیں کہ میں انھیں تیار کروں۔ ورنہ اگر وہ مجھ سے پیچھے رہ جائیں گے۔ تو انھیں شاق گزرے گا۔ قسم ہے اس کی جس کے قبضے میں محمدؐ کی جان ہے۔ میری تو یہ تمنّا ہے کہ راہِ خدا میں جنگ کرتے کرتے مارا جاؤں۔ پھر زندہ ہو کر جہاد کروں اور قتل کیا جاؤں پھر زندہ ہو کر قتال کرتا ہوا شہید کیا جاؤں۔

۳۰۵۔ دو قسم کی آنکھیں آگ سے محفوظ رہیں گی:

(ابن عباسؓ) رفعہ: عینان لا تمسھما النار

دو قسم کی آنکھیں ایسی ہیں جن کو آگ نہیں چھوئے گی۔

عین بکت من خشیة اللہ وعین باتت تحرس فی سبیل اللہ۔ (ترمذی)

ایک وہ آنکھ جو خوفِ الٰہی سے روئے اور دوسری وہ جو شب کو فی سبیل اللہ پہرہ دے۔

۳۰۶۔ درجات جنّت اور جہاد:

(ابو سعیدؓ) رفعہ: من رضی باللہ ربا وبالاسلام دینا وبمحمد رسولا وجبت لہ الجنة فعجب لھا ابو سعید فقال اعدھا علی یا رسول اللہ فاعادھا علیہ ثم قال واخری یرفع اللہ بھا العبد مائة درجة فی الجنة ما بین کل درجتین کما بین السماء والارض قال وماھی یا رسول اللہ ۔ ؟ قال الجھاد فی سبیل اللہ الجھاد فی سبیل اللہ الجھاد فی سبیل اللہ ۔(مسلم، نسائی)

جو شخص خوش دلی کے ساتھ اللہ کو رب، اسلام کو نظامِ زندگی اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو رسولؐ مان لے۔ اس کے لیے جنّت ضروری ہے۔ ابو سعید یہ سُن کر متعجب ہوئے اور عرض کیا: دوبارہ ارشاد ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ یہی ارشاد فرمایا کہ: ایک چیز ایسی بھی ہے، جس کی وجہ سے اللہ بندے کے سو درجے جنّت میں بلند کرتا ہے اور ہر دو درجے کے درمیان بلندی کا اِتنا فاصلہ ہے جتنا زمین و آسمان کے درمیان ہے۔ ابو سعیدؓ نے عرض کیا کہ: وہ کیا چیز ہے یا رسول اللہ؟ فرمایا: جہاد فی سبیل اللہ، جہاد فی سبیل اللہ، جہاد فی سبیل اللہ۔

۳۰۷۔ جنّت کہاں ہے؟

(ابو موسیٰؓ) رفعہ: الجنّة تحت ظلال السیوف (مسلم، ترمذی)

جنّت تلوار کے سائے تلے ہے۔

۳۰۸۔ راہِ خدا میں تیر چلانا:

(ابو ھریرةؓ) رفعہ: من رمی بسھم فی سبیل اللہ کان لہ نورا لیوم القیامة۔ (بزار)

جو راہِ خدا میں ایک تیر چلائے وہ اس کے لیے قیامت کے دن نور بن جائے گا۔

۳۰۹۔ جہاد صرف قتال نہیں:

(زید بن خالدؓ) رفعہ: من جھز

جو کسی غازی کا سامانِ جہاد مہیّا کرے، وہ بھی

غازیا فی سبیل اللہ فقد غزا ومن خلف غازیا فی اھلہ بخیر فقد غزا۔ (للستۃ الا مالکا۔)

غازی ہے اور جو کسی غازی کے بال بچوں کی عمدگی سے رکھوالی کرے وہ بھی غازی ہے۔

۳۱۰۔ مجاہد کی تیاری:

(ابن عمرو بن العاصؓ) رفعہ: للغازی اجرہ وللجاعل اجرہ واجر الغازی (ابو داؤد)

غازی کے لیے تو ایک ہی اجر ہے اور مجاہد تیار کرنے والے کے لیے تیاری اور جہاد دونوں کا اجر ہے۔

۳۱۱۔ صحیح مجاہد کی شان:

(ابو ھریرۃؓ) رفعہ: طوبی لعبد اخذ بعنان فرسہ فی سبیل اللہ اشعث رأسہ مغبرۃ قدماہ ان کان فی الحراسۃ کان فی الحراسۃ وان کان فی الساقۃ کان فی الساقۃ ان استأذن لم یؤذن (وان شفع لم یشفع (بخاری، مطولا)۔

مبارک ہے وہ جو اپنے گھوڑے کی لگان پکڑے راہِ خدا میں جا رہا ہو، اس کے سر کے بال پریشان ہوں، پاؤں گرد آلود ہوں، پہرے پر لگا دیا جائے تو وہیں لگا رہے۔ لشکر کے پچھلے حصے میں رکھا جائے تو وہیں رہے۔ وہ چھٹی مانگے تو چھٹی نہ ملے، کسی کی سفارش کرے تو قبول نہ کی جائے۔

۳۱۲۔ خدا کی چار پسندیدہ چیزیں:

(ابو امامۃؓ) رفعہ: لیس شئ احب الی اللہ من قطرتین واثرتین قطرۃ دموع من خشیۃ اللہ وقطرۃ دم تھراق فی سبیل اللہ واما الاثران فاثر فی سبیل اللہ واثر فی فریضۃ من فرائض اللہ۔ (ترمذی)

دو قسم کے قطروں اور دو طرح کے نشانوں سے زیادہ کوئی چیز اللہ کو محبوب نہیں۔ ایک وہ قطرۂ اشک جو خوفِ الٰہی سے رواں ہو اور دوسرا وہ قطرۂ خون جو فی سبیل اللہ ہے اور نشانات میں ایک نشان وہ ہے جو فی سبیل اللہ پیدا ہو (مثلاً نشانِ زخم وغیرہ) اور دوسرا وہ نشان جو فرائض الٰہی ادا کرنے سے پیدا ہو (مثلاً نشان سجدہ وغیرہ)

شہدا کی فضیلتیں!

۲۱۳۔ شہید کی تمنّا:

(انسؓ) رفعہ: ما احد یدخل الجنة یحب ان یرجع الی الدنیا ولہ ما علی الارض من شئ الا الشھید یتمنی ان یرجع الی الدنیا فیقتل عشر مرات لما یری من فضل الشھادة (شیخین، ترمذی، نسائی)

جنّت میں پہنچنے کے بعد کوئی شخص بھی دنیا میں لوٹنا پسند نہیں کرتا، کیونکہ زمین پر اس کا کچھ نہیں رہ جاتا۔ مگر شہید جب شہادت کے انعامات کو دیکھتا ہے، تو یہ تمنّا کرتا ہے کہ کاش! وہ دنیا میں لوٹا دیا جائے اور دس بار قتل ہو۔

۲۱۴۔ شہید کا قرض معاف نہیں ہوتا:

(انسؓ) (ابوھریرةؓ) قال رجل للنبی صلی اللہ علیہ وسلم ارأیت ان قتلت فی سبیل اللہ صابرا محتسبا مقبلا غیر مدبر ایکفر اللہ عنی سیأتی؟ قال نعم ثم سکت ساعة قال این السائل آنفا؟ فقال الرجل فھا انا ذا قال ما قلت؟ قال ارأیت ان قتلت فی سبیل اللہ صابرا محتسبا مقبلا غیر مدبر ایکفر اللہ عنی سیأتی؟ نعم الا الدین سارّنی بہ جبریل علیہ السلام آنفا (نسائی)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک شخص نے دریافت کیا کہ: اگر میں فی سبیل اللہ ثابت قدمی کے ساتھ کارِ ثواب سمجھ کر جنگ کروں اور آگے ہی بڑھتا جاؤں، پیچھے نہ ہٹوں اور مارا جاؤں تو اللہ تعالیٰ میرے گناہوں کی تلافی فرما دے گا؟ فرمایا: ہاں۔ پھر ذرا دیر خاموش رہ کر فرمایا: سائل کدھر ہے؟ بولا۔ حاضر ہوں۔ فرمایا: تم نے ابھی کیا دریافت کیا تھا؟ عرض کیا: اگر میں راہِ خدا میں جنگ کرتا ہوا ثابت قدم رہوں اور قتال کو کارِ ثواب سمجھوں۔ پیش قدمی کرتا رہوں، پیچھے نہ ہٹوں تو کیا اللہ تعالیٰ میرے گناہوں کا کفارہ فرما دے گا؟ فرمایا: ہاں! بشرطیکہ تم پر کسی کا واجب الادا قرض نہ ہو۔ یہ مجھے ابھی جبرئیلؑ نے خاموشی سے بتایا ہے۔

۲۱۵۔ راہِ خدا میں قتل ہونے سے بندوں کا حق معاف نہیں ہوتا:

(ابن مسعودؓ) رفعہ: القتل فی سبیل اللہ

فی سبیل اللہ قتل ہونا تمام گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے۔

اللہ یکفر الذنوب کلھا الا الامانۃ والامانۃ فی الصلوٰۃ والامانۃ فی الصوم والامانۃ فی الحدیث واشد ذلک الودائع ۔ (کبیر)

بجز امانت کے ۔ امانت، صلوٰۃ، صوم اور گفتگو میں بھی ہوتی ہے ۔ لیکن سب سے زیادہ سخت امانت وہ ہے جس کا تعلق سونپی جانے والی چیزوں سے ہے ۔

۳۱۶ ۔ ایک لے عمل مگر خوش نصیب مجاہد و شہید :

(البراء) اتی النبی صلی اللہ علیہ وسلم رجل مقنع بالحدید فقال یا رسول اللہ أقاتل او أسلم ۔؟ قال اسلم ثم قاتل فاسلم ثم قاتل فقتل فقال صلی اللہ علیہ وسلم عمل قلیلا و اجر کثیرا ۔ (اصحاب سنن)

ایک شخص جو لوہے میں غرق تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں قتال کروں یا اسلام لے آؤں ؟ فرمایا : پہلے اسلام لے آؤ پھر قتال کرو ۔ وہ اسلام لایا اور پھر قتال کرتا ہوا مارا گیا ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کا عمل تو برائے نام ہی تھا لیکن اس نے ثواب خوب لوٹا ۔

۳۱۷ ۔ صدقِ نیّت کا اثر :

(سھل بن حنیفؓ) رفعہ : من سأل اللہ الشھادۃ بصدق بلغہ اللہ منازل الشھداء وان مات علی فراشہ ۔ (لمسلم واصحاب سنن)

جو صدق دل کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے شہادت کا طلبگار ہوگا ۔ اللہ تعالیٰ اُسے شہداء کا درجہ عطا فرمائے گا ۔ خواہ اس کی موت بستر پر ہی کیوں نہ ہو ۔

۳۱۸ ۔ شہادت کی اقسام میں وسعت :

(سعید بن زیدؓ) رفعہ : من قتل دون مالہ فھو شھید ومن قتل دون دمہ فھو شھید ومن قتل دون دینہ فھو شھید ومن قتل دون اھلہ فھو شھید ۔ (اصحاب سنن)

مال، جان، دین اور اہل و عیال میں سے جس کو بھی بچاتا ہُوا انسان مارا جائے گا شہید ہی ہوگا ۔

۳۱۹۔ ایضاً :

(سوید بن مقرنؓ) رفعہ : من قتل دون مظلمۃ فہو شہید۔ (نسائی) | ظلم کا مقابلہ کرتے ہوئے بھی کوئی مارا جائے تو وہ شہید ہوگا۔

جہاد کے آداب و وجوب

۳۲۰۔ جہاد و نماز کا غیر معیاری امام اور اجتماعیت کی اہمیت :

(ابوھریرۃؓ) رفعہ : الجہاد واجب علیکم مع کل امیر براً کان او فاجراً والصلوٰۃ واجبۃ علیکم خلف کل مسلم براً کان او فاجراً و ان عمل الکبائر۔ (ابو داؤد)

ہر امیر کے ساتھ خواہ وہ متقی ہو یا فاجر، تم پر جہاد فرض ہے۔ اسی طرح نماز ہر مسلمان (امام) کے پیچھے واجب ہے، خواہ وہ متقی ہو یا فاجر، بلکہ کبائر کا مرتکب کیوں نہ ہو چکا ہو۔

۳۲۱۔ جہاد میں ہر صلاحیت سے کام لینا چاہیئے :

(انسؓ) رفعہ : جاھدوا المشرکین باموالکم و انفسکم والسنتکم۔ (ابوداؤد، نسائی)

مشرکین سے اپنے مال، جان اور زبان سب سے جہاد کرو۔

۳۲۲۔ تمنائے جنگ کی ممانعت اور ثابت قدمی کا حکم :

(ابوھریرۃؓ) رفعہ : لا تتمنوا لقاء العدو فاذا لقیتموھم فاصبروا۔ (للشیخین)

دشمن سے مڈبھیڑ کی تمنا نہ کرو۔ لیکن جب مڈبھیڑ ہو جائے تو ثابت قدم رہو۔

۳۲۳۔ ترکِ جہاد کا نتیجہ :

(ابن عمرؓ) اذا تبایعتم بالعینۃ و

جب تم تجارت میں منہمک ہو کر یا بیل کی دم پکڑ

اخذتم اذناب البقر ورضیتم بالزرع وترکتم الجهاد سلط الله علیکم ذلا لا ینزعه عنکم حتی ترجعوا الی دینکم۔ (ابوداؤد)

کر اور کھیتی باڑی میں پھنس کر جہاد ترک کر دو گے، تو اللہ تعالیٰ تم پر ذلّت مسلط کر دے گا اور اس وقت تک تم سے اُسے نہ ہٹائے گا، جب تک تم اپنے صحیح دین پر واپس نہ آ جاؤ۔

۳۲۴۔ جہاد صرف اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے ہونا چاہیے:

(ابوموسیٰؓ) سئل النبی صلی الله علیه وسلم عن الرجل یقاتل شجاعة و یقاتل حمیة ویقاتل ریاء ای ذلک فی سبیل الله؟ فقال من قاتل لتکون کلمة الله هی العلیا فهو فی سبیل الله (للستة الا مالکا)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ ایک شخص جو اظہارِ شجاعت یا حمیّت یا نمائش کے لیے قتال کرے تو ان میں سے کون سا قتال جہاد فی سبیل اللہ ہوگا؟ فرمایا: کوئی بھی نہیں۔ البتہ جو قتال اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے ہو وہی جہاد فی سبیل اللہ ہوگا۔

۳۲۵۔ ایک مخلص خوش نصیب کی داستانِ شہادت:

(شداد بن الهاد) ان رجلا من الاعراب جاء النبی صلی الله علیه وسلم فآمن به واتبعه ثم قال اهاجر معك فاوصی به صلی الله علیه وسلم بعض اصحابه فلما کانت غزاة غنم النبی صلی الله علیه وسلم شیئا فقسم له فاعطی اصحابه ماقسم له وکان یرعی ظهرهم فلما جاء دفعوه الیه فقال ما هذا؟ قالوا قسم قسمه لك النبی صلی الله علیه وسلم فاخذه فجاء به فقال ما هذا؟ قال قسمته لك قال ما علی هذا

ایک اعرابی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر ایمان لایا اور اتباع کا عہد کیا اور کہا کہ: میں آپ کے ساتھ ہجرت کر کے آنا چاہتا ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض صحابہؓ سے اس کا خیال رکھنے کی وصیت فرمائی۔ جب ایک غزوہ پیش آیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ مالِ غنیمت ہاتھ آیا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ میں تقسیم فرمایا اور اس اعرابی کا حصہ بھی الگ کر دیا۔ اعرابی لوگوں کے اُونٹ چرایا کرتا تھا۔ جب وہ واپس آیا تو صحابہ نے اس کا حصہ اُس کے حوالے کر دیا۔ اس نے پوچھا: یہ کیا ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ یہ تمہارا وہ حصہ ہے جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے الگ کر دیا تھا، وہ اُسے لے کر خدمتِ نبوی میں حاضر ہُوا، اور پوچھا کہ: یہ کیسا مال ہے؟ فرمایا: یہ تمہارا حصہ ہے

اتبعتك ولكن اتبعتك على ان ارمى الى ههنا واشار الى حلقه بسهم فاموت فادخل الجنة فقال ان تصدق الله يصدقك فلبثوا قليلا ثم نهضوا فى قتال العدو فاتى به صلى الله عليه وسلم يحمل قد اصابه سهم حيث اشار فقال اهو هو؟ قالوا نعم قال صدق الله فصدقه ثم كفنه صلى الله عليه وسلم فى جبة النبى صلى الله عليه وسلم ثم قدمه فصلى عليه فكان مما ظهر من صلاته اللهم هذا عبدك خرج مهاجرا فى سبيلك فقتل شهيدا انا شهيد على ذلك - (نسائی)

نے لگایا ہے۔ یہ عرض کرنے لگا کہ: میں اس شرط پر تو حضور کا متبع نہیں ہوا تھا۔ میں نے تو اس لیے یہ اتباع اختیار کیا ہے کہ میری اس جگہ۔ اپنے حلق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ تیر لگے اور میں مر کر جنت میں داخل ہو جاؤں۔ فرمایا: اگر تو اللہ کے نزدیک اپنی نیت میں سچا ہے تو اللہ تجھے سچا ہی کر دکھائے گا۔ اس واقعے کے کچھ ہی دنوں بعد ایک اور غزوہ پیش آیا (جس میں وہ اعرابی بھی شریک ہوا۔) اور وہ اٹھا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا گیا۔ اسے ٹھیک اسی جگہ تیر لگا تھا جہاں اس نے اشارے سے بتایا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: یہ وہی ہے؟ جواب ملا۔ ہاں! فرمایا: یہ سچا تھا۔ اللہ نے بھی اسے سچا ہی کر دکھایا۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے جبے میں اسے کفنایا اور نماز جنازہ ادا فرمائی۔ دعائے جنازہ میں یہ الفاظ بھی تھے: (ترجمہ) مولا! یہ تیرا بندہ ہے جو تیری راہ میں مہاجر بن کر نکلا تھا اور شہید ہو کر مرا اور میں اس ہجرت و شہادت کا گواہ ہوں۔

۳۲۶- جنگی احتیاط ضروری چیز ہے:

(کعب بن مالک رض) كان النبى صلى الله عليه وسلم اذا غزا ناحية ورّى بغيرها وكان يقول الحرب خدعة - (ابوداؤد)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ جب کسی خاص سمت میں جنگ کے لیے جانا ہوتا تو گفتگو میں کسی دوسری سمت کا ذکر فرماتے، اور آپ فرمایا کرتے تھے کہ جنگ دھوکا ہے۔

۳۲۷- مجاہد کا بھروسا اسباب پر نہیں بلکہ خدا پر ہوتا ہے:

(انس رض) كان النبى صلى الله عليه وسلم اذا غزا قال اللهم انت عضدى

حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب جنگ فرماتے تو یہ دعا زبان پر ہوتی: (ترجمہ) اے اللہ! ہمارا تو ہی قوتِ بازو اور

ونصيره وبك اقاتل۔ (ابوداؤد)

مددگار ہے اور ہم تیرے ہی بل بوتے پر قتال کرتے ہیں۔

۳۲۸۔ جنگ میں قوانینِ اخلاق:

(انسؓ) ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان اذا بعث جیشًا قال انطلقوا بسم اللہ ولا تقتلوا شیخا فانیا ولا طفلا صغیرا ولا امرأۃ ولا تغلوا وضموا غنائمکم واصلحوا واحسنوا ان اللہ یحب المحسنین۔ (ابوداؤد)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب کوئی جیش روانہ کرتے تو فرماتے کہ اللہ کے نام پر روانہ ہو جاؤ۔ اور کسی بوڑھے کو، کسی بچے کو اور کسی عورت کو قتل نہ کرنا۔ خیانت نہ کرنا، بلکہ غنیمت کو اکٹھا جمع کرنا۔ مصالح عامہ اور حسن کاری کو پیشِ نظر رکھو کہ اللہ تعالیٰ حسن کاروں کو پسند فرماتا ہے۔

جہاد کے ضروری احکام

۳۲۹۔ ایضاً:

(یحیی بن سعیدؓ) ان ابابکر بعث جیوشا الی الشام فخرج یشیعهم فمشی مع یزید بن ابی سفیان وکان امیر ربع من تلک الارباع فقال یزید لابی بکر اما ان ترکب واما ان انزل فقال له ما انت بنازل ولا انا براکب انی احتسب خطای فی سبیل اللہ ثم قال انک ستجد قوما زعموا انهم حبسوا انفسهم للہ فدعهم وما زعموا انهم حبسوا انفسهم له وستجد قوما فحصوا عن اوساط رؤوسهم الشعر فاضرب ما فحصوا عنه بالسیف فانی موصیک بعشر

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جب شام کی طرف لشکر روانہ کرنے لگے تو مشایعت کے لیے باہر نکلے اور یزید بن ابی سفیان کے ساتھ ساتھ، جو چوتھائی لشکر کے امیر تھے پیدل چلنے لگے۔ یزیدؓ نے کہا: یا تو آپ بھی سوار ہو جائیں یا میں نیچے اُتر پڑوں۔ آپ نے فرمایا: نہ تم اُترو اور نہ میں سوار ہوں گا۔ میں تو ثواب سمجھ کر راہِ خدا میں چل رہا ہوں۔ پھر فرمایا: تمھیں وہاں کچھ لوگ ایسے ملیں گے۔ جو اپنے خیال میں اللہ کے لیے گوشہ نشین ہیں۔ ان کو ان کے خیال پر چھوڑ دو اور انھیں قتل نہ کرنا، کچھ لوگ ایسے ملیں گے جنھوں نے اپنے سروں کے بیچ میں بال رکھ چھوڑے ہیں، انھیں تلوار سے صاف کر دینا اور میری یہ دس نصیحتیں بھی ذہن میں رکھنا، کسی،

لا تقتلن امرأة ولا صبيا ولا كبيرا هرما ولا تقطع شجرا مثمرا ولا تخرب عامرا ولا تعقرن شاة ولا بعيرا الا لمأكلة ولا تغرقن نخلا ولا تحرقنه ولا تغلوا ولا تجبنوا۔ (مالک)

عورت، کسی بچے اور کسی بوڑھے کو مت مارنا، کسی پھلدار درخت کو نہ کاٹنا، آبادی کو ویران نہ کرنا، کسی بکری یا اُونٹ کو بلا ضرورتِ طعام ذبح نہ کرنا، کسی درخت خرما کو نہ کاٹنا، نہ جلانا، خیانت نہ کرنا اور بزدلی نہ دکھانا۔

۲۳۰۔ عورتوں کی شرکت جہاد اور دوسرے چند مسائل :

(نجدة بن عامر الحروری) انه كتب الى ابن عباس هل كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يغزو بالنساء؟ وهل كان يضرب لهن بسهم؟ وهل كان يقتل الصبيان؟ ومتى ينقضي يتم اليتيم؟ والخمس لمن هو؟ فقال ابن عباس لولا ان اكتم علما ما كتبت اليه كتبت تسألني هل كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يغزو بالنساء؟ فقد كان يغزو بهن فيداوين الجرحى ويحذين من الغنيمة واما بسهم فلم يضرب لهن وانه لم يكن يقتل الصبيان فلا تقتل الصبيان الا ان تكون تعلم ما علم الخضر من الصبي الذي قتل وزاد في اخرى : وتميز المؤمن فتقتل الكافر وتدع المؤمن واما اليتيم فلعمري ان الرجل لتنبت لحيته وانه لضعيف

(نجدہ بن عامر حروری) نے ابن عباس کو خط لکھ کر یہ مسائل دریافت کیے کہ : کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں کی معیت میں جہاد فرماتے تھے ؟ کیا عورتوں کا حصّہ غنیمت میں ہوتا تھا ؟ کیا بچوں کو قتل کیا جاتا تھا ؟ نیز یہ کہ یتیمی کی حالت کب ختم ہوجاتی ہے ؟ اور خمس کن لوگوں کے لیے ہے؟ ابن عباس (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے جواب دیا کہ : اگر میں علم کو پوشیدہ رکھتا تو تمھیں ان سوالات کا جواب نہ لکھ بھیجتا۔ سوال اوّل کا جواب یہ ہے کہ : حضور صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں کی معیت میں غزوات فرماتے تھے عورتیں زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں اور ان کو مناسب حصّہ غنیمت بھی ملا کرتا تھا۔ دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ بچوں کو قتل نہیں کیا جاتا تھا۔ لہٰذا تم بھی اس وقت تک بچوں کو قتل نہ کرو جب تک تمھیں ویسا علم نہ ہوجائے جیسا کہ حضرت خضر کو اس بچے کے متعلق حاصل تھا جسے انھوں نے قتل کیا۔ ایک اور روایت میں ہے کہ : (اس خضری علم کے بعد بھی) مومن و کافر کا فرق ملحوظ رہے گا۔ یعنی کافر ہی قتل کیا جائے گا نہ کہ مومن۔ چوتھے سوال کا جواب یہ ہے کہ : بخدا بعض اوقات تو ایک آدمی کی داڑھی نکل آتی ہے۔ لیکن لین دین کے معاملے میں اس کی عقل کمزور

الاخذ لنفسه ضعيف العطاء منها واذا اخذ لنفسه من صالح ما يأخذ الناس فقد ذهب عنه اليتم. واما الخمس فانا نقول هو لنا فابى علينا قومنا ذاك (مسلم، ابوداؤد، ترمذی)

ہوتی ہے۔ لہٰذا عام لوگوں کی طرح جب اپنے لیے صحیح انتخاب و پسند کی صلاحیت آجائے تو یتیمی ختم ہو جاتی ہے۔ رہا پانچواں سوال تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہمارے خیال میں خمس ہم ہاشمیوں کا حصہ ہے لیکن اُمت اس کے حق میں نہیں ہے۔

۳۳۱ - مجاہد عورتوں کی خدمات :

(معوذؓ) لقد كنا نغزوا مع النبی صلّی اللّٰہ علیه وسلّم لنسقی القوم ونخدمهم ونرد القتلی والجرحی الی المدینة۔ (بخاری)

ہم عورتیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک غزوات ہوا کرتی تھیں تاکہ پیاسوں کو پانی پلائیں، ان کی خدمت کریں اور مقتولوں اور مجروحوں کو مدینے واپس لے آئیں۔

۳۳۲ - ایضاً :

(ام عطیة) غزوت مع رسول الله صلّی اللّٰہ علیه وسلّم سبع غزوات اخلفهم فی رحالهم فاصنع لهم الطعام واداوی الجرحی واقوم علی المرضی۔ (مسلم)

میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سات غزوات میں شریک رہ چکی ہوں۔ میں خیموں اور ٹھکانوں میں قیام کرتی تھی، جہاں مجاہدوں کے لیے کھانا تیار کرتی، زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی اور مریضوں کی نگہداشت کرتی تھی۔

۳۳۳ - اخلاصِ نیّت اور قدر :

(انسؓ رفعه) : لقد ترکتم بالمدینة اقواما ما سرتم مسيرا ولا انفقتم من نفقة ولا قطعتم من وادٍ الا وهم معكم فيه قالوا يارسول الله وكيف يكونون معنا وهم بالمدينة؟ قال حبسهم العذر۔ (بخاری)

تم (مجاہدین) مدینے میں کچھ ایسے لوگوں کو چھوڑ آئے ہو کہ تمہاری ہر دوڑ، ہر انفاق اور ہر قطع منازل میں وہ تمہارے ساتھ ہیں۔ لوگوں نے عرض کیا کہ : وہ تو مدینے میں ہیں، ہمارے ساتھ ان کا کس طرح شمار ہو سکتا ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : اس لیے کہ وہ مجبوری سے رک گئے ہیں۔

شہسواری و تیر اندازی

۳۲۴ - اسبابِ جہاد کی تیاری اور اس کی فضیلت :

(عقبة بن عامرؓ) رفعه : ان الله تعالیٰ ليدخل بالسهم الواحد ثلاثة نفر الجنة صانعه يحتسب فی عمله الخير والرامی به والممد به فارموا واركبوا واحب الی ان ترموا من ان تركبوا كل لهو باطل ليس من اللهو محمود الا ثلاثة تاديب الرجل فرسه وملاعبته اهله ورميه بقوسه ونبله فانهن من الحق ومن ترك الرمی بعد ما علمه رغبة عنه فانها نعمة تركها او قال كفرها (اصحاب سنن)

اللہ تعالیٰ ایک تیر کے عوض تین طرح کے آدمیوں کو جنت میں داخل کرے گا۔ اس کے بنانے والے کو بشرطیکہ اس نے خیر کی نیت سے بنایا ہو، اس کے چلانے والے کو اور اس کے پیش کرنے والے کو۔ لہٰذا تیر اندازی اور شہسواری کی مشق رکھو۔ اور میرے نزدیک تو تیر اندازی شہسواری سے بھی زیادہ پسندیدہ ہے۔ لہو و لعب سب بے نتیجہ چیزیں ہیں۔ اس میں صرف تین قسم کی چیزیں قابلِ ستائش ہیں۔ گھوڑے کو سکھانا، بیوی سے تفریحی باتیں کرنا اور تیر کمان سے نشانہ بازی کرنا۔ یہ تینوں باتیں نتیجہ خیز ہیں اور جو شخص نشانہ بازی سیکھنے کے بعد بے توجہی کی وجہ سے اُسے ترک کر دے، تو وہ ترکِ نعمت یا کفرانِ نعمت کا ارتکاب کرتا ہے۔

(نوٹ: موجودہ زمانے میں یہ حدیث آلاتِ جنگ کی تیاری پر منطبق ہے)

کتابُ التفسیر

۳۲۵ - تلاوتِ قرآنِ حکیم کی برکات :

(ابو ھریرۃؓ) رفعه : ما اجتمع قوم فی بيت من بيوت الله يتلون كتاب الله ويتدارسونه بينهم الا نزلت عليهم السكينة وغشيتهم الرحمة وحفتهم

جو لوگ کسی مسجد میں یک جا ہو کر کتاب اللہ کی تلاوت کرتے ہیں اور باہم اس کا درس دیتے لیتے ہیں۔ ان پر سکینت نازل ہوتی ہے اور رحمت انھیں ڈھانپ لیتی ہے۔

الملائكة وذكرهم الله فيمن عنده۔ (ابوداؤد)

ملائکہ ان کو گھیر لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ بھی اپنے مقربین میں ان کو یاد فرماتا ہے۔

۲۳۶۔ قرآن میں سفر و اقامت کا اجتماع:

(ابن عباسؓ) قال رجل یارسول اللہ ای العمل احب الی اللہ؟ قال الحال المرتحل قال وما الحال المرتحل؟ قال الذی یضرب من اول القرآن الی اٰخرہ کلما حل ارتحل۔ (ترمذی)

ایک شخص نے پوچھا کہ: یارسول! کونسا عمل اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ پسند ہے؟ فرمایا: الحال المرتحل (سفر میں رہنے والا مقیم) اس نے پوچھا کہ: یہ حال مرتحل کیا چیز ہے۔؟ فرمایا: جو شروع سے آخر تک قرآن (حکیم) کی سیر کرتا ہے، وہ جب قرآن میں حلول (اقامت) کرتا ہے تو سیر و سفر میں ہوتا ہے۔

۲۳۷۔ انہماک قراءت کا اجر:

(ابوسعیدؓ) رفعہ: یقول الرب تعالیٰ من شغلہ قراءۃ القرآن عن مسئلتی اعطیتہ افضل ما اعطی السائلین۔ (ترمذی)

اللہ تبارک و تعالیٰ کا کہنا ہے کہ: اگر کوئی قراءت قرآن کے انہماک کی وجہ سے مجھ سے دُعا مانگنا فراموش کر جائے تو میں دُعا مانگنے والوں سے زیادہ بہتر انعام اُسے دیتا ہوں۔

۲۳۸۔ قراءت قرآن سری و جہری:

(عقبہ بن عامرؓ) رفعہ: الجاھر بالقرآن کالجاھر بالصدقۃ والمسر بالقرآن کالمسر بالصدقۃ (اصحاب سنن)

جو شخص بالجہر قرآن پڑھے وہ علانیہ صدقہ دینے والوں کی طرح ہے اور جو آہستہ پڑھے وہ پوشیدہ صدقہ دینے والے کی مانند ہے۔

۲۳۹۔ روانی کے ساتھ اور اٹک اٹک کر پڑھنے والے:

(عائشہؓ) رفعتہ: الماھر بالقرآن مع السفرۃ الکرام البررۃ والذی یقرأ القرآن ویتتعتع فیہ وھو علیہ شاق

جو تلاوت قرآن کا ماہر (رواں پڑھنے والا) ہو اسے سفرہ کرام بررہ (بزرگ و نیکوکار کاتبین) کی معیت کا شرف حاصل ہوگا اور جو جبر ہونے کے باوجود اٹک اٹک کر پڑھے

له اجران - (ترمذی، ابوداؤد، شیخین بلفظہا)

وہ دُہرے اجر کا مستحق ہوگا۔

۴۴۰ - قراءت سے متعلق عمدہ تشبیہیں:

(انسؓ رفعه: مثل المؤمن الذی یقرأ القرآن مثل الاترجة ریحها طیب وطعمها طیب ومثل المؤمن الذی لا یقرأ القرآن مثل التمرة طعمها طیب ولا ریح لها ومثل الفاجر الذی یقرأ القرآن کمثل الریحانة ریحها طیب وطعمها مر ومثل الفاجر الذی لا یقرأ القرآن کمثل الحنظلة طعمها مر ولا ریح لها ومثل جلیس الصالح کمثل صاحب المسک ان لم یصبک منه شئ اصابک من ریحه ومثل جلیس السوء کمثل صاحب الکیر ان لم یصبک من سواده اصابک من دخانه - (ابوداؤد)

جو مومن قرآن حکیم پڑھتا ہو اس کی مثال اترج (لیموں یا نارنگی) جیسی ہے جس کا مزا بھی اچھا اور خوشبو بھی اچھی۔ جو مومن تلاوتِ قرآن نہ کرتا ہو تو وہ گویا چھوہارا ہے جس کا مزہ تو اچھا ہے۔ لیکن خوشبو کوئی نہیں اور وہ فاجر جو قرآن پڑھتا ہو ایسا ہے جیسا ریحانہ (خوشبودار پودا) جس کی مہک اچھی اور مزا کڑوا، اور جو فاجر تلاوتِ قرآن نہ کرتا ہو۔ اس کی مثال حنظلہ (اندرائن) جیسی ہے جس کا مزا کڑوا اور بُو کوئی نہیں۔

اور صالح کا ہم نشین ایسا ہے جیسے مشک پاس رکھنے والا یعنی اگر مشک میسر نہ آئے تو لپیٹ تو آ ہی جائے گی۔

اور بُری صحبت میں رہنے والا ایسا ہے جیسے بھٹی والا کہ اگر سیاہی سے بچ بھی گیا تو دھواں تو لگ ہی جائے گا۔

۴۴۱ - قاریِ قرآن غلام کو امیر بنایا گیا:

(عامر بن واثلة) ان نافع بن عبد الحارث لقی عمرؓ بعسفان وکان عمرؓ استعمله علی مکة فقال من استعملت علی اهل الوادی؟ قال ابن ابزی قال ومن ابن ابزی؟ قال مولی من موالینا قال فاستخلفت علیهم مولی؟ قال انه قاریٔ لکتاب الله تعالی وعالم بالفرائض

نافع بن عبد الحارث نے عسفان میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملاقات کی۔ ان کو حضرت عمرؓ نے مکے کا عامل بنایا تھا۔ انھوں نے پوچھا کہ: آپ نے اہلِ وادی کا عامل کسے بنا دیا ہے؟ کہا: ابن ابزیٰ کو۔ پوچھا: ابن ابزیٰ کون ہے؟ کہا: میرا ایک غلام ہے۔ بولے: آپ نے ایک غلام کو ان کا عامل بنایا ہے؟ کہا: ہاں! وہ کتاب اللہ کا قاری ہے اور علم فرائض سے واقف ہے۔ پھر آپ نے کہا کہ:

قال عمرؓ اما ان نبیکم صلی اللہ علیہ وسلم قد قال ان اللہ یرفع بھذا الکتاب اقواماً ویضع بہ اٰخرین۔ (مسلم)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ: اسی کتاب اللہ کے ذریعے اللہ تعالےٰ کسی قوم کو اٹھاتا ہے اور کسی کو گراتا ہے۔

۳۴۲ - خانہ خراب کون ہے؟:

(ابن عباسؓ) ان الذی لیس فی جوفہ شئی من القرآن کالبیت الخرب (ترمذی)

وہ شخص جس کے اندر قرآن کا کوئی حصہ محفوظ نہ ہو ایسا ہی ہے جیسے خانۂ خراب۔

۳۴۳ - قرآن پڑھ کر کس سے سوال کیا جائے؟:

(عمران بن حصین) رفعہ: من قرأ القرآن فلیسأل اللہ بہ فانہ سیجئ اقوام یقرؤن القرآن ویسألون بہ الناس۔ (ترمذی)

جو قرآن پڑھتا ہے وہ اس کے وسیلے سے اللہ ہی سے سوال کرے کیونکہ آئندہ کچھ لوگ ایسے ہوں گے جو قرآن پڑھ کر اسے لوگوں سے سوال کرنے کا ذریعہ بنائیں گے۔

۳۴۴ - ایمان بالقرآن کس کا نہیں ہوتا؟:

(صہیبؓ) رفعہ: ما آمن بالقرآن من استحل محارمہ۔ (ترمذی)

جو قرآن کریم کی حرام کردہ چیز کو حلال سمجھے۔ اُس کا قرآن پر ایمان ہی نہیں۔

۳۴۵ - کرامتِ قرآنی اور استعارے کی گفتگو:

(عقبۃ بن عامرؓ) لو ان القرآن جعل فی اھاب ثم القی فی النار ما احترق۔ (احمد، موصلی)

اگر قرآن حکیم کو کسی کھال میں لپیٹ کر آگ میں ڈال دیا جائے تو جل نہ سکے[1] گا

---

[1] انسان خود کھال ہے جس کے اندر اگر قرآن اُتر جائے تو یہ واقعی سزاوار دوزخ نہیں ہو گا۔ اس حدیث کا مطلب یہ نہیں کہ اگر قرآن کو کھال کے غلاف میں لپیٹ کر آگ میں ڈال دیا جائے تو وہ نہیں جلے گا جو لوگ ہر جگہ الفاظ کو ظاہر پر محمول کرنے کے عادی ہوتے ہیں انھیں اس حدیث پر خوب غور کرنا چاہیئے۔

۳۴۶ - برکات قرآنی :

(ابوھریرۃؓ) رفعہ : القرآن غنی لا فقر بعدہ و لا غنی دونہ - (کبیر بضعف)

قرآن تو سراپا غنا (امیری) ہے۔ نہ اس کے بعد کوئی فقر ہے اور نہ اس کے علاوہ کوئی غنا ہے۔

۳۴۷ - سبع مثانی کیا چیز ہے ؟ :

(ابوھریرۃؓ) رفعہ : الحمد للہ رب العالمین ، اُمّ القرآن واُمّ الکتاب والسبع المثانی ۔ (ابوداؤد ، ترمذی)

الحمد للہ رب العالمین (یعنی سورۂ فاتحہ) اُمّ القرآن یا اُم الکتاب ہے اور یہی سبع مثانی ہے۔

۳۴۸ - قرآن سیکھنے والے کی اعلیٰ مثالیں :

(ابوھریرۃؓ)...... فقال صلی اللہ علیہ وسلم تعلموا القرآن واقرؤوہ وقوموا بہ فان مثل القرآن لمن تعلمہ فقرأہ وقام بہ کمثل جراب محشو مسکا یفوح بریحہ کل مکان ومثل من تعلمہ ویرقد وھو فی جوفہ کمثل جراب اوکی علی مسک۔ (ترمذی)

...... حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : قرآن سیکھو، پڑھو اور قیام لیل میں اسی کو دہراؤ۔ جو ایسا کرتا ہے۔ اُس کے لیے قرآن گویا ایسی تھیلی ہے جس میں مُشک بھری ہو اور اُس کی خوشبو پھیل رہی ہو، اور جو سیکھنے کے بعد آرام کرے اور قرآن اس کے ذہن میں محفوظ ہو، اس کے لیے قرآن گویا ایسی مُشک کی تھیلی ہے جس کا منہ بند ہو۔

۳۴۹ - فضیلت سورۂ بقرہ :

(ابوھریرۃؓ) رفعہ : لا تجعلوا بیوتکم مقابر ان الشیطٰن ینفر من البیت الذی تقرأ فیہ سورۃ البقرۃ ۔ (مسلم ، ترمذی)

اپنے گھروں کو مقبرے نہ بناؤ۔ جس گھر میں سورۂ بقرہ کی تلاوت کی جاتی ہے وہاں سے شیطان بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔

۳۵۰۔ بعض اور سورتوں کے فضائل :

(ابن عمرؓ) من سرہ ان ینظر الی یوم القیامۃ کأنہ رأی عین فلیقرأ اذا الشمس کورت واذا السماء انفطرت واذا السماء انشقت۔ (ترمذی)

جو قیامت کو گویا سر کی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہے' وہ ان سورتوں کو پڑھ لے : اذا الشمس کورت الخ۔ اذا السماء انفطرت الخ اور اذا السماء انشقت الخ۔

سورۂ بقرہ

۳۵۱۔ آیتِ طوافِ صفا و مروہ کی تفسیر :

(عروہؓ) سألت عائشۃؓ فقلت لھا ارأیت قول اللہ تعالیٰ ان الصفا والمروۃ من شعائر اللہ فمن حج البیت او اعتمر فلا جناح علیہ ان یطوف بھما فو اللہ ما علی احد جناح ان لا یطوف بالصفا والمروۃ قالت بئس ما قلت یا ابن اختی ان ھذہ لو کانت علی ما اوّلتھا کانت لا جناح ان لا یطوف بھما ولکنھا انزلت فی الانصار کانوا قبل ان یسلموا یھلّون لمناۃ الطاغیۃ التی کانوا یعبدونھا عند المشلل وکان من اھلّ لھا یتحرج ان یطوف بالصفا والمروۃ فلما اسلموا سألوا النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن ذلک فقالوا

میں نے حضرت عائشہؓ سے آیت ان الصفا والمروۃ من شعائر اللہ فمن حج البیت او اعتمر فلا جناح علیہ ان یطوف بھما کی تفسیر دریافت کرتے ہوئے اپنا خیال ظاہر کیا کہ اگر کوئی صفا و مروہ کا طواف نہ کرے تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا، اے ہمشیرزادے تم نے بالکل غلط بات کہی، تمھاری بتائی تفسیر جب صحیح ہو سکتی تھی کہ آیت یوں ہوتی : فلا جناح ان لا یطوف بھما۔ بات یہ ہے کہ آیت انصار کے بارے میں اُتری ہے جو قبل از اسلام منات کے لیے تہلیل کرتے تھے۔ اور اسی کی پوجا مشلل کے پاس کرتے تھے' اس وقت جو منات کے لیے تہلیل کرتا تھا وہ صفا و مروہ کے طواف کو گناہ سمجھتا تھا، اسلام لانے کے بعد اُنھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ : یا رسول اللہ! ہم لوگ صفا و مروہ کے

یارسول اللہ انا کنا نتحرج ان نطوف بین الصفا والمروۃ فانزل اللہ تعالیٰ ان الصفا والمروۃ من شعائر اللہ الآیۃ وقد سن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الطواف بینھما۔ (بخاری، نسائی)

طواف کو گناہ سمجھتے تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی وان الصفا والمروۃ (الآیۃ) اس کے بعد حضرت عائشہ رضؓ نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طواف کو سنت قرار دیا ہے۔

۲۵۲ - آیتِ اطاقتِ صوم کی صحیح تفسیر:

(ابن عباسؓ) وعلی الذین یطیقونہ فدیۃ طعام مسکین قال لیست بمنسوخۃ ھی للشیخ الکبیر والمرأۃ الکبیرۃ لا یستطیعان ان یصوما فیطعمان مکان کل یوم مسکینا۔ (بخاری، نسائی)

ابن عباسؓ نے کہا کہ: وعلی الذین یطیقونہ فدیۃ طعام مسکین۔ ہرگز منسوخ نہیں بلکہ بہت بوڑھوں کے لیے ہے جو روزے رکھنے کی استطاعت نہیں رکھتے ایسے لوگ ہر روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلادیں۔

۲۵۳ - آیت تزوّد کی تفسیر:

(ابن عباسؓ) کان اھل الیمن یحجون ولا یتزودون ویقولون نحن المتوکلون فاذا قدموا مکۃ سألوا الناس فانزل اللہ تعالیٰ وتزودوا فان خیر الزاد التقوی۔ (بخاری، ابو داؤد)

اہل یمن جب حج کرتے تھے تو زادِ راہ ساتھ نہ لیتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم متوکل لوگ ہیں جب وہ مکے میں پہنچے تو لوگوں سے اس بارے میں مسئلہ دریافت کیا۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی کہ: وتزودوا فان خیر الزاد التقوی (زادِ راہ ساتھ رکھا کرو بہترزادِ راہ لینا عین تقویٰ ہے۔)

۲۵۴ - فضلِ الٰہی کی جستجو کوئی گناہ نہیں:

(ابو امامۃ التیمی) کنت رجلا اکری فی ھذا الوجہ وکان الناس

میں حج کے موقع پر سواری کرائے پر دے دیا کرتا تھا۔ لوگ کہنے لگے کہ: تیرا حج نہیں ہوا۔ میں ابن عمر

يقولون لى انه ليس لك حج فلقيت ابن عمر فقلت يا ابا عبد الرحمٰن كنت رجلا اكرى فى هذا الوجه وان ناسا يقولون انه ليس لك حج فقال ابن عمر أليس تحرم وتلبي وتطوف بالبيت وتفيض من عرفات و ترمى الجمار؟ قلت بلى قال فان لك حجا جاء رجل الى النبي صلى الله عليه وسلم فسأله عن مثل ما سألتني فسكت حتى نزلت هذه الآية ليس عليكم جناح ان تبتغوا فضلاً من ربكم فارسل اليه وقرأها عليه وقال لك حج۔ (ابو داؤد)

رضی اللہ عنہ سے ملا اور پوچھا کہ: اے ابو عبدالرحمٰن میں حج میں اپنا جانور کرائے پر دیتا ہوں اور لوگ کہتے ہیں کہ تیرا حج ہی نہیں ہوا۔ آپ نے کہا کہ: کیا تم احرام نہیں باندھتے تلبیہ نہیں کرتے۔؟ طواف نہیں کرتے۔؟ عرفات سے واپس نہیں ہوتے؟ رمی جمارہ نہیں کرتے؟ اس نے کہا: کیوں نہیں۔ سب مراسم ادا کرتا ہوں، کہا: تو پھر تمھارا حج بھی ہو گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص نے یہی سوال کیا تھا جو تم نے ابھی کیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے اور یہ آیت نازل ہوئی کہ: لیس علیکم جناح ان تبتغوا فضلا من ربکم (فضل الٰہی کی جستجو کوئی گناہ نہیں) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آدمی کو بلا بھیجا اور یہ آیت تلاوت کر کے فرمایا کہ: تیرا حج ہو گیا۔

سورۂ آل عمران

۳۵۵۔ ایک سوال کا لطیف جواب:

(ابو ھریرۃؓ) جاء رجل الى النبي صلى الله عليه وسلم قال ارأيت قوله: وجنة عرضها السموات والارض فاين النار؟ قال ارأيت الليل فالتبس كل شئ فاين النهار؟ قال حيث شاء الله قال فكذلك حيث شاء الله

(بزار)

ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ: وجنۃ عرضھا السموات والارض (جنت کی پہنائی زمین و آسمان کے برابر ہے) تو یہ دوزخ کدھر جائے گی؟ فرمایا:

جب رات آتی ہے اور کوئی شے سجھائی نہیں دیتی تو دن کہاں چلا جاتا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ: جہاں اللہ تعالیٰ چاہتا ہے فرمایا: اسی طرح اسے بھی سمجھو کہ جہاں اللہ تعالیٰ چاہے گا وہاں دوزخ چلی جائے گی۔

سُورۃ النساء

۲۵۶ - بحالتِ امن سفر میں قصرِ نماز کیوں ہے ؟ :

(یعلی بن اُمیّۃ) قلت لعمرؓ لیس علیکم جناح ان تقصروا من الصلوٰۃ ان خفتم ان یفتنکم الذین کفروا فقد امن الناس فقال عجبت مما عجبت منہ فسألت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من ذٰلک فقال صدقۃ تصدق اللہ بھا علیکم فاقبلوا صدقتہ ۔ (مسلم، اصحاب سنن)

میں نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے یہ آیت پڑھی : لیس علیکم جناح ان تقصروا من الصلوٰۃ ان خفتم ان یفتنکم الذین کفروا (قصرِ نماز میں کوئی مضائقہ نہیں، اگر تمھیں یہ اندیشہ ہو کہ کفار تمھیں فتنے میں ڈالیں گے) اور کہا کہ : اب تو لوگ امن سے ہیں (لہٰذا اب سفر میں قصر کیوں کیا جائے؟) آپ نے جواب دیا کہ : مجھے بھی یہی کھٹک پیدا ہوئی تھی ۔ آخر میں نے حضورؐ سے اس کے متعلق دریافت کیا تو حضورؐ نے فرمایا : یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک صدقہ ہے اسے قبول کر لینا چاہیے۔

۲۵۷ - جزائے عمل کی ایک خاص نوعیت :

(ابو ھریرۃؓ) لما نزلت من یعمل سوءًا یجز بہ بلغت من المسلمین مبلغا شدیدا قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قاربوا وسددوا ففی کل ما یصاب بہ المسلم کفارۃ حتی النکبۃ ینکبھا او الشوکۃ یشاکھا ۔ (مسلم، ترمذی وعن ابی بکر الصدیق)

جب آیت میں من یعمل سوءًا یجز بہ (انسان کوئی بدی بھی کرے گا تو اس کی سزا ملے گی) نازل ہوئی تو مسلمانوں کو بڑی شدید فکر لاحق ہوئی ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے (یہ معلوم کر کے) فرمایا کہ : میانہ روی اختیار کرتے رہو، تو مسلمان پر جو بھی مصیبت آئے گی وہ اس کے لیے کفارہ بن جائے گی ۔ حتیٰ کہ وہ بیماری بھی جو وہ جھیلے اور وہ کانٹا بھی جو اُسے چبھے ۔

طٰہٰ

۳۵۸ - دین کا مقصد ریاضت شاقہ نہیں :

(علیؓ) کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یراوح بین قدمیہ یقوم علی کل رجل حتی نزلت ما انزلنا علیک القرآن لتشقٰی ۔ (بزار ملین)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم باری باری ایک پاؤں پر کھڑے ہو کر ریاضت و عبادت فرماتے تھے۔ آخر یہ آیت نازل ہوئی کہ: ما انزلنا علیک القرآن لتشقٰی ۔ (یعنی ہم نے تم پر قرآن حکیم اس لیے تو نہیں اتارا کہ تم مصیبت میں پڑ جاؤ)

رُوم

۳۵۹ - قرآن حکیم میں نماز پنجگانہ :

(ابو رزینؓ) خاصم نافع بن الازرق ابن عباس فقال تجد الصلوٰت الخمس فی کتاب اللہ؟ قال نعم فقرأ علیہ سبحان اللہ حین تمسون المغرب حین تصبحون الصبح وعشیا العصر وحین تظہرون الظہر ومن بعد صلوٰۃ العشاء ۔ (کبیر بضعف)

نافعؓ بن ازرق نے عبداللہ بن عباسؓ سے مباحثہ کرتے ہوئے پوچھا کہ: کیا آپ کو قرآن میں نماز پنجگانہ کا صریح حکم ملتا ہے؟ ابن عباسؓ نے جواب دیا: ہاں! اس کے بعد آپ نے یہ آیت پڑھی: (ترجمہ) اللہ کی تسبیح کرو بوقت مسا یعنی مغرب اور بوقت صبح یعنی فجر اور بوقت عشی یعنی عصر اور بوقت دوپہر یعنی ظہر اور نماز عشاء کے بعد ۔

تحریم

۳۶۰ - تدبر قرآن کا مطلب محض لغوی تحقیق نہیں :

(انسؓ) ان عمر قرأ فاکہۃ وابا فقال

حضرت عمرؓ نے ایک بار "فاکہۃ وابا" والی آیت

فما الاب؟ ثم قال ما کلفنا او امرنا بھذا۔ (بخاری)

تلاوت کی اور کہا کہ: یہ "اب" کیا چیز ہے؟ پھر خود ہی بولے کہ: ہمیں اس کا نہ مکلف (پابند) کیا گیا ہے نہ اس کا حکم دیا گیا ہے۔

آداب تلاوت وغیرہ

۳۶۱۔ گر تو قرآن بریں نمط خوانی:

(البراءؓ) رفعه: زینوا القرآن باصواتکم۔ (ابوداؤد، نسائی)

قرآن حکیم کو اچھی آواز سے پڑھا کرو۔

۳۶۲۔ قراءت سے دوسروں کو دق کرنا:

(ابو سعیدؓ) اعتکف النبی صلی اللہ علیہ وسلم المسجد فسمعھم یجھرون بالقرآن فکشف الستر وقال الا ان کلکم مناج ربه فلا یؤذین بعضھم بعضا ولا یرفع بعضکم علی بعض فی القراءۃ او قال فی الصلوۃ۔ (ابوداؤد)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں معتکف تھے کہ بعض لوگوں کو زور زور سے قرآن پڑھتے سنا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پردہ ہٹا کر فرمایا کہ: تم میں سے ہر شخص مناجات الٰہی کر رہا ہے۔ لہٰذا ایک دوسرے کو خلل نہ پہنچائے اور دوسرے کی قراءت یا نماز میں حارج نہ ہو۔

۳۶۳۔ دور قرآنی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم:

ابو ھریرۃؓ) کان یعرض علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم القرآن کل عام فعرض علیه مرتین فی العام الذی قبض فیه۔

(بخاری)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر سال رمضان المبارک میں قرآن حکیم کا ایک دور (جبریل علیہ السلام) سے فرمایا کرتے تھے اور سال وفات میں دو دور فرمائے۔

اذکار و ادعیہ

۳۶۴۔ سو بات کی ایک بات:

(عبد اللہ بن بسرؓ) ان رجلا قال یا رسول اللہ ان ابواب الخیر کثیرۃ ولا استطیع القیام بکلها فاخبرنی عن شئی اتشبث به ولا تکثر علیّ فانسی قال لا یزال لسانک رطبًا بذکر اللہ۔ (ترمذی)

ایک شخص نے عرض کیا کہ: یا رسول اللہ! خیر کے تو بے شمار دروازے ہیں اور میں ان سب پر عمل کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا۔ لہٰذا مجھے کوئی ایک بات بتا دیجیے جس سے میں چمٹا رہوں۔ لیکن اتنی لمبی بات نہ ہو جو میں یاد نہ رکھ سکوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ذکرِ الٰہی میں ہمیشہ تر زبان رہو۔

۳۶۵۔ حسین بدلے:

(ابو ہریرۃؓ) رفعه: یقول اللہ تعالیٰ انا عند ظن عبدی بی وانا معه اذا ذکرنی فان ذکرنی فی نفسه ذکرته فی نفسی وان ذکرنی فی ملاء ذکرته فی ملاء خیر منه وان تقرب الیّ شبرا تقربت الیه ذراعا وان تقرب الیّ ذراعا تقربت الیه باعا وان اتانی یمشی اتیته هرولة۔ (شیخین، ترمذی)

اللہ تعالیٰ کا کہنا ہے کہ: میرا بندہ میرے متعلق جیسا گمان رکھتا ہے، میں اسی گمان سے متصل ہوتا ہوں جب وہ مجھے یاد کرتا ہے تو میں اس کے ساتھ ہی ہوتا ہوں، جب وہ اپنے دل میں یاد کرتا ہے تو میں بھی اُسے اپنے دل میں یاد کرتا ہوں۔ اور جب وہ مجھے کسی محفل میں یاد کرتا ہے تو میں اُسے اس سے بہتر محفل میں یاد کرتا ہوں اور جب وہ میری طرف ایک بالشت بڑھتا ہے تو میں اس کی جانب ایک ہاتھ بڑھتا ہوں اگر وہ ایک ہاتھ بڑھتا ہے تو میں ایک باع (دو ہاتھ) بڑھتا ہوں جب وہ میری طرف خراماں خراماں آتا ہے تو میں اس کی طرف دوڑتا ہوا جاتا ہوں۔

۳۶۶۔ دُنیا کی جنت:

(انسؓ) رفعه: اذا مررتم بریاض الجنّة فارتعوا قالوا وما ریاض الجنّة

جب تم جنت کے باغوں کے پاس سے گزرو تو خوب آسودگی حاصل کرو۔ لوگوں نے عرض کیا کہ: یا رسول اللہ! جنت کے

قال حلق الذکر (ترمذی)

باغ کون سے ہیں؟ فرمایا: ذکر الٰہی کے حلقے۔

۳۶۷ - قابلِ رشک اہلِ محبت:

(ابو درداءؓ) رفعہ: لیبعثن اللہ اقواما یوم القیامۃ فی وجوھھم النور علی منابر اللؤلؤ یغبطھم الناس لیسوا انبیاء ولا شھداء قال فجثی اعرابی علی رکبتیہ فقال یا رسول اللہ حلھم لنا نعرفھم قال ھم المتحابون فی اللہ من قبائل شتی و بلاد شتی یجتمعون علی ذکر اللہ یذکرونہ (کبیر)

اللہ تعالیٰ بروزِ حشر کچھ ایسے لوگوں کو اٹھائے گا جن کے چہروں پر نور جھلک رہا ہوگا۔ وہ موتیوں کے منبر (تخت) پر بیٹھے ہوں گے اور لوگ انھیں رشک کی نگاہوں سے دیکھ رہے ہوں گے، حالانکہ نہ وہ نبی ہوں گے نہ شہید۔ یہ سن کر ایک اعرابی اپنے گھٹنوں کے بل کھڑا ہوگیا اور عرض کیا کہ: ان کی صفت بیان فرمائیے یا رسول اللہ! تاکہ ہم بھی ان کو کچھ لیں؟ فرمایا: یہ وہ لوگ ہیں جو ہیں تو مختلف قبیلوں اور مختلف ملکوں کے، لیکن محض اللہ تعالیٰ کے لیے ایک دوسرے سے محبت رکھتے ہیں اور یکجا ہو کر ذکر الٰہی میں مصروف ہوتے ہیں۔

۳۶۸ - اولیاء اللہ کی پہچان:

(ابن مسعودؓ) رفعہ: ان من الناس مفاتیح لذکر اللہ اذا رأوا ذکر اللہ (کبیر وفیہ عمر بن القاسم)

بعض لوگ ذکر الٰہی کی کنجی ہوتے ہیں، یعنی جب ان پر نظر پڑتی ہے تو اللہ یاد آجاتا ہے۔

۳۶۹ - بہترین ذکر اور بہترین روزی:

(سعد بن مالکؓ) رفعہ: خیر الذکر الخفی وخیر الرزق ما یکفی۔ (احمد، موصلی، سلبین)

بہترین ذکر وہ ہے جو پوشیدہ ہو اور بہترین رزق وہ ہے جو کافی ہو جائے (یعنی ضرورت سے زائد نہ ہو)

۳۷۰ - غافلوں میں یادِ الٰہی کرنے والے کا درجہ:

(مالکؒ) بلغنی ان النبی صلی اللہ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ: غافلوں

علیہ وسلم کان یقول ذاکر اللہ فی الغافلین کالمقاتل خلف الفارین و ذاکر اللہ فی الغافلین کغصن اخضر فی شجر یابس و ذاکر اللہ فی الغافلین مثل مصباح فی بیت مظلم و ذاکر اللہ فی الغافلین یریہ اللہ مقعدہ من الجنۃ وھو حی و ذاکر اللہ فی الغافلین یغفرلہ بعدد کل فصیح واعجم والفصیح بنو آدم والا عجم البھائم۔ (رزین)

(یعنی جو یادِ الٰہی سے غافل ہوں) میں یادِ الٰہی کو باقی رکھنے والا ایسا ہی ہے جیسے قتال سے بھاگنے والوں میں قتال کو جاری رکھنے والا۔ یا سوکھے درخت میں ہری ٹہنی ہو یا تاریک گھر میں روشن چراغ ہو۔ یہ غافلوں میں یادِ الٰہی کرنے والا وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ زندگی ہی میں اُس کا مقامِ جنت دکھا دیتا ہے۔ اور تمام فصیح (بنی آدم) اور تمام اعجم (چوپایوں) کی تعداد کے برابر بھی اس کے گناہ ہوں تو ان کی مغفرت فرما دیتا ہے۔

۲۷۱۔ ذکرِ الٰہی کس حد تک ہو:

(ابو سعیدؓ) رفعہ: اکثروا ذکر اللہ حتّٰی یقولوا مجنون (احمد، موصلی، بلین)

ذکرِ الٰہی تو اس کثرت سے کیا کرو کہ لوگ مجنوں سمجھنے لگیں۔

۲۷۲۔ ذکرِ الٰہی اور نجات:

(معاذؓ) ما عمل ابن آدم من عمل انجی لہ من عذاب اللہ من ذکر اللہ۔ (مالک، ترمذی)

عذابِ الٰہی سے نجات دینے والا کوئی عملِ انسانی ذکرِ الٰہی سے بڑھ کر نہیں۔

۲۷۳۔ دُعا عین عبادت ہے:

(النعمان بن بشیرؓ) رفعہ: الدعاء ھو العبادۃ ثم قراء وقال ربکم ادعونی استجب لکم الذین یستکبرون عن عبادتی سیدخلون جھنم

دُعا تو عین عبادت ہے۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی (ترجمہ) تمھارے رب کا ارشاد ہے کہ مجھ سے دُعا کرو میں قبول کروں گا۔ جو لوگ میری عبادت سے سرتابی کرتے ہیں وہ جلد ہی جہنم

داخرین ۔ (ابوداؤد، ترمذی، بلفظہ) میں رسوائی کے ساتھ داخل ہوں گے ۔

۳۷۴ ۔ دُعا مغزِ عبادت ہے :

(انسؓ) رفعہ : الدعاء مخ العبادۃ (ترمذی) دُعا تو عبادت کا مغز ہے ۔

۳۷۵ ۔ سب سے بہتر دُعا کس چیز کی ہوتی ہے :

(ابن عمرؓ) رفعہ : من فتح لہ باب الدعاء فتحت لہ ابواب الرحمۃ وما سئل اللہ تعالیٰ شیئاً احب الیہ من ان یسأل العافیۃ وان الدعاء ینفع مما نزل ومما لم ینزل ولا یرد القضاء الا الدعاء فعلیکم بالدعاء ۔ (ترمذی)

جس کے لیے دُعا کا دروازہ کھلا اس کے لیے رحمت کے تمام دروازے کھل گئے ، اللہ تعالیٰ کو جو سوال سب سے زیادہ پسند ہے وہ اس آفت کے لیے ہے جو نازل ہو چکی ہو اور اس آفت کے لیے بھی جو ابھی نازل نہ ہوئی ہو ۔ دُعا ہی ہے جو تقدیر کو بھی بدل دیتی ہے ۔ لہٰذا دعا کا التزام رکھو ۔

۳۷۶ ۔ دُعا کی قبولیت کے کئی انداز ہیں :

(جابرؓ) رفعہ : مامن عبد یدعو بدعاء الا اتاہ اللہ ماسأل او کف عنہ من السوء مثلہ مالم یدع باثم او قطیعۃ رحم (ترمذی)

بندہ جس چیز کی بھی دُعا کرتا ہے ، اللہ تعالیٰ اُسے یا تو مرحمت فرما دیتا ہے یا اس کے برابر آنے والی آفت سے اسے بچا لیتا ہے ، بشرطیکہ وہ دُعا کسی گناہ یا قطع رحمی سے تعلق نہ رکھتی ہو ۔

۳۷۷ ۔ دُعا مومن کا ہتھیار ہے :

(جابرؓ) رفعہ : ألا ادلکم علی ما ینجیکم من عدوکم ویدر لکم ارزاقکم ؟ تدعون اللہ فی لیلکم ونہارکم فان الدعاء سلاح المؤمن ۔ (موصلی بضعف)

میں تمھیں ایک ایسی چیز نہ بتا دوں جو تمھیں دشمن سے بھی نجات دے اور فراوانی رزق کا بھی سبب بن جائے ؟ سنو ! دن رات اللہ تعالیٰ سے دُعا کیا کرو ۔ دُعا ہی مومن کا ہتھیار ہے ۔

دُعا کے اوقات اور کیفیات وغیرہ

۳۷۸۔ رحمت کی پکار:

(ابو ھریرۃؓ) رفعہ: ینزل ربنا کل لیلۃ الی سماء الدنیا حین یبقی ثلث اللیل الاخر فیقول من یدعونی فاستجیب لہ؛ من یسألنی فاعطیہ من یستغفرنی فاغفرلہ۔

اللہ تعالیٰ ہر رات کی آخری تہائی میں سماءِ دنیا پر نزول فرماتا ہے اور آواز دیتا ہے کہ: کون ہے جو مجھے پکارے اور میں اسے جواب دوں؟ کون ہے جو کچھ مانگے اور میں اسے عطا کروں؟ کون ہے جو مغفرت چاہے اور میں مغفرت کروں۔

۳۷۹۔ اوقاتِ مقبولیت:

(ابوامامۃؓ) قیل یارسول اللہ ای الدعاء اسمع؟ قال جوف اللیل الاخر ودبرالصلوٰت المکتوبۃ (ترمذی)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ: کون سی دعا سب سے زیادہ سُنی جاتی ہے؟ فرمایا: وہ دُعا جو رات کے آخری حصے میں ہو اور وہ دُعا جو فرض نمازوں کے بعد ہو۔

۳۸۰۔ سجدے میں دُعا:

(ابو ھریرۃؓ) رفعہ: اقرب مایکون العبد من ربہ تعالیٰ وھوساجد فاکثروا الدعاء (مسلم، ابوداؤد، نسائی)

بندہ اپنے رب سے سب سے زیادہ اس وقت قریب ہوتا ہے جب وہ حالتِ سجود میں ہوتا ہے۔ لہٰذا (بحالت سجدہ) خوب دُعا کیا کرو۔

۳۸۱۔ آسائش میں دُعا کی برکات:

(ابو ھریرۃؓ) رفعہ: من سرّہ ان یستجیب اللہ لہ عند الشدائد

جسے یہ پسند ہو کہ مصائب و آلام کے وقت اللہ تعالیٰ اُس کی دُعائیں قبول فرمائے تو وہ راحت و آرام کی

والکرب فلیکثر الدعاء فی الرخاء۔ (ترمذی)

حالت میں بھی بکثرت دُعائیں کیا کرے۔

۳۸۲۔ زوردار التجا اللہ پر دباؤ ڈالنا نہیں:

(ابوھریرۃؓ) رفعہ: اذا دعا احدکم فلا یقل اللھم اغفرلی ان شئت اللھم ارحمنی ان شئت ولکن یعزم المسئلۃ فان اللہ لا مکرہ لہ۔ (للستۃ الا النسائی)

جب کوئی دُعا کرے تو یوں نہ کہے کہ: اے اللہ! اگر تو چاہے تو میری مغفرت فرما۔ اگر تیری مرضی ہو تو مجھ پر رحم فرما۔ بلکہ پورے عزم کے ساتھ (یعنی کسی شرط اور اگر مگر کے بغیر) سوال کرے (اس عزم سے) اللہ تعالیٰ پر دباؤ ڈالنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۳۸۳۔ جامع دُعا سے دلچسپی:

(عائشۃؓ) کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یستحب الجوامع من الدعاء ویدع ماسوی ذلک (ابوداؤد)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایسی دعاؤں کو پسند فرماتے تھے جو جامع ہوں۔ غیر جامع دُعاؤں کو چھوڑ دیا کرتے تھے۔

۳۸۴۔ عدمِ قبول کا گلہ:

(ابوھریرۃؓ) رفعہ: یستجاب لاحدکم مالم یعجل یقول قد دعوت ربی فلم یستجب لی۔ (للستۃ الا النسائی)

بعض لوگوں کی دُعا اس صورت میں قبول ہوتی ہے کہ وہ جلدی نہ مچائیں اور یہ نہ کہیں کہ: میں نے اللہ تعالیٰ سے دُعا تو کی مگر اس نے قبول نہ کی۔

۳۸۵۔ کلماتِ بددُعا سے اجتناب کرو:

(جابرؓ) رفعہ: لاتدعوا علی انفسکم ولاتدعوا علی اولادکم ولاتدعوا علی خدمکم ولاتدعوا علی خدمکم ولاتدعوا علی اموالکم لا یوافق من اللہ ساعۃ نیل فیھا عطاء فیستجاب لکم۔ (ابوداؤد)

اپنی ذات یا اپنی اولاد یا اپنے نوکروں یا اپنے مال کے لیے بددُعا کے الفاظ منہ سے نہ نکالا کرو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ وقت قبولیت کا ہو اور تمھیں لینے کے دینے پڑجائیں۔

۳۸۶۔ جو مانگنا ہو اللہ ہی سے مانگو:

(انسؓ رفعه) لیسأل احدکم ربّه حاجته کلها حتی یسأل شسع نعله اذا انقطع ۔ (ترمذی)

اپنی ساری حاجتیں اللہ ہی سے طلب کرو۔ حتیٰ کہ اگر جوتی کا تسمہ بھی ٹوٹ جائے، تو وہ بھی اللہ ہی سے مانگو۔

۳۸۷۔ ترکِ دُعا کی عادت قابلِ ترک ہے:

(ابوھریرہؓ) من لم یسأل الله یغضب علیه ۔ (ترمذی)

جو اللہ تعالیٰ سے سوال نہیں کرتا، اس پر اللہ ناراض ہوتا ہے۔[1]

۳۸۸۔ قبولِ دُعا کا انتظار بھی بہترین عبادت ہے:

(ابن مسعودؓ) سلوا الله من فضله فان الله یحب ان یسئل وافضل العبادة انتظار الفرج ۔ (ترمذی)

اللہ تعالیٰ سے اس کا فضل مانگو۔ اللہ تعالیٰ کو دُعا پسند ہے اور (دُعا کے بعد) کشادگی کا انتظار کرنا بہترین عبادت ہے۔

۳۸۹۔ اُمتی پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی صلوٰۃ:

(جابرؓ) ان امرأة قالت للنبی صلی الله علیه وسلم صلّ علی وعلی زوجی فقال صلی الله علیک وعلی زوجک ۔ (ابوداؤد)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک عورت نے درخواست کی کہ مجھ پر اور میرے شوہر پر صلوٰۃ بھیجئے (یعنی دُعا کیجئے) حضور نے فرمایا کہ، صلی اللہ علیکِ وعلیٰ زوجکِ۔ اللہ تجھ پر تیرے شوہر پر رحمت نازل فرمائے۔

---

[1] ترکِ دُعا کے تین پہلو ہیں۔ ایک یہ ہے کہ انسان اپنی کاہلی یا بے توجہی کی وجہ سے ایسا کرے۔ دوسرے یہ کہ ابا (انکار) یا مایوسی کے باعث اور تیسرے یہ کہ رضا بقضا یا تفویض و سپردگی کے سبب سے ہو۔ اگر سستی و بے توجہی کی وجہ سے ہے تو یہ غفلت و فسق ہے، ابا ہو تو طغیان اور مایوسی ہو تو کفر ہے۔ اور اگر رضا بقضا کا بلند مقام ہے تو بظاہر یہ ایک سعادت سے محرومی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ یہ خاموشی ہی ہمہ تن دُعا میں شمار ہو۔ اس فرمانِ نبویؐ میں جس ترکِ دُعا کو معیوب بتایا گیا ہے۔ وہ پہلی قسموں کا ترک ہے۔

۳۹۰۔ زیادتی کرنے والے کے لیے بددعا:

(عائشہؓ) رفعتہ: من دعا علی من ظلمہ فقد انتصر۔ (ترمذی)

جس مظلوم نے اپنے ظالم کے لیے بد دعا کی اس نے بدلہ لے لیا۔

۳۹۱۔ اولاد کی دعا کیا اثر رکھتی ہے:

(ابو ھریرۃؓ) رفعہ: ان اللہ تعالیٰ لیرفع للرجل الدرجۃ فیقول انی لی ھذہ؟ فیقول بدعاء ولدک لک۔ (بزار)

اللہ تعالیٰ ایک شخص کا درجہ اتنا بلند فرمائے گا کہ وہ کہے گا کہ: یہ درجہ مجھے کہاں سے ملا؟ اللہ تعالےٰ جواب دے گا: یہ نتیجہ ہے اس دعا کا جو تیری اولاد نے تیرے لیے کی تھی۔

۳۹۲۔ تحکمانہ دعا:

(ابن مسعودؓ) قال لرجل اذا سألت ربک الخیر فلا تسأل و فی یدک حجر (کبیر برجل لم یسم)

انھوں (ابن مسعودؓ) نے ایک شخص سے کہا کہ: جب اللہ تعالےٰ سے سوال کرو تو اس طرح نہ کرو کہ جیسے تمھارے ہاتھ میں پتھر ہے (یعنی لہجہ عاجزانہ ہو نہ کہ تحکمانہ)۔

اسمائے حسنیٰ

۳۹۳۔ اسمائے الٰہیہ:

(ابو ھریرۃؓ) رفعہ: ان للہ تسعۃ و تسعین اسمًا من احصاھا دخل الجنّۃ ھو (۱) اللہ الذی لا الٰہ الا ھو (۲) الرحمٰن (۳) الرّحیم (۴) الملک (۵) القدوس (۶) السلام (۷) المؤمن

اللہ تعالےٰ کے ننانوے (۹۹) نام ہیں۔ جو ان کی نگہداشت کرے گا۔ جنّت میں داخل ہوگا:

(۱) اللہ ہے جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں وہ ہے ...... (۲) مادری رحمت والا (۳) پدری شفقت والا (۴) بادشاہ (۵) تمام کمزوریوں سے پاک

(۸) المهيمن (۹) العزيز (۱۰) الجبار
(۱۱) المتكبر (۱۲) الخالق (۱۳) البارى
(۱۴) المصوّر (۱۵) الغفار (۱۶) القهار
(۱۷) الوهاب (۱۸) الرزاق (۱۹) الفتاح
(۲۰) العليم (۲۱) القابض (۲۲) الباسط
(۲۳) الخافض (۲۴) الرافع (۲۵) المعز
(۲۶) المذل (۲۷) السميع (۲۸) البصير
(۲۹) الحكم (۳۰) العدل (۳۱) اللطيف
(۳۲) الخبير (۳۳) الحليم (۳۴) العظيم
(۳۵) الغفور (۳۶) الشكور (۳۷) العلى
(۳۸) الكبير (۳۹) الحفيظ (۴۰) المقيت
(۴۱) الحسيب (۴۲) الجليل (۴۳) الكريم
(۴۴) الرقيب (۴۵) المجيب (۴۶) الواسع
(۴۷) الحكيم (۴۸) الودود (۴۹) المجيد
(۵۰) الباعث (۵۱) الشهيد (۵۲) الحق
(۵۳) الوكيل (۵۴) القوى (۵۵) المتين
(۵۶) الولى (۵۷) الحميد (۵۸) المحصى
(۵۹) المبدى (۶۰) المعيد (۶۱) المحيى
(۶۲) المميت (۶۳) الحى (۶۴) القيوم
(۶۵) الواجد (۶۶) الماجد (۶۷) الواحد
(۶۸) الاحد (۶۹) الصمد (۷۰) القادر
(۷۱) المقتدر (۷۲) المقدم (۷۳) المؤخر
(۷۴) الاوّل (۷۵) الآخر (۷۶) الظاهر
(۷۷) الباطن (۷۸) الوالى (۷۹) المتعالى
(۸۰) البر (۸۱) التواب (۸۲) المنتقم
(۸۳) العفو (۸۴) الرؤف (۸۵) مالك الملك

منزہ (۶) تمام آفات سے محفوظ (۷) امن دینے والا (۸) نگہبان
(۹) غالب (۱۰) نقصان کی تلافی کرنے والا (۱۱) کبریائی والا
(۱۲) آفرینندہ (۱۳) نیست سے ہست کرنیوالا (۱۴) صورت گری
کرنے والا (۱۵) ڈھانپنے والا (۱۶) پورا غلبہ رکھنے والا (۱۷)
بے دریغ عطا کرنیوالا (۱۸) بڑا روزی رساں (۱۹) تمام فتح دینے
والا (۲۰) صاحب علم (۲۱) تنگی کر دینے والا (۲۲) کشادگی پیدا
کرنیوالا (۲۳) پست کرنے والا (۲۴) بلند کرنیوالا (۲۵) عزت
دینے والا (۲۶) ذلت دینے والا (۲۷) سننے والا (۲۸) دیکھنے والا (۲۹)
فیصلہ دینے والا (۳۰) عدل کرنیوالا (۳۱) لطف اور لطافت والا (۳۲) باخبر
(۳۳) حلم والا (۳۴) عظمت والا (۳۵) خطاپوش (۳۶) قدردان (۳۷) بلند
مرتبہ (۳۸) صاحب کبریائی (۳۹) نگہدار (۴۰) حافظ (۴۱) حساب
کتاب کی پڑتال کرنے والا (۴۲) جلالت شان والا (۴۳) صاحب کرم و
کرامت (۴۴) نگہبان (۴۵) قبول کرنے والا (۴۶) وسعت والا
(۴۷) حکمت والا (۴۸) بڑا محبت کرنیوالا (۴۹) بزرگی والا۔
(۵۰) دوبارہ زندگی دینے والا (۵۱) ہمہ بین (۵۲) حق،
(۵۳) کفایت کرنیوالا۔ (۵۴) صاحب قوت (۵۵) صاحب قدرت
(۵۶) مددگار (۵۷) لائق حمد (۵۸) شمار کنندہ (۵۹) اوّل آفرینندہ
(۶۰) باز آفرینندہ (۶۱) زندگی بخشنے والا (۶۲) موت دینے والا
(۶۳) زندہ (۶۴) قائم بالذات (۶۵) بے نیاز،
(۶۶) صاحب بزرگی (۶۷) یکتا (۶۸)
یگانہ (۶۹) مستغنی (۷۰) قدرت والا (۷۱) صاحب اقتدار
(۷۲) آگے بڑھانے والا (۷۳) پیچھے ہٹانے والا۔
(۷۴) پہلا (۷۵) آخری (۷۶) عیاں (۷۷)
نہاں (۷۸) مالک متصرف (۷۹) بلند (۸۰) نظر
رکھنے والا (۸۱) بڑا توبہ قبول کرنے والا (۸۲) انتقام لینے والا
(۸۳) عفو کرنے والا (۸۴) نرم خو (۸۵) بادشاہت کا مالک

(۸۶) ذو الجلال والاکرام (۸۷) المقسط (۸۸) الجامع (۸۹) الغنی (۹۰) المغنی (۹۱) المانع (۹۲) الضار (۹۳) النافع (۹۴) النور (۹۵) الهادی (۹۶) البدیع (۹۷) الباقی (۹۸) الوارث (۹۹) الرشید (۱۰۰) الصبور۔ (ترمذی)

(۸۶) عظمت وکرامت والا (۸۷) عدل کرنے والا، (۸۸) یکجا کرنے والا (۸۹) بے نیاز (۹۰) بے نیاز کرنے والا (۹۱) روکنے والا (۹۲) نقصان دینے والا (۹۳) نفع دینے والا (۹۴) روشنی (۹۵) ہدایت دینے والا، (۹۶) نیا سے نیا ایجاد کرنے والا (۹۷) صاحب بقا (۹۸) اصل مالک (۹۹) راہنما (۱۰۰) بڑا صابر۔

معاملات

جاہلیّت کے اقسامِ نکاح

۱۔ جاہلیّت کے اقسامِ نکاح :

عن عائشة رضـ ان النكاح في الجاهلية كان على اربعة انحاء نكاح منها نكاح الناس اليوم يخطب الرجل الى الرجل وليته او ابنته فيصدقها ثم ينكحها ونكاح آخر كان الرجل يقول لامرأته اذا طهرت من طمثها ارسلي الى فلان فاستبضعي منه ويعتزلها زوجها ولا يمسها حتى يتبين حملها من ذلك الرجل فاذا تبين حملها اصابها زوجها اذا احب وانما يفعل ذلك رغبة في نجابة الولد وكان هذا النكاح نكاح الاستبضاع ونكاح آخر يجتمع الرهط ما دون العشرة على المرأة كلهم يصيبها فاذا حملت ووضعت ومرّ ليال بعد ان تضع حملها ارسلت اليهم فلم يستطع رجل

جاہلیت میں نکاح کے چار طریقے تھے۔ ان میں سے ایک وہ نکاح ہے جو آج رائج ہے۔ یعنی ایک شخص دوسرے کے پاس اس کی ولیہ یا دختر کے نکاح کا پیغام دیتا ہے اور وہ مہر مقرر کرتا ہے اور اسے نکاح میں لے آتا ہے۔ دوسرا نکاح یہ تھا کہ کوئی شخص اپنی بیوی سے کہتا کہ جب تو حیض سے پاک ہو جائے تو فلاں کے پاس جا کر تعلق قائم کر لے اس دوران میں اس کا شوہر اس وقت تک اُس کے پاس نہ جاتا جب تک اُس شخص کا (جس کے پاس یہ رہی تھی) نطفہ بصورت حمل ظاہر نہ ہو جائے۔ یہ ظاہر ہونے کے بعد اگر شوہر کا دل چاہتا تو اس کے پاس جاتا یہ اس غرض سے کیا جاتا کہ بچے کی کوئی خاندانی نجابت قائم رہے۔ اس طریقۂ نکاح کا نام نکاح استبضاع تھا۔ تیسرا طریقہ یہ تھا کہ تقریباً دس آدمی ایک عورت کے پاس جاتے اور سب اس سے مواصلت کرتے۔ جب وہ حاملہ ہو کر وضع حمل سے فارغ ہو جاتی تو کچھ دنوں کے بعد سب کو بُلا بھیجتی اور کوئی آنے سے انکار نہیں کرسکتا تھا۔ جب سب اُس کے پاس

رجل منهم ان یمتنع حتی یجتمعوا عندها تقول لهم قد عرفتم الذی کان من امرکم وقد ولدت فهو ابنك یا فلان تسمی من احبت تلحق به ولدها لا یستطیع ان یمتنع الرجل ونکاح رابع یجتمع الناس الکثیر فیدخلون علی المرأۃ لا تمتنع ممن جاءها وھن البغایا کن ینصبن علی ابوابھن الرأیات وتکون علما فمن ارادھن دخل علیھن فاذا حملت احداھن ووضعت حملھا جمعوا لھا ودعوا لھا القافۃ ثم الحقوا ولدھا بالذی یرون فالتاط بہ ودعی ابنہ لا یمتنع من ذلك فلما بعث محمد صلی اللہ علیہ وسلم بالحق ھدم نکاح الجاھلیۃ الا نکاح الاسلام الیوم۔ (بخاری، ابوداؤد)

اکٹھے ہو جاتے تو وہ کہتی کہ تم سب نے جو کچھ کیا ہے وہ تمھیں معلوم ہے۔ پھر وہ جسے پسند کرتی اس کا نام لے کر کہتی کہ اے فلاں یہ تیرا بچہ ہے جو میں نے جنا ہے۔ پھر وہ اس بچے کو اسی سے وابستہ کر دیتی اور وہ اس سے انکار نہ کر سکتا۔ چوتھا طریقۂ نکاح یہ تھا کہ بہت سے لوگ یکجا ہونے اور مخصوص عورت سے ہم آغوش ہونے اور جو بھی اس وقت آئے وہ اسے روک نہ سکتی۔ یہ بغایا (طوائفیں یا بدکار عورتیں) ہوتی تھیں۔ ان کی علامت یہ ہوتی تھی کہ ان کے دروازوں پر جھنڈے کھڑے کر دیئے جاتے تھے۔ اس وقت جو بھی چاہتا بے تکلف اس پر جا پڑتا۔ جب ایسی عورتوں میں کوئی حاملہ ہو کر وضع حمل سے فارغ ہو جاتی تو سب لوگ اکٹھے ہوتے اور قیافہ شناسوں کو بلایا جاتا اور وہی اس بچے کو جس سے صحیح سمجھتے وابستہ کر دیتے اور وہ اسی کا بچہ سمجھا جاتا اور وہ اس سے انکاری نہ ہو سکتا۔ جب حضورؐ حق کے ساتھ مبعوث ہوئے تو بجز اس نکاح اسلام کے جو آج موجود ہے، تمام جاہلی طریقہ ہائے نکاح ختم فرما دیئے۔

۲ - تجرد کی زندگی کوئی تقویٰ نہیں:

(سمرۃؓ) ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم نھی عن التبتل وقرأ قتادۃ ولقد ارسلنا رسلا من قبلك وجعلنا لھم ازواجا وذریۃ۔

(ترمذی، نسائی)

آنحضرتؐ نے تجرد کی زندگی سے منع فرمایا ہے قتادہ نے اس موقعے کے لیے یہ آیت پڑھی (ترجمہ یہ ہے) کہ ہم نے اے رسولؐ تم سے پہلے بھی پیغمبر بھیجے ہیں اور اُن کو صاحب ازواج و اولاد بھی بنایا۔

کتابُ البیُوع

حلال روزی

۳۔ عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ طَلَبُ کَسْبِ الْحَلَالِ فَرِیْضَۃٌ بَعْدَ الْفَرِیْضَۃِ۔ (بیہقی، مشکوٰۃ)

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے کہا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ (شریعت کے دیگر) فرائض کے بعد حلال روزی حاصل کرنا فرض ہے۔

۴۔ عَنْ اَبِیْ بَکْرٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا یَدْخُلُ الْجَنَّۃَ جَسَدٌ غُذِّیَ بِالْحَرَامِ۔ (بیہقی، مشکوٰۃ)

حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ سرکار اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس بدن کو حرام غذا دی گئی۔ وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔

۵۔ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَاْتِیْ عَلَی النَّاسِ زَمَانٌ لَا یُبَالِی الْمَرْءُ مَا اَخَذَ مِنْہُ مِنَ الْحَلَالِ اَمْ مِنَ الْحَرَامِ۔ (بخاری شریف)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ: رسولِ کریم علیہ الصلاۃ والسلام نے فرمایا کہ لوگوں پر ایک زمانہ ایسا بھی آئے گا جب کہ کوئی اس بات کی پرواہ نہ کرے گا کہ اس نے جو مال حاصل کیا وہ حلال ہے یا حرام؟

ایمان، اسلام، اعتصام (مضبوط پکڑنا) اقتصاد (میانہ روی) امانت امر معروف (نیک کام کا حکم) اُمید، اجل وغیرہ!

۶۔ مَنْ عَمَّرَ اَرْضًا لَیْسَتْ لِاَحَدٍ فَھُوَ اَحَقُّ بِھَا۔ (البخاری)

جو ایسی زمین پر آبادی کرے، جس کا کوئی مالک نہ ہو تو وہی شخص اس کا زیادہ حق دار ہے۔

کتاب النکاح

۷۔ نکاح محافظ نگاہ و عصمت ہے، مجرد کے لیے روزہ محافظ ہے:

(علقمہؓ)...... قال لنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا معشر الشباب من استطاع منکم الباءۃ فلیتزوج فانہ اغض للبصر و احصن للفرج ومن لم یستطع فعلیہ بالصوم فانہ لہ وجاء۔ (للستۃ الا مالکا)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے فرمایا کہ نوجوانو! تم میں سے جو نکاح کی استطاعت رکھتا ہو وہ شادی کرے، کیونکہ اس سے نگاہیں اور عصمتیں محفوظ رہتی ہیں، اور جو اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو وہ روزے رکھے، اس سے قطع شہوت ہو جائے گا۔

۸۔ نکاح کا مقصد نسلِ انسانی کی بقا بھی ہے:

(معقلؓ بن یسارؓ) جاء رجل الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال انی اصبت امرأۃ ذات حسب وجمال وانھا لا تلد أفأتزوجھا؟ قال لا ثم اتاہ الثانیۃ فنھاہ ثم اتاہ الثالثۃ فقال تزوجوا الودود الولود فانی مکاثر بکم الامم (ابوداؤد، نسائی)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک آدمی آکر کہنے لگا کہ: مجھے ایک عورت ملی ہے جو خوبصورت اور شریف خاندان کی ہے، مگر وہ بانجھ ہے، کیا میں اسے اپنے نکاح میں لے آؤں؟ حضورؐ نے فرمایا: نہیں۔ دوبارہ اس نے پھر آکر یہی سوال کیا اور حضورؐ نے نفی میں جواب دیا۔ تیسری بار پھر آیا تو فرمایا کہ: اس عورت سے نکاح کر جو خوب محبت کرنے والی اور خوب جننے والی ہو تاکہ میں اپنی امت کی کثرت تعداد پر بھی فخر کر سکوں۔

۹۔ زنِ صالحہ کی قدر و قیمت:

(ابن عمروؓ بن العاص) رفعہ: الدنیا متاع وخیر متاعھا المرأۃ الصالحۃ۔ (مسلم، نسائی)

دنیا سامانِ زیست ہے اور اس کی بہترین متاع صالح عورت ہے۔

اچھّا تاجر

۱۰۔ عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ الْاَمِیْنُ مَعَ النَّبِیِّیْنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّھَدَاءِ۔

(ترمذی)

حضرت ابوسعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ سرکارِ اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بہت سچے اور دیانتدار تاجر (کا حشر) نبیوں، صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ ہوگا۔

۱۱۔ عَنْ عُبَیْدِ بْنِ رِفَاعَۃَ عَنْ اَبِیْہِ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ التُّجَّارُ یُحْشَرُوْنَ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ فُجَّارًا اِلَّا مَنِ اتَّقٰی وَبَرَّ وَصَدَقَ۔

(ترمذی، ابن ماجہ)

حضرت عبید بن رفاعہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ قیامت کے دن تاجروں کا حشر نافرمانوں کے ساتھ ہوگا مگر جو تاجر خدائے تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے حرام سے بچے، جھوٹی قسم نہ کھائے اور سچ بولے (تو اس کا حشر فاجروں کے ساتھ نہیں ہوگا)۔

۱۲۔ عَنْ وَاثِلَۃَ بْنِ الْاَسْقَعِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ مَنْ بَاعَ عَیْبًا لَمْ یُنَبِّہْ لَمْ یَزَلْ فِیْ مَقْتِ اللّٰہِ وَلَمْ تَزَلِ الْمَلٰٓئِکَۃُ تَلْعَنُہٗ۔

(ابن ماجہ)

حضرت واثلہ بن اسقع رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ میں نے حضور علیہ الصلاۃ والسلام کو فرماتے ہوئے سنا کہ جو شخص عیب دار چیز بیچے اور اس کے عیب کو ظاہر نہ کرے وہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے غضب میں رہے گا۔ اور فرشتے اس پر لعنت کرتے رہیں گے۔

سُود کا بیان

۱۳۔ عَنْ جَابِرٍ قَالَ لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اٰکِلَ الرِّبٰوا وَمُؤْکِلَہٗ وَکَاتِبَہٗ وَشَاھِدَیْہِ

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے سود لینے والوں، سود دینے والوں، سودی دستاویز لکھنے والوں اور اس کے گواہوں

وَقَالَ هُمْ سَوَاءٌ۔ (مسلم شریف)

پر لعنت فرمائی ہے اور فرمایا کہ وہ سب (گناہ میں) برابر کے شریک ہیں۔

۱۴۔ عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ حَنْظَلَۃَ غَسِیلِ الْمَلَائِکَۃِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ دِرْھَمُ رِبًا یَاْکُلُہُ الرَّجُلُ وَھُوَ یَعْلَمُ اَشَدُّ مِنْ سِتَّۃٍ وَ ثَلٰثِیْنَ زِنْیَۃً۔ (احمد، دارقطنی، مشکوٰۃ)

حضرت عبداللہ بن حنظلہ غسیل الملائکہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے کہا کہ حضور علیہ الصلاۃ والسلام نے فرمایا کہ سود کا ایک درہم جو آدمی جان بوجھ کر کھائے اس کا گناہ چھتیس بار زنا کرنے سے زیادہ ہے۔

۱۵۔ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلرِّبٰو سَبْعُوْنَ جُزْءً اَیْسَرُھَا اَنْ یَّنْکِحَ الرَّجُلُ اُمَّہٗ۔ (ابن ماجہ۔ بیہقی)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا کہ سود (کا گناہ) ایسے ستر گناہوں کے برابر ہے جن میں سب سے کم درجہ کا گناہ یہ ہے کہ مرد اپنی ماں سے زنا کرے۔

بیع، راستی، امانت، سہولت، اوزان، حرام چیز کا بیچنا دھوکا، شفعہ وغیرہ

۱۶۔ اَلتَّاجِرُ الْاَمِیْنُ الصَّدُوْقُ مَعَ النَّبِیِّیْنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّھَدَآءِ وَالصَّالِحِیْنَ۔ (الترمذی)

امین اور راست باز تاجر نبیوں، صدیقوں، شہیدوں اور صالحین کی صف میں ہوگا۔

۱۷۔ اَلْبَیِّعَانِ بِالْخِیَارِ مَالَمْ یَتَفَرَّقَا فَاِنْ صَدَقَ الْبَیِّعَانِ وَبَیَّنَا بُوْرِکَ فِیْ بَیْعِھِمَا وَاِنْ کَذَبَا وَکَتَمَا فَعَسٰی اَنْ یَّرْبَحَا رِبْحًا مَّا وَیُمْحِقَا بَرَکَۃَ بَیْعِھِمَا۔ (الخمسۃ)

بائع (بیچنے والے) اور خریدار کو اس وقت تک سودے پر اختیار ہے جب تک وہ جدا نہ ہو جائیں لیں اگر ہر دو نے سچ کہا اور مال متعلقہ کی بابت سب کچھ بیان کر دیا تو دونوں کے لیے برکت کا موجب ہے اور اگر جھوٹ کہا اور مال کے عیب چھپا رکھے، ممکن ہے کہ سر دست کچھ نفع ہو، مگر اس سودے میں برکت نہ ہوگی۔

۱۸۔ رَحِمَ اللّٰهُ رَجُلًا سَمْحًا اِذَا بَاعَ وَ اِذَا اشْتَرٰى وَ اِذَا اقْتَضٰى۔ (البخاری، و الترمذی)

خدا اس شخص پر مہربانی کرتا ہے جو خرید و فروخت اور قیمت وصول کرنے کے تقاضے میں سہولت اور نرمی اختیار کرتا ہے۔

۱۹۔ قَالَ لِاَهْلِ الْمِكْيَالِ وَالْمِيْزَانِ اِنَّكُمْ قَدْ وُلِّيْتُمْ اَمْرَيْنِ هَلَكَتْ فِيْهِمَا الْاُمَمُ السَّالِفَةُ قَبْلَكُمْ۔ (الترمذی)

ماپنے اور تولنے والوں کو فرمایا: تمھارے سپرد وہ کام ہیں جنھیں (ٹھیک طور پر نہ) کرنے سے تم سے پہلے بعض لوگ ہلاک ہو چکے ہیں۔

۲۰۔ اِذَا بِعْتَ فَكِلْ وَ اِذَا ابْتَعْتَ فَاكْتَلْ۔ (البخاری)

جب تو کوئی چیز فروخت کرے تو اُسے ناپ کر دے اور جب خرید لے تو ناپ کر لے۔

۲۱۔ اِنَّ رَجُلًا اَهْدٰى لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَاوِيَةَ خَمْرٍ فَقَالَ لَهٗ هَلْ عَلِمْتَ اَنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى حَرَّمَهَا قَالَ لَا فَسَارَّ اِنْسَانًا اِلٰى جَنْبِهٖ فَقَالَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَ سَارَرْتَهٗ قَالَ اَمَرْتُهٗ بِبَيْعِهَا قَالَ اِنَّ الَّذِىْ حَرَّمَ شُرْبَهَا حَرَّمَ بَيْعَهَا فَفَتَحَ الْمَزَادَتَيْنِ حَتّٰى ذَهَبَ مَا فِيْهِمَا۔ (مسلم، مالک، والنسائی)

ایک شخص تحفے کے طور پر ایک شراب کا مشکیزہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا، فرمایا، کیا تمھیں معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے شراب حرام کر دی ہے؟ اُس نے کہا نہیں (اور راستے میں) اس کے پاس والے آدمی نے کان میں کچھ کہہ دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا اس کے کان میں تم نے کیا کہا؟ اس نے کہا: میں نے کہا ہے کہ اسے بیچ ڈال۔ فرمایا جس نے اس کا پینا حرام کر دیا ہے۔ اس نے اس کا بیچنا بھی حرام کر دیا ہے۔ اس نے دونوں مشکیزوں کا جو اس کے پاس تھے منہ کھول دیا اور جو کچھ ان میں تھا سب بہہ گیا۔

۲۲۔ سَاَلَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ اَيْتَامٍ وَّرِثُوْا خَمْرًا فَقَالَ اَهْرِقْهَا قَالَ اَوَلَا اَجْعَلُهَا خَلًّا قَالَ لَا۔ (ابوداؤد، والترمذی)

ابوطلحہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اس شراب کو کیا کیا جائے جو بعض یتیموں کو وراثت میں ملی ہے۔ فرمایا پھینک دو۔ ابوطلحہ نے کہا کہ کیا اس کا سرکہ نہ بنا لوں؟ آپ نے فرمایا: نہیں۔

۲۳۔ مَنِ اشْتَرٰى طَعَامًا فَلَا يَبِيْعُهٗ حَتّٰى يَسْتَوْفِيَهٗ وَفِىْ اُخْرٰى حَتّٰى يَقْبِضَهٗ قَالَ وَكُنَّا نَشْتَرِى الطَّعَامَ مِنَ الرُّكْبَانِ جِزَافًا فَنَهَانَا

جو غلہ خریدے اس کا اس وقت تک فروخت کرنا جائز نہیں جب تک کہ وہ ناپا تولا نہ جائے اور دوسری روایت میں ہے کہ جب تک قبضہ میں نہ لایا جائے اور آگے چل کر راوی بیان کرتا ہے کہ ہم (بیوپاریوں سے) جو سوار ہو

رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنْ نَبِیْعَہٗ حَتّٰی نَنْقُلَہٗ مِنْ مَکَانِہٖ ۔ (الستۃ الا الترمذی)

کرایا کرتے تھے۔ غلہ خریدتے مگر بغیر ٹھیک طور پر ناپ تول کیے اس کی مقدار کا اندازہ لگا لیتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اس کو مت بیچو جب تک دوسری جگہ نہ لے جاؤ۔[۱]

۲۴۔ عَنْ حَکِیْمِ ابْنِ حِزَامٍ قَالَ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اِنَّ الرَّجُلَ لَیَاْتِیْنِیْ فَیُرِیْدُ مِنِّی الْبَیْعَ وَلَیْسَ عِنْدِیْ مَا یَطْلُبُ اَفَاَبِیْعُ مِنْہُ ثُمَّ اَبْتَاعُہٗ مِنَ السُّوْقِ قَالَ لَا تَبِعْ مَالَیْسَ عِنْدَکَ ۔

(ابوداؤد۔ والترمذی والنسائی)

حکیم بن حزام روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی کہ میرے پاس لوگ آتے ہیں اور بعض چیزیں خریدنا چاہتے ہیں، جو میرے پاس نہیں ہوتیں۔ کیا میں ان کے ساتھ سودا کر لیا کروں اور پھر بازار سے مطلوبہ چیز خرید کر انھیں دے دیا کروں، فرمایا ایسی چیز کے بیچنے کا سودا مت کیا کرو جو تمھارے پاس نہیں ہے۔[۲]

۲۵۔ لَا یَحِلُّ لِامْرِءٍ مُسْلِمٍ اَنْ یَبِیْعَ سِلْعَۃً یَعْلَمُ اَنَّ بِھَا دَاءً

کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ کوئی ایسی چیز بیچے جس میں کسی نقص کے ہونے کا اسے علم ہو، ہاں اگر

۱؎ اس سے مراد ممانعت اس قسم کے سودے اور بیوپار کی ہے کہ غلہ جب کھیتوں سے منڈیوں میں آتا ہے تو بسا اوقات اس کے ایک ہی جگہ پڑے پڑے ایک یا ایک ہی ہفتے میں کئی شخص بغیر دیکھے اس کے مالک یا خریدار بن کر بڑا بھاری نفع یا نقصان اٹھاتے ہیں۔ یہی ممنوع تجارت ہے جس کے سبب سے ملک میں باوجود جنس کے افراط سے موجود ہونے کے قحط و گرانی رہتی ہے اور یہ نافرمانی کی سزا ہے۔ مال کے دیکھنے اور اپنی جگہ موجود ہونے سے قبل بیع کرنا اس وقت سٹہ کہلاتا ہے۔

۲؎ یہ اسی قسم کی تجارت ہے جو آج کل کمیشن ایجنسی کے نام سے معروف ہے۔ اس کی قباحت صریح ہے اور محتاجِ بیان نہیں، جو فائدہ کہ فروشندہ یا خریدار کو ہونا چاہیے جس کے وہ ہر دو مستحق ہیں۔ ایک تیسرا شخص جس کی نہ ہلدی لگے نہ پھٹکڑی اڑا لے جاتا ہے۔ کمیشن ایجنسی تو پھر بھی کچھ ہے کہ مالک اور گاہک ہر دو کو اس کا علم ہوتا ہے اور اس وجہ سے وہ نا روا بھی نہیں ہو سکتی۔ مگر ناجائز اور ممنوع اور غارت کرنے والا وہ طریق ہے جو آج کل بڑے بڑے شہروں میں بعض لوگوں نے اختیار کر رکھا ہے کہ ان کے پاس نہ کوئی دوکان ہے نہ سامان۔ انگریزی ابجد کے چند حروف کو جوڑ کے اپنی فرضی دوکان یا کمپنی کا نام رکھ کر چیزوں کی ایک فہرست چھاپ لیتے ہیں اور جھوٹی قسموں اور اشتہار بازی سے بیچارے سادہ لوح اور کم علم لوگوں کو لوٹ لوٹ کر مزے اڑاتے ہیں۔

إلّا أخبره به۔ (البخاری)

خریدار کو نقص سے مطلع کرے۔

۲۶۔ مَنْ بَاعَ مُحَفَّلَةً فَهُوَ بِالْخِيَارِ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ فَإِنْ رَدَّهَا رَدَّ مَعَهَا مِثْلَ أَوْ مِثْلَيْ لَبَنِهَا قَمْحًا۔

(ابوداؤد)

جو شخص ایسے جانور کو خریدے جس کے تھنوں میں دودھ روکا گیا ہو۔ اسے اس کی واپسی کا تین دن تک اختیار ہے، مگر اُسے دودھ کا معاوضہ اس کے برابر یا اس سے دو چند غلے یا آٹے سے ادا کرنا چاہیئے۔

۲۷۔ نَهَى رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ النَّجْشِ أَخْرَجَهُ الثَّلَاثَةُ وَالنَّسَائِيُّ زَادَ مَالِكٌ وَالنَّجْشُ أَنْ تُعْطِيَهُ بِسِلْعَتِهِ أَكْثَرَ مِنْ ثَمَنِهَا وَلَيْسَ فِي نَفْسِكَ اشْتِرَاؤُهَا فَيَقْتَدِي بِكَ غَيْرُكَ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نرخ بڑھانے سے منع فرمایا۔ امام مالک سے روایت ہے کہ نرخ بڑھانے سے یہ مراد ہے کہ کوئی شخص کسی چیز کے خریدنے کا ارادہ نہ رکھتا ہو مگر اس کی قیمت بڑھاتا جائے۔ اس غرض سے کہ اسے دیکھ دیکھ کر لوگ بھی قیمت بڑھاتے جائیں۔

۲۸۔ وَلَا يَسُمِ الرَّجُلُ عَلَى سَوْمِ أَخِيهِ۔ (الستة)

جب کسی کا سودا ایک شخص کے ساتھ ہو جائے تو پھر دوسرے شخص کے واسطے پہلے مالک سے اس چیز کا سودا کرنا منع ہے۔

۲۹۔ وَفِي أُخْرَى الْمُتَبَايِعَانِ بِالْخِيَارِ مَا لَمْ يَتَفَرَّقَا أَوْ يَقُولُ أَحَدُهُمَا لِلْآخَرِ اخْتَرْ وَرُبَّمَا قَالَ أَوْ يَكُونُ بَيْعَ خِيَارٍ۔ (الستة)

ایک روایت میں ہے کہ بیچنے والا اور خریدنے والا جب تک جدا نہ ہو جائیں (سودے کے فسخ کا) اختیار رکھتے ہیں۔ یا ایک ان میں سے دوسرے کو کہہ دے (کہ اس سودے میں اختیار ہے۔ یا بیع اختیاری ہو (تو اور بات ہے)

۳۰۔ إِذَا اخْتَلَفَ الْبَيِّعَانِ فَالْقَوْلُ قَوْلُ الْبَائِعِ وَالْمُبْتَاعُ بِالْخِيَارِ۔

(مالك والترمذی)

جب بیچنے والے اور گاہک کے درمیان اختلاف ہو جائے تو بیچنے والے کی بات معتبر سمجھی چاہیئے اور گاہک کو اختیار ہے۔ خواہ خریدے خواہ نہ خریدے۔

۳۱۔ مَنِ احْتَكَرَ فَهُوَ خَاطِئٌ

(مسلم و ابوداؤد والترمذی)

جو شخص اس غرض سے غلہ جمع کر کے روک لے کہ نرخ بڑھنے پر بیچے تو وہ خطا کار ہے۔

۳۲۔ أَنَّ رَجُلًا قَالَ يَا رَسُولَ اللهِ سَعِّرْ لَنَا فَقَالَ أَدْعُوا ثُمَّ جَاءَ آخَرُ فَقَالَ يَا رَسُولَ اللهِ سَعِّرْ لَنَا فَقَالَ

ایک شخص نے عرض کی یا رسول اللہ نرخ مقرر فرما دیجئے (کہ غلہ گراں ہے) فرمایا میں دعا کرتا ہوں (کہ نرخ سستا ہو جائے) پھر ایک اور شخص آیا اور وہی درخواست کی فرمایا بلکہ

بَلِ اللّٰہُ تَعَالیٰ یَخْفِضُ وَیَرْفَعُ وَ اِنِّی لَاَرْجُوْ اَنْ اَلْقَی اللّٰہَ تَعَالیٰ وَلَیْسَ لِاَحَدٍ عِنْدِی مَظْلِمَۃٌ۔ (ابو داؤد)

ہی نرخ کو گھٹاتا ہے اور بڑھاتا ہے۔ اور میں چاہتا ہوں کہ اس کی بارگاہ میں ایسی حالت میں حاضر ہوں کہ کسی پر ظلم کرنے کا مطالبہ مجھ سے نہ کیا جائے۔

رہن اور بیع سلم

۳۳۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَدِمَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ الْمَدِیْنَۃَ وَھُمْ یُسْلِفُوْنَ فِی الثِّمَارِ السَّنَۃَ وَالسَّنَتَیْنِ وَالثَّلٰثَ فَقَالَ مَنْ اَسْلَفَ فِیْ شَیْءٍ فَلْیُسْلِفْ فِیْ کَیْلٍ مَّعْلُوْمٍ وَّوَزْنٍ مَّعْلُوْمٍ اِلٰی اَجَلٍ مَّعْلُوْمٍ۔ (بخاری، مسلم)

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالےٰ عنہما نے کہا کہ رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم مدینہ طیبہ میں تشریف لائے۔ مدینہ کے لوگ پھلوں میں سال دو سال اور تین سال کی (پیشگی) بیع کیا کرتے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اس طرح کی بیع کرے اُسے چاہیئے کہ معین پیمانہ معین وزن اور معین مدت کے ساتھ کرے۔

۳۴۔ عَنْ سَعِیْدِ بْنِ الْمُسَیَّبِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا یَغْلَقُ الرَّھْنُ الرَّھْنَ مِنْ صَاحِبِہِ الَّذِیْ رَھَنَہٗ لَہٗ غُنْمُہٗ وَعَلَیْہِ غُرْمُہٗ۔ (مشکوٰۃ)

حضرت سعید بن المسیب رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی چیز کو رہن کر دینے سے رہن کرنے والے کی ملکیت ختم نہیں ہو جاتی۔ اس کے منافع کا حقدار راہن ہے اور (چیز ضائع ہو جائے تو) مرتہن تاوان کا ذمہ دار ہے۔

شاہد و اذن

۳۵۔ بغیر گواہوں کے عورت کا خود نکاح کر لینا:

(ابن عباسؓ) رفعہ: البغایا اللاتی ینکحن انفسھن بغیر بینۃ۔
(ترمذی وصحح انہ موقوف)

بدکار ہیں وہ عورتیں جو بغیر گواہوں کے خود ہی اپنا نکاح آپ کر لیتی ہیں۔

۳۶- بالغہ کا اذن ضروری ہے :

(ابن عباسؓ) رفعه : الايم احق بنفسها من وليها والبكر تستاذن فى نفسها واذنها صماتها (بخاری)

بیوہ عورت اپنے متعلق فیصلہ کرنے کا حق اپنے ولی سے زیادہ رکھتی ہے اور کنواری عورت کے متعلق خود اس سے اذن لے لینا چاہیئے اور اس کا خاموش رہنا ہی اس کا اذن ہے۔

۳۷- نکاح بلا رضا کو عورت توڑ سکتی ہے خواہ باپ ہی کیوں نہ کرے :

(ابن عباسؓ) ان جارية بكرا اتت النبى صلى الله عليه وسلم فذكرت ان اباها زوجها وهى كارهة فخيرها النبى صلى الله عليه وسلم (ابوداؤد)

ایک باکرہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر فریاد کی کہ اس کے باپ نے اس کی رضا کے خلاف اسے بیاہ دیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے مختار کر دیا۔ (کہ خواہ یہ نکاح باقی رکھے یا توڑ دے۔)

درخت کا پھل

۳۸- لَا تَبِيعُوا الثَّمَرَ حَتّٰى يَبْدُوَ صَلَاحُهُ۔ (السنة)

درخت کا پھل مت بیچا کرو جب تک اس میں صلاحیت ظاہر نہ ہو جائے (یعنی اس کا نشو و نما اس درجہ تک پہنچ جائے کہ اس کے پک جانے کی اُمید بندھ جائے)

۳۹- أُصِيبَ رَجُلٌ فِي ثِمَارٍ ابْتَاعَهَا فَكَثُرَ دَيْنُهُ فَأَفْلَسَ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَصَدَّقُوا عَلَيْهِ فَتَصَدَّقَ النَّاسُ عَلَيْهِ فَلَمْ يَبْلُغْ ذٰلِكَ وَفَاءَ دَيْنِهِ فَقَالَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِغُرَمَائِهِ خُذُوا مَا وَجَدْتُمْ لَهُ لَيْسَ لَكُمْ

ایک شخص نے کچھ درختوں کا پھل خریدا۔ میوے پر آفت آگئی (اس وجہ سے) اس پر بہت سا قرضہ ہو گیا۔ اور وہ مفلس ہو گیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اسے صدقہ (حسب توفیق چندہ) دے دو۔ لوگوں نے چندہ دیا مگر اس کی مقدار قرضہ کی رقم سے کم رہی۔ آپؐ نے قرض خواہوں کو فرمایا : جو کچھ ملتا ہے (غنیمت سمجھ کر) لے لو۔ کیونکہ اس سے زیادہ تو تمھیں

اِلَّا ذٰلِكَ ۔ (الخمسۃ الا البخاری)

(کسی طرح) وصول ہی نہیں ہو سکتا۔

۴۰۔ اِنْ بِعْتَ مِنْ اَخِيْكَ ثَمَرًا فَاَصَابَتْهُ جَائِحَةٌ فَلَا يَحِلُّ لَكَ اَنْ تَاْخُذَ مِنْهُ شَيْئًا بِمَ تَاْخُذُ مَالَ اَخِيْكَ بِغَيْرِ حَقٍّ۔ (مسلم و ابو داؤد و النسائی وَفِيْ رِوَايَةٍ بِوَضْعِ الْجَوَائِحِ)۔

اگر تم نے کسی درخت کا پھل اپنے بھائی کے ہاتھ بیچا ہے اور اس پر کوئی آفت آئی ہے تو تمھارے لیے جائز نہیں کہ اپنے بھائی سے کچھ وصول کرو۔ کیونکہ ایسا کرنے میں تم بالکل ناحق پر ہوگے۔ اور ایک روایت میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آفت سے جو نقصان ہو وہ اصل قیمت میں سے وضع کر لیا جائے۔

قرضدار کو مہلت دینا

۴۱۔ عَنْ اَبِيْ قَتَادَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ اَنْظَرَ مُعْسِرًا اَوْ وَضَعَ عَنْهُ اَنْجَاهُ اللّٰهُ مِنْ كُرَبِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ۔ (مسلم شریف)

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ تعالٰی عنہ نے کہا کہ میں نے رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو فرماتے ہوئے سنا کہ جو شخص قرضدار کو مہلت دے یا قرض معاف کر دے تو اللہ تعالٰی اُس کو قیامت کے دن کی سختیوں سے محفوظ رکھے گا۔

۴۲۔ عَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ كَانَ لَهٗ عَلٰى رَجُلٍ حَقٌّ فَمَنْ اَخَّرَهٗ كَانَ لَهٗ بِكُلِّ يَوْمٍ صَدَقَةٌ۔ (احمد، مشکوٰۃ)

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالٰی عنہ نے کہا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ جس کا کسی شخص پر کوئی حق ہو وہ اُسے مہلت دے تو اُسے ہر دن کے عوض صدقہ کا ثواب ملے گا۔

۴۳۔ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَفْسُ الْمُؤْمِنِ مُعَلَّقَةٌ بِدَيْنِهٖ حَتّٰى يُقْضٰى عَنْهُ۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالٰی عنہ نے کہا کہ رسول کریم علیہ الصلاۃ والتسلیم نے فرمایا کہ مومن کی جان اپنے قرض کے سبب معلق رہتی ہے جب تک کہ اس کا قرض ادا نہ کر دیا جائے۔

۴۴ - عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يُغْفَرُ لِلشَّهِيْدِ كُلُّ ذَنْبٍ اِلَّا الدَّيْنَ ۔ (مسلم شریف)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ حضور علیہ الصلاۃ والسلام نے فرمایا کہ شہید کے سب گناہ بخش دیئے جاتے ہیں، سوائے قرض کے۔

مہر

۴۵ - صرف اسلام کا مہر ہونا، اُم سلیم کی جرأتِ ایمانی:

(انسؓ) خطب ابوطلحۃ ام سلیم فقالت واللّٰہ ما مثلک یا اباطلحۃ یرد ولکنک رجل کافر و انا امرأۃ مسلمۃ ولا یحل لی ان اتزوجک فان تسلم فذلک مھری ولا اسألک غیرہ فاسلم وکان ذلک مھرھا۔ قال ثابت فما سمعت بامرأۃ قط کانت اکرم مھراً من ام سلیم الاسلام فدخل بھا فولدت لہ۔ (نسائی)

ابوطلحہ نے اُم سلیم کو پیغام نکاح دیا تو انہوں نے جواب دیا کہ: ابوطلحہ تم جیسے آدمی کا پیغام رَد نہیں کیا جاسکتا، لیکن مشکل یہ ہے کہ تم کافر ہو اور میں مسلمان عورت۔ میرے لیے تم سے نکاح ہی درست نہیں۔ البتہ اگر تم اسلام لے آؤ تو (نہ فقط یہ کہ نکاح کر لوں گی) بلکہ تمھارا اسلام ہی میرا مہر ہو جائے گا۔ اور میں اُس کے سوا تم سے کچھ بھی طلب نہ کروں گی۔ غرض وہ اسلام لے آئے اور اسلام ہی ان کا مہر قرار پایا۔ ثابت کہتے ہیں کہ: میں نے اُم سلیم سے بہتر کسی عورت کا مہر نہیں سُنا یعنی اسلام۔ ابوطلحہؓ سے ان کے اولاد بھی ہوئی۔

۴۶ - ام المومنین ام سلمہؓ کا مہر صرف دس درہم تھا:

(انسؓ) ان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم تزوج ام سلمۃ علی متاع قیمتہ عشرۃ دراھم۔ (موصلی، بزار کبیر، تضعف۔)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ام سلمہؓ کو مہر میں جو چیزیں دی تھیں ان کی قیمت دس درہم تھی۔

۴۷۔ تین آسانیوں کا شمار عورت کی برکات میں ہے:

(عائشہؓ) رفعتہ: ان من یمن المرأة تیسیر خطبتها و تیسیر صداقها و تیسیر رحمها۔ (احمد بلفظ)

عورت کی ایک برکت تو یہ ہے کہ اُسے پیغام نکاح آسانی سے دیا جاسکے۔ دوسری برکت یہ ہے کہ اس کا مہر آسانی سے ادا ہو سکے۔ تیسری برکت یہ ہے کہ اس کا رحم آسانی سے حمل اور ولادت کا کام کر سکے۔

۴۸۔ مہر ہضم کرنے والے کا شمار زانیوں میں ہوگا:

(میمون الکردی) عن ابیہ رفعہ: ایما رجل تزوج امرأة علی ما قل من المھر او کثر لیس فی نفسہ ان تؤدی الیھا حقھا لقی اللہ یوم القیمة وھو زان۔ (اوسط صغیر)

جو شخص کسی عورت سے بھی قلیل یا کثیر مہر پر نکاح کرے اور اس کے دل میں یہ حق مہر ادا کرنے کا ارادہ نہ ہو تو بروز حشر وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے ایک زانی کی حیثیت سے پیش ہوگا۔

(ت) تفسیر اور متفرق!

۴۹۔ اِذَا تَشَاجَرْتُمْ فِی الطَّرِیْقِ فَاجْعَلُوْہُ سَبْعَةَ اَذْرُعٍ۔ (الخمسة الا النسائی)

جب تمہارا کسی رستے (کے عرض) میں اختلاف ہو، تو اُسے سات ہاتھ رکھ لو۔

۵۰۔ اِنَّ اَحَبَّ الْبِلَادِ اِلَی اللّٰہِ تَعَالٰی اَلْمَسَاجِدُ وَاَبْغَضَ الْبِلَادِ اِلَی اللّٰہِ تَعَالٰی اَلْاَسْوَاقُ۔ (المسلم)

خدا کے نزدیک پسندیدہ تر مقام مسجدیں ہیں اور بدترین مقام بازار۔

زمین پر ناجائز قبضہ

۵۱۔ عَنْ سَالِمٍ عَنْ اَبِیْہِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

حضرت سالم رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ رسولِ کریم علیہ الصلوٰة والتسلیم نے فرمایا

مَنْ اَخَذَ مِنَ الْاَرْضِ شَيْئًا بِغَيْرِ حَقِّهٖ خُسِفَ بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِلٰى سَبْعِ اَرْضِيْنَ ۔ (بخاری شریف)

کہ جو شخص دوسرے کی زمین کا کچھ حصہ ناحق دبا لے تو اُسے قیامت کے دن سات زمینوں کی (تہ) تک دھنسا یا جائے گا۔

۵۲ - عَنْ سَعِيْدِ بْنِ زَيْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَخَذَ شِبْرًا مِّنَ الْاَرْضِ ظُلْمًا فَاِنَّهٗ يُطَوَّقُهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ سَبْعِ اَرْضِيْنَ ۔ (مسلم، بخاری)

حضرت سعید بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ جو شخص کسی کی بالشت بھر زمین ظلم سے حاصل کرے گا اسے قیامت کے دن سات زمینوں کا طوق پہنایا جائے گا۔

۵۳ - عَنْ اَبِيْ حُرَّةَ الرَّقَاشِيِّ عَنْ عَمِّهٖ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلَا لَا تَظْلِمُوْا اَلَا لَا يَحِلُّ مَالُ امْرِئٍ اِلَّا بِطِيْبِ نَفْسٍ مِّنْهُ ۔ (بیہقی)

حضرت ابوحرہ رقاشی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے چچا سے روایت کرتے ہیں کہ اُنھوں نے کہا کہ حضور علیہ الصلوٰہ والسلام نے فرمایا کہ خبردار (کسی پر) ظلم نہ کرنا (اور) کان کھول کر سُن لو کہ کسی شخص کا مال (تمھارے لیے) حلال نہیں ہو سکتا مگر وہ خوشی دل سے راضی ہو جائے۔

ولیمہ

۵۴ - بدترین طعام ولیمہ، دعوتِ ولیمہ میں شرکت نہ کرنے والا:

(ابوھریرۃؓ) شر الطعام طعام الولیمۃ یدعی لہ الاغنیاء و یترک المساکین و من لم یأت الدعوۃ فقد عصی اللہ و رسولہ ۔ (شیخین، موطأ، ابو داؤد)

بدترین دعوتِ ولیمہ وہ ہے جس میں صرف اغنیاء بلائے جائیں اور مساکین کو نہ پوچھا جائے اور جو شخص اس دعوت میں (بلایا جائے اور) شریک نہ ہو وہ اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نافرمانی کا مرتکب ہوتا ہے۔

حدّ (سزا)

۵۵ - رُفِعَ الْقَلَمُ عَنْ ثَلَاثَةٍ

تین شخص مرفوع القلم ہیں (یعنی جن سے کوئی مواخذہ

عَنِ الصَّبِيِّ حَتّٰى يَبْلُغَ وَعَنِ النَّائِمِ حَتّٰى يَسْتَيْقِظَ وَعَنِ الْمَعْتُوْهِ حَتّٰى يَبْرَئَ۔ ابو داؤد۔ وَفِي اُخْرٰى زَادَ عَنِ الْخَرِفِ۔ (ابو داؤد)

نہیں کیا جاتا) لڑکا جب تک بالغ نہ ہو۔ سویا ہوا شخص جب تک بیدار نہ ہوا اور دیوانہ جب تک تندرست نہ ہو اور ایک روایت میں اتنا زیادہ کیا گیا ہے کہ وہ بڈھا بھی جس کی عقل زیادتی عمر کی وجہ سے زائل ہو گئی ہو مرفوع القلم ہے۔

حلالہ

۵۶ - حلالہ کرنے والے اور کرانے والے ملعون ہیں :

(ابن مسعودؓ) ان النبی صلّی اللہ علیہ وسلّم لعن المحلل والمحلل لہ۔ (ترمذی، نسائی)

حضور صلّی اللہ علیہ وسلم نے حلالہ کرنے والے اور کرانے والے دونوں کو ملعون قرار دیا ہے۔

دَین یعنی قرض کی اَدائیگی!

۵۷ - اِنَّ مِنْ اَعْظَمِ الذُّنُوْبِ عِنْدَ اللّٰهِ تَعَالٰى يَلْقَاهُ بِهٖ عَبْدٌ بَعْدَ الْكَبَائِرِ الَّتِيْ نَهَى اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا اَنْ يَّمُوْتَ رَجُلٌ وَعَلَيْهِ دَيْنٌ لَا يَدَعُ لَهٗ قَضَاءً۔ (ابو داؤد)

کبیرہ گناہوں کے بعد جن کی خدا نے ممانعت فرمائی ہے، سب سے بڑا گناہ حساب کے وقت خدا کے نزدیک انسان کا یہ ہوگا کہ وہ (اس حالت میں) مرجائے کہ اس کے ذمے اس قدر قرض ہو کہ اس کی ادائیگی کے لئے وہ جائیداد نہ چھوڑ مرا ہو۔

۵۸ - مَنْ اَخَذَ اَمْوَالَ النَّاسِ يُرِيْدُ اَدَاءَهَا اَدَّى اللّٰهُ عَنْهُ وَمَنْ اَخَذَهَا يُرِيْدُ اِتْلَافَهَا اَتْلَفَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى۔ (البخاری)

جو شخص اس نیت سے مال (قرض) لے کہ وہ اُسے ادا کرے گا تو اللہ اس سے ادا کرا دے گا۔ اور جو اس نیت سے لے کہ خُرد بُرد کرلے تو اللہ اُسے بھی خُرد بُرد کر دے گا۔

۵۹ - مَطْلُ الْغَنِيِّ ظُلْمٌ وَاِذَا اُتْبِعَ

دولت مند کا (قرض کے ادا کرنے میں) التوا کرنا ظلم

اَحَدُکُمْ عَلٰی مَلِیٍّ فَلْیَتَّبِعْ ۔ (الستة)

ہے جب کسی (قرض خواہ) کا قرضہ کسی مالدار آدمی کے ذمہ ڈالا جائے تو اُسے مان لینا چاہیئے ۔

۶۰ ۔ لَیُّ الْوَاجِدِ یُحِلُّ عِرْضَهٗ وَ عُقُوْبَتَهٗ قَالَ ابْنُ الْمُبَارَكِ یُغَلَّظُ لَهٗ وَیُحْبَسُ ۔ (ابوداؤد ۔ والنسائی)

صاحب توفیق کا (قرض کی ادائیگی میں) توقف کرنا (اس امر کو) جائز کر دیتا ہے کہ اس کی عزت میں فرق آئے اور اسے تنگ کیا جائے ۔ ابن مبارک نے کہا کہ (یہ بھی جائز ہے کہ) اس پر سختی کی جائے اور اُسے قید کیا جائے ۔

۶۱ ۔ مَنْ سَرَّهٗ اَنْ یُّنْجِیَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی مِنْ كُرَبِ یَوْمِ الْقِیٰمَةِ فَلْیُنَفِّسْ عَنْ مُّعْسِرٍ اَوْ یَضَعْ عَنْهُ ۔ (مسلم)

جو شخص یہ چاہے کہ قیامت کے دن کی سختیوں سے بچا رہے ۔ اُسے چاہیئے کہ تنگ دست کو (قرض ادا کرنے میں) مہلت دے یا (قرض) معاف کر دے ۔

۶۲ ۔ كَانَ لِرَجُلٍ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ سِنٌّ مِّنَ الْاِبِلِ فَجَآءَهٗ یَتَقَاضَاهُ وَاِنَّهٗ اَغْلَظَ فِی الْقَوْلِ حَتّٰی هَمَّ بِهٖ بَعْضُ الْقَوْمِ فَقَالَ دَعُوْهُ فَاِنَّ لِصَاحِبِ الْحَقِّ مَقَالًا ثُمَّ قَالَ اَعْطُوْهُ فَطَلَبُوْا سِنَّهٗ فَلَمْ یَجِدُوْا اِلَّا سِنًّا فَوْقَهَا فَقَالَ اَعْطُوْهَا فَقَالَ اَوْفَیْتَنِیْ اَوْفَاكَ اللّٰهُ تَعَالٰی فَقَالَ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ خَیْرَكُمْ اَحْسَنُكُمْ قَضَآءً ۔ (الخمسة الا ابوداؤد)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمے ایک آدمی کا اُونٹ تھا ۔ اس نے آکر تقاضا کیا اور سخت کلامی کی ۔ یہاں تک کہ بعض لوگوں نے (اس کو سرزنش کرنے کا) قصد کیا ۔ آپؐ نے فرمایا ۔ اسے کچھ نہ کہو ۔ کہ تقاضا کرنا لینے والے کا کام ہے ۔ پھر فرمایا اسے (اس کی چیز) دے دو ۔ تلاش کی گئی ۔ مگر اس کا (سا) اُونٹ نہ ملا ۔ البتہ ایک اُونٹ اس سے (قد میں) بڑا مل گیا ۔ آپؐ نے فرمایا یہی دے دو ۔ اُس نے کہا ۔ تو نے مجھے پورا (قرضہ) دے دیا خدا تجھے بھرا پُرا رکھے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ۔ کہ تم میں سے بہتر شخص وہی ہے (جو اپنے ذمے کی چیز) اچھی طرح ادا کرے ۔

کتاب الطلاق

۶۳ ۔ مسئلہ طلاق میں وقتی حالات کی رعایت :

ابن عباسؓ، کان الرجل اذا طلق

جب کوئی شخص اپنی بیوی کو قبل از دخول تین طلاقیں

امرأته ثلاثه قبل ان يدخل بها جعلوها واحدة على عهد النبي صلى الله عليه وسلم وابي بكرؓ وصدرًا من امارة عمرؓ فلما رأه الناس قد تتابعوا فيها قال اجيزوهن عليهن۔ (مسلم، ابو داؤد، نسائی بلفظه)

دے دیتا تو وہ ایک ہی طلاق سمجھی جاتی تھی یہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں تھا اور یہی حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں اور یہی حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں ابتداءً رہا۔ جب حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ لوگ اس معاملہ میں بے دھڑک واقع ہو گئے ہیں تو آپ نے کہا کہ: اب تین طلاقیں تین ہی سمجھی جائیں۔

۶۴۔ دماغ قابو سے باہر ہو جائے تو طلاق بے اثر ہے:

(ابو ھریرۃؓ) كل طلاق جائز الا طلاق المعتوه والمغلوب على عقله۔ (ترمذی)

ہر طلاق نافذ ہو جاتی ہے بجز معتوہ اور مغلوب العقل کی طلاق کے۔

۶۵۔ سخت غصے کی حالت میں طلاق بے اثر ہے:

(عائشۃؓ) قالت لا طلاق ولا عتاق في غلاق لابی داؤد وقال الغلاق الغضب۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ: "غلاق" میں نہ کوئی طلاق نافذ ہو گی نہ عتاق۔ ابو داؤد میں غلاق کے معنی غضب کے ہیں۔ (غلاق غضب کی اُس کیفیت کو کہتے ہیں، جب کہ بات کرنے والے کو یہ احساس ہی نہ ہو کہ اُس کے منہ سے کیا نکل رہا ہے)۔

۶۶۔ عورت کسی کے ساتھ نکاح پر مجبور نہیں کی جا سکتی:

(ابن عباسؓ) ان زوج بريرة كان عبدًا يقال له مغيث كأني انظر اليه يطوف خلفها و دموعه على لحيته فقال النبي صلى الله عليه وسلم للعباسؓ يا عباس الا تعجب من حب مغيث بريرة ومن بغض بريرة مغيثا؟ فقال صلى الله عليه وسلم

بریرۃ کا شوہر ایک غلام تھا مغیث نامی، اس کا نقشہ گویا میری آنکھوں کے سامنے ہے کہ وہ بریرہؓ کے پیچھے پیچھے گھوم رہا ہے اور اُس کے آنسو اس کی داڑھی پر بہہ رہے ہیں۔ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حضرت عباسؓ سے فرمایا کہ: اے عباسؓ! تمہیں مغیث کی محبتِ بریرہؓ اور بریرہؓ کی نفرتِ مغیث پر تعجب نہیں ہوتا۔!

پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بریرہ فرمایا کہ:

لو راجعتيه قالت يارسول الله تأمرني؟ قال انما اشفع قالت لاحاجة لي فيه (بخاری، اصحاب سنن)

اے کاش! کہ تو اس کی طرف رجوع کر لیتی۔ عرض کیا کہ: حضور! مجھے حکم دیتے ہیں؟ فرمایا: نہیں! بلکہ میری سفارش ہے۔ بولی: مجھے مغیث سے کوئی دلچسپی نہیں۔

۶۷ - اللہ کی نگاہ میں طلاق سب سے زیادہ قابلِ نفرت مباح ہے:

(ابن عمرؓ) رفعه: ابغض الحلال الی الله الطلاق۔ (ابوداؤد)

جائز باتوں میں جو چیز اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ ناپسند ہے وہ طلاق ہے۔

۶۸ - طلاق ایک ہی سبب سے ہو سکتی ہے:

(ابوموسیٰؓ) رفعه: لا تطلق النساء الا من ريبة ان الله تعالیٰ لا يحب الذواقين ولا الذواقات (بزار، کبیر، اوسط)

جب تک عورت متہم نہ ہو اُسے طلاق نہیں دینی چاہیے۔ گھاٹ گھاٹ کا مزہ چکھنے والے مردوں اور عورتوں کو اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا۔

۶۹ - بلا وجہ عورت کا خود مطالبۂ طلاق کرنا:

(ثوبانؓ) رفعه: ايما امرأة سألت زوجها الطلاق من غير بأس فحرام عليها رائحة الجنة۔ (ابوداؤد، ترمذی)

جو عورت بھی بلا کسی سخت ناگواری کے اپنے شوہر سے طلاق کا مطالبہ کرے، اُس پر جنت کی خوشبو حرام ہے۔

۷۰ - تین باتوں میں سنجیدگی و مزاح کا اثر یکساں ہے:

(ابوھریرۃؓ) رفعه: ثلاث جدهن جد وهزلهن جد النكاح والطلاق والرجعة۔ (ترمذی، ابوداؤد)

تین چیزیں ایسی ہیں کہ خواہ وہ سنجیدگی سے ہوں یا مزاح سے، مگر نافذ ہو جاتی ہیں۔ نکاح، طلاق اور رجعت۔

۷۱ - صرف ناپسندیدگی کی وجہ سے عورت مطالبۂ خلع کر سکتی ہے:

(ابن عباسؓ) ان امرأة ثابت بن قيس

ثابت بن قیس بن شماس کی بیوی نے

بن شماس اتت النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقالت لہ ما اعیب علی ثابت فی خلق ولا دین ولکن اکرہ الکفر فی الاسلام فقال تردین علیہ حدیقتہ؟ قالت نعم فقال لہ صلی اللہ علیہ وسلم اقبل الحدیقۃ وطلقہا تطلیقۃ۔

(بخاری، نسائی)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر کہا کہ: مجھے ثابت (رضی اللہ تعالےٰ عنہ) کے خُلق اور دین کے متعلق کوئی شکایت نہیں لیکن اسلام میں کُفر (یعنی منافقانہ محبّت) مجھے پسند نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ: کیا تم اس کا باغ (جو مہر میں ملا ہے) اُسے واپس کر دو گی؟ عرض کیا: ہاں! فرمایا: اے ثابت اپنا باغ لے لو، اور اُسے طلاق دے دو۔

۷۲۔ الولد للفراش:

(عمرو بن شعیب) عن ابیہ عن جدہ: قال رجل یا رسول اللہ ان فلانا ابنی عاھرت بامہ فی الجاھلیۃ فقال صلی اللہ علیہ وسلم لا دعوۃ فی الاسلام ذھب امر الجاھلیۃ الولد للفراش وللعاھر الحجر۔

(ابو داؤد)

ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلّم سے عرض کیا کہ: یا رسول اللہ! فلاں آدمی میرا فرزند ہے کیونکہ میں دورِ جاہلیت میں اس کی ماں سے مُلوّث ہوا تھا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اسلام کے بعد ایسا کوئی دعویٰ مقبول نہیں۔ جاہلیت کی بات ختم ہو چکی۔ بچہ اُسی شخص کا ہو گا جس کے بستر پر پیدا ہوا، ناجائز تعلق پیدا کرنے والے کے لیے وہ پتھر سے زیادہ نہیں۔

۷۳۔ خلع کی عدّت میں صرف ایک حیض کی مثال:

(ابن عباسؓ) ان امرأۃ ثابت بن قیس بن شماس اختلعت من زوجہا علی عہد النبی صلی اللہ علیہ وسلم فامرھا النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان تعتد بحیضۃ۔

(ابو داؤد، ترمذی بلفظہ)

عہدِ رسالت میں ثابت بن قیس بن شماس کی بیوی نے اُن سے خلع کرایا، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو صرف ایک حیض کی عدّت گزارنے کا حکم فرمایا۔

۷۴ ۔ مطلّقہ کے فرزند کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ :

(عمروؓ بن شعیب) عن ابیہ عن جدہ : ان امرأۃ اتت النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقالت ان ابنی ھذا کان بطنی لہ وعاء وثدیی لہ سقاء وحجری لہ حواء و ان اباہ طلقنی واراد ان ینزعہ منی فقال صلی اللہ علیہ وسلم انت احق بہ مالم تنکحی ۔ (ابوداؤد)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک عورت نے آ کر کہا کہ : یارسول اللہ! یہ بچہ ہے جس کے لیے میرا شکم اس کا ظرف ، میرا سینہ اس کا مشکیزہ اور میری گود اس کا مسکن رہا ۔ اس کے باپ نے مجھے طلاق دے دی اور اب اس بچے کو مجھ سے چھیننا چاہتا ہے ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ : جب تک عقدِ ثانی نہ ہو اس بچے کی حق دار تو ہی ہے ۔

طلاق

۷۵ ۔ مَا اَحَلَّ اللّٰہُ شَیْئًا اَبْغَضَ اِلَیْہِ مِنَ الطَّلَاقِ وَفِیْ اُخْرٰی اَبْغَضُ الْحَلَالِ اِلَی اللّٰہِ الطَّلَاقُ ۔ (ابوداؤد)

حلال چیزوں میں سے کوئی چیز خدا کے نزدیک ایسی بُری نہیں جیسی طلاق[1]

[1] طلاق کا دینا بعض حالتوں میں جائز رکھا گیا ہے اور اس کا فیصلہ کسی جج کی رائے پر نہیں چھوڑا گیا ۔ بلکہ خود مرد کو اس کا پورا اختیار دیا گیا ہے ۔ مگر اُسے اپنے اس اختیار کے برتنے میں بہت محتاط ہونے کی فہمائش کی گئی ہے اور اس حالت میں جب کہ سارے حیلے جن کی تفصیل طوالت کا موجب ہو گی ۔ باہمی صفائی رکھنے کے لیے ناکامیاب ہو جائیں ۔ طلاق دینے کی اجازت دی گئی ہے ۔ وہ بھی قریباً پچیس پچیس دن کا فاصلہ کر کے تین دفعہ تاکہ پہلی بلکہ دوسری طلاق کے بعد بھی اگر صلح ہو جائے تو وہ زائل ہو جائے ۔ ہاں اگر غم و غصہ اس غایت کو پہنچ گئے ہیں کہ پچاس دن کی لمبی میعاد میں بھی فرو نہیں ہوئے ۔ تو تیسری طلاق دے کر آپ بھی سبک سار ہو جاتے اور عورت کی بھی بند خلاص کر دے ۔

یہ بھی حکم ہے کہ جب عورت مرد سے علیحدہ رہتی ہو تو طلاق نہ دی جائے ۔ غرض اس سے یہ ہے کہ دُور سے کوئی بات سُن کر اگر مرد غضب میں آ کر طلاق دینے پر آمادہ ہو جائے تو ایسا نہ کرے ۔ کیونکہ ممکن ہے کہ ملاقات ہونے سے غصہ دُور ہو جائے ۔ مگر افسوس ہے کہ مسلمانوں نے ان احکام کو بالائے طاق رکھ چھوڑا ہے اور طلاق دینا ایک معمولی بات سمجھ رکھا ہے ۔ اکثر لوگ

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

۷۶۔ اِمْرَأَةٌ سَالَتْ زَوْجَهَا طَلَاقَهَا مِنْ غَيْرِ مَا بَأْسٍ فَحَرَامٌ عَلَيْهَا رَائِحَةُ الْجَنَّةِ۔ (ابوداؤد و الترمذی)

جو عورت بے وجہ اپنے خاوند سے طلاق مانگے اُسے جنّت کی ہوا (تک) نہیں لگے گی۔

۷۷۔ لَا يَحِلُّ لِامْرَأَةٍ اَنْ تَسْأَلَ طَلَاقَ اُخْتِهَا لِتَسْتَفْرِغَ صَحْفَتَهَا وَلْتَنْكِحْ فَاِنَّ لَهَا مَا قُدِّرَ لَهَا۔ (الستة)

کسی عورت کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنی بہن کی طلاق کی خواستگار ہو۔ تاکہ اس کے خاوند سے خود نکاح کرکے جو اس کے کاسے میں ہے انڈیل لے۔ کیوں کہ اُسے تو وہی ملے گا جو اس کے مقدور میں ہے۔

خرید و فروخت و کسبِ معاش

۷۸۔ علم کے باوجود مالِ مسروقہ کھانا چوری کرنے کے برابر ہے:

(بنت سعدؓ) قالت افتنا یارسول اللہ عن السرقة قال من أكلها وهو يعلم انها سرقة فقد اشرك في اثم سرقتها۔ (کبیر)

بنت سعد (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) نے پوچھا کہ: یارسول اللہ! مالِ مسروقہ کے متعلق کیا ارشاد ہے؟ فرمایا: جو شخص چوری کا مال کھائے اور اُسے یہ علم ہو کہ یہ مالِ مسروقہ ہے۔ وہ اس چوری میں شریک ہے۔

۷۹۔ غذائے حرام سے پرورش پائے ہوئے جسم کا انجام:

(ابوبکرؓ) رفعه، لا يدخل الجنة جسد

جس جسم کی پرورش حرام غذا سے ہو وہ جنّت

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ایک ہی دفعہ تین طلاقیں دے دیتے ہیں، اور بعض لوگ دُور دراز فاصلوں سے طلاق نامہ لکھ کر عورت کے پاس بھیج دیتے ہیں اور یہ جو فرمایا کہ خدا کے نزدیک طلاق بہت بُری ہے، سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ جب حلال یعنی جائز ہے تو پھر بری کیوں۔ انسان کا ہاتھ یا پاؤں اگر کسی بیماری یا ضرب سے ایسا ناقص اور ردّی ہو جائے کہ اس کا جسم کے ساتھ رہنا خطرناک ہو۔ مگر کاٹ دینا صحت بخش ہو تو اُسے کاٹ دیا جاتا ہے۔ گو ایک عضو کا کٹ جانا بہت بُری بات ہے۔ اِسی طرح طلاق اگرچہ بہت بُری چیز ہے۔ مگر جہاں اس کی ضرورت ہو جاتی ہے۔ جب کہ بیوی بجائے مونس غمگسار کے جان کا آزار ہو جاتی ہے اور گھر بجائے آرام گاہ کے دوزخ بن جاتا ہے۔

غذی بحرام (موصلی، بزار، اوسط)

ولہ عن حذیفۃؓ رفعہ: لایدخل الجنۃ لحم نبت من سحت النار اولی بہ۔

میں نہیں جائے گا۔

جس گوشت پوست کا نمو حرام خوری سے ہو، وہ جنت نہیں جاتے گا۔ اُس کی زیادہ حق دار آتشِ جہنم ہے۔

۸۰۔ مشتبہات سے بچنا ہی تقاضائے احتیاط ہے، دل کا مقام:

(النعمانؓ بن بشیرؓ) رفعہ: ان الحلال بیّن وان الحرام بیّن وبینھما مشتبھات لا یعلمھن کثیر من الناس فمن اتقی الشبھات استبرأ لدینہ ومن وقع فی الشبھات وقع فی الحرام کالراعی یرعی حول الحمٰی یوشک ان یرتع فیہ الا ولکل ملک حمٰی الا وان حمی اللہ محارمہ الا وان فی الجسد مضغۃ اذا صلحت صلح الجسد کلہ واذا فسدت فسد الجسد کلہ الا وھی القلب۔ (للستۃ)

حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی۔ ان دونوں کے درمیان مشتبہ چیزیں ہیں جن کا علم بیشتر لوگوں کو نہیں ہوتا۔ لہٰذا جو ایسی مشتبہ چیزوں سے بچے وہ اپنے دین اور اپنی آبرو کو بچا لیتا ہے اور جو ان میں پڑتا ہے، وہ آخر کار حرام میں بھی جا پڑتا ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک چرواہا ممنوعہ چراگاہ کے قریب اپنے گلے کو چرا رہا ہو تو اس کا اُس چراگاہ میں بھی جا پڑنا بعید نہیں۔ ہر فرمانروا کی ایک ممنوعہ اور مخصوص چراگاہ ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی چراگاہ اس کے محارم ہیں۔ اور سُن رکھو کہ جسم کے اندر ایک ایسا لوتھڑا ہے کہ اگر وہ ٹھیک ہے تو سارا جسم ٹھیک رہتا ہے اور اگر وہ خراب ہو تو سارا جسم ہی خراب ہو جاتا ہے۔ سنو! وہ لوتھڑا "دل" ہے۔

۸۱۔ نیکی وبدی کا فتویٰ اپنے دل سے لو:

(واصبہؓ) انہ اتی النبی صلی اللہ علیہ وسلم واضمر فی نفسہ انہ یسألہ عن البر والاثم فلما دنا منہ قال لہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم أخبرک ام تخبرنی؟ فقال لا بل اخبرنی فقال جئت تسألنی عن البر

واصبہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) اپنے دل میں کچھ سوالات لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے۔ جب وہ قریب آئے تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ: میں بتاؤں یا تم بتاؤ گے؟ عرض کیا: حضورؐ ہی ارشاد فرمائیں۔ فرمایا: کہ تم بِر (نیکی) اور اثم (گناہ) کے بارے میں دریافت کرنے آئے ہو۔ میں نے عرض کیا:

والاثم قلت نعم فجمع اناملہ الثلاثۃ فجعل ینکت بھن فی صدری ویقول یا وابصۃ استفت نفسك واستفت نفسك ثلاثا البر ما اطمأنت الیہ النفس والاثم ماحاك فی نفسك وتردد فی صدرك وان افتاك الناس وافتوك۔ (احمد، موصلی، بلین)

جی ہاں!

پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تین انگلیوں کو پیوستہ کر کے میرے سینے کو ٹھوکر دی۔ اور تین بار فرمایا کہ: اپنے دل سے فتویٰ پوچھ۔ نیکی وہ چیز ہے جس پر تیرا دل مطمئن ہو اور گناہ وہ شے ہے جو تیرے دل میں جم جائے اور بار بار کھٹک پیدا کرتی رہے۔ لوگ کچھ بھی فیصلہ دیں، اس سے بحث نہیں۔

۸۲۔ جسے اللہ نے واضح کیا اور جس سے سکوت اختیار فرمایا:

(سلمانؓ وابن عباسؓ) رفعاہ: الحلال ما احل اللہ فی کتابہ والحرام ما حرم اللہ فی کتابہ وما سکت فھو ما عفی عنہ فلا تتکلفوہ۔ (رزین)

حلال وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حلال کیا ہے اور حرام وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حرام کیا اور جس چیز سے سکوت اختیار کیا ہے وہ معاف ہے اس کے متعلق تکلف سے کام نہ لو۔

۸۳۔ سب سے زیادہ پاکیزہ کمائی:

(المقدامؓ) رفعہ: ما أکل احد طعاما قط خیرا من أن یاکل من عمل یدیہ وان نبی اللہ داؤد کان یأکل من عمل یدیہ۔ (بخاری)

اپنے ہاتھوں کی کمائی سے بہتر کوئی روزی نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے نبی حضرت داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھوں کی کمائی کھاتے تھے۔

۸۴۔ حرام خور کی دعا قبول نہیں ہوتی:

(ابوھریرۃؓ) رفعہ: ایھا الناس ان اللہ طیب لا یقبل الا طیبا وان اللہ امر المؤمنین بما امر بہ المرسلین تعالی یَا أَیُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ

اے لوگو! اللہ پاک اور ستھرا ہے اور صاف ستھری چیزوں کو قبول فرماتا ہے۔ اللہ نے مومن کو اسی بات کا حکم دیا ہے جس کا حکم پیغمبروں کو دیا ہے۔ وہ فرماتا ہے (ترجمہ) کہ اے رسولو! پاک اور ستھری چیزیں کھاؤ اور اچھے عمل کرو

الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ قَالَ يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ ثم ذكر الرجل يطيل السفر اشعث اغبر يمد يديه الى السماء يارب يارب ومطعمه حرام و مشربه حرام وملبسه حرام وغذی بالحرام انی يستجاب لذلك ۔ (مسلم، ت، مذ)

جو کچھ تم کرتے ہو میں اس سے واقف ہوں۔ نیز فرماتا ہے۔ (ترجمہ) کہ مسلمانو! ہم نے تمہیں جو کچھ دیا ہے اس میں سے پاک ستھری چیزیں کھاؤ۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ایک شخص بڑا لمبا سفر طے کرکے غبار میں اٹا ہوا آتا ہے اور آسمان کی طرف اپنے ہاتھ اٹھا کر ربّی ربّی کہتا ہوا دُعا کرتا ہے مگر اس کا کھانا پینا اور پوشش اور نشو و نما سب حرام کمائی سے ہو تو اس کی دُعا کہاں سے قبول ہو گی۔

۸۵۔ اولاد بھی والدین کی کمائی ہے:

(عائشۃؓ) رفعتہ: ان اطيب ما اكلتم من كسبكم و ان اولادكم من كسبكم۔ (اسباب سنن)

پاک ترین روزی وہ ہے جو تمہارے اپنے کسب سے حاصل ہو۔ اور تمہاری اولاد کا شمار بھی تمہارے کسب (کمائی) ہی میں ہے۔

۸۶۔ حکومتِ اسلامیہ کے عمّال کے لیے معیارِ زندگی:

(المستورد بن شدّاد) رفعه: من كان لنا عاملا فليكتسب زوجة وان لم يكن له خادم فليكتسب خادما وان لم يكن له مسكن فليكتسب مسكنا ومن اتخذ غير ذلك فهو غالّ اوسارق (ابو داؤد)

جو شخص ہمارے عمل میں ہو وہ شادی کرلے اور اگر اس کے پاس کوئی خادم نہ ہو تو خادم رکھ لے اور اگر اس کے پاس کوئی گھر نہ ہو تو گھر بنالے جو اس سے زیادہ کچھ بنائے گا وہ یا تو مسرف ہو گا یا چور۔

۸۷۔ خلیفہ کا حق بیت المال میں:

(عائشۃؓ): لما استخلف ابوبكر قال لقد علم قومی ان حرفتی لم تكن تعجز عن مؤنة اهلی وشغلت

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خلیفہ ہونے کے بعد فرمایا کہ: میری قوم جانتی ہے کہ میرا کاروبار میرے بال بچوں کی ضروریات پوری کرنے سے قاصر نہ تھا۔ اب میں

ما امر المسلمين فسيأكل آل ابي بكر من هذا المال ويحترف للمسلمين۔ (بخاری)

مسلمانوں کی امارت کے فرائض انجام دینے میں ہمہ تن مشغول ہوں۔ لہٰذا اب ابوبکرؓ کے بال بچے بیت المال سے کھائیں گے اور ابوبکرؓ مسلمانوں کا کام کرتا رہے گا۔

۸۸۔ جاگیروں سے زکوٰۃ :

(کثیر بن عبد اللہ بن عوف المازنی) انہ صلی اللہ علیہ وسلم اقطع بلال بن الحارث معادن القبلیۃ وھی من ناحیۃ الفرع وتلک المعادن لا یؤخذ منھا الا الزکوٰۃ حتی الیوم (ابوداؤد، مالک)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بلال بن حارثؓ مازنی کو قبلیہ کی کانیں عطا فرمائی تھیں، جو فرع کے کنارے واقع ہیں۔ ان کانوں سے آج تک زکوٰۃ ہی لی جاتی ہے۔

۸۹۔ پانی اور درخت مفادِ عامہ کے لیے ہیں :

(قیلۃ بنت مخرمۃ) ...... المسلم اخو المسلم یسعھما الماء والشجر یتعاونان علی الفتان (ابی داؤد و قال الفتان الشیطان)

...... مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ پانی اور درخت سبھوں کے لیے ہے۔ ان دونوں کو چاہیے کہ فتّان یعنی شیطان کے خلاف لڑنے میں باہمی تعاون رکھیں۔

۹۰۔ سب سے زیادہ پاکیزہ کمائی :

(رافع بن خدیج) قیل یا رسول اللہ ای الکسب اطیب؟ قال عمل الرجل بیدہ وکل بیع مبرور۔ (احمد، بزار، کبیر اوسط)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ: سب سے زیادہ پاک و حلال کمائی کون سی ہے۔؟ فرمایا: آدمی کا اپنے ہاتھوں سے کام کرنا اور ہر وہ تجارت جس میں بِرّ (تقویٰ) ہو یعنی جائز ہو۔

۹۱۔ اُجرت فوراً ادا کرنے کا حکم :

(عن ابن عمر) اعطوا الاجیر اجرۃ قبل ان یجف عرقہ۔ (ابن ماجہ)

مزدور کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کرو۔

۹۲ - دستکاری کی فضیلت :

(ابن عمرؓ) رفعہ : ان اللہ یحب المؤمن المحترف۔ (کبیر، اوسط۔ بضعف)

اللہ تعالیٰ حرفہ پیشہ مومن کو دوست رکھتا ہے۔

۹۳ - ایضاً :

(ابن عباسؓ) رفعہ : من امسی کالاً من عمل یدہ امسی مغفوراً لہ۔ (اوسط نحفی)

جو شخص دن بھر اپنی قوتِ بازو سے کام کرکے تھکا ماندہ شام گزارے تو اس کی وہ رات مغفرت میں گزرتی ہے۔

۹۴ - سیدنا زکریا بڑھئی کا کام کرتے تھے :

(ابوھریرۃؓ) رفعہ : کان زکریا نجاراً۔ (مسلم)

حضرت زکریا (علیہ السّلام) نجّار (بڑھئی) تھے۔

۹۵ - سونا چاندی اصل دولت نہیں :

(ابوھریرۃؓ) الدنانیر والدراھم خواتم اللہ فی ارضہ من جاء بخاتم مولاہ قضیت حاجتہ (اوسط بضعف)

اشرفی یا روپیہ اس زمین پر اللہ تعالیٰ کی مہریں ہیں۔ جو اپنے اللہ کی مُہر دکھاتا ہے اُس کی ضرورت پوری کر دی جاتی ہے۔

۹۶ - باغبانی باعثِ برکت ہے :

(الحسنؓ بن علیؓ) رفعہ : النخل والشجر برکۃ علی اھلہ وعلی عقبھم بعدھم اذا کانوا للہ شاکرین۔ (کبیر بضعف)

کھجور اور دوسرے درخت لگانے والے کے موجودہ اہل وعیال کے لیے بھی برکت ہے اور بعد والوں کے لیے بھی بشرطیکہ شکرِ الٰہی کرتے رہیں۔

۹۷ - بلڈنگیں بنانا کوئی نیکی نہیں :

(انسؓ) رفعہ : النفقۃ کلھا فی

تمام طرح کے خرچ خدا کی راہ میں ہو سکتے ہیں، بجز

سبیل اللہ الا البناء فلا خیر فیہ ۔ (زائد از ضرورت) عمارت کے کہ اس میں کوئی خیر نہیں ۔
(تش منذری)

۹۸ ۔ ضرورت سے زائد مکان بنانا جائز نہیں :

(ابن مسعودؓ) رفعہ : من بنی فوق ما یکفیہ کلف ان یحملہ یوم القیمۃ علیٰ عنقہ ۔ (کبیر)

جو شخص ضرورت سے زائد مکان بنائے اُسے قیامت کے دن مجبور کیا جائے گا کہ اسے اپنی گردن پر اُٹھائے رہے ۔

۹۹ ۔ امانت دار تاجر کی فضیلت :

(ابو سعیدؓ) التاجر الامین الصدوق مع النبیین والصدیقین والشہداء (تش منذری)

امانت دار اور راست باز تاجر کو انبیاء علیہم السلام صدیقین اور شہداء کی معیت کا شرف حاصل ہو گا ۔

۱۰۰ ۔ تاجر اگر نیکوکار نہ ہو؟ :

(رفاعۃ بن رافعؓ) رفعہ : فقال ان التجار یبعثون یوم القیمۃ فجاراً الاّ من اتقی اللہ وبرّ وصدق ۔ (تش منذری)

تاجر بروزِ حشر عموماً فاجروں کی صف میں اُٹھیں گے بجز ان تاجروں کے جو تقویٰ اللہ رکھتے ہوں اور نیکوکار ہوں اور راست باز ہوں ۔

۱۰۱ ۔ تاجرانہ مبالغوں کی تلافی :

(قیس بن ابی غرزۃ) ...... ان البیع یحضرہ اللغو والحلف وفی روایۃ : الحلف والکذب فشوبوہ بالصدقۃ ۔
(اصحاب سنن)

...... تجارت میں عموماً فضول باتیں ہو جاتی ہیں اور جھوٹی قسمیں بھی ، لہٰذا اس حلف اور کذب کو صدقے سے پاک کر دیا کرو ۔

۱۰۲ ۔ تجارت میں جھوٹی قسم :

(ابو ھریرۃؓ) رفعہ : الحلف منفقۃ

جھوٹی قسم سے سودے کی نکاسی تو

للسلغة ممحقة للكسب (شيخين، ابو داؤد) بلفظ: ممحقة للبركة۔

ہو جاتی ہے۔ لیکن کسب حلال کا ستیاناس ہو جاتا ہے۔

۱۰۳۔ فراخ دل خریدار و فروشندہ:

(جابرؓ) رفعه: رحم الله رجلاً سمحا اذا باع واذا اشترى واذا اقتضى۔ (بخاری، ترمذی)

اس آدمی پر اللہ تعالیٰ رحمت نازل کرے جو خرید و فروخت اور تقاضے کے وقت شرافت سے کام لیتا ہے۔

۱۰۴۔ ناپ تول میں بے احتیاطی کا نتیجہ:

(ابن عباسؓ) ان النبی صلی الله علیه وسلم قال لاهل الكيل و الميزان انكم قد وليتم امرين هلكت فيهما الامم السالفة قبلكم (ترمذی)

ناپ تول والوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: یہ دونوں چیزیں تمھارے سپرد کی گئی ہیں اور انہی دونوں باتوں (میں غلط روی) کی وجہ سے بعض گزشتہ اُمتیں ہلاک بھی ہوئی ہیں۔

۱۰۵۔ تاجر کے لیے اسلامی اصولِ تجارت کا علم ضروری ہے:

(عمرؓ) لا يبيع في سوقنا الا من قد تفقه في الدين۔ (ترمذی)

حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے فرمایا کہ: ہمارے بازار میں وہی تجارت کرے جو تفقہ فی الدین بھی رکھتا ہو۔

وراثت

۱۰۶۔ اَلْقَاتِلُ لَا يَرِثُ۔ (الترمذی)

قاتل (اپنے مقتول کا) وارث نہیں ہو سکتا۔

۱۰۷۔ اَيُّمَا رَجُلٍ عَاهَرَ بِحُرَّةٍ اَوْ اَمَةٍ فَالْوَلَدُ الزِّنَا لَا يَرِثُ مِنْ اَبِيْهِ وَلَا يُوَرِّثُهُ۔ (الترمذی)

اگر کوئی شخص کسی آزاد عورت یا لونڈی سے زنا کرے (اور اس فعل سے بچہ پیدا ہو) تو ولد الزنا اپنے باپ کا وارث نہیں ہوگا اور نہ اس کا باپ اس کا وارث ہوگا۔

۱۰۸۔ اَنَا اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ فَمَنْ مَاتَ وَعَلَيْهِ دَيْنٌ وَلَمْ

میں ایمان دار شخص سے اس کی جان کے نزدیک تر ہوں (یعنی اُس کا بہت خیر خواہ ہوں)، پس اگر کوئی مرجائے اور

يترك وفاءً فعلينا قضاءه ومن ترك مالاً فلورثته۔
(الخمسة الا النسائی)

اُس کے ذمے قرض ہو اور اُس کی وراثت سے ادا نہ ہو سکے تو اُس کا ادا کرنا ہمارے ذمّہ ہے اور اگر وہ کچھ مال چھوڑ مرے تو وہ اُس کے وارثوں کا ہے (کتاب تفسیر کی شیخین کی ایک حدیث میں جان سے نزدیک تر کی بجائے اور لوگوں کی نسبت زیادہ حق دار اور وارث لکھا ہے اور زنا اور زیادہ لکھا ہے ۔ کہ اگر متوفی کا کوئی عیال رہ جائے تو وہ بھی میرے پاس امداد حاصل کرنے کے لیے آتے کہ میں اُن کا ولی ہوں ۔)

جائز و ناجائز بیع

۱۰۹ ۔ حرام اشیاء کی تجارت :

(ابن عباسؓ) ...... وان الله اذا حرم علی قوم اكل شئ حرم عليهم ثمنه ۔ (مالك، مسلم، نسائی، ابو داؤد)

...... جس چیز کا کھانا اللہ تعالےٰ نے حرام کیا ہے اس کی قیمت لینا بھی حرام ہے ۔

۱۱۰ ۔ پھل تیار ہونے سے پہلے بیع کا معاملہ :

ابن عمرؓ) ...... ان النبی صلی الله عليه وسلم نهى عن بيع الثمار حتى يبدو صلاحها ونهى البائع والمبتاع۔
(الستۃ)

...... خریدار اور فروشندہ دونوں کو حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایسے پھلوں کی خرید و فروخت سے منع فرمایا ہے جو ابھی تیاری کے قریب نہ ہوں ۔

۱۱۱ ۔ ایضاً :

(انسؓ) ان النبی صلی الله عليه وسلم نهى عن بيع الثمر حتى تزهو فقلنا لانسؓ ما زهوها ؟ قال

انس رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے بتایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے "زھو" سے پہلے پھلوں کی خرید و فروخت سے منع فرمایا ہے ۔ ہم نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ

تحمر وتصفر قال ارأیت ان منع اللہ الثمرۃ بم تستحل مال اخیك۔
(شیخین، موطأ، نسائی)

سے دریافت کیا کہ : زہو ثمر کا کیا مطلب ہے ؟ کہا کہ : سُرخ ہو کر زرد ہو جائے۔ (یعنی پکنے لگے)......

۱۱۲۔ اس سے کیوں روکا گیا ؟ :

(زید بن ثابتؓ) کان الناس فی عھد النبی صلی اللہ علیہ وسلم یتبایعون الثمار فاذا جذ الناس وحضر تقاضیھم قال المبتاع انہ اصاب الثمر الدمان اصابہ مراض اصابہ قشام عاھات یحتجون بھا فقال صلی اللہ علیہ وسلم لما کثرت عندہ الخصومۃ فی ذلك اما لا فلا تبایعوا حتی یبدو صلاح الثمر کالمشورۃ یشیر بھا لکثرۃ خصومتھم۔ (بخاری، ابوداؤد)

عہد نبوی میں ہم لوگ درختوں کے پھل کی خرید و فروخت کیا کرتے تھے۔ جب پھل توڑ لیے جاتے اور تقاضے کا وقت آتا تو لینے والا کہہ دیتا کہ : درخت میں فلاں خرابی پیدا ہو گئی ہے یا اسے فلاں بیماری ہو گئی تھی۔ یا پکنے سے پہلے اس میں فلاں نقص ہو گیا تھا۔ اس طرح کے جھگڑے ہوا کرتے تھے۔ جب اس قسم کے جھگڑے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آنے لگے تو بطور مشورے کے فرمایا کہ ،
جب تک پھل صحیح اندازے پر نہ آئے۔ اُس وقت تک لین دین کی بات ہی نہ کرو اس سے مقصد تھا، جھگڑوں کی کثرت کی طرف اشارہ فرمانا۔

۱۱۳۔ بعد کے جھگڑوں سے بچنے کے لیے :

(ابن عباسؓ) نھی النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان تباع ثمرۃ حتی تطعم ولا صوف علی ظھر ولا لبن فی ضرع۔ (اوسط)

پھل اگر چکھ نہ لیا جائے اور پشم اگر جانور کے جسم پر ہو اور دودھ اگر تھن کے اندر ہو تو ان چیزوں کی خرید و فروخت سے روکا ہے۔

۱۱۴۔ چند اقسام بیع کی ممانعت :

(جابرؓ) نھی النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن المخابرۃ والمحاقلۃ و

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مخابرے، محاقلے اور مزابنے سے اور سبز پھل کی تیاری پر

عن المزابنة وعن بيع الثمر حتى يبدو صلاحه و ان لاتباع الا بالدينار والدرهم الا العرايا اما المخابرة فالارض البيضاء يدفعها الرجل الى الرجل فينفق فيها ثم يأخذ من الثمر والمزابنة بيع الرطب فى النخل بالتمر كيلا والمحاقلة فى الزرع على نحو ذلك بيع الزرع القائم بالحب كيلا ۔ (السنۃ ۱ الامالکا)

آنے سے قبل بیع کرنے سے روکا ہے اور فرمایا ہے کہ : یہ تجارت صرف درہم و دینار (یعنی سکّوں) کے ذریعے ہو ۔ ہاں صرف عرایا میں غیر سکہ سے بھی بیع ہو سکتی ہے ، مخابرت کا مطلب یہ ہے کہ ایک سفید زمین کوئی شخص کسی کو اس شرط پر دے کہ تمھارے اخراجات تمھارے اور پھل یا غلے میں میرا اتنا حصہ ہوگا ، مزابنت یہ ہے کہ کھجوریں درخت میں ہیں ان کے عوض پیمانے سے ناپ کر اتنے چھوہارے دیئے جائیں گے ، محاقلت بھی اسی طرح کی بیع ہے جو کھیتی میں ہوتی ہے یعنی اس کھیت کے عوض ناپ کر اتنا غلّہ دیا جائے گا

۱۱۵ ۔ حضرت عمر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کا نیا حکم :

(جابرؓ) بعنا امہات الاولاد علی عہد النبی صلی اللہ علیہ وسلم و ابی بکر فلما کان عمر نہانا فانتہینا (رزین)

ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں امّ ولد باندیوں کا لین دین کر لیا کرتے تھے ۔ لیکن حضرت عمرؓ نے اپنے عہد میں اس سے روک دیا اور ہم رُک گئے ۔

۱۱۶ ۔ پانی کی بیع کی ممانعت :

(ایاس بن عبد اللہؓ) نہی النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن بیع الماء (اصحاب سنن)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی کی تجارت سے منع فرمایا ہے ۔

۱۱۷ ۔ پانی، نمک اور ایندھن کو روک رکھنا :

(بہیسۃ)...... ثم قال یا رسول اللہ حدثنی ما الشئ الذی لا یحل منعہ؟ قال الملح قال ثم ماذا؟ قال النار قال

..... بہیسہ کے والد نے حضور صلی اللہ علیہ سے دریافت کیا کہ : یا رسول اللہ! وہ چیز بتایئے جس سے کسی کو روکنا جائز نہیں ۔ فرمایا : پانی ۔ پوچھا : اور کچھ ؟ فرمایا :

یا نبی اللہ ما الشئ الذی لا یحل منعہ؟ قال ان تفعل الخیر خیر لك۔ (ابوداؤد)

نمک۔ پوچھا: کچھ اور؟ فرمایا: آگ۔ پوچھا: اور کچھ؟ فرمایا: جتنی خیر کر سکو، وہ تمھارے لیے بہتر ہی ہے۔

۱۱۸۔ اٹکل تجارت:

(ابن المسیب): ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم نھی عن المضامین والملاقیح وحبل الحبلۃ فالمضامین ما فی بطون اناث الابل والملاقیح ما فی ظھور الجمال وحبل الحبلۃ ھو بیع الجزور الی ان تنتج الناقۃ ثم ینتج الذی فی بطنھا۔ (مالك)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مضامین، ملاقیح اور حبل الحبلہ کی تجارت سے منع فرمایا ہے، مضامین وہ ہوتے ہیں جو اُونٹنی کے شکم میں ہوں اور ملاقیح وہ جو اُونٹ کے صلب ہی میں ہوں اور حبل الحبلہ سے بچۂ شتر کی بیع مُراد ہے۔ اس طرح کہ اس حاملہ اُونٹنی یا بکری وغیرہ کے پیٹ میں جو بچہ ہو، اُس کے بعد جو دوسرا بچّہ ہوگا وہ میں اِتنے میں خریدتا ہوں (یہ بیع غرر ہے) اِس لیے نا جائز ہے۔

۱۱۹۔ سکّوں کی بلا ضرورت تبدیلی (DEVALUATION)

(علقمۃ بن عبد اللہؓ) قال نھی النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان تکسر سکۃ المسلمین الجائزۃ بینھم الا من باس۔ (لابی داؤد)

مسلمانوں میں جو سکہ رائج ہو، اُسے توڑنے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے روکا ہے، بجز اس کے کہ اس میں کوئی خاص دشواری ہو۔

۱۲۰۔ چند نا جائز اقسامِ بیع:

(ابن عمرو بن العاصؓ) رفعہ: لا یحل سلف وبیع ولا شرطان فی بیع ولا ربح مالم یضمن ولا بیع مالیس عندك۔ (اصحاب سنن)

سلف مع بیع جائز نہیں اور نہ ایک بیع میں دو شرطیں جائز ہیں۔ ایسی چیز کا منافع بھی جائز نہیں جس کے متعلق کوئی ضمانت نہ ہو۔ نیز ایسی چیز کی بیع بھی درست نہیں جو بائع کے قبضے میں نہ ہو۔

۱۲۱۔ مال کا نقص ضرور بیان کر دیا جائے:

(عقبۃ بن عامر) رفعہ: المسلم

مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ کسی مسلمان

اخو المسلم لا یحل لمسلم باع من اخیه بیعا فیه عیب الا بینه له ۔ (قزوینی)

کے لیے اپنے بھائی کو کوئی عیب دار سودا جائز نہیں جب تک وہ اُسے اچھی طرح بتا نہ دے ۔

۱۲۲ ۔ دھوکے کے لیے اچھے بُرے مال کا اختلاط :

(ابو ھریرۃؓ) ان النبی صلّی اللہ علیه وسلّم مرّ فی السوق علی صبرۃ طعام فادخل یدہ فیھا فنالت اصابعه بللا فقال ما ھذا یا صاحب الطعام؟ قال یا رسول اللہ اصابته السماء قال افلا جعلته فوق الطعام حتی یراہ الناس؟ من غشّنا فلیس منا ۔ (مسلم، والترمذی وابی داؤد وزاد فی الکبیر والصغیر ۔)

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم بازار میں ایک غلّے کے ڈھیر کے پاس سے گزرے اور اس میں اپنا ہاتھ داخل کیا تو اندر کی تہوں میں اُنگلیوں کو نمی محسوس ہوئی ۔ پوچھا یہ کیا بات ہے ؟ عرض کیا کہ بارش کی وجہ سے ایسا ہو گیا ہے ۔ فرمایا کہ نمی والے حصّے کو اُوپر کیوں نہیں کر دیتے کہ لوگ دیکھ لیں ؟ جو شخص دھوکا دیتا ہے ، وہ میری جماعت سے خارج ہے ۔

۱۲۳ ۔ بعض ناجائز اقسام بیع (ڈاک بڑھانا)

(ابن عمرؓ) نھی رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلّم عن النجش ۔ للشیخین والنسائی ومالك وقال : و النجش ان تعطیه بسلعته اکثر من ثمنھا ولیس فی نفسك شراؤھا نیقتدی بك غیرک ۔

بخش یعنی خریدار کو دھوکا دینے کے لیے بولی بڑھوانے سے حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے منع فرمایا ہے ۔

۱۲۴ ۔ دھوکے کے لیے ڈاک کی بولی زیادہ دینا :

(ابن ابی اوفیٰ) الناجش آکل الربوا خائن وھو خداع باطل

ناجش (خریدار کو فریب دینے کے لیے اپنے ایجنٹوں سے بولی زیادہ دلوانے والا) سود خور اور خائن کے شمار

لا یحل - للبخاری تعلیقاً)

میں ہے یہ ایک ناجائز دھوکہ ہے۔

۱۲۵ - بعض دیگر اقسام:

(ابوھریرۃ رضؓ) لا تلقوا الرکبان للبیع ولا یبیع بعضکم علی بیع بعض ولا تناجشوا ولا یبیع حاضر لباد ولا تصروا الابل والغنم فمن ابتاعها بعد ذلک فهو بخیر النظرین بعد ان یحلبها فان رضیها امسکها وان سخطها ردها وصاعا من التمر۔ (للستۃ)

(منڈی میں آنے سے پہلے ہی بالا بالا) مال لانے والوں سے سودا مت کرو، ایک کی بیع مکمل ہونے کے بعد دوسرا اس پر (بولی دے کر) سودا نہ کرے اور نجش (دوسروں کو فریب دینے کے لیے اپنے گرگوں سے ڈاک بڑھوانا) نہ کرو اور کوئی حاضر کسی غیر موجود کے لیے سودا نہ کرے، اور اونٹ یا بھیڑ بکری کا تصریہ (کئی دن تک دودھ نہ دوہنا تاکہ دودھ زیادہ معلوم ہو) نہ کرے۔ اگر کوئی ایسا جانور خرید لے تو دوہنے کے بعد اسے اختیار فسخ بیع رہے گا، مرضی ہو تو رکھے ورنہ ایک صاع کھجور کے ساتھ واپس کر دے۔

۱۲۶ - خرید و فروخت میں قیمتیں لگانے میں اعتدال:

(قیلۃ رضؓ ام بنی انمار) قلت یا رسول الله انی امرأۃ ابیع واشتری فاذا اردت ان ابتاع الشیء سمت به اقل مما ارید ثم زدت ثم زدت حتی ابلغ الذی ارید واذا اردت ان ابیع الشیء سمت به اکثر من الذی ارید ثم وضعت حتی ابلغ الذی ارید فقال صلی الله علیه وسلم لا تفعلی یا قیلۃ اذا اردت ان تبتاعی شیئا فاستامی به الذی تریدین اعطیت او منعت واذا اردت ان

قیلہ نے کہا کہ: یا رسول اللہ! خرید و فروخت اس طرح کرتی ہوں کہ خریدتے وقت اپنے اصلی ارادے سے بہت کم قیمت لگاتی ہوں اور آہستہ آہستہ اپنے اندازے پر آکر ختم کرتی ہوں اور فروخت کے وقت اپنے اصلی ارادے سے بہت زیادہ قیمت بتاتی ہوں اور گھٹتے گھٹتے اپنی اصلی قیمت پر آکر رکتی ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: قیلہ ایسا نہ کیا کر، بلکہ خرید اور فروخت دونوں صورتوں میں ایک جچی تلی قیمت لگا جو واقعی دل میں ہو، خواہ وہ سودا یا قیمت تجھے ملے یا نہ ملے۔

تبیع شیئاً ما ستامی به الذے
ترمیذی نے اعطیت او منعت (قزوینی)

کمائی!

۱۲۷۔ اِنَّ الْحَلَالَ بَیِّنٌ وَاِنَّ الْحَرَامَ بَیِّنٌ وَبَیْنَهُمَا اُمُوْرٌ مُّشْتَبِهَاتٌ لَا یَعْلَمُهُنَّ کَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ فَمَنِ اتَّقَی الشُّبُهَاتِ اسْتَبْرَأَ لِدِیْنِهٖ وَعِرْضِهٖ وَمَنْ وَقَعَ فِی الشُّبُهَاتِ وَقَعَ فِی الْحَرَامِ کَالرَّاعِیْ یَرْعٰی حَوْلَ الْحِمٰی یُوْشِكُ اَنْ یَقَعَ فِیْهِ وَاِنَّ لِکُلِّ مَلِكٍ حِمًی وَاِنَّ حِمَی اللّٰهِ مَحَارِمُهٗ اَلَا وَاِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَةً اِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ کُلُّهٗ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ کُلُّهٗ اَلَا وَهِیَ الْقَلْبُ۔ (الخمسة)

حلال ظاہر ہے اور حرام (بھی خود بخود) دکھائی دیتا ہے۔ اور ان کے بیچ بیچ ملتی جلتی مشتبہ چیزیں ہیں۔ جن سے کہ اکثر لوگ واقف نہیں ہوتے (کہ یہ حلال ہے یا حرام) جس نے مشتبہ چیز سے پرہیز کیا۔ اُس نے اپنے دین اور آبرو کو تہمت سے بچا لیا اور جس نے مشتبہ چیز میں ہاتھ ڈال دیا، اُس نے حرام میں ہاتھ ڈال دیا۔ اس چرواہے کی طرح جو شاہی چراگاہ کے اِردگرد اپنا گلہ چراتا ہے اور قریب ہے کہ اس کا گلہ چراگاہ میں بھی جا پڑے اور ہر ایک بادشاہ کی چراگاہ ہوتی ہے اور اللہ کی چراگاہ اس کی حرام کی ہوئی چیزیں ہیں اور سمجھ رکھو کہ (تمہارے) جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے۔ جب وہ درست ہو تو سارا جسم درست ہو جاتا ہے اور جب وہ بگڑ جائے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے اور معلوم رہے کہ وہ دل ہے۔

۱۲۸۔ مَا اَکَلَ اَحَدٌ طَعَامًا قَطُّ خَیْرًا مِّنْ اَنْ یَّاْکُلَ مِنْ عَمَلِ یَدِهٖ وَاِنَّ نَبِیَّ اللّٰهِ دَاؤدَ عَلَیْهِ السَّلَامُ کَانَ یَاْکُلُ مِنْ عَمَلِ یَدِهٖ۔ (البخاری)

اپنے ہاتھ کی کمائی ہوئی روزی سے کوئی روزی بہتر نہیں ہے۔ داؤد نبی علیہ السلام اپنے ہاتھ سے اپنی روزی کماتے تھے۔

۱۲۹۔ نَهٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ عَنْ طَعَامِ الْمُتَبَارِیَیْنِ السَّبَاقِ وَالْقِمَارِ۔ (ابوداؤد)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو فخر کرنے والوں کو کھانا کھانے سے منع فرمایا (۱) اس کا جو کھانے کھلانے میں (۲) اور اس کا جو جُوا بازی میں اوروں سے سبقت لیجانا چاہے۔

ربوٰا (سُود اور اُس کی قسمیں)

۱۳۰- آیت الربوٰا :

(عن عمر بن الخطابؓ) قال من آخر ما نزل آیة الربٰوا وان رسول الله صلی الله علیه وسلم قبض قبل ان یفسرها لنا فدعوا الربٰوا والریبة - رواه احمد فی مسنده -

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ (آیات احکام) میں سب سے آخر آیت الربوٰا نازل ہوئی مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اُس کی جزئیات کی تفصیل فرمانے سے قبل انتقال فرما گئے۔ پس تم سُود اور مشتبہ چیزوں کو چھوڑ دو۔

۱۳۱- بچۂ شکم، شیرِ پستان، غلام آبق، حصۂ غنیمت کی بیع :

(ابوسعیدؓ)...... نهی رسول الله صلی الله علیه وسلم عن شراء ما فی بطون الانعام حتی تضع وما فی ضروعها الا بکیل وعن شراء العبد وهو آبق وعن شراء المغانم حتی تقسم وعن شراء الصدقات حتی تقبض وعن ضربة الغائص۔ (للقزوینی مجهول)

...... حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مندرجہ ذیل چیزوں کی بیع سے روکا ہے:

۱- چوپائے کا بچۂ شکم جب تک پیدا نہ ہو چکے (۲) تھن کے اندر کا دودھ دوہنے کے بعد جب تک ناپ تول نہ ہو جائے (۳) بھاگا ہوا غلام یا قیدی (۴) حصۂ غنیمت جب تک تقسیم نہ ہو جائے۔ (۵) حصۂ زکوٰۃ جب تک مستحق کا اس پر قبضہ نہ ہو جائے (۶) غوطہ زنی کا معاملہ۔

۱۳۲- منڈی میں مال پہنچنے سے پہلے سودا کر لینا :

(ابن عمرؓ) نهی النبی صلی الله علیه وسلم عن تلقی البیوع وفی روایة: رفعه: لا تلقوا السلع حتی یهبط بها الی الاسواق (هما للشیخین وابی داؤد، والنسائی)

تجارتی مال کو باہر ہی باہر سے اُچک لینے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے روکا ہے۔ دوسری روایت میں ہے کہ جب تک منڈیوں میں مال نہ آ جائے اُس وقت تک باہر ہی باہر سے اس کا معاملہ نہ کرو۔

۱۳۳- ایک بیع میں دو رنگ کی بات :

(ابن مسعودؓ) نھی النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن صفقتین فی صفقۃ واحدۃ قال سماک الرجل یبیع البیع فیقول ھو بنساء بکذا وبنقد بکذا (احمد والبزار والاوسط)

ایک عقد میں دو طرح کی بیع کرنے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے روکا ہے۔ سماک اس کا مطلب یہ بتاتے ہیں کہ "اگر نقد دام دو تو اتنے میں اور اُدھار لو تو اتنے میں مال ملے گا۔

۱۳۴- حیوان اور بچے کی جُدا گانہ بیع :

(ابو ایوبؓ) رفعہ : من فرق بین والدۃ وولدھا فرق بینہ وبین احبتہ یوم القیامۃ۔ (ترمذی)

جو ماں اور اُس کے بچے کے درمیان جُدائی پیدا کرے گا، اللہ تعالیٰ اسے بھی بروزِ حشر اس کے عزیزوں سے جُدا کر دے گا۔

اولاد کی مشابہت اور نسب کا دعویٰ!

۱۳۵- اَتَی رَجُلُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ وُلِدَ لِیْ غُلَامٌ اَسْوَدُ وَ ھُوَ یُعَرِّضُ بِنَفْسِہٖ فَلَمْ یُرَخِّصْ لَہٗ فِی الْاِنْتِفَاءِ مِنْہُ فَقَالَ ھَلْ لَکَ مِنْ اِبِلٍ قَالَ نَعَمْ فَقَالَ مَا اَلْوَانُھَا قَالَ حُمْرٌ قَالَ ھَلْ فِیْھَا مِنْ اَوْرَقَ قَالَ نَعَمْ قَالَ عَلٰی اَنّٰی ذٰلِکَ لَکَ قَالَ لَعَلَّہٗ نَزَعَہٗ عِرْقٌ فَقَالَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ لَعَلَّ اِبْنَکَ نَزَعَہٗ عِرْقٌ۔ (الخمسۃ)

ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا۔ یا رسول اللہ میرے ہاں لڑکا پیدا ہوا ہے جس کا رنگ کالا ہے اور اس سے اس کی یہ غرض تھی کہ لڑکا اس کا نہیں۔ مگر آپؐ نے اسے انکار نہ کرنے دیا۔ فرمایا۔ کیا تیرے پاس کچھ اُونٹ ہیں؟ اُس نے کہا ہاں (ہیں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان کا رنگ کیا ہے؟ اس نے کہا سُرخ۔ فرمایا: کیا ان میں کوئی خاکستری بھی ہے؟ کہا۔ ہاں (ہے) فرمایا۔ یہ کہاں سے آگیا؟ اُس نے کہا شاید اسے رگ نے کھینچا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ شاید تیرے بیٹے کو بھی رگ نے کھینچا (یعنی اس کا رنگ اپنے دادا پڑدادا وغیرہ کے رنگ پر گیا ہو)

۱۳۶۔ اَیُّمَا رَجُلٍ جَحَدَ وَلَدَہٗ وَ ھُوَ یَنْظُرُ اِلَیْہِ اِحْتَجَبَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ وَفَضَحَہٗ عَلٰی رُءُوْسِ الْاَوَّلِیْنَ وَالْاٰخِرِیْنَ۔
(ابو داؤد، والنسائی)

جو مرد اپنے بیٹے (کی ولدیت) سے جان بوجھ کر انکار کرے۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس سے پردہ کرے گا (یعنی اُسے اللہ کا دیدار نہیں ہو گا) اور اُسے اگلے پچھلوں کے سامنے رُسوا کرے گا۔

ناپ تول اور حیوانات میں ربوٰا

۱۳۷۔ لعنت سُود کی ہمہ گیری:

(ابن مسعود) لعن النبی صلی اللہ علیہ وسلم اٰکل الربٰوا وموکلہ وشاھدیہ وکاتبہ۔
(مسلم، ابی داؤد، ترمذی، بلفظھما)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ربوٰا (سود) کے کھانے والے پر، گواہوں پر اور کاتب پر سب ہی پر لعنت فرمائی ہے۔

۱۳۸۔ دو مختلف جنسوں کا مبادلہ بھی دست بہ دست ہونا چاہیئے:

(عمرؓ) قال مالک بن اوس الحدثان من یصطرف الدرا ھو؟ فقال طلحۃ بن عبد اللہ وھو عند عمر ارنا ذھبک ثم ائتنا اذا جاء خادمنا نعطیک ورقک فقال عمر کلا واللہ لتعطینہ ورقہ او لتردن الیہ ذھبہ فان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال الورق بالذھب ربٰوا الا ھاء وھاء والبر بالبر ربٰوا الا ھاء وھاء والشعیر بالشعیر ربٰوا الا ھاء وھاء والتمر بالتمر ربٰوا الا ھاء وھاء (للستۃ)

مالک بن اوس بن حدثان نے کہا کہ: اس سونے کو دراہم کے عوض کون لے گا؟ ——— طلحہ بن عبد اللہ جو اس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس موجود تھے بولے کہ: اپنا سونا ہمیں دکھاؤ۔ پھر جب ہمارا ملازم آ جائے تو تم اپنے دراہم آ کر لے جانا۔ حضرت عمرؓ نے کہا: یا تو اسے ابھی دراہم دے دو یا اس کا سونا واپس کرو۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ: مبادلہ چاندی کا سونے سے ہو، یا گندم کا گندم سے، یا جَو کا جَو سے، یا خُرمے کا خُرمے سے۔ یہ سب کا سب ربوٰا ہے اگر برابر برابر نہ ہو اور دست بدست یعنی ایک ہی مجلس میں نہ ہو۔

۱۳۹۔ سود لینے والا اور دینے والا دونوں یکساں ہیں :

(ابوسعیدؓ) رفعه : الذهب بالذهب والفضة بالفضة والبر بالبر والشعير بالشعير والتمر بالتمر والملح بالملح مثلاً بمثل يداً بيد فمن زاد او استزاد فقد اربى الآخذ والمعطى فيه سواء (للستة الا ابا داؤد بلفظ مسلم)

مبادلہ سونے کا سونے سے، چاندی کا چاندی سے، گندم کا گندم سے، جَو کا جَو سے، چھوہارے کا چھوہارے سے اور نمک کا نمک سے برابر برابر ہونا چاہئیے۔ جو زیادہ دے گا یا لے گا وہ سود ہوگا۔ اس میں لینے والا اور دینے والا دونوں یکساں ہیں۔

۱۴۰۔ ربوٰا صرف اُدھار کی صورت میں ہوتا ہے :

(ابن عباسؓ)...... اخبرنى اسامة بن زيد ان النبى صلى الله عليه وسلم قال لا ربوا الا فى النسيئة۔

...... اسامہ بن زید نے مجھ سے یہ حدیث رسولؐ بیان کی ہے کہ : ربا ہوتا ہی ہے اُدھار میں (یعنی اگر دست بدست اور نقداً نقد ایک ہی جنس کی چیز کا مبادلہ تفاضل یعنی کمی بیشی سے بھی ہو تو ربا نہیں ہے۔)

۱۴۱۔ کوالٹی مختلف ہو تو تفاضل ربوٰا نہیں بشرطیکہ نقداً نقد ہو :

(ابن الصامت) رفعه : الذهب بالذهب والفضة بالفضة والبر بالبر والشعير بالشعير والتمر بالتمر والملح بالملح مثلا بمثل سواء بسواء يدا بيد فاذا اختلفت هذه الاصناف فبيعوا كيف شئتم اذا كان يدا بيد (لمسلم واصحاب سنن)

مبادلہ سونے کا سونے سے، چاندی کا چاندی سے، گندم کا گندم سے، خرمے کا خرمے سے اور نمک کا نمک سے ہونے میں تفاضل اس وقت ناجائز ہے جب کہ دونوں طرف ایک جیسی چیز ہو اور دست بدست ہو۔ اگر دونوں کی صنفیں مختلف ہوں (مثلاً ایک طرف معمولی گندم ہو اور دوسری طرف نفیس گندم) تو جس طرح چاہو معاملہ کر لو بشرطیکہ وہ دست بدست ہو۔

۱۴۲۔ دینار کی بجائے ہم قیمت درہم لینے میں یا اس کے برعکس میں مضائقہ نہیں :

(ابن عمرؓ) كنت ابيع الابل

میں بقیع میں دینار کی قیمت سے اُونٹنی بیچ

بالبقیع بالدنانیر فآخذ مکانها الورق وابیع بالورق فآخذ مکانها الدنانیر فاتیت النبی صلی اللہ علیہ وسلم فسألته فقال لا بأس به بالقیمۃ۔ (لاصحاب سنن)

کر اس کی بجائے درہم لیا کرتا تھا۔ اور درہم کی قیمت لگا کر اس کی جگہ دینار لیتا تھا۔ پھر میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بیع کے متعلق دریافت کیا تو فرمایا کہ: دونوں کے دام میں تفاوت نہ ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔

۱۴۳۔

(عن ابی ھریرۃ) قال: استقرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سنا فاعطاہ واعطی سنا فوقہ قال خیارکم محاسنکم قضاءً۔

ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چند نیزے بطور قرض لیے پھر واپس فرما دیے اور ایک نیزہ واپس دے کر فرمایا: کہ تم میں بہترین آدمی وہ ہے جو اچھی طرح سے ادائیگی کرے۔

۱۴۴۔ ربوٰا کی بدترین قسم:

(البراء بن عازب) (رفعہ) الربوٰا اثنان وسبعون بابا ادناها مثل اتیان الرجل امہ وان اربی الربا استطالۃ الرجل فی عرض اخیہ۔ (اوسط)

ربوٰا کی بہتر (یعنی بے شمار) قسمیں ہیں۔ اس کا جو کم سے کم درجہ ہے وہ ایسا ہے جیسے اپنی ماں کے ساتھ بدکاری کرنا اور اس کی بدترین قسم اپنے بھائی کی آبرو پر ہاتھ صاف کرنا ہے۔

نکاح!

۱۴۵۔ جَآءَ رَجُلٌ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنِّیْ اَصَبْتُ اِمْرَأَۃً ذَاتَ حَسَبٍ وَجَمَالٍ وَ اِنَّھَا لَا تَلِدُ اَفَاَتَزَوَّجُھَا قَالَ لَا ثُمَّ اَتَاہُ الثَّانِیَۃَ فَنَھَاہُ ثُمَّ اَتَاہُ الثَّالِثَۃَ فَنَھَاہُ فَقَالَ تَزَوَّجُوا الْوَدُوْدَ الْوَلُوْدَ

ایک آدمی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور کہا کہ مجھے ایک عورت ملتی ہے جو خاندانی اور خوبصورت ہے۔ مگر بانجھ ہے۔ کیا میں اس کے ساتھ نکاح کر لوں؟ آپؐ نے فرمایا نہ۔ پھر وہ دوسری دفعہ آیا۔ جب بھی آپؐ نے منع فرمایا۔ پھر وہ تیسری بار آیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

فَاِنِّیْ مُکَاثِرٌ بِکُمُ الْاُمَمَ۔
(ابوداؤد، والنسائی)

نے فرمایا۔ پیار کرنے والی اور جننے والی عورت سے نکاح کرو کہ تمھاری کثرت سے میں اور اُمتوں پر فخر کروں گا۔

۱۴۶۔ اَلدُّنْیَا مَتَاعٌ وَخَیْرُ مَتَاعِ الدُّنْیَا اَلْمَرْأَۃُ الصَّالِحَۃُ۔ (مسلم والنسائی)

دنیا فائدہ حاصل کرنے کی چیز ہے اور اس کا بہترین فائدہ نیک عورت ہے۔

۱۴۷۔ تُنْکَحُ الْمَرْأَۃُ لِاَرْبَعٍ خِصَالٍ لِمَالِھَا وَلِحَسَبِھَا وَلِجَمَالِھَا وَلِدِیْنِھَا فَاظْفَرْ بِذَاتِ الدِّیْنِ تَرِبَتْ یَدَاکَ۔
(الخمسۃ الا الترمذی)

عورت سے اس کی چار خوبیوں کے لیے نکاح کیا جاتا ہے۔ (۱) اس کا مال (۲) اس کا گھرانہ یا شرافت (۳) اُس کا حسن (۴) اور اس کا دین۔ پس تو دین والی عورت کو حاصل کر (ورنہ) تیرے ہاتھوں پر خاک[1]۔

۱۴۸۔ نَھٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ اَنْ یَّخْطُبَ الرَّجُلُ عَلٰی خِطْبَۃِ اَخِیْہِ حَتّٰی یَتْرُکَ الْخَاطِبُ قَبْلَہٗ اَوْیَاْذَنَ لَہٗ۔
(الستۃ)

رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے منع فرمایا (اس بات سے) کہ کوئی مرد (نکاح کا) پیغام اپنے بھائی کے پیغام پر بھیجے۔ بشرطیکہ پہلے پیغام بھیجنے والا پیشتر ہی (اپنا خیال) چھوڑ دے یا دوسرے کو (پیغام بھیجنے کی) اجازت دے دے۔

۱۴۹ اِذَا خَطَبَ اَحَدُکُمْ اِلَی الْمَرْأَۃِ فَاِنِ اسْتَطَاعَ اَنْ یَّنْظُرَ مِنْھَا اِلٰی مَا یَدْعُوْہُ اِلٰی نِکَاحِھَا فَلْیَفْعَلْ۔
(ابوداؤد)

جب تم میں کوئی نکاح کا پیغام کسی عورت کے پاس بھیجے۔ اگر ممکن ہو کہ اس کا چہرہ مہرہ دیکھ سکے جس سے اس کو اس سے نکاح کرنے کی رغبت ہو تو چاہیئے کہ دیکھ لے۔

۱۵۰۔ تَزَوَّجَ رَجُلٌ اِمْرَأَۃً مِّنَ الْاَنْصَارِ فَقَالَ لَہُ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنَظَرْتَ اِلَیْھَا قَالَ لَا قَالَ فَاذْھَبْ فَانْظُرْ اِلَیْھَا فَاِنَّ فِیْ

ایک آدمی نے ایک انصاری عورت سے نکاح کا ارادہ کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے فرمایا کہ کیا تُو نے اس عورت کو دیکھا ہے؟ اس نے کہا نہیں۔ آپؐ نے فرمایا جا اُسے دیکھ لے۔ کیونکہ انصار کی آنکھ میں

---

[1] ہم مذہب اور پابند مذہب عورت سے نکاح کرنا چاہیئے۔ اگر ایسا نہیں تو میاں بیوی میں لڑائی جھگڑا اور بدمزگی رہے گی اور اولاد تو خواہ مخواہ لامذہب ہوگی۔ جو شخص لامذہب ہے وہ اخلاق کے کسی ضابطہ کا پابند نہیں اور جو اخلاق کے کسی ضابطہ کا پابند نہیں۔ اس کا وجود ابنائے جنس کے لیے وبال ہے۔

اَعْيُنِ الْاَنْصَارِ شَيْئًا ۔ (مسلم والنسائی)	(کبھی کبھی) کوئی نقص ہوتا ہے ۔
۱۵۱۔ اَعْلِنُوْا هٰذَا النِّكَاحَ وَاجْعَلُوْهُ فِي الْمَسَاجِدِ وَاضْرِبُوْا عَلَيْهِ بِالدُّفُوْفِ ۔	نکاح کو مشتہر کرو ۔ دفیں بجاؤ ، اور اُسے مسجدوں میں بیٹھ کر پڑھو ۔
۱۵۲۔ فَصْلُ مَا بَيْنَ الْحَلَالِ وَالْحَرَامِ الدُّفُّ وَالصَّوْتُ ۔ (الترمذی والنسائی وزاد فی النکاح ۔)	نکاح کے وقت دف اور آواز (گانا) اس کے حلال اور حرام ہونے میں فیصلہ کر دیتا ہے ۔
۱۵۳۔ اَلْاَيِّمُ اَحَقُّ بِنَفْسِهَا مِنْ وَلِيِّهَا وَالْبِكْرُ تُسْتَاْذَنُ فِي نَفْسِهَا وَاِذْنُهَا صُمَاتُهَا ۔ (الستة الا البخاری)	بیوہ عورت دوسرے نکاح کے معاملے میں اپنی جان کا اپنے ولی سے زیادہ حق رکھتی ہے ۔ کنواری عورت سے بھی (نکاح کے وقت) اجازت لینی چاہیئے اور اس کی خاموشی (جو اکثر حجاب کی وجہ سے اختیار کرنی پڑتی ہے) اس کی طرف سے اجازت ہے ۔
۱۵۴۔ اَنَّ جَارِيَةً بِكْرًا ذَكَرَتْ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ اَنَّ اَبَاهَا زَوَّجَهَا وَهِيَ كَارِهَةٌ فَخَيَّرَهَا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ ۔ (ابوداؤد)	ایک کنواری لڑکی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی کہ میرے باپ نے میرا نکاح کر دیا ۔ حالانکہ وہ مجھے ناپسند ہے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اختیار دے دیا ۔
۱۵۵۔ اٰمِرُوا النِّسَاءَ فِيْ بَنَاتِهِنَّ ۔ (ابوداؤد)	عورتوں سے اُن کی بیٹیوں کے (نکاح کے) معاملے میں مشورہ کرو ۔
۱۵۶۔ اِنَّ اَحْسَابَ اَهْلِ الدُّنْيَا الَّذِيْنَ يَذْهَبُوْنَ اِلَيْهِ الْمَالُ ۔ (النسائی)	دنیا داروں کے لیے ذات صفات جسے وہ ملحوظ خاطر رکھتے ہیں ۔ دولت ہے ۔
۱۵۷۔ مَنْ كَانَتْ لَهٗ امْرَاَتَانِ وَلَمْ يَعْدِلْ بَيْنَهُمَا جَاءَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَشِقُّهٗ سَاقِطٌ وَفِيْ اُخْرٰى مَائِلٌ ۔ (الترمذی، ابوداؤد، النسائی)	جس شخص کی دو عورتیں ہوں اور وہ ان میں انصاف نہ کرے قیامت کے دن اس کا اُوپر کا دھڑ جھڑا ہوا ہوگا دوسری روایت ہے کہ جھکا ہوا ہوگا ۔
۱۵۸۔ اِذَا تَزَوَّجَ الرَّجُلُ الْمَرْاَةَ وَشَرَطَ لَهَا اَنْ لَا يُخْرِجَهَا مِنْ مِصْرِهَا	جب کوئی مرد کسی عورت سے نکاح کرے اس شرط پر کہ اُسے اس کے شہر سے باہر نہ لے جائے گا ۔ پس

فَلَيْسَ لَهٗ اَنْ يُّخْرِجَهَا بِغَيْرِ رِضَاهَا۔ (الترمذی)

اس کے واسطے جائز نہیں کہ بغیر اس کی رضا مندی کے اسے اس کے شہر سے باہر لے جائے۔

بعض احکام بیع

۱۵۹۔ لین دین کرنے والوں میں اگر اختلاف ہو:

(ابن مسعودؓ) رفعه: اذا اختلف البيعان فالقول قول البائع والمبتاع بالخيار۔ (مالك وترمذی)

اگر خریدار و فروشندہ میں اختلاف ہو، تو فروشندہ کی بات مانی جائے گی۔ البتہ خریدار کو لینے یا نہ لینے کا اختیار ہو گا۔

۱۶۰۔ دو خریداروں میں زیادہ حق کس کا ہے؟

(عقبه بن عامر وسمرة) رفعه: ايما رجل باع بيعا من رجلين فهو للاول منهما۔ للقزوینی ۔۔۔۔۔

جو شخص دو آدمیوں سے سودا کر لے تو حق ان دونوں میں سے پہلے کا ہو گا۔

....

۱۶۱۔ اگر خریدار کے مال پر آفت آجائے:

(جابرؓ) رفعه: ان بعت من اخيك ثمرا فاصابته جائحة فلا يحل لك ان تأخذ منه شيئا بم تأخذ مال اخيك بغير حق۔ (المسلم وابی داؤد والنسائی)

اگر تم اپنے بھائی کے ہاتھ کسی درخت کے پھل کو فروخت کرو اور اس پر کوئی آفت آجائے تو تمہارے لیے اس سے کچھ لینا جائز نہیں۔ بغیر کسی حق کے اپنے بھائی سے مال وصول کرنا کس بنیاد پر؟

منّت کا بیان

۱۶۲۔ اِنَّ النَّذْرَ لَا يُقَرِّبُ مِنِ ابْنِ اٰدَمَ شَيْئًا لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ قَدَّرَهٗ لَهٗ

نذر یا منّت آدمی کے نزدیک اس چیز کو نہیں لے آتی جو اس کے مقدر میں نہ ہو۔ لیکن کبھی ایسا ہوتا

وَلٰكِنَّ النَّذْرَ يُوَفِّقُ الْقَدَرَ وَيُخْرِجُ بِذٰلِكَ مِنَ الْبَخِيْلِ مَا لَمْ يَكُنِ الْبَخِيْلُ يُرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَ ۔ (الجمعۃ)

ہے کہ منت اور مقدر موافق ہو جاتے ہیں اور اس طرح بخیل کا مال خرچ ہو جاتا ہے ۔ وہ اپنی مرضی سے نہ کرتا ۔

۱۶۳ ۔ مَنْ نَذَرَ اَنْ يُّطِيْعَ اللّٰهَ تَعَالٰى فَلْيُطِعْهُ وَمَنْ نَذَرَ اَنْ يَّعْصِىَ اللّٰهَ تَعَالٰى فَلَا يَعْصِهٖ ۔ (الستۃ الامسلماً)

جو ایسی منت مانے کہ اس میں خدا کی فرمانبرداری کرے ۔ اُسے چاہیئے کہ اسے وقت پر پورا کرے اور جو ایسی منت مانے کہ اس میں خدا کی نافرمانی ہو ۔ اُسے چاہیے کہ وہ اس سے باز رہے[1]

۱۶۴ ۔ قَالُوْا هٰذَا اَبُوْ اِسْرَائِيْلَ نَذَرَ اَنْ يَّقُوْمَ فِى الشَّمْسِ وَيَصُوْمَ وَلَا يُفْطِرَ وَلَا يَسْتَظِلَّ وَلَا يَتَكَلَّمَ فَقَالَ مُرُوْهُ فَلْيَسْتَظِلَّ وَلْيَتَكَلَّمْ وَلْيُتِمَّ صَوْمَهٗ ۔

(البخاری، مالک، ابو داؤد)

(ایک شخص کو دیکھ کر اُس کا حال دریافت فرمایا) ۔ لوگوں نے کہا ۔ یہ ابو اسرائیل ہے ۔ اُس نے منت مان رکھی ہے کہ دھوپ میں کھڑا رہے ۔ اور سائے میں نہ آئے روزہ رکھے اور کھولے نہیں ۔ اور بات نہ کرے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ۔ اسے کہو کہ سائے میں آ جائے ۔ بات چیت کرے ۔ مگر اپنے روزے کو پورا کرے (یعنی صرف غروب آفتاب تک اس کے بعد کھائے پیئے) ۔

شُفعہ

۱۶۵ ۔ حق شُفعہ شاملات میں ہوتا ہے، شریک کا اذن بلکہ انتظار بھی ضروری ہے:

(جابرؓ) قضی النبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر اس چیز میں

---

[1] اس سے پہلی حدیث میں آیا ہے کہ منت کا اثر کسی کام کے حسب مراد ہونے پر نہیں ہوتا لیکن اگر منت مانی جائے ، اور وہ جائز فعل ہو ۔ جیسے کسی کنوئیں ، مسجد ، تیمم خانہ وغیرہ پر مال خرچ کرنا تو کام ہو جانے پر وہ ادا کر دینی چاہیئے ۔ کہ ایک تو وعدہ خلافی کی عادت نہ ہو ، دوسرا ایک نیکی کا کام سرانجام پا جائے اور اگر منت کا فعل ممنوع ہو جیسے لڑکے سے بھیک منگوانا ۔ ناک پر پھنسی ہو تو اچھی ہونے پر چاندی کی ناک کسی خانقاہ پر چڑھانا وغیرہ تو اس سے باز رہنا چاہیئے ۔ ایک اور حدیث میں جو پانچوں صحاح میں درج ہے ۔ ایک عورت کے لیے جس نے منت مانی تھی کہ ننگے پاؤں چل کر حج کرے ۔ فرمایا کہ اگر چاہے تو بے شک سوار ہو کر سفر کرلے (ننگے پاؤں چلنا لاحاصل ہے) ۔

بالشفعة فی کل مالم یقسم فاذا وقعت الحدود وصرفت الطرق فلا شفعة" وفی روایة: قضی النبی صلی الله علیه وسلم بالشفعة فی کل شرکة لم تقسم ربعة او حائط لا یحل له ان یبیع حتّٰی یؤذن شریکه فان شاء اخذ وان شاء ترک واذا باع ولم یؤذنه فهو احق به وفی اخرٰی: الجار احق بشفعة جاره ینتظر بها وان کان غائبا اذا کان طریقهما واحد"۔ (للستة الا مالکا)

شفعے کا فیصلہ فرمایا ہے جو تقسیم نہ ہو۔ ہاں اگر حد بندیاں ہو گئی ہوں اور راستے بدلے ہوئے ہوں تو حق شفعہ نہیں رہتا۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شفعے کے حق میں ہر اس چیز کے متعلق فیصلہ دیا ہے جسے احاطے یا دیوار نے منقسم نہ کر دیا ہو۔ اگر ایسا نہ ہو تو اپنے شریک کی اجازت کے بغیر کسی کو بیع کا حق نہیں۔ شریک چاہے تو لے چاہے تو چھوڑ دے۔ اگر وہ بلا اجازتِ شریک بیع کرے گا تو وہ شریک اس بیع کا زیادہ حق دار ہے۔ دوسری روایت میں ہے، کہ پڑوسی اپنے پڑوسی کا شفعے میں زیادہ حق دار ہے۔ اگر دونوں کا راستہ ایک ہی ہو تو فروشندہ کو اپنے پڑوسی کا اگر وہ موجود نہ ہو تو انتظار کرنا چاہیئے۔

۱۶۶۔ پڑوسی کا حق:

(سمرۃ) رفعه: جار الدار احق بدار الجار والارض۔ (ابو داؤد)

کسی کے گھر یا زمین کا (بصورت بیع) پڑوسی زیادہ حق دار ہے۔

۱۶۷۔ بیع میں دونوں فریق کا فائدہ مدِ نظر ہو پھل تیار ہونے سے پہلے درخت کی بیع:

(ابن عمرؓ) ان رجلا اسلف فی نخل فلم یخرج تلک السنة شیئاً فاختصما الی النبی صلی الله علیه وسلم فقال بم تستحل ماله؟ اردد علیه ماله ثم قال لا تسلفوا فی النخل حتّٰی یبدو صلاحه۔ (ابو داؤد)

ایک شخص نے ایک درخت خرما کسی کو ٹھیکے پر دیا۔ اتفاق سے اس سال کچھ پیدا نہ ہوا۔ دونوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنا معاملہ پیش کیا۔ آپ نے فرمایا: کس بنا پر تم اس کا مال لینا جائز سمجھ رہے ہو۔ اس کی رقم واپس کر دو۔ اس کے بعد فرمایا کہ: جب تک پھل پکنے کے قریب نہ ہو جائیں لین دین کا معاملہ نہ کرو۔

احادیثِ مشترکہ

۱۶۸۔ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی ثَلٰثَۃٌ اَنَا خَصْمُھُمْ

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تین شخص ہیں کہ قیامت کے دن

يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَرَجُلٌ اَعْطٰى بِيْ ثُمَّ غَدَرَ وَرَجُلٌ بَاعَ حُرًّا فَاَكَلَ ثَمَنَهٗ وَرَجُلٌ اِسْتَاْجَرَ اَجِيْرًا فَاسْتَوْفٰى مِنْهُ الْعَمَلَ وَلَمْ يُوْفِهٖ اَجْرَهٗ۔ (البخاری)

میں اُن کا دشمن ہوں گا (۱) وہ جس نے مجھے ضامن دیا اور پھر دغا کیا (۲) وہ جس نے آزاد شخص کو بیچا اور اس کی قیمت کھائی (۳) اور وہ جس نے کسی مزدور سے مزدوری مقرر کی پھر اُس سے پورا کام لیا۔ مگر مزدوری پوری نہ دی۔

ذخیرہ اندوزی

۱۶۹۔ احتکار (ذخیرہ اندوزی):

(ابن عمرؓ) رفعه: من احتكر طعاما اربعين يوما يريد به الغلاء فقد برئ من الله وبرئ الله منه (رزین)

جو مہنگا کر کے نفع کمانے کی غرض سے چالیس دن غلّے کا ذخیرہ رکھ چھوڑے وہ اللہ سے اور اللہ اس سے بری الذمہ ہے۔

۱۷۰۔ احتکار کرنے والے کی نفسی کیفیت:

(معاذؓ) رفعه: بئس العبد المحتكر ان ارخص الله الاسعار حزن وان اغلاها فرح۔ (رزین)

احتکار (HOARD) کرنے والا بھی عجیب بدطینت انسان ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اگر ارزانی پیدا فرما دے تو اُسے افسوس ہوتا ہے اور گرانی پیدا کر دے تو خوش ہوتا ہے۔

۱۷۱۔ جرم احتکار کی کوئی تلافی نہیں:

(ابو امامةؓ) رفعه: اهل المدائن هم الجلساء في سبيل الله فلا تحتكروا عليهم الاقوات ولا تغلوا عليهم الاسعار فان من احتكر عليهم طعاما اربعين يوما ثم تصدق به لم يكن له كفارة۔ (رزین)

شہروں کے لوگ فی سبیل اللہ ہی بیٹھنے والے لوگ ہیں۔ لہٰذا غذائیات کو ان پر تنگ کرکے احتکار نہ کرو اور نہ قیمتوں کو چڑھاؤ۔ اگر کوئی شخص ان پر چالیس دن احتکار کرے تو ساری جمع پونجی صدقہ کرنے کے بعد بھی اس گناہ سے احتکار کا کفارہ نہ ادا ہوگا۔

۱۷۲۔ احتکار اور بھاؤ کی تیزی :

(ابو ھریرۃ ومعقل بن یسار رفعہ: یحشر الحاکرون وقتلۃ الانفس فی درجۃ ومن دخل فی شئی من سعر المسلمین یغلیہ علیھم کان حقا علی اللہ ان یعذبہ فی معظم النار یوم القیامۃ۔ (رزین)

احتکار کرنے والے اور قتل کرنے والے دونوں ایک ہی صف میں۔ اگر کوئی شخص مسلمانوں پر عام بھاؤ کو گراں کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ پر یہ حق ہو جاتا ہے کہ بروزِ حشر وہ اسے جہنم کے سب سے بڑے طبقے میں عذاب کے لیے ڈال دے۔

۱۷۳۔ لعنتِ احتکار کی ہمہ گیری :

(ابو ھریرۃ ومعقل بن یسار) وایما اھل عرصۃ یصبح فیھم امرؤ جائع فقد برءت منھم ذمۃ اللہ۔ (احمد، موصلی، بزار، اوسط)

جن محلے والوں کی صبح اس حال میں ہو کہ ان میں رات کوئی بھوکا رہ گیا ہو، تو اُن لوگوں سے اللہ تعالیٰ بری الذمہ ہو گیا۔

حکومت کی طرف سے بھاؤ کا تعین

۱۷۴۔ جب بھاؤ کی کمی سے دوسرے تاجروں پر اثر ہو :

(ابن المسیب) ان عمر مر بحاطب بن ابی بلتعۃ وھو یبیع زبیبا بالسوق فقال لہ عمر اما ان تزید فی السعر واما ان ترفع من سوقنا۔ (مالک)

حاطب بن ابی بلتعہ منڈی میں مویز منقّٰی کی تجارت کر رہے تھے، حضرت عمرؓ اُن کے پاس سے گزرے۔ (بھاؤ معلوم کر کے) فرمایا کہ : یا تو اس کے دام میں کچھ اضافہ کرو ورنہ اس منڈی سے ہٹ جاؤ۔

قرض اور اُس کے آداب

۱۷۵۔ ادائے قرض کا سامان نہ کرنے کا گناہ :

(ابو موسیٰ) رفعه : ان اعظم الذنوب عند الله ان یلقاه به عبد بعد الکبائر التی نهی عنها ان یموت رجل وعلیه دین لا یدع له قضاء۔ (ابو داؤد)

ممنوعہ کبائر کے بعد سب سے بڑا گناہ جسے لے کر بندہ خدا کے سامنے پیش ہوگا وُہ یہ ہے کہ وہ قرض چھوڑ کر مرے اور اس کی ادائیگی کا کوئی سامان نہ کرے۔

۱۷۶۔ بدنیت قرض دار کا حشر :

(صہیبؓ) رفعه : ایما رجل تدین دینا وهو مجمع ان لا یوفیه ایاه لقی الله سارقاً (قزوینی، بلبنی)

جو شخص قرض لے اور یہ ٹھان لے کہ ادا نہ کرے گا۔ وہ اللہ تعالےٰ کے حضور چور کی حیثیت سے پیش ہوگا۔

۱۷۷۔ نیک نیّت قرض دار پر فضل :

(عمران بن حذیفة) : کانت میمونة تدان وتکثر فقال لها اهلها فی ذلك ولاموها ووجدوا علیها فقالت لا اترك الدین وقد سمعت خلیلی وصفی صلّی الله علیه وسلّم یقول ما من احد یدان دینا فی علم الله انه یرید قضاءه الا اداه الله عنه فی الدنیا۔ (للنسائی)

حضرت میمونہ قرض بہت لیا کرتی تھیں۔ ان کے خاندان والوں نے ان پر ایک بار بڑی خفگی و ملامت کا اظہار کیا تو آپ نے فرمایا کہ : میں یہ عادت نہ چھوڑوں گی میں نے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کو یہ فرماتے سُنا ہے کہ جو شخص قرض لے اور اللہ تعالیٰ اُس کی ادائیگی کی نیّت کو جانتا ہو تو اسی دنیا میں اس کی طرف سے اس کا سامان فرما دیتا ہے۔

۱۷۸۔ قرض دینے والوں کے ساتھ اللہ ہے (عبداللہ بن جعفر کی ایک ادا):

(عبداللہ بن جعفرؓ) رفعہ: ان اللہ مع الدائن حتی یقضی دینہ مالم یکن فیما یکرہ اللہ قال فکان عبداللہ یقول لخازنہ اذھب فخذ لی بدین فانی اکرہ ان ابیت لیلۃ الا واللہ معی بعد الذی سمعتہ من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ (قزوینی)

قرض ادا ہونے تک اللہ تعالیٰ قرض دینے والے کے ساتھ رہتا ہے۔ بشرطیکہ ایسی راہ میں وہ نہ دیا گیا ہو جسے اللہ تعالیٰ ناپسند فرماتا ہے۔ عبداللہ بن جعفر بعض اوقات اپنے خازن سے فرماتے کہ تم ہی میرے ثواب کی خاطر مجھ سے قرض لے لو، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات سننے کے بعد میں ایسی ایک رات بھی گزارنا پسند نہیں کرتا، جس میں اللہ تعالیٰ میرے ساتھ نہ ہو۔

۱۷۹۔ ادائے قرض میں ٹال مٹول:

(ابوھریرہؓ) رفعہ: مطل الغنی ظلم واذا اتبع احدکم علی ملی فلیتبع (للستۃ)

توانگر اگر (ادائے قرض میں) ٹال مٹول کرے تو ظلم کرتا ہے۔ اس کے پیچھے پڑ کے تقاضا کیا جا سکتا ہے۔

۱۸۰۔ تین قابلِ نفرت اشخاص:

(علیؓ) رفعہ: ان اللہ یبغض الغنی الظلوم والشیخ الجھول والعائل المختال۔ (بزار، اوسط، بلین)

اللہ تعالیٰ ظالم توانگر سے، بوڑھے جاہل سے اور محتاج متکبر سے نفرت کرتا ہے۔

۱۸۱۔ تقاضے میں نرمی و شرافت کرنے والے کی عاقبت:

(ابوھریرہؓ) رفعہ: ان رجلا لم یعمل خیرا قط وکان یداین الناس فیقول لرسولہ خذ ما تیسر و اترک ما عسر وتجاوز لعل اللہ یتجاوز

ایک شخص تھا جس نے کبھی کوئی نیک کام نہیں کیا۔ صرف اتنی سی بات تھی کہ لوگوں کو قرض دیا کرتا تھا اور جب وہ وصول کرنے کے لیے کسی کو بھیجتا تو یہ تاکید کرتا کہ جتنا آسانی سے مل جائے لے لو اور جس میں دقت ہو اُسے چھوڑ دو بلکہ

عنّا فلما هلك قال الله له هل عملت خيرًا قط؟ قال لا الا انه كان لی غلام وكنت اداين الناس و اذا بعثته يتقاضى قلت له خذ ما تيسر واترك ما عسر وتجاوز لعل الله يتجاوز عنا قال الله تعالیٰ قد تجاوزت عنك۔ (بخاری ونسائی)

معاف کر دو۔ اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ بھی ہم کو اسی طرح معاف فرما دے۔ جب وہ مرگیا تو اللہ تعالیٰ نے اس سے پوچھا کہ: تونے کوئی نیک کام بھی کیا ہے؟ عرض کیا کہ کوئی نیکی نہیں کی بجز اس کے کہ میں لوگوں کو قرض دیا کرتا تھا اور جب اپنے خادم کو تقاضے کے لیے بھیجتا تھا تو یہ کہتا تھا کہ جو کچھ آسانی سے مل جائے وہ لے لو اور جس کی ادائیگی میں دشواری ہو اُسے چھوڑ دو بلکہ معاف کر دو۔ اُمید ہے کہ اللہ بھی ہمیں یوں ہی معاف فرمائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جا ہم نے بھی تجھے معاف کیا۔

۱۸۲۔ تنگ دست کو مہلت دینے والے کا انعام:

(ابوھریرہؓ) رفعہ: من انظر معسرا او وضع له اظله الله يوم القيامة تحت ظل عرشه يوم لا ظل الا ظله (ترمذی)

جو تنگ دست قرضدار کو مہلت دے یا معاف کر دے اللہ تعالیٰ اُسے اپنے سایۂ رحمت میں لے لیگا۔ یہ دن قیامت کا وہ دن ہے جس دن اللہ کے سائے کے سوا کوئی اور سایہ نہ ہوگا۔

۱۸۳۔ فتح مکّہ سے پہلے اور بعد قرضدار کی نماز جنازہ:

(جابرؓ) كان رسول الله صلى الله عليه وسلم لا يصلي على رجل مات عليه دين فاتى بميت فقال أعليه دين؟ قالوا نعم ديناران قال صلوا على صاحبكم فقال ابوقتادة هما علی يا رسول الله فصلی عليه فلما فتح الله على رسوله قال انا اولى بكل مؤمن نفسه فمن ترك دينا فعلیّ قضاءه ومن ترك مالا فلورثته (ابوداؤد، نسائی، احمد، بزار)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی ایسی میت کا جنازہ نہ پڑھتے تھے جو قرض چھوڑ کر مرا ہو۔ ایک میت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس لائی گئی تو پوچھا کہ: کیا اس پر کوئی قرض بھی ہے؟ لوگوں نے کہا: ہاں! دو دینار۔ فرمایا: تو پھر تم لوگ جا کر نماز جنازہ پڑھ لو۔ ابوقتادہؓ نے عرض کیا کہ: یا رسول اللہ! یہ قرض میرے ذمے رہا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جنازہ پڑھ لیا۔ جب مکہ فتح ہو گیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر مومن کا اس کی اپنی ذات سے بھی زیادہ میں حق دار رہوں، لہٰذا اب جو قرض چھوڑ کر مرے اس کی ادائیگی میرے ذمے ہوگی، اور اگر وہ مال چھوڑ کر مرے تو یہ اس کے وارثوں کا حق ہوگا۔

۱۸۴۔ قرض دینے کا اجر:

(ابن مسعودؓ) رفعه: ما من مسلم یقرض مسلما قرضا مرتین الا کان کصدقتها مرة۔ (قز، وبنی مطولا)

جس شخص نے اپنے مسلمان بھائی کو دو بار قرض دیا۔ اس نے گویا ایک قرض کو صدقہ کر دیا۔

۱۸۵۔ ایضاً:

(ابو امامةؓ) دخل رجل الجنة فرأی علی بابها مکتوبا الصدقة بعشر امثالها والقرض بثمانیة عشر (کبیر)

ایک شخص جنت میں گیا تو اس نے اس کے دروازے پر یہ لکھا ہوا دیکھا کہ صدقے کا ثواب تو دس گنا ہے اور قرض کا اٹھارہ گنا۔

۱۸۶۔ قرض دینے سے خوف نہ کھاؤ:

(عقبة بن عامرؓ) رفعه: لا تخیفوا انفسکم بعد امنها قالوا وما ذاک؟ قال الدین۔

(احمد، کبیر، موصلی)

بے خوف ہونے کے بعد اپنے آپ کو خوف میں مبتلا نہ کرو۔ لوگوں نے پوچھا کہ اس کا کیا مطلب ہے؟ فرمایا: قرض (یعنی قرض دے کر اس کے متعلق تردد نہ کرو۔ ادا ہو جب بھی اور نہ ہو جب بھی اجر کہیں نہیں گیا۔)

۱۸۸۔ قرض کا دخولِ جنت میں رکاوٹ بننا:

(جابرؓ) ان رجلا اتی النبی صلی اللہ علیه وسلم فقال أرأیت ان جاهدت بنفسی ومالی فقتلت صابرا محتسبا مقبلا غیر مدبر أأدخل الجنة؟ قال نعم فاعاد ذلک مرتین اوثلاثا قال نعم ان لم یکن علیک دین لیس عندک وفاءه۔ (احمد، بزار)

ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر دریافت کیا کہ: اگر میں اس طرح اپنے مال و جان سے جہاد کروں، کہ ثابت قدم رہوں، باعث ثواب سمجھوں، آگے ہی بڑھتا جاؤں اور پیچھے نہ ہٹوں تو کیا میں جنت میں جاؤں گا؟ فرمایا: ہاں! اس نے دو تین بار یہ سوال دہرایا۔ ہر بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی جواب دیا اور آخر میں فرمایا کہ: بشرطیکہ تم پر کوئی ایسا قرض نہ ہو جس کی ادائیگی کا سامان نہ کیا ہو۔

۱۸۹: فکرِ حق:

(جابرؓ) رفعہ: لاھم الا ھم الدین ولا وجع الا وجع العین۔ (اوسط، صغیر بضعف)

فرمایا: سب سے بڑی فکر قرض کی فکر ہے، اور سب سے بڑی تکلیف آنکھ کی تکلیف ہے۔

۱۹۰: تنگدست قرض دار کے لیے کشادگی پیدا کرنا:

(ابن عمرؓ) رفعہ: من اراد ان تستجاب دعوته و ان تکشف کربته فلیفرج عن معسر (احمد، ابی یعلی)

جو یہ چاہتا ہے کہ اس کی دعائیں قبول ہوں اور اس کی مصیبتیں دور ہوں۔ وہ تنگدست قرض داروں کے لیے آسانی پیدا کرے۔

۱۹۱۔ ادائے قرض کا اجر:

(ابن عباسؓ) من مشی الی غریمه بحقه صلت علیه دواب الارض و نون الماء و نبت له بکل خطوة شجرة فی الجنة و ذنب یغفر (للبزار بخفی)

جو شخص اپنے قرض خواہ کا قرض لے کر ادا کرنے جاتا ہے اس کے لیے خشکی کے تمام ذی روح اور پانی کی مچھلیاں دعائیں کرتی ہیں اور اس کے ہر ہر قدم پر جنت میں ایک درخت اُگتا ہے اور ایک گناہ بھی معاف ہو جاتا ہے۔

حکومت کی طرف سے دیوالیے کا حکم

۱۹۲: دیوالیے کا حکم:

(ابو سعیدؓ): اصیب رجل فی عهد النبی صلی الله علیه وسلم فی ثمار ابتاعها فکثر دینه نا فلس فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم تصدقوا علیه فتصدق الناس علیه

عہدِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) میں ایک شخص نے کچھ پھل خریدے مگر اس پر کوئی آفت آ گئی اور وہ بہت مقروض ہو کر دیوالیہ ہو گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: تم لوگ اسے صدقہ دو۔ سب نے صدقات پیش

فلم یبلغ ذلک وفاء دینه فقال صلی الله علیه وسلم لغرمائه خذوا ما وجدتم ولیس لکم الا ذلک ۔ (مسلم، اصحاب سنن)

کیے لیکن اس کے قرض کے برابر پھر بھی نہ ہو سکے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے قرض خواہوں کو فرمایا کہ: یہ جو کچھ ہے سو لے لو۔ اس کے سوا اور تمھارا کوئی حق نہیں رہا۔

عاریت، ہبہ وغیرہ

۱۹۳۔ کچھ دے کر واپس لینا:

(ابن عباسؓ و ابن عمرؓ) رفعاه: لا یحل لرجل ان یعطی عطیة او یهب هبة ثم یرجع فیها الا الوالد فیما یعطی ولده ومثل الذی یرجع فی عطیته او هبته کالکلب یأکل فاذا شبع قاء ثم عاد فی قیئه (لاصحاب سنن)

کسی شخص کے لیے یہ جائز نہیں کہ کسی کو بطور عطیہ یا ہبہ کچھ دے کر واپس لے۔ ہاں صرف باپ اپنے بیٹے سے واپس لے سکتا ہے۔ اس کے علاوہ جو بھی ایسا کرتا ہے۔ اس کی مثال ایسے کتے کی سی ہے جو خوب کھا کر قے کرے اور پھر اسی قے میں منہ ڈالے۔

جائز و ناجائز ہدایا

۱۹۴۔ مبادلۂ ہدایا کی برکت:

(ابو هریرةؓ) رفعه: تهادوا فان الهدیة تذهب وحر الصدور ولا تحقرن جارة لجارتها ولو شق فرسن شاة (للترمذی)

آپس میں ہدیوں کا مبادلہ کیا کرو۔ ہدیہ سینے کے کینے کو دُور کرتا ہے۔ ایک پڑوسن دوسری پڑوسن کی تحقیر نہ کرے خواہ بکری کا ایک پایہ ہی کیوں نہ بھیج دے۔

۱۹۵۔ سفارش کی قیمت لینا ربا ہے:

(ابو امامةؓ) رفعه: من شفع

اگر کوئی شخص کسی کی سفارش کرے اور وہ

لاحد شفاعة فاهدى لها هدية عليها فقبلها فقد اتى بابا عظيما من ابواب الربٰوا۔ (ابوداؤد)

اس سفارش کی وجہ سے کوئی ہدیہ بھیجے، جسے سفارش کرنے والا قبول کرے تو وہ ربا (سود) کی ایک بڑی قسم کو قبول کرتا ہے۔

۱۹۶۔ تعلیم دین کی اُجرت حرام ہے:

(عبادة بن الصامت) علّمت ناسا من اهل الصفة الكتاب والقرآن فاهدى الىّ رجل منهم قوسا فقلت ليست بمال و ارمى عليها فى سبيل الله لآتين رسول الله صلّى الله عليه وسلّم واسألنّه فقال ان كنت تحب ان تطوق طوقا من نار فاقبلها۔

(ابوداؤد)

میں نے بعض اصحابِ صفّہ کو کتاب یعنی قرآن کی تعلیم دی تھی۔ ان میں سے ایک آدمی نے ایک کمان بطور ہدیہ پیش کی۔ میں نے کہا: یہ کوئی ایسا مال تو ہے نہیں بلکہ اس میں سے فی سبیل اللہ تیر چلاؤں گا تاہم میں اس کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت ضرور کروں گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے پوچھنے پر فرمایا کہ: اگر تم یہ پسند کرتے ہو کہ تمھاری گردن میں آگ کا طوق ڈال دیا جائے تو اُسے قبول کر لو۔

۱۹۷۔ الہدایہ مشترک:

(ابنِ عباسؓ) رفعه: من أهديت له هدية وعنده قوم فهم شركاء فيها (للكبير والاوسط بلين)

اگر کسی کے پاس ہدیہ آئے اور وہاں کچھ اور لوگ بھی موجود ہوں تو اُس میں سب لوگوں کو شریک کرنا چاہیئے۔

۱۹۸۔ قرض خواہ کی خاطر مدارات:

(انسؓ) رفعه: اذا اقرض احدكم قرضا فاهدى اليه اوحمله على الدابة فلا يركبها ولا يقبله الّا ان يكون جرى بينه وبينه قبل ذلك۔

(للقزوينى بمجهول)

اگر کوئی شخص کسی کو قرض دے اور وہ مقروض اُسے کوئی ہدیہ یا سواری پیش کرے تو وہ نہ اس ہدیے کو قبول کرے نہ سواری استعمال کرے بجز اس کے کہ اس قرض سے پہلے بھی دونوں کے درمیان اس طرح کے روابط موجود ہوں۔

شرکت

۱۹۹- معیتِ خداوندی، عدمِ خیانت سے مشروط ہے:

(ابوھریرۃؓ) رفعه: ان اللّٰه تعالیٰ یقول انا ثالث الشریکین ما لم یخن احدھما صاحبه فاذا خانه خرجت من بینھما۔ (ابوداؤد)

اللہ تعالیٰ کا کہنا یہ ہے کہ جب دو آدمی کوئی معاملہ کرتے ہیں تو اگر کوئی ایک دوسرے کی خیانت نہیں کرتا تو میں بھی ان دونوں کا شریک (مددگار) ہوتا ہوں اور اگر کوئی ایک خیانت کا مرتکب ہو تو میں بیچ سے نکل جاتا ہوں۔

رہن

۲۰۰- مالِ مرہونہ ہر حال میں واپس کیا جائے:

(ابن المسیبؓ) ارسله: لا یغلق الرھن لمالک وقال تفسیرہ ان یرھن الرھن وفیه فضل عما رھن فیه فیقول المرتھن ان لم تأتنی بحقی الی اجل کذا فھو لی او یقول الراھن ھو لک ان لم آتک الی اجل وھو الذی نھی عنه صلی اللّٰہ علیه وسلم فلا یصلح فان جاء صاحبه بما فیه بعد الاجل فھو له۔

"غَلَقِ رہن" نہ کیا جائے۔ ابن مسیب اس کا یہ مطلب بتلاتے ہیں کہ کوئی چیز اپنی اصلی قیمت سے کم پر رہن رکھی جائے اور مرتہن (جس کے پاس رہن رکھی جائے) یہ کہے کہ اگر فلاں وقت تک تم زرِ رہن نہ ادا کروگے، تو یہ چیز میری ہو جائے گی۔ یا راہن (رہن رکھنے والا) یوں کہے اگر میں فلاں وقت تک ادا نہ کر دوں تو یہ چیز تمھاری ہو گی۔ یہی ہے غَلَقِ رہن جس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے روکا ہے۔ لہٰذا یہ درست نہیں بلکہ مالک مدت گزرنے کے بعد بھی اگر زرِ رہن لے کر آئے تو وہ مرہونہ چیز اسی کی ہو گی۔

۲۰۱- زمین پر قبضۂ ناحق:

(ابن عمرؓ) رفعه: من اخذ شبرًا

جو ناحق ایک بالشت زمین پر بھی قبضہ کرے گا

من ارض بغیر حق خسف بہ یوم القیامۃ الی سبع ارضین ۔ (بخاری)

وہ بروزِ حشر اسی میں سات تہوں تک دھنسایا جاتا رہے گا۔

زمین کو بٹائی یا کرائے پر دینا

۲۰۲۔ اُجرت پر زمین دینے کا جواز :

(رافع بن خدیج رض) کنا اکثر الانصار حقلا فکنا نکری الارض علی ان لنا ھذہ و لھم ھذہ فربما اخرجت ھذہ ولم تخرج ھذہ فنھانا عن ذلک ....

انصار میں زیادہ تر لوگ زمینداری کاشت کاری کرتے تھے۔ ہم زمین کو اس شرط سے کرائے پر دیتے تھے کہ اس حصہ زمین کی پیداوار میری اور اس حصے کی تمھاری لیکن بعض اوقات یہ ہوتا کہ ایک حصے میں پیداوار ہوتی اور دوسرے میں نہ ہوتی (اور کسی فریق کا نقصان ہوتا) للذا آنحضرت ؐ نے اس سے روک دیا....

ومنھا عن نافع : ان ابن عمر کان یکری مزارعہ علی عھد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفی امارۃ ابی بکر وعمر وعثمان وصدراً من خلافۃ معاویۃ حتی بلغہ فی اٰخر خلافۃ معاویۃ ان رافع بن خدیج یحدث فیھا بنھی عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فدخل علیہ و انا معہ فسألہ فقال کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم ینھی عن کراء المزارع فترکھا ابن عمرؓ وکان اذا سئل عنھا بعد قال زعم ابن خدیج ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم نھی عنھا۔

نافع کا بیان ہے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہٗ بعہدِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے کھیت کرائے پر دیتے تھے بلکہ عہدِ ابوبکر رض وعمر رض و عثمان رض میں اور پھر دورِ معاویہ میں بھی ایسا کرتے رہے۔ آخری دورِ معاویہ میں رافع بن خدیج اس کی ممانعت کی حدیث بیان کرنے لگے، تو میرے ساتھ ابن عمر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے ان کے پاس جاکر دریافت کیا۔ انھوں نے کہا کہ :

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کھیت کو کرائے پر دینے سے روکتے تھے۔ اس کے بعد ابن عمر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے یہ کام ترک کر دیا۔ جب ان سے پوچھا جاتا تو جواب دیتے کہ :

ابن خدیج کا گمان ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے روکا ہے۔

ومنھا : انہ قال لا بأس بالذھب

ایک روایت میں ان کا قول یہ بھی ہے کہ اگر یہ معاملہ

والورق انما كان الناس يواجرون بما على الماذيانات واقبال الجداول واشياء من الزرع فيهلك هذا ويسلم هذا اويسلم هذا ويهلك هذا ولم يكن للناس كراء الا هذا فلذلك زجر عنه فاما شئ معلوم مضمون فلا بأس به۔

ومنها: نهانا صلى الله عليه وسلم عن امر كان نافعا لنا وطواعية الله ورسوله انفع لنا نهانا ان نحاقل الارض فنكريها على الثلث والربع والطعام المسمى وامر رب الارض ان يزرعها او يزرعها۔

ومنها عن رافع: انه زرع ارضا فمر به النبي صلى الله عليه وسلم وهو يسقيها فسأله لمن الزرع ولمن الارض: فقال زرعي ببذري وعملي لي الشطر ولبني فلان الشطر فقال اربيتما فرد الارض على اهلها وخذ نفقتك۔

ومنها: قال له ابن عمرؓ أسمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم نهى عن كراء الارض؟ فقال رافع سمعت النبي صلى الله عليه وسلم يقول لا تكروا الارض بشئ۔

سونے چاندی کے واسطے سے کیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں، دراصل بات یہ تھی کہ لوگ نالیوں اور حوضوں کے آس پاس کی پیداوار اور کچھ دوسرے حصوں کی پیداوار کو اپنی زمین کی اُجرت میں لیتے تھے، اور نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ کبھی یہ حصہ ضائع ہوتا اور وہ حصہ پیدا کرتا اور کبھی اس کے برعکس ہوتا۔ اس طرح کی مقررہ اُجرتوں میں کسی ایک فریق کا نقصان ہوتا۔ لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے روکا۔ لیکن اگر (روپے پیسے یا غلے) کی طرح غیر مبہم ضمانت ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔

ایک اور روایت ہے کہ یہ کام ہمارے لیے نفع بخش تو ضرور تھا مگر حضور علیہ السلام نے اس سے منع فرمایا ہے اور اللہ تعالیٰ و رسولؐ کی اطاعت اس سے زیادہ منفعت بخش ہے۔ حضور علیہ السلام نے ہمیں زمین کی محاقلت سے بھی منع فرمایا ہے (محاقلت کے معنی ہیں کھیتی کو خوشے ہی میں بیچنا) لہٰذا ہم لوگ تہائی، چوتھائی یا معین مقدار پیداوار پر زمین اُجرت پر دیتے تھے۔ حضورؐ نے صاحب زمین کو یہ حکم دیا ہے کہ زمین کی یا تو کھیتی کریں یا دوسروں سے کرائیں (بیکار نہ رکھیں)۔

رافع سے ایک اور روایت ہے کہ اُنھوں نے ایک کھیتی تیار کی جسے وہ سیراب کر رہے تھے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ادھر سے گزرے تو پوچھا کہ: یہ کھیتی کس نے کی ہے اور زمین کس کی ہے؟ عرض کیا کہ: یہ کھیت میں نے اپنے بیج اور محنت سے پیدا کیا ہے اس شرط پر کہ پیداوار میں نصف میرا ہوگا نصف بنی فلاں کا۔ فرمایا: تم دونوں ہی ربا کے مرتکب ہوئے۔ زمین زمین والوں کو واپس کر دو اور اپنا خرچ واپس لے لو۔

دوسری روایت یہ ہے کہ ابن عمرؓ نے رافع سے پوچھا کہ: تم نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو زمین کرائے پر دینے سے منع کرتے سُنا ہے؟ کہا: میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سُنا ہے کہ زمین کسی شے کے عوض کرائے پر مت دو۔

ومنها: فقد قال له عمران بن سهیل بن بن رافع یا ابتاہ انہ قد اکرینا ارضنا فلانۃ بمأتی درھم فقال یا بنی دع ذلک ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قد نھی عن کراء الارض۔

ایک اور روایت ہے کہ عمران بن سہیل بن رافع نے کہا کہ: اے پدرِ بزرگوار میں نے اپنی فلاں زمین دو سو درہم کے عوض اُجرت پہ دی ہے۔ اُنھوں نے کہا: اے فرزند! اسے چھوڑ دو کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین کو اُجرت پر دینے سے منع فرمایا ہے۔

ومنھا قال لہ ابن عمرؓ یا ابن خدیج ماذا تحدث عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی کراء الارض؟ فقال رافع سمعت عمی یحدثان اھل الدار انہ صلی اللہ علیہ وسلم نھی عن کراء الارض (الستۃ)

دوسری روایت ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ: اے ابن خدیج! اُجرت پر زمین دینے کے متعلق آپ کیا فرماتے ہیں؟ بولے کہ: میں نے اپنے دونوں چچاؤں کو اہلِ محلہ سے یہ بیان کرتے سنا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُجرت پر زمین دینے سے روکا ہے۔

(عروۃؓ): قال زید یغفر اللہ لرافع بن خدیج انا واللہ اعلم بالحدیث منہ اذما اتاہ رجلان من الانصار قد اقتتلا فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کان ھذا شانکم فلا تکروا المزارع فسمع لا تکروا المزارع۔ (ابوداؤد)

زید نے کہا کہ رافع بن خدیج کو خدا بخشے۔ بخدا میں ان سے حدیث کا زیادہ واقف ہوں، بات یوں ہے کہ دو انصاری لڑتے جھگڑتے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تھے جس پر حضورؐ نے فرمایا کہ جب تمھارا یہی حال ہے تو زمین کو اُجرت پر نہ دیا کرو۔ رافع نے صرف اتنا ہی سُن لیا کہ زمین کو اُجرت پر نہ دو۔

(سعدؓ) ان اصحاب المزارع یکرون مزارعھم بما یکون علی الساقی من الزرع فاختصموا الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی بعض ذلک فنھاھم ان یکروا بذلک وقال اکروا بالذھب والفضۃ۔ (نسائی، ابوداؤد)

کھیت والے اپنے کھیتوں کو نالیوں پر اُگنے والی پیداوار کے عوض اُجرت پہ دیتے تھے۔ چنانچہ اسی قسم کے بعض معاملات میں باہم جھگڑا ہو گیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شرط پر زمین کو اُجرت پر دینے سے روک دیا اور فرمایا کہ: (پیداوار کی بجائے) سونے چاندی (درہم و دینار) سے معاملت کرو۔

ملکیّت زمین اور افتادہ زمین کی کاشت

۲۰۳ - احیائے زمین (زمین میں کاشت کرنا) :

(عروۃؓ) ارسلہ : من احی ارضا میتۃ فھی لہ ولیس لعرق ظالم حق -
(مالک، ترمذی، ابوداؤد)

جو کسی مُردہ زمین کو زندہ کرے (یعنی کاشت کر کے اُسے سرسبز بنائے) وہ اسی کے لیے ہے اور غاصب کا کوئی حق نہیں (غصب کی شکل یہ ہے کہ ایک شخص نے زمین کو زندہ کیا۔ اس کے بعد دوسرے نے پھر اُسے اپنا قبضہ جمانے کے لیے زندہ کرلیا)۔

۲۰۴ - ملکیّت زمین کی حقیقت (زمین خدا کی اور بندے بھی اُسی کے) :

(عروۃؓ) اشھد ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قضی ان الارض ارض اللہ والعباد عباد اللہ فمن احی مواتا فھو احق بہ جاءنا بھذا عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الذی جاءنا بالصلوۃ عنہ - زاد الاوسط : قال عروۃ اشھد ان عائشۃؓ حدثتنی بھذا عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم واشھد ان عائشۃؓ ما کذبتنی۔

میں اس حقیقت کی گواہی دیتا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کا فیصلہ کر دیا ہے کہ یہ زمین خدا کی ہے اور یہ بندے بھی اُسی کے ہیں۔ لہٰذا جو شخص کسی مُردہ زمین کو زندہ کرے اس کا زیادہ حقدار بھی وہی ہے۔ جس نے نماز کی روایت نبوی ہم سے بیان کی ہے، اسی نے یہ بات بھی بیان کی ہے۔ اوسط کی روایت میں یہ اضافہ ہے کہ : میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ روایت مجھ سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کی اور اس بات کا بھی گواہ ہوں کہ حضرت عائشہ رضؓ نے مجھ سے جھوٹ نہیں بیان کیا۔

۲۰۵ - احیائے زمین کرنے والے کا حق تصرّف :

(سعیدؓ بن زیدؓ) رفعہ : من احی ارضا فعجز صاحبھا عنھا وترکھا

جس زمین کا مالک اسے زندہ کرنے سے عاجز ہو اور اُسے برباد حالت میں چھوڑ دے تو یہ

بمهلكة فهي له ۔ (سائرین)

اس کی ہو جائے گی جو اسے زندہ کرلے۔

۲۰۶۔ سامانِ آبپاشی کرنے والے کا اجر:

(ام سلمۃؓ) رفعته : ما من امرئ يحيى ارضا فيشرب عنه كبدٌ حرّاء و تصيب منها عافية الا كتب الله له به اجرا۔ (کبیر اوسط)

جو شخص کسی زمین کو زندہ کرے اور اُس سے کوئی پیاسا سیراب ہو کر راحت پائے، تو اللہ تعالیٰ اُس کے لیے بڑا اجر لکھ دیتا ہے۔

۲۰۷۔ بلا اجازت کسی کی زمین میں کاشت کرنا:

(رافعؓ بن خدیجؓ) رفعه : من زرع في ارض قوم بغير اذنهم فليس له من الزرع شئ وله نفقته۔ (للترمذی)

اگر کوئی شخص کسی کی زمین میں اُس کی اجازت کے بغیر زراعت کرلے تو اس کا کھیت میں کوئی حصہ نہ ہوگا۔ اس کا خرچہ اُسے ملے گا۔

عُہدۂ قضا اور اُس کے احکام

۲۰۷۔ قاضی کی بے کسی:

(ابو ہریرۃؓ) رفعه : من جعل قاضيا بين الناس فقد ذبح بغير سكين۔ (ابو داؤد، ترمذی)

جس شخص کے سپرد عہدۂ قضا ہوا سمجھ لو کہ وہ بے چھری کے ذبح کیا گیا۔

۲۰۸۔ جنّتی اور جہنّمی قاضی:

(ابو بریدۃؓ) رفعه : القضاة ثلاثة واحد في الجنّة واثنان في النار فاما الذي في الجنّة فرجل عرف الحق فقضى به ورجل عرف الحق فجار في الحكم فهو في النار

قاضی تین قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک جنتی ہوتا ہے اور دو جہنمی۔ جنتی قاضی وہ ہے جو حق کو پہچان کر اس کے مطابق فیصلہ دے اور جو قاضی حق کو جان کر فیصلے میں ظلم سے کام لے وہ بھی جہنمی

ورجل قضی للناس علی جھل فی النار۔ (ابوداؤد)

اور وہ قاضی بھی جو بے سوچے سمجھے فیصلے کرے۔

۲۰۹۔ عہدۂ قضا کی خواہش اور اُس سے گریز:

(انسؓ) رفعہ: من سأل القضاء وُکّل الی نفسہ ومن جبر علیہ ینزل علیہ ملک یسددہ۔ (ابوداؤد۔ ترمذی)

جو شخص عہدۂ قضا کو مانگ کر حاصل کرے گا وہ اپنے نفس کے داؤ میں آجائے گا اور جب مجبور کرکے یہ عہدہ سپرد کیا جائے گا۔ اس پر ایک فرشتہ نازل ہوگا جو اسے ٹھیک راہ پر لگاتا رہے گا۔

۲۱۰۔ عہدۂ قضا کی خواہش کے بعد:

(ابوھریرۃؓ) رفعہ: من طلب قضاء المسلمین حتی ینالہ ثم غلب عدلہ جورہ فلہ الجنۃ ومن غلب جورہ عدلہ فلہ النار۔ (ابوداؤد)

جو شخص مانگ کر عہدۂ قضا حاصل کرلے اور اس کی بے انصافی پر اس کا عدل غالب آجائے تو اس کے لیے جنّت ہے اور اگر اس کے عدل پر اُس کی بے عدلی غالب آجائے تو جہنمی ہے۔

۲۱۱۔ قاضی کے ساتھ رحمان یا شیطان کی معیّت:

(ابن ابی اوفیٰؓ) رفعہ: اللہ مع القاضی مالم یجروا ذا جار تخلی عنہ والزمہ الشیطان۔ (للترمذی)

قاضی جب تک بے انصافی سے بچا رہتا ہے اللہ اس کے ساتھ ہوتا ہے جب وہ بے عدلی کرتا ہے تو اس سے الگ ہوجاتا ہے اور شیطان کو اُس کا ساتھی بنادیتا ہے۔

۲۱۲۔ اجتہاد کا اجر:

(عمروؓ بن العاص) رفعہ: اذا حکم الحاکم فاجتھد فاصاب فلہ اجران واذا حکم فاجتھد فاخطاء فلہ اجر۔ (للشیخین، ابوداؤد)

اگر قاضی صحیح فیصلے کی کوشش کرتا رہے تو اگر صحیح فیصلہ ہوگا تو اُس کے لیے دو اجر ہوں گے۔ اور اس کوشش کے باوجود غلطی کرجائے تو اُس کے لیے ایک اجر ہے۔

۲۱۳ - قاضی ایک طبیب ہوتا ہے :

(یحییٰ بن سعیدؓ) : ان ابا الدرداء کتب الی سلمان ان ھلم الی الارض المقدسۃ فکتب الیہ سلمان ان الارض لا تقدس احدا وانما یقدس الانسان عملہ و قد بلغنی انک جعلت طبیبا تداوی فان کنت تبریٔ فنعما لک وان کنت متطببا فاحذر ان تقتل انسانا فتدخل النار فکان ابو الدرداء اذا قضی بین اثنین ثم ادبرا عنہ نظر الیھما فقال متطبب واللہ ارجعا الیّ اعیدا قصتکما۔ (مالک)

ابو درداءؓ نے سلمانؓ کو لکھا کہ تم ارضِ مقدس میں آ جاؤ۔ سلمانؓ نے جواب دیا کہ زمین انسان کو مقدس نہیں بناتی بلکہ اس کا عمل اسے مقدس بناتا ہے۔ مجھے خبر ملی ہے کہ تم طبیب (یعنی قاضی) بنائے گئے ہو اور لوگوں کا علاج کرتے ہو۔ اگر تم مرض کو دور کر دو تو سبحان اللہ اور اگر نقلی طبیب ہو تو ذرا ہوشیار رہو۔ کہیں کسی انسان کی جان لے کر مستحق دوزخ نہ بن جانا۔ اس کے بعد ابوالدرداء جب بھی دو آدمیوں کے درمیان فیصلہ کرنے بیٹھتے تو ان کے واپس ہونے کے بعد دونوں کو دیکھتے رہتے، اور آواز دیتے کہ یہی میں تو نقلی طبیب ہوں۔ واپس آکر دونوں اپنا بیان پھر دہراؤ۔

۲۱۴ - رشوت دینے والا اور لینے والا :

(ابوہریرہؓ و ابن عمرؓ) ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم لعن الراشی والمرتشی فی الحکم (للترمذی ولابی داؤد، عن ابن عمر وحدہ)

فیصلہ (اپنے حق میں کرانے کے لیے) جو شخص رشوت دے یا لے۔ دونوں پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے۔

۲۱۵ - قاضی دونوں فریقوں کا بیان سن کر فیصلہ دے :

(علیؓ) بعثنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الی الیمن قاضیا فقلت یا رسول اللہ تنرسلنی وانا حدیث السن ولا علم لی بالقضاء فقال ان اللہ سیھدی قلبک ویثبت لسانک فاذا جلس

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے قاضی یمن بنا کر بھیجنا چاہا تو میں نے عرض کیا کہ : یا رسول اللہ! مجھ کم سن کو آپ اس عہدے پر بھیج رہے ہیں ؟ مجھے تو فن قضاء کا کوئی علم ہی نہیں فرمایا : اللہ تعالیٰ تمھارے قلب کو راستہ سمجھا دے گا اور تمھاری زبان (فیصلے) کو ثبات عطا فرمائے گا۔ دیکھو اب جب تمھارے

بین یدیک الخصمان فلا تقضین حتی تسمع من الآخر کما سمعت من الاول فانہ احری ان یتبین لک القضاء فما زلت قاضیا او ما شککت فی قضاء بعد۔
(للترمذی و ابو داؤد و بلفظہ)

سامنے دونوں جھگڑے والے آئیں، تو جب تک مدعی کی طرح مدعا علیہ کے بیان کو بھی باطمینان نہ سن لو، اس وقت تک کوئی فیصلہ مت دو۔ اس طرح صحیح فیصلہ تمہارے سامنے روشن تر طریق پر آ جائے گا اس کے بعد میں برابر قاضی رہا اور کبھی کسی فیصلے میں تذبذب و شک نہیں پیدا ہوا۔

۲۱۶۔ غصے کی حالت میں فیصلہ نہ دیا جائے:

(ابو بکرۃؓ) رفعہ: لا یحکم احد بین اثنین وھو غضبان وفی روایۃ: لا یقضین فی قضاء بقضائین ولا یقضین احد بین خصمین وھو غضبان۔
(للستۃ الا مالکا)

غصے کی حالت میں کوئی شخص بھی دو آدمیوں کے درمیان فیصلہ نہ دے۔
ایک دوسری روایت میں ہے کہ اس معاملے میں کوئی قاضی دو فیصلے نہ دے اور نہ دو جھگڑے کرنے والوں کے درمیان بحالت غصہ فیصلہ دے۔

۲۱۷۔ فریقین میں ہر لحاظ سے برابری قائم رکھی جائے:

(ام سلمۃؓ) رفعتہ: اذا ابتلی احدکم بالقضاء بین المسلمین فلا یقضین وھو غضبان ولیسو بینھم بالنظر والمجلس والاشارۃ ولا یرفع صوتہ علی احد الخصمین فوق الآخر
(للموصلی والکبیر بنحوہ)

جب کوئی مسلمانوں کا قاضی ہونے کی آزمائش میں پڑے تو غصے کی حالت میں کبھی فیصلہ نہ دے اور متخاصمین کی طرف دیکھنے، ان کو بٹھانے اور ان کی طرف اشارہ کرنے تک میں برابری کو قائم رکھے اور کسی ایک فریق پر دوسرے کی بہ نسبت آواز زیادہ بلند نہ کرے۔

۲۱۸۔ قاضی بلائے تو جانا ضروری ہے:

(عمران بن حصینؓ) رفعہ: من دعی الی حاکم من حکام المسلمین فامتنع فھو ظالم او قال لا حق لہ (للبزار بلین)

کسی مسلمان قاضی کے بلانے پر جو شخص نہ جائے وہ ظالم ہے اور اسے اس کا کوئی حق نہیں۔

۲۱۹۔ فیصلے کے بعد اپنی مظلومیت کا اظہار غلط ہے:

(عوف بن مالکؓ) ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قضی بین رجلین فقال المقضی علیہ لما ادبر حسبی اللہ و نعم الوکیل فقال صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ یلوم علی العجز ولکن علیک بالکیس فاذا غلبک امر فقل حسبی اللہ ونعم الوکیل۔ (ابوداؤد)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دو آدمیوں کے جھگڑے کا فیصلہ فرمایا۔ جس کے خلاف فیصلہ ہوا وہ واپس جاتا ہوا، بولا کہ "حسبی اللہ و نعم الوکیل" میرے لیے اللہ کافی ہے اور وہ بہتر مددگار ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا کہ: اس طرح کی عاجزی اللہ تعالیٰ کے نزدیک قابلِ ملامت ہے تمہیں عقل و فراست سے بھی کام لینا چاہیئے اس کے بعد بھی تم مغلوب ہو جاؤ تو حسبی اللہ و نعم الوکیل کہو۔

۲۲۰۔ فیصلے کی تین بنیادیں: (کتاب، سنت اور اجتہاد)

(معاذؓ) ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم لما اراد ان یبعثہ الی الیمن قال لہ کیف تقضی اذا عرض لک قضاء؟ قال اقضی بکتاب اللہ تعالیٰ قال فان لم تجد فی کتاب اللہ؟ قال اقضی بسنۃ رسول اللہ قال فان لم تجد فی سنۃ رسول اللہ ولا فی کتاب اللہ؟ قال اجتھد رائی ولا آلو فضرب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صدرہ وقال الحمد للہ الذی وفق رسول رسول اللہ لما یرضی رسول اللہ۔ وفی روایۃ: ان معاذاً سال النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال یارسول اللہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب معاذؓ بن جبل کو قاضی یمن بنا کر بھیجنا چاہا تو پوچھا کہ: تمہارے پاس کوئی مقدمہ آئے تو تم کس طرح فیصلہ کرو گے؟ عرض کیا: کتاب اللہ سے فیصلہ دوں گا۔ فرمایا: اگر تمہیں کتاب اللہ میں اس کے متعلق کوئی حکم نہ ملے تو؟ عرض کیا، سنت رسول اللہ کے مطابق فیصلہ دوں گا۔ فرمایا: اگر وہاں بھی نہ ملے؟ عرض کیا کہ پھر اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور اس میں کوئی کوتاہی نہ کروں گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ (رضی اللہ عنہ) کے سینے پر ہاتھ مار کر فرمایا: اس کے لیے حمد ہے جس نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول (فرستادہ) کو رسولِ خدا کی مرضی کے مطابق چلنے کی توفیق بخشی۔

دوسری روایت میں ہے کہ معاذ (رضی اللہ عنہ) ہی نے سوال کیا کہ یارسول اللہ! میں کس چیز کے مطابق فیصلے کروں؟

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

دعویٰ، ثبوت اور گواہی کے احکام

۲۲۲ - ثبوت اور قسم کس کے ذمّے ہے؟ :

(ابن عمرو بن العاصؓ) رفعه : البیّنة علی المدعی والیمین علی المدعٰی علیه۔ (الترمذی)

مدعی کے ذمّے ثبوت پیش کرنا ہے اور مدعا علیہ کے ذمّے قسم کھانا۔

۲۲۳ - ایک قسم اور ایک گواہی پر بھی فیصلہ ہو سکتا ہے :

(ابن عباسؓ)...... ان النبی صلی اللہ علیه وسلم قضا بیمین وشاھد (مسلم، ابوداؤد)

...... ایک قسم اور ایک گواہ پر بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ فرمایا ہے۔

۲۲۴ - ایک قسم ایک گواہ کے ساتھ مل کر کام دے جاتی ہے :

(ابو ھریرۃؓ) ان النبی صلی اللہ علیه وسلم قضی بالیمین مع الشاھد الواحد (لابی داؤد والترمذی وله عن جابر مثله)

حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یمین اور ایک ہی گواہی پر بھی فیصلہ دیا ہے۔ ترمذی میں جابرؓ سے بھی ایسی ہی روایت آئی ہے۔

۲۲۵ - کن لوگوں کی گواہیاں نامقبول ہیں؟ :

(عائشةؓ) رفعته : لا تجوز شھادة خائن ولا خائنة ولا مجلود حدا ولا ذی غمر علی اخیه ولا مجرب شھادة ولا القانع لاھل البیت ولا ظنین فی ولاء ولا قرابة (قال الفزاری القانع التابع۔) (للترمذی)

مندرجہ ذیل قسم کے لوگوں کی گواہی جائز نہیں :

(۱) خائن اور خائنہ (۲) جسے کسی حد میں کوڑے لگے ہوں۔ (۳) جسے اپنے بھائی سے کینہ ہو۔

(۴) جس کی غلط گواہی آزمائی جا چکی ہو۔

(۵) گھر والوں کے تابع (مثلاً ملازم وغیرہ)

(۶) جو دوستی یا قرابت کے معاملے میں متہم ہو۔

۲۲۵۔ کسی کے خلاف گواہی دینے والا اُسی کی سطح کا ہونا چاہیئے:

(ابو ھریرۃؓ) رفعہ: لا تجوز شھادۃ بدوی علی صاحب قریۃ۔ (ابو داؤد)

دیہقانی کی گواہی بھی شہری کے خلاف جائز نہیں۔

۲۲۶۔ جھوٹی گواہی شرک کے برابر ہے:

(ایمن بن خریمؓ) رفعہ: ایھا الناس عُدلت شھادۃ الزور اشراکا باللہ تعالیٰ ثم قرأ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فاجتنبوا الرجس من الاوثان واجتنبوا قول الزور الآیۃ۔ (ابو داؤد، ترمذی بلفظہ واعلّہ)

اے لوگو! جھوٹی گواہی شرک کی ہم پلہ ہے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی:

(ترجمہ): کہ بتوں کی پلیدی سے بچو اور جھوٹی بات سے بھی۔

۲۲۷۔ بہترین گواہ کون ہے؟:

(زید بن خالدؓ) الا اخبرکم بخیر الشھداء؟ الذی یأتی بشھادتہ قبل ان یسئلھا۔ (مالک، مسلم، ابی داؤد، ترمذی)

میں تمھیں نہ بتادوں کہ سب سے بہتر گواہ کونسا ہے؟ وہ ہے جو اپنی گواہی قبل اس کے کہ اس سے اس کی درخواست کی جائے، پیش کر دے۔

۲۲۸۔ خزیمہ کی ایک عجیب ادا (ان کی ایک گواہی دو کے برابر ہے):

(خزیمہ بن ثابتؓ) ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم ابتاع فرسا من اعرابی فاستتبعہ الی منزلہ لیقبضہ ثمن فرسہ فاسرع النبی صلی اللہ علیہ وسلم المشیٔ وابطأ الاعرابی بالفرس فطفقت رجال

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اعرابی سے ایک گھوڑا خریدا۔ اعرابی، حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پیچھے ہو لیا، تاکہ گھر پہنچ کر اپنے گھوڑے کی قیمت لے لے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تیز قدمی فرما رہے تھے اور اعرابی اپنے گھوڑے کی وجہ سے سست رفتاری سے چل رہا تھا۔ راستے میں کچھ لوگ

یعترضون الاعرابی بیساومونه بالفرس لا یشعرون ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم ابتاعه فنادی الاعرابی النبی صلی اللہ علیه وسلم فقال ان کنت مبتاعا هذا الفرس والا بعته فقام النبی صلی اللہ علیه وسلم حین سمع نداء الاعرابی فقال اولیس قد ابتعته منک ؟ قال الاعرابی لا واللہ ما بعتکم فقال صلی اللہ علیه وسلم بلی قد ابتعته منك فطفق الاعرابی یقول هلم شهیدا فقال خزیمة انا اشهد انک قد بایعته فاقبل النبی صلی اللہ علیه وسلم علی خزیمة فقال بم تشهد؟ قال بتصدیقک یا رسول اللہ فجعل صلی اللہ علیه وسلم شهادة خزیمة بشهادة رجلین۔

(ابوداؤد، نسائی)

اُسے ملے اور گھوڑے کا مول تول کرنے لگے۔ انھیں یہ علم نہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گھوڑا خرید چکے ہیں۔ اعرابی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو آواز دی کہ آپؐ خریدتے ہیں یا میں اور کسی کے ہاتھ فروخت کر دوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اُس کی آواز سن کر کھڑے ہوگئے اور فرمایا کہ : کیا میں تجھ سے یہ خرید نہیں چکا ہوں ؟ اعرابی بولا کہ : بخدا میں نے اسے آپؐ کے ہاتھ ابھی فروخت تو نہیں کیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ : ہاں ہاں ! میں تجھ سے خرید چکا ہوں۔ اعرابی بولا کہ : لاؤ تو کوئی گواہ۔ خزیمہ (رضی اللہ عنہ) یہ سن کر بول اُٹھے کہ : میں گواہی دیتا ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس سے بیع کا معاملہ کر چکے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف مڑ کر پوچھا کہ : تم کس بنیاد پر یہ گواہی دے رہے ہو۔ خزیمہ رضؓ نے عرض کیا کہ : حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کو سچا ماننے کی وجہ سے۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خزیمہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کی اکیلی گواہی کو دو آدمیوں کی گواہی کے برابر قرار دیا۔

۲۲۹۔ کتمانِ شہادت، جھوٹی گواہی کے برابر ہے :

(ابو موسیٰ) رفعه : من کتم شهادة اذا دعی الیها کان کمن شهد بالزور۔

(کبیر، اوسط)

جس شخص کو گواہی کے لیے بلایا جائے اور وہ شہادت کو پوشیدہ رکھے تو وہ ایسا ہی ہے جیسے جھوٹی گواہی دینے والا۔

۲۳۰۔ ایک مرد یا ایک عورت کی گواہی کا موقع :

(ابن عمرؓ) سئل النبی صلی اللہ علیه

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ :

وسلّم ما الذی یجوز فی الرضاع من الشهود؟ فقال رجل او امرأة وفی روایۃ: رجل و امرأة۔ (لاحمد والکبیر بضعف)

رضاعت کے ثبوت کے لیے کتنی گواہیاں کافی ہیں؟ فرمایا کہ: ایک مرد ہو یا ایک عورت۔ دوسری روایت میں ہے کہ ایک مرد اور ایک عورت۔

۲۳۱۔ ایک ہی عورت کی گواہی کا موقع:

(حذیفہؓ) ان النبی صلی اللہ علیہ وسلّم اجاز شہادۃ القابلۃ۔ (اوسط بخفی)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دائی جنائی کی شہادت کو بھی جائز قرار دیا ہے۔

۲۳۲۔ اہلِ کتاب کی گواہی (جبکہ کوئی مسلمان نہ ملے):

(الشعبیؒ) ان رجلا من المسلمین حضرتہ الوفاۃ بدقوقاء ولم یجد احدا من المسلمین یشھدہ علی وصیتہ فاشھد رجلین من اھل الکتاب فقدما الکوفۃ فاتیا ابا موسٰی الاشعری فاخبراہ وقدما وترکتہ ووصیتہ فقال ابو موسٰی ھذا لم یکن بعد الذی کان فی عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاحلفھما بعد العصر باللہ ما خانا ولا کذبا ولا بدلا ولا کتما ولا غیرا وانھا لوصیۃ الرجل وترکتہ فامضی شہادتھما۔ (ابوداؤد)

ایک مرد مسلمان دقوقا، میں مرنے لگا اور اُسے کوئی مسلمان نہ ملا جو اس کی وصیت کا گواہ ہوتا، تو اُس نے دو اہلِ کتاب کو گواہ بنایا۔ یہ دونوں کوفے میں ابوموسٰی اشعری (رضی اللہ عنہ) کے پاس آئے اور صورتِ حال بتاکر اس کا ترکہ اور وصیت پیش کر دی۔ ابوموسٰی (رضی اللہ عنہ) نے کہا کہ: عہد نبویؐ کے بعد پھر ایسا کوئی واقعہ نہیں پیش آیا۔ چنانچہ اُنھوں نے بعد عصر دونوں سے اس بات پر حلف لیا کہ اُنھوں نے نہ کوئی خیانت کی ہے نہ جھوٹ بتا رہے ہیں نہ ترکے میں کوئی تغیر و تبدل کیا ہے اور نہ کچھ چھپایا ہے اور یہ کہ یہی اس کا ترکہ اور یہی اس کی وصیت ہے۔ اس کے بعد ابوموسٰی (رضی اللہ عنہ) نے ان دونوں اہلِ کتاب کی گواہی کو قبول کر لیا۔

مجرم کو حبس میں رکھنا

۲۳۳۔ تحقیق حال تک کسی کو حبس میں رکھنا:

(بہز بن حکیم) عن ابیہ عن جدّہ:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم حبس رجلا فی تھمۃ ۔ (ابوداؤد وزاد ترمذی ونسائی)

کسی تہمت کے عوض حبس میں رکھا ہے۔

۲۳۴۔ صحیح غلط جانے بغیر گواہی دینا اور گواہ ہونے کا مغالطہ دینا:

(ابوھریرۃؓ) رفعہ: من اعان علی خصومۃ وھو لا یعلم احق او باطل فھو فی سخط اللہ حتی ینزع ومن مشی مع قوم یری انہ شاھد ولیس بشاھد فھو کشاھد زور۔ (للاوسط بلین مطولا)

جو کسی جھگڑے میں (کسی فریق کی) اعانت کرے اور اسے یہ علم نہ ہو کہ یہ حق پر ہے یا ناحق پر تو اللہ تعالیٰ کی ناراضی میں اُس وقت تک رہتا ہے جب تک اس سے الگ نہ ہو جائے اور جو شخص گواہ تو نہ ہو لیکن کسی فریق کے ساتھ اس انداز سے جائے کہ لوگ اُسے بھی گواہ سمجھیں، تو اس کا شمار بھی جھوٹے گواہوں میں ہوگا۔

۲۳۵۔ ظالم کی اعانت گویا ترکِ اسلام ہے:

(اوس بن شرجیل) رفعہ: من مشی مع ظالم لیعینہ وھو یعلم انہ ظالم فقد خرج من الاسلام۔ (للکبیر وفیہ عیاش بن یونس)

جو کسی ظالم کو ظالم جانتا ہوا بھی اس کی مدد کے لیے اس کے ساتھ جائے وہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔

کارِ خیر میں زمین وغیرہ کا وقف

۲۳۶۔ کسی میّت کی طرف سے کارِ خیر:

(سعدؓ بن عبادۃؓ): قلت یارسول اللہ ان امی ماتت فای الصدقۃ افضل؟ فقال الماء فحفر بیرا وقال ھذہ لام سعد۔ (ابوداؤد، نسائی)

میں نے عرض کیا کہ: یا رسول اللہ میری ماں کا انتقال ہو گیا ہے۔ لہٰذا کون سا صدقہ بہتر ہے؟ (جو اس کی طرف سے ادا کیا جائے)، فرمایا: کنواں! چنانچہ سعدؓ نے کنواں کھدوایا اور نیت کی کہ: (اس کا ثواب) سعدؓ کی ماں کے لیے ہے۔

۳۲۷۔ زمین کو تقسیم نہ کرنا بہتر ہے :

(اسلمؓ) انه سمع عمرؓ یقول اما والذی نفسی بیده لولا ان اترک اخر الناس بیانا لیس لهم من شیٔ ما فتحت علی قریة الا قسمتها کما قسم رسول الله صلی الله علیه وسلم خیبر ولکنی اترکها خزانة لهم یقتسمونها۔ (ابوداؤد، بخاری، بلفظه)

اسلمؓ نے حضرت عمر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کو یہ کہتے سنا کہ : سنو قسم ہے اس کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، اگر یہ خطرہ نہ ہوتا کہ بعد میں آنے والے لوگ کہیں گے کہ ہمارے لیے کچھ بھی نہ رہا تو میں جو لبستی بھی فتح کرتا اُسے اسی طرح تقسیم کر دیتا جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کو کیا۔ لیکن اسے میں ایک ایسے خزانے کی طرح باقی رکھنا چاہتا ہوں جس کی آمدنی لوگوں میں تقسیم ہوتی رہے۔

صلح جائز

۳۲۸۔ ناجائز شرطوں پر صلح غلط ہے :

(ابوھریرةؓ) رفعه : الصلح جائز بین المسلمین الا صلحًا حرم حلالا او احل حراما والمسلمون علی شروطهم الا شرطاً حرم حلالا او احل حراما۔ (للترمذی)

مسلمانوں کے درمیان ہر طرح کی صلح جائز ہے بجز اس صلح کے جس سے کوئی حلال چیز حرام یا حرام شے حلال ہوتی ہو۔ اور مسلمانوں کو ہر شرط پر قائم رہنا چاہیے بجز اس شرط کے جو کسی حلال کو حرام یا حرام کو حلال کرنے والی ہو۔

امانت داری کے احکام

۳۲۹۔ امانت داری ہر ایک سے ہو :

(ابوھریرہؓ) رفعه : اد الامانة الی من ائتمنک ولا تخن من خانک۔ (ترمذی، ابوداؤد)

جو تمہارے ساتھ امانت کا برتاؤ کرے تم بھی اس کے ساتھ امانت داری کا حق ادا کرو۔ لیکن جو تمہارے ساتھ خیانت کرے تم اُس کے جواب میں خیانت نہ کرو۔

۲۴۰ - امانت دار خزانچی کی تعریف اور اُس کا درجہ:

(ابوموسیٰؓ) رفعه : ان الخازن المسلم الامین الذی یعطی ما امر به فیعطیه کاملاً موفرًا طیبة به نفسه فیدفعه الی الذی امر له به احد المتصدقین۔ (شیخین، ابوداؤد، نسائی)

امانت دار مسلمان خزانچی کا شمار بھی صدقہ دینے والوں میں ہوگا، بشرطیکہ جو رقم ادا کرنے کا اسے حکم دیا جائے اُسے پورا پورا، اور خوش دلی کے ساتھ اس کے حوالے کر دے جسے دینے کا حکم دیا گیا ہے۔

۲۴۱ - امانت داری اور پاسِ عہد:

(انسؓ) رفعه : لا ایمان لمن لا امانة له ولا دین لمن لا عهد له (لاحمد والموصلی والبزار والاوسط بلین)

جس میں امانت نہ ہو اس کا کوئی ایمان نہیں اور جس میں پاسِ عہد نہ ہو اس کا کوئی دین نہیں۔

لعنتِ غلامی کو ختم کرنے کے طریقے

۲۴۲ - غلام کا مقام:

(الحسنؒ) ان رجلا اتی النبی صلی الله علیه وسلم بعبد فقال انی اشتریت هذا فاعتقه فما تری لی فیه؟ قال هو اخوک ومولاک قال فما تری فی صحبته؟ قال ان شکرک فهو خیر له وشر لک وان کفرک فهو خیر لک وشر له قال فما تری فی ماله؟ قال ان مات ولم یترک عصبة

ایک شخص ایک غلام کو لے کر حضور علیہ السلام کے پاس آیا اور کہا کہ میں نے اسے خریدا ہے۔ اگر میں اسے آزاد کر دوں تو حضور علیہ السلام کی رائے میں اس کا کیا مقام ہوگا؟ فرمایا: یہ تمہارا بھائی اور تمہارا آزاد کردہ ہوگا۔ عرض کیا، اگر میں اسے ساتھ ہی رکھوں تو؟ فرمایا: اس صورت میں اگر یہ تمہارا قدر دان ہوگا تو اس کے لئے بھلا اور تمہارے لیے بُرا ہوگا اور اگر نا قدرا ثابت ہوا تو تمہارے لیے خیر اور اس کے لیے شر ہوگا۔ عرض کیا اس کے مال کے بارے میں کیا ارشاد ہے؟ فرمایا:

فانت وارثه - (دارمی بارسالہ)

اگر یہ مرجائے اور اس کا کوئی عصبہ نہ ہو تو تم اس کے وارث ہو گے۔

۳۴۳ - قیدی و غلام کو آزاد کرنے کا اجر:

(ابوھریرۃؓ) رفعہ: ایما رجل اعتق امرأ مسلما استنقذ اللہ بکل عضو منہ عضوا منہ من النار ...... (شیخین، ترمذی)

جو شخص بھی کسی مرد مسلمان کو غلامی سے آزاد کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے ہر ہر عضو کے بدلے اس کا وہی وہی عضو آگ سے بچا لیتا ہے۔

۳۴۴ - ایضاً:

(ابو امامۃؓ) ایما امرئ مسلم اعتق امرأ مسلما کان فکاکہ من النار یجزی کل عضو منہ عضوا منہ وایما امرئ مسلم اعتق امرأتین مسلمتین کانتا فکاکہ من النار یجزی کل عضو منھما عضوا و ایما امرأۃ مسلمۃ اعتقت امرأۃ مسلمۃ کانت فکاکھا من النار یجزی کل عضو منھا عضوا منھا (ترمذی)

جو مسلمان کسی مسلمان کو غلامی سے آزاد کرلے گا وہ جہنم سے اس طرح آزاد ہوگا کہ آزاد ہونے والے کے ہر عضو کے عوض اس کا وہی عضو آزاد ہوگا اور جو مسلمان دو مسلمان عورتوں کو آزادی بخشے گا اس کا جہنم سے اس طرح چھٹکارا ہوگا کہ دونوں کے ہر عضو کے بدلے اس کا وہی عضو نجات پائے گا، اور اگر کوئی مسلمان عورت ایک مسلمان عورت کو آزاد کر دے تو اس کے ہر عضو کے جزا میں اس کا وہی عضو آگ سے آزاد ہو جائے گا۔

۳۴۵ - غلام کو رہا کرنے کا اجر:

(ابو نجیح رض) رفعہ: من اعتق رقبۃ مؤمنۃ کانت لہ فداہ من النار۔ (ترمذی)

جو شخص کسی مسلمان کو غلامی سے رہا کرے وہ رہائی اس کے لیے آتشِ جہنم سے بچنے کا فدیہ ہو جائے گی۔

۳۴۶ - قتل کی تلافی غلام کی رہائی سے:

(الغریف بن الدیلمی) اتینا واثلۃ الاسقع فقلنا حدثنا حدیثا لیس

ہم نے ایک بار واثلہ بن اسقع کے پاس آکر فرمائش کی، کہ کوئی حدیث ایسی سنائیے جس میں کوئی کمی بیشی نہ ہو۔ واثلہ نے

فیہ زیادۃ ولا نقصان فغضب وقال ان احدکم لیقرأ ومصحفہ معلق فی بیتہ فیزید وینقص فقلنا انما اردنا حدیثا سمعتہ من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال اتینا النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی صاحب لنا اوجب یعنی النار بالقتل فقال اعتقوا عنہ یعتق اللہ بکل عضو منہ عضوا منہ من النار۔ (ترمذی)

خفا ہو کر کہا کہ: جب تم میں سے کوئی شخص زبانی قرآن پڑھ رہا ہو اور اس کا مصحف گھر میں لٹکا ہوا ہو تو کیا وہ اس میں جان بوجھ کر کوئی کمی بیشی کرتا ہے؟ ہم نے کہا کہ: ہمارا مقصد حدیث سے کلام الٰہی نہیں بلکہ وہ قولِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے، جو آپ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہو تو اُنھوں نے کہا کہ: ہم لوگ ایک بار حضور علیہ السلام کے پاس ایک ایسے شخص کی بابت دریافت کرنے آئے جو قتلِ ناحق کی وجہ سے مستحق دوزخ ہو گیا تھا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ: اس کی طرف سے ایک غلام آزاد کر دو تو اللہ تعالیٰ اس کے ہر عضو کے بدلے اس جہنمی کا بھی وہی عضو آگ سے بچا لے گا۔

۳۴۷۔ حُسنِ سلوک:

(رافع بن مکیثؓ) رفعہ: حسن الملکۃ یمن وسوء الخلق شوم (ابوداؤد)

اچھا برتاؤ برکت ہے اور بدخلقی شومیٔ قسمت۔

۳۴۸۔ الفاظ تعظیم و تحقیر میں احتیاط:

(ابوہریرہؓ) رفعہ لایقولن احدکم عبدی وامتی ولایقولن المملوک ربی وربتی لیقل المالک فتای وفتاتی ولیقل المملوک سیدی وسیدتی فانکم المملوکون والرب اللہ تعالیٰ (شیخین و ابی داؤد)

مالک اپنے مملوک و مملوکہ کو عبدی (میرا بندہ) اور اَمتی (میری باندی) کے الفاظ نہ کہے اور وہ اپنے مالک و مالکہ کو ربی (میرا آقا) اور ربتی (میری آقائن) نہ کہے۔ بلکہ وہ اسے فتای اور فتاتی (صاحبزادے اور صاحبزادی) کہے اور یہ اسے سیدی و سیدتی (میرے سردار) کہہ کر یاد کرے کیونکہ مملوک تم تمام لوگ ہو اور رب اللہ تعالیٰ ہے۔

احکامِ وصیّت

۳۴۹۔ وصیّت کی تاکید:

(ابن عمرؓ) رفعہ: ما حق امرئ مسلم

اگر کسی مسلمان کے پاس کوئی قابلِ وصیّت مال ہو، تو

مسلم لہ شئ یوصی فیہ ان یبیت لیلتین وفی روایۃ: ثلاث لیال الا ووصیتہ مکتوبۃ عندہ قال نافع سمعت ابن عمرؓ یقول ما مرت علیّ لیلۃ منذ سمعتہ من النبی صلی اللہ علیہ وسلم الا وعندی وصیتی مکتوبۃ۔ (للستۃ)

تو اسے یہ حق نہیں کہ دو یا تین راتیں بھی ایسی گزارے جن میں اس کی وصیت اس کے پاس لکھی ہوئی موجود نہ ہو۔ نافع نے ابن عمرؓ کو یہ کہتے سُنا ہے کہ جب سے میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سُنا ہے۔ مجھ پر کوئی رات ایسی نہیں گزری جس میں میرا وصیت نامہ میرے پاس موجود نہ ہو۔

۳۵۰۔ سب سے افضل صدقہ وُہ ہے جو تندرستی کی حالت میں دیا جائے:

(ابو ھریرۃؓ) قیل للنبی صلی اللہ علیہ وسلم ای الصدقۃ خیر؟ قال ان تتصدق وانت صحیح شحیح تامل الغنی وتخشی الفقر ولا تدع حتی اذا بلغت الحلقوم قلت لفلان کذا وقد کان لفلان۔

(شیخین، ابوداؤد)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ بہترین صدقہ کیا ہے؟ ارشاد ہوا کہ وُہ وہ صدقہ ہے جو تندرستی اور حرص کی حالت میں ادا کیا جائے جب کہ اس کے موجود ہونے سے امیر رہنے کی اُمید اور نہ ہونے سے فقیر ہو جانے کا خطرہ ہو۔ تم اُسے چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوتے، مگر جب جان حلق میں اٹک جاتی ہے تو کہنے لگتے ہو کہ اتنا فلاں کا حصّہ ہے اور اتنا فلاں کے لیے رکھا تھا۔

۳۵۱۔ زندگی میں ایک درہم دینا مرتے وقت کے سو درہموں سے بہتر ہے:

(ابوسعیدؓ) رفعہ: لان یتصدق المرء فی حیاتہ وصحتہ بدرھم خیر لہ من ان یتصدق عند موتہ بمائۃ۔

(ابوداؤد)

اگر کوئی شخص اپنی زندگی اور تندرستی کی حالت میں ایک درہم صدقہ کرے تو وہ اس سے کہیں بہتر ہے کہ مرتے وقت سو درہم صدقہ دے دے۔

۳۵۲۔ اہل و عیال کو محتاج نہیں چھوڑنا چاہیے (بیوی کے منہ میں لُقمہ ڈالنا بھی باعثِ اجر ہے):

(سعدؓ)...... انک ان تذر ورثتک اغنیاء خیر لک من ان تذرھم عالۃ

...... اپنے وارثوں کو غنی چھوڑ کر مرنا اس سے کہیں بہتر ہے کہ انھیں محتاج چھوڑ کر مرو اور وہ لوگوں کے آگے دستِ سوال

يتكففون الناس وانك لن تنفق نفقة تبتغي بها وجه الله الا اجرت بها حتى ما تجعل في امرأتك ۔ (للستة)

دراز کرتے پھریں ۔ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لیے تم جو کچھ بھی خرچ کرو گے حتیٰ کہ اپنی بیوی کے منہ میں جو لقمہ ڈالو گے اس کا بھی اجر ملے گا ۔

۲۵۳ ۔ جن کا کوئی آگے پیچھے وارث نہ ہو :

(ابن مسعودؓ) قال يموت احدكم ولا يدع عصبة ولا رحما فما يمنعه ان يضع ماله في الفقراء والمساكين ۔ (طبرانی)

ابن مسعودؓ نے کہا کہ بعض لوگ مرتے ہیں ، اور اُن کے آگے پیچھے کوئی وارث نہیں ہوتا ۔ ایسے لوگوں کو اپنا مال فقراء و مساکین کی راہ میں دے دینے سے کیا چیز مانع ہے ۔؟

۲۵۴ ۔ آنحضرت (صلّی اللہ علیہ وسلم) نے مال کی وصیت نہیں فرمائی (وصیت قرآن) :

(طلحہؓ بن مصرف) سألت ابن ابي اوفى هل اوصى النبي صلى الله عليه وسلم؟ قال لا فقلت كيف كتب على الناس الوصية وامر بها ولم يوص؟ قال وصى بكتاب الله ۔ (شيخين، ترمذی، نسائی)

میں نے ابن ابی اوفی سے پوچھا کہ : کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کوئی وصیت فرمائی تھی ؟ کہنے لگے نہیں ۔ میں نے پوچھا : جب خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی وصیت نہیں فرمائی تو لوگوں پر وصیت کو کیوں ضروری قرار دیا ؟ : کہا کہ : ہاں ! کتاب اللہ کی وصیت فرمائی تھی ۔

۲۵۵ ۔ وصیت کا اثر نجات پر :

(ابو ھریرہؓ) رفعه : ان الرجل ليعمل بعمل اهل الخير سبعين سنة فاذا اوصى حاف في وصيته فيختم له بشر عمله فيدخل النار وان الرجل ليعمل بعمل اهل الشر سبعين سنة فيعدل في وصيته فيختم له

ایک شخص ستّر سال تک اہل خیر جیسے کام کرتا ہے لیکن وصیت میں ظلم سے کام لیتا ہے تو اس کا خاتمہ بدترین عمل پر ہونے کی وجہ سے وہ جہنم میں چلا جاتا ہے اور اس کے برعکس دوسرا شخص ستّر برس اہل شر جیسے عمل کرتا رہتا ہے لیکن وصیت میں پورے عدل سے کام لیتا ہے تو اُس کی زندگی پر اُسی نیک عمل کی مُہر لگ جاتی ہے اور

بغیر عمله فیدخل الجنة. قال ابوهریرة واقرءوا ان شئتم تلک حدود الله الی عذاب مهین۔ (قرز وبیہقی)

وہ جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔ ابوہریرہؓ نے پھر کہا کہ: دل چاہے تو سورۂ نساء کی آیت: تلک حدود الله سے عذاب مهین تک پڑھ لو۔

حدود اللہ

۳۵۶۔ حدود اللہ کی ضرورت:

(النعمان بن بشیرؓ) رفعه: مثل القائم فی حدود الله والواقع فیها کمثل قوم استهموا علی سفینة فاصاب بعضهم اعلاها وبعضهم اسفلها فکان الذین فی اسفلها اذا استقوا من الماء مروا علی من فوقهم فقالوا لو انا خرقنا فی نصیبنا خرقا ولم نؤذ من فوقنا فان ترکوهم وما ارادوا هلکوا جمیعا وان اخذوا علی ایدیهم نجوا ونجوا جمیعا۔ (ترمذی، بخاری)

حدود اللہ کو جو نافذ کرتا ہے اور جن پر وہ نافذ ہوتی ہیں ان دونوں کی مثال ایسی ہے جیسے کچھ لوگ ایک کشتی میں اپنی اپنی جگہیں تقسیم کر کے بیٹھ گئے ہوں، بعض اوپر کی منزل میں ہوں اور بعض نیچے کی منزل میں۔ پھر نیچے والوں کو پانی کی ضرورت محسوس ہو اور وہ اوپر والوں سے جا کر کہیں کہ ہم اپنے نیچے والے حصے میں پانی لینے کے لیے ایک سوراخ کرنا چاہتے ہیں اور آپ کو ہم کوئی تکلیف نہیں پہنچائیں گے —— ایسی حالت میں اگر اوپر والے ان کو اپنا ارادہ پورا کرنے کے لیے آزادی دے دیں تو نتیجے میں سب کے سب ہلاک ہوں گے اور اگر وہ ان کے ہاتھ پکڑ لیں گے تو وہ بھی اور یہ بھی سب بچ جائیں گے۔

۳۵۷۔ حدود سے بچانے کے لیے بہانے تلاش کرو:

(عائشہؓ) رفعته: ادرؤا الحدود عن المسلمین ما استطعتم فان کان له مخرج فخلوا سبیله فان الامام ان یخطئ فی العفو خیر له من ان یخطئ العقوبة۔ (للترمذی وقال قد روی موقوفا وهو اصح)

جہاں تک تم سے ممکن ہو مسلمان کو حدود سے بچاؤ۔ کوئی صورت بھی اگر اس سے محفوظ رکھنے کی نکل سکے تو اسے بچاؤ، کیونکہ امام کے لیے معافی میں چوک جانا سزا میں چوک جانے سے بہتر ہے۔

۳۵۸۔ جرم کی ستر پوشی بہتر ہے:

(یزید بن نعیم) عن ابیہ: ان ماعزًا اتی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فاقر عندہ اربع مرات فامر بہ فرجم وقال لھزال لو سترتہ بثوبک کان خیرًا لک قال ابن المنکدر وھزال امر ماعزًا ان یاتی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فیخبرہ۔ (مالک)

ماعز نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر اپنے جرم زنا کا چار حلفیہ شہادتوں کے ساتھ اقرار کیا اور بحکم نبویؐ انھیں رجم کیا گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہزال سے کہا کہ: اگر تم اس کے جرم کو اپنے دامن میں چھپا لیتے تو زیادہ بہتر ہوتا۔ یہ ہزال (بقول ابن منکدر) وہی تھے جنھوں نے ماعز کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اقرار جرم کرنے پر آمادہ کیا تھا۔

۳۵۹۔ سفارشِ مجرم عدالت میں آنے سے پہلے تک ہے:

(زبیرؓ بن العوامؓ) لقی رجلا قد اخذ سارقا وھو یرید ان یذھب بہ الی السلطان فشفع لہ الزبیر لیرسلہ فقال لا حتی ابلغ بہ السلطان فقال الزبیر انما الشفاعۃ قبل ان تبلغ الی السلطان فاذا بلغ الیہ فقد لعن الشافع والمشفع۔ (مالک)

کسی شخص نے ایک چور کو گرفتار کیا اور سلطان (کورٹ) میں لے جانے کا ارادہ کیا۔ زبیر نے اس کے لیے چھوڑ دینے کی سفارش کی۔ اس نے کہا کہ: جب تک میں اُسے عدالت میں پیش نہ کروں، اُس وقت تک تمھاری سفارش قبول نہ کروں گا۔ آپ نے فرمایا کہ: سفارش عدالت میں پہنچنے سے پہلے پہلے ہوتی ہے۔ پہنچنے کے بعد تو سفارش کرنے والا بھی ملعون ہوتا ہے اور وہ بھی جس کے حق میں سفارش قبول کی جائے۔

۳۶۰۔ تعزیر دس کوڑے سے زیادہ نہ ہو:

(ھانی بن دینار) رفعہ: لا یجلد فوق عشرۃ اسواط الا فی حد من حدود اللہ۔ (شیخین، ابوداؤد، بخاری، ترمذی)

حدود الٰہی کے سوا اور کسی جرم میں دس کوڑوں سے زیادہ کی سزا نہ دی جائے۔

۳۶۱ - حدود اور رحمتِ الٰہی :

(علیؓ) رفعه : من اصاب حدا فعجل عقوبته فی الدنیا فالله تعالیٰ اعدل من ان یثنی علی عبده العقوبة فی الآخرة ومن اصاب حدًّا فستره الله تعالیٰ علیه وعفا عنه فالله اکرم من ان یعود فی شئ قد عفا عنه - (للترمذی)

جو شخص قابلِ حد جرم کا مرتکب ہو اور جلد ہی اسے اس دنیا میں وہ سزا مل جائے تو عدلِ خداوندی یہ گوارا نہ کرے گا کہ اُسے آخرت میں بھی دوبارہ اس جرم کی سزا دے، اور جو شخص قابلِ حد جرم کا ارتکاب کرے اور اللہ اُس کے جرم کو پوشیدہ رکھے اور معاف کر دے تو اس کا کرم یہ گوارا نہ کرے گا کہ وہ جس جرم کو یہاں معاف کر چکا ہے اس کی سزا کا آخرت میں اعادہ کرے۔

جائز و ناجائز قتل کے احکام

۳۶۲ - غاصب سے کب قتال کیا جائے :

(مخارق) جاء رجل الی النبی صلی الله علیه وسلم فقال الرجل یأتینی فیأخذ مالی قال ذکره الله قال فان لم یذکر؟ قال فاستعن علیه من حولک من المسلمین قال فان لم یکن حولی احد من المسلمین؟ قال فاستعن علیه بالسلطان قال فان نأی السلطان عنی؟ قال قاتل دون مالک حتی تکون من شهداء الآخرة او تمنع مالک (للنسائی)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص نے آکر پوچھا کہ: میرے پاس ایک آدمی آکر میرا مال چھیننا چاہیے تو کیا کرنا چاہیے؟ فرمایا: اسے خدا کا خوف دلاؤ۔ عرض کیا: اگر اس میں خدا ترسی نہ پیدا ہو؟ فرمایا: اپنے آس پاس مسلمانوں سے اس کے خلاف مدد لو۔ کہا: اگر میرے آس پاس کوئی مسلمان نہ بستا ہو؟ فرمایا: پھر اس کے خلاف حکومت (عدالت) سے چارہ جوئی کرو۔ عرض کیا: اگر عدالت مجھ سے بہت دُور ہو؟ فرمایا: پھر اپنے مال کی حفاظت میں اس سے قتال کرو تاآنکہ اپنے مال کو بچا لو یا مر کر شہداء میں داخل ہو جاؤ۔

۳۶۳ - ساحر کی سزا :

(جندبؓ) رفعه : حد الساحر

ساحر کی سزا اُسے تلوار کے گھاٹ

ضربة بالسیف۔ (ترمذی) — اتارنا ہے۔

قصاص

۳۶۴۔ نقصان جان و عضو کے معاوضے کی تین شکلیں:

(ابو شریح الخزاعی) رفعہ: من اصیب بقتل او خبل فانہ یختار احدے ثلث اما ان یقتص و اما ان یعفو و اما ان یأخذ الدیۃ فان اراد الرابعۃ فخذوا علی یدیہ ومن اعتدی بعد ذلک فلہ عذاب الیم۔ (ابو داؤد)

جسے جان یا کسی عضو کا صدمہ پہنچے، وہ تین باتوں میں سے ایک کو اختیار کر لے: یا تو قصاص لے لے، یا معاف کر دے یا خون بہا لے لے۔ اگر وہ کوئی چوتھی صورت اختیار کرنا چاہے تو اس کا ہاتھ پکڑ لو۔ جو اس کے بعد زیادتی کرے گا وہ بہت بڑے عذاب کا مستحق ہوگا۔

۳۶۵۔ قتلِ خطا کرنے والے مفلس کو معاف کیا جا سکتا ہے:

(وائل بن حجر) انی لقاعد مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذ جاء رجل یقود آخر بنسعۃ فقال یا رسول اللہ ھذا قتل اخی فقال لہ صلی اللہ علیہ وسلم أقتلتہ؟ فقال انہ لو لم یعترف اقمت علیہ البینۃ قال نعم قتلتہ قال کیف قتلتہ؟ قال کنت انا وھو نختبط من شجرۃ فسبنی و اغضبنی فضربتہ بالفاس علی قرنہ فقتلتہ فقال لہ صلی اللہ علیہ وسلم

میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا کہ ایک آدمی دوسرے آدمی کو تسمے سے باندھے ہوئے لایا اور فریاد کی کہ: یا رسول اللہ! اس نے میرے بھائی کو مار ڈالا ہے، حضورؐ نے پوچھا کہ: کیا تم نے واقعی اُسے قتل کیا ہے؟ فریادی نے کہا کہ: اگر یہ اعترافِ جرم نہ کرے تو میں ثبوت پیش کرنے کو حاضر ہوں۔ وہ بولا: کہ ہاں! میں نے قتل کیا ہے۔ حضورؐ نے پوچھا: کیوں اور کس طرح قتل کیا؟ بولا کہ: میں اور وہ (مقتول) دونوں درخت سے پتیاں جھاڑ رہے تھے۔ اس دوران میں اس نے مجھے گالی بھی دی اور غصہ دلایا۔ میں نے اُس کے سر پر ایک کلہاڑا رسید کر دیا اور وہ مر گیا۔ دوسری روایت میں (جو اس روایت کے آخر میں درج ہے) ہے کہ میں نے اس کے سر پر کلہاڑا مارا لیکن میری نیت قتل کرنے کی نہ تھی۔ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم)

ھل لك من شئ تؤدیه عن نفسك؟ قال مالی الا کسائی وفاسی قال أتری قومك یشترونك؟ قال انا اھون علی قومی من ذلك فرمی الیه النبی صلّی اللّٰہ علیه وسلّم بنسعته وقال دونك صاحبك فانطلق به الرجل فلما ولی قال صلّی اللّٰہ علیه وسلّم ان قتله فھو مثله فرجع الیه فقال بلغنی انك قلت ان قتله فھو مثله وما اخذته الا بامرك فقال صلّی اللّٰہ علیه وسلّم اما ترید ان یبوء باثمك واثم صاحبك؟ قال بلی یا نبی اللّٰہ قال فان ذلك كذلك فرمی بنسعته وخلی سبیله - وفی روایة: قال کیف قتلته؟ قال ضربت رأسه بالفاس ولم ارد قتله - (مسلم، ابوداؤد، نسائی)

نے فرمایا کہ: تمھارے پاس خون بہا ادا کرنے کو کچھ ہے؟ اس نے کہا: کہ میری ساری دولت یہ ایک چادر اور یہ ایک کلہاڑا ہے۔ فرمایا: کیا تیری قوم تیری قیمت ادا کر سکتی ہے؟ عرض کیا کہ: میری ہستی میری قوم کی نگاہ میں مقدار خون بہا سے فروتر ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے یہ سن کر وہ تسمہ فریادی کے آگے پھینک دیا اور فرمایا کہ: اسے لے جا کر قتل کر دے۔ وہ اسے لے کر کچھ دُور گیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ: اگر اس نے قتل کر دیا، تو یہ بھی ویسا ہی مجرم ہوگا۔ فریادی واپس آ گیا اور عرض کیا کہ مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کا یہ فرمان معلوم ہوا ہے کہ اگر اس نے اسے قتل کیا تو یہ بھی ویسا ہی قاتل ہوگا۔ حالانکہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلّم ہی کے حکم سے اُسے پکڑ رکھا ہے۔ فرمایا کہ: کیا تم یہ نہیں چاہتے کہ تمھارے اور تمھارے ساتھی دونوں کے گناہوں کا وبال اس پر پڑے؟

عرض کیا: ہاں یا رسول اللہ! فرمایا بس یہی تو وہ بات ہے جو میں نے کہی۔ اس کے بعد فریادی نے وہ تسمہ پھینک دیا اور اُسے چھوڑ دیا۔

۲۶۶ - اگر ایک بےکس کو کئی آدمی مل کر مار ڈالیں:

(ابن عمرؓ) ان غلاما قتل غیلة فقال عمرؓ لو اشترك فیه اھل صنعاء لقتلتھم۔ للبخاری ولمالك عن ابن المسیب: ان عمر قتل نفرا خمسة او سبعة برجل واحد قتلوه غیلة وقال عمرؓ لو تمالأ علیه اھل

ایک غلام کو دھوکا دے کر قتل کر دیا گیا۔ حضرت عمرؓ نے سب قاتلین کو سزائے موت دیتے ہوئے فرمایا کہ: اگر صنعاء کی پوری آبادی اس کے قتل میں شریک ہوتی تو میں ان سب کو قتل کر دیتا۔ مالکؒ ابن مسیب سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے ان پانچ یا سات آدمیوں کو قتل کرایا۔ جنھوں نے ایک آدمی کو دھوکے سے مل کر قتل کیا تھا اور فرمایا کہ تمام

صنعاء لقتلتهم جميعا۔

اہل صنعاء بھی اس قتل میں شریک ہوتے تو ان کو قتل کرا دیتا۔

۳۶۷۔ قصاص میں آزاد و غلام یکساں ہیں:

(سمرۃ) رفعه: من قتل عبده قتلناه ومن جدع عبده جدعناه۔ لاصحاب السنن وفي رواية: من خصی عبده خصيناه۔

جو اپنے غلام کو قتل کرے گا، اُسے میں قتل کر دوں گا۔ اور جو کوئی اس کا عضو کاٹے گا اس کا وہی عضو کٹوا دوں گا۔ دوسری روایت میں ہے کہ جو اپنے غلام کو خصی کرے گا، میں اُسے خصی کرا دوں گا۔

۳۶۸۔ قاتل اگر مجنون ہو:

(یحیٰی بن سعید) ان مروان كتب الى معاوية انه اتى اليه بمجنون قد قتل رجلا فكتب اليه معاوية ان اعقله ولا تقد منه فانه ليس على مجنون قَوَدٌ۔ (موطا)

مروان نے معاویہؓ کو لکھ بھیجا کہ: ایک مجنون نے کسی کو قتل کر دیا ہے۔ اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟ معاویہؓ نے لکھ بھیجا کہ: اُسے چھوڑ دو، اور قصاص نہ لو مجنون پر قصاص نہیں۔

۳۶۹۔ قصاص سے پہلے کی منزل:

(انسؓ) ما رأيت النبي صلى الله عليه وسلم رفع اليه شئ في قصاص الا امر فيه بالعفو۔

(ابو داؤد، نسائی)

میں نے تو ہمیشہ یہ دیکھا کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی قصاص کا معاملہ آیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے معاف ہی کرنے کا حکم دیا۔

۳۷۰۔ رسم جاہلیت جو روحِ اسلام کے خلاف نہ ہو باقی رہ سکتی ہے:

(ناس من الصحابة) ان القسامة

قسامتؔ جاہلیت کی ایک رسم تھی، جسے حضورؐ

لہ اگر ایک قبیلے کا کوئی آدمی دوسرے قبیلے کی زمین میں مقتول پایا جائے تو لازماً یہ شبہ ہوگا کہ ربانی حاشیہ لگے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

كانت فى الجاهلية فاقرها النبى صلى الله عليه وسلم على ما كانت عليه فى الجاهلية وقضى بها بين ناس من الانصار فى قتيل ادعوه على يهود خيبر۔ (مسلم، نسائی)

صلی اللہ علیہ وسلم نے جوں کا توں باقی رکھا، بلکہ اس کے مطابق ایک مقدّمے کا فیصلہ بھی کیا جو یہ تھا کہ ایک انصاری قتل ہُوا اور انصار نے یہودِ خیبر پر اس قتل کا الزام لگایا۔

دیت (خون بہا)

۲۷۱ ۔ جان اور مختلف اعضا کی دیت (خون بہا)

(عبد اللہؓ بن ابی بکرؓ بن محمدؒ بن عمرو بن حزمؓ) .... ان من اعتبط مؤمنا قتلا عن بينة فانه قود الا ان يرضى اولياء المقتول وان فى النفس الدية مائة من الابل وفى الانف اذا اوعب جدعة الدية وفى اللسان الدية وفى الشفتين الدية وفى البيضتين الدية وفى الذكر الدية وفى الصلب الدية وفى العينين الدية وفى الرجل الواحدة نصف الدية وفى المأمومة ثلث الدية و

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ یمن کو جو احکام خون بہا بھیجے تھے وہ یہ تھے ..... جو شخص کسی مسلمان کے خون سے اپنا ہاتھ رنگے اور اس کا ثبوت مل جائے تو اس پر قصاص ہوگا بجز اس صورت کے کہ مقتول کے اولیا (خون بہا یا معافی پر) راضی ہوجائیں۔ جان کی دیت، (خون بہا) سو اُونٹ ہیں۔ اگر کسی کی پوری ناک یا زبان یا دونوں ہونٹ یا دونوں بیضے یا عضو تناسل یا ریڑھ یا دونوں آنکھیں ضائع کردی جائیں تو بہر صورت پوری دیت لازم آئے گی اور ایک پاؤں کی دیت آدھی ہوگی جو ضرب اُم الدماغ یا جوف تک اثر کرے اس کی دیت تہائی ہے اور استخوان شکن ضرب کی دیت پندرہ اُونٹ ہیں۔ ہاتھ یا پاؤں کی ہر انگلی کی دیت دس

(بقیہ حاشیہ صفحہ سے آگے) وہیں کے لوگوں نے مارا ہے۔ ایسے موقعوں پر ورثائے مقتول ان لوگوں سے یہ کہتے ہیں کہ یا تو تم میں سے پچاس آدمی حلف لیں کہ ہم نے اسے نہیں مارا ہے یا تم سب مل کر خون بہا ادا کرو ورنہ جس پر شبہ ہوگا ہم اسے مار ڈالیں گے۔ اس طرح کی قسم کو قسامت کہتے ہیں۔ اس کے موجد ابو طالب تھے اور یہ رسم جاہلیت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی قبائلی خصوصیات کے پیشِ نظر روا رکھی کیونکہ اس میں کوئی ایسی چیز نہ تھی جس میں عدل کے خلاف کوئی بات ہو۔

وفي الجائفة ثلث الدية وفي المنقلة خمس عشرة من الابل وفي كل اصبع من اصابع اليد والرجل عشرة من الابل وفي السن خمس من الابل وفي الموضحة خمس من الابل وان الرجل يقتل بالمرأة وعلى اهل الذهب الف دينار وفي رواية : وفي العين الواحدة نصف الدية وفي اليد الواحدة نصف الدية۔ (مالک، نسائی)

اُونٹ ہیں اور ہر دانت کی پانچ اُونٹ جس ضرب سے ہڈی نظر آجائے، اس کی دیت بھی پانچ اُونٹ ہیں۔

عورت کا قصاص مرد سے (اگر مرد ہی مجرم ہو) اسی طرح لیا جائے گا۔

جو لوگ اُونٹ نہ رکھتے ہوں اور دینار رکھتے ہوں، اُن سے پوری دیت ہزار دینار کی صورت میں لی جائے گی۔

ایک روایت میں ہے کہ ایک آنکھ اور ایک ہاتھ کی دیت بھی نصف ہوگی۔

۳۷۲۔ قیمت شتر کے تفاوت سے رقم میں فرق ہو جاتا ہے:

(عمرو بن شعیبؓ) عن ابيه عن جده : ان النبي صلى الله عليه وسلم كان يقوم دية الخطاء على اهل القرى اربعمائة دينار او عدلها من الورق ويقومها على اثمان الابل اذا اغلت رفع في قيمتها واذا هاجت نقص من قيمتها وبلغت على عهده ما بين اربعمائة الى ثمانمائة دينار وعدلها من الورق ثمانية آلاف درهم وقضى على اهل البقر مائتي بقرة ومن كانت دية عقله في شاة فالفي شاة وقال صلى الله عليه وسلم العقل ميراث بين ورثة القتيل على قرابتهم فما فضل فللعصبة وقضى في الانف اذا جدع الدية كاملة وان جدعت ثندوته فنصف

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شہر والوں سے دیت خطا میں چار سو دینار یا اس کی ہم قیمت چاندی وصول فرماتے تھے اور اُونٹوں کی قیمت کے مطابق رقم دیت کو متعین فرماتے تھے۔ یعنی جب اُونٹ گراں ہوتے تو قیمت زیادہ دلواتے اور جب ارزاں ہوتے تو کم رقم دلواتے۔ عہد نبویؐ میں پوری دیت کی قیمت چار سو اور آٹھ سو دینار کے مابین ہوتی اور آٹھ سو دینار کے برابر آٹھ ہزار درہم ہوتے تھے۔ علاوہ ازیں گائے والوں سے پوری دیت دو سو گائیں اور بکری والوں سے دو ہزار بکریاں دلواتے۔

نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ: دیت مقتول کے ورثاء میں اسی طرح تقسیم ہوگی جس طرح میراث تقسیم ہوتی ہے (یعنی اصحاب فرائض کو ان کے حصے پہلے ملیں گے اور جو بچے گا وہ عصبہ کا ہوگا۔)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی فرمان

الدية وذكر نحو ما قبله ثم قال وقضى صلى الله عليه وسلم ان عقل المرأة بين عصبتها من كانوا لا يرثون منها شيئا الا ما فضل عن ورثتها وان قتلت فعقلها بين ورثتها وهم يقتلون قاتلهم وقال صلى الله عليه وسلم ليس للقاتل شئ وان لم يكن له وارث فوارثه اقرب الناس اليه ولا يرث القاتل شيئا......

(ابو داؤد، نسائی)

ہے کہ ناک اگر پوری کاٹ لی جائے تو پوری دیت ہوگی اور اگر صرف نیچے کی نرم ہڈی کٹے تو نصف دیت ہوگی۔

(باقی تفصیلات وہی ہیں جو اوپر بیان ہوئیں)

دیت میں قاتل کا کوئی حصہ نہیں۔ اگر اس کا کوئی وارث موجود نہ ہو تو اس کا وارث وہ ہوگا جو قرابت میں سب سے قریب ہو اور قاتل وارث بھی نہ ہوگا۔

۲۷۳۔ دیت کا بعض فرق:

(عمرو بن شعیبؓ) ان النبي صلى الله عليه وسلم قضى في العين العوراء السادة لمكانها اذا طمست بثلث ديتها وفي اليد الشلاء اذا قطعت بثلث ديتها وفي السن السوداء اذا نزعت بثلث ديتها (نسائی)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کان، آنکھ کے بارے میں جو اپنی جگہ بالکل ٹھیک ہو اور اسے پھوڑ دیا جائے۔ فیصلہ فرمایا ہے کہ: اس کی دیت تہائی ہے اور شل شدہ ہاتھ کو اگر کاٹ دیا جائے یا سیاہ دانت کی جو نکال لیا جائے دیت بھی تہائی ہے۔

۲۷۴۔ بچۂ شکم کی دیت:

(ابو ھریرۃؓ) اقتتلت امرأتان من هذيل فرمت احداهما الاخرى بحجر فقتلتها وما في بطنها فاختصموا الى النبي صلى الله عليه وسلم فقضى ان دية جنينها غرة عبد او وليدة وقضى بدية المرأة على عاقلتها....

ہذیل کی دو عورتوں میں لڑائی ہوئی۔ ایک نے دوسری کے ایسا پتھر مارا کہ وہ بھی مرگئی اور اس کے پیٹ کا بچہ بھی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس یہ مقدمہ آیا تو آپ نے فیصلہ فرمایا کہ بچۂ شکم کے بدلے تو ایک غلام یا لونڈی آزاد کیا جائے اور مقتولہ کی دیت قاتلہ کے عاقلہ[1] ادا کریں......

---

[1] عاقلہ جمع ہے عاقل کی جس کے معنیٰ ہیں دیت ادا کرنے والا۔ اس سے مراد وہ ورثا ہیں جو (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

۳۷۵۔ادائے دیت میں اعانت کا درجہ :

(انس رضی رفعه : درهم اعطيته في عقل احب الى من مائة في غيره -
(للاوسط بمجهول)

وہ ایک درہم جو میں کسی کے خون بہا میں (بطور امداد) دوں مجھے ان سو درہموں سے زیادہ محبوب ہے جو کسی اور مصرف میں جائیں ۔

مُرتد کے ساتھ سلوک

۳۷۶۔مُرتد کے ساتھ کیا برتاؤ ہونا چاہیے :

(عبد الرحمٰن بن محمد بن عبد الله بن عبد القاری رضی) عن ابيه : قال قدم على عمر رضی رجل من اليمن من قبل ابي موسٰى وكان عاملاله فسأله عمر عن الناس ثم قال هل كان فيكم من مغربة خبر؟ قال نعم رجل كفر بعد اسلامه قال فما ذا فعلتم به؟ قال قربناه فضربنا عنقه قال فهلا حبستموه ثلاثا واطعمتموه كل يوم رغيفا واستتبتموه لعله يتوب ويراجع امر الله اللهم انى لم احضر ولم أمر ولم ارض اذا بلغني -

(مالک)

ایک یمنی شخص حضرت عمر رضی کے پاس آیا۔ یہ حضرت ابو موسیٰ رضی کا بھیجا ہوا تھا اور ان کا عامل بھی تھا۔ حضرت عمر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے لوگوں کے متعلق جہاں بہت سی باتیں پوچھیں وہاں یہ بھی دریافت کیا کہ: اُدُر کوئی نئی خبر بھی ہے! کہا: ہاں! ایک شخص اسلام لاچکنے کے بعد کافر ہوگیا۔ حضرت عمر رضی نے پوچھا کہ: پھر تم لوگوں نے اس کے ساتھ کیا کیا؟ بولا: اُسے پاس بُلا کر گردن ماردی۔ حضرت عمر رضی بولے کہ: تم نے اُسے تین دن قید میں رکھا ہوتا اور ہر روز اُسے روٹی کھلائی ہوتی اور توبہ کی طرف مائل کیا ہوتا، بہت ممکن تھا کہ وہ تائب ہو کر دینِ حق پھر قبول کر لیتا۔ مولا! میں نہ تو اس واقعے میں موجود تھا اور نہ میں نے اس کا کوئی حکم دیا۔ بلکہ یہ خبر ملنے کے بعد بھی میں اس کارروائی سے بالکل راضی نہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) ترکہ پاتے ہیں۔ اس دیت میں عاقلہ (ورثا) اسی تناسب سے شرکت کریں گے جس تناسب سے وہ ترکہ لیتے ہیں۔

سزائے زنا

۲۷۷۔ کنوارے زانی کی حد:

(ابن عمرؓ): ان النبي صلى الله عليه وسلم ضرب وغرب وان ابابكر ضرب وغرب وان عمر ضرب وغرب۔ (ترمذی)

(ابن عمرؓ) بیان ہے زانی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کوڑے بھی لگوائے ہیں اور (ایک سال کے لیے) شہر بدر بھی کیا ہے اور بالکل یہی طریقہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے بھی اختیار فرمایا ہے۔

۲۷۸۔ بیاہے زانی کی حد اور ایک مومنہ کی خدا ترسی:

(روا المسلم عن بريدة): انه حفر له حفرة ثم امر به فرجم فجاءت الغامدية فقالت: يا رسول الله اني زنيت فطهرني فردها فلما كان من الغد قالت يا رسول الله لم تردني لعلك تردني كما رددت ماعزاً فوالله اني حبلى قال اما لا فاذهبي حتى تلدي فلما ولدت اتته بالصبي في خرقة قالت: هذا قد ولدته قال فاذهبي فارضعيه حتى تفطميه فلما فطمته اتته بالصبي في يده كسرة خبز فقالت: هذا يا نبي الله قد فطمته وقد اكل الطعام فدفع الصبي الى رجل

ماعزؓ کے رجم کیے جانے کے بعد ایک غامدیہ عورت آئی اور عرض کیا کہ: یا رسول اللہ! میں بھی یہ فعل شنیع کر بیٹھی ہوں، مجھے بھی پاک فرما دیجئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ٹالنے کے لیے واپس کر دیا۔ دوسرے دن وہ پھر آئی اور کہنے لگی کہ حضور مجھے واپس کیوں فرماتے ہیں؟ معلوم ہوتا ہے کہ مجھے بھی ماعزؓ کی طرح بار بار واپس فرمانا چاہتے ہیں۔ بخدا میں تو حاملہ بھی ہوں (یعنی پورا ثبوت زنا موجود ہے) فرمایا کہ: پھر تو واپس جا اور ولادت کا انتظار کر۔ جب ولادت ہو گئی تو بچے کو ایک کپڑے میں لپیٹے ہوئے لائی اور عرض کیا، کہ اب تو ولادت بھی ہو چکی۔ فرمایا: واپس جا کر دودھ پلاتی رہ اور دودھ کے چھوٹنے کا انتظار کر۔ جب دودھ چھڑا چکی تو بچے کو لے کر حاضر ہوئی۔ بچے کے ہاتھ میں روٹی کا ایک ٹکڑا بھی تھا۔ عرض کیا کہ: اے نبی اللہ میں اس کا دودھ چھڑا چکی ہوں اور یہ کھانا کھانے لگا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بچے کو ایک

من المسلمين ثم امر بها فحفر لها الى صدرها وامر الناس فرجموها فيقبل خالد بن وليد بحجر فرمى رأسها فنضح الدم على وجهه فسبها فسمع صلى الله عليه وسلم فقال مهلاً يا خالد فوالذي نفسي بيده لقد تابت توبة لو تابها صاحب مكس لغفر له ثم امر بها فصلى عليها ودفنت۔

(شیخین، ترمذی، ابو داؤد)

مسلمان کے سپرد کیا اور حکم نبویؐ کے مطابق اس کے سینے تک گڑھا کھودا، اور لوگوں نے پتھراؤ شروع کر دیا۔ خالدؓ بن ولید نے آگے بڑھ کر ایک پتھر اُس کے سر پر مارا اور خون کا چھینٹا اُن کے منہ پر پڑا، جس پر خالدؓ کی زبان سے گالی نکلی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سن لی۔ حضورؐ نے فرمایا کہ: خالدؓ اپنی زبان روک۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے۔ اس نیک بخت عورت نے وہ توبہ کی ہے کہ اگر ظالم چُنگی والا بھی ایسی توبہ کرتا تو بخش دیا جاتا۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق اس غامدیہ کی نماز جنازہ ہوئی اور وہ دفن کی گئی۔

۳۷۹۔ حضرت عثمانؓ کی اجتہادی غلطی:

(مالکؒ) بلغني: ان عثمانؓ اتى بامرأة ولدت في ستة اشهر فامر برجمها فقال له عليؓ ما عليها رجم لان الله تعالى يقول: وحمله وفصاله ثلاثون شهراً وقال والوالدات يرضعن اولادهن حولين كاملين لمن اراد ان يتم الرضاعة فالحمل يكون ستة اشهر فلا رجم عليها فامر عثمانؓ بردها فوجدت قد رجمت۔

(ابو داؤد)

حضرت عثمانؓ کے پاس ایک عورت لائی گئی جسے شادی کے چھ ماہ بعد ہی ولادت ہو گئی تھی۔ حضرت عثمانؓ نے اُسے رجم کا حکم دیا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ: اسے رجم نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ایک جگہ فرماتا ہے (ترجمہ) کہ بچے کی مدت حمل اور مدت رضاعت مل کر تیس مہینے ہوتی ہے اور دوسری جگہ فرماتا ہے (ترجمہ) کہ مائیں اپنی اولاد کو کامل دو سال دودھ پلائیں اگر مدت رضاعت پوری کرنی مقصود ہو۔ پس (تیس ماہ میں سے دو سال رضاعت کے نکال لینے کے بعد) کم سے کم مدت چھ ماہ ہوتی ہے لہٰذا اسے رجم نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے بعد حضرت عثمانؓ نے اسے واپس لیجانے کا حکم دیا اور وہ واپس ہو گئی۔

۳۸۰۔ کن لوگوں پر قانونی گرفت نہیں:

(ابن عباسؓ) .... ان القلم مرفوع عن ثلاثة عن المجنون

(حضرت عمرؓ نے ایک مجنونہ زانیہ کو رجم کا حکم دیا تو حضرت علیؓ نے فرمایا کہ: ان تین آدمیوں پر شرعی گرفت نہیں۔ مجنون

حتی یبرأ وعن النائم حتی یستیقظ وعن الصبی حتی یعقل فقال بلی قال فما بال ھذہ قال لا شئی قال فارسلھا فارسلھا عمر وجعل یکبر ۔ (لابی داؤد)

پر تندرست ہونے تک، سونے والے پر جاگنے تک اور لڑکے پر عقل آنے تک۔ حضرت عمرؓ نے کہا: ہاں ٹھیک تو ہے۔ حضرت علیؓ نے کہا: پھر اس مجنونہ کے بارے میں کیا فیصلہ ہے؟ کہا اس پر کوئی حد نہیں۔ آپ نے کہا: پھر اسے چھوڑ دیجئے چنانچہ حضرت عمرؓ نے اُسے چھوڑ دیا اور تکبیر الٰہی فرمانے لگے۔

۳۸۱۔ سزا بقدر برداشت ہونی چاہیے:

(ابو امامۃؓ) عن بعض الصحابۃ من الانصار انہ اشتکی رجل منھم حتی اضنی فعاد جلدۃ علی عظم فدخلت علیہ جاریۃ لبعضھم فھش لھا فوقع علیھا فلما دخل علیہ رجال من قومہ یعودونہ اخبرھم بذلک وقال استفتوا لی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فذکروا لہ ذلک وقالوا ما رأینا باحد من الضر مثل ما بہ ولو حملناہ الیک لتفرخت عظامہ ما ھو الا جلد علی عظم فامر صلی اللہ علیہ وسلم ان یأخذوا لہ مائۃ شمراخ فیضربوہ بھا ضربۃ واحدۃ۔ لابی داؤد والنسائی نحوہ فی مقعد زنی، ضربہ صلی اللہ علیہ وسلم باثکول رحمۃ لزمانۃ وخفف عنہ۔

ایک انصاری صحابی بیمار ہو کر بے حد کمزور ہو گئے۔ حتیٰ کہ ہڈی سے چمڑا لگ گیا۔ اس دوران میں ایک عورت آپ کے پاس آئی جسے دیکھ کر ان میں تازگی آ گئی اور اس پر جا پڑے (یعنی مواصلت کر لی) جب بعض دوسرے انصار اُن کی عیادت کے لیے آئے تو اُن سے واقعہ بیان کرتے ہوئے کہا کہ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے میرے متعلق حکم دریافت کرو۔ ان لوگوں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے اس واقعے کا ذکر کیا اور عرض کیا کہ ہم نے کسی کو اتنا بیمار نہیں دیکھا ہے جیسا کہ وہ ہے، اگر ہم اسے یہاں تک لائیں تو اس کی ہڈیاں بکھر جائیں گی۔ اس کا تو ہڈی چمڑا ایک ہو رہا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ سو نرم ٹہنیوں کا مٹھا لے کر اُسے ایک ضرب لگا دو۔

دوسری روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شاخدار ٹہنی سے اُن کو مارا اور یہ رحمت و تخفیف ان کی ناتوانی کی وجہ سے فرمائی۔

۳۸۲۔ حد لگاتے وقت چہرے کو بچانا چاہیے:

(ابوھریرۃؓ) اذا ضرب احدکم

اگر کوئی حد لگائی جائے تو اس کے چہرے پر ضرب لگانے

فلیستنق الوجه - (لابی داؤد)

سے پرہیز کیا جائے ۔

چوری کی سزا

۳۸۳ - چور ماخوذ ہو تو قاضی کو ایسا انداز اختیار کرنا چاہیئے کہ وہ انکار جرم کر دے :

(ابو امیة المخزومی) ان النبی صلی اللہ علیه وسلم اتی بلص قد اعترف اعترافا ولم یوجد معه متاع فقال له النبی صلی اللہ علیه وسلم ما اخالك سرقت فقال بلی فاعاده علیه مرتین او ثلاثا کل ذلک یعترف فامر به فقطع وجئ به فقال له صلی اللہ علیه وسلم استغفر اللہ وتب الیه فقال استغفر اللہ واتوب الیه فقال صلی اللہ علیه وسلم اللھم تب علیه ثلاثا - (نسائی، ابو داؤد بلفظه)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک چور لایا گیا جس نے چوری کا اقرار تو کر لیا لیکن اس کے پاس سے کوئی مال برآمد نہ ہوا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے تو گمان نہیں کہ تم نے چوری کی ہو گی ۔ مگر اس نے کہا کہ : میں نے تو کی ہے ۔ حضور علیہ السلام نے دو تین مرتبہ اپنی بات کا اعادہ فرمایا، مگر وہ ہر بار اقرارِ جرم کرتا ہی رہا، آخر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔ جب وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا گیا تو فرمایا کہ : اللہ تعالٰی سے مغفرت طلب کرو اور اس کی طرف رجوع کرو ۔ اس نے کہا : میں اللہ سے مغفرت مانگتا ہوں اور توبہ کرتا ہوں ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار یہ دعا فرمائی کہ اے اللہ اس کی توبہ قبول فرما۔

۳۸۴ - قانون کی نظر میں سب برابر ہیں :

(عائشہؓ) ان قریشا اھمھم شان المرأة المخزومیة التی سرقت فقالوا من یکلم فیھا رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم؟ فقالوا ومن یجترئ علیه الا اسامة حبه صلی اللہ علیه وسلم

ایک مخزومی عورت نے چوری کی (سزا کے خوف سے) قریش چپقلش میں پڑ گئے اور باہم صلاح کی کہ کون اس کے بارے میں سفارشی گفتگو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کر سکتا ہے ؟ پھر خود ہی کہنے لگے کہ : حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چہیتے اسامہ رضؓ کے سوا اور کون اس کی جرأت کر سکتا ہے ؟ چنانچہ اسامہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے

تشفع فی حد من حدود اللہ؟ ثم قام فاختطب فقال انما ھلک الذین من قبلکم انھم کانوا اذا سرق فیھم الشریف ترکوہ واذا سرق فیھم الضعیف اقاموا علیہ الحد وایم اللہ لو ان فاطمۃ بنت محمد سرقت لقطعت یدھا (للستۃ الا مالکا)

سفارش کی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ :- تم حدود اللہ کے متعلق سفارش کرتے ہو؟ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر خطبہ دیا، کہ تم سے پہلے کے لوگ اسی لیے برباد ہوئے کہ جب ان میں کوئی صاحب وجاہت چوری کرتا تو اُسے چھوڑ دیتے اور جب کوئی بیکس چوری کرتا تو اس پر حد جاری کرتے۔ خدا کی قسم اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہ بھی ارتکابِ سرقہ کرتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا۔

۳۸۵- ہر چوری کی سزا قطع ید نہیں:

(ابن عمروؓ بن العاص) ان رجلا من مزینۃ اتی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال یا رسول اللہ کیف تری فی حریسۃ الجبل؟ قال ھی ومثلھا والنکال ولیس فی شئی من الماشیۃ قطع الا فیما اواہ المراح فبلغ ثمن المجن ففیہ غرامۃ مثلیہ وجلدات نکال قال یا رسول اللہ کیف تری فی الثمر المعلق؟ قال ھو ومثلہ معہ والنکال ولیس فی شئی من الثمر المعلق قطع الا فیما اواہ الجرین فما اخذ من الجرین فبلغ ثمن المجن ففیہ القطع ومالم یبلغ ثمن المجن ففیہ غرامۃ مثلیہ۔

(اصحاب ستن)

بنی مزینہ کے ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر سوال کیا کہ یا رسول اللہ! حریسۃ الجبل کے متعلق کیا ارشاد ہے؟ فرمایا کہ : وہ چوپایہ بھی چور سے لیا جائے گا اور ایک ویسا ہی چوپایہ اور دلوایا جائے گا اور کوئی مناسب تنبیہی سزا بھی دی جائے گی۔ ہاتھ صرف اُسی چوپائے کی چوری پر کاٹا جائے گا جو اپنے تھان پر محفوظ ہو اور ایک ڈھال کی قیمت کے برابر ہو۔ اگر ایک ڈھال کی قیمت سے کم کا چوپایہ ہو تو (تھان سے چوری ہو جانے کے باوجود) چور سے دوگنا ڈنڈ دلوایا جائے گا۔ اور عبرت کے لیے چند کوڑے لگائے جائیں گے ـــ اس مزنی نے پھر پوچھا کہ: یا رسول اللہ! درخت میں لٹکے ہوئے پھلوں کے متعلق کیا حکم ہے؟ فرمایا: یہاں بھی دوگنا ڈنڈ اور کچھ عبرتناک سزا۔ ہاتھ صرف انہی پھلوں کی چوری پر کاٹا جائے گا جو کھلیان میں محفوظ ہوں اور اسکی قیمت ایک ڈھال کے برابر ہو اور اگر مسروقہ پھول کی قیمت ایک ڈھال کی قیمت سے کم ہو تو (باوجود کھلیان سے چوری ہونے کے) صرف اس کا دوگنا ڈنڈ دلوایا جائے گا۔

۳۸۶ - صرف مال لینا چوری میں داخل نہیں :

(جابرؓ) رفعه : ليس على خائن ولا منتهب ولا مختلس قطع - (ترمذی، نسائی)

خیانت کرنے والے، جبراً یا بے استحقاق لینے والے اور اچکنے پر قطع ید نہیں۔

۳۸۷ - بعض چوریوں پر سزا کی بجائے انعام بھی ہے :

(عباد بن شرحبیل) اصابتني سنة فدخلت حائطاً من حيطان المدينة ففركت سنبلا فاكلت وحملت في ثوبي فجاء صاحبه فضربني واخذ ثوبي فاتي بي النبي صلى الله عليه وسلم فذكر ذلك له فقال له ما علمت اذ كان جاهلا ولا اطعمت اذ كان جائعا او ساغبا فامره فرد علي ثوبي فاعطاني وسقا او نصف وسق من طعام - (ابو داؤد، نسائی)

مجھے ایک بار قحط کا سامنا کرنا پڑا تو میں مدینے کے ایک باغ میں داخل ہوا۔ پھر ایک خوشے کو مل کر کھالیا اور کچھ اپنے کپڑے میں رکھ لیے۔ اتنے میں مالکِ باغ آ پہنچا۔ اس نے مجھے مارا بھی اور میرا کپڑا بھی چھین لیا اور مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پکڑ کر لایا اور تمام واقعہ کہہ سُنایا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ : یہ نادان تھا تم نے اُسے کوئی تعلیم نہ دی۔ یہ بھوکا تھا تو تم نے اُسے کچھ کھلایا نہیں۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے اُس نے مجھے میرا کپڑا بھی واپس کر دیا اور ایک یا آدھا وسق غلّہ بھی دیا۔

۳۸۸ - بعض چوری قابلِ معافی ہے :

(رافع بن عمروؓ) كنت ارمي نخل الانصار فاخذوني فذهبوا بي الى النبي صلى الله عليه وسلم فقال يا رافع لم ترمي نخلهم؟ قلت يا رسول الله الجوع قال لا ترمي وكل ما وقع اشبعك الله وارواك - (لابي داؤد والترمذي)

میں انصار کے نخلستان میں ڈھیلے مار مار کر کھجوریں گرا رہا تھا کہ مجھے انھوں نے پکڑ لیا اور حضورؐ کے پاس لائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ : اے رافع ! تم ان کے درختوں پر کلوخ اندازی کیوں کر رہے تھے؟ عرض کیا یا رسول اللہ! بھوک نے مجبور کیا۔ فرمایا : کلوخ آزمائی نہ کرو بلکہ جو کھجوریں خود ٹپک پڑیں وہی اُٹھا کر کھالیا کرو، اللہ تمھیں شکم سیر اور سیراب کرے۔

۳۸۹ - غلام اگر چوری کرے :

(ابن عمرؓ) جاء رجل الی عمرؓ بغلام له فقال اقطع يده فانه سرق مرآة لامرأتی فقال عمر لا قطع عليه وهو خادمكم اخذ متاعكم ۔ (مالک)

ایک شخص نے اپنے نوکر کو لے کر حضرت عمرؓ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ : اس کا ہاتھ کاٹیے کیونکہ اس نے میری بیوی کا آئینہ چرایا ہے ۔ آپؓ نے فرمایا کہ : اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا ۔ تمہارا ہی خادم ہے ، اور تمہارا ہی مال لیا ۔

۳۹۰ - فیصلے میں قانونِ تنزیلی دوسرے ذرائع علم پر مقدم ہے :

(جابرؓ) جيئ رسول الله صلی الله عليه وسلم بسارق فقال اقتلوه قالوا يا رسول الله انما سرق فقال اقطعوه فقطع ثم جيئ به الثانية فقال اقتلوه فقالوا يا رسول الله انما سرق فقال اقطعوه فقطع ثم جيئ به الثالثة فقال اقتلوه قالوا يا رسول الله انما سرق قال اقطعوه ثم اتی به الرابعة فقال اقتلوه فقالوا يا رسول الله انما سرق قال اقطعوه فاتی به الخامسة فقال اقتلوه فانطلقنا به فقتلناه ثم اجتررناه فالقيناه فی بئر ورمينا عليه بالحجارة ۔ (ابو داؤد ، نسائی نحوہ وانکرہ)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک چور لایا گیا ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ : اسے قتل کر دو ۔ لوگوں نے عرض کیا کہ : یا رسول اللہ ! اس نے چوری کی ہے ۔ فرمایا : اچھا تو ہاتھ کاٹ دو ۔ دوسری بار پھر وہی چور لایا گیا ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر وہی حکم دیا کہ قتل کر دو ۔ لوگوں نے پھر عرض کیا کہ : اس نے چوری کی ہے ۔ فرمایا کہ : اچھا (پاؤں) کاٹ دو ۔ تیسری بار وہ پھر چوری میں ماخوذ ہوا اور اسی طرح سوال و جواب کے بعد اس کا دوسرا ہاتھ اور پھر چوتھی بار دوسرا پاؤں کاٹا گیا ۔ پانچویں بار پھر اسی جرم میں لایا گیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ : اسے قتل کر دو ۔ چنانچہ ہم لوگ اُسے لے گئے اور قتل کر دیا اور اُسے گھسیٹ کر ایک اندھے کنوئیں میں ڈال آئے اور اُوپر سے پتھر مار مار کر ڈھانپ دیا ۔

۳۹۱ - غلام کی چوری پر آقا سے دوگنا ڈنڈ :

(یحییٰ بن عبد الرحمانؓ) ان رقیقا لحاطب سرقوا ناقة الرجل من مزینة فانتحروها فرفع ذلک الی عمر فامر کثیر بن الصلت ان یقطع ایدیهم ثم قال عمر اراک تجیعهم والله لاغرمنک غرما یشق علیک ثم قال للمزنی کم ثمن ناقتک؟ فقال عمر کنت والله امنعها من اربعمائة درهم فقال اعطه ثمان مائة درهم۔ (مالک)

حاطب کے غلاموں نے بنی مزینہ کے ایک شخص کی اُونٹنی چُرا لی اور ذبح کرکے چٹ کر گئے، یہ مقدمہ حضرت عمرؓ کے پاس آیا۔ آپ نے کثیر بن صلت کو حکم دیا کہ ان سب کے ہاتھ کاٹ دو۔ پھر فرمایا کہ: معلوم ہوتا ہے کہ تم (اے حاطب) ان کو بھوکا رکھتے ہو۔ لہٰذا تم ہی پر مَیں ایسا تاوان لگاؤں گا کہ تمھیں یاد رہے۔ پھر آپ نے اس مزنی سے پوچھا کہ: تمھاری اُونٹنی کے کیا دام تھے؟ پھر خود ہی فرمایا کہ: مَیں تو چار سو درہم قیمت لگاتا ہوں۔ اس کے بعد آپؓ نے حاطب سے کہا کہ: اس مزنی کو آٹھ سو درہم ادا کر دو۔

۳۹۲ - خدا کا مال اگر خدا کا مال چُرا لے :

(ابن عباسؓ) ان عبداً من رقیق الخمس سرق من الخمس فرفع ذلک الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فلم یقطعه وقال مال اللہ سرق بعضه بعضاً (قزوینی بمعنہ)

خُمس (مالِ غنیمت کا پانچواں حصّہ) کے غلاموں میں سے ایک غلام نے مالِ خمس میں سے کچھ حصّہ چُرا لیا۔ مقدمہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تو آپؐ نے اس کا ہاتھ نہیں کاٹا اور فرمایا کہ: دونوں ہی خدا کا مال ہیں۔ ایک نے دوسرے کو چُرا لیا تو کیا ہُوا؟

۳۹۳ - محض شُبہ سرقہ پر مارنا نہ چاہیے :

(ازهر بن عبد الله) ان قوماً من الکلاعیین سرق لهم متاع فاتهموا اناساً من الحاکة فاتوا بهم

بنی کلاع کے کچھ لوگوں کا مال چوری ہو گیا تو اُن لوگوں نے چند باشندوں پر الزام لگایا اور اُن کو پکڑ کر نعمان بن بشیر کے پاس لائے۔ انھوں نے ان کو چند

النعمان بن بشیر فحبسھم ایاما ثم خلی سبیلھم فاتوا النعمان فقالوا خلیت سبیلھم بغیر ضرب ولا امتحان فقال لھم النعمان ما شئتم ان شئتم ان اضربھم فان خرج متاعکم فذاک والا اخذت لھم من ظھورکم مثل ما اخذ من ظھورھم فقالوا ھذا حکمک؟ قال ھذا حکم اللہ ورسولہ۔

(ابوداؤد، نسائی)

دن حبس میں رکھ کر چھوڑ دیا۔ بنی کلاع نے نعمان کے پاس آکر فریاد کی کہ آپ نے ان کو بغیر مارے پیٹے اور بغیر جانچ پڑتال کیسے یوں ہی رہا کر دیا؟ آپ نے جواب دیا کہ: تم یہی چاہتے تھے نا کہ میں انھیں ماروں پیٹوں؟ اس کے بعد اگر تمھارا مال برآمد ہو جاتا تو پھر بات ٹھیک ہوتی۔ لیکن ایسا نہ ہوتا، تو ان بے گناہوں کی پیٹھ پر جو مار پڑتی وہ تمھاری پیٹھ سے وصول کر لی جاتی۔ وہ کہنے لگے کہ یہ آپ کا فیصلہ ہے؟ جواب دیا کہ: نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا فیصلہ ہے۔

۳۹۴۔ اجرائے حد اور تاوان دونوں ایک ساتھ نہیں:

(عبدالرحمٰن بن عوفؓ) رفعہ: لا یغرم صاحب سرقۃ اذا اقیم علیہ الحد (نسائی)

جس چور پر حد جاری ہو جائے اس سے تاوان کوئی نہیں لیا جائے گا۔

۳۹۵۔ اگر کسی نیک نام کے پاس سے مال مسروقہ برآمد ہو:

(اسید بن حضیر) ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قضی انہ اذا وجدھا یعنی السرقۃ فی ید الرجل غیر المنھوم فان شاء اخذھا بما اشتراھا وان شاء اتبع سارقہ وقضی بذلک ابوبکر وعمر (نسائی)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ ہے کہ جو شخص اپنا مال مسروقہ کسی ایسے شخص کے ہاتھ میں پائے جو چوری سے متہم نہیں تو جتنے میں اس نے اُسے خریدا ہے، اُتنا اسے دے کر اپنا مال لے لے یا اس کے ذریعے سے اصل چور کا سراغ لگائے۔ حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کا بھی یہی فیصلہ ہے۔

۳۹۶۔ سفر میں چوری کی حد نہیں:

(بسر بن ارطاۃ) رفعہ: لا تقطع الایدی فی السفر (اصحاب سنن)

سفر میں چور کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔

مے خواری کی سزائیں

۳۹۷ - مے خواری کی سزا اسّی دُرّے:

(ثور بن زید) ان عمر استشار فی حد الخمر فقال له علیؓ اری ان تجعله ثمانین فانه اذا شرب سکر واذا سکر ھذی واذا ھذی افتری فجلد عمر ثمانین۔ (مالک)

سزائے شراب خوری کے متعلق حضرت عمرؓ نے مشورہ فرمایا تو حضرت علیؓ نے رائے دی کہ اسّی کوڑے مقرر کیجئے کیونکہ جب شراب پیے گا تو بدمست ہوگا اور جب بدمست ہوگا تو ہذیان بکے گا اور جب ہذیان بکے گا تو افترا بھی کرے گا (جس کی سزا اسّی کوڑے ہے) غرض حضرت عمرؓ نے اسّی کوڑے اس کی سزا مقرر فرمائی۔

۳۹۸ - سزا دینے سے گریز چاہیے:

(ابن عباسؓ) ان النبی صلی اللہ علیه وسلم لم یقت فی الخمر حدا وقال شرب رجل منکر فلقی یمیل فی الفج فانطلق به الی النبی صلی اللہ علیه وسلم فلما حاذی بدار العباس انفلت فدخل علی العباس فالتزمه فذکروا ذلک للنبی صلی اللہ علیه وسلم فضحک وقال أفعلها؟ ولم یامر فیه بشیئ۔ (ابوداؤد)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب نوشی کی کوئی قطعی (معیّن) حد نہیں بتائی ہے۔ ایک شخص پی کر بدمست ہوگیا اور راستے میں جھومتا لڑکھڑاتا ہوا جا رہا تھا۔ اُسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا جانے لگا جب وہ حضرت عباسؓ کے مکان کے سامنے آیا تو ایک جست لگا کر مکان کے اندر جا گھسا اور حضرت عباسؓ سے چمٹ گیا۔ جب یہ واقعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو ہنس دیئے۔ صرف اتنا پوچھا کہ: اس نے فی الواقع یہ حرکت کی تھی؟ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے کسی سزا کا حکم نہیں دیا۔

۳۹۹ - اللہ اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سے محبّت رکھنے والا سزا یافتہ شرابی۔

(عمرؓ) ان رجلا فی عهد النبی

عہدِ نبوی میں عبداللہ نامی ایک شخص تھا جس

صلی اللہ علیہ وسلّم کان اسمہ عبد اللہ وکان یلقب حمارا وکان یضحک النبی صلّی اللہ علیہ وسلّم احیانا وکان صلی اللہ علیہ وسلم قد جلدہ فی الشراب فاتی بہ یوما فامر بہ فجلد فقال رجل من القوم اللّٰھم العنہ ما اکثر ما یوتی بہ فقال صلّی اللہ علیہ وسلّم ولا تلعنوہ فو اللہ ما علمت الا انّہ یحب اللہ ورسولہ ۔ (بخاری)

کا لقب حمار ہو گیا تھا۔ یہ کبھی کبھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہنسایا کرتا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے شراب نوشی کی سزا میں کوڑے لگوائے تھے! لیکن اسے دوبارہ پھر اسی جرم میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے کوڑے لگے تو کسی نے کہا کہ: اس پر خدا کی لعنت ہو، یا ربار اسی جرم میں پکڑ کر لایا جاتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اس پر لعنت نہ کرو۔ بخدا میں یہی جانتا ہوں کہ یہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھتا ہے۔

۴۰۰۔ سزا یافتہ شرابی کے لیے دعائے خیر:

(ابو ھریرۃ رضی) ان النبیّ صلی اللہ علیہ وسلّم اتی برجل قد شرب فقال اضربوہ فمنا الضارب بیدہ والضارب بنعلہ والضارب بثوبہ ثم قال لنا بکتوہ فاقبلنا علیہ نقول اما اتقیت اللہ اما خشیت اللہ اما استحییت من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم فلما انصرف قال لہ بعض القوم اخزاک اللہ فقال صلّی اللہ علیہ وسلّم لا تقولوا ھکذا لا تعینوا علیہ الشیطان ولکن قولوا اللّٰھم ارحمہ اللّٰھم تب علیہ ۔

(البخاری وابی داؤد بلفظہ)

حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے پاس ایک شرابی لایا گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اسے مارو۔ پس کسی نے ہاتھ سے، کسی نے جوتے سے اور کسی نے کپڑے سے مارنا شروع کر دیا۔ پھر فرمایا کہ: اسے زبان سے شرمندہ کرو۔ چنانچہ ہم لوگ اس کے سامنے کہنے لگے کہ تجھے خدا کا لحاظ نہیں؟ تجھے خدا کا خوف نہیں؟ تجھے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شرم نہیں۔ جب یہ قصے ختم ہوئے اور وہ چلا گیا تو کسی نے کہا کہ: خدا تجھے رسوا کرے۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ، یہ کہہ کر اس کے خلاف شیطان کی مدد نہ کرو، بلکہ یوں کہو کہ: اللہ اس پر رحم فرما اور اس کی توبہ قبول فرما۔!

نشہ

۴۰۱ ۔ بہر کثیر الخ :

(جابرؓ) رفعہ : ما اسکر کثیرہ فقلیلہ حرام (ترمذی، ابوداؤد)

جس چیز کا کثیر حصّہ نشہ پیدا کرے، اُس کا قلیل حصّہ بھی حرام ہے۔

۴۰۲ ۔ نشہ وہ ہے جو "صلوٰۃ" سے غافل کر دے :

(ابوموسیٰ) بعثنی النبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم ومعاذاً الی الیمن فقال ادعوا الناس وبشرا ولا تنفرا ویسرا ولا تعسرا وتطاوعا ولا تختلفا فقلت یارسول اللہ افتنا فی شرابین کنا نصنعھما بالیمن البتع وھو من العسل ینبذ حتی یشتد والمزر وھو من الذرۃ والشعیر ینبذ حتی یشتد وکان صلی اللہ علیہ وسلم قد اعطی جوامع الکلم بخواتمہ فقال انھی عن کل مسکر اسکر عن الصلوٰۃ۔ (شیخین، ابوداؤد، نسائی)

مجھے اور معاذ رضی اللہ عنہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن بھیجتے ہوئے فرمایا کہ : لوگوں کو اس طرح دعوتِ حق دو کہ کشش پیدا ہو گریز نہ پیدا ہو آسانی پیدا کرو۔ دشواری میں مت ڈالو۔ تم دونوں آپس میں ایک دوسرے کے معاون رہو اور اختلاف پیدا نہ ہونے دو۔ میں نے عرض کیا کہ : یا رسول اللہ دو شرابوں کے متعلق ارشاد فرمایئے جو ہم لوگ یمن میں تیار کرتے ہیں، ایک تو ہے "بتع" یہ شہد سے تیار ہوتی ہے۔ جب اس کی نبیذ بنتی ہے تو اس میں تیزی آ جاتی ہے اور دوسری ہے "مزر" یہ "ذرہ" اور "جو" سے بنتی ہے اور اس کی نبیذ میں بھی تیزی آ جاتی ہے۔ حضورؐ کو تو ایک آخری اور جامع بات فرمانے کا ملکہ حاصل تھا فرمایا کہ : میں ہر اس مسکر سے روکتا ہوں جو نماز سے غافل کر دے۔

۴۰۳ ۔ ہر نشہ لانے والی چیز حرام ہے :

(اُم سلمہؓ) نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن کل مسکر ومفتر (ابوداؤد)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر اُس چیز سے منع فرمایا ہے جو نشہ لائے اور (بعد میں) سُست کر دے۔

۴۰۴ - نشہ پینے کے حیلے :

(دیلم الحمیری) قلت یا رسول اللہ انا بارض باردة ونعالج فیها عملا شدیدا وانا نتخذ شرابا من هذا القمح نتقوی به علی اعمالنا وعلی برد بلادنا قال هل یسکر؟ قلت نعم قال فاجتنبوا قلت ان الناس غیر تارکیه قال ان لم یترکوه فاقتلوهم - (ابوداؤد)

میں نے عرض کیا کہ: یارسول اللہ! ہم لوگ سرد ملک کے رہنے والے ہیں اور ہمیں بڑی سخت محنت کرنی پڑتی ہے اس لیے ہم وہاں گندم سے ایسی شراب تیار کرتے ہیں جس سے کام کے لیے چستی بھی آئے اور سردی کے اثر سے بھی محفوظ رہیں۔ فرمایا: کیا اس میں نشہ بھی ہوتا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ: ہاں ہوتا ہے۔ فرمایا: پھر اس سے پرہیز کرو۔ میں نے عرض کیا کہ: تمام لوگ تو اسے نہ چھوڑیں گے فرمایا کہ اگر ترک نہ کریں تو ان سے قتال کرو۔

۴۰۵ - نشہ ام الخبائث ہے :

(عثمانؓ) اجتنبوا الخمر فانها ام الخبائث (نسائی)

شراب سے بچو کیونکہ یہ تمام برائیوں کی جڑ ہے۔

۴۰۶ - دائم الخمر مشرک جیسا ہے :

(ابوھریرہؓ) مدمن الخمر کعابد وثن (قزوینی بلبنی)

دائم الخمر ایسا ہی ہے جیسا بُت کا پجاری۔

۴۰۷ - نشے کی بدمستی میں کیا ہوتا ہے :

(ابن عباسؓ) رفعه: الخمر ام الفواحش واکبر الکبائر من شربها وقع علی امه وخالته وعمته (اوسط، کبیر بضعف)

نشہ تمام بے حیائیوں کی جڑ ہے اور تمام کبائر گناہ سے بڑا گناہ ہے، جو پی لیتا ہے وہ بدمست ہو کر اپنی ماں، خالہ اور پھوپھی پر بھی جا پڑتا ہے۔

۴۰۸ - دس ملعون :

(انسؓ) لعن رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم فی الخمر عشرة عاصرها ومعتصرها وشاربها وساقیها وحاملها والمحمولة

نشے سے تعلق رکھنے والے دس قسم کے آدمیوں پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت کی ہے: تیار کرنے والا، تیار کرانے والا، پینے والا، پلانے والا، اٹھا کر لے جانے

الیہ ربائعها ومبتاعها وواهبها واکل ثمنها - (ترمذی)

والا، منگوانے والا، بیچنے والا اور خریدنے والا، مفت دینے والا اور دام لے کر کھانے والا۔

۴۰۹ - خمر کی تعریف، اور تین تشنہ مسائل :

(عمرؓ) قال علی المنبر اما بعد ایها الناس انه نزل تحریم الخمر وهی من خمسة انواع من العنب والتمر والعسل والحنطة والشعیر، والخمر ما خامر العقل ثلاث وددت ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان عهد الینا فیهن عهداً ننتهی الیه الجد والکلالة وابواب من ابواب الربوٰ۔ (للستة الا مالکا)

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے منبر پر خطبہ دیتے ہوئے فرمایا کہ : لوگو! شراب کی حرمت نازل ہو چکی ہے اور یہ (عموماً) پانچ چیزوں سے تیار ہوتی ہے : انگور، خرما، شہد، گیہوں اور جو سے ۔ لیکن خمر (نشہ) ہر وہ چیز ہے جو عقل کو ڈھانپ لے ۔ تین باتیں جن کے متعلق مجھے تمنا ہوتی ہے کہ کاش ! حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے متعلق واضح اور آخری احکام بتا جاتے : ایک دادا کا ترکہ، دوسری کلالہ کا حصہ اور تیسری سود کی بعض قسمیں۔

۴۱۰ - نام دوسرا، کام وہی :

(رجل من الصحابة) یشرب ناس من امتی الخمر یسمونها بغیر اسمها - (النسائی)

میری اُمت میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جو پئیں گے تو شراب، لیکن اس کا نام کچھ اور رکھیں گے ۔

۴۱۱ - شراب چھڑوانے میں حکمت نبویؐ :

(ابو سعیدؓ) ان ناساً من عبد القیس قدموا علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقالوا یا نبی اللہ انا حی من ربیعة و بیننا و بینك کفار مضر ولا نقدر علیك الا فی هذه الاشهر الحرم فمنا بامر نأمر به من ورائنا وندخل به الجنة اذا نحن اخذنا به فقال

بنی عبد قیس کا ایک وفد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور عرض کیا کہ ہم بچے از قبائل ربیعہ ہیں، اور ہمارے اور آپؐ کے درمیان کفار مضر حائل ہیں۔ ہم حضور کے پاس صرف شہور حرام ہی میں حاضر ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں ایسی جامع بات فرمائیے کہ جو ہم اپنے لوگوں کو بتا دیں جس پر عمل کر کے مستحق جنت ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ : میں تمہیں چار باتوں پر عمل کرنے کا حکم دیتا ہوں اور چار باتوں سے بچنے کا۔

آمرکم باربع وانهاکم عن اربع اعبدوا الله ولا تشرکوا به شیئا واقیموا الصلوٰة وآتوا الزکوٰة وصوموا رمضان واعطوا الخمس من الغنائم وانهاکم عن اربع عن الدباء والحنتم والمزفت والنقیر قالوا یا نبی الله ما علمك بالنقیر؟ قال بلی جذع تنقرونه فتلقون فیه من القطیعاء او قال من التمر ثم تصبون فیه من الماء حتی اذا سکن غلیانه شربتموه حتی ان احدکم او احدهم لیضرب ابن عمه بالسیف وفی القوم رجل اصابته جراحة کذلك قال وکنت اخبأها حیاء من النبی صلی الله علیه وسلم فقلت فیم نشرب یا رسول الله؟ قال فی اسقیة الادم التی یلاث علی افواهها قالوا یا نبی الله ان ارضنا کثیرة الجرذان ولا تبقی بها اسقیة الادم فقال وان اکلها الجرذان ثلاثا وقال صلی الله علیه وسلم ان فیك خصلتین یحبهما الله عز وجل الحلم والاناة ۔ (مسلم، نسائی)

کرنے کے کام یہ ہیں کہ : اللہ کی عبدیت اختیار کرو اور کسی شے کو بھی اس کا شریک نہ بناؤ، نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو، اور رمضان کے روزے رکھو اور غنیمتوں کا خمس ادا کیا کرو اور چار چیزوں سے پرہیز کرو : دُبّا، حنتمہ، مزفت اور نقیر۔ لوگوں نے پوچھا کہ : یا نبی اللہ! حضور کو نقیر کا علم ہے؟ فرمایا: کیوں نہیں! کھجور کا تنا کُھرچ کُھرچ کر برتن سا بنا لیتے ہو پھر اس میں چھوہارے اور پانی ڈال کر پکاتے ہو، پھر جب اس کا جوش سکون پر آجاتا ہے تو اسے پیتے ہو۔ اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کوئی اسی نشے میں اُٹھ کر اپنے عم زاد بھائی پر تلوار چلانی شروع کر دیتا ہے۔" اتفاق سے اس وفد میں ایک شخص ایسا بھی موجود تھا جو اسی طرح زخمی ہوا تھا، اس کا بیان ہے کہ : حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شرم کی وجہ سے میں نے اس مانع کو پوشیدہ رکھا اور (گفتگو کا رُخ بدلتے ہوئے) پوچھا کہ : یا رسول اللہ! پھر ہم پانی وغیرہ کس چیز میں پئیں؟ فرمایا : چمڑے کے برتنوں میں جن کو ڈھانک کر یا باندھ کر محفوظ رکھا جاتا ہو۔ لوگوں نے عرض کیا کہ : یا رسول اللہ! ہمارے ہاں جنگلی چوہے بہت ہوتے ہیں اور وہ چمڑے کے برتنوں کو چھوڑتے نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار فرمایا : خواہ چوہے کُتر ہی کیوں نہ ڈالتے ہوں۔ پھر فرمایا کہ : تمہارے اندر دو خصلتیں ایسی ہیں کہ جن کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے : ایک ہے حلم اور دوسری سنجیدگی۔

۴۱۲۔ مصلحت پوری ہونے کے بعد حکم کی واپسی :

(بریدۃ) رفعه : کنت نهیتکم عن الاشربة الا فی ظروف الادم فاشربوا فی کل وعاء

میں نے تمہیں پہلے چمڑے کے برتنوں کے سوا دوسرے برتنوں کے استعمال سے روکا تھا مگر اب سب برتن استعمال کر سکتے ہو لیکن نشہ آور

غیر ان لا تشربوا مسکرا۔ وفی روایۃ: کنت نھیتکم عن الظروف وان الظروف ازظرفا لا یحل شیئا ولا یحرمہ وکل مسکر حرام (مسلم واصحاب السنن)

رہے کہ نشہ لانے والی چیز نہ ہو۔ دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ: میں نے تمھیں (شراب کے) برتنوں سے روکا تھا، لیکن نفس برتن نہ کسی چیز کو حلال کرتا ہے نہ حرام، بلکہ حرام در اصل نشہ پیدا کرنے والی چیز ہے۔

۴۱۳۔ مشرک کے برتنوں کا استعمال:

(جابرؓ) کنا نغزوا مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم فنصیب من آنیۃ المشرکین واسقیتھم نستمتع بھا فلا یعیب ذلک علینا۔ (ابوداؤد)

غزوات میں ہم لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک ہوتے تھے اور مشرکوں کے برتنوں اور پیالوں سے فائدہ اُٹھاتے تھے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر کوئی اعتراض نہ فرمایا۔

لباس وزینت

۴۱۴۔ تولنے میں فراخ دلی چاہیئے:

(سوید بن قیسؓ) جلبت انا ومخرمۃ العبدی بزا من ھجر فاتینا بہ مکۃ فجاءنا النبی صلی اللہ علیہ وسلم فساومنا بسراویل فبعناہ وثم رجل یزن بالاجر فقال للذی یزن زن وارجح (اصحاب سنن والموصلی والاوسط)

میں نے اور مخرمہ نے ہجر کا ایک خاص کپڑا خرید اور مکے میں لائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس آئے اور ہم سے چند پاجاموں کا مول تول کیا۔ ہم نے تول کے حساب سے اس کا سودا کر لیا۔ جو تولتا اُس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ذرا اَپلہ جھکا کر (یعنی کچھ زیادہ دے دیا کرو اس سے کچھ نقصان نہیں ہوتا اور خریدار خوش ہو جاتا ہے)

غنیمت اور غلول

۴۱۵۔ مالِ غنیمت کا ناجائز استعمال:

(رویفع بن ثابت الانصاری)

جو شخص اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے۔ وہ

رفعه: من كان يؤمن بالله واليوم الآخر فلا يركب دابة من فئ المسلمين حتى اذا اعجفها ردها فيه ومن كان يؤمن بالله واليوم الآخر فلا يلبس ثوبا من فئ المسلمين حتى اذا اخلقه رده فيه ـ (ابوداؤد)

(قبل از تقسیم) غنیمت کے کسی جانور پر سواری نہ کرے کہ وہ دُبلا ہو جائے تو وہ (تقسیم کے وقت) واپس کر دے اور جس کا اللہ تعالیٰ اور آخرت پر یقین ہے، وہ غنیمت کا کوئی کپڑا بھی استعمال نہ کرے۔ کہ جب پُرانا ہو جائے تو اُسے واپس کر دے۔

۴۱۶۔ دشمن سے بھی عہد کی پابندی کی تعلیم:

(حذیفہؓ) ما منعني ان اشهد بدرًا الا اني خرجت انا وابي حسيل فاخذنا كفار قريش فقالوا انكم تريدون محمدًا فقلنا ما نريد الا المدينة فاخذوا منا عهد الله وميثاقه لننصرفن الى المدينة ولا نقاتل معه فاتينا النبي صلى الله عليه وسلم فاخبرناه الخبر فقال انصرفا نفي لهم بعهدهم ونستعين الله عليهم (مسلم)

میں بدر میں شرکت نہ کر سکا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی تھی کہ میں اور میرے والد حُسیل ہجرت کے لیے نکلے تو کفارِ قریش نے ہمیں گرفتار کر لیا اور کہا کہ: تم محمدؐ کے پاس جانے کے لیے نکلے ہو؟ ہم نے کہا کہ: ہم تو مدینے جا رہے ہیں۔ اس پر اُنھوں نے ہم سے قسم لی کہ مدینے تو جائیں گے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریکِ جنگ نہ ہوں گے۔ ہم جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تو یہ واقعات بیان کیے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اچھا جاؤ! ہم ہر حال وفائے عہد کریں گے اور دشمنوں کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ سے امداد طلب کریں گے۔

اخلاقیات

حُسنِ نیّت اور صدق وکذب

۱۔عمل کا نتیجہ نیّت کے مطابق ہوتا ہے:

(عمرؓ) رفعہ: انما الاعمال بالنیات وفی روایۃ بالنیۃ وانما لکل امرئ مانوی فمن کانت ھجرتہ الی اللہ ورسولہ فھجرتہ الی اللہ ورسولہ ومن کانت ھجرتہ الی دنیا یصیبھا او امرأۃ یتزوجھا فھجرتہ الی ماھاجر الیہ۔ وفی روایۃ: فمن کانت ھجرتہ الی دنیا یصیبھا او امرأۃ ینکحھا فھجرۃ الی ماھاجر الیہ۔ (للستۃ الا مالکا)

اجرِ عمل، نیتِ عمل کے ساتھ وابستہ ہے۔ ایک دوسری روایت میں اس کے بعد یہ الفاظ بھی ہیں کہ: ہر ایک شخص کا اجر اس کی نیّت کے مطابق ہوگا لہٰذا جس (مہاجر) نے اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہجرت کرنے کی نیّت کی اُس کی ہجرت تو اللہ اور رسولؐ ہی کی طرف شمار ہوگی اور جس نے اس نیّت سے ہجرت کی ہو کہ دنیا ملے، یا کسی عورت سے شادی کرے اُس کی ہجرت کا مقصود بھی وہی شمار ہوگا جس کی اُس نے نیّت کی تھی۔

ایمان کی خصلتیں

۲۔ تین خصائل ایمان:

(عمار بن یاسرؓ) رفعہ: ثلاث من الایمان الانفاق من الاقتار و

یہ تین امور (بھی) داخلِ ایمان ہیں:

(۱) اپنی تنگ دستی میں بھی دوسروں کی اعانت

بذل السلام للعالم والانصاف من نفسك ۔ (رموز)

(۲) تمام عالم کے لیے سلامتی کی تڑپ (۳) اپنی ذات سے بھی انصاف کرنا ۔

۳ - تکمیل ایمان کا سب سے بڑا ذریعہ :

(انس رض) رفعه : لا یؤمن احدکم حتی یحب لاخیه ما یحب لنفسه ۔ (شیخین، ترمذی، نسائی)

تم میں سے کوئی پکا مومن اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک اپنے بھائی کے لیے بھی وہی نہ پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے ۔

۴ - بہترین اسلام :

(ابن عمرو بن العاص) ان رجلا سأل النبی صلی اللہ علیہ وسلم ای الاسلام خیر؟ قال تطعم الطعام وتقرأ السلام علی من عرفت ومن لم تعرف ۔ (شیخین، نسائی)

ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا : کہ بہترین اسلام کونسا ہے ؟ فرمایا : بھوکوں کو کھانا کھلانا ، اور شناسا و غیر شناسا سب کو سلام کرنا ۔

احکام ایمان اور بیعت ایمان

۵ - ایمان کے بعض تقاضے :

(ابوبکرہ رض) رفعه :..... ثلاث لا یغل علیهن قلب مسلم اخلاص العمل للہ ومناصحة ولاة الامر لزوم جماعة المسلمین فان دعوتهم تحیط من ورائهم ۔ (رزین)

.... تین چیزوں میں مسلمان خیانت نہیں کرتا ۔

(۱) اخلاص فی العمل میں

(۲) حکام وقت کی خیر خواہی میں

(۳) مسلمانوں سے مل کر رہنے میں ، کیونکہ ان سے کٹ کر رہنے والوں پر جماعت کی بد دعا کارگر ہو جاتی ہے ۔

۶۔ گناہ کرتے وقت ایمان جدا ہو جاتا ہے:

(ابو ھریرۃؓ) رفعہ: لا یزنی الزانی حین یزنی وھو مؤمن ولا یسرق السارق حین یسرق وھو مؤمن ولا یشرب الخمر حین یشربھا وھو مؤمن۔ (للستۃ الا مالکا)

زانی جب زنا کر رہا ہو، چور جب چوری کر رہا ہو، شرابی جب شراب پی رہا ہو، تو وہ اس وقت مومن نہیں ہوتا۔

۷۔ بدکاری کے وقت ایمان معلّق رہتا ہے:

(ابو ھریرۃؓ) رفعہ: اذا زنی الرجل خرج منہ الایمان وکان علیہ کالظلۃ فاذا اقلع رجع الیہ الایمان۔ (ابو داؤد)

ارتکاب زنا کے پورے وقت تک ایمان اُوپر لگ کر سایہ فگن رہتا ہے اور فارغ ہونے کے بعد پھر لوٹ آتا ہے۔

اعمال میں میانہ روی

۸۔ اچھی سیرت اور میانہ روی:

(ابن عباسؓ) رفعہ: ان الھدی الصالح والسّمت الصالح والاقتصاد جزء من اربعۃ وعشرین جزء من النبوۃ (ابوداؤد)

صالح سیرت، عمدہ طریقہ اور میانہ روی نبوت کے چوبیس اجزاء میں سے ایک خاص جز ہے۔

کتاب العلم

۹۔ عالم اور عابد کی فضیلتوں میں کیا تناسب ہے؟:

(ابوامامۃؓ) ذکر للنبی صلی اللہ علیہ وسلم

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ

رجلان عالم و عابد فقال فضل العالم علی العابد کفضلی علی ادناکم ان اللہ وملائکتہ و اھل السموات والارض حتی النملۃ فی جحرھا والحیتان فی البحر یصلّون علی معلّم الناس الخیر۔ (ترمذی)

عالم و عابد دونوں میں افضل کون ہے؟ فرمایا: جس طرح تم میں سے ادنیٰ آدمی پر میری فضیلت ہے، اسی طرح عابد پر عالم کو فضیلت ہے۔ خدا تعالیٰ، اس کے فرشتے اور ارض و سما کا ایک ایک فرد حتیٰ کہ چیونٹی بھی اپنے بل میں اور مچھلیاں بھی سمندر میں اس معلم کے لیے دُعا کرتی ہیں جو لوگوں کو خیر کی تعلیم دے۔

۱۰۔ فقیہ اور عابد کا فرق:

(ابن عباسؓ) رفعہ: فقیہ واحد اشدّ علی الشیطان من الف عابد۔ (ترمذی)

ایک فقیہ، شیطان پر سو عابدوں سے زیادہ بھاری ہے۔

۱۱۔ علم کے طفیل روزی:

(انسؓ) کان اخوان علی عھد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم احدھما یحترف والآخر یلزم رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم ویتعلم منہ فشکی المحترف اخاہ الی رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم فقال لعلک بہ ترزق۔

(ترمذی)

عہد نبوی (صلی اللہ علیہ وسلّم) میں دو بھائی تھے، ایک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے پاس علم حاصل کرتا، دوسرا دستکاری کرکے روٹی کماتا۔ دستکار نے اپنے بھائی کا شکوہ رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا۔ فرمایا: تمہیں اسی (طالب علم) کے صدقے میں روزی ملتی ہے۔

۱۲۔ جویانِ علم کا درجہ اور انبیاء کی میراث:

(ابو درداءؓ) من سلک طریقا یطلب بہ علما سلک بہ طریقا من طرق الجنۃ وان الملائکۃ لتضع اجنحتھا رضی لطالب العلم وانّ العالم لیستغفر لہ من فی السموٰت

حصولِ علم کے لیے سفر کرنا جنّت کی راہ طے کرنا ہے۔ جویانِ علم کی رضاجوئی کے لیے فرشتے اپنے پر بچھاتے ہیں۔ ارض و سما کا ایک ایک فرد حتیٰ کہ سمندر کی مچھلیاں بھی اس کی مغفرت کے لیے دست بدعا رہتی ہیں۔ عالم و عابد کی

ومن فی الارض والحیتان وجوف الماء و ان فضل العالم علی العابد کفضل القمر لیلۃ البدر علی سائر الکواکب وان العلماء ورثۃ الانبیاء وان الانبیاء لم یورثوا دینارًا ولا درھمًا ولکن ورثوا العلم فمن اخذہ اخذ بحظ وافر (ترمذی، ابوداؤد)

فضیلتوں کا فرق یہ ہے کہ عالم بدر کامل کی مانند ہے اور عابد ستاروں کی طرح ترکۂ انبیا علیہم السلام کے یہی اہل علم وارث ہیں نبیوں نے درہم و دینار کی کوئی میراث نہیں چھوڑی بلکہ میراث علم چھوڑی ہے۔ جس نے اسے حاصل کر لیا، اُس نے بہت کچھ لے لیا۔

۱۳- اہلِ علم کی اہانت منافقت ہے:

(ابو امامۃؓ) ثلاثۃ لا یستخف بھم الا منافق ذو الشیبۃ فی الاسلام و ذو العلم وامام مقسط (کبیر بضعف)

ان تین شخصوں کی توہین منافق ہی کر سکتا ہے: (۱) بوڑھا مسلمان آدمی۔ (۲) عالم (۳) اور امام عادل۔

۱۴- اہلِ علم نجوم ہدایت ہیں:

(انسؓ) مثل العالم فی الارض کمثل النجوم فی السماء یھتدی بھا فی ظلمات البر والبحر فاذا انطمست النجوم اوشك ان تضل الھداۃ۔ (احمد بضعف)

زمین پر عالم کی مثال فلک پر روشن ستاروں کی مانند ہے اور ستاروں کے ڈوب جانے پر ہدایت یافتوں کا گم ہوجانا بھی بہت ممکن ہے۔

۱۵- تعلیم کے اجر میں عمل کا اجر بھی شامل ہوجاتا ہے:

(معاذ بن انسؓ) رفعہ: من علم علما فلہ اجر من عمل بہ لا ینقص من اجر العامل۔ (رفن وینی)

جو شخص کسی کو کوئی تعلیم دے اور وہ اُس پر عمل کرے تو اُس عمل کا اسے بھی اجر ملے گا، بغیر اس کے کہ عمل کرنے والے کے اجر میں کوئی کمی آئے۔

۱۶- حصولِ علم میں لگے رہنا فرض ہے:

(ابو مسعودؓ) رفعہ: طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم۔ (کبیر)

ہر مسلمان پر علم حاصل کرنا واجب ہے

۱۷- الٰہی ارادہ خیر تفقہ فی الدین کی شکل میں:

(ابن عباسؓ) رفعه: من يرد الله به خيرًا يفقهه في الدين۔ (ترمذی، شیخین)

اللہ جل شانہ جس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے اُسے دین کی سمجھ عنایت فرما دیتا ہے۔

۱۸- حکمت مومن کی گمشدہ دولت ہے:

(ابو ہریرہؓ) رفعه: الكلمة الحكمة ضالة المؤمن فحيث وجدها فهو احق بها..... (ترمذی)

سخن حکیمانہ مومن ہی کی گم شدہ دولت ہے، جہاں بھی اس کا زیادہ حق دار وہی ہے۔

۱۹- علم کے ساتھ حکمت بھی ضروری ہے: (لقمان حکیم کی نصیحت):

(ابو امامہؓ) رفعه: ان لقمان قال لابنه يا بني عليك بمجالسة العلماء واستمع كلام الحكماء فان الله يحي القلب الميت بنور الحكمة كما يحي الارض الميتة بوابل المطر۔ (کبیر بضعف)

حضرت لقمان نے اپنے فرزند کو نصیحت فرمائی کہ: تم حلقۂ علما میں بیٹھا کرو اور حکما کی باتیں غور سے سنا کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ دلوں کو نور حکمت سے اسی طرح زندگی بخشتا ہے جس طرح موسلا دھار بارش سے مُردہ زمین کو۔!

۲۰- علم کی کنجوسی اور اس کی سزا:

(ابو ہریرہؓ) رفعه: من سئل علما يعلمه فكتمه الجم بلجام من نار۔ (ترمذی، ابو داؤد)

اگر عالم سے کوئی بات دریافت کی جائے جسے وہ جانتا ہو کر وہ اسے چھپالے تو قیامت کے دن اُسے آگ کی لگام چڑھائی جائے گی۔

۲۱- ہدایت کی قدر و قیمت:

(سہل بن سعدؓ) رفعه: والله لان يهدى بهداك رجل واحد خير لك من حمر النعم۔ (ابو داؤد)

بخدا! اگر تمھاری تبلیغ سے ایک شخص کو بھی ہدایت حاصل ہو جائے تو یہ تمھارے لیے سُرخ اُونٹوں سے بہتر ہے۔

علمی سوال و جواب کے آداب

۲۲۔ مواعظ میں سامعین کی اکتاہٹ کا خیال رکھنا:

(شقیق) کان عبد اللہ یذکر الناس فی کل خمیس فقال لہ رجل یا ابا عبد الرحمٰن لوددت انک ذکرتنا کل یوم قال اما انہ یمنعنی من ذلک انی اکرہ ان املکم وانی اتخولکم بموعظۃ کما کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یتخولنا بہا مخافۃ السآمۃ علینا۔ (شیخین و ترمذی)

عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ ہر جمعرات کو وعظ و نصیحت فرمایا کرتے تھے، ایک شخص نے آپ سے کہا کہ: اے ابو عبد الرحمٰن! میری تمنا تو یہ ہے کہ آپ ہر روز یہ جاری رکھیں۔ آپ نے جواب دیا کہ: مجھے اس سے جو چیز مانع ہے وہ یہ ہے کہ میں تم لوگوں کو اکتانا پسند نہیں کرتا۔ جس طرح حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم لوگوں کی اکتاہٹ کا لحاظ رکھتے ہوئے وعظ فرمایا کرتے تھے، اسی طرح میں بھی تم لوگوں کو وعظ و نصیحت کرتا ہوں۔

۲۳۔ فقیہ کے اوصاف، غور و فکر کی غیر معمولی اہمیت:

(علیؓ) قال ان الفقیہ حق الفقیہ من لم یقنط الناس من رحمۃ اللہ ولا یؤمنھم من عذاب اللہ ولا یرخص لھم فی معاصی اللہ انہ لا خیر فی عبادۃ لا علم فیھا ولا خیر فی علم لا فھم فیہ ولا خیر فی قراءۃ لا تدبر فیھا۔ (دارمی)

فقیہ کامل وہ شخص ہے جس کا زور نفاہت لوگوں کو رحمتِ الٰہی سے مایوس نہ کر دے اور عذابِ خداوندی سے بے خوف نہ کر دے اور ان میں گناہ کے لیے ڈھیل نہ پیدا ہونے دے۔ جس عبادت میں علم شامل نہ ہو اس میں کوئی خیر نہیں اور جس علم میں فہم نہ ہو، اس میں بھی اور جس قراءت میں تدبر (غور و فکر) نہ ہو، اس میں بھی کوئی خیر نہیں۔

۲۴۔ گفتگو میں موقع و محل کی ضروری رعایت اور علم کا حق:

(کثیر بن مرۃ) قال لا تحدث الباطل للحکماء فیمقتوک ولا تحدث الحکمۃ

داناؤں کے سامنے بے سر و پا بات نہ کرو، ورنہ وہ خفا ہو جائیں گے! کم عقل سے اونچی باتیں نہ کرو، ورنہ وہ

للسفهاء فیکذبوک ولا تمنع العلم اهله فتأثم ولا تضعه فی غیر اهله فتجهل إن علیك فی علمك حقا کما ان علیك فی مالك حقا (دارمی)

تمھاری تکذیب کرے گا۔ علم کے اہل کو علم سے محروم نہ رکھو، یہ معصیت ہے۔ نااہل سے علمی گفتگو نہ کرو۔ ورنہ وہ تمھی کو جاہل کہے گا۔ علم ہو یا دولت تم پر دونوں کے کچھ حقوق ہیں۔

۲۵۔ کلام بے محل :

(ابن مسعودؓ) قال ما انت بمحدث قوما حدیثا لا تبلغه عقولھم الا کان لبعضھم فتنة۔ (مسلم)

جب تم لوگوں کے سامنے ایسی گفتگو کرو گے، جو ان کی عقل کی رسائی سے باہر ہو، تو وہ کچھ لوگوں کے لیے فتنہ بن جائے گی۔

۲۶۔ دو قسم کے حریص :

(ابن مسعودؓ) رفعه : منھومان لا یشبعان طالب علم وطالب دنیا۔ (کبیر بضعف)

دو حریص قانع نہیں ہو سکتے : (۱) حریص علم اور (۲) حریص دنیا۔

۲۷۔ حقوق علم کی ادائیگی کی نصیحت کرنا :

(ابن عباسؓ) رفعه : ناصحوا فی العلم فان خیانة احدکم فی علمه اشد من خیانته فی ماله وان الله سائلکم یوم القیامة۔ (کبیر بضعف)

حقوق علم ادا کرنے کی ایک دوسرے کو نصیحت کرتے رہو۔ مال کی خیانت سے علم کی خیانت زیادہ معیوب ہے۔ حشر میں اللہ تعالیٰ اس کا بھی حساب لے گا۔

۲۸۔ تعلّم کا غلط ترین مصرف :

(کعبؓ بن مالک) رفعه : مَنْ طلب العلم لیجاری به العلماء اولیماری به السفھاء ولیصرف به وجوه الناس الیه ادخله الله النار۔ (ترمذی)

جو شخص اس لیے علم پڑھتا ہے کہ علماء کا مقابلہ اور جہلاء سے مناظرہ کر کے عوام کو اپنی طرف مائل کرے۔ اسے اللہ تعالیٰ دوزخ میں ڈالے گا۔

۲۹۔ معلّم بے عمل کی لطیف مثال:

(جندل رضؓ) رفعہ: مثل الذی یعلم الناس الخیر وینسی نفسہ کمثل السراج یضئ للناس و یحرق نفسہ۔ (کبیر، مطولا)

جو شخص دوسروں کو نیکی کی تعلیم دے اور خود اس پہ عمل نہ کرے، اس کی مثال چراغ کی سی ہے کہ اوروں کو روشنی دے اور خود کو جلاتا رہے۔

۳۰۔ لغو مسائل کی تحقیق:

(ابو ھریرۃؓ) رفعہ: شرار الناس الذین یسألون عن شرار المسائل کی یغلطوا بھا العلماء۔ (رزین)

بدترین وہ لوگ ہیں جو شرانگیز مسائل پوچھ پوچھ کر علماء کو مغالطے میں ڈالتے ہیں۔

۳۱۔ صاف اور سیدھی بات:

(ثعلبۃ الخشنی) رفعہ: ان اللہ فرض فرائض فلا تضیعوھا وحد حدودا فلا تعتدوھا وحرم اشیاء فلا تقربوھا وترک اشیاء من غیر نسیان فلا تبحثوھا (رزین)

اللہ تعالیٰ نے کچھ مسائل مقرر فرماتے ہیں، ان کو ضائع مت کرو اور کچھ حدیں معین کی ہیں، ان سے تجاوز نہ کرو۔ کچھ چیزیں حرام کی ہیں ان کے قریب بھی نہ جاؤ اور کچھ چیزوں کو جان بوجھ کر ترک کر دیا ہے اُن سے بحث نہ کرو۔

روایت و کتابتِ حدیث

۳۲۔ جیسا سُنا جائے ویسا ہی بیان کیا جائے:

(ابن مسعود) رفعہ: نضر اللہ امرأ سمع منا شیئا فبلغہ کما سمعہ فرب مبلغ اوعی من سامع (ترمذی)

اللہ تعالیٰ اس شخص کو خوش رکھے جس نے ہم سے کوئی بات سُن کر اسی طرح دوسروں سے بیان کی بعض سُننے والے باتوں کو سُنانے والوں سے زیادہ محفوظ رکھتے ہیں۔

۳۳ تعلیمِ دین عام نہ کرنے پر تہدید :

(عبد الرحمٰن بن ابزی) خطب النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم ذات یوم فاثنی علی طوائف من المسلمین خیرا ثم قال مابال اقوام لایفقھون جیرانھم ولا یعلمونھم ولا یعظونھم ولا یأمرونھم ولا ینھونھم ومابال اقوام لایتعلمون من جیرانھم ولا یتفقھون ولا یتعظون واللّٰہ لیعلمن قوم جیرانھم ولیفقھونھم ولیعظونھم ولیأمرونھم ولینھونھم ولیتعلمن قوم من جیرانھم ویتفقھون ویتعظون اولاعاجلنھم العقوبۃ ۔ (کبیر بلبن)

ایک خطبہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے مختلف طبقوں کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا : لوگوں پر کیسی غفلت طاری ہے کہ وہ ہمسایوں کو نہ فقہ سکھاتے ہیں نہ علم، نہ انہیں نصیحت کرتے ہیں نہ امر و نہی ۔ پھر ان لوگوں کا کیا عجیب حال ہے جو اپنے پڑوسیوں سے نہ فقہ سیکھتے ہیں، نہ علم، نہ نصیحت حاصل کرتے ہیں ۔ بخدا اس طرح کے (باہم تعلق رکھنے والے) لوگوں کو چاہیئے کہ وہ اپنے پڑوسیوں کو علم و فقہ سکھائیں ۔ وعظ و نصیحت کریں اور امر و نہی کا فریضہ ادا کریں اور (جو اس کام کے اہل ہوں) ان کو چاہیئے کہ اپنے پڑوسیوں سے علم و فقہ اور پند حاصل کریں، ورنہ میں دار و گیر سے اس کا علاج کروں گا ۔

۳۴ ۔ علم کس طرح اُٹھ جاتا ہے؟ :

(ابن عمرو بن العاص) ان اللّٰہ لاینتزع العلم انتزاعا ینتزعہ من الناس ولکن ینتزع العلم بقبض العلماء حتی اذا لم یبق اتخذ الناس رؤسا جہالا فسئلوا فافتوا بغیر علم فضلوا واضلوا ۔ (شیخین و ترمذی)

اللہ تعالیٰ سینوں میں سے یُوں علم ختم نہیں فرماتا بلکہ علماء کی موت سے اُسے ختم کرتا ہے ۔ جب کوئی عالم باقی نہیں رہتا تو لوگ ناخواندہ رہنماؤں سے مسئلہ دریافت کرتے ہیں اور وہ علم کے بغیر فتویٰ دیتے ہیں ۔ وہ خود تو گمراہ تھے ہی اوروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں ۔

۳۵ ۔ اہل علم کی موت :

(عائشۃ) رفعتہ : موت العالم ثلمۃ

عالم کی موت قصر اسلام میں ایسی دراڑ ہے ، جو

فی الاسلام لا تنسد ما اختلف الليل والنهار ۔ (بزار) | قیامت تک نہیں بھر سکتی ۔

جھوٹی روایت سے احتراز اور سچی کو جھٹلانا

۳۶۔ جھوٹی حدیثیں بیان کرنا :

(المغیرۃ رضی اللہ عنہ) رفعہ : ان کذبا علیّ لیس ککذب علی احد فمن کذب علیّ متعمدا فلیتبوأ مقعدہ من النار ۔ (شیخین و ترمذی)

میری طرف جھوٹی نسبت ایسی معمولی چیز نہیں جیسی دوسروں کی طرف ہوتی ہے ۔ جو شخص عمداً جھوٹی بات میری طرف منسوب کرے وہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں بنا لے ۔

کتاب طہارت و پاکیزگی

نجاست

۳۷۔ ایک نازیبا حرکت کی اصلاح :

(ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ) ان الاعرابی لما دخل صلی رکعتین ثم قال اللھم ارحمنی ومحمدا ولا ترحم معنا احدا فقال صلی اللہ علیہ وسلم لقد تحجرت واسعا ثم لم یلبث ان بال فی ناحیۃ المسجد فاسرع الیہ الناس فنھاھم صلی اللہ علیہ وسلم و قال انما بعثتم میسرین ولم تبعثوا معسرین صبوا علیہ سجلا من ماء ۔ (ابو داؤد)

ایک اعرابی مسجد نبویؐ میں آیا اور دو رکعت نماز ادا کر کے دعا میں کہا : اللھم ارحمنی ومحمدًا ولا ترحم معنا احدًا ۔ صرف مجھ پر اور حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر رحم فرما اور کسی پر نہیں !) حضورؐ نے فرمایا کہ : تم نے ایک بڑی وسیع حقیقت کو تنگ کر دیا ۔ کچھ دیر بعد ہی وہ اعرابی اٹھا اور مسجد کے ایک کونے میں بیٹھ کر پیشاب کر دیا ۔ لوگ اُدھر دوڑے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں یہ فرما کر ہٹا دیا کہ تم نرمی کے لیے ہو نہ کہ سختی کرنے کو ؛ اس جگہ پر پانی کا ایک ڈول انڈیل دو ۔

وضو اور اُس کے متعلّقات

۳۸ - اکل و شرب سے پہلے ہاتھ دھو لینا :

(عائشہؓ) اذا اراد ان یأکل اویشرب غسل یدیہ ثم یأکل اویشرب۔ (مالک)

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم جب کھانے پینے کا ارادہ کرتے پہلے ہاتھ دھوتے پھر کھاتے پیتے۔

مسجد

۳۹ - تفرّد و تفرّق کا انجام کیا ہوتا ہے؟ :

(معاذؓ) رفعہ : ان الشیطان ذئب الانسان کذئب الغنم یأخذ الشاۃ القاصیۃ والناحیۃ فایاکم و الشعاب وعلیکم بالجماعۃ والعامۃ والمسجد۔ (احمد)

انسان کا بھیڑیا شیطان ہے۔ جو بکری ریوڑ سے الگ ہوئی اُسے بھیڑیا اُچک لیتا ہے (مسلمانو! جماعت عامہ سے کٹ جانے سے بچو! جماعت اور عوام اور مسجد سے وابستہ رہو۔

استقبال قبلہ

۴۰ - حرام کمائی کے کپڑوں میں نماز، لباس اور امانت کی اہمیت :

(علیؓ) ان رجلا من اھل العالیۃ قال یارسول اللہ خبرنی باشد شئ فی ھذا الدین والینہ فقال الینہ

...... اہل عالیہ میں سے ایک شخص نے پوچھا کہ : یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اس دین میں سب سے زیادہ سخت اور سب سے زیادہ نرم جو چیز ہے وہ بتائیے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم

شهادة ان لآ اله الا الله و ان محمدًا عبده و رسوله و اشده یا اخا العالیة الامانة انه لا دین لمن لا امانة له ولا صلوٰة له ولا زکوٰة له یا اخا العالیة انه من اصاب مالا من حرام فلبس جلبابًا لم تقبل صلوته حتی ینحی ذلک الجلباب عنه ان الله اکرم واجل یا اخا العالیة من ان یقبل عمل رجل او صلاته وعلیه الجلباب من حرام۔ (بزار بضعف)

نے فرمایا کہ: سب سے زیادہ نرم تو یہ گواہی دینا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے بندے اور رسول ہیں اور سب سے زیادہ سخت امانت کا معاملہ ہے جس شخص میں امانت نہیں، اس کا نہ دین ہے، نہ نماز، نہ زکوٰۃ۔ اے برادرِ عالیہ! جو مالِ حرام کی کمائی کی چادر اوڑھ کر نماز ادا کرے اس کی نماز اس وقت تک قبول نہ ہوگی، جب تک اُسے الگ نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ اس سے بہت بلند و بالا ہے کہ کسی کا کوئی عمل یا اس کی نماز اس حالت میں قبول کرے کہ اس کے اُوپر حرام کی چادر موجود ہو۔

کتاب الجنائز

امراض میں رحمت

۴۱۔ مومن کی ہر تکلیف کفّارہ گناہ ہے:

(ابوسعیدؓ وابوھریرۃؓ) رفعاہ: ما یصیب المؤمن من وصب ولا نصب ولا سقم ولا حزن حتی الھم یھمه الا کفر الله به سیاٰته۔ (شیخین، ترمذی)

مومن کی کوئی تکلیف، کوئی تھکی، کوئی بیماری، کوئی غم، حتیٰ کہ کوئی فکر مند کرنے والی چیز بھی ایسی نہیں، جسے اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کا کفّارہ نہ بنا دیتا ہو۔

۴۲۔ بخار کے فائدے:

(جابرؓ) ان رسول الله صلی الله علیه وسلم دخل علی ام السائب او علی ام المسیب فقال مالکِ تزفزفین؟

حضور صلی اللہ علیہ وسلم، ام سائب یا ام مسیب کے پاس تشریف لے گئے تو فرمایا کہ: تم کپکپا کیوں رہی ہو؟ عرض کیا، کہ بخار ہے،

قالت الحمی لا بارک اللہ فیہا فقال لا تسبی الحمی فانہا تذھب خطایا بنی آدم کما یذھب الکیر خبث الحدید (مسلم)

خدا اُس کا ناس کرے۔ فرمایا: بخار کو کوسا نہ کرو یہ تو انسان کی لغزشوں کو اس طرح دُور کر دیتا ہے جس طرح بھٹی لوہے کے میل کچیل کو۔

۴۳ - سُرخ رُو ہوتا ہے انسان آفتیں پانے کے بعد:

(یحییٰ بن سعیدؓ) ان رجلا جاءہ الموت فی زمن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال رجل ھنیئا لہ مات ولم یبتل بمرض فقال صلی اللہ علیہ وسلم ویحک ما یدریک لو ان اللہ ابتلاہ بمرض فکفر عنہ من سیئاتہ۔ (مالک)

ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں مرگیا۔ کسی نے کہا کہ بڑا مبارک ہے کہ اسے مرض کی کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: تمھیں کیا معلوم کہ: خدا اسے کسی مرض میں مبتلا کرتا تو وہ اُس کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتا۔

تراویح

۴۴ - آزمائش میں اللہ کا ایک خاص مقصد:

(عمروؓ بن مرۃؓ) قال ان مما انزل اللہ تعالیٰ ان اللہ لیبتلی العبد وھو یحب یسمع تضرعہ۔ (اوسط، بلبن)

خداوند تعالیٰ کی نازل کردہ باتوں میں ایک یہ بھی ہے کہ: اللہ تعالیٰ بندے کو بعض اوقات مبتلائے مصیبت اس لیے کرتا ہے کہ وہ اس کے تضرع وزاری کو سننا پسند فرماتا ہے۔

۴۵ - چھوٹی سے چھوٹی تکلیف بھی باعث اجر ہے:

(عائشہؓ) رفعتہ: لا یصیب المؤمن شوکۃ فما فوقہا الا رفعہ اللہ

مومن کو ایک کانٹا وغیرہ بھی چبھے تو اللہ تعالیٰ اس کے عوض اس کا ایک درجہ بلند کر

بها درجة وحط عنه بها خطيئة (شیخین، موطا، ترمذی، اوسط صغیر)

دیتا ہے اور اس کی ایک خطا معاف فرما دیتا ہے۔

۴۶ - اہلِ آزمائش کا غیر معمولی درجہ:

(ابن عباسؓ) رفعه: يؤتى بالشهيد يوم القيامة فينصب للحساب ثم يؤتى بالمتصدق فينصب للحساب ثم يؤتى باهل البلاء فلا ينصب لهم ميزان ولا ينصب لهم ديوان فيصب عليهم الاجر صبًا حتى ان اهل العافية ليتمنون في الموقف ان اجسادهم قرضت بالمقاريض من حسن ثواب الله لهم (کبیر بلین)

شہید (قیامت میں) حاضر کیا جائے گا، تو حساب کتاب کے لئے پیش کیا جائے گا، پھر صدقہ دینے والا پیش ہوگا، تو وہ بھی حساب کتاب کے لیے پیش کیا جائے گا۔ پھر اہلِ بلا وامتحان پیش ہوں گے تو ان کے لیے نہ کوئی میزان نصب ہوگی نہ کوئی رجسٹر پیش ہوگا، بلکہ ان پر اجر و ثواب کی ایسی بارش ہوگی کہ اہلِ عافیت اس مقام پر تمنا کرنے لگیں گے کہ کاش اس ثواب کی خاطر ہمارے جسموں کو مقراض سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جاتا۔

(عن الحسنؓ بن علیؓ) رفعه، وفي آخره: انما يوفى الصابرون اجرهم بغير حساب (کبیر، بلین بضعف)

اس مضمون کی روایت کے آخر میں حسنؓ بن علیؓ سے یہ آیت بھی منقول ہے: (ترجمہ) صبر کرنے والوں کو بے حساب و شمار اجر عطا کیا جائے گا۔

تقدیر و تدبیر

۴۷ - اولاد کے مرنے پر حمد و ارجاع کا اجر:

(ابو موسیٰؓ) رفعه: اذا مات ولد لعبد قال الله تعالى لملئكته قبضتم ولد عبدي

جب کسی نیک بندے کی اولاد مرجاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے ملائکہ سے فرماتا ہے کہ: تم نے میرے بندے کی اولاد کی روح قبض کرلی؟ وہ

فیقولون نعم فیقول قبضتم ثمرۃ فؤادہ؟ فیقولون نعم فیقول ماذا قال عبدی؟ فیقولون حمدک واسترجع فیقول ابنوا لعبدی بیتا فی الجنۃ وسموہ بیت الحمد (ترمذی)

عرض کرتے ہیں، ہاں بارالہا۔ پھر فرماتا ہے کہ تم نے اس کے دل کی کلی توڑ لی؟ وہ کہتے ہیں: ہاں خداوندا! پھر فرماتا ہے: کہ اس بندے نے کیا کہا: وہ عرض کرتے ہیں کہ: اس بندے نے تیری حمد (شکر) ادا کی اور انا للہ الخ کہا۔ پھر وہ حکم دیتا ہے کہ میرے اس بندے کے لیے جنّت میں ایک مکان بناؤ اور اس کا نام "بیت الحمد" رکھو۔

۴۸۔ دختر کے مرنے پر صبر کا اجر و انعام:

(ابوھریرۃؓ) رفعہ: یقول اللہ تعالٰی من اذھبت حبیبتہ فصبر و احتسب لم ارض لہ ثوابا دون الجنۃ۔ (بخاری)

اللہ تعالٰی کہتا ہے کہ جس کی چہیتی (دختر وغیرہ) مر جائے اور وہ حصول ثواب کے لیے صبر کرے تو میں اس کے معاوضے کے لیے جنّت سے کم کسی چیز پر راضی نہ ہوں گا۔

۴۹۔ گزشتہ اُمتوں کی بعض سخت آزمائشیں اور اہلِ اسلام کے لیے خوشخبری:

(خبابؓ بن الارت) شکونا الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال قد کان من قبلکم یؤخذ الرجل فیحفر لہ فی الارض فیجعل فیھا ثم یؤتی بالمیشار فیوضع علی رأسہ فیجعل نصفین و یمشط بامشاط الحدید مادون لحمہ وعظمہ مایصدہ ذلک عن دینہ واللہ لیتمن اللہ ھذا الامر حتی یسیر

(خباب بن ارتؓ نے اپنی کچھ تکلیف بیان کی تو) حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: تم سے پہلی اُمتوں میں بعض لوگوں کو پکڑا جاتا اور زمین میں گڑھا کھود کر اس میں ان کو گاڑ دیا جاتا تھا اور ان کے سر پر آرا رکھ کر دو حصّوں میں چیر دیا جاتا تھا اور لوہے کے کنگھے اُن پر اس طرح پھیرے جاتے تھے کہ ہڈی سے گوشت الگ ہو جاتا تھا، پھر بھی یہ اذیتیں ان کو ان کے دین سے نہیں پھیر سکتی تھیں۔ بخدا اللہ تعالٰی اپنے دین کو پورا کرکے رہے گا۔ تاآنکہ ایک سوار صنعا سے

الراکب من صنعاء الی حضرموت لا یخاف الا اللّٰہ والذئب علی غنمہ ولکنکم تستعجلون۔ (بخاری، ابوداؤد، نسائی)

حضرموت تک اس طرح سفر کرے گا کہ اسے صرف اللہ تعالیٰ ہی کا خوف ہوگا، یا اسے اپنے گلّے کے متعلق بھیڑیئے کا خطرہ ہوگا۔ مگر تم لوگ ذرا جلد باز ہو۔

۵۰۔ صبر کا ایک خاص انداز اور اُس کا اجر:

(ابن عباسؓ) رفعہ: من اصیب بمصیبۃ فی مالہ او فی نفسہ فکتمھا ولم یشکھا الی الناس کان حقا علی اللّٰہ ان یغفرلہ۔ (اوسط)

جسے کوئی مالی یا جانی نقصان پہنچے اور وہ اسے پوشیدہ رکھے، یعنی لوگوں سے اس کی شکایت نہ کرے تو اللہ تعالیٰ پہ یہ حق ہوجاتا ہے کہ وہ اس کی مغفرت فرمائے۔

۵۱۔ جلوت کی زندگی خلوت کی زندگی سے بہتر ہے:

(یحییٰ بن وثابؒ) عن شیخ من الصحابۃ رفعہ: المسلم الذی یخالط الناس ویصبر علی اذاھم خیر من الذی لا یخالط الناس ولا یصبر علی اذاھم۔ (ترمذی)

وہ مسلمان جو لوگوں سے گھل مل کر رہے اور ان کی اذیتوں پہ صبر کرتا رہے، اس سے بہتر ہے جو لوگوں سے کٹا ہوا رہے، اور ان کی اذیتوں پہ صبر نہ کرے۔

۵۲۔ موت کی تمنّا کرنا:

(انسؓ) رفعہ: لا یتمنّین احدکم الموت من ضر اصابہ فان کان لابدّ فاعلاً فلیقل اللّٰھم احینی ما کانت الحیاۃ خیراً لی وتوفنی اذا کانت الوفاۃ خیراً لی (للثلثۃ الا مالکا)

کوئی مصیبت آجانے کی وجہ سے کوئی موت کی تمنا نہ کرے اگر یہ (تمنائے موت) کرنا ہی پڑے تو یوں دُعا کرے کہ: اے اللہ! اگر میرے لیے حیات بہتر ہے تو مجھے زندہ رکھ اور اگر موت بہتر ہے تو موت دے۔

۵۳۔ ایضاً:

(ابوھریرۃؓ) رفعہ: لا یتمنّین احدکم

تم میں سے کوئی شخص موت کی تمنا نہ کرے ممکن

الموت اما محسنًا فلعله یزداد واما مسیئًا فلعله یستعتب۔ (شیخین، نسائی)

۔۔۔ ہے وہ نیکوکار ہو اور زندگی سے) اس کی نیکی میں اور اضافہ ہو یا وہ بدکار ہو تو (توبہ کا موقع پانے کی وجہ سے) وہ مستحق عتاب ہو۔

عیادت مریض

۵۴۔ عیادت مریض کا اجر:

(علیؓ) قال مامن رجل یعود مریضًا ممسیا الا خرج معہ سبعون الف ملک یستغفرون لہ حتی یصبح وکان لہ خریف فی الجنۃ ومن اتاہ مصبحا خرج معہ سبعون الف ملک یستغفرون لہ حتی یمسی وکان لہ خریف فی الجنۃ (ابوداؤد، ترمذی نحوہ مرفوعاً)

جو شخص بھی شام کو کسی مریض کی عیادت کرتا ہے، اُس کے لیے ستّر ہزار فرشتے صبح تک دُعائے مغفرت کرتے رہتے ہیں اور اس کے لیے جنّت میں ایک نخلستان تیار ہو جاتا ہے اور جو صبح ایسا کرے اُس کے لیے ستّر ہزار فرشتے شام تک دُعائے مغفرت کرتے رہتے ہیں۔ اور جنّت میں اُس کے لیے ایک نخلستان مہیّا ہو جاتا ہے۔

۵۵۔ معمولی امراض میں عیادت ضروری نہیں:

(ابوھریرۃؓ) رفعہ: ثلاث لا یعاد صاحب الرمد وصاحب الضرس وصاحب الدملۃ (اوسط بضعف)

تین قسم کے مریضوں کی عیادت چنداں ضروری نہیں جس کی آنکھ آگئی ہو یا جس کے دانت میں درد ہو یا جسے پھنسی نکل آئی ہو (یعنی معمولی قسم کی تکلیف میں عیادت ضروری نہیں)

۵۶۔ مریض کو تسکین و تسلّی دینا چاہیئے:

(ابوسعیدؓ) رفعہ: اذا دخلتم علی مریض فنفّسوا لہ فی اجلہ فان ذلک یطیب نفسہ۔ (ترمذی)

جب تم کسی مریض کے پاس جاؤ تو اُسے تسلّی دے کر غم کو دُور کرو، اس سے اس کے دل کو راحت ہوتی ہے۔

۵۷ - مریض پر بار نہ ہونا چاہیے :

(ابن عباس رض) قال من السنة تخفيف الجلوس وقلة الصخب في العيادة عند المريض قال وقال النبي صلى الله عليه وسلم لما كثر لغطهم واختلافهم قوموا عني - (رزین)

مریض کی عیادت کے وقت کم نشینی بھی سنت ہے۔ اور شور کم کرنا بھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک بار جب شور اور اختلافی گفتگو زیادہ ہوئی تو فرمایا کہ: بھئی! میرے پاس سے ہٹ جاؤ۔

۵۸ - بندوں کا اتصال خدا سے :

(ابو هريرة رض) رفعه: ان الله تعالىٰ يقول يوم القيمة يا ابن آدم مرضت فلم تعدني قال يا رب كيف اعودك وانت ربّ العلمين؟ قال اما علمت ان عبدي فلانا مرض فلم تعده اما علمت انك لو عدته لوجدتني عنده يا ابن آدم استطعمتك فلم تطعمني قال يا رب كيف اطعمك وانت ربّ العلمين؟ قال اما علمت انه استطعمك عبدي فلم تطعمه اما علمت انك لو اطعمته لوجدت ذلك عندي يا ابن آدم استسقيتك فلم تسقني قال يا رب كيف اسقيك وانت ربّ العلمين؟ قال استسقاك عبدي فلان فلم تسقه اما انك لو سقيته لوجدت ذلك عندي۔ (مسلم)

اللہ تعالیٰ بروزِ قیامت پوچھے گا کہ: اے فرزندِ آدم! میں بیمار رہا اور تو نے میری عیادت بھی نہ کی، وہ کہے گا کہ: تو رب العالمین ہے (یعنی تو کبھی بیمار نہیں ہوتا) میں تیری کس طرح عیادت کرتا؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ: تجھے یاد نہیں کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہوا، اور تو نے اس کی عیادت نہ کی۔ تجھے نہیں معلوم کہ اگر تو اس کی عیادت کرتا تو تو مجھے اس کے پاس ہی پاتا۔ اے فرزندِ آدمؑ! میں نے تجھ سے کھانا مانگا اور تو نے مجھے نہیں کھلایا۔ وہ کہے گا کہ: تو ربّ العلمین ہے (کھانا نہیں کھاتا) پھر میں تجھے کھانا کیا کھلاتا؟ فرمائے گا کہ: تجھے یاد نہیں کہ میرے ایک بندے نے تجھ سے کھانا مانگا اور تو نے اسے نہیں کھلایا، تجھے علم نہیں کہ اگر تو اسے کھلا دیتا تو اسے تو میرے پاس ہی پاتا۔ اے فرزندِ آدمؑ! میں نے تجھ سے پانی مانگا اور تو نے مجھے نہیں پلایا۔ وہ کہے گا کہ: تو رب العالمین ہے (پانی نہیں پیتا) تجھے کس طرح پلاتا؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ: میرے فلاں بندے نے تجھ سے پانی مانگا اور تو نے اسے نہیں پلایا۔ اگر تو اسے پانی پلا دیتا تو اسے تو میرے پاس ہی پاتا۔

۵۹ ۔ مریض کی خواہش طعام کی اپیل :

(ابن عباسؓ) ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم عاد رجلا قال ما تشتھی؟ قال اشتھی خبز بر قال صلی اللہ علیہ وسلم من کان عندہ خبز بر فلیبعث الی اخیہ ثم قال اذا اشتھی مریض احدکم شیئا فلیطعمہ ۔ (ترمذی بلین)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کی عیادت فرمائی اور پوچھا کہ : تمھیں کس چیز کی اشتہا ہے ؟ کہا : نان گندم کی ۔ فرمایا کہ جس کے پاس نان گندم ہو وہ اپنے اس بھائی کے پاس بھیج دے ۔ پھر فرمایا کہ : جب کوئی مریض کسی چیز کی اشتہا ظاہر کرے تو اُسے وہ چیز دو ۔

۶۰ ۔ مریض سے اپنے لیے دُعا کرانا چاہیئے :

(عمرؓ) رفعہ : اذا دخلت علی مریض فمرہ ان یدعو لک فان دعاءہ کدعاء الملائکۃ (قزوینی)

جب کسی مریض کے پاس جاؤ تو اُس سے اپنے لیے دُعا کی درخواست کرو ۔ کیونکہ اُس کی دُعا فرشتوں کی دُعا کی طرح (مقبول) ہوتی ہے ۔

موت

۶۱ ۔ خدا سے اچھی ہی اُمیدیں رکھنی چاہئیں :

(حیان ابو النضر)..... قال کیف ظنک بربک ؟ قال واشار برأسہ ای حسن قال ابشر فانی سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول قال اللہ تعالیٰ انا عند ظن عبدی بی فلیظن بی ما شاء ۔

(احمد، اوسط)

ابو الاسود جرشی کی وفات کے وقت واثلہ بن اسقع اور حیان ابو النضر عیادت کو گئے ۔ واثلہ نے پوچھا کہ : اللہ سے تمھیں کیا اُمیدیں ہیں ؟ ابو الاسود نے اپنے سر سے اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ : اچھی اُمیدیں ہیں ۔ واثلہ نے کہا کہ : مبارک ہو ہیں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ : اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ : میں اس گمان سے قریب ہوں جو میرا بندہ میرے متعلق رکھتا ہے ۔ لہٰذا وہ جیسا چاہے میرے ساتھ گمان رکھے ۔

گریہ و غم

۶۲ - زبان کا مقام کیا ہے ؟ :

(ابن عمرؓ) اشتکی سعد بن عبادہ فاتاہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعودہ مع عبد الرحمٰن بن عوف وسعد و ابن مسعود فلما دخل علیہ وجدہ فی غشیۃ فقال قد تقضی قالوا لا قال فبکی صلی اللہ علیہ وسلم فلما رأی القوم بکاءہ بکوا قال الا تسمعون ان اللہ لا یعذب بدمع العین ولا بحزن القلب ولکن یعذب بھذا واشار الی لسانہ او یرحم - (شیخین)

سعد بن عبادہؓ ایک بار بیمار ہوئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کی عیادت کو تشریف لے گئے۔ عبدالرحمٰنؓ بن عوفؓ اور سعدؓ بن مسعودؓ بھی ساتھ تھے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس پہنچے تو ان کو بحالت غشی پایا۔ پوچھا کہ: کیا قضا کر گئے ؟ لوگوں نے کہا کہ: نہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم روئے اور جب دوسروں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو روتے دیکھا تو وہ بھی رونے لگے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: کیا تم نے سنا نہیں کہ اللہ تعالیٰ آنکھ کے آنسوؤں یا دل کے غم کی وجہ سے عذاب نازل نہیں فرماتا بلکہ — زبان کی طرف اشارہ کرکے فرمایا: — اس کی وجہ سے عذاب کرتا ہے اور اسی کی وجہ سے رحم فرماتا ہے (یعنی اگر نوحہ کرے گا تو عذاب ہوگا اور صبر و شکر کرے گا تو رحمت ہوگی)۔

۶۳ - جاہلیت کا ماتم :

(ابن مسعودؓ) رفعہ: لیس منا من ضرب الخدود وشق الجیوب ودعی بدعوی الجاھلیۃ - (شیخین، ترمذی، نسائی)

میری جماعت سے وہ خارج ہے جو اپنے منہ پر تھپڑ مارے، گریبان چاک کرے اور جاہلیت کی رسم کو رائج کرے۔

۶۴ - ایضاً :

(امرأۃ من المبایعات) قالت کان

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بوقتِ بیعت جن معروف

فیما اخذ علینا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلّم فی المعروف الذی اخذ علینا ان لا نعصیہ فیہ وان لا نخمش وجھا ولا ندعوا ویلا ولا نشق جیبا ولا ننشر شعرًا ۔ (ابوداؤد)

باتوں کا ہم عورتوں سے عہد لیا تھا، ان میں یہ چیزیں بھی تھیں کہ: ہم معروف میں رسول اللّٰہ علیہ وسلّم کی نافرمانی نہ کریں گے اور منہ نہ نوچیں گے اور کوسنے نہ دیں گے ۔ (خلاصہ یہ کہ کسی غلط اور جاہلی طریق سے اظہار ماتم نہ کریں گے ۔)

۶۵۔ تین موقعوں پر خاموشی :

(زید بن ارقم) دفعہ: ان اللّٰہ یحب الصمت عند ثلاث عند تلاوۃ القرآن وعند الزحف وعند الجنازۃ۔ (للکبیر بوجل لم یسم۔)

تین مواقع پر اللّٰہ تعالیٰ خاموشی کو پسند فرماتا ہے۔
۱۔ بوقتِ تلاوتِ قرآن حکیم
۲۔ بوقتِ جنگ ——— اور
۳۔ بوقتِ جنازہ۔

نمازِ جنازہ

۶۶۔ حالات کے بدلنے سے احکامِ جنازہ میں تبدیلی :

(ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ) ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کان یؤتی بالرجل المتوفی علیہ الدین فیسأل ھل ترک لدینہ قضاء فان حدث انہ ترک وفاء و الا قال للمسلمین صلوا علی صاحبکم فلما فتح اللّٰہ علی رسولہ کان یصلی ولا یسأل عن الدین وکان یقول انا اولی بالمؤمنین من انفسھم فمن توفی من المؤمنین فترک دینًا او کلا او ضیاعا فعلیّ والیّ ومن ترک مالا فلورثتہ ۔ (شیخین، ترمذی، نسائی)

حضور صلی اللّٰہ علیہ وسلم کے پاس جب کوئی ایسا جنازہ آتا جس پر قرض ہوتا تو حضور صلی اللّٰہ علیہ وسلم دریافت فرماتے کہ کیا اس نے ادائے قرض کا کوئی بندوبست کیا ہے؟ اگر یہ بتا دیا جاتا کہ ہاں کیا ہے (تو نماز پڑھ لیتے) ورنہ عام مسلمانوں سے فرماتے کہ تم جاکر نماز جنازہ پڑھ لو لیکن جب مکہ فتح ہو گیا تو حضور صلی اللّٰہ علیہ وسلم قرض کے بارے میں کچھ سوال نہ فرماتے۔ بلکہ یہ فرماتے کہ: اہلِ ایمان کا سب سے قریب تر ولی میں ہوں، لہٰذا جو مسلمان قرض یا یتیم یا عیال چھوڑے اس کا ذمہ دار میں ہوں اور جو مال چھوڑے وہ اس کے وارثوں کا ہے۔

۶۷۔ جنازے کا حق کس طرح ادا ہو جاتا ہے؟:

(ابو هريرةؓ) من تبع جنازة وحملها ثلث مرات فقد قضى ما عليه من حقها۔ (ترمذی)

جو شخص کسی کے جنازے کے ساتھ چلے اور تین بار کندھا دے تو اس نے جنازے کا حق ادا کر دیا۔

مشایعت جنازہ

۶۸۔ شہادت علی الناس کا آغاز اسی دنیا سے ہوتا ہے:

(ابو هريرةؓ) مرّوا على رسول الله صلى الله عليه وسلم بجنازة فاثنوا عليها خيرا فقال وجبت ثم مروا بأخرى فاثنوا عليها شرا فقال وجبت ثم قال ان بعضكم لبعض شهداء۔ (ابو داؤد)

کچھ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب سے ایک جنازے کو لیے گزرے اور اس کی تعریفیں کیں۔ فرمایا کہ: اس کے لیے جنت واجب ہو گئی۔ پھر دوسرا جنازہ لے کر گزرے تو لوگوں نے اس کی بُرائی کی۔ فرمایا کہ: اس کے لیے دوزخ لازم ہو گئی۔ پھر فرمایا کہ: تم ہی آپس میں ایک دوسرے کے گواہ عمل ہو۔

۶۹۔ ہمسایوں کی گواہی کی اہمیت:

(ابو هريرةؓ) رفعه: ما من عبد مسلم يموت فيشهد له ثلاثة ابيات من جيرانه الادنين بخير الا قال الله تعالى قد قبلت شهادة عبادى على ما علموا وغفرت له ما اعلم۔

(احمد)

اگر کوئی مسلمان مر جائے اور اس کے قریب ترین پڑوسیوں میں تین گھرانے بھی اس کی نیکی کی گواہی دیں تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ: میرے بندے اپنے علم کے مطابق جس چیز کی گواہی دے رہے ہیں میں اسے قبول کرتا ہوں اور اس کی جو بُرائی میں جانتا ہوں، اُسے میں معاف کرتا ہوں۔

تعزیت

۷۰۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جامع تعزیت نامہ :

(معاذؓ) انه مات له ابن فكتب اليه النبي صلى الله عليه وسلم التعزية : بسم الله الرحمٰن الرحيم من محمد رسول الله الى معاذ بن جبل سلام عليك فانى احمد اليك الله الذى لا إله الا هو اما بعد فاعظم الله لك الاجر والهمك الصبر و رزقنا واياك الشكر فان انفسنا واموالنا واهلنا من مواهب الله الهنيئة وعواريه المستودعة متعك الله به فى غبطة وسرور وقبضه منك باجر كبير الصلوٰة والرحمة والهدى ان احتسبته فاصبر ولا يحبط جزعك اجرك فتندم واعلم ان الجزع لا يرد ميتا ولا يدفع حزنا وما هو نازل فكان قد والسلام .

(كبير، اوسط بضعف)

حضرت معاذؓ کے ایک فرزند کا انتقال ہوا، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں ایک تعزیت نامہ بھیجا جس کا مضمون یہ تھا (ترجمہ) : شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے ۔ یہ تعزیت نامہ ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے معاذؓ بن جبل کے نام ۔ تم پر سلامتی ہو۔ میں اس کی حمد کرتا ہوں جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں اما بعد اللہ تمھارے اجر کو اور زیادہ کرے ۔ اور ہمیں اور تمھیں شکر کی توفیق دے ۔ ہماری جانیں، ہمارے اموال اور ہمارے اہل و عیال سب کچھ اللہ کی خوش آئند بخششیں ہیں اور اس کی ودیعت کردہ عاریتیں ہیں تمھیں شگفتہ مسرت کے ساتھ اس سے سرفراز کرتا رہا۔ اور بڑے اجر کے عوض تم سے اُسے واپس لے لیا۔ یہ وہ اجر ہے صلوٰۃ رحمت اور ہدیٰ ہے۔ لہٰذا اگر تم اسے کار ثواب سمجھتے ہو تو صبر سے کام لو تمھاری بے صبری تمھارے اجر و ثواب کو ضائع کر کے تمھیں نادم نہ کرنے پائے۔ یہ سمجھ لو کہ بے صبری کا ماتم نہ مرے ہوئے کو واپس لا سکتا ہے نہ غم کو دور کر سکتا ہے اور ہونے والا حادثہ تو ہو کر ہی رہتا ہے ، والسلام !

۷۱۔ زیارت قبور کا مقصد آخرت کی یاد ہے :

(بریدہؓ) : قد كنت نهيتكم عن

میں نے تمھیں پہلے زیارت قبور سے روک دیا تھا،

زيارة القبور فزوروها فانها تذكركم الآخرة۔
(مسلم، اصحاب سنن)

(کیونکہ تم حدیث الاسلام تھے) (اب جب کہ توحید پختہ ہو چکی ہے) زیارت کر سکتے ہو۔ کیونکہ قبریں تمھیں آخرت کی یاد دلاتی ہیں۔

کتاب الزکوٰۃ

۷۲۔ منعِ زکوٰۃ ہلاکتِ مال کا سبب بن جاتا ہے:

(عمرؓ) رفعہ: ما تلف مال فی بر و بحر الا بحبس الزکوٰۃ (اوسط بضعف)

بحر و بر میں جو مال تلف ہوتا ہے وہ زکوٰۃ روک رکھنے کی وجہ سے ہوتا ہے۔

۷۳۔ منعِ زکوٰۃ قحط سالی کا بھی سبب ہوتا ہے:

(بریدۃ) رفعہ: ما منع قوم الزکوٰۃ الا ابتلاھم اللہ بالسنین)

جب لوگ زکوٰۃ ادا کرنا بند کر دیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ انھیں قحط سالی میں مبتلا کر دیتا ہے۔

عاملِ صدقہ کو ہدایات

۷۴۔ محصّلِ صدقہ کے لیے ضروری تنبیہ:

(ابن حمیدؓ الساعدی) استعمل النبی صلی اللہ علیہ وسلم رجلا من الازد یقال لہ ابن اللتبیۃ علی الصدقۃ فلما قدم قال ھذا لکم و ھذا اھدی الیّ فقام النبی صلی اللہ علیہ وسلم فحمد اللہ واثنی علیہ ثم قال اما بعد

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ازدی شخص کو عاملِ صدقہ مقرر فرمایا، جس کا نام ابن لُتبیہ تھا۔ جب وہ صدقات لے کر آیا تو بولا کہ: یہ تو ہے آپ لوگوں کے لیے اور یہ مجھے ہدیہ میں ملا ہے۔ یہ سن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو گئے اور حمد و ثنا کے بعد فرمایا کہ: میں اس اختیار سے جو مجھے اللہ نے دیا ہے، تم میں سے کسی کو عامل بناتا ہوں اور وہ آکر یہ

ما فی استعمل الرجل منکم علی العمل مما ولانی اللہ فیاتی فیقول هذا لکم وهذه هدیة اهدیت لی افلا جلس فی بیت ابیه وامه حتی تأتیه هدیته ان کان صادقاً واللہ لا یأخذ احد منکم شیئاً بغیر حقه الا لقی اللہ یحمله یوم القیٰمة فلا اعرفن احداً منکم لقی اللہ یحمل بعیراً له رغاء او بقرة لها خوار او شاة تیعر ثم رفع یدیه حتی رؤی بیاض ابطیه یقول اللّٰهم هل بلغت۔ (شیخین، ابوداؤد)

کہتا ہے کہ یہ آپ لوگوں کا ہے اور یہ مجھے ہدیہ میں ملا ہے۔ اگر وہ سچا ہے تو اپنے والدین کے گھر بیٹھ کر دیکھے کہ اس کے پاس ہدیہ آتا ہے یا نہیں۔ خدا کی قسم تم میں سے جو بھی ناحق کوئی چیز وصول کرے گا وہ اُسے قیامت میں اُٹھائے ہوئے خدا کے سامنے پیش ہوگا۔ میں وہاں تم میں سے کسی ایسے شخص کو نہیں پہچانوں گا، جو خدا کے سامنے بلبلاتا ہوا اُونٹ یا ڈکارتی ہوئی گائے یا چلاتی ہوئی بکری کو اُٹھائے ہوئے حاضر ہو۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ اتنے بلند کئے کہ بغلوں کی سفیدی نظر آ رہی تھی اور فرمایا کہ: الٰہی میں نے تیرا پیغام پہنچانے کا فرض ادا کر دیا ہے۔

۷۵۔ دیانتدار محصّل کی فضیلت:

(رافع بن خدیجؓ) رفعه: العامل فی الصدقة بالحق کالغازی فی سبیل اللہ حتی یرجع الی بیته۔ (ابوداؤد، ترمذی)

حصولِ صدقات کا سچائی سے کام کرنے والا گھر واپس آنے تک ایسا ہی ہے، جیسے راہِ خدا میں جہاد کرنے والا۔

۷۶۔ ادائے زکوٰۃ میں خُوش دلی کی دُعا کرو:

(ابوھریرۃؓ) رفعه: اذا اعطیتم الزکٰوة فلا تنسوا ثوابها ان تقولوا اللّٰهم اجعلها مغنما ولا تجعلها مغرما۔ (قزوینی، بضعف)

جب تم زکوٰۃ ادا کرو تو اُس کے ثواب کے پہلو کو نہ بھولو جو اس دُعا سے حاصل ہوتا ہے کہ: اے اللہ اسے مالِ غنیمت بنا (جس کے لینے میں خوشدلی ہوتی ہے) اور تاوان نہ بنا (جس کے دینے میں کڑھن ہوتی ہے)

زکوٰۃ کس کو دینا جائز نہیں

۷۷ ۔ غنی اور ہٹے کٹے کے لیے بھی زکوٰۃ لینا جائز نہیں :

(ابن عمروؓ بن العاص) رفعہ : لا تحل الصدقۃ لغنی ولا لذی مرۃ سوی ۔ (نسائی)

صدقے کا مال نہ غنی کے لیے جائز ہے اور نہ ہٹے کٹے آدمی کے لیے ۔

۷۸ ۔ صدقے کے استعمال میں حضرت عمرؓ کی احتیاط :

(زیدؓ بن اسلم) شرب عمر لبنا ما عجبه فسأل من این ھو؟ فاخبر انه من نعم الصدقۃ فادخل یدہ فاستقاءہ ۔ (مالک)

حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے ایک بار دودھ پیا تو انھیں خوب لطف آیا ۔ پوچھا : یہ دودھ کہاں سے آیا ہے ۔ کسی نے کہا صدقے کے جانور کا ہے ۔ آپؓ نے اپنی انگلیاں ڈال کر فوراً قے کر دی ۔

صدقات یا کارِ خیر

۷۹ ۔ مالِ طیّب کی زکوٰۃ کا فضل :

(ابو ھریرۃؓ) رفعه : ما تصدق احد بصدقۃ من طیّب ولا یقبل اللہ الا الطیب الا اخذھا الرحمٰن بیمینه وان کانت تمرۃ فتربو فی کف الرحمٰن حتی تکون اعظم من الجبل کما یربی احدکم فلوہ او فصیلة ۔ (للستۃ)

اللہ تعالیٰ پاک ہی چیزوں کا صدقہ قبول فرماتا ہے ۔ لہٰذا جو شخص پاک صدقہ دیتا ہے اسے اللہ تعالیٰ اپنے دائیں ہاتھ سے لیتا ہے خواہ وہ ایک چھوہارا ہی کیوں نہ ہو اور وہ خدا کے ہاتھ میں بڑھتے بڑھتے پہاڑ سے بھی بڑا ہو جاتا ہے ۔ اس کی بڑھنت ایسی ہی ہوتی ہے جیسے تم دودھ چھڑانے کے بعد اپنے بچھیرے کو (خوب کھلا پلا کر) بڑھا لیتے ہو ۔

۸۰۔ کپڑا پہنانے کا اجر :

(ابن عباسؓ) جاءہ سائل فقال له ابن عباس اتشهد ان لا اله الا الله وان محمدا رسول الله ؟ قال نعم قال وتصوم رمضان ؟ قال نعم قال سألت وللسائل حق انه يحق علينا ان نصلك فاعطاه ثوبا ثم قال سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول مامن مسلم يكسو مسلما ثوبا الا كان فی حفظ الله ما دام عليه منه خرقة ۔ (ترمذی)

عبداللہ بن عباسؓ کے پاس ایک سائل آیا۔ آپ نے پوچھا کہ : کیا کلمۂ شہادت (لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ) کے قائل ہو؟ کہا ہاں۔ پوچھا : رمضان کے روزے رکھتے ہو؟ کہا : ہاں! فرمایا : تم سائل ہو اور سائل کا حق ہوتا ہے۔ ہم پر تمہارے ساتھ حسنِ سلوک کرنا ضروری ہے۔ پھر آپ نے اُسے کپڑا دیا اور کہا کہ : میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ ایک مسلمان اگر کسی دوسرے مسلمان کو کپڑا پہنائے تو وہ پہنانے والا اس وقت تک حفاظت خداوندی میں رہتا ہے جب تک اُس کی ایک دھجی بھی اس کے جسم پر باقی ہے۔

۸۱۔ چند نیکیوں کی برکات :

(ابوامامةؓ) رفعه : صنائع المعروف تقى مصارع السوء وصدقة السر تطفئ غضب الرب وصلة الرحم تزيد فی العمر۔ (کبیر)

معروف کام کرنا بُری موت (یا آفات) سے بچاتا ہے اور پوشیدگی کا صدقہ اللہ تعالیٰ کے غضب کو ٹھنڈا کرتا ہے اور صلۂ رحمی سے عمر میں برکت ہوتی ہے۔

۸۲۔ سخی اور بخیل کا فرق :

(ابوهريرةؓ) رفعه : مامن يوم يصبح فيه العباد الا ملكان ينزلان يقول احدهما اللهم اعط منفقاً خلفاً ويقول الآخر اللهم اعط ممسكا تلفاً ۔

(شیخین)

ہر روز جب بندوں کی صبح ہوتی ہے، تو دو فرشتے نازل ہوتے ہیں۔ ایک یہ دُعا کرتا ہے کہ اے اللہ ہر انفاق کرنے والے کو اس کے انفاق کی جزا دے اور دوسرا کہتا ہے کہ اے اللہ ہر کنجوس پر بربادی نازل فرما۔

چند مستحقینِ زکوٰۃ

۸۳۔ بال بچوں پر خرچ کرنا سب سے بہتر خرچ ہے:

(ابو ھریرۃؓ) رفعه: دینار انفقته فی سبیل الله و دینار انفقته فی رقبة و دینار تصدقت به علی مسکین و دینار انفقته علی اھلک اعظمھا اجرا الذی انفقته علی اھلک (مسلم)

اپنی رقم تم اللہ کی راہ میں (جہاد میں) بھی صرف کرتے ہو اور قیدی کی آزادی میں بھی مسکین کو بھی دیتے ہو اور اپنے اہل و عیال کو بھی، ان سب مصارف میں سب سے بڑھ کر ثواب اس خرچ میں ہے، جو تم اپنے اہل و عیال پر کرتے ہو۔

۸۴۔ اپنے آپ کو کھلانا بھی صدقہ ہے:

(المقدام بن معدی کربؓ) رفعه: ما اطعمت نفسك فھو لك صدقة وما اطعمت ولدك فھو لك صدقة ما اطعمت زوجتك فھو لك صدقة وما اطعمت خادمك فھو لك صدقة۔ (احمد)

تم اپنے آپ کو کھلاؤ یا اپنی اولاد کو یا اپنی بیوی کو یا اپنے خادم کو، یہ سب کا سب صدقہ ہی ہے۔

۸۵۔ صدقے کے اوّل مستحق قرابت مند ہیں:

(ابو ھریرۃؓ) رفعه: والذی بعثنی بالحق لا یعذب الله یوم القیامة من رحم الیتیم و لان له فی الکلام و رحم یتمه و لم یتطاول علی جاره بفضل ما اتاه الله

قسم ہے اس ذات کی جس نے مجھے حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ بروزِ قیامت اس شخص پر عذاب نہیں کرے گا جس نے یتیم پر رحم کیا ہو، اس سے نرمی سے بات کی ہو، اس کی یتیمی اور کمزوری پر ترس کھایا ہو، نیز اپنے پڑوسی

یا امۃ محمد والذی بعثنی بالحق لا یقبل اللہ صدقۃ من رجل ولہ قرابۃ محتاجون الی صلتہ ویصرفھا الی غیرھم والذی نفسی بیدہ لا ینظر اللہ الیہ یوم القیٰمۃ۔

(اوسط۔ بلین)

پر اللہ کی زائد نعمتیں حاصل ہونے کی وجہ سے ظلم نہ کرے، اے اُمّتِ محمّدیہ! قسم ہے اُس ذات کی جس نے مجھے حق کے ساتھ بھیجا ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی شخص کا ایسا صدقہ قبول نہیں فرمائے گا کہ ادھر اس کے قرابت مند اس کی صلۂ رحمی کے محتاج ہوں اور ادھر وہ غیروں کو دیتا پھرے۔ قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، اللہ تعالیٰ ایسے شخص کی طرف قیامت کے دن رُخ بھی نہیں کرے گا۔

صدقے کا وسیع مفہوم

۸۶۔ کلمۂ خیر بھی صدقہ ہے:

(عدی رضؓ بن حاتم) رفعہ: اتقوا النار ولو بشق تمرۃ فان لم تجدوا فبکلمۃ طیبۃ۔ (شیخین، نسائی)

آگ سے بچنے کی کوشش کرو چاہے آدھا خرما ہی دے کر کرو، اور اگر یہ بھی میسّر نہ ہو تو اچھی بات کہہ کر ہی سہی۔

۸۷۔ مسکین کی جو مدد ہو سکے کرو:

(ام بجید رضؓ الانصاری) رفعتہ: ردوا المسکین ولو بظلف محرق (مالک، اصحاب سنن)

مسکین کو کچھ دے کر واپس کرو، خواہ ایک جلا ہوا پایہ ہی کیوں نہ ہو۔

۸۸۔ بہترین صدقہ اور اُس کا اوّل حق دار:

(ابو ھریرۃ رضؓ) قال یا رسول اللہ ای الصدقۃ افضل؟ قال جُھدُ المُقِلّ وابدأ بمن تعول۔

(ابو داؤد)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ بہترین صدقہ کون سا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: وہ جسے ایک تنگدست بمشقت عطا کرے، اور دیتے وقت ہمیشہ ابتدا اُن لوگوں سے کرو جن کی پرورش تمھارے ذمّہ ہے۔

۸۹ - اہم معاملات کے لئے بھی اذان و نماز ہوتی تھی -

رجابرؓ) اتی النبیؐ صلّی اللہ علیہ وسلّم قوم عراۃ مجتابی النمار و العباء متقلدی السیوف عامتھم من مُضر بل کلھم من مُضر فتمعر وجہ النبیؐ صلّی اللہ علیہ وسلّم لما رأی بھم من الفاقۃ فدخل ثم خرج فامر بلالا فنادی واقام فصلی ثم خطب فقال ایھا الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدۃ الی رقیبا والآیۃ التی فی الحشر اتقوا اللہ ولتنظر نفس ما قدمت لغد تصدق رجل من دینارہ من درھمہ من ثوبہ من صاع برہ من صاع تمرہ حتی قال ولو بشق تمرۃ فجاء الناس حتی رأیت کومین من طعام وثیاب حتی رأیت وجہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم یتھلل کانہ مدھنۃ فقال صلّی اللہ علیہ وسلّم من سن فی الاسلام سنۃ حسنۃ فلہ اجرھا و اجر من عمل بھا من بعدہ من غیر ان ینقص من اجورھم شئی ومن سن فی الاسلام سنۃ سیئۃ کان علیہ وزرھا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے پاس کچھ لوگ اس حالت میں آئے کہ ان کے پاس کافی کپڑے نہ تھے صرف مخطط صوف کے کُرتے اور عبائیں پہنے ہوئے اور تلواریں پہلو میں لٹکائے ہوئے تھے۔ ان میں زیادہ تر بلکہ سب کے سب قبیلۂ مُضَر سے تعلق رکھنے والے تھے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم نے اُن پر فاقے کے اثرات دیکھے، تو چہرہ مبارک متغیر ہو گیا۔ پریشانی میں کبھی گھر کے اندر تشریف لے جاتے تھے کبھی باہر تشریف لے آتے تھے۔ آخر حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا۔ اُنھوں نے اذان دی، اقامت کہی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھنے کے بعد خطبہ ارشاد فرمایا اور یہ آیت رقیبا تک پڑھی: ایھا الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدۃ (ترجمہ): اے لوگو! اپنے اُس پروردگار سے ڈرو جس نے تم کو نفس واحدہ سے پیدا کیا۔ نیز سورۂ حشر کی یہ آیت بھی پڑھی: اتقوا اللہ ولتنظر نفس ما قدمت لغد (ترجمہ)، خدا سے ڈرو! اور ہر شخص یہ دیکھے کہ اُس نے کل کے لیے آگے کیا بھیجا ہے۔ اس کا اثر یہ ہُوا کہ لوگوں نے دینار، درہم، کپڑا اور صاع بھر جَو اور کھجور تک دینا شروع کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو آدھا خرما دے سکتا ہے وہ بھی دے چنانچہ لوگ اپنی اپنی چیزیں لیے ہوئے آئے۔ میں نے دیکھا کہ کھانے اور کپڑے کی دو ڈھیریاں لگ گئی ہیں۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم کے چہرے پر نظر پڑی تو اس طرح دمک رہا تھا، جیسے اس پر چکنا ہٹ مَل دی گئی ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

ووزر من عمل بها من غير ان ينقص من اوزارهم شيء۔
(مسلم، نسائی)

نے فرمایا کہ: جو اسلام میں کوئی اچھا نمونہ پیش کرتا ہے اس کو اس کے اپنے عمل کا ثواب بھی ملتا ہے اور اس کا بھی جو اس کے بعد اس پر عمل کرے۔ لیکن بعد والے کے ثواب میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی، اس کے برعکس اگر کوئی برا نمونہ پیش کرے تو اس پر اس کے اپنے عمل کا بھی بوجھ پڑے گا اور اس کا بھی جو بعد میں اس پر عمل کرے بغیر اس کے کہ بعد والوں کے بوجھ میں کوئی کمی کی جائے۔

متعلقاتِ صدقہ

۹۰۔ صدقے کے کئی قابلِ لحاظ پہلو:

(ابوھریرۃ رض) (۱) الید العلیا خیر من الید السفلی (۲) وابدأ بمن تعول (۳) وخیر الصدقۃ عن ظھر غنیٍّ (۴) ومن یستعفف یعفہ اللہ (۵) ومن یستغن یغنہ اللہ۔
(بخاری، ابوداؤد، نسائی)

(۱) اُوپر کا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے (۲) اور عطاء و بخشش کی ابتداء اُن لوگوں سے کرو جن کا رزق تمہارے ذمے ہے۔ (۳) اچھا صدقہ وہ ہے جو غنیٰ کو قائم رکھتے ہوئے دیا جائے۔ (۴) اور جو عفیف رہنے کی سعی کرے گا اللہ اُس کو عفیف رکھے گا (۵) اور جو بے نیازی و استغنا چاہے گا۔ اللہ اُس کو بے نیاز کر دے گا۔

۹۱۔ یدِ علیا اور یدِ سفلیٰ کی شرح:

(ابن عمر رض) رفعہ: الید العلیا خیر من الید السفلی والعلیا ھی المنفقۃ و السفلی ھی السائلۃ (للستۃ الا الترمذی)

اُوپر کا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے کہیں بہتر ہے۔ اُوپر کے ہاتھ سے مُراد خرچ کرنے والا ہاتھ ہے۔ اور نیچے والے ہاتھ سے مراد وہ ہے جو طلبِ سوال کے لیے پھیلے۔

۹۲۔ ایسا صدقہ نہیں چاہیے جو خود کو مفلس کر دے:

(جابر رض) کنا عند رسول اللہ صلی اللہ

ہم آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے تھے کہ

علیه وسلم اذ جاء رجل بمثل البیضة من ذهب فقال یا رسول الله اصبت هذا من معدن فخذها فهی صدقة ما املک غیرها فاعرض عنه ثم قال مثل ذلک من قبل یمینه فاعرض عنه ثم من یساره فاعرض عنه ثم من خلفه فاخذها صلی الله علیه وسلم فحذفه بها فلو اصابته لاَوْجَعَتُه او لعقرته وقال یأتی احدکم بجمیع ما یملک فیقول هذه صدقة ثم یقعد یستکف الناس خیر الصدقة ما کان عن ظهر غنی۔ (ابو داؤد)

ایک آدمی بیضے کے برابر سونے کا ایک ڈلا لایا اور کہنے لگا کہ: یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)، مجھے ایک کان سے ملا ہے۔ آپ اسے بطور صدقہ قبول فرما لیجئے۔ اور میرے پاس یہی پونجی ہے۔ آپ نے یہ سُن کر اعراض فرمایا: اب اس نے داہنی طرف گھوم کر یہی بات کہی، آپ نے اس پر بھی توجہ نہ کی۔ پھر بائیں جانب سے آیا اور آپ نے پھر منہ پھیر لیا۔ پھر یہ پیچھے کی طرف لوٹ کر آیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی بات دہرائی۔ آپ نے یہ ڈلا لیا اور اس کی طرف اس زور سے دے مارا کہ اگر اُسے لگ جاتا تو اُسے تکلیف پہنچاتا، یا زخمی کر ڈالتا۔ پھر آپ نے فرمایا: بعض آدمی اپنا پورا اثاثہ لے آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ صدقہ ہے اور پھر تھک ہار کر بیٹھ جاتے ہیں اور لوگوں سے بھیک مانگتے ہیں۔ یاد رکھو بہترین صدقہ وہ ہے جو غنیٰ کو قائم رکھتے ہوئے دیا جائے۔

۹۳۔ دینا ہے تو بے حساب دو:

(عائشۃؓ) دخل علی سائل مرۃ وعندی رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم فامرت له لشیئ ثم دعوت به فنظرت الیه فقال صلی الله علیه وسلم اما تریدین ان لا یدخل بیتک شیئ ولا یخرج الا بعلمک؟ قلت نعم قال مهلا یا عائشة لا تحصی فیحصی الله علیک۔

(ابو داؤد، نسائی)

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں میرے پاس ایک سائل آیا۔ میں نے اُسے کچھ دے دینے کو کہا۔ پھر اس کو بُلا لیا اور دیکھا کہ اُسے کیا دیا ہے آپ نے فرمایا: تم یہی چاہتی ہونا؟ کہ تمھارے گھر میں جتنا آئے اور جتنا خرچ ہو۔ اُس کا تم کو علم رہے۔ میں نے (عائشہ رضی اللہ عنہا نے) کہا: جی ہاں! فرمایا: حساب کتاب کے پھیر میں نہ پڑو۔ گِن گِن کر نہ دو۔ ورنہ اللہ تمھیں بھی گِن گِن کر دے گا۔

۹۴۔ نیکی کا ثواب کافر کو بھی ملتا ہے:

(ابن مسعودؓ) رفعه: ما احسن محسن من مسلم ولا كافر الا اثيب قلنا: يا رسول الله هذه اثابة المسلم قد عرفناها فما اثابة الكافر؟ قال اذا تصدق بصدقة او وصل رحما او عمل حسنة اثابه الله بهذا المال والولد فى الدنيا و عذابا دون العذاب فى الاخرة وقرأ ادخلوا آل فرعون اشد العذاب۔ (بزار)

فرمایا: کوئی شخص بھی، مسلم ہو، چاہے کافر، جب نیکی کا کوئی کام کرے گا تو اس کا صلہ دیا جائے گا۔ ہم نے پوچھا یا رسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وسلم) مسلمان کو ثواب سے بہرہ مند کیا جاتا ہے، اس کا تو ہمیں علم ہے لیکن کافر کو ثواب کیونکر ملتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: جب وہ عطا و بخشش اختیار کرتا ہے یا قرابت داری کا خیال رکھتا ہے یا اور کوئی عمدہ کام کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے دنیا میں مال و منال اور اولاد کی صورت میں اس کا صلہ دیتا ہے اور آخرت میں اس کے عذاب میں تخفیف کر دیتا ہے، خاتمے پر آپؐ نے یہ آیت پڑھی: ادخلوا آل فرعونؑ اشد العذاب (آلِ فرعون کو سخت ترین عذاب میں داخل کرو)

۹۵۔ بچ رہنے کا صحیح مطلب؟:

(عائشہؓ) انهم ذبحوا شاة فقال النبىؐ صلى الله عليه وسلم مابقى منها؟ قالت مابقى منها الا كتفها قال بقى كلها الا كتفها۔ (ترمذی)

اُنھوں نے ایک بکری ذبح کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: کچھ اس میں سے بچا بھی ہے؟ حضرت عائشہؓ نے کہا: ہاں! ایک دست بچا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: نہیں! بلکہ بجز اس دست کے اور سب کچھ بچ گیا ہے۔

۹۶۔ ہر کار خیر صدقہ ہے، اور باعثِ اجر:

(ابو ذرؓ) ان ناسا من اصحاب النبىؐ صلى الله عليه وسلم قالوا يا رسول الله ذهب اهل الدثور بالاجور يصلون كما نصلى

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے کچھ لوگوں نے کہا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سرمائے والوں نے اجر کی بازی جیت لی۔ وہ نماز اور روزے میں تو ہمارے برابر کے شریک ہیں۔ لیکن ان کو یہ رعایت حاصل ہے،

ويصومون كما نصوم ويتصدقون بفضول اموالهم قال اوليس قد جعل الله لكم ما تصدقون به ان بكل تسبيحة صدقة وكل تكبيرة صدقة وكل تحميدة صدقة وكل تهليلة صدقة وامر بالمعروف صدقة ونهى عن منكر صدقة وفى بضع احدكم صدقة قالوا يارسول الله ايأتى احدنا شهوته ويكون له فيها اجر؟ قال ارأيتم لو وضعها فى حرام كان عليه وزر؟ فكذلك اذا وضعها فى الحلال كان له اجر۔ (مسلم)

کر زائد مال کو خوب اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: کیا اللہ تعالیٰ نے تمھیں وہ دولت نہیں دی، جو تم اس کی راہ میں لٹا سکو؟ سن لو ہر تسبیح پر نیکی و اجر ہے، ہر تکبیر پر نیکی و اجر ہے۔ ہر تحمید پر نیکی و اجر ہے، ہر تہلیل پر نیکی و اجر ہے، امر بالمعروف میں اجر ہے۔ برائی سے روکنے میں نیکی ہے حتیٰ کہ جنسی تعلقات میں بھی نیکی ہے۔ لوگوں نے کہا کہ: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کیا یہ ممکن ہے کہ ایک آدمی اپنی خواہشات کو پورا کرے اور اس پر بھی اجر و نیکی کا مستحق ٹھہرے۔؟ آپؐ نے فرمایا کہ: اگر وہ (خواہشات کا غلط استعمال کرتے ہوئے) حرام کا مرتکب ہوتا، تو کیا اس پر کوئی گناہ عاید نہ ہوتا؟ اسی طرح جب اس نے اس کا صحیح استعمال کیا، تو اجر کا بھی مستحق ہوا۔

۹۷۔ سات اہل فضل:

(ابو ھریرۃؓ) رفعہ: سبعة يظلهم الله فى ظله يوم لا ظل الا ظله (۱) الامام العادل و (۲) شاب نشأ فى عبادة الله و (۳) رجل قلبه معلق بالمسجد اذا خرج منه حتى يعود اليه (۴) رجلان تحابا فى الله اجتمعا على ذلك وتفرقا عليه و (۵) رجل دعته امرأة ذات منصب وجمال فقال انى اخاف

سات ایسے اشخاص ہیں کہ ان پر اللہ کا سایہ ہوگا اور ایسے دن میں کہ اس میں سوائے اللہ کے سائے کے اور کہیں تمھیں پناہ نہیں ملے گی۔ (امام عادل (۲) وہ نوجوان جو اللہ کی عبادت میں پروان چڑھا پلا اور بڑھا (۳) وہ شخص کہ مسجد سے باہر نکل کر بھی اس کا دل مسجد ہی میں اٹکا رہا، یہاں تک کہ وہ پھر مسجد میں آئے (۴) وہ دو شخص جنھوں نے اللہ کے لیے محبت کی، اسی پر جمع ہوئے اور اسی سبب سے ایک دوسرے سے علیحدہ ہوئے (۵) وہ آدمی جس کو ایسی عورت نے برائی کی

الله و (۶) رجل تصدق بصدقة فاخفاها حتی لاتعلم شماله ماتنفق یمینه و (۷) رجل ذکرالله خالیا ففاضت عیناه۔

(شیخین)

طرف بلایا جو منصب بھی رکھتی ہے اور جمال بھی لیکن اس نے جواب میں کہا کہ اللہ سے ڈرتا ہوں (۶) وہ شخص جس نے کوئی چیز اللہ کی راہ میں دی ہو اور اتنا اس میں اخفا سے کام لیا ہو کہ اُسکے بائیں ہاتھ کو بھی اس کی خبر نہ ہوئی ہو کہ سیدھے ہاتھ نے کیا خرچ کیا ہے۔ (۷) اور وہ آدمی جس نے تنہائی میں خدا کو یاد کیا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

سوال اور قناعت

۹۸۔ پیشہ ور بھکاری کا انجام:

(ابن عمرؓ) لاتزال المسألة باحدکم حتی یلقی الله تعالیٰ ولیس فی وجهه مزعة لحم۔ (شیخین، نسائی)

ایک شخص جو بھیک مانگتا رہے، اللہ (تعالیٰ) سے اس حال میں ملے گا کہ اس کے چہرے پر گوشت نہیں ہوگا۔

۹۹۔ سوال سے لکڑی کا بوجھ ڈھولینا بہتر ہے:

(ابو ھریرۃؓ) رفعه، لان یحتطب احدکم حزمة علی ظهره خیرله من ان یسأل احدا فیعطیه او یمنعه (السته الا ابا داؤد)

تم میں سے کسی شخص کا اپنی پشت پر لکڑی کا گٹھا رکھ لینا (اور اُسے بیچ لینا) اس سے کہیں بہتر ہے کہ کسی کے سامنے دستِ سوال دراز کرے۔ پھر بھی وہ چاہے تو دے اور چاہے تو نہ دے۔

۱۰۰۔ سوال سے فقر کا دروازہ کھلتا ہے:

(ابو ھریرۃؓ) رفعه: لا یفتح احدکم علی نفسه باب مسألة الا فتح الله علیه باب فقر (موصلی)

جو شخص اپنے اُوپر سوال کا دروازہ کھولتا ہے، خدا اس پر افلاس و احتیاج کا باب وا کر دیتا ہے۔

۱۰۱۔ سوال کس کے لیے جائز ہے؟ (ایک قابلِ اقتدا اسوہ)

(انس رضی اللہ عنہ) ان رجلا من الانصار اتی النبی صلی اللہ علیہ وسلم یسألہ فقال اما فی بیتک شیء؟ قال بلی حلس نلبس بعضہ ونبسط بعضہ وقعب نشرب فیہ الماء قال ائتنی بہما فاتاہ بہما فاخذہما بیدہ وقال من یشتری ہذین؟ قال رجل انا آخذہما بدرہم قال صلی اللہ علیہ وسلم من یزید علی درہم؟ مرتین او ثلاثا قال رجل انا آخذہما بدرہمین فاعطاہما ایاہ فاخذ الدرہمین واعطاہما الانصاری وقال اشتر باحدہما طعاما فانبذہ الی اہلک واشتر بالآخر قدوما فأتنی بہ فاتاہ بہ فشد فیہ صلی اللہ علیہ وسلم عودا بیدہ ثم قال اذہب فاحتطب وبع ولا اراک خمسۃ عشر یوما ففعل وجاء وقد اصاب عشرۃ دراہم فاشتری ببعضہا ثوبا وببعضہا طعاما فقال لہ صلی اللہ علیہ وسلم ہذا خیر لک من ان تجیء المسألۃ نکتۃ فی وجہک یوم القیامۃ ان المسألۃ لا تصلح

ایک انصاری آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کچھ مانگنے لگا۔ آپؐ نے پوچھا: کیا تمھارے گھر میں کوئی چیز نہیں ہے؟ اس نے کہا: کیوں نہیں، ایک ٹاٹ ہے جس کا ایک حصہ ہم اوڑھتے ہیں اور ایک سے ہم فرش کا کام لیتے ہیں۔ دوسرا ایک پیالہ ہے جس میں ہم پانی پیتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: دونوں چیزیں گھر سے لے آ۔ وہ لے آیا۔ آپؐ نے انھیں اپنے قبضے میں لے لیا اور پوچھا: انھیں کون خریدتا ہے؟ ایک آدمی نے کہا: میں اس کو ایک درہم میں خریدتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا: ایک سے زیادہ درہم کا کون خریدار ہے؟ دو یا تین مرتبہ یہ فرمایا۔ ایک آدمی نے کہا۔ میں دو درہم میں یہ دونوں چیزیں خرید لیتا ہوں۔ آپؐ نے اس سے یہ دونوں درہم لیے اور انصاری کو دیتے ہوئے فرمایا: ایک درہم سے کھانے پینے کی چیزیں خرید لے اور بال بچوں کے لیے گھر بھیج دے۔ دوسرے درہم کا ایک کلہاڑا لے لے۔ اور لا کر مجھے دکھا۔ وہ گیا اور کلہاڑا خرید لایا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دکھایا۔ آپؐ نے اپنے ہاتھ سے اس میں لکڑی کا دستہ ٹھونکا اور فرمایا: جاؤ اس سے لکڑیاں کاٹو اور بیچو۔ اب پندرہ دن تک میں تمھیں نہ دیکھوں۔ اس نے آپؐ کے حکم کی تعمیل کی پندرہ دن کے بعد آیا تو اس کے پاس دس درہم ہو گئے تھے۔ اس سے اس نے کپڑا خریدا اور کھانے پینے کا سامان مول لیا۔ آپؐ نے فرمایا: یہ مشغلہ اس سے کہیں بہتر ہے۔ بھیک مانگنے سے قیامت کے دن تیرے چہرے پر داغ پڑ جاتے۔ یاد رکھو! کہ سوال صرف تین اشخاص کے لیے جائز ہے۔ ایک اس کے

الاثلاث لذی فقر مُدقِع او الذی غُرم مُفظِع او لذی دم مُوجِع۔
(ابوداؤد)

لیے جو ذلّت رساں فقر میں مبتلا ہو یا جس پر کوئی خوفناک تاوان عاید ہوتا ہو۔ یا جودیت کے اعتبار سے تکلیف میں مبتلا ہو۔

۱۰۲۔ سوال بس خدا ہی سے ہونا چاہیئے:

(ابن مسعودؓ) رفعہ: من نزلت به فاقة فانزلها بالناس لم تُسدّ فاقته ومن نزلت به فاقة فانزلها بالله فيوشك الله له برزق عاجل او آجل۔
(ابوداؤد، ترمذی)

اگر کسی پر فاقہ کی نوبت آجائے اور وہ اس سے مخلصی کے لیے لوگوں کی طرف رجوع کرے تو اس کا فاقہ دور نہ ہوگا۔
اور اگر فاقہ کشی کی صورت میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہو تو اللہ تعالیٰ جلد یا بدیر اس کے لیے رزق کا اہتمام فرمائے گا۔

۱۰۳۔ کامیاب آدمی کون ہے؟

(ابن عمروؓ بن العاص) رفعہ: قد افلح من اسلم و رُزِق کفافاً وقنّعه الله بما آتاه۔ (مسلم، ترمذی)

وہ کامیاب رہا جس نے اسلام قبول کیا اور جس کو روزی بقدر کفایت ہی ملی اور اللہ نے جتنا کچھ بھی دیا اس پر اسے قناعت بھی بخشی۔

۱۰۴۔ انسان کا دنیا میں اصلی حق کیا ہے؟

(عثمانؓ) رفعہ: لیس لابن آدم حق فی سوی هذه الخصال بیت یکنه وثوب یواری عورته وجِلَفُ الخبز والماء
(ترمذی)

ابن آدم کا حق سوا ان (تین) چیزوں کے کسی اور شے سے وابستہ نہیں، وہ گھر جس میں وہ رہے، وہ کپڑا جس سے وہ ستر پوشی کا کام لے اور خشک روٹی اور پانی۔

۱۰۵۔ سب سے زیادہ قابلِ رشک ولی کون ہے؟:

(ابوامامہؓ) رفعہ: ان اغبط اولیائی عندی مؤمن خفیف الحاذ ذو حظ

اللہ کا کہنا ہے کہ: میرے دوستوں میں سے زیادہ قابلِ رشک وہ مومن ہے جو سبک حال ہو، نماز سے بہرہ مند ہو، اپنے

من الصلوٰة احسن عبادة ربه واطاعه فی السر وکان غامضاً فی الناس لا یشار الیه بالاصابع وکان رزقه کفافاً فصبر علی ذالک ثم نقر بیده فقال عجلت منیّته قلّت بواکیه قلّت تراثه ۔ (ترمذی)

رب کی اچھی طرح عبادت کرتا ہو۔ پوشیدگی میں بھی اس کا اطاعت گزار ہو۔ لوگوں میں اس طرح غیر معروف زندگی بسر کرتا ہو کہ اس کی طرف انگلیاں نہ اٹھتی ہوں، اور رزق اگرچہ اس کو بقدرِ کفایت ہی میسر ہوتا ہو، تاہم اس پر صابر و قانع ہو، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ پر ہاتھ مارا اور فرمایا: اس کی موت بھی جلد ہی آجائے، وہ کچھ چھوڑ کر جائے وہ کم ہو اور اس کو رونے والیاں بھی کم ہوں۔

۱۰۶۔ غنا کا تعلق دل سے ہے نہ کہ مال سے:

(ابو هریرةؓ) رفعه: لیس الغنیٰ عن کثرة العرض ولکن الغنیٰ غنی النفس ۔ (شیخین، ترمذی)

سازو سامان کی کثرت سے کوئی شخص غنی نہیں ہوتا، غنی وہ ہے جو دل کا غنی ہو۔

۱۰۷۔ مسکین کی صحیح تعریف:

(ابو هریرةؓ) رفعه: لیس المسکین الذی ترده اللقمة واللقمتان والتمرة والتمرتان ولکن المسکین الذی لا یجد غنی یغنیه ولا یفطن به فیتصدق علیه ولا یقوم فیسأل الناس للستة الا الترمذی وفی روایة: انما المسکین الذی یتعفف اقرؤا ان شئتم لا یسألون الناس الحافا۔

مسکین وہ نہیں کہ ایک دو لقمے یا ایک دو خرمے بھی اس کو جواب دے دیں مسکین تو وہ ہے جو غنا سے محروم ہو۔ اور لوگوں کو بظاہر اس کی غربت کا احساس نہ ہو، کہ وہ اس کو دیں۔ اور وہ خود لوگوں سے سوال کرنے نہ کھڑا ہو۔ ایک اور روایت میں ہے: قرآن حکیم کی اصطلاح میں مسکین وہ ہے جو محتاج ہونے کے باوجود عفیف رہے۔ اس کی تائید میں چاہو تو یہ آیت پڑھ لو: لا یسألون الناس الحافا۔ (ترجمہ: یہ لوگوں کے سامنے اوّل تو ہاتھ ہی نہیں پھیلاتے اور اگر سوال کرتے بھی ہیں تو پیچھے نہیں پڑتے۔

۱۰۸۔ نعمتِ الٰہی کی تحقیر سے بچنے کا علاج:

(ابو هریرةؓ) انظروا الی من هو اسفل

دُنیا کے لحاظ سے تو اس کی طرف دیکھو، جو تم سے کم

منکم فی الدنیا و فوقکم فی الدین فذلکم فی احدر ان لا تزدروا نعمۃ اللہ علیکم۔
(رزین)

درجے کا ہے اور دین میں اس کی طرف دیکھو جو تم سے اُونچے مرتبے کا ہے یہ بات تمہارے لیے زیادہ مناسب ہے کہ اس طرح تم تحقیرِ نعمت کی معصیت سے بچ جاؤ گے۔

۱۰۹۔ بلا سوال اگر کچھ مل جائے تو اُسے قبول کر لینا چاہیے:

(عطاءؓ بن یسارؒ) ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم ارسل الی عمر بعطاءٍ فردہ عمر فقال لہ لم رددتہ؟ فقال یارسول اللہ ألیس اخبرتنا ان خیر الاحدنا ان لا یأخذ من احد شیئا؟ فقال لہ صلی اللہ علیہ وسلم انما ذلک عن المسئلۃ فاما ما کان من غیر مسئلۃ فانما ھو رزق یرزقکہ اللہ فقال عمر اما والذی نفسی بیدہ لا اسأل احدا شیئا ولا یأتینی شئ من غیر مسئلۃ الا اخذتہ۔
(مالک، شیخین، نسائی)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی چیز حضرت عمرؓ کے پاس بطور عطیہ بھیجی۔ آپؓ نے اسے لوٹا دیا، اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: یہ کیوں لوٹایا ہے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب میں کہا: یارسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وسلم) کیا یہ آپؐ ہی کا ارشاد نہیں کہ ہمارے لیے یہی بہتر ہے کہ ہم کسی سے بھی کوئی چیز نہ لیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کا مطلب یہ ہے کہ سوال نہیں ہونا چاہیے اور جو بغیر سوال کے میسر آئے وہ تو اللہ تعالیٰ کی دین ہے جس سے اس نے تمھیں بہرہ مند کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ: اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ آئندہ میں کسی سے بھی از خود کوئی شے طلب نہیں کروں گا۔ اور جو چیز بغیر طلب کے میرے پاس آئے گی اُسے قبول کرنے میں کوئی عذر نہ ہوگا۔

۱۱۰۔ شیطان خون کے ساتھ دوڑتا ہے:

(صفیہؓ) کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم معتکفا فاتیتہ ازورہ لیلاً فحدثتہ ثم قمت لانقلب فقام معی لیقلبنی وکان مسکنہا فی دار اسامۃ فمر رجلان من الانصار فلما رأیا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم معتکف تھے اور میں (ام المومنین صفیہؓ) شب کے وقت ملنے آئی اور گفتگو کرتی رہی۔ پھر واپسی کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میرے ساتھ اُٹھ کھڑے ہوئے تاکہ مجھے چھوڑ آئیں۔ صفیہؓ کا مکان دارِ اسامہ میں تھا۔ اتنے میں دو انصاری بھی

النبیّ اسرعا فقال علیٰ رسلکما انھا صفیۃ بنت حییّ فقالا سبحان اللہ یا رسول اللہ فقال ان الشیطٰن یجری من ابن اٰدم مجری الدم وانی خشیت ان یقذف فی قلوبکما شرا او قال شیئًا۔

(شیخین، ابو داؤد)

ادھر سے گذرے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر انھوں نے اپنے قدم تیز کر لیے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہیں ٹھہرے رہو۔ یہ صفیہ بنت حیی ہیں (لہٰذا تمھیں کوئی سوئے ظن نہ ہو) عرض کیا: توبہ توبہ! یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم!) فرمایا ٹھیک ہے، مگر شیطان انسان کے اندر خون کی طرح گردش کرتا رہتا ہے اور مجھے یہ اندیشہ تھا کہ شیطان تمھارے دلوں میں کوئی شر (بدگمانی) کی بات نہ ڈال دے۔

کتابُ الحج

۱۱۱۔ ادائے قرض ادائے حج پر مقدم ہے:

(ابو ھریرۃؓ) ان رجلا قال للنبی صلّی اللہ علیہ وسلم علیّ حجۃ الاسلام وعلیّ دَیْنٌ قال اقض دینک۔

(مسند رزین)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک شخص نے پوچھا کہ مجھ پر حج بھی واجب ہے اور مجھ پر قرض بھی ہے۔ فرمایا: پہلے قرض ادا کرو۔

۱۱۲۔ روانگیٔ جہاد میں عجلت نہ کرنے کا نتیجہ:

(ابن عباسؓ) بعث النبیّ صلی اللہ علیہ وسلم عبد اللہ بن رواحۃ فی سریۃ فوافق ذلک الیوم یوم الجمعۃ فغدا اصحابہ فقال أتخلف فاصلی مع النبیّ صلی اللہ علیہ وسلم ثم الحقھم فلما صلی معہ صلّی اللہ علیہ وسلم رآہ فقال ما منعک

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عبد اللہ بن رواحہ کو ایک سریہ (قافلہ مجاہدین) میں روانہ ہونے کا حکم دیا۔ وہ دن جمعے کا تھا۔ ان کے ساتھی روانہ ہو گئے۔ لیکن عبد اللہ نے سوچا کہ میں ٹھہر کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز ادا کروں، پھر قافلے سے جا ملوں گا۔ جب وہ حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز ادا کر چکے تو انھیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھ کر پوچھا کہ: تم اپنے ساتھیوں کے ساتھ کیوں نہ روانہ

ان تغدو مع اصحابک ؟ فقال اردت ان اصلی معك ثم الحقهم فقال لو انفقت ما فی الارض ما ادرکت فضل غدوتهم۔ (ترمذی)

ہے؟ عرض کیا: میں نے یہ سوچا کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ نماز ادا کرکے پھر ان سے جا ملوں گا۔ فرمایا کہ: ساری کائناتِ زمین بھی تم خرچ کر ڈالو تو ان کی اس ٹولی کی فضیلت کو نہیں پا سکو گے۔

۱۱۳ - جانوروں پر رحم کی تعلیم:

(معاذ بن انس) ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم مرّ علی قوم وھم وقوف علی دواب ورواحل فقال لھم ارکبوھا سالمۃ ودعوھا سالمۃ ولا تتخذوھا کراسی لاحادیثکم فی الطرق والاسواق فرب مرکوبۃ خیر من راکبھا واکثر ذکراً للہ منہ۔

(احمد)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کچھ لوگوں کے پاس سے گزرے جو اپنی سواری کے جانوروں پر چڑھے ہوئے (باتیں کر رہے) تھے۔ فرمایا کہ: اچھی حالت میں ان پر سوار ہو اور اچھی حالت میں انھیں چھوڑ بھی دیا کرو۔ ان کو اپنی گفتگو کے لیے راستوں اور بازاروں میں کرسیاں نہ بنا لیا کرو۔ بہتیری سواریاں ایسی ہیں جو اپنے سوار سے زیادہ بہتر اور زیادہ ذکرِ الٰہی کرنے والی ہوتی ہیں۔

خطبۂ حج

۱۱۴ - حجرِ اسود کو بوسہ دیتے وقت حضرت عمرؓ کا ایک ضروری انتباہ:

(حنظلہ) ...... قال ابن عباسؓ رأیت عمر فعل مثل ذلك ثم قال انك حجر لا تنفع ولا تضر ولولا انی رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبلك ما قبلتك ....

(نسائی)

حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ حجرِ اسود کو چوم کر انھوں نے فرمایا کہ تو محض ایک پتھر ہے۔ تیرے اندر نفع یا نقصان پہنچانے کی کوئی طاقت نہیں۔ اگر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چومتے نہ دیکھا ہوتا تو میں تجھے کبھی نہ چومتا ....

....

۱۱۶۔ مفادِ عامّہ کے لیے کسی کو حج سے روکنا، اطاعتِ امیر کی نادر مثال:

(ابن ابی ملیکۃ) ان عمر مرّ بامرأۃ مجذومۃ وھی تطوف بالبیت فقال لھا یا امۃ اللہ لا تؤذی الناس لو جلست فی بیتک لکان خیرا لک فجلست فی بیتھا فمر بھا رجل بعد ما مات عمر فقال لھا ان الذی نھاک قد مات فاخرجی فقالت واللہ ما کنت لاطیعہ حیا واعصیہ میتا۔ (مالک)

حضرت عمرؓ ایک جذامی عورت کے پاس سے گزرے جو طواف کر رہی تھی۔ آپؓ نے اس سے کہا کہ: اللہ کی بندی! لوگوں کو اذیت نہ دے۔ تو اگر اپنے گھر بیٹھی رہے تو تیرے لیے یہی بہتر ہے۔ اس کے بعد وہ عورت اپنے گھر بیٹھی رہی۔ حضرت عمرؓ کی رحلت کے بعد ایک شخص نے اس عورت کے پاس سے گزرتے ہوئے کہا کہ: اب تو طواف کے لیے نکل۔ کیونکہ جس نے تجھے منع کیا تھا وہ مر چکا، کہنے لگی کہ: بخدا میں ایسی نہیں کہ ان کی زندگی میں ان کی بات مان لوں اور مر چکنے کے بعد اُن کی نافرمانی کروں۔

۱۱۷۔ ذخیرہ اندوزی حرم میں خصوصاً حرام ہے:

(یعلی بن اُمیہ) رفعہ: احتکار الطعام فی الحرم الحادٌ فیہ۔ (ابوداؤد)

حرم میں کھانے کی چیزوں کا احتکار (ذخیرہ اندوزی) حرام ہے۔

قسم

۱۱۸۔ جھوٹی قسم کا عذاب اللہ انجام:

(الاشعث بن قیسؓ) کان بینی وبین رجل خصومۃ فی بئر فاختصمنا الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال شاھداک اویمینہ قلت اذاً یحلف ولا یبالی فقال من حلف

ایک شخص کے اور میرے درمیان ایک کنوئیں کے بارے میں جھگڑا ہو گیا اور ہم دونوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مقدمہ لے گئے۔ فرمایا کہ: تم یا تو دو گواہ پیش کرو یا وہ قسم کھائے۔ میں نے عرض کیا کہ: قسم کھانے میں کیا جاتا ہے؟ وہ بڑی بے پروائی سے قسم کھا سکتا ہے۔ فرمایا کہ جو شخص

علی یمین صبر لیقتطع بہا مال امرئ مسلم ہو فیہا فاجر لقی اللہ وہو علیہ غضبان ونزلت ان الذین یشترون بعہد اللہ وایمانہم ثمنا قلیلا ۔ الآیۃ ۔
(شیخین، ابوداؤد، ترمذی، مطولا)

یمین صبر کے موقعے پر اس لیے قسم کھالے کہ کسی مسلمان کے مال پر قبضہ ہو جائے اور ہو وہ جھوٹا تو غضب الٰہی سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی (جس کا ترجمہ یہ ہے) : کہ جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کے ذریعے معمولی پونجی حاصل کرتے ہیں...... الخ

شاہد و اذن

۱۱۹۔ خدا کی نگاہ میں سب بندے یکساں ہیں فضیلت صرف تقویٰ سے ہے :

(ابو سعیدؓ) رفعہ : ان ربکم واحد وابا کم واحد فلا فضل لعربی علی عجمی ولا لاحمر علی اسود الا بالتقوٰی ۔ (للاوسط)
وللبزار: ان اباکم واحد وان دینکم واحد وابوکم آدم وآدم خلق من تراب ۔

تم سب انسانوں کا رب بھی ایک ہے اور اب (باپ) بھی، لہٰذا نہ کسی عربی کو عجمی پر فضیلت ہے نہ کسی سُرخ کو سیاہ پر۔ اگر کوئی چیز باعث فضل ہے تو وہ عمل تقویٰ ہے۔ بزار کے الفاظ یوں ہیں کہ : تم سب کا باپ ایک اور تمہارا دین بھی ایک ہے۔ تم سب کے پدر بزرگوار آدمؑ ہیں اور آدمؑ کی خلقت مٹی سے ہوئی ۔

ولیمہ

۱۲۰۔ بدترین طعام ولیمہ، دعوتِ ولیمہ میں شرکت نہ کرنے والا :

(ابن عمرؓ) رفعہ : ......من دعی فلم یجب فقد عصی اللہ ورسولہ ومن دخل علی غیر دعوۃ دخل سارقا وخرج مغیرا ۔ (شیخین، ابوداؤد، ترمذی)

دوسری روایت میں ہے کہ جو دعوتِ ولیمہ میں بلایا جائے اور نہ جائے وہ اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نافرمانی کرتا ہے اور جو شخص بے بلائے گھس جائے وہ داخل ہوتے وقت چور رہتا ہے اور نکلتے وقت ڈاکو ۔

۱۲۱۔ غیرتِ الٰہی کا تقاضا ہے تحریم فواحش:

(ابن مسعودؓ) رفعه: لا احد اغير من الله من اجل ذلك حرّم الفواحش ما ظهر منها وما بطن ولا احد احب اليه المدح من الله من اجل ذلك مدح نفسه۔ (شیخین، ترمذی)

اللہ تعالیٰ سے زیادہ کوئی غیرت مند نہیں۔ یہی وجہ ہے جو اس نے ظاہری اور باطنی بے حیائی کو حرام کیا ہے اور مدح اللہ تعالیٰ سے زیادہ کسی کو محبوب نہیں، اسی لیے اس نے خود اپنی مدح فرمائی ہے۔

۱۲۲۔ اگر پرائی عورت پر اچانک نظر پڑ جائے:

(جریرؓ) سألت رسول الله صلى الله عليه وسلّم عن نظر الفجاءة فقال اصرف بصرك۔

(مسلم، ابو داؤد، ترمذی)

میں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عورت پر دفعتہً نظر پڑ جانے کے متعلق دریافت کیا تو فرمایا کہ نگاہ پھیر لیا کرو۔

۱۲۳۔ دوسری بار نظر ڈالنا:

(بریدہؓ) رفعه: یا علیؓ لا تتبع النظرة النظرة فان لك الاولى وليس لك الثانية۔ (ترمذی، ابو داؤد)

فرمایا کہ: اے علیؓ! ایک اچانک نظر کے بعد دوسری بار عورت پر نگاہ مت ڈالو۔ پہلی اچانک نظر تو معاف ہے لیکن دوسری جائز نہیں۔

۱۲۴۔ زنانے مرد اور مردانی عورت:

(ابن عباسؓ) لعن رسول الله صلى الله عليه وسلّم المخنثين من الرجال و المترجلات من النساء وقال اخرجوهم من بيوتكم واخرج فلانة اخرج عمر فلانا۔

(بخاری، ترمذی، ابو داؤد)

جو مرد ہیجڑے بنتے ہیں اور جو عورتیں مردانی بنتی ہیں، ان دونوں پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت کی ہے۔ اور فرمایا ہے کہ: انھیں اپنے گھروں سے باہر کر دو۔ اس قسم کی ایک عورت کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے باہر کر دیا تھا اور ایسے ہی ایک مرد کو حضرت عمرؓ نے بھی نکال دیا تھا۔

۱۲۵۔ پردے میں کمال احتیاط:

(ام سلمۃؓ) کنت عند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وعندہ میمونۃ فاقبل ابن ام مکتوم وذلک بعد ان امرنا بالحجاب فدخل علینا فقال احتجبا منه فقلنا یا رسول اللہ الیس اعمی لا یبصرنا ولا یعرفنا قال أفعمیاوان انتما الستما تبصرانه. (ترمذی، ابوداؤد)

میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھی تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس (ام المومنین) میمونہ بھی تھیں۔ اتنے میں ابن ام مکتوم سامنے آتے۔ اس وقت آیتِ حجاب نازل ہو چکی تھی۔ جب وہ اندر داخل ہوئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: تم دونوں پردے میں چلی جاؤ۔ ہم نے عرض کیا کہ: حضور! یہ نابینا ہیں، نہ ہمیں دیکھ سکیں نہ پہچان سکیں، فرمایا کہ: کیا تم دونوں بھی نابینا ہو اور اسے نہیں دیکھ سکتیں۔؟

کتاب الطلاق

۱۲۶۔ غلط انتساب کی ممانعت:

(ابوذرؓ) رفعه: لیس من رجل ادعی لغیر أبیه وهو یعلمه الا کفر ومن ادعی مالیس له فلیس منا ولیتبوأ مقعده من النار ومن رمی رجلا بالکفر او قال عدو اللہ ولیس کذلک الاحار علیه۔ (شیخین، ابوداؤد)

جان بوجھ کر جو شخص اپنا نسب اپنے باپ کے علاوہ کسی اور سے ملائے وہ ازتکابِ کفر کرتا ہے اور جو ایسا دعوے کرے وہ میری جماعت سے خارج ہے۔ اسے اپنے ٹھکانا جہنم کو بنا لینا چاہیئے اور نیز جو شخص کسی کو کافر یا دشمنِ خدا کہے اور وہ درا صل ایسا نہ ہو، تو یہ قول کہنے والے ہی پر پلٹ کر آجائے گا۔

خرید و فروخت و کسبِ معاش

۱۲۷۔ درخت لگانا بھی کارِ خیر ہے:

(ابوہریرۃؓ) رفعه: مامن مسلم

اگر کوئی مسلمان درخت لگائے یا کھیت اُگائے

يغرس غرسا او يزرع زرعا فياكل منه طير او انسان او بهيمة الا كان له به صدقة ۔ (شيخين و ترمذی)

اور اس میں سے کوئی پرندہ یا انسان یا چوپایہ کھا لے تو یہ بھی اس کے لیے صدقہ بن جاتا ہے۔

۱۲۸ - رزق الٰہی کو کوئی روک نہیں سکتا :

(ابن مسعودؓ) ان العبد له رزقه فلو اجتمع عليه الثقلان الجن والانس ان يصدوا عنه شيئا من ذلك ما استطاعوا ۔ (اوسط)

ابن مسعود (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کا کہنا ہے کہ انسان کا رزق جو لکھا ہوتا ہے اسے جن و انس مل کر بھی اگر روکنا چاہیں تو روک نہیں سکتے۔

۱۲۹ - روزی موت سے بھی زیادہ رسا ہے :

(ابو الدرداء) رفعه: ان الرزق ليطلب العبد اكثر مما يطلبه اجله ۔ (بزار، کبیر)

موت جتنا مرنے والے کو ڈھونڈ لیتی ہے۔ اس سے زیادہ روزی اُسے تلاش کر لیتی ہے۔

خادموں اور ماتحتوں سے سلوک

۱۳۰ - خادموں سے درگزر :

(ابن عمرؓ) جاء رجل الى النبي صلى الله عليه وسلم فقال يارسول الله كم اعفو عن الخادم؟ فصمت ثم قال يارسول الله كم اعفو عن الخادم؟ قال اعف عنه كل يوم سبعين مرة ۔ (ابوداؤد، ترمذی)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص نے آکر سوال کیا کہ : یارسول اللہ! میں نوکر سے کہاں تک درگزر کروں ؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے۔ اُس نے پھر یہی سوال کیا، تو فرمایا : ہر روز ستّر بار۔ (یعنی بکثرت)

۱۳۱۔ خادموں کی دلداری اور مساویانہ سلوک:

(ابو ھریرۃؓ) رفعہ: اذا صنع لاحدکم خادمہ طعاما ثم جاءہ بہ وقد ولی حرہ و دخانہ فلیقعدہ معہ فلیاکل فان کان الطعام مشفوھا فلیضع منہ فی یدہ أکلۃ او أکلتین (بخاری، ترمذی، ابوداؤد)

تم میں سے کسی کے لیے اس کا خادم کھانا تیار کرکے لائے اور گرمی اور دھوئیں سے پریشان ہو تو چاہیئے کہ وہ اس خادم کو اپنے ساتھ بٹھا کر (کھانا) کھلائے۔ اگر کھانے والے زیادہ ہوں (اور جگہ تنگ ہو) تو اُس کے ہاتھ ہی میں دو ایک لقمے رکھ دے۔

آدابِ طعام

۱۳۲۔ اسلامی لیڈر کے معیارِ زندگی کا واجب الاتباع نمونہ:

(یحییٰ بن سعیدؒ) ان عمر کان یأکل خبزا بسمن فدعا رجلا من اھل البادیۃ فجعل یأکل و یتتبع باللقمۃ وضر الصحفۃ فقال لہ عمر کانک متقفر قال واللہ ما اکلت سمنا ولا سمینا ولا رأیت اکلا بہ منذ کذا وکذا فقال عمر لا آکل السمن حتی یحیی الناس من اول ما یحیون۔ (مالک)

حضرت عمرؓ ایک بار روٹی اور گھی کھا رہے تھے۔ آپؓ نے ایک دیہاتی کو بلایا۔ وہ پے در پے لقمے توڑ توڑ کر پیالے میں لگے ہوئے گھی کو پونچھ پونچھ کر کھانے لگا۔ آپؓ نے فرمایا کہ: معلوم ہوتا ہے کہ تمھیں گھی نصیب نہیں ہوتا۔ اس نے جواب دیا کہ: خدا کی قسم اتنے عرصے سے نہ میں نے گھی چکھا ہے اور نہ گھی میں ملی روٹی دیکھی ہے۔ آپؓ نے فرمایا: اب میں بھی اس وقت تک گھی نہیں چکھوں گا جب تک تمام لوگ اپنے پہلے کے معیارِ زندگی پر نہ آجائیں۔

۱۳۳۔ دوسروں کی خاطر اپنے عیش میں کمی کرو:

(جابرؓ) ادرکنی عمر و انا اجیئی من السوق ومعی حمال لحم فقال ما ھذا؟ قلت قرمنا الی اللحم فاشتریت

میں بازار سے آرہا تھا اور میرے ساتھ ایک مزدور گوشت اُٹھائے ہوئے تھا۔ راستے میں حضرت عمرؓ ملے اور پوچھا کہ: یہ کیا ہے؟ میں نے کہا، گوشت کی طرف بڑی لپک پیدا ہو رہی تھی اس

بدرهم لحما فقال اما يريد احدكم ان يطوى بطنه عن جاره وابن عمه اين يذهب عنكم قوله تعالىٰ اذهبتم طيباتكم فى حياتكم الدنيا واستمتعتم بها ۔ (مالکؒ)

لیے میں نے ایک درہم کا گوشت خرید لیا۔ آپؓ نے کہا کہ: کیا تم میں کوئی اتنا حوصلہ نہیں رکھتا کہ اپنے پڑوسی یا عم زاد بھائی کی خاطر اپنا پیٹ خالی رکھے۔؟ اللہ تعالیٰ کا یہ قول تمھیں یاد نہیں رہتا کہ (ترجمہ) حیات دنیا میں تم نے اپنا بہترین حصّہ پا لیا اور اس سے فائدہ اُٹھا چکے۔

۱۳۴۔ جنتی ہونے کے لیے:

(ابن عمروؓ بن العاص) رفعه: اعبدوا الرحمٰن واطعموا الطعام وافشوا السلام تدخلوا الجنة بسلام ۔ ترمذی)

خدائے رحمان کی بندگی کرو اور بھوکوں کو کھانا کھلاؤ اور افشائے اسلام کرو تو سلامتی کے ساتھ جنّت میں داخل ہو جاؤ گے۔

۱۳۵۔ سب سے بہتر کھانا اللہ کی نگاہ میں:

(جابرؓ) رفعه: ان احب الطعام الى الله ما كثرت عليه الايدى ۔ (موصلی، اوسط)

اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ وہ کھانا ہے جس کے کھانے والے زیادہ سے زیادہ ہوں۔

لباس و زینت

۱۳۶۔ چند اچھی اور بُری باتیں:

(البراءؓ) امرنا النبى صلى الله عليه وسلم بسبع ونهانا عن سبع امرنا (۱) بعيادة المريض (۲) واتباع الجنائز (۳) وتشميت العاطس (۴) وابرار المقسم (۵) ونصر المظلوم (۶) واجابة الداعى (۷) وافشاء السلام ونهانا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ہمیں سات باتوں کا حکم دیا ہے اور سات باتوں سے منع فرمایا ہے۔ حکم ان باتوں کا دیا ہے: (۱) مریض کی عیادت (۲) جنازے کی شرکت (۳) چھینک آنے پر الحمد للہ کہنا (۴) قسم پورا کرنا (۵) مظلوم کی مدد کرنا (۶) دعوت (ولیمہ) کو قبول کرنا (۷) ہر مسلمان کو سلام کرنا۔

(۱) عن خواتم الذهب (۲) وعن شرب بالفضة (۳) وعن المیاثر الحمر (۴) وعن القسّی (۵) وعن لبس الحریر (۶) و الاستبرق (۷) والدیباج۔

(شیخین، ترمذی، نسائی)

جن باتوں سے روکا ہے وہ یہ ہیں :-
(۱) سونے کی انگوٹھی استعمال کرنا (مردوں کے لیے)
(۲) چاندی کے برتن میں کچھ پینا (۳) ریشمی سرخ زین پوشش استعمال کرنا (۴) کھوٹا سکہ دینا (۵) عام ریشم (۶) استبرق (موٹا ریشم (۷) اور دیباج (دیباج یکے از قسم ریشم) استعمال کرنا)

۱۳۷۔ ریشم کی جائز مقدار :

(ابوعثمانؓ النھدی) کتب الینا عمرؓ ونحن بآذربیجان مع عتبة بن فرقد یا عتبة انه لیس من کدّک ولا کدّ ابیك ولا کدّ امّك فاشبع المسلمین فی رحالھم مما تشبع منه فی رحلك وایاك والتنعم وزیّ اھل الشرك ولبوس الحریر فان رسول الله صلی الله علیه وسلم نھی عن لبوس الحریر الا ھکذا ورفع لنا صلی الله علیه وسلم اصبعیه السبابة والوسطی وضمھما۔ وفی روایة : نھی النبی صلی الله علیه وسلم عن لبس الحریر الا فی موضع اصبعین او ثلاث او اربع۔ (للستة الا مالکا)

ہم لوگ جب عتبہ بن فرقد کے ساتھ آذربائیجان میں تھے تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک خط میں لکھا کہ اے عتبہ! (یہ حکومت و ملک) نہ تمھاری محنت کا نتیجہ ہے نہ تمھارے والدین کی کاوش کا۔ لہٰذا جو کچھ تم اپنے گھر میں کھاؤ وہی تمام مسلمانوں کو ان کے گھروں میں کھلاؤ، اور عیش و تنعم سے بچو۔ نیز مشرکوں کے فیشن اور ریشم پوشی سے بھی پرہیز کرو۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ریشمی کپڑے کے استعمال سے منع فرمایا ہے۔ ہاں دو انگل ریشم (کی گوٹ) میں کوئی حرج نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی انگشت شہادت اور بیچ کی انگلی کو جوڑ کر یہ مقدار بتائی ہے۔

دوسری روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ریشم پہننے سے منع فرمایا۔ البتہ دو، تین یا چار انگل کی اجازت ہے۔

۱۳۸۔ ریشم کی اجازت ضرورتاً :

(انسؓ) رخص رسول الله صلی الله علیه وسلم للزبیر وعبد الرحمٰن

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے زبیر اور عبدالرحمٰن بن عوف (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) کو ریشم پہننے کی

بن عوف فی لبس الحریر لحکۃ بھما۔ (للستۃ الا مالکا)

اجازت دی تھی، کیونکہ ان دونوں کو خارشت ہوگئی تھی۔

۱۳۹۔ اعمال کی شکل اور نیت:

(ابن عمرؓ) ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال من جر ثوبہ خیلاء لم ینظر اللہ الیہ یوم القیامۃ فقال ابوبکر یا رسول اللہ ان ازاری یسترخی الا أن اتعاھدہ فقال انک لست ممن یفعلہ خیلاء۔

(شیخین والبو داؤد والنسائی)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار فرمایا کہ: جو اپنے کپڑے کو تکبراً لٹکائے گا، اُسے اللہ تعالےٰ بروز حشر نظر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! میں اگر ہر وقت دیکھ بھال نہ کروں، تو میرا تہمد ڈھیلا ہوکر لٹک جاتا ہے۔ فرمایا کہ: تمھارا شمار ان لوگوں میں نہیں جو تکبراً ایسا کرتے ہیں۔

۱۴۰۔ سادگی لباس تواضعاً للہ ہونا:

(معاذ بن انسؓ) رفعہ: من ترک اللباس تواضعاً للہ وھو یقدر علیہ دعاہ اللہ یوم القیٰمۃ علی رؤس الخلائق حتی یخیرہ من ای حلل الایمان شاء یلبسھا۔ (ترمذی)

جو شخص مقدور ہونے کے باوجود محض اللہ تعالےٰ کے سامنے متواضع بنے رہنے کے لیے لباسِ فاخرہ کو ترک کردے اسے بروز حشر اللہ تعالےٰ تمام مخلوق کے سامنے بلا کر یہ اختیار دے گا کہ جنت کے جس لباس کو چاہے پہن لے۔

۱۴۱۔ صفائی و نظافت:

(ابن المسیب) ارسلہ: ان اللہ طیب یحب الطیب نظیف یحب النظافۃ کریم یحب الکرم جواد یحب الجود فنظفوا أراہ قال افنیتکم ولا تشبھوا بالیھود .... (ترمذی)

اللہ تعالےٰ خود پاکیزہ ہے اور پاکیزگی کو پسند فرماتا ہے ستھرا ہے اور صفائی کو عزیز رکھتا ہے سخی ہے اور سخاوت کو محبوب رکھتا ہے، فیاض ہے اور فیاضی کو دوست رکھتا ہے۔ لہٰذا تم لوگ اپنے گھروں کے صحن کو بھی صاف ستھرا رکھو اور یہود کی مشابہت سے بچو۔[1]

[1] یہود اس وقت غالباً صحن کی صفائی کا خیال نہ رکھتے ہوں گے۔ لیکن اب تو معاملہ کچھ برعکس سا ہے۔

۱۴۲۔ خوشبو کو رد نہ کرو:

(ابو عثمانؓ النھدی) ارسلہ: اذا اعطی احدکم الریحان فلایردہ فانہ خرج من الجنۃ۔ (ترمذی)

جب تمہیں خوشبودار پھول یا پتی دی جائے تو اُسے رد نہ کرو۔ خوشبو تو جنت سے آئی ہوئی ایک نعمت ہے۔

مرنا یا زخمی ہونا

۱۴۳۔ دو قسم کے مجاہد:

(ابو سعیدؓ) اتی رجل النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال ای الناس افضل؟ قال مؤمن یجاھد بنفسہ ومالہٗ فی سبیل اللہ قال ثم من؟ قال ثم رجل فی شعب من الشعاب یتقی اللہ ویدع الناس من شرہ۔ (الستۃ الا مالکا)

.......ایک شخص نے خدمتِ نبوی میں حاضر ہو کر پوچھا کہ: کون شخص سب سے افضل ہے؟ فرمایا: وہ مومن جو راہِ خدا میں اپنی جان اور مال سے جہاد کرے۔ پوچھا: اس کے بعد کون افضل ہے؟ فرمایا: اس کے بعد وہ افضل ہے جو کسی قبیلے (یا محلے) میں رہتا ہو اور اللہ تعالیٰ کا تقویٰ لیے رکھتا ہو اور لوگوں کو اپنے شر سے محفوظ رکھے۔

۱۴۴۔ دو متضاد چیزوں کا اجتماع:

(ابو ھریرۃؓ) رفعہ: لا یجتمعان فی النار مسلم قتل کافرا ثم سدد وقارب ولا یجتمعان فی جوف مؤمن غبار فی سبیل اللہ وفیح جھنم ولا یجتمعان فی قلب عبد مؤمن الایمان والحسد۔

(مسلم، ابوداؤد، نسائی بلفظہ)

دو شخص اکٹھے جہنم میں نہ جائیں گے، ایک کافر اور دوسرے وہ مسلمان جس نے اسے (بموقعہ جہاد) قتل کیا ہو اور پھر معتدل طریقے سے اپنی زندگی گزاری ہو اور مومن کے دل میں دو چیزیں یکجا نہیں ہو سکتیں۔ جہاد فی سبیل اللہ کی گرد اور جہنم کی پھنکار۔ اور مومن کے دل میں دو چیزیں ایک ساتھ نہیں ہوتیں، ایمان اور حسد۔

۱۴۵۔ جنگ میں قوانینِ اخلاق :

(انسؓ) ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان اذا بعث جیشاً قال انطلقوا بسم اللہ ولا تقتلوا شیخاً فانیاً ولا طفلاً صغیراً ولا امرأۃً ولا تغلوا وضموا غنائمکم واصلحوا واحسنوا ان اللہ یحب المحسنین۔ (ابوداؤد)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب کوئی جیش روانہ کرتے تو فرماتے کہ : اللہ کے نام پر روانہ ہو جاؤ اور کسی بوڑھے کو، کسی بچے کو اور کسی عورت کو قتل نہ کرنا خیانت نہ کرنا، بلکہ غنیمت کو الگ جمع کرنا، مصالح عامہ اور حسن کاری کو پیشِ نظر رکھو کہ اللہ تعالیٰ احسن کاروں کو پسند فرماتا ہے۔

غنیمت اور غلول

۱۴۶۔ غلول کرنے والے کے جرم کو چھپانا :

(سمرۃ) رفعہ : من کتم غالاً فانہ مثلہ۔ (ابوداؤد)

جو کسی غلول کرنے والے کے جرم کو چھپائے وہ بھی ویسا ہی مجرم ہے۔

۱۴۷۔ غلول کرنے والے کا انجام :

(ابن عمروؓ بن العاص) کان علی ثقل النبی صلی اللہ علیہ وسلم رجل یقال لہ کرکرۃ فمات فقال صلی اللہ علیہ وسلم ھو فی النار فذھبوا ینظرون الیہ فوجدوا عباءۃ قد غلھا۔ (بخاری)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامان سفر پر کرکرہ نامی ایک شخص متعین تھا۔ جب وہ مرا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ جہنم میں گیا۔ لوگ اُسے دیکھنے گئے تو اس کے پاس سے ایک عبا نکلی جو اس نے مالِ غنیمت میں سے اُڑا لی تھی۔

۱۴۸۔ ایضاً :

(زید بن خالد) ان رجلا من

ایک شخص جو صحابہؓ میں شمار ہوتا تھا، غزوہ خیبر کے

الصحابة توفی یوم خیبر فذکر لرسول الله صلی الله علیه وسلم فقال صلوا علی صاحبکم فتغیرت وجوه الناس لذلک فقال ان صاحبکم غل فی سبیل الله ففتشنا متاعه فوجدنا خرزا من خرز یهود لا یساوی درهمین (مالک، ابوداؤد، نسائی)

دن مر گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا تو فرمایا: تم ہی لوگ جا کر اس کا جنازہ پڑھ لو (یعنی میں نہیں پڑھوں گا) یہ سن کر لوگوں کے چہرے متغیر ہو گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اس نے مالِ غنیمت میں خیانت کی ہے۔ چنانچہ ہم لوگوں نے جب تفتیش کی تو اس کے پاس سے یہودیوں کے چند منکے نکلے۔ جن کی قیمت دو درہم کے برابر بھی نہ تھی۔

۱۴۹ - لوٹ کا مال حرام ہے:

(رجل من الانصار) خرجنا مع النبی صلی الله علیه وسلم فی سفر فاصاب الناس حاجة شدیدة وجهد فاصابوا غنما فانتهبوها فان قدورنا لتغلی اذ جاء رسول الله صلی الله علیه وسلم یمشی فاکفاء قدورنا بقوسه ثم جعل یرمل اللحم بالتراب ثم قال ان النهبة لیست باحل من المیتة او ان المیتة لیست باحل من النهبة۔ (ابوداؤد)

ہم لوگ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سفر میں تھے کہ لوگوں کو سخت بھوک محسوس ہوئی۔ اتفاق سے کچھ بکریاں نظر آئیں تو سب نے انھیں لوٹ لیا اور ہانڈیاں پکنے لگیں۔ اسی دوران میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ٹہلتے ہوئے تشریف لائے اور (حقیقتِ حال معلوم کرکے) ہماری ہانڈیوں کو اپنی کمان سے اُلٹ اُلٹ کر گوشت کو مٹی میں ملانے لگے۔ پھر فرمایا کہ: لوٹی ہوئی چیز مُردار سے اور مُردار لوٹی ہوئی چیز سے زیادہ حلال نہیں۔

سورۂ آلِ عمران

۱۵۰ - راسخ فی العلم کی تفسیر:

(انس) سئل النبی صلی الله علیه وسلم

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ:

من الراسخون فی العلم؟ قال ھو من تبرت یمینہ وصدق لسانہ وعف فرجہ وبطنہ فذاک الراسخ فی العلم۔ (الکبیر بضعف)

الراسخون فی العلم کون لوگ ہیں؟ فرمایا: جس کی آنکھ میں قرار (نہ بھٹکنا) ہو، زبان سچی ہو، شرم گاہ اور شکم محفوظ ہو، وہی راسخ فی العلم ہے۔

سورۃ النساء

۱۵۱۔ کفارۂ گناہ کی ایک اور شکل:

(علیؓ بن زید) عن امہ: انہا سألت عائشۃؓ عن قول اللہ تعالیٰ ان تبدوا ما فی انفسکم او تخفوہ یحاسبکم بہ اللہ وعن قولہ من یعمل سوء یجز بہ فقالت ما سألنی عنہا احد منذ سألت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال ھذہ معاتبۃ اللہ العبد بما یصیبہ من الحمی والنکبۃ حتی البضاعۃ یضعہا فی ید قمیصہ فیفقدھا فیفزع لہا حتی ان العبد لیخرج من ذنوبہ کما یخرج من ذنوبہ کما یخرج التبر الاحمر من الکیر۔ (ترمذی)

علیؓ بن زید کی والدہ نے حضرت عائشہؓ سے ان تبدوا فی انفسکم او تخفوہ یحاسبکم بہ اللہ (اپنے دل کی بات تم ظاہر کرو یا چھپاؤ اللہ تعالیٰ اس کا محاسبہ کرے گا۔) اور من یعمل سوء یجز بہ (ترجمہ اوپر گزر چکا ہے۔) کا مطلب دریافت کیا تو انھوں نے کہا کہ جب سے میں نے یہی بات حضورؐ سے دریافت کی ہے، اس وقت سے اب تک کسی نے مجھ سے یہ بات نہیں پوچھی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سوال کا یہ جواب دیا کہ: یہ دراصل بندے پر اللہ تعالیٰ کے عتاب کی ایک قسم ہے۔ بندے پر بخار یا دوسری بیماری کی مصیبت آتی ہے یا اس کی کوئی چیز جو وہ اپنی قمیص کی جیب میں رکھتا ہے اور وہ کھو جانے کی وجہ سے صدمہ ہوتا ہے۔ یہ ساری چیزیں اسی عتاب سے تعلق رکھتی ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بندہ اپنے گناہوں سے اس طرح پاک ہو جاتا ہے جس طرح سونا بھٹی میں ڈالنے سے صاف ہو جاتا ہے۔

سورۃ الانعام

۱۵۲۔ فرقے بندی کی بدعت:

(عمرؓ) رفعہ: یا عائشۃؓ ان الذین

اے عائشہؓ ان الذین فرّقوا دینھم و

فرقوا دینھم وکانوا شیعا ھم اصحاب البدع والا ھواء لیس لھم توبۃ انا منھم بریٔ وھم منی براء۔ (للصغیر)

کانوا شیعا (جو لوگ دین میں تفرقہ پیدا کرتے ہیں اور مختلف ٹولیوں میں بٹ جاتے ہیں) یہ وہ لوگ ہیں جو اہل بدعت ہیں اور اپنی خواہشوں کے بندے۔ ان کی توبہ قبول نہیں۔ میں اُن سے اور وہ مجھ سے بری ہیں۔

۱۵۳۔ رحمت الٰہی کی وسعت:

(ابوھریرہؓ) رفعہ: یقول اللہ اذا اراد عبدی ان یعمل سیئۃ فلا تکتبوھا علیہ حتی یعملھا فان عملھا فاکتبوھا بمثلھا وان ترکھا من اجلی فاکتبوھا لہ حسنۃ واذا اراد ان یعمل حسنۃ فلم یعملھا فاکتبوھا لہ حسنۃ فان عملھا فاکتبوھا لہ بعشر امثالھا الی سبع مائۃ (شیخین، ترمذی) وزاد: ثم قرأ من جاء بالحسنۃ فلہ عشر امثالھا (شیخین) عن ابن عباس نحوہ وفیہ: الی سبع مائۃ ضعف الی اضعاف کثیرۃ۔

اللہ تعالیٰ کا کہنا ہے کہ: جب میرا بندہ کسی بُرائی کا ارادہ کرتا ہے لیکن اس پر عمل نہیں کرتا تو (اے کرام کاتبین) اسے اس کے نامۂ اعمال میں نہ لکھو اور اگر وہ اسے میری خاطر ترک کر دے تو ایک نیکی لکھو۔ اور اگر وہ کسی نیکی کا ارادہ کرے اور عمل نہ کر سکے، تو پھر بھی ایک نیکی لکھ لو اور اگر وہ اُسے کر لے تو اسے دس سے لے کر سات سو گنے تک (حسب درجہ اخلاص ومراقع) لکھ لو۔ ترمذی میں اس کے بعد ہے کہ پھر حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ آیت تلاوت فرمائی کہ: من جاء بالحسنۃ فلہ عشر امثالھا۔ (جو ایک نیکی کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی دس گنی جزا دیتا ہے) ابن عباسؓ سے اسی مضمون کی جو روایت ہے اس میں ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک نیکی کی جزا سات سو گنے سے بیشمار گنے تک دیتا ہے۔

مومنون

۱۵۴۔ دفع بالاحسن کی تفسیر:

(ابن عباسؓ) ادفع بالتی ھی احسن قال الصبر عند الغضب

ادفع بالتی ھی احسن (بہترین طریقے سے مدافعت کرو) اس کا طریقہ یہ ہے کہ غصّے کے وقت

والعفو عند الاساءة فاذا فعلوه عصمهم الله وخضع لهم عدوهم (بخاری تعلیقا)

صبر ہو اور برائی کے جواب میں عفو ہو۔ اگر یہ طریقہ اختیار کر لیا جائے تو اللہ تعالیٰ شر سے محفوظ رکھے گا، اور دشمن جھک جائے گا۔

شوریٰ

۱۵۵۔ لمم کی تفسیر:

(ابن عباسؓ) ما رأیت شیئا اشبہ باللمم مما قال ابو ہریرۃؓ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال ان اللہ کتب الی ابن آدم حظہ من الزنا ادرک ذلک لا محالۃ فزنا العینین النظر وزنا اللسان النطق والنفس تتمنی وتشتہی والفرج یصدق ذلک ویکذبہ۔

لمم (چھوٹے گناہ) کے متعلق ابو ہریرہؓ نے جو کچھ بیان کیا ہے، اس سے بہتر بات میری نظر میں کوئی نہیں۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث بیان کی کہ:

فرزند آدم کی قسمت میں اللہ تعالیٰ نے اس کا حصہ زنا رکھ دیا ہے۔ آنکھوں کا زنا نظر بازی ہے اور زبان کا گناہ شہوانی گفتگو، دل تمنا اور خواہش کرتا ہے اور شرم گاہ اس خواہش کی تصدیق یا تکذیب کرتی ہے۔

والبو داؤد فی روایۃ: والاذنان زناہا الاستماع والید زناہا البطش والرجل زناہا الخطا۔ (شیخین)

دوسری روایت میں یہ ہے کہ کانوں کا زنا شہوانی گفتگو سننا ہے، ہاتھ کا زنا اُدھر بڑھنا ہے اور پاؤں کا اُدھر چلنا۔

نجم

۱۵۶۔ چھوٹے گناہوں سے کوئی بندہ نہیں بچ سکتا:

(ابن عباسؓ) الذین یجتنبون کبائر

الذین یجتنبون کبائر الاثم والفواحش الا اللمم کے

الاثم والفواحش الا اللمم قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: ان تغفر اللھم تغفر جما ؛ وای عبدلک لا الما۔ (ترمذی)

سلسلے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ شعر پڑھا کرتے تھے : (ترجمہ) اے اللہ! تیری مغفرت تو بڑے ہی بڑے گناہوں کے لیے ورنہ چھوٹے گناہوں کے ارتکاب سے تیرا کون بندہ بچ سکا ہے۔؟

رحمان

۱۵۷۔ خدا ترسی تمام گناہوں کا کفّارہ ہے :

(ابو الدرداء) انہ سمع النبی صلی اللہ علیہ وسلم وھو یقص علی المنبر ولمن خاف مقام ربہ جنّتان فقلت وان زنا وان سرق یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم؟ فقال الثانیۃ ولمن خاف مقام ربہ جنتان فقلت وان زنا وان سرق؟ فقال الثالثۃ ولمن خاف مقام ربہ جنتان فقلت وان زنا وان سرق؟ قال نعم وان رغم انف ابی الدرداء (احمد، کبیر)

میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو منبر پر یہ آیت تلاوت کرتے سُنا کہ : ولمن خاف مقام ربہ جنّتان (خدا ترس کے لیے دو جنّتیں ہیں) میں نے عرض کیا کہ : اگرچہ وہ خدا ترس زنا اور چوری کر چکا ہو؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری بار یہ آیت پڑھی میں نے پھر یہی سوال کیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تیسری بار پھر یہی آیت تلاوت فرمائی۔ میں نے پھر یہی سوال کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ : ہاں ہاں! اگرچہ ابو درداء کو ناگوار ہو۔

حدید

۱۵۸۔ دل کی زندگی علم و حکمت سے ہوتی ہے :

(ابن عباسؓ) اعلموا ان اللہ یحیی الارض

یہ خوب سمجھ لو کہ : ان اللہ یحیی الارض

بعد موتها قال يلين القلوب بعد قسوتها فيجعلها مخبتة منيبة يحيى القلوب الميتة بالعلم والحكمة وإلا فقد علم احياء الارض بالمطر مشاهدة۔ (رزین)

بعد موتہا (اللہ تعالیٰ زمین کو مُردہ ہو چکنے کے بعد زندہ کر دیتا ہے۔) اسی طرح دلوں کو سخت ہو چکنے کے بعد نرم بھی کر دیتا ہے اور ان کو جھکا کر فرماں بردار بنا دیتا ہے۔ دلوں کو وہ علم و حکمت کے ذریعے زندگی بخشتا ہے اور زمین کا بارش سے زندہ ہونا تو مشاہدے میں آتا ہی ہے۔

تقویٰ

۱۵۹۔ تقویٰ اور رزق کا تعلق:

(معاذ) رفعه: یا ایها الناس اتخذوا تقوی الله تجارة یأتیکم الرزق بلا بضاعة ولا تجارة ثم قرأ ومن یتق الله یجعل له مخرجا ویرزقه من حیث لا یحتسب۔ (کبیر بضعف)

اے لوگو! تقویٰ اللہ کو اپنی تجارت بنالو، تو تمھارے پاس بلا مال اور بلا دکان رزق آئے گا، اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی:

ترجمہ: جو اللہ تعالیٰ کا تقویٰ رکھے گا، اللہ تعالیٰ اس کے لیے سبیل پیدا فرما دے گا اور بے گمان رزق پہنچائے گا۔

نصرت و اخوت و سفارش و تعصب

۱۶۰۔ ظالم اور مظلوم کی امداد:

(انسؓ) رفعه: انصر اخاك ظالما او مظلوما فقال رجل یا رسول الله انصره اذا کان مظلوما افرأیت ان کان ظالما کیف انصره؟ قال تحجزه او تمنعه عن الظالم فان ذلك نصره (بخاری)

اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم، یہ سن کر ایک شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں مظلوم کی تو مدد کر سکتا ہوں لیکن یہ فرمائیے کہ ظالم کی کس طرح مدد کروں؟ فرمایا کہ: اسے ظلم سے روک دو، یہی اس کی مدد ہے۔

۱۶۱۔ مسلمان کی بے عزتی کے وقت مدد کرنا :

(جابرؓ و ابوطلحہؓ) رفعہ: ما من مسلم یخذل امرأ مسلما فی موضع ینتهك فیه حرمته وینتقص فیه من عرضه الا خذله الله فی موضع یحب فیه نصرته وما من امرئ ینصر مسلما فی موضع ینتقص فیه من عرضه وینتهك فیه من حرمته الا نصره الله فی موضع یحب نصرته (ابوداؤد)

کسی مسلمان کی بے عزتی یا بے حرمتی ہو رہی ہو اور دوسرا مسلمان اس کی مدد نہ کرے، تو دوسرے موقعے پر جب کہ اُسے مدد کی ضرورت ہوگی، اللہ تعالیٰ اس کی کوئی مدد نہ کرے گا اور جب کسی مسلمان کی بے حرمتی یا بے عزتی کے موقعے پر دوسرا مسلمان اس کی مدد کرے گا، تو اللہ تعالیٰ بھی دوسرے موقعے پر جب خود اُسے امداد مطلوب ہو اس کی امداد فرمائے گا۔

۱۶۲۔ کسی بھائی کی آبرو کا تحفظ :

(ابوالدرداءؓ) رفعہ: من ذب عرض اخیه رد الله النار عن وجهه یوم القیامة۔ (ترمذی)

جو شخص اپنے کسی بھائی کی آبرو کی مدافعت کرے گا، اللہ تعالیٰ بروزِ قیامت اس کے چہرے سے آگ کو دُور کر دے گا۔

۱۶۳۔ عصبیّت کی صحیح تعریف :

(واثلة بن الاسقع) قلت یا رسول الله ما العصبیة؟ قال ان تعین قومك علی الظلم۔ (ابوداؤد)

میں نے پوچھا کہ: یا رسول اللہ! عصبیت کیا چیز ہے؟ حضورؐ نے جواب دیا کہ: اپنی قوم کے ظلم کی تائید و حمایت کرنا۔

۱۶۴۔ خیر خواہی کی جزا اللہ کی طرف سے :

(ابن عمرؓ) رفعہ: المسلم اخو المسلم

مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ نہ وہ اُس پر

لا یظلمه ولا یسلمه ومن کان فی حاجة اخیه کان الله فی حاجته ومن فرج عن مسلم کربة فرج الله عنه بها کربة من کرب یوم القیامة ومن ستر مسلما ستره الله یوم القیامة - لا ابی داؤد زاد رزین : ومن مشی مع مظلوم حتی یثبت له حقه ثبت الله قدمیه علی الصراط یوم تزول الاقدام -
(شیخین والترمذی)

ظلم کرتا ہے نہ اُسے ہلاکت میں جاتا دیکھ کر چھوڑ دیتا ہے، جو شخص اپنے بھائی کی حاجت روائی کرے گا، اللہ تعالیٰ اُس کی حاجت روائی فرمائے گا۔ اور جو شخص کسی مسلمان کی ایک تکلیف کو دُور کرے گا اللہ تعالیٰ بروزِ حشر اس کی ایک تکلیف کو دُور فرمائے گا اور جو اس کی پردہ پوشی کرے گا، اللہ تعالیٰ بروزِ قیامت اُس کی پردہ پوشی فرمائے گا۔ رزین کی روایت یہ بھی ہے کہ : جو شخص کسی مظلوم کے ساتھ چل کر جائے اور اُس کا حق ثابت کرے تو اللہ تعالیٰ اُسے اس دن ثابت قدم رکھے گا، جس دن بہت سے قدم پھسل جائیں گے۔

۱۶۵ - دین اور خیر خواہی کا ربط :

(ابوھریرۃؓ) رفعه : الدین النصیحة قالوا لمن یارسول الله ؟ قال لله ولکتابه ولائمة المسلمین والمسلم اخو المسلم لا یخذله ولا یکذبه ولا یظلمه وان احدکم مرآة اخیه فان رأی به اذی فلیمطه عنه (ترمذی)

دین نام ہے بہی خواہی کا۔ لوگوں نے پوچھا کہ : کس کی بہی خواہی کا ؟ فرمایا کہ : اللہ تعالیٰ کی، اس کی کتاب کی اور اولی الامر کی، اور مسلمان تو دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ وہ نہ اس کی امداد سے پہلو تہی کرتا ہے نہ اُس سے جھوٹ بولتا ہے اور نہ اس پر ظلم کرتا ہے۔ تم میں ہر شخص دوسرے کا آئینہ ہے۔ لہٰذا جب اُسے تکلیف میں دیکھے تو اُسے دُور کرے۔

۱۶۶ - جماعت مومنین کی مثال :

(ابوموسیٰؓ) رفعه : المؤمن للمؤمن کالبنیان یشد بعضه بعضا وشبك بین اصابعه - (شیخین، ترمذی)

مومن، مومن کے لیے ایسی عمارت ہے جس کا ایک جز دوسرے سے مضبوط جڑا ہوا ہے۔ حضورؐ نے یہ گفتگو فرماتے وقت تمثیل کے لیے اپنے ایک پنجے کو دوسرے پنجے میں ڈال لیا۔

۱۶۷ - ہمنس مکھ ہونا اور پڑوسی کا خیال رکھنا :

(ابو ذرؓ) رفعہ : لا یحقرن احدکم شیئا من المعروف فان لم یجد فلیلق اخاہ بوجہ طلق واذا اشتریت لحما اوطبخت قدرا فاکثر مرقتہ واغرف لجارک منہ ۔ (ترمذی)

کوئی شخص معروف (خوش اطواری) کی تحقیر نہ کرے ۔ اگر یہ نہ کر سکتا ہو تو کم از کم یہی کرے کہ جب اپنے بھائی سے ملے تو خوش روئی سے پیش آئے ، اور جب تم گوشت خرید و یا کوئی ہانڈی پکاؤ تو شوربا کچھ زیادہ کر دو اور تھوڑا اپنے پڑوسی کے لیے بھی نکال لو ۔

۱۶۸ - مرجع خلائق خادم قوم :

(ابن عمرؓ) رفعہ : ان للہ خلقا خلقھم لحوائج الناس یفزع الناس الیھم فی حوائجھم اولئک الآمنون من عذاب اللہ ۔ (کبیر ، بلین)

اللہ تعالیٰ کے کچھ بندے ایسے بھی ہیں جن کو اس نے انسانوں کی حاجت روائی کے لیے پیدا کیا ہے ۔ اپنی ضرورت کے وقت لوگ انہی کی طرف دوڑتے ہیں ۔ ایسے بندے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے محفوظ ہوتے ہیں ۔

۱۶۹ - ہدایت یا ضلالت کی طرف بلانے والا :

(ابو ھریرۃؓ) رفعہ : من دعا الی ھدی کان لہ من الاجر مثل اجور من اتبعہ ولا ینقص ذلک من اجورھم شیئا ومن دعا الی ضلالۃ کان علیہ من الاثم مثل آثام من اتبعہ لا ینقص ذلک من اوزارھم شیئا ۔
(للشیخین ، ابو داؤد ، ترمذی)

جو شخص کسی کو ہدایت کی طرف دعوت دیتا ہے اس کا اجر ویسا ہی ہے جیسے اس پر عمل کرنے والے کا ، بغیر اس کے کہ عمل کرنے والے کے اجر میں کوئی کمی واقع ہو اور جو کسی گمراہی کی طرف دعوت دے اس کا گناہ بھی ویسا ہی ہے جیسے اس پر عمل کرنے والے کا ، بغیر اس کے کہ عمل کرنے والے کے بوجھ میں کوئی کمی آئے ۔

ایمان و اخلاق کے تقاضے

---

۱۷۰ - اہل ایمان کے باہمی ربط کی مثال :

(النعمان بن بشیرؓ) رفعہ : مثل

باہمی یگانگت محبت و رحمت اور لطف و کرم میں

المومنین فی توادھم وتراحمھم و تعاطفھم مثل الجسد اذا اشتکی منه عضو تداعی له سائر الجسد بالسھر والحمی ۔ (شیخین)

اہل ایمان کی مثال ایک جسم کی سی ہے، کہ اگر ایک عضو میں کوئی تکلیف ہو، تو سارا جسم ہی شب بیداری اور بخار میں اس کا شریک ہو جاتا ہے۔

۱۷۱۔ محبّت کی اطلاع دینا:

(المقدام رض) رفعه: اذا احب الرجل اخاه فلیخبره انه یحبه ۔ (ابو داؤد، ترمذی)

اگر کوئی مسلمان اپنے مسلمان بھائی سے محبّت کرتا ہو تو اُسے بتا دینا چاہیے کہ میں تم سے محبّت کرتا ہوں۔

۱۷۲۔ محبّت و عداوت میں میانہ روی:

(ابو ھریرة رض) احبب حبیبك ھونا ما عسیٰ ان یکون بغیضك یوما ما و ابغض بغیضك ھونا ما عسیٰ ان یکون حبیبك یوما ما ۔ ترمذی وقال اراه رفعه ۔

اپنے دوست سے اعتدال کے ساتھ محبّت کرو۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی روز تمھارا دشمن ہو جائے اور اپنے دشمن سے دشمنی بھی اعتدال کے ساتھ رکھو ممکن ہے کہ وہ کسی روز تمھارا دوست ہو جائے۔

۱۷۳۔ محض اللہ تعالیٰ کے لیے باہمی محبّت رکھنا:

(ابو ھریرة رض) رفعه: یقول الله تعالیٰ یوم القیامة این المتحابون لجلالی؟ الیوم اظلھم فی ظلی لا ظل الا ظلی ۔ (مالك، مسلم)

اللہ تعالیٰ بروز قیامت فرمائے گا کہ میری خاطر باہم محبّت کرنے والے لوگ کہاں ہیں؟ آج میں اُنھیں اپنے سایۂ رحمت میں لوں گا جب کہ میرے سائے کے سوا کوئی اور سایہ موجود نہیں۔

۱۷۴۔ محبّت و عداوت اللہ تعالیٰ کے لیے:

(ابو ذر رض) افضل الاعمال الحب فی الله والبغض فی الله ۔ (ابو داؤد)

بہترین عمل ہے اللہ تعالیٰ کے لیے محبّت کرنا اور اللہ تعالیٰ ہی کے لیے بُغض رکھنا۔

۱۷۵۔ صرف اللہ تعالیٰ کے لیے محبت رکھنے والوں کا مقام:

(عمرؓ) رفعہ: ان من عباد اللہ ناسًا ما ھم بانبیا ولا شھداء یغبطھم الانبیاء والشھداء یوم القیامۃ بمکانھم من اللہ قالوا یا رسول اللہ تخبرنا من ھم؟ قال ھم قوم تحابوا بروح اللہ علی غیر ارحام بینھم ولا اموال یتعاطونھا فواللہ ان وجوھھم لنور وانھم لعلی نور لا یخافون اذا خاف الناس ولا یحزنون اذا حزن الناس وقرء الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون۔ (ابو داؤد)

اللہ تعالیٰ کے کچھ بندے ایسے بھی ہیں جو نبی یا شہید تو نہیں، مگر انبیاء اور شہداء کو بھی اُن کا مرتبہ دیکھ کر رشک آئے گا، لوگوں نے عرض کیا کہ: یا رسول اللہ! وہ کون لوگ ہیں؟ ارشاد ہوا: یہ وہ لوگ ہیں جو آپس میں وحدتِ روح کی وجہ سے محبت رکھتے ہیں۔ نہ رشتے داری کو اس میں دخل ہوتا ہے۔ نہ مالی لین دین کو۔ خدا کی قسم اُن کے چہرے ہمہ تن نُور ہوں گے۔ اور یہ نُور پر ہی قائم ہوں گے۔ دوسرے لوگ خوف و حزن میں مبتلا ہوں گے۔ اور ان کو کوئی خوف و غم نہ ہوگا۔ پھر حضورؐ نے یہ آیت تلاوت فرمائی کہ: الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون (اللہ کے دوستوں کو کوئی خوف و حزن نہ ہوگا)۔

۱۷۶۔ حبّ و بغض کا فیصلہ پہلے آسمان پر ہوتا ہے:

(ابو ہریرہؓ) رفعہ: ان اللہ اذا احبّ عبدًا دعا جبریل فقال انی احب فلانا فاحبہ فیحبہ جبریل ثم ینادی فی السماء فیقول ان اللہ یحب فلانا فاحبوہ فیحبہ اھل السماء ثم یوضع لہ القبول فی الارض واذا ابغض عبدًا دعا جبریل فیقول انی ابغض فلانا فابغضہ جبریل ثم ینادی فی اھل السماء ان اللہ یبغض فلانا فابغضوہ فیبغضونہ ثم یوضع لہ البغضاء فی الارض۔ (بخاری، مسلم، ترمذی بلفظ مسلم)

اللہ تعالیٰ جب کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو جبریلؑ کو بلا کر بتاتا ہے کہ میں فلاں سے محبت رکھتا ہوں تم بھی اس سے محبت رکھو پھر جبریلؑ بھی اس سے محبت کرتے ہیں اور وہ آسمان میں پکار کر بتا دیتے ہیں کہ: اللہ تعالیٰ فلاں بندے سے محبت کرتا ہے لہٰذا تم بھی اس سے محبت کرو بغرض اہلِ آسمان بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ اس کے بعد اس کی مقبولیت کا پروانہ زمین پر نازل ہوتا ہے اور جب اللہ کسی بندے سے بغض رکھتا ہے تو جبریل علیہ السلام کو بلا کر بتاتا ہے کہ میں فلاں سے بغض رکھتا ہوں تم بھی اس سے بغض رکھو چنانچہ جبریلؑ بھی اس سے بغض کرنے لگتے ہیں اور آسمان والوں کو ندا دے کر بتاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فلاں بندے سے بغض رکھتا ہے لہٰذا تم اس سے بغض رکھو چنانچہ آسمان والے بھی بغض رکھنے لگتے ہیں اور پھر اس کے لیے پروانۂ بغض زمین پر نازل ہوتا ہے۔

۱۷۷۔ محبّ کا حشر محبوب کے ساتھ :

(انسؓ) ان رجلا سأل النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال متی الساعۃ؟ قال وما اعددت لھا؟ قال لاشیٔ الا انی احب اللہ ورسولہ فقال انت مع من احببت قال انسؓ فما فرحنا بشیٔ فرحنا بقولہ صلی اللہ علیہ وسلم انت مع من احببت فانا احب النبی صلی اللہ علیہ وسلم وابابکرؓ وعمرؓ و ارجوان اکون معھم بحبی ایاھم وان لم اعمل اعمالھم۔
(شیخین، ابوداؤد، ترمذی)

ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ قیامت کب آئے گی؟ حضورؐ نے فرمایا: تم نے اس کے لیے کیا تیاری کی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ: اور تو کچھ نہیں ہے، بس اتنی سی بات ہے کہ میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ سے محبّت رکھتا ہوں۔ فرمایا: پھر تم اُسی کے ساتھ ہو گے جس سے تم محبت رکھتے ہو۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے اس ارشاد سے کہ تم اسی کے ساتھ ہوگے جس سے محبّت رکھتے ہو" جتنی خوشی ہوتی ہے کسی چیز سے نہیں ہوئی۔ کیونکہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اور حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ سے محبت رکھتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ اس اپنی محبّت کی وجہ سے میرا حشر بھی انہی بزرگواروں کے ساتھ ہوگا۔ اگرچہ ان جیسے میرے عمل نہیں۔

۱۷۸۔ ارواح کی مختلف ٹولیاں :

(عائشۃ) وفد قدمت امرأۃ مزاحۃ من اھل مکۃ المدینۃ فنزلت علی نظیرۃ لھا فقالت عائشۃؓ صدق حبّی صلی اللہ علیہ سمعتہ یقول الارواح جنود مجندۃ فما تعارف منھا ائتلف وما تنافر منھا اختلف۔ (بخاری)

مکّے کی رہنے والی ایک بذلہ سنج، پُر مذاق عورت مدینے آئی اور اپنے ہی جیسی ایک عورت کے پاس ٹھہری۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے کہا کہ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ فرمایا ہے کہ: روحیں مختلف گروہوں میں منقسم ہوتی ہیں۔ جو باہم متعارف ہوتی ہیں۔ وہ مل بھی جاتی ہیں اور جو متعارف نہیں ہوتیں وہ الگ ہوجاتی ہیں۔

۱۷۹۔ اللہ اور اُس کے بندوں کے فیصلے کی یکسانی :

(ابوسعیدؓ) رفعہ: الا اخبرکم باحبکم الی اللہ؟ قالوا بلی قال ان احبکم الی اللہ احبکم الی الناس الا اخبر کم

میں تمھیں بتا نہ دوں کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب کون ہے؟ لوگوں نے کہا: ضرور ارشاد ہو۔ فرمایا: سب سے زیادہ محبوب اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی وہی ہے جو انسانوں

بابغضکم الی اللہ؟ قلنا بلی قال ان ابغضکم الی اللہ البغضکم ابغضکم الی الناس (اوسط وفیہ عبد الرحمٰن بن حیدۃ الانباری)

کو سب سے زیادہ محبوب ہو۔ پھر فرمایا: میں بتادوں کہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں سب سے زیادہ قابلِ نفرت کون ہے؟ لوگوں نے عرض کیا: ضرور! فرمایا: جو انسانوں کی نگاہ میں زیادہ قابلِ نفرت ہے وہی اللہ کے نزدیک بھی زیادہ قابلِ نفرت ہے۔

۱۸۰۔ نماز، روزے سے بھی افضل عمل:

(ابوالدرداءؓ) رفعہ: الا اخبرکم بافضل من درجۃ الصیام والصلوٰۃ والصدقۃ؟ قالوا بلی قال صلاح ذات البین فان فساد ذات البین ھی الحالقۃ (ابوداؤد، ترمذی)

میں تمھیں ایک ایسی چیز نہ بتادوں جس کا درجہ صوم، صلوٰۃ اور صدقے سے بھی افضل ہے؟ لوگوں نے کہا: ضرور ارشاد ہو۔ فرمایا: باہم صلح رکھنا، کیونکہ باہمی فساد تباہ کن چیز ہے۔

۱۸۱۔ حسن خلق کی وصیت:

(معاذؓ) کان آخر ما اوصانی بہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم حین وضعت رجلی فی الغرزان قال یا معاذ احسن خلقک للناس۔ (موطا)

جس وقت میں سفر میں جا رہا تھا۔ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو آخری وصیت فرمائی وہ یہ تھی کہ: اے معاذ! لوگوں کے ساتھ اپنے اخلاق اچھے رکھو۔

۱۸۲۔ غرض بعثت نبوی:

(مالکؒ) بلغہ: ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال بعثت لاتمم حسن الاخلاق۔ (ابوداؤد)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں مبعوث ہی اس لیے ہوا ہوں کہ حُسن اخلاق کو کمال تک پہنچا دوں۔

۱۸۳۔ حسن خلق کا عجیب درجہ:

(عائشۃؓ) رفعتہ: ان المؤمن لیدرک بحسن خلقہ درجۃ الصائم القائم۔ (ابوداؤد)

مومن محض اپنے حُسنِ اخلاق کی وجہ سے صائم النہار اور شب زندہ دار کے درجہ کو پالیتا ہے۔

۱۸۴۔ مقیاس ایمان :

(عائشۃؓ) رفعتہ : ان من اکمل المؤمنین ایماناً احسنھم خلقاً و الطفھم باھلہ ۔ (ترمذی)

جس کے اخلاق سب سے بہتر ہوں، اور جو اپنے اہل وعیال پر سب سے زیادہ مہربان ہو وہی ایمان میں بھی سب سے زیادہ کامل ہے۔

۱۸۵۔ خلق حسن کا وزن :

(ابوالدرداءؓ) رفعہ : ما من شئ اثقل فی میزان المؤمن یوم القیامۃ من خُلق حسن وان اللہ تعالیٰ یبغض الفاحش البذی ۔ (ترمذی)

قیامت کے دن اچھے اخلاق سے زیادہ کوئی چیز بھی مومن کی میزان میں زیادہ وزن نہیں رکھتی اور اللہ تعالیٰ بے حیا بیہودہ گو سے بغض رکھتا ہے۔

۱۸۶۔ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا سب سے زیادہ پیارا اور سب سے زیادہ قابلِ نفرت :

(جابرؓ) رفعہ : ان من احبکم الی واقربکم منی مجلساً یوم القیامۃ احاسنکم اخلاقاً وان ابغضکم الی وابعدکم منی مجلساً یوم القیامۃ الثرثارون والمتشدقون والمتفیھقون ۔ (ترمذی)

مجھے سب سے زیادہ محبوب اور بروزِ حشر سب سے زیادہ قریب وہ لوگ ہوں گے جو اخلاق میں سب سے زیادہ بہتر ہوں اور میری نگاہ میں سب سے زیادہ مبغوض اور بروز قیامت مجھ سے سب سے زیادہ دور وہ لوگ ہوں گے جو زیادہ بکواس کرتے ہوں اور خواہ مخواہ کلام کو طول دیتے ہوں اور تکبر کرتے ہوں۔

۱۸۷۔ اثم (گناہ) کی قابلِ غور تعریف :

(النواس بن سمعان) رفعہ : البر حسن الخلق والاثم ما حاک فی صدرک وکرھت ان یطلع علیہ الناس (مسلم، ترمذی)

بِرّ (نیکی) حسن خلق کا نام ہے اور اثم (گناہ) وہ ہے جو تمہارے دل پر اثر کرے اور تمہیں یہ پسند نہ ہو کہ دوسروں کو اس کا علم ہو۔

۱۸۸۔ حیا اور بے حیائی کا انجام :

(ابوھریرۃؓ) رفعہ : الحیاء من الایمان والایمان فی الجنۃ والبذاء من الجفاء والجفاء فی النار ۔

حیا ایمان ہی کا ایک جزء ہے اور ایمان کا انجام بہشت ہے فحش کلامی بدخلقی ہے اور بدخلقی کا انجام دوزخ ہے۔

۱۸۹ - حیا اور بے حیائی کا اثر دوسری چیزوں پر :

(انس رض) رفعه : ماشان الفحش فی شیٔ الاشانه وما کان الحیاء فی شیٔ الازانه - (ترمذی)

بے حیائی جس چیز میں بھی شامل ہوگی اُسے معیوب بنا دے گی اور حیا جس شے میں ہوگی اُسے مزین کر دے گی۔

۱۹۰ - دین اسلام کا قوام :

(زید بن طلحة بن رکانة) بسنده مرفوعا: ان لکل دین خلقا و خلق الاسلام الحیاء - (مالك)

ہر دین کا ایک خاص اخلاقی مزاج ہوتا ہے اور اسلام کا اخلاقی قوام حیا ہے۔

۱۹۱ - دوست کا انتخاب :

(ابو ھریرة رض) رفعه : المرء علی دین خلیله فلینظر احدکم من یخالل - (ابو داؤد، ترمذی)

انسان اپنے دوست کے دین (طریقۂ زندگی) پر ہوا کرتا ہے اس لیے ہر شخص کو یہ دیکھ لینا چاہیئے، کہ وہ کس سے دوستی کر رہا ہے۔

۱۹۲ - حلقۂ احباب مقیاس ہے :

(ابن مسعود رض) قال اعتبروا الناس باخوانهم (کبیر بلین)

لوگوں کا اندازہ ان کے بھائی بندوں سے کر لیا کرو۔

۱۹۳ - عفو و درگزر کی تاثیر :

(ابن عمر رض) رفعه : تعافوا تسقط الضغائن بینکم - (بزار بضعف)

باہم عفو و درگزر سے کام لیا کرو اس سے باہمی کینے دُور ہو جاتے ہیں۔

۱۹۴ - سوئے ظن سے بچو :

(انس رض) رفعه : احترسوا من الناس بسوء الظن - (اوسط بمدلس)

لوگوں کے متعلق بدگمانی سے بچو۔

۱۹۵۔ دورخاپن کا حشر:

(ابوہریرہؓ) رفعہ: تجدون من شر الناس عند اللہ تعالیٰ یوم القیامۃ ذاالوجہین الذی یأتی ہؤلاء بوجہ وہؤلاء بوجہ۔ (الستۃ الا النسائی)

اللہ تعالیٰ کے نزدیک بروز قیامت سب سے بدتر اسے پاؤ گے جو دورخی پالیسی والا ہوگا۔ اِدھر اس کا کچھ اور رُخ، اور اُدھر کچھ اور۔

۱۹۶۔ اطمینان وسکون کی فضیلت:

(سہل بن سعدؓ) رفعہ: الاناۃ من اللہ والعجلۃ من الشیطان۔ (ترمذی)

سنجیدگی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے۔ اور جلدبازی شیطان کی طرف سے۔

۱۹۷۔ کسی کی تعریف کرنے کا طریقہ:

(ابوبکرۃؓ) اثنی رجل علی رجل عند النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال ویلک قطعت عنق صاحبک قطعت عنق صاحبک ثلاثا ثم قال من کان منکم مادحا اخاہ لامحالۃ فلیقل احسب فلانا واللہ حسیبہ ولا یزکی علی اللہ احدا احسب کذا وکذا ان کان یعلم ذلک منہ۔ (شیخین، ابوداؤد)

ایک شخص نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک دوسرے شخص کی تعریف کی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار فرمایا کہ: تم نے اپنے رفیق کی گردن کاٹ ڈالی۔ پھر فرمایا کہ اگر تمھیں اپنے بھائی کی تعریف کرنی ہی پڑے تو یوں کہو کہ: میرا گمان فلاں کے متعلق یہ ہے اور حقیقتِ حال کا علم اللہ ہی کو ہے کسی کی تعریف میں اللہ تعالیٰ سے آگے مت بڑھ جاؤ۔ تمھیں اگر کسی کے متعلق قابلِ تعریف ہونے کا یقین ہے، تو بس اتنا کہہ دو کہ میرے خیال میں وہ ایسا ہے۔

۱۹۸۔ نرمی سے جو محروم ہو:

(جریرؓ) رفعہ: من یحرم الرفق یحرم الخیر کلہ۔ (مسلم، ابوداؤد)

جو نرمی سے محروم ہوا وہ ساری خوبیوں سے محروم ہوا۔

امر و نہی اور خیر خواہی

۱۹۹۔ درجاتِ ایمان اور اس کے تقاضے (برائی کو دیکھنے کے بعد):

(ابو سعیدؓ) رفعه : من رای منکم منکرا فلیغیره بیده فان لم یستطع فبلسانه فان لم یستطع فبقلبه و ذلک اضعف الایمان۔
(مسلم، اصحاب سنن)

تم میں سے جس شخص کو منکر (خلاف مرضی الٰہی بات) نظر آئے وہ اُسے اپنے ہاتھ (طاقت) سے ٹھیک کر دے۔ اگر اُس کی قدرت نہ ہو تو زبان سے کام لے اور اُس کا بھی یارا نہ ہو تو دل سے ہی سہی اور یہ ایمان کا سب سے ضعیف درجہ ہے۔

۲۰۰۔ ظلم سے نہ روکنے کی سزا:

(ابو بکرؓ) یا ایها الناس انکم تقرءون هذه الآیة وتضعونها علی غیر موضعها یا ایها الذین آمنوا علیکم انفسکم لا یضرکم من ضل اذا اهتدیتم وانا سمعنا رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول ان الناس اذا راوا الظالم فلم یأخذوا علی یدیه اوشک ان یعمهم الله بعقاب۔
(ابو داؤد، ترمذی)

اے لوگو! تم آیت پڑھتے ہو لیکن اسے اس کا صحیح مقام نہیں دیتے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ: (ترجمہ) مسلمانو! اپنے آپ کو سنبھال لو۔ ایسا نہ ہو کہ تمھارے ہدایت یافتہ ہو چکنے کے بعد کوئی گمراہ تمھیں نقصان پہنچا دے۔ ہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ: لوگ کسی ظالم کو ظلم کرتے دیکھیں اور اس کا ہاتھ نہ پکڑلیں۔ (یعنی اسے ظلم سے نہ روک دیں) تو یہ کچھ بعید نہیں اللہ سب ہی کو اپنے عتاب کی لپیٹ میں لے لے۔

۲۰۱۔ امر و نہی ایک دائمی فریضہ ہے:

(حذیفہؓ) رفعه : والذی نفسی بیده لتأمرون بالمعروف ولتنهون عن

قسم ہے اس ذات پاک کی کہ جس کے قبضے میں میری جان ہے تم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ضرور کرتے

المنکر اولیوشکن الله یبعث علیکم عقابا منه ثم تدعونه فلا یستجیب لکم۔ (ترمذی)

رہو ورنہ یہ بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ تم سب پر اپنا عتاب نازل فرمائے اور تم اُسے پکارنے رہو جب بھی جواب نہ ملے۔

۲۰۲۔ سب سے بڑا جہاد:

(ابوسعیدؓ) رفعه: ان من اعظم الجهاد کلمة عدل عند سلطان جائر۔ (ابوداؤد، ترمذی)

ظالم سلطان کے آگے عدل کا کلمہ کہہ دینا سب سے بڑا جہاد ہے۔

۲۰۳۔ واعظ بے عمل کا حشر:

(اسامةؓ)..... وانی سمعته یقول مررت لیلة اسری بی باقوام تقرض شفاههم بمقاریض من نار قلت من هؤلاء یا جبریل؟ قال خطباء امتک الذین یقولون ما لا یفعلون۔ (شیخین)

...... میں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو یہ کہتے سنا ہے کہ: میں شب اسرا ایسے لوگوں کے پاس سے گزرا جن کے ہونٹ آگ کی قینچی سے کاٹے جا رہے تھے۔ میں نے جبریل علیہ السلام سے پوچھا: یہ کون لوگ ہیں؟ انھوں نے کہا کہ: یہ آپؐ کی اُمت کے وہ خطبا ہیں جو کہتے تھے لیکن عمل نہیں کرتے تھے۔

۲۰۴۔ گمراہی اپنی انتہا کو کس طرح بتدریج پہنچتی ہے:

(علیؓ) رفعه: کیف بکم اذا فسق فتیانکم و طغیٰ نساءکم؟ قالوا یا رسول الله وان ذلک لکائن؟ قال نعم و اشد کیف بکم اذا لم تأمروا بالمعروف وتنهوا عن المنکر؟ قالوا یا رسول الله وان ذلک لکائن؟ قال نعم واشد کیف بکم اذا امرتم بالمنکر ونهیتم عن المعروف؟ قالوا

کیا حال ہوگا تم لوگوں کا اُس وقت جب تمھارے نوجوان فاسق اور تمھاری عورتیں بدکار ہو جائیں گی۔؟ لوگوں نے عرض کیا کہ: یا رسول اللہ! کیا واقعی ایسا ہو جائے گا؟ فرمایا: ہاں اس سے بھی بڑھ چڑھ کر، اور کیا حال ہوگا جب تم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ترک کر دو گے؟ لوگوں نے عرض کیا کہ: یہ بھی ہوگا؟ فرمایا: ہاں! اس سے بھی سوا ہوگا۔ جب تم منکر کا حکم دینے لگو گے اور معروف سے روکنے لگو گے۔ لوگوں نے عرض کیا کہ:

الله وان ذلك لكائن قال نعم واشد كيف بكم اذا رأيتم المعروف منكرًا والمنكر معروفا (رزين)

یا رسول اللہ! کیا یہاں تک نوبت آجائے گی؟ فرمایا: ہاں! اس سے بھی زیادہ جب تم معروف کو منکر اور منکر کو معروف سمجھنے لگو گے (یعنی قدریں ہی بدل جائیں گی)

۲۰۵۔ تذلیل مومن کے وقت ترک مدد:

(سهل بن حنيف) رفعه: من اذل عنده مؤمن فلم ينصره وهو يقدر على ان ينصره اذله الله على رؤس الخلائق يوم القيٰمة۔ (احمد كبير)

جس کے سامنے کسی مومن کی تذلیل ہو رہی ہو اور وہ امداد کی قدرت رکھتا ہوا بھی اس کی مدد نہ کرے تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تمام مخلوق کے سامنے اُسے رسوا کرے گا۔

۲۰۶۔ آٹے کے ساتھ گھن کیوں پستا ہے؟:

(جابرؓ) رفعه: اوحى الله الى ملك من الملائكة ان اقلب مدينة كذا وكذا على اهلها قال ان فيها عبدك فلان لم يعصك طرفة عين قال اقلبها عليه وعليهم فان وجهه لم يتمعر في ساعة قط۔ (اوسط بلين يعني لم يغضب الله)

اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتے کو حکم دیا کہ فلاں شہر کا طبقہ اُلٹ دو۔ فرشتے نے عرض کیا کہ: بارالٰہا! اس میں تیرا فلاں بندہ بھی ہے جس نے ایک لحظے کے لیے بھی تیری نافرمانی نہیں کی۔ ارشاد ہوا کہ: اس پر بھی اور دوسروں پر بھی شہر کو اُلٹ دو، کیونکہ لوگوں کی بداعمالیوں کی وجہ سے کبھی اس کے چہرے سے ناگواری کا اثر ظاہر نہیں ہوا۔

۲۰۷۔ امر ونہی کے لیے سو فی صد عمل ہونا ضروری نہیں:

(انسؓ) قلنا يا رسول الله لانأمر بالمعروف حتى نعمل به ولا ننهى عن المنكر حتى نجتنبه كله؟ فقال بل مروا بالمعروف وان لم تعملوا به

ہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ: کیا امر ونہی کا فریضہ اس وقت تک ادا نہ کریں جب تک معروف پر پورا عمل اور نہی سے کامل اجتناب نہ کرلیں؟ فرمایا: اگرچہ معروف پر تمہارا پورا عمل اور منکر سے کامل پرہیز

وانهوعن المنكر وان لم تجتنبوه كله - (اوسط صغير بضعف)

نہ ہو لیکن امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیے جاؤ۔

۲۰۸۔ دین ہر ایک کی خیر خواہی کا دوسرا نام ہے:

(تميم الدارى) رفعه: ان الدين النصيحة قلنا لمن يارسول الله؟ قال لله ولكتابه ولرسوله ولائمة المسلمين وعامتهم (مسلم، ابوداؤد، نسائی)

دین تو نام ہے خیر خواہی کا۔ ہم نے پوچھا کہ: یارسول اللہ! کس کی خیر خواہی؟ فرمایا: اللہ، قرآن، رسولؐ، اولی الامر اور عوام کی۔

۲۰۹۔ بیعت اسلام کی شرط خاص:

(جرير بن عبد الله) اتيت النبى صلى الله عليه وسلم فقلت ابايعك على الاسلام فشرط على الاسلام فشرط على والنصح لكل مسلم (للثلاثة الامالكا)

میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر عرض کیا کہ: بیعت اسلام کرنا چاہتا ہوں حضورؐ نے منجملہ اور باتوں کے ہر مسلمان کی خیر خواہی کو بھی شرط اسلام قرار دیا۔

حُسنِ نیّت اور صدق و کذب

۲۱۰۔ جہاد کا مقصد ہدایت ہے نہ کہ غنیمت و قتل:

(على بن سهل رضٰ)..... قال على ان اباه حدثه قال بعثنا رسول الله صلى الله عليه وسلم فى سرية فلما بلغنا المغار استحثثت فرسى فسبقت اصحابى وتلقانى الحى بالرنين فقلت لهم قولوا لا اله الا الله تحرزوا فقالوها فلامنى اصحابى وقالوا احرمتنا الغنيمة

..... حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم لوگوں کو ایک سریے میں بھیجا۔ جب ہم لوگ مقام غارت گری پر پہنچے تو میں نے اپنے گھوڑے کو تیز کر دیا اور اپنے ساتھیوں سے آگے نکل گیا۔ مجھے زنین کا وہ قبیلہ مل گیا۔ ان سے میں نے کہا کہ: لا الٰہ الا اللہ کہہ دو تو تم محفوظ ہو جاؤ گے انہوں نے کلمۂ شہادت پڑھ لیا اور بچ گئے۔ اس پر میرے ساتھیوں نے مجھے یہ کہہ کر ملامت کی کہ: تم نے ہم لوگوں کو مالِ غنیمت سے محروم کر دیا۔

فلما قدمنا علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اخبروہ بالذی صنعت فدعانی فحسن لی ما صنعت وقال اما ان اللہ قد کتب لک من کل انسان منھم کذا وکذا .... (رزین)

جب ہم لوگ واپس آئے تو میرے اس فعل کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ملی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بلا کر میرے اس فعل کی تحسین فرمائی اور فرمایا کہ ہر انسان (جس کی جان بچی) کے بدلے اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے یہ یہ انعام رکھا ہے ....

۲۱۱ - غلط مفتی اور غلط مشیر:

(ابو ھریرۃؓ) رفعہ: من افتی بغیر علم کان اثمہ علی من افتاہ ومن اشار علی اخیہ بامر یعلم ان الرشد فی غیرہ فقد خانہ - (ابوداؤد)

جو بغیر واقفیت کے فتویٰ دے تو اس غلط فتوے کا گناہ اس مفتی کے سر ہوگا، اور جو شخص اپنے بھائی کو ایسی بات کا مشورہ دے جس کے متعلق وہ جانتا ہے کہ یہ صحیح مشورہ نہیں وہ خیانت کا مرتکب ہوتا ہے۔

۲۱۲ - مشورہ امانت ہے:

(ام سلمۃؓ) رفعتہ: المستشار مؤتمن۔ (ترمذی، ابوداؤد عن ابی ھریرۃؓ)

جس سے مشورہ لیا جائے اُس کی حیثیت امین کی ہو جاتی ہے۔

۲۱۳ - اللہ تعالیٰ کی نظر ظاہر پر نہیں ہوتی:

(ابو ھریرۃؓ) رفعہ: ان اللہ لا ینظر الی صورکم واموالکم ولکن انما ینظر الی اعمالکم وقلوبکم - (قزوینی)

اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں یا باتوں کو نہیں دیکھتا بلکہ تمہارے اعمال اور دلوں کو دیکھتا ہے۔

۲۱۴ - ایضاً:

(ابن عباسؓ) رفعہ: من اخلص للہ اربعین صباحاً ظھرت ینابیع الحکمۃ من قلبہ علی لسانہ - (رزین)

اگر کوئی شخص چالیس یوم مسلسل اخلاص و للہیت میں بسر کرے تو اس کے دل اور زبان سے حکمت کے چشمے اُبلنے لگتے ہیں۔

۲۱۵ - شک سے اطمینان کی طرف :

(ابوالجوزاء السعدی) قلت للحسن ابن علی ماحفظت من النبی صلی اللہ علیہ وسلم؟ قال حفظت منہ دع مایریبک الی مالایریبک فان الصدق طمانینۃ والکذب ریبۃ۔ (ترمذی، نسائی)

میں نے حسنؓ بن علیؓ سے پوچھا کہ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کون سا ارشاد آپ کو یاد ہے؟ بولے کہ: مجھے یہ بات یاد ہے کہ: جو بات تمھیں شک میں ڈالے اُسے چھوڑ کر وہ بات کرو جس میں کوئی شک نہ رہے کیونکہ سچ اطمینان کا ذریعہ اور جھوٹ شک کا سبب ہے۔

۲۱۶ - جھوٹ کا اثر :

(ابن عمرؓ) رفعہ: اذاکذب العبد تباعد عنہ الملک میلا من نتن ما جاء بہ۔ (ترمذی)

جب بندہ جھوٹ بولتا ہے تو فرشتہ اُس کی بدبو سے میلوں دُور بھاگ جاتا ہے۔

۲۱۷ - کسی کو خوش کرنے کے لیے جھوٹ بولنا :

(بہزؓ بن حکیم) عن ابیہ عن جدہ رفعہ: ویل للذی یحدث بالحدیث یضحک بہ القوم فیکذب ویل لہ ویل لہ (ابوداؤد، ترمذی)

بُرا (ناس) ہو اُس کا جو محض لوگوں کو ہنسانے کے لیے جھوٹی باتیں کرتا ہو ایسے شخص کے لیے بربادی ہی بربادی ہے۔

۲۱۸ - دروغ گوئی کا بدترین انداز :

(سفیان بن اسید الحضرمی) رفعہ: کبرت خیانۃ ان تحدث اخاک حدیثا ھولک بہ مصدق وانت لہ بہ کاذب۔ (ابوداؤد)

تم اپنے بھائی سے کوئی ایسی بات بیان کرو جس میں وہ تمھیں سچا سمجھ رہا ہو اور تم دراصل جھوٹ کہہ رہے ہو تو یہ شدید گناہ ہے۔

سخاوت وبخل

۲۱۹۔ سخی وبخیل کا فرق :

(ابوھریرۃ) رفعہ : السخی قریب من الله قریب من الناس قریب من الجنۃ بعید من النار والبخیل بعید من الله بعید من الناس بعید من الجنۃ قریب من النار ولجاھل سخی احب الی الله من عابد بخیل (ترمذی)

سخی اللہ، انسان اور جنت تینوں سے قریب ہوتا ہے اور دوزخ سے دُور، اور بخیل اللہ تعالیٰ، انسان اور جنت تینوں سے دُور ہوتا ہے اور آگ سے قریب۔ ایک جاہل (یعنی گنوار اور اُجڈ) مگر سخی اللہ کو بخیل عابد سے زیادہ پیارا ہوتا ہے۔

۲۱۹۔ منفق پر خدا کا انفاق :

(ابوھریرۃ) رفعہ : قال الله تعالیٰ اَنفِقْ اُنفِقْ علیك وقال صلی الله علیه وسلم ید الله ملآی لا یغیضها نفقۃ سحاء اللیل والنهار أرأیتم ما انفق منذ خلق السموات والارض فانه لم یغض ما فی یده ...... (شیخین وترمذی)

اللہ تعالیٰ کا کہنا ہے کہ : تم دوسروں پر انفاق کرو تو میں تم پر انفاق کروں گا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: اللہ تعالیٰ کا ہاتھ معمور ہی رہتا ہے۔ رات دن کی بارشِ جود وعطا سے بھی اس میں کوئی کمی نہیں آتی۔ دیکھتے نہیں کہ زمین وآسمان کی آفرینش کے دن سے آج تک کبھی اس کے خزانے میں کمی نہیں آسکی۔

۲۲۰۔ دولت مند خدا کی بادشاہت میں کس طرح جاسکتا ہے؟ :

(ابوذر رض) انتھیت الی النبی صلی الله علیه وسلم وھو جالس فی ظل الکعبۃ فلما رانی قال ھم الاخسرون ورب الکعبۃ فجئت حتی جلست فلم اتقار ان قمت فقلت یا رسول الله فداك ابی وامی من ھم؟ قال ھم الاکثرون اموالا الا من قال ھکذا وھکذا وھکذا من بین یدیه

حضور صلی اللہ علیہ وسلم دیوار کعبہ کے سائے میں بیٹھے تھے اور میں وہاں حاضر ہوا۔ مجھے دیکھ کر فرمایا: ربِّ کعبہ کی قسم وہ لوگ گھاٹے میں ہیں۔ میں حضورؐ کے پاس آکر بیٹھ گیا اور تھوڑی دیر بھی نہ گزری تھی کہ میں کھڑا ہو گیا اور عرض کیا کہ: حضورؐ پر میرے ماں باپ قربان ہوں، وہ کون لوگ ہیں؟ (جن کے متعلق ابھی فرمایا ہے کہ وہ لوگ گھاٹے میں ہیں) فرمایا: وہ لوگ جو دولت مند ہیں بجز ان دولت مندوں کے جو اپنی دولت ہر چہار طرف

ومن خلفه وعن یمینه وعن شماله و قلیل ما هم ۔ (شیخین، ترمذی، نسائی)

(راہِ خدا میں) دیتے ہیں اور ایسے لوگ بہت کم ہیں۔ اس موقعے پر حضورؐ نے ہاتھوں سے اپنے آگے، پیچھے، دائیں، بائیں دینے کا ارشاد فرمایا۔

۲۲۰۔ شُحّ بدترین خصلت ہے:

(ابن عمرؓ) رفعه: ایاکم و الشحّ فانما هلك من کان قبلکم بالشح امرهم بالبخل فبخلوا و امرهم بالفجور ففجروا ۔ (ابوداؤد)

شُحّ (بخیلانہ حرص یا حریصانہ بخل) سے بچو، پچھلی اُمتیں اسی شُحّ کی وجہ سے ہلاک ہوئی ہیں۔ یہ شُحّ انھیں بُخل پر اُکساتا تو وہ بُخل کرتے اور جب فجور پر اُبھارتا تو فجور کرتے۔

۲۲۱۔ جائداد بنانے سے بچو:

(ابن مسعودؓ) رفعه: لا تتخذوا الضیعة فترغبوا فی الدنیا ۔ (ترمذی)

اپنی کوئی جائیداد نہ بناؤ۔ ورنہ دنیا میں پھنس جاؤ گے۔

۲۲۲۔ اُمت کے لیے سب سے بڑا فتنہ:

(کعبؓ بن عیاضؓ) رفعه: ان لکل امة فتنة و ان فتنة امتی المال ۔ (ترمذی)

ہر اُمت کے لیے ایک ذریعہ آزمائش ہوتا ہے اور میری اُمت کا ذریعہ آزمائش مال ہے۔

۲۲۳۔ مال میں مالدار کا اصلی حصہ کتنا ہے؟:

(ابوھریرہؓ) یقول العبد مالی مالی و إنّما له من ماله ثلاث ما اکل فافنی او لبس فابلی او اعطی فاقتنی وما سوی ذلك فهو ذاهب تارکه للناس ۔

(مسلم)

بندہ "میرا مال میرا مال" بکتا رہتا ہے، حالانکہ مال میں اس کا حصہ صرف تین چیزیں ہوتی ہیں: (۱) جو وہ کھاکر ہضم کر لیتا ہے۔ (۲) پہن کر پُرانا کر دیتا ہے۔ (۳) اور کسی کو دے کر اپنا ذخیرۂ آخرت بناتا ہے۔ ان تین چیزوں کے علاوہ جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ چلا جاتا ہے یا وہ اُسے دوسروں کے لیے چھوڑ جاتا ہے۔

۲۲۴۔ انسان کا اپنا مال کونسا ہے ؟ :

(ابن مسعودؓ) رفعه : ایکم مال وارثه احب الیه من ماله؟ قالوا یارسول الله مامنا احد الا ماله احب الیه قال فان ماله ماقدّم ومال وارثه ما اخر۔ (بخاری و نسائی)

حضورؐ نے پوچھا کہ : تم میں کون شخص ہے جسے اپنے مال سے زیادہ اپنے وارث کا مال پیارا ہے ؟ لوگوں نے عرض کیا کہ : یارسول اللہ ! ہم میں ایسا تو کوئی بھی نہیں جسے اپنا مال زیادہ پیارا نہ ہو۔ فرمایا : تو سن لو کہ ہر ایک کا اپنا مال وہ ہے جو وہ آگے بھیج چکا ہے (یعنی راہِ خدا میں دے چکا ہے) اور دوسروں کا مال وُہ ہے جو اس نے رکھ چھوڑا ہے۔

۲۲۵۔ دنیا مومن و کافر کے لیے :

(ابو ھریرۃؓ) الدنیا سجن المؤمن وجنّة الکافر۔ (مسلم، ترمذی)

دُنیا مومن کے لیے قیدخانہ اور کافر کے لیے جنّت ہے۔

۲۲۶۔ حُبِّ دنیا انسان کو کیا بنا دیتی ہے ؟ :

(النوؓ) رفعه : حُبُّ الدنیا رأس کل خطیئة وحبك الشئی یعمی ویصم۔ (رزین)

دُنیا کی محبّت گناہوں کی جڑ ہے۔ کسی شے کی محبّت انسان کو اندھا اور بہرا کر دیتی ہے۔

۲۲۷۔ انسان کی مثال اِس دُنیا میں :

(ابن مسعودؓ) مالی وللدنیا ما انا والدنیا الا کراکب استظلّ تحت شجرة ثم راح وترکھا۔ (مسلم، ابوداؤد)

میرا دنیا سے کیا سروکار ہے، میری اور دُنیا کی مثال ایسی ہے جیسے ایک مسافر کسی درخت کے سائے تلے ذرا آرام کرے اور پھر اُسے چھوڑ کر چل دے۔

۲۲۸۔ آخرت کے مقابلے میں دُنیا کی ہستی کی مثال :

(المستورد اخوبنی نهر) رفعه : ما

آخرت کے مقابلے میں دنیا کی مثال

الدنیا فی الآخرة الامثل ما یجعل احدکم اصبعه هذه واشار یحیی بالسبابة فی الیم فلینظر بم یرجع۔ (مسلم، ترمذی)

ایسی ہے جیسے کوئی یہ انگلی (یعنی انگشت شہادت) سمندر میں ڈال کر نکال لے۔ پھر دیکھے کہ اس نمی کو پورے سمندر سے کیا نسبت ہے؟

اخلاق رذیلہ

۲۲۹۔ بہادر کون ہے:

(ابو ھریرۃؓ) رفعه، لیس الشدید بالصرعة انما الشدید الذی یملك نفسه عند الغضب۔ (شیخین، موطأ)

بہادر وہ نہیں جو کسی کو پچھاڑ دے، بہادر وہ ہے جو غصّے کے وقت اپنے اُوپر قابو رکھے۔

۲۳۰۔ غصّے کی حقیقت اور اُس کا علاج:

(ابووائل)...... قال لی النبیّ صلّی اللّٰہ علیه وسلّم ان الغضب من الشیطان وان الشیطان خلق من نار وانما یطفأ النار بالماء فاذا غضب احدکم فلیتوضأ۔ (ابوداؤد)

...... عطیہ کا بیان ہے کہ مجھے حضور صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ: غصّہ شیطانی فعل ہے شیطان آگ سے پیدا ہوا ہے اور آگ پانی سے بجھتی ہے لہٰذا جسے غصّہ آئے وہ وضو کر لے۔

۲۳۱۔ ایضاً:

سلیمان بن سردؓ) استب رجلان عند النبیّ صلّی اللّٰہ علیه وسلّم ونحن عنده فبینما احدهما یسب صاحبه مغضبا قد احمر وجهه فقال صلّی اللّٰہ علیه وسلّم انی لاعلم کلمة لو

دو شخصوں نے حضور صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم کے سامنے آپس میں گالی گلوچ کی ہم لوگ بھی وہیں موجود تھے۔ ان دونوں میں ایک شخص دوسرے کو گالی دے رہا تھا تو غصّے سے اُس کا چہرہ لال ہو رہا تھا حضور صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ: مجھے ایک کلمہ ایسا معلوم ہے کہ اگر وہ اُسے

فالها لذهب عن الذی یجد لو قال اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم ذھب مایجد ..... (شیخین، ابوداؤد)

زبان سے ادا کرے (یا اس کا قائل ہو جائے) تو اس کا غصہ جاتا رہے۔ یعنی اگر وہ اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم کہے تو اس کا غصہ دور ہو جائے۔

۲۳۲۔ ترکِ غصہ کی نصیحت کی تکرار:

(ابوھریرۃؓ) ان رجلا قال للنبی صلی اللہ علیہ وسلم مرنی بامر و اقلله علی کی اعقله قال لا تغضب فردد مراراً قال لا تغضب (بخاری، موطأ، ترمذی)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک شخص نے عرض کیا کہ: مجھے کوئی حکم فرمائیے مگر وہ ایسا مختصر ہو کہ میرے دماغ میں آجائے۔ فرمایا: غصہ نہ کیا کرو۔ اس نے بار بار اپنا سوال دہرایا اور حضورؐ نے ہر بار یہی فرمایا کہ: غصہ نہ کیا کرو۔

۲۳۳۔ غصے کا ایک اور علاج:

(ابن عباسؓ) رفعه: علموا ولیسروا ولا تعسروا واذا غضب احدکم فلیسکت واذا غضب احدکم فلیسکت واذا غضب احدکم فلیسکت۔ (احمد، کبیر)

تعلیم دو اور آسانی کو پیشِ نظر رکھو اور دشواری نہ پیدا کرو۔ پھر تین بار فرمایا: اگر کسی کو طیش آجائے تو سکوت اختیار کرلے۔

۲۳۴۔ حکام کے لیے قابلِ غور:

(محمد بن عطیۃؓ) عن ابیه عن جده۔ رفعه: اذا استشاط السلطان تسلط الشیطان۔ (احمد، کبیر)

اگر کسی سلطان پر غصہ سوار ہو تو سمجھ لو کہ اس پر شیطان مسلط ہو گیا ہے۔

۲۳۵۔ غیبت کی تعریف اور بہتان سے فرق:

(ابوھریرۃؓ) رفعه: أتدرون ما الغیبة؟ قالوا اللہ ورسوله اعلم قال ذکرک اخاک بما یکره فقال رجل ارأیت ان کان فی اخی ما اقول؟

جانتے ہو کہ غیبت کیا چیز ہے؟ انھوں نے عرض کیا: اللہ اور رسولؐ بہتر جانتا ہے، فرمایا: کسی کا اپنے بھائی کے متعلق ایسی باتیں بیان کرنا جو اُسے ناگوار ہوں۔ ایک شخص نے عرض کیا: اگر اس میں واقعی وہ بات موجود ہو جیں

قال ان کان فیه ما تقول فقد اغتبته وان لم یکن فیه ما تقول فقد بهتّه ۔ (ابوداؤد، ترمذی)

کہتا ہوں ؟ فرمایا : تم جو کچھ کہو اگر وہ واقعی اس میں موجود ہو تو یہ غیبت ہوگی ۔ اور اگر اس میں وہ بات نہ ہو جو تم کہہ رہے ہو تو یہ بہتان ہوگا ۔

۲۳۶۔ شبہہ غیبت پر نوٹس :

(عائشةؓ) قلت یا رسول الله حسبك من صفیة قصرها قال لقد قلت کلمة لو مزج بها البحر لمس جبته .... (ابوداؤد، ترمذی)

میں (عائشہ رض) نے عرض کیا کہ : یا رسول اللہ ! صفیہؓ (ام المؤمنین) کی مذمت کے لیے تو ان کا پست قامت ہونا ہی کافی ہے ۔ حضورؐ نے فرمایا کہ : تم نے ایسی بات کہی ہے کہ اگر اسے سمندر میں ملا دیا جائے تو وہ اُسے بھی گدلا کر دے ...

۲۳۷۔ مسلمان کی بے حرمتی بھی سُود خواری ہے :

(سعید بن زید) رفعه : ان من اربی الربوا الاستطالة فی عرض المسلم بغیر حق ۔ (ابوداؤد)

بدترین ربا (سود) کسی مسلمان کی عزت پر بے جا حملہ ہے ۔

۲۳۸۔ چغل خور کا انجام :

(حذیفةؓ) رفعه : لا یدخل الجنة قتات ۔ (شیخین، ابوداؤد، ترمذی)

چغل خور جنّت میں نہیں جائے گا ۔

۲۳۹۔ بلیغ تنبیہ :

(ابن مسعودؓ) کنا عند النبی صلی الله علیه وسلم فقام رجل فوقع فیه رجل من بعده فقال له صلی الله علیه وسلم تخلل فقال ومما اتخلل یا رسول الله أاکلت لحما ؟ قال انك اکلت لحم اخیك ۔ (کبیر)

ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے کہ ایک شخص اُٹھ کر چلا گیا ۔ دوسرے شخص نے اس کے جانے کے بعد اس کی کچھ عیب چینی کی ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ : خلال کر لو ۔ اس نے کہا : خلال کس بات کا ؟ کیا میں نے کوئی گوشت کھایا ہے ؟ فرمایا : ہاں تم نے اپنے بھائی کا گوشت کھایا ہے ۔

لہو ولعب

۲۴۰۔ کبوتر بازی :

(ابوھریرۃؓ) ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم رای رجلا یتبع حمامۃ فقال شیطان یتبع شیطانۃ (ابوداؤد)

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کبوتر باز کو کسی کبوتر کے پیچھے جاتے دیکھا تو فرمایا : شیطانہ کے پیچھے شیطان لگا ہوا ہے۔

۲۴۱۔ نشانے بازی کی مشق ذی رُوح پر :

(ابن جبیر)...... ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم لعن من اتخذ الروح عرضًا۔ (شیخین، نسائی)

.... جو شخص کسی ذی روح پر نشانے بازی کی مشق کرے، اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے۔

۲۴۲۔ اظہارِ مسرت کا ایک طریقہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا :

(انسؓ) لما قدم النبی صلی اللہ علیہ وسلم المدینۃ لعبت الحبشۃ لقدومہ فرحا بذلک لعبوا بحرابھم۔ (ابوداؤد)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینے میں تشریف لائے تو حبشیوں نے اپنے نیزوں کے کرتب دکھا کر اپنی خوشی کا اظہار کیا۔

لعن وطعن

۲۴۳۔ مومن کی زبان کا منفی پہلو :

(ابن مسعودؓ) رفعہ : لیس المؤمن بطعان ولا لعان ولا فاحش ولا بذی۔ (ترمذی)

مومن نہ لعن طعن کیا کرتا ہے، نہ بے حیائی نہ فحش گوئی۔

۲۴۴۔ مومن کو گالی دینے اور قتل کرنے کا فرق :

(ابن مسعودؓ) رفعه : سباب المؤمن من فسوق وقتاله کفر۔ (شیخین، ترمذی، نسائی)

مومن کو گالی دینا فسق اور اس سے جنگ کرنا کفر ہے۔

۲۴۵۔ کسی کو فاسق و کافر کہنے کا نتیجہ :

(ابوذرؓ) رفعه : لا یرمی رجل رجلا بالفسق او الکفر الا ارتدت علیه ان لم یکن صاحبه کذلك۔ (بخاری)

اگر کسی کو فاسق یا کافر کہا جائے اور وہ دراصل ایسا نہ ہو تو یہ الفاظ پلٹ کر کہنے والے ہی پر آئیں گے۔

۲۴۶۔ کسی چیز پر لعنت کرنے کے بعد :

(ابوالدرداءؓ) رفعه : اذا لعن العبد شیئا صعدت اللعنة الی السماء فتغلق ابواب السماء دونها ثم تهبط الی الارض فتغلق ابوابها دونها فتأخذ یمینا وشمالا فا ذا لم تجد مساغاً رجعت الی الذی لعن فان کان لذلك اهلا والا رجعت الی قائلها۔ (ابوداؤد)

جب بندہ کسی پر لعنت کرتا ہے، تو وہ لعنت آسمان کی طرف جاتی ہے اور آسمان کے دروازے اس لعنت کو روکنے کے لیے بند ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ زمین کی طرف آتی ہے تو زمین کے دروازے بھی بند ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ دائیں بائیں جاتی ہے اور جب اُسے کوئی ٹھکانا نہیں ملتا تو اس کے بعد اُدھر جاتی ہے جس پر لعنت کی گئی ہے۔ اگر وہ واقعی اس لعنت کا مستحق ہوا تو فبہا، ورنہ لعنت کرنے والے کی طرف پلٹ آتی ہے۔

۲۴۷۔ گالی کا آغاز کرنے والا :

(ابوھریرةؓ) رفعه : المستبان ما قالا فعلی البادی منهما حتی یعتدی المظلوم۔ (مسلم، ابوداؤد، ترمذی)

دو آدمی جب ایک دوسرے کو گالیاں دیتے ہیں تو ان سب گالیوں کا گناہ اس پر ہوتا ہے جو ابتدا کرے۔ الّا آنکہ مظلوم زیادتی کا مرتکب ہو۔

۲۴۸ - زمانے کو برا بھلا کہنا :

(ابو ھریرۃؓ) رفعه : قال اللہ تعالیٰ یسب بنو آدم الدھر وانا الدھر بیدی اللیل والنھار - وفی روایة: یؤذینی ابن آدم یقول یا خیبة الدھر فانی انا الدھر اقلب لیله ونھاره - (شیخین، ابوداؤد، موطأ)

اللہ تعالیٰ کا کہنا ہے : یہ آدم زادے "زمانے" کو گالی دیتے ہیں، حالانکہ میں ہی زمانہ ہوں۔ یعنی رات اور دن میرے قبضے میں ہیں۔ دوسری روایت کے الفاظ یوں ہیں کہ : جب فرزندِ آدمؑ یہ کہتا ہے کہ یہ نامراد "زمانہ"، تو دراصل مجھے (اللہ کو) اذیت پہنچاتا ہے (لہٰذا کوئی زمانے کو نامراد نہ کہے) کیونکہ زمانہ میں خود ہی ہوں، یعنی رات اور دن کو میں ہی گردش دیتا ہوں -

۲۴۹ - ہوا پر ملامت کرنا :

(ابن عباسؓ) ان رجلا نازعته الریح رداءہ فلعنھا فقال النبی صلی اللہ علیه وسلم لا تلعنھا فانھا مأمورة مسخرة وانه من لعن شیئاً لیس له باھل رجعت علیه - (ابوداؤد، ترمذی)

ہوا ایک آدمی کی چادر کو اُڑانے لگی تو اس نے ہوا پر لعنت کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ہوا پر لعنت نہ کرو - یہ تو مامور و مسخر ہے (یعنی ارادے سے نہیں چلتی) جو شخص کسی پر لعنت کرے اور وہ اُس کا مستحق نہ ہو تو وہ لعنت کرنے والے پر پلٹ آتی ہے -

۲۵۰ - مُردوں کی برائی کرنا :

(عائشۃؓ) رفعه لا تسبوا الاموات فانھم قد افضوا الی ما قدموا - (بخاری، ابوداؤد، ترمذی)

مُردوں کو بُرا بھلا نہ کہا کرو وہ جو کچھ آگے بھیج چکے ہیں اُدھر ہی جا چکے ہیں -

۲۵۱ - مُردوں کی خوبیاں بیان کرنی چاہئیں :

(ابن عمرؓ) رفعه : اذکروا محاسن موتاکم وکفوا عن مساویھم (ابوداؤد، ترمذی)

مُردوں کی نیکیوں کا ذکر کرو اور برائیوں کے ذکر سے پرہیز کرو -

۲۵۲۔ اُونٹنی پر لعنت:

(عمران بن حصینؓ) بینما النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی بعض اسفارہ و امرأۃ من الانصار علی ناقۃ لھا فضجرت فلعنتھا فسمع ذلک صلی اللہ علیہ وسلم فقال خذوا ما علیھا و دعوھا فانھا ملعونۃ قال عمران فکأنی اراھا الآن تمشی فی الناس ما یعرض لھا احد۔ (مسلم، ابوداؤد)

ایک سفر کے موقعے پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک انصاریہ عورت بھی اپنی اُونٹنی پر سوار تھی۔ اُس کی کسی بات سے زچ ہو کر اُس نے اپنی اُونٹنی پر لعنت کی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سُنا تو فرمایا: اسے نیچے اُتار کر چھوڑ دو۔ یہ معلونہ ہے۔ اس وقت میری (عمران کی) آنکھوں کے سامنے وہ منظر ہے کہ وہ لوگوں میں پیدل چلی جا رہی ہے اور کوئی اُس کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔

حسد، بدگمانی و پردہ دری

۲۵۳۔ حسد، رشک کے دو جائز موقعے:

(ابن مسعودؓ) لا حسد الا فی اثنتین رجل اتاہ اللہ الحکمۃ فھو یقضی بھا و یعلمھا و رجل اتاہ اللہ مالا فسلطہ علی ھلکتہ فی الحق۔ (شیخین)

(حسد و رشک) صرف دو موقعوں پر غیر مُضر ہو سکتا ہے: ایک تو ایسے آدمی سے جسے اللہ نے حکمت دی ہو اور وہ اُسی کے مطابق فیصلے دیتا ہو اور اُس کی تعلیم دیتا ہو، دوسرے اُس آدمی سے جسے اللہ نے مال دیا ہو اور وہ اسے راہِ حق میں فنا کرنے کے درپے ہو۔

۲۵۴۔ حسد کا انجام:

(ابو ھریرۃؓ) رفعہ: ایاکم والحسد فان الحسد یأکل الحسنات کما تأکل النار الحطب او قال العشب۔ (ابوداؤد)

حسد سے بچو! یہ نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑی کو۔

۲۵۵ - بدگمانی، ایک مسلمان دوسرے کے لیے کیسا ہو؟ :

(ابو ھریرۃؓ) رفعه: ایاکم والظن فان الظن اکذب الحدیث ولا تجسسوا ولا تنافسوا ولا تحاسدوا ولا تباغضوا ولا تدابروا وکونوا عباد اللہ اخوانا کما امرکم المسلم اخو المسلم لا یظلمه ولا یخذله ولا یحقره التقوی ھھنا التقوی ھھنا التقوی ھھنا ویشیر الی صدرہ حسب امرئ من الشر ان یحقر اخاہ المسلم کل المسلم علی المسلم حرام دمه وعرضه وماله ان اللہ لا ینظر الی اجسادکم ولا الی صورکم و اعمالکم ولکن ینظر الی قلوبکم۔

(للستة الا النسائی)

بدگمانی سے بچو! کیونکہ یہ سب سے بڑا جھوٹ ہے۔ ٹوہ بھی نہ لیا کرو۔ تاہم خودغرضی، حسد، بغض اور دشمنی نہ کیا کرو۔ اللہ کے بندے اور بھائی بھائی بنے رہو۔ جیساکہ حکم الٰہی ہے: مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے، ایک مسلمان دوسرے پر ظلم نہیں کرتا، اُسے بےیار و مددگار نہیں چھوڑتا اور اس کی تحقیر نہیں کرتا۔ پھر اپنے دل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ: تقویٰ اس جگہ ہوتا ہے، اس جگہ ہوتا ہے، اس جگہ ہوتا ہے۔ کسی کی طرف سے شر ہونے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کی تحقیر کرے۔ ہر مسلمان کا خون آبرو اور مال دوسرے مسلمان پر حرام ہے۔ اللہ تمھارے جسموں شکلوں اور عملوں کو نہیں دیکھتا بلکہ تمھارے دلوں کو دیکھتا ہے۔

۲۵۶ - تین دن سے زیادہ ترک کلام کیے رہنا:

(ابو ھریرۃؓ) رفعه: لا یحل لمؤمن ان یھجر مؤمنا فوق ثلاث فان مرت به ثلاث فلیلقه ولیسلم علیه فان رد علیه فقد اشترکا فی الاجر ان لم یرد علیه فقد باء بالاثم۔

(ابوداؤد)

مومن کے لیے یہ حلال نہیں کہ دوسرے مومن سے تین دن سے زیادہ قطع تعلق کیے رہے۔ اگر تین دن ہو جائیں تو چاہیئے کہ وہ اُس سے ملے اور اُسے سلام کرے۔ اگر وہ سلام کا جواب دے تو دونوں ہی اجر میں شریک ہوں گے اور اگر جواب نہ دے تو خود گناہ کی لپیٹ میں آجائے گا۔

۲۵۷ - مومن کی حرمت کا قیام :

(ابن عمرؓ) صعد النبیّ صلّی الله علیه وسلّم المنبر فنادی بصوت رفیع فقال یا معشر من اسلم بلسانه ولم یُفض الایمان الی قلبه لاتؤذوا المسلمین ولا تعیروهم ولا تتبعوا عوراتهم فان من یتبع عورة اخیه المسلم یتبع الله عورته ومن یتبع الله عورته یفضحه ولو فی جوف رحله وقال نافع ونظر ابن عمر یوما الی الکعبة فقال ما اعظمكِ وما اعظم حرمتك والمؤمن اعظم حرمةً عند الله منكِ - (ترمذی)

حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے ایک بار منبر پر چڑھ کر زوردار آواز میں پکار کر فرمایا کہ: اے وہ لوگو! جو زبان سے اسلام لے آئے ہو اور دل میں ابھی ایمان نہیں اُترا ہے، مسلمانوں کو اذیت نہ پہنچاؤ، ان کو شرمندہ نہ کرو اور ان کی پردے کی باتوں کے پیچھے نہ پڑو۔ جو شخص اپنے مسلمان بھائی کے پردے کی باتوں کے پیچھے پڑتا ہے اللہ تعالٰی اس کی پردہ دری کرکے رُسوا کرے گا خواہ وہ اپنے گھر میں کیوں نہ بند ہو۔

نافعؓ کا بیان ہے کہ: حضرت ابن عمرؓ نے ایک دن کعبے کو دیکھ کر فرمایا: تیری شان اور تیرا احترام زبردست ہے لیکن اللہ تعالٰی کی نظروں میں ایک مسلمان کا احترام تجھ سے بھی زیادہ ہے۔

۲۵۸ - کسی کی مُصیبت پر خوش ہونے کا انجام :

(واثلة بن الاسقع) رفعه: لاتظهر الشماتة باخیك فیعافیه الله ویبتلیك- (ترمذی)

اپنے بھائی کی مصیبت پر خوشی کا اظہار نہ کیا کرو۔ ورنہ اُسے تو اللہ عافیت دے گا، اور تمھیں اُسی میں مبتلا کر دے گا۔

۲۵۹ - بلیغ اندازِ تنبیہ :

(عائشةؓ) کان النبیّ صلّی الله علیه وسلّم اذا بلغه عن الرجل لم یقل مابال فلان؟ ولکن یقول مابال اقوام یقولون کذا وکذا- (ابی داؤد)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ: جب کسی کی کوئی شکایت پہنچتی تو یہ کبھی نہ فرماتے کہ: فلاں شخص کا کیا حال ہے بلکہ یوں فرماتے کہ ان قوموں کا کیا حال ہے جو ایسا کہتے ہیں (یا ایسا کرتے ہیں)

تکبّر و ریاکاری وغیرہ

۲۶۰- تکبّر اور جمال پسندی کا فرق :

(ابن مسعودؓ) رفعہ: لا یدخل الجنّۃ من کان فی قلبہ مثقال حبۃ من کبر فقال رجل ان الرجل یحب ان یکون ثوبہ حسنا و نعلہ حسنا قال ان اللہ جمیل و یحب الجمال الکبر بَطَرُ الحق وَغَمْطُ الناس۔ (مسلم، ترمذی، ابو داؤد)

جس کے دل میں رائی برابر بھی کبر ہوگا وُہ بہشت میں نہیں جائے گا۔ ایک شخص نے کہا کہ: انسان تو یہ پسند کرتا ہے کہ اس کا کپڑا جُوتا اچھا ہو۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اللہ جمیل ہے اور جمال کو پسند فرماتا ہے۔ یہ کبر نہیں۔ بلکہ انکار حق اور لوگوں کو نگاہ حقارت سے دیکھنا کبر ہے۔

۲۶۱- ریاکار قاری کا ٹھکانا :

(ابو ھریرۃؓ) رفعہ: تعوذوا باللہ من جُبِّ الحزن قالوا وما جُبُّ الحزن؟ قال وادٍ فی جہنّم تتعوذ منہ جہنّم کل یوم مائۃ مرۃ قیل ومن یدخلہ؟ قال القراء المراؤن باعمالھم۔ (ترمذی)

"حبّ حزن" سے اللہ تعالٰی کی پناہ مانگو لوگوں نے پوچھا کہ "حبّ حزن" کیا چیز ہے؟ فرمایا: جہنّم کا ایک طبقہ ہے جس سے خود دوزخ ہر روز سوبار پناہ مانگتی ہے۔ پوچھا گیا کہ: اس میں جائے گا کون؟ فرمایا: ریاکار قرّاء۔

۲۶۲- پوشیدہ نیکی کے ظاہر ہو جانے پر خوشی :

(ابو ھریرۃؓ) ان رجلا قال یا رسول اللہ الرجل یعمل فیُسِرّھا ذا اطّلع علیہ اعجبہ ذلک فقال صلّی اللہ علیہ وسلّم لہ اجران اجر السرّ و

ایک شخص نے پوچھا کہ: یا رسول اللہ! بعض اوقات انسان چھپا کر نیک عمل کرتا ہے۔ لیکن جب وہ ظاہر ہو جاتا ہے تو اُسے خوشی ہوتی ہے (یہ ریاکاری تو نہیں؟) فرمایا: اس کے لیے دوہرا اجر ہے

اجر العلانیة - (ترمذی)

ایک پوشیدہ رکھنے کا اور دوسرا ظاہر ہو جانے کا۔

۲۶۳۔ اکبر الکبائر:

(ابو بکرۃؓ) رفعه: الا انبئکم باکبر الکبائر ثلاثا الاشراک باللہ وعقوق الوالدین الا وشھادة الزور وقول الزور وکان متکئا فجلس وما زال یکررھا حتی قلنا لیتہ سکت۔

(شیخین، ترمذی)

میں تمہیں سب سے بڑے گناہوں (اکبر کبائر) کی نشان دہی نہ کر دوں؟ یہ تین بار دہرانے کے بعد فرمایا کہ: یہ گناہ ہیں: اللہ کے ساتھ شرک کرنا اور والدین کی نافرمانی اور سُن لو جھوٹی گواہی اور جھوٹا بیان بھی حضورؐ اُس وقت ٹیک لگائے ہوئے تھے۔ پھر اُٹھ بیٹھے اور اس کی (یعنی جھوٹی گواہی اور جھوٹے بیان کی) اتنی بار تکرار فرماتے رہے کہ ہم لوگ دل میں کہنے لگے کہ کاش! حضور صلی اللہ علیہ وسلم اب بس فرمائیں۔

۲۶۴۔ نو کبائر:

(عبید بن عمیرؓ) عن ابیه: انّ النبیّ صلی اللہ علیه وسلّم قال وقد سأله رجل عن الکبائر فقال ھن تسع فذکر الشرک والسحر وقتل النفس واکل الربوا واکل مال الیتیم والتولی لیوم الزحف وقذف المحصنات وعقوق الوالدین واستحلال البیت الحرام قبلتکم احیاء وامواتا۔ (رزین)

ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کبائر (بہت بڑے گناہوں) کو دریافت کیا کہ وہ کون کون سے ہیں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ نو ہیں (۱) شرک (۲) سحر (۳) قتل نفس (۴) سُود خوری (۵) یتیم کا مال کھانا (۶) جہاد کے موقع پر فرار اختیار کرنا (۷) پاکدامن عورتوں پر تہمت لگانا (۸) والدین کی نافرمانی کرنا (۹) کعبۃ اللہ میں خلاف حرمت کام کرنا، خواہ زندوں کے ذریعے سے یا مُردوں کے۔

۲۶۵۔ علاماتِ نفاق:

(ابن عمروؓ بن العاص) رفعه: اربع من کن فیه کان منافقا خالصا و من کانت فیه خصلة منھن کانت فیه خصلة من النفاق حتی یدعھا

چار خصلتیں ایسی ہیں جو کسی کے اندر یکجا ہوں تو وہ پکا منافق ہوتا ہے۔ اور اگر کسی میں ایک خصلت ہو تو اس میں نفاق کی ایک خصلت ہوگی تا آنکہ وہ اُسے ترک کر دے (۱) جب امین بنایا جائے تو خیانت کرے (۲) بات کرے تو جھوٹ بولے۔

اذا ائتمن خان واذا حدث کذب واذا عاھد غدر واذا خاصم فجر۔ (للستة الا مالکا)

(۳) جب معاہدہ کرے تو عہد شکنی کرے اور (۴) جب جھگڑے تو حد سے تجاوز کر جائے۔

جھگڑنا

۲۶۶۔ مناظرہ قوموں کی بربادی ہے:

(ابوامامہؓ) ما ضل قوم بعد ھدی کانوا علیه الا اوتوا الجدل ثم تلا ما ضربوہ لك الا جدلا بل ھم قوم خصمون۔ (ترمذی)

ہدایت کے بعد وہی قوم گمراہی کی طرف آتی ہے جس میں جھگڑنے کی عادت پیدا ہو جاتی ہے، اس کے بعد حضورؐ نے یہ آیت پڑھی: (ترجمہ) اے رسولؐ! یہ لوگ محض جھگڑنے کے لیے آپؐ پر ضرب المثل چسپاں کرتے ہیں۔ یہ لوگ ہیں ہی جھگڑالو۔

۲۶۷۔ اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ قابلِ نفرت:

(عائشہؓ) رفعته: ان ابغض الرجال الی الله الالد الخصم۔ (شیخین، ترمذی، نسائی)

اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ قابلِ نفرت وہ لوگ ہیں جو جھگڑنے میں سب سے زیادہ بڑھ چڑھ کر ہیں۔

نام اور کنیت

۲۶۸۔ ناموں میں جمالیاتی رعایت:

(ابوالدرداؓ) رفعه: انکم تدعون یوم القیامة باسمائکم واسماء آبائکم فاحسنوا اسمائکم۔ (ابوداؤد)

تم لوگوں کو بروزِ قیامت تمہارے اور تمہارے آباء کے نام سے بلایا جائے گا۔ اس لیے اپنے نام اچھے رکھو۔

۲۶۹۔شاہنشاہ کا لقب ذلیل ترین نام ہے:

(ابو ہریرۃؓ) رفعه: ان اخنع اسم عند الله رجل تسمّٰی ملك الاملاك لاملك الا الله قال سفیان مثل شاهنشاه۔ (شیخین، ابو داؤد، ترمذی)

اللہ تعالیٰ کے نزدیک ذلیل ترین نام جو کوئی رکھ سکتا ہے مَلِکُ الاملاک (شاہنشاہ) ہے۔ بادشاہ اللہ کے سوا کوئی نہیں۔ سفیان نے اس کی مثال میں لفظ "شاہنشاہ" بتایا ہے۔

۲۷۰۔ناموں میں ذوقِ نبویؐ:

(یحییٰ بن سعیدؒ) ان النبی صلی الله علیه وسلّم قال للقحة تحلب من یحلب هذه؟ فقام رجل فقال له صلّی الله علیه وسلّم ما اسمك۔؟ قال مرة فقال له اجلس ثم قال من یحلب هذه؟ فقام رجل فقال له صلی الله علیه وسلّم ما اسمك؟ قال حرب فقال له اجلس ثم قال من یحلب هذه؟ فقام رجل فقال له صلّی الله علیه وسلم ما اسمك؟ قال یعیش فقال له احلب۔ (مالك)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دودھ دینے والی اُونٹنی کو دیکھ کر ایک بار فرمایا کہ: اس اُونٹنی کا دُودھ کون دوہے گا۔ ایک شخص اُٹھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: تمھارا نام کیا ہے؟ عرض کیا: مرہ (کڑوی چیز) فرمایا: تم بیٹھو۔ اس کے بعد پوچھا: اسے کون دوہے گا؟ ایک دوسرا آدمی کھڑا ہوا، پوچھا: تمھارا نام؟ عرض کیا: حرب (جنگ) فرمایا: تم بھی بیٹھو۔
پھر دریافت فرمایا: کون اسے دوہے گا؟ تیسرا اُٹھا۔ فرمایا: تمھارا کیا نام ہے؟ عرض کیا: یعیش (جیتا ہے) فرمایا: تم دوہو۔

۲۷۱۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طرزِ عمل بُرے ناموں کے ساتھ:

(عائشہؓ) ان النبی صلّی الله علیه وسلّم كان یغیر الاسم القبیح۔ (ترمذی)

حضور صلی اللہ علیہ وسلّم قبیح ناموں کو بدل دیا کرتے تھے۔

۲۷۲۔حُسنِ بیان اور اچھے شعر کی قدر افزائی:

(ابن عباسؓ) جاء اعرابی الی النبی صلی الله

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک اعرابی

عليه وسلم فجعل يتكلم بكلام فقال ان من البيان سحرا وان من الشعر حكما۔ (شیخین، ترمذی)

آیا۔ بڑے اچھے انداز میں گفتگو کرنے لگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بعض گفتگو میں جادو اور بعض شعروں میں حکمتیں ہوتی ہیں۔

شعر کہنا اور سُننا

۲۷۳۔ لبید کا حقیقت آگاہ مصرعہ:

(ابوھریرۃؓ) رفعه: اصدق كلمة قالها الشاعر كلمة لبيد "الا كل شئ ما خلا الله باطل" وكاد ابن ابي الصلت ليسلم۔

(شیخین، ترمذی)

سب سے زیادہ سچی بات جو کوئی شاعر کہہ سکتا ہے وہ وہ ہے جو لبید نے ایک مصرعے میں کہی ہے کہ "الا كل شئ ما خلا الله باطل" (یاد رکھو اللہ کے سوا ہر شے باطل ہے) یہ ابن ابی الصلت تو قریب قریب اسلام لے ہی آیا تھا۔

۲۷۴۔ مضمون کے لحاظ سے نظم و نثر میں کوئی فرق نہیں:

(ابن عمرؓ) رفعه: الشعر بمنزلة الكلام فحسنه كحسن الكلام وقبيحه كقبيح الكلام۔ (اوسط)

شعر کی حیثیت عام گفتگو (نثر) جیسی ہے۔ جو بات نثر میں اچھی ہے وہ شعر میں بھی اچھی ہے۔ اور جو اس میں بُری ہے اس میں بھی بُری ہے۔

زہد و فقر وغیرہ

۲۷۵۔ حبّ جاہ و مال کی قابلِ غور تمثیل:

(ابن عمرؓ) رفعه: ما ذئبان ضاريان في حظيرة يأكلان ويفسدان باضر فيها من حب الشرف وحب المال

دو خونخوار بھیڑیوں کا کسی زخم کو چاٹ چاٹ کر خراب کرنا زخم کے لیے اتنا مضر نہیں جتنی مضر ایک مسلمان کے دین کے لیے حب جاہ و مال

فی دین المرء المسلم ۔ (ترمذی، ابن حبان)

(کعب بن مالک) ماذئبان جائعان ارسلا فی غنم بافسد لها من حرص المرء علی المال والشرف لدینه۔ (ترمذی، دارمی، احمد)

دو بھیڑیئے اگر کسی غلّے میں چھوڑ دیئے جائیں تو وہ اس کے لیے اتنے فساد انگیز نہیں جتنی انسان کے دین کے لیے مال وجاہ کی ہوس ہے۔

۲۷۶- میانہ روی :

(ابن عباسؓ) رفعه : ماعال مقتصد قط۔ (کبیر، اوسط بلین)

میانہ روی اختیار کرنے والا کبھی محتاج نہیں ہوتا۔

۲۷۷- بڑھاپے میں کیا چیز جوان ہوجاتی ہے ؟ :

(انسؓ) یھرم ابن آدم ویشب معه اثنتان الحرص علی المال والحرص علی العمر۔ (شیخین، ترمذی)

فرزندِ آدم بوڑھا تو ہوجاتا ہے، مگر اس کی دو چیزیں جوان ہو جاتی ہیں:۔
(۱) ایک مال کی حرص
اور (۲) دوسرے زندگی کی ہوس۔

۲۷۸- انسانی ہوس کم نہیں ہوتی :

(انسؓ) رفعه : لو کان لابن آدم وادیان من مال لا بتغی لهما ثالثا ولا یملأ جوف ابن آدم الا التراب ویتوب الله علی من تاب۔ (شیخین، ترمذی)

اگر فرزندِ آدم کے پاس دو میدان بھی مال سے لبریز ہو جائیں، تو وہ چاہتا ہے کہ ایک میدان بھر مال اور ہو جائے۔ فرزندِ آدم کا شکم مٹی (قبر) ہی سے بھرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اسی کی طرف توجہ فرماتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرے۔

رقائق و مواعظ وغیرہ

۲۷۹- اُمید و بیم والے کو خوشخبری :

(انسؓ) ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم

حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک نوجوان کے ہاں تشریف

دخل علی شاب وھو فی الموت فقال کیف تجدك؟ قال: ارجو اللہ یارسول اللہ وانی اخاف ذنوبی فقال صلی اللہ علیہ وسلم لا یجتمعان فی قلب عبد فی مثل ھذا الموطن الا اعطاہ اللہ مایرجو منہ وامنہ مما یخاف۔ (ترمذی)

لے گئے جو جان بلب تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: تم اپنے آپ کو کس حال میں پاتے ہو؟ عرض کیا: یارسول اللہ! اللہ سے تو اچھی اُمیدیں رکھتا ہوں۔ البتہ اپنے گناہوں سے خوف آتا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا: موت و حیات کی اس جنگ کے موقعے پر جس بندے کے دل میں بھی یہ دونوں (امید و بیم) کیفیتیں یکجا ہو جائیں۔ اس کی اُمیدیں اللہ تعالیٰ پوری فرما دیتا ہے اور خوف سے بچا لیتا ہے۔

۲۸۰۔ مرکزِ فکر کے فرق کے نتائج:

(انسؓ) رفعہ: من کانت الآخرۃ ھمہ جعل اللہ غناہ فی قلبہ وجمع علیہ شملہ واتتہ الدنیا وھی راغمۃ ومن کانت الدنیا ھمہ جعل اللہ فقرہ بین عینیہ وفرق علیہ شملہ ولم یأتہ من الدنیا الا ما قدرلہ۔ (ترمذی)

جس کا مرکزِ فکر آخرت ہو اللہ تعالیٰ اس کے دل میں غنا پیدا کر دیتا ہے اور اس کے منتشر شیرازے کو سمیٹ لیتا ہے اور دنیا ذلیل ہو کر اس کے پاس آتی ہے اور جس کی ساری توجہ دنیا کی طرف ہو اس کی محتاجی کو اس کی آنکھوں کے درمیان رکھ دیتا ہے۔ اور اس کے شیرازے کو پراگندہ کر دیتا ہے اور اس کے پاس دنیا اتنی ہی آتی ہے جتنی مقدر ہوتی ہے۔

۲۸۱۔ محتاجی کیسے ختم ہوتی ہے؟:

(ابوھریرۃؓ) رفعہ: یقول اللہ تعالیٰ ابن آدم تفرغ لعبادتی املأ صدرك غنی واسد فقرك والا تفعل ملأت یدیك شغلا ولم اسد فقرك۔ (ترمذی)

اللہ تعالیٰ کا کہنا ہے: اے فرزند آدم تو پوری فراغت کے ساتھ میری عبدیت اختیار کر لے تو میں تیرے سینے کو غنا سے معمور کر دوں گا اور تیری محتاجی کو ختم کر دوں گا، اور اگر تو ایسا نہ کرے گا تو تیرے ہاتھوں کو کاروبار میں پھنسائے رکھوں گا۔ مگر تیری محتاجی کو ختم نہ ہونے دوں گا۔

۲۸۲ - فقیہ کون ہے ؟ :

(علیؓ) قال الا لا خیر فی قراءۃ لیس فیہا تدبر ولا فی عبادۃ لیس فیہا تفقہ الفقیہ کل الفقیہ من لم یُقنط الناس من رحمۃ اللہ ولم یُؤمنہم من مکر اللہ ولم یدع القرآن رغبۃ عنہ الیٰ ما سواہ۔ (رزین)

سُن لو کہ جس تلاوت میں تدبر نہ ہو، اور جس عبادت میں تفقّہ نہ ہو اُس میں کوئی خیر نہیں۔ مکمل فقیہ وہ ہے جو لوگوں کو رحمتِ الٰہی سے مایوس نہ کرے اور گرفت خداوندی سے بے پروا نہ کرے، اور قرآن حکیم کو غیر قرآن کی طرف راغب ہونے کے لیے نہ چھوڑ دے۔

۲۸۳ - نصیحت مسیح علیہ السلام :

(مالکؒ) بلغہ : ان عیسیٰ بن مریم کان یقول لا تکثروا الکلام بغیر ذکر اللہ فتقسو قلوبکم فان القلب القاسی بعید من اللہ ولکن لا تعلمون ولا تنظروا فی ذنوب الناس کأنکم ارباب انظروا فی ذنوبکم کأنکم عبید فانما الناس مبتلی ومعافی فارحموا اھل البلاء واحمدوا اللہ علی العافیۃ (رزین)

عیسیٰؑ ابن مریمؑ کہا کرتے تھے کہ : ذکرِ الٰہی سے خالی ہو کر زیادہ باتیں نہ بناؤ ورنہ تمھارے دل سخت ہو جائیں گے۔ سخت دل اللہ تعالیٰ سے دُور ہوتا ہے۔ لیکن تم اس حقیقت کو سمجھتے نہیں اور لوگوں کے گناہوں کو اس طرح نہ دیکھو گویا کہ تم رب ہو بلکہ اپنے گناہوں پر اس طرح نظر رکھو کہ جیسے تم بندے ہو۔ انسان آزمائشوں میں بھی پڑتا ہے اور عافیت بھی حاصل کرتا ہے۔ لہٰذا آزمائش والوں پر رحم کرو اور عافیت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔

۲۸۴ - نصیحتِ لُقمان حکیم :

(مالکؒ) ان لقمان قال لابنہ یا بنی ان الناس قد تطاول علیہم ما یوعدون وھم الی الآخرۃ سراعا یذھبون وانک قد استدبرت الدنیا

لقمان حکیم نے اپنے صاحبزادے سے کہا تھا کہ : اے فرزند! لوگوں سے جس بات کا وعدہ کیا گیا تھا اسے بہت دن گزر گئے۔ لیکن وہ آخرت کی طرف بڑی تیزی سے جا رہے ہیں۔ جب سے تمھارا وجود ہوا تم دنیا کو پیچھے

منذ کنت واستقبلت الاٰخرۃ وان دارًا تسیر الیھا اقرب الیک من دار تخرج عنھا ۔ (رزین)

چھوڑتے جا رہے ہو اور آخرت کی طرف بڑھتے جا رہے ہو۔ وہ گھر جس کی طرف تم جا رہے ہو اس گھر سے زیادہ قریب تر ہے جس سے تم نکل رہے ہو۔

۲۸۵ - زمین پر گمنام اور آسمان پر نام آور :

(ابن مسعودؓ) کونوا ینابیع العلم مصابیح الھدی احلاس البیوت سرج اللیل جدد القلوب خلقان الثیاب تعرفون فی اھل السماء وتخفون علی اھل الارض ۔ (دارمی)

علم کا سرچشمہ بنو اور ہدایت کی شمع، گھر کا ٹاٹ بنو اور رات کا چراغ، ہمو اور دل اور کہنہ پوش بنو۔ اس طرح آسمان والوں میں تو پہچان لیے جاؤ گے اور زمین والوں سے پوشیدہ رہو گے۔

۲۸۶ - کام کی باتیں :

(عمر بن عبد العزیزؒ) من تعبّد بغیر علم کان ما یفسد اکثر مما یصلح ومن عد کلامہ من عملہ قلّ کلامہ الا فیما یعنیہ ومن جعل دینہ غرضًا للخصومات کثر تنقلہ ۔ (دارمی)

جہالت کے ساتھ جو عبادت کرتا ہے اس کا فساد اس کی اصلاح سے زیادہ ہوتا ہے اور جو اپنی گفتگو کا مقابلہ اپنے عمل سے کرے اس کی گفتگو کم ہو جاتی ہے۔ صرف وہیں گفتگو ہوتی ہے جہاں گفتگو مفید ہو۔ اور جو شخص جھگڑوں کو دین کا مقصد بناتا ہے اس کی رائے بدلتی رہتی ہے۔

۲۸۷ - ذکرِ الٰہی کی قدر و قیمت (عجیب اسوہ)

(عبد اللہ بن ابی بکرؓ) ان ابا طلحۃ کان یصلّی فی حائط لہ فطار دُبسیٌّ فطفق یتردد یلتمس مخرجا فلا یجد فاعجبہ ذلک فتبعہ بصرہ ساعۃ ثم رجع الی صلاتہ فاذا ھو لا یدری کم صلّی فقال لقد اصابنی فی مالی ھذا

ابو طلحہؓ اپنے باغ میں نماز ادا کر رہے تھے کہ دُبسی (ایک قسم کی چڑیا) اڑتی ہوئی آگئی اور باہر نکلنے کے لیے اِدھر سے اُدھر راہ ڈھونڈنے لگی۔ اُسے کوئی راستہ نہ ملتا تھا (یعنی باغ بہت گھنا تھا) ابو طلحہؓ کو اس پر حیرت ہوئی اور کچھ دیر نگاہ اس کی طرف جمی رہی۔ پھر اپنی نماز کی طرف دھیان دیا اور اُنھیں پتہ نہ چل سکا کہ کتنی رکعتیں ہوئیں۔

فتنة فجاء الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فذکر لہ الذی اصابہ فی صلاتہ وقال یارسول اللہ ھو صدقة فضعہ حیث شئت ۔ (مالک)

انھوں نے کہا کہ وہ میرے مال نے مجھے فتنے میں ڈال دیا۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی نماز کا یہ حادثہ بیان کیا اور عرض کیا کہ: یارسول اللہ! یہ باغ کارِ خیر میں دیتا ہوں اُسے حضورؐ جہاں چاہیں کام میں لائیں۔

۲۸۸۔حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہُوا:

(عتبہ بن عبیدؓ) رفعہ: لو ان رجلا یخر علی وجھہ من یوم ولد الی یوم یموت فی مرضاة اللہ تعالی لحقرہ یوم القیامة۔ (احمد)

اگر ایک شخص اپنی پیدائش کے دن سے لے کر موت کے وقت تک اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی میں اپنی جبینِ نیاز گھستا رہے، تو قیامت کے دن اُسے بھی بہت کمتر سمجھے گا۔

۲۸۹۔چار بدبختیاں:

(انسؓ) رفعہ: اربعة من الشقاء جمود العین وقساوة القلب وطول الامل والحرص علی الدنیا (بزار بضعف)

چار باتیں بڑی بدبختی کی ہیں: (۱) آنسو کا نہ نکلنا (۲) دل کا سخت ہونا (۳) آرزوؤں کا دراز ہونا اور (۴) دنیا کی حرص ہونا۔

۲۹۰۔پانچ نصیحتیں:

(ابوھریرہؓ) رفعہ: من یاخذ ھذہ الکلمات فیعمل بھن او یعلم من یعمل بھن؟ قال ابو ھریرةؓ فقلت انا یا رسول اللہ فاخذ بیدی وعد خمسا فقال اتق المحارم تکن اعبد الناس وارض بما قسم اللہ لک تکن اغنی الناس واحسن الی جارک تکن مؤمنا

کون یہ کلمے قبول کرتا ہے، جن پر وہ خود عمل کرے یا کسی عمل کرنے والے کو بتا دے؟ ابوہریرہؓ نے عرض کیا کہ: میں یا رسول اللہ! حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑ کر پانچ باتیں بتائیں: (۱) حرام باتوں سے بچو تو سب سے بڑھ کر عابد بن جاؤ گے (۲) اللہ تعالیٰ نے جو کچھ تمھاری قسمت رکھی ہے، اس پر راضی و شاکر رہو تو سب سے زیادہ غنی ہو جاؤ گے (۳) اپنے پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کرو، تو مومن بن جاؤ گے۔

وَ اَحِبَّ للناس ما تحب لنفسك تكن مسلما ولا تكثر الضحك فان كثرة الضحك تميت القلب (ترمذی)

(۴) تمام انسانوں کے لیے وہی پسند کرو جو اپنے لیے کرتے ہو تو مسلم بن جاؤ گے (۵) اور زیادہ ہنسا نہ کرو۔ کیونکہ اس سے دل مُردہ ہو جاتا ہے۔

۲۹۱۔ نُو احکام:

(ابو ھریرۃؓ) رفعه: امرنی ربی بتسع (۱) خشیة الله فی السر والعلانیة (۲) وکلمة العدل فی الرضا والغضب (۳) والقصد فی الفقر والغنی (۴) وان اصل من قطعنی (۵) واعطی من حرمنی (۶) واعفو عمن ظلمنی (۷) وان یکون صمتی فکرًا (۸) ونطقی ذکرًا (۹) ونظری عبرة وامر بالمعروف۔ (رزین)

میرے رب نے مجھے ان نو باتوں کا حکم دیا ہے۔ (۱) باطناً اور ظاہراً ہر حال میں خدا کا ڈر ہو (۲) خوشی اور غصے میں عدل باقی رہے (۳) غنا اور فقر ہر ایک میں میانہ روی باقی رہے (۴) قطع رحمی کرنے والے کے ساتھ بھی صلۂ رحمی ہو (۵) محروم رکھنے والے کو بھی حق دیا جائے (۶) زیادتی کرنے والے سے درگزر ہو۔ (۷) خاموشی میں فکر ہو (۸) گفتگو میں ذکرِ الٰہی ہو (۹) نگاہ میں عبرت پذیری ہو اور امر بالمعروف ہو۔

۲۹۲۔ بدی کا علاج کس طرح ہو؟:

(ابوذرؓ) رفعه: اتق الله حیث ما کنت واتبع السیئة الحسنة تمحها وخالق الناس بخلق حسن۔ (سنن ھذہ)

تم جس حال میں بھی ہو تقویٰ اللہ کو اختیار کیے رہو۔ بُرائی کو نیکی کے ذریعے مٹاؤ اور تمام انسانوں سے اچھے اخلاق سے پیش آؤ۔

۲۹۳۔ شاکر و صابر عند اللہ کون ہوتا ہے؟:

(ابن عمروؓ بن العاص) رفعه: خصلتان من کانتا فیه کتبه الله شاکرًا صابرًا ومن لم تکونا فیه لم یکتبه الله شاکرا ولا صابرًا من

دو خصلتیں ایسی ہیں کہ جس میں موجود ہوں اللہ تعالیٰ اسے شاکر و صابر قرار دیتا ہے، اور جس میں یہ نہ ہوں، اسے صابر و شاکر کی فہرست میں نہیں لکھتا۔ جو شخص دین میں اپنے سے برتر کو دیکھے اور اس کی پیروی کرے

نظر فی دینه الی من هو فوقه فاقتدی به ونظر فی دنیاه الی من هو دونه فحمد الله علی ما فضّله علیه کتبه الله شاکرًا صابرًا ومن نظر فی دینه الی من هو دونه فی دینه الی دینه الی من من هو دونه ونظر فی دنیاه الی من هو فوقه فاسفه علی مافاته منه لم یکتبه الله شاکرًا ولا صابرًا۔ (ترمذی)

اور دنیا میں اپنے سے کمتر کو دیکھے اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اسے زیادہ دیا ہے اس پر شکر کرے، تو اللہ تعالیٰ اُسے صابر و شاکر لکھ دیتا ہے۔ اور اس کے برعکس جو شخص دین میں اپنے سے کمتر کو دیکھے اور دنیا میں اپنے سے برتر کو دیکھ کر اپنی کمی پر افسوس کرے، اللہ تعالیٰ اُسے شاکر و صابر نہیں لکھتا۔

۲۹۴۔ نجات کی رُوح کیا ہے؟:

(عقبہؓ بن عامرؓ) قلت یارسول الله ما النجاة؟ قال امسک علیک لسانک ولیسعک بیتک وابک علی خطیئتک۔ (ترمذی)

میں نے عرض کیا کہ: یارسول اللہ! نجات کیا ہے؟ فرمایا: اپنی زبان پر قابو رکھو، تمہارا گھر کشادہ رہے۔ اور اپنی خطاؤں پر آنسو بہاؤ۔

۲۹۵۔ مومن آپ اپنی تذلیل کب کرتا ہے؟:

(حذیفہؓ) رفعه: لا ینبغی للمؤمن ان یذل نفسه قالوا وکیف یذل نفسه؟ قال یتعرض من البلاء لما لا یطیق۔ (ترمذی)

مومن کے لیے اپنے آپ کو ذلیل کرنا زیبا نہیں۔ لوگوں نے عرض کیا کہ: اپنے آپ کو ذلیل کرنے سے کیا مقصد ہے؟ فرمایا: ایسی آزمائشوں کے درپے ہونا جو طاقتِ برداشت سے باہر ہوں۔

۲۹۶۔ ایک جامع نصیحت:

(معاویہؓ) کتب الی عائشة ان اکتبی لی کتابا توصینی فیه ولا تکثری علیّ فکتبت: سلام علیک اما بعد فانی سمعت رسول الله صلی الله

معاویہؓ نے حضرت عائشہؓ کو اس مضمون کا خط لکھا کہ: مجھے کوئی نصیحت لکھ بھیجیے لیکن وہ لمبی چوڑی نہ ہو۔ آپ نے لکھا کہ: اما بعد۔ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سُنا ہے کہ: جو شخص انسانوں کی ناراضی کے مقابلے

علیه وسلم یقول من التمس رضی الله بسخط الناس کفاه الله مؤنة الناس ومن التمس رضا الناس بسخط الله وکله الله الی الناس والسلام علیك ۔ (ترمذی)

میں اللہ کی رضاجوئی کرتا ہے تو لوگوں کی سختی دُور کرنے کے لیے اللہ کافی ہو جاتا ہے اور جو اللہ کی ناراضی کے مقابلے میں انسانوں کی رضاجوئی کرتا ہے، اسے اللہ انسانوں ہی کے حوالے کر دیتا ہے۔ والسّلام عَلَیْكَ۔

۲۹۷۔ مومن کون ہے اور فاجر کون ؟ :

(ابو ہریرۃ) رفعه : المؤمن غرّ کریم والفاجر خبّ لئیم ۔ (ترمذی)

مومن سادہ دل اور سخی ہوتا ہے اور فاجر دغاباز اور بخیل ہوتا ہے۔

۲۹۸۔ مومن ایک ہی بار دھوکا کھاتا ہے :

(ابو ہریرۃ) رفعه : المؤمن لا یلدغ من جحر مرّتین ۔ (شیخین، ابوداؤد)

مومن ایک بل سے دوبارہ نہیں ڈسا جاتا۔

۲۹۹۔ رسُولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم تین طرح کے آدمیوں کے خلاف ہوں گے :

(ابن عمرو بن العاص) رفعه : ثلاثة انا خصمهم یوم القیامة رجل اعطی بی ثم غدر ورجل باع حرّا ثم اکل ثمنه ورجل استاجر اجیرًا فاستوفی منه العمل ولم یوفه اجره ۔ (بخاری)

تین طرح کے آدمیوں کا میں بروزِ حشر مخالف ہوں گا۔ ایک وہ شخص جو مجھ سے کوئی معاہدہ کرے اور پھر عہد شکنی کرے۔ دوسرے وہ جو کسی آزاد کو بیچ کر اس کے دام کھا جائے اور تیسرے وہ جو کسی مزدور سے معاملہ طے کر کے اس سے محنت تو پوری لے اور اُس کی اُجرت پوری نہ دے۔

۳۰۰۔ بہشت کی ضمانت :

(ابو ہریرۃ) رفعه : من یضمن لی ما بین رجلیه وما بین لحییه ضمنت له بالجنة ۔ (بخاری، ترمذی)

جو شخص اپنی دو ٹانگوں کے درمیان کی چیز (شرمگاہ) کی اور دو جبڑوں کے درمیان والی شے (زبان) کی ضمانت دے میں اُس کے لیے جنّت کی ضمانت دیتا ہوں۔

۳۰۱ ۔ بدترین خصلتیں :

(ابوھریرۃؓ) رفعہ : شر ما فی الرجل شح ھالع وجبن خالع ۔ (ابوداؤد)

بدترین خصلت والا شخص وہ ہے جو حریص اور بے صبر ہو یا بزدل والے حیا ہو۔

۳۰۲ ۔ محروم جنت اشخاص :

(ابوبکرؓ) رفعہ : لا یدخل الجنّۃ خبّ ولا بخیل ولا منّان ۔ (ترمذی)

دغاباز، کنجوس اور احسان جتانے والا جنت میں نہیں جائے گا۔

۳۰۴ ۔ زیادتی اور فخر کی ممانعت :

(عیاضؓ بن حمار) رفعہ : ان اللہ اوحی الی ان تواضعوا حتی لا یبغی احد علی احد ولا یفخر احد علی احد ۔ (ابوداؤد)

اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی ہے کہ : تم سب ایسا انکسار پیدا کرو کہ کوئی ایک دوسرے پر نہ زیادتی کرے اور نہ فخر۔

۳۰۵ ۔ فنِ خطابت کا غلط مقصد :

(ابوھریرۃؓ) رفعہ : من تعلم صرف الکلام لیسبی بہ قلوب الرجال او الناس لم یقبل اللہ منہ صرفا ولا عدلا ۔ (ابوداؤد)

جو شخص لوگوں کو دام میں لانے کے لیے خوش بیانی کا فن سیکھتا ہے ۔ اللہ تعالیٰ اس کے (جرم کی تلافی کے لیے) کوئی قیمت ومعاوضہ قبول نہ فرمائے گا۔

۳۰۶ ۔ قوم کا بہت زیادہ ماتم کرنے والے :

(ابوھریرۃؓ) رفعہ : اذا سمعتم الرجل یقول ھلک الناس فھو اھلکھم (مسلم، موطأ، ابوداؤد)

جب تم کسی کو یہ کہتے سنو کہ : لوگ تو برباد ہوگئے ۔ تو سمجھ لو کہ سب سے زیادہ برباد ہونے والا وہ خود ہے ۔

۳۰۷ ۔ غلط اور صحیح تکلف :

(انسؓ) رفعہ : خیر شبابکم من

بہترین نوجوان وہ ہے جو ادھیڑوں کی سی مشابہت

تشبه بکھولکم وشر کھولکم من تشبه بشبابکم۔ (اوسط، بزار بضعف)

پیدا کرے اور بدترین ادھیڑ وہ ہے جو جوانوں کی مشابہت اختیار کرے۔

۳۰۸۔ اُلفت واُنسِ باہمی مومن کی صفت ہے:

(سہل بن سعدؓ) رفعہ: المؤمن یألف ویؤلف ولا خیر فی من لا یألف ولا یؤلف۔ (احمد، کبیر)

مومن وہ ہے کہ وہ دوسروں سے اور دوسرے اُس سے مانوس ہوں جس میں یہ دونوں باتیں نہ ہوں وہاں کونسی خیر ہو سکتی ہے۔

۳۰۹۔ گناہ کا ثابت ہونا:

(عمرانؓ بن حصین) رفعہ: کفی بالمرء من الاثم ان یشار علیہ بالاصابع قیل یا رسول اللہ وان کان خیرا؟ قال وان کان خیرًا فھو شر لہ الا من رحم اللہ وان کان شرًا فھو شر لہ۔ (کبیر بضعف)

کسی انسان کا گناہ ثابت ہونے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ اس کی طرف انگلیاں اُٹھنے لگیں (کہ یہ بڑا اچھا آدمی ہے) عرض کیا گیا کہ: اگرچہ وہ اشارہ نیکی کی وجہ سے ہو۔؟ فرمایا: اگر نیکی کی وجہ سے ہو جب بھی وہ اس کے لیے شر ہے بجز اس کے جس پر اللہ تعالیٰ کا خاص کرم ہو۔ اور اگر وہ اشارہ کسی شر کی وجہ سے ہو پھر تو شر ہی ہے۔

توبہ و مغفرت

۳۱۰۔ بے پایاں مغفرتِ الٰہی:

(انسؓ) رفعہ: قال اللہ تعالیٰ یا ابن اٰدم انک ما دعوتنی ورجوتنی غفرت لک علی ما کان فیک ولا ابالی یا ابن اٰدم لو بلغت ذنوبک عنان السماء ثم استغفرتنی غفرت لک ما کان فیک ولا ابالی یا ابن اٰدم انک

اللہ تعالیٰ کا قول کہتا ہے کہ: اے فرزندِ آدمؑ جب تک تو مجھے پکارتا رہے گا اور مجھ سے اُمیدِ خیر رکھتا ہے گا میں تیرے گناہوں کی پوشش کرتا رہوں گا۔ خواہ وہ کوئی سا بھی گناہ ہو، اے بنی آدم اگر تیرے گناہ آسمان کی بلندیوں تک بھی پہنچ جائیں اور تو مجھ سے مغفرت کا طلب گار رہو تو مجھے پروا نہیں ہوگی۔ اور میں اُس کی مغفرت کروں گا خواہ وہ کیسا ہی گناہ ہو۔ اور اگر

لو اتیتنی لقراب الارض خطایا ثم لقیتنی لا تشرک بی شیئا لا تیتک بقرابها مغفرة - (ترمذی)

کرۂ ارض کے برابر بھی تو گناہ کا بوجھ لے کر میرے پاس آئے بشرطیکہ تو نے کسی کو میرا شریک نہ کیا ہو تو مجھے پروا نہ ہوگی بلکہ اسی مقدار کے مطابق برابر مغفرت عطا کر دوں گا۔

۳۱۱ - عجیب وصیت اور اُس کا صلہ:

(ابوھریرۃؓ) رفعه: كان رجل يسرف على نفسه فلما حضره الموت قال لبنيه اذا انا مت فاحرقوني ثم اطحنوني ثم ذروني في الريح فو الله لئن قدر علىّ ربي ليعذبني عذابا ما عذبه احدًا فلما مات فعل به ذلك فامر الله الارض فقال اجمعي ما فيكِ منه ففعلت فاذا هو قائم فقال ما حملك على ما صنعت؟ قال خشيتك يارب فغفر له - (شیخین، موطا، نسائی)

ایک شخص تھا جس نے اپنے اُوپر (گناہ کر کر کے) بڑی زیادتیاں کی تھیں جب اس کا وقتِ مرگ آیا تو اس نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی کہ: جب میں مرجاؤں تو مجھے جلا کر چکی میں باریک پیس ڈالنا اور ہوا میں اُڑا دینا کیونکہ مجھ پر اگر اللہ نے قابو پالیا، تو مجھے ایسی سزا دے گا جو کسی کو بھی نہ دی ہوگی۔ جب وہ مرگیا اور اس کی وصیت پوری کر دی گئی تو اللہ تعالیٰ نے زمین کو حکم دیا کہ: وہ تمام ذرّے جو تیرے اندر ہیں یکجا کرلے۔ جب زمین نے تعمیلِ حکم کی تو وہ مُردہ سامنے حاضر تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے پوچھا کہ: یہ تو نے ایسی وصیت کیوں کی تھی؟ اس نے عرض کیا کہ: مولا! صرف تیرا خوف تھا! آخر اللہ تعالیٰ نے اس کی مغفرت فرما ہی دی۔

کتاب الفتن

۳۱۲ - ماحول کا اثر اعمال پر:

(ابوھریرۃؓ) رفعه: انكم في زمان من ترك فيه عشر ما امر هلك ثم ياتي زمان من عمل فيه بعشر ما امر نجا -

(ترمذی)

تم ایک ایسے دور میں ہو کہ اگر کوئی شخص احکامِ الٰہی کا دسواں حصّہ بھی چھوڑ دے تو برباد ہو جائے۔ پھر وہ زمانہ آنے والا ہے کہ اگر کوئی احکامِ الٰہی کے دسویں حصّے کے برابر بھی عمل کرے تو اُس کی نجات ہو جائے گی۔

۳۱۳ - قاتل و مقتول دونوں جہنم میں:

(الاحنف بن قیس) ...... فانی سمعتہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول اذا توا جہ المسلمان بسیفیہما فالقاتل و المقتول فی النار فقلت او قیل یا رسول اللہ ھذا القاتل فما بال المقتول؟ قال انہ کان قد اراد قتل صاحبہ۔ (شیخین، ابوداؤد، نسائی)

...... ابوبکرہؓ کہتے ہیں کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سُنا ہے کہ: جب دو مسلمان اپنی تلواریں لے کر مقابلے پر آجاتے ہیں تو قاتل اور مقتول دونوں جہنم میں جاتے ہیں۔ میں نے یا کسی اور نے دریافت کیا کہ: یا رسول اللہ! ایک تو قاتل ہوا لیکن مقتول کا کیا قصور؟ فرمایا: اس نے بھی تو اپنے ساتھی کو قتل کرنے کا ارادہ کیا تھا۔

۳۱۴ - متکبر کا حشر:

(ابو ھریرۃؓ) رفعہ: یحشر المتکبرون یوم القیامۃ فی صور الذر۔ (بزار، بخعی)

کبر و نخوت کرنے والے لوگ قیامت کے دن چیونٹیوں کی شکل میں اُٹھائے جائیں گے (یعنی جتنے بڑے بنتے تھے اتنے ہی چھوٹے بنا دیئے جائیں گے۔

۳۱۵ - مفلس کون ہے؟:

(جابرؓ) اتدرون ما المفلس و قالوا المفلس فینا من لا درھم لہ ولا متاع قال ان المفلس من یأتی یوم القیامۃ بصلاۃ وصیام وزکوۃ ویأتی قد شتم ھذا و قذف ھذا و اکل مال ھذا وسفک دم ھذا و ضرب ھذا فیعطی ھذا من حسناتہ وھذا من حسناتہ فان فنیت حسناتہ قبل ان یقضی ما علیہ اخذ من خطایاھم فطرحت علیہ ثم یطرح فی النار۔ (مسلم، ترمذی)

جانتے ہو مفلس کسے کہتے ہیں؟ لوگوں نے عرض کیا کہ: ہم میں تو مفلس اُسے کہا جاتا ہے جس کے پاس نہ روپیہ پیسہ ہو، نہ مال اسباب۔ فرمایا: نہیں بلکہ مفلس وہ ہے جو قیامت میں اپنی نماز، روزہ اور زکوٰۃ لے کر آئے گا۔ لیکن دنیا میں کسی کو گالی دی ہوگی، کسی پر بہتان لگایا ہوگا، کسی کا مال کھایا ہوگا، اور کسی کو مارا ہوگا، کسی کا خون بہایا ہوگا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ ان میں سے کسی کو فلاں نیکی دے دی جائے گی اور کسی کو فلاں (اس طرح ہوتے ہوتے) اس کے ذمے جو حق آتا ہے اگر چکائے جانے سے پہلے ہی اس کی نیکیاں ختم ہوگئیں تو ان لوگوں کی خطائیں اس کے حصے میں آتی جائینگی اور آخر کار اُسے جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔

۳۱۶۔ بدی کی روک تھام نہ کرنے کا نتیجہ:

(جابرؓ) قال کنا نسمع ان الرجل یتعلق با لرجل یوم القیامۃ وھو لا یعرفہ فیقول لہ مالک الیّ ما بینی وبینک معرفۃ؟ فیقول کنت ترانی علی الخطاء وعلی المنکر ولا تنھانی۔ (رزین)

ہم سُنا کرتے تھے کہ: قیامت کے دن ایک شخص دوسرے سے چمٹ جائے گا۔ وہ اُسے پہچانتا بھی نہ ہوگا۔ پھر وہ پوچھے گا کہ یہ کیا قصہ ہے؟ میرے تمھارے درمیان تو کوئی تعارف بھی نہیں۔ وہ جواب دے گا کہ: تم مجھے خطاء منکر میں گرفتار دیکھنے کے باوجود اس سے روکتے نہ تھے۔

۳۱۷۔ آخری نجات یافتہ شخص:

(ابوذرؓ) رفعہ: انی لَاَعْلَمُ اٰخر اھل الجنۃ دخولا الجنۃ واٰخر اھل النار خروجا منھا رجل یوتی بہ یوم القیامۃ فیقال اعرضوا علیہ صغار ذنوبہ وارفعوا عنہ کبارھا فیعرض علیہ صغارھا فیقال لہ عملت یوم کذا وکذا کذا وکذا وعملت یوم کذا وکذا کذا وکذا؟ فیقول نعم لا یستطیع ان ینکر وھو مشفق من کبار ذنوبہ ان تعرض علیہ فیقال لہ فان لک مکان کل سیئۃ حسنۃ فیقول رب قد عملت اشیاء لا اراھا ھنا قال فلقد رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ضحک حتّٰی بدت نواجذہ۔

(مسلم، ترمذی)

مجھے علم ہے کہ سب سے آخری جنتی اور سب کے بعد دوزخ سے نکلنے والا کون ہوگا؟ ایک شخص ہوگا جو قیامت کے دن حاضر کیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ: اس کے چھوٹے چھوٹے گناہ پیش کرو اور بڑے گناہوں کو ابھی الگ رکھو۔ پھر اس کے چھوٹے چھوٹے گناہ پیش کیے جائیں گے اور پوچھا جائے گا کہ: تم نے فلاں دن فلاں فلاں گناہ اور فلاں فلاں دن فلاں فلاں گناہ کیے تھے؟ وہ کہے گا ہاں! اسے انکار کی مجال نہ ہو سکے گی۔ وہ اس خوف سے کانپ رہا ہوگا کہ دیکھیے بڑے بڑے گناہوں کی باری کب آتی ہے؟ پھر اس سے کہا جائے گا کہ: جاؤ تمھاری ہر بُرائی کے بدلے ویسی ہی نیکی لکھ دی گئی ہے۔ یہ سُن کر وہ بول اُٹھے گا کہ لا! میں نے تو اور بھی بہت سے گناہ کیے ہیں۔ جو یہاں میرے سامنے ابھی نہیں آئے ہیں۔ یہ فرمانے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسی ہنسی آئی کہ دندان مبارک ظاہر ہو گئے۔

۳۱۸۔ راہِ خدا میں تھوڑا وقت اور بہشت کی تھوڑی جگہ کا مرتبہ:

(انسؓ) رفعہ: غدوۃ فی سبیل اللہ

راہِ خدا میں ایک صبح یا ایک شام گزارنا دنیا و مافیہا

اوروحة خیر من الدنیا وما فیہا ولقاب قوس احدکم اوموضع قدہ فی الجنۃ خیر من الدنیا وما فیہا (ترمذی بضعف حدیث ابی ایوب)

سے بہتر ہے اور تمہاری نصف کمان یا قدآدم کے برابر بھی جنت کی جگہ دنیا اور مافیہا سے بہتر ہے ....

....

سخی اور بخیل

۳۱۹۔ عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَاَنْ یَّتَصَدَّقَ الْمَرْءُ فِیْ حَیٰوتِہٖ بِدِرْھَمٍ خَیْرٌ لَّہٗ مِنْ اَنْ یَّتَصَدَّقَ بِمِاْئَةٍ عِنْدَ مَوْتِہٖ۔ (ابوداؤد)

حضرت ابوسعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ: حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ انسان کا اپنی زندگی کے ایام میں ایک درہم صدقہ کرنا مرنے کے وقت سو درہم صدقہ کرنے سے بہتر ہے۔

۳۲۰۔ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ السَّخِیُّ قَرِیْبٌ مِّنَ اللّٰہِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْجَنَّةِ قَرِیْبٌ مِّنَ النَّاسِ بَعِیْدٌ مِّنَ النَّارِ وَالْبَخِیْلُ بَعِیْدٌ مِّنَ اللّٰہِ بَعِیْدٌ مِّنَ الْجَنَّةِ بَعِیْدٌ مِّنَ النَّاسِ قَرِیْبٌ مِّنَ النَّارِ وَلَجَاھِلٌ سَخِیٌّ اَحَبُّ اِلَی اللّٰہِ مِنْ عَابِدٍ بَخِیْلٍ۔ (ترمذی)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ حضور علیہ الصلاۃ والسلام نے فرمایا کہ سخی اللہ تعالیٰ سے قریب ہے۔ جنت کے قریب ہے۔ لوگوں سے قریب ہے اور دوزخ سے دور ہے اور بخیل اللہ تعالیٰ سے دور ہے، جنت سے دور ہے، لوگوں سے دور ہے اور جہنم سے قریب ہے اور جاہل سخی خدا کے نزدیک عبادت گزار بخیل سے کہیں بہتر ہے۔

نظامات

بیمار کی مزاج پُرسی

۱ - عَنْ عَلِیٍّ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ مَا مِنْ مُسْلِمٍ یَعُوْدُ غُدْوَۃً اِلَّا صَلّٰی عَلَیْہِ سَبْعُوْنَ اَلْفَ مَلَکٍ حَتّٰی یُمْسِیَ وَاِنْ عَادَہٗ عَشِیَّۃً اِلَّا صَلّٰی عَلَیْہِ سَبْعُوْنَ اَلْفَ مَلَکٍ حَتّٰی یُصْبِحَ وَکَانَ لَہٗ خَرِیْفٌ فِی الْجَنَّۃِ۔ (ترمذی، ابو داؤد)

حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ نے فرمایا کہ میں نے نبی کریم علیہ الصّلوٰۃ والتسلیم کو فرماتے سُنا کہ جب کوئی مسلمان اپنے مسلمان بھائی کی صبح کے وقت عیادت کرتا ہے تو شام تک ستر ہزار فرشتے اس کے لیے مغفرت ورحمت کی دُعا کرتے ہیں اور جو شام کے وقت عیادت کرتا ہے اُس کے لیے ستر ہزار فرشتے صبح تک دُعائے مغفرت کرتے ہیں اور اس کے لیے جنّت میں ایک باغ ہے۔

۲ - عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ عَادَ مَرِیْضًا لَمْ یَزَلْ یَخُوْضُ الرَّحْمَۃَ حَتّٰی یَجْلِسَ فَاِذَا جَلَسَ اِغْتَمَسَ فِیْھَا۔ (احمد، مالک)

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ حضور علیہ الصّلاۃ والسلام نے فرمایا کہ جو شخص مریض کی عیادت کو جاتا ہے تو وہ رحمت کے دریا میں غوطہ زن رہتا ہے، جب تک بیٹھ نہیں جاتا اور جب بیٹھ جاتا ہے تو غرقِ دریائے رحمت ہو جاتا ہے۔

۳ - صحیح معاشی نظام کا اثر کیا ہونا چاہیے :-

(ابو موسیٰ) رفعہ :- لیأتین علی الناس زمان یطوف الرجل فیہ بالصدقۃ من الذھب ثم لا یجد احدًا یأخذھا منہ (بخاری مسلم)

عنقریب لوگ ایسا وقت دیکھ لیں گے کہ انسان اپنی زکوٰۃ کا سونا لے کر مستحق کو تلاش کرتا پھرے گا۔ اور کوئی لینے والا نہ ملے گا۔

کتاب النکاح

۴ - عورت کا اصل وصف کیا ہے؟:-

(ابوھریرۃؓ) رفعہ: تنکح المرأۃ لاربع لمالھا ولحسبھا ولجمالھا ولدینھا فاظفر بذات الدین تربت یداک (شیخین، ابوداود، نسائی)

عورت کو عموماً چار وجوہ سے نکاح میں لایا جاتا ہے، مال، خاندان، حسن اور دین لہذا تم دین والی ہی عورت حاصل کرو۔ اللہ تمہارا بھلا کرے۔

۵ - تزوج نصف ایمان ہے:-

(انسؓ) رفعہ:- من تزوج فقد استکمل نصف الایمان فلیتق اللہ فی النصف الباقی - (اوسط)

جس نے شادی کی، اس نے نصف ایمان حاصل کر لیا۔ اب دوسرے نصف میں اسے تقوٰی اللہ اختیار کرنا چاہیئے۔

۶ - تین باتوں میں اعانت کرنا اللہ پر حق ہوتا ہے:-

(جابرؓ) رفعہ: ثلاث من فعلھن ثقۃ باللہ واحتسابا کان حقا علی اللہ ان یعینہ وان یبارک لہ من سعی فی فکاک رقبۃ ثقۃ باللہ واحتسابا کان حقا علی اللہ ان یعینہ وان یبارک لہ ومن احی ارضا میتۃ ثقۃ باللہ واحتسابا کان حقا علی اللہ ان یعینہ ویبارک لہ ومن تزوج ثقۃ باللہ واحتسابا کان حقا علی اللہ ان یعینہ ویبارک لہ (اوسط، صغیر)

تین باتیں ایسی ہیں جو اگر یقین اور حُسن نیت سے کی جائیں تو اللہ تعالیٰ پر یہ حق ہو جاتا ہے کہ اس کی مدد فرمائے۔ اور اس میں برکت عطا فرمائے (۱) جو شخص یقین اور حسن نیت کے ساتھ کسی قیدی کو آزاد کرانے کی کوشش کرے اور (۲) جو مردہ زمین کو زندہ کرے اور (۳) جو شادی کرے تو ان تینوں میں سے ہر ایک کام میں مدد اور برکت دینا اللہ تعالےٰ کے ذمے ایک ضروری حق ہو جاتا ہے۔ اگر یقین اور حسن نیت موجود ہو۔

۷ - نکاح سے پہلے عورت کو چھپ کر دیکھنا روا ہے :-

(جابرؓ) رفعہ : اذا خطب احدکم المرأۃ فان استطاع ان ینظر منہا ما یدعوہ الی نکاحہا فلیفعل فخطبت امرأۃ فکنت اتخبأ لہا حتی رأیت منہا ما دعانی الی نکاحہا فتزوجتہا (ابو داؤد)

اگر کوئی شخص کسی عورت کو پیغام نکاح دے اور یہ ممکن ہو کہ وہ اس کی کوئی ایسی چیز (جمال) دیکھ لے جو اپنے اندر ازدواجی کشش رکھتی ہو تو اسے دیکھ لینا چاہیئے۔ چنانچہ میں نے ایک عورت کو پیغام دیا اور چھپ کر اس کی وہ چیز دیکھ لی جو میرے لئے کشش نکاح کا سبب تھی (یعنی حسن) پھر اس سے شادی کر لی۔

۸ - ایضاً

(ابوھریرۃؓ) خطب رجل امرأۃ من الانصار فقال لہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم ھل نظرت الیہا قال لا قال فاذھب فانظر الیہا فان فی اعین الانصار شیئاً (مسلم و نسائی)

ایک شخص نے کسی انصاری عورت کو پیغام نکاح دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پوچھا کیا تم نے اس کو دیکھ لیا ہے؟ عرض کیا نہیں۔ فرمایا: جا کر اسے دیکھ لو۔ کیونکہ بعض اوقات انصاری کی آنکھ میں کچھ نقص بھی ہوتا ہے۔

۹ - نکاح خفیہ نہ ہونا چاہیئے، مسجد میں نکاح، دف اور کھیل :-

(عائشہؓ) رفعتہ :- اعلنوا ھذا النکاح واجعلوہ فی المساجد واضربوا علیہ بالدفوف۔ للترمذی۔ زاد رزین: فان فصل ما بین الحلال و الحرام الاعلان۔ وللبخاری:- زففنا امرأۃ الی رجل من الانصار فقال صلی اللہ علیہ وسلم اما یکون معکم لھو فان الانصار یعجبھم اللھو (اوسط)

نکاح بالاعلان کیا کرو۔ اور مساجد میں کیا کرو۔ اور دف کے ذریعے اعلان کیا کرو۔

رزین کی روایت میں یہ بھی ہے کہ حلال (نکاح) اور حرام (خفیہ آشنائی) کے درمیان فرق ہی اعلان کا ہے۔ بخاری کی روایت میں ہے کہ ایک انصاری کے گھر میں ایک لڑکی کی رخصتی ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: کیا کھیل وغیرہ تمہارے ساتھ نہیں؟ انصاری تو کھیل کو پسند کرتے ہیں۔

۱۰ - رخصتی کے وقت دف بجانا اور گانا بہتر ہے :-

(عائشہؓ) رفعتہ:- ما فعلت فلانۃ؟ لیتیمۃ کانت عندھا فقلت اھدیناھا الٰی زوجھا فقال ھل بعثتم معھا ضاربۃ تضرب بالدف وتغنی؟ قلت تقول ماذا؟ قال تقول اتیناکم اتیناکم فحیونا نحییکم، لولا الذھب الاحمر ما حلت بوادیکم، ولولا الحنطۃ السمراء ما سمنت عذاریکم (اوسط بلین)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا۔ اس یتیمہ کا کیا ہوا۔ عائشہؓ نے کہا: ہم نے اسے اس کے شوہر کے پاس رخصت کر دیا۔ فرمایا: تم کوئی عورت اس کے ساتھ نہ کر دی جو ذرا گاتی اور دف بجاتی ہوئی ساتھ جاتی؟ عرض کیا: ایسے گیت کے بول کیا ہونے چاہئیں تھے؟ فرمایا یہ مصرعے گائی جاتی (ترجمہ)

ہم تمہارے گھر آئے، ہم تمہارے دوارے آئے تم ہم پر سلامتی بھیجو اور ہم تم پر۔ اگر زر سرخ نہ ہوتا تو تمہارے دیہات میں کون آتا۔ اور اگر گندمی رنگ کے گیہوں نہ ہوتے تو تمہاری چھوکریاں گداز نہ ہوتیں۔

۱۱ - نکاح سنت رسول ہے :

(عائشہؓ) رفعتہ: النکاح من سنتی فمن لم یعمل بسنتی فلیس منی (ابن ماجہ)

نکاح میری سنت ہے۔ لہٰذا جو میری سنت پر عمل نہیں کرتا۔ وہ مجھ سے نہیں

فرائض زوجین

۱۲ - اپنے شوہر سے کسی عورت کا ذکر کرتے میں احتیاط چاہیئے :-

(ابن مسعودؓ) رفعہ: لا تباشر المرأۃ المرأۃ فتنعتھا لزوجھا کانہ ینظر الیھا (ابوداؤد، ترمذی)

ایک عورت دوسری عورت سے اس قدر گھل مل کر رہے کہ وہ اُس کی تعریفیں اپنے شوہر سے اس طرح بیان کرنے لگے کہ گویا وہ اسے دیکھ رہا ہے۔

۱۳ - زوجین کو باحیا رہنا چاہیئے :-

(ابن مسعودؓ) رفعہ: اذا اتی احدکم

جب تم میں سے کوئی اپنی رفیقۂ حیات سے مواصلت

اهله فليستر ولا يتجرد اتجرد العيرين (بزار)

کرے تو بے لباس اونٹوں کی طرح برہنگی نہ اختیار کرو۔ بلکہ پردے کا خیال رکھے۔

۱۴ ۔ اولاد کی پرورش عورت کا جہاد ہے:

(ابن عمرؓ) احسبه رفعه : المرأة فی حملها الی وضعها الی فصالها كالمرابط فی سبیل الله فان ماتت فیما بین ذلك فلها اجر شهید (کبیر)

عورت ایام حمل سے لے کر زچگی بلکہ دودھ چھڑانے تک ایسی ہے۔ جیسے سرحد کی فی سبیل اللہ نگرانی کرنے والا۔ اگر وہ اس دوران میں مر جائے تو وہ بھی شہید کا اجر و ثواب حاصل کرے گی۔

زوجین ایک دوسرے کے لئے

۱۵ ۔ عورت کے لئے شوہر کا مقام:۔

(ابو هریرةؓ) رفعه:۔ لو كنت آمرا احدا ان يسجد لاحد لامرت الزوجة ان تسجد لزوجها (ترمذی، بزار)

اگر میں کسی کو کسی کے آگے سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو بیوی کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔

۱۶ ۔ رضائے شوہر کا صلہ جنت ہے:۔

(ام سلمةؓ) رفعته:۔ ایما امرأة ماتت وزوجها راض عنها دخلت الجنة (ترمذی)

جو عورت ایسی حالت میں مرے کہ اس کا شوہر اس سے راضی رہا تو وہ جنت میں داخل ہو گئی۔

۱۷ ۔ بہترین بیوی کے خصائل:۔

(ابو هریرةؓ) قیل لرسول الله صلی الله علیه وسلم ای النساء خیر؟ قال التی تسره اذا نظر وتطیعه

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ:۔ بہترین عورت کونسی ہے؟ فرمایا: وہ جس کو اس کا شوہر دیکھے تو خوش ہو جائے! اور جب وہ حکم دے تو بجا لائے اور خود اس کی

اذا امرہ ولا تخالفہ فی نفسہا ولا مالہا بما یکرہ (نسائی)

اپنی ذات اور اپنے مال کے بارے میں بھی شوہر جس بات کو ناپسند کرے اس کی مخالفت نہ کرے۔

۱۸۔ تقوی اللہ کے بعد سب سے بڑی نعمت الٰہی:۔

(ابوامامۃ) رفعہ: ما استفاد المؤمن بعد تقوی اللہ خیر الہ من زوجۃ صالحۃ ان امرہا اطاعتہ وان نظر الیہا سرتہ وان اقسم علیہا ابرتہ وان غاب عنہا نصحتہ فی نفسہا ومالہ (قزوینی)

مومن کے لئے تقوی اللہ کے بعد سب سے بڑی نعمت وہ صالح بیوی ہے کہ شوہر حکم دے تو بجا لائے، اسے شوہر دیکھے تو خوش ہو جائے۔ شوہر قسم کھائے تو وہ اسے پورا کر دے اور شوہر غیر حاضر ہو تو اپنی ذات اور شوہر کے مال میں خیر خواہی کا پورا حق ادا کرے۔

۱۹۔ اختلاف زوجین میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عجیب فیصلہ:۔

(ابوسعیدؓ) جاءت امرأۃ الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقالت زوجی صفوان بن المعطل یضربنی اذا صلیت ویفطرنی اذا صمت ولا یصلی الفجر حتی تطلع الشمس وصفوان عندہ فسألہ فقال یا رسول اللہ اما قولہا یضربنی اذا صلیت فانہا تقرأ بسورتین وقد نہیتہا فقال صلی اللہ علیہ وسلم لو کانت سورۃ واحدۃ لکفت الناس و اما قولہا یفطرنی اذا صمت فانہا تنطلق تصوم وانا رجل شاب فلا اصبر فقال صلی اللہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک عورت آئی اور کہا کہ میرا شوہر صفوان بن معطل ہے۔ جب میں نماز پڑھتی ہوں تو مجھے مارتا ہے۔ اور روزہ رکھتی ہوں تو تڑوا دیتا ہے اور خود ہر روز صبح کی نماز سورج نکلنے کے بعد پڑھتا ہے۔ صفوان بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہی موجود تھا۔ جب اس سے صورت حال دریافت ہوئی تو کہنے لگا کہ: یا رسول اللہ! یہ کہتی ہے کہ میں نماز پڑھتی ہوں تو یہ مجھے مارتا ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ یہ نماز میں دو دو سورتیں پڑھتی ہے۔ اور میں اسے منع کرتا ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ اگر قرآن کی ایک ہی سورت ہوتی تو لوگوں کے لئے کافی ہوتی۔ پھر بولا کہ اس کا یہ کہنا کہ جب روزہ رکھتی ہوں تڑوا دیتا ہے۔ تو بات در اصل یہ ہے کہ روزہ رکھنا شروع کر دیتی ہے اور میں ایک نوجوان ہوں۔ مجھ سے صبر نہیں ہوتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ

عليه وسلم لا تصوم المرأة الا باذن زوجها واما قولها انی لا اصلی حتی تطلع الشمس فانا اهل بيت قد عرف لنا ذلك لا نكاد نستيقظ حتی تطلع الشمس قال فاذا استيقظت يا صفوان فصل (ابوداؤد)

وسلم نے فرمایا کہ: شوہر کی اجازت کے بغیر عورت روزہ نہ رکھے پھر وہ کہنے لگا کہ اس کا یہ کہنا کہ میں سورج نکلنے سے پہلے نماز (فجر ادا) نہیں کرتا تو بات یہ ہے کہ ہم ایسے گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں کہ جہاں کی یہ عادت مشہور ہے کہ سورج نکلنے سے پہلے ہم لوگوں کی آنکھ ہی نہیں کھلتی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا اچھا اب پہلے ہی جاگ کر نماز ادا کر لیا کرو

۲۰ - ایک جفاکش اور خدمت گزار عورت (اسماء بنت ابی بکرؓ)

(اسماء بنت ابی بکرؓ)، تزوجنی الزبير وما له فی الارض مال ولا مملوك ولا شئ غير ناضح وغير فرسه فكنت اعلف فرسه واكفيه مؤنته واسوسه وادق النوی لناضحه فاعلفه واسقی الماء واخرز غربه واعجن ولم اكن احسن اخبز فكان يخبز لی جارات من الانصار وكن نسوة صدق وكنت انقل النوی من ارض الزبير التی اقطعه رسول الله صلی الله عليه وسلم علی رأسی وهی علی ثلثی فرسخ قالت فجئت يوما والنوی علی رأسی فلقيت النبی صلی الله عليه وسلم ومعه نفر من اصحابه فدعانی ثم قال اخ اخ ليحملنی خلفه فاستحييت وعرفت غيرتك فعرف رسول الله

اسماء بنت ابی بکرؓ کہتی ہیں کہ جب زبیرؓ نے مجھ سے شادی کی تو ان کے پاس نہ کوئی مال تھا نہ خادم اور نہ کچھ اور بس ایک آب بردار اونٹ تھا یا ایک گھوڑا۔ میں ہی ان کے گھوڑے کو چارہ دیتی اور اس کی خوراک کا انتظام کرتی اور اس کی دیکھ بھال کرتی۔ میں ہی ان کے اونٹ کے لئے گٹھلیاں کوٹتی اور اسے چارہ دیتی۔ میں ہی آبپاشی کرتی اور ان کے چرس (بڑے ڈول یا پَیر) میں ٹانکے لگاتی اور میں ہی آٹا بھی گوندھتی تھی۔ لیکن روٹی اچھی نہیں پکا سکتی تھی۔ اس لئے چند مخلص انصاری عورتیں جو میری پڑوسن تھیں۔ میری روٹی پکا دیا کرتی تھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے زبیر رضی اللہ عنہ کو ایک قطعہ زمین عطا فرمایا تھا۔ جو ⅔ فرسخ (دو میل) کے فاصلے پر تھا۔ میں وہاں سے اپنے سر پر گٹھلیوں کا گٹھڑ اٹھا کر لاتی تھی۔ ایک بار ایسا اتفاق ہوا کہ میں یہ گٹھڑ سر پر لا رہی تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مع چند صحابہ کرامؓ کے راستے میں ملے اور اپنے اونٹ کو بٹھانے لگے۔ تاکہ مجھے بھی اپنے پیچھے سوار کر لیں۔ لیکن مجھے زبیرؓ کی غیرت کا خیال آگیا اور مجھے

صلی اللہ علیہ وسلم انی حتی استحییت نمضی فحئت الزبیرؓ نقلت لقینی صلی اللہ علیہ وسلم وعلی رأسی النوی ومعہ نفر من اصحابہ فاناخ لارکب فاستحییت منہ وعرفت غیرتک فقال واللہ لحملک النوی علی رأسک اشد علی من رکوبک معہ حتی ارسل الی ابوبکرؓ بعد ذلک بخادم فکفتنی سیاسۃ الفرس فکانما اعتقتنی (شیخین)

شرم دامنگیر ہوتی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے میری اس غیرت و حیا کو محسوس فرما لیا اور روانہ ہو گئے میں زبیرؓ کے پاس آئی تو یہ واقعہ بیان کیا کہ مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم چند صحابہ کے ساتھ ملے اور میرے سر پر گٹھلیوں کا گٹھڑ تھا حضورؐ نے سواری کو میرے لئے بھی لیکن مجھے شرم دامنگیر ہوئی۔ اور تمہاری غیرت کا خیال آ گیا۔ زبیرؓ نے کہا کہ :- بخدا تمہارا اپنے سر پر گٹھڑی لاد کر لانا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بیٹھنے سے زیادہ شاق ہے۔ اس کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ نے میرے پاس ایک خادم بھیج دیا ہے اور مجھے گھوڑے کے انتظام سے فرصت ملی اور گویا انہوں نے مجھے قید غلامی سے آزاد کر دیا۔

۲۱ ۔ عورت کے چند فرائض اور اُن کی تکمیل کا صلہ :-

(عبد الرحمٰن بن عوفؓ) رفعہ : اذا صلت المرأۃ خمسہا وصامت شہرھا وحفظت فرجہا واطاعت زوجہا قیل لہا ادخلی الجنۃ من ای ابواب الجنۃ شئت (احمد، اوسط)

اگر عورت پانچ نمازیں ادا کرے اور رمضان کے روزے رکھ لے نیز اپنی عصمت کو محفوظ رکھے اور اپنے شوہر کی فرمانبرداری کرتی رہے تو اسے کہا جائے گا :- جنت کے جس دروازے سے تو چاہے داخل ہو جا۔

۲۲ ۔ عام عورتوں کی مزاجی کیفیت کی تمثیل اور حُسن سلوک کی تاکید :-

(ابوھریرۃؓ) رفعہ :- استوصوا بالنساء خیراً فان المرأۃ خلقت من ضلع اعوج وان اعوج ما فی الضلع اعلاہ فان ذھبت تقیمہ کسرتہ وان ترکتہ

میری اس وصیت کو قبول کرو، اور عورتوں کے ساتھ عمدہ (دانشمندانہ اور رحیمانہ) سلوک کرو۔ کیونکہ عورت کی خلقت ٹیڑھی پسلی سے ہوئی ہے (یعنی ان کے مزاج کی مثال ایسی ہی ہے۔ جیسے ٹیڑھی پسلی) پسلی کی ہڈی جتنی اوپر ہوتی ہے اتنی ہی زیادہ ٹیڑھی ہوتی ہے۔ اگر اسے سیدھا کرنے کی کوشش کرو گے تو توڑ کر رکھ دو گے اور اگر اسے چھوڑ دو گے تو وہ ٹیڑھی

لم یزل اعوج فاستوصوا بالنساء خیرا
وفی روایۃ :- وکسرھا طلاقھا
(شیخین ، ترمذی)

رہے گی۔ لہٰذا ان کے متعلق میرے اچھے سلوک کی وصیت کو پیش نظر رکھو (یعنی ان سے اسی ٹیڑھ کے رہتے ہوئے فائدہ اٹھاؤ اور سیدھا کرکے توڑنے کی کوشش نہ کرو) ایک دوسری روایت میں ہے کہ عورت کو طلاق دینا ایسا ہی ہے۔ جیسے پسلی کی ٹیڑھی ہڈی کو سیدھا کرنے کے لئے توڑ ڈالنا

۲۳ - عورتوں کے حقوق مردوں پر:-

(حکیم بن معاویہؓ) عن ابیہ - قلت یارسول اللہ ماحق زوجۃ احدنا علیہ؟ قال ان تطعمھا اذا طعمت وتکسوھا اذا اکتسیت ولا تضرب الوجہ ولا تقبح ولا تھجر الا فی البیت (ابوداؤد)

میں نے عرض کیا :- یارسول اللہ : بیوی کا شوہر پر کیا حق ہے ؟
فرمایا کہ : جب تم کھاؤ تو اسے بھی کھلاؤ۔ جب تم پہنو۔ تو اسے بھی پہناؤ۔ اس کے چہرے پر نہ مارو اور اس کی تفضیحت نہ کرو اور اگر اس سے (بہ بنائے تنبیہ) علیحدگی اختیار کرنی پڑے تو یہ گھر کے اندر ہی ہو۔ (یعنی خفا ہو کر گھر نہ چھوڑ دو)

۲۴ - مردوں کے لئے سب سے بڑی آزمائش عورتیں ہیں:-

(اسامہ بن زیدؓ) رفعہ :- ماترکت بعدی فتنۃ اضر علی الرجال من النساء (شیخین - ترمذی)

میرے بعد مردوں کے لئے جو سب سے زیادہ نقصان رساں امتحان ہے وہ عورتوں کا وجود ہے۔

۲۵ - اہل ایمان کے لئے ایک غیرت آموز سبق :-

(ابوھریرۃؓ) رفعہ : ان اللہ یغار وان المؤمن یغار وان غیرۃ اللہ ان یأتی المومن ما حرم اللہ علیہ
(شیخین - ترمذی)

اللہ تعالیٰ بھی غیرت مند ہے۔ اور مومن بھی غیرت مند ہوتا ہے۔ اور مومن کا حرام کام کرنا خود اللہ تعالیٰ کے لئے باعث غیرت ہے۔

۲۶ - اجازت شوہر کے بغیر عورت سے ملنا

(موقوف لعمرو بن العاصؓ)... ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نھانا ان ندخل علی النساء بغیر اذن ازواجھن (ترمذی)

... - حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شوہر کی اجازت کے بغیر غیر عورت کے پاس جانے سے منع فرمایا ہے۔

خرید و فروخت وکسب معاش

۲۷ - رفاہ عام کے لئے مکان اور باغ تیار کرنا بڑا کار خیر ہے :-

(معاذ بن انسؓ) رفعہ :- من بنی بنیانا فی غیر ظلم ولا اعتداء او غرس غرسا فی غیر ظلم ولا اعتداء کان لہ اجرا جاریا ما انتفع بہ من خلق الرحمٰن (احمد، کبیر)

جو شخص کوئی عمارت بنائے اور اس میں کوئی ظلم و زیادتی نہ ہو - یا کوئی درخت لگائے اور اس میں کوئی ظلم و زیادتی نہ ہو تو جب تک مخلوق خدا اس سے فائدہ اٹھاتی رہے - اس کے لئے ثواب جاری رہے گا۔

آداب طعام

۲۹ - ذکر الٰہی بوقت طعام :-

(عائشہؓ) رفعتہ :- اذا اکل احدکم طعاما فلیقل بسم اللہ فان نسی فی الاول فلیقل فی الآخر بسم اللہ فی اولہ وآخرہ (ابوداؤد، ترمذی)

جب کھانا کھاؤ تو بسم اللہ کہہ لیا کرو - اگر آغاز میں بھول جائے تو آخر میں کہہ لیا کرو کہ بسم اللہ فی اولہ وآخرہ (اللہ ہی کے نام سے شروع میں بھی اور آخر میں بھی)

۳۰ - اکٹھا کھانے اور بسم اللہ کی برکات :-

روحشی بن حرب بن وحشی) عن ابیہ عن جدہ : ان اصحاب النبیّ صلی اللہ علیہ وسلّم قالوا یارسول اللہ انا نأکل ولا نشبع قال لعلکم تفترقون؟ قالوا نعم قال فاجتمعوا علی طعامکم واذکروا اسم اللہ یبارک لکم فیہ (ابوداؤد)

بعض صحابہ (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) نے عرض کیا کہ ، یا رسول اللہ! ہم کھانا کھاتے ہیں۔ مگر (غالباً قلت طعام کی وجہ سے) پیٹ نہیں بھرتا۔ فرمایا: تم لوگ الگ الگ تو نہیں کھاتے ؟

عرض کیا : ہاں

فرمایا: اکٹھا کھایا کرو اور ذکر الٰہی سے آغاز کیا کرو تو اللہ تعالےٰ اس میں برکت دے گا۔

۳۱ - شیطان نے اپنا کھایا ہوا اُگل دیا :-

(امیۃ بن مخشی) کان النبی صلی اللہ علیہ وسلّم جالسا ورجل یأکل فلم یسم حتی لم یبق من طعامہ الا لقمۃ فلما رفعہا الی فیہ قال بسم اللہ فی اولہ وآخرہ فضحک النبی صلی اللہ علیہ وسلم ثم قال ما زال الشیطان یأکل معہ فلما ذکر اسم اللہ آخراً استقاء ما فی بطنہ (ابوداؤد)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے اور ایک شخص کھانا کھا رہا تھا۔ یہ بسم اللہ کہنا بھول گیا۔ جب کھانے کا ایک لقمہ باقی رہ گیا اور اسے منہ میں ڈال لیا تو بسم اللہ یاد آئی اور کہا کہ: بسم اللہ فی اولہ وآخرہ جضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہنسی آگئی اور فرمایا کہ اس کے ساتھ شیطان کھانے میں برابر شرکت کر رہا تھا لیکن جب اس نے بسم اللہ پڑھی تو شیطان نے اپنا کھایا ہوا اُگل دیا۔

۳۲ - کھانا بھی ذریعۂ مغفرت ہو سکتا ہے :-

(انس رض) رفعہ : ان الرجل لیوضع طعامہ فما یرفع حتی یغفر لہ فقیل یارسول اللہ ولم ذاک؟ قال یقول بسم اللہ اذا وضع والحمد للہ اذا رفع (للاوسط بضعف)

ایک آدمی کے لئے دسترخوان بچھایا جاتا ہے۔ پھر جب تک اس کی مغفرت نہیں ہو جاتی وہ اٹھایا نہیں جاتا۔ عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ! یہ نعمت کس طرح حاصل ہو سکتی ہے ؟ فرمایا : اس طرح کہ جب دسترخوان بچھے تو بسم اللہ کہے اور جب اٹھے تو الحمد للہ کہے۔

۲۳ - اجتماع کی برکت

(ابوهریرۃ رض) رفعه: طعام الاثنین کافی الثلاثة وطعام الثلاثة کافی الاربعة (شیخین، موطأ، ترمذی)

دو آدمیوں کا کھانا تین آدمیوں کے لئے اور تین کا چار کے لئے کافی ہو جاتا ہے

۲۴ - کم خوری

(ابن عمرؓ) تجشأ رجل عند النبی صلی الله علیه وسلم فقال کف عنا جشائك فان اکثرهم شبعا فی الدنیا اطولهم جوعا یوم القیمة (ترمذی)

ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ڈکار لی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنی ڈکار کو روکو۔ (یعنی کم کھاؤ گے تو ڈکار نہیں آئے گی) کیونکہ دنیا میں زیادہ کھانے والا بروزِ حشر زیادہ بھوکا رہے گا۔

۲۵ - صحیح مقدار طعام کیا ہے:-

(مقدام بن معدی کرب) رفعه: ما ملأ آدمی وعاء شرا من بطن حسب ابن آدم لقیمات یقمن صلبه فان کان لا محالة فثلث لطعامه وثلث لشرابه وثلث لنفسه (ترمذی)

شکم سے زیادہ بُرا کوئی ظرف نہیں جو انسان بھرتا ہو۔ فرزند آدم کو کمر سیدھی رکھنے کے لئے چند لقمے کافی ہیں۔ اگر اس سے زیادہ کھانا ضروری ہی ہو تو اپنے شکم کا تہائی حصہ کھانے سے پُر کرے اور ایک تہائی پانی کے لئے رکھے اور ایک تہائی سانس کے لئے۔

۲۶ - دعوت میں آخر تک بیٹھنا چاہیئے:

(ابن عمرؓ) رفعه: اذا وضعت المائدة فلا یقوم رجل حتی ترفع المائدة ولا یرفع یده وان شبع حتی یفرغ القوم ولیعذر فان الرجل یخجل جلیسه فیقبض یده وعسی

جب (دعوت وغیرہ کے موقعے پر) دسترخوان بچھایا جائے تو کوئی ایک آدمی دسترخوان اٹھائے جانے سے پہلے نہ اٹھ کھڑا ہو۔ بلکہ اس کا پیٹ بھر گیا ہو۔ جب بھی اپنا ہاتھ اس وقت تک نہ روکے۔ جب تک تمام لوگ فارغ نہ ہو جائیں اس طرح کرنے سے اس کا ساتھی شرمندہ ہوتا ہے اور وہ بھی اپنا ہاتھ کھینچ لیتا ہے۔ حالانکہ بہت ممکن ہے کہ

ان یکون لہ فی الطعام حاجۃ (ترمذی)

اسے ابھی اور کھانے کی ضرورت ہو۔

لباس و زینت

۳۷ - پردے کی حدود

(عائشۃؓ) ان اسماء بنت ابی بکر دخلت علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وعلیہا ثیاب رقاق ناعرض عنہا وقال یا اسماء ان المرأۃ اذا بلغت المحیض لن یصلح ان یری منہا الا ھذا و ھذا واشار الی وجہہ وکفیہ (ابوداؤد)

اسماء بنت ابی بکرؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ ان کے جسم پر باریک کپڑے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منہ پھیر لیا اور فرمایا کہ اے اسماء جب عورت جوان ہو جائے تو اس کے لئے چہرے اور ہاتھوں کے سوا اور کچھ نظر آنا درست نہیں (چہرے اور ہتھیلیوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارے سے بتایا)

۳۸ - پھٹیچر رہنا کوئی بزرگی نہیں:-

(ابو الاحوص) عن ابیہ :- اتیت النبی صلی اللہ علیہ وسلم وعلی ثوب دون فقال لی الک مال؟ قلت نعم قال من ای المال؟ قلت من کل المال قد اعطانی اللہ تعالیٰ من الابل و البقر و الغنم و الخیل و الرقیق قال فاذا اتاک اللہ مالا فلیر اثر نعمۃ اللہ علیک وکرامتہ (نسائی)

میں ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت میرے جسم پر بہت معمولی لباس تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ تمہارے پاس کچھ مال بھی ہے؟ میں نے عرض کیا۔ ہاں پوچھا: کس قسم کا مال ہے؟ عرض کیا کہ ہر قسم کا مال اللہ تعالیٰ نے دے رکھا ہے اونٹ، گائے، بکریاں، گھوڑے اور خدام وغیرہ سب کچھ ہے۔ فرمایا کہ جب اللہ نے تمہیں اتنا کچھ دیا ہے تو اس کے انعام و اکرام کا لباس سے بھی کچھ اظہار ہونا چاہیئے۔

۳۹ - سونے کا دانت :-

(عبد اللہ بن عبد اللہ بن ابی) :- ان ثنیۃ اصیبت مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فامرہ ان یتخذ ثنیۃ من ذھب (بزار)

عبداللہ بن عبداللہ بن اُبی کا ایک سامنے کا دانت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کسی جنگ میں ٹوٹ گیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں سونے کا دانت لگوانے کی اجازت دے دی

۴۰ - بال اور ڈاڑھی کو سلجھا کر رکھو :-

(عطاء بن یسارؒ) قال کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی المسجد فدخل رجل ثائر الرأس واللحیۃ فاشار الیہ صلی اللہ علیہ وسلم بیدہ کأنہ یامرہ باصلاح شعرہ ولحیتہ ففعل ثم رجع فقال صلی اللہ علیہ وسلم الیس ھذا خیراً من ان یأتی احدکم ثائر الرأس کانہ شیطان (مالک)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں جلوہ افروز تھے۔ کہ ایک شخص داخل ہوا۔ اس کے بال پریشان اور ڈاڑھی الجھی ہوئی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اشارے سے حکم دیا کہ اپنے بال اور ڈاڑھی ٹھیک کرے۔ اس نے تعمیل حکم کی اور واپس چلا گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ بہتر ہے، یا یہ کہ بکھرے ہوئے بال لے کر آنا جیسے شیطان چلا آ رہا ہو۔

خلافت و امارت

۴۱ - تفریق جماعت پیدا کرنے والے کی سزا قتل :-

(عرفجۃ بن شریح) رفعہ :- من اتاکم وامرکم جمیع علی رجل واحد یرید ان یشق عصاکم او یفرق جماعتکم فاقتلوہ ھما المسلم ولہ ولابی داؤد و النسائی : ستکون ھنات وھنات فمن اراد

جب ایک شخص پر معاملۂ امارت میں اتفاق ہو جائے۔ اور کوئی شخص آکر تمہاری جمعیّت کی مخالفت کرے یا جماعت میں تفریق پیدا کرنا چاہے، تو اسے قتل کر دو۔

دوسری روایتوں میں ہے کہ عنقریب قسم قسم کے آزمائشی معاملے پیش آئیں گے! اس وقت اس امت

ان یفرق امر ھذہ الامۃ وھی جمیع فاضربوہ بالسیف کائنا من کان

کے اجماع کو بگاڑ کر جو تفریق پیدا کرنا چاہے۔ اسے تلوار سے اڑا دو کسے باشد۔

۴۲ - حکومتِ اسلامیّہ کا نظام :-

(ابوھریرۃؓ) نعہ: اذا کان امراءکم خیارکم واغنیاءکم سمحاءکم وامورکم شوری بینکم فظھر الارض خیر لکم من بطنھا واذا کانت امراءکم شرارکم واغنیاءکم بخلاءکم وامورکم الی نساءکم فبطن الارض خیر لکم ظھرھا (ترمذی)

جب تمہارے حکام بہترین لوگ ہوں اور دولتمند فیاض لوگ ہوں اور حکومت اصول شوری پر ہو تو اس زمین کی پشت اس کی آغوش سے (یعنی زندگی موت سے) بہتر ہے۔ اور جب بدترین لوگ حکام ہوں اور دولت مند کنجوس ہوں، اور حکومت کے معاملات عورتوں کے سپرد ہو جائیں، تو آغوش زمین پشت زمین سے (یعنی موت زندگی سے) بہتر ہے۔

۴۳ - راعی اور رعایا کی قسمیں :

(ابن عمرؓ) رفعہ:- کلکم راع و مسئول عن رعیتہ فالامام راع و مسئول عن رعیتہ والرجل راع فی اھلہ ومسئول عن رعیتہ والمرأۃ فی بیت زوجھا راعیۃ ومسئولۃ عن رعیتھا والخادم فی مال سیدہ راع وھو مسئول عن رعیتہ فسمعت ھولاء من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واحسب النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال والرجل فی مال ابیہ راع وھو مسئول عن رعیتہ فکلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ (شیخین، ابوداؤد، ترمذی)

تم میں سے ہر شخص راعی کی حیثیت رکھتا ہے اور اس سے اس کی رعیّت کے متعلق باز پرس ہوگی۔ امام ایک راعی ہے۔ اور اس سے اس کی رعیّت کے بارے میں باز پرس ہوگی مرد بھی اپنے بال بچوں کا راعی ہے اور اس سے اس رعیت کی باز پرس ہوگی۔ عورت بھی اپنے شوہر کے گھر کی راعی ہے۔ اور اس سے اس رعیت کی باز پرس ہوگی۔ نوکر بھی اپنے اپنے آقا کے مال کا راعی ہے اور اس سے اس رعیت کی باز پرس ہوگی (میں نے ان تمام راعی و رعیّت کا ذکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے سنا ہے! اور مجھے خیال آتا ہے کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بھی کہتے سنا ہے کہ آدمی اپنے باپ کے مال کا بھی راعی ہے۔ اور اس سے اس کی باز پرس ہوگی، غرض تم میں سے ہر شخص راعی ہے۔ اور (اپنے دائرے میں) اپنی رعیّت کے متعلق جواب دہ ہے۔

۴۴ ۔ عادل کا انعام :

(ابن عمرو بن العاص) رفعہ: ان المقسطین عند اللہ علی منابر من نور عن یمین الرحمٰن وکلتا یدیہ یمین الذین یعدلون فی حکمھم واھلیھم وما ولوا (مسلم، نسائی)

عدل کرنے والے اللہ کی دائیں طرف نورانی ممبروں پر بیٹھیں گے۔ اور اللہ کے تو دونوں ہی ہاتھ داہنے ہیں۔ یہ لوگ جب تک اپنے عہدے پر رہتے ہیں۔ اپنے فیصلوں میں اپنے اہل و عیال کے معاملے میں بھی عدل ہی سے کام لیتے ہیں۔

۴۵ ۔ خائن راعی کا انجام

(معقل بن یسار) رفعہ... یقول ما من عبد یسترعیہ اللہ رعیۃ یموت یوم یموت وھو غاش لرعیتہ الا حرم اللہ علیہ الجنۃ (شیخین)

.... جسے اللہ تعالےٰ کسی رعیت کا راعی بنائے اور وہ اپنے فرض میں خیانت کا ارتکاب کر کے مرے تو اللہ تعالےٰ اس پر جنت حرام کر دے گا۔

۴۶ ۔ اللہ کے قرب و بعد کا تعلق امام کے عدل و جور سے :-

(ابوسعید) رفعہ) احب الناس الی اللہ یوم القیامۃ وادناھم منہ مجلسا امام عادل وابغض الناس الی اللہ وابعدھم منہ مجلسا امام جائر (الترمذی)

بروز حشر اللہ تعالےٰ کا سب سے زیادہ محبوب اور اللہ کے حضور سب سے زیادہ قریب بیٹھنے والا شخص امام عادل ہوگا اور سب سے زیادہ قابل نفرت اور سب سے زیادہ دور جگہ پانے والا شخص ظالم امام ہوگا۔

۴۷ ۔ عہدوں کا نہ ملنا بڑی رحمت ہے ۔

(المقدام بن معدی کرب) ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم ضرب علی منکبیہ ثم قال افلحت یا قدیم ان مت ولم تکن امیرا ولا کاتبا ولا عریفا (ابوداؤد)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مقدام بن معدی کرب کے کاندھوں پر ہاتھ مار کر فرمایا کہ اے قدیم اگر کہیں کے امیر یا منشی (سیکرٹری) یا چودھری بنے بغیر مر جاؤ تو سمجھو کہ تم نے فلاح حاصل کر لی۔

۴۸ - عہدوں کی طلب چھوڑ دو :-

(عبدالرحمٰن ابن سمرۃ) رفعہ : یاعبدالرحمٰن لاتسأل الامارۃ فانک ان اوتیتہا عن مسئلۃ وکلت الیہا وان اعطیتہا من غیر مسألۃ اعنت علیہا (للستہ الامالکا)

اے عبدالرحمٰن کبھی امارت کی طلب نہ کرو اگر تمہیں مانگنے سے امارت ملی تو نفس کے پھندوں میں آجاؤ گے اور اگر بے طلب ملی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہاری امداد ہو گی۔

۴۹ - عہدوں کی حرص :-

(ابوھریرۃؓ) رفعہ : انکم ستحرصون علی الامارۃ وستکون ندامۃ یوم القیامۃ فنعمت المرضعۃ وبئست الفاطمۃ (بخاری ۔ نسائی)

تم لوگوں میں عنقریب امارت کی حرص پیدا ہونے لگے گی۔ لیکن ایسی امارت بروزِ حشر سبب ندامت بنے گی یہ دودھ پلانے والی تو بڑی اچھی ہے۔ مگر دودھ چھڑاتے وقت بڑی بُری ہوتی ہے۔

۵۰ - عہدوں کا مطالبہ

(ابوموسیٰؓ) دخلت علی النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم انا ورجلان من بنی عمی فقال احدھما یارسول اللّٰہ أمرنا علی بعض ما ولاک اللّٰہ وقال الآخر مثل ذلک فقال انا واللّٰہ لانولی ھذا العمل احداً سألہ او احداً حرص علیہ (شیخین، ابوداؤد، نسائی)

میں اور میرے دو عم زاد بھائی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے۔ ان میں سے ایک نے عرض کیا کہ، یارسول اللہ آپ اپنے عطا شدہ اختیارات سے مجھے بھی کہیں کی امارت سپرد کیجئے۔ دوسرے شخص نے بھی ایسی ہی درخواست پیش کی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ :- خدا کی قسم میں اس عہدے پر کسی ایسے شخص کو مقرر نہ کروں گا جو اس کی طلب یا حرص رکھتا ہو۔

۵۱ - امارت و وزارت کا باہمی تعلق :-

(عائشہؓ) رفعتہ : اذا اراد اللّٰہ بالامیر خیراً جعل لہ وزیر صدق

جب اللہ تعالیٰ کسی امیر کی بھلائی چاہتا ہے تو اسے ایک مخلص وزیر بھی دے دیتا ہے۔ امیر اگر کچھ

ان نسی ذکرہ وان ذکر اعانہ واذا اراد بہ غیر ذلک جعل لہ وزیر سوء ان نسی لم یذکرہ وان ذکر لم یعنہ (ابوداؤد، نسائی)

بھول جائے تو وہ یاد دلا دیتا ہے۔ اور اگر یاد رکھے تو مدد دیتا ہے۔ اور اگر کسی امیر کی بھلائی مقصود نہ ہو تو اس کے لئے ایک بُرا وزیر پیدا کر دیتا ہے جو بھولتے وقت کچھ یاد نہیں دلاتا اور یاد رہے تو کوئی مدد نہیں پہنچاتا۔

۵۲۔ خوشامد اور ظلم سے امرا کی اعانت نہ کرو:

(کعب بن عجرۃ) رفعہ: اسمعوا انہ سیکون من بعدی امراء فمن دخل علیھم فصدقھم بکذبھم واعانھم علی ظلمھم فلیس منی ولست منہ ولیس بوارد علی الحوض ومن دخل علیھم ولم یعنھم علی ظلمھم ولم یصدقھم بکذبھم فھو منی وانا منہ وھو وارد علی الحوض (ترمذی، ونسائی)

سن لو کہ عنقریب چند (نالائق) امراء ہوں گے۔ جو شخص ان کے پاس جائے اور ان کے جھوٹ کی تصدیق کر کے ان کے ظلم میں اعانت کرے وہ مجھ سے اور میں اس سے الگ ہوں گا اور وہ میرے پاس حوض سے سیراب ہونے کے لئے نہ آسکے گا لیکن جو ان امرا کے پاس جا کر نہ ان کے مظالم میں ہاتھ بٹائے گا اور نہ ان کی جھوٹی باتوں کو سچا بتائے وہ میرا اور میں اس کا ہوں گا۔ اور وہ حوض سے سیراب ہونے کے لئے میرے پاس پہنچ جائے گا۔

۵۳۔ مشقت میں ڈالنے والا حاکم:

(عبدالرحمٰن بن شماسۃ المھری عن عائشہؓ) رفعتہ ۔۔۔۔ اللھم من ولی من امر امتی شیئا فشق علیھم فاشقق علیہ ومن ولی من امر امتی شیئا فرفق بھم فارفق بہ (مسلم)

۔۔۔۔ اے اللہ جو شخص میری امت کے کسی معاملے کا امیر ہو، اور وہ لوگوں کو مشقت میں ڈالے تو بھی اسے مشقت میں ڈال، اور جو امیر ان سے نرمی کا برتاؤ کرے تو بھی اس کے ساتھ نرمی کا سلوک فرما۔

۵۴۔ اولی الامر سے قصاصِ ظلم لیا جائے گا:۔

(عمرؓ) قال فی خطبتہ انی لم ابعث عمالی لیضربوا ابشارکم ولا لیاخذوا اموالکم فمن فعل بہ ذلک فلیرفعہ

حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے اپنے ایک خطبے میں فرمایا: "میں اپنے عمال کو اس لئے نہیں بھیجتا کہ تمہارے جسموں کو مار کر تکلیف پہنچائیں یا تمہارا مال چھین لیں۔ جس کے ساتھ ایسا ہو وہ

بما يحفظ به نفسه واهله الا لم يجد رائحة الجنة (اوسط، صغير لضعف)

اپنے بال بچوں کی نگاہ داشت کرتا ہے۔ تو وہ جنت کی خوشبو بھی نہ سونگھ سکے گا۔

۵۹۔ ایضاً

(ابن عباسؓ) رفعه: من ولی شيئا من امر المسلمين لم ينظر الله فی حاجته حتی ينظر فی حوائجهم (کبير بلين)

جو مسلمانوں کا امیر ہو، اس کی ضرورتوں پر اللہ تعالیٰ نگاہ بھی نہیں ڈالے گا۔ جب تک وہ لوگوں کی ضرورتوں پر نظر نہ رکھے۔

۶۰۔ اولی الامر کی خیر خواہی اور اس کا طریقہ:

(عیاض بن غنمؓ) من اراد ان ينصح لذی سلطان بامر فلا يبد له علانية ولكن ليأخذ بيده فيخلو به فان قبل منه فذاك والا قد كان قد ادی الذی عليه (احمد، مطولا)

جو کسی حاکم کی کسی معاملے میں خیر خواہی کرنا چاہے۔ وہ اسے علانیہ رسوا نہ کرے۔ بلکہ اس کا ہاتھ پکڑ کر تنہائی میں لے جائے (اور بات سمجھا دے) اگر وہ مان جائے تو فبہا۔ ورنہ سمجھانے والا تو اپنے فرض سے سبکدوش ہو ہی جائے گا۔

۶۱۔ اولی الامر کے سامنے جا کر:

(ابن عمرؓ) رفعه: من حضر اماما فليقل خيرا اوليسكت (اوسط بلين)

جو امام کے پاس جائے وہ یا تو اچھی بات کہے یا خاموش رہے (یعنی ہر ہاں میں ہاں نہ ملائے۔ اور بُری بات زبان سے نہ نکالے)۔

۶۲۔ امیر کا بیت المال میں کتنا حق ہے:

(علیؓ) رفعه: لا يحل للخليفة من مال الله الا قصعتين قصعة ياكلها هو واهله وقصعة يضعها بين يدی الناس (احمد)

خلیفے کے لئے اللہ تعالیٰ کے مال میں سے دو پیالے سے زیادہ لینا جائز نہیں۔ یعنی ایک پیالہ تو اس کے اور اس کے بال بچوں کے لئے اور دوسرا وہ جو لوگوں کے سامنے رکھے۔

بما يحفظ به نفسه واهله الا لم يجد رائحة الجنة (اوسط، صغير لضعف)

اپنے بال بچوں کی نگاہ داشت کرتا ہے۔ تو وہ جنت کی خوشبو بھی نہ سونگھ سکے گا۔

۵۹۔ ایضاً

(ابن عباسؓ) رفعه: من ولی شیئا من امر المسلمين لم ينظر الله فی حاجته حتی ينظر فی حوائجهم (کبیر بلین)

جو مسلمانوں کا امیر ہو، اس کی ضرورتوں پر اللہ تعالیٰ نگاہ بھی نہیں ڈالے گا۔ جب تک وہ لوگوں کی ضرورتوں پر نظر نہ رکھے۔

۶۰۔ اولی الامر کی خیرخواہی اور اس کا طریقہ:

(عیاض بن غنمؓ) من اراد ان ينصح لذی سلطان بامر فلا يبده له علانية ولكن ليأخذ بيده فيخلو به فان قبل منه فذاك والا قد كان قد ادى الذی عليه (احمد مطولا)

جو کسی حاکم کی کسی معاملے میں خیرخواہی کرنا چاہے۔ وہ اسے علانیہ رسوا نہ کرے۔ بلکہ اس کا ہاتھ پکڑ کر تنہائی میں لے جائے (اور بات سمجھا دے) اگر وہ مان جائے تو فبہا، ورنہ سمجھانے والا تو اپنے فرض سے سبکدوش ہو ہی جائے گا۔

۶۱۔ اولی الامر کے سامنے جاکر:

(ابن عمرؓ) رفعه: من حضر اماما فليقل خيرا او ليسكت (اوسط بلین)

جو امام کے پاس جائے وہ یا تو اچھی بات کہے یا خاموش رہے (یعنی ہر بات میں ہاں نہ ملائے۔ اور بُری بات زبان سے نہ نکالے)۔

۶۲۔ امیر کا بیت المال میں کتنا حق ہے:

(علیؓ) رفعه: لا يحل للخليفة من مال الله الا قصعتين قصعة ياكلها هو واهله وقصعة يضعها بين يدی الناس (احمد)

خلیفے کے لئے اللہ تعالیٰ کے مال میں سے دو پیالے سے زیادہ لینا جائز نہیں۔ یعنی ایک پیالہ تو اس کے اور اس کے بال بچوں کے لئے اور دوسرا وہ جو لوگوں کے سامنے رکھے۔

۶۳ - حضرت ابوبکرؓ کا عجیب اسوہ :-

(ابوبکرؓ) قال لما احتضر یا عائشة انظری اللقحة التی کنا نشرب من لبنها والجفنة التی نصطنع فیها والقطیفة التی کنا نلبسها فانا کنا ننتفع بذلک حین کنا نلی امر المسلمین فاذا مت فردیه الی عمرؓ فلما مات ابوبکرؓ ارسلت بها الی عمرؓ فقال عمر رحمک اللہ لقد اتعبت من جاء بعدک۔

(کبیر)

حضرت ابوبکرؓ نے بوقت رحلت فرمایا کہ : اے عائشہؓ دیکھو یہ تو وہ اونٹنی ہے جس کا ہم دودھ پیا اور یہ ہے وہ پیالہ جس میں کھانا تیار کرتے تھے۔ اور یہ وہ چادر ہے جو ہم اوڑھا کرتے تھے۔ ان تینوں چیزوں سے ہم اس وقت فائدہ اٹھا رہے تھے جب ہم مسلمانوں کے امیر تھے۔ لہذا جب میں مرجاؤں تو یہ عمرؓ کو واپس کر دینا۔ چنانچہ جب آپ وفات پا چکے تو حضرت عائشہؓ نے یہ تینوں چیزیں حضرت عمرؓ کے پاس بھیج دیں۔ آپ نے فرمایا کہ : اے ابوبکرؓ آپ پر خدا کی رحمت ہو۔ آپ نے اپنے بعد آنے والے کو تھکا دینے کا سامان کر دیا۔

اطاعتِ امام اور جماعت سے وابستگی

۶۴ - اطاعت امیر کی حدود :

(انسؓ) رفعہ :- اسمعوا واطیعوا و ان استعمل علیکم عبد حبشی کان رأسه زبیبة ما اقام فیکم کتاب اللہ (غ، س)

اگر تم پر کوئی ایسا حبشی غلام بھی جس کا سر مویز منقّی کی طرح چھوٹا ہو، امیر بنا دیا جائے تو جب تک وہ کتاب اللہ کے مطابق چلائے۔ اس کی سمع و طاعت کرتے رہو۔

۶۵ - امیر کی اطاعت عین خدا و رسول کی اطاعت ہے :

(ابوھریرةؓ) رفعہ : من اطاعنی فقد اطاع اللہ ومن عصانی فقد عصے

جو میری اطاعت کرتا ہے۔ وہ اللہ تعالےٰ کا مطیع ہے اور جو میرا نافرمان ہے وہ اللہ تعالیٰ کا بھی نافرمان ہے اور جو

الله ومن یطع الامیر فقد اطاعنی ومن یعص الامیر فقد عصانی

امیر کا اطاعت گزار ہے وہ میرا فرمانبردار ہے۔ اور جو امیر کی نافرمانی کرے وہ میرا بھی نافرمان ہے۔

۶۶ - امام کون ہوتا ہے؟

زاد فی روایة: وانما الامام جُنة یقاتل من ورائه ویتقی به فان امر بتقوی الله وعدل فان له بذلك اجراً وان قال بغیره کان علیه منه وزر۔ (شیخین ۔ نسائی)

دوسری روایت میں یہ بھی ہے کہ امام ایک سپر ہے۔ جس کی پناہ میں جنگ کی جاتی ہے اور جس کے ذریعے بچاؤ کیا جاتا ہے پس اگر وہ تقویٰ اللہ کا حکم دے اور عدل کو قائم رکھے تو اس کے لئے اجر ہے۔ اور اگر اس کے علاوہ کچھ کہے تو اس کا بوجھ اسی پر ہوگا۔

۶۷ - ترک اطاعت کب ہے؟

(ابن عمرؓ) رفعه: علی المرء المسلم السمع والطاعة فیما احب وکره الا ان یؤمر بمعصیة فلا سمع ولا طاعة۔ (للستة الا مالکا)

مرد مسلم پر تو سمع و اطاعتِ امیر واجب ہے خواہ وہ اسے پسند ہو یا ناپسند۔ ہاں اگر اسے معصیت کا حکم دیا جائے تو وہاں کوئی سمع و طاعت نہیں۔

۶۸ - معصیتِ الٰہی میں کسی کی اطاعت نہیں:

(ابن مسعودؓ) رفعه: سیلی امورکم بعدی رجال یضعون السنة ویعملون بالبدعة ویؤخرون الصلوٰة عن مواقیتها قلت یارسول الله ان ادرکتهم کیف افعل؟ قال تسألنی یا ابن ام عبد کیف تفعل؟ لا طاعة لمن عصی الله (قزوینی)

میرے بعد کچھ ایسے لوگ تمہارے امیر ہوں گے۔ جو سنت کو ہٹا کر بدعتیں جاری کریں گے اور نماز کے اوقات میں تاخیر کریں گے۔ میں نے عرض کیا کہ: یا رسول اللہ! اگر ایسے لوگ مجھے ملیں تو میں کیا کروں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے ام عبد کے فرزند! مجھ سے پوچھتے ہو کہ ایسی صورت میں کیا کروں؟ ارے جو اللہ کا نافرمان ہو۔ اس کی اطاعت کیسی؟

۶۹ - اولی الامر کی ہر حال میں اطاعت:

(ابوھریرۃؓ) رفعہ، علیک بالسمع والطاعۃ فی عسرک ومنشطک مکرھک وأثرۃ علیک (مسلم، نسائی)

تم پر امیر کی سمع و اطاعت ہے۔ تنگی میں بھی، فراخی میں بھی، خوشی میں بھی ناخوشی میں بھی اور اپنے آپ پر ترجیح دینے میں بھی۔

۷۰ - بہترین اور بدترین ائمہ:

(عوف بن مالک) رفعہ خیار أئمتکم الذین تحبونھم ویحبونکم وتصلون علیھم ویصلون علیکم وشرار ائمتکم الذین تبغضونھم ویبغضونکم وتلعنونھم ویلعنونکم قلنا یا رسول اللہ افلا ننا بذھم؟ قال لا ما اقاموا فیکم الصلوۃ لا ما اقاموا فیکم الصلوۃ لا ما اقاموا فیکم الصلوۃ الا من ولی علیہ وال فرآہ یأتی شیئا من معصیۃ اللہ فلیکرہ ما یأتی من معصیۃ اللہ ولا ینزعن یداً من طاعۃ (مسلم)

تمہارے بہترین امام وہ ہیں جن سے تم اور جو تم سے محبت رکھتے ہوں۔ تم انہیں اور وہ تمہیں دعائے خیر سے یاد کرتے ہوں اور بدترین امام وہ ہیں جن سے تم اور جو تم سے بغض رکھتے ہوں اور جن پر تم اور جو تم پر ملامت ولعنت کرتے رہتے ہوں۔ ہم نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کیا ہم ایسے ائمہ سے انقطاع یا اعلان جنگ نہ کریں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار فرمایا کہ: جب تک تم میں اقامت صلوٰۃ کرتے رہیں اس وقت تک الیامت کرو۔ پھر فرمایا کہ: جس پر کوئی امیر مقرر کر دیا جائے۔ اور وہ اس امیر کو کسی معصیت کا ارتکاب کرتے دیکھے، تو اس معصیت کو تو ضرور برا سمجھے لیکن اس کی طاعت سے اپنا ہاتھ نہ کھینچے۔

۷۱ - دنیاوی غرض سے بیعت:

(ابوھریرۃؓ) رفعہ: ثلاثۃ لا یکلمھم اللہ یوم القیامۃ ولا ینظر الیھم ولا یزکیھم ولھم عذاب الیم رجل علی فضل ماء بفلاۃ یمنعہ ابن السبیل ورجل

تین قسم کے آدمی ایسے ہیں۔ جن سے اللہ تعالیٰ بروز حشر بات بھی نہیں کرے گا۔ نہ ان کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھے گا۔ نہ انہیں پاک کرے گا۔ بلکہ ان کے لئے دردناک عذاب ہوگا۔ ایک وہ شخص جو کسی بیابان میں زائد از ضرورت پانی پر قابض ہو اور مسافروں کو پانی نہ لینے

بایع رجلا بسلعة بعد العصر فحلف بالله لاخذها بكذا وكذا فصدقه فاخذها وهو على غير ذلك ورجل بايع اماما لا يبايعه الا للدنيا فان اعطاه منها ما يريد وفى له وان لم يعطه لم يف۔
(شیخین، ابوداؤد، نسائی)

دے۔ دوسرا وہ شخص جو بعد عصر کوئی سودا یہ کہہ کر بیچے کہ خدا کی قسم میں نے تو اتنے کو خریدا ہے اور خریدار اسے سچا سمجھ کر خرید لے۔ حالانکہ اس نے قسم غلط کھائی تھی۔ تیسرا وہ شخص ہے جو کسی امام کی بیعت محض دنیا کے لئے کرے۔ یعنی اگر وہ امام اس کا دنیوی مطالبہ پورا کردے پھر تو اس کے ساتھ وفا کرے اور اگر اسے کچھ نہ دے تو بے وفائی پر اتر آئے۔

۷۲ - اولی الامر کو کوسنا:

(ابو امامۃؓ) رفعه: لا تسبوا الائمة وادعوا الله لهم بالصلاح فان صلاحهم لكم صلاح (كبير، اوسط)

اماموں کو گالیاں نہ دو، بلکہ ان کے لئے دعائے خیر کرو، کیونکہ تمہاری اصلاح بھی ان ہی کی اصلاح سے وابستہ ہے۔

۷۳ - نظام اجتماع سے وابستگی:

(ابوذرؓ) رفعه: من فارق الجماعة شبرا فقد خلع ربقة الاسلام من عنقه (ابوداؤد)

جو شخص جماعت سے بالشت بھر بھی الگ ہوا اس نے اسلام کا قلادہ اپنی گردن سے اتار پھینکا۔

۷۴ - ضلالت پر اجماع نہیں ہوتا:

(ابن عمرؓ) رفعه: لن تجتمع امتی علی ضلالة فعليكم بالجماعة فان يد الله على الجماعة (كبير)

میری امت کا اجتماع گمراہی پر نہ ہوگا۔ لہٰذا تم لوگ جماعت سے وابستہ رہو۔ کیونکہ جماعت کے ساتھ خدا کی مدد ہوتی ہے۔

۷۵ - اجتماع سے انقطاع:

(معاذؓ) رفعه: ان الشيطان ذئب الانسان كذئب الغنم يأخذ الشاة

بھیڑ بکری کی طرح انسان کے بھی بھیڑیئے ہوتے ہیں اور انسان کا بھیڑیا شیطان ہے۔ دور اور

القاصية والناحية فاياكم والشعاب و عليكم بالجماعة والعامة والمسجد.

(احمد، كبير)

کنارے رہنے والی بکری کو بھیڑیا اٹھالے جاتا ہے لہٰذا تفریق سے بچو اور جماعت سے، عوام سے اور مسجد سے وابستہ رہو۔

۷۶ - کتاب اللہ اور حکومت کے افتراق کے وقت کیا کرنا چاہیئے؟

(معاذؓ) رفعه: الا انه رحى الاسلام دائرة فدوروا مع الكتاب حيث دار الا ان الكتاب والسلطان سيفترقان فلا تفارقوا الكتاب الا انه ستكون عليكم امراء يقضون لانفسهم ما لا يقضون لكم فان عصيتموهم قتلوكم وان اطعتموهم اضلوكم قالوا يا رسول الله كيف نصنع؟ قال كما صنع اصحاب عيسى بن مريم نشروا بالناشر وحملوا على الخشب موت فاطاعة الله خير من حياة فى معصية الله (كبير بلين)

اسلام کی چکی چل پڑی ہے۔ لہٰذا جدھر کتاب اللہ لے جائے اُدھر ہی تم بھی گھوم جاؤ۔ سنو! کتاب اللہ اور حکومت عنقریب الگ الگ ہو جائیں گی۔ تم اس وقت کتاب کو نہ چھوڑنا۔ سنو! عنقریب تم پر ایسے امرا مسلط ہونے والے ہیں۔ جن کے فیصلے تمہارے لئے کچھ اور ہوں گے۔ اور اپنے لئے کچھ اور، ان کی نافرمانی کرو گے تو وہ تمہیں قتل کر دیں گے۔ اور اگر اطاعت کرو گے، تو گمراہ کر دیں گے۔ لوگوں نے عرض کیا کہ: یا رسول اللہ، اس وقت ہمارا کیا طرزِ عمل ہو؟ فرمایا: وہی جو اصحاب عیسیٰ (علیہ السلام) کا تھا۔ انہیں آروں سے چیرا گیا اور سولی پر لٹکایا گیا۔ اللہ تعالےٰ کی طاعت میں مر جانا اس کی نافرمانی میں زندہ رہنے سے بہتر ہے۔

۷۷ - اولی الامر کے سامنے بے خوف حق گوئی:

(ابو هريرةؓ) رفعه: لا تدخلن على الامراء فان غلبت على ذلك فلا تجاوز سنتى ولا تخافن سيفه ولا سوطه ان تأمرهم بتقوى الله.

(اوسط بضعف)

حکام کے پاس حتی الامکان نہ جایا کرو۔ اگر ایسا ہی کرنا پڑے۔ تو میری سنت سے تجاوز نہ کرو، اور انہیں تقویٰ اللہ کا حکم سنانے میں تلوار اور کوڑے سے نہ ڈرو۔

۷۸ - گمراہ دور میں کیا طرزِ عمل ہو؟:

(ابو ھریرہؓ) رفعہ: یکون فی آخر الزمان امراء ظلمۃ ووزراء فسقۃ و قضاۃ خونہ وفقہاء کذبۃ فمن ادرک ذلک الزمان منکم فلا یکونن لھم جابیا ولا عریفا ولا شرطیا

(اوسط، صغیر بلیہ)

آخر زمانہ میں ظالم اولی الامر، فاسق وزراء، خائن قاضی اور جھوٹے فقہا ہوں گے۔ تم میں سے جو بھی ایسا دور دیکھے۔ وہ نہ ان کا محصل بنے نہ نقیب اور نہ سپاہی۔

۷۹ - ظالم امام اور سرکش نقندی:

(ابو امامۃؓ) رفعہ: صنفان من امتی لن تنلھما شفاعتی امام ظلوم غشوم وکل غال مارق (کبیر، اوسط)

میری امت میں دو قسم کے لوگ ایسے ہیں جنہیں میری شفاعت نصیب نہ ہوگی۔ ایک تو ظالم و غاصب امام اور دوسرے وہ خود پسند جو دین (نظام اجماع) سے نکل جائیں۔

معاہدے کے احکام

۸۰ - معاہد کے ساتھ عدل و رحم کی تاکید:

(صفوان بن سلیم) عن عدۃ من ابناء الصحابۃ عن آبائھم۔ رفعوہ: من ظلم معاھداً او انتقصہ او کلفہ فوق طاقتہ او اخذ منہ شیئا بغیر طیب نفس فانا حجیجہ یوم القیمۃ (ابو داؤد)

کئی فرزندان صحابہؓ اپنے آبا کے حوالے سے مرفوعاً روایت کرتے ہیں کہ جو معاہد (معاہدہ کرنے والے) پر ظلم کرے یا معاہدے میں کمی پیدا کرے یا اس کی قوت برداشت سے زیادہ اس پر بوجھ ڈالے یا اس کی خوشی دلی کے بغیر اس سے کچھ وصول کرے تو میں بروز قیامت اس کی طرف سے وکیل ہوں گا۔

۸۱ - پابندی عہد معاہد:

(ابو رافع) بعثنی قریش الی النبی صلی

مجھے کفار قریش نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت

الله عليه وسلم فلما رأيته ألقي في قلبي الاسلام فقلت يا رسول الله لا ارجع اليهم ابدا فقال اني لا اخيس بالعهد ولا احبس البُرُد ولكن ارجع فان كان في نفسك الذي في نفسك الآن فارجع فذهبت ثم اتيته صلى الله عليه وسلم فاسلمت (ابوداؤد)

میں بھیجا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتے ہی میرے دل میں اسلام اتر گیا۔ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں تو اب کبھی ان کے پاس واپس نہ جاؤں گا۔ فرمایا کہ: میں معاہدے میں غداری نہیں کرتا۔ اور نہ سفیروں کو قید کر سکتا ہوں۔ تم اس وقت تو واپس ہو جاؤ۔ پھر اگر تمہارے دل میں یہی جذبہ باقی رہے تو واپس آ جانا۔ بغرض اس وقت تو میں واپس ہو گیا۔ اس کے بعد دوبارہ آ کر اسلام لایا۔

۸۲ - اصول کی محافظت:

(سلمة بن نعيم) عن ابيه: قال سمعت النبي صلى الله عليه وسلم يقول حين قراء كتاب مسيلمة للرسول ما تقولان انتما قالا نقول كما قال قال اما والله لولا ان الرسل لا تقتل لضربت اعناقكما (ابوداؤد)

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسیلمہ کذاب کا خط پڑھا تو قاصدوں سے پوچھا کہ تم دونوں کا کیا عقیدہ و خیال ہے۔ بولے: وہی جو مسیلمہ کا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اگر قاصدوں کو قتل کیا جا سکتا تو میں تم دونوں کی گردنیں مار دیتا۔

۸۳ - عورت کا درجہ:

(عائشة رض) ان كانت المرأة لتجير على المسلمين فيجوز (ابوداؤد)

اگر عورت کسی کو مسلمانوں کے مقابلہ میں پناہ دے تو جائز ہے۔

۸۴ - بدعہدی کی سزا کیا ہوتی ہے؟

(مالك رض) بلغني: ان ابن عباس رض قال ما ختر قوم بالعهد الا سلط عليهم العدو (ابوداؤد)

ابن عباس رض فرماتے ہیں کہ جو قوم بدعہدی کرتی ہے اس پر دشمن مسلط کر دیا جاتا ہے۔

۸۵ - مجوس اہل کتاب کی صف:

(جعفر بن محمد) عن ابيه: ان عمر ذكر المجوس فقال ما ادري كيف اصنع في

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک بار مجوس کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان لوگوں کے معاملے

امرهم فقال عبدالرحمٰن بن عوف اشهد سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول سنوا بهم سنة اهل الكتاب (مالك)

میں کیا روش اختیار کروں؟ عبدالرحمٰن بن عوفؓ بولے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ ان کے ساتھ وہی معاملہ کرو جو اہل کتاب کے ساتھ ہوتا ہے۔

۸۶ - بدعہدی کی شہرت

(ابن عمرؓ) رفعه: ان الغادر ینصب له لواء یوم القیامة فیقال هذه غدرة فلان (شیخین، ابوداؤد، ترمذی)

غداری (معاہدے کی خلاف ورزی اور بدعہدی) کرنے والے کے لئے قیامت کے دن ایک جھنڈا نصب کیا جائے گا۔ اور یہ بتایا جائے گا کہ فلاں شخص کی بدعہدی کا نشان ہے۔

غنیمت اور غلول

۸۷ - مرد وزن کے مساوی حصے:

(حشرج بن زیاد) عن جدته ام ابیه: خرجت فی غزاة خیبر سادسة ست نسوة فبلغ ذلك النبی صلی اللہ علیہ وسلم فبعث الینا فجئنا فرأینا فیه الغضب فقال مع من خرجتن وباذن من خرجتن؟ فقلنا خرجنا نغزل الشعر ونعین به سبیل اللہ ونناول السهام ومعنا دواء للجرحی ونسقی السویق قال قمن اذاً حتی اذا فتح اللہ علیهم خیبر اسهم لنا کما اسهم للرجال فقلت لها یا جدة ما کان ذلك قالت تمراً (ابوداؤد)

غزوۂ خیبر میں شریک ہونے والی چھ عورتوں میں میں بھی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جب علم ہوا تو ہم سب کو بلا بھیجا۔ جب ہم آئیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو غصّہ میں پایا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ تم کس کے ساتھ اور کس کی اجازت سے آئی تھیں۔ ہم نے جواب دیا کہ ہم اُون کی چیزیں بنتی ہیں جن سے قتال فی سبیل اللہ میں مدد ملتی ہے اور تیر بھی پیش کرتی ہیں۔ نیز ہمارے پاس زخمیوں کے لئے دوا بھی ہے۔ اور ہم انہیں دارو (یا ستّو) بھی پلاتی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پھر اپنا کام کئے جاؤ۔ بالآخر جب خیبر فتح ہوا، تو ہم عورتوں کو بھی حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اسی طرح حصہ دیا جس طرح مردوں کو دیا۔ میں نے پوچھا کہ دادی جان! آپ کے حصے میں کیا چیز آئی تھی؟ بولیں: کھجوریں۔

۸۸ ۔ مال غنیمت میں غیر مسلموں کے حصّے :

(الزہری): ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اسھم لقوم من الیھود قاتلوا معہ (ترمذی)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان یہودیوں کو بھی حصّے دیئے ہیں، جنہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ جنگ میں شرکت کی تھی۔

۸۹ ۔ حضرت عثمان غنیؓ کا حصہ غنیمت بلا شرکت جہاد :

(ابن عمرؓ) ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال یعنی یوم بدر ان عثمان انطلق فی حاجۃ اللہ وحاجۃ رسولہ وانی ابایع لہ فضرب لہ بسھم ولم یضرب لاحد غاب غیرہ (ابوداؤد)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بموقع بدر فرمایا کہ: عثمان رضی اللہ اور اس کے رسول ہی کے کام سے غیر حاضر رہے ہیں۔ میں ان کی طرف سے غائبانہ بیعت لیتا ہوں۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا بھی حصہ غنیمت نکال دیا اور ان کے سوا کسی دوسرے غیر حاضر شخص کا حصّہ نہیں نکالا۔

تعبیر خواب وغیرہ

۹۰ ۔ خواب کی قسمیں اور بُرے خواب کا علاج :

(ابو ھریرۃؓ) رفعہ: اذا اقترب الزمان لم تکد رؤیا المسلم تکذب واصدقکم رؤیا اصدقکم حدیثا ورؤیا المسلم جزء من ستۃ واربعین جزءا من النبوۃ والرؤیا ثلاث فالرؤیا الصالحۃ بشری من اللہ ورؤیا تحزین من الشیطان ورؤیا مما یحدث المرء نفسہ فان رای احدکم ما یکرہ

قربِ قیامت کے وقت عموماً مسلمان کا خواب جھوٹا نہ ہوگا۔ اور جو مسلمان جتنا راست گفتار ہوگا اتنا ہی اس کا خواب سچا ہوگا۔ مسلمان کا صحیح خواب نبوت کے چھیالیس اجزا میں سے صرف ایک جزو ہے۔ خواب تین طرح کے ہوتے ہیں۔

(۱) صالح خواب تو اللہ (تعالیٰ) کی طرف سے بشارت ہوتی ہے (۲) غم انگیز خواب جو شیطان کی طرف سے ہوتے ہیں اور (۳) حدیث النفس جو اپنے خیالات کا عکس ہوتا ہے۔ لہذا اگر کسی کو کوئی

فلیقم فلیصل ولا یحدث بہا الناس
(شیخین، ترمذی، ابوداؤد)

ناگوار بات نظر آئے تو وہ اٹھ کر نماز ادا کرے اور اس کا ذکر کسی سے نہ کرے۔

۹۱ - خواب پریشان کے اثرات سے بچنے کا طریقہ:

(ابوقتادۃؓ) رفعہ: الرؤیا الصالحۃ من اللہ والحلم من الشیطان فاذا حلم احدکم الحلم یکرھہ فلیبصق عن یسارہ ولیستعذ باللہ منہ فلن یضرہ۔
(للستۃ الا النسائی)

اچھے خواب اللہ کی جانب سے اور پریشان کرنے والے خواب شیطان کی طرف سے ہوتے ہیں پس جب تمہیں ناگوار خواب نظر آئے تو اپنی بائیں جانب تین بار تھوک دو اور اس سے اللہ کی پناہ مانگو (یعنی اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم وغیرہ پڑھ لے) تو وہ خواب اسے کچھ نقصان نہ پہنچا سکے گا۔

۹۲ - مبشرات:

(ابوھریرۃؓ) رفعہ: لم یبق بعدی من النبوۃ الا المبشرات قالوا وما المبشرات؟ قال الرؤیا الصالحۃ
(مالک، ابوداؤد، بخاری)

میرے بعد نبوت کی کوئی خصوصیات بجز "مبشرات" کے باقی نہ رہے گی۔ لوگوں نے عرض کیا کہ: مبشرات کیا چیز ہے؟
فرمایا: (صالح) اچھے خواب۔

۹۳ - ام المومنین عائشہ صدیقہؓ کا ایک خواب اور اس کی تعبیر:

(عائشۃؓ) رأیت ثلاثۃ اقمار سقطن فی حجرتی فقصصت رؤیای علی ابی بکر فسکت فلما توفی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و دفن فی بیتی قال لی ابوبکرؓ ھذا احد اقمارک وھو خیرھا۔
(مالک، کبیر بنحوہ)

میں نے خواب میں دیکھا کہ میرے حجرے میں تین چاند گرے ہیں۔ میں نے یہ خواب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے بیان کیا تو وہ خاموش رہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب وفات پاکر میرے حجرے میں دفن ہوئے تو حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ ان تین چاندوں میں سے ایک یہ ہے جو سب سے بہتر چاند ہے۔ (اس کے بعد دوسرے دو چاند حضرت ابوبکرؓ اور پھر حضرت عمرؓ دفن ہوئے)

کتاب الطبّ

۹۴ - دوا ہر مرض کی موجود ہے مگر حرام دوا نہ ہو:

(ابو الدرداء) رفعہ: ان اللہ انزل الداء والدواء وجعل لکل داء دواء فتداووا ولا تداووا بالحرام (ابو داؤد)

اللہ نے بیماری بھی پیدا کی ہے۔ اور دوا بھی۔ ہر مرض کی دوا بھی ہوتی ہے۔ لہٰذا دوائیں استعمال کیا کرو۔ ہاں حرام چیزوں کو دوائً استعمال نہ کرو۔

۹۵ - بڑھاپے کی دوا نہیں

(اسامۃ بن شریک) رفعہ: تداووا فان اللہ تعالیٰ لم یضع داء الا وضع لہ دواء غیر داء واحد وھو الھرم (ابو داؤد و ترمذی)

دوا استعمال کیا کرو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر مرض کے لئے دوا بھی پیدا کی ہے۔ صرف ایک مرض کی دوا نہیں، اور وہ ہے بڑھاپا۔

۹۶ - معدے کی لطیف مثال:

(ابو ھریرۃ رضی اللہ عنہ) رفعہ: المعدۃ حوض البدن والعروق الیھا واردۃ فاذا صحت المعدۃ صدرت العروق بالصحۃ واذا سقمت المعدۃ صدرت العروق بالسقم (اوسط بضعف)

معدہ بدن کا حوض ہے۔ جس سے سیراب ہونے کے لئے رگیں ملی ہوئی ہیں۔ اگر معدہ درست ہے تو یہ رگیں بھی جام صحت پی کر واپس ہوتی ہیں۔ ورنہ بیماری کے گھونٹ پی کر لوٹتی ہیں۔

۹۷ - اتباع سنت کا غلط مطلب سمجھنے کا نتیجہ:

(ابو کبشۃ الانماری)۔۔۔۔ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم احتجم علی

۔۔۔۔۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے زہریلے گوشت کا اثر دور کرنے کے لئے اپنے

هامته من الشاة المسمومة قال معمر فاحتجمت انا من غير سم كذلك في يافوخي فذهب حسن الحفظ عني حتى كنت القن فاتحة الكتاب في الصلوة (ابوداؤد)

سر پر پچھنا لگوایا تھا۔ معمر کا بیان ہے کہ میں نے بھی بغیر اس کے کہ کسی زہر کا اثر دور کرنا مقصود ہو، اپنی چندیا پر پچھنے لگوایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میری قوت حافظہ ختم ہو گئی حتیٰ کہ نماز کے اندر سورۂ فاتحہ تک میں لقمہ دیا جانے لگا۔

جھاڑ پھونک فال وغیرہ

۹۸ ۔ جبر و قدر کا امتزاج :

(ابو خزامة) عن ابيه قلت يا رسول الله ارأيت رقى نسترقي بها ودواء نتداوى به وتقاة نتقيها هل ترد من قدر الله شيئا؟ قال هو من قدر الله۔ (ترمذی)

میں نے پوچھا کہ: ہم لوگ جھاڑ پھونک بھی کرتے ہیں اور دوائیں بھی استعمال کرتے ہیں۔ اور بچاؤ کی دوسری تدبیریں بھی کر لیتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے میں کیا یہ چیزیں قضاء و قدر پر اثر انداز ہوتی ہیں؟ فرمایا جو کچھ تم کرتے ہو یہ بھی قضاء و قدر ہی میں داخل ہے۔

۹۹ ۔ بعض لغو اعتقادات :

(قطن بن قبيصة) عن ابيه رفعه العيافة والطيرة والطرق من الجبت۔ (ابوداؤد)

پرندے اڑا کر نیک شگون لینا، یا کسی اور طرح بدشگونی لینا یا جادو منتر کے طور پر کنکریاں پھینکنا، یہ سب فضول اور بے برکت چیزیں ہیں۔

سحر و نجوم وغیرہ

۱۰۰ ۔ نجوم کی لغویت :

(ابن عباسؓ) رفعه: من اقتبس بابا من

جو شخص علم نجوم سے اللہ تعالیٰ کے بتلائے ہوئے

علم النجوم لغير ما ذكر الله فقد اقتبس شعبة من السحر المنجم كاهن والكاهن ساحر والساحر كافر (رزين، ابو داؤد لبعضه)

مقصد کے علاوہ کچھ اور استفادہ کرتا ہے۔ وہ گویا سحر (جادو) سے استفادہ کرتا ہے۔ منجم ایک قسم کا کاہن ہے اور کاہن ساحر ہے اور ساحر کافر۔

۱۰۱ - پیروی علم نجوم کی گمراہی:

(العباسؓ) خرجت مع النبي صلى الله عليه وسلم من المدينة فالتفت اليها فقال ان الله قد طهر هذه القرية من الشرك ان لم تضلهم النجوم (موصلی، کبیر، اوسط، بلین)

میں ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدینے سے باہر گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مڑ کر مدینے کی طرف دیکھا اور فرمایا کہ اللہ تعالٰی نے اس آبادی کو شرک سے پاک کر دیا ہے بشرطیکہ انہیں نجوم گمراہ نہ کر دے۔

۱۰۲ - کہانت کی حقیقت:

(عائشةؓ) سئل النبي صلى الله عليه وسلم عن الكهان؟ فقال ليس بشيءٍ قالوا يا رسول الله انهم يحدثون احيانا بالشيء فيكون حقا فقال تلك الكلمة من الحق يخطفها الجن فيقذفها في اذن وليه فيخلطون معها مائة كذبة (شيخين)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کاہنوں کے بارے میں دریافت کیا گیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس میں کوئی حقیقت نہیں۔ لوگوں نے عرض کیا کہ: یا رسول اللہ! یہ لوگ بعض اوقات کچھ باتیں بتلاتے ہیں جو سچی نکلتی ہیں۔ فرمایا: ایک آدھ سچی بات شیطان اڑا لیتا ہے اور اسے اپنے دوست کے کان میں ڈال دیتا ہے۔ اور اس کے ساتھ سو جھوٹ بھی ملا دیتا ہے۔

سلام و مصافحہ وغیرہ

۱۰۳ - سلام اور اندر آنے کی اجازت:

(كلدة بن حنبلؓ) ان صفوان بن امية بعثه الى النبي صلى الله عليه

صفوان بن امیہ نے کلدہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کچھ دودھ، پیوسی اور سبزی لے کر بھیجا۔

وسلم بلبن ولباء وضغابیس والنبی صلی اللہ علیہ وسلم باعلی الوادی قال فدخلت علیہ ولم استأذن ولم اسلم فقال صلی اللہ علیہ وسلم ارجع فقل السلام علیکم ء ادخل ؟ وذلک بعد ما اسلم صفوان (ترمذی، ابو داؤد)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت وادی کے بالائی حصے میں تشریف رکھتے تھے۔ کلدہ کا بیان ہے کہ میں بلا اجازت لیے اندر داخل ہو گیا اور سلام بھی نہیں کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: باہر واپس جاؤ۔ اور پہلے السلام علیکم کہہ کر پوچھو کہ: میں اندر آ جاؤں ؟ یہ واقعہ صفوان کے اسلام لانے کے بعد کا ہے۔

۱۰۴ - اپنے گھر کے اندر داخل ہونے کے آداب :

(انسؓ) قال لی النبی صلی اللہ علیہ وسلم یا بُنی اذا دخلت علی اھلک فسلم یکن سلامک برکۃ علیک وعلی اھل بیتک (ترمذی)

مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اے فرزند! جب تم اپنے گھر کے اندر داخل ہو تو پہلے سلام کر لیا کرو۔ یہ سلام تمہارے لئے اور تمہارے گھر والوں کے لئے بھی باعثِ برکت ہوگا۔

۱۰۵ - گفتگو سے پہلے سلام :

(جابرؓ) رفعہ: السلام قبل الکلام (ترمذی)

گفتگو سے پہلے سلام ہوتا ہے۔

۱۰۶ بچوں کو سلام کرنا :

(انسؓ) مر علی صبیان فسلم علیھم وقال کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یفعلہ (شیخین، ترمذی، ابو داؤد)

(حضرت) انس (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کچھ بچوں کے پاس سے گذرے تو ان کو سلام کیا۔ اور کہا کہ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایسا ہی کیا کرتے تھے۔

۱۰۷ - سلام میں جماعت کی نمائندگی :

(علیؓ) رفعہ: یجزی عن الجماعۃ اذا مروا ان یسلم احدھم ویجزی عن الجلوس ان یرد احدھم . . . وحدیث تقرأ السلام علی من عرفت ومن لم

آنے والوں میں اگر پوری جماعت ہو، تو ایک آدمی کا سلام کر دینا سب کی طرف سے کافی ہے اور اسی طرح ایک آدمی کا جوابِ سلام دے دینا تمام اہلِ محفل کی طرف سے کفایت کرتا ہے . . . . . اور اس مضمون کی حدیث کہ ہر آشنا و

تخریج مر فی خصال الایمان (ابوداؤد)

ناآشنا کو سلام کرو۔ خصال ایمان کے باب میں گزر چکی ہے۔

۱۰۸ - سلام میں سبقت:

(ابوامامۃؓ) رفعہ: اولی الناس باللہ من بدأھم بالسلام (ترمذی، ابوداؤد بلفظہ)

اللہ تعالیٰ کے سب سے زیادہ قریب وہ ہوتا ہے جو سلام کرنے میں ابتدا کرے۔

۱۰۹ - کبر شکنی کی عجیب تعلیم:

(ابوھریرۃؓ) رفعہ: یسلم الراکب علی الماشی والماشی علی القاعد والقلیل علی الکثیر۔

سوار پیدل چلنے والے کو اور کھڑا ہونے والا بیٹھے ہوئے کو اور قلیل التعداد، کثیر التعداد کو سلام کرے۔

۱۱۰ - من نہ دیدم کہ سگے پیش سگے سر خم کرد:

(انسؓ) سمعت رجلاً یقول للنبی صلی اللہ علیہ وسلم الرجل منا یلقی اخاہ وصدیقہ أینحنی لہ؟ قال لا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
(ترمذی)

میں نے ایک شخص کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کرتے سنا کہ اگر کوئی آدمی اپنے بھائی یا دوست سے ملے تو کیا اس کے لئے جھکنا بھی چاہیئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۱۱۱ - لفظ سلام کا مصدر:

(ابن مسعودؓ) رفعہ: السلام اسم من اسماء اللہ تعالیٰ وضعہ فی الارض فافشوہ بینکم فان الرجل المسلم اذا مر بقوم فسلم علیھم فردوا علیہ کان لہ علیھم فضل درجۃ بتذکیرہ ایاھم السلام فان لم یردوا علیہ ردعلیہ من ھو خیر منھم واطیب (بزار، کبیر)

"سلام" اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ہے جسے اس نے زمین پر رکھ دیا ہے۔ لہٰذا اسے آپس میں پھیلاؤ۔ اگر ایک مسلمان کچھ لوگوں کے پاس سے گزرتا ہوا انہیں سلام کرے! اور وہ اسے جواب سلام دیں تو اس مسلمان کا ایک درجہ فضیلت ان لوگوں سے زیادہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس نے ان لوگوں کو "سلام" کی یاد دلائی۔ اگر لوگ اس کے سلام کا جواب نہ دیں تو اس کا جواب وہ دیتا ہے جو ان سب سے بہتر اور پاکیزہ تر ہے (یعنی اللہ تعالیٰ یا اس کا مقرب فرشتہ)

۱۱۲ - سب سے بڑا بخیل :

(ابوھریرۃؓ) رفعہ : اعجز الناس من عجز فی الدعاء وابخل الناس من بخل بالسلام (کبیر)

سب سے زیادہ عاجز وہ ہے جو دعا سے عاجز ہو۔ اور سب سے زیادہ بخیل وہ ہے جو سلام میں بخل کرے۔

۱۱۳ - مصافحے کے موجد :

(انسؓ) لما جاء اھل الیمن قال النبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم جاءکم اھل الیمن و ھم اوّل من جاء بالمصافحۃ (ابوداؤد)

جب اہل یمن آئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ : تمہارے پاس اہل یمن آئے ہیں اور مصافحے کی ابتدا انہیں سے ہوئی ہے۔

۱۱۴ - اجر مصافحہ :

(البراءؓ) رفعہ : ما من مسلمان یلتقیان فیتصافحان الا غفر لھما قبل ان یتفرقا (ابوداؤد، ترمذی)

جب بھی دو مسلمان باہم ملتے اور مصافحہ کرتے ہیں تو جُدا ہونے سے پہلے تک کے سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

۱۱۵ - مصافحے اور ہدایا کی برکات

(عطاء الخراسانی) ارسلہ : تصافحوا یذھب الغل و تھادوا تحابّوا و تذھب الشحناء (مالک)

مصافحہ کیا کرو۔ اس سے باہمی رنج دور ہو جاتے ہیں اور ایک دوسرے کو ہدیہ بھیجا کرو۔ اس سے باہمی محبت قائم رہتی ہے اور کینہ دور ہوتا ہے۔

۱۱۶ - صحابہؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کھڑے نہ ہوتے تھے :

(انسؓ) لم یکن شخص احب الیھم من النبی صلی اللہ علیہ وسلّم و کانوا اذا رأوہ لم یقوموا لما یعلمون من کراھیتہ لذلک (ترمذی)

صحابہ کرامؓ کی نظر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کوئی بھی محبوب نہ تھا لیکن جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتے تو کھڑے نہ ہوتے تھے۔ اس لئے کہ انہیں علم تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اسے پسند نہیں فرماتے۔

۱۱۷ - خواہش مندِ قیام جہنمی ہے:

(معاویہؓ) دفعہ: من احب ان یتمثل لہ الناس قیاماً فلیتبوأ مقعدہ من النار (ابوداؤد۔ ترمذی)

جو شخص یہ پسند کرتا ہو کہ لوگ اس کے لیے (تعظیماً) کھڑے ہو جایا کریں۔ اسے اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لینا چاہیے۔

داخلے کی اجازت

۱۱۸ - پہلے سلام پھر اندر آنے کی اجازت:

(ربعی بن حراش) جاء رجل فاستأذن علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال ءالج؟ فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم لخادمہ اخرج الی ھذا فعلمہ الاستیذان فقل لہ قل السلام علیکم ءادخل فسمع الرجل ذلک فقال السلام علیکم ءادخل؟ فاذن لہ صلی اللہ علیہ وسلم فدخل (ابوداؤد)

ایک شخص آیا اور اس نے حضورؐ سے اندر آنے کی اجازت چاہتے ہوئے یوں کہا کہ: میں اندر آجاؤں؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خادم سے کہا کہ: باہر جاکر اسے اجازت لینے کا طریقہ بتا دو۔ اس سے کہو کہ: پہلے السلام علیکم کہے۔ پھر پوچھے کہ میں اندر آسکتا ہوں؟ اس شخص نے یہ گفتگو باہر ہی سے سن لی اور وہیں سے بولا کہ السلام علیکم! میں اندر آسکتا ہوں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دے دی اور وہ اندر آگیا۔

۱۱۹ - سعدؓ کی ایک عجیب ادا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مساویانہ برتاؤ:

(قیس بن سعدؓ) زارنا النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی منزلنا فقال السلام علیکم ورحمۃ اللہ فرد ابی رداً خفیاً فقلت الا تأذن لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم؟ فقال ذرہ حتی یکثر علینا من السلام فقال صلی

قیس بن سعدؓ بیان کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار ہمارے غریب خانے پر تشریف لائے اور باہر ہی سے فرمایا۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ! میرے والد سعدؓ نے دھیمی آواز سے جوابِ سلام دیا۔ میں نے اپنے والد سعدؓ سے کہا کہ حضورؐ تشریف لائے ہیں۔ اندر آنے کی اجازت کیوں نہیں دیتے؟ انہوں نے کہا کہ چھوڑو بھی! حضور صلی اللہ علیہ وسلم

الله عليه وسلم السلام عليكم ورحمة الله فرد سعد ردا خفيا ثم قال صلى الله عليه وسلم السلام عليكم ورحمة الله ثم رجع فاتبعه سعد فقال يا رسول الله اني كنت اسمع تسليمك وارد عليك ردا خفيا لتكثر علينا من السلام فانصرف معه النبي صلى الله عليه وسلم وامر له سعد بغسل فاغتسل ثم ناوله ملحفة مصبوغة بزعفران اوورس فاشتمل بها ثم رفع يديه وهو يقول اللهم اجعل صلواتك ورحمتك على آل سعد ثم اصاب صلى الله عليه وسلم من الطعام فلما اراد الانصراف قرب له سعد حمارا قد وطأ عليه بقطيفة فقال سعد يا قيس اصحب رسول الله صلى الله عليه وسلم فصحبته فقال لي اركب معي فابيت فقال اما ان تركب و اما ان تنصرف فانصرفت (ابوداؤد)

کو، ہم پر، خوب بار بار سلامتی بھیجنے دو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر فرمایا: السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ سعدؓ نے پھر دھیرے سے جواب دیا۔ حضورؐ پھر تیسری بار سلام کہہ کر واپس ہونے لگے تو سعدؓ پیچھے ہو لئے اور عرض کیا: یا رسول اللہ! میں حضورؐ کا سلام سن رہا تھا، اور دھیرے سے جواب بھی دیتا رہا۔ غرض یہ تھی کہ حضورؐ بار بار ہم پر سلامتی بھیجتے رہیں۔ اس کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم (سعد رضی اللہ تعالےٰ عنہ) کے ساتھ واپس آئے اور سعدؓ نے غسل کا پانی تیار کرنے کا حکم دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غسل فرمایا اور سعدؓ نے زعفران سے رنگی ہوئی ایک چادر حضورؐ کو پیش کی۔ حضورؐ نے وہ اوڑھ لی اور ہاتھ اٹھا کر یوں دعا فرمائی کہ اے اللہ! آل سعدؓ پر اپنی رحمتیں اور برکتیں نازل فرما۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانا نوش فرمایا۔ پھر جب واپس ہونے کا ارادہ کیا تو سعدؓ نے ایک گدھا تیار کیا اور اس پر نرم جھول دار چادر کا گدا بچھا دیا اور اپنے فرزند قیس سے کہا کہ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جاؤ۔ قیسؓ کہتے ہیں کہ میں ساتھ چلنے لگا تو حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے ساتھ سوار ہو جاؤ۔ میں نے ادباً انکار کیا تو فرمایا کہ یا تو تم بھی میرے ساتھ سوار ہو جاؤ۔ یا پھر واپس جاؤ۔ آخر میں واپس آ گیا۔

۱۲۰ - اپنے گھر میں اجازتِ داخلہ لینا:

(عطاء بن یسارؓ) ان رجلا سال النبي صلى الله عليه وسلم فقال استأذن على امي؟ فقال نعم قال اني معها

ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ: کیا میں اپنی ماں سے بھی اندر آنے کی اجازت لیا کروں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں! اس نے کہا کہ: میں اسی

في البيت فقال استأذن عليها قال اني خادمها فقال استأذن عليها اتحب ان تراها عريانة؟ قال لا فقال استأذن عليها۔

(مالك)

کے ساتھ ایک گھر کے اندر رہتا ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا پھر بھی اجازت لے کر اندر آؤ۔ عرض کیا کہ: اس کی خدمت بھی میں کرتا ہوں۔ فرمایا کہ: پھر بھی اذن لے لیا کرو۔ کیا تم یہ پسند کرتے ہو کہ کسی وقت تم اسے برہنہ دیکھ لو؟ عرض کیا: نہیں! فرمایا: پھر اجازت لے لیا کرو۔

۱۲۱ - "میں" کی ایک عام عادت:

(جابرؓ) اتيت النبي صلى الله عليه وسلم في امر دين كان على ابي فدققت الباب فقال من ذا؟ فقلت انا فخرج وهو يقول انا انا كانه يكرهه۔

(شيخين، ابو داؤد، ترمذی)

میرے والد کے ذمے جو قرض تھا۔ اس کے متعلق کچھ پوچھنے کے لئے میں حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ دروازہ کھٹکھٹایا تو فرمایا: کون ہے۔ میں نے کہا: "میں"۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی "میں میں" کہتے ہوئے باہر آئے۔ یعنی اس "میں" کے جواب کو پسند نہ فرمایا۔

۱۲۲ - بلا اجازت اندر گھسنا:

(ابو هريرةؓ) رفعه: من اطلع في بيت قوم بغير اذنهم فقد حل لهم ان يفقئوا عينه (شيخين، ابو داؤد، نسائی)

اگر کوئی شخص کسی کے گھر میں بغیر اطلاع کے اچانک گھس آئے تو گھر والوں کے لئے اس کی آنکھ پھوڑ دینا روا ہے۔

مختلف آداب

۱۲۳ - چھینک اور جمائی کے آداب

(ابو هريرةؓ) رفعه: ... فاذا عطس احدكم فحمد الله فحق على كل مسلم سمعه ان يقول يرحمك الله و

.... جب کوئی چھینک مار کر "الحمد للہ" کہے تو ہر سننے والے مسلمان پر اس کے جواب میں "یرحمک اللہ" کہنا

واما التثاؤب فانما هو من الشیطان فاذا تثاءب احدکم وهو فی الصلوٰة فلیکظم ما استطاع ولا یقل ها فان ذلکم من الشیطان یضحک منه. و فی روایة: فاذا تثاءب احدکم فلیضع یده علی فیه فاذا قال آه آه فان الشیطان یضحک من جوفه (شیخین ترمذی، ابوداؤد، مسلم)

حق ہو جاتا ہے اور جمائی تو شیطانی فعل ہے اگر جمائی نماز میں آئے تو اسے جہاں تک ممکن ہو دبا لو اور "ہا ہا" نہ کرو۔ یہ شیطان کی طرف سے ہوتا ہے جس پر خود شیطان بھی ہنستا ہے۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ جب جمائی آئے تو منہ پر اپنا ہاتھ رکھ لو۔ "آہ آہ" کرنے سے شیطان اندر سے ہنستا ہے۔

۱۲۴۔ راستے کے حقوق

(ابوسعیدؓ) رفعہ: ایاکم والجلوس فی الطرقات فقالوا یارسول اللہ، ما لنا من مجالسنا بد نتحدث فیها فقال فاذا ابیتم الا المجلس فاعطوا الطریق حقه فقالوا وما حق الطریق یارسول اللہ؟ قال غض البصر وکف الاذی ورد السلام والامر بالمعروف والنهی عن المنکر (شیخین، ابوداؤد) وله عن عمرؓ بنحوه فیه، وتغیثوا الملهوف وتهدوا الضال۔

راستوں پر بیٹھنے سے بچو۔ یہ سن کر بعض لوگوں نے کہا کہ، یارسول اللہ! ہمیں بعض اوقات گفتگو کے لیئے راستے پر ہی بیٹھنا پڑتا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ: اگر تمہیں مجبوراً ایسا ہی کرنا پڑے تو راستے کا حق بھی ادا کیا کرو۔ لوگوں نے پوچھا: سڑک یا راستے کا حق کیا ہے؟ فرمایا نگاہیں نیچی رکھنا، ایذا رسانی سے بچنا، سلام کا جواب دینا، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا

ابوداؤد کی ایک دوسری روایت میں یہ بھی ہے کہ: مصیبت زدوں کی امداد کرنا اور بھٹکے ہوئے کو راہ بتانا۔

۱۲۵۔ اپنے لیے کسی کو اٹھانا

(ابن عمرؓ) رفعه: لا یقیمن احدکم رجلا من مجلسه ثم یجلس فیه ولکن توسعوا وتفسحوا یفسح اللہ لکم (شیخین۔ ابوداؤد، ترمذی)

محفل میں کسی آدمی کو اٹھا کر اپنے لیئے جگہ نہ پیدا کرو۔ بلکہ ذرا پھیل کر کشادگی پیدا کر لو تو اللہ تعالیٰ بھی تمہارے لئے کشادگی پیدا فرما دے گا۔

۱۲۶ - بیٹھک کا زیادہ حق دار:

(ابوھریرۃ) رفعہ: اذا قام احدکم من مجلس ثم رجع الیہ فھو احق بہ (مسلم، ابوداؤد)

اگر کوئی شخص محفل سے اٹھ کر کہیں جائے اور پھر واپس آئے تو وہی اس جگہ کا زیادہ حق دار ہے۔

۱۲۷ - سب سے زیادہ ضروری ادبِ محفل:

(جابر بن سمرۃ) کنا اذا اتینا النبی صلی اللہ علیہ وسلم جلس احدنا بحیث ینتھی (ابوداؤد)

ہم لوگ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں آتے تو کنارے بیٹھ جایا کرتے تھے۔

۱۲۸ - دو آدمیوں کے بیچ میں بیٹھنا:

(عمرو بن شعیبؓ) عن ابیہ عن جدہ رفعہ لا تجلس بین رجلین الا باذنھما۔ (ابوداؤد، ترمذی)

دو آدمیوں کے درمیان اجازت کے بغیر نہیں بیٹھنا چاہیئے

۱۲۹ - صدر نشینی کے شائق پر لعنت:

(ابومجلز) ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم لعن من جلس وسط الحلقۃ (ابوداؤد، ترمذی)

جو شخص بیچ حلقے میں جا کر بیٹھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر لعنت فرمائی ہے۔

نصرت و اخوت و سفارش و تعصب

۱۳۰ - مومن پر مومن کے حقوق:

(ابوھریرۃ) للمؤمن علی المؤمن ست خصال یعودہ اذا مرض ویشھدہ اذا

مومن پر دوسرے مومن کے چھے حق ہیں (۱) مریض ہو تو عیادت کرے (۲) مرے تو جنازے میں شرکت کرے

مات ويجيبه اذا دعاه ويسلم عليه اذا لقيه ويشمته اذا عطس وينصح له اذا غاب او شهد (الستة الا مالكا بلفظ النسائی)

(۳) دعوت کرے (یا بلائے) تو آ جائے (۴) ملے تو سلام کرے (۵) چھینکے تو یرحمك الله کہے (۶) سامنے یا پیٹھ پیچھے ہو تو اس کی خیر خواہی کرے۔

ایمان و اخلاق کے تقاضے

۱۳۱ - گفتگو امانت ہوتی ہے

(جابرؓ) رفعه: اذا حدث رجل رجلا بحديث ثم التفت فهو امانة۔ (ابوداؤد، ترمذی)

اگر کوئی شخص کسی دوسرے سے کوئی بات کر کے چلا جائے تو وہ بات امانت کی ایک قسم میں داخل ہے

۱۳۲ - کن بندوں کی تعظیم عین تعظیم الٰہی ہے:

(ابوموسٰیؓ) رفعه: ان من اجلال الله اکرام ذی الشيبة المسلم وحامل القرآن غير الغالی فيه ولا الجافی عنه واکرام ذی السلطان المقسط (ابوداؤد)

کسی بوڑھے مسلمان اور حامل قرآن اور سلطان عادل کی تعظیم کرنا بھی اللہ تعالیٰ ہی کی تعظیم ہے۔ بشرطیکہ اس میں نہ غلو ہو نہ کمی (بلکہ اعتدال ملحوظ رہے)۔

۱۳۳ - بوڑھے کی تعظیم کا اجر:

(انسؓ) رفعه: ما اكرم شاب شيخا لسنه الا قيض الله له من يكرمه عند سنه

(ترمذی)

جو نوجوان کسی بوڑھے کی کبر سنی کی وجہ سے تعظیم کرتا ہے۔ اس کی کبر سنی کی تعظیم کے لئے اللہ تعالیٰ کسی کو متعین کر دیتا ہے۔

۱۳۴ - بڑوں کی تعظیم :

(انسؓ) جاء شیخ یرید النبیّ صلی اللہ علیہ وسلّم فابطاء القوم ان یوسعوالہ فقال صلی اللہ علیہ وسلم لیس منا من لم یرحم صغیرنا و لم یوقر کبیرنا (ترمذی)

ایک بوڑھا شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے کے لئے آیا۔ لوگوں نے اسے جگہ دینے میں کوتاہی کی جضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ : جو چھوٹوں پر رحم اور بڑوں کی توقیر نہ کرے۔ وہ میری جماعت سے باہر ہے۔

۱۳۵ - خواجہ کی بندہ نوازی :

(ابوھریرۃؓ) ان جریر بن عبد اللہ دخل البیت وھو مملوء فلم یجد مجلساً فرمی الیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم بازارہ او بردانہ وقال اجلس علی ھذا فاخذہ وقبلہ ووضعہ الیہ وقال اکرمک اللہ یا رسول اللہ کما اکرمتنی فقال صلی اللہ علیہ وسلّم اذا اتاکم کریم قوم فاکرموہ۔ (اوسط۔ بزار طبرانی)

جریر بن عبد اللہؓ کاشانۂ نبوت میں داخل ہوئے تو وہ پُر تھا اور انہیں بیٹھنے کی کوئی جگہ نہ ملی جضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے ردائے مبارک ان کی طرف پھینک دی اور فرمایا کہ : اس پر بیٹھ جاؤ۔ جریرؓ نے وہ چادر لی اور چُوم کر سینے سے لگالی اور کہا کہ : یا رسول اللہ ! اللہ آپؐ کا اکرام فرمائے جس طرح آپؐ نے میرا اکرام فرمایا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ : جب کسی قوم کا کوئی باعزت آدمی آئے تو اس کا اکرام کیا کرو۔

۱۳۶ - حُسنِ سلوک کا زبانی جواب :

(اسامۃؓ) رفعہ :- من صنع الیہ معروف فقال لفاعلہ جزاک اللہ خیراً فقد ابلغ فی الثناء (ترمذی)

جس کے ساتھ نیک سلوک کیا جائے۔ اور وہ جزاک اللہ خیراً (اللہ تعالیٰ تمہیں بہتر جزا دے) کہہ دے تو یہ بڑی کافی ثناء (تعریف) ہے۔

۱۳۷ - عطایا کا جواب :

(جابرؓ) من أعطی عطاء فلیجز بہ ان

جسے کوئی عطیہ ملے وہ اس کا بدلہ بھی دے۔ اور اگر

وجد فان لم یجد فلیثن به فان من اثنی به فقد شکرہ ومن کتمه فقد کفرہ (ابوداؤد، ترمذی بلفظہ)

یہ میسر نہ ہو تو ثنا و تعریف ہی کر دے۔ کیونکہ ثنا اس کا شکریہ ہے۔ اور اسے دبا رکھنا ناشکری ہے۔

۱۳۸۔ محسن کی شکر گذاری:

(ابوسعیدؓ) رفعہ: من لا یشکر الناس لا یشکر اللہ (ترمذی)

جو انسان کا شکر ادا نہیں کرتا وہ اللہ تعالیٰ کا بھی شکر گزار نہیں۔

حسنِ نیت اور صدق و کذب

۱۳۹۔ ہر سُنی ہوئی بات کو بیان کرتے پھرنا:

(ابوھریرۃؓ) رفعہ: کفی بالمرء کذبا ان یحدث بکل ما سمع (مسلم، ابوداؤد)

کسی کے جھوٹے ہونے کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ جو سُنے اسے بلا تحقیق بیان کرتا پھرے۔

۱۴۰۔ بچوں سے غلط گوئی میں احتیاط:

(عبداللہ بن عامرؓ) دعتنی امی یوما والنبی صلی اللہ علیہ وسلم قاعد فی بیتنا فقالت ھا تعال اعطیک فقال لہا ما اردت ان تعطیہ؟ قالت اردت ان اعطیہ تمرا فقال اما انک لو لم تعطیہ شیئا کتبت علیک کذبۃ (ابوداؤد)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم میرے غریب خانے پر تشریف لائے کہ میری والدہ نے مجھے یہ کہہ کر بلایا کہ: آؤ تمہیں ایک چیز دوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: کیا دینے کا ارادہ ہے؟ بولیں: کھجور۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اگر تم اسے کچھ نہ دیتیں تو تمہارے نامۂ اعمال میں ایک جھوٹ لکھ لیا جاتا۔

۱۴۱۔ صرف تین جھوٹ کی اجازت:

(اسماء بنت یزید) رفعتہ: یا ایھا الناس ما یحملکم علی ان تتابعوا علی الکذب

اے لوگو! جھوٹ بولنے پر تمہیں کیا چیز ابھارتی ہے جھوٹ بھی ایسا مسلسل کہ جیسے پروانے یکے بعد دیگرے

كما تتابع الفراش في النار؟ الكذب كله على ابن آدم الا في ثلاث خصال رجل كذب امرأته ليرضيها ورجل كذب في الحرب فان الحرب خدعة ورجل كذب بين المسلمين ليصلح بينهما (رزين، ترمذی)

آگ میں گر رہے ہوں؟ فرزندِ آدم سے ہر جھوٹ کا مواخذہ ہوگا۔ صرف تین موقعے مستثنیٰ ہیں۔ (۱) بیوی کو خوش رکھنے کے لئے (۲) جنگ کے موقعے پر، کیونکہ جنگ نام ہی ہے فریب کا۔ اور (۳) دو مسلمانوں میں صلح کرانے کے لئے

حُسنِ سلوک

والدین

۱۴۲ - خدمت و معیت کا سب سے زیادہ حق دار:

(ابو هريرة) جاء رجل الى النبي صلى الله عليه وسلم فقال يا رسول الله من احق الناس بحسن صحابتي؟ قال امك قال ثم من؟ قال ثم امك قال ثم من؟ قال ثم امك قال ثم من؟ قال ثم ابوك.
(شيخين)

ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر پوچھا کہ: یا رسول اللہ: میری معیت کا سب سے زیادہ حق دار کون ہے؟ فرمایا۔ تمہاری ماں۔ اس نے پوچھا: اس کے بعد کون؟ فرمایا تمہاری ماں۔ اس نے پھر پوچھا۔ اس کے بعد؟ فرمایا: تمہارا باپ؟

۱۴۳ - حُسنِ سلوک کے ترتیب وار حق دار:

(كليب بن منفعة) عن جده قال: يا رسول الله من ابر؟ قال امك واباك واختك واخاك ومولاك الذي يلي ذلك حق واجب ورحم

کلیب کے دادا نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ: میں کس کس کے ساتھ (حُسنِ سلوک) کروں؟ فرمایا اپنی ماں، باپ بہن، بھائی اور قریبی مولا کے ساتھ یہی ضروری

موصولة (ابوداؤد)

حق اور صلہ بھی ہے۔

۱۴۴ - اولاد مع اپنے مال کے باپ کی ہے:

(ابن عمرو بن العاص) ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اتاہ رجل فقال یا رسول اللہ ان لی مالا وولدا وان ابی یحتاج الی مالی فقال انت ومالک لوالدک ان اولادکم من اطیب کسبکم فکلوا من کسب اولادکم (ابوداؤد)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص نے آکر دریافت کیا کہ: میرے پاس دولت بھی ہے۔ اور اولاد بھی۔ اور میرے ماں باپ کو بھی میرے مال کی ضرورت ہے فرمایا: تم اپنے مال سمیت اپنے باپ کے ہو، اور تمہاری اولاد تمہاری بہترین کمائی میں شامل ہے۔ لہٰذا اپنی اولاد کی کمائی میں سے کھا سکتے ہو۔

۱۴۵ - سب سے زیادہ بد نصیب:

(ابوھریرة) رفعہ: رغم انفہ رغم انفہ رغم انفہ قیل من یا رسول اللہ؟ قال من ادرک والدیہ عند الکبر احدھما ثم لم یدخل الجنة۔ (مسلم)

وہ شخص رسوا ہوا۔ ذلیل ہوا۔ بے عزت ہوا۔ لوگوں نے دریافت کیا کہ: کون یا رسول اللہ؟ فرمایا: وہ جس نے اپنے ماں باپ دونوں کو یا کسی ایک کو بڑھاپے کی حالت میں پایا۔ اور ان کی خدمت کر کے داخل بہشت ہونے کا موقع نہ حاصل کیا۔

۱۴۶ - جہاد اور ہجرت سے پہلے والدین کی خوشنودی:

(ابن عمرو بن العاص) جاء رجل الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فاستاذنہ فی الجہاد فقال احی والداک؟ قال نعم قال ففیھما فجاھد (للستة الا مالکا)

ایک شخص نے آکر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جہاد میں جانے کی اجازت چاہی حضورؐ نے پوچھا: تمہارے والدین زندہ ہیں؟ عرض کیا: ہاں۔ فرمایا: پہلے ان کے ساتھ حق وفا ادا کر دو پھر جہاد کرنا۔

وفی روایة: جاء رجل فقال جئت ابایعک علی الھجرة وترکت ابوی یبکیان قال فارجع الیھما فاضحکھما کما ابکیتھما (للستة الا مالکا)

دوسری روایت میں ہے کہ: ایک شخص آکر کہنے لگا کہ: میں حضورؐ کے پاس بیعت ہجرت کرنے آیا ہوں اور اپنے والدین کو روتا چھوڑ آیا ہوں۔ فرمایا: واپس جا کر اپنے والدین کو اسی طرح ہنساؤ۔ جس طرح رلایا ہے۔

۱۴۷ ۔ جنّت ماں کے قدموں کے پاس:

(معاویۃ بن جاھمۃ) ان جاھمۃ قال یا رسول اللہ اردت ان اغزو وقد جئت استشیرک فقال ھل لک من ام؟ قال نعم قال الزمھا فان الجنۃ عند رجلھا (نسائی)

جاہمہ نے عرض کیا کہ: یا رسول اللہ! میں غزوے کا ارادہ رکھتا ہوں اور حضورؐ سے مشورہ کرنے حاضر ہوا ہوں حضورؐ نے دریافت کیا: تمہاری کوئی ماں بھی ہے؟ عرض کیا: ہاں! فرمایا! اسی کی خدمت میں رہو۔ جنت اس کے قدموں کے پاس ہے۔

۱۴۸ ۔ مشرک ماں کی خدمت و امداد:

(اسماء بنت ابی بکرؓ) قدمت علی امی وھی مشرکۃ فاستفتیت النبی صلی اللہ علیہ وسلم قلت قدمت علی امی وھی راغبۃ افاصل امی؟ قال نعم صلی امک۔

(شیخین، ابوداؤد)

ایک بار میری ماں میرے پاس آئی۔ اس وقت وہ مشرکہ تھی۔ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ: میری ماں میرے پاس آئی ہوئی ہے اور وہ مجھ سے مالی امداد کی طالب ہے۔ تو کیا میں اس کے ساتھ صلہ رحمی کر سکتی ہوں؟ فرمایا: ضرور۔ اپنی ماں کے ساتھ صلہ رحمی کرو۔

۱۴۹ ۔ ماں کی قائم مقام:

(ابن عمرؓ) قال رجل یا رسول اللہ انی اصبت ذنبا عظیما فھل لی من توبۃ؟ فقال ھل لک من ام؟ قال لا قال فھل لک من خالۃ؟ قال نعم قال فبرھا (ترمذی)

حضورؐ سے ایک شخص نے پوچھا کہ: میں نے بعض بڑے گناہ کئے ہیں کیا اس کی توبہ بھی ہو سکتی ہے؟ حضورؐ نے پوچھا: کیا تمہاری کوئی ماں بھی زندہ ہے؟ عرض کیا: نہیں۔ پوچھا: کوئی خالہ ہے؟ کہا: ہاں! فرمایا: بس اس کے ساتھ حسن سلوک کرو (یہی اس بڑے گناہ کی توبہ ہے)۔

۱۵۰ ۔ والدین کی موت کے بعد بھی حُسنِ سلوک ہو سکتا ہے:

(ابو اسید الساعدی) ان رجلا قال یا رسول اللہ ھل بقی من بر ابوی

ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ: میرے والدین کے مرنے کے بعد بھی کوئی ایسا حسن سلوک ہے

شئ ابرهما به بعد موتهما؟ قال نعم الصلوٰة عليهما والاستغفار لهما وانفاذ عهدهما من بعدهما وصلة الرحم التي لا توصل الا بهما واكرام صديقهما۔ (ابوداؤد)

جو میں کروں تو والدین ہی کے ساتھ حسن سلوک میں شمار ہو؟ فرمایا: ہاں! ان کے لئے دعا اور استغفار کرو۔ جو عہد وہ پورا نہ کر سکے ہوں۔ ان کو تم پورا کرو۔ ان کی وجہ سے جس کے ساتھ صلہ رحمی ہو سکتی تھی وہ کرو۔ اور ان کے مخلصوں کا اکرام قائم کرو۔

۱۵۱ - رضاعی والدین اور بھائی کے ساتھ حسن سلوک:

(عمر بن السائبؓ) بلغه: ان النبي صلى الله عليه وسلم كان جالسا يوما فاقبل ابوه من الرضاعة فوضع له بعض ثوبه فقعد عليه ثم اقبلت امه من الرضاعة فوضع لها شق ثوبه من جانبه الآخر فجلست عليه ثم اقبل اخوه من الرضاعة فقام النبي صلى الله عليه وسلم فاجلسه بين يديه (ابوداؤد)

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن بیٹھے تھے کہ: حضورؐ کے رضاعی والد آئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کپڑے کا ایک گوشہ ان کے لئے بچھا دیا۔ اور وہ اس پر بیٹھ گئے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاعی والدہ آئیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کپڑے کا دوسرا گوشہ ان کے لئے بچھا دیا۔ اور وہ وہاں بیٹھ گئیں۔ پھر رضاعی بھائی آگئے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو گئے اور اپنے سامنے انہیں بٹھا لیا۔

۱۵۲ - ماں یا باپ کی طرف سے حج:

(زید بن ارقمؓ) رفعه: من حج عن احد ابويه اجزأ ذلك عنه وبشرروحه بذلك في السماء وكتب عند الله باراً ولو كان عاقاً (رزين)

جو شخص اپنے ماں یا باپ کی طرف سے حج کرے تو وہ (احد الوالدین کی طرف سے) ادا ہو جائے گا! (اور اس کی روح آسمان میں خوش ہو جائے گی اور وہ فرزند عاق (نا فرمان) بھی ہو گا تو اللہ کے ہاں اسے بار (فرمانبردار) لکھ لیا جائے گا۔

۱۵۳ - باپ کے ساتھ حسن سلوک اور عفت کا اثر:

(ابن عمرؓ) رفعه: بروا آباءكم تبركم ابناؤكم وعفوا

تم اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو تو تمہاری اولاد تمہارے ساتھ حسن سلوک کرے گی اور تم خود پاکدامن

تعف نساؤکم (اوسط) | رہو تو تمہاری عورتیں بھی پاک دامن رہیں گی۔

اولاد

۱۵۴۔ اولاد کی نافرمانی کو دور کرنے کا طریقہ:

(ابو ھریرۃ) رفعہ: اعینوا اولادکم علی البر من شاء استخرج العقوق لولدہ (اوسط بخفی)

حسن سلوک میں اپنی اولاد کی مدد کرو۔ اس طرح جو چاہے اپنی اولاد کی نافرمانی کی عادت کو دور کر سکتا ہے۔

لڑکی

۱۵۵۔ بیٹیوں کے ساتھ حسن سلوک کا نتیجہ:

(عائشۃ رض) دخلت علیّ امرأۃ ومعھا ابنتان لھا تسأل فلم تجد عندی شیئاً غیر تمرۃ فاعطیتھا ایاھا فقسمتھا بین ابنتیھا ولم تأکل منھا ثم خرجت فدخل علی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فاخبرتہ فقال من ابتلی من ھذہ البنات بشئ فاحسن الیھن کن لہ ستراً من النار۔ (شیخین، ترمذی)

میرے پاس ایک عورت سوال کرتی آئی۔ اس کے ساتھ دو لڑکیاں بھی تھیں۔ میرے پاس اس وقت بجز ایک چھوہارے کے اور کچھ نہ تھا۔ میں نے وہی دے دیا۔ اس نے اس کے دو حصے کئے اور اپنی لڑکیوں کو دے دیئے اور خود کچھ نہ کھایا اور چلی گئی۔ جب حضور صلی اللّٰہ علیہ وسلم تشریف لائے تو میں نے اس واقعہ کا ذکر کیا فرمایا جو ان معصوم بچیوں کے سلسلے میں کسی آزمائش میں پڑے اور ان کے ساتھ حسن سلوک کا حق ادا کرے تو وہ لڑکیاں اس کے لئے آگ سے بچاؤ کا ذریعہ بن جائیں گی۔

۱۵۶۔ سب سے افضل کار خیر:

(سراقۃ بن مالک رض) رفعہ: الا ادلک علی

میں تمہیں سب سے افضل صدقہ (کار خیر) بتاتا

افضل الصدقۃ ابنتک مردودۃ الیک لیس لہا کاسب غیرک (قزوینی)

ہوں۔ تمہاری وہ بیٹی جس کی کفالت تم کرو اور تمہارے سوا اس کا کوئی کمانے والا نہ ہو۔

۱۵۷۔ جوانی تک لڑکیوں کی کفالت کا صلہ:

(انسؓ) رفعہ: من عال جاریتین حتی تبلغا جاء یوم القیامۃ انا وھو وضم اصابعہ (ترمذی۔ مسلم بلفظہ)

جو دو لڑکیوں کی ان کے جوان ہونے تک کفالت کرے۔ وہ قیامت کے دن ان انگلیوں کی طرح میرے ساتھ ہوگا۔

۱۵۸۔ سب سے اعلیٰ عطیہ کیا ہے؟

(سعید بن العاصؓ) رفعہ: ما نحل والد ولداً من نحل افضل من ادب حسن (ترمذی)

عمدہ تربیت سے بہتر کوئی عطیہ نہیں جو باپ اپنی اولاد کو دے سکے۔

۱۵۹۔ بہترین انسان کون ہے:

(عائشۃؓ) رفعتہ: خیرکم خیرکم لاھلہ وانا خیرکم لاھلی (ترمذی)

تم میں بہترین انسان وہ ہے جو اپنے اہل وعیال کے لئے بہترین ہو۔ اور میں اپنے اہل وعیال کے حق میں تم سب سے بہتر ہوں۔

یتیم

۱۶۰۔ کفالت یتیم کا اجر:

(سہل بن سعد) رفعہ: انا وکافل الیتیم فی الجنۃ ھکذا واشار بالسبابۃ والوسطی۔ (ترمذی، ابوداؤد)

حضور اکرمؐ نے اپنی انگشت شہادت اور بیچ کی انگلی کو ملا کر فرمایا کہ: میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا دونوں جنت میں اس طرح ہوں گے۔

۱۶۱ ۔ سخت دلی کا علاج

(ابو ھریرۃ) ان رجلا شکی الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم قسوۃ قلبہ فقال امسح راس الیتیم واطعم المسکین۔ (احمد)

ایک شخص نے حضورؐ سے اپنی سخت دلی کی شکایت کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا علاج یہ بتایا کہ یتیم کے سر پر رحمت کا ہاتھ پھیرو۔ اور مسکین کو کھانا کھلاؤ۔

۱۶۲ سب سے بہتر اور سب سے بدتر گھر:

(ابو ھریرۃ) رفعہ: خیر بیت فی المسلمین بیت فیہ یتیم یحسن الیہ وشر بیت فی المسلمین بیت فیہ یتیم یساء الیہ (ترمذی ۔ طبرانی)

مسلمانوں میں سب سے بہتر وہ گھر ہے ۔ جس میں کوئی یتیم ہو۔ اور اس کے ساتھ عمدہ سلوک کیا جاتا ہو۔ اور بدترین مسلمان گھر وہ ہے جہاں کوئی یتیم ہو، اور اس کے ساتھ بُرا برتاؤ کیا جاتا ہو۔

مسکین

۱۶۳ ۔ شادی کا مقصد کثرت اولاد نہیں:

(عوف بن مالک الاشجعی) رفعہ: انا وامرأۃ سفعاء الخدین کھاتین یوم القیامۃ واوما بالوسطی والسبابۃ امرأۃ امت من زوجھا ذات منصب وجمال حبست نفسھا علی یتاماھا حتی بانوا اوماتوا (ابوداؤد)

میں اور وہ عورت ان دو انگلیوں یعنی وسطی اور سبابہ کی طرح بروزِ حشر قریب قریب ہوں گے یعنی وہ عورت جو بیوہ ہو گئی ہو۔ عزت اور دولت رکھتی ہو (اور اپنے بن باپ کے بچوں کی خدمت کرتے کرتے) اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا ہو۔ اور وہ عقد ثانی سے باز رہی ہو، تاآنکہ وہ بچے جدا ہو جائیں یا مر جائیں۔

۱۶۴ ۔ محتاج و مسکین کی پرورش کا درجہ:

(ابو ھریرۃ) رفعہ: الساعی علی الارملۃ

بیوہ اور مسکین کے لئے کوشش کرنے والا ایسا

والسکین کالمجاھد فی سبیل اللہ واحسبہ قال وکالقائم لا یفتر وکالصائم لا یفطر (شیخین، ترمذی، نسائی)

ہی ہے۔ جیسے مجاہد فی سبیل اللہ۔ مجھے خیال آتا ہے کہ حضورؐ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ وہ ایسا ہے جیسے ساری رات قیام کرنے والا اور ہمیشہ روزہ رکھنے والا۔

صدقہ (کارِ خیر)

۱۶۵۔ صدقہ کے اقسام

(ابوموسیٰؓ) علی کل مسلم صدقۃ قیل ارأیت ان لم یجد؟ قال یعمل بیدیہ فینفع نفسہ ویتصدق قال ارأیت ان لم یستطع؟ قال یعین ذا الحاجۃ الملھوف قال ارأیت ان لم یستطع؟ قال یأمر بالمعروف او الخیر قال ارأیت ان لم یفعل؟ قال یمسک عن الشر فانھا صدقۃ۔ (شیخین)

صدقہ ادا کرنا ہر مسلمان پر ضروری ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ: اگر وہ اس قابل نہ ہو؟ فرمایا اپنے ہاتھوں سے کوئی کام کرے اور اس کمائی سے اپنے آپ کو نفع پہنچائے اور کچھ صدقہ کرے۔ عرض کیا۔ اگر اس کا مقدور نہ ہو؟ فرمایا: کسی حاجت مند فریادی کی مدد کرے۔ پوچھا: اگر اس کی بھی استطاعت نہ ہو؟ فرمایا۔ امر بالمعروف کرے۔ سوال کیا۔ اگر یہ بھی نہ کر سکے؟ فرمایا اپنے آپ کو شر پہنچانے سے باز رکھے یہی اس کا صدقہ ہے۔

۱۶۶۔ ایام کفر کی نیکیوں کا اثر:

(حکیم بن حزامؓ) قال یا رسول اللہ ارأیت امورًا کنت اتحنث بھا فی الجاھلیۃ من صلوۃ و عتاقۃ و صدقۃ ھل لی فیھا اجر؟ قال اسلمت علی ما سلف لک من خیر (شیخین)

میں نے عرض کیا کہ: میں جاہلیت کے ایام میں کئی ایک نیک کام کیا کرتا تھا مثلاً صلوۃ، غلاموں کی رہائی اور صدقہ وغیرہ اب اسلام لانے کے بعد کیا ان نیکیوں کا اجر ملے گا؟ فرمایا جو نیکیاں تم کر چکے ہو۔ ان ہی کی برکت سے تم مسلمان ہوئے ہو۔

۱۶۷۔ کافر کی نیکیاں کب نفع بخش ہو سکتی ہیں؟

(عائشہؓ) قلت یا رسول اللہ ان ابن

میں نے عرض کیا کہ: یا رسول اللہ! ابن جدعان

جدعان كان فى الجاهلية يصل الرحم ويطعم المسكين فهل ذلك نافعة ؟ قال لا ينفعه انه لم يقل يومًا رب اغفرلى خطيئتى يوم الدين۔ (مسلم)

جاہلیت میں صلۂ رحمی کرتا تھا اور مسکینوں کو کھانا کھلاتا تھا۔ کیا اس کے یہ اعمال اسے کچھ نفع پہنچائیں گے؟ فرمایا: نہیں! کیونکہ اس نے ایک دن بھی یہ نہیں کہا کہ: اے میرے رب قیامت کے دن میرے گناہوں کو بخش دے۔

صلۂ رحمی

۱۶۸ - "رحم" کا اشتقاق اور صلۂ رحمی:

(عبدالرحمٰن بن عوف) رفعه: قال الله تعالىٰ انا الله وانا الرحمٰن خلقت الرحم وشققت لها اسماً من اسمى فمن وصلها وصلته ومن قطعها بتتّه۔ (شیخین)

اللہ تعالیٰ کا کہنا ہے کہ: میں اللہ ہوں۔ میں رحمان ہوں۔ میں نے رحم کو پیدا کر کے اپنے نام (رحمان) سے اس کے لئے بھی ایک نام (رحم) نکال لیا ہے۔ لہٰذا جو اس کے تعلق کو باقی رکھے گا۔ میں بھی اس سے اپنا تعلق باقی رکھوں گا اور جو اسے قطع کرے گا۔ اسے میں بھی قطع کردوں گا۔

۱۶۹ - کشائش رزق اور درازیٔ عمر کا ذریعہ:

(ابوهريرةؓ) رفعه: من سره ان يبسط الله فى رزقه وان ينسأله فى اثره فليصل رحمه (بخارى، ترمذى)

جو یہ پسند کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی روزی میں کشادگی پیدا کرے اور اس کی زندگی دراز ہو تو وہ صلۂ رحمی کرے۔

۱۷۰ - قطع رحمی اور جنت:

(جبير بن مطعم) رفعه لا يدخل الجنة قاطع رحم (شیخین، ابوداؤد، ترمذی)

قطع رحمی کرنے والا جنت میں نہیں جائے گا۔

۱۷۱ - دنیوی سزا جلدی دلانے والا جرم:

(ابوبكرةؓ) رفعه: ما من ذنب أجدر

کوئی ایسا گناہ نہیں جس کے کرنے والے کو

ان يعجل لصاحبه للعقوبة في الدنيا مع ما يدخر له في الآخرة من البغي وقطيعة الرحم (ترمذی، ابوداؤد)

اُخروی مواخذے کے ساتھ ساتھ دنیاوی سزا دینے میں بھی جلدی کی جائے بجز بغاوت اور قطع رحمی کے۔

۱۶۲ ۔ بدی کے جواب میں نیکی کرنے کا انعام:

(ابوهريرة) ان رجلا قال يا رسول الله ان لي قرابة اصلهم ويقطعوني واحسن اليهم ويسيئون الي واحلم عنهم ويجهلون علي قال لئن كنت كما قلت فكانما تسفهم المل ولا يزال معك من الله ظهير عليهم ما دمت على ذلك۔

(مسلم)

ایک شخص نے عرض کیا کہ: یا رسول اللہ! میرے کچھ اہل قرابت ہیں۔ جن کے ساتھ میں صلہ رحمی کرتا ہوں۔ مگر وہ میرے ساتھ قطع رحمی کرتے ہیں۔ میں اُن کے ساتھ حسن سلوک کرتا ہوں اور وہ میرے ساتھ بدسلوکی کرتے ہیں۔ میں ان کی باتوں پر حلم سے کام لیتا ہوں اور وہ مجھ سے بدپن کرتے ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا۔ اگر واقعہ یہی ہے جو تم کہتے ہو تو تم گویا ان کے منہ پر خاک ڈالتے ہو اور جب تک اس روش پہ قائم رہوگے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک مددگار (فرشتہ) تمہارے ساتھ رہے گا۔

۱۶۳ ۔ ذی رحم کو صدقہ دینا:

(سلمان بن عامرؓ) رفعه: الصدقة على المسكين صدقة وعلى ذي الرحم ثنتان صدقة وصلة رحم (نسائی)

مسکین کو صدقہ دینا تو ایک صدقے کا ثواب ہے لیکن کسی ذی رحم (رشتہ دار) کو دینا دوہرا ثواب ہے ایک تو صدقے کا دوسرا صلۂ رحمی کا۔

پڑوسی

۱۶۴ ۔ پڑوسی کے حق پر زور:

(ابن عمروؓ بن العاص) ذبحت له شاة في اهله فلما جاء قال اهديتم لجارنا اليهودي اهديتم لجارنا اليهودي؟

ابن عمرؓ کے ہاں ایک بکری ذبح ہوئی۔ جب ابن عمرؓ آئے تو انہوں نے کہا کہ: ہمارے یہودی پڑوسی کا حصہ بھیجا؟ (مکرر) میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ

سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول ما زال جبریل یوصینی بالجار حتی ظننت انہ سیورثہ (ابوداؤد، ترمذی بلفظہ)

جبریل نے مجھے پڑوسی کے متعلق اس قدر مسلسل وصیت کی کہ مجھے یہ گمان ہونے لگا کہ یہ پڑوسی کو وارث بھی بنا دیں گے۔

۱۷۵۔ بُرے پڑوسی کا غیر متشددانہ اور دلچسپ علاج:

(ابوھریرۃؓ) جاء رجل الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم یشکو جارہ فقال لہ اذھب فاصبر فاتاہ مرتین او ثلاثا فقال اذھب فاطرح متاعک فی الطریق ففعل فجعل الناس یمرون و یسألونہ ویخبرھم خبر جارہ فجعلوا یلعنونہ فعل اللہ بہ و فعل وبعضھم یدعو علیہ فجاء الیہ جارہ فقال ارجع فانک لن تری منی شیئا تکرھہ (ابوداؤد)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص آکر اپنے پڑوسی کی شکایت کرنے لگا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ: واپس جاؤ اور صبر سے کام لو۔ وہ دو یا تین بار حضورؐ کے پاس پھر آیا۔ حضورؐ نے فرمایا: واپس جا کر اپنا تمام مال و اسباب سڑک پر ڈال دو۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ اب جو لوگ ادھر سے گزرتے اس سے اس حرکت کا سبب پوچھتے۔ اور وہ پورا قصہ بیان کر دیتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ اس (پڑوسی) کو کوسنے اور بد دعائیں دینے لگے کہ "خدا اس کے ساتھ بھی ایسا ہی کرے"۔ آخر وہ پڑوسی اس کے پاس آکر کہنے لگا کہ: خدا کے لئے تم واپس چلو، مجھ سے اب تمہیں کوئی شکایت کا موقع نہ ملے گا۔

۱۷۶۔ شر انگیز پڑوسی مومن نہیں:

(ابوھریرۃؓ) رفعہ: واللہ لا یؤمن واللہ لا یؤمن واللہ لا یؤمن قیل من یا رسول اللہ؟ قال الذی لا یأمن جارہ بوائقہ (شیخین)

بخدا وہ مومن نہیں، بخدا وہ مومن نہیں، بخدا وہ مومن نہیں۔ عرض کیا گیا کہ: کون یا رسول اللہ! فرمایا وہ جس کے شر سے اس کا پڑوسی محفوظ نہ ہو۔

۱۷۷۔ وعید شدید:

(انسؓ) رفعہ: ما آمن بی من مات

مجھ پر اس کا ایمان ہی نہیں جو ایسی حالت میں مرے

شبعان وجاره جائع الى جنبه وهو يعلم به (كبير، بزاز)

کہ اس کا پیٹ تو بھرا ہوا ہو! ور اس کی بغل میں اس کا پڑوسی بھوکا ہو اور اسے اس کے بھوکے ہونے کا علم بھی ہو۔

۱۷۸ - پڑوس کی حدود اربعہ :

(ابو ہریرہؓ) رفعہ: حق الجار اربعين دارا هكذا وهكذا وهكذا وهكذا يمينا وشمالا وقدام وخلف (موصلی بضعف)

پڑوس کے حق کا دائرہ دائیں، بائیں، آگے، پیچھے چالیس چالیس گھر تک وسیع ہوتا ہے۔

۱۷۹ - تین شدید مصیبتیں :

(فضالة بن عبيدؓ) رفعه: ثلاثة من الفواقر امام ان احسنت لم يشكر وان اسأت لم يغفر وجار سوء ان رأى خيرا دفنه وان رأى شرا اذاعه وامرأة ان حضرت اذتك وان غبت عنها خانتك۔

(كبير)

تین مصیبتیں بڑی سخت ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ کسی اولی الامر کے ساتھ تم حسن سلوک کرو تو وہ شکر گزار نہ ہو۔ اور برا سلوک کرو تو معاف نہ کرے۔ دوسرے وہ پڑوسی جو تمہاری کوئی نیکی دیکھے تو اسے دفن کر دے۔ اور کوئی برائی دیکھے تو اس کی اشاعت کرتا پھرے۔ تیسرے وہ عورت کہ جب تم گھر پر آؤ تو تمہیں ایذا پہنچائے۔ اور جب تم باہر ہو تو تمہاری خیانت کرے۔

۱۸۰ - زبان اور جنت دوزخ کا فرق :

(ابو هريرةؓ) قال رجل يا رسول الله ان فلانة تذكر من كثرة صلاتها وصدقتها وصيامها غير انها تؤذي جيرانها بلسانها قال هي في النار قال يا رسول الله ان فلانة تذكر من قلة صيامها وصلاتها وانها تصدق بالاثوار من الاقط ولا تؤذي بلسانها جيرانها قال

ایک شخص نے عرض کیا کہ: یا رسول اللہ! ایک عورت ہے جس کی صلوٰۃ، صدقہ اور صوم کی کثرت مشہور ہے۔ مگر وہ اپنی زبان سے اپنے پڑوسیوں کو ایذا پہنچاتی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ وہ جہنمی ہے۔ پھر اس نے عرض کیا کہ: ایک دوسری عورت ہے جس کے متعلق مشہور ہے کہ وہ روزے، نماز سے کمتر تعلق رکھتی ہے۔ اور صرف پنیر کے ٹکڑے صدقے میں دے دیتی ہے۔ لیکن اپنی زبان سے اپنے پڑوسیوں کو دکھ نہیں دیتی

ھی فی الجنۃ (احمد، بزار)	فرمایا: وہ جنتی ہے۔

رحم وکرم

۱۸۱ - زمین کا رحیم آسمان کا مرحوم :

(ابن عمرو بن العاص) رفعہ: الراحمون یرحم الرحمٰن ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء (ترمذی، ابوداؤد) بلفظہ	رحم کرنے والوں پہ رحمان رحم کرتا ہے تم زمین والوں پہ رحم کرو، آسمان والا تم پہ رحم فرمائے گا۔

۱۸۲ - بے رحم مستحقِ رحم نہیں ہوتا :

(ابوھریرۃؓ) قبّل النبیّ صلی اللہ علیہ وسلّم الحسن بن علی وعندہ الاقرع بن حابس فقال الاقرع ان لی عشرۃ من الولد ما قبّلت منھم احدًا قط فنظر الیہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلم ثم قال من لا یرحم لا یرحم (شیخین، ترمذی، ابوداؤد)	حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار حسنؓ بن علیؓ کو چوما۔ اس وقت اقرع بن حابس بھی موجود تھے۔ وہ بولے کہ: میرے دس بچے ہیں۔ لیکن میں نے آج تک کبھی کسی کو نہیں چوما۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اقرع کی طرف دیکھ کر فرمایا کہ جو رحم نہیں کرتا۔ اس پہ رحم کیا بھی نہیں جاتا۔

۱۸۳ - بچوں کا پیار علامتِ رحم ہے :

(عائشۃؓ) جاء اعرابیٌّ الی النبیّ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فقال انکم تقبلون الصبیان وما نقبلھم فقال ولملک لک ان نزع اللّٰہ الرحمۃ من قلبک (شیخین)	حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک اعرابی (دیہاتی) آ کر کہنے لگا کہ آپ لوگ بچوں کو چومتے ہیں۔ لیکن ہم لوگ تو کبھی نہیں چومتے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ: اگر تمہارے دل سے اللہ تعالیٰ نے جذبہ رحم نکال لے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔

۱۸۴ - رحمتِ خداوندی غضبِ الٰہی پر غالب ہے :

(ابوھریرۃؓ) لما خلق اللّٰہ الخلق کتب فی	جب اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کو پیدا کیا تو اپنی کتاب

كتابه فهو عنده فوق العرش ان رحمتي تغلب غضبي۔ (شيخين وترمذي)

میں جو اُس کے عرش کے اوپر رکھی ہے، یہ لکھ دیا کہ: میری رحمت میرے غصے پر غالب رہا کرے گی۔

۱۸۵ - بے پایاں رحمت الٰہی - رحمت و غضب کا توازن:

(ابو هريرةؓ) ان لله مائة رحمة انزل منها رحمة واحدة بين الجن والانس والبهائم والهوام فبه يتعاطفون وبها يتراحمون وبها تعطف الوحوش على ولدها واخر الله تسعا وتسعين رحمة يرحم الله بها عباده يوم القيامة وفي رواية: ولو يعلم الكافر بكل الذي عند الله من الرحمة لم ييأس من الجنة ولو يعلم المؤمن بكل الذي عند الله من العذاب لم يأمن من النار۔ (شيخين وترمذي)

اللہ تعالیٰ کے اندر رحمت کے سو حصے ہیں۔ جن میں سے صرف ایک حصہ ہے جو اُس نے جن و انس، چوپایوں اور کیڑوں اور مکوڑوں میں تقسیم فرما دیا ہے۔ اسی ایک حصے کی بدولت لوگ باہمی لطف و مہر کو قائم رکھتے ہیں اور اسی کی وجہ سے جنگلی جانور بھی اپنے بچوں پر شفقت رکھتے ہیں بقیہ ننانوے حصے اس نے اس لئے رکھ دیئے ہیں کہ اپنے بندوں پر بروز قیامت رحم فرمانے کے لئے ان کو کام میں لائے۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ: اللہ تعالیٰ کی تمام و کمال رحمت کا علم اگر کافر کو ہو جائے تو وہ جنت سے کبھی ناامید نہ ہو اور اگر اس کے کل عذاب کا علم مومن کو ہو جائے تو وہ کبھی آگ سے اپنے آپ کو محفوظ نہ سمجھے۔

داخلے کی اجازت

۱۸۶ - حدیثِ سلام میں حضرت عمرؓ کی احتیاط:

ابو سعیدؓ . . . .

(ایک بار ابو موسیٰ اشعری حضرت عمرؓ کے پاس گئے اور تین بار آواز دے کر اندر آنے کی اجازت چاہی۔ حضرت

. . . .
. . . .
. . . .
. . . .
. . . .
. . . .
. . . .
. . . .
. . . .
. . . .

قال عمر اما انی لم اتهمك ولكن خشيت ان يتقول الناس على النبي صلى الله عليه وسلم

(السنن: الا النسائی)

عمرؓ کسی کام میں مشغول تھے۔ اس لئے جواب نہ دیا۔ جب ابو موسےٰ واپس ہونے لگے تو حضرت عمرؓ باہر آئے اور فرمایا کہ: واپس کیوں جا رہے ہو؟ انہوں نے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: تین بار اجازت طلب کرنے کے بعد جواب نہ ملے تو واپس ہو جاؤ۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ: اس حدیث کے لئے کوئی گواہ لاؤ۔ ورنہ تمہیں عبرت بنا کر رکھ دوں گا۔ ابو سعیدؓ یا ابی بن کعبؓ نے گواہی دی تو ابو موسےٰ کی جان چھوٹی۔ بعض روایتوں میں ہے کہ: ابی بن کعبؓ نے کہا کہ اے ابن خطاب، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کے لئے عذاب جان مت بنو! اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میں تم پر غلط حدیث بیان کرنے کا اتہام نہیں لگاتا۔ مجھے یہ ڈر رہا ہے کہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جھوٹی باتیں منسوب نہ کرنے لگیں۔

موت

۱۸۷۔ عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَكْثِرُوْا ذِكْرَ هَاذِمِ اللَّذَّاتِ الْمَوْتَ۔ (ترمذی، نسائی)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا کہ لذتوں کو ختم کر دینے والی چیز (موت) کو اکثر و بیشتر یاد کرو۔

۱۸۸۔ عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَتَمَنّٰى اَحَدُكُمُ الْمَوْتَ اِمَّا مُحْسِنًا فَلَعَلَّهٗ اَنْ يَّزْدَادَ خَيْرًا وَاِمَّا مُسِيْئًا فَلَعَلَّهٗ يَسْتَعْتِبُ

(بخاری شریف)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ تم میں کوئی موت کی آرزو نہ کرے (اس لیے کہ) وہ یا تو نیکوکار ہو گا تو ممکن ہے اس کے نیک عمل میں زیادتی ہو جائے اور یا بدکار ہو گا تو ہو سکتا ہے کہ آئندہ توبہ کر کے خدائے تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرے۔

سیرت و مناقب

۱- دفنِ میّت :

عَنْ عُرْوَةَ بْنِ الزُّبَيْرِ قَالَ كَانَ بِالْمَدِيْنَةِ رَجُلَانِ اَحَدُهُمَا يَلْحَدُ وَالْاٰخَرُ لَا يَلْحَدُ فَقَالُوْا اَيُّهُمَا جَاءَ اَوَّلًا عَمِلَ عَمَلَهٗ فَجَاءَ الَّذِيْ يَلْحَدُ فَلَحَدَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ (شرح السنۃ۔ مشکوٰۃ)

حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ مدینہ شریف میں دو آدمی قبر کھودا کرتے تھے۔ ایک ان میں سے (حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے جو) لحد یعنی بغلی کھودتے تھے اور دوسرے (حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے جو) بغلی نہیں کھودتے تھے (بلکہ شق یعنی صندوقی قبر بناتے تھے۔ حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کے وصال پر) صحابہؓ نے آپس میں طے کیا کہ جو ان دونوں میں سے پہلے آئے گا وہ اپنا کام کرے گا۔ تو پہلے وہ صحابی آئے جو لحد کھودا کرتے تھے۔ تو انھوں نے حضور (علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کے لیے بغلی قبر تیار کی۔

۲- (ب) برّ یعنی نیکی۔ ماں باپ، اولاد، اقارب اور یتیموں کے ساتھ نیک سلوک و متفرق :

اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ جَالِسًا فَاَقْبَلَ اَبُوْهُ مِنَ الرَّضَاعَةِ فَوَضَعَ لَهٗ بَعْضَ ثَوْبِهٖ فَقَعَدَ عَلَيْهِ ثُمَّ اَقْبَلَتْ اُمُّهٗ مِنَ الرَّضَاعَةِ فَوَضَعَ لَهَا شِقَّ ثَوْبِهٖ مِنْ جَانِبِهِ الْاٰخَرِ فَجَلَسَتْ عَلَيْهِ ثُمَّ اَقْبَلَ اِلَيْهِ اَخُوْهُ مِنَ الرَّضَاعَةِ فَقَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَجْلَسَهٗ بَيْنَ يَدَيْهِ۔ (ابوداؤد)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھے تھے کہ آپؐ کے رضاعی باپ (یعنی جن کی بیوی آپؐ کی انّا تھی) آگئے، آپؐ نے اُن کے لیے اپنے کپڑے کا ایک کونہ بچھا دیا، اور وہ اس پر بیٹھ گئے۔ پھر آپؐ کی انّا تشریف لے آئیں۔ آپؐ نے کپڑے کا دوسرا کونہ اُن کے واسطے بچھا دیا۔ اور وہ اُس پر بیٹھ گئیں۔ بعد اس کے آپؐ کے برادر رضاعی آگئے آپؐ کھڑے ہو گئے اور اُنھیں اپنے آگے بٹھا لیا۔

سراپائے حبیبؐ

۴ - سراپائے حبیبؐ ایک بدوی عورت (ام معبد) کی زبان سے :

(حنیس بن خالد)... قالت رأیت رجلاً ظاهر الوضاءة ابلج الوجہ حسن الخلق، لم تعبہ ثجلة ولم تزربہ سعلة وسیم قسیم فی عینیہ دعج وفی اشفارہ وطف وفی صوتہ صحل وفی عنقہ سطع وفی لحیتہ کثافة۔ ازج، اقرن - ان صمت فعلیہ الوقار، وان تکلم سما وعلاہ البہاء۔ اجمل الناس وابہاہ من بعید، واحلاہ واحسنہ من قریب۔ حلو المنطق۔ لاهذر ولا نزر۔ کان نطقہ خرزات نظم ربعۃ لا تشنؤہ من طول، ولا تقتحمہ من قصر، غصن بین غصنین، فہو انضر الثلاثة منظراً واحسنہم قدراً لہ رفقاء یحفون بہ۔ ان قال انصتوا لقولہ وان امر تبادروا امرہ۔ محفود۔ محشود۔ لا عابس ولا مفند۔ قال ابو معبد: ہو واللہ صاحب قریش الذی ذکر لنا من امرہ ما ذکر بمکة ولقد ہممت ان اصحبہ ولا تعلن ان وجدت الی ذلک سبیلا۔ (کبیر نجفی)

(ہجرت فرماتے ہوئے حضورؐ، ام معبد کے خیمے سے گزرے تھے۔ جب اُس کا شوہر ابو معبد گھر پر آیا اور اپنے خالی برتنوں کو دودھ سے بھرا ہوا دیکھا تو پوچھا: یہ کہاں سے آیا ہے؟ ام معبد نے کہا: کہ یہ برکت ہے ایک شخص کی جو ابھی ادھر سے گزرا تھا۔ اس نے کہا: کہ ذرا اس کا حال تو بتاؤ اس پر وہ بولی:) میں نے ایک شخص کو دیکھا جس کی نظافت نمایاں، جس کا چہرہ روشن اور جس کی بناوٹ (خلق) میں حُسن تھا۔ نہ موٹاپے کا عیب، نہ دُبلاپے کا نقص، خوش رو، حسین آنکھیں کشادہ اور سیاہ، پلکیں لمبی، آواز میں کھنک، گردن صراحی دار، ڈاڑھی گھنی، بھویں کماندار اور جُڑی ہوئی، خاموشی میں وقار کا مجسمہ، گفتگو میں صفائی اور دلکشی، حُسن کا پیکر اور جمال میں یگانۂ روزگار، دُور سے دیکھو تو حسین ترین، قریب سے دیکھو تو شیریں ترین بھی جمیل ترین بھی، گفتگو میں مٹھاس، نہ فضول گفتگو کرے اور نہ ضرورت کے وقت خاموش رہے۔ گفتگو اس انداز کی جیسے پروئے ہوئے موتی۔ ایسا میانہ قد جس میں نہ قابلِ نفرت درازی، نہ حقارت آمیز کوتاہی، اگر دو شاخوں کے درمیان ایک اور شاخ ہو تو وہ دیکھنے میں ان تینوں شاخوں سے زیادہ ترو تازہ دکھائی دے اور قدر و قیمت میں ان سب سے زیادہ بہتر نظر آئے۔ اس کے کچھ جاں نثار تھے جو اسے گھیرے رہتے۔ جب وہ بولتا تو سب خاموش ہو جاتے۔ جب کوئی حکم دیتا تو اس کی تعمیل کے لیے ٹوٹ پڑتے، سب کا مخدوم، سب کا مطاع۔ ترش روئی سے پاک اور قابلِ گرفت باتوں سے مبرا۔ ابو معبد بولے کہ خدا کی قسم یہ وہی قریشی معلوم ہوتا

ہے جس کا ذکر میں کتنے ہی سن چکا ہوں ۔ میں ارادہ بھی کر چکا ہوں کہ اس کی صحبت نصیب ہو ۔ اگر اس کی سبیل نظر آئی تو میں یہ ضرور کروں گا ۔

روایت و کتابتِ حدیث

۴ ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم قرآن خود لکھواتے تھے :

(زید بن ثابتؓ) کنت اکتب الوحی لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وکان اذا انزل علیہ الوحی اخذتہ برحاء شدیدۃ وعرق عرقا شدیدا مثل الجمان ثم سری عنہ فکنت ادخل علیہ بقطعۃ کتف اوکسرۃ فاکتب وھو یملی علی فما افرغ حتی تکاد رجلی تنکسر من ثقل القرآن حتی اقول لا امشی علی رجلی ابدا فاذا فرغت قال اقرأ فاقرأہ فان کان فیہ سقط اقامہ ثم اخرج بہ الی الناس ۔ (اوسط)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جو وحی قرآن آتی تھی اسے میں (زید) لکھا کرتا تھا ۔ جب حضورؐ پر وحی آتی تھی ، تو حضورؐ کو سخت قسم کی تکلیف ہوتی تھی اور موتیوں کی طرح پسینہ چھوٹنے لگتا تھا ۔ پھر جب وحی کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ، تو میں شانے کی ہڈی یا ٹھیکرا لے کر خدمت میں حاضر ہوتا ۔ حضورؐ لکھواتے جاتے اور میں لکھتا جاتا ۔ بارِ قرآن کا یہ اثر ہوتا کہ لکھتے لکھتے میرا پاؤں ٹوٹنے لگتا اور میں دل میں کہتا کہ اب میں اپنے پاؤں پر کبھی بھی نہ چل سکوں گا ۔ جب میں کتابت سے فارغ ہو چکتا تو حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے: پڑھ کر سناؤ ۔ میں پڑھتا جاتا اور جہاں کوئی لغزش رہ جاتی ، اسے حضورؐ درست فرما دیتے ۔ اس کے بعد میں اُسے لے کر لوگوں کے پاس آتا ۔

۵ ۔ کتابتِ حدیث کی اجازت :

(ابوھریرۃؓ) قال رجل من الانصار یا رسول اللہ انی لاسمع منک الحدیث فیعجبنی ولا احفظہ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم استعن بیمینک واوما بیدہ للخط ۔ (ترمذی)

ایک انصاری نے عرض کیا کہ : یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ، جب آپؐ کی باتیں سنتا ہوں ، تو بڑی پیاری معلوم ہوتی ہیں مگر یاد نہیں رہتیں ۔ فرمایا : اپنے دائیں ہاتھ سے مدد لو (یعنی لکھنے کا ارشارہ فرمایا ۔

۶۔ ابن عمرؓ حدیث لکھ لیا کرتے تھے:

(ابو ھریرۃؓ) ما من اصحاب النبی صلّی اللہ علیہ وسلّم احدٌ اکثر حدیثا منّی الا ما کان من ابن عمر فانہ کان یکتب ولا اکتب۔ (بخاری، ترمذی)

صحابہ کرام (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) میں مجھ سے زیادہ حدیث دان کوئی نہ تھا۔ صرف عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ تھے۔ کیونکہ وہ لکھ لیا کرتے تھے۔ در میں لکھتا نہ تھا۔

۷۔ دوسری زبان سیکھنے کا حکم:

(زید بن ثابت) امرنی رسول اللہ علیہ وسلّم فتعلمت لہ کتاب یھود بالسریانیۃ وقال انی واللہ ما آمن یھود علی کتابی فما مرلی نصف شھر حتی تعلمتہ وحذقتہ فکنت اکتب لہ الیھم واقرألہ کتبھم (بخاری، ابوداؤد، ترمذی)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یہودیوں کا رسم الخط "سریانی" سیکھنے کا حکم دے کر فرمایا کہ: مجھے یہودی منشی پر اعتماد نہیں۔ چنانچہ میں نے نصف ماہ میں زبان کی پوری پوری مہارت حاصل کر لی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے میں ہی اس زبان میں نوشت وخواند کرتا تھا۔

وضو اور اُس کے متعلقات

۸۔ گندگی سے پرہیز:

(روابصۃؓ) سألت النبیّ صلی اللہ علیہ وسلّم عن کل شیئ حتی عن الوسخ الذی یکون فی الاظفار فقال دع ما یریبک الی ما لا یریبک۔ (کبیر بضعف)

میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلّم سے (صفائی و پاکیزگی) کے تمام مسائل دریافت کئے ہیں۔ حتّٰی کہ اس میل کے متعلق بھی دریافت کیا ہے جو ناخنوں کے اندر ہوا کرتا ہے حضورؐ نے جواب میں فرمایا: کہ مشتبہ کام کو غیر مشتبہ کام کے مقابلے میں ترک کر دیا کرو۔

۹۔ تیامن :

(عائشہؓ) کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یحب التیامن ما استطاع فی شأنہ کلہ فی طھورہ و ترجلہ و تنعلہ (للستۃ الا مالکا)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ہر کام میں جہاں تک ممکن ہوتا تیامن (دائیں جانب سے شروع کرنے) کو پسند فرماتے تھے۔ وضو میں، کنگھی کرنے میں اور جوتا پہننے میں بھی تیامن کا خیال فرماتے تھے۔

مسجد

۱۰۔ حضورؐ کی شرکت عام کاموں میں اور فن کی حوصلہ افزائی :

(ابو سعیدؓ)...... فکان صلی اللہ علیہ وسلم ینقل اللبن معھم و یقول، ھذا الحمال لا حمال خیبر : ھذا ابر ربنا و اطھر : و لقیہ رجل و ھو ینقل التراب فقال یا رسول اللہ نا ولنی لبنتک احملھا عنک قال اذھب فخذ غیرھا فلست بافقر منی الی اللہ وجاء رجل کان یحسن عجن الطین وکان من حضرموت فقال صلی اللہ علیہ وسلم رحم اللہ امرأً احسن صنعتہ وقال لہ الزم انت ھذا الشغل فانی اراک تحسنہ ۔ (قزوینی)

مسجد نبویؐ کی تعمیر میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہمارے ساتھ پتھر ڈھوتے اور یہ شعر پڑھتے جاتے۔ ؎

ہٰذا الحمال لا حمال خیبر
ہٰذا ابر ربنا و اطہر

ایک شخص نے جو مٹی ڈھو رہا تھا، آگے بڑھ کر عرض کیا: اے رسولِ خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے حصے کی اینٹیں مجھے دیجئے، انھیں میں لے جاؤں، فرمایا: دوسری اٹھا لو! تم مجھ سے زیادہ اللہ کے محتاج تو نہیں۔

ایک اور شخص جو گارا بنانے میں ماہر تھا اسے دیکھ کر فرمایا:

اللہ اس پر رحم فرمائے جسے کسی صفت میں کمال حاصل ہو، اور اُسے تاکید فرمائی کہ تم یہی کرو۔ اس میں تمھیں خوب ملکہ ہے۔

۱۱۔ فنِ سپہ گری کا معاینہ عورت کے لیے :

(عائشۃؓ) لقد رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی باب حجرتی والحبشۃ یلعبون فی المسجد یسترنی بردائہ انظر الیھم (شیخین)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے حجرہ کے دروازے پر کھڑے ہو کر مسجد میں فنِ سپہ گری دکھانے والے حبشیوں کے کرتب دیکھے اور مجھے بھی اپنی چادر میں چھپا کر دکھائے اور میں انھیں دیکھتی رہی۔

۱۲۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حجرے میں کیوں دفن کیے گئے :

(عائشۃؓ) قال صلی اللہ علیہ وسلم فی مرضہ الذی لم یقم منہ لعن اللہ الیھود والنصاریٰ اتخذوا قبور انبیائھم مساجد ولولا ذلك ابرز قبرہ غیر انہ خشی ان یتخذ مسجدا ۔ (شیخین ونسائی)

اس مرض میں جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پھر صحت مند نہ ہو سکے ۔ فرمایا : یہود اور نصاریٰ پر اللہ کی لعنت ہو۔ انھوں نے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا۔ ام المومنینؓ فرماتی ہیں : اگر یہ خدشہ نہ ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مزار کھلے میدان میں ہوتا ۔ پس خطرہ یہ تھا کہ اُسے سجدہ گاہ نہ بنا لیا جائے۔

۱۳۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک خاص دُعا :

(عطاء بن یسارؓ) رفعہ : اللّٰھم لا تجعل قبری وثنا یعبد ۔ (مالک)

اے اللہ! میرے بعد میری قبر کو صنمِ معبود نہ بنا دینا ۔

اِستقبال قبلہ

۱۴۔ مُسرفانہ لباس میں نماز :

(عقبۃؓ بن عامرؓ) اھدی الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فروج حریر فلبسہ فصلی فیہ ثم انصرف فنزعہ نزعا

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حریر (ریشم) کے ٹکڑے ہدیے میں آئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو پہن کر نماز ادا فرمائی ۔ بعد فراغت اسے نفرت آمیز انداز

شديدا كالكاره له وقال له ينبغي هذا للمتقين - (نسائی)

سے بُری طرح اُتار پھینکا اور فرمایا کہ اہلِ تقوٰی کو یہ زیب نہیں دیتا۔

مریض کی نماز

۱۵۔ نماز میں ایک ہی آیت کی تکرار:

(ابو ذرؓ) ان رسول الله صلى الله عليه وسلّم قام حتى اصبح بآية والآية: ان تعذبهم فانهم عبادك وان تغفرلهم فانك انت العزيز الحكيم - (نسائی)

ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے تو ایک ہی آیت کی تکرار میں صبح کر دی آیت یہ تھی: ان تعذبهم فانهم عبادك وان تغفرلهم فانك انت العزيز الحكيم. (یعنی اگر تو ان پر عذاب کرے گا تو یہ تیرے ہی بندے ہیں، اور اگر تُو ان کی مغفرت فرمائے تو تُو غالب ودانا ہی ہے۔)

نماز میں جائز و ممنوع افعال

۱۶۔ تعلیم و تفہیم کا لاجواب طریقۂ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم):

(معاویۃ بن الحکمؓ) بينا انا اصلي مع رسول الله صلى الله عليه وسلّم اذ عطس رجل من القوم فقلت يرحمك الله فرماني القوم بابصارهم فقلت واثكل امياه ما شأنكم تنظرون الي؟ فجعلوا يضربون بايديهم على افخاذهم فلما رأيتهم يصمتوني لكني

میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز ادا کر رہا تھا کہ کسی کو چھینک آئی اور میں نے یرحمک اللہ کہہ دیا، بس لوگ مجھے گھور گھور کر دیکھنے لگے۔ میں نے کہا میری کیا شامت آگئی؟ مجھے تم لوگ اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو۔ بس لوگوں نے اپنی رانوں پر ہاتھ مارنا شروع کر دیا۔ پھر جب میں نے محسوس کیا کہ لوگ مجھے خاموش کرنا چاہتے ہیں تو میں خاموش ہو گیا۔ جب حضور صلے اللہ علیہ نماز پڑھ چکے تو میرے

سکت فلما صلی النبی صلی اللہ علیہ
وسلم فبابی ھو و امی ما رأیت معلما
قبلہ ولا بعدہ احسن تعلیما منہ فو اللہ
ما کھرنی ولا ضربنی ولا
شتمنی فقال ان ھذہ الصلوۃ لا
یصلح فیھا شئ من کلام الناس
انما ھی التسبیح والتکبیر وقراءۃ
القرآن او کما قال صلی اللہ علیہ
وسلم قلت یا رسول اللہ انی حدیث
عھد بجاھلیۃ وقد جاء اللہ بالاسلام
وان منا رجالا یأتون الکھان قال
فلا تأتھم قال ومنا رجال یتطیرون قال ذلک
شئ یجدونہ فی صدورھم
فلا یصدنھم قال ومنا
رجال یخطون قال کان نبی
من الانبیاء یخط فمن
وافق خطہ فذاک قال
وکانت لی جاریۃ ترعی
غنما لی قبل احد والجوانیۃ
فاطلعت ذات یوم فاذا الذئب
قد ذھب بشاۃ من غنمنا
وانا رجل من بنی آدم آسف کما یأسفون
لکن صککتھا صکۃ فاتیت النبی
صلی اللہ علیہ وسلم فعظم ذلک علی
قلت یا رسول اللہ افلا اعتقھا؟ قال
ائتنی بھا فاتیتہ بھا فقال لھا این اللہ؟

ماں باپ اُن پر قربان ہوں، میں نے آپ سے بہتر تعلیم
دینے والا معلم نہ پہلے دیکھا ہے نہ بعد میں ۔ بخدا نہ
تو مجھے جھڑکا، نہ مارا اور نہ گالی دی، بلکہ یہ فرمایا کہ :
دیکھو نماز نام ہے تسبیح و تکبیر اور تلاوت قرآن کا اس لیے
اس میں عام انسانی گفتگو زیب نہیں دیتی۔ بس اسی قسم کی
باتیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائیں۔ پھر میں نے
عرض کیا، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں بہت قریبی
دور میں جاہلیت سے وابستہ رہا ہوں اور اب اللہ تعالیٰ
نے مجھے اسلام سے سرفراز کیا ہے۔ ہماری قوم میں بعض لوگ
کاہنوں کے پاس جاتے ہیں۔ فرمایا: تم ایسا نہ کرو۔

پھر کہا کہ: میری ایک لونڈی تھی، جو
میرے گلّے کو اُحد اور جوانیہ کی طرف
لے جا کر چرایا کرتی تھی، ایک دن ایسا ہوا
کہ وہ باہر نکلی اور ایک بھیڑیا ہمارے گلّے
میں سے ایک بکری لے بھاگا، میں بھی آخر
آدمی ہوں اور آدمیوں ہی کی طرح صدمہ بھی
ہوتا ہے ——— میں نے صرف
ایک طمانچہ مار دیا۔ پھر میں حضور صلی اللہ
علیہ وسلم کے پاس آیا، کیونکہ یہ حرکت
مجھ پر بہت شاق تھی۔ میں نے عرض کیا کہ:
یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم!
میں اسے آزاد نہ کر دوں :۔ فرمایا:
اسے یہاں لے آؤ۔ چنانچہ میں لے آیا۔
اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے
پوچھا کہ: اللہ کہاں ہے؟ اس نے کہا:
آسمان میں۔ پھر پوچھا کہ: میں کون ہوں؟

فقالت فی السماء، قال من انا؟ قالت انت رسول اللہ قال اعتقھا فانھا مؤمنۃ۔ (مسلم، ابوداؤد، نسائی)

کہا: اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) فرمایا: یہ مومنہ ہے اسے آزاد کر دو۔

نمازِ جمعہ

۱۹۔ عمل میں ہُوکا نہیں بلکہ میانہ روی ہونی چاہیئے:

(الحکم بن الحزن الکلفی) شھدالجمعۃ مع النبیّ صلی اللہ علیہ وسلّم فقام متوکئًا علی عصًی او قوس فحمد اللہ واثنی علیہ بکلمات خفیفات طیبات مبارکات ثم قال ایھا الناس انکم لن تطیقوا ولن تفعلوا کل ما امرتم بہ ولکن سددوا وابشروا۔ (ابوداؤد)

حکم بن حزن نے جمعہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وعظ سُنا۔ اس وقت رسُولِ خُدا (صلی اللہ علیہ وسلم) عصا یا کمان پر ٹیک لگائے کھڑے تھے، پہلے آپؐ نے اللہ (تعالیٰ) کی حمد کی اور اس کی تعریف کے چند ہلکے پھلکے پاکیزہ کلمات کہے۔ پھر فرمایا: لوگو! تمھیں جو احکام دیے جاتے ہیں، اُن کی پوری تعمیل تمھاری قدرت سے باہر ہے۔ البتہ عمل میں میانہ روی قائم رکھو اور خوش رہو۔

۲۰۔ خطبہ چھوڑ کر حاجت روائی کرنا:

(ابورفاعۃ العدوی) اتیت النبیّ صلی اللہ علیہ وسلم وھو یخطب فقلت یارسول اللہ رجل غریب جاء یسأل عن دینہ لا یدری ما دینہ فاقبل علیّ وترک خطبتہ حتی انتھی الیّ فاتی بکرسی حسبت قوائمہ حدیدا فقعد علیہ وجعل یعلمنی ثم اتی الخطبۃ فاتم اخرھا۔ (مسلم، نسائی)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ جمعہ فرما رہے تھے، میں اسی موقعہ پر حاضر ہو کر عرض گزار ہوا: یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)! یہ غریب الدیار "دین" کے متعلق دریافت کرنا چاہتا ہے، اسے معلوم نہیں کہ دین کیا ہے؟ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ چھوڑ کر میرے پاس ہی تشریف لے آئے۔ ایک آہنی پایوں کی کرسی پر بیٹھ کر مجھے سمجھاتے رہے اور پھر خطبہ کے لیے واپس تشریف لے گئے۔

قیام لیل

۲۱۔ قیام لیل تقاضائے شکر بھی ہے:

(المغیرۃ رضؓ بن شعبۃ) قال قام النبی صلی اللہ علیہ وسلم حتّٰی تورّمت قدماہ فقیل لہ قد غفر اللہ لک ما تقدم من ذنبک وما تأخر قال افلا اکون عبداً شکوراً۔

(ترمذی، نسائی، شیخین۔)

آنحضرت (صلّی اللہ علیہ وسلم) (بعض اوقات) اتنا قیام فرماتے کہ آپؐ کے پائے مبارک سُوج جاتے تھے۔ آپؐ سے عرض کیا گیا کہ حضور (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کے تمام اگلے پچھلے گناہ معاف کیے جا چکے (پھر قیام میں اتنا انہماک کیوں ہے؟) فرمایا: تو کیا میں شکر گزار بندہ نہ بنوں۔؟

۲۲۔ سیرت رسول (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کے متعلق آخری اور جامع بات:

(سعد بن ھشام) ..... فقلت یا ام المؤمنین انبئینی عن خُلُق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم قالت الست تقرأ القرآن؟ قلت بلی قالت فان خُلُقَہ کان القرآن۔

(مسلم، ابوداؤد، نسائی)

..... سعد بن ہشام نے حضرت عائشہ صدیقہ (رضی اللہ عنہا) سے پوچھا کہ اے ام المؤمنین مجھے خلق نبوی (صلی اللہ علیہ وسلّم) کے بارے میں تو کچھ بتایئے؟ فرمایا کہ: کیا تم قرآن نہیں پڑھتے؟ عرض کیا پڑھتا تو ہوں۔ کہا کہ: بس قرآن آنحضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کا خلق ہی تو ہے۔

۲۳۔ "شبینہ" کوئی سُنّت نہیں:

(سعدؓ بن ھشام)..... وکان اذا صلی صلوۃ احب ان یداوم علیھا وکان اذا غلبہ نوم اووجع عن قیام اللیل صلی من النھار ثنتی عشرۃ رکعۃ ولا اعلمہ قرأ القرآن کلہ فی لیلۃ

..... حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) جب کوئی نماز نفل پڑھتے تو اس کی مداومت کو پسند فرماتے تھے اور جب نیند یا کسی اور تکلیف کی وجہ سے قیام لیل نہ ہو سکتا تو دن کے وقت بارہ رکعتیں ادا فرما لیتے۔ جہاں تک مجھے (یعنی حضرت عائشہؓ کو) علم ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک رات میں پورا قرآن

ولا صلی لیلۃ الی الصبح ولا صام شھرًا کاملًا غیر رمضان۔
(مسلم، ابو داؤد، نسائی)

کبھی نہیں پڑھا اور کسی رات میں صبح تک قیام نہیں فرمایا، اور رمضان کے سوا کسی پورے ماہ کے روزے نہیں رکھے۔

کتاب الجنائز

امراض میں رحمت

۲۴۔ آزمائش بمقدار دین ہوتی ہے:

(مصعب بن سعدؓ) عن ابیہ قلت یا رسول اللہ ای الناس اشد بلاءً؟ قال الانبیاء ثم الامثل فالامثل یبتلی الرجل علی حسب دینہ صلبا اشتد بلاءہ وان کان فی دینہ رقۃ ابتلاہ علی حسب دینہ فما یبرح البلاء بالعبد حتی یترکہ یمشی علی الارض وما علیہ خطیئۃ۔
(ترمذی)

میں (سعدؓ) نے عرض کیا کہ: یا رسول اللہ! آزمائش میں سب سے زیادہ سختی کس انسان کے ساتھ ہوتی ہے۔؟ فرمایا: انبیاؑ کے ساتھ پھر جو ان سے مشابہ ہوں، پھر جو ان سے نسبتاً کم مشابہ ہوں۔ ہر شخص کی آزمائش اس کے دین کے مطابق ہوتی ہے۔ اگر وہ اپنے دین میں پختہ ہے تو ویسی ہی سخت اس کی آزمائش بھی ہوگی اور اگر اس کے دین میں ڈھیلا پن ہے تو اسی کے مطابق اللہ اس کی آزمائش کرے گا۔ بندے کے ساتھ آزمائشوں کا یہ سلسلہ اسی طرح قائم رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ زمین پر اس طرح چلتا پھرتا ہے کہ اس پر گناہ کا کوئی بوجھ نہیں ہوتا۔

موت

۲۵۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کس مرض میں ہوئی؟:

(عائشہؓ) ما مات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اِلّا من ذات الجنب۔
(اوسط، موصلی)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ذات الجنب سے ہوا تھا۔

روزے کے متعلق چند باتیں

۲۶ - ہر فعلِ نبوی کی نقل اتباعِ سنت نہیں :

(ابن عمرؓ) ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم نھی عن الوصال قالوا انک تواصل قال انی لست کھیئتکم انی اطعم واسقی (شیخین، ابوداؤد، موطأ)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو صوم وصال (بلا افطار تین تین دن کے روزے) رکھنے سے منع فرمایا۔ لوگوں نے عرض کیا کہ: یا رسول اللہ! آپ خود تو رکھتے ہیں۔ فرمایا: میں تمھارے جیسا نہیں! (مجھے خدا کی طرف سے روحانی طور پر) کھانا پینا مل جاتا ہے۔

کتاب الحج

۲۷ - قافلۂ مجاہدین میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول :

(جابرؓ) کان صلی اللہ علیہ وسلم یتخلف فی المسیر فیزجی الضعیف و یردف و یدعولھم۔ (ابوداؤد)

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سفر جہاد میں عموماً پیچھے رہتے تھے۔ بایں مصلحت کہ کمزوروں کو ہمت دلاتے، اپنے ساتھ سواری پر بٹھاتے اور ان کے لیے دعائے خیر فرماتے۔

۲۸ - شیطان بھی مسلمان ہو سکتا ہے :

(جابرؓ) رفعہ: لا تلجوا علی المغیبات فان الشیطان یجری من احدکم مجری الدم قلنا ومنک؟ قال ومنی ولکن اللہ اعاننی علیہ فاسلم .... (ترمذی)

پردے کی باتوں کے پیچھے نہ پڑا کرو کیونکہ شیطان بعض آدمیوں کے خون کی طرح اندر گھس کر دوڑتا رہتا ہے۔ ہم نے کہا: کیا حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اندر بھی وہ موجود ہے۔ فرمایا: ہاں! مگر اللہ نے مجھے اس پر فتح دی اور وہ مطیع ہو گیا ہے۔

خطبۂ حج

۲۹۔ حجۃ الوداع کا ایک خطبۂ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم):

(جعفر رضی بن محمد رضی بن علی رضی)......
فخطب الناس وقال ان دماءكم وأموالكم حرام عليكم كحرمة يومكم هذا في شهركم هذا في بلدكم هذا الا كل شئ من امر الجاهلية تحت قدمي موضوع ودماء الجاهلية موضوعة وان اول دم اضع من دمائنا دم ابن ربيعة بن الحارث كان مسترضعا في بني سعد فقتلته هذيل وربوا الجاهلية موضوع واول ربوا اضع ربانا ربوا العباس بن عبد المطلب فانه موضوع كله واتقوا الله في النساء فانكم اخذتموهن بامان الله واستحللتم فروجهن بكلمة الله ولكم عليهن ان لا يوطئن فرشكم احدا تكرهونه فان فعلن ذلك فاضربوهن ضربا غير مبرح ولهن عليكم رزقهن وكسوتهن بالمعروف وقد تركت فيكم مالن تضلوا بعده ان اعتصمتم به كتاب الله........

(مسلم، نسائی، ابوداؤد)

بموقعۂ حج حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا کہ: تمھاری جانیں اور تمھارے مال اسی طرح قابلِ احترام ہیں جس طرح اس شہر اور اس ماہ میں آج کا دن۔ سنو! جاہلیت کی تمام باتیں آج میرے قدموں کے نیچے روندی جا چکیں۔ دورِ جاہلیت کے خون کا بدلہ آج سے ختم ہے۔ پہلا خون جو میں معاف کرتا ہوں۔ وہ ابن ربیعہ بن حارث کا خون ہے جس نے بنی سعد رضی کا دودھ پیا تھا اور ہذیل نے اُسے قتل کیا تھا۔ (رسمِ جاہلیت کے مطابق ہاشمیوں کو اس خون کا بدلہ لینا تھا)۔ جاہلیت کا سودی کاروبار بھی آج سے ختم ہے، پہلا سود جو میں آج ختم کرتا ہوں وہ ہمارا وہ سود ہے جس کے حق دار عباس بن عبدالمطلب ہیں۔ یہ کُل کا کُل ختم کیا جاتا ہے۔ (اب عباس اس کا مطالبہ نہیں کر سکتے)۔ عورتوں کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہو۔ تم نے ان کو امانِ الٰہی کے سہارے حاصل کیا ہے اور بواسطۂ کلمۂ الٰہی ان کو اپنے لیے حلال کیا ہے۔ ان پر تمھارا حق یہ ہے کہ کسی ایسے شخص سے تمھارا بستر نہ روندوائیں جسے تم ناپسند کرتے ہو اگر وہ ایسا کریں تو انھیں مار بھی سکتے ہو۔ مگر اذیت رساں نہ ہو۔ ان کا حق تم پر یہ ہے کہ معروف کے مطابق ان کو روٹی کپڑے وغیرہ کا بندوبست کرو۔
میں تم میں ایک ایسی چیز چھوڑے جاتا ہوں جس سے اگر تم وابستہ رہے تو کبھی گمراہ نہ ہو گے، وہ چیز کتاب اللہ ہے........

۳۰ - حجۃ الوداع کا ایک اور خطبۂ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم)

(العداء بن خالدؓ) ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال یوم حجۃ الوداع ان اللہ یقول یا ایہا الناس انا خلقناکم من ذکر وانثی وجعلناکم شعوبا وقبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم فلیس لعربی علی عجمی فضل ولا لعجمی علی عربی فضل ولا لاسود علی ابیض فضل ولا لابیض علی اسود فضل الا بالتقوی یا معشر قریش لا تجیئوا بالدنیا تحملونها علی رقابکم ویجئ الناس بالآخرۃ فانی لا اغنی عنکم من اللہ شیئا - (کبیر)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ (ترجمہ آیت): "اے انسانو! ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور خاندانوں اور قبیلوں میں تمھیں اس لیے بانٹ دیا کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ محترم وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔" لہٰذا کسی عربی کو عجمی پر، یا عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت نہیں اور کسی کالے کو گورے پر اور گورے کو کالے پر بھی کوئی شرف نہیں۔ صرف تقویٰ ہی باعثِ فضیلت ہے۔ اے قریشی بھائیو! ایسا نہ ہو کہ دوسرے لوگ تو آخرت سنواریں اور تم دنیا کا بوجھ اپنی گردن پر اٹھائے (خدا کے حضور) جاؤ۔ یہ یاد رہے کہ میں وہاں تمھارے کوئی کام نہ آسکوں گا۔

۳۱ - قومی جذبات کے احترام کی عجیب مثال:

(عائشہؓ) رفعتہ: الم تری الی قومک حین بنوا الکعبۃ اقتصروا عن قواعد ابراہیم فقلت یا رسول اللہ الا تردها علی قواعد ابراہیم؟ فقال لولا حدثان قومک بالکفر لفعلت ...... (للستۃ الا ابا داؤد)

اپنی قوم کو دیکھو۔ انھوں نے بنائے کعبہ کو اصل ابراہیمی بنیاد سے کم رکھا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ: یا رسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وسلم) اسے بنائے ابراہیمی ہی پر کیوں نہ ازسرِ نو تعمیر فرما دیں؟ فرمایا: اگر تمھاری قوم تازہ تازہ کفر سے اسلام میں نہ آئی ہوتی، تو میں یہ کر لیتا........

۳۲ - جو قربانی نہ دے سکا ہو اُس کی طرف سے بھی قربانی ادا ہو چکی ہے:

(ابو سعیدؓ) انہ صلی اللہ علیہ وسلم اتی بکبشین املحین وقال فذبح

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دو سفید مینڈھے لائے گئے۔ ایک کو ذبح کرتے وقت فرمایا کہ:

احدھما ھذا عن محمّد واھل بیته وفی ذبح الاٰخر عمن لم یضح من اُمّتی (ترمذی، ابو داؤد، احمد، بزاز)

یہ میری طرف سے اور میرے گھر والوں کی طرف سے ہے، اور دوسرے کو ذبح کرتے وقت فرمایا کہ یہ ہر اُس اُمّتی کی طرف سے جو قربانی نہ دے سکا ہو۔

۴۳۔ نکاح سُنّتِ رسولؐ ہے :

(انسؓ) جاء ثلاثة رھط الی بیوت النبیؐ صلّی اللّٰہ علیه وسلّم یسئلون عن عبادۃ النبیؐ فلما اخبروا کانھم تقالّوھا فقالوا این نحن من النبیؐ وقد غفرله ماتقدم من ذنبه وماتأخّر قال احدھم اما انا فاصلی اللیل ابدا وقال اٰخر انا اصوم الدھر ولا افطر وقال اٰخر انا اعتزل النساء فلا اتزوج ابدا فجاء رسول اللّٰہ فقال انتم الذین قلتم کذا وکذا؟ اما واللّٰہ انی لاخشاکم للّٰہ واتقاکم له لکنی اصوم وافطر واصلی وارقد واتزوج النساء فمن رغب عن سنتی فلیس منی۔
(نسائی ومسلم)

امہات المومنین کے پاس تین شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کے بارے میں دریافت کرنے آئے۔ جب انھیں بتایا گیا تو انھوں نے حضورؐ کی اس عبادت کو کم سمجھا۔ کہنے لگے: کہاں ہم اور کہاں حضورؐ جن کے تمام اگلے پچھلے گناہ معاف ہو چکے ہیں۔ ایک نے کہا: میں تو ہمیشہ ساری رات نماز پڑھتا رہوں گا۔ دوسرا بولا: میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا اور کبھی ناغہ نہ کروں گا۔ تیسرے نے کہا: میں عورتوں سے الگ رہوں گا اور کبھی شادی نہ کروں گا۔ اتنے میں حضورؐ تشریف لے آئے اور فرمایا: کیا تم لوگوں نے یہ یہ باتیں کہی ہیں؟ بخدا میں تم سے زیادہ خدا ترس اور متقی ہوں۔ لیکن روزے رکھتا بھی ہوں اور چھوڑ بھی دیتا ہوں، نماز پڑھتا ہوں اور آرام بھی کرتا ہوں اور شادیاں بھی کرتا ہوں۔ لہٰذا جو میری سنّت سے روگردانی کرے وہ مجھ سے نہیں۔

زوجین ایک دوسرے کے لیے

۴۴۔ ایک بہترین جوڑے کی گھریلو زندگی کا نقشہ :

(علیؓ) قال لابن اعبد الا احدثك

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ابن اعبد سے کہا:

عني وعن فاطمةؓ ؟ قلت بلى قال انها جرّت بالرحا حتّى اثّر في يدها واستقت بالقربة حتى اثرت في نحرها وكنست البيت حتى اغبرّت ثيابها فاتى النبيّ صلّى الله عليه وسلّم خَدَم فقلت لو اتيتِ اباكِ فسألته خادما فاتته فوجدت عنده حُدّاثا فرجعت فاتاها من الغد فقال ما كان حاجتك ؟ وسكتت فقلت انا احدثك يارسول الله جرت بالرحا حتى اثرت في يدها وحملت بالقربة حتى اثرت في نحرها فلما ان جاء الخدم امرتها ان تأتيك فتستخدمك خادما يقيها حَرّما هي فيه فقال اتقي الله يافاطمةؓ وأدّي فريضة ربكِ واعملي عمل اهلكِ واذا اخذتِ مضجعكِ فسبّحي ثلاثا وثلثين واحمدي ثلاثا وثلثين وكبّري اربعا وثلاثين فتلك مائة فهي خيرلك من خادم فقالت رضيت عن الله وعن رسوله ولم يخدمها

رشيخين، ابوداؤد،

ترمذی)

میں تمھیں اپنی اور فاطمہؓ کی کیفیت بتاؤں ؟ کہا: ضرور! فرمایا: فاطمہؓ کے ہاتھ میں چکی پیستے پیستے نشان پڑگیا تھا اور پانی کی مشک ڈھوتے ڈھوتے ان کی گردن میں داغ پڑگیا تھا اور گھر میں جھاڑو دیتے دیتے ان کے کپڑے گرد آلود ہو جاتے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ خادم آئے تو میں نے کہاکہ : فاطمہؓ ! کیا اچھا ہو جو تم اپنے پدر بزرگوار سے جاکر ایک خادم کا سوال کرو ۔ فاطمہؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں تو وہاں بہت سے لوگوں کو باتیں کرتے ہوئے دیکھا اور واپس آگئیں اور پھر دوسرے دن آکر حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے پوچھا : کیا کام ہے ؟ فاطمہؓ خاموش رہیں ۔ میں نے کہاکہ : میں عرض کرتا ہوں ۔ بات یہ ہے کہ چکی پیستے پیستے ان کے ہاتھ میں اور مشکیزہ اُٹھاتے اُٹھاتے ان کی گردن میں داغ پڑ گئے ہیں ۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس خدام آئے تو میں نے اُن سے کہاکہ : حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاکر ایک خادم کا سوال کرو ، تاکہ یہ اس مشقت سے بچ جائیں جس میں گرفتار ہیں ۔ فرمایاکہ : فاطمہؓ تقویٰ اللہ اختیار کر اور اپنے گھر والوں کا کام کیا کر ، اور جب تو سونے لگے تو تینتیس بار تسبیح (سبحان اللہ) اور تینتیس بار تحمید (الحمد للہ) اور چونتیس بار تکبیر (اللہ اکبر) کہہ کر سو کی تعداد پوری کرلیا کر ۔ یہ ورد تیرے لیے ایک خادم سے زیادہ بہتر ہوگا ۔ فاطمہؓ کہنے لگیں کہ : میں اللہ اور اُس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سے راضی ہوں ۔ غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں کوئی خادم نہیں دیا ۔

احکامِ وصیّت

۳۵۔ اسلامی ریاست کے بعض فرائض دربارۂ قرض و وراثت :

(المقدامؓ) رفعه : انا اولی بکل مؤمن من نفسه فمن ترك دینا او ضیعة فالیّ ومن ترك مالا فلورثته وانا مولی من لا مولی له ارث ماله وافلكّ عانیه والخال مولی من لا مولی له یرث ماله ویفكّ عانیه وفی روایة : من ترك كلا فالیّ ومن ترك مالا فلورثته وانا وارث من لا وارث له اعقل منه وارثه ۔ (ابو داؤد)

میں ہر مومن کا خود اس کی اپنی ذات سے بھی زیادہ قریب تر ولی ہوں ، لہٰذا جو شخص کوئی قرض یا واجب الادا مال چھوڑ جاتے اُس کی ادائیگی کا میں ذمّے دار ہوں گا اور جو ترکہ چھوڑ جائے وہ اس کے وارثوں کا حق ہے۔ جس کا کوئی ولی نہ ہو اُس کا میں ولی ہوں ۔ اُس کے مال کا وارث بھی میں ہوں گا ، اور اس کے اسیر کو بھی میں چھڑاؤں گا اور ماموں ہر اُس شخص کا وارث ہو گا جس کا کوئی وارث نہ ہو ، وہی اس کے مال کا وارث ہو گا اور وہی اُس کے اسیر کو چھڑائے گا ۔ دوسری روایت میں ہے کہ جو بال بچے چھوڑ جائے اس کا ذمّے دار میں ہوں اور جو مال چھوڑ جائے وہ اس کے وارثوں کا ہے اور جس کا کوئی وارث ہی نہ ہو ، اس کا وارث میں ہوں گا ۔ اس کے مال کا وارث میں ہوں گا ، اور اُس کا خون بہا بھی میں ادا کروں گا ۔

نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم کی وراثت

۳۶۔ نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم کی وراثت :

(ابو ھریرۃؓ) رفعه : لا تقتسم ورثتی دینارًا ماتركت بعد نفقة نسائی ومؤنة عاملی فهو صدقة ۔ (مالك شیخین و ابی داؤد)

میرے ورثا میں ایک دینار بھی بطور ترکہ تقسیم نہ ہو گا ۔ بلکہ میری بیویوں کی ضروریات اور منتظم کی خوراک کے بعد جو کچھ بھی بچے وہ صدقہ ہو گا ۔

۳۷ - نبی کا ذریعۂ معاش نبی کے بعد :

(ابو الطفیلؓ)...... سمعت رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم یقول ان اللّٰہ تعالیٰ اذا اطعم نبیا طعمۃ فھو للذی یقوم من بعدہ ۔ (ابو داؤد)

...... میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سُنا ہے کہ : اللہ تعالیٰ اپنے کسی نبی کو جو روزی دیتا ہے وہ پھر اس کے لیے ہوتی ہے جو اس کے بعد اس کا قائم مقام ہوتا ہے۔

۳۸ - نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ترکہ چھوڑا :

(عمروؓ بن الحارث الخزاعی) ماترک النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلّم دینارًا ولا درھما ولا عبدًا ولا امۃً ولا شیئًا الّا بغلۃ البیضاء التی کان یرکبھا وسلاحہ وارضا جعلھا لابن السبیل صدقۃ ۔ (بخاری ونسائی)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ترکہ میں کوئی درہم و دینار یا لونڈی غلام نہیں چھوڑا، صرف تین چیزیں چھوڑیں : ایک خچّر جس پر سوار ہوتے تھے اور چند ہتھیار اور ایک قطعۂ زمین جسے آپؐ نے مسافروں کے لیے وقف فرما دیا تھا۔

۳۹ - نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اصلی ترکہ :

(ابن عباسؓ) ماترک النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلّم من شئ الا ما بین الدفتین ۔ (بخاری)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے دو جلدوں کے درمیان والی چیز (یعنی قرآنِ پاک) کے سوا اور کوئی ترکہ نہیں چھوڑا۔

قصاص

۴۰ - نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم سے قصاص کا مُطالبہ :

(عبد اللّٰہ بن جبیر الخزاعی) قال طعن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلّم رجلا فی

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار ایک شخص کے پیٹ میں چھڑی یا مسواک کا کونچا لگایا ۔ اس نے کہا کہ مجھے

بطنه اما بقضيب و اما بسواك، فقال اوجعتني فاقدني فاعطاه العود الذي كان معه فقال استقد فقبل بطنه ثم قال بل اعفو لعلك ان تشفع لي بها يوم القيامة۔ (كبير)

اس سے اذیت ہوئی اور مجھے قصاص لینے دیجیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ چھڑی جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھی اُسے دیتے ہوئے فرمایا کہ: اپنا قصاص لے لے۔ وہ دوڑ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے شکم مبارک کو چومنے لگا اور کہا کہ: یارسول اللہ! میں یہ قصاص اس لیے معاف کرتا ہوں کہ حضورؐ بروزِ حشر میرے شفیع ہو جائیں۔

آدابِ طعام

۴۱ - آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی غذا کیسی تھی؟

(ام ايمن): انها غربلت دقيقا فصنعته للنبي صلی اللہ علیہ وسلم رغيفا فقال ما هذا؟ قالت طعام نصنعه بارضنا فاحببت ان اصنع منه لك رغيفا فقال ردّيه فيه ثم اعجنيه (قزويني)

ام ایمن نے ایک بار آٹے کو چھان کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے چپاتی پکائی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: یہ کیا؟ عرض کیا کہ ہمارے وطن میں اسی طرح روٹی پکاتے ہیں، میں نے کہا: آج حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی ایسی ہی پکا دوں۔ فرمایا کہ: اسے بھوسے میں واپس کر کے پھر سے آٹا گوندھو۔

۴۲ - شانِ امتیاز و تکبر کے اظہار سے نفرت (قابلِ غور و عبرت نمونہ):

(ابن عمرو بن العاصؓ) ما رأى النبي صلی اللہ علیہ وسلم يأكل متكئا قط ولا يطأ عقبه رجلان قط ان كانوا ثلاثة مشى بينهما وان كانوا جماعة قدم بعضهم۔ (ابو داؤد)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی تکیہ لگا کر کھاتے نہیں دیکھا۔ کبھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے دو آدمی بھی نہیں چلے۔ (یعنی حضورؐ کو ملا کر) جب تین آدمی ہوتے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے بیچ میں چلتے اور جب زیادہ ہوتے تو چلنے میں کسی اور کو آگے کر دیتے۔

۴۳ - کسی کھانے کی برائی نہ کرنی چاہیے:

(ابو ھریرۃؓ) ما عاب رسول اللہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی کھانے کی

صلی اللہ علیہ وسلم طعاماً قط ان اشتہاہ اکلہ وان کرھہ ترکہ۔
(شیخین، ابوداؤد، ترمذی)

بُرائی نہیں فرمائی۔ اگر پسند ہو تو کھا لیا، ورنہ چھوڑ دیا۔

۴۴۔ ذوقِ نبوی (کھانے کی بعض چیزوں میں):

(جابر بن سمرۃؓ) نزل النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن ابی ایوب فکان اذا اکل طعاما بعث الیہ بفضلہ فبعث الیہ یوما بطعام لم یأکل منہ صلی اللہ علیہ وسلم فلما اتی ابوایوب النبی صلی اللہ علیہ وسلم ذکر ذلک لہ فقال صلی اللہ علیہ وسلم فیہ الثوم فقال یارسول اللہ احرام ھو؟ قال لا ولکنی اکرھہ من اجل ریحہ۔ (ترمذی)

(مہاجر ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم ابو ایوبؓ انصاری کے گھر اُترے تھے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کھانا کھا لیتے تو بقیہ ان کے پاس بھیج دیتے۔ ایک دن انھوں نے کھانا بھیجا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کھایا۔ جب ابو ایوب آئے تو انھوں نے اس کا سبب دریافت کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اس میں لہسن پڑا تھا۔ انھوں نے پوچھا کہ: یارسول اللہ! کیا لہسن حرام ہے؟ فرمایا: نہیں! لیکن میں اس کی بُو کی وجہ سے پرہیز کرتا ہوں۔

۴۵۔ شاہنشاہ کا فقیرانہ لباس:

(ابو بردۃؓ) دخلت علی عائشۃ فاخرجت الینا کساء ملبدا من التی یسمونہا الملبدۃ وازارا غلیظا مما یصنع بالیمن واقسمت باللہ لقد قبض روح النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی ھذین الثوبین۔
(شیخین، ابوداؤد، ترمذی)

میں حضرت عائشہ صدیقہؓ کے پاس گیا تو آپؓ نے مجھے ایک پیوند لگی ہوئی چادر دکھائی جسے لوگ ملبّد (پیوند لگا ہوا) کہتے تھے۔ اس کے ساتھ ایک موٹے کپڑے کا تہبند بھی دکھایا۔ جو یمن میں بنتا ہے پھر قسم کھا کر بیان کیا کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان ہی دو کپڑوں میں وفات پائی تھی۔

سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

آغازِ وحی

۴۶۔ آغازِ وحی اور اُس کی کیفیات، بیوی کی شہادت و زبر کی :

(عائشہؓ) اوّل ما بدئ به رسول الله صلی الله علیه وسلم من الوحی الرؤیا الصالحة فی النوم وکان لا یری الاحلام مثل فلق الصبح ثم حبب الیه الخلاء وکان یخلو بغار حراء فیتحنث فیه و هو التعبد اللیالی ذوات العدد قبل ان ینزع الی اهله ویتزود لذلك ثم یرجع الی خدیجة فیتزود لمثلها حتی فجئه الحق وهو فی غار حراء فجاءه الملك فقال اقرأ قال ما انا بقارئ قال فاخذنی فغطنی حتی بلغ منی الجهد ثم ارسلنی فقال اقرأ فقلت ما انا بقارئ فاخذنی فغطنی الثانیة حتی بلغ منی الجهد ثم ارسلنی فقال اقرأ فقلت ما انا بقارئ فاخذنی فغطنی الثالثة حتی بلغ منی الجهد ثم ارسلنی فقال اقرأ باسم ربك الذی خلق، خلق الانسان من علق اقرأ، وربك الاکرم الذی علم بالقلم حتی بلغ مالم یعلم فرجع بها رسول الله صلی الله علیه وسلم

پہلی چیز جس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی کا آغاز ہوا وہ صالح خواب تھے۔ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو خواب دیکھتے وہ سپیدۂ صبح کی طرح ظاہر ہو جاتا۔ اس کے بعد حضور کو خلوت گزینی کی طرف رغبت ہوئی اور آپؐ غارِ حرا میں تنہا جا کر تحنّث فرمانے لگے تحنّث کا مطلب یہ ہے کہ متعدد روز و شب عبادت میں گذارتے پھر اپنے گھر تشریف لاتے اور توشۂ راہ لے جاتے پھر خدیجہؓ کے پاس واپس آتے اور اسی طرح توشہ لے جاتے۔ آخر ایک دن دفعتہً پیغامِ حق غارِ حرا کے اندر آ پہنچا یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وہ فرشتہ (جبرئیل) آیا اور کہنے لگا: پڑھیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا: میں پڑھا ہوا نہیں۔ اس کے بعد حضورؐ فرماتے ہیں کہ: مجھے اس زور سے بھینچا کہ مجھے بھی مدافعت کے لیے پورا زور لگانا پڑا پھر مجھے چھوڑ دیا۔ پھر وہی سوال و جواب ہوا اور اسی طرح بھینچا اور چھوڑ دیا۔ تیسری بار پھر یہی ہوا ایۃ اقرأ باسم۔ سے "مالم یعلم" تک کے الفاظ کہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم واپس ہوئے تو آپؐ کا دل دھڑک رہا تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت خدیجہؓ کے پاس پہنچے اور فرمایا کہ: مجھے کپڑا اوڑھا دو، کپڑا اوڑھا دیا گیا اور رفتہ رفتہ وہ وحشت جاتی رہی۔

حضرت خدیجہؓ سے تمام واقعہ بیان کرنے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: مجھے تو اپنی جان کا خوف

يرجف فؤاده فدخل على خديجة فقال زملوني زملوني فزملوه حتى ذهب عنه الروع فقال لخديجة و اخبرها الخبر لقد خشيت على نفسي فقالت له كلا ابشر فو الله ما يخزيك الله ابدا انك لتصل الرحم وتصدق الحديث وتحمل الكل وتكسب المعدوم وتقري الضيف و تعين على نوائب الحق فانطلقت به خديجة حتى اتت به ورقة بن نوفل بن اسد بن عبد العزى بن قصي و هو ابن عم خديجة اخي ابيها وكان امرأ تنصر في الجاهلية وكان يكتب الكتاب العبراني فيكتب من الانجيل بالعربية ما شاء الله ان يكتب وكان شيخا كبيرا قد عمي فقالت له خديجة يا ابن عم اسمع من ابن اخيك فقال له ورقة يا ابن اخي ماذا ترى؟ فاخبره صلى الله عليه وسلم خبر ما رأى فقال له ورقة هذا الناموس الذي نزل الله على موسى يا ليتني فيها جذعا ليتني اكون حيا اذ يخرجك قومك فقال صلى الله عليه وسلم او مخرجي هم؟ قال نعم لم يأت رجل قط بمثل ما جئت به الا عودي وان يدركني يومك انصرك

دامن گر رہے ۔ خدیجہؓ بولیں : ایسا نہیں ہو سکتا ۔ آپ کو تو خوش رہنا چاہیئے ۔ بخدا اللہ تعالےٰ آپ کو کبھی رسوا و نامراد نہ کرے گا ۔ آپ صلۂ رحمی کرتے ہیں، راست گفتار ہیں ، دوسروں کا بار اپنے سر لیتے ہیں ، اُن ہونے کام بھی کرتے ہیں ، مہمان نوازی فرماتے ہیں اور پیش آنے والے حوادث میں حق کی حمایت کرتے ہیں ۔ اس کے بعد (حضرت) خدیجۃ الکبریٰ آپ کو ساتھ لے کر اپنے عم زاد بھائی ورقہ بن نوفل (بن اسد بن عبدالعزیٰ بن قصی) کے پاس گئیں ۔ یہ ورقہ قبل از اسلام نصرانی ہو گئے تھے اور عبرانی تحریریں لکھا کرتے تھے ۔ چنانچہ انجیل کا کچھ حصّہ بھی انھوں نے عربی زبان میں لکھا تھا ۔ اس وقت یہ خاصے بوڑھے اور نابینا ہو چکے تھے (حضرت) خدیجۃ الکبریٰ نے ان سے کہا : اے ابن عم ذرا اپنے برادرزادے کی زبان سے کچھ حال سنیئے ۔ ورقہ نے کہا : برادرزادے کیا معاملہ ہے ؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سب واقعات بیان فرمائے تو ورقہ نے کہا کہ : یہ وہی ناموس (پیغام وحی) ہے، جو (حضرت) موسیٰ (علیہ السلام) پر نازل ہوا تھا ۔ اے کاش ! میں اس وقت جوان ہوتا اور اے کاش ! میں اس وقت زندہ ہوتا جب تمھاری قوم تمھیں شہر بدر کر رہی ہوگی ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ : کیا یہ لوگ مجھے شہر سے نکال باہر کریں گے ؟

ورقہ نے جواب دیا کہ : ہاں ہاں !! تمھارے جیسی چیز جو بھی لایا ہے ، اس کے ساتھ دشمنی ہی کی گئی ہے ۔ اگر میرے سامنے یہ وقت آیا تو میں تمھاری زبردست مدد کروں گا ۔ اس کے بعد ورقہ زیادہ

نسراً منه زمراً ثم لم ينشب ورقة ان توفي وفتر الوحي ۔ (شيخين)

زندہ نہ رہ سکے اور اُن کی وفات ہو گئی اور وحی کا سلسلہ (کچھ عرصے کے لیے) منقطع ہو گیا۔

تبلیغ اور مصائب پر صبر

۴۷ ۔ دشمنانِ دین کی ایذا رسانی :

(ابن مسعود) بينما النبي صلى الله عليه وسلّم يصلي عند البيت و ابوجهل و اصحابه جلوس وقد نحرت جزور بالامس فقال ابوجهل ايكم يقوم الى سلا جزور بني فلان فيأخذه فيضعه بين كتفي محمّد اذا سجد؟ فانبعث اشقى القوم فاخذه فلما سجد صلى الله عليه وسلّم وضعه بين كتفيه فاستضحكوا وجعل بعضهم يميل على بعض وانا قائم انظر لو كانت لى منعة طرحته عن ظهره والنبي صلى الله عليه وسلم ساجد ما يرفع رأسه حتى انطلق انسان فاخبر فاطمة فجاءت وهي جويرية فطرحته عنه ثم اقبلت عليهم تسبهم فلما قضى صلوٰته رفع صوته ثم دعا عليهم وكان اذا دعا دعا ثلاثا واذا سأل سأل ثلاثا ثم قال اللهم عليك بقريش ثلاث

ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کعبۃ اللہ کے پاس نماز ادا فرما رہے تھے ۔ ابوجہل اور اُس کے ساتھی بیٹھے ہوئے تھے ۔ ایک دن پہلے کہیں اونٹنی ذبح ہوئی تھی ۔ ابوجہل بولا : کوئی ہے جو بنی فلاں کی اونٹنی کا اوجھ اُٹھا لائے اور جب محمدؐ سجدے میں جائے تو اُس کی پیٹھ پر ڈال دے ؟ یہ سُن کر ایک بدبخت اُٹھا اور جا کر لے آیا ۔ جب حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) سجدے میں گئے تو اس اوجھ کو حضور (اکرمؐ) کی پُشت پر ڈال دیا اور وہ سب اس قدر ہنسے کہ ایک دوسرے پر گر گر پڑے ۔ میں کھڑا یہ سب تماشا دیکھ رہا تھا ۔ میرے بس میں ہوتا تو میں ضرور اسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیٹھ پر سے ہٹا دیتا ۔ حضورؐ اسی طرح سجدے میں پڑے رہے ۔ اور اپنا سر مبارک نہ اُٹھایا ۔ آخر کسی شخص نے جا کر حضرت فاطمہؓ کو اطلاع دی ، اس وقت آپؓ کمسن تھیں ۔ آپ آئیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی پیٹھ پر سے اس اوجھ کو ہٹایا اور ان کے سامنے آ کر بُرا بھلا کہنا شروع کیا ۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نماز ادا کر چکے تو بآواز بلند اُن کے لیے بددُعا فرمائی ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ جب

مرات فلما سمعوا صوته ذهب عنهم الضحك وخافوا دعوته ثم قال اللهم عليك بابي جهل بن هشام وعتبة بن ربيعة وشيبة بن ربيعة والوليد بن عتبة وامية بن خلف وعقبة بن ابي معيط وذكر السابع ولم احفظه، فوالذى بعث محمدا بالحق لقد رأيت الذين سمى صرعى ثم اسحبوا الى القليب قليب بدر۔ (شیخین، متن منتہی)

اللہ سے دُعا یا سوال فرماتے تو تین تین بار اس کی تکرار فرماتے ۔ تین بار فرمایا:

مولا! قریش کی گرفت فرما۔ جب ان لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سُنی تو ہنسی تو بھول گئے اور اُلٹا بد دُعا سے کانپ اُٹھے ۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے اللہ! ابوجہل کو، عتبہ بن ربیعہ کو، شیبہ بن ربیعہ کو، ولید بن عتبہ کو، اُمیہ بن خلف کو، عقبہ بن ابی معیط کو، اور فلاں کو (جس کا نام مجھ کو یاد نہیں رہا) اپنی گرفت میں لے لے ۔ اس کے بعد قسم ہے اُس کی جس نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو حق کے ساتھ مبعوث کیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جن جن لوگوں کے نام لیے تھے، ان سب کو کشتہ حالت میں دیکھا ۔ پھر یہ سب میدانِ بدر کے گڑھے میں ڈال دیئے گئے ۔

۴۸ ۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی آزمائش اور صبر:

(عمروؓ بن العاص) ما رأيت قريشا ارادوا قتل النبي صلى الله عليه وسلم الا يوما جلسوا فى ظل الكعبة وهو يصلي عند المقام فقام اليه عقبة بن ابي معيط فجعل رداءه فى عنقه ثم جذبه وتصايح الناس وظنوا انه مقتول فاقبل ابوبكر يشتد حتى اخذ بضبعه صلى الله عليه وسلم وهو يقول أتقتلون رجلا ان يقول ربي الله ثم انصرفوا عنه ۔

(موصلی، کبیر)

میں نے ایک بار کے سوا کبھی قریش کو قتلِ رسولؐ کا اقدام کرتے نہیں دیکھا ۔ قریش سایۂ دیوارِ کعبہ میں بیٹھے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم مقامِ ابراہیم کے پاس نماز ادا فرما رہے تھے ، اتنے میں عقبہ بن ابی معیط اُٹھا اور اپنی چادر کا پھندا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی گردن میں ڈال کر دبایا اور کھینچنا شروع کیا ۔ لوگ بھی شور مچانے لگے اور ان کو یہ خیال ہُوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم (خاک بدہن) چل بسے ۔ اتنے میں حضرت ابوبکرؓ ناراض ہوتے ہوئے آئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بازو پکڑ کر کہنے لگے کہ : تم لوگ ایک شخص کو محض اس جرم میں قتل کرنا چاہتے ہو وہ اللہ کو اپنا رب مانتا ہے ؟ یہ سُن کر لوگ ہٹ گئے ۔

۴۹۔ شقاوتِ ابوجہل :

(رجل من بنی مالك بن كنانة) رأيت النبی صلی الله عليه وسلم بسوق ذی المجاز يتخللها يقول يا ايها الناس قولوا لا اله الا الله تفلحوا وابو جهل يحثی عليه التراب يقول يا ايها الناس لا يغوينكم هذا عن دينكم فانما يريد لتتركوا دينكم ولتتركوا اللات والعزی وما يلتفت اليه صلی الله عليه وسلم (احمد)

میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ ذوالمجاز کے بازار میں اِدھر اُدھر پھر پھر کر کہتے جاتے ہیں کہ: اے لوگو! لا الٰہ الا اللہ کے قائل ہو جاؤ، تو فلاح پاؤ گے۔
ابوجہل شقی حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر مٹی پھینک پھینک کر یہ کہتا جاتا تھا کہ: دیکھو یہ شخص تمھیں تمھارے دین سے برگشتہ نہ کرنے پائے، یہ چاہتا ہے کہ تم اپنے دین کو اور لات و عزیٰ کو چھوڑ دو (ابوجہل یہ کچھ کر رہا تھا، مگر) حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کی طرف کوئی توجہ نہ فرماتے تھے۔

ہجرتِ حبشہ

۵۰۔ کوائف حبشہ، خطبہ جعفر طیارؓ اور شہادت نجاشی :

(ابن مسعودؓ) بعثنا رسول الله صلی الله عليه وسلم الی النجاشی نحو ثمانين رجلا فيهم جعفر وعبد الله بن عرفطة وعثمان بن مظعون وابو موسیٰ فاتينا النجاشی وبعث قريش عمرو بن العاص وعمارة بن الوليد بهدية فلما دخلا علی النجاشی سجدا له وقالا له ان نفرا من بنی عمنا نزلوا ارضك ورغبوا

نجاشی کی طرف ہم لوگوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیجا تھا۔ یہ قریباً اسّی آدمی تھے، ان میں جعفر، عبداللہ بن عرفطہ، عثمان بن مظعون اور ابوموسیٰ بھی تھے۔ ہم لوگ تو نجاشی کی طرف آئے ادھر اُدھر قریش نے عمرو بن العاص اور عمارہ بن ولید کو کچھ تحائف دے کر بھیجا۔ جب یہ دونوں نجاشی کے پاس آئے تو اسے سجدہ کیا اور کہا کہ ہمارے بنی عم کے کچھ افراد آپ کے ملک میں آ گئے ہیں۔ یہ ہم سے بھی متنفر ہو گئے ہیں اور ہمارے دین سے بھی برگشتہ ہو گئے ہیں۔ نجاشی نے پوچھا وہ کہاں ہیں؟ انھوں نے

عنا و عن ملتنا قال فاین هم قال فی ارضك فبعث الیهم قال جعفر انا خطیبکم الیوم فاتبعوه فسلم ولم یسجد فقالوا له مالك لا تسجد للملك؟ قال انا لا نسجد الا لله تعالیٰ قال وما ذاك؟ قال ان الله تعالیٰ بعث الینا رسوله صلی الله علیه وسلم وامرنا ان لا نسجد الا لله تعالیٰ وامرنا بالصلوٰة والزکوٰة قال عمرو فانهم یخالفونك فی عیسیٰ قال ما تقولون فی عیسیٰ وامه؟ قالوا القول کما قال الله تعالیٰ هو کلمة الله وروحه القاها الی العذراء البتول التی لم یمسها بشر ولم یفرضها ولد فرفع النجاشی عوداً من الارض وقال یا معشر القسیسین والرهبان والله ما تزیدون علی الذی یقول ما یسوی هذا مرحبا بکم وبمن جئتم من عنده اشهد انه رسول الله وانه الذی نجده فی الانجیل وانه الذی بشر به عیسیٰ انزلوا حیث شئتم فوالله لولا ما انا فیه من الملك لاتیته حتی اکون انا احمل نعلیه واوضوه وامر بهدیة الآخرین فردت علیهما ثم

کہا کہ: آپ ہی کے ملک میں ہیں۔ نجاشی نے مسلمانوں کی طرف بلاوا بھیجا۔ جعفرؓ ابن ابی طالب نے کہا: آج تمہاری طرف سے گفتگو کا فریضہ میں انجام دوں گا۔ غرض سب وہاں پہنچے۔ حضرت جعفر نے نجاشی کو سلام کیا لیکن سجدہ نہ کیا۔ لوگوں نے اعتراضاً کہا کہ: کیا بات ہے کہ آپ بادشاہ کو سجدہ نہیں کرتے۔ جواب دیا کہ: ہم لوگ بجز اللہ تعالیٰ کے اور کسی کو سجدہ نہیں کرتے۔ نجاشی نے پوچھا یہ کیوں؟ جواب دیا کہ: اللہ نے ہماری طرف اپنا رسول مبعوث فرمایا ہے اور اس نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کو سجدہ نہ کریں، اس نے صلوٰۃ اور زکوٰۃ کا بھی حکم دیا ہے۔ عمرو بن العاص بولے یہ لوگ حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں بھی آپ (نجاشی) کے خلاف رائے رکھتے ہیں۔ نجاشی نے پوچھا کہ: تم لوگ حضرت عیسیٰ اور ان کی والدہ کے متعلق کیا عقیدہ رکھتے ہو؟ جواب دیا کہ: ہم وہی کہتے ہیں جو اللہ فرماتا ہے یعنی وہ اللہ کا کلمہ اور روح ہیں، جسے اس نے مریم عذرا و بتول کی طرف القا فرمایا (مریم کو) کسی بشر نے مس نہیں کیا اور نہ انھیں اس سے قبل کوئی اور ولادت ہوئی۔

یہ سن کر نجاشی نے زمین سے ایک تنکا اٹھایا اور بولا کہ: اے پادریو اور راہبو! اس شخص کے اظہار حقیقت پر تم لوگ جو خفا اور مبالغہ کرتے ہو، وہ اس تنکے کے برابر بھی وقعت نہیں رکھتا مسلمانو! انھیں اور تمھارے لائے ہوئے پیغام محمدی کو میں خوش آمدید کہتا ہوں، بلکہ اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ وہ اللہ کا رسول ہے اور یہ وہی ہے جسے ہم انجیل میں پاتے ہیں اور جس کی بشارت حضرت عیسیٰ نے دی ہے۔ تم جاؤ جہاں چاہو خوشی سے رہو اگر میں حکومت کے جھنجھٹ میں نہ پھنسا ہوتا تو میں خود حاضر ہو کر اس کی جوتیاں

تعجل ابن مسعودؓ حتی ادرك بدرا
فكبّر بلين ولأحمد عن ام سلمة
نحوه ....

وفيه: ان جعفرا قال: يايها
الملك كنا قوما اهل جاهلية نعبد
الاصنام ونأكل الميتة ونأتي
الفواحش ونقطع الارحام ونسيئ
الجوار ويأكل القوي منا الضعيف
حتى بعث الله الينا رسولا منا
نعرف نسبه وصدقه وامانته و
عفافه فدعانا الى الله لنوحده و
نعبده ونخلع ما كنا نعبد نحن و
آباؤنا من دون الله من الحجارة
والاوثان وامرنا بالصدق والامانة
وصلة الرحم وحسن الجوار والكف
عن المحارم والدماء والفواحش
وشهادة الزور واكل مال
اليتيم وقذف المحصن وامرنا ان
نعبد الله ولا نشرك به شيئا و
اقام الصلوة وايتاء الزكوة فعدد
عليه امور الاسلام فصدقناه و
امنا به واتبعناه على ما جاء به
فعدى علينا قومنا فعذبونا و
فتنونا عن ديننا وشقوا علينا
فخرجنا الى بلدك واخترناك على
من سواك ورغبنا في جوارك و

اٹھاتا۔ اس کے لیے پانی لاتا۔ پھر اس نے حکم دیا اور ان دونوں کے تحائف کو واپس کر دیا گیا۔ اس کے بعد ابن مسعودؓ نے واپس آنے میں (بہ نسبت دوسروں کے) جلدی کی اور وہ بدر میں شریک ہوئے۔

ایک دوسری روایت میں یوں مذکور ہے کہ جعفرؓ نے کہا: اے ملک! ہم لوگ جاہلیت والی قوم تھے، بت پرستی کرتے اور مردار کھاتے تھے۔ بے حیائی کے مرتکب ہوتے، قطع رحمی کرتے، پڑوسی کا کوئی حق نہ پہچانتے تھے، اور طاقت ور ضعیف کو کھا جاتا تھا، آخر اللہ تعالیٰ نے ہماری طرف رسول بھیجا۔ جس کے نسب، صداقت، امانت اور پاک دامنی سے ہم اچھی طرح واقف تھے۔ اس نے ہمیں اللہ تعالیٰ کی طرف بلایا کہ اس کی توحید کے قائل ہو جائیں، اسی کی عبادت کریں، اس کے سوا جن پتھروں اور بتوں کی ہمارے اسلاف عبادت کیا کرتے تھے انھیں ترک کر دیں۔ نیز اس نے ہمیں سچائی، امانت داری، صلہ رحمی، حسن ہمسائیگی کا حکم دیا اور حرام کاری، بے حیائی، خون ریزی، جھوٹی گواہی سے، مال یتیم کھانے اور کسی پاک دامن پر تہمت لگانے سے روکا۔ ہمیں اس نے یہ بھی حکم دیا کہ صرف اللہ کی عبادت کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ بنائیں۔ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ غرض جعفرؓ نے امور اسلام کے مناقب بیان کیے اور کہا: پھر ہم نے اس کی تصدیق کی، اس پر ایمان لائے اور اس کے پیغام کی پیروی اختیار کی۔ مگر ہماری قوم نے ہم پر ظلم کرنے شروع کر دیے۔ ہمیں سزائیں دیں، ہمارے دین سے برگشتہ کرنے کی کوشش کی اور ہم پر جفائیں کرتے رہے آخر ہم لوگ آپ کی سرزمین پر آ گئے اور دوسروں پر آپ کو ترجیح دی اور آپ کی ہمسائیگی کو اس امید پر

رجونا ان لا نظلم عندك فقال النجاشي هل معك مما جاء به من شئ؟ قال نعم فقرأ عليه صدراً من كهيعص فبكى النجاشي وبكت اساقفته ثم قال ان هذا والذی جاء به موسى ليخرج من مشكوة واحدة انطلقوا والله لا اسلمهم اليكما ابداً ولا اكاد ثم قال اذهبوا فانتم سيوم بارضی والسيوم الآمنون من سبكم غرم قاله ثلاثا قالت واقمنا عنده فی خير دار مع خير جار وان عدوا للنجاشي نزل به فو الله ما علمنا حربا قط اشد من حرب حربناه عند ذلك تخوفاً ان يظهر عليه من لا يعرف من حقنا ما كان النجاشي يعرف۔

(کبیر، بزار)

پسند کیا کہ ہم پر یہاں ظلم نہ کیا جائے گا۔ نجاشی نے کہا کہ وہ شخص جو پیغام وحی لایا ہے، اس کا کوئی حصہ تمہارے پاس ہے؟ حضرت جعفر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے کہا: ہاں! اس کے بعد سورۂ مریم کی ابتدائی آیتیں تلاوت کرکے سنائیں۔ نجاشی اور اس کے پادری بے اختیار رونے لگے اور نجاشی بول اٹھا کہ: یہ کلام اور وہ کلام جو موسیٰؑ لائے تھے، دونوں ایک ہی چشمۂ نور سے نکلے ہوئے ہیں۔ پھر دونوں قریشی سفیروں سے کہا کہ: میں کبھی ان لوگوں (مسلمانوں) کو تمہارے حوالے نہیں کر سکتا۔ پھر مسلمانوں سے کہا کہ: تم جاؤ! میری مملکت میں اَمن کے ساتھ رہو۔ پھر تین بار کہا کہ: تمھیں کوئی گالی بھی دے گا تو اس پر تاوان لگے گا۔ اس کے بعد ام سلمہ (جو اس دوسری روایت کی راویہ ہیں) فرماتی ہیں کہ: اس کے بعد ہم لوگ وہاں بہترین ملک میں بہترین پڑوسی کے ساتھ مقیم رہے اس دوران میں نجاشی کا ایک دشمن حبشہ پر حملہ آور ہوا اس وقت ہم لوگوں نے بھی جنگ میں شرکت کی اور یہ جنگ ہمارے لیے سب سے زیادہ اہم جنگ تھی کیونکہ ہمیں اس وقت یہ خوف تھا کہ، نجاشی تو ہمارے حقوق کو پہچانتا تھا اس پر ایسا شخص غالب نہ آجائے جو ہمارے حقوق کو نہ پہچانتا ہو۔

۵۱۔ ظالموں سے رسولِ رحمت کی توقعات؛

(عائشہؓ): قلت للنبی صلی اللہ علیہ وسلم هل اتى عليك يوم كان اشد من يوم احد؟ قال لقد لقيت من قومك وكان اشد ما لقيت يوم العقبة اذ عرضت نفسی علی

میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ: کیا حضور پر یوم اُحد سے زیادہ سخت دن بھی کبھی آیا ہے؟ فرمایا: تمھاری قوم کے ہاتھوں سب سے زیادہ سخت ایذا مَیں نے یوم عقبہ کے موقعے پر اس دن اٹھائی ہے جب میں نے اپنے آپ کو ابن عبدیا لیل بن عبد کلال کے آگے

ابن عبد یالیل بن عبد کلال فلم
یجبنی الی ما اردت فانطلقت و
انا مھموم علی وجھی فلم استفق
الا وانا بقرن الثعالب فوضعت
راسی واذا انا بسحابۃ قد اظلتنی
فنظرت فاذا فیھا جبریل
فنادانی فقال ان اللہ قد سمع
قول قومک وما ردوا علیک و
قد بعث الیک بملک الجبال لتامرہ
بما شئت فیھم فنادانی ملک الجبال
مسلم علی ثم قال یا محمد ان اللہ
قد سمع قول قومک وانا ملک
الجبال وقد بعثنی ربک الیک
لتامرنی بامرک فما شئت ان شئت
اطبقت علیھم الاخشبین قال صلی
اللہ علیہ وسلم بل ارجوان یخرج اللہ
من اصلابھم من یعبد اللہ وحدہ لا
یشرک بہ شیئا (شیخین)

پیش کیا۔ اس نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ میں وہاں سے رنجیدہ ہو کر لوٹا۔ ابھی مجھے افاقہ بھی نہ ہوا تھا کہ میں قرن ثعالب میں پہنچ گیا۔ میں نے وہاں سر رکھ دیا۔ اتنے میں ابر کا ایک ٹکڑا مجھ پر سایہ فگن ہو گیا۔ میں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو جبریل موجود تھے۔ انہوں نے مجھے آواز دی کہ: آپ کی قوم کی باتیں اور ان کا جواب اللہ نے سن لیا۔ اور آپ کے پاس ملک الجبال (فرشتۂ کوہ) کو بھیجا ہے کہ آپ جو کچھ اسے ان ظالموں کے بارے میں حکم فرمائیں وہ اسے بجا لائے پھر خود ملک الجبال نے آواز دی اور مجھے سلام کر کے کہا کہ: اللہ تعالیٰ نے آپ کی قوم کی باتیں سن لی ہیں اور میں ملک الجبال ہوں، جسے اللہ تعالیٰ نے آپ کی خدمت میں بھیجا ہے تاکہ آپ مجھے کوئی حکم دیں بتائیے آپ کیا چاہتے ہیں؟ اگر آپ پسند کریں تو میں مکے کی دونوں پہاڑیوں (جبل ابوقبیس و جبل احمر) سے ان کو کچل دوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا کہ: مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ انہی کے صلب سے ایسے لوگوں کو پیدا فرمائے گا جو صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں اور کسی شے کو اس کا شریک نہ کریں۔

۵۲۔ اللہ سے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی فریاد کا عجیب انداز:

(عبد اللہ بن جعفرؓ) ... اللھم
اشکو الیک ضعف قوتی و ھوانی
علی الناس یا ارحم الراحمین انت
ارحم الراحمین الی من تکلنی الی
عدو یتجھمنی ام الی قریب
ملکتہ امری ان لم تکن غضبان علی

.... (طائف میں شدید ایذاؤں کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے جو کلمات نکلے وہ یہ تھے): مولا! اپنی بے بسی و بے کسی کا گلہ تیرے آگے پیش کرتا ہوں۔ اے ارحم الراحمین مجھے تو نے کن لوگوں کے سپرد کیا ہے؟ ایسے دشمنوں کے حوالے جو ترش روئی سے پیش آتے ہیں؟ یا ایسے اپنوں کے سپرد جن کو تو نے میرے معاملات پہ متصرف بنا دیا ہے؟ اگر یہ تیرا غضب

فلا ابالی غیر ان عافیتك اوسع لی اعوذ بنور وجهك الذی اشرقت به الظلمات وصلح علیه امر الدنیا والآخرۃ ان تنزل بی غضبك او تحل بی سخطك لك العتبی حتی ترضی ولا حول ولا قوۃ الا باللہ۔

(کبیر)

نہیں تو مجھے ان تکالیف کی کوئی پروا نہیں۔ تیری دوسری عنایتیں میرے لیے بہت وسیع ہیں۔ میں تیرے نورِ وجہ کی پناہ لیتا ہوں۔ جس سے ظلمتیں بھی چمک اٹھتی ہیں اور جس کی برکت سے دنیا و آخرت کے تمام معاملات درست ہو جاتے ہیں۔ پناہ اس بات سے کہ مجھ پر تیرا غضب نازل ہو یا تیری ناراضی ——— میری رضا تیری ہی رضا کے ساتھ وابستہ ہے۔ ہر حرکت اور ہر قوت اللہ ہی کی توفیق سے وابستہ ہے۔

ہجرتِ مدینہ

۵۳ - ابوبکرؓ اور فنائیت فی الرسول کا مقام:

(عائشہؓ) ....

فقال ان مثلك لا یخرج و لا یخرج انك تكسب المعدوم وتصل الرحم وتحمل الكل وتقری الضیف وتعین علی نوائب الحق فانالك جار فارجع واعبد ربك ببلدك[1]

(حضرت ابوبکر صدیقؓ جب ہجرت کر کے حبشہ جانے لگے تو برک الغماد میں ابن الدغنہ ملا جس نے آپ کو یہ کہہ کر پناہ دی اور واپس لے آیا: تمہارے جیسے شریف انسان کو نہ جانے دیا جائے گا اور نہ وہ جا سکتا ہے کیونکہ تم ان ہونے کام بھی کر دیتے ہو صلہ رحمی کرتے ہو، دوسروں کا بار اپنے سر لے لیتے ہو مہمان نواز ہو اور پیش آنے والے حوادث میں حق کی حمایت کرتے ہو میں تمہیں پناہ دیتا ہوں، واپس چلو اور اپنے رب کی عبادت اپنے شہر ہی میں رہ کر کرو۔

۵۴ - پیغمبرؐ اور صدیقؓ کے حوصلوں کا فرق:

(ابوبکرؓ) نظرت الی اقدام المشرکین

جس وقت ہم دونوں (ابوبکرؓ اور رسول کریمؐ) غارِ ثور

[1] وہ الفاظ پڑھیے جو جناب خدیجہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق فرمائے تھے دیکھیے رسول اور صدیق کی سیرتیں کس درجے ہم آہنگ ہیں۔

ونحن فی الغار وھم علی رؤسنا فقلت یا رسول اللہ لو ان احدھم نظر الی قدمیہ ابصرنا تحت قدمیہ فقال یا ابا بکرؓ ماظنک باثنین اللہ ثالثھما[1]

(شیخین، ترمذی)

میں تھے اور تلاش کرنے والے دشمن سر پہ کھڑے تھے تو میں ان کے قدموں کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے عرض کیا کہ: یا رسول اللہ! اگر ان میں سے کسی نے اپنے قدموں کو (جھک کر) دیکھ لیا تو ہمیں اپنے قدموں کے نیچے ہی دیکھ لے گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اے ابوبکرؓ ان دو کے متعلق تمہارا کیا گمان ہے جن کے ساتھ تیسرا وجود اللہ کا ہے۔

۵۵۔ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دعائے ناز و نیاز بموقع بدر:

(ابن عباسؓ)..... اللھم انجز لی ما وعدتنی اللھم اتنی ما وعدتنی اللھم انک ان تھلک ھذہ العصابۃ من اھل الاسلام لا تعبد فی الارض فمازال یھتف بربہ مادا یدیہ مستقبل القبلۃ حتی سقط ردائہ عن منکبیہ فاتاہ ابوبکر فاخذ ردائہ فالقاہ علی منکبیہ ثم التزمہ من ورائہ وقال یا نبی اللہ کفاک مناشدتک ربک فانہ سینجز لک ماوعدک فانزل اللہ اذ تستغیثون ربکم فاستجاب لکم انی ممدکم بالف من الملائکۃ مردفین فامدہ اللہ بالملائکۃ

(ترمذی، مسلم بلفظہ)

(بدر میں مشرکوں کی تعداد ایک ہزار اور مسلمانوں کی تعداد تین سو تیرہ تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ دیکھ کر رُو بقبلہ ہو گئے اور اپنے ہاتھ پھیلا کر بآواز بلند اللہ سے یوں دعا کرنے لگے:) "مولا! تو نے جو وعدہ کیا ہے اسے پورا فرما اور جو دینے کا وعدہ کیا ہے وہ آج دے دے۔ مولا! اگر تو نے مسلمانوں کی اس جماعت کو فنا کر دیا تو اس زمین پر تیری عبادت بندگی بھی ختم ہو جائے گی۔" حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ہاتھوں کو پھیلا کر اور رُو بقبلہ ہو کر مسلسل اسی طرح دعا کرتے رہے یہاں تک کہ آپ کی چادر کاندھوں سے سرک کر نیچے آ گئی، اور حضرت ابوبکرؓ نے آ کر وہ چادر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کاندھوں پر ڈالی اور پیچھے سے چمٹ کر عرض کرنے لگے کہ: اے نبی اللہ! حضورؐ کی دعا کافی ہو چکی۔ اللہ اپنا وعدہ پورا ہی کرے گا۔ اسی وقت یہ آیت نازل ہوئی کہ: (ترجمہ) یاد کرو وہ وقت جب اپنے رب سے تم مدد مانگ رہے تھے اور خدا نے تمہاری دعا قبول کر لی اور بتا دیا کہ میں ایک ہزار پے در پے فرشتوں سے تمہاری مدد کروں گا۔ سو اللہ نے فرشتوں سے آپ کی مدد کی۔

---

[1] اس مضمون کو اس آیت سے لائیے..... ثانی اثنین اذھما فی الغار۔

غزوات

بدر

۵۶ - صدیقؓ و فاروقؓ کی تمثیل بزبانِ رسالتؐ :

(ابن مسعودؓ) .... فقال مثلك يا ابا بكرؓ كمثل ابراهيم قال فمن تبعني فانه مني ومن عصاني فانك غفور رحيم و كمثل عيسى قال ان تعذبهم فانهم عبادك وان تغفر لهم فانك انت العزيز الحكيم ومثلك يا عمر كمثل نوح قال رب لا تذر على الارض من الكافرين ديارا وكمثل موسى قال واشدد على قلوبهم فلا يؤمنوا حتى يروا العذاب الاليم ....

(ابو داؤد)

(قیدیانِ بدر کے متعلق جب مشورہ کیا گیا، تو حضرت ابوبکرؓ نے رائے دی کہ: فدیہ لے کر ان کو رہا کر دیا جائے۔ شاید اللہ تعالیٰ ان کی طرف آئندہ توجہ فرمائے (اور یہ ہدایت پا جائیں) حضرت عمرؓ بولے کہ ان لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نکالا ہے اور جھٹلایا ہے۔ لہٰذا ان سب کی گردنیں اُڑا دیجئے .... اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:) اے ابوبکرؓ تمہاری مثال تو حضرت ابراہیم اور حضرت عیسیٰ جیسی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا تھا کہ: (ترجمہ آیت) جو میری پیروی کرے وہ میرا ہے اور جو میری نافرمانی کرے تو اللہ غفور رحیم ہے اور حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا کہ: (ترجمہ آیت) اگر تو انھیں سزا دے تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر ان کی مغفرت فرمائے تو تو عزیز و حکیم ہے اور اے عمرؓ تمہاری مثال نوحؑ اور موسیٰؑ جیسی ہے۔ نوحؑ نے یہ دعا کی کہ: (ترجمہ آیت) ان کافروں میں کسی کو بھی زمین پر زندہ نہ چھوڑ۔ اور موسیٰ نے یہ دعا کی (ترجمہ آیت) کہ: ان کے دلوں میں اور سختی پیدا کر دے تاکہ عذابِ الیم کو دیکھے بغیر یہ ایمان ہی نہ لا سکیں.....

۵۷ - بنتِ رسولؐ کے شوہر کا فدیہ اور عدلِ رسالتؐ :

(عائشہؓ) لما بعث اهل مكة

جب مکے والوں نے اپنے قیدیوں کے فدیے

فی فداء اساراھم بعثت زینب فداء زوجھا ابی العاص و بعثت فیہ بقلادۃ لھا کانت عند خدیجۃؓ ادخلتھا بھا علی ابی العاص فلما راٰھا صلی اللّٰہ علیہ وسلّم رق لھا رقۃ شدیدۃ وقال ان رأیتم ان تطلقوا لھا اسیرھا و تردوا علیھا الذی لھا فقالوا نعم وکان صلی اللّٰہ علیہ وسلّم اخذ علیہ ووعدہ ان یخلی سبیل زینب الیہ و بعث صلی اللّٰہ علیہ وسلّم زید بن حارثۃ ورجلا من الانصار فقال لھما کونا ببطن یاجج حتی تمر بکما زینب فتصحباھا حتی تأتیا بھا۔ (ابو داؤد)

بھیجے تو حضرت زینب بنت رسول اللہ صلی اللہ نے بھی اپنے خاوند ابو العاص کا فدیہ بھیجا۔ انہوں نے ایک (چاندی کا ہار) بھیجا، جو حضرت خدیجہؓ کا تھا۔ ابو العاص کے پاس رخصت کرتے وقت حضرت خدیجہؓ نے یہ ہار زینب کو دیا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر جب اس ہار پر پڑی تو شدید رقت پیدا ہوئی اور آپ نے فرمایا کہ:

اگر تم مسلمانوں کی رائے ہو تو زینب کے اسیر کو آزاد کر دو اور اس کا یہ ہار بھی اسے واپس کر دو، سب نے کہا کہ: ہاں ہاں یا رسول اللہ! اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو العاص سے یہ وعدہ لیا کہ وہ زینب کے یہاں آنے میں مانع نہ ہوں گے۔ اس کے بعد زید بن حارثہ کو اور ایک انصاری کو مکے بھیجا اور فرمایا کہ: تم دونوں بطن یاجج میں ٹھہرے رہو اور جب زینب تمہارے پاس سے گزریں تو ان کے ساتھ ہو جاؤ اور ان کو ہمارے پاس لے آؤ۔

۵۸۔ اہلِ بدر کی فضیلت:

(رافع بن خدیج رضؓ) ان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلّم قال یوم بدر والذی نفسی بیدہ لو ان مولودًا ولد فی فقہ اربعین سنۃ یعمل لطاعۃ اللّٰہ ویجتنب معاصیہ کلھا الی ان یرد الی ارذل العمر لم یبلغ احدکم ھذہ اللیلۃ۔ (کبیر، فیہ جعفر ابن مفلس۔)

غزوۂ بدر کے دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے۔ اگر کوئی پیدا ہونے والا فقہ کی آغوش میں آنکھ کھولے اور چالیس سال تک طاعت الٰہی پر عمل کرتا رہے اور تمام گناہوں سے بچا رہے۔ حتیٰ کہ آخر عمر تک اسی حال میں رہے۔ جب بھی اس دن کی فضیلت حاصل نہیں کر سکتا۔

اُحُد

۵۹ - غزوات میں عورتوں کا حصہ :

(انس رض) .... ولقد رأیت عائشۃ رض وأم سلیم رض وانهما لمشمرتان اری خدم سوقهما تنقلان القرب علی متونهما ثم تفرغانه فی افواه القوم ثم ترجعان فتملآنها فتفرغانه فی افواههم .... (شیخین)

.... (میں نے غزوۂ احد کے موقعے پر) عائشہ رض اور اُم سلیم رض کو دیکھا کہ دونوں بڑی تیز رفتاری سے کام کر رہی ہیں۔ ان کی پنڈلیاں اس وقت میری نگاہوں کے سامنے تھیں۔ دونوں اپنی اپنی پشت پر مشکیں اُٹھا کر اِدھر سے اُدھر جاتیں اور لوگوں کے منہ میں پانی ڈالتیں اور پھر واپس آکر مشک پُر کرتیں اور لوگوں کے منہ میں ڈالتیں....

۶۰ - شہادت کے لیے بے چینی :

(جابر رض) قال رجل للنبی صلی اللہ علیہ وسلم یوم اُحد أرأیت ان قتلت این انا؟ قال فی الجنۃ فالقی تمرات فی یده ثم قاتل حتی قتل۔ (شیخین ونسائی)

یوم اُحد کے موقعے پر ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ: اگر میں قتل کر دیا جاؤں تو میرا کہاں ٹھکانا ہوگا؟ فرمایا: جنت میں! یہ سن کر اس نے اپنے ہاتھ کی کھجوریں (جو وہ کھا رہا تھا) پھینک دیں اور لڑتا ہوا شہید ہو گیا۔

۶۱ - ایک شہید کا آخری پیغام :

(یحییٰ بن سعید رض) لما کان یوم اُحد قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من یأتینی بخبر سعد بن الربیع؟ قال رجل انا یا رسول اللہ فذهب یطوف بین القتلی حتی وجده فقال له سعد ما شانك؟ قال بعثنی صلی اللہ

دورانِ غزوۂ احد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: سعد بن الربیع کی کوئی خبر لا سکتا ہے؟ ایک شخص نے کہا میں لا سکتا ہوں یا رسول اللہ! چنانچہ وہ لاشوں کے درمیان انھیں ڈھونڈنے لگا اور سعد رض کو وہیں پایا۔ سعد رض اس وقت زندہ (مگر زخمی) تھے۔ انھوں نے اس آدمی سے پوچھا: کیا بات ہے؟ بولا: مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے

علیہ وسلم لانبیہ یخبرک قال فاقرأہ منی السلام واخبرہ انی قد طعنت اثنتی عشرۃ طعنۃ ولقد انفذت مقاتلی واسألہ ان یستغفرلی واخبر قومک انھم لا عذر لھم عند اللہ ان قتل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ومنھم عین تطرف۔

(شیخین، نسائی)

تمھاری خبر لانے کو بھیجا ہے۔ سعدؓ نے کہا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو میرا اسلام پہنچا دینا۔ اور عرض کر دینا کہ: مجھے بارہ زخم لگے ہیں۔ میری موت یقینی ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے میرے لیے دعائے مغفرت کی درخواست کرنا۔ اور مسلمانوں کو بتا دینا کہ ان میں اگر آنکھ جھپکانے کی سکت بھی باقی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم شہید کر دیئے گئے تو اللہ تعالیٰ کے سامنے وہ کوئی عذر نہ پیش کر سکیں گے۔

۶۲۔ ایک مومنہ کا حوصلۂ ایمانی:

(انسؓ) لما کان یوم احد حاص اھل المدینۃ حیصۃ وقالوا قتل محمد حتی کثرت الصوارخ فی ناحیۃ المدینۃ فخرجت امرأۃ من الانصار فاستقبلت بابیھا وابنھا وزوجھا واخیھا فقالوا ھذا ابوک۔ اخوک، زوجک وابنک تقول ما فعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم؟ یقول امامک حتی وقفت علیہ فاخذت بناحیۃ ثوبہ ثم قالت بابی انت وامی یارسول اللہ لا ابالی اذا سلمت من عطب۔ (للاوسط وفیہ شیخہ محمد ابن شعیب۔)

غزوۂ احد میں ایک موقع ایسا بھی آیا کہ لوگ تتر بتر ہو گئے اور افواہ پھیل گئی کہ (خاکم بدہن) حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی شہید کر دیئے گئے۔ اس وقت مدینہ کے قریب نالہ و فریاد سن کر ایک انصاری خاتون[1] باہر نکل پڑیں۔ میدانِ جنگ میں اس نے اپنے بیٹے، باپ، شوہر اور بھائی کی لاش کو دیکھا اور لوگوں نے اسے بتایا کہ یہ تیرے باپ، بھائی، شوہر اور فرزند کی لاشیں ہیں۔ مگر وہ ہر ایک موقعے پر یہی پوچھتی رہی کہ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کس حال میں ہیں؟ لوگوں نے بتایا کہ: وہ تیرے سامنے تشریف رکھتے ہیں۔ وہ خاتون وہاں پہنچی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا گوشۂ دامن پکڑ کر بول اٹھی کہ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر میرے ماں باپ قربان ہوں، اگر حضورؐ زندہ و سلامت ہیں تو مجھے کسی کے مرنے کی پروا نہیں۔

---

[1] نیک بخت خاتون کا نام ہند ہے اور یہ انصاریہ ہیں۔

رجیع

۶۳۔ خبیبؓ کا اندازِ شہادت اور پاسِ انسانیت:

(ابو ھریرۃؓ) ....

....

....

....

....

فمكث عندهم اسيرا حتى اذا اجمعوا على قتله استعار موسى من بعض بنات الحارث ليستحد بها فاعارته قالت فغفلت عن صبي لي فدرج اليه حتى اتاه فوضعه على فخذه فلما رأيته فزعت فزعة عرف ذلك مني وفي يده الموسى فقال اتخشين ان اقتله؟ ما كنت لافعل ذلك ان شاء الله و كانت تقول ما رأيت اسيرا قط خيرا من خبيبؓ لقد رأيته يأكل من قطف عنب وما بمكة يومئذ ثمرة وانه لموثق في الحديد وما كان الا رزق رزقه الله خبيبا فخرجوا به من الحرم ليقتلوه فقال دعوني أصلي ركعتين

(کچھ لوگوں کی خواہش پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دس مبلغین بھیجے۔ عسفان و مکہ کے درمیان بنو ہذیل اور بنو لحیان کے تیراندازوں نے انھیں گھیر لیا۔ مقابلہ ہوا۔ زیدؓ بن دثنہ اور خبیبؓ گرفتار اور باقی شہید ہوئے۔ خبیبؓ کو بنو حارث بن عامر بن نوفل نے (قتل کرنے کے لیے خرید لیا)۔

اس کے بعد خبیبؓ ان کی قید میں کئی دن رہے۔ جب سب نے انھیں قتل کرنے پر اتفاق کر لیا تو اُنھوں نے کسی حارثی عورت سے بال صاف کرنے کے لیے اُسترہ مانگا۔ اس نے دے دیا۔ اس عورت کا بیان ہے کہ مجھے خیال نہ رہا اور میرا ایک بچہ کھسکتا ہوا خبیبؓ کے پاس چلا گیا۔ خبیبؓ نے اسے اپنے زانو پر بٹھا لیا۔ جب ماں نے دیکھا، تو اُس کے اوسان خطا ہو گئے۔ خبیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھ میں اُس وقت وہ اُسترہ موجود تھا۔ اُنھوں نے بدحواسی کو محسوس کر کے کہا کہ: کیا تجھے یہ اندیشہ ہے کہ میں اسے قتل کر دوں گا؟ انشاء اللہ یہ کبھی نہ کروں گا۔ اس عورت کا بیان ہے کہ: میں نے خبیبؓ سے زیادہ شریف قیدی کوئی نہیں دیکھا۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ وہ زنجیروں میں جکڑا پڑا ہے اور خوشے سے انگور توڑ توڑ کر کھا رہا ہے۔ حالانکہ اس وقت مکے میں کوئی پھل کہیں موجود نہ تھا۔ یہ بجز اس رزق کے جو اللہ تعالیٰ نے خبیبؓ کے لیے بھیجا ہو اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ مختصر، لوگ اُن کو قتل کرنے کے لیے حرم مکہ سے باہر لے گئے اُنھوں

ثم انصرف عليهم فقال لولا ان تروا انما بي جزع من الموت لزدت فكان اول من سن الركعتين عند القتل هو وقال اللهم احصهم عددا ثم قال:

ما ابالي حين اقتل مسلما
على اي شق كان لله مصرعي
وذلك في ذات الاله وان يشأ
يبارك على اوصال شلو ممزع

(بخاری، ابوداؤد)

نے کہا کہ: مجھے دو رکعت نماز ادا کر لینے دو۔ نماز کے بعد وہ لوگوں کی طرف مخاطب ہو کر بولے: اگر تمھیں یہ گمان نہ ہوتا کہ میں موت سے خائف ہوں تو میں نماز کو ذرا طول دیتا۔ یہ خبیبؓ پہلے شخص ہیں جنھوں نے مرنے سے پہلے دو رکعت نماز ادا کرنے کے رواج کی بنیاد ڈالی۔ اس کے بعد انھوں نے کہا کہ: اے اللہ! ان سب کو شمار کر لے۔ اس کے بعد یہ اشعار پڑھے۔ (ترجمہ)

جب میں مسلمان ہوتے ہوئے قتل کیا جا رہا ہوں تو خواہ کسی پہلو سے موت آئے مجھے پروا نہیں۔ یہ موت اللہ ہی کی راہ میں ہے اور اگر وہ چاہے تو ایک ایک عضو کی بکھری ہوئی بوٹیوں میں برکت عطا فرمائے۔۔۔۔۔۔۔۔

خندق

۶۴ - مجاہدین کا رجز اور مصائب کی برداشت :

(انسؓ) خرج النبي صلى الله عليه وسلم الى الخندق فاذا المهاجرون والانصار يحفرون في غداة باردة ولم يكن لهم عبيد يعملون ذلك لهم فلما رأى ما بهم من النصب والجوع قال: اللهم ان العيش عيش الآخرة، فاغفر للانصار والمهاجرة، فقالوا مجيبين له: نحن الذين بايعوا محمدا، على الجهاد ما بقينا ابدا۔ وفي رواية ..... فيؤتون بملأ كف من شعير فيصنع لهم باهالة سنخة توضع بين يدي القوم والقوم جياع

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ خندق کے لیے باہر نکلے، تو (سلمان فارسیؓ کے مشورے سے) مہاجرین و انصار خندق کھودنے لگے اس دن سردی بہت سخت تھی اور لوگوں کے پاس ایسے خدام نہ تھے جو یہ کام کرتے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان مجاہدوں کی جانفشانی اور بھوک دیکھی تو یہ رجز پڑھنے لگے: (ترجمہ) اے اللہ! زندگی تو بس آخرت کی زندگی ہے۔ لہٰذا تو انصار و مہاجرین کی مغفرت فرما۔ اس کے جواب میں صحابۂ کرام یہ رجز پڑھنے لگے (ترجمہ) ہم نے تو محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ہاتھ پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بیعت جہاد کر لی ہے۔ دوسری روایت میں یہ ہے کہ .... ان مجاہدین کو ایک مٹھی جو ملتے تھے (جیسے) اُبلے ہوئے روغن کے ساتھ پکا کر ان کے سامنے

وهي بشعة في الحلق لها ريح منكرة (شيخين، ترمذی)

پیش کیا جاتا تھا۔ یہ کھانا بُودار اور بدمزہ ہوتا تھا مگر لوگ بھوکے تھے اس لیے وہی کھا لیتے تھے۔

۶۵۔ پیغمبری درویشی ہے نہ کہ شاہنشاہی :

(البراءؓ) رأيت النبي صلى الله عليه وسلم ينقل معنا التراب وهو يقول: (والله لولا الله ما اهتدينا، ولا تصدقنا ولا صلينا، فانزلن سكينة علينا، وثبت الاقدام اذلاقينا، والمشركون قد بغوا علينا، اذا ارادوا فتنة ابينا. ويرفع بها صوته - وفي رواية: رفع بها صوته ابينا ابينا - (شيخين)

میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ ہمارے ساتھ مٹی ڈھونے میں مصروف ہیں اور یہ رجز پڑھتے جاتے ہیں۔ (ترجمہ) بخدا! اگر توفیقِ الٰہی شاملِ حال نہ ہوتی۔ نہ ہمیں ہدایت نصیب ہوتی۔ نہ ہم صدقات ادا کر سکتے نہ نماز، اے اللہ! تو ہم پر سکینہ نازل فرما؛ اور جب ہماری دشمنوں سے مڈبھیڑ ہو، تو ہمیں ثابت قدم رکھ، یہ مشرکین ہم پر حملہ آور ہوئے ہیں اور جب بھی یہ کوئی فتنہ کھڑا کرتے ہیں تو ہم اس سے منہ پھیر لیتے ہیں۔" ابینا کے لفظ پر جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پہنچتے تو آواز کو خوب بلند کرتے۔

حدیبیہ

۶۶۔ شوریٰ میں عورت کا مقام؛ عہد کی پابندی :

(المسور بن مخرمة ومروان) :...

....

....

فلما فرغ من تضية الكتاب قال صلى الله عليه وسلم لاصحابه قوموا فانحروا ثم احلقوا فوالله ماقام منهم رجل حتى قال ذلك

جب حدیبیہ سے فراغت ہوئی تو چونکہ بظاہر مسلمانوں کی شرائطِ صلح بہت کمزور اور کفارِ قریش کی شرائط بہت جابرانہ نظر آتی تھیں۔ اس لیے مسلمان بڑے دل شکستہ ہو رہے تھے یہاں تک کہ :)... جب صلح نامہ لکھنے سے فراغت ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ : اٹھو اور اپنے اپنے قربانی کے جانور (جو ساتھ لائے ہیں) ذبح کرکے سر کے بال اُتار لو، لیکن خدا کی قسم ایک شخص بھی نہ اٹھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم

ثلاث مرات فلما لم يقم منهم
احد دخل على ام سلمة فذكر
لها ما لقي من الناس فقالت اتحب
ذلك؟ اخرج ثم لا تكلم احدا منهم
حتى تنحر بدنك وتدعو حالقك
فيحلقك فخرج فلم يكلم احدا حتى
نحر بدنه ودعا حالقه فحلقه فلما
رأوا ذلك قاموا فنحروا وجعل
بعضهم يحلق بعضا ....
ثم رجع النبي صلى الله
عليه وسلم الى المدينة فجاءه ابو بصير
رجل من قريش وهو مسلم فارسلوا
في طلبه رجلين فقالوا العهد الذي
جعلت لنا فدفعه الى الرجلين...
.... (بخاری، ابوداؤد)

یہ حکم دیا۔ مگر جب کوئی بھی نہ اُٹھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم، ام سلمہؓ کے پاس تشریف لے گئے اور مسلمانوں کی جو شکستہ دلی کا حال دیکھا تھا بیان فرمایا۔ ام سلمہؓ نے کہا کہ: اگر حضورؐ یہ پسند فرماتے ہیں کہ تعمیل حکم ہو تو کسی سے کچھ کہے بغیر آپ نکل کر قربانی کر لیجئے اور سر کے بال اُتروا لیجئے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاموشی سے باہر نکلے، اپنی قربانی کی اور حالق (بال اتارنے والے) کو بُلا کر اپنے بال اتروالیے جب لوگوں نے یہ دیکھا تو خود ہی سب اُٹھ کھڑے ہوئے اور قربانیاں کر کے ایک دوسرے کے بال اتارنے لگے ....

مدینے واپس آنے کے بعد ایک قریشی ابوبصیر جو مسلمان ہو چکے تھے، بھاگ کر مدینے آگئے اور قریش نے دو آدمی ان کو لینے کے لیے بھیجے (کیونکہ شرائط صلح میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ یہاں سے جو آدمی مدینے جائے گا اُسے واپس کرنا ہوگا) اور کہا کہ جو معاہدہ آپ نے کیا ہے اُسے پورا کیجئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبصیر کو ان کے حوالے فرمادیا۔

موتہ

۶۷ - کلمہ گو کی جان لینے پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضی:

(اسامةؓ) بعثنا النبي صلى الله
عليه وسلم الى الحرقة فصبحنا القوم
فهزمناهم ولحقت انا ورجل من
الانصار رجلا منهم فلما غشيناه
قال لا اله الا الله فكف الانصاري
وطعنته برمحي حتى قتلته فلما

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم لوگوں کو حرقہ کی طرف بھیجا۔ ہم لوگوں نے صبح کے وقت حملہ کیا اور شکست دی۔ اسی اثنا میں میں اور ایک انصاری ایک دشمن سے ملے۔ جب ہم اس پر تلوار چلانے لگے تو وہ لا الہ الا اللہ کہنے لگا۔ میرے انصاری ساتھی نے تو وہیں اپنا ہاتھ روک لیا۔ لیکن میں نے اُسے نیزے کا چرکا لگا کر مار دیا۔ جب ہم لوگ واپس آئے اور حضورؐ

فقدمنا بلغ النبي صلی اللہ علیہ وسلم
فقال یا اسامة اقتلته بعد ما قال لا اله
الا الله ؟ قلت انما کان متعوذاً
فقال اقتلته بعد ما قال لا اله الا الله؟
فما زال یکررها حتی تمنیت انی لم
اکن اسلمت قبل ذلک الیوم......
......قال افلا شققت عن قلبه
حتی تعلم قالها ام لا ؟..........
.... (شیخین، ابو داؤد)

صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعے کی اطلاع ہوئی تو فرمایا کہ: تم نے اسے لا الہ الا اللہ کہنے کے بعد بھی مار دیا؟ میں نے عرض کیا کہ: یا رسول اللہ! اس نے تو محض جان بچانے کو کہا تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر وہی فرمایا کہ: تم نے تو اسے لا الہ الا اللہ کہنے کے بعد بھی مار دیا؟ غرض حضورؐ اس جملے کی اتنی بار تکرار فرماتے رہے کہ میں یہ تمنا کرنے لگا کہ کاش! میں آج سے پہلے اسلام نہ لایا ہوتا۔ دوسری روایت میں یہ ہے کہ.......... حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار فرمایا کہ: کیا تم نے اس کا دل چیر کر دیکھا تھا کہ وہ سچے دل سے کہہ رہا ہے یا تلوار کے ڈر سے؟........

فتحِ مکہ

۶۸- فتحِ مکہ کے دن رحمتِ نبویؐ کی بارش:

(ابن عباسؓ).............
..........فقلت یا رسول اللہ
ان اباسفیان رجل یحب هذا
الفخر فاجعل له شیئا قال نعم
من دخل دار ابی سفیان فهو آمن
ومن اغلق بابه فهو آمن ومن
دخل المسجد فهو آمن فتفرق الناس
الی دورهم و الی المسجد۔ (ابوداؤد)

.........(فتح مکہ کے دن حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب ابوسفیان کو لے کر علی الصبح مر الظہران پہنچے اور) حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ: یا رسول اللہ! ابوسفیان کوئی شرف چاہتا ہے، اس لیے اس کے لیے کچھ ارشاد ہو۔ فرمایا کہ: جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو اُسے پناہ، جو اپنے گھر کا دروازہ بند کر لے اُسے پناہ، اور جو کعبے کے اندر داخل ہو جائے اُسے پناہ، یہ سن کر لوگ اپنے گھروں میں اور بیت اللہ میں داخل ہونے لگے۔

۶۹- نبوت بادشاہت سے بالکل الگ چیز ہے:

(میمونہؓ)...............

.....فتح مکہ کے دن ابوسفیان نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ

. . . .

. . . .

فقال ابوسفيان يا ابا الفضل لقد اصبح ملك ابن اخيك عظيما فقال ليس بملك و لكنها النبوة - (كبير بضعف)

علیہ وسلم وضو فرماتے ہیں، تو لوگ غسالۂ وضو کو اپنے چہروں پر ملنے کے لیے ٹوٹ پڑتے ہیں، یہ محبوبیت و شوکت دیکھ کر...... ابوسفیان نے کہا کہ: اے عباس تمہارے برادرزادے کی بادشاہت تو بڑی زبردست ہے عباسؓ نے جواب دیا کہ: یہ بادشاہت نہیں، نبوّت ہے!

حنین

۷۰ - اِنصار کا نصیبہ:

(انس رض) . . . .

. . . .

. . . .

. . . .

. . . . فجمعهم في قبة فقال يا معشر الانصار ما حديث بلغني عنكم؟ فسكتوا فقال يا معشر الانصار اما ترضون ان يذهب الناس بالدنيا وتذهبون بمحمد تحوزونه الى بيوتكم؟ قالوا بلى يا رسول الله رضينا فقال لو سلك الناس واديا و سلك الانصار شعبا لأخذت شعب الانصار۔

(متفق علیہ، شیخین)

...... غزوۂ حنین میں جو غنیمتیں حاصل ہوئیں ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تالیفِ قلب کے لیے نومسلموں میں تقسیم فرما دیا۔ اس پر بعض انصار بول اُٹھے کہ جب جنگ پیش آتی ہے تو ہمیں بلایا جاتا ہے اور جب مالِ غنیمت آتا ہے تو دوسروں پر تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر ملی تو سب کو ایک خیمے میں جمع کیا اور فرمایا:

اے انصار! یہ کیا بات ہے جو تمہارے متعلق مجھے خبر پہنچی ہے؟ جواب میں سب خاموش رہے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: کیا تم اس بات پر راضی نہیں کہ لوگ دنیا لے کر واپس جائیں اور تم محمدؐ کو لے کر اپنے گھروں میں داخل ہو؟ انصار نے کہا کہ: ہاں! یا رسولؐ اللہ! ہم سب اس پر خوش ہیں۔ پھر حضورؐ نے فرمایا کہ: اگر لوگ ایک میدان میں گزر رہے ہوں اور انصار کسی راستے پر جائیں تو میں انصار ہی کے راستے کو اختیار کروں گا۔

۷۱ - مجاہدہ عورت (ام سلیم) :

(انسؓ) ان ام سلیم اتخذت خنجرًا یوم حنین فرآها ابوطلحة فقال یا رسول الله هذه ام سلیم معها خنجر فقال لها النبی صلی الله علیه وسلم ما هذا الخنجر؟ قالت اتخذته ان دنامنی احد من المشرکین بقرت بطنه فجعل صلی الله علیه وسلم یضحك ۔ (مسلم، ابو داؤد)

غزوۂ حنین کے موقعے پر ام سلیم نے ایک خنجر کو ہاتھ میں لیا اور ابوطلحہؓ نے ان کو دیکھا تو کہا کہ : یا رسول اللہ! یہ ام سلیم ہیں اور ان کے ہاتھ میں خنجر ہے ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ام سلیم سے پوچھا کہ : یہ خنجر کیسا ہے ؟ بولیں کہ : میں نے یہ اس لیے تیار کر رکھا ہے کہ اگر کوئی مشرک قریب آیا تو اس کا پیٹ پھاڑ دوں گی ۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ان کے عزم پر ہنسی آگئی ۔۔۔۔۔۔

بنی جذیمہ

۷۲ - اطاعت صرف معروف میں ہونی چاہیئے :

(علیؓ) بعث النبی صلی الله علیه وسلم سریة واستعمل علیهم رجلا من الانصار و امرہ ان یطیعوہ فغضب فقال الیس امرکم رسول الله صلی الله علیه وسلم ان تطیعونی ؟ قالوا بلی قال فاجمعوا حطبا فجمعوا فقال اوقدوا نارًا فاوقدوها فقال ادخلوا فیها فهموا وجعل بعضهم یمسك بعضًا و یقولون فررنا الی النبی صلی الله علیه وسلم من النار فما زالوا حتی

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سریہ روانہ کیا اور ایک انصاری کو ان کا امیر مقرر کر کے ان کی اطاعت کا حکم دیا (ایک موقعے پر) اس امیر کو غصہ آیا اور وہ کہنے لگا کہ : کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تمھیں میری اطاعت کا حکم نہیں دیا ہے ؟ لوگوں نے کہا کہ : ہاں دیا ہے ۔ امیر نے کہا کہ : پھر لکڑیاں جمع کرو ، لکڑیاں جمع کی گئیں تو کہا : ان کو سلگا دو ۔ لوگوں نے سلگا دیں ۔ کہا کہ : اب تم سب اس آگ میں داخل ہو جاؤ ۔ لوگوں نے ارادہ کیا تو بعض نے بعض کو پکڑ کر روک لیا ، اور کہنے لگے کہ آگ ہی سے تو بھاگ کر ہم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف آتے ہیں ۔ یہی بحثیں ہوتی رہیں اور آگ

خمدت النار فسکن غضبه فبلغ ذلك النبی صلی الله علیه وسلم فقال لو دخلوها ما خرجوا منها الی یوم القیامة الطاعة فی المعروف ۔
(شیخین، ابوداؤد، نسائی)

ٹھنڈی بھی ہوگئی اور ساتھ ہی امیر کا غصہ بھی ٹھنڈا ہو گیا۔ جب اس واقعے کی اطلاع حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوئی تو فرمایا کہ: اگر یہ لوگ اس آگ میں داخل ہو جاتے تو قیامت تک اس سے باہر نہ آسکتے۔ طاعت صرف معروف میں ہوا کرتی ہے۔

تبوک

۷۳۔ شرکت جہاد کی صحیح غرض کیا ہونی چاہیئے:

(واثلة) نادی النبی صلی الله علیه وسلم فی غزوة تبوك فطفقت فی المدینة انادی الا من یحمل رجلا له سهمه فاذا شیخ من الانصار فقال لنا سهمه علی ان نحمله عقبة وطعامه معنا فقلت نعم قال فسر علی برکة الله فخرجت خیر صاحب حتی افاء الله علینا فاصابنی قلائص فسقتهن حتی اتیته فخرج فقعد علی حقیبة من حقائب ابله ثم قال سقهن مدبرات ثم قال سقهن مقبلات فقال ما اری قلائصك الا کراما قلت انما هی غنیمتك التی شرطت لك قال خذ فلا تصلك یا ابن اخی فغیر سهمك اردنا۔ (ابوداؤد)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب غزوۂ تبوک کے لیے منادی کرائی تو میں مدینے میں یہ صدا لگانے لگا کہ: کوئی ہے جو ایک آدمی کے لیے سواری مہیا کر دے اور اس کے عوض میں مالِ غنیمت قبول کر لے۔؟ اتنے میں ایک بوڑھے انصاری نکلے اور کہنے لگے کہ: ہم اس کا حصہ قبول کرتے ہیں، اس شرط پر کہ اسے باری باری اپنے ساتھ سوار کرائیں گے۔ اور اس کا کھانا ہمارے ذمہ ہوگا۔ میں نے کہا: منظور ہے۔ انھوں نے کہا: پھر اللہ کے نام پر روانہ ہو جاؤ۔ غرض میں بہترین رفاقت کے ساتھ روانہ ہوا اور اللہ نے غنیمت بھی دلائی۔ میرے حصے میں کچھ دراز قامت اونٹنیاں آئیں جن کو ہانکتا ہوا میں اُس انصاری کے پاس لے آیا۔ وہ باہر آئے اور اپنی اونٹنی کے پیچھے بیٹھ کر کہنے لگے کہ: ان کو پیچھے دوڑاؤ۔ پھر کہا آگے دوڑاؤ۔ پھر بولے کہ: یہ دراصل آپ ہی کی غنیمت ہیں، جن کا میں نے وعدہ کیا تھا۔ انھوں نے جواب دیا کہ اے برادر زادے! اپنی اونٹنیاں اپنے ہی پاس رکھو کیونکہ میرا مقصد اس حصہ غنیمت کے سوا کچھ اور تھا (یعنی ثوابِ اجر)۔

براءت

۷۴ ۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا تقاضائے رحمت :

(ابن عمرؓ) لما توفی عبد اللہ یعنی ابن ابی بن سلول جاء ابنہ عبد اللہ الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فسألہ ان یعطیہ قمیصہ یکفن فیہ اباہ فاعطاہ ثم سألہ ان یصلی علیہ فقام لیصلی علیہ فقام عمر فاخذ بثوبہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال یا رسول اللہ تصلی علیہ وقد نہاک ربک ان تصلی علیہ؟ فقال صلی اللہ علیہ وسلم انما خیرنی اللہ تعالیٰ فقال استغفر لھم او لا تستغفر لھم ان تستغفر لھم سبعین مرۃ الخ وسازید علی السبعین قال انہ منافق فصلی علیہ صلی اللہ علیہ وسلم فنزل ولا تصل علی احد منھم مات ابداً الی فاسقون ۔
(شیخین ونسائی)

جب عبد اللہ بن ابی بن سلول (رأس المنافقین) مر گیا تو اُس کے صاحبزادے عبد اللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور اپنے باپ کو کفن دینے کے لیے حضور اکرمؐ سے قمیص کی درخواست کی جو حضورؐ نے دے دی ۔ پھر اُنھوں نے نماز جنازہ پڑھنے کی درخواست کی۔ حضورؐ اس کے لیے تیار ہو گئے ۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اُٹھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن پکڑ کر عرض کیا کہ : یا رسول اللہ! آپؐ اس کی نماز جنازہ پڑھیں گے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اس سے روکا ہے ؟ فرمایا کہ : اللہ نے مجھے (جنازہ پڑھنے اور نہ پڑھنے کے درمیان) اختیار دے دیا ہے ۔ وہ فرماتا ہے کہ : استغفر لھم او لا استغفر لھم ، ان استغفر لھم سبعین مرۃ الخ (خواہ تم ان منافقوں کے لیے استغفار کرو یا نہ کرو اور خواہ ان کے لیے ستّر بار بھی استغفار کرو اللہ نہیں بخشے گا) تو میں ستّر بار سے زیادہ استغفار کر لوں گا حضرت عمرؓ نے کہا کہ : وہ تو منافق تھا ۔ بہرحال حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا جنازہ پڑھ لیا ۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ : ولا تصل علی احد منھم ۔ الآیۃ (نہ ان کا جنازہ پڑھو ، نہ ان کی قبر پر کھڑے رہو)

ہود، واقعہ و مُرسلات وغیرہ

۷۵ ۔ بعض سورتوں کا اثر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحت پر :

(ابن عباسؓ) قال ابو بکر یا رسول اللہ

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض

قد شِبْتَ قال شیبتنی هود والواقعة والمرسلات وعم یتساءلون و اذا الشمس کورت ۔ (ترمذی)

کہا کہ: یا رسول اللہ! حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو بوڑھے ہو گئے ۔ فرمایا: سورۂ ہود، واقعہ، مرسلات، نبا، اور تکویر نے مجھے بوڑھا کر دیا ۔

شُعَرا

۷۶ ۔ مقامِ نبوت کی عجیب تمثیل اور سورۂ لہب کا نزول:

(ابن عباسؓ) لما نزلت و انذر عشیرتک الاقربین صعد النبی صلی اللہ علیہ وسلم علی الصفا فجعل ینادی یا بنی فهر یا بنی عدی لبطون قریش حتی اجتمعوا فجعل الرجل اذا لم یستطع ان یخرج ارسل رسولا لینظر ما هو فجاء ابولهب وقریش فقال ارأیتکم لو اخبرتکم ان خیلا بالوادی ترید ان تغیر علیکم کنتم مصدقی؟ قالوا نعم ما جربنا علیك الا صدقا قال فانی نذیر لکم بین یدی عذاب شدید فقال ابولهب تبًّا لك سائر الیوم ألهذا جمعتنا؟ فنزلت تبت یدا ابی لهب وتبّ ما اغنی عنه ماله وما کسب (شیخین، ترمذی)

جب آیت: وانذر عشیرتك الاقربین (اپنے قریبی رشتہ داروں کو وارننگ دے دو) نازل ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کوہ صفا پر چڑھ کر آواز دینے لگے کہ اے قریش! اے بنی فہر اور اے بنی عدی — اس آواز پر سب جمع ہو گئے اور جو نہ آسکا اس نے دستور کے مطابق اپنا نمائندہ بھیج دیا تاکہ جا کر معاملے کی حقیقت معلوم کرے ۔ ابولہب اور دوسرے قریش بھی آ گئے ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: دیکھو اگر میں تم سے یہ کہوں کہ شہسواروں کا ایک دستہ دوسری طرف سے دامنِ کوہ سے تم پر حملہ آور ہونا چاہتا ہے، تو کیا تم مجھے سچا سمجھو گے؟ سب نے جواب دیا کہ: یقیناً، اس لیے کہ ہم نے آپؐ کو ہمیشہ راست گو پایا ہے ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اچھا تو ایک سچی بات سن لو کہ تمہیں ایک بڑے سخت آنے والے عذاب سے آگاہ کرتا ہوں ۔ ابولہب بولا کہ: تم پر سارا دن ہلاکت آتی رہے، کیا اسی مقصد کے لیے تم نے ہم لوگوں کو جمع کیا تھا؟ اس کے بعد تبت یدا ابی لهب ۔۔۔الخ نازل ہوئی ۔

۷۷۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رشتے داری کوئی کام نہ آئے گی :

(ابوھریرۃ) قال قام النبی صلی اللہ علیہ وسلم حین نزل وانذر عشیرتک الاقربین قال یا معشر قریش او کلمۃ نحوھا اشتروا انفسکم لا اغنی عنکم من اللہ شیئًا یا عباس بن عبدالمطلب لا اغنی عنک من اللہ شیئًا ویا صفیۃ عمۃ رسول اللہ لا اغنی عنکِ من اللہ شیئًا ویا فاطمۃ بنت محمد سلینی ماشئت من مالی لا اغنی عنک من اللہ شیئًا۔ (نسائی)

ایک دوسری روایت یوں ہے کہ جب یہ آیت (وانذر عشیرتک الاقربین) نازل ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر فرمایا کہ : اے معشر قریش اپنی قدر و قیمت خود پیدا کرو! میں تمھیں اللہ تعالیٰ کی گرفت سے نہ بچا سکوں گا۔ اے عباس بن عبدالمطلب! میں اللہ تعالیٰ کے ہاں تمھارے کوئی کام نہ آسکوں گا۔ اے رسولؐ اللہ کی پھوپھی صفیہ! میں تمھیں اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے نہ چھڑا سکوں گا۔ اور اے محمدؐ کی بیٹی فاطمہؓ میرے مال میں سے تم جو کچھ چاہو مانگ لو، مگر میں اللہ کے حضور تمھارے کوئی کام نہ آسکوں گا۔

زمر

۷۸۔ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) صرف مبشر نہیں منذر بھی ہیں :

(العلاء بن زیاد) کان یذکر بالنار فقال رجل لم تقنط الناس؟ قال وانا اقدر علی ان اقنط الناس واللہ یقول یا عبادی الذین اسرفوا علی انفسھم لا تقنطوا من رحمۃ اللہ و یقول ان المسرفین ھم اصحاب النار و لکنکم تحبون ان تبشروا بالجنۃ علی مساوی

علاء بن زید ایک موقعے پر دوزخ کی آگ کا ذکر کرنے لگے۔ ایک شخص بولا کہ : آپ لوگوں کو مایوس کیوں کرتے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا کہ : میں لوگوں کو مایوس کرنے پر اس سے بھی زیادہ قادر ہوں۔ بات یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتا ہے کہ : (ترجمہ) اے مسرف بندو! رحمتِ الٰہی سے مایوس نہ ہو۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی فرماتا ہے ان المسرفین ھم اصحاب النار (مسرف لوگ جہنمی ہیں) لیکن تم لوگ یہ چاہتے ہو کہ تمھاری بداعمالیوں پر بھی

اعمالکم و انما بعث اللہ تعالیٰ محمدا صلی اللہ علیہ وسلم مبشراً بالجنۃ لمن اطاعہ و منذراً بالنار لمن عصاہ ۔ (بخاری ، تعلیقاً)

تمھیں جنت ہی کی بشارت دی جایا کرے ، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مبشرِ جنت اس کے لیے بنایا ہے جو طاعت الٰہی کرتا ہے اور جو نا فرمان ہو۔ اس کے لیے منذرِ دوزخ بنا کر بھیجا ہے۔

ممتحنہ

۷۹ - رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا تقویٰ :

(عائشہؓ) کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یبایع النساء بالکلام بھذہ الآیۃ لا یشرکن باللہ شیئا وما مست ید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ید امرأۃ لا یملکھا ۔ (شیخین، ترمذی)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم جن الفاظ سے عورتوں کی بیعت لیتے تھے وہ یہ آیت ہے : لا یشرکن باللہ شیئا ۔الخ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ کبھی کسی ایسی عورت کے ہاتھ سے مَس نہیں ہُوا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی نہ ہو۔

کتاب الطبّ

۸۰ - نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندہ دلی آخری لمحات میں :

(عائشہؓ) لددنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی مرضہ فجعل یشیر الینا ان لا تلدونی فقلنا کراھیۃ المریض للدواء فلما افاق قال الم انھکم ان تلدونی ؟ قلنا کراھیۃ المریض للدواء فقال لا یبقی احد فی البیت

ہم لوگوں نے مرض وفات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دہن مبارک میں دوا ٹپکائی ۔ حضورؐ نے اشارے سے منع فرمایا اور ہم نے یہ سوچا کہ مریض تو دوا کو ناپسند کرتا ہی ہے ۔ حضورؐ کو افاقہ ہُوا تو فرمایا کہ کیا میں نے تم لوگوں کو دوا پلانے سے منع نہیں کیا تھا ؟ ہم لوگوں نے عرض کیا کہ ہم یہ سمجھے کہ مریض تو دوا سے نفرت کرتا ہی ہے۔

الا العبّاس فانّه لم یشھدکم۔ (بخاری)

حضورؐ نے فرمایا کہ : اس گھر میں جتنے لوگ ہیں، اُن سب کے منہ میں میرے سامنے یہ دوا ٹپکاؤ بجز عباسؓ کو رکھا جائے۔ کیونکہ وہ تمہارے ساتھ مجھے دوا پلانے میں شریک نہ تھے۔

۸۱۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مزاح کی باتیں کرنا :

(صہیب) قدمت علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم وبین یدیه خبز وتمر فقال ادن فکل فاخذت اٰکل من التمر فقال تاکل تمرًا وبك رمد؟ قلت انی امضغ من ناحیة اخری فتبسم صلی اللہ علیه وسلم۔ (قزوینی بلین)

میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا سامنے روٹی اور کھجوریں تھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قریب آجاؤ اور کھاؤ۔ میں کھانے لگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہاری ایک آنکھ میں آشوب ہے اور تم کھجور کھا رہے ہو؟ میں نے عرض کیا کہ : آشوب تو اس طرف ہے اور میں چبا رہا ہوں دوسری طرف سے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس پر مسکرانے لگے۔

ایمان و اخلاق کے تقاضے

۸۲۔ حیائے نبویؐ کی فراوانی :

(ابو سعیدؓ) کان النبی صلی اللہ علیه وسلم اشد حیاء من العذراء فی خدرھا فاذا رأی شیئًا یکرھه عرفنا فی وجھه۔ (شیخین)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک پردہ نشین کنواری سے بھی زیادہ باحیا تھے۔ کسی ناپسندیدہ چیز پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر پڑتی تو ناگواری کو ہم لوگ حضورؐ کے چہرے سے پہچان لیتے تھے۔

۸۳۔ حیاداری کی انتہا :

(عائشہؓ) کنت ادخل بیتی وانی واضع ثوبی فاقول انما ھو زوجی

میں اپنے حجرے (روضۂ نبویؐ) میں یوں ہی بدن پر کپڑا رکھ کر بھی چلی جاتی تھی اور یہ سمجھتی تھی کہ ایک میرا شوہر (حضورؐ)

وابی فلما دفن عمرؓ معهم فواللہ ما دخلته الا وانا مشدودۃ علی ثیابی حیاء من عمرؓ۔ (احمد)

اور دوسرا میرا باپ (حضرت ابوبکرؓ) وہی مدفون ہیں۔ لیکن جب حضرت عمرؓ بھی وہاں دفن ہوئے تو ان کی حیاء کی وجہ سے باقاعدہ اوڑھ لپیٹ کر جانے لگی۔

۸۴۔ رسولِ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی صحیح پوزیشن :

(انسؓ) رفعه ...... انی لا ارید ان ترفعونی فوق منزلتی التی انزلتنیها اللہ تعالی انا محمد بن عبداللہ عبدہ ورسولہ۔ (سانین)

میں یہ نہیں چاہتا کہ تم مجھے اس مرتبے سے جو خدا نے مجھے دے رکھا ہے زیادہ بڑھاؤ۔ میری صحیح پوزیشن یہ ہے کہ میں عبداللہ کا فرزند محمد ہوں۔ اللہ کا بندہ اور اسی کا رسولؐ ہوں۔

۸۵۔ رسولِ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعریف میں مبالغہ :

(عمرؓ) رفعه : لا تطرونی کما اطرت النصاریٰ ابن مریم فانما انا عبدہ فقولوا عبد اللہ ورسولہ۔

(سانین)

میری تعریف میں اس طرح مبالغہ نہ کرو جس طرح نصاریٰ نے مسیح بن مریم کی تعریف میں کیا۔ میں اللہ کا بندہ ہوں۔ تم مجھے اللہ کا بندہ اور رسولؐ کہو۔

سخاوت و بخل

۸۶۔ کوئی سائل تیرے در سے کبھی خالی نہ گیا :

(جابرؓ) ما سئل النبی صلی اللہ علیہ وسلم شیئاً قط فقال لا۔ (شیخین)

ایسا کبھی نہ ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی سوال کیا گیا ہو اور حضورؐ نے "نہیں" کی ہو۔

۸۷۔ مالیات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طرزِ عمل :

(عبد اللہ الہوزنی) لقیت بلالاً بحلب فقلت کیف کان نفقۃ النبی صلی اللہ

میں نے بلالؓ سے ملاقات کرنے کے بعد دریافت کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جود وعطا کا کیا انداز تھا؟

عليه وسلم؟ فقال ماكان له شئ كنت
الي ذلك منه منذ بعثه الله تعالى
ان توفاه وكان اذا اتاه الانسان
مسلما فيراه عاريا يأمرني فانطلق
فاستقرض فاشتري له البردة و
واكسوه واطعمه حتى اعترضني
رجل من المشركين فقال ان
عندي سعة فلا تستقرض من
احد الا مني ففعلت فلما ان كان
ذات يوم توضأت ثم قمت لاؤذن
للصلوة فاذا المشرك قد اقبل في
عصابة من التجار فلما ان رآني
قال يا حبشي قلت يالباه فتجهمني
وقال لي قولا غليظا وقال تدري
كم بينك وبين الشهر؟ قلت
قريب قال انما بينك وبينه اربع
فآخذك بالذي عليك فاردك
ترعى الغنم كما كنت قبل ذلك
فاخذ في نفسي ما اخذ في انفس
الناس حتى اذا صليت العتمة رجع
صلى الله عليه وسلم الى اهله
فاستأذنت عليه فاذن لي فقلت
يا رسول الله بابي انت وامي
ان المشرك الذي كنت أتدين منه
قال لي كذا وكذا وليس عندك ما
تقضي عني ولا عندي وهو فاضحي

کہا: حضورؐ کے پاس کوئی ایسی چیز اندوختہ نہیں رہی جس کی
رکھوالی میرے سپرد رہی ہو، اور یہ انداز زیست بعثت
کے دن سے لے کر وفات تک برابر قائم رہا۔ جب حضور
صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی مسلمان آتا اور
حضور اسے بے پوشاک دیکھتے تو مجھے حکم فرماتے اور میں
جا کر کہیں سے قرض لاتا، پھر چادر خرید کر اُسے پہناتا اور
اسے کھانا کھلاتا۔ ایک دن ایسا ہوا کہ ایک مشرک مجھے
راستے میں ملا اور کہنے لگا کہ: میرے پاس بہت کچھ ہے،
اس لیے میرے سوا اور کسی سے قرض نہ لیا کرو، چنانچہ میں
نے اس کا بھی تجربہ کیا۔ ایک دن میں وضو کر کے اذان دینے
کے لیے اُٹھنے لگا تھا کہ وہی مشرک چند تجاروں کے ساتھ
آیا اور مجھے دیکھ کر بولا: اے حبشی! میں نے جواب دیا:
ہاں مہربان! اس نے بڑی ترش روئی دکھائی اور بڑی سخت
باتیں کہیں اور بولا کہ: تمھیں علم ہے کہ مہینہ ختم ہونے میں
کتنے دن رہ گئے ہیں؟ میں نے کہا: ہاں چند ہی دن ہیں۔
بولا: صرف چار دن رہ گئے ہیں! اس کے بعد تم سے قرض
وصول کر لوں گا، ورنہ تمھیں پہلے کی طرح میری بکریاں
چرانی پڑیں گی۔ مجھے اس سے ایسی کوفت ہوئی جو شاید
اور لوگوں کو نہ ہوتی ہوگی۔ عشاء ادا کرنے کے بعد حضور اکرم
صلی اللہ علیہ وسلم گھر واپس ہوئے اور میں اجازت لے
کر اندر داخل ہوا، اور عرض کیا کہ: یا رسول اللہ! آپ
پر میرے ماں باپ قربان ہوں۔ اس مشرک نے جس سے
میں نے قرض لیا تھا، مجھے یہ یہ باتیں کہی ہیں۔ اس وقت
میرا قرض ادا کرنے کے لیے نہ حضورؐ کے پاس کچھ
ہے نہ میرے پاس۔ اس لیے مجھے اجازت دیجئے
کہ میں کسی مسلمان قبیلے کی طرف چل دوں، تا آنکہ

فتأذن لی ان آبق الی بعض هؤلاء
الاحیاء الذین اسلموا حتی یرزق
الله رسوله ما یقضی عنی فخرجت
حتی اتیت منزلی فجعلت سیفی و
جرابی ونعلی ومجنی عند رأسی حتی
اذا انشق عمود الصبح الاول اردت
ان انطلق فاذا انسان یدعو یا بلال
اجب النبی صلی الله علیه وسلم
فانطلقت حتی اتیته فاذا اربع
رکائب مناخات عند الباب علیهن
احمالهن فاستأذنت فقال لی
ابشر فقد جاء الله بقضائك
ثم قال ألم تر الرکائب المناخات
الاربع؟ فقلت بلی قال فان
لك رکابهن وما علیهن و
ان علیهن کسوة وطعاما
اهداهن الی عظیم فدك
فاقبضهن واقض دینك
ففعلت ثم انطلقت الی المسجد
فاذا فیه النبی صلی الله علیه وسلم
قاعد فسلمت علیه فقال ما
فعل ما قبلك؟ فقلت قضی الله
کل شئ کان علی رسول الله صلی الله
علیه وسلم قال أفضل شئ؟
قلت نعم قال انظر ان تریحنی منه
فانی لست بداخل علی احد من

اللہ تعالٰے اپنے رسولؐ کے لیے ادائے قرض کا سامان
کرے۔ غرض میں وہاں سے سیدھا اپنی قیام گاہ پر
آیا اور اپنی تلوار، سپر (یا چرمی برتن) جوتا اور
ڈھال اپنے بچۂ شُتر پر رکھا اور جب صبح کی پہلی پَو
پھٹی تو میں نے روانگی کا ارادہ کیا۔ اتنے میں ایک
آدمی آیا اور کہنے لگا کہ : بلالؓ! حضور صلی اللہ علیہ وسلم
یاد فرماتے ہیں۔ مَیں حاضر ہُوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اُونٹوں
کی چار قطاریں دروازے پر بیٹھی ہوئی ہیں اور اُن پر
اسباب لدا ہُوا ہے۔ میں اجازت لے کر اندر داخل ہُوا تو
فرمایا! خوش ہوجاؤ۔ اللہ تعالٰے نے تمھارے قرض
کی ادائیگی کا سامان کر دیا ہے۔ وہ اونٹوں کی چار قطاریں
بیٹھی ہوئی دیکھ رہے ہو نا؟ میں نے عرض کیا : ہاں
یا رسول اللہ! فرمایا : یہ سارے اُونٹ مع اس
اسباب کے سب تمھارے قبضہ و انتظام میں ہیں۔
ان پر کپڑے اور غلے ہیں۔ جو سردار فدک نے مجھے
ہدیے میں بھیجے ہیں، ان کو اپنے قبضے میں لو اور
اپنا قرض بھی ادا کرو۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔
اس کے بعد میں مسجد میں گیا تو حضور صلی اللہ
علیہ وسلم جلوہ افروز تھے۔ میں نے سلام عرض کیا۔ حضورؐ
صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ : اسباب کیا ہُوا۔؟
میں نے عرض کیا ! اللہ تعالٰے نے حضور صلی اللہ
علیہ وسلم کا سارا قرض ادا کر دیا۔ فرمایا : کچھ بچ
بھی گیا؟ عرض کیا، ہاں! فرمایا : میں اس کا منتظر
ہوں کہ اس بچے ہوئے سے مجھے کب نجات دلاتے ہو۔
میں اس وقت تک اپنے حجرے میں نہ جاؤں گا
جب تک مجھے اس سے بھی نجات نہ دلادو (یعنی

اهلی حتی متی یجئی منه فلما صلی العتمة دعانی فقال ما فعل الذی قبلك؟ قلت هو معی لم یأتنا احد فبات صلی الله علیه وسلم فی المسجد و اقام فیه حتی صلی العتمة یعنی من الغد ثم دعانی فقال ما فعل الذی قبلك؟ فقلت قد اراحك الله منه فکبر وحمد الله وما کان یفعل ذلك شفقا من ان یدرکه الموت وعنده ذلك ثم اتبعته حتی جاء ازواجه فسلم علی امرأة امرأة حتی اتی التی عندها مبیته فهذا الذی سألتنی عنه - (ابوداؤد)

راہ خدا میں دے کر مجھے سکون و راحت پہنچاؤ) جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم عشاء ادا فرما چکے، تو مجھے بلا کر پوچھا: کہو کیا ہوا اس کا؟ میں نے عرض کیا کہ: اللہ تعالٰے نے حضورؐ کو اس کی فکر سے بھی نجات دے دی۔ حضورؐ نے اظہارِ تشکر کے لیے تکبیر و تحمید فرمائی حضورؐ کا یہ عمل اس لیے رہتا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی مال باقی رہ جائے اور موت آجائے۔ اس کے بعد میں حضورؐ کے ساتھ ہو لیا اور حضورؐ نے ازواجِ مطہرات میں سے ایک ایک کے پاس جا کر سلام فرمایا اور آخر میں وہاں تشریف لے گئے جہاں کی باری تھی — یہی ہے وہ حقیقت جو تم (اے عبداللہ ہوزنی!) نے مجھ سے دریافت کی تھی۔

۸۸ - کل کے لیے ذخیرہ :

(انسؓ) کان النبی صلی الله علیه وسلم لا یدخر شیئا لغد - (ترمذی)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کل کے لیے کچھ بھی ذخیرہ نہ فرماتے تھے۔

۸۹ - جمع شدہ مال سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بے چینی :

(عقبة بن الحارث) انه صلی وراء النبی صلی الله علیه وسلم العصر فسلم ثم قام مسرعا یتخطی رقاب الناس الی بعض حجر نسائه ففزع الناس من سرعته فخرج علیهم فرأی انهم قد عجبوا من سرعته فقال ذکرت شیئا من تبر عندنا فکرهت ان یبیت عندنا فامرت بقسمته - (بخاری، نسائی)

میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نمازِ عصر ادا کی۔ سلام پھیرتے ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم تیزی کے ساتھ لوگوں کو پھاندتے ہوئے کسی زوجۂ مطہرہ کے حجرے میں تشریف لے گئے لوگوں پر اس تیز رفتاری کی وجہ سے ایک دہشت سی طاری ہوئی، جب حضور واپس تشریف لائے اور لوگوں کو اس تیز روی سے حیرت زدہ سا محسوس کیا تو فرمایا: مجھے ایک سونے کا ڈلا یاد آگیا جو میرے پاس رکھا تھا۔ مجھے یہ پسند نہ ہوا کہ یہ رات تک میرے پاس رکھا رہے۔ اسے تقسیم کرنے کا حکم دے کر آیا ہوں۔

۹۰ - حوصلۂ نبوت :

(ابوہریرہؓ) لوکان عندی مثل أحد ذهبًا لسرنی ان لا یمر علی ثلاث لیال وعندی منه شیٔ الاشیٔ ارصده لدین - (شیخین)

میرے پاس کوہِ اُحد کے برابر بھی سونا ہوتا تو میری مسرت اس میں ہوتی کہ تین دن کے بعد میرے پاس اس میں سے کچھ باقی نہ رہے ، صرف اتنا رہ جائے جسے میں قرض ادا کرنے کے لیے رکھ لوں ۔

۹۱ - قابلِ عبرت تاسف :

(ابووائلؓ) جاء معاویة الی ابی هاشم بن عُتبةؓ وهو مریضؓ یعوده فوجده یبکی فقال یا خالی ما یبکیك ؟ أوَجع یشئزك ام حرص علی الدُّنیا ؟ قال کَلَّا ولکن رسول الله صلی الله علیه وسلم عهد الینا عهدا لم اخذ به قال وماذاك؟ قال سمعته یقول انما یکفی من جمع المال خادم ومرکب فی سبیل الله . و احد فی الیوم قد جمعتُ ۔ وزاد رزین : فلما مات حصل ما خلف فبلغ ثلاثین درهما وحُسِب فیه القصعة التی کان فیها یعجِن و یأکل - (ترمذی نسائی)

ابوہاشم بن عتبہؓ بیمار پڑے تو امیر معاویہؓ ان کی عیادت کو گئے - ابوہاشم اس وقت رو رہے تھے ۔ حضرت معاویہؓ نے پوچھا کہ : آپ رو تے کیوں ہیں ؟ کوئی تکلیف ہے یا حیاتِ دنیا کی طلب بے آرام کر رہی ہے ۔ جواب دیا : ان دونوں میں سے کوئی بھی بات نہیں ۔ بلکہ بات صرف یہ ہے کہ حضورؐ نے مجھ سے ایک عہد لیا تھا جس پر میں قائم نہ رہ سکا ۔ معاویہؓ نے پوچھا : وہ کیا عہد تھا ؟ ابوہاشم نے کہا : میں نے حضورؐ کو یہ فرماتے سُنا ہے کہ : آدمی کے لیے صرف ایک خادم اور ایک سواری جو فی سبیل اللہ ہو کافی ہے ۔ اس سے زیادہ مال جمع رکھنے کی ضرورت نہیں ۔ لیکن میرے پاس اس وقت اس سے کچھ زیادہ مال موجود ہے ۔ رزین کی روایت میں اس سے آگے الفاظ یہ ہیں کہ : جب ان کی وفات ہوئی تو ابوہاشم کی کُل جمع پونجی جو وہ چھوڑ گئے تیس درہم کی مالیت تھی جس میں وہ پرات (پیالہ) بھی شامل تھا جس میں آٹا گوندھتے اور کھانا کھاتے تھے ۔

اخلاق رذیلہ

۹۲ - صحابہؓ کی بُرائی کرنے پر تنبیہ :

(ابن مسعودؓ) رفعه : لا یبلّغنی احد

میرے کسی صحابی کے متعلق کوئی شخص بُری بات مجھ سے

عن احد من اصحابی شیئًا فانی احبّ ان اخرج الیھم وانا سلیم الصدر۔ (ابوداؤد، ترمذی)

نہ کہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ میں اُن لوگوں کے سامنے آؤں تو صاف سینہ لے کر آؤں۔

گانا بجانا

۹۳۔ عورتوں کا گانا سننا اور حبشیوں کے کرتب دیکھنا :

(عائشہؓ) دخل رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلّم وعندی جاریتان تغنیان بغناء بعاث فاضطجع علی الفراش وحوّل وجھہ و دخل ابوبکرؓ فانتھرنی وقال مزمارۃ الشیطان عند النبیّ صلی اللّٰہ علیہ وسلم؟ فاقبل علیہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فقال دعھما فلما غفل غمزتھما فخرجتا وکان یوم عید یلعب السودان بالدرق والحراب فی المسجد فاما سألت النبیّ صلّی اللّٰہ علیہ وسلم واما قال تشتھین تنظرین؟ فقلت نعم فاقامنی ورائہ خدی علیٰ خدہٖ ولیقول دونکم یا بنی ارفدۃ حتی اذا مللت قال حسبک؟ قلت نعم فاذھبی۔

(شیخین، نسائی)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم میرے ہاں تشریف لائے، اُس وقت دو چھوکریاں جنگ بُعاث کے گانے گا رہی تھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بستر پر لیٹ گئے اور دوسری طرف کروٹ لے لی۔ اتنے میں حضرت ابوبکرؓ تشریف لے آئے۔ اور مجھے ڈانٹ کر کہا کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں اور یہ شیطانی گیت؟ حضورؐ نے جناب ابوبکرؓ کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا: رہنے دو ان بیچاریوں کو۔ اس پر جب وہ خاموش ہو گئے تو میں نے ان دونوں چھوکریوں کو اشارہ کیا اور وہ چلی گئیں۔ اس روز عید بھی تھی اور حبشی مسجد میں اپنی ڈھالوں اور نیزوں کے کرتب دکھا رہے تھے۔ اس کے بعد میرے پوچھنے پر یا از خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: کیا تمھیں (حبشیوں کا کھیل) دیکھنے کی خواہش ہے؟ میں نے عرض کیا: ہاں! آپؐ حضورؐ نے مجھے اپنے پیچھے کھڑا کر لیا کہ میرا رخسارہ رخسارۂ نبویؐ سے ملا ہوا تھا۔ (یعنی حضورؐ کے کاندھے پر میری ٹھوڑی تھی) حضورؐ فرماتے جاتے: ہاں بنی ارفدہ (یعنی حبشیو) دکھاؤ اپنے کرتب آخر میں میں کھڑے کھڑے اُکتا گئی تو حضورؐ نے فرمایا بس؟ میں نے عرض کیا: ہاں! فرمایا: تو اب جاؤ۔

۹۴۔ گانے والیوں کی اصلاح :

(الربیع بنت معوذ) جاء النبی صلی اللہ علیہ وسلم حین بنی علی فدخل بیتی وجلس علی فراشی فجعل جویریات لنا یضربن بالدف و یندبن من قتل من آبائھن یوم بدر اذ قالت احدا ھنّ نبینا نبی یعلم ما فی غد" قال لھا صلی اللہ علیہ وسلم دعی ھذہ وقولی بالتی کنت تقولین۔

(بخاری، ابوداؤد، ترمذی)

جب میری رخصتی ہو چکی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم میرے غریب خانے پہ جلوہ افروز ہوئے اور میرے ہی بستر پر بیٹھ گئے۔ چند لڑکیاں دف بجا بجا کر اپنے بدر میں شہید ہونے والے بزرگوں کی مدح سرائی کرنے لگیں ایک نے مصرعہ گایا کہ: "فینا نبی یعلم ما فی غد" "ہم میں ایک پیغمبر ایسا ہے جو یہ جانتا ہے کہ کل کیا ہوگا" حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: یہ نہ کہو۔ وہی کہو جو تم پہلے کہہ رہی تھیں۔

لہو ولہب

۹۵۔ گڑیا کھیلنا :

(عائشہؓ) کنت العب بالبنات عند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وکن یأتین صوا حبی فکن ینقمعن منہ صلی اللہ علیہ وسلم فکان یُسَرِّبھن فیلعبن معی۔ (شیخین، ابوداؤد)

میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں لڑکیوں کے ساتھ کھیلا کرتی تھی۔ میری سہیلیاں آتیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے شرما کر اوٹ میں ہو جاتیں۔ اس وقت حضورؐ انھیں بلا کر میرے پاس بھیج دیتے۔

لعن وطعن

۹۶۔ دشمن پر بددعا سے پرہیز :

(ابوھریرہؓ) قیل للنبی صلی اللہ علیہ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک بار درخواست کی

وسلم ادع اللہ علی المشرکین والعنھم فقال انی انما بعثت رحمۃ ولم ابعث لعانا ۔ (مسلم)

گئی کہ مشرکین کے لیے بد دُعا فرمائیے ۔ حضورؐ نے فرمایا کہ : میں رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں نہ کہ لعنت (بد دُعا) کرنے والا بنا کر ۔

۹۷ ۔ نبوت کا قابو زبان پر :

(انسؓ) لم یکن النبی صلی اللہ علیہ وسلم سبابا ولا فاحشا ولا لعانا کان یقول لاحدنا عند المعتبۃ مالہٗ تربت یمینہ وفی روایۃ : تربت جبینہ ۔ (بخاری)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نہ گالیاں دیا کرتے تھے ، نہ فحش گوئی ولعنت کیا کرتے تھے ۔ ہم میں سے جب کسی پر عتاب فرماتے تو زیادہ سے زیادہ یہ فرماتے کہ : اسے کیا ہو گیا ہے ، اس کا ہاتھ خاک آلود ہو یا اس کی پیشانی خاک آلود ہو ۔

۹۸ ۔ بشریت رسولؐ کے تقاضوں کی عجیب تلافی :

(ابو ھریرۃؓ) رفعہ : اللّٰھم انی اتخذ عندک عھدًا لن تخلفنیہ فانما انا بشر فای المؤمنین اذیتہ شتمتہ لعنتہ جلدتہ فاجعلھا لہ صلوٰۃ زکوٰۃ وقربۃ تقربہا الیک یوم القیامۃ ۔ (شیخین)

اے اللہ ! میں تجھ سے ایک عہد لینا چاہتا ہوں ۔ ایسا عہد جسے تُو کبھی نہ توڑے ۔ مَیں ایک بشر ہوں ۔ اگر میں نے کبھی کسی مومن کو ایذا پہنچائی ہو ، گالی دی ہو ، لعنت کی ہو یا کوڑا لگایا ہو تو بروزِ حشر ان سب چیزوں کو اُس کے لیے سراپا دُعائے پاکیزگی اور باعثِ قربِ الٰہی بنا دے ۔

مزاح

۹۹ ۔ مزاح نبویؐ کا انداز :

(ابو ھریرۃؓ) قالوا یا رسول اللہ انک لتداعبنا قال انی لا اقول الا حقاً ۔ (ترمذی)

بعض لوگوں نے کہا کہ یا رسول اللہ ! حضورؐ تو ہم لوگوں سے مزاح بھی فرماتے ہیں ۔ ؟ فرمایا کہ : ہاں ! اگر کہتا ہوں حق ہی ۔

۱۰۰۔ مزاحِ نبویؐ ایک سائلہ سے:

(انسؓ) ان امرأة اتت النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقالت احملنا علی بعیر فقال احملکم علی ولد الناقة قالت وما نصنع بولد الناقة؟ فقال هل یلد الابل الا النوق۔

ایک عورت نے درخواست کی کہ: یا رسول اللہ! ہمارے لیے اُونٹ کی سواری مہیا فرما دیجئے۔ فرمایا: میں تمھارے لیے اُونٹ کا بچہ مہیا کر دوں گا۔ کہنے لگی۔ ہم اُونٹ کا بچہ لے کر کیا کریں گے؛ فرمایا: کیا بڑا اُونٹ اُونٹ کا بچہ نہیں ہوتا۔

شعر کہنا اور سُننا

۱۰۱۔ حسّانؓ بن ثابت کی عزّت افزائی:

(عائشہؓ) کان النبی صلی اللہ علیہ وسلّم یضع لحسان منبرًا فی المسجد یقوم علیه فائما یفاخر عن النبیّ صلی اللہ علیہ وسلم او ینافح فیقول صلی اللہ علیہ وسلّم ان اللہ یؤید حسان بروح القدس ما نافح اوفاخر عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

(بخاری، ابوداؤد، ترمذی)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم حسّانؓ بن ثابت کے لیے منبر رکھوا دیتے تھے جس پر وہ چڑھ کر کھڑے ہو جاتے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مفاخرت اور مدافعت کا فرض انجام دیتے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے کہ: جب تک حسّانؓ، رسولؐ کی طرف سے مفاخرت و مدافعت کرتے رہتے ہیں، اللہ تعالیٰ، روح القدس سے اُن کی تائید فرماتا رہتا ہے۔

رحم و کرم

۱۰۱۔ رحمۃٌ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی نظرِ رحمت ایک اُونٹ پر:

(عبداللہ بن جعفرؓ) اردفنی رسول اللہ

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار مجھے اپنے

صلی اللہ علیه وسلم خلفه ذات یوم فاسرّ الیّ حدیثا لا احدث به احدا من الناس وکان احبّ ما استتر به لحاجته هدفًا او حائش نخل فدخل حائطاً لرجل من الانصار فاذا فیه جمل فلما رأی النبی صلی اللہ علیه وسلم حنّ وذرفت عیناه فاتاه صلی اللہ علیه وسلم فمسح ذفراه فسکت فقال من رب هذا الجمل؟ لمن هذا الجمل؟ فجاء فتی من الانصار فقال لی یا رسول اللہ فقال له افلا تتقی اللہ فی هذه البهیمة التی ملکك اللہ ایاها؟ فانه شکی الی انك تجیعه وتدئبه

(ابوداؤد)

پیچھے سواری پر بٹھا لیا اور مجھے ایک ایسی راز دارانہ بات بتائی جسے میں کسی سے بیان نہیں کروں گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو رفع حاجت کی ضرورت محسوس ہوتی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس تنہائی کے لیے یا تو کوئی اونچی جگہ پسند فرماتے تھے یا وہ جگہ جہاں گنجان درخت ہوں۔ حضورؐ ایک انصاری کے باغ میں داخل ہوگئے۔ وہاں ایک اونٹ نظر آیا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتے ہی بلبلانے لگا اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے نبی کریم اس کے پاس تشریف لے گئے اور اس کی گُدّی پر ہاتھ پھیرا وہ خاموش ہوگیا حضورؐ نے دریافت فرمایا کہ: اس اونٹ کا مالک کون ہے؟ یہ اونٹ کس کا ہے؟ ایک انصاری نوجوان نے آکر عرض کیا کہ: میرا ہے یا رسول اللہ! فرمایا: اس چوپائے کے معاملے میں تم اُس خدا کا خوف نہیں رکھتے جس نے تمھیں اس کا مالک بنایا ہے؟ اس نے ابھی مجھ سے گلہ کیا ہے کہ تم اسے بھوکا رکھتے ہو اور بہت محنت لیتے ہو۔

۱۰۲ - چڑیا پر رحم:

(عبدالرحمن بن عبداللہ)

عن ابیه: کنّا مع النبی صلی اللہ علیه وسلم فی سفر فانطلق لحاجته فرأینا حُمّرة معها فرخان فاخذنا فرخیها فجاءت الحمرة فجعلت تعرش فلما جاء صلی اللہ علیه وسلم قال من فجع هذه بولدها؟ ردوا ولدها الیها ......

(ابوداؤد)

ہم لوگ ایک سفر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے کہ حضورؐ رفع حاجت کے لیے تشریف لے گئے۔ ہم لوگوں نے ایک حمّرہ (ایک قسم کا پرند) دیکھا جس کے ساتھ دو بچے بھی تھے۔ ہم نے بچے پکڑ لیے۔ حمّرہ آیا اور ہمارے سروں پر پھڑ پھڑانے لگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو فرمایا: کس نے اس کے بچے لے کر اسے بے قرار کر دیا ہے؟ اس کے بچے اسے واپس دے دو۔

مناقب

ابراہیمؑ

۱۰۳- بہترین مخلوقات کون ہے؟

(انسؓ) جاء رجل الی النبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم فقال لہ یا خیر البریۃ فقال صلی اللہ علیہ وسلم ذاک ابراھیم خلیل اللہ (مسلم، ابوداؤد، ترمذی)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص نے آکر کہا کہ: اے خیر بریۃ (اسے بہترین مخلوقات) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ شان تو حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی ہے[1]

اسحاقؑ

۱۰۴- ذبیح اللہ کون ہے؟:

(العباسؓ) رفعہ: الذبیح اسحاق- (بزار بلین)

ذبیح اللہ اسحاقؑ ہیں (یا اسحاق بھی ہیں)[2]

خاتم الانبیاءؐ

۱۰۵- خاتم النبیینؐ کا صحیح مقام:

(ابوھریرۃؓ) رفعہ: ان مثلی ومثل

میری اور جو انبیا مجھ سے پہلے گزرے ہیں ان کی

---

[1] حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی "خیر البریۃ" ہیں لیکن اپنے لیے عبدہ و رسولہ سے بہتر کوئی لقب نہیں سمجھتے۔ [2] سیدنا اسمٰعیلؑ کے ذبیح اللہ ہونے پر بھی بہت سے شواہد ہیں۔ ہم نے یہ روایت اس لیے درج کی ہے کہ ہمیں ذبیح اللہ کی شخصیت سے اتنی بحث نہیں ہونی چاہیے جتنی کہ جذبہ ذبیحیت سے ہونی چاہیے ذبیح اللہ کوئی ہو، ایک ہو، یا دونوں ہوں۔ ہمیں تو اپنے اندر وہ جذبہ قربانی پیدا کرنا ہے خواہ کسی نام سے ہو۔

الانبیاء من قبلی کمثل رجل بنی بیتا فاحسنه واجمله الا موضع لبنة من زاویة من زوایاه فجعل الناس یطوفون به ویعجبون له و یقولون هلا وضعت هذه اللبنة؟ فانا اللبنة وانا خاتم النبیین - (شیخین)

مثال یوں ہے جیسے کسی نے ایک بڑی خوب صورت اور عمدہ عمارت بنائی ہو اور اس کے کسی کونے میں ایک اینٹ کی جگہ خالی چھوڑ دی ہو۔ لوگ اس عمارت کے گرد گھوم گھوم کر حیرت زدہ ہو رہے ہوں اور یہ کہہ رہے ہوں کہ یہ اینٹ کیوں نہیں لگائی گئی؟ بس سمجھ لو کہ وہ اینٹ میں ہی ہوں اور میں خاتم النبیین ہوں۔

۱۰۶۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو:

(عائشہؓ) کان کلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کلام فصل یفهمه کل من سمعه - (ابوداؤد)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو اتنی صاف ہوتی تھی کہ ہر سننے والا اسے بخوبی سمجھ لیتا تھا۔

۱۰۷۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت و سیرت:

(انسؓ) .... کان النبی صلی اللہ علیه وسلم احسن الناس و کان اجود الناس و کان اشجع الناس ولقد فزع اهل المدینة ذات لیلة فانطلق ناس من قبل الصوت فتلقاهم صلی اللہ علیه وسلم راجعا وقد سبقهم الی الصوت

.... حضور صلی اللہ علیہ وسلم حسن میں، سخاوت میں اور شجاعت میں تمام لوگوں سے بڑھے ہوئے تھے۔ مدینے کے لوگ ایک رات (ایک آواز سے) ڈر گئے اور سب اسی آواز کی طرف دوڑ پڑے تو دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرف سے واپس آرہے ہیں یعنی اس آواز کی طرف سب سے پہلے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم تنہا نکل پڑے تھے۔

۱۰۸۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سب کے لیے یکساں تھے:

(انسؓ) کانت الامة من اماء المدینة لتاخذ بید رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم

مدینے کی کوئی لونڈی بھی اگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن پکڑ لیتی تو حاجت[1] اتی

ل[1] "اخذ ید" محاورہ ہے جس کا صحیح ترجمہ ہماری زبان میں دست گیری کرنا یا چاہنا ہے۔

فتنطلق به حيث شاءت ۔ (بخاری)

کے لئے جہاں چاہتی لے جاتی ۔

۱۰۹۔ قابلِ اقتدا اُسوۂ نبویؐ :

(انسؓ) كان النبى صلى الله عليه وسلم اذا استقبله الرجل فصافحه لا ينزع يده من يده حتى يكون الرجل ينزع يده ولا يصرف وجهه عن وجهه حتى يكون الرجل هو يصرفه ولم يُرَ مقدمًا ركبته بين يدى جليس له ۔

(ابو داؤد، ترمذی بلفظہ)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جب کسی کا سامنا ہوتا اور وہ مصافحہ کرتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت تک اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے نہ چھڑاتے جب تک وہ خود نہ چھوڑ دے اور اپنا رخ مبارک اس طرف سے نہ ہٹاتے تاآنکہ وہ خود ہی اپنا رخ بدل لے اور اپنے کسی ہم نشین سے آگے اپنا زانو نہ بڑھاتے ۔

۱۱۰۔ کاشانۂ نبوّت کے اندر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مشاغل :

(الاسودؓ) سألت عائشة ؓ ما كان النبى صلى الله عليه وسلم يصنع فى بيته؟ قالت كان يكون فى مهنة اهله فاذا حضرت الصلوٰة يتوضأ ويخرج الى الصلوٰة ۔

(مسلم، ترمذی)

میں نے حضرت عائشہ صدیقہؓ سے پوچھا کہ : حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا گھر کے اندر کیا شغل رہتا تھا ؟ انہوں نے کہا کہ : اپنے گھر والوں کا کام کاج کیا کرتے تھے اور جب نماز کا وقت آجاتا تو وضو کر کے نماز کے لئے باہر تشریف لے جاتے ۔

۱۱۱۔ گستاخی کا جواب :

(ابو هريرةؓ) كان النبى صلى الله عليه وسلم يجلس معنا فى المسجد يحدثنا فاذا قام قمنا قياما حتىّٰ نراه قد دخل بعض بيوت

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ مسجد میں ہم لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر گفتگو فرماتے جب حضورؐ اُٹھ کھڑے ہوتے تو ہم لوگ بھی اُٹھ جاتے اور ہماری آنکھوں کے سامنے کسی حجرہ

ان ولحبه فحدثنا یوماً فقمنا حین قام فنظرنا الی اعرابی قد ادرکه فجبذه بردائه فحمر رقبته وکان رداء خشنا فالتفت الیه فقال له الاعرابی احملنی علی بعیری هذین فانك لا تحملنی من مالك ولا مال ابیك فقال صلی اللہ علیہ وسلم لا واستغفر اللہ لا واستغفر اللہ لا واستغفر اللہ لا احملك حتی تقیدنی من جبذتك التی جبذتنی فکل ذلك یقول له الاعرابی واللہ لا اقید کما قد ذکر الحدیث قال ثم دعا رجلا فقال له حمل له علی بعیریه هذین علی بعیر شعیرا و علی الآخر تمراً ثم التفت الینا فقال انصرفوا علی برکة اللہ۔ (ابوداؤد، نسائی)

ام المؤمنین میں چلے جاتے۔ایک دن ایسا ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم گفتگو فرمانے کے بعد اُٹھے اور ہم لوگ بھی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ہم نے دیکھا کہ ایک اعرابی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پکڑ لیا اور حضورؐ کی چادر کو جو موٹی اور سخت تھی اس زور سے جھٹکا دے کر کھینچا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی گردن اس کی رگڑ سے سرخ ہو گئی۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کی طرف متوجہ ہوئے، تو وہ اعرابی بولا: میرے ان دو لوں اونٹوں کو خوراک سے لاد دو، تم جو کچھ دو گے وہ نہ تمہارا مال ہے نہ تمہارے باپ کا۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار فرمایا کہ: لا واستغفر اللہ (بے شک یہ مال نہ میرا ہے نہ میرے باپ کا اور میں نے ایسا سمجھا ہو تو اللہ تعالیٰ سے مغفرت کا طلبگار ہوں) پھر فرمایا کہ: جب تک تم چادر کھینچ کر رگڑ ڈالنے کا بدلہ نہ لینے دو گے میں تمہیں خوراک نہ دلواؤں گا۔حضورؐ جب یہ فرماتے تو وہ اعرابی یہ جواب دیتا کہ: بخدا میں اس کا بدلہ نہ لینے دوں گا۔پھر حضورؐ نے ایک آدمی کو بلا کر فرمایا کہ: اس کے دونوں اونٹوں پر خوراک لاد دو۔ایک پر جَو اور ایک پر کھجوریں۔پھر ہم لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا: کہ اللہ کی برکت لیے ہوئے اپنے گھر جاؤ۔

۱۱۲۔ سیرتِ رسول اللہؐ کی سب سے قوی شہادت:

(انسؓ) خدمت النبی صلی اللہ علیہ وسلم عشر سنین واللہ ما قال لی اف قط ولا قال لشیٔ لم فعلت کذا وھلا فعلت کذا۔ (شیخین، ابوداؤد، ترمذی)

میں نے دس سال حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کی ہے۔خدا کی قسم حضورؐ نے کبھی میری بات پہ اُف نہیں کی اور کبھی یہ نہیں فرمایا کہ: یہ کیوں کیا اور یہ کیوں نہیں کیا۔

نبویؐ پیش گوئیاں

۱۱۳۔ کسریٰ و قیصر کے مغلوب ہونے کی پیش گوئی :

(جابر بن سمرۃؓ) رفعہ : اذا ھلک کسریٰ فلا کسریٰ بعدہ واذا ھلک قیصر فلا قیصر بعدہ والذی نفسی بیدہ لتنفقن کنوزھما فی سبیل اللہ (شیخین)

اس کسریٰ کے ختم ہو جانے کے بعد پھر کوئی دوسرا کسریٰ نہ ہو گا اور قیصر کے خاتمے کے بعد کوئی اور قیصر نہ ہو گا۔ قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے تم لوگ ان دونوں کے خزانوں پر قابض ہو کر راہ خدا میں خرچ کرو گے۔

۱۱۴۔ توکل علی اللہ کی عجیب مثال :

(جابرؓ) غزونا مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم غزاۃ قبل نجد فادرکنا النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی القائلۃ فی واد کثیر العضاۃ فنزل تحت شجرۃ فعلق سیفہ بغصن من اغصانھا وتفرق الناس فی الوادی یستظلون بالشجر فقال صلی اللہ علیہ وسلم ان رجلا اتانی وانا نائم فاخذ السیف فاستیقظت وھو قائم علی راسی والسیف صلتاً فی یدہ فقال من یمنعک منی قلت اللہ فشام السیف فھا ھو ذا جالس ثم لم یعرض لہ وکان ملک قومہ فانصرف حین عفی عنہ فقال لا اکون فی قوم ھم حرب لک (شیخین)

ہم لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں نجد کی طرف ایک غزوے کی شرکت کی۔ دوپہر کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسے میدان میں فروکش ہوئے جہاں بکثرت خاردار جھاڑیاں تھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک درخت کے نیچے ٹھہرے اور اپنی تلوار ایک شاخ میں لٹکا دی۔ دوسرے لوگ اس میدان میں درختوں کے سائے تلے دم لینے کے لیے اِدھر اُدھر بکھر گئے۔ اس موقعے پر ایک واقعہ ہوا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں بیان فرمایا : ایک شخص میرے پاس آیا۔ میں سو رہا تھا۔ اس نے تلوار ہاتھ میں لے لی۔ میں بیدار ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ ننگی تلوار ہاتھ میں لیے میرے سر پر کھڑا ہے۔ اس نے کہا کہ : تمھیں اس وقت مجھ سے کون بچا سکتا ہے ؟ میں نے کہا : اللہ بچائے گا۔ یہ سُن کر اس نے تلوار نیام میں کر لی۔ دیکھو وہ شخص وہ بیٹھا ہوا ہے۔ اس کے بعد اس کی طرف کوئی تعرض نہ فرمایا۔ وہ اپنی قوم کا سردار تھا جب اسے معاف کر دیا گیا تو اس نے کہا کہ میں ایسی قوم میں نہ ہوں گا جو حضورؐ سے برسرِ پیکار ہو۔

۱۱۵۔ عبداللہ بن سلام کا اسلام اور یہود کا متضاد تبصرہ:

(انسؓ) ...... ثم قال یا رسول اللہ ان الیھود قوم بھت ان علموا باسلامی قبل ان تسألھم بھتونی عندک فجاءت الیھود و دخل عبداللہ البیت فقال صلی اللہ علیہ وسلم ای رجل فیکم عبداللہ بن سلام؟ قالوا اعلمنا و ابن اعلمنا واخیرنا وابن اخیرنا فقال صلی اللہ علیہ وسلم افرأیتم ان اسلم عبداللہ؟ قالوا اعاذہ اللہ من ذلک فخرج عبداللہ الیھم فقال اشھد ان لا الہ الا اللہ واشھد ان محمداً رسول اللہ قالوا شرنا ابن شرنا ووقعوا فیہ۔ زاد فی روایۃ: قال ھذا الذی کنت اخافہ یارسول اللہ

(بخاری)

...... (عبداللہ بن سلام نے جو یہودیوں کے حبر تھے چند سوال وجواب کے بعد اسلام قبول کیا اس کے بعد عرض کیا کہ: یارسول اللہ! ہماری قوم یہود حیرت افزا حد تک بہتان طراز واقع ہوئی ہے۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم انھیں نہ بتائیں تو میرے اسلام لانے کا حال معلوم ہونے پر وہ حضورؐ کے سامنے وہ وہ تہمتیں تراشیں گے کہ حیرت ہونے لگے گی۔ اتنے میں کچھ یہود آگئے اور عبداللہ بن سلام دوسرے کمرے میں چھپ گئے۔ حضورؐ نے ان یہودیوں سے پوچھا کہ: تم میں یہ عبداللہ بن سلام کس مرتبے کے آدمی ہیں؟ انھوں نے جواب دیا کہ: سب سے بڑے عالم اور سب سے بڑے عالم کے فرزند، بہترین انسان اور بہترین انسان کے جگر گوشے۔ حضورؐ نے پوچھا کہ: اچھا بالفرض وہ اگر وہ اسلام قبول کرلیں؟ کہنے لگے کہ خدا اُن کو اس سے محفوظ رکھے۔ اس کے بعد ہی عبداللہ بن سلام نے باہر نکل کر کہا کہ: اشھد ان لا الہ الا اللہ واشھد ان محمداً رسول اللہ۔ یہ سن کر یہودیوں نے کہنا شروع کیا کہ: یہ بدترین خلائق ہے اور اس کا باپ بھی ایسا ہی تھا۔ اس کے بعد اور بھی بہت کچھ طعن کرتے رہے۔ دوسری روایت میں اس کے بعد عبداللہ بن سلام کا یہ قول بھی ہے کہ: حضورؐ نے ملاحظہ فرمایا؟ یہ خطرہ مجھے پہلے ہی تھا۔

۱۱۶۔ فتح ایران و روم کی خوشخبری:

(رجل من الصحابۃ) لما امر النبی صلی اللہ علیہ وسلم بحفر الخندق عرضت لھم صخرۃ حالت بینھم

غزوۂ احزاب کے موقعے پر جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خندق کھودنے کا حکم فرمایا تو کھدائی میں ایک بڑا پتھر بیچ میں رکاوٹ بن گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ

وبين الحفر فقام صلى الله عليه وسلم واخذ المعول ووضع رداءه ناحية الخندق وقال وتمت كلمات ربك صدقا وعدلا لا مبدل لكلماته وهو السميع العليم فبدر ثلث الحجر وسلمان الفارسي ينظر فبرق مع ضربته صلى الله عليه وسلم برقة ثم ضرب الثانية وقال وتمت كلمات ربك الآية فبدر الثلث الآخر فبرقت فرأها سلمان ثم ضرب الثالثة وقال تمت كلمات ربك الآية فبدر الثلث الباقي وخرج صلى الله عليه وسلم واخذ رداءه وجلس قال سلمان يا رسول الله رأيتك حين ضربت ما تضرب ضربة الا كانت معها برقة قال له يا سلمان رأيت ذلك؟ قال اي والذي بعثك بالحق قال فاني حين ضربت الضربة الاولى رفعت لي مدائن كسرى وما حولها ومدائن كثيرة حتى رأيتها بعيني فقال من حضر من اصحابه يا رسول الله ادع الله ان يفتحها علينا و يغنمنا ذراريهم ويخرب

وسلم کو معلوم ہوا تو اُٹھے اور ہاتھ میں کدال لے لی۔ اپنی چادر خندق کے کنارے رکھ دی۔ اور یہ آیت پڑھتے ہوئے ایک ضرب لگائی کہ: وَتَمَّتْ كَلِمٰتُ رَبِّكَ[1] صِدْقًا وَّعَدْلًا لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (تیرے ربّ کی بات صدق اور عدل میں پوری ہو چکی اس کے قوانین فطری کو کوئی بدل نہیں سکتا اور وہ سننے والا اور جاننے والا ہے) اس ضرب سے ایک تہائی پتھر نکل آیا اور ساتھ ہی ایک چمک پیدا ہوئی۔ سلمان فارسیؓ یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ پھر یہی آیت پڑھتے ہوئے ایک دوسری ضرب لگائی جس سے اسی طرح ایک روشنی چمکی اور ایک تہائی پتھر اور باہر آگیا۔ پھر تیسری ضرب یہی آیت پڑھتے ہوئے لگائی جس سے اسی طرح ایک نور چمکا اور پتھر کی آخری تہائی بھی باہر نکل آئی۔ یہ سب کچھ سلمانؓ بغور دیکھتے رہے اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی چادر لی اور بیٹھ گئے۔ سلمانؓ نے عرض کیا کہ: یا رسول اللہ! حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر ضرب کے ساتھ ایک روشنی کی چمک کیسی نظر آئی؟ فرمایا اے سلمانؓ! تم نے خود وہ چمک دیکھی تھی؟ عرض کیا! ہاں! اسکی قسم جس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے میں نے خود دیکھی۔ فرمایا: پہلی ضرب لگاتے ہی حجاب اٹھ گیا اور میں نے کسریٰ کے شہروں کو اور اس کے اردگرد کے بے شمار شہروں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ جو لوگ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس موجود تھے۔ انہوں نے عرض کیا کہ: یا رسول اللہ! دعا فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ ان شہروں کو ہمارے ہاتھوں سے فتح کرائے اور ان کی نسل کو ہمارا مالِ غنیمت بنائے اور ان شہروں کی

---

[1] آیت میں "كَلِمَةُ رَبِّكَ" ہے اور یہاں "كَلِمٰتُ رَبِّكَ" ہے ممکن ہے راوی کا سہو ہو۔

بایدینا بلادھم فدعا صلی اللہ علیہ وسلم بذلک ثم ضربت الضربۃ الثانیۃ فرفعت لی مدائن قیصر وما حولہا حتی رأیتہا بعینی فقالوا یا رسول اللہ فادع اللہ ان یفتحہا علینا و یغنمنا ذراریھم ویخرب بایدینا بلادھم فدعا صلی اللہ علیہ وسلم ثم ضربت الضربۃ الثالثۃ فرفعت لی مدائن حبشۃ وما حولہا من القریٰ حتی رأیتہا بعینی قال صلی اللہ علیہ وسلم عند ذلک دعوا الحبشۃ ما ودعوکم و اترکوا الترک ما ترکوکم (نسائی)

ویرانی ہمارے ہی ہاتھوں سے ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی۔ پھر فرمایا کہ: جب میں نے دوسری ضرب لگائی اور پردہ اُٹھ گیا۔ تو قیصر اور اس کے اردگرد کے شہروں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ صحابہ کرام رضؓ نے پھر ویسی ہی دعا کی درخواست کی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی۔ پھر فرمایا کہ: تیسری ضرب میں پردہ اُٹھا تو حبشہ اور اس کے اردگرد کی بستیوں کو بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ اس کے بعد ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تک اہلِ حبشہ تم سے تعرض نہ کریں تم بھی ان سے تعرض نہ کرو۔ بلکہ تُرک بھی جب تک تمھیں نہ چھیڑیں تم بھی اُس وقت تک ان سے باز رہو۔

حضرت ابوبکر صدیق رضؓ

۱۱۷۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ

(ابوھریرۃ رضؓ) ...... وما عرضت الاسلام علی احد الا کانت لہ کبوۃ الا ابوبکر رضؓ فانہ لم یتلعثم فی قولہ۔ (ریاض)

کوئی بھی ایسا شخص نہیں جس کے سامنے میں نے اسلام پیش کیا ہو اور اس میں تامل و پژمردگی نہ پیدا ہوئی ہو۔ لیکن ابوبکر صدیق رضؓ نے اقرارِ حق میں ذرا بھی توقف نہیں کیا۔

۱۱۸۔ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ

(ابوھریرۃ رضؓ) رفعہ: من اصبح الیوم منکم صائماً؟ قال ابوبکر رضؓ انا

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار لوگوں سے پوچھا کہ: آج تم میں سے روزے دار کون ہے؟ ابوبکر رضؓ نے

قال فمن تبع اليوم منكم جنازة قال ابوبكرؓ انا قال فمن اطعم اليوم منكم مسكينا؟ قال ابوبكرؓ انا قال فمن عاد اليوم منكم مريضا؟ قال ابوبكر انا قال صلی اللہ علیہ وسلم ما اجتمعن فی رجل الا دخل الجنۃ۔

(مسلم)

جواب دیا: میں ہوں۔ پھر فرمایا: تم میں سے آج جنازے کے ساتھ کون گیا ہے؟ ابوبکرؓ نے جواب دیا: مَیں۔ پھر پوچھا: تم میں سے آج کس نے مسکین کو کھانا کھلایا ہے؟ ابوبکرؓ نے جواب دیا: مَیں نے۔ پھر دریافت فرمایا: تم میں سے کس نے آج مریض کی عیادت کی ہے؟ ابوبکرؓ نے جواب دیا: میں نے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص کے اندر (ایک ہی دن میں) اتنی نیکیاں جمع ہو جائیں وہ جنتی ہے۔

حضرت عُمر فارُوقؓ

۱۱۹۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ:

(عقبۃ بن عامرؓ) رفعہ: لقد کان فیمن کان قبلکم ناس محدثون من غیر ان یکونوا انبیاء فان یکن فی امتی احد فانہ عمر۔

(شیخین)

گزشتہ اُمتوں میں بعض لوگ ایسے ہوتے تھے جو نبی تو نہ تھے مگر محدّث ہوتے تھے (جن سے اللہ تعالیٰ باتیں کرتا ہے) میری اُمت میں اگر کوئی محدّث ہُوا تو وہ عمرؓ ہوں گے۔

۱۲۰۔ حضرت عمرؓ سے شیطان بھاگتا ہے:

(سعدؓ) استأذن عمرؓ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم وعندہ نسوۃ من قریش یکلمنہ عالیۃ اصواتھن علی صوتہ فلما استأذن عمرؓ علیہ قمن یبتدرن الحجاب

چند قریشی عورتیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھی تھیں اور بڑی اونچی آواز سے باتیں کئے جا رہی تھیں۔ اتنے میں حضرت عمر فاروقؓ نے اندر آنے کی اجازت مانگی، اور یہ عورتیں جلدی جلدی اوٹ میں چھپنے لگیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کو اجازت دی۔ اندر آئے تو حضور صلی اللہ

فاذن له فدخل رهو صلی اللہ علیه وسلّم یضحك فقال عمرؓ اضحك الله سنك یا رسول الله بابی انت وامی ما اضحکك؟ قال عجبت من هؤلاء اللاتی کن عندی فلما سمعن صوتك ابتدرن الحجاب قال عمرؓ فانت یا رسول الله لاحق ان یھبن ثم قال عمرؓ ای عدوات انفسھن اتھبننی ولا تھبن رسول اللهؐ صلی الله علیه وسلّم؟ فقلن نعم انت افظ واغلظ من رسول الله صلی الله علیه وسلّم فقال صلی الله علیه وسلّم ایه یا ابن الخطاب والذی نفسی بیده ما لقیك الشیطان سالکا فجًا الا سلك فجًا غیر فجك۔ (شیخین)

علیہ وسلم ہنس رہے تھے۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ حضورؐ کو ہنستا رکھے میرے ماں باپ حضورؐ پر صدقے ہوں۔ اس وقت ہنسنے کا کیا سبب ہے؟ فرمایا: ان عورتوں پر ہنسی آئی جو ابھی میرے پاس بیٹھی تھیں، تمھاری آواز سنتے ہی یہ سب اوٹ میں چھپ گئیں حضرت عمرؓ نے کہا: یارسول اللہ! ان کو کسی اور کی بہ نسبت حضورؐ سے زیادہ ڈرنا چاہیے۔ پھر ادھر متوجہ ہو کر کڑکے کہ: اے اپنی جانوں کی دشمن! تم پر میری ہیبت طاری ہوتی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی ہیبت طاری نہیں ہوتی۔؟ کہنے لگیں: ہاں بات تو یہی ہے، کیونکہ تم حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت زیادہ سخت مزاج اور درشت کلام ہو۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ اے ابن خطابؓ! قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے۔ شیطان جب تمھیں کسی راستے پر چلتا ہوا ملتا ہے تو وہ اس راستے سے کترا کر اور راستے پر ہو جاتا ہے۔

حضرت عثمان غنیؓ

۱۲۱- حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ:

(عبد الرحمٰن بن خباب) شھدت النبیّ علیه وسلّم و یحث علی تجھیز جیش العسرة فقام عثمانؓ فقال یارسول الله علیّ مائة بعیر

میں اس وقت موجود تھا جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم جیش عسرت (غزوۂ تبوک) کا سامان مہیا کرنے کی لوگوں کو ترغیب دے رہے تھے۔ حضرت عثمانؓ نے کھڑے ہو کر عرض کیا: یارسول اللہ! فی سبیل اللہ میرے ذمے

باحلاسها واقتابها فی سبیل اللہ ثم حض علی الجیش فقام عثمانؓ فقال یارسول اللہ علی مائتا بعیر باحلاسها واقتابها فی سبیل اللہ ثم حض علی الجیش فقام عثمانؓ فقال یا رسول اللہ علی ثلاث مائة بعیر باحلاسها واقتابها فی سبیل اللہ فانا رأیت النبی صلی اللہ علیہ وسلم ینزل عن المنبر و ھو یقول ما علی عثمان ما عمل بعد ھذہ ما علی عثمان ما عمل بعد ھذہ۔ (ترمذی)

سو اونٹ مع اُن کے "احلاس واقتاب" کے رہے حضورؐ نے پھر ترغیب دلائی حضرت عثمانؓ نے کھڑے ہوکر عرض کیا کہ: یارسول اللہ! اللہ کی راہ میں میرے ذمے دو سو اونٹ مع ان کے "احلاس واقتاب" کے رہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر لوگوں کو ترغیب دلائی۔ عثمانؓ نے پھر کھڑے ہوکر عرض کیا کہ: یا رسول اللہ! خدا کی راہ میں میرے ذمے تین سو اونٹ مع اُن کے "احلاس واقتاب" کے رہے۔ اس وقت میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ: منبر سے یہ فرماتے ہوئے نیچے اُتر رہے ہیں کہ اس کے بعد عثمانؓ کچھ بھی کریں ان کا کوئی مواخذہ نہ ہوگا (یعنی اُن سے کوئی مواخذے والا کام ہی نہیں ہوگا)۔

حضرت علیؓ

۱۲۲۔ حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ:

(ام سلمہؓ) رفعتہ: لا یحب علیاً منافق ولا یبغضہ مؤمن (ترمذی)

حضرت علیؓ سے کوئی منافق محبت نہیں رکھتا، اور کوئی مومن بغض نہیں رکھتا۔

(علیؓ) رفعہ: انا مدینة العلم وعلی بابھا۔ (ترمذی)

میں علم کا شہر ہوں اور علیؓ اس کے دروازے ہیں۔

اسامہؓ اور زیدؓ

۱۲۳۔ اسامہ اور زید رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں:

(ابن عمرؓ) بعث النبی صلی اللہ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جیش روانہ فرمایا۔

علیه وسلم بعثاً و امّر علیهم اسامة بن زید فطعن بعض الناس فی امارته فقال صلی الله علیه وسلم ان تطعنوا فی امارته فقد کنتم تطعنون فی امارة ابیه من قبل و ایم الله ان کان لخلیقا للامارة و کان لمن احب الناس الیّ و ان هذا لمن احب الناس الیّ بعده۔
(شیخین، ترمذی)

اور اسامہ بن زیدؓ بن حارثہ کو امیرِ لشکر مقرر فرمایا۔ بعض لوگوں کو ان کی امارت پر اعتراض ہوا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: آج تم اس کی امارت پر معترض ہوتے ہو تو یہ کوئی نئی بات نہیں۔ اس سے پہلے تم اُس کے باپ (زیدؓ) کی امارت پر بھی معترض ہو چکے ہو۔ حالانکہ خدا کی قسم وہ اس کا اہل تھا اور یہ (اسامہؓ) بھی اپنے باپ کے بعد مجھے سب سے زیادہ پیارا ہے۔

۱۲۴۔ اسامہؓ رسول اللہ کی نظروں میں:

(عائشة رض) قالت عثر اسامة بعتبة الباب فشج فی وجهه فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم امیطی عنه الاذی فتقذرته فجعل یمص عنه الدم و یمجه عن وجهه ثم قال لو کان اسامة جاریة لحلیته و کسوته حتی انفقه۔ (قزوینی)

اسامہؓ بن زیدؓ (بچپن میں) چوکھٹ پر پھسل کر گر پڑے اور ان کے چہرے پر زخم آ گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ: عائشہؓ اس کا زخم صاف کر دو۔ مجھے گھن (کراہت) سی آئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود اس کے زخم کو چوس چوس کر تھوکتے رہے۔ پھر فرمایا کہ: اگر اسامہؓ لڑکی ہوتا تو میں جی بھر کے اُسے زیور اور کپڑے پہناتا۔

حضرت ابوذر غفاریؓ

۱۲۵۔ اُمّتِ محمدیہ کا واحد درویش ابوذر غفاریؓ:

(ابراهیم بن الاشتر) : ان اباذرؓ حضره الموت بالربذة فبکت امرأته فقال ما یبکیك؟ قالت ابکی انه لا یدان لی بنفسك و لیس عندی ثوب یسعك کفناً فقال لا تبکی فانی

ربذے میں حضرت ابوذر غفاریؓ کی وفات کا وقت قریب آیا تو ان کی بیوی رونے لگیں۔ آپ نے پوچھا کہ: روتی کیوں ہو؟ بولیں کہ: اس لیے رو رہی ہوں کہ تمھارے پاس کوئی مال نہیں اور میرے پاس کوئی ایسا کپڑا نہیں جو تمھارے کفن کے لیے کافی ہو۔ ابوذرؓ نے

سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول لیموتن رجل منکم بفلاۃ من الارض یشھدہ عصابۃ من المؤمنین فکل من کان معی فی ذلک المجلس مات فی جماعۃ و قریۃ ولم یبق منھم غیری و قد اصبحت بالفلاۃ اموت فراقبی الطریق فانک سوف تری ما اقول فانی ما کذبت ولا کذبت فبینما ھی کذلک اذا القوم تخب بھم رواحلھم حتی وقفوا علیھا فقالوا مالک؟ قالت امرؤ من المسلمین تکفنوہ وتوجروا قالوا ومن ھو؟ قالت ابوذر ففدوہ بآبائھم وامھاتھم ووضعوا سیاطھم یبتدرونہ فقال ابشروا انتم النفر الذی قال فیکم النبی صلی اللہ علیہ وسلم ما قال فانشدکم باللہ لا یکفننی رجل منکم کان عریفا او امیرا او بریدا فکل القوم قد نال من ذلک شیئا الا فتی من الانصار فقال عندی ثوبان فی عیبتی من غزل امی قالت انت صاحبی۔

(احمد، بزار)

کہا کہ: اس لیے مت رو۔ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ تم (صحابہؓ) میں سے ایک شخص چٹیل میدان میں مرے گا اور مومنوں کی جماعت وہاں پہنچ جائے گی۔ اس وقت حضورؐ کی محفل میں جتنے آدمی تھے وہ سب کے سب یا تو کسی جماعت کی موجودگی میں مرچکے ہیں یا کسی بستی میں۔ اب ان میں سے میرے سوا کوئی بھی باقی نہیں۔ بس میں ہی اس میدان میں دم توڑ رہا ہوں تم راستے پر نظر جمائے رہو۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، وہ عنقریب ہی اپنی آنکھوں سے دیکھ لوگی۔ نہ میں غلط کہہ رہا ہوں نہ مجھ سے غلط کہا گیا ہے۔ وہ انتظار کر رہی تھیں کہ ایک قافلہ نظر آیا جس کے اونٹ تیزی سے قدم بڑھاتے چلے آرہے تھے۔ یہ قافلہ ان کے پاس آکر کھڑا ہوگیا اور پوچھا کہ: تم یہاں کیوں کھڑی ہو۔ انھوں نے جواب دیا کہ: ایک مرد مومن ہے جس کی تکفین اور ثواب تمھارے سپرد ہے۔ قافلے والوں نے پوچھا۔ وہ کون آدمی ہے؟ انھوں نے کہا: ابوذرؓ۔ ابوذرؓ کا نام سن کر وہ سب بول اٹھے کہ: تمھیں مبارک ہو تم ہی وہ جماعت ہو جس کے متعلق حضورؐ نے یہ پیش گوئی فرمائی ہے مگر میں تمھیں اللہ کا واسطہ دے کر یہ فرمائش کرتا ہوں کہ میری تکفین کوئی ایسا آدمی نہ کرے جو حکومت کا مقرر کردہ چودھری، امیر یا قاصد ہو۔ اتفاق سے اس قافلے میں کوئی ایسا نہ تھا جو کسی نہ کسی عہدے سے سرفراز نہ ہو۔ صرف ایک انصاری نوجوان اس سے مستثنیٰ تھا۔ اس نے کہا کہ: میرے تھیلے میں دو کپڑے ہیں جو میری والدہ کے ہاتھ کے کتے بنے ہوئے ہیں۔ ابوذرؓ نے کہا: بس تم ہی میرے رفیق ہو۔

حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب

۱۲۶ - سید الشہداء کون ہے (حضرت حمزہؓ) :

(ابن عباسؓ) رفعہ : سید الشهداء یوم القیامة حمزة بن عبد المطلب ورجل قام الی امام جائر فامره ونهاه فقتله۔ (اوسط بسند ضعیف)

قیامت کے دن شہیدوں کے سردار ایک تو حمزہ بن عبدالمطلب ہوں گے ۔ اور دوسرا ہر وہ شخص ہوگا جو ظالم امام کے سامنے امر و نہی کا فرض ادا کرنے کے جرم میں قتل کر دیا جائے ۔

حضرت ورقہؓ بن نوفل

۱۲۷ - ورقہ بن نوفل کا اسلام :

(عائشۃؓ) رفعته : لا تسبوا ورقة فانی رأیت له جنة او جنتین ۔ (بزار)

ورقہ بن نوفل کو بُرا بھلا نہ کہو ، میں نے اُن کے لیے ایک یا دو جنتیں دیکھی ہیں ۔

خدیجہؓ بنت خویلد

۱۲۸ - حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خدیجہؓ سے قلبی تعلق :

(عائشۃؓ) ما غِرت علی احد من نساء النبی صلی الله علیه وسلم. الّا علی خدیجةؓ قط وما رأیتها قط ولکن کان یکثر ذکرها وربما ذبح الشاة

مجھے کبھی کسی عورت پر اتنا رشک نہیں آیا جتنا کہ خدیجہؓ پر آیا، حالانکہ میں نے ان کو کبھی دیکھا بھی نہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم اکثر ان کا ذکر فرمایا کرتے تھے، بعض اوقات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کوئی بکری

ثم يقطعها اعضاء ثم يبعث فی صدائق خدیجة وربما قلت له كأن لم يكن فی الدنيا امرأة الا خدیجة فيقول انها كانت وكانت وكان لی منها ولد۔ (شیخین، ترمذی)

ذبح فرماتے تو اس کے حصے کر کے خدیجہؓ کی سہیلیوں کو بھی بھیج دیا کرتے تھے۔ بعض اوقات تو میں کہہ دیتی کہ: کیا دنیا میں خدیجہؓ کے سوا اور کوئی عورت ہی موجود نہیں؟ اُس وقت حضورؐ فرماتے کہ: وہ ایسی تھیں اور ایسی تھیں اور اُن سے اللہ تعالیٰ نے مجھے اولاد بھی دی۔

مریمؑ، خدیجہؓ، فاطمہؓ اور آسیہؓ

۱۲۹۔ چار ممتاز ترین عورتیں:

(انسؓ) رفعه: حسبك من نساء العلمين مريم بنت عمران و خديجة بنت خويلد وفاطمة بنت محمد واسية امرأة فرعون۔

(ترمذی)

دنیا کی عورتوں میں تو چار نمونے بس ہیں۔ مریمؑ بنت عمران، خدیجہؓ بنت خویلد، فاطمہؓ بنت محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم اور آسیہؓ زوجہ فرعون۔

فاطمہؓ و علیؓ

۱۳۰۔ فاطمہؓ اور علیؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور عائشہؓ کی نگاہ میں:

(عائشةؓ) سئلت اى الناس كان احب الى النبى صلى الله عليه وسلم؟ قالت فاطمة قيل من الرجال؟ قالت زوجها ان كان ما علمت صواما قواما۔

(ترمذی)

حضرت عائشہؓ سے دریافت کیا گیا کہ: حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ کون محبوب تھا۔؟ جواب دیا: فاطمہؓ۔ پوچھا گیا کہ: مردوں میں؟ بولیں: فاطمہؓ کا شوہر۔ میرے علم کے مطابق وہ (علی مرتضیٰؓ) بڑے ہی روزے دار اور شب زندہ دار تھے۔

حضرت عائشہ رض

۱۳۱۔ عائشہ رض کی فضیلتِ علمی:

(ابوموسیٰ رض) ما اشکل علینا اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حدیث قط فسألنا عائشۃ الا وجدنا عندھا منہ علما۔ (ترمذی)

ہم صحابہ نبوی کو جب بھی کسی حدیث میں دشواری پیش آئی اور ہم نے اُسے عائشہ رض سے دریافت کیا تو اس کا واقف کار پایا۔

۱۳۲۔ علمِ عائشہ رض:

(الزھری) ارسلہ: لوجمع علم نساء ھذہ الامۃ فیھن ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان عائشۃ رض اکثر من علمھن۔ (کبیر)

اگر اس اُمت کی تمام عورتوں کا علم مع تمام ازواجِ مطہرات کے علم کے اکٹھا کیا جائے تو تنہا حضرت عائشہ رض کا علم ان سب سے زیادہ نکلے گا۔

زینب رض بنت جحش

۱۳۳۔ زینب رض بنت جحش (اُم المومنین)۔

(عائشہ رض) قالت عائشۃ رض فارسلنا زینب رض بنت جحش وھی التی کانت تسامینی منھن فی المنزلۃ عند النبی صلی اللہ علیہ وسلم ولم ار امرأۃ قط خیرا فی الدین من

.... اُم المومنین زینب بنت جحش ہی وہ عورت تھیں جو حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نگاہوں سے میری برابری کرتی تھیں۔ میرے علم میں زینب رض تمام عورتوں سے زیادہ دین دار۔ خدا ترس اور راست گفتار تھیں۔ صلۂ رحمی میں سب سے

زینب وافقی للہ واصدق حدیثا واوصل للرحم واعظم صدقۃ واشد ابتذالا لنفسھا فی العمل الذی تصدق بہ وتقرب بہ الی اللہ تعالیٰ.........
(شیخین، ترمذی، نسائی)

آگے اور صدقات دینے میں سب سے بڑھ کر تھیں۔ کارِ خیر اور عمل تقرب کر کے بھی اپنے آپ کو سب سے زیادہ حقیر سمجھتی تھیں۔

اُمّتِ محمّدیؐ

۱۳۴۔ یہود و نصاریٰ اور مسلمانوں کے اجر کی تمثیل :

(ابوموسیٰؓ) رفعہ : مثل المسلمین والیھود والنصاریٰ کمثل رجل استأجر قوما یعملون لہ عملا الی اللیل علی اجر معلوم نعملوا لہ الی نصف النھار فقالوا لا حاجۃ لنا الی اجرک الذی شرطت لنا وعملنا باطل فقال لا تفعلوا اکملوا بقیۃ عملکم وخذوا اجرکم کاملاً فالوا ترکوا واستأجر اٰخرین بعدھم فقال اکملوا بقیۃ یومکم ولکم الذی شرطت لھم من الاجر نعملوا حتی اذا کان حین صلوۃ العصر قالوا ظل عملنا باطل ولک الاجر الذی جعلت لنا فقال اکملوا بقیۃ عملکم فانما بقی

اہل اسلام، یہود اور نصاریٰ کی مثال یوں سمجھو کہ جیسے ایک شخص نے کچھ آدمیوں کو ایک مقررہ اُجرت پر صبح سے شام تک کی مزدوری پر لگایا۔ آدھا کام کرنے کے بعد وہ کہنے لگے کہ: تم نے جو مزدوری مقرر کی ہے ہمیں اس کی ضرورت نہیں اور اب تک جو کچھ ہم کر چکے ہیں وہ رائیگاں (بلے معاوضہ) ہی سہی۔ اس نے کہا کہ: بھئی! بقیہ دن بھی ختم کر لو اور اپنی پوری مزدوری لے لو۔ ان سب نے انکار کر دیا کام چھوڑ کر چلے گئے۔ اس کے بعد اُس نے دوسرے آدمیوں کو اسی کام پہ لگایا اور کہا کہ: بقیہ دن ختم کر لو تو تمھیں پورے دن کی مزدوری مل جائے گی، جو میں نے اُن لوگوں سے طے کی تھی (یعنی کام چھوڑ جانے والوں سے) ان (دوسرے) لوگوں نے کام شروع کیا، اور جب عصر کا وقت ہوا تو کہنے لگے کہ: ہمارا کیا دھرا سب اکارت (بلے اجرت) رہا اور جو مزدوری تم دینے

من النهار شئ يسير فابوا فاستأجر قوماً ان يعملوا بقية يومهم فعملوا بقية يومهم حتى غابت الشمس فاستكملوا اجر الفريقين كليهما فذلك مثلهم ومثل ما قبلوا من هذا النور۔ (بخاری)

وہ تم ہی کو مبارک ہو۔ اس نے کہا کہ: بقیہ دن پورا کرلو اب تھوڑا ہی سا وقت رہ گیا ہے۔ مگر ان سب نے انکار کر دیا۔ آخر اس نے کچھ اور لوگوں کو بقیہ کام پر لگایا اور انھوں نے غروب آفتاب تک کام کر کے دونوں ہی فریقوں کی مزدوری پوری پوری لے لی۔ گزشتہ اُمتوں کی اور ان لوگوں کی جنھوں نے اس نور (اسلام) کو قبول کیا ہے، یہی مثال ہے۔

شفاعتِ اُمّت

۱۳۵۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت اہلِ کبائر کے لیے ہے شفیع دوسرے بھی ہوں گے:

(ابو سعیدؓ) رفعه: انما شفاعتی فی اهل الکبائر و انه لیؤمر برجل الی النار فیمر برجل کان سقاه شربة ماء علی ظمأ فیعرفه فیقول الا تشفع لی؟ فیقول ومن انت؟ فیقول الست انا سقیتک الماء یوم کذا وکذا؟ فیعرفه فیشفع فیه فیرد من النار الی الجنة۔ (رزین)

میری شفاعت (سفارش) ان لوگوں کے لیے ہے جو کبائر کے مرتکب ہوئے ہوں۔ بروزِ حشر ایک شخص کو جہنّم میں لے جانے کا حکم ہوگا اور اس کا گزر ایک ایسے شخص کے پاس سے ہوگا جس کو اس نے کبھی پیاس کی حالت میں پانی پلایا تھا۔ وہ اسے پہچان کر کہے گا کہ: کیا تم میرے لیے شفاعت نہ کرو گے؟ وہ پوچھے گا کہ: تم کون ہو؟ وہ کہے گا کہ: میں نے تم کو فلاں روز پانی نہیں پلایا تھا؟ پھر وہ اُسے پہچان لے گا اور سفارش کرے گا، جس کی وجہ سے وہ جہنّم سے ہٹا کر جنّت میں لے جایا جائے گا۔

بنی دوس

۱۳۶۔ بنی دوس کے لیے دُعا (بحالتِ کفر)

(ابو ھریرةؓ) جاء الطفیل بن عمرو

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس طفیل بن عمرو دوسی

الدوسی الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال لو ان دوسا قد هلکت عصت وابت فادع اللہ علیهم فظن الناس انه سیدعو علیهم فقال اللهم اهد دوسا وائت بهم۔
(شیخین)

نے آ کر عرض کیا کہ: کاش! بنی دوس کے لوگ ہلاک ہو جاتے۔ کیونکہ انھوں نے نافرمانی کی ہے اور حق سے منہ موڑا ہے۔ حضورؐ اُن کے لیے بد دعا فرمائیں۔ لوگوں کو گمان ہُوا کہ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے لیے بد دُعا فرمائیں گے لیکن حضورؐ نے یُوں دُعا فرمائی کہ: اے اللہ! بنی دوس کو ہدایت دے اور اُن کو مجھ سے ملا دے۔

۱۳۷۔ لباسِ نبویؐ:

(انسؓ) لبس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الصوف واحتذی المخصوف واکل بَشَعًا ولبس خشنًا فقیل للحسن ما البشع: قال غلیظ الشعیر ما کان یسیغه الا بجرعة ماء۔
(ترمذی بضعف)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صوف (اُونی کپڑے) اور پیوند دار جُوتی پہنی ہے۔ بَشِع کھایا ہے اور موٹا لباس پہنا ہے۔ حسنؓ سے دریافت کیا گیا کہ: بَشِع کیا چیز ہے؟ انھوں نے بتایا کہ: جَو کا موٹا آٹا جو پانی کے بغیر حلق سے نیچے نہ اتر سکے۔

۱۳۸۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آزمائشیں اور غذا:

(انسؓ) رفعه: لقد اخفت فی اللہ ما لم یُخَفْ احد واوذیت فی اللہ ما لم یؤذَ احد قبلی ولقد اتی علیّ ثلاثون من بین یوم ولیلة ومالی ولبلال طعام الا شیٔ یواریه ابط بلال۔ (ترمذی)

اللہ کی راہ میں جتنا خوف مجھے دلایا گیا ہے اور جتنی اذیت مجھے پہنچائی گئی ہے، مجھ سے پہلے کسی کو بھی اتنا نہ ڈرایا گیا ہے اور نہ اتنی ایذا دی گئی ہے۔ مجھ پر پورے مہینے کے دن اور راتیں ایسی بھی گذری ہیں جب کہ مجھے اور بلالؓ کو صرف اتنا کھانا نصیب ہوتا جو بلالؓ کی بغل میں چھپ جائے۔

۱۳۹۔ صحابہ کی غذائی حالت :

(ابن عمرؓ) ما شبعنا من تمر حتی فتحنا خیبر۔ (بخاری)

فتح خیبر سے پہلے ہم لوگوں نے پیٹ بھر کھجور بھی نہیں کھائی تھی ۔

۱۴۰۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مالی حالت :

(عائشہؓ) ...... توفی النبی صلی اللہ علیہ وسلّم ودرعہ مرھونۃ عند یھودی فی ثلاثین صاعًا من شعیر۔ (شیخین، نسائی)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ایسی حالت میں ہوئی تھی کہ ایک صاع جَو کے عوض حضور علیہ الصلوٰۃ والسّلام کی زرہ ایک یہودی کے پاس رہن تھی ۔

۱۴۱۔ پوشاکِ رسول اللہ کی قلت :

(عائشہؓ) ما رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم یسب احداً ولا یُطوی لہ ثوب ۔ (قزوینی)

میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی کو گالی دیتے نہیں دیکھا اور نہ یہ دیکھا کہ حضورؐ کا کوئی کپڑا تہ کرکے رکھا گیا ہو ۔

۱۴۲۔ تنگی میں صبر اور فراخی میں بے صبری :

(عبد الرحمٰن بن عوف) قال ابتلینا مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم بالضراء فصبرنا ثم ابتلینا بالسراء بعدہ فلم نصبر۔

(ترمذی)

ہم لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ جب تنگی معاش میں مبتلا تھے تو صبر سے کام لیتے تھے ۔ لیکن (حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد) جب فراخی کی آزمائش میں پڑے تو بے صبر ہو گئے ۔

۱۴۳۔ فقر و غنا مال سے ہے یا دل سے ؟ :

(ابوذرؓ) یا اباذر تقول کثرۃ المال الغناء قلت نعم قال تقول

اے ابوذرؓ کیا مال کی کثرت کو تم امیری سمجھتے ہو؟ میں نے عرض کیا : ہاں ! پھر فرمایا : کیا مال کی کمی کو

فلعلة المال الفقر؟ فقلت نعم قال ذلك ثلاثاً ثم قال الغنی فی القلب والفقر فی القلب من کان الغنی فی قلبه فلا یغنیه ما اکثر فی الدنیا و انما تصیر نفسه کریما - (کبیر بخنی)

تم فقر سمجھتے ہو؟ میں نے عرض کیا: ہاں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سوال تین بار فرمایا۔ اس کے بعد فرمایا کہ: غنا دل میں ہوتی ہے اور فقیری کا تعلق بھی دل ہی سے ہے۔ جس کے دل میں غنا ہو تو اسے دنیوی مال کی کثرت غنی نہیں کرتی، بلکہ اس کے دل میں یہ شرفِ غنا پیدا ہو جاتا ہے۔

۱۴۴۔ مال کی موجودگی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بے چینی:

(ام سلمۃؓ) دخل علیّ رسول اللہ صلّی اللہ علیه وسلم وهو ساهم الوجه فحسبت ذلك من وجع فقلت یا رسول اللہ مالك ساهم الوجه؟ فقال من اجل الدنانیر السبعة التی اتتنا امس امسینا و لم ننفقها۔ (احمد، موصلی)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار میرے پاس تشریف لائے۔ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تیوریاں چڑھی ہوئی تھیں۔ مجھے خیال ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کہیں درد ہے۔ میں نے پوچھا کہ: یا رسولؐ اللہ! حضورؐ کی تیوریاں کیوں چڑھی ہوئی ہیں۔ فرمایا: ان سات دیناروں کی وجہ سے جو میرے پاس کل آئے تھے۔ رات گذر گئی اور ہم نے ان کو تقسیم نہیں کیا۔

۱۴۵۔ رسولِ خدا کی غذائی پسند:

(عائشۃؓ) اتی رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم بقدح فیه لبن و عسل فقال شربتین فی شربة وادمین فی قدح لا حاجة لی به اما انی لا ازعم انه حرام اکره ان یسألنی اللہ عن فضول الدنیا یوم القیامة۔ (اوسط، بلین)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک پیالہ لایا گیا، جس میں دودھ اور شہد تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ایک حوض میں دو قسم کے پانی۔ اور ایک پیالے میں دو طرح کے سالن؟ مجھے یہ نہیں چاہیئے۔ میں اسے حرام نہیں سمجھتا، بلکہ میں یہ پسند نہیں کرتا کہ اللہ تعالیٰ مجھ سے قیامت کے دن دنیا کی زائد از ضرورت چیزوں کے متعلق باز پرس فرمائے۔

۱۴۴ - ابن عمرؓ کو نصیحتِ نبویؐ :

ابن عمرؓ اخذ النبی صلی اللہ علیہ وسلم بمنکبی وقال کن فی الدنیا کانک غریب او عابر سبیل وکان ابن عمر یقول اذا امسیت فلا تنتظر الصباح واذا اصبحت فلا تنتظر المساء وخذ من صحتک لمرضک ومن حیاتک لموتک۔ (بخاری، ترمذی)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار مونڈھے پکڑ کر فرمایا کہ : دنیا میں تم اس طرح رہو، جیسے غریب الوطن یا مسافر رہتا ہے۔
ابن عمرؓ کہا کرتے تھے کہ : جب شام ہو تو صبح کا اور جب صبح ہو تو شام کا انتظار مت کرو۔ اپنی صحت سے اتنا ہی فائدہ اٹھاؤ جو مرض کے وقت کام آئے اور اپنی زندگی سے اتنا ہی فائدہ حاصل کرو جو موت کے لیے مفید ہو۔

۱۴۵ - عَنْ ثَوْبَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَا خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ - (ابوداؤد، ترمذی) مشکوٰۃ - ص۴۶۵ -)

حضرت ثوبان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے انھوں نے کہا کہ حضور علیہ الصّلاۃ والسّلام نے فرمایا کہ میں خاتم النبیینؐ ہوں - میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا -

۱۴۶ - عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خُتِمَ بِيَ الرُّسُلُ - (بخاری، مسلم، مشکوٰۃ ص۵۱۱)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا کہ رسول کریم علیہ الصّلاۃ والتسلیم نے فرمایا کہ رسولوں کا سلسلہ مجھ پر ختم کر دیا گیا -

صلی اللہ علیہ وسلم

رسول نمبر

نقوش

۷

رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۱۲ ٹیلی فون نمبر ۵۲۵۲۵

زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمائندہ

نقوش

رسولؐ نمبر

جلد ہفتم

شمارہ نمبر ۱۳۰

جنوری ۱۹۸۴ء

مُدیر:
محمد طفیل

اِدارۂ فروغِ اُردو ۔ لاہور

قیمت لائبریری ایڈیشن : ۱۲۵ روپے

ترتیب

مکالماتِ رسولؐ

کاتبانِ وحی

سیرُ الطیبات (سرورِ کائنات کی بیٹیوں کا ذکر)

عہدِ نبویؐ کے چند نامور سپہ سالار

حضرت حمزہ بن عبد المطلبؓ

حضرت زید بن حارثہؓ

حضرت ابوعبیدہ بن الجراحؓ

سیدنا حضرت علی المرتضیٰؓ

سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ

سیدنا حضرت عمر فاروقؓ

حضرت عمرو بن العاصؓ

حضرت خالد بن ولیدؓ

حضرت اسامہ بن زیدؓ

رسولؐ اللہ کے فیصلے

رسول اکرمؐ کی حکمتِ سیاست

بارگاہِ رسالت میں حاضر ہونے والے وفود

النبی الامّی

محمد طفیل پرنٹر پبلشر و ایڈیٹر نے نقوش پریس سے چھپوا کر ادارہ فروغِ اردو، لاہور سے شائع کیا

طلوع

چیونٹی، ایک ننھی سی جان!
جب سلیمان علیہ السلام کی فوج ایک مقام سے گزرنے والی تھی تو ایک چیونٹی نے دُوسری چیونٹیوں سے کہا:
"اپنا بچاؤ کر لو، فوج آ رہی ہے"۔
یہ بات سلیمان علیہ السلام نے آسمان پر سن لی، کیونکہ وہ ایسی قدرت رکھتے تھے۔
قرآن میں یہ واقعہ یُوں آیا ہے:
وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ○ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَتَوْا عَلٰى وَادِ النَّمْلِ ۙ قَالَتْ نَمْلَةٌ يّٰۤاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ ۚ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ ۙ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ○ فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا۔ (سورۃ النمل)
(اور سلیمان کے لیے ان کا لشکر جمع کیا گیا جن بھی اور انسان بھی اور پرندے بھی اور انھیں (صف بندی کے لیے) روکا جاتا تھا یہاں تک کہ ایک مرتبہ جب وہ چیونٹیوں کے میدان میں پہنچے ایک چیونٹی نے کہا کہ اے چیونٹیو! اپنے سوراخوں میں جا گھسو کہیں سلیمان اور ان کا لشکر تمہیں روند نہ ڈالیں اور انھیں خبر بھی نہ ہو (سلیمان) اس بات پر مسکرا کر ہنس پڑے)
چیونٹی کی آواز، ایک نحیف آواز، حضرت سلیمان کو آسمانوں پر سنائی دیتی ہے —— اور جو لفظ کُن سے پُوری کائنات تخلیق کر سکتا ہو اُس نے بھی تو اپنے بندے کی آواز سنی ہو گی!
آوازیں
"چیونٹیو! گھس جاؤ اپنے گھروں میں۔"
محمد طفیل کی بھی التجا پوری ہو —— اُس محمد طفیل کی کہ جو خود بہ طفیلِ محمدؐ ہے!

محمد طفیل

اس شمارے میں

اس جلد میں مضمون تھوڑے ہیں مگر بے حد اہم ہیں۔ پہلا مضمون مکالماتِ رسول ؐ ہے۔ یہ مضمون میرے اُسی جذبہ کی ترجمانی کرتا ہے کہ حضورؐ کی زبانِ مبارک سے جو کچھ نکلا ہو اُسے ان نمبروں میں بھی محفوظ کیا جائے۔ "دربارِ رسالت کے فیصلے" بھی اسی نوعیت کا مضمون ہے۔ جو اپنے اندر حکمتوں کے خزانے رکھتا ہے۔ ایک نکتہ کی وضاحت سے ہزار نکتوں کی وضاحت ہوتی ہے۔ یہ مضامین ہماری زندگی کے رہنما مضامین ہیں، کُتبہ ہیں!

کاتبانِ وحی پر اتنی تفصیل سے مضمون اردو کی کسی سیرت کی کتاب میں نہ ملے گا۔ ابوبکر صدیقؓ بھی کاتبِ وحی، خالدؓ بن ولید بھی کاتبِ وحی اور ابو ایوب انصاریؓ بھی کاتبِ وحی!

اسی طرح سیر الطیبات پر مضمون، جو حضورؐ کی بیٹیوں سے متعلق ہے خاصی تفصیل سے پیش کیا جا رہا ہے۔

عہدِ نبویؐ کے سپہ سالار، یوں تو ہم نے قبل ازیں چوتھی جلد میں بھی 'مہماتِ رسول ؐ' کے تحت چند مضامین پیش کیے تھے مگر یہ مضمون قدرے مختلف ہے، یہاں بحث کون کس محاذ پر لڑا اور کیا کارنامے انجام دئے۔

سیرت ابنِ ہشام، جو سیرت کی بنیادی کتاب ہے۔ اس میں حضورؐ کی خدمت میں پہنچنے والے وفود کا اتنا تفصیل سے ذکر نہیں ہے جتنا کہ اس مضمون میں ہے۔ یعنی یہ مضمون اس موضوع پر اضافہ ہوا۔

آخر میں "النبی الامی" مضمون ہے۔ وُہ ہستی کہ جو جامع کمالات تھی۔ جن کی زبان سے نکلا ہُوا ایک ایک لفظ حکمت رکھتا تھا۔ وُہ اُمّی تھا، ان کی زبان پر جو کچھ تھا وہ منشائے خداوندی تھا، وہ علمِ خداوندی تھا۔ یہاں اس مضمون کی اشاعت اسی نکتہ کی وضاحت کے لیے ہے۔ کون جان سکتا تھا کہ جو ایسے حکمت آمیز کلمات کہہ رہا ہے وہ اُمّی ہے۔ جو ایسے فیصلے دے رہا ہے وُہ اُمّی ہے۔

ایک مستشرق نے " THE HUNDRED " کتاب میں رسولؐ اللہ کو پہلا نمبر ایسے تو نہیں دیا جبکہ اس نے عیسٰی علیہ السلام کو تیسرا نمبر دیا حالانکہ عقیدتاً اُسے عیسٰی علیہ السلام کو پہلا نمبر دینا چاہیے تھا۔

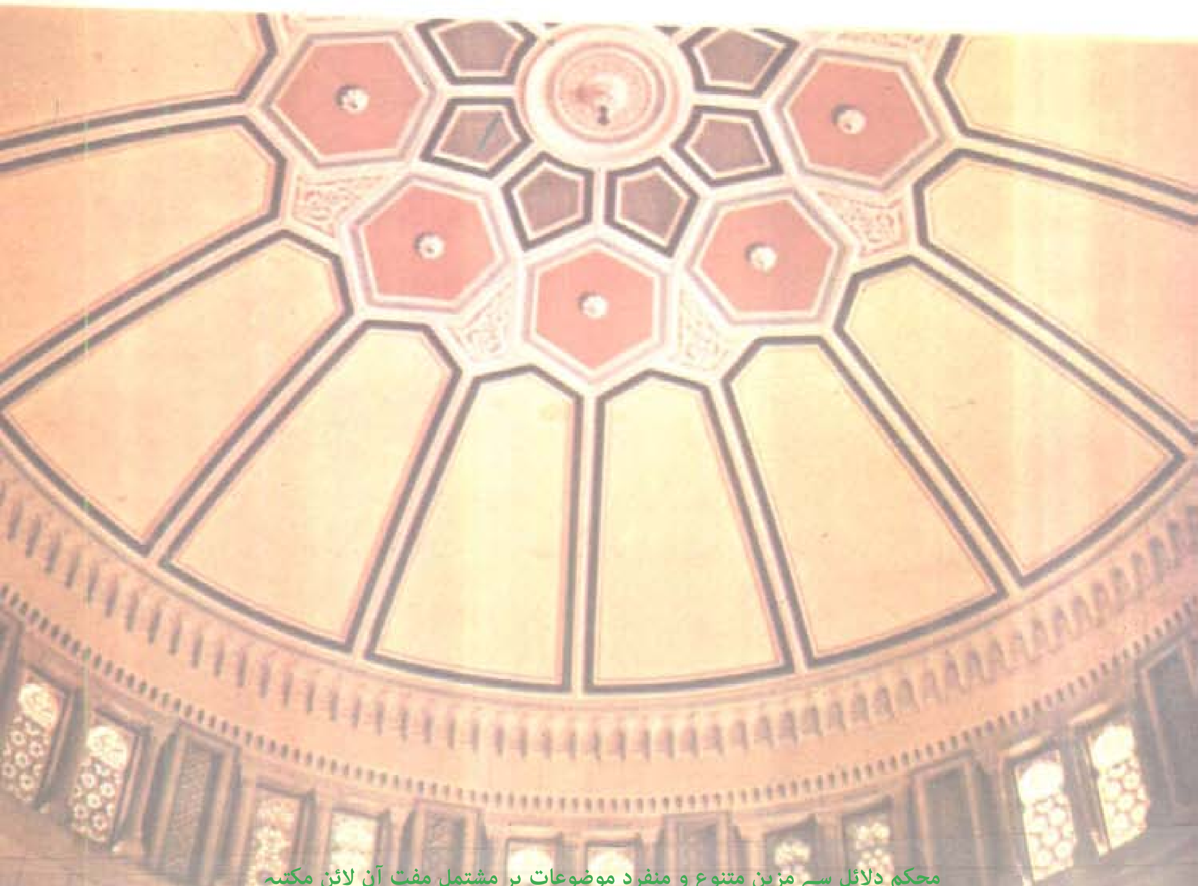
یہ فضیلتیں، یہ عظمتیں ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ہیں۔

محمد نقوش

ادْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ
الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ

آپ اپنے پروردگار کی راہ کی طرف بلائیے حکمت سے اور اچھی نصیحت سے
اور ان کے ساتھ بحث کیجیے پسندیدہ طریقہ سے ۔ (النحل: ۱۲۵)

مکالماتِ رسول ﷺ



مکالماتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

پروفیسر فیض اللہ منصور

اصنافِ ادب میں مکالمہ منفرد خصوصیات کا حامل ہے، تقریر و تحریر کے مقابلہ میں یہ صنف اثر انگیزی میں کہیں بڑھ کر ہے کیونکہ متکلم اور مخاطب کے درمیان براہ راست گفتگو ہوتی ہے۔ مزید برآں اس میں آمد کی سی خصوصیات بھی پائی جاتی ہیں۔ مکالمہ متکلم کی شخصیت، اس کے مزاج و مرتبہ اس کے علم و فضل، فکر و نظر کی افتاد، اس کے ظاہر و باطن کے احوال، غرضیکہ متکلم کے ہر پہلو کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ ماحول کے تقاضوں کا بھی عکاس ہوتا ہے۔ اس کے ذریعے افہام و تفہیم کا جو ماحول پیدا ہوتا ہے وہ کسی بھی دوسری صنفِ ادب میں ممکن نہیں، نیز یہ تعلیم و تعلم کا بھی مؤثر ترین ذریعہ ہے۔

عالمی ادب میں عظیم مکالمات کی فہرست زیادہ لمبی چوڑی نہیں، جدید تحقیق کے مطابق اس کی ابتدا سسلی کے "سوانگ ادب" سے ہوئی۔ یہ سوانگ نثر مسجع میں لکھے گئے تھے۔ یہ ناپید ہیں۔ ان کے بعد افلاطون، جو سسلی کے سوانگ ادب سے واقف تھا، نے مکالمات کو اپنی فکر کا ذریعۂ اظہار بنایا۔ وہ اپنی مشہور زمانہ اکاڈیمی میں اپنے طلبہ کو مکالمات کے ذریعہ اپنے فلسفیانہ افکار کی تعلیم دیتا تھا۔ افلاطون نے مکالمات کو ایک نیا اور منفرد اسلوب دیا۔ اور اپنے فلسفیانہ افکار کے اظہار کے لیے جس طریقے سے اُس نے اپنایا یہ صرف افلاطون کا حصہ ہے۔ افلاطون کے بعد دو فرانسیسیوں برنارڈ ڈی فانٹی نیلی اور فینی لون نے "روحوں کے مکالمات" کے نام سے اپنے افکار کو پیش کیا۔ تاریخِ ادب میں جان۔ ڈی ویلڈی، ٹرکواٹو ٹاسو ڈانو برونو۔ گلیلیو وغیرہ کے مکالمات کا ذکر بھی آتا ہے۔ ان اہم مکالمات میں سے کچھ کا موضوع، نیچرل تھیالوجی، حیات صوفیہ اور ما فوق الفطرت مسائل ہیں۔ جبکہ کچھ روزمرہ مسائل سے متعلق طنزیہ انداز میں لکھے گئے ہیں۔

عالمی ادب کے ان تمام مکالمات میں جو شہرتِ دوام افلاطون کے حصہ میں آئی وہ کسی دوسرے کو نصیب نہیں ہوئی، جہاں کہیں بھی مکالمات کا نام آتا ہے یا لیا جاتا ہے۔ اس سے مراد مکالماتِ افلاطون ہوتی ہے۔ افلاطون کی عظمت ایک فلسفی اور ادیب کی حیثیت سے مسلّم ہے۔ اس سے کسی کو انکار کی مجال نہیں۔ لیکن وہ بنیادی طور پر ایک فلسفی اور حکیم تھا۔ ظاہر ہے کہ فلسفہ کی ابتدا بھی تشکیک سے ہوتی ہے اور انتہا بھی تشکیک پر۔ اس لئے جب ہم مکالماتِ افلاطون کا جائزہ لیتے ہیں۔ تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے، اپنی تمام تر عظمت کے باوجود اُن کے مکالمات میں مسائل سلجھتے نہیں، الجھتے جاتے ہیں اور قاری کسی ایک حتمی نتیجہ پر نہیں پہنچ پاتا ۔۔ اس لئے اُن کی ہمہ گیری محلِ نظر ہے۔ اُن کے مکالمات میں فلسفیانہ افکار و مسائل بھرپور انداز میں ملتے ہیں جو افلاطون کی شخصیت (بحیثیت فلسفی کے) کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ ان کا مطالعہ کرتے وقت ہمیں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ یہ ایک فرد کے فکر کا نچوڑ ہیں۔ اور انسانی فکر اپنی تمام تر وسعتوں کے باوجود محدود ہوتی ہے ۔۔ دوسری قابلِ لحاظ بات جو ہمیں پیشِ نظر رکھنی چاہیئے وہ ہے ان کی افادیت۔ افادیت کے لحاظ سے مکالمات

افلاطون کا دائرہ محدود تر ہے کیوں کہ اس کی فلسفیانہ موشگافیاں اور مبحث کا سمجھنا ایک خاص طبقہ تک محدود ہے - نیز یہ کہ اس خاص طبقہ کے دانش ور بھی اس کے افکار کی تشریح اور تفصیل میں متفق نہیں — اور عمل کے لحاظ سے تو ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک عظیم فلسفی کے عظیم افکار ہیں — جو عمل کی بنیاد نہیں بن سکتے -

حضور سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے مکالمات ہر لحاظ سے ارفع و اعلیٰ ہیں - اگرچہ آپؐ کے "مکالمات" کو دوسرے مکالمات کی طرح منضبط اور مدون نہیں کیا گیا - یہ دُرِ بے بہا احادیث، سیر، شمائل، مغازی اور تاریخ کی کتب میں بکھرے پڑے ہیں - جہاں کہیں کوئی قاری، مکالماتِ نبویؐ کا مطالعہ و تجزیہ کرتا ہے - تو اس کا ذہن اس حقیقت کو فوراً قبول کر لیتا ہے کہ ان کے پیچھے اللہ کے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عظیم شخصیت کارفرما ہے اور اس پردے میں اللہ کا نبیؐ بول رہا ہے — کوئی فلسفی، ادیب، یا دانش ور نہیں -

حضور سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے مکالمات اپنی خوبیوں کے لحاظ سے منفرد ہیں - ان کی خصوصیات کا احاطہ کرنا تو ایک ناچیز بندے کے بس کی بات نہیں تاہم اہم خوبیاں یہ ہیں:-

سلاست و سادگی -

ایجاز و جامعیت

برجستگی و معنویت

گفتگو کا متوازن انداز - یعنی برمحل، مناسبِ حال عام فہم بات چیت

فلسفیانہ موشگافیوں اور گنجلک اندازِ بیان سے پاک -

فصاحت و بلاغت

اور سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ہمہ گیر ہیں - ایک مفکر اور دانش ور سے لے کر ایک عامی تک ان کے مطالعہ سے یکساں طور پر مستفید ہوتے ہیں -

یہ خوبیاں حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے مکالمات کو دنیا کے دوسرے "مکالمات" کے مقابلے میں منفرد، ممتاز اور ہر لحاظ سے بلند و برتر ثابت کرتی ہیں، ان کا بنظر غائر مطالعہ کرنے کے بعد مسلمان تو الگ رہے، منصف مزاج غیر مسلم سکالر بھی اس بات کا اقرار کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں کہ جس طرح قرآن مجید ہر لحاظ سے ایک منفرد اور اعلیٰ اور ارفع مقام کا حامل ہے - بعینہٖ کلام سید الابرار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنی خوبیوں کے لحاظ سے منفرد و ممتاز ہے - وہ اللہ کا کلام ہے، یہ اللہ کے نبیؐ کا — اور ہر لحاظ سے ایک معجزہ ہے -

سید العالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک میں دین اسلام کی تکمیل ہوئی - اس لحاظ سے آپؐ دین و شریعت کے مکمل ہیں - اللہ کی آخری اور کامل الکتاب آپ پر نازل ہوئی - نبوت آپ کی ذات میں اتمام کو پہنچی - اس لحاظ سے آپ کسی ایک امت، کسی ایک قریہ، کسی ایک ملک کے لئے مبعوث نہیں کئے گئے، بلکہ آپ کی بعثت پورے عالم کے لیے ہے - بلکہ عالمین کے لئے اور ہمہ گیر ہے - اس لئے اللہ تعالیٰ نے آپ کو جمیع صفات سے نوازا - آپ ترجمانِ وحی الٰہی - بشارتِ موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام اور انسانِ کامل ہیں - ظاہر ہے کہ اس منصب جلیلہ

کو بطریق احسن پورا کرنے کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جمیع علوم کی کلید عطا کی گئی۔ شریعت کے اسرار و غوامض سے آپؐ کو آگاہ فرمایا گیا۔ حقیقت کائنات کے اسرار آپ پر واضح فرمائے گئے۔ اس راز دانِ علومِ الٰہیہ کو نہ صرف کلام پر کامل قدرت عطا کی گئی بلکہ فصاحت و بلاغت کا ایسا جوہرِ عظیم عطا کیا گیا کہ بڑے سے بڑے فصاحت کے دعوے داروں نے آپ کے قدموں میں سر جھکانے کو مقامِ شرف سمجھا۔

آپؐ کا کلام شیرینی، جامعیت اور خوبی کے لحاظ سے منفرد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو کلام کا ایسا سلیقہ ودیعت فرمایا تھا کہ دل اس کو سن کر مسحور ہو جاتے تسکین و اطمینان کی نعمت سے بہرہ ور ہوتے۔ دماغوں کو ایک نئی روشنی ملتی۔ جو شک و ارتیاب کے کانٹوں کو نکال کر انھیں گلزار بنا دیتی۔ آپ کو فصاحت و بلاغت جامعیت و معنویت، ایجاز و اعجاز۔ جو کلام کی بلند ترین خصوصیات ہیں۔ عطا کی گئیں اس کی مثال حضورؐ کے وہ کلمات ہیں، جن کا جواب دُنیا کی کسی زبان کے ادب العالیہ میں نہیں ملتا۔ اور نہ ہی ممکن ہے۔ ویسے تو آپؐ کا پورا کلام اقوال زریں کا نفیس نمونہ ہے لیکن اختصار کے لیے جوامع الکلم ایک ایسا نمونہ ہیں، جس سے حضورؐ کے کلام کی خصوصیات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ان اقوال کو حضورؐ نے ایک خوب صورت گفتگو میں پیش فرمایا۔ جو حضرت علیؓ سے آپ نے فرمائی — یہ مکالمہ سنئے۔

حضرت علیؓ عرض کرتے ہیں "یا رسول اللہؐ! آپ کا طریقہ کیا ہے؟" حضورؐ فرماتے ہیں :۔

معرفت، میرا راس المال ہے۔

عقل، میرے دین کی اصل ہے۔

محبت، میری بنیاد ہے۔

شوق، میری سواری ہے۔

ذکرِ الٰہی، میرا مونس ہے۔

اعتماد، میرا خزانہ ہے۔

حزن، میرا رفیق ہے۔

علم، میرا ہتھیار ہے۔

صبر، میرا لباس ہے۔

رضا، میری غنیمت ہے۔

عجز، میرا سرمایہ ہے۔

زہد، میرا حرفہ ہے۔

یقین، میری خوراک ہے۔

صدق، میرا ساتھی ہے۔

طاقت، میری ڈھال ہے۔

جہاد، میرا خلق ہے۔[1]

یہ مکالمہ پڑھ کر ہر فہمیدہ انسان اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ جس طرح "الکتاب" کا مثیل کسی سے نہیں بن پڑا۔ اسی طرح حضورؐ کے کلام کا مثیل بھی ممکن نہیں۔ جس طرح قرآن مجید ہر لحاظ سے اکمل احسن ہے بعینہٖ کلام رسول اللہ بھی ہر لحاظ سے اکمل و کامل ہے۔ ایک دوسرا مکالمہ ملاحظہ کریں۔ حضورؐ سے جب آپ کے مسلک و فرائض سے متعلق استفسار کیا جاتا ہے۔ تو آپؐ فرماتے ہیں۔

میرے رب نے مجھے نو (۹) باتوں کا حکم دیا ہے:۔

۱۔ کھلے اور چھپے، ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا خوف دل میں رکھوں۔

۲۔ محبت اور غصہ، دونوں حالتوں میں حق و انصاف کی بات کہوں۔

۳۔ امیری ہو یا فقر، ہر حال میں راستی اور اعتدال پر قائم رہوں۔

۴۔ جو مجھ سے تعلق توڑے، میں اس سے رشتہ جوڑوں۔

۵۔ زیادتی کرنے والے کو معاف کر دوں۔

۶۔ محروم کرنے والے کو عطا کروں۔

۷۔ میرا سکوت، فکر و تدبر کا سکوت ہو۔

۸۔ میری نگاہ۔ نگاہ عبرت ہو۔

۹۔ ذکر الٰہی۔ میری گفتگو کا محور و مرکز ہو۔ اور نیکی کا حکم دوں، بدی سے روکوں۔

محدثین، مورخین، علمائے سیر و مغازی نے اپنی تالیفات میں حضورؐ کے مکالمات کثیر تعداد میں محفوظ کئے ہیں۔ ان کا احاطہ کرنا نہایت ہی عرق ریزی کا کام ہے۔ لیکن جب کوئی ان کا مطالعہ کرتا ہے، تو اس پر ان دُرِّ نایاب کی قدر و قیمت آشکارا ہو جاتی ہے۔ یہ آبدار موتی ایک سلک میں پروئے ہوئے ہیں۔ جن میں سے ایک موتی بھی اپنی جگہ سے ہٹانا ممکن نہیں۔ یہ مکالمات آپؐ کی بھرپور شخصیت۔ آپؐ کے منصب جلیل، آپؐ کے اخلاقِ حسنہ، آپؐ کے وہبی علم و فضل اور آپؐ کے جلال و جمال کے آئینہ دار ہیں۔ آج بھی اثر انگیزی کے لحاظ سے اُن کی وہی کیفیت ہے جو روز اول تھی ان کو پڑھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم خود تکلم فرما رہے ہوں دل والے تو دل کی آنکھ سے وہ منظر تک متحرک دیکھتے ہیں۔ قاری پر ایک ایسی حالت طاری ہو جاتی ہے جسے زبان اور بیان ادا کرنے سے قاصر ہیں! الفاظ ایسے مناسب و موزوں فقرے ایسے بچے و تلے، بیان ایسا مربوط اور مکمل۔ مطلب ایسا واضح و صاف اور انداز ایسا دلنشیں کہ پڑھنے کے ساتھ ساتھ دل میں اترتے چلے جاتے ہیں ــــ اس پر جامعیت، معنویت۔ سبحان اللہ، گفتارِ رسولِ رحمت۔ کلام نبی اللہ۔ کون ہے ایسا بدنصیب جو اِس عظیم نعمت سے محروم رہنا پسند کرے۔

آپؐ کی دعوت میں اعتدال تھا یہی وجہ ہے کہ آپؐ کی گفتگو کا انداز بھی معتدل و متوازن ہے۔ آپؐ کا واسطہ ہر قسم کے لوگوں

---

[1] رحمۃ للعالمین جلد نمبر ۳ صـ۱۹۹

سے تھا۔ ان میں مہذب و غیر مہذب دانش مند و اجڈ، عاقل و گنوار، خواص اور عامی۔ امیر اور غریب، سب شامل تھے۔ لیکن ہر قسم کے لوگوں کے ساتھ شفقت سے پیش آتے۔ نہایت تحمل سے گفتگو فرماتے جس سے پتھر دل بھی موم ہو جاتے۔ آپ کی گفتگو سادہ و سہل تھی جس میں حکمت و دانش علم و حلم پیغمبرانہ جلال و جمال عظمت و شکوہ رسالت —— واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ ایسا انداز گفتگو کہیں اور ملنا محال ہے۔ اگر ہم اس انداز تکلم کو انداز رسالت کہیں، تو بجا ہوگا۔ کیونکہ بطور نبی اللہ کے اسکا انداز منفرد و ممتاز ہے۔ یہ وہبی ہے کسبی نہیں۔

آپ کے انداز گفتگو کے مختلف زاویے سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس حقیقت کو پیش نظر رکھیں کہ آپ کی خدمت میں ہر قسم کے افراد، یا گروہ حاضر ہوتے کئی دین کی معلومات حاصل کرنے کے لیے حاضر خدمت ہوتے۔ کئی مسائل دین سمجھنے کے لئے مختلف قسم کے سوالات کرتے۔ کفار و مشرکین محض مزاحمت و مخالفت کی وجہ سے ایسے حیلے بہانے پیش کرتے، جن کا مقصد ترغیب، تحریض یا غم و غصہ کا مظاہرہ ہوتا۔ استفسارات کرنے والوں میں اجنبی، تاجر، مزدور، کسان، رؤسا۔ شاعر، خطیب، غرض ہر حیثیت کے لوگ شامل ہوتے۔ کمال تو یہ ہے کہ آپ ہر شخص سے اس کے مقام اور مرتبے کے مطابق گفتگو فرماتے۔ عربی زبان کی ہر بولی پر ایسی قدرت آپ کو حاصل تھی کہ مختلف علاقوں سے آنے والے چاہے بدوی تھے یا حضری۔ اُن سے اُن کے اپنے لب و لہجہ اور بولی میں گفتگو فرماتے۔

صحابہ کرام جو شب و روز آپؐ کی خدمت میں رہتے۔ اُن کو قرآنی علوم کی تعلیم اکثر مکالمات کی صورت میں دیتے۔ جو سوال وہ کرتے اُن کا نہایت ہی تشفی بخش جواب دیتے، جو اشخاص بیعت کے لئے آتے۔ تو اُن کے پوچھنے پر اُن کو دین کی نہایت ہی آسان اور سادہ تعلیمات ارشاد فرماتے۔ آپ کے بولنے کا انداز بالکل ہی الگ تھا۔ جب آپ گفتگو فرماتے —— تو لہجہ نہایت ہی مناسب ہوتا۔ آواز نہ اتنی بلند کہ گونج پیدا ہو اور نہ اتنی دھیمی کہ مخاطب سن ہی نہ سکے۔ الفاظ جملے، فقرے ٹھیر ٹھیر کر ادا فرماتے تاکہ مخاطبین ایک ایک لفظ سن لیں اور اُسے اپنے دل پر نقش کرلیں۔ اور اگر کوئی بات پوچھنا چاہیں تو سوچ سمجھ کر موقع پر ہی پوچھ لیں۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو تم لوگوں کی طرح مسلسل اور تیز نہیں ہوتی تھی۔ آپ دھیرے دھیرے بولتے تھے مضمون اس قدر سادہ اور واضح کہ سننے والے اچھی طرح ذہن نشین کر لیتے۔"

ایک دوسری روایت کے مطابق:

"اگر کوئی شخص چاہتا تو حضورؐ کے بولے ہوئے الفاظ گن سکتا تھا۔"

آپؐ گفتگو میں اس قدر تحمل سے کام لیتے کہ سوال والا پورے اطمینان سے اپنی بات کہہ لیتا۔ آپ اس کی بات پوری توجہ، انہماک، اور ہمدردی سے سماعت فرماتے اور جب تک وہ اپنی بات پوری نہ کر لیتا۔ آپ خاموش رہتے۔ اور یہی انداز اپنی گفتگو میں بھی قائم رکھتے۔ گفتگو سننے کے بعد قاری کے ہر سوال کا جواب نہایت ہی اطمینان سے مختصر مگر پُرمغز الفاظ میں دیتے۔ زبان نہایت ہی سادہ ہوتی۔ اور بیان بھی سہل۔

ان خصوصیات کا جائزہ لینے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ آپ نفسیات انسانی کے ماہر تھے۔ اس لئے اپنی گفتگو میں نفسیاتی مسلمات کو ہمیشہ پیش نظر رکھتے —— اس امر کو ملحوظ خاطر رکھنے کی وجہ سے سائل آپ کی بات سنتے ہی پوری طرح متوجہ ہو جاتا —— اس

پر آپ کے کلام کا امتیاز۔ محفل میں ایسا سکوت طاری ہوجاتا جیسے وہاں کوئی موجود ہی نہ ہو۔

آپ کے اندازِ تکلم کی اپنی خصوصیات کی بدولت۔ ہر مخاطب نے اپنے فہم اور استعداد کے مطابق آپ کے کلمات، خطبات، احکام مسائل اور سب سے بڑھ کر مکالمات کو حرزِ جان بنایا اور ہمیشہ یاد رکھا۔ جب کہ اعلیٰ استعداد کے لوگوں نے حضورؐ کے اس عظیم سرمایہ کو ہر لحاظ سے محفوظ رکھنے کی سعی بلیغ کی صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین نے قرآن کے ساتھ ساتھ آپؐ کے فرمودات کو نہ صرف سینوں میں محفوظ کیا بلکہ اسے سفینوں میں منتقل کر کے قیامت تک آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ کر لیا۔

حضور کے مکالمات کا صحیح مقام متعین کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کا اسوۂ حسنہ کی روشنی میں جائزہ لیا جائے۔ حضور کی شفقت و رافت، حلم اور تواضع۔ دلوں کو پھیر دیتی تھی۔ اسی سادہ طریقہ سے آپ تعلیم دیتے تھے۔ نجد کا ایک بدوی مدینہ آتا ہے۔ اتنا سلیقہ بھی نہیں کہ مسجد نبوی اور محفلِ نبوی کا احترام کرے۔ وہ اپنا اونٹ مسجد کے اندر لا کر دروازے سے باندھ دیتا ہے۔ اور نہایت اکھڑپن سے مجلس رسولؐ میں در آتا ہے۔ آتے ہی نہایت ہی درشت لہجے میں سوال کرتا ہے:

"کون ہے ابن عبد المطلب؟"

صحابہ کرام اس کے درشت لہجے کو محسوس کرتے ہیں لیکن مجسم رحمت سرور عالمؐ نہایت ہی تحمل سے جواب دیتے ہیں: "میں ہوں"۔ وہ کہتا ہے:

"میں نجد سے آیا ہوں، قبیلہ بنو سعد سے تعلق ہے، قبیلہ والوں نے حقیقتِ حال معلوم کرنے کو مجھے بھیجا ہے، میں تم سے سوال کرنا چاہتا ہوں۔ میرا لہجہ سخت اور درشت ہے، میں سختی سے بات کروں گا آپ اسے محسوس نہ کریں۔"

رحمت للعالمین جواب دیتے ہیں:

"تمہیں جو کچھ پوچھنا ہے پوچھو، میں دل پہ میل نہیں لاؤں گا۔"

پھر وہ سوال کرتا ہے اور حضور نہایت ہی اطمینان سے اس کے ہر سوال کا جواب مرحمت فرماتے ہیں۔ حالاں کہ پورے مکالمہ میں سائل کا لہجہ درشت رہتا ہے۔ تعلیم اور تحمل کا یہ طریقہ اس طرح کارگر ثابت ہوتا ہے کہ وہ شخص بلیاختہ پکار اٹھتا ہے:

"تو اس ذات کی قسم جس نے آپ کو صادق نبیؐ بنایا ہے، میں آپ کی بتائی ہوئی باتوں میں کمی بیشی نہیں کروں گا۔ میں آپؐ کا دین قبول کر چکا ہوں۔ میں اپنی قوم کا قاصد ہوں، میرا نام ضمام بن ثعلبہ ہے۔"

آپؐ صحابہ کو دین کی تعلیم دیتے وقت اسی طریق سے کام لیتے تھے۔ ایجاز و اختصار اور جامعیت کو ملحوظ خاطر رکھتے، اندازِ بیان دلنشین اور مسائل نہایت ہی سادہ زبان میں بیان فرماتے، ایک مکالمہ جو حضورؐ اور صحابہ کرامؓ کے درمیان ہوا، جس کے راوی حضرت ابو موسیٰ اشعری ہیں۔ صحابہ کرام عرض کرتے ہیں:

"یا رسول اللہ! کون سا اسلام افضل ہے؟"

آپؐ فرماتے ہیں: "اس کا اسلام جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں۔"

ایک صحابی :- یارسول اللہ! اسلام کی بہترین خصوصیت کونسی ہے ؟"

رسول اللہؐ :- یہ کہ تو (بھوکے کو) کھانا کھلائے۔ واقف و ناواقف سب کو سلام کرے۔

صحابہؓ :- کونسا عمل افضل ہے؟

رسول اللہؐ : اللہ اور اس کے رسول پہ ایمان لانا۔

صحابہؓ :- اس کے بعد کونسا عمل -؟

رسول اللہؐ : جہاد فی سبیل اللہ -

صحابہؓ :- پھر کونسا عمل؟

رسول اللہؐ :- حج مبرور (وہ حج جس کے بعد گناہوں کا ارتکاب نہ کرے)- اس مختصر سے مکالمہ میں معانی کی ایک پوری کائنات بیان فرمائی گئی ہے۔ ان کی تشریح اور توضیح کے لیے سینکڑوں صفحات بھی سیاہ کئے جائیں، پھر بھی ان کے معنی اور مطالب بیان کرنے کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔ علمائے دین نے حضورؐ کے کلام کی تشریح و توضیح کے لیے کئی کئی ضخیم مجلدات لکھی ہیں۔ کیا اس سے بڑھ کر کوئی ایجاز و اعجاز، جامعیت اور معنویت کی مثال پیش کی جاسکتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی تاثر کا یہ عالم، کہ جس نے بھی دین کا کوئی مسئلہ دریافت کیا، اس کو حرزِ جاں بنالیا۔ اور اس کی ایک ایک جزء پر عمل کو اپنا فرض اولین جانا۔ بدوی کی مثال ہی کافی ہے کہ اس نے سوالات کئے، مسائل کا علم حاصل کیا اور پھر انہیں ضابطہ عمل بنالیا۔ صحابہ کی مثال تو ظاہر و باہر ہے۔ کوئی اس سے انکار کرسکتا ہے؟

فصاحت و بلاغت حضورؐ کے کلام کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ اگرچہ بنیادی طور پر آپ نہایت ہی سادگی سے سادہ لفظوں میں پند و نصائح بیان فرماتے لیکن آپ کسی کو تعلیم دیتے یا کلام کو زیادہ مؤثر و دلنشین بنانے کا ارادہ فرماتے تو سوال کی صورت میں شروع فرماتے۔ اس طرح۔ آپ کی گفتگو مکالمات کی صورت اختیار کرلیتی۔ یہ مکالمات مختلف حالات، مختلف ماحول اور مختلف مقامات پہ صورت پذیر ہوتے ہیں، اس لیے پیرایہ بیان بھی مختلف ہے۔ اور بلاغت کا تقاضہ بھی یہی ہے۔ اختلاف بیان آپ کے کلام کی بلاغت و فصاحت کا ایک بیّن ثبوت ہے۔ کوہ صفا کا مکالمہ اس انداز کی بہترین مثال ہے۔

سید المرسلین تمام قبائل قریش کو اکٹھا کرنے کے لیے کوہ صفا پر جاتے ہیں اس غرض کے لیے "یا صباحاً" کی صدا لگاتے ہیں۔ اس آواز کو سنتے ہی قریش کے سارے لوگ کوہ صفا کے دامن میں جمع ہو جاتے ہیں۔ یہاں پہ آپ اُن کے نفسیاتی لمحات کو تصرف میں لانے کے لئے تمثیلی پیرایۂ بیان اختیار فرماتے ہیں۔ کیوں کہ ان حالات میں تمثیل۔ ایک مؤثر ترین عامل ثابت ہوتا ہے۔ اور حاضرین۔ جن میں ہر درجے کے لوگ شامل ہوتے ہیں۔ ہمہ تن توجہ بن جاتے ہیں۔ چنانچہ حضور سرور عالمؐ ارشاد فرماتے ہیں :-

اے بنی عبدالمطلب! اے بنی فہر! ! اے بنی کعب!
اگر میں تم سے یہ کہوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے ایک لشکر جرار تیار کھڑا ہے اور

وہ تم پر حملہ کرنے کے لیے پر تول رہا ہے۔
تو کیا تم میری بات کا یقین کر لو گے؟
اس انداز اور طرزِ بیان کا تحیر؟ سب بیک آواز پکار اٹھتے ہیں:
"کیوں نہیں — ہمیں یقین ہے۔
ہم نے ہمیشہ آپ کو صادق پایا ہے۔"

یہ ابتدائی مرحلہ طے ہوتے ہی سرورِ عالم فوراً نہایت ہی حکیمانہ انداز سے اپنا پیغام بیان فرماتے ہیں:۔
چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:۔

"تو خوب غور سے سنو! میں تم کو ایک سخت اور المناک عذاب سے آگاہ کرتے اور ڈرانے آیا ہوں۔ جو بالکل تمہارے سامنے ہے۔"

یہ دراصل منصب نبوت کی صحیح صحیح نشان دہی تھی یعنی حقائق، دینی اسرار و غوامض اور وہبی علوم میں نبوت کو جو خصوصیت اور انفرادیت حاصل ہے۔ یہ اس کی بین مثال ہے کہ حضورؐ نے کیسی حکمت کے ساتھ ان خصوصیات کی مختصر طور پر ترجمانی کی — اس کی نظیر۔ دنیا کے مذاہب اور عالمی ادب کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس سے زیادہ قابلِ فہم اور واضح پیرایہ بیان اور اسلوب۔ ناممکن ہے یہ اسلوب رسالت کی منفرد خصوصیت ہے۔

ویسے تو حضورؐ کے مکالمات کی تعداد اس قدر زیادہ ہے۔ کہ ان تمام کا احاطہ کرنا ممکن نہیں۔ اور ہر مکالمہ اپنی جگہ۔ ایک نادر دستاویز ہے۔ دو ایک مزید مثالیں اس ضمن میں کافی رہیں گی۔

غزوہ حنین میں سیدالانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تالیف قلوب کی غرض سے مکہ کے نومسلم رئیسوں اور دیگر نومسلموں کو مالِ غنیمت میں سے حصہ وافر عطا فرماتے ہیں، تو بعض انصاریوں کو محرومی کی شکایت پیدا ہوتی ہے۔ حضورؐ کے علم میں جب یہ بات آتی ہے تو آپ انصار کو ایک جگہ اکٹھا ہونے کا فرمان جاری کرتے ہیں آپؐ جس اندازِ حکیمانہ اور پُرتاثیر لہجے میں ان سے گفتگو فرماتے ہیں۔ کہ جو دلوں کے تار چھیڑ دیتا ہے۔ آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے ہیں، محبت اور شوق کے ولولے از سرِ نو انگڑائی لیتے ہیں — آپؐ فرماتے ہیں۔

"اے گروہ انصار! جس وقت میں تمہارے یہاں آیا تو کیا تم گمراہ نہیں تھے۔ اللہ تعالیٰ نے تمہیں میری بدولت ہدایت فرمائی۔ تم محتاج تھے۔ اللہ نے میری وجہ سے تمہیں غنی بنا دیا۔ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ پروردگار نے میرے طفیل تمہارے دلوں کو جوڑ دیا۔"

انصار اس بات کی تصدیق کرتے ہیں۔ حضور پھر یہی کلمات دہراتے ہیں تو انصار جواب دیتے ہیں:۔

"ہمارے پاس آپ کی اس بات کا کیا جواب ہے۔ سارا فضل و احسان اللہ اور اللہ کے رسولؐ کا ہے۔"

سرورِ عالم موقع کی مناسبت سے بات کا رُخ فوراً موڑ دیتے ہیں۔ تاکہ حاضرین میں ندامت کے ساتھ ساتھ سربلندی کے احساسات بھی بیدار

ہوں ۔ اور انصاف کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوٹے ۔ یہ اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ آپؐ انسانی نفسیات کے کس قدر ماہر تھے ارشاد ہوتا ہے :

اے گروہ انصار ! نہیں ! خدا کی قسم اگر تم چاہو تو کہہ سکتے ہو ۔ اور تمہارا کہنا بجا ہو گا ۔ جس کی تصدیق میں خود کروں گا ۔

یہ کیوں نہیں کہتے کہ اے محمد ! تم ہمارے پاس اس حالت میں آئے کہ اپنوں نے تمہیں جھٹلایا ۔
ہم نے تمہاری تصدیق کی ۔

تم بے سہارا تھے ۔ ہم نے تمہیں سہارا دیا ۔
تمہیں وطن سے نکال دیا گیا ، ہم نے تمہیں پناہ دی
تم خالی ہاتھ تھے ۔ ہم نے ہمدردی کی ۔ ہم نے تمہاری امداد کی ۔

اس کے بعد آپؐ نے انصار کی طرف رُخ کر کے ایک ایسی بات ، ایک ایسے انداز میں فرمائی جس کی تاثیر اور رقت آمیزی بے مثال ہے ۔ اس بات کے سنتے ہی انصار بے تاب ہو گئے ۔ ایمان و محبت کے سوتے دلوں سے بے ساختہ پھوٹ پڑے اور آنکھوں کی راہ سے بہ نکلے ۔ آپ نے فرمایا :

اے گروہِ انصار ! کیا تم اس پر خوش نہیں کہ لوگ اپنے ساتھ بھیڑ بکریاں لے جائیں اور تم اپنے ساتھ اللہ کے نبی کو لے جاؤ ۔

آپ کے مکالمات تاثیر اور رقت انگیزی میں درحقیقت معجزۂ الٰہی تھے ۔ پتھر دل بھی آپ کی باتیں سن کر موم ہو جاتے ۔ مسجد نبوی سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی درس گاہ تھی ۔ جہاں آپ صحابہ کو ۔ دور سے آنے والوں کو ہر سطح کے لوگوں کو تعلیم دیا کرتے تھے ۔ حضور کی تعلیم دینے کا انداز بھی منفرد تھا ۔ آپ لمبی چوڑی اور بے معنی گفتگو سے احتراز فرماتے ۔ کبھی آپ خود بات چھیڑ دیتے ۔ اور بیچ بیچ میں حاضرین کے سوالات کا جواب بھی عطا کرتے جاتے ۔ کبھی حاضرین استفسار کرتے ۔ تو آپ اُن کے جواب دیتے ۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آپؐ نے تعلیم و تعلّم کے لئے مکالمات کا انداز اختیار فرمایا ۔ کیونکہ ہر لحاظ سے مکالمات تعلیم کا بہتر اور مؤثر ترین طریق ہیں جدید تعلیمی نظریات بھی اس طرز تعلیم کی تائید کرتے ہیں سوال و جواب سے موضوع پوری وضاحت سے سائل کے ذہن نشین ہو جاتا ہے ۔
حضور کے اس طرز تعلیم سے اَن پڑھ بھی مستفید ہوتے اور عالم بھی ۔

انداز ملاحظہ کریں ۔ ابن مسعودؓ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں ۔ اور عرض کرتے ہیں ۔

یا رسول اللہ ! کون سا عمل افضل ہے ؟

آپ جواب دیتے ہیں : وقت پر نماز پڑھنا ۔

ابن مسعودؓ : حضورؐ ! اس کے بعد ؟

رسول اللہ : والدین سے حسن سلوک ۔

ابن مسعود : اور اس کے بعد یا نبی اللہ؟

رسول اللہؐ : جہاد فی سبیل اللہ۔

ایک اعرابی حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے اور عرض کرتا ہے۔ اس کا نام عمرو بن عبسہ ہے۔

عمرو : آپ کون ہیں؟

رسول اللہؐ : میں اللہ کا رسول ہوں۔

عمرو : کیا آپ کو خدا نے مبعوث کیا ہے؟

رسول اللہؐ : بے شک مجھے خدائے واحد و لاشریک نے نبی بنا کر بھیجا ہے۔

عمرو : آپ کس چیز کی دعوت دیتے ہیں۔

رسول اللہ : اللہ کو ایک مانو۔ جس کا کوئی شریک نہیں۔ اور نہ کوئی دوسرا عبادت کے لائق ہے۔
قرابت داروں سے محبت و شفقت سے پیش آؤ۔

.... (الخ)

حضور سرور عالم کے سارے مکالمات ــــ دین، دین کے مسائل۔ قوانین شریعت اور عام زندگی کے مسائل سے مالا مال ہیں۔ ان کا بنیادی مقصد ہی تعلیم و تعلم ہے۔ یہ سلسلہ نہ صرف آپ کی حیات مبارک تک ہی جاری رہا۔ بلکہ یہ فیضان رسالت آج بھی جاری ہے۔ اور رہتی دنیا تک جاری رہے گا۔

سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مکالمات میں کبھی کبھار تشبیہ و استعارہ سے بھی کام لیتے تھے۔ اس کا استعمال آپ نے اخبار غیب کے سلسلہ میں فرمایا یا کسی مسئلہ کی تعبیر میں۔ لیکن عام حالات میں اس صنعت کا استعمال نہیں فرماتے تھے۔ مکالمۂ جبرئیل میں جب نو وارد حضور سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے علاماتِ قیامت بیان کرنے کو کہتا ہے۔ تو ارشاد ہوتا ہے؛

قرب قیامت کی بدیہی علامتیں یہ ہوں گی کہ لونڈی اپنے آقا کو جنے گی۔
گڈریوں کے پاس مال و دولت کی فراوانی ہو گی . . . . اور وہ بلند و بالا عمارات بنانے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کریں گے
انجام سے غافل لوگ قوموں کی قسمت کے مالک ہوں گے۔

جناب سید المرسلین کے علم کا سرچشمہ وحیِ الٰہی ہے۔ جس کی بدولت آپؐ کو یقین و اذعان کی عظیم نعمت حاصل ہوئی۔ اور آپ کی منزل نہ صرف آپ کو نظر آئی بلکہ عین الیقین کی حد تک اُن کے سامنے تھی۔ جس پر پہنچنے کے لیے آپ سراپا عمل تھے ــــ اس یقین کا بھرپور اظہار آپ کے کلام میں موجود ہے۔ اور یہی آپ کے مکالمات کا امتیازی وصف ہے۔ اور وہ تعلیمات جو آپ کے مکالمات کا طرۂ امتیاز ہیں۔ ہر آدمی کے لئے مشعلِ راہ ہیں۔ ان کی روشنی میں انسان ایک ہی جست میں عشق کی تمام منزلیں طے کر لیتا ہے اور یہ جہانِ رنگ و بو اس کے لیے بیکراں نہیں رہتا۔

المختصر حضور کے مکالمات میں حکمت و موعظت، حقائق کے اسرار و غوامض، ہدایت و استقامت کے دُرِّ بے بہا، علم و عرفان کے

بے بہا موتی عقل و فہم کے نادر جواہر، اس قدر کثرت سے پائے جاتے ہیں کہ اس بحرِ زخار میں غواصی کرنے والے کو ہر قسم کی نعمت غیر مترقبہ مل جاتی ہے۔ شکوک و شبہات کے کانٹے دور ہو جاتے ہیں۔ تذبذب سے نجات ملتی ہے۔ علم الیقین اور حق الیقین جیسی منزل پر پہنچ کر سائل شرحِ صدر جیسی عظیم نعمت سے بہرہ ور ہوتا ہے۔

حقیقت وحی :

حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ حارث بن ہشام اور حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان وحی کے بارے میں مندرجہ ذیل گفتگو ہوئی :

حارث : یا رسول اللہ! آپ پر وحی کیسے نازل ہوتی ہے؟

رسول اللہ : کبھی تو یہ صورت ہوتی ہے کہ مجھے ایک گھنٹی کی سی آواز سنائی دیتی ہے، وحی کی یہ قسم میرے لیے سخت و شدید ہوتی ہے۔ جب یہ کیفیت دور ہو جاتی ہے تو جو کچھ وحی میں ارشاد ہوا تھا۔ وہ مجھے یاد ہو جاتا ہے۔

اور کبھی یوں ہوتا ہے کہ فرشتہ خود کسی شخص کے روپ میں میرے سامنے آجاتا ہے اور مجھ سے ہم کلام ہوتا ہے جو کچھ وہ کہتا جاتا ہے میں اُسے حفظ کر لیتا ہوں۔

صحیح بخاری ۱/۱، کتاب الوحی ص۸

بعثت :

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ پہلے پہل وحی کی ابتدا سچے اور پاکیزہ خوابوں کی صورت میں ہوئی چنانچہ جو خواب آپ دیکھتے وہ روز روشن کی طرح سچ ثابت ہوتا۔ اس کے بعد آپ گوشہ نشینی کی طرف مائل ہو گئے۔ آپ غار حرا کی تنہائیوں میں قیام فرماتے کئی کئی راتیں عبادت میں مصروف رہتے، جب آپ کو توشہ کی ضرورت ہوتی تو گھر تشریف لاتے، چند روز حضرت خدیجہ کے گھر قیام فرما کر پھر غارِ حرا تشریف لے جاتے، یہاں تک کہ ایک دن جبکہ آپ غارِ حرا میں مصروفِ عبادت تھے۔ اللہ کا فرستادہ پیغام حق لے کر آپ کے پاس آیا اور کہا۔

فرشتہ :۔ پڑھئے۔

رسول اللہ :۔ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔

فرشتہ :۔ (بہت زور سے حضورؐ کو بھینچتے ہوئے) پڑھئے۔

رسول اللہ :۔ مجھے پڑھنا نہیں آتا۔

فرشتہ : (پھر نہایت ہی زور سے حضورؐ کو اپنے بازوؤں میں دباتے ہوئے) پڑھئے۔

رسول اللہ : میں پڑھنا نہیں جانتا۔

فرشتہ : (حضور کو چھوڑتے ہوئے) اچھا تو " پڑھئے اپنے رب کے نام سے جس نے ہر چیز کو پیدا کیا۔

انسان کو جمے ہوئے خون سے تخلیق کیا پڑھیے آپ کا رب بڑا کریم ہے .....''

یہ کلمات آپ کو حفظ تو ہو گئے لیکن جب آپ واپس لوٹے تو تھر تھر کانپ رہے تھے ، جس وقت آپ حضرت خدیجہؓ کے ہاں پہنچے تو فرمایا:

''خدیجہ! مجھے کمبل اڑھا دو - مجھے کمبل اڑھا دو -

چنانچہ حضرت خدیجہ نے آپ پر کمبل ڈال دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب قلب مبارک کو ذرا سکون ہوا تو آپؐ نے حضرت خدیجہؓ کو سارا واقعہ سنا دیا اور فرمایا:

خدیجہ! خدا کی قسم مجھے تو اپنی جان کا خطرہ ہے -

حضرت خدیجہ! آپ کو بشارت ہو - آپ ہرگز خوف نہ کھائیں خدا کی قسم اللہ آپ کو کبھی رسوا نہ کرے گا -
آپ تو صلہ رحمی فرماتے ہیں، ہمیشہ سچ بولتے ہیں، امین ہیں - لوگوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں آپؐ مہمانوں کی خاطر مدارات کرتے ہیں، حق کا ساتھ دیتے ہیں آپ مصائب کو بھی خاطر میں نہیں لاتے قسم ہے اُس ذات پاک کی جس کے قبضہ میں خدیجہ کی جان ہے! مجھے قوی امید ہے کہ آپ اس امت کے نبی ہوں گے -

ابنِ ہشام

(مزید تشفی کے لئے) حضرت خدیجہؓ آپ کو اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں۔ ورقہ عہد جاہلیت میں نصرانی ہو گئے تھے - عبرانی زبان میں انجیل لکھتے اور پڑھتے تھے - اس وقت بڑھاپے کی وجہ سے بینائی جاتی رہی تھی - حضرت خدیجہؓ نے ورقہ سے کہا:

خدیجہ :- بھائی جان ذرا اپنے بھتیجے سے اُن کی کیفیت کا حال سنئے -

ورقہ :- بھتیجے - تمھیں غار میں کیا نظر آیا -؟

(حضورؐ سے غارِ حرا کا پورا ماجرا سننے کے بعد)

یہ تو وہی ناموس اکبر ہے جس کو اللہ تعالےٰ نے موسیٰؑ کے پاس بھیجا تھا کاش میں اس وقت تندرست و توانا ہوتا -
کاش میں اس وقت تک زندہ رہوں جب آپ کی قوم آپ کو وطن چھوڑنے پر مجبور کر دے گی -

رسول اکرمؐ : تو کیا میری قوم مجھے وطن سے نکال دے گی ؟

ورقہ : ہاں، جب کوئی شخص وہ چیز لے کر آیا، جو آپ لائے ہیں تو لوگ اس کے دشمن بن گئے - اگر میں آپ کے اس کٹھے وقت تک زندہ رہا، تو آپ کا ساتھ دوں گا -

چند روز بعد ورقہ کا انتقال ہو گیا - اور وحی کا سلسلہ بھی تھوڑے عرصے کیلئے منقطع ہو گیا - پھر یہ سلسلہ شروع ہو گیا - اس کی بابت آپؐ نے جابر بن عبداللہ انصاری سے فرمایا -

رسول اللہؐ : ایک روز میں جا رہا تھا کہ راستہ میں مجھے آسمان سے ایک آواز سنائی دی - آنکھیں اوپر اٹھائیں تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہی فرشتہ جو غار حرا میں آیا تھا زمین اور آسمان کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا، مجھ پر رعب ساطاری ہو گیا - فوراً گھر واپس ہوا اور کہا -

مجھے کمبل اوڑھا دو، کمبل اوڑھا دو۔
اسی حالت میں یہ آیات نازل ہوئیں
یٰاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ
وَرَبَّکَ فَکَبِّرْ
وَثِیَابَکَ فَطَھِّرْ
وَالرُّجْزَ فَاھْجُرْ
اے کملی والے! اُٹھ اور لوگوں کو خوفِ خُدا سے ڈرا۔
اپنے رب کی بزرگی بیان کر، اپنے لباس کو پاک رکھ اور نجاست سے دور رہ۔
پھر تو وحی کا سلسلہ خوب شروع ہو گیا اور لگاتار رہا۔

۱۔ صحیح بخاری جلد اول کتاب الوحی صـ۳ تا ۱۱
۲۔ سیرۃ ابن ہشام۔ جلد ۱ صـ۲۹۴ - ۲۶۱

تخلیق اوّل :۔

۱۔ تخلیق اول سے متعلق حضرت جابر انصاریؓ کے استفسار پر یہ گفتگو ہوئی :

حضرت جابرؓ :۔ میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں، مجھے بتائیے کہ سب اشیأ سے پہلے اللہ تعالےٰ نے کون سی چیز پیدا کی ؟

رسول اکرمؐ : اے جابر! اللہ تعالےٰ نے تمام اشیا کی تخلیق سے پہلے اپنے نور سے تیرے نبیؐ کا نور پیدا فرمایا۔ یہ نور اللہ کی قدرت سے، جہاں اُسے منظور ہوا، سیر کرتا رہا۔

اس وقت نہ لوح تھی، نہ قلم، بہشت تھی نہ دوزخ، فرشتے بھی نہیں تھے، آسمان تھا نہ زمین، سورج تھا نہ چاند، جن تھا نہ انس اللہ پاک نے جب مخلوق پیدا کرنے کا ارادہ فرمایا تو اس نور کے چار حصے کئے، ایک حصہ سے قلم پیدا فرمایا۔ دوسرے سے لوح اور تیسرے سے عرش۔

۲۔ ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ صحابہ کرام کے استفسار پر حضورؐ نے یہ گفتگو فرمائی۔

صحابہ : یا رسول اللہ! آپ کے لئے نبوت کس وقت ثابت ہو چکی تھی؟

رسول اکرمؐ : آدم اس وقت روح اور جسد کے درمیان تھے جبکہ مجھ سے میثاق نبوت لیا گیا۔
بے شک میں حق تعالےٰ کے نزدیک خاتم النبیین ہو چکا تھا۔ اور آدم علیہ السلام ہنوز اپنے خمیر میں تھے۔
میں اپنے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعا کا مصداق ہوں۔

اور اپنے بھائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت ہوں۔

(مشکوٰۃ۔ مصنف عبدالرزاق، سنن ترمذی، شعبی)

اپنے خاندان کے لوگوں کو دعوت

جس وقت حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن مجید کی آیت اَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ کا نزول ہوا تو آپ نے بحکم خداوندی اپنے عزیزوں کو جن میں بنی عبد المطلب بنی ہاشم کے علاوہ بنی عبد مناف وغیرہ بھی تھے، اپنے ہاں مدعو کیا۔ اس دعوت کی غرض وغایت — اپنوں کو دین کی دعوت دینا تھا۔ دعوت کے خاتمے پر جب حضور نے اپنی بات پیش کرنے کا ارادہ فرمایا تو آپ کے چچا ابولہب نے اپنی بے معنی، بے جا باتوں سے محفل کو منتشر کر دیا۔ مجبوراً حضور صلعم نے دوسرے دن انھیں پھر اپنے ہاں بلایا۔ یہ تعداد میں چالیس یا اس سے کچھ اوپر تھے۔ دعوتِ دین پیش کرنے کی خاطر آپ نے گفتگو کا آغاز فرمایا۔

رسول اللہؐ:۔ اے حاضرین! میں تم سب کے لئے دُنیا اور آخرت کی بھلائی لے کر آیا ہوں، مجھے علم نہیں کہ کسی شخص نے اس سے بہتر اور افضل شے اپنی قوم کو پیش کی ہو۔ اللہ پاک کا حکم ہے کہ میں تم کو اس کی دعوت دوں۔ بتاؤ۔؟ تم میں سے کون میرا ساتھ دینے کے لئے تیار ہے۔

حضرت علی: یا رسول اللہ۔ اگرچہ میں کمزور ہوں پھر بھی میں آپ کا ساتھ دوں گا۔

ابوطالب: میں عبدالمطلب کے دین کو تو نہیں چھوڑ سکتا، البتہ تمھیں جو فرض سونپا گیا ہے اُسے بجا لاؤ۔ میں تمہاری حمایت و حفاظت کے لئے حاضر ہوں۔

ابولہب:۔ خدا کی قسم، یہ کوئی خوش آئند بات نہیں، اپنے بھتیجے کو منع کریں۔ اس سے پہلے کہ دوسرے اس کے مقابل آئیں۔

ابوطالب: خدا کی قسم، جب تک جان میں جان ہے۔ میں اس کی حفاظت سے دستبردار نہیں ہوں گا۔

رسول اللہؐ: اے بنی عبدالمطلب، اے عباس، اے محمدؐ کی پھوپھی صفیہ، اے محمدؐ کی بیٹی فاطمہ! تم لوگ نارِ جہنم سے اپنا آپ بچاؤ، یہ میرے اختیار سے باہر ہے کہ تمھیں اللہ کی پکڑ سے بچا سکوں — ہاں میرے مال میں تمہارا حق ہے، جو جی چاہے، طلب کرو۔

(بلاذری جلد ۱، تاریخ الکامل ۲، سیرت سرور عالم جلد ۲، تاریخ طبری جلد ۱ صفحہ ۹۰-۸۹ سیرت ابن ہشام جلد ۱)

قبائل قریش کو دعوت:

تبلیغ دین کے سلسلہ میں یہ قدم انقلابی نوعیت کا تھا۔ کیوں کہ اللہ پاک کی طرف سے آپ کو صریح حکم ملا، فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ (سورہ حجر ۹۴)

(پس جو حکم تمھیں خدا کی طرف سے ملا ہے وہ (لوگوں کو) سنا دو، اور مشرکوں کی پروا مت کرو) تو آپ صبح سویرے کوہ صفا پر چڑھے

---

[1] سورۃ الشعراء ۲۱۴۔

اور بلند آواز میں یہ صدا لگائی۔ یا صباحاہ :۔ اس آواز کے سنتے ہی لوگ ہر طرف سے دوڑ پڑے۔ جو خود نہیں آسکے، انہوں نے اپنے نمائندے بھیجے۔ جب سب لوگ اکٹھے ہو گئے تو آپؐ نے گفتگو کا آغاز فرمایا:۔

رسول اللہؐ:۔ اے بنی عبدالمطلب، اے بنی فہر، اے بنی کعب، اے بنی عبد شمس۔ اے آل قریش۔
اگر میں تم سے یہ کہوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے ایک لشکر تیار کھڑا ہے۔ اور تم پر حملہ کرنا چاہتا ہے۔
تو کیا تم اس بات پر یقین کر لوگے؟

لوگ (بیک آواز): ہاں ہمیں تمہاری بات کا یقین ہے ہم نے تم کو کبھی جھوٹ بولتے نہیں پایا۔

رسول اللہ:۔ تو غور سے سنو کہ میں تم کو ایک سخت عذاب سے ڈرانے اور آگاہ کرنے آیا ہوں، جو تمہارے سروں پر منڈلا رہا ہے۔ اپنی جانوں کو اس کی پکڑ سے بچانے کی کوشش کرو۔ اللہ نے مجھے اپنے قریبی عزیزوں کو خبردار کرنے کا حکم دیا ہے۔ تم لوگ میرے عزیز و اقارب ہو، یہ بات میرے دائرہ اختیار سے باہر ہے کہ میں تمہاری آخرت میں سفارش کر سکوں، جب تک کہ تم لا الٰہ الا اللہ نہ پڑھ لو۔ ہاں

اگر اسلام قبول کر لو تو میں اپنے اللہ کے ہاں تمہاری شہادت دے سکتا ہوں اس کلمہ کی بدولت عرب تمہارے تابع اور عجم تمہارے مطیع ہو جائیں گے۔

اے آلِ قریش۔ سنو! خدا کے مقابلہ میں میں تمہارے کسی کام نہیں آسکتا۔

قیامت میں صرف متقی اور پرہیزگار لوگ میرے قریب ہوں گے کہیں ایسا نہ ہو کہ دوسرے تو اعمال حسنہ لے کر حاضر ہوں اور تمہارے سروں پر دنیا کا بوجھ ہو، تمہاری پکار بھی اس وقت رائیگاں جائے گی۔ (سناٹا چھا جاتا ہے)

ابولہب (وقفہ کے بعد) خدا تجھے غارت کرے، کیا صرف یہی بتلانے کے لئے ہمیں بلایا تھا۔

(صحیح بخاری، مسلم، ترمذی (متفق علیہ)

سیرت ابن ہشام: جلد ۱ صفحہ ۲۰۱ - ۲۷۸ تاریخ طبری جلد اول صفحہ ۹۱)

مکالمات عمرو بن عبسہ

۱- عمرو بن عبسہ کا بیان ہے کہ ہوش سنبھالتے ہی مجھے بت پرستی سے نفرت ہو گئی۔ کیوں کہ یہ بے جان مورتیاں نہ کسی کو نفع دے سکتی ہیں اور نہ نقصان۔ اپنی تلاش حق کے دوران میری ملاقات ایک اہلِ کتاب سے ہوئی، اُس نے مکہ میں ایک نئے نبی کے ظہور کی پیش گوئی کی اور بتایا کہ وہ نبی بت پرستی کو مٹا کر خدائے واحد کی پرستش کی تبلیغ کریں گے۔ وہ ایک افضل ترین شریعت کے حامل ہوں گے۔

میں اسی انتظار میں گھڑیاں گنا کرتا کہ اُسی اہل کتاب کی زبانی پتہ چلا کہ "وہی نبی" کا ظہور ہو چکا ہے۔ میں مکہ کی جانب چل پڑا، عکاظ میں میلہ زوروں پر تھا۔ میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تبلیغ فرما رہے ہیں، جب آپ کو قدرے اکیلے پایا۔ تو آپ کے قریب گیا اور گفتگو کا آغاز کیا:

عمرو :- آپ کون ہیں ؟
رسول اکرمؐ : میں اللہ کا نبی ہوں -
عمرو : کیا آپ کو اللہ نے مبعوث کیا ہے ؟
رسول اکرمؐ : بے شک، میں خدائے واحد و لاشریک کا فرستادہ ہوں
عمرو :- آپ کی دعوت -؟
رسول اکرمؐ :- خدائے تعالیٰ پر ایمان - کہ وہ لاشریک ہے -
بت پرستی سے اجتناب
اپنوں سے محبت
عمرو : کوئی شخص آپ پر ایمان بھی لایا ہے ؟
رسول اکرمؐ :- ہاں، ایمان لانے والوں میں ایک آزاد - (ابوبکر)
اور ایک غلام (بلال) دونوں شامل ہیں -
عمرو :- اسلام کیا ہے ؟
رسول اللہ : ہر شخص کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آنا - مساکین کی دیکھ بھال کرنا -
عمرو : اور ایمان -
رسول اللہ : اللہ کی راہ میں صبر و رضا سے کام لینا -
عمرو : اسلام کا سب سے اعلیٰ درجہ کونسا ہے -
رسول اللہؐ : نہ کسی کو زبان سے دکھ دو، نہ کسی کو یدی ایذا پہنچاؤ
عمرو :- ایمان کی رفعت کی کیا علامت ہے ؟
رسول اللہ :- اخلاق حسنہ،
عمرو :- یا رسول اللہ! میں آپ پر ایمان لاتا ہوں،
آپ کی تعلیمات پر میرا ایمان ہے -
اے اللہ کے نبی! مجھے بھی ابوبکر اور بلال کی طرح اپنی رفاقت کا شرف بخشیے -
رسول اللہؐ : ہمیں جس قدر مظالم کا نشانہ بنایا جا رہا ہے - وہ تم برداشت نہیں کر سکتے - فی الحال واپس جاؤ - وہ وقت قریب ہے کہ دین غالب ہو گا تم کو علم ہو جائے گا - اس وقت جہاں میرا قیام ہو — آجانا -

(تاریخ طبری جلد اول صفحہ ۸۶)

۲۔ عمرو بیان کرتے ہیں کہ میں کہے کر تو وطن واپس چلا آیا لیکن دن رات اسی فکر میں مبتلا رہتا۔ کہ الٰہی کب وہ مبارک ساعت طلوع ہوگی جب اسلام غالب ہوگا اور حبیبِ خدا کے دیدار سے دیدہ و دل منور ہوں گے، وہ مبارک ساعت آخر کو آن پہنچی۔ میں وہی رات ایک کرکے مدینہ پہنچا۔ حضور کی خدمت میں حاضری دی اور عرض کیا:۔

عمرو :۔ یا رسول اللہ! آپ نے مجھے پہچانا۔؟

رسول اللہ:۔ ہاں، تم وہی تو ہو، جو مکے میں حاضر ہوئے تھے۔ اور میری تصدیق کی تھی۔

عمرو:۔ یارسول اللہ ﷺ مجھے بھی اس کلام کی تعلیم دیں۔ جس کا نزول آپ پر ہوا ہے۔ (اصابہ۔)

(۳) عمرو بن عبسہ بیان کرتے ہیں کہ جب سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرمائے مدینہ ہوئے تو میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور گفتگو کا آغاز کیا۔

عمرو: یا رسول اللہ! مجھے نماز کے اوقات تعلیم فرمائیے۔

رسول اللہ ﷺ:۔ صبح کی نماز جب پڑھ لو۔ تو سورج کے نکلنے کا انتظار کرو۔ جب سورج طلوع ہو رہا ہو تو کوئی نماز نہ پڑھو۔ یہاں تک کہ وہ اونچا ہو جائے۔ پھر نماز پڑھ سکتے ہو، اس وقت تک کہ نیزہ کا سایہ نیزہ سے آ لگے۔ ان اوقات کی نماز میں فرشتے شرکت کرتے ہیں۔

اس کے بعد سایہ ڈھلنے تک کوئی نماز نہ پڑھو۔ کیوں کہ اس وقت دوزخ دہکائی جاتی ہے۔ پھر نماز پڑھ سکتے ہو۔ یہاں تک کہ عصر کی نماز سے فارغ ہو جاؤ۔ پھر سورج غروب ہونے تک نماز نہ پڑھو، کیونکہ سورج غروب ہوتے وقت کافر اس کی عبادت کرتے ہیں۔

عمرو: اے اللہ کے رسول! وضو سے متعلق کچھ ارشاد ہو۔

رسول اللہ ﷺ: جو شخص بھی وضو کرتے وقت جب ناک میں پانی ڈال کر ناک صاف کرتا ہے، تو اس کے منہ اور اس کے نتھنوں کی ساری آلائشیں اور لغزشیں نکل جاتی ہیں۔

اس کے بعد جب شریعت کے مطابق منہ دھوتا ہے تو پانی کے ساتھ ساتھ اس کے چہرہ کی گندگی اور لغزشیں داڑھی کے کناروں سے ٹپک جاتی ہیں، جب وہ کہنیوں تک اپنے دونوں ہاتھ دھوتا ہے تو پانی کے ساتھ ساتھ اس کی انگلیوں کے پوروں سے اس کے ہاتھوں کی لغزشیں دور ہو جاتی ہیں۔

سر کے مسح کے ساتھ، سر کی آلائشیں دور ہو جاتی ہیں۔

جب وہ پیر ٹخنوں تک دھوتا ہے تو پانی کے ساتھ اس کے پیروں کی آلائشیں۔ اس کے پیروں کے پوروں کے راستے نکل جاتی ہیں۔ اب اگر وہ کھڑا ہو گیا۔ نماز بھی پڑھ لی۔

اور سبحانک اللّٰھم پڑھ کر خدا کی حمد و ثنا کی، جیسے کہ اس کے ادا کرنے کا حق ہے۔ اور اپنے دل کو محض اللہ کے واسطے خالی کر لیا۔

تو نماز سے فارغ ہونے کے بعد وہ گناہوں سے ایسا پاک ہو جاتا ہے جیسا اپنی ماں سے
پیدائش کے دن پاک صاف تھا۔ (صحیح مسلم۔ بحوالہ ترجمان السنۃ جلد ۲ صفحہ ۲۶۸ - ۲۶۹)

قریش کا ردِ عمل، ترغیب و تحریص کے ہتھکنڈے اور ناکامی

قریش کی سخت مخالفت اور ستم رانیوں کے باوجود بھی اسلام روز بروز بڑھ رہا تھا۔ جب کفار مکہ کو حبش میں بھی ناکامی ہوئی تو رئیسانِ قریش سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ تاکہ کوئی لائحہ عمل بنایا جائے۔ آخر کار انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ ترغیب و تحریص کے ہتھکنڈوں کو استعمال میں لایا جائے اگر یہ حربہ بھی کارگر نہ ہوا تو دھمکی سے کام لیا جائے۔ اس خدمت کے لیے مکہ کے ایک صاحب ثروت رئیس عتبہ نے اپنی خدمات پیش کیں، وہ حضور کے پاس آیا اور گفتگو کا آغاز کیا۔

عتبہ : میرے بھتیجے تم ہمارے درمیان جس حیثیت کے مالک ہو، وہ تمہارے علم میں ہے۔ تم نے اپنی قوم کو ایک ایسے فتنے میں مبتلا کیا ہے، جس نے اُن کا شیرازہ منتشر کر دیا ہے۔ تم نے اُن کو، اُن کے آباء کو بیوقوف و احمق ٹھہرایا۔ ان کے مذہب کی توہین کی، ان کے معبودوں کو بُرا بھلا کہا۔ میں کچھ باتیں تمہارے سامنے پیش کرتا ہوں، شاید تمھیں کوئی بات قبول ہو۔

رسول اللہ ؐ : ابوالولید: کہو میں سن رہا ہوں۔

عتبہ : بھتیجے ! اگر تم اس کارروائی سے مال و دولت جمع کرنا چاہتے ہو تو ہم تمھیں اس قدر مال و دولت دیں گے کہ تو مکہ کا امیر ترین شخص بن جائے۔

اگر عزت اور ناموری کی خواہش ہے تو ہم سب تمھیں اپنا رئیس ماننے کو تیار ہیں۔

اگر تمہارا مقصود حصول حکومت ہے تو ہم تمھیں عرب کا بادشاہ بنانے کو تیار ہیں۔

غرض جو چاہو، سو کرنے کو ہم تیار ہیں۔ مگر تم اپنے اس طریقہ سے باز آجاؤ۔

اور اگر تمہارے دماغ میں کوئی خلل واقع ہو گیا ہے، یا آسیب اور جن وغیرہ کا اثر ہے۔ جس کا وظیفہ تمہارے بس میں نہیں۔ تو بتاؤ، ہم تمہارا علاج کرائیں، اس کا سارا خرچ ہم برداشت کریں گے۔

رسول اللہ ؐ : تم نے جو کچھ کہنا تھا۔ کہہ چکے؟

عتبہ : ہاں۔

رسول اللہ ؐ : جو کچھ تم نے میری بابت کہا۔ اس میں ذرہ برابر صداقت نہیں نہ ہی میرا مقصود مال و دولت جاہ و عزت یا حکومت ہے اور نہ ہی میرے دماغ میں خلل ہے، میری حقیقت کا عکاس اللہ کا یہ کلام ہے۔ (آپ نے سورۂ فصلت کی چند آیات ــ سجدہ تک تلاوت فرمائیں ....) عتبہ کلام الٰہی

کے سننے میں ایسا محو ہوا۔ کہ اُسے ہوش تک نہ رہا۔ تلاوت کے بعد آپ نے فرمایا ابو الولید
— میں نے جو کچھ کہنا تھا۔ تم نے سن لیا۔ اب تمہاری مرضی —

عتبہ جب واپس ہوا۔ تو اس کا رنگ بدلا ہوا تھا۔ اس کے رفیقوں نے پوچھا۔

ابو الولید: کیا خبر لائے ہو؟

عتبہ :- میں نے ایک ایسا کلام سنا ہے، جو اس سے پہلے کبھی نہیں سُنا بخدا۔ نہ وہ شعر ہے نہ جادو۔
نہ منتر ہے نہ کہانت میری مانو تو محمدؐ کو اُس کے حال پر چھوڑ دو۔

جب ترغیب و تحریص کے ہتھکنڈے بھی ناکام ہوگئے۔ تو سارے رئیس اکٹھے ہو کر حضورؐ کے چچا ابو طالب کے پاس آئے تو دھمکانے کے انداز میں کہا:-

اے ابو طالب — ہم نے آپ کا بہت لحاظ کیا، اب ہمارے لیے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا ہے۔
اگر تمہارا بھتیجا ہمارے معبودوں کی مذمت سے باز نہ آیا اور ہمارے بزرگوں کو بُرا بھلا کہتا رہا، تو ہم
اُسے جان سے مار ڈالیں گے۔ عافیت چاہتے ہو تو اپنے بھتیجے کو روکیں۔

—— یہ حالت دیکھ کر ابو طالب کا دل بھر آیا۔ اُس نے حضور صلعم کو بلایا اور کہا۔

جانِ پدر! ان کے معبودوں کو بُرا مت کہو' ان کے بزرگوں کی توہین نہ کیا کرو — اگر
یہی صورتِ حال رہی (تو) میں بھی تمہاری کچھ حمایت نہیں کر سکوں گا۔ مجھ پر اتنا بوجھ نہ ڈالو، جس کو
میں اٹھا نہ سکوں، —

رسول اللہؐ :- چچا! خدا کی قسم اگر یہ میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند رکھ دیں' اور
یہ چاہیں کہ میں اس کام سے باز آجاؤں۔ ایسا ممکن نہیں۔ یہاں تک کہ اللہ اس کو غالب کر
دے یا اس کام میں میری جان بھی جاتی رہے۔

ابو طالب (حضورؐ کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر)

میرے بھتیجے، جاؤ، جو تمہارا دل چاہے، کہو، اور جس طرح جی چاہے تبلیغ کرو، خدا کی قسم میں کسی
حالت میں تمہارا ساتھ نہیں چھوڑوں گا۔

اس ناکامی پر قریش بڑے جز بز ہوئے اور ایک فیصلہ کُن اقدام کے لئے انہوں نے حرمِ پاک میں ایک مجلسِ مشاورت بلائی۔
فیصلہ یہ ہوا کہ (حضرت) محمدؐ کو بُلا کر اُن سے بالمشافہ گفتگو کی جائے، اس غرض کے لیے انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بُلا بھیجا۔
سید المرسلینؐ خوشی خوشی حرم کعبہ تشریف لائے۔ کیوں کہ آپ کو رئیسانِ مکہ کے ایمان لانے کی بڑی آرزو تھی، جب حضورؐ وہاں پہنچے — تو
انہوں نے گفتگو کا آغاز کیا:

قریش :- اے محمدؐ! بخدا ہمیں علم نہیں کہ کسی شخص نے اپنی قوم کو اتنی مشکلات میں مبتلا کیا ہو، جیسی تم

نے ہم پہ ڈال رکھی ہیں۔ کوئی مصیبت ایسی نہیں جو تمہاری وجہ سے ہم پہ نہ آئی ہو۔
اب ہمیں بتاؤ کہ اس نئے دین سے تمہارا مقصود اگر مال اکٹھا کرنا ہے ——— تو ہم تمہیں اتنا مال دے دیں گے کہ تم امیر ترین شخص بن جاؤ۔
اگر عزت و سرداری کی خواہش ہے، تو ہم تمہیں اپنا سردار بنانے کو تیار ہیں۔
اور اگر حکومت چاہتے ہو، تو ہم تمہیں اپنا بادشاہ بنانے کو تیار ہیں۔
اور اگر تم پہ کوئی آسیب یا جن غالب آ گیا ہے تو ہم جھاڑ پھونک کے ذریعہ اپنے خرچ پہ تمہارا علاج کروانے کو تیار ہیں۔ تاکہ تم تندرست ہو جاؤ یا پھر ہم تمہیں معذور سمجھیں۔

رسول اللہ ؐ: تم نے جو کچھ کہا۔ اس میں رتی بھر صداقت نہیں۔ میں جو تعلیم لے کر آیا ہوں، وہ نہ طلب اموال کے لیے ہے اور نہ اس کا مقصد محض جلب شرف یا محض حصول سلطنت ہے۔ حق تو یہ ہے کہ خدا نے مجھے تمہاری طرف اپنا رسول ؐ بنا کر بھیجا ہے، مجھ پہ کتاب نازل فرمائی ہے۔
مجھے اپنا بشیر اور نذیر بنایا ہے۔
میں نے اپنے آقا کا پیغام تم تک پہنچا دیا ہے اور تمہیں سمجھائے دیتا ہوں۔ اگر ان تعلیمات پہ عمل کرو گے تو دنیا و آخرت میں فلاح پاؤ گے۔
انکار کرو گے۔ تو میں اللہ کے حکم کا انتظار کروں گا کہ وہ میرے اور تمہارے درمیان کیا فیصلہ کرتا ہے۔

قریش: چلو ایسا ہی سہی۔ اگر تم ہماری باتوں کو خاطر میں نہیں لاتے، تو یہ بات تو سنو۔ تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ ہمارا علاقہ تنگ ہے۔ پانی کی سخت قلت ہے۔ زندگی بسر کرنا ہمارے لئے سخت دشوار ہے۔ ہمارے لئے دعا کرو کہ یہ پہاڑ جنہوں نے ہمارے شہر کو گھیر رکھا ہے۔ وہ تمہارا پروردگار پیچھے دھکیل دے، تاکہ ہمارا شہر کشادہ ہو جائے۔ اس میں شام اور عراق جیسی نہریں جاری کر دے۔ ہمارے اسلاف کو زندہ کر دے۔ ان میں قصی بن کلاب بھی ہوں۔ وہ حق گو سردار تھا۔ ہم اس سے تمہاری بابت دریافت کر لیں گے۔ اگر اس نے تمہاری تصدیق کی۔ اور تم نے ہمارے دوسرے مطالبات بھی پورے کر دیئے تو ہم بھی تمہاری تصدیق کریں گے اور مان لیں گے کہ تو خدا کا فرستادہ ہے۔

رسول اللہ ؐ: میں تمہاری طرف ان چیزوں کے لئے رسول بنا کر نہیں بھیجا گیا ہوں۔ میں تو یہ تعلیم دے کر مبعوث کیا گیا ہوں، جسے اگر تم قبول کر لو تو دنیا و آخرت میں تمہاری خوش نصیبی ہے۔ اگر نہیں

مانو گے۔ تو میں حکم الٰہی کا انتظار کروں گا۔ حتیٰ کہ اللہ تعالےٰ میرے اور تمہارے درمیان جو چاہے فیصلہ فرما دے۔

قریش :- اچھا۔ اگر تمھیں ہماری خاطر منظور نہیں تو اپنی ذات کے لیے ہی خدا سے سوال کرو، اپنے خالق سے استدعا کرو کہ وہ تمہارے ساتھ ایک فرشتہ کو لگا دے۔ جو تمہارے کلام کی تصدیق کرے تاکہ ہم تمہاری مخالفت سے باز رہیں یا پھر یہ استدعا کرو، کہ وہ تمہارے لئے محل، باغات۔ اور سونے چاندی کے ڈھیر مہیا کرے۔ تاکہ تم اِن فکروں سے بے نیاز ہو جاؤ۔ جو تمہیں لاحق ہیں۔ تاکہ ہم جان لیں کہ خدا کے ہاں تمہارا کوئی مرتبہ ہے۔

رسول اللہؐ :- میں اِن باتوں کے لیے مبعوث نہیں کیا گیا۔ اور نہ ہی میں یہ چاہوں گا کہ اللہ سے اس قسم کی استدعا کروں مجھے تو اللہ نے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔

پس اگر تم اِسے مان لو تو دنیا و آخرت کی بھلائی ہے اور تم نہیں مانو گے، تو میں صبر کروں گا۔ حتیٰ کہ اللہ میرے اور تمہارے درمیان فیصلہ کر دے۔

قریش :- اچھا تو ہم پر آسمان کا کوئی ٹکڑا ہی گرا دو۔ کیوں کہ تمہارا دعویٰ ہے کہ اگر خدا چاہے تو ایسا کر سکتا ہے۔

پس جب تک تم ایسا نہیں کرو گے، ہم ایمان نہیں لانے کے۔

رسول اکرمؐ :- یہ خدا کے اختیار میں ہے، وہ اگر چاہے تو ایسا کر سکتا ہے۔

قریش : محمدؐ: کیا تیرے خدا کو اس بات کا علم نہ تھا کہ ہم تجھے بلائیں گے، کیا اس نے تمھیں پہلے سے یہ نہیں بتایا کہ ایسے ایسے سوال کریں گے، یہ یہ چیزیں طلب کریں گے۔ کیا ہماری باتوں کا جواب تمہارے خدا نے تمھیں نہیں بتلایا۔ اور یہ کہ وہ ہم سے کیا معاملہ کرنے والا ہے۔ ہم تم پر ایمان لانے کے نہیں۔

ہم تو سمجھتے ہیں کہ جو کچھ ہم نے سُنا ہے صحیح ہے کہ تم یمامہ میں رہنے والے رحمٰن نامی شخص سے تعلیم حاصل کرتے ہو۔

اے محمدؐ ہم نے اپنے تمام عذر پیش کر دیئے، ہم نے پکا ارادہ کر لیا ہے کہ اب تمھیں اس دین کی اشاعت نہیں کرنے دیں گے۔

(سیرت ابن ہشام جلد ۱ صفحہ ۳۰۱ تا صفحہ ۳۱۲)

تاریخ طبری جلد اول صفحہ ۹۱ - ۹۵

مکالمۂ ابوجہل

ابوطالب سخت بیمار تھے۔ ابوجہل، ابوسفیان اور چند دیگر رؤسائے قریش عیادت کے لیے آئے، اور کہا:

ہم تو آپ کی عظمت کے قائل ہیں۔ آپ کے بھتیجے نے ہمیں سخت فتنہ میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اُس نے اپنے اور قریش کے درمیان اختلاف کی ایک خلیج حائل کر دی ہے۔ آپ بھی اچھی طرح اس سے واقف ہیں، بہتر ہے کہ آپ کے سامنے وہ اور ہم کوئی معاہدہ کر لیں۔ ہم تو بس یہ چاہتے ہیں کہ وہ ہمارے معبودوں کو بُرا بھلا نہ کہے۔ ہمارے دین کی توہین نہ کرے۔ ہم اُن کے کام میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ ڈالیں گے۔

ابوطالب نے حضورؐ کو بلایا۔ آپ پر قریش کا موقف پیش کیا اور آپؐ کو اس کام سے باز رہنے کی تلقین کی۔ جب ابوطالب نے بات ختم کی تو حضورؐ نے فرمایا:

رسول اللہؐ: عمِ محترم، میری تو صرف ایک بات ہے۔ اگر قریش اسے مان لیں، تو عرب و عجم دونوں اُن کے زیرنگیں ہو جائیں۔

ابوجہل: بتاؤ۔ ہم ایک نہیں ایسی دس باتیں ماننے کو تیار ہیں تاکہ اختلاف مٹ جائے۔

رسول اللہؐ: وہ یہ کہ تم لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ کو مان لو۔ جھوٹے خداؤں کا جُوا گردن سے اُتار دو۔

ابوجہل (سکتے کے عالم میں)۔ اے محمدؐ۔ عجیب بات کہی تم نے، بھلا اتنے معبودوں کو چھوڑ کر ہم کیسے ایک خدا کی عبادت شروع کر دیں۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے

(سیرت ابن ہشام جلد ۱)

ضماد کا اسلام

ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ضماد ازدی مکہ مکرمہ آئے، یہ تعویذ گنڈوں اور جھاڑ پھونک کا دھندا کیا کرتے تھے، مکہ کے رئیس اس کے پاس گئے اور ان احمقوں نے اُسے بتایا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر آسیب کا اثر ہو گیا ہے۔ جس سے دماغ میں خلل واقع ہوا ہے۔ ضماد نے جب یہ باتیں سُنیں تو اس کے دل میں حضورؐ کو دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہوا، دل میں سوچا کہ میں آپؐ کو جھاڑ پھونک کروں۔ شاید خدائے تعالیٰ میرے ہاتھوں اُسے شفا دے دے۔ یہی سوچ کر وہ حضورؐ کے پاس آیا اور بولا۔

ضماد: اے محمدؐ، سنا ہے آپ پر آسیب کا اثر ہے، میں جنات کی جھاڑ پھونک کرتا ہوں۔ آپ اگر چاہیں تو میں علاج کے لیے تیار ہوں۔

رسول اللہؐ: اے ضماد! تمام تعریفیں اللہ کو زیب دیتی ہیں۔ ہم اس کی تعریف کرتے ہیں اور ہر معاملہ میں اس کی استعانت کے خواستگار ہیں جسے اللہ پاک ہدایت دے۔ اُسے کوئی گمراہ نہیں کر سکتا۔ جسے راہ سے ہٹا دے، کسی کی مجال نہیں کہ اُسے راہِ راست پر لے آئے۔ میں گواہی دیتا ہوں۔ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، وہ واحد ہے۔ لاشریک ہے اس بات کی بھی شہادت

دیتا ہوں کہ محمدؐ اُس کا بندہ اور رسول ہے ۔

ضماد : (حضورؐ کی بات کے درمیان بولتے ہوئے) ، یہ کلمات پھر سے ارشاد فرمائیے (حضورؐ نے یہ کلمات تین بار دُہرائے ۔ تو ضماد بولا)

میں نے کاہنوں کے قول سُنے ، ساحروں کے منتر پڑھے ، شاعروں کے اشعار سے محظوظ ہوا لیکن بخدا ۔ ان کلمات کا جواب نہیں ، ایسا کلام کبھی سننے میں نہیں آیا ۔ بخدا یہ تو بحرِ معرفت کے دُرِّ بے بہا ہیں ۔ ان کی گہرائی کے کیا کہنے ، اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) لائیے ۔ اپنا ہاتھ بڑھائیے میں آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہوں ۔ (یہ کہہ کر اس نے اسلام پر بیعت کر لی)

(صحیح مسلم بحوالہ (ترجمان السنۃ جلد ۲)

عبداللہ بن سلام کا اسلام

حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ عبداللہ بن سلام اپنے باغ میں پھل توڑنے میں مصروف تھے ۔ جب انھیں پتہ چلا کہ حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف فرما ہوئے ہیں فوراً حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور گفتگو کا آغاز کیا ۔

ابن سلام : میں آپ سے تین باتیں پوچھتا ہوں ، جن کا علم نبی کے علاوہ کسی کو نہیں ہو سکتا ۔ بتائیے ؟

۱ ۔ قیامت کی علامات میں سب سے پہلی علامت کونسی ہے ؟

۲ ۔ اہلِ جنت کا سب سے پہلے کھانا کیا ہوگا ؟

۳ ۔ بچہ اپنے باپ یا ماں کے مشابہ کب ہوتا ہے ؟

رسول اکرمؐ : جبرئیل علیہ السلام نے مجھے ابھی ابھی ان باتوں کی اطلاع دی ہے ۔ سنو :

۱ ۔ قیامت کی سب سے پہلی علامت ایک آگ ہوگی جو لوگوں کو مشرق سے مغرب کی سمت دھکیل کر لے جائے گی ۔

۲ ۔ رہی جنتیوں کی پہلی ضیافت تو یہ مچھلی کے جگر کے ایک ٹکڑے سے کی جائے گی ۔

۳ ۔ جہاں تک بچہ کی مشابہت کا تعلق ہے ۔ اگر مرد کا مادہ غالب ہوا تو بچہ باپ پر ہوتا ہے جہاں عورت کا مادہ غالب رہا وہاں بچہ ماں پر ہوتا ہے ۔

ابنِ سلام :۔ یا رسول اللہ میں آپ کی تصدیق کرتا ہوں ، (کلمہ شہادت پڑھنے کے بعد) اے اللہ کے نبی ۔ اہل یہود الزام تراشی میں بہت آگے ہیں ، اگر آپ میرے متعلق اُن کی سامنے معلوم کرنے سے پہلے میرے اسلام کا حال اُن سے کہیں گے تو وہ فوراً مجھ پر کوئی نہ کوئی بہتان باندھ دیں گے ، بہتر ہے کہ آپ پہلے اُن سے میرے متعلق دریافت فرمالیں ۔

جب یہود آپ کی خدمت میں آئے تو ابنِ سلام اوٹ میں ہو گئے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

اُن سے پوچھا:

رسول اللہؐ: عبداللہ بن سلام کس قسم کے آدمی ہیں؟

یہود: وہ ہم سب میں بہتر، ہم سبھوں کے سردار ہیں۔

رسول اللہ: اور اگر وہ اسلام قبول کر لیں۔ تو؟

یہود: توبہ۔ اللہ تعالےٰ اُن کو ایسی حرکت سے محفوظ رکھے۔

ابنِ سلامؓ: (اوٹ سے باہر آکر) اشھدُ ان لا الٰہ الا اللہ واشھد ان محمداً عبدہٗ ورسولہٗ

یہود: (نہایت ہی غصے سے) یہ شخص ہم سب میں بدتر ہے۔ بدتر کی اولاد ہے....

ابنِ سلام:۔ یا رسول اللہ! مجھے اُن سے اسی قسم کی بہتان طرازی کی توقع تھی۔

(بخاری شریف)

سفرِ طائف

ابن اسحٰق کی روایت ہے:۔ جب ابوطالب کا انتقال ہوگیا اور حضرت خدیجہؓ بھی اپنے خالق سے جا ملیں، تو قریش کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذارسانی کی آزادی حاصل ہوگئی۔ حضورؐ طائف کی جانب تشریف لے گئے تاکہ بنی ثقیف سے مدد حاصل کر کے اُن کی حفاظت میں رہیں۔ آپ کو توقع تھی کہ شاید وہ اس دعوت پر لبیک کہیں۔ آپؐ ان کے پاس تنہا تشریف لے گئے۔ آپؐ سب سے پہلے بنو ثقیف کے رئیسوں، عبدیالیل، مسعود اور حبیب، تین بھائیوں سے ملے۔ یہ لوگ بے حد مغرور اور سرکش تھے۔ آپ نے اُن کو اسلام کی دعوت دی تو وہ بول اُٹھے۔

پہلا بھائی: میں کعبہ کے غلاف کو ٹکڑے ٹکڑے کر دوں۔ اگر تجھے اللہ نے رسول بنایا ہو۔

دوسرا بھائی: کیا خُدا کو تیرے سوا اور کوئی بھی رسول بنانے کو نہ ملا جس کے پاس سواری تک میسر نہیں۔ اُسے اگر رسول بنانا ہی تھا تو کسی حاکم یا رئیس کو بناتا۔

تیسرا بھائی: میں تو تم سے بات ہی نہیں کرنے کا۔ اگر تو خدا کا رسول ہے جیسا کہ تیرا دعویٰ ہے تب تو یہ بات خطرے سے خالی نہیں کہ میں تیرے کلام کو رد کر دوں اور اگر تو خدا پر بھی بہتان باندھتا ہے تو مجھے زیب نہیں دیتا کہ تیرے ساتھ بات کروں۔

رسول اللہؐ: میں تم سے صرف اتنا چاہتا ہوں کہ تم نے جو کیا، کیا مگر جو کچھ مجھ سے سنا ہے اُسے اپنے پاس رکھو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے خیالات دوسرے لوگوں کے ٹھوکر کھانے کا سبب بن جائیں۔

لیکن ان مغرور رئیسوں نے یہ بات راز میں نہ رکھی، اپنے غلاموں اور اوباشوں کو حضورؐ کے پیچھے لگا دیا۔ اُن کی بدتمیزیوں کی وجہ سے آپ عتبہ اور شیبہ پسران ربیعہ کے باغ میں پناہ لینے پر مجبور ہوگئے۔ وہ دونوں وہاں موجود تھے۔ آپ انگور کی ایک بیل کے سائے میں بیٹھ گئے۔ جب قدرے سکون ہوا، تو اللہ کے حضور نہایت الحاح اور زاری سے دعا فرمائی۔

"خدا وندا، میں تیرے ہی حضور اپنی بے بسی و بے چارگی اور لوگوں کی نگاہ میں اپنی بے قدری کا شکوہ کرتا ہوں اے ارحم الراحمین تو سارے ہی کمزوروں کا رب ہے اور میرا رب بھی تو ہی ہے۔ مجھے کس کے حوالے کر رہا ہے؟ کیا کسی بیگانے کے حوالے جو مجھ سے درشتی کے ساتھ پیش آئے یا کسی دشمن کے حوالے جس کو تو نے مجھ پر قابو پالینے کا یارا دے دیا ہے۔ اگر تو مجھ سے ناراض نہیں تو مجھے کسی مصیبت کی پروا نہیں مگر تیری طرف سے عافیت مجھے نصیب ہو جائے تو اس میں میرے لئے زیادہ کشادگی ہے۔ میں پناہ مانگتا ہوں تیری ذات کے اس نور کی جو اندھیرے میں اجالا کرتا اور دنیا و آخرت کے معاملات کو درست کرتا ہے مجھے اس سے بچالے کہ تیرا غضب مجھ پر نازل ہو یا میں تیرے عتاب کا مستحق ہو جاؤں۔ تیری مرضی پر راضی ہوں یہاں تک کہ تو مجھ سے راضی ہو جائے کوئی زور اور طاقت تیرے بغیر نہیں۔"

(طبرانی، معجم کبیر، زاد المعاد، طبری۔ البدایہ ابن کثیر)

عتبہ اور شیبہ نے جب حضورؐ کی بے بسی دیکھی۔ تو انھیں آپؐ کی حالت زار پر رحم آیا۔ انہوں نے اپنے غلام عداس کو ایک طاس میں انگور کے خوشے دے کر حضورؐ کی طرف بھیجا عداس طاس لے کر آیا اور آپ کے حضورؐ کے سامنے رکھ کر گویا ہوا۔

عداس: کھائیے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انگوروں کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بسم اللہ پڑھی اور انگور تناول فرمانے لگے۔ عداس یہ کلمات سن کر حیران ہوا اور کہنے لگا:۔

عداس:۔ واللہ یہ کلام تو ایسا ہے کہ یہاں کے رہنے والے نہیں بولتے۔

رسول اللہؐ: اے عداس، تم کہاں کے رہنے والے ہو؟

عداس:۔ حضور! نینوی کا۔

رسول اللہ: تیرا دین کیا ہے؟

عداس:۔ حضورؐ میں نصرانی ہوں۔

رسول اللہ:۔ کیا اسی شہر کے، جو مردِ صالح یونس بن متی کا مسکن تھا؟

عداس:۔ آپ کو کیا خبر۔ کہ یونس بن متی کون تھا؟ اور کیسا تھا۔

رسول اللہ: وہ میرے بھائی اور نبی تھے۔ اور میں بھی نبی ہوں۔

عداس یہ سنتے ہی آپ پر جھک گیا، آپ کے سر، ہاتھ اور پاؤں کو بوسہ دینے لگا۔ یہ دیکھ کر عتبہ اور شیبہ ششدر رہ گئے۔ جب عداس واپس ہوا تو کہا۔

عتبہ و شیبہ:۔ کم بخت تجھے کیا ہو گیا تھا کہ اس شخص کے سر اور ہاتھوں کو بوسہ دینے لگا۔

عداس :۔ جناب عالی! آج روئے زمین پر اس شخص سے بہتر کوئی شخص نہیں۔ انہوں نے مجھے ایسی بات کی خبر دی ہے جو صرف اللہ کا نبی ہی دے سکتا ہے۔

عتبہ ، شیبہ : کم بخت۔ کہیں وہ تجھے تیرے دین سے برگشتہ نہ کر دے۔ تیرا دین اس کے دین سے کہیں بہتر ہے۔

۱۔ تاریخ طبری جلد اول صفحہ ۱۰۹ تا صفحہ ۱۱۱
۲۔ سیرۃ ابن ہشام جلد اول صفحہ ۴۶۵ تا صفحہ ۴۷۱۔

ہجرتِ مدینہ :۔

جب حضور سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے صحابہ مکہ سے ہجرت کرکے مدینہ جانے لگے تو حضرت ابوبکرؓ نے آپ سے ہجرت کی اجازت طلب کی۔ تو آپؐ نے فرمایا :۔

"ابوبکر! جلدی نہ کرو، شاید اللہ تعالیٰ تمہارے لئے کوئی ساتھی پیدا کر دے۔"

یہ کلمات سن کر حضرت ابوبکرؓ کو امید بندھ گئی کہ شاید اس "ساتھی" سے مراد حضورؐ کی اپنی ذات مبارک ہے۔ اس لئے انہوں نے دو اونٹنیاں محض اسی سفر کے لئے خرید لیں، انھیں اپنے گھر ہی میں پالتے رہے۔

حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ آپ بلاناغہ روزانہ صبح یا شام ہمارے گھر تشریف لاتے۔ جس روز اللہ کی طرف سے آپ کو ہجرت کا حکم ملا۔ آپ اس روز خلاف معمول ٹھیک دوپہر میں ہمارے یہاں تشریف لائے۔ میرے والد (حضرت ابوبکرؓ) نے آپ کو دیکھتے ہی کہا کہ ضرور کوئی غیر معمولی بات پیش آئی ہے کہ آپؐ اس وقت تشریف لائے ہیں آپ اندر تشریف لائے اور بستر پر بیٹھ گئے۔ گھر میں اس وقت میرے اور میری بہن اسمأ کے سوا کوئی موجود نہیں تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

رسول اللہؐ :۔ ابوبکر! جو لوگ یہاں موجود ہیں ۔ انھیں یہاں سے ہٹا دو۔

ابوبکرؓ :۔ یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں، یہاں میری بیٹیوں کے سوا کوئی غیر نہیں فرمایئے کیا حکم ہے؟

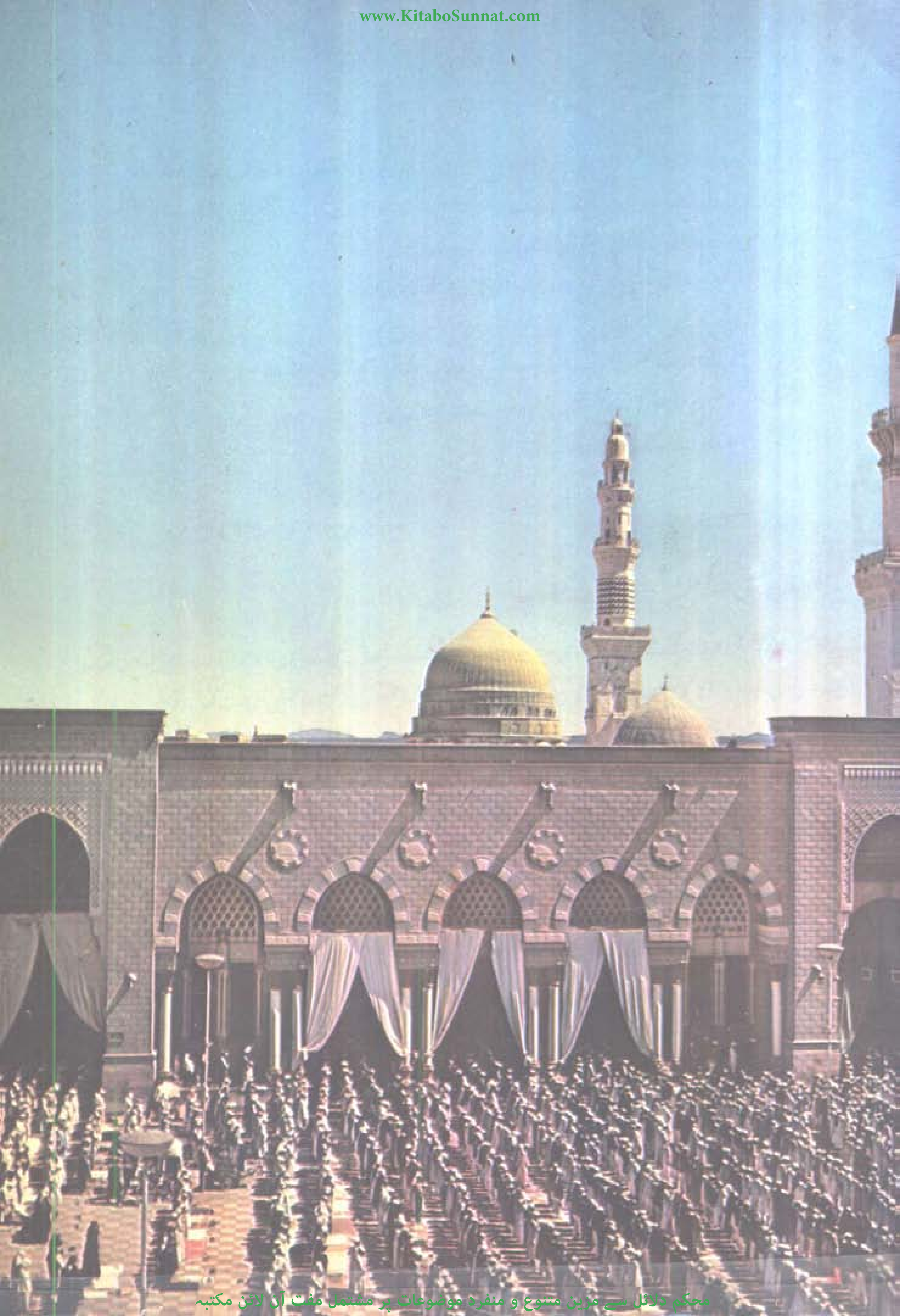
رسول اللہؐ :۔ اے ابوبکر۔ اللہ نے مجھے ہجرت کے سفر کا حکم دے دیا ہے۔

ابوبکرؓ :۔ حضور۔ تو مجھے بھی ساتھ چلنے کا شرف عطا فرمائیں۔

رسول اللہؐ : ہاں تم سفرِ ہجرت میں میرے رفیق ہوگے۔

ابوبکرؓ : (فرطِ مسرت سے روتے ہوئے) یا رسول اللہ۔ یہ میرے پاس دو سواری کے اونٹ ہیں ان کو میں نے پہلے سے اِسی سفر کے لئے تیار کر رکھا تھا۔

ابن اسحاق بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے نکلنے کا ارادہ فرما لیا۔ تو آپ حضرت ابوبکرؓ کے گھر تشریف لائے۔ دونوں حضرات گھر کے پشت کی طرف جو کھڑکی تھی۔ وہاں سے نکلے اور جبل ثور کی طرف روانہ ہوئے۔ وہاں ایک غار میں قیام فرمایا۔ عبداللہ بن ابوبکر ــ دن میں جو باتیں حضورؐ کے متعلق ہوتیں، شام کو اُن سے حضورؐ کو مطلع کرتا۔ شام کے وقت اسمأ بنت ابوبکرؓ



کھانا لے آتیں ۔ حضرت ابوبکرؓ کا غلام عامر بن فہیرہ دن بھر بکریاں چراتا ۔ شام کو وہاں لے آتا ۔ اس طرح قدموں کے نشان باقی نہ رہتے ۔ تین دن گزرنے کے بعد عامر بن فہیرہ اونٹنیاں لے کر پہنچ گیا ۔ حضرت ابوبکرؓ نے دونوں اونٹنیاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیں ۔ ان دونوں میں سے جو بہتر تھی، اُسے آگے رکھا ۔ اور عرض کی ۔

ابوبکرؓ : میرے ماں باپ آپؐ پر فدا ہوں، آپ اس پر سوار ہو جائیں ۔

رسول اللہ : نہیں، مجھے ایسی سواری پر بیٹھنا گوارا نہیں، جو میری نہ ہو ۔

ابوبکرؓ : اے اللہ کے رسولؐ میرے ماں باپ آپؐ پر فدا یہ آپؐ کی خدمت میں ہدیہ ہے ۔

رسول اللہؐ : نہیں، ایسا نہیں ہوگا، لیکن بتاؤ تو تم نے اسے کتنے میں خریدا ۔

ابوبکرؓ : اے اللہ کے رسولؐ ۔ وہ آپ کی ہو گئی ۔

۱۔ تاریخ طبری جلد ۲ صفحہ ۱۲۵

۲۔ سیرت ابن ہشام جلد ۱ صفحہ ۵۲۸ تا صفحہ ۵۲۶

سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم اور یہود کے درمیان مکالمات

۱۔ صفوان بن عسال مرادی کہتے ہیں، ایک یہودی نے اپنے ایک رفیق سے کہا کہ مجھے اُس نبی کے پاس لے چلو، ہم اُن سے آیت وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسٰى ..... الخ کا مطلب دریافت کریں گے ۔ وہ بولا ۔ خدارا ایسا غضب نہ کرنا ۔ انھیں نبی مت کہو ۔ اگر کہیں انہوں نے تیری زبان سے نبی کا لفظ سن لیا، تو وہ بہت مسرور ہوں گے ـــــ وہ دونوں حضورؐ کے پاس آئے اور گفتگو کا آغاز کیا ۔

یہود : ان آیات (ولقد آتینا موسیٰ ۔۔۔ الخ) سے کیا مراد ہے ؟

رسول اکرمؐ : ان سے مراد وہ احکام ہیں جو موسیٰ پر نازل کئے گئے وہ احکام یہ ہیں :

کسی کو اللہ تعالیٰ کا شریک نہ ٹھیراؤ ۔

چوری نہ کرو ۔

زنا نہ کرو ۔

کسی محترم جان کو قتل نہ کرو مگر یہ کہ حق ہو ۔

سحر کا عمل نہ کرو ۔

سود نہ کھاؤ

کسی بے گناہ کو پکڑ کر کسی حاکم کے پاس اِس لئے نہ لے جاؤ کہ وہ اُسے قتل کر دے ۔

کسی پاکباز، عفیفہ عورت پر اتہام مت لگاؤ ۔

جہاد میں پشت نہ پھیرو ۔

اور ہاں۔ تمہارے لیے ایک خصوصی حکم بھی ہے کہ شنبہ کے دن شکار کھیلنے کا جواز پیدا کرنے کے لئے شریعت کی حد و دمت توڑو۔

یہود : (حضور کے ہاتھوں اور پیروں کو بوسہ دیتے ہوئے)
ہم گواہی دیتے ہیں۔ آپ بے شک برحق نبی ہیں،

رسول اللہؐ : تو پھر میری اتباع میں کون سی چیز تمہیں مانع ہے۔

یہود : ۔ حضرت داؤد کی یہ دُعا۔ کہ اُن کی نسل میں ہمیشہ نبوت رہے گی، ہمارے لئے روک ہے۔ اگر ہم آپ کے ہاتھ پہ بیعت کریں۔ تو ہمیں خوف ہے کہ کہیں یہودی ہمیں مار ہی نہ ڈالیں۔

(احمد، ابوداؤد، بحوالہ ترجمان السنتہ جلد۲ صہ ۶۹)

(۴) ثوبانؓ بیان کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھا جب ایک یہودی عالم وہاں آیا۔ آپؐ کو دیکھتے ہی کہنے لگا۔

یہودی : ۔ السلام علیک یا محمدؐ !

یہ الفاظ سُنتے تو میں غصے سے بھر گیا، اور یہودی کے دھکا لگایا۔

یہودی : ۔ تم نے مجھے دھکا کیوں دیا ؟

ثوبان : اس لئے کہ تم نے یا رسول اللہ کہنے کی بجائے آپؐ کو نام سے پکارا۔

یہودی : ۔ میں نے تو وہی نام لیا، جو آپؐ کے گھر والوں نے آپ کا رکھا ہے۔

رسول اللہؐ : واقعی ! میرے گھر والوں نے مجھے یہی نام دیا ہے۔

یہودی : میں اس لئے حاضر ہوا ہوں کہ آپ سے چند باتیں دریافت کروں۔

رسول اللہؐ : آخر یہ باتیں جان کر تمہیں کیا ملے گا ؟

یہودی : چاہتا ہوں کہ یہ باتیں اپنے کانوں سے سنوں۔

رسول اللہؐ : ۔ (چھڑی سے زمین کریدتے ہوئے) اچھا۔ پوچھو۔

یہودی : جس دن زمین کی صورت بدل جائے گی آسمان دگرگوں ہوں گے۔ اُس دن بھلا مخلوقِ خدا کہاں ہوگی ؟

رسول اللہؐ : اس تاریکی میں جو پُل صراط سے پہلے محیط ہوگی۔

یہودی : وہ کون لوگ ہوں گے جن کا گذر سب سے پہلے پل صراط پہ ہوگا ؟

رسول اللہؐ : مہاجرین کے فقیر۔

یہودی : ۔ جنت میں داخل ہونے والوں کو سب سے پہلے ناشتہ میں کیا ملے گا ؟

رسول اللہؐ : مچھلی کے جگر کا بڑھا ہوا ٹکڑا۔

یہودی :- اس کے بعد اہلِ جنت کی کونسے طعام سے ضیافت کی جائے گی؟
رسول اللہؐ :- وہ بیل ذبح کیا جائے گا جو جنت کے کناروں پر چرا ہو گا۔
یہودی :- ان کے لیے مشروب کونسا ہو گا۔
رسول اللہؐ:- چشمہ سلسبیل کا پانی۔
یہودی :- بس آخری بات پوچھنی ہے۔ جس کا علم روئے زمین پر سوائے نبی کے کسی کو نہیں۔
رسول اللہؐ :- اگر جان بھی لو، تو تمھیں کیا فائدہ ملے گا، بہر حال پوچھو۔
یہودی : فرمایئے کہ ماں کے پیٹ میں لڑکا کیسے بنتا ہے۔
رسول اللہؐ :- یہ تو کوئی راز نہیں، مرد کا مادہ سفید رنگ کا اور گاڑھا ہوتا ہے جبکہ عورت کا مادہ زرد اور رقیق ہوتا ہے۔ ملاپ کے دوران جس کا مادہ غالب رہے۔ تو اولاد بھی اُس کے مناسب ہو گی، اگر مرد کا مادہ غالب رہا تو لڑکا۔ ورنہ لڑکی پیدا ہو گی۔
یہودی : بے شک آپ نے حق بات کہی، آپؐ سچے نبی ہیں
رسول اللہؐ : اس شخص نے جو باتیں دریافت کی ہیں، اُس کے استفسار سے پہلے مجھے ان میں سے کسی، بات کا علم نہیں تھا.... یہاں تک کہ اس کے پوچھنے پر اللہ تعالےٰ نے مجھے ان باتوں کے متعلق آگاہ فرمایا؛ (مسلم شریف)

۳- ابنِ عباسؓ- اور ابن اسحاق- دوسروں سے روایت بیان کرتے ہیں کہ یہودی علما کی ایک جماعت حضور کی خدمت میں حاضر ہوئی- اُن کے اور سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان گفتگو کا یوں آغاز ہوا۔
علمائے یہود : یارسول اللہؐ! ہمیں چند باتیں پوچھنی ہیں، ہمارا ایمان ہے کہ ان باتوں کا علم سوائے نبی کے اور کسی کو نہیں۔
رسول اللہؐ : جو دل چاہے شوق سے پوچھو، تمہاری باتوں کا اگر تمہیں جواب مل جائے۔ جس کی صداقت پر تمھیں یقین ہو۔ تو پھر وعدہ کرو کہ تم اسلام لے آؤ گے۔ اور اس بات کا بھی عہد کر لو جس کا عہد یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں سے لیا تھا۔ کہ اللہ تعالےٰ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کریں گے۔
یہودی : ہمیں اقرار ہے، ہمیں چار باتیں بتایئے جو ہم آپ سے دریافت کرتے ہیں اگر آپ یہ باتیں بتا دیں تو ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے۔
رسول اللہؐ : مجھ سے اللہ تعالےٰ کے نام پر عہد کرو کہ اگر میں نے تمھیں اُن کا جواب دے دیا تو پھر تم ضرور میری تصدیق کرو گے۔
یہودی :- ہاں۔ ہمیں منظور ہے۔
رسول اللہؐ: اب جو مناسب سمجھو، پوچھ لو۔
یہودی : ہمیں وہ چیزیں بتایئے۔ جن کو تورات کے نزول سے پہلے اسرائیل (حضرت یعقوبؑ) نے اپنی ذات پر حرام ٹھہرا لیا تھا۔

رسول اللہؐ :۔ میں تمھیں اُس خدائے واحد کی قسم دیتا ہوں، جس نے موسیٰؑ پر توریت نازل فرمائی تھی کیا تم نہیں جانتے کہ انھیں کھانے میں اونٹ کا گوشت اور پینے میں اونٹنی کا دودھ نہایت مرغوب تھا، وہ سخت بیمار ہوئے اور جب یہ بیماری طوالت پکڑ گئی تو انہوں نے منت مانی کہ اگر اللہ تعالےٰ مجھے شفا عطا فرمائے تو میں اپنی پسندیدہ، کھانے پینے کی چیزوں کو ترک کر دوں گا۔

یہودی : یا رسول اللہ، بے شک آپ نے صحیح فرمایا۔
ہمیں یہ بتائیے کہ لڑکا اپنی ماں پر کیوں جاتا ہے، جبکہ نطفہ تو باپ کا ہوتا ہے۔

رسول اللہؐ : میں تمھیں اس خدا کی ذات کی قسم دیتا ہوں، جس کے سوا کوئی معبود نہیں اور جس نے موسیٰ علیہ السلام پر توریت نازل فرمائی۔ (سچ سچ بتاؤ) کیا تم نہیں جانتے کہ مرد کا نطفہ سفید اور کثیف ہوتا ہے جبکہ عورت کا نطفہ رقیق اور زردی مائل ہوتا ہے۔ ان دونوں میں جو بھی دوسرے پہ غالب رہتا ہے، اولاد اُسی کے مشابہ ہوتی ہے۔

یہودی :بے شک آپ نے حق بات فرمائی۔
ہاں تو تورات میں نبی اُمّی کی کیا علامت بیان کی گئی ہے ؟

رسول اللہؐ :میں تمھیں اللہ کی قسم دیتا ہوں، اور ان نعمتوں کی جو اللہ پاک نے بنی اسرائیل کو عطا فرمائیں (سچ کہو) کہ کیا تمھیں اس بات کا علم نہیں، کہ اُس نبی کی جس کے متعلق تمہارا زعم ہے کہ میں وہ نہیں، ایک علامت یہ ہے کہ نیند صرف اس کی آنکھوں پر طاری ہوتی ہے جبکہ دل اس کا بیدار رہتا ہے۔

یہود :۔ یہ سچ ہے۔

رسول اللہؐ :۔ پس میری نیند بھی ایسی ہے، میری آنکھ سوتی ہے۔ پر میرا دل بیدار رہتا ہے۔

یہود :۔ بس آخری بات بتا دیجئے۔ وہ یہ کہ کونسا فرشتہ (روح) آپ کے پاس آتا ہے۔

رسول اللہؐ :۔ تمھیں قسم ہے اللہ کی اور ان نعمتوں کی جو اللہ نے بنی اسرائیل کو بخشی تھیں، کیا تم نہیں جانتے کہ وہ جبرئیل ہے۔ میرا دلی دوست ہے۔ میرے پاس آتا ہے۔ مجھ سے پہلے بھی جو نبی ہوتے۔ اُن کے پاس بھی آتے تھے۔

یہود :۔ آپ سچ فرماتے ہیں! اور اسی بات پر آپ سے جُدا ہوتے ہیں۔ اے محمدؐ! وہ ہمارا دشمن ہے۔ وہ سختیوں اور خونریزیوں کا لانے والا ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی اور آپ کا رفیق کوئی اور ہوتا۔ تو ہم ضرور آپ کی تصدیق کرتے اور آپ کی اتباع کرتے۔

۱۔ابن ہشام جلد ۱ صفحہ ۶۰۹ تا ۶۱۱
۲۔ابوداؤد بحوالہ ترجمان السنہ جلد ۳ صفحہ ۲۰۱ تا ۲۰۲

غزوۂ بدر الکبریٰ

جنابِ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم ۳۱۳ صحابہ کرام کے ہمراہ ۸ ر رمضان ۲ ہجری کو مدینہ سے نکلے، منزلیں تیزی سے طے کیں تاکہ قافلۂ ابوسفیان کو جالیں۔ وادیٔ ذفران جاکر پتہ چلا کہ لشکرِ قریش قافلہ کی حفاظت کے لئے آن پہنچا ہے۔ صورتِ حال مختلف تھی، اب مقابلہ قافلہ کے محافظوں سے نہیں، رؤسائے قریش اور اہل مکہ سے تھا، مدینہ واپسی بھی خطرے سے خالی نہیں تھی۔ صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لیے آپ نے صحابہ سے مشورہ ضروری سمجھا، آپؐ نے انھیں اکٹھا کیا لشکر قریش کی خبر دی۔ اور فرمایا:۔

رسول اللہؐ : اے لوگو! مجھے مشورہ دو۔

حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کھڑے ہوئے اور اپنی جاں نثاری کا اظہار کیا، حضرت عمر فاروق رضؓ نے بھی موزوں طریقے سے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

رسول اللہؐ :۔ اے لوگو۔ مجھے مشورہ دو کہ اب کیا کرنا چاہیے۔

مقداد رضؓ : (نہایت ہی جوش سے) یارسول اللہ! جس چیز کا آپ کو اللہ پاک نے حکم دیا ہے، اس پر عمل فرمائیے۔ ہم سب آپ کے ساتھ ہیں۔ خدا کی قسم ہم بنی اسرائیل کی طرح نہیں ہیں، جنہوں نے حضرت موسیٰؑ سے کہہ دیا تھا کہ جاؤ اور تیرا خدا جاکر لڑو، ہم تو یہاں سے ہلنے کے نہیں (ہم عہد کرتے ہیں) کہ آپؐ کا خالق اور آپؐ جہاد و قتال کریں۔ ہم بھی آپ دونوں کے ساتھ قتال میں برابر کے شریک ہوں گے۔

ہم آپؐ کے دائیں اور بائیں۔ آگے اور پیچھے قتال کریں گے۔

تمام صحابہ: (ایک آواز) یارسول اللہؐ! ہم بنی اسرائیل نہیں نہ اُن کی تقلید کریں گے، ہم ہر حال میں آپ کے ساتھ ہیں۔

رسول اللہؐ : (تمام صحابہ کو مخاطب کرتے ہوئے)۔ اے لوگو! مجھے مشورہ دو۔ آپ بھی تو اپنی اپنی رائے کا اظہار کریں۔

(سعد بن معاذ سمجھ جاتے ہیں کہ سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کا روئے سخن انصار کی طرف ہے)

سعد بن معاذ رضؓ : کیا آپؐ کا روئے سخن ہماری طرف ہے؟

رسول اللہؐ : ہاں۔

سعد رضؓ : ہم آپ پر ایمان لائے۔ آپ کی تصدیق کی، اور اس بات کی شہادت دی کہ آپؐ کا دین برحق ہے جہاں تک اطاعت اور جاں نثاری کا تعلق ہے، ہم آپؐ کو پختہ عہد و میثاق دے چکے ہیں۔

یارسول اللہؐ! آپؐ مدینہ سے کسی اور ارادہ سے نکلے، لیکن اللہ تعالیٰ نے دوسری صورت پیدا فرما دی جو منشاءِ مبارک ہو، کیجئے، ہم ہر حال میں آپ کے ساتھ ہیں ہمارے مال میں سے جس قدر چاہیں لیں جس قدر چاہیں عطا فرمائیں۔ مال کا جس قدر حصہ آپ لیں گے وہ اس حصہ سے زیادہ محبوب ہوگا جو

ہمارے پاس رہے گا آپ ہم کو جو حکم دیں، ہم اطاعت کریں گے، اگر آپ ہم کو برک الغماد تک جانے کا حکم دیں گے، ہمیں مستعد پائیں گے،

اس خدا کی قسم جس نے آپؐ کو رسالت کے منصب پر فائز کیا۔ آپ اگر سمندر میں کود پڑنے کا حکم دیں گے، ہمیں پیچھے رہ جانے والوں میں نہیں پائیں گے، ہم دشمن کے مقابلہ میں نڈر ہیں، ہم رزم میں ثابت قدم اور صابر، اور بزم میں راست گفتار ہیں۔

ہمیں اللہ تعالےٰ سے توقع ہے کہ ہماری جاں نثاری سے آپ مسرور و مطمئن ہوں گے بسم اللہ کیجئے،

رسول اللہؐ: (جان نثارانہ خطاب سے مسرت محسوس کرتے ہوئے)۔ اللہ کے نام پر چلو۔ اللہ پاک کا میرے ساتھ وعدہ ہے کہ وہ دو جماعتوں (قافلہ ابوسفیان یا لشکر قریش) میں سے کسی ایک پر مجھے ضرور غلبہ و نصرت عطا فرمائے گا۔

(دریں اثنا حضرت سعد بن وقاص دو غلام پکڑ کے لے آئے، حضورؐ نے صورتِ حال معلوم کرنے کے لئے ان سے پوچھ گچھ کی —)

رسول اللہؐ:۔ اچھا یہ تو بتاؤ کہ اُن کے یہاں روزانہ کتنے اونٹ ذبح کئے جاتے ہیں۔

غلام:۔ کسی دن نو۔ اور کسی دن دس۔

رسول اللہؐ: معلوم ہوتا ہے مکہ والے تقریباً ایک ہزار ہیں۔

(ہاں تو لشکر میں کون کون شامل ہیں)؟

غلام:۔ اکثر رئیسان قریش (نام لیتے ہیں)

رسول اللہ:۔ اے لوگو! لو مکہ نے اپنے تمام جگر گوشوں کو تمہاری طرف بھیج دیا ہے۔

چونکہ ابوسفیان نے رستہ بدل لیا اور قافلے کو ساحل بحر کی جانب سے بچا کر لے گیا۔ اس لیے لشکر اسلام دشمنوں کے مقابلہ کے لئے عازم بدر ہوا، آپؐ پانی کے قریب پہنچ کر رُک گئے تو حباب بن منذر جو بدر کے محلِ وقوع سے خوب واقف تھے۔ حضورؐ کے پاس آئے اور عرض کی،

حباب: یارسول اللہؐ! آپ نے اپنی مرضی سے یہ مقام منتخب فرمایا ہے، یا اللہ پاک نے وحی کے ذریعے آپ کو یہاں ٹھہرنے کا حکم دیا ہے۔

رسول اللہؐ: حباب! اگر کوئی مصلحت ہو تو اس مقام کو تبدیل کرنے میں کوئی امر مانع نہیں،

حباب:۔ یارسول اللہ! لوگوں کو حکم دیجئے، یہاں سے کوچ کر کے اس کنوئیں پر پڑاؤ کریں جو دشمن سے قریب ہے اور حکم دیجئے کہ اس کے عقب میں جس قدر کنوئیں ہیں ان کو پانی سے بھر دیں، ایسا کریں تو ہمیں پانی کی کمی نہیں رہے گی۔ لیکن دشمن پانی کی کمی کی وجہ سے سخت مشقت میں مبتلا ہوگا۔

رسولؐ اللہ: (حباب کی رائے کو پسند فرماتے ہوئے) ۔قبول ہے ۔ اے لوگو! میں بھی تمہاری طرح ایک بشر ہوں ۔ سنو ہمیں اپنے تمام کام باہمی مشورے سے طے کرنے چاہئیں، آئندہ میں بھی کسی کام کا قصد نہ کروں گا، جب تک مشورہ نہ کر لوں ۔

رسولؐ اللہ: (جنگ شروع ہونے سے پہلے) ۔ اے لوگو! اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں محمدؐ کی جان ہے، آج جس نے بھی صبر و استقامت سے جنگ میں حصہ لیا، اور ایمان و احتساب کے اس عالم میں شہید ہوا، کہ اُس نے نہایت بے جگری سے دشمنوں کا مقابلہ کیا اور پیٹھ نہ دکھائی ــ تو اللہ تعالیٰ کی جنت کے دروازے اس کے لیے کھلے ہیں ۔

جنگ ہوئی۔ جس میں ۷۰ کافر مارے گئے اور اتنے ہی گرفتار ہوئے ۔ باقی اہل مکہ نے راہِ فرار اختیار کی ۔ مقتولین کی لاشیں ایک گڑھے میں دبا دی گئیں ، حضورؐ نے اپنے صحابہ کے ساتھ وہ رات میدانِ بدر میں بسر کی ، رات کے کسی لمحے حضورؐ اُس گڑھے کی طرف آئے اور فرمایا:

رسولؐ اللہ: اے گڑھے میں دبے ہوئے قریشیو! اے عتبہ بن ربیعہ ، اے شیبہ بن ربیعہ! اے امیہ بن خلف ، اے ابن ہشام (ابوجہل) (دیکھ لیا) ۔ خدا نے جو وعدہ تم سے کیا تھا ۔ کیا تم نے اُسے سچا پایا؟ ہاں ، مجھ سے جو وعدہ میرے رب نے کیا تھا ۔ وہ تو پورا ہو گیا ۔

صحابہ: ۔ یارسول اللہؐ! کیا یہ سنتے ہیں؟

رسولؐ اللہ: ہاں! تم یہ بات ان سے زیادہ نہیں سنتے ۔ لیکن یہ جواب نہیں دے پاتے ۔

اسیرانِ بدر

مدینہ پہنچنے کے پندرہ دن بعد آپؐ نے صحابہ کو بلا بھیجا تاکہ اسیرانِ بدر کے متعلق مشورہ سے کوئی بات طے کی جائے ، آپؐ نے گفتگو کا آغاز فرمایا ۔

رسولؐ اللہ: تحقیق اللہ نے تم کو اِن پر قدرت دی ہے ۔
(بتاؤ ۔ ان کے متعلق کیا فیصلہ دیا جائے)

حضرت عمرؓ: یارسول اللہ ، مناسب یہی ہے کہ اِن سب کی گردن اڑا دی جائے ، یہ خدا اور رسول کے دشمن ہیں انہوں نے آپ کی تکذیب کی ۔ آپ کے ساتھ جنگ کی ۔

رسول اکرمؐ: (مزید استفسار کی خاطر) اے لوگو! تحقیق اللہ نے تمہیں اُن پر قدرت دی ہے ۔ کل یہ تمہارے بھائی تھے

حضرت ابوبکرؓ: ۔ یارسول اللہؐ! یہ لوگ سب کے سب آپ ہی کی قوم سے ہیں ، میری رائے تو یہ ہے کہ انھیں فدیہ لے کر رہا کیا جائے ، عجب نہیں کہ اللہ تعالیٰ انھیں نارِ جہنم سے نجات دے دے ، ان کے دل اسلام کی طرف مائل ہو جائیں ۔ اور یہی لوگ کافروں کے مقابلہ میں ہمارے معین و مددگار ثابت ہوں ۔

رسول اللہؐ : اے عمر تیری مثال حضرت نوحؑ اور حضرت موسیٰؑ جیسی ہے۔ حضرت نوحؑ نے تنگ آکر اپنی قوم کے لیے یہ دعا کی تھی:" اے پروردگار! مت چھوڑ زمین پر کافروں میں سے کسی بسنے والے کو، تو اگر ان کو چھوڑ دے گا، تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے۔ اور بدکار کافروں کو جنم دیں گے۔" (سورہ ۷۱)
اور حضرت موسیٰ نے تنگ آکر دعا کی تھی کہ:

"اے ہمارے پروردگار۔ مٹا دے ان کے مال و متاع اور مہر کر دے ان کے دلوں پر، یہ اس وقت تک ایمان نہ لائیں جب تک دردناک عذاب نہ دیکھ لیں اپنی آنکھوں سے" (القرآن ۱۰-۸۸)

اور اے ابوبکرؓ۔ تیری شان حضرت ابراہیمؑ اور حضرت عیسیٰؑ جیسی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے حضور مشرکین کے لئے دعا کی تھی کہ

"پس جس نے میری پیروی کی، وہ مجھ سے ہے اور جس نے میری نافرمانی کی پس۔ تو ارحم الراحمین ہے" (القرآن)

اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے جانی دشمنوں کے لئے پروردگار کے حضور فریاد کی۔

"اے اللہ! اگر تو انھیں عذاب دے تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو انھیں بخش دے تو بیشک تو غالب حکمت والا ہے" (القرآن)

آپؐ نے حضرت ابوبکرؓ کی رائے کو پسند فرمایا۔ چنانچہ اس تمثیلی ارشاد کے بعد فرمایا۔

"اے لوگو، اصل بات یہ ہے کہ تم میں کوئی بھی ایسا نہیں، جسے کچھ احتیاج نہ ہو، بہتر یہ ہے کہ اسیرانِ بدر کو فدیہ لے کر رہا کر دو۔ اور جو فدیہ نہ دے سکیں، انھیں قتل کر ڈالو۔"

۱۔ "تاریخ طبری : جلد ۱ ص ۱۵۳ تا ص ۴۶
۲۔ ابن ہشام : جلد ۱ ص ۲۰۰ تا ص ۴۲۹

سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر میں

جابرؓ کہتے ہیں کہ حضور رسالتمآبؐ کے دروازہ پر کئی لوگ جمع تھے۔ لیکن کسی کو ملاقات کی اجازت نہیں ملی۔ اتنے میں حضرت ابوبکرؓ صدیقؓ آئے تو انھیں حضورؐ نے اندر آنے کی اجازت دے دی۔ ان کے فوراً بعد حضرت عمر فاروقؓ آئے تو انھیں بھی شرف باریابی حاصل ہوگیا۔ یہ دونوں حضرات اندر گئے تو دیکھا کہ سید المرسلینؐ خاموش اور مغموم بیٹھے ہیں۔ حضرت ابوبکر کو خیال آیا کہ کوئی ایسی بات کہی جائے۔ جسے سن کر حضورؐ ہنس پڑیں۔

حضرت ابوبکرؓ : یارسول اللہؐ! اگر بنت خارجہ مجھ سے میری حیثیت سے زیادہ نفقہ کا مطالبہ کریں، تو میں اُس کے اٹھ کے آتا۔

رسول اللہ ﷺ (مسکراتے ہوئے) : ابوبکرؓ تم دیکھ نہیں رہے ۔ میری بیبیاں اسی غرض کے لیے میرے گرد جمع ہیں ۔

حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ : (حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ کے گلے دباتے ہوئے) ۔

" آخر تم حضورؐ سے آپؐ کی بساط سے زیادہ نفقہ کا مطالبہ کیوں کرتی ہو ۔ اتنا سوال کیوں کرتی ہو جتنا آپ کے پاس نہیں ۔ "

حضرت عائشہؓ و حفصہؓ : " بخدا ہم پھر کبھی اس قسم کا مطالبہ پیش نہیں کریں گی ۔ "

اس سلسلہ میں حضور ﷺ نے ایک ماہ یا ۲۹ روز تک اپنی ازواج سے علاحدگی اختیار کر لی، اسی پر قرآن کی آیت قُل لازواجِکَ ... . (المحسنات منکن اجراً عظیما .... نازل ہوئی ۔ اس میں آپ کی ازواج مطہرات کو اختیار دیا گیا کہ وہ خدا اور خدا کے رسولؐ اور دنیاوی فراخی میں سے جسے چاہیں اختیار کریں ۔ اللہ اور رسول کو اپنائیں تو دُنیا و آخرت دونوں کی بھلائی ورنہ دنیا و آخرت دونوں کا خسران " ۔

اس آیت کے نزول کے بعد آپ فوراً حضرت عائشہ کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا ۔

رسول اللہ ﷺ : عائشہ ! سنو، میں ایک خاص بات تمہارے سامنے رکھتا ہوں بہتر ہے کہ اس کا جواب سوچ سمجھ کر دو، عجلت سے کام نہ لو اور اپنے والدین سے بھی اس ضمن میں مشورہ کر لو ،

حضرت عائشہؓ : یا رسول اللہ ﷺ ۔ فرمایئے ۔ وہ کیا بات ہے ۔؟

(رسول اللہ ﷺ نے وہ آیت پڑھ کر سنا دی ۔ وہ بے ساختہ بول اٹھیں)

یا رسول اللہ، کیا آپ کی رفاقت کا مسئلہ بھی ایسا ہے ۔ جس کے لئے میں اپنے والدین سے مشورہ کروں گی مجھے مشورہ کی ضرورت نہیں، میں دل و جان سے، بغیر کسی استخارہ کے اللہ اور اللہ کے رسولؐ کو اختیار کرتی ہوں لیکن اتنا ضرور عرض کروں گی کہ میرے جواب سے کسی دوسری بی بی کو آگاہ نہ فرمائیں ۔

رسول اللہ ﷺ : نہیں ۔ ایسا نہیں ہوگا، مجھ سے تو جس نے پوچھا میں اُس کو تمہارا جواب سنا دوں گا مجھے اس لیے مبعوث نہیں کیا گیا کہ لوگوں کو مشقت (آزمائش) میں ڈالوں میں معلم ہوں، میرا فرض ہے کہ لوگوں کے لیے آسانی پیدا کروں ۔ (اور انہیں تعلیم دوں)

(صحیح مسلم ۔ بحوالہ ترجمان السنہ جلد ۲ صفحہ ۹۱)

مکالمات بسلسلۂ صلح حدیبیہ (فتح مبین)

مسلمانوں کو مکہ چھوڑے چھ سال بیت چکے تھے، ہر ایک بیقرار تھا کہ زیارت کعبہ سے اپنے دیدہ و دل منور کرے، حج و عمرہ ادا کر کے اللہ کی خوشنودی حاصل کرے ۔ ان ہی دنوں حضور سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو خوش خبری سنائی کہ ہم ان شاء اللہ قریبی زمانے میں امن و سلامتی سے حدودِ حرم میں داخل ہوں گے ۔ بس پھر کیا تھا ۔ آتش شوق بھڑک اٹھی ۔ اور دلِ مسرت سے لبریز ہو گئے ۔

حج بیت اللہ کا اعلان کر دیا گیا۔ قبائل کو بھی دعوت نامے بھیجے گئے۔

یوم دوشنبہ یکم ذی قعدہ ۶ھ کو حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم۔ تقریباً چودہ سو صحابہ کے ہمراہ مکہ کی جانب روانہ ہوئے۔ اس مقدس جماعت کے پاس بحکم الٰہی، نیام شدہ تلوار کے علاوہ کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ ازواجِ مطہرات میں صرف حضرت ام سلمہ رض ساتھ تھیں۔

جب یہ قدسی صفات جماعت ذوالحلیفہ پہنچی تو حضور ص کے ساتھ تمام رفیقوں نے احرام باندھا قربانی کے جانوروں پر نشان لگائے گئے۔

قریش بخوبی واقف تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے رفیق محض حج کے ارادہ سے مکہ آرہے ہیں۔ پھر بھی ان سرکشوں نے فیصلہ کیا کہ کسی صورت میں مسلمانوں کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے انہوں نے مسلمانوں کا راستہ روکنے کے لیے دو سو سواروں کا ایک دستہ خالد بن ولید اور عکرمہ بن ابو جہل کی سرکردگی میں آگے بھیجا۔ یہ دستہ مقام ذی طویٰ میں آکر ٹھیر گیا۔

حضور ص اور آپ کے رفیق مقام عسفان تک پہنچے تو آپ کو یہاں بنی کعب کا ایک شخص ملا آپ نے اُس سے استفسار فرمایا:

رسول اللہ ص:۔ سناؤ: قریش کس حال میں ہیں۔

وہ شخص: وہ آپ کی روانگی کا سن کر غصے میں بے حال ہو گئے۔ انہوں نے عہد کیا ہے کہ وہ آپ کو مکے میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ آپ کو روکنے کے لیے انہوں نے دو سو سوار بھیجے ہیں جو ذی طویٰ میں پڑاؤ ڈالے پڑے ہیں۔

رسول اللہ ص: افسوس، صد افسوس کس قدر غلط کار ہیں قریشی۔ جنگ نے اُن کی اجتماعیت کا شیرازہ بکھیر دیا ہے۔ اُن کے لئے بہتر تھا کہ مجھے قبائل عرب کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتے اگر میں قبائل عرب کے ہاتھوں مغلوب ہو جاتا، تو اُن کی دلی تمنا بر آتی۔ اور اگر اللہ کے حکم سے میں اُن پر غالب آجاتا تو پھر وہ فوج در فوج دینِ اسلام کے حلقہ میں داخل ہوتے۔ اس میں اُن کی عزت بلند ہوتی۔

اگر انھیں یہ بھی منظور نہیں تھا، تو جنگ کر سکتے تھے۔ اُن کے پاس قوت ہے۔ نہ جانے قریش کے عزائم کیا ہیں بخدا، جس مقصد کے لئے مجھے مبعوث کیا گیا ہے، اُس کے لیے اس وقت تک جد و جہد جاری رکھوں گا، تا آنکہ مجھے اُن پر غلبہ حاصل ہو، یا پھر میں ہی نہ رہوں۔

اسی دوران قریش کا لشکر آن پہنچا، لیکن آپ کسی حالت میں بھی جنگ نہیں چاہتے تھے۔ اس لیے آپ نے دوسرا راستہ اختیار فرمایا اور ایک شخص کی رہنمائی میں دشوار گزار راستوں سے ہوتے ہوئے مرار نامی ٹیلہ کے قریب جب حدیبیہ کی گھاٹی میں پہنچے تو آپ کی اونٹنی بیٹھ گئی اُسے اُٹھانے کی کوشش کی گئی۔ لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اس لیے حضور نے اپنے ساتھیوں کو حدیبیہ کی گھاٹی میں پڑاؤ ڈالنے کا حکم دیا۔ اور فرمایا:

رسول اللہ ص: اس اونٹنی کو مکے میں داخل ہونے سے اُس ذاتِ پاک نے روک دیا ہے۔ جس نے ابرہہ کے

ہاتھی کو روک دیا تھا۔ اب قریش مجھے صلہ رحمی کا واسطہ دیتے ہوئے جس امر کی بھی دعوت دیں گے وہ مجھے قبول ہوگی۔

مکہ والوں کو حقیقت حال کا علم ہوا تو اُن میں اضطراب پھیل گیا، آپؐ نے اس موقعہ پر مناسب سمجھا کہ صحابہ کرام میں سے کسی صاحب ''کو مکہ بھیجا جائے'' تاکہ وہ انھیں اطمینان دلائے کہ ہم جنگ کے ارادے سے نہیں، حج و عمرہ کے ارادہ سے آئے ہیں۔ آپ نے حضرت عمرؓ کو بلایا۔ اور ارشاد فرمایا۔

رسول اللہؐ: اے عمر! تم قریش کے پاس جاؤ۔

حضرت عمر: یا رسول اللہ! مکہ میں بنی عدی بن کعب کا ایک فرد بھی موجود نہیں، جو اس وقت میری حمایت کرے۔ جب مکہ والے میرے درپے آزار ہوں۔ آپ کو بخوبی علم ہے کہ اہل مکہ مجھ سے کس قدر برہم ہیں اور کس درجہ میرے دشمن ہیں آپ عثمانؓ کو وہاں جانے کا حکم دیں۔ اُن کا پورا خاندان مکہ میں موجود ہے جو اُن کی حمایت میں اُٹھ سکتا ہے۔ اس طرح وہ سفارت کا فریضہ بطریق احسن انجام دے سکتے ہیں۔

رسول اللہ: (حضرت عثمان کو بُلا کر حکم دیتے ہوئے): اے عثمان جاؤ ابوسفیان اور دوسرے سردارانِ قریش کو ہمارا پیغام پہنچا دو کہ ہم جنگ کرنے کے لئے نہیں آئے۔ ہمارا ارادہ حج اور عمرہ ادا کرنے کا ہے۔ اُن کو اسلام کی دعوت بھی دینا۔ اور مکہ میں جو اہل ایمان موجود ہیں۔ اُن کو یہ بشارت سنا دو، گھبرائیں نہیں، عنقریب اللہ تعالےٰ مکہ میں اپنے دین کو غالب فرمائے گا۔ اور انھیں اپنا ایمان پوشیدہ رکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔

حضرت عثمان مکہ پہنچے۔ تو قریش کے اکابرین سے ملے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام پہنچایا۔ انہوں نے یہ بات چیت کی:

قریش:۔ اے عثمان! اگر تم کعبہ کا طواف کرنا چاہتے ہو تو کر لو۔

عثمانؓ:۔ ہم سب کعبہ کی زیارت اور فریضہ حج ادا کرنے کے لیے آئے ہیں جب تک رسول اللہؐ طواف نہ کرلیں، میں اس وقت تک طواف نہیں کرسکتا۔ میری اس بات کا ثبوت قربانی کے جانور ہیں، جو ہم اپنے ساتھ لائے ہیں، ہم زیارت و قربانی کے بعد مدینہ واپس چلے جائیں گے۔

مکہ والوں نے حضرت عثمانؓ کو اپنے ہاں روک لیا، مسلمانوں کے کیمپ میں یہ بات پھیل گئی کہ حضرت عثمانؓ شہید کر دیے گئے۔ مسلمان طیش میں آ گئے۔ حضورؐ ایک ببول کے درخت کے نیچے بیٹھ گئے اور فرمایا۔

جب تک ہم ان لوگوں سے خون عثمانؓ کا بدلہ نہ لے لیں۔ یہاں سے قدم نہیں ہٹائیں گے۔ (اپنا دست مبارک تھام کر):۔ یہ عثمانؓ کی طرف سے ہے۔ تمام صحابہؓ نے موت پر بیعت کی، تاریخ میں یہ بیعت بیعتِ رضوان کے نام سے مشہور رہے۔ اس کا ذکر قرآن مجید میں بھی آیا ہے۔ حضرت عثمان واپس پہنچ گئے۔ قریش کو بھی احساس ہوگیا کہ جنگ میں خسارہ ہے۔

اس دوران بُدیل بن ورقہ خزاعی اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور گفتگو کا آغاز کیا:۔

بُدیل :- حضور! آپ کس ارادے سے آئے ہیں۔ قریش آپ کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔

رسول اللہؐ : ہم کسی سے جنگ کرنے نہیں آئے، ہم عمرہ کی نیت سے یہاں پہنچے ہیں، قریش کو پہلے ہی جنگ نے خستہ حال بنا دیا ہے، اگر وہ چاہیں تو میں کچھ مدت اُن سے طے کر لوں، تاکہ اس مدت میں کوئی ایک دوسرے سے تعرض نہ کرے۔ وہ مجھے اور عرب کو اپنے حال پر چھوڑ دیں اگر اللہ کے فضل سے میں غالب ہوا، تو وہ چاہیں تو ہمارے ساتھ شامل ہو جائیں۔ ورنہ انھیں کچھ مدت کے لیے آرام کا موقع تو مل جائے گا۔ بُدیل! میری بات غور سے سنو، اللہ تعالیٰ یقیناً اس دین کو غالب فرمائے گا۔

اپنے دین کے ظہور، غلبہ اور نصرت کا جو وعدہ اُس خالقِ حقیقی نے فرمایا ہے وہ ضرور پورا ہوگا۔ ہاں۔ اگر وہ جنگ ہی چاہتے ہیں، تو قسم اس ذات پاک کی جس کے قبضے میں محمد کی جان ہے میں دین کے معاملہ میں قتال سے گریز نہیں کروں گا۔ اُس وقت تک کہ یا تو میری جان چلی جائے یا اللہ کا دین غالب ہو کر رہے۔

بُدیل نے واپس جا کر قریش کو صورتِ حال سے آگاہ کیا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم سے صلح کے خواہش مند ہیں۔ وہ لڑائی کے ارادہ سے نہیں بلکہ زیارت کعبہ کے لیے آئے ہیں۔ لیکن مکہ والے اپنی ضد پہ قائم رہے۔ اور مزید گفتگو کے لیے عروہ بن مسعود کو بھیجا۔ حضورؐ نے اُس سے بھی وہی بات کہی جو بُدیل سے فرما چکے تھے۔ عروہ نے عرض کیا :-

عروہ :- اے محمد! مکہ آپ کا وطن ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی نے اپنی قوم کو خود ہلاک و تباہ کیا ہو۔ یہ بھی سن لیں کہ اگر قریش نے آپ پر غلبہ پا لیا۔ تو آپ کے ساتھی آپ کا ساتھ چھوڑ کر راہِ فرار اختیار کر لیں گے۔

ابوبکرؓ : کیا کہا۔ کیا ہم — ہم حضورؐ کا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ راہِ فرار اختیار کریں گے۔؟

عروہ صحابہ کی جاں نثاری کے مظاہر بچشم خود دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ چنانچہ واپس جا کر کہا :

اے میری قوم! میں نے بادشاہوں کے دربار دیکھے ہیں۔ میں نے قیصر و کسریٰ کی شان و شوکت بھی دیکھی ہے۔ لیکن خدا کی قسم جو جاہ و جلال میں نے یہاں دیکھا، نہ کہیں دیکھنے میں آیا اور نہ سننے میں، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رفیق آپ کا ایسا ادب اور اس درجہ تعظیم بجا لاتے ہیں، جو بادشاہوں کا مقدر بھی نہیں۔

میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ جاں نثارانِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کبھی آپؐ کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے انہوں نے بہت اچھی تجویز پیش کی ہے۔ میری مانو تو اس تجویز کو مان لو۔ اسی میں تمہاری عافیت ہے۔

متکبرانِ قریش کو یہ بات کہاں گوارا تھی۔ انہوں نے سہیل بن عمرو کو معاملات طے کرنے کے لیے بھیجا۔ آپ نے سہیل کو دیکھا تو فرمایا:

"البتہ اب معاملہ کچھ سہل ہو گیا۔ سہیل کا آنا اس بات کی علامت ہے کہ قریش صلح کرنے پر مائل ہو گئے ہیں۔"

کافی بحث و تمحیص کے بعد فیصلہ ہو گیا کہ معاہدۂ صلح تحریر کیا جائے۔ آپؐ نے حضرت علی کو طلب فرمایا۔ اور ارشاد ہوا۔

رسول اللہؐ: اے علی! لکھو، بسم اللہ الرحمان الرحیم

سہیل:۔ مجھے یہ کلمہ منظور نہیں، مجھے نہیں علم کہ رحمان کون ہے۔ تم اُسی پُرانے دستور کے مطابق لکھو۔ باسمک اللّٰھم۔

رسول اللہؐ:۔ (مسلمانوں کے احتجاج کے باوجود)۔ اچھا تو باسمک اللّٰھم ہی لکھو (ذرا توقف کے بعد) آگے لکھو، یہ وہ عہدنامہ ہے جس پر محمد رسول اللہ نے .....

سہیل: ٹھہریئے۔ خدا کی قسم۔ اے محمدؐ۔ اگر ہمارا اس پر ایمان ہوتا کہ آپ اللہ کے رسول ہیں تو ہم آپ کو بیت اللہ کی زیارت سے روکتے ہی کیوں۔ کیوں آپ سے جنگ کرتے۔ پھر تو جھگڑے کی کوئی بات ہی نہ رہتی۔ آپ اس جگہ محمد بن عبداللہ لکھیں۔

رسول اللہؐ: میں اللہ کا رسول ہوں، کب تک تم نہ مانو گے۔ (حضرت علی سے) رسول اللہ کو مٹا دیں۔

حضرت علیؓ: یا رسول اللہ! خدا کی قسم، مجھ سے یہ نہیں ہونے کا۔

رسول اللہ: تو مجھے وہ جگہ بتا دو۔ (حروف مٹاتے ہوئے حضرت علی سے): محمد بن عبداللہ لکھو اور۔ اللہ کے رسول نے یہ معاملہ اس پر کیا ہے کہ تم لوگ ہمارے اور بیت اللہ کے درمیان روک نہ ہوؤ تاکہ ہم اس کا طواف کریں۔

سہیل: اے محمد اس طرح تو سارے عرب میں چرچا ہوگا کہ قریش نے دب کر یہ معاہدہ کیا ہے۔ ہاں۔ آئندہ سال آپ طواف کر سکتے ہیں۔ مگر صرف تین دن قیام کی اجازت ہوگی۔ ہم مکہ خالی کر دیں گے۔ اور یہ بھی سن لیں کہ آپ اور آپ کے ساتھیوں کے پاس صرف نیام شدہ تلواریں ہوں گی۔

رسول اللہؐ:۔ مجھے منظور ہے۔

سہیل: یہ بھی لازم ہوگا کہ اگر ہمارے یہاں سے کوئی شخص آپ کے یہاں چلا جائے گا۔ خواہ وہ آپ کے دین پر ہو تو آپ اس کو ہمیں لوٹا دیں گے۔

صحابہؓ: سبحان اللہ! یہ عجیب بات رہی۔ اگر کوئی مسلمان ہو کر ہمارے پاس آتا ہے تو ہم اُسے کس طرح مشرکوں کے حوالے کر سکتے ہیں۔

یہ بات ہو رہی تھی کہ سہیل کا بیٹا ابو جندل بیڑیوں میں جکڑا ہوا ، گرتا پڑتا ۔ کسی نہ کسی طرح مسلمانوں کے پاس پہنچ گیا ۔ سہیل نے اُسے دیکھا تو پکار اٹھا ،۔

سہیل : اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ پہلا شخص ہے جسے معاہدہ کے مطابق آپ کو لوٹانا ہوگا ۔

رسول اللہؐ :۔ ابھی تو تحریر بھی مکمل نہیں ہوئی ۔

سہیل : اگر ایسا ہے ، تو پھر کسی بات پر میں آپ سے معاملہ کرنے کو تیار نہیں ۔

رسول اللہؐ : میرے لئے ہی سہی ، اِسے اجازت دے دو ۔

سہیل : نہیں ، ہرگز نہیں ۔ ایسا نہیں ہو سکتا ۔

رسول اللہؐ ۔ اچھا ۔ جو جی میں آئے کرو ، مجھے تم سے کچھ نہیں کہنا

ابو جندل ۔ (یہ جملہ سن کر) یا رسول اللہ ۔ مسلمان بھائیو ! میں تو آپ کے دین پر ہوں ، مجھے کیوں مشرکوں کے حوالے کر رہے ہو ؟ دیکھتے نہیں ، کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے ؟

رسول اللہؐ (ابو جندل کو تسلی دیتے ہوئے) : اے ابو جندل ! صبر سے کام لو اللہ پر بھروسا رکھو ، ہم معاہدے کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے یقین رکھو ، ضرور اللہ تعالےٰ تمہارے لیے کوئی راہ پیدا کر دے گا ۔

سہیل : یہ معاہدہ دس سال کے لئے ہوگا ، اس وقت میں فریقین کشت و خون سے احتراز کریں گے ۔

رسول اللہؐ :۔ منظور ہے ۔

سہیل : اگر قریش کا کوئی بندہ اپنے ولی یا سرپرست کی اجازت کے بغیر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس چلا آیا ۔ تو اُسے واپس کیا جائے گا ۔ لیکن محمدؐ کے ساتھیوں میں سے کوئی شخص قریش کے پاس آ گیا ۔ تو وہ اس کی واپسی کے پابند نہیں ہوں گے ۔

رسول اللہ : یہ بھی منظور ہے ۔

سہیل : جو شخص یا قبیلہ محمد (ص) کے معاہدہ اور جواز میں داخل ہونا چاہے ہو سکتا ہے ۔ اس طرح جو قریش سے معاہدہ کرنا چاہیں ۔ ان پر بھی کوئی پابندی نہ ہوگی ۔

رسول اللہؐ : یہ بھی منظور ہے ۔

معاہدے کی شرطیں بظاہر بڑی کڑی تھیں ، اور اس قدر روح فرسا کہ صحابہ بیقرار ہو گئے اور حضرت عمر فاروق رضؓ ۔ کی تو جان پر بن آئی ۔ وہ پہلے حضرت ابو بکر رضؓ اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کی ۔

حضرت عمر رضؓ :۔ یا رسول اللہؐ : کیا آپ اللہ کے برحق نبی نہیں ۔

رسول اللہؐ : کیوں نہیں ۔

حضرت عمر رضؓ : کیا ہم حق پر اور وہ باطل پر نہیں ؟

رسول اللہؐ : بیشک ۔

عمرؓ : کیا وہ مشرک نہیں ۔

رسول اللہؐ : یقیناً ہیں ۔

عمرؓ : یا رسول اللہ! پھر ہم یہ ذلت کیوں گوارا کریں ؟

رسول اللہؐ : اے عمر! میں اللہ کا رسول اور برحق نبی ہوں ، اس کے حکم کے خلاف نہیں کر سکتا ۔ وہ میرا معین و مددگار ہے ۔

عمرؓ : کیا آپ نے ہم سے یہ نہیں فرمایا تھا کہ ہم لوگ بیت اللہ جائیں گے اور طواف کریں گے ۔

رسول اللہؐ : اے عمر! یہ میں نے کب کہا تھا کہ اسی سال طواف کریں گے ۔

حضور سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم جب اس صلح نامے سے فارغ ہوئے تو قربانی کے جانور ذبح کئے ۔ حلق کرایا ۔ احرام اتارا ۔ صحابہ نے بھی حضورؐ کی تقلید کی ۔ بعض نے سر کے بال منڈوائے اور بعض نے صرف ترشوانے پر اکتفا کی ۔ حضورؐ نے یہ دیکھ کر دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے ۔

رسول اللہؐ :۔ اللہ کی رحمت ہو اُن پر جنہوں نے بال منڈوائے ہیں ۔

صحابہ :۔ یا رسول اللہؐ! اور بال ترشوانے والوں کے بارے میں کیا حکم ہے؟

رسول اللہؐ : (دوبارہ) اللہ کی رحمت ہو اُن پر جنہوں نے بال منڈوائے ہیں ۔

صحابہ : بال کٹوانے والوں کے متعلق حضور کا کیا ارشاد ہے ۔

رسول اللہؐ : اللہ بال کٹوانے والوں پر بھی رحم فرمائے ۔

ایک صحابی :۔ یا رسول اللہ! آپؐ نے بال منڈوانے والوں کے لیے دوبارہ رحمت کی دُعا کی ، جبکہ بال کٹوانے والوں کے لیے ایسا نہیں فرمایا اس کا سبب ؟

رسول اللہؐ :۔ انہوں نے (بال منڈوانے والوں نے) اپنے دل میں شک و شبہ کو جگہ نہیں دی ۔

آپؐ نے حدیبیہ میں دو ہفتے قیام فرمایا ۔ پھر مدینہ کو مراجعت فرمائی ۔ ابھی مکہ اور مدینہ کی درمیانی منزل میں تھے کہ یہ آیات نازل ہوئیں ۔

انا فتحنا لک فتحاً مبیناً .... نصراً عزیزا ....

حضور نے صحابہ کو جمع کر کے یہ آیات تلاوت فرمائیں اور انھیں فتح مبین کا مژدہ سنایا ۔

صحابہؓ : یا رسول اللہ ۔ کیا یہ فتح مبین ہے ؟

رسول اللہؐ : اے لوگو! قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے قبضے میں محمد کی جان ہے ، یقیناً " یہ فتح مبین " ہے ۔

ابو بصیر صاحب علیس (السلسلۂ حدیبیہ) جاری :۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ پہنچ گئے ، تو ابو بصیر جس نے اسلام قبول کر لیا تھا ، کسی طرح قریش کی قید سے جان چھڑا کر

مدینہ پہنچا اور حضورؐ کی خدمت میں حاضری دی قریش نے بھی اپنے دو کارندے حضورؐ کی خدمت میں ابوبصیر کو واپس لانے کے لیے بھیجے۔ آپ نے از روئے معاہدہ ابوبصیر کو اُن کے حوالے کر دیا۔

رسول اللہ:۔ ہمارے اور قریش کے درمیان جو معاہدہ ہوا ہے اس کا تمہیں بخوبی علم ہے۔ معاہدہ کے خلاف کرنا مجھے پسند نہیں، بہتر ہے تم واپس چلے جاؤ۔

ابوبصیر۔ یا رسول اللہ! آپ مجھے مشرکین کے حوالے کر رہے ہیں۔ وہ تو مجھے طرح طرح کی ایذائیں دیتے ہیں دین کے معاملہ میں مجھے فتنہ میں ڈال دینا چاہتے ہیں۔

رسول اللہؐ:۔ اے ابوبصیر اصبر سے کام لو۔ اللہ کی ذات پر بھروسا رکھو وہ ضرور تمہاری مدد کرے گا، عنقریب اللہ تعالیٰ ضرور تم ایسے ستم رسیدہ لوگوں کے لیے نجات کی کوئی نہ کوئی سبیل کھول دے گا۔

قریش کے کارندے ابوبصیر کو لے کر روانہ ہوگئے۔ ذوالحلیفہ کے مقام پر ستانے کے لیے رُکے اور کھجوریں کھانی شروع کیں۔ ابوبصیر نے کسی طرح اُن سے تلوار لی اور ایک شخص کو ایک ہی وار میں ختم کر دیا دوسرا آدمی وہاں سے بھاگا اور حضورؐ کے پاس جا کر رُکا۔

رسول اللہؐ: اے شخص۔ تو نہایت ہی خوفزدہ ہے۔ تجھ پر کونسی افتاد پڑی ہے؟

وہی شخص: یا رسول اللہؐ! آپ کے رفیق نے میرے ساتھی کو قتل کر دیا اور شاید میرا بھی یہی حشر ہو۔

(اتنے میں ابوبصیر بھی وہاں پہنچ گیا۔ اور عرض کی)

ابوبصیر:۔ یا رسول اللہؐ: آپؐ کی شرط تو اللہ تعالیٰ نے پوری کر دی آپؐ نے جو عہد کیا۔ اُسے پورا کر دکھایا آپؐ نے مجھے اُن کے حوالے فرمایا۔ جبکہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اُن سے نجات دی۔ یا رسول اللہ! آپ کو معلوم ہے۔ اگر میں واپس مکہ چلا جاؤں تو یہ لوگ دین سے مجھ کو پھر جانے پر مجبور کریں گے یہ میرا ذاتی فعل ہے، میرے اور اُن کے درمیان کوئی معاہدہ نہیں۔

رسول اللہؐ ۔ یہ تو لڑائی کو ہوا دینا چاہتا ہے۔

اس کے بعد ابوبصیر مدینہ سے چلا گیا، سمندر کے کنارے عیص کے مقام پر اس نے ڈیرے ڈال دیئے۔ مکہ میں مقیم مظلوم مسلمانوں کو جب ابوبصیر کی بابت علم ہوا۔ تو وہ بھی بھاگ بھاگ کر اُس کے پاس جمع ہونے لگے ان میں ابوجندل بھی شامل تھا۔ بس پھر کیا تھا۔ مکہ والوں کا جو بھی قافلہ اُدھر سے گذرتا اُسے لوٹ لیتے۔ آدمیوں کو جو مزاحمت کرتے قتل کر دیتے۔ قریش کا ناک میں دم کر دیا قریش نے رسول اللہؐ سے درخواست کی کہ خدارا، معاہدے سے اس شرط کو نکال دیا جائے۔ آئندہ جو شخص بھی مسلمان ہو کر آپ کے پاس پہنچے گا۔ ہمارا اس پر کوئی دعویٰ نہیں ہوگا۔

۱۔ صحیح بخاری، باب شروط الجہاد۔ حدیبیہ

۲۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد والسیر۔ صلح حدیبیہ

۳۔ زاد المعاد ۔ ابن قیم ۔ سیرۃ ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۳۲۵ تا صفحہ ۳۹۱ ۔ ۵۔ تاریخ طبری، جلد ۱ صفحہ ۳۲۴ تا صفحہ ۳۴۵

مکالمات بسلسلہ غزوہ فتح (فتح مکہ)

بنو بکر اور بنو خزاعہ کے درمیان زمانۂ جاہلیت سے دشمنی چلی آ رہی تھی۔ بنو بکر قریش کے حلیف تھے اور بنو خزاعہ مسلمانوں کے صلح حدیبیہ کی وجہ سے فریقین بے خوف ہو گئے۔ بنو بکر نے قریش کے رئیسوں کے اکسانے پر ایک رات جبکہ بنو خزاعہ وتیر نامی چشمہ پر محوِ خواب تھے تاریکی میں حملہ کر دیا۔ بنو بکر کے ساتھ رئیسانِ قریش بھی شامل تھے۔ بنو خزاعہ نے بھاگ کر حرم پاک میں پناہ لی۔ مگر انھیں وہاں بھی امان نصیب نہ ہوئی ان کے بہت سے آدمی قتل ہو گئے۔ ان کا سردار عمرو بن سالم ایک وفد لے کر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور صورتِ حال سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آگاہ کیا۔ حضورؐ کا رخ انور غصے سے سرخ ہو گیا، آپ نے ایک قاصد کے ذریعے رؤسائے مکہ کو یہ پیغام بھجوایا کہ وہ ان جو چاہیں اختیار کر لیں۔

۱۔ مقتولوں کا خون بہا ادا کیا جائے۔

یا ۲۔ بنو نفاثہ کے عہد اور عقد سے علاحدگی اختیار کی جائے۔

یا ۳۔ معاہدۂ حدیبیہ کے فسخ کا اعلان کیا جائے۔

مکہ والوں نے جلد بازی میں حضور کی شرائط کو ٹھکرا دیا۔ جب قاصد چلا گیا تو انھیں اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ انہوں نے اگرچہ ابو سفیان کو تجدید معاہدہ کے مدینہ بھیجا۔ مگر اُسے ناکامی ہوئی۔

جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ چلنے کی تیاری، سامان سفر، آلات حرب درست کرنے کے احکامات جاری فرما دیے، ساتھ ہی یہ احکامات بھی جاری کیے کہ یہ تمام تیاریاں پوشیدہ رکھی جائیں۔ اور اُن کا اظہار اور اعلان نہ کیا جائے۔ حلیف قبائل کو بھی تیاری کے پیغامات ارسال کر دیے گئے۔

حاطب بن ابی بلتعہ

جناب رسالت مآبؐ کی واضح ہدایات کے باوجود ایک صحابی حاطب بن ابی بلتعہ سے غلطی سرزد ہو گئی۔ اس نے اہل مکہ کے نام ایک خط لکھا جس میں اُن کو آپؐ کی حربی تیاریوں سے متعلق اطلاع دی۔ یہ خط ایک عورت کے ہاتھ مخفی طور پر روانہ کیا۔ آپؐ کو بذریعہ وحی اس کی اطلاع ہو گئی۔

حضورؐ نے حضرت علیؓ، زبیرؓ اور مقدادؓ کو اس کے تعاقب میں بھیجا۔ انہوں نے اُسے روضۂ خاخ میں جا لیا اور اس سے خط برآمد کر لیا۔ خط لے کر حضور کی خدمت میں پہنچے، حضورؐ نے حاطب کو بُلا کر فرمایا۔

رسول اللہؐ:۔ حاطب! یہ کیا معاملہ ہے؟

حاطب: یا رسول اللہ! آپ مواخذہ میں جلدی نہ فرمائیں۔ میری قریش سے کوئی قرابت نہیں۔ اور نہ ہی میں منافق ہوں۔ میرے قریش کے ساتھ صرف حلیفانہ تعلقات ہیں۔

حضورؐ! میرے اہل وعیال مکہ میں ہیں۔ وہاں اُن کا کوئی حامی و ناصر نہیں، وہ غیر محفوظ ہیں۔ میں نے اس طرح قریش پہ احسان کرنا چاہا تاکہ اس کے بدلے میں وہ میرے اہل وعیال کی حفاظت کریں۔

خدا کی قسم، میں مرتد نہیں ہوا۔ میں نے اسلام سے منہ موڑ کر یہ کام نہیں کیا۔ میری غرض وہی تھی۔ جو میں نے حضورؐ کی خدمت میں پیش کر دی۔

رسول اللہؐ :۔ یقیناً۔ تم نے سچی بات کہی ہے۔

عمرؓ (جوش سے)، یارسول اللہؐ! اجازت دیجیے کہ اس منافق کی گردن اڑا دوں۔

رسول اللہؐ : نہ، نہ، ایسا نہ کہو۔ حاطب غزوہ بدر میں شامل تھا۔

اے عمر! تمہیں کیا معلوم، اللہ تعالیٰ نے شرکائے بدر کی ایسی لغزشیں معاف کر دی ہیں۔

(اس کی تصدیق قرآن نے کر دی)

عمرؓ :۔ یارسول اللہ! اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔

جناب رسالتمآب دسویں رمضان المبارک کو دس ہزار صحابہ کی معیت میں مکہ کے لئے روانہ ہوئے راستہ میں حضرت عباسؓ مل گئے، سامان مدینہ بھجوا دیا۔ اور خود لشکر اسلام میں شامل ہو گئے۔

ابوسفیان بن حارث اور عبداللہ بن امیہ :۔

یہ حضرات ابواء کے مقام پر آپ کو ملے۔ اسلام لانے کی غرض سے مدینہ آرہے تھے۔ ابوسفیان بن حارث آپؐ کا چچازاد اور رضاعی بھائی تھا۔ نبوت کے بعد آپ کا جانی دشمن بن گیا اور آپ کی ہجو میں شعر بھی کہے۔ عبداللہ، آپؐ کی پھوپھی عاتکہ کا بیٹا تھا۔ حضورؐ کے شدید مخالفوں میں سے تھا۔ دونوں نے بارگاہ نبوی میں حاضری کی اجازت چاہی۔ لیکن آپ نے انکار کر دیا اس پر ام المومنین ام سلمہؓ نے سفارش کی

ام المومنینؓ :۔ یارسول اللہ۔ ایک آپؐ کے چچا کا بیٹا ہے اور دوسرا آپ کی پھوپھی کا فرزند ہے۔

رسول اللہؐ : مجھے ان سے ملنے کی ضرورت نہیں۔ ابن عم نے میری آبرو ریزی کی اور پھوپھی کا بیٹا وہی شخص ہے، جس نے مکہ میں کہا تھا۔ خدا کی قسم، میں تم پہ ہرگز ایمان نہ لاؤں گا۔ تو اگر سیڑھی لگا کر آسمان پہ چڑھ جائے۔ اور میں ان آنکھوں سے تجھے جاتے دیکھوں۔ پھر ایک استادیز لے کر آسمان سے اُترے۔ چار فرشتے تیرے ساتھ ہوں اور یہ گواہی دیں کہ تجھ کو اللہ نے رسول بنا کر بھیجا ہے تو پھر بھی میں ایمان لانے کا نہیں۔

ام المومنین : آپ کے مکارم اخلاق سے یہ توقع ہے کہ آپ کے در سے آپ کا ابن عم اور پھوپھی زاد بھائی نامراد نہیں جائیں گے۔ جب آپ کا ترحم اور عفو عام ہے تو پھر یہ تبرا تبدار محروم کیوں رہیں۔

ابوسفیان : یارسول اللہ! اگر آپ اپنی بارگاہ میں حاضری کی اجازت نہیں دیتے۔ تو میرے لئے اس لئے اس کے سوا چارہ

نہیں کہ اپنے بیٹے کو لے کر کسی صحرا میں نکل جاؤں۔ اور وہاں بھوک اور پیاس سے تڑپ تڑپ کر مر جاؤں۔

قسم ہے اللہ پاک کی، بے شک اللہ نے آپ کو ہم پر فضیلت دی اور بلا شبہ ہم قصور وار ہیں۔

رسول اللہؐ: آج کے دن تم پر کوئی الزام نہیں، اللہ تمہارا قصور معاف کرے، وہ سب مہربانوں سے بڑا مہربان ہے۔

ابوسفیان: یہ قدسی صفات لشکر۔ منزلیں طے کرتا ہوا مرالظہران پہنچا۔ وہاں پر پڑاؤ ڈال دیا قریشِ مکہ بدعہدی کی وجہ سے خوفزدہ تھے کہ نہ جانے کب آپ مکہ پر چڑھائی کر دیں۔ چنانچہ ابوسفیان بن حرب، بدیل اور حکیم اسی غرض سے نکلے تھے کہ انہوں نے جب اسلامی لشکر دیکھا تو ان کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی اور وہ صورت حال کا جائزہ لے رہے تھے کہ پہرہ داروں نے انہیں گرفتار کر لیا۔ انہوں نے پہرہ داروں سے بھی بات چیت کرنے کی کوشش کی کہ اتنے میں حضرت عباسؓ حضورؐ کے خچر پر سوار ادھر آ نکلے۔ انہوں نے ابوسفیان کو پہچان لیا۔ اُسے اپنے پیچھے خچر پر سوار کر کے حضورؐ کی طرف روانہ ہوئے۔ حضرت عمرؓ نے ابوسفیان کو دیکھا تو اُسے قتل کرنا چاہا۔ لیکن وہ تیزی سے نکل کر آپؐ کی خدمت میں پہنچ گئے۔

حضرت عمرؓ بھی تلوار سونتتے ہوئے وہاں آن پہنچے۔ اور کہا:

عمرؓ: یا رسول اللہؐ! یہ اللہ اور رسولؐ کا دشمن ابوسفیان ہے۔ الحمد للہ، بغیر کسی عہد و پیمان کے ہاتھ آ گیا ہے۔ اجازت مرحمت فرمائیے کہ ابھی اس کا سر قلم کر دوں۔

عباسؓ:۔ یا رسول اللہؐ! میں نے اس کو اپنی امان میں لے لیا ہے۔

عمرؓ:۔ حضورؐ! اجازت دیجئے کہ .....

عباسؓ: (جھلا کر) اے عمرؓ! ذرا صبر سے کام لو، اس کا تعلق اگر بنو عدی سے ہوتا تو تم اس قدر اصرار نہ کرتے۔ چونکہ یہ بنی عبد مناف سے متعلق ہے۔ اس لئے تم اس کو قتل کرنے پر مصر ہو۔

عمرؓ: اے عباسؓ! مجھے تمہارا اسلام اپنے باپ خطاب کے اسلام کی نسبت زیادہ محبوب ہے۔ میرا باپ اگر اسلام لے آتا تو مجھے اتنی خوشی نہ ہوتی جتنی تمہارے اسلام لانے سے ہوئی۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ رسول اللہؐ کو تمہارا اسلام خطاب کے اسلام سے زیادہ مرغوب تھا۔ میں تو تمہیں اس نگاہ سے دیکھتا ہوں، تم جو چاہے سمجھو۔

رسول اللہؐ: عم محترم! ابوسفیان کو اپنے خیمہ میں لے جاؤ صبح میرے پاس لے آنا۔

صبح کے وقت حضرت عباسؓ ابوسفیان کو لے کر جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم

نے ابوسفیان کو مخاطب فرمایا۔

رسول اللہؐ: افسوس اے ابوسفیان! کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ تو یقین کرے، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں؟

ابوسفیان:۔ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، آپ نہایت ہی حلیم و کریم ہیں۔ نہایت ہی صلہ رحمی کرنے والے ہیں۔ بخدا! قسم اگر اللہ کے سوا کوئی اور معبود ہوتا تو آج ہمارے کام ضرور آتا۔ اور میں آپ کے مقابلہ میں اس سے مدد مانگتا۔

رسول اللہؐ:۔ افسوس! اے ابوسفیان۔ کیا تیرے لیے ابھی وہ وقت نہیں آیا۔ کہ تو مجھ کو اللہ کا بھیجا ہوا رسول تسلیم کرے؟

ابوسفیان: میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں، بیشک آپ حد درجہ حلیم و کریم ہیں سب سے زیادہ صلہ رحمی کرنے والے ہیں ابھی تک آپ ہم پر مہربان ہیں۔ باوجود میری عداوت کے مجھ پر نظر کرم ہے۔ مجھے اس میں ذرا تردد ہے۔

حضرت عباس کے سمجھانے سے ابوسفیان نے اسلام قبول کر لیا تو انہوں نے عرض کی۔

عباس:۔ یا رسول اللہ۔ ابوسفیان مکہ کے رئیسوں میں سے ہے۔ فخر اسے پسند ہے۔ اس لئے کوئی ایسا اکرام فرمائیں جو اس کے لئے عزت و شرف اور امتیاز کا باعث ہو۔

رسول اللہؐ: اچھا، اعلان کر دو کہ جو شخص ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے وہ مامون ہے۔

ابوسفیان: یا رسول اللہ! میرے گھر میں سارے لوگ کہاں سما سکتے ہیں؟

رسول اللہؐ: اچھا تو جو شخص مسجد حرام میں داخل ہو جائے وہ بھی مامون ہے۔

ابوسفیان:۔ مسجد حرام میں بھی اتنی وسعت نہیں کہ سارے لوگ اس میں سما سکیں۔

رسول اللہؐ: اچھا تو جو شخص اپنے گھر کا دروازہ بند کر کے بیٹھ جائے۔ وہ بھی مامون ہے۔

ابوسفیان:۔ واقعی! اس میں سب کی بہتری ہے۔

حضرت عباسؓ رسول پاکؐ کے ارشاد کے مطابق ابوسفیان کو لے کر ایک پہاڑی پر ٹھہر گئے۔ مقصد یہ تھا کہ ابوسفیان حضورؐ کی رفعت و شان اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ مجاہدین صف شکن روانہ ہوتے۔ قبائل آلاتِ حرب سے لیس جوق در جوق گذرنے لگے، تو ابوسفیان یہ رنگ دیکھ کر دنگ رہ گیا اور پکار اٹھا۔

ابوسفیان۔ بخدا، تمہارا بھتیجا تو بہت بڑے ملک کا بادشاہ بن گیا ہے۔

عباسؓ: ابوسفیان۔ یہ بادشاہت نہیں۔ نبوت ہے۔

قبائل باری باری گذرنے لگے، جو قبیلہ بھی سامنے سے گذرتا، ابوسفیان پوچھتا یہ کون لوگ ہیں۔ آخر میں جناب سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم

کی سواری۔ مہاجرین اور انصار کے زرہ پوش جلو میں اس شان سے گذری کہ ابوسفیان دنگ رہ گیا۔ مہاجرین کے علمبردار حضرت زُبیر تھے اور انصار کا علم سعد بن عبادہ کے ہاتھ میں تھا۔

سعد بن عبادہ: (ابوسفیان کو دیکھ کر نہایت ہی جوش سے): آج کا دن یوم کارزار ہے آج کعبہ میں قتل و قتال حلال ہوگا۔

ابوسفیان (گھبراہٹ سے): یہ کون ہیں؟

حضرت عباس: یہ مہاجرین اور انصار کا لشکر ہے۔ جس میں رسول اللہؐ جلوہ فرما ہیں۔

ابوسفیان (حضور کو سامنے دیکھ کر زور سے) یارسول اللہ! کیا آپ نے سعد بن عبادہ کو حکم دیا ہے کہ وہ آپ کی قوم کو قتل کریں؟

یارسول اللہ! آپ کو اللہ کا، اور قرابتوں کا واسطہ آپ نیکی، حلم اور صلہ رحمی میں سب سے بڑھ کر ہیں۔

رسول اللہؐ: اے ابوسفیان (گھبراؤ نہیں)۔ آج کا دن مہربانی اور صلۂ رحمی کا ہے۔ آج قریش کو سربلندی اور عظمت نصیب ہوگی۔

سعد نے غلط کہا۔ آج کعبہ کی عظمت و شوکت کا دن ہے۔ خانہ کعبہ کی عظمت بحال ہوگی، اس کو غلاف سے مزین کیا جائے گا۔

حضورؐ نے انصار کا علم سعد سے لے کر اُس کے بیٹے کو دے دیا۔ سرورِ ذیشانؐ بصد عجز و نیاز مکہ میں داخل ہوئے۔ آپ کے رُخِ انور پر مسرت و انبساط کے آثار کے ساتھ تضرع، عجز اور خشیت بھی جھلک رہی تھی۔ آپ نے غسل فرما کر خانہ کعبہ کا قصد کیا۔ چند سرپھروں نے حضرت خالد کی جماعت پر حملہ کیا۔ جس میں ۳ مسلمان شہید ہوئے۔ ۱۳ کافر مارے گئے امن و امان بحال ہوگیا، فتح کی تکمیل ہوگئی۔ حضور رسید المرسلینؐ نہایت ہی عاجزی سے مسجد حرام میں داخل ہوئے۔ خانہ کعبہ کا طواف کیا۔ پھر خانہ کعبہ کو بتوں سے پاک کیا۔ یہ رمضان کی بیسویں تاریخ تھی۔ آپ باب کعبہ پر فروکش ہوئے اور خطبہ دیا۔ جس میں نسلی تفاخر بے جا غرور، جیسی بدعات کی بیخ کنی فرمائی۔ خطبہ سے فارغ ہوئے تو دیکھا کہ جبابرۂ قریش ایک طرف کھڑے ہیں، یہ وہی تو تھے جنھوں نے حضورؐ کو ایذائیں دیں مکہ سے نکالا، غریب مسلمانوں پر ستم ڈھائے، اُن کو گھروں سے نکالا ـــــ آپ کو لہولہان کیا، مدینہ پر یلغاریں کیں۔

رحمت للعالمین ـــ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی طرف دیکھا۔

رسول اللہؐ: (نہایت خوف انگیز لہجے میں): تمھیں کچھ معلوم بھی ہے کہ آج میں تم سے کیا معاملہ کرنے والا ہوں؟

قریش: تو شریف بھائی ہے اور شریف بھائی کا بیٹا ہے۔

رسول اللہ: آج تم پر کوئی الزام نہیں۔

جاؤ! آج تم سب آزاد ہو۔

عثمان بن طلحہ:۔

جب آپؐ کعبہ سے باہر آئے تو کلید کعبہ رحمت للعالمین کے دست مبارک میں تھی۔ رخ انور۔ مہ تاباں کی طرح چمک رہا تھا۔

حضرت علی: (کلید کعبہ آپؐ کے ہاتھ میں دیکھ کر) یا رسول اللہؐ! اللہ آپ پر درود و سلام بھیجے۔ سقایہ کے ساتھ حجابت بیت اللہ کا شرف بھی ہمیں مرحمت فرمائیں۔

رحمت للعالمینؐ:۔ عثمان بن طلحہ کہاں ہیں؟

(عثمان کو بلایا گیا)

:۔ عثمان! لو۔ یہ کلید کعبہ ہے۔ آج حسن سلوک اور پاس وفا کا دن ہے۔ لو، یہ کلید ہمیشہ کے لئے تمہارے پاس رہے گی۔ یہ میں نے خود تمہیں نہیں دی۔ یہ اللہ پاک نے تمہیں عطا فرمائی ہے۔ سوائے ظالم اور غاصب کے کوئی تم سے یہ کلید نہیں چھین سکے گا۔

(تھوڑے سے توقف کے بعد):۔ عثمان! وہ دن یاد ہے میں نے ہجرت مدینہ سے ایک روز پہلے تم سے یہ کلید طلب کی تھی، تو تم نے نہایت ہی درشتی سے انکار کر دیا تھا۔

اور میں نے کہا تھا۔ عثمان! تم یہ کلید ایک دن میرے ہاتھ میں دیکھو گے اور میں اپنے اختیار سے جس ہاتھ میں چاہوں گا۔ رکھوں گا۔

تم نے کہا تھا۔ کہ ایسا ہوا تو وہ دن قریش کی بڑی ذلت اور تباہی کا ہوگا۔

اور میں نے کہا تھا کہ نہیں، وہ اس دن آباد اور باعزت ہوں گے ــ یہ اُن کی عظمت کا دن ہوگا۔

عثمان:۔ یا رسول اللہ، بیشک آپ اللہ کے رسول ہیں۔

رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم طواف سے فارغ ہو کر کوہ صفا پر تشریف لے گئے چہرہ مبارک بیت اللہ کی طرف تھا، دیر تک اللہ پاک کی حمد و ثنا میں مشغول رہے، صفا کے دامن میں انصار جمع تھے۔ حضورؐ کا یہ استغراق دیکھ کر بعض انصار کی زبانوں سے بیساختہ یہ الفاظ نکلے:

انصار:۔ یا رسول اللہ! اللہ تعالےٰ نے آپ پر آپ کا شہر اور آپ کی زمین ــ فتح کر دی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ یہیں مقیم ہو جائیں۔ کہ میں رہ پڑیں اور مدینہ واپس تشریف لے جانے کا ارادہ ترک فرما دیں۔

رسول اللہ: (بات کرنے کو تھے کہ وحی کا نزول شروع ہو گیا۔ نزول کے بعد)

اے گروہ انصار! کیا تم نے یہ اور یہ باتیں کی ہیں؟

انصار:۔ ہاں۔ یا رسول اللہ!

رسول اللہؐ:۔ تو غور سے سنو، ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسولؐ ہوں۔ میں نے اللہ کے حکم سے ہجرت کی ہے۔ اب تو ــــــ

تمہاری زندگی۔ میری زندگی ہے اور تمہاری موت میری موت ہے۔

انصار :۔ (روتے ہوئے) ۔ یارسول اللہ۔ (ہمیں معاف فرمائیں) ہمیں یہ فکر لاحق ہوئی کہ کہیں ایسا نہ ہو، جس شمع کے ہم پروانے ہیں، وہ شمع ہماری محفل سے نہ اٹھالی جائے ۔ ہم غلامانِ جانثار اور خادمانِ وفا شعار ہر قسم کے ایثار کے لیے تیار ہیں ۔ لیکن اللہ اور اس کے رسول کے بارہ میں انتہائی بخیل ہیں۔

رحمت للعالمین :۔ اللہ اور اُس کا رسول تمھیں معذور ۔ لیکن حق پر سمجھتے ہیں ۔

دُعا سے فراغت کے بعد رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت عامہ کا آغاز فرمایا ۔ لوگ بیعت کے لیے دامن صفا میں جمع تھے ۔ آپؐ اسلام پر ۔ اور خدا اور رسولؐ کی اطاعت پر بیعت لیتے گئے ۔ مردوں کے بعد عورتوں کی باری آئی ۔ مکہ کی عورتوں کے ساتھ ہندہ ۔ زوجۂ ابوسفیان بھی نقاب اوڑھ کر حاضر ہوئی ۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اُس نے حضورؐ کے عم محترم حضرت حمزہؓ کی نعش کی بے حرمتی کرائی تھی ۔ حیا اور ندامت دامن گیر تھی ۔ نقاب اوڑھ کر حاضر ہوئی ۔ اس کے اور حضورؐ کے درمیان یہ گفتگو ہوئی :۔

ہندہ : یارسول اللہ! آپ ہم سے کن چیزوں کا عہد اور میثاق لیتے ہیں؟

رحمت للعالمینؐ : خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا ۔

ہندہ : یارسول اللہ! آپ ہم سے اُن باتوں کا عہد لیتے ہیں، جن کا اقرار آپ نے مردوں سے نہیں لیا تاہم ہمیں منظور ہے ۔

رحمت للعالمینؐ : اور یہ کہ چوری نہیں کریں گی ،

ہندہ :۔ یارسول اللہ! میں اپنے شوہر (ابوسفیان) کے مال میں سے بغیر ان سے پوچھے کچھ لیا کرتی ہوں خدا معلوم ، یہ چوری میں داخل ہے یا نہیں؟

رحمت للعالمینؐ : بقدر ضرورت شوہر کے مال سے آتنا لے سکتی ہو کہ دستور کے مطابق تیری اور تیرے بچوں کی ضرورت پوری ہو سکے اور یہ کہ زنا نہ کرو گی ۔

ہندہ : یارسول اللہؐ! کیا شریف عورت زنا کر سکتی ہے؟

رحمت للعالمینؐ : اور اولاد کو قتل نہیں کرو گی ۔

(مزاح کے انداز میں)

ہندہ :۔ یارسول اللہؐ! ہم نے بچپن میں انھیں پال پوس کر بڑا کیا ۔ اور آپ نے جنگ بدر میں انھیں مار دیا ۔ بس آپ اور وہ جانیں ۔

رحمت للعالمینؐ :۔ اور کسی پر بہتان نہیں لگاؤ گی ۔

ہندہ : خدا کی قسم ۔ کسی پر بہتان باندھنا ۔ نہایت ہی قبیح فعل ہے اور آپ ہم کو رشد وہدایت اور مکارم اخلاق کے سوا کسی چیز کا حکم نہیں دیتے ۔

رحمت للعالمینؐ :۔ اور کسی کارِ خیر میں نافرمانی اور حکم عدولی نہیں کرو گی ۔

ہندہ : ہم اس مجلس میں آپ کی نافرمانی اور حکم عدولی کے ارادہ سے نہیں آئے ۔

(بیعت کرنے کے بعد)

یا رسول اللہ ! اسلام سے پہلے آپ کے چہرہ سے زیادہ کوئی چہرہ ہمیں مبغوض نہیں تھا اور آپ سے زیادہ کسی کو دشمن نہیں سمجھتی تھی ۔ لیکن بخدا ، اب آپ اور آپ کے چہرہ سے زیادہ مجھے کوئی شے محبوب نہیں ۔

رحمت للعالمینؐ : ابھی ۔۔ میری محبت میں اور اضافہ ہو گا ۔

عکرمہ کا معاملہ

غزوہ فتح میں جن اشخاص کو آپؐ نے مباح الدم قرار دیا ۔ ان میں سے عبداللہ بن ابی سرح، عکرمہ بن ابی جہل ، ہبار بن اسود ۔ وحشی بن حرب ، کعب بن زُہیر ، عبداللہ بن زبعری ۔ ہبیرہ بن ابی وہب (تینوں مشہور شاعر تھے) اور ہندہ زوجہ ابوسفیان کو معاف فرما دیا ۔ عکرمہ ۔ غزوہ فتح میں حضرت خالد کے جیش پر حملہ کرنے والوں میں تھے مکہ سے بھاگ کر یمن چلے گئے ۔ ان کی بیوی ام حکیم بنت حارثہ اسلام لائیں اور اپنے خاوند کے لئے امان کی درخواست کی جسے رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے منظور فرمایا ۔ وہ یمن پہنچیں اور اپنے خاوند عکرمہ بن ابی جہل کو سمجھا بجھا کر مکہ لے آئیں ۔ ابھی وہ پہنچے نہیں تھے کہ حضورؐ نے صحابہ سے مخاطب ہو کر فرمایا ۔

رحمت للعالمینؐ : عکرمہ مومن ہو کر آ رہا ہے ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اُس کے باپ کو بُرا بھلا کہنے لگو ، مُردوں کو بُرا کہنے سے زندوں کو تکلیف ہوتی ہے ۔

عکرمہؓ : (خدمتِ اقدس میں حاضر ہو کر) ۔ حضور ! یہ میری بیوی حاضر ہے ۔ اس نے مجھے خبر دی ہے کہ آپ نے مجھے امان دی ہے ۔

رحمت للعالمینؐ :۔ اس نے سچ کہا : تجھ کو امان ہے ۔

عکرمہؓ : یا رسول اللہ ! آپ کس چیز کی دعوت دیتے ہیں ؟

رحمت للعالمینؐ :۔ شہادت دو کہ اللہ واحد ہے ۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں ۔ زکوٰۃ دو ، رمضان کے روزے رکھو ، حج بیت اللہ کرو ، الخ

عکرمہؓ :۔ یا رسول اللہ ! بیشک ، آپ نے خیر ، مستحسن اور پسندیدہ باتوں کی دعوت دی ہے ۔

یا رسول اللہؐ! اس دعوت سے پیشتر بھی آپ ہم میں سب سے زیادہ پیارے اور نیکو کار تھے۔
(کلمہ شہادت پڑھنے اور بیعت کرنے کے بعد)
یا رسول اللہؐ! میں اللہ اور تمام حاضرین کو گواہ بنا کر وعدہ کرتا ہوں کہ میں مسلمان، مجاہد اور مہاجر ہوں
یا رسول اللہؐ! آپ سے درخواست ہے کہ آپ میرے لیے دعائے استغفار فرمائیں۔ (حضورؐ دعائے مغفرت فرماتے ہیں)
یا رسول اللہؐ! قسم ہے رب ذوالجلال کی:
جو خرچ میں نے اللہ کی راہ سے لوگوں کو روکنے کے لیے کیا۔ اس سے دوگنا۔ لوگوں کو اللہ کی راہ پر بلانے کے لئے کروں گا۔
یا رسول اللہ! جس قدر قتال۔ خدا اور اسکے رسولؐ کے خلاف کیا ہے، اس سے بڑھ کر ربِ ذوالجلال کی راہ میں کروں گا ——— اور جس مقام پر جا کر لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکا ہے اس مقام پر جا کر لوگوں کو اللہ کی طرف بلاؤں گا۔

۱۔ صحیح بخاری جلد ۴ ۔ کتاب المغازی صفحہ ۱۷۰، ۱۷۳، ۱۷۷، ۱۸۱
۲۔ صحیح مسلم۔ کتاب المغازی والسیر۔
۳۔ مسند احمد۔ ۴۔ الکامل۔
۵۔ تاریخ طبری جلد ۱ صـ ۳۸۶ تا صـ ۴۰۸۔
۶۔ ابن ہشام جلد ۲ صـ ۴۶۹ تا ۴۹۶۔

غزوۂ حنین و طائف

حنین مکہ و طائف کے درمیان ہوازن اور بنو ثقیف کے جنگجو قبائل کا مسکن تھا، مکہ کے فتح ہونے کی خبر سن کر ان کے ہوش ٹھکانے آ گئے، انہوں نے پیش بندی کے طور پر بیس ہزار جنگجو افراد کی جمعیت اکٹھی کی۔ اس میں بنی ہوازن، ثقیف، بنی نصر اور بنی جشم کے قبائل شامل تھے۔ ان کا سردار رئیس قبیلہ مالک بن عوف نصری تھا، یہ لوگ اپنے ساتھ اہل و عیال اور مال مویشی بھی لے آئے۔ ان کے ساتھ جہاں دیدہ، جنگ آزمودہ سردار درید بن صمہ بھی تھا۔ وہ بوڑھا اور نابینا تھا۔ اس نے مالک کو مشورہ دیا کہ اہل و عیال اور مال مویشی کو ساتھ نہ لیا جائے۔ لیکن مالک نے اس کی بات نہ مانی، یہ لوگ اوطاس کے میدان میں خیمہ زن ہوئے۔
حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم ۶ شوال ۸ھ کو ۱۲۰۰۰ آدمیوں کے ساتھ حنین کے ارادے سے روانہ ہوئے ان میں ۲۰۰۰ نو مسلم شامل تھے، بعض غیر مسلم بھی ساتھ تھے۔ اس بار انھیں اپنی کثرت پر ناز تھا۔ لیکن اس قسم کی خود پسندی۔ اللہ کو ناپسند ہے۔
لشکرِ اسلام نے حنین کی وادی کے باہر پڑاؤ ڈالا۔ صبح کو لشکر وادی میں داخل ہوا، سرورِ عالمؐ پیچھے پیچھے اپنے سفید خچر پر سوار تھے۔

ان پر قبائل ہوازن و ثقیف کمین گاہوں سے نکل کر ٹوٹ پڑے ۔ تیروں کی بارش شروع ہو گئی ۔ اسلامی لشکر اس اچانک یلغار سے منتشر ہو گیا ۔ صرف رفقائے خاص حضورؐ کے ساتھ باقی رہ گئے، حضورؐ جلال کا پیکر بن کر پکار اُٹھے ۔

رسول اللہؐ :- میں سچا نبی ہوں، کذاب نہیں ۔ اللہ پاک نے مجھ سے جو فتح و نصرت کا وعدہ فرمایا ہے ۔ وہ ضرور پورا ہو گا ۔ میں ابن عبدالمطلب ہوں ۔

حضرت عباسؓ : (نہایت ہی بلند آواز سے) اے گروہ انصار! کہاں ہو؟ تم ہی تو تھے جنہوں نے حضور صلعم کو پناہ دی تھی ۔ آپ کی امداد کی تھی ۔

اے گروہِ انصار، مہاجرین ۔ کہاں ہو؟ ۔ تم وہی تو ہو جنہوں نے درخت کے نیچے اپنے پیغمبر کے ہاتھ پر موت کی بیعت کی تھی ۔

کہاں ہو ؟ ادھر آؤ ۔ پیغمبرِ اسلامؐ زندہ ہیں ۔

اس آواز میں ایسا اثر تھا کہ جاں نثارانِ خیرالبشرؐ ہر طرف سے پروانہ وار شمعِ رسالت کے گرد اکٹھے ہو گئے ۔ ایسی بے جگری سے برق کی مانند لشکرِ اعدأ پر ٹوٹے کہ دشمن کو بھاگتے ہی بنی ۔

رسول اللہ (دشمنوں پر مشت خاک پھینکتے ہوئے) بُرے ہوئے یہ چہرے ۔

یہ کہنا تھا کہ میدان دغا دشمنوں سے خالی ہو گیا ۔ دشمن کو اہل و عیال اور مال مویشی کا بھی ہوش نہ رہا ۔ بے شمار قیدی، اور کثیر مالِ غنیمت لشکرِ اسلام کے ہاتھ آیا ۔ جسے جعرانہ منتقل کر دیا گیا ۔

لشکرِ اسلام نے آگے بڑھ کر طائف کا محاصرہ کر لیا ۔ چونکہ محاصرہ طوالت اختیار کر گیا ۔ اس لئے آپ نے محاصرہ اُٹھانے کا حکم دیا ۔ اور لشکر کے ساتھ واپس جعرانہ تشریف لائے ۔ مال غنیمت میں سے خمس نکال کر باقی لشکر اسلام میں تقسیم فرمایا ۔ حضورؐ نے تالیف قلوب کو پیش نظر رکھتے ہوئے رؤسائے قریش اور نو مسلموں کو دل کھول کر مال عطا فرمایا اشرافِ قریش کو زیادہ مال ملا ۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر انصار کے بعض نوجوانوں کے منہ سے بے اختیار یہ الفاظ نکل گئے ۔

انصاری :- رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے قریش کو تو مالا مال کر دیا اور ہمیں چھوڑ دیا ۔ حالاں کہ ہماری تلواروں سے ابھی تک ان کا خون ٹپک رہا ہے ۔

مشکلات اور شدائد میں تو ہم بُلائے جائیں ۔ اور مالِ غنیمت دوسروں کو ملے ۔

سعدؓ بن عبادہ نے یہ شکوہ حضورؐ کے گوش گذار کیا :

سعد بن عبادہ :- انصار کی اس مال فیئی کی تقسیم کے بارے میں جو آپؐ کو شکایت ملی ہے ۔ ان کو شکایت ہے کہ آپ نے اپنی قوم میں اسے بانٹ دیا ہے قبائل عرب کو زیادہ عطیات ملے ہیں اور انصار محروم رہ گئے ۔

رسول اللہؐ : سعد! تمہارا اپنا کیا خیال ہے؟

سعد : یا رسول اللہ! میں بھی اپنی قوم کا ایک فرد ہوں ۔

رسول اللہؐ : سعد! انصار کو اس احاطہ میں جمع کر دو ۔

(انصار کے مجمع سے)

اے انصار! یہ کیا بات ہے جو میں سن رہا ہوں؟

انصار :- یا رسول اللہ! ہمارے سربرآوردہ، سمجھدار اور اہل رائے لوگوں میں سے کسی نے یہ بات نہیں کہی، صرف بعض نوجوانوں سے جذبات میں آکر یہ لغزش سرزد ہوگئی۔

رسول اللہؐ :- اے گروہ انصار! آخر ایسا کیوں؟ شاید تمہارے دلوں میں گرہ پڑ گئی ہے۔ کیا میں تمہارے پاس اس حالت میں نہیں آیا تھا کہ تم سب گمراہ تھے۔ پھر میرے ذریعہ اللہ تعالے نے تمھیں ہدایت نصیب فرمائی تم سب ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ اللہ نے میرے واسطے سے تمہارے ٹوٹے ہوئے دل جوڑ دیئے۔

تم مفلس و نادار تھے، اللہ تعالیٰ نے میرے ذریعے سے تمھیں صاحب ثروت بنایا؟

انصار : بے شک اللہ اور اس کے رسولؐ کے ہم پر بیشمار احسانات ہیں۔

رسول اللہؐ : اے گروہ انصار! کیا تم مجھے میرے سوال کا جواب نہ دو گے۔

انصار : یا رسول اللہؐ! ہم کیا عرض کریں آپ نے جو فرمایا۔ بالکل درست ہے۔ سارا فضل و احسان اللہ اور اس کے رسولؐ کا ہے۔

رسول اللہؐ : نہیں! خدا کی قسم اگر تم چاہو تو کہہ سکتے ہو، اور جو تم کہو گے سچ ہو گا اور میں اس کی تصدیق بھی کروں گا۔

اے گروہ انصار۔ تم کہہ سکتے تھے۔

کہ اے محمدؐ! تم ہمارے پاس اس حالت میں آئے کہ (آپؐ) تم کو اپنوں نے جھٹلا دیا تھا۔ اس وقت ہم نے (آپ) کی تیری تصدیق کی اور (آپ کو) تمہیں سچا تسلیم کیا۔ اپنے سارے تمہارا ساتھ چھوڑ چکے تھے ہم نے تمہاری مدد کی تم کو اپنوں نے بے خانماں کر دیا تھا۔ ہم نے تمہیں پناہ دی تم آئے تو خالی ہاتھ تھے۔ ہم نے تیری یاوری اور غم گساری کی۔ اے گروہ انصار! کیا تمہارے دل اس بات سے رنجیدہ ہوئے کہ دنیا کی چند روزہ سرسبزی و شادابی کے لئے جو متاع قلیل میں نے انھیں اُن کی تالیف قلب کے لئے دی ہے۔ تاکہ وہ اسلام پر ثابت قدم رہیں۔ تمہارے ایمان، ایقان اور اذعان پر مجھے اعتماد اور کامل بھروسا ہے۔ اس اعتماد پر میں نے تمھیں چھوڑ دیا تمہارے دلوں میں میرے بارے میں بھی کچھ خیال آتا ہے؟

اے گروہ انصار! قریش نے قتل و خونریزی، اور قید و بند کے مصائب اُٹھائے ہیں۔ اس عطا اور داد و دہش سے اُن کے نقصانات کی کچھ تلافی مقصود ہے۔ میری خواہش ہے کہ اُن کے دل اسلام سے مانوس ہو جائیں۔

تم تو ان مصائب سے محفوظ رہے۔
اے گروہِ انصار۔ کیا تم اس پر راضی نہیں کہ لوگ تو اونٹ، بھیڑ اور بکریاں لے کر گھروں کو جائیں
اور تم اللہ کے رسولؐ کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔
قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمد کی جان ہے۔ تم جس چیز کو اپنے ساتھ لے جاؤ گے وہ اس
سے کہیں بہتر ہے جو وہ لے کر جائیں گے۔
بخدا، اگر ہجرت امرالٰہی نہ ہوتا۔ تو میں بھی انصار میں کا ایک فرد ہوتا۔
اگر لوگ کسی ایک راستہ اور وادی میں چلتے اور انصار کسی دوسری گھاٹی میں، تو میں انصار ہی کا رفیق ہوتا۔
انصار تو شعار ہیں اور دوسرے لوگ دثار ہیں (شعار جسم کا پہلا کپڑا۔ دثار اوپر والے کپڑے)
اے اللہ! انصار پر رحم فرما۔
انصار کی اولاد پر رحم فرما۔
اور انصار کی اولاد کی اولاد پر رحم فرما۔
انصار: (بے ساختہ روتے ہوئے۔ باچشم و ریش نم)
ہم اس پر دل و جان سے راضی ہیں،
ہم خوش ہیں۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے حصہ اور ہمارے نصیب میں آئیں،
(اس سے زیادہ خوش بختی کون سی ہے؟)

وفدِ بنی ہوازن

بنو ہوازن کا ۱۴ افراد پر مشتمل ایک وفد رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اسلام قبول کرنے کے بعد سیدالمرسلینؐ کے دست مبارک پر بیعت کی بعد ازاں حضورؐ کی خدمت میں اپنے اہل و عیال اور مال و اموال کی واپسی کے لیے درخواست پیش کی۔ رئیسِ وفد زُہیر بن صُرد۔ کھڑے ہوئے اور گفتگو کا آغاز کیا:

زُہیر: یارسول اللہؐ! ان قیدیوں میں آپ کی ماسیاں (خالائیں) آپ کی پھوپھیاں شامل ہیں۔ ان میں وہ عورتیں
بھی شامل ہیں جنہوں نے بچپن میں آپ کو اپنے سینوں سے لگائے رکھا کبھی چھاتی پر لٹایا۔ تو کبھی گود میں لیا۔
ہماری عورتوں نے اگر حارث غسانی اور نعمان بن منذر کو دودھ پلایا ہوتا اور اُن کو ہمارے اوپر
یہی اختیار حاصل ہوتا۔ جو آج آپ کو ہم پر حاصل ہے۔ تو اس مصیبت میں ضرور ہمارے کام آتے۔
اور آپ — آپ کی شان تو ان سب سے ارفع و اعلیٰ ہے۔ آپ سب سے بہتر، اور سب سے افضل
قرابت دار ہیں،

آپ ہم پر احسان فرمائیں۔ اللہ آپ پر احسان فرمائے گا۔

رحمت للعالمینؐ :۔ اے اہل ہوازن! تم نے آنے میں دیر کردی، میں نے تمہارا بہت انتظار کیا۔ اور جب تم نہ آئے تب میں نے مال واسباب اور تمام قیدی غانمین میں تقسیم کر دیئے۔ تم دیکھ رہے ہو کہ میرے ساتھ کون ہیں؟ —

مجھے سب سے زیادہ وہ بات پسند ہے جو سچی ہو، اب یہ بتاؤ کہ تمھیں تمہاری اولاد اور تمہاری عورتیں یا تو محبوب ہیں، یا اپنا مال و اسباب؟

زہیر :۔ یا رسول اللہ! آپ نے ہمیں اہل وعیال اور مال و اسباب میں۔ ایک چیز کا اختیار دیا ہے۔ تو سُنئے۔ ہم اپنی اولاد اور اپنی عورتوں کے برابر کسی چیز کو نہیں سمجھتے، آپ کا احسان ہوگا کہ آپ ہمارے اہل وعیال واپس کر دیں۔ ہم حسب نسب کو اختیار کرتے ہیں۔

رحمت للعالمینؐ :۔ اے اہل ہوازن، جو چیز میرے اور بنی عبدالمطلب کے حصہ میں آئی ہے۔ مجھے اس پر اختیار ہے اس لئے وہ سب تمہارا ہے لیکن جو کچھ دوسرے مسلمانوں کے حصہ میں جا چکا ہے۔ اس پر میرا اختیار نہیں ہاں کل صبح ظہر کی نماز کے بعد تم لوگ کھڑے ہو کر یہ کہنا :۔

کہ ہم مسلمانوں کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سفارشی بناتے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے مسلمانوں کو سفارشی بنا کر پیش کرتے ہیں کہ آپ ہمارے اہل و عیال (جنھیں تم نے غلام اور باندی بنایا ہے) واپس فرما دیں۔

میں اس وقت تمہیں اپنا اور بنی عبدالمطلب کا حصہ بھی دے دوں گا اور مسلمانوں سے سفارش کر دوں گا کہ وہ اپنا اپنا حصہ تمہیں واپس کر دیں۔

—— دوسرے روز جب آپ صبح کی نماز سے فارغ ہوئے تو زہیر نے آپؐ کی ہدایت پر عمل کیا۔ ان کے سربرآوردہ افراد نے نہایت ہی فصاحت و بلاغت سے اپنا مدعا بیان کیا اور مسلمانوں سے درخواست کی کہ وہ انھیں قیدی واپس کر دیں۔

سید المرسلین رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی اور ارشاد فرمایا ۔

رسول اللہؐ : اے لوگو! بنی ہوازن تمہارے بھائی ہیں۔ انہوں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ جو چیز میرے حصہ میں آئی ہے یا بنی عبدالمطلب کے حصہ میں جو کچھ آیا ہے۔

اے بنو ہوازن، وہ تمہارے حوالے ہے،

میں تمہارے لیے دوسرے لوگوں سے سفارش کرتا ہوں۔

مناسب یہی ہے کہ دوسرے مسلمان بھی اُن کے قیدی واپس کر دیں۔

جو شخص برضا و رغبت ایسا کرنے کو تیار نہیں۔ میں بعد میں اُس کا معاوضہ ادا کر دوں گا۔

مہاجرین : یارسول اللہؐ ! ہمارے حصہ میں جو کچھ آیا ہے وہ سارا ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

انصار : اے اللہ کے نبی ! ہمارے حصّہ کا جو کچھ ہے وہ بطیب خاطر۔ سارا ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

بنی تمیم، بنی فزارہ اور بنی سلیم کے بعض افراد اپنے حق سے دستبردار ہونے کے لئے تیار نہیں تھے، حضورؐ نے اُن سے فرمایا:-

رسول اللہؐ : اگر کسی کے پاس ان کے قیدی ہوں، وہ ان کو خوش دلی سے ان کے حوالے کر دیں۔ اگر وہ اس پر راضی نہیں، تو پھر بھی بنو ہوازن کے حوالے کر دیں اُن کو ہر حصے کے بدلے میں چھ حصّے اُس پہلے مالِ غنیمت سے ملیں گے۔ جو اللہ تعالےٰ ہمیں عطا کرے گا۔

لوگ : یارسول اللہ ! آپؐ کی خاطر ہم خوشی سے واپس کرنے کو تیار ہیں۔

رسول اللہ : مجھے معلوم نہیں کہ تم میں سے کون راضی ہے اور کون نہیں اس لئے تم اپنے رئیسوں سے مشورہ کرو۔ وہ ہمیں صحیح صورت حال سے آگاہ کریں۔

رحمت للعالمین کے فرمان، عمل اور سفارش کے نتیجے میں تمام غانمین نے بنو ہوازن کی عورتیں اور بچے خوشی خوشی واپس کر دیے۔ وہ بھی خوشی خوشی اللہ اور اللہ کے رسولؐ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنے علاقے کو لوٹ گئے۔

بی بی شیمأ

غزوۂ حنین میں اسیر ہونے والے افراد میں سیدعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاعی ماں حلیمہ سعدیہ کی بیٹی بی بی شیماؓ بھی شامل تھیں۔ بی بی شیماؓ آپؐ کی رضاعی بہن تھیں، انہوں نے مسلمانوں کو بتایا بھی کہ میں آپ کے رسولؐ کی رضاعی بہن ہوں مسلمان چونکہ اُن کو نہیں جانتے تھے۔ اس لئے اُن کے ساتھ سختی سے پیش آئے اور حضورؐ کی خدمت میں پہنچا دیا۔ بی بی شیماؓ اور حضور کے درمیان یہ گفتگو ہوئی :-

بی بی شیماؓ : یارسول اللہ میں آپ کی رضاعی بہن ہوں۔ حلیمہ سعدیہ کی بیٹی ہوں۔

رسول اللہؐ : تمہارے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہے۔

بی بی شیماؓ : یارسول اللہ، ہے۔ ایک روز جب میں نے آپؐ کو پشت پر اٹھا رکھا تھا، آپ نے میری پیٹھ میں دانت گاڑ دیئے تھے۔ اس کا نشان اب تک باقی ہے۔ یہ دیکھیں۔

رسول اللہ : (نشان پہچان کر) : مرحبا — آؤ۔ اس چادر پر بیٹھو اور رہو۔ اگر تم چاہو تو بہت محبت اور عزت کے ساتھ میرے پاس رہ سکتی ہو۔ یہ بات میرے لئے خوشی کا باعث ہوگی، تمہارا بھائی ہوں، اگر تم واپس اپنے

قبیلہ میں جانا چاہتی ہو۔ تو تم کو اختیار ہے۔ اگر میں تمہیں تحائف و سامان کے ساتھ عزت اور تکریم سے رخصت کر دوں۔

بی بی شیماؓ: برادر مکرم: آپ جو کچھ عنایت فرمانا چاہیں، دے دیں اور مجھے میری قوم میں واپس بھجوا دیں۔

رسول اللہؐ: مجھے منظور ہے۔

آپ نے اپنی رضاعی بہن کو تین غلام، ایک کنیز اور چند بکریاں عطا کیں۔ یہ عنایات کریمانہ دیکھ کر انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔ اور اپنے وطن لوٹ گئیں۔

۱۔ زاد المعاد جلد ۱، ۲
۲۔ صحیح بخاری جلد ۲، کتاب المغازی ص ۲۰۱ تا ص ۲۰۲
۳۔ صحیح مسلم۔ کتاب المغازی۔
۴۔ سیرۃ ابن ہشام جلد ۲ ص ۵۲۳ تا ص ۵۵
۵۔ تاریخ طبری جلد ۱ ص ۴۱ تا ص ۴۳۔

عام الوفود

ضمام بن ثعلبہ

انس بن مالکؓ بیان کرتے ہیں کہ ہمیں (قرآن مجید میں) اس بات کی ہدایت کی گئی کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بے ضرورت سوالات نہ کیا کریں اس لئے ہم اس بات کے منتظر رہتے تھے کہ اہل بادیہ میں کوئی اللہ کا بندہ آ نکلے۔ وہ حضورؐ سے سوالات کرے اور ہم سنیں۔ اتفاقاً ایک گنوار شخص اونٹنی پر سوار وہاں آن پہنچا۔ اونٹنی کو مسجد کے اندر لایا اور اُسے دروازے سے باندھ دیا۔ خود بیباکی سے حضور کی مجلس میں در آیا۔

ضمام:۔ ابن عبدالمطلب کون ہے؟

رسول اللہؐ: میں ہوں ابن عبدالمطلب۔

ضمام: میں نجد کا رہنے والا ہوں۔ مجھے میرے قبیلہ والوں نے حقیقت حال معلوم کرنے کو بھیجا ہے۔ میں آپ سے کچھ سوال کرنا چاہتا ہوں۔ میرا لہجہ سخت اور درشت ہے، امید ہے آپ محسوس نہیں کریں گے۔

رسول اللہؐ:۔ جو کچھ پوچھنا ہے پوچھو۔ میں دل میں میل نہیں لاؤں گا۔

ضمام: اے محمدؐ! آپ کا قاصد ہمارے پاس آیا تھا۔ اُس نے ہم سے کہا کہ آپ کو اس بات کا یقین ہے کہ اللہ تعالےٰ نے آپ کو پیغمبر بنا کر بھیجا ہے۔ میں آپ کے رب کی قسم دے کر آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا اللہ نے آپ کو تمام لوگوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا ہے؟

رسول اللہؐ :- ہاں خدا گواہ ہے - اُس نے سچ کہا - ایسا ہی ہے -
ضمام : آسمان کس نے بنایا ہے ؟
رسول اللہ : اللہ نے -
ضمام : اور زمین کا خالق کون ہے ؟
رسول اللہ : اللہ -
ضمام : اچھا تو یہ پہاڑ کس نے قائم کئے ، ان میں قسم قسم کی چیزیں کس نے پیدا کیں -
رسول اللہؐ : اللہ نے -
ضمام : اسی کی قسم ہے جس نے آسمان و زمین پیدا کئے ، سچ بتائیں کیا واقعی اللہ تعالٰے نے آپ کو رسول بنایا ہے -

رسول اللہؐ - ہاں -
ضمام : آپ کے قاصد نے ہم سے یہ بھی کہا تھا کہ دن رات میں ہم پر پانچ نمازیں فرض ہیں -
رسول اللہؐ : اس نے سچ کہا -
ضمام : اس ذات کی قسم ، جس نے آپؐ کو پیغمبر بنایا - سچ بتائیے - کیا واقعی اللہ تعالٰے نے اس کا آپؐ کو حکم دیا ہے
رسول اللہؐ : ہاں
ضمام : - آپ کے قاصد نے یہ بھی کہا تھا کہ ہمارے اموال پر زکوٰۃ فرض کی گئی ہے ،
رسول اللہؐ :- اس نے سچی بات کہی -
ضمام : اس ذات کی قسم جس نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا ہے ، کیا اللہ تعالٰے نے آپ کو اس تعلیم کا حکم دیا ہے -
رسول اکرمؐ : ہاں
ضمام :- آپ کے ایلچی نے یہ بھی کہا تھا کہ ہم پر سال میں ایک ماہ (ماہِ رمضان) کے روزے فرض ہیں -
رسول اللہؐ - ہاں ، اس نے درست کہا -
ضمام : اس ذات کی قسم جس نے آپؐ کو پیغمبر بنا کر بھیجا ہے - کیا اُسی نے آپ کو اس بات کا حکم دیا ہے -
رسول اللہؐ :- ہاں
ضمام : آپ کے قاصد نے یہ بھی کہا تھا کہ ہم میں ہر اس شخص پر جو صاحبِ استطاعت ہو ، حج فرض ہے -
رسول اللہؐ : میرے سفیر نے سچ کہا -
ضمام :- اس ذات کی قسم جس نے آپ کو پیغمبر بنا کر مبعوث کیا ، کیا یہ اُسی کا حکم ہے -

رسول اللہ صلعم۔ ہاں

ضمام : اس ذات کی قسم، جس نے آپ کو حق کے ساتھ پیغمبر بنا کر مبعوث کیا ہے۔ نہ تو میں ان احکام میں کچھ زیادتی کر دوں گا اور نہ کمی جو دین آپ لائے ہیں۔ میں اس کو قبول کر چکا ہوں۔ میں اپنی قوم کا قاصد ہوں، جو میرے پیچھے ہے۔ میرا نام ضمام بن ثعلبہ ہے،

میں بنو سعد بن بکر کا بھائی ہوں،

رسول اللہ : اگر یہ شخص سچ کہہ رہا ہے تو یقیناً جنت میں جائے گا۔

۱- احمد و مسلم ، بحوالہ ترجمان السنۃ جلد ۱ صفحہ ۵۴۶

۲- صحیح بخاری جلد ۱ کتاب العلم صفحہ ۵۹ - ۶۱

وفد عبد القیس

ابی جمرہؓ حضرت عباسؓ سے روایت کرتے ہیں۔

جب عبد القیس کا وفد مدینہ میں جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، تو آپ نے استفسار فرمایا۔

رسول اللہؐ :- یہ کون لوگ ہیں۔

صحابہؓ : یا رسول اللہ یہ قبیلہ ربیعہ کے لوگ ہیں۔

رسول اللہؐ : مرحبا۔ خوش آمدید۔ (تم لوگوں نے برضا و رغبت اسلام قبول کیا) نہ تو دنیا میں رسوائی کی نوبت آئی اور نہ آخرت میں شرمندہ ہوگے

عبد القیس :- یا رسول اللہ! ہم ایک لمبی مسافت طے کر کے آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں۔

اے اللہ کے نبی! آپ کے اور ہمارے درمیان قبیلہ مضر کے کافر آباد ہیں۔ یہ جنگجو اور جھگڑالو ہیں اس لیے ہم آپ کی خدمت میں اشہر حُرم (حرام مہینے۔ جن میں جنگ ممنوع ہے) ہی میں حاضری دے سکتے ہیں۔ اس لئے آپ ہمیں مختصر مگر واضح تعلیمات بتلا دیں۔ جن پر ہم خود بھی عمل کرتے رہیں اور ہمارے قبیلہ کے دیگر افراد بھی۔

ایسی تعلیمات جن پر عمل کر کے ہم جنت کے حق دار بنیں۔

یا رسول اللہؐ۔ ان برتنوں سے متعلق بھی ہمیں آگاہ فرمائیں۔ جن میں نبیذ پی جاتی ہے ان کے متعلق آپ کا کیا حکم ہے؟

رسول اللہ :- اے عبد القیس کے لوگو! میں تمہیں چار باتوں کا حکم دیتا ہوں،

یہ کہ صرف اللہ پر ایمان لائیں، جانتے بھی ہو کہ اللہ پر ایمان کیوں کر لایا جاتا ہے؟

عبدالقیس: یارسول اللہ: اللہ اور اللہ کے رسول کو ہی علم ہے۔
رسول اللہؐ: اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ ایک ہے لاشریک ہے۔ صرف وہی ذات عبادت کے لائق ہے۔
اور یہ کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے رسول ہیں۔
نماز قائم کرو۔
اپنے اموال میں سے زکوٰۃ ادا کرو۔ رمضان کے روزے رکھو، اور مالِ غنیمت میں سے پانچواں حصہ
ادا کرو۔
اے ربیعہ کے لوگو! میں چار چیزوں کے استعمال نہ کرنے کا تمہیں حکم دیتا ہوں وہ چار چیزیں یہ ہیں:
روغنی ٹھلیا (حنتم)، کدو کے تونبے (دُبّا) کریدے ہوئے لکڑی کے برتن (نقیر) اور زفت کے روغن
لگے برتن کے استعمال سے اپنا آپ روکیں۔
عبدالقیس:- اے اللہ کے رسول! آپ کو کیا معلوم کہ نقیر کیا ہوتی ہے؟
رسول اللہ:- اے عبدالقیس۔ خوب جانتا ہوں، تم کھجور کے تنے میں زخم لگا کر اس کا رس نکالتے ہو۔ اس میں
کھجوریں ڈال کر جب پانی ملاتے ہو، تو اس میں اُبال پیدا ہوتا ہے۔ جب یہ جوش بیٹھ جاتا ہے تو اسے
پیتے ہو۔
عبدالقیس: یارسول اللہ! تو پھر ہم پانی پینے کے لئے کس قسم کے برتن استعمال کریں۔
رسول اللہؐ: چمڑے کی مشکیں استعمال کریں، جن کا منہ بندھا ہوا ہو۔
عبدالقیس: یارسول اللہ۔ ہمارے یہاں چوہوں کی کثرت ہے۔ وہ چمڑے کی مشکیں کاٹ کر خراب کر دیتے ہیں۔
رسول اللہ: کچھ بھی ہو، (اسے استعمال کریں۔)
اور ہاں۔ ان باتوں کو خوب یاد کر لو، جو لوگ نہیں آسکے اور جو تمہارے اس طرف رہتے ہیں، ان کو
بھی اِن تعلیمات سے آگاہ کر دو۔

وفد عبدالقیس (جاری) ایک نصرانی کا قبول اسلام۔
ابن اسحاق کا بیان ہے کہ وفد عبدالقیس کے ہمراہ ایک نصرانی بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس کا نام جارود
بن علاء تھا۔ اس کے اور حضور صلعم کے درمیان مندرجہ ذیل گفتگو ہوئی۔
جارود نصرانی:- یارسول اللہؐ میں پہلے سے ایک دین (عیسائیت) کا پیروکار ہوں۔ میری خواہش ہے کہ آپ
کے دین کی خاطر میں اپنے دین کو ترک کر دوں۔ میرے ساتھی بھی آپ کے دین میں داخل ہونا چاہتے ہیں۔

کیا آپ ہمارے ضامن بن سکتے ہیں ؟

رسول اللہؐ : ہاں میں ضمانت دینے کو تیار ہوں، کیوں کہ جس دین کی میں دعوت دیتا ہوں، وہ اس دین سے کہیں بہتر ہے۔ جس پر اب تم ہو۔

۱۔ زاد المعاد جلد ۳ ، صفحہ ۹۶۲ بحوالہ رحمت للعالمین

۲۔ صحیح مسلم بحوالہ ترجمان السنۃ جلد ۱ صفحہ ۵۵

۳۔ صحیح بخاری جلد اول، کتاب الایمان صفحہ ۵

۴۔ ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۹-۷۰۹

عدیؓ بن حاتم طائی

۹ھ ۔ ربیع الاول کے مہینے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مہم حضرت علیؓ کی قیادت میں طے کے علاقے کی طرف بھیجی۔ لشکر اسلام کی آمد کی خبر سنتے ہی عدی بن حاتم، معہ اپنے اہل و عیال کے شام کی طرف فرار ہو گیا۔ حضرت علیؓ نے طے کے بہت سارے لوگوں کو قید کیا، ان میں حاتم طائی کی بیٹی سفانہ بھی تھی۔ یہ ایک بھاری بھر کم لیکن نڈر عورت تھی۔ یہ قیدی مدینہ لائے گئے۔ اور انہیں مسجد نبوی کے قریب ایک حظیرہ میں رکھا گیا۔ سفانہ بھی ان کے ساتھ تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس طرف سے گذر ہوا، تو سفانہ نے حضورؐ کی خدمت میں التجا کی :

سفانہ :۔ میں سردار قوم کی بیٹی ہوں، میرا باپ رحم و کرم میں مشہور تھا، وہ مر گیا۔ اور مجھے فدیہ دے کر چھڑانے والا فرار ہو گیا۔ آپ مجھ پر احسان فرمائیں اللہ تعالیٰ آپ پر احسان فرمائے گا۔

رسول اللہؐ : تمہارا فدیہ دینے والا کون ہے ؟

سفانہ : عدی بن حاتم۔ میرا بھائی۔

یہ سن کر حضورؐ چلے گئے دوسرے دن حضورؐ پھر وہیں سے گذرے۔ اگرچہ میں مایوس تھی۔ پھر بھی ہمت کر کے آپؐ کے قریب گئی اور التجا کی،

سفانہ :۔ میرا باپ مر چکا ہے، چھڑانے والا بھاگ گیا ہے آپ مجھ پر احسان فرما کر آزاد کر دیں، اللہ آپؐ پر احسان فرمائے گا۔

رسول اللہؐ : کون ہے تمہارا چھڑانے والا۔

سفانہ : میرا بھائی ۔۔ عدی بن حاتم۔

رسول اللہؐ : وہی جو اللہ اور اس کے رسولؐ سے فرار ہوا ہے۔ تیرے باپ میں مومنوں جیسی صفات تھیں میں نے تمہاری درخواست قبول ہے۔ اور میں تجھ پر احسان کرتا ہوں، بہتر ہے جانے میں عجلت نہ کرو، میں چاہتا ہوں کہ تمہاری قوم کا کوئی قابلِ اعتماد شخص مل جائے تو تمہیں اس کے ہمراہ بھیج دوں۔

(حضورؐ نے سفانہ کو سواری اور لباس عطا فرمایا۔ جب آپؐ اُسے رخصت فرمانے لگے تو بولی

سفانہ: خدا کرے وہ ہاتھ تیرا ہمیشہ شکر گذار رہے جو خوشحالی کے بعد فقیر اور خالی ہو۔
اور وہ ہاتھ آپ پر کبھی قابو نہ پائے جو تنفر کے بعد امیر ہو۔

سفانہ جب شام پہنچی تو سیدھا اپنے بھائی کے پاس گئی۔ تو بولی۔

سفانہ: او قطع رحمی کرنے والے ظالم۔ تجھے اپنے بال بچے تو عزیز تھے۔ اُن کو حفاظت سے اپنے ساتھ لے آیا لیکن اپنے باپ کی امانت کو چھوڑ دیا۔ جس کی حفاظت تیرا فرض تھا۔

عدی: میری بہن! خدا کے لیے مجھے معاف کر دو، میں واقعی ظالم ہوں، میرے پاس کوئی عذر نہیں۔ ہاں تو، سفانہ! تم نے اُن صاحب (رسول اللہؐ) کو کیسا پایا؟

سفانہ: خدا کی قسم۔ میری مانو تو تم فوراً جا کر اُن سے ملو اگر وہ نبی ہیں تو اُن کی طرف پیش قدمی میں سبقت کرنا تیرے لیے فضیلت کا باعث ہے۔ اور اگر وہ بادشاہ ہیں۔ تو ان کے پاس جانے میں تمہاری ذلت نہیں اور تم، تم ہی رہو گے۔

عدی: خدا کی قسم، تم نے مجھے بہت ہی نیک مشورہ دیا ہے۔

عدی بیان کرتے ہیں:-

مَیں شام سے سیدھا مدینہ پہنچا، اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبوی میں تھے۔ میں مسجد میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور سامنے جا کر سلام عرض کیا۔

رسول اللہؐ: کون!

عدی:- یا رسول اللہ! عدی بن حاتم۔

سرورِ عالم کھڑے ہو گئے۔ مجھے لے کر آپ گھر کی طرف چلے تو ایک ضعیفہ مل گئی۔ جس نے آپ کو روک لیا۔ آپ بڑی دیر تک نہایت تحمل سے اُس کی باتیں سنتے رہے۔ میرے دل نے فیصلہ کیا کہ "خدا کی قسم۔ یہ بادشاہ نہیں" بڑھیا سے فارغ ہو کر آپ مجھے گھر لے گئے۔ آپ نے چمڑے کا ایک گدا میری طرف بڑھایا اور فرمایا۔

رسول اللہؐ:- عدی! اس پر بیٹھ جاؤ۔

عدی: نہیں حضورؐ۔ آپ ہی اس پر بیٹھیں۔

رسول اللہؐ: (اصرار کے ساتھ) نہیں، تم بیٹھو۔

چنانچہ میں گدے پر بیٹھ گیا۔ جبکہ حضور سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم خود زمین پر بیٹھ گئے۔

عدی: (اپنے آپ سے) خدا کی قسم۔ یہ کام کسی بادشاہ کا نہیں ہو سکتا۔

رسول اکرمؐ:- اے عدی۔ کیا تم رکوسی نہیں ہو؟

عدی : جی ہاں!
رسول اکرمؐ :- تم تو اپنی قوم سے پیداوار کا چوتھا حصہ لیتے ہو۔
عدی : جی ہاں!
رسول اللہؐ :- لیکن ایسا کرنا تو تیرے دین میں جائز نہیں۔
عدی :- یا رسول اللہ- خدا کی قسم آپ نے بالکل صحیح فرمایا -(جی ہی جی میں) خدا کی قسم - یہ نبی مرسل ہیں کہ آپ کو اُن باتوں کا بھی علم ہے- جو دوسرے نہیں جانتے۔
رسول اللہؐ : اے عدی! اس دین میں داخل ہونے سے شاید تم کو یہ امر مانع ہے کہ مسلمان غریب ہیں، خدا کی قسم وہ وقت دور نہیں جب مال و دولت کی اس قدر فراوانی ہوگی کہ کوئی شخص مال لینے والا باقی نہ رہے گا۔

اے عدی : شاید تمھیں اس دین میں داخل ہونے سے یہ چیز روک رہی ہے کہ ہم مسلمان تعداد میں تھوڑے ہیں- جبکہ ہمارے دشمن کثیر تعداد میں۔

خدا کی قسم وہ گھڑی قریب ہے جب تو سن لے گا کہ اکیلی عورت قادسیہ سے چلے گی اور بیت اللہ کا حج کرے گی اور اُسے کسی کا ڈر خوف نہیں ہوگا۔

اے عدی! - اے عدی - اس دین میں داخل ہونے سے تم اس لئے بھی ہچکچا رہے ہو کہ حکومت اور سلطنت دوسری قوموں کے ہاتھ میں ہے - واللہ- وہ وقت دور نہیں جب تو خود اپنے کانوں سے سن لے گا کہ ارض بابل کے سفید محل مسلمانوں نے فتح کر لئے ہیں۔

اے عدی! - بتاؤ- لا الٰہ الا اللہ کہنے میں تمھیں کیا تامل ہے۔
کیا اللہ کے سوا کوئی اور بھی معبود ہو سکتا ہے۔

۱- سیرۃ ابن ہشام جلد ۲ ص ۲۱۷ تا ص ۲۱۹
۲- تاریخ طبری جلد ۲ ص ۴۴۶ - ۴۴۹
۳- ترجمان السنۃ جلد ۱ ،

ثمامہ ابن اثال

ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نجد کی طرف سواروں کا ایک دستہ بھیجا- یہ سوار ایک نجدی کو گرفتار کر کے لے آئے- جس کا نام ثمامہ بن اثال تھا- انہوں نے حضورؐ کے حکم سے ثمامہ کو مسجد نبوی کے ایک ستون سے باندھ دیا- آپؐ اُس کے پاس تشریف لے آئے اور فرمایا :

رسول اللہؐ:۔ اے ثمامہ! کہو، کس حال میں ہو؟
ثمامہ:۔ ٹھیک ہوں اے محمدؐ!۔ اگر مجھے قتل کر دو۔ تو یہ قتل ایک ایسے شخص کا ہوگا جو اپنی قوم کا سردار ہے۔
اگر احسان کرو، تو اُسے احسان فراموش نہیں پاؤ گے اور اگر میرے بدلے مال چاہتے ہیں۔
تو جتنا بھی طلب کرو حاضر ہے۔
آپ نے اتنی ہی گفتگو فرمائی۔ ثمامہ کو اسی حال میں چھوڑا اور تشریف لے گئے۔ دوسرے دن پھر تشریف لائے اور فرمایا۔
رسول اللہؐ:۔ بولو ثمامہ! اب کیا خیال ہے؟
ثمامہ:۔ اے محمدؐ! میرا اب بھی وہی خیال ہے جو میں بیان کر چکا ہوں۔
اگر احسان کرو گے۔ تو مجھے شکر گذار پاؤ گے۔
دوسرے دن بھی آپ ثمامہ کو اسی حال میں چھوڑ کر تشریف لے گئے۔ تیسرے دن پھر وہاں آئے تو فرمایا:
رسول اللہؐ:۔ ثمامہ! کیا حال ہے؟
ثمامہ: میں تو عرض کر چکا ہوں۔
رسول اللہ:۔ ثمامہ، مبارک ہو۔ تمہیں رہا کیا جاتا ہے۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے اُسے رہا کر دیا گیا، ثمامہ مسجد کے قریب کھجوروں کے ایک باغ میں گیا، وہاں پر غسل کیا۔
اس کے بعد مسجد نبوی میں حاضری دی۔ اور کہا۔
ثمامہ:۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ اور گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ اللہ کے رسولؐ ہیں۔

(حضور کو مخاطب کرتے ہوئے)

یا محمدؐ! آج سے پہلے روئے زمین پر آپ کے چہرے سے زیادہ مجھے کسی چہرے پر غصہ نہیں آتا تھا لیکن آج آپ کا رُخِ انور میرے لیے محبوب ترین چہرہ ہے۔ خدا کی قسم، آپ کے دین سے زیادہ مجھے کسی دین سے نفرت نہ تھی۔ پر آج میرا محبوب ترین دین یہ ہے۔ خدا کی قسم، آپ کے شہر سے زیادہ مجھے کسی دوسرے شہر سے نفرت نہیں تھی، اب یہ شہر، مجھے تمام شہروں سے زیادہ محبوب ہے۔

یا رسول اللہ! آپ کے سواروں نے مجھے عین اس وقت گرفتار کیا۔ جب میں عمرہ کی نیت سے مکّہ جا رہا تھا۔ فرمایئے۔ مجھے اب کیا کرنا چاہیے۔

رسول اللہؐ:۔ بشارت ہو تمہیں۔ جاؤ اور عمرہ ادا کرو۔
جب ثمامہؓ۔ عمرہ کے لیے مکہ پہنچے تو وہاں کافروں سے یہ گفتگو ہوئی۔

ایک کافر :۔ ثمامہ! سنا ہے تم بے دین ہو گئے ہو۔

ثمامہ :۔ ہرگز نہیں، میں تو اللہ کے رسول پر ایمان لایا ہوں۔ قسم ہے اس ذات پاک کی۔ جس نے آپ کو مبعوث فرمایا۔ جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اجازت نہیں دیں گے۔ تمہارے پاس یمامہ سے گیہوں کا ایک دانہ بھی نہیں آنے کا۔

۱۔ صحیح بخاری : جلد ۲، کتاب المغازی صہ ۲۲۹ - ۲۳۰

۲ - ترجمان السنۃ جلد ۱ صہ ۱۵۷ - ۱۵۶

ابورزین عقیلی

ابورزین عقیلی مدینہ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس کے اور سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان یہ گفتگو ہوئی :۔

ابورزین : یارسول اللہ - ایمان کی حقیقت کیا ہے ؟

رسول اللہؐ :۔ تو اس بات کی شہادت دے کہ معبود کوئی نہیں مگر اللہ جو وحدہٗ لاشریک ہے۔

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بیشک اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔

اللہ اور اللہ کا رسول تجھے تمام ماسوا سے زیادہ محبوب ہوں۔

کسی کو اللہ کا شریک ہرگز نہ ٹھیراؤ چاہے اس کے لئے تمہیں آگ میں بھی کودنا پڑے۔

ان لوگوں سے بھی تمہیں محبت ہو، جن سے رشتہ اور نسب کا تعلق بھی نہ ہو۔

جس وقت تم ان خوبیوں کے حامل بن جاؤ، تو سمجھ لو کہ تمہارے دل میں ایمان کی حلاوت ایسی رچ بس گئی ہے۔ جیسے شدت کی گرمی میں کسی پیاسے کے دل میں پانی کی محبت۔

ابورزین :۔ یارسول اللہ - اس بات کا مجھے کیسے علم ہوگا کہ میرا ایمان کامل ہو گیا ہے۔

رسول اللہؐ :۔ میری امت میں کوئی اللہ کا بندہ ایسا نہیں کہ جب نیکی کرے تو اس کو غرور ہو کہ میں نے نیکی کی ہے۔

ہاں اُسے اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ اس کا اجر اللہ تعالےٰ عطا کریں گے۔

لیکن جب کوئی بُرائی کرے تو اُسے محسوس ہو کہ یہ بُرائی ہے - اس کے لئے اللہ تعالےٰ کے حضور توبہ کرے۔

اور یہ یقین رکھے کہ سوائے اُس ذات پاک کے کوئی بخشنے والا نہیں۔

— جب یہ صفات پائی جائیں۔ تو سمجھو کہ ایسا شخص یقیناً مومن کامل ہے۔

(مسند احمد بحوالہ ترجمان السنۃ جلد ۱ صہ ۱۵۵)

ابن المنفتق

ابن المنفتق حضورؐ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش میں میدانِ عرفات پہنچا۔ اُس کے اور حضورؐ کے درمیان یہ بات چیت ہوئی،

ابن المنفتق :۔ یا رسول : میں دو باتیں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں آتش دوزخ سے مجھے کونسا عمل بچا سکتا ہے ؟ جنتی بننے کے لئے کیا عمل چاہیے ۔؟

رسول اللہؐ :۔ اے سائل !۔ سوال تو تُو نے نہایت مختصر کیا مگر بات بڑی ہی طویل دریافت کی ۔ غور سے سنو !

صرف خدائے واحد کی عبادت کرو ۔

کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ ۔

فرض نماز اچھے طریقے سے ادا کیا کرو ۔

اپنے اموال میں زکوٰۃ ادا کرو ۔

رمضان کے روزے رکھو ۔

اور جو بات تو پسند کرتا ہے کہ لوگ تیرے ساتھ کریں ۔ ویسا ہی تو اُن کے ساتھ کر ۔

اور جو بات تو اپنے لیے پسند نہیں کرتا ۔ وہ دوسروں کے لئے بھی پسند نہ کر ۔

(۔ صحیح بخاری ۔ کتاب الحج)

معاویہ بن حیدہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات چیت

معاویہ بن حیدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مدینہ حاضر ہوا تو اُن کے درمیان یہ بات چیت ہوئی ۔

معاویہ :۔ یا رسول اللہ ! میں بیسیوں مرتبہ قسم کھا چکا تھا کہ میں نہ تو آپ کے پاس حاضر ہوں گا ۔ اور نہ ہی آپ کا دین قبول کروں گا — اب میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوں ۔ اے اللہ کے نبیؐ ! میں قطعاً بے علم شخص ہوں ، ناسمجھ ہوں بس وہی میرے لئے کافی ہے ، جو اللہ اور اللہ کا رسول مجھے بتا دے ۔ میں خدا کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں کہ اللہ پاک نے آپ کو ہمارے پاس کیا کیا احکام دے کر بھیجا ہے ؟

رسول اللہؐ :۔ (سب سے پہلے) اسلام کا حکم دیا ہے ۔

معاویہ :۔ اسلام کیا ہے ؟

رسول اللہؐ :۔ اسلام یہ ہے کہ تو اقرار کرے کہ میں اپنا آپ اللہ کے سپرد کر چکا ۔ کفر و شرک ترک کر دے ۔ نماز پڑھے ۔ زکوٰۃ دے ۔

تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں ۔ انہیں ایک دوسرے کا احترام کرنا چاہیے ۔ ایک دوسرے کے کام آنا

چاہیے جو شخص اسلام لانے کے بعد شرک کرے۔
اس کے سارے اعمال اکارت گئے۔
جب تک وہ انھیں چھوڑ کر۔ پھر سے اسلام قبول نہ کرے۔
(تمام لوگوں سے) ۔ عجیب بات ہے، میں تو تمھیں پکڑ پکڑ کے نارِ جہنم سے بچانا چاہتا ہوں (اور تم ایک نہیں سنتے)
سن لو، میرا پروردگار (قیامت کے روز) مجھے طلب فرمائے گا۔ وہ مجھ سے یقیناً پوچھے گا۔ کہ تم نے
میرے بندوں کو میرا پیغام پہنچا دیا۔
میں عرض کروں گا۔ اے میرے اللہ! میں نے پہنچا دیا۔
سن لو۔ غور سے سنو،۔
جو لوگ یہاں موجود ہیں۔ وہ میرا پیغام اُن تک بھی پہنچا دیں۔ جو یہاں نہیں۔
سنو! پھر تم بھی بلائے جاؤ گے، اور تم غلط بات نہیں کہہ سکو گے۔
سب سے پہلے انسانی بدن کے جو حصے بیان دیں گے۔
وہ تمہاری رانیں ۔ اور ہاتھ ہوں گے۔

معاویہ :۔ یا رسول اللہ ۔ بس، ہمارا دین یہ ہے؟
رسولؐ اللہ: ہاں ۔ یہ تو تمہارا دین ہے ۔ بھلائی جہاں بھی کرو گے، تمہارے حق میں، کافی ہو گی۔
(احمد، حاکم۔ بحوالہ ترجمان السنۃ جلد ۱ صفحہ ۵۸)

سوید ازدی کا وفد

سوید ازدی بیان کرتے ہیں کہ ہم اپنی قوم کے سات آدمی جناب سید البشر صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بات چیت شروع کی تو آپؐ کو ہمارا انداز بہت بھایا۔ آپ نے فرمایا:

رسول اللہؐ :۔ تم کون لوگ ہو؟
سوید :۔ یا رسول اللہ! مسلمان
رسول اللہ (تبسم فرماتے ہوئے) : لوگو! ہر بات کی ایک حقیقت ہوتی ہے بتاؤ۔ تمہارے قول اور ایمان کی کیا حقیقت ہے؟
سوید : یا رسول اللہ! پندرہ چیزیں ہیں۔ جن پر ہم قائم ہیں ان میں پانچ تو ایسی ہیں، جن کے متعلق آپ کے سفیروں نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم اُن پر یقین رکھیں۔
دوسری پانچ ایسی ہیں۔ جن کے متعلق حکم دیا ہے کہ اُن پر عمل کریں۔

اور تیسری پانچ وہ ہیں۔ جن پر ہم زمانۂ جاہلیت سے عمل کرتے چلے آرہے ہیں، اور اب بھی اُن پہ ہمارا عمل ہے اگر آپ وہ پسند نہ کریں تو ہم انھیں ترک کر دیں گے۔

رسول اللہ: وہ پانچ باتیں کونسی ہیں، جن پہ یقین رکھنا ضروری ہے۔

سوید: یہ کہ ہم اللہ، اُس کے رسولوں، اس کے فرشتوں، اُس کی کتابوں پر ایمان لے آئیں اور یہ یقین رکھیں کہ موت کے بعد بھی زندگی ہے۔

رسول اللہ: وہ پانچ باتیں کون سی ہیں۔ جن پر عمل کرنا ضروری ہے۔؟

سوید: یارسول اللہ یہ کہ: ہم اقرار کریں اللہ ایک ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، نماز قائم کریں، زکوٰۃ دیں، رمضان کے روزے رکھیں اور اگر استطاعت ہو تو بیت اللہ کا حج بھی کریں۔

رسول اللہ: اچھا تو وہ پانچ باتیں کونسی ہیں۔ جن پہ تم زمانۂ جاہلیت سے عمل پیرا ہو؟

سوید: یارسول اللہ۔ وہ یہ ہیں۔

- فراخی میں شکر کرنا۔
- مصائب میں صبر کرنا۔
- تقدیر پر راضی رہنا۔
- جنگ میں ثابت قدم رہنا
- اور دشمنوں کو مصائب میں گھرا دیکھ کر خوشی نہ منانا۔

رسول اللہ: سبحان اللہ۔ تم تو سارے دانا و بینا نکلے۔

اچھا تو اب پانچ مزید باتوں کی میں تمھیں تلقین کرتا ہوں تاکہ مل ملا کر بیس بن جائیں۔ اگر بات ایسی ہے جیسی کہ تم نے ذکر کی ہے تو:

۱۔ ضرورت سے زیادہ خوراک ذخیرہ نہ کرو۔

۲۔ ضرورت سے زیادہ مکانات تعمیر نہ کرو۔

۳۔ جو چیز پائیدار نہیں۔ جسے تم نے اسی دنیا میں چھوڑ دینا ہے۔ اس میں مسابقت کی کوشش نہ کرو۔

۴۔ خدائے واحد کا خوف دل میں رکھو، اُسی کی طرف تم نے لوٹ کر جانا ہے۔ اور اسی کے سامنے تم نے اپنے اعمال کا حساب دینا ہے۔

۵۔ اُس گھر کی فکر کرو۔ جہاں تم نے ہمیشہ کے لئے رہنا ہے۔

شرح المواہب: بحوالہ ترجمان السنۃ جلد ۱ صہ ۵۹۹۔

وفد کندہ

حج کے موقع پر جب حضرت علیؓ نے اعلان کیا ۔ تو خصوصاً جنوبی یمن کے لوگ اسلام قبول کرنے کے لیے مدینہ آنے شروع ہوئے ۔ انھیں میں اسی سواروں پر مشتمل ۔ ایک وفد اپنے رئیس اشعث بن قیس کی سرکردگی میں مدینہ پہنچا ۔ لباس تبدیل کئے اور خوب سج دھج سے مسجد نبوی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے ۔ ان لوگوں کے جبّوں کے استر ریشمین تھے ۔ جن پر خوب صورت نقش و نگار بنے ہوئے تھے ۔ آنکھوں میں سرمہ لگا ہوا تھا ۔ اور زلفیں کندھوں پر بکھری ہوئی تھیں ۔ ان کو دیکھ کر حضورؐ نے فرمایا :۔

رسول اللہؐ : کیا تم لوگ ابھی تک اسلام نہیں لائے ؟

اشعث : یا رسول اللہ ۔ خدا کے فضل سے ہم سب مسلمان ہیں ۔

رسول اللہ : پھر یہ ریشمیں لباس کیوں پہن رکھے ہیں ؟

(یہ سنتے ہی سب نے اپنے ریشمیں جبّے تار تار کر دیے ۔)

رئیس وفد نے عرض کی :۔

اشعث : یا رسول اللہ ! ہم دونوں آکل المرار کی اولاد ہیں ۔

رسول اللہؐ (تبسم فرماتے ہوئے) ۔ اے لوگو ! آکل المرار کی اولاد میں سے ہونے کا فخر اگر ہوگا ۔ تو عباس بن عبد المطلب اور ربیعہ بن حارث کو ہیں تو اُس کی اولاد میں سے نہیں ، ہم تو نضر بن کنانہ کی اولاد ہیں ۔ ہم لوگ اپنا نسب ماں کی طرف سے نہیں ملتے، بلکہ اپنے باپ کی نسبت سے مانتے ہیں ۔

(سیرۃ ابن ہشام جلد ۲ صہ ۲۲۲)

وفد اشعریین

جب یمن کا وفد مدینہ کے قریب پہنچا تو صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی :۔

صحابہ :۔ یا رسول اللہ ایک جماعت آ رہی ہے ۔ جو نہایت ہی رقیق القلب ہے ۔

رسول اللہ : (وفد کے پہنچنے پر) اہل یمن آن پہنچے ۔

ایمان بھی یمن والوں کا ہے اور حکمت بھی ،

ان کے دل نہایت رقیق ۔ اور طبائع نرم ہیں ۔

اہلِ یمن : یا رسول اللہؐ ! ہم آپؐ کی خدمت میں اس خاطر حاضر ہوئے ہیں کہ آپؐ سے دین کی سمجھ حاصل کریں آپؐ تکوین عالم کی ابتدا ، اور آغاز سے متعلق کچھ فرمائیں ۔

رسول اللہؐ :۔ اے اہل یمن ! غور سے سنو !

جب کچھ بھی موجود نہیں تھا۔ تو خدا تھا۔
اُس کا عرش پانی پر تھا۔
پھر اُس نے آسمان و زمین کی تخلیق فرمائی
اور ہر چیز کو لوح محفوظ میں لکھ دیا۔

بخاری/فتح الباری بحوالہ سیرت المصطفیٰ جلد ۳ ص ۲۷۵

وفد بنو حارث

بنو حارث نجران کا ایک معزز قبیلہ تھا۔

جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے سنہ ۱۰ھ میں حضرت خالد بن ولید کو اُن لوگوں کیطرف بھیجا۔ آپ نے خالدؓ کو ہدایت فرمائی کہ تین دن تک دعوت اسلام دیں اور ان سے تعرض نہ کریں۔ ہاں اگر پھر بھی وہ اسلام نہ لائیں۔ تو پھر اُن سے جنگ کرنا۔ حضرت خالد کی دعوت پر اُن لوگوں نے لبیک کہا۔ اطراف و جوانب کے لوگوں نے بھی خوشی سے اسلام قبول کر لیا۔ اس خوش خبری کی اطلاع حضرت خالدؓ نے آپؐ کو ایک خط کے ذریعہ دی۔ جس کے جواب میں حضورؐ نے خالد کو ہدایت کی کہ وہ بنو حارث کا ایک وفد لے کر آئیں۔ چنانچہ حضرت خالد بنی حارث کا ایک وفد لے کر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضورؐ نے جب وفد کے ارکان کو دیکھا تو فرمایا:۔

رسول اللہؐ :۔ یہ کون لوگ ہیں۔ جو ہندوستان کے لوگوں سے ملتے جلتے ہیں؟

بنو حارث :۔ یا رسول اللہ! ہمارا تعلق بنی حرث بن کعب سے ہے۔ ہم اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ واحد ہے۔ لاشریک ہے۔ اور یہ کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔

رسول اللہؐ :۔ میں بھی گواہی دیتا ہوں کہ خدائے واحد کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، اور یہ کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔

سنو، تم وہ لوگ ہو، کہ جنھیں جب للکارا جائے۔ تو آگے بڑھ کر جرأت سے مقابلہ کرتے ہو۔

اہلِ وفد خاموش رہے۔ حضورؐ نے اس بات کا تین بار اعادہ فرمایا۔ جب چوتھی بار اسے دہرایا۔ تو اہلِ وفد میں سے ایک شخص یزید بن عبدالمدان نے عرض کیا۔

یزید بن عبدالمدان :۔ ہاں، اے اللہ کے رسول! ہم وہ ہیں کہ جب ہمیں للکارا جائے تو ہم پیش قدمی کر کے جرأت سے مقابلہ کرتے ہیں۔

رسول اللہؐ : اگر خالد مجھے یہ نہ لکھتے کہ تم اسلام لے آئے ہو، اور تم نے قتال نہیں کیا۔ تو میں تمہارے سروں کو تمہارے قدموں کے نیچے بچھا دیتا۔

یزید بن عبدالمدان :۔ اللہ کی قسم نہ ہم نے آپؐ کی حمد و ثنا کی نہ خالد کی۔

رسول اللہؐ :- پھر کس کی ثناخوانی کی؟

یزید بن عبدالمدان :- یارسول اللہ۔ ہم نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی جس نے ہمیں آپ کے واسطے سے سیدھی راہ دکھائی۔

رسول اللہؐ :- تم نے سچ کہا،

ہاں۔ یہ تو بتاؤ کہ زمانہ جاہلیت میں تم اپنے دشمنوں پر کیوں کر غالب رہتے؟

یزید :- یارسول اللہ! ہم نے تو کسی کو مغلوب نہیں کیا

رسول اللہؐ : کیوں نہیں، جن لوگوں نے بھی تمہارے خلاف جنگ کی۔ تم ان پر غالب رہے۔

یزید : یارسول اللہؐ! ہم اپنے دشمنوں پر اس لئے غالب رہتے کہ ہم متحد ہیں۔ آپس میں اختلاف نہیں کرتے۔ آپس ہی ایک دوسرے پر حسد نہیں کرتے۔ ہم کسی پر ظلم میں پہل نہیں کرتے۔ سختی اور تنگی کے وقت صبر کرتے ہیں۔

رسول اللہؐ : بخدا۔ تم نے سچ کہا۔ آج سے قیس بن حصین تمہارا امیر ہے۔

سیرت ابن ہشام جلد ۲ صہ ۲۲۹ تا ۲۳۱

وفد بنو ثقیف

ابن اسحاق کا بیان ہے۔ رسول اللہ جب غزوۂ تبوک سے واپس مدینہ تشریف لائے۔ تو ان دنوں بنو ثقیف کا وفد جو چھ افراد پر مشتمل تھا۔ مدینہ پہنچا۔ مغیرہ بن شعبہ رضؓ نے اُن کو دیکھتے ہی فرط مسرت سے اپنے اونٹوں کو چھوڑ دیا۔ کیوں کہ یہ اُن کے ہم جد تھے اس کی اطلاع دینے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دوڑے۔ راستہ میں حضرت ابوبکر صدیق رضؓ ان کو مل گئے۔ انہوں نے مغیرہ کو اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ اس وفد کی آمد کی اطلاع جناب رسالتمآبؐ کو دیں گے۔ مغیرہ واپس ہوئے اور اپنے بھائیوں بنو ثقیف کے پاس پہنچے۔ حضرت مغیرہ نے انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کرنے کے آداب بتائے۔ اس کے باوجود بھی انہوں نے جاہلیت کے طور طریق برتے۔ جب یہ لوگ حضورؐ کی خدمت میں پہنچے۔ تو آپؐ نے اُن کے لیے مسجد کے ایک کونے میں خیمہ لگوا دیا۔ خالد بن سعید بن العاص نے بنو ثقیف اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان سفیر کے فرائض انجام دیئے۔ حضرت مغیرہ رضؓ بھی ان کے قریب رہنے کی کوشش کرتے۔ بنو ثقیف اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان یہ بات چیت ہوئی۔

بنو ثقیف نے چند ایک مطالبات بھی پیش کئے۔

بنو ثقیف : اے صاحب! ہم نے آپ کی باتیں غور سے سنیں۔ آپ اپنی ذات پر ایمان لانے کی تاکید فرماتے ہیں۔ لیکن اپنے رسول ہونے کی شہادت نہیں دیتے۔

رسول اللہؐ : اے گروہ ثقیف! اپنے رسول ہونے کی شہادت تو سب سے پہلے میں نے دی ہے۔

بنو ثقیف:۔ کیا آپ ہمارے ساتھ تحریری معاہدہ کرنا پسند کریں گے؟

رسول اللہؐ:۔ اسلام لانے کی صورت میں۔ ورنہ نہیں۔

بنو ثقیف نے کلمۂ شہادت پڑھا۔ اور پھر گفتگو شروع ہوئی۔

بنو ثقیف: جہاں تک زنا کا تعلق ہے۔ ہم لوگ اکثر مجرد رہتے اور غیر شادی شدہ رہتے ہیں۔ اس لئے اس کے بغیر چارہ نہیں۔

رسول اللہؐ: وہ تم پر قطعاً حرام ہے، اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے۔ "اور زنا کے پاس بھی نہ پھٹکنا کہ وہ بے حیائی ہے اور (بہت ہی) بُری راہ ہے"۔ بنی اسرائیل سورہ: $\frac{۱۷}{۳۲}$

بنو ثقیف: سود کے بارے میں جو آپ کہتے ہیں۔ تو ہمارا سارا مال سود ہی سود ہے ––؟

رسول اللہؐ: سود قطعاً حرام ہے۔ ہاں اصل راس المال لینے کا تمہیں حق ہے۔ باری تعالیٰ فرماتے ہیں "اے ایمان والو، اللہ سے ڈرو۔ اگر ایمان رکھتے ہو۔ تو جتنا سود (لوگوں کے ذمہ) باقی رہ گیا ہے۔ اُسے چھوڑ دو۔" (۲ : ۲۷۸)

بنو ثقیف:۔ جہاں تک شراب کا تعلق ہے تو وہ تو ہماری زمین کا نچوڑ ہے۔ ہم اس کے بغیر نہیں رہ سکتے۔

رسول اللہؐ:۔ اللہ تعالےٰ نے اسے حرام کیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:۔

"اے ایمان والو، شراب، جوا، بت اور پانسے (یہ سب) ناپاک اعمال شیطان سے ہیں سو ان سے بچتے رہنا تاکہ تم فلاح پاؤ"۔ (سورۂ مائدہ (۵ : ۹۰))

بنو ثقیف: ہمیں نماز سے بھی معاف فرمایا جائے۔

رسول اللہؐ: قطعاً نہیں۔ جس دین میں خُدا کی عبادت نہ کی جائے۔ اس دین میں کوئی بھلائی نہیں۔

بنو ثقیف:۔ ربّہ بُت کے بارے میں آپ کا کیا حکم ہے؟

رسول اللہؐ:۔ اُس کو توڑ دیا جائے۔

بنو ثقیف:۔ اگر ربّہ کو معلوم ہو جائے کہ آپ اُسے توڑ دینا چاہتے ہیں۔ تو وہ اپنے تمام پجاریوں کو ملیامیٹ کر دے۔

حضرت عمرؓ:۔ تمہارا بُرا ہو۔ تم کس قدر جاہل ہو۔ ربّہ ایک پتھر کے سوا ہے کیا؟

بنو ثقیف:۔ ابن خطاب ہم تمہارے پاس نہیں آئے ہیں۔

(حضورؐ سے) : آپ خود اسے توڑ ڈالیں، ہماری یہ جرأت نہیں کہ ہم اس پہ ہاتھ اٹھائیں۔

رسول اللہؐ: میں اپنے آدمیوں کو بھیج دوں گا۔ وہ تمہارے لئے یہ کام انجام دیں گے۔

بنو ثقیف :- یا رسول اللہ، آپ ہمارے لئے ہماری قوم کا کوئی امیر بنا دیجئے۔

رسول اللہؐ :- آج سے عثمان بن ابی العاص تمہارے امیر ہیں۔

(جو اگرچہ عمر میں کم ہیں لیکن علم دین میں انھیں اچھی سمجھ ہے)

ابوبکرؓ : یارسول اللہؐ! درحقیقت میں نے اس لڑکے کو ان لوگوں میں تفقہ فی الدین اور تعلیم قرآن کا سب سے زیادہ حریص پایا۔

۱۔ سیرۃ ابن ہشام جلد ۲ صـ ۶۴۷ تا ۶۵۴

۲۔ تاریخ طبری جلد ۱ صـ ۴۳۳ تا ۴۳۶۔

۳۔ زاد المعاد جلد ۲ بحوالہ نبی رحمت جلد ۲

مکالمۂ جبرئیل علیہ السلام

حضرت عمرؓ بیان فرماتے ہیں:

ایک روز ہم جناب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہِ اقدس میں حاضر تھے کہ اچانک ایک اجنبی وہاں آن پہنچا۔ سفید براق لباس زیب تن کئے۔ گھنے سیاہ بال، نہ تو چہرے پر کسی قسم کی تھکان کے اثرات تھے۔ اور نہ ہی لباس شکن آلود تھا نووارد کو حاضرین میں سے کوئی بھی نہیں پہچانتا تھا۔ وہ نہایت ہی بے تکلفی سے آگے بڑھا۔ اور حضورؐ کے بالکل قریب جڑ کر، دوزانو ہو کر بیٹھ گیا۔ اُس نے اپنے دونوں ہاتھ حضورؐ کے گھٹنوں پر اس طرح رکھ دیئے جیسے پرانی شناسائی ہو، اور یوں بات چیت شروع کی۔

نووارد —— اے محمدؐ! اسلام کیا ہے؟

رسول اللہؐ :- اسلام یہ ہے کہ تم (دل وزبان سے) اس بات کی شہادت دو کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، اور محمدؐ اس کے رسول ہیں نماز قائم کرو، فرض زکوٰۃ ادا کرو، رمضان کے روزے رکھو۔ اور اگر خدا توفیق دے تو بیت اللہ کا حج ادا کرو۔

نووارد : سچ فرمایا آپ، واقعی اسلام یہی ہے۔

اور ہاں، احسان کیا چیز ہے؟

رسول اللہؐ : اللہ کی عبادت اس طور کرو، گویا تم اُسے دیکھ رہے ہو، پس اگر یہ مقام (مشاہدۂ حق) تمھیں حاصل نہ ہو —— تو پھر اس تصور کے ساتھ عبادت کرو گویا وہ تمھیں دیکھ رہا ہے —— اور وہ تمہاری نگاہوں کے سامنے ہے۔ اگر یہ کیفیت بھی پیدا نہ ہو سکے تو خدا کے متعلق اتنا یقین ضرور رکھو کہ وہ تمہارے قیام و سجود کو دیکھ رہا ہے۔

نووارد :- سبحان اللہ۔ واقعی احسان کی حقیقت یہی ہے —— اور ہاں! ایمان کی حقیقت کیا ہے؟

رسول اللہ : یہ یقین رکھو کہ خدا تعالیٰ واحد اور لاشریک ہے۔ فرشتوں کو حق جانو۔
اللہ کے رسولوں اور اللہ کی کتابوں کی تصدیق کرو۔
آخرت کے دن، ہر خیر و شر کی تقدیر
اور قیامت کا اقرار کرو۔

نووارد :۔ بے شک ایمان یہی ہے۔ آپ سچ فرماتے ہیں۔
اور ہاں قیامت کب آئے گی؟

رسول اللہ :۔ اس کے متعلق میرا علم سائل کے علم سے زیادہ نہیں، یہ اُن پانچ چیزوں میں سے ہے جس کا علم سوائے خالقِ ارض و سما کے کسی کو نہیں۔
ارشاد ربانی ہے :۔
"یقیناً صرف اللہ کے پاس ہے قیامت کے وقتِ خاص کا علم اور وہی نازل کرتا ہے بارش
(یعنی اسی کے علم میں ہے کہ بارش کب اور کہاں ہوگی)
اور وہی جانتا ہے جو رحموں میں ہوتا ہے — اور کسی نفس کو پتہ نہیں کہ کل کیا ہوگا؟
اور کسی نفس کو خبر نہیں کہ اس کی موت کب اور کہاں واقع ہوگی۔
یقیناً اللہ ہی ان باتوں کا پورا جاننے والا ہے۔ اور ان کی پوری خبر رکھنے والا ہے۔

نووارد :۔ حق بات فرمائی آپ نے۔
اور ہاں تو قیامت کی کچھ علامات ہی بتلا دیجئے؟

رسول اللہ :۔ قربِ قیامت کی ظاہر اور واضح علامات یہ ہیں [1]، لونڈی اپنے آقا کو جنے گی (اولاد والدین کو غلام سمجھے گی [1])
چرواہے اس قدر مال و زر کے مالک ہوں گے کہ بڑی بڑی، بلند و بالا عمارات تعمیر کرنے میں ایک دوسرے سے مسابقت کریں گے — انجام سے غافل لوگ قوموں کی قسمت کے مالک ہوں گے
(یعنی، نا اہل لوگوں کے ہاتھ میں حکومت اور معاملات کے اختیارات کی زمام ہوگی)

یہ گفتگو کرنے کے بعد نووارد اٹھا اور نظروں سے اوجھل ہوگیا، نہ اُس کے آنے کی کسی کو خبر ہوئی۔ اور نہ جانے کا پتہ چلا۔

رسول اللہ ؐ :۔ جاؤ۔ اور اُسے دوبارہ میرے پاس لاؤ۔ (تلاشِ بسیار کے بعد بھی پتہ نہیں چلتا)

حضورؐ :۔ اے لوگو! جانتے ہو، یہ اجنبی کون تھا؟

حاضرین : یا رسول اللہ۔ اللہ اور اللہ کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔ ہمیں کچھ علم نہیں۔

رسول اللہ ؐ : یہ جبرئیل امین تھے۔ اس لئے تمہاری محفل میں تشریف لائے کہ تمہیں دین کی تعلیم دیں۔

صحیح مسلم ۔ بحوالہ حضرت عمرؓ ۔ کتاب الایمان
صحیح بخاری ۔ بحوالہ حضرت ابوہریرہ ۔ جلد ۱ ، کتاب الایمان صفحہ ۲۸ ، ۲۸۱
معارف الحدیث ۔ جلد ۱ کتاب الایمان ص ۷۵ تا ص ۱۷ ۔

"فتنوں کا ظہور اور اُن سے بچنے کی تدابیر"

حضرت علی رضؓ اور سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم

رسول اللہؐ : اے علی ! عنقریب فتنوں کا ظہور ہوگا

علی رضؓ : یا رسول اللہ ! ان فتنوں سے محفوظ رہنے کی کیا سبیل ہے ۔

رسول اللہؐ : اللہ کی کتاب کو مضبوطی سے تھامے رکھنا ۔

اس میں پہلی امتوں کے واقعات ، ان کو خبردار کرنے کے لئے تنبیہ اور تمہارے لئے احکام ہیں ۔

یہ محض قصے کہانیوں کی کتاب نہیں ، محکم فیصلہ ہے ۔

جو سرکش اس سے کنارہ کشی کرے گا اللہ تعالیٰ اس پر ضعف مسلط کرے گا ۔

جس نے اللہ کی کتاب کے علاوہ کہیں اور راہ ہدایت کی جستجو کی ، اللہ تعالیٰ راہِ راست سے اُسے دور کردے گا ۔

یہی ۔ اور صرف یہی ، اللہ تعالٰے کی مضبوط رسی ہے ۔

یہی ذکر حکیم ہے ۔

یہی صراط مستقیم ہے ۔

یہی وہ کتاب اللہ ہے جو اس پر عمل کرے گا ، وہ بُری خواہشات میں مبتلا نہیں ہوگا ۔

زبانیں شک و ارتیاب سے محفوظ رہیں گی ۔

یہی وہ الکتاب ہے ، جس سے علماً کی طبائع سیر نہیں ہوتیں بار بار کی تلاوت سے شوق مزید بڑھتا ہے ۔

اس کے عجائب لا انتہا ۔

جس نے اس کے ساتھ کلام کیا ، حق ہمیشہ اس کے ساتھ رہا ۔

جس نے اس کی تعلیمات پر عمل کیا ، ثواب کا مستحق ٹھیرا ۔

جس نے اس کے موافق حکم جاری کیا ۔ انصاف کیا ۔

اور جس نے اس کی دعوت پر لبیک کہا ۔ اُس نے راہِ راست پائی ۔

(دارمی) بحوالہ خلاصہ مطالب قرآن ص ۲۰

سہیل بن سعد بیان فرماتے ہیں کہ ہم سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے کہ اتنے میں ایک عورت وہاں آئی اور کہنے لگی:

وہ عورت :۔ یارسول اللہ! میں نے اپنی جان آپ کو ہبہ کردی۔

آپ نے عورت کو کوئی جواب نہ دیا۔ لیکن عورت وہیں کھڑی رہی حاضرین میں سے ایک شخص نے کھڑے ہو کر حضور کی خدمت میں عرض کیا۔

وہ شخص :۔ یارسول اللہ! اگر آپ کو اس عورت کی حاجت نہیں تو میرے ساتھ اس کا نکاح فرما دیں۔

رسول اللہ ؐ : مہر کے طور پر دینے کو کچھ پاس ہے؟

وہ شخص : یارسول اللہ کچھ بھی نہیں۔

رسول اللہ ؐ : کیا لوہے کی انگوٹھی بھی دینے کو نہیں؟

وہ شخص : یارسول اللہ! یہ بھی میسر نہیں۔ بس یہ تہ بند ہے۔ اگر فرمائیں تو نصف پھاڑ کر اسے دے دوں اور نصف اپنے لیے رکھ لوں۔

رسول اللہ ؐ : تجھے کچھ قرآن مجید یاد ہے۔

وہ شخص : جی ہاں۔ یارسول اللہ! کچھ سورتیں حفظ کر رکھی ہیں۔

رسول اللہ ؐ : جا۔ میں نے اس عورت کو تجھے نکاح میں دے دیا۔ قرآن کی ان سورتوں کے سبب سے جو تمہیں یاد ہیں۔

صحیح بخاری جلد ۳؎ ؛ کتاب النکاح صفحہ ۷۹۹

قصاص

عروہ بن زبیر کا بیان ہے : بنی مخزوم کی ایک عورت فاطمہ نامی نے فتح مکہ کے موقعہ پر چوری کا ارتکاب کیا۔ اُس کے رشتہ دار جو صاحب حیثیت تھے، حضرت اُسامہ بن زید کے پاس گئے۔ انہیں درخواست کی کہ وہ اس سلسلہ میں حضور سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں سفارش کریں تاکہ حد جاری نہ ہو۔

اُسامہ بن زید نے حاضر ہو کر جب سفارش کی تو حضور ؐ جلال میں آ گئے۔

رسول اللہ ؐ : اُسامہ! اللہ کی مقرر کردہ حدود میں سفارش کرنے آیا ہے؟

اُسامہ رضؓ یارسول اللہ ؐ! میرے لیے اللہ پاک سے دعا فرمائیں کہ میری بخشش فرما دے۔

رسول اللہ ؐ : (اللہ پاک کی تعریف و توصیف کرنے کے بعد)

تم سے پہلے والی قومیں بھی اس لئے تباہ ہوئیں۔ جب اُن میں کا کوئی صاحب ثروت آدمی چوری کرتا۔ تو اس پر حد جاری نہ کرتے لیکن جب یہ قصور کسی غریب سے سرزد ہو جاتا، تو اُسے فوراً سزا دیتے قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے۔ اگر محمد کی بیٹی فاطمہ رضؓ بھی (نعوذ باللہ) اس قصور میں ماخوذ ہو کر آئے تو میں اس کے ہاتھ

قطع کر دوں۔

بخاری: جلد ۲۔ کتاب المغازی صد ۱۸۸

بیعت آخر

مجاشع رض کہتے ہیں کہ میں اپنے بھائی مجالد رض کو فتح مکہ کے بعد حضور ص کی خدمت میں بیعت کے لیے لے گئے۔ وہاں جا کر اُسے حضور ص کے سامنے پیش کیا اور عرض کیا۔

مجاشع: یا رسول اللہ! آپ کی خدمت میں میرا بھائی حاضر ہے۔ آپ اس سے ہجرت پر بیعت لیجیے:

حضور ص: ہجرت تو تمام ہو چکی اور ثواب مہاجرین لے چکے۔

مجاشع: یا رسول اللہ! پھر آپ اس سے کس بات پر بیعت لیں گے؟

حضور ص: اسلام، ایمان اور جہاد فی سبیل اللہ پر۔

بخاری جلد ۲ جز ۱۷ کتاب المغازی صد ۱۸۹۔

صحف بنی اسرائیل

ایک روز حضرت عمر فاروق رض حضور سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا:۔

عمر فاروق رض:۔ یا رسول اللہ! یہودیوں کی بعض باتیں اس لائق ہیں کہ اُن کو یاد رکھا جائے۔ اگر آپ اجازت دیں تو اُن میں سے چند ایک لکھ لی جائیں۔

رسول اللہ ص:۔ اے عمر! کیا تم بھی گمراہی کے گڑھے میں گرنا چاہتے ہو۔ یہود اور نصاریٰ نے اپنی کتابوں کو پس پشت ڈالا۔ تو ذلت اُن کا مقدر ہوئی۔

میں تمہارے پاس آفتاب کی مانند روشن اور آئینہ کی طرح شفاف شریعت لایا ہوں۔

بخدا، اگر آج موسیٰ ع بقید حیات ہوتے، تو اُن پر بھی میری پیروی لازم ہوتی۔

(صحیح مسلم) بحوالہ راہ عمل صد ۳۵، ۳۶

اللہ اور اللہ کے رسول ص سے محبت

عبدالرحمٰن بن ابی قراد بیان کرتے ہیں۔

ایک دن حضور سید الکونین ص نے وضو فرمایا۔ وہاں جو صحابہ موجود تھے۔ انہوں نے استعمال شدہ پانی کو اپنے چہروں وغیرہ پر ملنا شروع کر دیا۔ حضور ص نے یہ رنگ دیکھ کر فرمایا۔

رسول اللہؐ :۔ آخر، تم ایسا کس جذبے کے تحت کرتے ہو؟

صحابہؓ : محض اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی محبت کے جذبہ سے۔

رسول اللہؐ : تو جو لوگ اللہ اور اللہ کے رسولؐ سے محبت کرنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ اُن کے لئے لازم ہے کہ

جب بات کریں تو سچ بولیں۔

جب کوئی امانت اُن کے سپرد کی جائے۔ تو مطالبہ پر اُس کے مالک کے حوالے کریں۔

اور پڑوسیوں کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آئیں۔

(مشکوٰۃ ۔ ایمانیات)

ایک فیصلہ

علقمہ بن وائل اپنے والد سے بیان کرتے ہیں کہ ہم حضور سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں حاضر تھے۔ جب ایک شخص دوسرے شخص کو رسی سے گھسیٹتے ہوئے وہاں لایا۔ اور عرض کیا :

یا رسول اللہ! اس نے میرے بھائی کو قتل کیا ہے، یہ قاتل ہے۔

رسول اللہؐ : (قاتل سے) کیا تو نے اِس قتل کا ارتکاب کیا ہے؟

(مدعی سے) اگر اس شخص نے قتل کا اعتراف نہ کیا تو تمہیں (دعویٰ کے ثبوت میں) شہادت لانی ہوگی۔

مدعا علیہ : یا رسول اللہ۔ مجھ سے یہ جرم سرزد ہُوا ہے۔

رسول اللہؐ : کیوں؟

مدعا علیہ : حضور! میں اور وہ ایک درخت سے لکڑیاں کاٹ رہے تھے کہ اُس نے بغیر کسی وجہ کے مجھے گالی دی، مجھے سخت غصہ آیا اور میں نے اس کے سر پہ کلہاڑی ماری جس سے اس کی موت واقع ہوگئی۔

رسول اللہؐ : کیا تیرے پاس کچھ مال ہے جو دیت میں ادا کرسکے؟

مدعا علیہ : حضور! میرے پاس اِس کمبل اور کلہاڑی کے سوا کچھ نہیں۔

رسول اللہؐ :۔ کیا تیرے قبیلہ والے تجھے چھڑا لیں گے؟

مدعا علیہ :۔ حضور! میری قوم کی نظروں میں میری اس قدر وقعت نہیں۔

رسول اللہؐ : (رسی مدعی کی طرف پھینکتے ہوئے) جاؤ۔ تم جانو اور تمہارا ساتھی مدعی جب قاتل کو لے کر جانے لگا تو حضورؐ نے فرمایا:

اگر اس نے (مدعی) اس (قاتل) کو قتل کر دیا۔ تو یہ بھی اُسی کی طرح قاتل ٹھیرے گا۔

یہ بات سن کر وہ شخص واپس پلٹا اور عرض کیا:

مدعی :۔ یا رسول اللہؐ۔ آپ کا فرمان ہے کہ اگر میں نے اِسے قتل کر دیا تو میں بھی اُسی کی طرح قتل کا مرتکب ٹھیروں گا۔ حالانکہ میں نے

تو اسے آپ کے حکم سے پکڑا ہے۔

رسول اللہؐ : کیا تو اس بات پر راضی نہیں کہ یہ شخص اپنے اور مقتول کے گناہ اپنے سر لے۔

مدعی : یارسول اللہ! کیوں نہیں۔

رسول اللہؐ : تو پھر ایسا ہی ہوگا۔ اس صورت میں اس کے سر اپنے اور اس کے حریف کے گناہوں کا بوجھ ہوگا۔

یہ سن کر مدعی نے رسی پھینک دی، اور قاتل کو آزاد کر دیا۔

(صحیح مسلم)

سہیل کہتے ہیں کہ ایک شخص کا گزر حضورؐ کے سامنے سے ہوا تو سیدالکونین صلی اللہ علیہ وسلم نے حاضرین مجلس سے دریافت فرمایا:

رسول اللہؐ :۔ اس شخص کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟

حاضرین : اگر یہ شخص کہیں شادی کا پیغام دے تو برضا و رغبت قبول کیا جائے گا۔

اگر یہ کسی کے حق میں سفارش کرے تو مان لی جائے گی۔

اگر یہ کوئی بات کرے تو لوگ غور سے سنیں گے۔

اسی اثنا میں ایک دوسرے شخص کا وہاں سے گزر ہوا تو آپؐ نے پوچھا۔

رسول اللہؐ : اس شخص کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟

حاضرین : یہ تو ایسا شخص ہے کہ اگر کہیں شادی کے لیے پیغام بھیجے تو کوئی قبول کرنے کو تیار نہ ہو۔

اگر کسی کی سفارش کرے تو کوئی نہ مانے۔

اگر کوئی بات کرے تو کوئی اس کی بات پر کان نہ دھرے۔

رسول اللہؐ : تو غور سے سنو۔

یہ شخص تنہا پہلے شخص جیسے مال دار لوگوں سے کہیں بہتر ہے۔

(بخاری شریف)

بغیر عمل کے علم بے معنی چیز ہے

حضرت زیاد بن لبید بیان کرتے ہیں کہ حضور نے فتنوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

رسول اللہؐ : ایسا وقت آنے والا ہے جب دین کا علم باقی نہیں رہے گا۔

زیاد :۔ یارسول اللہؐ۔ دین کا علم کیوں کر محو ہوگا؟ جب کہ ہم تو قرآن مجید پڑھ رہے ہیں اپنی اولاد کو اس کی تعلیم دے رہے ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ ہماری اولاد اپنی اولاد کو قرآن کی تعلیم دیتی رہے گی۔

رسول اللہؐ :۔ خوب زیاد! میری نگاہ میں تو تم نہایت ہی عاقل اور فہیم آدمی تھے۔ کیا تم دیکھ نہیں رہے کہ

یہود و نصاریٰ ۔ تورات اور انجیل کی تلاوت و تعلیم میں کس قدر محو ہیں ۔ لیکن انہوں نے ان کی تعلیمات کو پسِ پشت ڈال رکھا ہے ۔

(ابن ماجہ) ۔ بحوالہ راہِ عمل صلا

آسان احتساب

حضرت عائشہ رض فرماتی ہیں کہ میں نے حضور کو اکثر نمازوں میں یہ دعا فرماتے سنا ۔ اے اللہ! مجھ سے آسان محاسبہ کیجیو ۔ تو میں نے حضور کی خدمت میں عرض کیا ۔

حضرت عائشہ رض : اے اللہ کے نبی! آسان محاسبہ سے حضور کی کیا مراد ہے؟

رسول اللہ ﷺ : اے عائشہ! آسان محاسبہ یہ ہے کہ اللہ پاک بندہ کا اعمال نامہ ملاحظہ فرماتے وقت درگذر سے کام لیں ۔ اے عائشہ! اگر کہیں احتساب کے وقت ایک ایک چیز کی چھان بین ہوئی ۔ تو بس وہ ہلاک ہوا ۔

(مسند احمد) بحوالہ راہِ عمل صفحہ ۵۔۵۱

بیعت عمرو بن العاص

حضرت عمرو بن العاص بیان کرتے ہیں کہ جب اللہ نے مجھے اسلام قبول کرنے کی توفیق عطا فرمائی تو میں حضور سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا ۔ اور گفتگو کا آغاز کیا ۔

عمرو رض : یا رسول اللہ ﷺ : اپنا ہاتھ بڑھائیے ۔ میں آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہوں ۔

(حضور نے جب اپنا ہاتھ بڑھایا ۔ تو میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا ۔ تو آپ نے فرمایا)

رسول اللہ ﷺ : اے عمرو! ہاتھ کیوں کھینچ لیا؟

عمرو رض : یا رسول اللہ ۔ میری ایک شرط ہے ۔

رسول اللہ ﷺ : کیسی شرط؟

عمرو : یا رسول اللہ! یہ کہ اسلام لانے سے قبل جس قدر گناہ مجھ سے سرزد ہوئے ہیں ۔ وہ سب معاف فرمائے جائیں ۔

رسول اللہ ﷺ : اے عمرو! کیا تمھیں اس بات کا علم نہیں کہ اسلام پہلے کے کئے ہوئے گناہوں کو مٹا دیتا ہے ۔

یہی حال ہجرت اور حج کا ہے ۔ یہ بھی اُن گناہوں کو مٹا دیتے ہیں ۔ جو انسان پہلے کر چکا ہو ۔

(مسلم)

پند و نصائح

حضرت معاذ بن جبل رض بیان کرتے ہیں کہ حضور سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دس باتیں نصیحت فرمائیں — وہ یہ ہیں ۔

آپؐ نے فرمایا :۔ اے معاذ!

و اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرانا، چاہے اس میں تمھیں جان سے ہاتھ دھونے پڑیں۔

و اپنے والدین کی نافرمانی ہرگز نہ کرنا چاہے وہ تمھیں بیوی کو طلاق دینے کا حکم دیں یا مال سے دست بردار ہونے کا۔

و فرض نماز ہرگز ترک نہ کرنا۔ جو شخص جان بوجھ کر فرض نماز ترک کرتا ہے۔ وہ اللہ تعالےٰ کی حفاظت اور نگرانی سے محروم ہو جاتا ہے۔

و شراب کے نزدیک نہ پھٹکنا کہ یہ اُمّ الخبائث ہے۔

و اللہ کی نافرمانی سے بچنا کہ یہ اللہ کے غضب کو ہوا دیتی ہے۔

و دشمن کے مقابلے میں پیٹھ مت دکھانا چاہے تمہارے سارے ساتھی قتل ہو جائیں۔

و جب کہیں لوگوں پر کوئی وبا نازل ہو تو وہاں سے بھاگنا مت۔

و اہلِ خانہ کو اپنی حیثیت کے مطابق اخراجات دینا۔

و اہلِ خانہ کی تربیت سے غافل نہ رہنا۔

و اپنے اہلِ خانہ کو خوف دلانا کہ وہ اللہ کے حقوق ادا کریں۔

(ترغیب و ترہیب / طبرانی۔ بحوالہ زادِ راہ ص ۱۱۱، ۱۱۲)

کبیرہ گناہ

حضرت عمیرؓ کا بیان ہے کہ سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا:

رسول اللہؐ :۔ وہ لوگ جو :۔ پانچ وقت فرض نمازوں کو ٹھیک ٹھیک ادا کرتے ہیں۔

رمضان کے روزے رکھتے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ راضی ہو۔

زکوٰۃ دلی رغبت سے ادا کرتے ہیں محض اس نیت سے کہ آخرت کا توشہ ثابت ہو۔

اور اُن بڑے بڑے گناہوں سے اجتناب کرتے ہیں جن سے اللہ پاک نے منع فرمایا ہے۔

اللہ کے دوست ہیں۔

صحابہ :۔ اے اللہ کے نبیؐ! وہ گناہِ کبیرہ کون کون سے ہیں؟

رسول اللہؐ :۔ وہ نو ہیں ۔ ۱۔ اللہ کا شریک ٹھیرانا

۲۔ ناحق کسی مومن کی جان لینا۔

۳۔ جہاد سے منہ موڑنا۔

۴۔ کسی پاکباز و پاکدامن خاتون پر بہتان لگانا ۔
۵۔ جادو کا علم سیکھنا ۔
۶۔ یتیم کا مال کھانا ۔
۷۔ مسلمان والدین کے حقوق ادا نہ کرنا ۔
۸۔ سود خوری ۔
۹۔ بیت اللہ کی بے حرمتی کرنا ۔ حالاں کہ اسی کی طرف رخ کر کے نماز ادا کرتے ہو، اور مرنے کے بعد قبر میں بیت اللہ کی جانب تمہارا رُخ کیا جاتا ہے ۔
ایسا شخص جو ان کبیرہ گناہوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھے نماز ٹھیک سے ادا کرے ۔ اور زکوٰۃ کی ادائیگی بھی کرتا ہو ۔
تو ایسا شخص جنتی ہے اور اُسے جنت میں میری رفاقت نصیب ہوگی ۔

(طبرانی)

اسلام و ایمان

عمرو بن عتبہ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص دربارِ رسالت میں حاضر ہوا اور درج ذیل گفتگو کی :

وہ شخص : یارسول اللہ ! اسلام کیا چیز ہے ؟

رسول اکرمؐ : یہ کہ تیرے قلب میں سوائے اللہ کے کوئی نہ ہو، تیری زبان اور تیرے ہاتھوں سے تمام مسلمان محفوظ رہیں۔

وہ شخص : اے اللہ کے نبی ! - اسلام کا افضل ترین رکن کونسا ہے ؟

رسول اکرمؐ : ایمان ،

وہ شخص : ایمان کی حقیقت کیا ہے ؟

رسول اکرمؐ : یہ کہ تو اللہ تعالیٰ پر، اُس کے فرشتوں پر، اُس کی کتابوں پر اور بعث بعد الموت پر یقین رکھے ۔ اس کے رسولوں پر دل سے ایمان لائے ۔

وہ شخص :۔ اے اللہ کے رسول :۔ ایمان کی بہتر خصوصیت کونسی ہے ؟

رسول اکرمؐ : ہجرت ۔

وہ شخص : ہجرت کسے کہتے ہیں ؟

رسول اکرمؐ :۔ یہ کہ تو بُرے اعمال کو ترک کر دے ۔

وہ شخص : بہترین ہجرت کے متعلق ارشاد فرمائیے ۔

رسول اکرمؐ :- جہاد — کافروں کے خلاف دل و جان سے جہاد کرنا۔

وہ شخص :- اچھا تو بہتر جہاد کون سا ہے؟

رسول اکرمؐ :- ایسے شخص کا جہاد کہ اس راہ میں جس کی سواری بھی زخمی ہو، اور وہ خود بھی راہِ حق میں مارا جائے۔

اس کے علاوہ دو عمدہ عمل یہی ہیں — حج — جس کے بعد گناہوں کا ارتکاب نہ کرے۔ اور عمرہ — کی ادائیگی۔

(احمد، بحوالہ ترجمان السنۃ ص۵۵۹)

حضرت معاذ بن جبلؓ سے ایک گفتگو

سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم جب غزوہ تبوک کے بعد مدینہ تشریف فرما ہوئے۔ تو یمن کے نومسلم رئیسوں کا ایک وفد جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انہوں نے درخواست کی کہ یمن کی امارت پر کسی ایسے شخص کا تقرر فرمایا جائے، جو عام تبلیغ کے ساتھ ساتھ مسائل دین کی تعلیم بھی دے۔ اور ملک کا نظم ونسق بھی انصاف سے چلائے۔

اس اہم ذمہ داری کے لیے آپؐ کی نظرِ انتخاب حضرت معاذ پر پڑی۔ آپ نے انھیں طلب کیا اور فرمایا:۔

رسول اللہؐ :- میں چاہتا ہوں کہ تمھیں یمن کا عامل مقرر کیا جائے۔ وہاں تمہیں قسم قسم کے مسائل درپیش ہوں گے، جب تمہارے پاس کوئی مسئلہ آئے تو بتاؤ کس طرح فیصلہ کرو گے؟

معاذؓ : یا رسول اللہ! اللہ کی کتاب کے مطابق۔

رسول اللہؐ :- اگر تمھیں قرآن مجید میں اس کے متعلق کوئی نص صریح نہ ملے تو پھر؟

معاذؓ :- تو پھر سنت نبوی کی روشنی میں اس کو حل کروں گا۔

رسول اللہؐ : اگر سنت میں اس کا حل نہ پاؤ تو پھر؟

معاذؓ : اے اللہ کے رسولؐ - اس صورت میں میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا ۔ اس معاملہ میں مجھ سے کوتاہی نہیں ہوگی۔

رسول اللہؐ :- (معاذ کے سینے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے) شکر ہے اس ذات پاک کا جس نے اپنے رسول کے عامل کو اس چیز کی توفیق بخشی، جس سے اللہ اور اللہ کا رسولؐ دونوں راضی رہیں۔

(سنن ابوداؤد، سنن ترمذی)

اس کے بعد آپؐ نے یمن والوں کے نام فرمان لکھنے کا حکم صادر فرمایا اور معاذ کو ارشاد فرمایا:۔

— اے معاذ! عوام سے نرمی کا برتاؤ کرنا۔ سختی سے اجتناب کرنا۔ لوگوں کو خوش رکھنا تاکہ وہ متنفر نہ ہوں باہمی تعاون سے کام کرنا۔

اے معاذ! تمھیں وہاں دوسرے مذاہب کے پیرو کار بھی ملیں گے۔ جب ان کے پاس تم پہنچو۔ تو انھیں توحید و رسالت

کی دعوت دینا جب وہ اِسے قبول کرلیں، تو انھیں بتاتا کہ اللہ نے تم پر دن رات میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں۔ جب وہ اس کو تسلیم کرلیں تو انھیں بتانا کہ تم پر زکوٰۃ بھی واجب ہے۔ یہ تمہارے صاحبِ ثروت لوگوں سے لے کر تمہارے غریبوں میں تقسیم کی جائے گی، جب وہ اس پر راضی ہو جائیں تو کہیں ایسا نہ ہو۔ کہ تم اُن کی بہترین چیزیں لے لو۔ مظلوم کی بد دُعا سے ڈرتے رہنا کہ اُس کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کوئی حجاب نہیں۔

(بخاری جلد ۲ کتاب المغازی صد ۲۱۲)

(جب معاذؓ یمن جانے کے لئے تیار ہو کر آئے تو رسالتمآبؐ نے کچھ دور تک اُن کی مشایعت کی۔ اثنائے گفتگو آپ نے فرمایا)

رسول اللہ صلعم: معاذ! تم پر قرضوں کا بوجھ ہے۔ اگر کوئی ہدیہ پیش کرے تو قبول کر لینا۔ میری طرف سے اجازت ہے۔

اور ہاں شاید۔ تم سے میری ملاقات نہ ہو سکے، جب مدینہ واپس آؤ۔ تو تمھیں میری قبر دیکھنے کو ملے۔

(معاذ بیقرار ہو گئے۔ آنسو پھوٹ پڑے، بڑے ادب سے حضورؐ کو الوداعی سلام کیا تو حضورؐ نے فرمایا۔)

جاؤ۔ تمھیں اللہ کے سپرد کیا۔ خدا تمہاری حفاظت فرمائے ہر قسم کے مصائب سے محفوظ رکھے اور جن و انس کے شر سے بچائے۔

(چالیس جان نثار خیر البشر صلعم کے صد ۴۲ – ۲۴۰)

قابلِ تعجب ایمان

عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے درمیان درج ذیل گفتگو ہوئی۔

رسالتمآبؐ:۔ تمہارے نزدیک ایمان کے لحاظ سے کس کا ایمان زیادہ قابلِ تعجب ہے؟

صحابہؓ:۔ یا رسول اللہ! فرشتوں کا۔

رسالتمآب صلعم:۔ کیوں انھیں کیا ہوا کہ وہ ایمان نہ لائیں جبکہ وہ ہمہ وقت اللہ پاک کے حضورؐ میں حاضر رہتے ہیں۔

صحابہؓ:۔ اے اللہ کے نبیؐ! ۔ تو پھر انبیائے کرام کا۔

رسالتمآب:۔ وہ کیوں ایمان نہ لائیں جب کہ اللہ کی وحی کا اُن پر نزول ہوتا ہے۔

صحابہ:۔ اچھا تو پھر ہمارا۔

رسالتمآبؐ:۔ تم کیوں ایمان نہ لاؤ جبکہ میں تمہارے درمیان موجود ہوں سن لو۔ غور سے سنو! میرے نزدیک تو سب سے زیادہ قابلِ تعجب اُن لوگوں کا ایمان ہے، جو تمہارے بعد آئیں گے۔

اُن کے حصہ میں تو چند اوراق آئیں گے جن میں کتاب مقدس ہوگی وہ جو کچھ اس میں لکھا ہوا پائیں گے۔

اس پہ ایمان لے آئیں گے۔

(مستدرک حاکم، ابنِ کثیر بحوالہ ترجمان السنہ جلد ۲ صہ ۱)

ایمان کی حقیقت

محمد بن صالح انصاری بیان کرتے ہیں کہ ایک بار رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی حضرت عوف بن مالکؓ سے ملاقات ہوئی۔ تو آپ نے فرمایا:

عوف! سناؤ کس حال میں ہو؟

عوف: یارسول اللہؐ! اللہ کا فضل ہے، سچا اور پکا مومن ہوں،

رسالتمآبؐ: اے عوف! ہر قول کی کچھ حقیقت ہوا کرتی ہے، تمہارے اس قول کی کیا حقیقت ہے؟

عوف: یارسول اللہ! میں نے اپنے نفس کو دنیاوی علائق سے آزاد کر لیا ہے۔ رات میں بیدار رہتا ہوں۔ تپتی دوپہروں میں پیاسا رہتا ہوں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے پروردگار عالم کا عرش میری نگاہوں کے سامنے ہے، اہلِ جنت ایک دوسرے سے مصروف ملاقات ہیں اور اہلِ دوزخ۔ چیخ و پکار میں مصروف ہیں۔

رسالتمآبؐ: مبارک ہو، تمہیں حقیقت کی معرفت حاصل ہو گئی۔ اس کیفیت کو ضائع نہ کرنا۔

(ترجمان السنۃ جلد دوم صہ ۲۱)

شرم و حیا

عبداللہ بن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک روز حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے فرمایا:

اللہ تعالیٰ سے ایسا شرماؤ جیسا شرمانے کا حق ہے۔

صحابہؓ: یارسول اللہؐ! اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ہمیں اُس سے حیا آتی ہے۔

رسول اللہؐ: یہ اصل حیا نہیں،

جو شخص حقیقی معنوں میں اللہ تعالیٰ سے شرماتا ہے۔ اُسے لازم ہے کہ:۔

اپنے دماغ کو، اپنے چشم و گوش کو، اپنی زبان و دہن کو اپنے شکم و خواہشات کو تمام ناجائز باتوں سے محفوظ رکھے موت اور اس کے بعد اپنے جسم کی خستگی کو ہمیشہ پیش نظر رکھے۔ جسے آخرت کی خواہش ہو، اُسے چاہیے کہ دنیا کی زیب و زینت میں جی نہ لگائے۔

جس شخص نے یہ سارے مراحل طے کر لئے۔ سمجھ لو کہ اُس نے خالقِ ارض و سما سے شرمانے کا حق ادا کر دیا۔

(مشکوٰۃ شریف بات تمنی الموت)

پند و نصائح

حضرت عبداللہ بن عمرو بیان کرتے ہیں کہ ایک روز صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت فرمایا:۔

یارسول اللہؐ ۔ بہترین آدمی کی کیا نشانی ہے؟

رسالتمآبؐ :۔ ہر وہ شخص جو صدوق اللسان ہو، مخموم القلب ہو ۔

صحابہؓ : اے اللہ کے نبی! صدوق اللسان شخص تو ہم پر واضح ہو گیا ۔ ذرا مخموم القلب کی تشریح فرما دیں کہ ہم سمجھنے سے قاصر ہیں ۔

رسالت مآبؐ : اس سے مراد ایسا شخص ہے جو دل کا صاف ہو ۔ جو نہ گناہوں کے بوجھ تلے دبا ہو، اور نہ اس پر ظلم و تعدی کا بار ہو ۔

جس کا دل کینہ و حسد سے پاک ہو ۔

(ابن ماجہ بحوالہ ترجمان السنہ جلد ۱ صفحہ ۳۴۱ ۔)

رسالت مآبؐ مقام تشریع میں

ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ کے دوران فرمایا: اے لوگو! اللہ تعالیٰ نے تم پر حج فرض قرار دیا ہے اس لئے حج ادا کیا کرو۔

ایک شخص! یارسول اللہ ۔ کیا ہر سال ۔

(حضور خاموش رہے، سائل نے تین مرتبہ اپنی بات دہرائی تو حضورؐ نے فرمایا)

رسالت مآب :۔ اگر میں اس کا اقرار کر لیتا ۔ اور ہاں کہہ دیتا تو پھر ہر سال تم پر حج فرض ہو جاتا ۔ لیکن ہر سال حج ادا نہ کر سکتے ۔

اے لوگو! جب تک میں خود تم سے کوئی بات نہ کہوں تم بھی سوال نہ کیا کرو ۔ تم سے پہلے کی امتیں صرف اس لئے ہلاک ہوئیں ۔ کیوں کہ وہ اپنے انبیاؑ کرام سے بیجا سوالات کرتے تھے جس کے نتیجے میں وہ بے جا اختلافات میں پڑ گئے ۔

اس لیے ۔ جب میں تمہیں کسی بات کا حکم دوں تو اپنے مقدور بھر اس پر عمل کرو ۔

اور جس بات سے روکوں، اُسے یک قلم ترک کر دیا کرو ۔ (صحیح مسلم)

گناہِ عظیم

حضرت ابن مسعودؓ اور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان ایک گفتگو :

ابن مسعود: یارسول اللہ! سب سے بڑا گناہ کون سا ہے ؟

رسالت مآبؐ : اپنے خالق کے ساتھ دوسروں کو شریک کرنا حالاں کہ اسی نے تجھے پیدا کیا ہے ۔

ابنِ مسعود: اس کے بعد کون سا گناہ ہے؟
رسالت مآبؐ: اپنی اولاد کو محض اس لئے قتل کرنا۔ کہ ان کی کفالت کرنی ہوگی۔
ابنِ مسعود: اس کے بعد۔
رسالت مآبؐ: اپنے ہمسائے کی بیوی سے زنا کرنا۔

اس پر یہ آیت نازل ہوئی:۔

وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ
الَّتِىْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ه

جو لوگ نہیں پکارتے ساتھ اللہ کے دوسروں کو
اور نہیں قتل کرتے کسی نفس کو جسے اللہ نے حرام قرار دیا ہو، بغیر حق کے
اور نہیں جاتے نزدیک زنا کے۔
اور جو ایسا کرے گا۔ سخت گنہگار ہوگا۔

(صحیح بخاری جلد ۵ جز ۲۴ ص ۲۴۶)

اللہ کا حق

معاذ بن جبل بیان کرتے ہیں کہ میں حضور رسالت مآبؐ کے ساتھ ایک ہی اونٹنی پر سوار تھا۔ ہمارے درمیان صرف کٹری کا پالان حائل تھا۔ اثنائے سفر حضورؐ نے ارشاد فرمایا۔

رسول اللہؐ: معاذ!
معاذ: لبیک یا رسول اللہ!
(حضورؐ نے سواری کی رفتار تیز کر دی اور تھوڑی دیر بعد پھر ارشاد فرمایا)
رسول اللہ: معاذ!
معاذ: میں حاضر ہوں، یا نبی اللہ!
رسول اللہ: (تھوڑے وقفہ کے بعد) معاذ!!!
معاذ: میں حاضر ہوں، یا رسول اللہ۔ فرمائیے۔
رسول اللہؐ:۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ بندوں پہ اُن کے خالق کا کیا حق ہے؟
معاذ: اے اللہ کے نبی! اللہ اور اللہ کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔
رسول اللہ: تو سنو، اللہ کا حق بندوں پہ یہ ہے کہ وہ صرف اسی کی عبادت کریں کسی کو اُس کا شریک نہ ٹھہرائیں۔ (تھوڑے توقف کے بعد)

کیا تم جانتے ہو کہ بندوں کا اللہ پر کیا حق ہے؟

معاذ :۔ یارسول اللہ۔ اللہ اور اللہ کے رسولؐ کو ہی علم ہے۔

رسول اللہؐ :۔ بندوں کا یہ حق ہے کہ اللہ پاک انھیں عذاب سے چھٹکارا دے جب وہ اللہ کا حق ادا کر دیں۔

(صحیح بخاری جلد ۲ صہ ۳۸۶)

قیامت کی علامات

حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک روز ہم حضور رسالتمآب کی مجلس میں بیٹھے تھے اور حضور رسالت مآبؐ ہم سے گفتگو فرما رہے تھے کہ ایک اعرابی آیا۔ اور پوچھنے لگا۔

اعرابی :۔ قیامت کب قائم ہو گی ؟

(آپ نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور اپنی گفتگو جاری رکھی جب آپ نے اپنی بات مکمل کر لی تو اس طرف متوجہ ہوئے۔)

رسالت مآبؐ :۔ ہاں! تو قیامت سے متعلق دریافت کرنے والا کہاں ہے؟

اعرابی :۔ یارسولؐ اللہ! میں حاضر ہوں۔

رسالتمآبؐ : تو سنو، جب لوگ امانتیں ضائع کرنے لگیں تو سمجھو۔ قیامت قریب ہے۔ اس کا انتظار کرو۔

اعرابی :۔ یارسول اللہ! امانت داری کیوں کر اُٹھ جائے گی؟

رسالت مآبؐ :۔ حکومت کی ذمہ داریاں نا اہلوں کے سپرد کی جانے لگیں تو سمجھو۔ قیامت قریب ہے۔

(صحیح بخاری جلد ۱۔ کتاب العلم صہ ۲۳۲ / ۵۵)

افضل عمل

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضور رسالتمآبؐ کے درمیان ایک گفتگو :

ابن مسعودؓ :۔ یارسول اللہ! کونسا عمل افضل ہے؟

رسالتمآبؐ :۔ وقت پر نماز ادا کرنا۔

ابن مسعودؓ :۔ اس کے بعد ؟

رسالتمآبؐ :۔ والدین سے حسن سلوک کے ساتھ پیش آنا۔

ابن مسعودؓ :۔ اس کے بعد ؟

رسول اللہؐ :۔ جہاد فی سبیل اللہ :۔

(صحیح بخاری جلد ۳۔ کتاب الجہاد صہ ۳۱۷)

جہاد فی سبیل اللہ

ابوموسیٰ اشعریؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور مندرجہ ذیل گفتگو کی :

وہ شخص :۔ یارسول اللہ! قتال فی سبیل اللہ کا کیا مطلب ہے؟ کیوں کہ ہم میں سے کوئی تو غیرت کے سبب سے قتال کرتا ہے اور کوئی غصے میں آکر۔

رسول اللہؐ : (سر مبارک اٹھاتے ہوئے)

جو شخص محض اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لئے قتال کرے وہی قتال فی سبیل اللہ ہے۔

(صحیح بخاری جلد ۱ کتاب العلم ص ۹۶)

بہترین اسلام

حضرت ابوموسیٰ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ اور حضور سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان مندرجہ ذیل گفتگو ہوئی۔

صحابہؓ : یارسول اللہؐ! کونسا اسلام افضل ہے؟

رسول اللہؐ: اُس کا اسلام، جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں۔

ایک شخص :۔ یارسول اللہ۔ اسلام کی بہترین خصلت کونسی ہے؟

رسول اللہؐ:۔ یہ کہ تو کھانا کھلائے اور واقف و ناواقف سب کو سلام کرے۔

صحابہؓ :۔ یارسول اللہ! کونسا عمل افضل ہے؟

رسول اللہؐ :۔ اللہ اور اللہ کے رسولؐ پر ایمان لانا۔

صحابہؓ :۔ پھر کونسا عمل؟

رسول اللہؐ :۔ جہاد فی سبیل اللہ

صحابہؓ :۔ پھر کونسا — ؟؟

رسول اللہؐ :۔ حج مبرور (جس کے بعد گناہوں کا ارتکاب نہ کرے)

(صحیح بخاری جلد ۱، کتاب الایمان ص ۲۷، ۳۵)

مسلم اور مومن

سعد بن ابی وقاصؓ روایت بیان کرتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کچھ لوگوں میں مالِ غنیمت تقسیم فرما رہے تھے۔ میں آپ کے قریب بیٹھا ہوا تھا۔ آپ نے تقسیم کے دوران ایک ایسے شخص کو چھوڑ دیا، جو اُن میں مجھے سب سے زیادہ محبوب تھا۔ اس پر میں نے حضورؐ کی خدمت میں عرض کیا:۔

سعد :۔ یارسول اللہ! اس شخص کو محروم کرنے کا سبب؟ اللہ کی قسم میں تو اسے مومن سمجھتا ہوں۔

سرورِ عالمؐ : مومن سمجھتے ہو کہ مسلم ؟

سعدؓ: (قدرے توقف کے بعد)، حضور اس شخص کو نہ دینے کا کیا سبب ہے ؟
اللہ کی قسم میرے نزدیک تو یہ مومن ہے۔

سرورِ عالمؐ : مومن سمجھتے ہو یا مسلم۔؟؟

سعدؓ : (تھوڑی دیر بعد) حضورؐ!۔

سرورِ عالمؐ : میں ایسے شخص کو جو ضعیف الایمان ہو دیتا ہوں۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں اللہ تعالےٰ اسے دوزخ میں نہ ڈال دے۔ حالانکہ دوسرا آدمی مجھے نسبتاً زیادہ عزیز ہوتا ہے (کامل الایمان ہوتا ہے) مگر اسے نہیں دیتا۔ (اُسے تالیفِ قلب کی ضرورت نہیں)

(صحیح بخاری جلد ۱ کتاب الایمان ص ۳۳)

مقاماتِ انبیاءؑ کی نشان دہی

حضرت عبداللہ بن عباس بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم حضور سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان سفر کر رہے تھے کہ حضورؐ نے پوچھا:۔

رسول اللہؐ :۔ اس وادی کا کیا نام ہے؟

صحابہؓ :۔ اے اللہ کے نبیؐ! یہ وادیٔ ازرق ہے۔

رسول اللہؐ: اے لوگو! گویا میں اپنی آنکھوں سے موسیٰ (علیہ السلام) کو دیکھ رہا ہوں، وہ اپنے دونوں کانوں میں انگلیاں دیئے ہوئے ہیں اور اپنے رب کی تلبیہ زور زور سے پڑھتے ہوئے اس وادی سے گذر رہے ہیں۔
(ہم وہاں سے چل پڑے اور دوسری گھاٹی میں پہنچے تو حضورؐ نے فرمایا)

رسول اللہؐ : اس گھاٹی کا نام کیا ہے؟

صحابہؓ :۔ حضورؐ! اسے ہرشی یا لفت کہتے ہیں۔

رسول اللہ : تو سنو گویا میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ یونس (علیہ السلام) اُون کا جُبہ پہنے ایک اونٹنی پر سوار ہیں، اونٹنی کی مہار، درخت کی چھال سے بنی ہوئی ہے۔ وہ بھی اپنے رب کی تلبیہ زور زور سے پڑھتے ہوئے اس وادی سے گذر رہے ہیں۔

(ابن عباسؓ ہی سے مروی ہے کہ حج کے سفر کے دوران جب ہمارا گذر وادیٔ عسفان سے ہوا تو اچانک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔)

رسول اللہؐ :۔ ابوبکر! اس وادی کا کیا نام ہے؟

ابوبکرؓ : یارسول اللہ! یہ وادیٔ عسفان ہے۔
رسول اللہ : تو سنو! اس وادی سے حضرت نوحؑ، حضرت ہودؑ، حضرت ابراہیم علیہم السلام گذرے، اُن کی لنگیاں، عبائیں اور چادریں اُون کی تھیں، وہ اونٹوں پر سوار تھے جن کی مہاریں کھجور کی چھال کی تھیں، یہ حضرات اللہ تعالٰے کے قدیم گھر (بیت العتیق) کا طواف کرنے جارہے تھے۔

مسلم شریف، مسند احمد،
بحوالہ ترجمان السنۃ جلد ۳ صہ ۳۰۴

اعمالِ حسنہ

حضرت کعب بن عجرہ بیان کرتے ہیں کہ ہم لوگ حضورؐ کے فرمان کے مطابق منبر کے قریب جمع ہوئے۔ حضورؐ مسجد میں تشریف لائے اور منبر کی طرف بڑھے۔ جب آپؐ نے قدم مبارک پہلی سیڑھی پر رکھا فرمایا۔ آمین ـــ اسی طرح دوسری اور تیسری سیڑھی پہ قدم رکھتے وقت بھی آپؐ نے آمین فرمایا۔ یہ نئی بات تھی۔ اس لیے جب حضورؐ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ سے فارغ ہوئے اور منبر سے نیچے آترے تو ہم سب نے عرض کیا۔

صحابہ : یا رسول اللہؐ! آج ہم نے آپ کی زبان مبارک سے وہ بات سنی۔ جو پہلے کبھی سننے میں نہیں آئی۔
رسول اللہ : اے لوگو! جونہی میں نے پہلی سیڑھی پر قدم رکھا تو حضرت جبرئیل تشریف لائے اور فرمایا" وہ شخص غارت ہو جس نے رمضان کا مہینہ پایا اور بخشش سے محروم رہا" اس پر میں نے کہا۔ آمین جب میں نے دوسری سیڑھی پہ قدم دھرا۔ تو انہوں نے کہا " ایسا شخص خدا کی رحمت سے محروم رہے۔ جس کے سامنے آپ کا نام لیا گیا تو اس نے آپ پر درود و سلام نہیں بھیجا" تو میں نے کہا آمین۔ پھر جب میں تیسری سیڑھی کی طرف بڑھا تو جبرئیل بولے " وہ شخص اللہ کی رحمت سے دور ہے، جس نے اپنے ماں باپ دونوں کو یا اُن میں سے ایک کو ضعیفی کی حالت میں پایا۔ اور جنّت کا حق دار نہیں بنا" تو میں نے کہا۔ آمین۔

(حاکم۔ ابن حبان) / بحوالہ زادراہ صہ ۱۱۸، ۱۱۹

حقیقتِ صدقہ

حضرت ابوذر غفاریؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: " ہر مسلمان پر فرض ہے کہ وہ ہر روز صدقہ کرے"۔
اس پر صحابہ نے عرض کیا :
صحابہؓ : یارسول اللہ! ہمارے پاس اس قدر مال کہاں۔ کہ ہر روز صدقہ کریں؟

رسول اللہؐ :۔ صدقہ کرنے کے کئی ایک راستے ہیں ۔
- سبحان اللہ ، الحمدللہ ، اللہ اکبر اور لا الٰہ الا اللہ کا ورد کرنا ۔
- دوسروں کو برائیوں سے روکنا اور اعمال نیک کی تلقین کرنا ۔
- راستہ سے کانٹے وغیرہ دور کرنا ۔
- نابینا شخص کو راستہ دکھانا ۔
- کسی شخص کو اس کے نیک مقصد کے حصول میں امداد دینا ۔
- مصیبت میں گھرے ہوئے فریادی کی دست گیری کرنا ۔
- کسی ناتواں وضعیف کا بوجھ اٹھانا ۔

یہ بھلائی کے کام اگر کوئی انجام دے تو اُسے صدقات کے برابر ثواب ملے گا ۔
(ترغیب وترہیب) بحوالہ زاد راہ صفحہ ۱۲۸ ، ۱۲۹

پسندیدہ صفات

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا " کون ہے جو میری باتیں غور سے سُنے ، اور اس پر عمل کرے ۔ دوسرے لوگوں تک بھی پہنچائے تاکہ وہ بھی اس پر عمل کریں ۔

ابوہریرہؓ : یا رسول اللہؐ ! فرمایئے ۔ میں حاضر ہوں ۔

رسول اللہ (میرا ہاتھ تھامتے ہوئے) ، تو سنو وہ پانچ باتیں یہ ہیں ۔

۱۔ اللہ کی نافرمانی سے بچو ، 'بہت بڑے عابد بن جاؤ گے' ۔
۲۔ جو روزی اللہ تعالےٰ نے تمہارے لیے مقدر فرما دی ہے اس پر قناعت کرو" سب سے زیادہ غنی ہو جاؤ گے" ۔
۳۔ اپنے ہمسایہ کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ ، 'مومن بن جاؤ گے' ۔
۴۔ دوسروں کے لئے بھی وہی چیز پسند کرو ، جو تمہیں اپنے لیے پسند ہو ۔ مسلم بن جاؤ گے' ۔
۵۔ زیادہ نہ ہنسو ۔ ایسا کرنے سے دل مردہ ہو جاتے ہیں ۔

(مشکوٰۃ / زاد راہ صفحہ ۱۲۸)

اعمالِ جنت

براءؓ بن عازب کہتے ہیں کہ ایک مسلمان بدو ، حضورؐ کے پاس آیا اور اس طرح گفتگو شروع کی :

بدو :۔ یا رسول اللہ ! وہ کون سے اعمال ہیں ، جن پر عمل کر کے مجھے جنت ملے ۔

رسول اللہؐ : کہے تو تم نے مختصر الفاظ ہیں۔ لیکن بات بڑی اچھی پوچھی ہے۔

اگر جنت کی خواہش ہے تو کسی جان کو آزاد کراؤ اور گردنوں کی غلامی سے اُسے نجات دلاؤ۔

بدو : یا رسول اللہ! یہ تو ایک ہی بات ہوئی۔

رسول اللہؐ : نہیں، ایسا ہرگز نہیں۔

اگر تم کسی غلام یا کنیز کو پورے طور پر آزاد کر دو، جو کچھ اس پر خرچ ہوا ہے، اُسے خود ادا کرو۔ تو تم نے کسی جان کو آزاد کروا دیا۔ ہاں اگر چند ایک آدمی کسی غلام یا کنیز کو آزاد کرائیں جس میں تمہارا بھی حصہ ہو تو تم نے گردن چھڑائی۔

اپنی دودھ والی اونٹنی کسی کو بخش دو تاکہ وہ اس سے فائدہ اٹھائے۔

قطع رحمی کرنے والے رشتہ داروں سے تم ناطہ جوڑو۔

بھوکوں کو کھانا کھلاؤ، اگر یہ اعمال تم نہ کر سکو۔ تو

لوگوں کو نیک بات کہو۔ بُری باتوں سے روکو

اگر یہ بھی نہ کر سکو تو اپنی زبان کو قابو میں رکھو۔

(احمد / ترغیب و ترہیب بحوالہ زادِ راہ صفحہ ۱۲۹،۱۲۸)

محبوب بندے

حضرت عبداللہ بن مسعود روایت کرتے ہیں کہ صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

رسول اللہؐ : اے ابن مسعود! اللہ تعالیٰ نے جس طرح اپنے بندوں کے درمیان رزق کی تقسیم فرما دی ہے۔ اسی طرح اخلاق بھی بانٹ دیے ہیں اللہ تعالیٰ رزق تو ہر ایک کو عطا کرتا ہے۔ اُن کو بھی جو اُس کو پیارے ہیں، اُن کو بھی جو اُس کو ناپسند ہیں۔

لیکن دین پر چلنے کی توفیق صرف اُن کو عطا ہوتی ہے جو اللہ کو محبوب ہیں۔

سارے دیندار اللہ کے پیارے بندے ہیں۔

قسم ہے اس ذات پاک کی، جس کے قبضے میں محمدؐ کی جان ہے۔

کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک اُس کا دل اور اس کی زبان — دونوں مسلمان نہ ہو۔

اور کوئی بندہ اس وقت تک مومن کہلانے کا مستحق نہیں جب تک اُس کا ہمسایہ اُس کے بوائق سے سے اپنے آپ محفوظ نہ سمجھے۔

صحابہ : یا رسول اللہ! بوائق سے آپ کی کیا مراد ہے؟

رسول اللہؐ: کسی کا حق مارنا ظلم کرنا۔ تو سنو! کسبِ حرام کرنے والا اللہ کی برکت سے محروم رہتا ہے۔
اس کی خیرات رائیگاں جاتی ہے۔ جو مال چھوڑ کر وہ مر جاتا ہے۔ وہ اس کے لیے جہنم کا توشہ ہے۔
اللہ تعالےٰ بُرائی کو بُرائی سے نہیں بھلائی سے مٹاتا ہے۔

(احمد)

ایک وصیت

سیدالکونین صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوذر غفاریؓ کا مکالمہ۔

ابوذرؓ: یارسول اللہ! مجھے کچھ وصیت فرمائیے۔

رسول اللہؐ: اللہ سے ڈرو، یہ تمام اعمالِ حسنہ کی بنیاد ہے۔

ابوذرؓ: اے اللہ کے نبیؐ! کچھ اور فرمائیے۔

رسول اللہؐ: قرآن کی تلاوت کرو، اللہ کا ذکر کثرت سے کرو، یہ اعمال دنیا میں تمہارے لیے روشنی کا ذریعہ ہوں گے
اور آسمانوں پہ تمہارے ذکر کا باعث ہوگا۔

ابوذرؓ: یارسول اللہؐ: مزید ارشاد ہو

رسول اللہؐ: بہت زیادہ مت ہنسو، یہ دلوں کو مردہ اور چہروں کو تاریک بنا دیتا ہے۔

ابوذرؓ: یارسول اللہ! کچھ اور فرمائیے۔

رسول اللہؐ: جہاد میری اُمت کی رہبانیت ہے۔ اسے فرض سمجھو، غریبوں سے محبت رکھو، اُن کے
قریب جاؤ۔

ابوذر: یارسول اللہ! مزید ارشاد فرمائیں۔

رسول اللہ: ہمیشہ اُن کی طرف دیکھو جو مال و مرتبہ میں تم سے کم ہوں۔ ایسوں کو مت دیکھو، جو دنیاوی
مال و جاہ میں تم سے آگے ہوں۔ اگر ایسا کرو گے، تو کفرانِ نعمت کے جذبے سے محفوظ رہو گے۔
ہمیشہ سچی بات کہو، چاہے کڑوی کیوں نہ ہو۔

ابوذر: یارسول اللہؐ! کچھ اور مرحمت فرمائیں۔

رسول اللہؐ: اے ابوذر! دوسروں کے عیوب سے صرف نظر کرو، ہمیشہ اپنی کمزوریوں اور عیوب
کو نگاہ میں رکھو، کبھی اس بات کا بُرا نہ مناؤ کہ لوگ وہی کچھ کرتے ہیں، جو تم کرتے ہو۔
یہ گناہِ کبیرہ ہے کہ آدمی کی نگاہ اپنے عیوب پر تو نہ ہو، لیکن ہمیشہ دوسروں میں عیوب ڈھونڈھتا
پھرے۔ (ابوذر کے سینے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے۔)
اے ابوذر! عقل مند وہ ہے جو غور و تدبر سے کام لے انجام کو نظر میں رکھ کر کام کرے۔ حرام سے

نیچے کہ یہ سب سے عظیم تقویٰ ہے۔
حسن اخلاق سے پیش آئے کہ اس سے بڑی کوئی شرافت نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے معاملے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا خوف دل میں نہ لانا۔

بیہقی شعب الایمان - ترغیب و ترہیب بحوالہ ترجمان السنۃ جلد ۲ صفحہ ۲۰۱

ایک جامع مکالمہ

حضرت جابر بن سلیم روایت کرتے ہیں کہ میرا گذر ایک مقام پر ہوا، کیا دیکھتا ہوں کہ وہاں ایک شخص کلام فرما رہے ہیں، اور مرجع خلائق بنے ہوئے ہیں۔ وہ صاحب جو کلمہ بھی منہ سے نکالتے ہیں، لوگ آمنا وصدقنا پکار اٹھتے ہیں۔ میں نے ایک شخص سے پوچھا، یہ کون صاحب ہیں ــ؟ لوگوں نے کہا۔

یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔
میں ان کے پاس گیا اور عرض کیا۔
جابرؓ: علیک السلام۔ یا رسول اللہ
رسول اللہؐ: علیک السلام مت کہو۔ ایسا تو مردوں کو کہا جاتا ہے۔
السلام علیک کہا کرو۔
جابرؓ: آپ اللہ کے رسول ہیں؟
رسول اللہؐ: ہاں!
اس اللہ کا، جسے تم مصیبت میں پکارو، تو مصیبت دور فرما دے بارش کے لیے دعا کرو، تو پانی برسائے اور تمہارے لئے غلہ اگائے۔ کسی صحرا یا بیابان میں دوران سفر، اگر تمہاری سواری گم ہو جائے۔ اسے پکارو، تو تمہیں تمہاری سواری واپس مل جائے۔
جابرؓ: اے اللہ کے نبیؐ! مجھے کچھ نصیحت فرمائیے۔
رسول اللہ: کسی کو برا بھلا نہ کہو۔
احسان کو حقیر مت جانو۔
تمہارا تہبند ٹخنوں سے نیچے نہ ہو، یہ تکبر کی علامت ہے اور اللہ تکبر کو پسند نہیں فرماتا:
ہمیشہ اپنا تہبند نصف پنڈلی تک رکھو،
اگر کوئی تمہیں برا بھلا کہے۔ تمہارے عیوب گنوا کر تمہیں شرمندہ کرے تو تم صبر کرو۔ اس صورت میں اللہ تعالیٰ خود اس سے بدلہ لے گا ظلم کے قریب نہ جاؤ۔ یہ قیامت کے دن ظالم کے لئے تاریکیوں کا سبب بنے گا۔

خود غرضی ، حرصِ مال، اور بخل سے دُور رہو، ان عادات نے تم سے پہلوں کو غارت کیا، لوگوں کو قتل و غارت گری پر اُکسایا۔ جان ، مال، آبرو تباہ ہوئے جس کی وجہ سے کئی دوسرے گناہ وجود میں آئے ۔

(مسلم، ترمذی، نسائی)

اسوۂ حسنہ

حضرت ابوہریرہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا میرے رب نے مجھے نو باتوں کا حکم دیا ہے۔

۱۔ کھلے اور چھپے ۔ ہر حال میں خدا سے ڈروں ۔

۲۔ مہربانی ہو غصہ، دونوں صورتوں میں انصاف کو ہاتھ سے نہ جانے دوں ۔

۳۔ امیری ہو یا فقیری۔ ہر حال میں راستی و اعتدال پر قائم رہوں ۔

۴۔ جو مجھ سے قطع تعلق کرے ۔ میں صلہ رحمی برتوں۔

۵۔ زیادتی کرنے والے کو معاف کر دوں ۔

۶۔ محروم کرنے والے کو عطا کروں۔

۷۔ میری نگاہ ، نگاہِ عبرت ہو،

۸۔ میرا سکوت ، فکر و تدبر کا حامل ہو۔

۹۔ اللہ کا ذکر۔ میری گفتگو کا محور و مرکز ہو،

اور نیکی کا حکم دوں اور بدی سے روکوں ۔

(مشکوٰۃ شریف)

ایک خاص واقعہ

اُسامہ بن زید کہتے ہیں کہ ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سریہ کے سلسلہ میں جہینہ کے اطراف میں بھیجا۔ وہاں جب پہنچے، تو دشمنوں کا ایک آدمی ہمارے ہاتھ لگا، اُس نے فوراً ہی لا الٰہ الا اللہ پڑھا ۔ مگر میں نے سُنی اَن سُنی کر دی اور اُسے قتل کر دیا ۔۔۔ یہ حادثہ میرے لیے بعد میں ذہنی خلفشار کا موجب بن گیا۔ جب ہم واپس مدینہ پہنچے تو میں نے سارا ماجرا حضورؐ کے گوش گذار کیا ۔۔۔ تو حضورؐ نے فرمایا۔

واقعی ۔ کیا لا الٰہ کہنے کے باوجود بھی ۔ تم نے اُسے قتل کر دیا ؟

اُسامہؓ : ہاں، یا رسول اللہؐ ! ایسا ہی ہوا، مگر اُس نے کلمہ محض جان کے خوف سے پڑھا۔ دل سے نہیں ۔

رسول اللہؐ: اُسامہ ! کیا تو نے اُس کا دل چیر کر دیکھ لیا تھا۔ کہ اُس نے محض جان کے خوف سے اسلام کا اقرار کیا ، یا واقعی یہ اُس کا دلی اقرار تھا ؟

اُسامہ کہتے ہیں۔ حضورؐ نے یہ جملہ بار بار دہرایا۔ تو میری جان پر بن آئی۔ حالت یہ ہو گئی کہ میں تمنا کرنے لگا۔ کاش! میں نے اسی دن اسلام قبول کیا ہوتا۔

خیرات

ابو موسیٰ اشعریؓ بیان کرتے ہیں، سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

رسول اللہؐ: ہر مسلمان پر صدقہ کرنا فرض ہے۔

صحابہؓ: اے اللہ کے نبیؐ! اگر قدرت نہ ہو؟

رسول اللہؐ: ہاتھوں سے محنت کرے۔ خود بھی مستفید ہو اور خیرات بھی کرے۔

صحابہؓ: یا رسول اللہ! اگر یہ بھی ممکن نہ ہو؟

رسول اللہؐ: تو دوسرے عاجز، محتاج اور معذور بندوں کی امداد کرے۔

صحابہؓ: اے اللہ کے رسول! اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو؟

رسول اللہؐ: اچھی باتوں کی تلقین کرے۔

صحابہؓ: اگر یہ بھی نہ کر سکے تو؟

رسول اللہ: برائی سے اپنا دامن بچائے۔ یہی اُس کا صدقہ ہے۔

(بخاری جلد ۳، کتاب الادب صفحہ ۲۵)

حکومت کے طلبگار

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ روایت کرتے ہیں کہ اپنی قوم کے دو شخصوں کے ہمراہ میں بارگاہِ رسالتؐ میں حاضر ہوا، میرے ایک ساتھی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا۔

ایک ساتھی:۔ یا رسول اللہؐ۔ اللہ تعالےٰ کے امر سے آپ حاکمِ وقت ہیں مجھے بھی ملک کے کسی حصّہ کی امارت عطا فرمایئے۔

دوسرا ساتھی:۔ یا رسول اللہ۔ میری بھی یہی تمنا ہے۔

رسول اللہ:۔ خدا کی قسم! جو شخص بھی ہم سے حکومت کا طلبگار ہوگا۔ ہم اُس کو ہرگز حاکم نہیں بنائیں گے۔

عبدالرحمان بن سمرہؓ کہتے ہیں کہ حضور سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا:

اے عبدالرحمان، حکومت اور امارت کے طلبگار نہ بننا، کیوں کہ اگر طلب کرنے پر تجھے امارت و حکومت ملی، تو تو اللہ تعالےٰ کی مدد سے محروم رہے گا، اور اگر بن مانگے تجھے امارت مل گئی تو

اللہ تعالیٰ تمہارا معاون و مددگار ہوگا۔
ہاں۔ اگر تم نے کوئی کام کرنے کی قسم کھالی۔
اور پھر اُس کے خلاف کرنا مناسب سمجھا۔
تو اپنی قسم کا کفارہ ادا کرکے جو کام بہتر معلوم ہو۔ وہی کرو

بخاری جلد ۶ کتاب الاحکام صہ ۲۳۵-۲۳۴۔

قیامت میں رفیق

حضرت انسؓ بن مالک کہتے ہیں کہ ایک دن حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور میں مسجد سے باہر نکل رہے تھے کہ ایک شخص آیا اور اس نے دریافت کیا۔

وہ شخص: اے اللہ کے نبی ۔ قیامت کب برپا ہوگی؟
رسول اللہؐ: تو نے قیامت کے لیے کوئی توشہ بھی تیار کیا ہے۔
وہ شخص: (سوچتے ہوئے) حضورؐ! میں نے بہت زیادہ روزے، نماز اور صدقہ تو تیار نہیں کیا۔
البتہ مجھے اللہ اور اللہ کے رسولؐ سے شدید محبت ہے۔
رسول اللہ! تو سن لے، قیامت کے روز تجھے اُسی کی رفاقت نصیب ہوگی جو تجھے محبوب ہوگا!

(بخاری جلد ۶ :کتاب الاحکام صہ ۲۳۸)

طوالتِ نماز

حضرت ابومسعود انصاریؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا
یارسول اللہ! خدا کی قسم کہ میں صرف اس وجہ سے صبح کی نماز میں شامل نہیں ہوتا ۔ کہ فلاں صاحب نماز کو زیادہ طویل کر دیتے ہیں ۔
رسول اللہؐ: (سخت جلال میں) : تم میں سے بعض لوگ ایسے ہیں۔ جو لوگوں کے دلوں میں دین کے خلاف نفرت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔
یاد رکھو۔ اگر تم میں سے کسی کو امام مقرر کیا جائے۔ تو وہ نماز میں اختصار سے کام لے۔
مقتدیوں میں کمزور بھی ہوتے ہیں، اور ضعیف العمر بھی ایسے بھی ہوتے ہیں۔ جنہیں کام پر جانا ہوتا ہے

(بخاری جلد ۶، کتاب الاحکام صہ ۲۴۱)

حضرت علی حیدرؓ اور سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان مکالمہ

سنتِ مصطفویہؐ و طریقہِ محمدیہؐ:-

حضرت علی حیدرؓ :۔ یا رسول اللہ۔ اپنی سنت اور طریقہ سے متعلق کچھ ارشاد فرمائیں ۔

رسول اللہ: لے علی :

معرفت میرا راس المال ہے
عقل میرے دین کی اصل ہے ۔
محبت میری بنیاد ہے ۔
شوق میرا مرکب ہے ۔
ذکر الٰہی میرا مونس ہے
اعتماد میرا خزانہ ہے
حزن میرا رفیق ہے ۔
علم میرا ہتھیار ہے ۔
صبر میرا لباس ہے ۔
رضا میری غنیمت ہے ۔
عجز میرا فخر ہے ۔
زہد میرا حرفہ ہے ۔
یقین میری خوراک ہے ۔
صدق میرا ساتھی ہے ۔
طاعت میری خلق ہے ۔
اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے ۔

(کتاب الشفاء قاضی عیاض، بحوالہ رحمت للعالمین جلد ۳ صـ ۱۹۹

یہود سے ایک گفتگو

حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ کچھ یہودی دربار رسالتؐ میں آئے اور کہا :

السام علیکم (تم پر موت وارد ہو) تو میں نے جواباً کہا۔

علیکم ولعنکم اللہ وغضب اللہ ۔

(تم ہی پر موت وارد ہو، اللہ کی پھٹکار ہو تم پر، اللہ کا غضب تم پر بھڑکے)

رسول اللہ: لے عائشہ، صبر کرو، نرمی اور ملائمت اختیار کرو ۔ سخت کلامی سے بچو،

حضرت عائشہؓ : یا رسول اللہؐ! آپ نے ان کی بات نہیں سُنی ۔
رسول اللہؐ :۔ تو نے میرا جواب نہیں سنا ۔ میں نے بھی تو اُن کا جملہ انھیں پہ لوٹا دیا ۔
میرے الفاظ کو تو بارگاہِ الٰہی میں شرفِ قبولیت حاصل ہوگی ۔ مگر
اُن کے قول کو نہیں ۔

(صحیح بخاری کتاب الادب صف۲۵)

(۲)
تعلیمات

صدقات، محنت کی کمائی

ایک غریب آدمی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نصیحت
ایک غریب انصاری: یا رسول اللہؐ ۔ حاجت مند ہوں، کچھ عطا فرمایئے ۔
رسول اللہؐ : کیا تیرے گھر میں کچھ بھی نہیں؟
انصاری : صرف ایک کمبل ہے، جس سے اوڑھنے بچھونے کا کام لیتے ہیں ۔ پانی پینے کا ایک پیالہ ہے ۔
رسول اللہؐ: یہ دونوں چیزیں میرے پاس لے آؤ ۔
(کمبل اور پیالہ ہاتھ میں لیتے ہوئے) کون ہے جو ان دونوں چیزوں کو خریدنے ۔
ایک شخص : یا رسول اللہؐ ۔ میں ان کی قیمت ایک درہم دے سکتا ہوں ۔
رسول اللہ :۔ اے لوگو! کوئی ہے ۔ زیادہ قیمت لگانے والا؟ ۔ (۳ بار فرمایا)
دوسرا شخص : یا رسول اللہ! میں دو درہم دینے کو تیار ہوں ۔
رسول اللہ : اچھا یہ چیزیں لو اور ۲ درہم اس کے مالک کو دے دو ۔
(انصاری سے) ، سنو، ایک درہم میں اپنے بال بچوں کے لئے کھانے پینے کا سامان لو اور دوسرے
سے ایک کلہاڑی خرید لو ۔ پھر میرے پاس آؤ ۔
وہ شخص کلہاڑی لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ نے اپنے مبارک ہاتھوں سے اس میں دستہ لگایا ۔ (کلہاڑی
انصاری کو دیتے ہوئے) جاؤ، جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاؤ اور بیچو ۔ پندرہ دن تک میرے پاس نہ آنا ۔
وہ شخص پندرہ دن تک حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی :۔
انصاری : یا رسول اللہ ۔ کل دس درہم کمائے ۔ کچھ کا تو کپڑا خریدا ۔ کچھ پیسوں سے غلہ ۔

رسولؐ اللہ : اپنی محنت سے کمانا تمہارے لیے اس سے بہت بہتر ہے کہ قیامت کے دن لوگوں سے سوال کرنے کا داغ تمہارے چہرے پر ہو۔

سوال کرنا صرف تین آدمیوں کو زیب دیتا ہے۔

ایک وہ جو فقر و فاقہ سے بالکل زار و لاچار ہو گیا ہو۔

دوسرا وہ جس پر قرض کا بوجھ ہو، یا تاوان کا۔

تیسرا وہ، جس کو خون بہا ادا کرنا ہو، اور ادا کرنے کی استطاعت نہ رکھتا ہو۔

(ابوداؤد — بروایت حضرت انسؓ معارف الحدیث جلد ۴)

انفاق اور توکل

رسول اللہؐ (حضرت بلال کے پاس چھواروں کا ڈھیر دیکھ کر) - اے بلال! یہ کیا ہے؟

حضرت بلالؓ : یا رسول اللہ — اسے آنے والے دنوں کے لئے ذخیرہ کیا ہے۔

رسول اللہؐ :- بلال! کیا تمھیں اس بات کا خوف نہیں کہ کل قیامت کے روز تمھیں اس کی سوزش اور تپش برداشت کرنی پڑے۔

اے بلال - جو رزق تمھیں ملے۔ اُسے اپنے پر اور دوسروں پر خرچ کرو۔

اور یہ خوف مت کھاؤ کہ اللہ پاک کمی کر دے گا۔

شعب الایمان بیہقی — بروایت حضرت ابوہریرہؓ
معارف الحدیث جلد ۴

اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا اجر، اور نہ کرنے کا خسارہ

حضرت ابوذر غفاریؓ بیان کرتے ہیں کہ میں ایک دفعہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضورؐ اس وقت کعبہ کے سایہ میں تشریف فرما تھے۔ مجھے دیکھتے ہی فرمایا۔

رسول اللہؐ : کعبہ کے رب کی قسم، وہ لوگ بڑے گھاٹے میں ہیں؟

ابوذرؓ : میرے ماں باپ آپ پر قربان۔ کون لوگ؟

رسول اللہؐ وہ جو دولت مند اور سرمایہ دار ہیں۔

ہاں ان میں وہ لوگ عافیت میں رہیں گے جو اپنی دولت ہر طرف نہایت فراخ دلی اور کھلے ہاتھوں امکارِ خیر میں صرف کرتے ہیں مگر ان میں ایسے لوگ بہت ہی کم ہیں۔ (صحیح بخاری و مسلم)

بہتر صدقہ

ایک شخص بیار رسول اللہ! کونسا صدقہ زیادہ بڑا ہے؟ اور بڑے اجر والا ہے؟

رسول اللہ:۔ صدقہ کا زیادہ اجر اس صورت میں ہے کہ تم تندرست بھی ہو۔ تم میں مال کی چاہت بھی ہے اور تمھیں محتاج ہونے کا خطرہ ہو، اور دولت مند بننے کی آرزو بھی۔

ایسا نہ ہو کہ تم اسی سوچ بچار میں عمرِ عزیز گذار دو۔ جب موت سر پر آن کھڑی ہو، جان کھنچ کر حلق میں اٹکی ہو۔ تو تم مال کے بارے میں وصیت کرنے لگو، کہ اتنا فلاں کو اور اتنا فلاں کو۔ — حالاں کہ اب تو مال ان (وارثوں) کو مل ہی جائے گا۔

(صحیح بخاری و مسلم) بروایت ابوھریرہ رضؓ

مکالمہ ۲

ایک شخص: یارسول اللہ! میرے پاس ایک دینار ہے۔

رسول اللہ: اس سے اپنی ضرورتوں کو پورا کرو

وہی شخص: ان کو پورا کرنے کے لیے میرے پاس ہے۔

رسول اللہ: تو اس سے اپنی اولاد کی ضرورتوں کو پورا کرو۔

وہی شخص: ان کو دینے کے لئے میرے پاس اور ہے۔

رسول اللہ: تو اس کو اپنی بیوی کی ضروریات پر خرچ کرو۔

وہی شخص: یارسول اللہ۔ اُسے دینے کو بھی میرے پاس ہے۔

رسول اللہ: تو تمہارے غلام اور خادم اس کے حق دار ہیں۔

وہی شخص: ان کے لیے بھی میرے پاس (گنجائش) ہے۔

رسول اللہ: پھر تم ہی بہتر جانتے ہو۔

(ابوداؤد، نسائی) بحوالہ ابوھریرہ رضؓ

معارف الحدیث جلد ۴

اہلِ قرابت اور صدقہ

ابو طلحہ انصاری رضؓ:۔ یا رسول اللہ! ارشادِ ربانی ہے:۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ہ

ترجمہ (نیکی اور مقبولیت کا مقام تم اُس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ تم اپنی پیاری چیزوں کو راہِ خدا میں خرچ نہ کرو)

اے اللہ کے رسولؐ! مجھے اپنے سارے اموال میں بیرُحاءَ سب سے زیادہ عزیز ہے اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اسے اللہ کی راہ میں صدقہ کر دوں۔ مجھے امید ہے کہ آخرت میں میرا یہ توشہ ہوگا اور ثواب کا باعث اُس لئے جیسا اللہ تعالیٰ آپؐ کو سمجھائے۔ اس بارے میں فیصلہ دیں۔

رسول اللہؐ: سبحان اللہ۔ یہ تو بڑی ہی سودمند اور کارآمد جائداد ہے۔ میں نے سُن لیا جو تم نے کہا مناسب یہی ہے کہ تم اسے اُن قریبی رشتہ داروں میں تقسیم کر دو جو حاجت مند ہوں۔

ابوطلحہؓ: یا رسول اللہؐ۔ ایسا ہی ہوگا۔

چنانچہ ابوطلحہؓ نے وہ باغ اپنے عزیزوں اور چچازاد بھائیوں میں تقسیم کر دیا۔

(صحیح بخاری و مسلم بروایت حضرت انس)

مرنے والوں کی طرف سے صدقہ

سعد بن عبادہ: یا رسول اللہ۔ میں موجود نہیں تھا۔ جب میری والدہ انتقال فرما گئیں۔ اب اگر میں اُن کی طرف سے صدقہ کروں تو کیا صدقہ کا انھیں فائدہ ملے گا؟

رسول اللہؐ: ہاں! (اس کا فائدہ) انھیں ضرور پہنچے گا۔

سعد بن عبادہ: یا رسول اللہؐ! آپؐ میرے گواہ ہیں کہ میں نے اپنا باغ مخراف۔ اپنی مرحومہ والدہ کے لئے صدقہ کر دیا۔

(صحیح بخاری: بروایت ابنِ عباسؓ)

رمضان کا چاند: (شہادت)

بدوی: یا رسول اللہ! میں نے آج چاند دیکھا ہے۔

رسولؐ اللہ: کیا تم 'لا اِلٰہ الا اللہ' کی شہادت دیتے ہو؟

بدوی: ہاں، یا رسول اللہ! میں 'لا اِلٰہ الا اللہ' کی شہادت دیتا ہوں۔

رسول اللہؐ: اور کیا تم 'محمدؐ رسول اللہ' کی شہادت دینے پر تیار ہو؟

بدوی: ہاں! اے اللہ کے رسولؐ۔ میں اس کی بھی شہادت دیتا ہوں۔

رسول اللہؐ: بلال جاؤ اور لوگوں میں چاند کا اعلان کر دو کہ کل سے روزے رکھیں۔

ابی داؤد، ترمذی۔ بروایت ابن عباس
معارف الحدیث جلد ۴

روزے کا کفّارہ

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے کہ ایک شخص وہاں آیا اور عرض کیا:-

ایک شخص:- یارسول اللہ! میں تو برباد ہوگیا۔

رسول اللہؐ:- کیا ہوا۔ کیوں؟

وہی شخص:- میں نے روزہ کی حالت میں اپنی بیوی سے جماع کر لیا۔

رسول اللہؐ:- کیا تمہارا کوئی غلام ہے، جسے اس فعل کے کفارہ کے طور پر آزاد کر دو؟

وہی شخص:- یا رسول اللہؐ نہیں۔

رسول اللہؐ:- پھر دو مہینے متواتر روزے رکھو۔

وہی شخص:- حضور! ایسا کرنے کی اپنے میں سکت نہیں پاتا۔

رسول اللہؐ:- تو کیا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا سکتے ہو؟

وہی شخص:- حضور، میرے پاس اتنا مال نہیں۔

رسول اللہؐ:- تو پھر انتظار کرو۔

(اتنے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کھجوروں کا ایک بڑا بورا آیا۔)

رسول اللہؐ:- سائل کہاں ہے؟

وہی شخص: میں حاضر ہوں، یارسول اللہ!

رسول اللہؐ:- اس بورے کو لو اور صدقہ کر دو۔

وہی شخص:- یارسول اللہ۔ کیا ایسے محتاجوں پر صدقہ کروں جو مجھ سے زیادہ حاجتمند ہوں؟ خدا کی قسم۔ مدینہ کی دونوں طرف کی چٹانوں کے درمیان میرے اہلِ خانہ سے زیادہ کوئی دوسرا حاجت مند نہیں۔

رسول اللہ (ہنستے ہوئے کہ دندان مبارک بھی ظاہر ہو گئے) اچھا۔ یہ کھجوریں اپنے اہلِ خانہ ہی کو کھلا دو۔

(صحیح بخاری)

نفلی روزے

۱۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص۔

رسول اللہؐ: مجھے تمہارے متعلق علم ہوا ہے کہ تم ہمیشہ دن کو روزہ رکھتے ہو اور ساری رات نوافل پڑھنے میں گزار دیتے ہو۔

عبداللہ:- ہاں، یارسول اللہ! ایسا ہی ہے۔

رسول اللہؐ :۔ یہ معمول ترک کر دو۔ روزے بھی رکھو اور ناغہ بھی کیا کرو۔
رات میں نماز بھی پڑھا کرو اور سوؤ بھی،
تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے۔
تمہاری آنکھوں کا بھی تم پر حق ہے۔
تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے۔
تمہارے مہمان بھی تم پر حق رکھتے ہیں۔
سنو! جو مسلسل روزہ رکھے۔ اُس نے گویا روزہ رکھا ہی نہیں۔ ہر مہینہ میں تین نفلی روزوں کا حکم ہے۔ اگر اس پر تمہارا عمل ہو تو سمجھو کہ ہمیشہ روزہ سے رہے۔
بس ہر مہینہ میں تین روزے رکھو اور ہر ماہ (تہجد) میں ایک بار قرآن پاک ختم کیا کرو۔
عبداللہؓ :۔ یارسول اللہ! مجھ میں اس سے زیادہ کی طاقت ہے۔
رسول اللہؐ : تو پھر تم (حضرت) داؤدؑ کے اسوہ پر عمل کرو۔ ایک دن روزہ رکھو، ایک دن ناغہ کرو۔ سات راتوں میں ایک بار قرآن ختم کیا کرو۔ اس سے زیادہ نہیں۔ (صحیح بخاری)

۲۔ ایک شخص :۔ یارسول اللہؐ! آپ کا روزہ رکھنے کا طریقہ کیا ہے۔
حضرت عمرؓ: (حضورؐ کے رُخِ انور پر ناگواری کے اثرات دیکھتے ہوئے) ———
ہم راضی ہیں اللہ، کو اپنا ربّ مان کر اسلام کو اپنا دین مان کر اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا نبی مان کر ——— ہم اللہ کی ناراضی اور اس کے رسولؐ کی ناراضگی سے اللہ کی پناہ چاہتے ہیں۔
(حضورؐ کے رُخِ انور پر شگفتگی دیکھتے ہوئے) :۔ یارسول اللہؐ!
اس شخص کے متعلق آپ کیا فرمائیں گے جو لگاتار روزہ رکھتے؟
رسول اللہؐ : نہ اُس نے روزہ رکھا، نہ افطار کیا۔
حضرت عمرؓ :۔ ایسے شخص کے بارے میں حضورؐ کا کیا فرمان ہے جو دو دن روزہ سے رہے اور ایک دن ناغہ کرے۔
رسول اللہؐ : کیا کسی شخص میں اتنی سکت ہے؟
حضرت عمرؓ :۔ اس بارے میں حضورؐ کا کیا خیال ہے کہ ایک دن روزہ سے رہے۔ اور ایک دن ناغہ کرے۔
رسول اللہؐ :۔ یہ سنت داؤدؑ ہے۔
حضرت عمرؓ :۔ اس بارے میں حضورؐ ارشاد فرمائیں کہ ایک دن تو روزہ سے ہو اور دو دن ناغہ کیا جائے ——— تو کیسا رہے۔

رسول اللہؐ :۔ میری آرزو ہے کہ اللہ پاک مجھے اس کی قوت عطا فرمائے ہر مہینہ میں ۳ نفلی روزے رمضان تا رمضان، مسلسل روزے رکھنے کے برابر ہیں۔
یوم عرفہ کا روزہ اپنے سے پہلے سال اور اپنے بعد کے سال کے گناہوں کو پاک کر دیتا ہے۔
مجھے اپنے اللہ سے اسی کرم کی توقع ہے۔ جہاں تک یوم عاشورا کے روزے کا تعلق ہے مجھے امید ہے کہ اللہ پاک اس سے پہلے سال کے گناہوں کی تطہیر کر دیتا ہے۔

(صحیح مسلم)

یوم عاشورہ کا روزہ

۱۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں :۔

"ہجرت فرمانے کے بعد جب سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے۔ تو آپ کو معلوم ہوا کہ یہود یوم عاشورہ کا روزہ رکھتے ہیں۔ آپؐ کے اور یہود کے درمیان یہ بات چیت ہوئی :"

رسول اللہؐ :۔ آخر اس میں کونسی ایسی خصوصیت ہے کہ تم اس کا روزہ رکھتے ہو؟

یہود :۔ ہمارے نزدیک اس دن کی بڑی عظمت ہے۔ یہی وہ دن ہے جب اللہ پاک نے موسیٰؑ اور اُن کی قوم بنی اسرائیل کو نجات دی تھی یہی وہ دن ہے۔ جب فرعون بمعہ اپنے لشکر کے اللہ کے حکم سے غرقِ آب ہُوا، اس لیے موسیٰ علیہ السلام نے شکر ادا کرنے کی خاطر اس دن روزہ رکھا۔ ہم بھی حضرت کی پیروی کرتے ہیں۔

رسول اللہؐ :۔ اللہ کے پیغمبر موسیٰؑ سے ہمارا تعلق تم سے کہیں زیادہ ہے۔ اور ہم اس لحاظ سے زیادہ حق رکھتے ہیں۔

چنانچہ حضورؐ نے خود بھی عاشورہ کا روزہ رکھا اور اپنی امت کو بھی اس کا حکم دیا۔

(صحیح بخاری)

۲۔ ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں :۔ جب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے یومِ عاشورہ کو روزہ رکھنا اپنا معمول بنا لیا تو اپنی امت (صحابہؓ) کو بھی اس کا حکم دیا۔ بعض صحابہ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا۔

صحابہؓ : یا رسول اللہ! یہود و نصاریٰ کے نزدیک یہ دن بڑی اہمیت اور عظمت کا حامل ہے، وہ اِسے خاص دِن کی حیثیت سے مناتے ہیں۔

رسول اللہؐ :۔ ان شاء اللہ۔ اگلے سال ہم نویں کو بھی روزہ رکھیں گے۔

(صحیح مسلم)

حضرت عائشہ صدیقہؓ اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان گفتگو

رسول اللہؐ: اے عائشہ، کیا تمہارے پاس اس وقت کچھ کھانے کو ہے ؟

حضرت عائشہؓ: حضور، اس وقت تو کچھ بھی نہیں۔

رسول اللہؐ: اچھا۔ تو اب ہم روزہ رکھے لیتے ہیں۔

(پھر کسی دوسرے دن حضرت کی تشریف آوری)

حضرت عائشہؓ: یارسول اللہؐ! آج ہمارے ہاں حَیس ہدیہ میں آیا ہے۔ آپ اسے نوش فرمالیں۔

رسول اللہؐ: تو لاؤ۔ ویسے تو ہم نے آج روزے کی نیت کر رکھی تھی۔ پھر آپؐ نے نوش فرمالیا اور روزہ نہیں رکھا۔

احرام۔

ایک مکالمہ

ایک شخص: یا رسول اللہ محرِم کو کیا کیا کپڑے پہننے چاہئیں ؟

رسول اللہؐ: (محرِم) کرتا، قمیص پہنے نہ سر پر عمامہ باندھے۔ نہ شلوار پاجامہ پہنے اور نہ بارانی۔

اور نہ پاؤں میں موزے پہنے، ہاں اگر اُس کے پاس چپل یا جوتا نہ ہو تو مجبوری ہے۔

ایسے میں وہ موزے پہن لے، لیکن ان کو ٹخنوں کے نیچے سے کاٹ کر جوتے جیسا بنا لے۔

اور ہاں۔ ایسا کوئی کپڑا استعمال نہ کرے جس میں زعفران یا ورس لگا ہو۔

بخاری بروایت عبداللہ بن عمرؓ

یوم النحر — کی گفتگو

ابوبکرہ ثقفیؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دسویں ذی الحجہ کو حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے گفتگو فرمائی۔

رسول اللہؐ: زمانہ گھوم پھر کر اپنی اُس اصلی حالت پر آ گیا ہے۔ جیسا کہ وہ اس وقت تھا جب زمین و آسمان تخلیق کئے گئے۔ سال میں بارہ مہینے ہوتے ہیں۔ ان میں کے ۴ مہینے خاص طور پر قابلِ احترام ہیں۔

تین مہینے تو لگاتار ہیں یعنی ذی القعدہ، ذی الحجہ اور محرم الحرام — اور چوتھا مہینہ رجب ہے، جو جمادی الاُخریٰ اور شعبان کے بیچ میں آتا ہے۔

جسے مُضر کے لوگ زیادہ مانتے ہیں۔

ہاں بتاؤ تو یہ مہینہ کون سا ہے ؟

حاضرین: یارسول اللہؐ! اللہ اور اللہ کا رسولؐ ہی بہتر جانتے ہیں۔

رسول اللہ ؐ : (چند لمحے خاموشی کے بعد) کیا یہ " ذی الحجہ " نہیں ہے؟
حاضرین ۔ بیشک ، اے اللہ کے رسول ؐ !
رسول اللہ ؐ :۔ ہاں تو ۔ اس شہر کا کیا نام ہے؟
حاضرین : یا رسول اللہ ؐ ۔ اللہ اور اس کے رسول ؐ کو ہی زیادہ علم ہے ۔
رسول اللہ ؐ (تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد) کیا یہ " مکہ " نہیں ۔
حاضرین : بے شک ۔ اے اللہ کے نبی ۔
رسول اللہ : آج کونسا دن ہے ؟
حاضرین :۔ اللہ اور اللہ کے رسول ہی بہتر جانتے ہیں ۔
رسول اللہ ؐ :۔ کیا آج " یوم النحر " نہیں
حاضرین :۔ یا رسول اللہ ۔ یقیناً آج یوم النحر ہے
رسول اللہ ؐ :۔ تو غور سے سنو ، تمہارے خون ، تمہارے اموال اور تمہاری آبروئیں تم پر حرام ہیں ۔ بالکل اُسی طرح جیسے آج کے مبارک اور مقدس دن میں ، اس بلدۃ الحرام میں اور خاص اس ماہِ حرام میں کسی کا مال لوٹنا یا کسی کی آبرو پر حملہ کرنا حرام ہے ۔ وہ وقت قریب ہے ۔ جب تمہیں اپنے مالک کے حضور پیش ہونا ہے ۔ جہاں تمہیں اپنے اعمال کا حساب پیش کرنا ہوگا ۔

خبردار ۔ اے لوگو خبردار ، میرے بعد کہیں گمراہ نہ ہو جانا ۔
اے لوگو ! بتاؤ کیا میں نے تم تک اللہ کا پیغام پہنچا دیا ۔
حاضرین :۔ یا رسول اللہ ! بے شک آپ نے رسالت کا حق ادا فرما دیا ۔
رسول اللہ ؐ : (اللہ کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے) :۔ " اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ " اے اللہ تو گواہ رہنا ۔
(حاضرین سے مخاطب ہوتے ہوئے) :۔ اے لوگو غور سے سنو !
جو لوگ یہاں موجود ہیں ، انہیں چاہیے کہ وہ (میرا پیغام) ان لوگوں تک پہنچا دیں جو لوگ یہاں موجود نہیں ، (ایسا ہوتا ہے کہ) بہت سے وہ لوگ جن کو کسی سننے والے کے ذریعے کوئی بات پہنچے ، وہ اس سننے والے سے زیادہ محفوظ کرنے والے ہوتے ہیں ۔
(صحیح بخاری ، صحیح مسلم)

قربانی

رسول اللہ ؐ : (عیدالاضحیٰ کے موقعہ پر) : اے لوگو ! تم میں سے جو شخص قربانی کرے ۔ اُسے چاہیئے کہ (قربانی سے)

تیسرے دن کے بعد اس کے گھر میں اپنی قربانی کے گوشت میں سے کچھ بھی باقی نہ رہے۔

صحابہؓ: (دوسرے سال) یا رسول اللہ۔ کیا اس سال بھی ہم ویسا کریں جیسا آپ نے گئے سال ہمیں ہدایت فرمائی تھی۔

رسول اللہؐ: نہیں، خوب کھاؤ۔ کھلاؤ اور پس انداز بھی کرو۔ گذشتہ سال عام لوگ تنگدستی کا شکار تھے۔ اس لیے میں نے تمھیں (پس انداز کرنے سے منع کیا تھا)۔ میری خواہش تھی۔ کہ غریب لوگ بھی قربانی کے گوشت سے متمتع ہو سکیں۔

(صحیح بخاری: صحیح مسلم)

حرم پاک کی حرمت

حضرت ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ فتح مکہ کے دن جناب رسالتمآب نے فرمایا۔

رسول اللہؐ:۔ اے لوگو! ہجرت تمام ہوئی۔ البتہ جہاد باقی ہے۔ اور نیت بھی، تو جب تمہیں اللہ کی راہ میں کوچ کرنے کا حکم ملے تو اس کی تعمیل کرو۔

یہ بلدۃ الحرام! اللہ تعالٰے اس شہر کو اُسی دن سے محترم قرار دیا ہے جس دن کہ زمین و آسمان کی تخلیق ہوئی۔ (اور تا قیام قیامت محترم رہے گا)

مجھ سے پہلے اللہ نے کسی بندے کو اس محترم سرزمین میں قتال فی سبیل اللہ کی بھی اجازت مرحمت نہیں فرمائی۔ مجھے بھی اگر اجازت ملی۔ تو تھوڑے سے وقفے کے لئے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کی گئی یہ رخصت صرف ہنگامی تھی۔

اس لمحہ کے بعد قیامت تک کے لئے اس سرزمین حرام میں نہ تو قتال کی اجازت ہے اور نہ کسی ایسے اقدام کی جو اس کی عظمت و حرمت کے منافی ہو۔ اس سرزمین کی کانٹے دار جھاڑیاں بھی کاٹنا خلاف ادب ہے۔ یہاں شکار کرنا بھی منع ہے اگر یہاں کوئی گری پڑی چیز ملے۔ تو اس کے اٹھانے کا وہی حق دار ہے۔ جو باقاعدہ اس کا اعلان اور تشہیر کرے۔ یہاں اُگنے والی سبز گھاس بھی نہ کاٹی جائے۔

حضرت عباسؓ:۔ یا رسول اللہؐ! اذخر گھاس کو مستثنیٰ فرما دیں۔ یہاں کے آہن گر اسے (بھٹیوں میں) استعمال کرتے ہیں اور گھروں کی چھتیں پاٹنے میں بھی استعمال ہوتی ہے۔

رسول اللہؐ:۔ اچھا۔ تو اس کے کاٹنے کی اجازت ہے۔

(صحیح بخاری، صحیح مسلم)

طہارت سے غفلت

حضرت ابن عباس کا بیان ہے:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دو قبروں کے پاس سے گذرے تو آپ نے فرمایا:

رسول اللہؐ :۔ ان قبروں کے مکینوں پر عذاب ہو رہا ہے ۔
یہ عذاب کسی بھاری یا ایسے گناہ کی وجہ سے بھی نہیں ہو رہا جس سے بچنا مشکل ہو ان میں سے ایک گناہ تو یہ ہے کہ وہ پیشاب کی آلائش سے بچنے اور اسے دور کرنے کی کوشش اور فکر نہیں کرتا تھا۔
دوسرے میں چغلیاں کھانے کی عادت تھی ۔

حضورؐ نے کھجور کی ایک سبز شاخ لی، اُس کو درمیان سے چیرا۔ اور ایک ایک ٹکڑا دونوں قبروں پر گاڑ دیا۔

صحابہ : (یہ دیکھتے ہوئے) یا رسول اللہ ۔ اس کا فائدہ ؟

رسول اللہؐ :۔ مجھے امید ہے کہ جب تک یہ ٹکڑے سبز رہیں گے ان کے عذاب میں تخفیف کر دی جائے گی ۔
(صحیح بخاری ، صحیح مسلم)

حضرت ابو ایوب انصاریؓ، حضرت جابرؓ اور حضرت انسؓ بیان فرماتے ہیں

جب سورۂ توبہ کی اس آیت کا نزول ہوا :

"فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ۚ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ"

(اس (مسجد قبا) میں ایسے بندے ہیں جو پاکیزگی پسند کرتے ہیں، اللہ پاکیزگی پسند کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے)

تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار فرمایا:

رسول اللہؐ :۔ اے انصاریو! اللہ نے پاک صاف رہنے والوں میں تمہاری تعریف فرمائی ہے۔ وہ کونسی صفائی اور طہارت ہے، جو تم کرتے ہو؟

انصار : یا رسول اللہؐ! ہم نماز کے لیے وضو کرتے ہیں ۔
غسلِ جنابت کرتے ہیں۔
اور استنجا میں پانی استعمال کرتے ہیں ۔

رسول اللہؐ :۔ بہت خوب، اس کو تم اپنے اوپر لازم کر لو۔

(ابن ماجہ / معارف الحدیث جلد ۳)

رسول اللہؐ : اے لوگو! میں تمہارے لیے مثل ایک باپ کے ہوں ۔ اس لیے میں تمھیں تعلیم دیتا ہوں کہ :۔
جب تم قضائے حاجت کے لیے جاؤ ۔ تو نہ تو قبلہ کی طرف منہ کر کے بیٹھو اور نہ اُس طرف تمہاری پیٹھ ہو۔ استنجا کرتے وقت تین پتھر استعمال کیا کرو ۔ استنجا میں لید اور ہڈی ہرگز استعمال نہ کرو۔ اور استنجا کرتے

وقت اپنا دایاں ہاتھ استعمال میں نہ لاؤ۔

(ابن ماجہ، دارمی / معارف الحدیث جلد ۳)

وضو :- ایک مکالمہ :

رسول اللہؐ :- کیا تمھیں میں وہ اعمال نہ بتاؤں — ؟ جن کی برکت سے اللہ تعالٰے گناہوں کو مٹا دیتے ہیں۔
اور درجات بلند فرماتے ہیں۔

صحابہؓ : یا رسول اللہؐ ضرور ارشاد فرمائیں۔

رسول اللہؐ : چاہے تکلیف ہو، چاہے ناگوارِ خاطر ہو — وضو پورا پورا کرو۔
تمہارے قدم ہمیشہ مسجد کی طرف اٹھیں۔
ایک نماز کے بعد تمھیں دوسری نماز کا انتظار ہو۔
پس یہی ہے حقیقی رباط۔ یہی ہے اصلی رباط
(شیطان کی غارت گری کے خلاف حصار)

(صحیح مسلم بروایت ابوہریرہ رضؓ)

اے لوگو! دس چیزیں امور فطرت میں داخل ہیں :

۱۔ لبیں ترشوانا۔
۲۔ داڑھی کا چھوڑنا۔
۳۔ مسواک کا استعمال۔
۴۔ ناک میں پانی ڈال کر صاف کرنا۔
۵۔ ناخن کٹوانا۔
۶۔ انگلیوں کے جوڑوں کا دھونا۔
۷۔ بغل کے بال صاف کرنا۔
۸۔ زیرِ ناف بالوں کی صفائی۔
۹۔ پانی کا استنجے میں استعمال۔

(صحیح مسلم بروایت حضرت عائشہؓ)

ایک اعرابی :- یا رسول اللہؐ! وضو کرنے کا طریقہ بتائیے؟

رسول اللہؐ : (ہر عضو کو تین بار دھو کر دکھلاتے ہوئے)
اے شخص! وضو کرنے کا یہ طریقہ ہے۔

تو جو بھی اپنی طرف سے اس میں کچھ اضافہ کرے گا۔
وہ برائی۔ ظلم اور زیادتی کا مرتکب ہو گا۔

سنن نسائی۔ بروایت حضرت عمرو بن العاصؓ
معارف الحدیث جلد ۳ صہ ۷۲

لقیط بن صبرہؓ : یارسول اللہ۔ وضو کی بابت کچھ فرمائیں۔
رسول اللہؐ : وضو اچھی طرح اور پورا پورا کرو
ہاتھ پاؤں دھوتے وقت اُن کی انگلیوں میں خلال کرو۔
نتھنوں میں پانی چڑھا کر۔ اُن کی اچھی طرح صفائی کرو۔
مگر روزہ کی حالت میں ایسا کرنا جائز نہیں۔

سنن ابی داؤد۔ بروایت لقیطؓ
معارف الحدیث جلد ۳ صفحہ ۷۷

سعد بن ابی وقاص وضو کر رہے تھے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے پاس سے گذرے۔ دیکھا تو فرمایا:
رسول اللہؐ :۔ اے سعد! کیوں اسراف سے کام لے رہے ہو۔
سعدؓ :۔ یارسول اللہؐ! وضو کے پانی میں بھی اسراف ہوتا ہے؟
رسول اللہؐ :۔ کیوں نہیں۔ یہ بھی اسراف میں داخل ہے۔ چاہے تم آب رواں کے کنارے پر ہی کیوں نہ بیٹھے (وضو کر رہے) ہو۔

مسند احمد بروایت عبداللہ بن عمرو بن العاص
معارف الحدیث جلد ۳ : صہ ۷۹

حضرت بلالؓ اور رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان مکالمہ

رسول اللہؐ :۔ (فجر کی نماز کے بعد) : اے بلال، وہ کونسا عمل ہے؟
جس سے تمہیں زیادہ اجر و ثواب کی توقع ہے۔
جنت میں مجھے تمہارے قدموں کی آہٹ اپنے آگے آگے سنائی دی ہے۔
حضرت بلالؓ : یارسول اللہ۔ میرا عمل۔ جس سے مجھے اپنے اعمال میں سب سے زیادہ خیر و ثواب کی امید ہے۔ یہ ہے کہ میں نے رات یا دن میں۔ کسی بھی وقت جب بھی وضو کیا ہے۔ اُس وضو سے نماز ضرور پڑھی ہے۔
اِس قدر۔ جتنی توفیق مجھے حق تعالٰی نے عطا فرمائی ہے۔ (صحیح بخاری۔ صحیح مسلم)

غسل:۔ رسول اللہؐ : اے لوگو! جسم کے ہر بال کے نیچے جنابت کا اثر ہوتا ہے اس لئے غسل جنابت میں، بالوں کو خوب اچھی طرح دھونا چاہیے۔ اور جسم کے جس حصہ پر بال نہ ہوں۔ اُس کو بھی اچھی طرح صاف صاف دھو لینا چاہیے۔

ابی داؤد ۔ ابن ماجہ بروایت حضرت ابوہریرہؓ

معارف الحدیث جلد ۳ صفحہ ۸۵

حضور سرورِ عالمؐ کا غُسلِ جنابت :۔

جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم جب بھی غسل جنابت فرماتے تھے تو سب سے پہلے اپنے دونوں ہاتھ دھوتے تھے۔ پھر بائیں ہاتھ سے مقام استنجا کو صاف کرتے اور دائیں ہاتھ سے اُس پر پانی ڈالتے جاتے (طہارت کے بعد) وضو کرتے، جیسا وضو نماز کے لئے کیا جاتا ہے۔ پھر پانی لے کر اپنی انگلیوں سے پانی کو بالوں کی جڑوں تک پہنچاتے۔ جب یقین ہو جاتا ہے کہ تمام بالوں میں، پانی پوری طرح پہنچ گیا ہے تو دونوں ہاتھ بھر کر تین دفعہ اپنے سر پہ پانی ڈالتے۔ اور پھر سارے بدن پر پانی بہاتے۔ آخر میں دونوں پاؤں دھو لیتے تھے۔

صحیح بُخاری / مسلم بروایت حضرت عائشہ صدیقہؓ

نماز :

(۱) : (صحابہ :۔ حضورؐ! نماز کے متعلق کچھ فرمائیں)

رسول اللہؐ :۔ جو بندہ اہتمام کے ساتھ نماز ادا کرے گا تو نماز قیامت کے دن اُس کے واسطے نور ہو گی۔ بُرہان ہوگی۔ اور اس کے لیے ذریعہ نجات بنے گی۔

لیکن جس شخص نے نماز کی ادائیگی کا اہتمام نہ کیا تو نماز نہ اس کے لیے نور ہوگی۔ نہ بُرہان اور نہ وسیلہ نجات قیامت میں ایسا بدبخت قارون، فرعون، ہامان اور اُبی بن خلف جیسے لوگوں کا رفیق ہوگا۔

مسند احمد بروایت عبداللہ بن عمرو بن العاص

معارف الحدیث جلد ۳ : صفحہ ۱۱۲

(۲) سخت سردی کے دن تھے۔ پت جھڑ کا موسم تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لے گئے (ابوذرؓ ساتھ تھے) آپؐ نے ایک درخت کی ۲ شاخوں کو پکڑ کر زور سے ہلایا۔ تو ایک دم پتے جھڑنے لگے۔

حضورؐ نے فرمایا :۔

رسول اللہؐ : اے ابوذر۔

ابوذرؓ : میں حاضر ہوں، حضورؐ!

رسول اللہؐ : (جھڑے ہوئے پتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) جب کوئی مومن بندہ نماز کو

اللہ کے لیے خالص کر کے ادا کرتا ہے۔ تو اس کے گناہ بھی ان پتوں کی طرح جھڑ جاتے ہیں۔

مسند احمد بروایت ابوذر غفاری رض / معارف الحدیث جلد ۳، ص ۱۱۵

(۳) صحابہ رض: یا رسول اللہ! نماز کے اوقات تعلیم فرمائیں۔

رسول اللہ: نماز فجر کا وقت اس لمحہ تک ہے۔ جبکہ سورج کا ابتدائی کنارہ نمودار نہ ہو۔

نماز ظہر کا وقت وہ ہے جب آفتاب بیچ آسمان سے مغرب کی طرف ڈھل جائے۔ یہ نمازِ عصر تک رہتا ہے۔

نمازِ عصر اس وقت تک ادا ہو سکتی ہے۔ جب تک کہ سورج زرد نہ پڑنے لگے اور اس کا پہلا کنارہ ڈوبنے لگے۔

نمازِ مغرب کا وقت وہ ہے جب آفتاب بالکل غروب ہو جائے۔ یہ شفق کے غائب ہونے تک رہتا ہے۔

نمازِ عشاء کی نماز تم نصف رات گئے تک ادا کر سکتے ہو۔

(صحیح بخاری و مسلم بروایت عبداللہ بن عمرو بن العاص)

عورتوں کی نماز کا حکم

ام حمید ساعدیہ رض اور حضور سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کا مکالمہ۔

ساعدیہ رض: یا رسول اللہ! میرا جی چاہتا ہے، آپ کی اقتداء میں نماز ادا کروں۔

رسول اللہ ﷺ: جانتا ہوں، تمہیں میرے ساتھ نماز ادا کرنے کا بڑا اشتیاق ہے۔

لیکن غور سے سنو!

تمہاری وہ نماز جو تم گھر کے اندرونی حصہ میں ادا کرو۔ افضل اور بہتر ہے اس نماز سے جو تم بیرونی دالان میں پڑھو۔ اور بیرونی دالان میں نماز کا ادا کرنا بہتر ہے اس نماز سے جو تم اپنے گھر کے صحن میں ادا کرو۔

اور اپنے گھر کے صحن میں نماز پڑھنا اس سے بہتر ہے کہ تم اپنے محلے کی مسجد میں نماز ادا کرو۔

اور اپنے محلہ کی مسجد میں نماز ادا کرنا تمہارے لیے بہتر ہے کہ تم میری مسجد میں نماز آن کر ادا کرو۔

کنز العمال:

معارف الحدیث جلد ۳ ص: ۱۸۹

نماز باجماعت

رسول اللہ ﷺ: جس شخص نے بھی نماز باجماعت کے لیے موذن کی آواز سنی اور بغیر کسی عذرِ واقعی کے جماعت میں نہ آیا۔ تو اس کی نماز اللہ کے ہاں ہرگز قبول نہیں ہو گی۔

صحابہؓ :۔ یا رسول اللہ! واقعی عذر سے آپ کی کیا مراد ہے؟
رسول اللہ:۔ جان و مال کا خوف یا مرض ۔

ابی داؤد ، دارقطنی بروایت ابن عباسؓ
معارف الحدیث جلد ۳ : ص ۱۹۷

صحیح نماز

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں ۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں ایک طرف تشریف فرما تھے۔ ایک شخص مسجد میں آیا۔ نماز پڑھی اور حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور سلام عرض کیا ۔
رسول اللہؐ :۔ تم نے نماز صحیح طریقے سے ادا نہیں کی ۔ دوبارہ پڑھو۔ وہ شخص واپس ہوا۔ نماز ادا کی اور دوبارہ حضورؐ کی خدمت میں سلام پیش کیا ۔
رسول اللہؐ (سلام کا جواب دیتے ہوئے) تم نے اس بار بھی نماز صحیح طریقہ سے ادا نہیں کی ۔ پھر پڑھو ۔
وہ شخص دوسری بار واپس ہوا۔ نماز ادا کی۔ لیکن حضورؐ نے اس بار بھی وہی فرمایا تو اس شخص نے حضورؐ کی خدمت میں التجا کی ۔
——— یا رسول اللہؐ! مجھے صحیح طریقہ سے نماز ادا کرنا سکھا دیجئے ۔ اور فرمائیے میں نماز کس طرح پڑھوں ۔
رسول اللہؐ :۔ جب تم نماز پڑھنے کا ارادہ کرو۔ تو خوب اچھی طرح وضو کر لو۔ پھر قبلہ رُو ہو کر تکبیر تحریمہ کہو اور نماز شروع کر دو۔ اس کے بعد قرآن کا جو حصہ تمہیں یاد ہو اور تم اُسے آسانی سے پڑھ سکو اس کی قرأت کرو۔ قرأت کے بعد نہایت اطمینان اور سکون سے رکوع کرو۔ رکوع سے اٹھ کر سیدھے کھڑے ہو جاؤ۔ پھر نہایت ہی اطمینان اور سکون سے سجدہ کرو۔
پھر اٹھو، یہاں تک کہ اطمینان سے بیٹھ جاؤ۔ اپنی ساری نماز میں اسی طریق پر عمل کرو۔
(یعنی نماز کے تمام ارکان خوب اطمینان اور سکون سے ادا کرو)

(بخاری و مسلم)

حضرت ابوہریرہ بیان کرتے ہیں، میں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تکبیر تحریمہ اور قرأت کے درمیان کچھ دیر کے لئے سکوت فرماتے دیکھا۔ تو ایک دفعہ عرض کیا ۔
——— یا رسول اللہؐ! میرے ماں باپ آپؐ پر فدا ہوں۔ ذرا بتائیے تو سہی کہ آپ تکبیر تحریمہ اور قرأت کے درمیانی سکوت میں کیا پڑھتے ہیں؟
رسول اللہؐ : اے ابوہریرہ !۔ میں اللہ کے حضورؐ دعا کیا کرتا ہوں:۔
اے بار الٰہا! میرے اور میری خطاؤں کے درمیان اتنا طویل فاصلہ کر دے جتنا مشرق اور مغرب کے درمیان ہے۔
اے اللہ! مجھے خطاؤں سے ایسا پاک و صاف کر دے جیسے سفید کپڑا میل کچیل دور ہونے سے پاک و صاف ہو جاتا ہے۔

اے اللہ! میری خطائیں پانی سے، برف سے اور اولوں سے صاف فرما دے۔

(بخاری و مسلم)

نماز میں مناسب قرأت

حضرت جابرؓ کا بیان ہے۔ معاذ بن جبل کا معمول تھا کہ وہ پہلے جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی امامت میں مسجد نبوی میں نماز ادا کرتے اور پھر اپنے قبیلہ کی مسجد میں لوگوں کو نماز پڑھاتے۔ ایک رات حضورؐ کے ساتھ عشار کی نماز پڑھنے کے بعد اپنے قبیلہ کی مسجد میں آئے اور نماز پڑھانی شروع کی اور سورۂ بقرہ کی قرأت کرنے لگے۔ اس پر ایک شخص نے جماعت سے علیحدہ ہو کر تنہا نماز ادا کی۔ اہلِ جماعت نے محسوس کیا اور کہا:۔

اہلِ محلہ : اے فلانے تو منافق تو نہیں ہو گیا ؟

وہی شخص : اللہ کی قسم۔ ایسا ہرگز نہیں۔ میں حضورؐ کی خدمت میں جا کر خود یہ معاملہ پیش کروں گا۔ چنانچہ وہ شخص نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی

وہی شخص : یا رسول اللہ! ہم اونٹوں کے ذریعے پانی سینچتے ہیں۔ دن بھر محنت مشقت کرتے ہیں۔ معاذ عشاء کی نماز آپ کے پیچھے پڑھنے کے بعد اپنی مسجد کو لوٹے۔ نماز شروع کی جس میں سورۂ بقرہ کی قرأت شروع کر دی؟

رسول اللہؐ : (معاذؓ کی طرف رُخ فرماتے ہوئے)

معاذ! کیا تم چاہتے ہو کہ لوگ فتنہ میں مبتلا ہوں؟ یہ سورتیں پڑھا کرو۔ سورۂ والشمس وضحٰہا، سورۂ والضحٰی۔ سورۂ واللیل اذا یغشٰی اور سبح اسم ربک الاعلٰی۔

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

درود شریف : کعب بن عجرہؓ اور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان مکالمہ

کعبؓ :۔ یا رسول اللہؐ! اللہ پاک نے ہمیں آپ کی خدمت سلام کرنے کا طریقہ تو بتلا دیا۔ اب آپؐ ہمیں یہ تعلیم دیں کہ آپؐ پر (درود) وصلاۃ کیسے بھیجا کریں۔

رسول اللہؐ : اس طرح پڑھا کرو :

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ ۝ اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ ۝

جمعہ کے دن کا خصوصی وظیفہ درود، اور انبیاء کے جسموں کی حفاظت

حضرت اوس بن اوس ثقفی رض روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :۔

' جمعہ کا دن افضل ترین ایام میں سے ہے ۔ اسی میں حضرت آدم ؑ کی تخلیق ہوئی ۔ اسی دن وہ خالق حقیقی سے جا ملے ۔ جمعہ کے دن ہی قیامت کا صور پھونکا جائے گا اور یہی دن ہوگا جب مخلوقات پر موت کی اور فنا کی بیہوشی اور بے حسی طاری ہوگی لہٰذا تم جمعہ کے دن مجھ پر کثرت سے درود بھیجا کرو۔ کیوں کہ تمہارا درود مجھ پر پیش کیا جاتا ہے اور پیش کیا جاتا رہے گا ۔

صحابہ رض :۔ یا رسول اللہ! آپ کا پاک جسد تو اس وقت مٹی میں مل کر مٹی ہو چکا ہوگا ۔ پھر ہمارا درود آپ پر کیوں کر پیش ہوگا ۔

رسول اللہ ؐ :۔ اللہ تعالےٰ نے زمین پر انبیاء کے جسموں کو حرام کر دیا ہے ۔ (ان کے اجساد صحیح وسالم رہتے ہیں)

ابو داؤد، نسائی ، ابن ماجہ

معارف الحدیث جلد ۳ : ۲۷۸

عیدین

حضرت انس رض بیان فرماتے ہیں ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ سے ہجرت کر کے تشریف فرمائے مدینہ ہوئے ۔ تو اہلِ مدینہ دو تہوار منایا کرتے تھے ۔ ان تہواروں میں کھیل تماشے کیا کرتے تھے ۔ حضور ؐ نے یہ دیکھ کر اہلِ مدینہ سے پوچھا ۔

—— ان دو دنوں کی حقیقت کیا ہے ، جن کو تم خاص کر کے مناتے ہو ؟ ۔

اہلِ مدینہ :۔ یا رسول اللہ ۔ ہم یہ تہوار ایام جاہلیت سے مناتے چلے آ رہے ہیں ۔ اسی طرح کھیل تماشے ہوتے تھے ۔

رسول اللہ ؐ :۔ اے لوگو ، اب ان تہواروں کو رہنے دو ۔ ان کے بدلہ میں اللہ تعالےٰ نے تمہارے لئے دو بہتر دن مقرر فرمائے ہیں ۔

یوم عید الاضحیٰ اور یوم عید الفطر ۔

ابو داؤد

(معارف الحدیث جلد ۳ : ۳۹۷)

عید قربان :

زید بن ارقم رض روایت فرماتے ہیں کہ صحابہ اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان قربانی سے متعلق یہ گفتگو ہوئی :

صحابہ رض :۔ یا رسول اللہ! ان قربانیوں کی حقیقت کیا ہے ؟

رسول اللہ ؐ :۔ اے لوگو ۔ یہ تمہارے عظیم باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے ۔

صحابہ رض :۔ یا رسول اللہ ۔ ان قربانیوں کا کیا اجر ہمیں ملے گا ۔

رسول اللہ ؐ : قربانی کے جانور کے ہر ہر بال کے بدلہ میں ایک نیکی ۔

صحابہ رض :۔ حضور ۔ کیا اون کا بدلہ بھی ملے گا ۔

رسول :۔ ہاں ! اُون والے جانور کا بدلہ بھی اسی طرح ملے گا ۔ اس کے ہر بال کے عوض ایک نیکی ۔ (احمد ۔ معارف الحدیث ۳ ، ۴۲۶)

صحابیؓ :- یارسول اللہ- کن جانوروں کی قربانی جائز نہیں ؟

رسول اللہؐ : (دستِ مبارک سے اشارہ کرتے ہوئے) چار -

ایک لنگڑا جانور، جس کا یہ نقص عیاں ہو -

دوسرا کانا - جس کی یہ خرابی ظاہر ہو -

تیسرا بیمار جانور -

چوتھا لاغر وکمزور- جس کی ہڈیاں بھی خشک ہوں -

(ابی داؤد -- معارف الحدیث ۳ : ۴۱۵)

بروایت براءؓ بن عازب

میت پر گریہ و زاری

حضرت عبداللہ بن عمر روایت فرماتے ہیں ، سعد بن عبادہ سخت بیمار پڑ گئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ، عبدالرحمان بن عوفؓ سعد بن ابی وقاص اور عبداللہ بن مسعود کو ساتھ لے کر عیادت کو گئے - آپ جب اندر تشریف لائے تو سعد کی حالت غیر تھی - تو پوچھا -

— کیا اللہ کو پیارے ہوگئے ؟

وہ لوگ :- نہیں حضورؐ ! ابھی زندہ ہیں -

حالت غیر دیکھ کر آپؐ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے - آپؐ کے رُخِ انور پہ گریہ کے آثار دیکھ کر اور لوگ بھی رونے لگے

آپؐ نے ایسے میں ارشاد فرمایا :

رسول اللہؐ : اے لوگو ! غور سے سنو، اللہ تعالیٰ آنکھ کے آنسو اور دل کے غم پر تو سزا نہیں دیتا - لیکن یہ زبان مستوجب سزا ہوسکتی ہے اور رحمت بھی یہ حقیقت ہے کہ اگر میت کے گھر والے گریہ زاری کریں تو اس کو عذاب ہوتا ہے -

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

رحمت و شفقت :

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضورؐ کے صاحبزادے ابراہیم جان کنی کی حالت میں تھے جب ہم (میں اور عبدالرحمان بن عوف) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گئے - ابراہیم کی یہ حالت دیکھ کر رسول اللہؐ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہوگئے -

عبدالرحمان بن عوف : (حضورؐ کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر تعجب سے) یا رسول اللہ ، آپ بھی --؟

رسول اللہؐ : اے ابن عوف :- یہ شفقت اور دردمندی ہے آنکھ نم ہے - دل مغموم ہے - لیکن زبان پر ہم وہی لائیں گے جسے اللہ پسند فرماتا ہے : (اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۝)

اے ابراہیم، ہم پر تمہاری جدائی بھاری ہے۔

(صحیح بخاری، صحیح مسلم)

تعزیت کا ایک خط: ۔ معاذؓ بن جبل کے بیٹے کے انتقال پر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ کے رسول محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جانب سے معاذ بن جبل کے نام

سلامٌ علیک :۔ بیشک تعریف کا سزاوار اللہ ہے۔ جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں میری دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تم کو اس صدمہ پر اجر عظیم عطا فرمائے اور تمھیں صبر دے۔ ہمیں توفیق دے کہ ہم اس کی نعمتوں کا شکر ادا کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری جانیں، ہمارے مال اور ہمارے اہل وعیال، سب اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہیں۔ اور امانتیں ہیں جنھیں اللہ تعالےٰ نے ہمارے سپرد فرمایا ہے جب تک اللہ کی مرضی تھی۔ تم اس سے شاداں اور جی بہلاتے رہے۔ اور جب اُس نے چاہا۔ اپنی امانت تم سے واپس لے لی، اللہ تعالےٰ تم کو اس کا بڑا اجر دے گا۔ اگر تم نے رضائے الٰہی اور ثواب کی نیت سے صبر کیا۔ تو اللہ تعالیٰ کی رحمت تم پر ہوگی۔ اور ہدایت نصیب ہوگی۔

پس اے معاذ صبر سے کام لو، کہیں ایسا نہ ہو کہ جزع فزع کر کے تم اس اجر عظیم کو ضائع کر دو۔ اور پھر تمھیں اس بات پر ندامت ہو یقین رکھو، جزع فزع سے کوئی مرنے والا واپس نہیں آیا۔۔ بلکہ اس سے رنج وغم بھی دور نہیں ہوتا۔ اللہ تعالےٰ جو حکم نازل فرماتے ہیں وہ ہو کر رہتا ہے وہ یقیناً ہو چکا۔ (ٹل نہیں سکتا) والسلام۔

(معجم کبیر طبرانی) / معارف الحدیث جلد ۳ : ۴۶۶

حضورؐ پر ایمان لانا۔ نجات کیلئے ضروری ہے

ایک صاحب : یا رسول اللہؐ۔ ایک نصرانی ہے جو انجیل کی تعلیمات پر عمل کرتا ہے اسی طرح ایک یہودی ہے جو توریت کے احکام پر چلتا ہے۔ اگرچہ وہ اللہ اور اللہ کے رسول پر ایمان لاتا ہے۔ مگر اس کے باوجود وہ آپ کے دین اور آپ کی شریعت پر عمل نہیں کرتا۔ ایسے شخص کے بارے میں آپ کا کیا فرمان ہے؟

رسول اللہؐ : یہودی ہو یا نصرانی۔ اگر اس کو میری دعوت پہنچ گئی اس کے بعد بھی اُس نے میری پیروی اختیار

نہیں کی تو وہ شخص دوزخ کا حصّہ ہے۔

(دار قطنی۔ بروایت عبداللہ بن مسعودؓ)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ

حضرت ابوہریرہ بیان کرتے ہیں، غزوۂ تبوک میں ہمارے پاس سامانِ رسد ختم ہوگیا۔ بھوک کے مارے ہم لوگوں کی جان پر بن آئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا۔

صحابہؓ: یا رسول اللہ! اجازت دیں کہ ہم باربردار اونٹوں کو ذبح کرلیں تاکہ اُن کا گوشت کھائیں اور اُن کی چربی بھی استعمال میں لائیں۔

رسول اللہؐ: اچھا تو ذبح کرلو۔

حضرت عمر: یا رسول اللہ! آپ نے اجازت دے دی۔ اس طرح سواریاں کم ہوجائیں گی، مناسب سمجھیں تو، لوگوں کو حکم دیں کہ جو کچھ بچا کھچا سامان خوراک کا اُن کے پاس ہو لے آئیں۔ آپؐ اللہ کے حضور دعا فرمائیں۔ ان شاء اللہ، اللہ پاک اس میں برکت دیں گے۔

رسول اللہؐ! ہاں، یہی مناسب ہے۔

اے لوگو! دسترخوان بچھادو۔ جو تھوڑا بہت (خوراک کا سامان) ہے اس پر لاکر ڈال دو۔

(دعا فرمانے کے بعد)

اے لوگو! (کھاؤ بھی) اور اپنے اپنے برتن بھرلو۔

(سب نے سیر ہوکر کھایا۔ برتن بھی بھرلیے، پھر بھی باقی بچ رہا)

رسول اللہؐ: (اس پر نگاہ ڈالتے ہوئے) میں شہادت دیتا ہوں کہ نہیں کوئی معبود مگر اللہ۔ اور میں اللہ کا رسول ہوں غور سے سُنو: جو شخص بھی شک و ریب کے بغیر کامل یقین اور پورے اذعان کے ساتھ۔ یہ دو گواہیاں دے گا۔ وہ سیدھا جنت میں داخل ہوگا۔ (صحیح مسلم)

لا الٰہ الا اللہ

عتبان بن مالک: (التجا کرتے ہوئے) یا رسول اللہ، بینائی کمزور پڑ گئی ہے میں اپنی قوم کو نماز پڑھاتا ہوں، میرے (مکان) اور میری قوم کے درمیان ایک نالہ پڑتا ہے۔ بارشوں کے موسم میں جب اس میں پانی آجاتا ہے۔ تو میں نماز پڑھانے کے لیے مسجد تک نہیں جاسکتا۔

یا رسول اللہ! میرا جی چاہتا ہے کہ آپ میرے گھر میں قدم رنجہ فرمائیں۔ میرے گھر میں کسی جگہ نماز پڑھ کر اُسے برکت دیں، تاکہ میں اُسی مقام کو مستقلاً نماز کے لیے خاص کرلوں۔

رسول اللہ ؐ: انشاء اللہ! میں ضرور آؤں گا۔

(دوسرے روز صبح کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ابوبکرؓ کے ساتھ وہاں جاتے ہیں)

رسول اللہ ؐ: عتبان کیا ہم اندر آسکتے ہیں؟

عتبانؓ: یارسول اللہ۔ میرے سر اور آنکھوں پر تشریف لائیے۔

رسول اللہ ؐ: عتبان، کس جگہ نماز ادا کی جائے؟

(حضورؐ نے اللہ اکبر فرما کر نماز شروع فرمادی، ہم آپؐ کے پیچھے صف میں کھڑے ہوگئے۔ رسالتمآبؐ نے دو رکعت ادا کرنے کے بعد سلام پھیرا، آپؐ کے سامنے حزیرہ رکھا گیا آپؐ کی آمد کی خبر سن کر دوسرے لوگ بھی دوڑے دوڑے آئے۔ ان میں سے کسی نے کہا)

ایک شخص: مالک بن دخشن کہاں؟

دوسرا شخص: اس کا ذکر نہ کرو، وہ تو منافق ہے، اُسے اللہ اور اللہ کے رسولؐ سے محبت نہیں۔

رسول اللہ: ایسا نہ کہو۔ وہ تو لا الٰہ الا اللہ کا قائل ہے اور اس سے اُس کا مقصود رضائے الٰہی ہے۔

وہی شخص: یارسول اللہ! اللہ اور اللہ کا رسولؐ ہی زیادہ جانتے ہیں۔ ہم نے تو ہمیشہ اس کا رُخ اور اس کی خیرخواہی منافقوں کی طرف دیکھی ہے۔

رسول اللہ ؐ: غور سے سنو۔ یقیناً اللہ تعالیٰ نے اس پر دوزخ کی آگ حرام کر دی ہے جس نے اخلاص کے ساتھ لا الٰہ الا اللہ پڑھا ہو۔ اس کا مقصد اس کار سے محض حصولِ رضائے الٰہی ہو:۔

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

وساوس

ایک آدمی: یارسول اللہ! کبھی کبھار دل میں ایسے ایسے فاسد خیالات آتے ہیں (کہ سوچتا ہوں) ان کو زبان پر لانے سے بہتر ہے کہ جل کر خاک سیاہ ہو جاؤں۔

رسول اللہ ؐ: شکر ہے اس ذات پاک کا جس نے اس کے معاملہ کو وسوسہ کی طرف لوٹا دیا ہے۔

(ابو داؤد بروایت حضرت ابن عباس)

صحابہؓ: یارسول اللہ! بعض اوقات ہم اپنے دلوں میں، ایسے فاسد خیالات اور وساوس پاتے ہیں کہ اُن کو زبان پر لانا۔ بہت ہی بُرا، اور بھاری معلوم ہوتا ہے۔

رسول اللہ ؐ: کیا واقعی۔ ایسی حالت سے دوچار ہو؟

صحابہؓ: یارسول اللہ بالکل ایسا ہی ہے۔

رسول اللہ ؐ: یہ تو خالص ایمان ہے۔ (صحیح مسلم بروایت حضرت ابوہریرہ)

رسول اللہ :۔ تم سے کسی کسی کے پاس شیطان کو آنے کا موقعہ ملتا ہے۔ تو وہ کہتا ہے کہ فلاں چیز کا خالق کون ہے؟
فلاں چیز کو کس نے پیدا کیا؟ یہاں تک کہہ اٹھتا ہے تیرے رب کو کس نے پیدا کیا؟
اگر سوالات کا سلسلہ یہاں تک دراز ہو جائے تو بندہ کو چاہیے کہ اللہ سے پناہ مانگے، اور سوچنا چھوڑ دے۔ (صحیح بخاری و مسلم بروایت ابوہریرہ)

رسول اللہؐ :۔ سنو! تم لوگوں میں فضول سوالات (وساوس) اور چون وچرا کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہے گا۔ نوبت یہاں تک پہنچے گی کہ یہ احمقانہ سوال بھی پیدا ہوگا، کہ اللہ ساری مخلوقات کا خالق ہے۔ تو پھر اللہ کو پیدا کرنے والا کون ہے؟
پس جس کسی کو یہ حالت پیش آئے،
تو وہ پڑھے: کہ اللہ پر اور اللہ کے رسولوں پر میرا ایمان ہے۔
(صحیح بخاری و صحیح مسلم۔ بروایت حضرت ابوہریرہ رض)

عذابِ قبر —— ایک تعلیمی مکالمہ

زید بن ثابتؓ انصاری بیان کرتے ہیں،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ ایک دن اپنے خچر پر سوار قبیلہ بنو نجار کے باغ میں سے گذرے۔ چلتے چلتے آپؐ کا خچر بدک اُٹھا۔ دیکھا تو وہاں پانچ چھ قبریں تھیں۔ حضورؐ نے فرمایا:

رسول اللہؐ : یہ کن لوگوں کی قبریں ہیں۔ کوئی اِن سے واقف ہے؟
ایک ساتھی : یارسول اللہؐ مجھے معلوم ہے۔
رسول اللہؐ : یہ کب مرے تھے؟
وہی ساتھی : یارسول اللہؐ زمانۂ شرک میں۔
رسول اللہؐ : (تو سنو)! ان لوگوں پر ان کی قبروں میں عذاب ہو رہا ہے۔ اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ تم لوگ اپنے مردوں کو دفن کرتے ہوئے گھبرا اُٹھو گے، تو میں اللہ پاک سے دعا کرتا کہ عذابِ قبر سے جتنا کچھ میں سن رہا ہوں، اُس کی معمولی سی جھلک تم بھی سن لیتے۔ (صحابہ سے مخاطب ہوتے ہوئے) دوزخ کے عذاب سے اللہ سے پناہ مانگو۔
صحابہؓ (بیک زبان) ہم دوزخ کے عذاب سے اللہ سے پناہ مانگتے ہیں۔
رسول اللہؐ : قبر کے عذاب سے اللہ کی پناہ مانگو۔


وزارة الحج والأوقاف
مكتبة مكة المكرمة

صحابہؓ : ہم قبر کے عذاب سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔
رسول اللہؐ : تمام فتنوں سے پناہ مانگو ظاہری فتنوں سے بھی اور باطنی فتنوں سے بھی۔
صحابہؓ : ہم ظاہری اور باطنی ہر قسم کے فتنوں سے پناہ مانگتے ہیں۔
رسول اللہؐ : دجال کے فتنے سے اللہ کی پناہ مانگو۔
صحابہؓ : ہم فتنۂ دجال سے بھی اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ (صحیح مسلم)

حیات بعد الموت

ابو رزین عقیلی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بات چیت

ابو رزین : یا رسول اللہؐ! اللہ تعالےٰ اپنی مخلوق کو دوبارہ کیسے زندہ کریں گے اس دنیا میں اس امر کی کیا علامت ہے؟

رسول اللہؐ : کبھی تمہارا گذر اپنی قوم کی وادی میں اس وقت ہوا ہے جبکہ زمین مردہ، سبزے سے خالی، خشک اور مٹی ہو۔ اور پھر کبھی تم نے دیکھا کہ یہی مردہ زمین جی اٹھی ہو، وہ ہری ہو۔ لہلہا رہی ہو۔

ابو رزین : یا رسول اللہؐ! ہاں۔

رسول اللہؐ : یہی ہے نشانی۔ اس کی مخلوق میں۔ اسی طرح اللہ مردوں کو زندہ کرے گا۔

ابو رزین ۔ بحوالہ معارف الحدیث ط : ۲۱۳

رویائے باری تعالےٰ عزاسمہٗ

صحابہ کرامؓ اور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان مکالمہ

صحابہؓ :۔ یا رسول اللہؐ! کیا قیامت کے روز باری تعالےٰ کا دیدار ہمیں نصیب ہوگا۔

رسول اللہؐ : دوپہر کا وقت ہو، مطلع صاف ہو۔ تو کیا تمہیں آفتاب کو دیکھنے میں کوئی دقت پیش آتی ہے؟

صحابہؓ :۔ یا رسول اللہ ہرگز نہیں؟

رسول اللہؐ : مطلع صاف ہو۔ چودھویں رات کا چاند چمک رہا ہو۔ تو اسے دیکھنے میں تمھیں کوئی امر مانع ہوتا ہے۔

صحابہؓ : نہیں، اے اللہ کے رسول؟

رسول اللہؐ : قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے جس طرح آفتاب و ماہتاب کو معمولی آنکھ سے دیکھتے ہو۔ نہ تم میں کوئی اختلاف و نزاع پیدا ہوتا ہے نہ کشمکش اسی طرح تمھیں اللہ پاک قیامت میں نظر آئیں گے۔

تو اے لوگو! غور سے سنو :

قیامت میں جب بندہ اللہ کے حضور پیش ہوگا تو رب العزت فرمائیں گے۔ اے فلاں۔

کیا میں نے تمھیں دنیا میں عزت نہیں بخشی تھی؟

کیا تمھیں اپنی قوم کا رئیس نہیں بنایا تھا؟

کیا تم کو بیوی (جیسی نعمت) عطا نہیں کی تھی؟
کیا تیرے لئے گھوڑے اونٹ مسخر نہیں کئے تھے؟
کیا تمھیں مہلت نہیں دی تھی کہ ریاست میں حکم چلائے اور مال غنیمت میں سے چوتھا وصول کرے؟

اور بندہ عرض کرے گا۔

ہاں۔ اے رب العزت۔ تو نے یہ سب کچھ مجھے عطا کیا تھا۔

پھر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے:۔

تو کیا تمہیں اس بات کا گمان تھا کہ تمھیں ایک دن میرے سامنے پیش ہونا ہے؟

بندہ عرض کرے گا:۔

رب العزت، مجھے یہ گمان نہیں تھا۔

پس باری تعالیٰ فرمائیں گے:

جس طرح تو نے مجھے بھلائے رکھا۔ آج اُسی طرح میں بھی تمھیں اپنے رحم وکرم سے دور رکھے دیتا ہوں۔

اسی طرح دوسرے بندے سے اور پھر تیسرے بندے سے باری تعالیٰ فرمائیں گے۔ تو بندہ عرض کرے گا:۔

باری تعالیٰ۔ میں تجھ پر ایمان لایا۔ تیری کتابوں پر اور تیرے رسولوں پر ایمان لایا۔ نمازیں ادا کیں، روزے رکھے صدقہ بھی دیا۔ اور اس کے علاوہ دوسری خوبیاں بھی گنوائے گا۔ اللہ پاک فرمائیں گے، ٹھہرو، ہم ابھی تجھ پر گواہ بلاتے ہیں۔ وہ بندہ جی ہی جی میں کہے گا۔ کون ہے آخر مجھ پر گواہی دینے والا؟ اس کے منہ پر مہر کر دی جائے گی۔ اور اس کی ران کو حکم دیا جائے گا کہ بول۔

اس پر اُس کی ران، اس کی ہڈیاں، اس کا گوشت، اس کے اعمال کی گواہی دیں گے۔

یہ صرف اس لئے ہوگا کہ بندہ کا عذر باقی نہ رہے۔

یہ شخص منافق (ثابت) ہوگا، (اس کی منافقت) اللہ تعالیٰ کی ناراضی کا سبب بنے گی۔

(صحیح مسلم)

زُہد اور ترک دنیا

ایک شخص: یا رسول اللہ، کوئی ایسا عمل بتلائیں جسے اگر میں کروں تو اللہ بھی مجھ سے محبت کرے اور اللہ کے بندے بھی

رسول اللہ ﷺ:۔ دنیا سے دل نہ لگاؤ۔ لوگوں کے مال و مرتبہ سے اعراض و بے رُخی اختیار کرو، تو لوگ تم سے محبت کریں گے۔

(ترمذی / ابن ماجہ / بروایت سہل بن سعد)

رسول اللہ ﷺ: ارشادِ ربانی ہے" فمن یرد اللّٰہ ان یھدیہ یشرح صدرہٗ للاسلام"

(پس جب اللہ تعالیٰ کسی کو ہدایت دینے کا قصد فرماتے ہیں تو اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتے ہیں) تو سنو! اس کا مطلب یہ ہے، کہ نور جب سینہ میں آتا ہے تو وہ سینہ کھل جاتا ہے۔

صحابہؓ : یا رسول اللہؐ، اس امر کی کوئی پہچان۔
رسول اللہؐ: (اے لوگو!) دنیا دھوکے کی ٹٹی ہے۔ اس سے طبیعت کا اکتا جانا اور ہٹ جانا۔
آخرت جو ابدی قیام گاہ ہے اس کی طرف دل کا میلان ہونا اور موت کی آمد سے قبل اس کی تیاری میں لگ جانا۔
(یہ تین باتیں اس امر کی پہچان ہیں)

(البیہقی بروایت ابن مسعودؓ)

رسول اللہ:۔ زہد کے معنی یہ ہرگز نہیں کہ بندہ حلال کو اپنے اوپر حرام کرے۔
مال و دولت کو ضائع کر دے۔
زہد کا اصل معیار اور تقاضا یہ ہے کہ
جو کچھ تمہارے پاس ہے اس پر کلی اعتماد نہ رکھو۔
زیادہ اعتماد اس پر رکھو جو اللہ کے پاس اور قبضہ میں ہے۔
جب تمہیں تکلیف اور ناگوار حالات سے سابقہ پڑے تو ایسی خواہش نہ کرو کہ کاش یہ بات تمھیں
پیش نہ آتی بلکہ تمہارے دل میں اُس اُخروی ثواب کی لگن ہو جو ان کے بدلے میں تمہیں عطا ہوگا۔
(ترمذی۔ بروایت ابوذر غفاریؓ / بحوالہ (معارف الحدیث جلد ۲)

دنیاوی لذّات کی حقیقت

حضرت عمر فاروقؓ بیان فرماتے ہیں، مَیں حضور سرورِ کونینؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپؐ اس وقت چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے جس پر صرف کھجور کے پتّوں سے بُنی ہوئی چٹائی پڑی ہوئی تھی۔ جس کے کھردرے پن کی وجہ سے سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے جسمِ مبارک پر نشان پڑ گئے تھے۔ سرہانے کھجور کی چھال سے بھرا ہو چمڑے کا تکیہ رکھا تھا۔ یہ حالت دیکھ میں نے عرض کیا۔
عمر فاروقؓ۔ یا رسول اللہ! اللہ کے حضور دعا فرمائیں کہ وہ آپ کی امت کو خوشحالی عطا فرمائے۔
روم اور فارس والے خدا پرست بھی نہیں۔ پھر بھی دنیا کے مزے لُوٹ رہے ہیں۔
رسول اللہؐ بولے اے ابنِ خطاب! کیا تم بھی انھیں رشک کی نگاہ سے دیکھتے ہو۔ یہ سب تو وہ لوگ ہیں کہ ان کو وہ لذتیں اس دنیا میں دی گئی ہیں۔
اے عمر! کیا تم اس پر راضی نہیں، کہ ان کے لئے محض اس دنیا کا عیش ہو اور ہمارے لئے آخرت کے (ابدی) مزے۔ (مسلم و بخاری)

رسول اللہؐ (ایک دوسرے موقعہ پر): اے لوگو! تین باتیں ایسی ہیں، جن پر میں قسم کھاتا ہوں۔ اس کے

علاوہ ایک بات اور ہے جسے تمہیں بتانا چاہتا ہوں تمہیں چاہیے کہ انہیں یاد رکھو۔
جن تین باتوں پر میں قسم کھاتا ہوں یہ ہیں :۔

۱۔ صدقہ دینے سے مال میں ہرگز کمی واقع نہیں ہوتی۔

۲۔ کسی بندہ پر جب ناجائز ظلم و ستم کیا جاتا ہے۔ اگر وہ صبر سے کام لے تو باری تعالے اُس کے درجات بلند فرماتے ہیں۔

۳۔ جو شخص (دنیا والوں کے آگے) دست سوال دراز کرتا ہے تو اللہ تعالے اُس پر فقر و محتاجی مسلط کر دیتا ہے۔

اس کے علاوہ میری یہ بات غور سے سنو، اور اسے یاد رکھو، دنیا میں چار قسم کے لوگ ہوتے ہیں:۔

- وہ جن کو اللہ تعالے نے مال سے نوازا۔ اور انھیں صحیح طریقے سے زندگی گزارنے کا علم بھی عطا کیا۔ یہ اپنا مال ناجائز خرچ نہیں کرتے۔ اس کے ذریعہ صلہ رحمی کرتے ہیں۔ جو کچھ خرچ کرتے ہیں محض اللہ کی خوشنودی کے لیے کرتے ہیں۔ یہ بلند ترین مرتبہ کے مالک ہیں۔
- دوسرے وہ جنھیں اللہ تعالے نے علم کی دولت سے نوازا ہے۔ لیکن وہ دنیاوی مال و دولت سے محروم ہیں — یہ نیک نیت بندے دل و زبان سے دعا کرتے ہیں۔ کاش، ہمیں اگر مال و دولت حاصل ہوتا، تو ہم بھی اللہ کے (نیک بندوں کی طرح) نیک کاموں میں خرچ کرتے۔ یہ بھی پہلوں کی مانند بلند مرتبہ پر فائز ہیں۔
- تیسرے وہ جن کے پاس مال و دولت تو ہے لیکن صحیح علم سے تہی دامن ہیں۔ یہ نادان، خوف خدا سے بے نیاز ہو کر اللہ کی نعمت کا بے جا اسراف کرتے ہیں۔ ناجائز طریقے سے مال لٹاتے ہیں۔ صلہ رحمی سے دور رہتے ہیں۔ ایسے لوگ۔ بدترین لوگ ہیں۔
- اور وہ لوگ بھی ہیں کہ نہ تو ان کے پاس دنیاوی مال ہے اور نہ علم۔ ان کی ہمیشہ یہی آرزو ہوتی ہے۔ کہ اے کاش ہمارے ہاتھ بھی اگر مال آجاتا، تو ہم بھی فلاں شخص (مصرف) کی طرح مزے اڑاتے۔ نیت ان کی بھی فاسد ہے۔ یہ بھی بدترین مخلوق ہیں۔

(ترمذی بروایت ابوکبشہ)
معارف الحدیث ۲۰

ایک اور موقع پر:۔

اگر تم کسی ایسے شخص کو دیکھو۔ جو مال و دولت، حسن و صورت میں تم سے بڑھا ہوا ہو۔ تو تمھیں چاہیے کہ ان بندوں پر نگاہ کرو۔ جو اس حیثیت میں تم سے کمتر ہیں (صحیح بخاری و مسلم)

جامع نصیحت

ایک صاحب: یا رسول اللہ! مجھے نصیحت کیجیے لیکن مختصر ہو،
رسول اللہؐ: اے شخص، غور سے سنو!
جب تم نماز ادا کرنے کا ارادہ کرو۔ تو تمھیں یہ خیال دل میں لانا چاہیے۔ کہ تم سب سے الوداع کہہ کر رخصت ہونے والے ہو۔ (خالق حقیقی سے ملنے والے ہو)۔
ایسا کوئی کلمہ زبان سے نہ نکالو جس کے لئے کل تمھیں معذرت کرنی پڑے۔ اور جس کے لئے جواب دہ ہونا پڑے۔ دوسرے لوگوں کے مال سے نہ تو سروکار رکھو اور نہ توقع (محض خدا سے توقع رکھو)

(مسند احمد)

کتابیات

۱۔ صحیح بخاری، ۶ جلد، ناشرانِ قرآن لمیٹڈ، لاہور
۲۔ صحیح مسلم۔ ” ، لاہور۔ مکتبہ رحمانیہ
۳۔ سیرۃؐ ابن ہشام ۲ جلد۔
۴۔ تاریخ طبری۔ جلد اول
۵۔ مشکوٰۃ شریف،
۶۔ ترجمان السنۃ۔ سید بدر عالم میرٹھیؒ
۷۔ معارف الحدیث۔ مولانا محمد منظور نعمانی
۸۔ سیرۃ سرورِ عالمؐ۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ
۹۔ رحمت للعالمینؐ ۳ جلد:۔ قاضی محمد سلیمان، سلمان منصور پوری۔
۱۰۔ محبوب کائناتؐ: عبدالحمید دہلوی۔
۱۱۔ مکالمات نبویؐ: ابویحییٰ امام خان نوشہروی۔
۱۲۔ نہج الفصاحت: سید نصیر الاجتہادی۔
۱۳۔ خاتونِ پاکستان: رسولؐ نمبر
۱۴۔ موطا امام مالک: اسلامی اکاڈمی لاہور
۱۵۔ بلاغ مبین: مولانا حفظ الرحمان سیوہاروی

کاتبانِ وحی صلی اللہ علیہ وسلم

ترجمہ: حافظ محمّد سعداللہ

۱۔ حضرت ابان بن سعید بن العاص بن امیّہ بن عبد شمس بن عبد مناف القرشی الاموی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

آپ کے دو بھائی عمرؓ اور خالدؓ آپ سے پہلے مسلمان ہو چکے تھے۔ ان کا اسلام لانا آپ کو ناگوار گزرا اور فرمایا:

الالیت میتا بالصریمۃ شاھد[1] لما یفتری فی الدین عمرو وخالد
اطاعا معًا امر النساء فاصبحا یعینان من اعدائنا من یکاید

[ترجمہ: کاش! عمرو اور خالد اپنے دین میں کمزور پڑنے سے پہلے کٹی ہوئی فصل کی طرح موت کی آغوش میں چلے گئے ہوتے۔

ان دونوں نے بیویوں کا کہا مانا اور ہمارے ان دشمنوں کے مددگار بن گئے جنہوں نے ہمیں تھکا دیا ہے]

جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مکہ بھیجا تو حضرت ابان نے آپ کو پناہ دی اور اپنے گھوڑے پر سوار کر کے آپ سے فرمایا:

اقبل وادبر ولا تخف احدا[2] آپ یہاں وہاں جہاں جانا چاہیں تشریف لے جائیں اور کسی سے خوف زدہ نہ ہوں۔
اس وقت مکہ مکرمہ میں بنو سعید بہت بڑے سردار ہیں۔ آپ حدیبیہ کے بعد جلد ہی اسلام لے آئے کیونکہ حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ آپ کے بارے میں روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو مدینہ سے نجد کی طرف ایک مہم پر روانہ کیا تھا اور آپ مع غنائم کے خیبر میں حضور کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے تھے اور ان غنائم کی تقسیم کے بارے میں عرض کیا تھا[3] اس وقت خیبر فتح ہو چکا تھا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ حدیبیہ اور خیبر کے درمیانی تین[4] ماہ کے عرصے میں اسلام لائے جب رسول اللہ نے ۹ھ میں[5] علاء بن الحضرمی کو بحرین سے معزول کیا تو ابان بن سعید کو بحرین کے خشکی اور سمندری تمام معاملات پر

---

[1] الاستیعاب ۱: ۴، اور اسد الغابہ ۱: ۳۵ میں لفظ الصریمۃ نقل ہوا اور الاصابہ ۱: ۱۳ میں الظربیہ نقل ہوا، جس سے مصرع کے معنی یہ ہوتے ہیں: کاش! تم کسی سخت تیز پتھر کے لگنے سے مر گئے ہوتے۔

[2] الاستیعاب ۱: ۷۵ اور الاصابہ میں ہے: اسبل واقبل یعنی آپ جہاں چاہیں جائیں اور جو کہنا چاہیں کہیں۔

[3] اسد الغابہ: ۳۶ [4] تاریخ خلیفہ بن خیاط: ۵۰ [5] سیر اعلام النبلاً ۱: ۱۸۹

عامل[1] مقرر فرمایا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک حضرت ابان بحرین کے عامل تھے۔ اس کے بعد حضرت ابان رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور شام کے محاذِ جنگ پر روانہ ہو گئے جہاں آپ شہید ہو گئے۔ بعض نے کہا ہے کہ آپ اجنادین ۱۳ھ ہجری میں شہید ہوئے اور بعض نے یرموک میں ۱۵ھ میں آپ کی شہادت بتائی ہے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ آپ کافی عرصہ بعد تک زندہ رہے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جو مصحف لکھوایا تھا اس کی عبارت حضرت ابان رضی اللہ عنہ نے لکھی تھی[2] مگر اس روایت پر علامہ ابنِ حجر نے جرح کی ہے اور کہا ہے کہ یہ روایت شاذ ہے اور اس میں نعیم بن حماد عن الدراوردی متفرد ہے۔ اور معروف یہ ہے کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ کے مصحف کی کتابت کرنے والے حضرت سعید بن سعید بن العاص ہیں جو کہ حضرت ابان بن سعید کے بھتیجے ہیں[3] اور حقیقتِ حال اللہ کو بہتر معلوم ہے۔ آپ کو عمر بن شبہ[4]، ابوبکر بن ابی شیبہ[5]، ابن عبدالبر[6]، ابن الاثیر[7]، ابن کثیر الدمشقی[8]، ابن سید الناس[9]، العراقی[10]، الانصاری[11]، المسعودی[12] اور ابن مسکویہ[13] نے حضرت نبی کریمؐ کے کاتبین میں شمار کیا ہے۔

۲۔ سیدنا حضرت ابو ایوب الانصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ

آپ کا اسمِ گرامی خالد بن زید بن کلیب بن ثعلبہ بن کعب النجاری تھا۔ آپ کی والدہ ماجدہ کا اسمِ مبارک ہند بنت سعید بن عمرو تھا۔ آپ بنی الحارث بن الخزرج سے تھیں[14]

حضرت ابو ایوب الانصاری سابقون الاوّلون میں سے تھے یعنی آپ سب سے پہلے اسلام لانے والوں میں سے تھے۔ آپ بیعت عقبہ ثانیہ میں موجود تھے۔ اس کے بعد غزواتِ بدر، اُحد اور خندق سمیت ان تمام غزوات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں واقع ہوئے[15]

ہجرت کے موقع پر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبا سے مدینہ کی طرف چلے تو بہت سے قبائل نے آپ کے ٹھہرانے کی تمنا ظاہر کی لیکن یہ سعادت سیدنا ابو ایوب کے لیے مقدر ہو چکی تھی۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ کے مکان کے قریب بیٹھ گئی اور آپ نے اونٹنی کا کجاوہ کھولا اور اٹھا کر گھر لے گئے۔

---

[1] الاستیعاب ۱ : ۷۵
[2] الاستیعاب ۱ : ۷۷، اسد الغابہ ۱ : ۳۷، المصباح المضئ ۱۸ : ۱
[3] الاصابہ ۱ : ۱۴
[4] المصباح المضئ ۱۸-۱
[5] البدایہ والنہایہ ۵ : ۳۴۰
[6] الاستیعاب ۱ : ۵۱
[7] الکامل ۲ : ۳۱۲
[8] البدایہ والنہایہ ۵ : ۳۴۰
[9] عیون الاثر ۲ : ۳۱۵
[10] العجالۃ السنیہ ۲۴۶
[11] المصباح المضئ ۱۸-۱
[12] التنبیہ والاشراف ۲۴۶
[13] تجارب الامم ۱ : ۲۹۱
[14] الاصابہ ۱ : ۴۰۵
[15] سیرت ابن ہشام ۱ ۴۹۶ - ۴۹۷

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابو ایوب انصاری کے گھر کے نچلے حصے میں ٹھہر گئے۔ حضرت ابوایوب نے مکان کے بالائی حصہ میں قیام فرمانے کے لیے عرض کیا تو آپ نے جواباً فرمایا مجھے اور میرے ملنے والوں کو اس میں آرام رہے گا کہ نیچے کے حصے میں ہوں۔[۱] حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ مکان کے بالائی حصے میں منتقل ہو گئے۔ اتفاقاً ایک دن حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ کا پانی سے بھرا ہوا ایک مٹکا ٹوٹ گیا اور آپ اور آپ کی زوجہ محترمہ رضی اللہ عنہما نے بہت کوشش کر کے پانی کو نیچے ٹپکنے سے اس لیے روکے رکھا کہ کہیں یہ پانی حضور پر جا نہ پڑے۔ اس کے بعد حضرت ابوایوب نے یہ واقعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم بالائی حصے میں منتقل ہونے پر رضامند ہو گئے۔[۲]

حضرت علی کرم اللہ وجہہ جب عراق جانے لگے تو حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کو مدینہ میں اپنا قائم مقام بنا گئے، بعد میں حضرت ابوایوب عراق میں حضرت علی کے پاس آ گئے اور خوارج کی جنگ میں حضرت علیؓ کی طرف سے حصہ لیا۔ اس کے بعد پوری زندگی جہاد فی سبیل اللہ کے لیے وقف کر دی اور معرکۂ قسطنطنیہ میں شہید ہوئے۔[۳]

جب آپ کے وصال کا وقت قریب آیا تو یزید بن معاویہ جو اسلامی لشکر کا اس وقت کماندار تھا عیادت کے لیے حاضر ہوئے اور آپ سے آپ کی خواہش پوچھی، آپ نے فرمایا، جب میں مرجاؤں تو میری میت کو کوشش کر کے دشمن کی سرزمین میں آگے لے جا کر دفن کر دینا۔ جب آپ کا انتقال ہوا تو یزید نے ایک دستہ تیار کیا جس کی نگرانی میں آپ کو قسطنطنیہ کے قریب لے جا کر دفن کر دیا گیا۔[۴]

آپ کو الیعمریؒ[۵]، العراقیؒ[۶]، ابنِ سید الناسؒ[۷] اور الانصاریؒ[۸] نے کاتبینِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں شمار کیا ہے۔

۳۔ سیدنا ابوبکر الصدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ

افضل الامت خلیفۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم غارِ ثور کے ساتھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے وفا شعار دوست نہایت مشفق محب اور بڑے زیرک وزیر سیدنا عبداللہ بن ابی قحافہ عثمان القرشی التیمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ[۹] ہجرت سے پچاس برس قبل پیدا ہوئے[۱۰] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی محبت کی وجہ سے مجھ پر سب سے

---

[۱] سیرت ابن ہشام ۱/۴۹۸، الاستیعاب ۱/۴۰۴، الاصابہ ۱/۴۰۵

[۲] الاصابہ ۱/۴۰۵، اسد الغابہ ۲/۸۱

[۳] الاستیعاب ۱/۴۰۴، الاصابہ ۱/۴۰۵

[۴] الاصابہ ۱/۴۰۵

[۵] اسد الغابہ ۵/۱۴۳

[۶] العجالۃ السنیہ والفیۃ العراقی ۲۴۶

[۷] شرح الفیۃ العراقی ۲۴۶

[۸] عیون الاثر ۲/۳۱۶

[۹] المصباح المضیٔ ۲۱ - أ

[۱۰] الکلام مقتبس من تذکرۃ الحفاظ للذہبی ۱/۲

[۱۱] تذکرۃ الحفاظ ۱/۵

زیادہ احسان کرنے والے ہیں۔ اگر میں اپنے رب کے سوا کسی اور کو خلیل بناتا تو یقیناً ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بناتا۔ البتہ ان کے ساتھ اسلامی اخوت و محبت کا رشتہ ہے۔ سیدنا ابوبکرؓ کے دروازے کے سوا باقی تمام صحابہ کے مسجد والے دروازے بند کر دئے جائیں۔[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

> ابوبکر صدیقؓ کے سوا کسی کا ایسا احسان نہیں جو ہم نے چکا نہ دیا ہو، البتہ صدیق کے احسان کا بدلہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ادا کرے گا۔[2]

جناب ابوبکرؓ کو کاتبینِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ابن شبہؒ[3]، المزیؒ[4]، ابن کثیرؒ[5]، ابن سید الناسؒ[6]، العراقیؒ[7] اور الانصاریؒ[8] نے شمار کیا ہے۔ بقول علی بن حسین علی الاحمدی' جرجی زیدان مسیحی نے لکھا ہے کہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ لکھنا نہ جانتے تھے۔ اور اس نے صدر اسلام میں مکہ میں کتابت جاننے والوں میں آپ کا نام درج نہیں کیا۔

جرجی زیدان لکھتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ہی سے بہت سی غلط باتیں آپ کی طرف منسوب کر دی گئیں۔ اور سرداروں کے حواریوں نے اپنے سرداروں کے بارے میں ایسے ایسے دعوے شروع کر دئے جو خود ان سرداروں نے اپنے بارے میں نہیں کیے تھے نہ ان کے وہم و گمان میں اس طرح کی باتیں کبھی آئی تھیں۔ مثلاً یہ دعویٰ کرنا کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ لکھنا جانتے تھے۔ علی الاحمدی نے اس پر کوئی علمی بحث نہیں کی بلکہ اس کے بیان سے صرف خلفائے راشدین کے اور دیگر صحابہ کے ساتھ اس کا روایتی بغض ظاہر ہوتا ہے۔

ہم جرجی زیدان کی بات کس طرح مان لیں جبکہ وہ تاریخ اسلامی کے بیان میں اپنے مذہبی تعصب کی بنا پر بد دیانتی کا مرتکب ثابت ہو چکا ہے اور صلیبی مرکز کا اہم ترین رکن رہا ہے اور اس کے برعکس عمر بن شبہ ایک مسلم مورخ جو اس سے گیارہ صدیاں قبل ہوا ہے اس کی بات کو ہم کس طرح رد کر دیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس نے یہ روایت واقدی سے بحوالہ البلاذری کی فتوح البلدان[9] نقل کی ہے۔ لیکن اس روایت میں تو زمانۂ جاہلیت اور صدر اسلام میں بعض ان کتابت جاننے والوں کے نام گنوائے گئے ہیں جو لکھنا سکھاتے تھے۔ اس روایت میں نہ تو واقدی نے تمام اہلِ مکہ اور تمام اہلِ عرب کے لکھنے والوں کا احصاء کیا ہے اور نہ ہی بلاذری نے، تو پھر اس سے یہ کیسے ثابت ہو گیا کہ سیدنا صدیق لکھنا نہ جانتے تھے۔ البتہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ نے بہت کم لکھا۔ لیکن اس استدلال سے یہ ثابت کرنا کہ آپ لکھنا جانتے ہی نہ تھے۔ ایک امرِ واقع کے خلاف ہے۔ سراقہ بن مالک کی روایت

---

[1] بخاری، فضائل صحابہ مسلم، فضائل صحابہ ۲

[2] فتح الباری ۷/ ۱۳ نقلاً عن سنن الترمذی

[3] الروض الانف ۲/ ۲۴۰ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بعض اوقات ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم نے بھی لکھا ہے۔

[4] تہذیب الکمال ۴۰ ب

[5] البدایہ والنہایہ ۳۵۱

[6] عیون الاثر ۲/ ۳۱۵

[7] شرح الفیہ العراقی ۲۲۵

[8] المصباح المضئ ۸ ب

[9] فتوح البلدان ۵۸۰

سے بھی حضرت صدیقِ اکبرؓ کے لکھنے کی تصدیق ہوتی ہے، جسے زہری نے عبدالرحمٰن بن مالک بن جعشم سے، اس نے اپنے والد سے، اور اس نے سراقہ بن مالک سے روایت کیا ہے کہ جس وقت سیدنا صدیق رضی اللہ عنہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے موقع پر غار سے نکل کر چلے اور سراقہ کی زمینوں کے پاس سے گزرے اور سراقہ آپ کے پاس پہنچ گیا اور اس کے گھوڑے کے دھنس جانے کا واقعہ پیش آیا تو اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مکتوبِ امان کی درخواست کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کو لکھنے کا حکم دیا اور آپ نے اس کے لیے ایک امان نامہ لکھا اور اس کے حوالہ کر دیا[1]

اور مسند امام احمدؒ میں یہ جو وارد ہوا ہے کہ وہ امان نامہ عامر بن فہیرہ نے لکھا تھا۔ ابنِ کثیر نے ان دونوں روایتوں میں اس طرح تطبیق کی ہے کہ امان نامہ کا کچھ حصہ حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے لکھا اور کچھ حصہ آپ کے غلام عامر نے لکھا[3] واللہ اعلم بالصواب۔

امام بخاریؒ کی روایت میں کئی مرتبہ اور دیگر کتبِ سنت میں بھی کئی مرتبہ حضرت انس بن مالک کا یہ قول وارد ہوا ہے کہ سیدنا صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے آپ کو احکامِ زکوٰۃ جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے نافذ فرمائے لکھ کر دیے[4] یہ ٹھیک ہے کہ بعض دفعہ لفظ کَتَبَ بمعنی املا یعنی لکھوانا کے معنی میں بھی آیا ہے لیکن جب تک کوئی ضروری وجہ نہ ہو اور اصل مراد لیا جا سکتا ہو تو مجاز مراد لینا جائز نہیں۔

ان دلائل کی موجودگی میں ہم یقین سے جانتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ لکھنا جانتے تھے اور آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر لکھا جیسا کہ کتبِ مغازی اور سیر میں وارد ہوا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

۴۔ حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ

آپ کا پورا نام صخر بن حرب بن امیہ بن عبد شمس بن عبد مناف القرشی الاموی تھا۔ آپ کی عمر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دس برس زیادہ تھی[5] آپ مؤلفۃ القلوب[6] میں سے تھے۔ آپ فتح مکہ کے بعد اسلام لائے اور جس طرح پہلے اسلام دشمن سرگرمیوں میں سرگرم تھے اسی طرح اب اسلام کی نصرت میں سرگرم ہو گئے[7] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن فرمایا تھا کہ جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے اسے بھی امان ہے[8] آپ نے اسلامی جنگوں میں سے حنین و طائف اور یرموک میں

---

[1] البدایہ والنہایہ ۵ : ۲۵۱ ، الوثائق السیاسیہ ص ۳۶

[2] مسند احمد ابن حنبل ۴ : ۱۷۶

[3] البدایہ والنہایہ ۵ : ۲۵۱

[4] بخاری کتاب الزکوٰۃ ۳۳ - ۳۷

[5] الاصابہ ۲ ۱۷۹

[6] جو لوگ کسی مالی یا معاشرتی احسان سے ترغیب پاکر مسلمان ہو جائیں۔ تاریخ خلیفہ ۱ : ۶۰ ، الاصابہ ۲ : ۱۷۹

[7] اسد الغابہ ۵ : ۲۱۶

[8] سیرت ابنِ ہشام ۲ : ۳۰۴ ، الاصابہ ۲ : ۱۷۹

حصہ لیا۔ آپ کی ایک آنکھ بھی ان جنگوں میں ضائع ہوگئی۔ جنگِ یرموک کے دن کا ایک واقعہ ابنِ سعد نے صحیح سند سے روایت کیا ہے، کہ اس دن تمام لوگوں کی آواز جنگ کے ہنگاموں میں دب گئی تھی مگر ایک آواز "اے اللہ کی مدد قریب آ" بہت بلند تھی اور وہ آواز حضرت ابوسفیان کی تھی[1] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو نجران کا عامل مقرر فرمایا تھا[2]

واقدی نے کہا ہے کہ ہمارے رواۃ نے اس بات کا انکار کیا ہے کیونکہ اس وقت نجران کے عامل عمرو بن حزم تھے[3]

حضرت ابوسفیان زمانۂ جاہلیت سے ہی لکھنا جانتے تھے۔ واقدی نے آپ کو مکہ کے زمانۂ جاہلیت میں لکھنے والوں میں شمار کیا ہے[4]

آپ کو کاتبینِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں العراقی[5]، ابن سید الناس[6]، ابن مسکویہ[7] اور الانصاری[8] نے شمار کیا ہے۔

آپ کی وفات حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے دوران میں ہوئی، اس وقت آپ کی عمر ۹۰ برس کے لگ بھگ تھی۔ بعض نے آپ کی وفات میں اختلاف کیا ہے۔ بعض نے کہا ہے آپ کا ۳۰ھ ہجری میں انتقال ہوا، بعض نے کہا ہے کہ ۳۱ھ میں، جبکہ کچھ نے ۳۴ھ کی روایت کی ہے[9]

۵۔ حضرت ابوسلمۃ عبداللہ بن عبدالاسد رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت ابوسلمۃ زیادہ تر اپنی کنیت سے ہی پہچانے جاتے ہیں۔ لیکن پورا اسمِ گرامی عبداللہ بن عبدالاسد بن ہلال بن عبداللہ بن مخزوم المخزومی ہے[10] آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رضاعی بھائی تھے[11] ابنِ اسحاق کی روایت کے مطابق آپ گیارہویں مسلمان تھے[12] اس لیے آپ سابقون الاولون میں شمار کیے جاتے ہیں۔ آپ کی شادی حضرت ام سلمۃ رضی اللہ عنہا سے ہوئی۔ پھر آپؓ کی وفات کے بعد حضرت ام سلمہ کو اللہ تعالیٰ نے ام المومنین ہونے کے شرف سے نوازا[13]

مصعب الزبیری کی روایت کے مطابق حضرت عبداللہ بن الاسد نے سب سے پہلے حبشہ کی طرف ہجرت کی[14]

ابنِ مندہ نے بھی یہی روایت کی ہے کہ حضرت عبداللہ بن الاسد نے اپنے ہووج اور سازوسامان سمیت سب سے پہلے

---

[1] الاصابہ ۲ : ۷۹
[2] الاستیعاب ۲ : ۱۹۰، الاصابہ ۲ : ۱۷۹
[3] تاریخ خلیفہ ۱ : ۷۳
[4] فتوح البلدان ۵۸۰
[5] شرح الفیہ العراق ۲۴۶
[6] عیون الاثر ۲ : ۳۱۶
[7] تجارب الامم ۱ : ۲۹۱
[8] المصباح المضئ ۲۵-۲۸ أ
[9] الاستیعاب ۲ : ۱۹۱، الاصابہ ۲ : ۱۸۰
[10] الاصابہ ۲ : ۳۳۵
[11] اسد الغابہ ۳ : ۱۹۵
[12] سیرۃ ابن ہشام ۱ : ۲۵۲
[13] الاصابہ ۲ : ۳۳۵
[14] الاستیعاب ۲ : ۳۳۸

حبشہ کی طرف ہجرت کی اور بعدہ سب سے پہلے مدینہ کی طرف بھی آپ نے ہی ہجرت کی۔[۱]

ابونعیم نے روایت کی ہے کہ حضرت ابوسلمہؓ نے بیعت عقبہ سے قبل مدینہ کی طرف ہجرت کی اور حضرت ام سلمہؓ آپ کے ہمراہ تھیں۔[۲] لیکن مشہور یہ ہے کہ حضرت ام سلمہ نے آپ کے ساتھ ہجرت نہیں کی بلکہ بعد میں ہجرت کی۔

آپ غزوۂ بدر اور احد میں شامل تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو غزوۃ العشیرہ پر جاتے ہوئے ۲ھ میں مدینہ میں اپنا قایم مقام مقرر فرمایا تھا۔[۳]

ابن ابی عاصم نے حدیث ابن عباسؓ کے شروع میں یہ روایت نقل کی ہے کہ قیامت کے دن دائیں ہاتھ میں اعمالنامے وصول کرنے والوں میں حضرت ابوسلمہؓ سب سے پہلے شخص ہوں گے۔

آپ کی وفات غزوۂ اُحد میں لگے ہوئے زخموں سے جانبر نہ ہوسکنے کی وجہ سے ۴ھ میں ہوئی۔[۴]

آپ کاتبینِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے تھے۔ آپ کا ذکر کاتبین میں ابنِ مسکویہؒ، ابومحمد الدمیاطیؒ، العراقیؒ، ابن سیدالناسؒ، الیعمریؒ اور الانصاریؒ نے کیا ہے۔

۶۔ حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ

اسمِ گرامی اُبی بن کعب بن قیس بن زید بن معاویہ بن عمرو الانصاری النجاری تھا۔ آپ کی کنیت ابو المنذر اور ابو الطفیل تھی۔

آپ بیعتِ عقبۂ ثانیہ میں شریک تھے۔ آپ نے غزوۂ بدر اور باقی تمام غزوات میں حصہ لیا۔ آپ کا شمار فقیہ اور قاری صحابہ کرام میں ہوتا ہے۔ بلکہ آپ کو سیّد القرأ بھی کہا جاتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپؓ سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ تم کو قرآن سناؤں۔ حضرت ابی بن کعبؓ نے عرض کی: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کیا اللہ تعالیٰ نے میرا نام آپ کو بتایا ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں۔ تب حضرت ابی بن کعب فرطِ مسرت سے رونے لگے۔[۱۱]

حضرت ابی بن کعب نبی کریمؐ کے معروف کاتبین اور قرأ میں سے تھے۔

---

[۱] اسد الغابہ ۳: ۱۹۶
[۲] اسد الغابہ
[۳] تجارب الامم ۱: ۲۹۱
[۴] شرح الفیۃ العراقی ۲۴۶
[۵] العجالۃ السنیہ شرح الفیۃ العراقی ۲۴۶
[۶] اسد الغابہ
[۷] الاصابہ ۲: ۳۳۵
[۸] المصباح المضئ ۳۴ ب
[۹] عیون الاثر ۲: ۳۱۶
[۱۰] المصباح المضئ ۳۴۔أ
[۱۱] بخاری، تفسیر لم یکن ۲:

واقدی نے اپنے شیوخ سے روایت کی ہے کہ مدینہ میں سب سے پہلے آپؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے لکھا[1] آپ کا ذکر بطور کاتبِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم عمر بن شبہ[2]، الطبری[3]، ابنِ مسکویہ[4]، الیعقوبی[5]، الجہشیاری[6]، ابن الاثیر[7]، العراقی[8]، المزی[9]، ابن کثیر[10] اور الانصاری[11] نے کیا ہے۔

ابنِ خیثمہ کی روایت ہے کہ آپ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھ کر وحی لکھنے والوں میں سے سب سے اوّل ہیں[12]

ابنِ اثیر کی روایت کے مطابق ابی بن کعب رسول اللہؐ کے سب سے پہلے کاتب ہیں[13] ابنِ سیدالناس کی روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ تشریف لانے کے بعد انصار میں سے ابی بن کعب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے پہلے کاتب ہیں[14]۔ روایت مذکورہ سے طبری کی اس روایت کی تائید ہوتی ہے جس میں آیا ہے کہ حضرت علی اور حضرت عثمان وحی کی کتابت کرتے تھے۔ لیکن اگر بامرِ مجبوری وہ موجود نہ ہوتے تو اس صورت میں حضرت ابی بن کعب اور زید بن ثابت وحی لکھا کرتے تھے[15]

اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ مہاجرین کتابت کی مہارت میں اپنی نظیر آپ تھے۔ کیونکہ اگر بوقتِ ضرورت ان میں سے کوئی نہ ہوتا تب دوسروں کو لکھنے کی اجازت ہوتی تھی۔ اور حقیقتِ حال یہ ہے کہ انصار میں سے حضرت ابی بن کعب سب سے پہلے کاتبِ وحی ہیں۔ رہا یہ قول کہ آپ سب سے پہلے کاتبِ وحی ہیں، تو مکہ میں بھی قرآن نازل ہوتا رہا جب کہ ابی بن کعبؓ وہاں موجود نہ تھے۔ لہٰذا اس قول کا اطلاق جائز نہ ہوگا کہ ابی بن کعب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سب سے پہلے وحی لکھی۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ قرآن کے آخری حصہ کی کتابت آپ نے سب سے پہلے کی ہے اور اس کے بعد بعض دوسرے اصحاب نے[16]۔

ڈاکٹر حمید اللہ نے "الوثائق السیاسیہ" میں کئی ایک ایسے مکاتیب کا ذکر کیا ہے جن میں کاتب کا نام ابی بن کعب درج ہے۔ مثال کے طور پر وثیقہ نمبر ۶۳، ۶۴، ۷۶، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۴، ۱۶۳، ۱۷۴، ۲۰۶،

---

[1] المصباح المضئ ۱۸

[2] المصباح المضئ ۸-ب

[3] تاریخ الطبری ۲ : ۱۷۹

[4] تجارب الامم ۱ : ۲۹۱

[5] تاریخ الیعقوبی ۲ : ۸۰

[6] الوزراء والکتاب ۱۲

[7] اسد الغابہ ۱ : ۵۰

[8] شرح الفیۃ العراقی ۲۴۵

[9] تہذیب الکمال ۵ : ۲۴۰

[10] البدایہ والنہایہ ۵ : ۲۴۰

[11] المصباح المضئ ۱۸-أ

[12] البدایہ والنہایہ ۵ : ۳۴۱

[13] الکامل ۲ : ۱۳

[14] عیون الاثر ۲ : ۳۱۵

[15] تاریخ الطبری ۶ : ۱۷۹، تجارب الامم لابن مسکویہ ۱ : ۲۹۱

[16] الاصابہ ۱ : ۱۹، الاستیعاب ۱ : ۵۰-۵۱ نقلاً عن الواقدی۔

۲۴۴ھ[1]

مورخین میں آپ کی تاریخ وفات پر اختلاف ہے۔ ابن معین کے مطابق آپ کی وفات ۱۹؍۲۰ھ میں ہوئی۔ بعض روایات سے پتا چلتا ہے کہ آپ کی وفات شہادتِ عثمان رضی اللہ عنہ سے چند روز قبل بروز جمعہ ہوئی[2] واقدی نے بعض دوسرے ذرائع سے روایت کیا ہے کہ آپ ۲۲ھ میں فوت ہوئے۔ اور بعض دوسرے مورخین کا کہنا ہے کہ آپ کی وفات ۳۵ھ میں ہوئی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

۷۔ حضرت ارقم بن ابی الارقم عبد مناف بن اسد المخزومی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

آپؓ ساتویں اسلام لانے والے تھے۔ اور بعض نے کہا ہے آپ گیارھویں اسلام لانے والے تھے۔

آپؓ کا گھر دامنِ کوہِ صفا میں مرکزِ دعوتِ اسلام تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپؓ کے گھر میں مسلمانوں سے ملا کرتے تھے۔ آپ یہیں سے اسلام کی دعوت خفیہ طور پر دیتے رہتے، یہاں تک کہ مسلمانوں کی تعداد چالیس ہوگئی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مسلمانوں کے اس خفیہ محفوظ اڈے میں سب سے آخری مسلمان ہونے والے تھے۔ اس کے بعد مسلمانوں نے دعوت کا کام اعلانیہ کرنا شروع کر دیا۔

حضرت ارقم پہلے پہلے ہجرت کرنے والوں میں سے تھے۔ آپ نے جنگِ بدر میں حصہ لیا اور غنائم میں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو ایک تلوار حصہ سے زیادہ عطا کی[3] آپ نے تمام غزوات میں بھرپور حصہ لیا[4]۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو صدقات جمع کرنے پر مامور فرمایا[5]۔ مدینہ طیبہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو ایک حویلی بھی عطا فرمائی تھی[6]۔

آپ کا اسمِ گرامی کاتبینِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ابن کثیر[7]، العراقی[8]، الانصاری[9] اور ابن سید الناس[10] نے شمار کیا ہے۔

ابنِ کثیر نے لکھا ہے کہ حضرت ارقم رضی اللہ عنہ نے عظیم ابن الحارث المحاربی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ایک بہت بڑی جاگیر لکھ کر دی[11]۔

---

[1] الوثائق السیاسیہ : ڈاکٹر محمد حمید اللہ
[2] الاصابہ ۱ : ۱۹-۲۰
[3] اسد الغابہ ۱ : ۶۰ ، العقد الثمین ۳ : ۲۸۱
[4] الاصابہ ۱ : ۲۸۰
[5] اسد الغابہ ۱ : ۶۰
[6] الاصابہ ۱ : ۲۸
[7] البدایہ والنہایہ ۱ : ۶۰
[8] العجالۃ السنیہ شرح الفیہ : ۲۴۷
[9] المصباح المضئ : ۱۸ ب
[10] عیون الاثر ۲ : ۳۱۶
[11] البدایہ والنہایہ ۵ : ۳۴۱

ڈاکٹر حمید اللہ کے "الوثائق السیاسیہ" میں وثیقہ نمبر ۸۴، ۸۸، ۱۷۶، ۲۱۲ پر حضرت ارقم رضی اللہ عنہ کے دستخط بحیثیت تحریر کنندہ موجود ہیں۔

آپ کی تاریخ وفات میں اختلاف ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ آپ کی اور سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہما کی وفات ایک ہی روز ہوئی۔ اور بعض نے کہا ہے کہ آپ ۵۵ھ میں فوت ہوئے جبکہ آپ کی عمر ۸۰ برس سے تجاوز کر چکی تھی اور آپ کی وصیت کے مطابق آپ کی نمازِ جنازہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے پڑھائی۔[1]

۸۔ حضرت بریدہ بن الحصیب بن عبداللہ بن الحارث الاسلمی رضی اللہ عنہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب بوقتِ ہجرت حضرت بریدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس سے گزرے تو آپؓ بمقام الغمیم اسلام لائے۔[2] آپ نے غزوۂ احد کے بعد مدینہ کی طرف ہجرت کی[3] اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں تقریباً سولہ غزوات میں حصہ لیا۔[4] آپ مدینہ سے بصرہ تشریف لے گئے تھے اور وہاں ایک مکان بنا لیا تھا مگر پھر بغرضِ جہاد وہاں سے نکل کھڑے ہوئے اور آخر زندگی میں مرو میں قیام فرمایا وہیں آپ کی وفات ہوگئی اور وہیں آپ دفن ہوئے۔ کاتبینِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ضمن میں آپؓ کا شمار ابنِ سید الناس[5]، العراقی[6] اور الانصاریؒ[7] نے کیا ہے۔

بلال بن سراج بن مجاعۃ نے اپنے والد سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے والد کو یمن میں ایک جاگیر عطا کی تھی اور اس عطا یا ہبہ کی تحریر حضرت بریدہ نے یہ لکھی:

"محمد رسول اللہ کی طرف سے مجاعۃ بن مرارہ جو بنی سلم سے ہے کے لیے کہ میں تم کو ایک سرحدی زمین دیتا ہوں جو کوئی تم سے اس معاملہ میں جھگڑا کرے اسے چاہیے کہ میرے پاس آئے۔"

اس کو بریدہ نے لکھا۔[8]

۹۔ حضرت ثابت بن قیس بن شماس بن زہیر الانصاری الخزرجی رضی اللہ عنہ

حضرت ثابت بن قیس انصار اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خطیب تھے۔ جس طرح کہ حضرت حسان بن ثابتؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شاعر تھے۔[9] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو حضرت ثابت نے خطبہ دیا اور فرمایا ہم دشمن سے آپ کی اس طرح حفاظت کریں گے جس طرح اپنی جان اور اپنی اولاد کی کرتے ہیں لیکن اس کے

---

[1] اسد الغابہ ۱ : ۶۰، العقد الثمین ۳ : ۲۸۱، الاصابہ ۱ : ۲۸
[2] اسد الغابہ ۱ : ۱۷۵
[3] اسد الغابہ ۱ : ۱۷۵
[4] الاصابہ ۱ : ۱۴۶
[5] عیون الاثر ۲ : ۳۱۶
[6] العجالۃ السنیہ شرح الفیہ العراقی ۲۴۶
[7] المصباح المضئ ۱۸ ب
[8] المصباح المضئ ۱۸ : ۱
[9] اسد الغابہ ۱ : ۲۲۹

بدلے میں کیا ملے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جنت۔ تمام مجمع نے بیک زبان کہا ہم اس پر خوش ہیں[۱]۔ سب سے پہلے غزوۂ احد میں شمولیت کی۔ اس کے بعد تقریباً تمام غزوات میں شامل رہے[۲]۔

ایک مرتبہ حضرت ثابتؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت سے غیر حاضر تھے۔ آپ نے فرمایا کہ ثابتؓ کے بارے میں مجھے کون بتائے گا، تو ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم! میں معلوم کر کے آتا ہوں۔ چنانچہ وہ شخص حضرت ثابت کے گھر پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ آپؓ سر جھکائے بیٹھے ہیں۔ اس نے دریافت کیا: کیا بات ہے؟ تو حضرت ثابتؓ نے جواب دیا کہ میں مصیبت میں پڑ گیا ہوں، برباد ہو گیا ہوں، میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اونچی آواز سے گفتگو کی ہے اور میرے تمام اعمال ضائع ہو گئے ہیں اور میں اہلِ دوزخ میں سے ہو گیا ہوں۔ وہ شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور حضرت ثابت کا قصہ اور آپ کی حالت بیان کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جاؤ اور اسؓ سے کہو کہ تو اہلِ دوزخ میں سے نہیں بلکہ اہلِ جنت میں سے ہے"[۳]۔

آپؓ کا ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتبین میں ابنِ سعدؒ[۴]، المزیؒ[۵]، ابنِ کثیرؒ[۶]، العراقیؒ[۷]، ابنِ سید الناسؒ[۸] اور الانصاریؒ[۹] نے کیا ہے۔

ڈاکٹر حمید اللہ نے "الوثائق السیاسیہ" میں وثیقہ نمبر ۱۵۱ میں تحریر کنندہ کا نام قیس بن شماس الرویانی لکھا ہے۔ لیکن صحابہ کرام میں اس نام کا کوئی شخص نہیں ہوا، شاید یہ ثابت بن قیس بن شماس ہوگا۔ آپ جنگِ یمامہ میں ۱۱ھ میں شہید ہوئے۔ آپؓ کی شہادت کے بعد ایک شخص نے خواب میں آپ سے آپ کے ساز و سامان کے بارے میں وصیت سنی، پھر اس شخص نے یہ خواب حضرت خالدؓ بن ولید اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کو سنایا۔ تو آپؓ نے اس خواب کی وصیت کو جائز قرار دیا[۱۰]۔

۱۰۔ حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ

بیہقی کی ابنِ اسحاق والی روایت کے سوا میں نے کاتبینِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں جعفر رضی اللہ عنہ کا نام کسی کو ذکر کرتے نہیں پایا[۱۱]۔ مزید برآں یہ کہ میرے نزدیک یہ شخصیت بھی غیر واضح ہے کیونکہ اس نام کے متعدد صحابہ کرام تھے۔ شاید

۱؎ الاصابہ ۱: ۱۹۵ ۲؎ اسد الغابہ ۱: ۲۲۹، الاصابہ ۱: ۱۹۵

۳؎ الاستیعاب ۱: ۱۹۳-۱۹۴، اسد الغابہ ۱: ۲۲۹، الاصابہ ۱: ۱۹۵

۴؎ طبقات ابنِ سعد ۱/ ۲: ۸۲ ۵؎ تہذیب الکمال ۴ ب ۶؎ البدایہ والنہایہ ۵: ۳۴۱

۷؎ العجالۃ السنیہ شرح الالفیہ ۲۴۵ ۸؎ عیون الاثر ۲: ۳۱۵ ۹؎ المصباح المضئ ۱۹-اُ

۱۰؎ الاستیعاب ۱: ۱۹۵، اسد الغابہ ۱: ۲۲۹-۲۳۰، الاصابہ ۱: ۱۹۵-۱۹۶

۱۱؎ مثال کے طور پر دیکھیے الاصابہ ۲: ۲۳۹-۲۹۹

یہ جعفر ابنِ ابی طالب ہیں یا جعفر ابن ابی سفیان۔

بیہقی نے ابنِ اسحاق کے اس سلسلہ سے روایت کیا ہے جس میں ابنِ اسحاق محمد بن جعفر بن الزبیر سے اور وہ عبداللہ ابنِ زبیر سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن ارقم سے لکھنے کے لیے کہا، حضرت عبداللہ بن ارقم اور آپ کے غلام بھی لکھا کرتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عبداللہ بن ارقم پر اتنا اعتماد ہوگیا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے بعض بادشاہوں کو بھی خط لکھواتے تھے۔ بعد میں آپؐ صرف یہ فرما دیتے کہ یہ لکھ کر اس پر مُہر لگا دو اور بھروسے کی بنا پر اس لکھے ہوئے کو بھی دوبارہ سُنتے تھے۔ اس کے بعد حضرت زیدؓ سے بھی لکھواتے تھے اور حضرت زید وحی اور خطوط دونوں چیزیں لکھتے تھے۔ جب کبھی حضرت زید اور عبداللہ بن ارقم وقت پر موجود نہ ہوتے اور کسی کمانڈر کو، کسی بادشاہ کو یا کسی دوسرے انسان کو کوئی چیز لکھ کر دینا ہوتی تو حضرت جعفر سے لکھوا لیتے تھے۔ اور حضرت عثمانؓ اور حضرت عمرؓ نے بھی آپ کے لیے لکھا ہے۔ حضرات زید بن مغیرہ و معاویہ و خالد بن سعید بن العاص وغیرہ کا شمار بھی عربوں میں سے لکھنے والوں میں ہوتا تھا۔[۱]

۱۱۔ حضرت جہم بن سعد رضی اللہ عنہ

ابنِ حجر کی روایت ہے کہ حضرت جہم رضی اللہ عنہ کو القضاعی نے کاتبینِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں شمار کیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ حضرت زبیر اور جہم اموالِ صدقہ لکھا کرتے تھے۔

اسی طرح مفسر القرطبی نے بھی اپنی تالیف مولد النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں کاتبین میں آپ کا ذکر کیا ہے[۲]۔ اس کے علاوہ العراقیؒ[۳] اور الانصاریؒ[۴] نے آپ کا شمار کاتبین کے ضمن میں کیا ہے۔

۱۲۔ حضرت جہیم بن الصلت بن مخرمہ بن المطلب بن عبد مناف القرشی المطلبی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

آپ نے خواب میں دیکھا کہ گھوڑے کا سوار کھڑا ہے اور قومِ قریش کے بڑے بڑے شرفا کی موت کی خبر سناتا ہے۔ آپ اس وقت تک مسلمان نہ ہوئے تھے۔ جب یہ بات ابوجہل نے سُنی تو کہنے لگا کہ بنی مطلب میں سے ایک اور نبی پیدا ہوگیا ہے۔ کل تک معلوم ہو ہی جائے گا کہ کون کون قتل ہوگا، ذرا ہمارا ٹکراؤ تو ہونے دو[۵]۔ آپ کے اسلام لانے میں علماء کا اختلاف ہے۔ ابن عبدالبر

---

[۱] السنن الکبریٰ للبیہقی ۱۰ : ۱۲۶ (یہ روایت سنن الکبریٰ کے مطبوعہ نسخے میں ہے اور ابن حجر نے ابن اسحاق سے الاصابہ جلد دوم کے صفحہ ۲۰۷ پر روایت نقل کی ہے کہ جب حضرات زید بن ثابت اور ابن الارقم بوقتِ ضرورت موجود نہ ہوتے تو حضرت علی اور حضرت عمر یہ خدمت سرانجام دیتے) مجھے یہ معلوم نہیں کہ کون سی روایت صحیح ہے خصوصاً جبکہ آج تک ان کتب کی کوئی تحقیقی اشاعت منظرِ عام پر نہیں آئی۔

[۲] الاصابہ ۱ : ۲۵۵ [۳] شرح الفیہ العراقی ۲۴۶ [۴] المصباح المضئ ۱۹ ب

[۵] سیرت ابن ہشام ۱ : ۶۱۸

نے لکھا ہے کہ آپ فتح خیبر کے سال میں مسلمان ہوئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو تیس وسق یعنی ۱۸۰ من غلہ وغیرہ عطا کیا[1] - اور ابن الاثیر کی روایت بھی یہی ہے[2] لیکن ابنِ سعد نے لکھا ہے کہ آپ فتح مکہ کے بعد مسلمان ہوئے[3]

البلاذری نے لکھا ہے کہ جہیم بن الصلت زمانہ جاہلیت سے لکھنا جانتے تھے - پھر اسلام آیا تو بھی آپ لکھتے تھے اور آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر بھی لکھا[4]۔ المسعودی نے لکھا ہے کہ زبیر بن العوام اور جہیم بن الصلت اموالِ صدقہ کی تفصیلات لکھا کرتے تھے[5] اس کے علاوہ آپ[6] کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے لکھنے والوں میں ابن شبہ[7]، یعقوبی[8] ابن مسکویہ[9] ابن سید الناس[10]، العراقی[11]، ابنِ حجر[12]، الانصاری[13] اور البلاذری[14] نے شمار کیا ہے - ڈاکٹر حمید اللہ کے "الوثائق السیاسیہ" میں وثیقہ نمبر ۲۸ میں کاتب کا نام جہیم بن الصلت لکھا ہوا ہے -

۱۳ - حضرت حاطب بن عمرو بن عبد شمس بن عبدود القرشی العامری رضی اللہ عنہ اخو سہیل بن عمرو وسلیط بن عمرو

ابنِ عبد البر نے لکھا ہے کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دار الارقم کو تبلیغی سرگرمیوں کا مرکز بنانے سے پہلے اسلام لائے تھے[15] اور دو دفعہ اپنے دیگر بھائیوں کے ساتھ حبشہ کو ہجرت کی[16]

واقدی نے اور دیگر متاخرین نے لکھا ہے کہ حضرت حاطب رضی اللہ عنہ نے حبشہ کی جانب ہجرت اول میں شمولیت کی[17]

آپ جنگِ بدر میں بھی شریک ہوئے تھے[18]

کاتبین میں ابنِ مسکویہ[19]، ابن سید الناس[20]، العراقی[21] اور الانصاری[22] وغیرہم نے آپ کا ذکر کیا ہے -

۱۴ - حضرت حذیفہ بن الیمان العبسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

آپ کا تعلق علاقہ یمن سے تھا - غزوۂ بدر کے وقت آپ موجود تھے لیکن مشرکینِ مکہ سے ایک معاہدہ پہلے کر چکے تھے جس کی

---

[1] الاستیعاب ۱: ۲۴۷ ، العقد الثمین ۳ : ۵۴۴ — [2] اسد الغابہ ۱ : ۳۱۱

[3] الاصابہ ۱ : ۲۵۵ — [4] الاصابہ ۱ : ۲۵۵ — [5] التنبیہ والاشراف ۲۴۵

[6] المصباح المضئ ۸ ب — [7] تاریخ لیعقوبی ۲ : ۸۰ — [8] تجارب الامم ۱ : ۲۹۱

[9] عیون الاثر ۲ : ۳۱۵ — [10] شرح الفیۃ العراقی ۲۴۷ — [11] الاصابہ ۱ : ۲۵۵

[12] المصباح المضئ ۱۹ ب — [13] انساب الاشراف ۱ : ۵۳۲ — [14] الاستیعاب ۱ : ۳۴۷

[15] العقد الثمین ۴ : ۴۵ ، اسد الغابہ ۱ : ۳۶۳ — [16] الاصابہ ۱ : ۳۰۱

[17] الاصابہ ۱ : ۳۰۱ — [18] تجارب الامم ۱ : ۲۹۱ — [19] عیون الاثر ۲ : ۳۱۶

[20] شرح الفیۃ العراقی ۲۴۶ — [21] المصباح المضئ ۲۰ ب

رُو سے آپ کفار پر تلوار نہ اُٹھا سکتے تھے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے معاہدے کی بابت دریافت کیا تو آپ نے فرمایا: معاہدہ پُورا کرو اور ان کے خلاف اللہ سے ہمارے لیے مدد مانگو۔[۱] غزوۂ اُحد میں حضرت حذیفہ شریک ہُوئے۔ اس غزوہ میں حضرت حذیفہ کے والد غلطی سے مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہوئے۔[۲] غزوۂ احزاب (خندق) میں ایک رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حذیفہ کو ایک جاسوسی کی مہم پر مامور فرمایا تاکہ کفار کی نقل و حرکت کی خبر لے آئیں۔ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے منافقین کی حرکات پر نظر رکھنے کے لیے مامور تھے اور آپ کو صاحبِ سرِ رسول اللہؐ بھی کہا جاتا ہے۔[۳]

حضرت عمرؓ کے زمانے میں اگر کوئی شخص مرجاتا تو حضرت عمرؓ فرمایا کرتے: اگر حذیفہ (رضی اللہ عنہ) اس کے جنازے میں شامل ہوگا تو عمرؓ بھی شامل ہوگا اور اگر حذیفہ شامل نہ ہوگا تو عمر بھی شامل نہ ہوگا۔[۴]

حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ اپنے ساتھیوں سے کہا: کوئی تمنا کرو۔ اُنہوں نے تمنا کی کہ ان کے وُہ گھر جن میں وہ رہتے ہیں جواہرات اور روپے پیسے بھرے ہوئے ہوں اور وہ اس کو اللہ کی راہ میں خرچ کریں۔ لیکن حضرت عمرؓ نے کہا میں چاہتا ہُوں کہ میرے پاس ابی عبیدہ، معاذ بن جبل اور حذیفہ بن الیمان جیسے لوگ ہوں جن کو میں اللہ کی اطاعت کے لیے عامل مقرر کروں۔[۵]

حضرت حذیفہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دبا کا عامل مقرر فرمایا۔ ابن سعد نے لکھا ہے کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک دبا کے عامل تھے۔[۶]

آپ جنگِ نہاوند میں شریک تھے۔ ہمدان، رے اور دینور کے علاقے آپؓ نے ۲۲ہجری میں فتح کیے۔[۷] آپ نے فتح جزیرہ میں بھی حصہ لیا اور نصیبین میں پڑاؤ کے دوران شادی کی۔[۸]

حضرت عمرؓ نے آپ کو مدائن کا عامل مقرر فرمایا تھا۔ ابنِ سیرین نے لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ جب بھی کسی کو عامل مقرر فرماتے تو اس کے تقرری کے کاغذات میں لکھتے میں فلاں کو (عامل بناکر) بھیجتا ہُوں اور اس کو یہ حکم دیتا ہُوں۔ مگر حذیفہؓ کے تقرر نامہ میں لکھا کہ ان کی بات سُنی جائے اور ان کی اطاعت کی جائے کچھ طلب فرمائیں دیا جائے۔ جب آپ مدائن پہنچے تو وہاں کے کسانوں نے آپ کا خیر مقدم کیا جب آپ نے اپنا عہد نامہ یا سندِ تقرر پڑھ کر سُنائی تو لوگوں نے کہا: آپ جو چاہتے ہیں ہم سے طلب کریں۔ آپ نے فرمایا: میں آپ سے اپنے لیے دو وقت کا کھانا اور اپنے گدھے کا چارہ چاہوں گا جب تک کہ میں تم میں رہوں آپ مدائن کے عامل رہے۔ یہاں تک کہ حضرت عمرؓ نے آپ کو لکھا کہ آپ ایک مرتبہ مدینہ حاضر ہوں۔ چنانچہ جب حضرت عمرؓ کو آپ کے آنے کی اطلاع ہوئی تو حضرت عمرؓ اس راستے پر ہولیے جس راستے سے حضرت حذیفہ آ رہے تھے۔ جب آپ نے

---

[۱] اسد الغابہ ۱: ۳۹۱، الاصابہ ۱: ۳۲۱ یہ مفصل قصہ صحیح مسلم میں بھی ذکر ہوا ہے [۲] الاصابہ ۱: ۳۲۱ - ۳۲۲

[۳] اسد الغابہ ۱: ۳۹۱ [۴] الاستیعاب ۱: ۲۷۸، اسد الغابہ ۱: ۳۹۱ [۵] اسد الغابہ ۱: ۳۹۱-۳۹۲

[۶] ابن سعد ۵: ۳۸۵ [۷] اسد الغابہ ۱: ۳۹۱ [۸] الاستیعاب ۱: ۲۷۸

[۹] اسد الغابہ ۱: ۳۹۱

حضرت حذیفہ کو بالکل اسی حال میں دیکھا جس حال میں کہ روانہ ہوئے تھے تو آپ آگے بڑھے اور بڑھ کر حضرت حذیفہ سے چمٹ گئے اور فرمایا: تُو میرا بھائی ہے اور میں تیرا بھائی ہُوں[۱]

آپ کاتبینِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے تھے۔ آپ کا شمار کاتبین میں قرطبی[۲]، ثعلبی[۳]، عراقی[۴] اور انصاری[۵] نے کیا ہے، اوران سب نے لکھا ہے کہ حضرت حذیفہ کھجور کی چھال پر لکھا کرتے تھے۔ اور مسعودی نے لکھا ہے کہ حضرت حذیفہ حجاز کی متوقع آمدنی کے گوشوارے مرتب فرمایا کرتے تھے[۶]

آپ کا انتقال ۳۶ھ میں شہادتِ عثمانؓ کے بعد ہُوا[۷]

۱۵۔ حضرت حصین بن نمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ

الجہشیاری نے لکھا ہے کہ حصین بن نمیر اور مغیرہ بن شعبہ لوگوں کے معاملات لکھا کرتے تھے[۸]

انصاری نے لکھا ہے کہ مغیرہ ابن شعبہ اور حصین بن نمیر لوگوں کے قرض اور معاملات تحریر کیا کرتے تھے[۹] اور ابن مسکویہ نے آپ کو کاتبینِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں شمار کیا ہے اور لکھا ہے کہ مغیرہ بن شعبہ اور حصین بن نمیر عوام الناس کے معاملات لکھا کرتے تھے اور خالد اور معاویہ اگر موقع پر موجود نہ ہوتے تو ان کی نیابت بھی کرتے تھے[۱۰]

ابنِ حجر نے لکھا ہے کہ العباس بن محمد الاندلسی نے معتصم بن صمادح کے لیے ایک تاریخ کی کتاب جمع کی تھی جس میں اس نے لکھا ہے کہ مغیرہ بن شعبہ اور حصین بن نمیر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بوقتِ ضرورت لکھا کرتے تھے اور اس طرح متاخرین کی جماعت نے لکھا ہے جن میں المولد النبویؐ میں قرطبی نے اور شرح السیرۃ میں القطب الحلبی نے اس بات کا تذکرہ کیا ہے۔ اس روایت کو القضاعی کی کتاب کتاب النبیؐ سے ماخوذ بتایا ہے اور اسی طرح آپ کا ذکر کاتبینِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں العراقی[۱۲]، الیعقوبی[۱۳] نے بھی کیا ہے۔ ابن حجر حصین بن نمیر کی شخصیت کے تعیّن کے بارے میں مذبذب ہی رہے ہیں۔

۱۶۔ حضرت حنظلہ بن الربیع بن صیفی بن ریاح التمیمی رضی اللہ عنہ

آپ اکثم بن صیفی کے بھائی کے لڑکے تھے۔ آپ کے بارے میں روایت مشہور ہے کہ آپ ایک دفعہ حضرت سیدنا

۱؎ اسد الغابہ ۱: ۳۹۲
۲؎ ایضاً، المصباح المضئ ۲۱۔أ ب
۳؎ الاستیعاب ۱: ۲۷۸
۴؎ المصباح والمضئ ۲۰ ب
۵؎ شرح الفیۃ العراقی ۲۴۷
۶؎ المصباح المضئ ۲۱۔أ
۷؎ ایضاً
۸؎ الوزراء والکتاب ۱۲، التنبیہ والاشراف مسعودی
۹؎ تجارب الامم ۱: ۲۹۱
۱۰؎ تاریخ یعقوبی ۲: ۸۰
۱۱؎ العجالۃ السنیہ علی الفیۃ السیر ۲۴۶
۱۲؎ التنبیہ والاشراف ۲۴۵
۱۳؎ الاصابہ ۱: ۳۳۹

صدیقِ اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس سے روتے ہوئے گزرے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے استفسار فرمایا کہ کیوں روتے ہو؟ حضرت حذیفہ نے فرمایا: اے ابوبکرؓ! حنظلہ تو منافق ہوگیا ہے (معاذاللہ) کیونکہ جب ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہوتے ہیں اور آپ ہمیں جنت اور دوزخ کی بابت بتاتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ گویا ہم ان کو دیکھ رہے ہیں اور جب ہم لوٹتے ہیں تو ہم اپنی عورتوں میں اور کھیتی باڑی میں مشغول ہوجاتے ہیں اور تقریباً وہ سبھی کچھ بھول جاتے ہیں۔ سیدنا صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بخدا یہ بات تو میں بھی اپنے اندر پاتا ہوں۔ آؤ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چلیں۔ دونوں حضرات رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا:

اے حنظلہ! تجھے کیا ہوا؟

عرض کی: میں منافق ہوگیا ہوں یارسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم! (معاذاللہ)

جب آپ دوزخ اور جنت کا ذکر فرماتے ہیں تو گویا ہم ان چیزوں کو آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ لیکن جب آپ سے الگ ہوکر گھروں کو جاتے ہیں تو اپنی عورتوں اور کھیتیوں میں مشغول ہوکر یہ سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ تو آپ نے فرمایا:

اے حنظلہ! اگر تم اس حال پر ہمیشہ قائم رہو جو میرے پاس ہونے سے ہوتا ہے تو یقیناً فرشتے تم سے مجلسوں اور راستوں میں تم سے مصافحہ کرنے لگیں اور بستروں پر تم سے ملاقات کریں۔ لیکن اے حنظلہ! وقت وقت کی بات ہوتی ہے۔[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حنظلہ کو اہلِ طائف کے پاس یہ معلوم کرنے کے لیے بھیجا کہ آیا وہ صلح چاہتے ہیں یا نہیں؛ جب حضرت حنظلہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے اہلِ طائف کی طرف جانے لگے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حاضرینِ مجلس سے فرمایا: اس کی اور اس جیسوں کی اقتدا کیا کرو۔[2]

آپ کاتبینِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے تھے۔ جہشیاری نے لکھا ہے کہ آپ تمام کاتبین کے نائب تھے اور ہر ایک کی طرف سے 'جب وہ غیر حاضر ہوتا' لکھتے تھے۔ اس طرح آپ کا نام 'کاتب' پڑ گیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی مُہر حضرت حنظلہ کے پاس رکھ چھوڑی تھی اور فرمایا کرتے تھے کہ ہر تیسرے دن مجھے تمام لکھایا ہوا یاد دلا دیا کرو۔ حضرت حنظلہ تیسرے روز حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام اموال اور طعام وغیرہ جو آپ کی تحریری تحویل میں ہوتا یاد دلا دیا کرتے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان اموال کو سونے سے پہلے پہلے تقسیم فرما دیا کرتے تھے۔[3]

حضرت حنظلہ مشہور کاتبین میں سے ہیں۔ امام بخاری نے التاریخ الکبیر میں لکھا ہے: حنظلہ رضی اللہ عنہ کاتب النبی تھے صلی اللہ علیہ وسلم۔[4]

امام مسلم نے طبقات میں لکھا ہے کہ حنظلہ بن الربیع کاتب النبی صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔[5] ابنِ سعد نے

---

[1] اسد الغابہ ۲: ۵۸ نقلاً عن الترمذی [2] اسد الغابہ ۲: ۵۸
[3] الوزراء والکتاب ۱۲: ۱۳ [4] التاریخ الکبیر ۲/۱: ۳۶ [5] الطبقات لمسلم بن حجاج القشیری ۲۸۰ ب

واقدی سے روایت کیا ہے کہ آپ نے کئی مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کتابت کی اور اسی وجہ سے آپ کا نام "کاتب" پڑ گیا۔[1] آپ کا ذکر کاتبین میں یعقوبی[2]، ابن الاثیر[3] المزی[4]، ابن سید الناس[5]، العراقی[6]، ابن شبہ[7]، خلیفہ بن الخیاط[8]، ابن کثیر[9]، ابن حجر[10]، الانصاری[11] اور مسعودی[12] نے کیا ہے۔

آپ نے جنگِ قادسیہ میں حصہ لیا، اس کے بعد کوفہ میں قیام پذیر ہو گئے اور جنگِ جمل کے دوران میں کوفہ میں حضرت علیؓ کے نائب مقرر ہوئے۔ اس کے بعد آپ قرقیسیا تشریف لے گئے اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کے دور میں وہیں وفات پائی۔[13]

۱۷۔ حضرت حویطب بن عبد العزیٰ بن ابی قیس القرشی العامری رضی اللہ عنہ

آپ نے بہت طویل عمر پائی۔ آپ فتح مکہ کے سال تقریباً ساٹھ برس[14] کی عمر میں مسلمان ہوئے۔ آپ کا شمار مؤلفۃ القلوب[15] میں ہوتا ہے۔ آپ کو غنائمِ حنین میں سے ایک سو اونٹ عطا کیے گئے۔[16] آپ پکے مسلمان تھے۔

امام احمد ابن حنبلؒ نے امام شافعیؒ سے روایت کیا ہے کہ حضرت حویطب رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسلام کی بہت تعریف کرنے والوں میں سے تھے۔[17] آپ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خانہ کعبہ کے پتھروں کی مرمت پر بعض دوسرے اصحاب کے ساتھ مامور فرمایا تھا۔[18]

آپ کاتبینِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے تھے۔ آپ کا ذکر کاتبین میں ابنِ مسکویہ[19]، العراقی[20]، ابن سید الناس[21] اور الانصاری[22] نے کیا ہے۔ آپ کی تاریخِ وفات میں اختلاف ہے۔ راجح قول یہی ہے کہ آپ کی وفات ۵۴ھ ہجری میں خلافتِ امیر معاویہؓ کے دور میں ہوئی۔[23]

---

1. طبقات لابنِ سعد ۶ : ۳۶۲
2. تاریخ یعقوبی ۲ : ۸۰
3. اسد الغابہ ۲ : ۵۸
4. تہذیب الکمال ۴ ب
5. عیون الاثر ۲ : ۳۱۵
6. شرح الفیۃ العراقی ۲۴۵
7. المصباح المضئ ۸ ب
8. تاریخ خلیفہ ۱ : ۷۷
9. البدایہ والنہایہ ۵ : ۳۴۲
10. الاصابہ ۱ : ۳۵۹ ـ ۳۶۰
11. المصباح المضئ ۲۰ ـ أ
12. التنبیہ والاشراف ۲۸۲
13. الاصابہ ۱ : ۳۶۰ ، اسد الغابہ ۲ : ۵۸
14. الاستیعاب ۱ : ۳۸۷
15. الاستیعاب ۱ : ۳۸۷ ، الاصابہ ۱ : ۳۶۴ ، اسد الغابہ ۲ : ۶۷
16. الاستیعاب ۱ : ۳۸۴ ، اسد الغابہ ۲ : ۶۷
17. العقد الثمین ۴ : ۲۵۳
18. الاستیعاب ۱ : ۳۸۴ ، الاصابہ ۱ : ۳۶۴
19. تجارب الامم ۱ : ۲۹۱
20. شرح الفیۃ العراقی ۲۴۶
21. عیون الاثر ۲ : ۳۱۶
22. المصباح المضئ ۲۰ ب
23. العقد الثمین ۴ : ۲۵۳

۱۸۔ حضرت خالد بن سعید بن العاص بن امیہ بن عبد شمس رضی اللہ عنہ

آپ بہت پہلے اسلام لائے۔ آپ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ آپ حضرت ابوبکرؓ کے بعد اسلام لائے تھے۔ بعض روایات کے مطابق آپ تیسرے، چوتھے یا پانچویں مسلمان ہیں[۱]

آپ کے اسلام لانے کا واقعہ کچھ یُوں ہے کہ آپ نے ایک رات خواب میں دیکھا کہ وہ آگ کے گڑھے کے کنارے کھڑے ہیں اور آپ کا باپ آپ کو آگ میں دھکا دے رہا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو کندھوں سے پکڑ کر پیچھے کھینچ رہے ہیں۔ آپ نے یہ خواب حضرت ابوبکر صدیقؓ سے بیان کیا تو آپ نے اسلام قبول کر لینے کا مشورہ دیا۔ آپ مقام اجیاد میں نبی کریمؐ سے ملے اور اسلام قبول کیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے اسلام کو مخفی رکھا[۲] جب آپ کے والد کو کسی طرح اس بات کا علم ہُوا تو سخت ناراض ہوا۔ آپ کو مارا پیٹا اور گالیاں دیں۔ آپ کے بھائیوں کو حکم دیا کہ کوئی آپ سے گفتگو نہ کرے ورنہ میں اس کے ساتھ بھی وہی کروں گا جو اس کے ساتھ کیا ہے۔ پھر آپ کو قید کر دیا گیا اور آپ پر سخت تنگی کی گئی آپ کو بھُوکا اور پیاسا رکھا گیا حتیٰ کہ مکّہ جیسے گرم علاقہ میں تین دنوں تک آپ نے نہ کچھ کھایا نہ پیا اور آخر کار اپنے والد سے اپنے تمام تعلقات توڑ لیے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے پاس آگئے اور آپ کے ہی ہو کر رہنے لگے[۳]

جب صحابہ کرام کو حبشہ کی طرف ہجرتِ ثانیہ کرنا پڑی تو حضرت خالد نے سب سے پہلے ہجرت کی اور آپ کی بیوی امیمۃ بنت خالد الخزاعیۃ بھی آپ کے ساتھ تھی اور وہاں آپ کم و بیش دس سال مقیم رہے۔ اس کے بعد آپ حضرت جعفرؓ بن ابی طالب کی معیت میں دو کشتیوں میں فتح خیبر کے موقع پر بمقام خیبر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے لیے مسلمانوں سے کہا کہ آپ کو غنائم خیبر میں سے حصہ دیا جائے[۴] حضرت خالدؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ مدینہ لوٹ آئے۔ اس کے بعد حضرت خالدؓ نے عمرۃ القضا، حنین، تبوک اور طائف کے غزوات میں حصّہ لیا[۵]

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے آپ کو مذحج اور صنعاء الیمن کے صدقات کا عامل مقرر فرمایا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک آپ اس عہدہ پر فائز تھے[۶] حضرت خالد کی کوشش سے ہی اہلِ طائف اور نبی کریمؐ کے درمیان صلح ہُوئی اور آپ ہی نے وفدِ ثقیف کو اہلِ طائف کا نوشتہ لکھ کر دیا[۷]

کتابتِ وحی ابنِ حجر عسقلانی نے ابی داؤد کی کتاب المصاحف کی روایت کے حوالہ سے جو ابراہیم بن عقبہ نے ام خالد بنت خالدؓ سے اخذ کی ہے انہوں نے بیان کیا میرے والد نے سب سے پہلے بسم اللہ

۱؎ الاستیعاب ۱ : ۳۹۹ ۲؎ ابن سعد: الطبقات ۴/۱ : ۶۷ - ۶۸ ۳؎ ایضاً

۴؎ العقد الثمین ۴ : ۲۶۶ ۵؎ ایضاً ، الاستیعاب ۱ : ۴۰۰ ۶؎ ایضاً

۷؎ طبقات ابنِ سعد ۴/۱ : ۶۹ ، البدایہ والنہایہ ۵ : ۳۴۲

الرحمٰن الرحیم لکھا[1]۔ اور یہ مشہور ہے کہ یہ جملہ قرآن مجید میں سے ہے کچھ بعید نہیں کہ ہجرتِ حبشہ سے قبل آپ مصحف لکھتے ہوں جبکہ آپ اس زمانہ میں ہمہ وقت نبی کریمؐ کے پاس رہتے تھے۔ اور انصاریؒ نے حضرت خالد کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ آپ نے رسول اللہ کے لیے سب سے پہلے لکھا[2]۔ اور یہ قول اسی وقت صحیح ہو سکتا ہے جبکہ اس کو حضرت خالد کے مکہ میں قیام کے زمانے کے متعلق مانا جائے کیونکہ ہجرتِ مدینہ کے بعد تو اُبی بن کعب، زیدؓ بن ثابت اور علیؓ بن ابی طالب کتابتِ مصحف پر مامور تھے اور حضرت خالد غزوۂ خیبر سے قبل مدینہ میں تشریف فرما ہی نہ تھے، البتہ یہ ضرور ہے کہ حضرت خالد قدیم الاسلام تھے اور وہ پہلے صحابی ہیں جو مکہ میں آپ کے حکم سے مصحف یعنی وحی بھی لکھتے رہے۔ اور جب پھر مدینہ لوٹے تو نبی کریمؐ کے لیے دوبارہ خطوط لکھنا شروع کیا۔

طبری نے لکھا ہے کہ حضرت خالد اور حضرت معاویہ بن سفیان آپ کے پاس بیٹھ کر آپ کی ضروریات اور معاملات لکھا کرتے تھے[3]۔

آپ مشہور کاتبینِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے ہیں۔ آپ کا ذکر کاتبین میں ابنِ اسحاق[4]، ابنِ سعد[5]، ابنِ شبہ[6]، الطبری[7]، الجہشیاری[8]، ابنِ اثیر[9]، ابنِ کثیر[10]، المزی[11]، عراقی[12]، ابن سید الناس[13]، ابن مسکویہ[14]، الانصاری[15] اور بعض دوسروں نے بھی کیا ہے۔

مسعودی نے لکھا ہے کہ حضرت خالد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام امور کی کتابت فرمایا کرتے تھے[16]۔ الوثائق السیاسیہ میں وثیقہ جات نمبری ۱۹، ۲۰، ۱۱۴، ۲۰۲، ۲۱۳، ۲۱۴ اور ۲۲۳ کے کاتب آپ ہیں۔

بنو سعید کا وفاتِ رسول اللہؐ کے بعد عہدوں اور وظیفوں کو چھوڑ دینا

حضرات خالد و ابان و عمر پسران سعید بن العاص نے نبی کریم کی وفات کے بعد اپنے عہدے چھوڑ دیے اور لوٹ آئے۔ حضرت سیدنا صدیق اکبرؓ نے ان حضرات کو پھر اپنے فرائض سنبھالنے کو کہا تو انھوں نے جواباً عرض کیا کہ ہم بنو سعید نبی کریمؐ کے بعد کسی دوسرے کے لیے عامل بن کر جانے کے قابل نہیں ہیں[17]۔ پھر حضرت صدیق اکبرؓ نے حضرت خالدؓ کو شام کے مرتدین کے مقابلے میں بھیجا[18]۔ آپ بقولِ بعض یوم اجنادین میں اور بقولِ دیگر یوم مرج الصفر میں ۱۴ھ میں شہید ہوئے[19]۔

---

[1] اصابہ ۱ : ۴۰۶ نقلاً عن المصاحف لابی داؤد، الاستیعاب ۱ : ۴۰۰
[2] المصباح المضئ ۱۲ ب
[3] تاریخ الطبری ۶ : ۱۷۹، الجہشیاری۔ الوزراء والکتاب ۱۲
[4] البدایہ والنہایہ ۵ : ۳۵۰
[5] الطبقات ۴/۱ : ۶۹
[6] المصباح المضئ ۱۲ ب
[7] تاریخ الطبری ۶ : ۱۷۹
[8] الوزراء والکتاب ۱۲
[9] الکامل ۲ : ۳۱۳
[10] البدایہ والنہایہ ۵ : ۳۴۲
[11] تہذیب الکمال ۹۴ ب
[12] شرح الفیۃ العراقی ۲۴۵
[13] عیون الاثر ۲ : ۳۱۵
[14] تجارب الامم ۱ : ۲۹۱
[15] المصباح المضئ ۲۱ ب
[16] التنبیہ والاشراف ۲۴۵
[17] الاستیعاب ۱ : ۴۰۱
[18] الاصابہ ۱ : ۴۰۷
[19] ایضاً

۱۹۔ حضرت خالد بن ولید بن مغیرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

قائد المجاہدین سیف اللہ خالد بن ولید اسلام کے بہت بڑے شہسوار، معرکہ آزما اور بکہ میں بہت بڑے سردار تھے۔ آپ کی کنیت ابوسلیمان تھی۔ آپ کا تعلق قریش کے قبیلہ بنی مخزوم سے تھا۔

آپ اُمّ المومنین حضرت میمونہ بنت حارث کے بھانجے تھے[۱] آپ ہجرت سے چالیس برس قبل پیدا ہوئے[۲] زمانۂ جاہلیت میں بھی آپ کا شمار معززینِ قریش میں ہوتا تھا۔ زمانۂ جاہلیت میں جنگی مہارت وسیادت کے امتیازات آپ کے پاس رہتے تھے۔ آپ کے پاس ایک قبہ نما اسلحہ خانہ تھا جہاں سے لشکر وغیرہ کی تیاری کا اہتمام ہوا کرتا تھا۔ آپ جنگ میں قائد ہوا کرتے تھے۔ اور غزوۂ اُحد میں آپ کفارِ مکہ کی فوج کے حصے کی کمان کر رہے تھے یہاں تک کہ واقعہ حدیبیہ[۳] تک آپ کفار کے طرف دار اور کمان دار رہے[۴]۔ واقعہ عمرۃ القضا کے وقت حضرت خالد مکہ سے اس لیے بھاگ گئے کہ کہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے ساتھی دیکھ نہ لیں۔ جب آپؐ نے حضرت خالدؓ کی بابت ان کے بھائی ولید ابنِ ولید سے سوال کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر وہ ہمارے پاس آتا تو ہم اس کی عزت کرتے۔ اور یہی بات ولید نے حضرت خالد کی طرف لکھ بھیجی تو آپؐ کی اس شفقت سے حضرت خالد کے دل میں اسلام جاگزین ہو گیا[۵]۔ اور آپ فتح خیبر کے بعد[۶] ۸ھ میں مسلمان ہو گئے اور عمرو بن العاصؓ اور عثمان بن طلحہ کے ساتھ مدینہ ہجرت کی۔ جب رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا مکہ نے اپنے کلیجے کے ٹکڑے آج ہماری طرف پھینک دیے ہیں[۷]۔ حضرت خالد کو نبی کریمؐ نے ان کے گھر کے لیے ایک قطعۂ زمین دیا[۸]۔ جب آپ اسلام لائے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو اسلامی لشکروں کی قیادت عطا کی اور آپ مشرکین سے جنگ کرنے میں پیش پیش ہوتے تھے۔ رسول اللہ کی معیت میں فتح مکہ میں حصہ لیا۔ رسول اللہؐ نے آپ کو عُزّیٰ کا بُت گرانے کے لیے بھیجا۔ آپ نے جا کر اس کو مسمار کر دیا۔ غزوۂ حنین میں آپ زخمی ہوئے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود عیادت کے لیے تشریف لے گئے اور آپ کے زخم پر دم فرمایا اور وُہ بند ہو گیا[۹]۔

آپ ہمیشہ اللہ کی راہ میں اپنے گھوڑوں اور زرہوں میں محبوس رہتے[۱۰] اور آپ کا سب سے بڑا مشغلہ جہاد تھا۔ آپ فرمایا کرتے تھے: جہاد کی وجہ سے میں قرآن کا کثیر حصہ حاصل نہیں کر سکا[۱۱] مرتدین کے معرکوں میں آپ کے بڑے بڑے کارنامے ہیں، فتح عراق اور شام میں آپ کا بہت بڑا حصہ ہے۔ سیدنا حضرت عمرؓ نے آپ کو قیادتِ جیوشِ اسلامی سے معزول کر دیا تھا لیکن آپ نے ایک مسلمان سپاہی کے لیے مثال قائم کر دی اور نئے سالار حضرت ابوعبیدہ بن جراح کی

---

[۱] سیر اعلام النبلاءُ ۱ : ۲۶۴ [۲] ایضاً [۳] الاصابہ ۱ : ۴۱۲

[۴] العقد الثمین ۴ ، ۲۹۰ نقلاً عن سیرۃ ابنِ ہشام [۵] ایضاً [۶] الاصابہ ۱ : ۴۱۳

[۷] الاستیعاب ۱ : ۴۰۶ [۸] طبقات ابنِ سعد ۴/۲ : ۱ [۹] الاستیعاب ۱ : ۴۰۷

[۱۰] ایضاً ۱ : ۴۱۴ [۱۱] ایضاً

قیادت میں ایک معمولی سپاہی کی حیثیت سے جنگ لڑتے رہے[1]۔ حضرت عمرؓ سے صحیح اسناد سے مروی ہے کہ حضرت خالدؓ کی وفات کے بعد فرمایا کرتے تھے: ابوسلمان (خالد) پر اللہ تعالیٰ رحم فرمائے، ہم نے اس کے بارے میں وہ گمان کیا جو اس میں نہ تھا[2]۔

آپ کاتبینِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے تھے آپ کا اسم گرامی کاتبین میں عمر بن شبہ[3]، ابنِ کثیر[4]، ابنِ سیدالناس[5]، عراقی[6] اور الانصاری[7] نے لکھا ہے۔

ابنِ کثیر نے حضرت خالد کے رقم کردہ ایک خط کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ عتیق بن یعقوب نے عبدالملک بن ابی بکر سے اور اس نے اپنے باپ سے اور اس نے اپنے دادا سے اور اس نے عمرو بن حزم سے روایت کیا کہ یہ اراضیات رسول اللہ کی ہیں:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے تمام مومنین کی طرف کہ یہاں کوئی شکار نہ کرے اور شکار کو نہ پکڑے اور نہ ہی قتل کرے اگر کوئی ایسا کرتا ہوا پایا گیا تو اسے کوڑے مارے جائیں گے اور اس کے کپڑے اتار دیے جائیں گے، اور اگر کوئی ان حدود کو توڑے گا تو وہ ماخوذ ہوگا اور اسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رُو برو پیش کر دیا جائے گا۔ اور یہ تحریر محمد رسول اللہ کی طرف سے ہے اور اسے خالد نے رسول اللہؐ کے حکم سے لکھا ہے۔ اور کوئی انہیں پامال نہ کرے ورنہ وہ اپنے اوپر ظلم کرنے والا ہوگا جیسا کہ محمد رسول اللہ نے حکم دیا ہے[8]۔

حضرت خالدؓ کی وفات ۲۱ھ[9] میں حمص میں ہوئی۔ آپ نے حضرت عمرؓ کو وصیت کی اور حضرت عمرؓ نے آپ کی وصیت پوری فرما دی[10]۔

۲۰ ۔ حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ تعالیٰ عنہ

آپ ہجرت سے ۱۸ برس قبل پیدا ہوئے۔ مدائنی نے لکھا ہے کہ حضرات طلحہؓ، علیؓ اور زبیرؓ ابن عوام ہم عمر تھے[11]۔
حضرت زبیرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی کے بیٹے اور آپ کے حواری تھے۔ لڑکپن ہی میں اسلام قبول کر لیا تھا۔ بروایت عروہ بوقت قبول اسلام آپ کی عمر ۸ برس کی تھی[12]۔ سیدنا ابوبکر صدیقؓ کے بعد جلد ہی اسلام لائے۔ آپ نے اسلام برضا و خوشی قبول کیا تھا[13]۔ یہ مشہور ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کی بلندیوں سے سب کو پکارا تو حضرت زبیرؓ

---

[1] طبقات ابن سعد ۷/۲ : ۱۲۱
[2] ایضاً
[3] المصباح المضئی ۸ ب
[4] البدایہ والنہایہ ۵
[5] عیون الاثر ۲ : ۳۱۵
[6] العجالۃ السنیۃ علی الفیۃ السیرۃ ۲۴۶
[7] المصباح المضئی ۲۲ : ۱
[8] البدایہ والنہایہ ۵ : ۳۴۴
[9] سیر اعلام النبلاء ۱ : ۲۷۶
[10] الاصابہ ۱ : ۴۱۵
[11] سیر اعلام النبلاء ۱ : ۲۸
[12] ایضاً
[13] اسد الغابہ ۲ : ۱۹۷

بھی نکلے اور ہاتھ میں تلوار لیے ہوئے تھے۔ وہ اس وقت کم و بیش بارہ برس کے ہوں گے۔ رسول اللہؐ نے دریافت فرمایا:

اے زبیر! تلوار کیوں لیے ہوئے ہو؟

تو آپ نے عرض کی:

یا رسولؐ اللہ! یہ اس لیے لایا ہوں کہ آپ سے اگر کوئی جھگڑا کرے تو میں اس کو اس سے ماروں۔

اس طرح اللہ کی راہ میں سب سے پہلے تلوار اٹھانے والے حضرت زبیرؓ ہیں۔

آپ کا چچا آپ کو اسلام لانے پر (طرح طرح کی) اذیتیں پہنچاتا، آپ کو اُلٹا لٹکا دیتا اور آپ کو دھونی دیتا۔ مگر آپ فرماتے:

"لا ارجع الی الکفر ابداً۔"[۱]

(اب میں کبھی بھی کفر کی طرف نہیں لوٹوں گا)

آپ نے حبشہ کی طرف ہجرت فرمائی مگر وہاں زیادہ دیر قیام نہیں رہا۔[۲]

حضرت زبیرؓ غزوۂ بدر میں شریک ہوئے۔ غزوۂ بدر کے موقعہ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دو گھوڑسوار تھے۔ دائیں طرف حضرت زبیرؓ اور بائیں جانب حضرت مقدادؓ بن الاسود تھے۔[۳] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن حضرت زبیرؓ کو سعدؓ بن عبادہ کا جھنڈا عطا فرمایا (اس طرح) حضرت زبیرؓ دو جھنڈوں کے ساتھ مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے۔[۴] آپ تمام غزوات میں شریک رہے اور کسی غزوۂ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے پیچھے نہیں رہے۔[۵]

مناقب آپ عشرہ مبشرہؓ میں سے ایک ہیں۔[۶] حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے متعلق فرمایا:

"لکل نبی حواری و حواری الزبیر۔"[۷]

(ہر نبی کا ایک حواری (دوست، خیرخواہ، مددگار) ہوتا ہے اور میرا حواری زبیر ہے)

آپ حضرت عمرؓ بن الخطاب کے دور میں فتح مصر میں حاضر ہوئے۔[۹] آپ اُن چھ میں سے ایک ہیں جن کو حضرت عمرؓ نے مشورہ اور امارت کا اہل ٹھہرایا۔[۱۰] حضرت عمرؓ بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کے بعد آپ نے اپنا نام رجسٹر سے مٹا دیا۔[۱۱]

جنگِ جمل میں ام المومنین حضرت عائشہؓ کے ساتھ حضرت علی المرتضیٰؓ کے مقابلہ میں جنگ کے لیے نکلے۔ حضرت علیؓ

---

۱ سیر اعلام النبلاً ۱: ۲۷
۲ ایضاً ۱/ ۲۹
۳ سیرۃ ابن ہشام ۱: ۴۴۳، سیر اعلام النبلاً ۱: ۴۰
۴ سیر اعلام النبلاً ۱: ۲۹
۵ ایضاً ۱: ۳۳
۶ الاستیعاب ۱: ۵۸
۷ سیر اعلام النبلاً ۱: ۲۷
۸ ایضاً ۱: ۲۹
۹ اسد الغابہ ۲: ۱۹۸
۱۰ سیر اعلام النبلاً ۱: ۴۴
۱۱ ایضاً ۱: ۳۷

نے آپ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک قول یاد دلایا تو واپس مُڑ گئے اور جنگ نہ کی۔ واپسی میں جبکہ آپ وادی سباع میں نماز پڑھ رہے تھے[1] ابن جرموز نے آپ کو قتل کر دیا۔ یہ مقام بصرہ سے ۹ فرسخ (تقریباً ۲۷ میل) پر واقع ہے[2]۔ یہ واقعہ قتل (جمادی الاولیٰ ۳۶ھ) میں پیش آیا ہے[3]۔ حضرت علیؓ اور ان کے ساتھیوں نے جب سُنا تو آپ پر روئے[4]۔ حضرت علیؓ نے آپ کے قاتل سے فرمایا:

"تبوّء یا اعرابی مقعدك من النار"۔

(اے اعرابی! تُو اپنا مقام اور ٹھکانہ جہنم میں بنا)

کیونکہ حضورؐ نے بیان فرمایا کہ زبیر کا قاتل جہنمی ہوگا[5]

آپ کاتبانِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہیں۔

مسعودی نے کہا: زبیر بن عوام اور جہیم بن الصلت اموالِ صدقات لکھا کرتے تھے[6]۔ آپ کا اسمِ گرامی کاتبانِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ضمن میں ابنِ شبنہ[7]، ابن کثیر[8]، عراقی[9]، ابن سیدالناس[10] اور انصاری[11] وغیرہم نے درج کیا ہے۔ آپ (زبیر) نے ہی قبیلہ طی کے بنو معاویہ کی طرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خط تحریر فرمایا[12]۔

۲۱۔ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ

آپ ابو خارجہ زید بن ثابت بن ضحاک بن زید خزرجی انصاری، بہت بڑے امام، قرّا اور علمائے میراث کے شیخ، مدینہ کے مفتی اور کاتبِ وحی ہیں۔ آپ کے والد یومِ بعاث کو قتل ہو گئے۔ حضرت زید اس وقت چھ برس کے تھے[13] یتیمی کی حالت میں پرورش پائی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ منورہ تشریف لائے حضرت زید اس وقت گیارہ برس کے تھے اور سترہ سُورتیں سیکھ چکے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ سُورتیں پڑھ کر سُنائیں تو آپؐ بہت خوش ہوئے[14]۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں پُورا قرآن مجید حفظ کر لیا تھا[15]۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو حکم فرمایا یہود کی زبان سیکھیں، تو آپ نے صرف نصف ماہ میں اس زبان کو سیکھ لیا۔ حضرت زیدؓ خود فرماتے ہیں: "میں (اس زبان میں اتنا ماہر ہو گیا تھا کہ) یہود کی طرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خطوط لکھتا تھا اور ان کی طرف سے آمدہ خطوط آپؐ کو پڑھ کر سُناتا تھا۔"[16]

---

[1] اسد الغابہ ۲ : ۱۹۹ [2] سیرا علام النبلاء ۱ : ۴۲ [3] الاصابہ ۱ : ۵۴۶ عن ۶۶ او ۶۷ سنۃ

[4] سیر اعلام النبلاء ۱ : ۳۹ [5] ایضاً ۱ : ۴۰ [6] التنبیہ والاشراف ۲۴۵

[7] انظر المصباح المضیٔ ۸ ب [8] البدایہ والنہایہ ۵ : ۳۴۴ [9] العجالۃ السنیہ ۲۴۶

[10] عیون الاثر ۲ : ۳۱۵ [11] المصباح المضیٔ ۲۳-۱ [12] انظر الوثائق السیاسیہ، الوثیقۃ رقم/۱۹۳

[13] سیر اعلام النبلاء ۲ : ۳۱۰ [14] ایضاً ۲ : ۳۰۷ [15] صحیح بخاری، فضائل القرآن ۸، طبقات ابنِ سعد ۲ : ۳۵۵، المحبر ۲۸۶، الفہرست لابن الندیم ۲۷ [16] التاریخ الکبیر للبخاری ۲/۱ : ۳۸۱

آپ اس امت کے قضاۃ اور فقہاء میں شمار ہوتے ہیں۔ امام شعبیؒ نے کہا:
" (قابلِ ذکر) قاضی چار ہیں: حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت زیدؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ"[1]
حضرت مسروق نے فرمایا:
" صحابۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے چھ آدمی (خاص طور پر) اصحابِ فتویٰ ہیں: حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، ابنِ مسعودؓ، زیدؓ، اُبیؓ اور ابوموسیٰ اشعریؓ۔"[2]
حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے متعلق ارشاد فرمایا:
"افرض امتی زید بن ثابت۔"[3]
(میری اُمت میں سب سے زیادہ علمِ فرائض جاننے والے زید بن ثابتؓ ہیں)
آپ پہلے شخص ہیں جنہوں نے علمِ فرائض میں تالیف فرمائی۔[4]
آپ غزوات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک رہے۔ پہلا غزوہ جس میں آپ شریک ہُوئے وہ غزوۂ خندق ہے۔[5]
غزوۂ تبوک کے موقعہ پر بنی نجار کا جھنڈا آپ ہی کے ہاتھ میں تھا۔ یہ جھنڈا پہلے عمارہؓ بن حزم کے پاس تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے لے کر زید بن ثابت کو عطا فرمایا۔ عمارہؓ نے عرض کیا:
"یا رسول اللہ! میری طرف سے کوئی شکایت پہنچی ہے؟"
آپؐ نے فرمایا:
" لا ولکن القرآن مقدم"۔[6]
(نہیں، بلکہ قرآن مقدم ہے)
(کیونکہ حضرت زید قرآن کے زیادہ عالم تھے) جنگِ یمامہ میں ایک تیر آپ کو لگا مگر اس نے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔[7]

---

[1] العلل لابن المدینی: ۴۳، سیر اعلام النبلاء ۲: ۳۱۰
[2] سیر اعلام النبلاء ۲: ۳۱۱، العلل لابن المدینی: ۴۴
[3] سیر اعلام النبلاء ۲: ۳۰۹
[4] انظر للتفصیل دراسات فی الحدیث النبوی و تاریخ تدوینہ، الجزء الانجلیزی: ۵۹-۶۰
[5] سیر اعلام النبلاء ۲: ۳۱۰
[6] الاصابہ ۱: ۵۶۰، الاستیعاب ۱: ۵۵۲
[7] الاستیعاب ۱: ۵۵۳

جنگِ یرموک میں غنائم تقسیم کرنے کی خدمت آپ کے سپرد ہوئی۔[1] حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب سفر پر تشریف لے جاتے تو زید بن ثابت کو اپنا خلیفہ (نائب) مقرر کر جاتے اور بسا اوقات مدینہ منورہ واپسی پر ان کو کھجور کا باغ بھی مرحمت فرماتے۔[2] حضرت عثمانؓ بھی جب حج پر تشریف لے جاتے تو آپ ہی کو مدینہ منورہ میں اپنا نائب ٹھہرا جاتے۔[3]

آپ کاتبانِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں سے ہیں۔ تمام مورخین نے آپ کو کاتبانِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمرے میں شمار کیا ہے۔ مثلاً ابنِ اسحاق[4]، خلیفہ بن خیاط، عمرو بن شبہ[5]، بخاری[6]، طبری[7] اور جہشیاری نے کہا ہے کہ "زید بن ثابت کتابتِ وحی کے ساتھ ساتھ بادشاہوں کو بھی خطوط لکھا کرتے تھے۔"[8] اور مسعودی[9] نے لکھا ہے کہ آپ کے متعلق کتابتِ وحی کی خبر درجۂ تواتر تک پہنچی ہوئی ہے۔ جس کے لیے مراجع (حوالے) ذکر کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ اگر حاضر نہ ہوتے تو بھی آپ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کتابتِ قرآن کے لیے بلواتے۔ حضرت براء بن عازب نے فرمایا جب یہ آیت (لَا يَسْتَوِي الْقَاعِدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ) نازل ہوئی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ادع لی زیدا، ولیجیٔ باللوح والدواۃ والکتف۔"[10]

(زید کو میرے پاس بلالاؤ اور وہ تختی، دوات اور قلم ساتھ لائیں)

اسی امتیازی وصف کی وجہ سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مشورہ سے آپ کو ایک ہی جگہ قرآن مجید جمع کرنے کی تکلیف دی۔[11] یہی وہ صفات تھیں جن کی بدولت ایک مرتبہ پھر آپ کو عہدِ عثمانی علیٰ صاحبہا رضوان اللہ میں مصاحفِ عثمانی نقل کرنے والی جماعت کا انچارج بنایا گیا۔ رضی اللہ عنہ وارضاہ[12] والامۃ الاسلامیہ مدینۃ لہ الیٰ یوم القیامۃ۔

۲۲۔ السجل

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

(يَوْمَ نَطْوِي السَّمَآءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ ۚ كَمَا بَدَأْنَآ أَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيدُهُ ۚ وَعْدًا عَلَيْنَا ۚ إِنَّا كُنَّا فَاعِلِينَ) {الانبیاء: ۱۰۴}

---

[1] سیر اعلام النبلاء ۲: ۳۰۶، الاصابہ ۱: ۵۶۱ [2] الاصابہ ۱: ۵۶۲ [3] الاستیعاب ۱: ۵۵۳

[4] البدایہ والنہایہ ۵: ۳۵۰ [5] تاریخ خلیفہ ۱: ۷۷ [6] المصباح المضئ ۸ ب

[7] فتح الباری ۹: ۲۲ [8] تاریخ الطبری ۶: ۱۷۹ [9] الوزراء والکتاب ۱۲

[10] التنبیہ والاشراف ۲۴۶، تجارب الامم لابن مسکویہ ۱: ۲۹۱ [11] صحیح بخاری، فضائل القرآن ۴

[12] صحیح بخاری، فضائل القرآن ۳ [13] ایضاً ۳

(وہ دن (بھی) یاد کرنے کے قابل ہے جس روز ہم (نفخۂ اولیٰ کے وقت) آسمان کو اس طرح لپیٹ دیں گے جس طرح لکھے ہوئے مضمون کا کاغذ لپیٹ دیا جاتا ہے (اور) ہم نے جس طرح اوّل بار پیدا کرنے کے وقت ہر چیز کی ابتدا کی تھی اسی طرح (آسانی سے) اس کو دوبارہ پیدا کر دیں گے یہ ہمارے ذمّہ وعدہ ہے (اور) ہم ضرور (اس کو پُورا) کریں گے)

مفسرین نے کلمہ "السجل" کی تفسیر میں اختلاف کیا ہے۔ بعض نے کہا اس سے مراد کتاب ہے، بعض نے کہا یہاں السجل سے مراد ایک فرشتہ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے اس صحابی کا نام مراد ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کتابت فرمایا کرتے تھے[1]۔ ابو داؤد، نسائی اور اسی طرح طبری نے ابنِ عباسؓ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا:

"السجل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک کاتب تھے۔"[2]

خطیب نے اپنی تاریخ میں ابنِ عمر کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:

"السجل کاتب النبی۔"

(سجل کاتبِ نبیؐ تھے)

پھر کہا:

"ھذا منکر جدا لا یصح اصلا من حدیث ابن عمر"[3]

(یہ بہت منکر قول ہے ابنِ عمر سے کوئی صحیح حدیث منقول نہیں)

اور ابنِ کثیر نے کہا کہ:

"اسی طرح ابنِ عباسؓ سے بھی کوئی صحیح روایت منقول نہیں۔"

اور مزید یہ کہا کہ:

"حفاظِ حدیث کی ایک جماعت نے اس کے موضوع ہونے کی صراحت کی ہے اگرچہ یہ روایت سنن ابی داؤد میں موجود ہے۔ اس جماعت میں سے ایک ہمارے شیخ الحافظ الکبیر ابو الحجاج المزی ہیں۔"

اور مَیں (ابنِ کثیر) نے اس حدیث پر ایک علٰحدہ رسالہ لکھا ہے۔ امام ابو جعفر بن جریر اس حدیث کے انکار کے درپے ہوئے اور اس کا بالکلیہ رد کیا اور کہا:

صحابہ میں سجل نامی کوئی شخص معروف نہیں اور کاتبانِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مشہور ہیں۔ ان میں کوئی ایک ایسا نہیں، جس کا

---

[1] تفسیر ابن کثیر: ۴: ۶۰۰-۶۰۲، البیہقی السنن الکبریٰ: ۱۰: ۱۲۶

[2] تفسیر ابنِ کثیر: ۴: ۶۰۲

[3] تفسیر ابن کثیر: ۴: ۶۰۲ وقد صححہ ابن حجر انظر الاصابہ: ۲: ۱۵

نام " السجل " ہو۔ اس سلسلہ میں آپ نے سچ فرمایا اور یہ اس حدیث کے منکر ہونے پر قوی دلائل میں سے ہے۔ اور جن لوگوں نے اس نام کو اسماءِ صحابہؓ میں شمار کیا ہے انہوں نے اسی (موضوع) حدیث پر اعتماد کیا ہے۔ واللہ اعلم[1] اور میرے نزدیک یہ روایت موضوع ہے یہاں میں نے اس حدیث کو اس لیے ذکر کیا ہے تاکہ میری غلطی نہ نکالی جائے۔

الانصاری نے ایک قصہ بیان کرکے کچھ غلط کر دیا ہے۔ قصہ یہ ہے کہ ایک نصرانی اسلام لایا۔ اس نے سورہ بقرہ اور سورہ آلِ عمران پڑھیں۔ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے لکھتا بھی تھا۔ بعد میں وہ دوبارہ نصرانیت کی طرف لوٹ گیا اور کہا کرتا:

مایدری محمد الا ما کتبت له۔

(محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میرے لکھے ہوئے کے سوا کچھ بھی نہیں جانتے)

اللہ تعالیٰ نے اس پر موت واقع کی اور لوگ اس کو دفن کرکے آگئے، صبح کو دیکھا تو زمین نے اسے باہر پھینک دیا تھا[2]

الانصاری نے اس مجہول آدمی کا نام " السجل " بتایا ہے، لیکن اس نے اس کلام کی کوئی سند نہیں ذکر کی۔ بہرحال اس " السجل " کو کاتبانِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں سے ذکر کیا ہے۔

ابنِ اثیر[3]، ابنِ سید الناس[4] اور العراقی[5] نے الفیہ السیرۃ میں اسے ذکر کیا ہے۔

۲۴۳۔ سعید بن سعید بن العاص القرشی الاموی رضی اللہ عنہ

وہ خالد اور ابان بن سعید بن العاص کے بھائی ہیں۔ فتح مکہ سے کچھ ہی پہلے اسلام لائے[6] نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن آپ کو بازارِ مکہ کا عامل بنایا[7]۔ یوم طائف میں شہید ہوئے[8]۔ آپ کاتبانِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں سے تھے — ابن سید الناس نے آپ کا اسم شریف کاتبانِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں شمار کیا ہے[10] اور اسی طرح انصاری نے بھی ذکر کیا ہے[11]

---

[1] ذکرہ ابن مندہ و ابونعیم کما فی اسد الغابہ ۲، ۲۶۱   [2] تفسیر ابن کثیر: ۴ : ۶۰۲

[3] بخاری المناقب : ۲۶ ، الحدیث ، ۳۶۱۷ ، وجاء فی روایۃ مسلم کما فی الفتح ۶ : ۶۲۵ " کان منا رجل من بنی النجار "۔

[3] اسد الغابہ : ۲ : ۲۶۱ ، وفیہ کاتب النبی صلی اللہ علیہ وسلم مجہول۔

[4] عیون الاثر : ۲ : ۳۱۶   [5] العجالۃ السنیہ : ۲۴۶

[6] اسد الغابہ : ۲ : ۳۰۹   [7] الاستیعاب : ۲ : ۸ ، اسد الغابہ : ۲ : ۳۰۹ ، الاصابہ : ۲ : ۴۸

[8] الاستیعاب : ۲ : ۸ ، الاصابہ : ۲ : ۴۷

[10] عیون الاثر : ۲ : ۳۱۵ نقلاً عن الدمیاطی

[11] المصباح المضئی : ۲۴ نقلاً عن ابن عبد البر

ابن مسکویہ نے کہا: سعید کے دونوں بیٹے عثمان اور ابان کاتبانِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں سے ہیں[1]۔ یہاں سعید کا لفظ پڑھنے میں غلطی لگی ہے۔

۲۴۔ شرحبیل بن حسنہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ[2]

سردارانِ قریش میں شمار ہوتے تھے۔ آپ قدیم الاسلام اور مہاجرینِ حبشہ میں سے ہیں[3]۔ عروہ نے ام المومنین ام حبیبہ بنت ابی سفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے یہ روایت بیان کی ہے کہ نجاشی نے جب انہیں (ام حبیبہؓ کو) حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں دے دیا تو شرحبیل بن حسنہ کے ساتھ انہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بھیجا[4]۔

حضرت ابوبکرؓ نے فتوحاتِ شام میں انہیں بھیجا[5]۔ حضرت عمرؓ نے انہیں (شرحبیل کو) شام کے علاقوں میں سے ایک علاقے کا والی مقرر کیا[6]۔

آپ کاتبانِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں سے ہیں۔ عمر بن شبہ[7]، المسعودی[8]، الیعقوبی[9]، المزی[10]، العراقی[11]، ابن سید الناس[12] اور الانصاری نے آپ کو کاتبانِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں شمار کیا ہے اور کہا ہے: آپ پہلے شخص ہیں جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کتابت کی ہے۔

مہاجرینِ حبشہ میں سے تھے[13]۔

داریون دو مرتبہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وفد کی شکل میں آئے، ایک مرتبہ ہجرت سے پہلے اور ایک مرتبہ ہجرت سے بعد۔ پہلی مرتبہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زمین کے ایک قطعہ کا سوال کیا۔ حضورؐ نے چمڑے کا ایک ٹکڑا منگوایا اور اس پر تحریر لکھ دی۔ یہ تحریر شرحبیل بن حسنہ نے لکھی تھی[14]۔

آپ شام میں طاعون عمواس میں ۱۸ھ کو فوت ہوئے تھے۔ رضی اللہ عنہ و ارضاہ۔

۲۵۔ طلحہ بن عبید اللہ بن عثمان بن عمرو التیمی رضی اللہ عنہ

ان آٹھ میں سے ایک ہیں جو پہلے پہل اسلام لائے اور ان پانچ میں سے ایک ہیں جو حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے

---

[1] تجارب الامم: ۱: ۲۹۱ (کذا فی النسخۃ المطبوعۃ)　[2] الاستیعاب: ۲: ۱۴۱

[3] الاستیعاب: ۲: ۱۴۱، الاصابہ: ۲: ۱۴۳　[4] سیر اعلام النبلاء: ۲: ۱۵۹

[5] الاصابہ: ۲: ۱۴۳　[6] الاستیعاب: ۲: ۱۴۱، الاصابہ: ۲: ۱۴۳　[7] المصباح المضیٔ ۹ ب

[8] التنبیہ والاشراف: ۲۴۶　[9] تاریخ الیعقوبی: ۲: ۸۰　[10] تہذیب الکمال ۹۰ ب

[11] العجالۃ السنیہ: ۲۴۵　[12] عیون الاثر: ۲: ۳۱۵　[13] المصباح المضیٔ: ۲۵-ا　[14] الوثائق السیاسیہ: وثیقہ ۲۳

ہاتھ پر اسلام لائے[۱] اللہ کے راستے میں بہت اذیتیں اُٹھائیں[۲]۔ جب حضرت زبیرؓ مسلمان ہوئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے طلحہ اور زبیر کے درمیان ہجرت سے قبل ہی مکہ میں مواخات قائم فرما دی[۳]۔

غزوۂ بدر میں حاضر نہیں ہوئے کیونکہ اس وقت شام میں تھے۔ ایک روایت یہ ہے کہ تجارت کے لیے گئے ہوئے تھے اور ایک قول یہ ہے کہ کاروانِ قریش کی جاسوسی کرنے کی غرض سے بھیجے گئے تھے۔ جب واپس ہوئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے (غنیمت میں) اپنے حصّہ کے متعلق بات کی آپ نے فرمایا: تجھے حصّہ ملے گا۔ پھر عرض کیا: میرا (اُخروی) اجر؟ آپ نے فرمایا تجھے اجر و ثواب بھی ملے گا۔ پھر اُحد اور تمام غزوات میں شریک ہوئے[۴] غزوۂ اُحد میں بڑی خوب صورت آزمائش میں ڈالے گئے۔ یُوں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی جان کے ذریعے بچاؤ کیا، تیر اپنے ہاتھوں پہ لیتے تھے حتیٰ کہ آپ کی انگلیاں شل ہو گئیں اس دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو "طلحة الخير" کا نام دیا۔

بیعتِ رضوان میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک پر بیعت کی[۵] غزوۂ حنین میں بھی آپ نے عظیم کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ اس دن حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کا نام "طلحة الجود" رکھا اور غزوۂ تبوک کے موقعہ پر "طلحة الفياض"۔ آپ اُن دس خوش نصیبوں میں سے ایک ہیں جن کو جنت کی بشارت دی گئی[۶]۔

ابن السکن نے کہا: کہا جاتا ہے کہ طلحہ نے چار ایسی عورتوں کے ساتھ نکاح کیا جن کی ایک ایک بہن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عقد میں بھی تھی:

۱۔ اُمِّ کلثومؓ بنتِ ابی بکرؓ اور ام المومنین حضرت عائشہؓ کی بہن

۲۔ حمنہؓ بنت جحش، حضرت ام المومنین زینبؓ کی بہن

۳۔ الفارعہؓ بنت ابی سفیان، ام المومنین ام حبیبہؓ کی بہن

۴۔ رقیہؓ بنت ابی امیہ ام المومنین ام سلمہؓ کی بہن رضوان اللہ علیہم اجمعین[۷]

حضرت طلحہؓ بڑے سخی، فیاض، غنی اور مالدار تھے۔ قبیصہ بن جابر نے کہا: میں نے کوئی ایسا آدمی نہیں دیکھا جو بن مانگے حضرت طلحہؓ سے زیادہ مال دینے والا ہو[۸]۔

حضرت عمرؓ جب جابیہ میں تشریف لائے تو حضرت طلحہؓ ان کے ہمراہ تھے۔ حضرت عمرؓ نے ان کو مہاجرین کا امیر بنایا[۱۰]۔

---

۱ الاصابہ: ۲: ۲۲۹ — ۲ اسد الغابہ: ۲: ۵۹، سیر اعلام النبلاء: ۱: ۱۵

۳ اسد الغابہ: ۲: ۵۹ — ۴ الاستیعاب: ۲: ۲۲۰ — ۵ انظر الاستیعاب: ۲: ۲۲۰

۶ اسد الغابہ: ۲: ۹۲ — ۷ الاستیعاب: ۲: ۲۲ — ۸ الاصابہ: ۲: ۲۳۰

۹ ایضاً

۱۰ سیر اعلام النبلاء: ۱: ۱۶

حضرت عمرؓ نے ان چھ آدمیوں میں آپ کو بھی رکھا جو شوریٰ کے لیے منتخب کیے گئے تھے۔[1] ابتداءً حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راضی نہ تھے مگر جب آپ کی شہادت کے وقت حاضر ہوئے تو گزشتہ موقف سے پھر گئے اور حضرت عثمان کی مدد نہ کرنے پر نادم ہوئے۔ قاتلینِ عثمانؓ نے آپ کو پکڑ کر حضرت علیؓ کے پاس حاضر کیا حتی کہ آپ نے حضرت علیؓ کے ہاتھ پر بیعت کی اور آپ پہلے آدمی ہیں جنھوں نے حضرت علیؓ کی بیعت کی۔[2] پھر ان لوگوں کے ساتھ بھی نکلے جو خونِ عثمانؓ کا مطالبہ لے کر اُٹھے تھے۔

واقعہ جمل میں مروان بن الحکم کے تیر سے شہید ہو گئے۔ حضرت علیؓ نے آپ پر رحم کھایا۔ آپ کے چہرہ اور داڑھی سے گرد و غبار کو جھاڑا اور فرمایا:

کاش! میں آج سے بیس سال قبل کا فوت ہو گیا ہوتا۔

اور مزید فرمایا:[3]

"بشروا قاتل طلحة بالنار"۔

(طلحہ کے قاتل کو جہنم کی بشارت سنا دو)

حضرت طلحہؓ کاتبانِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں سے ہیں۔ ابنِ مسکویہ[4]، ابن سید الناس[5]، العراقی[6] اور الانصاری[7] وغیرہ نے آپ کو کاتبانِ نبیؐ کی فہرست میں شمار کیا ہے۔

۲۶۔ عامر بن فہیرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ[8]

قبیلہ ازد سے متعلق سیاہ رنگت والے، طفیل بن عبداللہ بن سخبرہ کے غلام اور قدیم الاسلام تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دارِ ارقم میں دعوتِ اسلام دینے سے پہلے اسلام لا چکے تھے۔ قبولِ اسلام کی پاداش میں انہیں بہت اذیت دی جاتی تھی۔ حضرت ابوبکرؓ نے انہیں خرید کر آزاد کر دیا۔[9] جن دنوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غارِ ثور میں چھپے ہوئے تھے عامر اس غار کے اردگرد کے علاقے میں بکریاں چراتے رہتے جب شام ہوتی تو بکریوں کو غار کے پاس لے آتے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ (جو غار میں چھپے رہتے تھے)[10] بکریوں کا دودھ دوہ لیتے۔ جب صبح ہوتی تو عبداللہ بن ابی بکر یارانِ غار کے پاس سے عامر بن فہیرہ اور ان کی بکریوں کے قدموں کے نشانات پر چلتے، حتی کہ وہ مٹ جاتے[11]

---

[1] الاستیعاب ۲: ۲۲۰
[2] سیر اعلام النبلاء ۱: ۲۲
[3] ایضاً ۱: ۳۳
[4] تجارب الامم ۱: ۲۹۱
[5] عیون الاثر ۲: ۳۱۶
[6] العجالۃ السنیہ ۲۴۶
[7] المصباح المضئ ۲۹ ب
[8] الاستیعاب ۳: ۸۰
[9] الاصابہ ۲: ۲۵۶
[10] الاستیعاب ۳: ۷
[11] اسد الغابہ ۳: ۹۱

(گویا) ہجرتِ مدینہ میں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے رفیق سفر رہے [۱]
غزوہ بدر اور اُحد میں شریک ہوئے۔ بیرِ معونہ میں شہید ہوئے اور آپ کی نعش مبارک مقتولوں میں نہ مل سکی [۲]
آپ کاتبانِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں سے تھے۔ المزی [۳]، ابن کثیر [۴]، العراقی [۵]، ابن سید الناس [۶] اور الانصاری [۷]
وغیرہ نے آپ کا اسمِ گرامی کاتبانِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں شمار کیا ہے۔

مسند امام احمد میں ہے کہ (سفرِ ہجرت میں) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سراقہ بن مالک المدلجی کو جو امان نامہ لکھ دیا وہ عامر بن فہیرہ نے آپؐ کے حکم سے لکھا تھا۔

سراقہ (خود) کہتے ہیں:

"میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے امان نامہ لکھ دینے کی درخواست کی تو آپؐ نے عامر بن فہیرہ کو ارشاد فرمایا انہوں نے ایک چمڑے کے ٹکڑے پر وہ امان نامہ تحریر کر دیا۔" [۸]

۲۷ - العباس رضی اللہ عنہ

میں (محمد مصطفیٰ الاعظمی) نے کاتبانِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر قلم اٹھانے والوں میں سے کسی کو نہیں پایا کہ اس نے حضرت عباسؓ کا ذکر کیا ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر بعد میں آنے والا (عموماً) اپنے سے قبل کے لوگوں پر اعتماد کرتا ہے۔ میں اس امر سے کوئی مانع نہیں پاتا کہ کاتبانِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی فہرست میں حضرت عباسؓ کے نام کا اضافہ کر دوں۔ مگر اتنی بات ضرور ہے کہ عباسؓ کاتبِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت میرے نزدیک مبہم ہے کیونکہ صحابہ کرام میں بہت سارے ایسے حضرات موجود ہیں جن کا نام نامی عباس ہے۔ جن کو ابن عبدالبر، ابن حجر اور ابن اثیر وغیرہ نے ذکر کیا ہے زیادہ تر عباسؓ سے مراد عباسؓ بن عبدالمطلب ہی ہوتے ہیں، اور یہی ہمارا مقصود ہے۔ وہ تحریر جس پر ہم اس نام کے اضافہ کرنے کا اعتماد کر رہے ہیں، غنائم خیبر اور ان کو امہات المومنین وغیرہ پر تقسیم کرنے کے متعلق ہے۔ مشہور یہی ہے کہ فتح خیبر حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب کے مدینہ منورہ ہجرت کرنے سے پہلے ہوئی ہے۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ یہ وثیقہ فتح خیبر کے کچھ دن بعد لکھا گیا ہے تو (تطبیق ہو سکتی ہے) یہ جائز ہے اور اس میں کوئی اشکال نہیں رہتا۔ وہ وثیقہ یہ ہے:

---

[۱] الاستیعاب ۲ : ۷-۸ — [۲] الاستیعاب ۳ : ۸ — [۳] تہذیب الکمال ۱۸۳ ب

[۴] البدایہ والنہایہ ۵ : ۳۴۸ — [۵] العجالۃ السنیۃ ۲۴۵

[۶] عیون الاثر ۲ : ۳۱۵ — [۷] المصباح المضئ

[۸] حم ۴ : ۱۷۶، و انظر ایضاً الوثائق السیاسیہ ر/ز، والبدایہ والنہایہ ۵ : ۳۴۸ للتوافق بین روایۃ کتابۃ ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ لہذا الخطاب وبین کتابۃ عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"ذکر ما اعطی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نساءہ من قمح خیبر۔ قسم لھن مئة وسق وثمانین وسقا، ولفاطمة بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خمسة وثمانین وسقا ولاسامة بن زید اربعین وسقا وللمقداد بن الاسود خمسة عشر وسقا ولام رمیثة خمسة اوسق۔"

ترجمہ: "ذکر خیبر کی اُس گندم کا جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازواجِ مطہرات کو عطا فرمائی۔ ازواجِ مطہرات کے لیے ایک سو اسّی (۱۸۰)، فاطمہؓ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے پچاسی (۸۵)، اسامہؓ بن زید کے لیے چالیس (۴۰)، مقدادؓ بن الاسود کے لیے پندرہ (۱۵) اور ام رمیثہ کیلئے پانچ وسق ہوں گے۔"

(وسق ایک پیمانہ ہے جو ساٹھ صاع کا ہوتا ہے اور ایک صاع تقریباً چار سیر پاکستانی وزن کا ہوتا ہے)

عثمانؓ بن عفان اور عباسؓ گواہ بنے اور عباسؓ نے ہی لکھا۔[۱]

۲۸۔ عبد اللہ بن الارقم بن عبد یغوث القرشی الزہری رضی اللہ عنہ

ان کے دادا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ماموں تھے۔[۲] فتح مکہ کے دن اسلام لائے۔[۳] ان لوگوں میں سے تھے جن کا "حَسُنَ اِسْلَامُہٗ" اسلام بہت اچھا تھا۔ بڑے پاکباز اور صاف ستھرے آدمی تھے۔ عبد اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ نے اپنے باپ سے روایت کی ہے کہ میں نے عبد اللہ بن ارقم سے بڑھ کر کوئی شخص خدا سے ڈرنے والا نہیں دیکھا۔[۴]

اشہب نے حضرت مالک سے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے،

"میں نے عبد اللہ بن الارقم سے زیادہ خدا سے ڈرنے والا کوئی شخص نہیں دیکھا۔"

اور عبد اللہ سے فرمایا:

اگر تو سابقون اولون سے ہوتا تو میں تجھ پر کسی کو مقدم نہ کرتا۔[۵]

حضرت ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما دونوں کے کاتب رہے۔[۶]

---

[۱] سیرۃ ابن ہشام ۳: ۳۵۲-۳۵۳، انظر ایضاً الوثائق السیاسیہ وثیقہ ۱۸

[۲] الاصابہ ۲: ۲۷۳ [۳] ایضاً

[۴] سیر اعلام النبلاء ۲: ۳۴۴ [۵] الاستیعاب ۲: ۲۶۲

[۶] السنن الکبریٰ للبیہقی ۱۰: ۱۲۶ ھو الذی کتب کتاب ابی بکر الی اھل القادسیہ۔

حضرت عمرؓ نے آپ کو بیت المال کا نگران بنایا۔ پھر حضرت عثمانؓ کے دور میں بھی کافی عرصے تک بیت المال کے متولی رہے۔ بعد ازیں اس خدمت سے الگ ہو گئے۔ جب آپ بیت المال کے نگران تھے تو حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بطور معاوضہ تین ہزار (درہم یا دینار) دینا چاہے تو لینے سے انکار کر دیا اور فرمایا:

انما عملت للہ تعالیٰ، و انما اجری علی اللہ [۱]

(میں نے محض رضائے الٰہی کی خاطر کام کیا ہے، بے شک میرا اجر و ثواب اللہ کے ہاں ہے)

وفات سے قبل آپ کی بینائی چلی گئی[۲] آپ کی وفات خلافتِ عثمانیؓ میں ہوئی[۳] رضی اللہ عنہ وارضاہ۔

آپ کاتبانِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں سے ہیں اور آپ کا اسمِ گرامی کاتبانِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی فہرستوں میں ابنِ اسحاق، ابن شبہ[۴]، بخاری، مسلم بن الحجاج[۵]، طبری[۶]، جہشیاری[۷]، المسعودی[۸] اور ابنِ مسکویہ[۹] وغیرہم[۱۰] نے ذکر کیا ہے۔

ابن قاسم نے مالک سے روایت کیا کہ مجھے یہ خبر پہنچی کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک خط آیا تو آپ نے فرمایا میری طرف سے کون جواب دے گا؟

عبداللہ بن الارقم نے جواب دیا: "میں!"

اور انہوں نے اس کا جواب لکھ کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں پیش کیا[۱۱] تو حضورؐ نے فرمایا! ٹھیک ہے۔ اور پسند فرمایا اور دعا فرمائی:

"اللھم وفقہ۔"[۱۲]

(اے اللہ! اسے (خیر کی) توفیق عطا فرما)

حضرت عمرؓ کہتے ہیں میں نے عبداللہ بن الارقم سے کہا کہ حضورِ اکرمؐ نے آپ کے لکھے ہوئے کو پسند فرمایا ہے۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں یہ چیز ہمیشہ دل میں رہی حتیٰ کہ میں نے ان کو بیت المال کا متولی مقرر کیا۔[۱۳]

---

[۱] سیر اعلام النبلاء ۲ : ۴۴۴ [۲] اسد الغابہ ۳ : ۱۱۶ [۳] الاصابہ ۲ : ۲۷۴۔
[۴] المصباح المضی ۸ ب [۵] الطبقات للامام مسلم ۲۸۰ ب [۶] تاریخ الطبری ۶ : ۱۷۹
[۷] الوزراء والکتاب ۱۲ [۸] التنبیہ والاشراف ۲۴۵ [۹] تجارب الامم ۱ : ۲۹۱-۲۹۲
[۱۰] انظر علی سبیل المثال "تہذیب الکمال" للمزی ۴۴ ب، البدایہ والنہایہ ۵ : ۳۴۹، الاصابہ ۲ : ۲۷۳، ۲۷۴، الاستیعاب ۲ : ۲۶۲
[۱۱] الاستیعاب ۲ : ۲۶۱
[۱۲] السنن الکبریٰ للبیہقی ۱۰ : ۱۲۶
[۱۳] الاصابہ ۲ : ۲۷۴

ابن اسحاق نے محمد بن جعفر بن الزبیر سے اور انہوں نے عبداللہ بن الزبیر سے روایت کیا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عبداللہ بن الارقم بن عبد یغوث سے لکھوایا کرتے تھے اور وہ آپ کی طرف سے بادشاہوں کو جواب دیا کرتے تھے۔ کتابت میں ان کی امانت پر حضورؐ کو اس قدر اعتماد تھا کہ آپ انھیں کسی بادشاہ کی طرف خط لکھنے کا حکم فرماتے تو وہ لکھ کر اور مُہر لگا کر بند کر دیتے حضورؐ اسے دوبارہ پڑھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ فرماتے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم زیدؓ بن ثابت سے بھی لکھوایا کرتے تھے اور وہ وحی لکھا کرتے۔ جب ابن الارقم اور زید بن ثابت غائب ہوتے اور آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی کی طرف کوئی چیز لکھوانے کی ضرورت ہوتی تو جو بھی حاضر ہوتا اسے ارشاد فرماتے کہ لکھ دو۔ ان لوگوں میں (عموماً) حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت خالدؓ بن سعید، حضرت مغیرہؓ اور حضرت معاویہؓ تھے۔[1]

طبری ان کی کتابت اور تخصص کی نوعیت بھی لکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ عبداللہ بن الارقم بن عبد یغوث اور العلاء بن عقبہ لوگوں کے درمیان باہمی ضروریات (یعنی دین کی دستاویزات) لکھا کرتے تھے۔ عبداللہ بن الارقم بسا اوقات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بادشاہوں کو مکاتیب (بھی) لکھا کرتے تھے۔[2]

الجہشیاری کہتے ہیں کہ عبداللہ بن الارقم بن عبد یغوث اور العلاءؓ بن عقبہ قبائل کے درمیان باہمی معاہدات، ان کے درمیان پانی (کی تقسیم وغیرہ) کے معاہدات اور انصار کے مردوں اور عورتوں کے درمیان مکانات کے تصفیوں کو لکھا کرتے تھے۔[3]

اور مسعودی نے کہا کہ عبداللہ بن الارقم الزہری اور العلاءؓ بن عقبہ لوگوں کے درمیان کی دستاویزات، قرض کی تحریریں، تمام خرید و فروخت کے معاہدے، اور دیگر معاملات لکھا کرتے تھے۔[4]

۲۹۔ عبداللہ بن ابی بکر الصدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہما

آپ قدیم الاسلام تھے، فتح حنین اور طائف کے معرکوں میں موجود رہے۔ غزوۂ طائف میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حاضر ہوئے۔ ابو محجن ثقفی نے آپ کو تیر چلا کر مارا جس سے آپ زخمی ہو گئے۔ یہ زخم اس وقت تو مندمل ہو گیا مگر بعد میں پھر پھٹ پڑا جس سے آپ کی وفات شوال ۱۱ھ میں اپنے والد کے زمانۂ خلافت میں ہو گئی۔

ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نماز جنازہ پڑھائی اور ان کی قبر میں حضرت عمرؓ، حضرت طلحہؓ اور ان کے بھائی حضرت عبدالرحمٰنؓ بن ابی بکرؓ اترے۔[5]

میں (مصنف) نے کسی (سوانح نگار) کو نہیں پایا کہ اس نے آپ کا ذکر کاتبانِ نبیؐ میں کیا ہو لیکن "الوثائق السیاسیہ"

---

[1] الاصابہ ۲: ۲۷۳، انظر ایضاً السنن الکبریٰ للبیہقی ۱۰: ۱۲۶ وفیہ تفصیل اکثر

[2] تاریخ الطبری ۶: ۱۷۹ [3] الوزراء والکتاب ۱۲ [4] التنبیہ والاشراف ۲۴۵

[5] الاستیعاب ۸۷۴ - ۸۷۵ تحقیق البجادی

وثیقہ رقم /۴۹ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ بھی کاتب تھے۔

۳۰۔ عبداللہ بن خطل یا عبدالعزیٰ بن خطل (قُتِلَ مُرْتَدًّا)

بعض روایات میں آیا ہے کہ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے کتابت کرتا تھا۔ ابنِ سید الناس نے کہا کہ ہمیں نزال بن سبرہ اور علی کے واسطہ سے یہ روایت پہنچی کہ ابنِ خطل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لکھا کرتا تھا۔ جب "غفور رحیم" کے الفاظ نازل ہوتے تو وہ "رحیم غفور" اور جب "سمیع علیم" کے الفاظ کا نزول ہوتا تو وہ "علیم سمیع" لکھ دیتا۔ ابن خطل نے خود کہا کہ "میں وہی لکھتا تھا جو میں چاہتا تھا"

بعد میں مرتد ہو گیا اور مکہ چلا گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص ابنِ خطل کو قتل کرے گا وہ جنت میں جائے گا۔ چنانچہ فتح مکہ کے دن وہ قتل کر دیا گیا جبکہ وہ کعبہ مشرفہ کے غلاف سے چمٹا ہوا تھا۔

ابنِ سید الناس نے کہا: یہ ایک وہم ہے در اصل یہ واقعہ ابن ابی سرح کے متعلق مشہور ہے[1]۔

الانصاری نے ایک اور چیز کا اضافہ کیا اور کہا کہ وہ (ابنِ خطل) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لکھا کرتا تھا۔ "غفور رحیم" کی جگہ "رحیم غفور" اور "سمیع علیم" کی جگہ "علیم سمیع" لکھ دیتا۔ ایک دن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا:

"اعرض علیّ ما کنت املی علیك"

(جو کچھ میں تجھے اِملا کراتا تھا وہ مجھے دکھا)

جب اس نے لکھا ہوا پیش کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ:

"تو نے "غفور رحیم" کی جگہ "رحیم غفور" اور "سمیع علیم" کی جگہ "علیم سمیع" لکھ دیا ہے"

الانصاری نے بتایا کہ ابنِ خطل نے کہا:

"میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے واسطے وہی کچھ لکھتا جو چاہتا" پھر مرتد ہو گیا اور مکہ چلا گیا[2]۔

العراقی نے کہا کہ وہ (ابن خطل) کاتبانِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے تھا پھر گمراہ ہو گیا[3] مگر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے کاتبِ نبی صلی اللہ ہونے پر کوئی معتبر سند موجود نہیں۔ ابنِ عبدالبر نے فتح مکہ کے روز اس کے خون کے مباح ہونے کی وجوہات بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ اسلام لایا تھا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو صدقات کی وصولی کے لیے بھیجا۔ ایک اور مسلمان آدمی بھی اس کے ساتھ کر دیا۔ وہ (ابنِ خطل) اس مسلمان پر چڑھ دوڑا اور اسے قتل کر دیا۔ اقدامِ قتل کے بعد مرتد

---

[1] عیون الاثر ۲ : ۳۱۶

[2] المصباح المضئ ۳۷-۱

[3] العجالۃ السنیہ ۲۴۷

ہوگیا اور مشرکین مکہ کے ساتھ جا ملا[۱]

راجح وہی قول ہے جسے ابن اسحاق نے ذکر کیا کہ عبداللہ بن خطل بنی تیم بن غالب کا ایک فرد تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے قتل کا حکم فرمایا تھا وجہ یہ تھی کہ اس کے اسلام لانے کے بعد آپؐ نے اُسے صدقات کی وصولی کے لیے بھیجا۔ اس کے ساتھ دو اور انصاری بھی بھیجے اس کے ساتھ اس کا غلام تھا جو اس کی خدمت کرتا تھا اور وہ غلام مسلمان تھا۔ ابن خطل نے ایک جگہ قیام کیا اور اپنے غلام کو حکم دیا کہ وہ ایک پہاڑی بکرا ذبح کرکے اس کے لیے کھانا تیار کرے۔ یہ کہہ کر خود سو گیا۔ جب اٹھا تو کھانا تیار نہیں تھا۔ پس اس نے غلام پر زیادتی کرتے ہوئے اسے قتل کر دیا اور خود مرتد ہوگیا[۲] اس کی دو لونڈیاں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو میں گایا کرتی تھیں۔ حضورؐ نے اس لعین کے ساتھ ان لونڈیوں کے قتل کا بھی حکم فرمایا[۳]

اس وجہ سے ہمارا خیال یہ ہے کہ وہ کاتب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نہ تھا بلکہ مصدق تھا۔ چونکہ اس نے شیطان کی پیروی کی تھی اور اپنے مسلمان خادم کو بلا کسی جرم کے (سوائے اس کے کہ اس نے کھانا نہیں تیار کیا تھا) قتل کر دیا تھا۔ پھر سزا سے ڈرتے ہوئے مرتد ہوکر مکہ کی طرف بھاگ گیا۔ پھر وہ اپنی گمراہی میں انتہا کو پہنچ گیا حتیٰ[۴] کہ اپنی لونڈیوں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو کہلواتا۔ یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے خون کو مباح قرار دیا۔

۳۱۔ عبداللہ بن رواحہ بن ثعلبہ بن امرأ القیس الخزرجی الانصاری رضی اللہ عنہ

بلند پایہ شاعر تھے۔ ایام جاہلیت سے پڑھنا اور لکھنا جانتے تھے[۵] انصار میں سابقین اولین سے ہیں۔ عقبہ میں ستر آدمیوں کے ساتھ تھے اور انصار کے بارہ نقیبوں میں سے ایک ہیں[۶] غزوۂ بدر میں شریک ہوئے۔ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اہل العالیہ کی طرف غزوۂ بدر میں مسلمانوں کی مدد و نصرت کی خوشخبری سنانے کے لیے بھیجا[۷] حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب غزوۂ بدر کی طرف نکلے تو ان کو الموعد کا خلیفہ بنایا[۸]

غزوۂ اُحد، خندق، صلح حدیبیہ، غزوۂ خیبر اور عمرۃ القضاء میں شریک رہے[۹] ثابت نے انس بن مالک سے روایت کی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عمرۃ القضاء کے موقعہ پر مکہ میں داخل ہوئے اور ابن رواحہ آپ کے سامنے یہ شعر پڑھ رہے تھے:

خلوا بنی الکفار عن سبیلہ　　نحن ضربناکم علیٰ تأویلہ
ضرباً یزیل الھام عن مقیلہ　　ویذھل الخلیل عن خلیلہ

---

۱ الدرر فی المغازی والسیر ۲۳۲　۲ سیرۃ ابن ہشام ۴ : ۱۰۴　ایضاً　المغازی للواقدی ۸۵۹ - ۸۶۰

۳ ابن ہشام ۴ : ۱۰۴　۴ تصدیقنا الفاضل الدکتور حسن باجودۃ دراستہ ممتعۃ عن ہذا الشاعر

۵ طبقات ابن سعد ۳/۲ : ط　۶ ایضاً ۳/۲ : ۷۹　۷ ایضاً

۸ ایضاً　۹ الاصابہ ۲ : ۳۰۶

ترجمہ : اے کفار ! آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رستے سے ہٹ جاؤ۔ ہم نے تمہیں آپؐ کے لوٹا نے پر ایسی مار ماری جو کھوپڑی کو اس کی آرام گاہ سے جُدا کر دے اور جو دوست کو دوست سے غافل کر دے۔

حضرت عمرؓ نے کہا :

اے ابنِ رواحہ ! حرمِ مکہ اور پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایسے اشعار ؟

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

اے عمر ! اسے شعر کہنے دے ۔ اس ذات کی قسم، جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے اس کا کلام کفار پہ تیروں سے زیادہ سخت ہے۔

عبد اللہ بن رواحہ کا (ایک دفعہ) اپنی بیوی کے ساتھ بڑا ملیح (عجیب) قصہ ہوا اور وُہ یہ کہ ایک رات اپنی لونڈی کے پاس چلے گئے اور اس سے ہم بستر ہوئے۔ ان کی بیوی کو بھی معلوم ہوگیا ۔ بیوی نے شکوہ و ملامت کی تو انکار کر دیا۔ بیوی کہنے لگی : اگر تم سچ کہتے ہو تو قرآن مجید کی تلاوت کرو (کیونکہ جنبی تلاوت نہیں کرسکتا) لطف کی بات یہ تھی کہ بیوی نہ قرآن کا علم رکھتی تھی اور نہ ہی پڑھ سکتی تھی، تو ابنِ رواحہ نے کہا :

شھدت بان وعد اللہ حق   وان النار مثوی الکافرینَ
وان العرش فوق الماء حق   وفوق العرش رب العالمینا
وتحملہ ملائکۃ غلاظ   ملائکۃ الالٰہ مسومینا

ترجمہ : میں گواہی دیتا ہُوں کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ حق ہے اور جہنم کافروں کا ٹھکانا ہے ۔ اور پانی کے اوپر عرش کا ہونا حق ہے اور عرش کے اوپر تمام جہانوں کا پروردگار جلوہ فرما ہے ۔ اس عرش کو بڑے سخت جان اور نشان زدہ ملائکہ الٰہی اٹھائے ہُوئے ہیں۔

یہ سن کر بیوی نے کہا :

صدق اللہ وکذبت عینی [1]

ترجمہ : اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا اور میری آنکھ نے غلط دیکھا)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح و ستائش میں ان کے بہت سارے قصیدے ہیں۔ ابنِ حجر نے کہا : ابنِ رواحہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں جو کچھ کہا اس میں یہ شعر بڑا شاندار ہے :

لو لم تکن فیہ اٰیات مبینۃ
کانت بدیھتہ تنبیک بالخبر

---

[1] الاستیعاب ۲، ۲۹۶ - ۲۹۷

ترجمہ : اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر واضح نشانیاں نہ بھی ہوتیں تو آپؐ کی ظاہری شکل وصورت ہی ایسی (حسین وجمیل) تھی جو آپؐ کے نبی برحق ہونے کی خبر دیتی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم انہیں خیبر کی کھجوروں کا اندازہ لگانے کے لیے بھیجا کرتے تھے۔ جنگِ موتہ میں شہید ہوئے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب موتہ کی طرف لشکر روانہ فرمایا تو (اپنے آزاد کردہ غلام) حضرت زیدؓ بن حارثہ کو امیرِ لشکر بنایا اور فرمایا اگر زیدؓ شہید ہوجائیں تو جعفرؓ بن ابی طالب، جعفرؓ شہید ہوجائیں تو عبداللہؓ بن رواحہ، اگر عبداللہؓ بھی شہید ہوجائیں تو تمام مسلمان فوراً کسی دوسرے آدمی کو اپنا امیر مقرر کرلیں۔ جب مسلمان مقام "معان" میں اُترے تو انہیں معلوم ہوا کہ ہرقل مقام مآب میں ایک لاکھ رومیوں اور ایک لاکھ مستعربوں کے ساتھ پڑاؤ کیے ہوئے ہے۔ مسلمانوں نے دو دن "معان" میں قیام کیا اور ارادہ کیا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دشمن کی کثیر تعداد کی خبر دی جائے اور آپ کی طرف سے حکمِ ثانی کا انتظار کیا جائے۔ اس وقت حضرت عبداللہ بن رواحہ نے انہیں شجاعت ومردانگی پر اُبھارا۔ مومنین کی تعداد اس وقت صرف تین ہزار تھی۔ چنانچہ مسلمانوں نے پیش قدمی کی اور رومیوں سے بلقاء کے ایک گاؤں میں مردانہ وار مقابلہ کیا۔ پھر مسلمان (وہ جگہ چھوڑ کر) موتہ کی طرف ہٹ آئے۔ اس جنگ میں زیدؓ بن حارثہ شہید ہوگئے تو جعفرؓ بن ابی طالب نے جھنڈا تھام لیا۔ انہوں نے جامِ شہادت نوش کیا تو عبداللہؓ بن رواحہ نے جھنڈا پکڑ لیا، حتیٰ کہ وہ بھی شہید ہوگئے۔ رضوان اللہ علیہم اجمعین۔

یہ جنگ جمادی (اولیٰ یا اخریٰ) ۸ھ میں ہوئی۔[۱]

آپ (عبداللہؓ بن رواحہ) کاتبانِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں سے ہیں۔ ابنِ سعدؒ[۲]، عمرو بن شبہؒ[۳]، ابنِ عبدالبرؒ[۴]، ابنِ حجرؒ[۵]، العینیؒ[۶]، العراقیؒ[۷]، ابنِ سیدالناسؒ[۸] اور الانصاریؒ[۹] وغیرہم نے آپ کا اسمِ گرامی کاتبانِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ضمن میں شمار کیا ہے۔

۳۲۔ عبداللہ بن زید بن عبدربہ الانصاری الخزرجی رضی اللہ عنہ

ابنِ اثیر نے کہا کہ عبداللہ عقبہ، بدر اور دوسرے تمام غزوات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک ہوئے۔[۱۰] یہ وہی عبداللہ ہیں جنہیں خواب میں اذان کا طریقہ دکھایا گیا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلالؓ کو ارشاد فرمایا کہ وہ اسی طرح اذان دیں جس طرح عبداللہؓ نے دیکھا ہے۔[۱۱]

---

[۱] الاصابہ ۲ : ۳۰۷
[۲] اسد الغابہ ۳ : ۱۵۸ - ۱۵۹
[۳] الاصابہ ۲ : ۳۰۶
[۴] المصباح المضئی ۳۳ - ب
[۵] الاستیعاب ۲ : ۳۰۱
[۶] الاصابہ ۲ : ۳۰۶
[۷] عمدۃ القاری ۲۰ : ۱۹
[۸] العجالۃ السنیہ ۲۴۶
[۹] عیون الاثر ۲ : ۳۱۵
[۱۰] المصباح المضئی ۳۳ - ب
[۱۱] الاستیعاب ۲ : ۳۱۲ وقد اختلف فی وفاتہ حتی قال بعضہم استشہد ببدر
[۱۲] اسد الغابہ ۳ : ۱۶۶
[۱۳] الاصابہ ۲ : ۳۱۵، الاستیعاب ۲ : ۳۱۱ - ۳۱۲، اسد الغابہ ۳ : ۱۶۶

آپ کاتبانِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں سے ہیں۔

تمام تذکرہ نگاروں واقدیؒ، ابن سیدالناسؒ، ابن کثیرؒ، العراقیؒ اور الانصاریؒ[۵] نے آپ کا اسم شریف کاتبانِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمرے میں شریک کیا ہے۔ ابنِ سعدؒ نے عبداللہؓ بن زید کا وُہ خط بھی محفوظ کیا ہے جو انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے لخم کے قبیلہ حدس کو لکھا تھا[۶]۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھوایا:

"لخم کے قبیلہ حدس میں سے جس شخص نے ایمان قبول کیا، نماز قائم کی، زکوٰۃ دی، اللہ تعالیٰ کا حصّہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حصّہ ادا کیا اور مشرکین سے قطع تعلق کر لیا تو وُہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمّہ میں ہے (یعنی امن میں ہے) اور جس شخص نے اس کے دین سے رجوع کیا تو وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمّہ سے بری ہے۔ اور جس شخص کے اسلام کے متعلق کسی مسلمان نے گواہی دی وہ بھی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ذمّہ میں ہے اور مسلمانوں میں سے ہے۔"

یہ تحریر عبداللہؓ بن زید نے لکھی۔

۳۳ - عبداللہ بن سعد بن ابی سرح بن الحارث القرشی العامری رضی اللہ تعالیٰ عنہ

یہ حضرت عثمان بن عفان کے رضاعی بھائی اور قریش کے عقلمند اور سخی لوگوں میں سے ایک ہیں[۷]۔ آپ کے قبولِ اسلام کی تاریخ میں اختلاف ہے۔ ابنِ سعد نے کہا کہ قدیم الاسلام تھے[۸]۔ ابن عبدالبر نے کہا فتح مکّہ سے قبل اسلام لائے اور ہجرت کی[۹]۔ ابنِ اثیر نے بھی اسی طرح کہا کہ فتح مکّہ سے قبل اسلام لائے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہجرت فرمائی[۱۰] بعد میں مرتد ہو گئے۔ اور مشرکین کے ساتھ جا ملے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے خون کو مباح قرار دیا۔ فتح مکّہ کے روز حضرت عثمانؓ نے ان کے لیے سفارش کی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے امان دی اور ان کے اسلام کو قبول کیا[۱۱] پھر ان کا اسلام بہت ہی پختہ ہوا[۱۲]۔ ۲۰ھ میں حضرت سیّدنا عمر بن الخطابؓ کے عہد میں فتح مصر کے وقت سپہ سالار لشکر عمروؓ بن العاص کے میمنہ کے امیر تھے۔ اور انہی کے زمانہ میں الصعید پر بھی امیر مقرر ہوئے۔

جب حضرت عثمانؓ خلیفہ ہوئے تو انہوں نے عمروؓ بن العاص کو معزول کر کے ۲۵ھ میں عبداللہؓ بن سعد بن ابی سرح کو

۱؎ البدایہ والنہایہ ۵ : ۳۵۰ ۲؎ عیون الاثر ۲ : ۳۱۵ ۳؎ البدایہ والنہایہ ۵ : ۳۵۰

۴؎ العجالۃ السنیہ ۲۴۷ ۵؎ المصباح المضی ۳۵-۱

۶؎ طبقات ابن سعد ۱/۲ : ۲۱، انظر ایضاً الوثائق السیاسیہ : وثیقہ رقم ۴۱/

۷؎ اسد الغابہ ۳ : ۱۷۳، العقد الثمین ۵ : ۱۶۷ ۸؎ الطبقات ۲/۷ : ۱۹۰ ۹؎ الاستیعاب ۲ : ۳۷۵

۱۰؎ اسد الغابہ ۳ : ۱۷۳ ۱۱؎ فتح الباری ۸ : ۱۱ ۱۲؎ البدایہ والنہایہ ۵ : ۳۵۰

امیر مقرر فرمایا۔ ۲۷ھ میں ابن ابی سرحؓ نے افریقہ فتح کیا اور یہ ایک بہت بڑی فتح تھی جس میں وافر مالِ غنیمت حاصل ہوا حتیٰ کہ ایک گھوڑسوار کا حصہ مالِ غنیمت میں تین ہزار مثقال سونے تک جا پہنچا[۱] اس لشکر میں ان کے ساتھ عبادلہ ثلاثہ عبداللہؓ بن زبیر، عبداللہؓ بن عمر، عبداللہؓ بن عمرو بھی تھے[۲] ۳۱ھ میں ابن ابی سرح نے ارض نوبہ کے سیاہ فاموں سے[۳] اور ۳۴ھ میں روم کے صواری سے جہاد کیا[۴] معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۳۵ھ میں مدینہ کی طرف متوجہ ہوئے اور سائب بن ہشام بن عمیر کو نائب مقرر کیا (رستے میں ہی) سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کی خبر پہنچی تو وہ مصر کی طرف لوٹ گئے۔ جب مصر پہنچے تو مصر میں داخلہ منع کر دیے گئے۔ یہ عسقلان یا رملہ کی طرف چلے گئے اور فتنہ سے الگ رہے۔ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی:

اللھم اجعل آخر عملی الصبح۔

(اے الٰہ العٰلمین! میرا آخری عمل صبح کی نماز ہو)

صبح ہوئی تو وضو کیا اور نماز پڑھی۔ دائیں جانب سلام پھیرا، بائیں طرف ابھی سلام پھیر ہی رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے روح قبض فرمالی[۵] صحیح قول کے مطابق ان کی وفات ۳۶ھ میں ہوئی[۶]

وہ کاتبانِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں سے تھے۔ ارتداد سے پہلے کتابت کیا کرتے تھے۔ تمام مصادر کا اس بات پر اجماع ہے کہ وہ کاتبانِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں سے تھے[۷]

ایک شبہ کا ازالہ

کیا ابنِ ابی سرح قرآن میں تبدیلی کیا کرتے تھے؟ اور کیا وہ اس بات کے مدعی تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جدھر چاہتے پھیر دیتے؟

واقدی نے کہا: عبداللہ بن ابی سرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے وحی کی کتابت کر دیا کرتے تھے۔ بسا اوقات آپؐ اسے "سمیع علیم" لکھواتے اور وہ "علیم حکیم" لکھ دیتا۔ بالآخر وہ آزمائش میں پڑ گیا اور کہتا "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نہیں سمجھتے جو کچھ کہتے ہیں۔ میں ان کے لیے جو کچھ چاہتا ہوں لکھ دیتا ہوں۔ یہ جو میں نے کتابت کی ہے میری طرف وحی کی گئی ہے جس طرح محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف وحی کی جاتی ہے۔" بعد ازیں مرتد ہو کر مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ کی طرف بھاگ گیا۔ فتح مکہ کے روز حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا خون مباح قرار دیا[۸]

الانصاری نے ابن الکلبی سے نقل کرتے ہوئے کہا کہ ابن ابی سرح فتح مکہ سے قبل اسلام لایا اور ہجرت کی اور کاتبِ وحی تھا۔ بعض لوگوں نے کہا کہ قریش میں وہ پہلا شخص ہے جس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کتابت کی۔ پھر وہ مرتد ہو کر مکہ کی طرف چلا گیا

---

[۱] الاصابہ ۲: ۳۱۷ [۲] البدایہ والنہایہ ۵: ۳۵۱، اسد الغابہ ۳: ۱۷۳

[۳] الاستیعاب ۲: ۳۷۷، العقد الثمین ۵: ۱۶۷ [۴] الاستیعاب ۲: ۳۷۷ [۵] الاصابہ ۲: ۳۱۷

[۶] الاصابہ ۲: ۳۱۷ [۷] سیرۃ ابنِ ہشام ۳: ۴۰۵، تاریخ خلیفہ بن خیاط ۱: ۷۷، تاریخ الیعقوبی ۲: ۸۰

[۸] المغازی للواقدی ۸۵۵

اور کہا کرتا: "میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو پھیر دیتا ہوں جدھر چاہتا ہوں۔ وہ مجھے "عزیز حکیم" لکھواتے میں کہتا "علیم حکیم"۔ وہ فرماتے ہر طرح ٹھیک ہے۔"[1]

"انسان العیون میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن ابی سرح کے قتل کا حکم فرمایا۔ وہ فتح مکہ سے قبل اسلام لایا اور آپؐ کے لیے کتابت کیا کرتا تھا۔ آپؐ اسے "سمیعا بصیرا" لکھواتے اور وہ "علیما حکیما" لکھ دیتا۔ اور جب آپؐ "علیما حکیما" لکھواتے تو وہ "غفورا رحیما" لکھ دیتا۔ وہ اس قسم کی قبیح حرکتیں کرتا رہتا، حتیٰ کہ اس نے یہ بھی کہہ دیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جو کچھ کہتے ہیں سمجھتے نہیں۔" جب اس سے یہ جرم سرزد ہوا تو اب مدینہ منورہ میں ٹھہرنے کی جرأت نہ کر سکا اور مرتد ہو کر مکہ کی طرف بھاگ گیا اور کہا گیا ہے جب اس نے آیت "ولقد خلقنا الانسان من سلالة من طین" (المومنون: ۱۲) اللہ تعالیٰ کے قول "ثم انشأناه خلقا آخر" تک لکھی تو تخلیق انسان کی تفصیل سے بڑا متعجب ہوا اور حضورؐ کے لکھوانے سے قبل بول اٹھا "فتبارک اللہ احسن الخالقین"۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ جملہ لکھ لے اسی طرح آیت نازل ہوئی ہے۔ عبداللہ کہنے لگا: "اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نبی ہیں اور ان کی طرف وحی کی جاتی ہے تو میں بھی نبی ہوں اور میری طرف بھی وحی آتی ہے۔" پس مرتد ہو کر مکہ کی طرف نکل گیا اور قریش سے کہا: "میں محمدؐ کو جدھر چاہتا تھا پھیر دیتا تھا"[2]۔ ابن عبدالبر نے بھی الاستیعاب میں اسی طرح کا واقعہ کتابتِ قرآن کے سلسلہ میں نقل کیا ہے[3]

فرانسیسی مستشرق "ریگس بلاشیر" نے ایک سوال اٹھاتے ہوئے کہا کہ جب ہم بعض ثقہ کاتبانِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر بھروسہ کر سکتے ہیں تو عبداللہ ابن ابی سرح جیسے آدمی کے متعلق کیا کہیں گے جو مرتد ہو گیا تھا اور جو "غفورا رحیما" لکھ دیتا تھا جبکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اسے "عزیزا حکیما" لکھواتے تھے[4]۔ اس پر اس کے ایک شاگرد "رشید" نے یہ اضافہ فرمایا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کا علم ہی نہیں تھا کہ ان کا کاتب کلمات میں تبدیلی کر دیتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ سارا قصہ غلط ہے اور ابنِ ابی سرح کی طرف غلط منسوب ہے۔ اسلام سے اس کا ارتداد مسلّم ہے اور اس میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں، اور اس بات میں بھی کوئی شک نہیں کہ ارتداد سب سے بڑا گناہ ہے۔ مگر جب ایک آدمی مرتد ہو گیا تو اب اس کے لیے کوئی مانع نہ رہا اس بات سے کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی مرضی سے پھیرنے کا دعویٰ کرے۔ لیکن یہ کہاں جائز ہے کہ ہم اس کے ارتداد کی وجہ سے ہر کردہ یا ناکردہ بُرے عمل کو اس کی طرف منسوب کرتے جائیں۔ اس واقعہ سے انکار کے میرے نزدیک دو سبب ہیں:

اوّلاً یہ کہ اس قسم کے قصہ کی نسبت متعدد لوگوں کی طرف کی گئی ہے۔ ان میں سے ایک عبداللہ بن خطل الانصاری ہے جو مرتد ہو کر مرا تھا اور دفنائے جانے کے بعد زمین نے اس کو باہر پھینک دیا تھا[5]

---

[1] المصباح المضی ۳۴ [2] انسان العیون ۳: ۲۲۸ [3] الاستیعاب ۲: ۳۷۵
[4] تاریخ القرآن، عبدالصبور شاہین [5] ایضاً: ۵۵ نقلاً عن رسالة الشواذ: ۱۴

اور دوسرا عبداللہ بن سعد بن ابی سرح۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب کبھی لکھواتے تو کاتب سے فرماتے کہ اسے دُہرا اگر کوئی غلطی رہ جاتی تو قبل اس کے کہ کتابت رسمی شکل اختیار کرتی حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کی اصلاح فرما دیتے۔

دوسرے یہ ممکن نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیں اسی طرح آیت نازل ہوئی ہے جبکہ اس کے خلاف لکھا جائے جو آپ نے لکھوایا ہے اور قرآن من جانب اللہ ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے قرآن میں ادنیٰ دخل مباح نہیں۔ نہ ہی قرآن آپ کی تالیف اور آپ کے افکار کا مجموعہ ہے۔ پس یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم واقدی وغیرہ کے کلام کو قبول کریں اور کہیں کہ ابن ابی سرح اس کے خلاف لکھا کرتے تھے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم لکھواتے تھے پھر آپ کو پڑھ کر سناتے تو آپؐ فرماتے کہ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اتارا ہے اور اسے برقرار رکھتے ؟ یہ کہاں ہو سکتا ہے کہ حضورؐ اپنی املا اور جو نازل ہوا ہے اس کے خلاف کو برقرار رکھیں پھر اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر دیں ؟ بر سبیل تنزل اگر ہم فرض کر لیں کہ اسی طرح واقعہ ہوا تو ہم یہ جانتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

لا یلدغ المؤمن من جحر واحد مرتین۔

(مومن ایک ہی بل سے دو مرتبہ نہیں ڈسا جاتا)

روزمرہ کی زندگی میں ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ ہمارے کسی ملازم سے کوئی قصور سرزد ہو جاتا ہے تو ہم اس کی جگہ دوسرا ملازم رکھ لیتے ہیں اور پہلے سے زیادہ حساس ہو جاتے ہیں۔ اب پہلے کی طرح دھوکہ اور جھوٹ اور فریب کی نوبت نہیں آنے دیتے۔ تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اگر ایک مرتبہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خلافِ املا کا واقعہ ہوا تو دوسری مرتبہ بلکہ تیسری مرتبہ بھی اسی طرح ہوا۔ حاشا وکلا ایسا نہیں ہو سکتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اسی طرح ہوتا رہا۔ قرآن مجید کی ہر قسم کی تحریف سے سلامتی، اللہ تعالیٰ کا اس کی حفاظت کا ذمہ اٹھانا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قرآن مجید کے معاملہ میں غایت درجہ کی احتیاط جس کی شہادت دوستوں سے قبل دشمنوں نے دی۔ ان تمام چیزوں کی موجودگی میں ہمارے لیے یہ ممکن نہیں رہتا کہ ہم قرآن مجید میں تغیر کے اس قسم کے قصوں کو تسلیم کر لیں خصوصاً ایسی روایات کی بنا پر جو بے سند ہیں اور جن کو ابن ابی سرح کے دشمنوں نے تراشا اور پھر ان سے دوسروں نے نقل کی۔

معتمد علیہ قدیم مصادر ابنِ ابی سرح کے متعلق اس قسم کا کوئی واقعہ نہیں ذکر کرتے۔ قدیم مصادر میں سے ہمارے پاس سیرۃ ابنِ ہشام اور سیرۃ ابنِ اسحاق ہے۔ وہ اس کے متعلق اتنا ہی بیان کرتے ہیں کہ کاتبِ نبویؐ تھا پھر مرتد ہو گیا۔

ابنِ اسحاق نے کہا : حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابنِ ابی سرح کے قتل کا حکم دیا کیونکہ وہ اسلام لایا تھا، آپؐ کے لیے وحی کی کتابت کرتا تھا۔ پھر وہ مرتد ہو کر مشرک ہو گیا اور قریشِ مکہ کی طرف چلا گیا[1]

---

[1] سیرۃ ابنِ ہشام ۴ : ۴۰۹

ابنِ سعد نے کہا کہ قدیم الاسلام اور کاتبِ وحی تھا۔ پھر آزمائش میں پڑا اور مرتد ہو کر مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ کی طرف بھاگ گیا۔[۱]

خلیفہ ابنِ خیاط نے لکھا، عبداللہ بن سعد بن ابی سرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کاتب تھا۔ پھر مرتد ہو گیا اور اہلِ مکہ سے جا ملا۔[۲]

اور طبری نے کہا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن ابی سرح کے قتل کا حکم فرمایا کیونکہ وہ اسلام قبول کرنے کے بعد مرتد اور مشرک ہو گیا تھا۔[۳]

جب قدیم اور قابلِ اعتماد مآخذ ابن ابی سرح کے متعلق قرآن مجید میں تغیر کا کوئی ذکر نہیں کرتے اور غالب گمان یہ ہے کہ اصل میں یہ حکایت ابنِ کلبی سے منقول ہے جو شیعہ تھا اور عثمانیوں کا دشمن تھا اور واقدی سے منقول ہے جو ضعیف بلکہ وضعِ حدیث کے ساتھ متہم تھا۔ پھر ان کے بعد جو لوگ آئے انہوں نے بغیر کسی تحقیق کے اس واقعہ کو نقل کر دیا۔ تحقیق و تفتیش کی ضرورت کچھ اس لیے بھی محسوس نہ کی گئی کہ وہ مرتد ہو گیا تھا۔ جب معاملہ کی حقیقت اس طرح ہے کہ اس واقعہ کو ان لوگوں نے ذکر کیا جو عثمانیوں کی عداوت میں مشہور رہیں تو یہ لوگ جو کچھ کہیں اس کے قبول کرنے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔

ان عبارات کی بنیاد پر کوئی لکھنے والا ابنِ ابی سرح کی طرف تحریفِ قرآن کے انتساب پر کوئی بقدرِ کفایت دلیل نہیں پاتا اور اس پر مستزاد یہ کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم "کذلک انزل اللہ" (اسی طرح اللہ تعالیٰ نے نازل کیا ہے) کہہ کر اس کی توثیق فرما دیتے ہیں۔ کاتبانِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کوئی ایسی بات کہ فلاں فلاں قرآن میں تحریف کیا کرتا تھا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس سے غافل تھے، جھوٹی اور خلافِ واقع بات ہے۔ دین اس قسم کی ہفوات کو تسلیم کرتا ہے نہ علمی مباحث میں ایسی باتوں کو کوئی حیثیت حاصل ہے۔

۳۴۔ عبداللہ بن عبداللہ بن ابی بن سلول رضی اللہ تعالیٰ عنہ

ان کا نام حباب تھا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تبدیل کر کے عبداللہ رکھ دیا۔[۴] بدر، اُحد اور تمام غزوات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک ہوئے۔[۵] ان کا باپ رئیس المنافقین تھا، اور یہ وہی تھا جس نے غزوہ تبوک میں کہا تھا:

لَئِنْ رَّجَعْنَا إِلَى الْمَدِينَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْأَعَزُّ مِنْهَا الْأَذَلَّ۔ (المنافقون ، ۸)

یعنی ہم مدینہ پہنچے تو مدینہ سے عزت والا آدمی ذلیل آدمی کو نکال باہر کرے گا۔

اس کے بیٹے نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا:

---

[۱] طبقات ابنِ سعد ۳/۲ ، ۱۹۰ [۲] تاریخ خلیفہ ۱ : ۷۷ [۳] تاریخ الطبری ۳ : ۵۹

[۴] الاستیعاب ۲ : ۳۳۵ [۵] ایضاً

یا رسولؐ اللہ! اللہ کی قسم، وہی (اس کا باپ) ذلیل ہے اور آپ عزت والے ہیں[1] اور اس نے آپؐ سے اس کے قتل کی اجازت چاہی تو آپؐ نے فرمایا کہ:

"لوگ یہ کہیں گے کہ میں اپنے ساتھیوں کو قتل کراتا ہوں۔ تو اپنے باپ کے ساتھ نیکی اور حُسنِ سلوک کے ساتھ پیش آ۔"

ابنِ عمر نے کہا: جب رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی بن سلول مرا تو اس کا بیٹا عبداللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ سے آپ کی قمیص کی درخواست کی تاکہ اس میں اپنے باپ کو کفن دے سکے[2] وہ کاتبانِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں سے تھے۔ یعقوبی، عمر بن شبہ[3]، ابن عبدالبر[4]، سہیلی[5]، عراقی[6]، ابنِ حجر[7]، ابن سید الناس[8]، انصاری[9] اور عامری[10] وغیرہم نے ان کا نام کاتبانِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی فہرست میں شمار کیا ہے۔ خلافتِ ابی بکرؓ میں مرتدین کے ساتھ جنگ میں ۱۲ھ میں شہید ہوئے۔[11]

۳۵۔ عثمان بن عفان بن ابی العاص القرشی الاموی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

آپ امیر المومنین اور تیسرے خلیفہ راشد ہیں۔ عام الفیل سے چھ سال بعد میں پیدا ہوئے۔[12] وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اپنی زوجہ رقیہ دخترِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حبشہ کی طرف ہجرت کی۔[13] آپ قدیم الاسلام ہیں، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی دعوت پر اسلام لائے۔[14] غزوۂ بدر کے ایام میں آپ کی زوجہ محترمہ فوت ہو گئیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تیمارداری کی خاطر عثمان کو مدینہ ہی میں چھوڑا تھا مگر غنائمِ بدر میں آپ کا حصہ اور اجر مقرر فرمایا۔[15] پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ سے اپنی دوسری لختِ جگر اُمِّ کلثومؓ کا نکاح کر دیا۔ اسی وجہ سے آپ کو ذوالنورین کہا جاتا ہے۔ آپ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کی شہادت کی خبر دی۔ آپ کاتبانِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں سے ہیں۔ یعقوبی[16]، عمر بن شبہ[17]، واقدی[18]، طبری[19]، ابن مسکویہ[20]، جہشیاری[21]، ابنِ کثیر[22]، ابنِ اثیر[23]، مزی[24]، ابن سید الناس[25]، عراقی[26]، انصاری[27] اور دوسرے بہت سے لوگوں

---

[1] الاستیعاب ۲ : ۳۳۶
[2] الاصابہ ۲ : ۳۳۶
[3] المصباح المضی ۸ ب
[4] الاستیعاب
[5] المصباح المضی ۳۲ - أ
[6] العجالۃ السنیۃ ۲۴۷
[7] الاصابہ ۲ : ۳۳۶
[8] عیون الاثر ۲ : ۳۱۵
[9] المصباح المضی ۳۳ : ۱
[10] بہجۃ المحافل ۲ : ۱۶۱
[11] الاصابہ ۲ : ۳۳۶
[12] الاصابہ ۲ : ۴۶۷
[13] ایضاً
[14] الاصابہ ۲ : ۴۶۷
[15] ایضاً
[16] تاریخ الیعقوبی ۲ : ۸۰
[17] المصباح المضی ۸ ب
[18] البدایہ والنہایہ ۵ : ۳۳۹
[19] تاریخ الطبری ۶ : ۱۷۹
[20] تجارب الامم ۱ : ۲۹۱
[21] الوزراء والکتاب ۱۲
[22] البدایہ والنہایہ ۵ : ۳۰۱
[23] الکامل ۲ : ۳۱۲
[24] تہذیب الکمال ۴ ب
[25] عیون الاثر ۲ : ۳۱۵
[26] العجالۃ السنیہ ۲۴۵
[27] المصباح المضی ۴ ب

نے آپ کا اسم شریف کاتبانِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی فہرست میں شمار کیا ہے۔
ابن کثیر نے کہا: واقدی نے اپنی سند کے ساتھ روایت کیا کہ نہشل بن مالک وائلی جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تو آپؐ نے عثمان بن عفان کو حکم فرمایا اور انہوں نے اس کو ایک کتاب لکھ دی جس میں شرائع الاسلام[1] تھے ——
۲۸ ذی الحجہ ۲۳ھ کو آپ کو خلیفہ منتخب کیا گیا اور ۱۸ ذی الحجہ ۳۵ھ کو بعد عصر جمعہ کے دن شہید کر دیے گئے۔[2]

۳۶۔ عقبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

محمد بن سعد نے طبقات میں کہا:
کہتے ہیں کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے عوسجہ بن حرملہ الجہنی کو لکھا:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ وہ مروہ کا علاقہ ہے جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے عوسجہ بن حرملہ الجہنی کو عطا کیا (آپ نے اسے بلکثہ کے درمیان مصنعۃ، جفلات اور جد تک کا پہاڑی علاقہ عطا فرمایا) کوئی اس کے بارے میں اس کے ساتھ معارضہ نہ کرے۔ جو اس کے ساتھ معارضہ کرے اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اس کا کوئی حق نہیں اور عوسجہ کا حق ثابت ہے۔"

اس دستاویز کو عقبہ نے لکھا۔[3]

انصاری نے کہا کہ ابنِ سعد نے اس کا نسب ذکر نہیں کیا۔[4] ڈاکٹر حمید اللہ نے کاتب کا نام علاؑ بن عقبہ بتایا ہے[5] لیکن ابن سعد کی روایت کے مطابق عقبہ ہے نہ کہ عقبہ کا بیٹا۔ میں نے سوائے انصاری کے کاتبانِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرنے والوں میں سے کسی کو نہیں پایا کہ اس نے یہ نام کاتبانِ نبیؐ کی فہرست میں شمار کیا ہو۔ کئی ایک صحابہ کرام ہیں جن کا نام عقبہ ہے۔ راجح قول یہ ہے کہ وہ عقبہ بن عامر بن عبس الجہنی ہیں۔ کیونکہ ابو سعید بن یونس نے ان کے متعلق کہا ہے کہ وہ قاری، علم فرائض و فقہ کے جاننے والے، فصیح اللسان، شاعر اور کاتب تھے نیز قرآن جمع کرنے والوں میں سے ایک تھے۔ ابو سعید نے کہا کہ میں نے ان کا مصحف مصر میں دیکھا ہے جو مصحف عثمان سے تالیف میں مختلف تھا۔ اس کے آخر میں عقبہ بن عامر نے اپنے ہاتھ سے لکھا ہے۔[6]

۳۷۔ العلاؑ بن الحضرمی رضی اللہ عنہ

اسم شریف العلاؑ بن عبد اللہ بن عباد تھا۔ اور حضرموت سے تعلق رکھتے تھے۔ بنو امیہ کے حلیفوں اور سادات مہاجرین

---

[1] البدایہ والنہایہ ۵: ۳۵۱ [2] الاصابہ ۲: ۴۶۳ [3] طبقات ابن سعد ۱/۲: ۲۴
[4] المصباح المضیٔ: ۳۷: ۱ [5] الوثائق السیاسیۃ وثیقہ رقم/۱۵۴ [6] الاصابہ ۲: ۴۸۹

میں سے تھے۔ ان کا بھائی عمرو بن الحضرمی پہلا مقتول ہے جسے ایک مسلمان نے قتل کیا اور اس کا مال اسلام میں سب سے پہلے مالِ خمس قرار پایا اور اسی کے سبب سے غزوۂ بدر پیش آیا[1] حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بحرین کا والی مقرر فرمایا۔ حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ نے بھی انھیں اس عہدے پر برقرار رکھا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے انہیں بحرین کی طرف مرتدین کے قتال کے لیے بھیجا۔ ان کے اور مرتدین کے درمیان بحر رقراق پڑتا تھا۔ علاؓ نے اپنے لشکریوں کو لے کر سمندر میں چھلانگ لگا دی اور اس طرح سمندر کی اس جگہ کو عبور کر لیا جہاں بڑی بڑی کشتیاں چلا کرتی تھیں۔ سمندر پار کر کے مرتدین کے ساتھ جنگ لڑی اللہ تعالیٰ نے مومنین کو غلبہ عطا فرمایا[2] انصاری نے کہا کہ وُہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے کفار کی سرزمین میں مسجد بنائی، کفار پر جزیہ لگایا اور خلافت کی مُہر کندہ کی[3] آپ کاتبانِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں سے تھے۔ عمر و بن شبہ[4]، ابنِ مسکویہ[5]، المسعودی[6]، ابن الاثیر[7]، ابن کثیر[8]، ابنِ سیدالناس[9] اور انصاری[10] نے آپ کا نام کاتبانِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی فہرست میں شمار کیا ہے۔ کتاب[11] الوثائق السیاسیۃ میں آپ درج ذیل وثائق میں ان کا نام کاتب کی حیثیت سے پائیں گے، وثیقہ ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۹۶۔ ۲۱ھ میں بصرہ جاتے ہوئے راستہ ہی میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔

۳۸۔ العلاؔ بن عقبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

ابنِ حجر نے کہا "مستغفری نے انھیں (العلاؔ بن عقبہ) صحابہ میں شمار کیا اور کہا کہ انہوں نے عمرو بن حزم کا معاہدہ لکھا ابُو موسیٰ نے اس کی اصلاح کی۔ مرزبانی نے بھی اس کا ذکر کیا اور کہا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم انھیں اور ارقم کو انصار کے گھروں میں بھیجا کرتے تھے۔ میں نے تاریخ مصنّفہ معتصم بن صمادح میں پڑھا کہ علاؔ بن عقبہ اور ارقم لوگوں کے درمیان قرض، خرید و فروخت اور دیگر معاملات کی دستاویزات لکھا کرتے تھے"[12]

مسعودی نے بھی اسی طرح ذکر کیا ہے[13]۔ وہ کاتبانِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں سے تھے۔ طبری نے کہا کہ عبداللہ بن ارقم بن عبد یغوث اور العلاؔ بن عقبہ لوگوں کو روزمرّہ کے معاملات میں دستاویزات لکھ دیا کرتے تھے[14]

ابن الاثیر[15]، ابن کثیر[16]، العراقی[17]، ابن سیدالناس[18] اور الانصاری[19] وغیرہم نے بھی ان کا نام کاتبانِ نبی صلی اللہ علیہ

---

[1] الاستیعاب ۱۰۸۶ (تحقیق البجاوی) [2] الاصابہ ۲: ۴۹۴

[3] سیر اعلام النبلاء ۱: ۱۹۱ [4] المصباح المضئ ۲۳ ب [5] المصباح المضی ۸ ب

[6] تجارب الامم ۱: ۲۹۱ [7] التنبیہ والاشراف ۲۴۶ [8] الکامل ۲/۳۱۳

[9] البدایہ والنہایہ ۵: ۳۵۴ [10] عیون الاثر ۲: ۳۱۵ [11] المصباح المضی ۲۳ ب

[12] الاصابہ ۲: ۴۹۸ ولم یزد ابن علی ہذا شیئاً من غزواتہ واعمالہ ولم یذکر وفاتہ [13] التنبیہ الاشراف ۲۴۵ [14] تاریخ طبری ۶: ۱۷۹

[15] اسد الغابہ ۴: ۹ [16] البدایہ والنہایہ ۵: ۳۵۴ [17] العجالۃ السنیۃ ۲۷۷

[18] عیون الاثر ۲: ۳۱۶ [19] المصباح المضئ ۲۳ ب

وسلم میں شمار کیا ہے۔ کتاب "الوثائق السیاسیہ" کے وثیقہ نمبری ۱۵۴، ۱۵۵ اور ۲۱۰ میں ہم ان کا نام بطور کاتب پاتے ہیں۔

۲۹۔ علی بن ابی طالب بن عبدالمطلب الہاشمی رضی اللہ عنہ

آپ مومنوں کے امیر اور چوتھے خلیفہ راشد ہیں۔ بعثتِ نبویؐ سے دس برس[1] قبل پیدا ہوئے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی گود میں پرورش پائی اور کبھی حضورؐ سے جُدا نہیں ہوئے۔ تمام غزوات میں حاضر رہے اور اکثر غزوات میں جھنڈا آپؓ کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ غزوۂ تبوک میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے مدینہ منورہ میں رہے۔ اِس تخلف سے آپ کو اضطراب ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"الا ترضی ان تکون منی بمنزلۃ ھارون من موسٰی، الا انہ لیس بعدی نبی۔"

(کیا تُو اس بات پر راضی نہیں ہوتا کہ میرے نزدیک تیری وہی حیثیت ہو جو ہارون کی موسٰی علیہما السلام کے نزدیک تھی مگر یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں)

سنہ ۲ھ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیٹی فاطمہ رضی اللہ عنہا کا آپؓ سے نکاح کر دیا۔ آپ کے فضائل اور مناقب بے شمار ہیں آپ کی طرف غلط منسوب فضائل و مناقب کی بھی کمی نہیں، حالانکہ آپ ان غلط فضائل سے غنی ہیں۔

ابنِ عبدالبر نے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اے علی! تیرے بارے میں دو آدمی ہلاک ہوں گے، افراط یعنی غلو کرنے والا محب اور تفریط کرنے والا یعنی تیرا مرتبہ گھٹانے والا[2]

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیش گوئی آج مشاہدہ کی جاسکتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے متعلق فرمایا:

"اقضاھم علی بن ابی طالبؓ۔"

(تمام صحابہ میں علی بہتر فیصلہ کرنے والے ہیں)

حضرت عمرؓ نے فرمایا:

"علی اقضانا۔"[3]

(علی ہمارے سب سے بڑے قاضی ہیں)

حضرت معاویہؓ آپ کے ساتھ مخاصمت کے باوجود آپ سے امورِ دینیہ کے متعلق دریافت کیا کرتے تھے۔ جب انھیں آپ کی شہادت کی خبر پہنچی تو کہا:

---

[1] الاصابہ
[2] الاستیعاب: ۱۱۰۱ (البجاوی)
[3] الاستیعاب ۱۱۰۲
[4] ایضاً

"ذھب الفقہ والعلم بموت ابن ابی طالبؓ۔"
(حضرت علیؓ کی شہادت کے ساتھ ہی فقہ اور علم بھی چلے گئے)

سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد آپ نے خلافت کا انتظام سنبھالا۔ لیکن کبھی بھی امن و سکون نصیب نہ ہوا بلکہ ان کے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہم کے درمیان ہمیشہ جنگیں ہوتی رہیں۔ ۱۲ رمضان المبارک سنہ ۴۰ھ کو دھوکہ سے آپ کو شہید کر دیا گیا۔ آپ کاتبانِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں سے ہیں۔ ابنِ اسحاق[1]، عمر بن شبہ[2]، الیعقوبی[3]، الطبری[4]، الجہشیاری[5]، ابن مسکویہ[6]، ابن الاثیر[7]، المزی[8]، ابنِ کثیر[9]، العراقی[10]، ابن سید الناس[11]، الانصاری[12] اور دیگر متعدد لوگوں نے آپ کا اسم شریف کاتبانِ نبیؐ کی فہرست میں شمار کیا ہے۔ کتاب "الوثائق السیاسیہ" کے مطابق وثیقہ نمبر ۱۱، ۳۲، ۴۴، ۴۵، ۸۵، ۱۱۱، ۱۴۱، ۱۶۲، ۱۶۷، ۱۷۲، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۲/۱ میں آپ کا نام بطور کاتب موجود ہے۔

۴۰۔ عمر بن الخطاب بن نفیل القرشی العدوی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

آپ امیر المومنین اور دوسرے خلیفہ راشد ہیں۔ حضرت عمر عام الفیل سے تیرہ برس بعد میں پیدا ہوئے[13]۔ آپ قریش کے سرداروں میں سے تھے اور ایامِ جاہلیت میں سفارت کا کام آپ کے سپرد تھا[14]۔ جاہلیت کے دوران مسلمانوں پر بڑے سخت تھے۔ چالیس مردوں اور گیارہ عورتوں کے اسلام لانے کے بعد مسلمان ہوئے۔ آپ کے اسلام لانے سے اسلام کو عزت و غلبہ نصیب ہوا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد آپ کا مشہور قول ہے:

"لا نعبد سرّاً بعد الیوم"
(آج کے بعد ہم چھپ کر عبادت نہ کریں گے[15])

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"اللہ تعالیٰ نے عمرؓ کی زبان اور قلب میں حق رکھ دیا ہے۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

---

[1] الاستیعاب ۱۱۰۸
[2] البدایہ والنہایہ ۵: ۳۵۰
[3] تاریخ الیعقوبی ۲: ۸۰
[4] تاریخ الطبری ۶: ۱۷۹
[5] الوزراء والکتاب: ۱۲
[6] تجارب الامم ۱: ۲۹۱
[7] الکامل ۲: ۳۱۲
[8] تہذیب الکمال ۴ب
[9] البدایہ والنہایہ ۵: ۳۲۹
[10] العجالۃ السنیۃ ۲۴۵
[11] عیون الاثر ۲: ۳۱۵
[12] المصباح المضی ۱۶-۱
[13] الاستیعاب ۱۱۴۵ (البجاوی)
[14] ایضاً
[15] سیرۃ عمر بن الخطاب لعلی الطنطاوی ۴۰

"اے عمرؓ! قسم اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، شیطان اس راستہ ہی کو چھوڑ دیتا ہے جس راستہ پر تُو چل رہا ہو۔"[۱]

کئی مرتبہ آپ کی رائے کے مطابق وحی نازل ہوئی۔[۲] حضرت حذیفہ نے کہا:

"تمام لوگوں کا علم حضرت عمرؓ کے علم کے سامنے گویا مِٹ گیا تھا۔"

ابن مسعود نے کہا:

"اگر تمام زندہ عربوں کا علم ایک پلڑے میں اور حضرت عمرؓ کا علم دُوسرے پلڑے میں رکھ دیا جائے تو حضرت عمرؓ کا پلڑا بھاری ہوگا۔"[۳]

آپؓ کے آثار اور اعمال قیامت تک باقی رہیں گے اور ہر راہِ حق کے متلاشی کے لیے مشعلِ راہ کا کام دیتے رہیں گے (باذن اللہ تعالیٰ) ۱۳ھ میں حضرت ابوبکرؓ کی وفات کے بعد آپؓ نے زمامِ خلافت ہاتھ میں لی، اور ۲۶ ذی الحجہ ۲۳ھ کو ابُو لؤلؤ، مغیرہ بن شعبہ کے غلام کے ہاتھوں زخمی ہو کر جامِ شہادت نوش فرمایا۔

حضرت علی المرتضیٰؓ نے آپ کے مرثیہ میں فرمایا، آپ کے بعد کوئی ایسا آدمی نہیں جو آپ سے مجھے زیادہ محبوب ہو۔ اللہ کی قسم مجھے غالب گمان ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے دونوں ساتھیوں (رسولِ مقبولؐ اور حضرت ابوبکرؓ) کے ساتھ جگہ دے گا، کیونکہ میں نے اکثر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سُنا کہ "میں، ابوبکر اور عمر آئے، میں، ابوبکر اور عمر داخل ہوئے، میں، ابوبکر اور عمر نکلے۔ مجھے امید ہے اور غالب امید ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ان کے ساتھ ہی رکھے گا۔"[۴]

آپ کاتبانِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں سے ہیں۔ ابن اسحٰق[۵]، عمرو بن شبہ[۶]، ابن مسکویہ[۷]، ابن الاثیر[۸]، المزی[۹]، ابنِ کثیر[۱۰]، العراقی[۱۱]، ابن سید الناس[۱۲] اور انصاری[۱۳] وغیرہم نے آپ کا اسم شریف کاتبانِ نبی میں شمار کیا ہے۔

۴۱۔ عمرو بن العاص القرشی السہمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

وُہ ایامِ جاہلیت ہی سے عرب کے ہوشیار، شہسوار اور بہادر لوگوں میں سے تھے۔ اچھے شاعر تھے۔ انہوں نے اوائل ۸ھ میں خالد بن ولید اور کعبہ کے کلید بردار عثمان بن طلحہ کے ساتھ مل کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہجرت کی۔ حضور صلی اللہ

۱۔ م فضائل الصحابہ ۲۲ — ۲۔ ایضاً ۲۴، ۲۵ — ۳۔ الاستیعاب ۲: ۱۱۴۹، ۱۱۵۰
۴۔ م فضائل الصحابہ ۱۴ — ۵۔ البدایہ والنہایہ ۵: ۳۵۰ — ۶۔ المصباح المضی ۸-ب
۷۔ تجارب الامم ۱: ۲۹۱ — ۸۔ اسد الغابہ ۴: ۵۳ — ۹۔ تہذیب الکمال ۴-ب
۱۰۔ البدایہ والنہایہ ۵: ۳۳۹، ۳۵۲ — ۱۱۔ العجالۃ السنیۃ ۲۴۵ — ۱۲۔ عیون الاثر ۲: ۳۱۵
۱۳۔ المصباح المضی ۱۰ ب

علیہ وسلم ان کی آمد اور ان کے قبولِ اسلام سے بہت خوش ہوئے[1] اور فرمایا:

مکہ کی زمین نے اپنے چھپے ہوئے عزا نے تمہارے سامنے پھینک دیے ہیں[2]

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں جھنڈا عطا فرمایا اور عمان کا والی مقرر کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک وہ عمان کے والی رہے[3] پھر دورِ فاروقی میں لشکریوں کے امرا میں سے تھے[4]۔ انہی کے ہاتھوں قنسرین فتح ہوا اور اہلِ حلب، منبج اور انطاکیہ نے ان کے ساتھ صلح کی۔ حضرت عمرؓ نے آپؓ کو فلسطین کا والی مقرر کیا[5]

یہ وہی عمرو بن العاص ہیں جنہوں نے دورِ فاروقی میں مصر کو فتح کیا۔ اسی طرح ۲۲ھ میں عزبی طرابلس کو فتح کیا[6]۔ حضرت عثمانؓ خلیفہ ہوئے تو انہوں نے کچھ دن عمرو بن العاص کو مصر کی ولایت پر باقی رکھا بعد میں معزول کر دیا۔ اسی معزولی سے عمروؓ اور عثمانؓ کے درمیان تعلقات کی خرابی کی ابتدا ہوئی[7]۔ پھر وہ حضرت کے خلاف حضرت معاویہؓ کے ساتھ تمام جنگوں میں رہے۔ جب حضرت معاویہؓ تمام مسلمانوں کے امیر بن گئے تو انہوں نے عمروؓ بن العاص کو ایک مرتبہ پھر مصر کا والی مقرر کر دیا مصر میں امیر کی حیثیت سے ۴۳ھ میں وفات پائی۔

آپؓ کاتبانِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں سے تھے۔ ابن شبہ[8]، الیعقوبی[9]، ابنِ عبدالبر[10]، العراقی[11]، ابن سیدالناس[12]، العامری[13] اور الانصاری[14] وغیرہ نے آپ کا نام کاتبانِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی فہرست میں شمار کیا ہے۔

۴۲۔ محمد بن مسلمہ بن سلمہ الانصاری الاوسی الحارثی رضی اللہ عنہ

بعثتِ نبویؐ سے بائیس سال قبل پیدا ہوئے[15]۔ جاہلیت ہی میں ان کا نام محمد رکھا گیا۔ مصعب بن عمیر کے ذریعے شروع ہی سے اسلام قبول کیا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ سعد بن معاذ کے ذریعہ اسلام میں داخل ہوئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اور ابو عبیدہ کے درمیان مواخات قایم فرمائی۔ غزوۂ تبوک کے علاوہ تمام غزوات میں شریک رہے۔ غزوۂ تبوک میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے پیچھے رہے۔ کعب بن الاشرف اور ابن ابی الحقیق کے قتل کرنے میں بھی شامل تھے بعض غزوات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مدینہ میں اپنا نائب بھی مقرر فرمایا۔ فتح مصر میں بھی شریک تھے[16]۔

محمد بن مسلمہ حق بات کہنے میں بڑے جری تھے۔ ایک دفعہ حضرت عمر بنی حارثہ کے پاس آئے تو انہوں نے محمد بن مسلمہ کو

---

[1] سیر اعلام النبلاءُ ۳: ۷۰ — [2] الاستیعاب ۱۱۸۵ (البجاوی) — [3] سیر اعلام النبلاءُ ۳: ۳۰

[4] الاستیعاب ۱۱۸۷ (البجاوی) — [5] الاصابہ ۳: ۲ — [6] سیر اعلام النبلاء ۳: ۷۴

[7] الاستیعاب ۱۱۸۷ (البجاوی) — [8] المصباح المضئی ۸ ب — [9] تاریخ الیعقوبی ۲: ۸۰

[10] الاستیعاب — [11] العجالۃ السنیہ ۲۴۶ — [12] عیون الاثر ۲: ۳۱۵

[13] بہجۃ المحافل ۲: ۱۶۱ — [14] المصباح المضئی ۶۳ ب — [15] الاصابہ ۳: ۳۸۳

[16] سیر اعلام النبلاءُ ۲: ۲۶۷

دیکھ کر فرمایا:
"اے محمدؐ! میرے متعلق تیری کیا رائے ہے؟"
محمد بن مسلمہ نے فرمایا:
"آپ کے متعلق میری پسندیدہ رائے ہے۔ آپ مال جمع کرنے میں قوی، مال سے بچنے والے، مال کی تقسیم میں انصاف کرنے والے ہیں۔ اگر آپ اِدھر اُدھر ہُوئے تو ہم آپ کو تیر کی طرح سیدھا کر دیں گے۔"
یہ سُن کر حضرت عمرؓ کہنے لگے،
"تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جس نے میری قوم میں ایسے لوگ پیدا کر دیے ہیں کہ اگر میں ٹیڑھا ہو جاؤں تو وہ مجھے سیدھا کر دیں۔"[1]

حضرت عمرؓ نے انہیں جہینہ کے صدقات کی وصولی پر مقرر کیا تھا۔ حضرت عمرؓ کے زمانۂ خلافت میں نگراں ہوتے تھے، حضرت عمرؓ ان کو عمّال کے حالات اور اموال کی تفتیش کے لیے بھیجا کرتے تھے۔[2] یہ فتنہ سے الگ رہے۔ جنگِ جمل، صفین میں شریک نہیں ہُوئے بلکہ ربذہ کے مقام پر الگ تھلگ رہے۔[3] اُردن کے ایک آدمی نے ۴۳ھ میں آپ کو مدینہ منورہ کے اندر آپ کے گھر میں شہید کر دیا۔[4] آپ کاتبانِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں سے ہیں۔ عمر بن شبہ[5]، ابنِ عبدالبر[6]، ابنِ کثیر[7]، ابن سیدالناس[8]، العراقی[9]، عبدالکریم حلبی[10]، الانصاری[11] وغیرہم نے آپ کا اسم شریف کاتبانِ نبیؐ کی فہرست میں شمار کیا ہے۔ ابنِ سعد نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مہری بن الابیض کی طرف وہ خط بھی محفوظ کر دیا ہے جسے محمد بن مسلمہ نے لکھا تھا۔[12]

۴۳ - معاذ بن جبل الخزرجی الانصاری رضی اللہ عنہ

ہجرتِ نبویؐ سے تقریباً دس برس پہلے پیدا ہوئے۔ قد لمبا، خوبصورت چہرہ، حسین بال، موٹی موٹی آنکھیں اور سامنے کے دانت بجلی کی مانند چمکدار تھے۔ ان ستر انصار میں سے ایک ہیں جو بیعت عقبہ میں حاضر ہوئے اور جن لوگوں نے بنی سلمہ کے بتوں کو توڑا۔[13] حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اور ابنِ مسعود کے درمیان اور ابن اسحاق کے قول کے مطابق ان کے اور جعفر بن ابی طالب

---

[1] سیر اعلام النبلاء ۲ : ۲۶۸ | [2] اسد الغابہ ۴ : ۳۳۰ | [3] الاستیعاب ۱۳۷۷
[4] الاصابہ ۳ : ۳۸۴ | [5] المصباح المضی ۸ ب | [6] الاستیعاب ۱ : ۵۱
[7] البدایہ والنہایہ ۵ : ۳۵۴ | [8] عیون الاثر ۲ : ۳۱۵ | [9] العجالۃ السنیۃ : ۲۴۶
[10] المصباح المضی ۳۷ ب | [11] ایضاً ۳۷۔اُ | [12] طبقات ابن سعد ۱/۲ : ۸۲
[13] الاستیعاب : ۱۴۰۳
[14] الاستیعاب ۱۴۰۴

کے درمیان مواخات قائم فرمائی۔[۱] بیعتِ عقبہ، غزوۂ بدر اور دیگر تمام غزوات میں شریک رہے۔[۲] حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ اقدس ہی میں قرآن پاک جمع کیا۔[۳] آپ کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

چار آدمیوں سے قرآن سیکھو : عبداللہ بن مسعود، معاذ بن جبل، ابی بن کعب اور سالم، ابوحذیفہ کے غلام سے۔[۴]

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی فضیلت میں یہ بھی فرمایا :

معاذ بن جبل حلال و حرام کا علم سب سے زیادہ جاننے والے ہیں۔[۵]

حضرت عمرؓ نے فرمایا :

عورتیں معاذؓ جیسا سپوت جننے سے عاجز آگئیں۔[۶] نہایت کریم اور سخی تھے۔ دینے سے ہاتھ نہیں روکتے تھے حتیٰ کہ بہت سارا قرضہ چڑھ گیا۔ اس قرضے کے بدلے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا تمام مال فروخت کر دیا۔ فتح مکہ کے سال حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو یمن کی طرف بھیجا تاکہ اس طرح غنی ہو جائیں۔

ابن عبدالبر نے کہا :

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں یمن میں قاضی بنا کر بھیجا۔ یہ لوگوں کو قرآن اور اسلام کے احکام سکھاتے اور ان کے درمیان فیصلے بھی کرتے۔ یمن کے عمال سے صدقات کی وصولی بھی انہی کے سپرد ہوئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے علاقۂ یمن کو پانچ آدمیوں پر تقسیم فرما دیا تھا، صنعاء کے علاقہ پر خالد بن سعید، کندہ کے علاقہ پر مہاجر بن ابی امیہ، حضرموت کے علاقہ پر زیاد بن ابی لبید، جند کے علاقہ پر معاذ بن جبل اور زبید، عدن اور ساحل کے علاقوں پر ابو موسیٰ اشعریؓ مقرر تھے۔[۷]

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد معاذ مدینہ منورہ کی طرف واپس آ گئے۔ حضرت عمرؓ نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے کہا :

"معاذ کے لیے بقدر کفایت مال چھوڑ کر باقی مال اس سے لے لو۔"

حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا :

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے خود بھیجا تھا۔ میں ان سے کوئی شے نہ لوں گا مگر یہ کہ وہ از خود دے دیں۔

حضرت عمرؓ، معاذؓ کے پاس تشریف لے گئے اور ان سے یہ بات کہی۔ حضرت معاذؓ نے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا کہ انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لیے بھیجا تھا کہ وہ مستغنی ہو جائیں۔ لہٰذا وہ ایسا نہیں کریں گے۔ پھر بعد میں ایک خواب دیکھا تو تمام مال لے کر حضرت ابوبکرؓ کے پاس آ گئے مگر ابوبکرؓ نے کوئی چیز نہ لی اور تمام کا تمام مال انھیں بخش دیا۔ حضرت عمرؓ نے

---

۱ الاستیعاب ۳: ۱۴۰۳ (البجاوی) ۲ الاصابہ ۳: ۴۲۷ ۳ م فضائل الصحابہ ۱۱۹

۴ م فضائل الصحابہ ۱۱۶ ۵ الاستیعاب ۴: ۱۴۰۴ (البجاوی) ۶ الاصابہ ۳: ۴۲۷

۷ الاستیعاب ۳: ۱۴۰۳ (البجاوی)

حضرت ابوعبیدہؓ کی وفات کے بعد انھیں شام کا والی مقرر فرمایا ۔ ۱۸ھ میں طاعونِ عمواس میں شہید ہوئے[۱]
آپ کاتبانِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں سے ہیں ۔ یعقوبی نے اس چیز کو ذکر کیا[۲] اور انصاری نے نقل کیا[۳] یعقوبی کے علاوہ میں نے کسی کو نہیں پایا کہ اس نے آپ کی کتابت کی طرف اشارہ کیا ہو ۔

۴۴ ۔ معاویہ بن ابی سفیان القرشی الاموی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

بعثتِ نبویؐ سے پانچ برس قبل پیدا ہوئے[۴] ابنِ عبدالبر نے کہا کہ معاویہؓ ، ان کے باپ اور ان کے بھائی فتح مکہ کے وقت اسلام لانے والوں میں سے ہیں[۵]

واقدی نے روایت کیا ہے کہ معاویہ حدیبیہ کے بعد اسلام قبول کر چکے تھے مگر اسلام کو چھپائے رکھا اور فتح مکہ کے سال اسلام کا اظہار کیا ۔ عمرۃ القضاء میں وہ مسلمان تھے[۶] ابوسفیان نے حضور علیہ السلام سے مطالبہ کیا کہ آپ معاویہ کو اپنا کاتب بنالیں ۔ آپؐ نے ان کے اس مطالبے کو قبول فرمالیا[۷] حضرت عمرؓ نے انہیں ان کے بھائی یزید بن ابی سفیان کی موت کے بعد شام کا والی مقرر فرمایا ۔ چار سال کے بعد حضرت عمرؓ کی شہادت ہوئی تو حضرت عثمانؓ نے ان کو بارہ سال یعنی اپنی شہادت تک شام کا والی مقرر رکھا ۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد معاویہؓ حضرت علی المرتضیٰؓ سے پانچ برس تک برسرِ پیکار رہے[۸] ۳۸ھ یا ۳۹ھ میں اہلِ شام نے آپ کی بیعتِ خلافت کر لی ۔ ۴۱ھ میں حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما اور ان کی جماعت نے امیر معاویہؓ کی بیعت کی تو تمام عالمِ اسلام نے آپ کی بیعت کر لی اور اس طرح آپ تمام مومنوں کے امیر بن گئے ۔ حضرت معاویہؓ بیس برس تک شام کے امیر اور تقریباً اتنا ہی عرصہ خلیفہ رہے[۹] ۔ ابنِ عباسؓ نے فرمایا :

میں نے معاویہؓ سے زیادہ حکومت کرنے کے لائق کسی کو نہیں دیکھا[۱۰]

ابنِ عمرؓ نے کہا :

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد میں نے معاویہؓ سے بڑا سردار نہیں دیکھا ۔

کہا گیا : ابوبکرؓ، عثمانؓ اور علیؓ کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے ؟ تو فرمایا : اللہ کی قسم وہ لوگ معاویہ سے اچھے تھے ، تاہم معاویہ سرداری میں ان سے بھی بڑھ کر تھے[۱۱] ۔ ان کے عہد میں بہت ساری فتوحات ہوئیں ۔ رجب ۶۰ھ میں فوت ہوئے ۔ آپ کاتبانِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں سے ہیں ۔ ابنِ اسحاق[۱۲] ، ابنِ سعد ، ابنِ حنبل ، عمر بن شبہ[۱۳] ، خلیفہ ابن خیاط[۱۴] ، طبری[۱۵] ، جہشیاری[۱۶] ، المسعودی[۱۷]

---

۱ الاستیعاب ۱۴۰۵ (البجاوی) ۲ تاریخ الیعقوبی ۲ : ۸۰ ۳ المصباح المضی
۴ الاصابہ ۳ : ۴۳۳ ۵ الاستیعاب ۱۴۰۶ (البجاوی) ۶ الاصابہ ۳ : ۴۳۳
۷ م فضائل الصحابہ ۱۶۸ ۸ الاستیعاب ۱۴۰۷ (البجاوی) ۹ الاستیعاب ۱۴۱۸
۱۰ الاصابہ ۳ : ۴۳۴ ۱۱ الاستیعاب ۱۴۱۸ (البجاوی) ۱۲ البدایہ والنہایہ ۵ : ۳۵۰
۱۳ المصباح المضی ۸ ب ۱۴ تاریخ خلیفہ ۱ : ۷۷ ۱۵ تاریخ الطبری ۶ : ۱۷۹
۱۶ الوزراء و الکتاب ۱۲ ۱۷ التنبیہ و الاشراف ۲۴۶

ابن مسکویہ[1]، یعقوبی[2] اور دیگر بہت سے لوگوں[3] نے آپ کا اسم شریف کاتبانِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی فہرست میں شمار کیا ہے۔ کتاب "الوثائق السیاسیۃ" کے مطابق وثیقہ نمبر ۸۹، ۱۳۱، ۱۶۴، ۱۸۵، ۲۱۵ اور ۲۲۲ میں آپ کا نام بطور کاتب موجود ہے

۴۵۔ معیقیب بن ابی فاطمہ الدوسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

ابن شہاب نے کہا، معیقیب سعید بن العاص کے آزاد کردہ غلام تھے۔ ایک دوسرے نے کہا، سعید بن العاص کی آل کے حلیف تھے۔ شروع ہی میں مکہ کے اندر اسلام قبول کر لیا تھا۔ دوسری ہجرت حبشہ کے وقت ہجرت فرمائی۔ جب حضورؐ مدینہ تشریف لائے تو حبشہ سے آپ کے پاس حاضر ہو گئے[4] بیعتِ رضوان اور بعد کے غزوات میں شریک رہے[5] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مہر مبارک آپ کی نگرانی میں ہوتی تھی[6] شیخین نے آپ کو بیت المال کا نگران مقرر کیے رکھا[7] آپ کو جذام کا مرض ہوا تو حضرت عمرؓ نے حکیموں کو بلا کر آپ کا علاج کرایا جس سے مرض رفع ہو گیا[8] عثمان بن عفان کے دور میں مہر خلافت انہیں کے سپرد تھی[9] ان کے ہاتھ سے مہرِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اریس کے کنویں میں گر گئی اور پھر نہ مل سکی[10]

آپ کاتبانِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں سے ہیں۔ عمر بن شبہ[11] اور الجہشیاری نے آپ کا نام کاتبانِ نبویؐ میں شمار کیا ہے۔ جہشیاری نے یہ بھی کہا کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مالِ غنیمت کی فہرست لکھ دیا کرتے تھے[12] مسعودی[13]، العراقی[14]، ابن سید الناس[15] اور الانصاری[16] وغیرہ نے بھی اسی طرح ذکر کیا ہے۔

آپ کی تاریخ وفات میں اختلاف ہے۔ کہا گیا ہے کہ خلافتِ عثمانؓ میں فوت ہوئے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ۴۰ھ کے بعد تک زندہ رہے[17] رضی اللہ عنہ وارضاہ۔

۴۶۔ المغیرۃ بن شعبۃ بن ابی عامر الثقفی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

آپ کو "مغیرۃ الرائی" کہا جاتا تھا۔ عرب کے ہوشیار و چالاک لوگوں میں سے تھے۔ غزوۂ خندق والے سال میں اسلام لائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہجرت فرمائی۔ حدیبیہ اور بیعتِ رضوان میں شریک ہوئے۔ طائف میں قبیلہ ثقیف کے

---

[1] تجارب الامم ۱ : ۲۹۱
[2] تاریخ الیعقوبی ۲ : ۸۰
[3] اسد الغابہ ۴ : ۳۸۵، تہذیب الکمال ۴ - ب، العجالۃ السنیہ ۲۴۵
[4] الاستیعاب ۱۴۸۰ (البجاوی)
[5] الاصابہ ۳ : ۴۵۱
[6] الاستیعاب ۹ ۴ ۱۴
[7] البدایہ والنہایہ ۵ : ۳۵۵، الاستیعاب ۱۴۷۹
[8] اسد الغابہ ۴ : ۴۰۳
[9] الاصابہ ۳ : ۴۵۱
[10] اسد الغابہ ۴ : ۴۰۳
[11] المصباح المضی ۸۰ ب
[12] الوزراء والکتاب ۱۲
[13] التنبیہ والاشراف ۲۴۶
[14] العجالۃ السنیہ ۲۴۶
[15] عیون الاثر ۲ : ۳۱۵
[16] المصباح المضی ۴۱
[17] الاصابہ ۳ : ۴۵۱

باغیوں کی سرکوبی میں ابوسفیانؓ کے ساتھ تھے۔ غزوۂ یرموک میں آپ کی ایک آنکھ زخمی ہوگئی اور اس طرح آپ یکچشم رہ گئے۔ جنگِ یمامہ اور شام و عراق کی فتوحات میں شامل رہے[1] حضرت ابوبکرؓ نے آپ کو اہلِ بحیرکی طرف بھیجا[2] رستم کی طرف حضرت سعد کے ایلچی بنے[3] اسی طرح امراؤ القیس کی طرف نعمان بن مقرن کے ایلچی بنے[4] حضرت عمرؓ نے آپ کو بصرہ کا والی مقرر کیا[5] میسان، ہمدان اور دیگر بہت سارے شہر آپ کے ہاتھوں فتح ہوئے[6] ابنِ اثیر نے کہا ہے کہ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے بصرہ کا دیوان بنایا۔ حضرت عمرؓ نے ان کو بصرہ سے معزول کر کے کوفہ کا گورنر بنایا۔ حضرت عمرؓ کی شہادت تک کوفہ ہی کے گورنر رہے[7] حضرت عثمانؓ نے اوّلاً تو بحال رکھا مگر بعد میں معزول فرمادیا[8] جنگِ صفین میں الگ رہے۔ جب تمام لوگوں نے حضرت معاویہؓ کی بیعت کرلی تو انہوں نے بھی حضرت معاویہؓ کی بیعت کرلی[9] حضرت معاویہؓ نے آپ کو کوفہ کا گورنر مقرر کیا اور آخر دم تک گورنر رہے حتیٰ کہ ۵۰ھ میں وفات پائی[10] آپ کاتبانِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں سے ہیں۔ ابنِ اسحاق[11]، ابنِ شبہ[12]، ابنِ سعد اور جہشیاری نے آپ کا نام کاتبانِ نبیؐ[13] میں شمار کیا ہے۔ جہشیاری نے مزید یہ کہا کہ مغیرہ بن شعبہ اور الحصین بن نمیر لوگوں کے باہمی معاملات لکھا کرتے تھے[14] یعقوبی[15]، المسعودی[16]، ابن مسکویہ[17]، ابنِ کثیر[18]، العراقی[19]، ابن سید الناس[20] اور الانصاری[21] وغیرہم نے بھی آپ کا نام کاتبانِ نبیؐ میں شمار کیا ہے۔ کتاب "الوثائق السیاسیہ" کے وثیقہ نمبر ۸۱، ۸۲، ۸۶، ۹۵، ۱۵۳، ۱۹۴، ۱۹۵ اور ۲۰۴ میں آپ کا نام بطور کاتب پایا جاتا ہے۔

۴۷۔ نصرانی من الانصار

بنی نجار کا ایک آدمی نصرانی تھا پھر اسلام لایا سورۃ بقرہ اور آلِ عمران پڑھی وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کاتب تھا۔ مگر دوبارہ مرتد ہوگیا اور کہا کرتا:

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کچھ نہیں جانتے، مگر وہ جو میں لکھوں۔ اللہ تعالیٰ نے اسے موت دی۔ لوگوں نے اسے دفنایا تو زمین نے اسے قبول نہ کیا اور باہر پھینک دیا[22]

---

[1] الاصابہ ۲: ۴۵۲ — [2] ایضاً — [3] ایضاً — [4] ایضاً

[5] ایضاً — [6] ایضاً — [7] اسد الغابہ ۴: ۴۰۷

[8] الاستیعاب ۱۴۴۶ — [9] الاصابہ ۳: ۴۵۳ — [10] الاستیعاب ۱۴۴۶

[11] البدایہ والنہایہ ۵: ۳۵۰ — [12] المصباح المضی ۸ب — [13] الوزراء والکتاب ۱۲

[14] تاریخ الیعقوبی ۲: ۸۰ — [15] التنبیہ والاشراف ۲۴۵ — [16] تجارب الامم ۱: ۲۹۱

[17] البدایہ والنہایہ ۵: ۳۵۰ — [18] العجالۃ السنیۃ ۲۴۶ — [19] عیون الاثر ۲: ۳۱۵

[20] المصباح المضی ۴۲-۱ — [21] انظر المناقب ۲۶، الحدیث ۳۶۱۷، م فضائل ومنحۃ المعبود ۲ ۵۱۲

۴۸ - یزید بن ابی سفیان الاموی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت معاویہؓ کے باپ کی طرف سے بھائی تھے۔ انہیں "یزید الخیر" کہا جاتا تھا۔ ابوسفیانؓ کے بیٹوں میں سب سے افضل تھے[1] عرب کے مسلم عقلاء اور بہادر لوگوں میں سے تھے۔ فتح مکہ کے روز اسلام لائے اور پھر حُسنِ اسلام کی داد دی[2] غزوۂ حنین میں شریک ہوئے۔ حنین کے مالِ غنیمت میں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو سَو اونٹ اور چالیس اوقیہ چاندی عطا فرمائی۔ چاندی حضرت بلالؓ نے تول کر دی[3]۔ جب حضرت ابوبکرؓ ۱۲ھ میں حج سے لوٹے تو عمروؓ بن العاص ، یزیدؓ بن ابی سفیان ، ابوعبیدہؓ بن الجراح اور شرحبیلؓ بن حسنہ کو فلسطین کی طرف روانہ فرمایا۔ ذہبی نے کہا ہے : حضرت ابوبکرؓ نے یزید بن معاویہؓ کو امیر بنایا اور پیدل چل کر ان کے گھوڑے کے ساتھ ان کو رخصت کیا اور کچھ وصیتیں بھی فرمائیں۔ یہ سب کچھ یزید کے کمال شرف اور دین کی وجہ سے تھا[4]۔ رملہ اور بیت جبرین کے درمیان مقام اجنادین پر رومیوں کے ساتھ ان کی مڈبھیڑ ہوئی — اللہ تعالیٰ نے مشرکین کو شکست دی اور یہ فتح جمادی الاولیٰ ۱۳ھ میں ہوئی۔ حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے تو آپ نے حضرت ابوعبیدہؓ[5] بن الجراح کو شام کا گورنر مقرر فرمایا۔ شام کی فتح بھی انہی کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ جب حضرت ابوعبیدہؓ فوت ہوئے تو معاذؓ بن جبل گورنر بنائے گئے۔ جب ان کی بھی وفات ہوگئی تو یزیدؓ بن ابی سفیان والی مقرر کیے گئے[6] تادمِ حیات اس منصب پر فائز رہے[7]۔ حضرت یزیدؓ طاعونِ عمواس میں ۱۸ھ میں فوت ہوئے۔ اُن کی جگہ ان کے بھائی معاویہؓ بن ابی سفیان کو شام کا والی مقرر کیا گیا۔ معاویہؓ کا تقرر یزیدؓ کے احترام اور ان کی تولیت کی تنفیذ کی خاطر تھا[8]۔

آپؓ کاتبانِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں سے ہیں۔ ابنِ سعد[9]، ابنِ مسکویہ[10]، ابنِ عبدالبر[11]، ابنِ عبدربہ[12]، العراقی[13]، ابن سیدالناس[14] اور الانصاری[15] وغیرہم نے آپ کا نام کاتبانِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں شمار کیا ہے۔ رضی اللہ عنہ وارضاہ۔

---

[1] الاستیعاب ۱۵۷۵ (البجاوی) [2] سیر اعلام النبلاء ۱ : ۲۳۷ [3] الاستیعاب ۱۵۷۵

[4] ایضاً [5] سیر اعلام النبلاء ۱ : ۲۳۸ [6] الاستیعاب ۱۵۷۵، ۱۵۷۶

[7] الاصابۃ ۳ : ۶۵۶ [8] سیر اعلام النبلاء ۱ : ۲۳۸ [9] المصباح المضی ۲ ۴۲ - ۱

[10] تجارب الامم ۱ : ۲۹۱ [11] الاستیعاب [12] العقد الفرید

[13] العجالۃ السنیہ ۲۴۶ [14] عیون الاثر ۲ : ۳۱۶ [15] المصباح المضی ۲ ۴۲ - ۱

سیرالطیبات

[سرورِ کائنات کی بیٹیوں کا ذکر]

مولانا مقصود احمد بھوپالی

حضرت زینبؓ

نام جنابِ رسولِ خدا سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے بڑی صاحبزادی کا نام زینبؓ ہے جو راہِ الٰہی میں شہید ہوئیں، اُن کی نسبت حضرت عائشہؓ آنحضرت صلعم کا ارشاد نقل کرتی ہیں کہ آپ نے فرمایا: "وہ میری سب سے اچھی لڑکی تھی جو میری محبت میں ستائی گئی[1]"

ان کی والدہ محترمہ حضرت خدیجہؓ بنت خویلد بن اسد بن عبدالعزیٰ بن قصی ہیں جنہوں نے سب سے پہلے تصدیقِ رسالت کی اور جن کے فضائل و مناقب اس قدر ہیں کہ اُمتِ مسلمہ میں اُن کا وہی مرتبہ ہے جو اُمتِ ماضیہ میں حضرت مریمؑ کا، ابوعمرو کا قول ہے کہ سب صاحبزادیوں میں یہ بڑی صاحبزادی تھیں اس میں کوئی اختلاف نہیں، اور جو لوگ اختلاف کرتے ہیں وہ صحیح نہیں اور نہ قابلِ توجہ ہے،، اب اگر اختلاف ہے تو اس امر میں کہ اولادِ رسول صلعم میں اولاً حضرت زینبؓ پیدا ہوئیں یا حضرت قاسم، علمائے نسب کے ایک گروہ کا قول ہے کہ اول حضرت قاسم پیدا ہوئے اُن کے بعد حضرت زینبؓ۔ ابن کلبی کہتے ہیں کہ پہلے زینبؓ پیدا ہوئیں پھر قاسم، بہرحال سب صاحبزادیوں میں حضرت زینبؓ سب سے بڑی ہیں[2]

ولادت بعثت سے دس سال قبل پیدا ہوئیں اس وقت آنحضرت صلعم کی عمر شریف تیس سال کی تھی۔ حضرت زینبؓ کے حالاتِ طفولیت کا کتبِ تواریخ میں کہیں پتہ نہیں چلتا اس لئے اُن کا حال زمانۂ شادی سے قلمبند کیا جاتا ہے۔

نکاح آنحضرت صلعم کی صاحبزادیوں میں سب سے پہلے حضرت زینبؓ کی شادی کمسنی میں قبل نبوت اُن کے حقیقی خالہ زاد بھائی ابو العاص (ملقب بہ لقیط) بن ربیع بن عبدالعزیٰ بن عبد شمس بن مناف کے ساتھ ہوئی[3] جو حضرت خدیجہؓ کی حقیقی بہن ہالہ بنت خویلد کے بیٹے تھے[4]

حضرت زینبؓ کے جہیز میں منجملہ دیگر سامان کے ایک عقیق یمنی کا ہار تھا۔ جو حضرت خدیجہؓ نے دیا تھا[5] چونکہ یہ عقیق یمنی کا ہار ایک خاص اہم واقعہ سے تعلق رکھتا ہے اس لیے آگے کے بیان (عام حالات) میں درج کیا جائے گا۔

---

[1] زرقانی بحوالہ طحاوی ترجمہ حضرت زینبؓ [2] طبقات ص ۲۰، [3] ایضاً، [4] ایضاً، [5] ایضاً،

اسلام جب آنحضرت صلعم منصب نبوت پر فائز ہوئے تو حضرت زینبؓ بھی اسلام لے آئیں [1]۔ اور اپنے شوہر ابوالعاص کے اسلام لانے سے پہلے مدینہ کی طرف ہجرت کی [2]

عام حالات چونکہ ابوالعاص شرک میں مبتلا تھے بموجب احکام اسلامی زوجین میں تفریق کی ضرورت تھی لیکن چونکہ آنحضرت صلعم اس وقت مکہ میں مغلوب تھے اور کوئی اسلامی قوت موجود نہیں تھی، کفار کی ایذا رسانی کا بازار گرم تھا، اشاعت اسلام کا کام ابتدائی حالت میں تھا غرضکہ یہ ایک پُر آشوب زمانہ تھا اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مصلحتاً زوجین میں تفریق نہیں فرمائی [3]

اسلام کی اشاعت کے ساتھ کفار کی زبردست مخالفت بھی روز بروز بڑھتی جاتی تھی، آں حضرت صلعم کو تکلیف دینے کا کوئی طریقہ ایسا نہ تھا جو انہوں نے اختیار نہ کیا ہو منجملہ اور ایذا رسانی کیلئے ایک طریقہ یہ بھی اختیار کیا کہ قریش کے چند لوگوں نے ابوالعاص کو مجبور کیا کہ وہ حضرت زینبؓ کو طلاق دے دیں اور بجائے ان کے قریش کی کسی لڑکی سے عقد کر لیں لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ یہی وجہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کی قرابت کا اچھا خیال فرماتے اور زوجین کے باہمی تعلقات ارتباط اور شریفانہ طرز عمل کی اکثر تعریف فرماتے تھے [4]

حضرت زینبؓ کی محبت و ایثار کا ایک خاص واقعہ یہ ہے کہ نبوت کے تیرھویں سال جب آنحضرت صلعم نے مکہ معظمہ سے ہجرت فرمائی تو حضرت زینبؓ اپنی خسرال میں تھیں اور ابوالعاص مشرکین کے ہمراہ جنگ بدر میں شریک تھے، عبداللہ بن جبیر بن نعمان نے زمرہ اساری میں ابوالعاص کو بھی گرفتار کیا۔ اس گرفتاری کی خبر اہل مکہ کو پہنچی اہل مکہ اپنے قیدیوں کی رہائی کے لیے فدیہ بھیجا، حضرت زینبؓ نے بھی اپنے دیور عمرو بن ربیع کو یمنی ہار (جو اُن کی والدہ خدیجہؓ نے بوقت جہیز دیا تھا) دے کر روانہ کیا، رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں وہ ہار پیش کیا گیا، آنحضرت صلعم اُس کو دیکھ کر مغموم و محزون ہوئے اور رقت طاری ہوگئی، حضرت خدیجہؓ کی یاد تازہ ہوگئی رحم آ گیا پھر آپ نے لوگوں سے فرمایا کہ اگر تم لوگ مناسب خیال کرو تو زینبؓ کے قیدی کو رہا کر دو اور اُس کا ہار بھی واپس کر دو لوگوں نے عرض کیا کہ "ہم لوگ بسروچشم تعمیلِ حکم کے لیے تیار ہیں" وہ رہا کر دیئے گئے اور وہ ہار بھی واپس کر دیا گیا [5]

لیکن چونکہ سب قیدی فدیہ پر چھوڑے گئے تھے اور یہ اخلاق و انصاف اور شان نبوت کے خلاف ہوتا کہ ابوالعاص بغیر کسی فدیہ کے رہا کئے جاتے اس لئے ابوالعاص کا فدیہ صرف یہ قرار دیا گیا کہ وہ مکہ پہنچ کر حضرت زینبؓ کو مدینہ بھیج دیں [6]

حضرت زینبؓ کے لانے کے لیے ابوالعاص کے ہمراہ حضرت زید بن حارث کو روانہ کیا اور ہدایت کی کہ تم بطن یاجج میں

---

[1] طبقات ص ۲ ۔ [2] ایضاً ۔ [3] در المنثور ص ۲۳۱، طبقات ص ۲۱۔

[4] طبقات ص ۶۱ تا ص ۶۳، جلد ۸، جلد ۲ - ۱ - زرقانی ص ۲۰۸ جلد ۲- وسنن ابوداؤد ص ۲۲۴ جلد ۱ - وطبری ج ۱ ص ۱۳۴۶، سیرت ابن ہشام ص ۲۸ " [5] طبقات ص ۲۱ ۔ [6] ایضاً ۔

ٹھیرے رہنا جب زینبؓ وہاں آجائیں تو اُن کو اپنے ہمراہ لے کر مدینہ چلے آنا۔ چنانچہ ابو العاص نے مکہ پہنچ کر حضرت زینبؓ کو اپنے چھوٹے بھائی کنانہ کے ساتھ مدینہ جانے کی اجازت دی) حضرت زینبؓ جب سامان سفر کی تیاری میں مشغول تھیں تو ہند بنت عتبہ اُن کے پاس آئیں اور کہا "یا بنتِ محمدؐ صلعم کیا تم اپنے باپ کے پاس جا رہی ہو؟" حضرت زینبؓ نے کہا "فی الحال تو ایسا ارادہ نہیں ہے۔ آگے جو خدا کو منظور ہو۔"

ہندؔ نے کہا "بہن اس پوشیدگی کی کیا ضرورت ہے اگر تم واقعی جا رہی ہو تو کچھ زادِ راہ یا اور کسی چیز کی ضرورت ہو تو بے تکلف کہہ دو میں خدمت کے لئے حاضر ہوں۔"

ہندہ کی اس ہمدردی و غمخواری سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ابھی تک طبقۂ نسواں میں عداوت و دشمنی کا وہ زہریلا اثر نہیں پھیلا تھا جو مردوں میں سرایت کر چکا تھا حضرت زینبؓ فرماتی ہیں کہ ہندؔ جو کچھ کہہ رہی تھیں وہ سچے دل سے کہہ رہی تھیں اگر مجھے کسی چیز کی فی الواقع ضرورت ہوتی تو وہ غالباً ضرور پورا کرتیں لیکن وقت کی مصلحت سے انکار کر دیا۔[1]

غرض جب سامان سفر سے فارغ ہوگئیں تو اپنے دیور کنانہ ابن ربیع کے ساتھ اونٹ پر سوار ہو کر روانہ ہوئیں۔ چونکہ کفار کا غلبہ تھا اور اُن کے تعرض کا خوف تھا اس لیے اُن کے دیور کنانہ بن ربیع نے اپنے ساتھ ترکش اور کمان وغیرہ بھی رکھ لیا۔ جب وہ لوگ روانہ ہوئے تو قریش میں کھلبلی پھیل گئی۔ اور اُن کی گرفتاری کی فکر ہوئی چنانچہ قریش کی ایک جماعت اُن کے تجسس میں نکلی اور مقام ذی طویٰ میں اُن دونوں کو گھیر لیا اس جماعت میں ہبار بن اسود (جو حضرت خدیجہؓ کے چچازاد بھائی کے لڑکے تھے اور اس رشتے سے حضرت زینبؓ کے ماموں ہوئے) اور ایک دوسرا شخص بھی تھا دونوں میں سے کسی ایک نے حضرت زینبؓ پر حملہ کیا وہ اونٹ سے زمین پر گر پڑیں۔ وہ حاملہ تھیں اُن کا حمل ساقط ہوگیا چوٹ بھی زیادہ آئی (ہبار بن اسود کی اس بیجا حرکت پر فتح مکہ کے دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے قتل کی عام اجازت دے دی تھی لیکن انہوں نے اپنی تقصیر کی معافی چاہی اور مشرف بہ اسلام ہوئے تو آنحضرت صلعم نے معاف کر دیا[2]) اس پر کنانہ نے ترکش سے تیر نکالے اور کہا "جو کوئی اب میرے نزدیک آئے گا وہ ان تیروں کا نشانہ بنے گا۔" کچھ لوگ منتشر ہو گئے اور ابوسفیان سردارانِ قریش کے ساتھ آگے بڑھ کر آیا اور کہا "تم اپنے تیروں کو تھوڑی دیر روکے رہو کہ ہم تم سے کچھ باتیں کر لیں۔"

کنانہ نے اپنے تیر ترکش میں رکھ لیے اور اُن سے پوچھا "تم کیا کہتے ہو جو کچھ کہنا ہو جلد کہو۔"

ابوسفیان نے کہا "محمدؐ کے ہاتھوں جو مصیبتیں اور تکلیفیں شکست، رسوائی اور ذلت ہم لوگوں کو پہنچی ہے اس سے تم بے خبر نہیں ہو۔ اب اگر تم محمدؐ کی بیٹی کو علانیہ ہمارے سامنے سے لے جاؤ گے تو لوگ ہماری کمزوری اور بزدلی پر محمول کریں گے اور ہمارے ضعف و ادبار کا پیش خیمہ خیال کریں گے۔ یہ تو تم خود خیال کر سکتے ہو کہ ہمیں محمدؐ کی بیٹی کو روکنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے

---

[1] سیرت ابن ہشام ص ۲۸ تا ص ۳۱ ، طبری ص ۴۷ تا ص ۶۳ جلد ۱۔

[2] اصابہ حالات ہبار بن اسود۔

لیکن مقصد یہ ہے کہ اس وقت تم لوٹ چلو جب ہنگامہ فرو ہو جائے اور لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ محمدؐ کی بیٹی کو واپس کرا لائے تو تم چوری چھپے دوسرے وقت اُن کو لے جانا۔"

کنانہ نے اس بات کو منظور کیا اور وہ واپس آ گئے۔ جب یہ واقعہ عام طور سے مشہور ہو گیا تو ایک روز مخفی طریقے سے اُن کو لے کر روانہ ہو گئے۔ بطن یاجج میں زید بن حارث انتظار کر رہے تھے اُن کے سپرد کر دیا وہ حضرت زینبؓ کو لے کر مدینہ چلے گئے۔

ابوالعاص کو حضرت زینبؓ سے بہت محبت تھی زن و شوئی کے باہمی تعلقات اتحاد و ارتباط خوشگوار تھے۔ چنانچہ حضرت زینبؓ جب مدینہ تشریف لے گئیں تو ابوالعاص مغموم رہنے لگے۔ ایک مرتبہ شام کے سفر میں حضرت زینبؓ بہت یاد آئیں تو انہوں نے یہ شعر پڑھے[1]

ذکرت زینب لما ورکت ارما	جبکہ میں موضع ارم سے گذرا تو زینب کو یاد کیا (زینب یاد
فقلت سقیا لشخص یسکن الحرما	آئیں) تو میں نے بیساختہ یہ دعا دی کہ اللہ تعالیٰ اُس شخص کو
بنت الامین جزاها الله صالحة	شاد رکھے جو حرم میں سکونت پذیر ہے آمین (محمد صلعم کی بیٹی
وکل بعل سیثنی مالذی علما	کو خدائے تعالیٰ جزائے خیر دے۔ اور شوہر اُسی بات کی تعریف
	کرتا ہے جس کو وہ خوب جانتا ہے۔

چونکہ ابوالعاص تجارتی تجربہ اور امانت داری کے لحاظ سے بہت مشہور تھے اس لئے اہلِ قریش اپنا تجارتی مال اُن کے ہاتھ فروخت کے لئے بھیجا کرتے تھے۔ جمادی الاول سنہ ۶ھ میں ابوالعاص قریش کے ایک قافلہ کے ساتھ شام کی طرف روانہ ہوئے۔ جب شام سے واپس ہونے لگے تو آں حضرت صلعم نے زید بن حارث کو مع ایک سو ستر سوار کے تعاقب میں روانہ کیا۔ مقام عیص میں دونوں قافلہ ملاقی ہوئے[2] سواران اسلام نے مشرکین کو گرفتار کیا اور جو کچھ مال و متاع تھا سب پر قبضہ کر لیا[3] لیکن ابوالعاص سے کوئی مزاحمت نہ کی[4] ابوالعاص نے جب قافلہ کا یہ حشر دیکھا تو فوراً مدینہ پہنچ کر حضرت زینبؓ سے پناہ طلب کی چنانچہ حضرت زینبؓ نے اپنی پناہ میں لے لیا[5] اس وقت آنحضرت صلعم نماز فجر میں مشغول تھے۔ حضرت زینبؓ نے بآواز بلند کہا اِنّی قَدْ اَجرْتُ اَبا العاص[6] یعنی میں نے ابوالعاص کو اپنی پناہ میں لے لیا۔ جب آنحضرت صلعم نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا اے لوگو! تم نے کچھ سُنا سب نے عرض کیا جی ہاں سنا آپ نے فرمایا مجھے اس سے قبل اس واقعہ کی کچھ اطلاع نہ تھی۔ کیا عجیب بات ہے کہ مسلمانوں کے کمزور آدمی دشمنوں کو پناہ دیتے ہیں[7]

جب آں حضرت صلعم اپنے گھر تشریف لائے تو حضرت زینبؓ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا کہ ابوالعاص کا جو کچھ مال و متاع لیا گیا ہے وہ واپس کر دیا جائے چنانچہ آنحضرت صلعم نے اہل سریہ سے کہلا بھیجا کہ تم میرے اور ابوالعاص کے رشتہ

---

[1] زرقانی ص ۲۲۳ جلد ۳ و سیرۃ ابن ہشام ص ۳۱ و طبری ص ۱۳۴۹ ج ۱۔ [2] طبقات ص ۲۱ - [3] طبقات ص ۲۲
[4] ایضاً و طبری ص ۱۳۵ ، [5] طبقات ص ۲۲ - [6] ایضاً ، [7] ایضاً ، [8] ایضاً۔

سے واقف ہو اگر تم اس کے ساتھ احسان کرو گے اور اس کا مال و متاع واپس کر دو گے تو میری خوشی کا باعث ہوگا۔ ورنہ تمہیں اختیار ہے سب نے کہا ہم کل چیزیں واپس کرنے کیلئے حاضر ہیں چنانچہ سب چیزیں واپس کر دی گئیں۔ ادھر تو یہ حکم اہل سریہ کو بھیجا اور ادھر اپنی بیٹی زینبؓ سے یہ فرمایا کہ تم ابوالعاص کی خاطر و مدارات اور اعزاز و احترام میں کوئی کمی نہ کرنا۔ لیکن جب تک وہ مشرک رہیں اُن کی قرابت سے احتراز کرنا کیوں کہ اسلام و کفر دونوں جمع نہیں ہو سکتے ہیں[۱]

اس روایت سے عدم تفریق زوجین کی پہلی روایت کی تردید ہوتی ہے لیکن اب اسلام کی قوت بڑھ گئی تھی اور استحکام کی صورت پیدا ہو گئی تھی اور کوئی اسلامی کمزوری بھی نہ تھی اور اسلام کا منشا بھی یہی ہے کہ زوجین میں تفریق ہو جائے۔ اس لیے اب کوئی وجہ نہ تھی کہ اب آں حضرتؐ ایسا حکم نہ دیتے وہ وقت البتہ بہت نازک تھا اسی مصلحت سے اس وقت کوئی تفریق نہیں کی گئی۔ اس کے بعد ابوالعاص اپنا مال و اسباب لے کر مکہ روانہ ہو گئے مکہ پہنچ کر جس جس کا جو کچھ لینا دینا تھا اسے دے کر حساب صاف کر دیا[۲] اور ایک روز قریش کو مخاطب کر کے کہا۔ "اے اہل قریش اب میرے ذمہ کسی کا کوئی مطالبہ تو باقی نہیں ہے"۔

اہلِ قریش نے کہا "ہاں بے شک اب کوئی مطالبہ نہیں ہے اور خدا تم کو جزائے نیک دے تم ایک باوفا اور کریم النفس شخص ہو"۔

ابوالعاص نے کہا۔ "ہاں سن لو اب میں مسلمان ہوتا ہوں اور کہا اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ، خدا کی قسم مجھے آنحضرت صلعم کی خدمت میں حاضر ہونے کے بعد اسلام لانے سے صرف یہ امر مانع تھا کہ تم لوگ یہ خیال نہ کرلو کہ میں تمہارے مال کو غبن کر چکا ہوں تو اس لئے مسلمان ہو گیا لیکن اب جبکہ خدا نے مجھے۔ اس بار گراں سے بخیر و خوبی سبکدوش کر دیا تو اب کوئی امر حائل نہیں کہ میں اسلام نہ قبول کروں"۔

یہ واقعہ محرم ۷ھ کا ہے اس کے بعد حضرت ابوالعاص مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ گئے[۳]۔

جب حضرت ابوالعاص مشرف باسلام ہو کر مدینہ منورہ پہنچے تو آنحضرت صلعم نے حضرت زینبؓ کو بعقد اول اُن کی طرف رجوع کر دیا[۴] یعنی تجدید نکاح نہ کی بلکہ وہی پہلا نکاح قائم رکھا چونکہ اس وقت سورہ برأت نازل نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے مسلمان عورتیں اپنے شوہروں کے پاس اسلام لانے کے بعد بلا تجدید نکاح اُن کی زوجیت میں آجایا کرتی تھیں[۵]

حضرت زینبؓ اپنے والد اور شوہر سے بے انتہا محبت رکھتی تھیں[۶] قیمتی کپڑے پہننے کی شائق تھیں۔ حضرت انسؓ نے اُن کو ریشمی چادر اوڑھے دیکھا تھا جس پر زرد رنگ کی دھاریاں تھیں[۷]

اولاد حضرت ابوالعاصؓ کے صلب سے حضرت زینبؓ کے دو اولادیں پیدا ہوئیں۔ ایک فرزند علی اور دختر امامہ، علی ہجرت کے

---

[۱] طبقات ص۲۲ ۔ [۲] طبقات ص۲۲ ۔ [۳] طبقات ص ۲۲ [۴] ایضاً [۵] اصابہ کتاب النسا، حالات زینبؓ
[۶] استیعاب ص ۵۳، و دُرّ المنثور ص۲۲ ، [۷] طبقات ص۲۲ ۔

قبل پیدا ہوئے آنحضرت صلعم نے اُن کو اپنی کفالت میں لیا اور وہ آپ کے سایۂ عاطفت میں فخر و تربیت حاصل کرتے رہے، فتح مکہ کے روز جب آنحضرت صلعم مکہ میں داخل ہوئے تو علی آپ کے ساتھ اونٹ پر سوار تھے۔ سِن بلوغ ہی میں اپنے والد ابوالعاص کی زندگی میں انتقال کیا۔ لیکن ابن عساکر کی روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ علی جنگ یرموک تک زندہ رہے اور اسی جنگ میں آپ نے جام شہادت نوش فرمایا[۱] لیکن حضرت امامہؓ زندہ رہیں اور حضرت علیؓ کی زوجہ محترمہ حضرت فاطمہؓ کے انتقال کے بعد حضرت علیؓ کا عقد ثانی حضرت امامہؓ سے ہوا۔ حضرت امامہؓ عرصہ تک زندہ رہیں ان کے حالات زندگی آئندہ صفحات میں تفصیل سے لکھے جائیں گے۔

وفات حضرت زینبؓ حضرت ابوالعاصؓ کے اسلام لانے کے بعد تقریباً سال سوا سال تک زندہ رہیں اور اپنے والد بزرگوار رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارک ۸ھ میں راہگرائے فردوس ہوئیں[۲]

حضرت زینبؓ کی علالت کا تذکرہ کسی کتب تواریخ میں نہیں ملا صرف استیعاب میں وفات کا سبب یہ لکھا ہے۔

وَكَانَ سَبَبُ مَوتِهَا اِنَّهَا لَمَّا خَرَجَتْ مِنْ مَكَّةَ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صلى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَمَدَ لَهَا هَبَّارُ بن الاَسود و رجل اخر فَدَفَعَهَا اَحَدُ هُمَا فسقطت عَلٰى صَخرَةٍ فاسقطت وَ هَرقَتِ الدماء فلم يزل بهَا مَرَضُهَا ذٰلِكَ حَتّٰى ماتت سنة ثمان من الهجرة[۳]	جب حضرت زینبؓ مکہ سے اپنے والد بزرگوار رسول صلعم کی خدمت میں آنے لگیں تو راستہ میں ہبار بن اسود اور ایک دوسرے شخص نے حملہ کیا اور ان کو اونٹ پر سے گرا دیا وہ پتھر پر گر پڑیں بہت چوٹ آئی اور بہت خون نکلا اور آپ کا حمل ساقط ہو گیا عرصہ تک اسی مرض میں مبتلا رہیں حتیٰ کہ ۸ھ میں انتقال کر گئیں۔

حضرت ام ایمنؓ، حضرت سودہؓ، حضرت ام سلمہؓ، حضرت ام عطیہؓ۔ حضرت زینبؓ کے غسل میں شریک تھیں۔ انہی لوگوں نے غسل بھی دیا۔ ام عطیہ کہتی ہیں کہ آنحضرت صلعم نے بوقت غسل فرمایا کہ "ہر عضو کو تین یا پانچ مرتبہ غسل دو اس کے بعد کافور لگاؤ"[۴]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود قبر میں اُترے اور اپنی نور دیدہ کو ہمیشہ کے لیے سپرد خاک فرمایا۔ اُس وقت آپ کے چہرہ مبارک پر رنج و ملال کے آثار نمایاں تھے۔ اور اُس وقت آپؐ نے حضرت زینبؓ کو اور اُن کے ضعف کو یاد کیا تو خدائے تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کی کہ اے خدا تو زینبؓ کی مشکلات کو آسان کر دے اور اُس کی قبر کی تنگی کو کشادگی سے بدل دے[۵]

حضرت زینبؓ کے انتقال کے تھوڑے دن کے بعد حضرت ابوالعاص کا بھی انتقال ہو گیا[۶]

---

[۱] اصابہ صہ ۴۰ ۔ [۲] طبقات صہ ۲۴ وطبری صہ ۱۳۵۱ ، [۳] استیعاب صہ ۷۵۳، [۴] طبقات صہ ۲۲، ۲۳۔
[۵] اسد الغابہ صہ ۴۶۸ ، [۶] ایضاً و در المنثور صہ ۲۳۱۔

حضرت رُقیہؓ

نام سرورِ عالم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی منجھلی صاحبزادی کا نام رقیہ ہے ان کی والدہ ماجدہ بھی حضرت خدیجہؓ بنت خویلد بن اسد بن عبدالعزیٰ بن قصی ہیں۔ یعنی جناب زینبؓ کی حقیقی بہن ہیں۔

ولادت ہجرت سے سات سال قبل پیدا ہوئیں۔ ابن زبیر اور اُن کے چچا مصعب کا خیال ہے کہ حضرت رقیہ سب صاحب زادیوں میں چھوٹی تھیں چنانچہ جرجانی نسّاب نے اسی قول کو صحیح جانا ہے لیکن ان کے علاوہ اور لوگوں نے بھی یہ لکھا ہے کہ حضرت زینبؓ بڑی صاحبزادی تھیں اور منجھلی صاحبزادی رقیہ ابوالعباس محمد بن اسحاق سراج بروایت عبداللہ بن محمد بن سلیمان بن جعفر بن سلیمان الہاشمی لکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تیس برس کے تھے جب حضرت زینبؓ پیدا ہوئیں اور تینتیسویں سال حضرت رقیہ کی ولادت ہوئی۔ بہرحال ارباب سیر نے حضرت رقیہ کو منجھلی صاحبزادی قرار دیا ہے۔

نکاح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے پہلے حضرت رقیہ کا پہلا عقد ابولہب کے بیٹے عتبہ سے ہوا[1]۔ جب آنحضرت صلعم شرف نبوت پر فائز ہوئے تو قریش کی مخالفت اور زیادہ بڑھ گئی۔ قریش نے منجملہ اور تکلیف پہنچانے کے یہ صورت بھی اختیار کی کہ حضرت ابوالعاص سے کہا کہ تم زینبؓ بنت محمدؐ کو طلاق دے دو۔ مگر انہوں نے انکار کر دیا[2]۔ جب قریش نے حضرت ابوالعاص سے یہ دندان شکن جواب سنا تو اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ پھر عتبہ کے پاس گئے اُن سے بھی یہی کہا کہ تم رقیہ بنت محمدؐ کو طلاق دے دو۔ اور قریش کی جس لڑکی سے کہو شادی کرا دیں عتبہ نے منظور کیا اور کہا کہ سعید ابن العاص کی لڑکی سے میرا نکاح کرا دو اس پر قریش بخوشی راضی ہوگئے، اور کیوں نہ ہوتے یہ تو اُن کا عین منشا تھا کہ جس طریقہ سے ہو رسول صلعم کو روحانی و جسمانی تکالیف پہونچائیں چنانچہ عتبہ نے حضرت رقیہؓ کو طلاق دیدی۔

لیکن صحیح روایت یہ ہے کہ جب آنحضرت صلعم درجۂ نبوت پر فائز ہوئے اور سورۂ تَبَّتۡ یَدَاۤ اَبِیۡ لَہَبٍ نازل ہوئی تو ابولہب اور اُس کی بیوی ام جمیل (حمالۃ الحطب) نے کبیدہ خاطر ہو کر اپنے بیٹے عتبہ سے کہا کہ اگر تم نے رقیہ بنت رسول اللہ کو طلاق نہ دی تو میری زندگی، اور تمہارے ساتھ میرا اُٹھنا بیٹھنا حرام ہے۔ عتبہ نے بہ تعمیل حکم والدین حضرت رُقیہ کو طلاق دے دی[3]۔

اس موقعہ پر یہ ذکر کر دینا بھی ضروری ہے کہ عتبہ سے صرف آپ کا عقد ہوا تھا۔ ہنوز رخصتی نہ ہونے پائی تھی کہ یہ طلاق دافع پیش آئی۔ اور یہ رسول اللہ صلعم کا معجزہ اور اللہ تعالیٰ کا ایک مخصوص انعام تھا۔

اسلام اپنی والدہ محترمہ حضرت خدیجہؓ کے ساتھ اسلام لائیں اور بیعت اس وقت کی جب اور عورتوں نے آنحضرت صلعم سے

1۔ طبقات صفحہ ۲۴، 2۔ سیرۃ ابن ہشام صہ ۲۸ و طبری صہ ۱۳۴۶ جلد ۱۔ جز ثالث،

3۔ طبقات صہ ۲۴ 4۔ طبقات صہ ۲۴ ۔ و اصابہ کتاب النساء رقیہ۔

شرف بیعت حاصل کی[1]

حضرت عثمانؓ کا قبولِ اسلام اور حضرت رقیہؓ سے عقد کا عجیب واقعہ

حضرت عثمان اپنے قبول اسلام اور شادی کا واقعہ خود بیان فرماتے ہیں کہ " میں خانہ کعبہ کے صحن میں چند دوستوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا کہ دفعتہً کسی آدمی نے آکر مجھے یہ اطلاع دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی صاحبزادی حضرت رقیہ کا عقد عتبہ بن ابی لہب سے کر دیا چونکہ حضرت رقیہ حسن وجمال اور اپنے قابل رشک اوصاف کے لحاظ سے امتیاز رکھتی تھیں اس لئے میرا رجحان خاطر انکی طرف تھا جب یہ خبر میرے گوش گذار ہوئی تو حسرت ویاس کی کالی گھٹائیں دل پر چھا گئیں ہاتھ پاؤں پھول گئے اپنی قسمت پر رنجیدہ تھا۔ لیکن سمجھ میں نہیں آیا کہ اب کیا تدبیر کروں جو مجھے منزل مقصود تک پہونچائے۔

اس خبر سے میں ایسا مضطرب ہو گیا کہ اُس جگہ نہ ٹھیرا اور گھر پہونچا زہے نصیب کہ اتفاق سے گھر میں میری خالہ سعدہ تشریف رکھتی تھیں جو کہانت میں ماہر تھیں مجھے دیکھتے ہی بے ساختہ بولیں۔

" اَبْشِرْ وَحُيِّيتَ ثَلَاثًا وِتْرًا	" (اے عثمان) تجھیں مژدہ ہو اور تم پر تین مرتبہ سلام پہونچے
" ثُمَّ ثَلَاثًا وَثَلَاثًا اُخْرٰی	پھر تین مرتبہ اور پھر تین مرتبہ ۔ پھر ایک مرتبہ سلام
" ثُمَّ بِاُخْرٰی کَیْ تَتِمَّ عَشْرًا	پہونچے تاکہ دس پورے ہو جائیں ۔ (خدا کرے)
" لَقِيتَ خَيْرًا وَّوُقِيتَ شَرًّا	تم کو بھلائی نصیب ہو اور برائی سے بچائے جاؤ خدا کی
" اَنْكَحْتَ وَاللّٰهِ حِصَانًا زَاهِرًا	قسم تم نے ایک عفت مآب حسینہ وجمیلہ خاتون سے نکاح کیا
" وَاَنْتَ بِكْرٌ وَلَقِيتَ بِكْرًا	تم بھی ناکتخدا اور ناکتخدا ہی تم کو مل گئی ۔ ایک بہت عظیم القدر جلیل المرتبہ
" وَاَفَيْتَهَا بِنْتَ عَظِيمٍ قَدْرًا "	شخص کی بیٹی تم نے پائی "

مجھے اُن کی ایسی گفتگو سے سخت تعجب ہوا۔ میں نے پوچھا خالہ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ فرمایا:

" عُثْمَانُ يَا عُثْمَانُ يَا عُثْمَانَ	عثمان اے عثمان، اے عثمان، تم صاحب جمال ہو اور
لَكَ الْجَمَالُ وَلَكَ الشَّانَ	صاحب شان ۔ یہ نبی صاحب برہان ہیں وہ رسول برحق
هٰذَا نَبِیٌّ مَعَهُ الْبُرْهَانُ	ہیں جن کو خدائے تعالیٰ نے بھیجا ہے اور اُن پر فرقان
اَرْسَلَهُ بِحَقِّهِ الدَّيَّانُ	یعنی قرآن نازل ہوا ہے ۔ اُن کی اتباع کرو اور
وَجَاءَهُ التَّنْزِيلُ وَالْفُرْقَانُ	بتوں کے فریب میں نہ آؤ۔
فَاتْبَعْهُ لَا يَغُرَّنَّكَ الْاَوْثَانُ[2]	

میں اس مرتبہ بھی کچھ نہ سمجھا اور پھر میں نے کہا کہ ذرا تفصیل و تشریح کے ساتھ فرمائیے تو فرمایا:۔

---

[1] طبقات ص ۲۴ ۔ [2] اصابہ ص ۶۲۸، ۶۲۹

"إنَّ مُحَمَّدَ بنَ عَبدِ اللهِ رَسُولُ اللهِ مِنْ عِندَ اللهِ جَاءَ بِتَنْزِيلِ اللهِ يَدعُو بِهِ إلَى اللهِ مِصْبَاحُهُ مِصْبَاح ودِينُهُ فَلَاحُ مَا يَنْفَعُ الصِّيَاحُ وَلَوْ وَقَعَ الذِّبَاحُ وَسُلَّت الصِّفَاحُ وَمُدَّتِ الرِّمَاحُ [1]

محمد بن عبداللہ جو خدا کے رسول اور قرآن لے کر آئے ہیں خدا کی طرف بلاتے ہیں اس کا چراغ دراصل چراغ ہے اس کا دین ذریعہ فلاح ہے قتل و قتال شروع ہوگا اور تلواریں کھینچ کے جائیں گی اور برچھیاں تن جائیں گی۔ اس وقت شور و غل کوئی نفع نہ دے گا۔

اُن کی یہ گفتگو میرے دل پر مؤثر ہوئی اور میں اُس کے مآل کار پر غور و فکر کرنے لگا حضرت ابوبکرؓ کے پاس میں اکثر بیٹھا کرتا تھا دو روز کے بعد میں اُن کے پاس گیا اس وقت اُن کے نزدیک کوئی شخص نہ تھا میں متفکر و پریشان بیٹھا ہوا تھا کہ انہوں نے دریافت کیا کہ تم آج متفکر کیوں ہو، چونکہ وہ میرے رفیق تھے میں نے اُن سے اپنی خالہ کی گفتگو کا ماحصل بیان کیا۔ فرمایا کہ اے عثمان تم ایک سمجھدار آدمی ہو اگر تم حق و باطل کی کوئی تمیز نہ کرو تو بیحد تعجب ہے، تمہاری قوم ان بتوں کی پرستش کرتی ہے۔ کیا یہ بُت پتھر کے نہیں ہیں نہ دیکھ سکتے ہیں، نہ نفع پہونچا سکتے ہیں نہ نقصان، میں نے کہا بے شک آپ جو کچھ فرماتے ہیں وہ بالکل صحیح ہے۔

حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا اے عثمان بے شک خدا کی قسم تمہاری خالہ نے جو کچھ کہا وہ بالکل سچ ہے اور میں بھی یہی کہتا ہوں کہ محمد بن عبداللہ خدا کے رسولؐ ہیں جنھیں خدا نے اپنا پیغام بندوں تک پہنچانے کے لئے بھیجا ہے۔ پس کیا حرج ہے اگر تم اُن کے پاس چلو اور جو کچھ وہ فرمائیں سُنو، چنانچہ میں آنحضرتؐ کی خدمت میں گیا (ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس گفتگو کے بعد آں حضرت صلعم خود ہی وہاں تشریف لے آئے) آپؐ نے فرمایا "اے عثمان خدائے تعالیٰ تم کو جنت کی طرف بلاتا ہے تم اس کو قبول کرو۔ میں خدا کا رسول ہوں جو تمہارے اور تمام مخلوق کی طرف بھیجا گیا۔"

خدا ہی جانتے آپ کے جملوں میں کیا اثر تھا کہ میں بے قابو ہوگیا اور میں نے بے اختیار أشْهَدُ أنْ لَا إلٰهَ إلَّا اللهُ وَأشْهَدُ أنَّ مُحَمَّدًا الرَّسُولُ اللهِ، کہا اور مسلمان ہوگیا[2]

اس واقعہ کے بعد مکہ میں حضرت رقیہؓ سے میرا عقد ہوگیا[3]

ہجرت: سنہ ۵ نبوت میں حضرت رقیہ نے اپنے شوہر حضرت عثمان کے ہمراہ حبشہ کی طرف ہجرت کی[4]

اسماء (ذات النطاقین) بنت ابی بکرؓ سے منقول ہے کہ آنحضرت صلعم اور حضرت ابوبکرؓ غار میں تشریف رکھتے تھے اور میں غار میں کھانا لے کر جایا کرتی تھی ایک مرتبہ حضرت عثمانؓ نے آنحضرت صلعم سے ہجرت کی اجازت طلب کی آپؐ نے حبشہ جانے کی اجازت دی اس لیے آپ حبشہ کی طرف ہجرت کر کے چلے گئے۔ اس کے بعد میں نے کھانا لے کر گئی تو آنحضرتؐ نے استفسار فرمایا کہ عثمان اور رقیہ گئے یا نہیں میں نے عرض کیا کہ جی ہاں گئے آپ نے میرے والد ابوبکرؓ سے فرمایا: "لوط اور ابراہیم کے بعد عثمان پہلے شخص ہیں جنھوں نے کفار کی ایذارسانی کے باعث مع اپنی بیوی کے وطن کو خیرباد کہہ کر ہجرت کی[5]

---

[1] اصابہ ص ۶۲۸ و ص ۶۲۹۔ [2] ماخوذ از اصابہ ص ۶۲۹ [3] طبقات ص ۲۴، درالمنثور ص ۲۷ [4] ایضاً۔
[5] اصابہ ص ۲۵۸ و طبقات ص ۲۴۔

حضرت رقیہؓ حبشہ سے مکّہ واپس آئیں لیکن مکہ کی حالت پہلے سے زیادہ خراب تھی وہاں قیام کرنا مناسب نہ سمجھا تو پھر حبشہ چلی گئیں۔

چونکہ وہاں ایک عرصہ تک قیام رہا آنحضرت صلعم کو اُن کی خیریت کے متعلق کوئی خبر نہ ملی اس لئے متفکر تھے کہ اتفاق سے ایک عورت حبشہ سے آئی۔ تو اُس سے آنحضرتؐ نے حضرت عثمانؓ اور حضرت رقیہؓ کا حال دریافت فرمایا عورت نے کہا جی ہاں میں نے دونوں کو دیکھا ہے وہ خیریت سے ہیں۔"

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اُن کی جانب سے اطمینان ہُوا تو فرمایا! "رَحِمَهُمَا اللّٰہ اَنَّ عُثْمَانَ مَنْ هَاجِرَ بِاَهْلِهٖ[1] یعنی خدا ان دونوں پر رحم فرمائے۔

عثمان پہلے شخص ہیں جنھوں نے اپنے اہل وعیال کے ساتھ ہجرت کی۔ باھلہٖ کے بعد صاحب اصابہ کہتے ہیں۔ یعنی مِنْ هٰذِهِ الاُمَّةِ اس سے مراد یہ تھی کہ اُمت میں پہلے شخص ہیں۔ لیکن ان الفاظ کی تاویل مناسب نہیں ہے کیونکہ پہلی روایت مذکور ہو چکی ہے۔ لوطؑ اور ابراہیمؑ کے بعد عثمان پہلے شخص ہیں جنھوں نے اپنی بیوی کو ہمراہ لے کر ہجرت کی۔

حبشہ میں ایک عرصہ تک قیام کرنے کے بعد حضرت عثمانؓ نے مکہ کی طرف مراجعت کی اور بہت تھوڑے دن قیام کرنے کے بعد اپنے اہل وعیال کے ساتھ مدینہ منورہ چلے گئے[2]

علالت ووفات

مدینہ منورہ پہنچ کر ۲ھ میں حضرت رقیہؓ کی صحت خراب ہو گئی چیچک نکل آئی (صاحب تاریخ الخمیس صفحہ ۳۱۱ پر لکھتے ہیں کہ حضرت رقیہؓ کے کنکری لگ گئی تھی جس سے وہ بیمار ہو گئیں) بہرحال وہ اس قدر بیمار ہوئیں کہ صاحب فراش ہو گئیں چونکہ یہی زمانہ جنگ بدر کا تھا اور آنحضرت صلعم جنگ کی تیاری میں مشغول تھے اس لیے آنحضرت صلعم نے حضرت عثمانؓ کو اُن کی تیمارداری کے لئے مدینہ میں چھوڑ دیا[3] اور آپ خود جنگ بدر میں تشریف لے گئے۔

رمضان المبارک کا زمانہ تھا۔ ہجرت کو ایک سال سات مہینے گذر چکے تھے کہ حضرت رقیہؓ کا انتقال ہو گیا[4] اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ[5] عین اس وقت جبکہ حضرت رقیہؓ کی قبر پر مٹی ڈالی جا رہی تھی زید بن حارثہ فتح مکہ کی خوش خبری لے کر مدینہ میں داخل ہوئے[6] اس لحاظ سے آپ کی وفات ۲ھ ہی میں ہوئی۔

اولاد

حبشہ کے دوران قیام میں حضرت رقیہؓ کے بطن سے ایک صاحبزادے پیدا ہوئے جن کا نام عبداللہ تھا اور عبداللہ ہی کے نام سے حضرت عثمان کی کنیت ابوعبداللہ تھی[7]

اس ولادت سے قبل ہجرت اولیٰ میں حضرت رقیہؓ کا ایک حمل ساقط ہو چکا تھا[8]

عبداللہ کی ہنوز چھ سال کی عمر تھی کہ ایک مرغ نے اُن کی آنکھ میں چونچ مار دی جس سے تمام چہرہ ورم کر آیا۔ اور نظام جسم

---

[1] اصابہ ص ۵۸۲، ص ۵۸۳۔ [2] ایضاً۔ [3] طبقات ص ۲۴ و اصابہ ص ۵۸۳۔ [4] طبقات ص ۲۴۔ [5] ایضاً۔ [6] اصابہ ص ۵۸۳
[7] اسد الغابہ ص ۴۵۶، [8] ایضاً۔

میں فساد پیدا ہو گیا آخر اسی صدمہ سے جمادی الاول سنہ ۲ھ میں انتقال ہو گیا[1] آنحضرت صلعم نے جنازہ کی نماز پڑھائی اور حضرت عثمان نے قبر میں اُتارا[2]۔ اس کے بعد حضرت رقیہ رضؓ کے کوئی اولاد نہیں ہوئی[3]

عام حالات

ابن عباس سے مروی ہے کہ آنحضرت صلعم کی تشریف آوری پر حضرت رقیہ رضؓ کی وفات کا حال بیان کیا گیا۔ تو آپ نے صبر و شکر کے ساتھ فرمایا اَلْحَقِیْ بِسَلَفِنَا عُثْمَانَ بْنِ مَظْعُوْنٍ[4] "عثمان بن مظعون پہلے جا چکے اب تم بھی اُن کے پاس چلی جاؤ۔ (عثمان بن مظعون ایک جلیل القدر اور مقتدر رکن ملت صحابی تھے مہاجرین میں سب سے پہلے مدینہ میں انتقال کیا تھا۔) آنحضرتؐ کے اس ارشاد پر تمام عورتیں حضرت رقیہ رضؓ کو یاد کر کے رونے لگیں[5] حضرت عمر رضؓ بھی آ گئے تھے عورتوں کو روتا ہوا دیکھ کر تنبیہ و تہدید فرمانے لگے آنحضرت صلعم نے فرمایا ان لوگوں کو روتا ہوا چھوڑ دو کیونکہ جب رونے کا تعلق قلب اور آنکھ سے ہو تو وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت پر مبنی ہوتا ہے اور اگر ہاتھ اور زبان تک نوبت پہنچے تو شیطان کی تحریک سمجھنا چاہیے[6]۔

لوگوں نے آنحضرت صلعم سے حضرت رقیہؓ کی تعریف کی تو آپ نے فرمایا: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ دَفْنُ الْبَنَاتِ مِنَ الْمَكْرُمَاتِ[7]
یعنی سب تعریفیں خدا کی واسطے ہیں بزرگ بیٹیاں دفن کی گئیں۔

ایک روایت یہ بھی مذکور ہے کہ حضرت فاطمہ رضؓ (حضرت رقیہ رضؓ کی چھوٹی بہن) حضرت رقیہ رضؓ کی قبر کے کنارے آنحضرت صلعم کے پہلوئے مبارک میں بیٹھ کر رونے لگیں تو آنحضرت صلعم اپنی چادر کے گوشوں سے اُن کے آنسو پونچھتے جاتے تھے[8]۔

محمد بن سعد کہتے ہیں کہ اسی روایت کا ذکر میں نے محمد بن عمر سے کیا تو انھوں نے کہا کہ میرے نزدیک زیادہ صحیح یہ ہے کہ حضرت رقیہ رضؓ کی وفات کے وقت آنحضرت صلعم جنگ بدر میں تشریف رکھتے تھے۔ بوقت دفن شریک نہ تھے۔ پس گمان غالب یہی ہے کہ یہ روایت کسی دوسری صاحب زادی کے بارے میں ہوگی جن کے دفن میں آپ شریک ہوں گے راوی کو غلط فہمی ہوئی اور اگر کوئی مغالطہ نہیں ہوا تو یہ بہت ممکن ہے کہ آنحضرت صلعم بدر سے مراجعت فرما کر قبر پر تشریف لے گئے ہوں اور وہاں یہ واقعہ پیش آیا ہو۔

حسن و جمال

حضرت رقیہ رضؓ بہت خوب صورت اور موزوں اندام تھیں درالمنثور میں لکھا ہے[9] کہ "کانت ذات جمال بارع" یعنی وہ بہت حسینہ و جمیلہ خاتون تھیں۔ حبشہ کا ایک گروہ آپ کے حسن و جمال کا تعاقب کرتا تھا، اس گروہ نے آپ کو بہت اذیتیں پہونچائیں۔ آپ نے اُن لوگوں کے لیے بد دعا کی اور وہ سب لوگ ہلاک ہو گئے[10]۔

حضرت عثمان رضؓ اپنی ہمدم و غمگسار، بیوی کے انتقال سے بہت مغموم و محزون رہنے لگے ان دونوں میں خاصی محبت تھی

" احسن الزوجین راٰھما الانسان رقیة و زوجها عثمان "

یہ مقولہ اُن کی شان محبت میں بولا جاتا تھا جو عرب میں اب بطور ضرب المثل کے استعمال کیا جاتا ہے[11]۔

۱ے اسد الغابہ صـ۴۵۶ ، ۲ے ایضاً ، ۳ے طبقات صـ۲۴ ۔ ۴ے طبقات صـ۵۸۲ ۔ ۵ے طبقات صـ۲۴ و اصابہ صـ۵۸۲ ۶ے ایضاً۔
۷ے استیعاب صـ۷۴۹ ۔ ۸ے طبقات صـ۲۴ و ۲۵ و اصابہ صـ۵۸۲ ۹ے درالمنثور صـ۲۰۷ ۱۰ے ایضاً۔ ۱۱ے اصابہ صـ۶۲۹ ۔

حضرت اُمّ کلثوم

نام حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تیسری صاحبزادی کا نام اُم کلثومؓ ہے آپ کی والدہ محترمہ حضرت خدیجہؓ بنت خویلد بن اسد بن عبد العزیٰ بن قصی تھیں۔

زبیرؒ کہتے ہیں اُمّ کلثوم حضرت رقیہؓ اور حضرت فاطمہؓ سے بڑی تھیں۔ دیگر ارباب سیر نے زبیرؒ کے اس قول کی مخالفت کی ہے لیکن صحیح اور قابلِ وثوق یہی ہے کہ حضرت رقیہؓ سے چھوٹی تھیں اس لئے کہ جب حضرت رقیہؓ کا انتقال ہوگیا تو رسول اکرمؐ نے حضرت اُمّ کلثومؓ کو حضرت عثمانؓ سے بیاہ دیا[1]

اگر حضرت ام کلثوم حضرت رقیہ سے بڑی ہوئیں تو بالضرور پہلے حضرت ام کلثومؓ کا عقد حضرت عثمانؓ سے ہوتا نہ کہ حضرت رقیہ کا۔ غالباً ارباب سیر نے زبیر کے قول کی تردید اسی قول پر کی ہوگی۔

ولادت آپؓ کا سال ولادت کسی کتب تواریخ و سیر میں مذکور نہیں ہے لیکن قیاس ہے کہ چھ سال قبل بعثت ولادت ہوئی ہوگی۔ اس لیے کہ حضرت رقیہؓ کی ولادت سات سال قبل بعثت ہوئی اور حضرت فاطمہؓ کی ولادت پانچ سال قبل ہے۔ اور جب یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ حضرت رقیہ سے حضرت ام کلثومؓ چھوٹی اور حضرت فاطمہؓ سے بڑی ہیں تو لامحالہ ان دونوں کی ولادت کے درمیان کا زمانہ اُن کی ولادت کے لیے تسلیم کرنا پڑے گا۔

آپ کے حالات طفولیت بھی کتب تواریخ و سیر میں مذکور نہیں اور حقیقتہً یہ ہے کہ وہ ایسا پُرآشوب زمانہ تھا کہ معمولی حالات کا تاریکی میں رہ جانا کچھ تعجب خیز نہیں۔ اس لئے آپ کے زمانۂ شادی کا حال لکھا جاتا ہے۔

نکاح آنحضرت صلعم نے حضرت رقیہؓ کا عقد ابولہب کے بیٹے عتبہ سے اور حضرت اُمّ کلثومؓ کا عقد ابولہب کے دوسرے بیٹے عتیبہ سے قبل بعثت کر دیا تھا۔ لیکن جب آنحضرت صلعم مرتبہ رسالت پر فائز ہوئے اور سورۂ تبت یدا ابی لہب نازل ہوئی تو ابولہب نے اپنے ہر ایک بیٹے کو مخاطب کرکے کہا راسی من راسك حرام ان لم تطلق ابنتہ ؐ "یعنی میرا زندگی اور میرا اٹھنا بیٹھنا تم لوگوں میں حرام ہے اگر تم نے اُس کی (رسول صلعم) بیٹی کو طلاق نہ دیا۔ (جیسا کہ حضرت رقیہؓ کے طلاق کا واقعہ اُن کے بیان میں لکھا جا چکا ہے) (اسی طرح) عتیبہ نے بھی اپنے باپ کے حکم کی تعمیل میں حضرت ام کلثومؓ کو طلاق دے دی اس لحاظ سے اب دونوں کی طلاق کا زمانہ اور سبب ایک ہی ہوا۔ لیکن ان دونوں بہنوں کی رخصتی ابھی تک نہیں ہوئی تھی کہ یہ طلاق وقوع میں آئی۔ اور یہ خدا کا مخصوص انعام و اکرام تھا جو قبل رخصتی کے ایسا واقعہ پیش آیا۔

اس واقعہ کے بعد حضرت رقیہ کا عقد حضرت عثمان سے ہوگیا تھا جیسا کہ اُن کے بیان میں ذکر ہو چکا۔

جب سنہ ۲ھ میں حضرت رقیہؓ کا انتقال ہوگیا اور حضرت عثمانؓ اُس جانکاہ صدمہ سے بہت زیادہ مغموم و محزون رہنے لگے، آنحضرت صلعم نے اُن کی یہ حالت دیکھی تو فرمایا۔ کہ اے عثمان میں تم کو غم و الم میں مبتلا پاتا ہوں، اس کا کیا سبب ہے حضرت عثمانؓ

---

[1] طبقات صفحہ ۲۵ ۔ [2] ایضاً صفحہ ۲۵۔

نے عرض کیا یا حضرت رسول صلعم غمگین و پریشان نہ ہوں تو کیا کروں مجھ پر وہ مصیبت پڑی جو کبھی کسی پر نہ پڑی ہوں گی حضورؐ کی صاحبزادی کا انتقال ہوگیا اُن کی وفات سے میری کمر ٹوٹ گئی حضور سے جو رشتۂ قرابت وابستہ تھا منقطع ہوگیا اب کیا چارہ ہے۔ ابھی اُن کی گفتگو ختم نہ ہونے پائی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے جبریل علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے یہ حکم پہنچایا ہے کہ میں اپنی بیٹی اُم کلثوم کو اُسی مہر پر جو رقیہ کا تھا تمہارے عقد میں دوں[1]

چنانچہ آنحضرت صلعم نے ربیع الاوّل ۳ھ میں حضرت ام کلثومؓ کا عقد حضرت عثمان سے کر دیا۔[2]

رخصتی : نکاح کے دو ہی مہینے بعد جمادی الآخر ۳ھ میں رخصتی عمل میں آئی[3]

اسلام : حضرت ام کلثومؓ اپنی والدہ مکرمہ حضرت خدیجہؓ کے ساتھ اسلام لائیں[4] اور اپنی بہنوں کے ساتھ بیعت اس وقت کی، جب اور عورتیں آنحضرت صلعم کی شرف بیعت سے بہرہ اندوز ہوئیں[5]

ہجرت آنحضرت صلعم جب مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرما کر تشریف لے گئے، تو اہل و عیال مکہ ہی میں مقیم رہے۔ لیکن جب مکہ کی حالت زیادہ نازک اور خطرناک ہوگئی تو حضرت سودہؓ و حضرت فاطمہؓ مدینہ کی طرف ہجرت کر کے جانے لگیں تو حضرت اُم کلثوم بھی اُن کے ہمراہ ہجرت کر کے مدینہ چلی گئیں[6]

اولاد : آپ کے کوئی اولاد پیدا نہیں ہوئی[7]

وفات : وفات تک مدینہ میں قیام رہا۔ شادی کے پانچ سال گذرنے کے بعد شعبان ۹ھ میں انتقال فرمایا[8]۔ انصاری عورتوں نے آپ کو غسل دیا اس میں اُم عطیہؓ بھی تھیں۔ آنحضرت صلعم نے جنازہ کی نماز پڑھائی حضرت ابوطلحہؓ، حضرت علیؓ بن ابی طالب اور حضرت فضلؓ بن عباس و اسامہ بن زیدؓ نے قبر میں اُتارا[9]

عام حالات : انسؓ بن مالک سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت اُم کلثومؓ کی وفات سے سخت صدمہ پہنچا آپ قبر پر بیٹھے ہوئے تھے اور آپ کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے[10]

ایک روایت میں یہ بھی مذکور ہے کہ جب حضرت رقیہؓ کا انتقال ہوگیا تو حضرت عمرؓ بن الخطاب نے حضرت عثمان سے کہا تم میری بیٹی حفصہ سے عقد کر لو لیکن حضرت عثمانؓ نے تامل کیا اور کوئی جواب نہیں دیا اس لئے کہ وہ سن چکے تھے کہ آنحضرت صلعم حضرت حفصہؓ سے عقد کرنے کا خیال فرماتے ہیں پھر جب رسول اکرم کو یہ خبر پہنچی تو آپؐ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا کیا میں حفصہؓ کے لئے عثمانؓ سے بہتر شوہر اور عثمانؓ کے لیے حفصہؓ سے بہتر زوجہ تلاش کر دوں پھر آپؐ نے حضرت حفصہؓ کو اپنے دائرۂ ازدواج میں شرف بخشا، اور حضرت عثمانؓ کا عقد حضرت اُم کلثوم سے کر دیا[11]

---

[1] اسدالغابہ صہ ۶۱۲، صہ ۶۱۳۔ [2] طبقات صہ ۲۵ ۔ [3] ایضاً

[4] ایضاً ۔ [5] طبقات صہ ۲۵ [6] ایضاً ۔ [7] ایضاً ۔ [8] ایضاً و اسدالغابہ صہ ۶۱۲ ، [9] ایضاً ۔

[10] استیعاب صہ ۷۹۳ ۔ [11] طبقات صہ ۲۵

حضرت ام کلثومؓ کے انتقال کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر میری دس لڑکیاں ہوتیں تو ہر ایک لڑکی عثمانؓ ہی کے رشتۂ تزویج میں منسلک کرتا۔[1]

دوسری روایت میں مذکور ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ اگر میری سو لڑکیاں ہوتیں تو تین عثمانؓ کے عقد میں دیتا۔[2]

حضرت فاطمہؓ

نام آنحضرت سرورِ کائنات امام البشر خاتم المرسلینؐ کی چھوٹی صاحبزادی کا نام فاطمہؓ اور کنیت ام محمدؐ ہے۔ جن پر تمام مکارمِ اخلاق، وفضائل اوصاف ختم تھے آپؓ کی والدہ معظمہ بھی حضرت خدیجہ بنت خویلد تھیں۔

لقب: آپ سیدۃ النساء عالم اور سردار نساء اہل جنت ہیں۔ آپ کے القاب، زہرا، طاہرہ، مطہرہ، زاکیہ، راضیہ، مرضیہ، بتول، ہیں۔[3]

شیخ ابن حجر فاطمہ، بتول اور زہرا کی وجہ تسمیہ لکھتے ہیں کہ آپ کا نام فاطمہؓ اس وجہ سے ہے کہ خدائے تعالیٰ نے آپ کو اور آپ کے دوست رکھنے والوں کو دوزخ کی آگ سے محفوظ رکھا۔

بتول کا لقب اس وجہ سے ہے کہ آپ اپنے زمانہ کی عورتوں سے فضل و دین اور حسب میں ممتاز تھیں۔ اور زہرا لقب اس وجہ سے تھا کہ آپ کو حیض نہیں آتا تھا۔[4]

صاحب اخبار الدول زہرا کی وجہ تسمیہ لکھتے ہیں کہ جب حضرت امام حسنؓ و امام حسینؓ پیدا ہوئے تو ما بین عصر و مغرب کا وقت تھا اسی وقت آپ نفاس سے پاک ہوئیں اور غسل کرکے مغرب کی نماز ادا فرمائی اسی واسطے زہرا لقب ہوا۔

مولانا حضرت شیخ عبدالحق مدارج النبوۃ میں لکھتے ہیں کہ حضرت فاطمہ میں بہجت، زہرت، جمال و کمال بہت زیادہ تھا۔ اس مناسبت سے زہرا لقب قرار پایا۔

علامہ قسطلانیؒ مواہب لدنیہ میں لکھتے ہیں کہ فطم کے معنی لغت میں بچے کو دودھ پینے سے روکنے کے ہیں، تو گویا حضرت فاطمہ سیدۂ عالم لوگوں کو دوزخ کی آگ سے روکنے والی ہیں۔

اور بتول مشتق ہے بتل سے جس کے معنی قطع کرنے کے ہیں۔ منتہی الارب میں لکھا ہے کہ 'بتول' بروزن صبور عورت دوشیزہ کو کہتے ہیں۔ جو دنیا اور ماسوائے اللہ سے علیحدہ ہو حضرت مریم والدۂ عیسیٰ علیہ السلام کا لقب بھی بتول تھا۔

بچپن ہی سے حضرت فاطمہ کی طبیعت میں بہت زیادہ متانت، سادگی اور سنجیدگی تھی۔ آپ کی اور بہنیں لہو ولعب میں مشغول رہتیں لیکن آپ کا دل کھیل کود میں نہیں لگتا تھا۔ وہ بہنیں اپنے قبیلے کے اکثر گھرانوں میں چلی جایا کرتی تھیں لیکن آپ کہیں آنا جانا

---

[1] طبقات صہ ۲۵۔ [2] تاریخ الخمیس صہ ۳۰۲۔ [3] اصابہ صہ ۳۷۸۔

[4] منح شرح قصیدہ ہمزیہ صہ ۶۶۵ و صہ ۳۲۱ سے ماخوذ۔

پسند نہیں فرماتی تھیں ہمیشہ اپنی والدہ محترمہ کے پاس بیٹھی رہتی تھیں۔ آپ کی یہ سادگی اور استغنا آنحضرت صلعم کو بہت پسند تھا۔ اسی وجہ سے آپ بتول (تارک الدنیا) کے لقب سے یاد فرمائی جاتی تھیں۔

چونکہ آپ آں حضرت صلعم سے صورت، و سیرت، انداز، ادا، گفتار، رفتار، چلنے پھرنے اُٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے میں مشابہ تھیں اس لحاظ سے آپ کا لقب زاکیہ، راضیہ بھی ہوا۔

ولادت: آپ کی ولادت باسعادت نبوت سے پانچ سال قبل ہوئی۔[1] اور یہ وہ مبارک زمانہ تھا کہ اہلِ قریش خانہ کعبہ کی تعمیر میں مشغول تھے[2]

حضرت عباسؓ سے مروی ہے کہ آپؓ کی ولادت اس وقت ہوئی جبکہ خانہ کعبہ کی تعمیر ہو رہی تھی اور اُس وقت آنحضرت صلعم کی عمر مبارک ۳۵ سال کی تھی[3] اور آپؓ حضرت عائشہ سے پانچ سال بڑی تھیں[4]

نکاح: جس وقت آنحضرت صلعم ہجرت کرکے مدینہ منورہ تشریف لائے اُس وقت حضرت فاطمہؓ ناکتخدا تھیں لوگوں نے پیغام دیئے اُن میں سب سے پہلے حضرت ابوبکرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت فاطمہؓ سے عقد کرنے کی استدعا کی آپ نے فرمایا:

"حکمِ الٰہی کا انتظار کرو[5]"

اس کا ذکر حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ سے کیا اور اُن کو بھی ترغیب دی کہ تم اپنے لئے پیغام دو چنانچہ حضرت عمرؓ نے بھی اپنی استدعا پیش کی اور وہی جواب پایا جو حضرت ابوبکرؓ کو ملا تھا۔

پھر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو لوگوں نے آمادہ کیا لیکن آپ کو اپنی بے سروسامانی پر تامل ہوا اور یہ بھی خیال آیا کہ اب حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے بعد میرے لیے کیا گنجائش ہوسکتی ہے لیکن جب لوگوں نے اس امر پر زیادہ مجبور کیا اور آنحضرت صلعم کی قرابت کا استحقاق یاد دلایا تو آپ نے آنحضرت صلعم سے بطریقہ پیغام عرض کیا رسول صلعم نے یہ استدعا قبول فرمائی اور حضرت فاطمہ سے ذکر کیا کہ علیؓ کا رجحان خاطر تمہاری طرف ہے آپ خاموش ہو رہیں۔ چونکہ اس خاموشی سے ایک طرح کی رضامندی معلوم ہوئی اس لئے آپ نے حضرت عائشہ صدیقہؓ سے شادی کے چار مہینے بعد اوائل محرم ۲ھ میں حضرت علیؓ سے عقد کر دیا[6]

حضرت علیؓ نے شادی کے وقت اپنا اونٹ اور بعض اسباب فروخت کر ڈالا تھا جس کی کل قیمت چار سو اسی ۴۸۰ درہم تک پہونچتی ہے۔ آں حضرت صلعم نے فرمایا۔ دو ثلث خوشبویات میں صرف کرو اور ایک ثلث متاع میں (یعنی سامان خورد و نوش اور دیگر جملہ ضروریات خانگی[7])

---

۱ طبقات ص۱۱، ۲ اصابہ ص۱۲۵، ۳ اصابہ ص۱۲۵، ۴ طبقات ص۱۱، ۵ اصابہ ص۱۲۵، ۶ طبقات ص۱۱۔

۷ صاحب مصنف سیر الصحابیات صفحہ ۹۴ حضرت فاطمہؓ کے عقد کے بیان میں لکھتے ہیں: "ابن سعد نے روایت کی ہے کہ سب سے پہلے حضرت ابوبکرؓ نے آنحضرت صلعم سے درخواست کی آپؐ نے فرمایا جو خدا کا حکم ہوگا۔ پھر حضرت عمرؓ نے جرأت کی اُن کو بھی آپؐ نے کچھ جواب نہیں دیا بلکہ وہی الفاظ فرمائے۔ پھر مصنف صاحب موصوف لکھتے ہیں "لیکن بظاہر یہ روایت صحیح نہیں معلوم ہوتی ہے حافظ ابن حجر نے اصابہ میں ابن سعد کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ)

شادی کا حال حضرت علیؓ کی زبان قلم سے

حضرت علی کرم اللہ وجہہ اپنی شادی کا حال اس طرح بیان فرماتے ہیں کہ "میرے پاس ایک لونڈی تھی جس کو میں آزاد کر چکا تھا اُس نے مجھ سے دریافت کیا کہ کیا حضرت فاطمہ کا کسی نے پیغام دیا؟ میں نے کہا معلوم نہیں، پھر اُس نے کہا کہ آپ پیغام دیجئے آپ کو کون سا امر مانع ہے میں نے کہا کس بنا پر پیغام دینے کی جرأت کروں، میرے پاس کوئی چیز نہیں جس سے میں عقد کروں اُس نے مکرر کہا کہ نہیں آپ آنحضرت صلعم کے پاس جائیے چنانچہ میں اس کے اصرار سے حضور صلعم کی بارگاہ میں گیا لیکن آں حضرتؐ کی جلالت و ہیبت کا مجھ پر اس قدر اثر ہوا کہ مجھے کچھ کہنے کی جرأت نہ ہوئی اور میں خاموش بیٹھا رہا مجھ میں بالکل طاقت نہ تھی کہ کچھ گفتگو کرتا لیکن حضورؐ ہی نے توجہ فرما کر دریافت فرمایا کہ کیا فاطمہؓ کے پیغام کے لیے آئے ہو۔ میں نے عرض کیا جی ہاں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا تمہارے پاس کوئی چیز مہر ادا کرنے کے لئے بھی ہے عرض کیا نہیں، فرمایا وہ حطمی زرہ کہاں ہے جو میں نے تم کو دی تھی۔ وہ وہی مہر میں دے دو۔ اُس زرہ کی قیمت چارسو درہم سے زائد نہ تھی۔ نکاح ہوا اور وہ زرہ بالعوض مہر دے دی۔[1]"

ایک روایت یہ بھی مذکور ہے کہ انصار کی ایک جماعت نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو حضرت فاطمہ کے پیغام دینے کی ترغیب دی چنانچہ آپ آنحضرت صلعم کی خدمت میں گئے۔

آنحضرت صلعم نے فرمایا تم کیا چاہتے ہو آپ نے عرض کیا کہ حضرت فاطمہ سے عقد کی خواہش ہے آنحضرت صلعم نے فرمایا: "اھلاً و مرحبا" ان دو کلموں سے زیادہ آپؐ نے کچھ ارشاد نہ فرمایا۔ حضرت علیؓ واپس آئے۔ انصار کی جماعت جو کہ منتظر تھی مستفسر ہوئی کہ حضور نے کیا ارشاد فرمایا۔ حضرت علیؓ نے جواب دیا کہ آنحضرت صلعم نے مجھ سے اہلا و مرحبا کے سوا اور کچھ نہ فرمایا۔ ان لوگوں نے کہا رسول صلعم کا اہلا و مرحبا ہی فرمانا کافی ہے۔"

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

اکثر روایتیں حضرت فاطمہؓ کے حال میں روایت کی ہیں۔ لیکن اس کو نظر انداز کر دیا ہے۔"

معلوم نہیں ہوتا صاحب موصوف ابن سعد سے بالخصوص اس روایت سے کیوں اس قدر بدظن ہیں اور صرف حافظ ابن حجر کی نظر انداز کر دینے پر اس روایت کو غیر صحیح ماننے کی کیا وجہ ہے صاحب مصنف نے محض ذاتی رائے سے کام لیا کوئی قوی دلیل پیش نہیں کی اور نہ کسی قسم کا محاکمہ کیا۔ ضعف روایت کے دو ہی سبب ہوتے ہیں یا تو اسناد میں کلام ہو یا درایتاً کوئی نقص ہو بغیر اس کے کہ صاحب موصوف اس اصول سے بحث کرتے اور کسی قسم کے اسباب بتلاتے صرف یہ کہہ کر "بظاہر یہ روایت صحیح نہیں" عہدہ برآ کیسے ہو سکتے ہیں اس روایت کی صحت میں کوئی کلام نہیں، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے اس پیغام دینے سے نہ اخلاق پر کوئی بُرا اثر پڑتا ہے اور نہ معاذ اللہ آنحضرت صلعم یا آپ کی صاحبزادی کی اس میں کسر شان ہے، متعدد اصحاب کا پیغام دینا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ پھر آنحضرت صلعم سے شرف انتساب حاصل کرنے کی کس کو آرزو نہ ہوگی چہ جائیکہ حضرت ابوبکرؓ جیسے یار غار، اور حضرت عمرؓ جیسے حامیانِ اسلام۔ بہر حال صرف حافظ ابن حجر کا اپنی کتاب میں نہ لکھنا اس روایت کی عدم صحت کے لیے کافی ثبوت نہیں ہے۔

[1] اسد الغابہ صہ ۵۲۰، صہ ۵۲۱

جب نکاح سے فراغت ہوگئی تو آں حضور رسول اکرمؐ نے فرمایا کہ شادی کے لیے ولیمہ بھی ضروری ہے۔ حضرت سعد نے کہا میرے پاس ایک بھیڑ ہے اس سے ولیمہ کر دیا جائے اور اسی طرح سے انصار کے ایک قبیلہ نے حسب استطاعت ولیمہ کا انتظام کیا۔[1]

رخصتی : حضرت علیؓ نے ایک چھوٹا سا مکان رسول صلعم کے مکان سے کسی قدر فاصلہ پر کرایہ پر لیا تھا۔ آنحضرت صلعم نے اپنی لونڈی ام ایمن کے ہمراہ حضرت فاطمہؓ کو حضرت علیؓ کے گھر رخصت کر دیا۔ رخصتی کے وقت حضرت علیؓ سے آپ نے یہ بھی فرمایا کہ جب تک تم مجھ سے نہ مل لو کوئی بات (فاطمہ سے) نہ کرنا۔ پھر آنحضرت صلعم حضرت علی کے گھر تشریف لے گئے پانی طلب کیا اُس سے وضو کیا اور حضرت علی پر وہ پانی ڈال دیا اور یہ دعا پڑھی "اللّٰھُمَّ بارک فیھما وبارک علیھما وبارک لھما فی نسلھما"۔[2]

دوسری روایت میں مذکور ہے کہ جب دین و دنیا کے بادشاہ کی معزز بیٹی رخصت ہو کر خسرال جانے لگیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ جب تک میں تمہارے پاس نہ آلوں تم فاطمہ کے پاس نہ جانا۔ حضرت علی اور حضرت فاطمہ دونوں گھر کے ایک گوشہ میں بیٹھ گئے۔ پھر آنحضرت تشریف لائے آپ نے دروازہ کھلوایا۔ ام ایمن دروازہ کھولنے آئیں تو یہ گفتگو ہوئی۔

آنحضرت صلعم "کیا میرا بھائی بھی اس مکان میں ہے۔"

اُم ایمن "آپ کے بھائی کیسے ہوئے حالانکہ آپ نے اپنی صاحبزادی کا عقد اُن سے کیا ہے۔"

آنحضرت صلعم "ہاں وہ ایسا ہی ہے (پھر آپ نے دریافت کیا) کیا اس جگہ اسماء بنت عمیس بھی ہیں اور کیا تم بنت رسول اللہ کی تعظیم و تکریم کے لیے آئی ہو۔"

اُم ایمن "جی ہاں اسماء بنت عمیس بھی ہیں اور میں بنت رسول اللہ کی تعظیم و تکریم کے لیے آئی ہوں۔"

آپؐ نے ام ایمن کو دعائے خیر سے سرفراز فرمایا پھر پانی طلب کیا۔ پیالہ یا اور کسی برتن میں پانی پیش کیا گیا۔ آپؐ نے اس برتن میں ہاتھ دھوئے[3] اور حضرت علیؓ کو بلا کر اُن کے دونوں شانوں اور بازوؤں اور سینہ پر وہ پانی چھڑک دیا۔ پھر حضرت فاطمہؓ کو بلایا تو وہ شرم و حیا سے جھکتی ہوئی آنحضرتؐ کے پاس آئیں آپؐ نے اُن پر بھی پانی چھڑکا اور فرمایا اے فاطمہؓ میں نے تمہاری شادی اپنے خاندان کے بہترین شخص سے کی ہے۔[4]

مہر : حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ جب میں نے پیغام دینے کا ارادہ کیا تو میرے پاس کوئی چیز نہ تھی کہ مہر ادا کرتا اسی شش و پنج میں تھا کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ تم مہر کیا دو گے میں نے عرض کیا کہ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے پھر آپ نے فرمایا کہ وہ

---

[1] طبقات ص۱۳ ، [2] ایضاً واسد الغابہ ص۵۲۱ و اصابہ ص۴۲۷ ، [3] طبقات ص۱۵ ۔
[4] طبقات ص۱۵ ۔

زرہ حطمی کہاں ہے جو میں نے تم کو جنگ بدر کے بعد دی تھی۔ عرض کیا وہ میرے پاس ہے۔ فرمایا بس وہی مہر میں دے دو۔ چنانچہ میں نے وہی زرہ حضرت فاطمہ کے مہر میں دے دی۔

عکرمہ کہتے ہیں کہ اُس زرہ کی قیمت صرف چار درہم تھی[1]

حضرت فاطمہؓ کے مہر کے بارے میں ارباب سیر کا اختلاف ہے بعض کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ کے پاس اُس وقت زر مال کچھ نہ تھا صرف ایک زرہ تھی وہ مہر قرار دی گئی۔ بعض کہتے ہیں چار سو اسی درہم کا مہر قرار پایا جس کا ثلث حصہ رسول اللہ صلعم نے خوشبویات میں صرف کرنے کا حکم دیا بعض کا گمان ہے کہ حضرت علی نے آنحضرت صلعم کے حکم سے قبل رخصتی وہی زرہ بعوض مہر حضرت فاطمہ کے روبرو پیش کی[2]

سامان جہیز: حضور سرورِ عالم نے اپنی صاحبزادی سیدۂ عالم حضرت فاطمہ کو مندرجہ ذیل جہیز دیا[3] نقشی تخت، تکیہ، جس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی، پیالہ، کپڑا، چکیاں، مشکیزہ، گھڑے۔

اولاد: حضرت فاطمہؓ کے دو لڑکے امام حسنؓ، امام حسینؓ اور دو لڑکیاں ام کلثوم اور زینب پیدا ہوئیں[4] جو اہم واقعات کے لحاظ سے تاریخ اسلام میں سب سے عظیم الشان ہیرو ہیں۔

آں حضرت صلعم کو ان سب سے بہت محبت تھی آپ کی سب صاحبزادیوں میں یہ شرف صرف حضرت فاطمہؓ ہی کو حاصل ہُوا کہ اُن سے آپ کی نسل چلی[5]

اور دوسری روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ محسن اور رقیہ بھی آپ کی یادگار صالحات سے ہیں لیکن بچپن ہی میں رحلت فرما گئے[6]

فضائل و مناقب: حضرت فاطمہؓ کے فضائل و مناقب بیشمار ہیں منجملہ اُن کے اہل بیت میں اگرچہ بہت سے بزرگ داخل ہیں لیکن ان سب میں زیادہ قابلِ عظمت سیدۂ عالم حضرت فاطمہؓ کا وجود گرامی ہے۔ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ وَیُطَھِّرَکُمْ تَطْھِیْرًا ہ کا نزول حضرت فاطمہؓ کے فضائل مناقب پر خاص طور سے دال ہے۔

عبدالرحمٰن بن ابی نعیم بروایت ابی سعید الخیری لکھتے ہیں۔

آنحضرت صلعم نے فرمایا "سَیِّدَۃُ النِّسَاءِ اَھْلِ الْجَنَّۃِ"[7] یعنی فاطمہ جنت کی عورتوں کی سردار ہیں"

ایک دفعہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین پر چار خط کھینچے پھر لوگوں سے فرمایا کہ تم لوگ جانتے ہو کہ یہ کیا ہے۔ سب نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسولؐ زیادہ واقف ہے، آپ نے فرمایا فاطمہ بنت محمد۔ خدیجہ بنت خویلد۔ مریم بنت عمران۔ آسیہ بنت مزاحم۔ (عورت فرعون کی) ان لوگوں کو جنت کی عورتوں پر سب سے زیادہ فضیلت ہے[8]

---

[1] طبقات ص۱۲، [2] استیعاب ص۷۵۱، [3] طبقات ص۱۴، ص۱۶، [4] استیعاب ص۷۷۱، [5] اسد الغابہ ص۲۰،
[6] زرقانی ص۲۳۳ ج ۳۔ [7] استیعاب ص۷۷۱، ص۷۵۲۔ [8] استیعاب ص۷۵۰ و ص۷۵۲۔

خدائے تعالیٰ نے طبقۂ نسواں میں حضرت فاطمہؓ کی ذات مبارک میں جو مناقب ودیعت کئے ہیں اُن کی نظیر سے صفحات تاریخ مملو ہیں جیسا کہ اس حدیث سے ثابت ہے اور یہ حدیث حضرت فاطمہؓ کے فضائل کے لیے ایک بہترین شاہد ہے۔ کفاك من نساء العالمين مريم بنت عمران وخديجة بنت خويلد و فاطمة بنت محمد و آسية امرأة فرعون[1] یعنی تمہاری تقلید کے لیے تمام دنیا کی عورتوں میں مریم، خدیجہ، فاطمہ، آسیہ کافی ہیں۔

صداقت و راست گوئی میں بھی حضرت فاطمہؓ کی کوئی نظیر نہیں۔ حضرت عائشہؓ[2] فرماتی ہیں کہ ما رأيت احدا كان اصدق لهجة من فاطمة الا ان يكون الذى ولدها صلعم۔ میں نے فاطمہ سے بڑھ کر راست گو کسی کو نہیں دیکھا لیکن اُن کے والد آنحضرت صلعم البتہ مستثنیٰ ہیں۔

حضرت رسول صلعم جب کسی سفر سے مراجعت فرماتے تو سب سے پہلے حضرت فاطمہؓ کے گھر تشریف لاتے[3] حضرت فاطمہؓ کے ساتھ جس قدر آنحضرت صلعم کو محبت تھی اتنی اور کسی اولاد کے ساتھ نہ تھی، حالانکہ آپ کی بعض بہنیں آپ سے زیادہ تیز، فہیم اور خوب صورت تھیں لیکن آنحضرت صلعم کو حضرت فاطمہ بہت محبوب تھیں[4]

حضرت فاطمہؓ اگرچہ رسول صلعم کی محبوب ترین اولاد تھیں لیکن انہوں نے کوئی دنیاوی فائدہ نہیں اٹھایا[5]

حضرت فاطمہؓ کے مجملہ اور فضائل کے ایک فضیلت یہ بھی ہے کہ قیامت کے دن ایک ندائے غیبی ہوگی کہ یا اهل الجمع غضوا ابصاركم عن فاطمة بنت محمد حتى تمر[6] اے لوگو! تم اپنی آنکھیں بند کر لو تاکہ حضرت فاطمہؓ گذر جائیں۔

رسول صلعم نے حضرت فاطمہؓ سے فرمایا تمہاری رضامندی سے اللہ تعالیٰ خوش ہوتا ہے اور تمہارے غیظ و غضب سے وہ غضبناک ہوتا ہے[7]

آنحضرت صلعم جب کسی سفر یا جنگ سے مراجعت فرماتے تو پہلے مسجد میں تشریف لے جاکر دو رکعت نماز ادا فرماتے پھر حضرت فاطمہؓ کے گھر تشریف لے جاتے پھر دیگر ازواج مطہرات کے پاس[8]

ایک تابعی نے حضرت عائشہؓ سے دریافت کیا رسول اللہ صلعم سب سے زیادہ کس کو محبوب رکھتے ہیں۔ آپ نے جواب دیا عورتوں میں فاطمہ کو اور مردوں میں اُن کے شوہر علیؓ کو[9]

حضرت فاطمہؓ ہمیشہ سے اپنے ہر ایک انداز کھانے پینے، بول چال لباس وغیرہ غرض ہر ایک امر میں رسول صلعم کی پوری تقلید کرتی تھیں۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے فاطمہؓ سے زیادہ نشست و برخاست، عادت و خصائل، طرز و گفتگو، لب و لہجہ میں آنحضرتؐ کے مشابہ کسی کو نہیں دیکھا۔

---

[1] ترمذی کتاب المناقب۔ [2] استیعاب ص۷۷۱ ج ۲۔ [3] اسد الغابہ ص۵۲۳۔ [4] ایضاً ص۵۲۰۔ [5] سنن ابو داؤد۔ [6] اسد الغابہ ص۵۲۲۔ [7] ایضاً ص۵۲۲ و اصابہ ص۱۶۸۔ [8] استیعاب ص۷۷۱۔ [9] ایضاً ص۷۷۲۔

حضرت فاطمہؓ جب اپنے باپ کے پاس آتیں تو آنحضرت صلعم کھڑے ہو جاتے اور پیشانی کو بوسہ دیتے اور اپنی جگہ پر بٹھا لیتے اور یہی طریقہ عمل حضرت فاطمہؓ کا بھی تھا۔[1]

اُم سلمہ کہتی ہیں کہ رفتار و گفتار میں بہترین نمونہ رسول صلعم کا فاطمہؓ تھیں۔ یہی اسباب ہیں کہ جن کی وجہ سے آنحضرت صلعم اُن سے زیادہ محبت رکھتے تھے، حضرت فاطمہؓ کا حلیہ مبارک بھی آنحضرتؐ سے بہت ملتا جلتا تھا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں میری آنکھوں نے رسول اللہ صلعم کے بعد فاطمہؓ سے بہتر کسی کو نہیں دیکھا۔[2]

عام حالات : لڑکی خواہ امیر کی ہو یا فقیر کی سن شعور تک تو وہ اپنے شفیق والدین کی گود میں پرورش پاتی ہے اور فطرتاً ایک گونہ اپنے والدین، بہن بھائی اور اُس گھر سے جہاں اپنی عمر کا ایک بہترین حصہ گذار چکی ہے۔ محبت و ہمدردی ہو جاتی ہے لیکن پھر وہ وقت جلد آجاتا ہے جہاں اُس کو ایک نئی دنیا اور نئی زندگی اور نئے لوگوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے اور اپنے شفیق والدین سے مفارقت اختیار کرنا پڑتی ہے۔ یہ وہ وقت ہے جبکہ والدین باتباع شریعت لڑکی کا ہاتھ ایک اجنبی مرد کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں اور اپنے فرض منصبی سے دست بردار ہو جاتے ہیں وہ وقت لڑکی کے لیے ایک دردناک وقت ہوتا ہے۔

رخصتی کے وقت لڑکی کا گھر بجائے عشرت کدہ کے ماتم کدہ بن جاتا ہے لڑکی تقاضائے دل سے مجبور ہو کر گردن جھکائے زار و قطار روتی رہتی ہے۔

چنانچہ حضرت فاطمہ سیدۃ النسأ کا جب عقد ہوا تو آپ بھی بخیال مفارقت رو رہی تھیں۔ اسی عرصہ میں سرور کائنات نبی صلعم مکان کے اندر تشریف لائے۔ حضرت فاطمہؓ کو اس عالم (اشکباری) میں دیکھا تو فرمایا اے بیٹی فاطمہ! یہ رونا کیسا میں نے تمہاری شادی ایسے شخص سے کی ہے، جو علم و حلم میں سب سے افضل اور اسلام لانے میں سب سے اوّل ہے۔[3]

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ حضرت فاطمہ کی طبیعت کچھ ناساز ہوئی آنحضرت صلعم عیادت کو تشریف لائے آپؐ نے فرمایا "بیٹی تم کیسی ہو"۔ جواب دیا مجھے تکلیف ہے لیکن اُس تکلیف میں مزید اضافہ یہ ہے کہ میرے گھر میں کھانے کی کوئی چیز نہیں ہے۔ آپؐ نے فرمایا "بیٹی کیا تم کو پسند نہیں ہے کہ تم دنیا کی عورتوں کی سردار ہو" انہوں نے عرض کیا کہ "مریمؑ بنت عمران کا کیا مرتبہ ہے"؟ آپؐ نے فرمایا "وہ اپنے زمانہ کی عورتوں کی سردار ہیں تم اپنے زمانہ کی عورتوں کی سردار ہو؟ اور خدا کی قسم میں نے تمہاری شادی دنیا اور دین کے سردار سے کی ہے۔[4]"

آں حضرت صلعم ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو ابو ایوب انصاری کے مکان میں فروکش ہوئے۔ جب حضرت فاطمہؓ کا عقد ہوا تو آنحضرت صلعم نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ تم کوئی مکان کرایہ پر لے لو چنانچہ ایک مکان آنحضرت صلعم کے قیام گاہ سے کسی قدر فاصلہ پر لے لیا اور اُسی مکان میں رخصت کرا کے لے گئے۔ رخصتی کے بعد آنحضرت صلعم حضرت زینبؓ کے یہاں تشریف لے گئے

---

[1] استیعاب صفحہ ۷۷۲ و ابو داؤد بروایت حضرت عائشہؓ ۱۲۔ [2] اصابہ صفحہ ۷۲۶۔ [3] اسد الغابہ صفحہ ۵۲۰۔ [4] استیعاب صفحہ ۷۷۱۔

اثنائے گفتگو میں آپؐ نے اپنی صاحبزادی سے فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ تم کو اپنے قریب بلا لوں۔ حضرت فاطمہ نے عرض کیا کہ آپ حارث بن نعمان سے فرمایئے وہ کوئی مکان آپ کے قریب دے دیں گے۔ آپؐ نے فرمایا بیٹی حارث بن نعمان سے یہ بات کہتے ہوئے شرم آتی ہے اتفاق سے یہ خبر حارث کو پہنچی تو بارگاہ نبوت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ اپنی صاحبزادی صاحبہ کو اپنے قریب کے مکان میں منتقل کرانا چاہتے ہیں لہٰذا میرے مکانات موجود ہیں حضرت فاطمہ کو بلا لیجئے۔ میرا جان و مال اللہ اور اُس کے رسول کے لئے قربان ہے اور بخدا جو چیز آپ مجھ سے لیں گے مجھے اُس کا آپ کے پاس رہنا میرے پاس کے رہنے سے زیادہ محبوب ہو گا۔ رسولؐ نے فرمایا تم نے سچ کہا خدا تم کو برکت دے اور اپنی رحمت تم پہ نازل کرے، پھر حضرت فاطمہ کو حارث کے مکان میں منتقل کرا لیا [1]

حضرت فاطمہؓ نہایت متقی، پرہیزگار، دیندار خاتون تھیں اُن کی زندگی کا تمام تر حصہ زہد و قناعت پر گذرا، صبر و تحمل اور زہد و تورع اور شرم و حیا کی آپ بہترین مثال ہیں دنیاوی تکالیف و مصائب کا آپ کو ذرا بھی خیال نہیں ہوتا تھا۔ آپ کی زندگی جس عسرت و تنگدستی میں بسر ہوئی اس کا اندازہ صرف اس سے ہو سکتا ہے کہ آپ اپنے گھر کا تمام کام خود کرتی تھیں۔ روزانہ کی محنت و جانفشانی یہ تھی کہ اس قدر چکی پیستی تھیں کہ ہاتھوں میں چھالے پڑ جاتے تھے، پانی کی مشک سے کمر و سینہ میں نشان بن گئے تھے اور گھر میں جھاڑو دینے اور چولھے کے پاس بیٹھ کر چولھا پھونکنے سے کپڑے میلے و کثیف ہو جاتے تھے۔

فتوحات کی کثرت تھی مدینہ میں مال و زر کے خزانے لُٹ رہے تھے لیکن کوئی سوال کرے کہ سیدۃ النسأ حضرت فاطمہؓ کا کوئی اس میں حصہ تھا تو اس کا جواب سوائے نفی کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ بایں ہمہ جب آنحضرت صلعم سے یہ تکلیف وہ حالت عرض کر کے لونڈی کی استدعا کی جاتی تو آپ دوسرے طریقہ سے تسکین و تشفی، وعظ و نصیحت کر دیتے، کبھی کوئی وظیفہ بتا دیتے اور کبھی دنیا کی بے ثباتی کا حال بیان فرما دیتے، کبھی صاف انکار کر کے فرما دیتے کہ یہ فقرأ و یتامیٰ کا حق ہے۔

ائمہ حدیث فرماتے ہیں کہ حقیقتاً چکی پیسنے کے نشان حضرت سیدۃ النسأ فاطمہؓ کے ہاتھوں میں پڑ گئے تھے اور چولھا پھونکنے سے چہرۂ مبارک کا رنگ متغیر ہو گیا تھا لیکن یہ قدرت نہ تھی کہ ایک کنیز رکھ سکیں ایک دن حضرت علیؓ نے حضرت فاطمہؓ سے کہا اب تو پانی بھرتے بھرتے سینہ درد کرنے لگا، آج کل دربارِ نبوت میں بہت سے قیدی آئے ہیں تم جاؤ اور ایک خادم آنحضرت صلعم سے مانگو۔ حضرت فاطمہ نے کہا میں اپنا حال کس سے کہوں میرا خود یہ حال ہے کہ چکی پیستے پیستے ہاتھوں میں گھٹے پڑ گئے، پھر آپ اپنے والد بزرگوار رسول صلعم کی خدمت میں گئیں۔ آنحضرت صلعم نے فرمایا کیا حال ہے کیسے آئیں کیا کوئی کام ہے آپ نے عرض کیا کوئی کام نہیں صرف سلام کے لئے حاضر ہوئی۔ حضرت فاطمہ مراسم آداب و سلام بجا لا کر اپنے گھر واپس آئیں جن باتوں کے اظہار کی ضرورت تھی اور جس گذارش کے لیے گئی تھیں شرم کے مارے اُس کا اظہار نہ کیا جب گھر واپس آئیں تو حضرت علیؓ نے کہا تم جس کام کو گئی تھیں کیا کر کے آئیں آپ نے کہا میں سلام کر کے چلی آئی۔ میری شرم و حیا نے اجازت

---

[1] طبقات صـ۱۴ و اصابہ صـ۴۲۶۔

نہ دی کہ میں کوئی سوال کرتی۔ پھر دونوں میاں بیوی آنحضرت صلعم کی خدمت میں گئے حضرت علیؓ نے عرض کیا یا رسول اللہؐ پانی بھرتے بھرتے سینہ درد کرآیا۔ حضرت فاطمہؓ نے عرض کیا چکّی پیستے پیستے ہاتھوں میں گھٹے پڑ گئے اب ایسی تکلیفیں ناقابل برداشت ہیں حضور کی بارگاہ میں بہت سے قیدی آئے ہیں اُن میں سے ایک ہم کو دیجیے۔ آنحضرت صلعم نے فرمایا بخدا میں تم دونوں کو کوئی خادم نہیں دوں گا کیا میں اہل صفہ کے حق کو چھوڑ دوں اور اُن کو بھول جاؤں۔ جو فقر و فاقہ کی بدولت نان شبینہ کو محتاج ہیں اور میرے پاس کوئی چیز نہیں ہے کہ میں اُن لوگوں کے لئے صرف کروں اور امداد دوں سوائے اُس کے کہ ان قیدیوں کو فروخت کروں اور اُس کی قیمت سے اہلِ صفہ کی ضرورت پوری کراؤں جب یہ دونوں ایک منصفانہ جواب سن کر گھر واپس آئے تو آنحضرت صلعم اُن کے گھر تشریف لائے اس وقت دونوں اپنے اپنے فقیرانہ بستروں پر آرام کے لیے لیٹ چکے تھے لیکن جب آنحضرت صلعم کو آتے دیکھا تو تعظیماً و تکریماً اُٹھے آپ نے فرمایا تم نے جس چیز کی ضرورت ظاہر کی تھی اور جس کے تم خواہشمند تھے اُس سے بہتر ایک چیز تم کو بتانے کے لیے آیا ہوں انہوں نے عرض کیا فرمائیے۔

آپ نے فرمایا "ہر نماز کے بعد دس دس بار سبحان اللہ و الحمد للہ و اللہ اکبر پڑھا کرو، اور سوتے وقت سبحان اللہ، الحمد للہ ۳۳۔ ۳۳ بار اور اللہ اکبر ۳۴ بار پڑھ کر دم کر لیا کرو۔ یہی تمہارے لیے بہترین خادم ہیں[1]"

اسی روایت کے سلسلہ میں راوی نے حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کی بے بضاعتی و بے مائیگی کا اظہار کیا ہے کہ جب وہ دونوں بستروں پر آرام کے لئے لیٹے تو اوڑھنے کا چادرہ اس قدر چھوٹا تھا کہ جب آپ دونوں اپنے پیروں کو ڈھانکنا چاہتے تو سر کھُل جاتا اور اگر سر ڈھانکنا چاہتے تو پیر کھل جاتے تھے[2]

حضرت علیؓ جناب سیدہ فاطمہؓ کی خاطرداری کا بہت خیال رکھتے تھے، اور کوئی بات منشأ کے خلاف پسند نہ کرتے تھے، لیکن پھر بھی رسول اللہ صلعم اُن کو تاکید فرماتے تھے کہ فاطمہ کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا اُدھر حضرت فاطمہ کو بھی بار بار نصیحت کرتے رہتے تھے کہ عورت کا بڑا فرض شوہر کی اطاعت و فرمانبرداری ہے آپ ہمیشہ دونوں کے تعلقات میں خوشگواری پیدا کرنے کی کوشش فرماتے رہتے تھے۔ لیکن زن و شوئی کے تعلقات معاشرت ایسے اہم اور سخت ہیں کہ کیسی ہی احتیاط کی جائے پھر بھی کبھی نہ کبھی ایسے اتفاقات پیش آجاتے ہیں جس سے رنج و ملال پیدا ہو جاتا ہے۔ جس سے لطف و محبت کی زندگانی میں بدمزگی پیدا ہو جاتی ہے۔

چنانچہ ایک دفعہ حضرت علیؓ نے حضرت فاطمہؓ کے ساتھ قدرے تشدد سے کام لیا آپ کو ناگوار گذرا آپ کبیدہ خاطر اپنے والد بزرگوار رسول صلعم کی خدمت میں گئیں (آپ کے پیچھے پیچھے حضرت علیؓ بھی گئے اور ایسی جگہ کھڑے ہو گئے کہ آنحضرت صلعم اور حضرت فاطمہ کی گفتگو سن سکیں) حضرت علی کی شدت مزاج و غصہ کی شکایت کی آپ نے فرمایا اے بیٹی جو کچھ میں کہوں اس کو غور و فکر سے سنو اور عمل کرو۔ وہ مرد و عورت ہی کیا جن کے درمیان کوئی امر واقع نہ ہو اور یہ کیا ضروری ہے کہ مرد تمام کام عورت کے منشأ کے مطابق ہی کرے اور شوہر اپنی بیوی کو کچھ نہ کہے[3] حضرت علی پر اس مصلحانہ جواب کا اس قدر اثر ہوا کہ پھر انہوں نے کوئی ایسی بات نہ کی جس سے حضرت فاطمہ رنجیدہ خاطر ہوتیں۔

---

[1] طبقات صد ۱۶ و اصابہ صد ۴۲۹ و صد ۴۳۔ [2] طبقات صد ۱۶۔ [3] طبقات صد ۱۶۔

حضرت علیؓ خود فرماتے ہیں کہ میں جو تشدد حضرت فاطمہؓ پر کرتا تھا اُس سے میں دستبردار ہو گیا اور میں نے اپنی بیوی سے کہا خدا کی قسم میں اب ایسا فعل نہ کروں گا جس سے تم رنجیدہ ہو اور تمہاری دل شکنی ہو۔[1]

حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کے درمیان جب کبھی خانگی معاملات میں کوئی رنجش ہو جاتی تو آں حضرت صلعم اُسی طرح صلح کرا دیتے اور آپ کو ان دونوں کی مصالحت سے غیر معمولی مسرت ہوتی تھی ایک مرتبہ ایسا ہی اتفاق پھر پیش آیا آپ حضرت علیؓ کے یہاں تشریف لے گئے اُس وقت آپ کے چہرۂ مبارک پر کچھ آثار رنج و ملال کے نمایاں تھے۔ آپ نے ان دونوں میں صلح کرا دی جب باہر تشریف لائے تو آپ کا چہرۂ مبارک بشاش تھا لوگوں نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ یہ کیا بات ہے جب آپ گھر میں تشریف لے گئے تو آپ کا چہرہ متغیر تھا اور اب بشاش ہے۔ فرمایا میں نے ایسے دو شخصوں میں مصالحت کرا دی جو مجھے محبوب تر ہیں۔[2]

آنحضرت صلعم دنیاوی زینت و آرائش کو بہت ناپسند فرماتے تھے اور اولاد کے لئے بھی یہی صورت تھی آپ خود بھی زینت و آرائش کی چیز اولاد کو نہ دیتے تھے اور نہ دوسروں کو دینا پسند فرماتے تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ حضرت علیؓ نے حضرت فاطمہؓ کو ایک سونے کا ہار دیا جب آنحضرت صلعم کو معلوم ہوا تو آپؐ نے فرمایا اے فاطمہؓ کیا تم لوگوں سے کہلوانا چاہتی ہو کہ رسول اللہ کی لڑکی آگ کا ہار پہنتی ہے۔ حضرت سیدہ فاطمہؓ نے اُس کو فروخت کر کے اُس کی قیمت سے ایک غلام خرید لیا۔

ایک مرتبہ آنحضرت صلعم کسی غزوہ سے واپس تشریف لائے تو حضرت فاطمہؓ نے بطور خیر مقدم گھر کے دروازوں پر پردے لگا دیئے اور امام حسن و امام حسین علیہما السلام کو چاندی کے کنگن پہنا دیئے جب آنحضرت صلعم حسب معمول حضرت فاطمہؓ کے گھر تشریف لائے تو اس ساز و سامان کو دیکھ کر واپس تشریف لے گئے۔ حضرت فاطمہؓ کو آپؐ کی واپسی کا حال معلوم ہوا تو سمجھ گئیں کہ مزاج کے خلاف گذرا فوراً پردوں کو چاک کر ڈالا۔ صاحبزادوں کے ہاتھوں سے کنگن اُتار لیے۔

صاحبزادے روتے ہوئے آنحضرت صلعم کے پاس گئے۔ آپ نے فرمایا اگرچہ میرے اہل بیت ہیں مگر میں نہیں چاہتا کہ دنیا کے زخرفات سے آلودہ ہوں اور صحابہ سے فرمایا کہ اس کے عوض ہاتھی دانت کے کنگن خرید کر لا دو۔[3]

ابن ہشام بن مغیرہ برادر ابی جہل نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے کہا تم عزوراً بنت ابی جہل سے نکاح کر لو۔ حضرت علیؓ کا یہ ارادہ آنحضرت صلعم کو معلوم ہوا تو آپ کو سخت ناگوار گذرا آپ مسجد میں تشریف لائے اور منبر پر یہ خطبہ پڑھا

ان بنتی هشام بن المغيرة	آل ہشام علی بن ابی طالب سے اپنی لڑکی کا نکاح
استاذنونی ان ینکحوا ابنتهم علی	کرنے کے لیے مجھ سے اجازت چاہتے ہیں لیکن میں اجازت
ابن ابی طالب فلا اذن ثم لا اذن	نہ دوں گا البتہ ابن ابی طالب میری لڑکی کو طلاق دے کر
الا ان یرید ابن ابی طالب ان	اُس کی لڑکی سے نکاح کر لیں فاطمہ میری جگر گوشہ ہے
یطلق ابنتی وینکح ابنتهم	جس نے اُس کو اذیت دی گویا اُس نے مجھے اذیت دی

---

[1] طبقات صفحہ ۱۶ و اصابہ صفحہ ۷۳۔ [2] ایضاً [3] ابوداؤد نسائی سے ماخوذ۔

فانماهی بضعة منی یریبنی ما رابها و یوذینی ما اذاها۔[1]	جس سے اُسے دکھ پہونچے گا اس سے مجھے بھی پہونچے گا ۔

اور فرمایا :

وانی لست احرم حلالاً ولا احل حراماً ولٰکن واللہ لا تجتمع بنت رسول اللہ وبنت عدو اللہ ابداً۔[2]	اور میں حلال کو حرام اور حرام کو حلال نہیں کرنا چاہتا ہوں لیکن خدا کی قسم ایک رسول کی بیٹی اور دشمن خدا کی بیٹی دونوں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں ۔

اس خطبہ کا یہ اثر ہوا کہ حضرت علیؓ نے حضرت فاطمہؓ کی زندگی تک کوئی دوسرا نکاح نہیں کیا۔[3]

کسی صاحب کو مبادا یہ خیال ہو کہ (معاذ اللہ) آنحضرت صلعم نے صرف اپنی بیٹی پر سوت نہ آنے کی وجہ سے حضرت علیؓ کو اجازت نہ دی، خطبہ میں یہ الفاظ نہیں اور نہ خطبہ سے دنیاوی مفاد کا ترشح ہے یہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے کہ آنحضرت صلعم نے کوئی دنیاوی فائدہ کبھی نہیں حاصل کیا باوجود رسول خدا ہونے کے اپنی عمر نہایت عسرت و تنگی سے بسر کی تاکہ غافلین دنیا متنبہ ہو جائیں کہ دنیا کاملین کے لیے باعث عزت و وقعت نہیں ۔

حضرت علیؓ کو اجازت نکاح نہ دینے کے چند وجوہ ہیں اولاً اس وجہ سے کہ اُس سے حضرت فاطمہ کو تکلیف پہنچتی اور اس تکلیف کا پہنچنا گویا آنحضرت صلعم کو تکلیف پہنچانا تھا اور آں حضرت صلعم کو تکلیف دینا گویا خدائے تعالیٰ کو ناراض کرنا ہے[4] اور ایسا فعل حضرت علی مرتضیٰؓ کے لیے زیبا نہ ہوتا۔ دوسرے اس وجہ سے کہ حضرت فاطمہ پر بسبب غیرت کے فتنہ و فساد کا احتمال تھا تیسرے آنحضرت صلعم کا اجازت نہ دینا کچھ اس وجہ سے نہ تھا کہ آپ دو عورتوں کا جمع ہونا پسند نہیں فرماتے تھے اس لئے ممانعت فرمائی ہرگز ایسا خیال نہ تھا بلکہ آپ نے قضائے الٰہی سے متنبہ فرمایا کہ تقدیر الٰہی یہی ہے کہ یہ دونوں جمع نہ ہوں گے۔[5]

یحییٰ ابن سعد قطانی کہتے ہیں کہ میں نے عبد اللہ بن داؤد سے :

"لا اذن الا ان یرید ابن ابی طالب ان یطلق ابنتی وینکح ابنتھم"

اس ارشاد نبی صلعم کے معنی پوچھے تو انہوں نے کہا کہ اللہ نے حرام کر دیا حضرت علی پر کہ وہ حضرت فاطمہ کی حیات میں کسی اور سے نکاح کریں کیونکہ کلام اللہ میں ہے وَمَا اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا[6]

ترجمہ: اور (مسلمانو!) پیغمبر جو چیز تم کو (ہاتھ اُٹھا کر) دے دیا کریں وہ تو لے لیا کرو اور جس چیز کے لئے تم کو منع کریں اس سے دست کش رہو۔"

---

[1] صحیح بخاری ص ۳۸۰ ج ۲ ۔ [2] استیعاب ص ۷۷۱ ۔

[3] الدرۃ البیضا، حالات فاطمہ ، [4] ایضاً ، [5] ایضاً ، [6] الحشر پارہ ۲۸ ،

جب آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ میں اجازت نہیں دیتا تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو حضرت فاطمہ کی موجودگی میں بلا اجازت آنحضرت صلعم کے دوسری عورت سے نکاح درست نہیں۔

عمرو بن داؤد کہتے ہیں جبکہ آنحضرت صلعم کا ارشاد ہے۔ "فاطمۃ بضعۃ منی یریبنی ما اراب بھا ویوذ ینی ما اذا ھا" تو بے شک حضرت علی پر حرام ہے کہ فاطمہؓ کی موجودگی میں کوئی دوسرا نکاح کریں، اور اس سے آنحضرت صلعم کو تکلیف دیں اور وما کان لکم ان تو ذوا رسول اللہ کے موافق بھی کسی مسلمان کو لائق نہیں ہے کہ رسول اللہ کو تکلیف و ایذا پہنچائے[1]

یحییٰ بن سعد قطانی اور عمرو بن داؤد نے اس مسئلہ کو بہت واضح اور مشرح طریقے سے صاف کر دیا اب کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ "وَمَا اٰتَاکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا"

اور

وما کان لکم ان تو ذوا رسول اللہ سے تمام شکوک محو ہوگئے اور اسی پر کاربند رہنا چاہیئے۔

شعار اسلام ہمارا ایمان ہے کہ ہم اس کو تسلیم کریں اور دل سے عمل کریں رسول اللہ کا ہر فعل ہمارے لیے طریقہ عمل ہے خدائے تعالیٰ متعدد جگہ اپنے رسولؐ کی اطاعت کے لیے فرماتا ہے۔

اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ۔ — اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔

(آل عمران پارہ ۳)

مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ — جس شخص نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

(النساء پارہ ۵)

"یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْہُ" — اے وہ لوگو کہ (ایمان لائے ہو) اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور اس سے روگردانی نہ کرو۔

(انفال پارہ ۹)

خدائے تعالیٰ اپنے رسولؐ کا مرتبہ بتلا کر بندوں کو متنبہ کرتا ہے۔

"اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِھِمْ وَاَزْوَاجُہٗٓ اُمَّھٰتُھُمْ۔ — پیغمبر مسلمانوں پر خود ان کی جانوں سے بھی حق زیادہ رکھتے ہیں (اور مسلمانوں کے باپ کی جگہ ہیں) اور پیغمبرؐ کی بیویاں (ادب و تعظیم میں) ان کی مائیں ہیں۔

(الاحزاب پارہ ۲۱)"

مطلب یہ ہے کہ ہر ایک شخص اپنی جان کا پاس کرتا ہے لیکن پیغمبروں کے حکم کا پاس اس سے زیادہ کرنا چاہیے۔ جو شخص خدا کے

---

[1] الدرۃ البیضا حالات حضرت فاطمہؓ ۱۲

رسولؐ کو قولاً وفعلاً جانی و مالی کوئی ایذا دے یا اُن کے فعل حکم کو استہزاء قرار دے یا نکتہ چینی کرے تو اس کے لئے خدائے تعالیٰ تہدید کرتا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ وَاَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا عَظِیْمًا۔	جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کو کسی طرح کی ایذا دیتے ہیں اُن پر دنیا اور آخرت میں خدا کی پھٹکار ہے اور خُدا نے اُن کے لیے (ذلت کا) عذاب تیار کیا ہے۔

(الاحزاب پارہ ۲۱)

آنحضرت صلعم نے حضرت علیؓ حضرت فاطمہؓ اور امام حسنؓ اور امام حسینؓ سے فرمایا کہ تم لوگوں کی جس شخص سے لڑائی ہے اور جس سے تمہاری صلح ہے اُس سے میری بھی[1]۔ یعنی جن لوگوں سے تم رضا مند نہ ہوگے اُن سے میں بھی رضامند نہ ہوں گا اور جس سے تم خوش رہو گے اُس سے میں بھی۔ یہ اقتضائے محبت کا انتہائی اثر ہے۔

حضرت علیؓ فرماتے ہیں جس وقت میری شادی حضرت فاطمہؓ سے ہوئی تو میرے اور فاطمہؓ کے لیے کوئی بستر تک نہ تھا صرف ایک بھیڑ کی کھال تھی رات کو اُس پر لیٹ رہتا تھا اور دن میں اُس سے مشکیزہ کا کام لیتا تھا اور نہ کوئی خادم تھا[2]۔

ایک دفعہ حضرت علیؓ نے حضور صلعم سے عرض کیا کہ آپ ہم دونوں (فاطمہ و علی) میں سے کس کو زیادہ محبوب رکھتے ہیں۔ آپ نے فرمایا تم سے زیادہ فاطمہ محبوب ہے اور فاطمہ سے زیادہ تم عزیز ہو[3]۔

آنحضرت صلعم کی سرگوشی و حادثۂ جانگداز

مشہور روایت کے مطابق حضرت فاطمہؓ کی عمر انتیس سال کی تھی کہ والد بزرگوار رسول صلعم کا سایۂ عاطفت سر سے اُٹھ گیا یہ صرف داغِ مفارقت نہ تھا بلکہ داغ یتیمی تھا۔

آنحضرت کی محبوب ترین اولاد آپ ہی تھیں اور دوسرے آنحضرت صلعم کی اولاد میں صرف آپ ہی کا وجودِ گرامی یہ صدمۂ جانکاہ اُٹھانے اور رونے کے لیے باقی تھا۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ وفات سے قبل آنحضرت صلعم کے پاس میں بیٹھی ہوئی تھی کہ فاطمہ آئیں تو آنحضرت صلعم نے "مرحبا یابنتی" کہہ کر اپنے دائیں یا بائیں جانب بٹھا لیا پھر آپ نے اُن کے کان میں کچھ فرمایا وہ رونے لگیں پھر دوبارہ کچھ کان میں فرمایا تو ہنسنے لگیں مجھے بڑا تعجب ہوا اور مجھ سے نہ رہا گیا میں نے فاطمہؓ سے پوچھا یہ کیا بات ہے اس سے قبل میں نے ایک ہی وقت میں رونے اور ہنسنے کا اتصال نہیں دیکھا جیسا کہ اس موقع پر دیکھا۔ فاطمہؓ نے جواب دیا میں ہرگز اپنے باپ کا راز فاش نہ کروں گی جب رسول صلعم کا وصال ہو گیا تو میں نے پھر فاطمہؓ سے کہا اُس روز رونے اور ہنسنے کا کیا سبب تھا فاطمہؓ نے کہا چونکہ آنحضرت صلعم اس عالم سے تشریف لے گئے۔ اس لئے اب میں اُس واقعہ کو بیان کرتی ہوں پہلی مرتبہ تو آنحضرت صلعم نے فرمایا تھا کہ جبریل علیہ السلام سال میں ایک مرتبہ قرآن پاک کا دور کرتے تھے اس کے خلاف معمول سال میں دوبارہ دور کیا اس سے قیاس ہوتا ہے کہ میری موت کا وقت قریب

---

[1] اصابہ صد ۲۸، [2] طبقات صد ۱۳، [3] اسد الغابہ صد ۵۲۲۔

آ گیا ہے اور تم میرے اہل بیت میں سب سے پہلے مجھ سے ملوگی۔ اس پر میں رونے لگی پھر آپؐ نے دوبارہ فرمایا کیا تم اس کو پسند نہیں کرتیں کہ تم دنیا کی تمام عورتوں کی سردار ہو۔ میں یہ سن کر ہنسنے لگی[1]"۔

وفات سے قبل جب آنحضرت صلعم پر غشی طاری ہوئی تو حضرت فاطمہؓ فرماتی تھیں ۔" واکرب ابا ہ " ہائے میرے باپ کی بے چینی۔ اس پر آنحضرت صلعم نے فرمایا تمہارا باپ آج کے بعد پھر بے چین نہ ہوگا :

یہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ آنحضرت صلعم کی وفات کے بعد تک بنات طیبات میں صرف حضرت فاطمہؓ کا وجود گرامی تھا لیکن حقیقتاً امر یہ ہے کہ آپ پر بہت بڑی مصیبت پڑی اور آپ کی زندگی بھی اسی دن ختم ہو گئی۔ جس دن یہ صدمہ جانکاہ دیکھنا نصیب ہوا۔

کتب سیر میں مذکور ہے کہ وفات کے بعد حضرت فاطمہ بہت رنجیدہ رہا کرتی تھیں چنانچہ بقیہ ایام حیات میں آپ کو کسی نے ہنستا ہوا نہیں دیکھا[2]

جب آنحضرت صلعم کی تجہیز و تکفین سے صحابہ فارغ ہو کر حضرت فاطمہؓ کی خدمت میں آئے اور آپ کی تسلی و تشفی کرنے لگے تو آپ نے حضرت انسؓ سے پوچھا کیا تم رسول اللہؐ کو دفن کر آئے انہوں نے عرض کیا جی ہاں۔ آپ نے فرمایا تمہارے دل نے کیسے گوارا کیا کہ تم نے کئی من خاک کے نیچے آں حضرت کو دبا دیا[3]

آنحضرت صلعم کی قبر پر آپ تشریف لے گئیں وہاں روئیں اور ایک مشت خاک قبر شریف سے لے کر آنکھوں سے لگائی اور یہ دو شعر پڑھے[4]

ماذا علیٰ من شمّ تُربَۃِ احمدؐ	کیا چاہیے اُس شخص کو جو خاک مزار مبارک آنحضرت صلعم
ان لا یَشمّ مدی الزّمان غوالیا	سونگھے (لازم ہے اُس پر یہ کہ پھر) وہ تمام عمر کوئی خوشبو نہ سونگھے
صُبّت علیّ مصائب لو انّھا	مجھ پر جو مصیبتیں پڑیں اگر وہ دنوں پر پڑتیں تو
صُبّت علی الایّام صرن لیالیا	وہ رات ہو جاتے ۔

یہ شعر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ہیں ۔ جو حضرت فاطمہؓ نے وقت حاضریٔ مزار مبارک پڑھے اور جو اشعار آنحضرت صلعم کے مرثیے کے متعلق آپ سے منسوب ہیں وہ یہ ہیں[5]

اغبرّ آفاق السّماءِ و کورت	غبار آلودہ کنارے آسمان کے لپیٹ دیا گیا آفتاب اور
شمس النھار و اظلم العصران	تاریک ہو گیا زمانہ ۔
والارض من بعد النّبی کئیبۃ	اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد زمین غمگین و رنجیدہ ہے بلکہ
اسفا علیہ کثیرۃ الاحزان	بوجہ کثرت آلام و افسوس کے شق ہوئی جاتی ہے ۔

---

[1] البقات ص۱۷ و اسد الغابہ ص۵۲۲ و اصابہ ص۲۷ و ص۲۸ ۔ [2] درالمنثور ص۳۵۹ و اسد الغابہ ص۵۲۴ ج ۔
[3] اسد الغابہ ص۵۲ ، [4] درالمنثور ص۳۶ ۔ [5] درالمنثور ص۳۶ ۔

فليبكه شرق البلاد وغربها	آنحضرت صلعم پر مشرق و مغرب کے شہر کے لوگوں کو اور
ولتبكه مضر وكل يمان	قبیلہ مضر اور تمام اہل یمن کو رونا چاہیئے۔
وليبكه الطود الاشم وجوه	بلکہ بڑے بڑے پہاڑ اور خلوئے زمین و آسمان اور بیت اللہ
والبيت ذوالاستار والاركان	شریف جس کے پردے لٹکے ہوئے اور ستون والا ہے اس کو
يا خاتم الرسل المبارك ضوءه	بھی رونا چاہیئے ۔ اے سب رسولوں کے خاتم کہ مبارک ہے شاخ
صلى عليك منزل القرآن [1]	اُن کی (سلسلہ نسب) رحمت بھیجے اُن پر اُتارنے والا قرآن کا (یعنی
	خدا نے ان پر رحمت بھیجی ہے)

آں حضرت صلعم کے انتقال کے بعد میراث کا مسئلہ پیش ہوا حضرت فاطمہ رضؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے فرمایا کہ جو کچھ میراث ہے اس کو تقسیم کر دو۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ کے اعزہ کو اپنے اعزّہ سے زیادہ محبوب رکھتا ہوں لیکن دقت یہ ہے کہ خود آں حضرتؐ نے ارشاد فرمایا ہے کہ انبیا جو مال متروکہ چھوڑتے ہیں وہ کل کا کل صدقہ ہوتا ہے اس میں وراثت نہیں ہوتی اس بنا پر میں کیوں کر تقسیم کر سکتا ہوں۔ اس پر حضرت فاطمہ کو بہت قلق ہوا [2]۔

صحیح بخاری میں مذکور ہے کہ حضرت فاطمہ کو اس گفتگو سے سخت صدمہ ہوا اور وہ حضرت ابوبکرؓ سے اس قدر ناراض ہوئیں کہ آخر وقت تک اُن سے اس معاملہ میں بات چیت نہ کی [3]۔

لیکن طبقات کی ایک روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب آپ بیمار ہوئیں اور حضرت ابوبکرؓ آپ کو دیکھنے کے لئے آئے تو آپؓ نے اندر آنے کی اجازت مانگی حضرت علیؓ نے اپنی بیوی سیدہ حضرت فاطمہ سے کہا کہ ابوبکرؓ اندر آنے کی اجازت طلب کرتے ہیں آپ نے فرمایا اس کو تو آپ ہی سمجھ سکتے ہیں چنانچہ وہ اندر آئے مزاج پرسی کی اور معذرت چاہی آپ اُن سے خوش ہو گئیں [4]۔ اور کوئی رنج دل میں نہ رہا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گو پہلے بہت ناراض ہوں لیکن بعد میں آپ خوش ہو گئیں اور گذشتہ باتوں کا کچھ نہیں خیال کیا۔

وفات حضرت فاطمہؓ سیدہ عالم کی اور تین بہنیں جس طرح عین جوانی کی حالت میں گزر گئیں اسی طرح حضرت فاطمہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے آٹھ ماہ بعد اور بعض کے نزدیک ۷۰ یوم کے بعد اس دنیائے فانی سے کوچ کیا [5]۔ اور بعض کے نزدیک دو مہینے اور بعض کے نزدیک چار مہینے لیکن صحیح یہی ہے کہ آنحضرت صلعم کی وفات کے چھ مہینے بعد بہ عمر اُنتیس ۲۹ سال ۳ رمضان المبارک سلسھ راہگرائے فردوس بریں ہوئیں [6]۔

آنحضرت صلعم کی یہ پیش گوئی کہ میرے اہل بیت میں سب سے پہلے ملو گی پوری ہوئی۔

---

[1] درالمنثور صد ۲۶ [2] طبقات صد ۱۸ ۔ [3] صحیح بخاری صد ۵۲۶ جلد ۲ ۔

[4] طبقات صد ۱۷ ۔ [5] استیعاب صد ۷۷۳ ۔ [6] طبقات صد ۱۸ و اسد الغابہ صد ۵۲۴ ۔

انتیس سال کی عمر اسی وقت تسلیم کی جا سکتی ہے جب کہ سنہ ولادت پانچ سال قبل اگر ۱۴ محمدی سنہ ولادت مانا جائے تو یہ عمر نہیں ہو سکتی ہاں اگر چوبیس[۲] سال عمر تسلیم کی جائے تو البتہ سنہ مذکور کے مطابق یہ سن شریف ہو سکتا ہے لیکن ارباب سیر نے انتیس سال بالاتفاق تسلیم کیا جس سے سنہ ولادت پانچ سال قبل نبوت ثابت ہوتا ہے۔

واقدی مورخ لکھتے ہیں کہ حضرت فاطمہؓ کا انتقال ۳ رمضان المبارک ۱۱ھ میں ہوا۔ حضرت عباسؓ نے جنازہ کی نماز پڑھائی اور حضرت علیؓ اور فضلؓ و حضرت عباسؓ نے قبر میں اتارا[۳]۔

آپ کے مرض الموت کے متعلق صفحات تاریخ بالکل ساکت ہیں مگر جہاں تک معلوم ہو سکا وہ یہی ہے کہ آپ کا انتقال کسی ایسے سخت مرض میں ہوا کہ جس کی وجہ سے کچھ عرصہ تک صاحب فراش رہیں۔

ام سلمہؓ کہتی ہیں کہ جس وقت حضرت فاطمہؓ کی وفات کا وقت قریب ہوا تو حضرت علیؓ گھر میں تشریف نہیں رکھتے تھے، حضرت فاطمہؓ نے مجھ سے کہا کہ پانی کا انتظام کر دو میں غسل کروں گی اور صاف و عمدہ کپڑے نکال دو وہ پہنوں گی۔ چنانچہ میں نے یہ انتظام کر دیا۔ آپ نے خوب اچھی طرح غسل کر کے کپڑے پہنے پھر فرمایا کہ میرا بستر کر دو میں لیٹوں گی میں نے بستر بھی کر دیا وہ بستر پر قبلہ رو لیٹ گئیں اور مجھ سے فرمایا اب مفارقت کا وقت قریب ہے میں غسل کر چکی ہوں اس لئے اب غسل کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور نہ اب میرا بدن کھولا جائے۔ چنانچہ اس کے بعد ہی انتقال ہو گیا جب حضرت علیؓ آ گئے تو میں نے یہ واقعہ بیان کیا انہوں نے اسی غسل پر اکتفا کیا اور ان کو دفن کر دیا[۴]۔ یہی روایت کتاب اصابہ میں ام رافع سے مروی ہے[۵]۔

جنازہ میں بہت کم لوگوں کو شرکت کا موقع ملا اس کی وجہ یہ تھی کہ رات کو انتقال ہوا اور حضرت علیؓ سے وصیت کر دی تھی کہ میں رات کو دفن کر دی جاؤں چنانچہ رات ہی کو دفن کر دی گئیں[۶]۔ چونکہ رات کا وقت تھا لوگوں کو وفات کی خبر نہ پہنچ سکی اس لئے اکثر لوگ شرکت دفن سے محروم رہے۔

سیدۃ النساء حضرت فاطمہؓ کے مزاج میں انتہا کی شرم و حیا تھی جب آپ کی وفات کا وقت قریب آیا تو آپ نے حضرت اسماءؓ بنت عمیس سے فرمایا کہ مجھے یہ پسند نہیں ہے کہ عورت کا جنازہ قبرستان تک کھلا ہوا جائے اس میں بے پردگی ہوتی ہے اور مرد و عورت کے جنازہ میں کوئی تفریق نہیں رکھی گئی، مرد یہ اکرتے ہیں کہ جنازہ کھلا ہوا لے جاتے ہیں یہ مجھے بالکل پسند نہیں ہے حضرت اسماء نے کہا "یا بنت رسول اللہؐ میں نے حبش میں ایک بہترین طریقہ دیکھا ہے اگر آپ حکم دیں تو وہی طریقہ پیش کروں۔ یہ کہہ کر کھجور کی چند شاخیں منگوائیں اور ان پر کپڑا تانا جس سے ایک پردہ کی صورت نکل آئی۔ آپ کو یہ طریقہ بہت پسند آیا اور

۱؎ اسد الغابہ ص۴۲۷ و استیعاب ص۷۷۲۔ ۳؎ طبقات ص۱۷ و ص۱۸۔ ۴؎ اصابہ ص۱۲۹،

۵؎ اسد الغابہ ص۵۲۴

بہت خوش ہوئیں لے چنانچہ آپ کا جنازہ اسی طرح پردہ میں قبر تک گیا اور اسلام میں یہی پہلی خاتون ہیں جن کا جنازہ اس طریقہ سے اُٹھایا گیا۔ آپ ہی کی ذات مقدس نے اس پردہ کو رائج کیا اور آج تک اسی پر عمل درآمد ہو رہا ہے۔ آپ کے بعد حضرت زینب رض بنت حجش کا بھی جنازہ اسی طرح اُٹھایا گیا [۲]

حضرت علی کرم اللہ وجہہ جب تجہیز و تکفین سے فارغ ہو کر گھر تشریف لائے تو مغموم و محزون اور بہت پریشان تھے۔ اسی شدت غم والم میں آپ نے یہ شعر پڑھے [۳]

اری علل الدنیا علیّ کثیرۃٌ	میں خیال کرتا ہوں کہ مجھ میں دنیا کی بیماریاں بکثرت
وصاحبھا حتی الممات علیلٌ	پیدا ہو گئی ہیں اور اہل دنیا جب تک دنیا میں ہے بیمار ہے
لکل اجتماع من خلیلین فرقۃ	ہر ایک جانی (ہر وصل) کے بعد دوستوں سے مفارقت
وکل الذی دون الفراق قلیلٌ	ہو جاتی ہے اور وہ زمانہ جو فراق کے سوا ہوتا ہے وہ تھوڑا
وان افتقادی فاطما بعد احمد	ہوتا ہے۔ رسول صلعم کے بعد فاطمہ کی مفارقت اس بات
دلیلٌ علی ان لا یدوم خلیلٌ	پر دلالت کرتی ہے کہ دوست ہمیشہ نہیں رہتا ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ حضرت فاطمہ رض کی قبر شریف پر روزانہ تشریف لے جاتے اور حضرت فاطمہ کو یاد کر کے یہ شعر پڑھتے [۴]:

مالی مررت علی القبور مسلما	خدایا کیا ہے میرے واسطے کہ میں قبروں پہ گذرتا ہوں دراں
قبر الحبیب فلم یرد جوابی	حالیکہ حبیب کی قبر کی جانب سلام کرنے والا ہوتا ہوں لیکن حبیب
یا قبر مالک لا تجیب منادیا	کی قبر میرے سلام کا جواب نہیں دیتی اے قبر تجھکو کیا ہو گیا ہے
امللت بعدی خلۃ الاحباب	کہ پکارنے والے کو کوئی جواب نہیں دیتی (معلوم ہوتا ہے)
	کہ تو نے میرے بعد آئندہ کے لیے دوستوں کی محبت (رتی) کو
	مکدر کر دیا (منقطع کر دیا)

اس شعر کے جواب میں حضرت علی رض کو (حضرت فاطمہ رض کی طرف سے) ہاتف غیبی نے یہ جواب دیا [۵]

قال الحبیب وکیف لی بجوابکم	حبیب نے کہا میں کیونکر جواب دوں (کون ضامن ہے میرا
وانا رھین جنادل وتراب	کہ جواب دے) اور میرا حال یہ ہے کہ میں بڑی بڑی چٹانوں
اکل التراب محاسنی فنسیتکم	اور مٹی کے کیف ڈھیر میں دبی ہوئی ہوں مٹی نے میرے تمام
وحجبت عن اھلی وعن اترابی	محاسن کو کھا لیا اور میں تم کو بھول گئی اور میں اپنے اہل اور ہمجھر

لے اسد الغابہ ص۲۲۷ ۔ [۲] استیعاب ص۲۷۲ ، [۳] در المنثور ص۳۶۰ ، [۴] در المنثور ص۱۶۰ ۔ [۵] ایضاً ص۳۶۰ و ص۳۶۱ ۔

فعلیکم منی السلام تقطعت — لوگوں سے پوشیدہ ہوگئی ہوں تم کو میری طرف سے سلام پہونچے
منی و منکم خلة الاحباب — (اور افسوس) مجھ سے اور تم سے دوستی کی رسی منقطع ہوگئی۔

مدفن | واقدی کہتے ہیں میں نے عبدالرحمٰن بن ابی لیلی سے کہا کہ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت فاطمہؓ کی قبر مقام بقیع میں ہے۔آپ کا اس بارہ میں کیا خیال ہے۔؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ مقام بقیع میں وہ دفن نہیں کی گئیں بلکہ "دار عقیل" میں دفن کی گئیں اُن کی قبر اور راستہ کے درمیان تقریباً سات ہاتھ کا فاصلہ ہے[1]

شرف فضیلت | اس امر میں محدثین کا اختلاف ہے کہ اس اُمّت میں شرف افضلیت کس کو حاصل ہے۔کسی نے حضرت عائشہ صدیقہؓ کو افضل قرار دیا ہے، کسی نے حضرت فاطمہؓ کو۔ لیکن عام مسلمانوں کا اعتقاد یہی ہے کہ حضرت فاطمہؓ افضل ہیں۔

پھر اس امر میں بھی اختلاف ہے کہ حضرت خدیجہؓ افضل ہیں یا حضرت عائشہ صدیقہؓ لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ حیثیتیں مختلف ہیں۔ اولیت اسلام، اور ابتدائی کوششوں اور تصدیق رسالت اور آنحضرت صلعم کی اعانت و امداد کے لحاظ سے حضرت خدیجہؓ افضل ہیں اور علم و عظمت، ذکاوت، ذہانت، عقل مندی کو دیکھتے ہوئے حضرت عائشہؓ کا مرتبہ زیادہ ہے۔

بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ حضرت فاطمہؓ کی فضیلت اس وجہ سے ہے کہ وہ رسول اللہ صلعم کی صاحبزادی ہیں۔ لیکن یہ خیال صرف حسن اعتقاد پر ہے۔ اُن کی ذاتی خوبیوں کا مجموعہ جو ہر خود اُن کی افضلیت پر دال ہے۔ اسلام نسبی حسبی، شرافت کا لحاظ نہیں رکھتا، زہد و تقویٰ خود ایک ایسا وصف ہے جو اپنے معیار کے اعتبار سے ہر خوبی کے لیے کفیل ہو سکتا ہے۔

آنحضرت صلعم نے خود ایک مرتبہ حضرت فاطمہؓ سے فرمایا کہ تم یہ خیال نہ کرنا کہ میں تمہارا باپ ہوں، آخرت میں تمہاری بڑ کروں گا میں بلا اذن کسی کی شفاعت نہ کر دوں گا تم خود عمل صالح کرو اور اللہ پر بھروسہ رکھو۔ اُسی سے امداد چاہو اور یہ سمجھ لو کہ آخرت میں کوئی چیز سوائے عمل صالح کے فائدہ مند نہیں۔"

---

[1] اصابہ لفظ ۲۳۔

وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا ۙ فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا ۙ فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا ۙ
فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا ۙ فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا ۙ (العٰدیٰت ۱ تا ۵)

قسم ہے مجاہدین کے اُن گھوڑوں کی جو ہانپتے ہوئے دوڑتے ہیں پھر ٹاپ مار کر آگ جھاڑتے ہیں پھر صبح کے وقت تاخت و تاراج کرتے ہیں پھر اس وقت غبار اُڑاتے ہیں اور جماعت میں جا گھستے ہیں۔



عہدِ نبوی ﷺ کے سپہ سالار

عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے سپہ سالار

راجہ محمد شریف

حضورؐ نے جنہیں امیرانِ عساکر بنایا (ترتیب وار)

۱۔ حضرت حمزہ بن عبدالمطلب رضؓ
۲۔ حضرت عبیدہ بن الحارث رضؓ
۳۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضؓ
۴۔ حضرت عبداللہ بن جحش رضؓ
۵۔ حضرت محمد بن مسلمہ رضؓ
۶۔ حضرت زید بن حارثہ رضؓ
۷۔ حضرت ابو سلمہ مخزومی رضؓ
۸۔ حضرت عبداللہ بن انیس رضؓ
۹۔ حضرت عکاشہ بن محصن رضؓ
۱۰۔ حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رضؓ
۱۱۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضؓ
۱۲۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ
۱۳۔ حضرت ابو بکر صدیق رضؓ
۱۴۔ حضرت عبداللہ بن رواحہ رضؓ
۱۵۔ حضرت کرز بن جابر الفہری رضؓ
۱۶۔ حضرت غالب بن عبداللہ لیثی رضؓ
۱۷۔ حضرت عمر فاروق رضؓ
۱۸۔ حضرت اسامہ بن زید رضؓ
۱۹۔ حضرت بشیر بن سعد انصاری رضؓ
۲۰۔ حضرت شجاع بن وہب الاسدی رضؓ
۲۱۔ حضرت جعفر بن ابی طالب رضؓ
۲۲۔ حضرت عمرو بن العاص رضؓ
۲۳۔ حضرت خالد بن ولید رضؓ
۲۴۔ حضرت سعد بن زید اشہلی رضؓ
۲۵۔ حضرت قطبہ بن عامر رضؓ
۲۶۔ حضرت ضحاک بن سفیان کلابی رضؓ
۲۷۔ حضرت علقمہ بن مجزز مدلجی رضؓ

ان میں سے چند امیرانِ عساکر کا ذکر (ترتیب وار)

۱۔ حضرت حمزہ بن عبدالمطلب رضؓ
۲۔ حضرت زید بن حارثہ رضؓ
۳۔ حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رضؓ
۴۔ سیدنا حضرت علی المرتضیٰ رضؓ
۵۔ سیدنا حضرت ابو بکر صدیق رضؓ
۶۔ سیدنا حضرت عمر بن الخطاب رضؓ
۷۔ حضرت عمرو بن العاص رضؓ
۸۔ حضرت خالد بن ولید رضؓ
۹۔ حضرت اسامہ بن زید رضؓ

حضرت حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ

راجہ محمد شریف

پیدائش ابن سعد کے بیان کے مطابق آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عمر میں چار سال بڑے تھے، اس لحاظ سے آپ اندازاً ۵۶۷ء میں پیدا ہوئے (واللہ اعلم)

قبولِ اسلام نبوت کے چھٹے سال

شہادت غزوہ اُحد ـ بروز سینچر، شوال ۳ھ
مطابق ۲۳ مارچ ۶۲۵ء بعمر تقریباً ۵۸ سال، ساٹھ سال

نام و نسب حمزہ نام، ابویعلیٰ اور ابوعمارہ کنیت، اسداللہ اور اسدرسولہ لقب، پورا سلسلہ نسب یہ ہے۔ حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبدمناف بن قصیّ۔

آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی چچا تھے، آپ کی والدہ ہالہ بنت اُہیب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ سیدہ آمنہ بنت وہب کی چچازاد بہن تھیں، اس نسبی تعلق کے علاوہ حضرت حمزہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رضاعی بھائی بھی تھے۔ یعنی ابولہب کی لونڈی حضرت ثویبہؓ نے دونوں کو دودھ پلایا تھا۔ عمر میں حضرت حمزہؓ حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم سے تقریباً چار برس بڑے تھے۔[1] شمشیر زنی، تیراندازی اور پہلوانی کا شوق بچپن ہی سے تھا، نیز سیر و شکار سے بھی غیر معمولی دلچسپی تھی، غرض زندگی کا بڑا حصہ انہی مشغلوں میں بسر ہوا۔

دعوتِ توحید کی صدا اگرچہ ایک عرصہ سے مکہ کی گھاٹیوں میں گونج رہی تھی، تاہم حضرت حمزہؓ جیسے سپاہی منش اور سیر و شکار کے دلدادہ کو صحرا نوردی سے فرصت ہی کب تھی کہ شرک و توحید کی حقانیت پر غور کرتے لیکن اللہ تعالیٰ نے ایک عجیب طریقہ سے اُن کی رہنمائی فرمائی اور اُن کے دل میں وہ شمع روشن کر دی جس نے ان کی زندگی کی تاریکیوں کو یک قلم ختم کر دیا۔ اس انقلاب کی تفصیل یہ ہے کہ ایک روز حضرت حمزہؓ حسبِ معمول شکار سے واپس آتے ہوئے جب کوہِ صفا کے پاس پہنچے تو ایک لونڈی نے کہا:

"ابوعمارہ، کاش تھوڑی دیر پہلے اپنے بھتیجے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا حال دیکھتے، وہ خانہ کعبہ میں اپنے مذہب کا وعظ کر رہے تھے کہ ابوجہل نے سخت گالیاں دیں اور بہت بُری طرح ستایا، لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ جواب نہ دیا اور بے بسی کے ساتھ لوٹ گئے۔"[2]

---

[1] طبقات ابنِ سعد رح جلد سوم [2] سیر الصحابہ رضؓ حصہ مہاجرین۔

یہ سنتے ہی حضرت حمزہ رضؓ تڑپ اُٹھے، تیزی کے ساتھ خانہ کعبہ کی طرف بڑھے اور وہاں پہنچ کر سیدھے ابُوجہل کے پاس گئے اور اس کے سر پر زور سے کمان کھینچ ماری جس سے وہ زخمی ہو گیا۔ یہ منظر دیکھ کر بنی مخزوم کے کچھ آدمی ابُوجہل کی مدد کو دوڑے اور حضرت حمزہ رضؓ سے کہا۔ شاید تم بھی بددین ہو گئے۔

آپ نے فرمایا:

"جب اس کی حقانیت مجھ پر ظاہر ہو گئی تو کون چیز اس سے باز رکھ سکتی ہے؟ ہاں! میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) خدا کے رسولؐ ہیں اور جو کچھ وہ کہتے ہیں، سب حق ہے، خدا کی قسم! اب میں اس سے پھر نہیں سکتا۔ اگر سچے ہو تو مجھے روک کر دیکھ لو۔"

ابوجہل نے کہا ابُوعمارہ کو چھوڑ دو، خدا کی قسم میں نے ابھی اس کے بھتیجے (صلی اللہ علیہ وسلم) کو سخت گالیاں دی ہیں۔

یہ واقعہ اسلام کے اس زمانے کا ہے، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خانۂ ارقم میں پناہ گزین تھے اور مومنین کا حلقہ صرف چند کمزور ناتواں ہستیوں پر محدود تھا۔ لیکن حضرت حمزہ رضؓ کے اضافے سے دفعتہً حالت بدل گئی اور کفار کی مطلق العنان دست درازیوں اور ایذا رسانیوں کا سدباب ہو گیا، کیونکہ ان کی شجاعت و جانبازی کا تمام مکہ لوہا مانتا تھا۔

حضرت حمزہ رضؓ کے قبول اسلام کے بعد ایک روز حضرت عمر رضؓ نے آستانۂ نبویؐ پر دستک دی، چونکہ شمشیر بکف تھے۔ اس لیے صحابۂ کرام کو تشویش ہوئی مگر اس شیرِ خدا نے کہا "کچھ مضائقہ نہیں آنے دو، اگر وہ مخلصانہ آئے ہیں تو خیر بصورت دیگر انہی کی تلوار سے اُن کا سر قلم کر دوں گا۔" غرض دروازہ کھولا گیا، وہ اندر داخل ہوئے۔ معلوم ہوا کہ ان کا سر اسلام کی دہلیز پر جھک چکا ہے اور زبان سے کلمہ جاری ہے۔ چنانچہ حاضرین یہ دیکھ کر جوشِ مسرت سے اللہ اکبر کے نعرے بلند کرنے لگے۔

مواخات

مکہ کی مواخات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب غلام حضرت زید رضؓ بن حارثہ حضرت حمزہ رضؓ کے بھائی قرار پائے تھے۔ آپ اس رشتۂ اخوت کا یہاں تک احترام کرتے اور حضرت زید رضؓ کو اس قدر عزیز جانتے کہ جب غزوات پر تشریف لے جاتے تو ان ہی کو ہر قسم کی وصیت کر جاتے تھے۔

ہجرت

بعثت کے تیرہویں سال جب ہجرتِ مدینہ کا حکم ہوا تو حضرت حمزہ رضؓ بھی صحابہ کرام رضؓ کے ساتھ ہجرت کر کے مدینہ پہنچے اور حضرت سعد بن خیثمہ رضؓ کے پاس اُترے[1]

مدینہ کی فضاؤں میں چونکہ مسلمانوں کو ہر قسم کی آزادی حاصل تھی۔ اس لیے حضرت حمزہ رضؓ کو خداداد شجاعت کے جوہر دکھانے اور زور بازو آزمانے کا نہایت اچھا موقعہ ہاتھ آیا، چنانچہ رمضان المبارک ۱ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلا علَم ان کو عنایت فرمایا اور تیس ۳۰ صحابہ کرام رضؓ کے ساتھ قریش کی اس جماعت کے مقابلہ پر بھیجا جو ابُوجہل کی ماتحتی میں تین سو کفار پر مشتمل شام سے آرہی تھی۔ حضرت حمزہ رضؓ سیف البحر کے قریب پہنچے تو کفار سے آمنا سامنا ہو گیا۔ طرفین نے جنگ کے لیے صف بندی کی لیکن ایک شخص مجدی بن عمرالجہنی نے فریقین کو سمجھا بجھا کر لڑائی سے روک دیا اور حضرت حمزہ رضؓ بغیر کشت و خون مدینہ واپس آگئے۔

---

[1] بروایت محمد بن صالح اور عاصم بن عمر بن قتادہ (ابن سعد)

غزوات: غزوہ ودانؔ صفر ۲ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی دفعہ تقریباً ساٹھ صحابہ کرامؓ کے ساتھ قریش مکہ کی نقل و حرکت میں سدِراہ ہونے کے لیے الواء پر فوج کشی فرمائی، حضرت حمزہؓ علم بردار تھے اور فوج کی کمان ان کے ہاتھ میں تھی، لیکن چونکہ قریش کی جماعت آگے بڑھ چکی تھی اس لیے لڑائی کی نوبت نہ آئی۔

غزوہ ذوالعشیرہ اسی طرح جمادی الآخر ۲ھ میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ڈیڑھ صد مجاہدین کے ساتھ پھر قریش کی ایک جماعت کی مزاحمت کے لیے نکلے تو علمبر داری کا طرۂ افتخار حضرت امیر حمزہ رضؓ کی دستار فضل و کمال پر آویزاں تھا لیکن اس دفعہ بھی کوئی جنگ نہ ہوئی اور اس مہم میں صرف بنو مدلج سے امداد باہمی کا ایک عہد نامہ طے پایا۔

غزوہ بدر اسی سال وسط رمضان المبارک میں بدر کا عظیم الشان معرکہ پیش آیا صف آرائی کے بعد کفار کی طرف سے عتبہ، شیبہ اور ولید میدان میں نکلے اور ان کے مقابلہ پر مسلمانوں کی طرف سے چند انصاری نوجوان آگے بڑھے۔ لیکن عتبہ نے پکار کر کہا "محمد صلی اللہ وسلم، ہم ناجنسوں سے نہیں لڑ سکتے۔ ہمارے مقابل والوں کو بھیجو" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حمزہ رضؓ حضرت علی رضؓ اور حضرت عبیدہ رضؓ کا نام لیا۔ حکم کی دیر تھی کہ یہ تینوں نیزے ہلاتے ہوئے نبرد آزمائی کے لیے اپنے حریفوں کے مقابل جا کھڑے ہوئے۔ حضرت حمزہ رضؓ کے مقابلہ پر عتبہ تھا۔ جسے آپ نے ایک ہی وار میں داصل جہنم کیا حضرت علی رضؓ بھی اپنے حریف پر غالب آئے، البتہ حضرت عبیدہ رضؓ اور شیبہ میں دیر تک مقابلہ جاری رہا، حضرت عبیدہ رضؓ زخمی ہو گئے تو حضرت علی رضؓ اور حضرت حمزہ رضؓ نے حملہ کر کے شیبہ کو تہہ تیغ کر دیا۔ مشرکین نے طیش میں آ کر عام ہلہ بول دیا۔ دوسری طرف سے مجاہدین اسلام بھی شیروں کی طرح کفار پر ٹوٹ پڑے۔ گھمسان کا رن پڑا، حضرت حمزہ رضؓ کے سر پر شتر مرغ کی کلغی تھی۔ اس لیے جس طرف گھس جاتے صاف نظر آتے تھے۔ آپ کے دونوں ہاتھوں میں تلوار تھی اور مردانہ وار دو دستی حملوں سے پرے کا پرا صاف کر رہے تھے غرض تھوڑی دیر میں جب کفار بہت سے قیدی اور مال غنیمت چھوڑ کر راہ فرار اختیار کر گئے، تو بعض قیدیوں نے پوچھا "یہ کلغی لگائے کون ہے؟" لوگوں نے کہا حمزہ رضؓ بولے "آج سب سے زیادہ نقصان ہم کو اسی نے پہنچایا"۔

غزوہ بنو قینقاع اِدھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ بدر میں مصروف پیکار تھے۔ اُدھر مدینہ کے یہودیوں نے حضورؐ کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مدینہ کے مسلمانوں کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بدر سے واپس آئے تو یہودیوں کے قبیلہ بنو قینقاع کی دست درازیوں کا حال معلوم ہوا، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وسط شوال ۲ھ میں بنو قینقاع کا محاصرہ فرما لیا۔ محاصرہ پندرہ دن تک جاری رہا۔ یہودیوں نے بالآخر محاصرہ کی شدت سے مرعوب ہو کر ہتھیار ڈال دیے اور اپنی عہد شکنی کے باعث جلاوطن کر دیے گئے۔ اس فوج کشی میں بھی علمبر داری کا منصب حضرت حمزہ رضؓ کو عطا ہوا تھا۔

غزوہ احد بدر کی شکست فاش نے قریش مکہ کی آتش انتقام کو اور بھڑکا دیا تھا۔ چنانچہ شوال ۳ھ میں وہ غیض و غضب کا بادل بن کر مدینہ کی طرف بڑھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں سات سو جاں نثاروں کے ساتھ کوہِ اُحد کے دامن میں روکا، ۷ شوال ۳ھ بروز سنیچر لڑائی شروع ہوئی۔ کفار کی طرف سے

سباع نے بڑھ کر مبارز طلبی کی۔ حضرت حمزہ رضؓ اپنی شمشیرِ خارا شگاف تولتے ہوئے میدان میں آئے اور ایک ہی وار میں سباع کا کام تمام کر دیا۔ اس کے بعد گھمسان کی جنگ شروع ہوگئی۔ حضرت حمزہؓ نے رد بلا صفت کفار کے ٹڈی دل میں گھس کر کشتوں کے پشتے لگا دیے۔ آپ جس طرف بھی نکل گئے، صفوں کی صفیں اُلٹ دیں، غرض اس مردانگی اور جوش سے لڑے کہ تنہا بہت سے کفار کو واصلِ جہنم کر دیا۔

شہادت

حضرت حمزہ رضؓ نے چونکہ جنگ بدر میں قریش کے نامی گرامی سرداروں کو تہ تیغ کیا تھا۔ اس لیے تمام مشرکین قریش سب سے زیادہ انہی کے خون کے پیاسے تھے۔ چنانچہ جبیر بن مطعم کا ایک غلام، جس کا نام وحشی تھا، صلۂ آزادی کے لالچ میں ایک چٹان کے پیچھے گھات لگا کر بیٹھ گیا اور حضرت حمزہ رضؓ کا انتظار کرنے لگا۔ اتفاقاً حضرت حمزہ رضؓ اس کے قریب سے گزرے تو اس نے اچانک اس زور سے اپنا حربہ پھینک کر مارا کہ آپ دو ٹکڑے ہو کر گر پڑے، چونکہ سب کفار اسی شیرِ خدا کے حملوں سے سہمے ہوئے تھے۔ اس لیے ان کی شہادت سے کفار میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور ان کی عورتوں نے خوشی و مسرت کے ترانے گائے۔ ابو سفیان کی بیوی ہند بنت عتبہ نے حضرت حمزہ رضؓ کے کان ناک کاٹ کر ہار بنایا۔ نیز شکم چاک کر کے جگر نکالا اور چبا چبا کر تھوک دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا، تو پوچھا: "کیا اس نے کچھ کھایا بھی ہے؟" لوگوں نے عرض کی "نہیں" فرمایا، "خدا حمزہ کے کسی عضو کو جہنم میں داخل ہونے نہ دیتا۔"

تجہیز و تکفین

جنگ ختم ہونے کے بعد شہدائے اسلام کی تجہیز و تکفین شروع ہوئی۔ آنحضرت صلعم اپنے محترم چچا کی لاش پر تشریف لائے، چونکہ ہند نے کان ناک کاٹ کر نہایت دردناک صورت بنا دی تھی۔ اس لیے یہ المناک منظر دیکھ کر حضورؐ کا دل بے اختیار بھر آیا اور مخاطب ہو کر فرمایا:

"تم پر اللہ کی رحمت ہو، تم ایسے تھے کہ معلوم نہیں ایسا صلۂ رحم کرنے والا، خیرات دینے والا کوئی اور ہو، اگر صفیہ اپنے دل میں رنج نہ کرتیں، تو میں انہیں چھوڑ دیتا کہ چوپائے خوراک کھا لیتے اور وہ پرندوں اور درندوں کے پیٹوں سے اُٹھائے جاتے، بیشک مجھ پر لازم ہے کہ تمہارے بدلے ان میں سے ستر آدمیوں کا ضرور مثلہ کروں[۱]۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ابھی کھڑے تھے کہ جبرائیل علیہ السلام سورۂ نحل کی یہ آیتیں لے کر اترے۔

لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصَّابِرِينَ ۝ وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ ۝ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوا وَّالَّذِينَ هُم مُّحْسِنُونَ ۝ (آیت ۱۲۶ تا ۱۲۸)	تو وہ بہتر ہے صبر کرنے والوں کے لیے اور آپ صبر کیجیے اور نہیں صبر آپ کا مگر توفیقِ الٰہی اور آپ غم نہ کیجیے اُن پر اور نہ ہو جیے تنگی میں اس سے جو وہ حق کے خلاف تدبیریں کرتے ہیں، بیشک اللہ ساتھ ہے ان لوگوں کے جو پرہیزگار ہیں اور ان کے جو نیکوکار ہیں

چونکہ وحیِ الٰہی نے ناجائز انتقام کی ممانعت کر دی تھی۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قسم کا کفارہ دے کر اس

---

[۱] طبقات ابن سعد حصہ سوم

واقعۂ دلگداز پر صبر فرمایا۔

حضرت صفیہ رضؓ حضرت حمزہ رضؓ کی حقیقی بہن تھیں، بھائی کی شہادت کا حال سُنا تو روتے روتے جنازہ کے پاس تشریف لائیں مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھنے نہ دیا اور تسلی و تشفی دے کر واپس فرمایا۔ حضرت صفیہ رضؓ اپنے صاحبزادے حضرت زبیر رضؓ کو حضرت حمزہ رضؓ کے کفن کے لیے دو چادریں دے گئی تھیں مگر پہلو میں ایک انصاری کی لاش بے کفن پڑی تھی۔ اس لیے دونوں شہیدانِ اسلام میں ایک ایک چادر تقسیم کر دی، لیکن جسم ڈھانپنے کے لیے ایک چادر ناکافی تھی۔ اگر سر ڈھانپا جاتا تو پاؤں کھل جاتے اور پاؤں چھپائے جاتے تو سر برہنہ رہ جاتا، چنانچہ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سر کو چادر سے چھپا دو اور پاؤں پر گھاس اور پتے ڈال دو۔ غرض اسی عبرت انگیز طریقے سے سید الشہداء کا جنازہ تیار ہوا۔ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے خود نمازِ جنازہ پڑھائی اور پھر ایک ایک کر کے تمام شہدائے اُحد کے جنازے اُن کے پہلو میں رکھے گئے اور حضورؐ نے علٰحدہ علٰحدہ ہر ایک کی نماز پڑھائی۔ اس طرح تقریباً ستر نمازوں کے بعد حضرت حمزہ رضؓ کی میت کو بصد اندوہ و الم اسی میدان میں سپردِ خاک کیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا حزن و ملال

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سانحہ کا بے حد قلق تھا آپؐ مدینہ منورہ تشریف لائے اور بنی عبدالاشہل کی خواتین کو اپنے عزیز و اقارب پر روتے ہوئے سُنا تو فرمایا "افسوس، حمزہ رضؓ کے لیے رونے والیاں بھی نہیں"۔ جب انصارِ مدینہ نے سُنا تو اپنی عورتوں کو آستانۂ نبوتؐ پر بھیج دیا جنہوں نے نہایت رقت آمیز طریقے سے حضرت حمزہ رضؓ پر گریہ و زاری شروع کی، اسی اثنا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھ لگ گئی۔ کچھ وقفہ کے بعد جب بیدار ہوئے تو دیکھا کہ وہ اب تک نالہ و شیون کر رہی تھیں، فرمایا: کیا خوب یہ اب تک یہاں بیٹھی رو رہی ہیں ان کو حکم دو کہ واپس جائیں اور آج کے بعد پھر کسی مرنے والے پر نہ روئیں"۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس وقت سے مدینہ کی عورتوں کا یہی دستور ہو گیا تھا کہ جب وہ کسی پر روتی تھیں تو پہلے حضرت حمزہ رضؓ پر دو آنسو بہا لیتی تھیں۔

گزشتہ سطور میں عرض کیا جا چکا ہے کہ حضرت حمزہ رضؓ کو وحشی بن حرب نے شہید کیا تھا۔ چنانچہ جب وہ اسلام قبول کر کے بارگاہِ نبوت میں حاضر ہوئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دیکھ کر پوچھا: کیا تم ہی وحشی رضؓ ہو؟ عرض کی ہاں" فرمایا" تم نے حمزہ رضؓ کو قتل کیا تھا؟" وہ بولے" حضورؐ کو جو کچھ معلوم ہے صحیح ہے" فرمایا" تم اپنا چہرہ مجھ سے چھپا سکتے ہو؟" حضرت وحشی رضؓ اسی وقت اُٹھ کر باہر آگئے اور پھر جب تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حیات رہے، اُن کے سامنے نہ جا سکے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کے دور میں مسیلمہ کذاب کو اسی حربہ سے قتل کیا جس سے انہوں نے حضرت حمزہ رضؓ کو شہید کیا تھا۔ حضرت وحشی رضؓ اکثر کہا کرتے تھے کہ میں نے جاہلیت میں خیر الناس کو قتل کیا اور اسلام میں شر الناس کو۔[1]

---

[1] مسیلمہ کذاب کو قتل کرنے والے دو شخص تھے۔ ایک حضرت وحشی رضؓ دوسرے حضرت حبیب رضؓ بن زید۔ خود حضرت وحشی رضؓ کا بیان ہے کہ میں مسیلمہ کذاب کو قتل کرنے کے لیے آگے بڑھا تو ایک انصاری بھی بڑھے، میں نے مسیلمہ پر حربہ پھینکا اور وہ اس کو لگ گیا انصاری نے بھی نہایت تیزی سے تلوار کا وار کیا۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ہم دونوں میں سے کس کے وار سے مسیلمہ کا خاتمہ ہوا۔ (رسولِ رحمت صفحہ ۳۰۹ بحوالہ ابن ہشام)۔

اخلاق

حضرت حمزہ رضہ کے اخلاق میں سپاہیانہ خصائل نہایت نمایاں ہیں، شجاعت، بہادری اور جانبازی ان کے مخصوص اوصاف ہیں، اُن کے محاسن کی تعریف میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ ارشادات ہی کافی ہیں۔ جو حضورؐ نے ان کی لاش سے مخاطب ہو کر فرمائے تھے "کہ تم پر اللہ کی رحمت ہو تم ایسے تھے کہ معلوم نہیں ایسا صلہ رحم کرنے والا، خیرات دینے والا کوئی اور ہو۔"

ازواج واولاد

حضرت حمزہ رضہ نے متعدد شادیاں کیں اور ہر ایک کے بطن سے اولاد ہوئی۔ ایک بیوی کا نام بنت الملہ بن مالک بن عبادہ تھا جو قبیلہ اوس سے تھیں۔ اُن کے بطن سے یعلیٰ اور عامر دو لڑکے تھے۔ یعلیٰ کی وجہ حضرت حمزہ رضہ کی کنیت ابو یعلیٰ تھی۔ عامر لاولد مر گئے۔ یعلیٰ سے چند اولادیں ہوئیں جو بچپن میں ہی انتقال کر گئیں، دوسری بیوی کا نام خولہ بنت قیس تھا۔ جن کے بطن سے عمارہ پیدا ہوئے جن کی وجہ سے حضرت حمزہ رضہ کی کنیت ابو عمارہ تھی۔ تیسری بیوی کا نام سلمیٰ بنت عمیس تھا جن کے بطن سے امامہ بنت حمزہ رضہ پیدا ہوئیں، یہ وہی امامہ ہیں جن کی پرورش کے بارے میں حضرت علی رضہ، حضرت جعفر رضہ اور حضرت زید بن حارثہ رضہ نے جھگڑا کیا تھا۔ ان میں ہر شخص چاہتا تھا کہ وہ اس کے پاس رہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا فیصلہ حضرت جعفر رضہ کے حق میں کیا کیونکہ ان کی خالہ حضرت اسماء بنت عمیس حضرت جعفر رضہ کے نکاح میں تھیں۔[1]

---

[1] طبقات ابن سعد جلد سوم

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

راجہ محمد شریف

نام و نسب آپ کا نام زید رضؓ کُنیت ابو اسامہ رضؓ اور لقب حُبِّ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) تھا۔ والد کا نام حارثہ تھا جو یمن کے ایک نہایت معزز قبیلہ بنو قضاعہ سے تھے۔ والدہ کا نام سعدیٰ بنت ثعلبہ بن عبد عامر تھا جو قبیلہ طے کی ایک شاخ بنی معن سے تھیں۔ پُورا سلسلہ نسب یہ ہے حضرت زید رضؓ بن حارثہ بن شراحیل بن کعب بن عبد العزیٰ۔

ابتدائی حالات حضرت زید رضؓ ابھی بچے تھے کہ اپنی والدہ سعدیٰ کے ساتھ ننہال گئے، انہی دنوں بنی القین کے سوار جو غارت گری سے واپس آرہے تھے حضرت زید رضؓ کو خیمہ کے سامنے سے اُٹھا لائے اور غلام بنا کر عکاظ کے بازار میں حضرت حکیم رضؓ بن حزام کے ہاتھ چار سو درہم میں فروخت کر دیا۔ حضرت حکیم بن حزام رضؓ نے انہیں اپنی پھوپھی ام المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضؓ بنت خویلد کی خدمت میں پیش کیا۔ جن کی وساطت سے حضرت زیدؓ کو سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی کا شرف نصیب ہُوا جس پر ہزاروں آزادیاں اور دُنیا بھر کی شاہنشاہیاں قربان ہیں۔

حضرت زید رضؓ کے والد حارثہ بن شراحیل کو اپنے نونہال کی گمشدگی کا شدید غم ہُوا۔ آنکھوں نے سیلِ اشک بہائے اور غمزدہ دل نے جُدائی کے رنج و الم کو اس طرح اشعار کے قالب میں ڈھالا۔

(ترجمہ) "میں زید پر رویا اور مجھے نہیں معلوم کہ وہ کیا ہُوا۔ آیا زندہ ہے جس کی امید کی جائے یا اُسے موت آگئی۔ مگر واللہ مجھے معلوم نہیں اگرچہ تلاش میں ہوں کہ آیا تجھے سطحِ زمین کھا گئی یا پہاڑ کھا گیا۔ اس کے متعلق میں قیس اور عمر کو نصیحت کرتا ہوں اور یزید کو بھی وصیت کرتا ہوں اور اُن کے بعد جبل کو۔"

آخری شعر میں جس جبل کا ذکر آیا ہے اُس سے مُراد جبلہ بن حارثہ ہیں جو حضرت زید رضؓ کے بھائی تھے اور یزید سے مراد یزید بن کعب بن شراحیل ہے، جو حضرت زید رضؓ کے اخیافی بھائی تھے۔

ایک سال بنی کلب کے چند آدمی حج کے لیے مکہ آئے، اُنہوں نے اس یوسفِ گم گشتہ کو دیکھ کر پہچان لیا اور حارثہ کے غم کی داستان ان کو سُنائی، حضرت زید رضؓ کا دل بھی اپنے باپ کی حالتِ زار سُن کر بھر آیا اور اپنے دلی جذبات کا اظہار ان الفاظ میں کیا۔

(ترجمہ) "میں اپنی قوم کا مشتاق ہوں، گو ان سے دُور ہوں، میں بیت اللہ میں مشعر حرام کے پاس مقیم ہوں اس لیے اس غم سے باز آجاؤ جس نے تم کو حزیں کر دیا اور اونٹوں کی طرح چل کر دنیا کی خاک نہ چھانو، کیونکہ الحمد للہ میں بنی معد کے شریف خاندان میں ہُوں، ایسا شریف خاندان جو پشت ہا پشت سے معزز ہے۔"

بنی کلب کے زائرین جب واپس وطن پہنچے تو انہوں نے حارثہ کو حضرت زیدؓ کے متعلق اطلاع دی، حارثہ اپنے بیٹے کے متعلق

سُن کر نہایت خوش ہوئے اور انہیں ایسا محسوس ہوا کہ جدائی کی گھڑیاں اب ختم ہونے والی ہیں، مگر پھر اس خیال سے کہ زائرین نبی کلب نے کہیں پہچاننے میں غلطی نہ کی ہو کہنے لگے "ربّ کعبہ کی قسم کیا (واقعی وہ) میرا ہی نورِ نظر تھا۔" ان لوگوں نے جب تفصیل کے ساتھ حلیہ، جائے قیام اور مربّی کے حالات بیان کیے تو حارثہ اپنے لختِ جگر کو دیکھنے کے لیے بیتاب ہوگئے۔ چنانچہ اُسی وقت اپنے بھائی کعب بن شراحیل کو ہمراہ لے کر مکّہ کی طرف چل پڑے۔ یہاں پہنچ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور بصد منّت و سماجت عرض کی،

"اے ابنِ عبداللہ! اے ابنِ عبدالمطلب! اے اپنی قوم کے رئیس زادہ! تم اہلِ حرم اور اس کے مجاور ہو، مصیبت زدوں کی دستگیری کرتے اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے ہو، ہم تمہارے پاس اس غرض سے آئے ہیں کہ ہمارے لڑکے کو آزاد کر کے ہمیں رہینِ منت بناؤ۔ زرِ فدیہ جس قدر چاہو، ہم بیش قرار معاوضہ دینے کو تیار ہیں۔"

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا "وہ کون ہے؟" حارثہ نے عرض کی "زید رضہ بن حارثہ۔" آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے حضرت زید رضہ کا نام سُنا تو قدرے توقف کے بعد فرمایا: کیا اس کے سوا تمہاری کوئی حاجت نہیں" عرض کیا "نہیں" ارشاد ہوا۔

"بہتر، زید کو بلا کر اختیار دو، اگر وہ تمہیں پسند کرے تو وہ تمہارا ہے اور اگر مجھے ترجیح دے تو خدا کی قسم، میں ایسا نہیں ہوں جو اپنے ترجیح دینے والے پر کسی کو ترجیح دوں۔"

حارثہ اور کعب اس شرط پر نہایت شکرگزاری کے ساتھ راضی ہوگئے۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے حضرت زید رضہ کو بلایا اور پوچھا "تم اِن دونوں کو پہچانتے ہو؟" انہوں نے عرض کی "ہاں، یہ میرے والد اور چچا ہیں" حضورؐ نے قرعۂ انتخاب حضرت زید رضہ کے ہاتھ میں دے کر فرمایا:

"میں کون ہوں؟ اس سے تم واقف ہو، میری ہمنشینی کا حال بھی تم کو معلوم ہے، اب تمہیں اختیار ہے خواہ مجھے پسند کرو یا ان دونوں کو۔"

حضرت زید رضہ کو شہنشاہِ کونینؐ کی غلامی میں جو زندگی کا لطف آیا تھا اس پر ہزاروں آزادیاں نثار تھیں، عرض کی "میں ایسا نہیں ہوں جو حضورؐ پر کسی کو ترجیح دوں، آپ ہی میرے باپ ماں ہیں" حضرت زید رضہ کے اس جواب پر حارثہ اور کعب حیران رہ گئے، بولے، "زید! افسوس تم آزادی، باپ چچا اور خاندان پر غلامی کو ترجیح دیتے ہو۔" انہوں نے کہا "ہاں مجھے اس ذاتِ پاک میں ایسے ہی محاسن نظر آئے کہ میں اس پر کسی کو کبھی ترجیح نہیں دے سکتا۔"

حضرت زید رضہ کی اس غیر متزلزل وفا شعاری نے آقائے شفیق کے قلبِ رؤف و رحیم میں دبی ہوئی محبت کی چنگاری کو مشتعل کر دیا، محسنِ انسانیتؐ انہیں حجرِ اسود کے پاس لے گئے اور فرمایا:

"اے حاضرین گواہ رہو کہ زید رضہ میرے بیٹے ہیں، میں ان کا وارث ہوں، وہ میرے وارث ہیں۔"

اس اعلان سے حضرت زید رضہ کے والد اور چچا کے افسردہ دل گُلِ شگفتہ کی طرح کھل اٹھے اور اپنے لختِ جگر کو اپنے سے ہزاروں درجہ زیادہ شفیق و معزز باپ کی آغوشِ عاطفت میں دیکھ کر مطمئن ہوگئے اور نہایت خوشی و مسرت کے ساتھ وطن لوٹ گئے۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے اس اعلان کے بعد حضرت زید رضہ، زید بن محمدؐ کے نام سے زبان زدِ خاص و عام ہوئے

یہاں تک کہ جب اسلام کا زمانہ آیا اور قرآنِ حکیم نے صرف اپنے نسبی آباء کے ساتھ انتساب کی ہدایت فرمائی، تو وہ پھر اپنے باپ حارثہ کی نسبت سے زید بن حارثہ مشہور ہوئے۔

اسلام اللہ تعالیٰ نے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خلعتِ نبوت و رسالت سے نوازا تو حضرت زیدؓ نے ابتدا ہی میں شرفِ بیعت حاصل کیا۔ مؤرخین کا متفقہ فیصلہ ہے کہ حضرت زیدؓ غلاموں میں سب سے پہلے مومن ہیں۔ ۶ھ بعثت میں جب حضرت امیر حمزہ رضؓ حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے، تو سرورِ کائنات صلعم نے ان سے بھائی چارہ کرا دیا۔ ان دونوں میں اس قدر محبت ہو گئی تھی کہ حضرت حمزہ رضؓ جب غزوات پر تشریف لے جاتے تھے، تو حضرت زیدؓ کو اپنا وصی بنا کر جاتے تھے۔

شادی حضرت امّ ایمن رضؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دائی کھلائی تھیں، حضورؐ ان کو نہایت محبوب رکھتے تھے اور اماں کہہ کر خطاب کرتے تھے۔ ایک روز آپؐ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص کسی جنتی عورت سے نکاح کرنا چاہتا ہے، تو اسے امّ ایمن سے نکاح کرنا چاہیے حضرت امّ ایمن رضؓ اس وقت اگرچہ عمر میں حضرت زیدؓ سے دو چند، بیوہ اور حبشی الاصل تھیں تاہم حضرت زیدؓ نے حضورؐ کی خوشنودی کی خاطر کے لیے اُن سے نکاح کر لیا۔ چنانچہ حضرت اُسامہ رضؓ بن زیدؓ جو اپنے والد کے بعد حبِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لقب سے مشہور ہوئے، انہی کے بطن سے مکّہ میں پیدا ہوئے۔

ہجرت جب ہجرت کا حکم ہوا، تو حضرت زیدؓ بھی مکّہ سے ہجرت کر کے مدینہ پہنچے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح یہ بھی حضرت کلثوم رضؓ بن الہدم کے مہمان ہوئے۔ مواخات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ عبدالاشہل کے معزز رئیس حضرت اُسید بن حضیر رضؓ اور ان کے درمیان رشتہ اخوت قائم فرما دیا۔ حضرت زیدؓ اب تک خاندانِ نبوتؐ کے ایک فرد کی طرح پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہتے تھے مگر یہاں پہنچ کر حضورؐ نے ان کی رہائش کے لیے علیٰحدہ مکان مخصوص فرما دیا اور اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینبؓ بنت جحش سے نکاح کر دیا۔ اس طرح درحقیقت یہ دوسرا طرّہ افتخار تھا، جو حضرت زیدؓ کے دستارِ فضیلت پر نصب ہوا، لیکن یہ پیوند دیرپا ثابت نہ ہوا، خاندانی اور نسبی عدم توازن نے دونوں کے سطحِ مزاج میں نشیب و فراز پیدا کر دیا۔ حضرت زیدؓ نے دربارِ رسالتؐ میں حضرت زینبؓ کے رویے کی شکایت کی، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں وَ اَمْسِکْ عَلَیْکَ زَوْجَکَ کی نصیحت فرمائی اور وَاتَّقِ اللہ کہہ کر انہیں زیادہ برداشت کے لیے آمادہ کیا، لیکن حضرت زیدؓ روزمرّہ کی بڑھتی ہوئی ناگواریوں کے پیشِ نظر بالآخر طلاق دینے پر مجبور ہو گئے۔ انقضائے عدت کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زینب رضؓ کی دلجوئی کے لیے خود نکاح کرنا چاہا، مگر چونکہ زمانۂ جاہلیت کی رسُوم کا اثر باقی تھا، جن کے تحت متبنیٰ کو حقیقی بیٹے کا درجہ حاصل تھا، اس لیے منافقین کے اعتراض کا خیال وجہِ تامّل ہوا۔ قرآن حکیم میں بہت پہلے یہ ارشاد ہو چکا تھا:

مَاکَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِکُمْ۔ (سورہ الاحزاب، آیت ۴۰)

محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) تم مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں۔

اور مسلمانوں کو حکم ہوا:-

اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللہِ

مومنو! لے پالکوں کو ان کے (اصل) باپوں کے نام سے پکارا کرو

(سورۃ الاحزاب آیت ۵) خدا کے نزدیک یہی بات درست ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دل سے یہ خطرہ نکال دیا، تو آپؐ نے حضرت زیدؓ کی معرفت نکاح کا پیام بھیجا۔ حضرت زینبؓ نے پیام سن کر کہا "جب تک خدا کا حکم نہ ہو میں کچھ نہیں کہہ سکتی" یہ کہہ کر آپ مسجد میں تشریف لے گئیں اس کے بعد ہی اس آیت نے آپ کو امہات المؤمنین میں داخل کر دیا۔

فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا (سورۃ الاحزاب آیت ۳۷) پھر جب زید اس (عورت) سے بے تعلق کر چکا (یعنی طلاق دے دی اور عدت بھی پوری ہو گئی)، تو ہم نے تمہارے ساتھ اس (عورت) کا نکاح کر دیا۔

بہر کیف اس آیت کے نزول کے بعد حضرت زیدؓ اپنے والد حارثہ کی نسبت سے زید بن حارثہ مشہور ہوئے۔

غزوات حضرت زیدؓ کو تیراندازی میں حد درجہ کمال حاصل تھا۔ آپ کا شمار ان مشاہیر صحابہؓ میں تھا جو اس فن میں یکتائے روزگار تھے۔ غزوۂ بدر سے سریہ موتہ تک جس قدر اہم ترین معرکے پیش آئے سب میں حضرت زیدؓ نہایت پامردی و شجاعت سے شریک کارزار ہوئے۔ اس عرصہ میں آپ صرف غزوہ مریسیع میں شامل نہ تھے کیونکہ اس دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو مدینہ میں اپنی جانشینی کا فخر بخشا تھا۔

متفرق کارنامے حضرت زیدؓ نے مشہور معرکوں میں شمولیت کے علاوہ اکثر چھوٹی چھوٹی مہموں میں سپہ سالاری کے فرائض بھی انجام دیے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ جس فوج کشی میں حضرت زیدؓ شریک ہوتے تھے اس میں امارت کا منصب ان ہی کو عطا ہوتا تھا۔ اس طرح حضرت زیدؓ متعدد بار سپہ سالار بنائے گئے۔ ان مہمات میں پہلی مہم سریہ قردہ تھی، جمادی الآخر ۳ھ میں آپ سو صحابہؓ کے ساتھ قریش کے ایک قافلۂ تجارت پر حملہ کرنے کے لیے قردہ روانہ کیے گئے، اس مہم میں آپ نے دشمن کو نہایت کامیابی کے ساتھ شکست دی اور بیش قیمت مال تجارت پر قبضہ کرنے کے ساتھ قافلہ کے رہنما فرات بن حیان عجلی کو بھی گرفتار کر لائے۔

ربیع الآخر ۶ھ آپ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی سلیم کی سرکوبی کے لیے روانہ فرمایا۔ بنی سلیم مدینہ سے چار کوس کے فاصلے پر بطن نخلہ کے پاس مقام جموم میں مسکن گزین تھے۔ اس مہم میں حضرت زیدؓ کو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی اور آپ مالِ غنیمت کے طور پر بہت سے اونٹ بکریاں اور قیدی پکڑ کر لائے۔

اسی سال جمادی الاول کے مہینہ میں آپ کو قریش کے ایک کاروانِ تجارت کو جو شام سے واپس آ رہا تھا، روکنے کا حکم ہوا۔ آپ نے ستر سواروں کے ساتھ مقام عیص میں اس قافلہ پر کامیاب چھاپہ مارا اور تمام اہل قافلہ کو معہ سامان کے گرفتار کر لیا۔ مال غنیمت میں چاندی کا ایک بڑا ذخیرہ آپ کے ہاتھ لگا جو صفوان بن امیہ کے لیے شام سے آرہا تھا۔ قیدیوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد ابو العاص بھی تھے جنہوں نے اپنی اہلیہ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دختر نیک اختر زینبؓ کی پناہ حاصل کر کے قید سے رہائی حاصل کی

اسی سال جمادی الآخر میں آپ پندرہ مجاہدین کے ساتھ بنی ثعلبہ کی سرکوبی کے لیے مقام طرف کی جانب روانہ کیے گئے۔ غنیم آپ کی خبر ملتے ہی بھاگ گیا۔ چنانچہ آپ مالِ غنیمت میں کچھ اونٹ اور بکریاں لے کر مدینہ واپس آئے۔

رجب سنہ ۶ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو بارہ مجاہدین کا قائد بنا کر بنی فزارہ کی سرکوبی کے لیے وادی القریٰ کی جانب روانہ فرمایا، کفار نے مسلمانوں پر اچانک حملہ کر کے نو کو شہید اور ایک کو زخمی کر دیا تاہم آپ بسلامت مدینہ پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔

رمضان المبارک سنہ ۶ھ میں حضرت زیدؓ ایک اسلامی کاروانِ تجارت کے ساتھ شام کی طرف روانہ ہوئے۔ سامانِ تجارت میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کا بہت سا مال بھی آپ کے ساتھ تھا۔ لوٹتے وقت وادی القریٰ میں قبیلہ فزارہ کی رہزن و غارت پیشہ جماعت بنی بدر نے تمام قافلہ لوٹ لیا اور مسلمانوں کو سخت اذیتیں پہنچائیں۔ حضرت زیدؓ بمشکل اپنی جان بچا کر مدینہ واپس آئے اور دربارِ نبوت میں اس واقع کی اطلاع دی، چونکہ اس قسم کے متعدد واقعات پیش آ چکے تھے۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہی کو ایک جمعیت کے ساتھ قبیلہ کی سرکوبی پر مامور فرمایا۔ حضرت زیدؓ بڑی احتیاط سے دن کو چھپتے اور رات کو یلغار کرتے ہوئے اچانک ان رہزنوں پر جا ٹوٹے اور انہیں قرار واقعی سزا دے کر مدینہ واپس آئے، آپ نے آستانۂ نبوت پر پہنچ کر دستک دی، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس حالت میں تھے۔ اسی حالت میں باہر تشریف لائے اور آپ کی کامیابی کا سن کر نہایت خوش ہوئے اور جوشِ مسرت سے گلے لگا کر آپ کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

جمادی الآخر سنہ ۶ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو پانچ سو مجاہدین کے ساتھ مقامِ حسمیٰ کی طرف روانہ فرمایا۔ اس فوج کشی کی وجہ یہ تھی کہ آنحضرت صلعم کے قاصد حضرت دحیہ الکلبیؓ جب قسطنطنیہ کی سفارت سے واپس آ رہے تھے تو حسمیٰ کے مقام پر ہنید بن عارض اور اس کے ساتھیوں نے راستہ روک کر انہیں لوٹ لیا تھا۔ آنحضرت صلعم کو جب اس کی اطلاع ہوئی، تو آپ نے حضرت زیدؓ کو اس زیادتی کا انتقام لینے پر مامور فرمایا۔ حضرت زیدؓ نہایت خاموشی کے ساتھ دن کو پہاڑوں میں چھپتے اور رات کو قطع منازل کرتے ہوئے اچانک غنیم پر جا پڑے اور ہنید کو معہ اُس کے بیٹوں اور گروہ کے اکثر افراد کو تہ تیغ کر دیا۔ مالِ غنیمت میں ایک ہزار اونٹ پانچ ہزار بھیڑ بکریاں اور بہت سے قیدی گرفتار کر کے مدینہ لائے۔

سریہ موتہ اور شہادت

موتہ شام کے علاقہ میں ارضِ بلقاء کی ابتداء میں واقع ہے، اس جنگ کی وجہ یہ ہوئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سفیر حضرت حارث بن عمیرؓ ازدی کو جو شاہِ بصریٰ کے دربار سے سفارت کی خدمت انجام دے کر واپس آ رہے تھے۔ اسی مقام پر شرجیل بن عمرو الغسانی نے شہید کر دیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک چونکہ قاصد کا قتل ایک ناقابلِ معافی جرم تھا اس لیے شرجیل کی یہ قبیح حرکت حضور صلعم کو بہت شاق گزری، یہ مقام اگرچہ مدینہ سے کافی دور تھا اور فوج کشی آسان نہ تھی تاہم حضورؐ نے اس کے انتقام کے لیے تین ہزار کی جمعیت فراہم کر کے حضرت زیدؓ بن حارثہ کو علمِ قیادت عطا کیا اور فرمایا "اگر زیدؓ بن حارثہ شہید ہو جائیں، تو حضرت جعفرؓ بن ابی طالب امیرِ لشکر ہوں گے اور اگر وہ بھی جامِ شہادت نوش کریں تو حضرت عبداللہؓ بن رواحہ فوج کی قیادت کریں گے۔ حضرت جعفرؓ بن ابی طالب چونکہ اپنے مخصوص تعلقات کی بنا پر سمجھتے تھے کہ قیادت کا شرف انہی کو حاصل ہوگا، اس لیے انہوں نے کھڑے ہو کر یہ عرض کی "یا رسول اللہ، میرا کبھی یہ خیال نہ تھا کہ آپ زیدؓ کو مجھ پر امیر بنائیں گے۔"
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "اس کو جانے دو، تم نہیں جان سکتے کہ بہتر کیا ہے!"

جمادی الاولیٰ سنہ ۸ھ میں یہ مہم روانہ ہوئی، چونکہ دشمن کو اس لشکر کشی کی اطلاع پہلے سے مل چکی تھی، اس لیے ایک لاکھ کا ٹڈی دل اُمڈ آیا تھا۔ جب مسلمان مقامِ معان میں پہنچے تو انہیں اس لشکرِ جرار کا علم ہوا، لیکن حضرت زید رضؓ نے اس کثرت کی قطعی کوئی پروا نہ کی اور پیادہ پا دشمن پر بجلی بن کر گرے۔ دوسرے فوجی سرداروں نے بھی آپؓ کی تقلید کی اور دیر تک گھمسان کی جنگ رہی، حضرت زید رضؓ جوشِ جہاد اور شوقِ شہادت میں لڑتے لڑتے اتنے آگے نکل گئے کہ دشمنانِ اسلام کے نرغے میں پھنس گئے۔ اسی حالت میں نیزے کے ایک وار نے سرورِ دو عالمؐ کے وفا شعار غلام کی تمنائے شہادت پوری کر دی، ان کے بعد یکے بعد دیگرے حضرت جعفر رضؓ بن ابی طالب اور حضرت عبداللہ بن رواحہ رضؓ نے علم سنبھالا اور شدید کشت و خون کے بعد واصلِ بحق ہوئے۔ ان تینوں صحابہ رضؓ کی شہادت کے بعد حضرت خالد رضؓ بن ولید نے قیادت سنبھالی اور غازیانِ دین کو جمع کر کے ایک ایسا زور دار حملہ کیا کہ دشمن کے پاؤں اکھڑ گئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میدانِ جنگ سے کسی قاصد کے پہنچنے سے پہلے ہی صحابہ رضؓ کرام کو اُمرائے لشکر کی خبرِ شہادت سنا دی۔ حضرت زید رضؓ کی خبرِ شہادت سنانے کے بعد آپؐ نے فرمایا: "جعفر رضؓ نے علم لیا اور شہید ہوئے۔" پھر فرمایا "ابن رواحہ رضؓ نے علم لیا اور شہید ہوئے۔" یہ فرماتے وقت حضورؐ کی دونوں چشمِ مبارک سے آبدیدہ ہو گئے۔ حضرت زید رضؓ کی ایک صاحبزادی نے جب باپ کی شہادت کے متعلق سنا، تو زار و قطار رونے لگیں، اس کی آہ و زاری سن کر حضورؐ ضبط نہ فرما سکے اور اس قدر روئے کہ گلو گرفتہ ہو گئے۔ حضرت سعد رضؓ بن عبادہ نے عرض کیا، "یا رسول اللہ یہ کیا ہے؟" فرمایا "یہ جذبۂ محبت ہے۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے محبوب غلام کی مفارقت کا شدید غم تھا۔ چنانچہ آپؐ نے حجۃ الوداع سے واپسی کے تقریباً دو ماہ بعد اس کا انتقام لینے کے لیے حضرت زید رضؓ کے صاحبزادے حضرت اُسامہ رضؓ کو مامور فرمایا۔ وہ چونکہ ابھی نہایت کم سن تھے، اس لیے اکابر صحابہ رضؓ کی موجودگی میں ان کی سیادت پر منافقین کو شرارت کا موقع ملا، انہوں نے مسلمانوں میں یہ بات پھیلانی شروع کی کہ بڑے بوڑھوں کے ہوتے ہوئے ایک نوجوان کو یہ منصب کیوں عطا ہوا؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان دنوں صاحبِ فراش تھے تاہم آپؐ کو جب لوگوں کے اس اعتراض کا علم ہوا، تو آپؐ نے حیاتِ اقدس کے آخری خطبہ میں، جو آپ نے رحلت سے ایک دو دن قبل نمازِ ظہر کے بعد ارشاد فرمایا تھا، اس مسئلہ کی نسبت فرمایا:

> "اگر اسامہ رضؓ کی سرداری پر تم کو اعتراض ہے، تو اس کے باپ (زید رضؓ) کی سرداری پر بھی تم معترض تھے۔ خدا کی قسم وہ اس منصب کا مستحق تھا اور وہ مجھے سب سے زیادہ محبوب تھا اور اب اس کے بعد یہ سب سے زیادہ محبوب ہے۔"

اور جب اس ارشاد کے ایک دو دن بعد جبکہ یہ مہم ابھی روانہ نہیں ہوئی تھی، آفتابِ رسالت و نبوت غروب ہو گیا، تو حضرت ابوبکر رضؓ صدیق نے صحابہ رضؓ کی مخالفت اور ہجومِ مصائب کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری فرستادہ فوج کو کوچ کا حکم دیا اور حضرت اسامہ رضؓ بن زید اپنے شفیق باپ کے قاتلوں سے انتقام لینے کے بعد غیر معمولی کامیابی کے ساتھ مدینہ واپس آئے۔

اخلاق

حضرت زید رضؓ کے صحیفۂ اخلاق میں وفا شعاری کا باب سب سے نمایاں ہے، آپ کی زندگی کا مقصد آقائے نامدارؐ کی رضامندی و خوشنودی کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ آپ نے حضرت اُمِّ ایمن رضؓ جیسی معمر اور بیوہ عورت سے محض اس لیے

نکاح کیا کرم انہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بہت محبوب رکھتے تھے۔

اگرچہ حضرت زیدؓ کے اخلاقی کارناموں کی تفصیل نہیں ملتی، تاہم اُن کے اوصافِ حسنہ اور محاسنِ جمیلہ کے لیے یہی ثبوت کافی ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو اور ان کی اولاد کو سب سے زیادہ محبوب رکھتے تھے۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ اگر حضرت زیدؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد زندہ رہتے تو حضورؐ ان کو اپنا جانشین بناتے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ایک دفعہ حضرت زیدؓ کے پوتے محمد بن اُسامہ کو مدینہ کی مسجد میں دیکھا تو تعظیم سے گردن جھکا لی اور فرمایا: "اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دیکھتے تو اس کو بھی محبوب رکھتے۔"

اسلام سے محبت

حضرت زیدؓ کو اسلام سے اس قدر محبت تھی کہ عین اس وقت جبکہ آپ یقینی موت کے مُنہ میں تھے، آپ نے ارکانِ دین کی ادائیگی کے لیے بے انتہا خواہش کا اظہار فرمایا جس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک ظالم کے پنجے سے چھٹکارا دلایا۔ الاستیعاب کے بیان کے مطابق ایک دفعہ حضرت زیدؓ نے مکہ سے طائف تک کے لیے خچر کرایہ کیا، خچر والا ڈکیتی پیشہ تھا، وہ آپ کو ایک سنسان جنگل میں لے گیا جہاں لاشیں ہی لاشیں پڑی تھیں، وہ جب آپ کو قتل کرنے لگا، تو آپ نے اس سے دو رکعت نماز پڑھنے کی اجازت مانگی، اس نے اجازت دے دی، مگر ساتھ ہی کہا کہ جن لاشوں کو تو دیکھ رہا ہے یہ بھی نمازیں پڑھنے والے تھے لیکن میرے ہاتھ سے تو کوئی بھی نہ بچا۔ حضرت زیدؓ نے نماز پڑھی اور تین بار یا ارحم الرّاحمین کہا۔ حضرت جبرائیلؑ آئے اور انہوں نے ڈکیت کو قتل کر دیا[1]

حُلیہ اور عُمر

آپ کا قد کوتاہ، ناک پست اور رنگ گہرا گندمی تھا۔ آپ نے پچپن برس کی عمر میں سریہ موتہ میں جام شہادت نوش کیا۔

ازواج و اولاد

آپ نے متعدد شادیاں کیں جن سے دو لڑکے اور ایک لڑکی پیدا ہوئی، ان میں سے حضرت اُسامہؓ بن زیدؓ آپ کی وفات کے وقت موجود تھے باقی دو کم سنی میں ہی انتقال کر گئے تھے۔

---

[1] رحمۃ للعالمین جلد دوم

حضرت ابوعبیدہ بن الجرّاح رضی اللہ تعالیٰ عنہ

راجہ محمد شریف

نام و نسب آپ کا نام عامر، کنیت ابوعبیدہ اور لقب امین الامّت تھا، والد کا نام عبداللہ تھا، مگر آپ دادا کی طرف منسوب ہو کر ابن الجراح کے نام سے مشہور ہوئے۔ آپ کا سلسلۂ نسب ساتویں پُشت میں فہر پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مل جاتا ہے۔ آپ کی والدہ اُمیمہ بنت غنم بن جابر بھی فہری خاندان سے تعلق رکھتی تھیں اور اصحاب سیر کے مطابق مسلمان ہوئیں، پورا سلسلہ نسب یہ ہے: عامر بن عبداللہ بن الجراح بن ہلال بن اہیب بن ضبہ بن حارث بن فہر القرشی الفہری۔

قبولِ اسلام جب آفتابِ رسالتؐ طلوع ہوا اس وقت آپ تقریباً ستائیس سال کے تھے۔ ابن سعدؒ کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارقم رضؓ کے مکان میں پناہ گزین ہونے سے پیشتر آپ کو معہ حضرت عثمان بن مظعون رضؓ اور حضرت عبدالرحمن بن عوف کے مشرّف باسلام فرمایا، آپ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کی تبلیغ و دعوت پر حلقہ بگوش اسلام ہوئے تھے۔

ہجرت قبولِ اسلام کے بعد قریش مکہ کے ظلم و ستم سے تنگ آکر دو مرتبہ ہجرت کر کے حبشہ تشریف لے گئے۔ آخری دفعہ سب صحابہ رضؓ کے ساتھ ہجرت فرمائے مدینہ ہوئے اور حضرت کلثوم رضؓ بن الہدم کے پاس اُترے، مواخات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کا حضرت سعد بن معاذ رضؓ سے بھائی چارہ کرا دیا۔

غزوات مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ پہنچنے کے بعد بھی مشرکین قریش نے مسلمانوں کو سکون سے بیٹھنے نہ دیا اور چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ جاری رکھا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ رمضان المبارک ۲ھ میں مسلمان مجبور ہو کر بدر میں کفار کے مقابل صف آرا ہوئے، یہ حق و باطل کا اوّلین عظیم الشان معرکہ تھا جس میں تین سو تیرہ مسلمانوں نے حصہ لیا۔ حضرت ابوعبیدہ رضؓ بھی اس معرکہ میں نہایت شجاعت و جانبازی کے ساتھ سرگرم پیکار ہوئے۔ آپ کے والد عبداللہ جو کفار کی طرف سے لڑنے آئے تھے۔ قبولِ اسلام کی وجہ سے آپ کے سخت دشمن بن گئے تھے، انہوں نے آپ کو تاک تاک کر نشانہ بنایا مگر آپ نے ہر بار اُن سے درگذر فرمایا لیکن جب دیکھا کہ وہ باز نہیں آرہے ہیں تو بالآخر اسلامی حمیت نسبی تعلق پر غالب آگئی اور ایک ہی وار سے ان کا کام تمام کر دیا، حقیقت میں یہ اسلامی جوش اور مذہبی وارفتگی کی نہایت سچی مثال تھی۔ جس میں ماں باپ، بہن بھائی غرض تمام رشتہ دار ایک اجنبی دشمن کی طرح نظر آتے ہیں، قرآن نے اس انقطاع الی اللہ کی ان الفاظ میں داد دی۔

لَا تَجِدُ قَوْمًا یُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ یُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَلَوْ کَانُوْٓا اٰبَآءَھُمْ اَوْ اَبْنَآءَھُمْ اَوْ اِخْوَانَھُمْ اَوْ عَشِیْرَتَھُمْ

جو لوگ خدا پر اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتے ہیں تم اُن کو خدا اور اس کے رسولؐ کے دشمنوں سے دوستی کرتے ہوئے نہ دیکھو گے، خواہ وہ اُن کے باپ یا بیٹے یا بھائی یا خاندان ہی کے لوگ ہوں

اُولٰٓئِکَ کَتَبَ فِیْ قُلُوْبِھِمُ الْاِیْمَانَ وَاَیَّدَھُمْ بِرُوْحٍ مِّنْہُ ط

یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں خدا نے ایمان (پتھر پر لکیر کی طرح) تحریر کر دیا ہے، اور فیضِ غیبی سے ان کی مدد کی ہے۔

(سورۃ المجادلۃ، آیت ۲۲)

غزوہ اُحد میں جب مشرکین قریش کے اچانک حملے سے مسلمان افراتفری کے عالم میں اِدھر اُدھر بھاگ گئے تو آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ثابت قدم رہے۔ اس معرکہ میں عبداللہ بن قمیہ کے حملہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ اقدس زخمی ہو گیا اور زرہ کی دو کڑیاں رخسار مبارک میں گھس گئیں، جس سے آنحضرت صلعم کو سخت تکلیف تھی، حضرت ابوعبیدہ رضؓ نے ان کڑیوں کو دانتوں سے پکڑ کر کھینچا جس سے ان کے اپنے دو دانت شہید ہو گئے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت گزاری میں دو دانت کیا اگر جان بھی قربان ہو جاتی تو پروا نہ تھی۔

غزوہ خندق اور بنو قریظہ میں بھی نمایاں حصہ لیا۔ پھر ربیع الآخر ۶ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوعبیدہ رضؓ کو بنو ثعلبہ کی سرکوبی پر مامور فرمایا، آپ چالیس آدمیوں کے ساتھ یلغار کرتے ہوئے رات کے اندھیرے میں بنو ثعلبہ کے مرکزی مقام ذی القصہ پہنچے اور صبح کے وقت ان پر چھاپہ مارا، وہ لوگ حملہ کی تاب نہ لا کر پہاڑوں میں چھپ گئے، صرف ایک آدمی ملا جس نے اسلام قبول کر لیا حضرت ابوعبیدہ رضؓ مالِ غنیمت میں بنو ثعلبہ کے مویشی ہانک کر مدینہ لے آئے۔

اسی سال ماہ ذیقعد میں بیعت رضوان میں شریک ہوئے اور جو معاہدہ مسلمانوں اور قریش مکہ کے درمیان طے پایا تھا۔ اس پر بطور گواہ دستخط کیے، پھر ۷ھ میں خیبر کی فوج کشی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب ہوئے، اور اس کی فتح میں نہایت شجاعت و بہادری کے ساتھ حصہ لیا۔

جمادی الآخر ۸ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرو بن العاص رضؓ کو تین سو مجاہدین کے ساتھ ذات السلاسل کی جانب روانہ فرمایا۔ وہاں پہنچ کر جب معلوم ہوا کہ دشمن کی تعداد بہت زیادہ ہے، تو انہوں نے دربار رسالت مآبؐ میں کمک بھیجنے کی درخواست کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوعبیدہ رضؓ کو علیحدہ علَم مرحمت فرما کر دو سو مجاہدین کے ساتھ بھیجا، اس فوج کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس میں حضرت ابوبکر صدیق رضؓ اور حضرت عمر رضؓ جیسے جلیل القدر صحابہ رضؓ بھی تھے، غرض جب یہ فوج حضرت عمرو بن العاص کی فوج سے ملی تو قدرتی طور پر امامت اور سپہ سالاری کی بحث پیدا ہو گئی، ظاہر ہے کہ حضرت ابوعبیدہؓ کی موجودگی میں حضرت عمرو بن العاص رضؓ کو اس شرف گرامی کا استحقاق نہ تھا تاہم حضرت ابوعبیدہؓ نے ان کی ضد اور اصرار کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا اور جس مقصد کے لیے گئے تھے اُسے بحسن و خوبی انجام دینے کے بعد مدینہ واپس آئے۔

رجب ۸ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوعبیدہ رضؓ کو تین سو مجاہدین کا سردار بنا کر قریشی قافلوں کی نقل و حرکت کا پتہ لگانے نیز قبیلہ جہینہ پر حملہ کرنے کے لیے سیف البحر کی طرف روانہ فرمایا، اس لشکر میں حضرت عمر رضؓ اور حضرت جابر رضؓ بن عبداللہ بھی شامل تھے۔ چلتے وقت حضورؐ نے زادِ راہ کے طور پر صحابہ رضؓ کو کھجوروں کا ایک تھیلہ مرحمت فرمایا، جب یہ کھجوریں ختم ہو گئیں، تو صحابہ رضؓ نے ہر روز دو تین اونٹ ذبح کر کے چند روز گزارے، لیکن جب امیر العسکر حضرت ابوعبیدہ رضؓ نے اونٹ ذبح کرنے سے منع فرما دیا اور خوراک کے لیے کسی کے پاس

بھی کچھ نہ رہا، تو مجاہدین نے درختوں کے پتے توڑ توڑ کر کھانے شروع کیے کہ اللہ تعالیٰ نے بہت جلد یہ مصیبت دُور کر دی اور سمندر سے ایک تودہ جتنی مچھلی کنارے آ گئی مسلمانوں نے تقریباً اٹھارہ روز تک اُسی پر گذر اوقات کی اور کامیابی کے ساتھ مدینہ لوٹے۔

اسی سال رمضان المبارک میں مکہ فتح ہوا۔ پھر حنین اور طائف کے معرکے وقوع میں آئے جن میں حضرت ابُو عبیدہؓ نہایت جانبازی کے ساتھ پیش پیش رہے۔

متفرّق خدمات

جنگی مہمات کے علاوہ حضرت ابُو عبیدہؓ کو بعض دوسری اہم خدمات بھی سُپرد ہوئیں مثلاً ۹ھ میں جب اہلِ نجران کے ساتھ ایک عہدنامہ طے پایا اور وہ اسے لے کر واپس وطن جانے لگے، تو انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ ان کے ہمراہ کسی کو بھیجیں جو قرآن وسُنّت کی تعلیم دے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابُو عبیدہؓ بن الجراح کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا:

" یہ اس اُمت کے امین ہیں، ان کو تمہارے ساتھ کرتا ہوں ۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ بحرین سے مصالحت کر کے حضرت علاء بن الحضرمیؓ کو بحرین کا امیر مقرر کیا تھا۔ حضرت ابُو عبیدہؓ ایک دفعہ وہاں سے جزیہ کی رقم لانے پر مامور ہوئے، جب آپ رقم لے کر واپس مدینہ پہنچے تو اس روز نمازِ صبح میں انصار کا غیر معمولی مجمع ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے متبسم ہو کر فرمایا" شاید تم لوگوں کو ابُو عبیدہؓ کے آنے کی اطلاع ہو گئی ہے" لوگوں نے عرض کیا "ہاں یارسول اللہ" یہ سُن کر سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

" بشارت ہو کہ آج تمہیں خوش کر دوں گا، لیکن خدا کی قسم میں تمہارے فقر و افلاس سے نہیں ڈرتا، بلکہ خوف ہے کہ پہلی قوموں کی طرح تمہارے اُوپر بھی دنیا کشادہ ہو جائے گی۔ اور جس طرح ان کو منافست باہمی اور حسد و طمع نے ہلاک کر دیا ہے تمہیں بھی ہلاک کر دے گی۔"

۱۰ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع کے لیے تشریف لے گئے۔ حضرت ابُو عبیدہؓ ساتھ تھے۔ اس سفر سے واپسی کے تقریباً تین ماہ بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا اور سقیفہ بنوساعدہ میں خلافت کا جھگڑا پیدا ہو گیا لیکن صلحائے اُمت کی کوششوں سے یہ بہت جلد فرو ہو گیا، اس جھگڑے کو ختم کرنے کے لیے حضرت ابُو عبیدہؓ کی کوششیں بھی کسی سے کم نہ تھیں آپ نے انصار کو مخاطب کر کے فرمایا:

" اے گروہِ انصار، تم نے سب سے پہلے امداد و اعانت کا ہاتھ بڑھایا تھا، اس لیے تم ہی سب سے پہلے افتراق و اختلاف کے بانی نہ ہو جاؤ۔"[1]

حضرت ابوبکر صدیقؓ بھی اس مجمع میں موجود تھے، آپ نے خود ان کے نام پیش کر کے فرمایا، دیکھو یہ عُمر بن الخطابؓ ہیں جن کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اُن کی ذات سے اللہ نے دین کو معزز کیا ہے اور یہ دیکھو۔ ابُو عبیدہؓ بن الجراح موجود ہیں جن کو بارگاہِ نبوت سے "امین الامت" کا خطاب عطا کیا گیا ہے، ان دونوں میں سے جس کے ہاتھ پر چاہو بیعت کر لو، لیکن ان دونوں بزرگوں نے حضرت صدیق اکبرؓ کی موجودگی میں اپنے استحقاق سے نہ صرف انکار کیا بلکہ آگے بڑھ کر سب سے پہلے بیعت کر لی، اس کے بعد تمام مہاجرین و انصار نے بیعت

---

[1] سیر الصحابہ مہاجرین حصہ اوّل

کے لیے ٹوٹ پڑے اور اس طرح اُفقِ اسلام فتنہ کے تاریک بادلوں سے صاف ہوگیا۔

شام کی سپہ سالاری

حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے منصبِ خلافت سنبھالنے کے بعد ۱۲ھ میں کبار صحابہ رضؓ کے مشورہ سے شام پر کئی اطراف سے لشکرکشی کا اہتمام کیا۔ حضرت ابوعبیدہ رضؓ بن الجراح کو حمص پر، حضرت یزید رضؓ بن ابی سفیان کو دمشق پر، حضرت شرحبیل رضؓ بن حسنہ کو اُردن پر اور حضرت عمرو بن العاص رضؓ کو فلسطین پر مامور فرمایا اور ہدایت فرمائی کہ حضرت ابوعبیدہ رضؓ بن الجراح ان سب کے سپہ سالارِ اعظم ہوں گے۔

حضرت ابوعبیدہ رضؓ جب عرب کی سرحد سے باہر نکلے تو انہیں قدم قدم پر رُومی جتھوں کا سامنا ہُوا، اُن کی کثرت کا اندازہ کرکے حضرت ابوعبیدہ رضؓ نے تمام اسلامی فوج کو یکجا کرلیا اور دربارِ خلافت سے مزید کمک طلب کی، اس پر حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے حضرت خالدبن ولید رضؓ کو عراقی مہم چھوڑ کر شام کی طرف جانے کا حکم دیا، چنانچہ وہ حسب الحکم راہ میں چھوٹی چھوٹی لڑائیاں لڑتے ہُوئے شامی فوج سے آکر مل گئے اور پھر متحدہ فوج نے بصریٰ، فحل اور اجنادین کو فتح کرکے دمشق کا محاصرہ کرلیا، جو کامل تین ماہ تک جاری رہا۔

فتح دمشق

یہ محاصرہ ابھی جاری تھا کہ صدیق اکبر رضؓ کا زمانہ ختم ہوگیا اور دمشق کی فتح حضرت عمر فاروق رضؓ کی خلافت کے ابتدائی دور میں عمل میں آئی، اس کی تفصیل یہ ہے کہ دمشق کے بطریق کے گھر لڑکا پیدا ہُوا، تمام اہلِ شہر نے جشن میں خوب شرابیں پئیں اور ایسے بدمست ہوکر سوئے کہ کسی بات کی خبر نہ رہی، حضرت خالدبن ولید رضؓ کی بیدار مغزی اور ہمتِ مردانہ ایسے مواقع کی تلاش میں رہتی تھی، چنانچہ آپ کو جب اہلِ شہر کی غفلت کا علم ہُوا، تو آپ معہ چند جانبازوں کے فصیل پھاند کر اندر داخل ہوگئے اور شہر پناہ کے دروازے کھول دیئے، مسلمان باہر منتظر تھے وہ پھاٹک کھلتے ہی اندر داخل ہوگئے، اہلِ شہر اس ناگہانی مصیبت کو دیکھ کر گھبرا گئے، ان کی سمجھ میں اس کے علاوہ کچھ نہ آیا کہ وہ حضرت ابوعبیدہ رضؓ سے صُلح کی درخواست کریں، حضرت ابوعبیدہ رضؓ شہر کی دوسری طرف متعین تھے اور چونکہ انہیں اس صورتِ حال کا علم نہ تھا۔ اس لیے صُلح قبول کرلی، اب فتح دمشق کی ایک عجیب صورت پیدا ہوگئی تھی، یعنی ایک طرف سے حضرت خالدبن ولید رضؓ فاتحانہ داخل ہُوئے اور دوسری جانب سے حضرت ابوعبیدہ رضؓ مصالحانہ، مسلمانوں کے دونوں لشکر جب وسط بازار میں ملے تو اصل حقیقت کا انہیں علم ہُوا، لیکن چونکہ حضرت ابوعبیدہ رضؓ مصالحت کرچکے تھے، اس لیے دمشق کی فتح مصالحانہ قرار دی گئی اور مسلمانوں نے کسی سے کوئی تعرض نہ کیا۔

اُردن کی فتح

دمشق فتح کرکے اسلامی فوجیں آگے بڑھیں اور مقام فحل میں خیمہ افگن ہُوئیں۔ رُومیوں کو دمشق کے نکل جانے کا بڑا افسوس تھا، چنانچہ انہوں نے مسلمانوں کو روکنے کے لیے صوبہ اُردن کے شہر بیسان میں فوجیں جمع کیں، لیکن مسلمانوں کے عزم و استقلال کو دیکھ کر پھر حضرت ابوعبیدہ رضؓ کے پاس مصالحت کا پیام بھیجا اور گفت و شنید کے لیے ایک سفیر بلایا۔ حضرت معاذ بن جبل رضؓ نے سفارت کے فرائض سرانجام دیئے، مگر مفاہمت نہ ہوسکی، اب رومیوں نے براہِ راست حضرت ابوعبیدہؓ سے گفتگو کے لیے قاصد بھیجا، جس وقت وہ اسلامی لشکر میں پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ یہاں ہر ایک ادنیٰ و اعلیٰ ایک ہی رنگ میں ڈوبا ہُوا ہے، افسری ماتحتی کی کوئی تمیز نہیں، آخر قاصد نے گھبرا کر پُوچھا کہ تمہارا سردار کون ہے؟ لوگوں نے حضرت ابوعبیدہ رضؓ کی طرف اشارہ کیا، اس وقت وہ زمین پر بیٹھے ہوئے تھے۔ قاصد نے یہ تصدیق کرکے کہ آپ ہی مسلمانوں کے سردار ہیں یہ پیش کش کی کہ اگر آپ یہاں سے چلے جائیں، تو اسلامی فوج کے ہر شخص کو دو دو اشرفیاں دیں گے، حضرت ابوعبیدہ رضؓ نے انکار فرمایا اور قاصد کا رویّہ دیکھ کر فوج کو تیاری کا حکم دے دیا، غرض ذیقعدہ ۱۴ھ میں فریقین میں جنگ شروع ہوگئی، حضرت

ابو عبیدہ رضؓ ایک ایک صف میں جا کر کہتے "خدا کے بندو! صبر کے ساتھ خدا سے مدد چاہو کیونکہ خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے"
بالآخر کئی خون ریز معرکوں کے بعد عیسائیوں کو شکست فاش ہوئی اور اُردن کا پورا صوبہ مسلمانوں کے زیرنگیں ہو گیا۔

حمص کی فتح

دمشق اور اُردن کی فتح کے بعد بیت المقدس، حمص اور انطاکیہ تین بڑے شہر رہ گئے، حضرت ابو عبیدہ رضؓ پہلے حمص کی طرف بڑھے اور راستہ میں بعلبک پر قبضہ کرنے کے بعد حمص کا محاصرہ کر لیا، یہاں دفاع کے لیے کوئی فوجی انتظام موجود نہ تھا تاہم اہل شہر کچھ عرصہ تک امداد کی اُمید پر مدافعت کرتے رہے لیکن جب کوئی اُمید بر نہ آئی تو ناچار خود بخود شہر مسلمانوں کے حوالے کر دیا حضرت ابو عبیدہ رضؓ نے حمص کے محاصرہ کے دوران میں حماۃ، شیزر اور معرۃ النعمان وغیرہ فتح کر لیے تھے۔ اس لیے حمص کی تسخیر کے بعد یہاں حضرت عبادہ بن صامت رضؓ کو چھوڑ کر خود لاذقیہ روانہ ہو گئے۔

لاذقیہ نہایت مضبوط و مستحکم شہر تھا، حضرت ابو عبیدہ رضؓ نے اُسے فتح کرنے کے لیے ایک نئی تدبیر اختیار کی، آپ نے میدان میں بہت سے پوشیدہ غار کھدوائے اور بظاہر محاصرہ چھوڑ کر حمص کی طرف روانہ ہو گئے، اہل شہر نے مسلمانوں کے اس طرح چلے جانے کو تائید غیبی خیال کیا اور بڑے اطمینان کے ساتھ شہر پناہ کا دروازہ کھول کر کاروبار میں مصروف ہو گئے، لیکن حضرت ابو عبیدہ رضؓ جو اسی رات اپنی فوج کے ساتھ واپس آکر ان غاروں میں چھپ رہے تھے صبح کے وقت نکل کر اچانک شہر میں داخل ہو گئے اور آسانی کے ساتھ اسلام کا علم بلند کر دیا۔

یرموک کا فیصلہ کن معرکہ

مسلمانوں کی پے در پے کامیابیوں نے رُومیوں کو جوش سے لبریز کر دیا، اُنہوں نے ہرقل شہنشاہ روم کے پاس جا کر فریاد کی کہ مسلمانوں نے سارا شام روند ڈالا ہے اور کوئی طاقت انہیں روکنے والی نہیں، قیصر اگرچہ اہل اسلام کی روز افزوں فتوحات اور رُومیوں کی درماندگی کے پیش نظر شام چھوڑ کر قسطنطنیہ جانے کا ارادہ کر چکا تھا تاہم بےکس رُومیوں کی فریاد سن کر اسے غیرت آگئی، چنانچہ اس نے پوری قوت سے مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تمام ممالک محروسہ میں فوجوں کے اجتماع کے لیے فرمان جاری کر دیے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انطاکیہ میں فوجوں کا ایک طوفان اُمڈ آیا۔

حضرت ابو عبیدہ رضؓ کو جب خود شامی اُمرا اور رُوسا کے ذریعے ان واقعات کی اطلاع ہوئی تو آپ نے اچھی طرح دشمن کی تیاریوں کی تحقیق کر کے اپنے ماتحت افسروں کو جمع کیا اور اس مہیب طوفان کو روکنے کے متعلق اُن سے مشورہ طلب کیا، حضرت یزید رضؓ بن ابو سفیان حضرت شرجیل رضؓ بن حسنہ اور دیگر حاضرین نے اپنی اپنی رائے پیش کی، بالآخر کثرت رائے سے یہ طے پایا کہ مفتوحہ علاقوں کو چھوڑ کر تمام فوجوں کو دمشق میں جمع کیا جائے۔ اس فیصلے سے ظاہر ہے کہ مسلمان مفتوحہ علاقوں کے عیسائیوں کی حفاظت نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے حضرت ابو عبیدہ رضؓ نے حق و انصاف کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے جزیہ کی مد میں وصول شدہ ایک ایک کوڑی لوگوں کو واپس کر دی، مسلمانوں کے اس طرزِ عمل سے عیسائی اس قدر متاثر ہوئے کہ وہ رو رو کر ان کی واپسی کی دعائیں کرتے تھے [1]

دمشق میں فوجوں کے اجتماع کے بعد حضرت ابو عبیدہ رضؓ نے امیر المومنین رضؓ کو تازہ صورتِ حال سے مطلع کیا، رُومیوں کی تیاریوں کا حال سن کر مدینہ کا ہر شخص جوش سے لبریز ہو کر سر بکف میدانِ جہاد میں جانے کے لیے آمادہ ہو گیا، حضرت عمر رضؓ نے حضرت سعید رضؓ بن عامر کی زیر قیادت

---

[1] فتوح البلدان

تھوڑی سی مزید کمک شام روانہ کر دی، اس دوران میں حضرت ابوعبیدہ رضؓ نے فوجوں کے اجتماع کے ساتھ دمشق سے آگے بڑھ کر یرموک کے میدان میں مورچہ بندی کی یہ جگہ جنگی نقطۂ نظر سے نہایت مناسب اور باموقع تھی، اس کے قریب ہی مقام دیر الجبل میں رومیوں کا ٹڈی دل جو دو لاکھ سے زائد تھا، آکر خیمہ زن ہوا، تعداد میں اگرچہ رومی لشکر مسلمانوں سے سات گنا زیادہ تھا تاہم جو لوگ عربی تلوار کی کاٹ دیکھ چکے تھے، وہ صلح کے متمنی تھے اور یہی خواہش اُن کے سپہ سالارِ اعظم باہان کی تھی، غرض مصالحت کے لیے نامہ و پیام شروع ہوگیا۔ اتفاق سے جارج نامی ایک رومی قاصد اسلامی لشکرگاہ میں عین اس وقت پہنچا جب کہ شام ہو چکی تھی، ذرا دیر بعد نماز مغرب شروع ہوئی اور جارج مسلمانوں کے مؤثر طریقۂ عبادت خشوع و خضوع اور محویت و استغراق کو دیکھ کر حد درجہ متاثر ہوا، نماز کے خاتمہ کے بعد اس نے حضرت ابوعبیدہ رضؓ سے چند سوالات پوچھے جن میں ایک یہ تھا کہ مسلمان حضرت عیسیٰؑ کے متعلق کیا اعتقاد رکھتے ہیں، حضرت ابوعبیدہ رضؓ نے قرآن کی یہ آیات پڑھیں۔

يَآهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ۭ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰىهَآ اِلٰى مَرْيَمَ

(نساء آیت ۱۷۱)

اے اہلِ کتاب اپنے دین میں زیادہ غلو نہ کرو، اور خدا کی طرف حق کے سوا غلط بات منسوب نہ کرو، حقیقت میں مسیح بن مریمؑ خدا کے رسول اور اس کا کلمہ (بشارت) تھے جو اس نے مریمؑ کی طرف بھیجا تھا مسیح اور ملائکہ مقربین کو خدا کی بندگی میں عار نہیں ہے

لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰۗىِٕكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ (نساء آیت ۱۷۲)

جارج نے جب ان آیات کا ترجمہ سنا تو بے اختیار پکار اُٹھا کہ بیشک حضرت عیسیٰؑ کے اوصاف یہی ہیں اور بیشک تمہارا پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) سچا ہے۔ یہ کہہ کر اس نے بخلوص نیت اسلام قبول کر لیا، وہ اگرچہ یہاں سے جانا نہیں چاہتا تھا تاہم اس خیال سے کہ رومیوں کو بدعہدی کا گمان نہ ہو، حضرت ابوعبیدہ رضؓ نے اسے واپس جانے پر مجبور کیا اور کہا کل جو سفیر آئے گا اس کے ساتھ چلے آنا۔

غرض رجب ۱۵ھ میں فریقین میں پہلا مقابلہ ہوا جس میں مسلمانوں کا پلہ بھاری رہا۔ جنگ آئندہ کے لیے ملتوی ہوگئی، اسی دوران میں رومیوں نے سفارت طلب کی، حضرت ابوعبیدہ رضؓ نے حضرت خالد بن ولید رضؓ کو سفیر بنا کر بھیجا مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا البتہ دونوں فریق اور زیادہ جوش و خروش کے ساتھ ایک دوسرے کے مقابل ہوئے۔ اس جنگ میں رومیوں کا جنگی اہتمام دیدنی تھا، تیس ہزار رومی پاؤں میں بیڑیاں پہن کر لڑائی میں شریک ہوئے اور عیسائی پادریوں نے یسوع مسیحؑ کا نام لے لے کر اپنے لشکریوں کی آتشِ غضب بھڑکائی لیکن یہ سب کوششیں مسلمانوں کے غیر معمولی جوش کے سامنے بے اثر ثابت ہوئیں اور انجام کار میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہا۔ اس جنگ کی شدت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ رومیوں کے تقریباً ستر ہزار سپاہی کھیت رہے۔ مسلمان بھی کم و بیش تین ہزار شہید ہوئے جن میں حضرت ضرار بن ازور رضؓ، حضرت ہشام بن العاص رضؓ اور حضرت ابان بن سعید رضؓ جیسے جنگ آزما افسر بھی تھے۔

یرموک کی فتح کے بعد تمام ملک شام مسلمانوں کے استقبال کے لیے چشم براہ تھا۔ حضرت ابوعبیدہ رضؓ نے حمص پہنچ کر حضرت خالد رضؓ بن ولید کو قنسرین روانہ کیا اور خود حلب کی طرف بڑھے، یہ دونوں مقام آسانی کے ساتھ فتح ہوگئے اور چند دنوں بعد اہلِ انطاکیہ

بھی مطیع ہو گئے" اب صرف بیت المقدس رہ گیا تھا جس کا محاصرہ ایک عرصہ سے حضرت عمرو بن العاص رضؓ نے کیا ہوا تھا۔ اسی دوران میں حضرت ابو عبیدہ رضؓ بھی پہنچ گئے۔ عیسائیوں نے ہر چند مدافعت کی کوشش کی مگر آخر صلح کے لیے تیار ہو گئے، لیکن شرط پیش کی خود امیر المومنین رضؓ آکر معاہدہ صلح لکھیں، حضرت ابو عبیدہ رضؓ نے ایک خط کے ذریعہ حضرت عمر رضؓ کو اس شرط سے مطلع کیا جسے امیر المومنین رضؓ نے منظور فرما لیا اور مدینہ میں کاروبارِ خلافت حضرت علی رضؓ کے سپرد کر کے بیت المقدس روانہ ہوئے۔ آپ جب جابیہ کے مقام پر پہنچے تو حضرت ابو عبیدہ رضؓ نے دوسرے فوجی افسروں کے ساتھ آپ رضؓ کا استقبال کیا، بیت المقدس کے عیسائی بھی جابیہ آگئے تھے۔ چنانچہ اسی مقام پر معاہدہ صلح طے پا جانے کے بعد شہر مسلمانوں کے حوالے ہو گیا۔

رُومیوں کی آخری کوشش

جزیرہ جو عراق کا حصہ تھا اب تک فتح نہیں ہوا تھا۔ اس کی سرحد شام سے ملی ہوئی تھی، شام پر مسلمانوں کے مکمل قبضہ کے بعد اہل جزیرہ کو اپنے بارہ میں خطرہ پیدا ہوا۔ انہوں نے قیصر روم کو امداد کے لیے لکھا۔ رومیوں کو قسمت آزمائی کا ایک اور موقعہ ہاتھ آیا، چنانچہ وہ ایک عظیم الشان جمعیت کے ساتھ حمص کی طرف بڑھے۔

حضرت ابو عبیدہ رضؓ نے بھی ادھر اُدھر سے فوجیں جمع کیں اور حضرت عمر فاروق رضؓ کو صورتِ حال سے مطلع کیا۔ اس پر امیر المومنین رضؓ کے حکم سے عراق سے ایک بہت بڑی کمک پہنچ گئی۔ حضرت ابو عبیدہ رضؓ اس عظیم الشان لشکر کے ساتھ رومیوں کو روکنے کے لیے آگے بڑھے اور میدانِ کارزار میں پہنچ کر ایک پُرجوش تقریر سے مسلمانوں کی تمنائے شہادت کو ایک ایسی قوت بنا دیا جس کے سامنے رومی لشکر کے پاؤں اُکھڑ گئے اور مرج الدیباج تک انہیں کوئی جائے پناہ نہ ملی۔ یہ رومیوں کی آخری کوشش تھی جس میں ناکام ہونے کے بعد انہیں پھر کبھی پیش قدمی کا حوصلہ نہ ہُوا۔

امارت

حضرت خالد بن ولید رضؓ دمشق کے امیر یا والی مقرر ہوئے تھے لیکن حضرت عمر رضؓ نے انہیں سنہ ۱۸ھ میں معزول کر کے یہ عہدہ بھی حضرت ابو عبیدہ رضؓ کو تفویض کر دیا۔ مورخین کے مطابق جب حضرت خالد بن ولید رضؓ دمشق سے روانہ ہونے لگے، تو آپ نے لوگوں سے کہا، "تمہیں خوش ہونا چاہیے کہ امین الامت تمہارا والی ہے"۔ اس کے جواب میں حضرت ابو عبیدہ رضؓ نے فرمایا: "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ خالد رضؓ اللہ کی تلواروں میں ایک تلوار ہے"۔ غرض اس لطف و محبت کے ساتھ حضرت ابو عبیدہ رضؓ امارت یا ولایت کی ذمہ داری قبول کرنے کے بعد ملکی انتظامات میں مصروف ہُوئے۔

حضرت عمر فاروق رضؓ نے انتظامی حیثیت سے مُلکِ شام میں جو مختلف اصلاحات جاری فرمائیں، ان میں اکثر حضرت ابو عبیدہ رضؓ کے ہاتھ سے عمل میں آئیں، سنہ ۱۸ھ میں جب عرب میں قحط پڑا تو آپ نے اس میں سرگرم حصّہ لیتے ہُوئے شام سے چار ہزار اُونٹ غلّے سے لدے ہُوئے بھجوائے، اشاعتِ اسلام میں بھی آپ نے نمایاں حصّہ لیا، قبیلہ تنوخ، بنو سلیح اور عرب کے دوسرے بہت سے قبائل جو عیسائیت قبول کر کے مدت سے شام میں آباد ہو گئے تھے، حضرت ابو عبیدہ رضؓ کی کوششوں سے اسلام لائے نیز بعض شامی اور رُومی عیسائی بھی آپ کے اخلاق سے متاثر ہو کر حلقہ بگوشِ اسلام ہُوئے۔

طاعونِ عمواس

سنہ ۱۸ھ میں نہایت شدت سے طاعون کی وبا پھیلی، اس نے اگرچہ تمام مفتوحہ ممالک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا تاہم شام اس کا خصوصی ہدف بنا، بڑے بڑے نامور بزرگ اور یادگار ہستیاں اس کی ہلاکت خیزیوں کا نشانہ بن گئیں، حضرت عمر رضؓ کو اس وبا کا علم ہُوا، تو سخت فکرمند ہو گئے اور دار الخلافہ چھوڑ کر شام روانہ ہوئے۔ مقام سرغ پہنچے تو حضرت ابو عبیدہ رضؓ اور دوسرے

سرداروں نے استقبال کیا، اس دوران میں وبا کا زور بڑھتا جا رہا تھا، چنانچہ حضرت عمرؓ نے اس صورت حال کے پیش نظر پہلے مہاجرین اور انصار صحابہ رضؓ سے مشورہ طلب کیا، سب نے مختلف آرا پیش کیں، تاہم قریش کے بوڑھے اور تجربہ کار بزرگوں نے مشورہ دیا کہ سردست یہاں سے لوگوں کا منتقل ہو جانا ہی بہتر ہے، حضرت عمرؓ نے منادی کرا دی کہ میں کل صبح واپس جاؤں گا۔ سب ساتھ چلیں، حضرت ابوعبیدہؓ چونکہ نہایت شدت کے ساتھ تقدیر کے قائل تھے۔ اس لیے یہ حکم انہیں ناگوار گزرا اور آزادی کے ساتھ کہا۔

"افرارامن قدر اللہ" یعنی اللہ کی تقدیر سے بھاگتے ہو، حضرت عمرؓ نے سنا، تو فرمایا: ہاں تقدیر الٰہی کی طرف بھاگتا ہوں۔"

غرض حضرت عمرؓ وہاں سے واپس لوٹ آئے اور حضرت ابوعبیدہؓ کو خط لکھ کر بلایا کہ چند دنوں کے لیے یہاں چلے آیئے آپ سے کچھ کام ہے۔ حضرت ابوعبیدہؓ، امیرالمومنین رضؓ کا مقصد سمجھ گئے۔ آپ نے جواب میں لکھا کہ جو مقدر میں ہے وہ پورا ہو گا، میں مسلمانوں کو چھوڑ کر نہیں آسکتا، حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ وہ کسی طرح ٹلنے کا نام نہیں لیتے تو پھر تاکیداً لکھا کہ اگر تم نہیں آتے تو فوجوں کو مرطوب مقامات سے ہٹا کر کسی بلند اور صحت بخش مقام کی طرف لے جاؤ۔ اس حکم پر حضرت ابوعبیدہؓ نے فوجیں جابیہ میں منتقل کر دیں۔

حضرت ابوعبیدہؓ پر وبا کا اندرونی اثر ہو چکا تھا، چنانچہ جابیہ پہنچ کر طاعون میں مبتلا ہو گئے، جب مرض نے شدت اختیار کی تو حضرت معاذؓ بن جبل کو اپنا جانشین بنایا اور لوگوں کو جمع کر کے ایک نہایت مؤثر تقریر کی، آخر میں فرمایا: "صاحبو! یہ مرض خدا کی رحمت اور تمہارے نبیؐ کی دعوت ہے، پہلے بہت سے صلحائے روزگار اس میں جاں بحق ہوئے ہیں اور اب ابوعبیدہؓ بھی اپنے خدا سے اس سعادت میں حصہ پانے کا متمنی ہے۔"

نماز کا وقت آیا، تو حضرت ابوعبیدہؓ نے اپنے جانشین کو نماز پڑھانے کا حکم دیا، ادھر نماز ختم ہوئی اور ادھر امین الامت حضرت ابوعبیدہؓ بن الجراح نے داعی حق کو لبیک کہا: اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

اخلاق و عادات

حضرت ابوعبیدہؓ کے صحیفۂ اخلاق میں خدا ترسی، اتباع سنت، تقویٰ، زہد، تواضع، مساوات اور ترحم کے ابواب نہایت روشن ہیں، خوف خدا آپ کی رگ و پے میں اس طرح سمایا ہوا تھا کہ محض معمولی واقعات آپ کے لیے سرمایۂ عبرت بن جاتے اور اکثر خدا کی ہیبت و جلال کو یاد کر کے آبدیدہ ہو جاتے تھے۔ ایک دفعہ ایک شخص آپ کے گھر آیا تو دیکھا کہ زار و قطار رو رہے ہیں، اس نے متعجب ہو کر رونے کا سبب پوچھا، تو فرمانے لگے۔ ایک روز رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کی آئندہ فتوحات اور تموّل کا ذکر کرتے ہوئے شام کا تذکرہ فرمایا اور کہا ابوعبیدہؓ اگر اس وقت تمہاری عمر وفا کرے تو تمہارے لیے تین خادم کافی ہوں گے، ایک خاص تمہاری ذات کے لیے ایک تمہارے اہل و عیال کے لیے اور ایک سفر میں ساتھ جانے کے لیے اسی طرح سواری کے تین جانور کافی ہیں۔ ایک تمہارے لیے، ایک غلام کے لیے اور ایک اسباب و سامان کے لیے، لیکن اب دیکھتا ہوں کہ میرا گھر غلاموں سے اور اصطبل گھوڑوں سے بھرا ہوا ہے، آہ! میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ وہ شخص میرے نزدیک سب سے زیادہ بلند رتبہ ہو گا جو اسی حال میں ملے گا، جس حال میں میں اسے چھوڑ جاؤں گا۔

امین الامت حضرت ابوعبیدہؓ ہمیشہ ہادیٔ برحق کی محبت اور دین برحق کی اطاعت میں سب سے پیش پیش رہے۔ غزوہ بدر میں

باپ کو قتل کیا۔ غزوہ اُحد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی راحت رسانی کے لیے دو دانت شہید کیے، سریہ ذات السلاسل میں حضرت عمرؓ بن العاص سے اختلاف ہُوا تو صرف اس خیال سے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اتفاقِ باہمی کی ہدایت فرمائی تھی، طوقِ اطاعت گلے میں ڈال لیا، یہاں تک کہ زندگی کا آخری لمحہ بھی اطاعتِ رسُول میں گزرا، شام میں طاعون کی شدت ہوئی مگر آپ نے صرف اس بناء پر ٹلنے کا نام نہ لیا کہ اللہ کے رسولؐ نے اس سے بھاگنے کی ممانعت کی تھی۔

حضرت ابُوعبیدہؓ کی پوری زندگی زہد وبے نیازی کی ایک ایسی مثال ہے جس کی نظیر شاذ و نادر ہی ملے گی۔ ان کی نگاہ میں دُنیا اور اس کی نعمتیں پرکاہ کے برابر بھی حیثیت نہیں رکھتی تھیں، شام کی آب و ہوا نے بڑے بڑے صحابہ رضؓ کی طرزِ معاشرت کو بدل دیا تھا، چنانچہ حضرت عمر رضؓ نے سفرِ شام کے موقع پر جب فوجی افسروں کو پُرتکلف قبائیں اور زرق برق لباس پہنے دیکھا، تو اس قدر برہم ہوئے کہ گھوڑے سے اُتر پڑے اور سنگریزے اُٹھا اُٹھا کر ان کی طرف پھینکنے لگے کہ تم اس قدر جلد بدل گئے ہو اور تم نے اس سرعت سے عجمی عادات اختیار کر لی ہیں، لیکن زہد و بے نیازی کے اس بادشاہ کے جسم پر اس وقت بھی سادہ کپڑے تھے جس سے عرب کی سادگی نمایاں تھی۔ حضرت عمرؓ ان کی قیام گاہ پر تشریف لائے تو وہاں اس سے بھی زیادہ سادگی دیکھنے میں آئی یعنی ڈھال، تلوار اور اونٹ کے کجاوہ کے علاوہ کوئی سامانِ راحت موجود نہ تھا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا ابُوعبیدہؓ، کاش تم ضروری ضروری سامان تو فراہم کر لیتے" اس بے نیازِ عالم نے جواب دیا " امیرالمومنین رضؓ ہمارے لیے یہی بس ہے"۔

ایک دفعہ حضرت عمر رضؓ نے حضرت ابُوعبیدہؓ کے پاس چار سو دینار اور چار ہزار درہم بطور انعام بھیجے۔ اُنہوں نے اسی وقت تمام رقم فوج میں تقسیم کر دی اور ایک کوڑی بھی اپنے لیے نہ رکھی، امیرالمومنین رضؓ نے سُنا تو فرمایا "الحمد للہ، کہ اسلام میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں۔

ابن سعد رحؒ کے بیان کے مطابق ایک دفعہ عمرِ فاروق رضؓ اعظم نے اپنے ہمنشینوں سے کہا کہ کسی نے کچھ آرزو کی اور کسی نے کچھ، میری آرزو یہ ہے کہ ایک مکان ہوتا جو ابوعبیدہؓ بن الجراح جیسے لوگوں سے بھرا ہوتا۔ پاس بیٹھے لوگوں میں سے ایک شخص نے کہا کہ مَیں نے اسلام میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ فرمایا یہی تو مُراد ہے۔ ایک اور موقع پر حضرت عمر رضؓ نے فرمایا کہ میں اگر ابُوعبیدہؓ بن الجراح کو پاتا تو انہیں خلیفہ بناتا اور ان کے خلیفہ بنانے میں کسی سے مشورہ نہ کرتا، اگر ان کے متعلق مجھ سے باز پرس ہوتی، تو کہتا کہ میں نے اللہ کے "امین" اور اس کے رسولؐ کے "امین" کو خلیفہ بنایا۔

گذشتہ سطور میں یہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ جب رومی سفیر اسلامی لشکرگاہ میں پہنچا تو اُسے سردارِ فوج کی شناخت میں دقت پیش آئی کیونکہ خاکساری اور تواضع کے اس پیکر نے سپہ سالارِ اعظم ہونے کے باوجود کبھی جاہ و حشم سے سروکار نہ رکھا، بہرکیف جب سفیر نے سب کو ایک ہی رنگ میں ڈوبے ہوئے پایا تو اس نے متحیر اور گھبراہٹ کے عالم میں لوگوں سے پُوچھا کہ تمہارا سردار کون ہے؟ لوگوں نے حضرت ابُوعبیدہؓ کی طرف اشارہ کیا، اس نے دیکھا کہ ایک نہایت معمولی وضع قطع کا عرب افسری اور ماتحتی کی تمیز سے بے نیاز ہو کر فرشِ خاک پر بیٹھا ہے تو اور متحیر ہو گیا۔

حضرت ابُوعبیدہؓ اسلامی مساوات کا حد درجہ خیال رکھتے تھے، آپ کی نظر میں فوج کے ایک معمولی سپاہی کو وہی عزت حاصل تھی جو ایک بڑے سے بڑے سردار کو ہو سکتی ہے، ایک دفعہ ایک مسلمان نے دشمن کے ایک سپاہی کو پناہ دی۔ حضرت خالدؓ بن ولید اور حضرت

عمرو بن العاص رضؓ نے اس کے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا، لیکن حضرت ابوعبیدہ رضؓ نے فرمایا ہم اُسے پناہ دیتے ہیں، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ایک مسلمان سب کی طرف سے پناہ دے سکتا ہے۔

حضرت ابوعبیدہ رضؓ کا خلق و ترحم سب مخلوق کے لیے عام تھا، شام میں آپ کی شفقت و رعایا پروری نے عیسائیوں کو بھی مرہونِ منت بنا رکھا تھا۔ وہاں عیسائیوں کو اوقاتِ نماز میں ناقوس بجانے اور گزرگاہوں سے صلیب نکالنے کی اجازت نہ تھی تاہم انہوں نے سال میں ایک بار عید کے موقع پر صلیب نکالنے کی اجازت کے لیے درخواست گزاری جسے حضرت ابوعبیدہ رضؓ نے بخوشی منظور فرما لیا۔ اس رواداری کا اثر یہ ہوا کہ شامی خود اپنے ہم مذہب رومیوں کے دشمن ہو گئے اور برضا و رغبت جاسوسی اور خبر رسانی کی خدمات انجام دینے لگے۔

حضرت ابوعبیدہ رضؓ کے خانگی حالات کی تفصیل تذکروں میں موجود نہیں تاہم اس قدر یقینی ہے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی محبت نے دوسری کسی محبت کو غالب نہ ہونے دیا، غزوۂ بدر میں جب آپ نے رشتۂ اسلام کی مضبوطی کے لیے اپنے باپ کے قتل سے ہاتھ پیچھے نہ کھینچا تو پھر بیوی بچوں میں غیر معمولی شغف پیدا کرنا آپ کے جذبہ انقطاع الی اللہ کے منافی تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کی زندگی الحبّ للہ اور البغض للہ کی صحیح عملی تصویر تھی۔

حُلیہ آپ کا قد لمبا، جسم نحیف و لاغر، چہرہ کم گوشت والا اور سامنے کے دو دانت خدمتِ رسولؐ میں قربان ہو گئے تھے۔ ڈاڑھی گھنی نہ تھی اور بعض روایات کے مطابق خضاب استعمال کرتے تھے۔

اولاد و ازواج ابنِ سعدؒ کے مطابق حضرت ابوعبیدہ رضؓ کی اولاد میں دو لڑکے یزید اور عمیر تھے، ان دونوں کی والدہ ہند بنت جابر بن وہب تھیں لیکن بعض تذکروں میں عمیر کی والدہ کا نام ورجا بتایا گیا ہے، بہرکیف ان دونوں کے ہاں کوئی اولاد نہ ہوئی اور لاولد فوت ہوئے۔

سیدنا حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ

راجہ محمد شریف

نام و نسب آپ کا نام علیؓ لقب حیدر (شیر) اور کنیت ابوالحسن اور ابوتراب تھی، موخر الذکر کنیت آپ کو بہت محبوب تھی، اگر کوئی آپ کو اس سے پکارتا، تو بہت مسرور ہوتے، آپ کے والد کا نام ابوطالب والدہ کا نام فاطمہ بنتِ اسد بن ہاشم تھا پورا سلسلۂ نسب یہ ہے، حضرت علی بن ابی طالب بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبدمناف بن قصیّ بن کلاب بن مرۃ بن کعب بن لوی، چونکہ حضرت ابوطالب کی شادی اپنے چچا کی لڑکی سے ہوئی تھی، اس لیے حضرت علیؓ نجیب الطرفین ہاشمی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی چچازاد ہیں ـــ حضرت علیؓ مرتضیٰ کے والد حضرت ابوطالب مکہ کے نہایت ذی اثر بزرگ تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آٹھ سال کی عمر میں اُن کی آغوشِ عاطفت میں آئے اور تقریباً پچاس سال کی عمر تک انہی کے ساتھ رہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب چالیس سال کی عمر میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبعوث ہوئے، تو حضورؐ نے ان ہی کے زیرِ حمایت مکہ کے کفرستان میں دعوتِ حق کا اعلان کیا تھا۔ حضرت ابوطالب اس زمانہ میں جبکہ خدا کے آخری نبیؐ ہر طرف سے مشرکین مکہ کے نرغے میں گھرے ہوئے تھے، آپؐ کی حمایت اور پشت پناہی کرتے اور ہر موقعہ پہ آپؐ کے لیے سینہ سپر رہتے تھے، مشرکین قریش نے اس پشت پناہی اور حمایت کے باعث حضرت ابوطالب اور ان کے خاندان کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچائیں، ایک گھاٹی میں اُن کو محصور کر دیا، کاروبار اور لین دین بند کر دیا، شادی بیاہ کے تعلقات منقطع کر لیے، پھر بھی اس نیک طینت بزرگ نے زندگی کے آخری لمحہ تک اپنے عظیم بھتیجےؐ کے سر سے دستِ شفقت نہ اٹھایا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دلی آرزو تھی کہ ابوطالب کا دل نورِ ایمان سے منور ہو جائے، چنانچہ حضورؐ نے ابوطالب کی وفات کے وقت انہیں نہایت اصرار کے ساتھ کلمۂ توحید کی دعوت دی تاکہ خدا کے آخری نبی کی خدمت و حمایت کے صلے میں انہیں جنت الفردوس کی لازوال دولت حاصل ہو مگر صحیح روایات کے مطابق ابوطالب نے اگرچہ علانیہ قبولِ اسلام تو نہ کیا تاہم جس ثبات و استقلال کے ساتھ آپ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت و حمایت کا فرض انجام دیا اس کے پیشِ نظر اسلام کی تاریخ میں حضرت ابوطالب کا نام ہمیشہ شکر گزاری اور احسان مندی کے ساتھ لیا جائے گا۔

حضرت علیؓ کی والدہ ماجدہ حضرت فاطمہؓ بنتِ اسد نے بھی آنحضرت صلعم کی پرورش و پرداخت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا، مشہور روایات کے مطابق آپ نے اسلام قبول کیا اور ہجرت کر کے مدینہ گئیں، جب اُن کا انتقال ہوا، تو آنحضرت صلعم نے کفن میں اپنی قمیص مبارک پہنائی اور قبر میں لیٹ کر اس کو متبرک کیا، لوگوں نے اس عنایتِ بے پایاں کی وجہ دریافت کی تو فرمایا کہ حضرت ابوطالب کے بعد سب سے زیادہ اسی نیک سیرت خاتون کا ممنونِ احسان ہوں [1]

---

[1] سیر الصحابہؓ خلفائے راشدین

حضرت ابوطالب کی مالی حالت اچھی نہ تھی، اسی لیے حضورؐ نے نیک دل چچا کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے حضرت علی رضؓ کو اپنے دامنِ پرورش میں لے لیا تھا۔ چنانچہ وہ اس وقت سے برابر حضورؐ پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے۔

اسلام

حضرت علی رضؓ کی عمر ابھی صرف دس سال بھی کہ اُن کے شفیق مربیؐ کو دربارِ خداوندی کی طرف سے نبوت کا خلعت عطا ہوا، چونکہ حضرت علی رضؓ آپ کے ساتھ رہتے تھے، اس لیے اُن کو اسلام کے مذہبی مناظر سب سے پہلے نظر آئے۔ روایت ہے کہ ایک روز آپ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور امّ المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضؓ کو مصروفِ عبادت دیکھا تو طفلانہ استعجاب کے ساتھ پوچھا کہ آپ دونوں کیا کر رہے تھے؟ اس پر آنحضرت صلعم نے آپ کو نبوت کے منصبِ گرامی کی خبر دی اور کفر و شرک کی مذمت کر کے توحید کی دعوت دی، حضرت علی رضؓ کو یہ سُن کر اگرچہ یک گونہ تعجب ہوا، لیکن چونکہ آنحضرت صلعم کی پرورش کے باعث فطرت سنور چکی تھی، اس لیے بہ توفیقِ الٰہی دوسرے ہی دن بارگاہِ نبوت میں حاضر ہو کر مشرف باسلام ہو گئے۔ قبولِ اسلام کے متعلق حضرت علی رضؓ کا خود اپنا قول ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم دو شنبہ کو مبعوث ہوئے اور میں سہ شنبہ کو اسلام لایا (ترجمہ)

مکہ کی زندگی

قبولِ اسلام کے بعد حضرت علی رضؓ مشورہ کے جلسوں میں تعلیم و ارشاد کے مجمعوں میں، مشرکین و کفار کے مباحثوں میں اور معبودِ حقیقی کی عبادت و پرستش کے موقعوں پر غرض ہر قسم کی صحبتوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہتے، حضرت عمر رضؓ کے قبولِ اسلام تک چونکہ سرزمینِ مکہ میں مسلمانوں کے لیے علانیہ خدا کا نام لینا اور اس کی عبادت و پرستش کرنا تقریباً ناممکن تھا، اس لیے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چھپ چھپ کر معبودِ حقیقی کی عبادت و پرستش فرماتے تو حضرت علی رضؓ بھی شریک ہوتے، ایک دفعہ وادیٔ نخلہ میں حسبِ معمول مصروفِ عبادت تھے کہ اتفاق سے حضرت ابوطالب اِدھر سے گزرے، انہوں نے اپنے پیغمبر بھتیجےؐ اور بلند بخت بیٹے کو عبادت کرتے دیکھا، تو پوچھا کیا کرتے ہو؟ آنحضرت صلعم نے کلمہ حق کی دعوت دی تو کہنے لگے اس میں کوئی حرج نہیں، لیکن مجھ سے نہیں ہو سکتا[1]

حج کے دنوں میں سرزمینِ مکہ چونکہ قبائلِ عرب کا مرجع بن جاتی تھی، اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کو ہمراہ لے کر عام مجمعوں میں تشریف لے جاتے تھے اور تبلیغِ حق کا فرض ادا کرتے تھے۔ اس وقت حضرت علی رضؓ اگرچہ اپنی کم عمری کے باعث کوئی اہم خدمت انجام دینے کے قابل نہ تھے تاہم کبھی کبھار آنحضرت صلعم کے ساتھ ہو جاتے اور جب کبھی آنحضرت صلعم کے ساتھ خانہ کعبہ تشریف لے جاتے تو بتوں کو توڑ پھوڑ کر عیب دار کر دیتے تھے۔

انتظامِ دعوت

نبوت کے چوتھے سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو علانیہ تبلیغ کا حکم ہوا، جس کی ابتداء اپنے قریبی رشتہ داروں سے کرنا تھی۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ۙ — اپنے قریبی اعزا کو (عذابِ الٰہی سے) ڈراؤ۔

سورہ الشعراء آیت ۲۱۴

---

[1] سیر الصحابہ رضؓ خلفائے راشدین

کے مطابق بنو عبدالمطلب کی دعوت کی اور حضرت علی رضؓ کو انتظامِ دعوت پر مقرر فرمایا، حضرت علی رضؓ کی عمر اگرچہ چودہ پندرہ سال کے لگ بھگ تھی، تاہم آپ نے نہایت اچھا انتظام کیا اور مہمانوں کی تواضع بکرے کے پائے اور دودھ سے کی۔ دعوت میں حضرت حمزہ رضؓ، حضرت عباس رضؓ، ابولہب اور ابوطالب سمیت خاندان کے چالیس افراد شریک تھے، پہلے دن تو ابولہب کی بکواس سے آنحضرت صلعم کو بولنے کا موقع نہ ملا، البتہ دوسرے دن خاندان کے انہی افراد کی موجودگی میں کھانے سے فراغت کے بعد آنحضرت صلعم نے اٹھ کر فرمایا، خدا کی قسم میں تمہارے سامنے دنیا و آخرت کی بہترین نعمت پیش کرتا ہوں، تم میں سے کون میرا ساتھ دیتا ہے اور کون میرا معاون و مددگار بنتا ہے؟ اس کے جواب میں صرف ایک آواز بلند ہوئی جو حضرت علی المرتضیٰ رضؓ شیرِ خدا کی تھی۔ آپ نے کہا "گو میں عمر میں سب سے چھوٹا ہوں اور مجھے آشوبِ چشم کا عارضہ ہے اور میری ٹانگیں پتلی ہیں، تاہم میں آپؐ کا معاون و مددگار اور قوتِ بازو بنوں گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر آپ کو بیٹھ جانے کا حکم دیا اور پھر حاضرین مجلس سے خطاب فرمایا، لیکن اب کی بار حضرت علی رضؓ کے علاوہ کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ آنحضرت صلعم نے تیسری مرتبہ پھر اپنے سوال کو دہرایا، مگر جب اس بارِ گراں کو اٹھانے کے لیے کوئی آواز نہ ابھری تو حضرت علی رضؓ نے جانبازی کے لہجہ میں انہی الفاظ کا اعادہ کیا۔ اس پر حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو بیٹھ جانے کا حکم دیا اور ارشاد فرمایا:

"تم میرے وارث اور بھائی ہو" [1]

ہجرت

بعثت کے بعد تقریباً تیرہ برس تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کی گھاٹیوں میں صدائے اسلام بلند کرتے رہے، لیکن مشرکین قریش نے اس دعوتِ حق کا جواب محض بغض و عناد سے دیا اور آپؐ کے متبعین پر طرح طرح کے مظالم روا رکھے۔ جب کفار کے مظالم حد سے بڑھ گئے اور اہلِ اسلام پر عرصۂ حیات تنگ ہونے لگا تو رحمۃ اللعالمین ؐ نے اپنے فدائیوں کو ہجرتِ مدینہ کا حکم دیا، چنانچہ تھوڑے ہی دنوں میں چند نفوسِ قدسیہ کے علاوہ باقی مسلمان مدینہ ہجرت کر گئے۔ اب مشرکین کو یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ چونکہ مسلمان ان کے پنجۂ اقتدار سے آزاد ہو گئے ہیں، اس لیے کہیں اپنی قوت مضبوط کر کے ہم سے انتقام لینے پر نہ تل جائیں نتیجۃً اس خطرہ نے انہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جان کا دشمن بنا دیا، چنانچہ انہوں نے باہمی مشورہ سے خدا کے آخری پیغمبر کو قتل کرنے کے ارادہ سے رات کے وقت کاشانۂ نبوت کا محاصرہ کر لیا، لیکن مشیتِ ایزدی تو یہ تھی کہ آفتابِ رسالت ؐ کے نور سے تمام عالم منور ہو جائے اور توحید کی روشنی سے شرک کی ظلمت کافور ہو جائے، اس لیے وحیِ الٰہی نے آنحضرت صلعم کو کفار کے ارادوں کی اطلاع دے دی اور ہجرت مدینہ کا حکم ہوا آنحضرت صلعم نے اس خیال سے کہ کفار کو شبہ نہ ہو حضرت علی رضؓ کو اپنے بستر پر استراحت کا حکم دیا اور خود حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کو ساتھ لے کر مدینہ روانہ ہو گئے۔

جاں نثاری کا عدیم المثال کارنامہ

حضرت علی رضؓ کو پتہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بسترِ اطہر پر لیٹنا گویا خود موت کو دعوت دینا ہے مگر آپ نے ارشادِ نبوت کے مقابلہ پر اپنی جان کو پرِ کاہ کے برابر بھی خیال نہ کیا اور موت کے خطرہ سے بے نیاز ہو کر محوِ استراحت ہو گئے۔ اس وقت حضرت علی رضؓ کی عمر بائیس تئیس سال سے زیادہ نہ تھی، اس عنفوانِ شباب میں اس جرأتِ ایمانی سے اپنی زندگی کو قربانی کے لیے پیش کرنا بلا شبہ فدائیت و جاں نثاری کا عدیم المثال کارنامہ ہے

[1] سیر الصحابہ رضؓ خلفائے راشدین

بہر حال محاصرہ رات بھر جاری رہا اور مشرکین اس دھوکہ میں رہے کہ بستر پہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم محوِ استراحت ہیں، لیکن صبح جب انہیں معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بستر مبارک پر شہنشاہ کونینؐ کی جگہ ان کے ایک فدائی سر بکف سو رہے ہیں تو اپنی غفلت پر بہت جھنجھلائے، پہلے تو وہ غصے و ندامت کے عالم میں جناب امیر رضؓ پر پل پڑے مگر پھر انہیں چھوڑ کر اپنے اصل مقصود کی تلاش و جستجو میں روانہ ہو گئے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لے جانے کے بعد دو یا تین دن تک مکہ میں مقیم رہے، مکہ میں چونکہ آنحضرت صلعم کا لوگوں سے کاروبار اور لین دین تھا، اس لیے آپ نے آنحضرت صلعم کی ہدایت کے مطابق پہلے لوگوں کے معاملات سے فراغت حاصل کی اور پھر عازمِ مدینہ ہوئے، ان دنوں آنحضرت صلعم حضرت کلثوم رضؓ بن ہدم کے ہاں فروکش تھے، حضرت علیؓ بھی انہی کے مکان میں جا کر مقیم ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مہاجرین و انصار میں بھائی چارہ کرایا، تو حضرت علی رضؓ کو اپنا بھائی بنایا۔

تعمیرِ مسجد

مدینہ میں اسلام مکہ کی طرح بے بس و مجبور نہ تھا، یہاں ہر آدمی خدائے واحد کی پرستش اور احکامِ شرعیہ کو اطمینان اور دلجمعی سے ادا کرنے کے لیے آزاد تھا، یہ انہی آزاد فضاؤں کا اثر تھا کہ مسلمانوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی تھی، چنانچہ مدینہ منورہ پہنچنے کے فوراً بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک مسجد تعمیر کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ حضورؐ نے اس کی بنیاد رکھی اور اپنے صحابہؓ کے ساتھ خود بھی اس کی تعمیر میں حصہ لیا۔ حضرت علی رضؓ کرم اللہ وجہہ تعمیرِ مسجد کے لیے گارا اور پتھر لا لا کر دیتے اور یہ رجز پڑھتے تھے۔

جو مسجد تعمیر کرتا ہے، کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر اس مشقت کو برداشت کرتا ہے اور جو گرد و غبار کے باعث اس کام سے جی چراتا ہے، وہ برابر نہیں ہو سکتے۔ (ترجمہ)

غزوہ بدر

سلسلہ غزوات میں سب سے پہلا معرکہ غزوہ بدر ہے۔ اس غزوہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے تین سو تیرہ جانبازوں کے ساتھ مدینہ سے روانہ ہوئے، آگے آگے دو سیاہ رنگ کے علم تھے۔ جن میں سے ایک حیدرِ کرار رضؓ کے ہاتھ میں تھا۔ بدر کے قریب پہنچ کر پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے دشمن کی نقل و حرکت کا پتہ چلانے کے لیے حضرت علی رضؓ کو معہ چند منتخب جانبازوں کے بھیجا، آپ نے نہایت خوبی کے ساتھ یہ خدمت انجام دی، چنانچہ مجاہدین نے مشرکین سے پہلے پہنچ کر جنگی اہمیت کے اہم مقامات پر قبضہ کر لیا، جنگ کی ابتداء ۱۷ رمضان المبارک سنہ ۲ھ کو ہوئی۔ قاعدہ کے موافق پہلے تنہا تنہا مقابلہ کے لیے قریش کی صفوں سے تین نامی بہادر نکل کر مسلمانوں سے مبارز طلب ہوئے، تین انصاری مقابلہ کے لیے نکلے، قریش کے بہادروں نے ان کا نام و لقب دریافت کیا۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ یہ جوان یثرب کے ہیں تو انہوں نے ان کے ساتھ لڑنے سے انکار کر دیا اور آنحضرت صلعم کو پکار کر کہا کہ مقابلہ میں اُن کے ہم پلہ آدمی بھیجے جائیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خاندان کے تین عزیزوں کے نام لیے، حکم کی دیر تھی کہ حضرت حمزہ رضؓ حضرت علی رضؓ اور حضرت عبیدہ رضؓ میدان میں آ گئے، حضرت علی رضؓ نے اپنے حریف ولید کا ایک ہی وار میں کام تمام کر دیا۔ پھر جھپٹ کر حضرت عبیدہ رضؓ کی مدد کو پہنچے اور اُن کے حریف شیبہ پر کاری ضرب لگا کر اسے جہنم رسید کیا، مشرکین نے طیش میں آ کر عام ہلہ بول دیا، یہ دیکھ کر مجاہدین بھی نعرہ تکبیر بلند کرتے ہوئے کفار کے نرغہ میں گھس گئے اور عام جنگ شروع ہو گئی۔ شیرِ خدا نے صفوں کی صفیں الٹ دیں اور جس طرف بھی رُخ کیا۔ ذوالفقارِ حیدری بجلی کی طرح چمکتی دشمنانِ اسلام کے پرخچے اڑاتی چلی گئی، مشرکین کے پاؤں اکھڑ گئے اور مسلمان مظفر و منصور بے شمار مالِ غنیمت اور تقریباً ستر قیدیوں کے ساتھ مدینہ واپس ہوئے۔ مالِ غنیمت میں حضرت علیؓ

کو ایک زرہ، ایک اونٹ اور ایک تلوار ملی۔

حضرت فاطمہؓ سے نکاح

اسی سال یعنی ۲ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضؓ کو اپنی دامادی کا شرف بخشا، یعنی اپنی سب سے چھوٹی اور محبوب ترین صاحبزادی سیدۃ النساء حضرت فاطمۃ الزہراؓ سے نکاح کر دیا۔ مؤرخین کے مطابق جب حضرت علی رضؓ نے سیدہ فاطمہؓ سے نکاح کا پیغام بھیجا، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضؓ سے پوچھا، تمہارے پاس مہر ادا کرنے کے لیے کچھ ہے؟ عرض کی کہ ایک گھوڑے اور زرہ کے سوا کچھ نہیں، ارشاد ہوا "گھوڑا تو لڑائی کے لیے ہے، البتہ زرہ کو فروخت کر دو" حضرت علی رضؓ نے ارشادِ نبوتؐ کی تعمیل کرتے ہوئے چار سو اسی درہم میں اپنی زرہ حضرت عثمان رضؓ کے ہاتھ بیچی اور رقم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کی، حضورؐ نے حضرت بلالؓ کو بازار سے عطر اور خوشبو خریدنے کا حکم دیا۔ چنانچہ خود نکاح پڑھایا اور دونوں میاں، بیوی پر وضو کا پانی چھڑک کر خیر و برکت کی دعا دی۔

نکاح کے چند ماہ بعد رخصتی عمل میں آئی، اس وقت تک چونکہ حضرت علی رضؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہتے تھے، اس لیے رخصتی کے وقت حضورؐ نے حضرت علی رضؓ سے فرمایا کہ ایک مکان کرایہ پر لے لو، حضرت علی رضؓ نے حارث بن النعمان رضؓ کا مکان کرایہ پر حاصل کیا اور خاتونِ جنت کو رخصت کرا کے اس میں لے آئے۔

صحیح روایات کے مطابق سیدہ زہرا رضؓ کو ایک پلنگ، ایک بستر، ایک چادر، دو چکیاں اور ایک مشکیزہ جہیز میں ملا عجیب اتفاق ہے کہ یہی چیزیں سیدہ فاطمہ رضؓ کی زندگی تک ان کی رفیق رہیں اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ اس میں کوئی اضافہ نہ کر سکے۔

دعوتِ ولیمہ

حضرت علی رضؓ کی زندگی نہایت فقیرانہ و زاہدانہ تھی، شادی سے پہلے آپ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہتے تھے۔ اس لیے آپ کے پاس کوئی اندوختہ موجود نہ تھا، آپ کی ذاتی ملکیت صرف ایک اونٹ تھا، آپ نے اس کے ذریعہ اذفر (ایک قسم کی گھاس) کی تجارت کر کے کچھ رقم جمع کرنے کا ارادہ کیا۔ اتفاق سے حضرت حمزہؓ نے اونٹ ذبح کر کے سیخ کباب بنا دیا۔ چنانچہ جب یہ ذریعہ بھی ختم ہو گیا، تو اقلیم زہد کے اس تاجدار نے اسی رقم سے دعوت ولیمہ کا سامان کیا زرہ کی قیمت میں سے مہر ادا کرنے کے بعد بچ رہی تھی، آپ نے دعوت میں کھجور، جو کی روٹی، پنیر اور ایک خاص قسم کے شوربہ کا انتظام کیا جو اس زمانہ کے لحاظ سے نہایت پر تکلف ولیمہ تھا، حضرت اسماءؓ کا بیان ہے کہ اس زمانہ میں اس سے بہتر ولیمہ نہیں ہوا[1]

غزوۂ اُحد

۳ھ میں اُحد کا معرکہ پیش آیا، ۷ شوال بروز ہفتہ لڑائی شروع ہوئی اور مسلمان اس بہادری سے لڑے کہ غنیم کو بھاگتے ہی بنی لیکن ایک درہ کے محافظ تیر اندازوں کا اپنی جگہ سے ہٹنا تھا کہ مشرکین غفیب نے یکایک اس طرح ٹوٹ پڑے کہ مسلمانوں کے اوسان خطا ہو گئے۔ اسی حالت میں اللہ کے رسولؐ زخمی ہو کر خندق میں گر پڑے، مشرکین ادھر بڑھے کہ حضرت مصعب بن عمیرؓ سدِ راہ ہوئے حتیٰ کہ لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔ اس کے بعد حیدر کرارؓ نے علم سنبھالا اور نہایت بے جگری کے ساتھ دادِ شجاعت دی، مشرکین کے علمبردار ابو سعد بن ابی طلحہ نے للکارا۔ شیرِ خدا نے آگے بڑھ کر ایسا وار کیا کہ وہ زمین پر گرا اور بدحواسی کے عالم میں برہنہ ہو گیا، حیدر کرارؓ

---

[1] سیر الصحابہؓ خلفائے راشدین۔

کو اس کی بے لبسی پر رحم آ گیا اور اُسے زندہ چھوڑ کر واپس آ گئے۔

جب مشرکین کا زور کم ہوا تو حضرت علی رضؓ معہ دیگر صحابہ رضؓ کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہاڑ پر لے گئے۔ ڈھال میں پانی بھر بھر کر لائے جس سے حضرت فاطمہ رضؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زخم کو دھویا اور چٹائی جلا کر اس کی راکھ زخم پر رکھی کہ خون بند ہو جائے۔

غزوۂ خندق

ذیقعدہ ۵ھ میں غزوۂ خندق پیش آیا، کفار کے ایک لشکر جرار نے تقریباً ایک ماہ تک مدینہ کا محاصرہ کیے رکھا، کفار خندق کھد جانے کے باعث مدینہ کے اندر تو داخل نہ ہو سکے تاہم تیر اور پتھر برساتے رہے، مگر مسلمانوں کے صبر و استقلال کے سامنے ان کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی، آخر ایک روز سواروں کا ایک دستہ خندق کا ایک کم چوڑا حصہ دیکھ کر سلع اور خندق کے درمیان والے میدان میں پہنچ گیا، اس دستہ کا سردار عمرو بن عبدود تھا جو اگرچہ نوّے سال کا تھا، مگر بہادری میں بے مثال تھا، اس نے تنہا مقابلہ کی دعوت دی، حضرت علی رضؓ سامنے آئے اور اسے لڑنے کے لیے للکارا، وہ حضرت علی رضؓ کو دیکھ کر ہنس پڑا اور کہنے لگا" اس آسمان کے نیچے ایسی درخواست بھی مجھ سے کی جا سکتی ہے"۔ بہر حال وہ گھوڑے سے نیچے اُتر پڑا اور پوچھا تم کون ہو؟ حضرت علی رضؓ نے اپنا نام بتایا۔ اس نے سُن کر کہا "مَیں تم سے لڑنا نہیں چاہتا" حضرت علی رضؓ نے فرمایا" لیکن مَیں تم سے لڑنا چاہتا ہوں"۔ یہ سنتے ہی اس نے حضرت علی رضؓ پر ایک زبردست وار کیا، جسے انہوں نے ڈھال پر روکا۔ البتہ آپ کی پیشانی زخمی ہو گئی، اس کے بعد حضرت علی رضؓ نے وار کیا اور ابن عبدود کی لاش زمین پر تڑپنے لگی، اس کا مقتول ہونا تھا کہ باقی کفار بھاگ کھڑے ہوئے، اس محاصرہ کے دوران اگرچہ مسلمان سخت مصیبت میں مبتلا رہے، تاہم بتائید ایزدی یہ معرکہ بھی مجاہدین کرام رضؓ کے ہاتھ رہا۔

غزوۂ بنو قریظہ

غزوۂ خندق کے بعد غزوہ بنو قریظہ پیش آیا، بنو قریظہ نے مسلمانوں سے معاہدہ کے باوجود قریش کا ساتھ دیا تھا اور عرب کے تمام قبائل کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکایا تھا، مسلمان غزوہ خندق سے کامیاب لوٹے ہی تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بنو قریظہ کا محاصرہ کرنے کی وحی ہوئی، چنانچہ آنحضرت صلعم نے حسب ارشاد الٰہی بنو قریظہ کا محاصرہ فرما لیا۔ اس مہم میں عَلم حضرت علی رضؓ کے ہاتھ میں تھا اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد کے مطابق قلعہ پر قبضہ کر کے اس کے صحن میں نمازِ عصر ادا کی۔

سریہ فدک

شعبان ۶ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ملی کہ خیبر کے یہودیوں کی مدد کے لیے بنو سعد بن بکر نے فدک کے قریب لشکر جمع کیا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضؓ کو بنو سعد کی سرکوبی پر مامور فرمایا، آپ ایک مختصر سی جمعیت کے ساتھ بنو سعد پر حملہ آور ہوئے اور انہیں منتشر کر کے پانچ سو اونٹ اور دو ہزار بکریاں مالِ غنیمت میں لائے۔

صلح حدیبیہ

اس کے تقریباً دو ماہ بعد یعنی یکم ذیقعدہ ۶ھ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چودہ سو صحابہ رضؓ کرام کے ساتھ زیارت کعبہ کا ارادہ فرمایا۔ جب آپؐ حدیبیہ کے مقام پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ مشرکین مکہ مزاحمت کریں گے، حضور صلعم نے حضرت عثمان رضؓ کو سفیر بنا کر بھیجا کہ وہ مشرکین کے ساتھ اس معاملہ کے متعلق گفتگو کریں، کفار مکہ نے انہیں روک لیا، ادھر مسلمانوں میں یہ خبر مشہور ہو گئی کہ حضرت عثمان رضؓ شہید کر دیے گئے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان رضؓ کا انتقام لینے کے لیے مسلمانوں سے بیعت لی، حضرت علی رضؓ بھی اس بیعت میں شریک تھے، بعد میں جب یہ معلوم ہوا کہ شہادت کی خبر غلط تھی، تو مسلمانوں کا جوش قدرے

کم ہُوا اور طرفین میں مصالحت کی بات چیت شروع ہوگئی۔ نتیجۃً فریقین ایک معاہدہ پر رضامند ہوگئے، جسے ضبطِ تحریر میں لانے کے لیے حضرت علی رضؓ کو کاتب مقرر کیا گیا، حضرت علیؓ نے دستور کے مطابق محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبارت سے عہدنامہ کی ابتدا کی مشرکین نے لفظ "رسول اللہ" پر اعتراض کیا کہ اگر ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو رسول تسلیم کر لیتے تو جھگڑا ہی کیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لفظ کو مٹا دینے کا حکم دیا، لیکن حضرت علیؓ کی غیرت نے گوارا نہ کیا اور عرض کی خدا کی قسم میں اس کو نہیں مٹا سکتا۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے دستِ مبارک سے اس کو مٹایا، اس کے بعد معاہدہ صلح لکھا گیا اور آنحضرت صلعم زیارت کا ارادہ ملتوی فرما کر مدینہ تشریف لائے۔

غزوہ خیبر محرم ۷ھ میں خیبر پر فوج کشی ہوئی، عرب میں خیبر یہودیوں کا گڑھ تسلیم ہوتا تھا۔ خیبر کی بستی مدینہ سے تقریباً دو سو میل کے فاصلے پر تھی اور متعدد قلعوں پر مشتمل تھی، مسلمانوں نے یکے بعد دیگرے تمام قلعے فتح کر لیے مگر ایک قلعہ جس کا نام قموص تھا کسی طرح فتح نہیں ہو رہا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تسخیر پر پہلے حضرت ابوبکر رضؓ اور ان کے بعد حضرت عمر رضؓ کو مامور فرمایا، لیکن کامیابی نہ ہوئی، یہاں تک کہ محاصرہ کو بیس دن گزر گئے۔ آخری دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کل علَم اس شخص کو دیا جائے گا جس سے اللہ اور اس کا نبیؐ محبت کرتے ہیں۔ یہ خاص علَم حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ کی چادر سے بنایا گیا تھا۔

صبح ہوئی تو سب صحابہؓ منتظر تھے کہ قرعہ کس خوش قسمت کے نام نکلتا ہے اور اس فخر و شرف کا تاج کس کے سر پر رکھا جاتا ہے کہ دفعۃً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضؓ کا نام لیا، یہ آواز غیر متوقع تھی، کیونکہ حیدرِ کرارؓ آشوبِ چشم میں مبتلا تھے۔ حضرت علی رضؓ حاضر ہوئے، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا لعابِ دہن ان کی آنکھوں پر لگایا جس سے شکایت فوراً جاتی رہی، اس کے بعد علَم مرحمت فرمایا، حضرت علیؓ نے پوچھا یا رسولؐ اللہ کیا میں لڑ کر اُن کو مسلمان بناؤں؟ ارشاد ہُوا "نہیں بلکہ پہلے اسلام پیش کرو، اگر ایک شخص بھی تمہاری ہدایت سے اسلام لائے تو سُرخ اُونٹوں سے بہتر ہے۔

لیکن اہلِ خیبر کی قسمت میں چونکہ اسلام کی عزت کی بجائے شکست کی ذلت و رسوائی لکھی تھی۔ اس لیے انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حکم سے کوئی فائدہ نہ اُٹھایا۔ اُن کا سردار مرحب سر پر یمنی زرد رنگ کا مغفر اور اس پر سنگی خود پہنے یہ رجز پڑھتا ہُوا باہر نکلا:

"خیبر جانتا ہے کہ مَیں مرحب ہوں، دلیر ہُوں، تجربہ کار ہُوں، سلاح پوش ہوں۔"

مرحب کے جواب میں حضرت علی رضؓ نے یہ رجز پڑھا۔

"مَیں وہ ہُوں کہ میری ماں نے میرا نام شیر رکھا تھا۔ جنگل کے شیر کی طرح مہیب اور ڈراؤنا[1]"

اور جھپٹ کر مرحب پر اس زور کا وار کیا کہ ذوالفقارِ حیدری اس کے سر کو کاٹتی ہوئی دانتوں تک اُتر آئی اور ضربت کی آواز فوج تک پہنچی، اس کے بعد حیدرِ کرارؓ نے بڑھ کر حملہ کیا اور حیرت انگیز شجاعت کے ساتھ قلعہ قموص کو مسخر کر لیا۔

مکہ کی مُہم رمضان المبارک ۸ھ میں مکہ پر فوج کشی کی تیاریاں شروع ہوئیں، یہ تیاریاں اگرچہ نہایت رازداری کے انداز میں کی گئی

---

[1] سیرۃ النبیؐ جلد اوّل

تھیں تاہم مشہور صحابی حضرت حاطب رضؓ بن ابی بلتعہ سے یہ لغزش ہوگئی کہ آپ نے مدینہ منورہ کے حالات سے قریش مکہ کو مطلع کرنے کے لیے ایک عورت کو روانہ کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب بذریعہ وحی اس کی اطلاع ہوئی، تو آپؐ نے حضرت علی رضؓ، حضرت زبیر رضؓ اور حضرت مقداد رضؓ کو اس کی گرفتاری پر مامور فرمایا، ان حضرات نے قاصدہ کا تعاقب کیا اور خاخ کے باغ میں اسے گرفتار کرکے خط مانگا۔ پہلے اس نے لاعلمی ظاہر کی مگر پھر جامہ تلاشی کے خوف سے خط ان کے حوالے کر دیا۔ تینوں صحابہ رضؓ نے واپس مدینہ پہنچ کر خط آنحضرت صلعم کی خدمت میں پیش کیا، حضورؐ نے حضرت حاطب رضؓ سے اس کی وجہ پوچھی، انہوں نے عرض کیا یا رسولؐ اللہ، اس خط سے مخبری یا اسلام دشمنی مقصود نہیں تھی اور نہ ہی قریش سے میرا کوئی نسبی تعلق ہے۔ میں نے اس خیال سے یہ خط لکھا تھا کہ اگر کوئی نازک وقت آئے تو میرے بچے بے یار و مددگار نہ رہ جائیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عذر کو قبول کیا اور لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ انہوں نے سچ کہا ہے۔ لیکن حضرت عمر رضؓ کی آتش غضب بھڑک چکی تھی، انہوں نے حضورؐ سے حضرت حاطب رضؓ کے قتل کی اجازت چاہی لیکن رحمۃٌ للعالمینؐ نے فرمایا:۔

"یہ بدری ہیں، کیا تم کو معلوم نہیں کہ بدریوں کے تمام گناہ معاف ہیں[1]"

غرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ۱۰ رمضان المبارک ۸ھ کو مدینہ منورہ سے روانہ ہو کر دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ بڑے فاتحانہ جاہ و جلال کے ساتھ اس سرزمین میں داخل ہوئے جہاں سے آٹھ سال پہلے مسلمانوں کو نکالا گیا تھا، بتائید ایزدی مکہ بلا کسی خونریزی کے تسخیر ہوگیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خانہ کعبہ میں داخل ہوئے، خلیل ؑ بت شکن کی یادگار کے گرد تین سو ساٹھ بت نصب تھے۔ حضورؐ نے سب سے پہلے بتوں کو گرانے کا فریضہ ادا فرمایا، پھر خانہ کعبہ کے اندر حضرت ابراہیمؑ و اسمعیلؑ کی مورتوں کو الگ کروایا اور تطہیر کعبہ کے بعد اندر داخل ہوئے۔ لیکن چونکہ اس وحدت کدہ کا گوشہ گوشہ بتوں کی مورتوں سے اٹا ہوا تھا، اس اہتمام کے باوجود تانبے کا سب سے بڑا بت باقی رہ گیا، یہ لوہے کی سلاخ سے پیوست اگرچہ زمین میں نصب تھا، تاہم بہت بلندی پر تھا، پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضؓ کے کاندھوں پر چڑھ کر اس کو گرانے کی کوشش کی، لیکن وہ جسم اطہر کا بار نہ سنبھال سکے۔ اس لیے حضورؐ نے حضرت علی رضؓ کو اپنے شانۂ اقدس پر چڑھا کر اس کو گرانے کا حکم دیا۔ حضرت علی رضؓ نے حسب ارشادِ نبوتؐ بت کو سلاخ سے علیحدہ کرکے اسے پاش پاش کر ڈالا اور خانہ کعبہ کی کامل تطہیر ہوگئی۔[2]

ایک غلطی کا ازالہ

فتح مکہ کے بعد شوال ۸ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد رضؓ بن ولید کو تین سو پچاس مجاہدین کے ساتھ بنی جذیمہ میں تبلیغ اسلام کے لیے روانہ فرمایا، حضرت خالد رضؓ نے بنو جذیمہ کو دعوتِ اسلام دی جسے انہوں نے قبول کیا، مگر اپنی جہالت اور بدویت کے باعث اسلمنا کی بجائے صبانا (یعنی ہم بے دین ہوگئے) کہنے لگے، حضرت خالد رضؓ نے اس بنا پر سب کو قید کر لیا اور اکثر کو قتل کر ڈالا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو بے چین ہوگئے اور فرمایا:۔

"خداوندا، میں اس سے بری ہوں۔ جو خالد رضؓ نے کیا۔"

پھر حضورؐ نے حضرت علی رضؓ کو اس غلطی کی تلافی کے لیے روانہ فرمایا، فاتح خیبر نے وہاں پہنچ کر تمام قیدیوں کو آزاد کرا دیا اور مقتولین کے

---

[1] سیر الصحابہ رضؓ خلفائے راشدین، [2] ایضاً

معاوضہ میں خون بہا دیا۔

غزوۂ حنین

فتح مکہ کے بعد اسی ماہ میں حنین کا عظیم الشان معرکہ پیش آیا۔ اس معرکہ میں دشمن نے ایک ایسی جنگی حکمت عملی سے کام لیا کہ مسلمانوں میں افراتفری پھیل گئی اور بارہ ہزار مجاہدین میں سے صرف چند ثابت قدم رہ سکے۔ اس میں حضرت علی رضؓ بھی تھے، آپ نہ صرف خود پامردی و استقلال کے ساتھ قائم رہے بلکہ اپنی غیر معمولی شجاعت سے لڑائی کو بھی سنبھال لیا اور غنیم کے امیرِ عسکر پر حملہ کر کے اس کا کام تمام کر دیا اور دوسری طرف جو مجاہدین ثابت قدم رہ گئے تھے وہ اس بے جگری سے لڑے کہ مسلمانوں کی ابتری اور پریشانی کے باوجود دشمن کو شکست ہوئی۔

سریہ بنو طے

ربیع الآخر ۹ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضؓ کو ڈیڑھ سو مجاہدین کے ساتھ قبیلہ بنو طے کا مشہور بت فلس منہدم کرنے کے لیے روانہ فرمایا۔ آپ نے وہاں پہنچ کر فجر کے وقت قبیلہ طے پر حملہ کیا، بت خانہ منہدم کر کے عورتیں اونٹ اور بکریاں گرفتار کر لیں۔ قیدی عورتوں میں مشہور سخی حاتم طائی کی لڑکی سفانہ بھی تھیں۔

اہل بیت کی حفاظت

رجب ۹ھ میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تبوک کا قصد فرمایا تو حضرت علی رضؓ کو اہل بیت کی حفاظت کے لیے مدینہ میں رہنے کا حکم دیا۔ لشکر اسلام کی روانگی کے بعد منافقین نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت میں حضرت علی رضؓ کی طرف سے کچھ گرانی تھی، اس لیے انہیں یہاں ہی چھوڑ گئے۔ حضرت علی رضؓ کو شرکت جہاد سے محرومی کا پہلے ہی غم تھا کہ منافقین کی طعنہ زنی نے آپ کو اور رنجیدہ کر دیا۔ چنانچہ آپ مسلح ہو کر جرف کے مقام پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور منافقین کے پروپیگنڈے کا ذکر کیا۔ حضورؐ نے سن کر فرمایا کہ منافقین جھوٹ کہتے ہیں، میں نے تم کو اس لیے چھوڑا تھا کہ میرے اہل اور اپنے اہل میں میرے قائم مقام رہو، پھر ارشاد فرمایا:

"اے علی رضؓ! کیا تم اس سے راضی نہیں ہو کہ تم میرے لیے ایسے ہو جیسے ہارونؑ موسیٰؑ کے لیے، البتہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔"[1]

تبلیغ فرمانِ رسولؐ

غزوہ تبوک سے واپسی کے بعد ذیقعدہ ۹ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کو امیر حج بنا کر تین صد صحابہ رضؓ کے ساتھ مکہ روانہ فرمایا۔ ان کی روانگی کے بعد سورہ برأت کی آیتیں نقض عہد کے بارے میں نازل ہوئیں، ان آیات کو کفار کے سامنے پڑھنے کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضؓ کو مکہ روانہ فرمایا۔ آپ العرج یا ضجنان کے مقام پر حضرت ابوبکر رضؓ سے جا ملے، حضرت صدیق اکبر رضؓ نے پوچھا کہ وہ امیر ہو کر آئے ہیں یا مامور ہو کر، حضرت علی رضؓ نے جواب دیا مامور ہو کر۔

حج کے دنوں میں حضرت صدیق اکبر رضؓ نے مسلمانوں کو حج کرایا اور حضرت علی رضؓ نے سورہ برأت کی چالیس آیات پڑھ کر سنائیں اور اعلان کر دیا کہ اب کوئی مشرک خانہ کعبہ میں داخل نہ ہو سکے گا اور نہ کوئی اب برہنہ حج کرنے پائے گا، اور وہ معاہدے جو مشرکین سے تھے، ان کے نقض عہد

---

[1] طبقات ابن سعد حصہ سوم۔

کے سبب سے آج سے چار مہینے کے بعد ٹوٹ جائیں گے۔

حج سے واپسی پر حضرت صدیق اکبرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا "یا رسول اللہ! کیا میرے خلاف کوئی حکم نازل ہُوا" فرمایا "نہیں، مگر یہ مناسب نہ تھا کہ میرے اہل کے سوا اور کوئی شخص معاہدہ کے متعلق اعلان کرے۔"

سریہ علیؓ بسوئے یمن

انہی ایام میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد بن ولیدؓ کو اشاعتِ اسلام کے لیے یمن بھیجا، مگر آپ چھ ماہ کی مسلسل کوششوں کے باوجود اشاعتِ اسلام میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اس پر آنحضرت صلعم نے حضرت علیؓ کو بلا کر یمن جانے کا حکم دیا۔ حضورؐ نے خود اپنے دستِ مبارک سے حضرت علیؓ کے سر پر عمامہ باندھا جس کے تین پیچ تھے، عمامہ کا ایک کنارہ بقدر ایک ہاتھ سامنے لٹکایا اور دوسرا کنارہ ایک بالشت کے برابر پیچھے چھوڑا، پھر ان کے سینہ پر دستِ مبارک رکھ کر دعا فرمائی۔

"اے اللہ! اس کی زبان کو راست گو بنا اور اس کے دل کو ہدایت کے نور سے منور کر۔"

حضرت علیؓ کے یمن پہنچتے ہی یہاں کا رنگ تبدیل ہو گیا اور چند روز کی تعلیم و تلقین سے قبیلہ ہمدان اسلام کا شیدائی بن گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان حالات کی اطلاع ہوئی، تو آپ نے سجدۂ شکر ادا کیا اور جوشِ مسرت میں فرمایا: "السلام علیٰ ہمدان"

حج الوداع میں شرکت

حضرت علیؓ یمن میں ہی تھے کہ آپ کو اطلاع ملی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ سے حج کے لیے روانہ ہو چکے ہیں، چنانچہ آپ یہاں سے سیدھے مکہ معظمہ پہنچے اور اس یادگار حج میں شریک ہوئے۔ آپ کے ساتھ سو اونٹ قربانی کے تھے جو آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے لائے تھے، ان میں سے ترسٹھ آنحضرت صلعم نے اپنے دستِ مبارک سے ذبح کیے اور باقی کو ارشادِ نبوت کے مطابق آپ نے ذبح کیا۔

صدمہ عظیمہ

حج سے واپسی کے بعد آخر صفر ۱۱ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیمار ہوئے۔ حضرت علیؓ نے نہایت تندہی کے ساتھ تیمارداری کی اور پوری جانفشانی کے ساتھ خدمت گزاری کا فرض انجام دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری کے ایام میں حضرت عباسؓ نے حضرت علیؓ کا ہاتھ پکڑ کر کہا کہ خدا کی قسم میں موت کے وقت خاندان عبدالمطلب کے چہرے کو پہچانتا ہوں، آؤ چلو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کریں کہ ہمارے لیے خلافت کی وصیت کر جائیں، آپ نے جواب دیا، میں نہیں کروں گا۔ اگر خدا کی قسم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انکار کر دیا، تو پھر آئندہ کوئی امید باقی نہیں رہے گی۔[1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چند روز کی مختصر علالت کے بعد ۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ بروز دوشنبہ بوقتِ چاشت مسلمانوں کو اپنی مفارقت کا داغ دیا۔ حضرت علیؓ چونکہ حضورؐ کے قریب ترین عزیز اور خاندان کے رکنِ اولین تھے۔ اس لیے غسل اور تجہیز و تکفین کے تمام مراسم انہی کے ہاتھ سے انجام پائے۔ ایک روایت میں ہے کہ ایک انصاری حضرت اوس بن خولیؓ کو بھی شرکت کا شرف حاصل ہوا۔

خلیفہ اول کی بیعت، توقف کی وجہ: سقیفہ بنو ساعدہ کی مجلس نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت پر اتفاق کیا اور

---

[1] سیر الصحابہؓ خلفائے راشدین

تقریباً تمام اہل مدینہ نے بیعت کی۔ البتہ صحیح روایات کے مطابق حضرت علیؓ نے چھ مہینے دیر کی، لوگوں نے اس توقف کے عجیب و غریب وجوہ بیان کیے ہیں، لیکن صحیح یہ ہے کہ حضرت فاطمۃ الزہراؓ کی سوگوار زندگی نے ان کو بالکل خانہ نشین بنا دیا تھا، آپ اس عرصہ میں تمام معاملات سے قطع تعلق کر کے صرف ان کی تسلی و دلدہی اور قرآن حکیم جمع کرنے میں مصروف رہے، چنانچہ جب سیدۃ النساء حضرت فاطمہؓ کا انتقال ہوگیا تو آپ نے خود ابوبکرؓ سے ان کے فضل کا اعتراف کیا اور بیعت کر لی۔

عہدِ فاروقی

خلیفہ اول نے سوا دو سال کی خلافت کے بعد وفات پائی اور حضرت عمرؓ مسند آرائے خلافت ہوئے۔ حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں، حضرت علیؓ کو خصوصی مشیر کی حیثیت حاصل رہی، حضرت عمرؓ بڑی بڑی مہمات میں آپ کے مشورے کے بغیر کام نہیں کرتے تھے اور آپ بھی نہایت دوستانہ اور مخلصانہ مشورے دیتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے نہاوند کے معرکہ میں آپ کو سپہ سالار بنانا چاہا مگر آپ نے قبول نہ کیا۔ فاروق اعظمؓ جب بیت المقدس گئے تو کاروبارِ خلافت آپؓ کے سپرد کر گئے۔ غرض دونوں بزرگوں میں باہمی عزت و احترام اور اتحاد و یگانگت کا رشتہ حضرت عمرؓ کے آخری لمحہ حیات تک نہایت مستحکم رہا اور اس میں کسی قسم کی کوئی کمی نہ آنے پائی۔

دورِ عثمانی

حضرت عمر فاروق اعظمؓ کے بعد حضرت عثمانؓ خلیفہ بنے اور تقریباً بارہ سال تک خلیفہ رہے، آپ کی خلافت کے ابتدائی پانچ چھ سال نہایت امن و سکون سے گزرے۔ فتوحات کی وسعت مال غنیمت کی فراوانی، محاصل و خراج کی زیادتی، ... کی کثرت اور زراعت و تجارت کی ترقی نے جہاں ملک کو فارغ البالی اور عیش و تنعم کے سامانوں سے معمور کر دیا، وہاں بغض و حسد اور رشک و رقابت کا قدم بھی آیا۔ چنانچہ آپ کے دورِ خلافت میں جب فتنہ و فساد شروع ہوا، تو حضرت علیؓ نے اس آگ پر قابو پانے کے لیے نہایت مخلصانہ مشورے دیے۔ ایک دفعہ حضرت عثمانؓ نے حضرت علیؓ سے ملک میں موجودہ شورش و ہنگامہ کی حقیقی وجہ اور اسے رفع کرنے کے متعلق ان کی رائے پوچھی تو آپ نے نہایت خلوص و آزادی سے فرمایا کہ موجودہ بے چینی تمام تر آپ کے عمال کی پیش نظر تھے پھر ان سے عام ... کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی؟ جناب علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا بے اعتدالیوں کا نتیجہ ہے۔ حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ میں نے عمال کے انتخاب میں انہی صفات کو سامنے رکھا ہے جو فاروق اعظمؓ کے یہ سچ ہے لیکن حضرت عمرؓ نے سب کی نکیل اپنے ہاتھ میں رکھی تھی اور گرفت ایسی شدید تھی کہ عرب کا سرکش سے سرکش اونٹ بھی بلبلا اٹھا برخلاف اس کے آپ ضرورت سے زیادہ نرم دل ہیں آپ کے عمال اس سے فائدہ اٹھا کر من مانی کارروائیاں کرتے ہیں اور رعایا سمجھتی ہے کہ یہ سب کچھ دربارِ خلافت کے احکام کی تعمیل ہے۔ نتیجۃً عمال کی تمام بے اعتدالیوں کا ہدف بننا پڑتا ہے۔[1]

سب سے آخر یعنی ۳۴ھ میں مصری وفد کا معاملہ پیش آیا، مصر کے بلوائیوں نے حضرت عثمان کو شہید کرنے کی نیت سے ... کی حضرت عثمانؓ نے حضرت علیؓ کو بلا کر فرمایا کہ آپ جو کچھ مشورہ دیں میں اس پر عمل کرنے کے لیے تیار ہوں، آپ باغیوں کو واپس کر دیں پہلے تو حضرت علیؓ نے انکار کیا، لیکن پھر معاملہ کی اہمیت اور حضرت عثمانؓ کے اصرار سے مجبور ہو کر درمیان میں پڑے اور حضرت عثمانؓ سے اصلاحات کا وعدہ لے کر باغیوں کو اپنی ذمہ داری پر واپس کیا لیکن ابھی اس خوش آئند خواب کی تعبیر نہ نکلی تھی کہ ایک دن دفعۃً مصر کے باغیوں

---

[1] تاریخ طبری

کاگروہ مدینہ پہنچ گیا اور واپسی کا سبب یہ بیان کیا کہ وہ ابھی راہ میں تھے کہ انہیں ایک ہرکارہ مصر کی طرف جاتے ہوئے ملا۔ انہیں اس پر شک گزرا چنانچہ جب اس کی تلاشی لی گئی تو اس کے پاس سے ایک فرمان ملا جس میں والئی مصر کو ہدایت کی گئی تھی کہ وفد کے تمام شرکاء کو تہہ تیغ کر دیا جائے۔ حضرت علی رضؓ اس فرمان کو لے کر حضرت عثمان رضؓ کے پاس پہنچے اور اس کی حقیقت دریافت کی، اُنہوں نے حیرت کے ساتھ لاعلمی ظاہر کی، حضرت علی رضؓ نے کہا کہ مجھے بھی آپ سے ایسی توقع نہیں ہو سکتی، لیکن اب میں آئندہ کسی معاملہ میں نہ پڑوں گا۔ چنانچہ اس کے بعد حضرت علی رضؓ بالکل عزلت نشین ہو گئے۔[1]

مصریوں نے جوشِ انتقام میں نہایت سختی سے کاشانۂ خلافت کا محاصرہ کر لیا اور اس معاملہ میں یہاں تک شدت کی کہ باہر سے کوئی شے اندر نہ جانے دیتے تھے۔ حضرت علی رضؓ کو معلوم ہوا تو عزلت نشینی کے باوجود محاصرہ کرنے والوں کے پاس تشریف لے گئے اور انہیں ہر طرح سمجھایا، مگر باغیوں نے حضرت علی رضؓ کی سفارش کے باوجود محاصرہ میں سہولت پیدا کرنے سے قطعی انکار کر دیا۔

اس وقت مدینہ کی حالت نہایت نازک تھی۔ باغیوں پر کسی کا قابو نہیں رہ گیا تھا۔ ہر شخص کی جان خطرہ میں تھی۔ لوگوں نے گھر سے نکلنا چھوڑ دیا تھا اور بہت سے لوگ مدینہ سے ہی باہر چلے گئے تھے، لیکن حضرت علی رضؓ برابر باغیوں کو سمجھاتے رہے اور حالات کی سنگینی ختم کرنے کی مساعی فرماتے رہے۔ اس دوران میں جب دیکھا کہ ان کا جوشِ انتقام جنون کی حد تک پہنچ گیا ہے اور ان میں تحملا وصولب کی کوئی تمیز بھی باقی نہیں رہی، تو آپ نے اپنے صاحبزادوں کو حضرت عثمان رضؓ کی حفاظت کے لیے بھیج دیا۔ جنہوں نے نہایت تندہی اور جانفشانی کے ساتھ مدافعت کی۔ یہاں تک کہ اسی کش مکش میں زخمی ہو گئے۔ باغی کثیر التعداد ہونے کے باوجود اس مدافعت کی تاب نہ لا سکے۔ چنانچہ وہ دوسری طرف سے دیوار پھاند کر اندر گھس آئے اور خلیفۂ وقت کو شہید کر ڈالا۔ حضرت علی رضؓ کو معلوم ہوا، تو اس سانحہ جانکاہ پر حد درجہ متأسف ہوئے اور جو لوگ حفاظت پر مامور تھے ان پر سخت ناراضگی ظاہر کی، حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسین رضؓ کو مارا، حضرت محمدؐ بن طلحہ رضؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضؓ کو بُرا بھلا کہا کہ تم لوگوں کی موجودگی میں یہ واقعہ کس طرح پیش آیا۔

بیعتِ خلافت

حضرت عثمان رضؓ کی شہادت کے بعد تین دن تک مسندِ خلافت خالی رہی۔ مدینہ میں ایک شورِ قیامت بپا تھا اور ہر طرف باغی دندناتے پھرتے تھے، تاہم خلافت کا انتظام ضروری تھا۔ اس وقت کبار صحابہ رضؓ میں حضرت علی رضؓ کی شخصیت ایسی تھی جس پر سب کا اتفاق ہو سکتا تھا، چنانچہ لوگوں نے حضرت علی رضؓ کو منصبِ امارت سنبھالنے پر مجبور کیا، لیکن آپ نے انکار کر دیا اور فرمایا کہ امیر ہونے کے مقابلہ میں مجھے وزیر ہونا زیادہ پسند ہے، بالآخر مہاجرین و انصار صحابہ رضؓ کے بیحد اصرار پر آپ نے اس بارِ گراں کو اُٹھانا قبول فرما لیا اور حضرت عثمان رضؓ کی شہادت کے دردناک واقعہ کے تیسرے روز ۲۱ ذی الحجہ ۳۵ھ دوشنبہ کے دن لوگوں نے حضرت علی رضؓ کے دستِ اقدس پر بیعت کی، اس بیعت میں مدینہ کے تمام ممتاز صحابہ رضؓ شریک تھے۔[2]

قاتلینِ عثمان رضؓ کی تلاش

مسندِ خلافت سنبھالنے کے بعد حضرت علی رضؓ کا اولین کام حضرت عثمان رضؓ کے قاتلوں کا پتہ چلانا اور ان کو سزا دینا تھا، لیکن چند در چند وجوہ کی بنا پر اس گتھی کو سلجھانا آسان نہ تھا۔ سب سے

---

[1] سیر الصحابہ رضؓ خلفائے راشدین [2] طبقات ابنِ سعدؒ حصہ سوم۔

بڑی مشکل یہ تھی کہ متعین طور پر کسی شخص کے خلاف شہادت موجود نہ تھی۔ اس حادثۂ عظیمہ کی واحد گواہ حضرت عثمانؓ کی اہلیہ حضرت نائلہؓ تھیں جو پردہ نشین خاتون تھیں اور محمدؐ بن ابی بکرؓ کے علاوہ کسی کو پہچانتی نہ تھیں، حضرت علیؓ نے محمدؐ بن ابی بکرؓ کو پکڑا تو انہوں نے قسم کھا کر اپنی برأت ظاہر کی اور کہا کہ وہ قتل کے ارادے سے گئے ضرور تھے مگر حضرت عثمانؓ کے ایک جملہ سے شرمندہ ہو کر پیچھے ہٹ آئے، حضرت نائلہؓ نے اس بیان کی تصدیق کی، غرض حضرت علیؓ نے مجرموں کا پتہ چلانے کی ہر ممکن کوشش کی مگر کوئی سراغ نہ مل سکا۔ ایسی حالت میں حضرت علیؓ جیسے پیکر عدل و انصاف کے لیے سخت مشکل تھا کہ بغیر کسی واضح شہادت اور ٹھوس ثبوت کے کسی کو مجرم گردانتے اور قصاص لیتے، لیکن دوسری طرف عوام تو عوام اکابر صحابہؓ تک قصاص چاہتے تھے اور کسی کی حضرت علیؓ کی مجبوریوں پر نظر نہ تھی۔ چنانچہ حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ معہ چند دیگر صحابہؓ کے حضرت علیؓ سے ملے اور کہا کہ جو جماعت حضرت عثمانؓ کے قتل میں شریک ہے اس سے قصاص لینا ضروری ہے، آپ نے فرمایا کہ تم لوگ جو کچھ کہہ رہے ہو میں اس سے غافل نہیں لیکن ایسی جماعت کے ساتھ کیا کروں جس پر میرا قابو نہیں ہے۔

امیر معاویہؓ کی معزولی

حضرت علیؓ کے نزدیک اس انقلاب کا اصل سبب عمال کی بے اعتدالیاں تھیں، چنانچہ آپ نے عہدِ عثمانیؓ کے تمام عمال کو معزول کرنے کا فیصلہ کیا، حضرت مغیرہؓ بن شعبہ نے جو سیاست و تدبر میں امیر معاویہؓ کے ہم پایہ تھے۔ اس فیصلہ کی مخالفت کی اور حضرت علیؓ کی خیر خواہی کے پیش نظر یہ عاقبت اندیشانہ مشورہ دیا کہ فی الحال امیر معاویہؓ اور دوسرے عثمانیؓ عمال سے کوئی تعرض نہ کیجئے، جب وہ بیعت کرکے آپ کی خلافت تسلیم کر لیں، تو اس وقت جو دل آئے کیجئے گا۔ لیکن حضرت علیؓ اس فیصلہ پر سختی سے قائم رہے اور ۳۶ھ میں تمام عثمانیؓ عمال کو معزول کرکے ان کی جگہ نئے عمال مقرر کیے، اسی سلسلہ میں عثمانؓ بن حنیف کو بصرہ کا عامل مقرر کیا۔ عمارہؓ بن حسان کو کوفہ کی حکومت سپرد کی، حضرت عبیداللہ بن عباسؓ کو یمن کی ولایت پر مامور فرمایا اور سہل بن حنیفؓ کو حکومت شام کا فرمان دے کر روانہ کیا۔

حضرت امیر معاویہؓ کو معزول کرنا آسان نہ تھا، کیونکہ وہ خود بڑے مدبر تھے اور بیس بائیس سال سے شام کے والی چلے آ رہے تھے، چنانچہ سہل بن حنیفؓ جب حدودِ شام میں داخل ہوئے تو امیر معاویہؓ کے سوار مزاحم ہوئے اور انہیں شام کی سرحد تبوک سے ہی لوٹ آنا پڑا۔

حضرت علیؓ نے امیر معاویہؓ کو معزول کرنے کے ساتھ ہی انہیں ایک علیحدہ خط لکھا کہ مہاجرین و انصار نے اتفاق رائے سے میرے ہاتھ پر بیعت کی ہے، اس لیے یا تو میری اطاعت کرو یا جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اس وقت بڑے بڑے صحابہؓ حضرت عثمانؓ کی دردناک شہادت نیز آپ کے قاتلوں کا پتہ نہ چلنے کی وجہ سے سخت متاثر تھے۔ امیر معاویہؓ نے اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے مدینہ سے حضرت عثمانؓ کا خون آلود پیرہن اور حضرت نائلہ کی کٹی ہوئی انگلیاں منگا کر دمشق کی جامع مسجد میں آویزاں کرا دیں، اس سے شام کے مسلمانوں کے جذبات بھڑک اٹھے۔ لوگ جوق در جوق آتے تھے اور اس دردانگیز منظر کو دیکھ کر زار و قطار روتے تھے۔

امیر معاویہؓ نے حضرت علیؓ کے قاصد کو یہ منظر دکھانے کے بعد واپس کیا اور اپنے خاص قاصد کی معرفت ایک سادہ لفافہ حضرت علیؓ کے پاس بھیجا، جس پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے علاوہ کچھ تحریر نہ تھا۔ قاصد نہایت طرار اور زبان آور تھا۔ حضرت علیؓ نے اس سے شام کا حال پوچھا تو اس نے کہا کہ وہاں کے ساٹھ ہزار شیوخ حضرت عثمانؓ کے پیرہن پر رو رہے ہیں!

اس بات کا عہد کر چکے ہیں کہ جب تک اس خونِ ناحق کا قصاص نہیں لے لیں گے۔ اس وقت تک تلواریں بے نیام رہیں گی۔ اس وقت حضرت علیؓ کے سامنے حقیقت واضح ہوگئی۔ آپ نے فرمایا "خدایا میں عثمانؓ کے خون سے بری ہوں"

حضرت معاویہؓ کے مقابلہ کی تیاریاں

جب حضرت علیؓ کو واقعات کا پورا اندازہ ہوگیا تو آپ نے امیر معاویہؓ کے مقابلہ کی تیاریاں شروع کر دیں، یہ پہلا موقعہ تھا کہ مسلمانوں کی تلواریں آپس ہی میں ٹکرانے والی تھیں، اس لیے اکثر صحابہؓ اس کی شرکت کے بارہ میں متردد تھے۔ چنانچہ حضرت سعدؓ بن ابی وقاصؓ، حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ اور حضرت محمدؓ بن مسلمہؓ وغیرہ غیر جانب دار رہے۔ حضرت اسامہ بن زیدؓ نے بھی شرکت سے معذوری ظاہر کی اور کہا کہ میں نے عہد کیا ہے کہ کلمۂ شہادت پڑھنے والے سے جنگ نہ کروں گا، حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ حضرت علیؓ سے اجازت لے کر عازمِ مکہ ہوئے، غرض بہت سے محتاط صحابہؓ نے اس میں شرکت سے احتراز کیا تاہم بعض نے اپنی خدمات بھی پیش کیں [1]

حضرت عائشہؓ کی قصاص پر آمادگی

حضرت علیؓ نے امیر معاویہؓ سے مقابلہ کرنے کی تیاریوں کا ابھی آغاز ہی کیا تھا کہ دوسرا قضیہ پیدا ہوگیا جو اس سے بھی زیادہ شدید اور نازک تھا۔ اس کی تفصیل میں مورخین نے لکھا ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ ہر سال حج پر تشریف لے جایا کرتی تھیں۔ اس سال آپؓ ابھی مکہ میں ہی تھیں کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کا واقعہ پیش آیا، واپسی پر راستہ میں آپ کو ایک عزیز نے اطلاع دی کہ حضرت عثمانؓ شہید کر دیے گئے۔ حضرت علیؓ کے ہاتھ پر بیعت ہوئی، لیکن مدینہ میں ہنوز فتنہ کی گرم بازاری ہے۔ یہ خبر سن کر آپؓ مکہ لوٹ گئیں۔ لوگوں نے واپسی کا سبب پوچھا، تو فرمایا کہ عثمانؓ مظلوم شہید کر دیے گئے اور فتنہ دبتا نظر نہیں آتا۔ اس لیے تم لوگ خلیفۂ مظلوم کا خون رائیگاں نہ جانے دو اور قاتلوں سے قصاص لے کر اسلام کو معزز کر دو۔ انہی دنوں حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ بھی مکہ پہنچ گئے۔ انہوں نے مدینہ کے حالات حضرت عائشہ صدیقہؓ کے گوش گزار کرتے ہوئے کہا کہ مدینہ کے لوگ حیران و سرگرداں ہیں، ان کا حال یہ ہے کہ نہ حق کو پہچان سکتے ہیں نہ باطل سے گریز کر سکتے ہیں، اور نہ ہی ان میں اپنی حفاظت کی طاقت ہے، ان حضرات کے بیان سے حضرت عائشہؓ کے ارادوں میں اور تقویت ہوگئی اور آپؓ نے خلیفۂ مظلوم کے قصاص کی دعوت شروع کر دی۔

ام المومنینؓ حضرت عائشہؓ کی دعوتِ قصاص پر ہزارہا مسلمان سرفروشی پر تل گئے، سب سے پہلے والیٔ مکہ عبداللہ بن عامر نے اس دعوت پر لبیک کہا اور اعلان کیا جو شخص اس دعوت میں شریک ہونا چاہے مگر سواری اور زادِ راہ کا سامان نہ رکھتا ہو اسے پورا سامان دیا جائے گا۔ اس پر چھ سو سواریوں کا انتظام کیا گیا۔ اموی خاندان کے وہ تمام لوگ جو فتنہ و فساد کے دنوں میں مدینہ سے بھاگ کر مکہ آ گئے تھے۔ حضرت عائشہؓ کے ساتھ ہو گئے۔ ایک رئیس یعلیٰ بن امیہ نے چھ سو اونٹ اور چھ لاکھ درہم نقد پیش کیے۔ غرض دعوت میں شریک ہونے والوں کی مجموعی تعداد تین ہزار ہوگئی۔ اس تیاری کے بعد حضرت عائشہ صدیقہؓ کی رائے تھی کہ اصلاحِ احوال کے لیے مدینہ چلنا چاہیے کیونکہ سبائی جماعت اور قاتلینِ عثمانؓ کا گروہ وہیں ہے۔ کچھ لوگوں کا مشورہ شام چلنے کا تھا، لیکن آخر

---

[1] تاریخ اسلام حصہ اول از شاہ معین الدین احمد ندوی

بصرہ جانے کی رائے قرار پائی اور صفر ۳۶ھ میں حضرت عائشہ رضؓ بصرہ کے لیے روانہ ہوگئیں، رخصت ہوتے وقت مسلمان اسلام کی اس نازک گھڑی پر زار زار روتے تھے۔ علامہ طبری رحؒ کے لفظوں میں "اس دن مسلمان اسلام پر اتنا روئے کہ اس سے پہلے کبھی نہ روئے تھے اور اس دن کا نام "یوم گریہ" پڑ گیا۔

حضرت عائشہ رضؓ بصرہ جاتے ہوئے جس راہ سے بھی گزریں لوگوں کا ہجوم ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ اس ہجوم میں مخلص مسلمانوں کے ساتھ ایسے بہت سے مفسد بھی شامل ہوگئے تھے جن کا کام جنگ کی آگ مشتعل کرنا تھا۔ بہرحال جب حضرت عائشہ رضؓ بصرہ کے قریب پہنچیں تو عثمان بن حنیف نے جو حضرت علیؓ رضؓ کی جانب سے بصرہ کے گورنر تھے، عمران بن حصین اور ابو الاسود دوئلی کو تحقیق حال کے لیے بھیجا۔ وہ امّ المومنین حضرت عائشہ رضؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بصرہ آنے کا سبب پوچھا۔ حضرت عائشہ رضؓ نے فرمایا:

> : خدا کی قسم میرے رتبے کے لوگ اپنے ارادہ کو نہیں چھپاتے اور نہ کوئی ماں اپنے بیٹوں سے کوئی حال چھپاتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ بلوائیوں اور فتنہ پردازوں نے حرم رسولؐ (مدینہ) پر حملہ کیا اور اس میں فتنہ فساد بپا کرکے اور فتنہ پردازوں کو پناہ دے کر اپنے کو خدا اور رسولؐ کی لعنت کا مستحق بنا لیا۔ انہوں نے بے سبب اور بے گناہ امام المسلمین کو شہید کیا، معصوم خون بہایا۔ اس مال کو لوٹا جو ان کے لیے حرام تھا۔ مقدس شہر اور مقدس مہینہ کی بے حرمتی کی، لوگوں کی آبرو ریزی کی، مسلمانوں کو مارا، ان کے گھروں میں زبردستی گھس گئے اور جو ان کو رکھنے کے روادار نہ تھے۔ انہیں نقصان پہنچایا مسلمانوں میں ان سے بچنے کی طاقت ہے اور نہ وہ اس سے محفوظ ہیں۔ پس مسلمانوں کو لے کر اس غرض سے نکلی ہوں کہ مسلمانوں کو اصل واقعات سے مطلع کروں اور ان کی اصلاح کروں۔ اس خروج سے میرا مقصود مسلمانوں کی اصلاح کرنا ہے۔
>
> یہ کہہ کر آپؓ نے آیت قرآنی لَا خَيْرَ فِي كَثِيرٍ مِّن نَّجْوَاهُمْ[1] تا آخر تلاوت کی۔

یہ جواب سن کر عثمان رضؓ بن حنیف کے قاصد عمرانؓ بن حصین ان جھگڑوں سے الگ ہو کر بیٹھ گئے اور عثمان رضؓ نے بزور حضرت عائشہ رضؓ کو روکنے کا ارادہ کیا۔ لوگوں نے اسے مشورہ دیا کہ اسے حضرت علیؓ رضؓ کی آمد تک صلح و آشتی سے کام لینا چاہیے اور ایسا طرز عمل اختیار نہ کرنا چاہیے جس سے حالات اتنے نازک ہو جائیں کہ تلافی کی کوئی صورت پیدا نہ ہو سکے، لیکن عثمانؓ نے یہ مشورہ قبول نہ کیا اور فوج کو تیاری کا حکم دے کر مقابلہ کے لیے نکلا، اس پر حضرت طلحہ رضؓ اور حضرت زبیر رضؓ بھی مقابلہ کے لیے بڑھے اور حضرت علیؓ رضؓ کی آمد سے پہلے جنگ چھڑ گئی، لڑائی میں عثمانؓ نے شکست کھائی اور گرفتار ہوا، لیکن حضرت عائشہ رضؓ کے حکم سے رہا کر دیا گیا، تاہم عثمان کی جماعت کے بہت سے سبائی اور قاتلین عثمان رضؓ کی جماعت کے آدمی پکڑ کر قتل کر دیے گئے، جس کی وجہ سے بصرہ میں ایک جماعت حضرت حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ کے خلاف ہوگئی۔

حضرت علی رضؓ کی تیاریاں

حضرت علی رضؓ کرم اللہ وجہہٗ کو مکہ کی تیاریوں کا حال معلوم ہوا تو آپ نے مخالفین کے بصرہ پہنچنے سے پہلے وہاں کے بیت المال کی حفاظت کے خیال سے عراق کا قصد کیا۔ کبار صحابہ رضؓ نے آپ کو اس ارادہ سے باز رکھنے کی کوشش کی اور پُر زور دلائل سے آپ کو مدینہ سے غیر حاضری کے نتائج سے آگاہ کیا۔ مگر آپ کا اصرار تھا کہ

---

[1] سورۃ نساء آیت ۱۱۴

عراق پر مخالفین کے تسلط سے نہایت دشواری پیش آئے گی۔ وہ اس وقت مسلمانوں کی بہت بڑی آبادی ہے۔ وہاں کے بیت المال بھی مال و زر سے پُر ہیں، اس لیے میرا وہاں موجود رہنا بہت ضروری ہے۔ چنانچہ آپ نے مدینہ میں منادی کرا دی کہ لوگ سفرِ عراق کے لیے تیار ہو جائیں اس پر چند محتاط صحابہ رضؓ کے سوا تقریباً تمام اہلِ مدینہ ہمرکاب ہوئے اور حضرت علی رضؓ ربیع الاول ۳۶ھ میں مدینہ سے روانہ ہوئے حضرت عبداللہ رضؓ بن سلام صحابی کو خبر ہوئی تو انہوں نے حاضر ہو کر آپ کی سواری کی لگام تھام لی اور عرض کیا "امیر المومنین مدینہ سے نہ نکلیے۔ اگر اس وقت نکلے تو خدا کی قسم پھر آپ یہاں نہ آئیں گے اور مدینہ سے مرکزِ حکومت نکل جائے گا" لیکن اب صورتِ حال ایسی پیدا ہو چکی تھی کہ ان کی کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔

حضرت علی رضؓ مدینہ سے نکل کر ذی قار پہنچے تو آپ کو خبر ملی کہ حضرت طلحہ رضؓ اور حضرت زبیر رضؓ سبقت کر کے بصرہ پہنچ گئے ہیں اور بنو سعد کے علاوہ تقریباً تمام بصرہ والوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی ہے۔ یہ سُن کر آپ نے اسی جگہ قیام کیا اور حضرت امام حسن رضؓ کو حضرت عمار رضؓ بن یاسر کے ہمراہ لوگوں کو مرکزِ خلافت کی اعانت پر تیار کرنے کے لیے کوفہ بھیجا۔

حضرت امام حسن رضؓ جس وقت کوفہ پہنچے اس وقت والیٔ کوفہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضؓ مسجد میں ایک عظیم الشان مجمع کے سامنے تقریر کر کے لوگوں کو جنگ میں شرکت سے روک رہے تھے۔ آپ فرما رہے تھے کہ لوگو! جس فتنہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خوف دلایا تھا وہ اب سر پر ہے، اس لیے ہتھیار بے کار کر دو اور بالکل عزلت نشین ہو جاؤ۔ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ فتنہ و فساد کے وقت سونے والا بیٹھنے والے سے اور بیٹھنے والا چلنے والے سے بہتر ہے۔ اس اثنا میں حضرت امام حسن رضؓ مسجد میں داخل ہوئے اور انہیں مسجد سے نکال کر خود مجمع سے مخاطب ہوئے اور لوگوں کو امیر المومنین رضؓ کی امداد پر آمادہ کیا۔ حجر بن عدی کندی نے جو کوفہ کے نہایت معزز اور ذی اثر بزرگ تھے، حضرت امام حسن رضؓ کی تائید کی اور کہا "صاحبو! امیر المومنین رضؓ نے خود اپنے صاحبزادے کو بھیج کر تم کو دعوت دی ہے، لہٰذا دعوت کو قبول کرو اور علمِ حیدری کے نیچے جمع ہو کر فتنہ و فساد کی آگ سرد کر دو۔ میں خود سب سے پہلے چلنے کو تیار ہوں۔" ان تقریروں کا اثر یہ ہوا کہ ہر طرف سے حضرت علی رضؓ کی اطاعت اور فرمانبرداری کی صدائیں بلند ہوئیں۔ تقریباً دس ہزار جانبازوں کی جماعت مسلح ہو کر حضرت امام حسن رضؓ کے ساتھ روانہ ہوئی اور مقامِ ذی قار میں حضرت علی رضؓ کی فوج سے مل گئی۔ اس کے بعد جناب امیر رضؓ نے اپنی فوج کو نئے سرے سے ترتیب دے کر بصرہ کا رُخ کیا[1]

مصالحت کی کوششیں اور سبائیوں کی فتنہ انگیزی

اس وقت بصرہ کے لوگ تین گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ایک گروہ خاموش اور غیر جانب دار تھا، دوسرا حضرت علی رضؓ کا طرفدار اور تیسرا حضرت عائشہ رضؓ اور حضرت طلحہ رضؓ وغیرہ کا حامی تھا۔ خانہ جنگی کی تیاریاں دیکھ کر پہلے گروہ نے مصالحت کی بڑی کوشش کی اور تقریباً ہر فریق کے نیک نیت لوگ اس کی تائید میں تھے۔ حضرت عائشہ رضؓ اور حضرت علی رضؓ بھی چاہتے تھے کہ جنگ کی نوبت نہ آنے پائے اور کسی طرح باہمی اختلافات دُور ہو جائیں۔ کوفہ کے ایک بزرگ حضرت قعقاع رضؓ بن عمرو کی معرفت صلح کی گفتگو ترقی پر تھی اور فریقین

---

[1] سیر الصحابہ رضؓ خلفائے راشدین

اس کے نتیجہ میں امن و آشتی کی جھلک دیکھ رہے تھے

ایک طرف تو اطمینان کی یہ حالت تھی کہ دونوں فریق جنگ کے تمام خیالات دلوں سے دور کر کے رات کے سناٹے میں آرام کی نیند سو رہے تھے اور دوسری طرف ایک گروہ ایسا بھی تھا جو برابر اندر اندر فتنہ انگیزی میں مصروف تھا۔ یہ حضرت عثمان رضؓ کے قاتلوں اور سبائیوں کا گروہ تھا جو اس صلح کو اپنے لیے سمِ قاتل سمجھتا تھا۔ دونوں فریقوں کے ساتھ قریب قریب ہر قبیلہ کے آدمی تھے۔ چنانچہ یہ لوگ راتوں رات پھیل گئے اور اندھیرے میں دونوں فوجوں پر شبخون مارا۔ گھبراہٹ میں فریقین نے یہ سمجھ کر کہ دوسرے فریق نے دھوکا دیا۔ ایک دوسرے پر حملہ کر دیا۔ حضرت عائشہ رضؓ اور حضرت علی رضؓ نے ہر چند لوگوں کو روکنے کی کوشش کی مگر جو فتنہ پھیل چکا تھا۔ وہ کب رُک سکتا تھا، غرض صبح ہوتے ہوتے رات کا دلآویز خواب پریشان ہوگیا اور امن و صلح کے پیامی فوج کی قیادت سنبھالنے پر مجبور ہوگئے۔ چنانچہ فریقین اپنی اپنی فوجیں لے کر صف آرا ہوئے اور خونریز جنگ شروع ہوگئی۔

جنگِ جمل

عین ہنگامۂ کارزار میں حضرت علیؓ کی نظر حضرت زبیرؓ پر پڑی، آپؓ نے ان سے کہا: "ابو عبداللہ! تمہیں وہ دن یاد ہے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تم سے پوچھا تھا کہ کیا تم علیؓ کو دوست رکھتے ہو؟ تو تم نے عرض کی تھی "ہاں، یا رسول اللہ، یاد کرو، اس وقت تم سے حضور پُر نور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ ایک دن تم اس سے ناحق لڑو گے۔ حضرت زبیرؓ نے جواب دیا ہاں، اب مجھے یاد آیا۔

غرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیشین گوئی یاد کر کے حضرت زبیرؓ فوراً جنگ سے کنارہ کش ہوگئے اور اپنے صاحبزادے حضرت عبداللہؓ سے فرمایا جانِ پدر، علیؓ نے ایسی بات یاد دلا دی کہ جنگ کا تمام جوش فرو ہوگیا۔ بیشک ہم حق پر نہیں ہیں، اب میں اس جنگ میں شرکت نہیں کروں گا۔ تم بھی میرا ساتھ دو، لیکن اُنہوں نے انکار کر دیا۔ اس پر آپ اکیلے بصرہ کی طرف چل کھڑے ہوئے کہ وہاں سے سامان لے کر کسی اور طرف نکل جائیں، اس سفر میں ایک سبائی عمرو بن جرموز بھی آپ کے ساتھ ہوگیا۔ وادیٔ سباع میں نماز کا وقت آگیا، حضرت زبیرؓ نماز پڑھنے کے لیے ٹھہر گئے، ابن جرموز نے بھی اقتداء کی مگر جونہی آپ سجدہ میں گئے۔ اس نے ایسا وار کیا کہ آپ شہید ہوگئے۔ پھر وہ کارگزاری کے طور پر آپ کا سر، گھوڑا، تلوار اور زرہ لے کر خوش خوش حضرت علیؓ کے پاس پہنچا۔ آپ نے فرمایا، ابن صفیہ کے قاتل تجھے دوزخ کی بشارت ہو پھر حضرت زبیرؓ کی تلوار کی طرف اشارہ کر کے فرمایا؛" یہ اُس شخص کی تلوار ہے جس نے بارہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ انور سے حزن و ملال کے آثار دور کیے ہیں [1]

حضرت زبیرؓ کو واپس جاتے دیکھا، تو حضرت طلحہؓ کا ارادہ بھی متزلزل ہوگیا، مروان بن حکم کو معلوم ہوا، تو اس نے تاک کر ایک ایسا تیر مارا جو حضرت طلحہؓ کے گھٹنے میں پیوست ہوگیا۔ تیر چونکہ زہر میں بجھا ہوا تھا اس لیے زہر کے اثر سے آپ کا کام تمام ہوگیا۔

اب میدان جنگ میں امیر المومنین رضؓ، حضرت عائشہ رضؓ اور ان کے جاں نثار رہ گئے تھے۔ فریقین نہایت پامردی سے ایک دوسرے

---

[1] تاریخ اسلام حصہ اول از شاہ معین الدین احمد ندوی

کے مقابل ڈٹے ہوئے تھے۔ امّ المومنینؓ حضرت عائشہؓ زرہ پوش ہودج میں بیٹھی ہوئی جاں نثاروں کی حوصلہ افزائی کر رہی تھیں اور ہر طرف سے محمل پر تیروں کی بارش ہو رہی تھی۔ نامرتبہ شناس سبائی حضرت عائشہؓ کو گرفتار کرنا چاہتے تھے۔ لیکن آپ کے وفادار بیٹوں میں قبیلہ بنی ضبّہ نے جانیں فدا کیں اور ازد و اُونٹ کی حفاظت میں اپنی لاشوں پر لاشیں گرا رہے تھے۔ اس کی حفاظت میں دو ہزار سات سو ازدی اور دو ہزار بنی ضبّہ نے جانیں فدا کیں۔ بکر بن وائل، ازد اور بنو ضبّہ اُونٹ کو اپنے حصار میں لے کر اس جوش پامردی اور وارفتگی کے ساتھ لڑے، کہ خود حیدر کرارؓ کو حیرت تھی، اونٹ کی مہار پکڑنا گویا موت کو دعوت دینا تھی۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اُونٹ کی نکیل پکڑے تھے وہ زخمی ہو کر گرے تو فوراً دوسرے نے بڑھ کر نکیل پکڑ لی وہ مارا گیا تو تیسرے نے اس کی جگہ لی، اس طریقے سے چالیس یا ستر آدمیوں نے یہ سعادت حاصل کی، بصرہ کا شہسوار عمرو بن بجرہ اس جوش سے لڑ رہا تھا کہ حضرت علیؓ کی فوج کا جو شخص بھی سامنے جاتا تھا مارا جاتا تھا۔ آخر حضرت علیؓ کی فوج کے مشہور شہسوار حارث بن زبیرؓ ازدی مقابلہ پر آئے اور تھوڑی دیر تک تیغ و سنان کے ردّ و بدل کے بعد دونوں ایک دوسرے کے وار سے کٹ کر ڈھیر ہو گئے۔

حضرت علیؓ نے دیکھا کہ جب تک حضرت عائشہؓ کا اُونٹ اپنی جگہ قائم رہے گا، مسلمانوں کی خونریزی ترک نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ آپ نے حکم دیا کہ اُونٹ کے پاؤں زخمی کر کے اُسے گرا دیا جائے۔ اس پر ایک شخص بجیر بن ضبہ نے اونٹ کے پاؤں زخمی کر دیئے، اس کے بیٹھتے ہی لڑائی کا رنگ بدل گیا اور حضرت عائشہؓ کی فوج کی ہمت چھوٹ گئی۔

جنگ کا فیصلہ اپنے حق میں ہونے کے بعد حضرت علیؓ نے حضرت عائشہؓ کے بھائی محمد بن ابی بکرؓ کو، جو جنگ میں ان کے طرفدار تھے، حکم دیا کہ اپنی ہمشیر کی خبر گیری کریں، پھر آپ نے عام منادی کرا دی کہ نہ کسی بھاگنے والے کا تعاقب کیا جائے۔ نہ کسی زخمی کو پامال کیا جائے اور نہ کسی کا مال لوٹا جائے۔ جو ہتھیار ڈال دے یا گھر کا دروازہ بند کر لے وہ مامون ہے۔ اس کے بعد امّ المومنینؓ حضرت عائشہؓ کی مزاج پرسی کے لیے حاضر ہوئے اور پوچھا، "امّاں مزاج کیسا ہے؟" امّ المومنینؓ نے فرمایا: اچھی ہوں۔ امیر المومنینؓ نے فرمایا "خدا ہم دونوں کو معاف فرمائے۔" اس کے جواب میں حضرت عائشہؓ نے بھی یہی کلمات ارشاد فرمائے۔

چند دن تک بصرہ میں آرام و آسائش سے ٹھہرانے کے بعد حضرت علیؓ نے حضرت عائشہؓ کو محمد بن ابی بکرؓ کے ہمراہ نہایت عزت و احترام کے ساتھ مدینہ بھیج دیا۔ سواری، زادِ راہ، نقد و جنس وغیرہ جملہ ضروری سامان آپ کی خدمت میں پیش کر کے بصرہ کی چالیس معزز خواتین کو پہنچانے کے لیے ہمرکاب کیا۔ روانگی کے وقت چند میل تک خود ساتھ گئے اور ایک منزل تک اپنے صاحبزادوں یعنی حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کو مشایعت کے لیے بھیجا۔

حضرت عائشہؓ نے رخصت ہوتے وقت لوگوں سے فرمایا، "میرے بچو! یہ جنگ غلط فہمی کا نتیجہ تھی ورنہ مجھ میں اور علیؓ میں پہلے کوئی جھگڑا نہ تھا۔ حضرت علیؓ نے بھی مناسب الفاظ میں تصدیق کی اور فرمایا کہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حرم محترم اور ہماری ماں ہیں۔ ان کی تعظیم و توقیر ضروری ہے۔ بغرض پہلی رجب ۳۶ھ بروز سنیچر حضرت عائشہؓ مدینہ کی طرف روانہ ہو گئیں۔

مرکزِ خلافت کی تبدیلی

حضرت علیؓ نے بصرہ میں چند روز قیام فرمانے کے بعد کوفہ کا عزم کیا اور ۱۲ رجب ۳۶ھ بروز دوشنبہ شہر میں داخل ہوئے۔ اہلِ کوفہ نے قصرِ امارت میں ٹھہرانے کا اہتمام کیا مگر زہد و قناعت کے شہنشاہ نے اس میں

فروکش ہونے سے انکار کر دیا اور فرمایا: "حضرت عمرؓ بن الخطاب نے ہمیشہ ان عالی شان محلات کو حقارت کی نظر سے دیکھا، مجھے بھی اس کی حاجت نہیں، میرے لیے میدان بس ہے۔" غرض میدان میں ہی قیام فرمایا، مسجدِ اعظم میں داخل ہو کر دو رکعت نماز ادا کی اور جمعہ کے روز خطبہ دیا، جس میں لوگوں کو تقویٰ، پرہیزگاری اور وفاشعاری کی ہدایت فرمائی۔[1]

حضرت علیؓ نے جنگِ جمل کے خاتمہ کے بعد مدینہ چھوڑ کر کوفہ میں مستقل اقامت اختیار کی اور دار الحکومت حجاز سے عراق منتقل ہو گیا۔ مورخین نے اس تبدیلی کے اگرچہ مختلف وجوہ بیان کیے ہیں، تاہم سب سے اہم یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت سے حرم نبویؐ کی جو توہین ہوئی، اس نے حضرت علیؓ کو مجبور کیا کہ مدینہ جیسے علمی اور مذہبی مرکز کو آئندہ شر و فتن سے بچانے کے لیے سیاسی مرکز سے علیحدہ کر دیں، دوسرے حضرت علیؓ کے حامیوں اور طرفداروں کی زیادہ تعداد عراق میں تھی، اس لیے سیاسی حیثیت سے کوفہ آپ کے لیے زیادہ اہم تھا۔

اس تبدیلی سے یہ فائدہ تو ضرور ہوا کہ مدینہ منورہ سیاسی انقلابات کے مذموم نتائج سے محفوظ ہو گیا، لیکن اس سے مدینہ کی سیاسی حیثیت ختم ہو گئی اور حضرت علیؓ خود مرکزِ اسلام سے دور ہو گئے۔ جس کے نتائج اُن کے لیے بھی کچھ مفید ثابت نہیں ہوئے۔ بہرحال کوفہ میں قیام پذیر ہونے کے بعد حضرت علیؓ نے نئے سرے سے ملک کا نظم و نسق قائم کیا۔ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کو بصرہ کی ولایت سپرد کی۔ سہل بن حنیفؓ کو مدینہ کا حاکم بنایا، قیس بن سعد کو مصر کی ولایت پر مامور کیا۔ مدائن پر یزید بن قیس، کسکر پر قدامہ بن عجلان ازدی، صوبہ خراسان پر خلید بن کاس، بحرین پر عمر و بن ابی سلمہ اور شیر خرہ پر مصقلہ بن ہبیرہ، آذربائیجان پر اشعث بن قیس اور جزیرہ موصل اور شام کے متعلقہ علاقوں پر اشتر نخعی کو مامور کیا، اشتر نے بڑھ کر شام کے بعض علاقوں پر قبضہ کر لیا، لیکن امیر معاویہؓ کے عامل ضحاک بن قیس، حران اور رقہ کے درمیان اُن کے مقابلے پر آئے، امیر معاویہؓ نے عبد الرحمٰن بن خالد کو مدد کے لیے بھیجا اور نتیجۃً اشتر پھر موصل جانے پر مجبور ہو گئے، تاہم موصل میں مستقل قیام کر کے اشتر نے شامی فوج سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی اور امیر معاویہؓ کے عمال کو آگے بڑھنے سے روکے رکھا۔

صلح کی دعوت

گذشتہ سطور میں یہ بیان ہو چکا ہے کہ حضرت علیؓ کی خلافت کو امیر معاویہؓ نے تسلیم نہیں کیا تھا اور آپ سے مقابلہ کی تیاریاں کر رہے تھے کہ درمیان میں جنگِ جمل پیش آ گئی، جس کے باعث حضرت علیؓ ان کی طرف توجہ نہ کر سکے۔ چنانچہ اس سے فراغت کے بعد حضرت علیؓ نے انہیں پھر ایک دفعہ صلح کی دعوت دی اور حضرت جریرؓ بن عبد اللہ بجلی کو قاصد بنا کر بھیجا۔ جریرؓ جس وقت امیر معاویہؓ کے پاس پہنچے اس وقت دربار میں رؤسائے شام کا مجمع تھا۔ امیر معاویہؓ نے پہلے خط لے کر خود پڑھا پھر بلند آواز سے حاضرین کو سنایا۔ بعد حمد و نعت کے، خط کا مضمون یہ تھا۔

"جن لوگوں نے ابوبکرؓ، عمرؓ اور عثمانؓ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی، انہوں نے میری بیعت کر لی ہے، اس کے بعد کسی کے لیے چون و چرا کی گنجائش نہیں رہی۔ خلیفہ کے انتخاب کا حق مہاجرین و انصار کو ہے، اس لیے ان کے اتفاق کے بعد جو شخص بیعت سے گریز کرے گا، وہ جبراً اطاعت پر مجبور کیا جائے گا۔ پس تم مہاجرین و انصار کا اتباع کرو، عافیت سلامتی اسی

---

[1] سیر الصحابہؓ خلفائے راشدینؓ

میں ہے ورنہ جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔ تم نے عثمان رضؓ کی شہادت کو اپنی مقصد برآری کا وسیلہ بنایا ہے۔ اگر تم کو عثمان رضؓ کے حقیقی قاتلوں سے انتقام لینے کا حقیقی جوش ہے تو بیعت کے بعد باضابطہ مقدمہ پیش کرو، میں کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مطابق اس کا فیصلہ کر دوں گا۔" [1]

امیر معاویہ رضؓ تقریباً بیس بائیس سال سے شام کے والی تھے۔ اس طویل حکومت نے ان کے دل میں استقلال اور خود مختاری کی تمنا پیدا کر دی تھی۔ جس کے حصول کے لیے اس سے زیادہ بہتر موقع میسر نہیں آسکتا تھا۔ نیز حضرت عثمان رضؓ کی شہادت، حضرت علی رضؓ کی خلافت اور اموی عمال کی برطرفی سے بنو امیہ اور بنو ہاشم کی دیرینہ چشمک پھر تازہ ہوگئی تھی۔ حضرت علی رضؓ کے معزول کردہ تمام اموی عمال امیر معاویہ رضؓ کے گرد جمع ہوگئے تھے۔ بہت سے عرب قبائل جو اگرچہ اموی اور ہاشمی کش مکش سے کوئی سروکار نہ رکھتے تھے۔ تاہم امیر معاویہ رضؓ کی شاہانہ داد و دہش نے ان کو بھی ان کا طرفدار بنا دیا تھا۔ بعض صحابہ رضؓ بھی مقاصد کے لیے ان کے دست و بازو بن گئے تھے۔ مزید نامور مدبر حضرت مغیرہ رضؓ بن شعبہ جو تدبر و سیاست میں حضرت عمرو رضؓ بن العاص کے ہم پایہ تھے اور پہلے حضرت علی رضؓ کی طرف مائل تھے۔ اب ان سے دل برداشتہ ہو کر امیر معاویہ رضؓ سے آملے تھے لیکن ان تمام موافق حالات کے باوجود حضرت معاویہ رضؓ کو چند الجھنیں ایسی درپیش تھیں، جن کو سلجھانا بہت ضروری تھا۔ اوّل یہ کہ محمد بن حذیفہ جو ان کے شدید مخالفین میں سے تھے، قید خانہ سے بھاگ گئے تھے۔ دوسرے رومی سواحلِ شام پر حملہ کے لیے ذخیرہ رہے تھے کہ اسی دوران میں حضرت علی رضؓ کا یہ تہدیدی خط پہنچا، امیر معاویہ رضؓ نے حضرت عمرو رضؓ بن العاص کو بلا کر مشورہ کیا، انہوں نے اپنے لیے مصر کی حکومت کا وعدہ لے کر انہیں رائے دی کہ محمد بن حذیفہ کا فرار کچھ زیادہ اہم نہیں، انہیں تلاش کراؤ اگر مل گئے، تو خیر ورنہ وہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے، دوسرے قیصرِ روم کے قیدیوں کو چھوڑ کر اس سے صلح کر لو وہ اس شرط پر فوراً تیار ہو جائے گا، لیکن خود حضرت عمرو بن العاص رضؓ کی نظر میں سب سے اہم بات حضرت علی رضؓ کی یہ عظمت تھی کہ انہیں سبقتِ اسلام اور قرابتِ نبویؐ کا شرف حاصل تھا۔ اس بنا پر انہیں یقین تھا کہ لوگ حضرت علی رضؓ کے مقابلہ پر کبھی بھی امیر معاویہ رضؓ کو ترجیح نہیں دیں گے۔ اس لیے ان کی نظر میں بغیر کسی معقول سبب اور بنیاد کے حضرت علی رضؓ جیسی عظیم شخصیت کی مخالفت خطرے سے خالی نہیں تھی۔ چنانچہ اس ضمن میں ان کی رائے یہ تھی کہ بہر صورت عمائدِ شام کو یقین دلایا جائے کہ حضرت عثمان رضؓ کے قتل میں حضرت علی رضؓ کی شرکت تھی اور اس کی ابتدا شام کے با اثر شخص شرجیل بن سمط کندی سے کرنی چاہیے۔ اگر وہ ہمارے ہمنوا ہوگئے، تو ان کے ذریعہ بآسانی اس کی اشاعت ہو جائے گی، اس پر امیر معاویہ رضؓ نے شرجیل بن سمط کندی کو بلا کر اسے یہاں تک اپنا ہمخیال بنایا کہ اس نے رائے عامہ ہموار کرنے کے لیے شام کا دورہ کیا جس کے نتیجہ میں شام کا پورا ملک حضرت علی رضؓ کے مقابلہ پر امیر معاویہ رضؓ کے ساتھ ہوگیا۔

دوسری طرف حضرت عثمان رضؓ کے خون آلود پیراہن اور آپ کی اہلیہ حضرت نائلہ رضؓ کی کٹی ہوئی انگلیوں کی جن کو امیر معاویہ رضؓ نے جامع دمشق میں آویزاں کرا دیا تھا۔ نمائش برابر جاری رہی، حضرت علی رضؓ کے خلاف شامی فوجوں کے جذبات بھڑکانے کے لیے انہیں دمشق طلب کیا تاکہ یہ منظر دیکھ سکیں، لوگ جوق در جوق آتے اور اس دردانگیز منظر کو دیکھ کر زار زار روتے، غرض فوج سے لے کر ایک عام آدمی تک کے جذبات بھڑک اٹھے اور اہلِ شام نے قسم کھائی کہ جب تک خلیفہ مظلوم کا بدلہ نہ لیں گے، اس وقت تک نہ بستر پر سوئیں گے نہ اپنی بیویوں

---

[1] تاریخ اسلام حصہ اوّل۔

سے تعلق رکھیں گے۔

پھر مصالحت کی کوشش امیر معاویہؓ نے حضرت علیؓ کے قاصد حضرت جریر بن عبداللہ بجلی کو اپنے پاس اس وقت تک روک کے رکھا تھا اور یہ حالات مشاہدہ کرانے کے بعد واپس کیا، انہوں نے جا کر بیان کیا کہ سارا شام امیر معاویہؓ کے ساتھ ہے، لوگ حضرت عثمانؓ کا پیراہن دیکھ کر روتے ہیں اور کہتے ہیں کہ علیؓ نے حضرت عثمانؓ کو شہید کیا اور اُن کے قاتلوں کو پناہ دی ہے اور یہ عہد کیا ہے کہ یا اپنی جان دے دیں گے یا جان لے کر رہیں گے۔ حضرت علیؓ پوری طرح امیر معاویہؓ کے مقابلہ کے لیے تیار تھے۔ صرف ان کے آخری جواب کا انتظار تھا۔ چنانچہ قاصد کی واپسی کے بعد آپ کے لیے اور کوئی چارہ نہ رہ گیا کہ جنگ کے انتظامات کریں — یہ دیکھ کر ابھی جنگِ جمل کے زخم بھی مندمل نہیں ہوئے کہ پھر مسلمانوں کی تلواریں بے نیام ہونے والی ہیں بعض مخلص اور اُمت کے خیرخواہ اس تصادم کو روکنے کے لیے تدبیریں کرنے لگے۔ چنانچہ شام کے ایک عابد و زاہد بزرگ ابومسلم خولانی چند آدمیوں کو ساتھ لے کر امیر معاویہؓ کے دربار میں گئے اور حضرت علیؓ کے فضائل بیان کر کے اُن کے مقابلہ پر امیر معاویہؓ کی جنگی تیاریوں کا سبب پوچھا، امیر معاویہؓ نے کہا کہ میں فضیلت میں ان کی برابری کا مدعی نہیں، ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ قاتلینِ عثمانؓ کو ہمارے حوالے کر دیا جائے، ہم ان کی خلافت تسلیم کر لیں گے۔ ابومسلم خولانی نے کہا کہ تم یہی بات لکھ کر دے دو، میں خود حضرت علیؓ کے پاس جاؤں گا۔

ابومسلم خولانی حضرت علیؓ کے پاس پہنچا اور خط اُن کے حوالے کر کے اپنے طور پر گزارش کی کہ اگر حضرت عثمانؓ کے قاتلوں کو ہمارے حوالے کر دیا جائے، تو ہم اور تمام اہلِ شام بخوشی آپ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کو تیار ہیں، کیونکہ بلحاظ فضل و کمال آپ ہی خلافت کے حقیقی مستحق ہیں، حضرت علیؓ نے یہ سن کر ابومسلم کو اپنے پاس ٹھہرا لیا اور فرمایا کہ کل اس کا جواب دوں گا، دوسرے دن ابومسلم جامع کوفہ میں حضرت علیؓ سے ملے۔ یہاں دیکھا کہ دس ہزار مسلح آدمی جمع ہیں اور سب نعرے لگا رہے ہیں کہ "ہم سب عثمانؓ کے قاتل ہیں" یہ رنگ دیکھ کر ابومسلم نے بارگاہِ خلافت میں عرض کی کہ معلوم ہوتا ہے کہ سب نے باہم سازش کر لی ہے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ تم اس سے اندازہ کر سکتے ہو کہ عثمانؓ کے قاتلوں پر میرا کہاں تک اختیار ہے، پھر حضرت علیؓ نے امیر معاویہؓ کے جواب میں لکھا کہ:

> "عثمانؓ کے قتل سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ میں نے کسی کو اُن کے خلاف نہیں بھڑکایا، البتہ جب زیادہ ہنگامہ برپا ہوا، تو میں خانہ نشین ہو گیا۔ مجھے خوب معلوم ہے کہ قاتلینِ عثمانؓ کے حوالے کرنے کے مطالبہ کو تم اپنے حصولِ مقصد کا ذریعہ بنانا چاہتے ہو۔ اگر تم اس فتنہ انگیزی اور بے راہروی سے باز نہ آؤ گے تو جو سلوک باغیوں کے ساتھ کیا جاتا ہے وہی تمہارے ساتھ کیا جائے گا۔" [1]

ایک خط حضرت عمرو بن العاصؓ کو علیحدہ لکھا کہ "دنیا طلبی چھوڑ کر حق کی حمایت کرو، معاویہؓ کی غلط روی میں ان کا ساتھ دے کر اپنے اعمال برباد نہ کرو" لیکن حضرت علیؓ کی ان کوششوں کا کوئی نتیجہ نہ نکلا اور آپ کو مجبوراً قبضۂ شمشیر پر ہاتھ رکھنا پڑا، چنانچہ آپ نے حضرت ابومسعود انصاریؓ کو کوفہ میں اپنا قائم مقام بنا کر ذی الحجہ ۳۶ھ میں اسی ہزار کی جمعیت کے ساتھ حدودِ شام کا رُخ کیا۔ اس

---

[1] تاریخِ اسلام حصہ اوّل۔

فوج میں عام مسلمانوں کے علاوہ ستر بدری صحابہؓ، سات سو بیعت رضوان کے جاں نثار اور چار سو عام مہاجر و انصار صحابہؓ شامل تھے۔

معرکۂ صفین حضرت معاویہؓ پہلے سے جنگ کے لیے نکل چکے تھے، ان کا مقدمۃ الجیش حالات کا پتہ چلانے کے لیے ابوالاعور سلمی کی قیادت میں آگے آگے تھے، دوسری طرف علوی فوج کے افسر زیاد بن نصر اور شریح بن ہانی آ رہے تھے کہ فریقین کا آمنا سامنا ہوگیا۔ حضرت علیؓ کو اطلاع ملی تو آپ نے اشتر نخعی کو زیاد کی مدد کے لیے بھیجا۔ ابوالاعور نے دیکھا کہ اب مقابلہ دشوار ہے، تو رات کی تاریکی میں اپنی فوج کو پیچھے ہٹا لیا اور امیر معاویہؓ کو عراقی فوج کی نقل و حرکت کی اطلاع دی، انہوں نے صفین کے میدان کو مدافعت کے لیے منتخب کر کے فرات کے ساحل پر فوجیں اُتار دیں، تمام مناسب اور اہم مقامات پر مورچے جمانے کے بعد ابوالاعور کو دس ہزار فوج کے ساتھ فرات پر متعین کر دیا کہ علوی فوج کو دریا سے پانی نہ لینے دیں۔

پانی کے لیے کشمکش اسی دوران میں حضرت علیؓ بھی پہنچ گئے اور شامی فوجوں کے قریب ہی فوجیں اُتاریں۔ شامیوں نے چونکہ پہلے ہی اہم مقامات پر قبضہ کر کے پانی پر پہرا بٹھا دیا تھا۔ اس لیے علوی فوج کو پانی کی وجہ سے سخت دقت پیش آئی، حضرت علیؓ نے زبانی پیام کہلا بھیجا کہ پانی کی بندش مناسب نہیں مگر اس کا کوئی اثر نہ ہوا، آخر حضرت علیؓ نے مجبور ہو کر حکم دیا کہ شامی فوجوں کا مقابلہ کر کے بزور گھاٹ پر قبضہ کر لیا جائے، چنانچہ عراقی فوج کا ایک دستہ گھاٹ پر پہنچا، ابوالاعور نے روکنا چاہا مگر عراقی فوج نے شکست دے کر گھاٹ پر قبضہ کر لیا۔ اب جو دقت علوی فوج کو پیش آئی تھی وہی امیر معاویہؓ کو پیش آئی، لیکن جناب علی مرتضیٰؓ کی انسانی ہمدردی نے کسی کو تشنہ کام رکھنا گوارا نہ کیا اور فوج کو دریا سے پانی لینے کی اجازت دے دی، حضرت علیؓ کے اس فیاضانہ سلوک کا نتیجہ یہ نکلا کہ فریقین ایک دریا سے سیراب ہونے کے باعث بے خوف و خطر آپس میں ملنے جلنے لگے اور دونوں کیمپ کے سپاہیوں میں دوستانہ آمد و رفت شروع ہوگئی۔ یہاں تک کہ یہ خیال کیا جانے لگا کہ اب صلح ہو جائے گی۔ [۱]

میدانِ جنگ میں مصالحت کی کوشش حضرت علیؓ نے جنگ شروع کرنے سے قبل ایک دفعہ پھر بشر بن عمرو محصن انصاری، سعید بن قیس ہمدانی اور شبث بن ربعی کو امیر معاویہؓ کے پاس بھیج کر مصالحت کی کوشش کی، لیکن حسب سابق کامیابی نہ ہوئی۔ ان کے علاوہ دونوں فوجوں کے علماء، فضلاء اور حفاظ جو اس خونریزی کو ناپسند کرتے تھے اپنے طور پر مصالحت کی کوششوں میں مصروف تھے، اس دوران میں دونوں طرف سے تقریباً پچاسی دفعہ حملہ کا ارادہ کیا گیا لیکن ان بزرگوں نے ہمیشہ درمیان میں پڑ کر بیچ بچاؤ کر دیا، یہاں تک کہ اسی حالت میں تین ماہ گزر گئے، بالآخر جب مصالحت کی کوئی صورت پیدا نہ ہو سکی تو اوائل جمادی الآخر ۳۶ھ میں جنگ چھڑ گئی جو اسی ماہ کے آخر تک جاری رہی، اس دوران میں کوئی بڑی خونریز جنگ نہ ہوئی بلکہ ایک ایک دستہ میدان میں آتا تھا اور صبح و شام معمولی جھڑپ ہو جاتی تھی، لیکن جیسے ہی رجب کا چاند طلوع ہوا، اشہر حرم کی عظمت کے خیال سے جنگ روک دی گئی۔

مصالحت کی آخری کوشش اور ناکامی: التوائے جنگ کے بعد خیر خواہانِ اُمت نے پھر مصالحت کی کوششیں شروع کر دیں کہ

---

[۱] سیر الصحابہؓ خلفائے راشدین

شاید اسی حد پر یہ خانہ جنگی رُک جائے اور مسلمانوں کی قوت آپس میں ٹکرا کر برباد نہ ہو، چنانچہ حضرت ابو درداؓ اور حضرت ابو امامہؓ باہلی امیر معاویہؓ کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ تم علیؓ سے کیوں لڑتے ہو کیا وہ امامت کے تم سے زیادہ مستحق نہیں؟ انہوں نے جواب دیا "عثمانؓ کے خون ناحق کے لیے" پھر ان بزرگوں نے پوچھا "کیا عثمانؓ کو علیؓ نے قتل کیا ہے؟" امیر معاویہؓ نے جواب دیا قتل تو نہیں کیا، قاتلوں کو پناہ دی ہے اگر وہ انہیں ہمارے حوالے کر دیں تو میں سب سے پہلے اُن کے ہاتھ پر بیعت کر لوں گا۔

اس گفتگو کے بعد یہ دونوں بزرگ حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے انہیں امیر معاویہؓ کا مطالبہ سنایا، اسے سُن کر حضرت علیؓ کی فوج سے تقریباً بیس ہزار سپاہیوں نے باہر نکل کر نعرہ لگایا "ہم سب عثمانؓ کے قاتل ہیں" یہ رنگ دیکھ کر حضرت ابو درداؓ اور حضرت ابو امامہؓ باہلی لشکرگاہ چھوڑ کر ساحلی علاقہ کی طرف نکل گئے اور اس جنگ میں کوئی حصہ نہ لیا۔

غرض صلح کی جتنی کوششیں ہوئیں، سب ناکام رہیں اور شہر حرام کے ختم ہوتے ہی از سرِ نو جنگ چھڑ گئی، جس کا سلسلہ کئی ماہ تک جاری رہا، اس دوران میں تقریباً نوے معرکے ہوئے جن میں پینتالیس ہزار شامی اور پچیس ہزار عراقی کام آئے۔ ہزاروں عورتیں بیوہ اور لاکھوں بچے یتیم ہو گئے[1] لیکن پھر بھی اس خانہ جنگی کا فیصلہ نہ ہوا، حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اس طوالت سے تنگ آکر اپنی فوج کے سامنے نہایت پُرجوش تقریر کی اور اس کو فیصلہ کن جنگ پر اُبھارا، تمام فوج نے بلند حوصلہ ہو کر اس جوش و خروش سے حملہ کیا کہ شامی فوج کی صفیں درہم برہم ہو گئیں، اور بڑے بڑے بہادروں کے پاؤں اُکھڑ گئے حیدرِ کرارؓ خود فوج کے آگے تھے اور اس جانبازی سے لڑ رہے تھے کہ مقابل کی صفیں چیرتے ہوئے امیر معاویہؓ کے معصورہ کے قریب پہنچ گئے اور پکار کر کہا "معاویہؓ! خلقِ خدا کا خون گراتے ہو آؤ ہم تم باہم اپنے جھگڑوں کا فیصلہ کر لیں"۔

امیر معاویہؓ نے تو اس مجاہدانہ پکار کا کوئی جواب نہ دیا۔ البتہ حضرت عمروؓ بن العاص خود فاتح خیبر کے مقابلہ پر نکلے، دونوں میں دیر تک تیغ و سنان کا ردّ و بدل ہوتا رہا، مگر آخر حیدرِ کرار کے وار سے اس بدحواسی کے ساتھ گھوڑے سے گرے کہ بالکل برہنہ ہو گئے، شیرِ خدا نے اپنے حریف کو برہنہ دیکھ کر منہ پھیر لیا اور زندہ چھوڑ کر واپس چلے آئے[1]"

لیلۃ الہریر کی فیصلہ کن جنگ

اس جنگ کے بعد ایک دستہ کا مقابلہ ہونے کی بجائے پوری فوج سے جنگ ہونے لگی، یہ سلسلہ چند دنوں تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ جمعہ کے روز اتنی مہیب جنگ پیش آئی جو شدت و خونریزی کے لحاظ سے تاریخ اسلام میں اپنی نظیر آپ ہے۔ اس میں رات دن مسلسل جنگ ہوتی رہی اور اس زور کا رن پڑا کہ نعروں کی گونج، گھوڑوں کی ٹاپوں اور تلوار کی جھنکاروں سے زمین تھرا رہی تھی۔ عرب مؤرخین اسی مناسبت سے اسے لیلۃ الہریر کہتے ہیں دوسرے دن صبح کو مجروحین و مقتولین کے اُٹھانے کے لیے لڑائی ملتوی ہو گئی، اس دوران میں حضرت علیؓ نے اپنے طرفداروں سے خطاب کرتے ہوئے نہایت پُرجوش تقریر کی، آپ نے فرمایا "جانبازو! ہماری کوششیں اس حد تک پہنچ چکی ہیں کہ انشاء اللہ کل اس کا فیصلہ ہو جائے گا۔ پس آج کچھ آرام لینے کے بعد اپنے حریف کو آخری شکست دینے کے لیے تیار ہو جاؤ اور اس وقت تک میدان نہ چھوڑو جب تک کہ اس کا قطعی فیصلہ نہ ہو جائے"۔

---

[1] تاریخ اسلام حصہ اوّل از شاہ معین الدین احمد ندوی [1] سیر الصحابہ خلفائے راشدین

اس معرکہ سے پہلے امیر معاویہؓ اور عمرو بن العاصؓ نے نہایت جانبازی، شجاعت اور پامردی کے ساتھ اپنی فوجوں کو سرگرم کارزار رکھا تھا، لیکن لیلۃ الہریر کی خونریز جنگ نے کافی حد تک ان کے حوصلوں کو پست کر دیا تھا اور انہیں یقین ہو گیا تھا کہ لشکرِ حیدری کے مقابلہ پر ٹھہرنا ناممکن ہے، ادھر عراقی بھی مسلسل جنگ سے گھبرا گئے تھے۔ فریقین کے عاقبت اندیش لوگوں کو نظر آ رہا تھا کہ اگر مسلمان باہم اسی طرح نبرد آزما رہے تو مسلمانوں کی قوت تباہ ہو جائے گی اور ان میں غیر مسلموں کے مقابلہ کی طاقت باقی نہ رہے گی، امیر معاویہؓ نے کہا کہ اگر جنگ جاری رہی، تو رومی، شام میں ہمارے اہل و عیال پر قبضہ کر لیں گے اور فارس کے دہقان عراقیوں کے بال بچوں کو پکڑ لے جائیں گے، علوی فوج کے ایک مدبر اشعث بن قیس کندی نے بھی یہ خطرہ محسوس کیا اور اپنی جماعت سے کہا کہ گزشتہ خونریز جنگ کے بعد اگر آئندہ پھر جنگ ہوئی تو عرب تباہ ہو جائے گا اور ہماری عظمت و حرمت اٹھ جائے گی۔

مؤرخین کے مطابق امیر معاویہؓ نے یہ رنگ دیکھ کر حضرت علیؓ کو لکھا کہ "اگر ہم کو اور آپ کو معلوم ہوتا کہ یہ جنگ اس قدر طول کھینچے گی تو غالباً ہم دونوں اس کو چھیڑنا پسند نہ کرتے، بہرحال اب ہم کو اس تباہ کن جنگ کا خاتمہ کر دینا چاہیے، ہم لوگ بنی عبد مناف ہیں اور آپس میں ایک دوسرے پر کوئی فوقیت نہیں رکھتے۔ اس لیے مصالحت ایسی ہو کہ طرفین کی عزت و آبرو برقرار رہے[لہ]" لیکن حضرت علیؓ نے مصالحت کی اس تجویز پر کوئی توجہ نہ دی اور دوسرے روز علی الصبح زرہ بکتر پہن کر اپنی فوج کے ساتھ میدان میں صف آرا ہو گئے۔

امیر معاویہؓ چونکہ اپنی فوج کی حالت کا اندازہ کر چکے تھے۔ اس لیے انہوں نے حریف سے جنگ ختم کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ اس موقع پر انہیں حضرت عمرو بن العاصؓ نے یقین دلایا کہ اب میں ایسی تدبیر کروں گا جس سے قبول و انکار دونوں صورتوں میں حضرت علیؓ کی فوج میں پھوٹ پڑ جائے گی چنانچہ دوسرے دن جب شامی میدان میں آئے، تو ایک عجیب منظر دیکھنے میں آیا یعنی آگے دمشق کا مصحف اعظم پانچ نیزوں پر بندھا ہوا تھا جسے پانچ آدمی بلند کیے ہوئے تھے۔ اس کے پیچھے ہزاروں قرآن نیزوں پر بلند تھے، حضرت علیؓ کی طرف سے اشتر نخعی نے ایک عظیم جمعیت کے ساتھ حملہ کیا تو فضل بن ادہم، شریح جذامی اور ورقا بن معمر نے پکار کر علوی فوج سے کہا "معشر عرب! خدارا اپنی عورتوں اور بچوں کو فارس اور روم سے بچاؤ، اگر شامی ختم ہو گئے، تو رومیوں سے شام کی حفاظت کون کرے گا اور اگر عراقی فنا ہو گئے تو اہل عجم سے عراق کو کون بچائے گا آؤ ہم تم قرآن کو حکم مان لیں اور اس کا فیصلہ ہم دونوں کے لیے واجب التسلیم ہو۔"

حضرت علیؓ اور فوج کے بعض دوسرے عاقبت اندیش افسروں نے ہر چند لوگوں کو سمجھایا کہ ہم کو اس دامِ تزویر میں نہیں پھنسنا چاہیے؛ یہ حریف نے محض ناکامی و نامرادی سے بچنے کے لیے چال چلی ہے، لیکن چونکہ شامیوں کا جادو چل چکا تھا۔ اس لیے باوجود سعی و کوشش کے ایک جماعت نے نہایت سختی کے ساتھ اصرار کیا کہ ہم کو قرآن کی دعوت رد نہیں کرنی چاہیے، بعض لوگ اپنے اصرار میں اس حد تک بڑھ گئے کہ انہوں نے جناب امیرؓ کو دھمکی دی کہ اگر آپ نے قرآن کو حکم ماننے سے انکار کر دیا، تو ہم آپ سے لڑیں گے اور آپ کو بھی حضرت عثمانؓ کے پاس پہنچا دیں گے۔ مسعر بن فدکی، زید بن حصین اور ابن الکوا اس جماعت کے سرگروہ تھے۔ اشعث بن قیس نے اس موقع پر جناب امیرؓ سے عرض کی:

"امیر المومنینؓ! میں جس طرح کل آپ کا جاں نثار تھا اسی طرح آج بھی ہوں، لیکن میری بھی یہی رائے ہے کہ قرآن مجید کو حکم مان،

لہ سیر الصحابہؓ خلفائے راشدین

لینا چاہیے۔ غرض یہ تدبیر ایسی کامیاب ہوئی کہ مجبوراً جناب علی مرتضیٰ رضؓ کو اپنی فوج کو واپس کیمپ میں لوٹ آنے کا حکم دینا پڑا۔ کہتے ہیں کہ اس وقت اشتر نخعی نہایت کامیاب جنگ میں مصروف تھے۔ اس لیے انہیں واپسی کا حکم سُن کر بڑا صدمہ ہوا۔ چنانچہ جب آپ اپنے کیمپ میں واپس آئے تو آپ کی ان لوگوں سے شدید تلخ کلامی ہوئی جنہوں نے حضرت علی رضؓ کو التوائے جنگ پر مجبور کیا تھا اور قریب تھا کہ باہم کشت و خون کی نوبت پہنچ جائے کہ جناب امیر رضؓ نے درمیان میں پڑ کر معاملہ رفع دفع کر دیا۔

تحکیم کی تجویز اور حَکَم کا انتخاب

التوائے جنگ کے بعد فریقین میں خط و کتابت شروع ہوئی اور دونوں طرف کے علما اور فضلا کا اجتماع ہوا۔ آخر بحث و مباحثہ کے بعد طے پایا کہ دونوں فریق کی جانب سے ایک ایک حَکَم مقرر کیا جائے، وہ کتاب اللہ کی رُو سے جو فیصلہ کریں، اس کو قطعی تصور کیا جائے گا۔ اس پر شامیوں نے حضرت عمرو بن العاص کو حَکَم بنایا اور اہل عراق کی جانب سے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضؓ کا نام پیش کیا گیا، حضرت علی رضؓ کو اس سے اختلاف تھا۔ آپ نے فرمایا کہ ان پر مجھے اعتماد نہیں وہ ہماری مخالفت کر چکے ہیں، اس لیے ان کی بجائے ابن عباس رضؓ کو حَکَم بنایا جائے لیکن جن لوگوں نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضؓ کا نام تجویز کیا تھا، انہوں نے ابن عباس رضؓ پر یہ اعتراض کیا کہ وہ آپ کے عزیز ہیں اور حَکَم غیر متعلق شخص کو ہونا چاہیے، حضرت علی رضؓ نے اس ردّ و کد کے جواب میں فرمایا، تو پھر اشتر نخعی کو حَکَم بنایا جائے، اس موقع پر اشعث بن قیس نے اعتراض اٹھایا کہ جس شخص نے یہ آگ بھڑکائی ہے اُسے حَکَم کیسے تسلیم کیا جا سکتا ہے؟ غرض جب حضرت علی رضؓ نے دیکھا کہ یہ مسئلہ بھی مختلف فیہ بن جائے گا تو آپ چار و ناچار حضرت ابوموسیٰ اشعری رضؓ پر راضی ہو گئے۔

حضرت عمرو بن العاص رضؓ تو پہلے ہی امیر معاویہ رضؓ کے ساتھ موجود تھے۔ البتہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضؓ کو بلانے کے لیے قاصد بھیجا گیا۔ کیونکہ آپ جنگ سے کنارہ کش ہو کر شام کے ایک گاؤں میں گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ بہرحال آپ تشریف لائے تو دونوں فریق کے ارباب حل و عقد ایک عہد نامہ ترتیب دینے کے لیے جمع ہوئے۔ کتابت شروع ہوئی تھی کہ حضرت علی رضؓ کے نام کے ساتھ "امیر المومنین" لکھنے پر امیر معاویہ رضؓ معترض ہوئے اور کہا کہ اگر ہم انہیں "امیر المومنین" مانتے تو پھر جھگڑا ہی کیا تھا۔ حضرت عمرو بن العاص رضؓ نے مشورہ دیا کہ صرف نام پر اکتفا کیا جائے لیکن حضرت علی رضؓ کے بعض حامیوں کو اس پر اصرار تھا۔ فدائے رسول رضؓ نے فرمایا "خدا کی قسم یہ تو سنّت نبوی ہے، معاہدہ حدیبیہ میں رسول اللہ کے لفظ پر مشرکین کو اسی قسم کا اعتراض ہوا تھا، اس لیے جس طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اپنے دست مبارک سے مٹایا تھا۔ اسی طرح میں بھی اپنے ہاتھ سے مٹاتا ہوں" چنانچہ "امیر المومنین" کا لفظ کاٹ کر ایک طویل معاہدہ لکھا گیا، جس کا خلاصہ یہ ہے:

> علی رضؓ اور ان کی جماعت نے ابوموسیٰ اشعری رضؓ کو اور امیر معاویہ رضؓ اور ان کی جماعت نے عمرو بن العاص رضؓ کو حَکَم مقرر کیا ہے، یہ دونوں کسی فریق کی رعایت کے بغیر اُمت کی خیر خواہی کا لحاظ رکھتے ہوئے کتاب اللہ اور سنّت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مطابق جو فیصلہ کریں گے وہ فریقین کے لیے واجب التسلیم ہو گا، اور جو فریق اس کو ماننے سے انکار کرے گا، حَکَم اور عام مسلمان اس کے خلاف دوسرے فریق کی مدد کریں گے۔ لیکن اگر یہ فیصلہ کتاب اللہ اور سنّت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خلاف ہو یا کسی فریق کی جنبہ داری پائی جائے تو اس کی پابندی ضروری نہیں ہے۔ اس وقت ہر فریق خود اپنا فیصلہ کرنے کے لیے آزاد ہو گا۔ فیصلہ کے اعلان تک جنگ بالکل ملتوی

رہے گی اور کامل امن و امان رکھا جائے گا۔ دونوں حکموں کی جان اور مال محفوظ رہے گا اور رمضان تک فیصلہ کا اعلان ہو جائے گا۔[1]

متذکرہ عہد نامہ کو دونوں طرف کے سر برآوردہ لوگوں نے اپنے دستخطوں سے مُوثق کیا اور شام و عراق کی سرحد پر دومۃ الجندل کا مقام فیصلہ کے اعلان کے لیے مقرر ہوا۔ تکمیل کے بعد معاہدہ کا مضمون جب فریقین کی فوجوں میں مشتہر کیا گیا، تو اسے سُن کر حضرت علی رضؓ کی فوج کا ایک حصّہ خلاف ہو گیا جو بعد میں "خارجی" فرقہ کے نام سے موسوم ہُوا۔ بہرحال اس کے حالات آئندہ آئیں گے۔

تحکیم کا نتیجہ

فیصلہ کا مقام چونکہ دومۃ الجندل مُقرّر ہُوا تھا اس لیے حضرت علی رضؓ اور امیر معاویہ رضؓ نے چار چار سو کی جمعیت ساتھ کر کے اپنے اپنے حَکم کو اس مقام پر بھیج دیا۔ حضرت ابُوموسیٰ اشعری رضؓ کے ساتھ جو فوج گئی تھی۔ اس کے افسر شریح بن ہانی اور مذہبی نگران حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ تھے، حضرت عبداللہ بن عمر رضؓ، حضرت سعد بن ابی وقاص رضؓ اور حضرت مغیرہ بن شعبہ رضؓ جو اپنے زہد و تقویٰ کے باعث اس خانہ جنگی سے الگ رہے تھے تحکیم کی خبر سُن کر اور اس کا آخری فیصلہ معلوم کرنے کے لیے دومۃ الجندل تشریف لے آئے۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضؓ نے، جو نہایت معاملہ فہم اور نکتہ رس بزرگ تھے، دونوں حکموں سے علٰحدہ علٰحدہ گفتگو کر کے ان کی رائے کا اندازہ کیا اور پیش گوئی کی کہ اس تحکیم کا نتیجہ خوش آئند نہ ہوگا۔ بہرحال حضرت ابُوموسیٰ اشعری رضؓ اور حضرت عمرو بن العاص رضؓ کی مجلس شوریٰ منعقد ہوئی، حضرت عمرو بن العاص رضؓ بڑے مدبّر اور دانشمند تھے۔ انہوں نے پہلے ہی غیر معمولی عزّت و تکریم کے ذریعہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضؓ پر اثر ڈالنا شروع کر دیا۔ خود خاموش رہتے اور ہر معاملہ پر حضرت ابُوموسیٰ رضؓ سے کہتے کہ چونکہ آپ میرے بزرگ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقتدر صحابی رضؓ ہیں اس لیے پہلے آپ اپنے خیالات کا اظہار فرمائیے۔ مؤرخین کے مطابق دونوں میں اصل مسئلہ کے متعلق جو گفتگو ہوئی اس کا خلاصہ یہ ہے:۔

اُبوموسیٰ اشعری رضؓ: عمرو رضؓ ہم کیوں نہ ایسے شخص کو منتخب کریں جس میں خدا کی خوشنودی اور اُمّت کی فلاح، دونوں باتیں حاصل ہوں۔

عمرو بن العاص رضؓ: کس کو؟

اُبوموسیٰ اشعری رضؓ: عبداللہ بن عمر رضؓ کو جن کا دامن ان ہنگاموں سے پاک رہا ہے۔

عمرو بن العاص رضؓ: امیر معاویہ رضؓ پر آپ کو کیا اعتراض ہے؟

اُبوموسیٰ اشعری رضؓ: امیر معاویہ رضؓ کا کیا رتبہ ہے، وہ کس طرح اس کے مستحق ہو سکتے ہیں؟ ہاں! اگر تم اتفاق کرو تو فاروق اعظم رضؓ کا عہد لوٹ آئے اور عبداللہ رضؓ اپنے باپ کی یاد پھر تازہ کر دیں۔

عمرو بن العاص رضؓ: میرے لڑکے عبداللہ رضؓ پر آپ کی نظرِ انتخاب کیوں نہیں پڑتی۔ فضل و کرم منقبت میں تو وہ بھی کچھ کم نہیں۔

بوموسیٰ اشعری رضؓ: بیشک تمہارا لڑکا صالح اور راہل ہے۔ لیکن اس فتنہ میں شرکت سے اس کا دامن داغدار رہے، برخلاف اس کے ابن

---

[1] تاریخ اسلام حصّہ اوّل از شاہ معین الدین احمد ندوی

ابن خطیب عبداللہ بن عمرؓ کا لباس تقویٰ ہر قسم کے دھبوں سے محفوظ ہے۔ بس آؤ، ان کو ہی مسندِ خلافت پر بٹھا دیں۔

عمرو بن العاصؓ: ابو موسیٰؓ، خلیفہ ایسے شخص کو ہونا چاہیے جو ایک داڑھ سے خود کھائے اور دوسری سے دوسروں کو کھلائے۔

ابو موسیٰ اشعریؓ: عمروؓ، کشت و خون کے بعد مسلمانوں نے یہ معاملہ ہمارے سپرد کیا ہے، اب ان کو دوبارہ فتنہ میں نہ ڈالو۔

عمرو بن العاصؓ: پھر آپ کی کیا رائے ہے۔؟

ابو موسیٰ اشعریؓ: میری رائے تو یہ ہے کہ علیؓ اور معاویہؓ دونوں کو معزول کر کے مسلمانوں کو نئے سرے سے خلیفہ کے انتخاب کا حق دیا جائے۔

عمرو بن العاصؓ: مجھے اس سے اتفاق ہے، اُمت کی بھلائی اسی میں ہے۔

فیصلہ کا اعلان

بعض عاقبت اندیش اور سمجھ دار لوگوں کو حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی سادہ دلی اور حضرت عمرو بن العاصؓ کی ہوشمندی سے خطرہ تھا، چنانچہ مذکورہ بالا قرار داد کے بعد جب دونوں ایک دوسرے سے جدا ہوئے تو حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کے پاس حاضر ہو کر انہیں اس خطرہ سے آگاہ کیا اور مشورہ دیا کہ اگر آپ دونوں کسی فیصلہ پر متفق ہو چکے ہوں، تو اس کے اعلان میں خود پیشقدمی نہ کیجئے گا، عمرو بن العاصؓ ہوشیار آدمی ہیں، اس لیے مجھے خطرہ ہے کہ اگر آپ نے پہلے اعلان کر دیا، تو وہ آپ کو مات دے جائیں گے۔ حضرت موسیٰ اشعریؓ نے فرمایا کہ ہم لوگ ایسی رائے پر متحد ہوئے ہیں کہ اس میں اختلاف کی گنجائش ہی نہیں۔

غرض مقررہ تاریخ پر دونوں حکموں نے جامع مسجد میں فیصلہ سنایا، ہزاروں مسلمان اس کے اشتیاق میں جمع تھے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے حضرت عمرو بن العاصؓ سے فرمایا کہ وہ منبر پر چڑھ کر فیصلہ سنائیں، انہوں نے عرض کی "میں آپ پر سبقت نہیں کر سکتا، آپ فضل و منقبت میں سن و سال میں، غرض ہر حیثیت سے مجھ سے افضل اور ہمارے بزرگ ہیں، حضرت ابو موسیٰ اشعری پر یہ جادو چل گیا، چنانچہ آپ بغیر کسی پس و پیش کے کھڑے ہو گئے اور حمد و ثنا کے بعد کہا:

> صاحبو! ہم نے اس مسئلہ پر غور کیا۔ اس اُمت کے اتفاق و اتحاد اور اصلاح کی اس کے علاوہ اور کوئی صورت نظر نہ آئی کہ علیؓ اور معاویہؓ دونوں کو معزول کر کے خلافت کو شوریٰ پر چھوڑ دیا جائے۔ عام مسلمان جسے اہل سمجھیں اسے منتخب کریں، اس لیے میں علیؓ اور معاویہؓ دونوں کو معزول کرتا ہوں، آئندہ تم جسے پسند کرو اپنا خلیفہ بناؤ۔"

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ اپنا فیصلہ سنا کر منبر پر سے اتر آئے، تو حضرت عمرو بن العاصؓ نے کھڑے ہو کر کہا:

> "صاحبو! ابو موسیٰ اشعریؓ کا فیصلہ آپ لوگوں نے سن لیا، انہوں نے اپنے آدمی کو معزول کر دیا۔ میں بھی اس کو معزول کرتا ہوں۔ لیکن اپنے آدمی معاویہؓ کو برقرار رکھتا ہوں، وہ امیر المومنین عثمانؓ کے ولی اور ان کے قصاص کے طالب ہیں، اس لیے ان کی جانشینی کے لیے سب سے زیادہ مستحق ہیں[1]"

---

[1] تاریخ طبری حصہ سوم

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضؓ بہت سادہ اور نیک دل بزرگ تھے۔ آپ یہ فیصلہ سُن کر ششدر رہ گئے اور چلا کر کہا: "یہ غداری ہے"۔ لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا اور اب اس کی تلافی کی کوئی صورت نہ تھی۔

اس فیصلے سے قدرتاً حضرت علی رضؓ کے حامیوں میں سخت برہمی پیدا ہوگئی۔ شریح بن ہانی نے عمرو بن العاص رضؓ پر کوڑے برسانے شروع کر دیے۔ اس طرف سے ایک لڑکے نے شریح پر حملہ کر دیا، لیکن بات بڑھنے نہ پائی اور لوگوں نے درمیان میں پڑ کر معاملہ رفت گذشت کرا دیا۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضؓ کو اس قدر ندامت ہوئی کہ اسی وقت مکہ روانہ ہو گئے اور تمام عمر گوشہ نشین رہے۔

خوارج کی سرکشی

یہ فیصلہ اس قدر نامنصفانہ تھا کہ کوئی حق پسند اسے تسلیم نہ کر سکتا تھا۔ اس بنا پر حضرت علی رضؓ نے فیصلہ کے اعلان کے بعد امیر معاویہ رضؓ سے مقابلہ کی تیاریاں شروع کر دیں، آپ ابھی اس میں مشغول تھے کہ خارجیوں نے عراق میں اتنی شورش اور بدامنی پھیلائی کہ آپ کو امیر معاویہ رضؓ کے مقابلہ کا ارادہ ملتوی کر کے ادھر متوجہ ہونا پڑا۔

اوپر کے بیان سے معلوم ہو چکا ہے کہ شروع میں حضرت علی رضؓ نے تحکیم کی تجویز کی مخالفت کی تھی مگر پھر اپنی ہی فوج کے آدمیوں کے اصرار پر اسے قبول کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ لیکن اب تحکیم کی تجویز طے ہو جانے کے بعد آپ ہی کے حامیوں میں سے ایک جماعت اس کے خلاف ہو گئی تھی۔ چنانچہ جب آپ صفین سے کوفہ تشریف لائے، تو انھوں نے اپنی ناپسندیدگی کا ثبوت اس طرح دیا کہ بارہ ہزار آدمی آپ کی فوج سے کنارہ کش ہو کر حروراء میں اقامت پذیر ہو گئے۔ آپ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ کو انہیں سمجھانے کے لیے بھیجا، مگر جب وہ ناکام لوٹے تو آپ خود تشریف لے گئے اور انہیں سمجھا بجھا کر راضی کر لیا اور سب کو کوفہ لے آئے۔ اس پر یہ افواہ پھیل گئی کہ جناب امیرؓ نے ان لوگوں کی خاطر داری کے لیے تحکیم کو کفر تسلیم کر کے اس سے توبہ کر لی ہے، جناب امیرؓ کو خبر ہوئی تو آپ نے خطبہ دے کر اس افواہ کی پُرزور تردید کی اور فرمایا کہ پہلے انھی لوگوں نے جنگ ملتوی کرنے پر مجبور کیا۔ پھر تحکیم پر ناپسندیدگی ظاہر کی اور اب چاہتے ہیں کہ عہد شکنی کر کے قبل از فیصلہ پھر جنگ شروع کر دوں۔ خدا کی قسم یہ نہیں ہو سکتا۔ میں معاہدہ نہیں توڑ سکتا۔ خدا فرماتا ہے کہ جو عہد کرو اسے پورا کرو۔ بہرکیف جب ان لوگوں کے مجبور کرنے پر بھی آپ راضی نہ ہوئے تو انھوں نے دھمکی دی کہ اگر آپ تحکیم کو تسلیم کرتے ہیں، تو ہم خدا کے لیے آپ سے لڑیں گے۔ آپ نے فرمایا: تو تمہاری لاشیں خاک و خون میں تڑپیں گی۔

غرض رفتہ رفتہ اس جماعت نے ایک مستقل فرقہ کی صورت اختیار کر لی اور جب تحکیم کے نتیجہ میں نامنصفانہ فیصلہ ملک میں شائع ہوا تو اس گروہ نے عبداللہ بن وہب الراسبی کے ہاتھ پر بیعت کر کے حضرت علی رضؓ کی عملی مخالفت شروع کر دی، اس گروہ کا عقیدہ تھا کہ معاملاتِ دین میں انسان کو حَکَم بنانا کفر ہے، لمذا حَکَم اور اس کا فیصلہ ماننے والے سب کافر ہیں، جن کے خلاف جہاد فرض ہے اور اس عقیدے سے اتفاق نہ کرنے والوں کا خون مباح ہے۔ چنانچہ ان عقائد کی اشاعت کر کے اس گروہ نے کوفہ، بصرہ، مدائن اور عراق کے دوسرے شہروں میں ایک معتدبہ جماعت اپنی ہم خیال بنالی اور خفیہ خفیہ نہروان میں جمع ہو کر عام طور پر قتل و غارت گری کا بازار گرم کر دیا۔ اب صورت حال یہ تھی کہ کسی مسلمان کی جان اُن کے ہاتھوں سے محفوظ نہ تھی، جو شخص ان کے خیالات کی تائید نہ کرتا اُسے تہہ تیغ کر دیا جاتا، چنانچہ انھوں نے ایک صحابی حضرت عبداللہ بن خباب رضؓ کو اسی جرم میں شہید کر دیا اور ان کی حاملہ بیوی کا پیٹ چاک کر کے بے دردی سے قتل کر دیا۔ قبیلہ طے کی کئی عورتوں کو مار ڈالا، غرض جو انہیں ملا اس کو یا تو اپنا ہم خیال بنا کر چھوڑا یا موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ حضرت علی رضؓ کو

تب ان جگر خراش واقعات کی اطلاع ہوئی، تو آپ نے حارث بن مرّہ کو تحقیق حال کے لیے بھیجا، خارجیوں نے ان کا بھی کام تمام کر دیا۔

معرکہ نہروان

اُوپر معلوم ہو چکا ہے کہ جناب امیرؓ اس وقت نئے سرے سے شام پر فوج کشی کی تیاری فرما رہے تھے کہ مجبوراً آپ کو خارجیوں کی فتنہ انگیزیوں اور قتل و غارت کے سدباب کے لیے فی الحال شام کا ارادہ ملتوی کرنا پڑا، چنانچہ آپ خارجیوں کے مقابلہ کے لیے نہروان روانہ ہو گئے۔

یہاں پہنچ کر حضرت علیؓ نے اتمامِ حجت کے لیے حضرت ابو ایوب انصاریؓ اور حضرت قیسؓ بن عبادہ کو خارجیوں کے پاس بھیجا کہ وہ بحث مباحثہ کر کے انہیں راہِ راست پر لائیں، جب وہ ناکام ہوئے تو آپ نے خارجیوں کے سردار ابن الکواء کو بلا کر خود ہر طرح سمجھایا لیکن ان لوگوں کے دل اس قدر تاریک ہو چکے تھے کہ ارشاد و ہدایت کی کوئی کوشش بھی کامیاب نہ ہوئی۔ اب حضرت علیؓ کے لیے جنگ کے سوا کوئی چارہ نہ رہ گیا تھا، تاہم آپ نے آغازِ جنگ سے پہلے ایک مرتبہ پھر حضرت ابو ایوب انصاریؓ کو امان کا علم دے کر اعلان کرا دیا کہ جو شخص اس علم کے نیچے آ جائے یا لوٹ جائے یا خارجیوں کا ساتھ چھوڑ دے وہ مامون ہے۔ اس اعلان پر ایک خارجی سردار فروہ بن نوفل اشجعی نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ہمارے پاس حضرت علیؓ سے جنگ کرنے کی کوئی دلیل نہیں اس لیے لوٹ چلنا چاہیے اور اس وقت تک کوئی حصہ نہیں لینا چاہیے جب تک کہ ان سے لڑنے یا ان کی پیروی کرنے میں سے کسی ایک نتیجہ پر نہ پہنچ جائیں، چنانچہ اس نے پانچسو آدمی لے کر بندنجین کی راہ لی؛ ایک اور جماعت کوفہ واپس چلی گئی ایک ہزار آدمیوں نے توبہ کر کے علمِ حیدری کے نیچے پناہ لی اور عبداللہ بن وہب الراسبی کے ساتھ صرف چار ہزار خارجی باقی رہ گئے۔

اس وقت بھی "فاتح خیبرؓ" نے اپنی فوج کو جنگ کی ابتدا کرنے سے روکے رکھا تا آنکہ خود خارجیوں نے لاحکم الا اللہ کا نعرہ لگا کر علوی فوج پر اس زور سے حملہ کر دیا کہ اگر جاں نثارانِ علیؓ میں غیر معمولی ثبات و استقلال نہ ہوتا تو ان کا روکنا سخت مشکل تھا۔ خارجیوں کی حالت یہ تھی کہ اُن کے اعضا کٹ کٹ کر جسم سے علیحدہ ہو جاتے تھے، لیکن ان کی حملہ آوری میں کوئی فرق نہیں آتا تھا۔ ایک خارجی شریح بن ادنیٰ کا ایک پاؤں کٹ گیا، تو وہ اس حالت میں بھی لڑتا رہا۔ بالآخر ایک خونریز جنگ کے بعد خوارج کو نہایت فاش شکست ہوئی اور وہ ایک ایک کر کے مارے گئے۔

مؤرخین کے مطابق جنگ کے خاتمہ کے بعد حضرت علیؓ نے خارجی مقتولین میں اُس شخص[1] کو تلاش کرنا شروع کیا جس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش گوئی فرمائی تھی، چنانچہ تلاش کرنے پر ایک گڑھے سے ایک لاش برآمد ہوئی جس میں وہ تمام علامات موجود تھیں

---

[1] اس شخص کا نام ذوالثدیہ تھا، اس کے بازو پر عورت کے سینہ کی طرح اُبھار تھا اور اس اُبھار پر چند سیاہ بال تھے۔

ذوالثدیہ نے غزوہ حنین کے موقع پر حضورؐ کو مخاطب کر کے تین بار کہا تھا "اے محمدؐ انصاف کرو، تم نے انصاف نہیں کیا۔" اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مالِ غنیمت تقسیم فرما رہے تھے اور آپؐ نے قریشِ مکہ کے تالیف القلوب کے لیے انہیں زیادہ حصہ دیا تھا۔ آنحضرت صلعم نے جب اس شخص کی زبان سے تیسری بار یہی بات سُنی تو آپؐ نے اس کی طرف توجہ کی اور ارشاد فرمایا:

"میں انصاف نہیں کروں گا تو اور کون کرے گا؟"

صحابہؓ میں سے بعض نے اس کے قتل کی اجازت مانگی مگر رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں منع کیا اور فرمایا:

جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی تھیں۔

حضرت علیؓ نے دیکھا، تو سجدے میں گر گئے، پھر فرمایا:

"اللہ اکبر! خدا کی قسم نہ تو میں نے جھوٹ بولا تھا اور نہ میں جھٹلایا جا سکا۔ خدا کی قسم اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ تم عمل چھوڑ بیٹھو گے تو میں تمہیں وہ فیصلہ سناتا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک کے ذریعہ ان لوگوں کے حق میں سنایا گیا ہے جو ان خارجیوں سے جنگ کریں گے اور ان سے جنگ کو حق سمجھیں اور اس حق کو پہچانیں جس پر ہم قائم ہیں"

شام کا قصد اور حیدری لشکر کی کمزوری

گزشتہ سطور میں گزر چکا ہے کہ جناب مرتضیٰؓ نے عنانِ خلافت ہاتھ میں لیتے ہی عہدِ عثمانی کے تمام عمّال معزول کر کے نئے عمّال مقرر کیے تھے۔

چنانچہ مصر کی ولایت پر ایک مقتدر صحابی حضرت قیس بن سعدؓ کو مقرر کیا جو بڑے مدبّر اور معاملہ شناس تھے۔ انہوں نے حکمتِ عملی سے تقریباً تمام اہلِ مصر کو جناب علی کرم اللہ وجہہ کی خلافت پر راضی کر کے ان سے آپ کی بیعت لے لی، البتہ اہلِ خربتا کو، جو حضرت عثمانؓ کی شہادت سے زیادہ متاثر تھے، تامّل ہوا۔ حضرت قیسؓ نے انہیں چھیڑنا مناسب نہ سمجھا اور کہہ دیا ہم تم کو بیعت پر مجبور نہیں کرتے۔ تاہم تمہاری ہر خدمت کے لیے تیار ہیں۔ ان کی اس پالیسی کا اثر یہ ہوا کہ اہلِ خربتا مطیع و فرمانبردار ہو گئے اور خراج وغیرہ ادا کرنے میں انہوں نے کبھی کوئی جھگڑا نہ کیا یہ واقعہ جنگِ جمل سے پہلے کا ہے۔

جنگِ صفین کی تیاریاں شروع ہوئیں، تو امیر معاویہؓ کو خوف محسوس ہوا کہ اگر دوسری طرف سے حضرت قیسؓ بن سعد نے شام پر حملہ کر دیا، تو بڑی دقت کا سامنا ہو گا۔ چنانچہ حضرت معاویہؓ نے انہیں اپنے ساتھ ملانے کے لیے خط لکھا کہ "تم بھی قاتلین عثمانؓ کے ساتھ ہو اگر ان کا ساتھ چھوڑ کر طالبین قصاص کے زمرہ میں شامل ہو جاؤ، تو ہم تمہارا ہر حکم ماننے کے تیار ہیں اور تمہاری زندگی بھر عراق کی حکومت تمہارے لیے مخصوص رہے گی۔ حجاز کی حکومت پر تم کو اختیار ہو گا جس کو چاہنا حاکم بنانا۔ اس کے علاوہ اور جو تم چاہو گے سب پورا کرنے کو تیار ہوں اگر تم کو یہ منظور ہے تو اپنی رائے لکھو" حضرت قیسؓ عرب کے نامور مدبر تھے اور تدبّر و سیاست میں کسی طور امیر معاویہؓ سے کم نہ تھے، حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کی کش مکش (جس کا آغاز ہو چکا تھا) اور ملک کی دگرگوں حالت اُن کے سامنے تھی۔ اس بنا پر انہوں نے دنیا سازی کے طور پر نہایت گول جواب دے کر ٹال دیا۔ امیر معاویہؓ بڑے جہاندیدہ اور رمز شناس تھے، فوراً تاڑ گئے۔ چنانچہ آپ نے انہیں لکھا تم نے ایسا جواب دیا ہے کہ نہ تم کو دوست سمجھا جا سکتا ہے کہ تمہاری طرف سے اطمینان رکھا جائے اور نہ ہی دشمن یقین کیا جا سکتا ہے کہ تم سے مقابلہ کیا جائے، مجھ جیسا شخص کبھی تمہارے دام فریب کا شکار نہیں ہو سکتا، افسوس تم اس کو فریب دیتے ہو، جس کا ادنیٰ اشارہ مصر

"عنقریب ایک قوم خروج کرے گی جو حق کے ساتھ تکلّف یا تکلّم کریں گے، لیکن حق ان کے حلقوم سے نیچے نہیں اُترے گا، وہ حق سے ایسے نکل جائیں گے جیسا کہ تیر کمان سے، اُن کی علامت یہ ہے کہ اُن میں ایک سیاہ کوتاہ دست آدمی ہوگا، اُس کے ہاتھ میں چند سیاہ بال ہوں گے، اگر یہ وہی ہیں، تو تم نے بدترین کو قتل کیا ہے اور اگر وہ نہیں ہیں، تو تم بہترین کے قاتل ہو۔

(ازالۃ الخفا مقصد دوم اور تاریخ طبری حصّہ سوم سے ماخوذ)

تو پامال کر سکتا ہے۔" حضرت قیس بن سعدؓ نے اس تحریر کا نہایت سخت جواب دیا۔ آپ نے جواب میں لکھا کہ مجھ کو تمہاری عقل پر حیرت ہے۔ تم مجھ کو ایک مستحق خلافت، حق گو، حق پرست، سب سے زیادہ ہدایات یاب اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے قریب ترین عزیز کے مقابلہ میں ایک جھوٹے، گم کردہ راہ اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے بعید شخص کی اطاعت کی دعوت دیتے ہو، تم مجھے اپنی قوت کی دھمکی دیتے ہو، خدا نے چاہا، تو خود تم کو اپنی جان کے لالے پڑ جائیں گے۔

امیر معاویہؓ نے جب دیکھا کہ حضرت قیسؓ کے مقابلہ میں کچھ پیش نہ جائے گی، تو ان کو مصر سے ہٹانے کی یہ تدبیر کی کہ ان کے متعلق یہ مشہور کرنا شروع کر دیا کہ حضرت قیسؓ بن سعد ہمارے طرفدار ہیں آپ نے شامیوں کو منع کر دیا کہ ان کو برا بھلا نہ کہو کیونکہ وہ ہمارے ساتھ ہیں اور خفیہ طور پر اُن کے خطوط ہمارے پاس آتے رہتے ہیں، پھر اس کے ثبوت میں اہل خربتا سے ان کے بہتر سلوک کا حوالہ دیتے، رفتہ رفتہ یہ بات دربار خلافت تک پہنچ گئی۔ محمدؓ بن ابی بکرؓ نے اس کو اور بھی بڑھا چڑھا کر بیان کیا اور اہل خربتا سے بیعت نہ کرنے کا واقعہ دلیل کے طور پر پیش کیا۔ حضرت علیؓ نے ان افواہوں سے متاثر ہو کر حضرت قیسؓ کو خربتا والوں سے بیعت کیلئے لڑنے کا حکم دیا۔ انہوں نے جواب میں لکھا کہ "آپ ایسے لوگوں سے جنگ کرنے کا حکم دے رہے ہیں، جو اب تک غیر جانبدار ہیں، ان کو جونہی چھیڑا گیا یہ آپ کے دشمن کے ساتھ ہو جائیں گے۔ میرا مشورہ قبول کیجیے اور ان سے تعرض نہ فرمائیے؛ لیکن جب دربار خلافت سے مکرر اصرار ہوا تو حضرت قیسؓ مستعفی ہو کر مدینہ چلے گئے اور ان کی جگہ محمدؓ بن ابی بکرؓ والی مصر مقرر ہوئے۔

محمدؓ بن ابی بکرؓ کمسن اور ناتجربہ کار تھے۔ انہوں نے حکمت عملی سے کام لینے کی بجائے اہل خربتا پر فوج کشی کر دی جس کے نتیجہ میں شکست کھائی۔ اُن کی ناتجربہ کاری کے باعث سب سے بڑا نقصان یہ پہنچا کہ پہلے ایک جگہ کے لوگ حضرت علیؓ کے خلاف تھے مگر اب اور لوگ بھی مخالف ہو گئے۔ چنانچہ مصر کے ایک مقتدر رئیس معاویہ بن خدیج کندیؓ نے علانیہ قصاص عثمان کی دعوت شروع کر دی جس سے مصر کی فضا مسموم ہو گئی۔

حضرت علیؓ کو ان حالات کی اطلاع ہوئی، تو آپ نے معرکہ صفین کے بعد اشتر نخعی کو مصر روانہ کیا کہ وہ محمدؓ بن ابی بکرؓ کو سبکدوش کر کے ملک کے حالات درست کریں۔ لیکن امیر معاویہؓ نے راستہ میں ہی زہر دلا کر اشتر نخعی کا کام تمام کرا دیا۔ [1]

اِدھر سے فارغ ہو کر امیر معاویہؓ نے مسلمہ بن مخلد انصاریؓ اور معاویہ بن خدیجؓ سے مصر پر فوج کشی کے بارہ میں خط و کتابت کی، دونوں نے اپنی حمایت کا یقین دلاتے ہوئے انہیں مصر پر حملہ کی دعوت دی، اس پر امیر معاویہؓ نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کے بعد حضرت عمروؓ بن العاصؓ کو چھ ہزار فوج کے ساتھ مصر روانہ کیا۔ محمدؓ بن ابی بکرؓ کے لیے اگرچہ اس فوج کا مقابلہ نہایت دشوار تھا تاہم چار ہزار کی جمعیت فراہم کر کے اس بے جگری سے لڑے کہ حضرت عمروؓ بن العاصؓ کو معاویہؓ بن خدیج کی مدد طلب کرنی پڑی۔ اس نے ایک بڑی فوج کے ساتھ محمدؓ بن ابی بکرؓ کی فوج کو پیچھے سے گھیر لیا۔ مقابلہ میں ان کے ساتھی یا تو مارے گئے، یا جان بچا کر بھاگ گئے۔ محمدؓ بن ابی بکرؓ روپوش ہو گئے، مگر آخر حضرت عمرو بن العاصؓ کے جاسوسوں نے انہیں ڈھونڈ نکالا اور نہایت بے دردی کے ساتھ قتل کر کے ایک مردہ گدھے کے پیٹ میں ڈال کر جلا دیا۔[2] غرض

---

[1] سیر الصحابہؓ خلفائے راشدین [2] تاریخ طبری سوم

اس افسوسناک طریقہ پر ۳۸ھ میں مصر کی قسمت کا فیصلہ ہو گیا اور امیر معاویہؓ نے وعدہ کے مطابق حضرت عمرو بن العاصؓ کو مصر کا والی بنایا

ابنِ حضرمی کی بصرہ میں آمد

فتح مصر کے بعد اسی سال امیر معاویہؓ نے اہل بصرہ کو حضرت علیؓ کی اطاعت سے برگشتہ کر کے اپنی حکومت کا طرفدار بنانے کے لیے عبداللہ بن الحضرمی کو بصرہ روانہ کیا۔ مؤرخین کے مطابق اہل بصرہ نہ صرف واقعہ جمل کے باعث جناب امیرؓ سے کشیدہ خاطر تھے بلکہ وہ بھی امیر معاویہؓ کی طرح حضرت عثمانؓ کے خون کا معاوضہ طلب کرنے والوں میں تھے۔ اس لیے ابن الحضرمی کو اس مہم میں بڑی کامیابی ہوئی۔ قبیلہ بنو تمیم اور تقریباً تمام اہل بصرہ نے اس کی دعوت کو لبیک کہا۔ زیاد کو جو گورنر بصرہ عبداللہ بن عباسؓ کی غیر حاضری میں نیابت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ بصرہ چھوڑ کر حدان میں پناہ گزین ہونا پڑا۔ بارگاہِ خلافت کو اس صورتِ حال کی اطلاع ہوئی تو امیر المومنین حضرت علیؓ نے اعین بن ضبیعہ کو ابن الحضرمی کی ریشہ دوانیوں کے انسداد پر مامور فرمایا اور ہدایت کی کہ بصرہ پہنچ کر جس طرح ممکن ہو تمیم اور ابن الحضرمی میں نفاق ڈال دو اور جو شخص اس کی مخالفت کرے اس سے بلا تامل لڑو لیکن قبل اس کے کہ انہیں کامیابی ہو امیر معاویہؓ کے طرفداروں نے ناگہانی طور پر انہیں قتل کرا دیا۔

اعین بن ضبیعہ کے بعد جناب امیرؓ نے جاریہ بن قدامہ کو ابن الحضرمی کی سرکوبی پر مامور کیا۔ انہوں نے بصرہ پہنچ کر نہایت حکمتِ عملی سے ابنِ حضرمی اور اس کے ساتھیوں کا دارسنبل میں محاصرہ کر لیا پھر اس کے گھر کو ابنِ حضرمی اور اس کے ستر یا چالیس ساتھیوں کے جلا دیا۔ اہل بصرہ نے دوبارہ اطاعت کر لی جس پر امیر المومنینؓ کے ترحم نے عفو عام کا اعلان کر دیا۔

خریت بن راشد کی بغاوت

معرکہ نہروان میں اگرچہ خارجیوں کا زور ٹوٹ چکا تھا تاہم ان کے حامی ملک میں موجود تھے اور اپنی ریشہ دوانیوں سے روز ایک نہ ایک فتنہ برپا کرتے رہتے تھے۔ انہی خارجیوں میں خریت بن راشد بھی تھا جو مجوسیوں، مرتدوں اور نومسلموں کو اپنے دامِ تزویر میں پھنسا کر ملک میں ہر طرف لوٹ مار کرتا پھرتا تھا اور ہر جگہ ذمیوں کو بھڑکا کر بغاوت کرا دیتا تھا۔ حضرت علیؓ نے معقل بن قیس کو اس کی سرکوبی پر مامور کیا۔ انہوں نے اس کا مسلسل تعاقب کیا اور رامہرمز کی پہاڑیوں میں مقابلہ کر کے ملک کو اس کے وجود سے پاک وصاف کر دیا۔ اس کے جو ساتھی قتل سے بچ گئے۔ اُن سے پھر اطاعت کا عہد لے کر ان سے نہایت لطف و ترحم کا سلوک کیا۔ اس طرزِ عمل کا اثر یہ ہوا کہ معقل بن قیس جب رامہرمز سے روانہ ہوئے تو ان لوگوں نے دور تک مشایعت کی اور اشکبار آنکھوں سے آپ کو رخصت کیا۔

امیر معاویہؓ کا طرزِ عمل

امیر معاویہؓ کے قبضہ میں صرف شام و مصر تھے جبکہ سارا عرب و عجم حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے زیرنگین تھا۔ چنانچہ فتح مصر کے بعد امیر معاویہؓ نے حضرت علیؓ کے دوسرے مقبوضات کی طرف قدم بڑھایا اور سب سے اوّل ۳۹ھ میں نعمان بن بشر کو دو ہزار کی جمعیت کے ساتھ عین التمر روانہ کیا لیکن یہاں نعمان کو کوئی کامیابی نہ ہوئی اور حضرت علیؓ کے حاکم مالک بن کعب سے شکست کھا گیا۔ پھر اسی سال میں امیر معاویہؓ نے سفیان بن عوف کو چھ ہزار فوج دے کر انبار اور مدائن وغیرہ کی طرف روانہ کیا۔ سفیان بن عوف نے انبار پہنچ کر یہاں کی محافظ فوج کے افسر اشرف بن حسان البکری کو قتل کر کے انبار میں جو کچھ ملا لوٹ لیا۔ امیر المومنین حضرت علیؓ کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو آپ نے سعید بن قیس کو سفیان کے تعاقب میں روانہ کیا۔ مگر کوئی مقابلہ نہ ہوا، کیونکہ سفیان

ان کے پہنچنے سے پہلے ہی جا چکے تھے۔ پھر اسی سنہ میں امیر معاویہؓ نے عبداللہ بن مسعدہ فزاری کو ایک ہزار سات سو آدمیوں کے ساتھ اہلِ بادیہ سے صدقہ وصول کرنے کے لیے تیماء روانہ کیا۔ وہ اس فرض کو انجام دیتے ہوئے مکہ اور مدینہ پہنچے۔ حیدر کرار رضؓ کو خبر ہوئی، تو آپ نے مسیّب بن نجبہ فزاری کو مقابلہ کے لیے بھیجا۔ تیماء میں فریقین ایک دوسرے کے مقابل ہوئے۔ جنگ میں عبداللہ بن مسعدہ زخمی ہو کر قلعہ بند ہو گئے۔ مسیّب نے قلعہ کا محاصرہ کر کے اسے آگ لگا دی لیکن پھر عبداللہ کے پناہ مانگنے پر اسے چھوڑ دیا اور باقیماندہ ساتھیوں کو لے کر لوٹ گئے۔

اسی سنہ میں حضرت معاویہؓ نے ضحاک بن قیس کو تین ہزار کی جمعیت کے ساتھ واقصہ کے نشیبی علاقہ میں حضرت علیؓ کے باجگذار اعراب پر تاخت کے لیے روانہ کیا۔ ضحاک ثعلبیہ پر تاخت کرتے ہوئے قطقطانہ پہنچے کہ حضرت علیؓ کو اطلاع ہو گئی۔ آپ نے فوری طور پر حجر بن عدی کو چار ہزار سپاہ کے ساتھ ان کے مقابلہ پر روانہ کیا۔ تدمر کے مقام پر فریقین میں مڈبھیڑ ہوئی، مقابلہ میں حجر نے ضحاک کے انیس آدمی قتل کیے اور باقی تمامی رات کی تاریکی سے فائدہ اُٹھا کر نکل گئے۔

ذی الحجہ سنہ ۳۹ھ میں امیر معاویہؓ نے یزید بن شجرہ رہاوی کو اپنی طرف سے امیر الحج بنا کر بھیجا اور مکہ سے حضرت علیؓ کے عامل کو نکال کر اور وہاں کے لوگوں سے اپنی بیعت لینے کی خدمت اُن کے سپرد کی، مکہ کے علوی حاکم حضرت قثم بن عباسؓ کو اس کی خبر ہوئی تو انہوں نے اہلِ مکہ کو مزید مقابلہ کے لیے اُبھارا، لیکن شیبہ بن عثمان کے علاوہ کوئی اس پر آمادہ نہ ہوا، حضرت قثمؓ نے ان حالات سے حضرت علیؓ کو مطلع کر کے خود مکہ چھوڑ دینا چاہا، لیکن حضرت ابوسعید خدری کی درخواست پر اس اقدام سے باز رہے۔ اسی دوران میں شامی پہنچ گئے، لیکن کسی سے تعرض نہ کیا۔ حضرت علیؓ کو چونکہ صورتِ حال کی اطلاع ہو چکی تھی۔ اس لیے آپ کے حکم سے ریان بن ضمرہؓ اور ابوالطفیلؓ فوجیں لے کر مقابلہ کے لیے پہنچے لیکن کسی سے مقابلہ سے پہلے ہی یزید بن شجرہ نے خود ہی اعلان کر دیا کہ ہم حرم کے امن و امان میں خلل ڈالنا نہیں چاہتے۔ البتہ جو ہم سے لڑے گا، اس سے ضرور جنگ کریں گے۔ مزید برآں انہوں نے حضرت ابوسعید خدری سے درخواست کی کہ "میں حرم کی تعزلق پسند نہیں کرتا، اس لیے میرے اور قثمؓ کے علاوہ کسی ایسے تیسرے شخص کو امام بنا دیجیے، جس میں سب کو اتفاق ہو۔" تجویز چونکہ معقول تھی، اس لیے حضرت ابوسعید خدری کے ایماء پر قثمؓ الگ ہو گئے۔ لوگوں نے اتفاقِ رائے سے شیبہ بن عثمان کو امیر بنایا جن کی امارت میں اس سال کا حج ادا ہوا اور یزید بن شجرہ اختتامِ حج کے بعد واپس چلے گئے۔

اسی سنہ میں امیر معاویہؓ نے عبدالرحمٰن بن قباث بن اشیم کو جزیرہ بھیجا۔ یہاں کے حاکم شبیبؓ بن عامر نصیبین کے مقام پر تھے۔ انہوں نے کمیل بن زیاد کو ان حالات کی خبر دی، کمیل چھ سو سواروں کو لے کر مدد کو پہنچے اور عبدالرحمٰن کو شکستِ فاش دی۔ شامیوں کی بڑی تعداد کھیت رہی اور ان کے سامان پر کمیل نے قبضہ کر لیا۔ اسی اثنا میں شبیبؓ بھی پہنچ گئے۔ لیکن اس وقت شکست کھا کر واپس جا چکے تھے، تاہم آپ نے بعلبک تک ان کا تعاقب کیا۔ امیر معاویہؓ کو اطلاع ہوئی، تو آپ نے فوراً حبیب بن مسلمہ کو شبیبؓ کے مقابلہ پر بھیجا، لیکن ان کے پہنچتے پہنچتے شبیبؓ واپس جا چکے تھے۔

دومۃ الجندل کے باشندے غیر جانبدار تھے۔ انہوں نے اب تک حضرت علیؓ یا امیر معاویہؓ میں سے کسی کی بیعت نہ کی تھی۔ امیر معاویہؓ نے مسلم بن عقبہ کو ان کی بیعت کے لیے بھیجا، لیکن یہ لوگ آمادہ نہ ہوئے، امیر المومنین حضرت علیؓ کو خبر ہوئی، تو آپ نے مالک بن کعب کو اپنی بیعت کے لیے روانہ کیا۔ مالک اور مسلم میں جنگ ہوئی، مسلم شکست کھا کر لوٹ گئے۔ اس کے بعد مالک نے دومۃ الجندل کے لوگوں سے بیعت لینی

چاہی، مگر انہوں نے کہا کہ جب تک کسی ایک شخص پر سب کا اتفاق نہ ہو جائے، وہ بیعت نہیں کریں گے، مالک نے زیادہ اصرار مناسب نہ سمجھا اور واپس چلے آئے۔

حجاز اور عرب کے لیے کشمکش

ابھی تک حجاز جس کی بیعت دحکومت پر خلافت کا فیصلہ ہوتا تھا حضرت علیؓ کے قبضہ میں تھا۔ امیر معاویہؓ نے ۴۰ھ میں از سر نو چھیڑ چھاڑ شروع کی اور مشہور جفا کار بسر بن ابی ارطاۃ کو تین ہزار کی جمعیت کے ساتھ حجاز اور یمن روانہ کیا۔ وہ سیدھا مدینہ پہنچا۔ یہاں کے علوی حاکم حضرت ابو ایوب انصاریؓ نے حرم نبویؐ کے احترام کے خیال سے مزاحمت مناسب نہ سمجھی اور مدینہ چھوڑ کر کوفہ چلے گئے۔ بسر نے اہلِ مدینہ سے امیر معاویہؓ کے لیے زبردستی بیعت لی اور لوگوں کے دلوں میں ہیبت بٹھانے کے لیے چند گھروں کو مسمار کر کے مکہ کا رخ کیا اور اہلِ مکہ سے بھی بزور بیعت لی، پھر وہاں سے یمن کی طرف بڑھا، حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے پہلے ہی یمن کے حاکم حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو خفیہ طور پر بسر بن ابی ارطاۃ کے حملے کی اطلاع کر دی اور یہ بھی لکھ دیا کہ جو لوگ امیر معاویہؓ کی حکومت تسلیم کرنے میں پس و پیش کرتے ہیں، وہ ان کو نہایت بیدردی سے تہہ تیغ کر دیتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے بسر کی آمد سے قبل ہی عبداللہ بن عبد المدان کو اپنا قائم مقام بنا کر دربارِ خلافت سے مدد طلب کرنے کے لیے کوفہ کی راہ لی۔ بسر نے یمن پہنچ کر عبد المدان اور اس کے لڑکے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے دو صغیر السن بچوں اور حضرت علیؓ کے حامیوں کی ایک بڑی جماعت کو قتل کیا اور پھر شام روانہ ہو گیا۔

حضرت علیؓ کو بسر بن ارطاۃ کی ان سفاکیوں کی اطلاع ہوئی، تو آپ نے فوراً جاریہ بن قدامہ اور وہب بن مسعود کو چار ہزار سپاہ کے ساتھ روانہ کیا۔ بسر اس وقت نجران میں تھا، علوی فوج کی آمد کی خبر سن کر بھاگ نکلا۔ جاریہ اور وہب نے نجران پہنچ کر بسر کے چند آدمیوں کو تہہ تیغ کیا، پھر مکہ کا رخ کیا اور اہلِ مکہ سے حضرت علیؓ کی بیعت لے کر مدینہ پہنچے۔ یہاں کے لوگوں سے حضرت حسنؓ کی بیعت لی اور چند دن ٹھہر کر کوفہ روانہ ہو گئے۔

فریقین میں مصالحت

مؤرخین کے مطابق اس مسلسل خانہ جنگی اور بدامنی سے گھبرا کر حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ نے ۴۰ھ میں صلح کر لی۔ مؤرخ طبری کے لفظوں میں "جب دونوں فریقین میں کسی نے بھی دوسرے کی اطاعت قبول نہ کی، تو امیر معاویہؓ نے حضرت علیؓ کو تحریر کیا کہ اگر تم چاہو تو ایسا کر لو کہ عراق کی حکومت تمہارے حصہ میں ہو اور شام کی میرے حصے میں، تاکہ اس اُمت سے تلوار رک جائے اور مسلمانوں کے خون نہ بہیں اس پر حضرت علیؓ راضی ہو گئے۔ (چنانچہ) معاویہؓ کے لشکر شام اور اس کے گرد و نواح کا انتظام کرتے" غرض اس صلح کی رو سے حجاز، عراق اور مشرق کا پورا علاقہ حضرت علیؓ کے پاس رہا اور شام، مصر اور مغرب کا حصہ امیر معاویہؓ کے قبضہ میں آیا۔

فتوحات

گذشتہ حالات سے یہ معلوم ہو گیا ہو گا کہ حضرت علیؓ کا پورا زمانہ خانہ جنگیوں اور اندرونی شورشوں کو دبانے میں گزرا۔ عنانِ خلافت ہاتھ میں لینے کے بعد آپ کو اتنی فرصت نہ مل سکی کہ آپ بیرونی فتوحات کی جانب توجہ فرماتے اور اسلام کی فتوحات کے دائرہ کو بڑھا سکتے، تاہم آپ اس سے غافل نہ رہے۔ چنانچہ آپ نے سیستان اور کابل کی جانب، جو عرب خود مختار ہو گئے تھے۔ ان کو قابو میں کر کے، قدم آگے بڑھایا اور مسلمانوں کو بحری راستہ سے ہندوستان پر حملہ کرنے کی اجازت بخشی، سب سے پہلے رضا کار سپاہیوں نے کوکن (بمبئی کا علاقہ) پر حملہ کیا جو اس زمانہ میں سندھ میں شامل تھا۔ مؤرخ بلاذری، فتوح السندھ کے باب میں لکھتے ہیں:

"آخر ۳۸ھ یا اوائل ۳۹ھ میں حارث بن مرۃ العبدی نے (حضرت) علی بن ابی طالبؓ سے اجازت لے کر بحیثیت مطوع سرحد ہند پر حملہ کیا، فتحیاب ہوئے اکثر غنیمت ہاتھ آئی۔ صرف لونڈی غلام ہی اتنے تھے کہ ایک دن میں ایک ہزار تقسیم کیے گئے۔"

بغاوتوں کا استیصال

حضرت علیؓ نے اگرچہ اپنی جنگی صلاحیتوں اور ہمت مردانہ سے امیر معاویہؓ کے حملہ آور دستوں کو مقبوضہ علاقوں سے نکال دیا تھا تاہم مسلمانوں کی خانہ جنگی اور عام بدامنی سے فائدہ اٹھا کر سرزمین عجم میں جابجا بغاوتیں پیدا ہو گئی تھیں، کرمان اور فارس کے صوبے باغی ہو گئے تھے اور بعض دیگر علاقوں میں بھی بغاوت کے آثار تھے۔ حضرت علیؓ نے اندرونی دشواریوں کے باوجود ان بغاوتوں کو فرد کرنے کے لیے زیاد بن ابیہ کو اس مہم پر مامور فرمایا۔ انہوں نے بہت جلد کرمان، فارس اور تمام ایران میں بغاوت کی آگ فرد کر کے امن و سکون پیدا کر دیا۔ بغاوت فرو ہونے کے بعد حضرت علیؓ ایرانی باغیوں کے ساتھ اس قدر لطف و مہربانی سے پیش آئے کہ ایران کا بچہ بچہ منت پذیری کے جذبات سے لبریز ہو گیا۔ ایرانیوں کا خیال تھا کہ امیر المومنین حضرت علیؓ کے طریق جہانبانی نے نوشیروان عادل کی طرز حکومت کی یاد بھلا دی[1]

حضرت علیؓ پر قاتلانہ حملہ

۴۰ھ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شہادت کا اندوہناک حادثہ پیش آیا۔ اس کی تفصیل میں مورخین نے لکھا ہے کہ معرکہ نہروان میں خارجیوں کو سخت نقصان پہنچا تھا، چنانچہ اس واقعہ کے بعد چند خارجیوں نے حج کے موقع پر جمع ہو کر مسائل حاضرہ پر گفتگو شروع کی اور بحث و مباحثہ کے بعد بالاتفاق یہ رائے قرار پائی کہ جب تک حضرت علیؓ، حضرت معاویہؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ صفحہ ہستی پر موجود ہیں دنیائے اسلام کو خانہ جنگیوں سے نجات حاصل نہیں ہو سکتی، اس پر عبدالرحمٰن بن ملجم نے حضرت علیؓ کو، برک بن عبداللہ نے امیر معاویہؓ کو اور عمرو بن بکر نے حضرت عمرو بن العاص کو قتل کرنے کا بیڑہ اٹھایا، اور پھر ان تینوں صحابہ کو ایک ہی دن یعنی ۱۷ رمضان کی صبح کو قتل کرنے کا پختہ عہد کر کے یہ ملعون اپنی اپنی مہم پر روانہ ہو گئے۔

کہتے ہیں کہ ابن ملجم جب کوفہ پہنچا تو وہاں اس نے ایک خارجی عورت قطام بنت شجنہ کو دیکھا، جو حسن و جمال میں یگانۂ روزگار تھی ابن ملجم پہلی ہی نظر میں اس پر فریفتہ ہو گیا اور اسے نکاح کا پیغام دیا۔ اس عورت کے باپ اور بھائی جنگ نہروان میں حضرت علیؓ کے ہاتھ سے قتل ہو گئے تھے۔ اس لیے قطام نے نکاح کے لیے حضرت علیؓ کے قتل کی شرط پیش کی۔ ابن ملجم چونکہ پہلے ہی اس ارادہ کی تکمیل کے لیے کوفہ آیا تھا، اس لیے قطام سے نکاح کی خواہش نے اس کے ارادہ کو اور زیادہ مستحکم کر دیا۔

غرض مقررہ تاریخ پر نماز فجر کے وقت تینوں قاتلوں نے حضرت علیؓ، امیر معاویہؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ پر حملہ کیا۔ امیر معاویہؓ پر وار اوچھا پڑا اس لیے وہ علاج معالجے سے بچ گئے۔ حضرت عمرو بن العاصؓ اس دن امامت کے لیے نہیں آئے تھے، ایک اور شخص جو ان کا قائم مقام ہوا تھا۔ حضرت عمرو بن العاصؓ کے دھوکے میں مارا گیا۔ لیکن جناب امیرؓ کا پیمانۂ حیات لبریز ہو چکا تھا۔ چنانچہ اسی صبح

---

[1] سیر الصحابہ رضخلفائے راشدین

کہ جب آپ نمازِ فجر کے لیے نکلے تو ابن ملجم اور اس کے ساتھی شبیب بن بجرہ نے، جو آپ کی گزرگاہ میں چھپ رہے تھے، اچانک سامنے آکر حملہ کر دیا۔ شبیب کا وار خطا گیا مگر ابنِ ملجم کی تلوار پیشانی سے سر کے اندر تک اُتر گئی۔ حضرت علیؓ نے آواز دی، لوگ دوڑ پڑے۔ شبیب تو نکل گیا لیکن ابنِ ملجم گرفتار ہوگیا۔ حضرت علیؓ کی بجائے حضرت جعدہ بن ہبیرہؓ نے نماز پڑھائی، نماز کے بعد ابنِ ملجم کو حضرت علیؓ کے سامنے پیش کیا گیا آپ نے قاتل سے چند سوالات کرنے کے بعد حکم دیا کہ اُسے اچھا کھانا کھلاؤ اور نرم بستر دو۔ آپ نے لوگوں کو ہدایت فرمائی کہ اگر میں اس زخم کے صدمہ سے جانبر نہ ہو سکا، تو اس کو خدا کے حکم کے مطابق قصاص میں قتل کر دینا، اور اگر زندہ رہا، تو اس کے خون کو معاف کرنے یا قصاص لینے کا زیادہ مستحق ہوں گا۔[1] مزید فرمایا کہ میرے بعد ایک خون کے بدلہ میں مسلمانوں کا خون نہ بہانا، صرف میرے قاتل کو قتل کرنا۔ حضرت حسنؓ سے فرمایا: کہ اگر میں مرجاؤں تو ایک ضرب کے بدلہ میں قاتل کو ایک ہی ضرب لگانا اور مُثلہ نہ کرنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ممانعت فرمائی ہے۔

تلوار زہر میں بجھی ہوئی تھی اس لیے نہایت تیزی کے ساتھ اس کا اثر تمام جسم میں سرایت کر گیا۔ جب حالت خراب ہونے لگی، تو آپ نے حضرت امام حسنؓ، حضرت امام حسینؓ اور حضرت محمد بن حنفیہؓ کو بلا کر باہم اتحاد و اتفاق اور دین و دنیا میں خیر و برکت کے لیے وصیتیں فرمائیں آپ کی زندگی سے چونکہ مایوسی ہوگئی تھی، اس لیے حضرت جندب بن عبداللہ نے پوچھا کہ آپ کے بعد ہم حضرت حسنؓ کے ہاتھ پر بیعت کرلیں؟ فرمایا میں تم کو نہ اس کا حکم دیتا ہوں اور نہ روکتا ہوں، تم لوگ اس کو زیادہ بہتر سمجھ سکتے ہو۔[2]

حضرت علیؓ نے اسی روز جس دن کہ آپ زخمی ہوئے یا اس کے تیسرے دن ۲۰ رمضان المبارک سنہ ۴۰ھ کو انتقال فرمایا، حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ نے غسل دیا۔ حضرت حسنؓ نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور رشد و ہدایت کے اس آفتابِ عالمتاب کو کوفہ کے عزی نامی قبرستان میں سپردِ خاک کیا۔ انتقال کے وقت آپ کی عمر تریسٹھ سال تھی اور مدتِ خلافت چار سال نو ماہ۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ[3]

ازواج و اولاد

حضرت علیؓ نے سیدہ جنت حضرت فاطمہ زہراؓ کی رحلت کے بعد مختلف اوقات میں متعدد شادیاں کیں اور ان سے کثرت اولادیں ہوئیں، تفصیل حسب ذیل ہے:۔

۱۔ حضرت فاطمہؓ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بطن سے حضرت حسنؓ، حضرت حسینؓ اور حضرت محسنؓ پیدا ہوئے، حضرت محسنؓ کا انتقال بچپن میں ہی ہوگیا تھا۔ صاحبزادیوں میں حضرت زینبؓ کبریٰ اور حضرت ام کلثومؓ کبریٰ تھیں۔

۲۔ ام البنین بنتِ حرام سے عباسؓ، جعفرؓ، عبداللہؓ اور عثمانؓ پیدا ہوئے، ابنِ سعدؒ کے مطابق یہ سب حضرت امام حسینؓ کے ساتھ کربلا میں شہید ہوئے۔[3]

۳۔ لیلیٰ بنتِ مسعود، انہوں نے عبداللہ اور ابوبکر کو یادگار چھوڑا، ایک روایت کے مطابق یہ دونوں بھی کربلا میں شہید ہوئے۔

۴۔ اسماء بنت عمیس سے یحییٰ اور محمد اصغر پیدا ہوئے۔

۵۔ صہبا، یا ام حبیب بنت ربیعہ سے عمر اور رقیہ پیدا ہوئیں۔

۶۔ امامہ بنتِ ابی العاص، یہ حضرت زینبؓ بنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی تھیں، ان سے محمد اوسط تولد ہوئے۔

---

[1] طبقات ابن سعد، حصہ سوم [2] تاریخ طبری حصہ سوم [3] طبقات ابن سعدؒ حصہ سوم۔

۷۔ خولہ بنت جعفر کے بطن سے محمدؒ بن علی پیدا ہوئے جو تاریخ اسلام میں محمدؒ بن حنفیہ کے نام سے مشہور ہیں۔
۸۔ اُمّ سعید بنت عروہ، ان سے اُمّ الحسن اور رملہ کبریٰ پیدا ہوئیں۔
۹۔ محیاۃ بنت امراء القیس سے ایک لڑکی تولد ہوئی جو بچپن میں ہی قضا کر گئی۔

متذکرہ بالا بیویوں کے علاوہ متعدد لونڈیاں بھی تھیں جن سے حسب ذیل لڑکیاں پیدا ہوئیں۔

اُمّ ہانی، میمونہ، زینب صغریٰ، رملہ صغریٰ، اُمّ کلثوم صغریٰ، فاطمہ، امامہ، خدیجہ، اُمّ الکرام، اُمّ سلمہ، اُمّ جعفر، جمانہ اور نفیسہ۔

غرض حضرت علیؓ کی سترہ لڑکیاں اور چودہ لڑکے تھے۔ ان میں سے صرف حضرت امام حسنؓ، حضرت امام حسینؓ، محمدؒ بن حنفیہ اور عمرؒ سے سلسلۂ نسب جاری رہا۔ مزید ان بزرگوں میں سے حضرت امام حسینؓ کو بنائے لاالٰہ قائم کرنے کے لیے "سرداد، نہ داد دست در دستِ یزید" کی وجہ سے جو شہرت ملی وہ اسلام کی عظمت و رفعت کا ایک ایسا باب ہے جو میدانِ کربلا میں حضرت امام حسینؓ کے مقدس خون سے لکھا گیا اور جو قیامت تک حق پرستوں کو یزیدیت کے قلع قمع پر اُبھارتا رہے گا۔

حُلیہ آپ کا قد میانہ، رنگ گندم گوں، آنکھیں بڑی بڑی، سینہ چوڑا اور اس پر بال تھے۔ آپ نہایت شگفتہ رو، کشادہ جبیں، خنداں رخ، حسین و جمیل، قوی بازو اور آہنی پنجہ تھے۔ آپ کے سر میں بال نہ تھے۔ ریش مبارک بڑی اور اتنی چوڑی تھی کہ ایک مونڈھے سے دوسرے مونڈھے تک پھیلی تھی۔ آخر میں بال بالکل سفید ہو گئے تھے اور شاید تمام عمر میں ایک بار بالوں میں مہندی کا خضاب کیا تھا۔

عہدِ مرتضویؓ پر ایک نظر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا پورا عہدِ خلافت خانہ جنگی اور شورش کی نذر ہوا۔ آپ کو ایک دن کے لیے بھی ملکی نظم و نسق کے قیام اور بیرونی فتوحات کی طرف توجہ کرنے کی فرصت نہ ملی، اس لیے تعمیری کاموں کے لحاظ سے آپ کا عہد اپنے پیش روؤں کے مقابلہ میں زیادہ کامیاب نہیں رہا اور یہ ان حالات کا لازمی نتیجہ تھا جن میں آپ کو منصبِ خلافت ملا اور جو بعد میں پیش آتے رہے۔ لیکن ان گوناگوں مشکلات کے باوجود جنابِ امیرؓ کی زندگی عظیم الشان کارناموں سے مملو ہے تاہم ان کارناموں پر نظر ڈالنے اور مشکلات کے مقابلہ پر حضرت علیؓ کے تحمل و استقلال اور سلامت روی کے بیان سے پہلے ان اسباب کی ٹوہ لگانا ضروری ہے، جو آپ کے عہدِ خلافت میں اس قدر افتراق و اختلاف اور شر و فساد کا باعث بنے۔

مؤرخین کے مطابق ان میں سے بعض اسباب تو وہی تھے جنہوں نے عثمانیؓ خلافت کا نظام درہم برہم کیا تھا اور بعض نئے تھے۔ بہرکیف اس کا اندازہ عہدِ صدیقؓ کے ابتدائی حالات کے موازنہ سے زیادہ صحیح ہو گا۔

اس میں شک نہیں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جس وقت تختِ خلافت پر قدم رکھا اس وقت دنیائے اسلام نہایت پُرآشوب تھی، بہت سے قبائل مُرتد ہو گئے تھے۔ بعضوں نے اسلام کے رکنِ اعظم، زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ جھوٹے مدعیانِ نبوت ملحدانہ انقلاب پر آمادہ تھے غرض عرب کی اندرونی حالت سخت تشویشناک تھی لیکن دونوں حالتوں میں بیّن فرق ہے۔ یعنی حضرت صدیقؓ اکبر کے سامنے اگرچہ مصائب کا طوفان اُمڈ رہا تھا تاہم کفر و ارتداد اور اسلام کا مقابلہ تھا۔ اس لیے سارے مسلمان اس کے مقابلہ میں متحد تھے۔ کُل صحابہؓ ان کے معین و مددگار تھے، پھر خود حریف طاقتوں میں ہوا و ہوس اور باطل پرستی کی وجہ سے کوئی استقلال نہ تھا۔ اس لیے ان کو زیر کرنا نسبتاً آسان تھا۔ برخلاف اس کے جنابِ امیرؓ کے مقابلہ میں جو لوگ تھے وہ نہ صرف مسلمان تھے بلکہ ان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوب حرم حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت زبیر بن العوامؓ جیسے اکابر

صحابہؓ تھے جن کا سارا بدن غزوہ اُحد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت میں چھلنی ہوگیا تھا اور جنہیں اس جاں نثاری کے صلہ میں بارگاہِ نبوت سے "خیر" کا لقب ملا تھا۔ ان کے علاوہ امیر معاویہؓ جیسے مدبر تھے جنہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قرابت داری کا بھی شرف حاصل تھا۔ مزید حضرت عمرو بن العاصؓ فاتح مصر جیسے سیاست دان تھے جن کی اسلام میں بڑی خدمات تھیں اور اُن میں سے ہر ایک اپنے آپ کو برسرِحق سمجھتا تھا ساتھ ہی ان کو ایسے جاں نثار وفا شعار ملے تھے جن کی مثالیں حضرت علیؓ کے طرفداروں میں کم تھیں، اس لئے ان کے مقابلہ میں حضرت علیؓ کا عہدہ برآ ہونا بہت دشوار تھا۔

دوسرے خلافت حقہ قائم کرنے کے لیے حضرت علیؓ کو جو زمانہ ملا وہ عہد رسالتمآبؐ سے تقریباً پچیس سال دُور ہٹ آیا تھا اور اس میں عہدِ رسالتؐ کی اسلامی روح کافی حد تک مضمحل ہو چکی تھی۔ بہت سے جلیل القدر صحابہؓ جو خلافت کے رکنِ عظیم تھے۔ اُٹھ چکے تھے اور اُن کی جگہ نئی پود لے رہی تھی۔ جس میں وہ اخلاص اور اسلامی جوش و ولولہ مفقود تھا۔ جس نے ان کے اسلاف کو خدا اور رسولؐ کی نگاہ میں معزز کیا تھا۔ متعدد اکابر صحابہؓ کو حالات نے حضرت علیؓ سے جدا کر دیا تھا۔ حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ جو عشرہ مبشرہ میں سے تھے۔ آپ سے الگ ہو گئے تھے۔ جنابِ امیرؓ کے ساتھ جو بزرگوار تھے۔ ان کا دین و تقویٰ مسلّم لیکن ان میں بہت کم صاحبِ تدبیر و سیاست تھے پھر اپنے ضمیر کی آواز کے مقابلہ میں حضرت علیؓ صاحبِ تدبیر و سیاست بزرگوں کا مشورہ تک قبول نہ کرتے تھے۔ حضرت مغیرہؓ بن شعبہ اور عبداللہ بن عباسؓ نے آپ کو آغازِ خلافت میں حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو معزول نہ کرنے کا مشورہ دیا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ آپ کے خلاف فتنہ کھڑا کریں گے لیکن آپ نے اس کو قبول نہ کیا، جس کا نتیجہ جنگ صفین کی صورت میں ظاہر ہوا۔ حضرت قیس بن سعدؓ جیسے مدبر کو آپ نے محض محمد بن ابی بکرؓ اور محمد بن جعفر بن ابی طالبؓ جیسے نوجوانوں کی رائے سے متاثر ہو کر مصر سے ہٹا دیا جس کے نتیجہ میں مصر ہاتھوں سے نکل گیا نیز آپ نے تمام عثمانی عمال کو معزول کر کے اپنے خلاف کر لیا اور نتیجۃً انہوں نے آپ کے مخالفین کے ہاتھ مضبوط کیے!

تیسرے حضرت علیؓ جس زہد و اتقا، دینداری، امانت اور عدل و انصاف کے ساتھ حکومت کرنا چاہتے تھے۔ حالات کے تغیر سے لوگوں میں اس کو قبول کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہی تھی، آپ نازک سے نازک وقت میں بھی جادۂ حق سے ہٹنے کے لیے تیار نہ تھے اور بیت المال کی ایک ایک کوڑی کا حساب لیتے اور ایک حبہ بھی بے جا صرف نہ ہونے دیتے تھے جبکہ دوسری طرف امیر معاویہؓ اپنے طرفداروں کے لیے بیت المال کا خزانہ لٹا رہے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ آپ کے اعزۂ خاص تک دل برداشتہ ہو کر آپ سے جدا ہو گئے تھے۔ جبکہ امیر معاویہؓ کی داد و دہش مخالفین تک کا مُنہ بند کر دیتی تھی۔

مزید برآں ان سب سے زیادہ آپ کو ناکام رکھنے والے وہ نومسلم عجمی تھے۔ جو اہلِ بیت کی محبت کی آڑ میں مسلمانوں سے اپنی قومی تباہی کا انتقام لینا چاہتے تھے اور جنہیں حضرت علیؓ تو کیا سرے سے اسلام ہی سے کوئی محبت نہ تھی۔ بہت سے جدید الاسلام عرب بھی اپنی غرض کے لیے آپ کے ساتھ ہو گئے تھے۔ انہی لوگوں نے اہلِ بیت اور غیر اہلِ بیت کا سوال پیدا کر کے مسلمانوں کے اتحاد و یک جہتی کا خاتمہ کیا۔ حضرت عثمانؓ کو شہید کر کے مسلمانوں میں خانہ جنگی کا دروازہ کھولا۔ پھر حضرت علیؓ کی لاعلمی میں آپ کے ساتھ ہو کر اختلاف کی آگ بھڑکائی، اگر یہ عنصر نہ ہوتا تو جمل اور صفین کے واقعات بھی پیش نہ آتے۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے حضرت علیؓ کی مخالفت کے باوجود آپ کو تحکیم جیسی پُرفریب تجویز قبول کرنے پر مجبور کیا۔ پھر خود ہی اس کے خلاف ہو گئے اور حضرت علیؓ کے خلاف محاذِ جنگ قائم کیا۔ پھر انہی میں وہ لوگ تھے جنہوں نے امیر معاویہؓ کے مقابلہ پر آپ کا ساتھ چھوڑ دیا۔ غرض کسی موقع پر بھی انہوں نے وفاداری کا ثبوت نہ دیا۔

لیکن ان تمام مشکلات اور مجبوریوں کے باوجود جناب امیرؓ نے غیر معمولی ہمت و استقلال اور عدیم النظیر عزم و ثبات کے ساتھ زندگی کے آخری لمحہ تک ان مشکلات و مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کر کے دنیا کے سامنے بے نظیر تحمل و سلامت روی کا نمونہ پیش کیا اور اپنی ناکامی کے اسباب کا مشاہدہ کرنے کے باوجود دیانتداری اور شریعت سے سرمو تجاوز کرنا پسند نہ فرمایا۔ اگر آپ تھوڑی سی دنیا داری سے کام لیتے تو کامیاب ہو جاتے، لیکن دین ضائع ہو جاتا جس کا بچانا ایک خلیفۂ راشد اور جانشینِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے پہلا اور اصلی فرض تھا۔

نظامِ خلافت میں اصلاح اس ضمن میں حضرت علیؓ کا بڑا کارنامہ نظامِ خلافت کی اصلاح ہے۔ حضرت عثمانؓ کے آخری دور میں اموی نوجوانوں کے غلبہ سے خلافت کا نظام خلافت راشدہ کی شاہراہ سے ہٹ چلا تھا چنانچہ آپ نے اسے دوبارہ صراطِ مستقیم پر لانے کی سعی فرمائی۔ گو مخالف حالات نے آپ کو پورا موقع نہ دیا، تاہم جہاں تک آپ کے بس میں تھا۔ آپ نے شیخین کے دور کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی اور جو بدعنوانیاں حضرت عثمانؓ کے دور میں پیدا ہو گئی تھیں، انہیں دور کر کے عہدِ فاروقی کے نظم و نسق کو بغیر کسی ترمیم کے قائم رکھا۔ ایک دفعہ نجران کے یہودیوں نے جنہیں حضرت عمرؓ نے حجاز سے نجران جلاوطن کر دیا تھا، نہایت لجاجت کے ساتھ اپنے وطن آنے کی درخواست کی لیکن آپ نے صاف انکار کر دیا اور فرمایا عمرؓ سے زیادہ کون صائب الرائے ہو سکتا ہے۔[1]

فوجی انتظامات حضرت علیؓ فطرتاً سپاہی اور بڑے تجربہ کار جنگ آزما تھے۔ اس لیے فوج کی طرف آپ کی خصوصی توجہ رہی۔ اس سلسلہ میں آپ نے بہت سے انتظامات کیے اور شام کی سرحد پر نہایت کثرت کے ساتھ فوجی چوکیاں قائم کیں، جب امیر معاویہؓ نے ۳۹ھ میں عراق پر یورش کی تو ان ہی سرحدی فوجوں نے ان کو آگے بڑھنے سے روکا۔ اسی طرح ایران میں مسلسل شورش اور بغاوت کی وجہ سے بیت المال اور عورتوں اور بچوں کی حفاظت کے لیے نہایت مستحکم قلعے تعمیر کرائے۔ اصطخر کا قلعہ حصنِ زیاد اور فرات کا پل آپ ہی کے دور میں تعمیر ہوئے تھے۔

صیغۂ مال آپ نے صیغۂ مال میں بعض ایسی اصلاحات کیں جن سے اس کی آمدنی میں اضافہ ہو گیا۔ آپ کے دور سے پہلے جنگل سے کسی قسم کا مالی فائدہ حاصل نہیں کیا جاتا تھا لیکن آپ نے انہیں قابلِ محصول قرار دیا۔ چنانچہ برس کے جنگل پر چار ہزار درہم مالگذاری تشخیص کی گئی۔

بعض چیزوں پر سے محصول اٹھا دیا۔ عہد نبویؐ میں گھوڑے زکوٰۃ سے مستثنیٰ تھے مگر حضرت عمرؓ کے زمانے میں جب عام طور پر اس کی تجارت ہونے لگی، تو آپ نے اس پر بھی زکوٰۃ مقرر کر دی، لیکن حضرت علیؓ نے اپنے زمانہ میں اسے منسوخ کر دیا۔

عمال کی اخلاقی نگرانی عہد فاروقیؓ کی طرح آپ کو عمال کی اخلاقی نگرانی میں بڑا اہتمام تھا۔ آپ جب کسی عامل کو مقرر کرتے تھے، تو اس کو گراں بہا نصائح کرتے تھے۔ آپ وقتاً فوقتاً اپنے عمال کو قیامِ عدل اور رعایا کے ساتھ لطف و شفقت کے احکام بھیجتے رہتے تھے ان کی طرزِ حکومت کی تحقیقات کراتے اور ان کی غلط روی کا تدارک فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ

---

[1] تاریخِ اسلام حصہ اوّل از شاہ معین الدین احمد ندوی۔

ایک مرتبہ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ انصاری کو عراق کے حکام کی تحقیقات پر مامور کیا اور یہ ہدایت فرمائی:

"تم اپنے ساتھیوں کا ایک گروہ لے کر روانہ ہو جاؤ اور عراق کے ہر ضلع میں پھر کر عمال کی تحقیقات کرو اور ان کی روش پر غائر نظر رکھو۔"

منذر بن جارو د والیٔ اصطخر کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ اپنا زیادہ وقت سیر و شکار میں صرف کرتے اور فرائض منصبی کی ادائیگی میں غفلت برتتے ہیں تو انہیں لکھا۔

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم اپنے فرائض چھوڑ کر سیر و شکار میں نکل جاتے ہو اور کتوں سے کھیلتے ہو، اگر یہ صحیح ہے تو میں تم کو اس کا بدلہ دوں گا، تمہارے گھر کا جاہل بھی تم سے بہتر ہے۔"

چنانچہ انہیں طلب کر کے معزول کر دیا۔

بیت المال کی حفاظت

حضرت علی رضی اللہ عنہ بیت المال کی حفاظت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرح اہتمام کرتے اور عمال کے اسراف اور مالیات میں ان کی بدعنوانیوں کی سختی سے باز پرس فرماتے۔ ایک دفعہ اردشیر کے عامل مصقلہ نے بیت المال سے قرض لے کر پانچسو لونڈی اور غلام خرید کر آزاد کیے۔ آپ کو معلوم ہوا تو سختی کے ساتھ اس رقم کا مطالبہ کیا مصقلہ نے کہا "خدا کی قسم عثمان رضی اللہ عنہ کے نزدیک اتنی رقم کا چھوڑ دینا کوئی بات نہ تھی لیکن یہ تو ایک ایک حبہ کا تقاضہ کرتے ہیں۔ چنانچہ ناداری کے باعث مجبور ہو کر مصقلہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی پناہ میں چلے گئے۔ جناب امیر رضی اللہ عنہ کو پتہ چلا تو فرمایا:

"خدا اس کا برا کرے، اس نے کام تو سیدھا کیا، لیکن غلام کی طرح بھاگا اور تاجر کی طرح خیانت کی، خدا کی قسم اگر وہ مقیم ہوتا تو قید سے زیادہ اس کو سزا نہ دیتا اور اگر اس کے پاس کچھ ہوتا، تو لیتا ورنہ معاف کر دیتا۔"

اس باز پرس سے آپ کے عزیز و اقارب بھی مستثنیٰ نہ تھے۔ ایک مرتبہ ان کے چچیرے بھائی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے بصرہ کے بیت المال سے دس ہزار کی رقم لے لی، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا تو رقم واپس کرنے کے لئے لکھا۔ انہوں نے جواب دیا کہ میں نے ابھی اپنا پورا حق نہیں لیا ہے، لیکن اس عذر کے باوجود وہ خائف ہو کر بصرہ سے مکہ چلے گئے۔

ایک مرتبہ عمرو بن سلمہ اصفہان کا خراج لائے۔ اس میں شہد اور چربی بھی تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی ام کلثوم نے مانگ بھیجا۔ عمرو بن سلمہ نے ایک پیپا شہد اور ایک پیپا چربی بھیج دی۔ دوسرے دن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کا شمار کیا تو دو پیپے کم نکلے۔ عمرو بن سلمہ سے سختی کے ساتھ پوچھا، تو انہوں نے بتا دیا چنانچہ اسی وقت دونوں پیپے منگوا لیے اور اس میں سے جو کچھ خرچ ہو چکا تھا اس کا اندازہ لگا کر اس کی قیمت ادا کر دی۔[1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام حضرت ابو رافع رضی اللہ عنہ بیت المال کے نگران تھے۔ انہوں نے اس کا ایک موتی اپنی لڑکی کو پہنا دیا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دیکھا تو پہچان لیا ابو رافع رضی اللہ عنہ سے پوچھا تو انہوں نے اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا۔ فرمایا:

---

[1] تاریخ اسلام از شاہ معین الدین احمد ندوی

"تمہارا یہ حال ہے کہ اپنی لڑکی کو موتیوں سے آراستہ کرتے ہو۔ حالانکہ جب فاطمہؓ کے ساتھ میری شادی ہوئی تو میرے پاس مینڈھے کی صرف ایک کھال تھی جس پر رات کو سوتا تھا اور دن کو اسی پر مویشیوں کو چارہ دیتا تھا اور ایک خادم تک میرے پاس نہ تھا"۔

خراج کی آمدنی کا احتساب

عمال سے محاصل اور خراج کی آمدنی کا نہایت سختی کے ساتھ حساب لیتے تھے اور اگر مقررہ وقت سے ذرا بھی تاخیر ہو جاتی، تو فہمائشی احکام جاری فرماتے، ایک دفعہ یزید بن قیس نے خراج بھیجنے میں تاخیر کی تو آپ نے لکھا:

"تم نے خراج بھیجنے میں تاخیر کی، اس تاخیر کا سبب مجھے معلوم نہیں، لیکن میں تم کو خدا سے ڈرنے کی وصیت کرتا ہوں اور تمہیں اس سے ڈراتا ہوں کہ ایسا کام نہ کرو جس سے تمہارا اجر برباد اور تمہارا جہاد باطل ہو جائے، خدا سے ڈرو اور اپنے نفس کو حرام مال سے پاک رکھو اور مجھ کو اس کا موقع نہ دو کہ تم سے مواخذہ کرنے پر مجبور ہو جاؤں، مسلمانوں کو معزز کرو لیکن اہل معاہدہ پر زیادتی نہ ہو۔ خدا نے تم کو جو کچھ دیا ہے اس کو حصول آخرت کا ذریعہ بناؤ اور دنیا کا حصہ بھی فراموش نہ کرو"۔

ایک اور عامل نعمان بن عجلان کو جو بحرین کا خراج لے کر کہیں چل دیے تھے، لکھا:۔

"جس نے امانت میں خیانت کی اور اپنے نفس اور اپنے دین کو نہ بچایا، اس نے دنیا میں بھی اپنے کو نقصان پہنچایا اور آخرت میں جو کچھ پیش آنے والا ہے وہ اس سے زیادہ تلخ اس سے زیادہ مجتنب اور اس سے زیادہ دیرپا ہے۔ اللہ کا خوف کرو، تم صالح خاندان سے ہو اس لیے خوش گمانی کا موقع دو، مجھ کو جو خبر ملی ہے۔ اگر وہ صحیح ہے تو اس سے توبہ کرو اور اپنے متعلق رائے بدلنے پر مجبور نہ کرو، خراج ادا کر دو"۔

ذمیوں کے ساتھ سلوک

حضرت علیؓ ذمیوں کے حقوق کا خاص لحاظ رکھتے تھے اور اپنے عمال کو ان کے ساتھ حسن سلوک کی ہدایت فرماتے تھے۔ ذمیوں کو ایک عامل عمرو بن مسلمہؓ کی درشت مزاجی کی شکایت تھی، آپ نے انہیں لکھا:۔

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہارے علاقہ کے ذمی دہقانوں کو تمہاری درشت مزاجی کی شکایت ہے، اس میں کوئی بھلائی نہیں ہے، تم کو سختی اور نرمی دونوں سے کام لینا چاہیے، لیکن سختی ظلم اور نرمی نقصان کی حد تک نہ پہنچ جائے۔ ان سے جو مطالبہ ہو اسے وصول کیا کرو مگر ان کے خون سے اپنا دامن محفوظ رکھو"۔

اہل عجم کے ساتھ آپ نے جس لطف و کرم کا برتاؤ کیا تھا۔ اس کے متعلق وہ خود کہتے تھے۔ خدا کی قسم! اس عربی نے نوشیروان کی یاد تازہ کر دی۔

رعایا کے ساتھ شفقت

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا وجود رعایا کے لیے چشمۂ جود و سخا اور آئینۂ رحمت تھا۔ بیت المال کے

دروازے غرباء و مساکین کے لیے کھلے رکھتے تھے۔ اور اس میں جو رقم جمع ہوتی تھی۔ نہایت فیاضی و فراخدلی کے ساتھ مستحقین پر تقسیم کر دی جاتی تھی۔

عدل و مساوات

حضرت علی رضؓ کی نگاہ عدل و انصاف میں بلا امتیاز مذہب و ملت خویش و بیگانہ اور امیر و غریب سب یکساں تھے۔ یہاں تک کہ اگر خود کسی مقدمہ میں فریق ہوتے تو بغیر کسی ادنیٰ رعایت کے حسب قاعدہ عدالت میں حاضر ہوتے، اگر ثبوت نہ ہوتا تو اپنے خلاف فیصلہ سُن کر اسے قبول کرتے، ایک مرتبہ آپ کی زرہ گر پڑی جو ایک غیر مُسلم کے ہاتھ لگی۔ آپ نے قاضی شریح کی عدالت میں دعویٰ کیا۔ قاضی نے آپ سے زرہ کی ملکیت کا ثبوت مانگا۔ جب آپ نہ دے سکے تو فیصلہ فریق ثانی کے حق میں کر دیا۔ اس فیصلہ سے وہ غیر مُسلم اس قدر متاثر ہوا کہ مسلمان ہو گیا اور کہا:

"یہ تو انبیاء کے جیسا انصاف ہے کہ امیر المومنین مجھے اپنی عدالت کے قاضی کے سامنے پیش کرتے ہیں اور قاضی امیر المومنین کے خلاف فیصلہ کرتے ہیں۔"

بازار کی نگرانی

آپ بازار کی نگرانی اشیاء کے بھاؤ اور ناپ تول کی دیکھ بھال خود کرتے تھے، دِرّہ لے کر بازار نکل جاتے اور دکان داروں کو حسنِ معاملت اور ناپ تول میں ایمانداری کی ہدایت فرماتے۔

مذہبی خدمات

امام وقت کا سب سے اہم اور مقدس فرض مذہب کی اشاعت و تبلیغ اور خود مسلمانوں کی مذہبی تعلیم و تلقین ہے۔ حضرت علی رضؓ عہدِ رسالتمآبؐ سے ہی اِن خدمات میں ممتاز تھے۔ چنانچہ یمن میں اسلام کی روشنی ان ہی کی کوشش سے پھیلی تھی اور ۹ھ میں جب سورۂ براۃ نازل ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اشاعت و تبلیغ کی خدمت انہی کے سپرد فرمائی تھی۔

آپ کو اگرچہ مسندِ خلافت پر قدم رکھنے کے بعد سے آخر تک خانہ جنگیوں نے ان امُور کی طرف بھرپُور توجہ کرنے کی مہلت ہی نہ دی تاہم آپ اس فرض سے غافل نہ تھے۔ ایران اور آرمینیہ میں جب نو مُسلم عیسائی مرتد ہو گئے۔ تو آپ نے باخبر ہوتے ہی اتنی شدت سے اس بات کا نوٹس لیا کہ ان میں سے اکثر تائب ہو کر پھر حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے۔ خارجیوں کی سرکوبی اور ان سبائیوں کو جو شدتِ غلو میں آپ کو خدا کہنے لگے تھے۔ سزا دینا بھی دراصل مذہب کی ایک بڑی خدمت تھی [1]

فضل و کمال

حضرت علی رضؓ ابھی بچّہ ہی تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں آغوشِ تربیت میں لے لیا تھا۔ اس بنا پر حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کو ابتدا سے ہی درس گاہ نبوت میں تعلیم و تربیت حاصل کرنے کا پورا موقع ملا تھا۔ مزید جوانی میں رشتہ مصاہرت سے سرفراز ہوئے اور آنحضرت صلعم کے وصال تک چشمۂ علم و حکمت سے سیراب ہوتے رہے۔ ان خصوصیات کے ساتھ ساتھ قدرت نے تحصیل علم اور کسبِ کمال کی فطری صلاحیتوں سے بھی آپ کو مالا مال کیا تھا۔ چنانچہ مکتبِ نبوت سے جو فیض آپ کو پہنچا وہ بہت کم صحابہ رضؓ کے حصّہ میں آیا، اہلِ سیر کے مطابق آپ قرآن، تفسیر، حدیث اور جملہ دینی علوم کا ایک ایسا دریا تھے۔ جن کو زبان نبوت سے "انا مدینۃ العلم وعلی بابھا"[2] کی سند ملی۔ آپ کی جلالتِ علمی پر سب کا اتفاق ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ، جو خود حبرالامۃ تھے۔ فرماتے تھے کہ علم

---

[1] سیرالصحابہ رضؓ خلفائے راشدین [2] "میں علم کا شہر اور علی رضؓ اس کا دروازہ ہے۔"

کہ دس حصّوں میں سے خدا نے علیؓ کو نو حصّے عطا فرمائے اور دسویں میں بھی آپ شریک تھے۔

تفسیر اور علوم القرآن

اسلام کے علوم و معارف کا اصل سرچشمہ قرآن حکیم ہے اور حضرت علیؓ زبانِ وحی والہام سے تعلیم حاصل کرنے کے باعث اس چشمۂ صافی سے پوری طرح سیراب تھے۔ آپ اُن صحابہؓ میں سے تھے، جنہوں نے نہ صرف یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حیاتِ اقدس ہی میں پورا قرآن حکیم حفظ کر لیا تھا بلکہ اس کی ایک ایک آیت کے معنی اور شانِ نزول تک سے واقف تھے۔ کلام اللہ پر آپ کی نظر اتنی وسیع تھی کہ کسی آیت کا کوئی پہلو آپ کی نظر سے پوشیدہ نہ تھا۔ اس ضمن میں آپ خود فرماتے تھے کہ قرآن میں کوئی آیت ایسی نہیں ہے جس کے متعلق میں یہ نہ جانتا ہوں کہ وہ کس بارہ میں کہاں اور کس کے متعلق نازل ہوئی ہے[1] یہی وجہ ہے کہ آپ کا شمار مفسرین کے اعلیٰ طبقہ میں ہے اور صحابہؓ میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے علاوہ کوئی آپ کا ہمسر نہ تھا۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت علیؓ جو چھ ماہ تک گوشہ نشین رہے۔ اس دوران میں آپ نے آیتوں اور سورتوں کی نزولی ترتیب پر کلام الٰہی کا ایک نسخہ مرتب کیا تھا جس کی تفصیل ابن ندیم نے کتاب الفہرست میں دی ہے۔

قرآن حکیم میں غیر معمولی درک کی وجہ سے آپ کو کلام الٰہی سے اجتہاد اور مسائل کے استنباط میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ علم ناسخ اور منسوخ میں آپ کمال رکھتے اور اس کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ اس سلسلہ میں جن لوگوں کو درک نہ ہوتا ان کو درس و وعظ سے روک دیتے تھے۔ چنانچہ کوفہ کی جامع مسجد میں جو شخص وعظ و تذکیر کرنا چاہتا اس سے آپ دریافت فرماتے کہ تم کو ناسخ و منسوخ کا علم ہے؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہوتا، تو آپ اسے وعظ کی اجازت نہ دیتے تھے[2]

علمِ حدیث

حضرت علیؓ کو چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کے ساتھ صبح و شام اٹھتے، بیٹھتے، سفر و حضر میں تقرب کا زیادہ موقع ملا تھا۔ اس لیے حضرت ابوبکرؓ کو چھوڑ کر اسلام کے احکام و فرائض اور ارشاداتِ نبویؐ کے سب سے بڑے عالم آپ ہی تھے، پھر وصالِ نبویؐ کے بعد تقریباً تیس سال آپ تعلیم و ارشاد کی مسند پر جلوہ گر رہے۔ مزید حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے عہدِ خلافت میں یہ خدمت سرانجام دینے کے بعد چونکہ خود آپ کے زمانۂ خلافت میں بھی یہ فیض جاری رہا، اس لیے حفظِ حدیث اور روایتِ حدیث دونوں لحاظ سے آپ جماعتِ صحابہؓ میں نہایت ممتاز تھے۔ آپ کی مرویات کی تعداد پانچ سو چھیاسی ہے۔ یہ تعداد اگرچہ دوسرے کثیر الروایہ صحابہؓ کے مقابلہ پر بہت کم ہے تاہم یہ آپ کی کمالِ احتیاط کا نتیجہ ہے کیونکہ اس ضمن میں آپ بھی اپنے پیشرو خلفاء اور اکابر صحابہؓ کی طرح محتاط اور متشدد تھے۔ آپ ان چند صحابہؓ میں شامل ہیں جن کو احادیث نبویؐ قلمبند کرنے کا شرف حاصل ہے۔ آپ نے فقہی احکام کے متعلق احادیث کا ایک مجموعہ مرتب فرمایا تھا جس کا نام صحیفہ رکھا تھا۔

فقہ و اجتہاد

حضرت علیؓ کو فقہ و اجتہاد میں بھی کامل دستگاہ حاصل تھی، فقہ و اجتہاد کے لیے کلام اللہ اور احادیث نبویؐ میں وسعتِ علم کے ساتھ جس ذہانت طباعی، دقیقہ سنجی اور نکتہ رسی کی ضرورت ہے۔ حضرت علیؓ کا دامن فضل و کمال ان سے مالامال تھا۔ اس بنا پر فقہ میں آپ کا پایہ بہت بلند ہے صحابہؓ میں آپ کو امامت و اجتہاد کا درجہ حاصل تھا۔ اکابر صحابہؓ

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۲ [2] سیر الصحابہ۔ خلفائے راشدین۔

فقہی مشکلات میں آپ ہی کی طرف رجوع کرتے اور آپ کی نگاہِ نکتہ رس مشکل سے مشکل اور پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلہ کی تہ تک پہنچ جاتی۔

حضرت عمرؓ جنہیں خود مجتہد اور امام فقہ کا درجہ حاصل تھا، آپ سے استفادہ کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ کے سامنے ایک مجنون زانیہ عورت پیش کی گئی، حضرت عمرؓ نے اس پر حد جاری کرنے کا ارادہ کیا، لیکن حضرت علیؓ کی اس دلیل کے پیش نظر کہ مجنون حدودِ شرعی سے مستثنیٰ ہیں، حضرت عمرؓ اپنے ارادے سے باز آگئے۔

حضرت علیؓ کے علم اور آپ کی اجتہادی قوت اور دقتِ نظر کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ آپ کے حریف بھی دقیق اور مشکل مسائل میں آپ ہی کی طرف رجوع کرتے تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ امیر معاویہؓ نے لکھ کر دریافت کیا کہ خنثیٰ مشکل کی وراثت کی کیا صورت ہے؟ یعنی اسے مرد قرار دیا جائے یا عورت؟ حضرت علیؓ نے فرمایا: "خدا کا شکر ہے کہ ہمارے دشمن بھی علم دین میں ہمارے محتاج ہیں" پھر جواب دیا کہ پیشاب گاہ سے اندازہ کرنا چاہیے کہ وہ مرد ہے یا عورت؟ اہل سیر کے مطابق تقسیم میراث کے فن میں آپ مدینہ کے ممتاز علماء میں تھے

ایک دفعہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے کسی نے یہ مسئلہ پوچھا کہ ایک بار پاؤں دھونے کے بعد کتنے دن تک موزوں پر مسح کر سکتے ہیں، ام المومنین نے فرمایا کہ جا کر علیؓ سے دریافت کرو ان کو معلوم ہوگا، کیونکہ وہ سفر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ اس پر سائل حضرت علیؓ کے پاس گیا، آپ نے فرمایا: مسافر تین دن تین رات تک اور مقیم ایک دن ایک رات تک۔

قضا اور فیصلے

فقہی کمال کا ایک پہلو فصلِ مقدمات ہے۔ اس میں جماعت صحابہؓ میں کوئی آپ کا مقابل نہ تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو "اقضاھم علیؓ" یعنی صحابہؓ میں علیؓ سب سے بڑے قاضی ہیں کی سند عطا فرمائی تھی اور قضا کی خدمت آپ کو سپرد فرماتے تھے۔ چنانچہ اہل یمن کے قبول اسلام کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو وہاں کے عہدۂ قضا کے لیے منتخب فرمایا۔ حضرت علیؓ نے عرض کی "یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) وہاں نئے نئے مقدمات پیش ہوں گے اور مجھے قضا کا تجربہ اور علم نہیں" ارشاد ہوا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری زبان کو راہِ راست اور تمہارے دل کو ثبات و استقلال بخشے گا۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد پھر مجھے مقدمات کے فیصلہ میں تذبذب نہ ہوا۔

حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ ہم میں مقدمات کے فیصلے کے لیے سب سے موزوں علیؓ ہیں اور سب سے بڑے قاری ابیؓ ہیں[1]

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ ہم (صحابہؓ) کہا کرتے تھے کہ مدینہ والوں میں سب سے صحیح فیصلہ کرنے والے علیؓ ہیں۔

ایک دفعہ ایک دلچسپ مقدمہ آپ کے سامنے پیش ہوا، آپ نے اس کا جو فیصلہ صادر فرمایا وہ اس سے بھی زیادہ دلچسپ اور آپ کی نکتہ سنجی کی ایک روشن مثال ہے۔ اس مقدمہ کی تفصیل یہ ہے کہ دو شخص تھے جن کے پاس مجموعی طور پر آٹھ روٹیاں تھیں، یعنی ایک کے پاس پانچ اور دوسرے کے پاس تین، جب دونوں مل کر ایک ساتھ کھانے کو بیٹھے تو ایک تیسرا شخص بھی آگیا اور کھانے میں شریک ہوا۔ جب کھانے سے فراغت ہوئی، تو اس نے آٹھ درہم اپنے حصہ کی روٹیوں کی قیمت دے دی اور چلا گیا۔ جس شخص کی پانچ روٹیاں تھیں، اس نے اپنے حصے کے پانچ درہم رکھ کر تین درہم دوسرے کو دینے چاہے مگر وہ راضی نہ ہوا اور نصف کا مطالبہ کیا۔ جب بات بڑھی تو معاملہ حضرت

---

[1] سیر الصحابہؓ جلد اول خلفائے راشدین

علیؓ کی عدالت میں پیش ہوا۔ آپ نے تین روٹیوں کے مالک کو نصیحت فرمائی کہ جو فیصلہ تمہارا رفیق کر رہا ہے اُسے قبول کر لو اسی میں تمہارا نفع ہے مگر اس نے حق کے فیصلے پر اصرار کیا۔ آپ نے فرمایا کہ حق تو یہ ہے کہ تم کو صرف ایک درہم ملنا چاہیے اور تمہارے رفیق کو سات۔ وہ شخص اس فیصلے سے سخت متحیر ہوا۔ آپ نے اس کی حیرانی دور کرنے کے لیے فرمایا کہ تم تین آدمی تھے۔ تمہاری تین روٹیاں تھیں اور تمہارے رفیق کی پانچ۔ تم دونوں نے برابر کھائیں اور تیسرے کو بھی برابر کا حصہ دیا۔ تمہاری تین روٹیوں کے حصے اگر تین جگہ کیے جائیں تو ۹ ٹکڑے بنتے ہیں اور تمہارے ساتھی کی پانچ روٹیوں کے پندرہ، یعنی کل چوبیس ٹکڑے بنے جن میں سے تم تینوں نے برابر حصے کھائے یعنی آٹھ ٹکڑے فی کس۔ اس طرح تم نے اپنے نو حصوں میں سے آٹھ کھائے اور ایک دوسرے کے حصے میں آیا اور تمہارے رفیق کے پندرہ ٹکڑوں میں سے آٹھ اس نے خود کھائے اور سات دوسرے مسافر کو دیے۔ اس بنا پر آٹھ درہم میں ایک کے تم اور سات کا وہ مستحق ہے۔

تقریر و خطابت

آپ فصحائے عرب میں تھے۔ آپ کو تقریر و خطابت کا خداداد ملکہ حاصل تھا۔ آپ مشکل سے مشکل مسائل پر بڑے بڑے مجمعوں میں فی البدیہہ تقریر فرماتے تھے۔ آپ کے خطبات، فصاحت و بلاغت اور زبان و ادب کا اعلیٰ نمونہ اور اس کا معیار ہیں۔ علامہ شریف رضی نے چوتھی صدی ہجری کے آخر میں بڑی جستجو کے بعد ان کو نہج البلاغہ کے نام سے جمع کیا۔ مورخین کے مطابق ان سب کا انتساب حضرت علیؓ کی جانب صحیح نہیں ہے کیونکہ ان کے نزدیک نہج البلاغہ میں اصحاب رسولؐ کی نسبت ایسے تعریضات ہیں جن کا حضرت علیؓ سے صادر ہونا تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ دوسرا اس میں لفظی آرائش اور عبارت میں صنعت گری اس حد پر ہے کہ حضرت علیؓ کے زمانے میں مفقود تھی تیسرے اس میں تشبیہات و استعارات اور واقعات و مناظر کی صورت کشی اتنی مکمل ہے جس کا پتہ صدرِ اسلام میں اور کہیں نہیں ملتا، نیز اس کے ساتھ حکمت و فلسفہ کی اصطلاحیں اور مسائل کے بیان میں اعداد کا پیش کرنا یہ باتیں اس زمانہ میں رائج نہ تھیں، چوتھے اس کتاب کی عبارتوں سے علم الغیب کے ادعا کا پتہ چلتا ہے جو حضرت علیؓ ایسے پاکباز انسان کی شان سے بعید ہے۔ تاہم مورخین اس حقیقت کے معترف ہیں کہ ان میں بہت سے خطبات حضرت علیؓ کے ہیں۔ بہرکیف ذیل میں نہج البلاغہ کے حوالے سے چند نمونے پیش کیے جاتے ہیں تاکہ حضرت علیؓ جیسے افصح الفصحا کے زورِ بیان اور حسنِ خطابت کا اندازہ ہو سکے۔

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد جب حضرت علیؓ کے ہاتھ پر بیعت کا ارادہ کیا گیا، تو آپ نے فرمایا:

> مجھے چھوڑ دو اور (اس خلافت کے لیے) میرے علاوہ کوئی اور ڈھونڈ لو۔ ہمارے سامنے ایک ایسا معاملہ ہے جس کے کئی رخ اور کئی رنگ ہیں، جسے نہ دل برداشت کر سکتے ہیں اور نہ عقلیں اُسے مان سکتی ہیں۔ (دیکھو) افقِ عالم پر گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں، راستہ پہچاننے میں نہیں آتا۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اگر میں تمہاری اس خواہش کو مان لوں تو تمہیں اس راستہ پر لے چلوں گا جو میرے علم میں ہے اور اس کے متعلق کسی کہنے والے کی بات اور کسی ملامت کرنے والے کی سرزنش پر کان نہیں دھروں گا اور اگر تم میرا پیچھا چھوڑ دو تو پھر جیسے تم ہو ویسا میں ہوں اور ہو سکتا ہے کہ جسے تم اپنا امیر بناؤ۔ اس کی میں تم سے زیادہ سنوں اور مانوں اور میرا امیر ہونے سے وزیر ہونا بہتر ہے۔" [1]

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ص ۹۰

اہل نہروان (گروہ خوارج) کو ان کے انجام سے ڈراتے ہوئے فرمایا:

"میں تمہیں متنبہ کر رہا ہوں کہ تم اس نہر کے موڑوں اور اس نشیب کی ہموار زمینوں پر قتل ہو ہو کر گرے ہوئے ہو گے۔ اس عالم میں کہ نہ تمہارے پاس اللہ کے سامنے (عذر کرنے کے لیے) کوئی واضح دلیل ہو گی اور نہ کوئی روشن ثبوت، اس طرح کہ تم اپنے گھروں سے بے گھر ہو گئے اور پھر قضائے الٰہی نے تمہیں اپنے پھندوں میں جکڑ لیا۔ میں نے تو تمہیں پہلے ہی اس تحکیم سے روکا تھا لیکن تم نے میرا حکم ماننے سے مخالف پیمان شکنوں کی طرح انکار کر دیا یہاں تک کہ (مجبوراً) مجھے بھی اپنی رائے کو ادھر موڑنا پڑا جو تم چاہتے تھے۔ تم ایک ایسا گروہ ہو جس کے سر عقلوں سے خالی اور فہم و دانش سے عاری ہیں۔ خدا تمہارا بُرا کرے میں نے تمہیں نہ کسی مصیبت میں پھنسایا ہے اور نہ تمہارا برا چاہا ہے۔"[1] ایک خطبہ میں ارشاد فرمایا:

"خدا اس شخص پر رحم کرے جس نے حکمت کا کوئی کلمہ سُنا تو اسے گرہ میں باندھ لیا۔ ہدایت کی طرف اسے بُلایا گیا، تو دوڑ کر قریب ہُوا، صحیح راہبر کا دامن تھام کر نجات پائی۔ اللہ کو ہر طرف نظروں میں رکھا اور گناہوں سے خوف کھایا۔ عمل بے ریا پیش کیا۔ نیک کام کیے، ثواب کا ذخیرہ جمع کیا۔ بُری باتوں سے اجتناب برتا، صحیح مقصد کو پالیا، اپنا اجر سمیٹ لیا، خواہشوں کا مقابلہ کیا۔ اُمیدوں کو جھٹلایا، صبر کو نجات کی سواری بنالیا، موت کے لیے تقویٰ کا ساز و سامان کیا۔ روشن راہ پر سوار ہُوا۔ حق کی شاہراہ پر قدم جمائے۔ زندگی کی مہلت کو غنیمت جانا، موت کی طرف قدم بڑھائے اور عمل کا زاد ساتھ لیا۔"[2]

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے دعائیہ کلمات:

اے اللہ! تو ان چیزوں کو بخش دے جنہیں تو مجھ سے زیادہ جانتا ہے۔ اگر میں گناہ کی طرف پلٹوں تو تو اپنی مغفرت کے ساتھ پلٹ۔ بارالٰہا! جس عمل خیر کے بجالانے کا میں نے اپنے آپ سے وعدہ کیا تھا، مگر تُو نے اسے پورا ہوتے ہوئے نہ پایا، اسے بھی بخش دے، میرے اللہ! زبان سے نکلے ہوئے وہ کلمے جن سے تیرا تقرب چاہا تھا مگر دل اس سے ہمنوا نہ ہو سکا تھا، ان سے بھی درگزر کر۔ پروردگار! تو آنکھوں کے (طنزیہ) اشاروں اور ناشائستہ کلوں اور دل کی (بُری) خواہشوں اور زبان کی بیہودہ سرائیوں کو معاف کر دے۔[3]

اس زمانہ میں اگرچہ لکھنے پڑھنے کا زیادہ رواج نہ تھا تاہم حضرت علی کرم اللہ وجہہ تحریر میں پوری مہارت رکھتے تھے۔ چنانچہ جو صحابی وحی کی کتابت کرتے اور حضورؐ کے فرامین لکھتے تھے۔ ان میں حضرت علیؓ بھی تھے۔ حدیبیہ کا مشہور صلح نامہ آپ ہی نے لکھا تھا۔

آپ کے خطوط اور تحریریں ادب و انشا کا دلکش نمونہ ہیں۔

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۳۶۔ [2] نہج البلاغہ خطبہ ۷۳۔ [3] نہج البلاغہ خطبہ ۷۶

شاعری

اہل سیر کے مطابق حضرت علی کرم اللہ وجہہ شاعری کا بھی نہایت ستھرا اور پاکیزہ مذاق رکھتے تھے۔ حدیث کی کتابوں میں آپ کی زبان سے بعض اشعار منقول ہیں، چنانچہ حاکم نے مستدرک میں حضرت فاطمۃ الزہرا کے مرثیہ میں آپ کی زبان مبارک سے دو اشعار نقل کیے ہیں اور ابن رشیق نے کتاب العمدۃ میں آپ کے چند اشعار لکھے ہیں۔ ذیل کا رجز یہ شعر جو آپ نے معرکہ خیبر کے موقعہ پر پڑھا تھا۔ بخاری میں ہے۔

انا الذی سمتنی امی حیدرۃ   کلیث غابات کریہہ المنظرۃ

(یعنی میں وہ ہوں جس کا نام ماں نے حیدر رکھا ہے   جھاڑی کے شیر کی طرح مہیب اور ڈراؤنا)

لیکن بہت سے جعلی اشعار بھی بنا کر آپ کی طرف منسوب کیے گئے ہیں یہاں تک کہ ایک پورا دیوان 'دیوانِ علی' کے نام سے موجود ہے اور عام طور پر بازاروں میں ملتا ہے، لیکن علمائے ادب کے نزدیک وہ شاعری کے لحاظ سے اتنا پست ہے کہ کسی عربی شاعر کی طرف بھی منسوب نہیں کیا جا سکتا چہ جائیکہ حضرت علیؓ کی طرف۔

علم نحو کی ایجاد

علمِ نحو کی بنیاد خاص حضرت علیؓ نے رکھی اور سب سے پہلے اپنے اصحاب میں سے ایک شخص ابوالاسود دولی کو چند اصول تلقین فرما کر اس فن کی تدوین پر مامور فرمایا۔ اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے مؤرخین نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ کسی عجمی کو قرآن شریف غلط پڑھتے سنا، تو اس سے خیال پیدا ہوا کہ کوئی ایسا قاعدہ بنایا جائے جس سے اعراب میں غلطی واقع نہ ہو سکے۔ چنانچہ ابوالاسود دولی نے حضرت علیؓ کے بتائے ہوئے اصولوں کی روشنی میں نحو کے چند موٹے موٹے قواعد مرتب کیے۔ بغرض آپ کو مذہبی علوم اور اس عہد کے تمام مروجہ فنون میں کمال حاصل تھا۔

اخلاق و عادات

جیسا کہ گزشتہ سطور میں عرض کیا جا چکا ہے کہ حضرت علیؓ نے ایام طفولیت سے ہی فخر موجودات نبیٔ آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کے دامنِ عاطفت میں تربیت پائی تھی۔ اس لیے آپ قدرۃً محاسنِ اخلاق اور حسنِ تربیت کے نمونہ تھے۔ آپ کی زبان نہ کبھی کلمہ شرک و کفر سے آلودہ ہوئی اور نہ آپ کی پیشانی کبھی کسی کے سامنے جھکی آپ کا دامنِ عصمت ہر ایسے گناہ سے مبرا اور پاک رہا جو ایام جاہلیت میں عربوں کا روزمرہ تھے۔ اسلام سے پہلے بھی آپ کی زبان نے کبھی شراب کا ذائقہ تک نہ چکھا حالانکہ یہ ام الخبائث عربوں کی گھٹی میں پڑی تھی۔ اسلام کے بعد اس کا کوئی خیال بھی نہیں کیا جا سکتا۔ غرض آپ کی ذات خلقِ نبیؐ کا پیکر اور تعلیماتِ اسلامی کی تصویر تھی۔

زہد

آپ کے فضائلِ اخلاق میں زہد و تقویٰ سب سے نمایاں ہیں آپ کی پوری زندگی زہد و ورع میں اس قدر ڈوبی ہوئی ہے کہ کسی واقعہ کو اس سے الگ کر کے دکھانا مشکل ہے، آپ کی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جو زہد و تقویٰ کا مظہر نہ ہو۔ زہد کے بارہ میں آپ کا یہ حکیمانہ مقولہ مشہور ہے کہ "دنیا مردار ہے، جو اسے حاصل کرنا چاہے اُسے کتوں کی صحبت کے لیے تیار رہنا چاہیے"

آپ نے زندگی میں غربت و امارت کے مختلف دَور دیکھے، لیکن کسی دَور میں بھی مزخرفات دنیاوی کی طرف آنکھ نہیں اُٹھائی۔ آپ کو ابتدائی چند برسوں کے بعد ہی عیش و راحت کے تمام سامان میسر آ گئے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہی آپ کی آمدنی اتنی ہو گئی تھی کہ چالیس ہزار سالانہ اس کی زکوٰۃ ہوتی تھی، لیکن اس زمانہ میں بھی فاقوں کی نوبت آ جاتی تھی۔[1]

---

[1] تاریخ اسلام حصہ اوّل از شاہ معین الدین احمد ندوی۔

آپ نے پوری زندگی ایک معمولی سے گھر میں گزاری اور وسائل ہونے کے باوجود کوئی عمارت نہیں بنوائی۔ حضرت فاطمۃ الزہراؓ جو مختصر سا جہیز اپنے ساتھ لائی تھیں، آپ اس میں تاعمر کوئی اضافہ نہ کر سکے۔ آپ کے ساز و سامان میں ایک مینڈھے کی کھال تھی جو بستر کا کام دیتی تھی اوڑھنے کے لیے ایک مختصر سی چادر تھی۔ جس سے اگر سر چھپاتے تھے تو پاؤں کھل جاتے اور اگر پاؤں ڈھانپتے تو سر برہنہ ہو جاتا تھا۔

گھر میں کوئی ملازم نہ تھا۔ سارا کام کاج خاتونِ جنت سیدہ فاطمۃ الزہراؓ اپنے ہاتھوں سے کرتی تھیں۔ چکی پیسے پیسے ہاتھوں میں گھٹے پڑ گئے تھے۔ گھر میں کئی کئی دن چولہا نہ جلتا تھا۔ ایک دفعہ کئی فاقوں کے بعد بھوک کی حالت میں مزدوری کی تلاش میں نکلے اور اطرافِ مدینہ میں ایک بڑھیا کا کھیت سینچ کر مٹھی بھر کھجوریں حاصل کیں۔ ایک مرتبہ گھر میں کچھ نہ تھا، تو اپنی تلوار بیچ کر کھانے پینے کا سامان کیا۔

عبادت و ریاضت

عبادت و ریاضت آپ کی زندگی کا اہم ترین مشغلہ تھا۔ بنی ہاشم میں آپ سے زیادہ کوئی عبادت گزار نہ تھا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ وہ (علیؓ) قائم اللیل اور صائم النہار تھے۔

قرآن حکیم کی آیت ۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ز	محمد رسول اللہ اور وہ لوگ جو ان کے ساتھ ہیں کافروں پر سخت ہیں باہم رحمدل ہیں، تم ان کو دیکھتے ہو کہ بہت سجدہ کر کے خدا کا فضل اور اس کی رضامندی کی جستجو کرتے ہیں ۔

پارہ ع ۲۶ سُوْرَةُ الْفَتْحِ آیت ۲۹

کی تفسیر میں مفسرین نے یہ نکتہ لکھا ہے کہ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ سے حضرت ابوبکر صدیقؓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ سے حضرت عمر بن الخطابؓ، رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ سے حضرت عثمانؓ رُكَّعًا سُجَّدًا سے حضرت علیؓ اور يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا سے بقیہ صحابہؓ مراد ہیں، اس سے عبادات میں تمام صحابہؓ پر حضرت علیؓ کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ اگرچہ رکوع و سجود تمام صحابہؓ کا مشترک وصف تھا تاہم اس اشتراک میں حضرت علیؓ کی تخصیص سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اس اشتراک کے باوجود کچھ امتیازی حیثیت حاصل تھی۔

انفاق فی سبیل اللہ

عبادت و ریاضت کی طرح انفاق فی سبیل اللہ بھی آپ کا امتیازی وصف تھا۔ چالیس ہزار سالانہ زکوٰۃ کے بقدر آمدنی کے باوجود یہ عسرت زندگی آپ کے انفاق ہی کا نتیجہ تھا۔ آپ دل کے اس قدر غنی تھے کہ کوئی سائل آپ کے در سے ناکام واپس نہیں گیا۔ حتیٰ کہ قوتُ لایموت تک سائلوں کو دے دیتے اور خود فاقہ سے سو رہتے تھے۔ مؤرخین کے مطابق ایک دفعہ رات بھر باغ سینچ کر تھوڑے سے جَو حاصل کیے۔ صبح کے وقت گھر تشریف لائے تو اس میں سے ایک ثلث پسوا کر حریرہ پکوانے کا انتظام کیا۔ ابھی پک کر تیار ہی ہوا تھا کہ ایک سائل نے آواز دی۔ آپ نے سب اُٹھا کر اسے دے دیا۔ پھر بقیہ میں سے دو ثلث پکنے کا انتظام کیا۔ لیکن تیار ہوا تو ایک مسکین یتیم نے دستِ سوال دراز کیا۔ چنانچہ یہ پکا ہوا آپ نے اس کے نذر کیا۔ اسی طرح تیسرا حصّہ پکنے کے بعد ایک قیدی کے نذر کر کے خود رات بھر کی مشقت کے باوجود دن کو فاقہ مست رہے۔ اللہ تعالیٰ کو آپ کا یہ ایثار کچھ ایسا پسند آیا، تو بطورِ ستائش اس کے صلہ میں وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا کی آیت نازل فرمائی۔ (سورۃ الدھر آیت نمبر ۸)

امانت و دیانت

آپ ایک امینؐ کے تربیت یافتہ تھے۔ اس لیے ابتدا ہی سے امین تھے۔ ہجرت کے وقت قریش کی جو امانتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جمع تھیں، ان کی واپسی حضورؐ نے آپ کے ہی سپرد فرمائی تھی۔ اپنے عہدِ خلافت میں آپ نے مسلمانوں کی امانت بیت المال کی جس امانت داری سے حفاظت فرمائی۔ اس کا اندازہ حضرت امّ کلثومؓ کے اس بیان سے ہو سکتا ہے کہ ایک دفعہ بیت المال میں نارنگیاں آئیں۔ حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ نے ایک نارنگی اٹھالی، جنابِ امیرؓ نے دیکھا تو چھین کر لوگوں میں تقسیم کر دی۔

مورخین نے لکھا ہے کہ مالِ غنیمت تقسیم فرماتے وقت آپ برابر حصے لگا کر غایت احتیاط سے قرعہ ڈالتے تھے کہ اگر کوئی کمی بیشی رہ گئی ہو تو آپ اس سے بری ہو جائیں، ایک دفعہ اصفہان سے مال آیا، تو اس میں ایک روٹی بھی تھی۔ آپ نے تمام مال کے ساتھ اس کے بھی سات ٹکڑے کیے اور قرعہ ڈال کر تقسیم فرمائے۔ ایک مرتبہ تیز سردی میں آپ ایک معمولی سی چادر اوڑھے تھے۔ ایک شخص نے عرض کیا امیر المومنینؓ بیت المال میں آپ کا اور آپ کے اہل و عیال کا بھی حق ہے۔ آپ اپنے اوپر اتنی تکلیف کیوں اٹھاتے ہیں، فرمایا "میں تمہارے حصّہ کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔"

شجاعت

شجاعت و شہامت حضرت علیؓ کا ایسا وصف خاص تھا جس میں کوئی معاصر آپ کا حریف نہ تھا۔ آپ تمام اہم غزوات میں شریک ہوئے اور سب میں اپنی شجاعت کے جوہر دکھائے۔

غزوہ بدر میں جبکہ آپ کا عنفوانِ شباب تھا۔ ایسی دادِ شجاعت دی کہ آپ اس کے ہیرو قرار پائے۔ آغاز جنگ میں ولید آپ کے مقابل آیا اور مقتول ہوا۔ پھر شیبہ پر آپ اور حضرت حمزہؓ قہرِ الٰہی بن کر ٹوٹے اور اسے جہنم رسید کر دیا۔ غزوۂ اُحد میں کفار کے علمبردار طلحہ بن ابی طلحہ پر ایسا کاری وار کیا کہ اس کے سر کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ خبر ملی تو فرطِ مسرت سے آپؐ نے تکبیر کا نعرہ بلند کیا اور پھر مسلمانوں نے بھی تکبیر کے نعرے لگائے۔ غزوہ خندق میں عرب کے مشہور پہلوان عمرو بن عبدِ وُد کا آپ کے ہاتھ سے مارا جانا غزوہ خندق کے اہم واقعات میں سرِ فہرست ہے۔ غزوہ خیبر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادِ گرامی "کل علم ایسے شخص کو دیا جائے گا جس سے اللہ اور اس کے نبیؐ محبت کرتے ہیں" کے تحت آپ کا انتخاب اور پھر خیبر کے رئیس مرحب کو قتل کر کے خیبر پر اسلامی فتح کا پھریرا لہرا دینا آپ کی شجاعت و بسالت کا ناقابلِ فراموش باب ہے۔ غزوہ ہوازن میں بھی آپ ہر موقع پر ممتاز رہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جن اکابرؓ کو جھنڈے عنایت فرمائے تھے۔ آپ ان میں شامل تھے اور پھر جب آغاز جنگ میں کفار نے اچانک مسلمانوں پر تیروں کی بارش کر دی جس کے باعث مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ تو آپ ان ممتاز صحابہؓ میں سے تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ثابت قدم رہے۔ غرض عہدِ نبوت کے بعد خود آپ کے زمانہ میں بھی جو معرکے پیش آئے ان میں کبھی آپ کے پائے ثبات کو لغزش نہیں ہوئی۔

دشمن کے ساتھ حسن سلوک

حدیث میں آیا ہے کہ "بہادر وہ نہیں جو دشمن کو پچھاڑ دے بلکہ وہ ہے جو اپنے نفس کو زیر کرے" حضرت علیؓ اس میدان میں بھی اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ آپ کی زندگی کا بیشتر حصّہ مخالفین کی معرکہ آرائی میں گزرا لیکن بایں ہمہ آپ نے ہمیشہ دشمنوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا۔ ایک دفعہ ایک لڑائی میں آپ

کا حریف گر کر برہنہ ہوگیا تو آپ اس کو چھوڑ کر الگ ہوگئے تاکہ وہ شرمندہ نہ ہو۔ جنگ جمل میں جب ایک شخص نے حضرت عائشہ صدیقہؓ کے اُونٹ کو زخمی کرکے اسے گرا دیا، تو آپ نے آگے بڑھ کر ام المومنینؓ کی خیریت دریافت کی اور پھر بحفاظت انہیں بصرہ کے ایک رئیس کے گھر میں اُتارا۔

جنگِ جمل کا فیصلہ جب آپ کے حق میں ہوگیا تو آپ نے منادی کرا دی کہ بھاگنے والوں کا تعاقب نہ کیا جائے، مالِ غنیمت نہ لوٹا جائے اور زخمیوں کے اُوپر گھوڑے نہ دوڑائے جائیں۔ حضرت زبیرؓ جو اس جنگ میں آپ کے حریف کی حیثیت سے مقابلہ پر آئے تھے جب ابن جرموز کے ہاتھ سے قتل ہوگئے، تو آپ نے حضرت زبیرؓ کے قاتل کو جہنم کی بشارت دی اور ان کا کٹا ہوا سر اور تلوار دیکھ کر آبدیدہ ہوگئے۔

آپ کا سب سے بڑا دشمن آپ کا قاتل ابن ملجم ہوسکتا تھا۔ مگر آپ نے اس کے متعلق جو آخری وصیت فرمائی۔ وہ یہ تھی کہ اس سے معمولی طور پر قصاص لینا اور اس کے ہاتھ پاؤں اور ناک نہ کاٹنا اور جب وہ آپ کے سامنے لایا گیا تو مورخین کے مطابق آپ نے فرمایا کہ اسے اچھا کھانا کھلاؤ اور اس کو نرم بستر دو۔ بلاشبہ اپنے قاتل سے ایسے حسنِ سلوک کی مثال دنیا کی تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے۔

اصابت رائے

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ صاحبِ رائے بھی تھے۔ اصابت رائے پر عہد نبوتؐ کہے جاتے تھے۔ غزوہ طائف میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ سے اتنی دیر تک سرگوشی فرمائی کہ لوگوں کو اس پر رشک ہونے لگا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے عہد میں مہاجرین و انصار کی جو مجلس شوریٰ قائم کی تھی۔ حضرت علیؓ اس کے رکن تھے۔ اسی طرح حضرت عمرؓ کے دور میں بھی آپ کو مشیر کی حیثیت حاصل تھی۔ حضرت عمر فاروقؓ کو آپ کی رائے پر اتنا اعتماد تھا کہ جب کبھی مشکل معاملہ پیش آجاتا تو حضرت علیؓ سے مشورہ کرتے تھے۔ ایک موقعہ پر حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا کہ "اگر علیؓ نہ ہوتے تو عمرؓ ہلاک ہوجاتا"۔[1]

حضرت عثمان غنیؓ نے بھی اہم معاملات میں آپ سے مشورے لیے اور اگر آپ کے مشوروں کے مطابق عمل کیا جاتا تو عہد عثمانیؓ نہ صرف ہر قسم کے فتنہ و فساد سے محفوظ رہتا بلکہ قبائل میں ایک ایسا توازن قائم ہوجاتا کہ آئندہ جھگڑے کی کوئی صورت ہی پیدا نہ ہوتی۔

تواضع

سادگی اور تواضع حضرت علیؓ کی دستارِ فضیلت کا سب سے خوشنما طرّہ ہیں۔ آپ کی زندگی سادگی کا نمونہ تھی۔ جاہ و حشم کا کیا ذکر تکلف کا معمولی شائبہ تک نہ تھا۔ اپنا سارا کام اپنے ہاتھ سے کرتے تھے۔ حتیٰ کہ جوتا تک خود ہی گانٹھ لیتے تھے۔ مزاج میں بے تکلفی اس قدر تھی کہ فرشِ خاک پر بے تکلف سو جاتے۔ ایک دفعہ انہیں ڈھونڈتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لائے تو دیکھا کہ آپ نہایت بے تکلفانہ انداز میں زمین پر سوئے ہوئے ہیں، چادر پیٹھ کے نیچے سے سرک گئی ہے اور جسم انور گرد و غبار کے اندر کُندن کی طرح دمک رہا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کی یہ سادگی نہایت پسند آئی۔ خود دستِ مبارک سے آپ کا بدن صاف کرکے محبت آمیز لہجے میں فرمایا: "اجلس یا ابا تراب" یعنی مٹی والے اب اُٹھ بیٹھ۔ حضرت علیؓ کو زبان نبوتؐ کی عطا کردہ یہ کنیت اس درجہ محبوب تھی کہ آپ کو جب کوئی اس کنیت سے مخاطب کرتا، تو خوشی سے آپ کے ہونٹوں پر تبسم پھیل جاتا۔

زمانۂ خلافت میں آپ اکیلے بازاروں میں گھومتے پھرتے، بھولے بھٹکوں کو راستہ بتاتے اور کمزوروں اور ناتوانوں کی مدد کرتے۔

---

[1] سیر الصحابہؓ جلد اوّل خلفائے راشدین

غذا اور لباس

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے غیر معمولی زہد و ورع نے ان کی معاشرت کو نہایت سادہ بنا دیا تھا۔ آپ کی غذا معمولی اور لباس نہایت سادہ ہوتا تھا۔ عمامہ بہت پسند فرماتے تھے۔ اکثر کہا کرتے کہ عمامے عربوں کے تاج ہیں کبھی کبھی سفید ٹوپی بھی پہنتے تھے۔ کرتے کی آستین اتنی چھوٹی ہوتی کہ اکثر ہاتھ آدھے کھلے رہتے تھے۔ تہبند بھی نصف پنڈلی تک ہوتی تھی غرض آپ کو ظاہری نمائش و طمطراق کا قطعی شوق نہ تھا۔ پیوند لگے ہوئے کپڑے پہنتے اور اگر کوئی اس کے متعلق عرض کرتا تو فرماتے کہ اس سے دل خشوع پیدا ہوتا ہے۔ آپ پر سردی و گرمی کا کچھ اثر نہ ہوتا تھا۔ اس کی وجہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ دعا تھی جو حضور ؐ نے ان کے لیے غزوہ خیبر کے موقع پر فرمائی تھی کہ "اے اللہ اس سے گرمی اور سردی دور کر" اور یہ اسی دعا کا اثر تھا کہ آپ جاڑوں میں گرمیوں کا لباس پہنتے اور گرمیوں میں جاڑوں کا لباس زیب تن فرماتے، مگر آپ کو کوئی تکلیف نہ ہوتی۔

یہی حال کھانے کا تھا۔ آپ نفیس غذاؤں سے احتراز فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی نے فالودہ کا پیالہ پیش کیا تو فرمایا کتنا خوش رنگ اور خوش ذائقہ ہے، لیکن میں نفس کو ایسی غذاؤں کا عادی بنانا پسند نہیں کرتا جس کا وہ عادی نہیں ہے۔

سیرۃ المرتضیٰ ؓ پر ایک جامع تبصرہ

حضرت امیر معاویہ ؓ نے حضرت علی ؓ کے ایک حاشیہ نشین ضرار ؓ صدائی سے کہا کہ مجھ سے حضرت علی ؓ کرم اللہ وجہہ کے اوصاف بیان کرو، انہوں نے فرمایا:

"وہ بلند حوصلہ اور نہایت قوی تھے، فیصلہ کن بات کہتے تھے، عادلانہ فیصلہ کرتے تھے۔ اُن کے ہر سمت سے علم کا چشمہ پھوٹتا تھا اور تمام اطراف سے حکمت ٹپکتی تھی۔ دنیا کی دلفریبی اور شادابی سے وحشت کرتے، اور رات کی تاریکی اور اس کی وحشت سے اُنس رکھتے تھے۔ عبرت پذیر اور بہت زیادہ غور و فکر کرنے والے تھے۔ چھوٹا لباس اور موٹا۔ جھوٹا کھانا پسند تھا۔ ہم میں ہم ہی لوگوں کی طرح رہتے تھے۔ جب ہم کچھ پوچھتے تو اس کا جواب دیتے تھے اور جب ہم اُن سے انتظار کی درخواست کرتے تھے تو وہ ہمارا انتظار فرماتے تھے باوجودیکہ وہ ہم کو اپنے قریب رکھتے تھے اور خود ہمارے قریب رہتے تھے، لیکن اس کے باوجود خدا کی قسم ہم ان کی ہیبت سے ان سے گفتگو نہ کر سکتے تھے۔ وہ دینداروں کی تعظیم کرتے تھے۔ غریبوں کو مقرب بناتے تھے۔ قوی کو اس کے باطل میں حرص و طمع کا موقع نہیں دیتے تھے اور کمزور ان کے انصاف سے مایوس نہیں ہوتا تھا۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ میں نے ان کو بعض معرکوں میں دیکھا کہ رات گزر رہی ہے۔ ستارے جھلملا رہے ہیں اور وہ اپنی داڑھی مٹھی میں دبائے مار گزیدہ کی طرح بیقرار اور غم رسیدہ کی طرح اشکبار کہہ رہے ہیں، اے دنیا! کسی اور کو فریب دے، تو مجھ سے لگاوٹ کر رہی ہے، میری مشتاق ہے۔ افسوس، افسوس میں نے تجھ کو تین طلاقیں دے دی ہیں جس سے رجعت نہیں ہو سکتی۔ تیری عمر کم اور تیرا مقصد حقیر ہے۔ آہ! سفر طویل، راستہ وحشتناک، اور زادِ راہ تھوڑا ہے[1]

---

[1] سیر الصحابہ ؓ حصہ خلفائے راشدین اور تاریخ اسلام مؤلفہ شاہ معین الدین سے ماخوذ۔

سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ

راجہ محمد شریف

نام و نسب، خاندان

حضرت صدیقِ اکبر رضؓ کا نام عبداللہ اور کنیت ابوبکر تھی، آپ کے والد کا نام عثمان بن عامر تھا اور کنیت ابوقحافہ[1]۔ والدہ کا نام سلمیٰ بنت صخر بن عامر اور کنیت ام الخیر تھی۔ بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ اسلام لانے سے قبل حضرت ابوبکر رضؓ کا نام عبدالکعبہ تھا لیکن قبولِ اسلام کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بدل کر عبداللہ رکھ دیا۔

اہلِ سیر کے مطابق حضرت ابوبکر رضؓ کا لقب صدیق اور عتیق تھا، ابو وہب مولائے ابوہریرہ رضؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے شبِ اسریٰ (شبِ معراج) میں جبرائیلؑ سے کہا کہ قوم میری تصدیق نہیں کرے گی، انہوں نے کہا، ابوبکر رضؓ آپ کی تصدیق کریں گے (کیونکہ) وہ صدیق ہیں[2]۔ بعض روایات کے مطابق آپ کو عتیق کہنے کی وجہ یہ تھی کہ آپ کی والدہ کے لڑکے زندہ نہیں رہتے تھے، انہوں نے نذر مانی کہ اگر اُن کے لڑکا پیدا ہوا اور وہ زندہ رہا تو اس کا نام عبدالکعبہ رکھیں گی اور اسے کعبہ کی خدمت کے لیے وقف کر دیں گی، چنانچہ جب حضرت ابوبکر رضؓ پیدا ہوئے تو انہوں نے نذر کے مطابق اِن کا نام عبدالکعبہ رکھا مگر جوان ہونے پر وہ عتیق (آزاد کردہ غلام) کے نام سے موسوم کیے جانے لگے۔ کیونکہ انہوں نے موت سے رہائی پائی تھی۔ بعض راویوں کا خیال ہے کہ حضرت ابوبکر رضؓ کو عتیق کا لقب نہایت سُرخ و سپید ہونے کی وجہ سے دیا گیا تھا۔ بعض کا بیان ہے کہ چونکہ آپ کے نسب میں کوئی عیب نہیں تھا، اس لیے آپ کو عتیق کہا گیا[3]۔ ایک روایت کے مطابق حضرت صدیق اکبر رضؓ کی بیٹی ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے بعض لوگوں نے پوچھا کہ ابوبکر رضؓ کا نام عتیق (آزاد) کیوں رکھا گیا؟ انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان (حضرت ابوبکر رضؓ) کی طرف دیکھا اور فرمایا کہ یہ آگ (دوزخ سے) اللہ کے آزاد کیے ہوئے ہیں[4]۔ مقامِ تعجب ہے کہ آپ کی کنیت ابوبکر رضؓ جو آپ کے دیگر ناموں، القابات و خطابات پر غالب رہی، اس کا حقیقی سبب معلوم نہیں ہو سکا۔ بعض مؤرخین کے مطابق یہ کنیت اس لیے پڑی کہ آپ سب سے پہلے اسلام لائے، اللہ تعالیٰ نے قرآنِ حکیم میں آپ کو لفظ "صاحب" اور "ثانی اثنین" سے خطاب فرمایا ہے:

حضرت ابوبکر رضؓ کا والد کی طرف سے پورا سلسلۂ نسب یہ ہے۔ حضرت ابوبکر رضؓ (عبداللہ) بن ابوقحافہ (عثمان) بن عامر بن عمرو بن کعب بن تیم بن مرہ بن کعب بن لوی القرشی تیمی اور والدہ کی طرف سے سلسلۂ نسب یہ ہے۔ سلمیٰ (ام الخیر) بنت صخر بن عامر بن کعب بن سعد بن مرہ۔ اس طرح حضرت ابوبکر رضؓ کا سلسلۂ نسب ساتویں پشت پر مرہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مل جاتا ہے۔

---

[1] ابوقحافہ رضؓ صحابی ہیں، ۸ھ میں فتح مکہ کے وقت نوے برس کی عمر میں اسلام لائے اور ۱۴ھ میں حضرت عمر رضؓ کے زمانۂ خلافت میں وفات پائی۔

[2] طبقات ابنِ سعدؒ حصہ سوم [3] تاریخ الخلفاء۔ [4] طبقات ابن سعدؒ حصہ سوم۔

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبدمناف بن قصیٰ بن کلاب بن } مرّہ
حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن عثمان بن عامر بن عمرو بن کعب بن سعد بن تیم بن

حضرت ابوبکر صدیقؓ کا خاندان بنو تیم تھا، بنو تیم قبیلہ قریش سے تھے، قریش کی دس شاخیں تھیں اور کعبہ کے مناصب میں سے کوئی نہ کوئی منصب قریش کی ان شاخوں کے سپرد ہوتا تھا، خون بہا اور دیت وغیرہ کا اکٹھا کرنا بنو تیم کی ذمہ داری تھی، جب حضرت ابوبکر صدیق جوان ہوئے، تو یہ خدمت ان کے سپرد ہوئی، خون بہا اور دیتوں کے تمام مقدمات ان کے سامنے پیش ہوتے اور جو فیصلہ وہ صادر فرماتے، اسے قریش کو منظور کرنا ہوتا تھا۔ خون بہا کے متعلق تمام اموال بھی ان کے پاس جمع ہوتے تھے، اگر ان کے سوا کسی اور شخص کے پاس جمع ہوتے، تو قریش اُسے تسلیم نہ کرتے تھے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کے والد ابو قحافہ رضؓ (عثمان بن عامر) شرفائے مکّہ میں سے تھے اور نہایت سن رسیدہ تھے۔ آپ بھی ابتدا میں دیگر اہلِ مکّہ کی طرح تحریکِ اسلامی کو بچوں کا کھیل سمجھتے تھے، چنانچہ حضرت عبداللہؓ کا بیان ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت فرمائی تو میں آنحضرت کی تلاش میں حضرت ابوبکر رضؓ کے گھر آیا، وہاں ابو قحافہ رضؓ موجود تھے، انہوں نے حضرت علی رضؓ کو اس طرف سے گزرتے ہوئے دیکھ کر نہایت برہمی سے کہا کہ:

"ان بچوں نے میرے لڑکے کو بھی خراب کر دیا ہے۔"

ابو قحافہ رضؓ فتح مکہ (۸ھ) تک اپنے آبائی مذہب پر قائم رہے، فتح مکّہ کے بعد اپنے فرزند سعید حضرت ابوبکر کی معیت میں بارگاہ رسالتمآبؐ میں حاضر ہوئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ضعفِ پیری کو دیکھ کر فرمایا کہ ان کو کیوں تکلیف دی، میں خود ان کے پاس پہنچ جاتا، ازاں بعد نہایت شفقت سے اُن کے سینہ پر ہاتھ پھیرا اور کلماتِ طیبات تلقین کر کے مشرف باسلام فرمایا۔

حضرت ابو قحافہ رضؓ نے طویل عمر پائی، اپنے فرزند ارجمند حضرت ابوبکر صدیقؓ کے انتقال کے بعد بھی کچھ دنوں تک زندہ رہے۔ آخری عمر میں بے حد ضعیف ہو گئے تھے اور آنکھوں کی بصارت جاتی رہی تھی۔ حضرت عمر رضؓ کے دورِ خلافت ۱۴ھ میں بعمر ستانوے سال انتقال کیا۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کی والدہ اُمّ الخیر سلمیٰ رضؓ بنت صخر ابتداہی میں حلقہ بگوش اسلام ہو گئی تھیں، اس وقت تک صرف اُنتالیس اصحاب کو قبولِ اسلام کا شرف حاصل ہوا تھا، انہوں نے بھی بڑی عمر پائی اور اپنے نامور بیٹے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہدِ خلافت تک زندہ رہیں لیکن اپنے شوہر سے پہلے عالمِ آخرت کو سدھاریں۔

قبولِ اسلام تک

حضرت ابوبکر صدیقؓ مکّہ معظمہ میں پیدا ہوئے، بچپن یہیں گزرا اور بڑے ہو کر کپڑے کی تجارت شروع کر دی جس میں انہیں غیر معمولی فروغ حاصل ہوا اور ان کا شمار مکّہ کے کامیاب تاجروں میں ہونے لگا۔ تجارت کی کامیابی میں حضرت ابوبکر رضؓ کی جاذب نظر شخصیت اور بے نظیر اخلاق کو بھی بڑا دخل حاصل تھا۔

حضرت ابوبکر رضؓ دیانت، راستبازی اور امانت میں خصوصی شہرت رکھتے تھے۔ اہلِ مکّہ ان کو علم، تجربہ اور حسنِ اخلاق کے باعث نہایت معزز سمجھتے تھے۔ ایامِ جاہلیت میں جبکہ تمام لوگ اخلاقِ ذمیمہ میں مبتلا تھے۔ حضرت ابوبکر رضؓ کا ہر خلق، اخلاقِ محمدی کا پرتو تھا حضرت

عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ انہوں (حضرت ابوبکرؓ) نے جاہلیت اور اسلام دونوں زمانوں میں شراب کا قطرہ تک نہ چکھا۔ حالانکہ اہلِ مکّہ شراب کے عادی ہی نہیں عاشق تھے، ابن ہشام اپنی سیرت میں ان کے اخلاق کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

ابوبکرؓ اپنی قوم میں بہت ہر دلعزیز تھے، علم الانساب کے بہت بڑے ماہر تھے۔ قریش مکّہ کے تمام خاندانوں کے نسب انہیں ازبر یاد تھے اور ہر قبیلہ کے عیوب و نقائص اور محامد و فضائل سے بخوبی واقف تھے۔ اس وصف میں قریش کا کوئی فرد ان کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ وہ خلیق، ایمان دار اور ملنسار تاجر تھے۔ قوم کے تمام لوگ ان کے اعلیٰ اخلاق اور عمدہ برتاؤ کے معترف تھے اور انہی فضائل کے باعث ان سے بے حد محبت کرتے تھے۔

رسول اللہ سے تعلق

حضرت ابوبکرؓ مکہ معظمہ کے اس محلہ میں رہتے تھے جہاں حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ بنت خویلد اور قریش کے دوسرے بڑے بڑے تاجر سکونت پذیر تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ حضرت خدیجہؓ سے نکاح کرنے کے بعد انہی کے گھر منتقل ہو گئے تھے۔ اس لیے گمان ہے کہ اس بات نے رسول خدا صلعم اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے درمیان رشتۂ مودت و یگانگت پیدا کر دیا ہوگا، مزید برآں دونوں کی عمروں میں صرف دو اڑھائی سال کے معمولی فرق نے احساسِ ہم عمری کو پختہ کرتے کے ساتھ ساتھ پیشے میں اشتراک، طبائع میں یک جہتی، قریش کے عقائدِ فاسدہ سے نفرت اور اہلِ مکہ کی زندگی میں رچی بسی بُری عادات سے اجتناب جیسی قدرِ مشترک نے بھی دونوں کی دوستی کو پروان چڑھانے میں بہت مدد دی ہوگی۔

بہر حال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ابتدائی تعلقات سے متعلق مؤرخین میں اختلاف ہے بعض کہتے ہیں کہ بعثت سے پہلے ہی رسول اللہ اور حضرت ابوبکرؓ میں گہرے دوستانہ مراسم تھے۔ اور ان مؤرخین کے نزدیک یہی دوستی و یک جہتی حضرت ابوبکرؓ کے سب سے پہلے اسلام لانے کا محرک ہوئی، لیکن بعض مؤرخین کا بیان ہے کہ دونوں کے تعلقات میں پختگی اسلام کے بعد پیدا ہوئی، البتہ اسلام سے پہلے آنحضرت صلعم اور حضرت ابوبکرؓ کے تعلقات صرف ہمسائیگی اور ذہنی میلانات و رجحانات کی یکسانی و ہم رنگی تک ہی محدود تھے۔

قبولِ اسلام

جب اللہ تبارک و تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شرفِ رسالت سے مشرف فرمایا، تو حضورؐ مردوں میں سب سے پہلے اپنے باعتماد رفیق اور شریف و نجیب ہمسایہ حضرت ابوبکرؓ کو دعوتِ اسلام دینے کے لیے اُن کے ہاں تشریف لے گئے اور انہیں اللہ کی طرف بلایا جس پر حضرت ابوبکرؓ نے قطعی کوئی تردد نہ کیا اور ایک لمحہ ضائع کیے بغیر ایمان لے آئے، تمام مؤرخین اس حقیقت کے معترف ہیں کہ آزاد اور بالغ مردوں میں سب سے پہلے حضرت ابوبکر صدیقؓ، عورتوں میں حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ، بچوں میں حضرت علیؓ اور غلاموں میں حضرت زید بن حارثہؓ حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے، حضرت عائشہ صدیقہؓ سے مروی ہے کہ میں اپنے والدین کو سوائے اس کے نہ سمجھتی تھی کہ وہ دونوں ایک دین کے پیرو ہیں، ہم پر کوئی دن ایسا نہیں گزرا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صبح و شام ہمارے پاس نہ آئے ہوں۔[1]

حضرت اسماءؓ بنت حضرت ابوبکرؓ سے مروی ہے کہ سب مسلمانوں سے پہلے میرے والد اسلام لائے۔ واللہ میں اپنے والد کو بس اتنا

---

[1] ابن سعد کے مطابق یہ ابتدائے اسلام کا واقعہ ہے جب حضرت عائشہ صدیقہؓ چند سال کی تھیں۔

سمجھتی تھی کہ وہ ایک دین کے پیرو ہیں، ابن ہشام کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ:

"میں نے جس کسی کو اسلام کی دعوت دی، اُسے اس کے قبول کرنے میں ایک طرح کی تاخیر، سوچ و بچار اور پس و پیش تھا، بجز ابوبکرؓ بن ابی قحافہ کی حالت کے، کہ جب میں نے اُن سے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے اس میں تاخیر کی نہ پس و پیش۔"

غرض، ان روایات کی روشنی میں یہ بات مزید کسی تشریح کی محتاج نہیں رہتی کہ قبولِ اسلام میں اولیت کا طغرائے شرف و امتیاز حضرت اسی ذاتِ گرامی کے لیے مخصوص ہے۔

اشاعتِ اسلام

ابتدائے اسلام کی تاریخ شاہد ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ آغازِ اسلام سے ہی اپنے اندر دینِ حنیف کی نشر و اشاعت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امداد و اعانت کا غیر معمولی جذبہ رکھتے اور ہر وقت نہایت خلوص سے اس میں مشغول رہتے تھے۔ آپ نے مسلمان ہو کر اپنی ذات سے آنحضرت صلعم اور اسلام کو بڑی تقویت پہنچائی۔ حضرت ابوبکرؓ کے پاس تجارت کی وجہ سے دولت کی کمی نہ تھی، چنانچہ آپ نے بھاری رقوم ادا کر کے اُن غلاموں کو آزادی کی نعمت سے بہرہ ور کیا جو قبولِ اسلام کے باعث قریش کے مظالم گوناگوں کا شکار رہتے ہوئے تھے۔ مؤرخین کے بیان کے مطابق جس روز حضرت ابوبکرؓ اسلام لائے اُن کے پاس چالیس ہزار درہم تھے، چنانچہ وہ اسی رقم سے مسلمان غلام آزاد کراتے اور مسلمانوں کو قوت پہنچاتے رہے، یہاں تک کہ پانچ ہزار درہم مدینہ لائے اور پھر یہاں بھی وہی کرتے رہے جو مکہ میں کرتے تھے [1]

ابن ہشامؒ کی تصریح کے مطابق حضرت ابوبکرؓ نے مدینہ کی طرف ہجرت سے پیشتر حضرت بلالؓ علاوہ چھ لونڈیاں اور غلام [2] آزاد کرائے، اس ضمن میں ابن ہشامؒ ہی ایک روایت نقل کی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے والد ابو قحافہؓ نے انہیں کہا کہ اے بیٹے میں دیکھتا ہوں کہ تم کمزور (بردے) غلام آزاد کرتے ہو، تم جو کچھ بھی کرتے ہو، اگر ایسا کرو کہ قوی افراد کو آزاد کرو، تو وہ تمہاری مدافعت کریں گے اور تمہارے لیے سینہ سپر ہوں گے، اس کے جواب میں حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا:-

"ابا جان، میں جو کچھ کرنا چاہتا ہوں، اللہ عزوجل کے لیے کرنا چاہتا ہوں۔"

حضرت ابوبکرؓ کی اس خصوصیت کا اعتراف خود پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خطبے میں یوں فرمایا ہے:

"سب سے زیادہ میں جس کی دولت اور صحبت کا ممنون ہوا، وہ ابوبکرؓ ہیں [3]"

حضرت ابوبکرؓ چونکہ مال دار ہونے کے علاوہ اہلِ مکہ میں اپنی دیانت اور راست بازی کی وجہ سے نہایت ہر دلعزیز اور بے حد قابلِ احترام بھی تھے، اس لیے آپ نے قبولِ اسلام کے ساتھ ہی اپنے حلقۂ اثر میں اس کی تبلیغ و اشاعت کے لیے جدوجہد شروع کر دی، چنانچہ آپ کی ان مخلصانہ کوششوں سے ایسے اصحاب دولتِ ایمان سے بہرہ ور ہوئے جو بلا شبہ معدنِ اسلام کے نہایت درخشندہ تابدار

---

[1] طبقات ابن سعدؒ حصہ سوم [2] یعنی حضرت عامر بن فہیرہؓ، حضرت زنیرہؓ، حضرت امِ عبیسؓ، حضرت نہدیہؓ اور ان کی صاحبزادی اور بنی مؤمل کی لونڈی [3] سیرۃ النبیؐ جلد دوم

ہوتی ہیں، ان میں حضرت عثمان بن عفان رضؓ، حضرت زبیر بن العوام رضؓ، حضرت سعد بن ابی وقاص رضؓ، حضرت طلحہ بن عبداللہ رضؓ حضرت عثمان بن مظعون رضؓ، حضرت ابوعبیدہ رضؓ، حضرت ابوسلمہ رضؓ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضؓ اور حضرت خالد رضؓ بن سعید العاص جیسے عظیم المرتبت بزرگ شامل ہیں، جو اسی ذاتِ گرامی کی ہدایت سے دائرہ اسلام میں داخل ہو کر نیرِ اسلام حضرت محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد گھومنے والے اختر ہائے تاباں بنے۔

حضرت ابوبکر رضؓ کی علانیہ دعوتِ اسلام کے علاوہ آپ کا مخفی روحانی اثر، پیغمبر آخر الزمانؐ کے لائے ہوئے دین حنیفی سے آپ کا والہانہ جذب و عشق بھی سعید و پاکباز روحوں کو اسلام کی طرف مائل کرتا تھا۔ آپ نے اپنے صحنِ خانہ میں ایک چھوٹی سی مسجد بنائی تھی۔ جس میں آپ نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ عبادتِ الٰہی میں مشغول رہتے، آپ چونکہ نہایت نرم دل تھے۔ اس لیے جب قرآن حکیم کی تلاوت فرماتے تو آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے، لوگ آپ کی آہ و زاری اور گریہ و بکا کو سن کر جمع ہو جاتے اور اس پُر اثر منظر سے نہایت متاثر ہوتے۔[1]

مکہ کی زندگی

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بعثت کے بعد تقریباً تیرہ سال تک مکہ معظمہ میں رہے، اس دوران میں کفار نے پیغمبر اسلامؐ کی ایذا رسانی کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا اور قدم قدم پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا راستہ روکا مگر رسولِ خدا صلعم نے اس مخالفت و مزاحمت کی پروا کیے بغیر تبلیغ و دعوت کا سلسلہ جاری رکھا حضرت ابوبکر رضؓ چونکہ ابتدائے اسلام سے ہی اسلام کے جانثار اور سرورِ دو عالم صلعم کے رازدار بن گئے تھے، اس لیے آپ اس بے بسی کی زندگی میں جان، مال، رائے و مشورہ، غرض ہر حیثیت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست و بازو، اور رنج و راحت میں شریک رہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روزانہ صبح و شام اس رازدارِ نبوت کے گھر تشریف لے جاتے اور دیر تک مجلسِ راز قائم رہتی، آنحضرت صلعم جب قبائلِ عرب اور عام مجمعوں میں تبلیغ و ہدایت کے لیے جاتے تو حضرت ابوبکر رضؓ بھی ہمرکاب ہوتے اور نسب دانی اور کثرتِ ملاقات کے باعث لوگوں سے حضورؐ کا تعارف کراتے،[2]

مؤرخین اسلام نے نبوتؐ کے تیرہ سالہ مکی دور میں کفار کے ظلم و تعدی کے واقعات کی تفصیل بیان کرتے وقت حضرت ابوبکر رضؓ کی جانثاری و جانفروشی کا ذکر بھی بڑی وضاحت سے کیا ہے، اہلِ سیر کے مطابق کفار جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر دستِ تعدی دراز کرتے تو نبوتؐ کے یہ مخلص جانثار اپنی جان خطرہ میں ڈال کر خود سینہ سپر ہو جاتے، ایک دفعہ آنحضرت صلعم خانہ کعبہ میں تقریر فرما رہے تھے کہ مشرکین ارشادِ نبوتؐ سن کر سخت برہم ہو گئے اور حضورؐ کو اس قدر اذیت پہنچائی کہ آپ بیہوش ہو گئے، حضرت ابوبکر رضؓ نے بڑھ کر کہا: "خدا تم سے سمجھے، کیا تم صرف اس لیے ان کو قتل کر دو گے کہ یہ ایک خدا کا نام لیتے ہیں"[3] اسی طرح ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے کہ اسی حالت میں عقبہ بن ابی معیط نے اپنی چادر سے گلوئے مبارک میں پھندا ڈال دیا۔ اس وقت اتفاقاً حضرت ابوبکر رضؓ پہنچ گئے اور اس بدبخت کی گردن پکڑ کر آنحضرت صلعم سے علیحدہ کیا اور فرمایا:

"کیا تم ان کو قتل کر دو گے جو تمہارے پاس خدا کی نشانیاں لائے اور کہتے ہیں کہ میرا رب اللہ ہے۔"

مسلسل رفاقت

علماء کا اس پر کلی اتفاق ہے کہ حضرت ابوبکر رضؓ قبولِ اسلام سے آنحضرت صلعم کی رحلت تک سفر و حضر میں ہمیشہ حضورؐ کے ساتھ رہے، اس ضمن میں البتہ حج اور جہاد کے دوران خدمتِ اقدس سے دوری کو اہلِ سیر

[1] سیر الصحابہ حصہ مہاجرین جلد اول [2] ایضاً [3] سیر الصحابہ جلد اول، حصہ مہاجرین۔

نے مستثنیٰ قرار دیا ہے، کیونکہ حضرت ابوبکرؓ نے ایسے سفر منشائے نبوت کی تابعداری میں اختیار کیے تھے۔ تاہم آنحضرت صلعم کی رفاقت کے تقریباً تیئس سالوں میں مجموعی طور پر چند ماہ ہی ایسے گزرے ہوں گے جب کہ حضرت ابوبکرؓ بارگاہِ نبوتؐ سے غیر حاضر رہے ہوں، ورنہ آپ ہر آن ایک جانثار اور مشیرِ معین کی حیثیت سے بارگاہِ نبوتؐ میں حاضر رہے۔ بلکہ معظمہ میں مسلسل رفاقت کے علاوہ ہجرت میں آپ نے حضورؐ کا ساتھ دیا اور غار میں جیسا کہ قرآن حکیم کا ارشاد ہے، آپ (ثانی اثنین) دو میں سے دوسرے تھے۔ مکہ سے مدینہ تک کے سفر میں آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب رہے، اور جیسا کہ آئندہ کے واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ قیامِ مدینہ کے دوران میں بھی بارگاہِ رسالت مآبؐ سے آپ کی حاضری کا تسلسل کبھی ٹوٹنے نہ پایا۔

ہجرتِ حبشہ کا ارادہ

مکہ میں جب مسلمانوں پر کفار کے ظلم و ستم بہت بڑھ گئے اور اہلِ اسلام پر عرصۂ حیات تنگ ہو گیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کو سرزمینِ حبشہ کی طرف ہجرت کا مشورہ دیا۔ چنانچہ رجب ۵ھ بعثت میں ارشادِ نبوتؐ کے مطابق ہجرتِ حبشہ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ بھی چونکہ باوجود ذاتی وجاہت اور خاندانی اعزاز کے کفارِ مکہ کی اس دار و گیر سے محفوظ نہ تھے، اس لیے آپ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے رختِ سفر باندھ کر عازمِ حبشہ ہوئے۔ جب آپ برک الغماد کے مقام پر پہنچے تو ابن الدغنہ رئیسِ قارہ سے ملاقات ہوئی، اس نے پوچھا "ابوبکرؓ کہاں کا قصد ہے؟" آپ نے جواب دیا کہ قوم نے مجھے جلا وطن کر دیا ہے اب ارادہ ہے کہ کسی اور ملک میں چلا جاؤں اور آزادی کے ساتھ خدا کی عبادت کروں۔ ابن الدغنہ نے سن کر کہا:

> "تم سا آدمی جلا وطن نہیں کیا جا سکتا، تم مفلس و بے نوا کی دستگیری کرتے ہو، قرابت داروں کا خیال رکھتے ہو، مہمان نوازی کرتے ہو اور مصیبت زدوں کی اعانت کرتے ہو، تم میرے ساتھ چلو اور اپنے وطن میں ہی اپنے خدا کی عبادت کرو۔"[1]

چنانچہ آپ ابن الدغنہ کے ہمراہ مکہ واپس آ گئے، یہاں پہنچ کر اس نے آپ کو امان دینے کا اعلان کیا جسے قریش نے قبول کیا مگر فرمائش کی کہ (حضرت) ابوبکرؓ کو سمجھا دو کہ وہ جب اور جس طرح چاہیں اپنے گھر میں نمازیں پڑھیں اور قرآن حکیم کی تلاوت کریں، لیکن گھر سے باہر نمازیں پڑھنے کی ان کو اجازت نہیں۔

مگر جیسا کہ یہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے اپنے صحنِ خانہ میں ایک مسجد بنالی، جس میں آپ نمازیں پڑھتے اور اپنے رقت آمیز طریقے سے قرآن حکیم کی تلاوت کرتے کہ گھر کے پاس سے گزرنے والے لوگ جمع ہو جاتے اور کلامِ الٰہی کی تاثیر سے بے حد متاثر ہوتے، چنانچہ جب حضرت ابوبکرؓ نے حسبِ معمول خدائے واحد کی عبادت شروع کی تو کفار کو اس پر اعتراض ہوا اور انھوں نے ابن الدغنہ کو خبر دی کہ ہم نے ابوبکرؓ کو تمہاری اس شرط پر امان دی تھی کہ وہ اپنے مکان میں چھپ کر اپنے مذہبی فرائض ادا کریں گے، لیکن اب وہ صحنِ خانہ کی مسجد میں اعلان کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں جس کی وجہ سے ہم کو ڈر ہے کہ کہیں ہماری عورتیں اور بچے متاثر ہو کر اپنے آبائی مذہب سے برگشتہ نہ ہو جائیں۔ لہٰذا تم (حضرت) ابوبکرؓ کو اس سے باز رکھو یا خود ذمہ داری سے بری ہو جاؤ۔

---

[1] سیر الصحابہؓ جلد اوّل حصہ مہاجرین

ابن الدغنہ قریش کی طرف سے یہ پیغام ملنے پر حضرت ابو بکرؓ کے پاس گیا اور کہا کہ میں نے جس شرط پر تمہاری ذمہ داری قبول کی تھی، تم اس کے پابند رہو یا مجھے اس سے بری سمجھو، کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ اہلِ عرب مجھے کسی سے بدعہدی کرنے کا طعنہ دیں، حضرت ابو بکرؓ نے ابن الدغنہ کی گفتگو سن کر نہایت استغنا کے ساتھ جواب دیا کہ :

"مجھے تمہاری پناہ کی ضرورت نہیں، میرے لیے خدا اور اس کے رسولؐ کی پناہ کافی ہے۔"

رشتۂ مصاہرت

یہ نبوتؐ کا دسواں سال اور رمضان کا مہینہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی غمگسار و ہمدرد رفیقۂ حیات حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ نے اس جہانِ فانی سے کوچ کیا جس سے آنحضرت صلعم کے گھر کا نظام دگرگوں ہو گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مغموم و محزون رہنے لگے، حضرت صدیق اکبرؓ نے حضورؐ کی اس پریشانی کو دیکھتے ہوئے حضرت خولہؓ بنتِ حکم کی اس تحریک پر رضامندی ظاہر کر دی، جو انہوں نے آنحضرت صلعم کی مرضی سے حضرت عائشہ صدیقہؓ کے نکاح سے متعلق حضرت امِ رومانؓ[1] کی معرفت حضرت ابو بکرؓ صدیق تک پہنچائی تھی، چنانچہ شوال ۱۰ بعثت میں حضرت ابو بکرؓ نے اپنی بیٹی حضرت عائشہؓ کا عقد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کر دیا۔[2] اس طرح حضرت عائشہؓ اہلِ بیت میں شامل ہو کر ام المومنین کے درجہ پر ممتاز ہوئیں، حضرت ابو بکرؓ کے لیے یہ شرف کیا کم تھا کہ اُن کی دامادی میں وہ شخص داخل ہو جو پیغمبرِ عالمؐ اور شہنشاہِ کونین ہے۔

صدّیق کا لقب

مؤرخین کے مطابق ۲۷ رجب ۱۰ بعثت کی شب کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ بے نظیر شرف حاصل ہوا جسے عرفِ عام میں "معراج" کہا جاتا ہے۔ آنحضرت صلعم اس شب کے ایک حصہ میں بحکم تعالیٰ مکہ مکرمہ سے بیت المقدس تک تشریف لے گئے، اور پھر وہاں سے آپؐ ملاءِ اعلیٰ کے منازل ارتقا طے فرماتے ہوئے سبع سمٰوات اور سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچے۔ یہاں سے پھر عروج فرما کر ایسے مقام تک بلند ہوئے کہ جہاں سے حضورؐ صریف الاقلام کو سنتے تھے۔ ان بلند مقامات پر آیاتِ الٰہی کا مشاہدہ فرمانے کے بعد آنحضرت صلعم صبح سے پہلے مکہ مکرمہ پہنچ گئے۔ حضورؐ نے جب اس مقدس سفر کے حالات قریشِ مکہ سے بیان فرمائے، تو انہوں نے حسبِ معمول تالیاں بجائیں اور تمسخر اڑایا۔ چنانچہ کچھ لوگ حضرت ابو بکرؓ کے پاس آئے اور کہا کہ تمہارے دوست یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہ کہتے ہیں کہ میں آج رات بیت المقدس گیا اور صبح سے پہلے واپس آ گیا، کیا تم اس کی بھی تصدیق کرو گے ؟ حضرت ابو بکرؓ نے پوچھا کہ کیا رسولِ خداؐ نے ایسا ہی فرمایا ہے، لوگوں نے کہا، ہاں، اس پر آپؓ نے کہا کہ اگر حضورؐ نے فرمایا ہے تو بالکل سچ فرمایا ہے۔ میں اس کی تصدیق کرتا ہوں اور میں تو اس سے بھی بڑھ کر آپؐ کی بیان کردہ آسمانی خبروں کی صبح و شام تصدیق کرتا رہتا ہوں، چنانچہ اسی روز سے آپؓ کا لقب "صدّیق" ہو گیا۔[3] سعید بن منصورؒ نے اپنی مسند میں تحریر کیا ہے کہ رسول اللہؐ نے شبِ معراج میں مقام طویٰ پر پہنچ کر فرمایا، اس واقعہ کی تصدیق میری ملت نہیں کرے گی، تو جبریلؑ نے جواب دیا کہ آپؐ کی تصدیق حضرت ابو بکرؓ کریں گے جو "صدّیق" ہیں۔[4]

ہجرتِ مدینہ اور رفاقتِ غار

مکہ میں جب کفار و مشرکین کا دستِ ستم زیادہ دراز ہو گیا، تو حضرت ابو بکرؓ نے دوبارہ ہجرت کا قصد فرمایا اس دفعہ آپ کی منزلِ مقصود سرزمینِ مدینہ تھی، جہاں اسلام پوری آب و تاب

---

[1] حضرت عائشہ صدیقہؓ کی والدہ ماجدہ [2] حضرت عائشہ صدیقہؓ کی رخصتی شوال ۱ھ میں ہوئی [3] سیرۃ المصطفیٰ جلد اول [4] تاریخ الخلفاء۔

کے ساتھ نور پاشی کر رہا تھا اور مظلوم و ستم زدہ مسلمانوں کو نہایت خلوص و محبت کے ساتھ اپنے دامن میں پناہ دے رہی تھی، حضرت ابوبکرؓ ہجرت کی تیاری کر رہے تھے کہ بارگاہِ نبوت سے حکم ہُوا کہ ابھی عجلت نہ کرو، اُمید ہے کہ خدائے پاک کی طرف سے مجھے بھی ہجرت کا حکم ہوگا، حضرت ابوبکرؓ نے نہایت تعجب سے پوچھا میرے ماں باپ آپؐ پر قربان ہوں کیا آپؐ کو بھی ہجرت کا حکم ہوگا؟ ارشاد ہُوا "ہاں" عرض کی "یارسولُ اللہ! مجھے ہمراہی کا شرف نصیب ہو" فرمایا "ہاں، تم ساتھ چلو گے" اس بشارت کے بعد ارادہ ملتوی کر دیا اور چار ماہ منتظر رہے۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عموماً صبح و شام ہمارے گھر تشریف لایا کرتے تھے، ایک روز مُنہ چھپائے ہُوئے خلافِ معمول ناوقت تشریف لائے اور فرمایا کہ کوئی ہو تو ہٹا دو، مَیں کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کی کہ گھر والوں کے سوا کوئی نہیں، یہ سُن کر حضورؐ اندر تشریف لائے اور فرمایا کہ مجھے ہجرت کا حکم ہو گیا ہے، حضرت ابوبکرؓ نے نہایت بیتابی کے ساتھ کہا:۔

"یارسولُ اللہ! میرا باپ آپؐ پر قربان اور رفاقت؟"

ارشاد ہُوا، "ہاں" حضرت ابوبکرؓ تو چار ماہ سے اسی حکم کے منتظر تھے فوراً تیار ہو گئے، ام المومنین حضرت عائشہؓ اور حضرت اسماءؓ نے جلدی جلدی رختِ سفر درست کیا، حضرت اسماءؓ کو اس عجلت میں توشہ دان باندھنے کے لیے کوئی چیز نہ ملی تو انہوں نے اپنا کمر بند پھاڑ کر باندھا اور دربارِ نبوتؐ سے ذات النطاقین کا خطاب پایا، حضرت ابوبکرؓ نے پہلے ہی دو اونٹ اس دن کے لیے تیار کر لیے تھے، ان میں سے ایک آنحضرت صلعم کی خدمت میں پیش کیا اور دوسرے پر خود سوار ہوئے اور جبلِ ثور پہنچ کر ایک غار میں پوشیدہ ہو گئے۔ [1]

ہجرت کا واقعہ ایک پُرخطر راز تھا لیکن خاندانِ صدیقؓ کے سینے اس راز کا مدفن بن گئے تھے۔ اس ضمن میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت اسماءؓ کے علاوہ حضرت عبداللہ بن ابوبکرؓ اور حضرت عامر بن فہیرہؓ نے بھی قابلِ قدر خدمات انجام دیں، حضرت عبداللہ بن ابوبکرؓ نے یہ خدمت اپنے ذمّہ لی کہ جھٹ پٹے وقت غار پر پہنچ جاتے، رات وہیں بسر کرتے، صبح ہوتے ہی مکہ واپس آجاتے اور دن بھر قریش میں جو آنحضرت صلعم کے متعلق مشورے ہوتے، اُن سے رات کے وقت غار میں حاضرِ خدمت ہو کر حضورؐ کو آگاہ کرتے۔ اسی طرح حضرت ابوبکرؓ کے غلام حضرت عامر بن فہیرہؓ دن بھر مکہ کی چراگاہ میں بکریاں چراتے، رات کو چرواہوں کی نظر بچا کر ریوڑ غار کے دہانے پر لاتے۔ بکریوں کا دودھ دوہ کر آنحضرت صلعم اور حضرت ابوبکرؓ کو پہنچاتے۔ صبح ہوتی، تو حضرت عبداللہ بن ابوبکرؓ کے نشانِ قدم مٹانے کی غرض سے ریوڑ انہی راہوں پر ہانک کر دور لے جاتے، غرض تین دن اور تین راتیں اسی حالت میں بسر ہوئیں اور یہ تمام کارروائی اس طرح عمل میں آتی تھی کہ قریش کو ذرا بھی شُبہ نہ ہُوا۔ [2]

ایک طرف تو خاندانِ صدیقؓ کی یہ جاں نثاریاں تھیں کہ حضرت ابوبکرؓ اُن کا بیٹا، غلام، حتیٰ کہ جانور تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت گزاری کا شرف حاصل کر رہے تھے اور دوسری طرف قریش مکہ تھے جن کے سینے بُغض و عداوت کی آگ سے جل رہے تھے، انہوں نے

---

[1] سیر الصحابہؓ جلد اوّل [2] سیر الصحابہؓ جلد اوّل۔

چاروں طرف نگہبان مقرر کر دیے تھے کہ رسول اللہ مدینہ پہنچنے سے قبل ہی راستے میں روک لیے جائیں۔

مؤرخین کے مطابق مکہ کے اطراف میں کوئی آبادی، ویرانہ، جنگل، پہاڑ اور سنسان میدان ایسا نہ رہا تھا جس کا جائزہ نہ لیا گیا ہو یہاں تک کہ کفار کی ایک جماعت غارِ ثور کے پاس بھی پہنچ گئی۔ حضرت ابوبکرؓ نے قدموں کی چاپ سنی تو سر اٹھایا اور دیکھا کہ غار کے دہانے پر کفار کے پاؤں نظر آ رہے ہیں، یہ نہایت یاس انگیز منظر تھا، چنانچہ آپ نہایت بے چینی و اضطراب کے عالم میں بولے: "اگر وہ ذرا بھی نیچے کی طرف نگاہ کریں گے، تو ہم دیکھ لیے جائیں گے۔ مگر اللہ کے رسولؐ نے تشفی دیتے ہوئے فرمایا: "خاموش رہو! ابوبکرؓ تمہارا ان دو شخصوں کے متعلق کیا گمان ہے جن کا تیسرا خدا ہے؟ حضرت ابوبکرؓ ارشاد سنتے ہی خاموش ہو گئے اور ان کا مضطرب و بے قرار دل امدادِ غیبی کے یقین پر لازوال جرأت و استقلال سے مملو ہو گیا۔ خدا کی قدرت ملاحظہ ہو کہ آفتابِ نبوت کے سامنے کفار کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں اور وہ ناکام واپس ہو گئے۔" قرآن حکیم میں اس واقعہ کو یوں بیان کیا گیا ہے۔

اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ۭ وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ○

(سورۃ التوبۃ آیت ۴۰)

اگر تم لوگ اس (پیغمبر) کی مدد نہ کرو گے (تو کچھ پروا نہیں کیونکہ) خدا اس کی مدد کر چکا ہے۔ جب اس کو کافروں نے نکال دیا۔ دو میں کا دوسرا، جبکہ وہ دونوں غار میں تھے، جب وہ اپنے رفیق سے کہہ رہا تھا، گھبراؤ نہیں خدا ہمارے ساتھ ہے، تو خدا نے اس پر اپنی تسکین نازل کی اور اس کی ایسے لشکروں سے مدد کی جن کو تم نہیں دیکھتے، اور کافروں کی بات نیچی کر دی اور خدا ہی کی بات بلند ہے خدا غالب اور حکمت والا ہے۔

بہرکیف یکم ربیع الاول ۱۳ بعثت بروز دوشنبہ (مطابق ۲۰ ستمبر ۶۲۲ء) غار میں تین روز قیام فرمانے کے بعد یہ مقدس قافلہ رات کی تاریکی میں عازمِ مدینہ ہوا، اب اس قافلہ میں دو کی بجائے چار آدمی تھے یعنی راستے کی خدمت کے لیے حضرت ابوبکرؓ کے غلام حضرت عامر بن فہیرہؓ کے علاوہ عبداللہ بن اریقط بھی تھا، جو اگرچہ کافر تھا، تاہم قابلِ اعتماد ہونے کے باعث اجرت پر راہنما مقرر کیا گیا تھا، یہ آگے آگے راستہ بتاتا جاتا تھا اور حضرت ابوبکر صدیقؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کے لیے کبھی آگے بڑھ جاتے اور کبھی پیچھے ہو جاتے، یہ مقدس قافلہ رات بھر محوِ سفر رہا۔ دوسرے دن جب آفتاب سر پر آ گیا اور مسافروں کا چلنا موقوف ہوا تو حضرت صدیقؓ نے آنحضرت صلعم کے آرام کے لیے ایک چٹان کا دامن منتخب کیا، پھر اپنے ہاتھ سے زمین جھاڑ کر صاف کی، اس پر اپنی پوستین بچھائی اور سرورِ دو عالم صلعم سے عرض کیا کہ حضورؐ آرام فرمائیں، آنحضرت صلعم مصروفِ استراحت ہوئے اور جاں نثارِ نبوت نے آس پاس کی زمین صاف کرنا شروع کر دی، لیکن ساتھ ساتھ آپ دور دور تک نگاہ بھی دوڑا رہے تھے کہ کوئی نبی اللہ کے تعاقب میں نہ آ رہا ہو، ادھر سے جب قدرے اطمینان ہوا، تو خوراک کی تلاش میں نکلے، اتفاق سے ایک گڈریا ریوڑ لیے اسی چٹان کی طرف آ رہا تھا۔ آپ نے اس سے پوچھا کہ یہ بکریاں کس کی ہیں؟ اس نے ایک قریشی کا نام لیا، پھر دریافت فرمایا کہ ان میں کوئی دودھ دینے والی بکری بھی ہے؟ اس نے اثبات میں جواب دیا، فرمایا، دودھ دو گے؟ اس نے رضامندی کا اظہار کیا، پھر اس نے بکری کے پیر باندھے۔ آپ نے فرمایا کہ اس

کے تھن اور اپنے ہاتھ مٹی سے صاف کر لو' اس نے حسبِ ہدایت دودھ دوہ کر پیش کیا، جسے ٹھنڈا کرنے کے بعد آپ نے قدرے پانی ملایا اور کپڑے سے چھان کر جب خدمتِ اقدس میں پہنچے تو حضورؐ کو محوِ استراحت دیکھ کر بیدار کرنا اچھا معلوم نہ ہُوا لیکن آنحضرت صلعم خود ہی جاگ اُٹھے تھے، حضرت ابوبکرؓ کی درخواست پر سرورِ دوعالم صلعم نے جب دُودھ نوش فرمایا، تو حضرت صدیق اکبرؓ خوش ہو گئے" ازاں بعد آنحضرت صلعم نے دریافت فرمایا کہ روانگی کا وقت آیا؟ رفیقِ غار نے عرض کیا" جی ہاں" چنانچہ آفتاب ڈھل چکا تو کوچ کا حکم دیا[1]

صحیح روایات کے مطابق دلیلِ راہ نے درمیانی راستہ چھوڑ کر سمندر کے کنارے کنارے چلنا شروع کیا۔ روایت ہے کہ حضورؐ جب رابغ کے موجودہ قلعہ اور ساحلِ بحر کے درمیانی میدان سے گزر رہے تھے تو سراقہ بن جعشم (یا سراقہ بن مالک بن جعشم) نے نبیؐ اللہ کا تعاقب کیا[2] اور آنحضرت صلعم کے قریب پہنچ کر دم لیا' یہاں گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور سراقہ گر پڑا۔ اُٹھ کر ترکش میں ہاتھ ڈالا اور فال کے تیر نکالے' تیر میں "لا" نکلا، لیکن انعام کی لالچ میں تیر کی بات نہ مانی' پھر گھوڑے پر سوار ہُوا، جب زیادہ قریب آیا، تو حضرت ابوبکرؓ نے دیکھا کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم تلاوتِ کلامِ پاک میں مشغول تھے اور اپنے مالکِ حقیقی سے لو لگائے بڑھے چلے جا رہے تھے۔ لیکن آپؐ کے رفیقِ غار حضرت ابوبکرؓ نہایت اضطراب میں بار بار مُڑ کر دیکھتے تھے۔ آخر عرض کیا' یا رسولُ اللہ' یہ سوار آ گیا' حضورؐ نے فرمایا: "یا الٰہی ہمیں اس کی شر سے بچا" اِدھر یہ الفاظِ مبارکہ مُنہ سے نکلے اور اِدھر گھوڑے کے پاؤں زمین میں دھنس گئے۔ سراقہ گر پڑا اور سمجھ گیا کہ حفاظتِ الٰہی پر غالب آنا محال ہے' نہایت عاجزانہ الفاظ میں جان کی امان مانگی' امان دی گئی' سراقہ آگے بڑھا اور عرض کی کہ اب میں ہر ایک حملہ آور کو پیچھے ہی روکتا رہوں گا' پھر اس کی درخواست اور ارشادِ نبوّتؐ پر حضرت عامر بن فہیرہؓ نے خطِ امان لکھ کر سراقہ کے حوالے کیا[3]

اسی سفر کے دوران میں اس مُقدّس قافلہ کا گزر اُمِّ معبد خزاعیہ کے خیمہ پر ہُوا اور ایک مریل دکمزور بکری کے سوکھے تھنوں سے دودھ نکلنے کا معجزہ رونما ہُوا، جسے سب نے سیر ہو کر پیا' پھر راستے میں اس مقدس قافلہ کی ملاقات حضرت زبیرؓ سے ہوئی جو چند مسلمان تاجروں کے ساتھ شام سے واپس آ رہے تھے۔ حضرت زبیرؓ نے آنحضرت صلعم اور حضرت ابوبکرؓ کو سفید کپڑے پہنائے جنہیں پہنے ہوئے دونوں بزرگ مدینہ میں داخل ہوئے[4]

مدینہ کے مسلمانوں کو آنحضرت صلعم کی مکّہ سے روانگی کی خبر معلوم ہو چکی تھی' وہ روزانہ تڑکے اُٹھ کر حرّا کی طرف نکل جاتے اور دوپہر تک انتظار کرتے رہتے۔ جب دھوپ تیز ہو جاتی تو اپنے گھروں کو لَوٹ جاتے' ایک دن دیر تک انتظار کے بعد گھروں کو واپس آئے ہی تھے کہ ایک یہودی کی آواز نے انہیں چونکا دیا' وہ یہودی کسی ضرورت کے تحت اپنے مکان کی چھت پر چڑھا تھا کہ اُس نے رسول اللہ اور ان کے رفقائے سفر کو دور سے آتا دیکھ کر آواز دی اے گروہِ عرب' تمہارا شاہدِ مقصود آ پہنچا' مسلمان ہتھیار سجا کر دوڑتے ہُوئے آئے اور حرا کی پشت پر اس مقدس قافلہ کا نہایت پُرجوش استقبال کیا۔ حضور سرورِ دوعالم صلعم دائیں طرف مُڑ کر عمرو بن عوف کے قبیلہ میں اُتر پڑے[5] یہ دوشنبہ کا دن اور ربیع الاوّل کا مہینہ تھا[6] یہاں انصار جوق در جوق زیارت کے لیے آنے لگے' آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم خاموشی کے ساتھ تشریف فرما

---

[1] سیر الصحابہؓ جلد اوّل [2] رحمۃ للعالمین ج جلد اوّل [3] ایضاً [4] سیر الصحابہؓ جلد اوّل [5] سیر الصحابہؓ جلد اوّل جزء المہاجرین [6] مؤرخین کے مطابق حضورؐ کا قبا میں داخلہ ۸ ربیع الاوّل سنہ ۱۳ بعثت مطابق ۲۰ ستمبر سنہ ۶۲۲ء کو ہُوا تھا۔ اس دن حضورؐ کی عمرِ مبارک ٹھیک ترپن سال تھی۔

تھے اور حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کھڑے ہو کر لوگوں کا استقبال کر رہے تھے۔

انصار مدینہ میں جن لوگوں نے نبیؐ اللہ کے جمالِ مبارک کی زیارت نہیں کی تھی، وہ آپؐ کے دھوکہ میں حضرت ابوبکر رضؓ کو سلام کرتے تھے، یہاں تک کہ جب آفتاب سامنے آگیا اور حضرت ابوبکر رضؓ نے چادر تان کر اپنے آقائے نامدارؐ پر سایہ کیا تب لوگوں نے چادر کے سایہ میں آفتابِ رسالتؐ کو پہچانا۔

مدینہ میں ورُودِ مسعود

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قبا میں چار دن قیام فرمانے اور اسی دوران میں مسجد قبا کی بنیاد رکھنے کے بعد ۱۲ ربیع الاول بروز جمعۃ المبارک کو مدینہ تشریف لائے اور حضرت ابو ایوب انصاری رضؓ کے ہاں قیام پذیر ہوئے۔ حضرت ابوبکر رضؓ بھی حضورؐ کے ساتھ مدینہ آئے اور حضرت خارجہؓ بن زید بن ابی زہیر کے پاس اُترے، چند دنوں کے بعد حضرت ابوبکر رضؓ کے اہل و عیال بھی حضرت طلحہ رضؓ کے ساتھ مدینہ پہنچ گئے، مؤرخین کے مطابق مدینہ منورہ کی آب و ہوا مہاجرین کے لیے عموماً نہایت ناموافق ثابت ہوئی، حضرت ابوبکر رضؓ خصوصیت سے ایسے شدید بخار میں مبتلا ہوئے کہ زندگی سے مایوس ہو گئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ کیفیت معلوم ہوئی تو آپؐ نے دعا فرمائی جس کے نتیجہ میں حضرت ابوبکر رضؓ بسترِ علالت سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور مدینہ کی ہوا مہاجرین کے لیے مکہ سے بھی زیادہ خوش آئند ہو گئی۔

مواخات

مدینہ پہنچنے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین و انصار میں باہمی اجنبیت و بیگانگی دُور کرنے کے لیے ان کا ایک دوسرے سے بھائی چارہ کرا دیا، اس مواخات میں حضرت ابوبکر رضؓ کی برادری حضرت خارجہ بن زید رضؓ سے قائم کی گئی جو ایک بستی سنح میں رہتے اور نہایت معزز شخصیت کے مالک تھے۔ حضرت صدیق اکبر رضؓ کے تعلقات ان سے اس حد تک بڑھ گئے کہ انہوں نے اپنی بیٹی حبیبہ کو حضرت ابوبکر رضؓ کے عقد میں دے دیا جن کے بطن سے امِ کلثوم پیدا ہوئیں۔

تعمیر مسجد

مدینہ اسلام کے لیے آزادی کی سرزمین تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک آمد سے اس کو ایک مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی تھی، چنانچہ وہ فرزندانِ توحید جو کفار کے ظلم و ستم سے تنگ آکر ادھر اُدھر آبادیوں میں منتشر ہو گئے تھے، آہستہ آہستہ اس مرکز پر جمع ہونے لگے، اہلِ اسلام کو اب چونکہ آزادی و فراغت کے ساتھ اجتماعی طور پر معبودِ حقیقی کی عبادت کا موقع حاصل ہوا تھا۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سب سے پہلے تعمیر مسجد کی طرف متوجہ ہوئے، چنانچہ اس مقصد کے لیے جو جگہ حضورؐ نے منتخب فرمائی، وہ مدینہ کے دو یتیم بچوں کی ملکیت تھی، یہ زمین اگرچہ بچوں کے اولیا واقربا بلا قیمت دینے پر مصر تھے۔ تاہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یتیموں کا مال بغیر کسی معاوضہ کے لینا پسند نہ فرمایا اور حضرت ابوبکر سے اس کی قیمت دلوا دی، اس طرح حضرت صدیق اکبر رضؓ نے مدینہ پہنچنے کے بعد نہ صرف مالی ایثار کا شرفِ اولین حاصل کیا بلکہ تعمیر مسجد میں اس پیرانہ سالی کے باوجود نوجوانوں کے دوش بدوش کام کر کے اسلامی محبت کی ایک نئی مثال قائم کی۔

غزوات

مدینہ پہنچ کر اگرچہ مسلمانوں کی بے بسی اور مظلومیت کا دور ختم ہو چکا تھا اور نہایت آزادی و فراغت کے ساتھ دینِ اسلام کی نشر و اشاعت کا وقت آگیا تھا، تاہم عرب کی جنگجو قوم مذہب کی صداقت و حقانیت کو بھی تیر و تفنگ اور نوکِ سنان سے وابستہ سمجھتی تھی، یہی وجہ ہے کہ اس جنگجویانہ فطرت نے علمبرداران امن و سلامتی کو بھی منبرِ وعظ و ہدایت چھوڑ کر میدانِ جنگ میں آنے پر مجبور کیا، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ تشریف لانے کے بعد فتح مکہ تک خونریز لڑائیوں کا سلسلہ جاری رہا اور ان سب معرکوں میں حضرت

ابوبکرؓ ایک مشیر اور وزیر باتدبیر کی طرح ہمیشہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمرکابی سے مشرف رہے۔

غزوۂ بدر

غزوہ بدر حق و باطل کا اولین فیصلہ کن معرکہ تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک سائبان کے نیچے اپنی مٹھی بھر جماعت کے ساتھ حق و صداقت کی حمایت میں سرگرم کارزار تھے اور حضرت ابوبکرؓ آزمائش کی اس گھڑی میں بھی اس قدر جانبازی کے ساتھ شمشیر برہنہ اپنے ہادی کی حفاظت کے فرائض انجام دے رہے تھے کہ کفار و مشرکین ہر طرف سے جب یلغار کر کے آتے تو آپ نہایت شجاعت و پامردی کے ساتھ ان کو بھاگنے پر مجبور کر دیتے، تاریخ کے اوراق گواہ ہیں کہ اس خوفناک جنگ میں ایک لمحہ کے لیے بھی حضرت ابوبکرؓ حضور پرنور صلعم کی خدمت گزاری سے غافل نہ رہے، ایک دفعہ ردائے مبارک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شانۂ اقدس سے گر گئی، حضرت ابوبکرؓ نے دیکھا تو تڑپ کر آئے، اُسے اُٹھا کر حضورؐ کے مبارک شانوں پر رکھا اور پھر رجز پڑھتے ہوئے کفار کے لشکر میں گھس گئے، درحقیقت یہ حضرت ابوبکرؓ جیسے جاں نثاروں کا ہی جذبۂ لازوال تھا، جس نے قلت کو کثرت کے مقابلہ پر سربلند کیا۔[1]

غزوۂ اُحد

قریش کے لیے معرکہ بدر کی شکست ایک ایسا بدنما داغ تھا، جسے مٹانے کے لیے انہوں نے اپنے پورے وسائل و ذرائع داؤ پر لگا کر ایک لشکر جرار فراہم کیا اور جوش انتقام سے بھرے ہوئے جبل اُحد کے دامن میں خانہ زن ہوئے مجاہدین اسلام قلیل تعداد میں ہونے کے باوجود پہلے لشکر کفار پر غالب آئے، لیکن ایک درہ پر متعین تیراندازوں کی غلطی کے باعث جنگ کا پانسہ پلٹ گیا اور کفار کے اچانک حملہ سے ایسی سراسیمگی پھیلی کہ بہت سے مسلمانوں کے پائے ثبات متزلزل ہو گئے، مگر حضرت ابوبکرؓ آخر دم تک ثابت قدم رہے، پھر جب کفار کی پے در پے یورش سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مجروح ہوئے اور آپؐ کو صحابہ کرامؓ پہاڑ پر لائے تو جاں نثار نبوت حضرت ابوبکرؓ آنحضورؐ کے ساتھ تھے، لشکر کفار کے قائد ابوسفیان نے پہاڑ کے قریب آ کر پکارا، کیا قوم میں محمدؐ ہیں؟ جب ادھر سے کوئی جواب نہ ملا تو اس نے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کا نام لیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ابوسفیان کا حضرت ابوبکرؓ کے متعلق دریافت کرنا اس حقیقت کا برملا اعتراف ہے کہ کفار بھی حضور پرنور صلعم کے بعد حضرت ابوبکرؓ کو ہی رئیس اُمت سمجھتے تھے۔

اختتام جنگ کے بعد جب کفار مکہ واپس ہوئے تو جو جماعت ان کے تعاقب میں روانہ ہوئی اس میں حضرت ابوبکرؓ بھی شامل تھے۔ غزوہ اُحد کے بعد بنو نضیر کی جلاوطنی، غزوہ ذات الرقاع، غزوہ بدرالاخریٰ، غزوہ دومۃ الجندل، غزوہ بنو مصطلق غرضیکہ جو معرکہ بھی پیش آیا۔ حضرت ابوبکرؓ ان میں برابر کے شریک تھے۔

آلِ ابوبکرؓ کی برکات

غزوہ بنو مصطلق جو ۲ شعبان ۵ھ کو پیش آیا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ اور اُن کی اولاد کی برکات کا اعلیٰ نمونہ تھا، مورخین کی تصریح کے مطابق اس غزوہ سے واپس آتے ہوئے کسی مقام پر حضرت عائشہ صدیقہؓ کا ہار گر پڑا، جسے تلاش کرنے کی غرض سے تمام لشکر ٹھہر گیا، اتفاق سے جس جگہ لشکر کو رکنا پڑا وہاں پانی دستیاب نہ تھا۔ کچھ لوگوں نے حضرت ابوبکرؓ سے حضرت عائشہؓ کی شکایت کی کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام لوگوں کو روک رکھا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ حضرت عائشہؓ کی تنبیہہ کے لیے آئے تو دیکھا آنحضرت صلعم اُن کی ران پر سر مبارک رکھ کر سوئے ہوئے تھے۔ تاہم حضرت عائشہؓ سے

---

[1] سیرالصحابہؓ جلد اوّل، خلفائے راشدین

سخت ناراض ہوئے کہ تم لوگوں کے لیے بلا اور مصیبت کا ذریعہ بن گئی ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب بیدار ہوئے، تو وضو کے لیے پانی نہ تھا، چنانچہ اسی مقام پر تیمم کی آیت نازل ہوئی جس سے تمام صحابہؓ خوش ہو گئے۔ حضرت اُسید بن حضیرؓ نے جوشِ مسرت میں کہا:

"اے آلِ ابوبکرؓ! یہ تیمم کا حکم نازل ہونا تمہاری پہلی برکت نہیں بلکہ تمہاری برکت سے اور بھی بہت سی سہولتوں اور آسانیوں کے احکام نازل ہو چکے ہیں۔"

واقعۂ افک — ایک کڑی آزمائش

اسی غزوہ میں ایک کڑی آزمائش یہ پیش آئی کہ جس وقت حضرت عائشہ صدیقہؓ حوائج ضروری کے لیے خیمہ سے باہر گئی ہوئی تھیں، اہلِ قافلہ نے غلطی سے ان کا اونٹ ہانک دیا، آپ واپس آئیں تو گمشدہ ہار اس جگہ مل گیا، مگر قافلہ کوچ کر چکا تھا۔ آپ کو اس کا بڑا قلق ہوا اور آپ نہایت غمگین وملول اُسی مقام پر بیٹھ گئیں، اتفاق سے حضرت صفوان بن المعطلؓ نے جو نہایت ضعیف اور بوڑھے آدمی تھے اور عموماً کوچ کے بعد قیام گاہ کا جائزہ لے کر سب سے پیچھے روانہ ہوا کرتے تھے، حضرت عائشہ صدیقہؓ کو دیکھ لیا اور انہیں اُونٹ پر بٹھا کر خود مہار پکڑے ہوئے پیدل چل پڑے، یہاں تک کہ اگلی منزل پر جا کر مجاہدین سے مل گئے۔ لشکر میں راس المنافقین عبداللہ بن اُبی بھی موجود تھا۔ اس منافق کو اس سے بڑھ کر فتنہ پردازی کا کیا موقع مل سکتا تھا؟ چنانچہ ان لوگوں نے اِفک کا واقعہ تمام لشکر میں پھیلا دیا، غلطی سے چند مسلمان جن میں حضرت مسطح بن اثاثہؓ بھی تھے۔ ان لوگوں کے ہمنوا ہو گئے۔

مدینہ پہنچ کر حضرت عائشہؓ بیمار پڑ گئیں اور جب یہ خبر معلوم ہوئی تو مرض میں اور اضافہ ہو گیا، تحقیق کے لیے میکہ تشریف لائیں، اپنی ماں سے حالات دریافت کیے۔ انہوں نے تسکین دی، پھر پوچھا کہ میرے باپ کو بھی خبر ہے، ماں نے اثبات میں جواب دیا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق پُوچھا۔ ماں نے جواب دیا کہ اُن کو بھی یہ خبر مل چکی ہے، یہ سُن کر حضرت عائشہ صدیقہؓ چیخ چیخ کر رونے لگیں، حضرت ابوبکرؓ اس وقت بالاخانہ پر تلاوتِ کلام پاک میں مصروف تھے، جب آپؓ نے چیخوں کی آواز سُنی تو نیچے اُتر آئے اور بیٹی کا حال دیکھ کر خود بھی آبدیدہ ہو گئے۔

عزت و آبرو انسان کو دُنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہوتی ہے۔ اسی بنا پر یہ خبر حضرت ابوبکرؓ کے لیے ایک نہایت کڑی آزمائش تھی، لیکن خدائے عز وجل نے اپنے فضل وکرم سے بہت جلد خاندانِ صدیق کو اس کربناک اذیت سے نجات دے دی اور وحی الٰہی نے منافقین کے اس شرمناک بہتان کی اس طرح قلعی کھول دی:

اِنَّ الَّذِيْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ وَالَّذِيْ تَوَلّٰى كِبْرَهٗ مِنْهُمْ لَهٗ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (سورۃ النور آیت ۱۱)	جن لوگوں نے (حضرت عائشہؓ پر) تہمت لگائی وہ تمہاری ہی جماعت سے ہیں، اس کو تم اپنے لیے شر نہ سمجھو بلکہ وہ تمہارے لیے خیر ہے، ان میں ہر شریک گناہ کو بقدرِ شرکت سزا ملے گی اور ان میں سے جس نے بہت زیادتی کی ہے، اس پر سخت عذاب ہو گا۔

مزید ارشادِ باری تعالیٰ ہوا۔

لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا ۙ وَّقَالُوْا هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ (سورۃ النور آیت ۱۲)

جب تم نے وہ بات سُنی تھی تو مومن مردوں اور عورتوں نے کیوں اپنے دلوں میں نیک گمان نہ کیا اور (کیوں نہ) کہا کہ یہ صریح بہتان ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب برأتِ عائشہ رضؓ کے متعلق ارشادِ ربانی سے حضرت ابوبکر رضؓ کو مطلع فرمایا، تو حضرت صدیق اکبر رضؓ کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمتِ بے پایاں سے صدیق رضؓ اور خاندانِ صدیق رضؓ کو نگاہِ نبوت میں ایک بار پھر امتیازی شان بخش دی تھی۔

جیسا کہ یہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ حضرت مسطح رضؓ بن اثاثہ بھی اس تہمت میں منافقین کے ہمنوا ہو گئے تھے۔ حضرت مسطح رضؓ کی کفالت حضرت صدیق اکبر رضؓ کے ذمہ تھی، چنانچہ آیاتِ برأت کے نزول کے بعد حضرت ابوبکر رضؓ نے قسم کھائی کہ وہ حضرت مسطح رضؓ کا نفقہ بند کر دیں گے اور اُن کی کسی قسم کی امداد نہیں کریں گے، اس پر ارشادِ ربانی ہوا۔

وَلَا يَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ يُّؤْتُوْٓا اُولِي الْقُرْبٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۖ وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا ۭ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (سورہ النور آیت ۲۲)

تم میں سے جو لوگ صاحبِ فضیلت اور ذی مقدور ہیں وہ اس بات کی قسم نہ کھائیں کہ قرابت داروں مسکینوں اور مہاجرین سے سلوک نہ کریں گے، اُن کو عفو و درگزر سے کام لینا چاہیے، کیا تم یہ نہیں چاہتے کہ خدا تم کو بخش دے۔ خدا غفور رحیم ہے۔

اس ارشادِ خداوندی پر حضرت صدیق اکبر رضؓ نے فرمایا: "خدا کی قسم مَیں چاہتا ہوں کہ خدا مجھے بخش دے" اور قسم کھائی کہ اب ہمیشہ اس کا (یعنی حضرت مسطح رضؓ کا) کفیل رہوں گا،

سریہ اُم قرفہ | غزوہ بنو مصطلق کے بعد آپ غزوہ خندق، غزوہ بنو قریظہ، غزوہ بنو لحیان اور غزوہ ذی قردہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب رہے، رمضان المبارک ۶ھ میں آنحضرت صلعم نے آپ کو ایک جماعت کے ساتھ بنی فزارہ کی سرکوبی کے لیے بھیجا، اس قبیلہ کی سردار اُم قرفہ تھی جس کا اصل نام فاطمہ بنت ربیعہ تھا، ایک دفعہ حضرت زید بن حارثہ رضؓ مالِ تجارت کے ساتھ شام جاتے ہوئے اِدھر سے گزرے، بنی فزارہ نے حملہ کر کے اُن کو زخمی کیا اور تمام مالِ تجارت چھین لیا، حضرت زید رضؓ زخمی حالت میں مدینہ پہنچے تو آنحضرت صلعم نے ان لوگوں سے انتقام لینے کے لیے حضرت ابوبکر رضؓ کو روانہ فرمایا، چنانچہ آپ اس مہم سے کامیاب لوٹے، اکثر مؤرخین کے نزدیک اس دفعہ بھی حضرت زید رضؓ بن حارثہ کو بھیجا گیا تھا، مگر مؤلف "رحمۃ للعالمین" کے مطابق دوسری بار یہ جماعت حضرت صدیق اکبر رضؓ کی سرکردگی میں گئی تھی (واللہ اعلم)

واقعہ حدیبیہ | یکم ذیقعدہ ۶ھ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چودہ سو صحابہ رضؓ کے ساتھ زیارتِ کعبہ کا عزم فرمایا، ذوالحلیفہ پہنچ کر سرورِ دوعالم صلعم نے قبیلہ خزاعہ کے ایک شخص کو حالات معلوم کرنے کے لیے آگے بھیجا، وہ لوٹ کر غدیرالاشطاط کے مقام پر بارگاہِ رسالتمآب میں حاضر ہوا اور اطلاع دی کہ قریش مزاحم ہوں گے۔ یہ سُن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضؓ کو مخاطب

کرکے فرمایا: "لوگو مجھے مشورہ دو۔" حضرت ابوبکرؓ نے عرض کی:

"یارسولؐ اللہ، آپؐ زیارت کعبہ کے قصد سے روانہ ہوئے ہیں کسی سے لڑنے کے لیے نہیں، اس لیے تشریف لے چلیے، جو شخص مزاحم کرے گا، ہم اُس کا مقابلہ کریں گے۔"[1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کی اس رائے کو پسند کیا اور ارشاد فرمایا "خدا کا نام لے کر چلو۔" غرض آگے بڑھ کر حدیبیہ کے مقام پر پڑاؤ ڈالا گیا اور طرفین میں مصالحت کے لیے سلسلۂ جنبانی شروع ہوئی۔ اسی اثناء میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ حضرت عثمانؓ جو اسلامی سفیر کی حیثیت سے اہل مکہ کے پاس گئے تھے، شہید کر دیے گئے۔ یہ سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام جاں نثاروں سے بیعت لی، یہ وہی بیعت ہے جو تاریخ اسلام میں "بیعتِ رضوان" کے نام سے مشہور ہے۔

قریش مکہ مسلمانوں کی ان تیاریوں سے خوفزدہ ہو کر کچھ نرم پڑ گئے اور سہیل بن عمرو کو سفیر بنا کر بھیجا۔ جو نہایت فصیح و بلیغ مقرر تھا اور لوگوں میں "خطیبِ قریش" کے نام سے مشہور تھا۔ بالآخر کوششیں بارآور ثابت ہوئیں اور فریقین میں چند شرائط پر مصالحت ہو گئی جن میں پہلی شرط یہ تھی کہ مسلمان اس سال واپس چلے جائیں، بہرکیف جب دونوں طرفین میں مصالحت کے لیے سلسلۂ جنبانی شروع ہوئی اور عروہ بن مسعود قریش کی طرف سے سفیر بن کر آیا، تو اثنائے گفتگو میں اُس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا "محمدؐ فرض کرو کہ تم نے قریش کا استیصال کر دیا، تو کیا اس کی اور بھی کوئی مثال ہے کہ کسی نے اپنی قوم کو خود برباد کر دیا ہو، اس کے سوا اگر لڑائی کا رُخ بدلا، تو تیرے ساتھ جو یہ بھیڑ ہے۔ گرد کی طرح اُڑ جائے گی۔"

اس جملہ پر حضرت ابوبکرؓ جیسے حلیم الطبع بزرگ نے برہم ہو کر کہا "کیا ہم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔" عروہ نے پوچھا کہ یہ کون شخص ہیں؟ لوگوں نے بتایا "ابوبکرؓ"، اس نے مخاطب ہو کر کہا "اگر میں تمہارا زیرِ احسان نہ ہوتا، تو تمہیں نہایت سخت جواب دیتا۔"

بہرکیف حدیبیہ میں جو معاہدہ طے پایا وہ چونکہ بظاہر مسلمانوں کے خلاف تھا۔ اس لیے حضرت عمرؓ سخت مضطرب ہوئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا "کیا آپ پیغمبر برحق نہیں؟" فرمایا "ہاں ہوں" عرض کیا "کیا ہم حق پر اور ہمارا دشمن باطل پر نہیں" ارشاد ہوا۔ "ہاں" حضرت عمرؓ نے کہا "تو دین میں یہ ذلت کیوں گوارا کریں۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میں خدا کا پیغمبر ہوں، اور خدا کے حکم کی نافرمانی نہیں کر سکتا، خدا میری مدد کرے گا۔ حضرت عمرؓ یہ ارشادِ نبوت سننے کے بعد حضرت ابوبکرؓ کے پاس آئے اور وہی باتیں دہرائیں۔ حضرت ابوبکرؓ محرم اسرارِ نبوت تھے۔ فرمایا: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے رسولؐ ہیں، خدا کے حکم کی نافرمانی نہیں کر سکتے اور خدا ان کی مدد کرے گا۔ تم ان کی اتباع کرو، خدا کی قسم! وہ حق پر ہیں۔"[2]

سریہ بنو کلاب

معاہدہ حدیبیہ کے باعث قریش مکہ کی طرف سے یک گونہ اطمینان ہوا، تو محرم ۷ھ میں خیبر پر فوج کشی کی گئی۔ اس غزوہ میں حضرت ابوبکرؓ آنحضرت صلعم کے ہمرکاب تھے، پھر اسی سال ماہ شعبان میں حضرت ابوبکرؓ بنی کلاب کی سرکوبی کے لیے مامور ہوئے۔ حضرت سلمہ بن الاکوعؓ بھی آپ کے ساتھ تھے۔ اس معرکہ میں دشمن کے کچھ لوگ قتل ہوئے اور کچھ گرفتار کر لیے گئے غرض اس مہم کو کامیابی سے سر کرنے کے بعد حضرت ابوبکرؓ واپس مدینہ پہنچے۔

---

[1] سیر الصحابہؓ، جلد اوّل، جزء المہاجرین [2] سیرۃ النبی جلد اوّل

فتح مکہ

قریش مکہ دو سال تک تو معاہدہ حدیبیہ کے پابند رہے مگر بعد میں مسلمانوں کے حلیف قبیلہ خزاعہ کے خلاف بنو بکر کی حمایت کرکے معاہدے کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوئے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش مکہ کی اس عہد شکنی کے باعث ۱۰ رمضان ۸ھ کو دس ہزار صحابہؓ کے ساتھ مکہ کا عزم فرمایا اور فاتحانہ جاہ و جلال کے ساتھ مکہ میں داخل ہوئے، حضرت ابوبکرؓ بھی حضورؐ کے ہمراہ تھے۔ مکہ پہنچ کر حضرت ابوبکرؓ نے اپنے والد ابوقحافہ عثمانؓ بن عامر کو دربارِ رسالت مآب میں پیش کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بکمالِ شفقت اُن کے سینہ پر ہاتھ پھیر کر انہیں نورِ ایمان سے مشرف فرمایا۔

غزوۂ حنین و طائف

فتح مکہ کے بعد مسلمانوں کو بنو ہوازن سے برسرِ پیکار ہونا پڑا، بنو ہوازن نہایت شجاع اور ماہر تیر انداز تھے اور مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کے متعلق حاسدانہ جذبات رکھتے تھے، چنانچہ وادیٔ حُنین میں جب دونوں لشکروں کی مڈبھیڑ ہوئی تو بنو ہوازن کی ایک جنگی چال کی وجہ سے اوّل اوّل نہ صرف مسلمانوں کو پیچھے ہٹنا پڑا بلکہ دشمن کے اچانک حملہ سے لشکرِ اسلام میں ایسی افراتفری پھیلی کہ شکست کا خدشہ پیدا ہو گیا تھا، لیکن ایسی حالت میں بھی جو صحابہؓ آنحضرت صلعم کے ساتھ ثابت قدم رہے اُن میں حضرت صدیق اکبرؓ بھی شامل تھے، اس معرکہ میں کامیابی کے بعد لشکرِ اسلام نے آگے بڑھ کر طائف کا محاصرہ کیا، جہاں کفار کی شکست خوردہ فوج قلعہ بند ہو گئی تھی، حضرت ابوبکر صدیقؓ کے فرزند حضرت عبداللہؓ اسی محاصرہ کے دوران میں عبداللہ بن محجن ثقفی کے تیر سے زخمی ہوئے اور آخر کار یہی زخم حضرت صدیق اکبرؓ کی خلافت کے ابتدائی ایام میں ان کی شہادت کا باعث بنا۔

غزوۂ تبوک اور انفاق فی سبیل اللہ

رجب ۹ھ میں یہ افواہ پھیلی کہ قیصرِ رُوم عرب پر حملہ آور ہونا چاہتا تھا اور اس غرض کے لیے اُس نے ایک لشکرِ جرار فراہم کیا ہے، مسلمانوں کے لیے مسلسل جنگوں کے باعث یہ چونکہ نہایت عسرت اور تنگ حالی کا زمانہ تھا۔ اس لیے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگی تیاریوں کے لیے صحابۂ کرامؓ کو انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب دی، تمام صحابہؓ نے اپنی اپنی حیثیت کے مطابق اس میں حصّہ لیا۔ حضرت عثمانؓ چونکہ دولت مند تھے۔ اس لیے کافی کچھ دیا، حضرت عمرؓ نے اپنا آدھا اثاثہ پیش کیا، لیکن اس موقع پر بھی حضرت صدیق اکبرؓ نے امتیازی حیثیت حاصل کی یعنی جو کچھ گھر میں تھا سب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ڈال دیا۔ حضور سرورِ دو عالم صلعم نے فرمایا: "تم نے اہل و عیال کے لیے کچھ چھوڑا ہے؟" جاں نثارِ رسولؐ نے عرض کیا: "صرف اللہ اور اس کے رسول کی محبت"۔ غرض اس مجموعی سرمایہ سے ایک عظیم الشّان فوج تیار ہوئی، جو حدودِ شام کی طرف بڑھی لیکن تبوک پہنچ کر معلوم ہُوا کہ رُومی حملہ کی خبر غلط تھی، چنانچہ لشکرِ اسلام واپس آگیا

امارتِ حج

اسی سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کو امیر حج مقرر فرما کر تین سو صحابہؓ کے ساتھ روانہ فرمایا اور ہدایت کی کہ منیٰ کے عظیم الشان اجتماع میں اعلان کر دیں کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہ کرے اور نہ کوئی شخص برہنہ ہو کر خانہ کعبہ کا طواف کرے، اہلِ سیر کے مطابق اسلام میں امیر الحج کا یہ پہلا عہدہ تھا، جس پر حضرت ابوبکرؓ مامور ہوئے، قرآنِ حکیم نے اس کو حجِ اکبر کہا ہے، اس لیے یہ پہلا موقع تھا کہ رسمِ حج سنّتِ ابراہیمی کے مطابق ادا ہوئی، اس حج کا مقصد یہ تھا کہ خانۂ خلیلؑ میں عہدِ جاہلیت کے اختتام اور حکومتِ اسلام کی ابتدا کا اعلان کیا جائے، مناسک و رسُومِ حج کی عام تعلیم دی جائے، زمانۂ جاہلیت کے رسوم و عادات کا ابطال کیا جائے[1]

---

[1] سیرۃ النبیؐ جلد اوّل

سورہ برأت چونکہ اسی زمانہ میں نازل ہوئی تھی اور حضرت علیؓ حج کے موقع پر نقض عہد سے متعلق چالیس آیات سنانے کے لیے بھیجے گئے تھے۔ اس لیے بعضوں کو یہ شک پیدا ہوگیا کہ امارتِ حج کی خدمت حضرت ابوبکرؓ سے لے کر حضرت علیؓ ہی کو تفویض کی گئی تھی، لیکن یہ شدید غلطی ہے۔ مورخین اسلام کے مطابق ہر دو مختلف خدمتیں تھیں، ایک قافلہ سالار کی تھی اور دوسری نقیبِ اسلام کی حضرت علیؓ کے ذمہ دوسری خدمت تھی، چنانچہ حضرت علیؓ کی ایک روایت سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ اس شرف کے تنہا مالک تھے۔

صحابہؓ کی امامت ایک عظیم شرف

امامت نہایت مشکل کام ہے اور صحابہؓ کی امامت اور بھی مشکل تھی، لیکن حضرت ابوبکرؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زندگی میں دو مرتبہ یہ عظیم الشان شرف حاصل ہوا۔

ایک بار بنو عمرو بن عوف میں کچھ جھگڑا ہوا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے، نماز کا وقت آیا تو حضرت بلالؓ، حضرت ابوبکرؓ کے پاس آئے اور کہا کہ آپ نماز پڑھائیں گے؟ فرمایا "ہاں"، چنانچہ حضرت صدیق اکبرؓ کی امامت میں نماز شروع ہوئی تو آنحضرت صلعم تشریف لے آئے اور صف میں کھڑے ہو گئے، حضرت ابوبکرؓ کو جب کسی طرح اس بات کا علم ہوا تو آپؓ نے مڑ کر دیکھا لیکن آنحضرت صلعم نے اپنی جگہ قائم رہنے کا اشارہ فرمایا، حضرت ابوبکرؓ پھر بھی پیچھے ہٹ آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آگے بڑھ کر نماز پڑھائی، ادائے نماز کے بعد حضورؐ نے حضرت ابوبکرؓ سے پوچھا کہ تم اپنی جگہ کیوں قائم نہ رہے؟ میں نے تو اجازت دے دی تھی، حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا:

"ابوقحافہؓ کے بیٹے کی کیا مجال کہ آپؐ کے آگے کھڑا ہو جائے۔"

دوسری مرتبہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو حضرت صدیق اکبرؓ کو یہ خدمت انجام دینا پڑی۔ ان ایام میں جب حضورؐ تشریف لاتے رہے، خود امامت فرماتے رہے لیکن جب مرض میں اضافہ ہوا اور نقاہت کے باعث اٹھنا مشکل ہوگیا، تو حضرت بلالؓ سے فرمایا کہ ابوبکرؓ نماز پڑھائیں، اس طرح حضرت ابوبکرؓ نے ۹ ربیع الاول کی نمازِ عشاء سے لے کر ۱۲ ربیع الاول کی نمازِ فجر تک سترہ نمازوں کی امامت فرمائی۔ رحلت سے ایک دو روز قبل جب مرض میں ذرا تخفیف ہوئی تو آنحضرت صلعم حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ کا سہارا لے کر مسجد میں تشریف لائے۔ ظہر کا وقت تھا اور خود حضرت ابوبکرؓ کے برابر بیٹھ کر نماز میں داخل ہو گئے۔ حضورؐ نماز پڑھاتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ آپؐ کی اقتدا کرتے اور دیگر صحابہؓ حضرت ابوبکرؓ کی اقتدا کرتے تھے۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا جو آپؐ کی حیاتِ طیبہ کا آخری خطبہ تھا۔ ارشاد فرمایا:

"سب سے زیادہ میں جس کی دولت اور صحبت کا ممنون ہوں وہ ابوبکرؓ ہیں، اگر میں دنیا میں کسی کو اپنی امت میں سے اپنا دوست بنا سکتا تو ابوبکرؓ کو بناتا، لیکن اسلام کا رشتہ دوستی کے لیے کافی ہے۔ مسجد کے رخ کوئی دریچہ ابوبکر کے دریچہ کے سوا باقی نہ رکھا جائے۔"[۱]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشادِ گرامی حضرت ابوبکرؓ کے مالی ایثار، جاں نثاری اور مسلسل رفاقت کے اعتراف اور

---

[۱] سیرۃ النبیؐ، جلد اول

حضور سرورِ دو عالم صلعم کے قلبِ رؤف و رحیم میں ان کی قدر و منزلت کے لیے قطعی حجت کی حیثیت رکھتا ہے۔

پیکرِ صبر و استقلال

دو شنبہ ۱۲ ربیع الاول سنہ ۱۱ھ بوقتِ چاشت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انتقال فرمایا۔ آپؐ کی وفات ایک قیامتِ کبریٰ تھی جس کا صحابہؓ کو یقین نہیں آتا تھا۔ یہاں تک کہ حضرت عمرؓ جیسے جلیل القدر صحابہؓ بھی لوگوں کے ہمنوا تھے اور قسم کھا کھا کر آنحضرت صلعم کے وصال فرمانے سے انکار کر رہے تھے، حضرت ابوبکرؓ وصال کے وقت موجود نہ تھے اس روز چونکہ حضور سرورِ دو عالم کے مرض میں افاقہ معلوم ہوتا تھا، اس لیے نمازِ فجر کے بعد حضرت ابوبکرؓ اجازت لے کر مقام سخ تشریف لے گئے تھے، چنانچہ رحلت کی خبر ملنے پر تشریف لائے۔ کسی سے بات کیے بغیر سیدھے حضرت عائشہؓ کے حجرہ میں پہنچے اور حضورؐ کی نعش مبارک پر پڑی ہوئی چادر کو چہرۂ انور سے ہٹایا، جھکے اور بوسہ لیا، پھر رو کر فرمایا:

"میرے باپ ماں آپؐ پر قربان، آپؐ موت و زندگی میں پاک تھے، اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، خدا آپؐ کو دوبارہ موت نہ دے گا، جو موت آپؐ کے لیے لکھی ہوئی تھی وہ آچکی ہے"[۱]

پھر مسجد میں تشریف لائے، حضرت عمرؓ جوشِ وارفتگی میں اب تک قسم کھا کر آنحضرت صلعم کی رحلت سے انکار فرما رہے تھے اور تلوار ہاتھ میں لیے کہہ رہے تھے کہ جو یہ کہے گا کہ آنحضرت صلعم نے وفات پائی اس کا سر اُڑا دوں گا[۲] حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کو مخاطب کر کے فرمایا: "او قسم کھانے والے بیٹھ جا"[۳] حضرت عمرؓ نے انکار کیا تو آگے بڑھے، لوگ حضرت عمرؓ کو چھوڑ کر ان کے گرد جمع ہو گئے۔ آپ نے تقریر شروع کی، لوگ ہمہ تن گوش ہو گئے اور اب حضرت عمرؓ بھی بیٹھ گئے، آپ نے خدا کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا:

"ہاں! جو شخص محمدؐ کی عبادت کرتا تھا (وہ سن لے کہ) محمدؐ وفات پا گئے، اور جو خدا کی عبادت کرتا تھا اس کو معلوم ہونا چاہیے کہ خدا زندہ ہے اور کبھی نہ مرے گا، خدائے برتر فرماتا ہے۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ اَفَا۟ىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ۭ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰي عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَـيْـــًٔا ۭ وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ؀

محمدؐ صرف ایک رسولؐ ہیں اُن سے پہلے بھی بہت سے رسول گزر چکے، اگر وہ وفات پا جائیں یا قتل کر دیے جائیں تو کیا تم اُلٹے پاؤں واپس جاؤ گے؟ اور جو واپس جائے گا، خدا کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتا، اور خدا شکر گزار بندوں کو عنقریب جزا دے گا۔

سورہ آل عمران آیت ۱۴۴

حضرت ابوبکرؓ کی اس تقریر پر لوگ چیخ اُٹھے اور سب کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا یقین ہو گیا، اب ہر شخص کی زبان پر یہی آیت جاری تھی، حضرت عبداللہؓ فرماتے ہیں کہ خدا کی قسم ہم لوگوں کو ایسا معلوم ہوا کہ گویا یہ آیت پہلے نازل ہی نہیں ہوئی تھی[۴] خود حضرت عمرؓ کا یہ حال ہوا کہ جب حضرت ابوبکرؓ نے آیت پڑھی تو فرطِ غم سے زمین پر گر پڑے۔

سقیفہ بنو ساعدہ اور بیعتِ خلافت

مدینہ میں منافقین کی جماعت، جن کا شعار دوستی کے پردہ میں اسلام کا شیرازہ بکھیرنا

---

[۱] سیر الصحابہؓ جلد اوّل جزء المہاجرین [۲] سیرۃ النبی جلد دوم [۳] سیر الصحابہؓ جلد اوّل جزء المہاجرین [۴] سیر الصحابہؓ جلد اوّل خلفائے راشدین

تھا، ہمیشہ سے موجود تھی اور سلام دشمنی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتی تھی، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کی خبر مشہور ہوتے ہی منافقین کی سازش سے خلافت کا فتنہ کھڑا ہو گیا اور انصار نے سقیفہ بنو ساعدہ میں جمع ہو کر جانشینی کا دعویٰ کیا۔ یہ مسئلہ ایسے نازک وقت چھڑا تھا کہ اگر بر وقت تدارک نہ کیا جاتا، تو اسلام کا شیرازہ بکھر جاتا، لیکن حضرت ابوبکرؓ کو بر وقت اس کی اطلاع ہو گئی اور آپ فوراً حضرت عمرؓ اور حضرت ابو عبیدہؓ کو لے کر وہاں پہنچے، دوران گفتگو میں انصار نے مطالبہ کیا کہ ایک امیر ہمارا ہو اور ایک تمہارا، ظاہر ہے کہ اس دو عملی کا نتیجہ کیا ہوتا؟ اس صورت کو قبول کرنا اسلامی نظام کو خود اپنے ہاتھوں درہم برہم کرنے کے مترادف تھا۔ البتہ یہ ممکن تھا کہ مسندِ خلافت مستقل طور پر انصار کے حوالے کر دی جاتی، لیکن اس میں وقت یہ تھی کہ اولاً خود قریش، دوسرے عرب قبائل، قریش کے علاوہ اور کسی خاندان کے سامنے سر نہیں جھکا سکتے تھے۔ مزید برآں انصار میں بھی دو گروہ تھے، اوس اور خزرج، ان میں باہم اتفاق نہ تھا، غرض ان مشکلات کے پیش نظر حضرت ابوبکرؓ نے یہ تجویز پیش کی کہ امراء ہماری جماعت سے ہوں اور وزراء تمہاری جماعت سے، اس پر حضرت خباب بن المنذرؓ انصاری بول اٹھے "نہیں، خدا کی قسم نہیں، ایک امیر ہمارا ہو اور ایک تمہارا" حضرت ابوبکرؓ نے جب یہ جوش و خروش دیکھا تو نہایت نرمی اور آشتی سے انصار کو سمجھایا اور برمحل تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

"مجھے تم لوگوں کے فضائل و مناقب اور تمہاری خدماتِ اسلامی سے انکار نہیں، لیکن عرب، قریش کے علاوہ کسی اور کی سیادت تسلیم نہیں کر سکتے، پھر مہاجرین اپنے تقدم فی الاسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاندانی تعلق کی بنا پر آپ کی جانشینی کے زیادہ مستحق ہیں، یہ ابو عبیدہؓ اور عمر بن الخطابؓ موجود ہیں، ان میں سے جس کے ہاتھ پر چاہو بیعت کر لو[1]۔"

لیکن حضرت عمرؓ نے پیش دستی کر کے خود حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا اور کہا:

"نہیں! بلکہ ہم آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں، کیونکہ آپؓ ہمارے سردار اور ہم لوگوں میں سب سے بہتر ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپؓ کو سب سے زیادہ عزیز رکھتے تھے[2]۔"

چونکہ اس مجمع میں حضرت ابوبکرؓ سے زیادہ کوئی بااثر بزرگ اور معمر نہ تھا، اس لیے سب نے اس انتخاب کو بہ نظر استحسان دیکھا اور بیعت کے لیے ٹوٹ پڑے، اس طرح یہ اٹھتا ہوا طوفان دفعتہً رک گیا اور مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز و تکفین میں مشغول ہوئے۔

اس کے دوسرے دن مسجد نبوی میں عام بیعت ہوئی اور حضرت ابوبکرؓ نے منبر پر بیٹھ کر اپنی خلافت کا آغاز ان الفاظ سے کیا:

صاحبو! میں تم پر حاکم بنایا گیا ہوں، حالانکہ میں تمہاری جماعت میں سب سے بہتر نہیں ہوں، اگر میں اچھا کام کروں، تو میری اطاعت کرو اور اگر کجروی اختیار کروں تو مجھے سیدھا کر دو، سچائی امانت ہے اور جھوٹ خیانت، انشاء اللہ تمہارا ضعیف فرد بھی میرے نزدیک قوی ہے یہاں تک کہ میں دوسروں سے اس کا حق اس کو نہ دلا دوں،

---

[1] سیر الصحابہؓ جلد اول خلفائے راشدین [2] ایضاً

اور تمہارا قوی شخص بھی میرے نزدیک ضعیف ہے، یہاں تک کہ میں اس سے دوسروں کا حق حاصل نہ کر لوں، یاد رکھو جو قوم جہاد فی سبیل اللہ چھوڑ دیتی ہے، خدا اس کو ذلیل و خوار کر دیتا ہے اور جس قوم میں بدکاری پھیل جاتی ہے خدا اس کو عام مصیبت میں مبتلا کر دیتا ہے اگر میں خدا اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کروں، تو میری اطاعت کرو، اور اگر نافرمانی کروں تو تم پر میری اطاعت لازم نہیں۔‘‘ ؎۱

حضرت علیؓ کی بیعت میں تاخیر کا سبب

بیعتِ عام کے بعد حضرت علیؓ اور بعض دوسرے صحابہؓ نے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت میں کچھ دنوں تک تاخیر کی۔ اس توقف نے اگرچہ مسلمانوں میں عجیب و غریب مباحث پیدا کر دیے ہیں تاہم اگر اس تاخیر کی وضاحت میں حضرت علیؓ کا کوئی اپنا بیان موجود ہو تو ہمیں ایسے مباحث سے گریز کرنا چاہیے جو محض قیاسات پر مبنی ہوں اور ایک بالکل صاف اور سیدھی بات کو پیچیدہ بنا دیں۔ مؤرخین کے مطابق حضرت علیؓ نے خود حضرت ابوبکرؓ کے استفسار پر اس توقف کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا:

’’میں آپ کی امارت کو ناپسند نہیں کرتا، لیکن میں نے قسم کھائی ہے کہ جب تک قرآن جمع نہ کر لوں گا، اس وقت تک نماز کے سوا اپنی چادر تک نہ اوڑھوں گا۔‘‘ ؎۲ بہرکیف حضرت فاطمۃ الزہراؓ کی وفات ؎۳ کے بعد آپ نے بھی بیعت کر لی اور حضرت ابوبکرؓ کے فضائل کا اعتراف کرتے ہوئے فرمایا کہ:

آپ کو خدا نے جو رُتبہ دیا ہے اس پر ہم کو حسد نہیں، لیکن اتنا ضرور ہے کہ ہم اس کو اپنی حق تلفی سمجھتے ہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرابت کی وجہ سے ہم اسے اپنا حق سمجھتے تھے۔‘‘

حضرت علیؓ نے یہ بات کچھ اس انداز سے فرمائی کہ حضرت ابوبکرؓ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، آپ نے فرمایا:

’’اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ داروں کو اپنے رشتہ داروں سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں۔

غرض اس صاف دلی کی گفتگو کے بعد دونوں بزرگوں کا آئینہ دل صاف ہو گیا اور بعد نماز ظہر حضرت ابوبکرؓ نے مجمع عام میں حضرت علیؓ کی طرف سے عذر خواہی کی اور حضرت علیؓ نے سب کے سامنے نہایت شاندار الفاظ میں حضرت ابوبکرؓ کے فضائل کا اعتراف کیا۔

قضیۂ فدک

اکثر مؤرخین نے بیعت کی تاخیر کی ایک وجہ یہ بھی بیان کی ہے کہ باغ فدک اور مسئلہ وراثت کے جھگڑوں نے خلیفۂ اول کی طرف سے حضرت فاطمۃ الزہراؓ کے دل میں کسی قدر ملال پیدا کر دیا تھا

؎۱ طبقات ابن سعد حصہ سوم ؎۲ سیر الصحابہؓ خلفائے راشدین ؎۳ حضرت فاطمۃ الزہراؓ نے آنحضرت صلعم کی وفات کے چھ ماہ بعد انتقال فرمایا، اس بنا پر حضرت علیؓ نے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت میں چھ ماہ کی تاخیر کی۔

اس لیے ممکن ہے کہ حضرت علی رضؓ نے حضرت فاطمہ رضؓ کے پاس خاطر سے بیعت میں تاخیر کی ہو۔ اس واقعہ کی تفصیل میں اہل سِیَر نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت فاطمہ رضؓ اور عباس رضؓ عم رسولؐ اللہ، حضرت ابوبکر رضؓ کے پاس آئے اور حضورؐ کی اُس میراث کا مطالبہ کیا، جو ارضِ فدک اور خیبر کی جائیدادوں میں حضورؐ کے حصّہ پر مشتمل تھی، حضرت ابوبکر رضؓ نے فرمایا :-

"مَیں نے رسولؐ اللہ صلعم سے سُنا ہے، آپؐ فرماتے تھے کہ ہمارے مال میں وراثت جاری نہیں ہوگی، ہم جو کچھ چھوڑیں صدقہ ہوگا، البتہ آلِ محمدؐ اس سے نفقہ لے سکتے ہیں۔ خدا کی قسم! رسولؐ اللہ کی قرابت سلوک کرنے کے معاملہ میں مجھ کو اپنی قرابت سے زیادہ محبوب ہے۔"

مزید فرمایا :

"مَیں، خدا کی قسم، رسولُ اللہ صلعم کے صدقہ میں بالکل تغیر نہ کروں گا، جو حالت اُس کی عہدِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں تھی، وہی رہے گی اور مَیں وہی کروں گا جو رسولُ اللہ صلعم کرتے تھے۔"

حضرت ابوبکر رضؓ کا یہ جواب سُن کر حضرت فاطمہ رضؓ ناراض ہو کر اپنے گھر تشریف لے آئیں، حضرت ابوبکر رضؓ کو چھوڑ دیا اور وفات تک یہی حالت قائم رہی۔[1]

اُسامہ بن زیدؓ والی مہم

حضرت ابوبکر رضؓ کی خلافت کا آغاز اگرچہ بڑی مشکلات اور بڑے اہم حوادث سے ہُوا، تاہم آپ نے اپنے تدبّر، عاقبت اندیشی اور مذہبی بصیرت سے ان سب پر قابو حاصل کر لیا، ان میں سب سے اہم انقلاب عرب کا ارتداد تھا۔ بہت سے قبائل نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ اقدس میں اسلام قبول کر لیا تھا، لیکن یہ ابھی ان کے دلوں میں راسخ نہ ہُوا تھا، اس لیے حضورؐ کی وفات کے بعد وہ ارتداد کی رَو میں بہہ گئے۔ دوسری طرف جھوٹے مدعیانِ نبوت اُٹھ کھڑے ہُوئے تھے۔ مزید برآں منکرینِ زکوٰۃ نے علیحدہ شورش بپا کر رکھی تھی۔ ان مشکلات میں حضرت اُسامہ بن زید رضؓ کی مہم بھی درپیش تھی۔ جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیاتِ اقدس میں ہی شام پر حملہ کرنے کا حکم دیا تھا، لیکن جیشِ اُسامہ رضؓ کی روانگی سے قبل ہی چونکہ آنحضرت صلعم مرض الموت میں مبتلا ہوگئے تھے اس لیے فوج کی روانگی میں تاخیر ہوگئی تھی، چنانچہ جب آپ نے اس مہم کو روانہ کرنے کا عزم فرمایا تو جلیل القدر صحابہ رضؓ نے رائے دی کہ اس کو فی الحال ملتوی کر کے پہلے مُرتدین و کذاب مدعیانِ نبوت کا قلع قمع کیا جائے لیکن خلیفۂ اوّل کو یہ گوارا نہ تھا کہ جو عَلَم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر مُدوم کے مقابلہ کے لیے بُلند کیا گیا ہو اس کا رُخ کسی دوسری جانب پھیر دیا جائے، چنانچہ صحابہ کرامؓ کے بار بار اصرار پر آپؓ نے برہم ہو کر فرمایا :

"اگر جنگل کے بھیڑیے مدینہ میں داخل ہو کر مجھے اٹھا لے جائیں، تب بھی مَیں وہ کام کرنے سے باز نہیں آؤں گا جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کرنے کا حکم دیا ہے۔"[2]

غرض خلیفۃ الرسولؐ نے خطرات و مشکلات کے باوجود حضرت اُسامہ رضؓ کو روانگی کا حکم دیا اور خود پیادہ پا مدینہ کے باہر تک اُسے رخصت

---

[1] سیر الصحابہ رضؓ جلد اوّل، جزو المہاجرین [2] ابوبکر صدیق اکبر رضؓ از محمد حسین ہیکل

کرنے کے لیے نکلے، حضرت اُسامہؓ گھوڑے پر سوار تھے اور آپ پیادہ پا گھوڑے کے ساتھ دوڑتے جاتے اور ہدایات دیتے جاتے تھے کہ :

"خیانت نہ کرنا، مال نہ چھپانا، بیوفائی سے بچنا، بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کو قتل نہ کرنا، ہرے بھرے اور پھل دار درختوں کو نہ کاٹنا، کھانے کے علاوہ جانوروں کو بے کار ذبح نہ کرنا۔"[1]

حضرت اُسامہؓ نے آپ کو گھوڑے کے ساتھ دوڑتے دیکھ کر تعظیماً عرض کی : "اے جانشینِ رسولؐ، خدا کی قسم آپ گھوڑے پر سوار ہولیں، ورنہ مَیں بھی اُتر تا ہوں۔" فرمایا :

"یہ دونوں باتیں نہیں ہو سکتیں، نہ تم اُتر سکتے ہو اور نہ میں سوار ہوں گا، مَیں اس وقت اس لیے پیدل چل رہا ہوں تاکہ اللہ کی راہ میں کچھ دیر تک پیدل چل کر اپنے قدم خاک آلود کر لوں۔"[2]

بہر کیف چالیس دن کے بعد جب حضرت اُسامہؓ کی فوج اپنا مقصد پُورا کر کے شام سے لَوٹی تو حضرت ابوبکرؓ نے صحابہؓ کرام کے ساتھ شہر سے باہر نکل کر اس کا نہایت پُرجوش استقبال کیا۔

مُدعیانِ نبوّت کا استیصال

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ اقدس ہی میں بعض مدّعیانِ نبوت پیدا ہو گئے تھے، مسیلمہ نے اگرچہ اسی زمانہ میں نبوت کا دعویٰ کیا تھا، مگر کذب و افترا کی یہ آواز صورِ صداقت کے سامنے نہ اُبھر سکی تھی، لیکن حضورؐ کی وفات کے بعد اور بہت سے طالع آزماؤں کے دماغ میں یہی سودا سما گیا تھا، چنانچہ اسود عنسی، طلیحہ بن خویلد وغیرہ کئی مدعیانِ نبوت پیدا ہو گئے، مردوں کے علاوہ عورتیں بھی اس خبط میں مبتلا ہو گئی تھیں، اس ضمن میں قبیلہ تمیم کی ایک عورت سجاح قابلِ ذکر ہے جس نے نبوت کا دعویٰ کرنے کے بعد اپنی قوت مضبوط کرنے کے لیے مسیلمہ سے شادی کر لی تھی۔

بہر حال موتہ کی مُہم کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے ان کذابوں کے استیصال کی طرف توجہ دی اور صحابہ کرامؓ سے مشورہ کیا کہ اس کام کے لیے کون شخص زیادہ موزوں ہوگا، سب کی مُشترکہ رائے حضرت علیؓ کے متعلق تھی، لیکن چونکہ وہ اس وقت تک تمام تعلقات دنیوی سے کنارہ کش تھے۔ اس لیے اُن کے بعد قرعہ فال حضرت خالد بن ولیدؓ کے نام نکلا، چنانچہ وہ ۱۱ھ میں حضرت ثابت بن قیسؓ انصاری کے ساتھ مہاجرین و انصار کی ایک جمعیت لے کر ان جھوٹے نبیوں کی سرکوبی کے لیے نکلے۔

حضرت خالد بن ولیدؓ سب سے پہلے طلیحہ بن خویلد کی طرف بڑھے۔ اس کے پیروکاروں کو قتل و گرفتار کر کے عیینہ بن حصن سمیت تیس قیدیوں کو مدینہ روانہ کیا، طلیحہ شام بھاگ گیا، پھر تجدید اسلام کر کے مسلمان ہو گیا، مسیلمہ کی بیخ کنی کے لیے حضرت شرجیل بن حسنہؓ مامور ہوئے ان کے ساتھ حضرت عکرمہؓ بن ابوجہل بھی تھے۔ جنہوں نے حضرت شرجیلؓ سے پہلے پہنچ کر مسیلمہ کے پیرو بنی حنیفہ پر حملہ کر دیا مگر ہزیمت اُٹھائی اس پر حضرت ابوبکرؓ نے حضرت خالد بن ولیدؓ کو حضرت شرجیلؓ کی مدد کے لیے بھیجا، مسیلمہ کذاب نے اپنے چالیس ہزار متبعین کو لے کر نہایت شدید جنگ کی لیکن مسلمانوں نے اُسے شکست فاش دی اور مسیلمہ خود حضرت وحشی بن حربؓ کے ہاتھوں مقتول ہوا۔[3] اس کی بیوی سجاح

---

[1] تاریخ طبری حصہ دوم [2] ایضاً۔ [3] مؤرخین کے مطابق مسیلمہ کے قتل میں دو شخص شریک تھے، ایک حضرت وحشیؓ اور دوسرے حضرت حبیبؓ بن زید، خود حضرت وحشیؓ کا بیان ہے کہ مَیں نے مسیلمہ پر حربہ پھینکا اور ایک انصاری نے نہایت تیزی سے تلوار کا وار کیا، خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کس کے وار سے مسیلمہ کا خاتمہ ہُوا۔

جو خود مدعیہ نبوت تھی، شوہر کے قتل کے بعد بصرہ بھاگ گئی اور کچھ دنوں بعد مر گئی، اس جنگ میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد شہید ہوئی جس میں تقریباً ستر حفاظ قرآن بھی تھے! تیسرے مدعی نبوت اسود عنسی کی جماعت میں خود اختلاف پیدا ہو گیا اور وہ اپنے ہی ساتھیوں قیس بن مکشوح اور فیروز دیلمی کے ہاتھوں نشہ کی حالت میں مارا گیا، غرض چند دنوں کے اندر ان جھوٹے نبیوں کا خاتمہ ہو گیا۔[1]

مرتدین کا استیصال

مدعیان نبوت کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے ان عرب سرداروں کی طرف توجہ فرمائی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مرتد ہو کر اپنے اپنے حلقے کے بادشاہ بن بیٹھے تھے۔ ان میں نعمان بن منذر نے بحرین میں لقیط بن مالک نے عمان میں اور متعدد سرداران قبائل نے کندہ کے علاقہ میں مرتد ہو کر خود سری کا اعلان کیا، چنانچہ خلیفہ رسولؐ نے حضرت علاء بن حضرمیؓ، حضرت حذیفہ بن محصنؓ اور حضرت زیاد بن لبیدؓ کو بالترتیب ان مرتد سرداروں کے مقابلہ کے لیے بھیجا، حضرت علاءؓ نے نعمان کا قلع قمع کیا، حضرت حذیفہؓ نے لقیط کو قتل کیا اور حضرت زیادؓ نے ملوک کندہ کو زیر کر کے دوبارہ اسلام پر قائم کیا۔

منکرین زکوٰۃ کی تادیب

ان سب میں زیادہ اہم اور نازک مسئلہ منکرین زکوٰۃ کا تھا، چونکہ یہ گروہ اپنے آپ کو مسلمان کہتا اور صرف زکوٰۃ کی ادائیگی کا منکر تھا، اس لیے اس کے خلاف تلوار اٹھانے میں بعض کبار صحابہؓ نے اختلاف کیا، یہاں تک کہ حضرت عمرؓ جیسے متشدد صاحب رائے بزرگ بھی ان لوگوں کے خلاف تلوار اٹھانے کے حق میں نہیں تھے، لیکن خلیفۃ الرسولؐ کا ارادہ و استقلال صحابہ کرامؓ کے اختلاف کے باوجود غیر متزلزل رہا، چنانچہ آپ نے صاف کہہ دیا۔

"خدا کی قسم! جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بکری کا ایک بچہ بھی زکوٰۃ میں دیتا تھا، اگر وہ اس کے دینے سے انکار کرے گا، تو میں اس کے مقابلہ میں جہاد کروں گا۔"[2]

حضرت ابوبکرؓ کا اصرار یہ تھا کہ اگر آج انہیں زکوٰۃ نہ دینے پر معاف کر دیا جائے گا، تو کل یہ لوگ صوم و صلوٰۃ سے بھی منکر ہو جائیں گے اور اس طرح اسلام ایک تماشہ بن جائے گا، آخر آپ کی اصابت رائے کا حضرت عمرؓ کو بھی اعتراف کرنا پڑا، چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے نہایت مستعدی کے ساتھ منکرین زکوٰۃ قبائل کے مقابلہ میں فوجیں بھیجیں اور اس معاملہ میں یہاں تک سختی کی کہ بنی عبس اور بنی ذبیان کے مقابلہ میں خود تشریف لے گئے، اس تشدد کا نتیجہ یہ نکلا کہ چند دنوں کے اندر تمام منکرین نے زکوٰۃ ادا کر دی، اس طرح حضرت ابوبکرؓ کی مذہبی بصیرت، اصابت رائے اور استقلال و استقامت سے وہ تمام فتنے دب گئے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد دفعۃً بپا ہو گئے تھے۔

تدوین قرآن

مدعیان نبوت اور مرتدین اسلام کے مقابلہ میں بہت سے حفاظ قرآن شہید ہو گئے تھے، خصوصاً مسیلمہ کذاب کے خلاف خونریز جنگ میں اس قدر صحابہؓ کام آئے کہ حضرت عمرؓ کو خدشہ محسوس ہونے لگا کہ اگر صحابہؓ کی شہادت کا یہی سلسلہ رہا تو کلام الٰہی کا بہت سا حصہ ضائع ہو جائے گا، چنانچہ اس خدشہ کے پیش نظر انہوں نے خلیفہ اول حضرت صدیق اکبرؓ کو جمع قرآن کی تحریک کی، اہل سیر کے مطابق پہلے تو آپ نے عذر کیا مگر جب اس کام کی اہمیت واضح ہو گئی تو آپ نے حضرت زیدؓ بن ثابت کو جو عہد نبوتؐ میں کاتب وحی تھے، قرآن حکیم جمع کرنے کا حکم دیا، اس طرح قرآن حکیم نہایت کوشش و احتیاط کے ساتھ ایک کتاب کی شکل میں مدون

---

[1] تاریخ اسلام حصہ اول [2] سیر الصحابہؓ جلد اول خلفائے راشدین

ہو گیا اور ابدالآباد تک تحریف سے بچ گیا، نیز اُمم سابقہ کے آسمانی صحائف کا جو حشر ہُوا تھا، اسلام میں اس کا اعادہ نہ ہو سکا۔

اس ضمن میں ایک عام غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے وہ یہ کہ عہدِ صدیقی رضؓ میں قرآن حکیم کو باہم مُرتب کرنا نہ تھا، کیونکہ سورتوں کے نام اور آیتوں و سُورتوں کی باہمی ترتیب کا کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زندگی میں ہی وحی و الہام کے ذریعہ مکمل ہو چکا تھا۔ خود حضرت زیدؓ بن ثابت نے قرآن حکیم جمع کرنے کی جو صورت بتائی ہے وہ یہ تھی :-

"میں نے قرآن کو چمڑہ کے ورقوں، شانہ کی چوڑی ہڈیوں اور کھجور کی پتیوں اور لوگوں کے سینوں سے ڈھونڈھ ڈھونڈ کر جمع کرنا شروع کیا" [1]

اس تشریح سے صاف ظاہر ہو گیا کہ حضرت ابوبکرؓ کے حکم سے حضرت زیدؓ نے صرف قرآن حکیم کے متفرق اجزا کو جمع کر کے ایک کتاب کی صورت میں مدوّن کر دیا تھا۔

یہ نسخہ کب تک محفوظ رہا

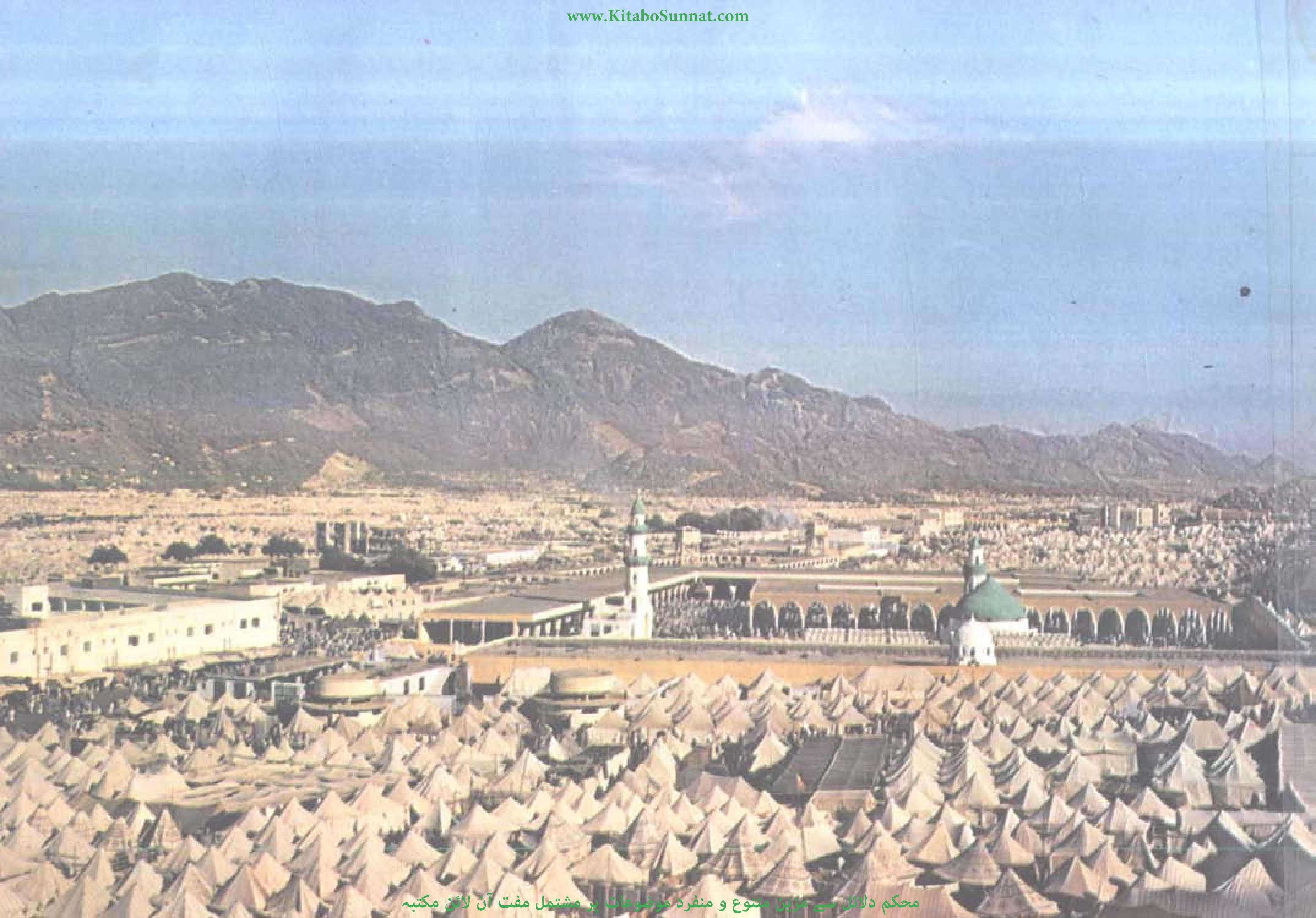
حضرت زید بن ثابتؓ کا مدوّن کیا ہُوا نسخہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس محفوظ رہا، اُن کے بعد حضرت عمرؓ کے قبضہ میں آیا۔ حضرت عمرؓ نے حضرت حفصہؓ کے حوالے فرما دیا اور وصیت کی کہ کسی شخص کو نہ دیں، البتہ جس کو نقل کرنا یا اپنا نسخہ صحیح کرنا ہو وہ اس سے استفادہ کر سکتا ہے، حضرت عثمانؓ نے اپنے دَور میں حضرت حفصہؓ سے عاریۃً لے کر چند نسخے نقل کرائے اور دوسرے مقامات پر روانہ کر دیے، لیکن اصل نسخہ بدستور حضرت حفصہؓ کے پاس رہا۔ جسے مروان نے ام المومنین حضرت حفصہؓ کے انتقال کے بعد حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے لے کر ضائع کر دیا [2]

فتوحات — ایران و روم کی مخالف حکومتیں

اندرونی انقلابات فرو کرنے کے بعد حضرت صدیق اکبرؓ کو عرب کے ناگزیر سیاسی حالات کی بنا پر بیرونی دشمنوں کی طرف توجہ کرنا پڑی، اس زمانہ میں جزیرہ نمائے عرب دنیا کی دو عظیم الشان سلطنتوں میں گھرا ہُوا تھا۔ ایک طرف شام پر رُومی پھریرا لہرا رہا تھا اور دوسری طرف ایران پر ساسانی خاندان کا تسلط تھا، دونوں حکومتیں عربوں کی پرانی دشمن تھیں اور ہمیشہ ان کی آزادی چھیننے کے درپے رہتی تھیں خصوصًا ایرانیوں نے اس مقصد کے لیے بارہا بڑی بڑی فوجیں بھیجیں اور بعض اوقات انہوں نے عرب کے ایک وسیع خطہ پر قبضہ بھی کر لیا، یہاں تک کہ ساسانی سلسلہ کے دوسرے فرمانروا سابور بن اردشیر نے حجاز و یمن دونوں کو باجگذار بنا لیا تھا، اس طرح سابور ذوالاکتاف یمن و حجاز فتح کرتا ہُوا مدینہ منورہ تک پہنچ گیا تھا۔ یہ عربوں کا اتنا شدید دشمن تھا کہ جو عرب گرفتار ہو کر اس کے قبضہ میں جاتے تھے، وہ اُن کے شانے اُکھڑوا دیتا تھا، اسی لیے وہ عربوں میں ذوالاکتاف یعنی شانے والے کے لقب سے مشہور ہُوا، لیکن عرب چونکہ کسی بیرونی طاقت سے دبنے والے نہ تھے۔ اس لیے جونہی انہیں موقع ملتا، چھٹکارا حاصل کر لیتے اور اُن کا ملک دبا بیٹھتے تھے، چنانچہ قبیلہ معد بن عدنان نے عراق میں چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کر لی تھیں اور اس سلسلہ کے ایک فرمانروا عمر بن عدی نے حیرہ کو دارالسلطنت بنایا تھا۔ غرض عربوں اور ایرانیوں میں قدیم عداوت چلی آ رہی تھی اور ایرانی عربوں کو نہایت حقارت سے دیکھتے تھے۔ اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ مُحرّم سنہ ۶ھ میں

---

[1] سیر الصحابہؓ جلد اوّل جزو المہاجرین، [2] سیر الصحابہؓ جلد اوّل خلفائے راشدین



جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت اسلام کے سلسلہ میں خسرو پرویز، شہنشاہ ایران کو خط لکھا تو اس نے غضبناک ہو کر نامہ مبارک پھاڑ کر پھینک دیا اور کہا: "میرا غلام ہو کر مجھے یوں لکھتا ہے" [1] بہرکیف پہلے تحقیر کا یہ جذبہ تھا لیکن اس کے بعد جب اسلام نے سارے عرب کو ایک متحدہ طاقت بنا دیا، تو اس وقت کی ساسانی حکومت اسے خوف و خطر کی نگاہ سے دیکھنے لگی تھی۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ عربوں کی دوسری ہمسایہ حکومت رومیوں کی تھی، جس کا پایۂ تخت قسطنطنیہ تھا، عرب کے پڑوس شام میں ہرقل رومیوں کے ماتحت حکومت کرتا تھا اگرچہ یہ حکومت ایرانیوں کی طرح عربوں کو تحقیر کی نگاہ سے نہ دیکھتی تھی، تاہم دونوں قوموں میں قدیم سے رقابت چلی آتی تھی عرب کے بہت سے قبائل جو شام کے سرحدی اضلاع میں آباد ہو گئے تھے انہوں نے عیسائیت قبول کر کے بڑی بڑی ریاستیں قائم کر لی تھیں اور راسی مذہبی تعلق کی بنا پر ان کو رومیوں کے ساتھ نہ صرف ایک قسم کی یگانگت پیدا ہو گئی تھی بلکہ ظہورِ اسلام کے بعد مشرکین عرب کی طرح حدود شام کے عرب عیسائی بھی مسلمانوں کے سخت دشمن ہو گئے تھے، چنانچہ ۷ھ میں انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک سفیر حضرت دحیہ کلبیؓ کو جو قیصر روم کو دعوتِ اسلام کا پیغام دے کر واپس آ رہے تھے، لوٹ لیا تھا اور دوسرے اسلامی سفیر حضرت حارث بن عمیر ازدیؓ کو حاکم بصریٰ شرجیل بن عمرو الغسانی نے قتل کر دیا تھا، اسی کا انتقام لینے کے لیے آنحضرت صلعم نے حضرت زید بن حارثہؓ کی زیرِ قیادت ۸ھ میں تین ہزار مجاہدین پر مشتمل ایک لشکر روانہ فرمایا تھا جس میں بڑے بڑے صحابہؓ نے جامِ شہادت نوش کیا، پھر ۹ھ میں جب یہ معلوم ہوا کہ رومی مدینہ پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہے ہیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کی مدافعت کے لیے جب بنفسِ نفیس تبوک تک تشریف لے گئے تو رومیوں کے حوصلے پست ہو گئے اور عارضی طور پر جنگ کا خطرہ ٹل گیا، تاہم مسلمانوں کو شامی عربوں اور رومیوں کی طرف سے ہر وقت حملہ کا خطرہ رہتا تھا چنانچہ اس خطرہ کے انسداد اور شہدائے موتہ کا انتقام لینے کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مرض الموت میں حضرت اسامہ بن زیدؓ کو شام بھیجنے کا ارادہ فرما ہی رہے تھے کہ آپؐ کا وصال ہو گیا، چنانچہ انہی اسباب کی بنا پر خلیفۂ رسولؐ حضرت ابوبکرؓ نے اندرونی جھگڑوں سے فراغت پاتے ہی بیرونی دشمنوں کے مقابلہ کی تیاریاں شروع کر دیں۔

عراق کی مہم

اس زمانہ میں ایران کی حکومت روز بروز کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ خسرو پرویز کے بعد اس کا بیٹا شیرویہ اپنے تمام بھائیوں کو قتل کر کے تخت نشین ہوا، مگر خود آٹھ ماہ سے زیادہ حکومت نہ کر سکا۔ اس کے بعد شیرویہ کا صغیر السن بیٹا تخت پر بیٹھا، جسے ایک درباری افسر نے قتل کر کے اپنی حکومت کا اعلان کر دیا، چند دنوں بعد دوسرے درباریوں نے اسے قتل کر کے جوان شیر کو تخت نشین کیا، ایک سال بعد یہ بھی مر گیا۔ اب شاہی خاندان میں ایک کم عمر شہزادے یزدگرد کے علاوہ اور کوئی نہ تھا جسے تخت نشین کیا جاتا، چنانچہ شاہی خاندان کی ایک عورت پوران دخت کو اس شرط پر تختِ کیانی پر بٹھایا گیا کہ یزدگرد کے سنِ شعور کو پہنچنے کے بعد وہ بادشاہ بنایا جائے گا [2]

عراق کے وہ قبائل جو ہمیشہ سے ایرانیوں کے ظلم و ستم برداشت کرتے آ رہے تھے، ایسے ایک موقع سے فائدہ اٹھانے کے منتظر تھے، چنانچہ عراق کے عرب قبیلہ وائل کے دو سرداروں مثنیٰ بن حارثہ شیبانی اور سوید عجلی نے تھوڑی تھوڑی سی جمعیت بہم پہنچا کر حیرہ اور ابلہ پر تاخت شروع کر دی، تاہم ایرانی حکومت اس زوال کے باوجود اتنی قوی تھی کہ اسے زیر کرنا عرب سرداروں کے بس کی بات نہ تھی، اس لیے مثنیٰ نے دربارِ خلافت میں

---

[1] سیرۃ النبی، جلد اوّل، [2] تاریخ اسلام حصہ اوّل مؤلفہ شاہ معین الدین۔

حاضر ہو کر عراق پر فوج کشی کی اجازت حاصل کی، مثنیٰ خود تو اسلام لا چکے تھے، لیکن ان کا قبیلہ بدستور عیسائی تھا، چنانچہ مدینہ سے واپس آکر سب سے پہلے انہوں نے اپنے قبیلہ کو اسلام جیسی نعمتِ عظمیٰ سے بہرہ ور کیا اور پھر اسے لے کر عراق روانہ ہو گئے، اس وقت تک حضرت خالد بن ولیدؓ جھوٹے مدعیانِ نبوت اور مرتدین کی بیخ کنی سے فارغ ہو چکے تھے، تاہم وہ ابھی راستہ میں ہی تھے کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے انہیں ایک جمعیت کے ساتھ مثنیٰ کی امداد کے لیے عراق جانے کا حکم دیا، چنانچہ وہ فوجیں لے کر سیدھے عراق روانہ ہو گئے، حضرت خالدؓ نے وہاں پہنچتے ہی جنگ کی صورت بدل دی اور بانقیا، کسکر، الیس اور امغیشیا وغیرہ فتح کر کے آپ نے حیرہ کا محاصرہ کر لیا، اہلِ حیرہ نے ایک لاکھ نوّے ہزار درہم سالانہ پر صلح کر لی اس کے ساتھ ہی قرب و جوار کے باشندے بھی بیس ہزار درہم سالانہ پر مطیع ہو گئے، ادھر سے فارغ ہو کر آپ انبار پہنچے اور اس کی تسخیر کے بعد عین التمر کا معرکہ سر کیا، یہاں سے آپ نے حضرت عیاضؓ کی مدد کے لیے دومۃ الجندل کا رخ کیا اور اکیدر اور جودی کو قتل کر کے ان کے قلعوں پر قبضہ کر لیا، پھر فراض روانہ ہوئے اور اس معرکہ میں اہلِ فارس و روم کی متحدہ فوجوں کو شکست فاش دی، علامہ طبریؒ کی روایت کے مطابق اس لڑائی میں دشمن کے ایک لاکھ سپاہی کھیت رہے، فراض میں دس دن قیام کے بعد اسلامی لشکر کو حیرہ کی طرف واپسی کا حکم دے کر خود ۲۵ ذیقعدہ ۱۲ھ کو خفیہ طور پر حج کے لیے روانہ ہو گئے اور واپسی پر دوبارہ عراق کی مہم میں مصروف ہو گئے۔

شام پر فوج کشی

عراق کی مہم کی ابھی ابتداہی ہوئی تھی کہ دوسری طرف شام کی سرحد پر جنگ چھڑ گئی، حضرت ابو بکرؓ نے ۱۳ھ میں کبار صحابہؓ کے مشورہ سے شام پر فوج کشی کا فیصلہ کیا اور ہر ہر حصہ میں علٰحدہ علٰحدہ فوجیں روانہ کیں، دمشق کی مہم پر حضرت یزید بن ابی سفیانؓ مامور ہوئے۔ حمص پر حضرت ابو عبیدہؓ بن جراح، اردن پر حضرت شرحبیلؓ بن حسنہ اور فلسطین پر حضرت عمرو بن العاصؓ فوج کی مجموعی تعداد ستائیس ہزار تھی اور حضرت ابو عبیدہؓ بن الجراح ان سب پر سالارِ اعظم مقرر ہوئے

مسلمانوں کی فوج کشی کے وقت ہرقل والیٔ شام، حمص میں تھا، اس نے مسلمانوں کی پیش قدمی روکنے کے لیے تمام مسلمان افسروں کے مقابلہ پر علٰحدہ علٰحدہ فوجیں روانہ کیں تاکہ مسلمان ایک مرکز پر جمع نہ ہو سکیں، چنانچہ مسلمان جب شام کی سرحد پر پہنچے تو انہیں قدم قدم پر رومی جتھوں کا سامنا ہوا، مسلمانوں نے اس صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے حضرت ابو بکرؓ کو مزید کمک کے لیے لکھا۔ اس وقت چونکہ دار الخلافہ میں کوئی فوج موجود نہ تھی، اس لیے خلیفۂ اوّل نہایت فکر مند ہوئے، آخر آپ نے حضرت خالد بن ولیدؓ کو شام بھیجنے کا فیصلہ کیا، چنانچہ آپ نے حضرت خالدؓ کو لکھا کہ وہ عراق کا انتظام مثنیٰ کے حوالے کر کے شام چلے جائیں، اس پر حضرت خالدؓ ایک جمعیت کے ساتھ شامی رزمگاہ کی طرف روانہ ہو گئے۔[1]

حضرت خالدؓ بن ولیدؓ کو راستہ میں حدّ، داع، سُویٰ، قصم اور مرج راہط وغیرہ میں چھوٹی چھوٹی لڑائیاں لڑنا پڑیں، سرزمینِ شام میں قدم رکھنے کے بعد بصریٰ پر فوج کشی کر کے یہاں کے بطریق کو شکست دی اور اہلِ بصریٰ سے اس شرط پر صلح کر لی کہ وہ جزیہ ادا کریں گے۔

دوسری طرف فلسطین کے مورچہ پر حضرت عمرو بن العاصؓ تھے اور اُن کے مقابلہ پر اجنادین میں رومیوں کا عظیم الشان لشکر جمع تھا، حضرت خالدؓ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر بصریٰ سے فراغت کے بعد حضرت عمرو بن العاصؓ کی مدد کے لیے روانہ ہو گئے۔ وہاں

---

[1] سیر الصحابہؓ جلد اوّل خلفائے راشدین

پہنچ کر رُومیوں سے نبرد آزما ہوئے اور انہیں شکست دے کر اجنادین پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد متحدہ لشکر نے حضرت ابوعبیدہؓ بن الجراح سے مل کر دمشق کا محاصرہ کر لیا جو کامل تین ماہ جاری رہا، یہ حالت ابھی قائم تھی کہ خلیفۂ رسول ﷺ حضرت ابوبکرؓ صدیق کا زمانہ ختم ہو گیا [1]

مرض الموت اور حضرت عمرؓ کا استخلاف

جمادی الثانی ۱۳ھ میں خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکرؓ بیمار پڑے اور پندرہ روز تک اس شدت کے ساتھ بخار میں مبتلا رہے کہ مسجد میں تشریف لانے سے بھی معذور ہو گئے، ان دنوں میں آپ کے حکم سے حضرت عمرؓ امامت کی خدمت انجام دیتے رہے، آخر آپ جب زندگی سے مایوس ہو گئے، تو اکابر صحابہؓ کو بلا کر اپنے جانشین کے بارہ میں مشورہ کیا، اور اپنی طرف سے حضرت عمرؓ کا نام پیش کیا، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے کہا "عمرؓ کے اہل ہونے میں کوئی شبہ نہیں، لیکن وہ کسی قدر سخت ہیں"۔ حضرت عثمانؓ نے فرمایا: "اُن کا باطن اُن کے ظاہر سے اچھا ہے"۔ حضرت طلحہؓ عیادت کے لیے آئے تو انہوں نے بھی حضرت عمرؓ کی درشتیٔ مزاج اور تشدّد کی شکایت کی اور کہا "جب وہ آپ کے سامنے اتنے سخت ہیں، تو آپ کے بعد نہ جانے کیا کریں گے"۔ حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا "جب ان پر خلافت کا بوجھ پڑے گا، تو آپ نرم پڑ جائیں گے" ایک صحابیؓ نے کہا "آپ عمرؓ کے مزاج کی سختی کے باوجود انہیں اپنا جانشین بنانا چاہتے ہیں، ذرا سوچ لیجئے کہ آپ خدا کو کیا جواب دیں گے" فرمایا: "میں عرض کر دوں گا کہ خدایا! میں نے تمہارے بندوں میں سے ایسے شخص کو منتخب کیا تھا جو ان سب میں اچھا تھا" غرض سب کو مطمئن کرنے کے بعد حضرت عثمانؓ کو بلا کر وصیت نامہ لکھوانا شروع کیا، ابتدائی الفاظ لکھوائے تھے کہ ضعف کے سبب غش آ گیا، حضرت عثمان نے اپنی طرف سے حضرت عمرؓ کا نام لکھ دیا، تھوڑی دیر بعد جب ہوش آیا تو حضرت عثمان سے فرمایا کہ وہ تحریر پڑھیں، جب حضرت عمرؓ کا نام سُنا تو بے ساختہ اللہ اکبر پکار اُٹھے اور فرمایا: "حق تعالیٰ آپ کو اسلام اور اہل اسلام کی طرف سے جزائے خیر عطا فرمائے"۔ غرض جب وصیت نامہ مکمل ہو گیا تو اپنے غلام کو حکم دیا کہ اُسے صحابہؓ کے عام مجمع میں سُناؤ، خود بالا خانہ پر تشریف لے جا کر حاضرین سے فرمایا:

"میں نے اپنے کسی عزیز کو خلیفہ نہیں بنایا، بلکہ حضرت عمرؓ بن خطاب کو آپ لوگوں کا خلیفہ مقرر کیا ہے پس آپ ان کے احکام سُنیں اور ان کی اطاعت کریں" [2]۔

سب نے بالاتفاق اس حسنِ انتخاب پر سمعنا و اطعنا کہا، اس کے بعد حضرت عمرؓ کو بلا کر نہایت مفید نصیحتیں کیں جو ان کی کامیاب خلافت کے لیے نہایت عمدہ دستور العمل ثابت ہوئیں۔

آخری وصیتیں اور وفات

انتخابِ خلیفہ کے فرض سے بطرز حسن و خوبی عہدہ برآ ہونے کے بعد حضرت صدیق اکبرؓ نے اپنے ذاتی اور خانگی امور کی طرف توجہ کی اور حضرت عائشہ صدیقہؓ کو بلا کر فرمایا: "میرے بعد بیت المال کا جو قرض میرے ذمہ ہے اسے ادا کرنا، میرے پاس مسلمانوں کے مال سے ایک لونڈی اور دو اونٹنیاں ہیں، انہیں حضرت عمرؓ کے پاس بھجوا دینا، اس کے علاوہ اگر اور کوئی چیز نکل آئے تو اُسے بھی بیت المال میں داخل کر دینا" [3] کفن کے متعلق فرمایا: "میرے بدن پر جو کپڑا ہے، اسی کو دھو کر دوسرے کپڑوں کے ساتھ کفن دینا" حضرت عائشہؓ نے عرض کی کہ یہ تو پرانا ہے، کفن کے لیے نیا ہونا چاہیئے فرمایا، زندے

---

[1] تاریخ اسلام حصہ اوّل مؤلفہ شاہ معین الدین [2] سیرۃ صدیق اکبر۔ مؤلفہ علامہ محمد رضا مصری

مُردوں کی نسبت نئے کپڑوں کے زیادہ حقدار ہیں۔" اس کے بعد پوچھا: "آج کونسا دن ہے" معلوم ہُوا کہ دوشنبہ ہے۔ پھر پوچھا: رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال کس روز ہُوا تھا؟ حاضرین نے کہا: دوشنبہ کے روز" فرمایا "میری بھی یہی آرزو ہے۔" چنانچہ آپ کی یہ آرزو پوری ہوئی اور آپ نے ۲۲ جمادی الاخری ۱۳ھ دوشنبہ کا دن گزرنے کے بعد مغرب اور عشاء کے درمیان بعمر تریسٹھ سال انتقال فرمایا[1] وصیت کے مطابق رات ہی کو تجہیز و تکفین ہُوئی۔ آپ کی زوجہ محترمہ حضرت اسماءؓ بنتِ عمیس نے غسل دیا، حضرت عمرؓ نے نمازِ جنازہ پڑھائی، حضرت عثمانؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن ابوبکرؓ اور حضرت عمر فاروقؓ نے قبر میں اُتارا اور اس طرح سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا رفیقِ غار حضورؐ کے پہلو میں مدفون ہو کر دائمی رفاقت کے لیے جنت میں پہنچ گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

ازواج و اولاد

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے مختلف اوقات میں متعدد شادیاں کیں بعض مؤرخین نے اُن کی تعداد پانچ لکھی ہے، ابنِ سعدؒ نے اُن بیویوں کا ذکر کیا ہے جن سے اولاد ہُوئی، اُن کے نام یہ ہیں :-

- قتیلہ بنت عبدالعزیٰ بن عبدِ اسعد بن نصر بن مالک بن حسل بن عامر، ان سے حضرت عبداللہؓ اور حضرت اسماءؓ پیدا ہوئیں حضرت اسماء کا لقب ذات النطاقین تھا۔
- امّ رومانؓ بنتِ عامر بن عویمر بن عبدِ شمس بن عتاب، یہ امّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت عبدالرحمٰن کی ماں تھیں۔
- اسماءؓ بنتِ عمیس بن معد بن تیم بن حارث کے بطن سے محمد پیدا ہوئے۔
- حبیبہؓ بنتِ خارجہ بن زید بن ابی زہیر سے ایک لڑکی حضرت ابوبکرؓ کی وفات کے بعد پیدا ہُوئی، جس کا نام امّ کلثوم تھا۔

حُلیہ

ابن سعدؒ نے طبقات میں لکھا ہے کہ لوگوں نے جب حضرت عائشہ صدیقہؓ سے عرض کیا کہ حضرت ابوبکرؓ کا حُلیہ بیان کیجیے تو انہوں نے فرمایا :

"وہ گورے اور دُبلے تھے۔ دونوں رُخساروں پر بہت کم گوشت تھا۔ سینہ آگے سے اُبھرا ہُوا تھا۔ پیشانی بلند و فراخ اور آنکھیں دھنسی ہُوئی تھیں، انگلیوں کی جڑیں گوشت سے خالی تھیں، ڈاڑھی میں کسم اور حنا کا خضاب لگاتے تھے۔"

لباس و غذا

حضرت ابوبکرؓ سادہ زندگی بسر کرتے اور موٹے جھوٹے کپڑے استعمال فرماتے تھے، دسترخوان پُر تکلف نہ تھا، خلافت کے بعد یہ سادگی اور ترقی کر گئی تھی، آپ نے چونکہ اپنی ساری دولت اسلام پر نثار کر دی تھی۔ اس لیے عُسرت کے باعث دو دو تین تین وقت فاقہ سے گزر جاتے تھے۔ ایک روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو اور حضرت عمرؓ کو مسجد میں بھوک سے بے قرار دیکھا تو فرمایا :-

"مَیں بھی تمہاری طرح سخت بھوکا ہُوں" حضرت ابوالہیثمؓ کو معلوم ہُوا، تو انہوں نے گھر پہ کھانے کی دعوت دی۔[2]

ذریعۂ معاش

آپ کا ذریعہ معاش تجارت تھا۔ فرماتے ہیں کہ مَیں قریش میں سب سے بڑا اور دولتمند تاجر تھا۔ عہدِ اسلام میں بھی یہی مشغلہ جاری رہا اور آپ نے مالِ تجارت لے کر دُور دراز ممالک کا سفر اختیار فرمایا، چنانچہ وصالِ نبویؐ سے ایک سال پہلے

---

[1] طبقات ابن سعد حصہ سوم، سیر الصحابہؓ جلد اوّل خلفائے راشدین۔

تجارت کے خیال سے بصریٰ تشریف لے گئے تھے۔

وظیفۂ خلافت

خلافت کا بار جب سر پر آیا تو قدرتی طور پر ان کا تمام وقت مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے وقف ہو گیا، اب بحیثیت خلیفۃ المسلمین اگر آپ چاہتے تو ایک حدیث کی رو سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی متروکہ جائداد سے اپنے لیے معاش کا سامان کر سکتے تھے، لیکن آپ نے انتہائی زہد و تقویٰ کی بنا پر ایسا نہیں کیا، چنانچہ صحابہ کرامؓ نے باہم مشورہ کر کے روزانہ آدھی بکری کا گوشت اور ان کے اہل و عیال کے لیے کپڑے اور کھانا مقرر کر دیا، حضرت ابوبکرؓ نے ان کو منظور کر کے فرمایا:

"میری قوم جانتی ہے کہ میرا پیشہ اہل و عیال کا بار اٹھانے سے قاصر نہ تھا اور اب میں مسلمانوں کے کام میں مصروف ہو گیا ہوں، اس بنا پر آلِ ابوبکرؓ اس مال میں سے کھائیں گے، اور مسلمانوں کے لیے تجارت کریں گے۔"

انفاق فی سبیل اللہ

مال و دولت اگر صحیح اور مناسب موقع پر صرف ہو تو اس کی قدر و قیمت لامتناہی ہو جاتی ہے، حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس قبولِ اسلام سے پہلے چالیس ہزار درہم نقد موجود تھے، انہوں نے یہ تمام دولت راہِ خدا میں خرچ کر دی جس کے برمحل ہونے کا اعتراف خود سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے بارہا فرمایا: "ابوبکرؓ کے مال سے زیادہ کوئی مال میرے لیے مفید نہ ہوا۔" اس فیاضی کے ساتھ اخلاص کا یہ عالم تھا کہ رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم جب بطور تشکر یہ ارشاد فرماتے تو حضرت ابوبکرؓ کی آنکھوں میں آنسو آجاتے اور عرض کرتے "یا رسول اللہ! جان و مال سب حضورؐ کے لیے ہے۔" آغازِ اسلام میں اکثر غلاموں اور لونڈیوں کو آزاد کر دیا۔ غزوہ تبوک کے موقع پر جس فیاضی کا آپ نے اظہار فرمایا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ حضرت ابوبکرؓ کی فیاضی کا سلسلہ آخری لمحہ تک جاری رہا یہاں تک کہ وفات کے وقت بھی فقراء و مساکین کو فراموش نہ کیا اور اپنے مال میں ایک خمس کی ان کے لیے وصیت فرما دی۔

اخلاق و عادات

حضرت صدیق اکبرؓ طبعاً اخلاقِ حمیدہ سے متصف تھے، ایامِ جاہلیت میں بھی عفت و پارسائی، رحمدلی، راستبازی اور دیانت داری ان کے مخصوص اوصاف تھے، اُن دنوں جبکہ اہلِ عرب ہر قسم کے فسق و فجور میں مبتلا تھے، شراب پیتے، جُوا کھیلتے، سُود کھاتے اور ہر بیحیائی روا رکھتے تھے، آپ کا دامنِ عفت کبھی اِن دھبّوں سے داغدار نہ ہوا تھا، رئیسِ قارہ ابن الدغنہ نے قریش کے سامنے آپ کے اخلاق کا ان الفاظ میں ذکر کیا ہے:

"یہ صلۂ رحم کرتے ہیں، مقروضوں کا بار اُٹھاتے ہیں، غریبوں کی اعانت کرتے ہیں، مہمانوں کی ضیافت کرتے ہیں، حق کی حمایت کرتے ہیں، مصیبتوں میں لوگوں کے کام آتے ہیں۔"[1]

لیکن یہ زمانۂ جاہلیت کے اوصاف کا ذکر ہے۔ زمانۂ اسلام میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت نے انہی اوصاف کو اور زیادہ جامع، ہمہ گیر، مؤثر، متنوع اور مجلّا بنا دیا تھا۔

ایثار: قوموں کی سعادت کا سرچشمہ ایثارِ نفس ہے اور یہ وصف حضرت ابوبکرؓ میں تقریباً تمام صحابہؓ سے نمایاں تھا،

---

[1] سیر الصحابہؓ جلد اول جزء المہاجرین۔

بیعتِ سقیفہ میں آپ نے تقریر کرنے کے بعد خلافت کے لیے حضرت عمرؓ اور حضرت ابوعبیدہؓ کا نام پیش کیا اور اپنے آپ کو بالکل علیحدہ کر لیا، یہ آپ کے اسی ایثار کا نتیجہ تھا کہ رسولِ خدا صلعم کے بعد مسلمانوں کو آپ جیسا خلیفہ ملا۔ جس کی بزرگی، پارسائی، ایثار اور عظمتِ کردار کا ہر شخص معترف تھا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے حکم پر سر جھکانا باعثِ سعادت خیال کرتا تھا۔

شجاعت ترقیٔ اقوام کا سب سے بڑا محرک جذبۂ شجاعت ہے، جو حضرت ابوبکرؓ میں تمام و کمال موجود تھا۔ کفرزارِ مکہ کا ذرہ ذرہ خدا کے آخری نبیؐ کا دشمن ہے، اکثر صحابہؓ حبشہ کی طرف ہجرت کر چکے ہیں، جاں نثارانِ خاص میں سے بھی زیادہ تر مدینہ روانہ ہو چکے ہیں، پیغمبرِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم دشمنوں کے نرغہ میں ہیں کہ ہجرت کی اجازت ملتی ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکرؓ کو ساتھ لے کر روانہ ہوتے ہیں، پھر غارِ ثور میں رسولِ خدا صلعم کے ساتھ تین دن قیام، ازاں بعد آپ مدینہ کے راستے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک چٹان کے سایہ میں لٹا کر محافظت کے لیے باہر نکلتے ہیں اور چاروں طرف نگاہ دوڑاتے ہیں کہ دشمن نہ آ رہا ہو، غزوہ بدر میں جب تمام صحابہؓ میدانِ جنگ میں مصروفِ پیکار ہیں، صرف آپ کی ذاتِ گرامی ہے جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی حفاظت پر کھڑی ہے اور اس وقت بھی "ثانی اثنین" بنی ہوئی ہے۔ غزوہ اُحد میں گو جسم چُور چُور ہے پھر بھی کفار کا تعاقب کر رہے ہیں، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مانعینِ زکوٰۃ کے مقابلہ پر جہاد کا عزم بالجزم، جب کہ بہت سے صحابہؓ اُن سے جہاد ضروری نہیں سمجھتے تھے، حضرت ابوبکرؓ کی شجاعت کی روشن دلیل ہے۔

تواضع حضرت ابوبکر صدیقؓ طبعاً نہایت منکسر المزاج واقع ہوئے تھے اور کسی کام سے ان کو عار نہ تھا، خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالنے سے پہلے اکثر بھیڑ بکریاں خود ہی چرا لیتے اور محلّہ والوں کی بکریوں کا دودھ دوہ دیتے تھے، جب آپ خلیفہ ہوئے تو سب سے زیادہ محلّہ کی ایک لڑکی کو فکر لاحق ہوئی اور اس نے تاسف آمیز لہجے میں کہا: اب ہماری بکریاں کون دوہے گا" آپ نے سُنا تو فرمایا "خدا کی قسم، میں بکریاں دوہوں گا۔ اُمید ہے کہ خلافت مجھے مخلوق کی خدمت گزاری سے باز نہ رکھے گی"[۱]

دار الخلافہ سے جب بھی کوئی مہم روانہ ہوتی، تو آپ ضعف و کبرسنی کے باوجود دُور تک پیادہ پا جاتے اور راہِ خدا میں اپنے پاؤں غبار آلود کرنے کو اپنے لیے سعادت سمجھتے، عجز و تواضع کی انتہا یہ تھی کہ لوگ جب جانشینِ رسولؐ کی حیثیت سے تعظیم و توقیر کرتے تو آپ کو تکلیف ہوتی اور فرماتے کہ "مجھے لوگوں نے بہت بڑھا دیا ہے" اسی طرح اگر کسی زبان سے اپنی مدح و ستائش سُنتے تو فرماتے۔

"اے خدا، تو میرا حال مجھ سے زیادہ جانتا ہے اور میں اپنی کیفیت ان لوگوں سے زیادہ جانتا ہوں، خدایا، تو اُن کے حُسنِ ظن سے مجھے بہتر ثابت کر، میرے گناہوں کو بخش دے اور لوگوں کی بے جا تعریف کا مجھ سے مواخذہ نہ کر"[۲]

مذہبی زندگی حضرت ابوبکرؓ رات رات بھر نمازیں پڑھتے، دن کو اکثر روزہ رکھتے اور موسمِ گرما خصوصاً روزوں ہی میں بسر ہوتا تھا۔ نماز پڑھتے تو خشوع و خضوع کا یہ عالم ہوتا کہ لکڑی کی طرح بے حس و حرکت نظر آتے۔ درد و سوز چونکہ آپ کی طبیعت کا خاصا تھا۔ اس لیے دورانِ نماز میں اس قدر رقت طاری ہوتی کہ روتے روتے ہچکی بندھ جاتی تھی۔ خوفِ محشر آپ کی

---

[۱] طبقات ابنِ سعد ج ۳ [۲] سیر الصحابہؓ جلد اوّل خلفائے راشدین

رگ و پے میں سمایا ہوا تھا، دنیا کا ذرہ ذرہ آپ کے لیے سرمایہ عبرت تھا۔ کوئی سرسبز درخت دیکھتے تو کہتے : کاش میں درخت ہوتا کہ عاقبت کے جھگڑوں سے چھوٹ جاتا ؛ اگر کسی باغ سے گزر ہوتا، تو چڑیوں کو چہچہاتے دیکھ کر آہِ سرد کھینچتے اور فرماتے :۔

" پرندو تمہیں مبارک ہو کہ دنیا میں چرتے چگتے ہو، درخت کے سایہ میں بیٹھتے ہو اور قیامت میں تمہارا کوئی حساب کتاب نہیں، کاش، ابوبکرؓ بھی تمہاری طرح ہوتا[1]"

قرآن حکیم کی تلاوت فرماتے تو بے اختیار آنکھوں سے جاری ہو جاتے اور اس قدر پھوٹ پھوٹ کر روتے کہ آس پاس کے لوگ جمع ہو جاتے۔ نرم دلی اور رقتِ قلب کی وجہ سے بات بات پر آہِ سرد کھینچتے، یہاں تک کہ " اواہ منیب" اُن کا نام ہو گیا تھا۔

خانگی زندگی

ہر شعبۂ حیات کی طرح خانگی زندگی میں بھی حضرت ابوبکرؓ ایک مثالی حیثیت رکھتے تھے۔ آپ اگرچہ بیوی بچوں سے محبت رکھتے تھے، اور ہر ایک کے دکھ درد میں برابر کے شریک ہوتے تھے تاہم حضرت عائشہ صدیقہؓ کو بہت عزیز جانتے تھے۔ نواحِ مدینہ میں اپنی ایک جاگیر ان کے نام ہبہ کر دی تھی، لیکن جب وفات آیا، تو اس کے دوسرے وارثوں کی حق تلفی کا خیال کرتے ہوئے حضرت عائشہ صدیقہؓ سے فرمایا : جانِ پدر " افلاس و امارت، دونوں حالتوں میں تم مجھے سب سے عزیز رہی ہو، میری خواہش ہے کہ جو جاگیر میں نے تمہیں دی ہے۔ اس میں اپنے دوسرے بھائی بہنوں کو بھی شریک کر لو" اس پر حضرت عائشہ صدیقہؓ نے آپ کی وفات کے بعد جاگیر تقسیم کر دی۔

مہمان نوازی

یوں تو ہمیشہ سے مہمان نوازی اہلِ عرب کا شیوۂ خاص تھا، تاہم جب اسلام آیا، تو اس نے مہمان نوازی کو اخلاقِ حسنہ کی ایک اعلیٰ قدر کے درجہ تک بڑھا دیا، حضرت ابوبکرؓ اس میں بھی ایک خاص مقام رکھتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ رات کے وقت چند اصحابِ صفہ حضرت ابوبکرؓ کے مہمان تھے، آپ نے اپنے صاحبزادہ حضرت عبدالرحمٰنؓ کو ہدایت فرمائی کہ میں بارگاہِ نبوتؐ میں جاتا ہوں، تم میری واپسی سے پہلے ان کی مہمان نوازی سے فارغ ہو جانا۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ نے جو کچھ حاضر تھا۔ مہمانوں کی خدمت میں پیش کیا لیکن انہوں نے صاحبِ خانہ کی غیر موجودگی میں کھانے سے انکار کر دیا، اتفاق سے حضرت ابوبکرؓ دیر سے تشریف لائے اور یہ جان کر کہ مہمان اب تک بھوکے بیٹھے ہیں، اپنے صاحبزادے پر سخت برہم ہوئے اور فرمایا : " واللہ، میں اس کو آج کھانے میں شریک نہیں کروں گا " لیکن بعد میں جب مہمانوں نے حقیقتِ حال کی وضاحت کی اور اصرار کیا کہ جب تک حضرت عبدالرحمٰنؓ کھانے میں شریک نہ ہوں گے وہ کھانا نہیں کھائیں گے، تو آپ کا غصہ فرو ہوا اور دسترخوان بچھانے کا حکم دیا، حضرت عبدالرحمٰنؓ فرماتے ہیں کہ اس روز کھانے میں اس قدر برکت نازل ہوئی کہ ہم لوگ کھاتے جاتے تھے، لیکن وہ کسی طرح ختم نہیں ہو رہا تھا، یہاں تک کہ اس میں سے کچھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں بھیج دیا۔

بخل سے نفرت

حضرت ابوبکرؓ بخل سے سخت نفرت کرتے تھے، ایک بار حضرت جابرؓ نے جب ان سے کہا کہ آپ مجھ کو دینے میں بخل کرتے ہیں، تو آپ نے ان الفاظ کو تین بار دہرایا :

" تم کہتے ہو کہ آپ بخل کرتے ہیں۔ بخل سے بڑھ کر کون بڑا مرض ہو سکتا ہے؟"

---

[1] سیر الصحابہؓ جلد اول خلفائے راشدین۔

شکر حضرت ابوبکرؓ کو اللہ تعالیٰ نے جو فضیلتیں عطا فرمائی تھیں، آپ اُن کا ہر آن شکر ادا کرتے رہتے تھے، ایک بار امامت کر رہے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو صف میں کھڑے ہو گئے اور حضرت ابوبکرؓ کو امامت کے لیے فرمایا، لیکن حضرت ابوبکرؓ نے نیت توڑ دی، ہاتھ اُٹھائے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد پر خدا کا شکر ادا کیا۔ پھر پیچھے ہٹ کر صف میں شامل ہو گئے۔

رازداری دوستی کے لیے رازداری شرطِ اولین ہے اور سرورِ دو عالم صلعم کے رفیقِ خاص حضرت ابوبکرؓ میں یہ وصف نہایت شدت کے ساتھ نمایاں تھا حضرت عمرؓ اور حضرت ابوبکرؓ آپس میں نہایت مخلص دوست تھے، تاہم حضرت عمرؓ کے مقابلہ پر آنحضرت صلعم کی دوستی کا پلہ ہمیشہ بھاری رہتا تھا حضرت عمرؓ کی صاحبزادی حضرت حفصہؓ، حضرت خنیسؓ بن حذافہ سہمیؓ کو منسوب تھیں۔ جو اصحابِ بدر میں تھے۔ اُن کا انتقال ہُوا تو حضرت عمرؓ نے حضرت عثمانؓ سے کہا کہ اگر آپ چاہیں تو حفصہؓ سے آپ کا نکاح پڑھا دوں، انہوں نے فرمایا کہ فی الحال میرا کوئی ارادہ نہیں، پھر حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے ذکر کیا، وہ خاموش ہو گئے اور کچھ جواب نہ دیا۔ حضرت عمرؓ کے تعلقات چونکہ ان سے بہت زیادہ تھے۔ اس لیے قدرتی طور پر حضرت عمرؓ کو سخت صدمہ ہُوا، خود فرماتے ہیں "عثمانؓ کے انکار پر مجھ کو غصہ تھا، ابوبکرؓ کی خاموشی پر اس سے زیادہ غصہ آیا" چند روز بعد رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حفصہؓ کے نکاح کا پیام دیا اور یہ مبارک تقریب انجام پائی۔ نکاح کے بعد حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ کے پاس آئے اور کہا کہ تم کو میری خاموشی سے رنج ہُوا ہو گا؟ اُنہوں نے کہا "ہاں" حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا:

> تمہاری درخواست کا جواب دینے میں جو چیز مجھ کو مانع ہوئی یہ تھی کہ آنحضرت صلعم اُن (حضرت حفصہؓ) کا ذکر فرما چکے تھے۔ مَیں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے راز کو فاش کرنا مناسب نہ سمجھا، اگر حضورؐ ارادہ فسخ کرتے تو مَیں اُن سے نکاح کر لیتا۔[1]

رقیق القلبی یہ رقتِ قلب اور لطافتِ طبع کا جوہر ہی تھا جو اکثر صحابہؓ کے قبولِ اسلام کا باعث بنا، لیکن حضرت ابوبکرؓ میں یہ جوہر اس قدر نمایاں تھا کہ انہوں نے حق کی پہلی ہی آواز پر اپنے تئیں اسلام کی دہلیز پر جھکا دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر بلا تامل اور بغیر جھجک کے لبیک کہا، آپ عموماً ہر بات کا شدت سے اثر قبول کرتے اور اپنے آنسوؤں کو نہ روک سکتے تھے۔ ابتدائے اسلام میں جب آپ صحنِ خانہ کی مسجد میں بیٹھ کر قرآن حکیم کی تلاوت کرتے تو آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی اور آپ کی اس قلبی کیفیت سے کفار تک متاثر ہوتے۔

واقعۂ افک میں جب حضرت عائشہؓ نے رونا شروع کیا، تو حضرت ابوبکرؓ کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ مرض الموت میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو جماعتِ صحابہؓ کا امام بنانا چاہا تو حضرت عائشہ صدیقہؓ نے اُن کی اسی خصوصیت کی بنا پر یہ عذر پیش کیا

---

[1] سیر الصحابہؓ جلد اوّل جزء المہاجرین۔

"ابوبکرؓ جب آپؐ کی جگہ کھڑے ہوں گے، تو اس قدر روئیں گے کہ قرأت کی آواز نہ سنائی دے گی۔"

حُبِّ رسولؐ

حضرت ابوبکرؓ کی زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ حبِّ رسولؐ ہے۔ قرآنِ حکیم نے ایمانِ کامل کا معیار یہ بتایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت جان و مال، اولاد، غرض تمام دنیاوی تعلقات پر غالب آجائے اور اس معیار پر حضرت ابوبکرؓ سے زیادہ کوئی شخص پورا نہیں اتر سکتا۔ رفاقتِ غار اور غزوات کے واقعات حبِّ رسولؐ کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔

انسان کے لیے مال نہایت محبوب چیز ہے، مگر حضرت ابوبکرؓ نے اپنا تمام مال رسولِ خدا صلعم کے قدموں پر نثار کر دیا اور اپنے لیے خدا اور اس کے رسولؐ کی محبت کے سوا کبھی کچھ نہ رکھا۔ اسی طرح اولاد سب کو عزیز ہوتی ہے، لیکن حضرت ابوبکرؓ کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ پر اولاد کوئی وقعت نہ رکھتی تھی، حضرت عائشہ صدیقہؓ آپ کی نہایت محبوب صاحبزادی تھیں اور ازواجِ مطہرات میں داخل تھیں، تاہم غزوہ مریسیع میں جب اُن کا ہار گم ہو گیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی تلاش میں قیام فرمانا پڑا تو حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عائشہؓ کو سخت تنبیہ کی، پسلی میں اُنگلیاں کونچیں اور سینہ پر دھکا مارا کہ رسول اللہ صلعم اور مسلمانوں کو تم نے کیوں روکا؟[1]

افک کے واقعہ میں جب حضرت عائشہ صدیقہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت لے کر میکہ آئیں تو حضرت ابوبکرؓ کو خیال پیدا ہوا کہ ان کے روکنے سے حضورؐ کو ملال ہو گا۔ یہ بڑا نازک وقت تھا۔ رسولِ خدا صلعم اس زمانہ میں حضرت عائشہ صدیقہؓ کی طرف بہت کم نظرِ کرم فرماتے تھے، وہ اس تبدیلی کو محسوس کرتیں تو انہیں سخت تکلیف ہوتی اور چونکہ آپ پہلے سے بیمار تھیں اس واقعہ نے بیماری میں اور اضافہ کر دیا تھا، وہ ماں باپ کے پاس بڑی اُمیدیں لے کر آئی تھیں کہ وہ میری حمایت کریں گے، لیکن حضرت ابوبکرؓ نے تمام حالات سن کر نظریں بدل لیں اور فرمایا:-

"بیٹی مَیں تجھ کو قسم دیتا ہوں کہ تو اپنے گھر کو واپس جا۔"

پھر جب آنحضرت صلعم نے حضرت عائشہؓ سے گفتگو فرمائی، تو انہوں نے حضرت ابوبکرؓ سے عرض کیا کہ آپ میری طرف سے جواب دیجئے، لیکن حضرت ابوبکرؓ نے صاف الفاظ میں فرمایا:

"مَیں نہیں جانتا کہ رسول اللہ صلعم کو کیا جواب دُوں۔"

یہ حضرت ابوبکرؓ کی اسی محبت کا نتیجہ تھا کہ آنحضرت صلعم جس قدر ان کے مکان میں تشریف لاتے تھے کسی کے مکان میں نہ جاتے تھے۔ مدینہ میں حضرت ابوبکرؓ کا مکان کاشانۂ نبوی سے کئی میل دُور تھا۔ اس لیے مجبوری تھی، مگر مکہ میں یہ حال تھا کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کی روایت کے مطابق:

"کوئی دن ایسا نہ ہوتا کہ رسول اللہ صلعم صبح یا شام ہمارے گھر تشریف نہ لاتے ہوں۔"

حبِّ اہلِ بیت

حضرت ابوبکرؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اہلِ بیت اور عزیز و اقارب سے نہایت محبت رکھتے تھے اور ان کو اپنے عزیز و اقارب پر ترجیح دیتے تھے۔ آپ کا عام قول تھا۔

"اہلِ بیت کے متعلق محمد صلعم کا لحاظ کرو۔"

حضرت علیؓ نے بیعت کرنے کے لیے جب ابوبکرؓ کو اپنے مکان پر بلایا اور آنحضرت صلعم کی قرابت کا تذکرہ کیا تو انہوں نے

[1] سیر الصحابہؓ، جلد اول، جزء المہاجرین

حضرت علیؓ کو مخاطب کر کے فرمایا:

"اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، سلوک کرنے میں مجھ کو رسول اللہ صلعم کے اقربا اپنے اقربا سے زیادہ محبوب ہیں"

ایک بار نمازِ عصر پڑھ کر جا رہے تھے کہ راستہ میں حضرت حسنؓ کو بچوں کے ساتھ کھیلتے دیکھا، آپ نے اُن کو کاندھے پر اٹھا لیا اور فرمایا:-

"میرا باپ قربان، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم شکل ہو، علیؓ کے مشابہ نہیں ہو"

حضرت علیؓ نے سُنا تو ہنس پڑے۔

حُبِ اہلِ بیت کے ضمن میں مطالبۂ میراث کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ کو یہ قطعی گوارا نہ تھا کہ حضرت فاطمہؓ اُن سے ناراض ہوں، مگر ارشادِ نبوت کے احترام کے باعث آپ نے اس مطالبہ کو تسلیم نہ کیا، چنانچہ اس موقع پر فرمایا:

"مجھے خوف ہے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کو ذرہ برابر بھی چھوڑا تو کج ہو جاؤں گا"

ظاہر ہے کہ آپ کا فیصلہ حبِ اہلِ بیت کے منافی نہیں تھا، بلکہ حبِ اہلِ بیت کے مقابلہ پر ارشادِ رسولؐ کو ترجیح دینے کا تھا جو آپ کی زندگی کا سب سے بڑا نصب العین تھا۔

عہدِ صدیقیؓ پر مختصر تبصرہ

حضرت ابوبکرؓ صدیق تعلیم اسلام کے زندہ پیکر اور اخلاقِ نبویؐ کی مجسم تصویر تھے، آپ کے دور کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ آپ نے سوا دو سال کی قلیل مدتِ خلافت میں ایسا کوئی کام نہیں کیا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ اقدس میں نہ ہوا ہو، آپ نے اس مختصر مدت میں اسلام اور مسلمانوں کی وہ گرانقدر خدمات انجام دیں کہ قیامت تک ان کے نقوش محو نہیں ہو سکتے، رسول خدا صلعم کے وصال کے ساتھ ہی بدبدلا اسلام عربوں نے جزیرۃ العرب میں شمع اسلام کو گل کر دینا چاہا تھا اور قریب قریب سارا عرب مُرتد ہو گیا تھا۔ مزید جو قبائل اسلام پر قائم بھی تھے۔ انہوں نے اسلام کے ایک رکنِ عظیم زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ جھوٹے مدعیانِ نبوت نے علاوہ عرب کے مختلف اطراف سے اپنی صدائیں بلند کر کے سارے نظام کو درہم برہم کر دیا تھا۔ ان نازک حالات میں حضرت ابوبکرؓ کی روشن ضمیری، سیاست اور غیر معمولی استقلال نے وہ کام کیا جو کسی دوسرے سے ممکن نہ تھا۔ آپ نے صحابہؓ کی مختصر جماعت ساتھ لی اور تمام عرب کو اپنی رُوحانی اور مادی طاقت سے مغلوب کیا۔ ارتداد کا فتنہ فرو ہو گیا، مدعیانِ نبوت ایک ایک کر کے اپنے انجام کو پہنچے اور اسلام کی آواز ایک بار پھر ملک کے گوشہ گوشہ میں گونجنے لگی۔

لاریب حضرت ابوبکرؓ کی عدیم النظیر کامیابیوں میں اُن کے ذاتی اوصاف اور تلاشِ حق کے اس جذبۂ صادق کو بھی دخل تھا۔ جس نے حق کی پہلی ہی آواز پر انہیں اسلام کی دہلیز پر جھکا دیا اور شمع رسالتؐ کا پروانہ بنا دیا تھا لیکن سب سے بڑا دخل پیغمبرِ خاتمؐ کی اُس صحبت کا ہے، جو متواتر تئیس سال تک ان کو حاصل رہی، اسی وجہ سے مؤرخین اس امر پر متفق ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ کی عظمت کلیتہً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کی رہینِ منت ہے کیونکہ جہاں اس پاک صحبت نے انہیں اسلام کی لازوال محبت عطا فرمائی، وہاں ان میں عزم و ہمت، ثبات و استقلال اور فہم و بصیرت کی وہ شمع بھی روشن کی جس نے ہر آزمائش میں اُن کے ارادوں کو مضبوط اور ہر ابتلا کے وقت اُن کے یقین و ایمان کو مستحکم رکھا۔

حضرت ابُوبکرؓ اگر تاریخ اسلام کے سب سے پہلے خلیفہ تھے تو اس لحاظ سے بھی ان کو اوّلیت کا شرف حاصل ہے کہ انہیں آنحضرت صلعم کے مبارک عہد سے بالکل متصل زمانہ ملا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس آواز ابھی کانوں میں گونج رہی تھی، رسول اللہ صلعم کے طرزِ عمل کو دیکھنے اور ارشادات و فرمودات کو سننے والے ابھی زندہ تھے۔ قرآن حکیم یا تو حفاظ کے سینوں میں موجود تھا یا کھجُور کے پتوں اور شانے کی ہڈیوں پر لکھا ہُوا، وحی و الہام کے سلسلہ کو ختم ہُوئے بھی کوئی خاص عرصہ نہیں گزرا تھا، مدینہ منورہ میں زندگی مستقلاً اسلامی سانچے میں ڈھلنے کے لیے کروٹیں لے رہی تھی۔ اسلامی مملکت اپنی توسیع کے لیے پَر تول رہی تھی اور مجُاہدین کے قدم آگے بڑھنے کے لیے بیقرار تھے کہ ان سب امُور کو تکمیلی مراحل طے کرانے کے لیے سب سے بڑے مزاج شناس رسولؐ کی قیادت مُیسّر آگئی اور مسلمانوں نے رسُولِ خدا صلعم کے بعد اپنے میں سے برگزیدہ و محُترم ہستی کے ہاتھ میں اپنے ارادوں اور عزائم کی عنان دے کر پیغمبر خاتمؐ کی عظمت کو محفوظ کر لیا، پھر جو کچھ جس طرح بھی پیش آیا۔ اس میں اسلام کی وہی رُوح کارفرما تھی جس کا عملی تجربہ اہلِ ایمان رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک عہد میں کر چکے تھے۔

حضرت ابوبکرؓ کا دامنِ عظمت ایسے کارناموں سے بھرا ہُوا ہے جن پر تاریخِ اسلام جتنا بھی ناز کرے کم ہے فتنۂ ارتداد کی بیخ کنی، منکرینِ زکوٰۃ کی سرزنش اور جھوٹے مدعیانِ نبوّت کی سرکوبی جیسے کارنامے آپ کی جلالتِ شان کے زندہ ثبوت ہیں پھر ان سے بھی بڑھ کر تدوینِ قرآن، احیائے سُنّت، بدعات کا تدارک اور اتباعِ رسولؐ کے لیے آپ کی سعی و کاوش نے یقیناً آپ کو نائبِ رسولؐ کی حیثیت سے ہمیشہ کے لیے سر بلند کر دیا ہے۔ (رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ)

اس میں شک نہیں کہ بڑے بڑے کام خلیفۂ دوم کے عہد میں انجام پائے، مُہماتِ امُور کا فیصلہ ہُوا۔ یہاں تک کہ روم و ایران کی قدیم سلطنتوں کے دفتر اُلٹ گئے تاہم اس کی داغ بیل کس نے ڈالی؟ عرب میں اُولوالعزمانہ رُوح کب پیدا ہوئی؟ اور اس عظیم الشان خلافت کا سنگِ بنیاد کس نے رکھا جو تاریخِ عالم میں خلافتِ راشدہ کے نام سے مشہور ہے؟ یقیناً ان تمام سوالوں کے جواب میں صرف حضرت ابوبکرؓ کا نام نامی ہی لیا جا سکتا ہے اور ان تمام عظمتوں کا رُخ متعین کرنے کے لیے اُنہی بنیادوں کو تلاش کرنا پڑتا ہے جو عہدِ صدیقیؓ میں استوار ہُوئیں اور جن پر عہدِ فاروقیؓ میں اسلام کی عظیم الشان عمارت تعمیر کی گئی۔

نظامِ خلافت

اسلام میں خلافت یا جمہوری حکومت کی بنیاد سب سے پہلے حضرت ابوبکرؓ نے ڈالی، خود ان کا انتخاب بھی جمہُور کی اتفاقِ رائے سے ہُوا تھا اور عملاً جس قدر بڑے بڑے کام انجام پائے۔ سب میں کبار صحابہؓ کی آراء اور مشوروں کو ایک نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ ابنِ سعدؒ کی تصریح کے مطابق جب کوئی معاملہ پیش آتا، حضرت ابوبکرؓ اہل الرائے صحابہؓ سے مشورہ کرتے اور مہاجرین و انصار میں سے چند ممتاز صحابہؓ یعنی حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت اُبیّ بن کعبؓ اور حضرت زید بن ثابتؓ کی مجلسِ مشاورت طلب کرتے تھے۔

حکّام کے انتخاب میں احتیاط

حضرت ابُوبکرؓ حکام کے انتخاب میں بڑی احتیاط برتتے تھے اور ہمیشہ ان بزرگوں کا انتخاب فرماتے تھے جو درس گاہِ نبوّت کے تربیت یافتہ ہوتے تھے۔ آپ نے عہدِ رسالتمآبؐ کے تمام حکام کو اُن کے عہدوں پر قائم رکھا، مثلاً عہدِ نبوتؐ میں مکہ پر حضرت عتاب بن اسیدؓ، طائف پر حضرت عثمانؓ بن ابی العاص، صنعا پر حضرت مہاجر بن اُمیہؓ، حضرموت پر حضرت زیاد بن لبیدؓ اور بحرین پر حضرت علاء بن الحضرمیؓ مامور تھے۔ آپ نے نہ صرف

انہی حضرات کو ان مقامات پر برقرار رکھا بلکہ نئے حکام کے انتخاب میں بھی اسی اصول کو پیشِ نظر رکھا، آپ کا قاعدہ تھا کہ جب کسی کو کوئی ذمہ دار عہدہ تفویض کرتے تو عملاً بلا کر اس کے فرائض کی تشریح کر دیتے اور نہایت مؤثر الفاظ میں سلامت روی و تقویٰ کی نصیحت فرماتے۔ چنانچہ جب حضرت ولید رضؓ بن عتبہ کو قبیلہ قضاعہ پر محصلِ صدقات بنا کر بھیجا تو ان الفاظ میں نصیحت فرمائی۔

خلوت و جلوت میں خدا کا خوف رکھو، جو خدا سے ڈرتا ہے، وہ اس کے لیے ایسی سبیل اور اس کے رزق کا ایسا ذریعہ پیدا کر دیتا ہے۔ جو کسی کے گمان میں بھی نہیں آ سکتا، جو خدا سے ڈرتا ہے وہ اس کے گناہ کم کر دیتا ہے اور اس کا اجر دو بالا کر دیتا ہے، بے شک بندگانِ خدا کی خیر خواہی بہترین تقویٰ ہے، تم خدا کی ایسی راہ پر ہو جس میں افراط و تفریط اور ایسی چیزوں سے غفلت کی گنجائش نہیں جس پر مذہب کا استحکام اور خلافت کی حفاظت مضمر ہے، اس لیے سستی اور تغافل کو راہ نہ دینا۔[1]

اسی طرح حضرت یزید بن ابی سفیان رضؓ کو شام کی مہم سپرد کی تو فرمایا:

"اے یزید، تمہاری قرابت داریاں ہیں، شاید تم ان کو اپنی قرابت سے فائدہ پہنچاؤ، درحقیقت یہی سب سے بڑا خطرہ ہے جس سے میں ڈرتا ہوں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو کوئی مسلمانوں کا حاکم مقرر ہو اور ان پر کسی کو بلا استحقاق محض رعایت کے طور پر افسر بنا دے تو اس پر خدا کی لعنت ہو اور خدا اس کا کوئی عذر اور فدیہ قبول نہ فرمائے گا، یہاں تک کہ اس کو جہنم میں داخل کرے گا۔"[2]

حکام کی نگرانی

کسی حکومت کا قانون و آئین کتنا ہی مرتب و منظم کیوں نہ ہو، جب تک اس کو چلانے والوں کی نگرانی و احتساب کا اہتمام نہ ہو، تمام نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کو اپنی فطری نرم دلی اور چشم پوشی کے باوجود اکثر موقعوں پر سخت رویہ اختیار کرنا پڑا، ذاتی معاملات میں رفق و ملاطفت آپ کا شیوۂ خاص تھا لیکن مذہب اور انتظامِ ملکی میں اس قسم کی مداہنت کو کبھی روا نہ رکھتے تھے۔ یمامہ کی جنگ میں مسیلمہ کذاب کے سپہ سالار مجاعہ نے حضرت خالد بن ولید رضؓ کو دھوکا دے کر مسیلمہ کی تمام قوم کو مسلمانوں کے پنجۂ اقتدار سے بچا لیا۔ حضرت خالد رضؓ نے مجاعہ کو اس غداری کی سزا دینے کی بجائے اس کی لڑکی سے شادی کر لی، چونکہ اس جنگ میں بہت سے صحابہ رضؓ شہید ہوئے تھے۔ اس لیے حضرت خالد رضؓ کا یہ عمل آپؓ کو سخت ناگوار گزرا، چنانچہ آپ نے حضرت خالد رضؓ کو ایک سخت خط لکھا جس کے لفظ لفظ سے طبری کے قول کے مطابق خون ٹپکتا تھا، آپ نے تحریر فرمایا:

"اے خالد رضؓ بن ولید! تمہیں کیا ہوا؟ تم عورتوں سے نکاح کرتے پھرتے ہو، حالانکہ تمہارے خیمہ کے سامنے بارہ سو مسلمانوں کا خون زمین پر پھیلا ہوا ہے جس کے خشک ہونے کی نوبت نہیں آئی۔"[3]

مالک بن نویرہ منکرِ زکوٰۃ تھا، حضرت خالد رضؓ بن ولید اس کی تنبیہ پر مامور ہوئے، لیکن انہوں نے زبانی ہدایت سے

---

[1] سیر الصحابہ رضؓ جلد اوّل خلفائے راشدین۔ [2] سیر الصحابہ رضؓ جلد اوّل خلفائے راشدین [3] ابوبکر رضؓ، صدیق اکبرؓ، مؤلفہ محمد حسین ہیکل۔

پہلے ہی اسے قتل کر ڈالا، مالک کا بھائی متمم بن نویرہ شاعر تھا۔ اس نے نہایت پُر درد مرثیہ لکھا اور ظاہر کیا کہ وہ تائب ہونے کے لیے تیار تھا مگر حضرت خالدؓ نے محض عداوت کی بناء پر اُسے قتل کر دیا۔ جب اس کی اطلاع حضرت ابوبکرؓ کو پہنچی تو آپ نے حضرت خالدؓ کو میدانِ جنگ سے واپس بلایا اور ان کی اس فعل پر سرزنش کی۔

مالی انتظام

عہدِ نبوتؐ میں صیغہ مال کا کوئی باقاعدہ محکمہ نہ تھا۔ مختلف ذرائع سے جو رقم آتی اسی وقت تقسیم کر دی جاتی۔ عہدِ صدیقی میں اگرچہ زکوٰۃ، عشر، جزیہ اور غنیمت کی آمدنی میں کافی اضافہ ہو گیا تھا تاہم حضرت ابوبکرؓ نے کوئی خزانہ قائم نہ کیا بلکہ عہدِ رسالت مآبؐ کے انتظام کو برقرار رکھا، اسلامی ضروریات میں صرف کرنے کے بعد جو کچھ بچتا اس کو بلا تفریق آزاد و غلام، ادنیٰ و اعلیٰ، مرد اور عورت عام مسلمانوں میں تقسیم کر دیا جاتا، چنانچہ خلافت کے پہلے سال حضرت ابوبکرؓ نے دس دس درہم اس اصول کے تحت تقسیم کیے، دوسرے سال بیس بیس درہم مرحمت فرمائے۔ اس مساوات پر ایک شخص نے اعتراض کیا، تو فرمایا:

"فضل و منقبت اور شے ہے، اس کو رزق کی کمی بیشی سے کوئی علاقہ نہیں۔"

آخر عہدِ خلافت میں آپ نے بیت المال کے لیے ایک عمارت تعمیر کرائی، لیکن اس میں کبھی کسی بڑی رقم کے جمع کرنے کی نوبت نہ آئی، اسی لیے اس کی حفاظت کا بھی کوئی انتظام نہ تھا۔ ایک مرتبہ کسی نے کہا کہ اے خلیفۂ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم)، آپ بیت المال کی حفاظت کے لیے کوئی محافظ کیوں مقرر نہیں فرماتے؟ جواب دیا، اس بیت المال کی حفاظت کے لیے ایک قفل کافی ہے، اکثر ایسا ہوتا کہ رقم تقسیم کرنے کے بعد بیت المال میں جھاڑو دِ پھروا دیتے، اور یہ اسی بات کا نتیجہ تھا کہ آپ کی وفات کے بعد جب حضرت عمرؓ نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ، حضرت عثمانؓ اور دوسرے صحابہؓ کو ساتھ لے کر بیت المال کا جائزہ لیا تو صرف ایک درہم نکلا۔

فوجی نظام

عہدِ نبوتؐ میں کوئی باضابطہ فوجی نظام نہ تھا۔ جب ضرورت پیش آتی، تو مسلمان خود ہی جوشِ جہاد جمع ہو جاتے تھے۔ عہدِ صدیقیؓ میں بھی یہی صورتِ حال قائم رہی البتہ اتنا اضافہ ضرور ہوا کہ ضرورت کے لحاظ سے فوج قبائل اور دستوں پر تقسیم کر دی گئی جن پر علیحدہ علیحدہ افسر ہوتے تھے اور ان سب پر ایک امیر العسکر ہوتا تھا۔ چنانچہ شام کی طرف جو فوج روانہ ہوئی، اس میں اسی طریقہ پر عمل کیا گیا۔

فوجوں کو رخصت کرتے وقت ان کی اخلاقی نگہداشت کے لیے مفید ہدایات فرماتے تھے، چنانچہ ملکِ شام پر فوج کشی ہوئی تو افسرانِ فوج سے یہ باتیں ارشاد فرمائیں:

"تم ایک ایسی قوم کو پاؤ گے جنہوں نے اپنے آپ کو خدا کی عبادت کے لیے وقف کر دیا ہے، ان کو چھوڑ دینا، میں تم کو دس وصیتیں کرتا ہوں، کسی عورت، بچے اور بوڑھے کو قتل نہ کرنا، پھل دار درختوں کو نہ کاٹنا، کسی آباد جگہ کو ویران نہ کرنا، کھانے کے سوا بکری یا اونٹ کو بیکار ذبح نہ کرنا، نخلستان نہ جلانا، مالِ غنیمت میں غبن نہ کرنا اور بزدلی نہ دکھانا۔"

حضرت ابوبکرؓ نے سامانِ جنگ کی فراہمی کے لیے یہ انتظام فرمایا تھا کہ مختلف ذرائع سے جو آمدنی ہوتی تھی۔ اس کا ایک معقول حصہ فوجی اخراجات کے لیے علیحدہ نکال لیتے تھے، جس سے اسلحہ اور بار برداری کے جانور خریدتے تھے، مزید جہاد کے اونٹوں اور گھوڑوں کی

پرورش کے لیے بعض چراگاہیں مخصوص کر دی تھیں۔

ذمیوں کے حقوق کی نگہداشت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آخر وقت ذمیوں کے حقوق کی حفاظت کی بڑی تاکید فرمائی تھی، اس لیے حضرت ابوبکرؓ ان کا بڑا خیال رکھتے تھے، چنانچہ عہدِ رسالت مآب میں ان کے جو حقوق متعین ہو چکے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں بھی اُن کو وہی حقوق حاصل رہے، اہلِ حیرہ سے جو معاہدہ ہوا اُس کے الفاظ یہ تھے :

" ان کی خانقاہیں اور گرجے منہدم نہ کیے جائیں گے اور نہ کوئی ایسا قصر گرایا جائے گا جس میں وہ ضرورت کے وقت دشمنوں کے مقابلے میں قلعہ بند ہوتے ہوں، ناقوس (ادر گھنٹے بجانے) کی ممانعت نہ ہوگی اور تہوار کے موقعوں پر صلیب نکالنے سے روکے نہ جائیں گے۔" [1]

جزیہ کی شرح اگرچہ نہایت آسان تھی۔ تاہم اس میں سے بھی بکثرت ذمی مستثنےٰ کر دیے جاتے تھے۔ چنانچہ حیرہ کے سات ہزار باشندوں میں سے ایک ہزار بالکل مستثنیٰ تھے، باقی سے دس دس درہم سالانہ لیا جاتا تھا اور اپاہج اور نادار ذمیوں کی کفالت بیت المال کے ذمہ تھی۔

تحفظِ دین

تاریخ ادیانِ عالم کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مذاہب کے مسخ ہو جانے کی اصل وجہ وہ بدعات ہیں جو رفتہ رفتہ جزوِ مذہب ہو کر ایسی صورت اختیار کر لیتے ہیں کہ مذہب کی صحیح تعلیم اور متبعین کی جدت طرازیوں میں امتیاز و تفریق بھی مشکل ہو جاتی ہے۔ حضرت ابوبکرؓ کے عہدِ خلافت میں اگرچہ ایسی صورت کم ہی پیش آئی تاہم جب کسی بدعت کا ادنیٰ شائبہ بھی نظر آیا۔ فوراً اس کا تدارک فرمادیا۔ اس میں احتیاط کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ کتابی صورت میں قرآن حکیم کی تدوین سے محض اس بنا پر تأمل ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا نہیں فرمایا۔ اسی طرح حج کے موقعہ پر آپ کو معلوم ہوا کہ قبیلہ احمس کی ایک عورت اس وجہ سے کسی سے گفتگو نہیں کرتی کہ اس نے خاموش حج کا ارادہ کیا ہے۔ یہ سن کر آپ اُس کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا :

" یہ جاہلیت کا طریقہ ہے، اسلام میں جائز نہیں، تم اس سے باز آؤ اور بات چیت کرو۔"

اس نے کہا آپ کون ہیں ؟ بولے، " ابوبکرؓ۔"

خدمتِ حدیث

قرآن حکیم کے متفرق اجزاء کی تدوین کے علاوہ ایک روایت کے مطابق، آپ نے پانچ سو احادیث بھی جمع فرمائی تھیں، لیکن وفات سے کچھ دن پہلے سے ضائع کر دیا کہ شاید اس میں کوئی روایت خلافِ واقعہ ہو اور اس کی ذمہ داری ان کے ذمہ رہ جائے، چنانچہ احادیث کے متعلق نہایت حزم و احتیاط سے کام لیتے تھے اور جب کبھی کسی روایت کی پوری طرح تصدیق ہو جاتی تھی تو بغیر کسی پس و پیش کے اسے قبول فرما لیتے تھے۔

اہلِ سیر کے مطابق دربارِ خلافت میں ایک دفعہ دادی کی وراثت کا جھگڑا پیش ہوا۔ قرآن حکیم چونکہ اس بارہ میں خاموش ہے اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا طرزِ عمل دریافت کرنا پڑا۔ حضرت مغیرہؓ بن شعبہ موجود تھے۔ انہوں نے کہا میں جانتا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دادی کو چھٹا حصہ دیتے تھے، اس پر احتیاطاً پوچھا " کوئی گواہ پیش کر سکتے ہو" حضرت محمدؓ بن مسلمہؓ نے کھڑے ہو کر حضرت مغیرہؓ کے بیان کی تصدیق کی، چنانچہ آپ نے اُسی وقت حکم نافذ کر دیا۔

---

[1] کتاب الخراج

محکمہ افتا حضرت ابوبکرؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں مسائلِ فقہ کی تحقیق و تنقید اور عوام کی سہولت کے پیشِ نظر افتا کا ایک محکمہ قائم کر دیا تھا اور حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ، حضرت معاذؓ بن جبل، حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت زیدؓ بن ثابت جیسے صحابہؓ جو اپنے علم و اجتہاد کے لحاظ سے تمام صحابہؓ میں منتخب تھے اس خدمت پر معمور تھے، اُن کے علاوہ کسی دوسرے کو فتویٰ دینے کی اجازت نہ تھی۔

تین چیزوں کی تمنا مورخ طبری کے بیان کے مطابق حضرت ابوبکرؓ فرمایا کرتے کہ جو چیزیں مجھ سے چھوٹ گئی ہیں وہ یہ ہیں۔

- کاش کہ جب اشعث میرے سامنے لایا گیا تھا، میں اس کی گردن مار دیتا، کیونکہ بعد میں میں نے دیکھا کہ جو برا کام اس کو نظر آتا ہے وہ اس کا معاون بن جاتا ہے۔
- کاش کہ جب حضرت خالدؓ بن ولید کو شام کی طرف بھیجا تھا۔ اس وقت حضرت عمرؓ کو عراق کی طرف بھیج دیتا اور اس طرح اپنے دونوں ہاتھ راہِ خدا میں پھیلا دیتا (یہ کہہ کر آپ نے دونوں ہاتھ پھیلا دیے)
- کاش کہ جب حضرت خالدؓ بن ولید کو مرتدین کے مقابلہ پر روانہ کیا تھا۔ اس وقت میں ذی القصہ میں جا کر قیام کرتا۔ اگر مسلمان فتح یاب ہوتے تو خیر الصورت دیگر میں مقابلہ کے درپے ہوتا یا معاون بن جاتا۔[1]

تین چیزیں آنحضرت صلعم سے پوچھنے کی آرزو حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا:

- کاش میں حضورؐ سے پوچھ لیتا کہ یہ امارت کسے ملنی چاہیے تاکہ پھر کسی کو نزاع کا موقعہ نہ ملتا۔
- کاش میں حضورؐ سے پوچھ لیتا کہ کیا انصار کے لیے اس حکومت میں کچھ حصہ ہے۔
- اور کاش میں آپؐ سے بھتیجی اور پھوپھی کی میراث کے متعلق دریافت کر لیتا، کیونکہ میرے دل میں اس بارہ میں بے اطمینانی ہے۔[2]

علمی کمالات خطابت حضرت ابوبکرؓ نے اگرچہ کسی مکتب میں باقاعدہ زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا تھا۔ تاہم دربارِ نبوتؐ کی حاشیہ نشینی اور فطری جودتِ طبع کی بناء پر آسمانِ فضل و کمال پر مہرِ درخشاں ہو کر چمکے، آپ فصاحت و بلاغت میں حد درجہ کمال رکھتے اور صحابہؓ میں سب سے بڑے خطیب تھے۔ حضرت ابوبکرؓ کے خطبہ میں بلاغت کے ساتھ ساتھ متانت، سنجیدگی اور وقار پایا جاتا تھا اور آپ اس قدر برجستہ تقریر کر سکتے تھے کہ بڑے بڑے بلغاء حیران رہ جاتے تھے۔ حضرت عمرؓ خطیب بے بدل تھے، تاہم جب سقیفہ بنو ساعدہ میں خطبہ دینے کے لیے آمادہ ہوئے تو چند بلیغ جملے سوچ لیے اور اس خیال سے عجلت کرنی چاہی کہ کہیں حضرت ابوبکرؓ اپنی تقریر میں ان جملوں کو ادا نہ کر دیں، لیکن جب ابوبکرؓ نے انہیں روک کر تقریر شروع کی تو حضرت عمرؓ نے خود اعتراف کیا۔ حضرت ابوبکرؓ ایسا بولے جیسے بہت بڑا بلیغ شخص بول سکتا ہے۔" حضرت ابوبکرؓ کی خاص خاص موقعوں پر معرکۃ الآرا تقاریر کے علاوہ عام تقریریں بھی نہایت پُر اثر

---

[1] تاریخ طبری حصہ دوم خلافت راشدہ [2] ایضاً

ہوتی تھیں، دورانِ تقریر میں آپ پر اکثر رقت طاری ہوجاتی اور سُننے والے بھی اس تاثیر سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتے، ایک تقریر کے چند فقرے یہاں نقل کیے جاتے ہیں، جن سے ان کی وجد آور کیفیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

"آج وہ حسین اور روشن اور وفورِ شباب سے حیرت میں ڈالنے والے چہرے کہاں ہیں؟ آج بڑے بڑے شہروں کو بسانے والے اور اُن کو قلعہ بند کرنے والے سلاطین کدھر گئے؟ آج بڑے بڑے غالب آنے والے مردِ میدان شور مے کیا ہوئے؟ زمانہ کی گردشوں نے ان کی قوتیں لپیٹ کر دیں، اور اُن کے بازو توڑ دیے اور قبر کی تاریکی میں ہمیشہ کے لیے سو گئے۔" [1]

طرزِ ادا حضرت ابوبکرؓ کی طرزِ ادا نہایت بلیغ تھی اور اُس کا اثر لوگوں پر شدت سے پڑتا تھا، وفاتِ نبوی کی خبر صحابہؓ کے کانوں کو نامانوس معلوم ہوتی تھی۔ لیکن جب حضرت ابوبکرؓ نے اس کو بلیغ پیرایہ میں ادا کرتے ہوئے فرمایا:

"ہاں جو شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کرتا تھا اُس کو معلوم ہونا چاہیے کہ محمد صلعم انتقال فرما گئے، اور جو خدا کی عبادت کرتا تھا وہ سُن لے کہ خدا زندہ ہے، کبھی نہیں مرے گا۔"

تو صحابہؓ کی حالت یہ ہوئی کہ۔ "چیخ چیخ کر رونے لگے۔" اور سب کو آنحضرت صلعم کی وفات کا یقین ہوگیا۔

تعبیر خواب کی تعبیر میں حضرت ابوبکرؓ کو خدا داد ملکہ تھا۔ اس فن میں آپ نے یہ کمال حاصل کیا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ کرامؓ آپ کو سب سے بڑا معبر سمجھتے اور اپنا اپنا خواب بیان کر کے تعبیر پوچھا کرتے تھے، ایک دفعہ حضرت خالدؓ بن سعید نے قبولِ اسلام سے پہلے خواب دیکھا کہ وہ دہکتی ہوئی آگ کے کنارے کھڑے ہیں اور ان کے والدین ان کو اس میں جھونک رہے ہیں، اسی اثناء میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاتے ہیں اور اُن کو کمر سے پکڑ کر کھینچ لیتے ہیں، حضرت ابوبکرؓ نے ان کا خواب سُن کر فرمایا "خالدؓ تمہیں اس کے ذریعہ سے راہِ حق کی ہدایت کی گئی ہے، تمہارا باپ تم کو کفر پر مجبور کرتا ہے لیکن آنحضرت صلعم کی اتباع تمہاری نجات کا باعث ہوگی۔"

حضرت عائشہؓ صدیقہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے کچھ پہلے خواب میں تین چاند اپنے حجرے میں گرتے ہوئے دیکھے، انہوں نے حضرت ابوبکرؓ سے اس کا تذکرہ کیا، آپ اس وقت تو خاموش رہے، لیکن جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوا اور وہ ان کے حجرہ میں مدفون ہوئے تو فرمایا "عائشہؓ، یہ تمہارے حجرہ کا پہلا اور سب سے بہتر چاند ہے۔"

نسب دانی علم الانساب یعنی قبائل کا نام و نسب یاد رکھنا۔ اس زمانہ کا بڑا مایۂ ناز علم تھا اور حضرت ابوبکرؓ اس میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ اس میں آپ کو وہ رُتبہ حاصل تھا کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اعتراف فرماتے تھے۔

ایک دفعہ ازواجِ مطہرات نے حضرت زینبؓ بنتِ جحش کو وکیل بنا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں بھیجا کہ

---

[1] سیر الصحابہؓ جلد اوّل خلفائے راشدین

حضرت عائشہ رضؓ کے معاملہ میں عدل سے کام لیں، انہوں نے نہایت بلند آہنگی سے اپنے مقصد کا اظہار کیا۔ حضرت عائشہ رضؓ بیٹھی تھیں اُن پر حملے شروع کیے، یہاں تک کہ سخت گفتگو کی نوبت آئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضؓ کی طرف دیکھا۔ انہوں نے مرتبی پاکر اس قدر مدلل تردید کی کہ حضرت زینب رضؓ خاموش ہو کر رہ گئیں، اُس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضؓ کی طرف دیکھ کر فرمایا "کیوں نہ ہو آخر ابوبکر رضؓ کی بیٹی ہے۔"

حضرت ابوبکر رضؓ کی نسب دانی سے اکثر موقعوں پر اسلام کو بھی فائدہ پہنچا، آغازِ نبوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تبلیغ و اشاعت کے لیے قبائل عرب میں تشریف لے جاتے، تو عموماً حضرت ابوبکر رضؓ بھی ساتھ ہوتے اور اپنی نسب دانی کے باعث حضورؐ کا لوگوں سے تعارف کراتے تھے۔

شاعری

شاعری اہلِ عرب کی عام خصوصیت تھی اور حضرت ابوبکر رضؓ بھی اس وصف سے خالی نہ تھے۔ ابتداء میں آپ کو شاعری کا ذوق بھی تھا، مگر اسلام کے بعد ترک کر دیا تھا اور صرف ایسے اشعار سے دلچسپی رہ گئی تھی جس میں خدا کی عظمت و جلالت کا ذکر ہوتا تھا، تاہم کبھی کبھی جذبات و خیالات خود بخود نظمِ موزوں کے قالب میں ڈھل جاتے۔ چنانچہ ہجرت کے بعد جب مدینہ میں قیام کیا اور بخار میں مبتلا ہوئے تو یہ شعر زبان پر جاری تھا۔

کل امرئ مصبح فی اھلہ　　والموت ادنٰی من شراک نعلہ

(یعنی) صبح کے وقت گھر کے لوگ آدمی کو سلامتی کی دعا دیتے ہیں۔ حالانکہ موت اس کے جوتے کے تسمے سے بھی زیادہ قریب ہوتی ہے۔

یہ شعر اس وقت پڑھتے جب بخار چڑھتا تھا۔

امامت و اجتہاد فقاہت

تمام علومِ اسلامیہ کا مرکز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس ہے۔ حضورؐ کے بعد یہ درجہ حضرت ابوبکر رضؓ کو حاصل ہوا جو صحابہ رضؓ میں سب سے زیادہ پیغمبرِ خاتم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت و رفاقت میں رہے تھے۔

امامت و اجتہاد کے لیے سب سے ضروری شرط فقاہت ہے اور اس وصف میں حضرت ابوبکر رضؓ اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ رحلت سے ایک دو دن قبل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضؓ سے جب خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"خدا نے ایک بندہ کو اختیار عطا فرمایا ہے کہ خواہ وہ دنیا کی نعمتوں کو قبول کرے یا خدا کے پاس (آخرت میں) جو کچھ ہے اس کو قبول کرے، لیکن اس نے خدا ہی کے پاس کی چیزیں قبول کیں۔"[1]

تو حاضرین اس ارشادِ نبوت سے کوئی نتیجہ نہ نکال سکے، بلکہ یہ خیال کرتے رہے کہ حضورؐ تو کسی شخص کا واقعہ بیان فرما رہے ہیں لیکن حضرت ابوبکر رضؓ صدیق رو پڑے، کیونکہ رازدارِ نبوت رضؓ سمجھ گئے تھے کہ بندہ سے مراد خود سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور یہ موت کی طرف

---

[1] سیرۃ النبی حصّہ دوم

اشارہ ہے، اسی بناء پر حضرت ابو سعید خدری رضؓ فرماتے ہیں :۔

"اور ابو بکر رضؓ ہم سب میں سے زیادہ عالم تھے۔"

علم تفسیر

حضرت ابو بکر صدیق رضؓ کو چونکہ سفر و حضر، خلوت و جلوت، جنگ و صلح غرض ہر موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت کا شرف حاصل تھا اور آپ تمام امور میں سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے مشیرِ خاص تھے۔ اس لیے اسلامی علوم و فنون میں بھی قدرۃً آپ کا پایہ سب سے بلند تھا۔ کلامِ الٰہی اسلام کا اصل الاصول ہے اور حضرت ابو بکر رضؓ اس سے غیر معمولی شغف کے باعث عموماً رسول عبداً صلعم سے آیاتِ قرآن کی تفسیر پوچھا کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ آپ ہر آیت کے شانِ نزول اور اس کے حقیقی مفہوم سے آگاہ تھے اور آیاتِ قرآن سے استدلال، استنباطِ احکام اور تفریع مسائل میں مجتہدانہ ملکہ رکھتے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد آپ نے جو تقریر فرمائی اور اس میں برجستہ قرآن حکیم کی آیت

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ج قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ط اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ط

یعنی محمدؐ صرف رسولؐ ہیں اور ان سے پہلے بھی بہت سے رسول گزر چکے ہیں، کیا اگر وہ مرجائیں یا شہید ہوں تو تم اُلٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟"

(آلِ عمران آیت ۱۴۴)

سے انبیاء کی وفات پر استدلال لائے تو یکایک لوگوں کے ایمان و اعتقاد کے متزلزل ستونوں کو مستحکم کر دیا اور انہیں ایسا معلوم ہوا کہ گویا یہ آیت پہلے موجود ہی نہ تھی۔

خلافتِ صدیقی پر اشاراتِ نبویؐ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اگرچہ صراحۃً کسی شخص کو خلیفہ نہیں بنایا تھا، تاہم حضورؐ نے متعدد بار جو عظمتیں حضرت ابو بکر رضؓ کو بخشیں انہیں ذیل میں حضرت ابو بکر رضؓ کی خلافت کے متعلق اشارات کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

- حضورؐ نے حضرت ابو بکر رضؓ کو غار کی رفاقت کے لیے منتخب فرمایا اور ہجرت میں ساتھ رکھا۔
- مدینہ میں داخلہ کے وقت وہ حضورؐ کے اونٹ پر آپؐ کے پیچھے بیٹھے ہوئے تھے اور مشترک طور پہ جلوس نکل رہا تھا۔
- غزوہ بدر میں حضرت ابو بکر رضؓ اس قبہ میں آنحضرت صلعم کے ساتھ موجود تھے جو حضورؐ کے لیے بنایا گیا تھا۔
- سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد سرایا پر ان کو امیر بنایا۔
- ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب بیان فرمایا کہ میں ایک حوض پہ لوگوں کو پانی پلا رہا ہوں پھر ابو بکر رضؓ آئے انہوں نے میرے ہاتھ سے ڈول لے لیا اور ایک یا دو ڈول کھینچے، اُن کے کھینچنے میں کمزوری پائی جاتی تھی، خدا اُن کی مغفرت کرے۔
- ایک بار حضورِ سرورِ دوعالم صلعم کی خدمت میں ایک عورت آئی، آپؐ نے فرمایا، پھر آنا، وہ بولی، اگر میں آؤں اور آپؐ نہ ملیں (یعنی وفات پا جائیں) ارشاد ہوا، اگر مجھ سے ملاقات نہ ہو تو ابو بکر رضؓ کے پاس آنا۔
- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سنہ ۹ھ میں حضرت ابو بکر رضؓ کو امیر الحاج کا منصب عطا فرمایا۔

- حضورؐ نے اپنے زمانۂ علالت میں انہیں باضابطہ امامِ نماز مقرر فرمایا اور حضرت ابُوبکرؓ نے ان دنوں میں سترہ نمازوں کی امامت کی۔
- زمانۂ علالت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خطبہ ارشاد فرمایا، اس میں حضرت ابوبکرؓ کو اپنا اسلامی بھائی فرمایا اور ان کے دروازے کے سوا تمام دروازے بند کرنے کا حکم دیا۔
- آغازِ علالت میں حضورؐ نے حضرت عائشہؓ سے یہ بھی ارشاد فرمایا:۔

"میں نے ارادہ کیا تھا کہ ابوبکرؓ اور اُن کے بیٹے کو بلاکر خلافت کی وصیت کروں۔ شاید کوئی مدعی یا آرزو مند پیدا ہو جائے، لیکن پھر میں نے کہا کہ خود خدا اور مسلمان (حضرت ابوبکرؓ کے سوا) کسی کو پسند نہ کریں گے۔" [1]

اِن واقعات کو صحابہ کرامؓ چونکہ خلافت کے اشارات سمجھتے تھے، اس لیے جب انتخاب کا وقت آیا، تو مسلمانوں نے بغیر کسی تذبذب اور پس و پیش کے حضرت ابوبکرؓ کو خلیفۂ رسولؐ تسلیم کر لیا اور مکمل اعتماد و یقین کے ساتھ اپنے معاملات کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں دے دی، (رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

جامع المناقب

ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

جو شخص ایک جوڑا راہِ خدا میں خرچ کرے گا، اس کو جنت کے دروازوں سے آواز دی جائے گی "اے خدا کے بندے یہ نیکی ہے" جو شخص نماز گزار ہوگا وہ باب الصلوٰۃ سے بلایا جائے گا، جو مجاہد ہوگا، باب الجہاد سے بلایا جائے گا جو روزہ دار ہوگا باب الریان سے بلایا جائے گا اور جو مُخیر ہوگا اس کو باب الصدقہ سے آواز دی جائے گی۔"

یہ سُن کر حضرت ابوبکرؓ نے بارگاہِ رسالتمآبؐ میں عرض کیا:

جو ایک ہی دروازے سے بلایا جائے۔ اس کو بھی کوئی تکلیف نہ ہوگی، لیکن کیا کوئی ایسا شخص بھی ہے، جو تمام دروازوں سے بلایا جائے گا۔؟"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سُن کر فرمایا:۔

"ہاں، اور مجھے اُمید ہے کہ تم انہی لوگوں میں ہوگے۔" [2]

یہ وہ شرفِ عظیم ہے جو صحابہ کرامؓ میں صرف حضرت ابوبکر صدیقؓ کو حاصل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے نماز گزار، مُجاہد، روزہ دار اور مُخیر ہونے کا اپنی زبان مبارک سے اعتراف فرمایا۔ نماز، جہاد، روزہ اور خیرات مذہبی اعمال میں سب سے بُلند درجہ رکھتے ہیں اور جو شخص ان چاروں چیزوں کا جامع ہے وہ یقیناً اسلام کی تعلیمات کا سب سے اعلیٰ نمونہ ہی کہا جا سکتا ہے۔

---

[1] سیر الصحابہؓ جلد اوّل جزء المہاجرین۔ [2] ایضاً

سیدنا حضرت عُمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ

راجہ محمد شریف

نام و نسب اور خاندان

آپ کا نام عمرؓ، کنیت ابوحفص اور لقب فاروق تھا، والد کا نام خطاب اور والدہ کا نام حنتمہ بنتِ ہاشم بن مغیرہ تھا، پورا سلسلۂ نسب یہ ہے، حضرت عمرؓ بن خطاب بن نفیل بن عبد العزیٰ بن ریاح بن عبداللہ بن قرط بن رزاح بن عدی بن کعب بن لوی بن فہر بن مالک۔ عدی کے دوسرے بھائی مرہ تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اجداد سے ہیں، اس بنا پر حضرت عمرؓ کا سلسلۂ نسب آٹھویں پشت میں آنحضرت صلعم سے جا کر مل جاتا ہے۔

تاریخ اسلام میں حضرت عمرؓ کا خاندان بنو عدی کے نام سے مشہور ہے جو قریش کی ایک شاخ تھے۔ قریش چونکہ خانہ کعبہ کے مجاور تھے۔ اس لیے دنیاوی جاہ و جلال کے ساتھ ان کو مذہبی سیادت بھی حاصل تھی، چنانچہ انہوں نے تعلقات کی وسعت اور کام کے پھیلاؤ کے پیش نظر کعبہ کے انتظام و انصرام کو دس صیغوں میں تقسیم کر کے اپنے ہی خاندان کی دس ذیلی شاخوں یعنی ہاشم، امیہ، نوفل، عبدالدار، اسد، تیم، مخزوم، عدی، جمح اور سہم کے سپرد کر رکھا تھا، ان صیغوں میں سفارت اور ثالثی کا صیغہ بنو عدی کے پاس تھا، جس کی وجہ سے یہ خاندان ایام جاہلیت سے نہایت ممتاز تھا اور نسلاً بعد نسل یہ امتیاز حضرت عمرؓ کے خاندان میں چلا آ رہا تھا۔ ددھیال کی طرح حضرت عمرؓ ننھیال کی طرف سے بھی نہایت معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کی والدہ حنتمہ[1] ہاشم بن مغیرہ کی بیٹی تھیں اور مغیرہ اس درجہ کے آدمی تھے کہ جب قریش کسی قبیلہ سے جنگ آزمائی کے لیے جاتے تو فوج کا اہتمام انہی سے متعلق ہوتا تھا۔

ولادت اور ابتدائی حالات

مؤرخین اسلام کی تصریح کے مطابق حضرت عمرؓ ہجرت نبوی ؐ سے چالیس سال قبل پیدا ہوئے، ایام طفولیت کے حالات اگرچہ پردۂ اخفا میں ہیں اور سن رشد کے حالات بھی بہت کم معلوم ہیں، تاہم تذکروں میں اتنا ذکر ضرور ملتا ہے کہ اس عمر میں اونٹوں کے چرانے کی خدمت آپ کے سپرد تھی اور آپ کے والد خطاب اس ضمن میں آپ سے بہتر سلوک نہ کرتے تھے، آپ پورا پورا دن اونٹ چراتے رہتے اور جب کبھی تھک کر دم لینا چاہتے تو خطاب سزا دیتے جس میدان میں حضرت عمرؓ کو یہ مصیبت انگیز خدمت انجام دینی پڑتی تھی۔ اس کا نام ضجنان تھا، خلافت کے زمانہ میں ایک دفعہ اس میدان سے آپ کا گزر ہوا تو مصیبت کے ان بیتے دنوں کو یاد کر کے آبدیدہ ہو گئے اور فرمایا:

"اللہ اکبر! ایک زمانہ وہ تھا کہ میں نمدہ کا کرتہ پہنے ہوئے اونٹ چرایا کرتا تھا اور تھک کر بیٹھ جاتا تو باپ سے مار کھاتا، آج یہ دن ہے کہ خدا کے سوا میرے اوپر کوئی اور حاکم نہیں[2]"

---

[1] حنتمہ حضرت خالدؓ بن ولید بن مغیرہ کی چچا زاد بہن تھیں۔ [2] الفاروق مؤلفہ علامہ شبلی نعمانی۔

جوانی کا آغاز ہوا تو ان شریفانہ مشغلوں میں مشغول ہوئے جو شرفائے عرب میں عموماً رائج تھے اور لازمۂ شرافت خیال کیے جاتے تھے۔ ان میں نسب دانی، پہلوانی، سپہ گری اور مقرری سرفہرست تھیں، حضرت عمرؓ نے ان مشغلوں میں مہارت پیدا کی اور شہسواری میں خصوصیت سے کمال حاصل کیا۔ اس زمانہ میں آپ نے لکھنا پڑھنا بھی سیکھ لیا تھا، چنانچہ آپ ان لوگوں میں سے ایک تھے جو ایام جاہلیت میں لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔

ان فنون سے فارغ ہونے کے بعد آپ تلاش معاش کی طرف متوجہ ہوئے۔ عرب میں چونکہ لوگوں کا ذریعۂ معاش زیادہ تر تجارت تھا، اس لیے آپ نے بھی یہی شغل اختیار کیا اور اس سلسلہ میں دور دور کے ممالک کا سفر کیا۔ اس سے آپ کو بڑے تجربات اور فوائد حاصل ہوئے۔ چنانچہ آپ کی خودداری، بلند حوصلگی، تجربہ کاری اور معاملہ فہمی انہی سفروں کا نتیجہ تھی اور یہی وہ اوصاف تھے جن کے باعث قریش نے آپ کو سفارت کے منصب پر مامور کر دیا تھا۔ مورخین کے مطابق جب کبھی قبائل میں کوئی پیچیدگی پیدا ہو جاتی تو آپ ہی سفیر بن کر جاتے اور اپنے غیر معمولی تجربہ اور فہم و تدبر سے ان پیچیدگیوں کو رفع کر دیتے۔

قبولِ اسلام

جس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے اور مکہ کی گھاٹیوں سے صدائے توحید بلند ہوئی اس وقت حضرت عمرؓ ستائیس سال کے تھے، یہ آواز چونکہ حضرت عمرؓ کے لیے بالکل نامانوس تھی، اس لیے آپ سخت برہم ہوئے اور جس کے متعلق یہ معلوم ہو جاتا کہ وہ مسلمان ہو گیا ہے اس کے دشمن بن جاتے، آپ کے خاندان کی ایک کنیز جن کا نام لبینہؓ تھا اس کو قبول اسلام کی وجہ سے اس قدر مارتے، کہ جب مارتے مارتے تھک جاتے تو کہتے کہ ذرا دم لے لوں پھر ماروں گا، ان کے سوا اور جس پر قابو چلتا زدوکوب سے دریغ نہ کرتے تھے۔

تاریخ و سیر کی کتابوں میں اگرچہ حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کی تفصیلات میں اختلاف ہے، تاہم ایک مشہور واقعہ جس کو ارباب سیر نے بالوضاحت لکھا ہے وہ یہ ہے کہ جب حضرت عمرؓ اپنی انتہائی سختیوں کے باوجود ایک شخص کو اسلام سے برگشتہ نہ کر سکے تو مجبور ہو کر (نعوذ باللہ) خود بانیٔ اسلام کا قصہ پاک کرنے کا فیصلہ کیا اور کمر سے تلوار باندھ کر سیدھے کاشانۂ نبوت کی طرف چل دیے، راستہ میں اتفاقاً نعیم بن عبداللہ مل گئے، انہوں نے حضرت عمرؓ کے تیور دیکھ کر پوچھا "خیر تو ہے"؟ بولے "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا فیصلہ کرنے جاتا ہوں۔ انہوں نے کہا "پہلے اپنے گھر کی خبر لو، خود تمہاری بہن اور بہنوئی اسلام لا چکے ہیں"[۱] یہ سن کر فوراً پلٹے اور بہن کے ہاں پہنچے، وہ قرآن حکیم پڑھ رہی تھیں، ان کی آہٹ پا کر چپ ہو گئیں اور قرآن کے اجزا چھپا لیے لیکن آواز چونکہ ان کے کانوں میں پڑ چکی تھی، اس لیے بہن سے پوچھا: "یہ کیسی آواز تھی" انہوں نے کہا کچھ نہیں، بولے، میں سن چکا ہوں کہ تم دونوں مرتد ہو گئے ہو، یہ کہہ کر بہنوئی سے دست و گریبان ہو گئے، اور جب آپ کی بہن فاطمہ اپنے خاوند کو بچانے کے لیے آئیں تو ان کی بھی خبر لی، یہاں تک کہ ان کا جسم لہولہان ہو گیا۔ ایسی حالت میں اُن کی زبان سے نکلا "عمر جو بن آئے کرو، لیکن اسلام اب دل سے نہیں نکل سکتا"[۲] ان الفاظ نے حضرت عمرؓ کے دل پر خاص اثر کیا، بہن کی طرف محبت کی نگاہ سے دیکھا۔ ان کے جسم سے خون جاری تھا۔ یہ دیکھ کر اور بھی رقت طاری ہوئی، فرمایا "تم لوگ جو پڑھ رہے تھے مجھے بھی سناؤ" فاطمہ بنت الخطاب نے قرآن کے اجزا

---

[۱] الفاروق مؤلفہ علامہ شبلی نعمانی [۲] سیر الصحابہؓ جلد اول خلفائے راشدین۔

لاکر سامنے رکھ دیئے آپ نے اپنی بہن کی درخواست پر وضو کر کے اجزا اُٹھا کر کھولے تو یہ سورۃ تھی :۔

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿سورہ الحدید آیت ۱﴾ زمین اور آسمان میں جو کچھ ہے سب خدا کی تسبیح پڑھتے ہیں، وہ غالب اور حکمت والا ہے۔

ایک ایک لفظ پر دل مرعوب ہوتا جاتا تھا، یہاں تک کہ جب اس آیت پر پہنچے :

اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ سُورہ الحدید آیت ۲۱ خدا اور اس کے رسولؐ پر ایمان لاؤ۔

تو بے اختیار پکار اٹھے :

اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۔

یہ وہ زمانہ تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خانۂ ارقم میں پناہ گزین تھے، جو کوہِ صفا کے نیچے واقع تھا، حضرت عمرؓ نے آستانہ مبارک پر پہنچ کر دستک دی، چونکہ شمشیر بکف تھے اس لیے صحابہ کرامؓ کو تردّد ہوا لیکن حضرت حمزہ جیسے مرد جری نے کہا "آنے دو مخلصانہ آیا ہے تو بہتر ورنہ اسی کی تلوار سے اس کا سر قلم کر دیا جائے گا۔" حضرت عمرؓ نے قدم آگے رکھا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود آگے بڑھے اور ان کا دامن پکڑ کر فرمایا "کیوں عمرؓ کس ارادے سے آئے ہو" نبوتؐ کی پُرجلال آواز نے انہیں کپکپا دیا۔ نہایت خضوع کے ساتھ عرض کی "ایمان لانے" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیساختہ اللہ اکبر پکار اُٹھے اور ساتھ ہی تمام صحابہؓ نے مل کر اس زور سے اللہ اکبر کا نعرہ مارا کہ مکہ کی تمام پہاڑیاں گونج اٹھیں[1]۔

یہی روایت تھوڑے سے تغیر کے ساتھ دیگر محدثین نے حضرت انسؓ سے روایت کی ہے، اگر فرق ہے تو صرف اس قدر کہ بعض کے نزدیک قرآن کے اجزا کھولتے وقت سورہ الحدید کی مندرجہ بالا آیت سامنے آئی تھی اور بعض کے مطابق سورہ طٰہٰ کی یہ آیت

اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ ۙ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ﴿سورہ طٰہٰ آیت ۱۴﴾ مَیں ہوں خدا کوئی نہیں معبود لیکن مَیں، تو مجھ کو پوجو اور میری یاد کے لیے نماز کھڑی کرو۔

مؤرخین نے حضرت عمرؓ کے قبول اسلام کے متعلق یہ وضاحت بھی کی ہے کہ ان کا اسلام لانا دراصل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دُعا کا نتیجہ تھا جو آپؐ نے خصوصیت سے ابوجہل اور حضرت عمرؓ کے متعلق فرمائی تھی۔ یعنی خدایا، اسلام کو ابوجہل یا عمرؓ بن الخطاب سے معزز کر۔ لیکن یہ دولت چونکہ قاسم ازل نے حضرت عمرؓ کی قسمت میں لکھ دی تھی، اس لیے ابوجہل محروم رہا، بہرکیف سرورِ دوعالم صلعم کی اس دُعا کا اثر یہ ہوا کہ کچھ دنوں بعد اسلام کا سب سے بڑا دشمن اس کا سب سے بڑا دوست اور جاں نثار بن گیا، یعنی حضرت عمرؓ کا خالی دامن دولتِ ایمان سے بھر گیا اور وہ ایک سچے مسلمان کی حیثیت سے ہمیشہ کے لیے معزز و محترم ہو گئے۔ (ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ)

حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کا واقعہ نبوتؐ کے چھٹے سال کا ہے، تمام مؤرخین اس حقیقت کے برملا معترف ہیں کہ حضرت

---

[1] سیرۃ النبی، جلد اوّل۔

عمرؓ کے ایمان لانے سے اسلام کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ اس وقت تک اگرچہ چالیس پچاس آدمی دولتِ ایمان سے بہرہ ور ہو چکے تھے اور عرب کے مشہور بہادر حضرت حمزہؓ سید الشہداء نے بھی اس واقعہ سے تین روز قبل اسلام قبول کر لیا تھا، تاہم قریش مکہ کے ڈر سے مسلمان علانیہ اپنے مذہبی فرائض ادا نہ کر سکتے تھے اور کعبہ میں نماز پڑھنا تو بالکل ناممکن تھا، لیکن حضرت عمرؓ کے اسلام کے ساتھ ہی یہ حالت دفعتہً بدل گئی۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ علانیہ اپنا اسلام ظاہر کیا، بلکہ مشرکین کو جمع کر کے بآواز بلند اپنے ایمان کا اقرار کیا جس پر مشرکین نہایت برافروختہ ہوئے اور شدت پر اُتر آئے۔ حضرت عمرؓ برابر ثابت قدمی کے ساتھ اُن کا مقابلہ کرتے رہے۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ آپ نے کعبہ میں جا کر نماز ادا کی، یہ پہلا موقع تھا کہ باطل کے مقابلہ پر حق سربلند ہوا، کفر کی بنیادیں ہل گئیں اور شرک کو پیغامِ موت ملا۔ حضرت عمرؓ کے لیے اس سے بڑھ کر کیا فخر ہو سکتا ہے کہ آپ کا اسلام اعلاءِ کلمۃ اللہ، غلبۂ ایمان، نصرتِ توحید، اشاعتِ حق اور ازالۂ کفر کا سبب ثابت ہوا اور آپ دربارِ نبوت سے فاروق (یعنی حق و باطل میں فرق کرنے والا) کے لقب سے نوازے گئے (رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

ہجرت

مکہ میں جس رفتار سے اسلام مقبول ہوتا جا رہا تھا اسی رفتار سے مشرکینِ قریش کے بغض و عناد میں اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ اپنی فطری خونخواری اور مشرکانہ عقائد کی بنا پر توحید پرستوں کو اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنا رہے تھے اور ہر ممکن طریقہ سے اسلام کے استیصال میں سرگرمِ عمل تھے، حقیقت یہ ہے کہ اگر بادہ کشانِ اسلام میں غیر معمولی جوشِ ثبات اور وارفتگی کا مادہ نہ ہوتا، تو مشرکینِ مکہ کی سختیوں کے مقابلہ پر مسلمانوں کا جادۂ اسلام پر ثابت قدم رہنا ناممکن تھا۔

یہ نبوت کا تیرھواں سال تھا کہ مسلمانوں کو مدینہ کی طرف ہجرت کی اجازت ملی، چنانچہ حضرت عمرؓ اس سفر کے لیے تیار ہو گئے اور بارگاہِ نبوت سے اجازت لے کر بیس۲۰ صحابہؓ کے ساتھ مدینہ کی طرف روانہ ہوئے [1] لیکن اس میں بھی اپنی انفرادیت کو قائم رکھا اور اس شان سے یہ سفر اختیار کیا کہ مشرکینِ مکہ آپ کے راستہ میں مزاحمت کی کوئی دیوار کھڑی نہ کر سکے۔ مورخین کے مطابق پہلے آپ مسلح ہو کر مشرکین کے مجمعوں سے گزرتے ہوئے خانہ کعبہ پہنچے، نہایت اطمینان سے طواف کیا، نماز پڑھی، پھر مشرکین سے مخاطب ہو کر فرمایا:۔

"تمہارے چہرے مسخ ہو جائیں، خدا تم ہی لوگوں کی ناک کو خاک آلود کرے گا، جو شخص چاہتا ہے کہ اپنی ماں کو اپنے پیچھے روتا چھوڑے، یا اپنے بچوں کو یتیم کرے یا اپنی بیوی کو بیوہ بنائے تو اس وادی کے پیچھے میرے ساتھ لڑے۔"

حضرت علیؓ فرماتے ہیں:۔

"ان کا کسی نے پیچھا نہ کیا، البتہ کچھ کمزور مسلمان آپ کے ساتھ ہو لیے، پھر آپ روانہ ہو گئے۔" [2]

مدینہ پہنچ کر حضرت عمرؓ عوالی میں، جس کا دوسرا نام قبا ہے، حضرت رفاعہؓ بن عبدالمنذر کے مہمان ہوئے، آپ کے بعد اکثر صحابہؓ نے ہجرت کی یہاں تک کہ ۲۰ ستمبر ۶۲۲ء کو خود آفتابِ رسالتؐ مکہ کی گھاٹیوں سے نکل کر مدینہ کے افق پر ضوافگن ہوا اور نورِ اسلام سرزمینِ مدینہ پر ضیا پاشی کرنے لگا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ تشریف لانے کے بعد مہاجرین کے رہنے سہنے کا اس طرح انتظام فرمایا کہ ان میں اور انصار

---

[1] سیر الصحابہؓ جلد اوّل جزء المہاجرین [2] عمر بن خطاب مؤلفہ طنطاوی

میں برادری قائم کردی، اس موقع پر انصار نے اپنے مال و اسباب میں مہاجرین کو نصف کا شریک بنا کر ایسے ایثار کا مظاہرہ کیا جس کی مثال تاریخ عالم پیش نہیں کر سکتی، اس رشتہ کے قائم کرنے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے طرفین کے درجہ و مراتب کا خاص طور پر خیال رکھا، یعنی جو مہاجر جس رتبہ کا تھا۔ اسی حیثیت کے انصاری سے اس کی برادری قائم کی گئی تھی، چنانچہ حضرت عمرؓ کو جن کا بھائی قرار دیا اُن کا نام حضرت عتبانؓ بن مالک تھا جو قبیلہ بنو سالم کے سردار تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ تشریف لانے پر بھی جن صحابہؓ نے قباہی میں قیام رکھا، اُن میں حضرت عمرؓ بھی تھے، لیکن آپ نے بارگاہ نبوتؐ میں حاضری کے لیے یہ معمول بنا لیا تھا کہ ایک دن خود خدمت اقدس میں حاضری دیتے اور دوسرے دن اپنے دینی بھائی حضرت عتبانؓ بن مالک کو بھیجتے وہ جو کچھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنتے واپس جا کر حضرت عمرؓ سے روایت کر دیتے۔

اذان - دیباچہ نماز

مدینہ پہنچ کر جب مسلمانوں کو آزادی اور اطمینان نصیب ہوا، تو اس بات کا وقت آیا کہ اسلام کے فرائض و ارکان محدود اور معین کیے جائیں، نیز مسلمانوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ اور دور دور محلوں میں آبادی کے پیش نظر نماز کے اعلان کا ایسا طریقہ معین کیا جائے جس سے مسلمان ایک مرکز پر جمع ہو کر نماز باجماعت کا اہتمام کر سکیں چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے ادھر توجہ کی اور صحابہؓ سے اس بارہ میں مشورہ فرمایا، بعض صحابہؓ نے رائے دی کہ آگ جلا کر لوگوں کو خبر کی جائے، جبکہ بعض کا خیال تھا کہ یہودیوں اور عیسائیوں کی طرح بوق و ناقوس سے کام لیا جائے۔ بہرحال یہ مسئلہ زیر بحث تھا کہ حضرت عمرؓ آنکلے اور انہوں نے کہا کہ ایک آدمی اعلان کرنے کے لیے کیوں نہ مقرر کیا جائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسی وقت حضرت بلالؓ کو اذان کا حکم دیا[1]

یہ بات لحاظ کے قابل ہے کہ اذان نماز کا دیباچہ اور اسلام کا ایک بڑا شعار ہے، حضرت عمرؓ کے لیے اس سے بڑھ کر فخر کی کیا بات ہو سکتی ہے کہ ایسا شعار اعظم جس سے تمام عالم قیامت تک دن اور رات میں پانچ وقت توحید و رسالتؐ کے اعلان سے گونجتا رہے گا، انہی کی رائے سے قائم ہوا۔ اس ضمن میں بعض اہل سیر نے حضرت عبداللہؓ بن زید کا ذکر بھی کیا ہے کہ انہوں نے اپنے ایک خواب کی بنا پر یہ تجویز پیش کی تھی، لیکن مستند روایات کے مطابق یہ شرف حضرت عمرؓ کے علاوہ کسی اور کو حاصل نہیں ہوا

غزوات و مشاہد

مدینہ کے دوران قیام میں اہل اسلام کو سب سے پہلا عظیم معرکہ، ۱۷ رمضان المبارک سنہ ۲ھ کو پیش آیا، جو تاریخ اسلام میں غزوہ بدر کے نام سے موسوم ہے، اس معرکہ میں حضرت عمرؓ اپنی رائے تدبر اور جانبازی کے لحاظ سے ہر موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست و بازو رہے، اس جنگ میں آپ نے عاص بن ہشام بن مغیرہ کو قتل کیا جو رشتہ میں آپ کا ماموں ہوتا تھا۔ یہ بات حضرت عمرؓ کی خصوصیات میں شمار کی گئی ہے کہ اسلام کے معاملات میں قرابت اور محبت کا اثر ان پر کبھی غالب نہیں آسکتا تھا، چنانچہ یہ واقعہ اس کی پہلی مثال ہے[1] اسی طرح آپ کی خصوصیت میں یہ بھی ہے کہ غزوہ بدر کے شہید اول حضرت مہجعؓ، جنہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے "سید الشہداء" کے خطاب سے نوازا، آپ ہی کے غلام تھے، مزید برآں قریش کے تمام قبائل اس معرکہ میں شامل ہوئے، لیکن بنو عدی یعنی حضرت عمرؓ کے قبیلے میں سے ایک متنفس بھی شریک جنگ نہیں ہوا۔[2]

---

[1] الفاروق، [2] الفاروق،

اللہ کے فضل سے معرکۂ بدر میں مسلمان فتح یاب ہوئے اور دشمن کو عبرتناک شکست ہوئی۔ قریش کے کم و بیش ستّر آدمی کھیت رہے اور اسی قدر گرفتار ہوئے، اسیرانِ جنگ میں چونکہ قریش کے اکثر بڑے بڑے معزّز سردار بھی تھے، اس لیے یہ مسئلہ زیرِ بحث آیا کہ ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام صحابہؓ سے رائے لی سب نے مختلف آراء پیش کیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ یہ چونکہ اپنے ہی بھائی بند ہیں۔ اس لیے فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے۔ لیکن حضرت عمرؓ نے اس رائے سے اختلاف کیا اور کہا کہ اسلام کے مقابلہ میں رشتہ و قرابت کو دخل نہیں لہٰذا سب کو قتل کر دینا چاہیے، اور یہ بھی اس طرح کہ ہم میں سے ہر شخص اپنے عزیز کو اپنے ہاتھ سے قتل کرے۔ علیؓ، عقیل کی گردن ماریں، حضرت حمزہؓ عباس کو قتل کریں اور فلاں شخص جو میرا عزیز ہے اس کا کام میں تمام کروں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شانِ رحمت کے اقتضاء سے حضرت ابوبکرؓ کی رائے پسند فرمائی اور فدیہ لے کر چھوڑ دیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی:۔

مَاكَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِى الْاَرْضِ ؕ (سورہ انفال آیت ۶۷)

کسی پیغمبر کے لیے یہ مناسب نہیں کہ اس کے پاس قیدی ہوں جب تک وہ خون ریزی نہ کرے۔

غزوہ اُحد

غزوہ بدر کے بعد غزوہ بنی سلیم، غزوہ بنی قینقاع، غزوہ سویق، غزوہ غطفان، غزوہ نجران وغیرہ جتنے چھوٹے چھوٹے معرکے پیش آئے، سب میں حضرت عمرؓ برسرِ پیکار رہے، یہاں تک کہ شوال ۳ھ میں اُحد کا وہ معرکہ پیش آیا، جس میں قریش مکہ بدر کا انتقام لینے کے لیے غیظ و غضب کا ایک طوفان بن کر آئے تھے، ان کی جمعیت تین ہزار تھی اور بیشمار سامانِ جنگ سے لیس ہو کر مدینہ منورہ کے قریب آکر خیمہ زن ہوئے تھے۔ ان کے مقابلہ پر غازیانِ اسلام کی کل تعداد صرف سات سو تھی جس میں سے پچاس تیر اندازوں کو آنحضرت صلعم نے حضرت عبداللہ بن جبیرؓ کی ماتحتی میں ایک درہ کی نگہبانی پر متعین فرما دیا تھا کہ اُدھر سے کفار حملہ نہ کرنے پائیں۔ غرض فریقین کی عسکری قوت میں اس تفاوت کے باوجود جب ۷ شوال ۳ھ بروز ہفتہ لڑائی شروع ہوئی، تو مسلمانوں نے دشمن کی صفوں کو تہ و بالا کر دیا۔ کفار شکست کھا کر بھاگے اور مسلمان مالِ غنیمت جمع کرنے میں مصروف ہو گئے، تیر اندازوں نے قریش کی پسپائی کو معرکہ کا اختتام سمجھ کر درہ چھوڑ دیا اور وہ بھی دیگر مجاہدین کے ساتھ مالِ غنیمت سمیٹنے میں مشغول ہو گئے۔ تیر اندازوں کا ہٹنا تھا کہ خالد بن ولید نے (جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے) مسلمانوں کی غفلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دفعۃً عقب سے حملہ کر دیا، مسلمان چونکہ غافل تھے اس لیے اس ناگہانی یلغار سے سراسیمہ ہو کر ادھر اُدھر منتشر ہونے لگے، کفار نے مسلمانوں کی اس افراتفری کے پیشِ نظر خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر یورش کر دی اور اس قدر تیر اور پتھر برسائے کہ سرورِ دو عالم صلعم کے دندان مبارک شہید ہوئے، پیشانی پر زخم آئے، رخساروں پر مغفر کی کڑیاں چبھ گئیں اور حضورؐ ایک گڑھے میں گر کر لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

جنگ کا زور و شور جب کسی قدر کم ہوا، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے تیس فدائیوں کے ساتھ پہاڑ پر تشریف لائے، اسی اثناء میں خالد بن ولید کو ایک دستہ فوج کے ساتھ اس طرف بڑھتے ہوئے دیکھ کر فرمایا کہ خدایا، یہ لوگ یہاں تک نہ آنے پائیں، حضرت عمرؓ نے چند مہاجرین و انصار کے ساتھ آگے بڑھ کر حملہ کیا اور ان لوگوں کو ہٹا دیا [1]

[1] الفاروق حصہ اوّل۔

ابوسفیان سالارِ قریش نے درّہ کے قریب پہنچ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اور حضرت ابوبکرؓ کو تین بار آواز دی، اس کے بعد تین مرتبہ حضرت عمرؓ کا نام پکارا "کیا قوم میں ابن الخطاب موجود ہیں؟"

چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دینے کی ممانعت فرمائی تھی، اس لیے صحابہؓ خاموش رہے۔ ابوسفیان نے لشکر میں واپس جاکر کہا کہ یہ لوگ مارے جاچکے ہیں، ورنہ اگر زندہ ہوتے تو جواب ملتا، اب حضرت عمرؓ سے ضبط نہ ہوسکا، پکار کر کہا:

"خدا کی قسم، او دشمنِ خدا تو جھوٹ کہتا ہے، جن لوگوں کا تو نے نام لیا ہے، سب زندہ ہیں اور جو تجھ کو بُرا معلوم ہوتا ہے، وہ باقی ہے۔"

دوسری روایت میں ہے:

"خدا نے تیری رسوائی کا سامان باقی رکھا ہے۔"[1]

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار کے نزدیک صنادیدِ اسلام یہی تین بزرگ تھے۔ اسی بنا پر ابوسفیان نے انہی بزرگوں کا نام پکارا، حضرت عمرؓ کے جواب سے ظاہر ہوتا ہے کہ کفار کو انہی بزرگوں کا وجود کھٹکتا تھا اور کفر و شرک کے قلع قمع کرنے والے یہی بزرگ تھے، ان بزرگوں کے مدارج میں جو ترتیب تھی وہ ابوسفیان کے بیان سے نمایاں ہوتی ہے۔

نکاح حضرت حفصہؓ

اس سال حضرت عمرؓ کو یہ شرف حاصل ہوا کہ آپ کی صاحبزادی حضرت حفصہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آئیں، حضرت حفصہؓ پہلے حضرت خنیسؓ بن حذافہ سہمی کے نکاح میں تھیں جو اصحابِ بدر میں تھے، انہوں نے مدینہ آکر وفات پائی، تو حضرت عمرؓ نے حضرت عثمانؓ سے حضرت حفصہؓ کا ذکر کیا، جواب ملا کہ بالفعل نکاح کا ارادہ نہیں ہے، پھر حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے خواہش کی کہ حضرت حفصہؓ کو اپنے نکاح میں لائیں، لیکن وہ خاموش رہے اور کوئی جواب نہ دیا، کیوں کہ ان دونوں صاحبوں کو معلوم ہوچکا تھا کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حفصہؓ سے نکاح کرنا چاہتے ہیں، چنانچہ شعبان ۳ھ میں آنحضرت صلعم نے حضرت حفصہؓ سے نکاح کر لیا۔[2]

غزوہ مریسیع تک

غزوہ اُحد کے بعد ربیع الاول ۴ھ میں بنو نضیر کا واقعہ پیش آیا، یہ یہودیوں کا دوسرا بڑا قبیلہ تھا جسے بدعہدی کے باعث مدینہ سے جلاوطن کیا گیا، اس کے بعد اسی سال غزوہ ذات الرقاع اور غزوہ بدر الاخریٰ پیش آئے، ان سب میں حضرت عمرؓ برابر شریک رہے۔ پھر ۳ شعبان ۵ھ کو غزوہ مریسیع وقوع پذیر ہوا، اس میں ایک مہاجر نے مذاق میں ایک انصاری کو تھپڑ مار دیا، انصاری سخت برہم ہوا اور انصار کو آواز دی، مہاجر نے مہاجرین کو پکارا، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آوازیں سُنیں تو موقع پر تشریف لائے اور فرمایا "جاہلیت کی یہ پکار کیسی" حاضرین نے قصہ عرض کیا، فرمایا "اس پکار کو چھوڑ دو، یہ بُری چیز ہے" منافقین میں جب یہ خبر پھیلی، تو رأس المنافقین عبداللہ بن ابی نے کہا: "اب یہاں تک نوبت پہنچ گئی، خدا کی قسم! مدینہ پہنچ کر جو عزیز ہے ذلیل کو نکال دے گا" یہ فقرہ کسی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا تو حضرت عمرؓ جو بارگاہِ رسالت مآب میں حاضر تھے، غصہ سے بیتاب ہوگئے اور کھڑے ہو کر

---

[1] سیر الصحابہؓ جلد اول جزء المہاجرین [2] الفاروق

عرض کیا :-

"یا رسول اللہ! مجھ کو اجازت دیجیے کہ اس منافق کا سر اڑا دوں۔"

لیکن رحمۃ للعالمینؐ نے فرمایا، جانے دو، لوگ کہیں گے کہ محمدؐ اپنے اصحاب کو قتل کراتے ہیں[1]

غزوہ خندق

مؤرخین کے مطابق ذلیقعد ۵ھ کو غزوہ خندق پیش آیا، جس میں تقریباً دس ہزار یا اس سے بھی زیادہ کفار نے حصہ لیا اور کم و بیش ایک ماہ تک مدینہ کا محاصرہ کیے رکھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چونکہ مدینہ سے باہر نکل کر سلع کے آگے ایک خندق تیار کرا لی تھی، اس لیے کفار خندق پار تو نہ کر سکے۔ البتہ کبھی کبھی خندق میں اتر کر حملہ کرتے تھے۔ آنحضرت صلعم نے اس غرض سے خندق کے ادھر ادھر کچھ فاصلہ پر اکابر صحابہ کو متعین کر دیا تھا کہ دشمن ادھر سے نہ آنے پائے، ایک حصہ پر حضرت عمر رضؓ متعلق تھے، چنانچہ یہاں پر ان کے نام کی ایک مسجد آج بھی موجود ہے۔ ایک دن کفار کے مقابلہ پر حضرت عمرؓ کو اس قدر مصروف رہنا پڑا کہ نماز عصر قضا ہوتے ہوتے رہ گئی، بعد مغرب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے، تو کفار کو برا کہہ رہے تھے، آنحضرت صلعم نے فرمایا، میں نے اب تک نہیں پڑھی ہے، چنانچہ بطحان پہنچ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کیا اور نماز پڑھائی،[2] اس غزوہ میں لشکر کفار کی زیادتی، محاصرے کی طوالت اور حالات کی سنگینی کے باوجود اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح یاب کیا اور کفار کے حصہ میں شکست کی ذلت کے سوا کچھ نہ آیا۔

غزوہ حدیبیہ

ذلیقعد ۶ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زیارت کعبہ کا قصد فرمایا اور اس خیال سے کہ لڑائی کا کسی کو شبہ نہ ہو حکم دیا کہ کوئی ہتھیار باندھ کر نہ چلے، مدینہ سے چھ میل باہر ذوالحلیفہ کے مقام پر پہنچ کر حضرت عمرؓ کو خیال آیا کہ دشمنوں میں اسلحہ کے بغیر چلنا مصلحت نہیں ہے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی رائے کے موافق مدینہ سے ہتھیار منگوا لیے[3] مکہ کے قریب پہنچ کر معلوم ہوا کہ قریش نے عہد کر لیا ہے کہ مسلمانوں کو مکہ کے اندر قدم نہ رکھنے دیں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو چونکہ لڑنا مقصود نہیں تھا۔ اس لیے مصالحت کی غرض سے حضرت عثمان رضؓ کو سفیر بنا کر بھیجا، قریش نے انہیں مکہ میں ہی روک لیا۔ جب کئی دن گزر گئے تو یہ خبر مشہور ہو گئی کہ حضرت عثمان رضؓ شہید کر دیے گئے ہیں۔ اس خبر پر آنحضرت صلعم نے صحابہ رضؓ سے جن کی تعداد چودہ سو تھی، ایک درخت کے نیچے جہاد پر بیعت لی، چنانچہ قرآن حکیم کی آیت لقد رضی اللہ ۔۔۔ تحت الشجرۃ[4] میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

حضرت عمرؓ نے بیعت سے پہلے ہی لڑائی کی تیاری شروع کر دی تھی، چنانچہ ہتھیار پہن رہے تھے کہ خبر ملی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیعت لے رہے ہیں، آپ فوراً بارگاہِ نبوتؐ میں حاضر ہوئے اور جہاد کے لیے دستِ اقدس پر بیعت کی۔

قریش کا اصرار تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سال مکہ میں داخل نہیں ہو سکتے۔ آخر بڑے ردّ و قدح کے بعد فریقین ایک معاہدہ پر راضی ہو گئے۔ اس معاہدہ میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ اگر قریش کا کوئی آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں چلا جائے، تو اس کو قریش کے پاس واپس بھیج دیا جائے گا لیکن اہلِ اسلام سے اگر کوئی شخص قریش کے ہاتھ آ جائے تو ان کو اختیار ہوگا کہ اس کو اپنے پاس روک لیں، یہ شرط چونکہ بظاہر مشرکین کے حق میں زیادہ مفید تھی، اس لیے حضرت عمرؓ کو نہایت اضطراب ہوا، چنانچہ بارگاہِ رسالت آبؐ میں حاضر ہو کر عرض

---

[1] سیر الصحابہؓ جلد اوّل جزء المہاجرین [2] سیر الصحابہؓ جلد اوّل جزء المہاجرین [3] الفاروق جلد اوّل [4] سورۃ الفتح آیت ۱۰

کی یارسول اللہ، کیا آپؐ خدا کے پیغمبر برحق نہیں؟ فرمایا "بیشک ہوں" عرض کی "کیا ہمارے دشمن باطل پر نہیں؟" ارشاد نبویؐ ہوا "ضرور ہیں" پھر عرض کیا "تو پھر ہم دین میں یہ ذلت گوارا کیوں کریں؟ خدا نے ہمارے اور دشمن کے درمیان کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے، پھر ہم کیوں واپس ہوں؟" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میں خدا کا رسول ہوں، اس کی نافرمانی نہیں کرتا، وہ میری امداد کرے گا اور مجھ کو برباد نہ ہونے دیگا" اس کے بعد آپ حضرت ابوبکرؓ کے پاس آئے اور اُن سے بھی یہی گفتگو کی انہوں نے بھی وہی جواب دیا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دے چکے تھے، حضرت عمرؓ کا یہ انداز گفتگو چونکہ ادب کے خلاف تھا۔ اس لیے سخت نادم ہوئے اور اس کے کفارہ کے لیے روزے رکھے نفلیں پڑھیں، خیرات دی اور غلام آزاد کیے۔ [1]

غرض معاہدۂ صلح لکھا گیا اور اس پر بڑے بڑے اکابر صحابہؓ کے، جن میں حضرت عمرؓ بھی شامل تھے، دستخط ثبت ہوئے، اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کا قصد فرمایا، راستہ میں سورہ فتح نازل ہوئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کو بُلا کر فرمایا کہ آج مجھ پر ایسی سورت نازل ہوئی ہے جو مجھے ان تمام چیزوں سے زیادہ محبوب ہے جن پر آفتاب طلوع ہوتا ہے، اس کے بعد اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا - آخر تک پڑھ کر سُنائی، حضرت عمرؓ نے تعجب سے عرض کیا، "یارسول اللہ کیا یہ فتح ہے؟" ارشاد ہوا "ہاں"۔ اسی موقع پر مسلمان عورتیں ہجرت کرکے آئیں اور یہ آیت نازل ہوئی۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا جَاءَكُمُ الْمُؤْمِنَاتُ مُهَاجِرَاتٍ ... وَلَا تُمْسِكُوا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ

مسلمانو، تمہارے پاس مسلمان عورتیں ہجرت کرکے آئیں - اور کافر عورتوں کو اپنے پاس روک نہ رکھو۔

(سورہ الممتحنہ آیت ۱۰)

تو حضرت عمرؓ نے اُسی دن اپنی دو بیویوں کو جو اب تک مشرکہ تھیں، طلاق دے دی ان میں سے ایک کے ساتھ معاویہ بن سفیان نے (اُس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے) اور دوسری کے ساتھ صفوان بن اُمیہ نے نکاح کر لیا [2]

غزوہ خیبر

محرم ۷ھ میں غزوہ خیبر پیش آیا، یہاں اہل یہود کے بڑے بڑے مضبوط قلعے تھے جن کا مفتوح ہونا آسان نہ تھا تاہم مسلمانوں کی یلغار سے چند قلعے تو جلد جلد فتح ہو گئے۔ مگر وہ قلعہ جس پر خیبر کا مشہور بہادر مرحب قابض تھا، فتح نہیں ہو رہے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی تسخیر کے لیے پہلے حضرت ابوبکرؓ کو سپہ سالار بنا کر بھیجا لیکن جب وہ کامیاب نہ ہوئے تو یہ خدمت عمرؓ کے سپرد فرمائی۔ حضرت عمرؓ دو دن لڑے مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ یہ دیکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ کل میں ایسے شخص کو علَم دوں گا جو حملہ آور ہوگا۔" اگلے دن تمام اکابر صحابہؓ علَم نبویؐ کی اُمید میں بڑے سرو سامان کے ساتھ سج دھج کر آئے، ان میں حضرت عمرؓ بھی تھے اور ان کا اپنا بیان ہے کہ "میں نے امارت کی اس دن کے علاوہ کبھی تمنّا نہیں کی تھی" لیکن یہ فخر چونکہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے لیے مقدر ہو چکا تھا۔ اس لیے آنحضرت صلعم نے ان کو بُلا کر علَم مرحمت فرمایا۔ مرحب رئیس خیبر حضرت علیؓ کے ہاتھ سے مارا گیا اور اس کے قتل کے ساتھ ہی اس معرکہ کا خاتمہ ہو گیا۔

---

[1] الفاروق حصہ اول۔ [2] سیر الصحابہؓ حصہ اول جزء المہاجرین

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کی زمین مجاہدین پر تقسیم فرمادی، چنانچہ ایک ٹکڑا جس کا نام ثمغ تھا حضرت عمرؓ کو عنایت فرمایا یہ اس قدر عمدہ باغ تھا کہ حضرت عمرؓ نے بارگاہِ رسالت مآبؐ میں حاضر ہو کر عرض کی "اس سے بڑھ کر عمدہ جائداد مجھ کو کبھی نہیں ملی" تاہم آپ نے اس باغ کو راہِ خدا میں وقف کر دیا اور اسلام کی تاریخ میں یہ پہلا وقف تھا جو عمل میں آیا[1]

سریہ تربہ اسی سال ماہ جمادی الآخر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کو تیس آدمیوں کے ساتھ بنو ہوازن کے مقابلہ کے لیے بھیجا۔ ان لوگوں نے جب حضرت عمرؓ کی آمد کے متعلق سُنا تو بھاگ گئے اور کوئی معرکہ پیش نہ آیا، چنانچہ حضرت عمرؓ بغیر جنگ کیے واپس مدینہ لوٹ آئے۔

فتح مکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور قریش کے درمیان حدیبیہ میں جو معاہدہ ہوا تھا اُسے معرکہ خیبر کے بعد قریش نے توڑ دیا۔ جب قریش کو اپنی غلطی کا احساس ہوا، تو ابوسفیان تجدیدِ عہد کے لیے مدینہ آیا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرف قطعی توجہ نہ فرمائی۔ اس کے بعد وہ باری باری حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے پاس گیا کہ وہ اس معاملہ کو طے کرا دیں، حضرت عمرؓ نے ابوسفیان کو اس سختی سے جواب دیا کہ وہ نااُمید ہو گیا اور تجدیدِ عہد کا یکطرفہ اعلان کر کے مکہ لوٹ گیا، غرض نقضِ عہد کے باعث آنحضرت صلعم نے دس ہزار مجاہدین کے ساتھ رمضان المبارک ۸ھ میں مکہ کا قصد فرمایا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اگرچہ نہایت خاموشی سے یہ تیاری فرمائی تھی تاہم حضرت حاطبؓ بن ابی بلتعہ سے یہ لغزش ہوئی کہ انہوں نے قریشِ مکہ کو خط لکھ کر ان حالات کی اطلاع دی، یہ خط جب راستے میں ہی پکڑ لیا گیا، تو حضرت عمرؓ غصے سے بیتاب ہو گئے اور عرض کی، "حکم ہو تو گردن اُڑا دوں"، لیکن جبینِ رحمت پر شکن نہ تھی۔ ارشاد ہوا "عمرؓ، تم کو کیا معلوم ہے، کہ خدا نے اہلِ بدر کو مخاطب کر کے کہہ دیا ہے کہ تم سے کوئی مواخذہ نہیں ہے"، حضرت حاطبؓ کے عزیز و اقارب اب تک مکہ میں تھے اور اُن کا کوئی حامی نہ تھا، اس لیے انہوں نے قریش پر احسان رکھنا چاہا کہ اس کے صلہ میں اُن کے عزیزوں کو ضرر نہ پہنچائیں گے، انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہی عذر پیش کیا اور آنحضرت صلعم نے قبول فرمایا[2]

بہرکیف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مرالظہران پہنچے اور لشکر نے وہاں آگ روشن کی، تو تمام صحرا چمک اُٹھا، اہلِ مکہ کو اس پر تشویش ہوئی، چنانچہ اُن کی طرف سے ابوسفیان، حکیم بن حزام اور بدیل بن ورقہ دریافتِ حال کے لیے آئے، خیمۂ نبویؐ کے دربانوں کی نظر اُن پر پڑ گئی اور دوڑ کر گرفتار کر لیا، پھر آنحضرت صلعم کی خدمت میں لے آئے، اس دوران میں حضرت عمرؓ کو بھی پتہ چل گیا، چنانچہ وہ بھی جلدی جلدی بارگاہِ نبوتؐ میں پہنچ گئے اور ابوسفیان کے قتل کی اجازت چاہی، لیکن ابوسفیان نے اُسی وقت اسلام قبول کر لیا، اب اگر اُن تمام حالات کا بغور مطالعہ کیا جائے، جو ابوسفیانؓ کے قبولِ اسلام کا باعث بنے تو صاف معلوم ہو گا کہ اُن کا اسلام حضرت عمرؓ کا ممنونِ احسان تھا[3]

غزوہ حنین: فتح مکہ کے کچھ دن بعد یعنی شوال ۸ھ میں ہوازن کی لڑائی پیش آئی، جو غزوہ حنین کے نام سے مشہور ہے، اس معرکہ

---

[1] الفاروق حصہ اوّل۔ [2] سیرۃ النبیؐ جلد اوّل [3] سیر الصحابہؓ حصہ اوّل جزء المہاجرین

میں بھی غزوہ اُحد کی طرح مسلمانوں کے پائے ثبات میں لغزش آگئی تھی لیکن حضرت عمرؓ اب بھی نہایت پامردی اور ثابت قدمی کے ساتھ شریکِ کارزار رہے، جب مسلمانوں کو ہزیمت ہوئی، تو شکست خوردہ جماعت کے ایک فرد حضرت ابو قتادہؓ میدان میں گشت لگانے کے لیے نکلے اُن کا بیان ہے کہ :۔

" ناگاہ عمرؓ بن خطاب نظر آئے جو لوگوں کو لیے کھڑے تھے ۔

حضرت ابو قتادہؓ نے پوچھا، لوگوں کا کیا خیال ہے ؟ حضرت عمرؓ نے جواب دیا " خدائے عزوجل کا جو حکم تھا وہ ہوا "۔

اِس غزوہ میں حضرت عمرؓ کو دو کنیزیں ملی تھیں جنھیں آپ نے مکہ کے کسی مکان میں بھجوا دیا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حُنین کے قیدیوں کو آزاد فرمایا، تو وہ مکہ کی گلیوں میں دوڑنے لگے، حضرت عمرؓ نے اپنے بیٹے سے فرمایا " عبداللہ دیکھو تو کیا ماجرا ہے " انہوں نے کہا کہ رسول اللہ نے قیدیوں پر احسان فرمایا ہے، حضرت عمرؓ بولے " جاؤ، اور تم بھی کنیزوں کو چھوڑ دو " ۔

واپسی پر حضرت عمرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ میں نے جاہلیت میں اعتکاف کی نذر مانی تھی، حضورؐ نے فرمایا، تم اس کو پورا کرو، چنانچہ انہوں نے مسجد حرام میں ایک رات اعتکاف کیا۔ [1]

غزوہ تبوک

رجب ۹ھ میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ قیصرِ روم عرب پر حملہ آور ہونا چاہتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سُن کر تمام صحابہؓ کو تیاری کا حکم دیا، چونکہ یہ زمانہ عُسرت اور تنگی کا تھا، اس لیے لوگوں کو جنگی تیاری کے لیے زر و مال سے اعانت کی ترغیب دی، چنانچہ اکثر صحابہؓ نے بڑی بڑی رقمیں پیش کیں، حضرت عمرؓ نے اس موقع پر اپنے تمام مال و اسباب میں سے نصف لاکر بارگاہِ رسالت مآبؐ میں پیش کیا، غرض اسلحہ اور سامانِ رسد مہیا ہو جانے کے بعد مجاہدین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں تبوک کا رُخ کیا، یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ خبر غلط تھی، اس لیے حضورؐ چند روز قیام فرمانے کے بعد واپس تشریف لے آئے۔

وفاتِ ابن ابی

غزوہ تبوک کے بعد راس المنافقین عبداللہ بن اُبی نے انتقال کیا۔ وہ چونکہ بظاہر مسلمان ہو گیا تھا۔ اس لیے اُس کے لڑکے کی درخواست پر رحمۃ للعالمین نے اپنا قمیص عطا فرمایا اور نماز پڑھنے کا ارادہ کیا، جب حضورؐ نماز پڑھانے کے لیے کھڑے ہوئے تو حضرت عمرؓ نے صف سے آگے نکل کر آپؐ کا دامن پکڑ لیا اور عرض کی آپؐ اس منافق کی نمازِ جنازہ پڑھتے ہیں حالانکہ اللہ تعالٰی نے آپؐ کو منافقین کے استغفار سے منع فرمایا ہے۔ مزید عرض کیا کہ اس نے فلاں دن آپؐ کو فلاں فلاں باتیں کہی تھیں، حضورؐ نے تبسم فرمایا اور کہا " اے عمرؓ ہٹ جاؤ " لیکن حضرت عمرؓ نے بار بار جب وہی گفتگو کی، تو ارشاد ہوا، کہ مجھ کو دونوں باتوں کا اختیار دیا گیا ہے، خدا نے فرمایا ہے :

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ؕ

سورۃ التوبہ آیت نمبر ۸۰

چاہیے تم اُن کے لیے استغفار کرو یا نہ کرو، اگر تم ان کے لیے ستر بار استغفار کرو گے، تب بھی خدا اُن کی مغفرت نہ کرے گا۔

---

[1] سیر الصحابہ جلد حصّہ اوّل، جزء المہاجرین

بیں ستر بار سے زیادہ اس کے لیے استغفار کروں گا۔

غرض حضورؐ نے نماز پڑھائی۔ کچھ دیر بعد سورہ برأت کی یہ آیت نازل ہوئیں :-

وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ۭ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ ۔ سورہ التوبۃ آیت ۸۴	اُن میں سے کوئی مرے تو تم ہرگز اُس کے جنازہ کی نماز نہ پڑھو، اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہو، ان لوگوں نے خدا اور رسولؐ کا انکار کیا ہے اور فاسق مرے ہیں۔

ذوالخویصرہ

حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ حضرت علیؓ نے یمن سے دربارِ رسالت مآب میں تھوڑا سا سونا بھیجا تھا جسے حضورؐ نے عیینہ بن بدر، اقرع بن حابس، زید الخیل اور علقمہ بن ثلاثہ کے درمیان تقسیم فرمادیا، اس پر قریش اور انصار کے بعض لوگوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صنادید اہلِ نجد کو مرحمت فرماتے ہیں، حالانکہ ہم زیادہ مستحق ہیں حضورؐ کو اطلاع ہوئی تو فرمایا، میں اُن کی تالیفِ قلب کرتا ہوں۔ مجمع میں بنو تمیم کا ایک شخص جس کا نام ذوالخویصرہ تھا۔ اُٹھا اور آنحضرتؐ کے پاس آکر کہنے لگے، عدل فرمائیے۔ حضورؐ نے فرمایا، کیا تم مجھ کو امین نہیں سمجھتے؟ حالانکہ میں خدا کا امین ہوں، میرے پاس صبح و شام آسمان کی خبر آتی ہے۔ اگر میں عدل نہیں کروں گا تو تم برباد ہو جاؤ گے، حضرت عمرؓ نے سُنا تو فوراً بولے :

"یا رسولؐ اللہ! مجھے اجازت دیجیے کہ اس کی گردن اُڑا دوں"

حضورؐ نے فرمایا: "اس کو چھوڑ دو۔"

حجۃ الوداع

سنہ ۱۰ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع کے لیے تشریف لے گئے، حضرت عمرؓ بھی ہمرکاب تھے حضرت عمرؓ نے اس شرکت کے متعلق خود بیان فرمایا ہے۔ ایک بار اہلِ یہود نے اُن سے کہا کہ آپ لوگ ایک آیت پڑھتے ہیں، وہ اگر ہم میں نازل ہوتی، تو ہم اس کو عید بناتے (یعنی یادگار قائم کرتے) حضرت عمرؓ نے جواب دیا، میں یہ جانتا ہوں کہ وہ کب نازل ہوئی؟ اور جب نازل ہوئی تو رسول اللہ صلعم کہاں تھے؟ عرفہ کا دن تھا اور ہم خدا کی قسم عرفہ میں تھے[1]

وفاتِ نبی صلعم

حجۃ الوداع سے واپس تشریف لانے کے بعد اوائل ربیع الاول سنہ ۱۱ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیمار ہو گئے اور چند روز کی مختصر علالت کے بعد ۱۲ ربیع الاول بروز دوشنبہ بوقت چاشت آپؐ کا وصال ہوگیا، لیکن حضرت عمرؓ کو اس کا یقین نہیں آتا تھا، چنانچہ آپ اس حادثۂ عظیم سے اس قدر از خود رفتہ ہوگئے کہ آپ نے مسجد نبویؐ میں اعلان کیا کہ جو یہ کہے گا کہ آنحضرت صلعم نے وفات پائی، اس کا سر اُڑا دوں گا[2] لیکن جب حضرت ابوبکرؓ نے آیاتِ قرآنی سے وفاتِ نبویؐ پر استدلال کیا تو حضرت عمرؓ مبہوت ہو کر زمین پر گر پڑے، خود فرماتے ہیں۔

"خدا کی قسم! جب ابوبکرؓ نے آیت تلاوت کی تو مَیں متحیر ہوگیا، یہاں تک کہ میرے پاؤں میرا بوجھ نہ اُٹھا سکے اور مَیں زمین پر گر پڑا۔"

---

[1] سیر الصحابہؓ حصہ اول جزء المہاجرین [2] سیرۃ النبیؐ جلد دوم

ان روایات کے مطابق وفاتِ نبویؐ کا جو اثر حضرت عمرؓ پر ہُوا، دوسرے صحابہؓ کے حالات میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ [1]

بیعتِ سقیفہ

بیعتِ سقیفہ تمام تر حضرت عمرؓ کی کوششوں کا نتیجہ تھی، کیونکہ جو فتنہ سقیفہ بنو ساعدہؓ میں کھڑا ہو گیا تھا۔ اُسے اگر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ وقت پر پہنچ کر ختم نہ کرتے تو کیا عجب تھا کہ یہی فتنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے ساتھ ہی شمع اسلام کو ہمیشہ کے لیے گُل کر دیتا، لیکن یہ حضرت عمرؓ کا ہی تدبّر تھا کہ جب انصارِ مدینہ دو خلفاء کے مطالبہ پر مُصر ہُوئے تو آپ نے حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کر کے اس گتھی کو سلجھا دیا، جس کا اثر یہ ہُوا کہ تمام مسلمان حضرت ابوبکرؓ کی خلافت پر متفق ہو کر تاریخ اسلام کے ایک سنگین بحران سے بچ گئے۔ حضرت عمرؓ کا یہ اقدام معاملہ کی اہمیت اور حالات کی نزاکت کے پیشِ نظر اس قدر مناسب بروقت اور برمحل تھا کہ تاریخِ عالم میں شاید ہی ایسی مثال ملے۔

خلافتِ صدیقیؓ — جمع قرآن کا مشورہ

حضرت ابوبکرؓ کی خلافت صرف سوا دو سال رہی، ان کے عہد میں جس قدر بڑے بڑے کام انجام پائے۔ سب میں حضرت عمرؓ ان کے مشیر اور معین و مددگار رہے، قرآن حکیم کی تدوین کا کام خصوصیت سے ان کے مشورہ اور اصرار سے عمل میں آیا، حضرت زید بن ثابتؓ کاتبِ وحی بیان فرماتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ نے جنگ یمامہ کے زمانہ میں مجھ کو بلا بھیجا، میں آیا تو اُن کے پاس حضرت عمرؓ بیٹھے ہُوئے تھے، حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا:

"عمرؓ میرے پاس آئے اور بیان کیا کہ جنگِ یمامہ میں حفاظِ قرآن بکثرت کام آئے ہیں اور مجھے خوف ہے کہ اگر اسی طرح لڑائیوں میں حفاظ کام آتے رہے تو قرآن کا بڑا حصہ جاتا رہے گا، میرا خیال ہے کہ قرآن جمع کرنے کا حکم دیجیے۔"

میں نے عمرؓ سے کہا، "تم وہ کام کیوں کرنا چاہتے ہو جس کو رسول اللہؐ نے نہیں کیا"، عمرؓ نے جواب دیا "خدا کی قسم! اسی میں بھلائی ہے۔" چنانچہ عمرؓ مجھ سے برابر اس کے متعلق گفتگو کرتے رہے، یہاں تک کہ خدا نے میرا سینہ اس کام کے لیے کھول دیا اور میری بھی وہی رائے قائم ہو گئی جو عمرؓ کی رائے تھی۔ حضرت زیدؓ بن ثابت کہتے ہیں کہ اس تمام گفتگو میں حضرت عمرؓ خاموش بیٹھے رہتے۔ [2]

حضرت عمرؓ کا استخلاف

حضرت ابوبکر صدیقؓ کو اپنے عہدِ خلافت میں تجربہ ہو چکا تھا کہ منصبِ خلافت کے لیے حضرت عمرؓ سے زیادہ کوئی شخص موزوں نہیں ہو سکتا، اور یہ سیاستِ عالم کا سب سے اہم واقعہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ صدیق نے وفات کے وقت حضرت عمرؓ کو اپنا جانشین بنایا جن سے بڑھ کر اورنگِ حکومت کو آج تک کوئی فرمانروا ہاتھ نہیں آسکا، یہ انتخاب، فی الحقیقت، حضرت ابوبکر صدیقؓ کا اتنا بڑا احسان تھا کہ تمام عالم اسلامی کی گردنیں قیامت تک اُن کے سامنے جھکی رہیں گی، تاریخِ عالم گواہ ہے کہ مسلمانوں کی جہانبانی اور کشورستانی کا راز اسی انتخاب میں مضمر تھا اور اسی انتخاب میں اُس اسلامی حکومت کی وسعتیں پوشیدہ تھیں جس کی حدود ساڑھے دس سال کے قلیل عرصہ میں ساڑھے بائیس لاکھ مربع میل تک پھیل گئی تھیں۔ [3]

خلیفہ کا لقب: حضرت ابوبکر صدیقؓ خلیفۂ رسولؐ کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے۔ لیکن حضرت عمرؓ خلیفہ ہو کر امیر المومنین کے لقب

---

[1] سیر الصحابہؓ حصّہ اوّل جزو المہاجرین۔ [2] سیر الصحابہؓ حصّہ اوّل جزو المہاجرین۔ [3] الفاروق میں علامہ شبلیؒ نے حضرت عمرؓ کے مقبوضہ ممالک کا کل رقبہ ۲۲،۵۱،۰۳۰ مربع میل لکھا ہے۔

سے مشہور ہوئے۔ مؤرخین کے مطابق سب سے پہلے حضرت عدی رضی بن حاتم اور حضرت لبید بن ربیعہ نے آپ کو اس لقب سے مخاطب کیا۔ پھر آپ کا یہ لقب اتنا مشہور ہوا کہ تمام لوگ جن میں مسلمان، یہود، نصاریٰ اور آبادی کے مختلف فرقے شامل تھے۔ آپ کو اسی لقب سے پکارتے تھے۔ یہاں تک کہ آپ نے خود اپنے متعلق یہی لقب استعمال فرمایا ہے۔

"اونٹ اور بکری کے گلّے والے اگر اُن کے جانور ہلاک ہوں گے، تو وہ اپنے گھر والوں کو لے کر میرے پاس پہنچیں گے اور کہیں گے اے امیر المومنین، اے امیر المومنین۔"

روایت ہے کہ حضرت عمر رضی نے وفات کے وقت حضرت عائشہ صدیقہ رضی کے پاس جب یہ درخواست بھیجی کہ انہیں اسی حجرہ میں دفن ہونے کی اجازت دی جائے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق دفن ہیں، تو اپنے بیٹے حضرت عبداللہ رضی سے فرمایا کہ "امیر المومنین نہ کہنا"

یہ لقب اگرچہ معنی کے لحاظ سے بالکل سادہ ہے، تاہم اس کی ہیبت یہ تھی کہ (اس کے ذکر سے ہی) کسریٰ وقیصر کے دل کانپ اُٹھتے تھے اور بڑے بڑے جابر حکمرانوں پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔ [1]

امیر المومنین کے اعمالِ عظیمہ

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:۔

ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۚۖ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ۚ۟ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْاَهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ۭ (سورہ الفتح آیت ۲۹)

ان کے (یعنی صحابہ رضی کے) یہی اوصاف تورات میں (مرقوم) ہیں اور یہی اوصاف انجیل میں ہیں، وہ گویا ایک کھیتی ہیں جس نے (پہلے زمین سے) ایک سوئی نکالی، پھر اس کو مضبوط کیا، پھر موٹی ہوئی اور پھر اپنی نال پر سیدھی کھڑی ہو گئی جس سے کاشت کار خوش ہوئے تاکہ اُن کے ذریعہ کفار غیظ میں آئیں۔

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا (ترجمہ)

"اس اثناء میں کہ میں ایک کنوئیں پر پانی کھینچ رہا تھا۔ ابوبکر رضی اور عمر رضی میرے پاس آئے، ابوبکر رضی نے ڈول لیا اور ایک دو ڈول نکالے، ان کے کھینچنے میں کمزوری تھی، خدا ان کی مغفرت کرے، پھر ابوبکر رضی کے ہاتھ سے ابن الخطاب رضی نے ڈول لے لیا، اور وہ اُن کے ہاتھ میں جا کر ایک بڑا چرسہ بن گیا تو میں نے کسی محنتی سردار کو اُن کے برابر کام کرتے ہوئے نہیں دیکھا، یہاں تک کہ لوگ سیراب ہو کر بیٹھ گئے۔"

اللہ تعالیٰ کی یہ پیشین گوئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ خواب حضرت عمر رضی کے ذریعہ پورا ہوا یعنی نہالِ اسلام جو کفرستانِ عرب کی ہواؤں سے جھک جھک جاتا تھا حضرت عمر رضی کے ہاتھوں اس قدر مضبوط اور تناور درخت بن گیا کہ کفرزارِ عالم کی بادِ مخالف کے

---

[1] سیر الصحابہ رضی حصہ اوّل جزء المہاجرین

جھو کے بھی آج تک اسے ہلا نہ سکے، خلافت کا سرچشمہ جو اب تک آبِ رحمت کے چند قطرے اُچھال رہا تھا، حضرت عمرؓ کے آتے ہی ایک بحرِ بیکراں اور اوقیانوسِ اعظم بن کر اس شدت سے چھلک اُٹھا کہ دنیا کے تمام تشنہ لب ابد الآباد تک سیراب ہو گئے۔ یہ اگرچہ استعارات کا پیرایہ ہے تاہم یہ اُن تمام طوفانوں کا کلی عکس ہے جن کا پیچ و تاب جزوی طور پر دورِ عمرؓ کے ایک ایک لمحہ میں دیکھا اور محسوس کیا جا سکتا ہے، بہرکیف آئندہ صفحات میں اس دور کی کلی اور جزوی خصوصیات ملاحظہ ہوں:

خلافت اور فتوحات

حضرت ابوبکرؓ صدیق کے عہد میں مدعیانِ نبوت، مرتدینِ عرب اور منکرینِ زکوٰۃ کا خاتمہ ہو کر فتوحاتِ ملکی کا آغاز ہو چکا تھا، یعنی ۱۲ھ میں عراق پر فوج کشی ہوئی اور حیرہ کے تمام اضلاع فتح ہو گئے، اسی طرح ۱۳ھ میں شام پر حملہ ہوا اور اسلامی فوجیں سرحدی اضلاع میں پھیل گئیں لیکن ابھی ان مہمات کا آغاز ہی ہوا تھا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا انتقال ہو گیا، حضرت عمرؓ نے عنانِ حکومت ہاتھ میں لی۔ تو اُن کا سب سے اہم اور اوّلین فرض انہی مہمات کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا تھا۔

فتوحاتِ عراق

مؤرخین کے مطابق عراق پر حملہ کا آغاز خلیفۂ اوّل کی اجازت سے مثنیٰؓ نے کیا تھا۔ ان کی مدد کے لیے حضرت ابوبکرؓ نے خالدؓ بن ولید کو بھیجا جنہوں نے بانقیا، کسکر اور حیرہ کے اضلاع پر علمِ فتح نصب کیا ہی تھا کہ انہیں مہم شام کی اعانت کے لیے شام جانا پڑا، جس کے باعث عراق کی فتوحات دفعۃً رُک گئیں۔

حضرت عمرؓ نے مسند آرائے خلافت ہوتے ہی سب سے پہلے عراق کی مہم پر توجہ کی، بیعتِ خلافت کے لیے عرب کے مختلف حصوں سے بے شمار مسلمان مدینہ آئے ہوئے تھے، حضرت عمرؓ نے اس موقع کو غنیمت سمجھ کر مجمع عام میں جہاد پر تقریر کر کے ان کو ایران کی مہم میں شرکت کے لیے اُبھارا، لیکن چونکہ عام خیال یہ تھا کہ عراق، حکومتِ فارس کا پایۂ تخت ہے اور اس کو فتح کرنا آسان نہیں، اس لیے ایک شخص نے بھی آمادگی ظاہر نہ کی، یہاں تک کہ حضرت عمرؓ تین دن تک جوش دلاتے رہے، لیکن کچھ اثر نہ ہوا۔ آخر چوتھے دن آپ نے ایسی پُرجوش تقریر کی کہ مسلمانوں میں حرارت پیدا ہو گئی اور حاضرین میں سے بنی ثقیف کے سردار حضرت ابوعبیدؓ نے اُٹھ کر اپنے آپ کو اس خدمت کے لیے پیش کیا، ان کی پیشقدمی پر ہر طرف سے آوازیں بلند ہونے لگیں اور تمام مسلمان شرفِ جہاد حاصل کرنے کے لیے تیار ہو گئے، اس پر حضرت عمرؓ نے حضرت ابوعبیدؓ ثقفیؓ کو چند ہزار کی سپاہ کے ساتھ ایران کی مہم پر روانہ کیا۔[1]

حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں عراق کی معرکہ آرائیوں نے ایرانیوں کو بہت ہوشیار کر دیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے از سرِ نو فوجی تنظیم کی اور ایران کے صغیر السن شہزادے یزدگرد کی متولیہ پوران دخت نے خراسان کے گورنر فرخ زاد کے شجاع اور مدبر بیٹے رستم کو سپہ سالار مقرر کیا۔ اس نے ایرانیوں کے مذہبی جذبات بھڑکا کر سارے ملک میں آگ لگا دی، جس کے نتیجہ میں پوری ایرانی قوم مسلمانوں کے مقابلہ کے لیے ہمہ تن جوش بن گئی اس کا اثر یہ ہوا کہ چند دنوں کے اندر عراق کے تمام مفتوحہ علاقوں میں بغاوت پھیل گئی اور اضلاع فرات، جو پہلے مسلمانوں کے قبضہ میں آ چکے تھے، ان کے ہاتھ سے نکل گئے۔

ایرانی فوج کی تنظیمِ نو کے سلسلے میں پوران دخت نے ایک اور فوجِ گراں تیار کی جس پر جاباں اور نرسی کو سپہ سالار مقرر کیا، یہ

---

[1] تاریخ اسلام حصۂ اوّل مؤلفہ شاہ معین الدین۔

دونوں فوجیں لے کر دو مختلف راستوں سے عراق کی طرف بڑھے، دوسری طرف سے حضرت ابوعبیدہؓ آرہے تھے، مقام فارق میں ان کا اور جاپان کا مقابلہ ہوگیا۔ حضرت ابوعبیدؓ نے اسے فاش شکست دی، اس کے دو مشہور افسر جوشن شاہ اور مردان شاہ مارے گئے اور وہ زندہ گرفتار ہوا، لیکن اس حیلہ سے بچ گیا کہ جس مسلمان نے گرفتار کیا تھا وہ اس کو پہچانتا نہ تھا۔ اس لیے جاپان نے اپنے عوض دو غلام دے کر رہائی حاصل کر لی بعض مسلمانوں نے پہچان کو دوبارہ گرفتار کر لیا، لیکن حضرت ابوعبیدؓ نے جاپان کو اس بنا پر چھوڑ دیا کہ اسلام میں بدعہدی جائز نہیں لہ

حضرت ابوعبیدؓ نے یہ معرکہ سر کرنے کے بعد کسکر کا رخ کیا، جہاں نرسی فوج لیے پڑا تھا۔ سقاطیہ میں دونوں فوجیں ایک دوسرے کے مقابل ہوئیں اور بہت بڑے معرکہ کے بعد نرسی کو بھی شکست ہوئی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ سقاطیہ کے قرب وجوار کے تمام ایرانی اُمراء خود بخود مطیع ہوگئے۔

ان پیہم شکستوں کی خبر سن کر رستم نے ایک تازہ دم فوج کے ساتھ مردان شاہ (بہمن جادویہ) کو ابوعبیدؓ کے مقابلہ پر روانہ کیا، اور ایرانیوں کا مقدس علم درفشِ کاویانی جو فتح و ظفر کا نشان سمجھا جاتا تھا، اس کے ساتھ کر دیا۔ مردان شاہ نے فرات کے ساحل پر فوجیں اتاریں دوسری طرف مسلمان تھے۔ ہر فریق دریا کے پار جانے سے بچنا چاہتا تھا۔ تاہم حضرت ابوعبیدؓ جوشِ جہاد میں ایسے مخمور تھے کہ فوجی افسروں کی شدید مخالفت کے باوجود فرات کو عبور کر کے اس پار چلے گئے۔ دریا پار ہوتے ہی لڑائی چھڑ گئی، چونکہ اس پار کا میدان تنگ و ناہموار تھا، مزید برآں چونکہ عربی ولاوروں کا ایران کے کوہ پیکر ہاتھیوں سے یہ پہلا مقابلہ تھا۔ اس لیے مسلمانوں کو سخت ہزیمت ہوئی، حضرت ابوعبیدؓ اُن کے بھائی حکم اور اُن کے خاندان کے دیگر سات آدمی شہید ہوگئے، لڑائی میں کام آنے والے مسلمانوں کے علاوہ پسپائی میں کئی ہزار مسلمان پانی میں غرق ہوگئے اور مثنیٰ بن حارثہ شیبانی جنہوں نے سب سے آخر علم سنبھالا تھا۔ بڑی مشکل سے تین ہزار جانیں بچا کر دریا کے اس پار لاسکے۔ ۲ے

واقعہ بویب ۱۴ھ

حضرت عمرؓ کو جب یہ خبر پہنچی تو آپ کو مسلمانوں کی شکست اور اس قدر جانوں کی بربادی کا سخت قلق ہوا۔ چنانچہ آپؓ نے اس شکست کا انتقام لینے کے لیے اپنے پُرجوش خطبوں سے تمام قبائل میں آگ لگا دی۔ اُن کے جوش کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ عرب کے عیسائی بھی قومیت کے جوش میں مسلمانوں کے ساتھ ہوگئے۔ غرض حضرت عمرؓ نے ایک بھاری فوج کے ساتھ جریر بجلیؓ کو محاذ جنگ کی طرف روانہ کیا۔ دوسری طرف مثنیٰ نے بھی اپنے طور پر سرحدی قبائل کی ایک علیحدہ فوج تیار کر لی تھی۔

پوران دخت کو جب مسلمانوں کی ان تیاریوں کی خبر ہوئی تو اس نے اپنی منتخب فوج میں سے بارہ ہزار بہادروں کو مہران بن مہرویہ کی ماتحتی میں مجاہدین اسلام سے نبرد آزمائی کے لیے بھیجا۔ اسلامی لشکر چونکہ بویب میں خیمہ زن تھا، اس لیے مہران سیدھا وہاں پہنچا اور فرات عبور کر کے اس پار صف آرا ہوئے۔ مسلمان پہلے سے تیار تھے، چنانچہ ایرانی فوج کے پہنچتے ہی خونریز مقابلہ شروع ہوگیا۔ گذشتہ

لہ تاریخ طبری حصہ دوم ۲ے تاریخ اسلام میں یہ لڑائی معرکہ جسر یعنی "پُل والی لڑائی" کے نام سے منسوب ہے۔

جنگ میں جن مسلمانوں کے پاؤں اُکھڑ گئے تھے، وہ اس بے جگری سے لڑے کہ قریب قریب سب شہید ہوگئے۔ مثنیٰ نے اپنے قبیلہ کو لے کر اس زور کا حملہ کیا کہ ایرانیوں کی صفیں درہم برہم ہوگئیں اور وہ بے ترتیبی سے پیچھے ہٹنے لگے۔ اس ریلے میں بنی تغلب کے نوجوان نے مہرآن کو قتل کر دیا۔ مثنیٰ نے فرات کے پل کا راستہ روک کر اتنے آدمیوں کو تہ تیغ کیا کہ کشتوں کے پُشتے لگ گئے۔ اس معرکہ میں کامیابی کے بعد مسلمان سارے عراق میں پھیل گئے۔[1]

ایرانیوں کا جوش

حیرہ کے کچھ فاصلے پر جہاں آج بغداد آباد ہے، وہاں اس زمانہ میں بہت بڑا بازار لگتا تھا۔ مثنیٰ نے عین بازار کے دن حملہ کیا، بازاری جان بچا کر بھاگ گئے اور بے شمار دولت مسلمانوں کے ہاتھ آئی۔ اسی طرح قرب وجوار کے مقامات میں بھی مسلمانوں کی پیش قدمی شروع ہوگئی اور سواد، کسکر، صراۃ اور فلالیج وغیرہ پر اسلامی پرچم لہرانے لگا، پایۂ تخت ایران میں جب یہ خبریں پہنچیں تو ایرانی قوم میں زبردست جوش پھیل گیا، حکومت کا نظام بالکل بدل گیا۔ پوران دخت کو معزول کر کے کیانی خاندان کے تنہا وارث سترہ سالہ یزدگرد کو تخت نشین کیا اور راز سرِ نو فوجی انتظامات کر کے تمام قلعوں اور چھاؤنیوں کو جنگی سامانوں سے بھر دیا۔ اسی کے ساتھ یہ کوشش بھی کی گئی کہ مسلمانوں کے مفتوحہ علاقوں میں بغاوت پھیلائی جائے۔ ان تبدیلیوں اور انتظامات سے ایرانی حکومت میں ایک نئی زندگی پیدا ہوگئی، جس کے نتیجہ میں تمام مفتوحہ مقامات مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئے، حضرت مثنیٰ مجبور ہو کر عرب کی سرحد پر ہٹ آئے، نیز دربارِ خلافت کو اہلِ ایران کی تیاریوں سے مفصل طور پر آگاہ کیا۔

حضرت عمرؓ کی تیاریاں

حضرت عمرؓ کو جب ان حالات کا علم ہوا، تو آپ نے عرب کے نامور بہادروں، رئیسوں، خطیبوں اور اہل الرائے اشخاص کو مدینہ طلب کیا، آپ کی دعوت پر سارا عرب اُمنڈ آیا اور آپ نے انہیں ساتھ لے کر بہ نفسِ نفیس نکلنے کا ارادہ کیا، لیکن اکابر صحابہؓ نے مخالفت کی کہ آپ کا دار الخلافہ چھوڑنا مناسب نہیں ہے[2]، آخر قرعۂ فال حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کے نام پڑا جو بڑے رتبہ کے صحابیؓ تھے اور عہدِ رسالت مآب میں بڑے کارہائے نمایاں کر چکے تھے، چنانچہ حضرت عمرؓ نے انہیں سپہ سالار مقرر کر کے بیس ہزار فوج کے ساتھ مہم عراق کی تکمیل پر مامور کیا اور چلتے وقت بڑی بیش بہا نصیحتیں کیں، اس فوج میں ستر وہ صحابیؓ تھے، جو بدر میں جوہر شجاعت دکھا چکے تھے۔ تین سو بیعت رضوان کے جاں نثار تھے نیز اسی قدر وہ صحابہؓ تھے جو فتح مکہ میں موجود تھے اور سات سو ایسے تھے جو اگرچہ خود صحابی نہ تھے۔ تاہم ان کی اولاد ہونے کا فخر رکھتے تھے۔[3]

حضرت عمرؓ چونکہ خود بسلسلۂ تجارت سارے عراق کا سفر کر چکے تھے، اس لیے یہاں کے چپہ چپہ سے واقف تھے۔ اس بنا پر آپ نے فوج کی نقل و حرکت، اس کی ترتیب و تنظیم اور مورچہ بندی وغیرہ سب اپنے ہاتھ میں رکھی، حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کو ہدایت تھی کہ وہ ہر منزل اور مرحلہ کا مفصل نقشہ بھیجتے رہیں، چنانچہ انہوں نے سب سے پہلی منزل شراف کا نقشہ بھیجا، جسے دیکھ کر حضرت عمرؓ نے فوج کی تنظیم اور پیش قدمی سے متعلق مفید ہدایات بھیجیں، اسی کے ساتھ یہ حکم بھی دیا کہ شراف سے آگے بڑھ کر قادسیہ میں مقام کرو اور اس طرح مورچے جماؤ کہ سامنے عجم کی زمین اور پشت پر عرب کے پہاڑ ہوں، تاکہ فتح ہو تو جہاں تک چاہو بڑھتے چلے جاؤ اور خدانخواستہ دوسری صورت پیش

---

[1] تاریخ اسلام حصہ اول از شاہ معین الدین [2] فتوح البلدان [3] سیر الصحابہؓ جلد اول خلفائے راشدین۔

آئے تو ہٹ کر پہاڑوں کی پناہ میں آسکو۔[1] مزید یہ فرمان بھی بھیجا کہ جنگ سے پہلے اسلامی سفیروں کو تبلیغ اسلام کے لیے دربار ایران بھیجا جائے۔

اسلامی سفارت

امیرالمومنین رضؓ کے اس فرمان کے مطابق حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نے قادسیہ کے میدان میں مورچہ بندی کی اور سرداران قبائل میں سے چودہ نامور اشخاص کو منتخب کرکے حضرت نعمان بن مقرنؓ کی قیادت میں سفیر بنا کر بھیجا تاکہ وہ شاہ ایران اور اُس کے رفقاء کو اسلام کی ترغیب دے سکیں، لیکن جو لوگ دولت و حکومت کے نشہ میں مخمور تھے، وہ خانہ بدوش عربوں اور اُن کے مذہب کو کب خاطر میں لاتے تھے؟ بہرکیف فریقین میں سلسلۂ گفتگو شروع ہوا اور یزدگرد کے اس سوال پر کہ "تم لوگ فارس پر کیوں حملہ آور ہوئے ہو؟ اسلامی وفد کے رئیس حضرت نعمان رضؓ نے بڑی وضاحت سے اپنا نقطۂ نظر پیش کیا اور آخر میں دوٹوک الفاظ میں یہ اعلان کیا کہ "اگر اسلام قبول کرنا تمہیں منظور نہیں تو جزیہ دینا قبول کرو اور اگر تم اس پر بھی رضامند نہیں تو پھر تلوار ہمارے تمہارے درمیان فیصلہ کردے گی۔" اس اعلان حق پر یزدگرد کا پیمانۂ صبر لبریز ہوگیا اور اُس نے چلا کر کہا: "اگر ایلچیوں کو قتل کرنا جائز ہوتا تو آج تم میں سے کوئی بھی زندہ بچ کر نہیں جاسکتا تھا، اے دوسروں کے ملک لوٹنے والو! تمہیں یہ خاک ملے گی خاک" یہ کہہ کر اُس نے تحقیر کے لیے تھوڑی سی خاک منگا کر دی کہ "لو ہماری زمین میں تمہارا یہ حصہ ہے۔" حضرت عمرو بن معدی کربؓ یہ خاک دامن میں لے کر لوٹ آئے، اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے پاس پہنچ کر یہ مبارک خبر دی کہ دشمن نے خود اپنی زمین ہم کو دے دی ہے جو اُن کے ملک پر قبضہ کے لیے نیک فال ہے۔

اس واقعہ کے بعد کئی ماہ تک دونوں طرف سکوت رہا، رستم ایک لشکر جرار کے ساتھ ساباط میں پڑا تھا۔ اُسے مسلمانوں کا پورا تجربہ ہو چکا تھا، اس لیے وہ یزدگرد کے تاکیدی احکامات کے باوجود جنگ کو ٹال رہا تھا۔ ادھر مسلمانوں کا یہ معمول تھا کہ آس پاس کے دیہات پر چڑھ جاتے تھے اور رسد کے مویشی وغیرہ لوٹ لاتے تھے، جب اس حالت نے طول کھینچا اور رعایا جوق در جوق یزدگرد کے پاس پہنچ کر اپنی حفاظت کے لیے فریادی ہوئی، تو رستم کو مجبوراً مقابلہ کے لیے بڑھنا پڑا اور ایرانی فوجیں ساباط سے نکل کر قادسیہ کے میدان میں خیمہ زن ہوئیں۔

رستم نے قادسیہ پہنچ کر بھی جنگ کو ٹالنے کی ہر ممکن کوشش کی اور ایک عرصہ تک سفراء کی آمد و رفت اور نامہ و پیام کا سلسلہ جاری رکھا، آخری سفارت میں اسلامی وفد کے قائد کی حیثیت سے حضرت مغیرہؓ بن شعبہ گئے، انہیں مرعوب کرنے کے لیے رستم نے بڑی ٹھاٹھ کا دربار آراستہ کیا۔ حضرت مغیرہؓ اس شان سے تھے کہ تلوار بھی قرینہ کی نہ تھی۔ نیام کی بجائے اوپر چیتھڑے لپیٹے ہوئے تھے، چنانچہ اسی شان سے دربار میں داخل ہوئے اور دونوں میں بڑی طویل گفتگو ہوئی، رستم نے بات چیت کے دوران میں سلطنت کی شان و شوکت کا ذکر کرکے اظہار احسان کے طور پر کہا کہ اب بھی تم لوگ واپس چلے جاؤ، تو ہم کو کچھ ملال نہیں بلکہ انعام میں کچھ دلا دیا جائے گا۔ حضرت مغیرہؓ نے تلوار کے دستہ پر ہاتھ رکھ کر کہا: "اگر اسلام یا جزیہ منظور نہیں تو اس سے فیصلہ ہوگا۔ رستم غصّے سے بھڑک اُٹھا اور کہا: "آفتاب کی قسم کل عرب کو برباد کردوں گا" حضرت مغیرہؓ اُٹھ کر چلے آئے اور صلح و آشتی کی تمام اُمیدوں کا خاتمہ ہوگیا۔[2]

جنگِ قادسیہ محرم ۱۴ھ

رستم جواب تک لڑائی کو برابر ٹال رہا تھا، حضرت مغیرہؓ کی گفتگو سے اس قدر غضبناک ہوا کہ اسی وقت فوج کو کر بندی کا حکم دے دیا اور خود تمام رات جنگی تیاریوں میں مصروف رہا، ایرانی فوجیں

---

[1] الفاروق حصہ اوّل [2] الفاروق حصہ اوّل۔

راتوں رات مرتب ہوگئیں اور صبح ہوتے ہوتے قادسیہ کے میدان میں ہر طرف ایرانی فوجوں کا ایک سمندر موجزن تھا۔ جن کے پیچھے ہاتھیوں کے کالے کالے پہاڑ عجیب خوفناک سماں پیدا کر رہے تھے، دوسری طرف مجاہدین اسلام کا لشکر جرار صف بستہ کھڑا تھا۔ عین اس موقع پر حضرت سعد بن ابی وقاص رضؓ کو عرق النساء کا دورہ ہوا جس کے باعث نقل و حرکت سے مجبور ہوگئے۔ چنانچہ اپنی جگہ خالد بن ارفطہ کو سپہ سالار مقرر کر کے خود میدان جنگ کے قریب ہی ایک محل میں جہاں سے جنگ کا پورا نقشہ نظر آتا تھا، ٹھہر گئے اور یہیں سے لڑائی کا رنگ دیکھ کر احکامات بھیجتے رہتے تھے۔ بعد نماز ظہر اللہ اکبر کے نعروں سے جنگ شروع ہوئی اور دن بھر ہنگامہ محشر برپا رہا، شام کو جب تاریکی چھا گئی، تو دونوں حریف اپنے اپنے خیموں میں واپس آئے، یہ قادسیہ کا پہلا معرکہ تھا جو یوم الارماث کے نام سے مشہور ہے۔

دوسرے دن پھر مقابلہ ہوا اور پہلے دن سے بھی زیادہ گھمسان کا رن پڑا، عین لڑائی کے وقت حضرت عمر رضؓ کی بھیجی ہوئی تازہ دم فوج پہنچ گئی۔ اس کے ساتھ وہ قاصد بھی تھے جو ممتاز بہادروں کے لیے بیش قیمت تحائف لائے تھے لڑائی کے دوران میں اعلان کیا گیا کہ "امیر المومنین رضؓ نے ان لوگوں کے لیے یہ تحائف بھیجے ہیں ——— سو اپنے آپ کو ان کا مستحق ثابت کریں"۔ اس نے مسلمانوں کے جوش و خروش کو اور بھڑکا دیا، صبح سے شام تک خون ریز جنگ ہوتی رہی، شام تک دو ہزار مسلمان شہید اور دس ہزار ایرانی مقتول و مجروح ہوئے، تاہم فتح و شکست کا کچھ فیصلہ نہ ہو سکا اور جنگ دوسرے دن کے لیے ملتوی ہو گئی۔ اس جنگ کا نام یوم اغواث ہے۔

رات گزرنے کے بعد تیسرا معرکہ شروع ہوا جو یوم العماس کے نام سے مشہور ہے۔ اس دن کی جنگ دونوں گذشتہ معرکوں سے زیادہ ہیبت ناک تھی۔ اس جنگ میں مسلمانوں نے سب سے پہلے ان کوہ پیکر ہاتھیوں سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کی جنہیں دیکھ دیکھ کر عربی گھوڑے بھڑکتے تھے۔ مسلمانوں نے اگرچہ گھوڑوں پر جھولیں ڈال کر ان کا جواب پیدا کر لیا تھا تاہم مشکل بات یہ تھی کہ ہاتھیوں کی قطار جدھر رُخ کر دیتی تھی، صف کی صف درہم برہم ہو جاتی تھی۔ حضرت سعد رضؓ نے نومسلم پارسیوں سے اس سیاہ بلا کے متعلق مشورہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ ان کی آنکھیں اور سونڈ بیکار کر دیے جائیں، تو اس بلا سے نجات کی راہ نکل سکتی ہے۔ اس پر چند جانباز نیزے لے کر ٹوٹ پڑے اور تاک تاک کر ان کی آنکھیں بیکار کر دیں، حضرت قعقاع رضؓ نے نشان کے سفید ہاتھی پر ایسا کاری وار کیا کہ سونڈ مستک سے الگ ہو گئی۔ ہاتھی جھرجھری لے کر بھاگا۔ اس کا بھاگنا تھا کہ تمام ہاتھی اس کے پیچھے ہو لیے، اس طرح یہ دیوار آہن ٹوٹ گئی اور مسلمانوں کو کھل کر قوت آزمائی کا موقع ملا۔ دن بھر ہنگامہ کارزار گرم رہا، یہاں تک کہ رات کو بھی اس شدت کی جنگ جاری رہی کہ تلواروں کی جھنکار، نعروں کی گونج اور گھوڑوں کی ہنہناہٹ کے سوا کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی، اسی مناسبت سے اسے لیلۃ الہریر کہتے ہیں، دوسرے دن دوپہر کو لڑائی کا فیصلہ ہوا، رستم اب تک نہایت پامردی اور استقلال کے ساتھ مقابلہ کرتا رہا تھا لیکن آخر میں زخموں سے چُور ہو کر بھاگا، ہلال بن علقمہ رضؓ نامی ایک مسلمان نے تعاقب کیا، اتفاق سے ایک نہر سامنے آگئی رستم کود پڑا کہ تیر کر نکل جائے، ساتھ ہی ہلال بھی کود پڑے اور ٹانگیں پکڑ کر اس کو نہر سے باہر کھینچ لائے پھر تلوار سے کام تمام کر دیا، اس کے بعد وہ رستم کے تخت پر چڑھ گئے اور زور سے پکارے "میں نے رستم کو قتل کر دیا ہے"۔

اس آواز کے سنتے ہی ایرانی فوجوں نے میدان چھوڑ دیا، مسلمانوں نے دور تک ان کا تعاقب کیا اور ہزاروں لاشیں میدان میں بچھا دیں، اس معرکہ میں ہتیس[1] ہزار ایرانی مقتول ہوئے، جب کہ مسلمان شہداء کی تعداد چھ ہزار کے لگ بھگ تھی۔ ان معرکوں میں مسلمانوں کی فتح کے باعث خاندان کسریٰ کی شان و شوکت کا نشان "درفش کاویانی" ہمیشہ کے لیے سرنگوں ہو گیا اور اسلام کا سبز ہلالی پرچم نہایت جاہ و جلال کے ساتھ

ایران کی سرزمین پر لہرانے لگا۔ (فاعتبروا یا اولی الابصار)

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے حضرت عمرؓ کو نامۂ فتح لکھا جس میں دونوں طرف کے مقتولین کی تفصیل بھی بھیجی، جس دن سے قادسیہ کی جنگ چھڑی تھی، حضرت عمرؓ کو نہایت بے چینی سے خبروں کا انتظار رہتا تھا، آپ ہر روز آفتاب نکلتے ہی مدینہ سے باہر نکل جاتے اور قاصد کی راہ دیکھتے رہتے، ایک دن معمول کے مطابق نکلے کہ قاصد سے ملاقات ہوگئی۔ اس سے حالات پوچھے، لیکن چونکہ وہ آپ کو پہچانتا نہ تھا اس لیے سواری پر سے حالات بتاتا جاتا تھا اور حضرت عمرؓ سواری کے ساتھ دوڑتے جاتے تھے۔ اسی حالت میں دونوں شہر میں داخل ہوئے، یہاں قاصد کو معلوم ہوا کہ امیر المومنینؓ یہی ہیں، وہ ڈر سے کانپ اٹھا اور گستاخی کی معافی چاہی، فرمایا، کچھ حرج نہیں تم سلسلۂ کلام نہ توڑو۔ پھر مسلمانوں کو جمع کرکے فتح کی خوش خبری سنائی اور ایک نہایت پُرجوش تقریر کی جس کا آخری فقرہ یہ تھا۔

"مسلمانو، میں بادشاہ نہیں ہوں کہ تم کو غلام بنانا چاہتا ہوں۔ میں خود خدا کا غلام ہوں۔ البتہ خلافت کا بارِگراں مجھ پر ڈالا گیا ہے۔ اگر میں اس طرح تمہاری خدمت کروں کہ تم شکم سیر ہو کر چین سے گھر میں سوؤ، تو میرے لیے عین سعادت ہے، اور اگر میری یہ خواہش ہو کہ تم میرے دروازے پر حاضری دو، تو میری بدبختی ہے، میں تم کو تعلیم دینا چاہتا ہوں لیکن باتوں سے نہیں بلکہ عمل سے۔" [1]

ایران کے پایۂ تخت مدائن پر قبضہ

ایرانیوں نے قادسیہ سے نکل کر بابل میں مقام کیا تھا اور چونکہ یہ ایک محفوظ و مستحکم مقام تھا اس لیے نہایت اطمینان کے ساتھ جنگ کے تمام سامان کر لیے تھے۔ حضرت سعدؓ نے ان کے استیصال کے لیے ۱۵ھ میں بابل کا ارادہ کیا اور چند سردار آگے روانہ کیے کہ راستہ صاف کرتے جائیں۔ قادسیہ کی جنگ نے ایرانیوں کی قوت بہت کمزور کر دی تھی، اس لیے وہ مسلمانوں کے مقابلہ پر کہیں بھی نہ ٹک سکے، چنانچہ مسلمان بابل، کوثی اور بہرہ شیر فتح کرتے ہوئے ایران کے پایۂ تخت مدائن کے قریب پہنچ گئے، بہرہ شیر اور مدائن میں صرف دجلہ حائل تھا۔ ایرانیوں نے مسلمانوں کو مدائن پر سے روکنے کے لیے دجلہ کا پُل توڑ کر کشتیاں روک دی تھیں، اسلامی لشکر جب وہاں پہنچا تو دجلہ عبور کرنے کا کوئی سامان نہ تھا۔ حضرت سعدؓ نے ان باتوں سے بے نیاز ہو کر اللہ کا نام لیا اور گھوڑا دریا میں ڈال دیا۔ انہیں دیکھ کر فوج بھی دجلہ میں اُتر گئی، دریا اگرچہ بارشوں کی کثرت کے باعث خوفناک طُغیانی کی زد میں تھا۔ تاہم مسلمان نہایت اطمینان کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے دوسرے کنارے تک پہنچ گئے۔ ایرانی دُور سے یہ حیرت انگیز منظر دیکھ رہے تھے۔ جب مسلمان کنارے پر پہنچے تو "دیواں آمدند، دیواں آمدند" کہتے ہوئے بھاگے، البتہ ایک افسر خرزاد نے تھوڑی سی مزاحمت کی لیکن مسلمانوں نے بہت جلد اسے مغلوب کر لیا، حضرت سعدؓ جب مدائن میں داخل ہوئے تو ہر طرف سناٹا طاری تھا کیونکہ یزدگرد پایۂ تخت چھوڑ کر بھاگ گیا تھا، جمعہ کا وقت قریب تھا۔ ایوانِ کسریٰ میں تختِ شاہی کی جگہ منبر نصب کرکے مسلمانوں نے نماز جمعہ ادا کی، یہ پہلا جمعہ تھا جو سرزمین عراق میں پڑھا گیا۔

یہاں دو تین دن ٹھہر کر حضرت سعدؓ کے حکم سے خزانۂ شاہی کی دولت اور تاریخی نوادرات جمع کیے گئے۔ ان نوادر میں نوشیروان کا ملبوس شاہی اور ایران کا تاریخی فرش بہار بھی تھا، مالِ غنیمت حسبِ قاعدہ تقسیم کرکے پانچواں حصہ دربارِ خلافت میں بھیجا گیا، فرش اور قدیم یادگاریں

---

[1] الفاروق حصہ اوّل

بجنسہٖ بھیجی گئیں، حضرت عمرؓ کے حکم سے نوشیروان کا ملبوس ایک شخص محلّم کو پہنایا گیا، جس وقت اس نے اس لباس کو زیب تن کیا، اور تاج زرنگار سر پر رکھا تو جواہرات کی جگمگاہٹ سے لوگوں کی نگاہیں خیرہ ہوگئیں اور انقلابات زمانہ کا نہایت عبرتناک منظر سامنے آگیا۔ فرش بہار سلاطین عجم کا قدیم تاریخی فرش تھا جس پر بیٹھ کر وہ موسم بہار میں شراب پیا کرتے تھے۔ سب کی رائے تھی کہ اُسے یونہی محفوظ رکھا جائے مگر حضرت علیؓ کے اصرار سے اس پر بھی خزاں آگئی اور وہ ٹکڑے ٹکڑے کرکے تقسیم کر دیا گیا، (الله بس باقی ہوس)

جلولا کا معرکہ ۱۶ھ مدائن سے نکلنے کے بعد ایرانیوں نے جلولا کو اپنا مرکز بنایا، رستم کے بھائی خرزاد نے اپنے حسن تدبر سے ایک زبردست فوج جمع کرلی اور شہر کے گرد خندق کھدوا کر اس کے دفاع کو ہر طرح مضبوط کرلیا، حضرت سعدؓ نے حضرت عمرؓ کی ہدایت کے مطابق حضرت ہاشم بن عتبہ اور حضرت قعقاعؓ کو بارہ ہزار فوج کے ساتھ جلولا روانہ کیا، انہوں نے وہاں پہنچ کر محاصرہ کرلیا، لیکن اس کی تسخیر میں کئی ماہ لگ گئے۔ اس دیر کی وجہ یہ تھی کہ اوّلاً جلولا نہایت مستحکم مقام تھا۔ دوسرے یزدگرد حلوان سے برابر مدد کی فوجیں بھیج رہا تھا۔ بہرکیف اس کے مفتوح ہونے پر تین کروڑ کا مالِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا اور ایک لاکھ ایرانی مقتول ہوئے۔ [1]

حلوان پر قبضہ جلولا کی فتح کے بعد ایک جمعیت حضرت قعقاعؓ کی زیر قیادت حلوان کی طرف بڑھی، یزدگرد اس وقت حلوان میں تھا، جونہی اُسے اسلامی لشکر کی آمد کی اطلاع ہوئی فوراً رے بھاگ گیا۔ اس کے جانے کے بعد حضرت قعقاعؓ حلوان پہنچے اور خسرو شنوم کو شکست دے کر حلوان پر قبضہ کرلیا، حضرت قعقاعؓ نے یہاں قیام کیا اور منادی کرادی کہ جو لوگ اسلام یا جزیہ قبول کرلیں گے وہ مامون و محفوظ رہیں گے، اس اعلان پر بہت سے اُمرا و رؤسا برضا و رغبت دائرہ اسلام میں داخل ہوگئے۔ حلوان کی فتح عراق کی آخری فتح تھی، کیونکہ یہاں اس کی حد ختم ہوجاتی ہے۔

جزیرہ عراق کے زیر نگین ہونے کے بعد حضرت عمرؓ کی دلی خواہش تھی کہ جنگ کا سلسلہ منقطع ہوجائے۔ آپ فرمایا کرتے کہ "کاش ہمارے اور فارس کے درمیان آگ کا پہاڑ ہوتا کہ نہ وہ (ایرانی) ہم پر حملہ کرسکتے اور نہ ہم ان پر" لیکن عراق کے ہاتھوں سے نکل جانے کے بعد ایرانی صبر نہیں کر سکتے تھے چنانچہ سب سے پہلے اہل جزیرہ نے ہتھیار سنبھالے کیونکہ ان کی سرحد عراق سے ملی ہوئی تھی تکریت میں نہایت زبردست اجتماع ہوا، حضرت سعدؓ کو ایران پر فوج کشی کے بارے میں چونکہ حضرت عمرؓ کے خیالات کا علم تھا، اس لیے انہوں نے تمام حالات لکھ کر دربار خلافت میں بھیجے، حضرت عمرؓ کے لیے ان حالات میں مقابلہ کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔ اس لیے آپ نے عبداللہؓ بن غنم کو اس مہم پر بھیجنے کا حکم دیا۔

تکریت پر قبضہ اس حکم پر عبداللہ بن غنمؓ پانچ ہزار کی جمعیت کے ساتھ تکریت کی طرف بڑھے اور شہر کا محاصرہ کرلیا، ایک ماہ سے زیادہ عرصہ تک محاصرہ جاری رہا اور اس دوران میں چوبیس حملے ہوئے، لیکن جزیرہ کے عیسائی عرب بھی چونکہ ایرانیوں کے ساتھ تھے۔ اس لیے کامیابی نہ ہوتی تھی عبداللہؓ نے عربوں کے پاس خفیہ نامہ و پیام بھیج کر انہیں اپنے ساتھ ملالیا اس کے بعد جب مسلمانوں نے حملہ کیا تو عقب سے عرب حملہ آور ہوگئے، جس کے نتیجہ میں ایرانی دونوں طرف سے گھر کر پامال ہوگئے اور تکریت پر مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا اس کے بعد چند دنوں تک جزیرہ کی مہم ملتوی رہی، ۱۷ھ میں جب عراق و شام کی طرف سے اطمینان ہوگیا، تو حضرت عمرؓ نے حضرت سعدؓ کو جزیرہ

---

[1] تاریخ طبری حصہ سوم

پر فوجیں بھیجنے کا حکم دیا۔ اس دفعہ حضرت عیاض بن غنمؓ اس مہم پر مامور ہوئے۔ انہوں نے جزیرہ بھر میں فوجیں پھیلا دیں اور معمولی لڑائیوں کے بعد تمام جزیرہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک زیر نگین کر لیا

خوزستان

عراق کی فتح کے بعد اس پر قبضہ قائم رکھنے کے لیے یہاں ایک اسلامی شہر بصرہ آباد ہو چکا تھا جس کے حاکم حضرت مغیرہؓ بن شعبہ تھے، چونکہ بصرہ کا سرحدی علاقہ خوزستان اب تک ایرانیوں کے قبضہ میں تھا، اس لیے بصرہ میں امن و امان قائم کرنے کے لیے اس کی تسخیر ضروری تھی' چنانچہ ۱۶ھ میں بصرہ کے والی حضرت مغیرہؓ نے اہواز پر حملہ کیا' یہاں کے رئیس ہرمز نے ایک مختصر سی رقم دے کر صلح کر لی' ۱۷ھ میں حضرت مغیرہؓ بن شعبہ معزول ہو گئے' اور ان کی جگہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ مقرر ہوئے۔ اس انقلاب میں اہواز کا رئیس باغی ہو گیا اور سالانہ رقم دینا بند کر دی' اس پر حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے لشکر کشی کی اور ہرمز کو شکست دے کر اہواز پر مستقل قبضہ کر لیا' مال غنیمت کے ساتھ ہزاروں آدمی لونڈی بنا کر تقسیم کیے گئے' لیکن جب حضرت عمرؓ کو اطلاع ہوئی' تو آپ نے لکھ بھیجا کہ سب رہا کر دیے جائیں' چنانچہ سب چھوڑ دیے گئے۔

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے اہواز کے بعد سوس فتح کیا اور اس کے بعد رامہرمز کا محاصرہ کر لیا۔ اس کے حاکم نے آٹھ لاکھ سالانہ پر صلح کر لی' یزدگرد اس وقت خاندان شاہی کے تمام ارکان کے ساتھ قم میں مقیم تھا اور حضرت ابوموسیٰؓ کی فتوحات کی خبریں اس کو برابر مل رہی تھیں' امیر ہرمزان نے یزدگرد کی خدمت میں جا کر درخواست کی کہ اگر اہواز اور فارس میری حکومت میں دے دیے جائیں تو میں عرب کے سیلاب کو آگے بڑھنے سے روک دوں گا' یزدگرد نے اسی وقت فرمان حکومت عطا کر کے ایک فوج بھی اس کے ساتھ کر دی' ہرمزان پردائہ شاہی کے ساتھ خوزستان کے صدر مقام شوستر آیا اور جنگی استحکامات درست کر کے ایک عظیم الشان جمعیت فراہم کر لی۔

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو ان تیاریوں کی خبر ہوئی' تو آپ نے دربار خلافت کو اطلاع دے کر اس صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے مدد مانگی' امیر المومنینؓ نے فوراً حضرت عمارؓ بن یاسرؓ والی کوفہ کو حکم بھیجا کہ وہ کوفہ کی فوجیں لے کر ابوموسیٰؓ کی مدد کو روانہ ہو جائیں ادھر حضرت جریر بن عبداللہ بجلیؓ بھی ایک بڑی فوج لے کر آ گئے' حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے اس ساز و سامان کے ساتھ شوستر کا رخ کیا اور شہر کے قریب پہنچ کر ڈیرے ڈالے' ہرمزان نے نہایت بہادری کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا' بہت سے مسلمان کام آئے لیکن آخر وہ پسپا ہو کر قلعہ بند ہو گیا' حضرت ابوموسیٰؓ نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا' ایک عرصہ تک محاصرہ جاری رہا۔ مگر کوئی کامیابی نہ ہوئی' ایک دن اتفاق سے شہر کا ایک باشندہ مل گیا' جس کے ذریعے اشرس نامی ایک عرب خفیہ راستے سے شہر میں داخل ہو کر تمام راستے دیکھ آیا۔ پھر دو سو جانبازوں کو ساتھ لے کر اسی تہ خانے کی راہ شہر پناہ کے دروازے تک پہنچا اور پہرہ داروں کو قتل کر کے اندر کی طرف سے دروازے کھول دیے' ادھر حضرت ابوموسیٰؓ فوج کے ساتھ موقع پر موجود تھے' چنانچہ دروازہ کھلنے کے ساتھ ہی تمام لشکر ٹوٹ پڑا اور شہر میں ہلچل پڑ گئی' ہرمزان نے بھاگ کر قلعے میں پناہ لی' مسلمان قلعہ کے نیچے پہنچے تو اس نے برج پر چڑھ کر کہا: "میرے ترکش میں اب بھی سو تیر ہیں اور جب تک اتنی ہی لاشیں یہاں نہ بچھ جائیں' میں گرفتار نہیں ہو سکتا' تاہم میں اس شرط پر اتر آتا ہوں کہ تم مجھ کو مدینہ پہنچا دو اور جو کچھ فیصلہ ہو' عمرؓ کے ہاتھ سے ہو"[1]۔ حضرت ابوموسیٰؓ نے اسے منظور کیا اور ہرمزان کو حضرت انسؓ کے ساتھ مدینہ بھیج دیا' ہرمزان یہاں پہنچ کر مسلمان ہو گیا اور حضرت عمرؓ نے دو ہزار سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ شوستر کے بعد جندی سابور پر حملہ ہوا' جس کی فتح کے ساتھ ہی خوزستان کا پورا علاقہ زیر نگین ہو گیا۔

---

[1] الفاروق حصہ اول

عراق عجم پر فوج کشی اور معرکہ نہاوند

یزدگرد اس وقت مرو میں تھا جب اسے خوزستان پر مسلمانوں کے قبضہ اور ہرمزان کی گرفتاری کی خبر ملی، اب تک ایرانی سمجھتے تھے کہ عربوں کا سیلاب سرحد پر آ کر رک جائے گا لیکن خوزستان پر قبضہ کے بعد ان کو نظر آیا کہ یہ سیلاب سارے ایران کو بہا کرلے جائے گا۔ چنانچہ یزدگرد نے مرو کو مرکز بنا کر نئے سرے سے حکومت کا نظم و نسق درست کیا اور اپنے فرامین بھیج کر لوگوں کو اس قدر ابھارا کہ تقریباً ڈیڑھ لاکھ فوج مسلمانوں کی مزاحمت کے لیے جمع ہو گئی، یزدگرد نے ایران کے مشہور بہادر مردان شاہ کو سپہ سالار بنا کر نہاوند روانہ کیا اور ایران کا تاریخی علم درفش کاویانی جو فتح و ظفر کا نشان سمجھا جاتا تھا، ساتھ کر دیا۔

حضرت عمار بن یاسرؓ والیٔ کوفہ کے ذریعہ جب حضرت عمرؓ کو ان تیاریوں کی اطلاع ہوئی تو آپ نے اکابر صحابہؓ سے مشورہ کیا، حضرت عثمانؓ نے کہا کہ آپ خود اہل حرم کو لے کر مقابلہ کے لیے نکلیے، لیکن حضرت علیؓ نے مخالفت کی اور کہا کہ اگر آپ خود جائیے گا، تو اندرونِ ملک بغاوت برپا ہو جائے گی، آپ تمام ممالکِ محروسہ کی ایک ایک تہائی فوج کو ایک مرکز پر جمع ہونے کا حکم دیجیے۔[1] حضرت عمرؓ اس مشورہ کے مطابق فوجیں جمع کر کے حضرت نعمانؓ بن مقرن کی زیر قیادت انہیں نہاوند روانہ کیا، مورخین نے اس لشکر کی تعداد تیس ہزار لکھی ہے، بہرکیف حضرت نعمانؓ نے نہاوند پہنچ کر چند میل ادھر منزل کی اور حضرت مغیرہؓ بن شعبہ کو سفیر بنا کر ایرانی لشکر میں بھیجا، اثنائے گفتگو میں مردان شاہ نے ایسا رویہ اختیار کیا جو حد درجہ ناپسندیدہ تھا، لہٰذا سفارت ناکام رہی اور فریقین میں جنگ چھڑ گئی، دونوں لشکر اس شدت سے سرگرم پیکار ہوئے کہ قادسیہ کے بعد ایسی خونریز جنگ کوئی نہیں ہوئی تھی، مسلمان اس ثبات و پامردی سے لڑے کہ ہزاروں لاشیں خاک و خون میں نہا گئیں اس جنگ میں خود اسلامی سپہ سالار حضرت نعمانؓ بن مقرن شہید ہو گئے، ان کے بعد انکے بھائی نعیم بن مقرنؓ نے علم ہاتھ میں لے کر اسی زور و شور کے ساتھ جنگ جاری رکھی، یہاں تک کہ رات ہوتے ہوتے ایرانیوں کے پاؤں اکھڑ گئے، مسلمانوں نے ہمدان تک ان کا تعاقب کر کے ہزاروں ایرانیوں کو تہ تیغ کر دیا، اس جنگ میں تیس ہزار عجمی کھیت رہے اور ان کی قوت ایسی تباہ ہوئی کہ اس سر و سامان کے ساتھ پھر کبھی انہیں مسلمانوں کے مقابلہ پر آنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ عرب مؤرخین نے نتائج کے لحاظ سے اس فتح کا نام فتح الفتوح رکھا، ابو لولوفیروز جس کے ہاتھ سے حضرت عمرؓ کی شہادت مقدر تھی، اسی لڑائی میں گرفتار ہوا تھا۔

حضرت عمرؓ کو مہینوں سے نہایت بیقراری کے ساتھ جنگ کے نتیجہ کا انتظار تھا۔ جب قاصد فتح کا مژدہ اور کسریٰ پرویز کے جواہرات کے ڈھیر لیے ہوئے پہنچا، تو آپ کو بڑی مسرت ہوئی، لیکن جب حضرت نعمانؓ کی شہادت کی خبر سنی تو بے اختیار سر پر ہاتھ رکھ کر رونے لگے اور جواہرات فروخت کر کے فوج میں تقسیم کرا دیے۔[2]

ایران پر عام لشکر کشی

حضرت عمرؓ سرزمین ایران کی طرف بڑھنا نہیں چاہتے تھے، لیکن عراق ہاتھ سے نکل جانے کے بعد ایرانی چین سے کب بیٹھتے تھے اور فوجیں جمع کر کے مفتوحہ علاقوں میں بار بار بغاوت کرا دیتے تھے امیر المومنین رضؓ کو اس بات پر بڑا تردد تھا اور آپ ان بغاوتوں کو رعایا کے ساتھ مسلمانوں کی بدسلوکی کا نتیجہ سمجھتے تھے، چنانچہ آپ نے ایک مرتبہ ان مسلمانوں کے سامنے جو عجم کی مہمات

---

[1]، [2] تاریخ اسلام حصہ اوّل از شاہ معین الدین۔ [3] الفاروق حصہ اوّل

میں شریک تھے۔ اس کا اظہار بھی کیا، کہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان ذمیوں کو تکلیف دیتے ہیں جس کے باعث وہ باغی ہو جاتے ہیں، حضرت احنفؓ بن قیس نے اس صورتِ حال کی توضیح کرتے ہوئے عرض کیا کہ جب تک تختِ کیانی کا وارث سرزمین ایران پر موجود رہے گا۔ بغاوت اور جنگ کا فتنہ فرو نہ ہو گا، اس لیے کہ ایک ملک میں دو بادشاہ نہیں رہ سکتے، حضرتِ فاروق اعظمؓ نے اس دانشمندانہ رائے کو پسند فرمایا اور ایران پر عام لشکر کشی کا ارادہ کر لیا[1]

اس کے کچھ دنوں بعد ۱۹ھ میں آپ نے صحابہؓ سے مشورہ کے بعد ایران کے مختلف صوبوں کیلئے علیحدہ علیحدہ افسر نامزد کیے۔ حضرت احنف رضؓ بن قیس کو جنہوں نے یزدگرد کے استیصال کا مشورہ دیا تھا، خراسان کی مُہم سپرد ہوئی، کیونکہ ان دنوں یزدگرد یہاں مقیم تھا، اردشیر اور سابور کا علم مجاشع بن مسعودؓ کو، اصطخر کا حضرت عثمانؓ بن ابی العاص کو، فسا کا حضرت ساریہؓ بن زہیم کنانی کو، کرمان کا سہیل بن عدی کو، سیستان کا حضرت عاصم بن عمرؓ کو، مکران کا حکم بن عمیر کو اور آذربائیجان کا حضرت عتبہؓ بن فرقد کو عطا ہوا، چنانچہ یہ بزرگ حسب الحکم اپنی اپنی مہمات پر روانہ ہو گئے، ان کے علاوہ اور متفرق مقامات پر بھی آپ نے متعدد افسروں کو مامور فرمایا:

اصفہان

اس سلسلہ میں سب سے اوّل عبداللہ بن عبداللہ نے اصفہان پر فوج کشی کی، اس کا رئیس، اسپیدان، اصفہان کے علاقے میں فوجیں لیے موجود تھا، مقدمۃ الجیش کی کمان ایک پرانے اور تجربہ کار بہادر شہر یار کے ہاتھوں میں تھی۔ اسلامی لشکر کے پہنچنے پر فریقین ایک دوسرے کے مقابل ہوئے، شہر یار نے مبارز طلبی کی، عبداللہ مقابلہ پر آئے، شہر یار ان کے ہاتھ سے قتل ہو گیا، اس کے ساتھ ہی جنگ کا خاتمہ ہو گیا اور اسپیدان نے صلح کر لی۔

ہمدان کی بغاوت

حضرت نعیمؓ بن مقرن ہمدان فتح کر چکے تھے۔ ۲۲ھ میں یہاں بغاوت ہوئی۔ حضرت نعیمؓ نے بغاوت فرو کر کے شہر ہمدان کا محاصرہ کر لیا، اہلِ شہر نے صلح کر لی، لیکن جب قرب وجوار کے رئیس اپنی اپنی فوجیں لے کر اہلِ ہمدان کی مدد کے لیے پہنچے تو انہوں نے صلح توڑ دی۔ حضرت نعیمؓ کو اطلاع ہوئی تو آپ مقابلہ کے لیے نکلے، وادئ رود میں ایک خونریز جنگ کے بعد ایرانیوں نے شکست کھائی اور ان کی بڑی تعداد قتل ہوئی۔ اسی سنہ میں براء بن عازب نے قزوین اور زنجان فتح کیے۔

رَے وغیرہ کی فتح

اس معرکہ کے بعد حضرت نعیمؓ رے پہنچے، یہاں کے حاکم سیاوش نے جو بہرام چوبیں کا پوتا تھا۔ دوسرے صوبوں کے اُمرا سے مدد طلب کی۔ یہ سب اپنی اپنی فوجیں لے کر پہنچے، لیکن رے کا ایک رئیس زینبی، جو کسی بات پر سیاوش سے برہم تھا، حضرت نعیمؓ سے مل گیا اور حسنِ تدبیر سے رے پر مسلمانوں کا قبضہ کرا دیا، یہاں مسلمانوں کو تقریباً مدائن کے برابر مالِ غنیمت ملا، حضرت نعیمؓ نے زینبی کو اس خدمت کے صلہ میں رے کی حکومت عطا کی اور یہیں سے اپنے بھائی سوید کو بھیج کر قومس پر قبضہ کرایا۔

طبرستان

قومس کے بعد چونکہ طبرستان کی سرحد شروع ہوتی ہے۔ اس لیے اب طبرستان کی باری تھی، لیکن مسلمانوں کی پیشقدمی سے پہلے ہی سرحدی علاقے کے باشندوں نے از خود صلح کر لی، اس صلح میں چونکہ اندرونی علاقہ شامل نہ تھا۔ اس لیے حضرت نعیمؓ اندرون ملک جرجان کی طرف بڑھے اور بسطام پہنچ کر جرجان کے حاکم زرنان سے نامہ و پیام کیا، اس نے جزیہ کی شرط پر مصالحت

---

[1] سیر الصحابہؓ جلد اوّل خلفائے راشدین

کرلی، اس کے ساتھ ہی طبرستان کے رئیس نے بھی اطاعت قبول کرلی اور ۲۲ھ میں طبرستان کا پورا علاقہ مطیع ہوگیا

آذربائیجان

اوپر گزر چکا ہے کہ امیرالمومنین حضرت عمرؓ نے حضرت عتبہؓ بن فرقد کو آذربائیجان کی مہم پر مامور کیا تھا۔ ان کے ساتھ حضرت بکیرؓ بن عبداللہ بھی تھے، یہ دونوں آذربائیجان کے مختلف حصوں سے علیحدہ علیحدہ بڑھے، کوہستان جرمیدان میں آذربائیجان کے حاکم اسفندیار کا جو دادئی ردد کی مہم سے ناکام واپس آرہا تھا حضرت بکیرؓ بن عبداللہ سے سامنا ہوگیا، چونکہ اسفندیار شکست خوردہ آرہا تھا اس لیے حضرت بکیرؓ نے آسانی سے اسے گرفتار کرلیا، اس کی ہمت پست ہوچکی تھی۔ اس نے حضرت بکیرؓ سے پوچھا کیا چاہتے ہو، صلح یا جنگ؟ حضرت بکیرؓ نے جواب دیا صلح، اس نے کہا، اگر صلح چاہتے ہو تو مجھے اپنے پاس روک کے رکھو، اس دوران میں حضرت عتبہؓ بن فرقد نے بھی اپنی سمت فتح کرلی اور حضرت بکیرؓ امیرالمومنینؓ کے حکم سے باب کی مہم میں مدد دینے کے لیے چلے گئے، ان کے جانے کے بعد اسفندیار کا بھائی بہرام عتبہ کی طرف بڑھا، لیکن حضرت عتبہؓ نے اسے شکست دے دی، اس کی شکست کے بعد اسفندیار نے جو حضرت بکیرؓ کے پاس تھا کہا کہ اب جنگ ختم ہوگئی، اور پھر اس نے مصالحت کرلی، اس طرح آذربائیجان کا پورا علاقہ مطیع ہوگیا،[1] بلاذری کے بیان کے مطابق آذربائیجان کو حضرت حذیفہ نے فتح کیا تھا۔

آرمینیہ

آذربائیجان کے بعد آرمینیہ کا علاقہ تھا۔ اس پر شام کی فوج کشی کے سلسلہ میں ۲۰ھ میں حملہ ہوا تھا، لیکن فتح نہیں ہوسکا تھا، اس لیے جن دنوں آذربائیجان میں جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ انہی دنوں حضرت سراقہ بن عمرو اور عبدالرحمن نے دوبارہ آرمینیہ پر فوج کشی کی، اسی اثنا میں حضرت بکیرؓ بن عبداللہ بھی آذربائیجان سے فراغت کے بعد آرمینیہ پہنچ گئے۔ عبدالرحمن اس وقت باب میں خیمہ زن تھے۔ آرمینیہ کا ایرانی حاکم شہربار اہلِ آرمینیہ کو بہت ذلیل سمجھتا اور ان سے کسی قسم کی ہمدردی نہ رکھتا تھا، چنانچہ وہ عبدالرحمن کے پاس آیا اور کہا کہ تم لوگ میری قوم اور ملک کو فتح کرچکے ہو اس لیے میں بھی تمہارا مطیع و مددگار ہوں، لیکن اتنی درخواست ضرور ہے کہ جزیہ لے کر مجھے ذلیل اور آرمینیوں کے مقابلہ پر کمزور نہ کرو، اس کی درخواست سن کر عبدالرحمن نے اسے حضرت سراقہؓ کے پاس بھجوا دیا، انہوں نے کہا کہ جزیہ تو ان کے لیے ہے جو جنگ میں شریک نہیں ہوتے، پھر اس کی درخواست منظور کرکے حضرت عمرؓ کو اطلاع دی، آپ نے بھی اس فیصلہ پر اظہار پسندیدگی فرمایا۔

باب سے فراغت کے بعد حضرت سراقہؓ نے حضرت بکیرؓ بن عبداللہ کو موقان اور حضرت حبیبؓ بن مسلمہ کو مع حضرت حذیفہؓ کے کوہستانِ لان کی طرف روانہ کیا، حضرت بکیرؓ نے اہلِ موقان کو مطیع بنایا اور عبدالرحمن بن ربیعہ صوبہ خزر کی طرف بڑھے اور اس کے پایۂ تخت کے قریب مقامِ بیضاء تک بڑھتے چلے گئے۔

فارس

فارس پر فوج کشی کے لیے درمیان میں دریا پڑتا تھا اور حضرت عمرؓ مسلمانوں کو دریا کے خطرات میں ڈالنا نہیں چاہتے تھے، پھر بھی ایک اولوالعزم جانباز حضرت علاء بن حضرمیؓ والیٔ بحرین نے ۱۷ھ میں امیرالمومنینؓ کی اجازت کے بغیر حملہ کردیا، لیکن اس حملہ میں انہوں نے سخت نقصان اٹھایا، لشکرِ اسلام کا بڑا حصہ برباد ہوگیا اور جو باقی بچا اسے اہلِ فارس نے گھیر لیا۔ حضرت عمرؓ کو صورتِ حال کا علم ہوا، تو آپ کو سخت رنج ہوا اور فوراً عتبہ بن غزوانؓ کو لکھ کر مدد کے لیے بھیجا، انہوں نے ایرانیوں کو شکست دے کر باقیماندہ مسلمانوں کو بچایا۔

اس کے بعد جب ایران پر عام فوج کشی ہوئی، تو حضرت ساریہؓ بن زنیم کنانی ۲۳ھ میں فارس کی طرف بڑھے، اہلِ فارس اس وقت

---

[1] تاریخ طبری حصہ سوم، خلافت فاروقی و عثمانی

توج میں جمع تھے۔ لیکن مسلمانوں نے اِدھر توجہ نہ کی اور اسی سمت بڑھتے چلے گئے جو اُن کے لیے متعین کر دی گئی تھی، اس بنا پر اہلِ فارس بھی توج سے منتشر ہو گئے۔ چنانچہ مجاشع بن مسعودؓ سابور اور اردشیر خرہ کی طرف بڑھے، توج میں اہلِ فارس سے مقابلہ ہوا اور اسے مسلمانوں نے فتح کر لیا دوسری طرف حضرت عثمانؓ بن ابی العاص اصطخر کی طرف بڑھے اور جور کے مقام پر یہاں کے باشندوں کو شکست دے کر جور اور اصطخر پر قابض ہو گئے اور پھر گازرون، توبنجان، شیراز، ارجان وغیرہ فارس کے بڑے حصہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔

حضرت عمرؓ کے آخر عہدِ خلافت میں یزدگرد کے اشارے پر فارس میں بغاوت ہو گئی جس کے نتیجہ میں بہت سے مفتوح مقامات مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئے، لیکن حضرت حکمؓ بن ابی العاص نے فارس کے مرزبان شہرک کو تہ تیغ کر کے بغاوت پر قابو پا لیا

فارس کے بعض مقامات فسا اور دارابجرد وغیرہ رہ گئے تھے، حضرت ساریہؓ ان دو شہروں کی مہم پر روانہ ہوئے اور ایرانیوں کی چھاؤنی کے قریب پہنچ کر اتر پڑے اور اس کا محاصرہ کر لیا۔ محاصرے نے طول کھینچا، تو ایرانیوں نے کردوں سے مدد طلب کی اور وہ ہر طرف سے ہجوم کر کے اُن کے پاس پہنچنے لگے۔ یہاں تک کہ اتنی طاقت فراہم ہو گئی کہ ان کے مقابلہ پہ مسلمانوں کی تعداد کچھ نہ تھی، تاہم حضرت ساریہؓ کی ہمت و شجاعت نے یہ معرکہ بھی سر کر لیا اور فسا اور دارابجرد پر قبضہ ہو گیا۔

کرمان

کرمان کی فتح پر حضرت سہیلؓ بن عدی مامور ہوئے تھے۔ فارس کے بعد کرمان کا صوبہ سامنے تھا، چنانچہ ۲۳ھ میں ایک فوج لے کر جس کا ہراول دستہ بشیر بن عمرو العجلی کی ماتحتی میں تھا، کرمان پر حملہ آور ہوئے، اہلِ کرمان قفص وغیرہ کی امداد لے کر مدافعت کے لیے نکلے۔ لیکن شکست کھائی اور یہاں کا مرزبان میدان جنگ میں نسیر کے ہاتھ سے مارا گیا۔ اس کے قتل کے بعد اسلامی فوجیں کرمان کے مرکزی مقامات جیرفت اور سیرجان تک بغیر کسی روک کے بڑھتی چلی گئیں اور بے شمار اُونٹ اور بکریاں غنیمت میں ہاتھ آئیں۔

سیستان

یہ ملک حضرت عاصم بن عمروؓ کے ہاتھ سے فتح ہوا۔ حضرت عاصمؓ کی فوج کشی کے دوران اہلِ سیستان مقابلہ کے لیے بڑھے مگر شکست کھائی، حضرت عاصمؓ بڑھتے چلے گئے، یہاں تک کہ زرنج پہنچ کر اس کا محاصرہ کر لیا اور دریا کا بند کھول دیا، جس سے سارے سیستان میں سیلاب آگیا، اہلِ سیستان نے مجبور ہو کر اس شرط پر صلح کر لی کہ ان کی تمام اراضی محفوظ قرار دی جائے، مسلمانوں نے منظور کیا اور اس شرط کا اس قدر لحاظ رکھا کہ کھیتوں کے پاس سے جلدی سے گزر جاتے تھے کہ زراعت چھو نہ جائے۔ اس ملک پر قبضہ ہو جانے کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ سندھ سے لے کر نہر بلخ تک جتنے ممالک تھے ان کی فتح کی کلید ہاتھ میں آگئی، چنانچہ وقتاً فوقتاً ان ملکوں پر حملے ہوتے رہتے تھے۔

مکران

سیستان، ایران کی آخری حد ہے، اس کے بعد سندھ کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے، اس لیے ایران کی سرزمین سے نکل کر اسلامی پرچم ہندوستان کی حدود کی طرف بڑھا۔ اس مہم میں حکم بن عمرو تغلبی مامور ہوئے تھے، چنانچہ آپ ۲۳ھ میں مکران کی طرف روانہ ہوئے اور نہر مکران کے اس طرف فوجیں اُتاریں، یہاں کا حکمران راسل سندھ کے حکمران کی مدد لے کر مقابلہ پر آیا، لیکن ایک خونریز جنگ کے بعد اسے شکست ہوئی اور مکران پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔

حکم بن عمرو نے صحار عبدی کو نامۂ فتح اور مالِ غنیمت جس میں چند ہاتھی بھی تھے، دے کر امیر المومنینؓ کے پاس بھیجا، آپ نے ان سے مکران کا حال پوچھا۔ اس پر صحار عبدی نے عرض کیا کہ :-

اَرْضٌ سَھْلُھَا جَبَلٌ وَمَاءُھَا وَشَلٌ وَتَمْرُھَا وَقَلٌ وَعَدُوُّھَا بَطَلٌ وَخَیْرُھَا قَلِیْلٌ وَشَرُّھَا طَوِیْلٌ وَالْکَثِیْرُ بِھَا قَلِیْلٌ[1]

حضرت عمرؓ نے فرمایا، واقعات کے بیان میں قافیہ بندی کا کیا کام؟ انہوں نے کہا "واقعی حالات بیان کر رہا ہوں"۔ حضرت عمرؓ نے یہ بھیانک نقشہ سُن کر حکم لکھ بھیجا کہ آگے پیشقدمی روک دی جائے، چنانچہ مشرق میں فتوحات فاروقیؓ کی آخری حد یہی مکران ہے، لیکن مؤرخ بلاذری کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ سندھ کے علاقہ دیبل تک اسلامی فوجیں پہنچ گئی تھیں، اگر یہ صحیح ہے تو حضرت عمرؓ کے عہد ہی میں اسلام کا قدم ہندوستان میں پڑ چکا تھا۔

خراسان کی فتح اور یزدگرد کا آخری مقابلہ

ان فتوحات کے دوران میں خاندانِ کیانی کا آخری تاجدار یزدگرد خراسان کے شہر مرو میں مقیم تھا، مقدس آگ ساتھ تھی اور وہ یہاں سے ہی بیٹھے بیٹھے ایران کے مختلف صوبوں میں بغاوت کراتا رہتا تھا۔ چنانچہ حضرت احنفؓ بن قیس جو خراسان کی مہم پر مامور تھے، ۲۲ھ میں خراسان کی طرف بڑھے اور ہرات کو فتح کرنے کے بعد یزدگرد کے مستقر مرو شاہجہان کا رُخ کیا اور مطرف بن عبداللہ کو نیشاپور اور حارث بن حسّان کو سرخس روانہ کیا، یزدگرد نے جب حضرت احنفؓ بن قیس کو مرو شاہجہان کی طرف بڑھتے دیکھا تو مروالرود چلا گیا اور خاقان چین اور ایران کے آس پاس کے سرحدی فرمانرواؤں سے مدد طلب کی، حضرت احنفؓ کو خبر ہوئی، تو آپ فوراً مروالرود پہنچ گئے، یزدگرد یہاں سے نکل کر بلخ چلا گیا حضرت احنفؓ نے تعاقب کیا، یزدگرد شکست کھا کر تاتاری علاقہ میں نکل گیا۔ حضرت احنفؓ نے بلخ پر قبضہ کر کے خراسان کے سارے علاقہ میں فوجیں پھیلا دیں، اس طرح چند دنوں کے اندر اندر نیشاپور سے طخارستان تک کا علاقہ زیرنگیں ہو گیا۔

یزدگرد ایران سے بھاگ کر جب خاقان کے دربار میں پہنچا تو اس نے بڑے احترام کے ساتھ ٹھہرایا اور چند دنوں کے بعد ترک، فرغانہ اور صغد کی فوجیں جمع کر کے یزدگرد کے ہمراہ خراسان کی طرف بڑھا، حضرت احنفؓ اس وقت مروالرود میں تھے، خاقان نے یہاں پہنچ کر حضرت احنفؓ کے مقابلہ میں صف آرائی کی، ایک دن خاقان کی فوج کے تین بہادر فوج کے آگے آگے طبل و دمامہ بجاتے ہوئے نکلے، حضرت احنفؓ نے تینوں کو قتل کر دیا جس سے خاقان کا عزم و استقلال متزلزل ہو گیا، اس نے سمجھ لیا کہ مسلمانوں سے لڑنے میں خود اس کا کوئی فائدہ نہیں اور دوسروں کے لیے ایسے بہادروں کو چھیڑنا مصلحت نہیں، چنانچہ اسی وقت کوچ کا حکم دے دیا اور اپنے حدود میں واپس چلا گیا۔

یزدگرد کو جب خاقان کے واپس جانے کی خبر ملی، تو اس نے مایوس ہو کر خاندانِ کیانی کے خزانہ اور کل موروثی دولت سمیت ترکستان جانے کا عزم کیا۔ درباریوں نے دیکھا کہ ملک کی دولت ہاتھ سے نکلی جاتی ہے، اسے روکا، لیکن یزدگرد نہ مانا اور خزانہ ساتھ لے جانے پر اصرار کیا، اس پر درباریوں نے تمام مال و اسباب اس سے زبردستی چھین لیا، یزدگرد بے سروسامانی کی حالت میں خاقانِ چین کے پاس پہنچا اور قدا کی نافرمانی کے باعث مدتوں فرغانہ کی گلیوں میں خاک چھانتا رہا۔

---

[1] الفاروق

یزدگرد کے ملک بدر ہو جانے کے بعد ایرانیوں نے حضرت احنف رضی اللہ عنہ کے پاس جا کر صلح کر لی اور تمام خزانہ ان کے حوالے کر دیا، مسلمانوں نے بھی اس کے صلہ میں ان لوگوں سے ایسا برتاؤ کیا کہ وہ اپنی بادشاہت بھول گئے اور نہایت فارغ البالی اور آرام و سکون سے رہنے لگے۔

حضرت احنف رضی اللہ عنہ نے بارگاہ خلافت میں نامۂ فتح روانہ کیا، حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے تمام لوگوں کو جمع کر کے فتح کا مژدہ سنایا اور اس موقع پر ایک مؤثر تقریر کی، آخر میں فرمایا:

"آج مجوسیوں کی سلطنت برباد ہو گئی۔ اب ان کے ملک کی ایک چپہ زمین بھی ان کے پاس نہیں ہے کہ مسلمانوں کو کسی قسم کا نقصان پہنچا سکیں، اللہ تعالیٰ نے ان کی زمین، ان کا ملک اور ان کی دولت کا تم کو اس لیے وارث بنایا ہے کہ تم کو آزمائے، اس لیے تم اپنی حالت نہ بدلو، ورنہ خدا بھی تمہاری جگہ دوسری قوم کو بدل دے گا۔" [1]

فتوحاتِ شام

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آغاز ۱۳ھ میں شام پر کئی اطراف سے لشکر کشی کے لیے حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کو حمص پر، حضرت یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کو دمشق پر، حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ کو اردن پر اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو فلسطین پر مامور کیا تھا۔ مسلمان فوجوں کی مجموعی تعداد چوبیس ہزار تھی، جب یہ افسر عرب کی سرحد سے نکلے تو قدم قدم پر انہیں رومیوں کے بڑے بڑے جتھے ملے جو پہلے سے مقابلہ کے لیے تیار تھے، ان کے علاوہ قیصر روم نے تمام ملک سے فوجیں جمع کر کے الگ الگ فسرون کے مقابلہ پر بھیجیں، اس پر اسلامی افسروں نے کل فوج کو ایک مقام پر جمع کرنے پر اتفاق کیا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو مزید کمک بھیجنے کے متعلق لکھ بھیجا، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو جو عراق کی مہم پر متعین تھے، دمشق پہنچنے کا حکم دیا، چنانچہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ عراق سے چل کر راہ میں چھوٹی چھوٹی لڑائیاں لڑتے اور فتح حاصل کرتے ہوئے دمشق پہنچے، اور اس کو صدر مقام قرار دے کر وہاں قیام کیا، قیصر نے ایک فوج گراں مقابلہ کے لیے بھیجی جس نے اجنادین پہنچ کر لڑائی کی تیاریاں شروع کیں، حضرت خالد رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ بن الجراح خود پیشقدمی کر کے اجنادین کی طرف بڑھے اور دیگر افسروں کو لکھ بھیجا کہ وہیں آ کر ملیں، حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے بڑھ کر حملہ کیا اور ایک خونریز معرکہ کے بعد فتح حاصل کر لی، پھر دمشق کا رخ کیا اور وہاں پہنچ کر محاصرہ کر لیا، یہ محاصرہ ابھی جاری تھا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت ختم ہو گیا اور اس کی فتح عہدِ فاروقی میں عمل میں آئی۔ [2]

فتح دمشق

دمشق کی فتح کے متعلق مؤرخین نے لکھا ہے کہ دورانِ محاصرہ دمشق کے بطریق کے گھر لڑکا پیدا ہوا۔ اہل شہر نے اس خوشی کے موقع پر جشن منایا، خوب شرابیں پئیں اور ایسے بدمست ہو کر سوئے کہ کسی بات کی خبر نہ رہی، حضرت خالد رضی اللہ عنہ راتوں کو سوتے نہ تھے بلکہ گھوم پھر کر خبریں لیا کرتے تھے، چنانچہ جب انہیں اہل شہر کی اس بے خبری کی اطلاع ہوئی، تو چند جانبازوں کے کمندوں کے ذریعہ شہر پناہ کی دیوار پر چڑھ کر شہر کے اندر اتر گئے اور محافظوں کو تہ تیغ کر کے پھاٹک کھول دیے۔ مسلمان جو باہر انتظار میں تھے، ہجوم کر کے شہر میں داخل ہو گئے۔ اہل شہر اس ناگہانی آفت سے ایسے بوکھلائے کہ انہیں کچھ سمجھ نہیں آتا تھا کہ کیا کریں، حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ شہر کی دوسری

---

[1] یہ تفصیلات الفاروق حصہ اول اور تاریخ اسلام حصہ اول از شاہ معین الدین سے ماخوذ ہیں۔ [2] الفاروق حصہ اول

سمت متعین تھے، یہ لوگ اُن کے پاس پہنچے اور صلح کی درخواست کی، حضرت ابُوعبیدہ رضؓ کو چونکہ صورتِ حال کا علم نہ تھا، اس لیے صلح کر لی، چنانچہ شہر کی ایک سمت سے حضرت ابوعبیدہ رضؓ مصالحانہ داخل ہوئے اور دوسری طرف سے خالد رضؓ فاتحانہ، لیکن حضرت ابوعبیدہ رضؓ چونکہ مصالحت کر چکے تھے، اس لیے دمشق کی فتح کو مصالحانہ قرار دے کر اہلِ دمشق کا جان و مال سے کسی قسم کا کوئی تعرض نہ کیا گیا۔

اُردن کی فتح — معرکۂ فحل

رومی، دمشق کی فتح سے سخت برہم ہوئے اور ہر طرف سے فوجیں جمع کر کے مسلمانوں کے مقابلہ کے لیے اردن کے مقام بیسان میں آ کر خیمہ زن ہوئے، مسلمانوں نے ان کے سامنے فحل میں پڑاؤ ڈالا۔ عیسائیوں کی درخواست پر حضرت معاذ بن جبل رضؓ سفیر بن کر گئے مگر مصالحت کی کوئی صورت نہ نکلی اور ذیقعدہ ۱۴ھ میں جنگ شروع ہو گئی۔ کئی خونریز معرکوں کے بعد عیسائیوں نے شکستِ فاش کھائی اور مسلمان اُردن کے پُورے صوبہ پر قابض ہو گئے۔ رعایا ذمی قرار دی گئی اور ہر جگہ اعلان کر دیا گیا کہ "مفتوحین کی جان، مال، زمین، مکانات، گرجے اور عبادت گاہیں سب محفوظ رہیں گی۔ صرف مسجدوں کی تعمیر کے لیے کسی قدر زمین لے لی جائے گی۔" [1]

حمص وغیرہ کی فتح

دمشق اور اُردن کی فتح کے بعد بیت المقدس، حمص اور انطاکیہ تین بڑے شہر رہ گئے تھے۔ اس لیے حضرت ابُوعبیدہ رضؓ اور حضرت خالد رضؓ حمص کی طرف بڑھے اور راستہ میں بعلبک پر قبضہ کرتے ہوئے حمص پہنچ کر اس کا محاصرہ کر لیا۔ یہاں حکومت کی کوئی فوج نہ تھی۔ پھر بھی اہلِ حمص نے حکومت کی امداد کی امید پر چند دنوں تک مدافعت کی لیکن چونکہ مسلمانوں نے مدد پہنچنے کا راستہ بند کر دیا تھا۔ اس لیے شہر والوں نے مایوس ہو کر آخر کار صلح کر لی، حمص کے محاصرہ کے دوران حضرت ابُوعبیدہ رضؓ نے حماۃ، شیزر اور معرۃ النعمان جیسے چھوٹے چھوٹے مقامات فتح کر لیے، چنانچہ اس کی تسخیر کے بعد حضرت ابُوعبیدہ رضؓ نے حضرت عبادہ رضؓ بن صامت کو یہاں متعین کیا اور خود لاذقیہ روانہ ہو گئے، یہ اگرچہ نہایت مستحکم و مضبوط شہر تھا، تاہم حضرت ابُوعبیدہ رضؓ نے ایک خاص تدبیر سے اسے فتح کر لیا اور پھر ہرقل کے پایۂ تخت انطاکیہ کا ارادہ کیا لیکن دربارِ خلافت سے حکم پہنچا کہ اس سال آگے بڑھنے کا قصد نہ کیا جائے، اس لیے رُک جانا پڑا۔

میدانِ یرموک اور شام کی قسمت کا فیصلہ

دمشق، اُردن، حمص اور لاذقیہ کی فتوحات نے رومیوں کو جوش سے لبریز کر دیا، انہوں نے ہرقل کے پاس جا کر فریاد کی کہ مسلمانوں نے سارا شام پامال کر دیا اور کوئی طاقت انہیں روکنے والی نہیں، ہرقل نے چند معزز اور صائب رائے لوگوں کو بلا کر پوچھا کہ کیا وجہ ہے؟ کہ عرب تم سے ہر چیز میں کم ہونے کے باوجود فتح حاصل کرتے جا رہے ہیں؟ اس کے جواب میں سب نے سر جھکا لیا، تاہم ایک تجربہ کار شخص نے جواب دیا کہ عربوں کا اخلاق ہمارے اخلاق سے اچھا ہے، وہ رات کو عبادت کرتے اور دن کو روزہ رکھتے ہیں، کسی پر ظلم نہیں کرتے اور آپس میں برابری سے رہتے ہیں، لیکن ان کے مقابلہ پر ہمارا یہ حال ہے کہ ہم شراب پیتے، بدکاریاں کرتے اور دوسروں پر ظلم روا رکھتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے ہر کام میں جوش و استقلال ہوتا اور ہمارے کام اُن سے خالی ہوتے ہیں۔

قیصر نے مسلمانوں کی روز افزوں فتوحات اور اس کے مقابلہ پر رومیوں کی بیچارگی سے دل برداشتہ ہو کر شام چھوڑ کر قسطنطنیہ

---

[1] الفاروق حصہ اوّل

جانے کا قصد کیا، لیکن جوق در جوق بیکس و درماندہ رومیوں کی فریاد سُن کر اسے غیرت آگئی اور وہ پوری طاقت سے مسلمانوں کے مقابلہ کے لیے تیار ہو گیا، چنانچہ تمام ممالک محروسہ میں فوجوں کے اجتماع کے فرامین جاری کر دیے۔ رومی پہلے ہی جذبۂ انتقام سے سرشار ہو رہے تھے، قیصر کے فرامین نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور انطاکیہ پر فوجوں کا طوفان اُمڈ آیا۔

مسلمانوں کی تیاریاں ادھر مسلمان بھی رومیوں کی ان پرجوش تیاریوں سے بے خبر نہیں تھے، حضرت ابوعبیدہؓ نے فوج کے افسروں سے مشورہ کیا، سب نے مختلف آراء پیش کیں، آخر میں یہ قرار پایا کہ تمام منتشر فوجیں ایک جگہ جمع کر لی جائیں، چنانچہ دمشق میں اجتماع ہوا اور ذمیوں سے جو کچھ جزیہ وصول کیا تھا۔ سب واپس کر دیا گیا، کیونکہ مسلمان اب ان کی حفاظت سے مجبور تھے، اس واقعہ سے عیسائی اور یہودی اس درجہ متاثر ہوئے کہ سب رو رو کر مسلمانوں کی واپسی کی دعائیں کرتے تھے۔

دمشق میں اجتماع کے بعد حضرت ابوعبیدہؓ نے امیرالمومنین حضرت عمرؓ کو ان تازہ حالات کی اطلاع بھجوائی، حضرت عمرؓ پہلے تو مفتوحہ مقامات سے مسلمانوں کے ہٹ آنے کی خبر سے بہت رنجیدہ خاطر ہوئے۔ لیکن جب معلوم ہوا کہ تمام افسروں کی یہی رائے تھی تو فی الجملہ تسلی ہو گئی اور فرمایا خدا کی مصلحت اسی میں ہو گی، پھر حضرت سعیدؓ بن عامر کو ایک ہزار کی جمعیت کے ساتھ مدد کے لیے روانہ کیا اور قاصد کو ہدایت کی کہ خود ایک ایک صف میں جا کر زبانی پیغام پہنچانا۔

> اے برادران اسلام! عمرؓ نے بعد سلام کے تم کو پیغام دیا ہے کہ پوری سرگرمی کے ساتھ جنگ کرو اور دشمن پر شیروں کی طرح، اس طرح حملہ آور ہو کہ وہ تم کو چیونٹیوں سے زیادہ حقیر معلوم ہوں، ہم کو یقین کامل ہے کہ خدا کی نصرت تمہارے ساتھ ہے اور آخری فتح تمہارے ساتھ ہے [1]

معرکۂ یرموک اُردن کی حدود میں یرموک کا میدان جنگی ضروریات کے لحاظ سے مسلمان کے لیے نہایت موزوں اور باموقع تھا، چونکہ اس کی پشت پر عرب کی سرحد تک کوئی روک نہ تھی، اس لیے حضرت ابوعبیدہؓ نے رومیوں کے مقابلہ کے لیے اسی میدان کا انتخاب کیا اور کل فوجیں دمشق سے یرموک میں منتقل کر دیں، رومیوں کی تعداد دو لاکھ تھی، جبکہ اس کے مقابلہ پر مسلمانوں کی تعداد تیس ہزار سے زیادہ نہ تھی، لیکن سب کے سب یگانۂ روزگار تھے۔ اس فوج کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس میں ایک ہزار بزرگ ایسے تھے جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جمال اقدس دیکھا تھا، ایک سو وہ تھے جنہیں غزوۂ بدر میں شرکت کا شرف حاصل تھا، باقی مجاہدین بھی ایسے قبائل سے تعلق رکھتے تھے جو شجاعت اور سپہ گری میں اپنی نظیر آپ تھے۔

یرموک کے پہلے مقابلہ میں اگرچہ مسلمانوں کا پلہ بھاری رہا تاہم کوئی نتیجہ نہ نکلا اور جنگ آئندہ کے لیے ملتوی ہو گئی، التوائے جنگ کے بعد رومیوں نے مصالحت کی کوشش کی اور گفتگو کے لیے سفیر طلب کیا۔ حضرت ابوعبیدہؓ نے حضرت خالد بن ولیدؓ کو بھیجا لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا، چنانچہ ۵ رجب ۱۵ھ کو دوسرا معرکہ پیش آیا، رومیوں کے جوش کا یہ عالم تھا کہ تیس ہزار آدمیوں نے پاؤں میں بیڑیاں پہن لیں کہ بھاگنے کا خیال تک نہ آئے۔ ہزاروں پادری اور بشپ ہاتھوں میں صلیب لیے آگے آگے تھے اور حضرت عیسیٰ کا نام لے لے کر

---

[1] سیر الصحابہ بحوالہ خلفائے راشدین۔

جوش دلاتے تھے، غرض اس جوش و اہتمام کے ساتھ رومیوں نے حملہ کیا اور ڈیڑھ لاکھ کا ٹڈی دل ایک ساتھ بڑھا، فریقین میں ایسی خونریز اور گھمسان کی جنگ ہوئی کہ کشتوں کے پشتے لگ گئے، درمیان میں بعض موقعوں پر مسلمانوں کا بازو کمزور پڑ گیا لیکن انجام کار ان کی ثابت قدمی اور پامردی کے آگے رومیوں کے پاؤں اکھڑ گئے، تقریباً ایک لاکھ عیسائی کھیت رہے اور مسلمان کل تین ہزار کام آئے۔ اس شکست نے رومیوں کی قوت کا خاتمہ کر دیا، چنانچہ جب قیصر کو اس کی خبر ہوئی تو نہایت حسرت و افسوس کے ساتھ شام کو الوداع کہہ کر قسطنطنیہ کی طرف روانہ ہو گیا حضرت عمرؓ نے مژدۂ فتح سنا تو اسی وقت سجدہ میں گر کر خدا کا شکر ادا کیا۔

یرموک کے معرکہ نے رومیوں کی قوت پاش پاش کر دی تھی، اس لیے مسلمانوں نے لوقا، حومہ، سرمین، توزی، تورس اور دلوک وغیرہ چھوٹے چھوٹے مقامات نہایت آسانی کے ساتھ فتح کر لیے، حلب، قنسرین اور پایۂ تخت انطاکیہ کے رومیوں نے کچھ مزاحمت کی، لیکن چونکہ کوئی بڑی طاقت ان کی پشت پر نہ تھی، اس لیے بہت جلد اطاعت قبول کر لی۔

بیت المقدس

اوپر گزر چکا ہے کہ فلسطین کی مہم پر حضرت عمرو بن العاصؓ مامور ہوئے تھے۔ انہوں نے نابلس، لد، عمواس اور بیت جبرین پر قبضہ کر کے ۱۶ھ میں بیت المقدس کا محاصرہ کر لیا۔ عیسائیوں نے قلعہ بند ہو کر مقابلہ کیا۔ اسی اثنا میں حضرت ابو عبیدہؓ بھی یرموک وغیرہ سے فارغ ہو کر ان سے مل گئے۔ عیسائیوں نے چند دنوں تک مدافعت کی، لیکن چونکہ ان کی قوت ٹوٹ چکی تھی، اس لیے مصالحت پر آمادہ ہو گئے اور اپنے اطمینان کے لیے یہ شرط پیش کی کہ امیر المومنینؓ خود آکر صلح کا معاہدہ لکھیں، حضرت عمرؓ کو اس کی اطلاع دی گئی۔ آپ نے اکابر صحابہؓ سے مشورہ کے بعد اسے منظور کر لیا اور حضرت علیؓ کو مدینہ میں اپنا قائم مقام بنا کر رجب ۱۶ھ میں مدینہ سے روانہ ہوئے۔

بیت المقدس کا سفر

حضرت عمرؓ کا یہ سفر نہایت سادگی سے ہوا، آپ کی روانگی کی خبر حضرت ابو عبیدہؓ اور تمام دوسرے مسلمان افسروں کو دے دی گئی تھی، انہوں نے مقام جابیہ میں آپ کا استقبال کیا۔ مسلمان افسروں کے بدن پر دیبا و حریر کی پر تکلف قبائیں تھیں۔ حضرت عمرؓ کو اسلامی سادگی کی جگہ یہ ٹھاٹھ باٹھ دیکھ کر غصہ آگیا اور کنکریاں مار کر فرمایا: "تم نے اتنی جلدی عجمی عادات اختیار کر لیں"۔ مسلمان افسروں نے قبا کا دامن اٹھا کر دکھایا کہ نیچے ہتھیار ہیں فرمایا "تو پھر کچھ مضائقہ نہیں"۔[1]

جابیہ میں دیر تک قیام رہا۔ بیت المقدس کے عیسائی بھی جابیہ آگئے تھے۔ چنانچہ یہیں معاہدہ صلح ترتیب دیا گیا اور اس پر تمام معزز صحابہؓ کے دستخط ہو گئے۔

معاہدہ کی تکمیل کے بعد حضرت عمرؓ بیت المقدس روانہ ہوئے، آپ کا لباس اس قدر فرسودہ اور معمولی حیثیت کا تھا کہ مسلمانوں کو شرم آتی تھی کہ عیسائی اپنے دل میں کیا کہیں گے، چنانچہ انہوں نے ترکی گھوڑا اور قیمتی پوشاک حاضر کی، آپ نے فرمایا "خدا نے جو ہم کو عزت دی ہے وہ اسلام کی عزت ہے اور وہی ہمارے لیے بس ہے"[2] غرض یہی لباس زیب تن کیے بیت المقدس میں داخل ہوئے۔ سب

---

[1] تاریخ اسلام حصہ اول از شاہ معین الدین [2] الفاروق حصہ اول۔

پہلے مسجد میں گئے، پھر عیسائیوں کے گرجا کی سیر کی، نماز کا وقت ہوا، تو عیسائیوں نے گرجا میں نماز پڑھنے کی درخواست کی، لیکن آپ نے اس خیال سے کہ آئندہ نسلیں اس کو حجت قرار دے کر مسیحی معبدوں میں دست اندازی نہ کریں، باہر نکل کر نماز پڑھی۔[1]

چونکہ یہاں اکثر افسرانِ فوج اور عمال جمع ہو گئے تھے۔ اس لیے بیت المقدس میں کئی دن تک قیام رہا، ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مؤذن حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے شکایت کی کہ امیر المومنین رضی اللہ عنہ ہمارے افسر پرند کا گوشت اور میدے کی روٹیاں کھاتے ہیں۔ لیکن عام مسلمانوں کو معمولی کھانا بھی نصیب نہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے افسروں کی طرف مستفسرانہ نگاہوں سے دیکھا، انہوں نے عرض کیا کہ یہاں سب چیزیں ارزاں ہیں، جتنی قیمت پر حجاز میں روٹی اور کھجور ملتی ہے، یہاں اسی قیمت پر پرندکا گوشت اور میدہ ملتا ہے، اس جواب پر ان کو منع تو نہ کر سکے لیکن حکم دے دیا کہ مالِ غنیمت اور تنخواہ کے علاوہ ہر سپاہی کا کھانا بھی مقرر کر دیا جائے۔[2]

ایک دن آپ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے اذان کہنے کی درخواست کی، انہوں نے کہا کہ میں نے عہد کیا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی کے لیے اذان نہ کہوں گا، لیکن آج (اور صرف آج) آپ کی خواہش پوری کر دوں گا، حضرت بلال رضی اللہ عنہ جب اذان دینے لگے، تو صحابہ رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عہدِ مبارک یاد آ گیا اور سب کی آنکھیں بے اختیار اشک بار ہو گئیں، حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ روتے روتے بیتاب ہو گئے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ہچکی بندھ گئی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیت المقدس سے واپسی کے وقت تمام مفتوحہ علاقوں کا دورہ کیا۔ سرحدوں کا معائنہ کر کے ملک کی حفاظت کا انتظام کیا اور پھر بخیر و خوبی مدینہ واپس تشریف لے گئے۔

حمص میں بغاوت

بیت المقدس کی فتح کے بعد بھی متفرق معرکے پیش آئے، جزیرہ جو عراق کا حصہ ہے، اس وقت تک فتح نہ ہوا تھا، اس کی اور شام کی سرحد ملی ہوئی ہے، اس لیے اہلِ جزیرہ کو شام کی فتح کے بعد اپنے ملک کے بارہ میں خطرہ پیدا ہوا، انہوں نے عیسائیوں کے جذبات سے فائدہ اٹھانا چاہا اور قیصرِ روم کو لکھا کہ اگر تم مسلمانوں کے مقابلہ کے لئے اٹھو تو ہم ساتھ دینے کے لئے تیار ہیں، اس پر قیصر نے ایک فوج کثیر حمص روانہ کی۔ ادھر سے اہلِ جزیرہ بھی تیس ہزار کی جمعیت کے ساتھ شام کی طرف بڑھے، دونوں فوجوں نے مل کر ۱۸ھ میں حمص واپس لینے کی کوشش کی لیکن ناکام رہیں اور تھوڑی دیر لڑ کر اس بدحواسی میں بھاگیں کہ مرج الدیباج تک ان کے قدم نہ جمے یہ آخری معرکہ تھا جس کی ابتداء خود عیسائیوں کی طرف سے ہوئی اور جس کے بعد ان کو پھر کبھی پیش قدمی کی جرأت نہ ہو سکی۔

حضرت خالد بن ولید کی معزولی

شام کی فتوحات اور ۱۷ھ کے واقعات میں سے اہم واقعہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ بن ولید کی معزولی ہے، عام طور پر مؤرخین کا بیان ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے زمامِ خلافت سنبھالتے ہی حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو معزول کر دیا تھا، لیکن صحیح روایات کے مطابق یہ واقعہ ۱۷ھ کا ہے۔[3] نیز اس واقعہ کی تفصیلات میں بھی اختلاف ہے، کہ آخر وہ کیا وجوہات تھیں جن کی بناء پر حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو معزول کیا گیا تھا، اس ضمن میں قوی تر وجہ وہی ہے جس کا اظہار خود

---

[1] سیر الصحابہ رضی اللہ عنہ خلفائے راشدین۔ [2] تاریخ اسلام حصہ اول۔ [3] الفاروق جلد اول

حضرت عمرؓ فاروق نے کیا، مؤرخین کے مطابق معزولی کے بعد حضرت خالدؓ نے مدینہ آکر حضرت عمرؓ سے شکوہ کیا حضرت عمرؓ نے فرمایا: "خالدؓ واللہ تم مجھے ویسے ہی محبوب ہو اور میں تمہاری عزت کرتا ہوں" اور عمال کو لکھ بھیجا کہ "میں نے خالدؓ کو ناراضی یا خیانت کی وجہ سے معزول نہیں کیا ہے، بلکہ ان کے کارناموں کی وجہ سے لوگ فتنے میں مبتلا ہو رہے تھے، اس لیے میں نے انہیں معزول کر دیا، تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ جو کچھ کرتا ہے خدا کرتا ہے"۔ مؤرخین کے بیان کے مطابق جو قاصد معزولی کا حکم لے کر آیا اس نے بھرے مجمع میں نشانِ معزولی کے طور پر حضرت خالدؓ کے سر سے ٹوپی اُتاری اور اُن ہی کے عمامہ سے اُن کی گردن باندھ دی۔ حضرت خالدؓ نے اس موقع پر صرف اس قدر کہا کہ میں نے اس حکم کو سنا اور مانا اور اب بھی میں افسروں کے احکام ماننے اور خدمت بجالانے کے لیے تیار ہوں، اس سے حضرت خالدؓ کی حق پرستی اور حضرت عمرؓ کے دبدبہ دونوں کا اندازہ ہوتا ہے کہ اتنے بڑے سپہ سالار کو بھرے مجمع میں معزول کیا جاتا ہے، لیکن دم نہیں مارتا، بہر حال اس واقعہ کو قدرے وضاحت کے ساتھ حضرت خالدؓ بن ولید کے حالات میں لکھا جائے گا، یہاں اس کی تفصیل کا موقع نہیں۔

طاعون عمواس

۱۸ھ میں شام میں نہایت سخت طاعون پھیلا اور اسلام کی بڑی بڑی یادگاریں خاک میں چھپ گئیں، وبا کا آغاز ۱۷ھ کے آخر میں ہوا اور کئی مہینے تک نہایت شدت رہی حضرت عمرؓ کو جب خبر پہنچی تو آپ کو بڑا تردد پیدا ہوا اور آپ خود اس کی تدبیر اور انتظام کے لیے شام روانہ ہوئے، لیکن مقام سرغ میں پہنچ کر معلوم ہوا کہ وبا کا زور بڑھتا جا رہا ہے۔ اس لیے صحابہؓ کے مشورہ سے لوٹ آئے اور حضرت ابو عبیدہؓ کو بھی بُلا بھیجا، وہ چونکہ تقدیر کے مسئلہ پر نہایت شدت سے اعتقاد رکھتے تھے، اس لیے جواب میں لکھ بھیجا کہ جو قسمت میں لکھا ہے وہ پورا ہو گا، میں مسلمانوں کو چھوڑ کر نہیں آسکتا۔ حضرت عمرؓ یہ خط پڑھ کر بہت روئے اور حضرت ابو عبیدہؓ کو دوبارہ لکھا کہ اگر تم نہیں آتے تو فوجوں کو مرطوب مقامات سے ہٹا دو، حضرت ابو عبیدہؓ نے اس حکم کی تعمیل کی اور جابیہ چلے گئے جو آب و ہوا کی خوبی کے لیے مشہور تھا۔

حضرت ابو عبیدہؓ پر وبا کا اندرونی اثر ہو چکا تھا، اس لیے جابیہ پہنچ کر بیمار ہو گئے۔ جب زیادہ شدت ہوئی، تو لوگوں کو جمع کر کے نہایت مؤثر تقریر کی۔ حضرت معاذ بن جبلؓ کو اپنا جانشین مقرر کیا اور انتقال کر گئے، وبا کا زور بڑھتا جا رہا تھا، حضرت عمروؓ بن العاص نے لوگوں سے کہا کہ یہ وبا انہی بلاؤں میں سے ہے، جو بنی اسرائیل کے زمانہ میں مصر پر نازل ہوئی تھیں، اس لیے یہاں سے نکل چلنا چاہیے۔ حضرت معاذؓ میں مذہب کا نشہ تیز تھا، چنانچہ جب انہیں حضرت عمروؓ بن العاص کی رائے کا علم ہوا، تو منبر پر چڑھ کر خطبہ پڑھا اور کہا، "یہ بلا نہیں بلکہ خدا کی رحمت ہے، اس میں بڑے بڑے صلحاء نے انتقال کیا ہے"۔ یہ تقریر کر کے گھر واپس آئے، تو نوجوان بیٹے کو بیمار پایا، وہ دیکھتے دیکھتے اُٹھ گیا۔ مگر حضرت معاذؓ کے استقلال میں فرق نہ آیا، بہر کیف بیٹے کو دفنا کر واپس آئے تو بیمار ہو گئے۔ حضرت عمروؓ بن العاص کو اپنا قائم مقام بنایا اور خود داعیٔ اجل کو لبیک کہا، حضرت عمروؓ بن العاص نے فوراً فوجوں کو پہاڑی مقامات میں بھیج دیا جس سے وبا کا خطرہ جاتا رہا۔

اس وبا سے پچیس ہزار جانیں ضائع ہوئیں ہزاروں عورتیں بیوہ اور ہزاروں بچے یتیم ہو گئے۔ حضرت عمرؓ نے اس قومی نقصان کے پیشِ نظر دوبارہ شام کا سفر اختیار کیا، اکثر اضلاع کا دورہ کر کے مناسب انتظامات کیے۔ فوج میں تنخواہیں تقسیم کیں اور متوفی مسلمانوں کے ورثاء کو بُلا کر ان کو ترکہ دلایا، سرحدی مقامات پر چھاؤنیاں قائم کیں اور جو جگہیں خالی ہو گئی تھیں، ان پر نئے عہدہ دار مقرر کیے، اُن

انتظامات سے فارغ ہوکر آپ مدینہ لوٹے، تو یہاں ایک اور مصیبت تاک میں تھی، وہ یہ کہ عرب میں شدید قحط ٹوٹ پڑا اور اگر آپ نہایت مستعدی سے انتظام نہ کرتے تو ہزاروں لاکھوں آدمی بھوک کا شکار ہو جاتے۔

قیساریہ کی فتح

طاعون عمواس سے پہلے ہی تقریب قریب پورا شام مسخر ہو چکا تھا لیکن ایک شہر قیساریہ رہ گیا تھا، جو اس زمانہ میں نہایت آباد اور پُر رونق تھا۔ اس شہر پر اوّل اوّل ۱۳ھ میں حضرت عمرو بن العاص رضؓ نے چڑھائی کی، مدت تک محاصرہ کیے رکھا، مگر شہر فتح نہ ہو سکا۔ حضرت ابوعبیدہؓ کے انتقال کے بعد امیر المومنین رضؓ نے حضرت یزیدؓ بن ابی سفیان کو اس مہم پر مقرر کیا، وہ سترہ ہزار کی جمعیت کے ساتھ وہاں پہنچے اور شہر کا محاصرہ کر لیا، لیکن ۱۸ھ میں جب بیمار ہوئے تو اپنے بھائی امیر معاویہ رضؓ کو اپنا قائم مقام کر کے دمشق چلے آئے اور یہیں وفات پائی، امیر معاویہؓ نے بڑے سر و سامان کے ساتھ محاصرہ جاری رکھا، تاہم شہر فتح نہ ہو سکا۔ ایک دن یوسف نامی ایک یہودی امیر معاویہؓ کے پاس آیا اور انہیں ایک سُرنگ کا نشان دیا، جو شہر کے اندر اندر قلعہ کے دروازے تک چلی گئی تھی، چند بہادروں نے اس سُرنگ کے راستے اندر پہنچ کر دروازہ کھول دیا، اسلامی لشکر دھاوا کر کے شہر میں داخل ہو گیا اور کشتوں کے پشتے لگا دیے، چونکہ یہ ایک مشہور مقام تھا، اس لیے اس کے مفتوح ہونے کے بعد شام کا مطلع بالکل صاف ہو گیا۔

مصر کی فتوحات

شام کے زیرِ نگین ہونے کے بعد اس کے اہم سرحدی ملک مصر پر لشکر کشی ہوئی، اس فتح کا سہرا تمام تر حضرت عمرو بن العاص کے سر ہے، آپ ظہورِ اسلام سے قبل بسلسلہ تجارت مصر آیا جایا کرتے تھے۔ چنانچہ اس زمانہ سے مصر کی شادابی اور زرخیزی ان کی نگاہ میں تھی۔ اس کے علاوہ دوسری وجہ یہ تھی کہ مصر کی قبطی حکومت قیصر روم کے ماتحت تھی۔ اس لیے شام کے اندر یا اس کے سرحدی علاقوں میں قبطیوں کے ذریعہ شورش بپا کرانے کا خدشہ ہر وقت موجود تھا، اس بنا پر شام کی حفاظت کے لیے مصر پر قبضہ کرنا ضروری تھا، چنانچہ حضرت عمروؓ بن العاص نے ۲۱ھ میں فاروق اعظمؓ سے باصرار اجازت لے کر چار ہزار فوج کے ساتھ مصر روانہ ہوتے اور عریش کے راستے فرما پہنچے، یہاں کی رومی فوجوں نے روکا، لیکن شکست کھائی، یہاں سے بڑھ کر حضرت عمروؓ بن العاص نے بلبیس اور ام دنین پر قبضہ کیا اور پھر فسطاط کی طرف بڑھے۔

فسطاط کا محاصرہ اور فتح

فسطاط اس زمانہ میں غیر آباد تھا، تاہم یہاں حکومتِ مصر کا ایک مضبوط قلعہ تھا، جس میں رومی فوجیں رہا کرتی تھیں، حضرت عمروؓ بن العاص نے ان کا محاصرہ کر لیا، لیکن چونکہ مصریوں کے مقابلہ پر مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی، اس لیے حضرت عمرؓ کو امدادی فوج کے لیے لکھا، امیر المومنینؓ نے حضرت زبیرؓ بن العوام، حضرت عبادہؓ بن صامت، حضرت مقدادؓ بن عمرو اور حضرت سلمہؓ بن مخلد کو دس ہزار کی جمعیت کے ساتھ بھیجا، حضرت عمروؓ بن العاص نے حضرت زبیرؓ بن العوام کو ان کے رتبے کے لحاظ سے افسر بنایا، کامل سات ماہ تک محاصرہ جاری رہا مگر کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ آخر میں حضرت زبیرؓ ایک دن ہمت کر کے قلعہ کی فصیل پر چڑھ گئے۔ بعض صحابہؓ بھی آپؓ کے ساتھ تھے، فصیل پر پہنچ کر اس زور سے نعرۂ تکبیر بلند کیا کہ عیسائی اس خیال سے کہ مسلمان قلعہ کے اندر گھس آئے ہیں، بدحواس ہو کر بھاگنے لگے، اسی اثنا میں حضرت زبیرؓ نے فصیل سے نیچے اُتر کر قلعہ کا پھاٹک کھول دیا اور لشکرِ اسلام اندر داخل ہو گیا۔ مقوقس والیٔ مصر نے صلح کر لی، قیصرِ روم کو جب اس مصالحت کی خبر ہوئی تو اس نے ایک لشکرِ گراں مسلمانوں کے مقابلہ کے لیے قسطنطنیہ سے اسکندریہ روانہ کیا۔

اسکندریہ کی فتح

فسطاط کی تسخیر کے بعد ۲۱ھ میں حضرت عمروؓ بن العاص اسکندریہ کی طرف بڑھے۔ راستہ میں رومیوں اور قبطیوں نے قدم قدم پر اسلامی لشکر کی پیش قدمی روکنے کی کوشش کی، مگر مسلمان برابر بڑھتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ مقام کریون میں پہنچ گئے۔ جہاں عیسائی لشکر سے نہایت خونریز معرکہ ہوا، تاہم میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہا۔ اس کے بعد پھر کسی نے راستہ روکنے کی جرأت نہ کی اور مسلمانوں نے اسکندریہ پہنچ کر اس کا محاصرہ کر لیا، مقوقس والیٔ مصر اگرچہ مصالحت پر قائم تھا، تاہم قیصر روم کے خوف سے بظاہر مقابلہ پر ڈٹا رہا لیکن خفیہ طور پر حضرت عمروؓ بن العاص سے طے کر لیا کہ چونکہ وہ اور اس کی قوم اس جنگ میں دل سے شریک نہیں ہیں اس لیے قبطیوں کو کوئی نقصان نہ پہنچنے پائے۔ بہرکیف اس خفیہ معاہدہ کے تحت قبطیوں نے مسلمانوں کو بہت کچھ مدد دی فسطاط سے اسکندریہ تک فوج کے آگے آگے پلوں کی مرمت کرتے اور سڑکیں بناتے گئے اور اسکندریہ کے محاصرہ میں بھی رسد وغیرہ کا انتظام انہی کی بدولت ہو سکا۔

اسکندریہ کا محاصرہ جس قدر طول کھینچتا جاتا تھا۔ حضرت عمرؓ کی تشویش بڑھتی جاتی تھی۔ چنانچہ آپ نے حضرت عمروؓ بن العاص کو لکھا کہ معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کے قیام کے اثر سے تم لوگ عیسائیوں کی طرح عیش و عشرت میں پڑ گئے ہو، ورنہ فتح میں اتنی دیر نہ ہوتی۔ میرا خط پہنچتے ہی متفقہ حملہ کر دو۔" اس خط پر حضرت عمرو بن العاصؓ نے تمام فوج کو یکجا کر کے خطبہ پڑھا اور ایسی مؤثر تقریر کی کہ بجھے ہوئے جوش تازہ ہو گئے۔ پھر حضرت عبادہؓ بن صامت کو سپہ سالار بنا کر اس زور کا متفقہ حملہ کیا کہ پہلے ہی حملہ میں شہر فتح ہو گیا۔ حضرت عمروؓ بن العاص نے اسی وقت حضرت معاویہؓ بن خدیج کے ذریعہ امیر المومنین کو فتح کی خوشخبری بھجوائی جسے سن کر حضرت عمرؓ زمین پر گرے اور سجدۂ شکر ادا کیا۔

متفرق فتوحات

حضرت عمروؓ بن العاص اسکندریہ فتح کرنے کے بعد واپس فسطاط آگئے، اب اگرچہ مصر میں کوئی اہم مقام باقی نہ رہ گیا تھا تاہم مصر کے چھوٹے چھوٹے مقاموں میں رومی پھیلے ہوئے تھے، چنانچہ اس خیال سے کہ آئندہ کسی خطرے کا احتمال نہ رہے، آپ ادھر متوجہ ہوئے اور خارجہ بن حذافہ عدوی اور عمر بن وہب الجمحی کو ان اضلاع پر مامور کیا خارجہ نے فیوم اشمونین اخیم بشرادات اور صعید وغیرہ کو مطیع بنایا، عمر بن وہب نے تنیس، دمیاط، تونہ، دمیرہ، دقہلہ اور شطا وغیرہ کو مسخر کیا اور عقبہ بن عامر الجہنی نے مصر کا نشیبی علاقہ فتح کیا، اس طرح چند دنوں کے اندر پورا مصر زیر نگیں ہو گیا۔

طرابلس الغرب کی تسخیر

مصر کی فتح کے بعد حضرت عمروؓ بن العاص نے شمالی افریقہ کا رخ کیا اور برقہ پہنچ کر اس کا محاصرہ کر لیا، اہل شہر نے جزیہ دے کر صلح کر لی، برقہ کی فتح کے بعد عقبہ بن نافع کو زویلہ بھیجا، یہاں کے باشندوں نے بھی صلح کر لی، پھر حضرت عمروؓ بن العاص نے طرابلس الغرب پر لشکر کشی کی اور ایک معمولی جنگ کے بعد وہ بھی فتح ہو گیا۔

حضرت عمرؓ کی شہادت

حضرت عمرؓ کی خلافت پورے عروج پر تھی کہ آپ کی شہادت کا حادثہ جانکاہ پیش آیا، اس کی تفصیل میں مؤرخین نے لکھا ہے کہ حضرت مغیرہؓ بن شعبہ کا پارسی غلام جس کا نام فیروز اور کنیت ابولولو تھی، ایک دن حضرت عمرؓ کے پاس آیا اور اپنے آقا کی شکایت کی کہ انہوں نے بہت بھاری محصول مقرر کیا ہے، آپ کم کرا دیجیے۔ آپ نے پوچھا، کتنا محصول لیتے ہیں؟ اس نے کہا دو درہم روزانہ، پوچھا تم کیا کام کرتے ہو؟ ابولولو نے کہا آہنگری

نجاری اور نقاشی، فرمایا ان صنعتوں کے مقابلے میں یہ رقم کچھ بہت نہیں ہے، اس فیصلہ پر وہ ناراض ہو کر چلا گیا ؎۱

دوسرے دن (یعنی ۲۶ ذوالحجہ ۲۳ھ کو فجر کی نماز کے وقت خنجر لیے مسجد میں آیا، جونہی حضرت عمرؓ نے نماز شروع کی ابولولو نے دفعۃً مسلسل چھ وار کیے جن میں سے ایک ناف کے نیچے پڑا، آپ اس صدمے سے گر پڑے اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے نماز تمام کرائی کچھ لوگ ابولولو کو گرفتار کرنے کے لیے بڑھے، اس نے انہیں بھی زخمی کر دیا، لیکن بالآخر پکڑ لیا گیا اور ساتھ ہی اس نے خودکشی کر لی، حضرت عمرؓ کو لوگ اٹھا کر گھر لائے، آپ نے پہلا سوال یہ کیا کہ میرا قاتل کون تھا؟

لوگوں نے عرض کیا "فیروز" فرمایا الحمدللہ، میرا قاتل مسلمان نہیں ہے؟ اس حادثہ سے تمام لوگوں پر ایک مصیبت نازل ہو گئی، بعض کہتے تھے کہ کوئی ڈر نہیں ہے، اچھے ہو جائیں گے، بعض کہتے تھے کہ ہم کو خوف معلوم ہوتا ہے، لیکن جب نبیذ پلایا گیا اور وہ شکم سے نکل گیا اور پھر دودھ بھی شکم میں نہ ٹھہر سکا تو اس وقت عام طور پر یقین ہو گیا کہ اب زندہ نہیں رہ سکتے، یہ خبر مشہور ہوئی تو چاروں طرف سے لوگ ٹوٹ پڑے، حضرت صہیبؓ آئے اور چیخ چیخ کر رونے لگے، حضرت عمرؓ نے فرمایا "صہیبؓ" تم مجھ پر روتے ہو؟ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ رونے پر بعض اقسام کے نوحہ سے عذاب ہوتا ہے۔" حضرت عمرؓ کو جب زندگی کی کوئی امید نہ رہی تو اپنی آخری قیامگاہ کی فکر متفکر ہوئی، چنانچہ اپنے صاحبزادے حضرت عبداللہؓ کو بلا کر حکم دیا کہ:

"عائشہؓ ام المومنین کے پاس جاؤ اور کہو عمرؓ آپ کو سلام کہتے ہیں، امیرالمومنین نہ کہنا کیونکہ میں آج مومنین کا امیر نہیں ہوں ان سے کہنا کہ عمرؓ بن خطاب آپ سے اپنے دونوں ساتھیوں (آنحضرت صلعم اور حضرت ابوبکرؓ) کے ساتھ دفن ہونے کی اجازت مانگتے ہیں" ؎۲

حضرت عبداللہؓ حضرت عائشہؓ کے پاس گئے، وہ رو رہی تھیں، حضرت عمرؓ کا سلام کہا اور پیغام پہنچایا، حضرت عائشہؓ نے فرمایا "یہ جگہ میں نے اپنے لیے تجویز کی تھی، لیکن عمرؓ کو اپنے اوپر ترجیح دوں گی" حضرت عبداللہؓ واپس آئے تو آپ نے پوچھا، کیا جواب لائے، عرض کی، امیرالمومنین کی جو تمنا تھی، فرمایا:-

"خدا کا شکر ہے، اس خوابگاہ سے زیادہ میرے لیے کوئی چیز اہم نہ تھی، جب میرا انتقال ہو تو جنازہ اٹھا کے جانا اور سلام کے بعد کہنا عمرؓ بن خطاب اجازت چاہتے ہیں، اگر وہ (حضرت عائشہؓ) اجازت دیں تو اندر لے جانا اور اگر انکار کریں تو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کر دینا۔"

جانشین

امیرالمومنین کی حالت اب نازک ہوتی جا رہی تھی، آخری وقت آ گیا تھا، اس لیے بعض لوگوں نے جانشینی کا سوال پیش کیا، ارشاد فرمایا: "اگر میں خلیفہ بناؤں تو ایسا کر سکتا ہوں کیونکہ ابوبکرؓ نے جو مجھ سے بہتر تھے خلیفہ بنایا تھا، اور اگر نہ بناؤں تب بھی ایسا کر سکتا ہوں کیونکہ رسول اللہ صلعم نے جو مجھ سے بہتر تھے خلیفہ نہیں بنایا تھا" ؎۳ لوگوں نے آپ کے اس خیال کی تعریف کی تاہم صحابہؓ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے بار بار درخواست کر رہے تھے، لیکن حضرت عمرؓ کی نظر کسی پر جمتی نہیں تھی، کیونکہ آپ اکثر زندگی میں اس مسئلہ پر غور

؎۱ الفاروق حصہ اول ؎۲ سیر الصحابہؓ جز المہاجرین ؎۳ ایضاً

کیا کرتے تھے۔ مگر اپنے معیار سے سب میں کچھ نہ کچھ کمی پاتے تھے۔ بعض لوگوں نے آپ کے صاحبزادے حضرت عبداللہؓ کا نام پیش کیا فرمایا "جسے بیوی کو طلاق دینے کا سلیقہ نہیں ہے وہ بارِ خلافت کیسے سنبھال سکتا ہے" لیکن جب متفقہ طور پر استخلاف کا مطالبہ ہوا تو فرمایا کہ،

"میں اس امر (خلافت) کا مستحق ان لوگوں سے زیادہ کسی کو نہیں پاتا، جن سے وفات کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم راضی تھے" اس کے بعد حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت سعدؓ ——— اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف چھ صحابہؓ کو، جن کی اسلام میں بڑی خدمات تھیں اور جنہیں رسول اللہ صلعم نے جنت کی بشارت دی تھی نامزد کر کے فرمایا کہ ان میں سے جس پر کثرتِ رائے ہو جائے، اسے امیر بنانا اور تاکید فرما دی کہ میری وفات کے بعد تین دن کے اندر اندر یہ مرحلہ طے ہو جائے، مزید حضرت صہیبؓ کو حکم دیا کہ میرے دفن سے فارغ ہونے کے بعد ان چھوؤں آدمیوں کو ایک مکان کے اندر بند کر دینا اور جب تک ان میں سے کسی کا انتخاب نہ ہو جائے، دروازہ نہ کھولنا، حضرت عبداللہؓ (آپ کے صاحبزادے) مشورہ میں شریک رہیں گے، لیکن امارت سے انہیں کوئی تعلق نہ ہوگا کثرتِ رائے کے بعد بھی اگر کوئی شخص خلافت کا مدعی رہے تو اسے قتل کر دینا"۔ [1]

آخری وصیتیں

نامزدگی کے مرحلے سے فراغت کے بعد فرمایا:

"میں اپنے بعد والے خلیفہ کو وصیت کرتا ہوں کہ مہاجرین اولین کا حق پہچانے اور ان کی عزت کی حفاظت کرے اور میں اس کو انصار کے حق میں بھلائی کی وصیت کرتا ہوں جنہوں نے مدینہ کو گھر بنایا اور ایمان کو پناہ دی مہاجرین سے پیشتر یہ کہ ان کے محسن کو قبول کرے اور برائی کرنے والے سے درگزر کرے اور میں اس کو اہلِ امصار کے متعلق بھلائی کی وصیت کرتا ہوں کیونکہ وہ اسلام کے پشت پناہ، مال کے فراہم کرنے والے اور دشمن کو غصہ دلانے والے ہیں، اُن سے جو کچھ لیا جائے۔ رضامندی سے لیا جائے اور فاضل مال لیا جائے اور میں اس کو اعراب کے ساتھ بھلائی کی وصیت کرتا ہوں کیونکہ وہ عرب کے اصل اور اسلام کا مادہ ہیں، اُن کا عمدہ مال نہ لیا جائے اور جو لیا جائے وہ اُن کے فقراء کو تقسیم کر دیا جائے اور میں اس کو ان لوگوں کی نسبت وصیت کرتا ہوں جن کو خدا اور رسولؐ کا ذمہ ہے، یہ کہ اُن کا عہد پورا کیا جائے اور ان کی طرف سے لڑا جائے اور ان کی طاقت سے زیادہ اُن کو تکلیف نہ دی جائے"۔ [2]

قومی اُمور سے فراغت کے بعد ذاتی معاملات کی طرف متوجہ ہوئے اور اپنے بیٹے حضرت عبداللہؓ کو بلا کر کہا کہ میرے بعد میرا قرض ادا کر دینا، اگر میرے متروکہ مال سے ادا نہ ہو سکے تو خاندان عدی سے درخواست کرنا، اگر ان سے بھی نہ ہو سکے تو کُل قریش سے، لیکن اُن کے علاوہ اور کسی کو تکلیف نہ دینا۔

وفات

غرض ہر قسم کی وصیتوں کے بعد چند دن بیمار رہ کر یکم محرم ۲۴ھ بروز شنبہ امیر المومنین حضرت عمرؓ بن الخطاب کی روح عالمِ قدس میں پرواز کر گئی، آفتاب تاریک ہو گیا، آسمان نے شفق کی سُرخی نمایاں کی، عرشِ عظیم جنبش میں آگیا، گردشِ روزگار رک گئی اور کائنات میں سناٹا چھا گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

بلاشبہ امیر المومنینؓ کی وفات کسی معمولی شخص کی وفات نہ تھی، کسی خاص مسلمان کی وفات نہ تھی، کسی برگزیدہ صحابیؓ کی وفات نہ تھی

---

[1] تاریخ اسلام حصہ اوّل از شاہ معین الدین۔ [2] سیر الصحابہؓ جزء المہاجرین۔

بلکہ ایک قوم کی وفات تھی، ایک امّت کی وفات تھی اور ایک کائنات کی وفات تھی اُن کے انتقال سے مدینہ میں در و دیوار متزلزل ہو گئے، عرب کا ستارۂ اقبال غروب ہو گیا، خلافتِ راشدہ کا شیرازہ بکھر گیا، شجاعت کی سدِ آہنیں پاش پاش ہو گئی ہو گئی، فتوحات کا سیلاب رُک گیا۔ فطرت کی شاہراہ گم ہو گئی۔ قلبِ اسلام شق ہو گیا اور علمِ توحید کے پرزے اُڑ گئے۔

تجہیز و تکفین کے بعد جنازہ اٹھایا گیا، جب حجرۂ عائشہ رضؓ (مزار نبویؐ) کے دروازہ پر پہنچے تو حضرت عبداللہؓ بن عمر رضؓ نے پکار کر کہا، "عمر رضؓ ابن الخطاب اجازت طلب کرتے ہیں" حضرت عائشہ رضؓ نے آواز دی، ان کو اندر لاؤ، چنانچہ میت اٹھا کر آنحضرت صلعم کی آغوش میں دے دی۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ

آج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر صحابی رضؓ اسلام کی عملی تصویر، قرآنِ حکیم کی روح اور عرب کا قلب، زمین کے اندر داخل ہوا تھا، اس لیے مسلمانوں پر ایک عالمگیر مصیبت چھا گئی، حضرت عمرو رضؓ بن العاص کہتے ہیں "ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آج سے قبل کبھی لوگوں پر مصیبت ہی نہیں آئی تھی"۔ انتقال کے وقت ترسیٹھ سال کی عمر تھی اور مدّتِ خلافت (زخمی ہونے تک) دس سال چھ ماہ اور چار دن۔

حُلیہ

آپ قوی آدمی تھے، قد لمبا، کہ سینکڑوں کے مجمع میں کھڑے ہوں تو سب سے سر بلند نظر آئیں۔ رنگ گندم گوں، داڑھی گھنی، رخسارے کم گوشت، جسم بھرا ہوا۔ آنکھیں سرخ اور چندیا کے بال صاف تھے۔

مسکن

روایات کے مطابق حضرت عمر رضؓ کے پاس دو مکان تھے، ایک عوالی میں تھا، جہاں خاندانِ بنو اُمیہ بن زید کی آبادی تھی، دوسرا مسجد نبویؐ کے قریب تھا، جہاں وہ بعد میں اٹھ آئے تھے، انتقال اسی مکان میں ہوا تھا۔

ازواج واولاد

حضرت عمر رضؓ نے مختلف اوقات میں متعدد نکاح کیے، اُن کے ازواج کی تفصیل یہ ہے:

- حضرت زینب رضؓ بنتِ مظعون بن حبیب بن وہب مکہ میں مسلمان ہو کر مریں۔
- قریبہ بنت اُمیہ المخزومی۔ یہ ام المومنین حضرت امِ سلمہ رضؓ کی بہن تھیں۔ مشرکہ ہونے کی وجہ سے غزوہ حدیبیہ کے زمانہ میں حضرت عمر رضؓ نے ان کو طلاق دے دی تھی۔
- ملیکہ بنت جرول خزاعی اُن کو بھی قریبہ کے ساتھ طلاق دے دی تھی۔
- جمیلہ بنتِ عاصم رضؓ بن ثابت انصاری
- عاتکہ بنتِ زید بن عمرو بن نفیل۔
- حضرت امِ کلثوم بنتِ علی رضؓ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نواسی اور حضرت فاطمۃ الزہرا رضؓ کی نورِ دیدہ تھیں۔ حضرت عمر رضؓ نے خاندانِ نبوت سے تعلق پیدا کرنے کے لیے ۱۷ھ میں چالیس ہزار مہر پر نکاح کیا۔

حضرت عمر رضؓ کی اولاد میں حضرت حفصہ رضؓ اس لحاظ سے سب سے ممتاز ہیں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات میں داخل تھیں۔ حضرت عمر رضؓ نے اپنی کنیت بھی ان ہی کے نام پر رکھی تھی۔ اولادِ ذکور کے نام یہ ہیں۔

عبداللہ رضؓ، عبیداللہ، عاصم رضؓ، ابوشحمہ، عبدالرحمٰن، زید اور مجیر، ان سب میں حضرت عبداللہ رضؓ، حضرت عبیداللہ رضؓ اور حضرت عاصم رضؓ اپنے علم و فضل اور مخصوص اوصاف کے لحاظ سے نہایت مشہور ہیں۔

حضرت عمر رضؓ نے علوم اسلامیہ کی جو سرپرستی فرمائی تھی، ان کی اولاد نے اس کو تمام عمر پیش نظر رکھا۔ محدثین کے نزدیک دو سلسلے سب سے زیادہ صحیح اور مستند ہیں اور ان کو وہ سلسلۃ الذہب (یعنی زنجیر زر) سے تعبیر کرتے ہیں اور یہ دونوں سلسلے حضرت عمر رضؓ کی اولاد سے قائم ہوئے ہیں، پہلا سلسلہ وہ ہے جس کی رواۃ میں امام مالکؒ، نافع رضؓ اور عبداللہ رضؓ بن عمر ہوں، دوسرا سلسلہ وہ ہے جس میں زہری، سالم اور عبداللہؓ بن عمر ہوں، ان میں امام مالکؒ اور زہری کے سوا باقی تمام لوگ حضرت عمر رضؓ کے ہی خاندان کے ہیں، حضرت عبداللہ رضؓ ان کے صاحبزادے سالم رضؓ پوتے اور نافع رضؓ غلام تھے۔[1]

حضرت عاصم رضؓ اپنے زمانہ کے مشہور محدث تھے اور ان کے بیٹے حفص نے بھی علوم اسلامیہ میں کمال حاصل کیا تھا۔ عاصم رضؓ حضرت عمر رضؓ بن عبدالعزیز اموی کے نانا تھے جو خلفائے بنو امیہ میں خلیفۂ راشد شمار کیے جاتے ہیں۔

موالی

حضرت عمر رضؓ کے متعدد غلام تھے، لیکن اسلم، ہنی اور یرفاء نے اپنی مخصوص قابلیتوں کی بنا پر امتیاز خاص حاصل کیا۔

فاروقی کارنامے

گذشتہ سطور میں جو کچھ پیش کیا گیا ہے اسے پڑھ کر ہر ذی فہم یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ فتوحات کی کثرت محاصل کی فراوانی، انتظامات کی خوبی، ظلم و جور کے انسداد، عدل و انصاف اور امن و امان کے قیام، ملک کی خوشحالی اور رعایا کی فارغ البالی وغیرہ تمام اوصاف و کمالات کے لحاظ سے دنیا کا کوئی حکمران فاروقِ اعظم کے مقابلہ میں پیش نہیں کیا جا سکتا یہی وہ خوبیاں ہیں جو کسی حکومت یا حکمران کو شہرت عام اور بقائے دوام کی سند عطا کرتی ہیں۔ اور یہی وہ اوصاف ہیں جو تاریخی طور پر آج تک کسی اور فرمانروا میں جمع نہیں ہوئے۔ دنیا میں بلاشبہ عظیم الشان فاتح گزرے ہیں، لیکن تاریخ کے اوراق آج بھی ان کے ظلم و جور کی داستانوں پر نوحہ کناں ہیں، اجڑی ہوئی بستیاں اور کھنڈر بن کر صفحۂ ارضی سے مٹ جانے والے شہر آج بھی اُن طوفانوں کی نشاندہی کرتے ہیں جو کسی فاتح کے جلو میں آئے اور انسانی آبادیوں کو ہمیشہ کے لیے اپنے ساتھ بہا کر لے گئے، لیکن حضرت عمر رضؓ کے دس سالہ دورِ خلافت میں، جبکہ ایران اور روم کی عظیم الشان سلطنتوں کے پرزے اُڑ گئے اور ہندوستان کی سرحد سے لے کر شمالی افریقہ تک اسلام کا پرچم لہرانے لگا تھا۔ ایک واقعہ بھی ایسا پیش نہیں کیا جا سکتا جس میں خونِ ناحق کا ایک قطرہ بھی گرنے پایا ہو اور ظلم و جور کو ایک لمحہ کے لیے بھی روا رکھا گیا ہو۔

یہ بات ایک حد تک صحیح ہے کہ اسلامی فتوحات کے وقت روم اور ایران کی سلطنتوں کی پرانی قوت اور عظمت باقی نہ رہ گئی تھی تاہم فنونِ جنگ کی واقفیت، رسد کی فراوانی، آلاتِ جنگ کا تنوع، غرضیکہ ہر لحاظ سے دونوں حکومتیں عربوں جیسی بے سروسامان قوم پر فوقیت رکھتی تھیں۔ پھر بھی عربوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جانا، خصوصاً غیر مسلم مؤرخین کے نزدیک ایک حیرت انگیز واقعہ رہا ہے اور اس ضمن میں کئی قسم کے دلائل پیش کیے جاتے رہے ہیں لیکن ان سب کا مسکت اور مدلل جواب علامہ شبلی کے لفظوں میں صرف اس قدر ہے کہ:

"مسلمانوں میں اس وقت بانئ اسلام کی بدولت جو جوش، عزم، استقلال، ہمت، بلند حوصلگی اور دلیری پیدا

---

[1] سیر الصحابہ رضؓ جزء المہاجرین

ہوگئی تھی اور جس کو حضرت عمرؓ نے اور زیادہ قوی اور تیز کر دیا تھا۔ روم و فارس کی سلطنتیں عین عروج کے زمانہ میں بھی اس کی ٹکر نہیں اٹھا سکتی تھیں، البتہ اس کے ساتھ اور بھی چیزیں مل گئی تھیں۔ جنھوں نے فتوحات میں نہیں بلکہ قیام حکومت میں مدد دی، اس میں سب سے مقدم چیز مسلمانوں کی راست بازی تھی، جس کے لوگ اس قدر گرویدہ ہو جاتے تھے کہ باوجود اختلاف مذہب کے ان کا زوال نہیں چاہتے تھے، یرموک کے معرکے میں مسلمان جب شام کے اضلاع سے نکلے تو تمام عیسائی رعایا نے پکارا کہ خدا تم کو پھر اس ملک میں لائے اور یہودیوں نے توریت ہاتھ میں لے کر کہا کہ ہمارے جیتے جی قیصر اب یہاں نہیں آ سکتا۔[1]

اکثر مؤرخین نے حضرت عمرؓ کا سکندر، چنگیز اور تیمور سے موازنہ کیا ہے، لیکن ان سب کے کارناموں کو پیش نظر رکھ کر اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ سکندر، چنگیز اور تیمور نے بلاشبہ ایک عالم کو زیر نگیں کیا لیکن اس کے ساتھ زیر و زبر بھی کر دیا، وہ صرف جہانگیر تھے جہاندار نہ تھے، ان کی فتوحات سے وابستہ ان کا ظلم و ستم انسانوں کو ان کی بداعمالیوں کی سزا تھی۔ یہ فاتح انسانوں کی بداعمالیوں کے لیے خدا کے نشتر تھے، جہاں گئے لوگوں پر قہر الٰہی بن کر ٹوٹے اور جدھر سے بھی گزرے انسانوں کو انہی کے خون میں لوٹاتے گئے۔ اس کے برعکس حضرت عمرؓ کا دورِ خلافت اسلام کی انسانیت نوازی کا ایک ایسا عملی مظاہرہ ہے جس نے انسان کو بحیثیت اشرف المخلوقات کے سربلند کیا اور اس کو اس جبر و قہر سے نجات دلائی جس کو وہ مطلق العنان فرمانرواؤں کے ہاتھوں صدیوں سے برداشت کر رہا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کے دور میں جس احتیاط اور جن قوانین کی پابندی کے ساتھ ملک کے ملک فتح ہوئے، اس احتیاط کے ساتھ دنیا کا کوئی حکمران خواہ وہ سکندر، چنگیز، تیمور یا کوئی اور ہو زمین کا ایک چپہ بھی فتح نہیں کر سکتا۔

حضرت عمرؓ کا حقیقی کارنامہ

مؤرخین کے نزدیک حضرت عمرؓ کی فتوحات سے بھی بڑھ کر اصل کارنامہ ایک ایسا آئین حکومت مرتب کرنا اور ایسا عادلانہ نظام قائم کرنا ہے، جو مسلمانوں کی جملہ سعادتوں اور ترقیوں کا ضامن تھا اور جس سے بڑھ کر عادلانہ نظام اس دورِ ترقی میں بھی پیش نہیں کیا جا سکتا۔

حضرت عمرؓ نے جس وقت مسندِ خلافت پر قدم رکھا اس وقت کوئی بڑا نظام حکومت نہ تھا، لیکن آپ نے اپنے دس سالہ عہدِ حکومت میں نہ صرف ایک نہایت وسیع نظام قائم کر دیا بلکہ اس کو اس قدر ترقی دی کہ حکومت کے جس قدر شعبے ہیں آپ ہی کے دور میں وجود پذیر ہوئے۔

جمہوری حکومت

حضرت عمرؓ کی حکومت اپنی ترکیب اور ساخت میں جمہوری طرزِ حکومت کے مشابہ تھی، جمہوری طرزِ حکومت کا طغرائے امتیاز رعایا کی مداخلت ہے، اس سلسلہ میں آپ کا بڑا کارنامہ مجلس شوریٰ کا قیام ہے، جس کے بغیر حکومت کا کوئی معاملہ طے نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے ممتاز ارکان میں حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف، حضرت معاذؓ بن جبل، حضرت ابیؓ بن کعب اور حضرت زیدؓ بن ثابت شامل تھے۔ اس کے علاوہ اہم معاملات میں مہاجرین، انصار اور سرداران

---

[1] الفاروق، بعنوان فتوحات کے اصل اسباب

لشکر کی رائے بھی ضروری سمجھی جاتی تھی اور ایرانیوں میں سے ہرمزان کا مشورہ ضروری خیال کیا جاتا تھا۔
جمہوریت کی انتہا یہ ہے کہ فرمانروائے وقت کا ذاتی اثر بالکل معدوم ہوجائے اور رعایا اپنے معاملات میں بالکل آزاد ہو۔ حضرت عمرؓ نے خود اپنے عمل سے یہ نظیر قائم فرمائی اور اپنی حیثیت صرف ایک متولی اور شیرازہ بند کی رکھی، آپ نے اس حیثیت کو متعدد مواقع پر واضح کیا، ایک موقعہ پر فرمایا:

"مجھ کو تمہارے مال میں اسی طرح حق ہے جس طرح یتیم کے مال میں اس کے مربی کا ہوتا ہے، اگر میں دولت مند ہوں گا تو کچھ نہ لوں گا، اور اگر صاحب حاجت ہوں گا تو اندازے سے کھانے کے لیے لوں گا، صاحبو! میرے اوپر حقوق ہیں جن کا تم کو مجھ سے مواخذہ کرنا چاہیے۔ ایک یہ کہ ملک کا خراج اور مال غنیمت بیجا طور پر صرف نہ ہونے پائے، ایک یہ کہ تمہارے روزینے بڑھاؤں اور تمہاری سرحدوں کو محفوظ رکھوں اور یہ کہ تم کو خطروں میں نہ ڈالوں[1]۔"

ایک دوسرے موقعہ پر فرمایا:

"میں تم کو مجبور کروں گا کہ تم نے جو بار مجھ پر ڈالا ہے اس میں میرا ہاتھ بٹاؤ، میری حیثیت تمہاری جماعت میں صرف ایک فرد کی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تم میری خواہشات کی پیروی کرو[2]۔"

حضرت عمرؓ کی مذکورہ بالا تقریر محض دل پذیر خیالات کی نمائش نہ تھی بلکہ آپ نہایت سختی کے ساتھ اس کے عامل بھی تھے جیسا کہ واقعات اس کی حرف بحرف تائید کرتے ہیں، ایک دفعہ آپ کی صاحبزادی ام المومنین حضرت حفصہؓ مال غنیمت کے آنے کی خبر سن کر حضرت عمرؓ کے پاس آئیں اور کہا کہ امیرالمومنینؓ ہم ذوی القربیٰ میں سے ہوں، اس لیے اس مال میں سے مجھ کو بھی عنایت کیجئے۔ آپ نے جواب دیا کہ "بیشک تم میرے خاص مال میں حق رکھتی ہو، لیکن یہ تو عام مسلمانوں کا مال ہے، افسوس ہے کہ تم نے اپنے باپ کو دھوکا دینا چاہا، بیچاری خفیف ہوکر چلی گئیں۔

ایک دفعہ خود بیمار پڑے لوگوں نے علاج میں شہد تجویز کیا، بیت المال میں شہد موجود تھا، لیکن اجازت کے بغیر نہیں لے سکتے تھے چنانچہ مسجد نبویؐ میں جاکر لوگوں سے کہا کہ: اگر آپ اجازت دیں تو تھوڑا سا شہد لے لوں۔ ان چھوٹی چھوٹی باتوں میں جب حضرت عمرؓ اس قدر محتاط تھے تو ظاہر ہے کہ بڑے امور میں آپ کس قدر احتیاط برتتے ہوں گے۔

حضرت عمرؓ نے لوگوں کو آزادی رائے اور حکومت پر نکتہ چینی کرنے کا پورا حق دے رکھا تھا۔ اس بنا پر ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان برسرعام حضرت عمرؓ کو ٹوک دیتا، ایک موقع پر ایک شخص نے کئی بار حضرت عمرؓ کو مخاطب کرکے کہا: "اے عمرؓ خدا سے ڈرو" حاضرین میں سے ایک آدمی نے اس کو روکنا چاہا، لیکن حضرت عمرؓ نے منع کردیا اور فرمایا: کہنے دو، اگر یہ لوگ نہ کہیں تو یہ بے مصرف ہیں اور ہم نہ مانیں تو ہم" یہ آزادی صرف مردوں تک محدود نہ تھی بلکہ عورتوں کو بھی حاصل تھی، ایک دفعہ حضرت عمرؓ مہر کی مقدار کے متعلق تقریر

---

[1] سیرالصحابہؓ خلفائے راشدین، [2] تاریخ اسلام حصہ اوّل شاہ معین الدین

فرما رہے تھے کہ اثنائے تقریر میں ایک عورت نے ٹوک دیا اور کہا "اے عمرؓ خدا سے ڈر"، اس کا اعتراض چونکہ صحیح تھا۔ اس لیے حضرت عمرؓ نے اعتراف کے طور پر فرمایا کہ ایک عورت بھی عمرؓ سے زیادہ جانتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ ایسی آزادی اور مساوات نے حضرت عمرؓ کی خلافت کو حد درجہ کامیاب کیا اور مسلمانوں کو جوشِ استقلال اور عزم و شجاعت کا مجسّم پتلا بنا دیا تھا۔

نظامِ حکومت

نظامِ حکومت کے سلسلہ میں سب سے پہلا کام ملک کا صوبوں اور ضلعوں میں تقسیم کرنا ہے، اسلام میں اس کا آغاز حضرت عمرؓ نے کیا اور ممالکِ محروسہ کو آٹھ صوبوں پر تقسیم کیا، مکہ، مدینہ، شام، جزیرہ، بصرہ، کوفہ، مصر اور فلسطین، ان کے علاوہ مشرق میں تین صوبے اور تھے خراسان، آذربائیجان اور فارس، صوبہ میں حاکم اعلیٰ، میر منشی، دفتر فوج کا میر منشی، کلکٹر، افسر پولیس، خزانچی اور قاضی ہوتے تھے۔ بعض حالات میں سپہ سالار الگ ہوتا تھا۔ لیکن عموماً فوج کی سپہ سالاری حاکم اعلیٰ کے ہی متعلق ہوتی تھی، چنانچہ کوفہ میں حضرت عمارؓ بن یاسر والی، حضرت عثمانؓ بن حنیف کلکٹر، حضرت عبداللہؓ بن مسعود افسر خزانہ، حضرت شریحؓ قاضی اور حضرت عبداللہؓ بن خلف الخزاعی میر منشی تھے۔[1]

عہدہ داروں کا انتخاب

بڑے بڑے عہدہ داروں کا انتخاب عموماً مجلسِ شوریٰ میں ہوتا تھا، حضرت عمرؓ کسی لائق، راستباز اور متدین شخص کا نام پیش کرتے تھے، اور چونکہ حضرت عمرؓ فطرتاً جوہر شناس اور دقیقہ رس واقع ہوئے تھے۔ اس لیے ارکانِ مجلس آپ کے حسنِ انتخاب کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے اور اس شخص کے تقرر پر اتفاق رائے کر لیتے تھے۔

تنخواہ

حضرت عمرؓ سے پہلے تنخواہ کا رواج نہ تھا، ایک بڑی غلط فہمی یہ پیدا ہو گئی تھی کہ لوگ تنخواہ لینا زہد و تقدس کے خلاف سمجھتے تھے، لیکن یہ چونکہ امرِ تمدن اور اصولِ انتظام کے خلاف تھا۔ اس لیے حضرت عمرؓ نے اس غلطی کو رفع کرنے کی بڑی کوشش کی، چنانچہ آپ نے خود اپنا وظیفہ مقرر کرایا۔ جس کے باعث بڑی حد تک یہ خیال زائل ہو گیا اور لوگ خوشی سے تنخواہ لینے لگے، تاہم بعض اب بھی قدیم خیال پر قائم تھے، حضرت ابو عبیدہؓ نے جو مشہور صحابی اور سپہ سالار تھے۔ حق خدمت لینے سے انکار کر دیا، تو حضرت عمرؓ نے بڑی مشکل سے ان کو راضی کیا، اسی طرح حضرت حکیمؓ بن حزام نے حضرت عمرؓ کے اصرار پر بھی کبھی روزینہ یا وظیفہ لینا گوارا نہ کیا۔

عاملوں کی تحقیقات

اگرچہ حضرت عمرؓ انتخاب کے وقت ہر قسم کی چھان بین فرماتے تھے۔ تاہم آپ نے عمال کے طرزِ عمل کی تحقیقات میں خاص کاوش کی اور حکام کی نگرانی کی جو ذمہ داری آپ پر عائد ہوتی تھی۔ اس کو نہایت اہتمام سے انجام دیتے تھے۔ آپ کا یہ اصول تھا کہ ہر عامل کے تقرر کے وقت اس کو ایک پروانہ دیتے جس میں اس کے اختیارات کی تصریح ہوتی تھی، جہاں وہ مقرر ہو کر جاتا وہاں یہ پروانہ مجمع عام میں پڑھ کر سنایا جاتا تھا[2] کہ وہ اپنی حد سے آگے بڑھنے نہ پائے، ہر عہدہ دار سے عہد لیا جاتا کہ وہ ترکی گھوڑے پر سوار نہیں ہو گا، باریک کپڑا نہ پہنے گا، چھنا ہوا آٹا نہ کھائے گا۔ دروازے پر دربان نہ رکھے گا اور

---

[1] الفاروق حصہ دوم [2] تاریخ اسلام حصہ اوّل از شاہ معین الدین

اہل حاجت کے لیے ہمیشہ دروازہ کھلا رکھے گا، اسی کے ساتھ ان کے مال و اسباب کی فہرست تیار کر کے محفوظ کر دی جاتی تھی۔ واپسی کے وقت جس عامل کے پاس اس فہرست سے زیادہ مال ہوتا، اس سے نہ صرف باز پرس کی جاتی بلکہ آدھا مال ضبط کر کے بیت المال میں داخل کر دیا جاتا تھا، ایک دفعہ بہت سے عمال اس زیادتی کے مرتکب ہوئے۔ خالد بن صعق نے اشعار کے ذریعہ حضرت عمرؓ کو اطلاع دی آپ نے سب کی املاک کا جائزہ لیا اور آدھا آدھا مال ضبط کر کے بیت المال میں داخل کر دیا[1]

تمام عمال کو حج کے موقع پر مکہ معظمہ میں حاضری کا حکم تھا، ان کی موجودگی کا اعلان عام کیا جاتا کہ جس عامل سے کسی کو شکایت ہو وہ فوراً بارگاہِ خلافت میں پیش کرے، چنانچہ اگر معمولی نوعیت کی شکایات بھی پیش ہوتی تھیں، تو تحقیقات کے بعد ان کا تدارک کر دیا جاتا تھا۔ حج کے موقع پر چونکہ تمام مسلمان جمع ہوتے تھے اس لیے شکایات معلوم کرنے کا یہ بہترین طریقہ تھا۔ ایک دفعہ ایک شخص نے شکایت کی کہ فلاں عامل نے مجھے بے وجہ کوڑے مارے ہیں، حضرت عمرؓ نے مستغیث کو حکم دیا کہ وہ مجمع عام میں عامل کو سو کوڑے لگائے۔ حضرت عمروؓ بن العاص نے استدعا کی کہ عمال پر یہ امر گراں ہوگا، لیکن حضرت عمرؓ نے فرمایا یہ نہیں ہو سکتا کہ میں ملزم سے انتقام نہ لوں۔ آخر متعلقہ عامل نے مستغیث کو ایک ایک کوڑے کے عوض دو دو اشرفیاں دے کر راضی کیا اور خلاصی حاصل کی۔ حضرت خالد بن ولیدؓ کی معزولی بھی اسی سلسلہ کی ایک اہم ترین کڑی ہے۔ عیاض بن غنم عامل مصر کو بیش قیمت لباس پہننے اور محل بنانے کی شکایت پر کمبل کا کرتہ پہنوا کر اُن سے بکریاں چروائیں، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ عامل کوفہ نے محل بنوایا جس میں ڈیوڑھی تھی۔ جب حضرت عمرؓ کو خبر ہوئی تو ڈیوڑھی کو آگ لگوا دی۔ اسی طرح اور بہت سے عاملوں کو اسی قسم کی سزائیں دیں، جن کا ذکر تاریخ کی کتابوں میں موجود ہے۔

حکام کے علاوہ عام مسلمانوں کی اخلاقی اور مذہبی نگرانی کا خاص اہتمام تھا، حضرت عمرؓ جس طرح خود اسلامی اخلاق کا مجسم نمونہ تھے چاہتے تھے کہ اسی طرح تمام قوم مکارمِ اخلاق سے آراستہ ہو جائے۔ آپ نے عرب جیسی فخار قوم سے فخر و غرور کی تمام علامتیں مٹا دیں، یہاں تک کہ آقا و غلام کی تمیز بھی باقی نہ رہنے دی، ایک دن صفوان بن اُمیہ نے آپ کے سامنے ایک خوان پیش کیا۔ آپ نے فقیروں اور غلاموں کو ساتھ بٹھا کر کھانا کھلایا اور فرمایا: "خدا ان لوگوں پر لعنت کرے جن کو غلاموں کے ساتھ کھانے میں عار آتا ہے"[2]

ایک دفعہ حضرت اُبیؓ بن کعب، جو بڑے رتبے کے صحابیؓ تھے، مجلس سے اُٹھے، تو لوگ ادب اور تعظیم کے خیال سے ساتھ ساتھ چلے۔ اتفاق سے حضرت عمرؓ آ نکلے، یہ حالت دیکھ کر آپ نے اُبیؓ بن کعبؓ کو ایک کوڑا لگایا، انہوں نے وجہ پوچھی، فرمایا تمہیں معلوم نہیں کہ یہ امر متبوع کے لیے فتنہ اور تابع کے لیے ذلت ہے۔

شعر و شاعری کے ذریعہ ہجوگوئی عرب کا عام مذاق تھا حضرت عمرؓ نے نہایت سختی سے بند کرایا۔ آپؓ نے حطیہ کو جو اُس زمانے کا مشہور ہجوگو شاعر تھا، قید کر دیا اور اس شرط پر رہا کیا کہ وہ پھر کسی کی ہجو نہیں لکھے گا، ہوا پرستی، رندی اور آوارگی کو نہایت شدت

---

[1] سیر الصحابہؓ خلفائے راشدین [2] ایضاً

سے روکا، شعراء کو عشقیہ اشعار میں عورتوں کا نام لینے سے قطعی طور پر منع کر دیا اور شراب خوری کی سزا سخت کر دی یعنی چالیس درّے سے بڑھا کر اسّی درّے کر دیے۔

حضرت عمرؓ نے مسلمانوں کو اخلاقِ ذمیمہ سے باز رکھنے کے ساتھ ساتھ مکارمِ اخلاق کی بھی خاص طور پر تعلیم دی، آپ مساوات اور عزّتِ نفس کا خاص خیال رکھتے تھے۔ آپ کی طرف سے تمام عمال کو ہدایت تھی کہ وہ مسلمانوں کو مارا نہ کریں کیونکہ اس سے وہ ذلیل ہو جائیں گے۔

صیغۂ محاصل عرب میں چونکہ کوئی منظم حکومت نہ تھی، اس لیے وہ خراج و محاصل کے نظم و نسق سے ناآشنا تھے۔ اسلام کی ابتداء میں اس قدر ہوا کہ جب خیبر فتح ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں کی درخواست پر خیبر کی زمین انہی کے پاس رہنے دی اور بٹائی پر معاملہ ہو گیا، اس کے سوا جن مقامات کے باشندے سب مسلمان ہو گئے تھے۔ ان کی زمین پر عُشر مقرر کر دیا جو ایک قسم کی زکوٰۃ تھی، حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں بھی یہی نظام برقرار رہا۔ لیکن حضرت عمرؓ نے اس کا نہایت وسیع اور مکمل نظام قائم کیا۔ ان کے عہد میں جب شام و ایران فتح ہوئے تو لوگوں نے رائے دی کہ مفتوحہ علاقے فوج کی جاگیریں میں دے دیے جائیں، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کہتے تھے کہ جن کی تلواروں نے ملک فتح کیا ہے، انہیں قبضہ کا بھی حق ہے، حضرت بلالؓ بھی اسی رائے پر مُصر تھے، مگر خود حضرت عمرؓ کی رائے تھی کہ زمین حکومت کی ملک اور باشندوں کے قبضے میں رہنے دی جائے، حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت طلحہؓ بھی حضرت عمرؓ کے ہمنوا تھے غرض مجلس عام میں مسئلہ پیش ہوا اور بالآخر بڑے بحث و مباحثہ کے بعد کثرتِ رائے سے فاروقِ اعظم کی رائے پر فیصلہ ہو گیا۔

اس فیصلہ کے بعد حضرت عمرؓ نے بڑے اہتمام سے عراق کی پیمائش کرائی، قابلِ زراعت اراضی کا بندوبست کیا اور عُشر و خراج کا طریقہ قائم کیا مالگذاری کی تشخیص میں ذمیوں کی رضامندی کا لحاظ رکھا اور زمینوں پر اتنی مالگذاری تشخیص کی گئی کہ اس کے بعد اضافہ کی کافی گنجائش باقی رہے، محاصل کی وصول کے وقت اتنی احتیاط برتی جاتی تھی کہ جب خراج آتا تھا تو ثقہ اشخاص کی شہادت سے اس کا پورا اطمینان کر لیا جاتا کہ اس میں ظلم و زیادتی کا کوئی حبہ نہیں ہے۔

عراق کے علاوہ اور کسی ملک میں کوئی نیا بندوبست نہیں کیا گیا بلکہ ہر ملک کے قدیم جابرانہ طریقوں کو منسوخ اور انتظامی غلطیوں کی اصلاح کر کے سابق نظام علی حالہٖ قائم رکھا گیا۔ مصر و شام وغیرہ میں جاگیرداری کا قدیم طریقہ جاری تھا اور ملک کی زمین کا بڑا حصّہ شاہی ارکانِ دولت اور افسرانِ فوج کی جاگیر میں تقسیم تھا۔ ملک کے اصل باشندوں اور کاشت کاروں کے قبضہ میں بہت کم حصّہ تھا اور جس قدر تھا اس کی حیثیت بھی مالکانہ نہ تھی، چنانچہ حضرت عمرؓ نے یہ طریقہ ختم کرایا اور زمین ملک کے اصلی باشندوں اور کاشت کاروں کے قبضہ میں دے دی، اور ان کو مسلمانوں کے قبضہ سے بچانے کے لیے یہ قانون بنا دیا کہ کوئی مسلمان خرید کر بھی زمین حاصل نہیں کر سکتا، زمین کی آبادی اور زراعت کی ترقی کے لیے یہ قانون بنایا کہ جو شخص کسی غیر آباد زمین کو آباد کرے گا وہ اس کی ملک ہو جائے گی، لیکن زمین لینے کے بعد تین برس کے اندر اس کا آباد کرنا ضروری قرار دیا، اس قانون سے افتادہ زمینیں بہت جلد آباد ہو گئیں۔[1]

محکمہ آب پاشی: حضرت عمرؓ نے زراعت کی سیرابی کے لیے متعدد نہریں جاری کیں، بند باندھے، تالاب بنائے، پانی

---

[1] تاریخ اسلام حصّہ اول از شاہ معین الدین۔

کی تقسیم کے لیے دہانے بنائے، نہروں کی شاخیں نکالنے اور اس قسم کے کاموں کے لیے نہایت وسیع محکمہ قائم کیا۔ اس ضمن میں نہر ابو موسیٰ، نہر معقل، نہر سعد اور نہر امیر المومنین وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں جن سے زراعت کی سیرابی اور رعایا کی ضروریات پوری ہوتی تھیں۔

اور قسم کی آمدنیاں

خراج کے علاوہ دیگر ذرائع آمدنی حسبِ ذیل تھے۔ زکوٰۃ جس میں چاندی، نقد، سکہ، مویشی، تجارتی سامان وغیرہ سب کی زکوٰۃ کی آمدنیاں شامل تھیں، خراج غیر مسلموں سے لیا جاتا اور عُشر یعنی پیداوار کا دسواں یا بیسواں حصہ مسلمانوں سے، تجارت پر عشور یعنی چُنگی لگائی گئی۔ اس کو اسلام میں سب سے اوّل حضرت عمر رضؓ نے جاری کیا۔ اس کی ابتدا یوں ہوئی کہ مسلمان جو غیر ممالک میں تجارت کے لیے جاتے تھے۔ ان کو دس فیصد ٹیکس دینا پڑتا تھا۔ حضرت عمر رضؓ کو معلوم ہوا تو آپ نے بھی غیر ملکی مال پر اسی قدر ٹیکس مقرر کر دیا۔ پھر رفتہ رفتہ ملک کے ذمیوں اور مسلمانوں سے بھی یہ ٹیکس لیا جانے لگا۔ ذمیوں کے لیے پانچ فیصدی تھا اور مسلمانوں کے لیے اڑھائی فیصدی، اسی طرح گھوڑوں کی تجارت پر بھی زکوٰۃ خاص حضرت عمر رضؓ کے حکم سے قائم کی گئی۔ اس حکم سے سواری کے گھوڑے مستثنیٰ تھے۔

حضرت عمر رضؓ کا عہد چونکہ فتوحات کے لحاظ سے تاریخِ اسلام میں ممتاز ہے، اس لئے اس زمانہ میں غنیمت کی بھی بڑی آمدنی ہوتی۔ اس کے علاوہ جزیہ بھی وصول کیا جاتا۔ یہ ایک قسم کا ٹیکس تھا جو ذمیوں سے اُن کی حفاظت اور جنگی خدمات کے معاوضہ میں لیا جاتا تھا، جزیہ کی تشخیص رعایا کی خوشحالی اور ناداری کے لحاظ سے کی جاتی، چنانچہ اہلِ شام پر فی کس چار دینار اور اہلِ یمن پر فی کس ایک دینار مقرر کیا گیا۔

بیت المال

حضرت ابوبکر رضؓ کے زمانہ میں اگرچہ بیت المال قائم ہو گیا تھا اور اس کے لیے انہوں نے ایک معمولی سی عمارت بھی بنوائی تھی تاہم آپ کا معمول تھا کہ جو آمدنی آتی اس میں سے خرچ کر کے جو کچھ بچتا اُسے مسلمانوں میں تقسیم کر دیتے تھے، چنانچہ ان کی وفات کے وقت جب بیت المال کا جائزہ لیا گیا، تو صرف ایک درہم نکلا۔

حضرت عمر رضؓ نے جب خلافت کا باقاعدہ نظام قائم کیا، تو دوسرے شعبوں کے ساتھ بیت المال کو بھی وسعت دی چنانچہ تمام صوبوں اور مرکزی مقامات میں بیت المال قائم کیے اور اُن کے لیے وسیع عمارتیں بنوا کر ہر جگہ اس محکمہ کے جُدا گانہ افسر مقرر کیے۔ دار الخلافہ کے بیت المال کے افسر حضرت عبداللہ رضؓ بن ارقم تھے۔ کوفہ کے حضرت عبداللہ رضؓ بن مسعود اور اصفہان کے حضرت خالد رضؓ بن حرثؓ کوفہ کے بیت المال کی عمارت نہایت وسیع اور شاندار تھی۔[1]

بیت المال کی آمدنیوں اور مصارف کا یہ انتظام تھا کہ ہر صوبہ کی آمدنی وہاں کے بیت المال میں آتی تھی، پھر یہاں کی حکومت کے مصارف سے جو رقم بچ جاتی، وہ سال کے اختتام پر صدر خزانہ یعنی مدینہ منورہ کے بیت المال میں منتقل کر دی جاتی تھی، حضرت عمر رضؓ اس کے متعلق عمال کو احکام بھیجتے تھے، صدر بیت المال کی وسعت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ دار الخلافہ کے باشندوں کی جو تنخواہیں اور وظائف مقرر تھے۔ صرف اس کی تعداد تین کروڑ درہم تھی۔[2]

---

[1] تاریخ اسلام حصہ اول از شاہ معین الدین۔ [2] سیر الصحابہ رضؓ خلفائے راشدین۔

بیت المال کی حفاظت

بیت المال کے قیام سے بھی زیادہ ضروری اس کی حفاظت تھی، کیونکہ اس میں جو کچھ بھی تھا، وہ مسلمانوں کی امانت تھی، اس لیے حضرت عمرؓ ادھر سے کبھی غافل نہ ہوتے۔ ایک ایک امانت کی حفاظت بنفسِ نفیس فرماتے اور اس کے ایک ایک اُونٹ کو مع حلیے کے درج رجسٹر کراتے۔

ایک مرتبہ بیت المال کا ایک اُونٹ بھاگ گیا۔ امیر المومنینؓ اس کی تلاش میں نکلے کہ عین اسی وقت ایک رئیس احنف بن قیس آپ سے ملنے کے لیے حاضر ہوئے، دیکھا کہ حضرت عمرؓ دامن چڑھائے ادھر اُدھر دوڑ رہے ہیں، جب آپ نے احنف کو دیکھا تو فرمایا، تم بھی میرا ساتھ دو، بیت المال کا ایک اُونٹ بھاگ گیا ہے۔ تم جانتے ہو کہ ایک اُونٹ میں کتنے غریبوں کا حق ہے۔" ایک شخص نے عرض کیا، امیر المومنینؓ آپ کیوں تکلیف اُٹھاتے ہیں، کسی غلام کو حکم دیجیے وہ ڈھونڈ لائے گا۔" فرمایا: مجھ سے بڑھ کر کوئی غلام ہو سکتا ہے؟[1] آپ کو اپنے مرحوم بھائی حضرت زیدؓ کی بچی سے والہانہ محبت تھی، ایک دن اس نے بیت المال کے زیورات میں سے ایک معمولی انگوٹھی اُٹھا کر پہن لی۔ آپ چونکہ اسے آزردہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے پیار سے بہلاتے رہے اور چپکے سے انگوٹھی نکال کر زیورات کے ڈھیر میں ڈال دی۔

ایک مرتبہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے بیت المال کا جائزہ لیا، تو اس میں صرف ایک درہم نکلا، انہوں نے اس خیال سے کہ ایک درہم کیوں پڑا ہے۔ حضرت عمرؓ کے بچے کو دے دیا۔ جب حضرت عمرؓ کو پتہ چلا تو فوراً بیت المال میں داخل کر دیا اور حضرت ابوموسیٰ اشعری سے فرمایا تم کو مدینے میں آلِ عمرؓ کے سوا کوئی کمزور نظر نہ آیا، تم چاہتے ہو کہ قیامت کے دن اُمّتِ محمدیؐ کا مطالبہ میری گردن پر رہے۔ اس قبیل کے کثرت واقعات ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ اس ضمن میں کس قدر محتاط تھے۔

صیغۂ عدالت

یہ صیغہ بھی اسلام میں حضرت عمرؓ کی بدولت عالمِ وجود میں آیا، حضرت ابوبکرؓ کے زمانے تک خود خلیفۂ وقت اور افسرانِ ملکی قضا کا کام بھی کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے ابتدا میں بعض انتظامی دشواریوں کی وجہ سے یہی رواج قائم رکھا، لیکن جب پورا انتظام قائم ہو گیا، تو حضرت عمرؓ نے قضا کا صیغہ بالکل الگ کر دیا۔ تمام اضلاع میں عدالتیں قائم کیں، قاضی مقرر کیے اور قضا کے اصول و آئین پر ایک فرمان لکھا، جو حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ گورنر کوفہ کے نام تھا۔ اس فرمان کا ترجمہ یہ ہے:

"امابعد، قضا ایک ضروری فرض ہے۔ لوگوں کو اپنے حضور میں، اپنی مجلس میں اپنے انصاف میں برابر رکھو، تاکہ کمزور انصاف سے مایوس نہ ہو اور معزز آدمی کو رو رعایت کی اُمید نہ پیدا ہو، جو شخص دعویٰ کرے اُس پر بارِ ثبوت اور جو شخص انکار کرے اس پر قسم ہے۔ صلح جائز ہے بشرطیکہ اس سے حرام حلال اور حلال، حرام ہونے نہ پائے۔ کل اگر تم نے کوئی فیصلہ کیا تو غور کے بعد اگر حق اس کے خلاف نظر آئے، تو اس سے رجوع کر سکتے ہو، جس مسئلے میں شبہ ہو اور قرآن و حدیث میں اس کا ذکر نہ ہو تو اس پر بار بار غور کرو، اور اس کی مثالوں اور نظیروں کو پہچان کر ان پر قیاس کرو، جو شخص ثبوت پیش کرنا چاہے۔ اس کے لیے ایک میعاد مقرر کر دو، اگر وہ ثبوت دے تو اس کا حق دلاؤ، ورنہ مقدمہ اس کے خلاف فیصلہ کرو، ان اشخاص کے سوا جنہیں سزا میں دُرّے لگائے گئے ہوں یا جھوٹی گواہی دی ہو، سب مسلمان ثقہ ہیں۔"[1]

---

[1] تاریخ اسلام حصۂ اول۔

قضاۃ کو ہدایت تھی کہ:

"مقدمات میں اوّل تو قرآن مجید کے مطابق فیصلہ کرو، اگر قرآن میں وہ صورت مذکور نہ ہو تو حدیث کی جانب رجوع کرو، اگر اس میں بھی نہ ہو، تو اجماع سے ورنہ اجتہاد سے کام لو۔"

قضا کی خدمت چونکہ بہت بڑی ذمہ داری ہے اس لیے حضرت عمرؓ قضاۃ کے انتخاب میں بڑی احتیاط سے کام لیتے تھے اور اس کے لیے انہی بزرگوں کو منتخب فرماتے تھے جن کا علم، تقوے، ذہانت اور قوتِ فیصلہ مسلّم تھی، چنانچہ پایۂ تخت یعنی مدینہ منورہ کے قاضی حضرت زید بن ثابتؓ تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کاتب وحی رہے تھے۔ کوفہ کے حضرت عبداللہؓ بن مسعود تھے جن کا فضل و کمال محتاج بیان نہیں، ان کے بعد ۱۹ھ میں قاضی شریح مقرر ہوئے جو اگرچہ صحابہؓ میں سے نہ تھے، لیکن اس قدر ذہین اور معاملہ فہم تھے کہ تمام عرب میں ان کا جواب نہ تھا۔ دوسرے مقاموں میں حضرت جمیلؓ بن المعمر حضرت ابو مریم حنفیؓ، حضرت سلمانؓ، حضرت ربیعہؓ باہلی، حضرت عبدالرحمٰنؓ بن ربیعہ، حضرت عمرانؓ بن حصین اور ابو قرہ کندی وغیرہ اس منصب پر مقرر تھے۔ یہ وہ بزرگ ہیں، جن کی علمی جلالت کا اندازہ رجال کی کتابوں سے معلوم ہو سکتا ہے۔

قاضی اگرچہ حاکم صوبہ یا حاکم ضلع کے تحت ہوتا تھا، اور ان لوگوں کو قضاۃ کے تقرر کا پورا اختیار حاصل تھا تاہم حضرت عمرؓ زیادہ احتیاط کے لحاظ سے اکثر خود لوگوں کا انتخاب کر کے بھیجتے تھے، انتخاب کے لیے گو خود امیدواروں کی سیرت کافی رہتی پھر بھی حضرت عمرؓ اس پر اکتفا نہ کرتے تھے، بلکہ اکثر عملی امتحان اور ذاتی تجربہ کے بعد لوگوں کو انتخاب کرتے تھے۔[1]

رشوت ستانی کے انسداد کے لیے حضرت عمرؓ نے قاضیوں کی بیش قرار تنخواہیں مقرر کیں، چنانچہ سلمان، ربیعہ اور قاضی شریح کی تنخواہیں پانچ پانچ سو درہم ماہانہ تھیں، حضرت عمرؓ نے مزید یہ قاعدہ مقرر کیا کہ دولت مند اور معزز شخص کے علاوہ معمولی آدمی قاضی مقرر نہ ہونے پائے، حضرت ابو موسیٰؓ اشعری کو جو فرمان لکھا اس میں قاعدہ کی وجہ یہ ظاہر کی کہ دولت مند رشوت کی طرف راغب نہ ہو گا اور معزز فیصلہ کرنے میں کسی کے رعب سے متاثر نہ ہوگا۔

عدالت و انصاف کا ایک بڑا لازمہ عام مساوات کا لحاظ ہے۔ یعنی دار القضاۃ کے اندر شاہ و گدا، امیر و غریب، شریف و رذیل، سب کی سطح برابر ہو اور قانون کی نگاہ میں لوگ مساوی سمجھے جائیں، یہاں تک کہ خود امیرالمومنینؓ بھی اس عالمگیر مساوات کے دائرے سے باہر نہ تھے۔ ایک بار انہوں نے حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف سے فرمایا، اگر آپ حاکم ہوں اور میں کسی شخص کو زنا یا چوری کرتے دیکھوں تو آپ کیا کریں گے؟ انہوں نے جواب دیا آپ کی شہادت صرف ایک مسلمان کی شہادت کے مساوی ہوگی (یعنی امارت کا کچھ اثر نہ ہوگا) حضرت عمرؓ نے فرمایا آپ نے سچ کہا۔

حضرت عمرؓ نے عدل و انصاف میں مساوات کے لیے یہاں تک عملی کوششیں کیں کہ قضاۃ کو عدل و مساوات کا سبق دینے خود فریق مقدمہ بن کر عدالت میں جاتے تھے۔ ایک مرتبہ ان میں اور حضرت اُبی بن کعبؓ میں کچھ نزاع ہو گیا، حضرت اُبی نے حضرت

---

[1] الفاروق حصہ دوم

زید رضؓ بن ثابت کی عدالت میں مقدمہ دائر کیا، حضرت عمر رضؓ مدعا علیہ کی حیثیت سے پیش ہوئے، حضرت زید رضؓ نے تعظیم کی، حضرت عمر رضؓ نے فرمایا یہ تمہارا پہلا ظلم ہے، یہ کہہ کر اپنے فریق حضرت اُبی رضؓ کے ساتھ بیٹھ گئے۔ حضرت زید رضؓ کے پاس کوئی ثبوت نہ تھا اور حضرت عمر رضؓ کو دعویٰ سے انکار تھا، چنانچہ حضرت اُبی رضؓ نے قاعدہ کے موافق حضرت عمر رضؓ سے قسم لینی چاہی، لیکن حضرت زید رضؓ نے آپ کے رتبہ کا پاس کر کے حضرت اُبی سے درخواست کی کہ امیر المومنین رضؓ کو قسم سے معاف رکھو، حضرت عمر رضؓ اس ترجیح پر نہایت رنجیدہ ہوئے اور فرمایا جب تک تمہارے نزدیک ایک عام آدمی اور عمر رضؓ برابر نہ ہوں، تم منصب قضا کے قابل نہیں ہو سکتے[1]

محکمہ افتاء

یہ صیغہ عدالت کے متعلق ہے اور اسلام کے سوا اور کہیں اس کی نظیر نہیں پائی جاتی، حضرت عمر رضؓ نے عوام کی آسانی کے لیے فقہا صحابہ رضؓ کی ایک جماعت مخصوص کر دی تھی۔ جن کا کام لوگوں کو مسائل بتلانا تھا۔ چنانچہ جو شخص جب کوئی مسئلہ دریافت کرنا چاہتا، ان سے دریافت کر سکتا تھا، حضرت علی رضؓ، حضرت عثمان رضؓ، حضرت معاذ رضؓ بن جبل، حضرت عبدالرحمٰن رضؓ بن عوف رضؓ، حضرت اُبی بن کعب رضؓ، حضرت زید رضؓ بن ثابت، حضرت ابوہریرہ رضؓ اور حضرت ابو درداء رضؓ اس شعبے کے ممتاز رکن تھے۔[2]

فوجداری اور پولیس

قیام امن کا مدار پولیس پر ہے، حضرت عمر رضؓ نے اس کا مستقل محکمہ قائم کیا، جس کو احداث کہتے تھے، اس کے افسر کا نام صاحب الاحداث تھا، حضرت ابوہریرہ رضؓ کو بحرین کا صاحب الاحداث بنایا، تو ان کو خاص طور پر ہدایت کی کہ امن و امان قائم رکھنے کے علاوہ احتساب کی خدمت بھی انجام دیں بعض مورخین کے نزدیک محکمہ احتساب ایک علیحدہ محکمہ تھا، جس کے فرائض میں ایسے امور کی نگرانی شامل تھی، جن کا تعلق عوامی مفاد اور احترام شریعت سے ہے، مثلاً دکاندار ناپ تول میں کمی نہ کریں، کوئی شخص شاہراہ پر مکان نہ بنائے، جانوروں پر زیادہ بوجھ نہ لادا جائے، شراب علانیہ نہ بکنے پائے۔

جیل خانہ کی ایجاد

حضرت عمر رضؓ نے اس صیغہ میں دو اہم ایجادیں کیں یعنی جیل خانہ کی ایجاد اور جلاوطنی کی سزا، ورنہ اس سے پیشتر عرب میں جیل خانوں کا نام و نشان تک نہ تھا۔ حضرت عمر رضؓ نے اوّل مکہ معظمہ میں صفوان بن اُمیہ کا مکان چار ہزار درہم میں خریدا اور اس کو جیل خانہ بنایا، اس کے علاوہ اضلاع میں بھی جیل خانوں کے نام ملتے ہیں، چنانچہ کوفہ کا جیل خانہ نرسل کا تھا۔[3]

جلاوطنی کی سزا بھی حضرت عمر رضؓ کی ایجاد ہے، چنانچہ ابو محجن ثقفی کو بار بار شراب پینے کے جرم میں ایک جزیرہ میں جلاوطن کر دیا تھا

تعمیرات

اسلام کا دائرہ حکومت جس قدر وسیع ہوتا گیا، اسی قدر تعمیرات کا کام بھی بڑھتا گیا، حضرت عمر کے عہد میں اس کے لیے کوئی مستقل صیغہ نہ تھا، تاہم صوبہ جات اور اضلاع کے حکام کی نگرانی میں تعمیرات کا کام نہایت منظم اور وسیع پیمانے پر جاری تھا، ہر جگہ حکام کی رہائش اور دیگر امور کے لیے عمارتیں تیار ہوئیں، رفاہ عام کے لیے سڑکیں، پل اور مساجد تعمیر کی گئیں، مسافروں کے لیے مہمان خانے اور فوجی ضروریات کے لحاظ سے چھاؤنیاں اور بارکیں تعمیر ہوئیں، حضرت عمر رضؓ اگرچہ تعمیرات کے باب میں نہایت کفایت شعار تھے، لیکن بیت المال کی عمارتیں عموماً شاندار اور مستحکم بنواتے تھے۔ چنانچہ کوفہ کے بیت المال کو ایک مشہور مجوسی معمار روزبہ نے بنایا تھا اور

---

[1] کنز العمال جلد ۳ [2] سیر الصحابہ خلفائے راشدین [3] تاریخ اسلام حصہ اول از شاہ معین الدین۔

اس میں خسروانِ فارس کی عمارات کا مسالہ استعمال کیا گیا تھا۔

مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں جو خاص تعلق تھا، اس کے پیشِ نظر ضروری تھا کہ دونوں شہروں کے درمیان راستہ سہل اور آرام دہ بنایا جائے، چنانچہ حضرت عمرؓ نے ۱۷ھ میں اس امر کی طرف توجہ کی اور مدینہ سے لے کر مکہ تک ہر ہر منزل پر چوکیاں، سرائیں اور چشمے تیار کرائے۔

مستعمرات مسلمان جب عرب کی گھاٹیوں سے نکل کر شام وایران کے چمن زار میں پہنچے تو اُن کو یہ ممالک ایسے خوش آئند نظر آئے کہ انہوں نے وطن کو خیر باد کہہ کر یہیں طرحِ اقامت ڈال دی اور نہایت کثرت سے نوآبادیاں قائم کیں، حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں جو شہر آباد ہوئے، اُن میں بصرہ، کوفہ، فسطاط، موصل اور جیزہ قابلِ ذکر ہیں۔ بصرہ ۱۴ھ میں حضرت عمرؓ نے عتبہ بن غزوان کو بندرگاہ اُبلہ کے قریب، جہاں بحرِ فارس کی خلیج کے ذریعے سے ہندوستان اور فارس کے جہاز لنگر انداز ہوتے تھے، ایک شہر بسانے پر متعین کیا۔ عتبہ آٹھ سو آدمیوں کے ساتھ روانہ ہوئے اور خریبہ میں آئے، جہاں اب بصرہ آباد ہے۔ یہاں کفِ دست میدان پڑا ہوا تھا اور چونکہ اس کی کنکریلی زمین اور آس پاس پانی اور چارہ کی فراہمی عرب کے مذاق کے بالکل موافق تھی اس لیے عتبہ نے حضرت عمرؓ کے حکم پر اس جگہ بنیاد کی داغ بیل ڈالی اور مختلف قبائل کے لیے الگ الگ احاطہ کھینچ کر گھاس اور پھونس کے مختصر مکانات بنوائے، ابتدا میں صرف آٹھ سو آدمیوں نے یہاں سکونت اختیار کی، لیکن اس کی آبادی بہت جلد ترقی کر گئی، یہاں تک کہ زیاد بن ابی سفیان کے عہدِ امارت میں صرف ان لوگوں کی تعداد جن کے نام فوجی رجسٹر میں درج تھے۔ اسی ہزار اور ان کی آل اولاد کی ایک لاکھ بیس ہزار تھی، بصرہ اپنی علمی خصوصیات کے لحاظ سے لاکھوں مسلمانوں کا مایۂ ناز شہر رہا، دنیا کی سب سے پہلی کتاب جو عربی علمِ لغت میں لکھی گئی وہ یہیں لکھی گئی، اس کا نام کتاب العین ہے جو خلیل احمد بصری کی تصنیف ہے۔ عربی علمِ عروض اور موسیقی کی ابتدا بھی یہیں سے ہوئی۔ علمِ نحو کا سب سے پہلا مصنف سیبویہ یہیں کا تعلیم یافتہ تھا اور ائمہ مجتہدین میں سے خواجہ حسن بصری یہیں کی خاک سے پیدا ہوئے۔[1]

کوفہ — دوسرا شہر جو بصرہ سے زیادہ مشہور ہوا کوفہ تھا، حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نے امیرالمومنینؓ کے حکم سے ۱۷ھ میں اس کی بنیاد رکھی اور چالیس ہزار آدمیوں کی آبادی کے لائق مکانات بنوائے، یہ جگہ جہاں کوفہ آباد ہوا، عراقِ عرب کے زمانہ النعمان بن منذر کے خاندان کا پایۂ تخت تھا اور ان کی مشہور عمارتیں خورنق اور سدیر وغیرہ اسی کے آس پاس واقع تھیں، اس کی زمین کا انتخاب حضرت سلمانؓ اور حضرت حذیفہؓ نے کیا تھا جو خاص اسی قسم کے کاموں پر مامور تھے۔ اس کا منظر اس قدر خوشنما تھا کہ اہلِ عرب اس مقام کو "عارضِ محبوب" کہتے تھے، یہاں کی زمین چونکہ ریتلی اور کنکریلی تھی اس لیے اس کا نام کوفہ رکھا گیا۔

حضرت عمرؓ کو اس شہر کے بسانے میں غیر معمولی دلچسپی تھی، چنانچہ آپ نے شہر کے نقشہ کے متعلق خود یادداشت لکھ کر بھیجی کہ شارع ہائے عام چالیس چالیس ہاتھ چوڑی رکھی جائیں، اس سے کم کی مقدار تیس تیس ہاتھ اور بیس بیس ہاتھ سے کم نہ ہو اور گلیاں سات سات ہاتھ چوڑی ہوں، جامع مسجد کی عمارت اس قدر وسیع بنائی گئی تھی کہ اس میں چالیس ہزار آدمی آسانی سے نماز ادا کر سکتے تھے۔ مسجد

---

[1] الفاروق حصہ دوم

کے سامنے دو سو ہاتھ لمبا ایک وسیع سائبان تھا، جو سنگِ رخام کے ستونوں پر قائم کیا گیا تھا۔ مسجد سے دو سو ہاتھ کے فاصلے پر ایوانِ حکومت تعمیر ہوا، جس میں بیت المال کا مکان بھی شامل تھا، ایک مہمان خانہ عام بھی تعمیر کیا گیا، جس میں باہر سے آئے ہوئے مسافر قیام کرتے تھے۔

یہ شہر حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی کے عہد میں اس عظمت و شان کو پہنچ گیا تھا کہ وہ اس کو راس الاسلام فرمایا کرتے تھے، علمی حیثیت سے بھی یہ شہر ممتاز رہا، ابوالاسود دؤلی نے اوّل اوّل نحو کے قواعد یہیں بیٹھ کر منضبط کیے اور فقۂ حنفی کی بُنیاد یہیں پڑی، امام ابُوحنیفہ نے قاضی ابُویوسف وغیرہ کی شرکت سے فقہ کی جو مجلس قائم کی وہ اسی شہر میں قائم کی، حدیث و فقہ اور علوم عربیت کے بڑے بڑے ائمہ جن میں امام نخعی رح حماد رح امام ابُوحنیفہ رح اور امام شعبی رح شامل تھے، سب اسی معدن کے لعل و گوہر تھے۔

فسطاط۔ دریائے نیل اور جبل مقطم کے درمیان ایک کف دست میدان تھا۔ عمرو بن العاص فاتح مصر نے اثنائے جنگ میں یہاں پڑاؤ کیا، اتفاق سے ایک کبوتر نے ان کے خیمہ میں گھونسلہ بنالیا، جب حضرت عمرو رضی اللہ عنہ بن العاص نے اسکندریہ کی تسخیر کے لیے یہاں سے کوچ کیا، تو قصداً اس خیمہ کو چھوڑ دیا کہ اس مہمان کو تکلیف نہ ہو، پھر جب آپ اسکندریہ کی فتح کے بعد واپس اسی مقام پر پہنچے تو دیکھا کہ خیمہ اسی حالت میں کھڑا تھا جیسا کہ آپ اسے چھوڑ گئے تھے۔ چنانچہ آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم سے سنہ ۲۱ھ میں اسی میدان میں ایک نئے شہر کی بُنیاد ڈالی، چونکہ خیمہ کو عربی میں فسطاط کہتے ہیں، اس لئے شہر کا نام فسطاط قرار پایا۔ فسطاط نے بہت جلد ترقی کی اور اسکندریہ کی بجائے پُورے مصر کا صدر مقام بن گیا، امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانے میں چالیس ہزار اہلِ عرب کے نام دفتر میں قلمبند تھے مؤرخین کے مطابق ایک زمانے میں یہاں تین سو ساٹھ مسجدیں، آٹھ ہزار سڑکیں اور گیارہ سو ستر حمام تھے، جامع مسجد کی تعمیر میں خاص اہتمام کیا گیا، عام روایت ہے کہ اسی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جمع ہو کر قبلہ کی سمت متعین کی، ان صحابہ رضی اللہ عنہم میں حضرت زبیر رضی اللہ عنہ، حضرت مقداد رضی اللہ عنہ، حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ اور بڑے بڑے اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم شامل تھے۔ اس مسجد کا طول پچاس گز اور عرض تیس گز تھا، تین طرف دروازے تھے جن میں ایک دارالحکومت کے مقابل تھا اور دونوں عمارتوں میں سات گز کا فاصلہ تھا۔

فسطاط مدت تک سلاطین مصر کا پایۂ تخت اور تمدن و ترقی کا مرکز رہا، چوتھی صدی کے ایک سیاح علامہ بشاری نے ان الفاظ میں اس شہر کے عروج و کمال کا نقشہ کھینچا ہے۔

> "یہ شہر بغداد کا ناسخ، مغرب کا خزانہ اور اسلام کا فخر ہے، دنیائے اسلام میں یہاں سے زیادہ کسی جامع مسجد میں علمی مجلسیں نہیں ہوتی ہیں اور نہ یہاں سے زیادہ کسی ساحل پر جہاز لنگر انداز ہوتے ہیں۔"

موصل۔ مؤرخین کے مطابق یہ مقام اسلام سے پہلے بھی موجود تھا، مگر ایک گاؤں کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہاں ایک قلعہ اور اس کے پاس عیسائیوں کے معبد تھے، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو ایک عظیم الشان شہر بنا دیا، ہرثمہ بن عرفجہ نے بنیاد رکھی اور ایک جامع مسجد تعمیر کرائی، چونکہ یہ شہر مشرق و مغرب کو آپس میں ملاتا ہے، اس لیے اس کا نام موصل رکھا گیا۔

جیزہ۔ یہ چھوٹا سا شہر دریائے نیل کے غربی جانب فسطاط کے مقابل واقع ہے، اس کی تعمیر کے متعلق مؤرخین نے لکھا ہے کہ حضرت عمرو رضی اللہ عنہ بن العاص نے فتح اسکندریہ کے بعد اس خیال سے کہ رُومی دریا کی سمت سے حملہ نہ کرنے پائیں، تھوڑی سی فوج لبِ ساحل متعین کر دی تھی جن میں حمیر اور ازد و ہمدان کے قبیلے کے لوگ تھے، فسطاط کی آبادی کے بعد حضرت عمرو رضی اللہ عنہ بن العاص نے لوگوں کو بُلا لینا چاہا مگر

ان کو دریا کا منظر ایسا اچھا لگا کہ وہاں سے ہٹنا پسند نہ کیا، چنانچہ حضرت عمرؓ نے ان لوگوں کی حفاظت کے لیے ۲۱ھ میں ایک قلعہ تعمیر کرا دیا اور اس وقت سے یہاں ایک مستقل نو آبادی کی صورت پیدا ہو گئی [۱]

فوجی انتظامات

حضرت ابو بکرؓ کے زمانہ میں فوج کا کوئی باقاعدہ محکمہ نہ تھا، لیکن جب اسلام ایک وسیع سلطنت کا مالک بن گیا اور قیصر و کسریٰ کے عظیم الشان ممالک اس کا ورثہ بن گئے، تو اس کو ایک منظم فوجی سسٹم کی ضرورت محسوس ہوئی، چنانچہ حضرت عمرؓ نے ۱۵ھ میں ولید بن ہشام کے مشورہ سے نہایت وسیع اور منظم صیغۂ فوج قائم کیا، اس باب میں پہلے آپ کا خیال تمام ملک کو فوجی بنانے کا تھا، لیکن چونکہ ابتدا میں ایسی تعمیم ممکن نہ تھی، اس لیے پہلے قریش و انصار سے آغاز کیا، مدینہ منورہ میں اس وقت تین بزرگ یعنی حضرت مخرمہؓ بن نوفل، حضرت جبیرؓ بن مطعم اور حضرت عقیلؓ بن ابی طالب علم الانساب اور حساب و کتاب کے فن میں ممتاز تھے، حضرت عمرؓ نے ان کو بلا کر یہ خدمت سپرد کی کہ وہ قریش و انصار کا ایک رجسٹر تیار کریں جس میں ہر شخص کا نام و نسب تفصیل سے درج ہو، اس ضمن میں یہ ہدایت بھی فرمائی کہ رجسٹر کا آغاز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قرابت داروں یعنی بنو ہاشم سے کریں اور پھر درجہ بدرجہ جو لوگ جس قدر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دور ہوتے گئے ہوں، اسی ترتیب سے ان کے نام لکھیں، یہاں تک کہ جب میرے قبیلے تک نوبت آئے تو میرا نام لکھیں، بہرکیف اس ہدایت کے مطابق رجسٹر تیار ہوا اور حسب حیثیت تنخواہیں اور بیوی بچوں کے گزارے کے لیے وظائف مقرر ہوئے، جن کی مقدار دو دو سو درہم سالانہ سے چار سو درہم تک اور اہل بدر کی اولاد ذکور کی دو دو ہزار درہم مقرر ہوئی۔ اس موقع پر یہ امر خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ جن لوگوں کی جتنی تنخواہیں مقرر ہوئیں اتنی ہی ان کے غلاموں کی بھی مقرر ہوئیں، اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ فاروق اعظمؓ نے مساوات کا کیا سبق سکھایا تھا، کچھ دنوں کے بعد اس نظام کو قریش و انصار سے وسعت دے کر عرب کے تمام قبائل میں عام کر دیا پورے ملک کی مردم شماری کی گئی اور ہر ایک عربی النسل کی مرتبہ کے لحاظ سے تنخواہ مقرر ہوئی، یہاں تک کہ شیر خوار بچوں کے لیے بھی وظائف کا قاعدہ جاری کیا گیا۔ اس نظام سے گویا عرب کا ایک بچہ اپنی پیدائش کے دن سے ہی اسلامی فوج کا ایک سپاہی تصور کر لیا جاتا تھا۔

فوجیوں کو تنخواہ کے علاوہ کھانا اور کپڑا بھی ملتا تھا، بھتہ اور تنخواہ کی تقسیم کے اوقات مختلف تھے۔ شروع محرم میں تنخواہ، فصل بہار میں بھتہ اور فصل کٹنے کے موقع پر خاص جاگیروں کی آمدنی تقسیم ہوتی تھی [۲] تنخواہ کی تقسیم کا طریقہ یہ تھا کہ ہر قبیلہ میں ایک عریف یعنی مقدم ہوتا تھا۔ اسی طرح ہر دس سپاہیوں پر ایک افسر ہوتا تھا جن کو امراء العشار کہتے تھے، تنخواہیں عریف کو دی جاتی تھیں، وہ امرائے اعشار کی معرفت فوج میں تقسیم کرتا تھا۔ ایک ایک عریف کے متعلق ایک ایک لاکھ درہم کی تقسیم تھی، کوفہ و بصریٰ میں سو عریف تھے، جن کے ذریعے ایک کروڑ کی رقم تقسیم ہوتی تھی، حسن خدمت اور کارکردگی کے لحاظ سے سپاہیوں اور افسروں کی تنخواہوں میں وقتاً فوقتاً اضافہ بھی ہوتا رہتا تھا، چنانچہ قادسیہ میں غیر معمولی جانبازی دکھانے کے صلہ میں زہرہ، عصمہ اور ضبی وغیرہ کی تنخواہیں دو دو ہزار سے بڑھا کر اڑھائی اڑھائی ہزار کر دی گئیں [۳]

فوج کی صحت و تندرستی اور آرام و آسائش کا اہتمام تھا۔ ۱۷ھ میں مدائن کی فتح کے بعد وہاں کی آب و ہوا کی خرابی کی

---

[۱] الفاروق حصہ دوم اور سیر الصحابہؓ خلفائے راشدین سے ماخوذ [۲] الفاروق حصہ دوم [۳] سیر الصحابہؓ خلفائے راشدین

وجہ سے جب فوج کی تندرستی متاثر ہوئی، تو حضرت عمرؓ نے عقبہ بن غزوان کو لکھا کہ فوجیں موسم بہار میں سرسبز و شاداب مقام پر چلی جایا کریں۔ حضرت عمرؓ کو فوج کی تربیت کا بھی بے حد خیال رہتا تھا۔ آپ نے اس ضمن میں تاکیدی احکام جاری کیے تھے کہ مفتوحہ ممالک میں کوئی شخص زراعت اور تجارت کا شغل اختیار نہ کرے، کیونکہ اس سے اُن کے سپاہیانہ جوہر کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے، فوجوں کے لیے شہسواری، تیراندازی، تیراکی اور ننگے پاؤں دوڑنے کی مشق ضروری تھی، ہفتہ میں جمعہ کا ایک دن آرام کے لیے ملتا تھا اور ہر چار ماہ کے بعد سپاہیوں کو وطن جاکر اپنے اہل و عیال سے ملنے کے لیے رخصت دی جاتی تھی، جفاکشی کے خیال سے حکم تھا کہ اہل فوج گھوڑے پر رکاب کے سہارے سوار نہ ہوں، نرم کپڑے نہ پہنیں، دھوپ سے بچیں اور حماموں میں نہ نہائیں۔

چھاؤنیوں کے انتخاب میں آب و ہوا کی خوبی کا خاص لحاظ رکھا جاتا تھا، بارکیں وسیع تعمیر کی جاتی تھیں اور اُن کے لیے کھلے میدان چھوڑ دیئے جاتے تھے، گرم ملکوں پر سردیوں اور سرد ملکوں پر گرمیوں میں فوج کشی ہوتی تھی، کوچ کی حالت میں حکم تھا کہ فوج جمعہ کے دن مقام کرے اور ایک شب و روز قیام رکھے تاکہ تازہ دم ہو جائے۔ غرض حضرت عمرؓ نے تقریباً چودہ سو برس پیشتر فوجی تربیت کے لیے ایسے اعلیٰ اصول وضع کر دیے تھے کہ آج بھی اصولی حیثیت سے ان پر کچھ اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔

حضرت عمرؓ نے سارے ممالک محروسہ میں فوجی مرکز قائم کیے جنہیں جند کہتے تھے، چنانچہ مدینہ، کوفہ، بصرہ، موصل، فسطاط، مصر، دمشق، حمص، اُردن اور فلسطین وغیرہ میں بڑے بڑے فوجی مرکز تھے، ان میں کوفہ، بصرہ اور فسطاط تو خاص طور پر فوجی ضرورت کے لیے ہی آباد کیے گئے تھے، ان مراکز میں صیغہ فوج کے حسب ذیل انتظامات تھے۔

- فوجوں کے لیے چھاؤنیاں تھیں اور بڑے بڑے اصطبل تھے جن میں چار چار ہزار گھوڑے ہر وقت ساز و سامان سے لیس رہتے تھے، تاکہ ضرورت کے وقت فوری طور پر سوار دستہ تیار ہو جائے۔ [1]
- ہر اصطبل کے متعلق چراگاہیں تھیں جن میں عمدہ نسل کے گھوڑوں کی پرورش کا خاص اہتمام تھا، حضرت عمرؓ نے مدینہ کے قریب ایک چراگاہ تیار کرائی اور اپنے ایک غلام کو اس کی حفاظت اور نگرانی پر مقرر کیا تھا۔ گھوڑوں کی رانوں پر داغ سے "جیش فی سبیل اللہ" نقش کیا جاتا تھا۔ [2]
- فوج کے متعلق جملہ کاغذات اور دفاتر انہی مقامات میں رہتے تھے۔
- رسد کے ذخیرے یہیں تھے جہاں سامانِ رسد جمع کیا جاتا اور مختلف مقامات پر بھیجا جاتا تھا، ان مرکزی مقامات کے علاوہ تمام ممالک محروسہ میں جہاں جہاں ضرورت تھی، بکثرت چھاؤنیاں قائم کیں، خوزستان کے علاقہ میں جگہ جگہ چھاؤنیاں تھیں، عجم میں ایرانی حکومت کی جو پرانی چھاؤنیاں تھیں، انہیں از سر نو تعمیر کرایا۔ جو نیا مقام فتح ہو جاتا تھا وہاں بقدرِ ضرورت فوج متعین کر دی جاتی تھی، سرحدی علاقوں اور ساحلی مقامات کی حفاظت کا مستقل جداگانہ انتظام کیا۔

اس صیغہ کے افسر اعلیٰ حضرت عبداللہ بن قیس تھے۔ فوجی بھرتی کو اس قدر وسعت دی کہ یہ نظام مہاجرین و انصار سے بڑھتے

---

[1] تاریخ طبری حصہ سوم [2] سیر الصحابہؓ خلفائے راشدین

بڑھتے حجارے عرب کو محیط ہو گیا' تقریباً دس لاکھ ہتھیار بند فوج ہر وقت تیار رہتی تھی اور ہر سال تیس ہزار نئی فوج فتوحات پر بھیجی جاتی تھی' فوج کے دروازے تمام مفتوحہ اقوام کے لیے کھلے ہوئے تھے، اس میں عجمی، رومی، یہودی اور ہندوستانی سب شامل تھے' فوج کا سٹاف خزانچی' محاسب' قاضی، مترجم اور طبیب و جراح پر مشتمل تھا، راستہ صاف کرنے، سڑک بنانے اور پل تعمیر کرنے کا کام مفتوحہ قوموں سے لیا جاتا تھا۔ چنانچہ مصر میں یہ خدمت قبطیوں نے انجام دی تھی' جاسوسی یعنی غنیم کی نقل و حرکت کے متعلق خبریں بہم پہنچانے کی خدمت زیادہ تر ذمیوں سے لی جاتی تھی، چنانچہ قیساریہ کے محاصرہ کے دوران یوسف نامی یہودی نے جاسوسی کی خدمت انجام دی تھی[1] اسی طرح عراق میں بعض وفادار مجوسی اپنی خوشی سے اس خدمت کو انجام دیتے تھے۔

خبر رسانی اور پرچہ نویسی کا نہایت مکمل انتظام تھا، ہر فوج کے ساتھ پرچہ نویس رہتے تھے' جو ایک ایک بات کی خبر حضرت عمرؓ کو پہنچاتے رہتے تھے' اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اسلامی فوجیں جس حصہ میں بھی ہوتی تھیں' ان کی باگ ڈور حضرت عمرؓ کے ہاتھوں میں رہتی تھی۔[2] آلاتِ جنگ میں تیغ و سنان کے علاوہ قلعہ شکنی کے لیے منجنیق اور دبابہ بھی ساتھ رہتا تھا۔ فوج حسب ذیل شعبوں میں منقسم تھی:۔

قلب[1]، مقدمہ[2]، میمنہ[3]، میسرہ[4]، ساقہ[5]، طلیعہ[6]، ردا یعنی عقبی گارڈ، سفر مینا[8]، شتر سوار[9]، سوار، پیادہ اور تیرانداز[12]

عرب کی تلوار اگرچہ اپنی فتوحات میں کبھی غیروں کی ممنونِ احسان نہیں رہی تاہم حریف اقوام کو خود اپنی ہم قوموں سے لڑانا جنگی تکنیک کا ایک اہم ترین اصول ہے۔ حضرت عمرؓ نے اس اصول کو نہایت خوبی سے استعمال کیا، چنانچہ صدہا عجمی، یونانی اور رومی بہادروں نے اسلامی فوج میں داخل ہو کر مسلمانوں کے دوش بدوش نہایت وفاداری کے ساتھ خود اپنی قوموں سے جنگ کی، یزدگرد شاہنشاہ ایران کا ایک منتخب دستہ جو چار ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھا، قادسیہ کے معرکہ کے دوران میں ہی ایرانیوں سے علیحدہ ہو کر حلقۂ اسلام میں آ گیا حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نے ان کو اسلامی فوج میں شامل کر لیا اور کوفہ میں آباد کر کے ان کی تنخواہیں مقرر کر دیں[2]۔ سندھ کے جاٹ جن کو اہل عرب زط کہتے تھے' یزدگرد کے لشکر میں شامل تھے' سوس کے معرکہ کے بعد حلقہ بگوش اسلام ہوئے اور اسلامی فوج میں بھرتی ہو کر بصرہ میں آباد ہو گئے، نوشیرواں کی طرف سے یمن کے گورنر باذان کی ایرانی فوج میں سے اکثر لوگ مسلمان ہو گئے تھے، یرموک کے معرکہ میں رومی لشکر کا مشہور سپاہی جارج عین حالتِ جنگ میں مسلمان ہو گیا اور مسلمانوں کے دوش بدوش لڑ کر شہید ہوا۔[3]

مذہبی خدمات

مذہبی خدمات کے سلسلہ میں سب سے بڑا کام اشاعت اسلام ہے۔ حضرت عمرؓ کو اس میں حد درجہ انہماک تھا، لیکن تلوار کے زور سے نہیں بلکہ اخلاق کی قوت سے' آپ نے خود ایک موقع پر اپنے غلام کو اسلام کی دعوت دی، مگر اس نے جب باوجود ہدایت و ترغیب کے انکار کیا تو فرمایا 'لا اکراہ فی الدین' یعنی مذہب میں جبر نہیں۔

حضرت عمرؓ جس ملک پر فوجیں بھیجتے تھے، تاکید کرتے تھے کہ جنگ سے پہلے لوگوں کے سامنے اسلام کے محاسن پیش کر کے ان کو اسلام کی دعوت دی جائے، اس کے علاوہ آپ نے تمام مسلمانوں کو اپنی تربیت اور ارشاد سے اسلامی اخلاق کا مجسم نمونہ بنا دیا تھا چنانچہ اسلامی فوجیں جس ملک میں جاتی تھیں' لوگوں کو خواہ مخواہ ان کے دیکھنے کا شوق پیدا ہوتا تھا اور مسلمانوں کی اخلاقی برتری کو دیکھ

---

[1] فتوح البلدان [2] الفاروق حصہ دوم [3] الفاروق حصہ دوم [4] سیر الصحابہ خلفائے راشدین

کر خود بخود اسلام کے گرویدہ ہوجاتے تھے۔ رومیوں کا سفیر اسلامی کیمپ میں آیا تو سالارِ فوج کی سادگی اور بے تکلفی سے اتنا متاثر ہوا کہ دفعۃً قوم اور خاندان سے الگ ہوکر مسلمان ہوگیا۔ مصری حکومت کا ایک بڑا رئیس مسلمانوں کے حالات سن کر اسلام کی کشش محسوس کرنے لگا اور آخر دو ہزار کی جمعیت کے ساتھ حلقہ بگوشِ اسلام ہوگیا۔

وہ عربی قبائل جو عراق و شام میں آباد تھے اور عیسائی ہوگئے تھے۔ نسبتاً آسانی سے اسلام کی جانب مائل کیے جاسکتے تھے۔ حضرت عمرؓ کو ان لوگوں میں تبلیغ کا خاص خیال تھا۔ چنانچہ اکثر قبائل نے معمولی سی کوشش سے اسلام قبول کرلیا تھا، مزید اسلامی فتوحات کی کثرت نے بھی اس خیال کو تقویت دی کہ مسلمانوں کے ساتھ تائیدِ آسمانی شامل ہے۔ چنانچہ بہت سے لوگ اسلام کی صداقت کے دل و جان سے قائل ہوگئے۔ فارس کے معرکہ میں جب پارسیوں کا ایک مشہور بہادر بھاگ نکلا اور سردارِ فوج نے اس کو گرفتار کرکے بھاگنے کی سزا دینا چاہی تو اس نے ایک بڑے پتھر کو تیر سے توڑ کر کہا کہ: "یہ تیر بھی جن لوگوں پر اثر نہیں کرتے، خدا ان کے ساتھ ہے اور ان سے لڑنا بے کار ہے"[1] اسی طرح ۱۶ھ کے آخر میں جب جلولا فتح ہوا تو بہت سے رؤسا برضا و رغبت مسلمان ہوگئے، جن میں جمیل بن بصہری، بسطام بن نرسی، رفیل اور فیروز جیسے نامور اور صاحبِ اختیار لوگ بھی تھے، عراق کی طرح شام اور مصر میں بھی کثرت سے لوگ مسلمان ہوئے، چنانچہ شہر فسطاط میں ایک بڑا محلہ نومسلموں کا تھا۔ غرض حضرت عمرؓ کے عہد میں کثرت سے اسلام پھیلا اور اس سے بڑھ کر یہ کہ آپ دینِ حنیف کی آئندہ اشاعت کے لیے راستہ صاف کرگئے۔

شعبۂ تعلیم۔ خدمتِ قرآن : خلفائے راشدین کے مقدس دور تک تعلیم کا مفہوم و مقصد صرف مذہبی تعلیم تھا، حضرت عمرؓ نے اس کی بڑی اشاعت کی، مذہبِ اسلام کی بنیاد کلام اللہ پہ ہے، اس لیے اس کی حفاظت، تعلیم اور اشاعت کا بڑا اہتمام کیا، اس میں شک نہیں کہ تدوینِ قرآن کا لازوال فخر حضرت ابوبکرؓ کے لیے مقدر ہوچکا تھا، تاہم اس کا خیال سب سے پہلے حضرت عمرؓ ہی کے دماغ میں آیا، اس کے بعد انہوں نے اپنے دور میں تمام مفتوحہ ملکوں میں قرآن کی تعلیم کے لیے مکتب قائم کیے اور ان کے لیے تنخواہ دار معلم مقرر فرمائے۔ ان مکتبوں میں کتابت کی تعلیم بھی ہوتی تھی۔

حفاظِ قرآن کو مختلف مقامات پر قرآن کا درس دینے کے لیے بھیجا، چنانچہ حضرت عبادہؓ بن الصامت، حضرت معاذ بن جبلؓ اور حضرت ابوالدرداءؓ شام بھیجے گئے۔ انہوں نے حمص، فلسطین اور شام میں درس جاری کیے۔ مزید قرآن شریف کو صحت کے ساتھ پڑھنے اور پڑھانے کے تاکیدی احکام جاری فرمائے۔ بدوؤں کے لیے قرآنِ حکیم کی تعلیم ایک گونہ جبری تھی۔ ایک معلم حضرت ابوسفیانؓ مع چند آدمیوں کے اس کام پر مقرر کیے گئے تھے کہ وہ قبائل میں پھر کر ہر شخص کا امتحان لیں اور جس کو قرآنِ حکیم کا کوئی حصہ یاد نہ ہو اسے سزا دیں۔ سورہ بقرہ، نساء، مائدہ، حج، اور نور کا جن میں احکام ہیں یاد کرنا ضروری قرار دیا۔ ایسی تدابیر سے حضرت عمرؓ کے دور میں قرآن کی تعلیم ایسی عام ہوگئی تھی کہ ناظرہ خوانوں کا تو شمار ہی کیا، حافظوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی تھی[2]

حدیث کی خدمات : اصولِ اسلام میں قرآن کے بعد حدیثِ نبویؐ کا درجہ ہے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے اس کی تلاش،

---

[1] الفاروق حصہ دوم [2] سیر الصحابہؓ خلفائے راشدین

حفاظت اور اشاعت کا بھی انتظام کیا۔ احادیث نبویؐ کو نقل کرا کے حکام کے پاس روانہ کیا کہ عام طور پر اس کی اشاعت ہو حفاظِ حدیث صحابہؓ کو حدیث کی تعلیم دینے کے لیے مختلف مقامات پر بھیجا، اُن میں سے حضرت عبداللہؓ بن مسعودؓ کو کوفہ حضرت معقلؓ بن یسار، حضرت عبداللہ بن مغفلؓ اور حضرت عمرانؓ بن حصین کو بصرہ اور حضرت عبادہؓ بن صامت اور حضرت ابو درداؓ کو شام روانہ کیا، اور حضرت امیر معاویہؓ والیٔ شام کو لکھا کہ اُن کے علاوہ دوسرے کی احادیث قبول نہ کی جائیں ۱؎

آپ کے زمانہ میں فتوحات کی کثرت اور سلطنت کی روز افزوں وسعت کے پیش نظر آئے دن نئے نئے مسائل پیدا ہوتے رہتے تھے۔ چنانچہ جب ایسی صورتِ حال پیش آتی تو آپ صحابہؓ سے دریافت فرماتے کہ اس کے متعلق انہیں کوئی حدیثِ نبویؐ معلوم ہے، اس طریقے سے احادیث کا اچھا خاصہ حصہ جمع ہوگیا اور حدیثوں کی بڑی اشاعت ہوئی ۲؎

اگرچہ محدثین کے نزدیک تمام صحابہؓ عادل ہیں، تاہم حضرت عمرؓ اس نکتہ سے خوب واقف تھے کہ خصائص بشری سے کوئی انسان مستثنیٰ نہیں، اس لیے آپ اشاعتِ حدیث کے ساتھ ساتھ روایات قبول کرنے میں بڑی احتیاط اور چھان بین سے کام لیتے اور بغیر شہادت کے کسی کی روایت قبول نہ کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت ابوموسیٰؓ اشعری تشریف لائے تو آپ کسی کام میں مشغول تھے چنانچہ وہ تین دفعہ سلام کرکے واپس چلے گئے، کام سے فراغت کے بعد آپ نے حضرت ابوموسیٰؓ اشعری کو بلایا اور واپس چلے جانے کا سبب پوچھا، انہوں نے جواب دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ تین دفعہ اجازت مانگو۔ اگر اس پر بھی نہ ملے تو واپس چلے جاؤ، فرمایا اس کا ثبوت دو، ورنہ میں تم کو سزا دوں گا۔ چنانچہ حضرت ابوموسیٰؓ نے حضرت ابوسعیدؓ خدری کو شہادت میں پیش کیا، اسی طرح حضرت مغیرہؓ بن شعبہ نے سقط (یعنی کسی عورت کے حمل ضائع کردینے) کے مسئلہ میں ایک حدیث بیان کی، آپ نے شہادت طلب کی اور جب حضرت محمدؓ بن مسلمہ نے تصدیق کی تو حضرت عمرؓ نے اسے تسلیم کیا۔

طرح حضرت مغیرہؓ بن شعبہ نے سقط (یعنی کسی عورت کے حمل ضائع کردینے) کے مسئلہ میں ایک حدیث بیان کی، آپ نے شہادت طلب کی آپ نے شہادت طلب کی اور جب حضرت محمدؓ بن مسلمہ نے تصدیق کی تو حضرت عمرؓ نے اسے تسلیم کیا۔

حضرت عمرؓ لوگوں کو کثرت روایات سے بھی نہایت سختی سے روکتے تھے۔ چنانچہ حضرت قرظہؓ بن کعب کو عراق روانہ کرتے وقت خاص طور سے ہدایت کی کہ تم ایسے ملک میں جا رہے ہو جہاں قرآن کی آواز گونجتی رہتی ہے، ایسا نہ ہو کہ تم ان کو قرآن سے ہٹا کر حدیث کی طرف لگا دو، اسی طرح آپ نے حضرت عبداللہؓ بن مسعود، حضرت ابو درداؓ اور حضرت ابو مسعودؓ کو روایت حدیث سے روک دیا تھا۔ حضرت ابوہریرہؓ حافظِ حدیث تھے، اس لیے وہ روایتیں بھی کثرت سے بیان کرتے تھے، ایک دفعہ لوگوں نے اُن سے پوچھا کہ آپ حضرت عمرؓ کے دور میں بھی اسی طرح روایت کرتے تھے؟ انہوں نے کہا کہ اگر اس زمانہ میں ایسا کرتا تو دُرّے کھاتا ۳؎

اس ضمن میں آپ نے ایک بڑی نکتہ سنجی یہ فرمائی کہ احادیث کی اہمیت کے اعتبار سے ان کے مراتب کو ملحوظ رکھا چنانچہ آپ نے ان ہی احادیث کی طرف زیادہ توجہ فرمائی جن کا تعلق عبادات، معاملات اور اسلام کے عملی نظام سے تھا۔ باقی احادیث کی طرف زیادہ اعتنا نہیں کیا، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ آپ کے دور میں اکثر احادیث کم روایت ہوئیں، تاہم جس قدر ہوئیں وہ آمیزش

۱؎ تاریخ اسلام حصہ اول مؤلفہ شاہ معین الدین ۲؎ ایضاً ۳؎ سیر الصحابہ۔ خلفائے راشدین

سے بالکل پاک ہیں۔ [1]

فقہ کی خدمت

حدیث کے بعد فقہ کا درجہ ہے اور عملی زندگی میں زیادہ تر فقہ سے کام پڑتا ہے، خصوصیت سے عہدِ فاروقی میں اسلامی تمدن کی ترقی سے صدہا نئے مسائل پیدا ہوئے، اس لیے اس زمانہ میں علمِ فقہ کی بڑی ترقی و اشاعت ہوئی۔ حضرت عمرؓ خود بالمشافہ اپنے خطبوں اور تقریروں میں فقہی مسائل بیان کرتے تھے اور اضلاع کے حکام اور افسران کو فقہی مسائل لکھ کر بھیجتے تھے۔ اختلافی مسائل کو صحابہؓ کے مجمع میں پیش کر کے طے کراتے تھے، اسلامی حکام انتظامی ذمہ داریوں کے ساتھ چونکہ مذہبی معلم بھی ہوتے تھے، اس لیے حضرت عمرؓ ان کی تقرری میں عالم اور فقیہہ ہونے کا خاص لحاظ رکھتے تھے۔

عمال اور حکام کے علاوہ مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کے لیے تمام ممالکِ محروسہ میں مستقل فقہاء مقرر کیے تھے، جو مذہبی احکام کی تعلیم دیتے تھے۔ صرف بصرہ میں دس بزرگوں کو اس کام پر مقرر کیا۔ ابن جوزی کی تصریح کے مطابق حضرت عمرؓ نے فقہا کی بیش قرار تنخواہیں مقرر کی تھیں، جبکہ ان سے پہلے فقہا اور معلمین کو تنخواہیں دینے کا کوئی رواج نہ تھا، غرض حضرت عمرؓ کے عہد میں تعلیم کا نہایت منظم اور جامع انتظام تھا۔

تعمیر مساجد

حضرت عمرؓ نے مذہب کی عملی خدمت کے سلسلہ میں کثرت سے مسجدیں تعمیر کرائیں اور ان کے لیے تنخواہ دار امام اور مؤذن مقرر کیے۔ شام کے عمال کو حکم بھیجا کہ ہر شہر میں ایک مسجد تعمیر کی جائے۔ کوفہ میں ہر قبیلہ کے لیے علیحدہ علیحدہ مسجد تعمیر کرائی، اس طرح آپ کے دور میں چار ہزار مسجدیں تعمیر ہوئیں [2]

حرمِ محترم کی عمارت ناکافی تھی، ۱۷ھ میں اس کو وسیع کیا اور احاطہ کی دیواریں بنوائیں، غلافِ کعبہ کے لیے ایک نہایت عمدہ کپڑے قباطی کو رواج دیا جو مصر میں بنا جاتا تھا، مسجد نبویؐ کو بھی نہایت وسعت دی پہلے اس کا طول ۱۰۰ گز تھا جسے بڑھا کر ۱۴۰ گز کر دیا اور عرض میں ۲۰ گز کا اضافہ کیا، مزید مسجد کے ساتھ ایک کونے میں چبوترہ بنوا دیا کہ جس کو بات چیت کرنا یا شعر پڑھنا ہو وہ یہاں سے چلا جائے [3] مسجدوں میں فرش اور روشنی کے لیے مکمل انتظام کیا، حجاج کی راحت و آسائش کا بھی پورا انتظام تھا، حضرت عمرؓ خود ہر سال حج کے لیے جاتے اور خبر گیری کی خدمت انجام دیتے۔

اجراء احکام

مذہبی احکام کا نفاذ و اجراء بھی ایک ضروری چیز ہے اور حضرت عمرؓ نے تمام خلفاء سے زیادہ اس کی ضرورت کا احساس کیا، عہد نبوتؐ میں عورتیں مسجد میں آکر نماز میں شریک ہوا کرتی تھیں، حضرت عمرؓ اگرچہ اس کو پسند نہ فرماتے تھے تاہم اس سے منع نہیں فرمایا، کیونکہ آنحضرت صلعم کا ارشاد ہے "تم لوگ خدا کی لونڈیوں کو خدا کی مسجدوں میں جانے سے نہ روکو"

حضرت عمرؓ گھر کے بچوں کو روزہ کا عادی بنانے کے لیے رمضان المبارک میں اُن سے روزہ رکھاتے تھے۔ ایک دفعہ اس مبارک مہینہ میں ایک شرابی سامنے لایا گیا تو اس پر حد جاری کرنے سے پیشتر فرمایا:

"ہمارے بچے تو روزہ سے ہیں، تُو بدمست ہے، افسوس!"

---

[1] تاریخ اسلام حصہ اول مرتبہ شاہ معین الدین۔ [2] الفاروق حصہ دوم [3] ایضاً

بارش کم ہوتی تو نمازِ استسقا پڑھاتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عمِ محترم حضرت عباس رضی اللہ عنہ بن عبدالمطلب کے وسیلہ سے دعا مانگتے تھے۔ دعا یہ تھی:۔

"خداوندا ہم پہلے اپنے پیغمبر صلعم کو وسیلہ بناتے تھے اور تو ہم کو سیراب کرتا تھا اور اب ہم اپنے پیغمبرؐ کے چچا کو وسیلہ بناتے ہیں، تو ہم کو سیراب کر۔"

راوی کا بیان ہے کہ حضرت عمرؓ جب یہ دعا کرتے تھے، قحط سالی دُور ہو جاتی تھی اور پانی برستا تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ اقدس میں لوگ رمضان المبارک میں راتوں کو نمازیں پڑھا کرتے تھے، کیونکہ حضورؐ نے اس کی فضیلت بیان فرمائی تھی۔ چنانچہ یہی طریقہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے آغازِ خلافت تک قائم رہا۔ ایک رات ماہِ رمضان میں حضرت عمرؓ مسجدِ نبوی میں تشریف لائے تو دیکھا کہ لوگ متفرق طور پر نمازیں پڑھ رہے ہیں کوئی تنہا پڑھ رہا ہے اور کسی کے پیچھے دو چار آدمی کھڑے ہیں اور اس کی اقتدا کر رہے ہیں، یہ دیکھ کر عبدالرحمٰن بن عبدالقاری سے فرمایا: میں خیال کرتا ہوں کہ اگر ان لوگوں کو ایک قاری پر مجتمع کر دوں تو زیادہ بہتر ہے"، چنانچہ جب خیال پختہ ہُوا تو حضرت ابی رضی اللہ عنہ بن کعب کو امام مقرر فرمایا اور کسی دوسری رات کو نماز کا نظارہ کرنے کے لیے نکلے، عبدالرحمٰن بن عبدالقاری بھی ساتھ تھے۔ ایک قاری کے پیچھے لوگوں کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو ان سے فرمایا:۔

"یہ کیسی اچھی بدعت ہے لیکن جس میں یہ لوگ سوتے ہیں، وہ اس سے افضل ہے جس میں نماز پڑھتے ہیں[1]

یعنی رات کا پچھلا حصّہ اگلے حصّہ سے افضل ہے، اس لیے عبادت اسی میں کرنی چاہیے۔

یہی "بدعتِ حسنہ" نمازِ تراویح کے نام سے مشہور ہے اور مسلمانوں پر حضرت عمرؓ کا ایک خاص احسان سمجھا جاتا ہے۔ رمضان المبارک میں مساجد کی آبادی کا سب سے بڑا ذریعہ یہی نماز ہے۔

نماز کی امامت حضرت عمرؓ نمازِ پنجگانہ، جمعہ اور عیدین کی امامت خود کرتے تھے اور لوگوں کو فرائض و سُنن کی تعلیم دیتے تھے، آپ جمعہ کی نماز آفتاب ڈھلنے کے فوراً بعد پڑھاتے تھے۔ جمعہ کی اذان اس وقت ہوتی جب آپ منبر پر آکر ٹھہر جاتے۔ آپ کے آخری ایام میں جب لوگ زیادہ ہو گئے تھے، کئی کئی مؤذن اذان دیتے تھے۔ خطبہ میں اکثر احادیث پڑھتے کبھی کبھی مذہبی اور سیاسی مسائل بیان کرتے اور کبھی صرف قرآن مجید کی کوئی سُورت تلاوت کرتے تھے۔ عید کی نماز پہلے پڑھاتے اور خطبہ نماز کے بعد پڑھاتے تھے ایک مرتبہ عید الاضحیٰ میں یہ خطبہ دیا:

"لوگو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تم کو ان دونوں عیدوں میں روزہ رکھنے سے منع فرمایا ہے، ان میں سے ایک تو روزوں کے افطار کا دن ہے اور دوسرا اس لیے کہ قربانی کا گوشت کھاؤ"[2]

امارتِ حج: حضرت عمرؓ خود امیر الحج ہوتے تھے اور عام طور پر لوگوں کو حج کرنے کی ترغیب دیا کرتے تھے۔ آپ کا قول تھا حج کے

---

[1] سیر الصحابہؓ جلد اول جزء المہاجرین، [2] ایضاً

لیے سمجھا دے کسو، کیونکہ وہ بھی ایک جہاد ہے"۔

خدا کے شہر میں پہنچتے تو جلالِ الٰہی سے لبریز ہوتے تھے۔ صحیح روایات کے مطابق حضرت عمرؓ منیٰ میں اپنے خیمہ کے اندر تکبیر کہتے تھے، اُن کی آواز پر مسجد میں لوگ تکبیر کہتے تھے اور پھر بازاروں سے تکبیر کی آواز سُنائی دیتی تھی۔ یہاں تک کہ تمام منیٰ تکبیر کے شور سے گونج اُٹھتا تھا۔ آپ طواف نماز صبح کے بعد کرتے، پھر سوار ہو کر ذی طویٰ جاتے، جو حرم سے باہر ایک مقام ہے، وہاں پہنچ کر طواف کی دو رکعتیں ادا فرماتے۔ واپسی پر محصب میں قیام ہوتا۔[1]

آپ نے حج کے سلسلہ میں بعض انتظامات بھی کیے، مثلاً جب کوفہ اور بصرہ فتح ہوئے، تو وہاں کے لوگ آئے اور کہا یا امیر المومنینؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نجد والوں کے لیے قرن احرام باندھنے کی جگہ مقرر فرمائی تھی جو ہمارے راستے سے ہٹا ہوا ہے اور اگر ہم قرن جاکر احرام باندھیں، تو ہمیں بڑی دشواری پیش آئے گی، آپ نے فرمایا: تم لیے راستے کا کوئی مقام بتاؤ جو اس کے مقابل واقع ہو" اس کے بعد ان لوگوں کے لیے ذات عرق احرام باندھنے کے لیے تجویز فرمایا:

متفرق انتظامات

ملکی، فوجی اور مذہبی انتظامات کے علاوہ اور بہت سے جزئیات ہیں، جو اگرچہ کسی عنوان کے تحت نہیں آتے تاہم ان کا ذکر نہایت ضروری ہے، ان میں سے ایک دفتر اور کاغذات کی ترتیب اور اس کی ضرورت سے سن وسال کا قائم کرنا ہے۔

اسلام میں اب تک کوئی سنہ نہ تھا، لوگ عام واقعات کو یاد رکھنے کے لیے بعض بعض واقعات سے سنہ کا حساب کرتے تھے، مثلاً ایک زمانے تک کعب بن لوی کی وفات سے سال کا شمار ہوتا تھا، پھر عام الفیل قائم ہوا، پھر عام الفجار اور اس کے بعد مختلف سنہ قائم ہوئے، یہاں تک کہ حضرت عمرؓ نے ایک مستقل سنہ جاری کیا جو آج تک جاری ہے۔

سنہ ہجری کی ابتداء کے متعلق مورخین نے تصریح کی ہے کہ حضرت عمرؓ کے سامنے ایک چیک پیش ہوئی جس پر صرف شعبان کا لفظ درج تھا، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ یہ کیونکر معلوم ہو کہ اس سے گزشتہ شعبان کا مہینہ مراد ہے یا موجودہ، چنانچہ اسی وقت مجلس شوریٰ منعقد کی جس میں تمام اکابر صحابہؓ کے علاوہ ہرمزان بھی شامل تھا۔ اس مسئلہ پر سب نے رائے دی اور آخر حضرت علیؓ کی رائے کے مطابق یہ طے پایا کہ سنہ کی ابتداء ہجرت نبویؐ سے کرنی چاہیے لیکن چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ربیع الاول میں ہجرت فرمائی تھی اور عرب میں سال کا آغاز محرم سے ہوتا تھا، اس لیے حضرت عثمانؓ کی رائے سے دو ماہ اور آٹھ دن پیچھے ہٹ کر شروع سال سے سنہ قائم کیا گیا اور ۲۰، جمادی الآخر ۱۷ھ مطابق ۹/۱۲ جولائی ۶۳۸ء باقاعدہ سنہ ہجری جاری ہو گیا۔[2]

ملکی حالات سے واقفیت کے لیے ملک کے ہر حصہ میں پرچہ نویس اور واقعہ نگار مقرر تھے جن کے ذریعے سے ملک کا کوئی واقعہ مخفی نہیں رہنے پاتا تھا۔ مورخ طبری کے مطابق حضرت عمرؓ پر کوئی بات مخفی نہیں رہتی تھی۔ عراق میں جن لوگوں نے خروج کیا اور شام میں جن لوگوں کو انعام دیے گئے سب ان کو لکھا جاتا تھا۔

---

[1] سیر الصحابہؓ جلد اوّل جزء المہاجرین [2] رحمۃ للعالمین جلد دوم

حضرت عمرؓ کی حکومت دُنیا کے وسیع خطوں پر پھیلی ہُوئی تھی لیکن اس کے باوجود جب دُور دراز ممالک سے وفود آتے تھے اور آپ نام بنام لوگوں کو پکارتے، تو حاضرین کو تعجب ہوتا تھا۔

محکمہ خبر رسانی کی سرگرمیوں کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ میسان کے حاکم نعمان بن عدی نے عیش و عشرت میں مبتلا ہو کر اپنی بیوی کو خط میں ایک شعر لکھا جس کا ترجمہ یہ ہے کہ :

"غالباً امیرالمومنین ؓ بُرا مانیں گے کہ ہم لوگ محلوں میں رندانہ صحبتیں رکھتے ہیں"

اس محکمہ کی بدولت حضرت عمرؓ کو اس رازونیاز کی بھی خبر ہوگئی، چنانچہ آپ نے ان کو معزول کر دیا اور لکھا "ہاں مجھ کو تمہاری یہ حرکت ناگوار ہوئی"[1]

ذمیوں کے حقوق

مورخین کے مطابق حضرت عمرؓ نے ذمی رعایا کے ساتھ جو سلوک کیے اور ان کو جو حقوق عطا فرمائے، وہ آج متمدن سلطنت میں بھی رعایا کو حاصل نہیں۔

آپ نے ذمیوں کو کبھی غلام اور ماتحت نہیں سمجھا بلکہ ان کو وہ درجہ دیا جو دو برابر کے معاہدہ کرنے والوں کا ہوتا ہے اسی بناء پر جب آپ بستر مرگ پر تھے آئندہ خلیفہ کو یہ وصیت فرمائی۔

"اور میں اس کو ان لوگوں کے حق میں وصیت کرتا ہوں جن کو خداؐ اور رسولؐ کا ذمہ دیا گیا ہے کہ ان سے جو عہد ہے وہ پورا کیا جائے اور اُن کی حمایت میں لڑا جائے اور ان کو اُن کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہ دی جائے"[2]

ذمیوں کو مذہبی معاملات میں پوری آزادی حاصل تھی، البتہ جن رسوم سے علانیہ اسلام کی توہین ہوتی تھی، ان کے اظہار کی ممانعت تھی۔ مثلاً مجوس محارم کے ساتھ نکاح کرتے تھے۔ اس بناء پر حکم دیا "مجوس کے ذمی محرم کے درمیان تفریق کرو" حضرت عمرؓ وقتاً فوقتاً اپنے عمال کو ذمیوں کے معاہدوں کی پابندی کی تاکید کرتے رہتے تھے، حضرت ابوعبیدہؓ فاتح شام کو لکھا :

"مسلمانوں کو ذمیوں پر ظلم کرنے، ان کو نقصان پہنچانے اور بے وجہ ان کا مال کھانے سے روکو، اور ان سے جو شرطیں کی گئی ہیں، ان کو پورا کرو"[1]

اگر کوئی مسلمان کسی ذمی کو قتل کر دیتا تھا، تو حضرت عمرؓ اس سے قصاص لیتے تھے۔ ایک مرتبہ قبیلہ بکر بن وائل کے ایک شخص نے حیرہ کے عیسائی کو قتل کر دیا حضرت عمرؓ نے قاتل کو مقتول کے وُرثاء کے حوالے کر دیا، انہوں نے اس کی گردن ماردی۔

ذمیوں کی املاک کو کوئی نقصان پہنچتا تو حضرت عمرؓ اس کا معاوضہ دلاتے تھے، ایک دفعہ فوج نے شام کے ایک ذمی کی زراعت پامال کر دی، آپ نے اس کو بیت المال سے دس ہزار معاوضہ دلایا[3]

غلامی کا رواج کم کرنا

حضرت عمرؓ نے اگرچہ غلامی کا انسداد کلّی نہیں کیا اور شاید ایسا کر بھی نہیں کر سکتے تھے، تاہم ایسے وسائل اختیار کیے جن سے غلامی کا دائرہ نہایت محدود ہو گیا، یہی وجہ ہے کہ حضرت عمرؓ کے دور میں گو عظیم الشان

---

[1] سیر الصحابہؓ جلد اول جزء المہاجرین [2] تاریخ اسلام حصہ اول از شاہ معین الدین [3] ایضاً۔

فتوحات ہوئیں، لیکن غلامی کا سلسلہ نہ صرف یہ کہ وسیع نہ ہو سکا بلکہ آپ نے مختلف طریقوں سے اس رواج کو کم کر دیا اور جس قدر قائم رکھا اور اس خوبی سے رکھا کہ غلامی، غلامی نہ رہی، بلکہ برابری اور ہمسری ہو گئی۔

غلاموں کی آزادی کا ایک طریقہ تھا جس کو مکاتبت کہتے تھے، یعنی غلام اور آقا میں ایک معاہدہ طے پا جاتا تھا کہ اتنی مدت میں اس قدر رقم ادا کر دینے پر غلام آزاد ہو جائے گا، یہ قاعدہ قرآن مجید میں موجود ہے لیکن صحابہؓ اس حکم کو وجوبی نہیں قرار دیتے تھے حضرت عمرؓ نے اس حکم کو وجوبی قرار دیا، چنانچہ حبیب سیرین نے جو حضرت انسؓ کے غلام تھے۔ اُن سے مکاتبت کی درخواست کی اور انہوں نے دولت مند ہونے کی بنا پر انکار کیا، تو سیرین حضرت عمرؓ کے پاس حاضر ہوئے۔ حضرت عمرؓ نے حضرت انسؓ سے فرمایا کہ ان کو مکاتب بناؤ اور ان کے انکار پر آپ نے حضرت انسؓ کو درے لگائے اور یہ آیت پڑھی۔

فَكَاتِبُوهُمْ إِنْ عَلِمْتُمْ فِيهِمْ خَيْرًا — تم ان کو مکاتب بناؤ اگر ان میں بھلائی دیکھتے ہو۔

(سورۂ نور آیت ۳۴)

چنانچہ حضرت انسؓ کو اس حکم کی تعمیل کرنا پڑی اور سیرین آزاد ہو گئے۔

لاوارث بچوں کو نہایت آسانی کے ساتھ غلام بنایا جاسکتا تھا لیکن اس ضمن میں حضرت عمرؓ نے قانون بنا دیا اللقیط حر۔ یعنی پڑے ہوئے بچے آزاد ہیں، مورخین کے مطابق عرب میں تو حضرت عمرؓ نے غلامی کا کلی استیصال کر دیا تھا اور اس ضمن میں آپ کو اس قدر اہتمام تھا کہ خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالتے ہی ان لوگوں کو آزاد کر دیا جو حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں قبائل مرتدہ سے رنڈی غلام بنائے گئے تھے۔ نیز اس کے ساتھ یہ اصول قائم کر دیا کہ اہلِ عرب کبھی کسی کے غلام نہیں ہو سکتے۔ [1]

غلامی کو روکنے کے متعلق ان کارناموں کے علاوہ حضرت عمرؓ نے ان لوگوں کو، جو غلام بنائے گئے تھے، وہ مراعات دیں کہ غلامی ہمسری کے درجہ تک پہنچ گئی، فوجی انتظامات کے ضمن میں یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ حضرت عمرؓ نے جب بدر وغیرہ کے مجاہدین کی تنخواہیں مقرر کیں تو اُن کے غلاموں کو بھی اُن کے برابر تنخواہیں دیں اور اس کے بعد کی تمام کارروائیوں میں بھی یہی اصول ملحوظ رکھا، آپ اضلاع کے عمال کو غلاموں سے بہتر سلوک کی تلقین کرتے رہتے اور ہمیشہ اُن کے سلوک کے متعلق پوچھتے رہتے تھے۔ اگر یہ معلوم ہو جاتا کہ کوئی عامل غلاموں کی عیادت کو نہیں جاتا، تو صرف اسی جرم پر اس کو معزول و موقوف کر دیتے تھے۔ آپ اکثر غلاموں کو ساتھ بٹھا کر کھانا کھلایا کرتے تھے اور حاضرین کو سنا کر کہتے تھے کہ خدا ان لوگوں پر لعنت کرے جن کو غلاموں کے ساتھ کھانے سے عار ہے۔

یہ اسلام کی انسانیت نوازی اور آنحضرت صلعم کی تعلیم کا نتیجہ تھا کہ غلامی، آقائی اور ہمسری بن گئی تھی۔ غلامی کو گھٹانا اور غلاموں کے ساتھ مساویانہ برتاؤ کرنا خود بانیٔ اسلام کا مقصد تھا اور حضرت عمرؓ نے اس ضمن جو کچھ کیا وہ اسی مقصد کی تعمیل تھی۔

سیاست و تدبیر، امن و امان

تاریخ عالم گواہ ہے کہ سیاست و تدبیر کے لحاظ سے حضرت عمرؓ نہ صرف خلفائے راشدین پر، نہ صرف سلاطین اسلام پر، نہ صرف شاہانِ عظام پر، بلکہ بلا استثنا تمام فرمانروایان

---

[1] الفاروق حصہ دوم

عالم پر ایسی فضیلت رکھتے ہیں جس کا اعتراف ہر دور کے مؤرخین نے کیا ہے، اور آج جبکہ علم التاریخ اپنے اُصول و ضوابط میں بے انتہا وسیع ہو گیا ہے، حضرت عمرؓ کے دَور کی عظمتیں اسی طرح قائم ہیں جس طرح یہ روزِ اوّل میں قائم تھیں اس کا سبب آپ کا وہ طریقۂ حکمرانی ہے جو ساڑھے دس سال تک اسلامی مملکت کے طول و عرض میں امن و امان اور عدل و انصاف کی سعادتوں سے ہر شخص کو نوازتا رہا اور بلا تفریق مذہب و ملت مملکت کے ہر فرد کو جینے کا حق دیتا رہا۔

حضرت عمرؓ کی خلافت مصر کے انتہائی حدود سے لے کر اقصائے خراسان و سیستان تک پھیلی ہوئی تھی، جس میں عربی، فارسی، شامی، عراقی، حبشی، قبطی، غرضیکہ ہر قوم اور ہر نسل کے لوگ رہتے تھے، مذہب کے لحاظ سے بھی ان میں کچھ کم اختلاف نہ تھا، قومی حیثیت سے ایران اور روم کا ایک ایک فرد مسلمانوں کو رشک و حسد کی نگاہ سے دیکھتا تھا تاہم اوراقِ تاریخ میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ملتا جس میں نقضِ امن اور ہجوم اضطراب کا شائبہ تک ہو۔ خود جزیرۃ العرب کا وسیع ریگستان جس کا ذرہ ذرہ قتل و غارت گری، خونریزی و بدامنی، ہیجان و انتشار کی خبر دیتا تھا، ایک ایسا معمورۂ امن بن گیا تھا جس میں سکون و آشتی کا دَور دورہ ہو یہی وہ حالت تھی، جس کی نسبت حضورِ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے چند سال قبل حضرت عدیؓ بن حاتم سے ارشاد فرمایا تھا۔

"اے عدیؓ! کیا تم نے حیرا دیکھا ہے؟ انہوں نے عرض کیا "نہیں، البتہ وہاں کے حالات جانتا ہوں"۔ ارشاد ہُوا "اگر تمہاری عُمر دراز ہوئی تو تم دیکھو گے کہ ایک پردہ نشین عورت تنہا حیرہ سے چل کر کعبہ کا طواف کرے گی اور خدا کے سوا اس کو کسی کا خوف نہ ہوگا" اس وقت تو حضرت عدیؓ کے دل میں یہ خیال پیدا ہُوا تھا کہ قبیلہ طے کے وہ قطاع الطریق، جنہوں نے ہر طرف فساد کی آگ مشتعل کر رکھی ہے۔ کہاں جائیں گے؟ لیکن ان کے اس سوال کا جواب عملی طور پر اس وقت مِلا جب حضرت عمرؓ کے دَور میں حیرہ فتح ہُوا، اور حضرت عدیؓ نے جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا، انہی کی زبان سے سُنیے، فرماتے ہیں :۔

"میں نے دیکھا کہ ایک پردہ نشین عورت تنہا حیرہ سے چلتی تھی اور کعبہ کا طواف کرتی تھی، اس کو خدا کے سوا کسی کا خوف نہ تھا"

یہ ہے اس عہد کے امن و امان کی ایک جھلک جو تاریخ میں حضرت عمرؓ کا عہد کہلاتا ہے، بے شبہ یہ نبوتِ حقّہ کا ایک واضح اور بیّن معجزہ اور حضرت عمرؓ کی سیاست کا عظیم الشان کرشمہ تھا، کہ لق و دق بیابانوں اور دشوار گزار ریگستانوں میں ایسا امن و امان قائم ہُوا، جس کی مثال پیش کرنے سے تاریخِ عالم قاصر ہے۔

امن و امان کی حالت

"اے عدیؓ! کیا تم نے حیرا دیکھا ہے؟" انہوں نے عرض کیا "نہیں، البتہ وہاں کے حالات جانتا ہوں" ارشاد ہُوا "اگر تمہاری عمر دراز ہوئی تو تم دیکھو گے کہ ایک پردہ نشین عورت تنہا حیرہ سے چل کر کعبہ کا طواف کرے گی اور خدا کے سوا اس کو کسی کا خوف نہ ہوگا" اس وقت تو حضرت عدیؓ کے دل میں یہ خیال پیدا ہُوا تھا کہ قبیلہ طے کے وہ قطاع الطریق، جنہوں نے ہر طرف فساد کی آگ مشتعل کر رکھی ہے۔ کہاں جائیں گے؟ لیکن ان کے اس سوال کا جواب عملی طور پر اس وقت مِلا جب حضرت عمرؓ کے دَور میں حیرہ فتح ہُوا، اور پھر حضرت عدیؓ نے جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا، انہی کی زبان سے سُنیے، فرماتے ہیں۔

"میں نے دیکھا کہ ایک پردہ نشین عورت تنہا حیرہ سے چلتی تھی اور کعبہ کا طواف کرتی تھی، اس کو خدا کے

سوا کسی کا خوف نہ تھا۔"

بلا شبہ یہ اس عہد کے امن و امان کی ایک جھلک ہے جو تاریخ میں حضرت عمرؓ کا عہد کہلاتا ہے۔ بے شبہ یہ نبوتِ عظمیٰ کا ایک واضح اور بین معجزہ اور حضرت عمرؓ کی سیاست کا عظیم الشان کرشمہ تھا کہ لق و دق بیابانوں اور دشوار گزار ریگستانوں میں ایسا امن و امان قائم ہوا جس کی مثال پیش کرنے سے تاریخِ عالم قاصر ہے۔

انصاف میں مساوات

حضرت عمرؓ کے دور کی ایک قابلِ ذکر خصوصیت یہ ہے کہ آپ نے تمام بیجا امتیازات کو مٹا کر شاہ و گدا، بلند و پست، شریف و رذیل اور عزیز و بیگانہ کو ایک سطح پر کر دیا تھا، اور اس کا عملی نمونہ خود اُن کی ذات تھی، امیر المومنینؓ اور عام رعایا کے حقوق میں کوئی فرق نہ تھا، آپ ہمیشہ اپنے عمال کو تاکیدی احکام بھیجتے رہتے تھے کہ وہ اپنے اور عام رعایا کے درمیان کوئی امتیاز پیدا نہ کریں، حضرت عمروؓ بن العاص نے مصر کی جامع مسجد میں منبر بنوایا، آپ کو خبر ہوئی تو لکھ بھیجا، "کیا تم پسند کرتے ہو کہ مسلمان نیچے بیٹھیں اور تم اوپر بیٹھو"! [1]

ایک بار مدینہ کی چند عورتوں کو چادریں تقسیم کیں اور ایک عمدہ چادر باقی رہی، بعض لوگوں نے رائے دی کہ یہ چادر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ مطہرہ کو جو آپ کی صاحبزادی ہیں عنایت فرما دیجئے، آپ نے جواب دیا:

"ام سلیط [2] رضی زیادہ حقدار ہیں کیونکہ وہ جنگِ اُحد میں ہمارے لیے مشکیں سیتی تھیں"!

شام کا ایک فرمانروا جبلہ بن ایہم غسانی مسلمان ہو گیا تھا، اس نے کعبہ کے طواف میں ایک شخص کو تھپڑ مارا، اس نے بھی برابر کا جواب دیا، جبلہ نے آکر حضرت عمرؓ سے شکایت کی، آپ نے فرمایا تم نے جیسا کیا ویسا پایا، جبلہ نے امارت کے زعم میں کہا، "ہم وہ ہیں کہ اگر کوئی شخص ہم سے گستاخی سے پیش آئے تو وہ قتل کا سزاوار ہے۔" حضرت عمرؓ نے فرمایا: "ہاں جاہلیت میں ایسا ہی تھا لیکن اسلام نے پست و بلند کو ایک کر دیا۔ جبلہ کو اس جواب سے حیرت ہوئی اور وہ مرتد ہو کر قسطنطنیہ بھاگ گیا۔

جب حضرت عمرؓ نے لوگوں کی تنخواہیں مقرر کیں، تو جو لوگ ہر موقع پر امتیاز و اعزاز کے خوگر تھے، ان کا خیال تھا کہ تنخواہ کے تقرر میں اُن کے نام سب سے پہلے نظر آئیں گے، لیکن حضرت عمرؓ نے اُن کے تمام خیالات غلط کر دیے، آپ نے جاہ و عظمت، شہرت و ناموری کی تمام خصوصیات مٹا کر اسلامی خدمات کی بنیادوں پر تنخواہیں مقرر کیں اور اصحابِ بدر کو سب پر مقدم رکھا، اس ضمن میں اس قدر انصاف کیا کہ امیر المومنینؓ کا اپنا وظیفہ بھی اصحابِ بدر سے زیادہ نہ تھا، حضرت عمرؓ چونکہ اس مقدس گروہ میں شامل تھے۔ اس لیے تمام اصحابِ بدر کی طرح آپ کو بھی پانچ ہزار کی رقم ملتی تھی۔

مہاجرینِ اولین کے وظائف چار چار ہزار سالانہ کے حساب سے مقرر کئے تھے، لیکن جب اپنے بیٹے حضرت عبداللہؓ کی باری آئی تو ساڑھے تین ہزار کا وظیفہ مقرر کیا اور یہ تفریق کی کہ جو خود ہجرت کر کے آیا ہو اور جس نے ماں باپ کے ساتھ ہجرت کی ہو، دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ حضرت عبداللہؓ نے چونکہ اپنے ماں باپ کے ساتھ ہجرت کی تھی۔ اس لیے ان مہاجرین کے مساوی درجہ نہ پا سکے

---

[1] الفاروق حصہ دوم، [2] حضرت ام سلیطؓ ایک انصاریہ اور قدیم الاسلام صحابیہ تھیں۔

جو خود ہجرت کر کے آئے تھے۔

فاروقی عدل و انصاف کا دائرہ صرف مسلمانوں تک ہی محدُود نہ تھا، بلکہ ان کا ایوانِ عدل مسلمان، یہودی، عیسائی سب کے لیے یکساں تھا۔ عربسوس کے عیسائیوں کو اُن کی متواتر یورشوں کی وجہ سے جلا وطن کیا گیا مگر اس طرح کہ ان کی تمام جائیداد کی قیمت دوگنا دی گئی، نجران کے عیسائیوں کو جلاوطن کیا گیا، تو ان کے ساتھ بھی نہایت اچھا سلوک کیا گیا۔[۱]

ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے ایک ضعیف ذمی آدمی کو گداگری کرتے دیکھا، تو بھیک مانگنے کا سبب پوچھا، اس نے کہا "مجھ پر جزیہ لگایا گیا ہے، حالانکہ میں بالکل نادار ہوں" حضرت عمرؓ اسے اپنے گھر لائے اور کچھ نقد مرحمت فرما کر مہتمم بیت المال کو لکھا کہ اس قسم کے ذمی مساکین کے لیے وظیفہ مقرر کیا جائے واللہ! یہ انصاف نہیں ہے کہ اُن کی جوانی سے ہم متمتع ہوں اور بڑھاپے میں ان کی خبر گیری نہ کریں۔[۲]

فاروقی رضؓ عدل و انصاف کی یہی وہ روشن مثالیں ہیں جو عہدِ نبوتؐ کے بعد اس دَور کو تاریخ میں انفرادیت عطا کرتی ہیں اور بے نظیر بناتی ہیں۔ یہ دَور اگرچہ زمانہ بعد کے حکمرانوں اور فرمانرواؤں کے لیے قابلِ تقلید رہا مگر یہ ایک تاریخی سانحہ ہے کہ اس دَور کو پھر دہرایا نہ جا سکا اور نہ ہی انسانی دکھوں کا مداوا ان بنیادوں پر کیا جاسکا جو عہدِ فاروقی رضؓ میں نمایاں نظر آتی ہیں۔

علم و فضل اسلام سے قبل عرب میں لکھنے پڑھنے کا چنداں رواج نہ تھا، چنانچہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو قبیلہ قریش میں صرف سترہؔ آدمی ایسے تھے جو لکھنا جانتے تھے، حضرت عمرؓ نے اسی زمانہ میں لکھنا اور پڑھنا سیکھ لیا تھا۔

حضرت عمرؓ ذاتی حیثیت سے نہایت ذہین طباع، بالغ نظر، مدبّر اور صائب الرائے تھے۔ جاہلی اور اسلامی، دونوں علوم پر آپ کو یکساں کمال حاصل تھا۔ فصاحت و بلاغت انشاء و خطابت۔ شاعری و نسابی سپہ گری اور بہادری وغیرہ تمام اوصاف و کمالات میں جو عرب میں لازمۂ شرافت سمجھے جاتے تھے، آپ کو وافر حصہ ملا تھا۔ آپ کے فرامین، خطوط، توقیعات اور خطبے اب تک کتابوں میں محفوظ ہیں ان سے آپ کی قوتِ تحریر اور برجستگی کلام اور زورِ تحریر کا اندازہ ہوتا ہے۔ بیعتِ خلافت کے بعد جو خطبہ ارشاد فرمایا، اس کے چند فقرے یہ ہیں:

> "اے خدا میں سخت ہوں تو مجھ کو نرم کر، میں کمزور ہوں مجھ کو قوت دے، ہاں، عرب والے سرکش اونٹ ہیں جن کی مہار میرے ہاتھ میں دی گئی ہے، لیکن میں اُن کو راستہ پر چلا کر چھوڑوں گا۔"[۳]

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کے نام ایک خط کے چند فقروں سے قوتِ تحریر کا اندازہ لگائیے، فرماتے ہیں:

> "اما بعد۔ مضبوطیٔ عمل کی یہ ہے کہ آج کا کام کل پر نہ اٹھا رکھو، ایسا کرو گے، تو تمہارے پاس بہت سے کام جمع ہو جائیں گے، پھر پریشان ہو جاؤ گے کہ کس کو کریں اور کس کو چھوڑ دیں، اس طرح کچھ بھی نہ ہو سکے گا۔"

---

[۱] سیر الصحابہؓ، جلد اوّل، [۲] ایضاً [۳] سیر الصحابہؓ جلد اوّل

شاعری کا نہایت بلند اور پاکیزہ مذاق رکھتے تھے، خود اگرچہ بہت کم شعر کہتے تھے، تاہم شعرائے عرب کے کلام پر تنقیدی نگاہ رکھتے تھے، ابن رشیق کا بیان ہے کہ "حضرت عمرؓ اپنے زمانہ میں شعر کے سب سے بڑے ناقد اور راز شناس تھے"۔ مشہور ادیب جاحظ لکھتا ہے کہ "(حضرت) عمرؓ اپنے عہد کے سخن سنج تھے"۔ آپ کو عرب کے بڑے بڑے شعراء کا کلام حفظ تھا اور اس پر ناقدانہ رائے رکھتے تھے، جاہلی شعرا میں سے امراء القیس، نابغہ اور زہیر کو ان تینوں میں سے زہیر کو زیادہ پسند کرتے تھے، اس ضمن میں یہ امر خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ آپ نے عرب شاعری کی بڑی اصلاح کی، آپ نے عربی شعراء کو عورتوں کا نام لے لے کر عشق و محبت کی داستانیں بیان کرنے اور لوگوں کی ہجو کرنے سے منع کر دیا تھا

فصاحت و بلاغت کلیہ حال تھا کہ آپ کے بہت سے مقولے ضرب المثل بن گئے جو آج بھی ادب عربی کی جان ہیں، علم الانساب میں بھی ید طولیٰ حاصل تھا، یہ علم کئی پشتوں سے آپ کے خاندان میں چلا آتا تھا، آپ کے والد خطاب قریش کے مشہور نساب تھے۔ جاحظ کے بیان کے مطابق نسب کے متعلق تمام معلومات اپنے والد ہی کے حوالہ سے بیان کرتے تھے۔

لکھنے پڑھنے کا ذوق آپ کو ابتداء سے ہی تھا اور اس زمانہ سے لکھنا پڑھنا جانتے تھے، جبکہ قریش میں چند آدمی ہی پڑھے لکھے تھے اور یہ شاید اسی ذوق کی وجہ سے تھا کہ آپ نے مدینہ پہنچ کر عبرانی زبان سے اچھی خاصی واقفیت پیدا کرلی تھی، مسند دارمی میں ہے کہ ایک مرتبہ آپ توریت کا ایک نسخہ آنحضرت صلعم کی خدمت میں لے گئے اور پڑھنا شروع کیا۔ آپ پڑھتے جاتے تھے اور آنحضرت صلعم کا چہرہ متغیر ہوتا جاتا تھا۔

حضرت عمرؓ کی ذہانت، طباعی اور اصابت رائے کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ آپ کی بہت سی رائیں مذہبی احکام بن گئیں، اذان کا طریقہ آپ ہی کی تجویز سے قائم ہوا۔ اسیرانِ بدر کے متعلق آپ کی رائے کو وحیٔ الٰہی کی تائید حاصل ہوئی، شراب کی حرمت، ازواجِ مطہرات کے پردہ اور مقام ابراہیم کو مصلّےٰ بنانے میں قرآن حکیم نے آپ کی رائے کی تاکید کی۔

قرآن پاک کے احکام و مسائل میں آپ بڑا فکر و تدبر کرتے تھے اور جو پیچیدہ مسائل حل نہ ہوتے انہیں آنحضرت صلعم کی خدمت میں پیش کرتے۔ کلالہ کی وراثت کا مسئلہ آپ نے اتنی مرتبہ پوچھا کہ حضورؐ نے تنگ آکر فرمایا کہ اس بارہ میں سورہ نساء کی آخری آیت کافی ہے، اسی طرح آپ نے سفر میں قصر نماز کے متعلق آنحضرت صلعم سے عرض کیا کہ جب راستے مامون ہو گئے ہیں، تو اب سفر میں یہ حکم باقی ہے؟ حضور سرورِ دو عالم صلعم نے فرمایا: یہ خدا کا انعام ہے۔"

اگرچہ حضرت عمرؓ کا شمار کثیر الروایہ صحابہؓ میں نہیں ہے اور آپ سے مرفوع روایات کی تعداد ستر سے زیادہ نہیں، تاہم اس سے یہ سمجھنا چاہیے کہ آپ صرف اسی قدر احادیث سے واقف تھے، حقیقت یہ ہے کہ آپ نے اپنے دورِ خلافت میں جس قدر احکام صادر فرمائے، وہ سب احادیث سے ہی ماخوذ ہیں، جس سے صاف ظاہر ہے کہ حدیث کے علم میں آپ کا پایہ نہایت بلند تھا اور اس ضمن میں آپ کسی بڑے سے بڑے محدث صحابی سے کم نہ تھے، تاہم آپ نے کلامِ رسولؐ کو بیرونی آمیزش سے پاک رکھنے کا شدت سے اہتمام کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کسی قول کو منسوب کرنے میں حد درجہ احتیاط سے کام لیا، مؤرخین کے مطابق جب تک آپ کو حدیث کے ہر لفظ پر یقین نہ ہو جاتا کہ رسول اللہ نے اسی طرح بیان فرمایا ہے آپ اس وقت تک قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا قطعی طور پر زبان سے نہیں نکالتے تھے۔[1]

---

[1] سیر الصحابہ رضا جلد اوّل

یہی سبب تھا کہ آپ خود بھی بہت کم احادیث روایت کرتے تھے اور دوسروں کو کثرتِ روایت سے روکتے تھے۔ علامہ ذہبی لکھتے ہیں:

"اور حضرت عمرؓ اس ڈر سے کہ صحابہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرنے میں غلطی نہ کریں، اُن کو حکم دیتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کم روایت کریں۔"

علمِ فقہ

فقہ میں آپ کا مقام اتنا بلند تھا کہ اس سلسلہ کو آپ ہی کا ساختہ پرداختہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جو اساطین فقہ میں ہیں آپ ہی کے تربیت یافتہ تھے۔ آپ کے زمانہ میں ہزاروں نئے مسائل پیش آئے، جنہیں آپ نے اپنی قوتِ اجتہاد سے حل کیا۔ آپ کے فقہی مسائل کی تعداد کئی ہزار ہے جن میں ایک ہزار مہمات مسائل ہیں۔ آپ نے اُصول فقہ کا فن ایجاد کر کے صرف جزئیات کی تدوین نہیں کی، بلکہ تفریع و استنباطِ مسائل کے اصول و ضوابط بنا کر آئندہ آنے والوں کے لیے اجتہادِ فکر کی ایک وسیع شاہراہ بھی قائم کر گئے۔ مؤرخین کے مطابق مختلف فیہ مسائل کے طے کرنے کے لیے اجتماعِ صحابہؓ جس کثرت سے عہدِ فاروقیؓ میں ہوا، پھر نہیں ہوا۔

اخلاق و عادات

پیغمبر آخرالزماں صلعم کی بعثت کا حقیقی مقصد دُنیا کو برگزیدہ اور پسندیدہ اخلاق کی تعلیم دینا تھا، صحابہ کرامؓ کو چونکہ براہِ راست اس سرچشمۂ اخلاق سے سیراب ہونے کا موقع ملا، اس لیے اس مقدس جماعت کا ہر فرد اسلامی اخلاق کا مجسم نمونہ تھا، یہی حال حضرت عمرؓ کا تھا، بلکہ بارگاہِ نبوت میں تقربِ خاص کی بنا پر آپ کو اس ضمن میں کچھ زیادہ ہی حصہ ملا تھا، یہی وجہ ہے کہ آپ کے آئینۂ اخلاق میں خلوص، انقطاع الی اللہ، لذائذِ دنیا سے اجتناب، حفظِ لسان، حق پرستی، راست گوئی، تواضع اور سادگی کا عکس سب سے نمایاں نظر آتا ہے، یہ اوصاف آپ میں ایسے راسخ تھے کہ جو شخص بھی آپ کی صحبت میں بیٹھتا وہ بھی کم و بیش متاثر ہو کر اسی رنگ میں رنگ جاتا تھا، حضرت مسور بن مخرمہؓ کا بیان ہے کہ ہم اس غرض سے حضرت عمرؓ کے ساتھ رہتے تھے کہ ان سے پرہیزگاری اور تقویٰ سیکھیں۔

خشیتِ الٰہی

تمام محاسنِ اخلاق کا سرچشمہ خوفِ خدا ہے اور یہ خوف حضرت عمرؓ کے رگ رگ میں اس قدر سمایا ہوا تھا کہ آپ مواخذہ کے خوف سے لرزہ براندام رہتے تھے، آپ فرمایا کرتے تھے کہ اگر آسمان سے ندا آئے کہ ایک آدمی کے سوا سب دنیا جنت میں داخل ہوگی، تب بھی مواخذہ کا خوف زائل نہ ہوگا کہ شاید وہ بدقسمت انسان میں ہی ہوں۔

ایک مرتبہ راہ سے تنکا اُٹھا کے فرمایا، کاش میں بھی خس و خاشاک ہوتا، کاش میں پیدا ہی نہ ہوتا، کاش میری ماں مجھے نہ جنتی۔ ایک بار آپ نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے پوچھا "کیوں ابوموسیٰ اس پر راضی ہو کر ہم لوگ اسلام ہجرت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت کے طفیل برابر برابر چھوٹ جائیں نہ عذاب ملے نہ ثواب" حضرت ابوموسیٰؓ نے کہا: "میں تو اس پر راضی نہیں ہوں، ہم لوگوں نے نیکیاں کی ہیں، اس لیے صلہ کی اُمید رکھتے ہیں۔" آپ نے فرمایا: "اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں عمرؓ کی جان ہے، میں تو صرف اُسی قدر چاہتا ہوں کہ بے مواخذہ چھوٹ جاؤں[1]۔"

---

[1] تاریخِ اسلام حصہ اوّل از شاہ معین الدین ندوی

آیاتِ قرآنی سے تاثر

حضرت عمرؓ خشوع و خضوع کے ساتھ رات رات بھر نمازیں پڑھتے، نماز میں عموماً ایسی سورتیں پڑھتے تھے، جن میں قیامت کی ہولناکی اور خدا کی عظمت و جلال کا ذکر ہوتا اور اس سے اس قدر متاثر ہوتے کہ روتے روتے ہچکی بندھ جاتی، حضرت عبداللہؓ بن شداد کا بیان ہے کہ میں باوجودیکہ پچھلی صف میں رہتا تھا۔ لیکن حضرت عمرؓ یہ آیت قَالَ اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ [1] پڑھ کر اس زور سے روتے تھے کہ میں رونے کی آواز سنتا تھا۔ حضرت امام حسنؓ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ نماز پڑھ رہے تھے کہ جب اس آیت پر پہنچے

اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ۙ مَّا لَهٗ مِنْ دَافِعٍ ۙ

تیرے رب کا عذاب یقینی ہو کر رہنے والا ہے، اس کو کوئی رفع کرنے والا نہیں۔

(سورہ الطور آیت نمبر ۷ تا ۸)

تو بہت متاثر ہوئے اور روتے روتے آنکھیں سوج گئیں۔

حُبِّ رسولؐ اور اتباعِ سُنّت

ایمان باللہ کے بعد مسلمان کا سب سے بڑا سرمایہ حُبِّ رسولؐ ہے۔ اس لیے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ تہذیبِ نفس اور اخلاقِ حمیدہ سے مزین ہونے کے لیے اپنے دل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خالص محبت اور اتباعِ سُنّت کا صحیح جذبہ پیدا کرے، جو دل اس محبت سے خالی اور جو قدم اسوۂ حسنہ کے جادۂ مستقیم سے ہٹا ہوا ہو وہ کبھی سعادتِ کونین کی نعمت سے متمتع نہیں ہو سکتا۔

حضرت عمرؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس سے جو محبت تھی، اس کو انہوں نے خود بیان فرمایا ہے، اس بنا پر وہ ہمارے استنباط سے بالاتر چیز ہے، ایک بار دیگر صحابہؓ کی موجودگی میں حضرت عمرؓ نے بارگاہِ نبوتؐ میں عرض کیا "یا رسول اللہ آپؐ مجھ کو جان کے علاوہ ہر چیز سے زیادہ محبوب ہیں۔" آنحضرت صلعم نے فرمایا "نہیں، اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے جب تک میں تم کو تمہاری جان سے بھی زیادہ محبوب نہ ہوں۔" (اس وقت تک مرتبۂ اعلیٰ حاصل نہیں ہو سکتا) حضرت عمرؓ نے عرض کیا: "خدا کی قسم اب آپؐ مجھ کو جان سے بھی زیادہ محبوب ہیں۔" آنحضرت صلعم نے فرمایا: "اے عمرؓ اب" (درجہ کمال حاصل ہو گیا۔)

اس گفتگو سے جو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوئی معیارِ محبت ظاہر ہونے کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کو حبِ رسولؐ میں کیا درجہ حاصل تھا؟ یہ وہ درجہ تھا جس کے کامل اور تام ہونے کی شہادت خود آنحضرت صلعم نے دی اور جو حضرت ابوبکر صدیقؓ کے سوا کسی صحابیؓ کو حاصل نہ ہو سکا۔ "وَكَفٰى بِذٰلِكَ فَخْرًا" [2]

آنحضرت صلعم کو جان، مال اور اولاد سے زیادہ عزیز رکھنے کا یہ اثر تھا کہ حضرت عمرؓ ہر وقت آنحضرت صلعم کی حفاظت پر کمربستہ رہتے تھے، اور اگر کوئی شخص رسول اللہ صلعم کی شان کے خلاف کوئی بات کرتا تو آپ کی تلوار نیام سے باہر نکل پڑتی تھی۔

حضرت حاطب بن ابی بلتعہؓ نے جو اصحابِ بدر میں سے تھے، ایک خاص سبب سے مشرکینِ مکہ کو آنحضرت صلعم کے بعض ارادوں

---

[1] سورۂ یوسف آیت ۸۶ میں تو اپنے غم و اندوہ کا اظہار خدا سے کرتا ہوں۔ [2] سیر الصحابہؓ جز المہاجرین۔

سے مطلع کرنے کے لیے خط لکھا۔ جب خط راستے میں پکڑا گیا، تو حضرت عمرؓ بیتاب ہو گئے اور حضور پُر نور صلعم سے کہا :
"مجھ کو اجازت دیجئے کہ اس منافق کا سر اڑا دوں" [1]

ذوالخویصرہ نے جب آنحضرت صلعم سے کہا کہ آپ عدل کریں، تو حضرت عمرؓ آپے سے باہر ہو گئے اور بارگاہِ نبوت میں عرض کی "مجھ کو اذن دیجئے کہ اس کی گردن مار دوں" [2]

حضرت عمرؓ جمالِ نبوتؐ کے سچے شیدائی تھے، آپ کا اس بارہ میں جان، مال، اولاد، عزیز و اقارب، غرض کسی قربانی سے دریغ نہ تھا۔ معرکہ بدر میں عاص بن ہشام، جو آپ کا ماموں تھا، خود آپ کے ہاتھ سے مارا گیا۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواجِ مطہراتؓ سے ناراض ہو کر چند دنوں کے لیے ان سے علیحدگی اختیار کر لی تھی، حضرت عمرؓ کا شانۂ نبوتؐ پر حاضر ہوئے۔ لیکن جب بار بار اذن طلب کرنے پر بھی باریابی کی اجازت نہ ملی تو پکار کر عرض کیا: "خدا کی قسم میں حفصہؓ [3] کی سفارش کے لیے نہیں آیا ہوں، اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حکم دیں تو اس کا سر قلم کر دوں۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت غلبۂ محبت میں آپ پر جو وارفتگی طاری ہو گئی تھی، اس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے آپ کے وصال کے بعد جب کبھی عہد مبارک یاد آجاتا، تو روتے روتے بیتاب ہو جاتے تھے۔ شام کے سفر میں جب حضرت بلالؓ نے مسجد اقصیٰ میں اذان دی تو حضرت عمرؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد تازہ ہو گئی اور اس قدر روئے کہ ہچکی بندھ گئی۔

حضرت عمرؓ ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مشربہ میں گئے، دیکھا کہ حضورؐ کھری چارپائی پر لیٹے ہوئے ہیں، سر مبارک کے نیچے چمڑہ کا تکیہ ہے، جس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی ہے، پاؤں کے پاس دباغت کا سامان رکھا ہے اور سر ہانے کچے چمڑے لٹک رہے ہیں۔ آپ نے شہنشاہ کونینؐ کے توشہ خانہ میں جب یہ سامان دیکھا اور پہلوئے مبارک میں بانوں کی بدھیاں پڑی ہوئی نظر آئیں تو آبدیدہ ہو گئے۔ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے رونے کا سبب پوچھا، عرض کی "کسریٰ و قیصر دنیا کی زینت و نعمت میں بسر کرتے ہیں اور آپؐ خدا کے رسولؐ ہیں (اور معیشت کا یہ سامان ہے)" حضورؐ نے فرمایا: "کیا تم کو یہ پسند نہیں کہ ان کے لیے دنیا ہو اور ہمارے لیے آخرت" [4]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس سے اس تعلق کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ آپ کسی کام میں سنتِ نبویؐ سے تجاوز نہ کرتے تھے، آپ خور و نوش، لباس و وضع، نشست و برخاست غرض ہر چیز میں اسوۂ حسنہ کو پیش نظر رکھتے اور اپنے عمال کو بھی پابندیٔ سنت کے تاکیدی احکام بھیجتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت یزیدؓ بن ابی سفیان کے ساتھ کھانا کھایا۔ معمولی کھانوں کے بعد جب عمدہ قسم کے کھانے دستر خوان پر لائے گئے تو آپ نے ہاتھ کھینچ لیا اور فرمایا: "قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں عمرؓ کی جان ہے کہ اگر تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روش سے ہٹ جاؤ گے تو خدا تم کو جادۂ مستقیم سے ہٹا دے گا" [5]

---

[1] سیر الصحابہؓ جزء المہاجرین [2] ایضاً [3] ام المومنین حضرت حفصہؓ حضرت عمرؓ کی صاحبزادی تھیں۔ [4] سیر الصحابہؓ جزء المہاجرین
[5] سیر الصحابہؓ خلفائے راشدین۔

اسلام میں شعائر اللہ کی تعظیم کا حکم ہے۔ اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجرِ اسود کو بوسہ دیا ہے حضرت عمرؓ کو اپنے زمانۂ خلافت میں جب اس کا موقع پیش آیا، تو اس خیال سے کہ پتھر کو بوسہ دینے سے مسلمانوں کو کبھی یہ دھوکا نہ ہو کہ اس میں بھی الٰہی شان ہے اتباعِ سنت میں بوسہ تو دیا، لیکن اس کے سامنے کھڑے ہو کر فرمایا: "میں جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہے، نہ نقصان پہنچا سکتا ہے نہ نفع، اگر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بوسہ دیتے نہ دیکھتا تو ہرگز بوسہ نہ دیتا"۔

اسی طرح طواف میں رمل کا حکم مشرکینِ عرب کے دلوں میں رعب ڈالنے کی مصلحت پر مبنی تھا، اس لیے جب مشرکین ہلاک ہو گئے تو حضرت عمرؓ کو خیال ہوا کہ اب رمل سے کیا فائدہ ہے۔ مگر پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یادگار کو ترک کرنے کی جرأت نہ ہوئی[1]۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چونکہ زندگی ہمیشہ فقر و فاقہ سے بسر کی تھی۔ اس لیے حضرت عمرؓ نے روم و ایران کی شہنشاہی حاصل ہونے کے بعد بھی فقر و فاقہ کی زندگی کو نہ چھوڑا۔ ایک مرتبہ حضرت حفصہؓ نے عرض کیا کہ اب خدا نے مرفہ الحالی عطا فرمائی ہے، اس لیے اب آپ کو نرم کپڑا اور اچھی غذا سے پرہیز نہ کرنا چاہیے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا، "جانِ پدر، تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عسرت کی زندگی بھول گئیں، خدا کی قسم میں اپنے آقا کے نقشِ قدم پر چلوں گا کہ آخر کی فراغت اور خوشحالی نصیب ہو"۔

حُبِ اہلِ بیت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے حضرت عمرؓ اہلِ بیت سے محبت کرتے اور ان کو علانیہ عظمت دیتے تھے۔ حضرت عباسؓ، آنحضرت صلعم کے عمِ محترم تھے۔ حضرت عمرؓ اپنے دورِ خلافت میں جب نمازِ استسقا پڑھاتے تو ان کے وسیلہ سے دعا مانگتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ پہلے ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وسیلہ بناتے تھے، اب ان کے چچا کو وسیلہ بناتے ہیں۔ حضرت عباسؓ کے صاحبزادے حضرت عبداللہؓ اپنے متعلق بیان کرتے ہیں:۔

"عمرؓ بن خطاب ابنِ عباسؓ کو تقرب کا درجہ عطا فرماتے تھے"۔

صدقاتِ نبویؐ میں سے نخلستانِ بنو نضیر کا انتظام حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ کے سپرد کیا۔ حضرت عمرؓ کے بعد اس پر حضرت علیؓ غالب آ گئے۔ ان کے بعد حضرت حسنؓ پھر حضرت حسینؓ پھر حضرت علی بن حسینؓ اور ان کے بعد حضرت زید بن حسن انتظام کرتے رہے۔

حُبِ متعلقینِ رسالت

حضرت عمرؓ جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام متعلقین کا پاس و لحاظ اپنی اولاد سے زیادہ کرتے تھے۔ جب آپ نے صحابہؓ کے وظائف مقرر کرنے چاہے تو حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف وغیرہ کی رائے تھی کہ حضرت عمرؓ بحیثیت امیر المومنین کے سب پر مقدم رکھے جائیں۔ لیکن حضرت عمرؓ نے انکار کیا اور آنحضرت صلعم کے قرب و بعد کے لحاظ سے وظائف مقرر کیے، چنانچہ سب سے پہلے بنو ہاشم کو رکھا اور پھر ان میں بھی حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ کو مقدم رکھا۔ اس کے بعد بنی امیہ، بنی عبد شمس، بنی نوفل، بنی عبد العزیٰ یہاں تک کہ اپنے قبیلہ بنی عدی کو پانچویں نمبر پر رکھا۔ تنخواہوں کی تعداد میں بھی یہی ترتیب ملحوظ رکھی، سب سے زیادہ تنخواہیں بدری صحابہؓ کی تھیں، اگرچہ حضرت امام حسنؓ و حسینؓ ان میں سے نہ تھے، تاہم آنحضرت صلعم کی ذریت کے تعلق سے ان کی تنخواہیں بدری صحابہؓ کے برابر مقرر کیں، آنحضرت صلعم کی ازواجِ مطہرات کے مرتبہ، ان کے

---

[1] سیر الصحابہ، خلفائے راشدین۔

احترام اور آرام و آسائش کا خاص لحاظ رکھتے تھے۔ چنانچہ ان کی تنخواہیں سب سے زیادہ بارہ بارہ ہزار مقرر کیں، ۲۳ھ میں جب امیر الحاج بن کر گئے تو ازواج مطہرات کو نہایت ادب و احترام کے ساتھ ہمراہ لے گئے، حضرت عثمانؓ اور حضرت عبدالرحمن بن عوف کو سواریوں کے ساتھ کر دیا تھا، یہ لوگ آگے پیچھے چلتے اور کسی کو سواریوں کے قریب نہیں آنے دیتے تھے۔

آنحضرت صلعم کے خادم حضرت زیدؓ بن حارثہ کے صاحبزادے حضرت اسامہؓ کی تنخواہ اپنے صاحبزادے حضرت عبداللہؓ سے جو بدری تھے، زیادہ مقرر کی۔ حضرت عبداللہؓ نے عذر کیا تو فرمایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسامہؓ کو تجھ سے اور اسامہؓ کے باپ کو تیرے باپ سے زیادہ محبوب رکھتے تھے۔ [1]

حبِ مدینہ حضرت عمرؓ کو مدینہ سے بے انتہا محبت تھی، اس محبت کی بنیادوں میں بھی وہی حبِ رسولؐ کام کر رہی تھی جس کا ذکر گذشتہ سطور میں کیا جا چکا ہے، مدینہ کو چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دارالہجرۃ ہونے کا شرف حاصل تھا، اس لیے حضرت عمرؓ اکثر یہ دعا فرمایا کرتے:

"خداوندا! مجھ کو اپنی راہ پر شہید کر اور مجھے اپنے رسولؐ کے شہر میں موت دے۔"

مدینہ میں مزار نبویؐ سب سے متبرک مقام ہے اور صحیح حدیث کی رو سے تختۂ جنت ہے۔ حضرت عمرؓ کو اس خوابگاہ میں آرام فرمانے کی سب سے بڑی آرزو تھی، چنانچہ جب وفات کے وقت حضرت عائشہؓ کے پاس پیغام کہلوایا اور انہوں نے اُن کی درخواست منظور کی تو مقدس خلیفہ کی زبان پر یہ الفاظ جاری ہوئے۔

خدا کا شکر ہے، اس خوابگاہ سے زیادہ کوئی چیز میرے نزدیک اہم نہ تھی۔ [2]

زہد و قناعت حضرت عمرؓ کے فضائل اخلاق میں یہ عنوان سب سے زیادہ جلی اور واضح نظر آتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ دُنیاوی حیثیت سے اللہ تعالیٰ نے ان کو جو اعزاز عطا کیا تھا، اس کے ساتھ اُنہوں نے جو زہد و قناعت کی زندگی اختیار فرمائی، اس کی نظیر انبیاء علیہم السلام کے علاوہ کسی عظیم الشان خلیفہ یا بادشاہ کی زندگی میں نہیں مل سکتی۔ حضرت طلحہؓ کا بیان ہے کہ قدامتِ اسلام اور ہجرت کے لحاظ سے بہت سے لوگوں کو حضرت عمرؓ بن الخطاب پر فوقیت حاصل ہے، لیکن زہد و قناعت میں وہ سب سے بڑھے ہوئے ہیں۔ صحیح مسلم میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب عمرؓ کو کچھ دینا چاہتے تو وہ عرض کرتے کہ مجھ سے زیادہ حاجتمند لوگ موجود ہیں جو اس عطیہ کے زیادہ مستحق ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے کہ اس کو لے لو پھر تمہیں اختیار ہے اپنے پاس رکھو یا صدقہ کر دو، انسان کو اگر بے طلب مل جائے تو لے لینا چاہیے۔

آپ کی زندگی کا ایک رُخ یہ ہے کہ ایران پر فوجیں بھیج رہے ہیں، قیصر و کسریٰ کے سفیروں سے معاملہ درپیش ہے، حضرت خالدؓ اور حضرت امیر معاویہؓ سے باز پرس ہو رہی ہے، فاتح مصر و ایران کے نام فرامین جاری ہو رہے ہیں اور دوسرا رُخ یہ ہے کہ بدن پر پیوند لگا ہوا کرتہ ہے، سر پر پھٹا ہوا عمامہ، پاؤں میں بوسیدہ جوتیاں اور اسی حالت میں بیوہ عورتوں کے گھروں میں پانی بھرنے کے لیے کاندھے پر مشک

---

[1] الفاروق حصہ دوم [2] سیر الصحابہؓ جزء المہاجرین

ہے یا کسی وقت مسجد کے گوشہ میں کام سے تھک کر فرش خاک پر نیند آگئی ہے۔

سادگی سفر میں خیمہ و خرگاہ کا کوئی اہتمام نہ ہوتا تھا، جہاں منزل ہوتی کسی درخت کے سایہ میں پڑ رہتے آپ کی سادگی کی وجہ سے ان لوگوں کو جن کی نگاہیں شان و شوکت ڈھونڈھتی تھیں آپ کو پہچاننے میں دقت ہوتی تھی۔

شام کے سفر میں جب بیت المقدس کے قریب پہنچے تو مسلمانوں نے اس خیال سے کہ عیسائی امیرالمومنین رضؓ کو دیکھ کر اپنے دل میں کیا خیال کریں گے۔ ترکی گھوڑا اور قیمتی لباس پیش کیا، لیکن آپ نے فرمایا خدا نے ہم کو جو عزت دی ہے، وہ اسلام کی عزت ہے اور ہمارے لیے کافی ہے۔

مزاج کی شدت مزاج فطرتاً تند و تیز واقع ہوا تھا۔ اسلام سے پہلے تو قہر مجسم تھے، اسلام کے بعد بھی سختی قائم رہی اور بات بات پر تلوار نیام سے باہر ہوجاتی تھی، لیکن خلافت کا بار اٹھانے کے بعد بہت نرم ہوگئے تھے پھر بھی کچھ کچھ اثر باقی تھا۔ اہل سیر کے مطابق یہ شدت حق و باطل کے درمیان ایک حدِ فاصل تھی، وہ مظلوم کے لیے نرم اور ظالم کے حق میں سخت ہوتے تھے، ان کی نرمی میں ضعف اور سختی میں جبر نہیں ہوتا تھا، حضرت عمر رضؓ کی تند مزاجی کے جتنے واقعات ہیں، وہ سب حق کی حمایت کے ہیں، ورنہ اپنی ذات کے لیے وہ نہایت بردبار اور متحمل تھے۔ جب معاملات ملکی میں لوگ آپ سے اختلاف کرتے اور معمولی معمولی بات پر ٹوکتے تو آپ اُسے بڑے تحمل سے برداشت کرتے اور ابرو پر شکن نہ پڑنے دیتے تھے، آپ خود فرمایا کرتے تھے: "واللہ میرا دل خدا کے بارہ میں نرم ہوتا ہے، تو جھاگ سے بھی زیادہ نرم ہوجاتا ہے اور سخت ہوتا ہے تو پتھر سے بھی زیادہ سخت ہوجاتا ہے۔" آپ کے اس بیان سے ظاہر ہے کہ آپ کا غصہ اور لطف و رحم محض خدا کے لیے تھا، ذاتیات کو مطلقاً دخل نہ تھا۔

شفقت اگرچہ شفقت اور شدت دو متضاد اوصاف ہیں لیکن حضرت عمر رضؓ میں شدت کے ساتھ شفقت بھی درجۂ کمال تک موجود تھی، آپ رعایا پر شفقت کرتے تھے۔ ذمیوں پر شفقت کرتے تھے اور غلاموں پر شفقت کرتے تھے۔

چراگاہ میں حضرت عثمان رضؓ اور حضرت عبدالرحمٰن رضؓ بن عوف کے مویشیوں کو چرنے کی ممانعت تھی لیکن غربا اس سے مستثنیٰ تھے۔ آپ نے چراگاہ کے مہتمم ہنی کو عام حکم دے رکھا تھا، اونٹوں اور بکریوں کے چھوٹے چھوٹے گلے جو لوگوں کے پاس ہیں، اُن کو چراگاہ میں آنے دو۔ عراق کی بیوہ عورتوں کی حالت کا یہاں تک خیال تھا کہ شہادت سے چار روز قبل فرماتے تھے۔

"اگر خدا نے مجھ کو زندہ رکھا تو اہلِ عراق کی بیوہ عورتوں کو اس (مالی) حالت میں چھوڑ جاؤں گا کہ میرے بعد ان کو کسی شخص کی احتیاج باقی نہ رہے گی۔"

ذمیوں پر یہ شفقت تھی کہ جب یہود خیبر کو جلاوطن کیا، تو صحیح روایات کے مطابق اُن کو جائیداد، اونٹ، دیگر گھریلو اثاثہ، یہاں تک کہ چھوٹے چھوٹے کجاووں اور رسیوں تک کی قیمت ادا فرمائی، حالانکہ یہ لوگ اسلام کے سخت دشمن تھے۔

غلاموں کے حال پر یہ عنایت تھی کہ غلامی کو آقائی کا ہم مرتبہ کر دیا تھا۔ غلاموں کی آزادی کے وسائل نکالتے تھے۔ ان کی تعلیم کا بندوبست کرتے تھے اور ان کو بڑے بڑے ملکی عہدے دیتے تھے۔

ذریعۂ معاش: دیگر معززین قریش کی طرح حضرت عمر رضؓ کا ذریعۂ معاش بھی اسلام سے قبل اور بعد تجارت تھا۔ جب آپ خلیفہ

بنے تو بیت المال سے وظیفہ مقرر ہونے تک یہی مشغلہ جاری رہا۔ مگر جب بقدر کفالت وظیفہ مقرر ہوا اور پھر کبار صحابہؓ کے وظائف کے ساتھ آپ کو بھی پانچہزار کی رقم ملنے لگی، تو آپ نے تجارت کا پیشہ ترک کر دیا اور اسی آمدنی پر گزر اوقات کرنے لگے۔

غذا و لباس آپ کی غذا نہایت سادہ ہوتی تھی، معمولاً روٹی اور روغن زیتون دستر خوان پر ہوتا تھا، روٹی اکثر گیہوں کی ہوتی مگر آٹا چھانا نہیں جاتا تھا، مہمان یا سفراء آتے تو اُن کو کھانے کی تکلیف ہوتی تھی کیونکہ وہ اس معمولی اور سادہ غذا کے عادی نہیں ہوتے تھے، حضرت حفص بن ابی العاص اکثر کھانے کے وقت موجود ہوتے مگر شریک نہیں ہوتے تھے، حضرت عمرؓ نے اس کی وجہ پوچھی تو انہوں نے عرض کیا کہ آپ کے دستر خوان پر ایسی سادہ اور معمولی غذا ہوتی ہے کہ ہم لوگ اپنے لذیذ اور نفیس کھانوں پر اسے ترجیح نہیں دے سکتے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا:

"کیا تم سمجھتے ہو کہ میں قیمتی اور لذیذ کھانا کھانے کی مقدرت نہیں رکھتا؟ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ اگر قیامت کا خوف نہ ہوتا، تو میں بھی تم لوگوں کی طرح عیش و عشرت کا دلدادہ ہوتا۔"

ایک دفعہ حضرت عتبہؓ بن فرقد شریک طعام تھے اور اُبلا ہوا گوشت اور سوکھی روٹی کے ٹکڑے زبردستی حلق سے فرو کر رہے تھے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: "اگر تم سے نہیں کھایا جاتا تو نہ کھاؤ۔" عتبہؓ سے نہ رہا گیا، کہنے لگے "امیرالمومنینؓ اگر آپ اپنے کھانے پہننے میں کچھ زیادہ صرف کریں گے، تو اس سے مسلمانوں کا مال کم نہ ہو جائے گا۔" حضرت عمرؓ نے فرمایا: افسوس تم مجھے دنیاوی عیش و تنعم کی ترغیب دیتے ہو۔[1]

غذا کی طرح لباس کا بھی یہی حال تھا، آپ کا جسم کبھی نرم اور ملائم کپڑے سے مس نہیں ہوا۔ بدن پر بارہ بارہ پیوند کا کرتہ، سر پر پھٹا ہوا عمامہ اور پاؤں میں پھٹی ہوئی جوتیاں ہوتی تھیں، آپ انہی کپڑوں میں قیصر و کسریٰ کے سفیروں سے ملتے، وفود کو باریاب کرتے اور برسرِ عام نکلتے تھے، حضرت امام حسنؓ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ جمعہ کے روز خطبہ دے رہے تھے، میں نے شمار کیا تو اُن کے تہبند میں بارہ پیوند لگے ہوئے تھے۔[2]

ایک دفعہ گرمی کا کُرتہ ایک شخص کو دھونے اور پیوند لگانے کے لیے دیا، اس نے اُس کے ساتھ ایک نرم کپڑے کا کُرتہ پیش کیا، حضرت عمرؓ نے اس کو واپس کر دیا اور اپنا کرتہ لے کر فرمایا، اس میں پسینہ خوب جذب ہوتا ہے، کپڑا عموماً گرمی میں نہلاتے تھے، جب پھٹ جاتا تو پیوند پر پیوند لگاتے چلے جاتے تھے۔ حضرت حفصہؓ نے اس کے متعلق گفتگو کی تو فرمایا: مسلمانوں کے مال میں اس سے زیادہ تصرف نہیں کر سکتا۔

ایک دفعہ دیر تک گھر میں رہے، باہر آئے تو لوگ انتظار کر رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ پہننے کو کپڑے نہ تھے، اس لیے انہی کپڑوں کو دھو کر سوکھنے کو ڈال دیا تھا، خشک ہو گئے تو وہی پہن کر باہر نکلے۔

جُود و سخا: حضرت عمرؓ اللہ تعالیٰ سے اکثر یہ دعا کرتے تھے:

---

[1] سیر الصحابہؓ خلفائے راشدین، [2] ایضاً

"خدا و ندا! میں تجھ سے درخواست کرتا ہوں کہ مال کو اس کے حق میں صرف کروں"

اور اسی کے مطابق وہ خرچ کرتے تھے۔ آپ کی سب سے زیادہ زرخیز جائیداد خیبر میں تھی جسے آپ نے راہِ خدا میں وقف کر دیا تھا۔

ایک بار ایک گھوڑا راہِ خدا میں نذر کیا، لیکن جس شخص کو دیا اس نے قدر نہ کی اور کم قیمت پر فروخت کرنا چاہا، چونکہ ارزاں فروخت ہو رہا تھا، اس لیے حضرت عمرؓ کو خیال ہوا کہ خود خرید لیں گے، آنحضرت صلعم کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہو کر اپنے ارادہ کا ذکر کیا، حضورؐ نے فرمایا: تم نہ خریدنا، نہ اپنا صدقہ واپس لینا، گو ایک درہم کو بھی ملتا ہو۔[1]

کوئی مستحق اگر حضرت عمرؓ کے مال سے محروم ہوتا، تو آپ افسوس کرتے تھے، ایک دفعہ حضرت ابو ہریرہؓ سے ملاقات ہوئی، وہ بھوک سے بیتاب تھے، انہوں نے حضرت عمرؓ سے قرآن حکیم کی ایک آیت پوچھی۔ حضرت عمرؓ اس حسنِ طلب پر غور نہ فرما سکے اور آیت بتلا کر مکان کے اندر چلے گئے، حضرت ابو ہریرہؓ کچھ دور چل کر گر پڑے۔ اتنے میں آنحضرت صلعم تشریف لائے، حضرت ابو ہریرہؓ کو اس حالت میں پڑا دیکھ کر آواز دی، وہ بولے، حاضر ہوں، آنحضرت صلعم نے ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور دولت خانہ پر لے گئے۔ ایک بڑے پیالہ میں دودھ منگوا کر حضرت ابو ہریرہؓ کو دیا، انہوں نے یہاں تک پیا کہ شکم اونچا ہو کر تن گیا، بعد میں حضرت عمرؓ سے ملاقات ہوئی، تو حضرت ابو ہریرہ رضؓ نے واقعہ بیان کیا اور کہا وہ آیت مجھے آپ سے زیادہ یاد تھی، لیکن جو زیادہ مستحق تھا (یعنی آنحضرت صلعم) اس نے میری ضرورت پوری کی۔" حضرت عمرؓ نے جواب دیا:۔

"خدا کی قسم اگر میں تم کو گھر لے جاتا، تو یہ مجھ کو سرخ اونٹوں سے زیادہ محبوب ہوتا۔"

بخل سے اجتناب

حضرت عمرؓ اگرچہ خود نہایت زاہدانہ اور زخارفِ دنیوی سے بیگانہ زندگی بسر کرتے تھے، تاہم دوسروں کو توسیع کی اجازت تھی، ایک بار کسی نے پوچھا کہ ایک کپڑا پہن کر نماز پڑھنا کیسا ہے، فرمایا:

"جب خدا وسعت دے تو تم کو بھی وسعت اختیار کرنا چاہیے۔"

نظافت

حضرت عمرؓ بالطبع نظافت پسند تھے، ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے استفتا کیا کہ:۔

"رات کو مجھے غسل کی ضرورت ہو جاتی ہے اس وقت کیا کروں؟ ارشاد ہوا وضو کر کے سو رہا کرو۔"

ایک دفعہ جمعہ کا خطبہ دے رہے تھے کہ مہاجرینِ اولین میں سے ایک بزرگ مسجد میں آئے، حضرت عمرؓ نے پکار کر فرمایا، "یہ کونسا وقت ہے؟" انہوں نے اپنی مصروفیات بیان کیں اور کہا کہ اذان سن کر وضو کیا اور سیدھا چلا آیا، آپ نے فرمایا: صرف وضو! حالانکہ آنحضرت صلعم غسل کا حکم دیتے تھے۔[2]

صلہ رحمی

صلہ رحم انسان کی ایک مخصوص فضیلت ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بڑی تاکید فرمائی ہے، حضرت عمرؓ میں یہ فضیلت اس درجہ تک موجود تھی کہ مسلمان تو مسلمان آپ کافر اعزہ کے ساتھ بھی سلوک کرتے تھے، آنحضرت

---

[1] سیر الصحابہؓ جزء المہاجرین [2] سیر الصحابہؓ جزء المہاجرین۔

صلعم نے ایک بار حضرت عمرؓ کو ایک حلّہ عنایت فرمایا جس میں ریشم ملا ہوا تھا، چونکہ اس کے پہننے کی ممانعت تھی، اس لیے حضرت عمرؓ نے اپنے ایک مشرک بھائی کے پاس مکہ بھجوا دیا۔

محارم سے اجتناب

حضرت عمرؓ نے محارم الٰہی سے اجتناب کا ایک اصول بیان کیا ہے، جس سے اُن کی زندگی پر روشنی پڑتی ہے، فرماتے ہیں:-

"ہم نے اپنی بہترین زندگی صبر میں پائی ہے"

یعنی محارم سے نفس کو روکنا بہترین زندگی ہے۔

جاہلیت میں لوگ اکثر باپ کی قسم کھایا کرتے تھے۔ جس سے حضرت عمرؓ بھی مستثنیٰ نہ تھے۔ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ کسی جماعت کے ساتھ جا رہے تھے کہ باپ کی قسم کھائی۔ آنحضرت صلعم نے سُنا تو فرمایا: "خدا تم لوگوں کو باپ کی قسم کھانے سے منع کرتا ہے۔ جو شخص قسم کھانا چاہتا ہو وہ خدا کی قسم کھائے یا خاموش رہے۔" اس تعلیم کا جو اثر حضرت عمرؓ پر ہوا، اس کے متعلق خود انہی کی زبان سے سُنیے، فرماتے ہیں:

"خدا کی قسم مَیں نے جب سے آنحضرت صلعم سے سُنا پھر وہ قسم نہیں کھائی نہ خود نہ دوسروں کی نقل کر کے"

عصمت

حضرت عمرؓ کو اس جامعیت کے ساتھ ساتھ عصمت کا درجہ حاصل تھا جو خدا کے نبیوں اور فرشتوں کو حاصل ہوتا ہے حضرت عمرؓ کی عصمت کو آنحضرت صلعم نے خود بیان فرمایا ہے۔

"اے ابن خطاب اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے

تم کو جب شیطان کسی راستہ میں چلتا ہوا ملتا ہے تو تمہارا راستہ چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کرتا ہے"

ظاہر ہے کہ جس شخص سے شیطان اس قدر دُور رہتا ہو اس کی عصمت کے متعلق اور کیا دلیل چاہیے؟

شہادت

یہ فطرتِ انبیاء کے قریب ہونے کا اثر تھا کہ حضرت عمرؓ کو شہادت کا درجہ حاصل ہُوا۔ عالمِ فانی میں جن لوگوں پر خدا نے اپنا انعام کیا ہے۔ قرآن حکیم نے اُن کے چار درجے بیان فرمائے ہیں یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین
حضرت عمرؓ کو ان میں تیسرا درجہ حاصل تھا یعنی آپ شہید تھے، اور یہ فضیلت خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہے۔ حضورؐ ایک بار کوہ اُحد پر چڑھے تو حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ بھی ہمرکاب تھے، جب اُحد پر لرزہ طاری ہُوا، تو فرمایا:-

"اے اُحد قائم رہ، تجھ پر ایک پیغمبرؐ ایک صدیقؓ اور دو شہید ہیں" یہ دو شہید حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ تھے۔

حضرت عمرؓ کی جامعیت

تاریخِ عالم کے اوراق اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ دنیا میں جن عظیم الشان ہستیوں نے راہ سعادت کو واضح کیا، ان میں مُصلحین عظام تھے، جنہوں نے مطلعِ اخلاق سے فسق و فجور کی سیاہی دُور کی۔ متقنین کرام تھے، جن کی دماغ سوزیوں نے قیام امن میں حصہ لیا، شاہان گردن فراز تھے جن کے آستانۂ اقبال پر جاہ و عظمت نے ناصیہ سائی کی۔ غازیانِ لشکر شکن تھے، جن کی شمشیر خارا شگاف نے میدان جنگ میں خون کے بادل برسائے، زاہدانِ شب زندہ دار تھے، جن کے نالہائے نیم شبی اور دُعاہائے سحری نے کنگرۂ افلاک میں تزلزل برپا کیا لیکن حضرت عمرؓ کا وجودِ قدسی ان تمام خصوصیات کا جامع تھا آپ

حسنات کے بیت المعمور، کرامات کے سدرۃ المنتہیٰ، فضائل کے مرکز، مکارم کے مدار، جلالت کے واسطۃ العقد، ایمان کے حصن حصین، خلافت کے حصار متین، زمین کی برکت، زمانہ کی نیک بختی، مُہرِ ہدایت، ماہِ سیاست، بحرِ عبادت، جسمِ ارشاد، روانِ یقین، شعشعۂ انوار در سایہ گرد گار تھے آپ میں وراثتِ نبوی، حکمتِ محمدیؐ، نظرِ قدسی اور تائیدِ ربانی کا جلوہ نظر آتا ہے۔ آپ کی یہی وہ جامعیت کبریٰ ہے جو آپ کو تمام صحابہؓ بلکہ باستثناء حضور سرورِ کائنات صلعم، تمام عالم سے ممتاز کرتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تو حضرت عمرؓ کی جامعیت کو بیان فرمایا ہے:۔

سب سے پہلے مذہبی حیثیت کو دیکھیے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔

"میں سو رہا تھا، میں نے دیکھا کہ لوگ میرے سامنے پیش کیے جا رہے ہیں، قمیصیں پہنے ہوئے ہیں، بعض کے قمیص سینہ تک ہیں بعض کے ان سے بھی کم، اور میرے سامنے عمرؓ بن الخطاب لائے گئے۔ وہ اس قدر دراز قمیص پہنے ہوئے تھے جس کے دامن زمین تک لٹک رہے تھے۔ صحابہؓ نے پوچھا" یا رسولؐ اللہ اس کی کیا تاویل ہے؟ فرمایا دین۔

اب علمی حیثیت کو سامنے لائیے۔ آنحضرت صلعم فرماتے ہیں:۔

"میں سو رہا تھا، ایک دودھ کا پیالہ مجھ کو دیا گیا، میں نے پیا، یہاں تک کہ سیرابی ناخنوں تک نکل آئی، پھر میں نے اپنا بچا ہوا عمرؓ بن خطاب کو دیا، صحابہؓ نے عرض کیا، یا رسولؐ اللہ اس کی کیا تاویل ہے؟ ارشاد ہوا علم"

اس کے بعد سیاسی حیثیت پر غور فرمائیے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنا رؤیا یوں بیان فرماتے ہیں:

"میں ایک کنوئیں پر پانی بھر رہا تھا کہ ابوبکرؓ و عمرؓ آئے، ابوبکرؓ نے ڈول ڈالا اور ایک یا دو ڈول کھینچے، اُن کے کھینچنے میں ضعف تھا۔ خدا ان کی مغفرت کرے۔ پھر اس کو ابن الخطاب نے ابوبکرؓ کے ہاتھ سے لے لیا اور وہ اُن کے ہاتھ میں ایک بڑا چرسہ بن گیا، تو میں نے کسی قومی سردار کو ان کی طرح کام کرتے نہیں دیکھا، یہاں تک کہ تمام لوگ سیراب ہو گئے۔

محیطِ وحیٔ الہام نے ان تینوں حیثیتوں میں حضرت عمرؓ کے مذہبی، علمی اور سیاسی کمالات کی طرف اشارہ فرمایا ہے اور ان کو تمام صحابہؓ پر علی الاطلاق فضیلت دی ہے۔

حضرت عمرؓ کی اوّلیات

مورخین کے مطابق حضرت عمرؓ نے جو نئی باتیں ایجاد کیں، ان کی مختصر فہرست یہ ہے:۔

(۱) بیت المال قائم کیا (۲) عدالتیں قائم کیں اور قاضی مقرر کیے (۳) تاریخ اور سنہ قائم کیا جو آج تک جاری ہے (۴) امیر المومنین کا لقب اختیار کیا (۵) فوجی دفتر ترتیب دیا (۶) والنٹیروں کی تنخواہیں مقرر کیں (۷) دفتر مال قائم کیا (۸) پیمائش کا طریقہ جاری کیا (۹) مردم شماری کرائی (۱۰) نہریں کھدوائیں (۱۱) شہر آباد کرائے (۱۲) ممالکِ محروسہ کو صوبوں پر منقسم کیا (۱۳) جیل خانہ قائم کیا (۱۴) درّہ کا استعمال کیا (۱۵) راتوں کو گشت کر کے رعایا کا حال دریافت کرنے کا طریقہ نکالا (۱۶) پولیس کا محکمہ قائم کیا۔ (۱۷) فوجی چھاؤنیاں قائم کیں (۱۸) پرچہ نویس مقرر کیے (۱۹) مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ تک آرام کے لیے چوکیاں اور سرائیں بنوائیں (۲۰) حضرت ابوبکرؓ سے باصرار قرآن حکیم کی تدوین کرائی (۲۱) قیاس کا اصول قائم کیا (۲۲) نماز تراویح جماعت سے قائم کی (۲۳) تین طلاقوں کو جو ایک ساتھ دی جائیں طلاق بائن قرار دیا (۲۴) شراب کی حد کے لیے اسی کوڑے مقرر کیے (۲۵) تجارت کے گھوڑوں پر زکوٰۃ مقرر کی (۲۶) وقف کا طریقہ ایجاد کیا (۲۷) مساجد میں روشنی کا انتظام کیا (۲۸) اماموں اور موذنوں کی تنخواہیں مقرر کیں (۲۹) مساجد میں وعظ کا طریقہ جاری

کیا (۳۰) نمازِ جنازہ میں چار تکبیروں پر اجماع کرایا (۳۱) قاعدہ مقرر کیا کہ اہلِ عرب غلام نہیں بنائے جا سکتے۔
(۳۲) مفلوک الحال عیسائیوں اور یہودیوں کے لیے روزینے مقرر کیے۔
(۳۳) راہ پڑے ہوئے بچوں کی پرورش اور پرداخت کے لیے روزینے مقرر کیے۔
(۳۴) مکاتب قائم کیے۔
(۳۵) گھوڑوں کی نسل میں اصیل اور مجنس کی تمیز قائم کی جو عرب میں نہ تھی۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ

راجہ محمد شریف

نام و نسب

آپ کا نام عمرو اور کنیت ابوعبداللہ اور ابومحمد تھی۔ والد کا نام عاص اور والدہ کا نام نابغہ تھا، جدی سلسلۂ نسب یہ ہے۔ حضرت عمرو بن العاص بن وائل بن ہاشم (یا ہشام) بن سعید بن سہم بن عمرو بن ہصیص بن کعب بن لوی بن غالب قرشی سہمی۔

ننھیالی نسب یہ ہے، نابغہ (سلمیٰ)، بنت حرملہ بن حارث بن کلثوم بن جوشن بن عمرو بن عبداللہ، یہ قحطانی قبیلہ قضاعہ کی شاخ بنو عذرہ سے تعلق رکھتی تھی۔ ایک بار ڈاکوؤں نے قبیلہ پر حملہ کیا اور اسے قیدی بنا کر سوقِ عکاظ میں فاکہ بن مغیرہ کے ہاتھ بیچ ڈالا، فاکہ سے عبداللہ بن جدعان نے خرید لیا اور عاص بن وائل کو ہدیتہً دے دیا۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا خاندان بنو سہم زمانۂ جاہلیت سے معزز چلا آتا تھا۔ قریش کے سیاسی نظام میں فیصلِ مقدمات کا عہدہ اسی خاندان میں تھا۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے والد عاص کو زمانۂ جاہلیت میں بڑی عزت و شہرت حاصل تھی، اسی وجہ سے مؤرخین نے اسے قریش کے حکام میں شمار کیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عاص کی زندگی میں نبوت کا دعویٰ کیا، لیکن نہ صرف یہ کہ عاص آپ پر ایمان نہ لایا بلکہ آپ کے راستے میں سنگِ گراں بن کر حائل ہو گیا اور آخری لمحۂ حیات تک حضور سرورِ دو عالم صلعم کو اپنی اسلام دشمنی اور زبان درازیوں سے بے حد تکلیف پہنچاتا رہا۔

قبل از اسلام

حضرت عمرو رضی اللہ عنہ بن العاص نے بھی جب تک اسلام قبول نہ کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت اور ایذا رسانی میں اپنے باپ کے صحیح جانشین ثابت ہوئے اور اسلام کے خلاف ہر سازش میں دیگر عمائد قریش کی طرح ہمیشہ پیش پیش رہے، چنانچہ مسلمانوں کا پہلا قافلہ جب ہجرت کر کے حبشہ گیا تو قریش کا جو وفد ان لوگوں کو حبشہ سے نکلوانے کے لیے نجاشی کے پاس گیا تھا، اس کے سرگرم رکن حضرت عمرو رضی اللہ عنہ بن العاص ہی تھے، آپ نے حبش پہنچ کر درباریوں سے ملاقات کی، تحائف وغیرہ دے کر انہیں ہموار کیا، سب سے یہی کہا کہ ہمارے ہاں کے چند لوگ اپنا آبائی مذہب چھوڑ کر یہاں آ گئے ہیں، انہوں نے مسیحیت اور یہودیت بھی قبول نہیں کی، لہٰذا انہیں ملک سے نکال دینے پر زور دینا چاہیے۔ پھر آپ نے دربار میں پہنچ کر شاہ حبش کی خدمت میں ہدایا پیش کر کے اسی انداز میں گفتگو کی۔ درباریوں اور پادریوں نے بھی حسبِ قرارداد آپ کے مطالبے کی تائید کی۔ لیکن ان ساری کوششوں کے باوجود شاہ حبش نے مسلمانوں کے اخراج کا مطالبہ تسلیم نہ کیا اور آپ کی تمام مساعی ناکام رہیں[1]

اس کے بعد خندق کا معرکہ پیش آیا جس میں سارا عرب مسلمانوں کے خلاف اُمڈ آیا تھا، اس موقعہ پر بھی حضرت عمرو رضی اللہ عنہ بن العاص قریش

---

[1] رسولِ رحمت مرتبہ غلام رسول مہر سے ماخوذ

کی فوج میں شامل تھے اور مسلمانوں کی بیخ کنی میں پورا زور صرف کر رہے تھے۔

اسلام کی طرف میلان

حضرت عمروؓ بن العاص اگرچہ اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے سخت ترین دشمن تھے تاہم غزوۂ خندق کے بعد اسلام سے متأثر ہونے لگے، وہ اکثر دنیا اس کے انجام اور اسلام کی تعلیمات پر غور کیا کرتے تھے۔ ان کا اپنا بیان ہے کہ اس غور و فکر سے اسلام کی حقیقت مجھ پر ظاہر ہونے لگی اور میرا دل اس سے متأثر ہونے لگا۔ چنانچہ میں نے رفتہ رفتہ مسلمانوں کی مخالفت سے کنارہ کشی اختیار کرنا شروع کی، قریش نے میری اس قلبی کیفیت کو بھانپ کر ایک شخص اس کی حقیقت دریافت کرنے کے لیے میرے پاس بھیجا جس نے مجھ سے بحث شروع کی، میں نے اس سے کہا کہ بتاؤ، ہم حق پر ہیں یا فارس و روم والے، اس نے کہا "ہم" پھر میں نے پوچھا کہ عیش و تنعم ان کو میسّر ہے یا ہم کو، اس نے کہا، "ان کو" پھر میں نے کہا، کہ اگر اس عالم کے بعد دوسرا عالم نہیں ہے تو ہماری حق پرستی کس کام آئے گی۔ جب کہ ہم دنیا میں بھی باطل پرستوں کے مقابلہ پر تنگ حال رہے اور دوسرے عالم میں بھی جزا کی کوئی اُمید نہ ہو، اس لیے محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی یہ تعلیم کہ مرنے کے بعد دوسرا عالم ہوگا، جہاں ہر شخص کو اس کے اعمال کے مطابق جزا و سزا ملے گی کس قدر صحیح اور دلنشین ہے۔[1]

قبولِ اسلام

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ غزوۂ خندق کے بعد آپ اسلام سے متأثر ہونے لگے تھے۔ چنانچہ جب آپ جنگ خندق سے واپس آئے تو آپ نے قریش کے ان آدمیوں کو جو آپ کی رائے سے اتفاق کرتے اور آپ کی بات توجّہ سے سُنا کرتے تھے، جمع کر کے کہا:

"خدا کی قسم! مجھے تو اب یہ دکھائی دے رہا ہے کہ محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ستارہ اَوج پر پہنچنے والا ہے، اس حالت میں ہمارے لیے یہی بہتر ہے کہ ہم حبشہ کے بادشاہ نجاشی کے پاس چلے جائیں اور وہاں سکونت اختیار کریں، کیونکہ نجاشی کی حکومت میں رہنا محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے تابع ہو کر رہنے سے بہتر ہے، اگر محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہماری قوم پر غلبہ حاصل کر لیا، تو اس طرح ہم اُن کی دسترس سے باہر رہیں گے اور اگر ہماری قوم غالب آگئی تو ہم لوگ ممتاز ہیں اور ہمارے ساتھ ان کا طرزِ عمل بہتر ہی ہوگا۔"

حضرت عمروؓ بن العاص اگرچہ بزعم خویش اسلام سے دُور جا رہے تھے لیکن وہ اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ اسلام کی جن سچائیوں سے متأثر ہو کر انہوں نے مسلمانوں اور قریش کی باہمی کش مکش سے کنارہ کشی اختیار کی ہے، وہی سچائیاں بہت جلد اُن کو اسلام کی دہلیز پر جھکا دیں گی۔ مگر فی الحال اسلام کی چوکھٹ سے ان کی جبیں تک کچھ فاصلہ باقی تھا جسے طے کرنا ضروری تھا۔ یہ فاصلہ کیسے طے ہوا؟ اس کی رُوداد خود اُن کی زبانی سُنیے، فرماتے ہیں:-

"جب میں نے یہ تجویز اپنے ساتھیوں کے سامنے پیش کی تو سب نے اس پر اتفاق کیا تو پھر میں نے کہا کہ اب جبکہ تم نے حبش جانے کا قصد کر لیا ہے، تو نجاشی کے لیے کچھ عمدہ سوغاتیں لے چلو، ہمارے ہاں چونکہ سب سے بہتر تحفہ چمڑہ تھا۔ اس لیے بہت سا چمڑہ لے کر ہم لوگ حبشہ روانہ ہو گئے۔

---

[1] سیر الصحابہؓ مہاجرین حصّہ دوم

جب ہم نجاشی کے محل کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ حضرت عمرورضؓ بن امیہ ضمری (جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) نے حضرت جعفرؓ اور اُن کے رفقاء کی کسی ضرورت سے نجاشی کے پاس بھیجا تھا) بادشاہ کے محل میں داخل ہوئے اور کچھ دیر ٹھہر کر واپس چلے گئے۔ اس پر میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ہم نجاشی سے درخواست کریں کہ عمروؓ بن اُمیہ ضمری کو ہمارے حوالے کر دے، اگر وہ دے دے تو اس کی گردن مار دیں تاکہ قریش کو معلوم ہو جائے کہ ہم نے محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سفیر کا سر قلم کر کے ان کا بدلہ لے لیا، یہ کہہ کر میں نجاشی کے دربار میں گیا اور حسبِ معمول سجدہ کیا، اس نے خوش آمدید کہا اور پوچھا کہ میرے لیے اپنے مُلک سے کیا تحفہ لائے ہو؟ میں نے جواب دیا، حضور بہت سا چمڑہ تحفہ میں لایا ہوں، پھر (یہ تحفہ) اس کو پیش کر دیا جسے اس نے بہت پسند کیا۔ پھر موقع غنیمت جان کر عرض کیا، جہاں پناہ میں نے ابھی ایک آدمی کو آپ کے دربار سے نکلتے دیکھا ہے، وہ ہمارے دشمن کا ایلچی ہے، آپ کی بڑی نوازش ہوگی۔ اگر اسے میرے حوالے کر دیں تاکہ میں اُسے قتل کر دوں کیونکہ اس نے ہمارے متعدد سرداروں اور معززین کو تکلیفیں پہنچائی ہیں، نجاشی یہ درخواست سن کر سخت غضبناک ہو گیا اور اس نے اپنا ہاتھ کھینچ کر اس زور سے اپنی ناک پر مارا کہ میں نے خیال کیا کہ وہ ضرور ٹوٹ گئی ہوگی، میں یہ دیکھ کر بہت شرمندہ ہوا اور کہا جہاں پناہ! اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ کو یہ بات ناگوار گزرے گی، تو میں کبھی ایسا سوال آپ سے نہ کرتا، وہ بولا، تم چاہتے ہو کہ میں ایسے شخصؐ کے قاصد کو قتل کے لیے تمہارے حوالے کر دوں جس کے پاس وہی ناموسِ اکبر (جبرائیلؑ) آتا ہے، جو موسیٰؑ کے پاس آتا تھا، میں نے عرض کیا، جہاں پناہ! کیا واقعی ایسا ہے؟ اس نے کہا: "اے عمرو، تم پر افسوس! تم میرا کہا مانو اور اس کی اطاعت قبول کر لو، خدا کی قسم! وہ حق پر ہے اور جس طرح موسیٰؑ فرعون اور اس کے لشکر پر غالب آ گئے تھے، اسی طرح یہ شخص بھی اپنے دشمنوں پر غالب آ جائے گا۔" میں نے کہا، میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں، کیا آپ اسلام پر میری بیعت لے سکتے ہیں؟ اس نے کہا، کیوں نہیں، یہ کہہ کر اس نے ہاتھ بڑھایا اور میں نے اسلام کی بیعت کی، یہاں سے جب میں اپنے ساتھیوں کے پاس لوٹ کر گیا، تو میرے خیالات پلٹ چکے تھے، لیکن میں نے اپنے ساتھیوں پر ظاہر نہیں کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر بیعت کرنے کی غرض سے مدینہ روانہ ہو گیا۔ راستہ میں مجھے خالد بن ولید مکہ سے آتے ہوئے ملے (یہ فتح مکہ سے چھ ماہ پہلے کا واقعہ ہے) میں نے پوچھا، اے ابا سلیمان! کہاں کا ارادہ ہے؟ انہوں نے کہا" مجھ پر یہ بات ظاہر ہو گئی ہے کہ محمدؐ اللہ کے رسولؐ ہیں، اس لیے میں تو اسلام قبول کرنے جا رہا ہوں آخر کب تک ہم ان کی مخالفت کرتے جائیں گے۔" میں نے کہا: "خدا کی قسم! میں بھی مسلمان ہونے کے لیے جا رہا ہوں۔" چنانچہ ہم دونوں مدینہ پہنچ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے حضورؐ کو ہماری آمد کی اطلاع ہو چکی تھی اور آپ کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا، پہلے خالد بن ولید نے آگے بڑھ کر بیعت کی، پھر عثمان بن طلحہ نے، اس کے بعد میری باری آئی، میں آگے بڑھا اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے آگے بیٹھ گیا لیکن شرم کے مارے میری نگاہ آپ کے سامنے نہ اُٹھتی تھی، میں نے دربارِ رسالت مآبؐ میں عرض کیا: "یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میں بیعت کروں گا لیکن میرے اگلے اور پچھلے گناہ معاف کر دیجئے۔" آپؐ نے فرمایا: "عمرو بیعت کر لو، اسلام اپنے ماقبل کے گناہوں کو معاف کر دیتا ہے اور ہجرت بھی اپنے ماقبل کے گناہوں کو ختم کر دیتی ہے۔" چنانچہ میں نے بیعت کی اور بیعت کر کے (مکہ) لوٹ گیا۔[1]

---

[1] سیر الصحابہؓ مہاجرین حصہ دوم اور حضرت عمرو بن العاصؓ مؤلفہ محمد فرج مصری سے ماخوذ۔

ہجرت

حضرت عمرؓو بن العاص قبولِ اسلام کے بعد مکہ لوٹ گئے۔ پھر کچھ دنوں کے بعد ہجرت کرکے مدینہ چلے آئے۔ [1]

غزوات و سرایا

حضرت عمرؓو بن العاص ایک انتہا پسند آدمی تھے، چنانچہ جس طرف بھی رہے اپنی روش پر قائم رہے۔ قبولِ اسلام سے قبل آپ نے اسلام کے استیصال کے لیے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور جب اسلام لائے تو اسی تشدد کے ساتھ کفر و شرک کی بیخ کنی پر کمربستہ ہو گئے۔ قبولِ اسلام کے بعد آپ گزشتہ مخالفتوں کو یاد کرکے پشیمان ہوتے۔ چنانچہ کہا کرتے تھے کہ جب میں حالتِ کفر میں تھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا دشمن تھا اور اگر اسی حالت میں مر جاتا تو دوزخ کے علاوہ کوئی ٹھکانہ نہ تھا، اور جب میں بیعت کرکے حلقہ بگوشِ اسلام ہوا، تو کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آنکھیں چار نہ کر سکا۔ مزید فرماتے ہیں کہ "خدا کی قسم! جس دن سے میں نے اسلام قبول کیا اس دن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے اور دوسرے صحابہؓ کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے تھے۔"

رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عمرؓو بن العاص کے قبولِ اسلام سے بہت خوش تھے، حضورؐ کو ان کی ذہنی اور عسکری صلاحیتوں پر اس قدر بھروسا تھا کہ آپؐ نے انہیں قبولِ اسلام کے چند روز بعد ہی ایک سریہ کی امارت مرحمت فرما کر جہاد فی سبیل اللہ کے لیے روانہ فرمایا اور اس طرح حضرت عمرؓو بن العاص رضؓ کو آغاز ہی سے اسلام کی خاطر خدمات سرانجام دینے کی سعادت نصیب ہوئی۔

سریہ ذات السلاسل

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ملی کہ قبیلہ قضاعہ کی ایک جماعت مدینہ کے اطراف پر حملہ کرنے کے لیے جمع ہو رہی ہے، حضور سرورِ دو عالم صلعم نے جمادی الثانی ۸ھ میں سفید علم درست فرما کر حضرت عمرؓو بن العاص کو تین صد مجاہدین کے ساتھ اس جماعت کی سرکوبی کے لیے بھیجا، اس لشکر میں تیس گھوڑے بھی تھے۔ علامہ ابن اثیر کی تصریح کے مطابق یہ سریہ مدافعت کے لیے نہیں بلکہ قبیلہ بَلی و عذرہ کی طرف دعوتِ اسلام کے لیے بھیجا گیا تھا۔ لیکن جب مسلمان قریب پہنچے، تو معلوم ہوا کہ وہ لوگ لڑنے پر آمادہ ہیں اور ان کی تعداد بہت زیادہ ہے، اس صورتِ حال کے پیشِ نظر حضرت عمرؓو بن العاص نے حضرت رافع رضؓ بن مکیث الجہنی کو دربارِ رسالتؐ میں بھیج کر کمک کی درخواست کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوعبیدہؓ بن الجراح کی قیادت میں دو سو مہاجرین و انصار کو مدد کے لیے بھیجا۔ اس لشکر میں حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر بن الخطابؓ بھی شامل تھے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے روانگی سے قبل حضرت ابوعبیدہؓ کو مختلف نصائح کیں اور فرمایا متحد رہنا اور کسی بارہ میں اختلاف کی نوبت نہ آنے دینا۔ حضرت ابوعبیدہ رضؓ جب امدادی دستہ لے کر پہنچے تو ان میں اور حضرت عمرؓو بن العاص میں امامت کے بارہ میں اختلاف ہو گیا۔ حضرت عمرؓو بن العاص کہتے تھے کہ امامت میرا حق ہے کیونکہ میں فوج کا امیر ہوں، آپ چونکہ میری امداد کے لیے آئے ہیں، اس لیے میرے ماتحت ہیں، حضرت ابوعبیدہؓ بن الجراح نے آنحضرت صلعم کی ہدایت کے مطابق اختلاف سے گریز کیا اور ان کی امامت قبول کر لی، اس کے بعد متحدہ لشکر قبیلہ بَلی و عذرہ کی آبادیوں کو پامال کرتا ہوا، اس کی آخری حد تک بڑھتا چلا گیا۔ راستہ میں صرف ایک جماعت سے مقابلہ ہوا جو

---

[1] سیر الصحابہؓ مہاجرین حصّہ دوم

مسلمانوں کے سخت حملہ کی تاب نہ لا کر ادھر اُدھر منتشر ہوگئی۔

اس مہم کے بارہ میں حضرت عمرؓو بن العاص سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے کہلا بھیجا کہ میں کپڑے اور ہتھیار پہن کر ان کی خدمت میں حاضر ہوں، چنانچہ جب میں بہ تعمیل ارشاد حضور کی خدمت میں پہنچا، تو آپؐ نے فرمایا: اے عمرو! میں چاہتا ہوں کہ تمہیں لشکر کا سردار بنا کر بھیجوں، اللہ تعالیٰ تمہیں مال غنیمت بھی عطا فرمائے گا اور تمہیں محفوظ بھی رکھے گا۔ میں نے عرض کیا۔ میں نے مال و دولت کے لالچ میں اسلام قبول نہیں کیا۔ فرمایا "حلال و طیب مال ایک صالح و متقی کے لیے بہترین نعمت ہے"[1]۔

سریہ عمرؓو بن العاص، انہدام سواع

مؤرخین کے مطابق سواع عورت کی شکل کا ایک بت تھا، جو حضرت شیث بن آدمؑ کے لڑکے سواع کے نام پر بنایا گیا تھا۔ قوم نوحؑ کے بعد قبیلہ ہذیل نے جو مکہ سے تین میل کے فاصلہ پر آباد تھا، اس کی پرستش شروع کر دی، فتح مکہ سے قبل تک ہر سال اس جگہ میلہ لگتا اور اس پر کثرت سے چڑھاوے چڑھتے تھے، ان تمام امور کی نگرانی بنو سلیم کرتے تھے اور تمام چڑھاوے بھی انہی کے پاس جمع ہوتے تھے۔

فتح مکہ کی وجہ سے جب اسلام کو عرب میں دیگر ادیان پر کلی غلبہ حاصل ہوگیا اور عربوں نے اسلام کے تابندہ اصول قبول کر لیے تو ان بت خانوں کے خلاف کارروائی ضروری ہوگئی، جو مکہ کے قرب و جوار میں موجود تھے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓو بن العاص کو سواع کا بت خانہ ڈھانے پر مامور فرمایا، جب آپ تعمیل حکم کے لیے مع چند سواروں کے وہاں پہنچے تو بت خانہ کے مجاور نے پوچھا کہ آپ کس نیت سے آئے ہیں، فرمایا بت ڈھانے کے لیے، اس پر مجاور نے مدافعت کرنے کی بجائے جواب دیا کہ آپ اس کو نہ گرا سکیں گے۔ یہ خود اپنی حفاظت کرے گا۔ آپ نے مجاور کی اس بات پر بڑا افسوس کیا اور فرمایا "تم اب تک باطل پر اڑے ہوئے ہو، یہ بھلا بت بھی دیکھتے ہیں اور سنتے ہیں؟" اس کے بعد بت کے قریب جا کر اسے پاش پاش کر دیا، آپ کے ساتھیوں نے بیت خزانہ کو گرا دیا مگر وہاں سے کچھ نہ ملا۔ اس کے بعد آپ نے مجاور سے پوچھا "کیا تم نے بت کا ٹکڑے ٹکڑے ہونا دیکھ لیا؟" اس نے کہا "بے شک" پھر مشرف باسلام ہوگیا۔[2]

سفارت

حضرت عمرؓو بن العاص میدان جنگ کے ہی شہسوار نہیں تھے بلکہ ایک ماہر سیاستدان، مومن اور صاحب عقل و دانش بھی تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو چونکہ ان کی صلاحیتوں کا بخوبی علم تھا، اس لیے حضورؐ کبھی تو میدان جنگ کے قائد کی حیثیت سے ان کا انتخاب فرماتے کبھی بتوں کے انہدام پر انہیں مامور فرماتے اور کبھی تبلیغی امور کی انجام دہی کے لیے انہیں سفیر بنا کر بھیجتے اور اسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی بجا آوری میں حضرت عمرؓو بن العاص کی مخلصانہ مساعی کا ثمرہ سمجھنا چاہیے کہ آپ جس مہم پر بھی جاتے، فتح و کامرانی کی خوشخبری لے کر لوٹتے۔

اہل سیر کے مطابق فتح مکہ کے بعد حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے قرب و جوار کے جن حکمرانوں کے نام دعوت اسلام کے خطوط بھیجے ان میں عمان کے حکمران بھی شامل تھے اور یہ تبلیغی مہم حضرت عمرؓو بن العاص کے سپرد فرمائی۔

---

[1] محمد رسول اللہ، مؤلفہ شیخ محمد رضا مصری [2] سیر الصحابہؓ مہاجرین حصہ دوم۔

عمان جزیرہ عرب کے جنوب مشرق میں ایک مملکت تھی، جہاں کے باشندے آگ کی پرستش کرتے تھے، وہاں دو بھائی حاکم تھے، بڑے کا نام جیفر تھا اور چھوٹے کا عباد، حضرت عمرو رضؓ بن العاص جب آنحضرت صلعم کا تبلیغی خط لے کر عمان پہنچے تو بجائے اس کے کہ آپ فوری طور پر اس خط کو دونوں بھائیوں کے حوالے کر دیتے، آپ نے ان کی شخصیتوں کی مطالعہ ضروری سمجھا، مطالعہ کے بعد آپ اس نتیجہ پر پہنچے کہ چھوٹا بھائی عباد بردباری و اخلاق میں بڑے بھائی سے بڑھا ہوا ہے، لہٰذا آپ نے اپنے تبلیغی مشن کا آغاز اسی سے کیا اور اس خوبی سے اس کے سامنے اسلام کے محاسن بیان کیے کہ وہ اسلام کا گرویدہ ہو گیا۔ پھر آپ عباد کی ہدایت کے مطابق جیفر سے ملے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خط اس کے حوالے کیا، دونوں بھائیوں نے مل کر خط پر غور کیا۔ حضرت عمرو رضؓ بن العاص سے اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق چند سوال کیے جب مطمئن ہو گئے تو مشرف بہ اسلام ہو گئے۔ پھر ان کی مملکت کے باشندے بھی ان کی تقلید میں کثرت سے مسلمان ہونے لگے اور اس طرح چند روز میں سارا عمان مسلمان ہو گیا۔

حضرت عمرو رضؓ بن العاص اپنی اس کامیابی پر خوشی خوشی مدینہ آئے اور اس مہم کی تفصیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گوش گزار کی جو آپ نے محض اپنی عقل، سیاست اور دینی امور سے واقفیت کی بنا پر سر کی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے اس کارنامہ پر بہت خوش ہوئے اور آپ کو وہاں کے لوگوں کو اسلامی احکام سکھانے اور کتاب اللہ کا درس دینے کے لیے دوبارہ عمان روانہ فرمایا۔ آپ عمان آکر دو سال تک اسلام کی تبلیغ کا کام سرانجام دیتے رہے۔ یہاں تک کہ آپ کو حضرت ابوبکر رضؓ صدیق کا خط پہنچا، جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے حادثہ فاجعہ کی خبر دے کر ہدایت کی گئی تھی۔ جو کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے سپرد کیا تھا وہ اسے بدستور پایہ تکمیل تک پہنچاتے رہیں۔ بہرکیف اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عمرو رضؓ بن العاص کی رفاقت ختم ہو گئی۔[1]

فتنۂ ارتداد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب ارتداد اور مدعیان نبوت کا فتنہ اُٹھا، تو حضرت عمرو رضؓ بن العاص اس وقت عمان میں ہی تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ خلیفۂ رسولؐ نے انہیں تمام حالات کی اطلاع دے کر ان فتنوں کو دبانے کے لیے مدینہ طلب فرمایا، واپسی پر ان کا گزر بنو عامر کی بستیوں سے ہوا جن کا سردار قرہ بن ہبیرہ تھا۔ آپ قرہ کے مہمان ہوئے، اُس نے بڑی آؤ بھگت کی اور جب آپ چلنے لگے تو تنہائی میں لے جا کر کہا کہ اگر عربوں سے زکوٰۃ لی گئی تو وہ کسی کی امارت قبول نہ کریں گے، البتہ اگر زکوٰۃ کا طریقہ بند کر دیا گیا، تو مطیع و فرمانبردار رہیں گے، اس لیے زکوٰۃ کا قانون اُٹھا دینا چاہیے، آپ نے کہا قرہ! کیا تم بھی ارتداد کی رَو میں بہ گئے ہو اور کیا تم ہمیں عرب سے ڈراتے ہو؟ خدا کی قسم! ہم گھوڑوں کے سموں سے عرب کی ساری زمین روند ڈالیں گے اور تمہاری گردنیں ہماری تلواروں سے کسی طرح محفوظ نہ رہ سکیں گی۔ یہ شخص بعد میں جب مانعین زکوٰۃ کے سلسلہ میں گرفتار ہوا، تو اس نے حضرت ابوبکر رضؓ سے کہا کہ جب عمرو رضؓ بن العاص عمان سے واپسی پر میرے پاس سے گزرے تھے تو میں نے اُن کی مہمانداری اور فرمانبرداری کی تھی، حضرت ابوبکر رضؓ نے حضرت عمرو رضؓ بن العاص سے اس معاملہ کے متعلق پوچھا، آپ نے قرہ کے بیان کی تصدیق کی، جس پر حضرت ابوبکر رضؓ نے اس کا خون معاف کر دیا۔[2]

مدینہ پہنچنے پر حضرت ابوبکر رضؓ نے حضرت عمرو رضؓ بن العاص کو بنو قضاعہ کے مرتدین سے جنگ کرنے کا کام سپرد کیا۔ چنانچہ آپ بارگاہ

---

[1] حضرت عمرو رضؓ بن العاص مؤلفہ محمد فرج مصری [2] فتوح البلدان حصہ اول۔

خلافت سے حکم ملتے ہی بنو قضاعہ کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوگئے، وہاں پہنچ کر دیکھا کہ بنو قضاعہ جنگ کے لیے پوری طرح تیار ہیں، چنانچہ فریقین میں مقابلہ شروع ہوا اور گھمسان کا رن پڑا، بالآخر شکست کی ذلت بنو قضاعہ کے حصہ میں آئی۔ حضرت عمرو بن العاص نے ان سے زکوٰۃ لے کر انہیں دوبارہ اسلام پر قائم کیا اور اس مہم کو سر کرنے کے بعد عمان لوٹ گئے۔[1]

فتوحات شام

فتنہ ارتداد فرو کرنے کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ نے عراق و شام کی طرف توجہ کی اور ۱۳ھ میں شام کے مختلف حصوں میں علیحدہ علیحدہ فوجیں روانہ کیں، حضرت عمروؓ بن العاص اس وقت عمان میں تھے۔ انہیں حضرت ابوبکرؓ نے لکھا:

"اے ابو عبداللہ، میں تمہارے سپرد ایسا کام کرنا چاہتا ہوں جو دین اور دنیا دونوں کے اعتبار سے تمہارے لیے بہتر ہے، لیکن تمہاری خوشی مجھے بہرحال منظور ہے۔"

حضرت عمروؓ بن العاص نے جواب میں لکھا:

"میں اسلام کے تیروں میں سے ایک تیر ہوں اور اللہ کے بعد آپ اس کے تیرانداز ہیں، اس لیے آپ کو اختیار ہے کہ جدھر چاہیے پھینکیے۔"

حضرت ابوبکر صدیقؓ اس جواب سے بہت خوش ہوئے، چنانچہ آپ نے حضرت عمروؓ بن العاص کو عمان سے واپس بلا کر فلسطین کی مہم پر مامور کیا، حضرت عمروؓ بن العاص کی فوج کی تعداد نو ہزار تھی اور وہ مکہ، طائف، ہوازن اور بنو کلاب کے لوگوں پر مشتمل تھی، مورخین کے مطابق اسلامی فوج کے چار حصے تھے اور ہر حصہ پر علیحدہ علیحدہ امیر مقرر کر کے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے انہیں الگ الگ علاقوں کی طرف روانہ فرمایا تھا، یعنی حضرت ابو عبیدہؓ بن الجراح، حمص، حضرت عمروؓ بن العاص، فلسطین، حضرت یزیدؓ بن ابی سفیان، دمشق اور حضرت شرجیلؓ بن حسنہ اردن کی مہم پر مامور ہوئے، چاروں فوجوں کی مجموعی تعداد ستائیس ہزار تھی[2] اور حضرت ابو عبیدہؓ بن الجراح ان چاروں فوجوں کے سپہ سالار اعظم تھے۔

اجنادین

حضرت عمروؓ بن العاص اپنی نو ہزار فوج کے ہمراہ فلسطین کے لیے روانہ ہوئے اور ایلیا کے راستے سفر کرتے ہوئے عربات میں جا کر اترے، جب شہنشاہ روم کو مسلمانوں کی نقل و حرکت کا پتہ چلا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ مسلمان کے چار لشکر شام پر حملہ کرنے کے لیے مدینہ سے روانہ ہو چکے ہیں، تو اس نے ان سب کے مقابلہ کے لیے علیحدہ علیحدہ فوجیں روانہ کیں، رومیوں کے مشہور سپہ سالار تذارق اور قیقلار نے اجنادین میں اپنی فوجیں اتاریں، حضرت عمروؓ بن العاص جو فلسطین کے علاقہ عربات میں تھے، رومیوں کے اجتماع کی خبر سن کر اجنادین کی طرف بڑھے۔ اسی دوران میں حضرت خالدؓ بن ولید اور حضرت ابو عبیدہؓ بھی بصریٰ کی مہم سر کرنے کے بعد اجنادین میں ان سے مل گئے۔ رومی سپہ سالار نے ایک عرب کو جاسوسی کے لیے اسلامی لشکر میں بھیجا، وہ دیکھ بھال کر جب واپس گیا، تو سپہ سالار نے پوچھا کیا خبر لائے ہو؟ اس نے کہا: یہ لوگ رات کو عابد شب زندہ دار اور دن کو میدان جنگ کے شہسوار ہیں اگر ان کا شہزادہ بھی کسی جرم کا مرتکب ہوتا ہے، تو

---

[1] سیر الصحابہؓ مہاجرین حصہ دوم [2] علامہ شبلی نے فوجوں کی تعداد چوبیس ہزار لکھی ہے (الفاروق حصہ اول)

اس پر بھی شرعی حدود جاری کرتے ہیں" یہ سن کر سپہ سالار نے کہا، اگر واقعی ان میں یہ صفات ہیں تو ان کے مقابلہ سے زمین میں دفن ہو جانا زیادہ بہتر ہے۔ غرض جمادی الاخریٰ ۱۳ھ میں رومیوں اور مسلمانوں میں مقابلہ ہوا۔ رومی سپہ سالار مارا گیا اور اس کی فوج کو شکستِ فاش ہوئی۔ اس معرکہ کے بعد حضرت عمروؓ بن العاص بھی حضرت خالدؓ اور حضرت ابو عبیدہؓ کے ساتھ ہو گئے اور ایک حصہ فوج کے سردار تھے۔ [1]

دمشق

یہ شہر شام کا ایک بڑا صدر مقام تھا اور جاہلیت میں اہلِ عرب چونکہ تجارت کے تعلق سے اکثر وہاں آیا جایا کرتے تھے، اس لیے دمشق کا شہرہ تمام عرب میں تھا، چنانچہ اجنادین کے بعد اسلامی لشکر دمشق کی طرف بڑھا اور بڑے اہتمام سے اس کا محاصرہ کر لیا، اسلامی سپہ سالار حضرت ابو عبیدہؓ نے شہر پناہ کے تمام صدر دروازوں پر الگ الگ افسر متعین کیے، حضرت عمروؓ بن العاص باب توما، حضرت شرحبیلؓ باب فرادیس، حضرت خالدؓ بن ولید باب الشرقی، حضرت یزیدؓ بن ابی سفیان باب کیسان اور خود حضرت ابو عبیدہ باب جابیہ پر متعین تھے۔ حضرت عمروؓ بن العاص کو شہر کے ایک حصہ پر متعین کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابو عبیدہؓ کو بھی ان کی بہادری، شجاعت اور اخلاص و وفاداری پر کامل اعتماد تھا۔ بہرکیف عرصہ تک محاصرہ جاری رہا، آخر رجب ۱۴ھ میں حضرت خالدؓ کی کوشش تدبیری سے دمشق مسلمانوں کے قبضہ میں آ گیا۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ دمشق کا محاصرہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دورِ خلافت میں ہوا تھا مگر اس کی فتح عہدِ فاروقیؓ میں عمل میں آئی۔

فحل اور بیسان

دمشق کی شکست نے رومیوں کو سخت برہم کیا اور وہ ہر طرف سے جمع ہو کر بڑے زور اور قوت کے ساتھ مسلمانوں کے مقابلہ کے لیے آمادہ ہوئے، دمشق کی فتح کے بعد مسلمانوں نے چونکہ اُردن کا رُخ کیا تھا اس لیے انہوں نے اسی صوبہ کے ایک شہر بیسان میں فوجیں جمع کرنی شروع کیں اور مسلمانوں نے اُن کے سامنے فحل میں پڑاؤ ڈالا۔ رومیوں نے اس ڈر سے کہ مسلمان اچانک حملہ نہ کر دیں، آس پاس کی تمام نہروں کے بند توڑ ڈالے جس کے باعث فحل اور بیسان کے درمیان ایک دنیائے آب رواں ہو گئی، مسلمان ابھی فحل میں ہی مقیم تھے کہ ایک دن اچانک اسی ہزار رومیوں نے عقب سے حملہ کر دیا، لیکن شکست کھائی اور اس بری طرح بھاگے کہ اس مہیب دلدل میں پھنس گئے جو انہوں نے مسلمانوں کے لیے تیار کی تھی، اسلامی لشکر نے دلدل میں پھنسنے والے کسی ایک شخص کو بھی زندہ نہ چھوڑا اور اسی ہزار رومیوں کو اسی حالت میں قتل کر دیا۔ اس سے فارغ ہو کر مسلمانوں نے بیسان کا محاصرہ کر لیا، ایک دن رومی لشکر نے قلعہ سے نکل کر مقابلہ کیا مگر سب کے سب مارے گئے اور باقی ماندہ آبادی نے صلح کر لی۔ [2]

یرموک

اس مسلسل اور پیہم شکستوں سے سارے روم میں کہرام مچ گیا اور رومیوں نے قیصر سے فریاد کی کہ مسلمانوں نے سارا شام ویران و تباہ کر ڈالا ہے (وہ خود بھی چونکہ مسلمانوں کی تاخت و تاراج سے تنگ آ چکا تھا۔ اس لیے اس نے ممالک محروسہ میں فرمان جاری کر کے ایک زبردست فوج جمع کی، جس کی تعداد بلاذری کے بیان کے مطابق دو لاکھ کے لگ بھگ تھی، حضرت عمروؓ بن العاص نے اس نازک اور خوفناک مرحلے سے عہدہ برآ ہونے کے لیے رائے دی کہ :

"تمام مسلمان ایک جگہ مجتمع ہو کر دشمن کا مقابلہ کریں، اگر ہم ایک جگہ جمع ہو جائیں گے تو قلتِ تعداد کے باوجود مغلوب

---

[1] سیر الصحابہؓ مہاجرین حصہ دوم [2] سیر الصحابہؓ مہاجرین حصہ دوم

نہ ہو سکیں گے۔ لیکن اگر بدستور علیحدہ علیحدہ رہیں گے، تو کوئی بھی رومیوں کے لشکرِ جرار کے سامنے نہ ٹھہر سکے گا۔"

دربارِ خلافت سے بھی اس مشورہ کی تائید ہوئی، چنانچہ اسلامی افواج ہر چہار طرف سے سمٹ کر یرموک میں جمع ہوئیں، چونکہ اس معرکہ میں سارا شام اُمڈ آیا تھا اور مسلمانوں کی تعداد اُن کے چوتھائی حصہ سے بھی کم تھی، اس لیے حضرت خالدؓ نے خاص توجہ سے کام لیتے ہوئے جدید طرز پر فوج کو چھتیس حصوں پر تقسیم کیا، میمنہ کے بھی کئی ٹکڑے کر کے اس پر حضرت عمروؓ بن العاص اور حضرت شرحبیلؓ بن حسنہ کو مقرر کیا، غرض دونوں فوجیں پوری تیاری کے ساتھ میدان میں اُتریں اور جنگ شروع ہو گئی۔

یہ جنگ بڑی ہولناک جنگ تھی، رُومی اس قدر جان توڑ کر لڑے اور مسلمانوں پر اتنی شدت سے حملہ کیا کہ انہیں پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا، پیچھے ہٹنے والوں میں مسلمانوں کا علمبردار بھی تھا، یہ دیکھ کر حضرت عمروؓ بن العاص اور حضرت خالدؓ بن ولید دونوں اس کے ہاتھ سے عَلَم لینے کے لیے آگے بڑھے۔ حضرت عمروؓ بن العاص چونکہ پہلے پہنچ چکے تھے۔ اس لیے پھرتی سے علم بردار کے ہاتھ سے عَلَم لے لیا اور ایک لمحہ کے لیے بھی اسے نیچے نہ ہونے دیا۔[1] میدانِ جنگ میں اپنا پھریرا پُوری شان سے لہراتا دیکھ کر ہزیمت خوردہ مسلمانوں کی ہمت بندھ گئی، چنانچہ انہوں نے دوبارہ مجتمع ہو کر اس زور کا حملہ کیا کہ رومی انتہائی کوشش کے باوجود نہ ٹھہر سکے، اور انجام کار میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہا۔ باختلاف روایت رومیوں کی ایک لاکھ یا ستر ہزار سپاہ کام آئی اور مسلمانوں کا جانی نقصان کل تین ہزار ہوا۔

بقیہ فلسطین

حضرت عمروؓ بن العاص کو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فلسطین کی تسخیر پر مامور فرمایا تھا، چنانچہ حضرت عمروؓ بن العاص فلسطین کے بعض مقامات عہدِ صدیقی میں ہی فتح کر چکے تھے، لیکن درمیان میں چونکہ دمشق، فحل اور یرموک وغیرہ کی مہمات آپڑی تھیں، اس لیے پہلی مہم اُدھوری رہ گئی تھی، چنانچہ یرموک وغیرہ سے فراغت کے بعد آپ پھر ادھر متوجہ ہوئے اور غزہ، سبطین، نابلس، لُد، عمواس اور بیت الجبرین پر نہایت آسانی سے تسلط حاصل کر لیا۔

بیت المقدس

اب صرف فلسطین کا سب سے بڑا شہر ایلیا (بیت المقدس) رہ گیا تھا، چنانچہ حضرت عمروؓ بن العاص نے چھوٹے چھوٹے مقامات لینے کے بعد بیت المقدس کا محاصرہ کر لیا۔ ساتھ ہی آپ نے رومی سپہ سالار ارطبون کو ایک خط لکھا جس میں مطالبہ کیا کہ شہر ان کے حوالے کر دیا جائے، اس نے جواب دیا کہ "آپ اس خیال میں نہ رہیں کہ اجنادین کے بعد بھی آپ کوئی فتح حاصل کر سکیں گے" اسی دوران میں حضرت ابوعبیدہؓ بھی قنسرین اور اس کے مضافات فتح کر کے حضرت عمروؓ بن العاص سے آملے۔[2] محاصرہ چار ماہ تک جاری رہا جب ارطبون نے دیکھا کہ مسلمان بیت المقدس کا محاصرہ اٹھانے کے لیے کسی طرح بھی تیار نہیں ہیں تو وہ اسقف صفرنیوس کو اپنا قائم مقام بنا کر خود مصر بھاگ گیا اور اپنے ہمراہ اپنی فوج بھی لیتا گیا، صفرنیوس کے پاس اتنی طاقت نہ تھی کہ وہ زیادہ دیر مسلمانوں کے مقابلہ میں ٹھہر سکتا۔ اس لیے وہ شہر مسلمانوں کے حوالے کرنے پر تیار ہو گیا، لیکن شرط یہ پیش کی کہ خلیفۃ المسلمین حضرت عمرؓ بن الخطاب خود صلح کا معاہدہ لکھیں، چنانچہ حضرت عمرؓ تشریف لائے۔ جابیہ کے مقام پر ان سے مصالحت کی اور انہیں ایک عہدنامہ لکھ کر دیا۔[3] اس طرح شام کا یہ متبرک شہر جس کو انبیاء و رُسل علیہم السلام کی آرام گاہ ہونے کا شرف حاصل تھا مسلمانوں کے

---

[1] حضرت عمروؓ بن العاص مؤلفہ محمد فرج مصری۔ [2] فتوح البلدان حصہ اوّل [3] حضرت عمروؓ بن العاص مؤلفہ محمد فرج مصری

قبضہ میں آگیا اور شام پر مکمل قبضہ ہوگیا۔

طاعونِ عمواس

مؤرخین کے مطابق سنہ ۱۸ھ میں شام میں نہایت سخت طاعون پھیلا جس میں بہت سے مسلمانوں نے وفات پائی۔ حضرت عمروؓ بن العاص نے مشورہ دیا کہ یہاں وبا کا زور ہے۔ اس لیے فوجیں ہٹا کر کسی محفوظ مقام پر بھیج دی جائیں، مگر اسلامی فوج کے امیر حضرت ابوعبیدہؓ نے اسے خدا کی رحمت قرار دے کر عمواس چھوڑنا قبول نہ کیا، آخر جب خود اس مرض میں مبتلا ہوگئے، تو حضرت معاذ بن جبلؓ کو اپنا جانشین قرار دے کر اسی رحمت کے دامن میں آگئے"، وبا کا زور رُک کر بڑھتا جا رہا تھا۔ اس لیے حضرت معاذؓ بھی اس کے حملہ سے نہ بچ سکے۔ چنانچہ آپ نے حضرت عمروؓ بن العاص کو اپنا قائم مقام مقرر کر کے اسی بیماری میں جان دے دی۔ ان کے بعد حضرت عمرو بن العاص نے فوراً فوجوں کو پہاڑی مقامات پر بھیج دیا، جس سے فوجیں اس وبا سے محفوظ ہوگئیں۔

فتوحاتِ مصر

شام اگرچہ پوری طرح مسلمانوں کے قبضۂ اقتدار میں آچکا تھا۔ تاہم حضرت عمروؓ بن العاص کے بلند حوصلے ابھی پورے نہیں ہوئے تھے، کیونکہ شام کی فتوحات میں زیادہ تر حضرت ابوعبیدہؓ اور حضرت خالدؓ کی قوتوں کو دخل تھا اور ان کو ایسے میدان کی تلاش تھی، جہاں وہ تنہا اپنی تلوار کے جوہر دکھا سکیں، اس بنا پر ان کی نظر شام کے اہم سرحدی ملک مصر پر تھی، جس کی شادابی و زرخیزی سے یہ اچھی طرح واقف تھے، کیونکہ ظہورِ اسلام سے قبل بسلسلۂ تجارت آپ اکثر مصر آیا جایا کرتے تھے۔ چنانچہ شام کی فتح کے بعد آپ نے حضرت عمرؓ سے مصر پر فوج کشی کی اجازت مانگی، لیکن امیر المومنینؓ کو اجازت دینے میں دو وجہوں سے پس و پیش ہوا، اوّل یہ کہ شام کی مہم سر کرنے کے بعد ابھی اسلامی فوجوں نے دَم نہ لیا تھا، دوسرے مقوقس شاہِ مصر کا قلیل فوج کے ساتھ مقابلہ کرنا دشوار تھا، لیکن جب حضرت عمروؓ بن العاص نے پیہم اصرار کیا تو حضرت عمرؓ رضامند ہوگئے اور شریک بن عبدہ کے ہاتھ انہیں ایک خط بھیجا جس میں لکھا تھا: "لوگوں کو مصر چلنے کی دعوت دو اور جو تیار ہوں انہیں ساتھ لے کر روانہ ہو جاؤ"ؔ مؤرخین کے مطابق جس وقت حضرت عمروؓ بن العاص کو امیر المومنین کا یہ خط پہنچا اُس وقت آپ نے قیساریہ کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ چنانچہ خط ملتے ہی محاصرہ کی کمان حضرت معاویہؓ بن ابی سفیان کے حوالے کی، امیر المومنینؓ کے قاصد شریک بن عبدہ کو کمک طلبی کا پیغام دے کر مدینہ واپس کیا اور خود تقریباً چار ہزار سپاہ کے ساتھ عریش کی طرف روانہ ہوگئے۔

اہلِ سیر کے بیان کے مطابق امیر المومنینؓ کا قاصد جب حضرت عمروؓ بن العاص کے خط کا جواب لے کر واپس پہنچا تو آپ رفح کے مقام پر تھے، قاصد نے جب کمک کا کوئی ذکر نہ کیا جس کا آپ کو انتظار تھا، تو آپ نے اپنی ذہانت سے یہ اندازہ لگا لیا کہ اس خط میں واپسی کا حکم ہوگا، چنانچہ آپ چلتے رہے اور قاصد سے مدینہ کی خبریں معلوم کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ایک گاؤں میں پہنچے جو رفح اور عریش کے درمیان تھا۔ وہاں پہنچ کر پوچھا: "یہ گاؤں کس مُلک میں ہے؟" لوگوں نے جواب دیا "مصر میں"، اس وقت آپ سواری سے اُترے اور قاصد سے خط لے کر پڑھا، پھر حاضرین سے کہا" امیر المومنینؓ نے حکم دیا ہے کہ اگر یہ خط مجھے مصر کی سرحد پار کرنے سے پہلے ملے تو میں واپس ہو جاؤں، لیکن یہ مجھے اس وقت ملا ہے جس وقت ہم مصر میں داخل ہو چکے ہیں، اس لیے اللہ کی برکت اور اعانت پر بھروسا کر کے بڑھے چلو۔" اسی طرح یہ بھی فرمایا کہ "اُن کے (یعنی امیر المومنینؓ) کے یہ کلمات پہلی فتح ہیں"ؔ

ا۔ عمرؓ فاروق اعظم از محمد حسین ہیکل۔

فرما کی فتح

بہر کیف حضرت عمروؓ بن العاص چار ہزار مجاہدین کے ساتھ مصر کی سرحد کے اندر بڑھتے ہوئے عریش پہنچے، لیکن وہاں مقابلہ کے لیے کوئی موجود نہ تھا۔ پھر آپ نے فرما کا رُخ کیا، راستے میں کوئی رکاوٹ پیش نہ آئی۔ یہاں تک کہ آپ فرما پہنچ گئے۔ جہاں رُومی فوج آپ کا مقابلہ کرنے کے لیے کیل کانٹے سے لیس کھڑی تھی۔

فرما مصر کا ایک مشہور شہر تھا جسے جالینوس کا مدفن ہونے کی وجہ سے خاص اہمیت حاصل تھی، یہاں اگرچہ رومی فوجوں نے عربوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے مضبوط مورچہ بندی کر رکھی تھی، تاہم حضرت عمروؓ بن العاص نے لڑائی چھیڑنے میں کسی تکلف و تامل سے کام نہ لیا اور رُومیوں کو نہایت شرمناک شکست دے کر شہر پر قبضہ کر لیا۔

بلبیس اور اُمّ دنین کی فتح

فرما کی فتح کے بعد حضرت عمروؓ بن العاص نے بلبیس کا رُخ کیا۔ جو مصر سے صرف تینتیس میل دُور تھا۔ راستے میں کوئی قابلِ ذکر مزاحمت نہ ہوئی۔ بلبیس پہنچ کر آپ نے تقریباً ایک ماہ تک قیام کیا اور اس دوران میں مصر کے شاہ مقوقس کی جانب سے پادریوں کا ایک وفد آپ سے ملا اور صلح کی گفتگو شروع کی، آپ نے اُن کے سامنے حسبِ معمول جزیہ دینے یا اسلام قبول کرنے کی شرط پیش کی، یہ وفد پانچ دن کی مہلت لے کر واپس گیا اور مسلمانوں کی شرائط مقوقس کے سامنے رکھیں، رومی سپہ سالار اطربون نے مسلمانوں سے جنگ کرنے پر اصرار کیا اور بارہ ہزار مسلح فوج کے ساتھ بلبیس پہنچ کر اچانک مسلمانوں پر ٹوٹ پڑا، لیکن شکست کھائی اور ایک روایت کے مطابق جنگ میں مارا گیا۔ بلبیس کی فتح کے بعد حضرت عمروؓ بن العاص صحرا کی سرحد پر پیش قدمی کرتے ہوئے اُمّ دنین کی بستی کے قریب پہنچ کر خیمہ زن ہوئے۔ یہ بستی ایک مضبوط قلعہ پر مشتمل تھی اور شہر مصر کے سب سے بڑے قلعہ بابلیون[1] کے شمال میں واقع تھی، رُومیوں نے مسلمانوں کی بے دریغ پیش قدمی سے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ عرب محض لوٹ کھسوٹ کے ارادے سے نہیں بلکہ فتح مصر کے پروگرام کے تحت آئے ہیں، اس بنا پر رومی قلعہ اُمّ دنین کو مستحکم کر کے اس میں قلعہ بند ہو گئے۔ حضرت عمروؓ بن العاص رومیوں کی ان کارروائیوں سے پوری طرح باخبر تھے، لیکن وہ خواہ مخواہ اپنی قلیل فوج کو ہلاکت میں ڈالنا نہیں چاہتے تھے، تاہم اُنہوں نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا اور امیر المومنینؓ کو تمام حالات کی خبر دے کر امدادی فوج بھیجنے کی درخواست کی

محاصرہ میں کئی ہفتے گزر گئے۔ اس عرصہ میں اُمّ دنین کی فوجیں کبھی کبھار قلعہ سے باہر نکلتیں اور ناکام جھڑپوں کے بعد واپس چلی جاتیں کہ اس اثنا میں بارگاہِ خلافت سے پہلی امدادی فوج پہنچ گئی۔ اس فوج کے پہنچتے ہی مجاہدین کے حوصلے بلند ہو گئے اور اسلامی لشکر نے حضرت عمروؓ بن العاص کے حکم کے مطابق ایک مقررہ وقت پر یکجان ہو کر قلعہ پر دھاوا بول دیا۔ اللہ تعالیٰ نے مجاہدینِ اسلام کو فتح و نصرت سے ہمکنار کیا، اور مسلمان دشمن کی بڑی تعداد کو تلوار کے گھاٹ اُتارنے اور زندہ بچ جانے والوں کو گرفتار کرنے کے بعد قلعے پر قابض ہو گئے۔

عین شمس یا فسطاط

اُمّ دنین کی فتح کے بعد حضرت عمروؓ بن العاص عین شمس پہنچے۔ عین شمس زمانہ قدیم میں بڑا عظیم الشان اور گنجان شہر تھا، یہاں آفتاب کا ہیکل تھا جس کے تبرک کو ہزاروں آدمی آتے تھے۔ لیکن جب وقت مسلمان یہاں پہنچے شہر کھنڈروں کے ڈھیر میں تبدیل ہو چکا تھا، البتہ یہاں ایک قلعہ تھا جس کا نام قصرِ شمع تھا، اس میں مقوقس کی فوج رہتی تھی اور

---

[1] مورخین کے مطابق اسی قلعہ کو "قصرِ شمع" اور باب الیون بھی کہتے ہیں

مصر کی تسخیر کے لیے اس پر قبضہ کرنا نہایت ضروری تھا۔ چنانچہ حضرت عمروؓ بن العاص نے اس قلعہ کی تسخیر کے لیے بڑے اہتمام سے تیاریاں شروع کیں، اسی دوران میں حضرت زبیرؓ بن عوام بھی دس ہزار کی جمعیت لے کر پہنچ گئے اور پھر دونوں نے دو سمتوں سے حملے شروع کر دیے، مگر قلعہ اس قدر مضبوط تھا کہ مہینوں لگ گئے۔ آخر کار ایک دن حضرت زبیرؓ بن عوام محاصرہ کی طوالت سے تنگ آ کر اکیلے ننگی تلوار لے کر قلعہ کی فصیل پر چڑھ گئے۔ آپ کی اس ہمتِ مردانہ کو دیکھ کر بہت سے جانثاروں نے بھی آپ کی تقلید کی، چنانچہ قلعہ کے دیوار پر پہنچ کر سب لوگوں نے اس زور سے نعرۂ تکبیر بلند کیا کہ قلعہ والوں نے بدحواس ہو کر خود ہی اس کے دروازے کھول دیے اور صلح کی درخواست کی جسے مسلمانوں نے قبول کر لیا، داخلہ اگرچہ فاتحانہ ہوا تھا، تاہم مسلمانوں نے شرائط بہت نرم رکھیں، مؤرخین کے مطابق یہی مقام بعد میں آباد ہو کر فسطاط کے نام سے موسوم ہوا۔[1]

اسکندریہ کی طرف پیشقدمی

عین شمس کی فتح کے بعد حضرت عمروؓ بن العاص نے حضرت عمرؓ سے اسکندریہ کی طرف پیشقدمی کی اجازت مانگی، وہاں سے اجازت ملنے کے بعد حضرت خارجہؓ بن حذافہ کو مفتوحہ ممالک کا حاکم مقرر کر کے خود اسکندریہ کا رُخ کیا۔ اس سفر میں حضرت عمروؓ بن العاص نے چند مختلف قبطی سرداروں کو بھی اپنے ساتھ لے لیا تھا تاکہ راستے میں جو شہر پڑیں ان کے باشندوں کو یہ رُوسا مسلمانوں سے قریب کرنے کا ذریعہ بنیں۔

نقیوس

حضرت عمروؓ بن العاص اسکندریہ کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے مشہور شہر نقیوس اور اس کے مضبوط قلعے کے سامنے پہنچ گئے۔ یہ شہر چونکہ اسکندریہ اور بابلیون کی درمیانی شاہراہ پر واقع ہونے کے باعث زبردست سیاسی اور جنگی اہمیت کا حامل تھا۔ اس لیے حضرت عمروؓ بن العاص نے اسے بلا تسخیر چھوڑ کر اسکندریہ کی طرف بڑھنا مناسب نہ سمجھا۔ اس شہر کا سپہ سالار دومنتیانوس تھا جس کے پاس معمولی سی جمعیت اور معدودے چند کشتیاں تھیں جن پر سوار ہو کر اُسے مسلمانوں کے مقابلہ پر نکلنا تھا، لیکن جونہی اس کی نظر مسلمان لشکر پر پڑی اُس کے اوسان خطا ہو گئے اور فوج کو وہیں چھوڑ کر اپنی خاص کشتی میں بیٹھ کر اسکندریہ کی طرف بھاگ گیا۔ رُومی فوج نے اپنے سپہ سالار کو بھاگتا دیکھ کر کشتیوں کے ذریعہ بھاگنے کی کوشش کی مگر عرب حملہ آوروں نے انہیں جا لیا اور ایک ایک کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ اس کے بعد عربوں نے شہر میں داخل ہو کر اس پر قبضہ کر لیا۔

کریون

نقیوس سے نکل کر حضرت عمروؓ بن العاص قلعہ کریون پہنچے جو اسکندریہ سے اِدھر کے قلعوں کے سلسلہ کی آخری کڑی تھی اور جہاں رُومی سپہ سالار تھیوڈور نے پھر ایک دفعہ رُومیوں کی کثیر التعداد فوج اکٹھی کر کے مسلمانوں کے مقابلہ میں اپنا حوصلہ نکالنے کی تیاری کر رکھی تھی۔ بہر کیف جنگ کا آغاز ہونے کے بعد اگرچہ مختلف مقامات سے رُومیوں کو تازہ دم امدادی دستے پہنچتے رہے۔ تاہم مسلمان نے ہمت نہ ہاری اور آخر بارہ۱۲ چودہ۱۴ دن کی شدید جنگ کے بعد اللہ تعالیٰ کی امداد سے شہر معہ قلعہ کے ان کے قبضہ میں آ گیا۔

اسکندریہ کی فتح

کریون کی تسخیر کے بعد اسکندریہ کا راستہ بالکل صاف تھا، حضرت عمروؓ بن العاص نے یہاں کچھ عرصہ اپنی فوج کو آرام دیا اور پھر بلا مزاحمت سیدھے اسکندریہ جا پہنچے۔

---

[1] سیر الصحابہؓ مہاجرین حصہ دوم

یہ وہی اسکندریہ تھا جسے سکندر اعظم نے بحرِ ابیض پر تعمیر کر کے اپنے نام پر اس کا نام رکھا تھا اور اب رومی حکومت کا دوسرا دارالخلافہ اور ساری دنیا کا اہم تجارتی مرکز تھا، وہی اسکندریہ جو اپنی رونق، خوبصورتی، چمک دمک، استحکام، فصیلوں، عمارتوں، فوجی بارکوں، محلوں اور باغات کے لحاظ سے یکتائے زمانہ ہونے کے ساتھ انجنیئرنگ کا شاہکار اور اپنے سیاسی و جغرافیائی محلِ وقوع کے لحاظ سے بہت بڑی عظمت کا حامل تھا۔ آج محاذِ جنگ بن کر توحید پرستوں کی یلغار روکنے کی تیاری کر رہا تھا۔ پچاس ہزار کے لگ بھگ فوج جو اس کی مستحکم فصیلوں پر بڑی بڑی منجنیقیں نصب کر کے اس کی حفاظت پر مامور تھی، مسلمانوں کو شکست دینے کے لیے کیل کانٹے سے لیس بالکل تیار کھڑی تھی، شمال میں شہر کی حفاظت سمندر کر رہا تھا۔ جنوب میں بحیرۂ مرلوطا اور ایک نہر محافظ تھی۔ اور مغرب میں نہر ثعبان اس کا پہرہ دے رہی تھی۔ اب عربوں کی پیشقدمی کے لیے شہر کا ایک ہی راستہ رہ گیا تھا جو کریون اور اسکندریہ کے درمیان چلتا تھا۔ لہٰذا حضرت عمروؓ بن العاصؓ شہر کے مشرقی جانب حلوہ اور قصرِ فارس کے درمیان خیمہ زن ہو گئے۔[۱]

اسکندریہ کے باشندے اگرچہ مقابلہ کے لیے ہمہ تن تیار تھے تاہم مقوقس خود صلح کا خواہشمند تھا اس لیے اس نے مفاہمت کی درخواست کی، لیکن حضرت عمروؓ بن العاص نے انکار کر دیا، اب مقوقس کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا کہ وہ رومیوں کی خواہش کے مطابق جنگ کی تیاری کرے، چنانچہ اس نے قلعوں کی فصیل پر فوجوں کی صف بندی کی اور مسلمانوں کو مرعوب کرنے کے لیے عورتوں کو بھی شامل کر کے ان کے چہرے شہر کی طرف کر دیے۔ حضرت عمروؓ بن العاص نے کہلا بھیجا کہ ہم اس اہتمام کو سمجھتے ہیں لیکن یاد رکھو کہ ہم نے کبھی فوج کی کثرت کے بل پر میدان سر نہیں کیے ہیں، مقوقس چونکہ خود جنگ کے خلاف تھا، اس لیے اس نے اسکندریہ والوں کو ایک بار پھر سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ جنگ سے باز رہیں مگر اہلِ اسکندریہ نے اس کی ایک نہ سنی اور بڑے زور و شور سے لڑائی کی تیاریاں ہونے لگیں۔

مقوقس اگرچہ ہرقل کے خوف سے علی الاعلان لڑائی سے کنارہ کش نہیں ہو سکتا تھا۔ تاہم در پردہ وہ مسلمانوں سے صلح کی کوشش کرتا رہا۔ جب ہرقل کو مقوقس کی ان کوششوں کی اطلاع ہوئی تو وہ سخت برہم ہوا اور اسی وقت اسکندریہ فوجیں روانہ کر دیں، ادھر مقوقس نے حضرت عمروؓ بن العاص سے خفیہ معاہدہ کر لیا تھا کہ چونکہ ہم بدرجہ مجبوری اس میں شریک ہیں اس لیے قبطیوں کے ساتھ وہ سلوک نہ کرنا جس کے رومی مستحق ہیں اور جنگ کے دوران قبطیوں اور رومیوں میں امتیاز رکھنا، چنانچہ اس معاہدے کے بعد قبطی ہر طرح مسلمانوں کے مددگار رہے اور ان کے لیے راستہ صاف کراتے اور پلوں وغیرہ کی مرمت کرتے تھے۔

غرض اسکندریہ والوں کی تیاری کے بعد مسلمانوں نے اسکندریہ کا محاصرہ کر لیا، لیکن اس کے قلعے اس قدر مضبوط اور مستحکم تھے کہ دو مہینہ تک کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا اس دوران میں رومی کبھی کبھی قلعے سے باہر نکل کر لڑتے اور دو چار ہاتھ کے ردو بدل کے بعد قلعہ بند ہو جاتے۔ ایک دن نہایت سخت معرکہ ہوا۔ تیر و خدنگ سے گزر کر تلوار کی نوبت آئی، ایک رومی نے صف سے نکل کر کہا "کون مسلمان میرے مقابلہ میں آتا ہے؟ حضرت مسلمہؓ بن مخلد نے گھوڑا بڑھایا، مگر رومی نے پچھاڑ دیا۔ حضرت عمرؓ بن العاص نے غصہ میں کہا "زنخوں کو میدانِ جنگ میں آنے کی کیا ضرورت ہے"[۲] حضرت مخلد کو یہ طنز ناگوار گزرا مگر مصلحتاً خاموش رہے، اس اثنا میں لڑائی کا بازار

---

[۱] عمر فاروق اعظمؓ از محمد حسین ہیکل [۲] الفاروق حصہ اوّل

اور گرم ہو گیا، مسلمان رومیوں کو دباتے ہوئے قلعہ کے اندر گھس گئے، دیر تک قلعے کے صحن میں معرکہ رہا، لیکن پھر رومیوں نے سنبھل کر حملہ کیا اور مسلمانوں کو قلعہ سے باہر نکال کر دروازے بند کر لیے۔ اتفاق سے چار مسلمان اندر رہ گئے جن میں حضرت عمرو رضؓ بن العاص اور حضرت مسلمہ رضؓ بن مخلد بھی تھے۔ رومیوں نے ان چاروں کو زندہ گرفتار کرنے کی کوشش کی مگر جب انہوں نے مردانہ وار جان دینے کی ٹھانی تو رومیوں نے یہ شرط پیش کی کہ دونوں طرف سے ایک ایک آدمی مقابلہ کے لیے نکلے۔ اگر رومی مارا گیا تو ہم تم سب کو چھوڑ دیں گے، اور اگر مسلمان قتل ہوا تو تم ہتھیار ڈال دو گے، حضرت عمرو رضؓ بن العاص نے اس شرط کو بخوشی منظور کر لیا اور خود مقابلہ کے لیے نکلنا چاہا لیکن حضرت مسلمہ رضؓ نے روکا کہ اگر تم پر کوئی آنچ آگئی، تو انتظام میں خلل ہو گا، یہ کہہ کر خود گھوڑا بڑھایا اور اپنے رومی حریف پر قابو پا کر اس کا کام تمام کر دیا، رومیوں نے اپنا وعدہ پورا کیا اور مسلمانوں کو قلعہ سے باہر نکال دیا، بعد میں جب رومیوں کو پتہ چلا کہ ان لوگوں میں خود سپہ سالار حضرت عمرو رضؓ بن العاص بھی شامل تھے تو بے حد پشیمان ہوئے اور مخالف سردار کے اس طرح بچ نکلنے پر کفِ افسوس ملتے رہ گئے، رومی قلعہ سے باہر آنے کے بعد حضرت عمرو رضؓ بن العاص نے حضرت مسلمہ رضؓ سے اپنی پہلی گستاخی کی معافی مانگی اور انہوں نے نہایت صاف دلی سے انہیں معاف کر دیا۔

اسکندریہ کے محاصرہ کو تقریباً دو سال گزر چکے تھے، لیکن ہنوز روزِ اول کی سی حالت تھی، امیر المومنین حضرت عمر رضؓ اس تاخیر سے سخت پریشان تھے۔ چنانچہ آپ نے حضرت عمرو رضؓ کو لکھ کر بھیجا کہ شاید تم لوگ وہاں رہ کر عیسائیوں کی طرح عیش پرست بن گئے ہو، ورنہ اس قدر تاخیر نہ ہوتی، جس دن میرا خط پہنچے تمام فوج کو جمع کر کے جہاد پر خطبہ دو، اور پھر اس طرح حملہ کرو کہ جن کو میں نے افسر کر کے بھیجا ہے۔ فوج کے آگے ہوں اور تمام فوج یکبارگی دشمن پر ٹوٹ پڑے، حضرت عمرو رضؓ بن العاص نے امیر المومنین رضؓ کی ہدایات کے مطابق تمام فوج کو یکجا کر کے جہاد پر خطبہ دیا اور ایک ایسی مؤثر تقریر کی کہ بجھے ہوئے جوش تازہ ہو گئے۔ پھر فوج کو مرتب کر کے حضرت عبادہ رضؓ بن صامت جو بڑے رتبے کے صحابی رضؓ تھے، کے نیزے پر اپنا عمامہ لٹکا کر ان کے حوالے کیا کہ یہ علم ہے اور آپ اس فوج کے سردار ہیں۔ حضرت زبیر رضؓ بن العوام اور حضرت مسلمہ رضؓ بن مخلد کو فوج کا ہراول کیا، غرض اس سر و سامان کے ساتھ قلعے پر دھاوا ہوا کہ پہلے ہی حملے میں شہر فتح ہو گیا۔ حضرت عمرو رضؓ بن العاص نے اسی وقت حضرت معاویہ بن خدیج کو مژدۂ فتح کے ساتھ دربارِ خلافت میں بھیجا وہ بعجلت منازل طے کرتے ہوئے ٹھیک دوپہر کے وقت مدینہ پہنچے اور سیدھے مسجدِ نبویؐ میں چلے گئے۔ اتفاق سے حضرت عمر رضؓ کی لونڈی ادھر سے گزری اور ان کو مسافرانہ شکل میں دیکھ کر پوچھا تم کون ہو؟ کہا میں حضرت عمرو رضؓ بن العاص کا قاصد معاویہ رضؓ بن خدیج ہوں، اس نے حضرت عمر رضؓ کو خبر کی اور ساتھ ہی واپس آئی کہ چلو تم کو امیر المومنین رضؓ بلاتے ہیں، حضرت عمر رضؓ نے ان کے آنے تک کا انتظار بھی نہ کیا اور خود چادر سنبھال کر باہر نکلنے لگے کہ حضرت معاویہ رضؓ بن خدیج پہنچ گئے، دیکھتے ہی پوچھا کیا خبر لائے ہو؟ عرض کیا، اللہ تعالیٰ نے کامیاب کیا، حضرت عمر رضؓ فتح کی خوشخبری سن کر زمین پر گرے اور سجدۂ شکر ادا کیا، اُٹھ کر مسجد میں آئے، منادی کرائی، اور جب سب مدینہ اُمنڈ آیا، تو مسلمانوں کے سامنے خود حضرت معاویہ رضؓ کی زبان سے فتح کے حالات سنوائے، پھر پوچھا کہ تم سیدھے مسجد میں کیوں چلے گئے۔ عرض کیا، دوپہر کا وقت تھا خیال کیا کہ آپ آرام کرتے ہوں گے، جواب دیا، "کیا میں دن کو سو کر رعایا کو تباہ کرتا۔"[1]

[1] سیر الصحابہ رضؓ مہاجرین حصہ دوم

اسکندریہ کی فتح اگرچہ بزورِ شمشیر عمل میں آئی تھی تاہم مسلمانوں نے شہر کے امن و امان میں کوئی فرق نہ آنے دیا، عام آبادی میں سے نہ کسی کو قتل کیا اور نہ ہی قیدی بنایا بلکہ جزیہ اور خراج کی تشخیص کر کے ہر شہری کو مکمل آزادی کے ساتھ جینے کا حق دے دیا۔

حضرت عمروؓ بن العاص فتح اسکندریہ کے بعد فسطاط واپس آگئے اور یہاں الگ الگ قطعے متعین کر کے ایک شہر کی داغ بیل ڈالی۔ اب اگرچہ اسکندریہ اور فسطاط کے بعد مسلمانوں کا کوئی حریف نہ رہا تھا تاہم منتشر طور پر جابجا رُومی پھیلے ہوئے تھے جن کا قلع قمع ضروری تھا کہ آئندہ بغاوت کا احتمال نہ رہے، چنانچہ آپ نے حضرت خارجہؓ بن حذافہ کو فیوم، اشمونین، بشرودات، اخمیم، صعید اور عمیر بن وہب کو تنیس، دمیاط، تونہ، دمیرہ، شطا، دقہلہ اور بوصیر وغیرہ کی طرف بھیجا، جنہوں نے ان مقامات کو مسخر کیا اور عقبہ بن عامر الجہنی نے مصر کے تمام نشیبی حصے فتح کر کے مصر اور اسکندریہ کی فتح کو مکمل کر دیا۔

فتوحاتِ مغرب برقہ

اسکندریہ کی مکمل تسخیر کے بعد حضرت عمروؓ بن العاص نے برقہ کا رُخ کیا، جو فسطاط سے پچیس میل دور اسکندریہ اور طرابلس کے درمیان ایک نہایت زرخیز اور آباد قطعہ زمین تھا۔ یہ قطعہ متعدد شہروں پر مشتمل تھا اور انطابلس یہاں کا بڑا شہر تھا، حضرت عمروؓ بن العاص نے انطابلس پہنچ کر اس کا محاصرہ کر لیا، یہاں کے لوگ چونکہ بہت نرم خو اور اطاعت شعار تھے، اس لیے بغیر کسی مزاحمت کے جزیہ قبول کر لیا اور تیرہ ہزار دینار سالانہ پر صلح ہو گئی۔

زویلہ

برقہ سے فارغ ہو کر حضرت عمروؓ بن العاص نے حضرت عقبہ بن نافع کو زویلہ روانہ کیا جو سوڈان کی سرحد پر ایک آباد شہر تھا، برقہ اور زویلہ کی درمیانی آبادیوں نے بغیر کسی مزاحمت کے اطاعت قبول کر لی اور اہلِ زویلہ نے بھی یہی شعار اختیار کیا اور بخوشی جزیہ دینا منظور کر لیا۔

طرابلس

اسلامی فوجوں نے زویلہ کے بعد طرابلس کا رُخ کیا، یہ شہر بحرِ رُوم کے ساحل پر آباد ہے اور اُس زمانہ میں افریقہ کے ممتاز ترین مقامات میں تھا، حضرت عمروؓ بن العاص نے طرابلس کے مشرق میں فوجیں اُتار کر نہایت اہتمام کے ساتھ طرابلس کا محاصرہ کر لیا، جو برابر دو ماہ تک جاری رہا، چونکہ شہر میں داخل ہونے کا کوئی راستہ نہ مل رہا تھا اس لیے محاصرہ طول پکڑتا جا رہا تھا۔ اتفاق سے ایک دن کچھ مُسلمان دریا کے کنارے کنارے شکار سے واپس اپنے کیمپ میں آ رہے تھے کہ انہوں نے شہر کے قریب پہنچ کر دیکھا کہ شہر اور دریا کے درمیان فصیل یا کوئی شہر پناہ وغیرہ نہیں ہے اور دریا کے گھٹاؤ کی وجہ سے درمیان میں خشک راستہ بھی چھوٹا ہُوا ہے، انہوں نے واپس آ کر فوری طور پر حضرت عمرو بن العاص رضؓ کو اطلاع دی، آپ نے اسی راستے سے فوراً حملہ کرا دیا۔ اس ناگہانی یلغار سے اہلِ شہر بدحواس ہو گئے اور ہر طرف سے راہ فرار مسدود پا کر ہتھیار ڈال دیے۔ اس طرح تسخیر میں زیادہ دشواری نہ ہُوئی اور آسانی سے شہر فتح ہو گیا۔

صبراتہ (سبرة)

طرابلس کے مغرب میں ۶ کیلومیٹر کے فاصلہ پر ایک پرانا شہر صبراتہ تھا جو شمالی افریقہ کا سب سے بڑا شہر تھا اور تجارتی حیثیت میں طرابلس سے بھی بڑھا ہُوا تھا۔

اہلِ صبراتہ نے جب مسلمانوں کی آمد کے متعلق سُنا تو قلعہ بند ہو گئے مگر طرابلس کی تسخیر میں جب تاخیر ہوئی تو مطمئن ہو کر قلعہ بندی ترک کر دی اور اپنے روزمرہ کے کاروبار میں مشغول ہو گئے، اِدھر جب اچانک طرابلس فتح ہو گیا، تو حضرت عمروؓ بن العاص نے بغیر کسی توقف کے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کو کثیر التعداد سواروں کے ساتھ راتوں رات صبراتہ پہنچ جانے کا حکم دیا، یہ فوج صبح کو عین اس وقت پہنچی جب اہلِ شہر بے خبری کی حالت میں اپنے

مویشیوں کو چرانے وغیرہ کے لیے شہر سے باہر لے جا رہے تھے، مسلمان انہی دروازوں سے اندر داخل ہو گئے اور بزورِ شمشیر شہر پر قبضہ کر لیا۔

ان مہمات کے بعد حضرت عمرو بن العاص نے امیر المومنین رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ طرابلس فتح ہو چکا ہے، اب اگر حکم ہو تو افریقہ (تونس، مراکش اور الجزائر وغیرہ) کی طرف پیش قدمی کی جائے جو یہاں سے صرف نو دن کی مسافت پر ہے، لیکن دربارِ خلافت سے حکمِ امتناعی آ گیا کہ :

"افریقیا افریقہ نہیں بلکہ تفریق کنندہ، عہد شکنی کرانے والا ہے، افریقہ والوں نے ہمیشہ رومیوں کو ان کے واجبات کم ادا کیے اور عہد شکنیاں زیادہ کی ہیں۔" [۱]

چنانچہ اس حکم پر حضرت عمرو بن العاص نے پیش قدمی روک دی، فوراً مصر کی طرف پلٹ آئے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے آخیر تک وہیں مقیم رہے۔

مصر کی گورنری اور اسکندریہ کی بغاوت

ان فتوحات کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمرو بن العاص کو مصر کی حکومت پر سرفراز کیا۔ کچھ دنوں کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کا حادثۂ عظمیٰ پیش آیا اور ان کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سریر آرائے خلافت ہوئے۔ اسی زمانہ میں اہلِ اسکندریہ نے بغاوت کر دی، اس بغاوت کی وجہ بیان کرتے ہوئے مؤرخین لکھتے ہیں کہ اسکندریہ پر مسلمانوں کے قبضہ کے وقت سے رومی ہمیشہ اس کو واپس لینے کی فکر میں رہتے تھے۔ کیونکہ اسکندریہ بحرِ روم کی اہم ترین بندرگاہ تھی اور اس کے بعد تمام افریقی مقبوضات خطرہ میں پڑ گئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے خط و کتابت کر کے اسکندریہ کی رومی آبادی کو اپنے ساتھ ملا کر بغاوت کرا دی اور ان کی امداد کے لیے قسطنطنیہ سے ایک لشکرِ جرار بھیجا، لیکن قبطی آبادی نے حصہ نہ لیا اور مقوقس معاہدہ صلح پر قائم رہا۔ حضرت عمرو بن العاص کو اطلاع ہوئی تو مقابلہ کو نکلے، فریقین میں شدید معرکہ ہوا۔ رومی شکست کھا کر اسکندریہ میں داخل ہو گئے۔ مسلمانوں نے تعاقب کر کے جہاں تک ہو سکا۔ انہیں تہ تیغ کیا، رومی سپہ سالار منویل خصی لڑائی میں کام آیا، رومیوں کو جب یہاں بھی پناہ نہ ملی تو اسکندریہ سے بھاگ نکلے اور راستے کی قبطی آبادیوں کو ان کے عدمِ تعاون کی وجہ سے اپنے انتقام کا نشانہ بناتے ہوئے نکل گئے۔ مسلمان دوبارہ قابض ہوئے، تو قبطی حضرت عمرو بن العاص کے پاس فریادی بن کر آئے کہ مسلمانوں کی حمایت کے جرم میں رومی ان کا تمام مال و متاع لوٹ کر لے گئے ہیں جو واپس دلایا جائے۔ حضرت عمرو بن العاص نے شناخت کرا کے ان کا مال واپس دلایا اور آئندہ بغاوت کے خطرہ سے بچنے کے لیے اسکندریہ کی شہر پناہ تڑوا دی۔ [۲]

معزولی

اہلِ سیر کے مطابق ۲۶ھ کے آخر یا ۲۷ھ کے شروع میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت عمرو بن العاص کو مصر کی گورنری سے علیحدہ کر دیا اور حضرت عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کو (جنہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے آخر عہدِ خلافت میں مصر کے ایک چھوٹے سے حصہ سعیدِ مصر کا والی بنایا تھا) ان کی جگہ مصر کی گورنری پر سرفراز کیا، مؤرخین نے اس معزولی کی متعدد وجوہ لکھی ہیں جن میں زیادہ قابلِ ذکر یہ ہے کہ حضرت عمرو بن العاص طبعاً کچھ سرکش واقع ہوئے تھے۔ اس لیے جلد ان کی سیاست حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی سیاست سے متصادم ہو گئی۔ جس کے باعث باہمی اختلافات پیدا ہونا شروع ہو گئے۔ اس پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ حضرت عمرو بن العاص صرف

---

[۱] فتوح البلدان حصہ اوّل۔ [۲] سیر الصحابہؓ مہاجرین حصہ دوم۔

امورِ حربیہ کے والی رہیں اور حضرت عبداللہ بن سعدؓ امورِ مال کے منتظم ہو جائیں، حضرت عمروؓ بن العاصؓ پہلے ہی حضرت عبداللہؓ کا سعید مصر سے تعلق بمشکل برداشت کیے ہوئے تھے کہ اس انتظامی تبدیلی نے دونوں کے تعلقات اور زیادہ کشیدہ کر دیے اور دونوں ایک دوسرے کے خلاف دربارِ خلافت میں شکایات بھیجنے لگے، حضرت عبداللہ بن سعدؓ لکھتے کہ حضرت عمروؓ بن العاص خراج کی وصولی میں رکاوٹ ڈالتے ہیں اور حضرت عمروؓ بن العاصؓ یہ اطلاع دیتے کہ حضرت عبداللہؓ جنگی تدبیروں میں رخنہ اندازی کرتے ہیں، بہرکیف یہ صورتِ حال زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی اور امیرالمومنین حضرت عثمانؓ نے حضرت عمروؓ بن العاص کو معزول کر کے حضرت عبداللہؓ بن سعدؓ کو مصر کا مستقل والی بنا دیا۔

اہلِ سیر کے مطابق حضرت عمروؓ بن العاص اس معزولی پر حضرت عثمانؓ سے اس درجہ برہم ہوئے کہ جب آپ معزول ہو کر مدینہ آئے اور حضرت عثمانؓ سے ملاقات ہوئی تو آپ خلیفۂ وقت کی باتوں کا ٹھیک ٹھیک جواب تک نہ دیتے تھے۔ کہتے ہیں کہ امیرالمومنینؓ سے پہلی ملاقات کے وقت حضرت عمرو بن العاصؓ روئی کا ایک جُبّہ پہنے ہوئے تھے۔ حضرت عثمانؓ نے ان سے پوچھا کہ اس جُبّہ میں کیا بھرا ہے؟ جواب دیا، عمروؓ بن العاص، اس پر حضرت عثمان نے فرمایا، یہ تو میں بھی جانتا ہوں، میرا مطلب یہ ہے کہ روئی ہے یا کوئی اور چیز؟ حضرت عثمانؓ نے پھر حضرت عبداللہ بن سعد کے متعلق پوچھا کہ تم نے مصر میں عبداللہؓ کو کس حال میں چھوڑا؟ کہا اپنی ذات کے لیے بڑے طاقتور اور اللہ کے لیے بیحد کمزور۔" امیرالمومنینؓ نے فرمایا: "میں نے انہیں تمہارے نقشِ قدم پر چلنے کی ہدایت کی تھی۔" جواب دیا۔ آپ نے ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ ان پر ڈالا۔" اس وقت والیٔ مصر حضرت عبداللہؓ کا بھیجا ہوا خراج پہنچ چکا تھا، جو تعداد میں حضرت عمروؓ بن العاصؓ کے دور کے خراج سے بہت زیادہ تھا، حضرت عثمانؓ نے خراج کی اس زیادتی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: "دیکھو اونٹنی نے دودھ دیا" حضرت عمروؓ بن العاص نے جواب دیا "ہاں، لیکن بچے بھوکے رہ جائیں گے۔"[1]

حضرت عمروؓ بن العاص اگرچہ اپنی معزولی کے باعث حضرت عثمانؓ سے برہم تھے تاہم آپ حضرت عثمانؓ کے اسی طرح خیر خواہ رہے جس طرح معزولی سے قبل تھے۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ کے خلاف جب مصر سے باغیوں کا گروہ چلا اور حضرت عثمانؓ کو اس کی خبر ہوئی تو آپ نے حضرت عمروؓ بن العاص کو ان لوگوں کو سمجھانے کے لیے بھیجا۔ حضرت عمروؓ بن العاص نے اپنے سابق اثر و رسوخ سے کام لے کر ان کو واپس کر دیا اور شہر کے لوگوں کو جمع کر کے حضرت عثمانؓ کی طرف سے صفائی پیش کی۔

حضرت عثمانؓ کو خود حضرت عمرو بن العاصؓ پر اس قدر اعتماد تھا کہ جب کوئی مشکل پیش آتی تو آپ ان سے مشورہ کرتے اور یہ بھی نہایت خیرخواہانہ مشورہ دیتے سازش کے زمانہ میں جب باغیوں نے اپنے مطالبات پیش کیے تو حضرت عثمانؓ نے ان مطالبات پر غور کرنے کے لیے ایک مجلسِ شوریٰ منعقد کی جس کے ایک رکن حضرت عمرو بن العاصؓ سے ان کی رائے پوچھی، انہوں نے اپنی مخلصانہ رائے دیتے ہوئے کہا کہ آپ ضرورت سے زیادہ نرمی کرتے ہیں اور گرفت کے وقت چشم پوشی کر جاتے ہیں آپ نے حضرت عمرؓ سے زیادہ لوگوں کو آزادی دے رکھی ہے لہٰذا میرا مشورہ یہ ہے کہ ملکی انتظام میں اپنے پیشرو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے نقشِ قدم پر چلیے اور نرمی کے موقع پر نرمی اور سختی کے موقع

---

[1] سیر الصحابہؓ مہاجرین حصہ دوم

پر سختی سے کام لیتے۔ [1]

فلسطین کی سکونت

معزولی کے بعد حضرت عمرو بن العاصؓ نے سیاسی زندگی ترک کرکے فلسطین میں اقامت اختیار کرلی، آپ کبھی کبھی مدینہ آتے اور پھر لوٹ جاتے، جن دنوں حضرت عثمانؓ محصور تھے آپ مدینہ میں ہی تھے، لیکن جب دیکھا کہ حالات قابو سے باہر ہو گئے ہیں اور فتنہ و فساد کی آگ کسی طرح بھی بجھنے میں نہیں آتی تو یہ کہہ کر کہ "حضرت عثمانؓ کے قتل میں جس کا ہاتھ ہوگا اس کو خدا ذلیل کرے گا جو شخص ان کی مدد نہ کرسکتا ہو اُس کو مدینہ چھوڑ دینا چاہیئے" خود شام چلے گئے مگر دل میں برابر کھٹکا لگا رہا چنانچہ ہر آنے جانے والے سے حالات پُوچھ لیا کرتے تھے، یہاں تک کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کا واقعۂ کبریٰ پیش آیا پھر حضرت علیؓ خلیفہ بنے اور جنگِ جمل کا ہنگامہ ہُوا، مگر آپ ان ہنگاموں سے دُور رہے اور اپنے گوشۂ تنہائی سے باہر قدم نہ نکالا۔

عہدِ علیؓ و معاویہؓ

حضرت علیؓ کے عہدِ خلافت کی ابھی ابتداء ہی ہوئی تھی کہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ میں اختلاف شروع ہو گیا حضرت علیؓ نے حضرت جریرؓ بن عبداللہ بجلی کو امیر معاویہؓ کے پاس اس مطالبہ کے ساتھ بھیجا کہ وہ بیعت کریں ورنہ جنگ کے لئے تیار ہو جائیں، امیر معاویہؓ نے حضرت علیؓ کے اس مطالبہ پر اپنے خاندان والوں سے مشورہ کیا عتبہ بن ابُو سفیان نے حضرت عمرو بن العاصؓ سے مشورہ کرنے کے متعلق رائے دی، حضرت عمروؓ بن العاص اس وقت فلسطین میں تھے چنانچہ بلائے گئے امیر معاویہؓ نے ان کے سامنے تین باتیں پیش کرکے ان کا مشورہ طلب کیا، اوّل، یہ کہ محمد بن حنیفہ اپنے ساتھیوں سمیت جیل خانہ توڑ کر فرار ہو گئے ہیں دوسرے قیصرِ روم شام پر حملہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، تیسرے حضرت علیؓ نے بیعت کا مطالبہ کیا ہے اور انکار کی صُورت میں جنگ کی دھمکی دی ہے حضرت عمرو بن العاصؓ نے انہیں مشورہ دیا کہ محمد بن حنفیہ کی تلاش کراؤ، مل جائیں تو بہتر ورنہ کوئی حرج نہیں، قیصرِ روم کے قیدی چھوڑ کر اس سے صُلح کرلو، حضرت علیؓ کا معاملہ البتہ بہت اہم ہے کیونکہ مسلمان کبھی بھی تم کو حضرت علیؓ پر ترجیح نہیں دیں گے، امیر معاویہؓ نے کہا وہ قتلِ عثمانؓ میں معاون تھے اور انہوں نے مسلمانوں میں پھوٹ ڈال کر فتنہ پیدا کیا اس پر حضرت عمرو بن العاصؓ نے کہا کہ حضرت علی کو سبقتِ اسلام اور قرابت نبویؐ کی وجہ سے جو شرف حاصل ہے تم ہرگز اس کی برابری نہیں کر سکتے مزید میں خواہ مخواہ تمہارے مقصد کے حصول کے لئے تمہاری مدد کیوں کروں؟ امیر معاویہؓ نے کہا آخر تم چاہتے کیا ہو؟ کہا۔

> اگر آپ مجھے مصر دے سکتے ہیں تو میں اپنے آپ کو بھی اس سودے میں نفع مند سمجھوں گا اور آپ بھی مصر دے کر ایک ایسے بوڑھے کو حاصل کرلیں گے جو نفع اور نقصان دونوں کی مقدرت رکھتا ہے۔ [2]

اس کے جواب میں امیر معاویہؓ نے مصر کی حکومت دینے کا تحریری وعدہ کر لیا، اس عہد و پیمان کے بعد حضرت عمرو بن العاصؓ نے امیر معاویہؓ کو مشورہ دیا کہ اہلِ شام کے دلوں میں یہ بات راسخ کر دو کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت میں حضرت علیؓ کا ہاتھ تھا پھر ان لوگوں کو اُن کی مخالفت پر آمادہ کرو، بصورتِ دیگر کامیابی کا کوئی امکان نہیں، مزید مشورہ دیا کہ شام کے با اثر آدمی شرحبیل بن سمط کندی کو بلا کر انہیں اپنا ہمنوا بناؤ۔ امیر معاویہؓ نے حضرت عمرو بن العاصؓ کی بتائی ہوئی تدبیروں سے عمائدِ شام کو یقین دلایا کہ حضرت عثمانؓ کے خونِ بے گناہی میں حضرت علیؓ کا ہاتھ بھی رنگین ہے۔ عمائدِ شام کی طرح جب شرحبیل بن سمط کندی کو بھی اس امر کا پورا یقین ہوگیا، تو اس نے شام کا دورہ کرکے لوگوں کو حضرت علیؓ کے خلاف اُبھارنا

---

[1] سیر الصحابہؓ مہاجرین حصہ دوم [2] حضرت عمرو بن العاص مؤلفہ محمد فرج مصری

شروع کر دیا۔

اسی اثناء میں حضرت نعمان رضؓ بن بشیر مدینہ سے خلیفۂ مظلوم کی زوجہ حضرت نائلہ رضؓ کی کٹی ہوئی انگلیاں اور خون آلود پیراہن لے کر شام پہنچ گئے، جس میں حضرت عثمان رضؓ شہید کیے گئے تھے، امیر معاویہ رضؓ نے ان اشیا کو جامع دمشق میں نمائش کے لیے آویزاں کر کے، لوگوں کے جذبات بھڑکانے میں کوئی دقیقہ فردگذاشت نہ کیا۔ اس سے اہلِ شام کے جذبات بھڑک اُٹھے، لوگ جوق در جوق آتے اور اس دردناک منظر کو دیکھ کر زار و قطار روتے۔ یہاں تک کہ انہوں نے قسم کھائی کہ جب تک قاتلینِ عثمان رضؓ سے انتقام نہ لیں گے اس وقت تک، نہ بستر پر لیٹیں گے نہ عورتوں کو چھوئیں گے۔[1]

اس کے بعد طرفین نے پوری شدومد کے ساتھ جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں، حضرت عمرو بن العاص رضؓ شامی افواج کے امیر العسکر مقرر ہوئے اور پھر اس جنگ کی ابتداء ہوئی جو تاریخِ اسلام میں جنگِ صفین کے نام سے مشہور ہے۔ اس جنگ کا سلسلہ مدتوں جاری رہا۔ آخری فیصلہ کن معرکہ کے بعد جب امیر معاویہ رضؓ کو یقین ہو گیا کہ شکست یقینی ہے، تو انہوں نے حضرت عمرو بن العاص رضؓ سے کہا:

"ابن العاص ہم تو ہلاک ہو گئے، اب تم اپنی پوشیدہ قوتوں کو حرکت میں لاؤ۔"[2]

حضرت عمرو بن العاص رضؓ جو اہلِ عرب میں ایک مشہور مدبر مانے جاتے تھے اس یقینی شکست سے بچنے کے لیے ایک ایسی تدبیر عمل میں لائے جس سے حالات کا رخ یکایک پلٹ گیا۔ مؤرخین کے مطابق حضرت عمرو بن العاص رضؓ نے شامی لشکر کو حکم دیا کہ:

"اے لوگو، جس شخص کے پاس تم میں سے کلام اللہ کے اجزا ہوں، وہ ان کو اپنے نیزے پر بلند کرے۔"

اہلِ لشکر نے ایسا ہی کیا، چنانچہ جوں ہی مصاحف نیزوں پر اٹھائے گئے، شامی لشکر سے یہ آوازیں بلند ہونے لگیں۔

"یہ اللہ کی کتاب فیصل ہے ہمارے اور تمہارے درمیان۔"

حضرت علی رضؓ کے لشکر نے بھی شامی فوجوں کے نعروں کے جواب میں یہی نعرہ بلند کیا کہ "ہم کتاب اللہ کے فیصلے کا استقبال کرتے ہیں" اور اس طرح حضرت عمرو بن العاص رضؓ اس جمعیت اور شدت کو توڑنے میں کامیاب ہو گئے۔ جو حضرت علی رضؓ کے لشکر میں پائی جاتی تھی۔ حضرت علی رضؓ نے ہر چند لوگوں کو سمجھایا کہ یہ محض فریب ہے۔ لیکن کسی نے ادھر توجہ نہ دی۔ آخر جب کوفی لشکر میں اختلاف کا خطرہ بڑھا، تو آپ بھی چار و ناچار اسی بات پر آمادہ ہو گئے۔

دوسرے دن تحکیم کا طریقہ طے کرنے کے لیے حضرت علی رضؓ اور امیر معاویہ رضؓ کے درمیان نامہ و پیام شروع ہوا۔ بالآخر طے پایا کہ دونوں طرف سے ایک ایک حکم مقرر ہو۔ دونوں مل کر کتاب اللہ کے مطابق جو فیصلہ دیں گے وہ فریقین کے لیے واجب التسلیم ہو گا۔ اس پر امیر معاویہ رضؓ کی طرف سے حضرت عمرو بن العاص رضؓ اور حضرت علی رضؓ کی جانب سے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضؓ حکم مقرر ہوئے اور ثالثی نامہ تحریر ہوا، جس کا خلاصہ یہ تھا:

"حکمین اختلافِ اُمت کا خیال رکھتے ہوئے کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رو سے عدل و

---

[1] طبری حصہ سوم۔ [2] حضرت عمرو بن العاص رضؓ مؤلفہ محمد فرج مصری۔

انصاف کے ساتھ جو فیصلہ کر دیں گے وہ طرفین کے لیے واجب التسلیم ہوگا اور جو فریق اس کو نہ مانے گا اس کے خلاف دونوں حکم مدد دیں گے۔ [۱]

اس ثالثی کے بعد دونوں نے اپنی اپنی فوجیں پیچھے ہٹالیں اور حکمین نے فیصلہ کے مقام دومۃ الجندل میں پہنچ کر آپس میں تبادلہ خیالات شروع کر دیا۔

اس ضمن میں حضرت عمرو بن العاصؓ اور حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ میں متعدد ملاقاتیں ہوئیں، بڑی بحث و تمحیص کے بعد دونوں اس نتیجہ پر پہنچے کہ حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ دونوں کو معزول کر کے مسلمانوں کو نئے سرے سے خلیفہ کے انتخاب کا موقع دیا جائے۔ [۲]

چونکہ بعض عاقبت اندیش اور سمجھ دار لوگوں کو حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی سادگی اور حضرت عمرو بن العاصؓ کی ہوشمندی سے خطرہ تھا، اس لیے انہوں نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو سمجھایا کہ اگر آپ لوگ کسی متفقہ فیصلے پر پہنچ چکے ہیں، تو اس کے اعلان میں سبقت نہ کیجیے گا، لیکن حضرت ابوموسیٰؓ نے ان خدشات کو قطعی قابلِ توجہ نہ سمجھا کیونکہ ان کے نزدیک دونوں حکمین کے درمیان طے پا جانے والے متفقہ فیصلے میں کسی انکار یا انحراف کی گنجائش نہ تھی، بہرکیف مقررہ تاریخ پر فریقین دومۃ الجندل کی جامع مسجد میں جمع ہوئے۔

جب فیصلہ سنانے کا وقت آیا تو حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے حضرت عمرو بن العاصؓ سے فرمایا کہ وہ منبر پر چڑھ کر فیصلہ سنائیں لیکن انہوں نے ازراہِ ادب انکار کیا اور کہا "میں آپ پر سبقت نہیں کر سکتا، آپ فضل و منقبت میں، سن و سال میں غرض ہر حیثیت سے مجھ سے افضل ہیں اور ہمارے بزرگ ہیں" حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ پر ان الفاظ کا ایسا جادو چلا کہ انکار نہ کر سکے۔ چنانچہ بغیر کسی لیت و لعل کے کھڑے ہو گئے اور خدا کی حمد و ثنا کے بعد لوگوں سے کہا کہ صاحبو! بہت غور و فکر کے بعد ہم دونوں اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ علیؓ اور معاویہؓ دونوں کو معزول کیے بغیر امت کی اصلاح نہیں ہو سکتی اس لئے میں نے ان دونوں کو معزول کیا اب آپ لوگوں کو اختیار ہے کہ جس کو خلافت کا اہل سمجھیں اس کو اپنا خلیفہ بنالیں۔

حضرت ابوموسیٰؓ کے خطاب کے بعد حضرت عمرو بن العاصؓ کھڑے ہوئے اور کہا۔

"صاحبو! آپ لوگوں نے ابوموسیٰؓ کا فیصلہ سن لیا انہوں نے علیؓ اور معاویہؓ دونوں کو معزول کیا میں بھی علیؓ کو معزول کرتا ہوں لیکن معاویہؓ کو برقرار رکھتا ہوں"

حضرت عمرو بن العاصؓ کے اس فیصلے سے مجمع پر سناٹا چھا گیا حضرت ابوموسیٰ نے اس پر احتجاج کیا لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا اور اب اس کی تلافی کی کوئی صورت نہ تھی، اس فیصلہ سے قدرتاً حضرت علیؓ کے حامیوں میں سخت برہمی پیدا ہو گئی اور قریب تھا کہ تلواریں میان سے نکل پڑیں لیکن شامیوں نے فوراً حضرت ابوموسیٰؓ کو اونٹ پر بٹھا کر مکہ روانہ کر دیا اور معاملہ رفت گزشت ہو گیا

مصر پر حملہ: اس فیصلہ کے بعد حضرت عمرو بن العاصؓ نے امیر معاویہؓ کے ایماء سے مصر پر توجہ کی اس وقت حضرت علیؓ کی طرف سے محمد بن ابوبکرؓ گورنر تھے حضرت عمرو بن العاصؓ نے حضرت مسلمہ بن مخلد انصاریؓ اور حضرت معاویہؓ بن خدیج کندی سے جو قتل عثمانؓ کے باعث رنجیدہ اور مصر میں مقیم تھے، خط و کتابت شروع کی یہ دونوں چونکہ حضرت علیؓ کے مخالف تھے اس لیے ساتھ دینے پر آمادہ ہو گئے اس کے بعد

---

[۱] سیر الصحابہؓ مہاجرین حصہ دوم [۲] بحث کا خلاصہ حضرت علیؓ کے حالات میں ملاحظہ فرمائیے

حضرت عمرو بن العاصؓ نے چھ ہزار فوج کے ساتھ مصر کی طرف کوچ کیا اور مصر کی حدود میں داخل ہو کر محمد بن ابوبکرؓ کو لکھا ۔

"اما بعد اے ابوبکرؓ کے بیٹے اپنی جان کی حفاظت چاہتے ہو تو میرا راستہ صاف کر دو۔ میں بھی یہ بات پسند نہیں کرتا کہ میرا تھپنگل تم پر پڑے۔ اس سرزمین کے لوگ تم سے برگشتہ تمہاری حکومت سے ناخوش اور تمہاری اطاعت پر شرمندہ ہیں اگر بات بگڑ گئی تو وہ خود تمہیں ہمارے حوالے کر دیں گے اس لئے بہتری اسی میں ہے کہ تم مصر سے نکل جاؤ اور میری نصیحت قبول کر لو۔ والسلام۔"

محمّد بن ابوبکرؓ نے یہ خط حضرت علیؓ کو بھیج دیا، دربار خلافت سے مقابلہ کرنے کا حکم آیا اس پر محمّد بن ابی بکرؓ مقابلے کے لئے تیار ہو گئے فریقین شہر مُسنّاۃ میں صف آرا ہوئے دونوں فوجوں میں شدید معرکہ ہوا کنانہ جو مصری فوج کے قوّتِ بازو تھے جب میدان میں کام آ گئے تو مصری فوج کے پاؤں اکھڑ گئے اور ان کا اکثر حصہ موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا محمّد بن ابوبکرؓ شکست کے آثار دیکھ کر پہلے ہی نکل گئے تھے، معاویہؓ بن خدیج کندی نے تعاقب میں آدمی بھیجے جو اُنہیں ایک کھنڈر سے گرفتار کر لائے معاویہؓ بن خدیج نے اُنہیں قتل کر دیا ۔

حضرت عمرو بن العاصؓ فسطاط میں تھے کہ اُنہیں صفر ۳۸ھ میں امیر معاویہ کا حکم پہنچا کہ تمہیں مصر کا حاکم بنایا جاتا ہے اور مصر تمہیں اس شرط پر دے دیا گیا ہے کہ فوج کا خرچ تمہارے ذمہ ہو گا اور اس کے بعد جو کچھ بچے گا اس کے مالک تم خود ہو گے۔[1]

مؤقف میں اختلاف

مؤرخین کے مطابق اگرچہ حسب وعدہ امیر معاویہؓ نے حضرت عمرو بن العاصؓ کو مصر کا گورنر بنا دیا تھا تاہم ان کے نزدیک یہ سب کچھ حضرت عمرو بن العاصؓ کے استحقاق سے زیادہ تھا، شاید اس کا پس منظر یہ ہو کہ حضرت معاویہؓ ان کی طاقت اور ہوشیاری کا اندازہ لگانے کے بعد اس بات سے خائف ہو گئے ہوں کہ حضرت عمروؓ بن العاصؓ کبھی نہ کبھی دمشق پر ضرور ہاتھ ماریں گے۔ اور دوسری طرف حضرت عمروؓ بن العاص کا مؤقف یہ تھا کہ ان کی خدمات کے پیش نظر مصر اور شام دونوں انہیں ملنا چاہئیں، چنانچہ دونوں میں جو خط و کتابت ہوئی اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خلیفۂ اُموی اور والئ مصر کے درمیان شکر رنجی پیدا ہو گئی تھی۔ امیر معاویہؓ نے جو انہیں مُراسلہ بھیجا اس کا ایک فقرہ یہ تھا کہ ؛

"بشرطیکہ کوئی شرط اطاعت کو نہ توڑے۔"

اس کے جواب میں حضرت عمرو بن العاصؓ نے لکھا کہ ؛

"بشرطیکہ کوئی اطاعت شرط کو نہ توڑے۔"

بہر حال جب یہ کشیدگی بڑھی تو حضرت معاویہؓ بن خدیج کندی نے بیچ میں پڑ کر باہمی صُلح کرا دی اور ابن سعد کے مطابق۔

"انہوں نے دونوں کے درمیان ایک اقرار نامہ لکھا جس میں لوگوں کے لیے اور خاص کر معاویہؓ اور عمروؓ پر کچھ شرطیں مقرر کیں، یہ کہ عمروؓ کے لیے سات سال تک مصر کی ولایت ہو گی، بہ ایں شرط کہ عمروؓ پر معاویہؓ کی اطاعت و فرمانبرداری ضروری ہو گی۔ اس پر دونوں نے اعتبار

---

[1] حضرت عمرو بن العاصؓ مؤلفہ محمّد فرج مصری [2] ایضاً۔

اور اقرار کرلیا اور دونوں نے اپنے اپنے اُوپر گواہ بنالیے۔" [1]

قاتلانہ حملہ معرکۂ نہروان میں خارجیوں کی شکست اور قتلِ عام کے بعد اُن کے باقی ماندہ افراد میں جذبۂ انتقام شدید ہوگیا تھا اس لیے تین خارجیوں نے اس مشورہ کے بعد کہ اسلام میں فتنہ و فساد حضرت علیؓ، امیر معاویہؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ کی وجہ سے ہے، اس بات کا پختہ عہد کیا کہ ایک ہی وقت میں اِن تینوں کا قصہ پاک کر دینا چاہیے، چنانچہ ابن ملجم، برک بن عبداللہ اور عمرو بن بکر التمیمی بالترتیب حضرت علیؓ، امیر معاویہؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ کو قتل کرنے کے ارادہ سے نکلے اور ۱۷ رمضان المبارک ۴۰ھ کی مقررہ شب کو تینوں صحابہؓ پر حملہ کیا۔ ابن ملجم نے حضرت علیؓ کو شہید کر دیا، امیر معاویہؓ کا قاتل ہمت ہار گیا اور حضرت عمرو بن العاصؓ کے قاتل نے دھوکہ میں ان کی بجائے قاضیٔ مصر خارجہ بن حذافہ کو قتل کر دیا، جو قتل کے وقت حضرت عمرو بن العاصؓ کی علالت کے باعث نماز پڑھا رہے تھے، قاتل کو گرفتار کر کے جب حضرت عمروؓ بن العاص کے سامنے پیش کیا گیا، تو وہ کہہ رہا تھا کہ:

"میں نے عمروؓ کا ارادہ کیا لیکن اللہ نے خارجہ کا ارادہ کر لیا۔"

اتنا کہہ کر وہ رو پڑا۔ حضرت عمروؓ بن العاص نے اس طرح بزدلی سے رونے کا سبب پوچھا۔ قاتل نے جواب دیا: خدا کی قسم میں موت سے ڈر کر نہیں رو رہا، بلکہ اس صدمہ میں رو رہا ہوں کہ میرے دونوں ساتھی تو علیؓ اور معاویہؓ کے قتل میں کامیاب ہو جائیں گے اور میں ناکام رہ گیا۔ پھر حضرت عمروؓ بن العاصؓ نے اس کی گردن مار دینے کا حکم دیا اور نعش کو سُولی پر لٹکا دیا۔ [2]

وفات حضرت عمروؓ بن العاص جو رمضان المبارک ۴۰ھ میں عمرو بن بکر التمیمی کی تلوار سے بچ گئے تھے۔ تین سال بعد طلبو موت کی آغوش میں چلے گئے، آپ ۴۳ھ میں اپنے عہدِ حکومت میں بیمار ہوئے جب زندگی کی زیادہ اُمید نہ رہی تو اپنی گزشتہ لغزشوں پر بہت نادم تھے۔

ابن عباسؓ عیادت کو آئے۔ سلام کے بعد پوچھا ابو عبداللہ کیا حال ہے؟ جواب دیا: کیا پوچھتے ہو، دنیا کم بنائی مگر دین زیادہ بگاڑا، اگر اس کو بگاڑا ہوتا جس کو بنایا ہے اور اُسے بنایا ہوتا جسے بگاڑا ہے تو یقیناً کامیاب ہوتا۔ آخر عمر کی آرزو فائدہ مند ہوتی، تو ضرور آرزو کرتا، اگر بھاگنے سے بچ سکتا تو ضرور بھاگتا مگر اب منجنیق کی طرح آسمان اور زمین کے درمیان معلق ہوں، نہ ہاتھوں کے سہارے اُوپر چڑھ سکتا ہوں نہ پاؤں کے سہارے نیچے اُتر سکتا ہوں۔ اے بھتیجے! مجھ کو کوئی ایسی نصیحت کر کہ اس سے فائدہ اُٹھاؤں۔" ابن عباسؓ نے کہا افسوس اب وہ وقت کہاں، اب وہ بھتیجا بوڑھا ہو کر آپ کا بھائی بن گیا ہے۔ اگر آپ رونے کے لیے کہیں تو میں رونے کے لیے تیار ہوں۔ مقیم سفر کا کیسے یقین کر سکتا ہے۔ حضرت عمروؓ بن العاص نے کہا، اس وقت اسّی برس سے کچھ اوپر میری عمر ہے اور تو مجھ کو پروردگار کی رحمت سے ناامید کرتا ہے، خدایا! یہ ابن عباسؓ مجھ کو تیری رحمت سے ناامید کر رہا ہے۔ ابھی تو مجھے یہاں تک تکلیف دے کر راضی ہو جا۔ ابن عباسؓ نے کہا، ہیہات ابو عبداللہ جو چیز لی تھی وہ تو نئی تھی اور جو دے رہے ہو وہ پرانی ہے۔ حضرت عمرو بن العاصؓ نے کہا، ابن عباسؓ تم کو کیا ہو گیا ہے، جو بات میں کہتا ہوں تم اس کو اُلٹا کہتے ہو۔ [3]

---

[1] طبقات ابن سعد، حصہ چہارم [2] حضرت عمرو بن العاصؓ مؤلفہ محمد فرج مصری [3] سیر الصحابہ مہاجرین حصہ دوم

عوانہ بن الحکم سے مروی ہے کہ حضرت عمرو بن العاص رضؓ کہا کرتے کہ اس شخص پر تعجب ہے کہ جو موت کے قریب ہو کر ہوش بجا رکھتا ہو مگر موت کی کیفیت بیان نہ کرے، چنانچہ جب ان پر یہی حالت طاری ہوئی، تو اُن کے بیٹے عبداللہ نے انہیں یہ بات یاد دلائی اور کہا کہ آپ موت کے متعلق بیان کیجئے کیونکہ آپ کی عقل آپ کے ساتھ ہے۔ اس پر حضرت عمرو بن العاص نے جواب دیا: "اے میرے بیٹے موت اس سے برتر ہے کہ اسے بیان کیا جائے، لیکن مَیں اس میں سے کچھ تم سے بیان کروں گا۔ میں اپنے آپ کو اس حالت میں پاتا ہوں کہ گویا میری گردن پر کوہِ رضویٰ ہے، میرے پیٹ میں کھجور کے کانٹے ہیں، اور میری سانس سوئی کے ناکے سے نکلتی ہے۔" لہ

ابن سعدؒ نے ابن شماسہ مہری سے روایت کی ہے کہ جس وقت حضرت عمروؓ بن العاص موت کے آثار میں تھے، تو ہم لوگ ان کے پاس حاضر ہوئے، وہ دیوار کی طرف اپنا مُنہ پھیر کر خوب رو رہے تھے۔ ان کے بیٹے عبداللہ نے دلاسہ دیا کہ آپ کو کیا چیز رُلاتی ہے؟ کیا آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فلاں فلاں بشارتیں نہیں دی ہیں؟ وہ اس پر بھی رو رہے تھے اور ان کا مُنہ دیوار کی طرف تھا۔

پھر انہوں نے ہماری طرف مُنہ کیا اور کہا میرے پاس افضل ترین دولت

لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔

کی شہادت ہے۔ مجھ پر زندگی کے تین دور گزرے ہیں، ایک دور وہ تھا کہ میرے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کوئی قابل بغض و عداوت نہ تھا۔ مجھے اس سے زیادہ کوئی امر پسند نہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قابو پاؤں اور آپ کو قتل کر دوں، اگر مَیں اس حالت میں مَر جاتا تو اہلِ دوزخ میں سے ہوتا۔ پھر اللہ عزّ وجل نے میرے دل میں اسلام ڈال دیا۔ مَیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا کہ آپ سے بیعت کروں۔ عرض کی یا رسُول اللہ! آپ اپنا ہاتھ پھیلائیے مَیں بیعت کروں گا۔ جب حضورؐ نے ہاتھ پھیلایا تو مَیں نے سمیٹ لیا، فرمایا عمرو بن العاص رضؓ تم کو کیا ہو گیا ہے؟ عرض کی مَیں کچھ شرط چاہتا ہوں، فرمایا وہ کونسی شرط ہے؟ مَیں نے عرض کیا۔ میری مغفرت ہو جائے۔ فرمایا، اے عمروؓ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اسلام انسان کے پہلے گناہوں کو کالعدم کر دیتا ہے، ہجرت بھی اپنے پہلے کے گناہوں کو مٹا دیتی ہے، اور حج بھی اپنے قبل کے گناہوں کو ختم کر دیتا ہے۔ اس کے بعد یہ حالت ہو گئی کہ میرے نزدیک رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کوئی شخص محبوب نہ تھا اور نہ میری نظر میں ان سے زیادہ کوئی بزرگ تھا۔ اگر مجھ سے درخواست کی جاتی کہ آپ کی تعریف کروں تو مَیں ایسا کبھی نہ کر سکتا۔ اس لیے کہ آپ کی بزرگی کو اپنی آنکھوں میں بھرنے کی طاقت نہ تھی اگر اس حالت میں مَر جاتا، تو اُمید تھی کہ میں اہلِ جنت میں ہوتا۔ پھر تیسرا دور آیا کہ چند چیزیں ہمارے قریب آ گئیں، مجھے معلوم نہیں کہ مَیں ان میں کیا ہوں یا اس میں میرا کیا ہے (اس لیے) جب مَیں مَر جاؤں تو نوحہ کرنے والیاں میرے ساتھ نہ جائیں نہ جنازے کے پیچھے آگ جائے۔ جب تم لوگ مجھے دفن کرنا تو مٹی آہستہ آہستہ ڈالنا اس سے فارغ ہو کر اتنی دیر میری قبر کے پاس ٹھہرنا جتنی دیر اونٹ ذبح کر کے گوشت تقسیم کیا جائے، کیونکہ تمہاری وجہ سے مجھے اُنس رہے گا۔ یہاں تک کہ مجھے معلوم ہو جائے کہ میرے پروردگار کے قاصد کس امر کے ساتھ میرے پاس لَوٹائے جاتے ہیں۔ لہ

ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمرو بن العاص رضؓ نے موت کے وقت اپنے محافظ دستے کو بلایا اور پوچھا کہ مَیں تمہارا کیسا ساتھی تھا، انہوں

لہ طبقات ابن سعدؒ حصہ چہارم

نے کہا کہ آپ ہمارے سچے ساتھی تھے۔ ہمارا اکرام کرتے اور ہمیں دل کھول کر دیتے تھے۔ یہ سلوک کرتے تھے وہ سلوک کرتے تھے۔ کہنے لگے، میں یہ سب اس لیے کرتا تھا کہ تم مجھے موت سے بچا لوگے، اب موت سامنے کھڑی ہے، لہٰذا تم لوگ مجھے اس سے بچاؤ۔ یہ عجیب فرمائش سن کر وہ ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھنے لگے، پھر بولے واللہ، اے ابو عبداللہ ہم کو آپ سے ایسی بات سننے کی امید نہ تھی، آپ جانتے ہیں کہ ہم لوگ موت کو آپ سے ذرا بھی نہیں ہٹا سکتے۔ حضرت عمرو بن العاصؓ نے کہا کہ میں نے یہ جانتے ہوئے تم سے ایسی فرمائش کی ہے کہ تم لوگ ذرا بھی مجھے موت سے نہیں بچا سکتے۔ کاش میں نے تم میں سے کسی کو اپنی حفاظت کے لیے نہ رکھا ہوتا۔ افسوس ابن ابی طالب سچ کہتے تھے کہ "انسان کی محافظ خود اس کی موت ہے۔" پھر کہا خدایا میں بری نہیں ہوں کہ معذرت کردوں، طاقت ور نہیں ہوں کہ غالب آجاؤں، اگر تیری رحمت نے دستگیری نہ کی تو میں ہلاک ہو جاؤں گا۔[1]

اس کے بعد اپنے بیٹے عبداللہ سے وصیت کی کہ جب میں مر جاؤں تو مجھے ایک غسل معمولی پانی سے دینا، پھر کپڑے سے پانی خشک کر کے تازہ اور صاف پانی سے نہلانا۔ تیسری مرتبہ ایسے پانی سے غسل دینا جس میں کسی قدر کافور ملا ہو پھر کپڑے سے خشک کرنا کفناتے وقت آزار کس کر باندھنا کیونکہ میں جھگڑا کرنے والا ہوں، پھر تابوت پہ اٹھانا اور ایسی رفتار سے چلنا جو دونوں رفتاروں (یعنی سست و تیز) کے درمیان ہو۔ لوگوں کو جنازہ کے پیچھے رکھنا کہ اس کے آگے ملائکہ چلتے ہیں، پچھلا حصہ بنی آدم کے لئے ہے قبر میں رکھ کر مٹی آہستہ آہستہ ڈالنا اس کے بعد دعا میں مصروف ہو گئے کہ اے اللہ! تو نے حکم دیا میں نے حکم عدولی کی، تو نے ممانعت فرمائی، میں نے نافرمانی کی میں بری نہیں ہوں کہ معذرت کروں طاقتور نہیں ہوں کہ غالب آجاؤں ہاں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ، لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ اور یہی کلمات کہتے کہتے جان، جان آفرین کے سپرد کر دی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

یکم شوال ۴۳ھ بعد نماز عیدالفطر آپ کے صاحبزادے نے نماز جنازہ پڑھائی اور مقطم میں سپرد خاک کیے گئے۔

اولاد

آپ نے دو لڑکے عبداللہ اور محمد یادگار چھوڑے، یہ دونوں خولہ بنت حمزہ سے تھے۔

حلیہ

آپ کا قد چھوٹا، اعضا نہایت مضبوط اور جسم ہر قسم کی محنت و مشقت برداشت کرنے کی طاقت رکھتا تھا۔ آپ کی پیشانی کشادہ آنکھیں سیاہ اور موٹی تھیں۔ داڑھی پر سیاہ خضاب کرتے تھے۔ ایک دفعہ اس قدر گہرا خضاب کیا کہ بال کوے کے پر کی طرح کالے ہو گئے۔ حضرت عمرؓ نے دیکھا، تو پوچھا، ابو عبداللہ! یہ کیا؟ عرض کی "امیرالمومنینؓ میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھ کو کسی قابل شمار کریں" اس کے بعد امیرالمومنینؓ نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔

حضرت عمرو بن العاصؓ کا چہرہ بڑا شاندار تھا اور بشرے سے سرداری اور سیادت کے آثار ظاہر ہوتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے انہیں دیکھ کر فرمایا تھا کہ ابو عبداللہ کا چہرہ تو واقعی کسی سردار کا معلوم ہوتا ہے۔[2]

عادات و خصائل

حضرت عمرو بن العاصؓ ابتداء سے ہی سرداری اور قیادت کے خواہشمند تھے۔ چنانچہ لوگوں کی امامت کے فرائض خود انجام دیا کرتے اور آخر وقت تک ان کا یہی معمول رہا۔

---

[1] الطبقات ابن سعدؒ اور سیر الصحابہؓ مہاجرین حصہ دوم سے ماخوذ۔ [2] حضرت عمرو بن العاصؓ مؤلفہ محمد فرج مصری۔

مال و دولت سے انہیں بے حد محبت تھی، اور شاید یہ اسی غیر معمولی محبت کا نتیجہ تھا کہ خلفائے راشدین ان سے ہمیشہ بدگمان رہتے تھے، حتیٰ کہ حضرت عمر فاروق اعظم رضؓ نے ایک دفعہ ان کا بہت سا مال ضبط کر لیا تھا، حضرت عثمانؓ کے دور میں ان کی ولایت مصر سے معزولی کا سبب بھی یہی ہوا تھا۔ کہ امیر المومنینؓ کو خیال تھا کہ خراج کی کثیر رقم اپنے پاس رکھ لی ہے اور اسے بیت المال میں داخل نہیں کرایا

حضرت عمرو بن العاصؓ اپنے جذبات و عواطف پر قابو پانے میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے اور عقل کے مقابلہ میں جذبات کی قطعی پروا نہ کرتے تھے۔ چنانچہ آپ کہا کرتے ۔

' بلیغ ترین شخص وہ ہے جس کی رائے اس کی خواہشات کو دور کر دے اور بہادر ترین انسان وہ ہے جو اپنے حلم سے اپنے جہل کو دور کر دے '۔

حضرت عمرو بن العاصؓ کو گانے سے بے حد لگاؤ تھا۔ اسی طرح شعر و شاعری کے بھی بے حد رسیا تھے، آپ کی شخصیت بڑی پرکشش تھی اور آپ میں ایک بہادر، شاعر، متقی اور پرہیز گار انسان کی صفات مجتمع تھیں، آپ کا ظاہر و باطن ایک جیسا تھا۔ آپ کو جو بات کہنا ہوتی، وہ کسی شخص کی ناراضگی کی پروا کیے بغیر بلا جھجک کہہ دیتے تھے ۔

حضرت عمرو بن العاصؓ نے اپنے عالم شباب میں شام، حبشہ اور مصر کے متعدد سفر کیے تھے۔ ان سفروں کے دوران آپ کو مختلف لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا جس سے ان کی واقفیت عامہ نہایت وسیع ہو گئی۔ ذہن صیقل ہو گیا اور دماغ میں جہالت کی تاریکی کی بجائے علم کی روشنی پھیل گئی ۔

حضرت عمرو بن العاصؓ میں شجاعت، بے خوفی، ہمت و استقلال، علم و حکمت اور عقلمندی و وفاداری کی جو صفات جمع تھیں وہ مشاہیر عالم میں سے بہت کم لوگوں کے حصہ میں آئی ہیں، آپ نادرۂ روزگار شخصیت تھے، سرزمین عرب کو آپ پر ناز تھا۔ آپ عرب کی سیاسی عمارت کے ان ستونوں میں سے تھے جس کے ٹوٹنے سے عرب سیاست کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔

حضرت عمرو بن العاصؓ کو چونکہ ابتلا و آزمائش کے مختلف ادوار سے گزرنا پڑا تھا۔ اس لیے آپ سے بعض ایسی لغزشیں بھی سرزد ہوئیں جو ایک صحابیؓ کے مرتبہ سے فروتر تھیں۔ تاہم آپ بارگاہ نبویؐ کے جلیس اور حضورؐ سرور دو عالم صلعم کے صحبت یافتہ تھے، اس لیے ان لغزشوں کے باوجود آپ کے وہ فضائل نظر انداز نہیں کیے جا سکتے جو فیضان نبوت نے تمام صحابۂ کرامؓ میں پیدا کر دیے تھے ۔

قوتِ ایمان

قوتِ ایمان تمام فضائل کا سرچشمہ ہے، اسی سے تمام فضائل کا ظہور ہوتا ہے۔ حضرت عمرو بن العاصؓ کی ایمانی قوت کا خود سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں اعتراف فرمایا: اسلم الناس وامن عمرو بن العاص اسی طرح ایک دوسرے موقع پر فرمایا ابنا العاص مومنان یعنی ہشام و عمرو[1]۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات کی تصدیق واقعات سے بھی ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرو بن العاصؓ کو بلا بھیجا کہ وہ ہتھیار سجا کر اور لباس بدل کر آئیں۔ آپ حسبِ ارشادِ نبوتؐ حاضر ہوئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ

---

[1] سیر الصحابہؓ مہاجرین، حصۂ دوم ۔

وسلم اس وقت وضو فرما رہے تھے، نظر اُٹھا کر انہیں دیکھا، پھر نگاہ نیچی کر کے فرمایا کہ میں تمہیں امیر بنا کر بھیجنا چاہتا ہوں۔ اِن شاء اللہ تم محفوظ رہو گے۔ مالِ غنیمت بھی ہاتھ لگے گا اور تمہیں بھی وافر حصّہ ملے گا، عرض کیا، یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میں نے مال کے لالچ میں نہیں، بلکہ دلی رغبت سے اسلام قبول کیا ہے، ارشاد ہوا۔

"مالِ صالح مردِ صالح کے لیے بہتر ہے"[1]

ایک موقع پر حضورؐ نے ارشاد فرمایا۔ عمرو بن العاصؓ قریش کے صالح افراد میں ہیں۔ عبداللہ اور ابو عبداللہ (عمرو بن العاصؓ) کیا اچھے گھرانے کے لوگ ہیں۔

حق پسندی

حضرت عمرو بن العاصؓ طبعاً حق پرست تھے۔ ایک دن خانہ کعبہ میں بیٹھے لوگوں کو حدیث سنا رہے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے بہ خلوصِ نیت کسی امام کی بیعت کر لی، اس کو مقدور بھر اس کی حمایت کرنی چاہیے اور اگر کوئی دوسرا شخص اس کے مقابلہ کے لیے کھڑا ہو تو اس کی گردن اُڑا دینی چاہیے۔ اس پر عبدالرحمٰن بن عبدرب کعبہ نے کہا، خدا آپ کو خوش رکھے۔ یہ حدیث آپ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنی ہے؟ آپ نے اپنے کانوں اور دل کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ میرے دونوں کانوں نے سُنی اور قلب نے محفوظ رکھی۔ اس پر عبدالرحمٰن نے امیر معاویہؓ کے کسی حکم کا ذکر کر کے اعتراض اُٹھایا کہ یہ حکم قرآنِ حکیم کے ارشاد یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْکُلُوْٓا …[2] کے خلاف ہے۔ حضرت عمروؓ بن العاص یہ سن کر خاموش ہو گئے۔ پھر فرمایا، جس میں خدا کی نافرمانی نہ ہوتی ہو اس کو مانو اور جس میں ہوتی ہو، اس کو نہ مانو۔"

تدبر و سیاست

تدبر و سیاست اور عقل و دانش میں حضرت عمروؓ بن العاص کا شمار عرب کے ان مخصوص اشخاص میں تھا جنہیں سب بالاتفاق مدبّر مانتے تھے۔ اُن کی اصابتِ رائے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں اعتراف فرمایا کہ تم اسلام میں صائب رائے کے آدمی ہو۔

حضرت فاروقِ اعظمؓ جیسے مدبّر نے اُن کی تعریف ان الفاظ میں کی کہ عمروؓ بن العاص حکومت کے لیے موزوں ہیں، آپ جب کبھی کسی ضعیف الرائے اور خام کار کو دیکھتے تو تعجب سے فرماتے کہ اس شخص اور عمروؓ بن العاص کا خالق ایک ہے[3]۔

حضرت عمروؓ بن العاص کی زندگی کا ہر صفحہ عقل و دانش اور تدبیر و شجاعت کے واقعات سے لبریز ہے، سریہ ذات السلاسل سے لے کر جنگِ صفین تک کے واقعات ان کے تدبّر، معاملہ فہمی، سیاسی سوجھ بوجھ اور شجاعت کی ایسی دلیلیں ہیں جن سے انکار ممکن نہیں۔

حضرت مغیرہؓ بن شعبہ تدبر و سیاست میں ان کے ہم پلّہ تھے۔ اس لیے دونوں میں کبھی کبھی چشمک بھی ہو جایا کرتی تھی، امیر معاویہؓ نے انہیں مصر کی حکومت سپرد کرنے کے بعد ان کے بیٹے عبداللہ کو کوفہ کا والی بنایا، تو حضرت مغیرہؓ بن شعبہ نے امیر معاویہؓ سے کہا کہ آپ نے باپ بیٹے کو مصر اور کوفہ کا والی بنا کر خود کو شیروں کے جبڑے کے درمیان دے دیا، امیر معاویہؓ بھی اس خطرہ کو بھانپ گئے۔ چنانچہ عبداللہ کو معزول کر کے ان کی جگہ حضرت مغیرہؓ بن شعبہ کو مقرر کیا۔ حضرت عمرو بن العاصؓ کو جب اس بات کی خبر ہوئی، تو انہوں نے امیر معاویہؓ سے کہا کہ آپ

۱؎ سیر الصحابہؓ مہاجرین حصّہ دوم ۲؎ سورۂ نساء آیت ۲۹ ۳؎ سیر الصحابہؓ مہاجرین حصّہ دوم۔

نے کوفہ کی حکومت ایسے آدمی کے سپرد کی جو اگر خراج کی رقم کھا جائے تو آپ وصول بھی نہیں کر سکتے۔ حضرت مغیرہؓ چونکہ تنگ دست رہا کرتے تھے، اس لیے امیر معاویہؓ نے ان سے خراج کا عہدہ نکال کر صرف امارت کے فرائض باقی رہنے دیئے۔ حضرت مغیرہؓ نے حضرت عمرو بن العاصؓ سے کہا کہ یہ تمہاری شکایت کا نتیجہ ہے، انہوں نے کہا نہیں، بلکہ تمہاری شکایت کا جواب ہے[1]

جہاد فی سبیل اللہ

حضرت عمرو بن العاصؓ کی کتاب زندگی میں جہاد فی سبیل اللہ کا عنوان بہت نمایاں ہے۔ آپ تمام مغازی میں اسلام کے مشہور مجاہد حضرت خالد بن ولید کے دوش بدوش رہے، خود حضرت عمرو بن العاصؓ کا بیان ہے کہ ابتدائے اسلام سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو مغازی میں میرے اور خالدؓ کے برابر نہیں کیا، اُن کی شخصیت نہ صرف شام، مصر اور طرابلس کی فتوحات میں نمایاں رہی بلکہ مدینہ میں ذرا بھی کوئی خطرہ پیدا ہوتا، تو آپ کی تلوار فوراً میان سے نکل آتی تھی۔ مؤرخین کے مطابق ایک دفعہ کسی وجہ سے یک بیک لوگوں میں کچھ انتشار پیدا ہو گیا۔ اس افراتفری کے عالم میں صرف حضرت ابو حذیفہؓ کے غلام سالمؓ مسجد میں تلوار چھپائے کھڑے رہے، حضرت عمروؓ بن العاص نے دیکھا، تو آپ بھی تلوار لگا کر اُن کے پاس کھڑے ہو گئے۔ اس عام سراسیمگی کو دیکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا اور فرمایا کہ تم لوگ خدا اور رسولؐ کی پناہ میں کیوں نہ آئے، اور عمروؓ بن العاص اور سالمؓ کو کیوں نمونہ نہ بنایا۔[2]

صدقہ و خیرات

حضرت عمروؓ بن العاص خدا کی راہ میں نہایت فراخدلی کے ساتھ صدقہ دیتے تھے، جس کا اعتراف کئی بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان مبارک سے کیا۔ حضرت علقمہؓ بن رمثہ بلوی بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمروؓ بن العاص کو ایک سریہ پر بحرین بھیجا اور خود ایک دوسرے سریہ میں نکلے، ہم لوگ حضورؐ کے ہمرکاب تھے، سرور دو عالم صلعم پر کچھ غنودگی طاری ہو گئی، بیدار ہوئے تو فرمایا خدا عمروؓ پر رحم کرے، یہ ارشاد سن کر ہم سب اس نام کے اشخاص کا ذکر کرنے لگے، اسی اثنا میں حضور کی پھر آنکھ لگ گئی، پھر بیدار ہو کر فرمایا خدا عمروؓ پر رحم کرے۔ اسی طرح جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی فقرہ تیسری مرتبہ فرمایا، تو ہم لوگ منبط نہ کر سکے۔ عرض کیا، حضورؐ کا ارشاد کس عمرو کے متعلق ہے۔ فرمایا "عمرو بن العاصؓ" ہم لوگوں نے اس کی وجہ پوچھی ارشاد ہوا، مجھ کو وہ وقت یاد ہے جب میں لوگوں سے صدقہ منگواتا تھا، تو وہ (یعنی حضرت عمرو بن العاصؓ) بہت وافر لاتے تھے اور جب پوچھتا کہاں سے لاتے ہو؟ کہتے، خدا نے دیا، ایک موقعہ پر تین مرتبہ فرمایا: "خدایا عمرو بن العاصؓ کی مغفرت فرما، جب میں ان کو صدقہ لانے کے لیے بلاتا تھا، تو وہ صدقہ لاتے تھے۔[3]

فضل و کمال

قبولِ اسلام کے بعد حضرت عمروؓ بن العاص کی عمر کا زیادہ حصہ میدان کارزار میں گزرا اس لیے ظاہر ہے کہ ان کو علم و عرفان کے سرچشمہ سے مستفید ہونے کا بہت کم موقع ملا تھا، پھر بھی آپ علم کی دولت سے تہی دامن نہ تھے۔

قرآنِ حکیم بہت سے علوم و فنون کا مجموعہ ہے اور اس کی قرأت ایک مستقل فن کی حیثیت رکھتی ہے۔ حضرت عمروؓ بن العاص قرأتِ قرآن کا خصوصی ذوق رکھتے تھے اور قرآنِ حکیم نہایت سوز و گداز کے ساتھ بہت صاف و واضح پڑھتے تھے۔

حضرت عمروؓ بن العاص کو اگرچہ لڑائیوں میں شرکت کے باعث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہنے کا زیادہ موقع نہیں ملا تاہم

---

[1] سیر الصحابہؓ مہاجرین حصہ دوم [2] اصابہ ج ۳ ص ۲ [3] سیر الصحابہؓ مہاجرین حصہ دوم

جو لمحات بھی میسر آئے۔ اُن میں خوشہ چینی سے غافل نہ رہے۔ اس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادِ مقدسہ کی اچھی خاصی تعداد اُن کے حصہ میں آئی۔ حضرت عمرو رضی اللہ عنہ بن العاص کی مرویات کی تعداد اُنتالیس ہے۔ جن میں تین متفق علیہ ہیں اور ایک میں بخاری اور تین میں مسلم منفرد ہیں۔

حضرت عمرو رضی اللہ عنہ بن العاص نے احادیثِ نبوی کے اس سرمایہ کو صرف اپنی ذات تک محدود نہ رکھا بلکہ دوسرے مسلمانوں تک پہنچایا۔ آپ سے استفادہ کرنے والوں میں آپ کے صاحبزادہ عبداللہ، غلام ابوالقیس اور قیس بن ابی حازم، ابوعثمان نہدی، علی بن رباح لخمی، عبدالرحمٰن بن شماسہ، عروہ بن زبیر، محمد بن کعب، عمارہ بن خزیمہ وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔[1]

تعلیم و تلقین حضرت عمرو رضی اللہ عنہ بن العاص جنگی مصروفیتوں کے ساتھ ساتھ اسلام کی تعلیم و تلقین کا فرض بھی انجام دیتے تھے۔ چنانچہ سریہ ذات السلاسل میں کامیابی کے بعد وہیں اقامت اختیار کرکے نومسلموں کو تعلیم دیتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد جب دُنیا طلبی کا رُجحان بڑھنے لگا، تو آپ لوگوں کے سامنے تقریر کرکے اُن کو اُسوۂ نبوی کی پیروی کی ہدایت کرتے تھے۔ علی بن رباح لخمی راوی ہیں کہ ایک دن حضرت عمرو رضی اللہ عنہ بن العاص منبر پر تقریر کر رہے تھے کہ :

"آج تم لوگوں کا حال یہ ہو رہا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جن چیزوں سے احتراز فرماتے تھے، تم ان کی طرف راغب ہو رہے ہو اور دُنیا کی تمنا کرتے ہو، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے کنارہ کشی اختیار فرماتے تھے۔"

علمِ اجتہاد حضرت عمرو رضی اللہ عنہ بن العاص تمام مسائل میں قرآن و حدیث سے کام لیتے تھے۔ لیکن ایسی صورت میں جبکہ دونوں سے عقدہ حل نہ ہوتا، تو اجتہاد سے کام لیتے۔ سریہ ذات السلاسل کے دوران ایک شب آپ کو نہانے کی ضرورت پیش آگئی۔ شدید سردی کے باعث نہانے سے بیماری کا خطرہ تھا اور نہ نہانے کی صورت میں نماز جاتی تھی۔ چنانچہ اس موقع پر آپ نے غسل کی حالت کو وضو پر قیاس کر لیا اور پانی نہ ملنے یا بیماری کے خطرہ کی بنا پر تیمم کے حکم کے مطابق تیمم کرکے نماز پڑھ لی، سریہ سے واپس آکر جب اس کا ذکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا۔ تو حضور نے فرمایا کہ عمرو رضی اللہ عنہ بن العاص! تم نے جنابت کی حالت میں نماز پڑھ لی، عرض کی یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) رات بہت سرد تھی۔ نہانے کی صورت میں جان کا خطرہ تھا۔ اس موقع پر مجھے قرآنِ حکیم کی آیت وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ۔ رحیماً[2] یاد آگئی، چنانچہ میں نے تیمم کر لیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہنس کر خاموش ہو گئے۔

فصاحت و بلاغت فصاحت و بلاغت میں بھی حضرت عمرو بن العاص کا پایہ نہایت بلند تھا۔ مؤرخین کے مطابق ان کے متعدد بلند پایہ اقوال اور علم و حکمت سے پُر جملے ادبیاتِ عرب کا قابلِ قدر سرمایہ ہیں۔

ابنِ عساکر کے مطابق ایک دفعہ حضرت عمرو رضی اللہ عنہ بن العاص نے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے کہا :

"نیک شخص اس وقت حملہ کرتا ہے، جب وہ بھوکا ہوتا ہے اور کمینہ اس وقت حملہ کرتا ہے جب اس کا پیٹ بھرا ہوتا ہے، اس لیے نیک آدمی کی بھوک دُور کرو اور کمینے کو قابو میں رکھو۔"

ہشام کلبی روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عمرو رضی اللہ عنہ بن العاص سے پوچھا :

---

[1] سیر الصحابہؓ مہاجرین حصّہ دوم۔ [2] اور اپنے آپ کو ہلاک نہ کرو۔ کچھ شک نہیں کہ خدا تم پر مہربان ہے۔ (سورہ نساء آیت ۲۹)

"سب سے زیادہ بلیغ شخص کون ہے ؟"
حضرت عمرؓو بن العاص نے جواب دیا: جس کی رائے اس کی خواہشاتِ نفسانی کے اُلٹ ہو۔"
پھر امیر معاویہؓ نے پوچھا: "سب سے زیادہ سخی کون ہے ؟"
جواب دیا: جو شخص اپنی دنیا اپنے دین کی بہتری میں خرچ کرے۔"
پھر پوچھا: سب سے زیادہ شجاع کون ہے ؟
حضرت عمرو بن العاصؓ نے فرمایا:
"جو شخص اپنے حِلم سے جہالت پر غالب آجائے۔"

ایک مرتبہ حضرت عمرو بن العاصؓ نے امیر معاویہؓ سے فرمایا: "مَیں نے تین باتیں اختیار اور تین باتیں ترک کر رکھی ہیں جو تین باتیں اختیار کر رکھی ہیں، وہ یہ ہیں:

۱- مَیں لوگوں کے دل ہاتھ میں لینے کی کوشش کرتا ہوں۔
۲- ہر شخص کی بات کان دھر کر سنتا ہوں۔
۳- جب کسی امر میں اختلاف پیدا ہو جائے تو جو امر سہل ہو اُسے اختیار کرتا ہوں،

جن باتوں کو ترک کر دیا ہے، وہ یہ ہیں:-

۱- جھگڑے سے ہمیشہ پرہیز کرتا ہوں۔
۲- کمینے کی صحبت کبھی اختیار نہیں کرتا ہوں
۳- ہر ایسی بات سے بچتا ہوں جس کے متعلق مجھے بعد میں عذر و معذرت پیش کرنی پڑے۔ میری مثال اس شعر جیسی ہے ؎

فَقُلْتُ لَهٗ تَجَنَّبْ كُلَّ شَيْءٍ ... يُعَابُ عَلَيْكَ اِنَّ الْحُرَّ حُرٌّ

(ترجمہ) مَیں نے اس سے کہا۔ تو ہر ایسی چیز سے پرہیز کر جس کی وجہ سے بعد میں تجھ پر عیب لگایا جائے، یاد رکھ کہ شریف آدمی ہمیشہ وہی کام کرتا ہے جو فی الواقع شرفاء کو زیب دیتا ہے۔

مصر کی امارت کے زمانہ میں آپ ایک بے حد بوڑھے خچر پر سوار ہوئے، لوگوں نے دیکھا، تو کہا کہ آپ امیر ہیں اور ایسے خچر پر سوار ہوتے ہیں، آپ نے جواب دیا:

"جب تک جانور میرا بوجھ اُٹھاتا رہے، بیوی مجھ سے خوش اخلاقی اور حُسنِ سلوک سے پیش آتی رہے اور دوست میرے راز کی حفاظت کرتا رہے۔ اس وقت تک مَیں ان تینوں سے نہیں اُکتاتا۔ اکتانا جھوٹے اخلاق میں سے ہے"[1]

---

[1] عمرو بن العاصؓ مؤلفہ محمد فرج مصری

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ

راجہ محمد شریف

نام و نسب آپ کا نام خالدؓ کنیت اَبُوسُلیمان اور لقب سیف اللہ تھا۔ سلسلۂ نسب یہ ہے حضرت خالد بن ولیدؓ بن مغیرہ بن عبداللہ بن عمر و بن مخزوم مخزومی۔ آپ کی والدہ کا نام لبابہ بنتِ حارث بن حزن تھا، جو اُمّ المومنین حضرت میمونہ رضؓ کی سگی بہن تھیں۔

خاندانی حالات حضرت خالدؓ بنو مخزوم سے تعلق رکھتے تھے جو قریش کا ایک معزز قبیلہ تھا۔ بنو مخزوم اور سردارانِ بنو ہاشم کے درمیان ازدواج کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ عاتکہ بنت عبدالمطلب حضرت خالدؓ کے چچا اَبُو اُمیہ بن مغیرہ سے بیاہی ہوئی تھیں۔ انہی کے لڑکے زہیر بن اَبُو اُمیہ نے سب سے پہلے قریش کے اس ظالمانہ معاہدہ کو فسخ کرنے کا سوال اٹھایا تھا، جس کے تحت آنحضرت صلعم اور آپ کے اہلِ خاندان تین سال تک شعب اَبُوطالب میں محصور رہے تھے۔ مزید آنحضرت صلعم کی دو ازواجِ مطہرات یعنی حضرت اُمِّ سلمہؓ اور حضرت میمونہ رضؓ اسی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔

جس طرح بنو مخزوم قریش میں انتہائی بلند مرتبہ کے مالک تھے۔ اسی طرح وہ دولت و ثروت میں بھی کسی سے کم نہ تھے۔ حضرت خالدؓ کا چچا اَبُو اُمیہ مغیرہ قریش میں زاد الراکب (مسافر کا توشہ) کے لقب سے مشہور تھا، کیونکہ جو شخص اس کا ہمسفر ہوتا اسے زادِ راہ لینے کی ضرورت نہ ہوتی تھی، اَبُو اُمیہ کا انتقال ظہورِ اسلام سے قبل ہی ہو گیا تھا۔ حضرت

خالدؓ کے دوسرے چچا فاکہ بن مغیرہ نے "جمعیت الضیافت" بنا رکھا تھا، جہاں جا کر ہر شخص بلا اجازت کھانا کھا سکتا تھا۔

حضرت خالدؓ کا والد ولید بن مغیرہ قریش میں صاحبِ عقل و فہم اور بڑا فصیح البیان مانا جاتا تھا۔ عبدالمطلب کی وفات کے بعد جن لوگوں نے قریش کی سیادت کا دعویٰ کیا ان میں یہ بھی شامل تھا۔ ولید قریش میں "عدل قریش" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ ایک سال خانہ کعبہ کا غلاف یہ اکیلا چڑھاتا اور دوسرے سال تمام قریش مل کر چڑھاتے تھے۔ حج کے موقعہ پر منیٰ کے مقام پر تمام حاجیوں کو کھانا کھلایا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ اور کسی کو کھانا پکانے کے لیے آگ جلانے کی اجازت نہ تھی، مورخین کے مطابق کسی وقت بھی بارہ ہزار دینار سے کم رقم اس کے پاس نہ ہوتی تھی اس کے باغات مکہ سے طائف تک چلے گئے تھے، جن کا پھل سال بھر ختم نہ ہوتا تھا[1] ولید بن مغیرہ قریش میں اپنے ارادے کی پختگی اور عزم و ہمت کی بنا پر ایک خاص مقام رکھتا تھا۔ تعمیر کعبہ کے دنوں میں جبکہ ہر شخص عذابِ الٰہی کے خوف سے کعبہ کو ڈھانے سے ڈرتا تھا۔ ولید ہی نے یہ کہہ کر عمارت ڈھانی شروع کی تھی کہ:

---

[1] حضرت خالد سیف اللہ مولفہ اَبُوزید شبلی۔

"اے اللہ! ہم جو کچھ کرتے ہیں اس میں کسی بد ارادے کو دخل نہیں ہمارا ارادہ نیک ہے۔"

ولید خانہ کعبہ کی تعظیم اس قدر کرتا تھا کہ کبھی جوتیاں پہن کر اس میں داخل نہیں ہوا، مورخین کے مطابق جس نے سب سے پہلے اس طریقہ کو رواج دیا وہ ولید ہی تھا اور یہ اپنے آبائی دین سے حد درجہ شغف اور عقیدے کی پختگی کا اثر تھا کہ اس نے زندگی بھر اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کو ناکام بنانے کی سرتوڑ کوشش کی، ولید اس وفد کا ایک رکن تھا، جو ابوطالب کے پاس یہ درخواست لے کر گیا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دین کی تحقیر اور بتوں کی مذمت کرنے سے روک دیں۔

ولید قریش میں "الوحید" کے نام سے پکارا جاتا تھا، کیونکہ وہ اپنی متعدد خوبیوں کی بناء پر تمام قوم میں ایک انفرادی حیثیت رکھتا تھا۔ ولید کی ان خوبیوں کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ اُسے اسلام کا پرستار بناتیں اور اسے ایمان باللہ کی حلاوتوں سے روشناس کرتیں لیکن یہ اس کی انتہائی بدبختی تھی کہ اس نے اسلام کی عظمتوں کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کی بجائے نخوت و تکبر کا مظاہرہ کیا اور نتیجۃً اسفل السافلین میں جا گرا۔ مفسرین کے مطابق قرآن حکیم کا ارشاد

اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ ۚ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ۝ (سورۃ الحجر آیت ۹۵-۹۶)	اے رسولؐ ہم ٹھٹھا کرنے والوں سے جو اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں، خود نبٹ لیں گے اور عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا کہ استہزاء کرنے کا کیا انجام ہوتا ہے۔

جن پانچ اشخاص کے متعلق ہے۔ ان میں ولید بھی شامل تھا، یہ سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دشمنی اور حضورؐ کا مذاق اڑانے میں پیش پیش تھے۔ بہرکیف ولید بن مغیرہ ظہور اسلام کے بعد جب تک زندہ رہا[1] اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بدترین دشمنوں کی حیثیت سے زندہ رہا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تیرہ سالہ مکی زندگی میں اس کی ریشہ دوانیاں اور معاندانہ کوششیں پورے عروج پر رہیں۔

قبول اسلام سے قبل

مورخین کے مطابق قبہ اور اعنہ یعنی فوج کی سپہ سالاری اور فوجی کیمپ کے انتظام کا عہدہ زمانہ جاہلیت سے حضرت خالدؓ کے خاندان میں چلا آ رہا تھا۔ چنانچہ ظہور اسلام کے وقت حضرت خالدؓ اسی عہدہ پر ممتاز تھے۔

حضرت خالدؓ چونکہ ایک امیر کبیر باپ کے فرزند تھے۔ اس لیے کوئی اور پیشہ اختیار کرنے کی بجائے آپ نے شہسواری، تیر اندازی اور شمشیر زنی وغیرہ کا شغل اختیار کیا اور اپنی فطری بہادری، شجاعت اور خطرات سے بے پروائی جیسی صفات کی بنا پر ان میں ایک نمایاں مقام حاصل کیا۔ آپ قدرت کی طرف سے جنگی دل و دماغ لے کر آئے تھے، خاندانی روایات نے آپ کی ان فطری صلاحیتوں کو مزید اُبھرنے کا موقع دیا جنگی فرائض کی بجا آوری آپ کے راہوار شوق کے لیے مہمیز ثابت ہوئی اور آپ ایک ایسے زبردست جنگی ماہر اور سپہ سالار اعظم بن گئے۔ جن میں بڑے بڑے قائدین عساکر کی صفات کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھیں۔

حضرت خالدؓ ظہور اسلام کے وقت تقریباً ستائیس۲۷ سال کے تھے۔ قریش مکہ کی طرف سے جب اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمومی مخالفت شروع ہوئی، تو حضرت خالد نے بھی اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، آپ کا گھرانہ چونکہ اسلام دشمنی میں پیش پیش تھا اس

---

[1] مورخین کے مطابق ولید ہجرت نبوی کے تین ماہ بعد پچانوے سال فوت ہوا۔

لیے آپ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضورؐ پر ایمان لانے والوں کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ اہل سیر کے مطابق یہ اسی مخالفت اور دشمنی کا اثر تھا کہ بعد میں جب کفارِ مکہ اور مسلمانوں کے درمیان لڑائیاں شروع ہوئیں، تو حضرت خالدؓ کی پوری کوشش یہ ہوتی تھی کہ مسلمان نیست و نابود ہو جائیں۔

غزوہ اُحد کے موقع پر جب مسلمانوں کی فتح یقینی ہو گئی تھی، حضرت خالدؓ نے اچانک پیچھے سے حملہ کر کے مسلمانوں میں افراتفری پھیلا دی، جس کی وجہ سے کفارِ مکہ کے اکھڑے ہوئے قدم جم گئے اور انہوں نے مسلمانوں پر دوبارہ حملہ کرنے کی ہمت کی۔

غزوہ خندق کے موقع پر جب کفار کے لشکر میں عام بھاگڑ پڑی اور گھبراہٹ کے عالم میں وہ محاصرہ اٹھا کر بھاگے، تو انہوں نے حضرت خالدؓ اور حضرت عمروؓ بن العاص سے درخواست کی کہ اگر مسلمان تعاقب کریں، تو وہ ان کی حفاظت کریں۔ چنانچہ یہ دونوں دو سو سواروں کے ساتھ بطور "ساقہ" لشکر کے پیچھے پیچھے رہے تاکہ کسی متوقع خطرے کی صورت میں مقابلہ کر سکیں۔ اسی طرح صلح حدیبیہ کے موقع پر قریش کا جو دستہ مسلمانوں کی نقل و حرکت کا پتہ لگانے آیا تھا۔ اس کے سردار حضرت خالدؓ ہی تھے۔

قبولِ اسلام

تاریخ اسلام میں صلح حدیبیہ ایک ایسے آئینہ ہزار پہلو کی حیثیت رکھتی ہے کہ اسے جس سمت سے بھی دیکھا جائے اسلام کی بے پناہ حقانیت آگے بڑھنے کے لیے بیتاب نظر آتی ہے۔ اس کے ایک ایک پہلو میں ہزاروں کامیابیاں اور ایک ایک لفظ میں اسلام کی ہمہ گیری اور عظمت و جلال کا عکس صاف نظر آتا ہے لیکن اس وقت جبکہ معاہدہ حدیبیہ ضبطِ تحریر میں لایا گیا تھا اس کی تمام خوبیاں خدا اور اس کے رسولؐ کے علاوہ کسی پر عیاں نہ تھیں۔ یہی وجہ ہے یہ صلح کفار کی طرح اکثر صحابہؓ پر بھی شاق گزری تھی، تاہم صاحبِ وحی و رسالتؐ کے استقلال اور سورۂ فتح کے نزول نے مسلمانوں کو تو مطمئن کر دیا۔ مگر مشرکین مکہ کی بے چینی دور نہ ہو سکی، مشرکین میں سے جن لوگوں پر یہ صلح بہت ناگوار گزری تھی۔ اُن میں قریش کے سپہ سالارانِ اعظم حضرت خالدؓ ابن ولید اور حضرت عمروؓ بن العاص بھی شامل تھے۔ انہیں اب یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ کوئی دن میں سارے عرب پر پرچم توحید لہرانے والا ہے، چنانچہ ان حالات کے پیش نظر حضرت عمروؓ بن العاص حبشہ چلے گئے اور اپنے ساتھ حضرت خالدؓ بن ولید کو بھی لے جانا چاہتے تھے مگر حضرت خالدؓ نے اسی میں مصلحت سمجھی کہ مکہ میں رہ کر ہی حالات کا جائزہ لیں۔

مؤرخین کے مطابق غزوہ حدیبیہ کے دنوں میں جبکہ حضرت خالدؓ مسلمانوں کی نقل و حرکت معلوم کرنے کے لیے گشت لگایا کرتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پُرکشش شخصیت، پاکیزہ زندگی، بزرگی اور رعب و جلال کو قریب سے دیکھ کر اور مسلمانوں کے عزم، اخلاق، بے نفسی اور رسول اللہؐ سے بے پناہ محبت و عقیدت کا مطالعہ کر کے غیر محسوس طور پر ان کے دل میں اسلام کی محبت پرورش پانے لگی تھی، چنانچہ وہ یہ بات سوچنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ مسلمانوں کے ساتھ اہل مکہ کا سلوک سراسر ظلم اور زیادتی پر مبنی ہے۔ بہرکیف اس محبت کی ابتدا کیسے ہوئی؟ حضرت خالدؓ پر اسلام کی صداقت جو بالآخر ان کے قبولِ اسلام کا باعث بنی، کیسے واضح ہوئی۔ یہ ایمان افروز روداد خود ان کی زبانی سنیے۔ فرماتے ہیں:

"جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مقامِ عنیان پر قیام فرما تھے۔ تو میں نے حضور سرورِ دو عالم صلعم کو نماز پڑھتے دیکھا، چنانچہ میں نے حضورؐ کو اور آپؐ کے صحابہ کو نقصان پہنچانے کا ارادہ کیا۔ مگر باوجود ہزار کوشش کے میں ایسا نہ کر سکا۔ اس وقت میرے دل پر القاء ہوا

کہ خدا ان کا حافظ و ناصر ہے اور ہم چاہے جتنی بھی کوشش کریں ان پر غالب نہیں آ سکتے۔"
مزید فرماتے ہیں کہ :

" جب اللہ تعالیٰ نے مجھ پر احسان فرمانا چاہا، تو اُس نے میرے دل میں اسلام کی محبت پیدا کر دی اور مجھ پر ہدایت کی راہ واضح فرما دی۔ مَیں نے اپنے دل میں کہا کہ میں ہر جنگ میں محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خلاف لڑا، لیکن ہمیشہ ہی ناکامی کا مُنہ دیکھنا پڑا، اس سے مجھے محسوس ہونے لگا کہ مَیں غلط راستے پر کھڑا ہوں اور حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سب پر غالب آکر رہیں گے۔ جب حضورؐ عمرۃ القضا ادا فرمانے مکہ تشریف لائے تو مَیں مکہ سے باہر چلا گیا۔ میرے بھائی ولید بن ولید جو مسلمان ہو چکے تھے، حضورؐ کے ساتھ مکہ آئے اور مجھے تلاش کیا، مگر مَیں نہ مِلا اس پر انہوں نے مجھے یہ خط لکھا :

" بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ میرے لیے یہ امر بعید استعجاب کا باعث ہے کہ آپ ابھی تک اسلام سے رو گرداں ہیں، حالانکہ آپ فہم و فراست میں مشہور ہیں۔ کیا اسلام جیسی نعمت سے کوئی شخص ناواقف رہ سکتا ہے ؟"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے آپ کے متعلق دریافت فرمایا ہے کہ خالد کہاں ہیں ؟ مَیں نے عرض کیا خالد کو اللہ ہی لائے تو لائے۔ حضورؐ نے فرمایا : " خالد جیسا شخص کبھی اسلام کی حقیقت سے بے بہرہ نہیں رہ سکتا۔ اگر وہ مسلمانوں کے ساتھ مِل کر مشرکین کے مقابلہ میں اپنی جنگی مہارت کا استعمال کرے، تو یہ اس کے لیے بہتر ہوتا اور ہم اسے دوسروں پر ترجیح دیتے "۔

پس اے میرے بھائی، آپ جہاد کے جن بہترین مواقع سے محروم رہ گئے ہیں، وقت آگیا ہے کہ اب اپنے عمل سے ان کی تلافی کر لیں "۔

" جب بھائی کا یہ خط مجھے مِلا، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری کی پُر مسرت لہر دوڑ گئی اور میرے دل میں اسلام کا شوق اور زیادہ ہو گیا۔ سب سے زیادہ خوشی مجھے اس گفتگو سے ہوئی جو رسول اللہ صلعم نے میرے متعلق میرے بھائی سے کی تھی۔ مَیں نے خواب میں دیکھا کہ گویا مَیں تنگ و قحط زدہ علاقہ سے نکل کر وسیع اور سر سبز و شاداب علاقہ میں آگیا ہوں "۔

جب مَیں نے مدینہ منورہ جانے کا مصمم ارادہ کر لیا، تو صفوان بن اُمیہ سے مِلا اور اس سے کہا " اے ابو وہب ! کیا تم نہیں دیکھ رہے کہ محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) عرب و عجم پر غالب آ گئے ہیں ؟ اگر ہم اُن کے پاس جا کر ان کی اطاعت قبول کر لیں، تو ان کی عظمت خود ہماری ہی عظمت ہو گی "۔ اس پر صفوان نے جواب دیا کہ اگر مکہ میں میرے سوا کوئی بھی اسلام لانے سے باقی نہ رہا تب بھی میں اس کا اتباع نہیں کروں گا۔ مَیں نے دل میں خیال کیا، یہ بیچارہ مجبور ہے کیونکہ اس کا باپ اور بھائی جنگِ بدر میں مارے جا چکے ہیں۔ اس کے بعد مَیں عکرمہ بن ابو جہل سے مِلا اور وہی بات جو صفوان سے کہہ چکا تھا اس سے کہی، عکرمہ نے بھی وہی جواب دیا جو صفوان نے دیا تھا۔ تب مَیں نے اس سے درخواست کی کہ وہ اس بات کا ذکر کسی اور سے نہ کرے۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ یہ راز اپنے تک ہی محدود رکھے گا۔ ازاں بعد مَیں عثمان بن طلحہ سے مِلا جو میرا دوست تھا، پہلے تو میں نے وہی باتیں اس سے بھی کہنے کا ارادہ کیا، لیکن

پھر مجھے اس کے باپ طلحہ، چچا عثمان اور اس کے چاروں بھائیوں (مسافع، حلاس، حارث اور کلاب) کا غزوۂ احد میں قتل ہونا یاد آگیا۔ جس کے باعث پہلے تو یہ بات اس سے کرنی مناسب معلوم نہ ہوئی، لیکن بالآخر کہتے ہی بنی۔ چنانچہ میں نے عثمان سے کہا کہ ہماری مثال اس لومڑی کی سی ہے جو بھٹ میں چھپی ہوئی ہو۔ لیکن بھٹ میں اگر کثرت سے پانی ڈالا جائے تو اُسے وہاں سے نکلنا ہی پڑتا ہے، ہمیں یہ نظر آرہا ہے کہ مسلمان ہم پر غالب آجائیں گے۔ چنانچہ کیوں نہ ہم پہلے ہی اسلام قبول کرلیں؟ میری توقع کے برعکس عثمان نے فوراً آمادگی ظاہر کردی۔ پھر مدینہ چلنے کی بات ہوئی اور یہ طے پایا کہ اگلے روز صبح سویرے ایک مقام پر دونوں پہنچ جائیں اور جو پہلے پہنچ جائے وہ دوسرے کا انتظار کرے۔"

اگلے روز طلوعِ فجر سے پہلے ہم دونوں مقررہ جگہ پر پہنچ گئے اور پھر مدینہ کی راہ لی۔ مقامِ ہدہ پر پہنچے تو عمرو بن العاصؓ سے ملاقات ہوئی جو حبشہ سے آرہے تھے۔ ہم نے ایک دوسرے کو خوش آمدید کہا، پھر انہوں نے مجھ سے پوچھا "ابوسلیمان! کہاں کا ارادہ ہے؟" میں نے جواب دیا "اللہ کی قسم! مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوگئی ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسولؐ ہیں اور میں مسلمان ہونے کے لیے مدینہ جارہا ہوں۔ عمرو بن العاصؓ نے کہا، "میں بھی اسی غرض سے یہ سفر کر رہا ہوں"۔ پھر ہم تینوں مل کر مدینہ کی طرف روانہ ہوگئے۔

ہم دوپہر کے وقت مدینہ پہنچے، اپنے اونٹ بٹھائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہونے کی تیاری کرنے لگے۔ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو بھی ہماری آمد کی خبر ہوگئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہت خوش ہوئے اور فرمایا "مسلمانو! مکہ نے اپنے جگر گوشے نکال کر تمہارے سامنے ڈال دیے ہیں"۔ میں نے نیا لباس پہنا اور آنحضرت صلعم کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے چلا تو پہلے اپنے بھائی سے ملا۔ انہوں نے کہا "جلدی کرو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ حضرات کی آمد سے بہت خوش ہیں اور آپ سب کا انتظار فرما رہے ہیں"۔ یہ سن کر ہم بسرعت حضورؐ کی خدمت میں پہنچے۔ جس وقت میں حضورؐ کے سامنے حاضر ہوا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تبسم فرما رہے تھے۔

"میں نے قریب جاکر حضورؐ کو سلامِ نبوت پیش کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت خندہ پیشانی سے میرے سلام کا جواب دیا۔ پھر میں نے کہا:-

اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ۔

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا "سب تعریفیں خدا ہی کے لیے ہیں، جس نے تمہیں ہدایت فرمائی، مجھے امید تھی کہ تمہاری عقل بالآخر سیدھے راستے کی طرف ضرور تمہاری رہنمائی کرے گی"۔ میں نے عرض کیا "یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میں آپؐ کے خلاف کئی جنگوں میں لڑ چکا ہوں، آپؐ اللہ سے میرے اس گناہ کی معافی کے لیے دعا فرمئیں"۔

حضورؐ نے فرمایا: "اسلام پہلے کی تمام برائیوں کو محو کردیتا ہے"۔ عرض کیا، کیا واقعی؟ فرمایا "ہاں"۔ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میری تمام پچھلی لغزشوں کی معافی کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائی۔ پھر عمرو بن العاصؓ اور عثمان بن طلحہ بھی خدمتِ اقدس میں پیش ہوکر حلقہ بگوشِ اسلام ہوگئے۔"[1]

ہجرت: قبولِ اسلام کے بعد حضرت عمرو بن العاصؓ تو مکہ لوٹ گئے مگر حضرت خالد بن ولیدؓ نے مدینہ ہی میں مستقل قیام

---

[1] طبقات ابنِ سعد جلد چہارم، محمد رسول اللہ مؤلفہ محمد رضا مصری اور خالد سیف اللہ مؤلفہ ابوزید شلبی سے ماخوذ۔

اختیار کر لیا۔ حضرت خالدؓ فرماتے ہیں "خدا کی قسم! جس دن سے میں نے اسلام قبول کیا ہے۔ اس دن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ میں اور دوسرے صحابہؓ کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے تھے اور ہر موقع پر مجھے بھی دوسرے صحابہؓ کے ساتھ شریک فرماتے تھے"، مدینہ میں رہائش کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن مکانوں میں سے جو حضرت حارثہؓ بن نعمان نے حضورؐ کو پیش کیے تھے، ایک مکان حضرت خالدؓ کو عنایت فرمایا۔[1]

غزوات

جیسا کہ یہ لکھا جا چکا ہے کہ ظہورِ اسلام کے وقت حضرت خالدؓ اپنے خاندانی عہدہ یعنی فوج کی سپہ سالاری اور فوجی کیمپ کے انتظام پر ممتاز تھے۔ قبولِ اسلام کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کا یہ اعزاز قائم رکھا، جس کے باعث اسلامی فتوحات میں بڑی امداد ملی، حضرت خالدؓ جس طرح اسلام لانے سے پہلے مسلمانوں کے سخت دشمن تھے۔ اسی طرح حلقہ بگوشِ اسلام ہونے کے بعد مشرکوں کے لیے سخت ترین خطرہ بن گئے۔ چنانچہ آپ کی تلوار اکثر معرکوں میں مشرکین کا شیرازہ بکھیرتی رہی۔[2]

سریہ موتہ

حضرت خالدؓ قبولِ اسلام کے بعد سب سے پہلے سریہ موتہ میں شریک ہوئے۔ مؤرخین کے مطابق اس جنگ کا سبب یہ ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف حاکموں اور رئیسوں کے نام دعوتِ اسلام کے خطوط بھیجے تو ایک خط شاہِ بصریٰ کے نام بھی ارسال فرمایا جسے حضرت حارثؓ بن عمیر ازدیؓ لے کر گئے تھے۔ حضرت حارثؓ شام کے علاقہ بلقاء سے گزرتے ہوئے بصریٰ جا رہے تھے کہ موتہ کے عامل شرحبیل بن عمرو غسانی نے انہیں قتل کر دیا، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شرحبیل کے اس ظالمانہ فعل کا علم ہوا تو یہ حد درجہ رنج افزا واقعہ آپ کی طبع مبارک پر بہت گراں گزرا، چنانچہ حضورؐ نے اس کے انتقام کے لیے جمادی الاولیٰ ۸ھ میں تین ہزار کی جمعیت حضرت زیدؓ بن حارثہؓ کی سرکردگی میں روانہ کی اور ہدایت فرمائی کہ اگر زیدؓ شہید ہو جائیں تو جعفرؓ ان کی جگہ لیں گے، اگر یہ بھی جامِ شہادت نوش کریں تو عبداللہؓ بن رواحہ لشکر کے امیر ہوں گے اور اگر ابن رواحہ بھی قتل سے محفوظ نہ رہیں، تو مسلمان جسے چاہیں امیر چن لیں۔[3]

جب مجاہدین کی یہ چھوٹی سی جماعت ارضِ بلقاء میں پہنچی تو معلوم ہوا کہ دشمن کا ایک بڑا لشکر موتہ سے چند میل دور مشارف میں پہنچ گیا ہے، اسلامی لشکر نے موتہ کو مرکز بنا کر اسی کے وسیع میدان میں جنگ کا آغاز کیا۔ دستور کے مطابق حضرت زیدؓ بن حارثہ پرچمِ اسلام اُٹھا کر آگے بڑھے اور بڑی مردانگی سے لڑ کر شہادت پائی۔ اُن کے بعد حضرت جعفر بن ابی طالبؓ نے علم اٹھایا اور جب تک جسم میں جان باقی رہی۔ یہ پرچمِ اسلام سرنگوں نہ ہونے دیا، ان کی شہادت کے بعد حضرت عبداللہ بن رواحہؓ نے علم ہاتھ میں لیا اور لڑتے لڑتے جامِ شہادت نوش کیا، حضرت عبداللہؓ کے بعد مسلمانوں کا کوئی امیر نہ رہا جس کے باعث اسلامی لشکر پر اضطراب طاری ہو گیا۔ مگر یہ حالت زیادہ دیر قائم نہ رہی کہ حضرت ثابت بن ارقمؓ کے حسنِ تدبیر، دُور اندیشی اور مردانگی کی برکت سے حضرت خالدؓ بن ولید کی سالاری پر اتفاق ہو گیا، حضرت خالدؓ نے فوری طور پر منتشر لشکر کو اکٹھا کر کے اچانک اس زور سے حملہ کیا کہ دشمن کے چھکے چھوٹ گئے۔ آپ اگرچہ دشمن کو شکست تو نہ دے سکے مگر اپنی جنگی قابلیت سے باقی ماندہ اسلامی فوج کو دشمن کی دستبرد سے بچا لائے

---

[1] طبقات ابنِ سعدؒ جلد چہارم [2] سیر الصحابہؓ مہاجرین حصہ دوم [3] رسولِ رحمتؐ مرتبہ مولانا غلام رسول مہر۔

اس جنگ میں حضرت خالد رضؓ کے ہاتھ سے نو۹ تلواریں ٹوٹیں اور بارگاہِ رسالت مآب سے آپ کو "سیف اللہ" کا معزز خطاب ارزانی ہُوا۔

دائرۂ اسلام میں آنے کے بعد حضرت خالد رضؓ کی غیر معمولی جنگی صلاحیتوں کی یہ پہلی جلوہ افروزی تھی، آگے چل کر اللہ کی اس تلوار نے جو حیرت انگیز کارنامے انجام دیے وہ حربیات کی تاریخ کا قابل فخر سرمایہ ہیں۔

فتح مکہ

حضرت خالد رضؓ فتح مکہ (۲۰ رمضان المبارک ۸ھ) میں میمنہ کے افسر تھے۔ اگرچہ اس فتح میں جنگ کی نوبت نہ آئی اور روسائے قریش نے بلا مزاحمت ہتھیار ڈال دیے تاہم چند مشرکین حضرت خالد رضؓ کے ہاتھوں مارے گئے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت خالدؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تھا کہ وہ اپنا دستہ مکہ کے بالائی حصہ کدا کی جانب سے لے کر آئیں چنانچہ یہ رہے تھے کہ قریش کے ایک گروہ نے مقابلہ کا قصد کیا۔ اور ان کے لشکر میں سے حضرت کرز رضؓ بن جابر الفہری اور حضرت خنیس رضؓ بن خالد بن خالد بن ربیعہ کو جو لشکر سے الگ ہو کر کسی اور راستے پر ہو لیے تھے۔ شہید کر ڈالا۔ حضرت خالد رضؓ کو علم ہُوا، تو مجبوراً جوابی حملہ کیا، مشرکین تیرہ لاشیں چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پتہ چلا تو حضرت خالد رضؓ سے باز پرس کی، لیکن جب معلوم ہُوا کہ ابتدا مشرکین کی جانب سے ہوئی تھی، تو فرمایا قضائے الٰہی یہی تھی"۔[1]

سریہ خالدؓ بن ولید انہدامِ عزیٰ

فتح مکہ کے پانچ دن بعد (۲۵ رمضان المبارک ۸ھ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد رضؓ بن ولید کو تیس سواروں کے ساتھ عرب کے مشہور و رسمی بت عزیٰ کو توڑنے کے لیے نخلہ بھیجا۔ حضرت خالدؓ یہ کام پُورا کر کے جب واپس آئے تو حضورؐ نے پوچھا کہ تم نے وہاں کچھ دیکھا؟ عرض کیا "نہیں" فرمایا کہ تب تو وہ ابھی منہدم نہیں ہُوا ہے۔ جاؤ اس کو منہدم کر کے آؤ، اس ارشاد پر حضرت خالد رضؓ ننگی تلوار لیے وہاں پہنچے تو ایک منتشر بالوں والی سیاہ فام ننگی عورت نکلی اور صنم خانہ کا خادم شور مچانے لگا حضرت خالد رضؓ نے اس عورت کو قتل کر دیا، اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی۔ حضورؐ نے فرمایا ہاں یہ عزیٰ تھی اور اب تمہارے ملک میں اس کی پرستش نہ ہوگی، یہ عزیٰ، قریش اور تمام بنی کنانہ کا سب سے بڑا بُت تھا اور بنی شیبان اس کے خادم تھے۔[2]

سریہ خالد بن ولید الیٰ بنو جذیمہ

عزیٰ کے انہدام کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جبکہ آپؐ مکہ میں ہی مقیم تھے۔ حضرت خالد رضؓ کو تین سو ساٹھ مہاجرین و انصار اور بنو سلیم کے ساتھ دعوتِ اسلام کی غرض سے بنو جذیمہ کی طرف روانہ فرمایا، لیکن انہیں قتل و قتال کا حکم نہ تھا۔ حضرت خالد رضؓ شوال ۸ھ وہاں پہنچے اور انہیں اسلام کی دعوت دی، انہوں نے بجائے اسلمنا (ہم اسلام لائے) کہنے کے صبانا، صبانا (ہم صابی ہوگئے۔ ہم صابی ہوگئے) کہنا شروع کر دیا، یہ سُن کر حضرت خالد رضؓ نے انہیں قتل کرنا اور گرفتار کرنا شروع کر دیا۔ جو لوگ گرفتار کیے گئے انہیں مسلمانوں میں بانٹ دیا گیا، دوسرے دن آپ نے قیدیوں کے قتل کا حکم دیا، انصار و مہاجرین اپنے قیدیوں کو قتل کرنے کی بجائے آنحضرت صلعم

---

[1] سیرۃ النبیؐ جلد اوّل [2] اصح السیر صفحہ ۳۱۲

کی خدمت میں لے آئے۔ البتہ بنو سلیم نے اپنی نگرانی میں دیے گئے قیدیوں کو حضرت خالدؓ کے حکم پر قتل کر دیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب حقیقتِ حال کا علم ہوا تو بے چین ہو گئے اور اپنے ہاتھ اوپر اٹھا کر دو مرتبہ فرمایا: اے اللہ! میں خالدؓ کے فعل سے بری الذمہ ہوں۔[1]

حضورؐ نے حضرت علیؓ کو ان سب کی دیت دے کر بھیجا۔ حضرت علیؓ نے سب کو جان و مال کا پورا پورا معاوضہ دیا۔ یہاں تک کہ کتوں تک کا خون بہا دیا۔ اس پر بھی جو بچ رہا سب ان ہی لوگوں میں تقسیم کر دیا۔

غزوۂ حُنین

فتح مکہ کے بعد شوال ۸ھ میں بنو ثقیف و ہوازن، اوطاس کے میدان میں جمع ہوئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس اجتماع کی خبر ہوئی، تو آپ بارہ ہزار فوج کے ساتھ مقابلہ کو نکلے۔ قبیلوں کے لحاظ سے اسلامی فوج کے مختلف حصے تھے۔ بنو سلیم کا قبیلہ مقدمۃ الجیش تھا اور اس کی کمان حضرت خالدؓ کے ہاتھ میں تھی۔ اس جنگ میں حضرت خالدؓ نے اس بہادری سے تلوار چلائی کہ صفوں کی صفیں کاٹ کر رکھ دیں تاہم ان کو خود بھی دوران جنگ کئی زخم آئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت خالدؓ سے جو تعلق تھا، وہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضورؐ بنفسِ نفیس اُن کی عیادت کے لیے تشریف لائے اور زخموں کو دم کیا جس سے حضرت خالدؓ جلد شفایاب ہو گئے۔[2]

غزوۂ طائف

مشرکین حُنین کی شکست خوردہ فوج نے طائف میں قلعہ بند ہو کر دوبارہ جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں پہنچ کر قلعہ کا محاصرہ فرما لیا، اہلِ قلعہ نے شدید مدافعت کی اور مجاہدینِ اسلام پر لوہے کی گرم سلاخیں، تیر اور پتھر اس شدت سے برسائے کہ بہت سے مسلمان شہید ہو گئے۔ مسلمانوں نے بھی مدافعانہ حملہ کیا۔ اس فوج کا مقدمۃ الجیش بھی حضرت خالدؓ کے زیرِ کمان تھا۔

تبوک

رجب ۹ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ملی کہ رومیوں نے مسلمانوں کے خلاف شام میں فوج جمع کی ہے اور اس کا مقدمۃ الجیش بلقاء تک پہنچ چکا ہے۔ اس اطلاع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تیس ہزار مجاہدین کے ساتھ مقابلہ کو نکلے اور مقامِ تبوک تک تشریف لے گئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ رومی فوج کے اجتماع کی خبر غلط تھی اس لیے جنگ کی نوبت نہ آئی تاہم حضورؐ نے اسی مقام پر تقریباً بیس دن قیام فرمایا اور گرد و نواح کے عربی النسل عیسائی رؤسا کو مطیع کرنا ضروری خیال کیا جن کے ذریعہ رومی ریشہ دوانیاں کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ ایلہ اور اذرح کے رئیسوں نے اطاعت قبول کر لی۔ صرف دومۃ الجندل کا رئیس اکیدر بن عبدالملک رہ گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالدؓ کو چار سو بیس سواروں کے ساتھ اکیدر کو مطیع بنانے پر مامور فرمایا اور روانگی کے وقت ہدایت فرمائی کہ اکیدر تم کو شکار کرتا ہوا ملے گا، اس کو قتل نہ کرنا بلکہ گرفتار کر کے میرے پاس لانا۔ البتہ وہ اگر انکار کرے تو قتل کر دینا۔ حضرت خالدؓ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ اکیدر بیل گائے کا شکار کر رہا ہے۔ اکیدر کے بھائی حسان نے مقابلہ کیا مگر قتل ہو گیا اور اس کے بقیہ ساتھی قلعہ میں گھس گئے۔ حضرت خالدؓ نے اکیدر کو گرفتار کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر کیا۔ اکیدر نے جزیہ دے کر اطاعت قبول کر لی اور حضورؐ نے اس کو جان و مال کا امان نامہ عطا

---

[1] خالدؓ سیف اللہ مؤلفہ ابوزید شلبی [2] سیر الصحابہؓ مہاجرین حصہ دوم۔

فرمایا [1]

سریہ خالد بن ولید (سریہ نجران)

بنی الحارث، نجران کا ایک معزز خاندان تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ربیع الآخر ۱۰ھ میں حضرت خالدؓ بن ولید کو تبلیغ اسلام کے لیے ان لوگوں کی طرف بھیجا اور ہدایت فرمائی کہ محض اسلام کی دعوت دینا، تلوار نہ اٹھانا، حضرت خالدؓ نے ارشادِ نبوتؐ کی پوری پابندی کی اور میدانِ جنگ کے سپاہی دفعتہً مبلغ اسلام کے قالب میں آگئے۔ اللہ تعالیٰ نے بنی الحارث پر رحم فرمایا کہ وہ بغیر کسی مزاحمت کے حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے۔ حضرت خالدؓ نے یہ خوش خبری لکھ کر بارگاہ رسالت مآبؐ میں بھیجی۔ حکم ہوا کہ ایک وفد لے کر دربارِ رسالتؐ میں حاضر ہوں۔ چنانچہ یہ لوگ حاضر ہوئے اور دیدارِ جمالِ نبویؐ سے فیضیاب ہو کر واپس گئے۔

حضرت خالدؓ یمن میں

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آخر ۱۰ھ میں حضرت علیؓ کی زیر امارت ایک سریہ یمن بھیجا اور دوسری سمت سے حضرت خالدؓ بن ولید کو یمن پہنچنے کا حکم دیا۔ مزید ہدایت فرمائی کہ جب دونوں لشکر مل جائیں تو حضرت علیؓ امیر لشکر ہوں گے اور جنگ کی ابتدا مسلمانوں کی طرف سے نہ ہوگی، اِلّا اس صورت کے کہ یمنی پیشقدمی کریں۔

یمن پہنچ کر حضرت علیؓ نے مشرکین کے سامنے اسلام پیش کیا۔ اس کے جواب میں انہوں نے تیر اور پتھر پھینکے۔ مسلمانوں نے اپنی مدافعت کے لیے تلوار اٹھائی، یمنی پسپا ہو گئے۔ اہلِ اسلام نے پھر اسلام پیش کیا، جسے اہلِ یمن نے بخوشی قبول کر لیا، اس کے بعد لشکر اسلام اپنی مہم میں کامیاب ہو کر واپس مدینہ لوٹ آیا۔

دورِ صدیقیؓ کی مشکلات

۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا۔ آپؐ کے بعد قوم نے متفقہ طور پر حضرت ابوبکر صدیقؓ کو خلیفہ منتخب کیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت کا آغاز ایسے وقت میں ہوا، جب کہ جزیرۃ العرب میں ہر طرف مرتدین اور جھوٹے مدعیان نبوت نے سخت اضطراب پیدا کر رکھا تھا۔ ان فتنوں سے سوائے مکہ، مدینہ اور طائف کے باشندوں اور چند بدوی قبائل کے عرب کا اور کوئی قبیلہ محفوظ نہ تھا، سارے کے سارے قبائل اس طوفان میں بہہ گئے تھے۔

اس نازک صورتِ حال پر قابو پانے کے لیے ایک ایسے صاحبِ عزیمت اور کامل الایمان شخص کی ضرورت تھی، جو بے نظیر عزم و ہمت اور لاثانی تدبر و فراست کی بدولت ان فتنوں پر قابو پا کر اہلِ عرب کو شدید ہیجان و اضطراب سے نجات دلا سکے، یہ سب صفات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رفیقِ غار حضرت ابوبکر صدیق میں پائی جاتی تھیں، چنانچہ آپ نے اپنے مضبوط عزم و ارادے اور ایمان کی لازوال قوتوں کے ساتھ ان فتنوں کے استیصال کے لیے قدم اٹھایا اور مرتدین اور جھوٹے مدعیان نبوت کی سرکوبی کے لیے گیارہ لشکر تیار کیے۔ ان میں ایک لشکر کی امارت حضرت خالدؓ بن ولید کے سپرد کر کے حکم دیا کہ وہ پہلے بزاخہ جا کر طلیحہ پر چڑھائی کریں، ازاں بعد مالک بن نویرہ کی سرکوبی کے لیے بطاح کی طرف بڑھیں [2]

---

[1] سیر الصحابہؓ مہاجرین حصہ دوم [2] خالدؓ "سیف اللہ" از ابو زید شبلی۔

کاذب مدعی نبوت طلیحہ کی سرکوبی

طلیحہ بن خویلد اسدی، بنو اسد بن خزیمہ میں سے تھا۔ حجۃ الوداع کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مرض کی خبر سن کر اس نے حضورؐ کی زندگی ہی میں نبوت کا دعویٰ کر دیا۔ حضورؐ نے حضرت ضرارؓ بن ازور کو طلیحہ کی سرکوبی کے لئے بھیجا حضرت ضرار نے اس فتنہ کو کافی حد تک دبا دیا کہ اسی دوران آنحضرت صلعم کے وصال کی خبر پہنچی، حضرت ضرارؓ اس مہم کو ناتمام چھوڑ کر مدینہ واپس آ گئے اُن کی واپسی کے بعد یہ فتنہ پوری شدت سے بھڑک اُٹھا اور بہت سے قبائل نے طلیحہ کی اطاعت قبول کر لی۔

حضرت خالدؓ خلیفۃ الرسول حضرت ابوبکرؓ کا حکم ملتے ہی بزاخہ کی طرف بڑھے اور پہنچتے ہی لڑائی کا میدان گرم کر دیا۔

طلیحہ کی فوج میں دیگر بہادروں کے علاوہ عرب کا نامور شجاع عیینہ بن حصن فزاری بھی اپنے سات سو آدمیوں کے ساتھ شامل تھا فریقین کے درمیان گھمسان کی لڑائی شروع ہوئی۔ طلیحہ اپنے آدمیوں کو دھوکا دینے کے لیے ایک طرف چادر اوڑھے وحی کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ طلیحہ کی فوج نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا۔ مگر خالد سیف اللہؓ نے اپنے تابڑ توڑ حملوں سے اس کے چھکے چھڑا دیے۔ لڑائی کا یہ رنگ دیکھ کر طلیحہ اپنی بیوی نوار سمیت گھوڑے پر سوار ہو کر شام بھاگ گیا، عیینہ بن حصن نے بھی بھاگنے کی کوشش کی، مگر حضرت خالدؓ نے تعاقب کر کے اُسے معہ تیس ساتھیوں کے گرفتار کر لیا اور حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں بھیج دیا۔

امّ زمل کی سرکوبی

مؤرخین کے مطابق حضرت خالدؓ چشمہ بزاخہ پر ایک ماہ تک مقیم رہ کر اس علاقہ کے امن و امان کی بحالی اور تحصیل زکوٰۃ میں مشغول رہے، اسی اثنا میں آپ کو خبر ملی کہ طلیحہ کی شکست خوردہ فوج قبیلہ فزارہ کی سردار امّ زمل[1] کے پاس جا کر جمع ہوئی ہے اور امّ زمل مسلمانوں سے نبرد آزما ہونے کا ارادہ رکھتی ہے، یہ اطلاع ملتے ہی حضرت خالدؓ بنو فزارہ کی طرف بڑھے، فریقین میں مقابلہ شروع ہُوا، امّ زمل ایک اونٹ پر سوار اپنی فوج کی ہمت بڑھا رہی تھی، مسلمان ہتھیلی پر جان رکھ کر امّ زمل کے اونٹ تک پہنچے اور اس کی کونچیں کاٹ کر اُسے زمین پر گرا دیا، امّ زمل قتل ہوئی اور اس کے حمائتی میدانِ جنگ سے فرار ہو گئے۔ حضرت خالدؓ ادھر سے فارغ ہو کر مالک بن نویرہ کی سرکوبی کے لیے بطاح کی طرف بڑھے۔

مالک بن نویرہ کا قتل

مالک بن نویرہ بنو تمیم کی ایک شاخ کا سردار تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد جن لوگوں نے ادائے زکوٰۃ سے انکار کیا اور مسلمانوں سے جنگ کا ارادہ کیا، ان میں مالک بن نویرہ بھی شامل تھا۔

جب حضرت خالدؓ بطاح پہنچے تو قبیلے کا کوئی فرد وہاں موجود نہ تھا۔ آپ نے نواحی علاقوں میں فوجی دستے بھیجے اور انہیں حکم دیا کہ وہ جس شخص سے ملیں اسے دوبارہ قبولِ اسلام کی دعوت دیں، ان میں سے ایک دستہ مالک بن نویرہ اور اس کے چند ہم قبیلہ لوگوں کو گرفتار کر کے حضرت خالدؓ کے پاس لے آیا، مسلمان فوجی دستہ میں اس بات پر اختلاف تھا کہ گرفتاری سے قبل ان لوگوں نے اذان دی تھی یا نہیں۔ جب کوئی فیصلہ نہ ہو سکا، تو حضرت خالدؓ نے مالک بن نویرہ اور اس کے ساتھیوں کو قید کرنے کا حکم دیا۔ رات چونکہ سرد تھی۔ اس لیے حضرت

---

[1] امّ زمل کا نام سلمیٰ بنت مالک بن حذیفہ تھا، یہ امِ قرفہ کی بیٹی تھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قتل کر دی گئی تھی۔ امّ قرفہ عیینہ بن حصن فزاری کی چچی تھی اور اپنی قوم بنی فزارہ میں بڑی عزت اور شان کی مالک تھی، اس کے قتل کے بعد اس کی بیٹی امِ زمل لونڈی بن کر حضرت عائشہ صدیقہؓ کے حصہ میں آئی۔ آپ نے اسے آزاد کر دیا چنانچہ اپنے قبیلہ میں واپس جا کر امّ زمل نے اپنی ماں کی جگہ سنبھال لی اور موقع ملنے پر مُرتدین کو ساتھ لے کر مسلمانوں کے مقابلہ پر آ گئی۔

خالدؓ نے منادی کرائی کہ "اپنے قیدیوں کو گرمی پہنچاؤ"۔ اس سے غلط فہمی پیدا ہوئی اور اسے قتل کا اشارہ سمجھ کر مسلمان نے قیدیوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ حضرت خالدؓ شور سُن کر خیمہ سے باہر آئے۔ لیکن اس وقت تک مالک بن نویرہ سمیت تمام قیدیوں کا کام تمام ہو چکا تھا۔

مالک بن نویرہ کا قتل جائز تھا یا نہیں، مؤرخین کے نزدیک یہ ایک اختلافی مسئلہ ہے۔ اس پر البتہ اتفاق ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کے طلب کرنے پر جب حضرت خالدؓ مدینہ پہنچے اور تمام واقعہ بیان کیا، تو حضرت صدیق اکبرؓ نے حضرت خالدؓ کا عذر قبول فرما لیا اور بیت المال سے مالک بن نویرہ کا خون بہا ادا کر دیا، تاہم مالک کی بیوہ سے حضرت خالدؓ کی شادی کو پسند نہ فرمایا اور انہیں حکم دیا کہ وہ اُسے طلاق دے دیں۔ [1]

مسیلمہ کذّاب کی پامالی جنگ یمامہ ۱۱ھ

دیگر قبائل کی طرح بنو حنیفہ کا ایک وفد بھی رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہُوا تھا اس وفد میں مسیلمہ بن حبیب بھی تھا۔ جب بنو حنیفہ واپس اپنے قبیلہ میں پہنچے تو مسیلمہ نے نبوت کا دعویٰ کر دیا اور مسجع اور مقفّع عبارتیں بنا کر اپنے قبیلہ کے سامنے بطور وحی پیش کیں جس کے باعث بنو حنیفہ نے اس کی اطاعت قبول کر لی۔

رسولُ اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی وفات کے بعد مسیلمہ کا فتنہ اور زور پکڑ گیا۔ اس فتنے کو بھڑکانے میں زیادہ حصّہ نہار الرجال بن عنفوا کا تھا۔ اس شخص نے ہجرت کے بعد مدینہ میں آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی نگرانی میں اپنی تعلیم حاصل کی تھی۔ جب اہل یمامہ مدینہ آئے تو حضورؐ نے ان کی تعلیم و تربیت کے لیے اُسے ان لوگوں کے ساتھ روانہ کیا۔ وہاں پہنچ کر یہ مُسیلمہ سے مل گیا جس کے باعث لوگوں کو مسیلمہ کی نبوت کا یقین ہو گیا اور اس طرح نہار الرجال کی امداد و اعانت سے ایک زبردست فتنہ اُٹھ کھڑا ہُوا۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے مُرتدین اور جھوٹے مدعیان نبوّت کے فتنوں کے استیصال کے لیے جو گیارہ علم تیار کیے تھے۔ ان میں سے ایک حضرت عکرمہؓ بن ابوجہل کے سپرد فرما کر انہیں ہدایت کی تھی کہ وہ مُسیلمہ کذّاب کی سرکوبی کے لیے روانہ ہو جائیں، اُن کے پیچھے حضرت شرجیلؓ بن حسنہ کو کمک دے کر بھیجا۔ حضرت عکرمہؓ نے اس خیال سے کہ مسیلمہ کذاب کی سرکوبی کا فخر صرف انہی کے حصّہ میں آئے۔ حضرت شرجیلؓ کے پہنچنے سے قبل ہی بنو حنیفہ پر حملہ کر دیا، لیکن ہزیمت اٹھائی۔ اس شکست کی خبر جب خلیفۃ الرسول حضرت ابوبکر صدیقؓ کو پہنچی، تو آپ نے حضرت عکرمہؓ کو لکھا "تم خود تو استاد نہیں مگر شاگردی کو عیب جانتے ہو شرجیلؓ کے پہنچنے سے پہلے حملہ کیوں کیا' اب تم مدینہ کا رُخ نہ کرنا بلکہ حذیفہ اور عرفجہ کے پاس چلے جاؤ اور ان کی ماتحتی میں مہرہ اور اہل عمان سے لڑو"۔ [2]

حضرت خالدؓ ان دنوں مالک بن نویرہ کے قتل کی جواب دہی کے سلسلے میں مدینہ میں تھے کہ حضرت عکرمہؓ کی ہزیمت کی خبر دربارِ خلافت میں پہنچی چنانچہ حضرت ابُوبکر صدیقؓ نے حضرت خالدؓ کو اسی وقت مسیلمہ کذّاب کی طرف روانہ کیا۔

حضرت خالدؓ روانگی کا حکم ملتے ہی یمامہ کی طرف روانہ ہُوئے۔ اس وقت بنو حنیفہ کا بہت زور و شور تھا۔ مؤرخین کے مطابق چالیس ہزار جنگ آور یمامہ کے دیہات اور وادیوں میں پھیلے ہوئے تھے حضرت شرجیلؓ نے بھی عجلت کر کے حضرت عکرمہؓ کی طرح لڑائی شروع کر دی

---

[1] خالدؓ "سیف اللہ" از ابو زید شبلی [2] تاریخ ابن خلدون حصّہ اوّل

اور ناکامی کے آثار نمایاں تھے کہ خوش قسمتی سے حضرت خالدؓ پہنچ گئے، اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے حضرت سلیط کی زیرِ کمان ایک اور گروہ حضرت خالدؓ کی امداد کے لئے بھیج دیا۔

مسیلمہ کذاب تک پہنچنے میں ابھی ایک روز کا راستہ باقی تھا کہ حضرت خالدؓ نے حضرت شرجیلؓ کو مقدمۃ الجیش پر مقرر کرکے آگے بڑھنے کو کہا اتفاق سے رات کے وقت اُن کی مڈبھیڑ مجاعہ سے ہوگئی جو چالیس یا ساٹھ آدمیوں کے ہمراہ بلاد بن علو تمیم کی طرف شب خون مارنے گیا تھا۔ مسلمانوں نے ان پر حملہ کرکے مجاعہ بن مرارہ کے علاوہ سب کو خاک و خون میں لوٹا دیا۔

مسیلمہ کو حضرت خالدؓ کی آمد کا حال معلوم ہُوا تو چالیس ہزار کی عظیم الشان جمعیت کے ساتھ عقربا کے مقام پر خیمہ زن ہوا۔ حضرت خالدؓ بھی تیرہ ہزار فوج کے ساتھ وہیں پہنچ گئے اور ایک خونریز جنگ کی ابتداء ہوئی' دونوں طرف سے لڑنے والے ایک دوسرے پر اس شدت کے ساتھ ٹوٹے پڑتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ یہی لڑائی فریقین کے مستقبل کا فیصلہ کرنے والی ہے' پہلے حملہ میں بنوحنیفہ لڑتے لڑتے حضرت خالدؓ کے اس خیمہ تک پہنچ گئے' جہاں مجاعہ قید تھا۔ اس کے بعد لشکرِ اسلام اللہ اکبر کہتا ہُوا بنی حنیفہ پر اس زور سے حملہ آور ہُوا کہ بنی حنیفہ بدحواسی کے عالم میں بھاگ نکلے' محکم بن طفیل نے جو لشکر مسیلمہ کے میسرہ پر تھا) بنوحنیفہ کو پکار کر کہا کہ حدیقہ[1] میں چلے جاؤ میں تمہاری حفاظت کروں گا۔ یہ سُن کر بنوحنیفہ نے تو باغ میں گھسنا شروع کردیا۔ مگر ابنِ طفیل جس نے ان کی حفاظت کا ذمہ لیا تھا حضرت عبدالرحمٰن بن ابوبکرؓ کے ہاتھ سے قتل ہوگیا' باغ کے اندر پہنچ کر مسیلمہ کے لشکر نے دروازہ بند کرلیا مگر مسلمان حضرت براء بن مالکؓ کی کوششوں سے دروازہ توڑ کر گھسنے میں کامیاب ہوگئے اور پھر قیامت خیز لڑائی شروع ہوگئی' اس افراتفری کے عالم میں لوگوں نے مسیلمہ سے پوچھا "تیرا وہ وعدہ کہاں ہے۔ جو تیرا خدا تجھ سے کرتا تھا" مسیلمہ نے جواب دیا "ہر شخص اپنے اہل و عیال کے لئے لڑے یہ موقع ان باتوں کے دریافت کرنے کا نہیں ہے"[1] مسیلمہ نے جب اپنی نجات کی کوئی صورت نہ دیکھی تو گھوڑے پر سوار ہوکر ایک جمعیت کو ساتھ لے کر لڑتا ہوا باغ سے باہر نکلا' جونہی باہر آیا حضرت وحشیؓ نے تاک کر ایسا وار کیا کہ وہیں ڈھیر ہوگیا اس کے ساتھ ہی بنوحنیفہ کی ہمت ٹوٹ گئی اور وہ پسپا ہونے لگے، مسلمانوں نے چاروں طرف سے گھیر کر انہیں قتل کرنا شروع کیا اور ان کی لاشوں سے سارا باغ پٹ گیا

اس دن لڑائی میں بنوحنیفہ کے اکیس ہزار آدمی کھیت رہے، مسلمان شہداء کی تعداد ایک ہزار تھی جن میں کثرت سے حافظ قرآن تھے مسیلمہ کذاب کے قاتل حضرت وحشیؓ فرمایا کرتے تھے کہ جس حربہ سے میں نے خیر الناس (یعنی حضرت امیر حمزہؓ) کو شہید کیا تھا اسی حربے سے شر الناس (مسیلمہ کذاب) کو قتل کیا۔

مُرتدین کی سرکوبی

مدعیانِ نبوت کی مہم سے فارغ ہوکر حضرت خالدؓ منکرین زکوٰۃ اور مُرتدین کی طرف بڑھے اور سب سے پہلے بنو اسد و غطفان سے برسرِ پیکار ہوئے اِن میں سے کچھ قتل ہوئے اور کچھ گرفتار' جو باقی بچے وہ تائب ہوگئے ان معرکوں کے علاوہ ارتداد کے سلسلہ میں جس قدر معرکے ہوئے' ان سب میں حضرت خالدؓ پیش پیش تھے علامہ طبری فرماتے ہیں

"ارتداد میں جتنی فتوحات ہوئیں وہ خالدؓ بن ولید کا کارنامہ ہیں"

عراق پر فوج کشی کے اسباب : سلہ ھ میں جب جزیرۃ العرب میں حالات پُرسکون ہوگئے اور مُرتدین کا فتنہ فرو ہوگیا

---

[1] مورخین کے مطابق شہر یمامہ کے دروازہ پر ایک باغ تھا جس کو حدیقۃ الرحمٰن کہتے تھے مسیلمہ نے اپنا خیمہ اسی باغ میں نصب کیا تھا۔ [2] تاریخ ابن خلدون حصہ اول[3] تاریخ الخلفاء سیوطی

تو مسلمانوں نے اپنی توجہ عراق کی جانب مبذول کی۔

جزیرہ عرب اس عہد کی دو عظیم الشان مخالف سلطنتوں میں گھرا ہوا تھا' ایران میں ساسانی اور شام میں رومی دونوں حکومتیں عربوں کی قدیم دشمن تھیں اور ہمیشہ ان کی آزادی چھیننے کے در پے رہتی تھیں۔

ظہورِ اسلام کے بعد جب عرب متحد ہو کر ایک مرکز پر جمع ہو گئے تو ان دونوں سلطنتوں کے لئے عرب کا سوال اور زیادہ اہمیت اختیار کر گیا۔ چنانچہ اپنے بغض و حسد کا اظہار اگر ایرانی حکومت نے آنحضرت صلعم کا نامۂ مبارک چاک کر کے کیا تو دوسری طرف رومی حکومت کے ایک حاکم شرجیل بن عمرو نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قاصد کو قتل کر کے اپنی دشمنی کا ثبوت دیا اور پھر جب آنحضرت صلعم کے وصال کے بعد عرب میں ارتداد کا فتنہ پھیلا تو ان سلطنتوں نے اس موقع کو اپنے لئے بے حد غنیمت جانا چنانچہ ایک طرف ہرقل کی فوجیں شام میں اور دوسری طرف ایران کی فوجیں عراق میں جمع ہونے لگیں

خلیفۂ رسول حضرت ابوبکر صدیقؓ ان دونوں حکومتوں کے عزائم سے اچھی طرح باخبر تھے' یہی وجہ ہے کہ آپ نے گیارہ لشکروں کو روانہ کرتے وقت ایک بہادر اور تجربہ کار شخص مثنیٰ بن حارث کو عراق کی جانب روانہ فرمایا تھا تاہم ان کو یہ ہدایت کی تھی کہ وہ فی الحال چھاپے مار کر عراقی رئیسوں کو ڈراتے رہیں' تاکہ وہ عرب کے اندرونی حالات میں فوجی مداخلت نہ کر سکیں

بہر کیف جب فتنۂ ارتداد ختم ہو گیا تو مثنیٰ بن حارث شیبانی نے حضرت صدیق اکبرؓ کو مدد کے لئے لکھا۔ حضرت صدیق اکبرؓ کی نگاہ میں سوادِ عراق کو فتح کرنے اور شاہانِ کسریٰ کی سلطنت کو ختم کرنے جیسے عظیم الشان کام کے لئے حضرت خالد سے زیادہ کوئی موزوں نہ تھا' چنانچہ آپ نے حضرت خالدؓ کو ان کی امداد پہ مامور کیا' اور شرفِ امارت بھی عطا کیا۔

جنگ اُبلہ اس وقت حضرت خالدؓ مدعیانِ نبوت اور مرتدین کی مہم سے فارغ ہو کر وادی الوبر میں مقیم دربارِ خلافت سے مزید احکام کے منتظر تھے چنانچہ حکم ملتے ہی عراق کی جانب بڑھے اور مقامِ نباج میں مثنیٰ سے مل گئے پھر بانقیا اور بارسوا کے حاکموں کو مطیع کرتے ہوئے اُبلہ پہنچے یہ مقام جنگی نقطہ نظر سے بہت اہم تھا اور عرب و ہندوستان کے بری و بحری خطوط یہاں آ کر ملتے تھے' بہر کیف اُبلہ کے حاکم ہرمز کو مسلمانوں کی پیش قدمی کی خبر ملی تو دربارِ ایران میں اردشیر کو اس امر کی اطلاع دے کر خود مقابلہ کے لئے بڑھا کاظمہ میں فریقین کا مقابلہ ہوا' ایرانیوں نے میدانِ جنگ سے فرار ناممکن بنانے کے لئے اپنے آپ کو زنجیروں میں جکڑ لیا تھا لیکن اسلامی فوج کی شجاعت نے اس زنجیرِ آہن کو بھی ٹکڑے ٹکڑے کر دیا' ایرانیوں نے فاش شکست کھائی اور ہرمز مارا گیا۔

جنگ مذار کسریٰ اردشیر نے ہرمز کا خط ملتے ہی ایک لشکرِ گراں قارن بن قریانس کی ماتحتی میں ہرمز کی امداد کے لئے بھیجا یہ لشکر جب مذار کے مقام پہ پہنچا تو اُسے ہرمز کی شکست اور قتل کی اطلاع ملی' چنانچہ قارن اسی مقام پر ٹھہر گیا اسی اثنا میں ہرمز کی شکست خوردہ فوج بھی قارن کے لشکر سے مل گئی قارن نے نہرِ ثنیٰ کے کنارے صف بندی کی اور اردشیر کے بیٹے قباذ اور انوشجان کو جو جنگ اُبلہ سے بچ کر نکل آئے تھے میسرہ اور میمنہ پر مقرر کیا حضرت خالد کو جب ان تیاریوں کی خبر ہوئی تو آپ مذار پہنچے اور ایک خونریز جنگ کے بعد ایرانیوں کو شکست فاش دی' جنگ میں قارن' قباذ' انوشجان اور دیگر بڑے بڑے افسروں کے علاوہ تیس ہزار ایرانی مقتول ہوئے۔

جنگ ولجہ[1] : جنگ مذار میں ایرانیوں کی حسرت ناک شکست کی خبر جب پایۂ تخت میں پہنچی تو اردشیر کو نہایت رنج ہوا' اس نے

---

[1] ولجہ کا شہر کسکر کے اس علاقہ میں واقع ہے جو صحرا سے ملحق ہے' یہ جنگ ماہِ صفر ۱۲ھ میں ہوئی۔

ایران کے ممتاز بہادروں اندرزغر اور بہمن جادویہ کو ایک عظیم الشان لشکر کے ساتھ یکے بعد دیگرے مسلمانوں کے مقابلہ کے لئے روانہ کیا دونوں مختلف راستوں سے بڑھے اور حیرہ اور کسکر کے تمام دہقانی اور آس پاس کے عربوں کو اپنے ساتھ لیتے ہوئے ولجہ کے مقام پر پہنچ کر خیمہ زن ہوگئے۔

حضرت خالدؓ ابھی مذار کے مقام پر ہی تھے کہ آپ کو اس عظیم اجتماع کی خبر ملی، چنانچہ آپ نے سوید بن مقرن کو ضروری ہدایات دے کر اپنے پیچھے چھوڑا اور خود مقابلہ کے لئے بڑھے، ایرانیوں کے لشکر گاہ کے قریب پہنچ کر تھوڑی سی فوج ساحل کے نشیب میں چھپا دی اور خود آگے بڑھ کر صف آرا ہوئے ایرانی پہلے سے تیار تھے۔ چنانچہ فریقین میں نہایت ہولناک جنگ شروع ہوگئی اور دیر تک گھمسان کا رن پڑا۔ جب حضرت خالدؓ نے دیکھا کہ ایرانی فوج میں تھکاوٹ کے آثار پیدا ہو رہے ہیں تو آپ نے اس فوج کو جو کمین گاہوں میں چھپی ہوئی تھی، میدانِ جنگ میں پہنچ جانے کا حکم دیا مسلمان کمین گاہوں سے نکل کر ٹوٹ پڑے ایرانی اس اچانک حملے کی تاب نہ لا سکے اور بدحواس ہو کر بھاگ نکلے، مسلمانوں نے ہر طرف سے گھیر کر انہیں قتل کرنا شروع کر دیا اس طرح بے شمار ایرانی مارے گئے، ایرانی سپہ سالار اندرزغر جان بچا کر بھاگ نکلا مگر کچھ دور آگے جا کر پیاس کی شدت سے مر گیا۔ جنگ کے بعد مسلمانوں نے عام آبادی سے کوئی تعرض نہ کیا اور ان کو پوری آزادی دے دی۔[1]

جنگ الیس

ولجہ کی جنگ میں عربی النسل عیسائی بھی جنہوں نے ایرانیوں کا ساتھ دیا تھا مارے گئے تھے، اس لئے تمام عیسائی قبائل اس کا انتقام لینے کے لئے بہمن جادویہ سے جو الیس میں پڑا ہوا تھا جا کر مل گئے حضرت خالدؓ ولجہ کی فتح کے بعد الیس پہنچے اور جاتے ہی جنگ چھیڑ دی، دیر تک کشت و خون کا سلسلہ جاری رہا، نتیجۃً حضرت خالدؓ نے ایرانیوں اور عربوں دونوں کو شکست دے کر ان کی بہت بڑی تعداد زندہ گرفتار کر کے قتل کرا دی۔

فتحِ امغیشیا

اس کے بعد حضرت خالدؓ امغیشیا کی طرف بڑھے مگر یہاں کے باشندے مسلمانوں کا رخ دیکھ کر پہلے ہی شہر خالی کر چکے تھے اس لئے جنگ کی نوبت نہ آئی تاہم حضرت خالدؓ نے ان تمام بستیوں کو جو اس کے ارد گرد تھیں، مسمار کرنے کا حکم دیا امغیشیا کا شہر حیرہ کا ہم پلہ تھا اور الیس کے قریب واقع تھا اس شہر سے مسلمانوں کو اس کثرت سے مال غنیمت ملا کہ ہر سوار کو پندرہ سو درہم ملے جب مال غنیمت کا خمس فتح کی خوشخبری اور حضرت خالدؓ کے عظیم الشان کارناموں کی خبر حضرت ابوبکرؓ کو پہنچی تو آپ کی خوشی کی انتہا نہ رہی اور آپ نے فرمایا

"اے معشر قریش! تمہارے شیر نے ایک شیر پر حملہ کر دیا اور اس کے بھٹ میں گھس کر اس کو مغلوب کر لیا اب عورتیں خالدؓ جیسا بہادر پیدا کرنے سے قاصر ہیں"[2]

خلیفۃ الرسول کے اس قول سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آپ حضرت خالدؓ سیف اللہ کی دل سے قدر کرتے اور ان کو اپنے فن میں یگانۂ روزگار سمجھتے تھے۔

حیرہ کی فتح

امغیشیا کی فتح کے بعد حضرت خالدؓ حیرہ کی طرف بڑھے، امغیشیا اور حیرہ کے درمیان نہر فرات تھی، حیرہ کے حاکم ازاذبہ نے پیش بندی کے طور پر پہلے ہی اپنے لڑکے کو مسلمانوں کے روکنے کے لئے آگے بھیج دیا تھا ابن ازاذبہ نے نہر فرات کا بند باندھ دیا جس سے مسلمانوں کی کشتیاں رک گئیں مسلمان کشتیوں سے اتر کر گھوڑوں پر سوار ہوگئے اور ابن ازاذبہ کو فرات کے دہانہ پر جا لیا، مقابلہ میں ابن ازاذبہ مارا گیا اور فوج تباہ ہوئی

---

[1] سیر الصحابہ مہاجرین حصہ دوم۔ [2] خالد سیف اللہ از ابو زید شبلی۔

اس کے بعد فرات کا بند کھول کر مسلمان حیرہ کی طرف بڑھے لیکن ان کے پہنچنے سے پہلے ہی ارادبہ حیرہ چھوڑ چکا تھا اہلِ شہر نے دروازے بند کر لیے حضرت خالدؓ نے ان کا محاصرہ کر لیا جو ایک عرصہ تک جاری رہا، اس دوران میں صلح کی گفت و شنید شروع ہوئی مگر جب کوئی نتیجہ نہ نکلا تو ایرانیوں نے قلعہ کے اوپر سے سنگباری شروع کر دی، جواب میں مسلمانوں نے پیچھے ہٹ کر اس شدت سے تیر برسائے کہ قلعہ اور محلات کی دیواریں چھلنی ہو گئیں آخر ایرانیوں نے محاصرہ سے گھبرا کر ایک لاکھ نوّے ہزار درہم سالانہ پر صلح کر لی، حضرت خالدؓ نے ایک صلح نامہ لکھ کر حوالہ کیا کہ :-

"اہلِ حیرہ ایک لاکھ نوّے ہزار درہم سالانہ ادا کریں گے ہم اس کے معاوضہ میں ان کی حفاظت کریں گے اور اگر ان کی حفاظت نہ کر سکیں تو یہ رقم ان پر واجب نہ رہے گی اور اگر وہ بدعہدی کریں تو ہم بری الذمہ ہیں"[1]

مسلمانوں کی ان فتوحات اور حضرت خالدؓ کے حُسنِ سلوک سے متاثر ہو کر حیرہ کے اطراف کے کاشتکاروں اور دیہی آبادی نے بھی بیس ہزار درہم سالانہ پر صلح کر لی۔ حضرت خالدؓ نے حیرہ اور ملحقاتِ حیرہ کی کامل تسخیر کے بعد حضرت ضرار بن الازور، ضرار بن خطاب، قعقاع بن عمرو، مثنیٰ ابن حارثہ اور عتبہ بن شماس، افسرانِ سرحد کو دجلہ کی ترائی میں بڑھنے کا حکم دیا، چنانچہ یہ لوگ حسب الحکم ساحل تک بڑھتے چلے گئے[2] اور جنوبی عراق پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔

نمازِ فتح

مورخین کے مطابق حیرہ فتح کر چکنے کے بعد حضرت خالدؓ نے آٹھ رکعت نمازِ فتح ادا فرمائی جس کے درمیان سلام نہیں پھیرا اس موقع پر آپ نے فرمایا کہ میرا اہلِ فارس جیسی کسی اور بہادر قوم سے مقابلہ نہیں ہوا اور ان میں اہلِ الیس زیادہ بہادر تھے۔

حضرت خالدؓ تقریباً ایک سال تک حیرہ میں مقیم رہے اور اس دوران میں سرحدوں کی حفاظت اور خراج کی وصولی کے لئے عہدہ دار مقرر کرنے کا کام انجام دیتے رہے[2]

جنگِ انبار

اس دوران میں اردشیر مر گیا، اس کی موت کے بعد اگرچہ ایرانیوں میں اندرونی اختلاف بڑھ گئے تھے تاہم مسلمانوں کے مقابلہ میں پوری قوم متحد تھی اور انہوں نے اپنی مرکزیت قائم کرنے کے لئے فرخزاد بن بندوان کو (جو شاہی خاندان سے نہ تھا) عنانِ حکومت سپرد کر دی تھی، اس وقت ایرانی فوجیں شمالی عراق میں عین التمر سے لے کر انبار اور فراض تک پھیلی ہوئی تھیں۔ حضرت خالد جنوبی عراق کی حفاظت کے لئے قعقاع بن عمرو کو چھوڑ کر خود انبار کی طرف بڑھے، ان کے پہنچنے سے پہلے ہی یہاں کے باشندے قلعہ بند ہو چکے تھے چنانچہ آپ نے محاصرہ کر کے قلعہ پر حملہ کر دیا ایرانی چونکہ خندق کے اس پار سے تیر برسا رہے تھے اس لئے مسلمانوں کا حملہ کامیاب نہ ہوتا تھا حضرت خالدؓ نے چاروں طرف چکر لگا کر اس کے استحکامات کا اندازہ لگایا پھر نوجوں کو حکم دیا کہ آنکھوں کو تاک تاک کر تیر مارو۔ اس تدبیر سے مسلمانوں نے ہزاروں آنکھیں بیکار کر دیں اس سے ایرانی گھبرا گئے اور حضرت خالدؓ نے خندق پٹوا کر فوجیں پار اتار دیں۔ ایرانی جو پہلے ہی تیر بازی سے گھبرائے ہوئے تھے مسلمانوں کی اس غیر متوقع آمد سے اس درجہ مرعوب ہوئے کہ بلا تامل سپر ڈال کر صلح کر لی۔

---

[1] تاریخ اسلام حصہ اوّل از شاہ معین الدین ندوی [2] سیر الصحابہؓ مہاجرین حصہ دوم۔

[3] سیرت صدیق اکبر از علامہ محمد رضا مصری

معرکہ عین التمر

حضرت خالدؓ ابھی انبار کی مہم میں مصروف تھے کہ بہرام چوبین کا لڑکا مہران تازہ دم فوجیں لے کر عین التمر پہنچ گیا عربی قبائل میں نمر، تغلب اور ایاد وغیرہ بھی عقہ بن عقہ کی ماتحتی میں اس کے ساتھ تھے، مہران بڑا متعصب تھا عرب قبائل نے اگرچہ اس کا ساتھ دیا تھا تاہم اُس نے قومی عصبیت میں ان قبائل کو مسلمانوں کے مقابلہ کے لئے آگے بڑھا کر ایرانی سپاہ کو قلعوں میں محفوظ کر دیا بعض انصاف پسند ایرانی اس پر معترض ہوئے، مہران نے جواب دیا کہ ان کی قوم نے ہمارا ملک تباہ کیا ہے اس لئے انہی کو ایک دوسرے کے ہاتھ سے کٹوانا چاہیے۔

حضرت خالدؓ انبار کی تسخیر سے فارغ ہو کر عین التمر کی طرف بڑھ رہے تھے کہ کرخ کے مقام پر عقہ بن عقہ سے مڈبھیڑ ہوگئی آپ نے عقہ کو گرفتار کر لیا، اپنے سردار کی گرفتاری کے بعد عرب قبائل نے میدان چھوڑ دیا جو باقی بچے وہ گرفتار ہوئے۔ حضرت خالدؓ نے قوم فروشی کے جرم میں عقہ اور اُس کے ساتھیوں کی گردنیں اُڑا دیں مہران کو جب عربوں کی حالت کی خبر ہوئی تو قلعہ چھوڑ کر بھاگ گیا، لیکن جب شکست خوردہ عرب پہنچے تو اس کی ہمت بندھی اور قلعہ بند ہو گیا۔ حضرت خالدؓ وہاں پہنچے تو ایرانیوں نے باہر نکل کر مقابلہ کیا لیکن ناکام ہو کر پھر قلعہ میں گھس گئے بالآخر ایرانیوں نے صلح کی درخواست کی، جسے حضرت خالدؓ نے مسترد کر دیا اور قلعہ پر بزورِ شمشیر قبضہ کر لیا تاہم آپ نے پھر کوئی سختی نہیں کی اور معمولی خراج کے سوا زمین پر کوئی ٹیکس نہیں لگایا۔[1]

معرکہ دومۃ الجندل

عراق و شام کی سرحد پر واقع دومۃ الجندل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک سے عربی عیسائی قبائل مسلمانوں کے خلاف سازشیں کیا کرتے تھے۔ غزوہ تبوک (ربیع الاول سنہ ۹ھ) اسی سلسلہ میں ہوا تھا اس غزوہ میں حضرت خالدؓ بھی حضورؐ کے ہمرکاب تھے اور اُنہوں نے یہاں کے ایک فرمانروا اکیدر بن عبدالملک کو گرفتار کر کے مطیع بھی بنایا تھا، چونکہ ان سازشوں کا سلسلہ اب تک جاری تھا اس لئے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت عیاضؓ بن غنم کو ان کے تدارک کے لئے مامور فرمایا۔ لیکن یہ مہم تنہا ان کے بس کی نہ تھی، اس لئے حضرت عیاضؓ نے حضرت خالدؓ کو جو اُن کے قریب ہی موجود تھے، مدد کے لئے لکھا، اب تک حضرت خالد عین التمر کی جنگ سے فارغ ہو چکے تھے چنانچہ آپ عراق کی مہم چھوڑ کر اُن کی مدد کو چلے آئے

دومۃ الجندل کے دو حاکم تھے، اکیدر اور جودی، اکیدر کو ایک مرتبہ حضرت خالد کا تجربہ ہو چکا تھا اس لئے اُس نے جودی کو جنگ سے روکا، مگر جب وہ نہ مانا تو اکیدر اس کی حمایت سے کنارہ کش ہو گیا مگر چونکہ پہلے اس کا شریک رہ چکا تھا اس لئے گرفتار کرا کے قتل کرا دیا گیا حضرت خالدؓ اور حضرت عیاض نے دو سمتوں سے دومۃ الجندل کا محاصرہ کر لیا جودی نے مقابلہ کیا لیکن شکست کھا کر مارا گیا حضرت خالدؓ نے پھاٹک توڑ کر قلعہ پر قبضہ کر لیا، اگر مسلمان چاہتے تو دشمن کا ایک آدمی بھی نہ بچ سکتا۔ لیکن حضرت عاصمؓ نے بنو کلب کو پناہ دے دی اور باقی قبائل قتل کر دیئے گئے[2]

حصید کی تسخیر

حضرت خالدؓ دومۃ الجندل میں تھے کہ اہلِ فارس نے موقع غنیمت جان کر حیرہ واپس لینے کی کوشش کی حیرہ کے عربوں نے بھی عقہ بن عقہ کے قتل سے برہم ہو کر ان کو مسلمانوں کے خلاف اُبھارا چنانچہ دو نامی سپہ سالار زرمہر اور روزبہ، انبار کی طرف بڑھتے ہوئے حصید اور خنافس تک پہنچ گئے حضرت قعقاعؓ بن عمرو نے جنہیں حیرہ میں حضرت خالدؓ نے نائب مقرر کیا تھا یہ خبر سن کر دو فوجیں حیرہ سے اہلِ فارس کے مقابلہ پر روانہ کیں یہ دونوں لشکر ایسے مقام پر ٹھہرے کہ حصید اور خنافس کا ریف سے تعلق منقطع ہو گیا۔ اور دشمن کے راستے مسدود ہو گئے۔

---

[1] سیر الصحابہ، مہاجرین، حصہ دوم [2] تاریخ اسلام حصہ اول از شاہ معین الدین ندوی۔

اسی اثنا میں حضرت خالدؓ ہذائن پر چڑھائی کرنے کے ارادہ سے براستہ حیرہ واپس آ رہے تھے کہ آپ کے پہنچنے سے پہلے ہی حضرت قعقاعؓ بن عمرو اور حضرت ابولیلیٰؓ اہل فارس سے بھڑ گئے اور ایک شدید جنگ کے بعد فتح حاصل کر لی [۱]۔ اس معرکہ میں عجمیوں کے لشکر کا دو تہائی حصہ جس میں زرمہر اور روزبہ بھی شامل تھے تہ تیغ ہوا باقی ایک حصہ خنافس کی طرف بھاگ گیا جہاں اس کا ایک مشہور و نامور شہسوار ہبوذان لشکر لئے ٹھہرا ہوا تھا حضرت ابولیلیٰؓ نے ان کا تعاقب کیا لیکن ہبوذان اس شکست خوردہ گروہ کے ساتھ خنافس سے نکل کر مصیخ کی طرف بھاگا، مصیخ میں ہذیل بن عمران اور ربیعہ بن بجیر ایک بڑی جمعیت کے ساتھ اہل حصید کی امداد کے لئے موجود تھے۔

فتح مصیخ

حضرت خالدؓ نے یہ واقعات سن کر حضرت قعقاعؓ اور حضرت ابولیلیٰؓ کو ایک معین شب اور وقت پر مصیخ کے قریب جمع ہونے کا حکم دیا اور خود بھی وہاں پہنچ گئے، حضرت خالدؓ نے ہذیل اور اس کے ساتھیوں پر رات کے وقت تین اطراف سے حملہ کر دیا ایرانی فوج بے خبر پڑی سو رہی تھی کہ اس اچانک حملہ سے وحشت زدہ ہو گئی مسلمانوں نے تقریباً تمام فوج کو تہ تیغ کر دیا صرف ہذیل مع اپنے چند ساتھیوں کے بھاگ جانے میں کامیاب ہوا اس معرکہ میں چونکہ عبدالعزیز بن ابی رہم اور لبید بن جریر بھی، جو مسلمان ہو چکے تھے، ہذیل کے ساتھیوں کے ساتھ قتل ہو گئے تھے اس لئے حضرت ابوبکرؓ صدیق نے ان کا خون بہا ادا کیا اور ان کی اولاد کے ساتھ حسن سلوک کی وصیت فرمائی، حضرت عمر فاروق اعظمؓ مالک بن نویرہ اور متذکرہ دونوں اصحاب کے قتل کی وجہ سے حضرت خالدؓ سے کبیدہ خاطر تھے لیکن ابوبکر صدیقؓ اکثر فرمایا کرتے تھے:۔

"مسلمان، دشمن کی سرزمین میں دشمن کے ساتھ قیام پذیر ہوں گے ان کے ساتھ ایسی صورت کا پیش آنا ممکن ہے" [۲]

جنگ ثنی اور بشر

مصیخ سے فرار ہو کر ہذیل، عتاب بن اسید کے پاس بشر جا پہنچا، حضرت خالدؓ نے حضرت قعقاعؓ اور حضرت ابولیلیٰؓ کو دو مختلف راستوں سے ثنی اور بشر روانہ فرمایا، جہاں ربیعہ بن بجیر تغلبی بدستور فوجیں لئے پڑا تھا ان دونوں کے پیچھے حضرت خالدؓ خود ایک جداگانہ راستہ سے روانہ ہوئے، اس حملہ کا پروگرام بھی ویسا ہی بنایا گیا جیسا جنگ مصیخ کے موقعہ پر بنایا تھا حضرت خالدؓ نے ثنی سے اپنی مہم کا آغاز کیا اور اپنے ساتھیوں سے مل کر رات کے وقت تین اطراف سے ربیعہ کے لشکر پر حملہ کر دیا یہ حملہ اس قدر اچانک اور غیر متوقع تھا کہ دشمنان خدا اپنے آپ کو سنبھال بھی نہ سکے تمام مرد قتل ہوئے اور عورتیں گرفتار کر لی گئیں، حضرت خالدؓ نے نعمان بن عوف شیبانی کے ہاتھ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خدمت میں خمس روانہ کیا، باقی مال غنیمت اور عورتیں مجاہدین میں تقسیم کر دی گئیں انہی عورتوں میں سے حضرت علیؓ نے ربیعہ بن بجیر کی لڑکی کو خرید تھا جس کے بطن سے عمر اور رقیہ پیدا ہوئے [۳]

ثنی کی مہم سے فارغ ہو کر حضرت خالدؓ نہایت تیزی کے ساتھ بشر میں عتاب بن اسید کے سر پر جا پہنچے جہاں ہذیل نے پناہ لے رکھی تھی، حضرت خالد نے یہاں بھی رات کے وقت تین جانب سے حملہ کیا اور گھیر کر ایک ایک کو قتل کر ڈالا صرف ہذیل امیر العسکر باقی بچا۔ اس کے بعد حضرت خالدؓ رضاب کی طرف بڑھے جہاں عقہ کا لڑکا ہلال مسلمانوں کا منتظر تھا مگر حضرت خالدؓ کے پہنچنے سے قبل ہی وہ مع اپنے ہمراہیوں کے بھاگ گیا اس لئے لڑائی کی نوبت نہیں آئی۔

---

[۱] تاریخ ابن خلدون حصہ اول [۲] خالد سیف اللہ مؤلفہ ابوزید شبلی

[۳] تاریخ طبری حصہ سوم

جنگ فراض

حضرت خالدؓ رضاب سے فراض کی طرف بڑھے، یہ مقام جنگی نقطۂ نظر سے بہت اہم تھا یہاں شام، عراق اور الجزیرہ کی سرحدیں ملتی تھیں، شام کی سرحد کی وجہ سے رُومی بھی ایک فریق بن گئے تھے اور اُنہوں نے اپنے قریب کی ایرانی چوکیوں سے مدد مانگی، ایرانی خوشی سے تیار ہو گئے ان کے ساتھ عربی قبائل تغلب، ایاد اور نمر وغیرہ بھی رومیوں کی حمایت پر کمربستہ ہوئے چنانچہ تینوں کی متحدہ فوجیں فراض میں جمع ہوئیں مسلمانوں کا مقابلہ چونکہ اس متحدہ طاقت سے تھا۔ اس لئے حضرت خالدؓ کو خاص اہتمام کرنا پڑا اور فراض میں از سرِ نو فوجیں مرتب کیں۔ فریقین کے درمیان فرات حائل تھا۔ اتحادی لشکر نے حضرت خالدؓ کو کہلا بھیجا کہ یا تم دریا عبور کر کے بڑھو یا ہمیں بڑھنے دو حضرت خالدؓ نے انہیں بڑھنے کا موقع دیا، چنانچہ اتحادی لشکر کے دریا عبور کرتے ہی لبِ ساحل معرکہ شروع ہو گیا مسلمان جوشِ جہاد میں اس پامردی سے لڑے کہ ایرانیوں، رُومیوں اور عرب قبائل کی متحدہ فوجیں پسپا ہونے لگیں، چونکہ ان کے عقب میں دریا اور سامنے مسلمان تھے اس لئے اُنہیں بھاگنے کا بھی راستہ نہ ملا اور مسلمانوں کے پے در پے حملوں سے قریب قریب کل فوجیں برباد ہو گئیں

حضرت خالد کا خفیہ حج

مسلمان فتح کے بعد دس دن تک فراض میں مقیم رہے پھر اُنہیں واپس حیرہ لوٹ جانے کا حکم دے کر حضرت خالدؓ خود خفیہ طور پر حج کو چلے گئے، مورخین کے مطابق آپ پچیس ذیقعد ۱۲ھ کو اپنے بعض ساتھیوں کے ہمراہ مکہ کی طرف روانہ ہوئے تھے آپ کے ساتھ کوئی رہبر نہ تھا تاہم نہایت کٹھن اور دشوار گزار راستہ طے کرتے ہوئے بعجلت مکہ پہنچے اور فریضۂ حج ادا کرنے کے بعد اس سرعت سے واپس آئے کہ ابھی فوج کا پچھلا حصہ حیرہ نہیں پہنچا تھا چنانچہ آپ فوج کے ساتھ مل کر اس کے ہمراہ شہر میں داخل ہوئے اگرچہ ان چند لوگوں کے سوا جو اس سفر میں آپ کے ساتھ تھے اور کسی شخص کو آپ کے حج کی خبر نہ تھی پھر بھی یہ اطلاع حضرت ابوبکر صدیقؓ تک پہنچ گئی خلیفۃ الرسولؐ نے حضرت خالدؓ کے اس فعل کو نامناسب خیال کیا اور ان پر عتاب فرمایا۔

اسی زمانہ میں اُن اُمراء نے جنہیں حضرت ابوبکر صدیقؓ نے شام کی جانب بھیجا تھا اپنے لئے مدد کی درخواست کی، اس پر صدیق اکبرؓ نے، رُومیوں کی طرف بھی اس خدائی تلوار کو بھیجنا مناسب خیال فرمایا جس نے شاہانِ کسریٰ کے تخت کو ہلا ڈالا تھا۔ اس سلسلہ میں آپ نے حضرت خالدؓ کو ذیل کا فرمان بھیجا:۔

"تم یہاں سے روانہ ہو کر یرموک میں مسلمانوں سے مل جاؤ کیونکہ وہاں وہ دشمن کے نرغے میں گھر گئے ہیں یہ حرکت (خفیہ حج) جو تم نے اب کی ہے آئندہ تم سے کبھی سرزد نہ ہو۔ خدا تعالیٰ کا فضل ہے کہ تمہارے سامنے دشمن کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں اور تم مسلمانوں کو دشمن کے نرغے سے صاف بچا لاتے ہو۔ اے ابوسلیمان! میں تمہارے خلوص اور خوش قسمتی پر مبارکباد دیتا ہوں پس اس مہم کو پایۂ تکمیل تک پہنچاؤ اللہ تعالیٰ تمہاری مدد فرمائے تمہارے دل میں غرور پیدا نہ ہونا چاہیئے کیونکہ غرور کا انجام نقصان اور رسوائی ہے اپنے کسی فعل پر نازاں بھی نہ ہونا فضل و کرم کرنے والا صرف اللہ ہے اور وہی اعمال کا صلہ دیتا ہے"

حضرت خالدؓ اب قادسیہ کو فتح کرنے کا ارادہ رکھتے تھے کہ آپ کو یہ فرمان ملا آپ نے حضرت ابوبکرؓ کا حکم پڑھ کر فرمایا "خدا اور خلیفۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حکم سب سے افضل ہے" چنانچہ آپ مثنیٰ کو عراق میں چھوڑ کر شام روانہ ہو گئے اور سرِدست عراق کی مہم رُک گئی، حضرت خالدؓ محرم ۱۲ھ سے صفر ۱۳ھ تک کل ایک سال دو ماہ عراق میں رہے اور اس قلیل عرصہ میں اپنی بے مثال شجاعت اور تدبر سے اس ملک

۱؎ خالدؓ سیف اللہ، از ابو زید شبلی

پر مکمل قبضہ کر لیا۔

فتوحاتِ شام

اوپر ان حالات کی تفصیل بیان کی جا چکی ہے جن کی بنا پر مسلمانوں کا ایرانیوں اور رومیوں سے نبرد آزما ہونا ناگزیر امر تھا اس لئے عراق کیساتھ ساتھ شام پر بھی فوج کشی ہوئی تھی اور ہر ہر صوبہ پر علیحدہ علیحدہ فوجیں بھیجی گئی تھیں حضرت خالدؓ عراق کی مہم سے تقریباً فارغ ہو چکے تھے کہ دربار خلافت سے مندرجہ بالا فرمان پہنچا چنانچہ آپ عراق سے روانہ ہو کر راستہ میں حدرِ فارک، تقم، سویٰ، حوارین اور مرج راہط وغیرہ چھوٹی چھوٹی لڑائیاں لڑتے ہوئے شام پہنچے اور پہلے بصریٰ کی طرف بڑھے۔

جنگ بصریٰ

اسلامی فوجیں حضرت شرحبیلؓ بن حسنہ کی ماتحتی میں یہاں پہلے سے حضرت خالدؓ کی منتظر تھیں، حضرت خالدؓ نے بصریٰ پہنچتے ہی یہاں کے بطریق پر حملہ کر کے اُسے پسپا کر دیا اور اہل بصریٰ نے اس شرط پر صلح کر لی کہ وہ جزیہ دیں گے اور اس کے معاوضہ میں مسلمان ان کی جان و مال کی حفاظت کریں گے۔

اجنادین

اس وقت مسلمان شام کے مختلف حصّوں میں پھیلے ہوئے تھے اور ہرقل نے ان کے مقابلہ کے لئے الگ الگ دستے بھیجے ہوئے تھے، تاکہ مسلمان ایک مرکز پر جمع نہ ہو سکیں، فلسطین کی مہم حضرت عمروؓ بن العاص کے متعلق تھی بصریٰ کے بعد رُومی سپہ سالار تذارق اور قبقلاز نے اپنی فوجوں کو اجنادین میں حضرت عمروؓ بن العاص کے مقابلہ پر جمع کیا حضرت خالدؓ بصریٰ سے فارغ ہو کر حضرت عمروؓ بن العاص کی امداد کو پہنچے، اجنادین میں دونوں لشکروں کا مقابلہ ہوا، رُومی لشکر کو شکست فاش ہوئی، لڑائی میں تذارق اور قبقلاز کے علاوہ تقریباً پچاس ہزار آدمی کھیت رہے۔

فتح دمشق

حضرت خالدؓ اجنادین کے بعد شام کے صدر مقام دمشق کی طرف بڑھے اور امیر فوج حضرت ابو عبیدہؓ سے مل کر شہر کا محاصرہ کر لیا اس شہر کی شہرت چونکہ تمام عرب میں تھی اس لئے حضرت خالدؓ نے اس کے محاصرہ کا خاص اہتمام کیا اور دمشق کو کم سے کم سامان سے جلد از جلد فتح کرنے کے لئے لشکرِ اسلام کو کئی حصّوں میں تقسیم کر کے مختلف دروازوں پر متعیّن کیا چنانچہ حضرت عمرو بن العاصؓ باب توما پر، حضرت شرحبیل بن حسنہؓ باب الفرادیس پر، حضرت ابو عبیدہؓ باب جابیہ پر اور خود حضرت خالدؓ پانچ ہزار فوج کے ساتھ باب شرقی پر اترے[1] محاصرہ کامل تین ماہ تک جاری رہا مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا، محاصرہ ابھی جاری تھا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا زمانہ ختم ہو گیا اور اس کی فتح حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں عمل میں آئی۔

مورخین کے مطابق فتح کی تفصیل یہ ہے کہ محاصرہ کے دوران میں دمشق کے بطریق کے گھر لڑکا پیدا ہوا، اس کے جشن میں اہلِ شہر نے خوب شرابیں پئیں اور ایسے بدمست ہو کر سوئے کہ دنیا و ما فیہا کی خبر نہ رہی حضرت خالدؓ دوران جنگ اکثر راتوں کو سوتے نہ تھے، بلکہ فوجی انتظامات اور دشمنوں کی

کی اطلاع ہوئی تو آپ کمند لگا کر معہ چند جانبازوں کے شہر پناہ کی دیوار پر چڑھ کر اندر اتر گئے اور پھاٹک کے محافظوں کو قتل کر کے پھاٹک کھول دئے، باہر فوج انتظار میں تھی چنانچہ پھاٹک کھلتے ہی اندر داخل ہو گئی، اہلِ شہر جو ابھی تک غافل سو رہے تھے۔ اس ناگہانی حملے سے گھبرا گئے اور حضرت ابو عبیدہؓ سے جو دوسری سمت متعیّن تھے صلح کی درخواست کی، انہیں چونکہ اس صُورتِ حال کا علم نہ تھا اس لئے درخواست قبول کر لی۔ ایک طرف سے حضرت خالدؓ فاتحانہ داخل ہوئے اور دوسری طرف سے حضرت ابو عبیدہؓ مصالحانہ، دونوں کی ملاقات وسط شہر میں ہوئی اگرچہ نصف شہر بزورِ شمشیر فتح ہوا تھا تاہم دمشق کی فتح مصالحانہ قرار دی گئی اس لئے نہ مالِ غنیمت حاصل کیا گیا اور نہ کسی کو لونڈی غلام بنایا گیا[2]

---

[1] الفاروق حصّہ اوّل [2] تاریخ اسلام حصّہ اوّل از شاہ معین الدین احمد ندوی۔

معرکۂ فحل

دمشق کی فتح نے رُومیوں کو بہت برہم کر دیا تھا، چنانچہ وہ ہر طرف سے جمع ہو کر بڑے زور اور قوت کے ساتھ مسلمانوں سے نبرد آزمائی پر آمادہ ہوئے، دمشق پر قبضہ کے بعد چونکہ مسلمانوں نے اُردن کا رُخ کیا تھا اس لئے رُومیوں نے اُردن کے شہر بیسان میں فوجیں جمع کیں اور مسلمانوں نے اُن کے سامنے فحل میں پڑاؤ ڈالا، رُومیوں نے مسلمانوں کے اچانک حملہ کے ڈر سے آس پاس کی نہروں کے بند توڑ دیئے جس کے باعث فحل اور بیسان کے درمیان کا علاقہ زیرِ آب آ گیا اور تمام راستے رک گئے لیکن اسلام کا سیلاب کب رک سکتا تھا چنانچہ عیسائیوں نے مسلمانوں کا استقلال دیکھ کر مصالحت کی کوشش کی مگر مفاہمت نہ ہو سکی اور ذیقعدہ ۱۳ھ میں دونوں فوجیں ایک دوسرے کے مقابل ہوئیں۔ اسلامی لشکر کا مقدمۃ الجیش حضرت خالدؓ کی کمان میں تھا، عیسائیوں نے کئی خونریز معرکوں کے بعد بُری طرح شکست کھائی اور اُردن کا پورا صوبہ فتح ہو گیا، کل رعایا ذمی قرار دی گئی اور عہد نامہ میں رعایا کی پوری املاک، زمین، گرجے اور دوسری عبادت گاہیں محفوظ کر دی گئیں [1]

دمشق کا دُوسرا معرکہ

دمشق اور اُردن کی فتح کے بعد بیت المقدس، حمص اور انطاکیہ تین بڑے شہر رہ گئے تھے اس لئے حضرت ابُوعبیدہؓ اور حضرت خالد حمص کی طرف بڑھے، یہ مقام یوحنّا کے کنیسہ کی وجہ سے رومیوں کا اہم مرکز تھا، ہرقل شاہِ رُوم کو خبر ہوئی تو اس نے توذر بطریق کو فوج دے کر مقابلہ کے لئے بھیجا، توذر دمشق کی مشرقی سمت مرج رُوم کے مقام پر خیمہ زن ہوا اور مسلمان بھی آگے بڑھ کر مرج رُوم کی دوسری جانب اُترے اسی اثناء میں رُومیوں کی ایک اور فوج شنس کی سرکردگی میں پہنچ گئی حضرت خالدؓ توذر کے مقابلہ کو بڑھے اور حضرت ابوعبیدہؓ شنس کے توذر مقابلہ کرنے کی بجائے دمشق واپس لینے کے ارادہ سے آگے بڑھا۔ حضرت خالدؓ بھی اس کے پیچھے پیچھے چلے، دمشق میں حضرت یزیدؓ بن ابُو سفیان موجود تھے، وہ توذر کی آمد کی خبر سُن کر اس کا راستہ روکنے کے لئے نکلے، دمشق کے باہر دونوں میں نہایت خونریز معرکہ ہوا، ابھی جنگ جاری تھی کہ پیچھے سے حضرت خالدؓ بھی پہنچ گئے اور رومی لشکر کو دونوں سمتوں سے گھیر کر اس درجہ پامال کیا کہ سوائے معدودے چند کے کوئی رومی زندہ نہ بچا، مقتولین میں رومی سپہ سالار توذر بھی تھا، جو حضرت خالدؓ کے ہاتھ سے قتل ہوا [2]

حمص

ہرقل کو جب اپنی فوجوں کی اس پامالی کا حال معلوم ہوا تو حمص سے بھاگ گیا اور حمص میں اپنے عامل کو یہ ہدایت دے گیا کہ شدید سردی کے دنوں میں مسلمانوں سے مقابلہ کیا جائے تاکہ وہ سردی کی شدت سے حوصلہ ہار بیٹھیں اور جم کر مقابلہ نہ کر سکیں

حضرت ابوعبیدہؓ بعلبک سے حمص کی طرف بڑھے اور حضرت خالدؓ جو بقاع کی تسخیر کے لئے گئے ہوئے تھے، اسے فتح کرنے کے بعد حضرت ابُوعبیدہؓ سے حمص میں آن ملے، مسلمانوں نے حمص کا محاصرہ بڑی سختی سے کئے رکھا حتیٰ کہ سردی کا موسم گزر گیا اور رُومیوں کی آخری اُمید بھی جاتی رہی، رُومیوں نے نا امید ہو کر صلح کی درخواست کی جو مسلمانوں نے قبول کر لی اور شہر پر ان کا قبضہ ہو گیا [3] اسی محاصرہ کے دوران میں حضرت ابُوعبیدہؓ نے آس پاس کے چھوٹے چھوٹے مقامات حماۃ، شیرز، معرۃ النعمان وغیرہ فتح کئے اور حمص کی تسخیر کے بعد لاذقیہ ایک خاص تدبیر سے زیرِ نگیں کر لیا۔

یرموک

رُومیوں کی پے در پے شکستوں اور مسلمانوں کی روز افزوں فتوحات سے بددل ہو کر قیصر نے شام چھوڑ کر قسطنطنیہ جانے کا ارادہ کیا مگر جوق در جوق بیکس رُومیوں کی فریاد سُن کر اُسے غیرت آ گئی چنانچہ اُس نے ملک کے گوشہ گوشہ میں فرامین بھیج کر فوجوں کو اکٹھا کیا اور

---

[1] فتوح البلدان، بلاذری [2] سیر الصحابہؓ مہاجرین حصہ دوم [3] خالدؓ سیف اللہ، از ابوزید شلبی۔

اس طرح دو لاکھ سے زائد کا ٹڈی دل مسلمانوں کے مقابلہ کے لئے اُمڈ آیا، رومی فوج کے جوش کا یہ عالم تھا کہ خانقاہوں کے گوشہ نشین راہب اور قسیس بھی مذہب کا واسطہ دے کر رومیوں کو جنگ پر اکسا رہے تھے، بہرکیف یہ پُرجوش لشکر رومی سپہ سالار باہان کی سرکردگی میں یرموک کے میدان میں آکر خیمہ زن ہوا۔

رومیوں کی یہ تیاریاں دیکھ کر حضرت ابوعبیدہؓ نے افسران فوج سے مشورہ کیا سب نے مختلف آراء پیش کیں، تاہم آخر یہ طے پایا کہ شام کے مختلف حصوں میں منتشر فوجوں کو ایک مرکز پر جمع کیا جائے، چنانچہ دمشق میں اجتماع ہوا مسلمان چونکہ اس وقت مفتوحہ علاقوں کے عیسائیوں کی حفاظت نہ کر سکتے تھے اس لئے انہوں نے جزیہ کی وہ رقم جو حقیقت میں مفتوحین کی حفاظت کا معاوضہ تھی انہیں واپس کر دی مسلمانوں کے اس طرز عمل سے عیسائی اس درجہ متاثر ہوئے کہ وہ رو رو کر مسلمانوں کی واپسی کی دعائیں کرتے تھے۔

دمشق میں اجتماع کے بعد حضرت ابوعبیدہؓ نے دربار خلافت کو ان نئے حالات سے مطلع کیا، رومیوں کی ان تیاریوں کا حال سن کر اہل مدینہ جوش جہاد سے لبریز ہو گئے اور ہر شخص سر بکف میدان کارزار میں جانے کے لئے بے تاب ہو گیا۔ حضرت عمرؓ نے مناسب ہدایات کے ساتھ مزید کچھ امدادی فوج شام روانہ فرمادی۔ ادھر حضرت ابوعبیدہؓ نے کل اسلامی لشکر کو دمشق سے یرموک میں منتقل کر دیا اور اس طرح دونوں لشکر ایک دوسرے کے مقابل آگئے۔

حضرت خالدؓ نے اس جنگ میں کارہائے نمایاں انجام دئے، اسلامی لشکر کی تعداد تیس ہزار سے زیادہ نہ تھی تاہم حضرت خالدؓ نے ان فوجوں کو از سر نو مرتب کیا اور اس کو جدید طرز پر چھتیس حصوں میں تقسیم کر کے صف آرائی کی، پھر ایک پُرجوش تقریر کر کے مسلمانوں کو جہاد پر ابھارا، اتفاق سے ایک مسلمان کے منہ سے نکل گیا کہ رومیوں کے مقابلہ پر ہماری تعداد بہت کم ہے حضرت خالدؓ یہ سن کر نہایت غضب ناک ہوئے اور فرمایا فتح و شکست تعداد کی قلت وکثرت پر نہیں بلکہ تائید ایزدی پر ہے، اگر میرے گھوڑے کے سُم درست ہوتے تو میں اس سے دوگنا تعداد کی پروا نہ کرتا۔[1]

ضروری انتظامات کے بعد حضرت خالدؓ نے حضرت عکرمہؓ بن ابوجہل اور حضرت قعقاعؓ بن عمرو کو حملہ کا حکم دیا، رومی پہلے ہی جوش سے بھرے ہوئے تھے چنانچہ یرموک کے میدان میں ہنگامۂ کارزار گرم ہو گیا اور ایسی خونریز اور گھمسان کی جنگ ہوئی کہ میدان جنگ میں کشتوں کے پشتے لگ گئے عین اس حالت میں ایک عیسائی جس کا نام جرجہ (جارج) تھا۔ رومی فوج سے نکل کر اسلامی لشکر میں آیا اور حضرت خالدؓ سے مذہب اسلام پر گفتگو شروع کر دی کہ اگر میں تمہارے مذہب میں داخل ہو جاؤں تو کیا میرے لئے آخرت کا دروازہ کھل جائے گا حضرت خالدؓ نے فرمایا "یقیناً" چنانچہ وہ میدان جنگ میں ہی مشرف بہ اسلام ہو کر مسلمانوں کی طرف سے لڑتا ہوا شہید ہو گیا۔[2]

اس جنگ کا سلسلہ مدتوں جاری رہا، اسلامی لشکر نے غیر معمولی شجاعت بہادری اور استقلال کا ثبوت دیا، انجام کار رومیوں نے شکست فاش کھائی مؤرخین کے مطابق اس جنگ میں ایک لاکھ یا ستر ہزار رومی سپاہ کام آئی اور مسلمانوں کا جانی نقصان کل تین ہزار ہوا۔ اس شکست نے رومیوں کی قوت کو اس حد تک ختم کر دیا کہ پھر ان کو اتنی بڑی تعداد فراہم نہ ہو سکی۔

فتح حاضر: یرموک کی فتح کے بعد حضرت ابوعبیدہؓ نے حضرت خالدؓ کو قنسرین کی طرف بھیجا اور خود حمص واپس ہو گئے، راستے میں حاضر کے

---

[1] تاریخ طبری حصہ دوم [2] ایضاً

مقام پر حضرت خالدؓ کی مڈبھیڑ رومیوں کے ایک لشکر سے ہوگئی جس کا سردار میناس تھا، دونوں فوجوں میں شدید لڑائی ہوئی۔ نتیجتاً میناس اور اُس کی فوج کا اکثر حصہ میدانِ جنگ میں کام آیا اہلِ حاضر نے حضرت خالدؓ سے امان کی درخواست کی اور کہا ہمارا اس جنگ سے کوئی تعلق نہ تھا اور ہماری رائے بھی اس میں شریک نہ تھی، اس لئے ہم کو امان دی جائے حضرت خالدؓ نے ان کی درخواست قبول کرلی اور اُنہیں چھوڑ کر آگے بڑھے [1]

فتح قنسرین

حضرت خالدؓ حاضر سے قنسرین پہنچے، اہلِ قنسرین پہلے ہی سے قلعہ بند ہو کر بیٹھے ہوئے تھے، حضرت خالدؓ نے شہر کا محاصرہ کرلیا اور اہلِ شہر کو کہلا بھیجا کہ اس طرح قلعہ بند ہونے کا کوئی فائدہ نہیں اور تم آسمان پر بھی چڑھ جاؤ گے تو اللہ یا ہمیں تمہارے پاس پہنچا دے گا یا تمہیں ہمارے پاس اُتار لائے گا [2] اہلِ قنسرین کو جب اطاعت کے علاوہ کوئی چارۂ کار نظر نہ آیا تو اُنہوں نے صلح کی درخواست کی، حضرت خالدؓ نے اس شرط پر منظور کرلی کہ شہر کے استحکامات توڑ دیئے جائیں، اہلِ قنسرین نے جان کے خوف سے مجبوراً اس شرط کو قبول کرلیا اور حضرت خالدؓ نے فصیل کو منہدم کرا دیا حاضر اور قنسرین میں حضرت خالدؓ نے جو کارہائے نمایاں سرانجام دئے انہیں سُن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا۔

"خالدؓ نے اپنے کارناموں کی وجہ سے خود ہی اپنے آپ کو سپہ سالار بنا لیا ہے، اللہ ابوبکرؓ پر اپنی رحمت نازل کرے وہ مجھ سے زیادہ مردم شناس تھے" [3]

بیت المقدس

قنسرین کے بعد بیت المقدس کا محاصرہ ہوا عیسائی اس شرط پر کہ معاہدۂ صلح خود امیرالمؤمنینؓ اپنے ہاتھ سے لکھیں، بلا جنگ بیت المقدس حوالہ کرنے پر آمادہ ہوگئے چنانچہ حضرت عمرؓ نے صلحنامہ لکھنے کے لئے شام کا سفر اختیار فرمایا اور تمام افسرانِ فوج کو جابیہ میں طلب کیا۔ حضرت خالدؓ بھی جابیہ آئے ان کا دستہ دیبا وحریر میں ملبوس تھا حضرت عمرؓ کی نگاہ پڑی تو گھوڑے سے اُترے اور انہیں کنکریاں مار کر فرمایا۔ "تم لوگوں نے اتنی جلدی اپنی عادتیں بدل دیں" ان لوگوں نے قبا کا دامن اُٹھا کر اسلحہ دکھایا اور کہا "لیکن سپہ گری کا جوہر نہیں گیا ہے" فرمایا تب کوئی مضائقہ نہیں"

حمص کی بغاوت

۱۸ھ میں اہلِ حمص نے بغاوت کر کے حمص واپس لینے کی کوشش کی لیکن حضرت ابوعبیدہؓ اور حضرت خالدؓ کی بروقت توجہ سے یہ بغاوت بہت جلد فرو ہوگئی اور شام کے پورے علاقہ پر مسلمانوں کا مکمل تسلط ہوگیا [4]

حضرت خالدؓ کی معزولی

شام کی فتوحات اور ۱۷ھ کے واقعات میں سب سے اہم واقعہ حضرت خالد کی معزولی کا ہے عام طور پر مؤرخین کا بیان ہے کہ حضرت عمرؓ نے عنانِ خلافت سنبھالتے ہی حضرت خالدؓ کو معزول کردیا تھا لیکن صحیح یہ ہے کہ حضرت خالدؓ خلافت فاروقی کے پانچ سال بعد ۱۷ھ میں معزول ہوئے۔

یہ واقعہ اس حیثیت سے نہایت اہم ہے کہ جس جانباز کی تلوار نے عراق و شام کی قسمت کا فیصلہ کیا تھا اُسے حضرت عمرؓ نے عین محاذِ جنگ میں معزول کر دیا، لیکن اس معاملہ کا اس سے بھی زیادہ اہم اور قابلِ توجہ پہلو یہ ہے کہ اس سے جہاں حضرت عمرؓ کے سطوت و جلال کا پتہ چلتا ہے، وہاں اس حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے سے حضرت خالدؓ کی اطاعتِ امیر، نیک نفسی اور حق پرستی کا اندازہ لگانا بھی مشکل نہیں، واقعی جو شخص بھرے مجمع میں معزولی کے حکم کو بخوشی قبول کر کے انتہائی صبر و تحمل کا مظاہرہ کرسکتا ہے وہ مشکل سے مشکل وقت میں اپنی اسی صلاحیت کو بروئے کار لا کر ان مشکلات پر درجۂ احسن قابو بھی پا سکتا ہے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں

---

[1] سیر الصحابہ مہاجرین حصہ دوم [2] خالد سیف اللہ از ابو زید شبلی [3] تاریخ طبری حصہ دوم

کہ رزم حق و باطل میں حضرت خالدؓ نے اپنے آہنی عزم سے باطل کی کمر توڑ کر رکھ دی مگر حلقۂ یاراں میں ریشم سے بھی زیادہ نرم ثابت ہوئے اور شکایت کا ایک لفظ بھی زبان سے نکالنا گوارا نہ کیا۔

مورخین نے اگرچہ ان کی معزولی کے متعدد وجوہ بیان کئے ہیں، تاہم ان میں سے قوی تر اور متفق علیہ یہ ہیں کہ حضرت خالدؓ اپنے شجاعانہ کارناموں کے ساتھ بعض معاملات میں لاپرواہی برتتے تھے، اہل سیر کے مطابق خلیفۃ الرسولؐ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانہ سے وہ فوجی مصارف کا حساب کتاب دربارِ خلافت کو نہیں بھیجتے تھے اور اپنے مزاج کی تندی کے باعث ہر معاملہ میں خود رائی سے کام لیتے تھے، عراق کی پیش قدمی روکنے کے بعد حضرت ابوبکرؓ کی اجازت کے بغیر خفیہ حج کو چلے گئے، ان کا یہ طرزِ عمل حضرت ابوبکرؓ صدیق کو ناگوار گزرا اور آپ نے تنبیہ کی، انہوں نے بارہا لکھا کہ بغیر میرے حکم کے کوئی کام نہ کیا کرو اور وہ دوسی کو کچھ دیا یا کرو۔ مگر حضرت خالدؓ اپنی روش پر قائم رہے، چنانچہ حضرت عمرؓ اسی زمانہ سے ان سے برہم رہتے اور حضرت ابوبکرؓ کو ان کی معزولی کا مشورہ دیتے تھے۔ لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اُن کی خدمات کی بناء پر چشم پوشی سے کام لیتے ہوتے ہمیشہ یہ جواب دیتے کہ میں اس تلوار کو نیام میں نہیں کر سکتا جسے خدا نے بے نیام کیا ہے[1] حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہدِ خلافت میں بھی حضرت خالدؓ نے اپنے طرزِ عمل میں کوئی تبدیلی نہ کی، تاہم حضرت عمرؓ نے انہیں فوراً معزول نہ کیا بلکہ عرصہ تک سمجھاتے رہے، ایک دفعہ آپ نے انہیں تاکید کی کہ وہ آئندہ سے اُن کی اجازت کے بغیر کسی کو بکری بھی نہ دیں مگر حضرت خالدؓ نے کوئی اثر نہ لیا اور حضرت عمرؓ کو جواب دیا کہ میں (حضرت) ابوبکرؓ کے زمانہ سے ایسا ہی کرتا چلا آیا ہوں اب اس کے خلاف نہیں کر سکتا[2]

دوسری وجہ یہ تھی کہ عام مسلمانوں کو خیال پیدا ہو گیا تھا کہ اسلامی فتوحات کا دارومدار حضرت خالدؓ کی قوتِ بازو پر ہے جس کو حضرت عمرؓ پسند نہیں کرتے تھے[3]

اور تیسری وجہ یہ کہ حضرت خالدؓ کے اخراجات اسراف کی حد تک پہنچ جاتے تھے، جو دوسرے افسروں کے لئے نمونہ بن سکتے تھے ایک مورخ کے لفظوں میں :-

"جب وہ (حضرت خالدؓ بن ولید) قنسرین واپس آئے تو اُن کے پاس بہت سا مالِ غنیمت جمع ہو گیا تھا اس لئے اِدھر اُدھر سے لوگ انعام کے لالچ میں ان کے پاس پہنچے اور حضرت خالدؓ نے انہیں مایوس نہ ہونے دیا ان لوگوں میں اشعث بن قیس بھی تھا جسے حضرت خالدؓ نے دس ہزار درہم انعام میں دئے۔ اور حضرت خالدؓ کے ان انعامات کا چرچا عام ہو گیا جو انہوں نے شاعروں اور سورماؤں کو دئے تھے، خاص طور پر اشعث بن قیس کے انعام کی بڑی شہرت ہوئی اور اسے بنو غسان اور حیرہ کے بادشاہوں کی نظیر ٹھہرایا گیا[4]"

چنانچہ جب اس انعام کی خبر حضرت عمرؓ کو ہوئی تو آپ نے حضرت ابوعبیدہؓ کو لکھ بھیجا کہ خالدؓ سے دریافت کریں کہ انہوں نے یہ روپیہ کس مد سے دیا ہے اگر مسلمانوں کے مال سے دیا ہے تو خیانت کی اور اگر اپنی جیب سے دیا ہے تو اسراف کیا، اس لئے دونوں حالتوں میں وہ معزولی کے قابل ہیں۔ اس موقع پر مولانا شبلی لکھتے ہیں :-

"خالدؓ جس کیفیت سے معزول کئے گئے وہ سُننے کے قابل ہے قاصد نے جو معزولی کا خط لے کر آیا تھا مجمع عام میں خالدؓ سے پوچھا کہ یہ انعام تم نے کہاں سے دیا، خالدؓ اگر اپنی خطا کا اقرار کر لیتے تو حضرت عمرؓ کا حکم تھا کہ درگزر کی جائے لیکن وہ خطا کے

---

[1] سیر الصحابہؓ مہاجرین حصہ دوم [2] تاریخ اسلام حصہ اوّل از شاہ معین الدین احمد ندوی [3] سیر الصحابہؓ مہاجرین حصہ دوم۔

[4] عمر فاروقؓ اعظم از محمد حسین ہیکل

اقرار کرنے پر راضی نہ تھے مجبوراً قاصد نے معزولی کی علامت کے طور پر ان کے سر سے ٹوپی اتار لی اور ان کی سرتابی کی سزا کے لیے انہی کے عمامہ سے ان کی گردن باندھی۔[۱]

اللہ اللہ واقعہ کس قدر حیرت انگیز اور منظر کتنا حسرت ناک ہے کہ ایسا بڑا سپہ سالار جس کا نظیر تمام عالمِ اسلام میں کوئی نہ تھا، اس موقع پر دم نہیں مارتا، دنیا کی کوئی قوم ایسی مثال پیش کر سکتی ہے! مورخین کے مطابق حضرت خالدؓ نے حمص پہنچ کر اپنی معزولی کے متعلق تقریر کی اور کہا کہ امیر المومنین عمرؓ نے مجھ کو شام کا افسر مقرر کیا اور جب تمام شام زیر کر لیا تو مجھے معزول کر دیا، اس پر ایک سپاہی نے کھڑے ہو کر حضرت خالدؓ کو ٹوکا اور کہا "اے سردار چپ رہ، ان باتوں سے فتنہ پیدا ہو سکتا ہے" حضرت خالدؓ نے فرمایا "ہاں لیکن عمرؓ کے ہوتے فتنے کا کیا احتمال ہے؟"

معزولی کے بعد حضرت خالدؓ نے مدینہ واپس آکر حضرت عمرؓ سے شکوہ کیا اور بیس ہزار کی رقم جو ان کے پاس زائد تھی بیت المال میں داخل کر دی۔ حضرت عمرؓ نے حضرت خالدؓ سے فرمایا "خالدؓ واللہ! تم مجھے ویسے ہی محبوب ہو اور میں تمہاری عزت کرتا ہوں" اور پھر تمام ممالک محروسہ میں فرمان جاری کروا دیا کہ میں نے خالدؓ کو کسی ناراضی یا خیانت کی وجہ سے معزول نہیں کیا ہے بلکہ ان کے کارناموں کی وجہ سے لوگ فتنے میں مبتلا ہو رہے تھے اس لئے میں نے انہیں معزول کر دیا تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے، جو کچھ کرتا ہے خدا کرتا ہے۔[۲]

مذکورہ بالا فتوحات کے علاوہ حضرت خالدؓ دوسری مہموں میں شریک ہو کر دادِ شجاعت دیتے رہے مگر مؤرخین کے مطابق ان مہمات میں آپ کی حیثیت معمولی مجاہد کی تھی اس لئے ان کی تفصیل نظر انداز کی جاتی ہے۔

گورنری

حضرت عمرؓ نے اگرچہ حضرت خالدؓ کو بمصالح معزول کر دیا تھا تاہم معزول کرنے کے بعد ان سے ان کے رتبہ کے مطابق کام لئے اور ان کی فطری انتظامی صلاحیتوں سے میدانِ جنگ کے بجائے دوسرے شعبوں میں فائدہ اٹھایا اور حضرت خالدؓ کو معزولی کے بعد رہا، حران، آمد اور رنیہ کا گورنر مقرر کر دیا لیکن حضرت خالدؓ ایک سال بعد اس منصب سے خود ہی مستعفی ہو گئے۔

وفات

مؤرخین میں حضرت خالدؓ کی جائے وفات اور سنہ وفات کے بارے میں کافی اختلاف ہے، بعض کا خیال ہے کہ آپ نے ۲۱ھ میں مدینہ میں وفات پائی حضرت عمرؓ آپ کے جنازہ میں شریک تھے اور آپ کی وفات سے مدینہ کی عورتوں خصوصاً بنی عذرا میں کہرام برپا تھا۔[۳]

اس کے برعکس طبری نے بحوالہ واقدی لکھا ہے کہ آپ نے ۲۱ھ میں حمص کے مقام پر انتقال فرمایا، ابن عساکر لکھتے ہیں کہ حضرت خالدؓ حمص کی سرحد پر مقیم ہو گئے تھے، آپ کے گھوڑے اور ہتھیار سب یہیں تھے اور یہیں وفات پائی، مزید لکھتے ہیں کہ حضرت خالدؓ کی قبر حمص میں ہے، مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ آپ کی میت کو کس کس نے غسل دیا اور کون کون جنازے پر حاضر تھے ابن حجر اپنی کتاب الاصابہ میں لکھتے ہیں "حضرت خالدؓ بن ولید نے ۲۱ھ میں شہر حمص میں وفات پائی، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ کی وفات مدینہ منورہ میں ہوئی، اکثر لوگوں کا خیال یہی ہے کہ آپ کی وفات حمص میں ہوئی" اسی طرح مؤلف کتاب اسد الغابہ بھی آپ کی وفات ۲۱ھ میں مقام حمص میں بتاتے ہیں، ان روایات پر غور کرنے سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ آپ نے ۲۱ھ میں حمص میں وفات پائی۔ (واللہ اعلم)

حضرت خالد کی وفات کی خبر سن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا "خالد کی موت نے اسلام میں وہ رخنہ ڈال دیا جس کا پُر ہونا مشکل ہے" نیز فرمایا

---

[۱] الفاروق حصہ اول [۲] سیر الصحابہؓ مہاجرین حصہ دوم۔ [۳] تاریخ اسلام حصہ اول از شاہ معین الدین احمد ندوی

اُن کے متعلق جو میرا طرزِ عمل رہا، اب مجھے اس پر ندامت محسوس ہوتی ہے۔" حضرت خالدؓ کی والدہ نے اُن کی موت پر یہ مرثیہ کہا۔

"جہاں جنگ میں بڑے بڑے سورما بچھڑ جاتے ہیں وہاں تو ہزار ہا ہزار آدمیوں پر بھاری پڑتا تھا اگر دنیا میں کوئی بہادر ہے تو تو جنگل کے شیر سے بھی کہیں زیادہ بہادر اور شیروں کے بچوں سے سب سے زیادہ محبت رکھنے والا تھا اگر دنیا میں کوئی سخی ہے تو تو گھنے جنگل میں پہاڑوں کے درمیان میں بہنے والے سیلاب سے کہیں زیادہ سخی تھا۔"[1]

ایک دن حضرت عمرؓ نے حضرت خالدؓ کی والدہ کو دیکھا کہ وہ اپنے نامور بیٹے کے غم میں ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گئی تھیں، آپ نے پوچھا یہ کون بی بی ہیں جو اس درجہ مغموم و پریشان ہیں، لوگوں نے عرض کیا یہ حضرت خالدؓ کی والدہ ہیں، آپ نے فرمایا "خوش نصیب ہے وہ ماں جس کے بطن سے خالد جیسا فرزند پیدا ہوا" پھر فرمایا "جب تک نعمت موجود ہو اُس کی قدر نہیں کی جاتی لیکن جب وہ ضائع ہو جائے تو اُس کی قدر و منزلت کا پتہ چلتا ہے۔"

اولاد

حضرت خالدؓ کی کئی بیویاں تھیں جن سے کثیر اولاد پیدا ہوئی ایک بیٹے سلیمان تھے جن کی وجہ سے آپ کی کنیت ابوسلیمان تھی، ایک بیٹے عبیداللہ تھے جو عراق میں شہید ہوئے، دو بیٹے عبدالرحمٰن و مہاجر خاص شہرت کے مالک ہوئے، دونوں آنحضرت صلعم کے زمانہ میں بہت چھوٹی عُمر کے تھے، جب حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کے درمیان اختلاف پیدا ہوا تو عبدالرحمٰن امیر معاویہؓ سے مل گئے اور مہاجرؓ حضرت علیؓ کے ساتھ، بعض روایتوں میں ہے کہ مہاجر جنگِ صفین میں شہید ہوئے۔ عبدالرحمٰن کا شمار عرب کے غیور بہادروں اور شہسواروں میں ہوتا تھا، آپ حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت میں امیر معاویہؓ کے تحت حمص کے والی تھے۔

ان لڑکوں کے علاوہ حضرت خالدؓ بن ولید کے اور بھی لڑکے تھے ابن قتیبہ لکھتے ہیں شام میں حضرت خالدؓ کے کئی لڑکے اور پوتے تھے، لیکن سب طاعون کی وبا میں فوت ہو گئے[2] اور کوئی زندہ نہ بچا۔

مہاجر نے جنگِ صفین میں حضرت علیؓ کی حمایت میں سرگرمی سے حصّہ لیا اور حضرت معاویہؓ کے عہد میں قسطنطنیہ کے مشہور معرکہ میں فوج کے ایک کمانڈر عبدالرحمٰن تھے۔

فضل و کمال

حضرت خالدؓ کی پوری زندگی، ابتدا سے لے کر آخر تک چونکہ میدانِ جنگ میں گزری اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ اقدس سے خوشہ چینی کا موقعہ کم ملا، آپ کا قول ہے "جہاد کی مشغولیت نے مجھ کو تعلیم قرآن کے بڑے حصّہ سے محروم رکھا" تاہم آپ آنحضرت صلعم کے فیضِ صحبت کے باعث دولتِ علم سے بے بہرہ نہ تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد مدینہ میں جو جماعت صاحبِ علم و افتاء تھی اس میں ایک نام ان کا بھی تھا لیکن چونکہ حضرت خالدؓ فطرتاً سپاہی تھے۔ اس لئے مسندِ افتاء پر نہ بیٹھے، یہی وجہ ہے کہ ان کے فتاویٰ کی تعداد دو چار سے زیادہ نہیں ہے، ابن عباسؓ، جابر بن عبداللہ، مقدام بن معدی کرب، قیس بن ابی حازم، اشتر نخعی، علقمہ بن قیس، جبیر بن نضیر وغیرہ نے ان سے حدیثیں روایت کی ہیں، ان کی روایات کی کل تعداد اٹھارہ ہے، جن میں سے دو متفق علیہ ہیں اور ایک میں بخاری منفرد ہیں[3]

حضرت خالدؓ دینی اُمور میں بڑی گہری نظر رکھتے تھے، اس کا ثبوت اس واقعہ سے ملتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت خالدؓ کو بنو الحارث بن کعب تک اسلام کا پیغام پہنچانے کے لئے نجران بھیجا تھا اور جب وہ لوگ اسلام لے آئے تو حضورؐ نے اُنہیں ہی حکم دیا کہ

---

[1] سیرت صدیق اکبرؓ از علامہ محمد رضا مصری [2،3] سیر الصحابہؓ مہاجرین حصّہ دوم۔

وہاں رہ کر لوگوں کو شریعتِ اسلام اور دینی امور کی تعلیم دیں۔[1]

رضائے نبویؐ صحابہ کرامؓ کے لئے زندگی کی سب سے بڑی دولت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رضا جوئی اور خوشنودی تھی اس بنا پر وہ اپنے جذبات کو بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان کے تابع رکھتے تھے حضرت خالدؓ اگرچہ تند مزاج تھے لیکن فرمانِ نبویؐ کے مقابلہ میں ان کی طبیعت کی تندی، حلم و عفو میں بدل جاتی تھی، ایک مرتبہ حضرت خالدؓ اور حضرت عمارؓ بن یاسر میں کسی بات پر بحث ہوگئی اور سخت کلامی تک نوبت پہنچ گئی، حضرت عمارؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی اتفاق سے اسی دوران میں حضرت خالدؓ بھی آگئے اور شکایت سن کر برہم ہوگئے اور حضرت عمارؓ کو بُرا بھلا کہنے لگے، حضور خاموشی سے یہ سب کچھ سُن رہے تھے کہ حضرت عمارؓ نے حضورؐ کی متوجہ کر کے عرض کیا، حضورؐ ان کی زیادتیوں کو فرما رہے ہیں، حضورؐ نے سرِ مبارک اُٹھا کر فرمایا

"جو شخص عمارؓ سے بُغض و عداوت رکھتا ہے وہ خدا سے بُغض و عداوت رکھتا ہے۔"

حضرت خالدؓ پر اس ارشادِ نبوتؐ کا اتنا اثر ہوا کہ آپ کا بیان ہے کہ جب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس سے اُٹھا تو عمارؓ کی رضا جوئی سے زیادہ کوئی چیز مجھے محبوب نہ تھی، چنانچہ ان سے ملے اور ان کو راضی کیا۔[2]

احترامِ نبویؐ حضرت خالدؓ کے دل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اس قدر احترام تھا کہ آپ کسی زبان سے حضورؐ کی شان میں کوئی نازیبا کلمہ برداشت نہیں کر سکتے تھے، ایک مرتبہ حضورؐ کے پاس کچھ سونا آیا جسے آپؐ نے اہلِ نجد میں تقسیم فرمایا اس پر قریش و انصار کو شکایت ہوئی کہ حضورؐ نے سب سونا نجدی سرداروں کو دے دیا اور ہمیں محروم رکھا، حضورؐ نے فرمایا میں نے ان کو تالیفِ قلب کے خیال سے دیا ہے یہ سُن کر ایک شخص نے کہا "محمدؐ! خدا سے ڈریئے"۔ آپؐ نے فرمایا اگر میں نافرمانی کرتا ہوں تو پھر خدا کی اطاعت کون کرتا ہے؟ حضرت خالدؓ کو اس گستاخی پر سخت غصہ آیا اور اس شخص کی گردن اُڑا دینے کی اجازت چاہی، لیکن حضورؐ نے روک دیا۔

آثارِ نبویؐ سے تبریک حضرت خالدؓ اس چیز سے والہانہ عقیدت رکھتے تھے جسے حضورؐ سے انتساب کا شرف حاصل ہوتا، چنانچہ حضرت خالدؓ نے حضورؐ کے موئے مبارک اپنی ٹوپی میں سلوائے تھے، جسے پہن کر میدانِ کارزار میں جاتے تھے، یرموک کے معرکہ میں یہ ٹوپی گر گئی تو آپ بے حد پریشان ہوئے یہاں تک کہ بڑی تلاش و جستجو کے بعد یہ ٹوپی ملی تو آپ کو سکون نصیب ہوا۔

جہاد فی سبیل اللہ حضرت خالدؓ کی کتابِ زندگی کا سب سے جلی اور سب سے روشن عنوان جہاد فی سبیل اللہ ہے آپ نے قبولِ اسلام کے بعد اپنے آپ کو ہمہ تن اسلام کی خدمت کے لئے وقف کر دیا تھا اور اس راہ میں نہ آپ کو اپنی جان کی پروا تھی نہ مال کی، آپ کے اسی ذوقِ جہاد اور شجاعانہ کارناموں کے صلہ میں آپ کو دربارِ نبوت سے "سیف اللہ" کا معزز لقب عطا ہوا جو آپ کے نام کا ایک ضروری حصہ بن گیا آپ نے زندگی میں تقریباً سوا سو جنگوں میں اپنی تلوار کے جوہر دکھائے اور جسم کے ہر حصہ پر تیروں اور تلواروں کے اَن گنت زخم کھائے مگر جہاد فی سبیل اللہ سے ایک لمحہ کے لئے بھی قدم پیچھے نہ ہٹایا، آپ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے میدانِ جنگ کی وہ سخت رات جس میں اپنے دشمنوں سے لڑوں اس شبِ عروسی سے زیادہ مرغوب ہے جس میں میری محبوبہ مجھ سے ہمکنار ہو۔[3]

---

[1] خالدؓ سیف اللہ از ابو زید شبلی [2] سیر الصحابہؓ مہاجرین حصہ دوم [3] اصابہ جلد اوّل صفحہ ۴۱۴

آخری وقت جب زندگی کی کوئی امید باقی نہ رہی تو بڑی حسرت اور افسوس کے ساتھ کہتے تھے کہ افسوس میری ساری زندگی میدانِ جنگ میں گذری اور آج اپنے بستر پر اسی طرح جان دے رہا ہوں جس طرح اونٹ جان دیتا ہے۔ پس خدا کسی کو بزدلوں کی موت نہ دے۔ میرے لئے کلمہ لا الٰہ الا اللہ سے بڑھ کر کوئی عمل باعثِ تقویت و امید نہیں رہا۔ ہمیشہ اسی کلمہ سے میری ڈھارس بندھی رہی۔[1]

اللہ تعالیٰ نے ان کے قدموں میں یہ برکت دی تھی کہ جدھر کا رخ کرتے تھے، کامیاب لوٹتے تھے، آپ خود فرمایا کرتے کہ میں نے جس طرف کا رخ کیا فتحیاب ہوا۔ ان کے اس قول کی صداقت پر ان کے عظیم الشان کارنامے شاہد ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کی شجاعت اور جنگی قابلیت پر اس درجہ اعتماد تھا کہ جب کسی مہم کا علم ان کو سونپ دیتے تو مطمئن ہو جاتے، غزوہ موتہ میں جب علم حضرت خالدؓ نے سنبھالا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غائبانہ فرمایا کہ اب لڑائی کا تنور گرم ہوا۔

آنحضرت صلعم کا مدح کرنا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت خالدؓ کی جانفروشیوں اور قربانیوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور متعدد موقعوں پر ان کے متعلق تعریفی کلمات ارشاد فرماتے، فتح مکہ کے موقع پر جبکہ مسلمان مختلف سمتوں سے مکہ میں داخل ہو رہے تھے ایک گھاٹی کی طرف حضرت خالدؓ نمودار ہوئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوہریرہؓ سے فرمایا "دیکھو کون ہے"؟ عرض کی خالد بن ولیدؓ فرمایا یہ اللہ کا بندہ بھی خوب آدمی ہے، یہ اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار ہے، جسے اس نے کفار اور منافقین پر کھینچا ہے۔"[2]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت خالدؓ کی خود بھی قدردانی فرماتے تھے اور لوگوں کو بھی ان کا لحاظ رکھنے کی ہدایت کرتے تھے، ایک موقع پر لوگوں سے فرمایا "خالدؓ کو تکلیف نہ دو، کیونکہ وہ اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار ہے، جسے اللہ نے کافروں پر گرایا۔"

ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کو زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے بھیجا تو حضرت ابن جمیل، حضرت خالدؓ اور حضرت عباسؓ نے دینے سے انکار کر دیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں جب یہ بات آئی تو آپؐ نے فرمایا:۔

> ابن جمیل فقیر تھا، خدا نے اس کو دولتمند کیا یہ اس کا بدلہ ہے، لیکن خالدؓ بن ولید پر تم لوگ زیادتی کرتے ہو، انہوں نے اپنا تمام سامانِ حرب راہِ خدا میں وقف کر دیا ہے، پھر ان پر زکوٰۃ کیسی، رہا عباس کا معاملہ تو ان کا میں ذمہ دار ہوں کیا تم کو معلوم نہیں ہے کہ چچا باپ کی جگہ ہے۔[3]

خلیفۂ رسولؐ کا مدح کرنا

خلیفۂ رسولؐ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو جب الیس اور امغیشیا کے معرکوں کے دوران میں آپ کے کارناموں کا حال معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا۔

"اے گروہ قریش تمہارے شیر نے ایک شیر پر حملہ کر دیا اور اس کے بھٹ میں گھس کر اس کو مغلوب کر دیا، اب عورتیں خالدؓ جیسا بہادر پیدا کرنے سے عاجز ہیں۔"

حضرت عمرؓ نے حضرت خالدؓ کو معزول کرنے پر اصرار شروع کیا تو حضرت صدیق اکبرؓ نے فرمایا "میں اس تلوار کو ہرگز نیام میں نہ ڈالوں گا جسے اللہ نے کفار پر مسلط کیا ہوا ہے۔" ایک مرتبہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت عمرو بن العاصؓ سے حضرت خالدؓ کے بارے میں رائے دریافت کی، تو آپؐ نے

---

[1] سیرت صدیق اکبرؓ مؤلفہ علامہ محمد رضا مصری [2] خالدؓ سیف اللہ از ابو زید شلبی [3] سیر الصحابہ مہاجرین حصہ دوم۔

کہا وہ جنگ کی سیاست کو خوب اچھی طرح جانتے ہیں موت کی پروا مطلق نہیں کرتے اُن میں بلے کی سی پھرتی ہے اور اُن کا حملہ شیر کی مانند ہوتا ہے۔"

حضرت خالدؓ کی جنگی قابلیت

حضرت خالدؓ ایک مدبّر اور دُور اندیش سپہ سالار تھے، آپ جنگ کے اصولوں اور طریقوں سے پُوری طرح واقفیت رکھتے تھے، آپ آگے بڑھنے اور مدافعت کرنے کے موقعوں سے اچھی طرح آگاہ تھے آپ میں سپہ سالار کی صفات کے ساتھ ساتھ ایک سپاہی کی صفات بھی بدرجۂ اتم موجود تھیں، جنگ میں آپ بوڑھوں کی سی تجربہ کاری، نوجوانوں کی سی بہادری اور شیر کی سی جرأت دکھاتے تھے، آپ دشمن کے حالات معلوم کرنے کی پُوری جستجو کرتے رہتے تھے کسی شہر کو زیرِ نگیں کرنے کے بعد اس کی حفاظت کرنے کے لئے ایک فوج وہاں متعین کر دیتے تھے دشمن پر اندھا دھند حملہ نہیں کرتے تھے بلکہ مناسب موقع کی تلاش میں رہتے تھے، آپ اپنی فوج کے عقب کی حفاظت بڑے اہتمام سے کرتے تھے تاکہ دشمن بےخبری سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش نہ کرے کثرت سے لڑائیاں لڑنے کی وجہ سے آپ کو اس قدر جنگی امور کا تجربہ ہوگیا تھا کہ کوئی شخص بھی اس میدان میں آپ کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا، آپ کو جب تک مکمل فتح نہ ہو جاتی میدانِ جنگ سے نہ ہٹتے تھے آپ دشمن کی کثرت بہادری و شجاعت اور سامانِ حرب کی فراوانی سے قطعی مرعوب نہ ہوتے میدانِ جنگ میں آپ نہ خود سوتے اور نہ دُوسروں کو سونے دیتے، آپ پر دشمن کی کوئی بات مخفی نہ رہ سکتی تھی۔[1]

حضرت خالدؓ اپنی ماتحت فوج سے نہایت نرمی سے پیش آتے تھے، آپ فوج کو ہمیشہ ایسے مقامات پر متعین کرتے تھے جہاں فتح کے حصول میں کوئی روک نہ ہو، آپ اپنے سپاہیوں کو ایسی جگہوں پر نہ لے جاتے تھے جہاں ہلاکت کا خوف ہو بلکہ ایسے موقعوں پر خود آگے ہوتے تھے غنیمت کے مال میں سے انہیں پُورا حصہ مرحمت فرماتے اور اس کے علاوہ بھی انعام واکرام سے نوازتے رہتے، میدانِ جنگ میں آپ کے وقت کا بیشتر حصہ فوج کو لڑائی پر اُبھارنے، ہمت بندھانے اور جوش و خروش دلانے پر صرف ہوا کرتا تھا، ایک ایک صف کے سامنے جاتے اور فرماتے "صبر میں عزت ہے اور بزدلی میں ذلت، خدائی مدد اسی کو حاصل ہوگی جو صبر اختیار کرے گا" یہ فوج کے ساتھ آپ کے حُسنِ سلوک کا نتیجہ تھا کہ ہر شخص آپ کا گرویدہ ہوگیا تھا اور آپ ہی کے جھنڈے تلے لڑنا چاہتا تھا، مؤرخین کے نزدیک آپ کی معزولی کا بڑا سبب بھی یہی تھا کہ لوگوں کو آپ پر بےحد بھروسا ہوگیا تھا جس سے حضرت عمرؓ کو خوف لاحق ہوا کہ کہیں لوگ خدا کو ہی نہ بھول جائیں چنانچہ آپ نے حضرت خالدؓ کو معزول کر کے لوگوں پر یہ حقیقت واضح کی کہ فتح کا دارو مدار حضرت خالدؓ پر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید پر ہے۔

حضرت خالدؓ ان صحابہؓ کا جنہوں نے ابتدائی زمانہ میں اسلام قبول کیا اور راہِ خدا میں بیش از بیش قربانیاں دی تھیں، بےحد خیال رکھتے اور اُن کی تعظیم و تکریم میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرتے تھے آپ کا یہ یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ کی مدد کا ظہور انہی لوگوں سے ہوتا ہے، اس عزت و توقیر کا جو لحاظ آپ نے غزوہ موتہ کے موقع پر فرمایا وہ آپ کے دلی جذبات کی صحیح عکاسی کرتا ہے مورخین کے مطابق حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کی شہادت کے بعد ایک بدری صحابیؓ نے آپ کو علمِ اسلام دینا چاہا تو آپ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا "میں جھنڈا نہیں لوں گا، آپ اس کے مجھ سے زیادہ حقدار ہیں، کیونکہ آپ غزوہ بدر میں شریک رہ چکے ہیں" آخر آپ نے انہی کے اصرار پر لشکرِ اسلام کی قیادت سنبھالی اور اپنی جنگی صلاحیتوں کی بنا پر لوگوں کو بچا لائے اسی طرح جب آپ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے حکم پر عراق سے شام جانے لگے تب بھی آپ نے ان صحابہ کرام کو دوسرے لوگوں پر ترجیح دی اور انہیں خاص طور پر اپنی فوج میں شامل کیا۔[2]

---

[1] خالدؓ سیف اللہ از ابُوزید شلبی [2] خالدؓ سیف اللہ از ابُوزید شلبی۔ —

حق پرستی

حضرت خالدؓ اگرچہ تند مزاج تھے اور طبیعت کی تیزی کے باعث ذرا سی خلاف مزاج بات پر بگڑ جاتے تھے تاہم آپ میں ہٹ دھرمی کا شائبہ تک نہ تھا، آپ حق بات کو فوراً قبول کر لیتے اور دوسروں کے فضائل کے اعتراف میں کبھی بخل سے کام نہ لیتے تھے، معزولی کے واقعہ پر آپ کا طرزِ عمل آپ کی حق پرستی کی ایسی روشن مثال ہے جس کا جواب نہیں، مجمعِ عام میں آپ کو اس طرح معزول کیا جاتا ہے کہ سر سے ٹوپی اُتاری جاتی ہے، عمامہ گردن میں باندھ دیا جاتا ہے اور آپ دم نہیں مارتے اور جب حضرت ابو عبیدہؓ کو آپ کی جگہ سپہ سالار مقرر کیا جاتا ہے تو آپ لوگوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اب اُس اُمت کا امین تم پر امیر مقرر کیا گیا ہے۔[۱]

اشاعتِ اسلام

اشاعتِ اسلام ہر مسلمان کا مذہبی فریضہ ہے حضرت خالدؓ بھی اس فرض سے غافل نہ ہوئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زندگی میں اور آپؐ کے بعد برابر اس فریضہ کو ادا کرتے رہے، فتح مکہ کے بعد حضور سرورِ دو عالم صلعم نے اشاعتِ اسلام کی غرض سے جو سرایا بھیجے ان میں سے متعدد سریئے ان کی سرکردگی میں کئے گئے، چنانچہ بنو خذیمہ، بنو عبد المدان بخرانی انہی کی کوششوں سے مشرف باسلام ہوئے، مزید اہل یمن کے قبولِ اسلام میں حضرت علیؓ کے ساتھ ان کی کوششیں بھی شامل تھیں، فتنۂ ارتداد میں طلیحہ کی جماعت بنو ہوازن، بنو سلیم اور بنو عامر وغیرہ دوبارہ حضرت خالدؓ کی کوششوں سے دائرہ اسلام میں آئے، ان جماعتوں کے علاوہ منفرد طور پر بھی بعض مشہور لوگ ان کے ہاتھ پر مشرف باسلام ہوئے جنگ یرموک میں قیصر روم کے سپہ جرجہ (جارج) کا قبولِ اسلام انہی کی کوششوں کا مرہونِ منت ہے۔[۲]

---

[۱] الاصابہ جلد اوّل صفحہ ۴۱۴ [۲] سیر الصحابہؓ مہاجرین حصہ دوم۔

حضرت اُسامہ بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ

راجہ محمد شریف

نام و نسب

آپ کا نام اُسامہ رضؓ کنیت ابُو محمدؐ اور لقب حبِّ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعنی محبُوبِ رسُولؐ تھا، والد کا نام زید رضؓ تھا۔ پُورا سلسلہ نسب یہ ہے:

حضرت اُسامہ رضؓ بن زید بن حارثہ بن شرجیل بن کعب بن عبدالعزیٰ بن زید بن امراء القیس بن عامر بن نعمان

پیدائش، اسلام اور ہجرت

آپ ۷ بعثت میں مکہ معظمہ میں پیدا ہُوئے، آپ کے والد حضرت زید رضؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے محبُوب غلام اور مُنہ بولے بیٹے تھے۔ آپ کی والدہ برکۃ رضؓ جو امّ ایمن کے نام سے مشہور ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دائی کھلائی تھیں اور حضورؐ کے دل میں ان کا اتنا احترام تھا کہ آپ فرماتے ہیں "امّ ایمن رضؓ میری ماں ہیں بعد میری ماں کے"۔ غرض ماں اور باپ دونوں کی طرف سے محبوبیت کا شرف حضرت اسامہ رضؓ کو ورثہ میں ملا تھا اور چونکہ آپ نے آنکھ کھولتے ہی اسلام کی بہار دیکھی اور پھر اسی کے آغوش میں پرورش پائی تھی، اسی لیے زندگی کا کوئی حصّہ کفر و شرک کی آلودگیوں سے مُلوّث نہ ہُوا۔ ہجرت کا شرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حاصل کیا۔

غزوات

اگرچہ واقعہ ہجرت کے بعد ہی غزوات و سرایا کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا، تاہم حضرت اُسامہ رضؓ اپنی کم عمری کے باعث اُن میں حصّہ نہ لے سکے۔ مؤرخین کے مطابق آپ نے پہلی بار رمضان المبارک ۷ھ میں بحیثیت امیر کے میدانِ جنگ کا رُخ کیا۔ اس وقت گو آپ کی عُمر زیادہ سے زیادہ چودہ سال تھی، پھر بھی فطری استعداد و صلاحیت کی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو یہ شرف عطا فرمایا۔

مؤرخین کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جہینہ کی طرف ایک سریہ بھیجا جس کی قیادت حضرت اُسامہ رضؓ کے سپرد فرمائی جب مجاہدینِ اسلام اپنی منزل پر پہنچے تو جہینہ کے لوگ جمع ہو کر رات کو مقابلہ پر آئے۔ حضرت اُسامہ رضؓ نے انہیں سمجھایا کہ وہ اطاعت اختیار کریں اور مخالفت سے باز آجائیں لیکن وہ آمادۂ جنگ ہُوئے۔ اس پر حضرت اُسامہ رضؓ نے مجاہدین کو منظم کر کے ان پر ایک زبردست حملہ کیا، اسی حملہ کے دوران میں حضرت اُسامہ رضؓ نے ایک شخص نہیک بن مرداس کا تعاقب کیا اور جب قریب پہنچ کر اس پر تلوار چلانی چاہی تو اس نے لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ کہا۔ حضرت اُسامہ رضؓ نے پھر بھی اسے تہ تیغ کر دیا۔ مجاہدین کی واپسی پر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو آپؐ بے چین ہو گئے اور حضرت اُسامہ رضؓ سے فرمایا: "کیا تُو نے اسے لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ کہنے کے بعد قتل کر دیا؟" حضرت اُسامہ رضؓ نے عرض کیا "یا رسول اللہؐ! اس نے محض جان بچانے کے لیے ایسا کہا تھا"۔ رحمۃ للعلمینؐ نے فرمایا: "تُو نے اس کا دل چاک کر کے تو نہیں دیکھا تھا کہ اس نے دل سے کہا ہے یا نہیں"۔

حضرت اُسامہؓ کو اس بات پر بہت افسوس ہُوا۔ عرض کی "یارسولؐ اللہ! اب کسی ایسے شخص کو قتل نہیں کروں گا جو لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ پڑھ لے" حضورؐ نے فرمایا "میرے بعد" عرض کی "آپؐ کے بعد بھی"

حضرت اُسامہؓ کا اپنا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے عذر کو نا قابلِ قبول سمجھا اور بار بار اس جملہ کو دُہراتے رہے کہ "تم نے ایک شخص کو کلمہ طیبہ پڑھنے کے بعد بھی قتل کر دیا" یہاں تک کہ مجھ کو اتنی ندامت ہُوئی کہ دل میں کہنے لگا "کاش آج سے پہلے اسلام نہ لایا ہوتا" مؤرخین نے اس سریہ کو سریہ خرتبہ کے نام سے موسوم کیا ہے۔

فتح مکہ فتح مکہ (رمضان المبارک ۸ھ) اسلام کی فتح و شکست کا آخری معرکہ تھا۔ حضرت اُسامہؓ اس میں شریک تھے صحیح روایات کے مطابق جب مکہ فتح ہوگیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیت اللہ میں داخل ہوئے تو حضرت اُسامہؓ حضورؐ کی سواری پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے جبکہ حضرت بلال حضرت عثمان رضؓ اور حضرت طلحہؓ جلو میں تھے۔ خانہ کعبہ کھلنے کے بعد چاروں اصحاب ساتھ داخل ہوئے اور ان کے بعد دروازہ بند کر لیا گیا۔

سریہ اُسامہؓ بن زید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیاتِ اقدس کے آخری ایام میں ایک اہم سریہ رومیوں کے مقابلہ پر بھیجنے کا ارادہ فرمایا جس کی امارت حضرت اُسامہؓ کے سپرد فرمائی تھی۔ اس سریہ کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس میں حضرت اُسامہؓ کو حضرت عمرؓ، حضرت ابو عبیدہؓ بن الجراح، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت سعید بن زیدؓ اور حضرت قتادہؓ بن نعمان رضوان اللہ علیہم اجمعین جیسے کبار صحابہؓ پر شرفِ امارت عطا ہُوا تھا۔ چنانچہ جب بعض لوگوں نے اس کی شکایت کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لڑکے کو مہاجرین اولین پر امیر بنایا ہے، تو حضورؐ کو اس سے سخت تکلیف پہنچی اور بیماری کی حالت میں منبر پر رونق افروز ہوئے اور اس مسئلہ کی نسبت ارشاد فرمایا:-

> "اگر اسامہ کی سرداری پر تم کو اعتراض ہے تو اس کے باپ (زید) کی سرداری پر بھی تم معترض تھے۔ خدا کی قسم وہ اس منصب کا مستحق تھا اور وہ مجھے سب سے زیادہ محبوب تھا اور اب اس کے بعد یہ سب سے زیادہ محبوب ہے۔"

مزید ارشاد فرمایا:

> "تم لوگ اس کے ساتھ بھلائی سے پیش آیا کرو کہ وہ تمہارے بہتر لوگوں میں ہے۔"

مؤرخین اسلام نے اس سریہ کا پس منظر بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سفیر حضرت حارث بن عمیرؓ ازدی شاہ بصریٰ کے دربار سے سفارت کی خدمت انجام دے کر واپس آ رہے تھے کہ مقام موتہ میں شرجیل بن عمرو غسانی نے ان کو شہید کر دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اسلامی سفیر کی شہادت کی اطلاع ہوئی، تو آپ نے ۸ھ میں اس کا انتقام لینے کے لیے حضرت زیدؓ بن حارثہ کی زیرِ قیادت ایک سریہ روانہ فرمایا، دشمن کو چونکہ پہلے خبر ہو چکی تھی۔ اس لیے مجاہدین اسلام جب موتہ کے مقام پر پہنچے تو معلوم ہُوا کہ عظیم ایک لشکر جرار کے ساتھ مقابلہ پر موجود ہے۔ تاہم حضرت زیدؓ نے تین ہزار کی قلیل جمعیت کے ساتھ دشمن کے ٹڈی دل پر حملہ کر دیا۔ اس جنگ میں آپ شہید ہوگئے اور آپ کے ساتھ اکابر صحابہؓ میں حضرت جعفر طیارؓ اور حضرت عبد اللہؓ بن رواحہ نے بھی جام شہادت نوش کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان بزرگوں کی شہادت کا بڑا قلق ہُوا۔ چنانچہ اپنی وفات سے کچھ دنوں پہلے ان شہداء کے انتقام کے لیے (صفر ۱۱ھ میں) ایک سریہ بھیجا۔ جس کی امارت حضرت اُسامہؓ کے سپرد فرمائی، لیکن ابھی یہ سریہ روانہ ہُوا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بیماری کی علامات شروع ہوگئیں۔ حضورؐ نے اس کی

روانگی ملتوی نہ فرمائی اور اسی بیماری کی حالت میں اپنے دستِ مبارک سے عَلَم مرحمت فرما کر روانگی کا حکم دیا اور سریہ روانہ ہو گیا۔

اس سریہ کی پہلی منزل گاہ مدینہ کے قریب مقامِ جرف تھی۔ اسلامی لشکر ابھی اسی مقام پر تھا کہ حضورؐ کی بیماری طول پکڑ گئی، چنانچہ لوگ عیادت کے لیے خدمتِ اقدس میں آتے تھے اور رخصت ہو کر جاتے تھے۔ حضرت اسامہؓ بھی چونکہ حضورؐ کو بیمار چھوڑ کر گئے تھے، اس لیے وہ بھی دیکھنے آجاتے تھے۔ اتوار کو آنحضرت صلعم کا مرض زیادہ بڑھ گیا۔ حضرت اسامہؓ مقامِ جرف سے مزاج پرسی کے لیے آئے تو دیکھا کہ آنحضرت صلعم پر بیہوشی طاری ہے۔ حضرت اسامہؓ نے آکر بوسہ دیا مگر حضورؐ بالکل خاموش تھے، تاہم حضرت اسامہؓ کے لیے دستِ مبارک آسمان کی طرف اٹھاتے تھے اور حضرت اسامہؓ پر رکھتے تھے۔ حضرت اسامہؓ لشکر میں واپس گئے اور دوسرے دن پھر دیکھنے آئے اس روز چونکہ افاقہ تھا اس لیے حضرت اسامہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق فوج کو کوچ کا حکم دے دیا۔ لیکن عین روانگی کے وقت آپ کو اپنی والدہ محترمہ حضرت ام ایمن کی طرف سے پیغام ملا کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وقتِ آخر ہے، فوراً مدینہ چلے آؤ"۔ اس پر حضرت اسامہؓ معہ حضرت عمرؓ اور حضرت ابو عبیدہؓ کے بعجلت مدینہ پہنچے، اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ اقدس کے آخری لمحات تھے۔ چنانچہ حضورؐ کی وفات کے بعد پورا اسلامی لشکر جرف سے مدینہ واپس آگیا اور یہ مہم اس وقت ملتوی ہو گئی۔ مدینہ پہنچ کر حضرت اسامہ بن زیدؓ دیگر صحابہؓ کے ساتھ تجہیز و تکفین میں مشغول ہو گئے اور جسم اطہر کو قبر انور میں اتارنے کا شرف بھی حاصل کیا۔[1]

غرض خلیفہ اوّل نے خطرات و مشکلات کے باوجود حضرت اسامہؓ کی مہم کو ملتوی نہ کیا اور خود دور تک پیادہ پا مشایعت کر کے ان کو نہایت زرّیں ہدایتیں فرمائیں، چونکہ حضرت اسامہؓ گھوڑے پر سوار تھے، اور جانشینِ رسولؐ پیادہ پا گھوڑے کے ساتھ دوڑ رہے تھے۔ اس لیے حضرت اسامہؓ نے تعظیماً عرض کی "اے خلیفۂ رسولِ خدا کی قسم آپ گھوڑے پر سوار ہو جائیں ورنہ میں بھی اتر تا ہوں" فرمایا: "اس میں کیا مضائقہ ہے اگر میں تھوڑی دیر تک راہِ خدا میں اپنا پاؤں غبار آلود کر لوں۔ غازی کے ہر قدم کے عوض سات سو نیکیاں لکھی جاتی ہیں"۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابو بکرؓ خلیفہ ہوئے تو آپ نے سب سے پہلے حضرت اسامہؓ کو روانگی کا حکم دیا، لیکن اسی دوران فتنۂ ارتداد کھڑا ہو گیا اور صحابہ کرامؓ نے ان حالات کے پیشِ نظر رائے دی کہ حضرت اسامہؓ والی مہم ملتوی کر کے پہلے مرتدین و کذاب مدعیانِ نبوت کا استیصال کیا جائے۔ لیکن خلیفۂ رسولؐ کی طبیعت نے یہ گوارا نہ کیا کہ ارادۂ نبوی اور حکمِ رسالت آب صلی اللہ علیہ وسلم معرضِ التوا میں پڑ جائے اور جو علم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایما سے روم کے مقابلہ کے لیے بلند کیا گیا تھا، اس کو کسی دوسری جانب حرکت دی جائے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا:

> "خدا کی قسم! اگر مدینہ اس طرح آدمیوں سے خالی ہو جائے کہ درندے آکر میری ٹانگ کھینچنے لگیں، جب بھی میں اس مہم کو روک نہیں سکتا"۔

بہرکیف حضرت اسامہؓ کی مہم رخصت ہو کر حدودِ شام میں پہنچی اور حضرت زیدؓ بن حارثہ کا انتقام لے کر نہایت کامیابی کے ساتھ

---

[1] طبقاتِ ابن سعدؒ حصّہ دوم۔

چالیس دن بعد واپس آئی، حضرت ابوبکرؓ نے معہ صحابہؓ کے مدینہ سے باہر نکل کر نہایت جوش و مسرت کے ساتھ ان کا استقبال کیا۔ حضرت اسامہؓ بڑے شاندار طریقے سے مدینہ میں داخل ہوئے۔ آگے آگے حضرت بریدہؓ بن حصیب پرچم لہرا رہے تھے اور ان کے پیچھے حضرت اسامہؓ اپنے والد کے سَبَہ نامی گھوڑے پر سوار تھے۔ شہر میں داخل ہونے کے بعد آپ نے پہلے دو رکعت نماز پڑھی اور پھر گھر گئے۔ [1]

دورِ فاروقی

چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت اسامہؓ کو بہت محبوب رکھتے تھے۔ اس لیے آپ کے جانشین بھی ان کا بہت لحاظ رکھتے تھے۔ حضرت فاروقِ اعظمؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں ہمیشہ اُن کا خصوصی خیال رکھا۔ چنانچہ جب آپ نے تمام صحابہؓ کے وظائف مقرر کیے، تو آپ نے اپنے صاحبزادہ حضرت عبداللہؓ کا ڈھائی ہزار اور حضرت اسامہؓ کا تین ہزار مقرر کیا۔[2] حضرت عبداللہؓ نے عرض کیا کہ جب میں تمام غزوات میں حضرت اسامہؓ کے دوش بدوش رہا اور آپ ان کے والد حضرت زیدؓ سے کبھی پیچھے نہ رہے تو اس تفریق کا سبب کیا ہے؟ حضرت فاروقِ اعظمؓ نے فرمایا کہ تم نے جو کچھ کہا وہ سچ ہے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُن کو تم سے اور ان کے والد کو تمہارے باپ سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔

عہدِ عثمانی

حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت میں اگرچہ اُسامہؓ نے فتنہ و فساد کے خیال سے ملکی حالات میں اعلانیہ کوئی حصہ نہیں لیا تاہم ایک خیر خواہ مسلمان کی حیثیت سے نظم و نسق کی بحالی اور مفاسد کی روک تھام کے لیے حضرت عثمانؓ سے خفیہ طور پر گفتگو کرتے تھے۔ لوگوں نے جب آپ سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ فتنوں کو فرو کرنے کے لیے آپ حضرت عثمانؓ سے گفتگو کریں، تو آپ نے جواب دیا کہ اس خوف سے کہ میری اعلانیہ گفتگو سے کوئی نیا فتنہ نہ اُٹھ کھڑا ہو۔ اور اس کی ذمہ داری مجھ پر عائد ہو جائے، میں خفیہ گفتگو کرتا ہوں۔

عہدِ معاویہؓ و علیؓ

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد جب شورش زیادہ بڑھی، تو حضرت اسامہؓ بالکل الگ ہو گئے، یہاں تک حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کی معرکہ آرائیوں میں بالکل الگ تھلگ رہے اور حضرت علیؓ کے پاس کہلا بھیجا کہ اگر آپ شیر کی داڑھ میں گھستے تو میں بخوشی آپ کا ساتھ دیتا لیکن اس معاملہ میں حصہ لینا پسند نہیں کرتا۔ آپ اگرچہ مسلمانوں کی خونریزی کے خوف سے ان لڑائیوں میں غیر جانب دار رہے اور اپنے اس وعدہ پر قائم رہے، جو آپ نے آنحضرت صلعم سے کیا تھا کہ میں کسی کلمہ گو پر زندگی بھر تلوار نہ اُٹھاؤں گا، تاہم حضرت علیؓ کو حق پر جانتے تھے اور اپنی اس غیر جانب داری پر آخر تک کفِ افسوس ملتے تھے۔ [3]

وفات

حضرت معاویہؓ کے زمانۂ امارت ۵۴ھ میں بعمر تقریباً ساٹھ سال مدینہ میں فوت ہوئے۔

اہل و عیال

حضرت اسامہؓ نے مختلف اوقات میں متعدد شادیاں کیں جن سے کثرت سے اولادیں ہوئیں، تاہم ابنِ سعد کے مطابق آپ کے لڑکوں اور لڑکیوں کی تعداد کسی زمانہ میں بھی بیس سے زیادہ نہیں ہوئی۔ بیویوں کے نام یہ ہیں:۔

(۱) زینب بنتِ حنظلہ بن قسامہ یہ پہلی شادی تھی جو حضرت اسامہؓ نے چودہ برس کی عمر میں کی، یہ نکاح آنحضرت صلعم نے کرایا تھا حضرت اسامہؓ نے بعد میں انہیں طلاق دے دی (۲) دوسری شادی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایماء سے حضرت نعیمؓ بن عبداللہ النحام کے

---

[1] ابن سعد ج ۴ [2] ابن سعدؒ کے مطابق حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا ساڑھے تین ہزار اور حضرت اسامہؓ کا چار ہزار وظیفہ مقرر ہوا تھا۔
[3] سیر الصحابہؓ حصہ مہاجرین جلد دوم۔

ہال ہوئی (۳)، ہند بنت فاکہہ (۴)، درہ بنت عدی، (۵) فاطمہ بنت قیس (۶) اُمّ حکیم بنت عتبہ (۷)، بنت ابی ہمدان سہمی (۸)، برزہ بنت ربعی۔

ذریعہ معاش دربارِ خلافت سے تین ہزار وظیفہ ملتا تھا، اس کے علاوہ وادی القریٰ میں کچھ جائیداد تھی جس کے انتظام کے لیے اکثر جایا کرتے تھے۔

فضائل و اخلاق اہل سیر کے مطابق بہت سے فضائل بیشتر صحابہؓ میں مشترک ہیں لیکن اکابر صحابہؓ میں بعض ایسے بھی ہیں جو مخصوص فضائل کی بنا پر منفرد ہیں اور یہ فضائل ان کی خصوصیات میں شمار کیے جاتے ہیں۔ مثلاً حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ اور حضرت ابوذرؓ غفاری کی اکثر صفات میں اشتراک ہے تاہم حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا علم و فضل اور حضرت ابوذرؓ غفاری کا زہد و تقویٰ ایک کو دوسرے سے ممتاز کرتا ہے اور یہی صفات دونوں بزرگوں کی زندگی کے روشن ابواب کہے جا سکتے ہیں۔ اسی طرح حضرت اسامہؓ کی بارگاہِ نبوتؐ میں پذیرائی اور ان کی محبوبیت ان کو ایک ایسا بلند و برتر مقام عطا کرتے ہیں جو ہر لحاظ سے ان کا طغرائے امتیاز ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبانِ مبارک سے بارہا اس کا اظہار فرمایا اور حضرت اسامہؓ کے ساتھ حضورؐ کا طرزِ عمل ہی پر شاہد ہے کہ آنحضرت صلعم اپنے متعلقین کی طرح ان سے محبت کرتے تھے۔ حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کسی تشریح کی محتاج نہیں، لیکن حضرت اسامہؓ وہ شخص ہیں جو اس میں بھی شریک و سہیم تھے۔ حضرت اسامہ بن زیدؓ سے مروی ہے کہ:

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم مجھے ایک زانو پر بٹھا لیتے تھے اور حضرت حسن بن علیؓ کو دوسرے پر، پھر ہم دونوں کو چمٹا لیتے تھے اور فرماتے تھے" اے اللہ ان دونوں پر رحمت کر کیونکہ میں بھی ان دونوں پر رحمت کرتا ہوں" دوسری روایت میں ہے کہ:۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے (یعنی اسامہؓ) اور حضرت حسنؓ کو (گود میں) لے کر فرماتے تھے کہ اے اللہ میں ان دونوں سے محبت کرتا ہوں تو بھی ان سے محبت کر"[1]

اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیاتِ اقدس کے آخری دنوں میں فرمایا تھا کہ: اس کا باپ (حضرت زیدؓ بن حارثہ) مجھ کو سب سے زیادہ محبوب تھا، اب یہ سب سے زیادہ عزیز ہے:

حضرت عائشہؓ صدیقہ رضی سے مروی ہے کہ (ایک مرتبہ) اسامہؓ دروازے کی دہلیز پر پھسل پڑے جس سے ان کی پیشانی پھٹ گئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اے عائشہ ان کا خون پونچھو" حضرت عائشہ کو کراہت ہوئی، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اٹھ کر خون صاف کیا اور لعاب دہن لگایا۔

کبھی کبھی وفورِ محبت، میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مزاح بھی فرماتے تھے، ابو السفر سے مروی ہے کہ:

---

[1] طبقات ابن سعد حصہ چہارم۔

"جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور (حضرت) عائشہ بیٹھے تھے۔ اُسامہ رض اُن کے پاس تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسامہ رض کا چہرہ دیکھا اور ہنسے' فرمایا۔ اگر اسامہ رض لڑکی ہوتے' تو میں انہیں زیور پہناتا، ان کی آرائش کرتا یہاں تک کہ اُن کا بازار گرم ہو جاتا[1] (یعنی ان کا چرچا ہوتا اور ہر جگہ سے پیام آتے)

بارگاہِ نبوت میں حضرت اسامہ رض کے رسوخ کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب کوئی ایسی سفارش، جس سے حضرت عائشہ رض صدیقہ بھی جھجکتیں، آنحضرت صلعم سے کرنی ہوتی، تو حضرت اُسامہ رض کے سپرد کی جاتی۔ حضرت عائشہ صدیقہ رض سے مروی ہے کہ

"قریش کو اس عورت کے حال نے پریشان کر دیا جس نے چوری کی تھی۔ ان لوگوں نے کہا کون ہے جو اس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کرے۔ لوگوں نے کہا کہ سوائے اسامہ بن زید رض کے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محب و محبوب ہیں کون جرات کر سکتا ہے، پھر جب حضرت اُسامہ رض نے آپ سے سفارش کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم حدود اللہ میں کیوں سفارش کرتے ہو"

اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے اور خطبہ دیتے ہوئے فرمایا کہ:

تم سے پہلے لوگوں کو صرف اس امر نے ہلاک کر دیا کہ جب ان میں شریف چوری کرتا تھا تو اسے چھوڑ دیتے تھے اور کمزور چوری کرتا تھا تو اس پر حد قائم کرتے تھے۔ اللہ کی قسم! اگر حضرت فاطمہ رض بنت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) چوری کرتیں تو اُن کا ہاتھ بھی کاٹا جاتا[2]۔

حضرت اسامہ رض کو چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے محرم راز اور معتمد علیہ کی حیثیت حاصل تھی۔ اس لیے حضور م اہم سے اہم اور نازک سے نازک خانگی امور تک اُن سے مشورہ لیتے تھے۔ افک جیسے نازک معاملہ میں جس میں منافقین نے ناموسِ نبوت م پر حرف لانے کی کوشش کی اور جس کی صفائی خود زبانِ وحی و الہام نے دی، حضرت اسامہ رض بھی حضرت علی رض کے ساتھ شریکِ مشورہ تھے۔ حضرت عائشہ رض فرماتی ہیں کہ:

"جب افک والوں نے اتہام لگایا، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رض اور حضرت اُسامہ رض بن زید رض سے اپنے اہلِ خانہ کی علیحدگی کے بارہ میں مشورہ کیا اور ان سے حالات دریافت کیے"[3]

چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت اسامہ رض کو محبوب رکھتے تھے۔ اس لیے صحابہ کرام رض بھی نہ صرف انہیں قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے بلکہ ان کی اولاد کا بھی احترام کرتے تھے۔ ایک دن حضرت عبداللہ بن عمر رض نے ایک شخص کو مسجد کے گوشے میں دیکھا، لوگوں سے پوچھا یہ کون ہے؟ کسی نے عرض کیا۔ ابو عبدالرحمن، آپ اس کو نہیں پہچانتے؟ یہ حضرت اسامہ رض کے بیٹے محمد ہیں: آپ نے یہ سن کر سر جھکا لیا اور کہنے لگے "اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انہیں دیکھتے تو محبوب رکھتے"

---

[1] طبقات ابن سعد حصہ چہارم [2] ایضاً

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جو چیز اچھی اور بیش قیمت ہوتی وہ حضرت اُسامہؓ کو دے دیتے۔ ایک دفعہ ذی یزن نے حالتِ شرک میں ایک قیمتی جوڑا حکیم بن حزامؓ کے ذریعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا۔ حضورؐ نے فرمایا: میں مُشرک کا ہدیہ قبول نہیں کرتا۔ لیکن اب چونکہ تم لا چکے ہو۔ اس لیے قیمتاً لے لوں گا۔ چنانچہ پچاس دینار میں خرید کر ایک مرتبہ پہنا اور پھر حضرت اسامہؓ کو دے دیا۔ اسی طرح ایک بار حضرت دحیہ کلبیؓ نے کتان کا کپڑا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدیتہً پیش کیا۔ حضورؐ نے حضرت اسامہؓ کو پہنا دیا۔ اُنہوں نے اپنی زوجہ کو دے دیا۔ ایک دن حضورؐ نے حضرت اسامہؓ سے پُوچھا کتان کیوں نہیں پہنتے۔ عرض کیا یا رسُول اللہؐ میں نے وہ اپنی بیوی کو دے دیا ہے۔ فرمایا اچھا: اس سے کہہ دو کہ نیچے سینہ بند پہن لے ورنہ بدن دکھائی دے گا۔ غرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اہل و عیال اور حضرت اسامہؓ میں کوئی تفریق نہیں کرتے تھے۔

فضل و کمال

اس حقیقت کے پیشِ نظر کہ حضرت اُسامہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دامنِ تربیت میں پرورش پائی تھی، آپ کو سراپا علم ہونا چاہیے تھا، لیکن ایسا نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے وقت آپ کی عمر اٹھارہ سال کے لگ بھگ تھی۔ اس لیے سنِ شعور کو پہنچنے کے بعد صحبتِ نبویؐ سے فیضیاب ہونے کا موقع زیادہ نہیں ملا تھا۔ تاہم اس مدت میں آپ نے جو کچھ حاصل کر لیا تھا۔ اس کو بھی کم نہیں کہا جا سکتا۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال کا کافی ذخیرہ آپ کے سینہ میں محفوظ تھا۔ اسی بناء پر بعض مرتبہ کبار صحابہؓ کو جس چیز کا علم نہ ہوتا، اس میں وہ آپ کی طرف رجوع کرتے۔ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کو جب طاعون کے متعلق کوئی حکم نہ ملا تو انہوں نے حضرت اسامہؓ سے دریافت کیا کہ طاعون کے متعلق اگر تم نے آنحضرت صلعم سے کچھ سنا ہو تو بتاؤ۔ حضرت اسامہؓ نے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ طاعون ایک قسم کا عذاب ہے جو بنی اسرائیل کے خاص طبقہ پر بھیجا گیا تھا۔ اس لیے جب تم سنو کہ فلاں جگہ طاعون پھیلا ہے تو وہاں نہ جاؤ اور خود تمہارے یہاں وباء پھیلے تو بھاگنے کی نیت سے نہ نکلو۔

حضرت اُسامہؓ کی مرویات کی تعداد ایک سو اٹھائیس ہے جن میں سے پندرہ متفق علیہ ہیں، ان کے علاوہ مزید دو دو بخاری اور مسلم میں ہیں۔ حسن، محمد بن عباسؓ، ابو ہریرہؓ، کریب، ابُو عثمان نہدی، عمرو بن عثمان بن عفان، ابو وائل، عامر بن سعد، حسن بصریؒ وغیرہم نے آپ سے روایتیں کی ہیں۔

اخلاق و عادات

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دامنِ تربیت میں پرورش پانے کے باعث حضرت اُسامہؓ کے اخلاق و عادات پر تعلیماتِ نبویؐ کا خاصا اثر پڑا تھا۔

رسولؐ خدا کی خدمت

آپ کا شانۂ نبویؐ میں چونکہ اکثر آتے جاتے تھے اور اکثر سفر میں ہمرکابی کا شرف حاصل ہوتا تھا اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کرنے کا زیادہ موقع ملتا تھا۔ وضو وغیرہ کے وقت اکثر پانی لانے کی خدمت حضرت اُسامہؓ انجام دیتے تھے۔

سُنّت کی پابندی

سنت کی شدت سے پابندی کرتے تھے۔ آخر عمر میں جبکہ قویٰ مضمحل ہو گئے اور جسمانی ریاضت برداشت نہ کر سکتے تھے۔ اس وقت بھی مسنون روزے التزام سے رکھتے تھے۔

حضرت اُسامہؓ کے غلام سے مروی ہے:

"آپ دوشنبہ اور پنج شنبہ کا روزہ رکھتے تھے۔ میں نے اُن سے کہا کہ آپ سفر میں بھی روزہ رکھتے

ہیں، حالانکہ آپ بوڑھے ہو گئے ہیں' فرمایا " میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے کہ دو شنبہ اور پنج شنبہ کو روزہ رکھتے تھے اور آپ نے فرمایا کہ اعمال دو شنبہ اور پنج شنبہ کو پیش کیے جاتے ہیں[1]

اطاعتِ والدین

حضرت اسامہؓ والدین کی خوشنودی کا بہت زیادہ خیال رکھتے تھے اور اس میں کسی بھی مالی قربانی سے دریغ نہیں کرتے تھے، محمد بن سیرین سے مروی ہے کہ حضرت عثمانؓ بن عفان کے عہدِ خلافت میں کھجور کے درخت کی قیمت ہزار درہم تک پہنچ گئی تھی۔ حضرت اسامہؓ نے کھجور کے ایک درخت کو چیر کر اس کا گودا نکالا اور اپنی والدہ کو کھلا دیا۔ لوگوں نے سبب اتنا قیمتی درخت ضائع کرنے کا سبب پوچھا، تو فرمایا کہ میری ماں نے اس کی فرمائش کی تھی۔ مزید فرمایا کہ وہ مجھ سے جب کسی ایسی چیز کی فرمائش کریں گی جس کے حصول پر میں قادر ہوں گا تو اس کو میں ضرور پوری کروں گا۔

---

[1] طبقات ابنِ سعدؒ حصہ چہارم

وَ اِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ

اور اگر آپ فیصلہ کریں تو ان کے درمیان عدل کے مطابق فیصلہ کریں۔

(المائدہ : ۴۲)



دربارِ رسول ﷺ کے فیصلے

رسولؐ اللہ کے فیصلے

پروفیسر فیض اللہ منصور

۱- باب الدیات والقصاص

ارشادِ ربّانی ﴿ اسی بنا پر ہم نے یہ حکم لکھ دیا تھا کہ جس کسی نے سوائے اس حالت کے کہ قصاص لینا ہو، یا ملک میں لوٹ مار مچانے والوں کو سزا دینی ہو، کسی جان کو قتل کر ڈالا۔ تو گویا اُس نے تمام انسانوں کا خون کیا۔ اور جس نے کسی کی زندگی بچا لی۔ تو گویا اُس نے تمام انسانوں کو زندگی دے دی۔

(المائدہ : ۳۲)

﴿ مسلمانو! جو لوگ قتل کر دیے جائیں، اُن کے لئے تمہیں قصاص کا حکم دیا جاتا ہے۔ اگر آزاد آدمی نے آزاد آدمی کو قتل کیا ہے تو اس کے بدلے وہی قتل کیا جائے گا۔ اگر غلام قاتل ہے تو غلام ہی قتل کیا جائے گا، عورت نے قتل کیا ہے تو عورت ہی قتل کی جائے گی۔ : (البقرہ : ۱۷۹)

﴿ اور ہم نے یہودیوں کے لئے توراۃ میں یہ حکم لکھ دیا تھا کہ "جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت اور زخموں کے بدلے ویسے ہی زخم، پھر جو کوئی بدلہ لینا معاف کر دے تو یہ اس کے لیے (گناہوں کا) کفارہ ہوگا، اور جو کوئی خدا کی نازل کی ہوئی کتاب کے مطابق حکم نہ دے گا، تو ایسے ہی لوگ ہیں جو ظلم کرنے والے ہیں : (المائدہ : ۴۵)

﴿ اے اربابِ دانش! قصاص کے حکم میں تمہارے لیے زندگی ہے : (البقرہ : ۱۷۹)

﴿ کسی جان کو ناحق قتل نہ کرو، جسے قتل کرنا اللہ نے حرام ٹھہرا دیا ہے جو کوئی ظلم سے مارا جائے۔ تو ہم نے اس کے وارث کو (قصاص کے مطالبہ کا) اختیار دے دیا ہے پس چاہیے کہ خونریزی میں زیادتی نہ کرے (یعنی حق سے زیادہ بدلہ لینے کا قصد نہ کرے) وہ (حد کے اندر رہنے میں) فتح مند ہے۔ (بنی اسرائیل : ۳۳)

فرمانِ نبویؐ ﴿ لوگو! خبردار، تمہارے لیے لازم ہے کہ تم اپنا آپ اللہ کی حدود سے بچاؤ۔ پھر جو کوئی بدکاری میں ملوث ہو جائے، تو (اُسے چاہیے کہ) اللہ کے ستر میں مستور رہے۔ کیونکہ جس نے ہمارے سامنے اپنے

جرم کا اعتراف کیا۔ اُس پر اللہ کی حدود جاری کی جائے گی۔

و سب سے بڑے گناہ (کبیرہ) تین ہیں۔ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرنا، کسی جان کو ناحق قتل کرنا اور والدین کی نافرمانی اور جھوٹی شہادت دینا۔

(راوی: انسؓ بن مالک: بخاری شریف جلد ۲)

و ایک مسلمان کا قتل، ساری دنیا کی تباہی پر بھاری ہے۔

(راوی: عبداللہ بن عمرؓ۔ ترمذی شریف)

و قیامت کے روز سب سے پہلے خون (ناحق) کے بارے میں فیصلہ کیا جائے گا۔

(راوی: عبداللہ بن عمرؓ۔ ترمذی شریف)

صحیح بخاری جلد ۹، کتاب الدیات ص ۴۹

سنن ابن ماجہ: جلد ۲: ابواب الدیات ص ۱۲۳

حضور سید الکونینؐ کے فیصلے:

(۱)

قبیلہ عکل یا عرینہ کے کچھ افراد جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام لے آئے، آپ نے انہیں صُفّہ میں ٹھہرایا۔ مدینہ کی آب و ہوا انھیں راس نہ آئی، بیماری نے انھیں اس قدر لاغر کر دیا جیسے موت کے سائے اُن پر منڈلا رہے ہوں آپ نے (اُن کی یہ حالت دیکھ کر) زکوٰۃ کے چند اونٹ اُن کے حوالے کئے۔ اور حکم دیا کہ وہ انھیں شہر سے باہر لے جائیں اور وہیں قیام کریں، اُن (اونٹنیوں) کا دودھ بطورِ غذا اور پیشاب بطورِ دوا استعمال کریں۔ وہ (آپؐ کے حکم کے مطابق) زکوٰۃ (بیت المال) کے اونٹوں میں چلے گئے۔ اور سید الکونینؐ کے فرمان کے مطابق انہوں نے دودھ کو بطورِ خوراک کے اور پیشاب (بول) کو بطورِ دوا کے استعمال کرنا شروع کیا، یہاں تک کہ بالکل تندرست و توانا ہوگئے۔ (لیکن کفرانِ نعمت کرتے ہوئے) مرتد ہوگئے۔ چرواہے کو (بڑی بیدردی سے) قتل کر ڈالا اور بیت المال کے اونٹوں کو لے کر فرار ہوگئے۔

یہ خبر جناب رسالتمآبؐ کو منہ اندھیرے ملی تو آپ نے چند سوار اُن کو گرفتار کرنے کے لئے روانہ فرمائے۔ انہوں نے دن چڑھے ہی اُن کو جا لیا اور گرفتار کر کے حضورؐ کی خدمت میں لے آئے۔

جنابِ سید الکونینؐ نے اُن سے متعلق مندرجہ ذیل فیصلہ صادر فرمایا:۔

۱۔ اُن کے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے قطع کئے جائیں۔

۲۔ اُن کی آنکھوں میں گرم سلائیاں پھیر دی جائیں۔

۳۔ اس کے بعد اُن کو گرم پتھریلی زمین پر پٹک دیا جائے۔

چنانچہ:۔ اُن کے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ دیئے گئے۔ ان کی آنکھیں پھوڑ دی گئیں اور انھیں حرّہ کی پتھریلی اور تپتی

ہوئی زمین پر پھینک دیا گیا۔ شدّت پیاس سے وہ تڑپنے لگے، پانی مانگا۔ لیکن انہیں پانی نہیں دیا گیا۔ اور وہ اسی طرح ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ٹھنڈے ہو گئے۔

ابوؔ قلابہ کا قول ہے :۔ کہ انہیں اس قدر شدید سزائیں اس لئے دی گئیں کیوں کہ انہوں نے شدید جرائم کا ارتکاب کیا تھا۔

۱۔ چوری کی۔ بیت المال کے اونٹوں کی۔

۲۔ چرواہے کو بڑی بیدردی سے قتل کیا۔

۳۔ اللہ اور اللہ کے رسولؐ کے خلاف پیکار پر آمادہ ہوئے۔

یعنی۔ چوری، قتل اور بغاوت تینوں سنگین جرائم کا ارتکاب کیا۔

راوی :۔ انس بن مالک

صحیح بخاری جلد ۶ : کتاب المحاربین صہ ۱۱۱ - ۱۴

صحیح مسلم جلد ۴ : صہ ۲۹۹ - ۳۰۲

(۲)

و ایک لڑکی مدینہ میں اپنے گھر سے باہر نکلی، اس نے چاندی کے زیور پہنے ہوئے تھے۔ ایک یہودی کی نظر اس پر پڑ گئی۔ زیور حاصل کرنے کے لالچ میں وہ دیوانہ ہو گیا۔ اس نے اس لڑکی کا سر پتھر سے کچل دیا۔ لوگ جب اسے (شدید زخمی حالت میں) اٹھا کر جناب سید الکونین کی خدمت میں لے آئے۔ اگرچہ سخت بُری طرح زخمی تھی، تاہم تھوڑی سی جان ابھی اس میں باقی تھی۔ حضورؐ نے اس سے دریافت فرمایا۔

”کیا تجھے فلاں شخص نے مارا ہے؟“

اس نے سر کے اشارے سے کہا کہ نہیں،

”آپ نے پھر پوچھا کہ کیا تمہیں فلاں شخص نے قتل کیا ہے؟

اس نے سر کو اٹھا کر اشارہ کیا۔ نہیں۔

تیسری بار آپ نے پھر اس لڑکی سے دریافت فرمایا“ کہ کیا تمہیں فلاں یہودی نے قتل کیا ہے۔“ تو اس نے سر کی جنبش سے ہاں کہا۔

اسی وقت آپؐ کے حکم سے اس یہودی کو دربارِ رسالتؐ میں طلب کیا گیا آپ نے اس پر مسلسل جرح فرمائی۔ یہاں تک کہ اس نے اپنے جرم کا اقرار کر لیا۔

اس پر آپ نے فیصلہ صادر فرمایا ـــ کہ قاتل کے سر کو بھی پتھروں سے کچل دیا جائے۔ چنانچہ اس کا سر بھی پتھروں سے کچل دیا گیا۔

صحیح مسلم اور مصنف عبدالرزاق کے مطابق :۔ آپ نے اسے رجم کرنے کا حکم صادر فرمایا۔

چنانچہ اُسے سنگسار کر دیا گیا۔ یہاں تک کہ اُس نے جان دے دی۔

راوی :۔ حضرت انس بن مالک

صحیح بخاری جلد ۶ : کتاب الدیات صہ ۵۵ - ۵۶

صحیح مسلم جلد ۴ صہ ۳۰۲ - ۳۰۳

سنن ابن ماجہ جلد ۲ ابواب الدیات صہ ۱۳۶

(۳)

عبداللہ بن سہل اور محیصہ رضؓ کو کسی ہنگامی مجبوری کی بنا پر خیبر جانا پڑا ۔ سنن ابن ماجہ کے مطابق ۔ یہ دونوں رزق کی تلاش میں خیبر کی جانب روانہ ہوئے ، عبداللہ ذرا پہلے نکلا اور اُن سے آگے ہو لیا جب محیصہ وہاں پہنچا ۔ تو دیکھا کہ عبداللہ کو کسی نے قتل کر کے گڑھے میں ڈال دیا ہے ۔ محیصہ فوراً یہودیوں کے پاس گئے اور کہا ، خدا کی قسم ، تم ہی عبداللہ کے قاتل ہو ۔ لیکن یہودیوں نے ماننے سے انکار کر دیا ۔ محیصہ اپنی قوم کی طرف واپس ہوئے اور انھیں ساری صورت حال سے آگاہ کیا ۔

چنانچہ محیصہؓ اُن کے بڑے بھائی حویصہ اور عبدالرحمان بن سہیل جناب سید الکونینؐ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے ۔ محیصہ نے گفتگو میں پہل کرنے کی کوشش کی تو جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :۔ (تم خاموش رہو) : مجلس کے آداب کا لحاظ رکھو ، اور اپنے بڑے بھائی کو بات کرنے دو ، اس لئے حویصہ نے سارا واقعہ حضورؐ کے گوش گذار کیا ، اُن کے بعد محیصہ نے بھی (پوری روئیداد بیان کی) ۔

یہ واقعات سماعت فرما کر آپ نے حکم دیا ۔

"یہودی یا تو خون بہا (دیت) ادا کریں یا پھر جنگ کے لئے تیار ہو جائیں "۔ آپؐ نے اس سلسلہ میں ایک فرستادہ کو یہ فرمان

" خدا کی قسم ۔ ہم نے قتل کا ارتکاب نہیں کیا "

اس پر جناب سید الکونین حویصہ ، محیصہ اور عبدالرحمان بن سہیل (مقتول کے بھائی) کی طرف مخاطب ہوئے اور فرمایا :

" کیا تم تینوں اس بات پر قسم کھانے کو تیار ہو کہ (عبداللہ) کو یہودیوں ہی نے قتل کیا ہے ؟

اور تم اس کے خون کا بدلہ لینے کے حق دار ہو ؟"

ان تینوں نے جواب دیا :

" ہم کیسے قسم کھا سکتے ہیں ۔ اے اللہ کے نبیؐ جبکہ قتل ہمارے سامنے نہیں ہوا "

اس پر جناب سید الکونینؐ نے فرمایا :

" تو پھر یہودیوں کی قسم کا اعتبار کرو "

انہوں نے کہا :

" یا رسول اللہؐ ! یہودی کافر ہیں ۔ (اور قسم اٹھانے کو ہر وقت تیار رہتے ہیں) بھلا ہم کافروں

کی قسم کا اعتبار کریں "۔

اس پر جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خیال سے کہ مقتول کا خون رائیگاں نہ جائے ۔ مقتول کی دیت اپنے پاس سے ادا فرما دی اور اُن کے پاس سو اونٹنیاں بھیج دیں ۔

۱ - سنن ابن ماجہ جلد ۲ قسامت کا بیان صـ ۱۳۹ - ۱۴۰

۲ - صحیح بخاری جلد ۶ کتاب الدیات صـ ۱۷ - ۴۷

۳ - صحیح مسلم جلد ۴ صـ ۲۹۳ - ۲۹۸ ۔

۴ - موطا امام مالک ۔

۵ - سنن نسائی ۔ جلد ۳ صـ ۲۸۷ - ۲۹۸

(۴)

علقمہ کے والد بیان کرتے ہیں :

میں جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھا کہ ایک شخص دوسرے شخص کو رسی سے جکڑے گھسیٹتا ہوا وہاں لایا اور عرض کیا :

"یارسول اللہ ! اس نے میرے بھائی کو قتل کیا ہے "۔

جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس شخص سے دریافت فرمایا : " کیا واقعی تو نے اس کے بھائی کو قتل کیا ہے ؟ اور ساتھ ہی مدعی کو مخاطب کرکے فرمایا :

" اے شخص، اگر اس نے قتل کا اقرار نہ کیا ۔ تو تمہیں شہادت پیش کرنی ہو گی " مگر ملزم نے جرم کا اقرار کرتے ہوئے کہا ۔ ہاں یارسول اللہ !"

جناب رسالتمآب نے پوچھا " کیوں اور کیسے قتل کیا ؟"

تو وہ کہنے لگا " یارسول اللہ ! میں اور اس کا بھائی لکڑیاں کاٹ رہے تھے ۔ کہ اس کے بھائی نے (بلا وجہ) مجھے گالی دی، مجھے سخت طیش آگیا، اور میں نے اُس کے سر پہ کلہاڑی دے ماری (حالاں کہ بخدا میرا ارادہ اس کو قتل کرنے کا نہیں تھا ۔) کلہاڑی کی ضرب سے وہ مر گیا ۔" اس پر جناب رسالتمآب نے فرمایا ۔ " کیا تو خون بہا ادا کر سکتا ہے ؟

ملزم ۔ یارسول اللہ — ! میرے پاس اس کلہاڑی اور اس چادر کے سوا کچھ بھی تو نہیں ۔ (دیت کہاں سے دوں گا)

رسول اللہ ؐ : " کیا تمہارے قبیلہ والے تمہاری طرف سے دیت ادا کرکے تمہیں چھڑانے کو تیار ہوں گے " ؟

ملزم : " یارسول اللہ ؐ ۔ میری قوم میں مجھے ایسا مقام حاصل نہیں کہ وہ میری طرف سے دیت ادا کرنے کو تیار ہو جائیں "۔

اس بات کو سن کر جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے رسی مدعی کی طرف پھینک دی اور فرمایا ۔ " اب تم جاؤ اور تمہارا یہ ساتھی "۔

آپ کا فرمان سنتے ہی مدعی قاتل کو لے کر جانے کے لئے مڑا ، جونہی اس نے پشت پھیری تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

" اگر اس شخص (مدعی) نے اس قاتل کو قتل کر دیا ۔ تو یہ بھی اُسی کی طرح قتل کا مرتکب ہو گا (جیسے قاتل) " ؛

اس شخص نے جب یہ بات سنی تو فوراً پلٹا اور عرض کیا۔

یا رسول اللہؐ!۔"میں نے آپ کا فرمان سُن لیا ہے کہ اگر میں نے اسے قتل کر دیا۔ تو میں بھی اس (قاتل) کی طرح قاتل قرار دیا جاؤں گا۔" حالاں کہ میں نے آپ کے حکم ہی سے اسے پکڑا ہے۔"

رسول اللہؐ نے فرمایا "کیا تمھیں یہ بات پسند نہیں، کہ یہ شخص (قاتل) اپنے اور تمہارے بھائی (مقتول) کے گناہوں کا بوجھ اپنے سر لے؟"

اُس نے کہا" یا رسول اللہؐ!۔ مجھے منظور ہے"۔

رسول اللہؐ نے فرمایا" ایسا تو تبھی ممکن ہے جب تو اسے آزاد کر دے"

چنانچہ مدعی نے رسی پھینک دی اور اُسے آزاد چھوڑ کر چلا گیا۔

صحیح مسلم جلد۲، صہ ۳۱۱

سنن ابن ماجہ جلد۲ ابواب الدیات۔

سنن نسائی جلد۳ صہ ۲۹۰ - ۳۰۲

(۵)

حمل بن مالک کا تعلق قبیلہ بنی ہُذیل سے تھا۔ اس کی دو بیویاں تھیں۔ ایک کا نام ام عفیف بن مسروح تھا اور دوسری کا ملیکہ بنت عویمر، ان کے درمیان کسی بات پر جھگڑا ہو گیا۔ (نوبت یہاں تک بڑھی) کہ ام عفیف نے خیمہ کی چوب ہاتھ میں لی اور ملیکہ کے اس زور سے ماری کہ بیچاری کا حمل بھی گر گیا، اور خود بھی فوت ہو گئی۔

یہ معاملہ جب جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہوا تو حضورؐ نے فیصلہ صادر فرمایا کہ بچہ کے بدلے میں ایک غلام یا کنیز دی جائے اور مقتولہ کے قصاص میں قاتلہ قتل کی جائے۔

صحیح بخاری میں ہے کہ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے قاتلہ کو قصاص میں قتل کرنے کا حکم صادر نہیں فرمایا۔ بلکہ مقتولہ کی دیت قاتلہ کے عصبوں پر ڈال دی۔ اور بچہ (جنین) کے لئے غرۃ کا حکم دیا۔ یعنی دیت کا ۱/۲۰ حصّہ (عصبہ = ددھیال)

۱- موطا امام مالک

۲- صحیح بخاری جلد ۶ کتاب الدیات صہ ۷۰ - ۸۰

۳- صحیح مسلم: جلد ۲ صہ ۳۱۳

(۶)

براء بن عازب بیان کرتے ہیں کہ

میں نے اپنے ماموں ابو بردہ کو دیکھا کہ وہ ایک نشان اٹھائے تیز تیز کہیں جا رہے تھے۔ میں نے اُن سے پوچھا" کہاں کا قصد ہے"

تو انہوں نے کہا:۔ مجھے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسے شخص کی طرف بھیجا ہے۔ جس نے اپنے باپ کی منکوحہ سے شادی رچائی ہے۔
آپ نے مجھے حکم دیا ہے کہ جاتے ہی اس کا سر قلم کر دوں اور کٹا ہوا سر آپ کی خدمت میں پیش کر دوں اور اس کا مال لوٹ لوں۔
چنانچہ حضورؐ کے حکم کے مطابق اس شخص کو قتل کر دیا گیا اور مال و اسباب لوٹ لیا گیا۔
نتیجہ:۔ اپنے باپ کی منکوحہ سے نکاح کرنا واجب القتل جرم ہے۔

مشکوٰۃ جلد ۲ صہ ۷۹

سنن نسائی :۔ جلد ۲ صہ ۴۰۴ - ۴۰۵

(۷)

ایک شخص نے دوسرے شخص کے بازو پر تلوار کا وار کیا۔ جس سے اس کی کلائی پر تو شدید ضرب آئی۔ لیکن جوڑ سلامت رہا۔ وہ شخص (مضروب) حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور پورا ماجرا بیان کیا۔ چنانچہ حضورؐ سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم نے مارنے والے کو حکم دیا کہ وہ دیت ادا کرے اس پر اُس شخص نے عرض کیا! "یا رسول اللہؐ، مجھے دیت نہیں چاہیے میں قصاص چاہتا ہوں۔"

اس پر جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"اللہ تجھ پر رحم فرمائے۔ دیت کو ہی کافی سمجھو۔"
چنانچہ آپ نے اُس مقدمے میں قصاص کا فیصلہ نہیں فرمایا۔

راوی:۔ نمران بن جاریہ

سنن ابن ماجہ جلد ۲ ابواب الدیات صہ ۱۳

(۸)

یعلیٰ بن امیہ اور سلمہ بن امیہ۔ روایت کرتے ہیں:
کہ ہم غزوۂ تبوک میں جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک تھے ہمارے ساتھ ہمارا ایک ساتھی بھی تھا۔ اُس کا ایک دوسرے شخص کے ساتھ جھگڑا ہو گیا، جھگڑے کے دوران اُس دوسرے شخص نے اس کے (ہمراہی) کے بازو میں دانت گاڑ دیئے۔ اُس نے اپنے بازو کو چھڑانے کے لیے زور سے جھٹکا دیا۔ تو اس کا ایک دانت بھی ساتھ نکل آیا۔ اس پر وہ شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور عرض کیا۔
یا رسول اللہؐ مجھے اُس سے دیت دلوائیے۔
حضورؐ نے (اس کا مطالبہ سن کر) فرمایا "تم یہ بھی چاہتے ہو کہ اپنے بھائی کے بازو کو ایسے چباڈالو، جیسے اُونٹ چباڈالتا ہے۔ اور اس پر دیت کا مطالبہ بھی کرتے ہو۔"

چنانچہ جناب رسالتمآبؐ نے اس کے دیت کے مطالبہ کو رد کر دیا۔

۱۔ سنن ابن ماجہ جلد ۲ صـ ۱۳۵
ابواب الدیات
۲۔ صحیح بخاری جلد ۶ کتاب الدیات صـ ۶۵-۶۶

(۹)

ایک شخص قتل ہو گیا، اس کی لاش دو قریوں کے درمیان پڑی ہوئی پائی گئی۔ قاتل کا پتہ نہیں چل رہا تھا۔ آپ کو جب صورت حال کا علم ہوا تو جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ جہاں مقتول کی لاش پڑی ہوئی ہے۔ اُس مقام سے دونوں بستیوں کے فاصلہ کی پیمائش کی جائے۔ چنانچہ آپ کے حکم سے پیمائش کی گئی۔ جس بستی کا فاصلہ اُس مقام سے کم نکلا (یعنی جس بستی سے لاش کا جائے وقوع نزدیک تر تھا)

آپ نے فیصلہ فرمایا کہ اُسی بستی کے لوگ اس قتل کے ذمہ دار ہیں۔

(مسند ابی شیبہ)

(۱۰)

حضرت انس کی پھوپھی ربیع نے ایک لڑکی کو اس زور سے تھپڑ مارا۔ کہ اس کا دانت ٹوٹ گیا، ربیع کے رشتہ دار اس لڑکی کے قبیلہ والوں کے پاس گئے اور معافی کے خواستگار ہوئے (ان کی درخواست کے باوجود) انہوں نے معافی دینے سے انکار کر دیا۔ وہ جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور صورت حال عرض کی۔

حضور رسالتمآبؐ نے قصاص کا حکم صادر فرمایا، یہ فیصلہ سن کر انس بن نضر نے عرض کیا "یا رسول اللہؐ! کیا ربیع کا دانت بھی توڑا جائے گا، اس ذاتِ پاک کی قسم! جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا۔ ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔"

اس پر جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ "انس! یہ اللہ کی کتاب کا حکم ہے (قصاص دینا ہوگا)"

حضورؐ کا یہ فرمان جب لڑکی کے قبیلہ والوں نے سُنا۔ تو انہوں نے عرض کیا "یا رسول اللہ! ہم قصاص کے مطالبہ سے دستبردار ہوتے ہیں۔ ہم دیت لینے پر رضامند ہیں۔"

چنانچہ رسول اللہؐ نے دیت کا فیصلہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:۔

"کچھ اللہ کے بندے ایسے بھی ہیں کہ وہ اگر اللہ پر قسم کھا لیں تو اللہ ان کی قسم پوری فرما دیتا ہے۔"

(راوی: حضرت انس) صحیح بخاری جلد ۶: کتاب الدیات صـ ۶۶

سنن ابن ماجہ جلد ۲ ابواب الدیات صـ ۱۳۳-۱۳۴

(۱۱)

ایک شخص کو قتل کیا گیا اور اس کی لاش چند گھروں کے سامنے پڑی ہوئی پائی گئی۔ کوشش کے باوجود جب کہ قاتل کا پتہ نہیں چلا۔ اس

لیے جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا: "کہ مدعا علیہم پر قسم واجب ہے اگر وہ قسم کھانے سے انکار کردیں تو مدعی قسم کھا کر مستحق ہو جائیں گے کہ فیصلہ اُن کے حق میں کیا جائے۔"

اور اگر دونوں قسم کھانے سے انکاری ہوں گے تو دیت کا نصف حصہ مدعا علیہم کے ذمہ ہوگا۔ اور نصف حصہ انھیں معاف کر دیا جائے گا۔ اگر قسم کھانے سے انکار کریں۔

(مصنف عبدالرزاق)

(۱۲)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

اگر کوئی حاملہ عورت کسی کو جان بوجھ کر قتل کرے۔ تو اُسے اس وقت تک قصاص میں قتل نہیں کیا جائے گا۔ جب تک وضع حمل نہ ہو لے اور رتا وقتیکہ کوئی شخص اس نومولود کی کفالت کی ذمہ داری قبول نہ کرے۔

اور اگر حاملہ زنا کرے تو اُسے اس وقت تک سنگسار نہیں کیا جائے گا۔ جب تک وہ بچہ نہ جن لے اور کوئی شخص اس بچے کی کفالت قبول نہ کرے۔

سنن ابن ماجہ جلد ۲ ابواب الدیات صـ ۱۴۵

(۱۳)

ایک شخص فریاد کناں بارگاہِ سید الکونینؐ میں حاضر ہوا۔ جناب رسالتمآب نے اُس سے چیخنے چلانے کا سبب دریافت فرمایا تو اس شخص نے عرض کیا۔

"یا رسول اللہ! عین اس وقت جبکہ میں اپنے مالک کی کنیز کا بوسہ لے رہا تھا۔ میرے آقا نے مجھے دیکھ لیا۔ اُس نے سزا کے طور پر میری پیشاب گاہ کٹوا دی۔ میں یہی فریاد لے کر حاضر ہوا ہوں۔"

جناب رسالتمآب نے اسی وقت اس غلام کے آقا کو طلب فرمایا۔ اس شخص کو بہت تلاش کیا گیا۔ لیکن وہ نہ ملا۔ اس لئے جناب آقائے نامدار نے اُس غلام کے حق میں فیصلہ صادر فرماتے ہوئے اُسے آزاد کر دیا۔ یہ فیصلہ سن کر وہ غلام حضورؐ کی خدمت میں ملتجی ہوا۔ اور عرض کی "یا رسول اللہ! اگر اُس شخص نے مجھے پھر سے غلام بنانے کی کوشش کی تو میری مدد کو کون آئے گا؟"

جناب رسالتمآب نے فرمایا "ہر مومن اور مسلم کا فرض ہے کہ وہ تیری مدد کرے تیری آزادی کی حفاظت کرے۔"

سنن ابن ماجہ جلد ۲ ابواب الدیات صـ ۱۴۱

(۱۴)

جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک شخص نے قتل کا ارتکاب کیا، اس کا مقدمہ بارگاہِ رسالت میں جب پیش کیا گیا۔ تو حضورؐ نے قاتل کو مقتول کے وارثوں کے حوالے کیا۔

اس پر قاتل نے عرض کیا۔

"یارسولؐ اللہ! مجھے ذاتِ پاک کی قسم، میرا ارادہ قتل کا ہرگز نہیں تھا" حضورؐ نے مقتول کے ولی کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:
"اگر یہ شخص (قاتل) اپنے قول میں سچا ہے۔ تو اس کا قتل تیرے لیے دوزخ میں جانے کا باعث ہوگا۔"
یہ سنتے ہی مقتول کے وارثوں نے قاتل کو آزاد کردیا۔

(سنن ابن ماجہ جلد ۲، ابواب الدیات صد ۱۴۲-۱۴۳)

(۱۵)

مقداد بن عمرو کندی۔ غزوہ بدر میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک تھے، انہوں نے حضور کی خدمت میں عرض کیا۔
"یارسول اللہ! اگر میرا مقابلہ کسی کافر سے ہو، اور وہ اپنی تلوار کے وار سے میرا ایک ہاتھ اڑا دے، پھر ایک درخت کی آڑ لے کر پکار اٹھے کہ میں اسلام لے آیا ہوں۔ کیا اس کے بعد میرے لیے اس کا قتل جائز ہے یا نہیں؟"
آپؐ نے فرمایا: "نہیں، اُسے قتل مت کرو۔"
اُس نے عرض کیا "یارسول اللہ! اُس نے میرا ایک ہاتھ کاٹ دیا۔ اب وہ (محض اپنی جان بچانے کی خاطر) اقرار کرتا ہے کہ میں اسلام لے آیا۔ تو کیا میں اُسے قتل نہیں کرسکتا؟"
آپؐ نے فرمایا۔ اے مقداد! اُس کا قتل کرنا تمہارے لئے جائز نہیں۔ تو اُسے (اسلام لے آنے کے بعد) قتل کرے گا۔ تو وہ تو اس مقام پر ہوگا جس مقام پر تو قتل کرنے سے پہلے تھا۔ (مسلم) تو۔ اس منزل پر پہنچ جائے گا جس پر وہ اسلام لانے سے قبل تھا (کفر)۔ (یعنی اُسے قتل کرنا تیرے لیے ارتکاب کفر ہوگا)

(صحیح بخاری جلد ۶ کتاب الدیات صد ۵)

(۱۶)

جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ مبارک میں ایک نابینا شخص تھا۔ اُس کی ایک لونڈی تھی، جس سے اُس کے دو بچے تھے، وہ اکثر جناب رسالتمآبؐ کا ذکر کرتی تو حضورؐ کی شان میں گستاخی کرتی۔ اور اس نابینا شخص (اپنے مالک) کی ڈانٹ ڈپٹ کے باوجود وہ اس فعلِ بد سے باز نہ رہتی۔
ایک رات حسبِ عادت اُس نے حضورؐ کا ذکر کیا تو سب و شتم کرنے لگی نابینا شخص بیان کرتا ہے کہ میں آپے سے باہر ہو گیا، چنانچہ میں نے کلا اٹھایا اور اس کے پیٹ میں گھونپ دیا۔ جس سے وہ مرگئی۔ صبح کے وقت لوگوں نے اُسے مردہ پایا تو اس بات کا ذکر جناب رسالتمآب سے کیا۔ حضورؐ نے لوگوں کو جمع ہونے کا حکم دیا۔ جب لوگ جمع ہوگئے تو آپ نے حاضرین کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:۔
"میں اس شخص کو قسم دیتا ہوں کہ جس پر میرا حق ہے کہ وہ شخص جس نے اس لونڈی کو قتل کیا ہے۔ وہ خود (اٹھ کر) اقرار کرے۔"
نابینا شخص نے جب حضورؐ کا فرمان سُنا۔ تو وہ گرتا پڑتا، خوف سے تھرتھر کانپتا بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوا اور عرض کی:

"یارسول اللہ یہ قتل میں نے کیا ہے۔ مقتولہ میری لونڈی تھی، اُسے مجھ سے محبت تھی، وہ مجھ سے لطف سے پیش آتی۔ اس سے میرے دو بچے ہیں۔ بالکل موتیوں کی طرح (خوب صورت)۔ لیکن حضور! اس کی ایک عادت بُد تھی۔ یہ آپ پر اکثر و بیشتر سب و شتم کرتی رہتی تھی۔ میرے منع کرنے کے باوجود وہ اپنے اس فعل بد سے باز نہ رہتی، میری ڈانٹ ڈپٹ اور زجر و توبیخ کا بھی اس پہ کچھ اثر نہ پڑتا۔

گذشتہ رات جب پھر اُس نے آپؐ کی شان میں گستاخی کی تو مجھ میں سننے کی تاب نہ رہی۔ قوت برداشت نے جواب دے دیا۔ اور میں نے تکلا اٹھا لیا اس کے پیٹ پر رکھ کر اس زور سے دبایا کہ یہ کیفرِ کردار کو پہنچی۔

یہ ماجرا سن کر جناب ختمی مرتبتؐ نے فرمایا:۔

اے لوگو! ۔ تم گواہ رہنا ۔ اس لونڈی کا خون ہدر (ھدر ہے یعنی۔ اس کے خون کا قصاص نہیں لیا جائے گا۔ کیوں کہ اس نے دُہرے جرم کا ارتکاب کیا ہے۔

(۱) جناب رسالت مآب کی شان میں گستاخی ۔ اور

(۲) اپنے خاوند کی نافرمانی ۔

راوی: ابن عباس

(سنن نسائی جلد ۳ ص ۱۰۸ - ۱۰۹)

(۱۷)

حُمید طویل ایک روایت میں بیان کرتے ہیں، کہ:

ایک شخص نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں دروازے کے سوراخ سے جھانکا، آپ نے اُس کی آنکھ میں مارنے کے لئے تیر سیدھا کیا۔ نیز آپ نے فرمایا۔ اگر کوئی شخص بغیر اجازت کے (کسی کے) گھر میں جھانکے۔ اور وہ ایک کنکری تاک کر مارے۔ جس سے اُس کی آنکھ پھوٹ جائے تو اس (مارنے والے) پر کوئی گناہ نہیں (نہ دیت ہے، نہ قصاص، نہ گناہ)

(صحیح بخاری جلد ۲ : کتاب الدیات ص ۶۳-۶۴)

(۱۸)

غزوۂ حُنین کے دن تھے۔ ایک روز جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کی نماز ادا فرمائی۔ تو آرام فرمانے کی غرض سے آپ ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ اس وقت اقرع بن حابس جناب رسالتمآبؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے آتے ہی محلّم بن جثامہ کے قصاص کا مطالبہ پیش کیا۔

عیینہ بن حصن بھی یہ سن کر کھڑے ہو گئے۔ اور عامر بن الاضبط اشجعی کے قصاص کا مطالبہ پیش کر دیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کا مطالبہ سن کر ارشاد فرمایا "کہ تم دیت قبول کر لو"۔

لیکن انھوں نے دیت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

اس پر ایک شخص مکیتل نامی، جس کا تعلق قبیلہ بنولیث سے تھا کھڑا ہوا اور بارگاہِ نبوی میں عرض کی۔
یا رسول اللہ! یہ قتل علیہ اسلام کے زمانہ میں ہوا ہے۔ اس کی نوعیت ایسی ہے کہ جیسے بکریوں کا ایک ریوڑ آ رہا ہو۔ اُن میں کے چند کو اگر مارا جائے۔ تو ریوڑ کی باقی بکریاں بھی بھاگ کھڑی ہوں۔
(یعنی۔ یہ قتل دانستہ نہیں ہوتے، وقت کی مجبوری تھی)

اس پر جنابِ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے فرمایا:
"تم بھائی کی دیت کے پچاس اونٹ مجھ سے یہاں لے لو۔ اور باقی کے پچاس مدینہ پہنچنے پر تمھیں دے دیئے جائیں گے۔" (راوی۔ زید بن ضمرہ)

سنن ابن ماجہ جلد ۲ الواب الدیات صہ ۱۲۶

(۱۹)

ایک شخص نے دوسرے شخص کے پیر کو سینگ سے زخمی کر دیا۔ زخمی اسی حالت میں جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور لگا قصاص کا مطالبہ کرنے۔
جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جب تک تمہارا زخم مندمل نہ ہو جائے۔ قصاص کے مطالبہ سے باز رہو۔ (حضورؐ کے سمجھانے کے باوجود) وہ شخص قصاص لینے پر مُصر تھا۔ چنانچہ حضورؐ نے قصاص لے لیا۔
اتفاق کی بات کہ ملزم کا زخم تو ٹھیک ہو گیا۔ اور وہ بھلا چنگا ہو گیا لیکن قصاص کا مطالبہ کرنے والا لنگڑا ہو گیا۔ اس لئے مدعی بارگاہِ رسالتؐ میں پھر حاضر ہوا اور لگا شکایت کرنے، اُس نے کہا:
"یا رسول اللہ! دشمن تو بھلا چنگا ہو گیا۔ لیکن (مجھ پر افتاد پڑی) میں لنگڑا ہو گیا۔"
اس پر جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"اے شخص! میں نے پہلے ہی تجھے کہا تھا کہ جب تک تمہارا زخم مندمل نہ ہو جائے۔ انتظار کرو۔ اور قصاص کے مطالبے سے باز رہو۔ لیکن تم نے میری بات سُنی اَن سُنی کر دی۔ نتیجہ دیکھ لیا۔ تم اللہ کی رحمت سے دور ہو گئے۔ اور مستقلاً لنگڑے بھی۔" ("مصنف عبدالرزاق")

(۲۰)

جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"جو شخص اپنے غلام کو قتل کرے گا۔ ہم اُسے (اس کے بدلے میں) قتل کریں گے اور جو شخص (غلام کے) ناک، کان یا کوئی دوسرا عضو کاٹے گا۔ تو اس کے بدلے اس کا بھی وہی عضو قطع کیا جائے گا۔
اور جو شخص اپنے غلام کو خصی کرے گا۔ تو اُسے بھی اس کے بدلے میں خصی کیا جائے گا۔"
راوی: سمرہؓ سنن نسائی جلد ۳ : صہ ۳۰۴

(۲۱)

کسی نادار شخص کا غلام تھا۔ اُس نے کسی صاحب ثروت شخص کے غلام کا کان کاٹ ڈالا، وہ صاحب اپنا مقدمہ لے کر جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

(آپ نے حقیقت حال سن کر) انھیں کوئی دیت نہ دلائی۔

(راوی: عمران بن حصین) سنن نسائی جلد ۳ صفحہ ۳۰۷، ۳۰۸

(۲۲)

ایک بار جناب سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کوئی شے تقسیم فرما رہے تھے۔ ایک شخص سامنے سے آیا اور آپ پر اس قدر جھک گیا (کہ آپ کو سخت تکلیف محسوس ہوئی) تو آپ کے ہاتھ میں جو چھڑی تھی۔ آپ نے اس چھڑی سے اُسے کچوکہ دیا۔ وہ شخص جب جانے لگا تو جناب رسالتمآب نے اُسے بلا کر فرمایا: "اے شخص! آؤ اور اپنا بدلہ چکاؤ۔"

اُس شخص نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ (میں بدلہ لینے سے رہا)

میں آپ کو معاف کرتا ہوں۔

(راوی: ابو سعید خُدری) سنن نسائی جلد ۳ صفحہ ۳۱۴

(۲۳)

ایک دن جناب سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم مسجد کے درمیان کھڑے ہوئے تھے کہ ایک اعرابی تیز تیز آپ کی خدمت میں حاضر ہوا گفتگو کا آغاز کرنے سے پہلے اُس نے حضورؐ کی ردائے مبارک پیچھے سے پکڑ کر اس زور سے کھینچا کہ حضورؐ کی گردن مبارک اس کی رگڑ سے سُرخ ہوگئی۔ کیونکہ چادر کھردری تھی۔ پھر وہ کہنے لگا۔

اعرابی: یا رسول اللہ! میرے اونٹوں کو غلہ سے لاد دیں۔ اور ہاں یہ غلہ نہ آپ نے اپنے پاس سے دینا ہے اور نہ ہی یہ آپ کے باپ دادا کا مال ہے۔

رسول اللہ: اے شخص! اللہ تعالےٰ مجھے معاف فرمائے۔ میں اس وقت تک تمھیں ہرگز غلہ نہیں دوں گا۔ جب تک تم نے مجھے جو تکلیف دی ہے۔ اس کا بدلہ تم سے نہ لے لوں۔

اعرابی: خدا کی قسم۔ میں بدلہ دینے کے لئے قطعی تیار نہیں۔

جناب رسالتمآبؐ نے اپنی بات تین مرتبہ دُہرائی کہ میں بدلہ لوں گا اور اعرابی نے ہر بار وہی درشت جواب دیا۔

یہ سن کر صحابہ (جو مسجد میں موجود تھے) دوڑ کر حضورؐ کے پاس پہنچے (تاکہ اعرابی کو سزا دیں)۔ تو آپ نے انھیں روکتے ہوئے فرمایا:

"جو بھی میری بات سن رہا ہے۔ اُسے اللہ پاک کی قسم کہ وہ میری اجازت کے بغیر اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے۔"

اس کے بعد آپ نے ایک شخص کو حکم دیا۔

اس اعرابی کے ایک اونٹ پر جَو لاد دو اور دوسرے پر کھجور (یعنی حضور رسالت مآب نے اُس شخص کا قصور معاف فرما دیا اور قصاص نہیں لیا) فارغ ہوئے۔ تو آپؐ نے لوگوں کو جانے کی اجازت دے دی۔

سنن نسائی جلد ۳ صد ۳۱۵

(۲۴)

ایک دفعہ جناب سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے ابی جہم بن حذیفہؓ کو کسی مقام پر صدقات وصول کرنے کے لئے بھیجا۔ وہ گئے۔ اور صدقات کی وصولی شروع کی۔ تو ایک شخص نے نہ صرف صدقہ ادا کرنے سے انکار کیا بلکہ وہ لڑائی پر اُتر آیا۔ چنانچہ ابوجہم نے (مجبور ہو کر) اُس کی پٹائی کی۔

وہ شخص اور اس کے قبیلہ والے جناب رسالتمآب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور حضورؐ سے قصاص کا مطالبہ کیا۔

آپ نے فرمایا۔ اچھا اتنا مال لے لو، وہ راضی نہ ہوئے تو حضورؐ نے فرمایا۔ اتنا اور سہی۔ اس پر وہ لوگ راضی ہو گئے۔ اس پر جناب رسالت مآب نے فرمایا۔ کہ میں لوگوں کو جمع کر کے آگاہ کروں گا کہ تم دیت پر رضامند ہو گئے ہو انہوں نے عرض کیا۔ بہتر حضور

چنانچہ لوگ جمع ہوئے تو جناب سید المرسلینؐ نے حاضرین سے فرمایا:۔

"اے لوگو! یہ لوگ میرے پاس قصاص کا مطالبہ لے کر آئے تھے۔ چنانچہ میں نے انھیں اس قدر مال بطور دیت دینا منظور کیا تو وہ راضی ہو گئے۔ (اور اپنے مطالبے سے دستبردار ہو گئے)

لیکن وہ لوگ معاً بول اُٹھے۔ کہ ہم اس پر رضامند نہیں۔

اس پر صحابہ کرام انھیں سزا دینے کو تیار ہو گئے۔ حضورؐ نے صورتِ حاصل دیکھی تو آپ نے صحابہ کرام کو روک دیا۔ آپ نے پھر ان لوگوں کو بُلایا اور فرمانے لگے۔

"کیا تم ہماری دیت سے راضی نہیں ہوئے؟"

انہوں نے عرض کیا۔ "یا رسول اللہ! ہم راضی ہیں"۔

اس لئے حضورؐ نے دوبارہ حاضرین کے سامنے انھیں مخاطب کر کے فرمایا:۔

"اے لوگو! کیا تم کو ہماری ادا کردہ دیت قبول ہے اور کیا تم راضی ہو"۔

انہوں نے عرض کیا"۔ ہاں! یا رسول اللہ۔ ہمیں کوئی شکوہ نہیں"۔

(سنن نسائی جلد ۳ صد ۳۱۶)

(۲۵)

حضرت ثعلبہ بن زیدمؓ روایت کرتے ہیں کہ

قبیلہ ثعلبہ کے چند افراد حضورؐ سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں عین اُس وقت پہنچے، جبکہ جناب رسالتمآب خطبہ ارشاد فرما رہے تھے

(اُن کو دیکھ کر) ایک شخص نے عرض کیا۔

یارسول اللہؐ: بنو ثعلبہ کے بعض افراد نے آپؐ کے فلاں فلاں صحابی کو قتل کیا تھا (اب آپ اُن سے مقتولوں کا قصاص لیں) تو۔"
حضورؐ نے فرمایا: "اے شخص! ایک شخص کی غلطی اور قصور کے بدلے میں دوسرے شخص پر گرفت کرنا جائز نہیں۔"
(سنن نسائی جلد ۳ صـ ۳۲۰ - ۳۲۱)

(۴۶)

حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے:۔
"جو آنکھ بے نور ہو۔ مگر اپنی جگہ پر قائم ہو۔ اور کوئی شخص اُسے پھوڑ دے، تو اُسے اُس آنکھ کی ایک تہائی دیت ادا کرنی ہوگی"
"اسی طرح اگر کسی کا ہاتھ شل ہو گیا ہو۔ اور کوئی شخص اس شل ہاتھ کو کاٹ دے۔ تو اس کے لئے بھی کاٹنے والے کو ایک تہائی دیت ادا کرنی ہوگی"
بیمار دانت کا بھی یہی قصاص ہے۔
یعنی اگر کوئی دانت (کیڑا لگنے سے) سیاہ پڑ جائے اور کوئی شخص اس دانت کو توڑ دے۔ تو توڑنے والے کو ایک تہائی دیت ادا کرنی ہوگی۔ (سنن نسائی جلد ۳ صـ ۳۳۲)

(۴۷)

عمرو بن حزم روایت بیان کرتے ہیں کہ
جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل یمن کے نام ایک خط تحریر فرمایا۔ اس خط میں فرض و سنت کے ساتھ دیت کے احکامات تحریر فرمائے یہ خط (حکم نامہ) عمرو بن حزم لے کر گئے، یہ خط عبد کلال کے تین بیٹوں شرحبیل بن عبد کلال، نعیم بن عبد کلال اور حارث بن عبد کلال کے نام تھا۔ یہ لوگ قبیلہ ذی رُعین، معافر اور ہمدان کے رئیس تھے۔ یہ خط انھیں پڑھ کر سنایا گیا۔ اس میں تحریر تھا۔
(۱) جو شخص کسی مسلمان کو بلا کسی جواز کے قتل کرے اور شہادت سے اُس کا قتل ثابت ہو جائے۔ یا وہ خود اعتراف جُرم کر لے، تو اس سے قصاص لیا جائے گا۔ ہاں اگر مقتول کے ورثا معاف کر دیں۔ تو کوئی مضائقہ نہیں۔
دیت کی شرح حسب ذیل ہے:
جان کی دیت سو اونٹ ہیں۔
اگر پوری ناک کاٹ دی جائے تو دیت سو اونٹ ہیں۔
اسی طرح زبان، لب، ذکر، پیٹ اور ہڈی وغیرہ کی بھی پوری دیت ہے دونوں آنکھیں ضائع ہونے کی صورت میں بھی پوری دیت ہے۔
جبکہ ایک پاؤں کے نقصان کی صورت میں نصف دیت، ہاں اگر دونوں پاؤں ہوں، تو ان کی پوری دیت ہوگی۔
جو زخم دماغ اور مغز تک گہرا ہو۔ اس کی آدھی دیت ہے۔ اور ایسا زخم جو پیٹ تک گہرا ہو۔ اس کی ایک تہائی دیت ہے
جس زخم میں ہڈی ٹل جائے یا ٹوٹے اس کی دیت پندرہ اونٹ ہیں۔ جبکہ ہاتھ اور پاؤں کی ہر انگلی کی دیت دس اونٹ اور ایک دانت کا بدلہ پانچ اونٹ ہیں (اور اگر کسی مرد نے عورت کو قتل کیا ہو) تو مرد کو عورت کے بدلے میں قتل کیا جائے۔

جو لوگ صاحب ثروت ہوں، ان کے پاس سونا چاندی ہو تو ان کے لیے دیت کی شرح ہزار دینار ہیں۔
(سنن نسائی جلد ۳ صہ ۲۲۴)

۲۔ "حدود"

ارشاد ربانی: (۱) زنا کاری کے قریب بھی نہ جاؤ۔ یقین کرو۔ وہ بڑی بے حیائی کی بات ہے اور بڑی بُرائی کا چلن ہے۔

(بنی اسرائیل ۔ ۳۲)

(۲) اور وہ جو اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کی پوجا نہیں کرتے، اور نہ اللہ کی حرام کی ہوئی کسی جان کو ناحق قتل کرتے ہیں اور نہ وہ زنا کے مرتکب ہوتے ہیں اور جو کوئی یہ بُرے کام کرے گا۔ وہ اپنے گناہوں کے وبال سے دوچار ہوگا۔

(الفرقان ۔ ۶۸)

ارشاد نبوی ؐ: حضرت عبادہ بن صامت بیان کرتے ہیں:۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جب کبھی وحی کا نزول ہوتا تھا تو آپ بیقرار ہو جاتے۔ رُخِ انور کا رنگ بدل جاتا ایک روز آپ پر وحی کا نزول شروع ہوا تو آپ پر یہی کیفیت طاری ہو گئی۔ جب یہ کیفیت ختم ہوئی تو آپ نے ارشاد فرمایا:۔
"غور سے سنو! ۔ اسے مضبوطی سے تھام لو، اللہ پاک نے عورتوں کے لیے ایک سبیل مقرر فرما دی ہے شادی شدہ مرد و عورت اگر زنا کے مرتکب ہوں تو انھیں (پہلے) سو کوڑے مارے جائیں اور پھر انھیں سنگسار کر دیا جائے۔

اور اگر زنا کا ارتکاب کرنے والے مرد و عورت غیر شادی شدہ ہوں۔ تو اُن کے لیے سو کوڑے اور پھر جلا وطنی کی سزا ہے۔"

(صحیح مسلم)

(ک) زنا سے متعلق فیصلے:۔

(۱)

خیبر میں جو یہودی قبائل آباد تھے، اُن میں ایک شادی شدہ جوڑے نے زنا کا ارتکاب کیا۔ توراۃ کے احکامات کے مطابق اُن کی

سزا سنگساری تھی۔ مگر یہود نے خواہشات نفس کی پیروی میں اِن احکامات کو پس پشت ڈال رکھا تھا۔ یہودیوں کا خیال تھا کہ شاید اسلامی شریعت، موسوی شریعت کی نسبت نرم ہے۔ اس لیے وہ یہ مقدمہ لے کر بارگاہِ رسالتؐ میں حاضر ہوئے۔ ان آنے والوں کو یہود نے بطورِ خاص یہ ہدایت کی تھی کہ اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمارے مطلب کے موافق فیصلہ دیں تو قبول کر لیں ورنہ نہیں۔ یعنی اگر رجم کے علاوہ آپؐ نے کوئی دوسرا فیصلہ کیا تو مان لیں گے ورنہ انکار کر دیں گے۔

جب وفد حضورؐ کی خدمت میں پہنچا تو انھوں نے حضورؐ سے پوچھا۔

"اے محمدؐ! اگر شادی شدہ مرد و عورت زنا کے مرتکب ہوں تو اُن کے لیے کیا حکم ہے"۔

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تو کیا جو فیصلہ میں کروں، تمھیں منظور ہوگا؟"

انھوں نے جواب دیا: "ہاں! ہمیں آپ کا فیصلہ منظور ہوگا"۔

اسی لمحے حضرت جبریل امینؑ اللہ تعالیٰ کا یہ حکم لے کر نازل ہوئے۔ کہ "ایسے مجرموں کی سزا رجم ہے"۔

یہ فیصلہ سُن کر یہودی بوکھلا گئے۔ اور ماننے سے انکار کر دیا۔

جبریل امینؑ نے جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کو مشورہ دیا "کہ آپ اِن یہودیوں سے یہ فرمائیں کہ وہ آپ کے فیصلے کے متعلق ابن صوریا کو حکم بنائیں"۔ انھوں نے ابن صوریا کے حالات اور صفات سے بھی حضورؐ کو مطلع کر دیا۔ چنانچہ آپ نے یہودیوں سے فرمایا

"(اگر میرا فیصلہ تمھیں منظور نہیں تو) تو میری بات غور سے سنو:-

کیا تم اس نوجوان سے واقف ہو، جس کا رنگ سفید ہے۔ اور جو ایک آنکھ سے معذور رہے ہے؟

انھوں نے کہا۔ "ہاں"،

آپ نے فرمایا: "تمہارا اس نوجوان کے متعلق کیا خیال ہے؟"

انھوں نے جواب دیا: "روئے زمین پر یہودیوں میں اس کے پایہ کا عالم نہیں۔

آپؐ نے ابن صوریا کو بُلا بھیجا۔ جب وہ حضور کی خدمت میں حاضر ہوا۔ تو حضور سید الکونین نے اُسے قسم دے کر پوچھا: "اے شخص! تورات میں اس جرم (زنا) کے متعلق احکامات ذرا بتلیئے"۔

ابن صوریا: "قسم ہے اُس ذات پاک کی، جس کی قسم آپ نے مجھے دی ہے۔ اگر آپ مجھے یہ قسم نہ دیتے۔ اور مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ اگر میں نے غلط بیانی کی، تو اللہ کی کتاب (تورات) مجھے جلا کر خاک کر دے گی۔ تو کبھی اس (صحیح) حکم کو ظاہر نہ کرتا۔ سچ تو یہ ہے کہ اسلامی شریعت کی طرح۔ تورات میں بھی یہ حکم ہے کہ (شادی شدہ) زانیوں کو سنگسار کیا جائے"۔

"(اصل بات یہ ہے) کہ ہمارے اشراف کے یہاں زنا کی کثرت ہوگئی۔ تو (اُن کے مرتبہ کی وجہ سے) ہم نے شرفا کو اِس سزا سے مستثنیٰ کرنا شروع کیا (اور یہ خیال نہ کیا کہ احکام خداوندی کو پس پشت ڈالا جا رہا ہے) ہاں غریب طبقہ پر رجم کی حد و جاری رہی۔ لیکن آہستہ آہستہ اس (طبقاتی) تفریق کو ختم کرنے کے بجائے ہم نے رجم کی سزا کو سرے سے موقوف کر دیا اور اس کی بجائے

دوسری سزائیں، مثلاً منہ کالا کرنا۔ جوتے مارنا۔ گدھے پر اُلٹے منہ سوار کرنا۔ اور کوڑے مارنا۔ جیسی سزائیں جاری کیں"۔

یہ سن کر جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

"یا اللہ! میں پہلا شخص ہوں، جس نے تیرے اِس حکم کو زندہ کیا۔ جب کہ (اس کے حاملین نے) اس کو موقوف کر دیا تھا"

چنانچہ آپ نے دونوں (زانی اور زانیہ) کو رجم کرنے کے احکامات جاری فرمائے۔ ان دونوں کو سنگسار کر دیا گیا۔

(۱) صحیح بخاری۔ کتاب الحدود۔

(۲) صحیح مسلم جلد ۲ کتاب الحدود ص ۲۳۲-۲۳۴

(۲)

چند یہودی جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے عرض کیا۔ کہ اُن میں سے ایک مرد اور ایک عورت نے زنا کیا ہے۔ (اس کے بارے میں آپ کا کیا حکم ہے؟)

جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا "توراۃ میں زنا سے متعلق کیا حکم ہے؟

انہوں نے کہا۔" ہم اُن کو (زانی اور زانیہ) رُسوا کرتے ہیں، اُن کو دُرّے مارتے ہیں۔

عبداللہ بن سلام جو وہاں موجود تھے انہوں نے یہودیوں کی بات سُن کر کہا" تم جھوٹ بول رہے ہو، توراۃ میں سنگسار سے متعلق آیت موجود ہے۔"

چنانچہ حضور کی خدمت میں توراۃ لائی گئی۔ یہودی اس کی ورق گردانی کرنے لگے، جب آیہ رجم آئی۔ تو اُن میں سے ایک شخص نے آیت مذکورہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ اور اس سے اگلی اور پچھلی آیات پڑھ کر سنانی شروع کیں۔

عبداللہ بن سلام (چپ نہ رہ سکے) نے کہا، ذرا اپنا ہاتھ تو ہٹاؤ۔ جب شخص مذکور نے اپنا ہاتھ ہٹایا۔ تو وہاں آیت رجم موجود تھی۔

آپ نے فیصلہ صادر فرمایا۔ کہ دونوں (زانی اور زانیہ) کو سنگسار کیا جائے۔

چنانچہ آپ کے حکم سے وہ دونوں سنگسار کئے گئے۔

۱۔ موطا امام مالک

۲۔ صحیح بخاری جلد ۲ کتاب المحاربین ص ۴۷

(۳)

ایک شخص جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اقرار کیا کہ اُس سے زنا سرزد ہوا ہے۔ (اور کہا مجھے پاک فرمایئے)

(چوں کہ اُس نے خود اقرار کیا تھا) اس لئے حضورؐ نے حاضرین میں سے کسی کو کوڑا لانے کو فرمایا۔ وہ شخص ایک ٹوٹا ہوا کوڑا

سے آیا۔ اس لئے آپ نے فرمایا: "اس سے بہتر کوڑا لاؤ"۔ اس بار وہ نیا کوڑا لایا۔ تو آپ نے فرمایا "یہ کوڑا سخت ہے۔ اس سے ذرا نرم کوڑا (استعمال شدہ) لاؤ۔

اس کے بعد ایسا کوڑا حضورؐ کی خدمت میں لایا گیا جو استعمال ہو چکا تھا۔ اس لیے نرم تھا۔ آپ نے حکم دیا کہ اس کوڑے سے حد جاری کی جائے۔

چنانچہ آپ کے حکم کے مطابق حد جاری کی گئی۔

اس کے بعد آپ نے ارشاد فرمایا:۔

اے لوگو! اب تمہارے لئے وقت آ چکا ہے کہ تم اللہ کی حدود سے تجاوز نہ کرو۔ تو جس شخص سے ان ناپاک افعال کا ارتکاب ہو جائے تو اسے چاہیے کہ اللہ کی پردہ داری کے ساتھ پردہ رکھے (یعنی اُسے چھپانے کی کوشش کرے) کیوں کہ جو شخص اپنا چہرہ ہم پر ظاہر کرے گا (جو شخص خود آکر اپنے جرم کا اقرار کرے گا) تو ہم اللہ کی کتاب کے مطابق اس پر حد جاری کریں گے۔

(موطا امام مالک)

(۴)

جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں دو شخص حاضر ہوئے اور اپنا مقدمہ حضورؐ کے سامنے پیش کیا۔

ایک شخص نے عرض کیا "یا رسول اللہ! ہمارے درمیان اللہ کی کتاب کے مطابق فیصلہ فرمائیں"۔

دوسرے شخص نے کہا "ہاں یا رسول اللہ۔ ہمارے مقدمہ کا فیصلہ کتاب اللہ کے مطابق فرمائیں۔ (اس سے پہلے) آپ مجھے اجازت دیں کہ میں صورت حال کھول کر آپ کے سامنے پیش کروں"۔

آپ نے فرمایا۔ بیان کرو، تو اس شخص نے کہا۔

یا رسول اللہ! میرا بیٹا اس شخص کے یہاں ملازم تھا۔ اُس نے اس شخص کی بیوی سے زنا کا ارتکاب کیا۔ بعض لوگوں کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ میرے بیٹے پر رجم کی حد جاری کی جائے گی۔ میں نے (اپنے بیٹے کی جان بچانے کی خاطر) اس کے فدیہ میں اس شخص کو سو بکریاں اور ایک لونڈی دی۔ (لیکن اس کے باوجود میرا ضمیر مطمئن نہ ہوا) تو پھر میں نے اہل علم کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ (ان علماء سے) مجھے پتہ چلا کہ میرے بیٹے کو سو کوڑوں کی سزا ملے گی اور اس کو ایک سال کے لئے جلا وطن کیا جائے گا۔ (کیوں کہ وہ کنوارا ہے) اور اس شخص کی بیوی پر رجم کی حد جاری ہوگی"۔

اس لیے ہم جنابؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں۔

(دونوں کا بیان) سُن کر جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں محمدؐ کی جان ہے میں تمہارے درمیان کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ اور وہ فیصلہ یہ ہے:

" اے شخص۔ تجھے تیری بکریاں اور لونڈی واپس کر دی جائے۔ تیرے بیٹے کو سو کوڑے مارے جائیں گے

اور اُسے ایک سال کے لئے جلاوطن کیا جائے گا۔"

چنانچہ اُس کے لڑکے کو حضور رسالتمآبؐ کے فیصلہ کے مطابق سزا دی گئی۔

اس کے بعد آپؐ نے ایک شخص کو مخاطب کر کے فرمایا:

"اور ہاں اُنیس! تم اس شخص کی بیوی کے پاس جاؤ۔ اور اگر وہ زنا کا اقرار کرے۔ تو اُسے سنگسار کر دو۔"

اس کی عورت نے انیس کے آگے اپنے جرم کا اعتراف کر لیا، اس لئے اُسے جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق سنگسار کر دیا گیا۔

۱۔ صحیح بخاری جلد ۶ صـ ۲۵، صـ ۳۴-۳۸۔

۲۔ موطا امام مالک۔

(۵)

ماعزؓ بن مالک قبیلہ اسلم کا ایک یتیم لڑکا تھا۔ جس کی پرورش و تربیت حضرت ہزال نے کی تھی۔ یہاں وہ ایک آزاد کردہ لونڈی سے زنا کا ارتکاب کر بیٹھا ہزال کو جب پتہ چلا تو اُس نے ماعز کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ خود بارگاہِ سیدالکونین صلی اللہ علیہ وسلم میں جا کر اپنے جرم کا اقرار کرے۔ ہوسکتا ہے حضورؐ اُس کے لئے کوئی راہ نکال لیں، یا دعائے مغفرت فرما دیں۔

وہ مسجد نبوی میں جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی۔ یا رسول اللہؐ مجھے پاک کر دیجئے۔ مجھ سے زنا کا ارتکاب ہوا ہے۔" آپؐ نے اس کی بات سُن کر منہ دوسری طرف پھیر لیا اور فرمایا: "لوٹ جا۔ اور اللہ پاک سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ۔ اور توبہ کر۔" اس پر بھی وہ وہاں سے نہ گیا۔ اور سامنے آکر پھر وہی بات دہرائی۔ آپ نے بھی اپنا رُخ پھر دوسری طرف کر لیا۔ اُس نے تیسری بار پھر وہی بات کہی۔ لیکن حضورؐ نے اس بار بھی منہ پھیر لیا۔ حضرت ابوبکرؓ پاس بیٹھے تھے۔ انھوں نے ماعز کو خبردار کیا کہ دیکھ اگر چوتھی بار بھی تُو نے اپنے جُرم کا اقرار کر لیا، تو پھر جناب رسول اللہؐ تجھ پر رجم کی حد جاری کر دیں گے۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ ماعز پہلے حضرت ابوبکرؓ کے پاس گیا۔ انھوں نے اُسے توبہ کا مشورہ دیا، لیکن اس کی تسلی نہیں ہوئی تو پھر آں حضرتؐ کی خدمت میں آکر اعترافِ گناہ کیا۔

بہر حال حضرت ابوبکر صدیقؓ کے سمجھانے پر بھی وہ نہ مانا اور چوتھی بار پھر حضورؐ سے عرض کی۔ "یا رسول اللہ! مجھے پاک کر دیجیے۔ میں نے زنا کیا ہے۔"

جب اس نے چوتھی بار بھی اپنے جرم کا اقرار کر لیا تو حضورؐ اس کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: "شاید تو نے بوس و کنار کیا ہوگا۔ چھیڑ خانی کی ہوگی۔ یا پھر اس عورت پر نظرِ بد ڈالی ہوگی۔"

اُس نے کہا۔ "یا رسول اللہ نہیں، میں نے فعل بد کیا ہے۔"

رسول اللہؐ نے فرمایا۔ "تو کیا تو نے اس سے ہم بستری کی؟"

اُس نے کہا۔ "ہاں۔"

رسول اللہؐ: "کیا تو نے اس سے مباشرت کی؟"

ماعز : "ہاں! یا رسول اللہؐ"۔
رسول اللہؐ : "کیا تو نے اس سے مجامعت کی"۔
ماعز : "ہاں"۔
رسول اللہؐ : "کیا اس حد تک کہ تیری وہ چیز اُس کی اُس چیز میں غائب ہو گئی"؟
ماعز : یا رسول اللہ۔ ہاں۔
رسول اللہؐ :۔ کیا اس طرح جیسے سلائی سرمہ دانی میں اور رسی کنویں میں چلی جاتی ہے
ماعز : ہاں، اللہ کے نبیؐ۔ بالکل اسی طرح۔
رسول اللہؐ :۔ کیا تجھے علم بھی ہے کہ زنا کسے کہتے ہیں؟
ماعز :۔ یا رسول اللہؐ۔ ہاں۔ میں نے وہی کچھ اس کے ساتھ حرام طریقے سے کیا جو شوہر حلال طریقے سے اپنی بیوی کے ساتھ کرتا ہے۔
رسول اللہ : کیا تو شادی شدہ ہے؟
ماعز :۔ جی ہاں۔
رسول اللہ : کیا تو نے شراب تو نہیں پی رکھی۔
ماعز : نہیں اللہ کے نبیؐ۔

اس پر حضورؐ نے ایک آدمی کو اشارہ کیا، اُس نے اٹھ کر ماعز کا منہ سونگھا اور اس بات کی تصدیق کی کہ اُس نے شراب نہیں پی، پھر آپ نے محلہ والوں سے اُس کے ہوش و حواس کے متعلق دریافت فرمایا: تاکہ پتہ چلے کہ کہیں یہ شخص دیوانہ تو نہیں۔ محلہ والوں نے بتایا کہ انہوں نے ماعز کی عقل میں کوئی فتور نہیں پایا۔

آپ نے ہزال کو کہا کہ کاش تم نے اس کا پردہ رکھ لیا ہوتا۔ تو تمہارے حق میں بھی بہتر تھا۔

چونکہ ماعز نے چار بار بغیر کسی دباؤ کے اپنے جرم کا اقرار کر لیا۔ اِس لئے جناب رسالتمآب نے ماعز کو سنگسار کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ اُسے سنگسار کرنے کے لیے شہر سے باہر لے گئے۔ جب اس پر پتھر برسنے لگے تو وہ بھاگا۔ اور چلّانے لگا "لوگو! خدارا مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے چلو۔ مجھے میرے قبیلہ والوں نے دھوکا سے مروا دیا۔ مجھے غلط تسلی دی کہ رسول اللہؐ مجھے رجم نہیں کریں گے"۔ مگر لوگوں نے پتھر مار مار کر اُسے ہلاک کر دیا۔

جب صورت حال کی اطلاع حضورؐ کو ملی۔ تو آپ نے فرمایا:

کاش! تم نے اُسے چھوڑ دیا ہوتا، میرے پاس لے آئے ہوتے۔ شاید وہ سچے دل سے توبہ کرتا اور اللہ اس کی توبہ قبول فرما لیتا۔

(صحیح بخاری جلد ۴ صہ ۱۶ - ۳۳)
(صحیح مسلم۔ جلد ۲ صہ ۳۲۲ - ۳۲۶)
(سنن ابی داؤد۔ کتاب الحدود صہ ۱۴۸)

چند اشخاص ایک عورت کو جناب سید الکونین کی بارگاہ میں لائے جس سے زنا سرزد ہوا تھا۔ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کون ہے۔ جو اس عورت کے ساتھ زنا میں ملوث ہوا ہے۔؟"

حاضرین نے عرض کیا۔

یہ فعل بد اُس معذور اور اپاہج شخص نے کیا ہے۔ جو حضرت سعد بن عبادہ کے باغ میں رہتا ہے۔

حضورؐ نے اُس شخص کو بلا بھیجا۔ لوگ اُسے سہارا دے کر لائے۔

آپ نے حکم دیا۔ کہ کھجور کے خوشے لائے جائیں اور اُن سے اِسے مارا جائے چنانچہ اُسے کھجور کے خوشوں سے مارا گیا۔

کتاب الاموال میں ہے کہ سعد بن عبادہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک ضعیف، اپاہج اور بیمار شخص کو لے آئے اور عرض کیا۔

یا رسول اللہ۔ اس نے میری ایک لونڈی سے زنا کا ارتکاب کیا ہے۔

رسول اللہؐ نے فرمایا۔ اس کے لیے ایک شاخ لے لو، جس میں سو ڈنٹھل ہوں۔ اُس سے اِسے ایک مرتبہ مار دو۔

چنانچہ اُسے عثکال (کھجور کے خوشوں) سے مارا گیا۔

سزا میں یہ تخفیف محض اس لئے کی گئی کہ ملزم معذور اور لاغر تھا۔ اگر اُسے کوڑوں کی سزا دی جاتی، تو جانبر نہ ہو سکتا۔

(راوی۔ ابو امامہ حنیف)

(سنن نسائی جلد ۳ صـ ۴۶۸-۴۶۹)

(۷)

جہینہ کی ایک عورت سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئی اور عرض کیا۔

"یا رسول اللہ! مجھ سے زنا سرزد ہوا ہے۔ اور کہ میں حمل سے ہوں، جناب رسالتمآبؐ نے اُس کے سرپرست کو بلایا اور حکم دیا۔ کہ اس عورت کو اپنے پاس رکھو، اس کی اچھی طرح دیکھ بھال کرو، جب تک بچہ کی ولادت نہ ہو جائے جس وقت وضع حمل ہو جائے تو مجھے اطلاع دینا۔

چنانچہ جس وقت وضع حمل ہوا۔ تو اس عورت کے ولی نے آپ کو اطلاع دی۔ (چوں کہ عورت نے خود اقرار کیا تھا) اس لیے آپ نے حکم صادر فرمایا "اس عورت کے جسم پر اس کا کپڑا لپیٹ دو اور سنگسار کر دو"۔

چنانچہ اس عورت کے بدن پر کپڑا لپیٹ کر اُسے رجم کر دیا گیا۔ رجم کے بعد آپؐ نے اس کی نماز جنازہ ادا کرنے کا حکم دیا تو حضرت عمرؓ نے عرض کیا، یا رسول اللہ! آپ اس زانیہ کی نماز جنازہ ادا فرمائیں گے تو آپ نے فرمایا "مجھے قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں محمد کی جان ہے۔ اس نے ایسی توبہ کی ہے۔ کہ اگر وہ مدینہ کے ستر شہریوں پر تقسیم کی جائے۔ تو بھی بھاری ہوگی۔ اس سے بڑھ کر کوئی بات ہو سکتی ہے کہ وہ خود حاضر ہوئی اور خود ہی اعتراف کیا۔

(ترمذی شریف، بروایت: عمران بن حصین)

(سنن ابی داؤد جلد ۲)

(۸)

حضرت انسؓ بن مالک بیان کرتے ہیں کہ میں جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں حاضر تھا۔ جبکہ ایک شخص وہاں آیا اور عرض کیا۔

"یارسول اللہؐ! مجھ سے ایساگناہ سرزد ہُوا ہے جو قابلِ حد ہے۔"

مگر جناب رسالت مآبؐ اُس کی طرف بالکل متوجہ نہ ہوئے۔ اتنے میں نماز کا وقت ہوگیا، اُس شخص نے جناب رسالتمآبؐ کے ساتھ نماز ادا کی۔ جب آپ نماز سے فارغ ہوگئے۔ تو وہ شخص پھر آپؐ کے پاس آیا اور عرض کی "یا رسول اللہ! مجھ سے ایسا گناہ سرزد ہوا ہے جو قابلِ حد ہے۔ آپ اللہ کی کتاب کے مطابق مجھ پر حد جاری فرمائیں۔"

اس پر آپؐ نے فرمایا "کیا تو نے ہمارے ساتھ نماز ادا نہیں کی؟"

اُس نے کہا "جی۔ ادا کی ہے۔"

آپ نے فرمایا۔ بس، جاؤ، اللہ پاک نے تیرے گناہ کو معاف کر دیا ہے۔ اور حد بھی معاف فرما دی ہے۔

(صحیح بخاری جلد ۶، کتاب المحاربین ص۲۳)

(۹)

ایک بار بنو غامدیہ کی ایک عورت بارگاہِ سید الکونین میں آئی اور عرض کیا، یارسول اللہ! مجھ سے زنا سرزد ہوا ہے، مجھے پاک فرمایئے۔

آپ نے فرمایا "واپس چلی جاؤ"۔

وہ عورت واپس چلی گئی۔ لیکن دوسرے روز پھر جناب رسالتمآب کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہنے لگی کہ غالباً آپ مجھے بھی اُسی طرح واپس کرنا چاہتے ہیں جیسے آپ نے مالک کے بیٹے ماعز کو لوٹا دیا تھا۔ یارسول اللہؐ۔ میں نے زنا کا ارتکاب کیا ہے مجھے پاک فرمائیں۔ بخدا میں حمل سے ہوں۔

آپ نے پھر فرمایا "اے عورت لوٹ جاؤ" وہ اس وقت چلی تو گئی لیکن تیسرے روز پھر آ گئی۔ اور اپنی بات دُہرائی۔

آپ نے ارشاد فرمایا "اس وقت چلی جا۔ اور جب وضع حمل ہو جائے، پھر آجانا"

چنانچہ حضورؐ کے حکم کے مطابق وہ چلی گئی اور جب واپس آئی تو اکیلی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ نومولود بچہ بھی تھا۔ اُس نے عرض کیا۔

"حضورؐ! یہ میرا بچہ ہے۔ میں نے اسے جنم دیا ہے۔"

آپ نے فرمایا: اس وقت چلی جاؤ۔ بچے کو دودھ پلاؤ۔ جب یہ اناج کھانے کے قابل ہو جائے۔ تو پھر آجانا۔

وہ چلی گئی اور تھوڑی مدت کے بعد بارگاہِ نبوی میں حاضر ہوئی۔ بچہ بھی اُس کے ساتھ تھا۔ بچے کے ہاتھ میں کوئی کھانے کی چیز تھی جسے وہ کھا رہا تھا۔

یہ دیکھ کر، آپ نے حاضرین میں سے ایک شخص کو کہا کہ وہ بچے کو عورت سے لے لے اور اس کی کفالت کرے۔

اس کے بعد جناب سید الکونین نے حکم دیا۔ کہ ایک گڑھا کھود کر اس عورت کو سنگسار کیا جائے۔
چنانچہ آپ کے حکم کے مطابق اس عورت کے سینے تک گڑھا کھودا گیا اور اُسے سنگسار کر دیا گیا۔
سنگسار کرنے والوں میں حضرت خالد بن ولید بھی تھے۔ انہوں نے بھی اس عورت کے پتھر مارا۔ اس کے خون کے چھینٹے خالد کے رخسار پر پڑے تو انہوں نے اس عورت کو گالی دی۔
اس پر آپ نے خالد کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔
خالد! سوچ سمجھ کر بات کرو، قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضے میں محمدؐ کی جان ہے۔
اس عورت نے تو ایسی توبہ کی ہے اگر ایسی توبہ کوئی ناجائز ٹیکس وصول کرنے والا محصّل بھی کرے۔ تو اس کی بخشش ہو جائے۔
پھر آپ کے حکم سے اس کی نماز جنازہ ادا کی گئی اور اسے دفن کر دیا گیا۔

۱۔ صحیح مسلم جلد ۲ کتاب الحدود ص ۳۲۲ - ۳۲۶

۲۔ سنن ابی داؤد جلد ۲ کتاب الحدود ص ۱۵۲

(۱۰)

حضرت جابرؓ بیان کرتے ہیں:
ایک شخص نے کسی عورت سے زنا کیا، اور اپنے جرم کا اعتراف بھی کیا۔ جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے کوڑے لگانے کا حکم صادر فرمایا۔ لیکن جب آں حضورؐ کو پتہ چلا کہ مجرم شادی شدہ ہے تو آپ نے اپنا حکم بدل دیا۔ اور اُس شخص کو سنگسار کرنے کا حکم دیا۔
چنانچہ وہ سنگسار کر دیا گیا۔

(۱۱)

جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم سے لونڈی کے زنا کرنے کے متعلق احکامات دریافت کئے گئے۔ آپ نے فرمایا:
اگر کوئی لونڈی زنا کرائے۔ اور اس کا زنا ثابت ہو جائے۔ تو اس پر کوڑوں کی حد جاری کی جائے۔ لیکن زبان سے اُسے ملامت نہ کی جائے۔

اگر وہ حرام کاری سے باز نہ رہے اور دوبارہ زنا کی مرتکب ہو۔ تو اُسے پھر کوڑے مارے جائیں۔ لیکن اُسے بُرا بھلا نہ کہا جائے (اگر وہ پھر بھی باز نہ آئے) اور تیسری بار پھر زنا کرائے اور اس کا زنا ثابت بھی ہو جائے۔ تو اس بار بھی اُسے کوڑے مارے جائیں۔ لیکن اب کے سزا دینے کے بعد اُسے فروخت کر دیا جائے۔ چاہے اُس کی قیمت ایک معمولی بالوں کی رسی کے برابر ہی کیوں نہ پڑے۔

(صحیح بخاری جلد ۶ کتاب المحاربین ص ۶)

(۱۲)

جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

جن اشخاص کو تم قوم لوط کے عمل میں ملوث دیکھو۔ تو فاعل اور مفعول دونوں کو قتل کر دو۔

راوی۔ ابن عباس،

نیل الاوطار۔ بحوالہ اسلامی حدود۔

(۱۳)

جناب ختمی مرتبت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اگر مرد مرد سے ہم جنسی کا ارتکاب کرے تو دونوں زانی ہیں"۔

اور اگر عورت عورت سے بدفعلی میں ملوث پائی جائے تو دونوں زانیہ ہیں۔

(یعنی ان دونوں حالتوں میں حد جاری ہو گی۔)

بیہقی۔ شرح الزرقانی

بحوالہ۔ اسلامی حدود

(۱۴)

حضور سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

"جو شخص کسی جانور سے فعل بد کا ارتکاب کرے تو اُسے قتل کر دو۔ اور اس جانور کو بھی اس کے ساتھ قتل کر دو۔

ابن عباس جو اس حدیث کے راوی ہیں، سے سوال کیا گیا۔ کہ (بے زبان) جانور کا کیا قصور ہے؟ (جو اِسے بھی سزا دی جائے) تو ابنِ عباس نے جواب دیا۔ کہ حضورؐ نے جانور کے متعلق تو کچھ نہیں فرمایا۔ البتہ اتنا ضرور محسوس ہوا کہ حضور سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو مکروہ سمجھا ہے کہ ایسے جانور کا گوشت کھایا جائے۔ یا اُسے کام میں لایا جائے۔ کیوں کہ اس سے بدفعلی کا ارتکاب کیا گیا ہے۔

سنن ابوداؤد، ترمذی شریف، مشکوٰۃ جلد ۲ صہ ۱۶۶

(۱۵)

جناب علی حیدرؓ بیان کرتے ہیں کہ جنابِ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی لونڈی نے زنا کا ارتکاب کیا، آپ نے مجھے اُس پر حد لگانے کا حکم دیا۔ (جب میں حد جاری کرنے کو تیار ہوا) تو مجھے پتہ چلا کہ وہ بچہ جننے کے قریب ہے۔ میں نے سوچا کہ اگر اس کو حد لگاؤں تو وہ جان بر نہیں ہوگی (اس لئے حد نہیں لگائی) اور اس کا ذکر جناب رسالتمآبؐ سے کیا تو آپ نے فرمایا — تو نے اچھا کیا ہے۔ (جو حد جاری نہیں کی)

لیکن ابوداؤد میں ہے کہ حضور نے فرمایا۔ اس وقت اِسے چھوڑ دو، جب اس کا خون بند ہو جائے تو حد جاری کرنا۔

۱۔ صحیح مسلم۔
۲۔ مشکوٰۃ جلد ۲ صہ ۱۶۴

(۱۶)

عمرو بن حمزہ اسلمی۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر حضورؐ کے ہمراہ تھے پھر جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدینہ آئے۔ یہاں جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے بادیہ جانے کی اجازت طلب کی، آپ نے اجازت دے دی۔ تو وہ بادیہ کو روانہ ہوئے۔ جس وقت عمرو ضبوعہ کے مقام پر پہنچے جو مدینہ سے مکہ کی راہ پر ایک منزل پر واقع ہے۔ وہاں انھیں ایک حسین و جمیل عرب لونڈی نظر پڑی۔ شیطان نے انھیں اس حد تک بہکایا کہ وہ اُس سے زنا کر بیٹھے۔ اس وقت تک اُن کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ اپنے کئے پر سخت نادم ہوئے تو واپس جناب رسالتمآبؐ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے ـــ (اور صورت حال سے آں حضورؐ کو آگاہ کیا) آپ نے عمرو بن حمزہ پر حد جاری فرمائی۔

آپؐ نے ایک شخص کو حکم دیا کہ انھیں جُدا جُدا کرکے کوڑے لگائے۔ اور کوئی ایسا کوڑا استعمال کرے جو استعمال شدہ اور نرم ہو۔

(طبقات ابن سعد، جلد ۳، ص ۱۷)

(۱۷)

جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک خاتون نماز کے ارادہ سے آرہی تھی کہ راستہ میں اُسے ایک شخص نے پکڑ لیا، زبردستی اُس سے زنا کیا۔ اور فرار ہوگیا۔ کیوں کہ عورت شور مچا رہی تھی۔ اتفاقاً (اُسی لمحے) ایک دوسرا شخص وہیں سے گذرا، عورت نے سمجھا کہ یہی شخص مجرم ہے۔ تو اُسی کے متعلق کہنے لگی کہ اِسی نے میرے ساتھ بدفعلی کی ہے۔ اُسی طرف سے مہاجرین کے چند آدمی گذر رہے تھے۔ عورت کے شور مچانے پر انہوں نے اِسی شخص کو پکڑ لیا۔ (حالاں کہ یہ شخص حقیقت میں بے قصور تھا) عورت نے بھی کہا کہ یہی شخص ہے جس نے میری آبرو ریزی کی ہے۔ اس لئے وہ اسے لے کر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

اصل مجرم کو جب پتہ چلا کہ ایک بے گناہ شخص پر حد جاری ہوگی۔ تو وہ خود بارگاہِ رسالتؐ میں پیش ہوگیا۔ اور عرض کی۔

یا رسول اللہ! یہ شخص بے قصور ہے۔ جرم کا ارتکاب میں نے کیا ہے۔

جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت سے فرمایا۔

"جاؤ۔ اللہ نے تیری بخشش فرمادی۔" پہلے شخص (بے قصور) کے متعلق کلمات خیر فرمائے۔ اور مجرم کے بارے میں حکم دیا کہ اُسے رجم کردو۔ چنانچہ اُسے سنگسار کردیا گیا۔

اس کے بعد آپ نے فرمایا۔ "اس شخص نے ایسی توبہ کی ہے۔ کہ اگر اہل مدینہ ایسی توبہ کرلیتے تو قبول کرلی جاتی۔"

۱۔ مشکوٰۃ جلد ۲ : ص ۳۶

۲۔ ابوداؤد جلد ۴ کتاب الحدود

(۱۸)

لجلاج رضؓ بیان کرتے ہیں:

"میں بازار میں بیٹھا اپنے کام میں مصروف تھا کہ اتنے میں ایک عورت اپنے بچہ کو سینے سے لگائے وہاں سے گذری۔ لوگ اُس کے پیچھے ہولئے۔ میں بھی (دیکھا دیکھی) اُن کے ساتھ ہولیا۔ وہ عورت (اور اس کے ساتھ لوگ) جب جنابِ سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم

کی بارگاہ میں پہنچی۔ تو آپ نے اس عورت سے دریافت فرمایا" اس بچے کا باپ کون ہے؟ وہ عورت تو خاموش رہی۔ لیکن اسی کے پاس سے ایک نوجوان نے آگے بڑھ کر کہا،

"یا رسول اللہؐ! اس (بچے) کا باپ میں ہوں"۔

اس پر جناب رسالتمآبؐ اس عورت کی طرف مخاطب ہوئے اور پھر پوچھا" بتاؤ۔ اس بچے کا باپ کون ہے"؟ عورت تو چپ چاپ رہی۔ لیکن اسی نوجوان نے پھر کہا:" یا رسول اللہؐ! میں ہوں اس کا باپ"۔

اس پر جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے (تحقیق کی خاطر) حاضرین سے پوچھا کہ کیا یہ شخص مجنون تو نہیں۔؟ سب نے عرض کیا، کہ نہیں۔ یہ تو بالکل بھلا چنگا ہے۔ اب جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص سے دریافت کیا، "کیا تو شادی شدہ ہے"؟ تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ چنانچہ آپ نے فیصلہ صادر فرمایا کہ اسے رجم کیا جائے۔ اور اس شخص کو آپ کے حکم کے مطابق سنگسار کر دیا گیا۔

(۱) سنن ابی داؤد جلد ۲ - کتاب الحدود

(۲) مسند امام احمد

قذف، لعان اور ظہار

ارشادِ ربانی:

(۱)

اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگائیں اور پھر (ثبوت میں) چار گواہ نہ لا سکیں، تو انھیں اَسی (۸۰) تازیانوں کی سزا دو، اور کبھی ان کی گواہی قبول نہ کرو۔ ایسے ہی لوگ ہیں، جو کہ فاسق ہیں۔ ہاں جن لوگوں نے اس بدعملی کے بعد توبہ کر لی اور اپنی زندگی سنوار لی تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ بخشنے والا۔ رحمت والا ہے۔ (سورۂ نور: ۵،۶)

(۲)

اور جو لوگ اپنی بیویوں پر زنا کا عیب لگائیں اور خود ان کے سوا، اُن کا کوئی گواہ نہ ہو، تو ایسے مدعیوں میں سے ہر ایک کی گواہی یہ ہو گی کہ پہلے چار مرتبہ اللہ تعالیٰ کو گواہ ٹھہرا کر قسم کھائے کہ وہ ضرور اپنے بیان میں سچا ہے، پھر پانچویں مرتبہ کہے: اگر میں جھوٹا ہوں، تو مجھ پر اللہ کی پھٹکار، اور اگر (شوہر کے قسم کھانے کے بعد) عورت بھی چار مرتبہ اللہ کو گواہ ٹھہرا کر قسم کھائے کہ یہ آدمی اپنے بیان میں سراسر جھوٹا ہے اور پانچویں مرتبہ کہہ دے: اگر یہ اپنے بیان میں سچا ہے تو مجھ پہ اللہ ہی کا غضب پڑے (اس صورت میں) عورت کے سر سے سزا ٹل سکتی ہے۔

(سورۂ نور ۷ : ۱۰)

جنابِ سید الکونین کے فیصلے

۱ - قذف

(ا)

جنابِ ختمی مرتبت، سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم ۵ھ میں غزوۂ بنی المصطلق میں تشریف لے گئے۔ آپ کے ساتھ اُمّ المومنین سیدہ عائشہ رضی صدیقہ کائنات بھی تھیں۔

غزوہ سے فراغت کے بعد آپ نے مدینہ طیبہ کی طرف مراجعت فرمائی۔ واپسی میں ایک روز یہ واقعہ پیش آیا۔ قافلہ نے ایک منزل پر پڑاؤ کیا۔ آخر شب میں کوچ کا اعلان کیا گیا تو اس وقت جنابِ صدیقہ رضی قضائے حاجت کے لیے جنگل کی طرف گئی ہوئی تھیں۔ اتفاقاً اُن کا ہار ٹوٹ کر گر گیا۔ اس کی تلاش میں جنابِ صدیقہ رضی کو دیر ہو گئی۔ قافلہ والوں نے جنابِ صدیقہ رضی کا خالی ہودہ اونٹ پر رکھ لیا تھا۔ اور وہ روانہ ہو گئے تھے۔ ام المومنین جب واپس ہوئیں تو قافلہ کو نہ پایا۔ انہوں نے کمال دانش مندی، جرأت اور استقلال سے کام لیا۔ قافلہ کے پیچھے اِدھر اُدھر دوڑنے کی سعی نہیں کی بلکہ چادر لپیٹ کر بیٹھ رہیں، ابھی رات باقی تھی، نیند کا غلبہ ہوا۔ تو آنکھ لگ گئی۔

حضرت صفوان رضی بن معطل کے ذمہ حضور صلعم نے یہ فرض عائد کیا تھا کہ قافلہ کے پیچھے رہا کریں تاکہ کوئی چیز اگر رہ جاتے تو اُسے محفوظ کر لیں۔ صبح جب وہ پڑاؤ کے مقام پر پہنچے۔ تو کسی کو سوتے ہوئے پایا۔ قریب آئے تو انہوں نے جنابِ صدیقہ رضی کو پہچان لیا۔ کیوں کہ آیاتِ حجاب کے نزول سے قبل انہوں نے ام المومنین رضی کو دیکھا ہوا تھا۔ انتہائی افسوس کے عالم میں اُن کی زبان سے "اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا الیہ راجعون" نکلا یہ آواز جب ام المومنین رضی کے کان میں پڑی۔ تو آنکھ کھل گئی۔ جلدی سے چہرہ ڈھانپ لیا صفوان رضی اُن کے قریب اُونٹ لے آئے اور خود دور کھڑے ہو گئے۔ جنابِ صدیقہ رضی اونٹ پر سوار ہو گئیں۔ تو صفوان رضی اُونٹ کی مہار پکڑ کر چل پڑے اور قافلہ کے ساتھ آن ملے۔

یہ صورتِ حال دیکھ کر راس المنافقین عبد اللہ بن ابی کو موقعہ ہاتھ آ گیا۔ اور لگا واہی تباہی بکنے۔ بہتان تراشی شروع کر دی، بس پھر کیا تھا۔ بھولے بھالے مسلمان بھی اس کے داؤ میں آ گئے۔ ان میں حضرت حسان رضی بن ثابت، مسطح اور ایک خاتون حمنہ بنت جحش بھی شامل ہو گئے اور باتیں بنانے لگے۔

اس منافق کے بہتان کا جب چرچا ہوا۔ تو جنابِ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کو دلی صدمہ پہنچا۔ جنابِ صدیقہ رضی بھی انتہائی رنجیدہ تھیں اور عام مسلمان بھی سخت رنج و محن میں مبتلا تھے۔ ایک مہینہ تک یہ سوگوار کیفیت برقرار رہی۔ آخر اللہ پاک نے حضرت ام المومنین جنابِ سیدہ عائشہ رضی کی براءت میں یہ آیات نازل فرمائیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ جَآءُوْ ..... لَھُم مَّغْفِرَۃٌ وَّ رِزْقٌ کَرِیْمٌ ۝

(سورۂ نور ۱۱ - ۲۶)

جنابِ رسالتمآب کو تسکینِ خاطر ہوئی۔ حضرتِ صدیقہ کی خوشی کا عجیب عالم تھا۔ کیوں کہ خالقِ ارض و سما نے خود قرآنی آیات کے ذریعے

جناب صدیقہؓ کی برأت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رہتی دنیا تک ثبت فرما دی۔

ان آیات میں اس مہم میں بہتان طرازی میں شریک ہونے والوں کی بھی مذمت کی گئی۔ اور قرآنی ضابطۂ قانون

اور جو لوگ عیب لگاتے ہیں حفاظت والیوں کو، پھر نہ لائیں
چار مرد شاہد۔ تو مارو اُن کو اسّی دُرّے۔ اور نہ مانو ان کی کوئی
گواہی۔ اور وہ لوگ ہی نافرمان ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (سورۂ نور)

کے مطابق تہمت تراشنے والوں سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ چار شاہد پیش کریں۔ یہ تو محض بے بنیاد تہمت تھی۔ بے سروپا بہتان تھا۔ گواہ کہاں سے لاتے، چوں کہ وہ گواہ نہ لا سکے۔ اس لیے آپؐ نے اُن پر حدِ قذف جاری فرمائی۔

اور حکمِ الٰہی کے مطابق ہر ملزم کو اسّی تازیانے لگائے گئے۔

جن تین مسلمانوں پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدِ قذف جاری فرمائی ان کے نام یہ ہیں:۔

حسّان بن ثابت رضؓ۔ حمنہ بنت جحش اور مسطح بن اثاثہ غلام صدیق اکبرؓ۔

حضرت عمر فاروقؓ کا فرمان ہے کہ:

جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی پر جو اس فتنہ کا اصل اور بانی تھا۔ دوہری حد جاری فرمائی۔

مومنین رضؓ نے اللہ کے حضور توبہ کر لی۔

لیکن منافقین۔ اپنے فتنہ و دجل میں مزید غرق ہوتے چلے گئے۔

۱۔ تفسیر تفہیم القرآن : سورۂ نور،
۲۔ تفسیر معارف القرآن : تفسیر سورۂ نور جلد ۶۔
۳۔ سیرۃ ابن ہشام جلد ۲ غزوہ بنی المصطلق۔ واقعہ افک
۴۔ تاریخ طبری : سیرت النبی جلد اوّل۔ غزوہ بنی المصطلق۔

(۲)

بنو بکر بن لیث کا ایک شخص جناب سید الکونینؐ کی بارگاہ میں حاضر ہوا۔ اُس نے جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور چار مرتبہ اقرار کیا کہ اُس سے زنا سرزد ہوا ہے۔ اُس نے حضورؐ کو یہ بھی بتایا کہ وہ غیر شادی شدہ ہے۔

چنانچہ آپؐ نے اس پر حد جاری کرنے کا حکم صادر فرمایا۔

اُسے سو کوڑے مارے گئے۔

پھر اُس شخص نے جس عورت کے ساتھ ملوث ہونا بیان کیا تھا۔ اُس عورت پر اُس کے گواہ اس شخص سے طلب کئے گئے۔

(لیکن گواہ کوئی بھی نہیں تھا) (وہ عورت بُلائی گئی) تو وہ کہنے لگی:

"یا رسول اللہ - خدا کی قسم - یہ شخص سراسر جھوٹا ہے (اس نے مجھ پر تہمت باندھی ہے)
چنانچہ اس شخص پر جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدِ قذف بھی جاری فرمائی

راوی - ابنِ عباس - سنن ابی داؤد - جلد ۴
مشکوٰۃ جلد ۲ صہ ۱۶۶

(ب) لِعان

(۱)

حضرت ابن عباس بیان فرماتے ہیں - کہ جب قرآن مجید میں قذف کی حد سے متعلق احکام کی آیات :

"اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگائیں اور (ثبوت میں) چار گواہ نہ لا سکیں،
تو انھیں اسّی (۸۰) تازیانوں کی سزا دو - اور کبھی ان کی گواہی قبول نہ کرو ایسے ہی
لوگ ہیں جو پکے فاسق ہیں" (النور : ۵)

کا نزول ہوا - تو انصار کے قبیلہ بنی خزرج کے رئیس سعد بن عبادہ نے جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا -

"کیا یہ آیات اسی طرح نازل ہوئی ہیں"

اُن کی زبانی اس قسم کی بات سن کر حضور دم بخود ہو گئے - اور انصار سے فرمایا :

"اے گروہ انصار! سن رہے ہو، اپنے سردار کی باتیں!"

تو حاضرین نے عرض کیا، یا رسول اللہؐ! آپ سعد کو ملامت نہ فرمائیں شدید غیرت کی وجہ سے اُن کے منہ سے یہ الفاظ نکل گئے ہیں - اس پر سعد بن عبادہ نے خود عرض کیا :-

یا رسول اللہؐ - میرے ماں باپ آپ پر قربان - میرا ایمان ہے کہ یہ آیات حق ہیں - اللہ تعالے نے نازل فرمائی ہیں - مگر جو بات پریشان کن ہے وہ یہ کہ اگر میں اپنی بے حیا بیوی کو کسی غیر مرد کے ساتھ ملوث دیکھوں، تو کیا میں حق پر نہیں ہوں گا - اگر اسے قتل کر دوں - تو کیا میرے لئے ضروری ہو گا کہ میں چار گواہ ڈھونڈتا پھروں، اور جب تک انھیں اکٹھا کر دوں، ملزم اپنا مطلب پورا کر کے فرار ہو جائے -

ان آیات کے نزول اور سعد بن عبادہ کی اس گفتگو پر تھوڑا ہی وقت گذرا تھا کہ ہلال بن اُمیہ - کو بعینہٖ یہی واقعہ پیش آ گیا - عشا کے وقت جب وہ اپنی زمینوں سے واپس ہوئے - تو انہوں نے ایک فرد کو اپنی بیوی پر پایا ان کی باتیں بھی سُنیں - لیکن کوئی قدم نہیں اُٹھایا - صبح دم ہلال جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور پورا قصہ من وعن حضورؐ کے گوش گذار کیا - جناب رسالتمآب یہ واقعہ سُن کر سخت رنجیدہ ہوئے - اتنے میں انصار کے دوسرے افراد بھی وہاں آن پہنچے اور آپس میں کہنے لگے -

"ہمارے سردار سعد بن عبادہ نے جو بات کہی تھی، ہم اسی ابتلا میں پڑ گئے - ہلال کے بس کا روگ نہیں کہ چار گواہ اکٹھے کر سکے اس لیے

جناب رسالتمآبؐ احکام الٰہی کے مطابق اسے حدِ قذف بھی لگائیں اور ساتھ ہی ہمیشہ کے لئے مردود الشہادت بھی قرار دیں گے۔
مگر ہلال نے کہا۔ بخدا مجھے اللہ تعالےٰ کی ذات پہ کامل یقین ہے کہ وہ مجھے رسوا نہیں کرے گا۔
جناب رسالتمآبؐ نے ہلال کا واقعہ سن کر فرمایا۔

اے ہلال! قرآنی حکم کے مطابق چار گواہ پیش کرو، ورنہ تمہاری پیٹھ پر اسی تازیانے لگائے جائیں گے۔
ہلال بن امیہ نے عرض کیا۔ یارسول اللہ، قسم ہے اس ذات پاک کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے۔ میں اپنے دعوے میں حق پر ہوں۔ میرا ایمان ہے کہ ضرور اللہ تعالےٰ کوئی ایسی سبیل پیدا فرمائیں گے۔ جو میری پیٹھ کو حد قذف سے نجات دلائے گی۔

دوران گفتگو حضرت جبریلؑ آئے یہ آیات ؛

اور جو لوگ اپنی بیویوں پر زنا کا عیب لگائیں اور خود اُن کے سوا، اُن کا کوئی گواہ نہ ہو، ایسے مدعیوں میں سے ہر ایک کی گواہی یہ ہوگی کہ پہلے چار مرتبہ اللہ تعالیٰ کو گواہ ٹھہرا کر قسم کھائے کہ وہ ضرور اپنے بیان میں سچا ہے۔ پھر پانچویں مرتبہ کہے؛ اگر میں جھوٹا ہوں تو مجھ پر اللہ کی پھٹکار۔

اور اگر (شوہر کے قسم کھانے کے بعد) عورت بھی چار مرتبہ اللہ کو گواہ ٹھہرا کر قسم کھائے کہ یہ آدمی سراسر اپنے بیان میں جھوٹا ہے اور پانچویں مرتبہ کہہ دے۔
اگر یہ اپنے بیان میں سچا ہے تو مجھ پر اللہ ہی کا غضب پڑے (اس صورت میں) عورت کے سر سے سزا ٹل سکتی ہے۔ (سورۂ نور ۷: ۱۰)

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ جب آیات لعان نازل ہوئیں تو جناب رسالتمآبؐ نے ہلال بن امیہ کو بلا کر بشارت دی کہ اللہ تعالےٰ نے تمہارے لیے راہ پیدا فرما دی ہلال نے عرض کیا؛ یارسول اللہؐ، میں تو اللہ پاک سے ایسی ہی آس لگائے ہوئے تھا۔
اس پر جناب رسول اللہؐ نے ہلال کی بیوی کو بھی بلا بھیجا۔ جب وہ آن پہنچی۔ تو حضورؐ نے اس دعویٰ سے متعلق اس سے باز پرس کی، جس پر وہ کہنے لگی "یارسول اللہؐ! ہلال نے مجھ پر بہتان باندھا ہے"۔
جناب رسالتمآبؐ نے فرمایا؛ اللہ تعالےٰ علیم و خبیر ہے۔ اُسے علم ہے کہ تم میں کا کوئی ایک جھوٹا ہے۔ کیا تم میں کوئی ہے جو (خدا کا خوف کرتے ہوئے) توبہ کرے اور حق بات ظاہر کردے۔"

اس پر ہلال بن امیہ نے عرض کیا۔ یارسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان میں نے حق بات کہی ہے۔ اور جو کچھ کہا ہے۔ سچ کہا ہے۔

اس پر جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم صادر فرمایا کہ دونوں میاں بیوی سے قرآنی احکام کے مطابق لعان کرایا جائے۔ اس لئے آپؐ نے پہلے ہلال کو حکم دیا۔ کہ وہ چار مرتبہ اُن الفاظ سے شہادت دے جو کلام پاک میں مذکور ہیں؛ چنانچہ ہلال نے چار مرتبہ

شہادت دی کہ :

"میں اللہ تعالیٰ کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں کہ میں اپنے دعوے میں سچا ہوں۔"

جب وہ پانچویں شہادت کے لئے تیار ہوا تو حضورؐ نے تاکیداً ہلال سے فرمایا:۔

"دیکھو ہلال : خدا کا خوف کرو، دنیاوی سزا آخرت کے عذاب سے کہیں ہلکی ہے۔ اور عذاب الٰہی۔ لوگوں کی دی ہوئی سزا سے کہیں زیادہ سخت ہے۔ یہ پانچویں شہادت آخری شہادت ہے۔ اسی پر فیصلہ کا دار و مدار ہے۔"

اس پر ہلال بن امیہ نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ مجھے کامل یقین ہے کہ اللہ پاک مجھے اس شہادت پر آخرت کا عذاب نہیں دیں گے ، اور اُس نے پانچویں شہادت دی۔

"اگر میں جھوٹ بولتا ہوں۔ تو مجھ پر اللہ کی لعنت ہو۔"

اس کے بعد ہلال بن امیہ کی بیوی آگے بڑھی، اس نے بھی چار بار شہادت دی اور قسمیں کھائیں اور ہر بار کہا کہ میرا خاوند جھوٹا ہے۔ جب پانچویں شہادت دینے لگی تو آپ نے اُسے روک دیا۔ اور فرمایا: "خدا سے ڈرو، یہ پانچویں شہادت آخری شہادت ہے۔ یاد رکھو اللہ کا عذاب اس دنیاوی سزا (زنا کی حد شرعی) سے زیادہ المناک ہے۔"

اُس نے جب یہ سُنا۔ تو وہ تھوڑی دیر رُکی۔ جھجکی۔ مگر پھر فوراً کہہ اُٹھی:

واللہ۔ میں اپنی قوم کو ہرگز رسوا نہیں کروں گی۔ اور پانچویں شہادت بھی دے دی۔

"کہ اگر میرا شوہر سچا ہے۔ تو اللہ کی پھٹکار مجھ پر پڑے۔"

جب ملاعنت کی کارروائی مکمل ہو گئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میاں بیوی میں تفریق فرما دی اور حکم دیا کہ۔

۱۔ اس حمل سے جو بچہ پیدا ہوگا۔ وہ ماں سے منسوب کیا جائے گا

۲۔ باپ کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔

۳۔ کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ بچے کو مطعون کرے۔ یا اس کی ماں کو ملامت کرے، اور اگر کوئی شخص اس کے باوجود الزام تراشی کا مرتکب ہوا، تو —— اس پر حدِ قذف جاری ہو گی۔

۴۔ عورت کو یہ حق حاصل نہیں ہو گا کہ وہ ہلال سے زمانہ عدت کے لئے نفقہ اور سکونت کا مطالبہ کرے۔ کیوں کہ یہ طلاق اور وفات کے بغیر اپنے خاوند سے الگ کی جا رہی ہے۔

پھر آپ نے حاضرین کو مخاطب کر کے فرمایا:۔

اس عورت کے ہاں جب بچہ کی ولادت ہو تو دیکھو وہ کس پر گیا ہے؟ وہ ہلال پر ہو تو سمجھو ہلال کا ہے۔ اور اگر دوسری صورت پر ہو تو سمجھ لو کہ یہ بچہ اُس شخص کا ہے۔ جس کے ساتھ عورت متہم کی گئی ہے۔

وضع حمل کے بعد جب دیکھا گیا تو بچہ ہلال کی صورت پر نہیں تھا۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کی اطلاع دی گئی تو آپؐ نے فرمایا:

اگر خدا کی کتاب پہلے فیصلہ نہ کر چکی ہوتی۔ تو میں اس پر ضرور حد جاری کرتا۔

۱۔ معارف القرآن۔ تفسیر سورۂ نور، صحیح بخاری: جلد ۶۔ کتاب المحاربین صہ ۴۰، ۴۴
جلد ۷۔ کتاب۔ صہ ۹۰۸ - ۹۰۹

۲۔ تفہیم القرآن: تفسیر سورۂ نور صحیح مسلم: جلد ۴: صہ ۱۳۳ - ۱۳۶
سنن نسائی:۔

(۲)

ایک شخص اور اس کی بیوی کا مقدمہ بارگاہِ سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم میں پیش کیا گیا۔ (خاوند نے بیوی پر الزام لگایا کہ وہ دوسرے شخص سے ملوث ہوئی ہے) ان کے درمیان لعان کرایا گیا۔

عورت حمل سے تھی، لیکن مرد کو اصرار تھا کہ یہ حمل اُس کا نہیں (ملاعنت کے بعد) جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے درمیان تفریق کرا دی اور فیصلہ دیا۔
کہ بچہ صرف ماں کا ہوگا۔

راوی عبد اللہ بن عمرؓ / موطا امام مالک صہ ۴۰۸

(۳)

ابن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ اسی طرح کا ایک اور معاملہ حضورؐ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ چنانچہ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے لعان کا حکم دیا۔ ملاعنت کے بعد حضورؐ نے فرمایا:

"تمہارا حساب اللہ پاک کے ذمے ہے۔ تم میں کا ایک بہر حال جھوٹا ہے۔" پھر آپ نے مرد کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

"یہ (عورت) اب تیرے حق میں نہیں رہی۔ اب تیرا اس کے ساتھ تعلق باقی نہیں رہا۔ تم اس (عورت) کے خلاف نہ تو کسی قسم کی دست درازی کر سکتے ہو، اور نہ کسی منتقمانہ کارروائی کرنے کے مجاز ہو۔"

اس پر اُس شخص نے حضورؐ کی خدمت میں عرض کیا۔

"یا رسول اللہ! میرے مال (جو اسے میں نے دیا ہے) کا کیا بنے گا؟"

جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تمھیں مال واپس لینے کا کوئی حق نہیں۔ اگر تو اپنے دعوے میں سچا ہے۔ تو بھی (تمہارا) مال اس لذت کا بدل ہے جو تو نے حلال کر کے اُس سے حاصل کی۔

اور اگر تمہارا دعویٰ جھوٹا ہے۔ تو بھی (جس طرح اب وہ عورت تم سے دور ہو گئی ہے) اسی طرح مال بھی تیرے حق ملکیت سے دور چلا گیا۔

(۴)

جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت لعان پر کلام کرتے ہوئے فرمایا:۔

" جو عورت کسی خاندان میں ایسا بچہ لے آئے جو اس خاندان کا نہیں (یعنی عمل حرام) تو وہ اللہ کی رحمت سے دور ہے۔ وہ ہرگز جنت میں داخل نہیں ہوگی۔

اور جو مرد اپنے بچے کے نسب سے انکار کرے، حالاں کہ بچہ اس کو دیکھ رہا ہو تو اللہ قیامت کے دن اپنے اور اس کے درمیان حجاب حائل کر دے گا۔ اور اُسے تمام اگلی اور پچھلی مخلوق کے سامنے رسوا کرے گا۔

راوی :- ابو ہریرہ رضؓ / سنن نسائی :-

(۵)

حضرت ابنِ عباس فرماتے ہیں :-

جب زنا کی تہمت لگانے والے پر حدِ قذف قائم کرنے کے احکام نازل ہوئے۔ تو جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر پر تشریف لاکر یہ احکام لوگوں کو سنائے۔ حاضرین میں عاصم بن عدی بھی تھے۔ وہ کھڑے ہو گئے اور عرض کیا :

یا رسول اللہؐ! میری جان آپ پر قربان ہو۔ اگر ہم میں سے کوئی شخص دیکھتا ہے کہ اس کی عورت کسی غیر مرد سے ملوث ہے۔ تو اگر وہ چشم دید واقعہ کو بیان کرتا ہے۔ تو حدِ قذف کا مستحق بنتا ہے۔ اور مردود الشہادت فاسق قرار دیا جاتا ہے لیکن اگر وہ گواہوں کی تلاش میں نکلتا ہے۔ تو جب تک وہ گواہ اکٹھے کرے۔ وہ شخص اپنی حاجت پوری کر کے فرار ہو چکا ہوگا۔

عاصم نے وہی سوال حضورؐ کی خدمت میں پیش کیا۔ جو اس سے قبل سعد بن عبادہ کر چکے تھے۔

چند روز کے بعد اس کے اپنے خاندان میں ایسا واقعہ رونما ہوا، عاصم کے چچازاد بھائی عویمر عجلانی کی بیوی، خولہ، جو اس کی چچازاد بہن بھی تھی۔ ایک روز شریک بنؓ سحماء کے ساتھ مبتلا پائی گئی۔ یہ شریک بھی عاصم کا چچازاد بھائی تھا۔ عویمر عجلانی نے یہ واقعہ اپنے چچازاد بھائی عاصم سے بیان کیا اور اُسے کہا کہ تم میرے واسطے اس مسئلہ کا حل جنابِ رسالتمآبؐ سے پوچھو۔ عاصم نے " اِنّا للہِ واِنّا الیہ راجعون" پڑھا۔ اور رسالتمآبؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا۔

یا رسول اللہؐ! میں نے جو سوال آپ کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ افسوس ہے کہ میں خود اس میں مبتلا ہو گیا۔ میرے ہی اہلِ بیت میں ایک ایسا واقعہ پیش آ گیا ہے۔ حضورؐ نے عاصم کے اس سوال کو ناپسند فرمایا۔ اور بُرا منایا۔ چنانچہ جب وہ واپس گھر گیا۔ تو عویمر کو کہا۔ تم نے میرے ساتھ اچھائی نہیں کی۔

عویمر نے کہا، بخدا! میں خود حضورؐ کی خدمت میں جا کر عرض حال کروں گا چنانچہ وہ خود حاضر ہوا اور عرض کیا۔

یا رسول اللہؐ! اگر کوئی شخص اپنی بیوی کے ساتھ کسی غیر مرد کو ملوث دیکھے۔ تو کیا اس کے لیے جائز ہے کہ وہ اس کو قتل کر دے اور اس کے بدلہ میں خود مارا جائے۔ بھلا۔ وہ اس کے علاوہ کرے تو کیا کرے اور اس کے بعد صورت حال حضورؐ کے سامنے بیان کی۔

(تمام واقعہ سن کر)

جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ (پریشان مت ہو) اللہ تعالٰے نے تمہارے اور تمہاری بیوی کے معاملے میں حکم نازل فرمایا ہے۔ جاؤ۔ اور بیوی کو لے آؤ۔

چنانچہ عویمر عجلانی اور اس کی بیوی خولہ، دونوں مسجد میں پہنچے۔ حضورؐ نے حکم دیا کہ وہ ملاعنت کریں لیکن ملاعنت کرنے سے پہلے تین بار آں کو تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا۔

" اللہ پاک علیم و خبیر ہے۔ وہ خوب جانتا ہے کہ تم میں کا ایک ضرور جھوٹا ہے۔ پھر کیا تم میں سے کوئی (خدا کا خوف کرتے ہوئے) توبہ کرنے کو تیار ہے؟"

حضورؐ کے انتباہ کے باوجود کوئی بھی توبہ کرنے کے لیے تیار نہ ہوا تو حضور سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ وہ ملاعنت کریں۔

جب دونوں میاں بیوی ـ پانچوں بار قسمیں اٹھا چکے۔ اور کسی نے بھی اپنے دعوے سے رجوع نہیں کیا۔ تو عویمر نے حضورؐ کی خدمت میں عرض کیا۔ یا رسول اللہ! اب اگر میں اس عورت کو اپنے پاس رکھتا ہوں تو (اس کا مطلب ہے کہ) میں جھوٹا ہوں (اور میں نے بہتان باندھا ہے) یہ کہہ کر۔ عویمر نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں۔ حالاں کہ ابھی حضورؐ نے انھیں ایسا کرنے کا حکم نہیں دیا تھا۔ بہر حال آپ نے ان طلاقوں کو نافذ فرما دیا۔ اور فیصلہ دیا کہ:

" یہ تفریق ہر ایسے جوڑے کے معاملے میں ہے جو باہم لعان کرے"

یہ سنت قائم ہو گئی کہ لعان کرنے والے میاں بیوی کو جدا کر دیا جائے۔ اور انھیں یکجا نہ رہنے دیا جائے۔

عویمر کی بیوی حمل سے تھی۔ لیکن عویمر مُصر تھا۔ کہ یہ حمل میرا نہیں اس لئے آپ نے فیصلہ صادر فرمایا:۔

۱۔ بچہ ماں کی طرف منسوب ہوگا۔

۲۔ نیز بچہ ماں سے میراث پانے کا حق دار ہوگا۔

اور ۳۔ ماں بھی اس سے میراث پانے کی مستحق ہوگی۔

صحیح بخاری : ۱۔ جلد ۲ : کتاب الطلاق ص ۹۰۹ - ۹۱۶
۲۔ جلد ۲ کتاب المحاربین ص ۴۵

صحیح مسلم : جلد ۲ ص ۱۲۶ - ۱۳۰

سنن نسائی :۔ معارف القرآن تفسیر سورۂ نور

موطا امام مالک ص ۴۰۷

(۶)

ایک شخص جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور عرض کیا۔

یا رسول اللہ! میری ایک بیوی ہے اور وہ مجھے حد سے زیادہ محبوب ہے۔ مگر اس کا حال کچھ ایسا ہے کہ کسی ہاتھ لگانے والے کا ہاتھ نہیں جھٹکتی۔

جناب رسالتمآبؐ نے فرمایا۔ تو اُسے طلاق دے دے

اس پر اُس شخص نے کہا۔ حضورؐ! مگر میں تو اس کے بغیر رہ بھی نہیں سکتا۔
حضورؐ نے فرمایا۔ تو اُسے اپنے پاس رہنے دے۔
چونکہ یہ معاملہ مبہم تھا۔ اس لئے جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے مدعی سے اس بات کا مطالبہ نہیں کیا کہ جو بات اُس نے اشارے کنایے میں کی ہے، اس کی تشریح کرے۔
اس لئے آپ نے اُسے رخصت فرما دیا اور لعان کا حکم نہیں دیا۔

(سنن نسائی)

(۷)

ایک اعرابی جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور عرض کیا۔
یا رسول اللہؐ! میری بیوی کے ایک لڑکا ہوا ہے۔ جس کا رنگ سیاہ ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ وہ میری اولاد ہے۔
آپ نے فرمایا:۔ تیرے پاس کچھ اونٹ تو ہوں گے۔
اس نے جواب دیا: ہاں: حضورؐ!
آپ نے استفسار فرمایا۔ وہ کس رنگ کے ہیں؟
اس نے عرض کیا۔ سُرخ رنگ کے۔
آپ نے فرمایا، کوئی خاکستری رنگ کا بھی ہے۔
اُس نے کہا: جی ہاں۔ بعض اُن میں سے ایسے بھی ہیں۔
آپ نے پوچھا۔ تو یہ رنگ کہاں سے آ گیا؟
اُس نے کہا: شاید کوئی رگ کھینچ لے گئی، (یعنی ان کے باپ دادا میں کوئی ایسے رنگ کا ہوگا اور اس کا اثر اُن میں آ گیا ہے)
اس پر جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
شاید اس بچے کو بھی کوئی رگ کھینچ لے گئی ہے۔
اس لئے تمہیں اس بات کا حق نہیں کہ اپنے بچے کے نسب سے انکار کرو۔

صحیح بخاری۔ [جلد ۳ کتاب الطلاق صـ ۹۰۸
جلد ۶ کتاب المحاربین صـ ۴۱
صحیح مسلم۔ جلد ۴ صـ ۱۳۶ - ۱۳۷

ج :۔ ظہار

ایک خاتون خولہ نامی جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور آپ کی خدمت میں عرض کیا:

یارسول اللہ! جب اوس نے مجھے اپنے نکاح میں لیا، تو میں اس وقت جوان، دلکش اور حسین دوشیزہ تھی۔ عمر کے ساتھ ساتھ میری جوانی ڈھلنے لگی، کثرتِ اولاد کے باعث میرا پیٹ پھول گیا۔ اور جسم پر جھُریاں پڑھنے لگیں۔ تو میرے خاوند نے میرے ساتھ اس قسم کا برتاؤ شروع کیا، جیسے میں اس کی ماں ہوں۔ (اب میرے لیے کیا حکم ہے؟)

پورا ماجرا سُننے کے بعد جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اے بی بی (تم جاؤ) میرے پاس اس سلسلے کا کوئی حکم نہیں ہے۔"

یہ سن کر وہ (مغموم ہوگئی) اور لگی الحاح و زاری کرنے۔ اور پھر جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا۔

یا رسول اللہ! میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں، اگر (انھیں بھی باپ نے لاتعلق کردیا) اور یہ میرے پاس رہ گئے۔ تو اِن کے نان نفقہ کا بندوبست کہاں سے ہوگا۔

اِسی پر اللہ تعالےٰ نے ظہار کے کفارے سے متعلق احکام کا نزول فرمایا:

"اور جو لوگ اپنی بیویوں کو ماں کہہ بیٹھیں، پھر اپنے قول سے رجوع کرلیں تو (اُن کو) ہم بستر ہونے سے پہلے ایک غلام آزاد کرنا (ضرور) ہے۔ (مومنو) اس (حکم) سے تم کو نصیحت کی جاتی ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو، خدا اُس سے خبردار ہے ۵ جس کو غلام نہ ملے وہ مجامعت سے پہلے متواتر دو مہینے روزے رکھے۔ جس کو اس کا بھی مقدور نہ ہو (اُسے) ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا (چاہیے)۔ یہ (حکم) اس لئے (ہے)، کہ تم خدا اور رسول کے فرمانبردار ہو جاؤ اور یہ خدا کی حدیں ہیں اور نہ ماننے والوں کے لئے درد دینے والا عذاب ہے ۵ (سورۂ المجادلہ: ۳، ۴)

چنانچہ ان احکام کے نزول کے بعد جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت (مدعیہ) کے شوہر کو بلایا اور کہا۔

رسول اللہ: کیا تو اتنی استطاعت رکھتا ہے کہ ایک غلام آزاد کر سکے؟

وہ شخص: یا رسول اللہ! نہیں۔

رسول اللہ: تو پھر متواتر دو ماہ روزے رکھ پائے گا؟

وہ شخص: یا رسول اللہ! معذور ہوں۔

رسول اللہ: اچھا تو پھر ساٹھ مسکینوں کو کھانا ہی کھلا دے۔

وہ شخص: یا رسول اللہ۔ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں۔

چنانچہ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس شخص کو پندرہ ۱۵ صاع جَو اپنے پاس سے عطا کئے جبکہ مزید پندرہ ۱۵ صاع جَو ایک دوسرے شخص نے دیئے۔

اور اس طرح یہ جَو اُس نے مسکینوں میں تقسیم کردیئے۔

(معانی زجاج)

(۲)

سلمان بن صخر ـــ جو سلمہ بن صخر بیاضی کے نام سے مشہور ہے، اُس نے اپنی بیوی سے کہا کہ تو میری ماں کی پشت کی مانند ہے۔ یہاں تک کہ رمضان کا مہینہ گذر جائے۔ لیکن ابھی ماہِ رمضان نصف کے قریب گذرا تھا۔ کہ رات اُس نے اپنی بیوی کے ساتھ ہمبستری کر لی۔ (اُسے اپنے کئے پر ندامت ہوئی) تو فوراً جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور سارا ماجرا بیان کیا۔ حضورؐ نے فرمایا:

رسول اللہؐ: تمہیں ایک غلام آزاد کرنا ہوگا۔

سلمان:۔ یا رسول اللہؐ! میں اتنا صاحبِ حیثیت کہاں ہوں۔

رسول اللہؐ: تو پھر دو ماہ کے متواتر روزے رکھو۔

سلمان: یا رسول اللہ۔ مجھ میں اتنی سکت نہیں۔

رسول اللہؐ: تو پھر (۶۰) ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا دے

سلمان: حضور مجھ میں تو اتنی استطاعت بھی نہیں

اس پر جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی فروہ بن عمرو کو حکم دیا کہ اسے کھجوروں کا ایک عرق[1] دے دو۔ تاکہ یہ ساٹھ مسکینوں میں بانٹ دے۔

راوی: ابو سلمہ / مشکوٰۃ جلد ۱ صـ ۱۰۴
سنن ابن ماجہ

باب الحدود (جاری): شراب پینے / پلانے سے متعلق فیصلے / چوری (سرقہ)

۱۔ شراب کیلئے حدود:

(۱)

جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جو شخص شراب نوشی کرے اُسے تازیانے مارو ـــ اگر وہ باز نہ آئے اور چار بار شراب نوشی کا ارتکاب کرے، تو چوتھی بار اُس کی گردن اڑا دو۔

پھر ایک شخص کو جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لایا گیا۔ اُس نے چوتھی مرتبہ شراب نوشی کی تھی۔

آپ نے حکم دیا۔ کہ "شرابی" کو تازیانے مارے جائیں۔

آپ نے اس شخص کے قتل کرنے کا حکم صادر نہیں فرمایا۔ راوی: جابرؓ / سنن ترمذی / مشکوٰۃ جلد ۲ صـ ۱۲۵

---

[1] زنبیل ۔ بورہ ۔ (ادارہ)

(۲)

نُعیمان یا ابن نُعیمان کو جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں ایسی حالت میں لایا گیا۔ جب کہ وہ شراب کے نشے میں دُھت تھا۔ آپ کو یہ حالت سخت ناگواری گزری (سخت غضب میں) آپؐ نے حاضرین کو حکم دیا کہ اس شخص کو حدیں ماریں۔

چنانچہ حاضرین نے اُسے خوب پیٹنا شروع کیا۔ (عقبہ بن حارث)

جبکہ حضرت انس بیان کرتے ہیں کہ حضور نے جب اُس کے مارنے کا حکم دیا۔ تو شرابی کو چھڑیوں اور جوتوں سے مارا گیا

(صحیح بخاری جلد ۵ صہ ۵۶)

(۳)

جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں ایک شخص کو پیش کیا گیا۔ جس نے شراب پی رکھی تھی۔

آپ کو یہ امر ناگوار گذرا۔ اس لئے صحابہ کو حکم دیا۔ اسے حد مارو۔

آپ کا یہ ارشاد سن کر کسی نے صحابہ میں سے، اُسے ہاتھ سے مارا۔ کسی نے جوتے سے اس کی پٹائی کی اور کسی نے اس غرض کے لیے کپڑا استعمال کیا۔

(صحیح بخاری جلد ۵ صہ ۱۶۱)

سنن ابی داؤد میں ہے اور نیز اس پر مزید ہے کہ پھر جناب رسالتمآبؐ نے فرمایا "اسے تنبیہ کرو"

چنانچہ صحابہ نے اس کی طرف توجہ کی اور کہا۔

"اے شخص! تو نے خدا کا خوف نہیں کھایا۔ تجھے خدا کے عذاب کا ڈر نہیں ہے۔ تجھے جنابِ رسالتمآب سے بھی حیا نہ آئی"

اُن میں سے کوئی آدمی کہنے لگا "اللہ تجھ کو رسوا کرے"۔

یہ کلمہ جب جنابِ ختمی مرتبتؐ نے سُنا تو اُسے ٹوک دیا اور ارشاد فرمایا:

"اے شخص! ایسا ہرگز نہ کہو۔ کیوں کہ ایسا کرنے میں تم شیطان کی مدد کرتے ہو" تاکہ وہ ایسوں پر غلبہ حاصل کرے"

بلکہ یوں کہو "اے پروردگار۔ اس پر اپنا رحم فرما۔ اس کی مغفرت فرما۔ اور اسے بخش دے"

راوی: ابو ہریرہ :-

سنن ابی داؤد بحوالہ مشکوٰۃ جلد ۲ صہ ۱۷۵-۱۷۶

(۴)

ایک شخص جس کا نام عبداللہ تھا۔ لوگ اُسے حمار کے لقب سے پکارتے تھے۔ وہ جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوتا اور معصوم مزاح سے حضورؐ کے تفننِ طبع کا انتظام کرتا تھا۔ حضورؐ بھی اُس کے مزاح سے لطف اندوز ہوتے اور تبسم فرماتے۔

لیکن اس میں شراب نوشی کی عادت تھی۔ آپؐ نے اس پر شراب پینے کی وجہ سے حد بھی جاری فرمائی تھی۔ ایک دن ایسا ہوا کہ اُس نے پھر شراب چڑھالی اور نشے کی حالت میں حضورؐ رسالتمآبؐ کی خدمت میں لایا گیا۔ آپؐ نے اس پر حد جاری فرمائی اور تازیانے لگانے کا حکم دیا۔

اُسے کوڑے مارے گئے۔
تو حاضرین میں سے ایک شخص نے کہا: "اللہ کی لعنت ہو ایسے شخص پر۔ کتنی بار شراب نوشی کے جرم میں سزا پا چکا ہے۔ لیکن باز پھر بھی نہیں آتا۔
آپ نے جب یہ کلمہ سُنا تو فرمایا:
"اے شخص! اس پر لعنت مت کرو۔ اللہ کی قسم۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ اِسے اللہ اور اللہ کے رسول سے کس قدر محبت ہے۔"

راوی: حضرت عمر فاروق

صحیح بخاری جلد ۵ ص ۶۵۲

(۵)

حضرت عبداللہ بن الدیلمی اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے بیان کیا:۔
ہم جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور عرض کیا:
یا رسول اللہؐ۔ آپ کو خوب علم ہے۔ کہ ہم لوگ کون ہیں۔ کہاں سے آئے ہیں اور کس انسان کی بارگاہ میں بیٹھے ہوئے ہیں۔
رسول اللہؐ: تم اللہ اور اللہ کے رسولؐ کے پاس آئے ہو۔
وہ لوگ: یا رسول اللہؐ ہمارے ہاں انگور کثرت سے پیدا ہوتے ہیں، ہم اُن کو کس طرح استعمال میں لائیں۔ (آپ اس بارے میں ہماری رہنمائی فرمائیں)؟
رسول اللہؐ:۔ اُن کی کشمش بنا لیا کرو۔
وہ لوگ:۔ یا رسول اللہؐ۔ اس قدر وافر مقدار میں کشمش ہمارے کس کام آئے گی؟
رسول اللہؐ۔ صبح ہی اُن کی نبیذ ڈال لیا کرو اور رات کو اُسے پی لو پھر رات میں انھیں پانی میں بھگو دو، صبح نوش کرو۔
البتہ غور سے سنو! انھیں مشکیزوں میں بھگونا۔ انھیں بڑے بڑے مٹکوں میں بھگونا تمہارے لئے جائز نہیں۔ کیوں کہ ان کے نچوڑنے میں اگر دیر ہو جائے تو کشمش سرکہ میں تبدیل ہو جائے گی۔

۱۔ ابو داؤد شریف۔ صـ ۵۲۱۔
۲۔ سنن نسائی جلد ۳ صـ ۵۴۳۔

(۶)

ایک شخص یمن سے آیا۔ اور اُس نے جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا۔
یمنی:۔ یا رسول اللہؐ ہم یمن میں جوار سے ایک قسم کی شراب کشید کرتے ہیں اسے ہم مزر کہتے ہیں اور ہم اسے پیتے ہیں۔ اس کے متعلق آپ کا کیا حکم ہے۔
رسول اللہؐ: کیا یہ شراب نشہ آور ہے؟

یمنی : جی ، ہاں یا رسول اللہؐ !
رسول اللہؐ :- تو سنو ! اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ جو شخص نشہ آور مشروب استعمال کرے - تو اُسے (قیامت میں) طینۃ الخبال پلایا جاتے گا -
صحابہ کرام :- یا رسول اللہ - یہ طینۃ الخبال - کس چیز کا نام ہے ؟
رسول اللہ :- یہ دوزخیوں کا پسینہ اور ان کے زخموں کی پیپ ہے -
راوی :- جابرؓ صحیح مسلم / مشکوٰۃ جلد ۲ صہ ۱۸۰
سنن نسائی جلد ۳ صہ ۵۳۸

(۷)

دیلم حمیری بیان کرتے ہیں :
کہ ہم جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے میں نے حضورؐ سے گفتگو کا آغاز کیا -
دیلم حمیری : یا رسول اللہؐ - ہم ایسے علاقے کے باسی ہیں جہاں شدت کی سردی پڑتی ہے - ہمیں (روزگار کے لیے) سخت محنت اور مشقت کرنی پڑتی ہے - اس لئے ہم گیہوں سے کشید کردہ شراب استعمال کرنے پر مجبور ہیں : تاکہ سردی سے بھی محفوظ رہیں اور توانائی بھی بحال رہے -
رسول اللہؐ : کیا وہ مشروب نشہ آور ہے ؟
دیلم حمیری :- جی ہاں ، یا رسول اللہؐ !
رسول اللہؐ :- اُسے بالکل ترک کر دو -
دیلم حمیری :- (مجھے خوف ہے) یا رسول اللہ لوگ اس شراب کو ترک نہیں کریں گے -
رسول اللہؐ :- تو میرا حکم سُن لو ، اگر وہ لوگ اس کا پینا ترک نہ کریں تو اُن کے خلاف جنگ کرو -
سنن ابی داؤد / مشکوٰۃ جلد ۲ صہ ۱۸۳

(۸)

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ بیان کرتے ہیں :
جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یمن کی طرف (حاکم بنا کر) بھیجا تو میں نے آپؐ سے عرض کیا -
ابو موسیٰؓ : یا رسول اللہؐ - یمن میں دو قسم کی شراب کشید کی جاتی ہے - میرے لیے کیا حکم ہے کہ میں ان میں کا کون سا مشروب استعمال کروں -
رسول اللہؐ : وہاں کس قسم کی شرابیں کشید کی جاتی ہیں -
ابو موسیٰؓ : یا رسول اللہؐ ! بتعؔ اور مزر -

رسول اللہؐ :- یہ (شرابیں) کس شے سے بنائی جاتی ہیں۔
ابوموسیٰ :- یا رسول اللہؐ! بتع شہد سے کشید کی جاتی ہے۔ اور مزر جَو سے بنائی جاتی ہے۔
رسول اللہؐ :- جو نبیذ (مشروب نشہ آور ہو، اُسے ہرگز استعمال نہ کرو۔
کیوں کہ مَیں نے ہر نشہ آور شے کو حرام کیا ہے۔

سنن نسائی جلد ۳ صہ ۱۴

باب السرقہ (چوری)

ارشادِ سیدالانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم :

جب زانی زنا کرتا ہے تو ایمان کی نعمت سے محروم ہو جاتا ہے۔ اِسی طرح چور جب چوری کرتا ہے تو ایمان کی دولت اُس سے چھین لی جاتی ہے۔

اور خرابی جب شراب پیتا ہے تو ایمان اس سے دُور ہو جاتا ہے۔ اور جو شخص لوگوں کے دیکھتے رہزنی اور ڈاکہ زنی کرے، تو وہ بھی ایمان کی نعمت گنوا دیتا ہے۔

(یعنی یہ افعال بندہ کو ایمان سے دور اور کفر سے قریب تر کر دیتے ہیں)

ہاں۔ اگر اس کے بعد توبہ کرے۔ تو اللہ تعالےٰ اُس کی توبہ قبول فرمائیں گے۔

راوی : حضرت ابوہریرہؓ
سنن نسائی جلد ۳ صہ ۳۴۰ - ۳۴۱

(۱)

جنابِ سیدالکونینؐ کی بارگاہ میں ایک شخص حاضر ہُوا، اور اقرار کیا کہ اُس نے چوری کی ہے (تلاشی لینے پر) اُس سے کسی قسم کا مال برآمد نہ ہوا تو جناب رسالتمآبؐ نے فرمایا "ایسا معلوم ہوتا ہے۔ تم نے چوری کا ارتکاب نہیں کیا"۔ لیکن اُس شخص نے عرض کیا۔ یا رسول اللہؐ میں اقرار کرتا ہوں۔ کہ میں نے چوری کی ہے۔ اس پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا "اسے لے جا کر اس کا ہاتھ کاٹ دو، اور پھر دوبارہ اِسے میرے پاس لے آؤ۔

چنانچہ آپؐ کے حکم پر اُس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔ اور پھر اُسے حضورؐ کے سامنے پیش کیا گیا تو۔

جنابِ سرورِ عالمؐ نے فرمایا "اے شخص کہو، مَیں اللہ تعالےٰ کے حضورؐ توبہ کرتا ہوں اور اُس سے معافی کا خواستگار ہوں"۔

اس پر اس (چور) نے عرض کیا "میں صدقِ دِل سے توبہ کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ سے معافی کا طلب گار ہوں"۔

تو حضورؐ نے (دستِ مبارک اُٹھا کر) دعا فرمائی۔

"اے اللہ اپنے اس (عاجز) بندے کو معاف فرما دے"۔

راوی : ابواُمیّہ مخزومی
سنن نسائی جلد ۳ صہ ۳۴۲

(۲)

ایک شخص نے ایک ڈھال مسجد نبوی کے ایک مقام صفتہ النسآ سے چرائی - اس ڈھال کی قیمت ۳ درہم تھی - جب اس چور کو حاضر کیا گیا تو حضورؐ نے اس چور کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔

اور ساتھ ہی آپؐ نے حکم دیا۔

کہ ہر اُس چور کا ہاتھ کاٹ دیا جائے جو چوتھائی دینار یا اس سے زیادہ کی چوری کا ارتکاب کرے۔

راوی :۔ عبداللہ بن عمرؓ حضرت عائشہ صدیقہؓ

سنن نسائی جلد ۳ صہ ۳۵۱ - ۳۵۲

(۳)

ایک شخص پر چوری کا الزام تھا۔ جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے قید میں ڈال دیا۔ لیکن بعد میں اُسے آزاد کر دیا۔

راوی: بہزبن حکیم ۔/ سنن نسائی جلد ۳ ، صہ ۳۶۲

(۴)

ایک عورت کی یہ عادت تھی کہ وہ لوگوں سے عاریتاً چیزیں لیتی ۔ لیکن انھیں واپس نہ کرتی ۔ بلکہ صاف انکار کر دیتی (کہ اس نے لی ہی نہیں)، اسی طرح لوگوں سے زیور عاریتاً لیتی اور اپنے پاس رکھ لیتی (مالکوں کو واپس کرنے سے انکار کر دیتی) جب اُس کی اس عادت بد کا جناب سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کو علم ہوا ۔ تو آپ نے اُس عورت کو بلا کر فرمایا کہ توبہ کرو اور دوسروں کا جو مال بھی تمہارے پاس ہے ۔ اُسے اُن کے مالکوں کو لوٹا دو۔" آپ نے یہ حکم کئی بار دُہرایا۔ لیکن وہ عورت ٹس سے مس نہ ہوئی۔ بلکہ اُس نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ تو جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ

" اس عورت کا ہاتھ کاٹ دیا جائے ۔

چنانچہ اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا ۔

راوی : حضرت ابن عمرؓ ، حضرت نافعؓ

سنن نسائی جلد ۳ صہ ۳۴۵

(۵)

جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں ایک شخص کو پیش کیا گیا جس نے چوری کی تھی۔ آپؐ نے اُس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ کٹا ہوا ہاتھ اس کے گلے میں لٹکا دو ۔ چنانچہ چور کا ہاتھ کاٹ کر اُس کے گلے میں لٹکا دیا گیا ۔

راوی : عبدالرحمان بن محریز / سنن نسائی جلد ۳ صہ ۳۶۵

(۶)

جناب سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ،

" جب غلام چوری کا مرتکب ہو۔ تو اُسے فروخت کر دو، چاہے اس کی قیمت ۲۰ درہم ہی وصول ہو۔

(راوی : ابوہریرہ : سنن نسائی جلد ۳ صہ ۳۶۶)

(۷)

جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں ایک شخص پیش کیا گیا۔ جس نے چوری کی تھی۔ تو آپ نے اُس کے قتل کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ لیکن حاضرین نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! اس نے چوری کی ہے۔

تو جناب رسالتمآبؐ نے اُس کا دایاں ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا اور اس کا دایاں ہاتھ کاٹ دیا گیا۔

وہ شخص باز نہ آیا۔ اور دوبارہ چوری میں ماخوذ ہوا، جب اُسے حضورؐ کی خدمت میں لایا گیا تو جناب رسالت آپؐ نے اُسے قتل کرنے کا حکم دیا۔ مگر حاضرین نے کہا۔ یا رسول اللہ! یہ شخص (دوبارہ) چوری کا مرتکب ہوا ہے۔ تو آپؐ نے حکم دیا کہ چور کا بایاں پاؤں کاٹ دیا جائے اور اس کا بایاں پاؤں کاٹ دیا گیا۔

(دو دفعہ سزا پانے کے باوجود یہ شخص چوری سے باز نہ آیا) اور تیسری دفعہ پھر چوری کی اس لئے اُسے تیسری بار حضورؐ کی خدمت میں لایا گیا۔ تو آپؐ نے اُس کے قتل کرنے کو کہا۔ لیکن حاضرین نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ۔ یہ چور ہے۔

چنانچہ آپؐ نے اس کا بایاں ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا اور بایاں ہاتھ کاٹ دیا گیا۔ (مگر چور ڈھیٹ تھا) چوتھی بار پھر اُس نے چوری کی۔ تو آپ نے حکم دیا کہ اس کا دایاں پاؤں بھی کاٹ دیا جائے اور اس کا دایاں پاؤں بھی کاٹ دیا جائے۔

وہ (سیاہ بخت) پانچویں دفعہ پھر چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا۔ تو حضورؐ نے حکم صادر فرمایا۔ کہ اب کے اسے قتل کر دیا جائے۔

اس لیے اُس شخص کو مربد کے مقام کی طرف قتل کرنے کے لئے لے گئے اور وہاں پر اُسے پیٹھ کے بل لٹا دیا گیا۔ لیکن وہ ہاتھ پاؤں کٹے ہونے کے باوجود دوڑنے لگا۔ اس کی یہ خوفناک ہیئت کذائی دیکھ کر اونٹ بھی خوف سے بلبلانے لگے۔ وہ شخص دوڑتے ہوئے گر پڑا۔ لوگوں نے پھر اس پر قابو پا لیا۔ اس کے باوجود بھی اس نے بھاگنے کی کوشش کی۔ لیکن بے سود تیسری دفعہ اُسے پکڑ لیا گیا اور لوگوں نے پتھر مار مار کر اُسے ہلاک کر دیا۔ اُس کی لاش لوگوں نے اٹھا کر کنوئیں میں پھینک دی، اس پر مزید پتھر برسائے (تاکہ لاش ڈھک جائے)

(راوی۔ جابرؓ / سنن نسائی جلد ۲ : صـ ۲۵۸ – ۲۵۹)

(۸)

ایک شخص جس کا تعلق قبیلہ مزینہ سے تھا۔ جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں (چوری سے متعلق احکامات دریافت کرنے کے لئے) حاضر ہوا۔ اور حضورؐ سے گفتگو کا آغاز کیا۔

وہ شخص: یا رسول اللہؐ! پہاڑ پر چرنے والے جانوروں کے متعلق آپؐ کا کیا حکم ہے (اگر کوئی چرائے)؟

رسول اللہؐ: اگر کوئی شخص اس قسم کا جانور چوری کرے تو اُسے وہ جانور لوٹانا ہوگا۔

اس کے ساتھ اسی قسم کا ایک اور جانور (بطور تاوان) دینا ہوگا۔

اس کے علاوہ اُسے سزا بھی دی جائیگی۔ لیکن چوری کرنے کے جرم میں اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔

ہاں اگر کوئی شخص ایسا جانور چوری کرتا ہے۔ جو باڑے کے اندر ہو اور اس کی قیمت ڈھال کی قیمت سے کم ہو، تو اسے وہ جانور

واپس کرنا ہوگا۔ ساتھ میں اُسے کوڑے بھی مارے جائیں گے۔

وہ شخص :- یا رسول اللہ - آپؐ کا ایسے پھل کے متعلق کیا حکم ہے جو درخت پر لگا ہو اور اُسے چرایا جائے؟

رسول اللہؐ :- اگر کوئی ضرورت مند شخص اشد ضرورت کے وقت ایسا پھل چوری کرے۔ تو اس پر کوئی مواخذہ نہیں۔ لیکن شرط یہ ہے یہ پھل کسی کپڑے میں باندھ کر چھپایا نہ لے۔ لیکن اگر کوئی شخص (عام حالات میں) ایسا پھل چوری کر کے نکل آئے۔ تو وہ چوری کردہ پھل واپس لوٹائے۔ اور اسی قدر مزید پھل بھی ادا کرے۔ یعنی اُسے دگنا تاوان دینا ہوگا۔ تاوان کے علاوہ اُسے سزا بھی دی جائے گی۔ ہاں ایسے پھل جنھیں توڑ کر کھلیان میں محفوظ کیا گیا ہو۔ تو جو شخص اُن میں سے اس قدر پھل چرائے کہ ان کی قیمت ڈھال کی قیمت کے برابر ہو۔ تو اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ اور اگر جو پھل اُس نے چرائے ہیں۔ اُن کی قیمت ڈھال کی قیمت سے کم ہوتی تو اُسے دُہرا تاوان ادا کرنا ہوگا۔ تاوان کے علاوہ اُسے کوڑوں کی سزا بھی دی جائے گی۔

راوی : عبداللہ بن عمرو بن العاص

سنن نسائی جلد ۳ صہ ۳۵۶ - ۳۵۷

(۹)

حضرت عائشۃ الصدیقہؓ فرماتی ہیں:

کہ جناب سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عورت کا جس نے چوری کی تھی، ہاتھ کٹوا دیا تھا۔ سزا پانے کے بعد وہ عورت اکثر ہمارے ہاں آیا کرتی تھی۔ میں اس بیچاری کی ضروریات جناب رسالتمآبؐ کی خدمت میں پیش کر دیا کرتی تھی۔ (اور جناب رسول اللہؐ اس کی ضروریات پورا فرماتے تھے)

جناب صدیقہ فرماتی ہیں، اس عورت نے توبہ کی اور بڑے خضوع و خشوع کے ساتھ توبہ کی۔

(صحیح بخاری جلد ۵ کتاب الحدود صہ ۶۲)

(۱۰)

ایک شخص نے چوری کی، اُسے حضورؐ کی خدمت میں لایا گیا تو حضورؐ نے اُسے معاف فرما دیا (کہ شاید توبہ کرلے)

لیکن وہ شخص چوری سے باز نہ آیا۔ اُسے چار بار چوری کرتے ہوئے گرفتار کیا گیا۔ اور حضور سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اُسے چار بار پیش کیا گیا۔ جناب رسالتمآب نے اُسے ہر بار معاف فرما دیا۔ (شاید توبہ کرلے) وہ شخص اس عادت بد سے باز نہ آیا۔ پانچویں بار چوری کی۔ تو حضور اکرمؐ نے اُس کا ایک ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ اور اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔ مگر چھٹی بار اُس نے پھر چوری کی۔ تو حضورؐ نے اس کا ایک پاؤں کاٹنے کا حکم دیا۔ ساتویں بار چوری میں ماخوذ ہونے کی وجہ سے جب اُسے حضورؐ کی خدمت میں لائے تو حضور رسالتمآبؐ کے حکم سے اُس کا دوسرا ہاتھ بھی کاٹ دیا گیا۔ اس کے باوجود اس نے چوری ترک نہیں کی۔ بدبخت کو آٹھویں بار جب حضورؐ کے سامنے لائے تو آپؐ کے حکم سے اس کا دوسرا پاؤں بھی کاٹ دیا گیا۔

۱۔ مصنف عبدالرزاق ۲۔ سنن نسائی جلد ۳ صہ ۳۵۸

(۱۱)

ایک شخص کو بچے چرانے کی عادت تھی۔ جناب سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ مگر جناب سید الکونین ؐ نے کھانا یا کھانے کی چیزیں چرانے پر معاف فرما دیا۔

(مصنف عبدالرزاق)

(۱۲)

صفوان بن امیہؓ سے روایت ہے۔ وہ فرماتے ہیں:۔

میں ایک دن مسجد میں اپنی چادر سر کے نیچے رکھے سو رہا تھا۔ جس کی قیمت ۳۰ درہم تھی۔ ایک آدمی آیا۔ اس نے چادر کو آہستہ آہستہ میرے سر کے نیچے سے سرکا کر کھینچ لیا۔ اور چادر لے کر بھاگ نکلا۔

چور کو پکڑ لیا گیا۔ جب اُسے جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے تو آپ نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم صادر فرمایا (یہ دیکھ کر مجھے دکھ ہوا اور) میں نے عرض کیا۔

یا رسول اللہؐ! آپ محض ۳۰ درھم کے لیے اس کا ہاتھ کاٹیں گے۔ اِسے معاف فرمائیں۔ میں اس چادر کو اس کے ہاتھ بیچتا ہوں"۔ اس پر آپ نے ارشاد فرمایا۔

(اب خدا کا قانون اور حکم ٹل نہیں سکتا۔) میرے پاس اِسے لانے سے پہلے ہی تم نے ایسا کیوں نہیں کر لیا۔

(ابو داؤد ص ۶۰۲ / سنن نسائی جلد ۲ ص ۲۴۲-۲۴۴)

(۱۳)

ایک عورت جس کا تعلق بنو مخزوم سے تھا۔ نے فتح مکہ کے دوران چوری کی لوگ اس عورت کو لے کر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے، چونکہ یہ ایک بڑے قبیلہ کی عورت تھی۔ اس لئے بنو مخزوم کے لوگ جو اس عورت کے رشتہ دار تھے۔ اُسامہ بن زیدؓ کے پاس آئے: تاکہ وہ حضورؐ کے پاس جائیں اور اس عورت کی سفارش کریں۔ اُن کا خیال تھا کہ جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم حضرت اُسامہؓ کی سفارش پر اس مخزومیہ کو معاف کر دیں گے۔

جب سفارش کرنے کے لئے اُسامہؓ بن زید حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ تو آپؐ سخت جلال میں آ گئے اور فرمایا۔

"اے اسامہ! بنی اسرائیل محض اس لئے تباہ ہوئے کہ اُن میں کا جب کوئی بڑا اور صاحبِ ثروت شخص کسی قابلِ حد جرم کا ارتکاب کرتا، تو وہ اس سے درگزر کرتے۔ لیکن کسی مفلس، نادار اور بے سہارا شخص سے کوئی ایسا جرم سرزد ہو جاتا تو اُس پر حد جاری کرتے۔ کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کی قائم کردہ حدود میں سے ایک حد تمہارے لئے توڑ دی جائے۔

اس ذات پاک کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے۔ (مخزومیہ تو ایک طرف رہی) اگر فاطمہ بنت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے بھی چوری کا ارتکاب ہو جائے تو میں اس کا بھی ہاتھ کٹوا دوں۔

پھر جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ اور آپؐ کے حکم کے مطابق اس عورت کا

ہاتھ کاٹا گیا۔

(سنن نسائی جلد ۳ صہ ۲۴۵ - ۲۴۹)

(۱۴)

عباد بن شرجیلؓ بیان کرتے ہیں:

مدینہ میں ایک سال سخت قحط پڑا، مجھے اُسی سال مدینہ جانے کا اتفاق ہوا، جب وہاں پہنچا۔ (بھوک سے نڈھال تھا) کہ میرا گذر ایک باغ پر سے ہُوا۔ (وہ انگوروں کا باغ تھا) میں نے باغ میں جاکر انگور کا ایک خوشہ توڑا اور اُسے کھا لیا۔ کچھ اور خوشے توڑ کر اپنی چادر میں رکھ لئے چلنے کو تھا کہ باغ کا مالک آن پہنچا۔ آنے کے ساتھ ہی اُس نے مجھے پکڑ لیا۔ مجھے نہ صرف اس نے مارا بلکہ میرے کپڑے بھی چھین لئے۔

میں اسی حالت میں جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہُوا اور سارا ماجرا آپ کی خدمت میں بیان کیا۔ آپؐ نے باغ کے مالک کو بلوا کر کہا۔

"جب یہ شخص بھوکا تھا۔ تو تو نے اِسے کھانا کیوں نہیں دیا۔ اور اگر وہ بے علم تھا۔ تو تُو نے (مارنے کی بجائے) اُسے بتایا کیوں نہیں (کہ ایسا کرنا جرم ہے) میرا حکم سن لو، جاؤ اور اس کے کپڑے واپس کر دو۔

ان کے ساتھ ایک وسق غلہ بھی (بطورِ تاوان) اس کے حوالے کر دو۔"

(سنن ابن ماجہ جلد ۲ صہ ۳۷)

(۱۵)

رافع بن عمرو الغفاریؓ بیان کرتے ہیں:

"میں نے ایک انصاری کے کھجور کے درختوں سے کھجور حاصل کرنے کے لئے پتھر مارے۔ تو اس کا مالک آ گیا۔ اور مجھے پکڑ کر جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے گیا۔ اور سارا واقعہ حضورؐ کو سنایا۔

اس پر جناب رسالتمآبؐ نے فرمایا "اے لڑکے! تو درخت پر پتھر کیوں مار رہا تھا۔"

میں نے عرض کیا "یا رسول اللہؐ۔ تاکہ کھجور حاصل کر کے کھاؤں"

اس پر آپؐ نے فرمایا "دیکھو! (کھجور کو) پتھر نہ مارا کرو، البتہ جو کھجور زمین پر گری پڑی ہو۔ اُسے اُٹھا کر کھا لیا کرو۔"

(سنن ابن ماجہ جلد ۲ صہ ۳۷)

۳۔ باب الجہاد

(۱)

غزوہ بدر الکبریٰ میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح نصیب فرمائی جناب سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم صادر فرمایا کہ

دشمنوں کا جو مال و اسباب ملے اُسے جمع کر لیا جائے ۔ آپؐ کے فرمان کے مطابق مالِ غنیمت ایک جگہ جمع کیا گیا ۔ ہر مومن نے جو کچھ اُسے ملا وہیں لاکر جمع کرا دیا ۔ لیکن مالِ غنیمت کی تقسیم کے بارے میں مسلمان مجاہدین کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا ۔ بڑے بڑے تین گروہ تھے جن میں کے ہر ایک کی رائے تقسیم کے بارے میں مختلف تھی ۔

۱ ۔ بعض وہ لوگ جنہوں نے مالِ غنیمت اکٹھا کیا تھا ۔ اس بات پر مُصر تھے کہ یہ مال اُن کا ہے ۔ اور انہیں ہی ملنا چاہیئے ۔ اس مطالبے کو وزنی بنانے کے لیے انہوں نے یہ توضیح پیش کی کہ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ مالِ غنیمت جس قدر، جس کو ملے وہ اسی کا ہے ۔

۲ ۔ دوسرا گروہ ان لوگوں کا تھا جو مصروفِ پیکار رہے اور کافروں کو اسیر کرنے میں لگے رہے ۔ اُن کا مؤقف یہ تھا کہ اگر ہم نہ ہوتے ۔ تو کسی صورت میں مالِ غنیمت پر تمہارا قبضہ نہیں ہو سکتا تھا ۔ ہم ہی نے تمہیں یہ موقع فراہم کیا کہ تم لوگ دشمن کا مال اکٹھا کر سکو ۔

۳ ۔ تیسرا گروہ ان لوگوں پر مشتمل تھا جو دشمن کی یلغار کے خوف سے جناب رسالتمآبؐ کی حفاظت کر رہے تھے ۔ انہیں اس بات پر اصرار تھا کہ اُن سے زیادہ کوئی دوسرا فریق مالِ غنیمت کا مستحق نہیں ۔ ان کی توجیح یہ تھی کہ اللہ نے جب ہمیں فتح دی، شکست خوردہ دشمن پیٹھ موڑ کر فرار ہوا ۔ تو ہم آسانی سے مالِ غنیمت پر قبضہ کر سکتے تھے ۔ لیکن جناب رسالتمآبؐ کی حفاظت کے خیال سے ہم نے ایسا قدم نہیں اٹھایا ۔ مبادا ۔ دشمن حضورؐ کو تنہا دیکھ کر پلٹ پڑے اور حضورؐ پر یورش کرے ۔

اس لیے مالِ غنیمت کے ہم زیادہ حق دار ہیں ۔

فریقین کے درمیان ۔ اپنا اپنا دعویٰ پیش کرنے اور اس پر اصرار کرنے کی وجہ سے سخت اختلاف پیدا ہو گیا ۔ اور نوبت تُو تکار (سخت کلامی) تک پہنچ گئی ۔ یہ حالات تھے جب سورۂ انفال کا نزول ہوا ۔ اللہ کے حکم سے تمام لوگوں نے جمع کردہ مالِ غنیمت جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے کر دیا ۔

آپ نے اللہ کے حکم کے مطابق سارا مالِ غنیمت مسلمانوں کے درمیان تقسیم فرما دیا ۔

۱ ۔ سیرۃ ابن ہشام جلد ۲

۲ ۔ تاریخ طبری جلد ۱ : سیرۃ النبی ص ۱۸۹ ۔ ۱۹۰

۳ ۔ معارف القرآن : تفسیر سورہ انفال ۔

۴ ۔ تفہیم القرآن : تفسیر سورۂ انفال ۔

(۲)

جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم اور یہودِ مدینہ

ہجرت کے بعد جب سید الکونینؐ مدینہ تشریف لائے ۔ تو آپؐ نے مدینہ کے دفاع کی خاطر یہودِ مدینہ سے ایک معاہدہ کیا جو تاریخ میں میثاقِ مدینہ کے نام سے مشہور ہے ۔ اس میثاق میں یہودیوں کے بڑے بڑے قبائل بنی قینقاع ، بنی نظیر اور بنی قریظہ شامل تھے ۔ اس معاہدہ

کی رُو سے یہود مدینہ اس بات کے پابند تھے کہ

۱۔ اگر کوئی خارجی طاقت مدینہ پر حملہ آور ہو تو وہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر مدینہ کا دفاع کریں گے۔

۲۔ ایسے کسی بھی OPERATION کے اخراجات وہ خود برداشت کریں گے۔

۳۔ قریش مکہ سے کسی قسم کا تعلق نہیں رکھیں گے۔

اور ۴۔ مذہبی رواداری سے کام لیں گے۔

غزوہ بدر کبریٰ۔ جب وقوع پذیر ہوا۔ تو یہود نہ صرف اس سے الگ رہے۔ بلکہ ان کی کوشش تھی کہ مسلمان کسی طرح تباہ ہوں۔ انہوں نے میثاق مدینہ کی خلاف ورزی کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں اٹھا رکھی۔ ان کی توقعات کے خلاف اللہ پاک نے مسلمانوں کو فتح مبین عطا فرمائی۔ یہود حسد کے مارے جل بھن گئے۔ کینہ و بغض کو چھپا نہیں سکے اور لگے بڑ ہانکنے کہ (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو شمشیر زنوں سے واسطہ نہیں پڑا۔ اگر ہم سے سابقہ پڑتا تو انھیں چھٹی کا دودھ یاد آجاتا۔

اب حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ضروری ہو گیا کہ آپ اس غدار اور سرکش قوم کے خلاف عمل قدم اٹھائیں ان سے متعلق حضورؐ نے مندرجہ ذیل فیصلے صادر فرمائے۔

۱۔ بنو قینقاع :

غزوۂ بدر کے معاً بعد ایک مسلمان انصاری عورت اپنا کچھ سامان بیچنے کے لئے بنو قینقاع کے بازار میں آئی۔ اپنا سامان بیچ کر، ایک سُنار کی دکان پر گئی۔ تو یہودیوں نے از راہِ شرارت اُس خاتون کی بے حرمتی کرنے کی کوشش کی۔ اُس نے جب فریاد کی۔ تو اُس کی فریاد پر ایک مسلمان نے اُس سنار کو قتل کر دیا۔ جس پر یہودیوں نے اُس پر جھپٹ کر شہید کر دیا۔

اطلاع ملتے ہی جنابِ سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم سُوقِ بنو قینقاع پہنچے۔ بنو قینقاع کو بازار میں جمع کر کے ارشاد فرمایا۔

"اے یہود! خدا کا خوف کرو، کہیں تمہارا حشر بھی ویسا نہ ہو، جیسا اللہ نے قریش کا کیا ہے۔ بہتر ہے اسلام قبول کر لو۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں اللہ کا فرستادہ ہوں۔ نبیِ مرسل ہوں جس کا ذکر تم اپنی کتابوں میں پاتے ہو، اُس میثاق میں پاتے ہو جو اللہ نے تم سے لیا تھا۔"

لیکن یہود نے مصالحت پر آمادگی کا اظہار کرنے کی بجائے نہایت ہی تکبر سے کہا۔

اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)! تم ہمیں بھی اپنی قوم پر قیاس کر رہے ہو۔ کہیں اس وہم میں نہ رہنا۔ تمہارا مقابلہ تو اُن لوگوں سے تھا۔ جو فنِ حرب سے قطعاً واقف نہیں، اور تم نے انھیں زیر کر لیا۔ لیکن بخدا۔ اگر تمہارا واسطہ ہم لوگوں سے پڑا، تو تمہیں پتہ چلے گا کہ ہم مردِ میدان ہیں۔

بنی قینقاع یہودیوں کا پہلا قبیلہ ہے۔ جس نے وہ عہد توڑ دیا۔ جو انہوں نے جنابِ رسالتمآبؐ سے کیا تھا۔ اور رزم آرائی کے لیے تیار ہو گئے۔ اور تجدید عہد سے انکار کر دیا۔

اسی پر یہ حکم خداوندی نازل ہوا:۔

"اگر تمھیں کسی قوم کی خیانت کا اندیشہ ہو۔ تو تم بھی اُن کے ساتھ ویسے پیش آؤ"

چنانچہ حضورؐ بمعہ مسلمان مجاہدین کے بنو قینقاع کی طرف گئے اور اُن کی گڑھیوں کا محاصرہ کر لیا۔ یہ حصار پندرہ دن تک قائم رہا۔ بنو قینقاع کو جب کوئی راہِ نجات سجھائی نہ دی۔ تو ہتھیار ڈال دیئے اور اپنے آپ کو رسول اللہ صلعم کے حوالے کر دیا۔

آپؐ نے حکم دیا کہ ان سب کی مشکیں کس دی جائیں۔ کیوں کہ حضورؐ کا ارادہ تھا کہ اُن کو قتل کیا جائے۔ چنانچہ انھیں رسیوں میں جکڑ دیا گیا لیکن عبداللہ بن ابی نے آپؐ کا دامن تھام لیا اور رحم کی درخواست کی۔ اُس نے اُس وقت تک آپؐ کا دامن تھامے رکھا جب تک آپؐ نے اُس کی بات مان نہ لی۔

اس لیے حضورؐ نے ان کے قتل سے درگذر فرمایا۔ اور کہا کہ اُن پر اُن کے ساتھی پر اللہ کی لعنت ہو۔ اور اس کے ساتھ ہی درج ذیل فیصلہ صادر فرمایا۔

۱۔ بنو قینقاع کو جلاوطن کیا جائے۔

۲۔ ان کی املاک کو مالِ غنیمت کے طور پر مسلمانوں میں تقسیم کیا جائے۔ آپؐ نے عبادہ بن صامت کو حکم دیا کہ وہ بنو قینقاع کو خارج البلد کر آئیں۔ یہ کل سات سو افراد تھے۔ چار سو غیر مسلح اور تین سو زرہ پوش

پھر آپؐ نے مالِ غنیمت تقسیم کرنے کا حکم دیا۔ وہ یوں تھا۔

۱۔ آپؐ نے اپنا خاص حصّہ لیا۔

۲۔ خمس وصول کیا۔ اور اپنا عام حصہ بھی۔

۳۔ اور بقیہ چار حصّوں کو جنابِ رسالت مآبؐ نے صحابہ میں تقسیم فرما دیا۔

خصوصیات:۔ اس غزوہ میں پہلا خمس نکالا گیا اور یہ پہلا خمس ہے جو جنابِ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے لیا۔

۱۔ سیرت ابنِ ہشام جلد ۲ صہ ۲۱ ـ ۲۸

۲۔ تاریخ طبری جلد ۱، سیرۃ النبیؐ صہ ۲۰۵ ـ ۲۰۸

۲۔ بنو نضیر:۔

عمرو بن امیّہ ضمری مدینہ کی طرف واپس ہو رہا تھا۔ تو اُس نے راستہ میں بنو عامر کے دو آدمیوں کو قتل کر دیا۔ حالاں کہ اُن کے ساتھ عہد جوار تھا لیکن عمرو اس امان سے بے خبر تھے۔ عامر بن الطفیل رئیس بنو عامر نے حضورؐ کو اس کے متعلق اطلاع دی اور لکھا کہ باوجود عہد جوار کے آپؐ نے ہمارے دو افراد قتل کر دیے ہیں۔ اس لیے اُن کی دیت ادا کی جائے۔

اس سے قبل حضورؐ نے بھی اُن کی دیت کا فیصلہ فرمایا تھا۔ آپؐ قبا آئے اور وہاں سے بنی نضیر کی گڑھیوں کا رُخ کیا۔ آپ کے ساتھ دیگر مہاجرین و انصار کے علاوہ حضرت ابوبکر صدیقؓ، عمر فاروقؓ، علی حیدرؓ اور اُسید بن حضیرؓ بھی تھے۔ چونکہ بنی نضیر اور بنو عامر حلیف بھی تھے۔ اس لئے آپ کے وہاں جانے کا مقصد یہ تھا کہ بنو عامر کے ان دو آدمیوں کی دیت کے بارے میں بنو نضیر کا تعاون حاصل کریں۔ چنانچہ جس وقت آپ وہاں پہنچے تو آپ نے اُن سے تعاون کے لیے کہا۔ جس پر انہوں نے کہا، ہاں، اے ابوالقاسم! ہم تعاون کے لیے تیار ہیں۔

لیکن در پردہ ان بدکردار یہودیوں کے عزائم کچھ اور تھے۔ اس لئے وہ آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ حضورؐ اس وقت بنو نضیر کے مکانوں کی ایک دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ یہودیوں نے یہ سازش کی کوئی شخص مکان کی چھت پر چڑھ جائے۔ اور ایک بھاری پتھر حضورؐ پر گرا دے۔ چنانچہ ایک یہودی عمرو بن جحاش اس فاسد ارادے سے مکان کی چھت پر چڑھ گیا۔ اور چاہا کہ بد ارادہ کو عملی جامہ پہنائے کہ اللہ پاک نے اس گھناؤنی سازش کی اطلاع آپ کو دے دی آپ فوراً اُٹھ کر مدینہ کی طرف چل پڑے۔ صحابہ کو بھی وہیں چھوڑ دیا اور کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ صرف اتنا کہا کہ تم یہاں ٹھیرو، میں ابھی آتا ہوں۔

جب حضور رسیالکونینؐ کو آنے میں دیر ہوئی تو صحابہ کرام بھی وہاں سے چل پڑے راستہ میں ایک شخص کی زبانی پتہ چلا کہ آپ مدینہ تشریف لے گئے ہیں، تو وہ بھی آپؐ کی خدمت میں وہیں پہنچ گئے۔

آپؐ نے صحابہ کرام کو حقیقت حال سے آگاہ کیا۔ اور حکم دیا کہ یہودیوں سے جنگ کے لیے تیار ہو جائیں اور صحابہ کرام کو ساتھ لے کر بنو نضیر کے مقابلہ کو پہنچ گئے اور ان کی گڑھیوں کا محاصرہ کر لیا۔ یہودی قلعہ بند ہو گئے تو آپؐ نے حکم دیا۔

"اُن کے تمام نخلستان کاٹ کر جلا دیئے جائیں"

یہودی چیخ اٹھے۔ تو آپ نے محمد بن مسلمہ کو بُلا کر فرمایا۔ "تم یہودیوں کے پاس فوراً جاؤ۔ اور اُن سے کہو کہ فوراً میرے علاقے خالی کر دیں اور یہاں سے نکل جائیں۔

چنانچہ انہوں نے آپ کا پیغام یہودیوں تک پہنچا دیا۔ یہودی آپ کا حکم ماننے کے لئے تیار ہو گئے۔ لیکن بعض منافقین نے جن کا سرغنہ عبداللہ بن اُبی بن سلول تھا، یہود بنی نضیر کو مدد کا یقین دلایا۔ اور کہا کہ وہ علاقے خالی نہ کریں۔ یہ بھی کہا کہ اگر تم سے قتال کیا گیا۔ تو میں اور میرے دو ہزار ساتھی۔ تمہارا ساتھ دیں گے اور دیس نکالے کی صورت میں بھی ہم تمہارے ساتھ ہوں گے۔ اور اس کے علاوہ بنی قریظہ بھی تمہاری امداد کو آئیں گے۔ لیکن رئیس بنی قریظہ کعب بن اسد نے صاف انکار کر دیا۔

سلام بن مشکم نے حُیَیّ بن اخطب رئیس بنو نضیر کو مشورہ دیا کہ وہ اور اس کے قبیلہ والے حضورؐ کا فیصلہ تسلیم کر لیں اور گڑھیاں خالی کر دیں تاکہ ہماری جان و مال محفوظ رہے۔ اور اگر ہم نے فیصلہ نہ مانا تو ——

—— ہمارے لڑنے والے افراد تہ تیغ کئے جائیں گے۔

ہمارے بچے اور عورتیں۔ غلام اور لونڈیاں بنا لئے جائیں گے

اور تمام مال و اسباب ضبط کر لیا جائے گا۔

اسی پر یہ حکم خداوندی نازل ہُوا :۔

" اگر تمھیں کسی قوم کی خیانت کا اندیشہ ہو۔ تو تم بھی اُن کے ساتھ ویسے پیش آؤ"

چنانچہ حضورؐ بمعہ مسلمان مجاہدین کے بنو قینقاع کی طرف گئے اور اُن کی گڑھیوں کا محاصرہ کر لیا۔ یہ حصار پندرہ دن تک قائم رہا۔ بنو قینقاع کو جب کوئی راہِ نجات سجھائی نہ دی۔ تو ہتھیار ڈال دیئے اور اپنے آپ کو رسول اللہ صلعم کے حوالے کر دیا۔

آپؐ نے حکم دیا کہ ان سب کی مشکیں کس دی جائیں۔ کیوں کہ حضورؐ کا ارادہ تھا کہ اُن کو قتل کیا جائے۔ چنانچہ انھیں رسیوں میں جکڑ دیا گیا لیکن عبداللہ بن ابی نے آپؐ کا دامن تھام لیا اور رحم کی درخواست کی۔ اُس نے اُس وقت تک آپؐ کا دامن تھامے رکھا جب تک آپؐ نے اُس کی بات مان نہ لی۔

اس لیے حضورؐ نے ان کے قتل سے درگذر فرمایا۔ اور کہا کہ اُن پر اُن کے ساتھی پر اللہ کی لعنت ہو۔ اور اس کے ساتھ ہی درج ذیل فیصلہ صادر فرمایا۔

۱۔ بنو قینقاع کو جلاوطن کیا جائے۔

۲۔ ان کی املاک کو مالِ غنیمت کے طور پر مسلمانوں میں تقسیم کیا جائے۔ آپؐ نے عبادہ بن صامت کو حکم دیا کہ وہ بنو قینقاع کو خارج البلد کر آئیں۔ یہ کُل سات سو افراد تھے۔ چار سو غیر مسلح اور تین سو زرہ پوش

پھر آپؐ نے مالِ غنیمت تقسیم کرنے کا حکم دیا۔ وہ یوں تھا۔

۱۔ آپؐ نے اپنا خاص حصہ لیا۔

۲۔ خمس وصول کیا۔ اور اپنا عام حصہ بھی۔

۳۔ اور بقیہ چار حصوں کو جنابِ رسالت مآبؐ نے صحابہ میں تقسیم فرما دیا۔

خصوصیات :۔ اس غزوہ میں پہلا خمس نکالا گیا اور یہ پہلا خمس ہے جو جنابِ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے لیا۔

۱۔ سیرت ابنِ ہشام جلد ۲ صـ ۲۱ ـ ۲۸

۲۔ تاریخ طبری جلد ۱ سیرۃ النبیؐ صـ ۲۰۵ ـ ۲۰۸

۲۔ بنو نضیر :۔

عمرو بن امیّہ ضمری مدینہ کی طرف واپس ہو رہا تھا۔ تو اُس نے راستہ میں بنو عامر کے دو آدمیوں کو قتل کر دیا۔ حالاں کہ اُن کے ساتھ عہد جوار تھا لیکن عمرو اس امان سے بے خبر تھے۔ عامر بن الطفیل رئیس بنو عامر نے حضورؐ کو اس کے متعلق اطلاع دی اور لکھا کہ باوجود عہد جوار کے آپؐ نے ہمارے دو افراد قتل کر دیئے ہیں۔ اس لیے اُن کی دیت ادا کی جائے۔

اس سے قبل حضورؐ نے بھی اُن کی دیت کا فیصلہ فرمایا تھا۔ آپؐ قبا آئے اور وہاں سے بنی نضیر کی گڑھیوں کا رُخ کیا۔ آپ کے ساتھ دیگر مہاجرین و انصار کے علاوہ حضرت ابو بکر صدیقؓ، عمر فاروقؓ، علی حیدرؓ اور اُسید بن حضیرؓ بھی تھے۔ چونکہ بنی نضیر اور بنو عامرؓ حلیف بھی تھے۔ اس لئے آپ کے وہاں جانے کا مقصد یہ تھا کہ بنو عامر کے ان دو آدمیوں کی دیت کے بارے میں بنو نضیر کا تعاون حاصل کریں۔ چنانچہ جس وقت آپ وہاں پہنچے تو آپ نے اُن سے تعاون کے لیے کہا۔ جس پر انہوں نے کہا، ہاں، اے ابوالقاسم! ہم تعاون کے لیے تیار ہیں۔

لیکن در پردہ ان بدکردار یہودیوں کے عزائم کچھ اور تھے۔ اس لئے وہ آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ حضورؐ اس وقت بنو نضیر کے مکانوں کی ایک دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ یہودیوں نے یہ سازش کی کوئی شخص مکان کی چھت پر چڑھ جائے۔ اور ایک بھاری پتھر حضورؐ پر گرا دے۔ چنانچہ ایک یہودی عمرو بن حجاش اس فاسد ارادے سے مکان کی چھت پر چڑھ گیا۔ اور چاہا کہ بد ارادہ کو عملی جامہ پہنائے کہ اللہ پاک نے اس گھناؤنی سازش کی اطلاع آپؐ کو دے دی آپؐ فوراً اُٹھ کر مدینہ کی طرف چل پڑے صحابہ کو بھی وہیں چھوڑ دیا اور کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ صرف اتنا کہا کہ تم یہاں ٹھیرو، میں ابھی آتا ہوں۔

جب حضور سید الکونینؐ کو آنے میں دیر ہوئی تو صحابہ کرام بھی وہاں سے چل پڑے راستہ میں ایک شخص کی زبانی پتہ چلا کہ آپؐ مدینہ تشریف لے گئے ہیں، تو وہ بھی آپؐ کی خدمت میں وہیں پہنچ گئے۔

آپؐ نے صحابہ کرام کو حقیقت حال سے آگاہ کیا۔ اور حکم دیا کہ یہودیوں سے جنگ کے لیے تیار ہو جائیں اور صحابہ کرام کو ساتھ لے کر بنو نضیر کے مقابلہ کو پہنچ گئے اور اُن کی گڑھیوں کا محاصرہ کر لیا۔ یہودی قلعہ بند ہو گئے تو آپؐ نے حکم دیا۔

" اُن کے تمام نخلستان کاٹ کر جلا دیئے جائیں "

یہودی چیخ اُٹھے۔ تو آپ نے محمد بن مسلمہ کو بُلا کر فرمایا۔ "تم یہودیوں کے پاس فوراً جاؤ۔ اور اُن سے کہو کہ فوراً میرے علاقے خالی کر دیں اور یہاں سے نکل جائیں۔

چنانچہ انہوں نے آپ کا پیغام یہودیوں تک پہنچا دیا۔ یہودی آپ کا حکم ماننے کے لئے تیار ہو گئے۔ لیکن بعض منافقین نے جن کا سرغنہ عبداللہ بن اُبی بن سلول تھا، یہود بنی نضیر کو مدد کا یقین دلایا۔ اور کہا کہ وہ علاقے خالی نہ کریں۔ یہ بھی کہا کہ اگر تم سے قتال کیا گیا۔ تو میں اور میرے دو ہزار ساتھی۔ تمہارا ساتھ دیں گے اور دیس نکالے کی صورت میں بھی ہم تمہارے ساتھ ہوں گے۔ اور اس کے علاوہ بنی قریظہ بھی تمہاری امداد کو آئیں گے۔ لیکن رئیس بنی قریظہ کعب بن اسد نے صاف انکار کر دیا۔

سلام بن مشکم نے حُیَی بن اخطب رئیس بنو نضیر کو مشورہ دیا کہ وہ اور اس کے قبیلہ والے حضورؐ کا فیصلہ تسلیم کر لیں اور گڑھیاں خالی کر دیں تاکہ ہماری جان و مال محفوظ رہے۔ اور اگر ہم نے فیصلہ نہ مانا تو ——

—— ہمارے لڑنے والے افراد تہ تیغ کئے جائیں گے۔

ہمارے بچے اور عورتیں۔ غلام اور لونڈیاں بنا لئے جائیں گے

اور تمام مال و اسباب ضبط کر لیا جائے گا۔

لیکن حُیَیّ بن اخطب ڈٹا رہا۔ اُس نے حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیغام بھیجا "کہ جو جی میں آئے کر لو، ہم تو وطن سے نکلنے سے رہے"۔
یہ کھلا پیغام جنگ تھا۔ حضورؐ نے محاصرہ اور سخت کرنے کا حکم دیا۔ عبداللہ بن اُبَی جس کی امداد کا انھیں مان تھا۔ وہ ان کی مدد کو نہ آیا۔ اس کے ساتھ ہی اللہ نے اُن کے دلوں میں ایسی ہیبت طاری کر دی اور وہ اس قدر بے بس ہو گئے کہ انہوں نے حضور سید الکونین کی خدمت میں درخواست کی۔

۱۔ انھیں قتل نہ کیا جائے۔

۲۔ انھیں جلا وطن کیا جائے۔

اور ۳۔ انھیں اسلحہ وغیرہ چھوڑ کر باقی مال و اسباب لے جانے کی اجازت دی جائے۔ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی درخواست منظور کر لی۔ اور آپؐ نے فیصلہ صادر فرمایا:

فیصلہ ۱ ۱۔ اُن (بنو نضیر) کو قتل نہیں کیا جائے گا۔

۲۔ اُن کے وطن اور زمینوں سے اُن کو بے دخل کیا جاتا ہے۔

۳۔ اُن کو جلا وطن کیا جائے۔

۴۔ البتہ وہ اپنا مال و اسباب ساتھ لے جا سکتے ہیں۔

چنانچہ یہود بنی نضیر اپنے مال و اسباب کے علاوہ اپنے گھروں کی چوکھٹیں تک اکھاڑ کر لے گئے۔ بعض تو خیبر کی طرف گئے اور بعض نے شام کی راہ لی۔

فیصلہ ۲: بنی نضیر اپنی تمام املاک اور بقیہ اموال جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے چھوڑ گئے۔ تاکہ آپ جس طرح چاہیں انھیں اپنے تصرف میں لائیں۔ آپؐ نے ان متروک املاک کے لیے مندرجہ ذیل فیصلہ صادر فرمایا۔

۱۔ یہ اموال و املاک مہاجرینِ اولین میں تقسیم فرما دیں

۲۔ انصار میں سے صرف ابو دجانہؓ اور سماکؓ، جو مفلوک الحال تھے کی امداد فرمائی۔

۳۔ بنو نضیر میں کے دو آدمیوں نے اسلام قبول کیا۔ انھیں اُن کی املاک واپس کر دی گئیں۔

(۱۔ سیرت ابنِ ہشام جلد ۲ صہ ۲۱۵ - ۲۳۴)

(۲۔ تاریخ طبری جلد ۱ : سیرۃ النبی صہ ۲۶۵ - ۲۷۰)

۳۔ غزوۂ خندق: (ا) بنی غطفان

(ب) بنو قریظہ

ا۔ **بنی غطفان**: غزوۂ خندق کے موقعہ پر احزاب کفار کے دس ہزار آدمیوں نے مدینہ کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ ان میں قریش کے جیوش

کے ساتھ دیگر قبائل کے علاوہ بنی غطفان کے جنگجو شامل تھے۔ منافقین کا اندرونی خطرہ اس کے علاوہ تھا۔ محاصرہ نے طول پکڑا۔ تو مسلمان سخت آزمائش میں مبتلا ہوگئے۔ جناب سید المومنین نے حالات کی نزاکت کے پیش نظر عیینہ بن حصین اور حارث بن عوف جو بنی غطفان کے قائدین تھے۔ کو بلا بھیجا آپ نے مدینہ کے پھلوں کی فصل کا ایک تہائی اس شرط پر دینے کی پیش کش کی کہ وہ جناب رسول اللہ اور مسلمانوں کی مخالفت چھوڑ کر اتحادیوں سے الگ ہو جائیں۔ دونوں طرف سے صلح کی پیش رفت ہوئی یہاں تک کہ آپ نے ایک تحریر بھی لکھ دی، لیکن ابھی تک اس پر گواہوں کے دستخط باقی تھے۔ کیوں کہ بنی غطفان کی رضامندی کا مسئلہ درپیش تھا۔ بنی غطفان کے دونوں رئیسوں نے صلح کی گفتگو پر آمادگی کا اظہار کیا۔ اب اس کا آخری اور قطعی فیصلہ ہونا تھا۔ چنانچہ اس کو قطعی شکل دینے کیلئے پہلے آپ نے سعدؓ بن معاذ اور سعدؓ بن عبادہ رئیسانِ انصار کو بلا بھیجا۔ اور ان سے اس گفتگو کا تذکرہ کر کے ان کا مشورہ طلب فرمایا۔ اس پر ان دونوں نے جواب دیا۔

"یا رسول اللہ! اگر یہ آپ کی خوشی ہے تو ہمیں مجالِ انکار نہیں۔ اگر یہ اللہ کا حکم ہے۔ تو اس پر عمل کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔ یا پھر آپ کو ہماری بھلائی منظور ہے؟"

رسول اللہ! اس میں میری ذاتی خواہش کو کوئی دخل نہیں، اس سے محض مجھے تمہاری بھلائی منظور ہے۔ دیکھتے نہیں کہ سارا عرب متحد ہو کر تمہارا استیصال کرنے کے لئے امڈ پڑا ہے۔ راستے مسدود ہو چکے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ کسی نہ کسی حد تک ان کی طاقت توڑ دوں۔

سعدؓ بن معاذ: یا رسول اللہ: اس سے قبل ہم ان ہی کی طرح مشرک و بت پرست تھے۔ ہمیں نہ خدا کی ذات کا علم تھا اور نہ ہی اس کی عبادت سے کام۔ ضیافت اور خریداری کی بات اور ہے یہ لوگ اپنی تمام تر خواہش کے باوجود مدینہ کی ایک کھجور کی طرف بھی نگاہ بد سے نہیں دیکھ سکتے تھے۔

یا رسول اللہ! اب جبکہ اللہ تعالےٰ نے ہمیں آپ کے ذریعے سے ایمان کی نعمت سے سرفراز فرمایا ہے۔ اسلام کے ذریعے ہمیں راہِ مستقیم دکھائی ہے۔ آپ کی اور اسلام کی برکت سے ہمیں عزت کا مقام عطا ہوا ہے ہمیں طاقت بخشی ہے۔ ہمیں غلبہ عطا فرمایا ہے تو ہم انھیں کیسے اپنے اموال حوالے کر سکتے ہیں؟

خدا کی قسم ہم انھیں اپنے اموال ہرگز نہیں دیں گے، ہمیں ان کی شرائط پر صلح کرنے کی ضرورت نہیں، ہاں جواب میں ہماری تلوار حاضر ہے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالےٰ ہمارے اور ان کے درمیان کوئی فیصلہ فرما دے۔

رسول اللہ:۔ اچھا تو تم جانو اور تمہارا کام اور یہ ہے وہ پرچہ، سعدؓ بن معاذ نے وہ پرچہ لے لیا اور وہ تحریر مٹا دی۔ اور کہا:

"یا رسول اللہ! اب وہ ہمارے خلاف قوت آزمائی کر لیں۔"

۱۔ سیرت ابن ہشام جلد ۲ صہ ۲۴۸ ۔ ۲۵۹

۲۔ تاریخ طبری جلد ۱، سیرۃ النبی صہ ۲۸۴ ۔ ۲۸۵

(۳۔ ب) **بنو قریظہ**: بنی قریظہ کا یہودی قبیلہ بھی میثاق مدینہ میں شامل تھا۔ انہوں نے میثاق کی خلاف ورزی میں نہ تو بنو قینقاع

کا ساتھ دیا اور نہ ہی بنی نضیر کی حمایت کی۔ بلکہ میثاق پر قائم رہے۔

غزوۂ احزاب کے محرک یہودی تھے۔ ان میں حُیَیّ بن اخطب رئیس بنو نضیر پیش پیش تھا۔ وہ احزاب کفار کو مدینہ پر چڑھا لایا۔ یہ تعداد میں دس ہزار تھے۔ ان قریش کے بعوش، دیگر قبائل کے علاوہ یہودی بھی شامل تھے۔

جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے دفاعی انتظامات کے لیے مدینہ کے ایک طرف خندق کھدوائی۔ اپنی جمعیت سے کر نکلے اور سلع پہاڑ کے قریب اس طرح پڑاؤ کیا کہ پہاڑ پشت پر تھا۔ جبکہ خندق مسلمانوں اور کفار کے درمیان حائل تھی۔ اس کے علاوہ حضورؐ نے مسلمان عورتوں اور بچوں کو محفوظ گڑھیوں میں منتقل کر دیا تھا۔ جہاں آپؐ نے حسانؓ بن ثابت کو متعین فرمایا۔

حُیَیّ بن اخطب بھی اپنی ریشہ دوانیوں میں مصروف تھا۔ اب اُس نے ایک اور چال چلی۔ اُس نے کعب بن اسد رئیس بنی قریظہ کے ساتھ رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ جب کعب کو پتہ چلا کہ حُیَیّ اُس سے ملنے آ رہا ہے۔ تو اُس نے قلعہ کا دروازہ بند کر دیا اور اُس سے ملنے سے انکار کر دیا۔ حُیَیّ نے کئی حیلے بہانے کئے اور آخر اپنی چکنی چپڑی باتوں سے اُسے شیشہ میں اُتار لیا۔ چنانچہ کعب نے دروازہ کھول دیا۔

حُیَیّ کعب کے قریب بیٹھ گیا اور کہا "میں قریش، بنی غطفان اور دیگر قبائل کا لشکر جرار لے کر آیا ہوں۔ وہ مسلمانوں کا مکمل استیصال کئے بغیر یہاں سے نہیں ٹلیں گے، میرا اُن سے عہد و پیمان ہے۔ لیکن کعب نے حضورؐ کے ساتھ کیا ہوا میثاق توڑنے سے انکار کر دیا۔ اور کہا۔

"تم منحوس اور بدبخت ہو۔ مجھے میری حالت پر چھوڑ دو، میں نے (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میں بجز وفائے عہد اور صداقت کے کچھ نہیں پایا۔ میں اس کی خلاف ورزی کرنے سے رہا۔

لیکن حُیَیّ نے اُس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ سبز باغ دکھائے اور آخر اُسے بدعہدی پر راضی کر لیا۔

جب حضورؐ کو اس امر کا علم ہوا تو آپؐ نے سعدؓ بن معاذ (رئیس اوس) سعد بن عبادہؓ (رئیس خزرج) عبداللہؓ بن رواحہ اور خوات بن جبیرؓ کو حقیقتِ حال معلوم کرنے کے لیے بھیجا۔ اور اُن کو ہدایت فرمائی۔ اگر بات صحیح ہو تو۔ اشارے کنائے میں بات کرنا۔ اور اگر غلط ہو تو تمام لشکر گاہ میں اعلان کر دینا۔

انہوں نے وہاں جا کر کعب بن اسد کے رویہ میں سخت تبدیلی دیکھی۔ اُس نے جناب رسالتمآبؐ کی شان میں گستاخی کرتے ہوئے کہا کہ جاؤ۔ ہم میں اور محمد (ﷺ) میں کوئی پیمان نہیں۔

چونکہ خبر کی تصدیق ہو گئی تھی، اس لئے جب وہ واپس آئے تو حضورؐ کی خدمت میں اشاروں اشاروں میں تصدیق کر دی۔

محاصرہ کے دوران یہودیوں نے ایک اور قدم اٹھایا اور بدعہدی کی بدترین مثال قائم کر دی۔ انہوں نے اپنا ایک آدمی اُن گڑھیوں کی طرف بھیجا جہاں مسلمان خواتین اور بچے پناہ گزین تھے۔ تاکہ صورتِ حال کا مشاہدہ کرے۔ تاکہ کوئی کارروائی کی جا سکے۔

حضرت صفیہ فرماتی ہیں کہ ہمارے پاس سوائے حضرت حسانؓ بن ثابت کے کوئی دوسرا مرد نہیں تھا۔ وہ شخص (یہودی) ہمارے گڑھیوں کے گرد چکر کاٹنے لگا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ اندر سے حملہ کر کے مسلمانوں کو نازک حالات سے دوچار کر دیا جائے۔"

حضرت صفیہؓ نے حسانؓ کو اسے قتل کرنے کو کہا۔ لیکن حسانؓ میں جرأت نہیں تھی۔ چنانچہ انہوں نے خود خیمہ کی ایک چوب ہاتھ میں لی۔ قلعہ سے نیچے اتریں، یہودی کو قتل کیا اور اس کا سر کاٹ کر یہودیوں کی طرف پھینک دیا۔ پھر یہودیوں کو ان گڑھیوں کی طرف آنے کی جرأت نہیں ہوئی۔

انہی دنوں نعیم بن مسعودؓ جن کا تعلق بنی غطفان سے تھا۔ حضور کی خدمت میں آئے اور عرض کیا۔

یا رسول اللہؐ! میں تو اسلام قبول کر چکا ہوں۔ لیکن میرے اسلام لانے کا حال میری قوم کو معلوم نہیں۔ اب جناب کا جو حکم ہو فرمایئے۔ میں حاضر ہوں۔ اگر آپ کا حکم ہو تو ایک چال کے ذریعے قریش اور بنو قریظہ کے درمیان پھوٹ ڈال دی جائے۔

اس پر حضورؐ نے فرمایا۔ اے نعیم الحرب خدعۃ (لڑائی چال سے سرزد ہوتی ہے)۔ تم ہم میں اکیلے ہو، ہم سے علاحدہ ہو جاؤ اور کوئی تدبیر ایسی کرو کہ ان مشرکوں میں تفرقہ پڑ جائے۔

چنانچہ نعیم بن مسعود نے پہلے تو کمال ہوشیاری سے بنی قریظہ کو قریش سے بدظن کیا۔ اور پھر قریش کے پاس آکر ایسی چال چلی کہ اُن کے دل میں بنی قریظہ سے متعلق شکوک پیدا ہو گئے۔

چنانچہ قریش بددل ہو گئے۔ اتنے میں اللہ تعالےٰ نے طوفان کی صورت میں اُن پر بلائے آسمانی نازل فرما دی۔ قریش نے خوفزدہ ہو کر محاصرہ اُٹھا لیا اور مکہ کی راہ لی۔

بنی غطفان اور دیگر قبائل بھی چلتے بنے۔

صبح ہوئی تو جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم تمام مسلمانوں کے ساتھ واپس مدینہ تشریف لے آئے۔ اور سب نے ہتھیار اُتار دیئے۔ لیکن ظہر کے وقت حضرت جبریل حضورؐ کی خدمت میں اللہ کا حکم لے کر آئے کہ فوراً بنی قریظہ کی طرف پیش قدمی کرو۔

چنانچہ اعلان کر دیا گیا کہ جو شخص اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی اطاعت کا دم بھرتا ہے وہ بنی قریظہ کی گڑھیوں میں جاکر نماز عصر ادا کرے۔ کوچ فوراً عمل میں آیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی بمعہ اپنے جان نثاروں کے وہاں پہنچ گئے۔ حضورؐ نے فوراً ہی بنی قریظہ کی بستیوں کا محاصرہ کر لیا۔ جو تقریباً پچیس دن جاری رہا۔

اللہ نے بنی قریظہ کے دل میں خوف و دہشت ڈال دی۔ یہودیوں کو یقین ہو گیا کہ جناب رسول اللہ صلعم جب تک مقاتلہ نہیں کر لیں گے، واپس نہیں ہوں گے۔

بنی قریظہ نے مصائب سے تنگ آکر حضور کو پیغام بھیجا کہ ہمارے معاملہ کا حکم سعد بن معاذ کو بنایا جائے۔ اُن کا فیصلہ ہمیں منظور ہوگا۔

تو حضورؐ نے بنی قریظہ کو حکم دیا کہ وہ قلعوں سے نیچے آئیں۔ صبح ہوئی تو بنی قریظہ گڑھیوں سے نیچے اُتر آئے۔ اُنھیں گرفتار کر لیا گیا۔ بنی اوس دوڑ کر حضور رحمت للعالمین کی خدمت میں پہنچے اور لگے بنی قریظہ کے حق میں سفارش کرنے انہوں نے عرض کی، یا رسول اللہ جس طرح آپ نے بنی خزرج کی سفارش پر بنو قینقاع کی جان بخشی کی۔ اسی طرح بنو قریظہ پر بھی رحم فرمائیں۔

اس پر آپ نے فرمایا۔ اے گروہ اوس! کیا تم اس بات سے خوش ہو گے اگر میں تم میں کا ایک آدمی حکم مقرر کر دوں۔ اُن

کے بارے میں جو فیصلہ وہ کرے ۔ تمھیں منظور ہوگا ۔

بنی اوس ۔ یا رسول اللہؐ ! ہمیں منظور ہے ۔

رسول اللہ : تو سنو ، تمہارے سردار سعد بن معاذ کو حکم بنایا جاتا ہے ۔

سعد چونکہ زخمی تھے ۔ اس لئے وہ اس خیمہ میں جو مسجد نبوی میں خاص اُن کے لیے نصب کیا گیا تھا ، مقیم تھے ۔ یہ سنتے ہی لوگ اُن کے پاس گئے اور انھیں سوار کرکے حضورؐ کی خدمت میں لائے ۔ راستہ میں انہوں نے حضرت سعد سے کہا ۔ اے ابو عمرو ! اپنے حلیفوں کے معاملے میں نرمی سے کام لینا ۔ جب بار بار انہوں نے اصرار کیا تو سعد نے کہا " اب سعد کے لئے وقت آگیا ہے ۔ کہ وہ اللہ کے معاملے میں لومۃ لائم کی پروا نہ کرے ۔ جب سعد حضورؐ کے قریب پہنچے تو حضورؐ نے فرمایا ۔ اپنے سردار کا احترام کرو ، تمام صحابہ نے اُن کا استقبال کیا اور کہا ۔ اے ابو عمرو ! جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمھیں تمہارے حلیفوں کے معاملے میں حکم بنایا ہے ۔ سعد نے کہا ۔ ہاں ، لیکن تم اللہ کے سامنے اس بات کا پختہ اقرار کرو کہ جو فیصلہ میں دوں گا ۔ وہ تمہیں قبول ہوگا ۔ اور اس پہ قائم رہو گے ۔

سب نے کہا ۔ ہاں ۔

پھر سعد نے اُس طرف رُخ کرکے جس طرف جناب رسالتمآب تشریف فرما تھے ۔ وہی بات دُہرائی تو جناب رسول اللہ نے بنفسِ نفیس فرمایا ۔ ہاں ، میں اس پہ صاد کروں گا ۔ اس پہ سعد نے مندرجہ ذیل فیصلہ دیا ۔

۱ ۔ اُن کے سارے مرد تہ تیغ کئے جائیں ۔

۲ ۔ اُن کی املاک اور اموال تقسیم کر دئے جائیں ۔

اور ۳ ۔ اُن کے بیوی بچوں کو لونڈی اور غلام بنایا جائے ۔

حضور رسالتمآب نے اس فیصلہ کی تصدیق کرتے ہوئے فرمایا ۔ سعد ! تم نے بنو قریظہ کے معاملہ میں اللہ کے حکم کے عین مطابق کیا ہے ۔ جس کا نزول آسمانوں سے ہوا ۔

پھر آپ مدینہ کے بازار کی طرف آئے ، وہاں خندقیں کھدوائیں ۔ اور پھر چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بنو قریظہ کے تمام مردوں کو لاکر اُن کی گردنیں ماردی گئیں ۔ ان قتل ہونے والوں میں رئیس بنو نضیر حیّی بن اخطب اور رئیس بنو قریظہ کعب بن اسد بھی شامل تھے یہ تعداد میں قریب قریب سات سو تھے ۔

بنی قریظہ کی صرف ایک عورت ، جس کا نام بنانہ تھا ۔ کو قصاص میں قتل کیا گیا ۔ یہ وہی عورت تھی جس نے خلاد بن سوید پر چکی پھینک کر اُسے قتل کیا تھا ۔

ایک لڑکے رفاعہ بن سموئیل کو سلمٰی بنت قیس جو رشتہ میں حضورؐ کی خالہ تھیں ۔ کے کہنے پہ رہا کیا گیا اور اُسے سلمٰی کے سوا لے کیا گیا ۔

اس سے فارغ ہو کر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق اموال غنیمت کی تقسیم مندرجہ ذیل طریقے پہ کی گئی ۔

۱۔ سب سے پہلے خمس نکالا گیا۔
۲۔ بنو قریظہ کے اموال اور ان کی عورتوں اور بچّوں کو مسلمانوں میں تقسیم کیا گیا۔
۳۔ سوار اور پیادہ لوگوں کے حصے مقرر کئے گئے۔
(ا) سوار کے تین حصّے۔ دو اس کے مرکب کے اور ایک اس کا ذاتی حصہ۔
(ب) پیادہ کا ایک حصہ۔
یہ پہلا مال غنیمت تھا۔ جس میں حصّوں کا تعین کیا گیا اور خمس نکالا گیا۔
جناب سیدالکونین صلی اللہ علیہ وسلم نے اموال غنیمت کی تقسیم کے طریقۂ کار کی جو مثال قائم فرمادی۔ اس کے مطابق اموالِ غنیمت کا اصول اور قانون قائم ہو گیا۔
بنو قریظہ کی عورتوں اور بچوں کو غلام اور کنیز کے طور پر شام میں فروخت کیا گیا۔

۱۔ سیرت ابن ہشام جلد ۲ صـ ۲۴۴ - ۲۸۷
۲۔ تاریخ طبری جلد اول؛ سیرۃ النبیؐ صـ ۲۷۰ - ۳۰۵

۳۔ غزوۂ خیبر ۷ھ

حدیبیہ سے واپسی کے بعد جناب سیدالکونین صلی اللہ علیہ وسلم تقریباً ۲ ماہ مدینہ میں مقیم رہے۔ آپ ۷ھ اواخر محرم میں خیبر کے لیے نکلے اور مختلف منازل طے کرتے ہوئے رجیع کے مقام پر پڑاؤ ڈالا، یہ مقام خیبر اور غطفان کی آبادیوں کے درمیان تھا۔ مقصد یہ تھا کہ بنی غطفان جو اہلِ خیبر کے حلیف تھے۔ اہلِ خیبر کی مدد کو نہ آسکیں۔ جب بنی غطفان کو حضورؐ کی پیش قدمی کا علم ہوا۔ تو وہ اپنی جمعیت سے کر روانہ ہوئے۔ ابھی ایک منزل ہی طے کی تھی کہ ان پر خوف طاری ہوا، اور وہ واپس اپنی آبادیوں کی طرف لوٹ گئے۔

جناب رسالتمآبؐ نے یہودیوں کی گڑھیوں کو فتح کرنا شروع کیا۔ جو گڑھی فتح ہوتی۔ وہاں کے یہودیوں کی املاک اور جائداد قبضے میں کر لیتے۔ سب سے پہلے آپ نے قلعہ حصن ناعم کو فتح کیا۔ پھر حصن قموص اور ابن ابی الحقیق کی گڑھیاں مسلمانوں کے قبضہ میں آئیں۔ یہاں پر اموال غنیمت، بہت سے لونڈی اور غلام آپ کے قبضے میں آئے۔ ان میں حضرت صفیہؓ بنت حیّی بن اخطب اور اس کی دو چچیری بہنیں آپ کے ہاتھ آئیں۔ آپ نے حضرت صفیہؓ جو کنانہ بن الربیع کی بیوی تھیں کو اپنے لیے مخصوص کر لیا اور مندرجہ ذیل احکامات جاری فرمائے۔

۱۔ گھروں میں پلے ہوئے گدھوں کا گوشت نہ کھایا جائے۔
۲۔ حاملہ قیدی عورتوں سے صحبت نہ کی جائے۔
۳۔ درندوں کا گوشت نہ کھایا جائے۔

۴۔ تقسیم سے پہلے مالِ غنیمت کی خرید و فروخت نہ کی جائے۔
اس کے بعد قلعہ صعب بن معاذ، اور دیگر قلعے فتح ہو گئے۔ جب باقی کے سارے قلعوں پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ تو یہودیوں کے لیے سوائے وطیح اور سلالم کے قلعوں کے اور کوئی جائے پناہ نہ رہی۔ خیبر کے تمام یہودی سمٹ کر ان قلعوں میں جمع ہو گئے۔
جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دو قلعوں کا محاصرہ کر لیا اور حصار تنگ کرتے چلے گئے۔ اور ساتھ ہی اس کے نزدیکی گڑھ شق، نطاۃ اور کتیبہ وغیرہ پر بھی قبضہ کر لیا۔ اب محصور یہودیوں کو یقین ہو گیا۔ کہ وہ ہلاک ہو جائیں گے۔ پورے دس روز سے وہ محصور تھے اور کوئی راہ نکل نہیں رہی تھی اس لیے انہوں نے جناب رسالتمآب کی خدمت میں درخواست کی۔
یا رسول اللہ۔ ہمیں وطن سے نکل جانے دیجئے اور جانوں کی امان دی جائے۔
آپؐ نے اہلِ خیبر کی درخواست منظور فرمائی۔
اس سے قبل جس قدر قلعے اور گڑھیاں فتح ہو چکی تھیں۔ وہ سارا مال و اسباب جو ان قلعوں میں ملا۔ آپ اس پر قبضہ فرما چکے تھے۔ اب ان دو قلعوں کے اموال بھی آپؐ کے قبضے میں آ گئے۔
اہلِ فدک کو جب اہلِ خیبر کے حشر سے متعلق علم ہوا۔ تو انہوں نے اسی میں عافیت دیکھی کہ حضورؐ سے امان کی درخواست کی جائے۔ چنانچہ انہوں نے درخواست بھیجی کہ:

۱۔ اُن کو جان کی امان دی جائے۔
۲۔ اُن کو جلا وطن کیا جائے۔
اور ۳۔ وہ اپنی تمام املاک مسلمانوں کے لیے چھوڑ جائیں گے۔

جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی درخواست بھی منظور فرمائی۔
جب خیبر کے یہودیوں نے اپنے آپ کو حضورؐ کے حوالے کر دیا۔ تو انہوں نے بنی حارثہ کے محیصہ بن مسعود کو وکیل بنا کر معاملات طے کرنے کے لیے جنابِ رسالتمآب کی خدمت میں درخواست پیش کی۔ یہ دوسری درخواست تھی۔
یا رسول اللہؐ! ہمیں کھیتی باڑی کا مسلمانوں کی نسبت علم بھی زیادہ ہے اور تجربہ بھی، اور ہم بہترین مزارعین بھی ہیں۔
آپ ہمیں یہاں رہنے کی اجازت دیں ہم زمینیں کاشت کریں گے اور نصف پیداوار بطور لگان / خراج آپ کے حوالے کریں گے۔ اس لیے آپ ہمارے ساتھ نصف نصف پر معاملہ فرما لیجئے۔
جناب رسالتمآب نے اُن کی درخواست اس شرط پر منظور فرمائی۔ کہ جب بھی ضرورت در پیش آئی۔ یا ہم نے چاہا۔ تو تمہیں بیدخل کر کے یہاں سے نکال دیا جائے گا۔
اہلِ خیبر نے یہ شرط منظور کر لی۔
اہلِ فدک نے بھی انہی شرائط پر صلح کر لی۔
اس کے بعد:

۱۔ سارا خیبر تمام مسلمانوں کے لیے مال غنیمت قرار دیا گیا۔
۲۔ فدک چوں کہ بغیر رزم آرائی کے فتح ہوا، اس لئے اُسے فے قرار دیا گیا اور جناب سیدالمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مخصوص کیا گیا۔

۱۔ سیرۃ ابن ہشام جلد ۲ صہ ۳۹۲-۴۳۰
۲۔ تاریخ طبری جلد ۱ سیرۃ النبی صہ ۳۵۸-۳۶۶

---

(۴)

فتح مکہ :-

فتح مکہ اسلام کی سربلندی اور رفعت کا دن تھا۔

قریش مکہ نے اسلام قبول کر کے اپنا کھویا ہوا وقار بحال کیا اور انھیں سرفرازی ملی جناب ختمی مرتبت، رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر شخص کو جان کی امان دی ۔۔ او سا پنے اُن دشمنوں کو بھی معاف کر دیا۔ جنہوں نے آپ پہ اور آپ کے جان نثاروں پہ ہر طرح کے ظلم وستم آزمائے۔ گھر سے نکالا، ایذائیں دیں۔ ہجرت کے بعد یلغاریں کیں۔ تاکہ اسلام اور اسلام کے نام لیوا مٹ جائیں۔ لیکن حبیب اللہ تعالیٰ نے آپ کو عظیم فتح سے سرفراز فرمایا۔ تو آپ نے فرمایا :

"لا تثریب علیکم الیوم"

صرف چند اشخاص تھے جنھیں سیدالکونین صلی اللہ علیہ وسلم نے واجب القتل قرار دیا اور ان کے قتل کے احکامات بھی جاری فرمائے۔ لیکن شانِ رحمت و رافت کے کیا کہنے، ان میں سے بھی جس نے سر نیاز خم کر دیا۔ یا جن کے لیے اُن کے اپنوں نے سرور عالم سے معافی طلب کی۔ اُن کی خطائیں بخش دیں اور انھیں بھی جان کی امان دی گئی۔

واجب القتل افراد کے نام مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ عبداللہ بن خطل	۶۔ بی بی سارہ (ہجوگو)
۲۔ مقیس بن صُبابہ	۷۔ حبار بن الاسود۔
۳۔ قریبہ (کنیز)	۸۔ عبداللہ بن سعد بن ابی سرح
۴۔ حویرث بن نقیذ	۹۔ عکرمہ بن ابوجہل
۵۔ فرتنی (کنیز)	۱۰۔ صفوان بن اُمیّہ

حضورؐ کے فیصلہ کی اہمیت ظاہر کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ان مباح الدم افراد کے جرائم کا مختصر سا حال بیان کیا جائے۔ تاکہ اس سزا کا پس منظر معلوم ہو سکے :۔

۱۔ عبداللہ بن خطل : اس کا تعلق بنی تیم بن غالب سے تھا۔ یہ مسلمان تھا۔ اسے جناب رسالت مآب نے عامل بنا کر صدقات وصول

کرنے کے لیے ایک انصاری کے ساتھ بھیجا۔ ان کے ساتھ ایک مسلمان مولی بھی تھا۔ جو اس کی خدمت پر مامور تھا۔ ابن خطل نے ایک منزل پر پڑاؤ کیا۔ تو اپنے غلام کو حکم دیا کہ بکرا ذبح کرکے کھانا تیار کرے۔ خود سو گیا، جب بیدار ہوا تو دیکھا کہ ابھی تک کھانا تیار نہیں تھا۔ ابن خطل نے خدمت گار کو غصے میں قتل کر دیا اور خود مرتد ہو گیا اس نے دو جرائم کا ارتکاب کیا قتل ناحق اور ارتداد۔

اس لیے اس دوہرے جرم کی وجہ سے آپ نے اس کے قتل کا حکم دے دیا۔

۲۔ مقیس بن حبابہ:۔ یہ اور اس کا بھائی مسلمان ہو کر مدینہ آئے اور وہیں رہنے لگے، ایک انصاری نے غلطی سے مقیس کے بھائی کو قتل کر دیا۔ اس لیے اس کی دیت ادا کر دی گئی۔ لیکن مقیس کا غصہ ٹھنڈا نہ ہوا، چنانچہ اس نے موقع ملتے ہی جان بوجھ کر انصاری کو قتل کر دیا۔ پھر بھی اس کی آگ نہ بجھی اور مرتد ہو کر مکہ چلا گیا اور مشرکوں سے مل گیا۔

اس کا جرم بھی دُہرا تھا۔ قتل عمداً اور ارتداد۔

اس بنا پر اس کو قتل کر دیا گیا۔

۳۔ قُریبہ:۔ یہ ابن خطل کی کنیز تھی۔ وہ اپنے آقا کے حکم پر جناب رسالت مآبؐ کی ہجو گایا کرتی تھی۔ قتل کا حکم سننے کے باوجود نہ توبہ کی اور نہ معافی طلب کی۔

اس لیے اس جرم میں اسے بھی قتل کر دیا گیا۔

۴۔ حویرث بن نقیذ بن وہب بن عبد قصی:۔ یہ شخص مکہ میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قیام مکہ کے زمانے میں ایذا دیتا تھا۔ دوسرا قصور اس کا یہ تھا کہ حضرت زینب بنت رسول اللہ کے اونٹ کو مار کر بھگانے میں یہ ہبار بن الاسود کا شریک کار تھا۔ سیدہ زینبؓ اونٹ سے گر پڑی تھیں جس سے ان کا حمل ساقط ہو گیا۔ یہ بدبخت بھی حضورؐ سے معافی مانگنے نہ آیا۔ اس لیے اسے بھی قتل کر دیا گیا۔

۵۔ فرتنی:۔ یہ عورت بھی ابن خطل کی کنیز تھی اور حضورؐ کی ہجو گانے میں قُریبہ کا ساتھ دیتی تھی۔ آپ نے اس کے قتل کا حکم صادر فرمایا۔ تو اس نے توبہ کی اور حضورؐ سے معافی طلب کی۔

جناب رسالتمآب نے اس کی جان بخشی فرمائی۔

۶۔ سارہ:۔ یہ بنی عبدالمطلب کے کسی فرد کی کنیز تھی۔ یہ ہجو یہ اشعار سُر تال سے گا گا کر دشمنانِ اسلام کو مسلمانوں کے خلاف اشتعال دلاتی تھی۔ اس کے قتل کا حکم دیا۔ تو یہ تائب ہوئی اور ہبار بن الاسود کو سفارش کے لیے حضورؐ کی خدمت میں بھیجا۔ آپ نے اس کی جان بخشی فرمائی۔ وہ حضورؐ کے عفو و کرم سے اس قدر متاثر ہوئی کہ اسلام لے آئی۔

۷۔ ہبار بن الاسود:۔ اس نے سیدہ زینب بنت رسول اللہ صلعم کے اونٹ کو زور سے کونچا دیا تھا۔ جس سے وہ سرپٹ دوڑا۔ سیدہ گر گئیں اور ان کا حمل ساقط ہو گیا۔ آپ نے اس کے قتل کا حکم صادر فرمایا۔ یہ اپنے قتل کی خبر سن کر پہلے تو روپوش ہو گیا۔ لیکن فوراً ہی حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، توبہ کی۔ حضور سے معافی اور جان بخشی کی درخواست کی۔ سرچشمۂ عفو و رحمت نے اس کی جان بخشی فرما دی۔

۸۔ عبداللہ بن سعد بن ابی سرح :۔ یہ شخص جب مسلمان ہوا تو حضورؐ نے اُس کو کاتب وحی بنایا۔ لیکن فریب نفس میں آکر مرتد ہوگیا مدینہ سے فرار ہوکر مکہ پہنچ گیا۔ جہاں وہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف سازشوں میں مصروف رہا۔ یہاں تک کہ وحی و الہام تک کا دعویٰ کر بیٹھا۔ فتح مکہ کے موقعہ پر آں حضورؐ نے جن لوگوں کو قتل کرنے کا حکم دیا چاہے وہ کعبہ کے پردوں میں بھی پناہ لیں۔ ان میں ابن سعد بھی شامل تھا۔ اس کے قتل کا حکم اس لیے دیا گیا کہ یہ مرتد ہوگیا تھا۔ اُس نے حضورؐ کے مکہ میں داخلہ کے وقت حضرت عثمان غنیؓ کے ہاں پناہ لی۔ حضرت ذوالنورینؓ نے اُسے پناہ دی۔ جب حالات پُرسکون ہوئے تو وہ ابن سعد کو لے کر حضورؐ کی خدمت میں پہنچے اور اس کے لیے حضورؐ کی خدمت میں امان کی درخواست کی۔ پہلے تو آپ خاموش رہے پھر آپ نے اُسے بھی معاف فرما دیا۔ جب حضرت عثمانؓ اُن کو واپس لے گئے تو صحابہ نے حضورؐ سے خاموش رہنے کا سبب دریافت کیا۔ آپ نے فرمایا "میں نے سکوت اس لیے اختیار کیا کہ کوئی خدا کا بندہ اُٹھ کر اُس کی گردن اُڑا دے"۔ ایک انصاری نے کہا۔ یا رسول اللہ آپ مجھے اشارہ ہی کر دیتے۔ تو حضور سید المرسلینؐ نے فرمایا:

"کسی نبی کے لیے یہ زیبا نہیں کہ وہ اشارے سے قتل کرائے۔"

۹۔ عکرمہ بن ابی جہل :۔ یہ شخص بنو مخزوم سے تھا۔ اور اسلام، رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کا بدترین دشمن تھا ہمیشہ مسلمانوں کے خلاف ریشہ دوانیوں میں مصروف رہتا۔ یہاں تک کہ فتح مکہ کے روز بھی رزم آرائی سے باز نہ رہا۔ مگر غلبۂ اسلام کے خوف سے فرار ہوکر یمن چلا گیا۔ اس کی بیوی ام حکیم بنت حارث اسلام لے آئی اور اپنے خاوند کے لیے امن و معافی کی درخواست کی۔ آپ نے از راہ لطف و کرم اُسے منظور فرمایا۔ چنانچہ ام حکیم یمن پہنچی اور اپنے خاوند عکرمہ بن ابو جہل کو سمجھا بجھا کر حضورؐ کی خدمت میں لے آئی۔ جہاں وہ اسلام لے آیا۔

۱۰۔ صفوان بن اُمیّہ :۔ جب بنو بکر نے رات کی تاریکی میں بنو خزاعہ پر شبخون مارا۔ تو اس کا محرک بھی اور اس معرکہ میں شریک بھی صفوان بن اُمیہ تھا۔ چونکہ بنو خزاعہ مسلمانوں کے حلیف تھے۔ اس لئے جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم نے دیت کا مطالبہ کیا۔ تو انہوں نے انکار کر دیا۔ اس بنا پر۔ قصاص میں صفوان بن اُمیہ کو واجب القتل قرار دیا گیا۔ یہ خوف کے مارے ساحل سمندر۔ (الشعیبہ کے نزدیک جدّہ) چلا گیا۔ وہاں سے یمن فرار ہونا چاہتا تھا۔ اس کے عم زاد بھائی عمیر بن وہب نے حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوکر اُس کے لیے امان طلب کی، حضور نے منظور فرمائی اور نشانی کے طور پر اپنا عمامہ عمیر کے حوالے کیا۔ وہ گئے اور صفوان کو امان کی نشانی دکھا کر۔ حضورؐ کی خدمت میں حاضر کیا۔ اُس نے اسلام قبول کرنے کے لئے دو ماہ کی مہلت طلب کی، حضورؐ نے از راہ عفو و کرم اُسے چار ماہ کی مہلت دے دی۔

غزوہ حنین میں جب اُس نے حضور سید الکونین کی شفقت اور جذبۂ ترحم اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ تو اسلام لے آیا۔

۱۔ سیرت ابن ہشام جلد ۲ صـ ۴۶۹ — ۴۹۰

۲۔ تاریخ طبری جلد ۱ سیرۃ النبیؐ صـ ۲۰۹-۲۴۸

جاسوس کی سزا کا فیصلہ

ایک بار کسی غزوہ کے سلسلے میں جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم ایک منزل پر پڑاؤ کئے ہوتے تھے۔ تو ایک مشرک کو دیکھا گیا جو وہاں جاسوسی کی غرض سے آیا ہوا تھا۔ اس کی اطلاع جب آپ کو ملی تو وہ واپس ہونے کو تھا۔ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ

"جاسوس کو قتل کر دو"۔

چنانچہ ایک شخص فوراً ہی گھوڑے پر سوار ہو کر اس کے تعاقب میں روانہ ہوا۔ اُسے راستہ میں جا لیا اور گرفتار کر کے قتل کر دیا۔ اس کے بعد مقتول کے سامان کو بھی قبضہ میں لے لیا۔

جب وہ حضور کی خدمت میں واپس ہوا۔ تو آپ نے مقتول کا سامان جاسوس کو قتل کرنے والے مجاہد کو مال غنیمت کے طور پر عطا فرما دیا۔

صحیح بخاری

(۶)

سفراء:

مسیلمہ کذاب نے ایک خط دو قاصدوں کے ہاتھ میں جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا۔ جب آپ خط سماعت فرما چکے تو آپ نے قاصدوں سے سوال کیا۔

رسول اللہ: تمہارا مسلک کیا ہے؟

سفراءؑ: جو کچھ مسیلمہ (کذّاب) کہتا ہے، وہی ہمارا مسلک ہے

رسول اللہ:۔ اگر سفیروں کا قتل قانونی طور پر جائز ہوتا۔ تو میں دونوں کی گردنیں اڑا دیتا۔

(سنن ابی داؤد)

(۷)

حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ:

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ احزاب کے دوران فرمایا۔ کون ہے جو دشمن سے متعلق اطلاعات ہمیں فراہم کرے"

زبیرؓ اٹھے اور عرض کیا: "یا رسول اللہؐ میں اس کے لیے تیار ہوں"

جناب رسالتمآبؐ نے دوبارہ فرمایا "دشمن کی جاسوسی کے لیے کون اپنا آپ پیش کرتا ہے"۔

زبیرؓ نے دوبارہ عرض کیا: "یا رسول اللہ۔ میں حاضر ہوں"۔

یہ سن کر جناب رسالتمآبؐ نے فرمایا "ہر پیغمبر کا ایک حواری ہوتا ہے۔ اور میرا حواری زبیرؓ ہے"۔

صحیح بخاری جلد ۳ : کتاب الجہاد والسیر صفحہ ۴۲

اہلِ کتاب اور جزیہ

۹ھ میں نجران کے عیسائیوں کا ایک وفد جناب سید الکونین کی خدمت میں آیا یہ کل ساٹھ افراد تھے۔ ان میں چودہ سربرآوردہ آدمی شامل تھے۔ عاقب عبدالمسیح رئیس وفد تھا جبکہ سید ایہم مشیر و منتظم۔ ان کا اسقف اعظم ابو حارثہ بن علقمہ بھی ان کے ساتھ تھا۔ یہ شخص اصلاً عرب تھا اور قبیلۂ بکر بن وائل سے تھا۔ لیکن عیسائیت قبول کر لی تھی اور اپنے علم و فضل کی بدولت اسے اسقفِ اعظم کا مرتبہ ملا۔ جب وفد کے ارکان مدینہ منورہ پہنچے۔ تو جنابِ رسالتمآب نے انھیں مسجدِ نبوی میں ٹھیرایا۔ یہ لوگ حضورؐ کے پاس مُناظرہ کے لیے آئے تھے۔

چنانچہ دوران قیام۔ انہوں نے حضرت عیسٰی علیہ السلام کی ابنیت اور الوہیت جیسے مسائل بحث کے لئے حضورؐ کے سامنے پیش کئے۔ حضورؐ نے نہایت ہی دل نشین انداز میں قطعی دلائل سے اُن پر ان مسائل کی حقیقت واضح کی اور ثابت فرمایا کہ یہ عقاید باطل ہیں۔

نجران کے نصاریٰ پر اگرچہ حق واضح ہو گیا۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے جان بوجھ کر اتباعِ حق سے انکار کر دیا۔ اس پر قرآن کی یہ آیات۔

الٓمٓ اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ..... لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھوالعزیز الحکیم ٥ (آل عمران ۱-۶)

اور

اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ .... لَعْنَۃَ اللّٰہِ علی الکٰذِبِیْنَ ٥ (آل عمران ۵۹-۶۱)

نازل ہوئیں۔ تو جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم مباہلہ کے لیے تیار ہو گئے۔ اور اگلے روز آپؐ حضرت علی حیدر رضؓ، سیدالنساءؓ فاطمۃ الزہراؓ اور جناب حسنینؓ کو اپنے ہمراہ لے کر باہر تشریف لائے۔ نجرانی عیسائیوں نے جب یہ مبارک نورانی چہرے دیکھے۔ تو وہ دہل گئے۔ مباہلہ سے باز آئے اور مہلت مانگی۔ انہوں نے باہم مشورہ کیا تو عاقب عبدالمسیح نے کہا "خدا کی قسم، تمھیں اچھی طرح علم ہے۔ کہ یہ شخص نبیؐ مرسل ہے، تم نے اگر مباہلہ کی جرأت کی۔ تو تباہ و برباد ہو جاؤ گے، بخدا میں ایسے ملکوتی چہرے دیکھ رہا ہوں۔ کہ اگر یہ دعا کریں تو پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل جائیں۔ آپؐ نے حضرت عیسٰی کے بارے میں جو کچھ فرمایا ہے۔ قولِ فیصل ہے۔ بہتر ہے، مباہلہ نہ کرو۔ ورنہ ہلاکت و بربادی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔ امن چاہتے ہو۔ اور اپنے دین پر قائم رہنا چاہتے ہو تو صلح کر لو ——

چنانچہ انہوں نے حضور کی خدمت میں صلح کی درخواست کی اور سالانہ جزیہ ادا کرنے کی پیش کش کی۔ چنانچہ انکی درخواست

پر حضورؐ نے صلح کرنے کا فیصلہ فرمایا جزیہ کی شرط پر اور اس غرض کے لئے ایک صلح نامہ تحریر کروایا۔ جس کی اہم دفعات حسب ذیل ہیں۔

۱۔ اہل نجران ہر سال دو ہزار حُلّے ادا کریں گے، ایک ہزار ماہ رجب میں اور ایک ہزار ماہ صفر میں، اور ہر حُلّہ کی قیمت چالیس درہم ہوگی۔

۲۔ اہل نجران پر لازم ہوگا کہ وہ جناب رسالتمآب کے سفیر کی ایک ماہ تک مہمانی کریں۔

۳۔ یمن میں اگر کوئی شورش یا فتنہ برپا ہوا۔ تو اہل نجران کے لیے ضروری ہے کہ وہ ۳۰ گھوڑے ۳۰ زرہیں اور ۳۰ اونٹ عاریتاً دیں گے۔ بعد میں یہ چیزیں اُن کو واپس کر دی جائیں گی۔ ہاں اگر کوئی چیز گم یا ضائع ہوئی۔ تو اس کی ذمہ داری ہم پر ہوگی۔

۴۔ اس کے بدلے اللہ اور اللہ کا رسول اُن کے جان و مال کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔ اُن کے اموال و املاک۔ ان کی زمینیں، ان کی جائیدادیں۔ اُن کے حقوق۔ اُن کا مذہب و ملت، اُن کے قسیس و راہب ان کے خاندان او متبعین۔ اُن سب کی حیثیت اپنی جگہ برقرار رہے گی۔

۵۔ جاہلیت کے کسی خون کا مطالبہ اُن سے نہیں کیا جائے گا۔

۶۔ اُن کی سرزمین میں کوئی لشکر داخل نہیں ہوگا۔

۷۔ جو شخص اُن سے حق کا مطالبہ کرے گا۔ تو ظالم و مظلوم کے درمیان انصاف کیا جائے گا۔

۸۔ جو شخص سود کھائے۔ ہم اُس سے بری الذمہ ہیں۔

۹۔ اگر کوئی شخص ظلم و زیادتی کرے گا۔ تو اس کے بدلہ میں کسی دوسرے شخص پر گرفت نہیں کی جائے گی۔

سیرۃ المصطفےٰ جلد ۳ صفحہ ۲۷۸-۲۸۳

بحوالہ: ۱۔ فتح الباری جلد ۸ صفحہ ۷۳ / ۲۔ شرح المواہب جلد ۴ صفحہ ۱۴
۳۔ تفسیر دُرِّ منثور جلد ۲ صفحہ ۳۸ / ۴۔ زاد المعاد جلد ۲ صفحہ ۴

۴: ابواب النکاح والطلاق

۱:۔ باب النکاح

ارشادِ سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم

۱۔ کسی بیوہ کا نکاح اس کی مرضی کے بغیر نہ کیا جائے۔

اور ۲۔ کسی کنواری کا نکاح بھی اس کی اجازت کے بغیر کرنا جائز نہیں۔

صحابہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! لیکن (کنواری) کی مرضی کا پتہ کیوں کر چلے گا۔

آپ نے فرمایا :۔ اس کا خاموش رہنا اس بات کی علامت ہے کہ وہ (اس نکاح پر) راضی ہے ۔
راوی : ابوہریرہؓ (متفق علیہ) ۱۔ مشکوٰۃ جلد ۲ صـ۱۷
۲۔ صحیح بخاری جلد ۳ کتاب الاکراہ صـ۱۰۸،۱۰۷

(۱)

خنسا بنت خذام بیوہ تھی۔ اس کے باپ نے (اُس کی اجازت یا مرضی پوچھے بغیر) اس کا نکاح کر دیا۔ وہ اس نکاح پر رضامند نہیں تھی۔ اس لئے وہ جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا ۔

یا رسول اللہ! میرے باپ نے مجھ سے پوچھے بغیر میرا نکاح کر دیا ہے (اور یہ نکاح مجھے منظور نہیں)

آپ نے (اس وجہ سے) یہ نکاح فسخ کر دیا ۔

بخاری شریف جلد ۳ باب الاکراہ صـ۱۰۷
راوی خنسا بنت خذام
مشکوٰۃ جلد ۲ صـ۱۷

(۲)

جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کنواری لڑکی کا نکاح کرتے وقت اُس کی مرضی معلوم کی جائے ۔ اگر وہ سکوت اختیار کرے تو اسے اس کی رضا پر محمول کیا جائے لیکن اگر وہ (اس نکاح سے) انکار کر دے ۔ تو اس پر جبر کرنے کا کوئی جواز نہیں ۔

راوی : ابوہریرہؓ :۔

ابوداؤد ۔ نسائی / مشکوٰۃ جلد ۲ صـ۱۲

(۳)

ایک شخص نے اپنی کنواری بیٹی کی شادی ایک شخص سے کر دی ۔ حالاں کہ اُس کی بیٹی کو اُس شخص سے کراہت تھی ۔ چنانچہ وہ لڑکی جناب سید الکونین کی بارگاہ میں حاضر ہوئی اور اپنا حال عرض کیا ۔

اس پر جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

تجھے اختیار ہے، چاہے تو (نکاح) فسخ کر دے، چاہے تو باقی رہنے دے ۔

راوی : ابن عباس (مصنف عبدالرزاق) مشکوٰۃ جلد ۲ صـ۱۲
سنن ابوداؤد

(۴)

جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

" دیکھو ۔ کوئی مرد نامحرم عورت کے ساتھ تنہائی نہ کرے "

یہ سن کر ایک شخص کھڑا ہوا اور کہنے لگا ۔

یارسول اللہ! میری عورت حج کے لیے جا رہی ہے (لیکن میں اس کے ہمراہ نہیں جا سکتا کیونکہ) مجھے تو فلاں فلاں غزوہ کے لئے نامزد کیا گیا ہے۔ (آپ کا اس بارے میں کیا فرمان ہے؟)

جناب سید الکونین نے فرمایا: تو واپس چلا جا اور اپنی بیوی کے ساتھ حج کو جا

(صحیح بخاری جلد ۲ کتاب النکاح صـ۸۶)

(۵)

عقبہ کا بیان ہے:۔

میں نے ایک عورت کے ساتھ نکاح کیا۔ تو ایک سیاہ رنگ کی عورت آئی اور کہنے لگی:۔

(یہ نکاح نہیں ہو سکتا کیوں کہ) میں نے تم دونوں کو دودھ پلایا ہے میں نے اس عورت کی یہ بات سنی تو جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری دی اور عرض کیا۔

یارسول اللہ! میں نے ایک عورت سے شادی کی ہے۔ تو (ہمارے ہاں) فلاں سیاہ رنگ کی عورت آن پہنچی۔ اس کا کہنا ہے کہ اس نے ہم دونوں (میاں بیوی) کو دودھ پلایا ہے ــ لیکن حضورؐ، وہ سراسر جھوٹ بولتی ہے۔

جب میں نے یہ الفاظ کہے تو حضورؐ نے (ناگواری سے) منہ پھیر لیا۔ میں اسی طرف گیا۔ جس طرف حضورؐ کا رخ انور تھا اور دوبارہ حضورؐ کی خدمت میں عرض کیا۔ یارسول اللہ! وہ عورت جھوٹی ہے۔

اس پہ جناب رسالتمآبؐ نے فرمایا۔

"(تعجب ہے) کہ جب دودھ پلانے والی خود اس بات کی تصدیق کرتی ہے۔ تو تم کس طرح اس عورت (رضاعی بہن) کو بیوی بنا سکتے ہو" (یعنی وہ تمہارے لئے حلال نہیں)

اور آپؐ نے حکم دیا کہ:

"اس عورت سے الگ ہو جاؤ۔"

(صحیح بخاری جلد ۲ کتاب النکاح صـ۷۷-۷۹)

(۶)

جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں رفاعہ بن سموال قرظی نے اپنی بیوی تمیمہ بنت وھب کو تین طلاقیں دے دیں۔ تو تمیمہ نے عبدالرحمان بن زبیرؓ سے دوسرا نکاح کر لیا۔ لیکن عبدالرحمان (جنسی کمزوری کی وجہ سے) اس پہ قادر نہ ہو سکا اور خلوت صحیحہ کرنے میں ناکام رہا۔ اس لیے اس نے بھی اس عورت (تمیمہ) کو الگ کر دیا۔

تب تمیمہ کے پہلے شوہر رفاعہ قرظی نے اس کو پھر اپنے نکاح میں لانا چاہا۔ چنانچہ وہ جناب رسالتمآبؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی اس خواہش کا ذکر حضورؐ سے کیا۔

لیکن جناب ختمی مرتبتؐ نے اُسے ایسا کرنے سے منع کر دیا اور فرمایا:

" اے رفاعہ! تیرے لئے وہ عورت اُس وقت تک کیسے حلال ہو سکتی ہے۔ جب تک دوسرے خاوند سے اس کی خلوتِ صحیحہ نہ ہو۔"

۱۔ موطا امام مالک : کتاب النکاح صہ ۳۸۲

۲۔ سنن نسائی جلد ۲ صہ ۴۵۱

۳۔ صحیح مسلم جلد ۲ صہ ۵۲ ۔ ۵۳

(۷)

ایک بار ایک کنواری عورت حضورؐ کی خدمت میں آئی اور عرض کیا۔

" یا رسول اللہ! ۔ میرے والد نے میری شادی میرے چچازاد بھائی سے کر دی۔ حالانکہ اس نے اس سلسلے میں مجھ سے پوچھا تک نہیں اور نہ اذن لیا ۔ اس شادی سے میرے چچازاد بھائی کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ وہ اپنی مالی حالت درست کرے۔ (یعنی اُسے کوئی دوسری رغبت نہیں تھی)

اب اس سلسلے میں آپ کا کیا حکم ہے؟

اس معاملے میں میرا بھی کوئی حق یا اختیار ہے؟

رسول اللہؐ ! ۔ "ہاں۔ تمہیں (ہر طرح کا حق حاصل) ہے"۔

وہ دوشیزہ : "یا رسول اللہ! اس بات کے کہنے سے میرا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ میں اپنے والد کے طے کئے ہوئے رشتے کو فسخ کر دوں یا توڑ دوں، میں تو صرف اتنا چاہتی ہوں کہ میری بہنیں جان لیں کہ انہیں (نکاح کے) سلسلے میں پورا پورا حق و اختیار حاصل ہے ۔ (یعنی نکاح میں اُن سے اجازت لینا ضروری امر ہے) (مصنف عبدالرزاق)

(۸)

ایک عورت جناب سید الکونین کے زمانے میں اسلام لے آئی۔ تو اُس نے دوسرا نکاح کر لیا حالاں کہ وہ پہلے سے شادی شدہ تھی (اس کے سابق شوہر کو جب پتہ چلا) تو وہ حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا۔

یا رسول اللہ! میں بھی اسلام لے آیا ہوں اور یہ عورت میرے اسلام سے اچھی طرح واقف ہے۔ (میں اس کا خاوند ہوں) اس کے باوجود اُس نے دوسری شادی رچالی ہے۔

یہ سن کر جناب رسالتمآبؐ نے اُس عورت کو دوسرے شوہر سے علاحدہ ہونے کا حکم دیا اور اُسے پہلے شوہر کے حوالے کر دیا۔

(سنن ابی داؤد)

(۹)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

کسی عورت کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسری عورت کا نکاح کر دے اور نہ ہی کسی عورت کو یہ اختیار ہے کہ وہ اپنا نکاح خود کرے۔

اس کے باوجود اگر کوئی عورت اپنا نکاح خود (بغیر ولی کے) کرتی ہے تو وہ زنا کار ہے۔
راوی: ابوہریرہ ابنِ ماجہ جلد ۲ / مشکوٰۃ جلد ۲ صہ ۲

(۱۰)

جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔
جو عورت بغیر اپنے ولی (سرپرست) کے اپنے طور پر اپنا نکاح خود کرتی ہے۔ اس کا نکاح باطل ہے!
اس کا نکاح باطل ہے!! اس کا نکاح باطل ہے!!!
اس کے باوجود (وہ شخص جس کے ساتھ اس نے نکاح کیا ہے) اگر اُس کے ساتھ خلوت صحیحہ کرتا ہے۔ تو اس کی شرمگاہ سے جو لذت اُس نے حاصل کی ہے۔ اس کے بدلہ میں اُسے مہر ادا کرنا ہوگا۔
جس عورت کا کوئی ولی نہ ہو۔ تو اس کا ولی سلطان ہے۔ راوی:۔ جناب صدیقہ رض
(ابوداؤد، احمد، ترمذی، ابن ماجہ۔ / مشکوٰۃ جلد ۲ صہ ۲)

(۱۱)

ایک انصاری بیان کرتے ہیں، کہ
میں نے ایک عورت سے نکاح کر لیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ باکرہ ہے لیکن جس وقت میں اُس کے قریب ہوا۔ تو اُس وقت مجھے معلوم ہوا، کہ وہ تو حمل سے ہے۔ اس لیے میں جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور صورتِ حال آپ سے بیان کی
اس پہ آپ نے فرمایا:۔
یہ عورت مہر کی حق دار ہے۔ کیونکہ تم اُس سے مقاربت کر چکے ہو ہاں (وضع حمل کے بعد) وہ بچہ تمہارا غلام ہوگا۔
پھر جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ:
وضع حمل کے بعد عورت کے تازیانے مارے جائیں۔ اور ان دونوں کے درمیان تفریق کروا دی جائے۔
(مصنف عبدالرزاق)

(۱۲)

غیلان دمشقی جب مسلمان ہوا۔ تو اس وقت زمانۂ جاہلیت سے دس عورتیں تھیں۔ ان عورتوں نے بھی (اپنے خاوند کے ساتھ) اسلام قبول کر لیا تو
جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے حکم دیا:۔
اے غیلان! صرف چار عورتیں رکھ سکتے ہو۔ باقی عورتوں کو علیحدہ کر دو۔
راوی ابن عمر : ابن ماجہ / مشکوٰۃ جلد ۲ صہ ۸

(۱۳)

نوفل بن معاویہ بیان کرتے ہیں کہ جس وقت میں نے اسلام قبول کیا تو میرے نکاح میں پانچ عورتیں تھیں۔ میں جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپؐ سے اس بارے میں استفسار کیا۔

تو آپ نے حکم دیا — چار بیویاں رہنے دو، اور ان میں سے ایک کو الگ کر دو۔

(مشکوٰۃ جلد ۲ صنہ ۸۰)

(۱۴)

فیروز دیلمی جب مسلمان ہوا۔ تو اس کے نکاح میں دو (سگی) بہنیں تھیں۔ جناب سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے حکم دیا۔ جو تمھیں پسند ہو۔ اُسے رکھ لو (اور دوسری کو جدا کر دو) (مشکوٰۃ ج ۲ صنہ ۸۰)

(۱۵)

ایک عورت مسلمان ہوئی، تو اُس نے دوسرا نکاح کر لیا۔ (یہ معلوم ہونے پر) اس کا پہلا خاوند جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا۔

یا رسول اللہ! میں مسلمان ہوں۔ (میری بیوی کو) میرے اسلام کا علم تھا۔ (لیکن اس نے دوسرا بیاہ رچا لیا۔)

جناب رسالتمآبؐ نے اُسے پہلے خاوند کے حوالے کر دیا۔

شرح السُّنہ میں ہے کہ حضور سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی عورتوں کو سابقہ نکاح کی وجہ سے اُن کے خاوندوں کے حوالے کر دیا۔ جبکہ خاوند اور بیوی دونوں اسلام لے آئے۔ حالاں کہ وہ مختلف دین پر تھے اور مختلف شہروں میں مقیم تھے۔ مثلاً

۱- ولید بن مغیرہ کی بیٹی صفوان بن امیہ کے نکاح میں تھی۔ جس روز مکہ فتح ہوا وہ اسلام لے آئی۔ لیکن اس کے خاوند نے اسلام قبول نہ کیا اور مکہ سے راہِ فرار اختیار کی۔ (جناب رسالتمآبؐ کو علم ہوا تو) آپ نے اس کے چچازاد بھائی وہب بن عمیر کو اپنی ردائے مبارک دے کر اُس کی طرف بھیجا۔ اور کہلایا کہ تمھیں امان دی جاتی ہے اور یہ چادر امان کی نشانی ہے۔ صفوان واپس مکہ آیا۔ تو اُسے نہ صرف امان دی گئی بلکہ چار ماہ کی مہلت بھی حضورؐ نے عطا فرمائی۔ یہاں تک کہ صفوان نے اسلام قبول کر لیا۔ تو اس کی بیوی بنت ولید اس کے نکاح میں رہی۔

۲- دوسری عورت حارث بن ہشام کی بیٹی، اُم حکیم تھی۔ جو عکرمہ بن ابو جہل کے نکاح میں تھی۔ یہ عورت بھی فتح مکہ کے روز اسلام لے آئی لیکن اُس کے میاں عکرمہ بن ابی جہل نے اسلام قبول نہ کیا۔ بلکہ رزم آرائی کی وجہ سے یمن کی طرف فرار ہو گیا۔

ام حکیم نے جناب رسالتمآب سے اپنے خاوند کے لئے امان طلب کی، جو حضورؐ نے منظور فرمائی۔ تو وہ اپنے خاوند کو واپس لانے کے لئے یمن گئی اور اُسے راضی کر کے واپس مکہ لے آئی۔ جہاں اُس نے اسلام قبول کر لیا۔ اس لیے ام حکیم اور عکرمہ بن ابی جہل سابقہ نکاح کی بنا پر میاں بیوی رہے۔ (راوی: عبداللہ بن عباسؓ)

(۱- سیرۃ ابن ہشام جلد ۲ باب فتح مکہ / ۲- مشکوٰۃ جلد ۲ صنہ ۸۰-۸۱)

(۱۶)

حضرت عقبہؓ روایت کرتے ہیں کہ جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اے لوگو! (تمہارے لئے) تمام شرائط کی نسبت اُن شرائط کا پورا کرنا لازمی ہے جن شرائط کی بنا پر تمہارے لئے عورتوں کی شرمگاہ حلال کی گئی" (یعنی جن شرائط پر تمہارا نکاح ہوا)

(صحیح بخاری جلد ۲ کتاب النکاح ص۱۸)

(۱۷)

عروہ نے جناب صدیقہؓ سے اس آیت وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی کا مطلب دریافت کیا۔ تو انہوں نے فرمایا:

"یہ آیت ایسی یتیم لڑکی کے متعلق ہے، جو کسی سرپرست کی تربیت و پرورش میں ہو، مال دار ہو، حسین ہو اور مال اور جمال کی وجہ سے اس کا سرپرست چاہے کہ اُسے اپنی زوجیت میں لے آئے۔ لیکن مہر جو اس کا حق ہے۔ پورا ادا نہ کرنا چاہے (جو کہیں دوسری جگہ اس کا نکاح ہونے کی صورت میں اُسے مل سکتا ہے) تو اُسے لازم ہے کہ وہ ایسی لڑکی (یتیم) کے ساتھ نکاح نہ کرے۔ البتہ اگر مہر کے سلسلے میں انصاف کا تقاضہ پورا کرے اور حق ادا کرے تو اس سے نکاح کر سکتا ہے۔ ورنہ یہ حکم ہے کہ اس (یتیم لڑکی) کے سوا جہاں چاہے نکاح کرے۔"

(صحیح بخاری جلد ۲ باب النکاح ص۲۲)

(۱۸)

حسن بصریؒ کہتے ہیں، میں نے حضرت معقل بن یسارؓ کی زبانی سنا وہ کہتے تھے کہ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ۔ آیت قرآنی میرے متعلق نازل ہوئی۔ وہ بیان کرتے ہیں۔

میری ایک بہن تھی۔ اس کا نکاح میں نے کسی شخص سے کر دیا تھا۔ لیکن اُس شخص نے اُسے طلاق دے دی۔ جب اس نے عدت کے ایام پورے کر لیے تو اسی شخص نے دوبارہ نکاح کے لیے پیغام دیا۔ تو میں نے اُسے کہا۔

میں نے تم سے اپنی بہن بیاہی۔ تجھے عزت دی کہ اُسے تیرے لیے باعث آرام بنایا تم نے (اس نیکی کا) بدلہ یہ دیا کہ اُسے طلاق دے دی۔ تو پھر دوبارہ اُسے کیوں اپنے نکاح میں لانا چاہتا ہے۔ خدا کی قسم۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اب میں دوبارہ اُسے تمہارے نکاح میں نہیں دے سکتا۔ وہ شخص فطرۃً برا نہیں تھا۔ میری ہمشیرہ کی بھی خواہش تھی کہ اُس کا نکاح دوبارہ اُس سے ہو جائے۔ (مگر میں اس پر راضی نہیں تھا) انہی دنوں یہ آیت نازل ہوئی۔

(سرورِ عالم نے مجھے بلایا اور یہ فرمانِ الٰہی سنایا) تو میں نے عرض کیا۔

"یا رسول اللہ۔ اللہ کا حکم نازل ہو چکا۔ میرے لیے سوائے اس حکم کے مان لینے کے اور کوئی چارہ نہیں۔

چنانچہ معقل نے اپنی بہن کو دوبارہ اس شخص سے بیاہ دیا۔

(صحیح بخاری جلد ۲ کتاب النکاح ص۶۹۷-۶۹۸)

(۱۹)

امّ المومنین ام حبیبہؓ فرماتی ہیں۔ میں نے جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا:

ام حبیبہؓ: یا رسول اللہؐ! کیا آپ کو میری بہن ابو سفیان کی بیٹی اچھی نہیں لگتی؟

رسول اللہؐ:- اس سے تمہارا کیا مطلب ہے؟

ام حبیبہؓ: یا رسول اللہؐ! آپ میری بہن سے نکاح کر لیں۔

رسول اللہؐ:- کیا تم اُس کو برداشت کر لوگی۔؟

ام حبیبہؓ:- حضورؐ! میں پہلے ہی کب (آپ کی) اکیلی (بیوی) ہوں۔ (جہاں اس قدر سوکنیں ہیں) وہاں ایک بہن بھی سہی پھر اگر میری بہن میرے ساتھ بھلائی میں شریک ہو، تو مجھے یہ کیسے پسند نہیں ہوگا؟

رسول اللہؐ: لیکن وہ تو میرے لیے حلال نہیں۔

(یعنی ایک شوہر کے پاس دو سگی بہنیں نہیں رہ سکتیں)

ام حبیبہؓ:- یا رسول اللہؐ! خدا کی قسم، ہم تو یہاں تک سُن رہے ہیں کہ آپ نے دُرّہ بنت ابو سلمہ کے لئے پیغام بھیجا ہے۔

رسول اللہؐ:- دُرّہ - ام سلمیٰ کی بیٹی؟

ام حبیبہؓ: جی ہاں۔

رسول اللہؐ: (نہیں، ہرگز نہیں) - خدا کی قسم، وہ اگر میری پروردہ نہ بھی ہوتی، تو بھی میرے لیئے حلال نہیں تھی، وہ تو میرے رضاعی بھائی کی بیٹی ہے (میری بھتیجی ہے) - میں نے اور اس کے باپ ابوسلمہؓ دونوں نے ثُویبہ کا دودھ پیا ہے غور سے سنو! آئندہ تم اپنی بہنوں اور بیٹیوں کے لیے مجھ سے نکاح کی خواہش ہرگز نہ کرو۔

۱- صحیح مسلم جلد ۲ کتاب الرضاع صہ ۶۹

۲- صحیح بخاری جلد ۳ کتاب النکاح صہ ۷۷۶، ۷۸۴

(۲۰)

حضرت علی حیدرؓ بیان فرماتے ہیں -

میں نے جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا۔

یا رسول اللہؐ سمجھ میں نہیں آتا کہ آپؐ قریشی عورتوں کی رغبت اور خواہش تو رکھتے ہیں۔ لیکن ہماری طرف آپؐ کا دھیان نہیں۔

رسول اللہؐ:- کیا کوئی ایسی عورت ہے؟

حضرت علیؓ: جی۔ ہاں یا رسول اللہؐ! آپ کے چچا حمزہ کی بیٹی وہ جوان ہے۔ حسین وجمیل ہے اور قریش سے ہے۔

رسول اللہؐ: وہ میرے لیے حلال نہیں۔ کیا تم نہیں جانتے کہ حمزہ میرے رضاعی بھائی تھے۔ جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے نسب کے لحاظ سے حرام قرار دیا ہے۔ وہ دودھ کے رشتے سے بھی حرام: (۱- صحیح مسلم جلد ۲ صہ ۶۵ / ۲ مشکوٰۃ جلد ۲ صہ ۳۳)

(۲۱)

جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم نے ام المومنین اُمّ سلمہ سے نکاح فرمایا۔ تو ان کے پاس تین دن قیام پذیر رہے۔ (تین شب قیام کیا) اور اُن سے فرمایا:۔

اے ام سلمہ: تم اپنے شوہر کے لئے اپنے اہل میں سے حقیر نہیں، تمہاری خواہش ہو۔ تو میں تمہارے پاس پورا ہفتہ قیام کروں۔ ہاں اگر ایک ہفتہ تمہارے یہاں رہا۔ تو پھر تمام ازواج کے پاس مجھے (باری باری) سات سات دن قیام کرنا ہوگا۔ اور اگر چاہے تو میں تیرے پاس تین دن قیام کروں گا۔ پھر اسی طرح دوسروں کے پاس بھی تین تین دن قیام کیا کروں گا۔

اُم سلمہ: یا رسول اللہ مجھے منظور ہے۔ تین روز قیام فرمائیں ام المومنین حضرت ام سلمہؓ سے ہی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:

باکرہ بیوی کے پاس سات روز قیام کرنا چاہیے اور ثیبہ (بیوہ) کے پاس تین روز۔

صحیح مسلم جلد ۲ صہ ۷۶-۷۷

(۲۲)

حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں:

جناب سید الکونین کی نو بیویاں تھیں۔ ہر ایک کی باری مقرر تھی اور آپ جب اُن میں باری مقرر فرماتے تھے تو پہلی بیوی کے پاس نویں دن تشریف لایا کرتے تھے۔ ازواج مطہرات میں یہ قاعدہ تھا۔ کہ آپ جس زوجۂ محترمہ کے گھر میں تشریف فرما ہوتے۔ تمام ازواج مطہرات وہیں، اکٹھی ہو جایا کرتیں۔

صحیح مسلم جلد ۲ صہ ۷

نکاحِ شغار:۔

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں۔

جناب سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ

"نکاح شغار نہ کیا جائے۔"

نکاح شغار یہ ہے:۔

ایک شخص کسی دوسرے شخص کے ساتھ اپنی بیٹی کا نکاح کرتا تو اس سے اقرار لیتا کہ وہ بھی اُسے اپنی بیٹی بیاہ دے اور دونوں نکاحوں میں مہر کا کوئی ذکر نہ ہوتا۔

تو آپؐ نے فرمایا:۔

"ایسا نکاح باطل ہے۔"

صحیح مسلم: جلد ۲: کتاب النکاح صہ ۱۷



جناب سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جس شخص کے پاس لونڈی ہو، وہ اگر اس کی اچھی طرح تعلیم و تربیت کرے۔ پھر اُسے آزاد کرکے اپنے نکاح میں لے آئے تو اللہ کے ہاں ایسے شخص کے لیے بڑا اجر ہے۔"

راوی: حضرت ابوہریرہ رضؓ

صحیح بخاری جلد ۲ کتاب النکاح ص ۷۶۵-۷۶۶

باب الطلاق:

(۱)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں:-

میں نے جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اپنی بیوی کو ایسے وقت میں طلاق دی۔ جبکہ وہ حیض کی حالت میں تھی۔ میرے والد جناب عمر فاروقؓ کو پتہ چلا تو وہ جناب سرور کونینؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنے بیٹے عبداللہ بن عمرؓ کا مسئلہ آپ کے سامنے رکھا۔ آپ نے فرمایا۔

عبداللہ سے کہو، رجعت کرے، اپنی عورت کو حیض سے پاک ہونے تک اپنے پاس رہنے دے۔ اس کے بعد دوبارہ حیض آنے اور پاک ہونے تک رُکے رکھے۔ پھر اس کی مرضی ہے، چاہے طلاق دے دے، چاہے رجوع کرلے۔ فرمایا۔ اور اللہ کے اس قول:

"عورتوں کو ان کی عدت پر طلاق دو"

کا یہی مطلب ہے۔

۱- صحیح بخاری جلد ۲ کتاب الطلاق ص ۸۷۰-۸۷۳

۲- صحیح مسلم جلد ۲ کتاب الطلاق ص ۸۷-۹۰

(۲)

ایک دفعہ جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی گئی کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دے دی ہیں۔ آپؐ نے یہ بات سُنی تو جلال میں آ گئے اور کھڑے ہو کر فرمایا۔

"کیا اللہ کی کتاب کے ساتھ بھی مذاق کیا جا رہا ہے۔ حالاں کہ ابھی تو میں تمہارے درمیان موجود ہوں۔"

یہ سن کر ایک شخص کھڑا ہو گیا اور عرض کی۔

'یارسولؐ اللہ! حکم ہو تو میں اُسے قتل کردوں'

راوی محمود بن لبید: نسائی / مشکوٰۃ جلد ۲ ص ۱۰۱-۱۰۲

(۳)

رکانہ بن عبد یزید نے اپنی زوجہ سہیمہ کو طلاق دے دی، پھر وہ جناب سید الکونین کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ کو اطلاع

دی اور عرض کیا:
یا رسول اللہ! خدا کی قسم۔ میرا اس سے صرف ایک طلاق کا ارادہ ہے۔
جناب رسالتمآب نے فرمایا:۔
نہیں ارادہ تھا تمہارا مگر ایک طلاق دینے کا، تو رکانہ نے کہا، خدا کی قسم نہیں ارادہ کیا۔ مگر ایک طلاق دینے کا۔
جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ عورت واپس اس کے حوالے کر دی۔
راوی: رکانہ۔ مشکوٰۃ جلد ۲ ص ۱۰۱

(۴)

حضرت نافعؓ روایت بیان کرتے ہیں کہ
حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے جب کوئی شخص حیض والی عورت کی طلاق سے متعلق مسئلہ دریافت کرتا۔ تو وہ کہتے۔
اگر تو نے اپنی بیوی کو ایک یا دو طلاق دی ہیں، تو تو رجوع کر سکتا ہے۔ کیوں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ایسا ہی حکم دیا تھا اور اگر تم نے تین طلاق دے دی ہیں۔ تو وہ عورت تجھ پر حرام ہو گئی۔ جب تک سوائے تمہارے وہ کسی دوسرے مرد سے نکاح نہ کرے۔ تو نے اپنی عورت کو تین طلاق دیں تو طلاق میں اپنے خالق کی نافرمانی کی۔
صحیح مسلم۔ جلد ۲، کتاب الطلاق ص ۸۸ - ۸۹

(۵)

فاطمہ بنت قیس کو اس کے خاوند ابو عمرو بن حفص نے طلاق دے دی۔ یہ طلاق بائن تھی۔ وہ خود شہر سے کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ اس لئے اُس نے ایک وکیل فاطمہ کے پاس بھیجا اور تھوڑے سے جَو بھی، فاطمہ اس پر غصہ ہوئی۔ (کہ اُس کے ہاں میرا کوئی حق نہیں بنتا۔)۔
اس پر اُس وکیل نے کہا۔ اللہ کی قسم۔ ہم پر اور ہماری کسی شے پر تمہارا کوئی حق نہیں۔ چنانچہ فاطمہ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور سارا ماجرا بیان کیا۔
اس پر جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"تمہارے لیے اُن کے ذمے کچھ بھی نہیں ہے۔ تیرے لیے کچھ بھی نفقہ نہیں، سوائے حاملہ ہونے کی صورت میں"
پھر جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے حکم دیا۔
"جاؤ اور ام شریک کے گھر اپنی عدت کے ایام پورے کرو"
پھر فرمایا:
(تمہارا وہاں جانا ٹھیک نہیں)"۔ ام شریک کے پاس تو اکثر ہمارے بہت سے اصحاب جمع رہتے ہیں۔
بہتر ہے کہ تم ابن ام مکتوم کے گھر قیام کرو اور وہاں اپنی عدت پوری کرو، وہ نابینا ہیں۔ وہاں تم بے تکلفی سے رہ سکتی ہو۔ وہاں

اگر تم اپنا دوپٹہ بھی اتار دو گی۔ تو تمھیں دیکھنے والا کوئی نہ ہوگا۔
پس وہ ابنِ امِ مکتوم کے گھر چلی گئی۔ پھر جب اس کی عدت پوری ہو گئی تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا نکاح اُسامہ بن زید سے کر دیا۔
(صحیح مسلم جلد ۲ ۔ کتاب الطلاق ص ۱۱۱۔۱۱۶)

(۶)

ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں تو اس عورت نے کسی دوسرے شخص سے نکاح کر لیا۔ دوسرے مرد نے اُس سے بغیر جماع کئے اُسے طلاق دے دی۔
جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں دریافت کیا گیا کہ آیا یہ عورت اپنے پہلے خاوند کے لیے حلال ہے؟
آپ نے فرمایا — ہرگز نہیں۔ جب تک اس کا نکاح جس دوسرے شخص سے ہوا ہے۔ وہ اس سے جماع کی لذت حاصل نہ کر لے، جیسے پہلے مرد نے اس کی صحبت سے حاصل کیا تھا۔ یہ پہلے شخص پر حرام ہے۔
راوی حضرت عائشہ رض (صحیح بخاری جلد ۲، کتاب الطلاق ص ۸۷۶)

(۷)

ابوسعید خُدری کی بہن فریعہ بنت مالک آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا:۔
"یا رسول اللہ! ہمارے غلام فرار ہو گئے۔ تو میرا خاوند اُن کی تلاش میں نکلا۔ فراریوں نے موقعہ پا کر میرے خاوند کو قتل کر دیا۔ مقتول نہ تو اپنے پیچھے کوئی مکان چھوڑ گیا ہے۔ جہاں میں قیام کر سکوں اور نہ نفقہ کہ گزارا کر سکوں۔ اب میرے لیے کیا حکم ہے؟ کیا میں اپنے خاندان بنی خُدرہ کی طرف چلی جاؤں؟"
اس پہ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔ "ہاں تو اپنے کنبہ میں چلی جا۔"
وہ کہتی ہیں کہ جب میں حجرہ کے قریب پہنچی تو حضورؐ نے مجھے واپس بلایا۔ اور فرمایا:
"اے عورت! اپنے گھر میں مقیم رہو۔ یہاں تک کہ اپنی عدت پوری کر لو۔"
راوی: زینب بنت کعب (سنن نسائی) (مشکوٰۃ ج ۲ ص ۱۱۴)

(۸)

ثابت بن قیس کی بیوی جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئی اور عرض کیا:
"یا رسول اللہ! مجھے ثابت بن قیس سے کوئی شکایت نہیں۔ وہ نہایت ہی دیندار اور صاحبِ اخلاق شخص ہیں۔ ان کے سلوک سے میں ناخوش نہیں۔
لیکن مجھے اندیشہ ہے۔ کہ کہیں مسلمان ہوتے ہوئے میں اپنے خاوند کی ناشکر گزاری کر دوں، اُس کے احسان کو پس پشت ڈال دوں اور اس طرح گناہ کا ارتکاب کر بیٹھوں۔
(جناب سید المرسلین ؐ اس عورت کے کنائے کا مطلب پا گئے) اس لئے آپ نے فرمایا:

تو ثابتؓ نے جو باغ تجھے (بطورِ حق مہر) دیا تھا۔ کیا تو اس سے دست بردار ہونے کو تیار ہے۔؟"
اس نے کہا "یا رسول اللہ۔ جی، ہاں۔ میں وہ باغ ثابتؓ کو واپس کرنے کے لئے تیار ہوں"
چنانچہ اس نے وہ باغ واپس کر دیا تو آپ نے ثابتؓ کو حکم دیا کہ اُسے طلاق دے دے۔
ثابتؓ نے آپ کے فرمان کے مطابق اُس سے علاحدگی اختیار کر لی۔
صحیح بخاری جلد ۲ کتاب الطلاق صفحہ ۸۸۹ - ۸۹۰

(۹)

ایک عورت جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا۔
وہ عورت: "یا رسول اللہ۔ میرا خاوند میرے قریب نہیں آیا"۔
عورت یہ شکایت کر رہی تھی کہ اُس کا خاوند بھی آن پہنچا۔ اُس نے یہ سنا تو کہا "یا رسول اللہؐ! یہ عورت صریح جھوٹ بول رہی ہے۔ میں اس کے قریب جاتا ہوں لیکن یہ محض حیلے بہانے کرتی ہے۔ ان حیلوں سے اس کا مقصد یہ ہے۔ کہ مجھ سے طلاق لے۔ اور پھر اپنے پہلے خاوند کے پاس چلی جائے"
اس پہ حضورؐ نے فرمایا۔ یہ طریقہ غلط ہے۔ ایسا اس وقت تک نہیں ہو سکتا، جب تک تو اس سے مقاربت نہ کرے
(سنن نسائی جلد ۲ صفحہ ۴۵۴)

(۱۰)

جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم نے امیمہ بنت شراحیل سے نکاح کیا۔ جب وہ عورت جنابِ رسالتمآبؐ کے پاس لائی گئی، تو آپؐ اس کے قریب ہوئے اور اُس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ تو اُس نے برا منایا۔ اور کہنے لگی۔
"میں آپ سے اللہ کی پناہ چاہتی ہوں"
اس پر آپؐ نے فرمایا "اے عورت، تو نے بڑی ہی عظیم الشان ہستی کی پناہ مانگ لی ہے۔ اب اپنے میکے چلی جا۔"
آپؐ نے ابو اُسید کو حکم دیا کہ اسے اُس کے گھر روانہ کر دو۔ اور اسے ایک جوڑا کپڑے بھی دے دو۔ (اس طرح حضورؐ نے اس پر احسان فرمایا اور اُسے الگ کر دیا۔) (راوی: حضرت عائشہؓ / حضرت اُسید)
(صحیح بخاری جلد ۲: کتاب الطلاق صفحہ ۸۷۲ - ۸۷۳)

ایلاء :-

ارشادِ ربانی :-

جو لوگ اپنی عورتوں سے تعلق نہ رکھنے کی قسم کھا لیں اُن کے لئے چار مہینے کی مہلت ہے۔ اگر انہوں نے رجوع کر لیا تو اللہ معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔ اور اگر انہوں نے

طلاق ہی کی ٹھان لی ہو تو جان لیں کہ اللہ سمیع اور علیم ہے۔

(البقرہ: ۲۲۶ - ۲۲۷)

و جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم نے ایلا فرمایا۔ (آپؐ نے قسم کھائی کہ ایک ماہ تک اپنی بیویوں کے پاس نہیں جاؤں گا۔ آپؐ مسلسل ۲۹ راتیں ایک بالاخانہ پر مقیم رہے۔

بعد ازاں آپ بالاخانے سے اُترے اور اپنی ازواج کے پاس تشریف لے گئے تو انہوں نے عرض کیا۔

"یا رسول اللہ! آپؐ نے تو پورے ایک ماہ تک نہ آنے کی قسم کھائی تھی۔"

اس پر آپؐ نے فرمایا: "مہینہ انتیس دن کا بھی ہوتا ہے۔"

(حضورؐ نے مقررہ مدت سے پہلے رجوع فرما لیا تھا)

راوی: انس بن مالک ۱۔ صحیح بخاری جلد ۲ کتاب الطلاق ص ۸۹

۲۔ صحیح مسلم جلد ۱ ص ۱۰۵

و حضرت عائشہ الصدیقہ رضؓ فرماتی ہیں۔

جب جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کو اختیار دے دیا گیا۔ تو سب سے پہلے جناب سید المرسلینؐ میرے پاس تشریف لائے اور فرمایا:

"اے عائشہ میری ایک ضروری بات غور سے سنو۔ لیکن اس (کے فیصلے کرنے میں) عجلت سے کام نہ لینا! اور بہتر یہ ہے، کہ تم اس سلسلہ میں اپنے والدین سے بھی مشورہ کر لو۔"

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضورؐ کو اس بات کا اچھی طرح علم تھا۔ کہ میرے والدین مجھے (حضورؐ سے) علاحدگی کا حکم ہرگز نہیں دے سکتے۔ (اس لئے آپؐ نے مشورہ کا فرمایا)

پھر جناب رسالتمآبؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں:

اے نبی! اپنی بیویوں سے کہو، اگر تم دنیا اور اس کی زینت چاہتی ہو۔ تو آؤ میں تمہیں کچھ دے دلا کر بھلے طریقے سے رخصت کر دوں اور اگر تم اللہ اور اس کے رسولؐ اور دارِ آخرت کی طالب ہو۔ تو جان لو کہ تم میں سے جو نیکوکار ہیں۔ اللہ کے ہاں اُن کے لئے اجر عظیم ہے۔

(الاحزاب: ۲۸ - ۲۹)

یہ احکام خداوندی سُن کر میں نے حضورؐ کی خدمت میں عرض کیا مجھے اپنے اس معاملے میں (جو میرے اور آپ کے درمیان ہے) والدین کی اجازت یا اصلاح مشورے کی ضرورت نہیں، مجھے تو اللہ، اللہ کے رسول اور دارِ آخرت کی طلب ہے۔

پھر تمام ازواج نے میری تقلید کی ——

۱۔ صحیح بخاری جلد ۲ کتاب الطلاق ص ۷۹۶
۲۔ صحیح مسلم جلد ۲ کتاب الطلاق ص ۹۶

• جناب صدیقہؓ فرماتی ہیں :

جناب سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اختیار دیا (کہ چاہیں تو آپ کو اختیار کریں اور چاہیں تو آپ سے الگ ہو کر دنیا کو اختیار کریں) —— تو ہم نے اللہ اور اللہ کے رسولؐ کو اختیار کر لیا۔

وہ فرماتی ہیں کہ اس طرح کرنے میں ہرگز طلاق واقع نہیں ہوتی۔

(۱۔ صحیح بخاری جلد ۲ کتاب الطلاق ص ۷۹۷)
(۲۔ صحیح مسلم جلد ۲ 〃 ص ۹۷)

• ابن عباس کہتے ہیں :-

اگر کوئی شخص اپنی عورت سے کہے کہ تو میرے لیے حرام ہے۔ تو ایسا کہنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا (یعنی طلاق واقع نہیں ہوتی) البتہ ایسا کہنے سے کفارہ واجب ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ یہ قسم ہے۔

وہ فرماتے ہیں کہ، تمہارے لیے اللہ کے رسولؐ میں مثالی نمونہ ہے۔

(یعنی حضورؐ کی مثال کی تقلید کرنے میں ہماری بہتری ہے) (۱۔ صحیح بخاری جلد ۲ ص ۷۹۸ / ۲۔ صحیح مسلم جلد ۲ ص ۹۲)

• سبیعہ کا بیان ہے :

مَیں سعد کے نکاح میں تھی، میرا تعلق قبیلہ بنی عامر سے تھا میرے خاوند حجۃ الوداع کے موقعہ پر رحلت فرما گئے۔ تو مَیں حمل سے تھی۔ اُن کی رحلت کے فوراً بعد میرے ہاں بچہ کی ولادت ہوئی۔ جب میں پاک صاف ہو گئی۔ تو میں نے پیغام (نکاح) دینے والوں کے لئے بناؤ سنگار کیا۔ یہ سُن کر میرے پاس ابو السنابل جن کا تعلق قبیلہ عبدالدار سے تھا، آئے اور پُوچھا کہ تم نے یہ بناؤ سنگار کس غرض سے کیا ہے۔ شاید نکاح کرنا چاہتی ہو۔ بخدا۔ تم ہرگز نکاح نہیں کر سکتیں۔ جب تک تم پہ چار ماہ اور دس دن نہ گزر جائیں۔ (یعنی جب تک عدت پوری نہ کر لو)

مَیں نے اس کی بات سُنی۔ تو کپڑے بدلے اور جناب سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئی۔ سارا ماجرا آپؐ کو سنایا اور عرض کیا : "یا رسول اللہؐ ۔ اب میرے لئے کیا حکم ہے ؟"

یہ سن کر آپ نے فرمایا :

"اے عورت! تیری عدت تو اُسی روز پوری ہو گئی جس روز تمہارے ہاں بچہ کی ولادت ہوئی "

اس کے بعد آپؐ نے حکم دیا۔
تو جب چاہے، نکاح کر سکتی ہے۔ (صحیح مسلم جلد ۲ کتاب الطلاق ص ۱۱۹-۱۲۰)

• فاطمہ بیان کرتی ہیں :۔
جب میرے خاوند نے مجھے تین طلاق دے دیں۔ تو میں جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا :۔

"یا رسول اللہ! خاوند نے مجھے طلاق دے دی ہے اب مجھے خوف ہے۔ کہ اگر میں وہاں رہوں، تو وہ میرے ساتھ سختی سے پیش آئیں گے اور نارواسلوک کریں گے۔ (فرمایئے میرے لیے کیا حکم ہے ؟)"

آپؐ نے فرمایا۔ (حکم دیا)
"تو کسی دوسرے گھر میں جا اور قیام کر۔" (صحیح مسلم جلد ۲ کتاب الطلاق ص ۱۱۱)

ابواب الفرائض والاحکام ومتفرقات

و میراث

اِرشادِ باری تعالےٰ

خدا تمہاری اولاد کے بارے میں تم کو ارشاد فرماتا ہے کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے حصہ کے برابر ہے۔ پھر اگر ایسا ہو کہ لڑکیاں دو سے زیادہ ہوں تو ترکے میں اُن کا حصّہ دو تہائی ہوگا۔ اور اگر ایکیلی ہو تو اُسے آدھا ملے گا۔

اور میت کے ماں باپ میں سے ہر ایک کو ترکے کا چھٹا حصہ ملے گا۔ لیکن یہ اُس صورت میں ہے کہ میت کے اولاد ہو۔ اگر اولاد نہ ہو اور وارث صرف ماں باپ ہی ہوں تو ماں کے لیے تہائی (باقی باپ کا۔)

اگر (ماں باپ کے علاوہ) میت کے ایک سے زیادہ بھائی یا بہنیں بھی ہوں تو ماں کا حصہ چھٹا ہو گا۔

لیکن، یاد رہے میت نے جو کچھ وصیت کر دی ہو، یا جو کچھ اس پہ قرض رہ

گیا ہو، اس کی تعمیل اور ادائیگی کے بعد یہ حصے تقسیم ہوں گے (دیکھو) تمہارے باپ دادا بھی ہیں اور تمہاری اولاد بھی ہے۔ تم نہیں جانتے، نفع رسانی کے لحاظ سے کون سا رشتہ تم سے زیادہ نزدیک ہے (اور کس کا حق زیادہ ہونا چاہیے، کس کا کم۔ اللہ کی حکمت ہی اس کا فیصلہ کر سکتی تھی۔ پس) اللہ نے حصے ٹھیرا دیے ہیں، اور وہ (اپنے بندوں کی مصلحت کا) جاننے والا اور (تمام اپنے احکام میں) حکمت رکھنے والا ہے۔ تمہاری بیویاں جو کچھ ترکے میں چھوڑ جائیں اُس کا حکم یہ ہے کہ اگر اُن سے اولاد نہ ہو تو تمہارا (یعنی شوہر کا) حصہ آدھا ہے۔ اور اگر اولاد ہو تو چوتھائی۔ مگر یہ تقسیم اس کے بعد ہوگی کہ جو کچھ وہ وصیت کر گئی ہوں۔ اس کی تعمیل ہو جائے اور جو کچھ ان پر قرض ہو، ادا کر دیا جائے۔

اور جو کچھ ترکہ تم چھوڑ جاؤ۔ تو اس کا حکم یہ ہے کہ اگر تم سے اولاد نہ ہو، تو بیویوں کا حصہ چوتھائی ہوگا۔ اگر اولاد ہو تو آٹھواں،

جو کچھ تم وصیت کر جاؤ اس کی تعمیل اور جو کچھ تم پر قرض رہ گیا ہو۔ اس کی ادائیگی کے بعد۔

اور اگر ایسا ہو کہ کوئی مرد یا عورت چھوڑ جائے۔ جس کے نہ باپ ہو نہ بیٹا، (کلالہ ہو) مگر اس کے بھائی یا بہن ہو۔ تو اس کا حکم یہ ہے کہ بھائی بہن میں سے ہر ایک کا حصہ چھٹا ہوگا۔ اور اگر (بھائی بہن) ایک سے زیادہ ہوں۔ تو پھر ایک تہائی میں سب برابر کے شریک ہوں گے لیکن اُس وصیت کی تعمیل کے بعد جو میت نے کر دی ہو۔ نیز اس قرض کی ادائیگی کے بعد جو میت کے ذمے رہ گیا ہو، بشرطیکہ (وصیت اور قرض سے) مقصود (حق داروں کو نقصان پہنچانا نہ ہو، یہ (ترکے کی تقسیم کے بارے میں) اللہ کی طرف سے حکم ہے اور (یقین رکھو) اللہ (بندوں کے مصالح) جاننے والا اور (اُن کی کمزوریوں کے لیے اپنے احکام اور قوانین میں) بہت بُردبار ہے۔ سورۃ النساء ۱۱، ۱۲

(ترجمہ مولانا ابوالکلام آزاد)

ارشاداتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

(۱)

جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"مسلمان کافر کا اور کافر مسلمان کا وارث نہیں ہو سکتا۔" (راوی: اسامہ بن زید) ۱۔ صحیح بخاری جلد ۵ صفحہ ۶۴۶
۲۔ سنن ابن ماجہ جلد ۲ صفحہ ۱۵۳-۱۵۴
۳۔ صحیح مسلم جلد ۴ صفحہ ۲۳۶

(۲)

جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جو میراث زمانہ جاہلیت میں جس طریقہ پر ہو چکی ہے وہ ویسے ہی برقرار رہے گی، ہاں جس میراث کی اب تک تقسیم نہیں ہوئی وہ قرآنی احکامات کے مطابق تقسیم کی جائے گی۔

سنن ابن ماجہ جلد ۲ صفحہ ۱۶۱

(۳)

جناب سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(میراث میں) جن لوگوں کا حق ہے۔ ان کو اُن کے حصے دے دو پھر جو بچ رہے۔ تو وہ اُس مرد کا حصہ ہے، جو رشتہ میں متوفی کے سب سے زیادہ نزدیک ہو۔ راوی: ابن عباس ۱۔ صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۲۴

۲۔ صحیح بخاری جلد ۵ صفحہ ۶۳۴

(۴)

سعدؓ بن الربیع کی بیوہ اپنی دونوں بیٹیوں کو جو سعد سے تھیں لے کر جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئی اور عرض کیا:

یا رسول اللہؐ۔ سعدؓ آپؐ کے ساتھ غزوۂ اُحد میں شریک تھے اور شہید ہو گئے۔ انہوں نے اپنے پیچھے دو لڑکیاں چھوڑیں، جو آپؐ کے سامنے موجود ہیں۔ ان لڑکیوں کے باپ (سعد) نے جو ترکہ اپنے پیچھے چھوڑا وہ ان بچیوں کے چچا (سعد کے بھائی) نے ہتھیا لیا۔ میرے یا ان بچیوں کے لئے کچھ بھی نہیں چھوڑا۔ (اب میرے لیے کیا حکم ہے؟)

محمد بن سحنون اپنی کتاب الفرائض میں لکھتے ہیں کہ سعد کی بیوہ نے سعد کے بھائی کی نہیں۔ بلکہ سعد کے باپ کی شکایت کی کہ اُس نے اپنی پوتیوں کا مال ہتھیا لیا ہے جبکہ ابی داؤد، ترمذی، ابن ماجہ اور احمد نے لڑکیوں کے چچا کا ذکر کیا ہے۔ لہٰذا صائب یہی ہے کہ مال چچا نے ہتھیا لیا تھا۔

حضور خاموش رہے تو اس عورت نے کہا۔ یا رسول اللہؐ۔ اب جبکہ لوگ مال دیکھ کر نکاح کرتے ہیں، تو ان بے سہارا یتیم بچیوں کے ساتھ بغیر مال کے کون نکاح کرے گا۔

اس پر جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ کے سامنے اُن کا معاملہ ہے۔ وہی ان کا فیصلہ کرے گا اور ضرور اُن کے معاملے میں کوئی حکم نازل فرمائے گا۔"

اس سلسلے اس وقت آپؐ نے اس عورت کو واپس کر دیا۔ حضورؐ اس بارے میں اللہ تعالیٰ کے احکامات کے چند روز منتظر رہے۔ (جبکہ اللہ تعالیٰ نے اس بارے میراث کی آیاتؐ نازل فرمائیں) ۔آپ نے سعد کی بیوہ کو پیغام بھیجا (کہ اس کی بیٹیوں کا اللہ تعالیٰ نے فیصلہ فرما دیا ہے) اور سعد بن ربیع کے بھائی کو بلا بھیجا۔ اُس کے سامنے میراث کی آیات تلاوت فرمائیں:۔

" اللہ تمہاری اولاد کے بارے میں یہ حکم دیتا ہے کہ لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے حصے کے برابر ہے۔
اگر (میت اپنے) پیچھے دو یا دو سے زیادہ لڑکیاں چھوڑے تو ترکہ میں اُن کا حصہ دو تہائی ہوگا۔
چنانچہ آپ نے سعد کے بھائی کو حکم دیا کہ سعد کے ترکے میں سے۔

۱۔ اس کی بیوہ کو آٹھواں حصہ ادا کرو۔
۲۔ سعد کی بیٹیوں کا $\frac{2}{3}$ (دو تہائی) حصہ انھیں ادا کر دو
اور ۳۔ جو باقی بچ رہے وہ تمہارا حصہ ہے۔

یہ پہلی میراث ہے۔ جو اسلام میں تقسیم کی گئی

۱۔ سنن ابن ماجہ جلد ۲ صـ ۱۵۱-۱۵۲
۲۔ مشکواۃ جلد ۲ صـ ۵۸-۵۹
۳۔ محمد بن سحنون۔ کتاب الفرائض

(۵)

حضرت عائشہ الصدیقہ رضؓ فرماتی ہیں:
جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
" ہم زمرۂ انبیا کا کوئی وارث (میراث میں) نہیں ہوا کرتا۔ جو (ترکہ) ہم چھوڑ جائیں۔ وہ صدقہ ہوتا ہے۔
اور حضرت ابوہریرہ رضؓ بیان کرتے ہیں۔
جناب سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
میرے ورثا۔ کا یہ حق نہیں کہ اگر میں ایک دینار بھی پیچھے چھوڑ دوں تو اُسے (آپس میں) تقسیم کریں۔ بلکہ جو املاک میں چھوڑ جاؤں تو (سب سے پہلے) اس میں سے میری ازواج اور عملہ کا خرچ الگ کیا جائے۔ اس کے علاوہ جو باقی بچ رہے۔ وہ سارے کا سارا صدقہ کر دیا جائے

صحیح بخاری جلد ۵ کتاب فرائض والاحکام، صـ ۶۲۶-۲۹۰

(۶)

ایک شخص فوت ہوگیا۔ اس کا کوئی بھی وارث نہیں تھا۔ اس کے پیچھے صرف اس کا ایک آزاد کردہ غلام تھا۔
جب حضور سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ معاملہ پیش کیا گیا۔ تو آپ نے فرمایا۔
" متوفی کا کوئی وارث بھی ہے؟ "
صحابہ رضؓ نے عرض کیا، یا رسول اللہ! اور تو کوئی نہیں، صرف ایک غلام ہے جسے متوفی نے (وفات سے قبل) آزاد کر دیا تھا۔
اس پر جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ۔
مرحوم کی میراث اُس کے آزاد کردہ غلام کے حوالے کر دی جائے۔ (وہی مرحوم کا وارث ہے)۔

• راوی: ابن عباس سنن ابن ماجہ جلد ۲ صـ ۱۵۱ / مشکواۃ جلد ۲ صـ ۶۰

(۷)

جناب سیدالمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور عرض کی۔
یارسول اللہؐ! میرا پوتا فوت ہو گیا ہے (اس نے اپنے پیچھے جو ترکہ چھوڑا ہے) کیا اس ترکہ میں میرا بھی کوئی حق بنتا ہے؟
آپؐ نے فرمایا۔(اے شخص!) اس کے ترکہ میں سے چھٹا حصہ تم لے سکتے ہو۔(یہ تمہارا حق ہے)
وہ شخص جب واپس جانے کے لیے مڑا۔ تو آپ نے اُسے پھر بلایا۔ اور فرمایا:۔
سنو! تیرے لئے ایک اور چھٹا حصہ بھی ہے اور آخر کا ⅙ حصہ تمہارے لئے رزق ہے۔
ابن عباسؓ فرماتے ہیں، کہ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے دادی کو بھی میراث کا چھٹا حصہ دلوایا۔

راوی:۔عمران بن حصین / حضرت ابن عباس ۱۔سنن ابن ماجہ جلد ۲ صہ ۱۵۲-۱۵۳
۲۔مشکوٰۃ جلد ۲ صہ ۵۹

(۸)

دو آدمی جناب سیدالکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور آپؐ کے سامنے میراث کا مقدمہ پیش کیا۔ اگرچہ دونوں اشخاص اپنے اپنے دعوے کو حق ثابت کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ لیکن دعوے کے حق میں دونوں کے پاس شہادت موجود نہیں تھی۔
ان کا دعویٰ سن کر جناب رسول اللہؐ نے فرمایا:
(غور سے سنو) میں اس بارے میں جس شخص کے حق میں فیصلہ دوں گا اگر یہ چیز درحقیقت میں اُس کی نہیں، بلکہ اُس کے بھائی (فریق ثانی) کی ہے۔ تو اس (مال) کی حقیقت آگ کے ٹکڑے کی ہے، جو اُس شخص کو دیا جا رہا ہے (جس کے حق میں فیصلہ دیا گیا)
آپؐ کا یہ قول سن کر، دونوں (بیک وقت) پکار اُٹھے۔
یارسول اللہ! (مجھے یہ مال نہیں چاہیے) میں اپنے بھائی (فریق مخالف) کے حق میں دستبردار ہوتا ہوں۔
اس پر آپ نے فرمایا:۔
تو جاؤ۔ باہمی رضامندی سے اِسے آپس میں تقسیم کر لو، لیکن حق کو ہاتھ سے نہ دو (کوئی دوسرے پر زیادتی نہ کرے) تقسیم کے بعد قرعہ اندازی کر لو۔ (جو جس کے حصہ میں آئے لے اس کے باوجود) تم دونوں پر لازم ہے کہ ایک دوسرے کو معاف کر دو۔

راوی: ام سلمہؓ (مشکوٰۃ جلد ۲ صہ ۲۰۵)

(۹)

جناب سیدالمرسلین ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"میں مومنوں پر خود ان کی جان سے زیادہ حق رکھتا ہوں (اُن پر خود اُن سے زیادہ مہربان ہوں)
(تو سنو!) اگر کوئی شخص ایسی حالت میں فوت ہو جائے کہ وہ مقروض ہو اور ادائیگی کے لیے جائداد وغیرہ بھی نہ ہو۔ تو اس کا قرض (بیت المال سے) ادا کرنا میرے ذمہ ہے۔

اور اگر اس کے پس ماندگان بے سہارا رہ جائیں اور اُن کا کوئی کفیل نہ ہو، تو میں اُن کی کفالت کا ذمہ دار ہوں۔
ہاں اگر متوفی اپنے پیچھے کوئی ترکہ چھوڑ جاتے ۔ تو وہ مال اس کے وارثوں کو ملے گا ۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا:
جس کا کوئی (وارث) نہ ہو، میں اس کا (وارث) ہوں ۔ اس کے مال کا وارث ہوں۔ اس کی گردن (قرض اور فرض سے) آزاد کرانا میرا فرض ہے ۔
جس شخص کا کوئی وارث نہ ہو ۔ اور صرف ایک ماموں ہو، تو وہی ماموں اس کا وارث ہے ۔ وہ متوفی کی طرف سے دیت ادا کرنے کا بھی ذمہ دار ہے اور اُسی پر یہ فرض بھی عائد ہوتا ہے کہ وہ اس کی گردن (قرض، فرض کے بوجھ سے) آزاد کرائے ۔ اس متوفی کے ترکہ کا وارث بھی وہی ہے ۔ راوی : ابوہریرہؓ ومقدامؓ

۱۔ صحیح بخاری جلد ۵ کتاب الفرائض صفحہ ۶۳ / ۲ مشکوٰۃ جلد ۲ صفحہ ۵۷
۳ ۔ سنن ابن ماجہ جلد ۲ صفحہ ۱۵۷، ۱۵۸ / ۴ ۔ صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۲۴۲

(۱۰)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں :
رُباب بن حذیفہ نے ام وائل بنت معمر سے نکاح کیا ۔ ام وائل سے رُباب کے تین بچے ہوئے ۔ (کچھ عرصہ بعد) ان بچوں کی والدہ فوت ہوگئیں تو اس کے بیٹے اس کی زمین اور اموال (ولاء) کے وارث قرار دیے گئے ۔

(سنن ابن ماجہ جلد ۲ صفحہ ۱۵۴)

(۱۱)

عزوہ بنت حمزہ کہتی ہیں :۔
میری ایک کنیز تھی ۔ اُس کا انتقال ہوگیا ۔ اس کے پس ماندگان میں صرف ایک لڑکی تھی ۔ (اور ترکہ بھی تھا) چنانچہ میں جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اس بارے میں حضورؐ کا حکم دریافت فرمایا ۔
تو آپ نے اس کنیز کے ترکہ کو میرے اور اس (متوفیہ) کی لڑکی کے درمیان تقسیم فرما دیا ۔ (سنن ابن ماجہ جلد ۲ صفحہ ۱۵۴)

(۱۲)

حضرت جابر بن عبداللہ روایت کرتے ہیں کہ میں سخت بیمار ہوگیا ۔ جناب رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت صدیق اکبر پیدل چل کر میری عیادت کو تشریف لائے (مجھ پر بے ہوشی کے دورے پڑ رہے تھے) چنانچہ جس وقت آپؐ میرے ہاں تشریف لائے تو مجھ پر بیہوشی طاری تھی ۔ آپؐ نے وضو فرمایا ۔ اور اپنے وضو کا پانی مجھ پر ڈالا تو مجھے ہوش آگیا ۔ میں نے عرض کیا ۔
یا رسول اللہؐ ۔ میں اپنے مال کا کیا کروں ؟
ایک روایت میں ہے کہ جابر نے عرض کیا ۔ یا رسول اللہؐ میری کئی بہنیں ہیں ۔ آپ اُس وقت خاموش رہے ۔ حتیٰ کہ ترکہ کی

تقسیم سے متعلق یہ آیات نازل ہوئیں :
یُوصِیکُمُ اللّٰہُ فِی اولادکم .... واللّٰہ علیمٌ حکیم ہ
(سورۂ نسأ = ۱۱: ۱۲)

اور حضورؐ نے مجھے ان احکامات سے آگاہ فرمایا۔

۱- صحیح بخاری جلد ۵ کتاب الفرائض ص ۶۲۵۔
۲- صحیح مسلم جلد ۲ ص ۲۳۸-۲۳۹۔

(۱۳)

حضرت عبداللہ بن مسعود بیان کرتے ہیں۔
جناب سیدالمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا۔
کہ بیٹی کو (ترکہ) کا آدھا حصہ ملے گا (اگر لڑکی اکیلی وارث ہو)
پوتی کو چھٹا حصہ اور
باقی مال بہن کو ملے گا۔ (گویا بہن بھی عصبہ ہوئی)

صحیح بخاری جلد ۵ کتاب الفرائض ص ۶۳۶

(۱۴)

جناب سیدالکونین صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے روز خطبہ دیتے ہوئے۔ ارشاد فرمایا :
'عورت اپنے خاوند کی دیت کی اور ترکہ کی وارث ہوگی۔ اُسی طرح خاوند اپنی عورت کی دیت اور ترکہ دونوں کا وارث ہوگا، جب تک دونوں ایک دوسرے کی جان کے درپئے نہ ہوں۔
اگر اُن میں کا ایک دوسرے کو جان بوجھ کر قتل کرے گا (قتل عمد کا ارتکاب کرے گا) تو نہ اس کی دیت کا وارث ہوگا۔ اور نہ ترکہ کی میراث اُسے ملے گی۔
ہاں اگر اُن میں کا کوئی ایک دوسرے کو غلطی سے قتل کر دے۔ تو ترکہ تو اُسے ملے گا۔ لیکن دیت کا وارث نہیں ہوگا۔

سنن ابن ماجہ جلد ۲ ص ۱۵۷۔

(۱۵)

جناب صدیقہؓ فرماتی ہیں :۔
جناب سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک غلام تھا۔ وہ کھجور کے درخت سے گرا اور جاں بحق ہوگیا۔ اُس غلام کی نہ تو کوئی اولاد تھی اور نہ ہی کوئی رشتہ دار تھے۔ چنانچہ حضورؐ نے حکم دیا۔
کہ اس غلام کے گاؤں والوں میں سے کسی ایک کو اس کا ترکہ (ولاء) دے دیا جائے۔

سنن ابن ماجہ جلد ۲ ص ۱۵۵۔

(۱۶)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں۔

جو بچہ کسی کے (والد) مرنے کے بعد اس کی جانب منسوب کیا جائے۔ یعنی میت کے ورثا اس بات کا دعویٰ کریں۔ کہ اس بچے کے ہم مالک ہیں۔ تو اس مسئلہ کا فیصلہ یہ ہے کہ

۱۔ اگر وہ بچہ ایسی لونڈی کے بطن سے پیدا ہوا ہے کہ جس روز (اس کے) مالک نے اس سے ہم بستری کی تھی۔ تو وہ اس کی ملکیت میں تھی۔ تو اس بچہ کی نسبت والد سے کی جائے گی۔ اور میراث میں بھی اس کا حصہ ہوگا۔

ہاں جو میراث زمانۂ جاہلیت میں تقسیم کی جا چکی ہے۔ اس میں سے اس کو کچھ نہیں ملے گا۔ البتہ اگر کچھ ترکہ باقی ہے اور اسے میراث بھی قرار دے دیا جائے تو اس صورت میں یہ بچہ (حکم خداوندی کے مطابق) اس ترکہ میں سے اپنا حصہ پائے گا۔

۲۔ مگر جب صورت یہ ہو کہ والد خود اس بچے کو اپنانے سے منکر ہو۔ تو پھر ورثا کا یہ دعویٰ کہ "بچہ ہمارا ہے" بے معنی ہے۔

۳۔ بصورت دیگر۔ اگر یہ بچہ ایسی باندی کے بطن سے ہو، جو اس مرد کی ملکیت میں نہیں تھی۔ یا پھر کسی ایسی آزاد عورت کے بطن سے ہے۔ جس کے ساتھ اس (مرد) نے زنا کیا ہے ۔

تو یہ بچہ کسی صورت میں بھی متوفی سے منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ (یعنی یہ بچہ کسی حالت میں میت کا وارث نہیں قرار دیا جا سکتا)

(سنن ابن ماجہ جلد ۲ صفحہ ۱۵۹ - ۱۶۰)

(۱۷)

حضرت سعد بن ابی وقاص کہتے ہیں۔

حجۃ الوداع کے موقعہ پر میں مکہ میں تھا۔ ایسا سخت بیمار پڑا۔ کہ جینے کی امید نہ رہی۔

جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم میری عیادت کو میرے پاس تشریف لے آئے۔ تو میں نے حضورؐ کی خدمت میں گذارش کی۔ یا رسول اللہ۔ (بستر مرگ پر ہوں) میرے پاس حد سے زیادہ دولت ہے۔ لیکن صرف ایک بیٹی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی دوسرا وارث نہیں۔ میری خواہش ہے کہ اپنا دو تہائی مال (اللہ کی راہ میں) خیرات کر دوں۔ اس بارے میں آپؐ کا کیا حکم ہے؟

آپ نے فرمایا۔ اے سعد نہیں، ایسا نہ کرو۔

سعد (دوبارہ عرض کرتے ہوئے) حضورؐ! تو پھر نصف مال ہی سہی۔

رسول اللہؐ۔ نہیں (یہ بھی ٹھیک نہیں)۔

سعدؓ: حضورؐ (اگر آپؐ کی اجازت ہو) تو پھر ایک تہائی مال خیرات کر دوں۔

رسول اللہؐ:۔ ہاں، اے سعد۔ بس ایک تہائی مال کافی ہے (اسے اللہ کی راہ میں خیرات کر دو)۔ تمہارے لیے بہتری اسی میں ہے کہ اپنی اولاد کو مرفع الحال چھوڑ جاؤ۔ وہ کسی کے محتاج نہ رہیں تاکہ دوسروں کے آگے انھیں ہاتھ نہ پھیلانا پڑے۔ اور تجھے ہر اس شے کا اجر ملے گا، جو تو محض اللہ کی رضا کی خاطر اس کی راہ میں خرچ کرے۔ حتیٰ کہ وہ لقمہ بھی تیرے لئے باعث اجر ہوگا۔

جو تو اپنی بیوی کے منہ تک لے جائے ۔

(صحیح بخاری جلد ۵ ۔ کتاب الفرائض ص ۶۳۱)

(۱۸)

حضرت عائشۃ الصدیقہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں :

ایک دن بریرہ رضی اللہ عنہا میرے پاس آئی اور کہنے لگی

"میں نے اپنے مالکوں سے نو اوقیہ پر مکاتبت کی ہے ۔ اور مجھے ہر سال ایک اوقیہ ادا کرنا ہوگا ۔ (جب نو پورے ہوں گے تو آزادی ملے گی) آپ میری مدد فرمائیں "

چنانچہ میں نے کہا :

اے بریرہ! اگر تمہارے مالک اس بات پر راضی ہوں تو میں پوری رقم یکمشت ادا کرنے کو تیار ہوں ۔ تاکہ تمہیں آزاد کر دیا جائے ۔ البتہ (یہ اپنے مالکوں کو بتا دے) کہ تیری (ولا) کی مالک میں ہوں گی ۔

بریرہ اپنے مالکوں کے پاس گئی اور انھیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی بات سنائی لیکن انہوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا ۔ البتہ وہ اس شرط پر سودا کرنے کو تیار ہو گئے کہ ولا اُن کو ملے ۔ (یعنی ترکہ کے وہ وارث ہوں گے)

جناب صدیقہ نے یہ معاملہ حضور کے گوش گذار کیا تو آپ نے فرمایا ۔

— تم اے عائشہ مکاتبت کی پوری رقم ادا کر دو ۔ اس کے بعد بریرہ کو آزاد کر دو ۔ ولا (ترکہ) کی مالک تم ہی ہو گی ۔ (کیوں کہ تم نے اُسے آزاد کرایا ہے)

پھر جناب سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا ۔

حیرانی کی بات ہے کہ لوگ اس قسم کی شرائط معاملات میں عائد کرتے ہیں ۔ جو اللہ کی کتاب میں موجود نہیں ۔ اور جو شرط اللہ کی کتاب میں نہ پائی جائے ۔ وہ باطل ہے ۔ (اس کا باندھنے والا گنہگار ہے ۔)

یاد رکھو! اللہ کا فیصلہ زیادہ وزنی اور اٹل ہے ۔ اللہ کی عائد کردہ (حدود) اور شرائط زیادہ مضبوط ۔

اور غور سے سنو! ولا کا مالک وہی ہوگا ۔ جو (لونڈی / غلام کو) آزاد کرائے ۔

۱ ۔ صحیح بخاری جلد ۵ کتاب الفرائض ص ۶۳۴
۲ ۔ صحیح مسلم ۔ / ۳ مشکوٰۃ جلد ۲ ص ۲۳

(۱۹)

جب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم عمرۃ القضاء ادا کرنے کے بعد فارغ ہو لئے اور معاہدے کی میعاد (تین یوم) بھی پوری ہو گئی ۔ تو قریش کے چند لوگ حضرت علی کے پاس آئے اور کہا ۔

یا علی! (معاہدے کی میعاد پوری ہو چکی) اپنے صاحب (جناب رسالتمآب) سے کہیں کہ وہ اب فوراً مکہ سے کوچ کریں ۔

چنانچہ آپ نے سنتے ہی کوچ کا حکم دیا ۔ جس وقت جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے روانہ ہونے کو تھے تو جناب حمزہ رضی اللہ عنہ

کی بیٹی، چچا، چچا پکارتی ہوئی حضورؐ کے پیچھے دوڑی ۔ حضرت علی حیدرؓ نے اُس بچی کو بازوؤں میں تھام لیا ۔ اور جناب فاطمۃ الزہراؓ کے حوالے کرتے ہوئے کہا ۔

لو ۔ یہ تمہارے چچا کی بیٹی ہے ۔ اسے سنبھالو ۔

اس پر حضرت علی حیدرؓ، حضرت زیدؓ اور حضرت جعفرؓ کے درمیان تُو تُو مَیں مَیں ہونے لگی ۔ ہر ایک کا یہی مطالبہ تھا کہ بچی پر اُس کا حق زیادہ ہے ۔ لہٰذا بچی اُسے ملنی چاہیے ۔

حضرت علیؓ کا دعویٰ تھا ۔ یہ میرے چچا کی بیٹی ہے ۔ (اس لئے میرا حق فائق ہے)

حضرت جعفرؓ کا اصرار تھا ۔ یہ میرے چچا کی بیٹی ہے، میری بھتیجی ہے ۔ اور اس کی خالہ میرے نکاح میں ہے (میرا حق دُہرا ہے)

جبکہ زید مُصر تھا کہ نہیں ۔ یہ میرے بھائی کی بیٹی ہے ۔

حضورؐ نے یہ صورت حال دیکھی تو تینوں کو بلایا اور فیصلہ دیا کہ بچی پر حضرت جعفرؓ کا حق زیادہ ہے ۔ اسے لئے اُسے ملنی چاہیے ۔ اس طرح یہ لڑکی اپنی خالہ کے پاس رہے گی (اور وہ اس کی اچھی طرح دیکھ بھال کرے گی) کیوں کہ خالہ بمنزلہ ماں کے ہوتی ہے ۔

پھر آپؐ نے حضرت علیؓ سے فرمایا ۔ تم مجھ سے ہو اور میں تم سے ہوں ۔

حضرت جعفرؓ سے فرمایا ۔ تم خَلق و خُلق میں مجھ سے زیادہ ملتے جلتے ہو ۔

اور حضرت زیدؓ سے فرمایا ۔ اے زید! تم میرے بھائی بھی ہو اور ساتھی بھی ۔ (صحیح بخاری .....)

(۲۰)

عُتبہ بن ابی وقاص نے اپنے بھائی سعد بن ابی وقاص کو وصیت کی کہ دیکھو سعدؓ! زمعہ بن قیس کی لونڈی کے بطن سے جو لڑکا ہے ۔ وہ میرے نطفے سے ہے ۔ لہٰذا جب مکہ جانا ہو ۔ تو اس لڑکے کو اپنے قبضہ میں کر لینا ۔

جس سال مکہ فتح ہوا ۔ تو حضرت سعدؓ بھی حضورؐ کے ساتھ تھے ۔ انہوں نے اُس لڑکے (عبدالرحمان) کو دیکھا ۔ تو پکڑ لیا ۔ اور لگے کہنے ۔

یہ میرا ہے ۔ میرا بھتیجا ہے ۔ میرے بھائی نے مجھے وصیت کی تھی کہ میں اسے اپنے سایہ عاطفت میں لے لوں ۔

یہ دیکھا تو عبد بن زمعہ بھی کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے ۔

نہیں، ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا ۔ یہ میرا بھائی ہے ۔ میرے باپ کے بستر پر پیدا ہوا ہے ۔ میرے باپ کی لونڈی کے بطن سے ہوا ہے ۔ (اس پر کوئی دوسرا کیسے حق جتا سکتا ہے؟)

دونوں میں تو تو میں میں ہونے لگی ۔ جھگڑتے ہوئے جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں پہنچے ۔ تو سعدؓ کہنے لگے ۔

۱؎ حضرت حمزہؓ حضورؐ کے رشتے میں چچا تھے ۔ لیکن رضاعی بھائی بھی تھے ۔ اس لئے حضرت علیؓ حضرت حمزہؓ کو جناب سیدۃ النساءؓ کا چچا بتا رہے ہیں

یارسول اللہؐ! یہ لڑکا میرا بھتیجا ہے۔ (میرے بھائی عُتبہ کا بیٹا ہے) اُس نے مجھے وصیت کی تھی کہ میں اِسے لے لوں۔
پھر عبد بن زمعہ کہنے لگے۔ نہیں، یارسول اللہ! یہ میرا بھائی ہے۔ یہ میرے باپ کے بستر پر پیدا ہوا۔ میرے باپ کی لونڈی نے اِسے جنا ہے۔ (اس پر میرا حق ہے)

دونوں کا دعویٰ اور جواب دعویٰ سننے کے بعد حضورؐ نے فیصلہ صادر فرمایا،
"اسے عبد بن زمعہ! یہ بچہ تو لے لے"۔ (اس پر تمہارا حق ہے)۔ بچہ اُسی کا ہوتا ہے۔ جس کے بستر پر پیدا ہُوا ہو۔ اور زانی کے لئے پتھر ہیں۔ (اُسے سنگسار کیا جائے)

اس فیصلہ کے باوجود آپؐ کو یقین ہو گیا کہ لڑکا عُتبہ کا ہے۔ اس لیے آپؐ نے اپنی زوجہ ام المومنین سودہ بنت زمعہ کو حکم دیا۔
"کہ آئندہ اس لڑکے سے پردہ کیا کرو"۔

چنانچہ ام المومنین مرتے دم تک اُس کے سامنے نہیں آئیں۔

(صحیح بخاری جلد ۵ کتاب الفرائض ص ۶۳۹ – ۶۴۰)

(۲۱)

جناب سیدالمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ عورت تین شخصوں کی میراث میں حق دار ہو سکتی ہے۔
۱۔ ایک تو وہ غلام جسے اُس نے آزاد کیا ہو۔
۲۔ دوسرے وہ بچہ جس کی اس نے پرورش کی ہو۔
۳۔ تیسرے وہ بچہ جو لعان کی صورت میں اُس کو ملا ہے۔

(راوی: واثلہ بن اَسقعؓ) مشکوٰۃ جلد ۲ ص ۵۸

(۲۲)

بنو خزاعہ کا ایک شخص انتقال کر گیا، لوگ اس کی میراث جنابِ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے آئے۔ (کیونکہ اس کے ترکہ کا کوئی وارث نہیں تھا)۔ اس لیے حضورؐ نے فرمایا:
"اس کے وارث کو یا کسی قریبی رشتہ دار کو تلاش کرو"۔
تلاش بسیار کے بعد بھی جب کوئی وارث یا قریبی رشتہ دار نہ ملا تو حضورؐ نے فیصلہ صادر فرمایا کہ
"بنو خزاعہ میں سے کسی بڑے کو تلاش کرو اور متوفی کا ترکہ اس کے حوالے کر دو"۔

مشکوٰۃ جلد ۲ ص ۵۸

(۲۳)

حضرت مغیرہ بن شعبہؓ اور محمد بن مسلمہ انصاریؓ دونوں بیان کرتے ہیں۔ کہ ہم اس وقت موجود تھے۔ جب سیدالمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نے (متوفی کی) نانی کو (ترکہ کا) چھٹا حصہ دلایا۔

(موطا امام مالک، باب المیراث ص ۵۶۷)

(۲۴)

زید بن اسلم روایت کرتے ہیں۔ کہ ایک بار حضرت عمر فاروق رضؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کلالے (کی میراث) کے متعلق دریافت کیا تو جناب سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

کیا سورۂ نسأ کی آخر کی وہ آیات جو گرمی میں نازل ہوئیں تیرے لئے کافی نہیں؟[ل]

موطا۔ امام مالک۔ باب المیراث ص۵۶۸-۵۶۹

(۲۵)

اوس بن ثابتؓ کی بیوہ جناب ختمی مرتبت سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور آپ کی خدمت میں عرض کیا۔

یارسول اللہؐ! میرے خاوند اوس بن ثابت فوت ہو گئے ہیں، اس نے اپنے پیچھے دو لڑکیاں اور ایک نابالغ لڑکا چھوڑا ہے۔ عرب کے قدیم دستور کے مطابق اوس کے دو چچا زاد بھائیوں نے آکر مرحوم کی املاک و مال پر قبضہ جما لیا۔ میری اولاد اور مجھے کچھ نہیں دیا۔ عورت تو (قدیم دستور کے مطابق) عورت ہونے کے ناطے وراثت کی حق دار نہ رہی۔ اس سلسلے میں اور دونوں بچیاں میراث سے محروم کی گئیں اور اوس کا لڑکا چوں کہ ابھی نابالغ تھا۔ اس لیے اُسے بھی اس وجہ سے میراث سے محروم کیا گیا۔ لہٰذا پورے مال کو ہتھیا کر دونوں اپنے طور پر وارث بھی بن گئے۔

یارسول اللہؐ! میں نے یہ بھی کوشش کی کہ یہ دونوں چچازاد بھائی جنھوں نے پورے ترکہ کو ہتھیا لیا ہے۔ ان دو لڑکیوں (اوس کی بیٹیوں) سے نکاح کریں تاکہ اُن کی فکر تو دامن گیر نہ رہے۔ مگر وہ اس کے لیے بھی تیار نہ ہوئے اور انکار کر دیا۔

اس لیے آپ کی بارگاہ میں حاضر ہوئی ہوں تاکہ اپنی محرومیوں اور بچوں کی بے کسی کی شکایت آپؐ کے حضور پیش کروں۔

ابھی تک چوں کہ قرآن مجید میں وراثت کا قانون نازل نہیں ہوا تھا۔ اس لیے جناب سید المرسلینؐ نے قدرے جواب دینے میں توقف فرمایا۔ لیکن جناب رسالت مآبؐ کو کامل یقین تھا کہ اس ظالمانہ رسمی قانون کو بدلنے کے لیے اللہ تعالیٰ ضرور احکامات نازل فرمائیں گے۔

چنانچہ اُسی وقت آیات میراث نازل ہوئیں۔ پہلے

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ . . . . . . اور كَثُرَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا ۝ (سورۂ نسأ: ۷)

اور اس کے بعد دوسری آیات میراث نازل ہوئیں جن میں میراث کے حصوں کی تفصیلات ہیں۔ (سورۂ نسأ ۱۱: ۱۲)

تو جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے احکام قرآنی کے مطابق فیصلہ صادر فرمایا۔

ل۔ کلالے کے باب میں دو آیتیں نازل ہوئیں:-

ا۔ سورۂ نسأ کے اول میں: وَإِن كَانَ رَجُلٌ يُورَثُ كَلَالَةً ۔ یہ سردیوں کے موسم میں نازل ہوئی۔

ب۔ سورۂ نسأ کے آخر میں: يَسْتَفْتُونَكَ قُلِ اللَّهُ يُفْتِيكُمْ فِي الْكَلَالَةِ ۔ یہ گرمیوں کے موسم میں نازل ہوئی۔

۱۔ بیوی کو کل ترکہ کا آٹھواں حصہ عطا فرمایا۔
۲۔ باقی مال میں نصف اوس کے لڑکے کو عطا فرمایا۔
۳۔ باقی نصف دونوں لڑکیوں کے درمیان برابر تقسیم فرمایا۔
۴۔ چچا زاد بھائیوں کو وراثت سے محروم کیا۔ کیوں کہ اولاد کے مقابلہ میں وہ اقرب نہ تھے۔

۱۔ معارف القرآن جلد ۲ تفسیر سورۂ نسار صـ ۳۰۹ - ۳۱۰
۲۔ معالم القرآن جلد ۴ تفسیر سورۂ نسار صـ ۶۳۹ - ۶۴۰
(بحوالہ روح المعانی و بیان القرآن)

متفرقات

(۱)

ابنِ عباسؓ فرماتے ہیں۔
جناب سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔
اگر محض دعویٰ کی بنا پر لوگوں کے حق میں فیصلہ کر دیا جائے تو ہو سکتا ہے۔ کہ لوگ بندوں کے خون اور اموال پر بھی دعویٰ کر بیٹھیں۔
ایسی صورت میں مدعا علیہ پر لازم ہے کہ وہ قسم کھائے۔ (مشکوٰۃ جلد ۲ صـ ۲۰۳)

(۲)

ابو امامہ بیان کرتے ہیں۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:
جو آدمی محض اس لیے قسم کھاتا ہے کہ وہ ایسا کرنے سے کسی (دوسرے) مسلمان کا حق غصب کرے گا۔ ایسے شخص کے لئے جنت حرام کر دی جاتی ہے اور اللہ پاک اس کیلئے نارِ جہنم واجب کر دیتے ہیں۔ (مشکوٰۃ جلد ۲ صـ ۲۰۳)

(۳)

ام المومنین حضرت ام سلمہؓ بیان فرماتی ہیں:۔

رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا:" تم میرے پاس اپنے دعوے لے کر آتے ہو۔ ہو سکتا ہے تم میں کے بعض تیز وطرار ہوں اور مدلل تقریر کرنے والے ہوں۔ اس صورت میں یہ بھی ممکن ہے کہ میں ایسے شخص کے حق میں فیصلہ کر دوں۔ (اگر ایسا ہو جائے) تو اُسے وہ چیز ہرگز نہیں لینی چاہیئے۔ جو حقیقت میں تمہارے بھائی کی ہو۔ اگر جانتے بوجھتے اُس چیز کو ہتھیانا چاہتے ہو، تو سمجھ لو، کہ تم محض آگ

کے ایک ٹکڑے کو اپنے قبضے میں لے رہے ہو۔ (متفق علیہ : ا۔ صحیح بخاری / ۲۔ صحیح مسلم)

(۴)

ایک عورت جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا۔
یا رسول اللہ! میں نے اپنی والدہ کو ایک کنیز صدقہ میں دی تھی۔
میری والدہ رحلت فرما گئیں۔ (اب میرے لیے اس بارے میں کیا حکم ہے؟)
آپ نے فرمایا: باری تعالیٰ تمھیں اس کا اجر عطا کریں گے۔
اور حکم دیا کہ وہ کنیز اب میراث کے طور پر پھر تیری ہو گئی۔ (سنن ابن ماجہ جلد ۲ صہ ۶۲)

(۵)

ایک شخص حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا
یا رسول اللہ! میں نے اپنی والدہ کو ایک باغ عطیہ کے طور پر دیا تھا۔ اب جبکہ میری والدہ انتقال کر گئی ہے۔ میرے سوا اس کا کوئی وارث بھی نہیں۔ (تو میرے لئے کیا حکم ہے؟)
آپ نے فرمایا۔ تیرا صدقہ اللہ پاک قبول فرمائیں گے، چونکہ اپنی والدہ کے ترکہ کا تو وارث ہے۔ اس لئے یہ باغ بطورِ میراث اب پھر تیرا ہو گیا۔ (سنن ابنِ ماجہ جلد ۲ صہ ۶۳)

(۶)

ایک انصاری نے اپنے والدین کو کچھ مال صدقہ کے طور پر دیا۔ وہ دونوں بقضائے الٰہی اس دارِ فانی سے رخصت ہو گئے
چونکہ اُن کا وہی ایک بیٹا تھا اس لیے وہی اُن کے مال و اسباب کا وارث ہوا۔
(بعض لوگوں کو اس پر تردد ہوا) تو انہوں نے جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہو کر اس بارے میں حضورؐ سے استفسار فرمایا۔ (اُن میں وہ شخص بھی تھا) آپ نے اُسی (فرزند) سے فرمایا۔
یہ میراث بھی تمہاری ہے اور تم نے جو صدقہ کیا تھا اس کا ثواب بھی تمہیں ملے گا۔ (موطا امام مالک)

(۷)

خیبر کی ایک عمدہ اراضی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے حصے میں آئی حضرت فاروق جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تاکہ اس بارے میں آپ سے رہنمائی حاصل کریں۔ چنانچہ انہوں نے آپ کی خدمت میں عرض کیا۔
یا رسول اللہ! خیبر میں جیسی عمدہ اراضی میرے حصہ میں آئی۔ ویسی زمین مجھے زندگی بھر نصیب نہیں ہوئی۔ آپ کا مشورہ مطلوب ہے۔ جنابِ رسالتمآبؐ نے فرمایا۔ بہتر ہے کہ تم اصل (زمین) رکھ لو اور اس سے جو نفع حاصل ہو اُسے صدقہ کر دو۔
اور صحیح مسلم میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ اگر چاہو تو اسے اللہ کی راہ میں وقف کر دو،
چنانچہ حضرت عمرِ فاروق نے آپ کے فرمان پر عمل کیا۔ اور یہ زمین وقف کر دی۔ اس کے لیے یہ شرائط متعین کر دیں۔

۱- یہ رقبہ زمین فروخت نہ کی جائے
۲- نہ اسے میراث میں تقسیم کیا جائے اور نہ ہی ہبہ میں کسی کو دیا جائے ۔
۳- یہ زمین فقراء- ذوی القربیٰ- غلاموں، مجاہدوں- مسافروں- کمزوروں اور مہمانوں کے لئے صدقہ ہے۔
۴- البتہ اس کا جو متولی ہو- اس کے لئے جائز ہے کہ وہ دستور کے مطابق اس زمین کی پیداوار خود کھائے - دوستوں کو کھلائے- لیکن اس سے حاصل شدہ مال جمع کرنے کی اُسے ہرگز اجازت نہیں ۔

۱- صحیح مسلم : باب الوقف
۲- سنن ابن ماجہ : جلد ۲ صہ ۹۳

(۸)

خیرہ، جو مالک کے فرزند کعب کی زوجہ تھی- جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی- وہ اپنے ساتھ اپنے زیورات بھی لے آئی اور عرض کیا ۔
یا رسول اللہؐ! میں انھیں (زیورات کو) صدقہ کرنا چاہتی ہوں- (آپؐ کا کیا فرمان ہے!)
رسول اللہؐ: (سنو) اگر کوئی عورت صدقہ کرنا چاہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ پہلے اپنے خاوند سے اجازت لے- ورنہ اس کا صدقہ جائز نہیں- کیا تم نے کعب (عورت کا خاوند) سے اجازت لے لی ہے؟
خیرہ :- جی ہاں - یا رسول اللہؐ!
پھر بھی (مزید تسلی کے لیے) جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو کعب کے پاس بھیجا- تا کہ معلوم کرے کہ اُس نے اپنی بیوی کو (زیورات) صدقہ کرنے کی اجازت دی ہے یا نہیں- جب اُس سے استفسار کیا گیا تو اُس نے اثبات میں جواب دیا۔
اس پر حضور سید الکونینؐ نے اُسے صدقہ کی اجازت دے دی ۔

سنن ابن ماجہ جلد ۲ صہ ۶۱

(۹)

نعمان بن بشیر بیان کرتے ہیں کہ
اُن کے والد یعنی جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے گئے اور عرض کیا ۔
یا رسول اللہ: آپ گواہ رہیں کہ میں نے فلاں فلاں چیز اپنے بیٹے نعمان کو ہبہ کر دی ہے ۔
بعض دوسری روایات میں ہے کہ اس کی والدہ کے اصرار پر یہ چیز ہبہ کر دی ہے اس کی بات سن کر حضور نے فرمایا۔
اے شخص! جیسے تم نے نعمان کو ہبہ کر دی ہے، کیا اتنا دوسرے بچوں کو بھی دیا ہے؟
تو میرے والد نے جواب دیا- نہیں، یا رسول اللہ ۔

اس پر حضور نے فرمایا۔ تو پھر مجھے معاف رکھو۔ کوئی دوسرا گواہ بنا لو، (میں اس معاملے میں تمہاری تائید نہیں کر سکتا) اور اسے شخص۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ تمہارے سارے بچے تمہارے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آئیں۔
میرے والد نے کہا۔ کیوں نہیں حضور!
تو آپ نے فرمایا۔ پھر ایسا مت کرو۔ (ہر ایک کو برابر کا حصہ دو)
(سنن نسائی / سنن ابن ماجہ جلد ۲ صـ۵۵)

(۱۰)

حضرت عمر فاروق رض بیان کرتے ہیں:
میرے پاس ایک عمدہ نسل کا گھوڑا تھا۔ میں نے اُسے اللہ کی راہ میں صدقہ کر دیا۔ لیکن جس شخص کو میں نے صدقہ میں یہ گھوڑا دیا تھا۔ (اس نے اس کی نگہداشت نہ کی) اور تباہ کر دیا۔ کیوں کہ وہ نادار تھا۔ میں نے جب اپنے گھوڑے کی یہ حالت دیکھی، تو چاہا کہ اپنے (صدقہ شدہ) گھوڑے کو اُس شخص سے واپس قیمتاً لے لوں لیکن میں نے ایسا کرنے سے پہلے یہ مناسب سمجھا کہ حضورؐ سے مشورہ کر لوں۔ چنانچہ میں حضور سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور صورتِ حال آپؐ کے سامنے رکھی۔

آپ نے فرمایا۔ (اے عمر!) مت خریدو اس کو، چاہے ایک درہم میں کیوں نہ ملے۔ اور مت واپس لو صدقہ اپنا۔ سنو صدقہ واپس لینے والے کی مثال اُس کتے کی سی ہے۔ جس نے خوب پیٹ بھر کر کھایا، پھر قے کر دی اور پھر اپنی ہی قے کو چاٹنے لگ گیا۔
(صحیح مسلم جلد ۲ صـ۲۴۳)

(۱۱)

عاص بن وائل نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی کہ میری طرف سے سو غلام آزاد کر دیئے جائیں۔ اس کے بیٹے ہشام نے تو باپ کی خاطر پچاس غلام آزاد کر دیئے۔ لیکن دوسرے بیٹے عمرو نے جب اپنی طرف سے پچاس غلام آزاد کرنے کا ارادہ کیا۔ (تو سوچ میں پڑ گیا)۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ جب تک اس بارے میں جنابِ سید الکونین سے پوچھ نہیں لوں گا۔ ایسا نہیں کروں گا۔
عمرو جنابِ رسالتمآبؐ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور عرض کیا۔ یا رسول اللہ! میرے باپ نے ہمیں (مجھے اور میرے بھائی) کو وصیت کی تھی۔ کہ اُس کی طرف سے سو غلام آزاد کئے جائیں۔ میرے بھائی ہشام نے تو وصیت پر عمل کرتے ہوئے پچاس غلام آزاد کر دیئے ہیں۔ اب مجھ پر پچاس غلام آزاد کرنا باقی ہیں۔ اب میرے لیے کیا حکم ہے؟ آیا میں بھی ایسا کر دوں؟
اس پر جنابِ رسالتمآبؐ نے فرمایا:
اے عمرو، اگر تمہارا والد مسلمان ہوتا۔ اور تم اس کی طرف سے غلام آزاد کرتے، صدقہ دیتے، یا حج کرتے۔ اُسے ثواب پہنچ جاتا۔ (لیکن اب ایسا کرنا جائز نہیں)

بحوالہ ابوداؤد مشکوٰۃ جلد ۲ صـ۶۳

(۱۲)

جنابِ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:
اگر کوئی شخص کوئی چیز کسی دوسرے شخص کو عمر بھر کے لیے دے تو یہ جائز ہے۔ بہتر یہی ہے کہ نہ عمریٰ کیا جائے اور نہ رقبیٰ
پھر بھی اگر کسی شخص نے عمریٰ اور رقبیٰ کر لیا۔ تو وہ چیز ہمیشہ کے لیے اس کی ہوگئی جس کے حق میں عمریٰ اور رقبیٰ کیا جائے۔ چاہیے
وہ زندہ رہے یا مر جائے۔
لیکن اگر کوئی شخص ایک چیز دے کر واپس لے (تو یہ جائز نہیں)۔ یہ تو ایسے ہے کہ جیسے اُس نے قے کی اور پھر اُسے چاٹ لیا۔
راوی: ابن عباس و ابن عمرؓ / سنن نسائی صہ ۱۳-۱۷ / ۳

(۱۳)

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی زُرعہ اور قبیلہ جہینہ کے ایک خاندان بنی ربعہ کو امان نامہ عطا فرماتے ہوئے لکھا:
ان کو جان اور مال کی امان دی جاتی ہے۔ اگر کوئی اِن کے خلاف جنگ کرے یا ظلم و
زیادتی کرے، تو اس کے خلاف اُن کی امداد کی جائے سوائے دین اور اہل کے۔ اور ان
میں سے جو دیہات کے رہنے والے ہیں، وہ اگر نیکی اور تقویٰ کو اپنائیں۔ تو اُن کے لیے بھی
وہ ساری مراعات ہوں گی جو اُن کے شہریوں کو عطا کی گئی ہیں۔ (طبقاتِ ابن سعد جلد ۱)

(۱۴)

ایک شخص کے چھ غلام تھے۔ ان غلاموں کے علاوہ اس کے پاس کوئی دوسرا مال یا ترکہ نہیں تھا۔
اُس نے مرتے وقت یہ سارے غلام آزاد کر دئیے۔ لیکن جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کے فیصلہ پر صاد نہیں فرمایا۔
چنانچہ ان غلاموں کو بلایا۔ اُن کو تین حصوں میں الگ الگ کر دیا۔ اور پھر ان پر قرعہ اندازی فرمائی۔ دو کو (جن کے نام قرعہ نکلا) آزاد
فرما دیا اور باقی چار غلام رہے۔
آپ نے آزاد کرنے والے متوفی کے بارے میں سخت کلامی فرمائی۔ (یعنی اس کے فعل کو پسند نہیں فرمایا)
(راوی: عمران بن حصین) سنن ابن ماجہ جلد ۲ صہ ۵ / مشکوٰۃ جلد ۲ صہ ۱۲۶

(۱۵)

ایک انصاری نے ایک غلام مدبر کیا۔ حالاں کہ اُس کے پاس سوائے اس غلام کے کوئی دوسرا مال ترکہ نہیں تھا۔ جب حضور
سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کی اطلاع ملی۔ تو آپ نے اس غلام کو بلایا اور حاضرین سے مخاطب ہو کر فرمایا:
"کون ایسا ہے، جو اس غلام کو مجھ سے خریدے؟"
نعیم بن نحام نے اُسے ۸۰۰ درہم میں خرید کر لیا اور پوری رقم حضورؐ کی خدمت میں پیش کی۔ چنانچہ آپ نے وہ پوری رقم
اُس شخص کے حوالے کی اور اُسے حکم دیا۔

(جاؤ) ! اس رقم کو اپنی جان پر خرچ کرو۔ اس کا تمھیں اجر ملے گا اگر کچھ بچ رہے تو اپنے اہل و عیال پر خرچ کرو۔
پھر بھی اگر بچ رہے تو اسے اپنے عزیز و اقارب میں تقسیم کر دو۔
اس کے باوجود بھی اگر رقم بچ رہے۔ تو اُسے اپنے ہمسایوں میں بانٹ دینا۔
راوی : جابرؓ صحیح مسلم / صحیح بخاری / مشکوٰۃ جلد ۲ صہ ۱۲۶ - ۱۲۷

(۱۶)

سویدؓ کہتے ہیں:۔
جناب سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا عہد مبارک تھا۔ ہم مقرن کے بیٹے اکٹھے رہا کرتے تھے۔ ہمارے پاس صرف ایک کنیز تھی۔ (اُس سے کوئی غلطی ہوگئی) تو ہم میں سے کسی ایک نے اُس کو منہ پر تھپڑ رسید کیا۔ جب اس بات کی خبر جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوئی۔ تو آپ نے ہمیں حکم دیا۔ کہ
اس کنیز کو آزاد کر دو۔ (صحیح مسلم جلد ۲ صہ ۲۸۴)

(۱۷)

معاویہؓ بن حکم روایت کرتے ہیں :
میری ایک لونڈی تھی۔ جسے میں نے بھیڑیں چرانے پر مامور کر رکھا تھا۔ وہ جبل اُحد اور جوانیہ کی وادی میں بھیڑیں چرایا کرتی۔ ایک دن ایسا ہوا کہ بھیڑیا آیا اور ایک بکری اُچک کر لے گیا۔ میں جب آیا۔ تو دیکھا کہ ریوڑ میں ایک بکری کم تھی۔ اس لیے میں نے اُس سے بکری کے متعلق استفسار کیا تو اُس نے جواب دیا کہ بکری تو بھیڑیا لے گیا۔
میں بنی آدم ہوں۔ غصے میں آپے سے باہر ہوگیا۔ میں نے اُس کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ رسید کیا۔ (اس کے فوراً بعد اپنے اس فعل پر مجھے ندامت محسوس ہوئی) تو میں جناب سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور پورا واقعہ آپ کے گوش گذار کیا۔

آپؐ کو میرا یہ فعل سخت ناگوار گذرا چنانچہ فرمایا " اے شخص — تو نے بڑا گناہ کیا ہے "۔
میں نے عرض کیا " یا رسول اللہ ! کیا میں اس لونڈی کو آزاد نہ کر دوں "
آپؐ نے فرمایا " اے معاویہ، جاؤ اور اس لونڈی کو میرے پاس لے آؤ "
جب میں لونڈی کو حضورؐ کی خدمت میں لے آیا تو حضور نے اس پر سوالات کئے:۔
رسول اللہؐ : " اللہ کہاں ہے ؟
لونڈی : " آسمان میں "۔
رسول اللہؐ : " اچھا بتلاؤ۔ میں کون ہوں ؟
لونڈی : حضورؐ ! آپ اللہ کے رسولؐ ہیں۔

یہ جوابات سن کر آپؐ نے حکم دیا۔ اسے معاویہ! اسے آزاد کر دو۔ یہ مسلمان ہے

(صحیح مسلم / مشکوٰۃ جلد ۲ صفحہ ۱۰۵)

لقطہ (گری پڑی چیز)

(۱)

سلمان بن ربیعہ کہتے ہیں، جناب سیدالکونین صلی اللہ علیہ وسلم کا عہد مبارک تھا مجھے سو اشرفیاں پڑی ملیں، میں وہ اشرفیاں لے کر جناب رسالتمآبؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور ان اشرفیوں سے متعلق آپ کا حکم دریافت کیا۔

آپ نے حکم دیا۔ پورا ایک سال ان کے متعلق اعلان کرتے رہو۔ (شاید ان کا مالک مل جائے) چنانچہ میں ایک سال تک حضورؐ کے فرمان کے مطابق اعلان کرتا رہا۔ لیکن اُن اشرفیوں کے مالک کا پتہ نہیں چلا۔ میں دوبارہ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا، صورتِ حال عرض کرنے کے بعد آپ سے پوچھا کہ اب میرے لیے کیا حکم ہے؟ آپ نے دوبارہ وہی حکم صادر فرمایا اس بار بھی اشرفیوں کا مالک تلاش کرنے میں مجھے ناکامی ہوئی۔ اس لیے پھر حاضرِ خدمت ہوا۔ تو حضورؐ نے فرمایا:

سلمان! اشرفیوں کو اچھی طرح گن لو، ان کی مہر کی خوب جانچ پڑتال کر لو۔ ایک سال مزید انتظار کرو۔ اگر اس کا مالک مل جائے تو بہتر۔ ورنہ تو ان اشرفیوں کا مالک ہوگا۔

(سنن ابن ماجہ جلد ۲ صفحہ ۹۳)

(۲)

زید بن خالد الجہنی بیان کرتے ہیں:

ایک شخص جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور حضورؐ سے سوالات کرنے لگا۔

اُس شخص نے حضورؐ سے گم شدہ اونٹ کے بارے میں دریافت کیا۔ (کہ اس بارے میں آپؐ کا کیا حکم ہے)؟ تو جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے رخسار مبارک لال سُرخ ہو گئے۔ آپ نے فرمایا۔

" اسے شخص! تجھے آخر اس (اونٹ) کے پکڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ چلنے کو اُس کے پاؤں ہیں۔ کھانے پینے کو اس کا پیٹ ہے۔ وہ خود چل پھر کر گھاس چرتا رہے گا، پیاس بجھائے گا۔ درختوں کے پتوں سے پیٹ بھر لے گا۔ یہاں تک کہ اس کا مالک اُسے پالے گا۔"

اُس شخص نے دوبارہ عرض کیا، "یارسول اللہ! گم شدہ بکری کے متعلق آپؐ کیا فرماتے ہیں؟" اس پر آپؐ نے فرمایا۔

"اُسے پکڑ کر قبضے میں کر لو، وہ تیرے لیے ہے۔ یا تیرے بھائی کے لیے ہے۔ ورنہ پھر بھیڑیئے کی ہے (یعنی۔ اس کا مالک آ جائے تو اُس کی ہے، ورنہ تیری اور اگر یونہی رہے۔ تو پھر بھیڑیا کی خوراک بن جائے گی)"

پھر اُس شخص نے پوچھا "یا رسول اللہ گری پڑی چیز کے لیے کیا حکم ہے"؟ تو آپ نے فرمایا۔

اُس کی تھیلی اور بندھن اچھی طرح ذہن نشین کر لو۔ ایک سال تک اس کے متعلق اعلان کرتے رہو۔ اگر اس گم شدہ مال کا مالک مل جائے تو اس کے حوالے کر دو، ورنہ تجھ کو اس پر تصرف کا پورا اختیار حاصل ہوگا۔

صحیح مسلم / صحیح بخاری / سنن ابن ماجہ جلد ۲ صد ۹۲-۹۳
مشکوٰۃ ۔ جلد ۲ صد ۵۴

احکام

(۱)

ایک شخص حضورؐ کی خدمت میں آیا اور عرض کی۔ "یا رسول اللہؐ! میرے باپ نے میرا پورا سرمایہ ختم کر دیا ہے"۔
جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :-

"اے شخص۔ تو بھی۔ اور تیرا سب کچھ تیرے باپ کا ہے۔ ہاں۔ تیری اولاد۔ تیری کمائی ہے۔ لہٰذا تجھے حق پہنچتا ہے کہ تو اُن کا کھا۔"

(۲)

دو آدمی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور ایک جانور کے متعلق اپنا دعویٰ پیش کیا۔ دونوں نے اپنے دعوے کے حق میں اپنی طرف سے گواہ بھی پیش کئے۔ گواہوں نے شہادت دی کہ جانور فلاں کا ہے۔ اس کی پیدائش اِس کے گھر میں ہوئی تھی۔

شہادت سننے کے بعد آپؐ نے اُس شخص کے حق میں فیصلہ دیا جس کے قبضہ میں جانور تھا۔

راوی : جابر بن عبداللہ   مشکوٰۃ جلد ۲ صد ۲۰۶

(۳)

دو شخص ایک اونٹ کا دعویٰ لے کر جناب سید الکونین کی بارگاہ میں حاضر ہوئے۔ ہر ایک کا یہی دعویٰ تھا کہ اونٹ میرا ہے۔ اور اپنے دعوے کے ثبوت میں دونوں نے اپنی طرف سے دو دو گواہ بھی پیش کئے۔

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ :

"یہ اونٹ دونوں میں نصف نصف تقسیم کر دیا جائے"

راوی : حضرت ابو موسیٰ اشعری رضؓ
مشکوٰۃ جلد ۲ صد ۲۰۶ / ابو داؤد، نسائی

(۴)

جناب سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کچھ لوگ حاضر ہوئے۔ اور آپؐ کے سامنے انہوں نے ایک

جھونپڑی کا مقدمہ پیش کیا - یہ جھونپڑی ان کے درمیان مشترک تھی۔ اس لئے دونوں فریق اس پر مصر تھے کہ یہ اُن کی ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حذیفہ رضؓ بن الیمان کو حکم بنا کر اُن کے ساتھ کر دیا - تاکہ حذیفہ (موقعہ پر جاکر) اُن کے درمیان فیصلہ کرے۔

حذیفہ رضؓ نے یہ فیصلہ صادر کیا کہ جس شخص کی رسی اِس جھونپڑی سے بندھی ہوئی ہے - وہی شخص اس جھونپڑی کا مالک ہے فیصلہ کرنے کے بعد حذیفہ رضؓ جناب رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا فیصلہ حضورؐ کے سامنے پیش کیا۔ حضورؐ نے اس پر صاد کرتے ہوئے فرمایا - تم نے صحیح اور احسن فیصلہ کیا ہے -

(سنن ابن ماجہ جلد ۲ صہ ۸۸ - ۸۹)

(۵)

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضؓ بیان کرتے ہیں کہ :-

جناب سیدالابرار صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دو شخص پیش کئے گئے جو ایک جانور کے بارے میں باہم جھگڑ رہے تھے - لیکن کوئی شخص ایسا نہیں جو ان میں سے کسی کے حق میں شہادت دے

اس لیے سرورِ عالمؐ نے اس جانور کو دونوں میں مساوی تقسیم فرما دیا -

(سنن ابن ماجہ جلد ۲ صہ ۴۵ - ۴۶)

(۶)

جناب سیدالمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دو شخص پیش ہوئے - ایک کا تعلق کندہ سے اور دوسرے کا حضرموت سے تھا - ان دونوں کے درمیان ایک قطعہ زمین کا مقدمہ تھا جو یمن میں واقع تھا۔

حضرمی نے عرض کیا :- یارسول اللہؐ ! اس کِندی کے باپ نے میری زمین پر غاصبانہ قبضہ کیا تھا - وہی غصب شدہ زمین اب اس کے قبضے میں ہے۔

آپؐ نے فرمایا - کیا تیرے پاس کوئی گواہ بھی ہے -

حضرمی نے کہا : یارسول اللہؐ - گواہ تو کوئی نہیں - ہاں اگر یہ شخص قسم کھائے اور اللہ کو حاضر ناظر جان کر کہے کہ اسے اس بات کا علم نہیں کہ اُس کے باپ نے غاصبانہ قبضہ میری اراضی پر کیا تھا - (تو میں دستبردار ہونے کو تیار ہوں)

کِندی قسم کھانے کو تیار ہو گیا تو حضورؐ نے فرمایا -

" قسم کھا کر کسی کا مال ہتھیا لینا ہرگز جائز نہیں - ایسا شخص (جھوٹی قسم کھانے والا) حبیب اللہ کے حضور حاضر ہوگا تو اس کی حالت یہ ہوگی کہ دست بریدہ ہوگا۔"

کندی نے حضورؐ کی بات سُنی تو پکار اٹھا :

" یارسول اللہؐ ! (میں قسم نہیں کھاتا - میں تسلیم کرتا ہوں کہ) یہ زمین اس شخص کی ہے ۔

چنانچہ وہ زمین حضرمی کے حوالے کر دی گئی۔

سنن ابوداؤد / مشکوٰۃ جلد ۲ صـ ۲۰۷

(۷)

اشعث بن قیس بیان کرتے ہیں کہ:

میرے اور ایک یہودی کے درمیان ایک مشترک قطعۂ زمین تھا۔ یہودی نے (میری ملکیت تسلیم نہ کرتے ہوئے) میرا حصہ دینے سے انکار کر دیا۔

میں جناب سید المرسلین کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنا مقدمہ پیش کیا۔ آپؐ نے فرمایا:

"اے اشعث۔ ! تیرا کوئی گواہ بھی ہے؟"

میں نے جواب دیا "یا رسول اللہؐ! نہیں۔

آپؐ نے یہودی کو بلایا اور اُسے حکم دیا کہ قسم کھاؤ۔ جس پر میں نے عرض کیا:

"یا رسول اللہؐ! (اس یہودی کی قسم کا کیا اعتبار) یہ تو قسم کھا کر میرا مال ہضم کر دے گا۔"

اس پر یہ آیت نازل ہوئی:۔

اَلَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ..... الآیہ (۳: ۷۷)

سنن ابن ماجہ جلد ۲ صـ ۴۷/۴۳

ابوداؤد / مشکوٰۃ جلد ۲ صـ ۳۰۶

(۸)

سلمہ اپنے والد سے بیان کرتے ہیں:۔

ایک لڑکے کو اس کے والدین لے کر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اُن میں سے ایک کافر تھا اور دوسرا مسلمان۔ دونوں یہی چاہتے تھے کہ بچہ اُسے ملے۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس لڑکے کو اختیار دے دیا (کہ وہ جس کو چاہے اپنا لے۔)

وہ لڑکا کچھ دیر کے لیے کافر کی طرف مائل ہوتا نظر آیا تو جناب سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نے بارگاہِ الٰہی میں دُعا فرمائی کہ "اے اللہ! اسے ہدایت دے۔ اِسے سیدھی راہ دکھا۔"

اس پر وہ لڑکا رکا اور پھر اُس نے مسلمان کا دامن تھام لیا۔ اس لیے آپؐ نے مسلمان کے حق میں فیصلہ دے دیا۔

(۹)

یہ تحریر جناب محمد النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جانب سے وائل بن حجرؓ کے نام ہے۔ جو حضرموت کا رئیس ہے۔ وہ یہ ہے:

"چونکہ تم اسلام لے آئے ہو، اس لئے جس قدر اراضی اور قلعے تمہارے قبضے میں ہیں اُن پر تمہارا قبضہ برقرار رہے گا۔"

میں تمہارے حق میں یہ فیصلہ دیتا ہوں کہ ان مقبوضات کے بارے میں تم پر کسی قسم کی زیادتی نہیں کی جائے گی۔ جب تک دین پر قائم رہوگے تو نبیؐ اور مومنین اس سلسلے میں ہمیشہ تمہاری مدد کریں گے۔

(طبقات ابن سعد) بحوالہ کتابت حدیث .... صد ۱۰۰ - ۱۰۱

(۱۰)

یہ دستاویز۔ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے زبیرؓ کو عطا کی ہے۔ اس کی رُو سے سوارق کا پورا علاقہ۔ اُوپر کے حصّے سے زیریں حصّہ تک اور مؤرع کے قریہ سے موقت قریہ تک انھیں عطا کیا جاتا ہے۔ لہٰذا کسی شخص کو یہ حق نہیں پہنچتا۔ کہ وہ ان کے مقابلے میں اپنا حق جتلانے لگے۔ (الوثائق السیاسیہ۔ ڈاکٹر حمید اللہ)

مزارعت

(۱)

جنابِ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ تھا۔ حضرت زبیرؓ بن العوام اور ایک انصاری کے درمیان پانی (کی تقسیم) پر جھگڑا ہوگیا۔ یہ تنازعہ ایک نہر کے (پانی کے) بارہ میں تھا۔ جو حرّہ میں بہتی تھی اور جس سے زمینوں کو سیراب کیا جاتا تھا۔

(معاملہ یہ تھا) کہ انصاری نے زبیر سے کہا کہ وہ پانی کو روک نہ رکھے۔ زبیر نے اُس کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ جس پر دونوں میں تُو تُو مَیں مَیں ہونے لگی۔ یہاں تک کہ دونوں جھگڑتے ہوئے جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش ہوئے۔

(دونوں کے بیانات سننے کے بعد) حضورؐ نے ارشاد فرمایا:

(اے زبیر!) "پانی (زمینوں میں) چھوڑ دو، جب بھر جائیں تو اُسے آگے جانے دو۔"

(کیوں کہ پانی کے قریب پہلے حضرت زبیرؓ کا کھیت تھا اور اس کے بعد اُس انصاری کا کھیت تھا)

حضورؐ کے اس فیصلہ پر انصاری نے ناگواری محسوس کی۔ وہ درشت لہجے میں کہنے لگا "یا رسول اللہؐ! آپ نے اپنے فیصلہ میں جانبداری برتی ہے (انصاف سے کام نہیں لیا)۔ کیوں کہ زبیر آپ کی پھوپھی کا بیٹا ہے۔"

(انصاری کی گستاخانہ بات سُن کر) حضور سرورِ عالمؐ کے رُخِ انور کا رنگ متغیر ہوگیا۔ آپ نے فرمایا:

" اے نادان اگر میں نے انصاف نہ کیا تو پھر اور کون انصاف کرے گا۔ بخدا جس نے انصاف میں جانبداری سے کام لیا وہ کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔" اس کے بعد آپؐ نے زبیرؓ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

" اے زبیر! اپنی زمینوں کو خوب سیراب کرو، اس کے بعد بھی پانی کو روکے رکھو یہاں تک کہ وہ دیواروں تک بلند ہو جائے۔"

راوی:۔ زبیر بن عوام (سنن ابن ماجہ جلد ۲ صد ۸۲)

(۲)

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے۔
جو شخص مردہ زمین کو پھر سے زندہ کرے (بنجر اراضی کو قابلِ کاشت بنائے) اور اگر یہ زمین پہلے سے کسی مسلمان کے تصرف میں نہ ہو۔ (افتادہ ہو) ۔ تو اس زمین کا حق ملکیت اُسے حاصل ہوگا۔
لیکن جو کوئی ظلم و جبر کے ذریعہ کسی کی اراضی کو زیرِ کاشت لانے کی کوشش کرے۔ تو اس پر ایسے شخص کا کوئی حق نہیں ہوگا۔
(صحیح بخاری)

(۳)

چار افراد نے مل جل کر ایک قطعۂ اراضی کو کاشت کرنے کا منصوبہ بنایا۔ (ہر ایک نے اپنی طرف سے کسی نہ کسی چیز کی پیش کش کی۔)
ایک شریکِ کار نے کہا۔ زمین میری طرف سے ہوگی۔
دوسرے نے کہا۔ اس کے لیے بیج میں دوں گا۔
جبکہ تیسرے نے کہا۔ بیلوں کا جوڑا میں مہیا کروں گا۔
اور چوتھے شریک کار نے کہا۔ اس پر محنت اور مزدوری میں کروں گا۔
سب نے اپنے اپنے حصہ کا کام پورا کیا۔ جب فصل پک کر تیار ہوگئی تو کٹائی کا کام کیا گیا۔ کٹنے کے بعد ان لوگوں کے درمیان (فصل کی تقسیم کے بارے میں) جھگڑا کھڑا ہوگیا۔ چنانچہ وہ چاروں اپنا مقدمہ لے کر جناب سیدالابرار صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ (اور اپنا اپنا دعویٰ پیش کیا)
سیدالمرسلینؐ نے چاروں کے بیانات سن کر مندرجہ ذیل احکامات صادر فرمائے:
۱۔ مالک زمین کا دعویٰ غلط ہے۔ اس لئے اُسے کچھ نہ دیا جائے۔
۲۔ جس شخص نے بیل کا جوڑا مہیا کیا ہے۔ اُسے مقررہ اجرت دی جائے (جو آپ نے مقرر فرما دی)
۳۔ جس شخص نے زمین کو جوتا۔ بویا، محنت کی اُسے ایک درہم روزانہ کے حساب سے مزدوری دی جائے۔
۴۔ اور جس شخص نے بیج مہیا کیا ہے۔ فصل کا مالک وہ ہے۔ (واضحہ)

(۴)

جناب ختمی مرتبت سیدالمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نے اراضی کو پانی دینے سے متعلق درج ذیل فیصلہ صادر فرمایا:
۱۔ سب سے پہلے اُوپر والا شخص اپنے درختوں کو سیراب کرے اور ٹخنوں تک پانی دے۔ پھر اپنے سے بعد والے باغ کے لئے پانی کو واگذار کرے جو اس سے متصل ہو۔
۲۔ یہ دوسرا شخص (اس متصل باغ کا مالک) بھی اپنے باغ کو اچھی طرح سینچ لے اور اپنے سے بعد والے کے لیے پانی کو چھوڑ دے۔

۳۔ یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہے۔ تاوقتیکہ باغوں کا سلسلہ ختم ہو جائے۔ یا پھر سیرابی والے پانی کی مقدار ختم ہو جائے۔
(سنن ابن ماجہ جلد ۲ صـ ۸۷)

(۵)

بنی بیاضہ کے ایک شخص نے دوسرے شخص کی زمین میں اُس کی اجازت کے بغیر زد رسے کھجور کا درخت لگا دیا۔ دوسرے شخص نے جب اُس کے اِس قدم پر احتجاج کیا تو دونوں کے درمیان جھگڑا کھڑا ہو گیا۔ دونوں لڑتے جھگڑتے حضور سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش ہوئے۔ آپؐ نے (دونوں کے بیانات سننے کے بعد) فیصلہ صادر فرمایا کہ:

" زمین صاحبِ زمین کی ہے۔

درخت لگانے والے کو حکم دیا کہ (اُس کا حق وہاں درخت لگانے کا نہیں تھا اس لیے) وہ اپنا درخت وہاں سے اکھیڑ لے۔
(صحیح بخاری۔ کتاب ابی عُبید)

(۶)

رافع بن خدیج ایک روایت بیان کرتے ہیں، کہ

میں ایک قطعۂ اراضی زیرِ کاشت لایا۔ ایک دن میں اس زمین کو پانی دے رہا تھا کہ جناب سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کا گذر وہاں سے ہوا۔ مجھے زمین سینچتے ہوئے دیکھا تو ٹھیر گئے اور فرمایا:۔

" یہ زمین کس کی ہے اور اس میں کاشت کس نے کی ہے؟"

میں نے عرض کیا:" یا رسول اللہؐ! میں نے اس زمین میں محنت کی، ہل چلایا۔ سینچا اَور بیج بھی ڈالا۔ یہ کھیتی (کاشت زندہ فصل) میری ہے۔ اس میں کا ایک حصہ میرا ہے۔ اور ایک حصہ اس شخص کا جو اس قطعہ زمین کا مالک ہے۔ اور اس کا تعلق فلاں قبیلہ سے ہے۔ میں اس کا مالک نہیں"۔

اس پر جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اے رافع! تم نے اچھا نہیں کیا (یہ تو گناہ کا ارتکاب ہے)۔ تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ زمین اُس کے مالکوں کے حوالے کر دو۔ اور جو کچھ (بیج اور محنت وغیرہ کی صورت میں) تم نے اِس پر خرچ کیا ہے۔ وہ رقم اس کے مالکوں سے لے لو۔
(سنن ابی داؤد) باب المزارعت

(۷)

عبادہ رضؓ بن صامت فرماتے ہیں: کہ

اگر کسی شخص کے ایک دو یا تین درخت ہوں۔ اور وہ اس کے حقوق میں مختلف ہو جائیں۔ تو اس صورت میں جناب سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ فرمایا۔

کہ درخت کا احاطہ اس قدر ہے جس قدر اُس کے ارد گرد ٹہنیاں رکھی ہوں۔ یا پھر اس قدر ہوگا۔ جہاں جہاں تک اس

کی نشانیں پھیلی ہوئی ہوں۔ (سنن ابن ماجہ جلد ۲ صفحہ ۸۸-۸۹)

۶۔ باب البیوع

ارشاد باری تعالیٰ:

۱۔ خرید و فروخت (تجارت) کرنا بھی ایسا ہے جیسے قرض دے کر سود لینا حالاں کہ خرید و فروخت کو تو اللہ نے حلال ٹھیرایا ہے اور سود کو حرام۔

(البقرہ : ۲۷۵)

۲۔ ہاں اگر ایسا ہو کہ نقد (لین دین) کا کاروبار ہو جسے تم (ہاتھوں ہاتھ) لیا دیا کرتے ہو۔ تو ایسی حالت میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اگر لکھا پڑھی نہ کی جائے۔

لیکن (تجارتی کاروبار میں بھی) سودا کرتے ہوئے گواہ کر لیا کرو (تاکہ خرید و فروخت کی نوعیت اور شرائط کے بارے میں بعد کو کوئی جھگڑا نہ ہو جائے)

(البقرہ : ۲۸۲)

۳۔ آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقے سے مت کھاؤ۔ البتہ تجارت کرکے باہمی رضامندی سے لے سکتے ہو۔ (النساء)

بیع نامہ:

(۱)

عبدالمجید بن وہب بیان کرتے ہیں:

مجھ سے العداء بن خالد نے پوچھا کہ کیا میں تم کو ایک دستاویز نہ دکھاؤں جو جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے لیے تحریر فرمائی تھی۔

میں نے کہا "ضرور دکھایئے" تو انہوں نے مجھے وہ دستاویز دکھائی۔ (جس میں تحریر کیا گیا تھا کہ)

یہ دستاویز اس چیز کی ہے۔ جو العداء بن خالد بن ہوذہ نے (حضرت) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خریدی ہے۔ انہوں نے آپؐ سے ایک غلام یا باندی کو خریدا ہے۔ جو ہر لحاظ سے صحت مند ہے۔ نہ اس میں کوئی ایسی بات ہے۔ جو مال کی بربادی کا باعث بنے اور نہ ہی کوئی طبعی خباثت ہے۔

یہ ایسی بیع ہے جو ہر مسلمان کو دوسرے مسلمان بھائی سے کرنی چاہیے۔

۱۔ سنن ترمذی باب البیوع
۲۔ سنن ابن ماجہ جلد ۲ صفحہ ۲۴

(۲)

جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

خریدنے والے اور بیچنے والے کو ایک دوسرے پر اختیار حاصل ہے۔ جب تک وہ دونوں ایک ہی جگہ رہیں۔ مگر بیع خیار کی صورت، میں جبکہ ایک شخص دوسرے کو اختیار دے دے۔ تو دونوں کے جُدا ہونے کے بعد بھی دونوں کو اختیار کا یہ حق حاصل رہتا ہے۔ بیع فاسد نہیں ہوتی بلکہ پوری ہو جاتی ہے۔

لیکن دونوں میں سے کسی کے لئے یہ بات جائز نہیں کہ سودا یا معاملہ کرتے ہی، اُس مقام سے اُٹھ کھڑے ہوں۔ اس خیال سے کہ دوسرے کو بیع فسخ کرنے کا اختیار باقی نہ رہے۔ بہتر یہی ہے کہ جب تک سودا طے نہ ہو جائے، وہ دونوں اکٹھے رہیں۔

پھر بھی اگر معاملہ طے کرنے کے بعد دونوں ایک دوسرے سے الگ بھی ہو گئے لیکن کسی نے بھی بیع کو فسخ نہیں کیا تو بیع لازم ہو جائے گی۔

اگر خریدنے والا اور بیچنے والا دونوں صدق بیانی سے کام لیتے ہوئے (بکاؤ) چیز کی حقیقت بیان کر دیں یعنی اگر مال میں کوئی نقص وغیرہ ہو تو اُسے صاف صاف بیان کر دیں۔ ایسا سودا بابرکت ہوتا اور تجارت کے بیے ترقی کا باعث بنتا ہے۔

لیکن اگر وہ اخفا سے کام لیتے ہوئے جھوٹ کا سہارا لیں گے۔ یعنی مال کے نقص کو ظاہر کرنے میں اخفا سے کام لیں گے یا قیمت غلط بتائیں گے۔ تو ایسے سودے سے برکت اٹھالی جاتی ہے۔ نہ بیع میں برکت ہوتی ہے اور نہ ترقی۔

آپؐ نے مزید فرمایا :۔

کہ مال و اسباب فروخت کرنے کی خاطر قسمیں کھانے سے احتراز کیا جائے قسمیں کھانے سے مال تو فروخت ہو جاتا ہے، لیکن کمائی برباد ہو جاتی ہے اور یہ کہ اللہ پاک نہ ایسے شخص سے کلام کریں گے اور نہ اُس کی طرف دیکھیں گے، جو خرید و فروخت میں جھوٹی قسمیں کھائے۔

آپ نے فرمایا کہ

سچا اور امانت دار تاجر نبیوں، ولیوں اور شہیدوں کے زمرہ میں ہو گا۔

(صحیح بخاری / مسلم / ابوداؤد / ترمذی / نسائی)

(۳)

جنابِ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

حلال و حرام سب پر واضح ہے۔ ان دونوں (حلال و حرام) کے درمیان چند چیزیں ایسی ہیں۔ جو اُن سے ملتی جلتی ہیں۔ (جن کی شناخت ضروری ہے) تو جو شخص مشتبہ اور مشکوک چیز سے اجتناب برتے گا۔ تو سمجھ لو کہ اُس نے واضح، جلی اور صاف گناہ کو بدرجۂ اولیٰ چھوڑ دیا۔ لیکن جس شخص نے مشتبہ چیز (کو استعمال کرنے کی) جرأت کر لی۔ تو وہ کھلم کھلا حرام کا ارتکاب کرتا ہے۔

راوی: نعمان بن بشیر۔ (صحیح بخاری جلد ۱ ۔ کتاب البیوع صفحہ ۹۲۵)

(۴)

حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں :۔

ایک شخص نے غلام خریدا۔ خریدنے والے نے اُس غلام سے مزدوری بھی لی۔ اس دَوران اُس میں کوئی عیب نکل آیا۔ تو اُس نے غلام کو واپس کر دیا۔ اس پر بیچنے والا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا۔

یارسول اللہؐ! اس شخص نے میرے غلام سے مزدوری بھی لی اور اُجرت بھی۔ تو جناب رسالتمآب صلعم نے حکم دیا کہ خراج بیچنے والے کا ہوگا۔ اور کہ غلام کی واپسی کا اختیار تین دن تک ہے اس کے بعد نہیں۔

(سنن ابن ماجہ جلد ۲ صـ ۲۲-۲۳)

(۵)

حضرت علیؓ بیان فرماتے ہیں :۔

جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دو غلام عطا فرمائے۔ جو آپس میں بھائی بھائی تھے۔ (وہ دونوں بھائی تھے) میں نے ان میں کا ایک غلام فروخت کر دیا۔ آپؐ نے استفسار فرمایا :

"اے علی! تم نے اُن دو غلاموں کا کیا کیا؟"

میں نے عرض کیا :" یارسول اللہؐ! میں نے ایک کو فروخت کر دیا"

اس پر آپؐ نے حکم دیا :" اسے واپس لے لو، (اس کا فروخت کرنا جائز نہیں)

(سنن ابن ماجہ جلد ۲ صـ ۲۴)

(۶)

جناب سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

تم میں سے کسی کے لئے جائز نہیں کہ اپنے بھائی کی بیع پر بیع کرے۔ یہ سوقیانہ پن ہے کسی شہری کے لیے یہ ہرگز جائز نہیں کہ وہ اہلِ بادیہ کا مال فروخت کرے۔ کسی شخص کے لئے یہ جائز نہیں کہ (لوگوں کو دھوکا دینے کی خاطر) بکری یا اونٹنی کے تھنوں میں دودھ کو روک رکھے۔

جس شخص نے ایسا جانور خریدا۔ جس کے تھنوں میں (زیادہ قیمت وصول کرنے کی خاطر) دودھ روکا گیا ہو۔ تو خریدار کو اختیار ہے کہ (اگر دودھ اتنا نہ نکلے جتنا اُسے گمان تھا۔ یا ظاہر کیا گیا تھا)۔ چاہے تو جانور اپنے پاس رکھ لے اور چاہے تو بیچنے والے کو واپس کر دے۔ ہاں اُسے جانور تین دن کے اندر اندر واپس کرنے کا اختیار ہے۔

واپس کرنے کی صورت میں اُسے ایک صاع کھجور (بطور تاوان) ادا کرنے ہوں گے۔ کھجور کے بدلے اتنا ہی دودھ یا اس کے برابر گندم بھی ادا کر سکتا ہے۔

صحیح مسلم جلد ۲ کتاب البیوع صـ ۱۵۰-۱۵۱

سنن ابن ماجہ جلد ۲ صـ ۲۱-۲۲

(۷)

جنابِ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ مبارک میں یہ رواج تھا کہ لوگ قافلہ والوں سے راستہ ہی میں جاکر غلہ خرید کر لیتے۔ اس لیے آپؐ اُن (قافلہ والوں) کے پاس ایک شخص کو بھیج دیتے۔ جو آپؐ کی طرف سے انھیں ہدایت کرتا کہ وہ اُس جگہ غلہ نہ بیچیں۔ اور اس وقت تک فروخت نہ کریں جب تک مال منڈی (بازار) میں نہ پہنچ جائے۔

نیز آپؐ نے فرمایا کہ جو شخص اناج خریدے۔ تو وہ اس وقت تک اُس کی فروخت شروع نہ کرے جب تک وہ مال اس کے قبضے میں نہ آجائے۔

اور جو شخص کسی چیز میں بیع سلم کرے۔ تو اُس پر اپنا قبضہ کرنے سے پہلے کسی دوسرے کے ہاتھ میں فروخت نہ کرے۔

(راوی: ابن عمرؓ، ابوسعید خدری) صحیح بخاری جلد ۲ صہ ۹۵۹-۹۶۰ / مشکوٰۃ جلد ۲: صہ ۳۶

(۸)

جنابِ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:- کہ

اپنے اناج (کے ذخیرہ) کو ناپ تول لیا کرو،۔ اس سے برکت حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ جو لوگ حضورؐ کے زمانے میں اناج کے ڈھیر (بغیر ناپے تولے محض اندازے سے) خرید لیتے۔ تو انہیں (آپ کے حکم سے) سزا دی جاتی (کیوں کہ آپ کا حکم تھا کہ جب تک اناج گھر نہ لے جائیں، اُسے بیچیں نہیں۔)

راوی: ابن عمرؓ۔ صحیح بخاری، کتاب البیوع جلد ۲ صہ ۹۶۱-۹۶۲

(۹)

ایک شخص جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور حضورؐ سے شکایت کی کہ "یا رسول اللہ! لوگ اکثر مجھے خرید و فروخت میں دھوکا دے جاتے ہیں۔"

اس کی بات سن کر آپ نے فرمایا: "اے شخص! تم جب بھی معاملہ کرو۔ تو دوسرے شخص سے صاف صاف کہہ دیا کرو۔ بیع دھوکے اور فریب کا کام نہیں ہے۔ مجھے اس میں فریب دینے کی کوشش مت کرو۔"

راوی: ابن عمرؓ: (صحیح بخاری جلد ۲ صہ ۹۵۶)

(۱۰)

جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گذر ایک جگہ ہوا۔ جہاں پر غلّہ کا ڈھیر پڑا ہوا تھا۔ آپؐ ڈھیر کے قریب گئے اور اپنا دستِ مبارک ڈھیر کے اندر ڈال دیا۔ آپ نے ڈھیر کے اندر نمی محسوس فرمائی تو غلہ والے سے دریافت فرمایا: "اے شخص! یہ کیا ماجرا ہے؟"

اُس شخص نے کہا: "یا رسول اللہ۔ غلہ پر بارش ہوئی تھی۔ (میں نے گیلا غلہ خشک غلّہ کے نیچے چھپا دیا ہے۔)"

آپ نے فرمایا: "تو نے گیلے غلے کو اوپر کیوں نہیں رکھا: تاکہ خریدار اسے دیکھ سکیں۔"

سنو (یہ سراسر دھوکا ہے) اور جو شخص بیع میں فریب دہی سے کام لے۔ میں اُس سے بری الذمہ ہوں۔"
(صحیح مسلم / صحیح بخاری / مشکوٰۃ صد ۱۹-۲۰)

(۱۱)

جنابِ سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم صادر فرمایا:" کہ (جب ضرورت پوری ہو جائے) تو زائد پانی کو فروخت نہ کیا جائے انگور اس وقت تک نہ بیچے جائیں، جب تک پک کر سیاہ نہ ہو جائیں، غلہ اس وقت تک فروخت نہ کیا جائے جب تک پک کر تیار نہ ہو جائے، اور کھجور اس وقت تک نہ بیچی جائے۔ جب تک پک کر خوش رنگ نہ ہو جائے۔"

اس لیے جنابِ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ:

"مزابنہ کو اختیار نہ کیا جائے۔"

یعنی۔ درخت پر لگی (تازہ کھجور) کو خشک کھجور کے بدلے تول کر نہ بیچے۔ تازہ انگوروں کو خشک انگوروں کے بدلے میں ناپ کر کے فروخت نہ کرے اور کھڑی فصل کو غلہ کے بدلہ میں ناپ تول کر کے فروخت نہ کرے۔ یہ معاملات بیوع ممنوع ہیں

ایک شخص جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا:" یا رسول اللہؐ۔ کیا تازہ کھجور کو خشک کھجور کے ساتھ فروخت کرنا جائز ہے؟"۔

آپؐ نے فرمایا:" تازہ کھجور تو خشک ہو کر کم ہو جاتی ہے۔"

اُس نے کہا:" یا رسول اللہؐ! ہاں۔"

آپؐ نے حکم دیا:" ایسا مت کرو۔ (یہ جائز نہیں)۔"

(راوی: سعد بن ابی وقاص / حضرت انس بن مالک) مشکوٰۃ۔ جلد ۲ صد ۱۳، ۱۹-۲۰

(۱۲)

نجرانی کا بیان ہے کہ میں نے ابن عمرؓ سے دریافت کیا، کیا درخت پر پھل آنے سے پہلے بھی بیع سلم کی جا سکتی ہے۔ انہوں نے میرا سوال سن کر فرمایا:" نہیں" اور اس کے بعد بیان کیا۔ کہ

ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں ایک باغ کے درختوں کی بیع سلم کی حالاں کہ اُس وقت تک درختوں پر پھل نہیں لگے تھے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ درختوں پر پھل نہ آئے۔ اس لیے خریدار نے بیچنے والے سے اس بات پر اصرار کیا کہ یہ باغ اُس وقت تک اُس کے قبضے میں رہے گا۔ جب تک اس کے درختوں پر پھل نہ آجائیں۔ لیکن بیچنے والے نے اُس کی بات ماننے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میں نے تو یہ باغ تیرے پاس صرف اس سال کے لئے فروخت کیا تھا۔ (پھلوں کا ذمہ دار میں نہیں)

چنانچہ دونوں شخص جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا مقدمہ پیش کیا۔ حضورؐ نے دونوں کے دعوے سن کر بیچنے والے سے فرمایا:" کیا خریدار نے اس (باغ) سے کچھ فائدہ اٹھایا ہے؟"

اُس نے عرض کیا:" یا رسول اللہ! نہیں۔"

اس پر آپ نے فرمایا: "تو اس کا مال تیرے لئے کیسے جائز ہو جائے گا۔" (چنانچہ آپ نے فیصلہ صادر فرماتے ہوئے حکم دیا) "تم نے جتنا مال اس سے لیا ہے۔ وہ واپس کردو۔ اور (سنو)! آئندہ اس وقت تک بیع سلم نہ کیا کرو جب تک درختوں پر پھل نہ آجائیں۔"
(سنن ابن ماجہ جلد ۲ صـ۲۳-۲۴)

(۱۳)

ابو رافع بیان کرتے ہیں کہ:
جنابِ سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص سے ایک اونٹ کی بیع سلم کی۔ بیع کے بعد آپ نے فرمایا:
"جب ہمارے پاس صدقہ کے اونٹ آئیں گے۔ تو ہم تیرا اونٹ تجھے واپس کر دیں گے۔" چنانچہ جس وقت صدقہ کے اونٹ آئے تو حضورؐ نے فرمایا:
"اے ابو رافع! اس کا اونٹ (حسبِ وعدہ) واپس کر دو۔"
ابو رافع کہتے ہیں کہ میں نے سارے اونٹوں پر نگاہ دوڑائی۔ لیکن مجھے اُس اونٹ جیسا کوئی اونٹ نظر نہ آیا۔ جو اس شخص نے حضورؐ کو دیا تھا۔ بلکہ اس سے بہتر چار دانتوں والے اونٹ تھے۔ چنانچہ میں نے صورتِ حال جناب رسول اللہ صلعم سے بیان کی۔ تو آپ نے حکم دیا۔
اُس سے بہتر اونٹ دے دو۔ اور ہاں سنو، بہتر لوگ وہی ہوتے ہیں جو اپنا قرضہ بطریقِ احسن ادا کرتے ہیں۔
صحیح بخاری / سنن ابن ماجہ جلد ۲ صـ۳۴۔

(۱۴)

ابوہریرہ بیان کرتے ہیں کہ دو اشخاص کا ایک چیز کی خریداری پر تکرار ہوگیا۔ لیکن اُن کا گواہ کوئی بھی نہیں تھا۔ چنانچہ دونوں حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا مقدمہ پیش کیا۔ تو حضورؐ نے حکم دیا کہ (چوں کہ گواہ کوئی نہیں۔ اس لیے ان دونوں کے درمیان قرعہ اندازی کی جائے اور جس شخص کے نام قرعہ نکلے۔ وہ شخص قسم کھا کر مال لے لے، چاہے اسے دوسرا شخص پسند کرے یا نہ کرے۔

(سنن ابن ماجہ کتاب البیوع صـ۵۰)

(۱۵)

جنابِ سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
جب کسی شخص کا مال چوری ہو جائے۔ یا ضائع ہو جائے۔ اگر وہ (اتفاقاً) کسی بھی شخص کو اس مسروقہ مال کو بیچتے ہوئے پائے۔ تو پھر مال اُس (مالک) کے حوالے کر دیا جائے۔ کیوں کہ یہ اُس مال کا زیادہ حق دار ہے۔
(اور اگر صورت یہ ہو) کہ مال کسی شخص نے خرید لیا ہو۔ تو خریدار کو بھی لازم ہے کہ مال اُس کے مالک کو واپس کرنے اور بیچنے والے سے اپنی رقم واپس لے لے۔ (سنن ابن ماجہ کتاب البیوع صـ۴۶)

(۱۶)

جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع حصاۃ اور بیع غرر سے متعلق فرمایا کہ یہ دونوں جائز نہیں۔

بیع حصاۃ سے مراد یہ ہے کہ ایک کنکر پھینک کر بیع کی جائے اور بیع غرر سے مراد ہے کہ کسی ایسی چیز بیع کی جائے۔ جس پر نہ قدرت حاصل ہو اور نہ قبضہ۔ ان بیوع کے علاوہ جناب رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ بیع عربان نہ کی جائے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ خریدار بیچنے والے کو ایک معمولی سی رقم بطور بیعانہ یا سائی کے دے دے اور اس پر شرط یہ باندھے کہ اگر یہ سودا طے ہو گیا۔ تو ادا کردہ رقم مجرا ہو جائے گی۔ اور اگر سودا طے نہ ہو سکا تو یہ رقم تیرے (بیچنے والے) کے پاس رہے گی، اور واپس نہ لی جائے گی۔ (ابوداؤد، ابن ماجہ / بروایت عمرو بن شعیب)

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب بائع اور مشتری کے درمیان بیع کے معاملہ میں اختلاف پیدا ہو جائے (اور وہ کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکیں تو) اس صورت میں بائع کا قول اعتبار کے لحاظ سے فائق ہو گا۔ اس کے ساتھ خریدار کو یہ حق حاصل ہو گا۔ کہ چاہے تو بیع کو قائم رکھے اور چاہے تو فسخ کر دے۔

(ابن مسعود۔ ترمذی۔ کتاب البیوع)

اور جو شخص کسی ایسی چیز کو جو عیب دار ہو۔ اگر کوئی شخص اس کا عیب ظاہر کئے بغیر (دھوکہ سے) بیچے۔ تو ایسا شخص ہمیشہ اللہ کے غضب کا شکار رہتا ہے۔ اور فرشتے بھی ہمیشہ اس پر لعنت بھیجتے ہیں۔

(واثلہ ابن اسقع۔ ابن ماجہ کتاب البیوع)

(۱۷)

جناب سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ٹاٹ اور ایک پیالہ بیچنے کا ارادہ فرمایا (تو ان دونوں چیزوں کو سامنے رکھ کر) فرمایا۔ کون ہے۔ جو اس ٹاٹ اور پیالہ کو خریدے۔" (یعنی اس کی قیمت لگائے) ایک شخص اٹھا اور اس نے عرض کیا:

"یا رسول اللہؐ! میں ان کے لیے ایک درہم کی بولی لگاتا ہوں۔"

حضورؐ نے (اس کی بات سن کر) پھر فرمایا:

"کوئی دوسرا شخص ایسا ہے جو ان کی قیمت ایک درہم سے زیادہ لگائے۔"

حاضرین میں سے ایک دوسرا شخص اٹھا اور اس نے ان کے دو درہم لگائے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ دونوں چیزیں دو درہم کے عوض اس شخص کے حوالے کر دیں۔

راوی: انسؓ (ترمذی / ابن ماجہ / ابوداؤد۔)

(۱۸)

جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: کہ

خون کی قیمت سے کتے کی قیمت سے اور زانی عورت کی کمائی سے اجتناب کیا جائے۔ البتہ شکاری کتا اس سے مستثنیٰ ہے۔ اس

کے ساتھ ہی آپ نے سود لینے والے اور دینے والے پر۔ جسم کو گودنے والے پر اور گندھوانے والے پر اور تصویر بنانے والے پر لعنت فرمائی ہے۔ (ابو جحیفہؓ)

جناب سرورِ عالم نے فرمایا ہے کہ میوہ کو چند سال کے لیے ایک بارگی فروخت نہ کیا جائے۔ اگر کوئی آفت یا بلائے ناگہانی آن پڑے تو بیع میں کمی کر دی جائے۔ (جابرؓ)

اور فرمایا کہ نر کو مادہ پر چھوڑنے کی اجرت نہ لی جائے (ابن عمرؓ)

(صحیح بخاری، صحیح مسلم)

حضورؐ نے مزید فرمایا: کہ اللہ کی رحمت ہو اُس شخص پر۔ جو خرید و فروخت۔ (اور رقم کا) تقاضا کرنے میں نرمی سے کام لیتا ہے۔

(صحیح بخاری)

(۱۹)

حضرت جابر انصاریؓ بیان کرتے ہیں کہ: "فتح مکہ کے موقع پر جناب سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ شراب، کا کاروبار۔ مردار کی خرید و فروخت، سؤر کا بیچنا اور بتوں کا کاروبار اللہ اور اللہ کے رسولؐ نے حرام قرار دیا ہے۔

(یہ سن کر) حاضرین نے پوچھا: یا رسول اللہؐ! مردار کی چربی کے متعلق اللہ اور اللہ کے رسولؐ کا کیا فرمان ہے؟ جبکہ وہ کشتیوں پر ملی جاتی ہے۔ اس سے چمڑے کو چکنا کیا جاتا ہے اور لوگ اس چربی سے چراغ بھی جلاتے ہیں۔

آپ نے فرمایا: (مردار کی چربی حرام ہے۔ اس سے کسی قسم کا فائدہ لینا جائز نہیں۔ اس کے فوراً بعد آپ نے فرمایا: اللہ کی لعنت ہو یہود پر۔ جب پروردگارِ عالم نے مردار کی چربی کو حرام قرار دیا۔ تو ان (بدبختوں) نے چربی کو پگھلا کر بیچنا شروع کر دیا اور اس کی قیمت کھانے لگے۔ (صحیح بخاری) جلد ۲ کتاب البیوع صہ ۱۰۱)

(۲۰)

جناب سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"سونے کا سونے کے عوض بیچنا سود ہے۔ البتہ نقد سودے کی اجازت ہے۔ گیہوں کے عوض گیہوں کا بیچنا بھی جائز نہیں، البتہ ہاتھوں ہاتھ دینے میں کوئی حرج نہیں۔

کھجور کو کھجور کے عوض میں فروخت کرنا بھی منع ہے۔ البتہ نقد سودا کرنے میں کوئی باک نہیں۔

جَو کے بدلے جَو فروخت کرنا بھی سود ہے۔ البتہ نقد سودے میں کوئی قباحت نہیں۔ البتہ سونا چاندی کے بدلے میں، کم و بیش یا مساوی فروخت کرنا جائز ہے۔ مگر سودا نقد ہونا چاہیے۔ اس میں میعاد درست نہیں۔

ہاں جس نے زیادہ دیا۔ یا زیادہ لیا۔ تو اُس نے (دوسرے لفظوں میں) سود دیا یا سود لیا۔

راوی: حضرت عمرؓ (صحیح بخاری جلد ۲ کتاب البیوع صہ ۹۶۳ / سنن ابن ماجہ ۳ صہ ۲۵ صحیح مسلم / سنن نسائی ۲ جلد ۳)

عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ :

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ - اگر کسی شخص نے ایک درخت کو پیوند کیا اور پھر پیڑ سمیت اُسے بیچ ڈالا ، تو جو پھل اس میں لگا ہو - وہ بائع کا ہوگا ، البتہ اگر خریدار صاف صاف وضاحت کرکے اس شرط پر درخت خریدے کہ پھل اس کا ہوگا - تو اس صورت میں پھل کا حق دار خریدار ہوگا - (صحیح بخاری ۲، کتاب البیوع ص ۹۸۷)

(۲۲)

جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لے آئے - تو آپؐ نے یہاں آکر ملاحظہ فرمایا - کہ اہلِ مدینہ کھجوریں دو دو یا تین تین سال کی میعاد کیلئے بیع سلم کیا کرتے تھے -

یہ حالت دیکھ کر آپ نے فرمایا :

" جب کسی چیز میں کوئی بیع سلم کرنا چاہے تو اس کے لیے ناپ ، تول اور میعاد مقرر ضرور کرے " (صحیح بخاری ۲ ص ۱۰۰۳)

(۲۳)

جناب سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نے دو قسم کی بیوع سے منع فرمایا ہے - یہ بیوع ہیں :

" منابذہ اور ملامسہ "

" منابذہ " یہ ہے کہ ایک شخص یہ کہے دوسرے سے کہ جو کچھ تمہارے پاس ہے اُسے پھینک دے اور دوسرا شخص بھی پہلے سے یہ کہے کہ جو کچھ تمہارے پاس ہے اُسے پھینک دے - حالاں کہ دونوں میں سے کسی کو نہ تو اس چیز کی مقدار معلوم ہو - اور نہ ہی اس شے کی خوبی و خامی -

اور " لامسہ " یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص سے کہے کہ میں یہ کپڑا تمہارے کپڑے کے بدلہ میں فروخت کرتا ہوں - حالاں کہ دونوں ایک دوسرے کے کپڑے کو دیکھیں نہیں - اور صرف چھو لینے پر اکتفا کریں -

(راوی : حضرت ابوہریرہ) سنن نسائی جلد ۲ ص ۲۳۶

(۲۴)

ابو سعید خدری روایت بیان کرتے ہیں :

جناب سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں ایک شخص نے پھل دار درخت خریدے - آسمانی آفت نازل ہوئی اور پھل تباہ ہو گئے - اس نقصان کی بدولت وہ شخص مقروض ہو گیا - حضورؐ کو جب اس کا علم ہوا - تو آپؐ نے صحابہ سے فرمایا :

" اس (مقروض شخص کو امداد کے طور پر) صدقہ دو "

صحابہ کرام رضؓ نے صدقہ دیا - لیکن اُس کے قرض کی رقم پھر بھی پوری نہ ہو سکی - اس بات کے پیشِ نظر جناب رسالت مآبؐ

نے اُس شخص کے قرض خواہوں سے ارشاد فرمایا:
اے لوگو! جو کچھ تمہیں اس سے وصول ہو گیا۔ اُسی کو کافی سمجھو، اس سے زیادہ تمھیں کچھ نہیں ملے گا۔
(سنن نسائی ج۲ ص۲۴۰)

(۲۵)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں۔
میں بقیع میں اونٹوں کی تجارت کیا کرتا تھا۔ اس وقت میں اونٹوں کو درھم کے عوض فروخت کر کے روپیہ لے لیتا تھا۔ میں اس لیے حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مبارک میں حاضر ہوا اور عرض کیا:۔
یا رسول اللہ! میں نفع کمانے کی خاطر اونٹ فروخت کرتا ہوں۔ ان کی قیمت اشرفیوں میں لگائی جاتی ہے۔ لیکن میں اُن کے بدلے میں روپے لیتا ہوں۔ (اس بارے میں آپ کا کیا فرمان ہے؟)
حضورؐ نے ارشاد فرمایا: "اے ابن عمر! کوئی حرج نہیں۔ اگر تم بیع کے دن کے نرخ کے مطابق روپیہ لے لو۔ اور سودا نقد بہ نقد ہو۔"

(سنن نسائی جلد ۲ ص۲۵۴)

(۲۶)

جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک اعرابی سے ایک گھوڑا خریدنے کا اتفاق ہوا۔ لوگوں نے اعرابی کو دیکھا تو اُس سے گھوڑے کی بابت بات کرنے لگے اور لگے گھوڑے کی قیمت لگانے، اور انھیں یہ علم نہیں تھا کہ حضورِ ختمی مرتبتؐ یہ گھوڑا خرید فرما چکے ہیں۔ بعض لوگ تو لاعلمی میں یہاں تک بڑھ گئے کہ انہوں نے حضورؐ کی طے کردہ قیمت سے دام بڑھا دیئے ـــ (اعرابی کی نیت میں فرق آ گیا) چنانچہ اُس نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پکارا ـــ اور کہا: "اگر آپ نے گھوڑا خریدنا ہے تو ٹھیک ورنہ میں یہ گھوڑا کسی دوسرے شخص کے ہاتھ فروخت کر دوں گا۔"
حضورؐ نے جب اعرابی کی آواز سُنی تو کھڑے ہو گئے اور اُس سے پوچھا:
"کیا تم نے یہ گھوڑا میرے پاس فروخت نہیں کیا؟ کیا میں نے تم سے اس کی قیمت طے نہیں کی؟ کیا میں اسے خرید نہیں چکا؟"
اعرابی نے کہا:
"بخدا، میں نے یہ گھوڑا آپ کے ہاتھ فروخت نہیں کیا۔"
حضورؐ نے فرمایا:
"(سنو) میں یہ گھوڑا تم سے خرید چکا ہوں"
کچھ لوگ حضورؐ کی تائید کرنے لگے۔ تو بعضوں نے (لاعلمی میں) اعرابی کا ساتھ دیا۔ اعرابی یہ حالت دیکھ کر کہنے لگا:

"بہتر ہے آپ کوئی ایسا گواہ سے آئیں جو شہادت دے کہ میں یہ گھوڑا آپ کے ہاتھوں فروخت کر چکا ہوں"۔
یہ سن کر خزیمہ بن ثابتؓ آگے بڑھے اور اعرابی سے کہا۔
"میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ تم یہ گھوڑا حضور کے ہاتھوں فروخت کر چکے ہو"۔
حضورؐ نے خزیمہؓ سے دریافت فرمایا۔" آخر تم کیوں کر یہ گواہی دے رہے ہو"۔
خزیمہ نے کہا۔" یا رسول اللہؐ مجھے کامل یقین ہے کہ آپ اللہ تعالٰی کے برحق نبی ہیں"۔
اس بات پہ جناب سرور عالمؐ نے خزیمہؓ کی گواہی کو دو اشخاص کی گواہی کے برابر قرار دیا۔

(راوی۔ خزیمہ بن ثابتؓ ۔ سنن نسائی صد ۲۷۰-۲۷۱)

(۲۷)

جناب سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو خیبر کا عامل مقرر فرمایا۔ وہ حضورؐ کی خدمت میں بہترین قسم کی کھجور (جنیب) لے آیا۔ حضورؐ نے یہ اعلیٰ قسم کی کھجور ملاحظہ فرمائی۔ تو کہا۔" کیا خیبر میں ساری کی ساری اسی قسم کی کھجوریں پیدا ہوتی ہیں"۔
اس شخص (عامل) نے عرض کیا۔" نہیں یا رسول اللہ! ایسا تو نہیں۔ ہم تو مجدا دو صاع گھٹیا قسم کی کھجور دے کر ایک صاع اور تین صاع گھٹیا قسم کی کھجور دے کر ڈیڑھ صاع اعلیٰ قسم کی کھجور حاصل کرتے ہیں۔
جناب رسالتمآبؐ نے فرمایا۔ ایسا کرنا جائز نہیں۔ ہاں یہ جائز ہے کہ پہلے معمولی قسم کی کھجور کو فروخت کر دو۔ اس سے جو رقم حاصل ہو۔ تو اس رقم سے جنیب خرید سکتے ہو۔
اسی طرح ایک بار آپ کی خدمت میں کھجور کی ایک دوسری اعلیٰ قسم (ریان) لائی گئی۔ اس وقت حضورؐ کے سامنے خشک کھجور رکھی ہوئی تھی۔ آپ نے یہ اعلیٰ قسم کی کھجور دیکھ کر استفسار فرمایا۔" یہ کھجور کہاں سے آئی ہے"؟
لانے والوں نے عرض کیا۔" یا رسول اللہ! ہم نے دو صاع (معمولی کھجور) دے کر اس کھجور کا ایک صاع حاصل کیا ہے۔
آپؐ نے فرمایا۔" ایسا کرنا قطعاً ٹھیک نہیں۔ ہاں البتہ یہ کر سکتے ہو کہ پہلے اپنی کھجوروں کو بیچ دو، اس سے جو دام حاصل ہوں۔ ان سے اپنی ضرورت کے مطابق ریان خرید لو۔
حضرت بلالؓ کے متعلق بھی بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ایک دن جناب سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں برنی کھجور (اعلیٰ قسم کی کھجور) لائے۔
آپ نے ملاحظہ کیں تو فرمایا۔" اے بلالؓ! یہ کھجوریں کہاں سے حاصل کیں"؟
حضرت بلالؓ نے کہا" یا رسول اللہؐ! ہمارے پاس کچھ گھٹیا قسم کی کھجوریں تھیں۔ میں نے دو صاع دے کر ایک صاع یہ اعلیٰ کھجور حاصل کی ہے"۔
آپ نے فرمایا۔" افسوس۔ یہ تو عین سود ہے۔ ایسا ہرگز مت کرو۔ اگر اعلیٰ کھجور خریدنا مقصود ہو، تو پہلے یہ (گھٹیا قسم کی)

کھجور فروخت کر دو۔ اس سے جو رقم حاصل ہو۔ تو نقد قیمت پر یہ کھجور خرید ا کرو۔

(راوی: ابوسعید خدری / ابوہریرہؓ) صحیح بخاری جلد ۲ کتاب البیوع ص ۹۸۶
سنن نسائی ص ۲۴۴-۲۴۶ / مشکوٰۃ جلد ۲ ص ۱۱-۱۲

(۲۸)

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں:۔
جناب ختمی مرتبت سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔
"اگر کسی شخص کے پاس کوئی جانور رہن ہو تو۔ اُسے حق حاصل ہے کہ اس پر سواری کرے۔ اُسے یہ بھی حق ہے کہ وہ اس کا دودھ پئے۔ ہاں اس صورت میں اس جانور کا چارہ، دانہ اُس کے ذمّہ ہو گا۔ (سنن ابن ماجہ جلد ۲ ص ۶۵)

(۲۹)

جابر بن عبداللہ بیان کرتے ہیں۔ کہ ہم میں سے بعض اشخاص کے پاس ضرورت سے زیادہ زمینیں تھیں۔ اس لیے ہم زمینوں کو تہائی یا چوتھائی کی بٹائی پر دے دیتے تھے۔ اس بارے میں جنابِ سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ جس کے پاس (ضرورت سے) زیادہ زمین ہو۔ وہ یا تو خود کاشت کرے۔ یا اپنے (مسلمان) بھائی کو بلا معاوضہ کاشت کے لیے دے۔ ہاں اگر وہ اِسے قبول نہ کرے تو زمین کو ایسے ہی رہنے دے۔ (صحیح مسلم)

(۳۰)

حضرت ابوہریرہ بیان کرتے ہیں کہ:
جنابِ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ایک سوداگر تھا۔ جو ضرورت مندوں کو قرض دیا کرتا تھا۔ چنانچہ جب اُسے کسی سے متعلق پتہ چلتا کہ وہ نادار اور محتاج ہے۔ تو اپنے کارندوں کو حکم دیتا کہ اِسے معاف کر دو، شاید اللہ تعالیٰ اس کے بدلے میں ہمیں معاف کر دے۔ جب وہ شخص فوت ہو گیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اُسے معاف کر دیا۔

روایت میں آتا ہے کہ جنابِ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ تھا کہ ایک شخص نے چند دینار کسی دوسرے کو بطورِ قرض دیئے۔ اُس نے مقروض شخص کا پیچھا کیا اور اپنے قرضہ کا مطالبہ کیا۔ لیکن اُس شخص نے کہا:۔
"میرے پاس تو کچھ بھی نہیں جو تمہیں دے سکوں۔"
اس پر قرض خواہ نے مقروض سے کہا:۔
"جب تک تم میرا قرض ادا نہیں کرو گے، یا ضمانت نہیں دو گے۔ تو میں تمھیں ہرگز نہیں چھوڑوں گا۔"
چنانچہ وہ اُسے پکڑ کر حضورؐ کی خدمت میں لے آیا۔ حضورؐ نے واقعہ سن کر قرض خواہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔
"تم اِسے کس قدر مہلت دے سکتے ہو؟"
اُس نے کہا "یا رسول اللہ! صرف ایک ماہ"۔ اس پر حضور نے فرمایا۔

"اچھا۔ تو تو اس کو بھی مہلت دے دے۔ میں اس کا ضامن ہوں۔"
جب ایک ماہ پورا ہوا، تو وہ شخص قرضہ کی رقم لے کر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے اُسے دیکھ کر فرمایا:۔
"اے شخص!۔ تیرے پاس یہ رقم کہاں سے آئی؟"
اُس نے کہا۔" یا رسول اللہ! ایک چھپے خزانہ سے ملے ہیں۔"
یہ سن کر جناب رسالت مآبؐ نے فرمایا۔
ایسی دولت میں بھلائی نہیں۔ چنانچہ آپ نے اُس شخص کا قرضہ خود ادا فرمادیا۔
صحیح بخاری جلد ۱ کتاب البیوع صـ۹۳۷
سنن ابن ماجہ جلد ۱ صـ۶۵-۶۶

(۳۱)

جناب سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
پھل اُس وقت تک فروخت نہ کئے جائیں۔ جب تک پک کر خوش رنگ نہ ہو جائیں۔ یعنی پک کر زرد یا سرخ نہ ہو جائیں اور کہ کسی ارضی یا سماوی آفت کا امکان بھی نہ رہے۔
دیکھو، (ہو سکتا ہے) کہ اللہ تعالےٰ پھلوں کو روک دے۔ (یعنی پھل پکنے سے پہلے ہی تباہ ہو جائیں) اس صورت میں تمہارا بھائی خسارے میں رہے گا۔

(۳۲)

جناب سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
۱۔ ہر اُس مال میں جو تقسیم نہ ہوا ہو، شفعہ کا حق قائم رہتا ہے۔ ہاں جب (تقسیم ہو جائے) اور حدود قائم ہو جائیں، رستے جُدا جُدا ہو جائیں۔ تو شفعہ کا حق باقی نہیں رہتا۔
۲۔ ہمسایہ قریب ہونے کی وجہ سے شفعہ کا زیادہ حق دار ہے۔
۳۔ مشترک زمین خواہ وہ گھر ہو یا باغ۔ اور جو تقسیم نہ کی گئی ہو، میں شفعہ کا حق باقی رہتا ہے اور یہ کہ دونوں شریکوں میں سے کسی ایک شریک کو اُس وقت تک اپنا حصہ بیچنے کا حق حاصل نہیں جب تک وہ اپنے ساتھی سے اجازت نہ حاصل کرے۔ یہ اُس شریک کی مرضی پر منحصر ہے۔ چاہے تو خود اس حصہ کو خرید لے۔ چاہے تو اُسے کسی دوسرے شخص کے ہاتھ فروخت کرنے کی اجازت دے دے۔ لیکن اگر کسی نے اپنے شریک کی مرضی کے بغیر اپنا حصہ فروخت کر دیا۔ تو اس صورت میں بھی اس کا شریک ہی خریدنے کا حقدار ہوگا۔ (کوئی دوسرا شخص یہ حق نہیں رکھتا) کیوں کہ شفعہ ہر چیز میں ہے۔

(صحیح بخاری ۔ صحیح مسلم۔ کتاب البیع

(۳۳)

جناب سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"تاجر کو رزق عطا ہوتا ہے۔ لیکن جو تاجر (گرانی کے خیال سے) غلہ کو روکتا ہے اور ذخیرہ کرتا ہے۔ تو ایسا شخص گنہگار اور ملعون ہے۔

(صحیح مسلم، سنن ابن ماجہ)

کتابیات

۱۔ صحاح ستہ

۲۔ تاریخ طبری۔ جلد اول سیرۃ النبیؐ

۳۔ سیرت ابن ہشام۔ جلد اول، دوم

۴۔ الوثائق السیاسیہ، ڈاکٹر حمید اللہ

۵۔ طحاوی شریف۔ چار جلدیں

۶۔ انسانِ کامل۔ ڈاکٹر علوی

۷۔ تفہیم القرآن۔ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

۸۔ معارف القرآن۔ مفتی محمد شفیعؒ

۹۔ ترجمان القرآن۔ مولانا ابوالکلام آزاد

۱۰۔ معالم القرآن جلد ۳، جلد ۴ مولانا محمد علی صدیقی

۱۱۔ دربارِ نبوی کے فیصلے۔ قرطبی

۱۲۔ علوم الحدیث۔ الدکتور صبحی الصالح

۱۳۔ تدوین حدیث۔ سید مناظر احسن گیلانی

عہدِ نبوی میں سفارتی ادارہ

محمد یوسف فاروقی

مختلف قوموں اور مملکتوں کے درمیان باہمی تعلقات اور دو طرفہ معاہدات کے لیے قدیم زمانے سے سفارتی سرگرمیاں تاریخ میں نظر آتی ہیں۔ جنگی معاملات اور تجارتی امور پر بھی اسی ادارہ کے ذریعہ رابطہ قائم کیا جاتا تھا۔ قدیم زمانہ میں اگرچہ یہ ادارہ اس قدر منظم اور ترقی یافتہ نہ تھا، نہ ہی سفارت خانوں کے مستقل دفاتر مختلف ممالک میں قائم ہوتے تھے۔ لیکن سیاسی طور پر اسے نمایاں مقام حاصل تھا۔ جب سفارتی رابطہ قائم کرنے کی ضرورت پیش آتی تھی، تو ایسے فرد کو سفیر بنا کر بھیجا جاتا تھا، جو زیرِ غور مسئلے کے ہر پہلو کو خوب سمجھتا ہو۔ ذہین اور سمجھ دار ہو اپنی بات کو مؤثر انداز میں پیش کر سکے اور دوسرے فریق سے اپنی بات منوا سکے۔

اسلام سے قبل عربوں کی سفارتی سرگرمیاں

جنگ بعاث میں جب قبیلہ اوس کو شکست ہونے لگی، تو انہوں نے ایک وفد ابو الحیس کی سربراہی میں قریش مکہ کے پاس بھیجا تھا۔ اس وفد میں ایاس بن معاذ بھی تھے۔ قبیلہ اوس نے یہ سفارتی رابطہ اس لیے قائم کیا تھا کہ قریش مکہ کو اپنا حلیف بنالیں اور جنگ میں ان سے خزرج کے خلاف مدد حاصل کریں[1]۔ مکہ کی شہری مملکت میں سفارت کا ادارہ خاندانِ عدی کے پاس تھا، اور بعثت کے وقت حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس عہدے پر فائز تھے[2]۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب نبوت کا اعلان کیا اور لوگوں کو توحید کی دعوت دی، تو قریش مکہ نے علمائے یہود سے سفارتی رابطہ قائم کیا۔ قریش نے نضر بن حارث اور عقبہ بن ابی معیط کو مدینہ منورہ بھیجا تھا تاکہ وہ علمائے یہود سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اور آپ کے پیغام وعید کے بارے میں ان سے مشورہ کریں اور یہ معلوم کریں کہ آیا یہ مدعی نبوت واقعی نبی ہیں؟ کیا اہلِ کتاب کی کتابوں میں کسی ایسے نبی کا تذکرہ موجود ہے؟[3] مشرکین مکہ کے ظلم و ستم سے تنگ آکر بعض مسلمانوں نے حبشہ کی جانب ہجرت کر لی تھی۔ اہلِ مکہ نے شاہ حبشہ کے پاس سفارتی نمائندے بھیجے تاکہ سفارتی ذریعہ سے شاہ حبشہ پر دباؤ ڈالا جائے تاکہ وہ ہجرت کر کے آنے والے مسلمانوں کو ان کے حوالہ کر دے یا کم از کم اپنی حکومت سے انہیں نکلنے پر مجبور کر دے۔ قریش مکہ کی جانب سے سفارت کے فرائض عمرو بن العاص اور عبداللہ بن ربیعہ نے انجام دیے۔ شاہ حبشہ نے دربار میں قریش کے ان سفیروں کے ساتھ مسلمانوں کے نمائندوں کو بھی بلا لیا۔ مسلمانوں کی جانب سے حضرت جعفر طیار نے ان قریشی سفیروں کی باتوں اور ان کے اعتراضات کا بہت مؤثر انداز میں مدلل جواب دیا۔ حضرت جعفر طیار کی مؤثر و مدلل گفتگو نے شاہ حبشہ کو متاثر کیا اور اس نے ان مسلمانوں کو واپس کرنے سے انکار کر دیا۔ سلطنت مکہ کی سفارت ان بے خانماں مہاجرین کے مقابلہ میں ناکام ہو گئی۔ مسلمان مہاجرین کی یہ بہت بڑی کامیابی تھی۔

---

[1] شبلی، سیرت النبی جلد اول، ص ۲۶۱ مطبوعہ قرآن محل، کراچی [2] ایضاً، ص ۲۱۲۔

[3] السہیلی، الروض الانف جلد اول، ص ۱۹۔ مطبوعہ ملتان ۱۹۷۷ء

اسلام کے بعد سفارتی رابطوں کی تنظیم

ان مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں سفارتی رابطے صرف اس وقت قائم کیے جاتے تھے یا دو باہمی معاہدات طے کرنے ہوں یا کوئی اہم مشکل آن پڑی ہو، بعض اوقات محض سیاسی تعلقات بنانے کے لیے بھی رابطہ قائم کیا جاتا تھا۔ لیکن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ادارہ کو زیادہ فعال اور منظم بنایا اور اس کے فرائض میں سب سے اہم ذمہ داری دعوتِ دین اور اشاعتِ حق کے کام کو قرار دیا۔

اسلام ایک آفاقی دین تھا، جس نے زمان و مکان کی حدود و قیود سے بالاتر ہو کر تمام انسانوں کی فلاح و سعادت کے لیے ایک جامع نظام حیات پیش کیا، اس نظام میں دعوتِ دین یا نظریہ کی اشاعت کو بنیادی حیثیت حاصل ہے، رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سفراء کے فرائض میں دعوتِ دین کے فریضہ کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے۔

اسلامی مملکت بنیادی طور پر ایک نظریاتی مملکت ہوتی ہے۔ نظریہ کی اشاعت اور دُنیا بھر میں شہادتِ حق اور اس کے قیام کے لیے جد و جہد مملکت اور ملّت کا اہم ترین فریضہ ہے، لہٰذا ایک ایسی مملکت کے سفراء کی ذمہ داریاں بہت اہم ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے انتخاب اور تقرر کے موقع پر اس عظیم الشان مقصد کو پیشِ نظر رکھا جاتا تھا۔ رسُول اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلم جن افراد کو یہ منصب عنایت فرماتے تھے وہ عملی اعتبار سے بہت پکے مسلمان ہوتے تھے، اس لیے کہ عمل اشاعت دین کا بہت مؤثر ذریعہ ہے۔ عملی زندگی کے ساتھ ساتھ بعض اور صفات بھی دیکھی جاتی تھیں، مثلاً دین کا وسیع علم رکھتے ہوں، اپنے افکار و خیالات کے اظہار کا اچھا ملکہ حاصل ہو اور اپنی بات مؤثر اور مدلل انداز میں پیش کر سکیں، لوگوں کی نفسیات کو سمجھتے ہوں اور جس قوم یا جس ملک میں بحیثیت سفیر جا رہے ہوں، وہاں کے حالات اور اُن کی زبان کو سمجھتے ہوں۔

سفیروں کی خصوصیات

محمد عجاج الخطیب نے المصباح المضی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ :

"وفی السنة السادسة کثرت بعوثه صلی اللہ علیہ وسلم فقد وجه بعد صلح الحدیبیة رسله الی الملوک یحملون کتبه، ففی یوم واحد انطلق ستة نفر الی جهات مختلفة یتکلم کل واحد منهم بلسان القوم الذین بعث الیهم[1]

(۶ھ میں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفارتی وفود کثرت سے روانہ ہوئے صلح حدیبیہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکمرانوں کے پاس اپنے خطوط دے کر ان سفیروں کو روانہ کیا، ایک دن چھ وفود مختلف ممالک کے حکمرانوں کے پاس روانہ ہوئے، ان میں سے ہر فرد اس قوم کی زبان جانتا تھا جس قوم میں اسے بھیجا گیا تھا)

حضرت زید بن ثابت کو رسُول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عبرانی زبان سیکھنے کا حکم اسی لیے دیا تھا کہ وہ یہودیوں کے ساتھ مذاکرات اور سفارتی سرگرمیوں میں زیادہ مؤثر کردار ادا کر سکیں۔[2] سفراء کی اہلیت کے بارے میں عبدالحی کتانی نے اپنی مشہور کتاب التراتیب الاداریہ میں ایک

---

[1] محمد عجاج الخطیب، السنۃ قبل التدوین، ص ۷۱۔ بحوالہ المصباح المضئ، ص ۴۰، مخطوطہ، مکتبۃ الاوقاف بحلب

[2] شبلی، سیرۃ النبیؐ، ج ۱، ص ۴۳۹۔ ۴ھ میں رسول اللہؐ نے حضرت زید بن ثابت کو یہ حکم دیا تھا۔

اور اہم صفت کا ذکر کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفراء کے انتخاب میں اس بات کا خاص طور سے خیال فرماتے تھے کہ سفراء کی شخصیت باوقار و پرکشش ہو۔ حضرت دحیہ کلبی ان سفراء میں سب سے زیادہ صاحب وجاہت اور جاذب نظر تھے۔ [1]

مدینہ میں پہلا مسلمان سفیر

تحریک اسلامی کے آغاز میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکمرانوں اور سرداروں کے پاس سفیر نہیں بھیجے بلکہ عام لوگوں سے خود بھی رابطہ رکھا اور اپنے نمائندے بھی ان میں بھیج کر ان سے قریبی رابطہ رکھا یہ نمائندے قبیلوں کے عام لوگوں میں جاتے اور انہیں اسلام کی دعوت دیتے اور اسلام کی بنیادی تعلیمات سے آگاہ کرتے۔

اسلام کی سیاسی تاریخ میں بیعت عقبہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے، یہ بیعت دو مرتبہ ہوئی پہلی مرتبہ بیعت نبوت کے گیارہویں سال ہوئی اور اس کے ساتھ ہی اسلام کی شعاعیں سرزمین مدینہ پہ پڑنے لگیں۔ اس بیعت کے ساتھ ہی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مصعب بن عمیر کو اپنا نمائندہ بنا کر قبائل اوس و خزرج میں روانہ کر دیا تاکہ وہ ان لوگوں میں دعوت دین اور اشاعت حق کا فریضہ انجام دیں اور جو لوگ دین اسلام کو قبول کریں ان کی تربیت اور تزکیۂ نفس کا کام کریں تاکہ تقویٰ اور مکارم اخلاق کی بنیاد پر امت مسلمہ کے مہذب و صالح معاشرہ کی تشکیل کر سکیں۔

حضرت مصعب بن عمیر کا انداز دعوت بہت لطیف ہوتا تھا وہ بہت ملاطفت کے ساتھ گفتگو کا آغاز کرتے اور مؤثر و مضبوط دلائل کے ساتھ مخاطب کو قائل کرتے تھے وہ جب بھی کسی کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کرتے تو کم ہی لوگوں کو انکار کی گنجائش ہوتی تھی، ورنہ عام طور پر لوگ اسلام قبول کر کے دعوت دین کی تحریک میں ان کے شریک کار بن جاتے تھے۔

عام لوگوں میں دعوت دین کا کام کرنا اور انہیں اپنے نظم میں منسلک کر لینا اتنا مشکل نہیں ہے جتنا ان افراد کو شامل کرنا دشوار ہوتا ہے جو سیاسی قیادت کرتے ہوں یا اقتدار و قوت رکھتے ہوں حضرت مصعب بن عمیر کا کمال یہ تھا کہ انہوں نے اوس و خزرج کے سرداروں کو بھی جو مکمل سیادت و اقتدار کے مالک تھے، دائرہ اسلام میں داخل کر لیا اوس و خزرج کے ان سرداروں سعد بن عبادہ اور سعد بن معاذ کے قبول اسلام کا نتیجہ یہ ہوا کہ جلد ہی مدینہ منورہ کے ان دو عظیم قبائل کے تقریباً تمام افراد مسلمان ہو گئے۔

اسلامی مملکت کے قیام کے بعد سفارتی رابطے

مدنی دور میں جب باقاعدہ اسلامی مملکت قائم ہو چکی تھی تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ادارہ کو خاص طور پر متحرک بنایا اور دین اسلام کی اشاعت، امن و سلامتی کے قیام اور انسانیت کی فلاح و سعادت کے لئے اپنے سفراء کے ذریعہ اس وقت کی بڑی بڑی سلطنتوں کے حکمرانوں، نیم خود مختار ریاستوں کے امراء اور قبائل کے سرداروں کے ساتھ سفارتی رابطے قائم کئے اور انہیں دین کے پیغام اور اسلام کی حقانیت سے آگاہ کیا اور یہ بات واضح کر دی گئی کہ ان کی اور ساری انسانیت کی سلامتی کا راستہ صرف دین اسلام ہے۔ [2]

حضرت دحیہ کلبی اور قیصر روم

جن حکمرانوں کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفراء گئے ان میں سب سے زیادہ اہم حکمران روم کا بادشاہ قیصر تھا۔ قیصر کے پاس حضرت دحیہ بن خلیفہ کلبی رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] عبدالحی کتانی، التراتیب الادرایۃ، ج ۱، ص ۱۹۰ [2] تفصیلات کے لیے دیکھیے محمد رضا مصری، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ص ۲۲۴ تا ۲۷۴ مطبوعہ قاہرہ ۱۹۶۶ء، ابن جریر طبری ۶ ھ کے واقعات کے تحت۔

کا پیغام لے کر گئے۔ یہ اس دور کی بات ہے جب روم کو اپنے زمانہ کی دوسری بڑی طاقت فارس کے مقابلہ میں کامیابی حاصل ہوئی تھی اس اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ روم اس دور کی سب سے بڑی طاقتور سلطنت تھی۔ حضرت دحیہ کلبی جب قیصر کے دربار میں پہنچے تو اُس نے ان کا اعزاز و احترام کیا آپ کا خط غور سے پڑھا اور بہت سے ضروری سوالات کئے۔ قیصر نے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے پیغام کے بارے میں صرف آپؐ کے سفیر ہی سے گفتگو نہیں کی بلکہ عرب کی سرزمین سے تجارت کے سلسلے میں آنے والے لوگوں کو بھی بلا بھیجا تاکہ اُن سے بھی معلومات حاصل کرے۔ ابوسفیان ان دنوں تجارتی قافلہ کے ساتھ غزہ میں تھے۔ اُنہیں دربار میں بلا کر ان سے بھی رسُول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بارے میں، اور آپؐ کے پیغام سے متعلق سوالات کئے، اس تمام گفتگو سے جو قیصر نے آپ کے نمائندہ اور ابوسفیان سے کی تھی اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کی صداقت کا یقین ہو گیا تھا قیصر نے مزید تصدیق کے لئے اپنی مملکت کے ایک بڑے عالم ضغاطر رومی سے بھی معلومات حاصل کی تھیں جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی رسالت کی تصدیق کی تھی[1]۔

قیصر روم نے آپؐ کے سفیر کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی عظمت کا اعتراف کیا اور آپ کے سفیر کو اعزاز و احترام کے ساتھ واپس روانہ کیا[2]۔

شاہ روم کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا تھا کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی دعوت کو قبول کرے یا اپنی وسیع و عریض مملکت کو برقرار رکھے اور اپنی رعایا کو خوش رکھے شاید سیاسی مصلحتیں اور مادی منافع رکاوٹ بن گئی تھیں[3] دنیا کی بڑی طاقت ہونے کا بھرم بھی برقرار رکھنا چاہتا تھا۔ لیکن ساتھ ہی رسُول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی عظمت اور رسالت کا رعب بھی دل و دماغ پر چھا گیا تھا یہی وجہ ہے کہ ۹ھ میں تبوک کے مقام پر قیصر کو ہمت نہ ہوئی کہ وہ مسلمان مجاہدین کے مقابلہ کے لئے نکلتا۔ غزوہ تبوک میں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی عظیم الشان کامیابی میں حضرت دحیہ کلبی کی کامیاب سفارت اور رسُول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے اس مکتوب کا بڑا حصہ ہے جو رسُول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے حضرت دحیہ کلبی کے ہاتھ بھیجا تھا۔

حکومتِ فارس کی طرف سفارت

فارس دنیا کی دوسری بڑی سلطنت تھی، دنیا کے بہت بڑے حصّے پر کسریٰ کا راج تھا۔ صلح حدیبیہ کے بعد غالباً اس وقت جب رسُول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے قیصر روم کے پاس سفیر بھیجا تھا، اسی زمانہ میں فارس کے شہنشاہ کسریٰ کے پاس بھی بھیجا۔ حضرت عبداللہ بن حذافہ سہمی رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفیر کی حیثیت سے کسریٰ کے پاس گئے اور اسے آپ کا پیغام پہنچایا کسریٰ کے لئے یہ بات ناقابل برداشت ہوئی کہ اتنی بڑی حکومت کے شہنشاہ کو جزیرۃ العرب کی چھوٹی سی مملکت کا ایک فرد دین الٰہی کی دعوت پیش کرے اور یہ بات کہے کہ اسلام قبول کر لو، اسی میں سلامتی ہے۔ کسریٰ نے سخت ردّ عمل کا مظاہرہ کیا اور آپؐ کے مکتوب کو پھاڑ دیا یمن اس زمانہ میں فارس کی نوآبادی تھا جہاں باذان گورنر تھا۔ کسریٰ نے یمن کے گورنر کو حکم بھیجا کہ فوراً دو طاقتور افراد سرزمین حجاز بھیجو اور اس شخص کو جو لوگوں کو نئے دین کی دعوت دے رہا ہے حکم دو کہ اپنے آباؤ اجداد کے دین کی طرف لوٹ جائے، اگر وہ باز نہیں آتا تو اس کا سر میرے پاس پیش کر دیا خود

---

[1] ابن حجر عسقلانی، فتح الباری، ج ۱، ص ۳۸ [2] الطبری، ج ۳، ص ۱۸۸۷ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، ج ۴، ص ۲۶۲ تا ۲۶۸۔

[3] السیرۃ الحلبیہ میں قیصر کے یہ الفاظ منقول ہیں "ان فعلت ذھب ملکی وقتلنی الروم" اگر میں آپؐ کی بات مان لوں، تو میری حکومت جاتی رہے گی اور رومی لوگ مجھے قتل کر دیں گے۔ شاید قیصر نے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان الفاظ پر غور نہیں کیا تھا: "اَسلم تسلم" اسلام قبول کرو تم بچ جاؤ گے۔

اسے گرفتار کر کے پیش کرو۔ باذان نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے دو قوی افراد بھیج دیئے، اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لکھا کہ آپ اپنے آپ کو ان سپاہیوں کے حوالے کر دیں، اگر آپ نے بچنے کی کوشش کی تو یہ نہ صرف آپ کی تباہی کا باعث ہوگا، بلکہ آپ کی پوری قوم اور آپ کے ملک کی تباہی کا بھی باعث ہوگا، یہ سپاہی باذان کا حکم نامہ لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس پہنچے تو آپ کی عظمت و تقدس سے مرعوب ہو گئے، اور خاموشی کے ساتھ حاکم یمن کا حکم نامہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پیش کر دیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے کہا کہ تم کچھ روز یہاں ٹھہرو، کل پھر مجھ سے ملنا اگلے روز جب یہ لوگ آپ کے پاس آئے تو آپ نے انہیں اطلاع دی کہ فارس کا کسریٰ قتل کر دیا گیا، اس کا بیٹا تخت وسلطنت پر قابض ہو گیا ہے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سپاہیوں کو بھی اسلام کی دعوت دی اور ان سے کہا کہ اب تم جاؤ اور میری طرف سے حاکم یمن کو بھی اسلام کی دعوت پیش کر دو، اور اسے یہ بھی بتا دینا کہ اللہ تعالیٰ کا دین اور میری مملکت وہاں تک پہنچے گی، جہاں تک کسریٰ کی حکومت پہنچی ہے۔ حاکم یمن کے سپاہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ پیغام لے کر واپس چلے گئے اور تمام حالات حاکم یمن سے بیان کیے جب اسے واقعہ کی تصدیق ہوئی کہ شاہ فارس کو قتل کر دیا گیا ہے اور اس کا بیٹا شیرویہ حکومت پر قابض ہو گیا ہے تو باذان اور اس کے رفقاء کار نے اسلام قبول کر لیا۔[1]

سفیرِ رسولؐ نجاشی کے دربار میں حاکم حبشہ اصحمہ نجاشی کے پاس عمرو بن امیہ ضمیری نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خط لے کر گئے نجاشی عیسائی بادشاہ تھا اور اس سے قبل جب مسلمان حبشہ ہجرت کر گئے تھے اور اہل مکہ نے سفارتی ذرائع سے اس پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کی تھی تاکہ وہ ان مسلمانوں کو جو ہجرت کر کے حبشہ چلے گئے ہیں، اپنے ملک سے نکال دے، لیکن مسلمانوں کے نمائندے سے گفتگو کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچ چکا تھا کہ ان مسلمانوں کا پیغام حق ہے اور ان کے مقاصد نیک ہیں۔ حضرت جعفر طیار کی تقریر سے شاہ حبشہ متاثر ہو چکا تھا۔ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے باقاعدہ سفیر پیغام لے کر گیا، اور شاہ حبشہ سے بہت مؤثر و بلیغ انداز میں گفتگو کی[2] نجاشی نے آپ کے مکتوب کو بہت ادب واحترام کے ساتھ پڑھا، اور اس خط کا جواب ارسال کیا جس میں اُس نے اسلام کا اعلان کیا اور لکھا کہ میں نے آپ کے ہاتھ پر آپ کی بیعت کر لی ہے۔[3]

مملکتِ مصر سے سفارتی رابطہ مصر کے حاکم مقوقس کے پاس حاطب بن ابی بلتعہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نمائندہ کی حیثیت سے گئے مقوقس نے آپ کے سفیر کا اعزاز واحترام کیا۔ حاطب بن ابی بلتعہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مکتوب گرامی مقوقس کو دیا، اور اسے اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں باتیں بتائیں۔ حاکم مصر نے مملکت اسلامیہ کے سفیر سے بات کرنے کے بعد یہ الفاظ کہے۔

"احسنت انت حکیم جاء من عند حکیم

(تم نے مجھے اچھی طرح سمجھایا ہے، تم سمجھ دار انسان ہو اور ایک دانا و حکیم کی طرف سے آئے ہو۔)[4]

قبطیوں کا یہ حکمران خود مختار نہ تھا بلکہ رومی سلطنت کے زیر اثر تھا اسے یہ جرأت تو نہ ہوئی کہ آپ کی دعوت کو بلا جھجک قبول کر لیتا

---

[1] علی بن برہان الدین الحلبی، السیرۃ الحلبیہ، ج ۲، ص ۲۹۱، ۲۹۲، ابن سید الناس: عیون الاثر، ج ۲، ص ۲۶۳۔ زرقانی، ج ۳، ص ۳۴۲ الطبری، جلد ۳، ص ۹۰۔ البدایہ والنہایہ، ج ۴، ص ۲۶۸، ۲۶۷، ۲ [2] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفیر کا شاہ حبشہ سے انداز گفتگو کے لیے دیکھیے ابن سید الناس + عیون الاثر ج ۲ صفحہ ۲۶۴ [3] علی بن برہان الدین حلبی، السیرۃ الحلبیہ، ج ۳، ص ۲۹۳ [4] السیرۃ الحلبیہ، ج ۳، ص ۲۹۶۔

اُس نے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو باقاعدہ جواب لکھا، اور خیر سگالی کا اظہار کرتے ہوئے بہت سے تحائف بھیجے۔[1]

بحرین کے لیے سفارت

حاکم بحرین کے پاس بھی سفارت بھیجی گئی۔ منذر بن ساوی بحرین کا حاکم مجوسی مذہب کا پیروکار تھا۔ حضرت علاء بن حضرمی نے سفارتی فرائض انجام دیئے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پیغام پہنچایا۔ شاہ بحرین نے اسلام قبول کر لیا اور اہل بحرین کو بھی رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خط پڑھوایا۔ بحرین میں مجوسیوں اور یہودیوں کی آبادی تھی ان میں سے بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔ منذر بن ساوی نے خط کا جواب لکھا اور آپ سے اس سیاسی اُلجھن کے بارے میں پوچھا جو ارکان حکومت اور رعایا کے بہت سے افراد کے قبولِ اسلام کے بعد پیدا ہو گئی تھی، وہ یہ کہ اب غیر مسلم رعایا کے ساتھ کس طرح کا تعلق ہوگا؟[2]

سلطنت عمان کے لیے سفارت

عمان کے حکمران جلندی کے دو بیٹے عبد اور جیفر عملاً حکمران تھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان دونوں کے پاس حضرت عمرو بن العاص کو سفیر بنا کر بھیجا۔ حضرت عمرو بن العاص خود ایک بہت بڑے سردار کے بیٹے تھے، ان کے والد کی قائدانہ صلاحیتوں کا عرب معترف تھا۔ حضرت عمرو بن العاص عمان پہنچے تو پہلے عبد بن جلندی سے ملاقات ہوئی۔ عبد بن جلندی بہت خوش اخلاق، بردبار اور سلیم الطبع انسان تھا اُس نے دین اسلام کے علاوہ بعض اہم سوالات کیے جو بین الاقوامی سیاست اور دیگر حکمرانوں کے اسلام کے بارے میں طرز عمل سے متعلق تھے مثلاً اُس نے حبشہ کے بادشاہ کے بارے میں سوال کیا کہ کیا اُسے بھی دعوت دی گئی ہے؟ اگر دی گئی ہے تو اس کا ردِ عمل کیا ہوا؟ نجاشی کے اسلام قبول کرنے کا اس کی رعایا پر کیا اثر ہوا؟ مملکت حبشہ کے پادریوں اور راہبوں نے اپنے بادشاہ کے قبول اسلام پر کس قسم کا ردِ عمل ظاہر کیا؟ روم کے شہنشاہ ہرقل کو بھی نجاشی کے قبول اسلام کی اطلاع ملی یا نہیں؟ اطلاع ملنے پر ہرقل نے حبشہ کی مملکت کے خلاف کیا اقدامات کیے؟ حضرت عمرو بن العاص نے اس کے تمام سوالات کے جواب دیئے اور خاصا مطمئن پایا پھر اس کے بڑے بھائی جیفر کے ساتھ بھی گفتگو ہوئی۔ جیفر و عبد کی معاونت کے لئے مملکت کے دیگر اہم ارکان اور مشیر بھی شریک رہے۔ مذاکرات کا سلسلہ جاری رہا۔ بالآخر عمان کے یہ دونوں حکمران اسلام کے بارے میں مطمئن ہو گئے۔ اور اسلام قبول کر لیا۔[3]

الاصابہ میں جلندی کے یہ اشعار نقل کیے ہیں جو اُنہوں نے قبول اسلام کے بعد کہے تھے۔

اتانی عمرو بالتی لیس بعدها ‏ ‏ ‏ من الحق شیی والنصیح نصیح

فیا عمرو قد اسلمت للہ جهرة ‏ ‏ ‏ ینادی بها فی الوادیین فصیح[4]

(عمرو میرے پاس حق و صداقت کا پیغام لائے ہیں جس کے بعد حق و صداقت کا کوئی حصہ باقی نہیں رہا، اور خیر خواہ تو خیر خواہ ہی ہوتا ہے اے عمرو! میں کھلم کھلا اللہ تعالےٰ پر ایمان لے آیا ہوں میرے ایمان کا اعلان ان دونوں وادیوں میں فصیح و بلیغ انسان باآواز بلند کرے گا)

یمامہ کی طرف ترسیل سفیر

یمامہ کا امیر ہوذہ بن علی تھا اس کے پاس حضرت سلیط بن عمرو عامری کو رسول اللہ نے بھیجا۔ حضرت سلیط بن عمرو کو اس لیے سفیر منتخب کیا کہ وہ اکثر یمامہ جاتے رہتے تھے، وہاں کے حالات سے واقف تھے۔[5] سلیط بن عمرو نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

---

[1] السہیلی، روض الانف، ج ۲، ص ۳۵۵۔ السیرۃ الحلبیہ، ج ۳، ص ۲۹۵، ۲۹۸، عیون الاثر، ج ۲، ص ۲۶۵ [2] السیرۃ الحلبیہ، ج ۳، ص ۳۰۰، عیون الاثر، ج ۲، ص ۲۶۶۔ روض الانف، ج ۲، ص ۳۵۶۔ [3] السیرۃ الحلبیہ، ج ۳، ص ۳۰۱ تا ۳۰۳۔ عیون الاثر، ج ۲، ص ۲۶۷، روض الانف، ج ۲، ص ۳۵۶، [4] السیرۃ الحلبیہ، ج ۳، ص ۳۰۲ ۔ [5] الاصابہ، ج ۲، ص ۳۰۳ ۔

کا مکتوب گرامی حاکم یمامہ کو پہنچایا۔ ہوذہ نے آپ کے نمائندے کا بہت اعزاز کیا آپ کے خط کو پڑھا۔ اس نے اس بات کا اعتراف کیا کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس دین کی دعوت دے رہے ہیں وہ بہت اچھا دین ہے لیکن حکومت واقتدار کی ہوس دامن گیر رہی ہوذہ نے سلیط بن عمرو سے کہا کہ دیکھو میں صرف حاکم ہی نہیں بلکہ اپنی قوم کا شاعر اور خطیب بھی ہوں۔ عرب میرے مقام و مرتبہ سے ڈرتے ہیں لہٰذا اگر رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھے حکومت میں شریک کریں تو میں ان کی اتباع کرنے کو تیار رہوں۔ اس جواب کے ساتھ حضرت سلیط کو خلعت عطا کی اور تحفے دے کر واپس روانہ کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امیر یمامہ کے سیاسی اسلام کو قبول نہ کیا' بلکہ فرمایا کہ" اگر وہ بالشت بھر زمین مانگے گا تو نہیں دوں گا۔ ہوذہ خود بھی تباہ ہوا اور اس کا ملک بھی تباہ ہوا"۔[۱]

دمشق سے سفارتی رابطہ

دمشق میں حارث بن ابی شمر غسانی کے پاس حضرت شجاع ابن وہب اسدی کو اپنا پیغام دے کر بھیجا۔ حارث رومی حکومت کے ماتحت تھا۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سفیر نے اس کے حفاظتی عملہ سے بہت کچھ معلومات حاصل کر لی تھیں۔ انہیں ملاقات سے قبل ہی یہ بھی معلوم ہوگیا تھا کہ حارث قیصر روم سے بہت ڈرتا ہے[۲]۔ حارث سے ملاقات ہوئی تو اُسے رسُول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مکتوب پیش کر دیا۔ حارث نے خط پڑھ کر پھینک دیا۔ کہنے لگا کہ بھلا مجھ سے میرا ملک کون چھین سکتا ہے، یہ کہہ کر اُس نے جنگی تیاری کا حکم دے دیا اور اجازت لینے کے لئے قیصر کو بھی لکھ دیا۔ قیصر کے پاس حارث کا خط لیکر قاصد اس وقت آیا۔ جب حضرت دحیہ کلبی اسے بھی رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اسی قسم کا پیغام پہنچا چکے تھے قیصر نے فوج کشی کے ارادہ سے منع کر دیا اور کہا کہ بیت المقدس میں میرے استقبال کی تیاری کرو۔ حارث بن شمر غسانی کو تو روم کی طاقت پہ گھمنڈ تھا جب اُس نے دیکھا کہ قیصر روم بھی ان سے خوفزدہ ہے تو اُس نے رسُول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نمائندہ کو بلایا اور سو مثقال سونا بطور تحفہ دے کر اُنہیں روانہ کیا۔[۳]

دوسری متفرق سفارتیں

رسُول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے علاوہ اور بھی بے شمار قبائل کے سرداروں' ریاستوں کے نوابوں اور سیاسی قیادت رکھنے والے معززین کے پاس اپنے نمائندوں کو بھیجا' مثلاً یمن کے بادشاہ حارث بن عبد کلال حمیری کے پاس مہاجر ابن اُمیہ مخزومی کو بھیجا[۴]۔ قبیلہ بنو کلاب کے سمعان بن قریط کے پاس عبد اللہ بن عوسجہ عرنی کو' بکر بن وائل کے پاس ظبیان بن مرثد کو قبیلہ حمیر کے رؤساء حارث' مسروح اور نعیم بن عبد کلال کے پاس عیاش بن ربیعہ مخزومی کو طائف کے مشہور قبیلہ بنو ثقیف کے پاس نمیر بن خرشہ کو' مسیلمہ کذاب کے پاس سائب بن عوام کو اور حضرت وائل بن حجر کو خود انہی کے قبیلہ کے لوگوں کے پاس پیغامات دے کر بھیجا۔[۵]

سفارتی رابطوں کے اثرات

عہد نبوی میں سفارتی ذرائع سے مختلف ممالک کے حکمرانوں کے ساتھ رابطہ قائم کرنے اور ان میں دعوت دین اور اشاعت حق کے لئے کام کرنے کے بہت سے دور رس نتائج برآمد ہوئے سب سے زیادہ اہم فائدہ تو یہی ہوا کہ بہت سے حکمرانوں' قبائل کے سرداروں اور سیاسی رہنماؤں نے اسلام قبول کر لیا اور دعوت دین کے کام میں خود بھی شریک ہوگئے۔ معاشرہ کے ان اثر و رسوخ رکھنے والے طبقات کے اسلام قبول کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی رعایا اور ان کے زیر اثر لوگ بھی دلچسپی اور جستجو

---

[۱] السیرۃ' ج ۳' ص ۳۰۴۔ عیون الاثر' ج ۲' ص ۲۶۹' زاد المعاد' ج ۳' ص ۶۳ [۲] حفاظتی عملہ کے افسر نے بتایا کہ" ھو یخاف قیصر" وہ قیصر سے ڈرتا ہے' السیرۃ الحلبیۃ' ج' ص ۳۰۵۔ [۳] زرقانی' ج ۳ ص ۶ ۵ ۳ عیون الاثر' ج ۲' ص ۲۷۰۔ السیرۃ الحلبیہ' ج ۳' ص [۴] ابن ہشام سیرۃ النبی ج ۴' ص ۲۸۰' ابن سید الناس عیون الاثر' ج ۲' ص ۲۵۹ [۵] طبقات ابن سعد ج ۴' طبقات ابن سعد ج ۱' ص ۳۴ تا ۵۷۔

کے ساتھ اسلام کی طرف متوجہ ہوئے اور بہت تھوڑے عرصے میں یہ لوگ بھی دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔

بعض حکمرانوں نے اگرچہ اسلام کو قبول تو نہیں کیا لیکن ذہنی طور پر وہ یہ بات ماننے پر مجبور ہو گئے کہ اسلام حق و صداقت کا دین ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دعوت دین کا کام مخلصانہ طور پر اسلام کی حقانیت کی بناء پر کر رہے ہیں ملکوں اور علاقوں پر قبضہ کرنا یا اپنی مملکت کی سرحدوں کو وسیع کرنا ان کا مقصد نہیں، اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسلام قبول کرنے والے حکمرانوں یا قبائلی سرداروں کو حکومت و قیادت سے برطرف نہیں کیا کرتے تھے بلکہ انہی لوگوں کو برقرار رکھتے تھے۔

اس سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بے مثال عزم و استقامت نے ان حکمرانوں کو یہ بات سوچنے پر بھی مجبور کر دیا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آج جس اعتماد و یقین کے ساتھ اسلام کی دعوت دے رہے ہیں، مستقبل میں یہ دین ضرور غالب و کامیاب ہو گا انہی وجوہات کی بناء پر بہت سے حکمرانوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان سفراء کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا، اُنہوں نے ان سفیروں کو تحفے پیش کئے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی تحائف بھیجے تاکہ دوستانہ تعلقات قائم کر سکیں۔

فارس کے شہنشاہ کسریٰ اور دو ایک دیگر حکمرانوں نے ان سفیروں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مکتوب گرامی کے جواب میں سخت ردعمل کا مظاہرہ کیا۔

سب سے بڑا فائدہ ان سفارتی سرگرمیوں کا یہ ہوا کہ ان حکمرانوں کے جوابات اور ان کے ردعمل نے ان کے مقاصد اور سیاسی رجحانات کو واضح کر دیا جس کی روشنی میں مملکت اسلامیہ کے لئے ان کے ساتھ مستقبل کی پالیسی مرتب کرنا اور ان کے ساتھ آئندہ تعلقات کی نوعیت متعین کرنا آسان ہو گیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سفیروں کے ساتھ طرزِ عمل

زمانہ جاہلیت میں اگرچہ یہ قانون موجود تھا کہ سفارتی نمائندوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا چاہیے اور بدسلوکی یا ایذا رسانی سے گریز کرنا چاہیئے لیکن اس قانون پر پوری طرح عمل نہیں کیا جاتا تھا۔ سفیروں کے ساتھ غیر مہذب سلوک حتیٰ کہ انہیں یرغمال بنانے اور قتل تک کر ڈالنے کی بے شمار مثالیں تاریخ میں موجود ہیں۔ خود مسلمان سفیروں کے ساتھ ناروا سلوک ہوتا رہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعض نمائندوں کو قتل بھی کیا گیا لیکن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سفارتی آداب کی تعلیم دی اور سفیروں کے ساتھ اعزاز و احترام کا سلوک کرنے کا حکم دیا ہے۔ جن سفراء کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مختلف حکمرانوں یا قبائلی سرداروں کے پاس بھیجا تھا اُنہیں بھی اس بات کی تربیت دی تھی کہ وہ لوگ اپنے مشن میں سفارتی آداب کو ملحوظ رکھیں اور حفظ مراتب کا خیال رکھتے ہوئے اپنے فرائض انجام دیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ان تمام سفیروں کی سرگرمیوں اور تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنہوں نے ان تمام باتوں کا ہر طرح سے خیال رکھا مثلاً حضرت دحیہ کلبی نے قیصر روم سے براہِ راست رابطہ قائم نہیں کیا بلکہ روم کی ایک ماتحت ریاست بصریٰ کے گورنر کے توسط سے ملاقات کا اہتمام کیا، بصریٰ کے گورنر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفیر کے ساتھ اپنے دربار کے ایک معتمد فرد عدی بن حاتم کو بھیجا تاکہ وہ قیصر روم کے ساتھ ملاقات کا انتظام کرائے۔[1]

---

[1] سیرت حلبیہ، ج ۳، ص ۲۸۴۔

مدینہ منورہ میں آنے والے سفراء اور وفود کے ساتھ آپ بہت عزت و احترام کا برتاؤ کرتے تھے اور اس قدر رواداری کا مظاہرہ فرماتے تھے کہ ان کی بہت سی نازیبا اور ناقابل برداشت حرکتوں کو بھی صبر و تحمل کے ساتھ برداشت کر لیتے تھے۔

مؤرخین لکھتے ہیں کہ سب سے بدترین وفد عامر بن طفیل کا وفد تھا جو رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا تھا، یہ وفد تین افراد پر مشتمل تھا عامر بن طفیل، اربد بن قیس اور جبار بن سلمی۔ عامر بن طفیل اس وفد کا قائد تھا۔ یہ تینوں سرداران قوم سے تھے اور ان کے عزائم ٹھیک نہ تھے عامر بن طفیل نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ بہت غیر مہذب بلکہ گستاخانہ انداز میں گفتگو کی۔ واپس جاتے ہوئے اُس نے دھمکی بھی دی کہ وہ اپنے مسلح لشکروں سے مدینہ کی مملکت کو تہس نہس کر دے گا لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے ساتھ بھی سفیروں کا سا سلوک کیا، اور اس کے جانے کے بعد صرف یہ دعا کی کہ اے اللہ تو عامر کے فتنوں سے ہمیں محفوظ فرما۔[1]

مسیلمہ کذاب کے سفیروں سے بھی بُرا سلوک نہیں کیا گیا۔ حالانکہ ان سفیروں نے تمام آداب کو نظر انداز کرتے ہوئے بڑی بدتمیزی اور شرارت کا مظاہرہ کیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے صرف یہ کہا:۔

"اما واللہ لولا ان الرسل لا تقتل لضربت اعناقکما"۔[2]

(خدا کی قسم اگر یہ بات نہ ہوتی، کہ سفیروں کا قتل جائز نہیں، تو میں ضرور تمہاری گردنیں اُتروا دیتا۔)

نجران کا ایک بہت بڑا وفد مدینہ منورہ آیا۔ یہ وفد ساٹھ افراد پر مشتمل تھا اور اس کی قیادت عبدالمسیح کر رہا تھا، یہ لوگ مسجد نبوی میں ٹھہرے۔ جب اُن کی نماز کا وقت ہوا تو اُنہوں نے مسجد نبوی میں نماز ادا کرنا چاہی، یہ لوگ عیسائی تھے اور بیت المقدس کی جانب منہ کر کے نماز پڑھتے تھے، جب لوگوں نے دیکھا کہ یہ لوگ اپنے مذہب کے مطابق اور اپنے قبلہ کی جانب منہ کر کے ہماری مسجد میں نماز پڑھنا چاہتے ہیں تو اُنہیں روکنا چاہا مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کو منع فرما دیا اور ان مہمانوں کو اپنے مسلک کے مطابق نماز پڑھنے کی اجازت دی، چنانچہ اُنہوں نے مسجد نبوی میں عیسائیت کے مطابق نماز ادا کی۔[3]

قبیلہ بنو ثقیف کا وفد آیا تو اسے بڑے اعزاز و احترام کے ساتھ مسجد نبوی میں ٹھہرایا اور خاص طور پر ان کے لئے خیمے لگوائے، ان کے ساتھ مذاکرات اور ضیافت کے لئے حضرت خالد بن سعید بن العاص کو افسر رابطہ و ضیافت مقرر فرمایا۔[4]

مدینہ منورہ میں آنے والے سفراء اور وفود کے پاس اگر زادِ راہ ختم ہو جاتا تو ان کی واپسی کے انتظامات فرماتے تھے۔ قبیلہ مزینہ کا وفد واپس جانے لگا تو ان کے پاس راستے میں کھانے پینے کا سامان پورا نہیں تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ کو حکم دیا کہ ان کے لئے اسباب خورد و نوش کا انتظام کر دیا جائے۔[5] اسی طرح بنو ثعلبہ کے وفد کے ہر فرد کو واپس جاتے ہوئے پانچ پانچ اوقیہ چاندی دینے کا حکم صادر فرمایا تھا۔[6]

حضرت بلال رضی اللہ تعالےٰ عنہ کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سفیروں کے ساتھ عزت و احترام کا سلوک کرنے کا حکم دیا تھا۔ آپؐ کے الفاظ یہ تھے۔

---

[1] ابن سید الناس، عیون الاثر، ج ۲، ص ۲۳۲۔ زاد المعاد، ج ۳، ص ۲۹۔ [2] ابن ہشام، سیرۃ النبی، ج ۴، ص ۲۷۲ [3] السیرۃ الحلبیہ، ج ۲، ص ۲۳۵ [4] عیون الاثر، ج ۲، ص ۲۲۸، السیرۃ الحلبیہ مجلد ۳، ص ۲۴۲، ۲۴۳، [5] الخصائص الکبریٰ، ج ۲، ص ۲۳، [6] الطبقات الکبریٰ، ج ۱، ص ۲۹۸

"أجزهم کما تجیز الوفد"

ان (وفد ثعلبہ) کے ساتھ اسی طرح خاطر و مدارات کرو جس طرح وفود کے ساتھ خاطر و مدارات کی جاتی ہے۔[1]

سفیروں کے تحفظ اور ان کے اعزاز و احترام کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس قدر خیال تھا کہ اپنے آخری ایام میں جو وصیت فرمائی تھی اس میں بھی سفیروں کے ساتھ باعزت سلوک کرنے کا حکم دیا تھا آپ نے فرمایا تھا ان نمائندوں کی عزت و مدارات اسی طرح کرتے رہنا جس طرح میں کرتا ہوں آپ کے الفاظ یہ تھے۔

"أجیزوا الوفد بنحو ما کنت اجیزهم"[2]

---

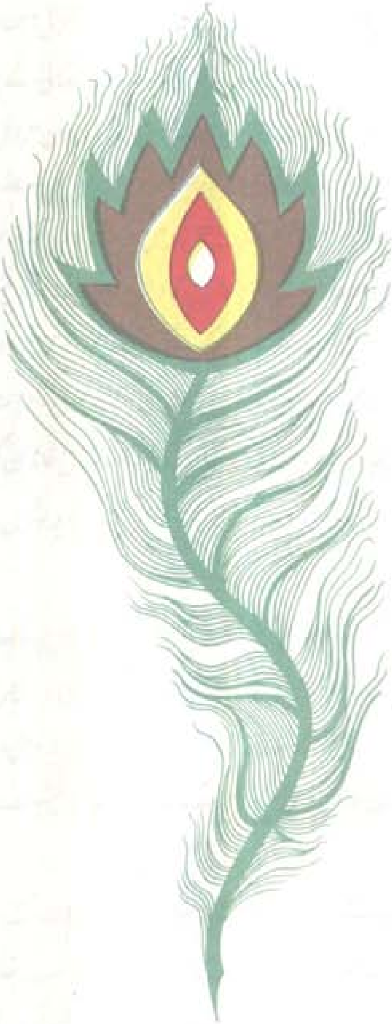
[1] الطبقات الکبریٰ، ج ۱، صـ ۲۹۸

[2] ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، ج ۲، ص ۲۴۲۔

وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ

اور ہم نے آپؐ کو نہیں بھیجا مگر تمام جہانوں کے واسطے رحمت بنا کر

(الانبیاء : ۱۰۷)



رسول اللہ کی حکمتِ سیاست

رسولِ اکرمؐ کی حکمتِ سیاست

سید اسعد گیلانی

حضور اکرمؐ کی قیادت میں اسلامی انقلاب جیسے عظیم الہٰی نظام کا برپا ہونا جہاں ایک واضح اور غیر معمولی احسان ربانی ہے۔ وہاں اس میں حضور اکرمؐ کی دانشورانہ حکیمانہ اور جرأت مندانہ قیادت کا بھی بہت بڑا دخل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی مشیت کو پورا کرنے کے لیے عالم اسباب میں سے جن موزوں ترین عوامل کو یکجا کرنے کی ضرورت محسوس فرمائی ان عوامل میں سب سے بڑا اور سب سے مؤثر عامل حضور اکرمؐ کی ذات مبارک تھی۔ آپ میں وہ ساری خوبیاں بدرجہ اتم موجود تھیں جن سے اسلامی انقلاب جیسا منفرد تاریخی کارنامہ سرانجام دیا جا سکتا تھا۔ یہ محض اقتدار کے الٹ پھیر کا نام نہ تھا۔ یہ محض کرسی بدلنے اور اقتدار پر قبضہ کرنے کا مسئلہ بھی نہ تھا بلکہ یہ ایک تعمیری اخلاقی تعلیمی تربیتی اور عظیم معاشرتی اور اصلاحی کام تھا جس کا دائرہ ایک فرد سے لیکر تمام عالم انسانیت تک پھیلا ہوا تھا۔ اس میں فرد کی روحانی ضروریات سے لیکر اس کی مادی ضروریات تک فراہم کرنے کا مسئلہ تھا۔ اس میں انسانی سوسائٹی میں سے نسلوں اور فرقوں کی پیدا شدہ برائیوں کو ختم کرنے کا مسئلہ تھا۔ یہ صدہا صدیوں سے انسانوں کی بگڑی ہوئی عادات کو سدھارنے اور انہیں سچے بندگان خدا بنانے کا مسئلہ تھا۔ یہ ان گنت مدتوں کے پیدا شدہ اونچ نیچ کو اٹھا کر آدمؑ کے انسانی خاندان کو ایک خاندانی اور برادرانہ سطح پر لانے کا مسئلہ تھا۔ یہ صدیوں سے باہمی ایک دوسرے کے حقوق انسانیت پر جابرانہ قابض شدہ جابر لوگوں سے مظلوموں کے حقوق حاصل کر کے انہیں لوٹانے اور ان میں شرف انسانیت پیدا کرنے کا مسئلہ تھا۔

انقلاب اسلامی محض کرسی حاصل کرنے کا مسئلہ نہ تھا جو بالعموم ہر طالع آزما اور سیاسی مہم جو کا مسئلہ ہوتا ہے۔ بلکہ یہ طالع آزماؤں کے آگے بند باندھ کر خدا کے نیک بندوں کو آگے لانے کا مسئلہ تھا۔ یہ بڑا ہی پیچیدہ شاخ در شاخ الجھا ہوا مسئلہ تھا۔ جسے حضور اکرمؐ نے ۲۳ سال کی قلیل ترین مدت میں سلجھا کر انسانیت کے قافلے کو بندگیٔ رب کی صراطِ مستقیم پر ڈال دیا جب حضورؐ نے اپنا کام مکمل فرمایا تو سارے انسانی مسائل سلجھ چکے تھے اور انسان خدا کی زمین پر آدمؑ کے بیٹے ہونے کی حیثیت سے باہمی بھائی بھائی بن چکے تھے

یہ کام محض معجزے دکھانے سے ہونے والا نہیں تھا آپؐ سے پہلے بہت سے انبیاءؑ ہزارہا معجزات کے ساتھ انسانوں کو دعوتِ بندگیٔ رب دے چکے تھے لیکن انسانوں نے قبول دعوت اور صراطِ مستقیم پر چلنے کی بجائے عذابِ خداوندی تک پہنچنے کا راستہ بار بار اختیار کیا تھا۔ آپؐ سے پہلے بہت بڑے بڑے زور آور فوجوں والے فاتحین آئے تھے لیکن فوجوں نے صرف قوموں کو تباہ کیا، ابن آدم کو مفتوح اور بے آبرو کر کے اپنا غلام بنایا اور ابن آدم کے مسائل میں مزید اضافہ کر دیا۔ آپؐ سے پہلے بہت سے مصلحینِ اخلاق بھی آئے لیکن ان سے کسی نے اصلاحِ اخلاق کا درس نہ لیا اور اگر کسی نے لیا تو اس نے تقسیم شدہ

انسانیت میں ایک اور متحارب گروہ کا اضافہ کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانیت اپنے دنیا کے دائرہ آسمان میں بڑی پریشان چلی آرہی تھی، بالآخر الجھے ہوئے پیچیدہ سوالات کا صحیح اور آسان حل صرف حضور اکرمؐ نے ہی انسانیت کو بتایا۔

یہ عظیم کارنامہ جو حضورؐ نے سرانجام دیا اس میں حضورؐ کی حکمت سیاست و بصیرت و دانش اور تدبر کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ افسوس یہ ہے کہ اس پہلو پر بہت کم غور کیا گیا ہے۔ ہمارے اس دور کا مطالبہ اور تقاضا یہ ہے کہ ہم حضورؐ کی اس جدوجہد میں اس سیاسی بصیرت و دانشوری اور اس حکمت و تدبر کی بھی نشاندہی کریں جس کا اتباع ہر دور کے اسلامی انقلاب کے لئے ضروری ہے۔ ہماری بدقسمتی سے دور حاضر میں جہاں دین و سیاست کو الگ کیا گیا ہے تاکہ سیاست کو دین سے آزاد رکھ کر اس سب سے زیادہ طاقتور ادارے کو باطل مقاصد اور ہوائے نفس کے لئے استعمال کیا جا سکے وہاں حضورؐ کی سیرت میں سے بھی سیاسی اجزاء کو نکال کر لے صرف پند و نصائح وعظ و تلقین، تبلیغ و اشاعت، عبادات، فقر و فاقہ اور دنیا سے مکمل اجتناب کی زندگی بنا کر ہی پیش کیا گیا ہے۔ حالانکہ حضورؐ کی سیرت کا سب سے بڑا اور اہم حصہ تو یہ ہے کہ حضورؐ نے ایک عظیم سیاسی اور روحانی انقلاب برپا کر کے باطل قوتوں کو بزور بازو سرنگوں کر دیا اکثر سیرت نگار انقلاب اسلامی کے کارنامے کو اس طرح پیش کرتے ہیں۔ جیسے یہ سارا کام خود بخود ہی ہو گیا اور اس میں صرف دعاؤں اور تسبیح و وظائف کا ہی دخل تھا۔ حالانکہ اس طرح پیش کرنے سے ایک طرف حضور اکرمؐ کی سیرت ادھوری رہ جاتی ہے، دوسری طرف حضورؐ کے اسوۂ حسنہ کا ایک نہایت اہم حصہ بھی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ جس کے بغیر مومن نظام باطل کو کبھی بھی چیلنج کر کے حضورؐ کے اسوۂ حسنہ کا کامل اتباع نہیں کر سکتا۔

سیاست و تدبر، بصیرت و حکمت اور تدبیر مملکت حضورؐ کی سیرت کا اہم ترین حصہ ہے۔ یہی وہ حصہ انسانی زندگی پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔ میں اس سمت میں سوچ و بچار کا راستہ کھولنے کے لئے اپنے طور پر حضور اکرمؐ کی سیاسی بصیرت و حکمت کے بعض پہلوؤں کی طرف نشاندہی کروں گا اس میں میرے مطالعہ، فیصلے اور اخذ و نتائج کا کم و بیش تعلق ہو سکتا ہے۔ لیکن میں جس جذبۂ خدمت دین اور نیت خیر کے ساتھ اس جہت میں اپنے نتائج فکر پیش کر رہا ہوں ان میں نقائص کے باوجود میں اس کوشش کے ذریعے اپنے مالک سے اجر و بخشش کی امید رکھتا ہوں۔

اسلامی انقلاب کے لئے اتحاد اور امن کا اہتمام

حضور اکرمؐ کی ۲۳ سالہ جدوجہد کا مطالعہ یہ بات بار بار ہمارے سامنے لاتا ہے کہ حضور اکرمؐ نے ملت کے اندر اتحاد کو سب سے بڑی اہمیت دی آپ نے سب انسانوں کے سامنے ایسی نظریاتی اور اصولی بنیادیں فراہم کیں جو پہلے سے بعید فطرت کثیر انسانوں کے درمیان متفق علیہ چلی آرہی تھیں۔ جن میں سب سے اہم اللہ تعالیٰ کی توحید کا اقرار کرنا اور آخرت میں اپنے اعمال کی جواب دہی کا احساس تھا۔ توحید سے مساوات اور آخرت کے عقیدے سے ذمہ داری پیدا ہوئی ہے بلاشبہ بعض لوگوں نے باپ دادا کے بگاڑ کی حفاظت کے لئے کچھ مزاحمت بھی کی جو ناگزیر تھی اور خود حضورؐ اور آپ کے ساتھیوں کی انقلابی تربیت کے لئے بھی اس مزاحمت کی ضرورت تھی لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ یہ بنیادیں کثیر انسانوں کے اندر مدت دراز سے متفق علیہ چلی آرہی تھیں اور یہ ایسی

انوکھی باتیں نہ تھیں کہ جنہیں تسلیم کر لینے سے کوئی شخص بہت ہی دور از خیال الذکے اصولوں کو تسلیم کرنے کا مرتکب ہو جاتا ان باتوں کو فطرتاً اور اصولاً سب مانتے تھے۔ صرف اپنے باپ دادا کے پیدا کردہ سفارشیوں کا واسطہ اپنے لئے مفید اور آسان کہتے تھے۔ چنانچہ لوگوں نے ان اصولوں کو تھوڑی سی مزاحمت اور رد و قدح کے بعد تسلیم کر ہی لیا اس سے اتحاد ملت پیدا ہوا۔ دوسرا مسئلہ امن کا تھا حضورؐ نے دعوت اسلامی کے لئے بطور ضرورت اور حکمت کے امن کے حالات کو ہمیشہ بہت اہمیت دی اور ایسے حالات پیدا کرنے کی ہمیشہ کوشش کی جس سے دعوت کے اخلاق و کردار اپنا کام کر سکیں اور تعصبات حائل نہ ہوں یہ دونوں چیزیں حضورؐ کی جدوجہد میں ہمیں بطور اصول کے پورے عرصۂ جدوجہد میں رواں دواں نظر آتی ہیں۔

عرب کردار پر اسلام کا اصلاحی غازہ

حضورؐ اکرم نے اپنے انقلاب کے لئے عرب کردار کو زیادہ توڑنے پھوڑنے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور نہ ہی اس کی زیادہ کوشش کی عربوں میں بنیادی انسانی کردار کی بہت سی خوبیاں پہلے سے موجود تھیں وہ مدت دراز سے درباداری سے دور سلطنتوں کی عیش پرستانہ زندگی سے بیگانہ آزاد اور خوددار لوگ تھے ان میں بنیادی طور پر شجاعت تھی، حمیت و غیرت تھی۔ فیاضی اور مہمان نوازی تھی۔ جذبہ مہم جوئی اور شوق سیاحت تھا امانت داری اور دیانت کا تصور موجود تھا۔ پاس عہد، احساس مروت دوستی اور وفاداری تھی حضورؐ نے قدیم عرب کردار کی ان خوبیوں کو قائم رکھا اور ان سے فائدہ اٹھایا۔ آپؐ نے ان عربیوں میں مناسب صالحیت کا اضافہ کر کے انسانیت کے لئے انہیں زیادہ مثبت اور مفید بنا دیا۔ لیکن ان کے قومی کردار کی زیادہ توڑ پھوڑ نہیں کی۔ اسلام کا نظام تدریج کے ساتھ خود ہی ایک ایسا سانچہ ہوتا ہے جو کردار کو اپنی منشا کے مطابق ڈھال لیتا ہے۔ مثلاً بنائے کعبہ کے بارے میں حضورؐ نے ایک بار ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے فرمایا تھا کہ حطیم کا حصہ کعبے کی عمارت کا حصہ ہے۔ میں اسے ڈھا کر عمارت میں شامل کر دیتا لیکن اے عائشہ تیری قوم ابھی جدید الاسلام ہے اس لئے مناسب نہیں ہے۔ غرض حضورؐ نے عربوں کی خوبیوں کو مزید اجاگر کر کے انہیں اسلام کے سپاہی بنایا اور انہوں نے بلاشبہ خدمت اسلام کا حق ادا کیا۔

معاشرتی مرتبے کی بجائے قبولیت حق، معیار فضیلت

حضور اکرمؐ نے اپنی تحریک کے اندر جاہلی دور کے باطل نظام کے پیدا کردہ معاشرتی مراتب کو وقعت دینے کی بجائے قبولیت حق کے لئے آگے بڑھنے کی مخلصانہ استعداد کو زیادہ اہمیت دی۔ سرداران قریش بار بار غلاموں، نوکروں، ملازموں، مزدوروں اور محنت پیشہ لوگوں کی طرف اشارہ کر کے کہتے تھے کہ کیا ہم ان کے ساتھ آ کر ایک ہی صف میں بیٹھیں؟ یہ شریف لوگ ذات برادری نسب اور پیشہ کی تقسیم کے سبب "کمین" لوگوں میں آ کر بیٹھنے سے کتراتے تھے اور ایک ہی صف میں محمود و ایاز کے اس طریقے کو ناپسند کرتے اور اپنے مرتبے سے فروتر سمجھتے تھے۔ حضورؐ کی دانش نے جو وحی سے فیض یاب تھی ان کے اس مطالبے کو بلا تاخیر رد کر دیا اور اگر کہیں اس اصول اور حکمت سے ذرا بھی صرف نظر ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے فوراً توجہ دلائی۔

"اے محمدؐ جس نے بے نیازی برتی تم اس کے پیچھے پڑتے ہو! حالانکہ اگر وہ نہ سدھرے تو تم پر اس کی کیا ذمہ داری ہے اور جو تمہارے پاس دوڑا آتا ہے۔ اس حال میں کہ وہ اللہ سے ڈر رہا ہے تم اس سے بے رخی برتتے ہو۔ ہرگز نہیں یہ تو ایک نصیحت ہے جس کا جی چاہے اسے قبول کرے"! (۵ ۔ ۱۳)

اسلامی تحریک میں معاشرتی مرتبے کو دین حق کی تبلیغ کے لئے تو استعمال کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کی وجہ سے کسی کو اسلامی تحریک میں بلند مقام عطا کیا جائے اور اس کے مقابلے میں کم تر معاشرتی مرتبے کے کارکنوں کو کم وزن دیا جائے۔ یہ چیز اسلام کے مزاج کے منافی ہے۔ حضورؐ نے اس کیفیت کو اپنی تحریک میں ایک لمحہ کے لئے بھی پیدا نہیں ہونے دیا۔ وہاں یہ اصول کار فرما تھا کہ مالدار لوگ ہی دیانت دار ہوتے ہیں اس لئے کہ انہیں بددیانتی کی کیا ضرورت ہے۔ بلکہ خدا ترسی، نیکی اور خدا خوفی انسان کی قدر و منزلت کا اصول تھا۔ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ہی قدر و منزلت کی بنیاد تھی اور حضورؐ جانتے تھے کہ باطل کے نظام میں معاشرتی مرتبہ، دیانت دار ہونے اور امانت دار ہونے سے نہیں بلکہ بے ضمیریوں سفارشوں، رشوتوں اور ظلم و زیادتی کا آلہ کار بننے سے حاصل ہوتے ہیں چنانچہ معاشرتی مرتبے کی فضیلت نظر انداز کر کے نظریاتی اور تحریکی حیثیت کو وقعت دینے سے حضورؐ کو مخلص اور جاں نثار ساتھیوں کا ایک بہترین گروہ حاصل ہو گیا۔

غلاموں کی آزادی اور مظلوموں کی دادرسی کی تحریک

حضورؐ نے غلاموں کی آزادی کی تحریک چلا دی۔ اس کے علاوہ آپ نے بے سہاروں، مظلوموں، کمزوروں، مسکینوں غلاموں، محتاجوں، مسافروں، قیدیوں، بیماروں، یتیموں اور بیوگان کی ہمہ پہلو امداد و معاونت کی مہم بھی جاری کی۔ حضورؐ کی یہ تحریک مکے میں بھی دکھائی دیتی تھی جب حضورؐ کے اشارے پر حضرت ابوبکر صدیقؓ اور دوسرے اکابر صحابہ اپنے غلاموں کو آزاد کر کے پھر دوسروں کے نو مسلم غلاموں کو بھی خرید خرید کر آزاد کرتے تھے۔ مدینہ کی آبادی میں پہنچ کر تو غلاموں کی آزادی، ایک تحریک کی صورت اختیار کر گئی غلام آزاد کرنا معاشرے کا فیشن بن گیا معمولی معمولی لغزشوں پر کفارہ غلام کی آزادی قرار پایا۔ مساکین کو کھانا کھلانا بھی ایک ایسا کفارہ قرار پایا جو ہر لغزش میں کام آنے والا تھا۔ بطرض زکوٰۃ کے فنڈ میں اس کام کے لئے حصہ مخصوص کیا گیا۔ اسلامی ریاست کا مقصد وجود ہی مظلوموں کی حمایت اور ظالموں کے فتنے کی سرکوبی بتایا گیا۔

دنیا کے سارے مذاہب میں غلامی جاری رہی اور کسی نے اس کی تنسیخ نہ کی لیکن اسلام نے ظہور کرتے ہی غلامی کو سارے ذرائع سے بتدریج ختم کر دینے کی مہم چلا دی۔ چنانچہ غلاموں کی آزادی کو نیکی کا اصول بنایا گیا والسآئلین وفی الرقاب (البقرہ ۔ ۱۲) پھر غلاموں کی آزادی کو آخرت میں نجات حاصل کرنے کا ذریعہ قرار دیا۔ فلا اقتحم العقبۃ وما ادراک ما العقبۃ فک رقبۃ (سورہ بلد) اسی طرح غلاموں کی آزادی کو بعض لغزشوں کے کفارے کا ذریعہ قرار دیا! مثلاً قتل خطا میں، ظہار کا کفارہ، روزہ توڑنے کا کفارہ، غلام کو مارنے کا کفارہ بھی اس کی آزادی قرار پایا۔ یہ بات یہاں تک چلی کہ اکابر صحابہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف وغیرہ نے ہزاروں غلام آزاد کئے اور بتدریج مسلمانوں نے غلامی کا رواج ختم کر دیا اور ان کا مرتبہ اتنا بلند کیا گیا کہ وہ مسلمانوں

کے قائد، امام، محدث، سپہ سالار، صوبوں کے حاکم بلکہ خود سلطان تک مقرر ہو گئے۔ محمود غزنوی خود خاندان غلاماں سے تعلق رکھتا تھا اور اس کا باپ سبکتگین غلام تھا۔ اس وجہ سے، عرب کی کثیر آبادی کی فطری ہمدردیاں اسلامی تحریک کے ساتھ ہو گئیں انہیں اس تحریک میں اپنا معاشرتی سیاسی اور معاشی مستقبل محفوظ اور درخشاں نظر آنے لگا۔ چنانچہ صہیب رومی اور بلال حبشی سے لیکر سلمان فارسی تک اسلام کے شیدائی اور جاں نثار دکھائی دینے لگے یہ اسلام کی وہ انقلابی روح تھی جس نے گرے ہوئے انسانوں کو سہارا دیا اور بے وسیلہ لوگوں کی دست گیری کی۔ اس کے نتیجے میں اسلام نے دنیا میں معاشرت اور ریاست کا تصور بدل دیا اور اسے اقتصادی خوشحالی اور نسلی افتخار سے نکال کر مساوات انسانی پر قائم کر دیا۔ حضورؐ کی یہ اسلامی تحریک مساوات انسانی، امداد مساکین اور غلاموں کی آزادی کے لئے زبردست مہم بن گئی۔ جس کے نتیجے میں اسلامی دعوت کی توسیع کے لئے یہ چیزیں زبردست محرک ثابت ہوئیں۔

حضورؐ میں یہ جذبہ نہایت قوی موجود تھا کہ مظلوموں کی مدد کی جائے اور ظالم کا ہاتھ پکڑا جائے۔ یہ بے لاگ انسانی خدمت اول روز سے حضورؐ کے اخلاق و کردار کا حصہ تھی۔ اس کی درخشاں مثال نبوت سے پہلے حلف الفضول کے معاہدے میں آپؐ کی شرکت تھی۔ حضورؐ کفار کی مختلف سرگرمیوں میں بالعموم کوئی دلچسپی نہ لیتے تھے۔ لیکن اس معاہدے میں آپؐ نے باقاعدہ شرکت فرمائی اور اس پر دستخط ثبت فرمائے۔ یہ ایک نوعیت کی انجمن امداد مظلومین تھی جس کے ممبر ظالموں کے ہاتھ روکتے اور مظلوموں کا حق دلاتے تھے۔ اس انجمن میں شریک ہونے والوں کا حلف یہ ہوتا تھا۔

> "خدا کی قسم ہم سب مل کر ایک ہاتھ بن جائیں گے اور وہ مظلوم کے ساتھ رہ کر اس وقت تک ظالم کے خلاف اٹھا ہوا رہے گا تاآنکہ وہ ظالم اس مظلوم کا حق ادا نہ کر دے اور جب تک سمندر گھونگوں کو بھگوتا رہے اور ثبیر کے پہاڑ قائم ہیں ہماری معیشت میں مساوات رہے گی۔"[1]

حضورؐ نے محنت کاروں اور اجیروں کے سلسلے میں بھی سختی کے ساتھ واضح ہدایات جاری فرمائیں۔

مزدور کی اجرت اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کرو۔

خدا کی لعنت ہے اس تاجر پر جو اجیر کا حق مار لے۔

اپنے خادم کو وہ کام کرنے کا حکم نہ دو جو تم خود نہ کر سکو۔ کام میں اس کا ہاتھ بٹاؤ۔ اور اس سے نرم سلوک کرو اس پر اس کی قوت سے زائد بوجھ نہ ڈالو۔

محنت کار کو اپنی طرح کا آدمی سمجھو اور اس کے اعزاز اور عافیت کا خیال رکھو۔

یاد رکھو کہ اجیر اجیر ہے اور تم مستاجر۔ یہ اللہ کے لئے کوئی مشکل امر نہیں کہ تم اجیر ہو جاؤ اور وہ تاجر۔

مومن کی شناخت یہ ہے کہ مرتے وقت بھی اس کی پیشانی محنت کے پسینے سے تر ہو۔

[1] سیاسی زندگی، ۲۷۔۲۸۔

اللہ کی رحمت ہو اس بندے پر جو اپنی روزی اپنی محنت سے کماتا ہے

غریبوں کے حق کو پہچانو۔ یہ تمہارا ہی کام کر رہے ہیں [1]

غرض حضورؐ کی اسلامی تحریک معاشرے کے پسماندہ طبقے کے حقوق کی پوری طرح محافظ تھی اس کا نتیجہ تھا کہ سرداروں اور خوشحال طبقے کے دباؤ کے باوجود غلاموں مسکینوں اور اجیروں نے اسلام کا کھل کر ساتھ دیا۔ وہ اسلام کی فوج کے بہترین سپاہی ثابت ہوئے۔

حجرِ اسود کی خونی نزاع کا متوازن قابلِ قبول فیصلہ

حجرِ اسود کی نزاع کا فیصلہ آپؐ کی حکمت و تدبر کا شاہکار ہے۔ بعثت سے پہلے حضور اہلِ مکہ میں دیانت و امانت اور صدق و شرافت کی اعلیٰ شہرت رکھتے تھے۔ آپؐ کا احترام دانش و حکمت کے سبب بھی پوری شہری سوسائٹی میں موجود تھا۔ قریش کعبے کی تعمیر نو اور مرمت کا کام کر رہے تھے جب حجرِ اسود والی دیوار ڈیڑھ گز اونچی ہو گئی تو حجرِ اسود جو عربوں میں متفق علیہ مقدس پتھر تھا اسے دیوار میں اس کی جگہ رکھنے کا مسئلہ پیدا ہوا جو دیکھتے ہی دیکھتے خطرناک نزاع کی صورت اختیار کر گیا۔ ہر قبیلہ چاہتا تھا کہ یہ شرف اسے حاصل ہو۔ حطیم کی تعمیر کرنے والے قبیلے نے خون سے پیالہ بھر کر رکھ دیا اور اسے چاٹنے لگا گویا اب مرے مارے بغیر وہ کسی دوسرے کو حجرِ اسود نہ رکھنے دیں گے یہاں تک کہ امیہ بن مغیرہ نے مشورہ دیا کہ اسے خدا پر چھوڑ دو اور بیت المقدس میں جو شخص اس راستے سے سب سے پہلے داخل ہو اسے ثالث بنا لو۔ اچانک حضورؐ داخل ہوتے ہوئے سب کو دکھائی دیئے تو سب نے شور مچایا کہ

"یہ لو امین آ رہا ہے ہم اس کے فیصلے پر راضی ہیں، یہ تو محمدؐ ہے"

حضورؐ نے سارا مقدمہ سن کر ایک چادر طلب کر کے بچھائی۔ حجرِ اسود اٹھا کر اس میں رکھا اور پھر جملہ قبائل کے نمائندوں سے کہا کہ وہ اس چادر کے کونے پکڑ کر حجرِ اسود کو دیوار کے مقام تنصیب تک لائیں جب وہ چادر اٹھا کر اوپر لائے تو حضورؐ نے اپنے ہاتھ سے حجرِ اسود اٹھا کر دیوار میں اس کی جگہ پر لگا دیا۔ حضورؐ کی حکمت و دانش کا یہ حال اس وقت بھی تھا جب آپؐ پر ابھی وحی کا نزول شروع نہیں ہوا تھا۔ یہی اعتماد تھا جس کے سبب بعد میں آپ کی تحریک میں مکہ نے اپنے جگر گوشے ڈال دیئے جو ابوبکر صدیقؓ، عمر فاروقؓ، عثمان غنیؓ اور علی مرتضیٰؓ کی صورت میں دنیا کے سامنے آئے۔

کلمۂ طیبہ اسلامی تحریک کے لئے ایک جامع انقلابی نعرہ

حضورؐ نے تحریکِ اسلامی کو ایک جامع انقلابی نعرہ دیا جسے ہم کلمہ طیبہ کے نام سے جانتے ہیں یہ کلمہ اس تحریک سے وابستہ ہر مومن کا قیامت تک کے لئے جزو ایمان ہے۔ اس مختصر کلمے میں تحریک کی نظریاتی روح کا پورا عکس آ گیا ہے اس

1۔ نقش سیرت ۶۶۶ - ۶۶۷

میں توحید آخرت اور رسالت کے تینوں بنیادی عقیدے سمو دیئے گئے ہیں یہ کلمہ مختصر ہے ۔ جامع ہے بیک وقت دعوتی بھی اور انقلابی بھی ہے اور اسلامی تحریک کے انقلابی نظریاتی کردار کا جامع نمونہ بھی ۔ اس مختصر کلمے نے عرب کا دل دہلا دیا اس ایک کلمے کی ضرب سے بڑے بڑے سرداران قریش بلبلا اٹھے ۔ اس کی سب سے بڑی خوبی اس کا اختصار ہے جو ہر نعرے میں ہونا چاہیئے ۔ دوسری خوبی اس کا نظریاتی پرت ہے تیسری خوبی یہ ہے کہ یہ نعرہ ایک ذاتی گرز کی طرح تمام مخالفین کے متفرق عقیدوں پر ضرب کاری کا کام کرتا ہے اور ان کے لیے مفاہمت کی کوئی راہ اطاعت کے سوا نہیں چھوڑتا تاکہ وہ غلط امید دل کا سہارا نہ لیں ۔ چوتھی خوبی یہ ہے کہ یہ فی الفور زبانوں پر چڑھ جاتا ہے ۔ آسان سلیس مترنم ، واضح دلکش اور خوش گوار ۔

اس سے پہلے کسی قبیلے کا کوئی نعرہ نہ تھا ۔ اسلامی تحریک کا عرب کی فضا میں پہلی بار ایک مختصر اور جامع نعرہ گونجا یہ نعرہ ہر کسی کی زبان پر چڑھ گیا اور ہر کسی کی سمجھ میں آگیا اس میں جرأت کا اظہار تھا ۔ مردانگی کا اعلان تھا اور وحدت اللہ کے متفقہ عقیدے کا پرچار تھا ۔ گویا ساری تحریک کی علمی شان کو اس مختصر سے جملے میں سمو دیا گیا تھا ۔ حضورؐ عوام کی نفسیات سے خوب آگاہ تھے وہ جانتے تھے کہ ایک آسان اور عام فہم نعرہ بہت سی علمی تقریروں اور مقالوں پر بھاری ہوتا ہے اس کلمے نے تحریک کی ایک بہت بڑی ضرورت کو پورا کر دیا جب یہ کلمہ میدان میں آگیا تو گویا ایک سریع الاثر نظریاتی ہتھیار میدان میں آگیا جو مخالف اسے سنتا وہ پیچ و تاب کھا کر رہ جاتا ۔ جو اس باختہ ہو جاتا اور اسے اس کی گونج اپنے چاروں طرف سنائی دیتی یہ کلمہ تحریک کی ہمہ وقت بولتی ہوئی زبان بن گیا ۔ اس میں تحریک کی دو مرکزی ذاتوں کا اجتماع اور تعارف موجود تھا ۔ اللہ اور محمدؐ ۔ گویا حاکم اعلیٰ جس کے آگے سب کو سر جھکانا چاہیئے اور جو بادشاہ حقیقی ہے ۔ اس کا تعارف بھی اس کلمے میں موجود ہے ۔ اس کے سوا دوسرا کوئی اس کا مدمقابل نہیں ہے ۔ اس بات کو کفار تسلیم بھی کرتے تھے ۔ دوسری بات یہ کہ محمدؐ لوگوں کے معبود اور حقیقی بادشاہ کے نمائندہ ہیں اس لیے ان کی پیروی اپنے بادشاہ کی پیروی کے مترادف ہے ۔ پھر آگے چل کر یہ کلمہ اذانوں میں بھی آگیا ۔ اللہ اکبر کے ذریعے اللہ کی کبریائی کا مزید اعتراف علی الاعلان کیا گیا غرض کلمہ طیبہ اور اللہ اکبر یہ اسلامی تحریک کے ایسے نعرے تھے کہ مشرک کفار کے پاس اس کا کوئی توڑ موجود نہ تھا اور وہ کلمہ کی گونج اور اللہ اکبر کی تکبیر میں گھر کر رہ گئے تھے ان دو نعروں سے حضور اکرمؐ نے اپنے مدمقابل کو فوراً لرزا دیا تھا ۔

مکے سے باہر دور کے علاقوں میں اسلامی تحریک کے اثرات پہنچانے کی کوشش

آپؐ نے اپنی تبلیغی سرگرمیاں صرف مکہ کی بستی تک ہی محدود نہیں رکھیں بلکہ اپنی دعوت کو دور دراز کے قبائل اور بستیوں تک بھی پہنچانے کی کوشش کی ۔ پہلے انبیاء صرف اپنی بستی تک دعوت پہنچاتے تھے اور جب وہ دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیتے تو نبی کا دعوتی میدان ختم ہو جاتا تھا اور ان بستیوں کو عذاب سے تباہ کر دیا جاتا تھا ۔ لیکن حضور اکرمؐ نے مکہ کو ہی صرف اپنی دعوتی سرگرمیوں کا میدان نہیں بنایا بلکہ دعوت کو دور و نزدیک تک پھیلایا ۔ بلاشبہ مکہ کو اس وقت مرکزی حیثیت حاصل تھی ۔ لیکن حضورؐ نے مکے کے باشندوں کو ہی تنہا اپنی دعوتی سرگرمیوں کا مخاطب اور محور نہیں بنایا بلکہ آپ طائف تشریف لے گئے ۔

اور باشندگان طائف تک بھی دعوت پہنچائی اس سفر میں ایک غلام عداس نینوی مسلمان بھی ہوا ہر سال حج کے موقعہ پر عرب کے ہر علاقے سے آنے والے قبائل کے کیمپوں میں جاکر دعوت اسلامی پیش کرتے تھے۔ آپؐ میلوں میں بھی دعوتی مہم چلاتے اور چل پھر کر لوگوں سے دعوتی مذاکرات کرتے۔ کبھی آپ سوق عکاظ میں نظر آتے کبھی سوق ذو المجاز و مجنہ میں۔ حج کے ایام میں یہ کوششیں بہت بڑھ جاتیں۔ انہی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ عقبہ کی گھاٹی میں مدینہ کے حاجیوں سے ملاقات ہوگئی۔ مدینہ کے لوگ یہودیوں کی ہمسائگی کے سبب خدا، رسالت، آخرت اور انبیاء کے سلسلے کی باتوں سے کچھ کچھ آگاہ تھے۔ انہوں نے دلچسپی سے آپ کی باتیں سنیں اور مطمئن ہوکر مسلمان ہوگئے۔ انہوں نے یہ بھی وعدہ کیا کہ مدینے جاکر اپنے لوگوں میں دین اسلام کی تبلیغ کریں گے۔ ان کی تبلیغ کے نتیجے میں اتنے افراد مسلمان ہوگئے، کہ وہاں ایک مبلغ بھیجنے کی ضرورت پیش آگئی۔ چنانچہ تین سو میل کے فاصلے کی بستی میں حضورؐ نے اپنا پہلا مبلغ حضرت مصعب بن عمیرؓ کو بناکر بھیجا۔ جنہوں نے مدینے کے نیک دل باشندوں میں زبردست کامیابی حاصل کی۔ اس تبلیغ کے نتیجہ میں بعد کے ایام میں مدینہ ہی تحریک اسلامی کا مرکز قرار پایا۔ بیرونی تبلیغ کی اس حکمت سے یہ ممکن ہوا کہ اگر ایک شہر کے باشندوں نے نبی کے کام کو مشکل تر بنا دیا تو دوسرے شہر کے لوگوں کے دل اللہ تعالیٰ نے کھول دیئے۔ حضورؐ کا یہ طرز عمل آخر دم تک رہا۔ آپ دعوت دین کی توسیع کے لئے نئے سے نئے گوشے تلاش کرتے تھے۔

مسجد نبوی کے اصحاب صفہ میں سے بے شمار تبلیغی وفود بنا بنا کر حضورؐ مختلف قبائل کی طرف ارسال فرماتے رہے ان میں بہت سے وفود کو لوگوں نے دھوکے سے قتل بھی کیا لیکن حضورؐ نے دعوت کو دور دور تک پہنچانے کا کام ترک نہ کیا، تاکہ اسلام کی وسعت واشاعت اور قوت تسخیر کا انحصار کسی ایک ہی علاقے کے لوگوں پہ نہ رہے۔ بلکہ جس قوم میں ان اصولوں کو اپنانے اور لے کر اٹھ کھڑے ہونے کی صلاحیت موجود رہے وہ قوم آگے بڑھے اور اقوام عالم کی قائد بن جائے چنانچہ جیسے ہی عرب میں ذرا اثرات مضبوط ہوئے۔ آنحضورؐ نے مکاتیب اور سفارتوں کے ذریعے دیگر سلاطین تک دعوت اسلامی کا پیغام پہنچانا شروع کر دیا اس طرح عرب کے لوگوں کو بھی اطمینان ہوا کہ یہ دعوت عجم تک پھیلنے والی تھی اور اس کے ابتدائی نتائج یہی تھے کہ دور ونزدیک دعوت کے ابتدائی علمبردار ہونے کی حیثیت سے عربوں کا سکہ چلنے والا تھا۔

حضورؐ کی اس حکمت تبلیغ نے بہت سے لوگوں کو اسلام کے قریب تر کر دیا اور اسلام کے لئے تسخیر اقوام کے راستے کھول دیئے۔

اصولوں کے بارے میں ناقابلِ مصالحت رویّہ

حضورؐ جس قدر نرم مزاج، خوش طبع، رحمدل، ہمدرد اور ہر انسان کے خیر خواہ حقیقی تھے۔ اپنے دعوتی اصولوں کے بارے میں اسی قدر سخت اور ناقابل مصالحت تھے۔ کوئی شخص حضورؐ کی نرم خوئی سے یہ توقع نہ رکھ سکتا تھا کہ وہ انہیں کسی اصول میں معمولی لچک پیدا کرنے کے لئے آپ کو آمادہ کر سکتا ہے یہ وہ صفت ہے جو حضورؐ کی پوری جد وجہد میں ہر طرف ہر جگہ ہیرے کی طرح جگمگاتی ہوئی نظر آتی ہے۔

مکہ میں کسمپرسی کا عجیب عالم ہے، سارا شہر دشمن ہے جا بجا مخالفت کے اکٹھ ہو رہے ہیں۔ سرداران قریش اس دعوت کی خطرناکی کا اندازہ کر کے اپنی سرداریوں کی موجودہ صورت کو متزلزل محسوس کرتے ہیں اور اس اٹھتی ہوئی دعوت کو جس قدر جلد ممکن ہو کچل دینا چاہتے ہیں۔ تشدد اور غنڈہ گردی کا آغاز کیا جا چکا ہے۔ حضورؐ کے بعض کمزور اور بے سہارا ساتھیوں کے ساتھ شب و روز مظالم کا ایک سلسلہ جاری ہے مکہ کی پوری بستی مسلمانوں کے لئے عقوبت گاہ بنی ہوئی ہے اور کسی طرف سے ٹھنڈی ہوا کا کوئی جھونکا نہیں آتا ہے۔ بس ایک اللہ ہی کی ذات ہے۔ جس کا سہارا ہر لحہ موجود ہے۔ باقی ساری بستی تو بچھوؤں اور سانپوں کی بانبی بن گئی ہے ہر کوچہ و گلی سے ہر طرف ہر وقت قتل کی خونی دھمکیوں کی گونج سنائی دیتی ہے۔

ایسی ہی صورت حال ہے جب قریش کا ایک جرگہ بیٹھتا ہے جو اس ساری صورت حال پر غور کرتا ہے۔ جس سے اس نئی دعوت کے سبب مکہ کی بستی دوچار ہو گئی ہے۔ جرگہ کی طرف سے پہلے ایک نمائندہ جہاندیدہ سردار عتبہ آتا ہے۔

"میرے بھتیجے اگر تم اس کارروائی سے مال و دولت جمع کرنا چاہتے ہو تو ہم خود ہی تیرے پاس اتنی دولت جمع کر دیتے ہیں کہ تم مالدار ہو جاؤ۔ اگر عزت کی بھوک ہے تو ہم تمہیں بادشاہ عرب بنائے لیتے ہیں جو چاہو ہم کرنے کو تیار ہیں" وہ کہتا ہے۔

"تم نے میری بابت جو کچھ کہا ہے وہ ذرا بھی صحیح نہیں۔ مجھے مال، عزت، دولت، حکومت کچھ درکار نہیں میری حقیقت تم کو قرآن بتلائے گا"

حضورؐ نے فرمایا اور قرآن پڑھنا شروع کر دیا۔ قرآن سن کر عتبہ پر محویت کا عالم طاری ہو گیا اور وہ چپ چاپ اٹھ کر چلا گیا۔

پھر سارے سرداروں کا جرگہ حضورؐ کے چچا ابو طالب کے پاس پہنچا اور دھمکی دی کہ ہم اسے جان سے مار ڈالیں گے تم ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکو گے۔

چچا نے انتہائی دکھ درد اور محبت سے آپکو بلا کر ساری بات بتائی اور کہا کہ اس حد تک معاملہ چلا گیا تو پھر میں بھی کچھ نہ کر سکوں گا یہ بات سن کر حضورؐ کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور فرمایا۔

"چچا جان اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے پر چاند لا کر رکھیں تو بھی اس کام سے نہیں ہٹ سکوں گا چاہے اس کام میں میری جان ہی چلی جائے"

اس پر چچا نے کہا۔ "تم بے خوف و خطر اپنا کام کئے جاؤ"

اس سے مایوس ہو کر پھر قریش کے جرگے نے آپ کو قوم کے سامنے بلانے کا فیصلہ کیا۔ حضورؐ خوشی خوشی سرداران قوم کے اجلاس میں تشریف لے گئے۔ سرداروں نے پہلے لالچ دیا۔ مال و دولت حسین عورت، بادشاہی علاج معالجہ جب ناکامی ہوئی تو پھر معجزات کے مطالبے کئے۔ نہریں، باغات، سونے کے پہاڑ، باپ دادوں کو زندہ کرنا جب بتایا گیا کہ رسول کا یہ کام نہیں ہے تو پھر دھمکیاں، مذاق اور استہزا کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ حضورؐ نے توحید، رسالت، آخرت اور دین کے اصولوں میں سر مو تغیر کرنے پر بھی آمادگی ظاہر نہ کی مسیلمہ کذاب نے بھی اسی طرح شرکت رسالت کا مطالبہ کیا تو حضورؐ نے خندۂ استہزا سے ٹھکرا دیا۔ غرض بڑی

سے بڑی ہولناک آزمائش اور لالچ کے مقابلے میں حضورؐ نے اپنی دعوت کے اصولوں میں مو تغیر کرنا بھی گوارا نہ کیا۔ حضور کے سارے دشمن اس بات کو خوب جانتے تھے کہ دین کے بارے میں حضور کی طرف سے نہ مصالحت ہوئی اور نہ مداہنت۔

جدید مستقر کا قیام

حضور کی انقلابی جدوجہد میں حالات کے مطابق منصوبہ بندی کا زبردست عنصر دکھائی دیتا ہے۔ تیرہ سال تک ہر ممکن طریقے سے دعوت دینے کے بعد حضور نے ان لوگوں کو دعوت کے ابتدائی علمبرداروں کے طور پر مزید آزمانا غیر ضروری سمجھا اس سے قوت اور وقت کا ضیاع ہوتا تھا اور چند مطلوب نتائج نہ نکلنے کی صورت میں مایوسی پیدا ہونے اور قوت کار مضمحل ہونے کا اندیشہ موجود تھا۔ چنانچہ مکہ کے لوگوں کی سنگ دلی اور ہٹ دھرمی دیکھ کر حضور نے دعوت اسلامی کا مرکز بدلنے کا فیصلہ کر لیا۔ ظاہر ہے کہ ایک سرد انقلاب انسانوں کے اندر لانا ہوتا ہے اگر کوئی بستی بانجھ ثابت ہونے لگے یا ضرورت سے زیادہ وقت لینے لگے جس سے دعوت کے زمانی تقاضے مجروح ہوں تو پھر ایک عملی رہنما کے لیے دعوتی مستقر بدلے بغیر کوئی چارہ نہیں رہ جاتا۔

چنانچہ حضور نے دعوت کی شدت مزاحمت، ظلم وستم اور کفار مکہ کی انتہائی سنگ دلانہ ہٹ دھرمی کو دیکھ کر دعوت کے پانچویں سال میں پہلے حبش کی موزونیت مستقر دیکھنے کے لیے مسلمان مردوں اور عورتوں کو اس کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت دیدی "وہاں کا بادشاہ رحمدل اور نرم خو ہے" حضور نے فرمایا چنانچہ مسلمان وہاں گئے تو شاہ حبش نے بلاشبہ ان کے ساتھ ہمدردانہ سلوک کیا لیکن پردیس بہرحال پردیس ہی ہوتا ہے اور ہر وقت وطن کی خبروں پر مہاجرین کے کان لگے ہوتے تھے۔ پھر ایک اور قافلہ بھی وہاں گیا لیکن پھر مدینہ کے لوگوں نے آگے بڑھ کر اسلام کی دعوت کو قبول کر لیا اور تین چار سال کے اندر مدینہ کی بڑی آبادی نے اسلام قبول کر کے اسے شہر اسلام بنا دیا۔ اسلام کے مبلغ حضرت مصعب بن عمیر نے بھی بہت کام کیا۔ چنانچہ وہاں سے ایک بڑا وفد حضورؐ سے بات کرنے آیا۔ بات چیت کے بعد حضور نے مدینہ کی طرف ہجرت کا فیصلہ کر لیا۔ اس فیصلہ کے نتیجہ میں مکہ کے مظلوموں کی خاصی تعداد آہستہ آہستہ مدینہ منتقل ہونے لگی۔ سب سے پہلے مہاجر ابو سلمہ تھے جو پہلے حبش گئے اور وہاں سے واپس آکر پھر مکہ والوں کی مشق ستم کا نشانہ بنتے ہوئے تھے اور پھر ان کے بعد یہ سلسلہ ایسا جاری ہوا کہ حضور کے منتقل ہونے سے پہلے بیسیوں خاندان اور افراد اپنے طور پر اجازت ملنے کے بعد مدینہ منتقل ہو چکے تھے حضور کی تشریف آوری سے پہلے نصف سے زیادہ صحابہ وہاں منتقل ہو چکے تھے۔

بہرحال مدینہ حضور کے ننھیال کا شہر بھی تھا اور اس کو نیا مستقر بنانے سے پہلے وہاں کے نمائندہ وفد کے ساتھ حضور نے کافی بات چیت بھی کی۔ انہوں نے بھی پہلے مرحلے پر ہی صورت حال کی نزاکت کا پورا پورا احساس کیا۔ مدینے پر سارے عرب کی تلواریں برسیں گی اور اشراف قتل ہوں گے اور بچے یتیم ہوں گے یہ سارے اندیشے ان کے سامنے تھے اور ان سارے خطروں کو سامنے رکھتے ہوئے انہوں نے حضور کا ہاتھ ہی نہیں تھاما بلکہ حضور کے ہاتھ میں اپنا دست اطاعت دے دیا۔ حضور کو اپنا ہادی، سربراہ، سردار اور پیشوا تسلیم کیا اور آپ پر اپنی جانیں بھی نچھاور کر دینے کا عہد کیا۔ اس کے جواب میں حضور نے بھی وعدہ فرمایا کہ میری زندگی اور موت تمہارے ہی درمیان ہوگی اور میں تمہیں چھوڑ کر واپس نہیں جاؤں گا۔ چنانچہ پرانے مستقر میں جہاں جہاں کی دھمکیاں دی

جا رہی تھیں۔ نئے مستقر میں حضور پر اپنی جانیں نچھاور کر دینے کے وعدے ہو رہے تھے۔ یہ بات فیصلہ کر دینے کے لیے کافی تھی کہ اب تحریک دعوت اسلامی کو اپنا مستقر بدل دینا چاہیے اور آگے بڑھ کر نئے حالات کے مطابق نئے تقاضوں کا سامنا کرنا چاہیے۔

مکہ سے مدینہ کے مستقر کی تبدیلی درحقیقت دعوت کی کامیابی کی طرف پہلا قدم تھا جو دن بدن اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی چلا گیا۔ اپنا گھر بار چھوڑ کر دین کے لیے نکل جانا اور نئی سرزمین کو دین حق کے تقاضوں کے لیے تلاش کرنا یہ صفت ابراہیمی بھی ہے اور سنت محمدی بھی۔ بہرحال حضورؐ نے مستقر بدل کر اپنی قوم اور عالم انسانیت کی تقدیر بدل ڈالی۔

اس طرح تحریک کو ایک آزاد اور خود مختار مستقر فراہم ہو گیا۔ جس میں آزادی کے ساتھ مشورہ کر کے سارے مسائل طے کئے جا سکتے تھے۔ بلکہ آگے بڑھ کر حضور کو یہ بھی پسند نہ تھا کہ مسلمانوں کا قبلہ جو اب تک بیت المقدس تھا۔ یہود و نصاریٰ کے قبلے کے تحت ہو اس سے تحریک کی انفرادیت اور جداگانہ تشخص مجروح ہوتا تھا۔ حضور کی تمنا تھی کہ مسلمانوں کا قبلہ بھی یہود و نصاریٰ کے قبلے سے مختلف اور آزاد ہو۔ آپ نے ایک مرتبہ حضرت جبریل علیہ السلام سے فرمایا

"اے جبریل میری خواہش ہے کہ اللہ میرا رخ یہود کے قبلے سے پھیر دے"

حضرت جبریل نے فرمایا ....

میں تو محض ایک بندہ ہوں آپ اپنے رب سے دعا کیجئے اور اسی سے درخواست کیجئے۔ چنانچہ حضور ایسا ہی کرتے رہے اور دعا میں اپنا رخ آسمان کی طرف اٹھاتے رہے یہاں تک کہ پورے ۱۶ ماہ بعد مسلمانوں کو آزاد مستقر کے ساتھ اپنا آزاد قبلہ ہی مل گیا اور حکم ہو گیا کہ فول وجهك شطر المسجد الحرام

اس طرح دعوت اسلامی نے اپنے نئے خد و خال پیدا کئے۔ قدیم مستقر کو سنگلاخ قرار دے کر بدل دیا گیا اور نئے قبلے کو دوسرے اہل مذہب کا تابع سمجھ کر تبدیل کر دیا۔ اس طرح تحریک اسلامی پوری طرح متعین اور مشخص ہو کر دنیا کے سامنے اسلامی نظام کے قیام کی جدوجہد کے لیے نمایاں ہو گئی۔

آپؐ نے اسلامی تحریک کا منشور پیش فرمایا۔

حضورؐ کو بارہ سال دعوت پیش کرتے ہوئے گذر چکے تھے۔ آپ کی دعوت قریش سے گذر کر آس پاس کے قبائل عرب، طائف اور دوسرے مقامات تک پہنچ چکی تھی۔ قریش کی طرف سے مخالفت کا سلسلہ انتہائی زوروں پر تھا مسلمان دربار حبش کی طرف ہجرت کر چکے تھے اور اب تیسری مدنی ہجرت بالکل تیار سامنے تھی یہی وقت تھا جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے تحریک اسلامی کو وہ منشور دیا گیا جو حضور کی طرف سے قریش اور ساری دنیا کے سامنے پیش کیا جاتا تھا۔ اول تو اس منشور کے دینے کا طریقہ ہی انتہائی حیرت انگیز تھا اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کو معراج عطا فرمائی پھر اس معراج میں وہ چودہ نکاتی منشور دیا جو قریش کے لیے لمحہ فکریہ پیش کرتا تھا اس سے پہلے حضور قریش سے متعدد بار فرما چکے تھے کہ تم اس دعوت کو قبول کر لو تو عرب و عجم پر تمہاری حکومت ہو گی اور تمہاری دعوت پر ساری دنیا لبیک کہے گی لیکن اکابرین قریش اب تک ہر معقول بات کو رد کرتے چلے آ رہے تھے جبکہ قریش کے دل و جگر کے

گروہ شبانہ روز اسلام کے دائرے میں داخل ہو رہے تھے۔ اس سے قریش کی دشمنی میں دن بدن اضافہ ہو رہا تھا اب اتمام حجت کے طور پر ان کے سامنے اس تحریک کا منشور بھی پیش کر دیا گیا جس کا علم حضور اکرم ان کے درمیان اٹھائے ہوئے تھے تاکہ وہ اس منشور پر غور کریں اور اگر اس کے اندر ایک عالم نو کے امکانات محسوس کریں تو اس کے علمبردار بنیں۔ اس لئے کہ اس کی علمبرداری میں ہی ان کی حقیقی فلاح پوشیدہ تھی۔

ہجرت مدینہ یعنی مکہ کو چھوڑ دینے اور قریش پر اتمام حجت تمام کرنے سے ذرا پہلے انتہائی نفسیاتی موقعہ پر اس منشور کو پیش کیا گیا! اس سے بہتر قریش کے لئے اور کوئی موقعہ نہ ہو سکتا تھا کہ وہ مفتوح ہو کر اسلام کے دائرے میں آنے کی بجائے اس کے علمبردار بن کر اٹھیں اور سارے عالم پر چھا جائیں۔

منشور کے نکات درج ذیل تھے۔

۱۔ صرف اللہ کی بندگی کی جائے اور اقتدار اعلیٰ میں اس کے ساتھ کسی کی شرکت تسلیم نہ کی جائے۔

۲۔ تمدن میں خاندان کی اہمیت ملحوظ رکھی جائے۔ اولاد، والدین کی فرمانبردار اور خدمت گذار ہو اور رشتہ دار ایک دوسرے کے ہمدرد اور مددگار رہوں۔

۳۔ سوسائٹی میں جو لوگ غریب اور معذور ہوں یا جو لوگ اپنے وطن سے باہر مدد کے محتاج ہوں وہ بے وسیلہ نہ چھوڑ دیئے جائیں۔

۴۔ دولت کو فضول ضائع نہ کیا جائے جو مال دار اپنے روپے کو بری طرح خرچ کرتے ہیں وہ شیطان کے بھائی ہیں۔

۵۔ لوگ اپنے خرچ کو اعتدال پر رکھیں۔ نہ بخل کر کے دولت کو روکیں اور نہ فضول خرچی کر کے اپنے لئے اور دوسروں کے لئے مشکلات پیدا کریں۔

۶۔ رزق کی تقسیم کا قدرتی انتظام کرنے والا مصلحتوں کو زیادہ بہتر سمجھتا ہے۔

۷۔ معاشی مشکلات کے خوف سے لوگ اپنی نسل کی افزائش نہ روکیں جس طرح موجودہ نسلوں کے رزق کا انتظام خدا نے کیا ہے۔ آنے والی نسلوں کیلئے بھی وہی انتظام کرے گا۔

۸۔ خواہش نفس کو پورا کرنے کے لئے زنا کا راستہ برا راستہ ہے لہذا نہ صرف زنا سے پرہیز کیا جائے بلکہ اس کے قریب جانے والے اسباب کا دروازہ بھی بند ہونا چاہیے۔

۹۔ انسانی جان کی حرمت خدا نے قائم کی ہے۔ لہذا خدا کے مقرر کردہ قانون کے سوا کسی دوسری بنیاد پر آدمی کا خون نہ بہایا جائے۔ نہ کوئی اپنے آپ کو قتل کرے اور نہ کسی دوسرے کو قتل کرے۔

۱۰۔ یتیموں کے مال کی حفاظت کی جائے جب وہ خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل نہ ہوں ان کے حقوق کو ضائع ہونے سے بچایا جائے۔

۱۱۔ عہد و پیمان کو پورا کیا جائے انسان اپنے معاہدات کے لئے خدا کے سامنے جوابدہ ہے۔

١٢۔ تجارتی معاملات میں لین دین اور ناپ تول ٹھیک ٹھاک راستی پر ہونا چاہیئے اوزان اور پیمانے صحیح رکھے جائیں۔

١٣۔ جس چیز کا تمہیں علم نہ ہو اس کی پیروی نہ کرو۔ وہم و گمان پر نہ چلو۔ کیوں کہ آدمی کو اپنی تمام قوتوں کے متعلق خدا کے سامنے جوابدہی کرنی ہے کہ اس نے انہیں کس طرح استعمال کیا۔

١٤۔ نخوت اور تکبر سے پرہیز کرو۔ غرور کی چال سے نہ تم زمین کو پھاڑ سکتے ہو اور نہ پہاڑوں سے اونچے ہو سکتے ہو۔

ان چودہ اصولوں کے ذریعے حضور نے معاشرے کو پاکیزہ ترین نہج پر استوار کرنے کے لئے جو اصول پیش فرمائے وہ آپ کی تحریک اور دعوت کے کردار کی خوبی کو بیان کرنے کے لئے کافی ہیں۔ اگر قریش ضد اور ہٹ دھرمی سے اجتناب کر کے ان اصولوں پر غور کرتے تو وہ سمجھ سکتے تھے کہ اس تحریک کے ذریعہ کتنا پاکیزہ معاشرہ کتنی اعلیٰ پائے کی انسانی تہذیب اور کتنا منصفانہ اور عادلانہ تمدن وجود میں آ رہا تھا۔ یہ حضور کی طرف سے "قریش کو وعظ و تلقین اور دعوت و انذار کے ذریعے سمجھانے کا آخری اور مؤثر ترین انداز تھا" لیکن جب وہ دعوت کے اس انداز معراج سے بھی نہ سمجھے تو پھر انہیں خندق و بدر سے گذر کر مکہ کو اسلام کے لئے فتح ہوتے ہوئے اپنی ہی آنکھوں سے دیکھنا پڑا اور انہیں حضرت یوسف کے بھائیوں کی طرح اپنے اخی الکریم سے جان بخشی کی بھیک مانگنی پڑی۔ یہ الگ بات ہے کہ رحمت للعالمین تو اس وقت بھی اپنے ان جانی دشمنوں کو معاف ہی کر دینے والے تھے۔ جب حکمت دعوت کے سارے مراحل گذر کر دعوت قوت کا مرحلہ آ گیا تھا۔

معاہدۂ مدینہ اور ایک نظریاتی اسلامی ریاست کے قیام کا سنگ بنیاد

مدینہ تشریف لانے کے بعد حضور اور آپ کے صحابہ کی جماعت کی پوزیشن اب وہ نہ تھی جو مکہ میں تھی۔ مکہ میں وہ ایک ستم رسیدہ مظلوم گروہ تھا جو اپنی مدافعت میں ہاتھ اٹھانے کی اجازت ہی نہ رکھتا تھا۔ لیکن مدینہ پہنچ کر وہ ایک آزاد اور خود مختار شہر میں تھے۔ جہاں کے باشندوں نے آپ سے عہد وفاداری باندھا تھا۔ یہ لوگ آپ سے عقیدے کے نظریاتی رشتے میں بندھے ہوئے تھے۔ اب مدینہ میں ایک نئے نظام کی بنیاد رکھی جا رہی تھی جس سے مدینے کی بستی کی حیثیت بہت کچھ بدل گئی تھی۔ مدینے میں یہود بھی ایک قوی گروہ تھے۔ جن کے قلعے تھے اس لئے اب ہر قوت کا مقام از سر نو متعین کرنے کی ضرورت تھی۔ اپنی اولین فرصت میں حضور نے ایک منشور مرتب فرمایا چنانچہ یہ منشور مختلف گروہوں کے دستخط ہو کر باقاعدہ نئی حکومت کا آئین بن گیا۔ اس منشور کی کسی شق سے بھی کسی کو بظاہر اختلاف کی گنجائش نہ تھی۔

"یہ تحریر محمد النبی کی طرف سے مسلمانوں کے درمیان جو قریش یا یثرب کے باشندے ہیں اور ان لوگوں کے ساتھ جو مسلمانوں کے ساتھ ملے ہوئے ہیں اور کاروبار میں ان کے ساتھ شامل ہیں کہ یہ سب ایک ہی قوم (وطنی سطح پر) سمجھے جائیں گے۔ بنی عوف کے یہودی مسلمانوں کے ساتھ ایک قوم ہیں اور جو کوئی اس معاہدہ کرنے والی قوموں کے ساتھ جنگ کرے گا۔ تو اس کے خلاف سب کے سب مل کر کام کریں گے۔ مسلمان ان کی نصرت کریں گے۔ معاہد قوموں کے تعلقات باہمی خیر خواہی، خیر اندیشی اور

فائدہ رسانی کے ہوں گے ضرر اور گناہ کے نہ ہوں گے۔ جنگ کے دنوں میں یہودی مسلمانوں کے ساتھ مصارف میں شریک رہیں گے یہودیوں کی راستدار قوموں کے حقوق یہودیوں کے برابر سمجھے جائیں گے۔ کوئی شخص اپنے معاہدہ کے ساتھ مخالفانہ کارروائی نہ کرے گا اور مظلوم کی مدد و نصرت کی جائے گی مدینے کے اندر کشت و خون کرنا اس معاہدہ کرنے والی سب قوموں پر حرام ہوگا۔ زنہاری بھی معاہد قوموں جیسے سمجھے جائیں گے۔ اس معاہدہ کی قوموں کے اندر اگر کوئی ایسی نئی بات یا جھگڑا پیدا ہو جائے جس میں فساد کا خوف ہو تو اس کا فیصلہ خدا اور اس کے رسول محمد رسول اللہ ﷺ کے متعلق سمجھا جائے گا۔"

یہ ایک ایسی امن پسندانہ صلح جویانہ اور بھائی چارے پر مبنی تحریر تھی کہ جن پر دستخط کرتے ہوئے کسی کو بھی رکاوٹ نہ ہوتی تھی لیکن دوسری طرف اس کے ذریعے مدینہ میں ایک ایسی مرکزی قوت وجود میں آگئی جو محمد رسول اللہ کو رسول تسلیم کرتی تھی اور معاہد قوموں سے صلح سندی کے ذریعے تعلق قائم رکھنا چاہتی تھی۔ اس پر مدینہ کے سب گروہوں کے دستخط ہو گئے۔ اور حضور نے کوشش کی کہ اس پاس کے قبائل کے بھی اس پر دستخط ہو جائیں۔ چنانچہ چھ دیگر قبائل نے بھی دستخط کر کے اس مدنی قوت کی پناہ حاصل کر لی۔ اس طرح مدینہ میں تشکیل ریاست کے اس معاہدے سے نراجیت اور قبائلی تشدد کی انارکی کا خاتمہ ہو گیا اور اس سے تمام فیصلوں کا آخری اختیار محمد رسول اللہ کے ہاتھ میں آگیا۔ اس طرح حضورؐ نے کمال حکمت سے نراجیت انارکی اور مختلف قبائل کی منتشر قوت کے اندر سے جہاں درس و مرج کو بھی یہ مرکزی پوزیشن حاصل نہ تھی حضورؐ تربیت منشور کے ذریعے پہلے ایک مرکزی اقتدار وجود میں لائے پھر تمام گروہوں کا رخ اطاعت و تعاون مرکز کی طرف موڑا۔ پھر تمام نزاعی امور کے فیصلوں کا اختیار اپنے ہاتھ میں لے کر اس مرکزی اقتدار کو اسلام کی طرف منتقل کر دیا۔ یوں بلا خون خرابہ صرف مسائل کو دانش و حکمت سے مرتب کرنے سے ایک اسلامی اقتدار وجود میں آگیا اور وہی اقتدار اسلامی ریاست کا مرکز و محور قرار پایا۔ یہ اقتدار خالص نظریاتی اور اصولی تھا اس میں کسی نسلی یا گروہی بنیاد پر اقتدار منتقل نہیں ہوا تھا اس منشور نے جو قومیت قرار دی تھی وہ قومیت اس اقتدار کے تحفظ کے لئے رفاعی نوعیت کی علاقائی قومیت تھی جو معاہدے سے وجود میں آئی تھی۔

مواخاۃ۔ نظریاتی اسلامی برادری کا قیام

مدینہ تشریف لانے کے بعد اولین کام جو حضورؐ نے سرانجام دیا وہ ایک معاہدے کے ذریعے مرکزی اقتدار کی تخلیق تھی جس سے ایک اسلامی ریاست کی بنیاد پڑ گئی اس کے بعد دوسرا فوری کام ان بے یار و مددگار اور بے گھر و بے در مہاجرین کی آبادکاری کا مسئلہ تھا جو مکہ اور دیگر قبائل کی طرف سے کفار و مشرکین کے ظلم و ستم سے پریشان ہو کر حضور کے حکم کے تحت اس نئے اسلامی مستقر کی طرف منتقل ہو رہے تھے۔ ان کے پاس کوئی وسائل نہ تھے اور نہ ہی ریاست کے پاس کوئی مؤثر ذرائع تھے۔ مقامی آبادی انصار مدینہ کی معیشت بھی متوسط درجے کی تھی۔ مہاجرین کے مسئلے کا بہترین حل حضور نے مواخاۃ کے ذریعے تلاش کر لیا۔ انصار کے مختلف گھرانوں میں مہاجرین کے مختلف گھرانوں کو اسلامی بھائی بنا کر مہمانوں کی حیثیت سے آباد کر دیا گیا۔ ایک گھر کے لئے کسی ایک گھر کے افراد کو بطور

مہمان اپنے جیسے یا اپنے سے کچھ کم ترحیثیت کے ساتھ گزارا کرنا کچھ مشکل نہ تھا اس طرح پوری مہاجرین کی بے گھر آبادی مواخاۃ کے اصول کے تحت ایک دن کے اندر اندر اپنے انصار دینی بھائیوں کے گھروں میں ابتدائی امداد کے طور پر آباد ہو گئی پھر پاؤں سے بازار تک جانے کے بعد تو کسی کے لئے بھی مشکل نہیں ہوتا کہ وہ جلد یا بدیر اپنے لئے نئے وسائل پیدا کر لے چنانچہ بعض مہاجرین نے تو ایک دن بھی اپنے انصار اسلامی بھائی پر بوجھ بننا پسند نہ کیا اور بعض چند دن رہ کر پھر اپنے پاؤں پر کھڑے ہو گئے۔

حقیقت یہ ہے کہ حضور اکرم نے اسلامی برادری کو مواخاتی اصول کے تحت آباد کر کے ایک طرف اسلامی ریاست کا جو ابھی کوئی وسائل نہ رکھتی تھی سارا بوجھ آبادی کی طرف منتقل کر دیا۔ پھر ان کو باہمی ایک شہر کے باشندے بن کر رہنا تھا۔ مستقل مہاجر اور انصار بن کر تو رہنا نہیں تھا اس لئے ایک ساتھ رہنے سے ان میں باہمی محبت و یگانگت اور تہذیبی یکسانی کے تعلقات پیدا ہو گئے اس طرح انہیں باہمی ایک دوسرے کے اطوار اپنانے کا موقعہ مل گیا۔ چنانچہ مدینہ کی جدید و قدیم آبادی دو مختلف گروہوں پر مشتمل ہونے کے باوجود باہمی بالکل شیر و شکر ہو کر رہ گئی اس حکمت آبادکاری نے مہاجرین اور مقامی لوگوں کے درمیان منافقت کا مسئلہ بھی حل کر دیا اور مسابقت کا بھی دونوں کے درمیان کوئی غیریت باقی نہ رہی۔ بالآخر دونوں گروہ باہمی اس طرح گھل مل گئے کہ ان میں مہاجر اور مقامی کی بنیاد پر کوئی تنازعہ پوری تاریخ میں نظر نہیں آتا۔ حضور اکرم کی اس حکمت آبادکاری سے ان کے سیاسی، معاشرتی، اقتصادی بلکہ نفسیاتی سارے ہی مسائل حل ہو گئے۔ مہاجرین کی کاروباری سوجھ بوجھ سے مدینہ کی کاروباری اور اقتصادی حالت پر بھی بہت اچھے اثرات پڑے۔

دعوتِ اسلامی کے مرکز کی تعمیر

حضورؐ حد درجہ دور اندیش، مدبر و مفکر، عقل خداداد کے مالک اور پختہ کار بابصیرت سیاست دان تھے۔ آپؐ جانتے تھے کہ اسلامی ریاست کے بنیادی اصولوں کی تنفیذ کے لئے ایک مرکز کا قیام اور اس مرکز کی تعمیر و ترقی و ارتقا انتہائی ضروری ہے، چنانچہ آپ نے سب سے پہلی فرصت میں مسجد نبوی کی بنیاد رکھ دی۔ جو دین و دنیا کے مشترکہ اقتدار کا نشان اور بندگیٔ رب کی حامل تحریک کی کھلی کھلی علامت ہے یہیں عبادت گاہ تھی یہی دار شوریٰ اور یہی مسلم جماعت کا مقام اجتماع تھا یہیں معاہدے ہوتے۔ وفود مرتب ہوتے، وفود کا استقبال کیا جاتا۔ دعوتی خطوط کا دفتر اور عسکری کارگزاریوں اور سرگرمیوں کا مرکز تھی اسی میں جہاد فی سبیل اللہ کی تیاری ہوتی۔ اسی میں انفاق فی سبیل اللہ کی اپیل کی جاتی تھی۔ یہیں تنازعات کے فیصلے ہوتے تھے یہیں اہم اہم دستور و تجاویز ہوتے تھے۔ غرض مسجد نبوی پہلی اسلامی ریاست کا مکمل سیکرٹریٹ تھا۔ اور اسی کے متصل ہر وقت موجود اور تیار مبلغین کی قیام گاہ صُفّہ پر تھی۔ وہیں حضور اکرم کے رہائشی حجرات تھے مستشرقین کو حضورؐ کے مکہ میں نبی اور مدینہ میں بادشاہ ہونے کا جو شکوہ ہے اگر وہ آکر اس بادشاہت کو دیکھ لیتے جو اللہ کے دین نے حضور کو عطا فرمائی تھی تو شائد وہ قائل ہو جاتے کہ زمین پر یہی وہ آسمانی بادشاہت تھی جس کی دعا حضرت عیسٰی نے فرمائی تھی۔

مدینہ پہنچنے کے چھ ماہ کے اندر حضور نے اسلامی ریاست کا نشان جھنڈا بھی تیار کر لیا۔ جو سب سے پہلے عبداللہ بن حارث کو عطا کیا گیا تھا تاکہ وہ اسے دشمنوں کے مقابلے میں بلند کریں۔ اس طرح کلمے کے لغریے کے بعد اسلامی ریاست کا ایک تشخص بھی وجود میں آگیا۔ مدینہ میں اس طرح اسلامی قوت کا مرکوز ہو جانا قریش کو بھی کھٹک رہا تھا اور وہ سمجھ گئے تھے کہ اب مدینے میں جو تجارتی شاہراہ کے قریب ہے اسلام کی قوت کی موجودگی ان کے لیے کھلا چیلنج ہے۔ وہ اگر ان کا دین روکیں گے تو مسلمان انکی تجارت روکیں گے

حضور اکرم نے اب مسجد میں نماز کو لازم قرار دیدیا جو اسلام کی تمام سرگرمیوں کا مرکز اور مدینے کی اسلامی ریاست کا بھی اب یہی مرکز تھی۔ تاکہ اس مرکز میں مسلمان دن میں پانچ بار جمع ہوں۔ درس تہذیب و تمدن لیں۔ قرآن کا مطالعہ کریں۔ سنت کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ اپنے کرداروں کو اسلام کے سانچے میں ڈھالیں اور یکجا آزاد و ہالش سے ایک اسلامی معاشرے کی بنیاد رکھیں۔ یہیں سب مسلمانوں کو اخوت، ہمدردی، تعارف، حریت معاشرتی عدل کی تعلیم دی گئی اور مذہبی اہمیت کے ساتھ ساتھ اس کی ریاستی حیثیت بھی تسلیم کی گئی حضور نے اپنی تمام ہی معاشرتی، اخلاقی، دینی، سیاسی اور عدل و انصاف کی سرگرمیوں کا مسجد کو ہی محور قرار دیا۔ باجماعت نماز کے اہتمام سے مسلمانوں کو نظم و ضبط کا درس دیا۔ ایک امام کی قیادت میں نماز ادا کرنے سے اطاعت امیر اور ایک آواز پر حرکت کرنے کی مشق پیدا کی۔ غرض اس مرکز نے مسلمانوں کی اخلاقی، دینی، معاشرتی اور عسکری تعلیم و تربیت میں غیر معمولی کردار ادا کیا۔ گویا مدینہ اسلامی ریاست کا دارالخلافہ تھا تو مسجد نبوی اسلامی حکومت کا مرکزی سیکرٹریٹ، پارلیمنٹ، عدالت عالیہ اور عسکری تیاریوں کا مرکز تھی۔

قریش کی دھمکی پر اندرونی فتنے کا علاج

جب کفار مکہ نے دیکھا کہ مسلمان مدینہ میں جا کر امن و چین سے رہنے لگے ہیں اور اپنے دین کی ترقی میں سرگرم ہو گئے ہیں تو انہوں نے کفار مدینہ اور منافقین کو ایک پیغام کے ذریعے مندرجہ ذیل دھمکی دی۔

> "تم نے ہمارے آدمی کو اپنے ہاں ٹھہرا لیا ہے۔ اب لازم ہے کہ تم اس سے لڑو یا اسے وہاں سے نکال دو ورنہ ہم نے قسم کھائی ہے کہ ہم یکبارگی تم پر حملہ کر دیں گے۔ تمہارے جوانوں کو قتل کر دیں گے اور تمہاری عورتوں پر قبضہ کر لیں گے۔"

یہ دھمکی بڑی کارگر ہوئی اور کفار مدینہ اور منافقین کا ایک مجمع لگ گیا جہاں عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھیوں نے حضور اور مسلمانوں سے جنگ کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ آپ کو بھی اطلاع مل گئی چونکہ آپ اپنے مخالفین کے بارے میں انتہائی باخبر رہتے تھے۔ آپ فوراً اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ اس مجمع میں بے دھڑک پہنچ گئے اور ان سے مخاطب ہوئے۔

> "دیکھو قریش نے تمہارے ساتھ ایک ایسی چال چلی ہے کہ اگر تم ان کی دھمکیوں میں آ گئے تو تمہارا بہت زیادہ نقصان ہو گا اس کی بہ نسبت کہ تم ان کی اس بات سے انکار کر دو گے۔ کیوں کہ اگر تم مسلمانوں سے لڑو گے تو اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے ہی بھائیوں اور فرزندوں کو (جو مسلمان ہو چکے ہیں) قتل کرو گے۔ اگر تمہیں قریش سے لڑنا پڑا تو وہ غیروں سے مقابلہ ہو گا۔"

حضور اکرم کی یہ دل نشین معتدل باتیں سن کر مجمع منتشر ہو گیا اور ایک خطرناک اندرونی شورش کا خطرہ حضور کی حکمت و دانش سے ٹل گیا۔

تجارتی قافلہ کی بجائے مسلح لشکر سے ٹکراؤ کا فیصلہ

کفار قریش کا قافلہ، تجارت شام سے لاکھوں روپے کا مال لے کر مکہ جا رہا تھا اور وہ مسلمانوں کی زد میں تھا۔ قافلے کا سردار ابوسفیان جانتا تھا کہ مسلمانوں کا وجود ان کی تجارتی شاہراہ کے لئے دھمکی ہے چنانچہ اس نے مکے آدمی دوڑا دیا کہ قافلہ خطرے میں ہے قریش نے مسلمانوں کے خطرے کو ہمیشہ کے لئے مٹانے کا عزم کر کے مسلح افراد پر مشتمل ایک لشکر قافلے کی امداد اور مسلمانوں کے مقابلے کے لئے روانہ کر دیا۔ اب حضور کے سامنے یہ صورت تھی کہ اگر قافلے پر جاتے ہیں تو بھی لشکر کفار سے مقابلہ ضروری ہے اور اگر کہیں نہیں جاتے اور بیٹھے رہتے ہیں تو عرب میں اسلام کی قوت کی ہوا ہمیشہ کے لئے اکھڑ جاتی ہے اور آس پاس کے قبائل بھی شیر ہو جاتے ہیں چنانچہ حضور نے انتہائی بے سروسامانی اور ہجرت کی بے گھری اور بے دری کے باوجود لشکر کفار سے ٹکرانے کا فیصلہ کر لیا اور اس کے لئے اپنے ساتھیوں کی وسیع مجلس میں مشورہ کیا۔ اکثر کی رائے تو یہی تھی کہ قافلہ آسان اور فائدہ مند ہے۔ اسے لے لیا جائے لیکن حضور کے بار بار اصرار پر لوگ سمجھ گئے کہ حضور کا ارادہ قافلہ کا نہیں ہے لشکر کا مقابلہ کرنے کا ہے مہاجر مسلمان تو مکہ کی ۱۳ سالہ مار کھا کر تحریک اسلامی کے پختہ کارکن بن چکے تھے اور اپنی جانیں ہتھیلیوں پہ رکھے ہوئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے بڑھ چڑھ کر کہا کہ ہم جانیں قربان کرنے کو تیار ہیں۔ آپ جہاں چاہیں ہمیں لے چلیں۔ لیکن انصار کو ایسی بے سروسامانی کے ساتھ اس سے پہلے کسی معرکے میں شرکت کا موقعہ نہ ملا تھا۔ اس لئے حضور نے ان کی رائے کا انتظار فرمایا تو انصار کے سرداروں نے بھی پرزور تائید کی اور بالآخر قافلہ کی بجائے لشکر سے ٹکرانے کا فیصلہ ہو گیا۔ لشکر کفار کے مقابلے میں مسلمانوں کی بے سروسامانی بھی بے مثال تھی۔ دو تین گھوڑے، چند اونٹ، تھوڑی سی زرہیں اور کچھ تلواریں اور نیزے۔ غرض اگر بدر کو غزوہ عسرت کہا جائے تو بیجا نہ ہو گا۔ لیکن حضور کی دانش اور سیاسی بصیرت یہ جانتی تھی کہ وہ وقت اسلام کی تحریک کے لئے زندگی اور موت کا وقت تھا اور سارا عرب اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔ اس وقت ایک جرأت مندانہ قدم اٹھانے کی ضرورت تھی اس کے بعد نتیجہ قدرت کے ہاتھ میں تھا بدر کی عسکری رزم آرائی سے محجوب ہو کر بیٹھ رہنا سسک سسک کر مرنے کے مترادف تھا اور اس میں مردانہ وار کود جانا عزت کی موت اور عزت کی شاندار زندگی دونوں کی طرف جانے والا یقینی راستہ تھا حضور نے جرأت اور مردانگی اور اسلام کی آبرو کا راستہ اختیار کیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس جرأت مندانہ قدم کو فتح سے پذیرائی بخشی اور مسلمانوں کو روحانی قوت، مضبوط تنظیم، وحدت قیادت اور اطاعت خدا و رسول کی خوبیوں کی بنا پر کامیابی عطا فرمائی۔ معرکہ بدر نے یہ بھی سبق دیا کہ ایک قلیل گروہ جرأت ایمانی اور یقین محکم سے کثیر گروہ پر غالب آ سکتا ہے اور یہ بھی سبق دیا کہ مال کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کو جہاد فی سبیل اللہ زیادہ پسند ہے۔

کفر کے مقابلے میں ڈٹ کر رہنے کا پُرعزیمت راستہ

حضور نے اپنی تمام تر مادی مشکلات، افرادی قوت کی کمی، دشمنوں کی بھاری تعداد کثیر وسائل اور پرہجوم مخالفت کے باوجود ہمیشہ ڈٹ کر رہنے کا پرعزیمت راستہ اختیار کیا۔ کبھی بھی کفار کی کثرت تعداد اور کثرت سامان سے نہ مرعوب ہوئے اور نہ ان کے رعب میں آکر اپنی پالیسی اور طرز عمل کو نرم کیا۔ جتنی نرمی حضور کے مزاج میں اپنے ساتھیوں کے بارے میں تھی اسی قدر سختی اور استقامت کفار کی چیرہ دستیوں کے مقابلے میں تھی۔ اللہ تعالیٰ کا بھی حضور کے لئے یہی حکم تھا۔ ایک اسلامی تحریک کا فرض کے نسخے میں

ایسا ہی پروقار طرز عمل رکھنے پر مامور ہوتی ہے۔ کافروں کے دباؤ سے دب کر صلح کی درخواستیں کرنا اور اپنی پالیسیاں تبدیل کرنا مسلمان کا شیوہ نہیں ہے، فرمایا گیا

فلا تھنوا وتدعوا الی السلم وانتم الاعلون (محمد ۳۵)

پس تم ـــــ نہ بنو اور صلح کی درخواست نہ کرو تم ہی غالب رہنے والے ہو۔

غرض حضور اکرم نے مکہ کی سخت ترین حالت میں بھی جب کہ جان کا خطرہ ہر وقت سر پر منڈلاتا تھا اور دوسری طرف لالچ کے بے شمار مواقع تھے آپ نے کفار کی درخواست اور خواہش کے باوجود ان کی کسی دھمکی اور حملے کی پرواکئے بغیر نہ دب کر صلح کی اور نہ ان کے سامنے امن وسلامتی کی درخواستیں پیش کیں۔ شعب ابی طالب کا تین سالہ دور عسرت گزارا بھوکے بچوں کو بلکتے دیکھا کمزور مسلمانوں کو مکہ کی گلیوں میں گھسیٹتے پایا۔ مدینہ میں کفار کا نرغہ، معاشی مقاطعہ اور بار بار کے جان لیوا حملے برداشت کئے لیکن دشمن سے دب کر رہنے اور اپنی جان بچانے کے لئے درخواستیں دینے کا رویہ کبھی اختیار نہ کیا۔ تحریک کا یہی مردانہ وار کردار تھا جس کی وجہ سے دشمنوں پر اس کا رعب اور دوستوں کے لئے اخلاص کے ساتھ اس کا ساتھ دینا ممکن تھا حقیقت یہ ہے کہ وہ حق حق نہیں ہے جو باطل کے سامنے اپنی سلامتی کی درخواستیں لے کر جائے اور اپنے مفادات کے تحفظ کی اس سے التجائیں کرے یہ اس کے تاریخی کردار کے منافی طرز عمل ہے حضور کا پورا کردار اسی پر عزیمت سانچے میں ڈھلا ہوا تھا اور آپ کا یہ طرز عمل حکم خداوندی کے عین مطابق تھا۔

فرمایا گیا۔

"اے مسلمانو کافروں سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین پورے کا پورا اللہ کے لئے ہو جائے" (الانفال ۳۹)

مزید سختی سے فرمایا گیا

اور تم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں (البقرہ - ۱۹۰)

دشمن کو مکمل طور پر کچل دینے کی پالیسی بتاتے ہوئے فرمایا۔

"کسی نبی کے لئے زیبا نہیں ہے کہ اس کے پاس قیدی ہوں جب تک کہ وہ زمین میں دشمنوں کو اچھی طرح کچل نہ دے" (الانفال - ۶۷)

دشمن کے خلاف ہر وقت تیار رہنے کی پالیسی بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

"اور تم لوگ جہاں تک تمہارا بس چلے زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے ان کے مقابلے کے لئے رکھو اور اس کے ذریعے سے اللہ اور اپنے دشمنوں کو اور ان دوسرے اعداء کو خوف زدہ کرو جنہیں تم نہیں جانتے۔ لیکن اللہ جانتا ہے۔ (الانفال - ۵۹)

گویا حضور کے لئے دشمنوں کے مقابلے کے لئے ہر وقت تیار رہنا اللہ تعالیٰ کی طے کردہ پالیسی کا حصہ ہے۔ دشمنوں کو اپنی

تیاریوں سے خوف زدہ کرنا ان کے خلاف ہر ممکن حد تک قوت فراہم کرنا وہ مستقل پالیسی ہے جو تحریک اسلامی کو خود اللہ تعالےٰ کی طرف سے دی گئی ہے حضور سختی سے اس پالیسی کے پابند تھے۔ چنانچہ حضور صلعم کی بات چیت بھی کبھی کمزوری کی حالت میں نہیں بلکہ اپنی بالا دستی کی حالت میں کرتے تھے اور وہ بھی اس صورت میں جب دشمن کی طرف سے اس کی پیشکش یا درخواست ہوتی تھی اس صورت میں حضور کا رویہ انتہائی فراخدلانہ اور فیاضانہ ہوتا تھا۔

ہرقل روم کی تیاریوں اور اس کے حملے کی خبر ملی تو حضور نے فی الفور اس کا حملہ سرحد شام پر ہی روکنے کا فیصلہ کر لیا آپ مارا مار بڑی سے بڑی تیاری کر کے تبوک کے لئے روانہ ہو گئے۔ ہرقل روم اسلامی لشکر کی اتنی سرعت رفتار مقابلے کیلئے تیاری اور جرأت کردار دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ مسلمانوں کی عرب کے اندر فتوحات کو وہ پہلے سے جانتا تھا اور مسلمانوں کے چھوٹے چھوٹے لشکروں کی بڑے بڑے لشکروں پر فتوحات کی خبریں بھی اس کے علم میں تھیں چنانچہ اس نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ وہ فوری طور پر مقابلہ کرنے کی بجائے طرح دے۔ حضورؐ نے دشمن کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھایا اور نہایت باوقار طریقے پر تبوک پر پڑاؤ کیا آس پاس کے قبائل بھی پوری طرح سے باخبر تھے وہ اس نئی قوت کو یوں ابھرتے ہوئے دیکھ رہے تھے اس لئے جوق در جوق وہ مطیع فرمان بن کر معاہدات کے ذریعے مسلمانوں کے معاون و مددگار بن گئے اس طرح اسلام کے لئے دور دور تک راستہ کھل گیا جرأت کردار حضور کی سیاسی حکمت عملی کا بنیادی پتھر ہے۔ جو ہمیں اسلامی تحریک کے تعمیری خدوخال میں ہر جگہ ہر کہیں نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے۔

دشمن کی درخواست صلح پر بے جھجک جرأت مندانہ پذیرائی

حضورؐ کا طریقہ یہ تھا کہ دشمنی کرنے والے سے کبھی نہ دبتے لیکن جو دشمن دب کر صلح کی درخواست کرتا آپ اس سے انتہائی فیاضی اور نرمی سے پیش آتے اور اسے ہر ممکن رعائت جان و مال و آبرو کی دیتے۔ یہ حضور کا طرز عمل قرآن کی طے کردہ پالیسی کے مطابق ہی تھا۔

وان جنحوا للسلم فاجنح لها وتوكل على الله انه هو السميع العليم ○ (الانفال - ۶۱)

”اور اے نبی اگر دشمن صلح و سلامتی کی طرف مائل ہو تو تم بھی اس کے لئے آمادہ ہو جاؤ اور اللہ پر بھروسہ کرو یقیناً وہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے۔“

یہ وہ جرأت مندانہ کردار ہے جو خدا نے اپنے نبی اور اسلامی تحریک کے کارکنوں کو سکھایا ہے کہ اگر دشمن صلح کرنے پر آمادہ ہے تو پھر خواہ مخواہ نزاع، خون خرابہ، اور خلق خدا کو مبتلائے آزمائش رکھنے کی بجائے باوقار صلح کر کے اس پر احسان کیا جائے اور اگر اس کا ارادہ دھوکے کا ہے تو بھی اللہ پر توکل کیا جائے جس اللہ نے اب دشمن کے مقابلے میں آپ کو اتنی قوت دی ہے کہ وہ دب کر صلح چاہتا ہے وہی اللہ اس کے دھوکے کا بھی علاج کر دے گا بہرحال صورت حال سے جرأت مندانہ کردار سے نپٹا جائے اگر وہ دھوکا کرے گا تو پھر دوبارہ کسی رعائت کا مستحق نہ ہوگا۔

حضور کا یہی جرأت مندانہ کردار ہے جو ہمیں صلح حدیبیہ میں دکھائی دیتا ہے اور یہی کردار غزوہ تبوک میں نظر آتا ہے۔

آپ ہر مقابلے میں باوقار، پرسکون، فیاض اور فراخ حوصلہ ہیں اور یہی آپ کی کامیابی کی دلیل ہے۔

دشمنوں کو ممنون احسان کرنا

حضور انسانی اور اخلاقی سطح پر ہر ذی روح کے لیے رحمۃ للعالمین تھے اس لئے حضور کی اسی حیثیت کا ایک پہلو تو یہ بھی تھا کہ آپ سیاسی مسائل میں بھی دشمنوں کے ساتھ احسان کا رویہ اختیار کرنے کا راستہ اپنا گئے تھے جب جنگ بدر میں کافر قیدی گرفتار ہوئے تو حضور نے ان کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں دینے کا اہتمام فرمایا۔ خوراک میں، سواری میں یہاں تک کہ رہائی تک میں معمولی شرائط پر انہیں آزاد کر دیا۔ حضور کو دشمن کے قیدیوں کی معمولی تکلیف تک بھی گوارا نہ تھی۔

پھر جب اس دشمن کے شہر مکہ میں سخت قحط پڑا اور غلہ ناپید ہو گیا تو حضور نے صلہ رحمی کا احترام کرتے ہوئے مکے کے سردار اور اپنے بدترین دشمن ابوسفیان کو ۵۰۰ اشرفیاں قحط زدہ فقراء میں تقسیم کرنے کے لئے روانہ فرمائیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں کے عوام آپ کو ایک شریف دشمن کہنے لگے۔ ایک دوسری روایت ہے کہ حضور نے مکہ والوں کو غلہ بھی ارسال فرمایا تھا۔ یہ گویا آپ کا ایک ایسا پیارا انداز ہے جس سے غیر محسوس طور پر ہر شخص متاثر ہو جاتا ہے۔

خبر رسانی اور دشمنوں کی صفوں میں اپنے آدمی رکھنا

حضور کا خبر رسانی کا نظام نہایت مؤثر جامع اور مکمل تھا۔ اس کام کو حضور نے بس افواہوں اور چلتی پھرتی اور سنی سنائی باتوں پر ہی نہیں چھوڑا ہوا تھا بلکہ آپ نے اس کا مؤثر اہتمام فرمایا اور ایک نظریاتی تحریک کے لئے یہ کام کچھ دشوار نہیں ہوگا اگر وہ ذرا بیدار مغزی، تنظیمی صلاحیت اور مستعدی کا ثبوت دے تو نظریہ سے متاثر ذہنی اور قلبی طور پر اس سے ہم آہنگ افراد انسانی زندگی کے ہر گوشے میں اور مخالفین کی صفوں کے اندر دور دراز کناروں تک میں مل جاتے ہیں۔ حضور اس کا جامع انتظام فرماتے تھے کہ آپ کو دشمن کی سرگرمیوں، آئندہ ارادوں اور پروگراموں اور منصوبوں کی بروقت، مؤثر اور حقیقی خبر ملتی رہے۔

یوں تو ہر قبیلے میں آپ کے نامہ نگار اور ہم خیال لوگ موجود تھے لیکن قریش جو حقیقی دشمن اور مد مقابل تھے ان کے اندر تو آپ کے بڑے مؤثر نامہ نگار اور مخبر موجود تھے۔ یہی سبب تھا کہ آپ مکہ پر بلا خون بہائے قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے جنگ احد میں بھی ان پیشگی اطلاعات سے تیاری کرنے میں آپ کو مدد ملی تھی اور پھر قریش کے لوٹ جانے کے بعد واپس پلٹ کر حملہ کرنے کے بارے میں آپ کو باوثوق ذرائع سے خبریں ملی تھیں۔ خصوصاً جنگ خندق کے موقعہ پر تو خبر رسانی کے اس نظام نے بہت اعلیٰ کردار ادا کیا اور حضور کو احزاب کے آنے سے بہت پہلے تیاریاں کرنے خندق کھودنے اور اپنے انتظامات مضبوط کرنے کا موقعہ مل گیا اگر وہ سارے احزاب جو دس بارہ ہزار کی فوج پر مشتمل تھے۔ یکبارگی مدینہ پر چڑھ آتے اور مدینہ والوں کو اچانک کسی ہولناک صبح کو ان کی آمد کا علم ہوتا تو تباہی و بربادی اور ناکامی کا کوئی ٹھکانہ نہ ہوتا۔ اور اسلامی تحریک پورے طور پر کچل کر رہ جاتی۔ یہ آپ کا اعلیٰ پائے کا نظام خبر رسانی تھا جس نے آپ کو بہت پہلے آگاہ کر دیا

اس طرح جب حضورؐ نے یہودیوں کے مختلف قلعوں پر مدینہ اور خیبر میں مختلف اوقات میں حملے کیے اور محاصرے کیے تو بیشتر ان کی خبر رسانی سے ہی حملے کو کامیاب کرنا یا محاصرہ کو مؤثر کر کے انہیں مجبور کرنا ممکن ہو سکا حضورؐ کے خبر رساں ہر اس گروہ میں موجود ہوتے تھے جو اسلامی تحریک سے مخالفانہ تعلق رکھتا تھا۔

نہ صرف دشمن کی خبروں سے حضورؐ آگاہ رہتے تھے بلکہ اپنی خبروں سے اسے بے خبر رکھنے کا بھی بہت اعلیٰ اور مؤثر انتظام فرماتے تھے۔ جب خندق کے معرکے میں قریش مدینہ پر قبائل غطفان وغیروں کو اتنی بڑی تعداد میں چڑھا لائے اسی زمانے میں حضور عرب کے شمال دومۃ الجندل کی طرف گئے ہوئے تھے۔ آپ کے سراغرسانوں نے آپ کو قریش کے ارادوں سے آگاہ کیا تو آپ آدھے راستے سے ہی واپس تشریف لے آئے اور آکر خندق کی جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں قریش اور قبائل کے مشترکہ لشکر سے پہلے پہلے خندق کی جنگ کی تیاریاں مکمل کر لیں جو آپ کے نظام سراغ رسانی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ لیکن جب حضور نے فتح مکہ کی مہم کا پروگرام بنایا تو کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ اگر کسی نے غلطی سے کوئی پیغام قریش کو بھیجا بھی تو وہ پیام رساں ناکہ بندی کے سبب راستے میں ہی پکڑا گیا اور قریش تک نہ پہنچ سکا غرض حضورؐ کے یہ اس طرح حملہ آور ہوئے کہ قریش مکہ کو بے خبری میں جالیا۔ وہ سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ تین سو میل کا فاصلہ طے کر کے حضور پہنچ گئے اور اسلامی فوج کے کیمپ کی روشنیاں اور آگ دیکھ کر انہیں پتہ چلا کہ کوئی لشکر ان کے سر پر پہنچ کر خیمہ زن ہو گیا تھا جس کا مقابلہ اب ان کے بس سے باہر تھا اس طرح دشمن کی خبروں سے آگاہ ہونا اور اپنی خبروں کو مکمل کنٹرول میں رکھنا یہ حضور کی حکمتِ سیاست کا بہت مؤثر حصہ تھا۔

حضورؐ کی حکمتِ سیاسی کا یہ بھی حصہ تھا کہ اپنی کوئی کمزوری دشمن پر کبھی ظاہر نہ ہونے دیتے ہمیشہ رعب، وقار اور جرأت کے مظاہرے سے دشمن پر اپنا وزن قائم رکھتے۔ صبر و استقلال توکل علی اللہ اور ہمت و شجاعت آپ کے جنگی ہتھیار بھی تھے اور سیاسی ہتھیار بھی۔ ان سے آپ ہر جگہ اور ہر حالت میں کام لیتے تھے۔ مکہ میں جب آپ دشمنوں کے نرغے میں ہیں اور آپ کو ہتھیار اٹھانے کی اجازت نہیں ہے۔ تو آپ صبر و تحمل کی نادر مثال قائم کرتے ہیں جس کا نمونہ تاریخ میں نہیں ہے اور جب آپ کو دشمنوں کے مقابلے میں ہتھیار اٹھانے، ان کا قوت اور حکمت سے مقابلے کرنے کا حکم ہوتا ہے تو آپ جس دانشوری جرأت اور بے سروسامانی میں بڑے بڑے سامان والوں کا مقابلہ کرتے ہیں وہ بھی اپنی جگہ ایک بے مثال واقعہ ہے۔

حج اور عمرے میں رَمل کا طریقہ بھی اسلام میں کفر کے مقابلہ میں اپنی قوت کا مظاہرہ کرنے کے لئے ہی جاری کیا گیا تھا جو اتنا پسند کیا گیا کہ قیامت تک لئے ارکان حج و عمرے کا حصہ بنا دیا گیا ہے۔

دشمنوں سے باری باری نپٹنے کی حکمت،

جب کوئی نظریاتی اور اصولی دعوت اٹھتی ہے تو دنیا بھر کی آفتیں جو اس کی کامیابی میں اپنی موت دیکھتی ہیں اس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جاتی ہیں حضور اکرم نے جب دعوت اسلامی کا آغاز کیا تو مخالفوں کا زور بھی دعوت کے زور کے ساتھ ساتھ بڑھتا چلا گیا۔ جوں جوں دعوتِ اسلامی مختلف مفاد یافتہ عصبیتوں کے لئے خطرہ بنتی چلی گئی۔ مخالفوں کی صف میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔

قریش مکہ اپنی سرداریوں، معاشی اجارہ داریوں، خاندانی عداوتوں باپ دادا کی عصبیتوں کے سبب مخالف تھی تو مختلف قبائل عرب قریش کے حلیف ہوئے اور بعض دیگر وجوہ سے مخالف ہو گئے یہودیوں نے اپنی دیرینہ بیماری اور قلبی ناحکمی کے سبب مخالفت رسول کا تاریخی کردار اپنے ذمے لے لیا۔ اور سازشوں، جوڑتوڑ، اکھاڑ پچھاڑ اور قبائل کو اکسانے اور بھڑکانے میں لگ گئے۔ منافقین اپنے دل کی نامسلمانی اور دنیاوی مفاد پرستی کا بت پوجنے لگے۔ غرض دعوت کے میدان میں آتے ہی مختلف نوعیت کے مخالفین میدان کارزار میں سرگرم عمل ہو گئے۔

آغاز دعوت کانٹوں کے بھرپور انبار کے درمیان نرم و نازک پھول کی مانند ہوتا ہے وہ کھلتے ہی اتنی شدید مخالفتوں میں گھر جائے تو اس کے لیے جانبر ہونا مشکل ہوجاتا ہے لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مخالفتوں کے اس ہمہ پہلو طوفان بلاخیز میں سے اپنا راستہ نکالا۔ آپ نے انتہائی بیدار مغزی، مستعدی اور سفارتی سرگرمیوں کے ذریعے مختلف دشمنوں کو بیک وقت اور مشترکہ طور پر برسرعمل آنے سے اکثر اوقات نہایت کامیابی سے روکا۔ بس ایک احزاب کا مشترکہ اقدام ہی وہ کر سکے۔ لیکن اسے بھی حضور نے اللہ تعالیٰ کی بتائی ہوئی تدابیر کے ذریعے اس انداز میں سنبھالا کہ اس میں باہمی پھوٹ پڑ گئی وہ احزاب جو عرب بھر کی قوت سمیٹ کر مدینہ کی چھوٹی سی بستی پر چڑھ دوڑے تھے۔ بالکل بے بس اور مایوس ہو کر اس مختصر سی بستی کو ناقابل فتح قرار دے کر واپس لوٹ گئے اس کے علاوہ حضور نے مختلف دشمنوں سے نپٹنے کے لئے ہمیشہ باری کا اہتمام رکھا۔ جب کسی ایک سے نپٹنا ہوا تو دوسرے دشمن کے ساتھ معاہدہ عدم محاربت کے ذریعے صلح رکھی۔

ہجرت مکہ کے بعد قریش سے جب آپ کی لڑائی ٹھن گئی تو آپ نے مختلف قبائلی دوروں اور فوجی دستوں کی ترسیل کے ذریعے مدینہ کے آس پاس کے زیادہ سے زیادہ قبائل کو عدم محاربت کے معاہدات میں باندھ لیا خود یہودیوں کے ساتھ بھی ایسا ہی معاہدہ کر لیا۔ جس کے نتیجے میں بدر اور احد کی جنگیں یکسوئی کے ساتھ برپا ہو سکیں۔ پھر احزاب کے موقعہ پر جب سارا عرب چڑھ آیا تو آپ نے یہودیوں کے قبیلے یعنی بنو قریظہ سے معاہدہ کر لیا تھا تاکہ سامنے کے دشمن سے مقابلہ ہو تو اندر کے دشمن کا خطرہ موجود نہ ہو۔ احزاب کے بعد اب اسلام کی پیش قدمی کا دور آیا۔ تو حضور نے صلح حدیبیہ کے ذریعے قریش سے معاہدہ عدم محاربت کر لیا۔ جس کے نتیجے میں خیبر اور غطفان کے یہودیوں سے آسانی سے نپٹا جا سکا اور جب یہودی دشمن پوری طرح زیر ہو گیا اور ان کی اکساہٹ میں آتے ہوئے سرکش قبائل بھی دب گئے تو پھر دو ہی سال بعد آپ نے قریش سے بھی معاہدہ شکنی اور مسلسل جارحیت کے جرم کا بدلہ لے لیا۔ جس کے نتیجے میں فتح مکہ جیسا تاریخی واقعہ ظہور پذیر ہوا۔

غرض حضورؐ کی حکمت کار کا اگر ہم بغور مطالعہ کریں تو آپ اپنی پوری جدوجہد میں اس امر کا اہتمام فرماتے نظر آتے ہیں کہ ایک وقت میں ایک ہی دشمن سے نپٹا جائے اور اس دوران دوسرے دشمنوں سے صلح صفائی یا معاہدہ عدم جارحیت برقرار رکھا جائے یہ وہ عملی حکمت سیاسی ہے جس کے سبب اسلام کی قوت نہایت قلیل ہونے اور بہت سے خوفناک دشمنوں کا نشانہ بننے کے باوجود اپنے سارے ہی دشمنوں کو باری باری سے شکست دیکر راستہ سے ہٹانے میں کامیاب ہو گئی۔ قریش کے ساتھ صلح حدیبیہ جیسا معاہدہ عدم محاربت جسے قرآن نے فتح مبین قرار دیا ہے وہ اس معنی میں فتح مبین ہے کہ اس نتیجے میں اسلام کو پھیلنے، قبائل کو اسے سمجھنے، مسلمانوں سے حلیفانہ تعلقات قائم کرنے اور اس نئی طاقت سے معاہدات قائم کر کے اپنے مستقبل کو محفوظ کرنے کا موقع فراہم ہوا دوسری طرف یہ بھی ممکن ہوا کہ اس صلح کے

ذریعے قریش کی طرف سے مکمل اطمینان حاصل کرکے یہودیوں کی فتنہ انگیزیوں کا کامل تدارک کر لیا جائے اس لئے کہ یہودی تو قریش سے بھی بڑھ کر بدخصلت کمینے دشمن تھے۔ ان سے پہلے نپٹ لینا اس لئے بھی ضروری تھا کہ میدان عمل میں پھر آخری اقدام قریش سے نپٹنا ہی باقی رہ جائے جو دعوت کے اولین سب سے مضبوط اور بڑے مخالف تھے۔ قریش کے مفتوح ہونے پر عرب میں اسلام کے لئے سارے راستے کھل جاتے تھے اور ان کے مفتوح ہونے سے اسلام کو افرادی قوت کا بھی بہت بڑا ذخیرہ ہاتھ آ جاتا تھا۔ غرض حضور نے چھوٹے دشمن کے بعد بڑے دشمن سے نپٹنے کا تدریجی سلسلہ جاری رکھا۔ یہاں تک کہ باری باری کرکے سارے ہی دشمن میدان مقابلہ سے محو ہو گئے اس کے بعد اسلام عرب سے باہر باطل کے مقابلے میں بین الاقوامی میدان کشمکش میں پہنچ گیا اور اس کا حقیقی مقام یہی تھا کہ وہ دنیا کی رہنمائی کرے۔

عرب کا افرادی ذخیرۂ قوت محفوظ رکھنے کا اہتمام

ہر تحریک کو مردان کار کی وافر ضرورت ہوتی ہے۔ دنیا کے سارے کام انسانوں کے ذریعے ہی چلائے جا سکتے ہیں اور جس قدر اعلیٰ و ارفع مقصد ہو اسی قدر بہتر استعداد و صلاحیت کے افراد کی ضرورت ہوتی ہے۔ قریش کے کردار میں جو انسانی خوبیاں تھیں اور ان میں عرب ہونے کی حیثیت سے بھی عربی کی دعوت کو لیکر اٹھنے کی جو پیدائشی صلاحیتیں موجود تھیں حضورؐ ان سے اچھی طرح آگاہ تھے خلفاً قریش عرب معاشرے میں مکھن کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کی برتری سے سیاست کو عرب تسلیم بھی کرتے تھے حضورؐ کو بھی اپنے ساتھیوں میں بہترین ساتھی قریش میں سے ہی ملے تھے۔ حضورؐ جانتے تھے کہ اسلام کا جھنڈا اٹھا کر وہ عرب سے عجم تک اسلام کی دعوت پہنچانے کے بہترین اہل تھے بس صرف ذرا ان کے اخلاق و کردار کو توحید اور آخرت کے عقیدے سے پالش کر دینے کی ضرورت تھی یہ عقیدہ سارے رنگ اتار کر انسان کو بہترین انسان بنا دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

بدر میں بلاشبہ قریش پر سخت کاری ضرب لگائی گئی تھی۔ اس معرکے میں ان کے بہت سے اکابر مارے گئے تھے۔ ان اکابر کا مارا جانا اسلام کا راستہ بنانا اور اس کے راستے کی رکاوٹیں دور کرنے کے لئے نہایت ضروری تھا۔ البتہ اس کے بعد قریش سے جتنی جنگیں ہوئیں ان میں ان کی افرادی قوت کا زیادہ نقصان نہیں ہوا۔ حضور کی حکمت یہ تھی کہ اسلام ایک چڑھتے ہوئے بادل کی طرح مدینہ سے اٹھے۔ مدینہ کے آس پاس کے مخالفین کو قوت و حکمت کے ذریعہ پایاب کرے یہودیوں کی بگڑتی ہوئی قوم کو مفتوح کرے اور مکہ تک پہنچتے پہنچتے اس کی قوت و توانائی اتنی بڑھ جائے کہ پھر قریش کے لئے مقابلہ کرنے کی بجائے بلا مقابلہ مفتوح ہو جانے کے سوا دوسرا کوئی چارہ باقی نہ رہ جائے تاکہ جنگی مقابلے میں وہ خون خرابہ نہ ہو جو ایک طرف افرادی قوت کو ضائع کرتا ہے اور دوسری طرف خاندانی دشمنیوں کی مستقل بنیاد ڈال دیتا ہے۔

اس سیاسی حکمت کے ساتھ حضورؐ اسلام کا لشکر لیکر میدان جد وجہد میں برابر آگے بڑھتے رہے۔ آپ نے ایک ایک یہودی قبیلے کو اسلام کو ضرر پہنچانے کے مقام سے خارج کیا۔ بدوی آزاد قبائل کو کچھ دعوت کے ذریعے اور کچھ قوت کے ذریعے زیر کیا اس عرصہ میں قریش سے بھی مقابلے ہوتے رہے لیکن بس وہی مقابلے جن میں وہ خود چڑھ چڑھ کر مسلمانوں پر آتے رہے، لیکن

حضور زیادہ تر قریش کے دست و بازو توڑنے میں مصروف رہے، آزاد بدوی قبائل میں سے کچھ کو قوت سے مطیع کیا کچھ کو مسلمان کیا اور کچھ سے معاہدت کر کے انہیں اپنا حلیف بنایا جس سے قریش بتدریج آہستہ آہستہ تنہا (ISOLATE) ہوتے چلے گئے جنگ احزاب کے بعد تو پھر ان کے لئے کوئی مشترکہ کارروائی کرنا بالکل ممکن نہ رہا تھا۔ دوسری طرف حضور نے یہود کی ریشہ دوانیوں کا پوری قوت سے قلع قمع کیا انہیں ایک ایک کر کے پوری طرح کچل دیا یہاں تک کہ فتح خیبر کے بعد وہ مکمل طور پر میدان مقابلہ سے نکال دیئے گئے اس کے بعد پھر صرف قریش مکہ میں رہ گئے جو ان تغیرات کو دیکھ بھی رہے تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ اب ان کے لئے اسلام کا مقابلہ آسان نہیں ہے چونکہ اس کے سارے حلیف ایک ایک کر کے میدان سے نکل گئے تھے۔ اسی صلح حدیبیہ کے دو سال بعد ہی جب مسلمانوں کے ایک حلیف قبیلے پر حملہ کرنے میں قریش نے مدد کی جس سے حدیبیہ کا معاہدہ ٹوٹ گیا تو انہیں یکایک یہ احساس ہوا کہ یہ معاہدہ توڑ کر انہوں نے اپنی حماقت سے وہ حصار توڑ ڈالا ہے جو اسلامی یلغار سے بچنے کیلئے صلح حدیبیہ کے بعد اپنے گرد تعمیر کیا ہوا تھا اس صورتحال کا احساس ہوتے ہی گھبرا کر انہوں نے تجدید معاہدہ کی کوشش کی چنانچہ قریش کا سردار ابوسفیان دوڑا دوڑا مدینہ پہنچا اور تجدید معاہدہ کی ہر ممکن کوشش کی اور اس کے لئے ہر سہارا تلاش کیا یہ وہ قریش تھے جن سے صرف دو سال پہلے حدیبیہ کے میدان میں مسلمانوں نے کچھ دب کر ہی معاہدہ کیا تھا اور وہ بات بات پر مسلمانوں کو دبانے کی مزید کوشش کرتے تھے۔ انہوں نے اس وقت مسلمانوں کو عمرہ تک کی اجازت نہ دی تھی۔ اب دو سال بعد یہ نوبت آگئی تھی کہ قریش کا سردار ابوسفیان مدینہ میں گھر گھر سفارشی تلاش کرتا پھرتا تھا تاکہ معاہدہ حدیبیہ کی تجدید ہو سکے وہ بعض شرائط کو جو مسلمانوں کے نزدیک اس وقت قابل اعتراض تھیں ساقط بھی کرنے کے لئے تیار تھا۔ لیکن اب تیر کمان سے نکل چکا تھا اور دعوت اسلامی اپنے مختلف دشمنوں سے نپٹنے کے بعد اس مقام پر آگئی تھی کہ اب اسے معاہدہ شکن لوگوں سے از سر نو معاہدہ کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی

اس طرح قریش بے یار و مددگار اور ہراساں تھے جب حضور نے بالآخر اس شکار کو جو پر شکستہ ہو چکا تھا پکڑ لینے کا فیصلہ کیا ظاہر ہے کہ ایسے شکار پر نہ کوئی گولی چلانے کی ضرورت تھی اور نہ اسے کوئی نقصان پہنچا کر کمزور کرنے کی حاجت تھی وہ خود اب اتنا کمزور ہو چکا تھا کہ اسے ہاتھ بڑھا کر بس پکڑ لینے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ حضور نے ۸ ھجری میں مکہ کو ہاتھ بڑھا کر صحیح سالم اسلام کے فتراک میں داخل کر لیا۔ اس طرح وہ افرادی قوت محفوظ رہی جو اسلام کے مستقبل کے معرکوں کے لئے بہت ضروری تھی۔

حضور اکرمؐ جیسے زیرک عبقری انسان سے یہ بعید تھا کہ وہ دعوت کے بنیادی انسانی سرمائے کو آسانی سے محض ذوق انتقام کی تسکین کے لئے تباہ و برباد کر دے۔ آپ تو سراپا رحمت تھے۔ پھر دعوت اسلامی کا بنیادی سرمایہ یہود نہ ہو سکتے تھے جو نسلوں کے بگڑے ہوئے لوگ اور انبیاء کے دشمن اور قاتل تھے بلکہ دعوت کا بنیادی سرمایہ وہی لوگ ہو سکتے تھے۔ جن میں سے ایک انسان نبی بنا کر اٹھایا گیا تھا اور جو نبیوں کے قتل کے جرم سے بہرحال بری تھے اسلام کی بعد کی تاریخ نے بھی یہ ثابت کر دیا کہ حضور کی یہ حکمت کتنی عظیم تھی حضور نے قریش کے انسانی سرمائے کو بچا کر اسلام کی خدمت کے لئے محفوظ کر لیا تھا۔ یہود جنہیں ہدایات کے لئے ہزاروں انبیاء بھی کافی نہ ہوئے اور انہوں نے ہزاروں انبیاء کو قتل کیا ان کے مقابلے میں عربوں میں اتنی سعادت اور شجاعت موجود تھی کہ انہوں نے ایک ہی نبی کی ہدایت کو قبول کر کے اس کی تعلیمات کو سارے جہان میں پہنچا دیا اور دعوت اسلامی کی کامیابی

کے لئے نبی کے ساتھ مل کر اس کے دشمنوں سے لڑے اور اس کے بعد اس کی دعوت کو سارے جہان میں پہنچایا اور پھیلایا اور قوموں کی قوموں کو راہ ہدایت دکھائی انسانوں کے اس سرمائے کو محفوظ کرنا حضور اکرم کی بصیرت وحکمت کا بہترین ثبوت ہے۔

صُلح حدیبیہ - وقفۂ دعوت و تبلیغ

باطل کے خلاف حضور کی جد وجہد میں صلح حدیبیہ بھی ایک حیرت انگیز اور تاریخ ساز معاہدہ ہے۔ جس کے الفاظ مسلمانوں پر گراں لیکن جس کے نتائج اسلام کے راستے کی ساری مشکلات کو دور کرنے والے ثابت ہوئے۔ یہ معاہدہ عدم محاربت جس طرح حضور نے قریش سے حاصل کیا .. وہ بھی تدبر وسیاست کا شاہکار ہے۔ حضور چاہتے تھے کہ اسلامی دعوت کے خلاف قبائلی دشمنیوں کے پردے چاک ہو جائیں اور لوگ اسے بے لاگ طور پر دیکھ سکیں حضور یہ بھی چاہتے تھے کہ قریش سے صلح صفائی کے نتیجے میں انہیں اسلام پر اس کی خوبیوں کے لحاظ سے غور کرنے کا موقعہ ملے۔ حضور یہ بھی چاہتے تھے کہ ایسے کسی معاہدے سے عام قبائل عرب کو قریش یا مسلمانوں سے برابر کی سطح پر معاہدات کرنے اور حلیف بننے کا موقعہ ملے اور عرب میں اسلام قریش کے مقابلے میں اس کے برابر کی ایک طاقت قرار پائے تاکہ اس کی حیثیت تسلیم کی جائے اور حضور یہ بھی چاہتے تھے کہ یہود کی ریشہ دوانیوں سے جو شب و روز اپنے قبائلی اثرات اور اپنی بے بہا دولت اسلام کے خلاف سازشوں میں استعمال کر رہے تھے۔ نپٹنے کا موقعہ مل جائے چنانچہ یہ معاہدہ جو اس وقت بظاہر مسلمانوں کو اپنی شان کے خلاف محسوس ہوا تھا لیکن اس کے پیچھے بے شمار وہ فوائد تھے جو قریش کو بہ حیثیت گروہ بالکل حاصل نہ ہو سکے چاہے ان کے لئے کتنے ہی شاندار الفاظ معاہدے میں درج ہوئے تھے اس کے مقابلے میں اسلام کو بہ حیثیت تحریک کے وہ سارے فوائد حاصل ہوئے جو ایسے وقفہ عدم محاربت سے دعوتی، تبلیغی، اور سفارتی سطح پر حاصل ہو سکتے تھے۔ چنانچہ حضور نے اس معاہدے سے وہ سارے ہی فوائد حاصل کئے جو اس وقت مسلمانوں کو مطلوب تھے معاہدے کے بعد کے حالات نے جو رخ اختیار کیا وہ یہ تھا کہ تھوڑے ہی دنوں بعد معاہدہ کی وہ شقیں بھی جو قریش نے بڑے فخر سے اپنی بڑائی کے اظہار کے لئے معاہدے میں رکھوائی تھیں نو مسلموں کے لئے نئے مستقر کی فوجی کارروائیوں سے بچنے کے لئے انہیں وہ معقول شقیں بھی خود معاہدے سے ساقط کروانی پڑیں۔ اگرچہ حضور خوب سوچ سمجھ کر ذلیقعد کے مہینے میں نہیں حج کے مہینے میں عمرے کے لئے آئے تھے تاکہ قریش پر آپ کا عمرے کے لئے آنا ثابت ہو جائے۔ لیکن قریش کی حکمت یہ تھی کہ مسلمان زیارت بیت اللہ کے لئے غیر مسلح آئے ہیں تو انہیں چھیڑ چھاڑ کر مشتعل کیا جائے اور بالآخر لڑنے پر آمادہ کر لیا جائے چنانچہ انہوں نے مسلمانوں کو مکہ میں داخل ہونے سے روکا۔ پھر چھوٹی چھوٹی فوجی ٹولیاں مسلمانوں کو چھیڑنے، نقصان پہنچانے اور مشتعل کرنے کے لئے ارسال کیں اور پھر مسلمانوں کے جو سفیر مذاکرات کے لئے بھیجے گئے ان کے ساتھ بدسلوکی کی اور حضرت عثمانؓ کو تو روک لیا جس سے یہ افواہ اڑائی گئی کہ انہیں شہید کر دیا گیا ہے اس سے قریش کی مراد یہ تھی کہ نہتے مسلمانوں سے بہتر شکار اور کوئی نہیں مل سکتا اور مشتعل ہو کر اگر وہ حملہ کریں گے تو سارے عرب میں یہی بات مشہور ہو گی کہ مسلمان زیارت بیت اللہ کا بہانہ کر کے قریش پر حملہ آور ہوئے تھے اس طرح ان کی اخلاقی ساکھ کو بھی نقصان پہنچایا جا سکے گا اور یوں نہتے غیر مسلح افراد کو گاجر مولی کی طرح کاٹ دینا بھی آسان ہو گا۔ حضور کی حکمت و تدبر اور

دمبر نے قریش کی یہ چال ناکام بنا دی۔ حضورؐ نے ایک طرف تو صبر کو آخری حد تک پہنچا دیا اور کسی نوعیت کے اشتعال کی رو نہ چلنے دی دوسری طرف قریش کی جو ٹولیاں چھیڑ چھاڑ کے لیے آتی تھیں انہیں گرفتار کر کے پھر چھوڑ دیا جاتا رہا۔ البتہ چھوڑنے سے پہلے انہیں مسلمانوں کے کیمپ کا نظم وضبط اور ڈسپلن ضرور دکھا دیا جاتا۔ آخر جب شہادت عثمانؓ کی افواہ اڑی تو حضورؐ نے بیعت رضوان لی جو دراصل راہ حق میں موت کی بیعت تھی صحابہ نے جس جوش وخروش سے وہ بیعت کی اس نے قریش کو ہلا دیا۔ ذہنی طور پر قریش خود بھی لڑائی کے لئے پہلے سے تیار نہ تھے اب غزوہ خندق کے بعد وہ حلیفوں کی امداد کے بغیر مسلمانوں سے تنہا ٹکراتے ہوئے بھی ڈرتے تھے مسلمانوں کے اس تہور و جاں نثاری کے اعلان کو دیکھ کر وہ گھبرا گئے اور انہیں اپنی حکمت الٹی پڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ انہیں خطرہ ہوا کہ اگر مسلمان اس حالت میں بھی ہمیں شکست دے گئے تو پھر سارے عرب میں ہماری ناک کٹ جائے گی۔ چنانچہ پھر وہ مذاکرات کے بارے میں سنجیدہ ہو گئے اگرچہ پھر بھی انہوں نے بڑی بڑی شرطیں رکھوائیں لیکن حضورؐ ان تمام شرطوں کو اشارہ خداوندی پر قبول فرما گئے اور بالآخر صلح نامہ پر دستخط ہو گئے۔ مسلمانوں کی طرف سے موت کے لئے جوش وخروش کی بیعت کے بعد ایسی شرطوں پر صلح انہیں فطری طور پر ناگوار تھی۔ لیکن یہ صلح درحقیقت حضورؐ کے اعلیٰ سیاسی تدبر اور مالک کائنات کے اشارہ خداوندی کا نتیجہ تھی صلح پر بظاہر مسلمانوں کا غم سنبھالے نہ سنبھلتا تھا لیکن جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے اعلان ہوا کہ یہ فتح مبین ہے۔

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا تب مسلمانوں کے دل ٹھنڈے ہوئے۔

اس صلح کے ذریعے مسلمانوں کے لئے تبلیغ اسلام کے راستے کھل گئے۔ قبائل کو حلیف بنا کر زیادہ سے زیادہ غیر جانبدار کرنے اور انہیں اپنے گرد سمیٹنے کے مواقع پیدا ہو گئے اور یہودیوں سے نپٹنے کی مہلت بھی مل گئی۔ گہرے مطالعہ کے لئے اس عظیم تاریخی صلح نامے کی شرائط کو سامنے رکھنا ضروری ہے تاکہ صلح میں مسلمانوں کے رنج کا حقیقی سبب معلوم ہو سکے اور ایسی دل شکن شرائط کے باوجود دور رس دعوتی فوائد کے لئے دشمن سے حکیمانہ صلح کا جواز بھی سمجھ میں آ سکے۔

۱۔ دس سال تک فریقین میں جنگ بند رہے گی اور ایک دوسرے کیخلاف خفیہ یا علانیہ کوئی جنگی کارروائی نہ کی جائیگی۔

۲۔ اس عرصے میں قریش کا جو آدمی مسلمانوں کی طرف بلا اجازت جائے گا وہ واپس ہو گا۔ لیکن مسلمانوں میں سے جو قریش کے پاس از خود جائے گا وہ واپس نہ کیا جائے گا۔

۳۔ قبائل عرب میں سے جو قبیلہ جس فریق معاہدہ کے ساتھ حلیف بن کر شریک معاہدہ ہونا چاہے گا اسے اختیار ہو گا۔

۴۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور انکے ساتھی اس سال واپس جائیں گے اور آئندہ سال عمرے کے لیے تین دن تک مکہ میں ٹھہر سکیں گے اور کوئی سامان حرب تلوار کے سوا ہمراہ نہیں لائیں گے۔ قریش اس دوران میں ٹکراؤ سے بچنے کے لئے شہر خالی کر دیں گے۔

ان میں شرط نمبر ۲ مسلمانوں پر بہت شاق تھی لیکن حضورؐ نے فرمایا کہ جو ہمارے پاس سے مرتد ہو کر ادھر جائے اس کی ہمیں کیا ضرورت ہے اور جو ادھر سے ادھر آنے میں روکا جائے اللہ تعالیٰ اس کے لیے ضرور کوئی راستہ نکالے گا۔

لیکن اس صلح سے جو فوائد نکلے وہ بے شمار تھے اور وہی پرامن غیر خونی فتح مکہ کا باعث بن گئے۔

: تبلیغ کے نتیجے میں کثرت سے لوگ مسلمان ہوئے۔ اس سے پہلے کے تمام عرصے میں لوگ اتنے مسلمان نہ ہوئے تھے جتنے اس معاہدے کے بعد ہوئے اس لیے کہ ملنے جلنے کے مواقع پیدا ہونے سے مسلمانوں کے اخلاق و کردار کو سمجھنے اور اسلام کو جاننے کا موقعہ اہل عرب کو پہلی بار ملا تھا۔

: بے شمار قبائل مسلمانوں کو قریش کے ہم پلہ ایک نئی قوت سمجھ کر ان کے حلیف ہو گئے جن میں اسلامی دعوت پھیلنے کے امکانات پیدا ہو گئے۔

: حضورؐ نے کشمکش سے فراغت پا کر ایک بڑے حملے کو آگے بڑھایا اور سلاطین کو بے شمار خطوط لکھے جن کی تعداد سینکڑوں سے تجاوز کرتی ہے جن میں انہیں اسلام کی دعوت دی گئی تھی۔ اس کے نتیجے میں چند سلاطین مسلمان بھی ہوئے اور دعوت عرب سے نکل کر عجم تک پھیل گئی اس دعوتی مہم سے غیر عرب لوگ بھی مسلمان ہوئے۔

: حضورؐ نے کثرت سے سفیر مختلف قبائل، حکومتوں اور ریاستوں کی طرف دعوت اسلام کے ساتھ ارسال کیے۔

: مکہ میں جو نئے مسلمان ہوئے ان کے لیے چونکہ مدینہ میں آنا منع تھا۔ انہوں نے ساحل سمندر پر ایک ٹھکانہ بنا لیا اور وہاں جمع ہو کر قریش کے مختلف قافلوں پر چھاپے مارنے لگے چونکہ وہ معاہدے کا حصہ نہیں تھے اس لیے قریش نے تنگ آکر (مسلمانوں) نومسلموں کو مدینہ جانے کی پابندی والی شق معاہدے سے خود ہی ساقط کر دی اور سارے نومسلم حضورؐ کے پاس پہنچ گئے۔

: اس صلح کے ذریعے حضورؐ نے قریش کو غیر جانب دار کر کے کینہ پرور یہود اور لوٹ مار کرنے والے قبائل سے نپٹنے کا موقعہ پیدا فرما لیا۔ چونکہ معاملات میں یہود کے مقابلے میں قریش زیادہ قابل اعتماد تھے اس لیے دونوں میں سے ایک فریق کو طرف دار کرنے کے لیے قریش ہی کو موزوں پایا۔ اور ویسے بھی قریش کو حضورؐ بلا قتل و غارت بے بس کر کے اسلام کے مطیع بنانا چاہتے تھے۔

غرض اسلامی انقلاب کی عظیم جد و جہد میں صلح حدیبیہ ایک ایسا معرکۃ الآرا مرحلہ ہے جو حیرت انگیز کامیابیوں کے دروازے کھول دیتا ہے۔ یہ حضورؐ کے تحمل اور تدبر کا شاہکار ہے۔ یہ صرف اللہ کے رسول کی ہی بصیرت تھی کہ انہوں نے بظاہر تاریک دفعات صلح میں سے صبح درخشاں کا چمکتا اور تاباں سورج ابھرتا ہوا دیکھ لیا تھا۔

صلاحیت اور جوہرِ قابل کا اعتراف اور استعمال

حضورِ اکرمؐ کے پیش نظر ایک انقلاب آفریں نظام کا قیام تھا۔ ظاہر ہے کہ ایک نیا نظام اپنے لیے افراد کی زبردست ٹیم کا تقاضا کرتا ہے۔ ہر سطح پر اس نظام کو چلانے اور اس کی روح کے مطابق نافذ کرنے والے بے شمار باصلاحیت افراد کی ضرورت ہوتی ہے کسی اصولی اور بامقصد نظام کا چلانا کسی ایک فرد کا کھیل نہیں ہے چاہے وہ کتنا ہی قابل اور صاحب صلاحیت کیوں نہ ہو حتیٰ کہ انبیاء کرام کو بھی اگر صاحبِ صلاحیت افراد کی قابل لحاظ ٹیم فراہم ہوئی اسی صورت میں وہ اپنی دعوت کو انسانی

معاشروں میں نافذ کر سکے اور اگر ایسی ٹیم فراہم نہ ہو سکی تو انبیاء کرام اور داعیان دعوت حق نے بلاشبہ اپنی قوتوں پر دعوت پیش کرنے کی حجت تو تمام کر دی لیکن وہ نظام نافذ نہ ہو سکا جوان کے پیش نظر تھا۔ اس طرح دنیا کا نظام چلا سکنے کی صلاحیت سے بہرہ ور افراد نہ ملنے اور انسانی معاشرے تباہی و بربادی کا شکار ہوتے رہے۔

حضور اکرم اس اجتماعی ضرورت کو خوب سمجھتے تھے کہ ایک نظام کو چلانے کے لیے کس طرح ایک ایک باصلاحیت فرد کی ضرورت ہوتی ہے چنانچہ آپ باصلاحیت افراد کی تلاش میں سرگرداں رہتے تھے۔ حضرت عمر فاروق کے ایمان کیلئے حضور اکرم نے خود دعا فرمائی۔ سرداران قریش سے خصوصی ملاقاتیں کر کے آپ انہیں اسلام کی دعوت دیتے رہے جب وہ اسلام کی طرف سے بے نیازی برتتے تو حضور دل ہی دل میں اسے دعوتِ اسلامی کا نقصان سمجھ کر بجید کڑھتے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم کو دعوتِ اسلامی کی تگ و دو میں اعتدال اور صبر کی تلقین فرمائی۔

حضورؐ جانتے تھے کہ ہر فرد جو بہتر صلاحیت کا حامل ہے۔ اگر اسلام کے حق میں اپنی صلاحیت استعمال کرے گا تو اس سے دعوت اسلامی کو فائدہ پہنچے گا۔ اس مقصد کے لئے حضور نے مختلف تدابیر اختیار کیں۔ تعلقات بڑھائے وظائف دیئے تالیف قلب کے لئے ہدیے مرحمت فرمائے۔ رشتہ داریاں قائم کیں۔ مناصب دیئے اور اس طرح باصلاحیت افراد کی صلاحیتوں کو اسلام کی خاطر وقف کرنے کے لیے تمام ممکن تدابیر اختیار فرمائیں۔ ابوسفیان کے خاندان میں جنگی اور انتظامی صلاحیتیں موجود تھیں ان جیسے شدید معاند اسلام کے گھر کو جو اوّل روز سے فتح مکہ تک مزاحمت کا گڑھ رہا تھا۔ فتح مکہ کے روز امن کا گھر قرار دیا۔ ان کے بیٹے کو اپنا کاتب مقرر کیا حالانکہ وہ فتح مکہ کے بعد اسلام لائے تھے اور وہ طلقاً کہلاتے تھے۔ حضرت خالد بن ولید کو جنہوں نے مسلمانوں کو جنگ احد میں سخت نقصان پہنچایا تھا اسلام قبول کرتے ہی فوج میں اعلیٰ منصب دیا۔ حضرت عمرو بن العاص کو جو مسلمان مہاجرین کا پیچھا کرنے کے لیے حبش تک قریش کے سفیر بن کر گئے تھے اسلام قبول کرنے پر عزت دی۔ انتہا یہ ہے کہ ابوجہل کے بیٹے عکرمہ کو اپنے پاس بلا کر معاف کیا اور اعلیٰ مناصب پر فائز کیا۔ مکہ والوں میں جو ہر قابل پایا تھا اور ان میں فوجوں کی کمان کرنے اعلیٰ مناصب کو نبھانے، سفارتیں کرنے اور ایک نئے نظام کو اعلیٰ پائے کی افرادی قوت فراہم کرنے کا جوہر موجود تھا۔ آپ نے یہ جوہر فتح مکہ پر ضائع کرنے کی بجائے ان کا ایک ایک فرد بچانے کی کوشش کی تالیف قلب کے طور پر انہیں مال غنیمت سے مالا مال کر کے ان کے دلوں کی کدورت کو اسلام کے لیے محبت میں تبدیل کرنے کی کوشش فرمائی اور خلافت جیسے اہم کام کے بارے میں ان کی صلاحیت اور اہمیت اور عرب کے قبائل میں ان کے وقار کے پیش نظر فرمایا کہ یہ قرآن کا ہی حصہ ہے۔

غرض ہمیں حضور اکرم کی سیاست کا یہ پہلو بہت ہی نمایاں نظر آتا ہے کہ آپ نے اپنے ذاتی اور شخصی غم و غصے کو کبھی نظام کی بہتری کے راستے میں رکاوٹ بننے نہیں دیا۔ آپ نے ہر باصلاحیت فرد کی قدر افزائی کی اور اسے اسلام کی گاڑی میں جوت کر منزل حق کی طرف روانہ کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ حضور اکرم کی اعلیٰ سیاسی بصیرت کا یہ شاہکار ہے۔ یہی سبب ہے کہ حضور کے گرد ایسے افراد جمع ہو گئے جو میدانوں کے فاتح مجالس صلح کے لیے بہترین مشیر اور غیر ملکی مشنوں

ہیں اسلام کے بہترین سفیر ثابت ہوئے ان کے ذریعے اسلام دور دور تک پہنچا اور جہاں جہاں پہنچا وہاں اسکی جڑیں ایسی پیوست ہوئیں کہ دوسری قومیں اپنی زبان لباس کلچر تک بھول کر عربی تہذیب و تمدن کا جزو بن گئیں حضور نے ایسے ہی باصلاحیت اور باکردار لوگ جمع کیے تھے آپ جوہر قابل کے بہترین جوہری تھے۔

جوہر قابل کی پذیرائی اور قدر افزائی کرنے والا حضور اکرم سے بڑھ کر ہمیں دوسرا کوئی قائد پوری انسانی تاریخ میں نہیں ملتا اس لیے جس قدر جوہر قابل حضور اکرم کو میسر آیا اور کسی کو میسر نہیں آیا۔ یہی سبب ہے کہ جس قدر پائیدار انقلاب حضور اکرم کا ثابت ہوا دوسرا کوئی انقلاب ایسا پائیدار ثابت نہیں ہوا، حضور کی محبت کا گرویدہ ہونے کے بعد کوئی شخص آپ سے علیحدہ ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

جانشین کے مسئلے کا پیشگی حل

بالعموم مملکتوں کو تباہ کرنے والا جانشین کا مسئلہ ہوتا ہے۔ اور بالغ رائے دہی کی بنیاد پر جدید مروجہ جمہوریت کے رواج پانے سے پہلے تو یہ مسئلہ بڑا ہی نازک مسئلہ ہوتا تھا۔ مملکتوں میں انتقال اقتدار کے لیے کوئی مقررہ اور پرامن طریق کار نہ ہونے کے سبب جنگ جانشینی ہر سربراہ مملکت کی اقامت کے بعد اس مملکت کی تاریخ کا لازمی جزو ہوا کرتی تھی اس مسئلے کو نسلی حکمرانی کے تصور کے ذریعے حل کرنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن نسلی حکمرانی میں جو پنہاں اخلاقی اور سیاسی خرابیاں ہیں ان سے اب ساری دنیا آگاہ ہے وہ خرابیاں بھی جنگ جانشینی سے کم مہلک نہیں ہیں۔

اسلام نے دنیا کو جو تصور سیاست و طرز حکومت دیا وہ شورائی تھا اس میں نسلی جانشینی کا تصور موجود نہیں تھا۔ بالغ رائے دہی کی بنیاد پر عام پبلک سے آزادی حاصل کرنے کے ذرائع بھی اس وقت ایجاد نہیں ہوئے تھے اور نہ ذرائع و سائل کی قلت کے سبب یہ ممکن تھا حضور اکرم نے نئے نظام کے استحکام اور اسے مضبوطی سے اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کے لئے جانشینی کے مسئلے کو نہایت ہی حکمت و تدبر سے اپنی زندگی میں ہی حل فرما دیا۔

حضرت ابوبکر صدیق حضور اکرمؐ کے بعثت سے قبل کے دوستوں میں سے تھے بلکہ یار غار دوست تھے جن سے حضورؐ کی راز داری اور انتہائی قربت و محبت کی دوستی تھی۔ خاندان سے باہر حضور پر سب سے پہلے ایمان لانے والے وہی تھے۔ سارے مراحل دعوت میں انہوں نے ہر ہر قدم پر حضور کا ساتھ دیا تھا انہوں نے زندگی میں کبھی ایک بار بھی حضور کے ذاتی مزاج سے مختلف انداز میں نہ سوچا تھا۔ ہر لمحہ، ہر حالت اور ہر صورت میں وہ حضور کا ساتھ دینے والے تھے انہوں نے پوری طرح مزاج نبوت شناس پایا تھا۔ قرآن نے انہیں غار ثور میں ثانی اثنین (دو میں کا دوسرا) قرار دیا تھا۔ یعنی حضور کے بعد دوسرا مسلم۔ حضور نے ان کے ساتھ ہی ہجرت کی تھی اور اللہ تعالیٰ نے انہیں کو حضور کی رفاقت ہجرت کا شرف عطا فرمایا تھا کہ وہ حضورؐ کی ایک ایک بات ایک ایک ضرورت اور ایک ایک راز سے آگاہ تھے حضورؐ نے ان کے بارے میں ہی فرمایا تھا۔ زندگی میں ہر شخص کے احسان کا بدلہ دیدیا ہے۔ لیکن ابوبکر صدیق کے احسان کا بدلہ ممکن نہیں ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ ہی دے گا حضرت ابوبکر کی رائے زندگی بھر حضور کے ساتھ ملتی رہی اور کبھی بھی کوئی اختلاف رائے پیدا نہیں ہوا۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ حضورؐ کے خاندان سے تعلق نہیں رکھتے تھے اور ان کی خلافت سے ملوکیت بالنسلی حکومت سے مماثلت کا کوئی خطرہ نہیں تھا ان کی قربانیوں اور اسلام کے بارے میں ان کی وفاداری غیر مشتبہ اور سب سے بالاتر تھی حضور کوئی کام بھی وحی کے اشارے کے بغیر نہ کرتے تھے آپ نے ابوبکر صدیق کے مختلف مناقب بیان کئے۔ ان کو اپنی رازداری میں لیا۔ ان کے ذمے ایسے کام لگائے جو حضور کے بعد دوسرے درجے کی اہمیت رکھتے تھے۔ حضور نے اپنی بیماری میں ان کو اپنی جگہ مسلمانوں کی امامت کے لئے کھڑا کیا جو مسلمانوں کے لئے عین توقع کے مطابق اور ہر لحاظ سے مطلوب تھا کسی ایک شخص نے بھی حضورؐ کے اس فیصلے پر دل گرفتگی محسوس نہیں کی۔ ہر شخص حضور کے بعد آپ کو ہی سب سے زیادہ اہمیت دیتا اور بزرگ گنتا تھا۔ ابوبکر صدیق نے بھی حضور کی وفات کے بعد ایک ہی دن میں حضور کی وفات کا مسئلہ، دفن کا مسئلہ، خلافت کا مسئلہ اور لشکر اسامہ کا مسئلہ حل کیا اور یہ ثابت کر دیا کہ سب سے زیادہ حضور کی خلافت کے وہی مستحق اور اہل تھے۔ حضور نے بھی اسلامی انقلاب کو مضبوط اور پائیدار بنیادوں اور طریق نبوی پر چلانے کے لئے حضرت ابوبکر صدیق کو ہی اپنے بعد خلافت کے لئے اشاروں اشاروں میں تجویز کیا تھا۔ گویا خلافت کے لئے صریحاً نامزدگی نہ کرنا تو مسلمانوں میں شورائیت اور جمہوریت کو رواج دینے کے مترادف تھا اور اشاروں اشاروں میں ان کو بہتر اور نبی کے بعد اسلام کا دوسرا آدمی قرار دینا گویا موزوں ترین فرد کے بارے میں اپنی رائے دینے کے مترادف تھا اور اپنے خاندان سے باہر کے آدمی کا تجویز کرنا نسلی اور خاندانی حکومت کی بجائے شورائی خلافت قائم کرنے کے مترادف تھا۔ اس طرح حضور نے کمال حکمت سے اسلامی انقلاب پر مبنی ایک نظام مملکت کو داخلی شورش، اختلافات اور خانہ جنگی سے بچا لیا اور اسلامی انقلاب کی بنیادیں اور زیادہ مضبوط اور گہری کر دیں۔ ظاہر ہے کہ حضور کا کوئی اشارہ بھی اشارۂ وحی کے بغیر نہ ہوتا تھا۔

نسلی ملوکیت اور خاندانی بادشاہت کا خاتمہ

حضورؐ نے اپنے بعد اپنے خاندان کے کسی بھی شخص کو خلیفہ نامزد نہ کیا حالانکہ اگر حضور ایسا کرتے تو مسلمانوں میں کوئی شخص بھی اس کی مخالفت کرنے والا نہ تھا لیکن حضورؐ نے اپنے طرز عمل سے ثابت کیا کہ وہ ایک ایسا نظام مملکت قائم کر رہے تھے جو تمام تر شورائیت پر مبنی تھا اور اس میں نسلی اور خاندانی حکومت کا شائبہ تک نہ تھا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ کے اصول پر تقویٰ پرہیزگاری اور صلاحیت و قابلیت کو ہی اہمیت کا حقیقی مقام حاصل تھا۔ اس طرح حضور نے اسلامی انقلاب برپا کرنے کے ساتھ ایک ایسے نظام کی بنیاد رکھی جو دنیا کے اس وقت کے رائج الوقت طرز حکومت سے بالکل مختلف تھا جس میں خلیفہ سب کا منتخب اور ان کا نمائندہ تھا جو سب مسلمانوں کے مشورے کا پابند تھا اور جو نسلی اور خاندانی نہیں بلکہ اصولی اور نظریاتی سربراہ ہوتا اور رائے عامہ کی اکثریت و اہمیت کی بنا پر منتخب ہوتا تھا۔ اس طرح حضورؐ نے اسلام میں سے ملوکیت اور خاندانی بادشاہت دونوں کا نشان مٹا دیا اور اسے عملاً قیصر و کسریٰ کی سنت قرار دیکر مکمل طور پر ترک کر دیا اسی سبب سے وہ انتہائی نظریاتی نظام و دستوری لحاظ سے ایک عرصہ تک معیاری کہلایا جب تک اس کے اندر یہ مدوح قائم رہی جب اس سے معمولی

انحراف بھی ہوا تو مسلمانوں نے اسے معیاری خلافت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور اپنی روایات میں اس کا معیاری اور دستوری تصور ہمیشہ قائم کیا۔ اسی محفوظ تصور نتیجہ ہے کہ مسلمان جب چاہیں اسے بحال کر کے اپنا نظریاتی نظام از سر نو لا سکتے ہیں۔

اسلامی نظام مملکت کے قیام میں حضرت علی کی قربانیوں اور جانفروشیوں سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ وہ ہر میدان کے مرد تھے اور حضور نے اپنے آپ کو علم کا شہر اور انہیں اس کا دروازہ قرار دیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود حضور نے اپنے کسی قول یا اشارے، یا عمل سے خاندانی بادشاہت کی طرف اشارہ بھی نہیں کیا ورنہ آپ کے لئے یہ کام مشکل نہ تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور کا مطلوبہ نظام ، خالص نظریاتی اور شورائی تھا اور حضور کے قائم کردہ اسلامی نظام میں نسلی اور خاندانی برتری کا کوئی تصور موجود نہ تھا۔

تلوار اور قوت کا استعمال

حضورؐ نے کفر کے مقابلے میں قوت کی قابل لحاظ تعداد تیار رہتے ہی اپنا علیحدہ نظریاتی پلیٹ فارم بنا لیا اور جب وہ علیحدہ پلیٹ فارم وجود میں آ گیا تو پھر آپ نے بھی اخلاقی حدود میں رہتے ہوئے اس طرح قوت استعمال کی جیسے کفر کے علمبردار اسلام کے خلاف قوت کا استعمال کر رہے تھے۔ اس کے لیے نہ حضور نے کوئی معذرت کی اور نہ ہی مہلت طلب فرمائی۔ حضور کا مسنون طریق انقلاب بلاشبہ مسلح انقلاب ہی تھا۔ وہ مسلح انقلاب نہیں جو زیر زمین سرگرمیوں کے ذریعہ فتنہ و فساد برپا کر کے انسانی جان و مال اور تباہی و بربادی اور گھیراؤ جلاؤ کا عظیم زیاں کر کے اشتراکی نظریات برپا کرتے ہیں بلکہ وہ اسلامی انقلاب جس میں قوت کا استعمال جرأت بہادری رو در رو داد شجاعت، مردانگی اور مردانگی پر مبنی تھی۔ آپ کے خلاف جب قوت کا استعمال ہوا تو آپ نے اسے قوت سے ہی روکا اور اس کے لیے کوئی معذرت پیش نہیں کی۔ قوت کے مقابلے میں قوت کا استعمال اپنا جواز خود ہوتا ہے کامیابی کی صورت میں اس سے بہتر کوئی بصیرت نہیں ہوتی اور ناکامی کی صورت میں اس سے بڑی اور کوئی شجاعت نہیں ہوتی جسے تاریخ اپنے دامن شہادت میں ہمیشہ محفوظ رکھتی ہے۔

جب تک تیاری نہ تھی اسلامی دعوت کے علمبرداروں نے ڈٹ کر مار کھائی نہ کفر کے سامنے کبھی معذرت کی اور نہ ہی اس کا کبھی خوف کھایا۔ نہ بیدلی اور کمزوری دکھائی۔ نہ بے صبری اور غیر مستقل مزاجی کا اظہار کیا۔ بہادری اور صبر سے مار کھائی بار بار کھائی لیکن اس مار میں بھی یہ شان رکھی کہ دشمن کو جتلا دیا کہ ایک وقت ہمارا موقعہ بھی آئے گا تو ہم نپٹ لیں گے اگر تمہارا طرز عمل یہی رہا تو پھر ایک روز بڑا اور کھلا مقتل ضرور قائم ہو گا جس میں انسانوں کی گردنیں کٹیں گی۔ چنانچہ آپ نے اور آپ کے ساتھیوں نے ہر مجلس میں ڈٹ کر بات کی۔ بے اصولی پیش کش کو پاؤں سے ٹھکرا دیا۔ ہر تشدد کا پورے صبر و استقلال سے جواب دیا اور ساتھیوں کو بھی بتا دیا کہ ایک روز زمانہ بدلے گا اور دنیا اسلام کے لئے فتح ہو گی۔ پھر جب وہ موقعہ ملا۔ تو ان کے قافلے پر حملے کی تیاری کر لی اور جب قافلے کی بجائے لشکر سامنے آیا تو اس کو بھی للکارا اور بالآخر تائید خداوندی کی قوت سے میدان میں اسے پچھاڑا۔ غرض حضور کی نفاذ نظام کی ساری جدوجہد خالص مسلح اور جوابی قوت کی مثبت جدوجہد ہے وہ کفر

کے ساتھ مسلح کشمکش ہے پھر جب میدان میں دو قوتیں ڈٹ کر لڑتی ہیں تو ایک کو لازماً فتح حاصل ہوتی ہے اس وقت بقائے صلح کا قانون کام کرتا ہے۔

غرض اسلامی انقلاب کے لئے اسوۂ حسنہ اور طریق نبوت تو دعوت کے بعد ہجرت اور ہجرت کے بعد جہاد ہی ہے اور جہاد میں وہ فیصلہ کن مرحلہ ہے جس کے بعد کفر کی مہلت عمر ختم ہو جاتی ہے اس لئے اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے مسنون طریقہ جہاد اور جنگ ہے دوسرے طریقے بھی اجتہادی طور پر اختیار کئے جا سکتے ہیں ملک و ملت اور حالات کے تقاضوں کی روشنی میں ہی طریق کار متعین ہو گا لیکن اس طریق کار کے پیچھے حضور کی جرأت شجاعت فراست اور باطل سے جانبدارانہ کشمکش کی روح ضرور قائم رہے گی حضور نے انقلاب اسلامی کے لئے یہی اسوہ پیش فرمایا ہے۔ ساری تدبیروں میں سے سب سے بڑی تدبیر باطل کو حق کی قوت سے سرنگوں کرنے کا کام ہی ہے۔

کعب بن اشرف کا قتل اور گوریلا تدابیر

حضور ایک عملی قائد تھے اور آپ نے اسلامی انقلاب کے راستے کی ساری رکاوٹیں اللہ کی مدد کے ساتھ اپنی فراست اور تدابیر سے دور کیں۔ کعب بن اشرف یہودی جو اسلام کے خلاف سازشوں کا سرغنہ اور اس کا گھر سازشوں کا اڈہ تھا۔ اسے حضور نے دو انصاری صحابہ کے ذریعے قتل کروا دیا۔ وہ شخص حضور کے قتل کی سازشیں کرتا رہتا تھا۔ معاہدہ امن کے باوجود دشمنوں سے ملا ہوا تھا۔ اور انہیں مسلمانوں کی ساری خبریں پہنچاتا رہتا تھا حضور کے اہل بیت کی اشعار میں توہین کرتا اور مجالس میں بے ہودہ گوئی کرتا تھا وہ اسلام کے خلاف زہریلے ناگ کی طرح مسلسل زہر ٹپکاتا رہتا تھا حضور نے اس ناگ کو مروا دیا۔ بلاشبہ حضور کو وحی کا اشارہ ملتا تھا لیکن وحی خود بھی طریق انقلاب طے کرنے کا ہی ذریعہ تھا۔ حضور نے کبھی کوئی کام منشائے خداوندی کے خلاف نہیں کیا تھا۔

اسلام کے کارواں کے راستے کا ایسا روڑہ جو تنہا دشمن کا کام کرے جو اپنی پوری ہستی سے ثابت کر دے کہ اس کی حیثیت سانپ سے بھی بدتر ہے اور اس میں اصلاح کی صلاحیت کلیۃً مفقود ہو چکی ہے لے راستے سے ہٹا دینے کی تدبیر بلاشبہ بہت غور طلب ہے اگرچہ یہ تدبیر پوری مدت انقلاب میں بس ایک ہی بار استعمال ہوئی ہے جس سے اس کی احتیاط کا اندازہ بھی کیا جا سکتا ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ تدبیر بھی آخری چارہ کار کے طور پر حضور نے اپنی اسلامی جدوجہد میں استعمال کی ہے۔ گویا خالص اور صرف اسلام کی خاطر کسی بدترین عہد فراموش کافر کے خلاف ایسی تدبیر کی گنجائش موجود ہے

خطرے کا بروقت نوٹس لینا

کسی تحریک کے رہنما کی انتہائی بیدار مغزی کا یہ ثبوت ہوتا ہے کہ وہ تحریک کے اندر یا باہر تحریک کیلئے منڈلانے والے خطرات کا بروقت نوٹس لے سکے اور اس کے نقصانات کا آغاز ہونے سے پہلے ان کا تدارک کر سکے۔

اگر تحریک کے اندر یا باہر کوئی خطرہ پیدا ہوا اور غفلت یا کم اندیشی سے اس کا بروقت نوٹس نہ لیا جائے تو بعض

اوقات معمولی سا خطرہ پہاڑ بن کر تحریک کے پورے وجود کو خطرے میں ڈال دیتا ہے۔ اس لیے چوکنے پہریدار کی طرح تحریک کے لیے رہنما کا کام خطروں کو جاننا، پہنچاننا اور ان کا بروقت نوٹس لینا بھی ہوتا ہے۔ تحریک کے اندر کی نزاعات ہوں تو انہیں بروقت دور کرنا اور تحریک کے باہر سے اس کے وجود کو خطرہ ہو تو اس کے چیلنج کو بروقت قبول کر کے اسکو زائل کرنا بروقت رہنمائی کا ضروری حصہ ہوتا ہے۔

جنگ خندق میں یہودی قبیلہ بنی قریظہ جو مسلمانوں کا معاہد تھا۔ اچانک معاہدے سے پھر گیا اور اس نے پہلے کردہ مدینہ کے اندر سے مسلمانوں پر حملہ آور ہو۔ حضورؐ کو اس کا علم ہو گیا۔ حضورؐ نے انصار کے بڑے سرداروں کو تحقیق حال کے لیے روانہ کیا۔ یہودیوں نے صاف کہہ دیا کہ ہمارے اور محمدؐ کے درمیان کوئی معاہدہ نہیں ہے اس سے اہل مدینہ میں اضطراب پھیل گیا لیکن اس موقعہ پر ایک طرف حضورؐ کی یہ تدبیر کام آگئی کہ نعیم بن مسعود نو مسلم کے سیاسی مذاکرات سے بنو قریظہ اور قریش و یہود کے متحدہ محاذ کے درمیان پھوٹ پڑ گئی اور دوسری طرف جیسے ہی خندق کا محاصرہ ختم ہوا حضورؐ نے اپنی اولین فرصت میں انہیں بسے سجائے ہتھیاروں کے ساتھ بنو قریظہ کا محاصرہ کر لیا چنانچہ انہیں دو تین ہفتوں کے محاصرے کے بعد ہی مکمل طور پر مدینہ میں سے اکھاڑ دیا گیا اس طرح مدینہ کا اندرونی محاذ یہود کی ریشہ دوانیوں سے کلیتہً محفوظ ہو گیا یوں خطرے کا بروقت نوٹس لینے سے وہ خطرہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا ورنہ وہ بڑھ کر جان لیوا بھی ہو سکتا تھا۔

اس طرح حدیبیہ میں آپ نے بروقت فیصلہ اور اقدام کر کے اسلام کی فتح کے راستے کھول دیئے۔ بدر میں آپ نے قافلہ کو ترک کر کے میدان جنگ سے نپٹنے کا فیصلہ کر کے کفار کی کمر پر زبردست کاری ضرب لگائی۔ غزوہ خندق میں آپ نے خندق کھود کر کافروں کو حیران و پریشان اور بے بس کر دیا۔ منافقین نے جو بظاہر مسلمان تھے اور صحابہ میں شامل دکھائی دیتے تھے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرنے کے لیے ایک مسجد تعمیر کی اور اس کا افتتاح کرنے کی درخواست خود حضور سے کی گئی لیکن اشارہ وحی سے منافقین کی سازشوں کا حال معلوم ہونے پر آپ نے بلا تاخیر اس مسجد ضرار کو جلا کر مسمار کر دینے کا حکم دیدیا تاکہ منافقوں کو پھر ایسی جرأت نہ ہو۔ اس طرح حضور اکرمؐ کو جب اطلاع ملی کہ بعض منافقین سویلم یہودی کے گھر میں جمع ہو کر لوگوں کو حضور کے ساتھ غزوہ تبوک میں جانے سے روک رہے ہیں تو آپ نے فی الفور علی بن عبیداللہ کو حکم دے کر بھیجا اور انہوں نے سویلم یہودی کا مکان نذر آتش کر کے ایسی سازشوں کا بر سر موقعہ قلع قمع کر دیا۔ اس کارروائی سے سارے منافقین منتشر ہو گئے۔

یہودی قبیلے بنو نضیر نے جب آپ ان کے پاس گئے تھے تو حضورؐ پر پتھر گرا کر آپ کو قتل کر دینے کی سازش کی یہ بات حضور کے علم میں آگئی۔ آپ نے فی الفور محاصرہ کر کے انہیں شہر چھوڑ دینے پر مجبور کر دیا۔ اس طرح مدینہ کا ایک حصہ یہودیوں کے سازشی وجود سے پاک ہو گیا۔ غرض ہمیشہ حضور کے بروقت اقدامات سے اسلام کی فتوحات کے لیے دروازے کھلتے چلے گئے۔

معاہدات صلح کے ذریعے قبائل کو حلیف اور غیر جانبدار بنانا

حضور اس امر پر ہمیشہ تدبیر و حکمت کے ساتھ کاربند رہے کہ دشمنوں میں سے زیادہ سے زیادہ تعداد کو غیر جانبدار بنایا جائے نیز ان غیر جانبدار قبائل میں سے زیادہ سے زیادہ کو اپنا حلیف بنالیا جائے تاکہ مخالف قوت کم سے کم میدان میں باقی رہ جائے اور جو قوت میدان میں موجود بھی ہو اس کو بھی باری باری سے مزاحمت اور مخالفت کے لئے میدان میں آنے کا موقعہ ملے۔ قبائل کو حلیف یا غیر جانبدار بنانے کے لئے حضور کی طرف سے بالعموم مندرجہ ذیل شرائط ہوتی تھیں۔

۱۔ انہیں ان کے جان و مال پر امان ہے۔

۲۔ ان کو ہر ایسے دشمن کے خلاف مدد دی جائے گی جو ان پر ظلم کرے یا ان سے جنگ کرے۔

۳۔ ان کے خانہ بدوشوں کو بھی جو جنگ سے اجتناب کریں وہی حقوق حاصل ہوں گے جو بستیوں میں رہنے والوں کو حاصل ہیں۔

۴۔ اور مدد تو اللہ ہی سے پائی جاتی ہے۔[۱]

یہ شرائط ایسی قبولیت عامہ رکھتی ہیں کہ کسی کو ان کی بنیاد پر حلیف یا غیر جانبدار رہنے میں اعتراض نہیں ہوتا تھا۔ قبائل اسے اپنی ایک بڑی قوت سے وابستگی کا ذریعہ سمجھ کر قبول کرلیتے اور تحریک کا داعی اس کے ذریعے آہستہ آہستہ منتشر قبائلی قوت کو مخالفت کے مقام سے ہٹ کر موافقت کے حصار میں لاتا چلا جاتا اس کے علاوہ ان معاہدات کے ذریعے عام مزاحیت طوائف الملوکی اور انتشار بھی ختم ہو جاتا اور ملک منظم معاہد اور متحد قوت کے زیر نگین جمع ہوتا چلا جاتا تھا اس طرح ایک مہذب ریاست کا قیام ممکن ہوگیا۔ حضور نے اس نوعیت کے معاہدات بے شمار کئے۔ جن کا ذکر تاریخوں میں ملتا ہے۔ جہینہ، بنی حمزہ۔ بنو لایج، بنی غفار، بنی مزینہ اشجع، بنو عامر، بنو خزاعہ، بنو اسلم، جذام، قضاعہ، عذرا اور ایسے ہی بیسیوں قبائل اور ان کی شاخیں ایسے معاہدات میں شامل ہوتے چلے گئے جس سے قریش خود بخود بتدریج اسلامی قوت کے سامنے یک و تنہا رہ گئے یہی معاہدے تبلیغ و تلقین، اشاعت اسلام کا ذریعہ بنے اور یہی معاہدے قوت و اجتماع و اعتماد و غلبہ کا سبب بنے۔

جب حضور نے مکاتیب کے ذریعے اسلامی دعوت عرب سے باہر پہنچائی اور متعدد بادشاہ اور حکمران مطیع اور مسلمان ہوگئے تو اس کے بعد اسلام قبول کرنے والے قبائل کا تانتا بندھ گیا۔ مدینہ میں ایمان لانے کے لئے پہنچنے والے وفود کی لڑی بندھ گئی جن میں دوس، صدا، ثقیف، عبدالقیس، بنی حنیفہ، طے، الشعرین، ازد، خروہ جذامی، ہمدان، طارق بن عبداللہ تجیب، بنی سعد، دریم، عذرا، خولان، محارب، نسان، بنی الحارث، بنی عیش، نمادبن حرادہ، سلامان، نجران، نخع وغیرہ یہ سارے قبائل اسلام کی دعوت قبول کرنے کے لئے خود حاضر ہوتے چلے گئے۔[۲]

انہیں معاہدات کا نتیجہ تھا کہ جب آخری طور پر قریش کو ہر طرف سے بے بس کر کے حضور نے فتح مکہ کے لئے اقدام کیا تو حضور کی فوج میں دس ہزار سے زائد لشکری موجود تھے جن میں بہت سے عرب قبائل شامل تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ فوج

---

[۱] سیاسی زندگی۔ ص ۲۴۹ [۲] سیاسی زندگی

مدینے کی آبادی اس وقت کی آبادی سے دگنی سے بھی کچھ زائد تھی۔

چیلنج کو جرأت و مردانگی سے قبول کرنا

حضور کی حکمت سیاست میں شجاعت و بہادری اور جرأت و فدا کاری کا ایک ایسا حیران کن عنصر موجود ہے جو بے مثل ہے اس عنصر نے حضور کی کامیابیوں کو تیز تر موثر تر حقیقی کامیابیاں بنا دیا ہے یغزوہ احد میں ابوسفیان نے یہ رن مار لیا اگرچہ اس وقت وہ اسی بات پر اکتفا کر گیا کہ مسلمانوں کو ہرا تو دیا ہے اس مختصر اور ادھوری سی فتح کو بچانے اور اس غیر متوقع کامیابی کی لوکھلاسٹ میں وہ یکایک مکہ کی طرف پلٹ گیا لیکن جاتے ہوئے یہ چیلنج دے گیا کہ اگلے سال انہیں دنوں میں بدر کے مقام پر مقابلہ ہوگا گویا اس کا مطلب یہ تھا کہ اب ہم بدر کا بدلہ بھی بر سر موقعہ لیں گے۔ فاتح کا یہ چیلنج ظاہر ہے کہ بڑے رعب داب اور سرپُرغرور کا چیلنج تھا۔ حضور نے بھی شدید زخمی حالت میں مسلمانوں کی منتشر قوت کے باوجود علی الاعلان اس چیلنج کو قبول کیا اور ابوسفیان کو اطلاع دیدی کہ مسلمان اس چیلنج کو قبول کرتے ہیں۔

پھر پورا سال گزر گیا اور وہ دن آ گئے۔

مسلمانوں کو جنگ احد نے سخت مجروح کر دیا تھا بہت سے قیمتی صحابہ شہید ہو گئے تھے۔ شکست کے نتیجے میں آس پاس کے قبائل بھی شیر ہو گئے تھے گھر کے یہودی بھی کھلی کھلی دشمنی پر تل گئے تھے مسلمانوں کا بدر کا قائم کردہ رعب داب بھی ختم ہو گیا تھا ظاہر ہے کہ ان خیالات میں جب آس پاس کے قبائل مخالف ہوں یہودی متخاصم ہوں، تیاری ناکافی ہو کسی چیلنج کو قبول کرنا بڑے دل گردے کی بات تھی لیکن حضور نے ابوسفیان کے چیلنج کے مطابق بدر کے مقام پر جا کر قریش کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کر لیا اور جہاد کا اعلان کر دیا۔

ابوسفیان اب مقابلے میں آنے سے گھبرا رہا تھا اس نے مدینے میں افواہ پھیلائی کہ قریش زبردست تیاری کے ساتھ آ رہے ہیں اس مقابلے پر نہ جانا ہی بہتر ہے بعض صحابہ کی بھی یہی رائے محسوس ہوتی تھی۔ لیکن حضور کے انقلابی مزاج کے یہ بات بالکل منافی تھی، حضور نے صاف صاف اعلان فرما دیا کہ ہم قریش کے مقابلے کے لئے بدر کے مقام پر ضرور جائیں گے البتہ آپ نے حکم دیا کہ چونکہ وہاں انہی دنوں بڑا میلہ لگتا ہے اس لئے لوگ تجارتی سامان بھی اپنے ہمراہ لے لیں۔ چنانچہ حضور بدر کے مقام پر وعدے کے مطابق پہنچ گئے۔ لیکن ابوسفیان کو مقابلہ کی ہمت نہ ہو سکی۔ وہ مرالظہران کے مقام پر پہنچ کر اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا۔ "اس مرتبہ خشک سالی اور قحط بہت زیادہ ہے۔ جانوروں کے لئے چارے اور پانی کی شدید کمی ہے اس لئے مناسب ہے کہ ہم اس سال یہ مہم ملتوی کر دیں" چنانچہ راستے میں سے ہی اپنا لشکر لیکر واپس چلا گیا حضور نے بدر میں آٹھ دن قیام فرمایا۔ سارے عرب نے حضور کا یہ منظر جرأت اور ابوسفیان کا وہ فرار بزدلی اپنی آنکھوں سے دیکھا مسلمان وہاں آٹھ دن تک ٹھہرے رہے چیلنج والوں کا انتظار کیا۔ میلے سے فائدہ اٹھا کر خوب تجارت کی اور جدال و قتال کے بغیر واپس

مدینے آ گئے۔ حضورؐ کی اس جرأت مقابلہ نے سارے عرب کو آپ کی شجاعت و بہادری اور وعدہ وفائی سے مسحور و مرعوب کر دیا۔

دعوتی قوت اور سیاسی دباؤ کا استعمال

صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کے بعد حضورؐ نے سلاطین کے نام کثرت سے دعوتی مکاتیب جاری کیے جن میں سے تاریخ نے اب تک دو اڑھائی سو مکاتیب تو محفوظ کیے ہیں [1] ظاہر ہے کہ وہ مکاتیب جو سرداران قبائل چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے سلاطین اور بڑے بڑے بادشاہوں کے نام جاری کیے گئے ہوں گے ان کی تعداد کسی صورت بھی سینکڑوں سے کم نہ ہوگی یہ مکاتیب عرب سے باہر بھی گئے اور غیر عرب لوگوں نے بھی ان مکاتیب کے ذریعے دعوت اسلامی کو قبول کر کے اسلام کی اطاعت اختیار کی۔ دعوت کے اس رخ کو عربوں نے اپنی تاریخ میں پہلی بار دیکھا تھا کہ غیر عرب لوگ بھی ایک عربی نبی اور سردار کے حلقۂ اطاعت وارادت میں داخل ہو رہے تھے۔ مال غنیمت خراج اور اموال زکوٰۃ و صدقات پر چہار طرف سے اسلامی عربی دارالسلطنت کی طرف امڈے چلے آ رہے تھے۔ یہ منظر ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ جب ان کے سامنے یہ دعوت پیش کی گئی تھی اور انہوں نے اس کی مزاحمت کا آغاز کیا تھا وہ اسے عرب کے اندر ایک نئی سرداری قائم کرنے کا کام کہتے تھے اور بعض اسے عرب کے اندر اپنی نبوت منوا کر اپنے کچھ عربی پیروکار بنانے کا خیال جانتے تھے لیکن یہ بات تو ان کے حاشیہ خیال میں بھی نہ تھی کہ دعوت صرف ان کے لیے نہ تھی بلکہ اس کے اندر پوری دنیا کو خطاب کرنے اور مسخر کرنے کی قوت بھی موجود تھی وہ دیکھ رہے تھے کہ اس دعوتِ مکاتبت تسخیر نے ان بہت سے سلاطین کو بھی اپنا مطیع و منقاد بنا لیا تھا۔ جن سلاطین کے درباروں میں وہ بڑے ادب و احترام سے جایا کرتے تھے۔ ان میں سے کئی ایک انتہائی ذوق و شوق سے نبی عربیؐ کے حلقہ بگوش ہو رہے تھے۔

عربوں کے لیے دعوت کا یہ رخ کشش و تسخیر کی زبردست قوت رکھتا تھا۔ جب حضورؐ کے دعوتی مکاتیب پر مختلف سرداروں اور سلاطین نے اسلام قبول کرنا شروع کیا تو اس کے نتیجے میں عربوں کے اندر بھی اسلام قبول کرنے کی تحریک ایک زبردست قوت بن کر ابھری۔ یہ صورت حال ان کے لیے سیاسی دباؤ کی حیثیت رکھتی تھی بالآخر سلاطین نے بھی اس دعوت اسلامی کو قبول کر لیا تھا۔ ان کے نزدیک اس دعوت کی مکاتیب کی یہ بہت بڑی دلیل تھی وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اس عالمگیر دعوت کی علمبرداری اہل عرب کے ہاتھ میں تھی جو دعوت عرب کے بعد اب عجم کے لالہ زاروں کو بھی مسخر کر رہی تھی وہ چاہتے تھے کہ اسلامی دعوت کی فتوحات کا جھنڈا ان کے ہاتھ میں رہے اور اس کی مرکزیت بھی عرب میں ہی قائم رہے۔ غرض عالمگیر دعوت کے آغاز نے عربوں کو دعوت کی طرف بڑی قوت سے کھینچا اس لیے کہ وہ اس دعوت کے فطری علمبردار اور امام تھے۔

[1] سیاسی زندگی ص ۱۰۶

ساتھیوں کے ساتھ مشفقانہ سلوک

حضورؐ نے جب دعوت اسلامی کا آغاز کیا تو جس نے بھی اس دعوت کو ایک بار قبول کر لیا اور آپ کا دامن تھام لیا پھر وہ آپ کا دامن چھوڑ کر اور کہیں نہیں گیا آنے والوں میں سے ہر شخص نے دکھ درد، تکالیف، مصائب سب کچھ برداشت کیا۔ لیکن آپ سے جدائی کبھی قبول نہیں کی۔ یہ حال اگر مردوں کا تھا تو یہی حال عورتوں کا بھی تھا۔ ابوجہل کے نیزے سے سمیہؓ نے شہادت قبول کر لی لیکن اسلام کا دامن نہ چھوڑا اس کی وجہ یہ ہے کہ قیادت کی بہترین صفات جو تصور میں آسکتی ہیں وہ آپ کی ذات میں موجود تھیں۔ ہر جاں نثار یہی سمجھتا تھا کہ حضور کو جس قدر اس سے محبت ہے شاید ہی کسی دوسرے سے ہو۔ دکھی مصیبت زدہ گنہگار، خطاکار، پریشان حال۔ گھر سے نکالے ہوئے ہر قسم کے ساتھی آتے تھے اور حضور کے دامن میں پناہ حاصل کرتے تھے وہی بات کہ

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز
یہی ہے رختِ سفر میر کارواں کے لئے

اس کیفیت سے بہت بالاتر تھے کہ

کوئی کارواں سے ٹوٹا کوئی بدگمان حرم سے
کہ امیر کارواں میں نہیں خوئے دلنوازی

خوئے دل نوازی تو آپ میں اس درجہ تھی کہ جان کا دشمن یمامہ کا سردار ثمامہ بن اثال بھی دو دن ٹھہر کر کہتا تھا کہ اب مجھے آپ سے زیادہ دنیا میں کسی سے محبت نہیں ہے۔ ہندہ جگر خوار نے بھی یہی کہا تھا کہ مجھے آپ کے خیمے سے زیادہ معتوب کوئی خیمہ نہ تھا اور اب آپ کے خیمے سے زیادہ کوئی محبوب خیمہ بھی نہیں ہے۔ آپ نے حاطب بن ابی بلتعہ کو معاف کر دیا اگرچہ ان سے زبردست اجتماعی جرم سرزد ہو گیا تھا۔ آپ نے الوب کو معاف کر دیا جنہوں نے اجتماعی راز فاش کر دیا تھا۔ آپ نے تو خاتون غامدیہ تک کو بار بار پردہ پوشی کی تلقین کی۔ انتہا یہ ہے کہ آپ نے عبداللہ بن ابی کو جو کسی سے چھپا ہوا نہ تھا آخر دم تک معاف کئے رکھا اور اس کی ہر زیادتی کو نظرانداز کر دیا۔ اس خیال سے کہ لوگ کہیں گے کہ خود اپنے ہی ساتھیوں سے بدسلوکی کرتا ہے۔ عبداللہ بن ابی سے آپ کا سلوک حیرت انگیز وسعت ظرف کا ثبوت ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ مرا تو اس کے لئے اپنی چادر کفن کی خاطر دے دی۔ اس کے جنازے میں شرکت کے لئے اور اس پر ستر سے زائد بار دعائے مغفرت کے لئے تیار ہو گئے۔

حضورؐ نے ایک خاتون کو اپنے بچے کو آپ کے پاس لئے کھڑی دیکھ کر صحابہ سے فرمایا تھا کہ کیا یہ ماں اپنے اس بچے کو آگ میں ڈال سکتی ہے تو صحابہ نے فرمایا کہ "نہیں" اس پر حضور نے فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ اس ماں سے بھی زیادہ اپنے بندوں پر مہربان ہے۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ ماں سے بھی زیادہ اپنے بندوں پر مہربان ہے۔ لیکن حضور بھی محبوب ترین ہستی کی طرح

اپنے ایک ایک ساتھی پر بیحد شفیق اور مہربان تھے اور اس کی خطاؤں کی طرف سے صرف نظر رکھتے تھے۔ ایک عورت نے کہا یا رسول اللہ کیا اللہ تعالیٰ ماں سے بھی زیادہ اپنے بندوں پر مہربان ہے تو حضور نے فرمایا کہ بیشک اللہ تعالیٰ ماں سے بھی زیادہ اپنے بندوں پر مہربان ہے اس پر اس عورت نے کہا" یا رسول اللہ پھر ماں تو اپنے بچے کو کبھی آگ میں ڈالنا پسند نہیں کرتی" اس عورت کی یہ بات سن کر حضور زار قطار رونے لگ گئے تھے اس لئے کہ وہ بھی اپنی امت کے لئے ایسے ہی مہربان تھے جیسے ماں اپنے بچوں پر مہربان ہوتی ہے۔ حضور کی اس شفقت کا خود قرآن نے بھی ذکر کیا۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ ط

(آل عمران ۱۵۹)

اے پیغمبر، یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان کے لئے بہت نرم مزاج واقع ہوئے ہو ورنہ اگر کہیں تم تند خواور سنگدل ہوتے تو یہ سب تمہارے گرد و پیش سے چھٹ جاتے۔ ان کے قصور معاف کر دو، ان کے حق میں دعائے مغفرت کر دو اور ان کو دین کے کام میں شریک ہونے کا مشورہ دو۔

غرض حضورؐ کی شفقت، محبت، نرمی، رحمت اور اپنے ساتھیوں سے مہربانی کا یہ عالم تھا کہ آپ ایک ایک ساتھی کے بارے میں پوچھا کرتے تھے پھر جو چند دن بھی نظر سے اوجھل ہوتا تو اس کے بارے میں خصوصاً پوچھتے اگر بیماری کا پتہ چلتا تو خود اس کی عیادت کے لئے تشریف لیجاتے آپ لوگوں کے ذاتی اور شخصی مسائل میں پوری پوری دلچسپی لیتے تھے ان کے دکھ درد اور خوشیوں میں برابر شریک ہوتے اور ان کے ساتھ ایک خاندان کے افراد کی طرح رہتے تھے۔ آپ نے کبھی کسی کو یہ احساس نہ ہونے دیا کہ اس کے ساتھ بے نیازی اور نظر اندازی کا سوتیلا سلوک ہو رہا تھا۔ آپ کی اس محبت بھری رحیم و کریم شخصیت کا اثر تھا کہ آپ کے ساتھی بھی آپ پر جان نچھاور کرتے اور آپ کی رہنمائی میں سر ہتھیلیوں پر لئے پھرتے تھے۔ آپ کا رویہ کسی ایک رفیق کے ساتھ بھی سخت گیری، خشکی، یبوست، بے پروائی، بے نیازی، نظر اندازی اور نفرت و حقارت کا رویہ نہ تھا۔ آپ سب کے ساتھ محبت و شفقت کا مساوی سلوک کرتے تھے۔ انتہا یہ ہے کہ گلی کے بچوں تک سے آپ انتہائی شفقت اور بے تکلفی سے پیش آتے تھے آپ ان کے ساتھ بھی ان کی دلچسپی کی باتیں کرتے اور انہیں سلام کہہ کر گذر تے تھے۔

آپ کی یہی وہ شخصیت تھی جو اپنے اندر قیادت کی بلند پایہ صفت رکھتی تھی۔ انسانوں کے ساتھ معاملہ ان کی نفسیات کے ساتھ ہوتا اور لوگ باہم کشیدہ خاطر ہو جایا کرتے ہیں۔ لیکن حضور کی تعلیمات شخصیت اور کردار کی کچھ ایسی نوعیت تھی کہ آپ کی ذات میں رحمت شفقت اور محبت مرکوز تھی۔ اپنے ساتھیوں کے لئے آپ کے اندر ان صفات حمیدہ کے سوا کوئی سختی نہ تھی حضرت ابوبکر صدیقؓ فرماتے ہیں کہ آپ ہمیں اتنے ہدیے ارسال کیا کرتے تھے کہ ہم آپ کے ہی ارسال کردہ ہدیوں میں سے پھر آپ کے پاس ہدیہ بھیج دیا کرتے تھے۔ اپنے ساتھیوں کے لئے اس سے بڑی نعمت اور رحمت کی گواہی اور کیا ہو سکتی ہے آپ کی کامیاب سیاسی جدوجہد میں آپ کے ساتھیوں کی جاں نثارانہ اور فدا کارانہ معاونت کا

بہت بڑا دخل ہے۔

فتح مکہ پر دشمنوں کے ساتھ آپؐ کا بلند پایہ اخلاقی سلوک

پوری انسانی تاریخ میں اتنی عظیم فتح پر جو اکیس سال کی طویل جان لیوا اور جانگسل کشمکش کے بعد حاصل ہوئی جو حضورؐ کا انتہائی پرامن طریقے پر خون بہائے بغیر شہر میں داخل ہونا قتل و غارت سے اسلامی فوج کو بالکل منع کر دینا۔ ایک صحابی کی زبان سے اتنی سی بات نکل جانے پر کہ آج انتقام کا دن ہے ان کے ہاتھ سے جھنڈا لیکر ان کے لڑکے کو دیدینا۔ پورے شہر کی اس طرح ناکہ بندی کرنا اور فوج کو پھیلا کر اس طرح شہر میں ہر در دانے سے داخل ہونا کہ کسی کو مزاحمت کی ہمت نہ پڑے اور کوئی قتل و خون نہ ہونے پائے حیرت انگیز رحمدلی کا مظاہرہ ہے جب کہ دنیا کے فاتحین خون بہائے بغیر داخل ہونا اپنے رعب و داب کے منافی سمجھتے ہیں۔ مکہ میں داخل ہوتے ہوئے ایک جگہ خالد بن ولید کے دستے سے شہریوں کی معمولی مزاحمت سے چند جانوں کے نقصان پر انتہائی افسوس کا اظہار کرنا اور اسے تقدیر کا فیصلہ قرار دینا گویا اس امر کی غمازی کرتا ہے کہ حضورؐ جس شہر سے نکالے گئے تھے۔ جس شہر میں حضورؐ کے قتل کے منصوبے بنے تھے جس شہر میں قدم قدم پر کانٹے بچھائے، کوڑے برسائے اور مظالم ڈھائے گئے تھے جس شہر میں گلے میں کپڑا ڈال کر آپ کو گھسیٹا گیا تھا اور جس شہر میں آپ کی گردن پر اوجھڑی ڈالی گئی تھی اس شہر میں حضورؐ ایک قطرہ خون کا گرانا بھی پسند نہ فرماتے تھے سبحان اللہ و بحمدہ سبحان اللہ العظیم رحمۃ للعالمین کی یہ شان انسانی ادراک کی پہنچ سے بالاتر رحمت کاملہ کی حامل شان ہے۔

بڑے بڑے جان کے لاگو دشمن مفتوح ہو کر سامنے آئے۔ تو حضورؐ نے ان سے فرمایا "میں تمہارے ساتھ وہی سلوک کروں گا جو یوسف نے اپنے بھائیوں سے کیا تھا۔ لا تثریب علیکم الیوم۔ جاؤ آج تم سے کسی شے کا کوئی محاسبہ نہیں ہے۔ پھر حضورؐ نے سب کے سامنے تقریر فرمائی۔

> "اے گروہ قریش، خدا نے تمہاری جاہلانہ اور آباؤ اجداد پر اترانے کا غرور آج ختم کر دیا۔ سچ تو یہ ہے کہ سب لوگ آدم کی اولاد ہیں اور آدم کو مٹی سے بنایا گیا تھا۔ پھر فرمایا اچھا جاؤ "تم سب آزاد ہو اور تم پر آج کوئی مواخذہ نہیں ہے۔"

پھر غزوہ حنین سے جس قدر بے پناہ مال غنیمت ہاتھ آیا۔ وہ سب مکہ کے ان نو مسلم طلقاء کے درمیان تقسیم کر دیا۔ حد یہ ہے کہ اس میں سے اپنے مدینے کے لشکر میں کبھی بھی کچھ تقسیم نہ کیا۔ سارے کا سارا مال ان لوگوں میں بانٹ دیا جو ابھی کل ایمان لائے تھے اور جن کی تلواروں سے اب تک مسلمانوں کے خون کی بو نہ گئی تھی یہ تالیف قلب کا کمال درجے کا نمونہ تھا۔ حضورؐ کے اس طرز عمل نے سارے عرب کو ایک طرف حیران کر دیا تو دوسری طرف اطمینان دلا دیا کہ مدینہ سے ابھرنے والی نئی قوت کوئی خونخوار ناتح قوت نہیں بلکہ ایک اصول قوت تھی وہ فیاض اور رحیم و کریم تھی۔ اس سے کسی شریف حلیف کو کوئی خطرہ نہیں تھا؟ نت ہی رحمت تھی اور اس کے ساتھ مل کر اپنے میں زندگی ہی زندگی تھی چنانچہ فتح مکہ کے بعد حضورؐ کے اس رحم دلانہ طرز سے

سارے عرب کے دل اسلام کے لئے کھل گئے اور لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہونے لگے

انصار کا گلہ اور ان کی دلجوئی

فتح مکہ کے بعد فوراً ہی غزوہ ہوازن پیش آیا جس میں مکہ کے نومسلم نوجوانوں کا بھی ایک خاصا لشکر شریک ہوا ہوازن کی شکست سے زبردست مال غنیمت ہاتھ آیا چونکہ وہ اپنا سارا مال و متاع بکریاں مال و اسباب لیکر میدان جنگ میں آئے تھے حضورؐ نے وہ سارا مال غنیمت مکہ کے نومسلموں میں بانٹ دیا اور اس میں سے اپنے مدینے کے ساتھیوں کو کچھ نہ دیا اس پر انصار کے گروہ میں گلے شکوے کی فضا پیدا ہوئی اور کچھ چہ میگوئیاں ہوئیں بعض کو یہاں تک خدشہ ہوا کہ فتح مکہ کے بعد اب حضورؐ اپنی قوم کے پاس مکہ میں ہی رہ جائیں گے۔ شاید مدینہ نہ جائیں گے ان باتوں سے وہ دل گرفتہ ہو گئے اور آپؐ نے جب یہ سنا تو اس کی تصدیق کے بعد آپ نے ایک تقریر فرمائی۔

"اے گروہ انصار، کیا یہ سچ نہیں ہے کہ تم پہلے گمراہ تھے، خدا نے میرے ذریعے تم کو ہدایت دی۔ تم منتشر اور پراگندہ تھے، خدا نے میرے ذریعے سے تم میں اتفاق پیدا کیا۔ تم مفلس تھے خدا نے میرے ذریعے تم کو دولت مند کیا حضور فرماتے جاتے تھے اور انصار ہر فقرے پر یہ بات کہے جاتے تھے کہ

"ہم پر خدا اور اس کے رسول کا احسان سب سے بڑھ کر ہے"

پھر یکایک آپ نے پلٹ کر فرمایا۔

"نہیں، تم جواب یہ دو کہ اے محمدؐ تم کو جب سب لوگوں نے جھٹلایا تو ہم نے تیری تصدیق کی تجھ کو جب لوگوں نے چھوڑ دیا تو ہم نے تمہیں پناہ دی، تم ہمارے پاس مفلس آئے تھے ہم نے ہر طرح تمہاری مدد کی۔ تم یہ جواب دیتے جاؤ" اور میں یہ کہتا جاؤں گا کہ تم سچ کہتے ہو"

حضورؐ کی اس بات پر انصار کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور وہ رونے لگے۔ پھر حضورؐ نے فرمایا۔

"اے گروہ انصار، کیا تم کو یہ پسند نہیں ہے کہ لوگ اپنے اپنے گھروں کو اونٹ اور بکریاں لے کر جائیں اور تم محمدؐ کو لے کر اپنے گھر جاؤ۔"

بس اس بات پر تو انصار کی چیخیں ہی نکل گئیں۔ اکثر کا یہ حال تھا کہ روتے روتے داڑھیاں تر ہو گئی تھیں پھر آپؐ نے ان کو سمجھا دیا کہ مکہ کے لوگ جدید الاسلام ہیں میں نے ان کو ان کے حق کی بنا پر نہیں بلکہ صرف ان کی تالیف قلب کے لئے اتنا کچھ دیا ہے۔ اس بات پر سب مطمئن ہو گئے سارے گلے شکوے دور ہو گئے سب کے ایمان ہزاروں گنا زیادہ بڑھ گئے اور انصار کے چہروں پر وہ رونق آ گئی جو پھر کسی دوسرے کے چہرے پر نہیں تھی۔

یوں حضورؐ نے اپنی شان دلربائی سے اپنے روٹھنے والے ساتھیوں کا دل ایک حکمت تقریر سے موہ لیا۔ اب وہ آپ کے پہلے سے بھی زیادہ گرویدہ اور جاں نثار ہو گئے۔

مردم شناسی اور قیادت کے لئے ایک مؤثر گروہ کی تیاری

حضورؐ نے اسلامی تحریک کو جو زمان و مکان کے حدود پھلانگ کر قیامت تک کے لیے سارے عالم کی ہدایت کے لئے اٹھی تھی مناسب اور مؤثر قیادت فراہم کرنے کا بھی اہتمام فرمایا حضورؐ نے اس کام کو بھی اپنی ہی کے رخ پر گذرنے والے وقت کے حوالے نہیں کر دیا کہ خود جو کچھ ہونا ہے وہ ہو جائے گا اور کوئی مرد ے از غیب نمودار ہو کر تحریک کی باگ ڈور تھام لے گا اور اس کی مستقبل کی منازل تک اس کی رہنمائی کرتا رہے گا بلکہ اول روز سے حضورؐ نے اس تحریک کی مؤثر اور اجتماعی قیادت کی تشکیل کا اہتمام فرمایا یہی وہ زبردست دور اندیشی تھی جس کے نتیجے میں اسلام کی دعوت حضورؐ کے بعد بھی آج تک نکھری ہوئی صورت میں دنیا کے سامنے موجود ہے۔ اگرچہ وہ سیاسی نظام مملکت اس صورت میں بعد کے دور میں قائم نہ رہا۔ عربوں کی سابقہ خاندانی چپقلش خصوصاً بنو امیہ کی خاندانی عصبیت اور ان کا حد سے بڑھا ہوا خاندانی احساس۔ وجاہت نظام کے معیاری وجود میں رکاوٹ بن گیا۔ اس کے باوجود حضورؐ نے جن اصولی، نظریاتی اور مضبوط دعوتی بنیادوں پر نظام اسلام کو کھڑا کر دیا تھا وہ صدیوں تک اپنے اس موقف سے اکھاڑا نہ جا سکا۔

حضورؐ نے اسلامی نظام مملکت کو قائم کرنے اور دعوت اسلامی کی تحریک کو فعال بنانے کے لئے اپنے ساتھ ساتھ ایک مؤثر قیادت بھی تیار فرمائی۔ جس کے لئے حضورؐ نے مختلف تدابیر اختیار فرمائیں۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ حضورؐ کے ہر اہم معاملے میں ہمیشہ شریک، مشیر اور قائم مقام رہے وہ اولین مسلمانوں میں سے تھے۔ اول روز سے جان و مال سے اسلامی تحریک کے لئے قربانیاں دیتے چلے آ رہے تھے اس کے ساتھ ہی حضورؐ نے ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ سے نکاح کر کے ان سارے تعلقات کو قریب تر اور مضبوط تر کر دیا۔ حضورؐ نے ان کے مناقب فراخدلی سے ارشاد فرمائے اور آپ کی تحریکی خدمت کی کثرت سے تعریف فرمائی۔ قرآن نے بھی اس کی تصدیق کی

حضرت عمرؓ فاروق کے اندر جوہر قیادت دیکھ کر حضورؐ نے ان کے اسلام کے لیے دعا کی۔ ان کو اپنے سارے مشوروں میں شریک رکھا۔ ان کے اکثر مشوروں کے مطابق قرآن کی آیات نازل ہوئیں جس سے آپ کی رائے اور زیادہ مستحکم ہوئی۔ آپ نے مشکل اوقات میں اسلام کی زبردست خدمات سرانجام دیں۔ حضورؐ نے اس تعلق کو آپ کی بیٹی ام المؤمنین حفصہ سے نکاح کر کے اور مضبوط کر دیا۔ حضورؐ نے آپ کی مختلف مواقع پر تعریف فرمائی۔ حضرت عمر کے بے شمار مناقب ہیں جو حضورؐ کی زبانی آپ کے بارے میں بیان ہوئے ہیں۔

حضرت عثمانؓ اور حضرت علی دونوں اول روز سے حضورؐ کے زیر تربیت رہے حضرت عثمانؓ نے اسلام کے لئے مال کی اور حضرت علیؓ نے جان ہتھیلی پر رکھ کر بے مثال قربانیاں پیش کیں حضورؐ نے ان دونوں کو اپنے داماد بنا کر اس رشتہ کو اور مستحکم کر دیا۔

اس طرح حضور نے اپنے بے شمار ساتھیوں سے مشورہ لے کر، انہیں مختلف غزوات میں اپنا قائم مقام بنا کر یا ان کو کسی غزوہ میں جھنڈا دے کر یا کسی لشکر کا امیر بنا کر یا اس کی خدمات کے بارے میں کلمات تحسین فرما کر یہ بتا دیا کہ یہ لوگ تحریک کے مقام رہنمائی پر فائز تھے اور ان پر اسلامی مملکت کو چلانے کی ذمہ داری ڈالی جا سکتی تھی مثلاً حضرت ابوبکر صدیق ہی تھے جنہوں نے حضور اکرم کی وفات کے بعد ایک ہی دن میں پے در پے ملی مسائل کو حل کیا یہ ان کی صلاحیت خلافت کے عظیم نشانات ہیں۔

حضورؐ کا انتقال ہوا تو سب پریشان تھے۔ حضرت عمرؓ تو تلوار لئے پھرتے تھے کہ جس نے کہا کہ حضورؐ کا انتقال ہو گیا وہ اس کی گردن اڑا دیں گے۔ لیکن جب حضرت ابوبکر صدیقؓ تشریف لائے تو انہوں نے اطمینان سے جا کر حضورؐ کو دیکھا آپ کی پیشانی کو بوسہ دیا۔ آپ کی موت کی گواہی دی۔ پھر سکون سے مسجد نبوی میں جا کر خطبہ دیا اور کہا کہ جو محمدؐ کو پوجتا تھا تو ان کا تو انتقال ہو گیا ہے۔ البتہ جو خدا کا پرستار ہے تو خدا حی و قیوم ہے حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ ان کے اس ارشاد سے ان کی آنکھیں کھل گئیں۔

پھر سقیفہ بنو ساعدہ میں خلافت کا مسئلہ پیدا ہوا۔ وہاں حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ہی حضورؐ کا ارشاد قریش کی امارت کے بارے میں سنا کر قضیہ کا فیصلہ کیا۔

پھر حضورؐ کے دفن کا مسئلہ آیا تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ہی یہ بتا کر کہ نبی جہاں فوت ہوتے ہیں وہیں دفن ہوتے ہیں وہ نزاع ختم کی جو بہت سخت تھی۔

پھر وراثت کی تقسیم کا مسئلہ اٹھا تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ہی یہ بتا کر کہ انبیاء کی وراثت نہیں ہوتی۔ مسئلے کا تصفیہ کیا غرض حضرت ابوبکرؓ جن کو حضورؐ نے اپنی جگہ نماز کے لئے آگے کیا تھا انہوں نے حضور کی غیر موجودگی کے پہلے ہی دن میں بار بار اپنی صلاحیت اور اہلیت کو ثابت کر دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ جس طرح حضورؐ نے اپنے بعد اسلام کی خدمت کرنے کے لئے انسانوں کی ایک پوری بے نظیر کھیپ تیار کی جو ہر صلاحیت اور ہر خوبی سے مزین تھی تاریخ العالم میں اور کوئی رہنما اپنے ساتھ ایسی عمدہ، اعلیٰ اور ارفع انسانی کھیپ تیار نہ کر سکا۔ صرف خلفائے راشدین کو ہی لے لیا جائے تو انسان ان کی قوتوں صلاحیتوں قربانیوں اور خدا ترسیوں کو دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہے اور یہ سارا بہترین انسانی سرمایہ حضورؐ کا تیار کردہ تھا۔ حضورؐ نے اسلامی تحریک کے اندر جو طریق تربیت ایک مؤثر قیادت تیار کرنے کے لئے اختیار فرمایا وہ طریق تربیت جہاں اور جس درجے میں بھی کہیں بروئے کار لایا گیا وہاں درخشاں سیرت کے انسان نمودار ہوتے چلے گئے۔

درحقیقت تحاریک اعلیٰ صلاحیتوں کے بے شمار افراد کے ذریعے کام کرتی ہیں اور اعلیٰ صلاحیتوں کے افراد تیار نہ ہونے کے نتیجے میں مر جاتی ہیں تاریخ اس بات پر ہر روز گواہی دیتی ہے کہ حضور اکرمؐ نے اپنے زور کردار و حکمت تربیت سے انسانوں کی ایک ایسی کھیپ تیار کی جو دنیا کی رہنمائی کے لئے بے نظیر تھی جس سے برتر اور بہتر انسانوں کے کسی گروہ

کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

عصبیتوں کو بھڑکانے سے اجتناب

حضورؐ انسانیت کے نبض شناس رہنما تھے آپ ہمیشہ اس بات کا پورا اہتمام رکھتے تھے کہ انسانوں کے اندر پوشیدہ نفسیاتی بیماریوں اور کمزوریوں، قیادت کی کسی بے احتیاطی کے سبب اس طرح ابھر آئیں جو تحریک اور دعوت اسلامی کے لئے فائدے کی بجائے الٹا نقصان کا سبب بن جائیں۔ حضورؐ نے جہاں ایک طرف اس نوعیت کی تمام لسانی، نسلی اور علاقائی عصبیتوں کو ایک ایک کر کے ختم کر دیا وہاں ایسی عصبیتوں کے بھڑکنے کے ہر موقعہ سے سختی سے اجتناب کیا۔

ایک غزوہ میں گھوڑوں کو پانی پلاتے ہوئے دو افراد مہاجر اور انصاری کے درمیان تو تکار ہو گئی جس کے نتیجے میں دونوں نے اپنے اپنے ساتھیوں کو اے گروہ "انصار" اور اے گروہ مہاجرین کہہ کر پکارنا شروع کیا جیسے ہی یہ آواز حضورؐ کے کان میں پڑی حضورؐ خیمے سے باہر تشریف لاتے اور سختی سے اس پکار کی مذمت کی اور فرمایا " میری موجودگی میں یہ جاہلیت کی پکار تم کیسے لگا رہے ہو" اسی طرح ایک موقعہ پر یہودیوں کے بھڑکانے سے اوس و خزرج کے قبائل میں قبیلوں کی پرانی عداوت کا جذبہ بھڑک اٹھا تو حضورؐ نے اسے سختی سے دبا دیا بغرض ایک اصولی اور نظریاتی خدا پرستانہ تحریک کے لئے نسل و وطن و قوم کی پرستش کی پکار جاہلیت کی پکار ہوتی ہے اور حضورؐ ان ساری عصبیتوں کو مٹانے کے لئے تشریف لائے تھے۔ لیکن حضورؐ کمال حکمت سے ایسی ہر عصبیت کے بھڑک اٹھنے سے سخت اجتناب کرتے تھے اور خود بھی کوئی کارروائی ایسی نہ کرتے تھے جس سے کسی کی کوئی عصبیت بھڑک اٹھے۔

فتح مکہ کے بعد سارے بت گرا دیئے گئے اور بیت اللہ شریف خالص اللہ کی عبادت کے لئے وقف ہو گیا لیکن حضورؐ نے خود عمارت کعبہ کے بارے میں کوئی کارروائی نہ کی۔ اس وقت کعبہ کی عمارت وہ تھی جو حضورؐ کی بعثت سے صرف پانچ سال پہلے، قریش نے تعمیر کی تھی اور جس میں حجر اسود نصب کرنے کی نزاع کا خود حضورؐ نے فیصلہ کیا تھا اس تعمیر کے وقت قریش نے سامان اور روپے کی کمی کے سبب عمارت کا طول کچھ کم کر دیا تھا۔ فتح مکہ کے بعد حضور اکرمؐ نے اپنا یہ منشا تو ظاہر فرما دیا کہ عمارت کا بنائے ابراہیمؑ پر تعمیر ہونا ہی بہتر تھا۔ لیکن اس خیال کے پیش نظر کہ قوم ابھی تازہ نو مسلم تھی۔ عمارت کو جوں کا توں چھوڑ دیا اس لئے کہ ابھی وہ لوگ موجود تھے جنہوں نے عمارت کی تعمیر کے لئے مالی اور بدنی امداد دی تھی ان پر عمارات کا انہدام شاق گذر سکتا تھا۔ حضورؐ نے حکمت نفسیاتی کے پیش نظر ان کی دلجوئی کی دیوار کو مضبوط کرنے کے لئے اینٹ پتھر کی عمارت کا اہتمام کرنے سے اجتناب فرمایا تاکہ کوئی شخص انہدام عمارت بیت اللہ سے کسی عصبیت میں مبتلا نہ ہونے پائے۔

زندگی کے ہر پہلو میں سادگی کا خصوصی اہتمام

حضورؐ نے اسلامی زندگی کے ہر پہلو میں بطور خاص سادگی کا اہتمام فرمایا۔ عبادت کے لئے مرکز اسلام مسجد نبوی تعمیر کی تو وہ اتنی سادہ بنائی کہ چھت پر کھجور کی شاخوں کا چھپر۔ مٹی کی دیواریں، کھجور کے تنوں کے ستون، اور منبر کے ساتھ سہارے کیلئے:

کھجور کا ہی ایک تنا گاڑھا ہوا جب کہ قیصر و کسریٰ کے محلات آسمان سے باتیں کرتے تھے۔ یہود و نصاریٰ کی عبادت گاہیں اس وقت بھی اعلیٰ درجے کی تعمیر شدہ تھیں۔ خود بیت المقدس میں حضرت سلیمان کی تعمیر کردہ مسجد عظیم الشان تھی لیکن حضورؐ نے یہ سارے سامان موجود ہوتے ہوئے بھی ہر معاملے میں سادگی کا ہی اہتمام فرمایا اور ہر شے میں صرف رضائے الٰہی کے حصول کو ہی محدود رکھا۔

حضورؐ نے اپنے لئے مسجد کے ساتھ جو کمرے بنوائے وہ بھی کچے، کھجوروں کے چھپروں والے کھجوروں کے تنوں کے ستونوں والے نہایت معمولی اور چھوٹے چھوٹے کہ نماز پڑھتے ہوتے کمرے کے دوسرے مکین کو سجدہ کے لئے پاؤں سمیٹنے پڑیں۔ بوریہ پر بستر لگا ہوا۔ بستر میں بھی صرف کھجور کی چٹائی جو جسم پر اپنے نقوش چھوڑے ایک دفعہ کسی ام المومنین نے کپڑا دوہرا کر کے حضورؐ کے آرام کی خاطر چٹائی پر بچھا دیا تو آپ کو ذرا گہری نیند آ گئی جاگنے پر آپ نے فرمایا۔ میرے لئے ایسا بستر نہ بناؤ۔ مجھے ان آرام دہ بستروں سے کیا کام؟" حضرت عمرؓ نے تقاضا کیا کہ قیصر و کسریٰ تو عیش کریں اور آپ کے جسم پر بوریئے اور چٹائی کے نشان پڑیں تو آپ نے فرمایا" ابن خطاب، میں تو اس سوار کی مانند ہوں جو کسی چھاؤں میں تھوڑی دیر دم لیتا ہے۔ اور پھر اپنی منزل کی طرف چلا جاتا ہے" یہ سادگی رہائش میں ہی نہیں لباس میں بھی تھی معمولی سوتی لباس جو دھلا ہوا اور صاف کیا ہوا ہوتا تھا۔ کئی کئی جوڑے بنا کر رکھنا آپ پسند نہ فرماتے تھے آپ نے یہی صفات صحابہ کرام کے اندر بھی پیدا فرمانے کا اہتمام کیا ایک انصاری نے دو منزلہ مکان کی ڈیوڑھی بنائی تو آپ اس سے ناراض ہو گئے یہاں تک کہ اس نے وہ ڈیوڑھی گرا دی۔ یہی معاملہ خوراک کا تھا، سادہ ترین خوراک، کھجور اور پانی، کھجور اور بکری کا دودھ، روٹی اور شوربا، روٹی اور سبزی گوشت اور روٹی، غرض دستر خوان کو نعمت ہائے رنگا رنگ کی نمائش گاہ بنانا آپ کو ہرگز پسند نہ تھا۔ مکان میں سادگی رہائش میں سادگی، لباس میں سادگی، خوراک میں سادگی، بات چیت میں بے تکلف محبت اور بے پناہ اپنائیت، آپ کی شخصیت اور عوام کے درمیان کوئی پردے حائل نہ تھے۔ نہ پردے کھڑکیوں پر تھے نہ دیواروں پہ تھے اور نہ شخصیت اور انسانوں کے درمیان پردے تھے۔ سادگی، خدا ترسی، نیک مخلص مستعد، بہادر مدبر دیانت دار شخصیت حضورؐ کی یہی سادگی دوستوں اور اجنبیوں میں احساسِ اپنائیت پیدا کرنے کا ذریعہ بنتی تھی اور حضرت ابوہریرہ اور حضرت بلالؓ ایسے ساتھی کسی احساس کمتری میں مبتلا نہیں ہوتے تھے اور نہ مال دار صحابہؓ حضورؐ کی اس سادگی کے کسی قسم کے احساس برتری میں مبتلا ہو سکتے تھے۔ معاشرے میں مساوات کا رنگ غالب رکھنے کے لئے حضورؐ کی یہ سادگی زبردست نفسیاتی اور معاشرتی حکمت پر مبنی تھی۔ وہاں کوئی معیار زندگی کی دوڑ نہ تھی صرف معیار اخلاق کی مسابقت تھی اور اس معیار کو بلند کرنے کے لئے کسی مال و دولت کی ضرورت نہ تھی۔ اس طرح حضورؐ نے ایک مساوات انسانیت کی فضا اپنے اس طرز عمل سے پورے معاشرے میں بنا دی تھی چنانچہ جب حضورؐ نے فرمایا کہ تم سب آدمؑ کی اولاد ہو اور آدمؑ مٹی سے بنے تھے تو یہ بات سب لوگوں کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ یہ الفاظ نہیں تھے کردار تھا۔

حضورؐ کی زندگی کا ہر گوشہ سادگی کا نمونہ تھا۔ یہ سادگی ایک انقلاب آفریں سادگی تھی اس سادگی میں سارے صحابہ

کے لیے ایک اسوۂ حسنہ بھی پوشیدہ تھا۔" چنانچہ حضورؐ کے صحابہؓ بھی اپنی روزمرہ زندگی میں سادہ طرزِ عمل کے ہی حامل تھے اسی سادگی کے سبب وہ فاتح تھے اور جب یہی سادگی مسلمانوں میں سے ختم ہوئی اور مسلمانوں کے دسترخوان الواع و اقسام کی نعمتوں کی نمائش گاہیں اور ان کے پیٹ حیوانات آبی، بری اور ہوائی کے قبرستان بنے تو پھر مسلمان خود ساری دنیا کی قوموں کیلئے دسترخوان بن گئے۔

عزمِ مصمم کے حامل اور متوکل

حضورؐ مذبذب الشان نہ تھے، آپ عزمِ مصمم کے حامل تھے۔ حضورؐ کی طبیعت کا یہی رخ آپ کو فیصلہ کرنے میں مدد دیتا اور پھر اقدام کرنے میں قوت پہنچاتا تھا۔ حضورؐ کی صفت قرآن پاک نے بھی بیان کی فاذا عزمت فتوکل علی اللہ ان اللہ یحب المتوکلین (آل عمران ۱۵۹)۔

پھر جب تمہارا عزم کسی رائے پر مستحکم ہو جائے تو اللہ پر بھروسہ کرو اللہ کو وہ لوگ پسند ہیں جو اس کے بھروسے پر کام کرتے ہیں حضورؐ کی ساری جد وجہد میں اللہ پر توکل کر کے بڑے بڑے اقدامات کرنے کا رنگ صاف دکھائی دیتا ہے۔

جنگ احد کے موقعہ پر یہ بحث چھڑی کہ جنگ شہر کے اندر رہ کر لڑی جائے یا باہر میدان میں جاکر تو نوجوان صحابہؓ کی رائے باہر نکل کر اور عمر رسیدہ سنجیدہ حضرات کی رائے شہر ہی رہ کر لڑنے کی تھی۔ خود حضورؐ کی رائے بھی یہی تھی کہ یہ جنگ شہر کے اندر رہ کر لڑی جائے۔ لیکن بدر میں شرکت سے محروم پرجوش نوجوان باہر جاکر لڑنے پر ضد کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ حضورؐ مکان کے اندر تشریف لے گئے۔ حضورؐ کے اندر جانے کے بعد سب نے سوچا کہ حضورؐ کو ان کی رائے کے خلاف مجبور کرنا مناسب نہیں ہے۔ چنانچہ جب حضورؐ ہتھیار بند ہو کر باہر تشریف لائے تو اکثر صحابہؓ نے یہ اصرار کیا کہ حضورؐ آپ اپنی رائے کے مطابق عمل فرمائیے لیکن حضورؐ نے جواب دیا "نہیں اب جنگ باہر جاکر ہی ہوگی، نبی جب ایک بار ہتھیار بند ہو جاتا ہے تو پھر میدان گرم کیے بغیر ہتھیار نہیں اتارتا۔" چنانچہ حضورؐ نے جب ایک بار باہر جاکر جنگ کا ارادہ فرمایا تو پھر آپ اس ارادے پر قائم رہے۔

آپ غور و فکر کرتے، مشورے حاصل کرتے اور مسائل کا فیصلہ کرنے کے بعد ہی ان پر عملدرآمد فرماتے تھے لیکن آپ نے کبھی نفع و نقصان کے میزانیے تیار کر کے اور نفع کے تمام امکانات کی ضمانت اور نقصان کے تمام امکانات کے سدِباب کا کلی اطمینان حاصل کر کے اس کی بنا پر فیصلے نہیں کیے۔ حضورؐ نفع و نقصان کو معیارِ فیصلہ نہیں بلکہ حق و باطل کو معیارِ فیصلہ بناتے تھے اور جب آپ فہم و دانش اور بحث و مذاکرے کے بعد ایک بار جو فیصلہ کر لیتے تھے تو پھر اس میں یکسوئی کے ساتھ عمل فرماتے تھے۔ آپ کو یہ بات بالکل پسند نہ تھی کہ بار بار فیصلے بدلے جائیں اور بار بار نفع و نقصان کے تخمینے لگائے جائیں۔ حضورؐ ایک عملی مدبر تھے اور تدبیر کا کام مکمل کر لینے کے بعد عمل کا حصہ بے دریغ و بلاتذبذب سرانجام دیتے تھے یہی وجہ ہے کہ آپ کی ساری جد وجہد میں آپ کہیں بھی کسی بات پر پریشان نہ ہوتے اور نہ پچھتاتے۔ آپ فہم و بصیرت سے فیصلے کرتے اور پھر یکسوئی اور توجہ سے ان فیصلوں پر عمل پیرا ہوتے تھے۔ اس کے بعد اس عمل کے جو نتائج بھی برآمد ہوتے آپ ان نتائج کو قدرت کا فیصلہ سمجھ کر بطیبِ خاطر قبول کرتے ہیں۔

آپ کو یہ اطمینان حاصل تھا کہ انسان اپنے فہم سے بڑھ کر مستقبل کو مزید آگے نہیں دیکھ سکتا۔ غیب اس سے پوشیدہ ہے جو جدو جہد کا نتیجہ ہے وہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر کے عین مطابق ہے اور سارے اعمال اگر اللہ تعالیٰ پر توکل اور بھروسہ کے ساتھ کیے جائیں تو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی رہنمائی بھی فرماتا ہے اور ان کی دست گیری بھی کرتا ہے۔

عالمگیر دعوت کا منشورِ انسانیت

حضورؐ جس دعوت کے علمبردار تھے وہ تمام عالمِ انسانیت کے لیے عالمگیر دعوت تھی۔ اس کا کوئی رنگ نہ تھا سوائے صبغۃ اللہ کے۔ اس کی کوئی جہت نہ تھی سوائے لوجہ اللہ کے۔ وہ آدم کی ساری ہی اولاد کے لیے دعوتِ فلاح و نجات تھی اور قیامت تک کے لیے تھی۔ اس دعوت کے نزول کے بعد سارے انسانوں کی بہتری اسی دعوت کے قبول کرنے اور اسی کی پیروی کرنے سے وابستہ ہے چنانچہ ۹ ذی الحجہ ۱۰ھ کو جمعہ کے دن آپ نے میدانِ عرفات میں جہاں ساری دنیا کے دینداروں کی ہمیشہ موثر نمائندگی ہوتی ہے اور جس سے بڑی عالمگیر اسمبلی کا اجلاس دنیا کے کسی خطے میں کہیں بھی منعقد نہیں ہوتا، آپ نے پورے عالمِ انسانیت کے لیے جو منشور پیش فرمایا۔ اس کی ہر دفعہ انسانوں کے بوجھ اتارنے والی اور انہیں اخوت کی لڑی میں پرونے والی ہے۔ اس منشور نے رسولِ اکرمؐ کی دعوت کو ہمیشہ کے لیے زندہ و پائندہ رواں دواں اور عالمگیر بنا دیا ہے۔

اس اجلاس کے واسطے سے آپ نے پوری انسانیت کو قیامت تک کے لیے جو خطاب کیا وہ درج ذیل ہے[1]:

۱۔ ساری تعریف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اور ہم اس کی حمد کرتے ہیں۔ اسی سے مدد چاہتے ہیں۔ اسی سے معافی مانگتے ہیں اسی کے سامنے توبہ کرتے ہیں اور ہم اسی کے پاس اپنے نفس کی برائیوں اور اعمال کی خرابیوں سے پناہ طلب کرتے ہیں جسے اللہ ہدایت دے اسے کوئی بھٹکا نہیں سکتا اور جسے اللہ گمراہ کرے۔ اسے کوئی راہ نہیں دکھا سکتا میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی اور معبود نہیں اس کا کوئی شریک نہیں اور میں شہادۃ دیتا ہوں کہ محمدؐ اس کا بندہ اور رسولؐ ہے

۲۔ اے اللہ کے بندو، میں تمہیں اللہ سے ڈرنے کی تاکید کرتا اور اس کی اطاعت پر مضبوطی سے قائم ہونے کی نصیحت کرتا ہوں۔ میں اسی بات سے ابتدا کرتا ہوں جو سراسر بھلائی ہے۔

۳۔ اے لوگو سنو! میں تمہیں بتاتا ہوں کہ شاید اس سال کے بعد میں اس جگہ تم سے پھر نہ مل سکوں گا۔

۴۔ لوگو، تمہارے خون، تمہارے مال اور تمہاری آبروئیں تمہارے لیے ایک دوسرے پر قیامت تک کے لیے حرام ہیں اور ایسے ہی حرم و محترم جیسے تمہارا یہ آج کا دن، یہ مہینہ اور یہ شہر حرمت والا ہے۔ اے لوگو گواہ رہو کہ کیا میں نے تمہیں اللہ کا پیغام پہنچا دیا (لوگوں کی آوازیں آئیں) تو پھر آپ نے آسمان کی طرف انگلی اٹھا کر فرمایا اے اللہ تو بھی گواہ رہنا،

۵ پھر فرمایا: لوگو، جس کے پاس کوئی امانت ہو تو وہ اس کو ادا کرے جس نے اس کے پاس وہ امانت رکھوائی ہو۔

۶ خبردار، سود حرام ہے اور جاہلیت کا سود ختم کیا جاتا ہے۔ البتہ تمہارے لیے راس المال پر حق ہے نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے۔ اللہ نے فیصلہ کر دیا ہے کہ کوئی سود نہ رہنے پائے اور پہلا سود جس کے ساقط کرنے سے میں اس

---

[1] سیاسی زندگی ۳۰۲ مرتبہ ڈاکٹر رسیم

ابتدا کرتا ہوں وہ میرے اپنے چچا عباس بن عبدالمطلب کا سود ہے۔

۷۔ خبردار، جاہلیت کے خون ختم کئے جاتے ہیں اور پہلا خون جس سے میں اسے ساقط کرنے کی ابتدا کرتا ہوں وہ میرے چچازاد بھائی کے بیٹے عامر بن ربیعہ بن الحارث بن عبدالمطلب کا خون ہے۔

۸۔ خبردار جاہلیت کے تمام آثار و مناصب ساقط کئے جاتے ہیں بجز خانہ کعبہ کی رکھوالی اور حجاج کو پانی پلانے کے۔

۹ قتل عمد پر قصاص ہے، مشابہ عمد وہ ہے جس میں لٹھ اور پتھر سے موت واقع ہو اس میں سو اونٹ خون بہا ہیں جو اس سے زیادتی کا مطالبہ کرے تو وہ جاہلیت والا ہے۔ اے لوگو کیا میں نے تم تک پیغام پہنچا دیا (آوازیں) اس پر آپؐ نے فرمایا اے اللہ تو بھی گواہ رہنا۔

پھر فرمایا ۱۰۔ اے لوگو شیطان اس سے تو مایوس ہو گیا ہے کہ اب تمہاری اس سرزمین میں اس کی پوجا ہو لیکن وہ اس پر راضی ہے کہ اس کے سوا دیگر ایسی باتوں میں اس کی اطاعت کی جائے جن کو تم اپنے اعمال میں حقیر سمجھتے ہو اس لئے اپنے دین کے متعلق اس (شیطان) سے محتاط رہو۔

۱۱۔ لوگو، سال کے حرام مہینوں میں ادل بدل کفر میں ایک زیادتی ہے جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ حرام کردہ چیز کو حلال کرتے ہیں۔ آج زمانہ چکر لگا کر پھر اسی صورت میں آگیا ہے جیسا کہ خدا کے زمینوں آسمانوں کو پیدا کرنے کے دن تھا سال کے بارہ مہینے ہیں اور ان میں ذیقعد، ذی الحج، محرم اور رجب حرام مہینے ہیں .... کیا میں نے پیغام پہنچا دیا (آوازیں) آپ نے فرمایا اے اللہ تو گواہ رہنا۔

پھر فرمایا ۱۲۔ اے لوگو تمہاری عورتوں کا تم پر حق ہے۔ تمہارا ان پر یہ حق ہے کہ وہ تمہارے بستر کو کسی اور سے نہ روندوائیں اور تمہارے گھروں میں تمہاری اجازت کے بغیر کسی کو نہ داخل ہونے دیں جن کو تم ناپسند کرتے ہو، اگر وہ ایسا کریں تو تم ان پر سختی کر سکتے ہو اگر وہ اطاعت کریں تو ان کو دستور کے مطابق اچھا کھلاؤ اور پہناؤ۔ میں تمہیں عورتوں کے بارے میں بھلائی کی تاکید کرتا ہوں ان کے بارے میں اللہ سے ڈرو، سنو کیا میں نے پیغام پہنچا دیا (آوازیں) آپ نے فرمایا اے اللہ تو بھی گواہ رہنا۔

پھر آپ نے فرمایا ۱۳ لوگو، تمام مومن بھائی بھائی ہیں، کسی شخص کے لئے اپنے بھائی کا مال حلال نہیں ہے۔ بجز اس کے کہ وہ اس کی اجازت سے لے۔

۱۴۔ لوگو، میرے بعد کافر نہ بن جانا کہ ایک دوسرے کی گردیں مارنے لگو، میں نے تم میں ایک ایسی چیز چھوڑی ہے کہ اگر تم اسے تھامے رہو گے تو تم گمراہ نہ ہو گے وہ ہے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ۔ کیا میں نے پیغام پہنچا دیا۔ آوازیں بلند ہوئیں تو آپ نے فرمایا "اے اللہ تو بھی گواہ رہنا۔

اسکے بعد فرمایا ۱۵۔ لوگو، تمہارا رب بھی ایک ہے اور تمہارا باپ بھی ایک ہے۔ تم سب آدم سے ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے جاہلیت کی عصبیتیں آج میرے پاؤں کے نیچے ہیں۔ تم میں اللہ کے نزدیک مکرم وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہو کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت نہیں ہے سوائے تقویٰ کے۔ بتاؤ کیا میں نے پیغام پہنچا دیا" اس پر لوگوں نے بآوازِ بلند گواہی دی تو آپ نے فرمایا کہ "حاضر کو چاہیئے کہ وہ غائب تک یہ باتیں پہنچا دے۔

پھر آپ نے فرمایا ۱۶- لوگو اللہ نے ہر وارث کے لئے ورثے میں حصہ مقرر کر دیا ہے اب کسی اور وصیت کی ضرورت نہیں بجز ایک تہائی کے۔ بچہ بستر کے مالک کا ہے اور زانی کے لئے پتھر ہیں جو شخص اپنے باپ کے سوا کسی اور کی طرف اپنے کو منسوب کرے یا اپنے مولا کے سوا کسی اور کو مولا بنائے تو اللہ اور اس کے فرشتوں کی اس پر لعنت ہے۔ اس سے کوئی رقم اور کوئی بدلہ قبول نہیں ہوگا۔ لہ

یہ ہے وہ عظیم منشور انسانیت جو ملکوں، نسلوں، قبیلوں، رنگوں اور زمانوں اور زمینوں کی حدود پھاند کر پوری انسانیت کے سارے ادوار کو اپنی حدود میں سمیٹ لیتا ہے جس کی دعوت عالمگیر ہے جس کے اثرات بین الانسانی اور بین الاقوامی ہیں اور جو جاری ہونے کے بعد سے قیامت تک کے لئے ایک زندہ تابندہ اور درخشاں ہدایت کا صحیفہ ہے۔ اس کے بعد انسانیت کو کسی مزید ہدایت کی ضرورت نہیں ہے حضور نے یہ منشور پیش فرما کر انسان کو ایک عالمی اسلامی ریاست کا شہری بنا دیا ہے۔

سیاست عبادت کی مانند ہر آلودگی سے پاک

اس کے باوجود کہ حضورؐ نے ایک عظیم انقلاب برپا کیا جو تاریخ کا ایک منفرد کارنامہ ہے اس جدوجہد میں حضورؐ کو دوستوں اور دشمنوں سے کینہ پرور مخالفین سے لیکر مکار اور دھوکے باز حلیفوں تک واسطہ پڑا، آپؐ معاہدات، جنگ وجدل اور مذاکرات کے مختلف سیاسی مراحل طے کرتے ہوئے ایک اسلامی ریاست کے سربراہ مملکت تک بن گئے لیکن آپ کی سیاست اتنی ہی پاک صاف ستھری پاکیزہ اور طاہر و مطہر تھی جیسے آپ کی نماز روزے، حج اور دیگر عبادات پاکیزہ تھیں اس لئے کہ آپ کی دونوں ہی چیزیں فی سبیل اللہ تھیں۔ سیاست بھی اور عبادت بھی۔ آپؐ اللہ سبحانہ ہی کی خاطر یہ سارے امور سرانجام دیتے تھے۔

آپؐ نے بیسیوں وعدے کئے لیکن کبھی ایک بھی وعدہ خلافی نہیں کی۔ آپؐ نے متعدد معاہدے کئے لیکن کبھی ایک بار بھی معاہدہ شکنی نہیں کی۔ آپؐ نے بے شمار سیاسی مذاکرات کئے لیکن کبھی کسی سے دھوکا دہی اور مکر و فن سے کام نہیں لیا آپ نے دشمنوں کو پچھاڑا لیکن دھوکے سے نہیں ہمت و جرأت قوت بازو اور تائید ایزدی سے پچھاڑا۔

حضورؐ نے اپنی سیاسی زندگی سے دنیا کو یہ سبق دیا کہ ایمانداری، صداقت اور امانت داری جس طرح انفرادی زندگی میں انسان کے لئے خوبی ہے اسی طرح اجتماعی اور سیاسی زندگی میں بھی انہی چیزوں کا وزن ہے۔ حضورؐ نے مظلومیت کا دور بھی گزارا اور ایک مملکت کے سربراہ کی حیثیت سے بھی بہت دن گزارے۔ دوستوں سے وعدے کئے اور دشمنوں کی وعدہ شکنیوں کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ لیکن آپ نے کبھی کسی سے جھوٹا وعدہ نہیں کیا۔ آپؐ نے کبھی کسی کے ساتھ عہد کر کے اسے نہیں توڑا آپؐ نے اپنی کسی بات کی غلط تاویل تک کرنا پسند نہ فرمایا۔ اپنے حلیفوں کا آپ نے نازک ترین حالات میں بھی ہمیشہ ساتھ دیا دشمنوں کے چیلنج کو مشکل ترین حالات میں بھی جرأت سے قبول کیا۔ آپ نے جان کے دشمنوں کے ساتھ بھی انصاف کیا بلکہ انصاف سے بھی آگے بڑھ کر ہمیشہ فیاضی اور احسان کا راستہ اختیار کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ سیاست کی اس کسوٹی پر حضورؐ کے سوا دنیا کا کوئی

لہ بخاری کے مطابق یہ خطبہ حضور اکرمؐ کے حکم سے لکھ کر حضرت ابو شاہ کو دیا گیا تھا سیاسی زندگی ص ۳۰۵

انسان بھی کھرا نہیں اترتا ہے۔ یہ حکمت سیاست حضورؐ کو نبوت کے واسطے سے ہی ملی تھی اور اللہ مالک الملک کی حفاظت اور پناہ بھی آپ کو حاصل تھی ایسی جانگسل کشمکش میں ربع صدی تک مبتلا رہنا۔ فوجی اقدامات کرنا، دشمن کے شہر فتح کرنا، ہزاروں قیدیوں کا آنا جانا برسوں تک معمول رہا لیکن کوئی ایک واقعہ بھی حضورؐ کے فوجیوں کے ذریعے کسی کی عزت پہ دست درازی کا رونما نہیں ہوا۔ لوٹ مار نہیں ہوئی ظلم وستم اور جبر و تشدد نہیں ہوا۔ اس سے زیادہ پاکیزہ سیاست اور کسے کہا جا سکتا ہے۔ یہ سیاست اتنی ہی پاکیزہ ہے جتنی کوئی نماز پاکیزہ اور طیبت ہو سکتی ہے۔

آپ کی سیاسی جد وجہد میں جو اصول شروع سے آخر تک دکھائی دیتا ہے وہ یہ ہے کہ آپ ایک مامور من اللہ انسان ہیں آپ اپنے مالک کا عائد کیا ہوا فریضہ احسن طریقے سے ادا کر رہے ہیں۔ چنانچہ جب وہ فریضہ ادا ہو جاتا ہے تو آپ حجۃ الوداع کے موقعہ پر اپنے مالک کو بار بار گواہ کر کے اپنے فرض کی ادائیگی کا اعلان کرتے ہیں آپ کا دوسرا اصول توکل علی اللہ ہے حضورؐ سے بڑھ کر متوکل اور صابر انسان پوری تاریخ میں کہیں کوئی نظر نہیں آتا۔ طائف کے بازاروں میں پاؤں زخمی ہونے اور بے ہوش ہونے کا مرحلہ بھی ہے اور فتح مکہ کا عظیم موقعہ بھی ہے لیکن آپ ہر مقام پر متوکل اور صابر ہیں۔ آپ کی تیسری خصوصیت آپ کی بے نظیر جفاکشی اور جرأت و شجاعت ہے جو شیر دل کو مات کرتی اور پہاڑوں کو شرماتی ہے۔ چاہے وہ احد کا میدان ہو یا ہوازن کا

آپ کا چوتھا اصول فتنہ و فساد اور قتل و غارت گری کے مقابلے میں امن و سلامتی کا قیام ہے۔ یہ خصوصیات ہیں جو حضورؐ کی ساری جدوجہد میں ہمیں ہر مقام پہ دکھائی دیتی ہیں۔ آپ زیادہ سے زیادہ اتحاد کو قائم رکھتے اور دشمنوں کو باری باری سے مسخر کرتے ہیں، کہیں قوت اور کہیں دعوتِ اسلامی کے ذریعے آپ دین کے راستے صاف کرتے چلے جاتے ہیں ہجرت کے بعد یہ عمل مسلسل ۸۔۹ سال تک جاری رہتا ہے یہاں تک کہ دشمن سب کے سب راستہ چھوڑ کر ہٹ جاتے ہیں اور خدا کے بندوں اور ان کے خدا کے درمیان دعوتِ حق کا صراط مستقیم بے روک ٹوک اور بلا مزاحمت و مخالفت استوار ہو جاتا ہے۔

حضورؐ کے مشن کی کامیابی دنیا کی کامیابیوں میں سب سے بڑی مثالی کامیابی ہے اور حضورؐ کا راستہ ہی دین و سیاست اور دنیا و آخرت میں کامیابی کا مستند راستہ ہے اسی راستے کا نام صراط مستقیم ہے۔

بارگاہِ رسالتؐ میں حاضر ہونے والے وفود

ابن ہشام المعافری ، ترجمہ محمد عبدالحکیم شرف قادری

امام ابو محمد عبدالملک ابنِ ہشام معافری بصری (متوفی ۲۱۳ ھ) کی تصنیف "السیرۃ النبویۃ" سیرتِ طیبہ کے مستند ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ عام طور پر اسے "سیرت ابن ہشام" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ذیل میں بارگاہِ رسالت میں حاضر ہونے والے وفود کا تذکرہ اسی کتاب سے کسی قدر تلخیص کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔

جب رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے مکہ مکرمہ فتح کرلیا۔ تبوک سے فارغ ہوگئے اور قبیلہ ثقیف اسلام لا کر بیعت سے مشرف ہوگیا تو ہر جانب سے عرب کے وفود بارگاہِ رسالت میں حاضر ہونے لگے۔ (ابنِ اسحاق)

ابُو عبیدہ نے بیان کیا کہ یہ ۹ھ کا واقعہ ہے۔ اس سال کا نام: سنۃ الوفود" قرار دیا گیا۔ (ابنِ ہشام)

عام طور پر عرب، اسلام لانے میں تاخیر سے کام لے رہے تھے۔ وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم اور قریش کے تعلقات کیا نوعیت اختیار کرتے ہیں کیونکہ قریش عام لوگوں کے امام اور ہادی تھے۔ بیت اللہ شریف کے خادم اور حرم کے باسی تھے۔ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی اولاد تھے اور عرب کے راہنما تھے۔ ان کی یہ حیثیات مسلّم تھیں اور قریش نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم سے برسرِپیکار اور مخالفت میں پیش پیش تھے۔

جب مکہ مکرمہ فتح ہوگیا۔ قریش نے اطاعت اختیار کرلی اور حلقہ بگوش اسلام ہوگئے، تو عربوں نے محسوس کیا کہ ہمارے اندر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ جنگ اور دشمنی کی سکت نہیں تو ہر طرف سے ان کی جماعتوں کی جماعتیں حاضر ہو کر مشرف بہ اسلام ہونے لگیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کو فرمایا:

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۙ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۙ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۝ (النصر - پ ۳۰)	جب اللہ کی مدد اور فتح آئے اور لوگوں کو تم دیکھو کہ اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہوتے ہیں، تو اپنے رب کی ثنا کرتے ہوئے اس کی پاکی بولو اور اس سے بخشش چاہو بے شک وہ بہت توبہ قبول کرنے والا ہے۔

یعنی اس بنا پر اللہ تعالیٰ کی حمد کرو کہ اس نے تمہارے دین کو غلبہ عطا فرما دیا اور اس سے بخشش کی دعا مانگو کہ وہ بہت توبہ قبول فرمانے والا ہے۔

وفد بنو تمیم

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں عرب کے مختلف وفود حاضر ہوئے چنانچہ بنو تمیم کے معززین میں عطارد بن حاجب بن زرارہ

بن عدس تمیمی، اقرع[1] بن حابس تمیمی، زبرقان[2] بن بدر تمیمی، عمرو[3] بن الاہتم اور حتات بن یزید حاضر ہوئے۔

یہ حتات وہی ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اور حضرت امیر معاویہ بن ابوسفیان کے درمیان بھائی چارہ (عقدِ مواخات) قائم کرایا تھا۔ اُن کے علاوہ آپ نے جن مہاجرین صحابۂ کرام کے درمیان برادرانہ تعلقات قائم کیے ان میں سے چند نام یہ ہیں:

حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ، حضرت عثمان بن عفان اور عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت طلحہ بن عبیداللہ اور زبیر بن العوام، حضرت ابوذر غفاری اور مقداد بن عمرو بہرانی، حضرت معاویہ بن ابوسفیان اور حتات بن یزید مجاشعی رضی اللہ عنہم (ابنِ ہشام)

بنوتمیم کے عظیم وفد میں یہ حضرات بھی تھے۔ نعیم بن یزید، قیس[4] بن الحرث، قیس بن عاصم (یہ بنوسعد میں سے ہیں) (ابن اسحاق)

ان کے علاوہ عیینہ بن حصن بن حذیفہ بن بدر فزاری بھی ساتھ تھے۔ حضرت اقرع بن حابس اور حضرت عیینہ بن حصن مکہ معظمہ، حنین اور طائف کی فتح کے موقع پر بارگاہِ رسالت میں حاضر تھے۔ جب بنوتمیم کا وفد آیا، تو یہ حضرات بھی اس میں شامل تھے۔ وفد نے مسجد میں داخل ہوکر حجرات مبارکہ کے باہر کھڑے ہوکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پکارا کہ اے محمدؐ! باہر تشریف لائیں (حضورؐ آرام فرما تھے) ان کے اس طرح بلند آواز سے پکارنے پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت پہنچی۔ آپؐ باہر تشریف لائے تو انہوں نے کہا کہ ہم آپ کے پاس اظہارِ فخر کے لیے آئے ہیں۔ ہمارے شاعر اور خطیب کو کچھ کہنے کی اجازت دیجئے۔ آپؐ نے فرمایا، تمہارے خطیب کو اجازت ہے۔

بنوتمیم کا خطاب

عطارد بن حاجب نے اُٹھ کر کہا:

تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے جس کا ہم پر فضل اور احسان ہے، وہ تمام تعریفوں کے لائق ہے جس نے ہمیں بادشاہ بنایا اور ہمیں بکثرت مال دیا۔ ہم اس مال کو نیک راستوں میں خرچ کرتے ہیں۔ اس نے ہمیں مشرق والوں پر عزت، تعداد اور خوشحالی میں فوقیت عطا فرمائی۔ دوسرے لوگوں میں ہم جیسا کون ہے؟ کیا ہم لوگوں کے سردار فضیلت میں اُن سے زیادہ نہیں ہیں؟ جو شخص فخر میں ہمارا مقابلہ کرنا چاہے اُسے چاہیے کہ ہماری بیان کردہ خوبیوں کے مقابل اپنی خوبیاں گنوائے۔ اگر ہم چاہیں، تو گفتگو کو طول دے سکتے ہیں، لیکن خداداد نعمتوں کے بارے میں ہم اس سے زیادہ کچھ کہنا نہیں چاہتے ہماری شناخت کے لیے یہی کچھ کافی ہے۔ میری گزارش ہے کہ آپ بھی جوابی طور پر ایسی ہی گفتگو فرمائیں اور ہمارے فضائل سے بڑھ کر فضائل بیان کریں ——— یہ کہہ کر عطارد بیٹھ گئے۔

حضرت ثابت بن قیس کا خطاب

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ثابت بن قیس بن شماس کو حکم دیا جن کا تعلق بنو حرث بن خزرج سے تھا کہ تم اُٹھ کر اس کے خطاب کا جواب دو۔ حضرت ثابت بن

---

[1] اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کی یہ آیت نازل فرمائی:

اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ○	بے شک وہ جو تمہیں حجروں کے باہر سے پکارتے ہیں، ان میں اکثر بے عقل ہیں
وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ پ ۲۶ الحجرات آیت ۴/۵	اور اگر وہ صبر کرتے یہاں تک کہ تم آپ ان کے پاس تشریف لاتے، تو یہ اُن کے لیے بہتر تھا اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

نے کھڑے ہو کر فرمایا:

"تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے جس نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا فرمایا، اس کے حکم نے اُن کے بارے میں فیصلہ کیا، اس کا علم اس کی کرسی کو محیط ہے۔ کوئی چیز اس کے فضل کے بغیر پیدا نہیں ہوئی۔ اس کی قدرت کے کرشمے نے ہمیں بادشاہ بنایا۔ اس نے اپنی تمام مخلوق میں سے افضل ہستی کو رسولؐ منتخب فرمایا جن کا نسب انتہائی اعلیٰ گفتگو حد درجہ سچی اور شرافت میں سب سے بڑھ کر ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اُن پر اپنی کتاب اتاری، انہیں مخلوق پر امین بنایا۔ وہ تمام جہانوں میں سے اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ ہیں، پھر آپؐ نے لوگوں کو اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کی دعوت دی، آپ کے رشتے دار اور آپؐ کی قوم کے مہاجرین آپؐ پر ایمان لائے جو شرافت، وجاہت اور نیکی میں سب لوگوں سے افضل ہیں اور دعوت اسلام قبول کرنے میں دوسروں کے پیش رو ہیں، پھر ہم نے خدا اور رسولؐ کے بلانے پر لبیک کہی، ہم اللہ تعالیٰ کے دین کے مددگار اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروکار ہیں۔ ہم کافروں سے جنگ کرتے ہیں، یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آئیں، جو شخص اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لے آئے گا۔ ہم اس کے جان و مال کے محافظ ہیں اور جو کفر پر رہے گا۔ ہم اللہ تعالیٰ کی راہ میں اس سے ہمیشہ جہاد کریں گے اور اس کا قتل ہمارے لیے آسان ہوگا۔ میں اپنی گفتگو اسی پر ختم کرتا ہوں، اپنے لیے اور تمام مومن مردوں اور عورتوں کے لیے اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی دعا کرتا ہوں۔ تم پر اللہ تعالیٰ کی سلامتی ہو!

زبرقان کے اشعار

پھر زبرقان بن بدر نے کھڑے ہو کر یہ اشعار پڑھے

نَحْنُ الْكِرَامُ فَلَا حَيٌّ يُعَادِلُنَا　　مِنَّا الْمُلُوكُ وَفِينَا تُنْصَبُ الْبِيَعُ

ہم عزت والے ہیں کوئی قبیلہ ہماری ہمسری نہیں کر سکتا۔ ہم میں سے بادشاہ ہیں اور ہمارے ہاں عبادت گاہیں تعمیر کی جاتی ہیں۔

وَكَمْ قَسَرْنَا مِنَ الْأَحْيَاءِ كُلِّهِمِ　　عِنْدَ النِّهَابِ وَفَضْلُ الْعِزِّ يُتَّبَعُ

ہم نے قتل و غارت کے وقت تمام قبیلوں کو شکست دے دی اور عزت کی فضیلت کی پیروی کی جاتی ہے

وَنَحْنُ يُطْعَمُ عِنْدَ الْقَحْطِ مَطْعَمُنَا　　مِنَ الشِّوَاءِ إِذَا لَمْ يُؤْنَسِ الْقَزَعُ

جب بادل دیکھنے میں نہ آتا ہو اور قحط کا عالم ہو تو ہمارے ہاں بھنا ہوا گوشت کھلایا جاتا ہے۔

بِمَا تَرَى النَّاسَ تَأْتِينَا سَرَاتُهُمُ　　مِنْ كُلِّ أَرْضٍ هُوِيًّا ثُمَّ نَصْطَنِعُ

تم دیکھتے ہو کہ ہر خطے کے سرکردہ لوگ دوڑتے ہوئے ہمارے پاس آتے ہیں، اور ہم ان کی خاطر مدارات کرتے ہیں۔

نَنْحَرُ الْكُوْمَ عُبْطًا فِي أَرُوْمَتِنَا ۔ لِلنَّازِلِيْنَ إِذَا مَا أُنْزِلُوْا شَبِعُوْا

ہم اپنی فطرت کے مطابق مہمانوں کے لیے بڑی کوہانوں والے اونٹ ذبح کرتے ہیں اور جب انہیں مہمان بنایا جاتا ہے، تو خوب سیر ہو کر کھاتے ہیں۔

فَلَا تَرَانَا إِلَى حَيٍّ نُفَاخِرُهُمْ ۔ إِلَّا اسْتَفَادُوْا فَكَانُوا الرَّأْسَ يُقْتَطَعُ

تم ہمیں جس قبیلے کے پاس بھی فخر کرتے ہوئے دیکھو گے، اس قبیلے نے ہم سے فائدہ حاصل کیا ہوگا اور اس کا سر ہمارے سامنے جھکا ہوا ہوگا۔

فَمَنْ يُفَاخِرُنَا فِي ذَاكَ نَعْرِفُهُ ۔ فَيَرْجِعُ الْقَوْمُ وَالْأَخْبَارُ تُسْتَمَعُ

جو شخص اس معاملے میں ہم پر فخر کرتا ہے ہم اسے اچھی طرح پہچانتے ہیں، لوگ واپس چلے جاتے ہیں اور خبریں پھر بھی سُنی جاتی ہیں۔

إِنَّا أَبَيْنَا وَلَا يَأْبَى لَنَا أَحَدٌ ۔ إِنَّا كَذَلِكَ عِنْدَ الْفَخْرِ نَرْتَفِعُ

ہم انکار کر دیتے ہیں اور ہمارے سامنے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ ہم عظمتِ شان کے اظہار کے وقت ایسے ہی سر بلند رہتے ہیں۔ ابن ہشام نے کہا: ایک روایت میں یہ شعر بھی ہے۔

مِنَّا الْمُلُوْكُ وَفِيْنَا تُقْسَمُ الرُّبُعُ ۔ مِنْ كُلِّ أَرْضٍ هَوَانًا ثُمَّ نُتَّبَعُ

ہم میں سے بادشاہ ہیں، مالِ غنیمت کا چوتھائی حصہ (جاہلیت کے طریقے کے مطابق) ہم میں ہی تقسیم کیا جاتا ہے۔ ہر علاقے کے لوگ ذلیل ہو کر ہمارے پاس آتے ہیں، پھر ہماری پیروی کی جاتی ہے۔

ابن ہشام کہتے ہیں کہ مجھے یہ اشعار بنو تمیم کے بعض افراد نے بیان کیے لیکن اشعار کے اکثر ماہرین تسلیم نہیں کرتے کہ یہ اشعار زبرقان کے ہیں۔

حضرت حسّان کا جواب

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ حضرت حسّان بن ثابت رضی اللہ عنہ اس وقت حاضر نہ تھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پیغام بھیج کر انہیں بلایا۔ حضرت حسّان فرماتے ہیں: میرے پاس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قاصد آیا اور اس نے مجھے بتایا کہ تمہیں بنو تمیم کے شاعر کا جواب دینے کے لیے بلایا ہے۔ میں بارگاہِ رسالت میں حاضر ہونے کے لیے چل دیا اور میری زبان پر یہ اشعار تھے۔

مَنَعْنَا رَسُوْلَ اللهِ إِذْ حَلَّ وَسْطَنَا ۔ عَلَى أَنْفِ رَاضٍ مِنْ مَعَدٍّ وَرَاغِمِ

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے ہاں تشریف لائے، تو ہم نے قبیلۂ مَعَدّ کی خوشی اور ناخوشی کی پروا کیے بغیر آپ کی حفاظت کی۔

مَنَعْنَاهُ لَمَّا حَلَّ بَيْنَ بُيُوْتِنَا ۔ بِأَسْيَافِنَا مِنْ كُلِّ بَاغٍ وَظَالِمِ

جب سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہماری بستی میں تشریف لائے، تو ہم نے اپنی تلواروں کے ساتھ ہر باغی اور ظالم سے

آپ کی حفاظت کی۔

بِبَیْتِ حَرِیْدٍ عِزُّہٗ وَ ثَرَاؤُہٗ ۔۔۔ بِجَابِیَۃِ الْجَوْلَانِ وَسْطَ الْاَعَاجِمِ

ھَلِ الْمَجْدُ اِلَّا السُّوْدَدُ الْعَوْدُ وَالنَّدٰی ۔۔۔ وَجَاہُ الْمُلُوْکِ وَاحْتِمَالُ الْعَظَائِمِ

ایسے منفرد گھر میں جس کی عزت و منزلت وہی ہے جو عجمیوں میں جابیۃ الجولان (شام کے بادشاہوں یعنی قبیلۂ غسان) کی ہے۔

بزرگی کیا ہے؟ پشت در پشت منتقل ہونے والی سرداری، سخاوت، شاہانہ جاہ و حشم اور بڑی بڑی ذمہ داریاں اُٹھانے کا نام ہے۔ حضرت حسان بن ثابت فرماتے ہیں جب میں بارگاہِ رسالت میں پہنچا، تو بنو تمیم کا شاعر اپنا کلام پیش کر رہا تھا۔ میں نے اس کے کلام پر تعریض کی اور اُسی کی زمین میں شعر کہے۔ جب زبرقان فارغ ہوگیا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسان بن ثابت کو فرمایا، حسان!

کھڑے ہو کر اس کے اشعار کا جواب دو۔

حضرت حسان نے اُٹھ کر یہ شعر کہے ؎

اِنَّ الذَّوَائِبَ مِنْ فِہْرٍ وَّاِخْوَتِہِمْ ۔۔۔ قَدْ بَیَّنُوْا سُنَّۃً لِّلنَّاسِ تُتَّبَعُ

قبیلۂ فہر اور ان کے معاصر قبیلوں کے چوٹی کے سرداروں نے لوگوں کو وہ طریقہ بتایا جس کی پیروی کی جاتی ہے۔

یَرْضٰی بِہِمْ کُلُّ مَنْ کَانَتْ سَرِیْرَتُہٗ ۔۔۔ تَقْوَی الْاِلٰہِ وَکُلَّ الْخَیْرِ یَصْطَنِعُ

ان سرداروں سے ہر وہ شخص راضی ہے جس کی سرشت میں خوفِ خدا اور ہر نیکی کا اختیار کرنا شامل ہے۔

قَوْمٌ اِذَا حَارَبُوْا ضَرُّوْا عَدُوَّہُمْ ۔۔۔ اَوْحَاوَلُوا النَّفْعَ فِیْ اَشْیَاعِہِمْ نَفَعُوْا

یہ وہ لوگ ہیں جو جنگ میں اپنے دشمن کو نقصان پہنچائے بغیر نہیں رہتے اور جب اپنے ہمنواؤں کو فائدہ پہنچانا چاہتے ہیں، تو پہنچا کر رہتے ہیں۔

سَجِیَّۃٌ تِلْکَ مِنْہُمْ غَیْرُ مُحْدَثَۃٍ ۔۔۔ اِنَّ الْخَلَائِقَ فَاعْلَمْ شَرُّہَا الْبِدَعُ

ان کی فطرت یہ ہے کہ وہ نئی نئی چیزیں پیدا نہیں کرتے۔ اچھی طرح جان لو کہ مخلوق میں سے بدترین لوگ وہ ہیں، جو بدعات (مخالف شریعت امور) کو رواج دیتے ہیں۔

اِنْ کَانَ فِی النَّاسِ سَبَّاقُوْنَ بَعْدَہُمْ ۔۔۔ فَکُلُّ سَبْقٍ لِاَدْنٰی سَبْقِہِمْ تَبَعُ

اگر ان کے بعد کچھ لوگ سبقت لے جانے کی کوشش کریں گے، تو اُن کی ہر سبقت ان سرداروں کی معمولی سبقت سے بھی پیچھے ہوگی

لَا یَرْقَعُ النَّاسُ مَا اَوْھَتْ اَکُفُّہُمْ ۔۔۔ عِنْدَ الدِّفَاعِ وَلَا یُوْھُوْنَ مَا رَقَعُوْا

ان کے ہاتھوں نے جس عمارت کو منہدم کر دیا، تمام لوگ مل کر بھی اس کی تلافی نہیں کر سکتے اور جسے یہ استوار کر دیں، اسے دوسرے لوگ نقصان نہیں پہنچا سکتے۔

إنّ سابقوا الناس یوماً فاز سبقهم ... اذ وازنوا اهل مجد بالندیٰ متعوا

اگر یہ دوسرے لوگوں کا مقابلہ کریں، تو سبقت انہی کے حصّہ میں آتی ہے اور اگر سخاوت میں بڑے لوگوں کا موازنہ کریں، تو ان کا پلّہ بھاری رہتا ہے

اَعِفَّۃٌ ذُکِرَتْ فِی الْوَحْیِ عِفَّتُھُمْ ... لَا یَطْبَعُوْنَ وَلَا یُرْدِیْھِمْ طَمَعٌ

یہ ایسے پاکدامن ہیں جن کی پاکدامنی کا قرآنِ پاک گواہ ہے۔ بداخلاقی ان کے پاس سے بھی نہیں گزری اور نہ ہی لالچ انہیں ہلاک کر سکتا ہے۔

لَا یَبْخَلُوْنَ عَلٰی جَارٍ بِفَضْلِھِمْ ... وَلَا یَمَسُّھُمْ مِنْ مَطْمَعٍ طَبَعٌ

وہ اپنے مال سے اپنے ہمسایوں پر بخل نہیں کرتے اور نہ ہی لالچ کی آلودگی اُن کے قریب سے گزرتی ہے۔

اِذَا نَصَبْنَا لِحَیٍّ لَمْ نَدِبَّ لَھُمْ ... کَمَا یَدِبُّ اِلَی الْوَحْشِیَّۃِ الذَّرَعُ

جب ہم کسی قبیلے سے محاذ آرائی کرتے ہیں، تو اُن کی طرف دبے قدموں نہیں بڑھتے جیسے وحشی گائے کا بچہ اپنی ماں کی طرف بڑھتا ہے (بلکہ کھلم کھلا پیش قدمی کرتے ہیں)

نَسْمُوْا اِذَا الْحَرْبُ نَالَتْنَا مَخَالِبُھَا ... اِذَا الزَّعَانِفُ مِنْ اَظْفَارِھَا خَشَعُوْا

جب جنگ کے پنجے ہم تک پہنچتے ہیں، تو ہمارے مجاہد کچھ اور اونچے ہو جاتے ہیں، حالانکہ ایسے وقت میں حاشیہ بردار قسم کے لوگ جنگ کے ناخنوں سے خوفزدہ ہو کر دبک جاتے ہیں۔

لَا یَفْخَرُوْنَ اِذَا نَالُوْا عَدُوَّھُمْ ... وَاِنْ اُصِیْبُوْا فَلَا خَوَرٌ وَلَا ھَلَعٌ

جب وہ اپنے دشمن پر غلبہ پالیں، تو اتراتے نہیں ہیں اور اگر انہیں چوٹ لگ جائے تو کمزوری اور بزدلی کا مظاہرہ نہیں کرتے

کَاَنَّھُمْ فِی الْوَغٰی وَالْمَوْتُ مُکْتَنِعٌ ... اَسْدٌ بِحَلْیَۃَ فِیْ اَرْسَاغِھَا فَدَعٌ

جب میدانِ جنگ میں موت سامنے نظر آ رہی ہو، تو وہ یوں محسوس کرتے ہیں گویا (حلیۃ (ایک مقام) کے شیر ہیں جن کے پنجوں میں کجی ہے۔

خُذْ مِنْھُمْ مَا اَتٰی عَفْوًا اِذَا غَضِبُوْا ... وَلَا یَکُنْ ھَمُّکَ الْاَمْرَ الَّذِیْ مَنَعُوْا

اُن کے غضب کی حالت میں جو عطیہ مل جائے لے لو اور جس چیز سے وہ منع کر دیں اس کا ارادہ بھی نہ کرو۔

فَاِنَّ فِیْ حَرْبِھِمْ فَاتْرُکْ عَدَاوَتَھُمْ ... شَرًّا یُخَاضُ عَلَیْہِ السَّمُّ وَالسَّلَعُ

اُن کی دشمنی کو چھوڑ دو کیونکہ ان کی دشمنی میں ایسی پریشانی ہے جس میں زہر اور انتہائی کڑوی بوٹی سلع ملا دی گئی ہے۔

اَکْرِمْ بِقَوْمٍ رَسُوْلُ اللہِ شِیْعَتُھُمْ ... اِذَا تَفَاوَتَتِ الْاَھْوَاءُ وَالشِّیَعُ

وہ قوم کتنی معزز ہے کہ خواہشات اور جماعتوں کے اختلاف کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی جماعت میں

اَھْدٰی لَھُمْ مِدْحَتِیْ قَلْبٌ یُؤَازِرُہٗ ... فِیْمَا اُحِبُّ لِسَانٌ حَائِکٌ صَنَعٌ

اُن کے لیے میری مدح و ثنا کا تحفہ ایسے دل نے پیش کیا ہے، جس کی ایک فصیح و بلیغ اور فنکار زبان پشت پناہی کر رہی ہے۔

فَاِنَّهُمْ اَفْضَلُ الْاَحْيَاءِ كُلِّهِمْ ۔۔۔ اِنْ جَدَّ بِالنَّاسِ جِدُّ الْقَوْلِ اَوْ شَمَعُوْا

بے شک وہ تمام قبیلوں سے افضل ہیں، خواہ لوگوں کی سنجیدہ گفتگو چل رہی ہو یا ہنسی مزاح کی۔

ابن ہشام کہتے ہیں ابو زید نے یہ شعر سنایا۔

يَرْضٰى بِهَا كُلُّ مَنْ كَانَتْ سَرِيْرَتُهٗ ۔۔۔ تَقْوَى الْاِلٰهِ وَبِالْاَمْرِ الَّذِيْ شَرَعُوْا

جس کے دل میں خوف خدا ہے وہ ان حضرات سے اور ان کے شروع کیے ہوئے کام سے ضرور خوش ہوگا۔

زبرقان کے مزید اشعار

ابن ہشام کہتے ہیں کہ مجھے بنو تمیم کے بعض ماہرین اشعار نے بیان کیا کہ جب زبرقان بن بدر، بنو تمیم کے وفد کے ہمراہ بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوا، تو اس نے یہ اشعار پڑھے۔

اَتَيْنَاكَ كَيْمَا يَعْلَمُ النَّاسُ فَضْلَنَا ۔۔۔ اِذَا احْتَفَلُوْا عِنْدَ احْتِضَارِ الْمَوَاسِمِ

بِاَنَّا فُرُوْعُ النَّاسِ فِيْ كُلِّ مَوْطِنٍ ۔۔۔ وَاَنْ لَيْسَ فِيْ اَرْضِ الْحِجَازِ كَدَارِمِ

وَاَنَّا نَذُوْدُ الْمُعْلِمِيْنَ اِذَا انْتَخَوْا ۔۔۔ وَنَضْرِبُ رَاْسَ الْاَصْيَدِ الْمُتَفَاقِمِ

ہم آپ کے پاس اس لیے حاضر ہوئے ہیں کہ جب لوگ مختلف مواقع کی حاضری کے وقت محفلیں منعقد کریں، تو انہیں ہماری فضیلت معلوم ہو جائے۔

اور یہ کہ ہم ہر جگہ سرکردہ لوگ ہیں اور حجاز کی زمین میں قبیلۂ دارم (بنو تمیم کی شاخ) جیسا کوئی نہیں ہے۔

اور یہ کہ جب نشان لگا کر لڑنے والے تکبر کا مظاہرہ کریں، تو ہم انہیں پیچھے دھکیل دیتے ہیں اور ٹیڑھی گردن والے متکبرین کا سر قلم کر دیتے ہیں۔

وَاَنَّ لَنَا الْمِرْبَاعَ فِيْ كُلِّ غَارَةٍ ۔۔۔ نُغِيْرُ بِنَجْدٍ اَوْ بِاَرْضِ الْاَعَاجِمِ

ہر لوٹ مار میں ہمارا چوتھائی حصہ ہوتا ہے (کیونکہ ہم سردار ہیں) خواہ نجد میں لوٹ مچائی جائے یا عجمی علاقے میں۔

حضرت حسّان کا جواب

حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کھڑے ہو کر یہ جوابی اشعار پڑھے۔

هَلِ الْمَجْدُ اِلَّا السُّؤْدَدُ الْعَوْدُ وَالنَّدٰى ۔۔۔ وَجَاهُ الْمُلُوْكِ وَاحْتِمَالُ الْعَظَائِمِ

عزت و شرافت، صرف قدیم سرداری، سخاوت، شاہانہ جاہ و حشم اور بڑی بڑی ذمہ داریاں اٹھانے کا نام ہے

نَصَرْنَا وَاٰوَيْنَا النَّبِيَّ مُحَمَّدًا ۔۔۔ عَلٰى اَنْفِ رَاضٍ مِنْ مَعَدٍّ وَرَاغِمِ

ہم نے قبیلۂ معد کی خوشی کی اور ناخوشی کی پروا کیے بغیر نبی عربی محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت و اعانت کی اور رہائش کے لیے جگہ پیش کی۔

بِحَيٍّ حَرِيْدٍ أَمْلُهُ وَثَرَاؤُهُ   بِجَابِيَةِ الْجَوْلَانِ وَسْطَ الْأَعَاجِمِ

ایسے تگڑا قبیلے میں جس کی عزت و منزلت رہی ہے جو عجمیوں کے درمیان جابیۃ الجولان (قبیلۂ غسان، بادشاہانِ شام) کی ہے۔

نَصَرْنَاهُ لَمَّا حَلَّ وَسْطَ دِيَارِنَا   بِأَسْيَافِنَا مِنْ كُلِّ بَاغٍ وَظَالِمِ

جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے علاقے میں تشریف لائے، تو ہم نے اپنی تلواروں کے ساتھ، ہر باغی اور ظالم سے آپ کی حفاظت کی۔

جَعَلْنَا بَنِيْنَا دُوْنَهُ وَبَنَاتِنَا   وَطِبْنَا لَهُ نَفْسًا بِفَيْءِ الْمَغَانِمِ

ہم نے اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کو آپ کی حفاظت پر مامور کر دیا اور خوش دلی سے مالِ غنیمت آپ کے سپرد کر دیا (جب حُنین کے ن آپ نے مالِ غنیمت مؤلفۃ القلوب کو دیا اور انصار کو نہیں دیا۔

وَنَحْنُ ضَرَبْنَا النَّاسَ حَتّٰى تَتَابَعُوْا   عَلٰى دِيْنِهِ بِالْمُرْهَفَاتِ الصَّوَارِمِ

ہم نے تیز تلواروں سے کافروں سے جہاد کیا، یہاں تک کہ وہ پے در پے آپ کے دین میں داخل ہونے لگے۔

وَنَحْنُ وَلَدْنَا مِنْ قُرَيْشٍ عَظِيْمَهَا   وَلَدْنَا نَبِيَّ الْخَيْرِ مِنْ آلِ هَاشِمِ

ہم سے قریش کے عظیم ترین انسان پیدا ہوئے، پھر ہمارے ہاں آلِ ہاشم سے بھلائیوں کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے (حضرت عبدالمطلب کی والدہ ایک انصاری خاتون تھیں)

بَنِيْ دَارِمٍ لَا تَفْخَرُوْا إِنَّ فَخْرَكُمْ   يَعُوْدُ وَبَالًا عِنْدَ ذِكْرِ الْمَكَارِمِ

بنو دارم! تم فخر نہ کرو، عظمتوں کے بیان کے وقت تمہارا فخر وبال بن جائے گا۔

هَبِلْتُمْ عَلَيْنَا تَفْخَرُوْنَ وَأَنْتُمْ   لَنَا خَوَلٌ مَا بَيْنَ ظِئْرٍ وَخَادِمِ

تمہاری ماں تمہیں گم کر بیٹھے! تم ہمارے غلاموں کی حیثیت رکھتے ہو، تمہاری عورتیں اُجرت پہ دودھ پلاتی ہیں اور مرد خدمت گار ہیں، اس کے باوجود تم ہم پر فخر کرتے ہو۔

فَإِنْ كُنْتُمْ جِئْتُمْ لِحَقْنِ دِمَائِكُمْ   وَأَمْوَالِكُمْ أَنْ تُقْسَمُوْا فِي الْمَقَاسِمِ
فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ نِدًّا وَأَسْلِمُوْا   وَلَا تَلْبَسُوْا زِيًّا كَزِيِّ الْأَعَاجِمِ

اگر تم اپنے خونوں کی حفاظت اور مالوں کو غنیمت کے طور پہ تقسیم کیے جانے سے بچانے کے لیے آئے ہو تو کسی کو اللہ تعالیٰ کا شریک نہ ٹھہراؤ، اسلام لے آؤ اور عجمیوں ایسا لباس نہ پہنو!

وفد کا مشرف باسلام ہونا

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ جب حضرت حسّان بن ثابت فارغ ہوئے تو اقرع بن حابس نے کہا، میرے باپ کی قسم! اس شخص (نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم) کو تائید ایزدی حاصل ہے، ان کا خطیب ہمارے خطیب سے اور ان کا شاعر ہمارے شاعر سے بہتر ہے، ان کی آوازیں ہماری آوازوں سے زیادہ میٹھی ہیں بنو تمیم اس گفتگو سے فارغ ہو کر مشرف باسلام ہو گئے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں انعامات سے خوب

خوب نوازا۔

عمرو بن الاہتم، عمر میں سب سے چھوٹے تھے۔ انہیں یہ لوگ سواریوں کی دیکھ بھال کے لیے پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ قیس بن عاصم، عمرو بن الاہتم سے ناخوش تھے۔ انہوں نے عرض کیا، یا رسولؐ اللہ! ایک شخص ہماری سواریوں کے پاس ہے، وہ ایک نوعمر لڑکا ہے اور ان کا تحقیر آمیز انداز میں ذکر کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرو بن الاہتم کو بھی اتنا ہی انعام عطا فرمایا جتنا دوسروں کو دیا تھا جب عمرو بن الاہتم کو معلوم ہوا کہ قیس نے ان کے بارے میں کیا کچھ کہا ہے، تو انہوں نے قیس کی ہجو میں کہا

ظَلِلْتَ مُفْتَرِشَ الْهَلْبَاءِ تَشْتِمُنِيْ عِنْدَ النَّبِيِّ فَلَمْ تَصْدُقْ وَلَمْ تُصِبِ

تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مجھے گالیاں دینے لگا۔ اس حال میں کہ تیری داڑھی بکھری ہوئی تھی۔ تو نے نہ سچ کہا اور نہ صواب کو پہنچا۔

وفد بنو عامر

رسولؐ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بنو عامر کا جو وفد آیا اس میں تین اشخاص تھے۔ یہ تینوں اپنی قوم کے سردار اور شیطان تھے۔ ان کے نام یہ ہیں: (۱) عامر بن طفیل (۲) اربد بن قیس (۳) جبار بن سلمی۔

اللہ تعالیٰ کی حفاظت

دشمن خدا عامر بن طفیل، رسولؐ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، تو اس کا ارادہ یہ تھا کہ فریب کاری سے کام لے کر آپ پر حملہ کرے گا۔ اس سے پہلے اس کی قوم نے کہا تھا عامر! لوگ اسلام لا چکے ہیں، تم بھی ایمان لے آؤ۔ عامر نے کہا تھا: میں نے قسم کھائی تھی کہ میں اس وقت تک کوشش جاری رکھوں گا جب تک عرب میرے نقش قدم پر چلنے کے لیے تیار نہیں ہو جاتے۔ کیا اب میں اس قریشی جوان (نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم) کا پیروکار بن جاؤں؟

عامر نے اپنے ساتھی اربد کو ہدایت دی تھی کہ جب ہم اس شخص (نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس پہنچیں گے، تو میں انہیں اپنی طرف متوجہ کر لوں گا۔ تم اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھا کر تلوار سے حملہ کر دینا۔ جب یہ لوگ بارگاہِ رسالت میں پہنچے، تو عامر نے کہا اے محمدؐ! مجھے تنہائی کا موقع دیجیے! آپؐ نے فرمایا: بخدا! ایسا نہیں ہو گا۔ جب تک تم اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان نہیں لے آتے اس نے پھر تخلیے کی درخواست کی اور گفتگو کرنے لگا۔ ساتھ ہی وہ منتظر تھا کہ اربد حملہ کر دے۔ لیکن اربد بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ عامر نے پھر کہا اے محمدؐ! مجھے تخلیہ کا موقع دیں، آپ نے وہی جواب دیا کہ بخدا! ایسا نہیں ہو گا جب تک تم خدائے واحد پر ایمان نہیں لے آتے۔ آپؐ کے انکار پر کہنے لگا۔ خدا کی قسم! میں اس خطے کو گھوڑوں اور مردوں سے بھر دوں گا۔ جب وہ چلا گیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی کہ اے اللہ! مجھے عامر بن طفیل کے شر سے محفوظ فرما۔

جب یہ لوگ بارگاہِ رسالت سے باہر آئے تو عامر نے کہا اربد! تم نے میرے حکم پر عمل کیوں نہیں کیا؟ خدا کی قسم! میرے نزدیک تمام روئے زمین پر تجھ سے زیادہ خوفناک شخص کوئی نہ تھا۔ بخدا! آج کے بعد میں تجھ سے کبھی نہیں ڈروں گا۔ اربد نے کہا: تیرا باپ نہ رہے، تو میرے بارے میں جلد بازی نہ کر، خدا کی قسم! جب بھی میں وار کرنا چاہتا تھا، تو میرے اور اس شخص (نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم)

کے درمیان تو حائل ہو جاتا تھا اب مجھے تیرے سوا کوئی دکھائی نہ دیتا۔ کیا تجھ پر تلوار کا وار کر دیتا۔

عامر کی حسرت ناک موت یہ لوگ اپنے شہروں کی طرف جا رہے تھے کہ راستے ہی میں اللہ تعالیٰ نے عامر کی گردن میں طاعون پیدا کر دیا جس سے وہ بنو سلول کی ایک عورت کے گھر میں ہلاک ہو گیا۔ مرتے ہوئے وہ کہہ رہا تھا: اے بنو عامر! کیا میں جوان اُونٹ کی طرح طاعون کے غدود میں مبتلا ہو کر بنو سلول کی ایک عورت کے گھر مر جاؤں گا۔

اربد کی ہولناک ہلاکت ابن اسحاق کہتے ہیں عامر کو دفن کر کے اس کے ساتھی اپنے علاقے کی طرف چل دیے۔ جب ان کی اپنی قوم، بنو عامر سے ملاقات ہوئی، تو انہوں نے پوچھا اربد! تمہارے پیچھے کیا ہے؟ اس نے کہا کچھ بھی نہیں، بخدا! انہوں نے مجھے ایک چیز کی عبادت کی دعوت دی۔ اگر اس وقت وہ میرے سامنے ہوں تو میں تیروں کی بوچھاڑ کر کے انہیں قتل کر دوں۔ اس گفتگو کے ایک یا دو دن بعد وہ اپنے اونٹ کے پیچھے جا رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر اور اس کے اُونٹ پر بجلی نازل فرما دی جس نے دونوں کو جلا کر راکھ کر دیا۔ اربد بن قیس، ماں کی طرف سے لبیدؓ بن ربیعہ کا بھائی تھا۔

ابن ہشام اپنی سند کے ساتھ حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے عامر اور اربد کے بارے میں یہ آیتیں نازل فرمائیں۔

اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى (الی قولہ) لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ؕ وَاِذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ ○ (الرعد — ۸ - ۱۱)	اللہ جانتا ہے جو کچھ کسی مادہ کے پیٹ میں ہے (یہاں تک کہ فرمایا) آدمی کے لیے بدلی والے فرشتے ہیں۔ اس کے آگے پیچھے، کہ بحکم خدا اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ بے شک اللہ کسی قوم سے اپنی نعمت نہیں بدلتا۔ جب تک وہ خود اپنی حالت نہ بدل دیں، اور جب اللہ کسی قوم سے برائی چاہے، تو وہ پھر نہیں سکتی اور اس کے سوا ان کا کوئی حمایتی نہیں۔ (ترجمہ مولانا احمد رضا خاں بریلوی)

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا: "مُعَقِّبٰتٌ" سے مراد وہ فرشتے ہیں جو بحکم خداوندی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت

لہ حضرت لبید مشرف باسلام ہو گئے تھے۔ اس کے بعد ساٹھ سال زندہ رہے۔ اسلام لانے کے بعد انہوں نے شاعری ترک کر دی۔ حضرت عمر فاروقؓ نے اس کا سبب پوچھا، تو کہنے لگے: اللہ تعالیٰ نے مجھے سورۂ بقرہ اور آل عمران سکھا دی ہے، اس کے بعد میں شعر کیوں کہوں گا۔ اس بات پر خوش ہو کر حضرت عمرؓ نے اُن کے وظیفے میں پانچ سو درہم کا اضافہ کر دیا۔ کہتے ہیں مسلمان ہونے کے بعد صرف ایک شعر کہا ؎

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ اِذْ لَمْ يَاْتِنِيْ اَجَلِيْ حَتّٰى اكْتَسَيْتُ مِنَ الْاِسْلَامِ سِرْبَالًا

خدا کا شکر ہے کہ اسلام کا لباس پہننے سے پہلے میری موت واقع نہیں ہوئی۔ الروض الانف ج ۲ ص ۳۳۸

کرنے والے ہیں۔ پھر ارید اور اس چیز کا ذکر کیا جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اُسے ہلاک کیا۔ چنانچہ فرمایا:

وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيبُ بِهَا مَنْ يَشَاءُ وَهُمْ يُجَادِلُونَ فِي اللَّهِ وَهُوَ شَدِيدُ الْمِحَالِ ۝ (الرعد آیت ۱۳)

اور کڑک بھیجتا ہے، تو اسے ڈالتا ہے جس پر چاہے اور وہ اللہ میں جھگڑتے ہوتے ہیں اور اس کی پکڑ سخت ہے۔

(ترجمہ مولانا احمد رضا خاں بریلوی)

وفد سعد بن بکر

ابن اسحاق کہتے ہیں بنو سعد بن بکر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ضمام بن ثعلبہ[1] کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا۔

ابن اسحاق نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالےٰ عنہما سے روایت کیا کہ سعد بن بکر نے ضمام بن ثعلبہ کو بارگاہِ رسالت میں نمائندہ بنا کر بھیجا۔ وہ آئے تو اونٹ کو مسجد کے دروازے پر گھٹنا باندھ کر بٹھا دیا۔ پھر مسجد میں داخل ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام میں تشریف فرما تھے۔ ضمام مضبوط جسم کے مالک تھے اور انہوں نے بالوں کی کثرت کی وجہ سے دو مینڈھیاں بنا رکھی تھیں انہوں نے صحابہ کرام کے پاس آکر پوچھا تم میں ابن عبدالمطلب کون ہیں؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں ابن عبدالمطلب ہوں۔ پھر پوچھا آپ محمد ہیں؟ آپ نے فرمایا: ہاں کہنے لگے اے ابن عبدالمطلب! میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔ آپ میرے سوال کی درشتی کو محسوس نہ فرمائیں آپ نے فرمایا: تم جو پوچھنا چاہو پوچھو، میں محسوس نہیں کروں گا۔

ضمام نے کہا: میں آپ کو خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں جو آپ کا، آپ سے پہلوں اور پچھلوں کا خدا ہے کیا اللہ تعالےٰ نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا ہے؟ آپ نے فرمایا: میں خدا کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ یہی بات ہے پھر پوچھا کہ میں آپ کو خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں جو آپ کا خدا ہے اور آپ سے پہلے گزرنے اور بعد میں آنے والوں کا خدا ہے کیا اللہ تعالےٰ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ ہمیں حکم دیں کہ ہم صرف اُسی کی عبادت کریں اور اُس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائیں۔ اور ان بتوں کو چھوڑ دیں جنہیں ہمارے آباؤ اجداد اللہ تعالےٰ کے ساتھ پوجتے تھے آپ نے فرمایا: ہاں۔ پھر اس نے کہا میں آپ کو اللہ تعالےٰ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں جو آپ کا اور آپ سے پہلے گزرنے اور بعد میں آنے والوں کا خدا ہے کیا اللہ تعالےٰ نے حکم آپکو دیا ہے کہ ہم یہ پانچ نمازیں پڑھیں؟ آپ نے فرمایا: ہاں پھر وہ اسلام کے دیگر فرائض، زکوٰۃ، روزہ حج اور اس کے علاوہ دوسرے احکام کے بارے میں ایک ایک کر کے پوچھنے لگا، اور ہر ایک کے ساتھ اسی طرح قسم دیتا جس طرح وہ پہلے دے چکا تھا۔

سوالات سے فارغ ہو کر کہنے لگے: میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالےٰ کے سوا کوئی سچا معبود نہیں اور محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] ان ہی کے بارے میں حضرت طلحہ بن عبید اللہ نے فرمایا: ہمارے پاس ایک اعرابی اہل نجد سے آیا جس کے سر کے بال بکھرے ہوئے تھے اس کی آواز کی بھنبھناہٹ سنائی دے رہی تھی لیکن یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے جب وہ قریب ہوا تو معلوم ہوا کہ اسلام کے بارے میں پوچھ رہا ہے۔ یہ حدیث امام مالک نے مؤطا میں روایت کی۔ (السہیلی: الروض الانف ج ۲ ص ۳۴۹)

اللہ تعالیٰ کے رسولؐ ہیں۔ میں ان فرائض کو ادا کروں گا اور جن چیزوں سے آپ نے منع کیا ہے، ان سے اجتناب کروں گا۔ پھر نہ کمی کروں گا نہ زیادتی۔ پھر اُٹھ کر اپنے اُونٹ کی طرف چلے گئے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر مینڈھیوں والے نے سچ کہا تو جنت میں داخل ہوگا۔

حضرت ضمام اونٹ کے پاس آئے۔ اس کی رسی کھولی اور روانہ ہو کر اپنی قوم کے پاس پہنچ گئے۔ لوگ اُن کے پاس جمع ہو گئے، تو انہوں نے سب سے پہلے یہ بات کہی: لات اور عزّیٰ بہت بُرے ہیں، لوگوں نے کہا ضمام! برص، کوڑھ اور جنون سے ڈرو اور ایسی بات زبان پر نہ لاؤ۔ انہوں نے فرمایا: خدا کے بندو! خدا کی قسم! یہ بُت نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں نہ فائدہ۔ اللہ تعالیٰ نے رسولِ گرامی کو بھیج دیا ہے۔ ان پر کتاب نازل کی اور تمہیں شرک و کفر سے نجات کی راہ دکھا دی ہے۔ جس شرک و کفر میں تم مبتلا تھے۔ میں گواہی دیتا ہُوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے عبدِ مکرم اور رسولؐ ہیں اور میں تمہارے پاس ان کے احکام لے کر آیا ہوں کہ انہوں نے کن چیزوں کا حکم دیا ہے اور کن چیزوں سے منع فرمایا ہے۔ شام سے پہلے پہلے وہاں جتنے مرد و زن تھے سب مسلمان ہو گئے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: ہم نے کسی قوم کا نمائندہ حضرت ضمام بن ثعلبہ سے افضل نہیں سنا۔

وفد عبد القیس

ابن اسحاق نے کہا: قبیلۂ عبد القیس کے جارود بن عمرو بن حنش حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

ابن ہشام کہتے ہیں: جارود بن بشر بن المعلی وفد عبد القیس میں حاضر ہوئے یہ پہلے عیسائی تھے۔

ابن اسحاق فرماتے ہیں: مجھے اس شخص نے بیان کیا جو میرے نزدیک مُتّہم نہیں ہے کہ حسین کہتے ہیں کہ جب جارود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہُوئے، تو آپ نے ان پر اسلام کی تعلیمات پیش کیں۔ انہیں اسلام کی دعوت دی اور ترغیب دی، انہوں نے کہا اے محمدؐ! میں اس سے پہلے ایک دین پر تھا۔ اب میں آپ کے دین کے لیے اس دین کو ترک کرتا ہُوں۔ کیا آپ میرے دین کی ضمانت دیں گے؟ آپ نے فرمایا: ہاں اگر اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس دین سے بہتر دین کی ہدایت عطا فرمائی۔ چنانچہ حضرت جارود اور ان کے ساتھی مسلمان ہو گئے۔

پھر انہوں نے عرض کیا کہ ہمیں سواریاں عطا کی جائیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بخدا! اس وقت میرے پاس تمہیں سوار کرنے کے لیے کوئی سواری نہیں ہے۔ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! مدینہ طیبہ اور ہمارے شہروں کے درمیان گم راہ لوگ موجود ہیں کیا ہم اُن کے پاس سے ہوتے ہوئے گزر جائیں؟ فرمایا: نہیں۔ یہ تو آگ میں جلنے کے مترادف ہے۔

دورِ ارتداد میں ثابت قدمی

حضرت جارود اجازت لے کر اپنی قوم کے پاس چلے گئے۔ وصال تک پوری ثابت قدمی کے ساتھ دین پر قائم رہے، انہوں نے ارتداد کا زمانہ بھی پایا۔ جب ان کی قوم کے کچھ لوگ جو اسلام لا چکے تھے۔ غرور بن منذر بن نعمان کے بہکانے پر مرتد ہو گئے، تو حضرت جارود نے کھڑے ہو کر حق کی گواہی دی، لوگوں کو اسلام کی طرف بُلایا اور فرمایا:۔

لوگو! میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے عبدِ مکرم اور رسول ہیں اور جو شخص یہ گواہی نہیں دیتا میرے نزدیک کافر ہے۔

ابنِ ہشام کہتے ہیں ایک روایت میں ہے: "وَاَكْفِيْ مَنْ لَمْ يَشْهَدْ" جو گواہی نہیں دیتا، میں اس کے لیے کافی ہوں۔

وفد بنو حنیفہ
اور مسیلمۂ کذاب کی آمد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بنو حنیفہ کا وفد حاضر ہوا، اس میں مسیلمہ بن حبیب حنفی کذاب بھی شامل تھا۔

ابنِ ہشام نے اس کا نام مسیلمہ بن ثمامہ اور کنیت ابو ثمامہ بیان کی۔

ابن اسحاق کہتے ہیں، ان کا قیام بنو نجار کی ایک انصاریہ، بنت الحرث کے گھر تھا۔ مجھے مدینہ طیبہ کے بعض علمائے نے بیان کیا کہ بنو حنیفہ مسیلمہ کو کپڑوں میں چھپا کر بارگاہ رسالت میں لائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابۂ کرام کے جھرمٹ میں تشریف فرما تھے اور آپ کے دستِ اقدس میں کھجور کی چھڑی تھی، جس کے کنارے پر کچھ پتے تھے۔ مسیلمہ کپڑوں میں لپٹا لپٹایا بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کی اور آپ سے کچھ مطالبہ کیا۔ آپ نے فرمایا: اگر تو مجھ سے یہ لکڑی بھی مانگے تو نہیں دوں گا۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ مجھے یمامہ کے رہنے والے، قبیلۂ بنو حنیفہ کے ایک شیخ نے بیان کیا کہ مسیلمہ کا واقعہ بیان مذکور سے مختلف تھا اس شیخ نے بیان کیا کہ بنو حنیفہ کا وفد بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوا۔ یہ لوگ مسیلمہ کو اپنی سواریوں کے پاس چھوڑ گئے۔ اسلام لانے کے بعد اس کی یاد آئی، تو عرض کیا یا رسول اللہ! ہم اپنے ایک ساتھی کو اپنے سامان اور سواریوں کی حفاظت کے لیے چھوڑ آئے ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لیے بھی اتنے ہی عطیے کا حکم دیا، جتنا دوسروں کو دیا تھا اور فرمایا: اس کی جگہ کچھ بری نہیں ہے: مطلب یہ تھا کہ وہ اپنے ساتھیوں کے سامان کی حفاظت کر رہا ہے۔ پھر یہ لوگ مسیلمہ کا حصہ لے کر بارگاہِ رسالت سے واپس آگئے۔

جب یمامہ پہنچے تو دشمنِ خدا مسیلمہ مرتد ہو گیا اور نبی بن بیٹھا اور دروغ گوئی سے کام لیتے ہوئے کہنے لگا کہ میں نبوت میں ان کے ساتھ شریک ہوں۔ اپنے ساتھیوں کو کہنے لگا جب تم نے میرا ذکر کیا تھا، تو حضورؐ نے فرمایا نہیں تھا کہ اَمَا اِنَّهٗ لَيْسَ بِشَرِّكُمْ مَكَانًا اس کی جگہ بری نہیں ہے۔ یہ اس لیے کہا تھا کہ انہیں علم تھا کہ میں نبوت میں اُن کے ساتھ شریک ہوں، پھر اُن کے سامنے من گھڑت مسجع مقفٰی کلام پیش کرتا اور دعویٰ یہ کرتا کہ یہ قرآن پاک جیسا کلام ہے۔ مثلاً۔

لَقَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَى الْحُبْلٰى اَخْرَجَ مِنْهَا نَسَمَةً تَسْعٰى مِنْ بَيْنِ صِفَاقٍ وَحَشَا وَاَحَلَّ لَهُمُ الْخَمْرَ وَالزِّنَا وَوَضَعَ عَنْهُمُ الصَّلٰوةَ۔

اللہ تعالیٰ نے حاملہ پر انعام فرمایا۔ اس کی انتڑیوں اور پیٹ کی جھلی کے درمیان سے ایسی روح نکالی جو دوڑتی پھرتی ہے اور اللہ تعالیٰ نے بندوں کے لیے شراب اور زنا کو حلال کر دیا اور نماز معاف کر دی۔

اس کے باوجود وہ گواہی دیتا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں، بنو حنیفہ اس پر اس کے ساتھ متفق ہو گئے

اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ مذکورہ بالا دونوں میں سے کون سا واقعہ صحیح ہے۔

وفد بنو طے

قیادت : زید الخیل

ابن اسحاق نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں قبیلۂ طے کا وفد حاضر ہوا جس میں ان کے سردار زید الخیل بھی تھے جب یہ لوگ بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے تو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے گفتگو فرمائی اور ان کے سامنے تعلیم اسلام پیش کی تو وہ دل و جان سے مسلمان ہو گئے مجھے قبیلۂ طے کے غیر متہم شخص نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:۔

میرے سامنے عرب کے جس شخص کی بھی فضیلت بیان کی گئی پھر وہ میرے پاس آیا تو جو کچھ اس کے بارے میں کہا گیا تھا میں نے اسے اس سے کم پایا سوائے زید الخیل کے ان کے بارے میں بیان کرنے والا پوری طرح بیان نہیں کر سکا تھا۔

پھر آپ نے اُن کا نام "زید الخیر" رکھا اور اُنہیں فید (گاؤں) اور اس کے آس پاس کی زمینیں عنایت فرمائیں اور تحریر لکھ کر دے دی حضرت زیدؓ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے رخصت ہو کر اپنی قوم کی طرف روانہ ہوئے تو آپ نے فرمایا:۔ اِنْ يَّنْجُ زَيْدٌ مِنْ حُمَّى الْمَدِيْنَةِ فَاِنَّهٗ اگر زید مدینہ کے بخار سے بچ گئے تو ... راوی کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بخار کے لئے لفظ حُمّٰی اور اُمِّ مِلْدَم کے علاوہ کوئی لفظ[1] استعمال کیا تھا جو مجھے یاد نہیں رہا۔

حضرت زید کا وصال

جب حضرت زیدؓ نجد کے ایک چشمے "فردہ" کے پاس پہنچے تو انہیں بخار نے آیا اور اسی میں ان کا وصال ہو گیا جب انہیں آخری وقت کا احساس ہوا تو اُنہوں نے کہا:۔

اَمُرْتَحِلٌ قَوْمِي الْمَشَارِقَ غُدْوَةً وَاُتْرَكُ فِيْ بَيْتٍ بِفَرْدَةَ مُنْجِدِ

کیا صبح میری قوم مشرق کی طرف روانہ ہو جائے گی اور مجھے نجد کے چشمۂ فردہ کے ایک گھر میں چھوڑ دیا جائے گا۔

اَلَا رُبَّ يَوْمٍ لَوْ مَرِضْتُ لَعَادَنِيْ عَوَائِدُ مَنْ لَمْ يُبْرَ مِنْهُنَّ يَجْهَدِ

کیا بہت دفعہ ایسا نہیں ہوا کہ میں بیمار ہوا تو ایسی عورتوں نے میری عیادت کی جو طویل سفر کی مشقت سے محفوظ نہ تھیں۔ (دُور دراز سے آئی تھیں۔)

جب ان کا وصال ہو گیا تو اُن کی اہلیہ نے تمام تحریرات نذر آتش کر دیں۔

عدی بن حاتم

مجھے یہ روایت پہنچی ہے کہ عدی بن حاتم کہا کرتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر سننے کے بعد عرب کا کوئی شخص مجھ سے زیادہ

---

[1] سہیلی کہتے ہیں کہ راوی کو بخار کا نام جو یاد نہیں رہا "اُمِّ کُلْبَۃ" ہے کُلْبَۃ سخت کپکپی کو کہتے ہیں۔ (الروض الانف ج ۱۲ ص ۳۴۲)

آپ کو ناپسند کرنے والا نہ تھا میں ایک معزز آدمی تھا اور عیسائیت کا پیرو میں اپنی قوم سے چوتھائی حصہ لیتا تھا اور اپنے خیال میں ایک دین پر عمل پیرا تھا میں اپنی قوم کا بادشاہ تھا اور میرے ساتھ بادشاہوں والا معاملہ کیا جاتا تھا جب میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں سنا تو ان سے نفرت کرنے لگا میں نے اپنے اونٹوں کے محافظ عربی غلام کو کہا تیرا باپ نہ ہو! میرے لئے طاقتور اور فرماں بردار قسم کے چند اونٹ تیار کر کے رکھو جب تم محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لشکروں کے متعلق سنو کہ وہ ان شہروں میں پیش قدمی کر رہے ہیں تو مجھے اطلاع دینا۔

عدی کا فرار

ایک صبح وہ غلام میرے پاس آیا اور کہنے لگا اے عدی! محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لشکروں کی آمد پر تم جو کچھ کرنا چاہتے تھے کر گزرو۔ مجھے کچھ جھنڈے دکھائی دیئے اور میرے استفسار پر بتایا گیا کہ یہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لشکر ہیں عدی کہتے ہیں میں نے کہا: میرے اونٹ قریب لاؤ جب وہ لایا تو میں نے اپنے اہل وعیال کو ان پر سوار کرایا اور کہا کہ میں انہیں لے کر اپنے ہم مذہب عیسائیوں کے پاس شام جا رہا ہوں، چنانچہ میں جوشیہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ ابن ہشام نے اس جگہ کا نام حوشیہ بتایا ہے اور حاتم کی بیٹی[1] کو بستی ہی میں رہنے دیا میں شام پہنچ کر وہیں قیام پذیر ہو گیا۔

بہن کی گرفتاری

میرے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سوار آئے اور دوسرے لوگوں کے ہمراہ حاتم کی بیٹی کو بھی گرفتار کر کے لے گئے انہیں قبیلۂ طے کے قیدیوں سمیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔ میرے شام کی طرف فرار کی اطلاع آپ کو مل چکی تھی۔ حاتم کی بیٹی کو مسجد کے دروازے کے پاس ایک باڑے میں رکھا گیا جہاں قیدیوں کو رکھا جاتا تھا بنت حاتم بڑی دانا خاتون تھیں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس سے گزرے تو انہوں نے کھڑے ہو کر عرض کیا۔

یا رسول اللہ! هَلَكَ الْوَالِدُ وَغَابَ الْوَافِدُ فَامْنُنْ عَلَيَّ مَنَّ اللهُ عَلَيْكَ

یا رسول اللہ! باپ فوت ہو گیا اور حفاظت کرنے والا بھاگ گیا آپ مجھ پر احسان فرمائیں اللہ تعالیٰ آپ پر احسان فرمائے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ تمہارا محافظ کون ہے؟ عرض کیا عدی بن حاتم آپ نے فرمایا۔ وہ خدا اور رسول سے فرار اختیار کر رہا ہے۔ حاتم طائی کی صاحبزادی کہتی ہیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھے وہیں چھوڑ کر آگے بڑھ گئے دوسرے دن جب میرے پاس سے گزرے تو میں نے وہی گذارش دوبارہ پیش کی۔ وہی سوال وجواب ہوا اور آپ تشریف لے گئے تیسرے دن میں مایوس ہو چکی تھی آپ تشریف لائے اور آپ کے پیچھے کھڑے ہوئے ایک شخص نے اشارہ کیا کہ اٹھ کر درخواست پیش کر دو! میں نے اٹھ کر عرض کیا یا رسول اللہ! باپ فوت ہو چکا ہے اور حفاظت کرنے والا بھاگ گیا ہے آپ مجھ پر احسان فرمائیں، اللہ تعالیٰ آپ پر احسان فرمائے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہاری درخواست منظور ہے، لیکن تم جانے میں جلدی نہ کرو، جب تمہاری قوم کا کوئی قابل اعتماد آدمی مل جائے جو تمہیں تمہارے شہر پہنچا دے تو مجھے اطلاع دے دینا۔ میں نے ان صاحب کے متعلق دریافت کیا جنہوں نے مجھے حضور سے گفتگو کرنے کا اشارہ کیا تھا تو مجھے بتایا گیا کہ وہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔

میں ٹھہری رہی یہاں تک کہ قبیلہ بلی یا قضاعہ کے سواروں کی ایک جماعت آ گئی۔ میرا ارادہ یہ تھا کہ اپنے بھائی کے پاس شام چلی جاؤں

---

[1] حاتم طائی کی اس صاحبزادی کا نام سفانہ تھا۔ (سہیلی)

مَیں بارگاہِ رسالت میں حاضر ہُوئی اور عرض کیا یا رسُول اللہ ! میری قوم کے کچھ لوگ آ گئے ہیں، ان میں قابلِ اعتماد لوگ بھی موجود ہیں، جو مجھے منزلِ مقصود تک پہنچا دیں گے۔

الطافِ کریمانہ

رسولُ اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے مجھے لباس، سواری اور سفر خرچ عنایت فرمایا۔ میں اس جماعت کے ساتھ روانہ ہو کر شام پہنچ گئی۔

عدی کہتے ہیں بخدا ! مَیں اپنے اہل و عیال میں بیٹھا ہُوا تھا۔ کیا دیکھتا ہُوں کہ ایک سوار خاتُون ہماری طرف آ رہی ہے۔ میں نے کہا یہ حاتم کی بیٹی ہے اور واقعی وہی تھی۔ جب میرے پاس آ کر ٹھہری تو اس نے کہا قطع رحمی کرنے والے ظالم ! تو اپنے اہل و عیال کو لے کر چل دیا اور اپنے باپ کی نشانی اور بہن کو یونہی چھوڑ آیا۔ مَیں نے کہا : میری ہمشیرہ تم کوئی بُری بات زبان پر نہ لانا۔ خدا کی قسم ! مَیں کوئی عذر پیش نہیں کر سکتا۔ واقعی مَیں نے وہی کیا، جو تم نے کہا ہے۔ پھر وہ سواری سے نیچے اُتر آئیں اور میرے پاس مقیم ہو گئیں۔

عدی بارگاہِ رسالت میں

عدی کہتے ہیں میری بہن دانشمند خاتون تھیں۔ میں نے ان سے کہا اس شخصیت کے بارے میں تمہاری رائے کیا ہے ؟ انہوں نے کہا : بخدا ! میری رائے یہ ہے کہ ہمیں جلد از جلد ان کی خدمت میں پہنچ جانا چاہیے۔ اگر وہ نبی ہیں، تو جو اُن کے پاس پہلے پہنچے گا وہ فضیلت حاصل کر جائے گا اور اگر وہ بادشاہ ہیں، تو تمہیں ان کی بارگاہ عزت کی بدولت کبھی ذلّت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا اور تم وہی رہو گے جو اب ہو، مَیں نے کہا : خدا کی قسم یہ رائے بالکل صحیح ہے۔

عدی کہتے ہیں مَیں مدینہ طیبہ بارگاہِ رسالت میں حاضر ہونے کے لیے چل دیا۔ جب رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں پہنچا، تو اس وقت آپ مسجد میں تشریف فرما تھے۔ میں نے سلام عرض کیا، تو آپؐ نے فرمایا ، تم کون ہو ؟ مَیں نے عرض کیا۔ عدی بن حاتم ، حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کھڑے ہو گئے اور مجھے ساتھ لے کر کاشانۂ مبارکہ کی طرف چل دیے۔

شانِ نبوّت

حضور مجھے ساتھ لیے گھر جا رہے تھے کہ راستے میں ایک معمّر اور ضعیف خاتون آپ کو مل گئیں۔ آپ اس کے لیے دیر تک کھڑے رہے اور وہ اپنی حاجت کے بارے میں گفتگو کرتی رہی۔ مَیں نے اپنے دل میں کہا ، خدا کی قسم ! یہ بادشاہ نہیں ہیں۔ پھر آپ مجھے اپنے گھر لے گئے۔ اندر جا کر آپ نے چمڑے کا ایک گدا اُٹھا کر مجھے دیا جس میں کھجور کے پتے بھرے ہُوئے تھے اور فرمایا اس پر بیٹھ جاؤ۔ مَیں نے عرض کیا آپ تشریف رکھیں۔ فرمایا : نہیں تم اس پر بیٹھو ، چنانچہ میں اس گدّے پر بیٹھ گیا اور آپ زمین پر بیٹھ گئے۔ مَیں نے دل میں سوچا کہ یہ بادشاہوں کا انداز نہیں ہے۔

پھر آپ نے فرمایا : عدی بن حاتم ، تم رکوسی (عیسائیوں اور صابیوں کے درمیان ایک مذہب کے پیرو) نہیں ہو ؟ عدی کہتے ہیں، مَیں نے عرض کیا ہاں میں رکوسی ہوں ، فرمایا : تم اپنی قوم سے چوتھائی حصّہ لیا کرتے تھے ؟ عرض کیا ہاں ! فرمایا تمہارے دین میں تمہارے لیے یہ حلال نہیں تھا۔ عرض کیا : ہاں میرے لیے حلال نہیں تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ آپ نبی مُرسل ہیں، آپ ان (غیبی) امُور سے باخبر ہیں، جنھیں دوسرے نہیں جانتے۔

پھر فرمایا : عدی ! تمہیں اس دین میں داخل ہونے سے یہ بات مانع ہے کہ تم مسلمانوں کو حاجت مند دیکھ رہے ہو ، خدا کی قسم ! ان کے پاس مال اس کثرت سے ہو گا کہ اسے لینے والا نہیں ملے گا۔ شائد تمہیں اس دین میں داخل ہونے سے یہ امر مانع ہے کہ مسلمانوں کی

تعداد کم اور دشمن زیادہ ہیں۔ بخدا! وہ وقت قریب ہے کہ تم سنو گے کہ ایک عورت بیت اللہ شریف کی زیارت کے لیے اپنے اونٹ پر سوار ہو کر قادسیہ سے چلے گی اور اسے کسی کا خوف نہیں ہوگا۔ اور شاید تمہارے لیے اس دین میں داخل ہونے سے یہ امر مانع ہے کہ حکومت اور سلطنت دوسروں کے پاس ہے۔ بخدا! عنقریب تم سنو گے کہ بابل کے سفید محلات، مسلمانوں کے لیے فتح ہو جائیں گے۔ حضرت عدی فرماتے ہیں، میں نے اسلام قبول کر لیا۔

پیشین گوئی کی صداقت حضرت عدی رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے۔ دو باتیں واقع ہو چکی ہیں اور تیسری باقی ہے، خدا کی قسم! وہ بھی واقع ہو کر رہے گی۔ میں نے دیکھ لیا کہ سرزمین بابل کے سفید محلات فتح ہو گئے۔ میں نے دیکھ لیا کہ ایک عورت قادسیہ سے اپنے اونٹ پر سوار ہو کر چلی یہاں تک کہ اس نے حج کر لیا اور اسے کسی کا خوف نہ تھا، بخدا تیسری بات بھی سچی ہو کر رہے گی۔ مال کی اتنی فراوانی ہوگی کہ لینے والا ڈھونڈے نہیں ملے گا۔

فروہ ابن مسیک مرادی کی آمد

ابن اسحاق فرماتے ہیں کہ فروہ ابن مسیک مرادی، کندہ کے بادشاہوں کو چھوڑ کر اور اُن سے کنارہ کشی اختیار کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اسلام سے کچھ پہلے قبیلۂ مراد اور ہمدان میں جنگ ہوئی تھی۔ جس میں قبیلۂ ہمدان نے مراد کو شدید نقصان پہنچایا تھا۔ اس دن کا نام ہی "یوم الردم" (تباہی کا دن) رکھ دیا گیا۔

ابن ہشام فرماتے ہیں ہمدان کے قائد کا نام مالک ابن حریم ہمدانی تھا۔

فروہ کی خوش بختی ابن اسحاق فرماتے ہیں، جب فروہ ابن مسیک، شاہان کندہ سے علٰحدگی اختیار کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو انہوں نے یہ شعر کہے ؎

لَمَّا رَأَيْتُ مُلُوْكَ كِنْدَةَ اَعْرَضَتْ ۔۔۔ كَالرِّجْلِ خَانَ الرِّجْلَ عِرْقُ نَسَائِهَا

جب میں نے بادشاہان کندہ کو اس طرح پاؤں کی طرح اعراض کرتے ہوئے پایا جس کی رگوں نے اس کے ساتھ خیانت کی ہو۔

قَرَّبْتُ رَاحِلَتِي اَؤُمُّ مُحَمَّدًا ۔۔۔ اَرْجُوْ فَوَاضِلَهَا وَحُسْنَ ثَرَائِهَا

میں نے حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا قصد کرتے ہوئے اپنی اونٹنی کو ان کی طرف چلا دیا مجھے ان کے احسانات اور بہترین فائدے کی امید تھی۔

ابن ہشام فرماتے ہیں مجھے ابو عبیدہ نے دوسرا مصرع اس طرح سنایا:

اَرْجُوْ فَوَاضِلَهُ وَحُسْنَ ثَنَائِهَا ۔۔۔ مجھے آپ کے عطیات اور اچھی تعریف کی امید تھی

ابن اسحاق فرماتے ہیں، جب فروہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو آپ نے انہیں فرمایا: اے فروہ! یوم ردم میں تمہاری قوم کو جو مصیبتیں پہنچیں کیا وہ تمہاری تکلیف کا باعث ہوئیں؟ انہوں نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! جو مصیبتیں میری قوم کو پہنچیں، کون ہے جس کی قوم کو وہ پہنچیں اور اس کی تکلیف کا باعث نہ ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اسلام تمہاری قوم کے لیے خیر اور بھلائی ہی کا باعث ہوگا۔ آپ نے انہیں قبیلۂ مراد، زبید اور مذحج پر عامل مقرر کیا اور صدقہ وصول کرنے کے لیے

ان کے ساتھ حضرت سعید ابن عاص کو بھیجا چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال تک وہ ان کے ساتھ رہے۔

وفد بنو زبید

قیادت: عمرو بن معدیکرب

عمرو ابن معدیکرب، بنو زبید کی ایک جماعت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہو کر مشرف باسلام ہوا جب ان لوگوں کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اعلان نبوت کی اطلاع پہنچی تھی تو عمرو نے قیس بن مکشوح مرادی کو کہا کہ ہمارے ساتھ اُن کے پاس چلو تاکہ ہمیں اُن کے متعلق صحیح معلومات حاصل ہوں جب ہم اُن سے ملاقات کریں گے تو تم پر صورت حال پوشیدہ نہیں رہے گی اگر وہ نبی ہوئے جیسے کہ وہ کہتے ہیں تو ہم ان کی پیروی کریں گے اور اگر وہ نبی نہ ہوئے تو بھی ہمیں معلوم ہو جائے گا قیس نے یہ مشورہ ماننے سے انکار کر دیا اور عمرو کی رائے کو بے بنیاد قرار دیا۔ عمرو بن معدیکرب سوار ہوا اور بارگاہ رسالت میں حاضر ہو کر مسلمان ہو گیا۔

قیس بن مکشوح کو یہ اطلاع ملی تو حضرت عمرو پر ناراض ہوا اُسے دھمکی دی اور کہا اس نے میری مخالفت کی ہے عمرو نے اس سلسلے میں یہ اشعار کہے۔

اَمَرْتُکَ یَوْمَ ذِی صَنْعَا — ءَ اَمْرًا بَادِیًا رُشْدُہٗ

میں نے تجھے ذوصنعاء کے دن ایک ایسے کام کے لئے کہا تھا جس کی ہدایت ظاہر تھی۔

اَمَرْتُکَ بِاتِّقَاءِ — اللّٰہِ وَالْمَعْرُوْفِ نَتَّعِدُہٗ

میں نے تجھے اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کا کہا تھا اور ہم اچھے کام کا وعدہ کیا کرتے تھے۔

خَرَجْتَ مِنَ الْمُنٰی مِثْلَ — الْحِمَیْرِ غَرَّہٗ وَتَدُہٗ

تو منیٰ سے اس گدھے کی طرح نکلا جسے اس کے کھونٹے نے دھوکہ دے دیا ہو۔

تَمَنَّانِیْ عَلٰی فَرَسٍ — عَلَیْہِ جَالِسًا اَسَدُہٗ

اُس نے میرا قصد کیا اس حال میں کہ میں شیر کی طرح گھوڑے پر بیٹھا ہوا تھا۔

عَلَیَّ مُفَاضَۃٌ کَالنِّھْیِ اَخْلَصَ مَاءَہٗ جَدَدُہٗ

مجھ پہ اس تالاب کی طرح چمکدار زرہ ہے، جس کے پانی کو چھوٹی زمین نے صاف کر دیا ہو۔

تَرُدُّ الرُّمْحَ مُنْثَنِیَ السِّنَانِ عَوَائِرًا قِصَدُہٗ

ایسی زرہ جو نیزے کو اس حال میں واپس کرتی ہے کہ اس کی نوک مڑی ہوئی اور ٹکڑے بکھرے ہوئے ہوں۔

فَلَوْ لَاقَیْتَنِیْ لَلَقِیْتَ لَیْثًا فَوْقَہٗ لِبَدُہٗ

اگر تو مجھ سے ملے گا تو ایسے شیر سے ملے گا جس کی گردن پہ بڑے بڑے بال ہیں۔

تُلَاقِیْ شَنْبَثًا شَثْنَ الْبَرَاثِنِ نَاشِزًا کَتَدُہٗ

تو مضبوط پنجوں والے موٹے تازے شیر سے ملاقات کرے گا جس کے کندھوں کا درمیانی حصّہ ابھرا ہوا ہے۔

يُسَامِي الْقِرْنَ اِنْ قِرْنٌ تَيَمَّمَهُ فَيَعْتَضِدُهُ

وہ شیر اپنے مدمقابل سے بلند ہوگا اور اگر مقابل اس پر حملہ کرنا چاہے تو اسے اپنے بازوؤں میں دبوچ لے گا۔

فَيَأْخُذُهُ فَيَرْفَعُهُ فَيَخْفِضُهُ فَيَقْتَصِدُهُ

وہ شیر اپنے مقابل کو پکڑے گا اٹھا کر پٹخ دے گا اور ہلاک کر دے گا۔

فَيَدْمَغُهُ فَيَحْطِمُهُ فَيَخْضِمُهُ فَيَزْدَرِدُهُ

اس کا بھیجا نکال دے گا۔ اسے توڑ پھوڑ دے گا۔ اسے کھا جائے گا اور نگل جائے گا۔

ظَلُومُ الشِّرْكِ فِيمَا اَحْرَزَتْ اَنْيَابُهُ وَيَدُهُ

اس شیر کے دانتوں اور ہاتھوں کے شکار میں جو شرکت کرنا چاہے اس پر ظلم وستم ڈھا دیتا ہے۔

ابن اسحاق فرماتے ہیں عمر ابن معدیکرب اپنی قوم بنو زبید میں قیام پذیر رہا ان پر حضرت فروہ ابن مسیک مقرر کیے ہوئے تھے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وصال ہوا تو عمر ابن معدیکرب مرتد ہوگیا

وفد کندہ

قیادت : اشعث ابن قیس

ابن اسحاق فرماتے ہیں: اشعث ابن قیس کندہ کے وفد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے مجھے زہری ابن شہاب نے بیان کیا کہ اشعث کندہ کے اسی سواروں کے ہمراہ بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے ان حضرات نے اپنے لمبے لمبے بالوں میں کنگھی کی ہوئی تھی آنکھوں میں سرمہ لگایا ہوا تھا اور حیرہ کے جبے پہنے ہوئے تھے جن کے ارد گرد ریشم لگا ہوا تھا۔ جب یہ حضرات مسجد میں بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا کیا تم لوگ اسلام نہیں لا چکے؟ انہوں نے عرض کیا۔ کیوں نہیں فرمایا۔ پھر تمہاری گردنوں میں ریشم کیسا ہے؟ انہوں نے ریشم پھاڑ کر پھینک دیا۔

آکل المرار کی طرف انتساب کی نفی

حضرت اشعث ابن قیس نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہم آکل المرار کی اولاد ہیں اور آپ بھی اس کی اولاد سے ہیں۔ اس پر آپ نے مسکراتے ہوئے فرمایا: یہ نسب تم عباس ابن عبدالمطلب اور ربیعہ ابن الحرث سے ملاؤ، یہ دونوں تاجر تھے جب یہ عرب کے بعض قبائل کے پاس جاتے تو ان سے پوچھا جاتا کہ آپ کس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں؟ تو وہ اعزاز حاصل کرنے کے لئے کہتے کہ ہم آکل المرار کی اولاد سے ہیں۔ کیونکہ قبیلہ کندہ بادشاہوں کا خاندان تھا۔ پھر انہیں فرمایا ہم آکل المرار کی اولاد سے نہیں بلکہ نضر ابن کنانہ کی اولاد سے ہیں ہم اپنے باپ سے نسب کی نفی کر کے ماں کی طرف منسوب نہیں کرتے اشعث ابن قیس نے، اپنے ساتھیوں کو فرمایا: اے گروہ کندہ! تم فارغ ہو گئے ہو؟ بخدا! میں نے آئندہ یہ بات کسی سے سنی تو اسے اسی کوڑے لگاؤں گا۔

ابن ہشام فرماتے ہیں: اشعث ابن قیس ماؤں کی طرف سے آکل المرار کی اولاد سے تھے۔ آکل المرار کا نام ونسب یہ ہے حرث ابن عمرو ابن حجر ابن عمر ابن معاویہ ابن حرث ابن معاویہ ابن ثور ابن مرتع ابن معاویہ ابن کندی۔ بعض نے کندی کی جگہ کندہ کہا ہے

آکل المرار کی وجہ تسمیہ آکل المرار نام رکھنے کی وجہ یہ تھی کہ عمرابن ہبولہ غسانی نے حرث کی عدم موجودگی میں کندہ پر حملہ کیا، مال غنیمت لوٹا، بچوں اور عورتوں کو گرفتار کر کے لے گیا قیدیوں میں حرث ابن عمر کی بیوی امّ اناس بنت عوف ابن مسلم شیبانی بھی تھی۔ اُس نے دوران سفر اپنے شوہر حرث کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عمر سے کہا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ آکل المرار کھانے والے اونٹ کی طرح لٹکتے ہوئے ہونٹوں والے ایک سیاہ رنگ شخص نے تمہاری گردن دبوچ لی ہے اس لئے حرث کا نام ہی آکل المرار پڑ گیا مرار کڑوی بوٹی کو کہتے ہیں پھر حرث نے بنوبکر ابن وائل کو ساتھ لے کر عمر کا تعاقب کیا اور اسے پکڑ کر قتل کر دیا اپنی بیوی کو چھڑا لیا اور لوٹا ہوا تمام مال واپس حاصل کر لیا۔

کہا جاتا ہے کہ آکل المرار حجر ابن عمر ابن معاویہ ہے اور یہ واقعہ اسی کا ہے۔ اس کا یہ نام اس لئے رکھا گیا کہ اس جنگ میں اُس نے اور اُس کے ساتھیوں نے مُرار نامی کڑوی بوٹی کھائی تھی۔

وفد ازد

قیادت : صُرد بن عبد اللہ

ابن اسحاق فرماتے ہیں۔ صرد ابن عبداللہ ازدی ازد کے ایک وفد کے ہمراہ بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو کر دل و جان سے اسلام لائے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی قوم کے مسلمانوں کا امیر مقرر فرمایا اور حکم دیا کہ مسلمانوں کو ساتھ لے کر یمن کے قریبی مشرک قبائل کے ساتھ جہاد کرو۔ حضرت صُرد ابن عبداللہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کے مطابق روانہ ہو کر جرش دیمن کے ایک شہر پہنچ گئے۔ اس شہر کی چاروں طرف قلعہ نما فصیل تھی، جس میں یمن کے مختلف قبائل آباد تھے

قبیلہ خثعم بھی آکر ان کے ساتھ مل گیا۔ جب انہیں مسلمانوں کی آمد کی اطلاع ملی تو یہ سب قلعہ بند ہو گئے مسلمانوں نے تقریباً ایک ماہ ان کا محاصرہ جاری رکھا۔ قلعہ بند ہونے کی وجہ سے یہ لوگ محفوظ رہے۔ ایک ماہ بعد مسلمان واپس آ گئے جب وہ شکر نامی پہاڑ کے پاس پہنچے تو قلعۂ جرش والوں نے سمجھا کہ وہ ڈر کر بھاگ گئے ہیں چنانچہ باہر نکل کر تعاقب کیا قریب پہنچے تو مسلمانوں نے پلٹ کر حملہ کیا اور کشتوں کے پشتے لگا دیئے۔

غیبی خبر جرش والوں نے دو افراد مدینہ طیبہ بھیجے ہوئے تھے جو حالات کا جائزہ لے رہے تھے ایک دن یہ دونوں عصر کے بعد بارگاہ رسالت میں حاضر تھے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: شکر نامی پہاڑ، اللہ تعالےٰ کے کس شہر میں ہے؟ دونوں افراد کھڑے ہوئے اور عرض کیا یا رسُول اللہ! ہمارے علاقے میں ایک پہاڑ ہے، جسے کشر کہا جاتا ہے جرش والے اس پہاڑ کو اسی نام سے پہچانتے تھے۔ آپ نے فرمایا۔ یہ کشر نہیں بلکہ شکر ہے۔ عرض کیا اس کے بارے میں کیا خبر ہے؟ فرمایا۔ اس وقت وہاں اللہ تعالےٰ کے اونٹ، ذبح کئے جا رہے ہیں۔ یہ دونوں حضرت ابوبکر یا حضرت عثمان کے پاس آکر بیٹھ گئے۔ اُنہوں نے فرمایا: خدا کے بندو! رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمہیں تمہاری قوم کی ہلاکت کی خبر دے رہے ہیں۔ تم حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے درخواست کرو کہ اللہ تعالےٰ تمہاری قوم سے ہلاکت اٹھالے۔ اُنہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دعا کی درخواست کی آپ نے دعا کی یا اللہ! اُن سے ہلاکت کو اٹھالے۔

یہ دونوں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے رخصت ہو کر اپنی قوم کی طرف روانہ ہوئے جب اپنی قوم کے پاس پہنچے تو انہیں،

معلوم ہوا کہ جس دن اور جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مذکورہ بالا بات فرمائی تھی اس وقت حضرت صرد ابن عبداللہ نے حملہ کیا تھا اور جرش والوں پر قیامت گزر گئی تھی۔

اہل جرش آغوش اسلام میں اس کے بعد جرش کا ایک وفد روانہ ہو کر بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوا اور مشرف بہ اسلام ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے گاؤں کے آس پاس کی جگہ گھوڑوں، اونٹوں اور بیلوں کی چراگاہ مقرر فرمائی اور اس کے گرد نشانات لگوا دیے اس خطے میں دوسرا آدمی جانور چراتا تو اس کا ساز و سامان چھین لیا جاتا۔

اس جنگ کے بارے میں ازد کے ایک شخص نے درج ذیل اشعار کہے۔ قبیلۂ خثعم دورِ جاہلیت میں ازد پر حملہ آور ہوا کرتا تھا۔ اور شہر حرام میں بھی ظلم و ستم روا رکھتا تھا۔

يَا غَزْوَةً مَّا غَزَوْنَا غَيْرَ خَائِبَةٍ ۔۔۔ فِيهَا الْبِغَالُ وَفِيهَا الْخَيْلُ وَالْحُمُرُ

وہ کیا خوب جنگ تھی جس میں ہم ناکامی کے بغیر لڑے۔ اس میں خچریں گھوڑے اور گدھے تھے۔

حَتّٰى أَتَيْنَا حُمَيْرًا فِي مَصَانِعِهَا ۔۔۔ وَجَمْعُ خَثْعَمَ قَدْ شَاعَتْ لَهَا النُّذُرُ

ہم نے جرش کے گدھوں (مشرکوں) پر ان کے قلعوں میں حملہ کیا اس وقت قبیلۂ خثعم کے نذر کے جانور ہر طرف بکھرے ہوئے تھے

إِذَا وَضَعْتُ غَلِيلًا كُنْتُ أَحْمِلُهُ ۔۔۔ فَمَا أُبَالِي أَدَانُوا بَعْدُ أَمْ كَفَرُوا

جب میں نے پیاس بجھالی جسے میں اٹھائے پھرتا تھا تو مجھے پروا نہیں تھی کہ وہ فرمانبردار ہو گئے ہیں یا کافر ہی ہیں۔

بادشاہان حمیر کا قاصد

تبوک سے واپسی پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں بادشاہانِ حمیر کا مکتوب پہنچا[1] یہ مکتوب حرث بن عبد کلال، نعیم بن عبد کلال اور ذو رعین، معافر اور ہمدان کے امیر نعمان نے زرعہ ذویزن مالک ابن مُرّہ رہاوی کے ہاتھ بھجوایا تھا جس میں تحریر تھا کہ ہم اسلام لا چکے ہیں اور شرک اور اہل شرک سے کنارہ کش ہو چکے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں جواب لکھوایا۔

بسم الله الرحمٰن الرحيم

اللہ تعالیٰ کے رسول اور نبی محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف سے حرث ابن عبد کلال، نُعیم ابن عبد کلال اور نعمان امیر ذو رُعَین معافر و ہمدان کی طرف اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک کی حمد کے بعد ارض روم سے ہماری واپسی کے وقت تمہارا قاصد ہمارے پاس مدینہ طیبہ پہنچا اس نے تمہارا پیغام پہنچایا۔ تمہارے حالات کی اطلاع دی۔ تمہارے اسلام لانے اور مشرکین کے ساتھ جہاد کرنے کی خبر دی اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں ہدایت سے نوازا ہے۔

احکام اسلام اگر تم راہِ راست پر رہے تم نے خدا و رسول کی اطاعت کی، نماز قائم کی، زکوٰۃ دی، غنیمت سے اللہ تعالیٰ کا حق پانچواں حصہ اور نبی صلی اللہ علیہ کا لازمی حصہ نکالا اور مسلمانوں پر جو صدقہ لازم کیا ہے ادا کیا یعنی چشمے کے پانی

[1] یہ واقعہ ماہِ رمضان المبارک ۹ھ کا ہے۔ طبقات ابن سعد، عربی مطبوعہ بیروت، ج ۱ ص ۳۵۶

سے سیراب کی جانے والی اور بارانی زمین کی پیداوار کا دسواں حصہ اور بڑے ڈول سے سیراب کی جانے والی زمین کی پیداوار کا بیسواں حصہ ادا کیا۔ چالیس اونٹوں میں سے بنت لبون (وہ اونٹنی جو دو سال پورے کر کے تیسرے سال میں داخل ہو چکی ہو) اور تیس اونٹوں میں ابن لبون (وہ اونٹ جو تیسرے سال میں داخل ہو گیا ہو) پانچ اونٹوں کی زکوٰۃ ایک بکری دس اونٹوں سے دو بکریاں، چالیس گایوں کی زکوٰۃ ایک گائے اور تیس گایوں میں ایک تبیع، جذع یا جذعہ ہے۔ ہر چالیس باہر چرنے والی بکریوں پر ایک بکری۔

یہ اللہ تعالیٰ کا فرض ہے جو اس نے ایمان داروں پر صدقہ میں لازم کیا، جس نے اس سے زیادہ دیا اس کے لیے وہ بہتر ہے اور جس نے یہ فریضہ ادا کیا اور اپنے سلام پر گواہ بنایا اور مشرکوں کے خلاف مسلمانوں کی امداد کی تو وہ مومنوں میں سے ہے، اس کے لیے وہی فوائد ہوں گے جو ایمان داروں کے ہیں اور اس پر وہی حقوق لازم ہوں گے جو دوسرے مومنوں پر ہیں اور اس کے لیے خدا و رسولؐ کا ذمہ ہے۔

جو یہودی یا عیسائی ایمان لایا، اس کے حقوق اور ذمہ داریاں وہی ہیں جو دوسرے مومنوں کی ہیں۔ جو شخص یہودیت یا عیسائیت پر قائم رہنا چاہے اُسے مجبور نہیں کیا جائے گا۔ البتہ اس پر جزیہ (ٹیکس) لازم ہے۔ ہر بالغ مرد و زن پر خواہ وہ غلام ہو یا آزاد ایک دینار ہے جسے وہ معافری یا دوسرے کپڑوں کی صورت میں ادا کر سکتا ہے۔ جو شخص یہ جذیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ادا کرے گا اس کے لیے خدا اور رسول کا ذمہ ہے اور جو انکار کرے گا وہ خدا اور رسول کا دشمن ہے۔

بے شک اللہ تعالیٰ کے رسول اور نبی محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے زرعہ ذو یزن کو پیغام دیا ہے کہ جب تمہارے پاس ہمارے نمائندے پہنچیں، تو تمہیں تاکیدی حکم ہے کہ اُن کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا۔ نمائندے یہ ہیں۔ معاذ ابن جبل، عبداللہ ابن زید، مالک ابن عبادہؓ عقبہ بن نمر، مالک ابن مرہ اور اُن کے ساتھی۔ تمہیں تاکید کی جاتی ہے کہ تم مسلمانوں سے صدقہ اور غیر مسلموں سے جزیہ جمع کر کے ہمارے نمائندوں کے پاس پہنچا دو، ان کے امیر معاذ ابن جبل ہیں وہ تم سے راضی ہو کر واپس آئیں۔

بے شک محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) گواہی دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ تعالیٰ کے بندے اور رسول ہیں مالک بن مرّہ رہاوی نے مجھے بتایا کہ تم قبیلۂ حمیر کے اولین اسلام لانے والے ہو اور تم نے مشرکین سے جہاد کیا ہے تمہیں بھلائی کی خوشخبری ہے۔ میں تمہیں حمیر کے ساتھ نیکی کا حکم دیتا ہوں، تم خیانت نہ کرو، ایک دوسرے کو بے یار و مددگار نہ چھوڑو۔ بے شک اللہ تعالیٰ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) تم میں سے غریب اور مال دار کے محافظ ہیں اور صدقہ محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے اہل بیت کے لیے حلال نہیں ہے۔ یہ تو وہ زکوٰۃ ہے۔ جو غریب مسلمانوں اور مسافروں کو دی جاتی ہے۔ مالک نے اطلاع پہنچائی اور راز کو محفوظ رکھا۔ میں تمہیں ان کے ساتھ نیکی کا حکم دیتا ہوں۔

میں تمہیں پاس اپنے صالح، دیندار اور صاحب علم صحابہؓ کو بھیج رہا ہوں اور تمہیں ان کے ساتھ بھلائی کا حکم دیتا ہوں۔ یہ ان کے لائق ہے۔ والسلام علیکم۔

حضرت معاذ بن جبل کو نصیحت

ابن اسحاق فرماتے ہیں مجھے عبداللہ ابن ابوبکر نے بیان کیا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ ابن جبل کو بھیجا، تو اُن کو خصوصی احکام دیے اور ان سے

عہد لیا۔ پھر انہیں فرمایا: آسانی بہم پہنچانا نہ کہ تنگی۔ لوگوں کو خوش رکھنا متنفر نہ کرنا۔ تم اہل کتاب کی ایک قوم کے پاس جاؤ گے وہ تم سے پوچھیں گے کہ جنت کی چابی کیا ہے؟ تو انہیں بتانا کہ اللہ تعالیٰ کے وحدہٗ لاشریک ہونے کی شہادت۔

شوہر کا بیوی پر حق

حضرت معاذ ابن جبل، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام لے کر یمن پہنچے، تو یمن کی ایک عورت ان کی خدمت میں حاضر ہوئی اور پوچھا کہ شوہر کا عورت پر کیا حق ہے؟ فرمایا: اللہ کی بندی! عورت شوہر کا حق ادا نہیں کر سکتی، تم طاقت کے مطابق اپنے آپ کو اس کی فرمانبرداری کے لیے مشقت میں ڈالو! اس نے کہا بخدا! اگر آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہیں، تو یقیناً آپ کے علم میں ہو گا کہ شوہر کا عورت پر کیا حق ہے۔ فرمایا: خدا کی بندی! اگر تو لوٹ کر جائے اور شوہر کو اس حال میں پائے کہ اس کے نتھنوں سے پیپ اور خون جاری ہے اور تو اسے چوس کر ختم کر دے تو پھر بھی اس کا پورا حق ادا نہیں کر پائی۔

فروہ ابن عمر جذامی کا اسلام

ابن اسحاق کہتے ہیں: فروہ ابن عمر ابن النافرہ جذامی نفاثی نے ایک قاصد کو اپنے اسلام کی اطلاع عرض کرنے کے لیے بارگاہ رسالت میں بھیجا اور ایک سفید خچر بہ طور ہدیہ بھجوائی۔ فروہ، شاہ روم کی طرف سے ان عربوں پر عامل مقرر تھے۔ جو ان کے قریب رہتے تھے۔ شام میں مُعان اور اس کے آس پاس کا علاقہ ان کے زیر انتظام تھا۔ جب شاہ روم کو ان کے اسلام کی خبر ملی تو انہیں بلایا اور گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا۔ حضرت فروہ نے جیل میں یہ اشعار کہے۔

طَرَقَتْ سُلَيْمَىٰ مَوْهِنًا اَصْحَابِي ‏ ‏ ‏ ‏ وَالرُّوْمُ بَيْنَ الْبَابِ وَالْقِرْوَانِ

سُلیمیٰ (حضرت فروہ کی بیوی خیالی پیکر میں) آدھی رات کے بعد میرے ساتھیوں کے پاس آئی جب کہ رومی دروازے اور جیل کے وسط میں تھے۔

صَدَّ الْخَيَالَ وَسَاءَهُ مَا قَدْ رَأَى ‏ ‏ ‏ ‏ وَهَمَمْتُ اَنْ اُغْفِيْ وَقَدْ اَبْكَانِي

محبوبہ کے خیالی پیکر کو سامنے کے منظر نے روک دیا اور تکلیف پہنچائی۔ میں ہلکی سی نیند لینا چاہتا تھا مگر اس پیکر نے مجھے رلا دیا

لَا تَكْحَلَنَّ الْعَيْنَ بَعْدِيْ اِثْمِدًا ‏ ‏ ‏ ‏ سَلْمَىٰ وَلَا تَدِيَنَّ لِلْاِتْيَانِ

سلمیٰ! میرے بعد آنکھوں میں اثمد (سرمہ) نہ لگانا اور آنے کی زحمت نہ اٹھانا

وَلَقَدْ عَلِمْتَ اَبَا كُبَيْشَةَ اَنَّنِيْ ‏ ‏ ‏ ‏ وَسْطَ الْاَعِزَّةِ لَا يُحَصُّ لِسَانِي

ابو کبیشہ! تم جانتے ہو کہ میں بہترین عزت والوں سے ہوں اور میری زبان کاٹی نہیں جا سکتی۔

فَلَئِنْ هَلَكْتُ لَتَفْقِدُنَّ اَخَاكُمْ ‏ ‏ ‏ ‏ وَلَئِنْ بَقِيْتُ لَتَعْرِفُنَّ مَكَانِي

اگر میں ہلاک ہو گیا، تو تم اپنے بھائی کو گم کر بیٹھو گے اور اگر میں زندہ رہا، تو تم ضرور میرا مقام پہچان لو گے۔

وَلَقَدْ جَمَعْتُ اَجَلَّ مَا جَمَعَ الْفَتَىٰ ‏ ‏ ‏ ‏ مِنْ جَوْدَةٍ وَشَجَاعَةٍ وَبَيَانِ

کسی بھی جوان میں جو عمدگی، بہادری اور فصاحت و بلاغت پائی جاتی ہے۔ مجھ میں اس سے کہیں زیادہ ہے۔

حضرت فروہ کی مظلومانہ شہادت

جب رومیوں نے فلسطین کے ایک چشمے کے کنارے حضرت فروہ کو سولی چڑھانے کا فیصلہ کر لیا، تو انہوں نے فرمایا:

اَلَا هَلْ اَتٰی سَلْمٰی بِاَنَّ حَلِیْلَهَا — عَلٰی مَاءِ عَفْرٰی فَوْقَ اِحْدَی الرَّوَاحِلِ

کیا سلمیٰ کو یہ خبر مل گئی ہے کہ اس کا شوہر عفریٰ چشمے کے کنارے ایک سواری پر سوار ہے۔

عَلٰی نَاقَةٍ لَمْ یَضْرِبِ الْفَحْلُ اُمَّهَا — مُشَذَّبَةٍ اَطْرَافُهَا بِالْمَنَاجِلِ

وہ ایسی اونٹنی (تختۂ دار) پر سوار ہے جس کی ماں کے پاس نر نہیں گیا۔ اور اس کے ہاتھ پاؤں درانتیوں سے کاٹ دیے گئے ہیں۔

زہری ابن شہاب کا کہنا ہے کہ جب انہیں شہید کرنے کے لیے لایا گیا، تو انہوں نے فرمایا:

بَلِّغْ سَرَاةَ الْمُسْلِمِیْنَ بِاَنَّنِیْ — سَلْمٌ لِرَبِّیْ اَعْظُمِیْ وَمَقَامِیْ

مسلمانوں کے سرداروں کو یہ خبر پہنچا دو کہ میری ہڈیاں اور میرے قیام کی جگہ میرے رب کی فرمانبردار ہے۔

پھر رومیوں نے ان کا سر قلم کر دیا اور اسی چشمے پر انہیں سولی چڑھا دیا۔

وفد بنو الحرث ابن کعب

بنو الحرث کا حضرت خالد ابن ولید کے ہاتھ پر اسلام

ابن اسحاق فرماتے ہیں، ماہ ربیع الثانی یا جمادی الاولیٰ ۱۰ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد ابن ولید رضی اللہ عنہ کو بنو الحرث ابن کعب کے پاس نجران بھیجا اور حکم دیا کہ جہاد سے پہلے تین دن تک اسلام کی دعوت دیں۔ اگر وہ اسلام لے آئیں، تو ان کا اسلام قبول کر لو اور اگر انکار کر دیں، تو ان سے جہاد کرو۔ حضرت خالد، بنو الحرث کے پاس پہنچے اور سواروں کو ہر طرف دعوت اسلام کے لیے روانہ کر دیا۔ یہ حضرات کہتے تھے۔ لوگو! اسلام لے آؤ محفوظ ہو جاؤ گے۔ چنانچہ وہ لوگ اسلام لے آئے اور جس دین کی انہیں دعوت دی گئی تھی۔ اس میں داخل ہو گئے۔ حضرت خالد نے ان کے ہاں قیام فرما کر انہیں اسلام کی تعلیم دی اور انہیں کتاب و سنت کی تعلیمات سے روشناس کرایا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں یہی حکم دیا تھا کہ اگر وہ مسلمان ہو جائیں اور جنگ نہ کریں، تو انہیں اسلامی تعلیم سے آراستہ کرنا۔ پھر حضرت خالد بن ولید نے بارگاہ رسالت میں عریضہ ارسال کیا۔ جس کا مضمون

حضرت خالد بن ولید کا عریضہ

یہ تھا: اللہ تعالیٰ کے نبی اور رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں خالد بن ولید کی طرف سے۔

اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْکَ وَسَلَّمَ

میں آپ کی بارگاہ میں اللہ تعالیٰ کی حمد کرتا ہوں جس کے سوا کوئی سچا معبود نہیں۔ امابعد! یا رسول اللہ! صلی اللہ تعالیٰ علیک وسلم آپ نے مجھے بنو حرث ابن کعب کی طرف بھیجا اور مجھے حکم دیا کہ جب میں ان کے پاس جاؤں تو تین دن تک ان سے جہاد نہ کروں اور انہیں اسلام کی

دعوت دوں اگر وہ اسلام لے آئیں تو ان میں قیام کروں اور ان کے اسلام کو تسلیم کرکے انہیں اسلامی تعلیمات، اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سکھاؤں اور اگر وہ اسلام نہ لائیں تو اُن سے جہاد کروں۔ میں نے اُن کے پاس آکر تین دن تک انہیں اسلام کی دعوت دی، جیسے مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تھا۔ میں نے سواروں کو ان کے پاس بھیجا، جنہوں نے کہا اے بنو الحرث! اسلام لے آؤ! سلامتی کے ساتھ رہو گے۔ چنانچہ انہوں نے جنگ نہیں کی اور اسلام لے آئے۔ میں اُن کے ہاں مقیم ہوں۔ انہیں اس چیز کا حکم دیتا ہوں جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اور اس چیز سے منع کرتا ہوں جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔ میں انہیں اسلامی تعلیمات اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی تعلیم دے رہا ہوں۔ یہاں تک کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکتوب ارسال فرمائیں۔

والسلام علیک یا رسول اللہ ورحمۃ وبرکاتہ!

بارگاہِ رسالت کا جواب

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد بن ولید کو جواب لکھوایا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ تعالیٰ کے نبی اور رسول محمد کی طرف سے خالد بن ولید کی طرف "سلام علیک"!

میں اللہ تعالیٰ کی حمد کرتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اما بعد! تمہارے قاصد کے ذریعے تمہارا مکتوب موصول ہوا جس میں تم نے اطلاع دی ہے کہ بنو الحرث جنگ کئے بغیر اسلام لے آئے ہیں۔ جس اسلام کی تم نے انہیں تبلیغ کی ہے اسے انہوں نے قبول کر لیا ہے اور گواہی دی کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی سچا معبود نہیں اور محمد مصطفٰے اس کے عبد خاص اور رسول ہیں اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی ہدایت عطا فرمائی ہے۔ انہیں خوشخبری اور ڈر سناؤ۔ تم خود بھی آؤ اور تمہارے ہمراہ ان کا وفد بھی آئے۔

والسلام علیک ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ بنو الحرث کے وفد کے ہمراہ بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے اس وفد میں قیس ابن الحصین ذو الغصہ، یزید ابن عبدالمدان، یزید ابن محجل، عبداللہ ابن قراد زیادی، شداد بن عبداللہ قنانی اور عمرو ابن عبداللہ قنانی تھے۔

جب یہ حضرات بارگاہ رسالت کے قریب حاضر ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ یہ کس قوم کے لوگ ہیں؟ یوں معلوم ہوتا ہے گویا ہند کے لوگ ہیں، عرض کیا گیا یہ بنو الحرث ابن کعب کے افراد ہیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر انہوں نے سلام عرض کیا اور کہا ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں اور اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا۔ میں بھی گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں۔ پھر فرمایا۔ تم وہ لوگ ہو جنہیں مقابلہ کرنے کے لئے کہا جاتا ہے تو بڑھ کر حملہ کرتے ہیں؟ وہ لوگ خاموش رہے اور کوئی جواب نہیں دیا یہی سوال آپ نے دوسری اور تیسری مرتبہ کیا مگر سب خاموش رہے چوتھی مرتبہ یہی سوال دہرایا تو حضرت یزید ابن عبدالمدان نے عرض کیا ہاں یا رسول اللہ! ہم ہی وہ لوگ ہیں جنہیں مقابلے کا حکم دیا جاتا ہے تو آگے بڑھ کر حملہ کرتے ہیں۔ انہوں نے (حضور صلی اللہ علیہ وسلم) کے سوال کے مطابق یہ جملہ چار مرتبہ کہا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اگر خالد مجھے یہ تحریر نہ کرتے کہ تم اسلام لے آئے ہو اور تم نے جنگ نہیں کی تو میں تمہارے سر تمہارے قدموں میں ڈال دیتا۔ یزید ابن عبدالمدان نے عرض کیا خدا کی قسم! ہم نے آپ کی اور حضرت خالد کی حمد و ثنا نہیں کی۔ آپ نے فرمایا تم

نے کس کی حمد و ثنا کی ہے۔ عرض کیا: اللہ تعالیٰ کی۔ یا رسول اللہ جس نے آپ کے وسیلے سے ہمیں ہدایت عطا فرمائی ہے۔ آپ نے فرمایا۔ تم نے سچ کہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ دورِ جاہلیت میں تم دشمنوں پر کس طرح غلبہ پایا کرتے تھے؟ عرض کیا ہم کسی پر غلبہ نہیں پایا کرتے تھے فرمایا، کیوں نہیں تم اپنے دشمنوں پر غلبہ پایا کرتے تھے۔ عرض کیا ہم اپنے دشمنوں پر اس طرح غلبہ پاتے تھے کہ ہم اکٹھے ہو جاتے تھے الگ الگ نہیں رہتے تھے کسی پر ظلم کی ابتدا نہیں کرتے تھے۔ فرمایا۔ تم نے سچ کہا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو الحرث پر قیس ابن حصین کو امیر بنا دیا، چنانچہ یہ وفد شوال کے آخری دنوں یا ذیقعدہ کے ابتدائی دنوں میں اپنی قوم کے پاس واپس چلا گیا ابھی چار مہینے نہیں گزرے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو گیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو رحمت و برکت اور رضا و نعمت سے نواز دیا۔

اس وفد کی روانگی کے بعد آپ نے حضرت عمر ابن حزم کو ان کے پاس بھیجا تاکہ انہیں دین و سنت اور تعلیمات اسلامیہ سکھائیں، اور ان سے صدقات وصول کریں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر بن حزم کو ایک تحریر عنایات فرمائی، جس میں ہدایات اور احکام درج تھے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی ہدایات ہیں، اے ایمان والو! عہد و پیمان کو پورا کرو۔ یہ اللہ کے نبی اور رسولؐ کا عہد ہے۔ عمرابن حزم کے لیے جب انہیں یمن کی طرف روانہ کیا۔

انہیں حکم دیا کہ ہر معاملہ میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَالَّذِیْنَ ھُمْ مُحْسِنُوْنَ۔ بے شک اللہ تعالیٰ متقین اور نیکو کاروں کے ساتھ ہے۔ انہیں حکم دیا کہ وہ حق پر عمل کریں جس طرح اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ لوگوں کو خیر کی بشارت دیں اور خیر کا حکم دیں۔ لوگوں کو قرآن پاک کی تعلیم دیں اور اس کے مطالب سمجھائیں۔ قرآن پاک کو وہی چھوئے جو پاک ہو۔ لوگوں کو ان کے حقوق اور ذمہ داریوں سے آگاہ کریں۔ حق میں لوگوں سے نرمی کریں اور ظلم کے معاملے میں ان پر سختی کریں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ظلم کو ناپسند فرماتا ہے اور اس سے منع فرماتا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: اَلَا لَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الظّٰلِمِیْنَ۔ ظالموں پر خدا کی لعنت ہے۔ لوگوں کو جنت کی خوش خبری دیں اور جنتیوں والے کام سکھائیں۔ جہنم اور جہنمیوں والے اعمال سے ڈرائیں۔ لوگوں سے الفت کا برتاؤ کریں، یہاں تک کہ وہ دین کی سمجھ حاصل کر لیں۔

لوگوں کو حج کے احکام، سُنتیں اور فرائض اور فرامینِ خداوندی سکھائیں۔ حج اکبر، حج ہے اور حج اصغر، عمرہ ہے۔ لوگوں کو ایک چھوٹے کپڑے میں نماز پڑھنے سے منع کریں۔ ہاں اتنا ہو کہ اس کے دونوں کنارے اس کے کندھوں پر آجائیں۔ اسی طرح ایک کپڑا باندھ کر اس طرح بیٹھنے سے منع کریں کہ اوپر سے ستر کھلا ہوا ہو۔ گدی پر بالوں کا جوڑا بنانے سے منع کریں۔ ہیجان کے وقت لوگوں کو قبائل اور گروہوں کی طرف بلانے سے منع کریں۔ انہیں چاہیے کہ اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک کی طرف بلائیں اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی طرف نہ بلائے بلکہ قبیلوں اور گروہوں کی طرف بلائے، اسے تلوار سے قتل کر دیں، یہاں تک کہ صرف اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک کی طرف بلائیں۔

لوگوں کو حکم دیں کہ وضو مکمل کریں، چہروں کو دھوئیں، ہاتھوں کو کہنیوں سمیت اور پاؤں کو ٹخنوں سمیت دھوئیں اور سروں کا مسح

کریں، جیسے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ لوگوں کو حکم دیں کہ نماز وقت پر پڑھیں، رکوع اور سجود مکمل طور پر خضوع و خشوع سے ادا کریں۔ صبح کی نماز اندھیرے میں، ظہر زوال آفتاب کے بعد اور عصر اس وقت پڑھیں جب سورج زمین کی طرف جا رہا ہو۔ مغرب رات کے آنے پر پڑھیں، ستاروں کے ظاہر ہونے تک مؤخر نہ کریں۔ عشار کی نماز رات کے ابتدائی حصے میں پڑھیں جب جمعہ کی اذان ہو جائے، تو اس کی طرف جلدی کریں اور جاتے وقت غسل کریں۔

حضرت عمرؓ ابن حزم کو حکم دیا کہ مالِ غنیمت سے پانچواں حصہ لیں۔ اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر زمین کا جو صدقہ واجب کیا ہے وصول کریں، جس زمین کو چشمے یا بارش سے سیراب کیا گیا ہے اس کی پیداوار کا دسواں حصّہ اور جسے بڑے ڈول سے سیراب کیا ہے اس کا بیسواں حصہ وصول کیا جائے ہر دس اونٹوں کی زکوٰۃ دو بکریاں اور ہر بیس کی زکوٰۃ چار بکریاں۔ ہر چالیس گایوں سے ایک گائے اور تیس میں سے ایک تبیع، جذع یا جذعہ، چرنے والی ہر چالیس بکریوں سے ایک بکری وصول کی جائے۔ یہ زکوٰۃ اللہ تعالیٰ نے فرض فرمائی ہے جو وہ زیادہ دے تو وہ اس کے لیے بہتر ہے۔

جو یہودی یا عیسائی خوش دلی سے، دل و جان سے اسلام لے آئے اور دینِ اسلام کی اطاعت قبول کرے تو وہ مومن ہے اس کے حقوق اور ذمہ داریاں وہی ہیں جو مسلمانوں کی ہیں اور جو شخص عیسائیت یا یہودیت پر قائم رہتا ہے اسے مجبور نہیں کیا جائے گا۔ البتہ ہر بالغ مرد و زن پر ایک دینار یا اس مالیت کے کپڑے (بطور جزیہ) لازم ہیں جو شخص یہ ادا کرے گا اس کے لئے خدا اور رسول کا ذمہ ہے اور جو انکار کرے وہ خدا و رسول اور تمام مومنوں کا دشمن ہے۔ صَلَوَاتُ اللّٰهِ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَالسَّلَامُ عَلَيْهِ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهُ اللہ تعالیٰ کی رحمتیں، سلامتی، مہربانی اور برکتیں نازل ہوں محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر۔

رفاعہ ابن زید جذامی کی حاضری

خیبر سے پہلے صلح حدیبیہ کے موقع پر رفاعہ ابن زید جذامی، ضبیبی بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے۔ ایک غلام پیش کیا[1]۔ اور دل و جان سے حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ان کی قوم کے نام ایک مکتوب عنایت فرمایا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ مکتوب اللہ تعالیٰ کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے، رفاعہ ابن زید کو دیا گیا۔ میں نے انہیں ان کی قوم اور قوم میں داخل ہونے والے تمام افراد کی طرف بھیجا ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بلائیں جو ان کی دعوت کو قبول کرے وہ خدا اور رسول کے گروہ میں داخل ہے اور جو قبول نہ کرے اس کے لئے دو ماہ کی مہلت ہے، جب حضرت رفاعہ نے آکر اپنی قوم کو دعوت اسلام دی تو وہ مسلمان ہو گئے اور حرۃ الرجلاء میں آکر قیام پذیر ہو گئے۔

وفد ہمدان

ابن ہشام فرماتے ہیں مجھے ایک معتمد شخص نے عمر ابن عبید اللہ ابن اُذینہ عبدی سے روایت کی کہ انہوں نے ابو اسحاق سبیعی سے

---

[1] اس کا غلام کا نام مدعم تھا جس کا ذکر مؤطا امام مالک میں ہے۔ (سہیلی)

روایت کی کہ بارگاہ رسالت میں ہمدان کا وفد حاضر ہوا جس میں مالک ابن غمط ابو ثور جنہیں ذوالمشعار کہا جاتا تھا مالک ابن الیفع ضمام ابن مالک سلمانی، عمیرہ ابن مالک خارفی تھے۔ یہ لوگ اس وقت بارگاہ اقدس میں حاضر ہوئے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تبوک سے واپس تشریف لائے تھے۔ انہوں نے یمنی چادروں کے سِلے ہوئے کپڑے اور عدنی عمامے زیب تن کئے ہوئے تھے (الیس لکڑی) کے بنے ہوئے کجاووں میں مہرہا (حضر موت کے ایک علاقے کی طرف نسبت) اور ارحی (ہمدان کے ایک قبیلے کی طرف نسبت) اونٹوں پر سوار تھے مالک ابن غمط اور ان کا ایک ساتھی یہ شعر پڑھ رہے تھے ؎

هَمْدَانُ خَيْرُ سُوْقَةٍ وَاَقْيَالُ لَيْسَ لَهَا الْعَالَمِيْنَ اَمْثَالُ

ہمدان کے باشندے بہترین راہنما اور بادشاہ ہیں، دنیا میں ان کی کوئی مثال نہیں ہے۔

مَحَلُّهَا الْهَضَبُ وَمِنْهَا الْاَبْطَالُ لَهَا اَطَابَاتٌ بِهَا وَآكَالُ

وہ بلند جگہ کے رہنے والے ہیں اور ان میں بڑے بڑے بہادر ہیں جنہیں تحفے اور نذرانے دیئے جاتے ہیں۔ ایک دوسرا شخص کہہ رہا تھا

اِلَيْكَ جَاوَزْنَ سَوَادَ الرِّيْفِ فِيْ هَبَوَاتِ الصَّيْفِ وَالْخَرِيْفِ مُخَطَّمَاتٍ بِحِبَالِ اللِّيْفِ

کھجور کے پتوں کی نکیل والی اونٹنیاں موسم گرما اور خزاں کے گرد و غبار سے گزرتی ہوئی سرسبز علاقوں کو طے کر کے آپ کے پاس پہنچی ہیں،

مالک ابن غمط بارگاہِ رسالت میں کھڑے ہو کر عرض کرتے ہیں یا رسول اللہ! ہمدان کے نمائندے شہروں اور دیہات سے تیز رو اور نوعمر اونٹنیوں پر سوار ہو کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں وہ اسلام کی رسی سے بندھے ہوئے ہیں اور انہیں راہ خداوندی میں کوئی ملامت متاثر نہیں کرتی۔ یہ لوگ قبیلۂ خارف، یام اور شاکر کے علاقے سے آئے ہیں جہاں اونٹ اور گھوڑے بکثرت ہیں انہوں نے اللہ تعالےٰ کے رسول کی دعوت قبول کی ہے۔ معبودان باطلہ کو چھوڑ دیا ہے اور ان کا معاہدہ کبھی نہیں ٹوٹے گا جب تک لعلع پہاڑ باقی رہے اور چٹیل میدانوں میں ہرن دوڑتے رہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ایک مکتوب عنایت فرمایا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریر ہے قبیلہ خارف کے شہر، بلند اور ریگستانی زمین والوں کے لئے جن کے ساتھ ان کا نمائندہ ذوالمشعار ہے یعنی مالک بن غمط اور ان لوگوں کے لئے جو ان کی قوم سے اسلام لائے ہیں۔

ان کے لئے ان کی بلند اور پست زمینیں ہیں، جب تک نماز قائم کرتے رہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے رہیں۔ یہ لوگ وہاں کی پیداوار کھائیں گے اور گھاس جانوروں کو کھلائیں گے ان کے لئے یہ اللہ تعالےٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا عہد ہے اور اس پر مہاجرین اور انصار گواہ ہیں۔

اسی بارے میں مالک ابن غمط نے یہ شعر کہے۔

ذَكَرْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ فِيْ فَحْمَةِ الدُّجَى وَنَحْنُ بِاَعْلٰى رَحْرَحَانَ وَصَلْدَدِ

میں نے گہری تاریکی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یاد کیا جب ہم رحرحان اور صلدد (مقامات) کے بالائی حصہ میں تھے۔

وَهُنَّ بِنَا خُوْصٌ طَلَائِحُ تَغْتَلِيْ بِرُكْبَانِهَا فِيْ لَاحِبٍ مُتَمَدِّدِ

اونٹنیاں اپنے سواروں کو لیے دُور دراز راستوں کو طے کر رہی تھیں، اور سفر کی صعوبتوں کی بنا پر ان کی آنکھیں دھنی

ہوئی تھیں۔

عَلَى كُلِّ فَتْلَاءِ الذِّرَاعَيْنِ جَسْرَةٍ تَمُرُّ بِنَا مَرَّ الهِجَفِّ الخَفَيْدَدِ

ہم لمبے بازوؤں والی تیز رفتار اونٹنیوں پر سوار تھے جو ہمیں لیے بڑے شتر مرغ کی طرح بھاگ رہی تھیں۔

حَلَفْتُ بِرَبِّ الرَّاقِصَاتِ إِلَى مِنًى صَوَادِرَ بِالرُّكْبَانِ مِنْ هَضْبِ قَرْدَدِ

منیٰ کی طرف جھومتے ہوئے جانے والی اونٹنیوں کے رب کی قسم کھاتا ہوں جو بلند و بالا زمینوں سے سواروں کو لے کر واپس آتی ہیں۔

بِأَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ فِينَا مُصَدَّقٌ رَسُولٌ أَتَى مِنْ عِنْدِ ذِي العَرْشِ مُهْتَدِ

کہ ہمارے ہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کی جائے گی اور آپ مالک عرش کے رسول اور راہ راست پر ہیں

فَمَا حَمَلَتْ مِنْ نَاقَةٍ فَوْقَ رَحْلِهَا أَشَدَّ عَلَى أَعْدَائِهِ مِنْ مُحَمَّدِ

حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم سے زیادہ دشمنان خدا پر شدت والا کسی اونٹنی نے اپنے کجاوے پر سوار نہیں کیا

وَأَعْطَى إِذَا مَا طَالِبُ العُرْفِ جَاءَهُ وَأَمْضَى بِحَدِّ المَشْرَفِيِّ المُهَنَّدِ

جب کوئی طالب احسان آپ کے پاس آتا ہے، تو آپ اسے بے حساب عطا فرماتے ہیں اور ہندی مشرفی تلوار کی دھار سے آپ کی قوتِ فیصلہ زیادہ تیز ہے۔

---

(۲)

لفظ وفد کی تحقیق

وَفْدٌ، وَافِدٌ کی جمع ہے۔ وفد، قوم کی اس منتخب جماعت کو کہتے ہیں جو اہم مقاصد کے لئے بڑے لوگوں کے پاس جاکر قوم کی نمائندگی کرتی ہے۔ (امام نووی، شرح مسلم ج ا ص ۳۳) وُفود، جمع کی جمع ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ معظمہ میں اعلان توحید و رسالت کیا فرمایا کہ دنیائے کفر و شرک میں زلزلہ آ گیا۔ چند نفوس قدسیہ کے علاوہ تمام مرد و زن، پیر و جواں دشمن جاں بن گئے ایک ایک کو دعوتِ اسلام دی مگر وہ رو براہ ہونے کی بجائے دشمنی میں سخت، سے سخت تر ہوتے گئے۔ سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ طریقہ اختیار فرمایا کہ حج کے موقعہ پر آنے والے مختلف قبائل کے پاس تشریف لیجاتے اور انہیں دین اسلام کی تبلیغ فرماتے، لیکن یہ قبیلے قریش کے منتظر تھے کہ وہ ایمان لائیں تو ہم بھی حلقہ بگوش اسلام ہو جائیں۔

بیعت انصار

اعلان نبوت کے گیارہویں سال (ہجرت سے دو سال پہلے) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم منیٰ کی ایک گھاٹی (عقبہ) میں تشریف فرما تھے کہ مدینہ طیبہ کا رہنے والا قبیلہ خزرج آپ کے پاس پہنچا۔ آپ نے انہیں اسلام کی دعوت دی۔ قرآن پاک سنایا اور فرمایا مجھے اللہ تعالیٰ نے رسول بنا کر بھیجا ہے اگر میری پیروی کرو گے تو دنیا و آخرت کی سعادت حاصل کرو گے۔ یہ لوگ یہودیوں سے سن چکے تھے کہ نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تشریف آوری کا زمانہ قریب آ چکا ہے۔ جب سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گفتگو سنی اور آپ کے جمال و کمال کا دیدار کیا تو آپس میں کہنے لگے۔ خدا کی قسم! یہی وہ پیغمبر ہیں جن کی خبریں یہودی ہمیں دیا کرتے تھے موقع غنیمت جانو اور ایمان لے آؤ۔ ایسا نہ ہو کہ مدینہ والوں میں سے کوئی اور ہم سے سبقت لیجائے۔ چنانچہ یہ حضرات مشرف باسلام ہو گئے یہ حضرات تعداد میں چھ تھے۔ حضرت اسعد ابن زرارہ اور حضرت جابر ابن عبداللہ اسی جماعت میں شامل تھے اس بیعت کو بیعت عقبۂ اولیٰ کہتے ہیں۔ جب یہ حضرات واپس پہنچے تو حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذکر سے مدینہ کی مجلسیں اور گھر منور ہو گئے

(مدارج النبوۃ فارسی، ج ۲، ص ۵۱ - ۵۲)

۱۷۔ وفد انصار

آئندہ سال ہجرت سے ایک سال پہلے اوس اور خزرج کے بارہ افراد مدینہ طیبہ سے آکر اسی گھاٹی کے پاس حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ حضرت عبادہ ابن صامت اور حضرت عویم ابن ساعدہ اور حضرت ذکوان ابن عبد القیس اس جماعت میں شامل تھے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس جماعت کی درخواست پر حضرت مصعب ابن عمیر کو قرآن پاک اور دین کی تعلیم کے لیے ان کے ساتھ بھیج دیا۔ اسی سال مدینہ مطہرہ میں جمعہ قائم کیا گیا (شیخ عبدالحق محدث دہلوی: مدارج النبوۃ فارسی ج ۲ ص ۵۳)

۱۸۔ انصار کا دوسرا وفد

اعلان نبوت کے تیرہویں سال ہجرت سے تین ماہ پہلے حضرت مصعب ابن عمیر ایک بڑی جماعت کے ساتھ حج کے موقعہ پر مکہ مکرمہ حاضر ہوئے۔ اس جماعت میں کچھ مشرک بھی تھے جو حج کے لئے آئے تھے اس وفد کی تعداد میں مختلف روایات ہیں (۱) پانچ سو کے قریب (۲) اوس اور خزرج کے تین سو افراد (۳) ستر (۴) تہتر۔

طے شدہ پروگرام کے مطابق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بارہ ذوالحجہ کو دو تہائی رات گزرنے کے بعد اسی گھاٹی کے پاس تشریف لائے، آپ کے ساتھ آپ کے چچا عباس ابن عبد المطلب بھی تھے جو ابھی اسلام نہیں لائے تھے لیکن آپ کی حفاظت کے خیال سے ساتھ چلے آئے تھے، مدینہ سے آئے ہوئے مشرکین زیارت سے مشرف ہوئے اور اسلام لے آئے۔

حضرت عباس نے فرمایا: تمہیں معلوم ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہمارے درمیان کتنی عزت و شرافت ہے ہم نے ہر چند انہیں منع کیا مگر انہوں نے ہماری بات نہیں سنی اور تمہاری ملاقات کا ارادہ ملتوی نہیں کیا اگر تم ان کیساتھ وفاداری کا پختہ ارادہ رکھتے ہو اور تمہیں اپنے اوپر مکمل اعتماد ہے کہ ان سے جو وعدہ کرو گے اسے پورا کرو گے تو فبہا ورنہ ابھی بتا دو، تاکہ بعد میں تمہیں پریشان نہ ہونا پڑے اور تم ہمیں اپنا دشمن بنالو۔ انہوں نے کہا عباس! ہم نے آپ کی بات سن لی اور سمجھ لی۔ یا رسول اللہ! آپ کیا فرماتے ہیں؟ آپ اپنے لئے اور اپنے رب کے لئے جو وعدہ ہم سے لینا چاہتے ہیں لے لیجئے۔

تعلیمات

حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن پاک کی چند آیات پڑھ کر سنائیں اور فرمایا! اللہ تعالیٰ کا عہد یہ ہے کہ اس کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ! اور میرا عہد یہ ہے کہ احکام الٰہیہ کی تبلیغ میں میرا ساتھ دو اور جو اس معاملے میں آڑے آئے اس سے جہاد کرنے سے گریز نہ کرو نیز فرمایا: میری بیعت کرو کہ جو کچھ میں تمہیں حکم دوں اسے سنو اور سستی ہو یا چستی ہر حال میں فرمانبرداری کرو۔ خوشحالی اور تنگدستی میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرو۔ امر و نواہی کو بجالاؤ۔ حق بات کہو اور کسی ملامت کرنے والے سے نہ ڈرو۔ میرے دست و بازو بنو۔ اور جب میں تمہارے پاس آؤں تو میری اسی طرح

حفاظت کرو جس طرح تم اپنے اہل و عیال کی حفاظت کرتے ہو: انھوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! آپ جانتے ہیں کہ ہمارے باپ دادا کا کام ہی جنگ و قتال تھا۔ لیکن ہمارے اور یہودیوں کے درمیان سابقہ روابط اور معاہدے ہیں اب ہم وہ سب منقطع کردیں گے۔ ایسا نہ ہو کہ جب اللہ آپ کو نصرت اور غلبہ عطا فرمائے تو آپ واپس اپنی قوم کے پاس آجائیں اور ہمیں تنہا چھوڑدیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسکراتے ہوئے فرمایا: ایسا نہیں ہوگا۔ میرا روحانی اور جسمانی تعلق تم سے ہوگا میری زندگی اور موت تمہارے ساتھ۔ میرا مزار تمہارے ہاں اور میرا قیام تمہارے پاس ہوگا۔ جو تم سے جنگ کرے گا میں اس سے جنگ کروں گا اور جو تمہارے ساتھ صلح کرے گا میں اس سے صلح کروں گا۔ عرض کیا یارسول اللہ! اگر ہم سب آپ کی محبت کے راستے میں شہید ہوجائیں اور جان و مال آپ پر قربان کردیں تو اس کی جزا کیا ہوگی؟ فرمایا: جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وہ باغ جن کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ عرض کیا: یہ تو کامیاب سودا ہے۔ یارسول اللہ! اللہ تعالیٰ کا نام لیکر اپنا دست کرم بڑھایئے، ہم آپ کی بیعت کرتے ہیں۔ اسی موقعہ پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ	بیشک اللہ نے مسلمانوں سے ان کے مال اور جان خرید لئے ہیں۔ اس بدلے پر کہ ان کے لئے جنت ہے۔
(التوبہ پ ۱۱ رکوع ۳)	(ترجمہ امام احمد رضا بریلوی)

"اس بیعت کو عقبۂ کبریٰ کہتے ہیں اور بعض ارباب سیرت عقبۂ ثانیہ کہتے ہیں۔ لیکن سابقہ تفصیل کے مطابق اسے عقبۂ ثالثہ کہنا چاہیئے۔ کیونکہ اس گھاٹی کے پاس انصار نے یہ تیسری مرتبہ بیعت کی تھی۔"

(شیخ عبدالحق محدث دہلوی؛ مدارج النبوۃ فارسی ج ۲ ص ۵۲-۵۴)

۱۹- وفد عبدالقیس

فتح مکہ سے کچھ پہلے (۸ھ) قبیلہ عبدالقیس کا وفد بارگاہ رسالت میں حاضر ہوا، قول مشہور کے مطابق اس وقت حج فرض نہیں ہوا تھا۔ حج ۹ھ میں فرض ہوا اسی لئے اس وفد کو دی جانے والی ہدایات میں حج کا ذکر نہیں ہے۔

(امام یحییٰ ابن شرف الدین النواوی، شرح مسلم ج ۱ ص ۳۴)

شرکاء وفد

اس وفد میں چودہ افراد شریک تھے۔ ان میں سے جن کے اسماء معلوم ہوسکے یہ ہیں:

الاشج العصری (قائد وفد) مزیدہ ابن مالک المحاربی، عبیدہ ابن ہمام المحاربی۔ صحار ابن عباس المری، عمر ابن محروم العصری، حارث ابن شعیب العصری اور حارث ابن جندب رضی اللہ تعالیٰ عنہم،

ان حضرات کی آمد کا سبب یہ تھا کہ بنو غنم میں سے منقذ ابن حیان دور جاہلیت میں تجارت کے لئے یثرب آیا

کرتے تھے۔ ایک دفعہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہجرت کے بعد مقام ہجر سے لحاف اور کھجوریں لے کر مدینہ طیبہ آئے ایک دن بیٹھے ہوئے تھے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پاس سے تشریف لیجا رہے تھے یہ اٹھ کر ملے۔ آپ نے فرمایا: منقذ ابن حیان! تمہارا اور تمہاری قوم کا کیا حال ہے؟ پھر ان کی قوم کے معززین کی نام بنام خیریت دریافت کی حضرت منقذ مشرف باسلام ہو گئے۔ سورۂ فاتحہ اور سورۂ اقراء کی تعلیم حاصل کی اور اپنے علاقہ ہجر کی طرف روانہ ہو گئے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں قبیلہ عبدالقیس کے نام ایک مکتوب عنایت فرمایا۔ وہ گرامی نامہ انہوں نے چند دن چھپائے رکھا پھر ایک دن ان کی بیوی بنت المنذر ابن عائذ نے دیکھ لیا۔ اس نے اپنے والد سے تذکرہ کیا اور کہا کہ جب سے میرے شوہر مدینہ سے آئے ہیں عجیب وغریب کام کرتے ہیں، اپنے اعضاء دھوتے ہیں اور ایک طرف (قبلہ کی طرف) منہ کر کے کبھی اپنی پشت جھکاتے ہیں اور کبھی اپنا ماتھا زمین پر رکھتے ہیں حضرت منذر جن کا نام چہرے کے زخم کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اشج رکھا تھا حضرت منقذ سے ملے گفتگو کی اور اسلام لے آئے۔ پھر حضرت منذر نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مکتوب اپنی قوم کو سنایا وہ بھی اسلام لے آئے اور طے پایا کہ بارگاہ رسالت میں حاضری دی جائے۔

بارگاہ رسالت میں

جب یہ وفد مدینہ طیبہ کے قریب پہنچا تو حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حاضرین کو فرمایا تمہارے پاس قبیلہ عبدالقیس کا وفد آ رہا ہے۔ یہ اہل مشرق سے بہترین لوگ ہیں ان میں اشج عصری ہیں۔ یہ لوگ نہ عہد شکن ہیں نہ ردو بدل کرنے والے اور نہ ہی شک میں واقع ہونے والے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں۔ قبیلہ عبدالقیس کا وفد بارگاہ رسالت میں حاضر ہوا انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہم قبیلہ ربیعہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہمارے اور آپ کے درمیان قبیلہ مضر کے کافر حائل ہیں۔ ہم صرف شہر حرام[2] میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو سکتے ہیں۔ آپ ہمیں ایسے احکام بیان فرمائیں جن پر ہم خود عمل کریں اور اپنے دوسرے ساتھیوں کو عمل کی دعوت دیں۔

---

[1] پہلے مدینہ طیبہ کا نام یثرب تھا۔ آب وہوا کے ناخوشگوار ہونے کے سبب وہاں جانیوالے کو ملامت کی جاتی تھی لیکن نبی اکرم کی برکت سے آب وہوا میں بھی تبدیلی آ گئی۔ مولانا سید محمد نعیم الدین مراد آبادی فرماتے ہیں حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ناگوار تھا کہ مدینہ پاک کو یثرب کہا جائے۔ کیونکہ یثرب کے معنی اچھے نہیں ہیں۔ (تفسیر خزائن العرفان پ۲۱ رکوع ۱۸) قرآن پاک میں منافقین کا مقولہ نقل کیا گیا ہے جس میں مدینہ طیبہ کو یثرب کہا گیا ہے ۱۲ اشرف قادری۔

[2] رجب، ذیقعد، ذوالحجہ اور محرم چار مہینوں کو اشہر الحرام کہتے ہیں۔ ان مہینوں میں جنگ ممنوع تھی۔ کافر بھی ان مہینوں کا احترام کرتے تھے اور جنگ سے باز رہتے تھے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

امرکم باربع وانہاکم عن اربع الایمان باللہ ثم فسرھا لھم فقال شھادۃ ان لا الٰہ الا اللہ وان محمدا رسول اللہ واقام الصلوٰۃ وایتاء الزکوٰۃ وان تؤدوا خمس ما غنمتم وانہاکم عن الدباء والحنتم والنقیر والمقیر[1]

میں تمہیں چار چیزوں کا حکم دیتا ہوں اور چار چیزوں سے منع کرتا ہوں یعنی اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا پھر اس کی تفسیر فرمائی کہ اللہ تعالےٰ پر ایمان لانا یہ ہے کہ اس کے وحدہٗ لاشریک ہونے کی گواہی دی جائے اور یہ کہ محمد مصطفیٰ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں (۲) نماز قائم کرنا (۳) زکوٰۃ دینا۔ (۴) غنیمت کا پانچواں حصہ ادا کرو۔ اور تمہیں چار چیزوں سے منع کرتا ہوں (۱) دُبّا (۲) سبز مٹکے (۳) نقیر (۴) مُقَیّر سے

ابتداً جب شراب حرام کی گئی تو ان برتنوں کے استعمال سے بھی منع کر دیا گیا جن میں شراب تیار کی جاتی تھی۔

۱۔ دُبّاء کدو پک کر خشک ہو جاتا تو اوپر سے سوراخ کر کے بطور برتن استعمال کیا جاتا تھا۔

۲۔ حَنتَم سبز مٹکا جس کے اوپر روغن لگا ہوا ہوتا تھا۔

۳۔ نقیر درخت کے تنے کو اندر سے کھوکھلا کر کے برتن بنا لیا جاتا تھا۔

۴۔ مُقیّر وہ برتن جس پر روغن سیاہ لگا دیا جاتا تھا۔

ان سے منع کرنے میں حکمت یہ تھی کہ ان میں انگور کا نچوڑ یا گنے کا رس وغیرہ ڈالا گیا تو وہ جلد نشہ آور ہو جائے گا اور ضائع ہو جائے گا۔ دوسرا یہ کہ لاعلمی میں کوئی اسے پی بیٹھے گا۔ بعد میں یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ کیونکہ شراب سے کلی طور پر اجتناب کیا جا چکا تھا اور احکام پوری طرح واضح ہو چکے تھے۔ حضرت بریدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے تمہیں چند برتنوں میں نبیذ تیار کرنے سے منع کیا تھا۔ اب جس برتن میں چاہو تیار کرو، لیکن نشہ آور نہ پیو۔

۲۰۔ وفد مزینہ

ماہ رجب ۵ھ میں مضر کی شاخ مُزَینہ کا وفد بارگاہ رسالت میں حاضر ہوا۔ یہ پہلا وفد ہے۔ جو بارگاہ رسالت میں مدینہ طیبہ حاضر ہوا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: تم مہاجر ہو چاہے جہاں بھی رہو۔ تم اپنے اموال کے

---

[1] مسلم شریف عربی، مطبوعہ نور محمد کراچی ج ۱ ص ۳۲۔ ۳۴

نوٹ: بقیہ تفصیلات امام یحییٰ ابن شرف النواوی کی شرح مسلم شریف سے ماخوذ ہیں۔

پاس لوٹ جاؤ چنانچہ یہ اپنے علاقے میں واپس چلے گئے۔

یہ دس افراد تھے ان میں خزاعی ابن عبد نہم بھی تھے۔ انہوں نے اپنی قوم کی طرف سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کی لیکن جب اپنی قوم کے پاس پہنچے تو ان کی توقعات پوری نہ ہوئیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانے پر حضرت حسان بن ثابت نے حضرت خزاعی کے بارے میں چند اشعار کہے، حضرت خزاعی نے فرمایا: اے قوم! حضور کے شاعر نے خاص طور پر تمہیں مخاطب کیا ہے۔ خدا کے لیے میری بات مان جاؤ۔ قوم نے کہا: ہم آپ کی مخالفت نہیں کریں گے۔ چنانچہ یہ لوگ مشرف با سلام ہو گئے فتح مکہ کے دن حضور نے مزنیہ کا جھنڈا حضرت خزاعی کو عطا فرمایا ان کی تعداد اس دن ایک ہزار تھی۔

(طبقات ابن سعد، عربی، مطبوعہ بیروت ج ۱ ص ۲۹۰-۲۹۱)

طعام میں برکت:

امام بیہقی اور امام احمد، حضرت نعمان ابن مقرن سے روایت کرتے ہیں کہ ہم قبیلۂ مزینہ کے چار سو افراد بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے۔ واپسی پر ہم نے زادِ راہ کی درخواست پیش کی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر کو فرمایا: انہیں زاد راہ دو، انہوں نے عرض کیا: میرے پاس تھوڑی سی کھجوریں ہیں جو اتنی بڑی جماعت کے لیے کافی نہیں ہوں گی۔ آپ نے فرمایا: جاؤ اور انہیں دیدو۔ حضرت عمر انہیں ساتھ لیکر اپنے بالا خانے پر پہنچے تو دیکھا کہ اونٹ کے برابر کھجوروں کا ڈھیر موجود ہے۔ تمام حضرات نے کھجوریں حاصل کیں۔ حضرت نعمان فرماتے ہیں میں سب سے آخر میں تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ ڈھیر جوں کا توں موجود ہے اس میں سے ایک کھجور بھی کم نہیں ہوئی۔

علامہ محمد ابن عبد الباقی زرقانی فرماتے ہیں اس میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے دو معجزے ہیں (۱) تھوڑی سی کھجوریں اتنی بڑی جماعت کے لیے کافی ہو گئیں (۲) سب نے ضرورت کے مطابق کھجوریں حاصل کر لیں۔ مگر اس ڈھیر میں سے ایک کھجور بھی کم نہ ہوئی

(زرقانی علی المواہب اللدنیہ، عربی، ج ۴، ص ۴۲)

۲۱- وفد اسد

۹ھ کی ابتداء میں بنو اسد کے دس افراد بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے اس جماعت میں یہ حضرات شامل تھے۔

(۱) حضرمی ابن عامر (۲) ضرار ابن الازور (۳) وابصہ ابن معبد (۴) قتادہ ابن القائف (۵) سلمہ ابن حبیش (۶) طلحہ ابن خویلد (۷) نقادہ ابن عبد اللہ ابن خلف۔

حضرمی ابن عامر نے عرض کیا۔

اَتَيْنَاكَ تَدَرَّعُ اللَّيْلَ الْبَهِيْمَ، فِيْ سَنَةٍ شَهْبَاءَ وَلَمْ تَبْعَثْ اِلَيْنَا بَعْثًا،

ہم خشک سالی کے عالم میں، انتہائی تاریک رات کو طے کر کے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں۔ جب کہ آپ نے ہمارے پاس کوئی جماعت نہیں بھیجی۔

اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

یمنون علیک ان اسلموا قل لا تمنوا علیّ اسلامکم بل اللہ یمن علیکم ان ھداکم للایمان ان کنتم صادقین ہ	اے حبیب! وہ تم پر احسان جتاتے ہیں کہ مسلمان ہوگئے۔ تم فرماؤ اپنے اسلام کا احسان مجھ پر نہ رکھو بلکہ اللہ تم پر احسان رکھتا ہے کہ اس نے تمہیں اسلام کی ہدایت کی، اگر تم سچے ہو۔

(سورۃ ق پ ۲۶ رکوع ۱۴) ترجمہ مولانا احمد رضا خاں بریلویؒ؛ (طبقات ابن سعد ج ا ص ۲۹۲)

ابن سعد نے وفد کے دس شرکاء میں سے سات کے نام بیان کئے ہیں۔ علامہ محمد ابن عبدالباقی زرقانی نے ساتواں نام ابوکمعت عرفطہ ابن نضلہ اسدی ذکر کیا ہے اور طلحہ ابن خویلد کی بجائے طلیحہ ابن خویلد ذکر کیا ہے۔ نیز بیان کیا کہ یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مرتد ہو گئے تھے اور نبوت کا دعویٰ کر بیٹھے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد ابن ولید کو حکم دیا کہ پہلے قبیلۂ مضر کی جانب رخ کریں اور مرتدین سے نمٹتے ہوئے یمامہ کی طرف بڑھیں (جہاں مسیلمہ کذاب اپنی بھاری جمعیت کے ساتھ موجود تھا) حضرت خالد ابن ولید نے طلیحہ کو شکست دی اور وہ شام کی طرف بھاگ گئے۔ پھر دل و جان سے اسلام لے آئے۔ اسلام لانے کے بعد ان پر کوئی شبہ نہیں کیا گیا۔ یہ حج کا احرام باندھے ہوئے تھے۔ حضرت عمر نے انہیں دیکھا تو فرمایا: تم دو بہترین مردوں کو شہید کر چکے ہو۔ اس لئے میں تم سے محبت نہیں رکھتا یعنی حضرت عکاشہ ابن محصن اور ثابت ابن اقرم یہ دونوں حضرت خالد ابن ولید کے جاسوس تھے جنہیں طلیحہ نے قتل کر دیا تھا۔ طلیحہ نے کہا یہ دو حضرات وہ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے میرے ہاتھوں عزت عطا فرمائی اور مجھے ان کے ہاتھوں ذلیل نہیں کیا۔

طلیحہ ابن خویلد، مسلمانوں کے ہمراہ قادسیہ اور نہاوند کی جنگ میں شریک ہوئے اور فتوحات میں قابل قدر حصہ لیا۔ کہا جاتا ہے کہ نہاوند میں ۲۱ھ میں شہید ہوئے۔

(زرقانی علی المواہب ج ۴ ص ۶۲-۶۳)

۴۲ - وفد عبس

حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں بنو عبس کے نو افراد حاضر ہوئے یہ مہاجرین اولین میں سے تھے۔ ان کے اسماء یہ ہیں۔ (۱) میسرہ ابن مسروق (۲) حارث ابن ربیع ان ہی کو کامل کہا جاتا ہے۔ (۳) قنان ابن دارم (۴) بشر ابن حارث ابن عبادہ (۵) ہدم ابن مسعدہ (۶) سباع ابن زید (۷) ابوالحصن ابن لقمان (۸) عبداللہ ابن مالک (۹) فروہ ابن الحصین

یہ حضرات مشرف باسلام ہوئے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے دعائے خیر فرمائی اور فرمایا: ایک اور

شخص تلاش کرو جس کے ساتھ مل کر تم دس ہو جاؤ اور میں تمہیں ایک جھنڈا دیدوں۔ اتنے میں حضرت طلحہ ابن عبیداللہ تشریف لائے تو آپ نے انہیں جھنڈا عنایت فرمایا اور ان کا نشان "یا عشرۃ" (اے دس کے گروہ) مقرر فرمایا:

ابن سعد، حضرت ابو ہریرہ سے راوی ہیں کہ بنو عبس کے تین افراد بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا ہمارے اہل علم ہمارے پاس تشریف لائے۔ اور ہمیں بتایا کہ جو ہجرت نہیں کرتا اس کا اسلام نہیں ہے۔ ہمارے پاس اموال اور مویشی ہیں جو ہمارا ذریعہ معاش ہیں۔ اگر ہجرت کے بغیر اسلام مقبول نہیں تو ہم اپنے اموال اور مویشی فروخت کر کے ہجرت کر آتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اتقوا اللہ حیث کنتم فلن یلتکم من اعمالکم شیئاً ولو کنتم بصمد وجازان

تم جہاں بھی رہو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال میں سے کوئی چیز کم نہیں فرمائے گا۔ اگرچہ تم صَمَد اور جازان (دو مقام) میں ہو۔

پھر آپ نے حضرت خالد ابن سنان علیہ السلام کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ ان کی کوئی اولاد نہیں ہے فرمایا: وہ نبی تھے جنہیں ان کی قوم نے ضائع کر دیا۔ پھر حضرت خالد ابن سنان علیہ السلام کے کچھ واقعات صحابہ کرام کو بیان فرمائے۔

(طبقات ابن سعد، عربی ج ۱ ص ۲۹۶)

۲۳۔ وفد فزارہ

۹ھ میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تبوک سے واپس تشریف لائے تو آپ کی خدمت میں بنو فزارہ کا دس سے زائد افراد کا ایک وفد حاضر ہوا جس میں یہ حضرات تھے۔ (۱) خارجہ ابن حصن (۲) حُر ابن قیس ابن حصن یہ عمر میں سب سے چھوٹے تھے یہ حضرات کمزور سواریوں پر سوار تھے۔ اور مسلمان ہو کر بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے ان کے شہروں کے بارے میں دریافت فرمایا تو انہوں نے عرض کیا ہمارے شہر خشک سالی کی زد میں ہیں۔ ہمارے مویشی ہلاک ہو گئے۔ ہمارا علاقہ قحط کا شکار ہے اور کھیتیاں خشک ہو گئی ہیں۔ آپ اپنے رب سے ہمارے لئے دعا کریں حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم منبر پر تشریف فرما ہوئے اور دعا کی۔

اَللّٰھُمَّ اَسقِ عبادکَ و بھآئمکَ وانشُر رَحمتکَ واحیِ بلدکَ المیّتَ اللّٰھُمَّ اسقنا غیثاً مغیثاً مریئاً مریعاً مطبقاً واسعاً عاجلاً غیر اٰجلٍ نافعاً غیر ضآرٍ اللّٰھُمَّ اسقنا سقیا رحمۃ لا سقیا عذاب ولا ھدمٍ

اے اللہ! اپنے شہروں اور چوپایوں کو سیراب فرما اپنی رحمت عام فرما اور اپنے مردہ شہر کو زندگی عطا فرما۔ اے اللہ! ہمیں سیراب کرنے والی، خوشگوار تازگی بخش، وسیع اور ہمہ گیر بارش جلدی عطا فرما۔ دیر سے نہیں، مفید ہو نقصان دہ نہ ہو۔ اے اللہ!

وَلَا غَرَقٍ وَلَا مَحْقٍ اَللّٰھُمَّ اسْقِنَا الْغَیْثَ وَانْصُرْنَا عَلَی الْاَعْدَاءِ

ہمیں رحمت کی بارش عطا فرما جو باعثِ عذاب، مکانات کو گرانے والی، افراد کو غرق اور فنا کرنے والی نہ ہو اے اللہ ! ہمیں بارش عطا فرما اور دشمنوں کے خلاف ہماری امداد فرما۔

بارش اس قدر ہوئی کہ اگلے چھ دن آسمان دکھائی نہیں دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پھر منبر پر تشریف فرما ہوئے اور دعا کی۔

اَللّٰھُمَّ حَوَالَیْنَا وَ لَا عَلَیْنَا عَلَی الْاٰکَامِ وَالظِّرَابِ وَبُطُوْنِ الْاَوْدِیَۃِ وَمَنَابِتِ الشَّجَرِ

اے اللہ ! ہمارے ارد گرد بارش ہو۔ ہم پر نہ ہو۔ ٹیلوں، پہاڑیوں، وادیوں کے پیٹ اور جنگلوں میں بارش ہو۔

مدینہ طیبہ کے اوپر سے بادل اس طرح ہٹ گیا جیسے کپڑا ایک طرف کر دیا جائے۔

(طبقات ابن سعد عربی ج ۱ ص ۲۹۷)

دُعا کی قبولیت

علامہ زرقانی کی بیان کردہ روایت میں ہے۔ خدا کی قسم آسمان پر بادل کا نام و نشان تک نہ تھا۔ مسجد نبوی اور سلع پہاڑ کے درمیان کوئی عمارت اور گھر نہ تھا (حتیٰ کہ بادل کے دیکھنے سے کوئی عمارت مانع ہوتی) سلع کے پیچھے سے ڈھال ایسا بادل نمودار ہوا اور آسمان کے درمیان پہنچ کر دیکھتے ہی دیکھتے پھیل گیا پھر اتنی بارش ہوئی کہ ہفتہ بھر سورج دکھائی نہ دیا۔

(زرقانی علی المواہب، ج ۴ ص ۶۲)

۲۴۔ وفد مُرّہ

۹ھ میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تبوک سے واپس تشریف لائے تو تیرہ افراد پر مشتمل بنو مُرّہ کا وفد بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوا۔ ان کے قائد حضرت حارث ابن عوف تھے۔ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ! ہم آپ کی قوم اور قبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہم لوئی ابن غالب کی اولاد ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسکرائے اور فرمایا : تم نے اپنے اہل و عیال کو کہاں چھوڑا ہے ؟ عرض کیا سلاح اور اس کے قرب و جوار میں۔ پھر آپ نے پوچھا تمہارے شہروں کا کیا حال ہے ؟ عرض کیا خشک سالی کے شکار ہیں۔ آپ ہمارے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے ! آپ نے دعا کی

اَللّٰھُمَّ اسْقِھِمُ الْغَیْثَ

یا اللہ ! انہیں بارش عطا فرما !

پھر حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا انہیں عطیات دو۔ انہوں نے ہر ایک کو دس اوقیہ چاندی (چار سو درہم کی مقدار) عنایت

کی اور حضرت حارث ابن عوف کو بارہ اوقیہ چاندی (چار سو اسی درہم کی مقدار) دی۔ یہ حضرات اپنے علاقہ میں واپس گئے تو معلوم ہوا کہ جس روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے دعا کی تھی اسی روز بارش ہو گئی تھی۔

(طبقات ابن سعد، عربی ج ۱ صـ ۲۹۷-۲۹۸)

۲۵۔ وفد ثعلبہ

سنہ ۸ھ میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جعرانہ سے واپس تشریف لائے تو قبیلہ ثعلبہ کے چار افراد بارگاہ اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کیا ہم اپنی قوم کے نمائندے ہیں۔ ہم اور ہماری قوم اسلام لا چکے ہیں۔ آپ نے حکم دیا کہ ان کی مہمانی کی جائے چند روز قیام کے بعد جب رخصت ہونے لگے تو آپ نے حضرت بلال کو فرمایا ان کو عطیہ دیا جائے جس طرح دوسرے وفود کو دیا جاتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے ہر ایک کو پانچ اوقیہ چاندی (دو سو درہم کی مقدار) عنایت کی اور یہ حضرات واپس چلے گئے اس وقت ان کی جیب میں نقدی بالکل نہیں تھی۔

۲۶۔ وفد محارب

سنہ ۱۰ھ میں دس افراد پر مشتمل قبیلہ محارب کا ایک وفد حجۃ الوداع کے موقع پر بارگاہ رسالت میں حاضر ہوا۔ اس وفد میں سواء ابن حارث اور ان کے بیٹے خزیمہ ابن سواء تھے۔ انہیں رملہ بنت حارث کے گھر میں ٹھہرایا گیا۔ حضرت بلال صبح اور شام کا کھانا ان کے پاس لاتے تھے۔ یہ حضرات اسلام لے آئے اور کہا کہ ہم اپنے پچھلوں کو اسلام کی دعوت دیں گے۔ اس موقعہ پر اس قوم سے زیادہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی دشمن نہ تھا۔ ان میں سے ایک شخص کو آپ نے پہچان لیا تو اس نے عرض کیا۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ ابقانی حتّٰی صدقت بک

تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے جس نے مجھے اس وقت تک زندہ رکھا کہ میں آپ پر ایمان لے آیا۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "اِنَّ ھٰذِہِ الْقُلُوْبَ بِیَدِ اللّٰہِ" "یہ دل اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں۔ آپ نے حضرت خزیمہ ابن سواء کے چہرے پر دست شفقت پھیرا تو وہ گورا اور روشن ہو گیا۔ آپ نے انہیں عطیات سے نوازا جس طرح دیگر وفود کو نوازتے تھے۔ پھر یہ حضرات واپس چلے گئے۔

(طبقات ابن سعد، عربی، ج ۱، صـ ۲۹۹)

مواہب لدنیہ میں امام بیہقی کے حوالے سے حضرت طارق ابن عبداللہ محاربی کی روایت میں ہے کہ میں سوق ذوالمجاز[۱] میں کھڑا تھا کہ ایک بزرگ تشریف لائے وہ کہہ رہے تھے۔ ایھا الناس قولوا لا الٰہ الا اللہ تفلحوا

---

[۱] عرفات سے تین میل کے فاصلے پر ایک جگہ جہاں عربوں کا میلہ لگتا ہے۔

کلمۂ طیبہ پڑھ لو کامیاب ہو جاؤ گے۔ ایک شخص ان کے پیچھے پیچھے پتھر مار رہا تھا اور کہہ رہا تھا یہ جھوٹے ہیں ان کی تصدیق نہ کرو۔ میں نے پوچھا یہ کون ہیں؟ مجھے بتایا گیا کہ یہ بنو ہاشم کے ایک شخص ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں میں نے پوچھا یہ پتھر مارنے والا کون ہے؟ تو بتایا گیا کہ یہ عبدالعزّیٰ ابولہب ہے۔

جب لوگ ایمان لے آئے اور ہجرت کر کے مدینہ طیبہ چلے گئے تو ہم ربذہ سے کھجوریں خریدنے کے ارادے سے مدینہ منورہ کی طرف روانہ ہوئے۔ جب ہم مدینہ طیبہ کے باغات اور نخلستان کے قریب پہنچے تو ہم نے مناسب سمجھا کہ اتر کر لباس تبدیل کر لیں، کیا دیکھتے ہیں کہ ایک صاحب تشریف لائے۔ انہوں نے دو چادریں زیب تن کی ہوئی تھیں۔ انہوں نے سلام کیا اور پوچھا تم لوگ کہاں سے آئے ہو؟ ہم نے بتایا ربذہ سے۔ پھر پوچھا کہاں کا ارادہ ہے؟ ہم نے بتایا مدینہ طیبہ کا۔ انہوں نے پوچھا مقصد کیا ہے؟ ہم نے کہا کہ ہم کھجوریں خریدنا چاہتے ہیں۔ ہمارے ساتھ ایک خاتون بھی تھیں اور ایک سرخ اونٹ جس کو نکیل ڈالی گئی تھی فرمایا: کیا تم یہ اونٹ میرے پاس فروخت کرنا پسند کرو گے؟ ہم نے کہا ہاں! اتنے صاع کھجوریں لیں گے انہوں نے اونٹ کی نکیل پکڑی اور لے کر چلے گئے۔

چودھویں کے چاند ایسا چہرہ

جب وہ مدینہ کے باغات اور نخلستان کی اوٹ میں چلے گئے تو ہم نے کہا۔ یہ ہم نے کیا کیا؟ ہم نے شناسائی کے بغیر اونٹ بیچ دیا اور اس کی قیمت بھی نہیں لی۔ ہماری ساتھی خاتون نے کہا۔ خدا کی قسم! میں نے ایسا شخص دیکھا ہے جس کا رخ تاباں چودھویں رات کے چاند کا ٹکڑا معلوم ہوتا ہے۔ میں تمہارے اونٹ کی قیمت کی ضامن ہوں۔ ابن اسحاق کی روایت میں ہے اس خاتون نے کہا تم ایک دوسرے کو ملامت نہ کرو۔ ان کا نورانی چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ دھوکہ نہیں دیں گے میں نے آج تک ان کے چہرے سے زیادہ بدر تمام کے مشابہ کوئی چیز نہیں دیکھی۔

ہم یہی گفتگو کر رہے تھے کہ ایک صاحب تشریف لائے اور بتایا کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیجا ہے۔ یہ تمہاری کھجوریں ہیں تم خوب جی بھر کر کھاؤ اور اس کے بعد پیمائش کر کے اپنا حق وصول کر لو۔ ہم نے پیٹ بھر کر کھجوریں کھائیں پھر مقررہ مقدار وصول کر لی۔ بعد ازاں ہم مدینہ طیبہ میں داخل ہوئے اور جب مسجد میں داخل ہوئے تو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر جلوہ افروز صحابہ کرام کو خطاب فرما رہے تھے جب ہم حاضر ہوئے تو آپ فرما رہے تھے۔

تصدقوا فان الصدقة خیر لکم الید العلیا خیر من الید السفلیٰ

صدقہ دو کیونکہ صدقہ تمہارے لئے بہتر ہے۔ اونچا ہاتھ (دینے والا) نیچے والے ہاتھ (لینے والے) سے بہتر ہے

(زرقانی علی المواہب، ج ۴، ص ۵۵-۵۶)

ے مدینہ طیبہ سے مشرق کی طرف تین دن کے فاصلے پر عراق سے حج کیلئے آنے والوں کے راستے میں ایک جگہ جہاں حضرت ابوذر غفاری اور دیگر صحابہ کرام کے مزارات ہیں یہ گاؤں ابتداء اسلام میں آباد تھا اب اس کا کوئی نام و نشان نہیں ہے۔ (زرقانی)

۲۷۔ وفد کلاب

۹ھ میں تیرہ افراد پر مشتمل بنو کلب کا ایک وفد بارگاہ رسالت میں حاضر ہوا ان میں لبید ابن ربیعہ اور جبار ابن سلمٰی تھے۔ آپ نے انہیں رملہ بنت حارث کے گھر میں ٹھہرایا حضرت جبار اور حضرت کعب ابن مالک آپس میں دوست تھے جب حضرت کعب کو ان کی آمد کا پتہ چلا تو انہوں نے انہیں خوش آمدید کہی اور حضرت جبار کو تحفہ پیش کیا اور ان کے شایان شان تعظیم و تکریم کی۔

یہ حضرات، حضرت کعب کے ساتھ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلامی طریقے کے مطابق سلام عرض کر کے کہنے لگے کہ حضرت ضحاک ابن سفیان ہمارے پاس اللہ تعالیٰ کی کتاب اور آپ کی سنت لیکر پہنچے جس کا آپ نے حکم دیا ہے اور ہمیں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ کی طرف بلایا چنانچہ ہم نے خدا اور رسول کے حکم کی تعمیل کی۔ انہوں نے ہمارے مالداروں سے صدقہ وصول کر کے ہمارے فقراء میں تقسیم کر دیا۔

(طبقات ابن سعد ج ۱ صـ ۳۰۰)

۲۸۔ وفد عقیل ابن کعب

بنو عقیل کا ایک وفد بارگاہ رسالت میں حاضر ہوا جس میں یہ حضرات تھے۔ (۱) ربیع ابن معاویہ (۲) مطرف ابن عبداللہ (۳) انس ابن قیس۔ انہوں نے بیعت کی اور حلقہ بگوش اسلام ہوئے اور اپنی قوم کی طرف سے بیعت کی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں عقیق بنو عقیل عطا فرمایا یہ ایک مقام تھا جس میں چشمے اور کھجوریں تھیں یہ مکتوب سرخ چمڑے میں لکھ کر عنایت فرمایا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

هٰذا ما اعطى محمد رسول الله صلى الله عليه وسلم ربيعًا و مطرفًا و انسًا اعطاهم العقيق ما اقاموا الصلوٰة واتوا الزكوٰة وسمعوا واطاعوا ولم يعطهم حقًا لمسلم

یہ اللہ تعالیٰ کے رسول محمد مصطفیٰ نے عطا کیا ہے۔ ربیع مطرف اور انس کو مقام عقیق عطا کیا ہے۔ جب تک وہ نماز قائم کریں، زکوٰۃ دیں، احکام سنیں اور اطاعت کریں۔ اور انہیں کسی مسلمان کا حق نہیں دیا۔

یہ مکتوب حضرت مطرف کے پاس تھا۔

(طبقات ابن سعد ج ۱ صـ ۲ - ۳۰۱)

۲۹۔ وفد جعدہ

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رقاد ابن عمر ابن ربیعہ ابن جعدہ حاضر ہوئے۔ آپ نے انہیں مقام فلجہ میں زمین عطا فرمائی اور انہیں تحریر لکھ دی۔

(ایضاً : ج ۱ صـ ۳۰۳)

۳۰ - وفد قشیر ابن کعب

حجۃ الوداع سے پہلے اور حنین کے بعد بارگاہِ رسالت میں بنو قشیر کے چند افراد کا ایک وفد حاضر ہوا۔ جس میں یہ حضرات تھے۔

(۱) ثور ابن عروہ (۲) حیدہ ابن معاویہ (۳) قُرۃ ابن ھُبیرہ یہ مشرف باسلام ہوئے۔ آپ نے اوّل الذکر کو ایک خطۂ زمین عنایت فرمایا اور تحریر لکھ دی اور آخر الذکر کو ان کی قوم پر صدقات کے وصول کرنے پر مقرر فرمایا اور انہیں ایک چادر عنایت فرمائی۔ (حوالہ مذکور)

۳۱ - وفد بنو البکاء

۹ھ میں بنو البکار کا ایک وفد بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوا۔ اس وفد کے چند شرکا کے اسماء یہ ہیں۔

(۱) معاویہ ابن ثور ابن عبادہ ابن البکاء ان کی عمر اس وقت سو سال تھی (۲) بشر ابن معاویہ (۳) فجیع ابن عبداللہ (۴) عبد عمر البکائی یہ اَصَمّ (بہرے) کہلاتے تھے۔

آپ نے ان کے قیام اور مہمانی کا حکم دیا اور عطیات سے نوازا۔ حضرت معاویہ ابن ثور نے عرض کیا: میں بوڑھا ہو چکا ہوں میرے اس بیٹے نے میری بہت خدمت کی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اس کے چہرے پر دست اقدس پھیر کر اسے برکت عطا فرمائیں۔ آپ نے حضرت بشر کے چہرے پر دستِ شفقت پھیرا اور انہیں چند بکریاں عنایت فرمائیں ان پر بھی دستِ اقدس پھیر کر انہیں برکت عطا فرمائی۔ حضرت جعد ابن عبداللہ فرماتے ہیں کہ بعض اوقات بنو البکاء خشک سالی کا شکار ہو جاتے تھے۔ لیکن ان حضرات پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ آپ نے عبد عمر کا نام عبدالرحمٰن رکھ دیا۔

(ایضاً ج ۱ ص ۵ - ۳۰۴)

۳۲ - وفد کنانہ

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تبوک کی طرف روانگی کی تیاری فرما رہے تھے کہ حضرت واثلہ ابن اسقع، مدینہ طیبہ حاضر ہوئے اور آپ کے ساتھ صبح کی نماز ادا کی آپ نے فرمایا: تم کون ہو؟ کیسے آئے ہو؟ اور مقصد کیا ہے؟ انہوں نے اپنا نام و نسب بیان کیا اور عرض کیا میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے لئے حاضر ہوا ہوں آپ نے فرمایا تم یہ بیعت کرو کہ تم احکام کی تعمیل کرو گے خواہ ذاتی طور پر تمہیں پسند ہوں یا ناپسند چنانچہ انہوں نے بیعت کی اور اپنی قوم کی طرف لوٹ گئے۔

جب انہوں نے اپنی قوم کو ایمان لانے کی اطلاع دی تو ان کے والد نے کہا۔ بخدا! میں تم سے کبھی کوئی بات نہیں

کروں گا۔ البتہ ان کی بہن نے ان کی گفتگو سنی تو اسلام لے آئی اور آپ کو سفر خرچ دیا۔ حضرت واثلہ مدینہ طیبہ آئے تو انہیں معلوم ہوا کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم تبوک تشریف لے گئے ہیں۔ حضرت واثلہ نے فرمایا جو مجھے اپنی سواری پر سوار کریگا، مال غنیمت میں سے میرا حصہ اس کے لئے ہو گا۔ حضرت کعب ابن عجرہ نے انہیں اپنے ساتھ لیا اور بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو گئے اور غزوہ تبوک میں شریک ہوئے۔ آپ نے حضرت واثلہ کو حضرت خالد ابن ولید کے ساتھ اکیدر کی طرف بھیجا۔ وہاں سے ملنے والے مال غنیمت کا حصہ لیکر حضرت کعب ابن عجرہ کے پاس آئے اور انہیں پیش کیا۔ لیکن انہوں نے لینے سے انکار کر دیا اور فرمایا اپنے پاس رکھو میں نے محض اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے آپ کو اپنی سواری پر سوار کیا تھا۔

(ایضاً ج ۱ ص ۶-۳۰۵)

۴۳- وفد بنو عبد ابن عدی

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں بنو عبد ابن عدی کا ایک وفد حاضر ہوا جس میں حارث ابن اہبان، عویمر ابن اخرم حبیب ابن ملّہ، ربیعہ ابن ملّہ اور ان کی قوم کے چند افراد تھے۔ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہم حرم کے باشندے اور حرم کے معزز ترین افراد ہیں ہم آپ سے جنگ نہیں کرنا چاہتے اگر آپ قریش کے علاوہ کسی قوم کے ساتھ جہاد کریں گے تو ہم آپ کا ساتھ دیں گے، ہم قریش سے جنگ نہیں کریں گے۔ ہم آپ سے اور آپ کے خاندان سے محبت رکھتے ہیں اگر آپ کی طرف سے ہمارا کوئی ساتھی خطأً قتل ہو گیا تو آپ دیت دیں گے اور اگر ہم نے غلطی سے آپ کے کسی ساتھی کو شہید کر دیا تو ہم اس کی دیت دیں گے۔ آپ نے یہ شرطیں منظور فرما لیں تو یہ حضرات اسلام لے آئے۔

(ایضاً ج ۱ ص ۳۰۶)

۴۴- وفد اشجع

جنگ خندق[1] کے سال قبیلہ اشجع کے ایک سو افراد بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے۔ ان کے سردار مسعود ابن رخیلہ تھے یہ حضرات سلع (پہاڑ) کی گھاٹیوں میں فروکش ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے پاس تشریف لے گئے اور حکم دیا کہ انہیں کھجوروں کی بوریاں عطا کی جائیں۔ انہوں نے کہا یا رسول اللہ! کوئی قوم ہماری قوم سے تعداد میں کم اور رہائش میں آپ کے زیادہ قریب نہیں ہے۔ ہم آپ سے اور آپ کی قوم سے جنگ کے متحمل نہیں ہیں ہم آپ سے مصالحت کے لئے حاضر ہوئے ہیں آپ نے ان سے مصالحت فرمائی۔

بعض نے کہا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنو قریظہ سے فارغ ہو گئے تو قبیلہ اشجع کے سات سو افراد بارگاہ رسالت

---

[1] جنگ خندق قول صحیح کے مطابق ۵ھ کو ہوئی ۱۲ شرح مسلم امام نواوی ج ۱ ص ۱۳۱

میں حاضر ہوئے آپ نے ان سے مصالحت فرمائی پھر وہ حضرات اسلام لے آئے۔

(ایضاً ج ۱ ص ۳۰۶)

۳۵ - وفد باہلہ

مطرف ابن کاہن باہلی اپنی قوم کے نمائندے کی حیثیت سے بارگاہ رسالت میں حاضر ہو کر مشرف باسلام ہوئے اور اپنی قوم کے لئے امان حاصل کی۔ آپ نے انہیں ایک تحریر دی جس میں صدقات کی تفصیلات تھیں پھر نہشل ابن مالک وائلی باہلی قوم کے نمائندے بن کر حاضر ہوئے اور اسلام لائے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اور ان کی قوم کے مسلمانوں کو ایک تحریر عنایت فرمائی جس میں اسلامی احکام لکھے ہوئے تھے۔ یہ مکتوب حضرت عثمان ابن عفان رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے لکھا تھا۔

(ایضاً ج ۱ ص ۳۰۷)

۳۶ - وفد سُلیم

بنو سلیم کے ایک فرد، قیس ابن نُسیبہ بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے۔ آپ کا کلام سنا اور چند اشیاء کے بارے میں سوال کیا۔ جن کا آپ نے جواب دیا۔ پھر آپ نے انہیں اسلام کی دعوت دی تو وہ اسلام لے آئے۔ جب اپنی قوم بنو سلیم کے پاس پہنچے تو انہیں کہا میں نے اہل روم اور فارس کی گفتگو، عرب کے اشعار، کاہنوں کی کہانت اور حمیر کا کلام سنا لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام ان سب سے مختلف ہے۔ میری بات مانو اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنا حصہ حاصل کرو۔ فتح مکہ کے سال بنو سلیم کے نو سو بعض نے کہا ایک ہزار افراد مقام قدید میں بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے۔ ان میں عباس ابن مرداس، انس ابن عیاض اور راشد ابن عبد ربّہ تھے۔ یہ حضرات اسلام لائے اور عرض کیا ہمیں لشکر کے مقدمہ میں جگہ دی جائے۔ ہمیں سرخ جھنڈا عطا کیا جائے اور ہماری علامت "مُقَدَّم" مقرر کی جائے آپ نے یہ سب باتیں قبول فرمائیں اور یہ حضرات فتح مکہ، طائف اور حنین میں آپ کے ساتھ رہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت راشد ابن عبد ربّہ کو مقام رہاط عطا فرمایا جس میں "عین الرسول" نامی ایک چشمہ تھا حضرت راشد، بنو سلیم کے بُت کے خادم ہوا کرتے تھے ایک دن انہوں نے دیکھا کہ دو لومڑیاں اس بُت پر پیشاب کر رہی ہیں تو کہنے لگے۔

أَرَبٌّ يَبُولُ الثُّعْلُبَانُ بِرَأْسِهِ ـــ لَقَدْ ذَلَّ مَنْ بَالَتْ عَلَيْهِ الثَّعَالِبُ

کیا دو لومڑیاں رب کے سر پر پیشاب کر رہی ہیں۔ جس پر لومڑیاں پیشاب کریں وہ بہت ہی ذلیل ہے۔

پھر انہوں نے بت کو پاش پاش کر دیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ آپ نے فرمایا: تمہارا نام کیا ہے؟ عرض کیا غاوی ابن عبد العزّیٰ، آپ نے فرمایا: تم راشد ابن عبد ربّہ ہو۔ چنانچہ وہ اسلام لے آئے اور فتح مکہ کے موقع پر بارگاہِ اقدس میں حاضر رہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: عرب کے دیہات میں سے بہترین خیبر ہے

اور بنو سلیم میں سے بہترین راشد ہیں۔ آپ نے انہیں ان کی قوم پر عامل مقرر فرما دیا۔

(ایضاً : ج ۱ ص ۸ - ۳۰۷)

۳۷ - وفد ہلال ابن عامر

بنو ہلال کے چند افراد بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے۔ ان میں سے ایک کا نام عبدعوف ابن اصرم تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نام پوچھا۔ انہوں نے اپنا نام عرض کیا تو آپ نے فرمایا : تمہارا نام عبداللہ ہے۔ (عبدعوف نہیں) وہ اسلام لے آئے۔ اس جماعت میں قبیصہ ابن مخارق بھی تھے۔ انہوں نے عرض کیا میں نے اپنی قوم کی طرف سے اپنے ذمہ قرض لے رکھا ہے۔ اس میں میری امداد فرمائیں آپ نے فرمایا ٹھیک ہے۔ جب صدقات آئیں گے تو تمہارا قرض ادا کر دیا جائے گا۔

زیاد ابن عبداللہ ہلالی بھی حاضر ہوئے۔ جب وہ مدینہ طیبہ میں داخل ہوئے تو ام المؤمنین حضرت میمونہ بنت حارث رض کے کاشانۂ مبارکہ میں حاضر ہوئے۔ حضرت میمونہ ان کی خالہ تھیں۔ ان کی والدہ کا نام غُرّہ بنت حارث تھا وہ اس وقت جوان تھے، جب رسول تشریف لائے تو انہیں حضرت میمونہ کے پاس دیکھا اور اظہار ناراضگی کے طور پر واپس تشریف لے آئے حضرت میمونہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ! یہ میرا بھانجا ہے۔ آپ اندر تشریف لے آئے اور زیاد کو ساتھ لیکر مسجد میں تشریف لے آئے اور ظہر کی نماز ادا کی۔ پھر زیاد کو قریب بلایا ان کے لئے دعا کی اور دست مبارک ان کے سر پر رکھا اور پھیرتے ہوئے ان کی ناک تک لے آئے۔ بنو ہلال کہا کرتے تھے کہ ہم (حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دست کرم کی بدولت) زیاد کے چہرے میں ہمیشہ برکت دیکھتے ہیں۔

(ایضاً : ج ۱ ص ۱۰ - ۳۰۹)

۳۸ - وفد ثقیف

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طائف کا محاصرہ کیا تو عروہ ابن مسعود اور غیلان ابن سلمہ حاضر نہ تھے یہ جُرش (مقام) میں پتھر پھینکنے کے آلات (منجنیق) اور ٹینک قسم کے آلات بنانے کا طریقہ سیکھ رہے تھے۔ جب آپ واپس تشریف لے آئے تو یہ دونوں طائف پہنچے تو انہوں نے منجنیق اور ٹینک نما آلات نصب کئے اور جنگ کے لئے تیار ہو گئے اللہ تعالیٰ نے حضرت عروہ کے دل میں اسلام کی محبت ڈال دی چنانچہ وہ بارگاہ رسالت میں حاضر ہو کر اسلام لے آئے۔

پھر انہوں نے اجازت طلب کی کہ میں اپنی قوم کے پاس جا کر انہیں اسلام کی دعوت دوں گا۔ آپ نے فرمایا : تب تو وہ تمہیں قتل کر دیں گے۔ انہوں نے عرض کیا وہ مجھے اپنی کمسن اولاد سے بھی زیادہ محبوب رکھتے ہیں۔ دوبارہ، سہ بارہ اجازت طلب کی تو فرمایا : اگر تم چاہتے ہو تو چلے جاؤ۔ حضرت عروہ اپنی قوم کے پاس طائف پہنچے، ان کے رشتہ دار ملنے آئے تو انہوں نے مشرکانہ رسم کے مطابق سلام کہا۔ حضرت عروہ نے کہا : تم جنتیوں کے طریقے کے مطابق سلام کہو اور انہیں

اسلام کی دعوت دی، وہ لوگ مشورہ کرنے کے لئے چلے گئے۔ صبح ہوئی تو حضرت عروہ نے بالاخانے پر چڑھ کر اذان کہی، پھر کیا تھا ہر طرف سے قبیلہ ثقیف کے افراد دوڑ پڑے۔ اوس ابن عوف نے تیر مارا جو ان کی کنپٹی پر لگا۔ خون تھا کہ بند ہونے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔

ان کے ہمنواؤں نے دیکھا تو وہ بھی مسلح ہو کر لڑنے کے لئے تیار ہو گئے۔ حضرت عروہ نے فرمایا تمہارے درمیان مصالحت کے لئے میں نے اپنا خون معاف کر دیا اور فرمایا اللہ تعالیٰ نے مجھے شہادت اور عزت عطا فرمائی ہے۔ مجھے ان شہداء کے پہلو میں دفن کر دینا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں جہاد کرتے ہوئے شہید ہو گئے تھے چنانچہ ان کے وصال کے بعد انہیں شہداء کے پاس سپرد خاک کر دیا گیا۔

ابوالملیح ابن عروہ اور قارب ابن اسود ابن مسعود بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو کر اسلام لائے۔ آپ نے ان سے مالک ابن عوف کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے عرض کیا کہ ہم انہیں طائف میں چھوڑ آئے ہیں۔ آپ نے فرمایا انہیں اطلاع دیدو کہ اگر اسلام لے آئیں تو ان کے اہل وعیال اور اموال واپس کر دیئے جائیں گے اور ایک سو اونٹ بطور عطیہ دیئے جائیں گے چنانچہ مالک ابن عوف اسلام لے آئے اور آپ نے اپنا وعدہ پورا فرما دیا اور انہیں ثقیف کی سرکوبی پر مقرر فرما دیا۔ انہوں نے ثقیف کے ساتھ معرکہ آرائی شروع کر دی۔

ان حالات کے پیش نظر ثقیف نے بارگاہ رسالت میں وفد بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ دس سے زیادہ افراد کا ایک وفد بارگاہ رسالت میں حاضر ہوا جس میں عبدیالیل، ان کے دو بیٹے کنانہ و ربیعہ، شرجیل ابن غیلان، حکم ابن عمر، عثمان ابن ابی العاص، اوس بن عوف، اور نمیر ابن خرشہ شامل تھے۔ ان کی آمد کی خبر سن کر سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم انتہائی مسرور ہوئے یہ حضرات مشرف باسلام ہوئے انہوں نے درخواست کی کہ ہمیں لات اور عزیٰ بتوں کے توڑنے کا پابند نہ کیا جائے یہ درخواست قبول کی گئی اور حضرت مغیرہ ابن شعبہ نے ان بتوں کو توڑنے کا فریضہ انجام دیا

(ایضاً : ج ۱ ص ۳۱۲-۳۱۳)

۳۹ - وفد بکر ابن وائل

قبیلہ بکر ابن وائل کا ایک وفد بارگاہ رسالت میں حاضر ہوا جس میں بشیر ابن الخصاصیہ، عبداللہ ابن مرثد، حسان ابن خوط اور عبداللہ ابن اسود تھے۔ حضرت عبداللہ ابن اسود، یمامہ میں قیام پذیر تھے۔ انہوں نے اپنا مال فروخت کیا اور ہجرت کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ اس وقت ان کے پاس کھجوروں کی ایک تھیلی تھی آپ نے ان کے لئے برکت کی دعا فرمائی۔

اس وفد میں سے ایک شخص نے عرض کیا کہ آپ قس ابن ساعدہ کو پہچانتے ہیں؟ آپ نے فرمایا وہ تم میں سے نہیں تھا وہ ایاد سے تعلق رکھتا تھا اور دور جاہلیت میں مشرکانہ طور طریق سے برگشتہ تھا۔ عکاظ میں لوگوں کے اجتماع کو اپنی گفتگو سنایا کرتا تھا۔

(ایضاً : ج ۱ ص ۳۱۵)

۴۰۔ وفد تغلب

بنو تغلب کے سولہ افراد کا ایک وفد بارگاہ رسالت میں حاضر ہوا جس میں مسلمان بھی تھے اور عیسائی بھی عیسائیوں نے سونے کی صلیبیں سجا رکھی تھیں۔ انہوں نے حضرت رملہ بنت حارث کے گھر میں قیام کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عیسائیوں کے ساتھ اس شرط پر صلح کی کہ وہ اپنی اولاد کو عیسائیت کے رنگ میں نہیں رنگیں گے اور مسلمانوں کو عطیات سے نوازا

(ایضاً : ص ۳۱۶)

۴۱۔ وفد شیبان

حضرت قیلہ بنت مخرمہ بارگاہِ رسالت میں حاضری کے لیے تن تنہا چل دیتی ہیں راستے میں انہیں ایک ساتھی مل جاتا ہے جس کے ہمراہ وہ حضور انور صلی اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہو جاتی ہیں۔ آپ عاجزی اور انکساری کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ حضرت قیلہ نے آپ کی زیارت کی تو ان پر لرزہ طاری ہو گیا۔ ایک صحابی نے عرض کیا یا رسول اللہ! مسکین عورت (جلال نبوت سے) کانپ رہی ہے آپ نے ان کی طرف دیکھے بغیر فرمایا۔ یامسکینۃ علیک السکینۃ اے مسکین عورت خوفزدہ نہ ہو اور پرسکون رہ۔ وہ اسلام لائیں تو آپ نے انہیں اور ان کی بیٹیوں کے لئے سرخ چمڑے پر ایک تحریر لکھوا کر عنایت فرمائی

لا یظلمن حقاً و لا یکرھن علی منکح و ان کی حق تلفی نہ کی جائے۔ ان سے زبردستی نکاح نہ
کل مومن مسلم لھن نصیر احسن و کیا جائے۔ اور ہر مومن مسلمان ان کا مددگار ہے
لا تسئن ط تم نیک کام کرو، برے کام نہ کرو۔

ان کے علاوہ حضرت حرملہ بارگاہ اقدس میں حاضر ہوئے۔ آپ نے انہیں اسلامی احکام سے روشناس کرایا پھر وہ رخصت ہوئے تو سوچا کہ ابھی نہیں جاؤں گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مزید علم حاصل کروں گا۔ واپس آکر آپ کے سامنے کھڑے ہو گئے اور عرض کیا یا رسول اللہ! آپ مجھے کس عمل کا حکم دیتے ہیں؟ فرمایا: حرملہ! نیک کام کر اور برے کام سے اجتناب کر حضرت حرملہ لوٹ کر اپنی سواری کے پاس آئے لیکن پھر واپس آکر پہلے سے بھی زیادہ قریب کھڑے ہو گئے اور عرض کیا " یا رسول اللہ! آپ مجھے کون سے عمل کا حکم دیتے ہیں۔ فرمایا: حرملہ! نیک کام کر اور برے کام سے گریز کر۔ جب تم کسی جماعت کے پاس سے اٹھ کر جاؤ تو جس کام کے بارے میں تم پسند کرتے ہو کہ وہ تمہاری طرف منسوب کر کے بیان کریں وہ کام کرو اور جس کام کی نسبت تم اپنی طرف پسند نہیں کرتے اسے چھوڑ دو

(ایضاً ج ۱ ص ۳۱۷، ۳۲۱)

۴۲۔ وفد تجیب

۹ھ میں تیرہ افراد پر مشتمل تجیب کا ایک وفد بارگاہ رسالت میں حاضر ہوا، یہ لوگ اموال میں اللہ تعالیٰ کے فرض کے

ہوئے صدقات بھی ساتھ لینے آئے تھے۔ ان کی آمد سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہت مسرور ہوئے۔ انہیں خوش آمدید کہی، انہیں عزت و احترام کے ساتھ ٹھہرایا اور حضرت بلالؓ کو حکم دیا کہ ان کی خوب اچھی طرح ضیافت کریں اور انہیں دیگر وفود کی نسبت زیادہ عطیات سے نوازا ان سے پوچھا تم میں سے کوئی اور باقی ہے؟ انہوں نے عرض کیا ایک نوعمر لڑکا ہے۔ جسے ہم ساز و سامان کے پاس چھوڑ آئے ہیں فرمایا: اسے میرے پاس بھیج دو۔

وہ نوجوان حاضر ہو کر عرض کرتا ہے۔ میں اس قبیلے سے تعلق رکھتا ہوں جو ابھی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ آپ نے ان کی حاجتیں پوری کر دی ہیں۔ میری حاجت بھی پوری فرما دیجئے۔ فرمایا: تمہاری حاجت کیا ہے؟ عرض کیا میرے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ میری مغفرت فرما دے، مجھ پر رحم فرمائے اور میرے دل کو غنا (بے نیازی) سے مالا مال فرما دے آپ نے دعا کی۔

اللّٰھم اغفرلہٗ وارحمہٗ واجعل غناہٗ فی قلبہٖ

اے اللہ! اسے بخش دے، اس پر رحم فرما اور اس کا دل غنا سے معمور فرما!

پھر اس نوجوان کو بھی اتنا ہی عطیہ دیا جتنا کہ دوسروں کو دیا تھا ———— یہ حضرات واپس اپنے اہل و عیال میں چلے گئے ۱۰ھ میں حج کے موقعہ پر منیٰ میں پھر بارگاہِ اقدس میں حاضر ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نوجوان کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے رزق پر اس سے زیادہ قناعت کرنے والا ہم نے کوئی نہیں دیکھا۔ حضور نے فرمایا مجھے امید ہے کہ ہم دنیا سے اکٹھے رخصت ہوں گے۔

۴۳۔ وفد خولان

(ایضاً: ج ۱ ص ۳۲۳)

۱۰ھ ماہ شعبان میں خولان کا دس افراد پر مشتمل وفد بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوا۔ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہم اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے ہیں اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کرتے ہیں اور ہم اپنی باقی ماندہ قوم کے نمائندے ہیں۔ آپ نے ان کے بت کے متعلق پوچھا کہ عم انس کا کیا حال ہے؟ عرض کیا اس کا حال برا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس کے بدلے آپ کا لایا ہوا دین عطا فرما دیا ہے۔ ہم لوٹ کر جائیں گے، تو اسے مسمار کر دیں گے۔ انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دین کے کچھ مسائل پوچھے آپ نے بیان کئے اور ایک صحابی کو حکم دیا کہ انہیں کتاب و سنت کی تعلیم دیں انہیں حضرت رملہ بنت حارث کے گھر میں ٹھہرایا گیا۔ آپ نے ان کی مہمانی کا حکم دیا۔ جو انہیں پیش کی گئی۔ چند روز کے بعد رخصت ہونے کے لئے آئے تو آپ نے انہیں بارہ اوقیہ سے کچھ زائد چاندی (تقریباً پانچ سو درہم) عطا فرمائی۔

جب یہ حضرات لوٹ کر اپنی قوم کے پاس گئے تو سب سے پہلے یہ کام کیا کہ عم انس (بت) کو گرا دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے جو کچھ حرام اور حلال قرار دیا تھا اس پر کاربند رہے۔

۴۴۔ وفد جعفی

(ایضاً: ج ۱ ص ۴ ۔ ۳۲۳)

ابو سبرہ یزید ابن مالک جعفی اپنے دو بیٹوں سبرہ اور عزیز کے ہمراہ بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عزیز سے پوچھا تمہارا نام کیا ہے؟ انہوں نے کہا عزیز فرمایا: عزیز صرف اللہ تعالیٰ ہے تمہارا نام عبدالرحمٰن ہے۔ یہ حضرات،

مشرف باسلام ہوئے۔ حضرت ابوسبرہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! میرے ہاتھ کی پشت پر ایک پھوڑا ہے۔ جس کے سبب میں اونٹنی کی نکیل نہیں پکڑ سکتا۔ آپ نے ایک پیالہ منگوا کر ان کے پھوڑے پر پھیرا یہاں تک کہ وہ جاتا رہا۔ آپ نے ان کے لئے ان کے بیٹوں کے لئے دعا فرمائی۔ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! مجھے یمن میں میری قوم کی وادی عنایت فرمائیں۔ جسے حروان کہا جاتا تھا۔ آپ نے انہیں عنایت فرما دی۔

(ایضاً: ج ۱ ص ۳۲۵-۶)

۴۵- وفد صداء

۸ھ میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جعرانہ سے واپس تشریف لائے تو آپ نے حضرت قیس ابن سعد ابن عبادہ کو یمن کی طرف بھیجا اور حکم دیا کہ قبیلہ صدا کو تہس نہس کر دیں۔ انہوں نے قناۃ کے کنارے چار سو مجاہدین کا لشکر آراستہ کیا۔ اتنے میں قبیلہ صداء کا ایک شخص (حضرت زیاد ابن حارث) ادھر آنکلا۔ اس نے لشکر کے متعلق پوچھا۔ اسے بتایا گیا تو وہ تیز رفتاری سے چلتا ہوا بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوگیا اور درخواست پیش کی کہ میں اپنی قوم کا نمائندہ ہوں۔ آپ لشکر کو واپس بلالیں۔ میں اپنی قوم کی ضمانت دیتا ہوں آپ نے لشکر کو واپس بلالیا۔

بعد ازاں اس قبیلے کے پندرہ افراد بارگاہ اقدس میں حاضر ہوئے اور اسلام لا کر اپنی قوم کی طرف سے بیعت کی۔ جب یہ اپنے علاقے میں گئے تو ان کی قوم میں اسلام پھیل گیا۔ حجۃ الوداع کے موقع پر ان کے سو آدمی بارگاہِ اقدس میں حاضر تھے۔

ایک سفر میں حضرت زیاد بن حارث صدائی نے اذان کہی۔ پھر حضرت بلال رضی اللہ عنہ تکبیر کہنے لگے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قبیلہ صداء کے ایک فرد نے اذان کہی وَمَنْ اَذَّنَ فَهُوَ يُقِيمُ جو اذان دے وہی تکبیر کہے۔

(ایضاً: ج ۱ ص ۳۲۶-۷)

۴۶- وفد صدف

قبیلہ صدف کے دس سے زیادہ افراد اونٹنیوں پر سوار ہو کر تہ بندا ور چادریں زیب تن کئے بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے۔ منبر اور کاشانہ مبارکہ کے درمیان نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے۔ لیکن سلام عرض کئے بغیر بیٹھ گئے۔ آپ نے فرمایا کیا تم مسلمان ہو؟ عرض کیا جی ہاں فرمایا: تم نے سلام کیوں نہیں دیا۔ انہوں نے کھڑے ہو کر سلام عرض کیا۔ السلام علیک ایہا النبی ورحمۃ اللہ فرمایا وعلیکم السلام، بیٹھ جاؤ۔ یہ حضرات بیٹھ گئے اور اوقات نماز دریافت کئے جو آپ نے بیان فرمائے۔

(ایضاً: ج ۱ ص ۳۹۹)

۴۷- وفد خشین

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خیبر کی طرف روانگی کی تیاری فرما رہے تھے کہ ابو ثعلبہ خشنی حاضر ہو کر اسلام لائے، اور آپ کے ساتھ غزوہ خیبر میں شریک ہوئے۔ پھر قبیلہ خشین کے سات افراد حاضر ہوئے انہوں نے حضرت ابو ثعلبہ کے پاس قیام کیا اور شرف اسلام و بیعت حاصل کر کے اپنی قوم کے پاس لوٹ گئے۔

(ایضاً ص ۳۲۹)

۴۸ ۔ وفد سعد ھذیم

حضرت ابوالنعمان اپنے والد سے راوی ہیں کہ میں اپنی قوم کے ایک وفد کے ہمراہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضری کے لیے آیا ہم مدینہ طیبہ کی ایک جانب فروکش ہوتے ۔ پھر ہم مسجد نبوی میں حاضر ہوتے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں نماز جنازہ ادا فرما رہے تھے[1]۔ جب آپ فارغ ہوئے تو فرمایا : تم کون ہو؟ عرض کیا ہم سعد ھذیم سے تعلق رکھتے ہیں ہم اسلام لائے بیعت کی اور اپنے ٹھکانے پر چلے آئے ۔ آپ کے حکم پر ہمیں قیام کے لیے جگہ دی گئی اور ہماری مہمانی کی گئی ۔ ہم نے تین دن قیام کیا پھر اجازت لینے کے لیے حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا : تم اپنے ایک آدمی کو اپنا امیر بنا لو آپ کے حکم پر حضرت بلال نے ہمیں چند اوقیہ چاندی عنایت فرمائی اور ہم لوٹ کر اپنی قوم کے پاس چلے آئے ۔ اللہ تعالیٰ نے ہماری قوم کو دولتِ اسلام عطا فرما دی ۔ ایضاً : ج ۱ ص ۳۳۰-۳۲۹

۴۹ ۔ وفد بلی

حضرت رُویفع ابن ثابت بلوی فرماتے ہیں ۔ ماہ ربیع الاول ۹ھ میں میری قوم کا وفد آیا ۔ میں نے انہیں اپنے گھر میں ٹھہرایا ۔ پھر انہیں لیکر بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوا ۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کے ساتھ اپنے کاشانۂ مبارک میں صبح کے وقت تشریف فرما تھے ۔ وفد کے رئیس ابوالضباب آپ کے سامنے بیٹھ گئے اور گفتگو کے بعد سب لوگ اسلام لے آئے انہوں نے ضیافت کا حکم اور چند دیگر دینی مسائل پوچھے جو آپ نے بیان فرمائے ۔ پھر میں ان حضرات کو لیکر اپنے گھر آگیا ۔ کیا دیکھتا ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کھجوروں کی ایک گٹھڑی اٹھا کر لا رہے ہیں فرمایا : ان کھجوروں سے کام چلاؤ ۔ میں نے ان حضرات کو یہ کھجوریں اور کچھ دوسری چیزیں پیش کیں ۔ انہوں نے تین دن قیام کیا پھر رخصت لینے کے لیے بارگاہِ اقدس میں حاضر ہوئے ۔ آپ نے انہیں عطیات عطا فرمائے اس کے بعد وہ لوگ اپنے علاقے میں چلے گئے ۔

(ایضاً : ج ۱ ص ۳۳۰)

۴۸ ۔ وفد بہرا

قبیلۂ بہرا کے تیرہ افراد بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے ۔ وہ اسلام لائے اور چند روز قیام کر کے فرائض کی تعلیم حاصل کی ۔ پھر رخصت ہونے لگے تو آپ نے انہیں عطیات سے نوازا ۔ (ایضاً : ج ۱ ص ۳۳۱)

۴۹ ۔ وفد عذرہ

ماہ صفر ۹ھ میں بارہ افراد کا ایک وفد بارگاہ رسالت میں حاضر ہوا جس میں حمزہ ابن نعمان عذری، سلیم ابن مالک،

---

[1] احناف کے نزدیک کسی عذر کے بغیر مسجد میں نماز جنازہ ادا کرنا مکروہ ہے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے مَنْ صَلّٰى عَلٰى جَنَازَةٍ فِي الْمَسْجِدِ فَلَا شَيْءَ لَهُ جس نے مسجد میں جنازہ پر نماز پڑھی اسے کوئی ثواب نہیں ہے (ابوداؤد شریف عربی، ج ۲، ص ۹۸) مذکورہ بالا نماز کسی عذر کی بنا پر مسجد میں ادا کی گئی ہوگی ۔ قادری

سعد ابن مالک، اور مالک ابن ابی ریاح شامل تھے۔ بارگاہ اقدس میں حاضر ہوئے تو جاہلیت کے طریقے کے مطابق سلام عرض کیا اور اپنا تعارف کرایا۔ آپ نے انہیں خوش آمدید کہا اور فرمایا: معلوم نہیں اسلامی طریقے کے مطابق سلام کہنے سے تمہیں کس چیز نے منع کیا ہے انہوں نے عرض کیا ہم اپنی قوم کی تلاش میں حاضر ہوئے ہیں پھر انہوں نے کچھ دینی مسائل پوچھے جو آپ نے بیان فرمائے یہ حضرات چند دن قیام کے بعد واپس چلے گئے اور آپ نے انہیں عطیات عطا فرمائے اور ان میں سے ایک کو چادر عطا فرمائی۔

زمل ابن عمر عذری بھی حاضر ہوئے اور بت سے سنی ہوئی گفتگو بیان کی آپ نے فرمایا: وہ ایماندار جن تھا۔ وہ بھی ایمان لائے۔ آپ نے انہیں جھنڈا عطا فرمایا اور ان کی قوم پر والی مقرر فرمایا: بعد ازاں حضرت زمل، حضرت امیر معاویہ کے ساتھ صفین میں شریک ہوئے پھر مرج میں شریک ہوئے اور وہیں میدان جنگ میں جان دیدی۔

(ایضاً: ج ۱ ص ۲-۳۳۱)

۵۰۔ وفد سلامان

ماہ شوال ۱۰ھ میں سات افراد کا ایک وفد بارگاہ رسالت میں حاضر ہوا حضرت حبیب ابن عمر سلامانی فرماتے ہیں۔ جب ہم حاضر ہوئے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نماز جنازہ پڑھنے کے لئے مسجد سے باہر تشریف لا رہے تھے ہم نے عرض کیا۔ اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! فرمایا: وَعَلَیْکُمْ۔ تم لوگ کون ہو؟ عرض کیا ہم قبیلۂ سلامان سے تعلق رکھتے ہیں اور بیعت اسلام کے لیے حاضر ہوئے ہیں۔ آپ نے اپنے غلام حضرت ثوبان کو ہمارے قیام کے انتظام کا حکم دیا۔

ظہر کے بعد آپ مسجد نبوی میں تشریف فرما تھے۔ ہم نے آگے بڑھ کر نماز، احکام اسلام اور دم کرنے کے بارے میں سوالات کئے اور اسلام لائے۔ آپ نے ہم میں سے ہر ایک کو پانچ اوقیہ (دو سو درہم) عطا فرمائے اور ہم واپس چلے آئے۔

(ایضاً: ج ۱ ص ۳-۳۳۲)

۵۱۔ وفد جہینہ

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ طیبہ تشریف لائے تو آپ کی خدمت میں عبدالعزیٰ ابن بدر اور ان کا چچازاد بھائی ابوروعہ حاضر ہوئے۔ آپ نے عبدالعزیٰ کو فرمایا: تمہارا نام عبداللہ ہے اور ابوروعہ کو فرمایا تم انشاء اللہ تعالیٰ دشمن کو مرعوب کرو گے۔ فرمایا تم کس قبیلے سے ہو؟ عرض کیا بنو غیان (گمراہی والے) سے فرمایا: تم بنو رشدان (ہدایت والے) ہو۔ ان کی وادی کا نام غوی (گمراہی) تھا آپ نے اس کا نام رُشد (ہدایت) رکھ دیا۔ ان کے لئے آپ نے مسجد کا نشان لگایا۔ مدینہ طیبہ میں یہ پہلی مسجد تھی جس کا نشان لگایا گیا تھا۔ فتح مکہ کے دن آپ نے عبداللہ ابن بدر کو جھنڈا عطا فرمایا۔

عمر ابن مرۃ جہنی فرماتے ہیں ہمارا ایک بت تھا جس کی ہم بہت تعظیم کرتے تھے اور میں اس کا دربان تھا۔ جب میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق سنا تو اسے توڑ کر بارگاہ اقدس میں حاضر ہوا اور اسلام لے آیا۔ پھر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دعوت اسلام دینے کے لئے ان کی قوم کی طرف بھیجا۔ چنانچہ ایک شخص کے علاوہ سب ہی اسلام لے آئے۔

(ایضاً: ج ۱ ص ۴-۳۳۳)

۵۲۔ وفد کلب

عبد عمر ابن جبلہ کلبی فرماتے ہیں میں اور بنو رقاش کا ایک شخص بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے آپ نے ہم پر اسلام پیش

کیا اور فرمایا :

انا النبی الامی الصادق الزکی والویل کل الویل لمن کذبنی وتولی عنی و قاتلنی والخیر کل الخیر لمن اوانی ونصرنی وآمن بی وصدق قولی وجاھد معی

میں نبی اُمی، سچا اور پاکیزہ ہوں، اس شخص کے لیے مکمل ہلاکت ہے جس نے میری تکذیب کی مجھ سے روگردانی کی اور مجھ سے جنگ کی اور اس شخص کے لیے مکمل خیر ہے جس نے مجھے پناہ دی، میری امداد کی، مجھ پر ایمان لایا۔ میرے قول کی تصدیق کی، اور میرے ہمراہ جہاد کیا۔

ہم نے کہا ہم آپ پر ایمان لاتے ہیں اور آپ کے فرمان کی تصدیق کرتے ہیں۔
اِن کے علاوہ حارثہ ابن قطن کلبی اور حمل ابنِ سعدانہ کلبی حاضر ہوئے اور مشرف باسلام ہوئے۔

(ایضاً : ج ۱ ص ۳۳۴)

۵۳۔ وفد جرم

حضرت عمر ابن سلمہ جرمی فرماتے ہیں ہم ایک ایسے چشمے کے پاس رہتے تھے جو عام گزرگاہ پر واقع تھا۔ ہم آنے جانے والوں سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں پوچھا کرتے تھے وہ ہمیں بتاتے کہ ایک شخصیت کا دعویٰ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نبی اور رسول ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان پر یہ وحی نازل کی ہے۔ میں ان سے جو کچھ سنتا اسے یاد کر لیتا۔ یہاں تک کہ قرآن پاک کا بہت سا حصہ یاد کر لیا۔ عرب فتح مکہ کے منتظر تھے۔ جونہی مکہ معظمہ فتح ہوا، ہر قوم اسلام لانے لگی۔ میرے والد بھی بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے اور کچھ عرصہ قیام کے بعد واپس آئے تو انہوں نے کہا خدا کی قسم! میں سچے رسول کے پاس سے آیا ہوں پھر آپ کی تعلیمات بیان کیں اور یہ فرمان بیان کیا کہ تم میں سے ایک آدمی اذان دے اور جسے قرآن پاک زیادہ یاد ہو وہ امامت کرائے ہمارے علاقے کے لوگوں نے تلاش کیا تو مجھ سے زیادہ کسی اور کو قرآن پاک یاد نہ تھا۔ انہوں نے مجھے امام بنا دیا اس وقت میری عمر چھ سال تھی۔ میری چادر چھوٹی تھی جو ستر پوشی کے لیے بمشکل کفایت کرتی۔ میری قوم نے مجھے ایک قمیص لے دی مجھے کسی چیز کی اتنی خوشی نہیں ہوئی جتنی اس قمیص کے ملنے پر ہوئی۔

ان کے علاوہ اصقع ابن شریح اور ھوذہ ابن عمر بارگاہ اقدس میں حاضر ہوئے اور اسلام لائے۔

(ایضاً : ج ۱ ص ۳۳۵، ۳۶)

۵۴۔ وفد غسان

رمضان المبارک ۱۰ھ میں غسان کے تین افراد کا ایک وفد بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوا۔ انہوں نے دیکھا کہ عرب کے تمام وفد دائرہ اسلام میں داخل ہو رہے ہیں۔ یہ حضرات بھی اسلام لائے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حسب معمول انہیں عطیات سے نوازا۔ جب یہ اپنی قوم کے پاس گئے تو انہوں نے دعوتِ اسلامی کو قبول نہ کیا۔ ان حضرات نے اپنا اسلام لانا مخفی رکھا یہاں تک کہ ان میں سے دو ایمان کے ساتھ وصال فرما گئے۔ تیسرے صحابی جنگ یرموک کے سال حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حضرت ابوعبیدہ کو اپنے مسلمان ہونے کی اطلاع دی تو وہ ان کی حد درجہ تعظیم کرتے تھے۔

(ایضاً : ج ۱ ص ۹-۳۳۸)

۵۵۔ وفد سعد العشیرۃ

جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کی خبر عام ہوئی تو بنو انس اللہ ابن سعد العشیرہ کے ایک شخص ذباب نامی دوڑ کر اپنی قوم کے بت کے پاس گئے جسے فراض کہا جاتا تھا اسے توڑ پھوڑ دیا اور بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو کر مشرف باسلام ہوئے ان کے صاحبزادے عبداللہ ابن ذباب جنگ صفین میں حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے

(ایضاً ج ۱ ص ۳۴۲)

۵۶۔ وفد عنس

قبیلہ عنس سے ربیعہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس وقت آپ شام کا کھانا تناول فرما رہے تھے انہیں کھانے کی دعوت دی تو وہ بیٹھ گئے۔ کھانے کے بعد فرمایا: کیا تم گواہی دیتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم، اس کے عبد مکرم اور رسول ہیں۔ انہوں نے کلمہ طیبہ پڑھا اور حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ آپ نے فرمایا تم دلچسپی کی بنا پر آئے ہو یا خوف کی بنا پر؟ ربیعہ نے کہا جہاں تک دلچسپی کا تعلق ہے تو خدا کی قسم! آپ کے پاس مال ہے ہی نہیں۔ رہی خوف کی بات تو میں ایسے شہر میں رہتا ہوں کہ وہاں تک آپ کے لشکر پہنچ نہیں سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ کے غضب سے ڈرایا گیا تو میں ڈر گیا اور مجھے کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آ تو میں ایمان لے آیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا: کہ قبیلہ عنس میں ایسے خطیب کم ہوں گے۔

چند روز بارگاہ رسالت میں حاضر ہوتے رہے پھر رخصت لینے کے لئے حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا تم فیصلہ کر چکے ہو تو جاؤ۔ اگر تم کوئی چیز محسوس کرو تو قریبی گاؤں میں پناہ لینا۔ حضرت ربیعہ روانہ ہوئے تو راستے میں بخار آنے لگا قریبی گاؤں میں تشریف لے گئے اور وہیں ان کا وصال ہو گیا۔

(ایضاً: ج ۱ ص ۳۴۲-۳)

۵۵۔ وفد الداریین

داریین کا دس افراد پر مشتمل وفد اس وقت بارگاہ رسالت میں حاضر ہوا۔ جب سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم تبوک سے واپس تشریف لائے۔ اس وفد میں تمیم ابن اوس، نعیم ابن اوس، یزید ابن قیس، فاکر ابن لغمان، جبلہ ابن مالک، ابوہند ابن ذر، طیب ابن ذر، ہانی ابن حبیب، عزیز ابن مالک، اور مرہ ابن مالک تھے۔ یہ حضرات مشرف باسلام ہوئے۔ رسول اکرمؐ نے طیب کا نام عبداللہ اور عزیز کا نام عبدالرحمٰن رکھا۔

ہانی ابن حبیب نے بارگاہ اقدس میں شراب کا ایک مشکیزہ، چند گھوڑے اور ایک قباء سونے سے مزین پیش کی۔ آپ نے گھوڑے اور قباء قبول فرمائی (شراب قبول نہیں فرمائی) قباء حضرت عباس ابن عبدالمطلب کو عطا فرمائی۔ انہوں نے عرض کیا میں اسے کیا کروں گا؟ (سونے کے جڑاؤ کی وجہ سے یہن تو نہیں سکتا) فرمایا: سونا اتار کر عورتوں کا زیور بنا لینا یا سونا فروخت کر دینا۔ دیباج کو بھی بیچ کر اس کی قیمت لے سکتے ہو۔ حضرت عباس نے وہ قباء ایک یہودی کے پاس آٹھ ہزار درہم میں

فروخت کر دی۔

حضرت تمیم نے عرض کیا ہمارے قریب رومیوں کے دو گاؤں جبری اور بیت علینون ہیں اگر اللہ تعالیٰ آپ کے لیے شام کو فتح فرما دے تو یہ دونوں گاؤں مجھے عطا فرما دیں۔ فرمایا وہ تمہیں دیدیئے جائیں گے۔ حضرت ابوبکر صدیق نے اپنی خلافت کے دور میں وہ گاؤں انہیں عطا فرما دیئے۔ یہ وفد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال تک قیام پذیر رہا۔

(ایضاً : ج ۱ ص ۴-۳۴۳)

۵۶۔ وفد الرہاویین

سنہ۱۰ھ میں پندرہ رہاوی بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے۔ انہیں حضرت رملہ بنت حارث کے گھر میں ٹھہرایا گیا حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لائے اور ان سے طویل گفتگو فرمائی۔ انہوں نے بارگاہِ رسالت میں مختلف تحائف پیش کیے جن میں ایک گھوڑا بھی تھا جس کا نام مراوح تھا۔ آپ کے حکم پر آزمائشی طور پر اس پر سواری کی گئی تو آپ نے اسے بہت پسند فرمایا۔ یہ حضرات مشرف باسلام ہوئے۔ قرآن پاک اور فرائض کی تعلیم حاصل کی۔ آپ نے انہیں حسب معمول عطیات سے نوازا پھر یہ حضرات اپنے علاقہ میں چلے گئے۔ بعد ازاں چند حضرات مدینہ طیبہ حاضر ہوئے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج کی سعادت حاصل کی۔ انہوں نے آپ کے وصال تک مدینہ طیبہ میں قیام کیا۔

ان کے علاوہ عمرو ابن سُبیع بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے اور اسلام لائے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں جھنڈا عطا فرمایا

(ایضاً : ج ۱ ص ۵-۳۴۴)

۵۷۔ وفد غامد

رمضان المبارک میں قبیلۂ غامد کے دس افراد کا ایک وفد حاضر ہوا۔ یہ حضرات بقیع الغرقد میں فروکش ہوئے۔ پھر عمدہ لباس پہن کر بارگاہِ اقدس میں حاضر ہوئے اور اسلام لائے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ایک تحریر عطا فرمائی جس میں اسلامی احکام کی تفصیل تھی حضرت ابی ابن کعب نے انہیں قرآن پاک کی تعلیم دی اور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حسب معمول انہیں عطیات عنایت فرمائے۔

(ایضاً : ج ۱ ص ۳۴۵)

۵۸۔ وفد نخع

قبیلۂ نخع نے دو افراد کا وفد بارگاہِ رسالت میں بھیجا۔ ان میں سے ایک ارطاۃ ابن شراحیل اور دوسرے ارقم تھے۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر اسلام پیش کیا تو وہ حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے اور اپنی قوم کی طرف سے بیعت کی۔ آپ کو ان کی وضع قطع بہت پسند آئی فرمایا: تمہاری قوم میں تم جیسے اور لوگ بھی موجود ہیں؟ انہوں نے عرض کیا ہماری قوم میں ستر افراد ایسے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک ہم سے افضل ہے۔ آپ نے ان کے لیے اور ان کی قوم کے لیے دعائے خیر کی اَللّٰھُمَّ بَارِکْ فِی النَّخَعِ اے اللہ! قبیلہ نخع میں برکت عطا فرما۔ حضرت ارطاۃ کو ان کی قوم کا جھنڈا عطا فرمایا۔ فتح مکہ کے موقع پر یہ جھنڈا ان کے

پاس تھا۔ قادسیہ کی جنگ میں بھی ان کے پاس تھا۔ ان کے شہید ہوجانے پر ان کے بھائی دُرید نے لے لیا۔ وہ شہید ہوئے تو حضرت سیف ابن حارث نے لے لیا۔ اور کوفے میں داخل ہو گئے۔

ابن سعد فرماتے ہیں کہ بارگاہِ رسالت میں سب سے آخری وفد قبیلہ نخع کا حاضر ہوا۔ ۱۱ھ نصف محرم میں دوسو افراد حاضر ہوئے۔ یہ حضرات یمن میں حضرت معاذ ابن جبل کے ہاتھ پر اسلام لا چکے تھے۔ ان میں حضرت زُرارہ ابن عمر بھی تھے وہ پہلے عیسائی تھے۔

(ایضاً : ج ۱ ص ۳۴۶)

۵۹۔ وفدِ بجیلہ

۱۰ھ میں جریر ابن عبد اللہ بجلی اپنی قوم کے ڈیڑھ سو افراد کے ساتھ مدینہ طیبہ حاضر ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہارے پاس اس راستے سے یمن والوں میں سے بہترین شخص آئے گا جس کے چہرے پر بادشاہی کا نشان ہوگا۔ چنانچہ جریر اپنی سواری پر سوار اپنی قوم کے ہمراہ آئے اور اسلام لائے۔ حضرت جریر فرماتے ہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دست اقدس پھیلایا اور مجھ سے ان باتوں کی بیعت لی کہ تم گواہی دو گے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں، تم نماز قائم کرو گے۔ زکوٰۃ دو گے۔ رمضان کے روزے رکھو گے۔ مسلمان کی خیر خواہی کرو گے اور والی (امیر) کی اطاعت کرو گے۔ اگرچہ حبشی غلام ہی ہو۔

قیس ابن عزرہ احمسی دو سو پچاس افراد کے ہمراہ بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم کس قبیلے سے تعلق رکھتے ہو؟ عرض کیا ہم اَحمَسُ اللہ (اللہ تعالیٰ کے بہادر بندے) ہیں فرمایا: وَ اَنْتُمُ الْیَوْمَ لِلّٰہِ تم آج اللہ تعالیٰ کے لئے ہو پھر حضرت بلال سے فرمایا بجیلہ کے سواروں کو عطیات دو اور پہلے قبیلہ احمس کے افراد کو دو۔

حضرت جریر ابن عبد اللہ حضرت فروہ ابن عمرو بیاضی کے پاس قیام پذیر تھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جریر سے ان کے علاقے کے لوگوں کے بارے میں دریافت فرمایا: انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے اسلام کو ظاہر فرما دیا ہے۔ ان کی مسجدوں اور میدانوں میں اذانیں دی جاتی ہیں، قبائل نے اپنے بت توڑ دیئے ہیں۔ فرمایا: ذو الخلصہ بت کا کیا ہوا؟ عرض کیا وہ ابھی باقی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے چاہا تو اس کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔ آپ نے انہیں جھنڈا عطا فرمایا اور اس بت کے توڑنے پر مامور فرمایا۔ جسے انہوں نے جا کر توڑ دیا۔ حضرت جریر نے عرض کیا میں گھوڑے پر نہیں بیٹھ سکتا۔ آپ نے ان کے سینے پر دست اقدس پھیرا اور دعا کی۔ اَللّٰھُمَّ اجْعَلْہُ ھَادِیًا مَّھْدِیًّا اے اللہ! انہیں ہدایت دینے والا اور ہدایت دیا ہوا بنا۔ (چنانچہ وہ بخوبی گھوڑے پر سواری کرتے تھے۔) (ایضاً : ج ۱ ص ۳۴۷)

۶۰۔ وفدِ خثعم

عثعث ابن زحر اور انس ابن مدرک، قبیلہ خثعم کی ایک جماعت کے ساتھ بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے۔ حضرت

جریر ابن عبداللہ نے جب ذوالخلصہ (بت) کو مسمار کر دیا اور خثعم کے بعض افراد جنگ میں کام آئے تو قبیلہ خثعم نے کہا کہ ہم اللہ تعالیٰ، اس کے رسول اور ان کے لائے ہوئے دین پر ایمان لاتے ہیں۔ آپ ہمیں ایک تحریر لکھ دیں جس میں لکھے ہوئے احکام پر عمل کریں گے۔ حضرت جریر نے انہیں تحریر لکھ دی

(ایضاً : ج ۱ ص ۳۴۸)

۶۱۔ وفد اشعریین

حضرت ابو موسیٰ اشعری پچاس افراد کے ہمراہ بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے۔ یہ حضرات کشتی میں سوار ہو کر سمندری سفر کرتے ہوئے آئے تھے۔ ان کی کشتی جدہ میں لنگر انداز ہوئی جب مدینہ طیبہ کے قریب پہنچے تو کہنے لگے غداً نلقی الاحبۃ محمداً وحزبہ کل ہم محبوب ہستیوں، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ سے ملاقات کریں گے۔ مدینہ طیبہ پہنچے تو معلوم ہوا کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم خیبر تشریف لے گئے ہیں پھر آپ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے، اور اسلام لا کر بیعت سے مشرف ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: الاشعرون فی الناس کصرۃ فیہا مسک لوگوں میں اشعریوں کی مثال اس تھیلی کی ہے جس میں کستوری ہو۔

(طبقات ابن سعد، ج ۱ ص ۹-۳۴۸)

مواہب لدنیہ میں ہے کہ یہ وفد ۷ھ میں خیبر کی فتح کے وقت حاضر ہوا۔ علامہ زرقانی فرماتے ہیں کہ یہ وفد کشتی میں سوار ہو کر مدینہ طیبہ کے قصد سے روانہ ہوا تھا۔ لیکن ہوا نے انہیں حبشہ پہنچا دیا۔ وہاں ان کی ملاقات حضرت جعفر سے ہوئی پھر مدینہ منورہ حاضر ہوئے۔

بخاری شریف میں ہے کہ بنو تمیم کے چند افراد بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، تمہیں بشارت ہو انہوں نے عرض کیا کہ آپ نے ہمیں بشارت عطا فرمائی ہے، تو مال بھی عنایت فرمائیں۔ آپ کے چہرۂ انور کا رنگ تبدیل ہو گیا۔ اہل یمن کا وفد (حضرت ابو موسیٰ اشعری کی قوم) حاضر ہوا تو فرمایا: تم بشارت قبول کرو، بنو تمیم نے تو قبول نہیں کی۔ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہم نے قبول کی ہم آپ سے دین سمجھنے آئے ہیں۔ ہم آپ سے کائنات کی ابتداء کے بارے میں معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ فرمایا: ازل میں اللہ تعالیٰ موجود تھا۔ اس کے سوا کوئی چیز موجود نہ تھی۔ ابتداءً اللہ تعالیٰ کا عرش پانی پر تھا اور اس نے لوح محفوظ میں ہر چیز لکھ دی تھی۔

(زرقانی علی المواہب، ج ۴ ص ۳۵-۳۴)

۶۲۔ وفد حضر موت

حضر موت کے بادشاہوں کی اولاد میں سے جمدہ، مخوس، مشرح اور ابضعہ کا وفد بارگاہ رسالت میں حاضر ہو کر اسلام لایا

حضرت مخوس نے عرض کیا یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ میری زبان کی لکنت دور فرمادے آپ نے ان کے لئے دعا کی اور حضرموت کے صدقات میں سے انہیں کھانا کھلایا۔

وائل ابن حجر ایک وفد کے ساتھ بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت وائل کے چہرے پر دست اقدس پھیرا اور ان کے لئے دعا فرمائی اور انہیں ان کی قوم کا سردار مقرر فرمایا: پھر صحابہ کرام سے خطاب فرمایا: لوگو! یہ وائل ابن حجر ہیں حضرموت سے تمہارے پاس آئے ہیں یہ اسلام کا شوق لئے ہوئے آئے ہیں۔

پھر حضرت امیر معاویہ کو فرمایا انہیں حرّہ میں ٹھہراؤ۔ حضرت امیر معاویہ فرماتے ہیں میں ان کے ساتھ روانہ ہوا تو زمین کی تپش نے میرے پاؤں کو جلا دیا میں نے ان سے کہا کہ مجھے اپنی سواری پر بٹھالو۔ انہوں نے کہا تم بادشاہوں کے ساتھ سوار ہونے کے لائق نہیں ہو۔ پھر میں نے کہا کہ مجھے اپنے جوتے دے دو تاکہ زمین کی تپش سے بچ جاؤں تو انہوں نے کہا کہ یمن والوں کو یہ خبر نہیں پہنچنی چاہیے کہ ایک عام آدمی نے بادشاہ کے جوتے پہنے ہیں البتہ اگر تم چاہو تو میں اپنی اونٹنی آہستہ چلاتا ہوں۔ تم اس کے سائے میں چل سکتے ہو۔

حضرت امیر معاویہ نے بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو کر یہ واقعہ عرض کیا تو آپ نے فرمایا ان میں جاہلیت کا تکبر ابھی باقی ہے اسلامی تعلیمات کی بدولت دور ہو جائے گا۔ حضرت وائل واپس جانے لگے تو آپ نے انہیں ایک تحریر عطا فرمائی۔

(طبقات ابن سعد، ج ۱ ص ۱۔ ۳۵۰)

۶۳ - وفد از دعمان

اہل عمان اسلام لے آئے تو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علاء ابن الحضرمی کو ان کے پاس بھیجا تاکہ انہیں اسلامی احکام کی تعلیم دیں اور ان سے صدقات وصول کریں پھر ان کا ایک وفد بارگاہ رسالت میں حاضر ہوا جس میں اسد ابن یبرح الطاحی تھے انہوں نے درخواست کی کہ ہمارے ساتھ کسی شخص کو بھیجیں جو ہماری اصلاح کرے۔ حضرت مخربہ عبدی جن کا نام مدرک ابن خوط تھا نے عرض کیا کہ مجھے ان کے ہاں بھیجا جائے کیونکہ ان کا مجھ پر ایک احسان ہے جنوب کی جنگ میں انہوں نے مجھے گرفتار کر لیا تھا۔ پھر مجھ پر احسان کیا۔ آپ نے انہیں عمان بھیج دیا۔

بعد ازاں سلمی ابن عیاذ ازدی ایک وفد کے ساتھ حاضر ہوئے انہوں نے دریافت کیا کہ ہم کس کی عبادت کریں اور لوگوں کو دعوت دیں۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا۔ انہوں نے عرض کیا اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ ہمارے درمیان اتفاق اور الفت پیدا فرمائے آپ نے دعا کی اور یہ وفد مشرف باسلام ہوا (ایضاً: ج ۱ ص ۳۵۱)

۶۴ - وفد غافق

جُلَیحہ ابن شجار ابن صُحار غافقی اپنی قوم کے ایک وفد کے ساتھ بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ! ہم اپنی قوم کے معتمد ہیں۔ ہم اسلام لے آتے ہیں اور ہمارے صدقات دوسرے میدانوں میں رکھے ہوئے ہیں فرمایا: تمہارے حقوق وہی

ہیں جو دوسرے مسلمانوں کے ہیں اور تمہاری ذمہ داریاں وہی ہیں جو دوسرے مسلمانوں کی ہیں۔ حضرت عوز ابن شہریہ غافقی نے عرض کیا۔ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ ہم اللہ پر ایمان لائے اور ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی قبول کی۔

(ایضاً : ج ۱ ص ۳۵۲)

۶۵ - وفد بارق

بارق کا وفد بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوا آپ نے انہیں اسلام کی دعوت دی تو وہ اسلام لے آئے اور بیعت سے مشرف ہوئے۔ آپ نے انہیں ایک تحریر عطا فرمائی :۔

یہ تحریر محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف سے بارق کے لئے ہے۔ ان کے پھل کاٹے نہیں جائیں گے۔ بارق سے اجازت لئے بغیر ان کے علاقے میں جانور نہیں چرائے جائیں گے۔ خواہ موسم بہار ہو یا موسم گرما۔ اور جو مسلمان مشقت یا قحط سالی کی حالت میں ان کے پاس سے گذرے گا۔ یہ لوگ اس کی تین دن مہمانی کریں گے۔ اور جب ان کے پھل پک جائیں تو مسافر پیٹ بھرنے کے لئے پھل چن سکے گا۔ بشرطیکہ چوری نہ کرے۔

اس پر حضرت ابو عبیدہ ابن جراح، حضرت حذیفہ ابن یمان گواہ ہوئے اور حضرت اُبیؓ ابن کعب نے تحریر لکھی

(ایضاً : ج ۱ ص ۳۵۲)

۶۶ - وفد دَوس

حضرت طفیل ابن عمر دَوسی مشرف باسلام ہوئے تو ان کی دعوت پر ان کی قوم بھی اسلام لے آئی۔ ان کے ساتھ ستّر یا اسّی گھنے مدینہ منورہ حاضر ہوئے ان میں حضرت ابوہریرہ اور حضرت عبداللہ ابن اُزَیہر دوسی بھی شامل تھے اسوقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خیبر میں تشریف فرما تھے (یہ ۷ھ کا واقعہ ہے) یہ حضرات خیبر میں جا کر حاضری کی سعادت سے بہرہ ور ہوئے۔ جب آپ نے مال تقسیم کیا تو انہیں بھی حصہ عطا فرمایا۔

پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ مدینہ طیبہ آئے۔ حضرت طفیل نے عرض کیا یا رسول اللہ! مجھے میری قوم سے جدا نہ فرمائیں آپ نے انہیں حرۃ الدجاج میں ٹھہرایا۔ حضرت ابوہریرہ ہجرت کر کے آئے تو راستے میں یہ شعر کہا۔

"یا طولھا من لیلۃ وعناءھا علی انھا من بلدۃ الکفر نجت"

وہ رات بہت ہی طویل اور پُر مشقت تھی لیکن اس نے کفر کے شہر سے نجات دی۔

حضرت عبداللہ ابن اُزیہر نے عرض کیا یا رسول اللہ! میری قوم میں میرا ایک مقام ہے۔ آپ مجھے ان پر امیر مقرر فرما دیں آپ نے فرمایا: اے دَوس کے بھائی! اسلام کی ابتداء غربت میں ہوئی اور وہ پھر غربت کی طرف لوٹ جائے گا۔ جس نے اللہ تعالیٰ

کی تصدیق کی اس نے نجات پائی اور جو منحرف ہوا وہ ہلاک ہو گیا۔ تمہاری قوم کا بڑا آدمی وہ ہے۔ جو سچائی میں بڑا ہے۔ عنقریب حق، باطل پر غالب ہو جائے گا۔ (ایضاً : ج ۱ ص ۳۵۳)

۶۷ - وفد ثمالہ و حُدّان

عبداللہ ابن عَلَس ثمالی اور مُسیلمہ ابن ہزّان حُدّانی فتح مکہ کے بعد اپنی قوم کے ایک وفد کے ہمراہ بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے، اسلام لائے اور اپنی قوم کی طرف سے بیعت کی۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ایک تحریر عنایت کی۔ جس میں اموال کے فرض صدقات درج تھے۔ یہ تحریر حضرت ثابت ابن قیس ابن شمّاس کی تھی اور اس پر حضرت سعد ابن عبادہ اور حضرت محمد ابن مسلمہ گواہ تھے۔ (ایضاً : ج ۱ ص ۴-۳۵۳)

۶۸ - وفد اسلم

عُمیرہ ابن اَفصٰی، قبیلہ اسلم کے ایک وفد کے ہمراہ بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے عرض کیا ہم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاتے ہیں اور آپ کے طریقے کی پیروی کرتے ہیں آپ ہمیں اپنی بارگاہ میں وہ مقام عطا فرمائیں جس کی فضیلت، عرب پہچانیں۔ ہم انصار کے بھائی ہیں ہم ہر سختی اور آسانی میں آپ سے وفا کریں گے اور آپ کی امداد کریں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ قبیلہ اسلم کو سلامتی عطا فرمائے اور قبیلہ غفار کی مغفرت فرمائے آپ نے قبیلہ اسلم اور عرب کے ان مسلم قبائل کو ایک تحریر عطا فرمائی، جو سمندر کے کنارے اور ہموار زمین کے رہنے والے تھے۔ اس تحریر میں صدقہ اور چوپایوں کے فرض صدقات کا ذکر تھا۔ یہ مکتوب حضرت ثابت ابن قیس ابن شماس نے لکھا حضرت ابو عبیدہ ابن الجراح اور حضرت عمر ابن الخطاب گواہ بنے۔ (ایضاً : ج ۱ ص ۳۵۴)

۶۹ - وفد مہرہ

قبیلہ مہرہ کا وفد مہری ابن الابیض کی قیادت میں بارگاہ رسالت میں حاضر ہوا۔ آپ نے ان پر اسلام پیش کیا۔ تو وہ اسلام لے آئے۔ آپ نے انہیں عطیات سے نوازا اور ایک تحریر عطا فرمائی۔

یہ مکتوب ہے محمد رسول اللہ کی طرف سے مہری ابن الابیض کے لئے ان لوگوں کے بارے میں جو ان کے ساتھ ایمان لائے ہیں۔ ان کا مال نہیں لوٹا جائے گا۔ ان پر حملہ نہیں کیا جائے گا۔ ان پر اسلامی احکام کا قائم کرنا لازم ہے۔ جس نے رد و بدل کیا اس نے جنگ کا آغاز کر دیا ہے۔ جو ایمان لایا اس کے لئے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ذمہ ہے۔ گری ہوئی چیز واپس کی جائے گی۔ اونٹ چرانے والی جماعت کو نوازا جائے گا۔ میل کچیل، گناہ ہے اور رفث، بدکاری کا نام ہے۔ یہ مکتوب حضرت محمد ابن مسلمہ انصاری نے لکھا۔

قبیلۂ مہرہ کا ایک شخص زُہیر ابن قرضم بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم انہیں اپنے قریب جگہ دیتے اور عزت افزائی فرماتے کیونکہ وہ دور دراز کی مسافت طے کر کے آئے تھے۔ جب وہ واپس جانے لگے تو آپ نے انہیں ثابت قدمی کی دعا دی زادِ راہ دیا اور ایک مکتوب عطا فرمایا : (ایضاً : ج ۱ ص ۹ - ۳۵۵)

۷۰ - وفد نجران

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل نجران کی طرف ایک مکتوب ارسال فرمایا تو ان کا ایک وفد بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوا جس میں ان کے چودہ معززین تھے۔ چند نام یہ ہیں۔ (۱) عاقب اس کا نام عبد المسیح تھا۔ اس کا تعلق قبیلہ کندہ سے تھا۔ (۲) ابو الحارث ابن علقمہ، بنو ربیعہ سے اور کرز کے بھائی تھے۔ (۳) السید ابن الحارث (۴) اوس ابن الحارث (۵) زید ابن قیس (۶) شیبہ (۷) خُوَیلد (۸) خالد (۹) عمر (۱۰) عبید اللہ۔ ان میں سے تین ان کے معاملات کے نگران تھے۔ عاقب ان کے امیر تھے دوسرے لوگ ان کے مشوروں پر عمل کرتے تھے۔ ابو الحارث ان کے بشپ، عالم، امام اور مدارس کے منتظم تھے۔ السید، سفر میں راہنمائی کرتے تھے۔ یہ لوگ مسجد نبوی میں داخل ہوئے تو انہوں نے حبرہ کے کپڑے پہنے ہوئے تھے اور چادروں کے کناروں پر ریشم لگا ہوا تھا۔ یہ لوگ مشرق کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے لگے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا انہیں پڑھنے دو۔ پھر یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے ان سے اعراض فرمایا اور ان سے گفتگو نہیں کی۔ حضرت عثمان غنی نے انہیں فرمایا تمہارے اس لباس کی وجہ سے تمہارے ساتھ گفتگو نہیں کی گئی۔ دوسرے دن وہ راہبوں کا لباس پہن کر آئے اور سلام عرض کیا، تو آپ نے انہیں جواب دیا پھر انہیں اسلام کی دعوت دی۔ دیر تک ان سے گفتگو ہوتی رہی۔ انہیں قرآن پاک سنایا لیکن وہ اسلام لانے کے لیے تیار نہ ہوتے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا کہ اگر تم ایمان لانے سے انکاری ہو تو آؤ میں تم سے مباہلہ کرتا ہوں۔ اسوقت تو یہ لوگ واپس چلے گئے۔ دوسرے دن صبح عبد المسیح اور ان کے دو صاحب فکر افراد حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ آپ سے مباہلہ نہ کریں۔ آپ حکم فرمائیں۔ ہم صلح کرنے کے لیے تیار ہیں۔ چنانچہ دو ہزار حُلّے سالانہ دینے پر صلح ہوئی، ایک ہزار رجب میں اور ایک ہزار صفر میں اور یہ طے پایا کہ اگر یمن میں جنگ ہوئی تو یہ چیزیں عاریۃً دی جائیں گی، تیس زرہیں، تیس نیزے تیس اونٹ اور تیس گھوڑے، اور فرمایا کہ نجران اور اس کے اطراف کے لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی پناہ اللہ تعالیٰ کے نبی اور رسول محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذمہ ہے۔ ان کی جانوں، ان کی ملت، زمین، اموال، ان کے حاضر و غائب۔ اور ان کے گرجوں کا، ان کے بشپ اور عالم کو اس کے مرتبہ سے، راہب کو رہبانیت سے اور واقف کو وقف سے روکا نہیں جائیگا اس پر ابوسفیان ابن حرب، اقرع ابن حابس اور مغیرہ ابن شعبہ کو گواہ بنایا۔

یہ لوگ اپنے علاقہ کی طرف چلے گئے۔ چند روز کے بعد سیّد اور عاقب بارگاہِ اقدس میں حاضر ہو کر اسلام لے آئے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال تک اور اس کے بعد خلافت صدیقی میں نجران کے عیسائی اس معاہدہ پر قائم رہے۔ خلافت فاروقی

میں انہوں نے سودی کاروبار کیا تو حضرت عمر نے انہیں جلاوطن کر دیا۔ چنانچہ ان میں سے کچھ لوگ عراق چلے گئے اور کوفہ کے قریب نجرانیہ میں قیام پذیر ہو گئے۔ (طبقات ابن سعد، ج ۱ ص ۸ - ۳۵۷)

علامہ زرقانی فرماتے ہیں کہ نجران، مکہ معظمہ سے یمن کی طرف سات مرحلوں کے فاصلے پر ایک بڑا شہر ہے۔ قرآن پاک میں جس اخدود کا ذکر ہے وہ نجران کا ایک گاؤں ہے۔ ذونواس یہودی حمیری نے نجران کے عیسائیوں سے جنگ کی اور جنہوں نے عیسائیت سے ارتداد قبول نہ کیا انہیں اخدود میں جلا کر ہلاک کر دیا۔

یہ وفد ساٹھ سواروں پر مشتمل تھا۔ ان میں سے چوبیس معزز افراد تھے۔ ابن سعد نے چودہ کی تعداد بتائی ہے ممکن ہے وہ بہت ہی زیادہ معزز ہوں۔ ابن ابی شیبہ اور ابو نعیم کی روایت میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے پاس فرشتہ یہ خبر لیکر آیا ہے کہ اگر اہل نجران نے مباہلہ کا فیصلہ کر لیا تو وہ ہلاکت سے بچ نہ سکیں گے۔ دوسرے دن آپ نے حضرت حسین اور حضرت حسن کا ہاتھ پکڑا اور روانہ ہوئے۔ پیچھے پیچھے حضرت فاطمہ زہرا چل رہی تھیں اور ان کے پیچھے حضرت علی مرتضیٰ تھے آپ انہیں فرما رہے تھے کہ جب میں دعا مانگوں تو تم آمین کہنا۔ عیسائیوں کے بشپ نے کہا۔

انی لاری وجوھا لو سألوا اللہ ان — میں ایسے چہرے دیکھ رہا ہوں کہ اگر اللہ تعالیٰ سے کسی پہاڑ
یزیل جبلا من جبالہ لازالہ فلا — کو اس کی جگہ سے ہٹا دینے کی دعا کریں تو اسے ہٹا دیگا۔
تباھلوا فتھلکوا ولا یبقی علی وجہ الارض — لہٰذا تم مباہلہ نہ کرو، ہلاک کر دیئے جاؤ گے اور قیامت
نصرانی الی یوم القیامۃ — تک روئے زمین پر کوئی عیسائی باقی نہیں رہے گا۔

چنانچہ انہوں نے عرض کیا کہ ہم آپ سے مباہلہ نہیں کرتے۔ البتہ ہم مصالحت کے لئے تیار ہیں (زرقانی علی المواہب، ج ۴ ص ۴۹، ۴۷)

وفد جیشان

ابو وہب جیشانی اپنی قوم کے وفد کے ساتھ بارگاہ رسالت میں حاضر ہوا۔ انہوں نے یمن میں پائی جانے شرابوں کے بارے میں دریافت کیا اور بتایا کہ شہد سے تیار کی جانے والی شراب کو بتع اور جو سے تیار شدہ شراب کو مزر کہتے ہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا ان کے پینے سے تمہیں نشہ آتا ہے۔ ؟ عرض کیا اگر زیادہ پئیں تو نشہ آور ہے۔ فرمایا: فحرام قلیل ما اسکر کثیرہ، جس کی زیادہ مقدار نشہ آور ہو۔ اس کی تھوڑی مقدار بھی حرام ہے۔ پھر انہوں نے سوال کیا کہ ایک شخص شراب بناتا ہے اور اپنے کارندوں کو پلاتا ہے فرمایا: کل مسکر حرام ہر نشہ آور حرام ہے۔

طبقات ابن سعد، ج ۱ ص ۳۵۹

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آنے والے وفود کے اعزاز و اکرام کو اتنی اہمیت دی کہ وصیت میں فرمایا۔

اجیزوا الوفد بنحو ما کنت اجیزھم

(بخاری شریف، عربی، ج ۲ ص ۶۳۸)

آنے والے وفود کو اسی طرح عطیات دینا جس طرح میں دیا کرتا تھا۔

النبیّ الأمّیؐ

تالیف : علامہ شہید مرتضیٰ المطہری
مترجم : نور الٰہی ایڈووکیٹ

ایران کے مقتدر علماء و مصنفین میں علامہ آیت اللہ سید مرتضیٰ مطہری ایک نامور فلسفی اور مصنف ہیں۔ ان کی سیرت کے بارے میں یہ مختصر سی کتاب اپنے دامن میں بے شمار وسعتیں رکھتی ہے۔ انہوں نے سیرتِ مطہرہ کے جس پہلو کو بطورِ خاص زیرِ بحث رکھا ہے وہ آپ کے اُمّی ہونے کا وصف ہے اور یہ وصف قرآن کریم کے منزل من اللہ ہونے کے دلائل میں سے ایک وقیع دلیل ہے۔ اس لئے اس کا تعلق بھی حضورِ رسالت مآبؐ کے اوصافِ نبوت سے ہے جناب مطہری نے اس پہلو کو اس کتابچے میں نمایاں کیا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے بارے میں واضح ترین امور میں سے یہ ہے کہ آں حضرتؐ نے کسی سے تعلیم حاصل نہیں کی اور نہ ہی کسی کے آگے زانوئے تلمذ تہ کیا اور نہ ہی آپ کو کسی مقالہ یا کتاب کے بارے میں کچھ پتہ تھا اور نہ ہی کسی مسلمان یا غیر مسلم مورخ نے آپؐ کے دورِ طفولیت یا شباب اور زمانہ کہولت و شیخوخت (یعنی دورِ رسالت) میں آپؐ کے تعلم و تلمذ کا دعویٰ کیا ہے چنانچہ کسی فردِ واحد نے بھی نہ تو اس کا ذکر کیا ہے اور نہ ہی کوئی ایسی سند پیش کی ہے جس سے واضح ہو کہ بعثت کے قبل آں حضرتؐ نے کبھی کوئی ایک سطر پڑھی ہو یا کوئی ایک کلمہ لکھا ہو۔

اس زمانہ میں اہلِ عرب اور بالخصوص اہلِ حجاز اَن پڑھ لوگ تھے اور ان میں سے لکھنا پڑھنا جاننے والے انگلیوں پہ گنے جا سکتے تھے اور ان کی نشاندہی کی جا سکتی تھی ان حالات میں اس بات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ ایک شخص لکھنے پڑھنے کا ماہر ہو اور اس کے بارے میں کسی کو علم نہ ہو۔

ہم جانتے ہیں اور ہم عنقریب اس کی وضاحت کریں گے کہ اس زمانے میں آنحضرت کے مخالفین آپؐ پر یہ الزام تراشی کرتے تھے کہ آپؐ دوسروں سے سن کر ان کی تعلیمات نقل کرتے ہیں لیکن ان معارضین نے آپؐ کے بارے میں کبھی یہ نہیں کہا کہ آپؐ لکھنا پڑھنا جانتے تھے یا آپؐ کے پاس ایسی کتابیں ہیں جن سے آپؐ کچھ حصے چرا کر استفادہ کر رہے ہیں اگر آں حضرتؐ کو معمولی سے معمولی بھی لکھنے پڑھنے کا ملکہ ہوتا تو یہ اتہام آپ پر بڑی آسانی سے لگایا جا سکتا تھا۔ لیکن آپؐ کے کسی مخالف نے بھی اس کی جسارت نہیں کی۔

غیر مسلموں کے اعترافات

مستشرقین جو اسلامی تاریخ کو دقیق ناقدانہ نظر سے دیکھنے کے عادی ہیں انہیں بھی آپؐ کے لکھنے پڑھنے کے بارے میں کوئی اشارہ نہیں ملا۔ اسی لئے انھوں نے بھی بحث وتمحیص کے بعد یہ اعتراف کر لیا ہے کہ آنحضرتؐ امی تھے جو ایک اَن پڑھ قوم میں پروان پڑھے۔

کارلائل اپنی کتاب "الابطال" (HEROES) میں لکھتا ہے: "ہمیں یہ چیز فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ محمدؐ نے کسی معلم سے کسی قسم کی تعلیم حاصل نہیں کی کیونکہ اس وقت قبائل عرب میں لکھنے کا رواج بہت کم تھا اور یہ حقیقت ہے کہ محمد لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے اور آپؐ صرف صحرائی طرز زندگی سے آشنا تھے۔

مستشرق ویل ڈیورانت اپنی کتاب "تہذیب وتمدن کی کہانی" (قصۃ الحضارت) میں لکھتا ہے:

"ظاہر ہے کہ کوئی بھی ایسا نہ تھا جسے آنحضرتؐ کی تعلیم وتدریس (یعنی لکھانے پڑھانے) کی فکر لاحق ہوتی۔ عربوں کی نظر میں کتابت وقرأت کی چنداں اہمیت نہ تھی اسی لئے اس زمانے میں لکھنا پڑھنا جاننے والوں کی تعداد سترہ سے متجاوز نہ تھی۔ اور ہمارے علم میں یہ بات نہیں ہے کہ محمدؐ نے اپنے ہاتھ سے کوئی چیز لکھی ہو۔ (نبوت کے بعد آپؐ کے پاس کاتب خاص تھے) اس کے باوجود عربی کی معروف ترین اور مشہور ترین کتاب (القرآن) آپؐ کی زبان پر جاری ہوئی اور اکثر متعلمین کی بہ نسبت آپؐ حقائق و دقائق اشیا کا علم زیادہ رکھتے تھے۔"

جان ڈیون پورٹ اپنی کتاب "الاعتذار الی محمدؐ والقرآن" (APOLOGY) میں رقم طراز ہے کہ معروف علمی وتہذیبی دنیا بالاجماع اس بات کی معتقد ہے کہ محمدؐ نے کوئی تعلیم حاصل نہیں کی اور آپؐ صرف وہی کچھ جانتے تھے جو آپؐ کے قبیلے میں متداول تھا۔

کونستان ورژیل گیورگیو اپنی کتاب "محمدؐ ۔ ۔ ۔ ۔" میں تحریر کرتا ہے:

"اگرچہ آنحضرتؐ ان پڑھ تھے لیکن ان پر نازل شدہ ابتدائی آیات میں ہمیں "قلم" اور "علم" یعنی کتابت وتکنیب اور تعلیم وتعلم کا تذکرہ ملتا ہے دنیا کے ادیانِ کبریٰ میں سے کسی دین نے بھی علم ومعرفت کا یہ اہتمام نہیں کیا اور یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی ایسا دین ہو جس نے علم ومعرفت کی تحصیل میں وہ مقام پایا ہو جو دینِ اسلام کو حاصل ہے اگر محمدؐ عالم ہوتے تو غارِ حرا میں ان آیات کے نزول پر آپؐ کے لیے مجالِ تعجب نہ تھا کیونکہ ایک عالم تو علم کی قدر پہچانتا ہے لیکن آپؐ امی تھے اور آپؐ نے کسی معلم سے اکتسابِ علم نہیں کیا تھا اور اپنی طرف سے مسلمانوں کو مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ انہوں نے ابتدا ہی سے اس ارفع واعلیٰ مقام کی معرفت حاصل کر لی۔"

گوستاف لی بون (G. LE BON) اپنی تصنیف "عربی اسلامی تہذیب" (الحضارت العربیۃ الاسلامیہ) میں لکھتا ہے:۔

"مشہور ہے کہ نبیؐ امی تھے اور یہ امر قیاس وقاعدہ کے مطابق ہے کیونکہ اگر آپؐ اہلِ علم ہوتے تو

مطالب و مضامینِ قرآن کا ربط موجودہ صورت سے بہتر ہوتا[1] اور اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی قرینِ قیاس ہے کہ اگر آپؐ امی نہ ہوتے تو آپؐ ایک جدید مذہب نہ لا سکتے تھے اور نہ ہی اس کی نشر و اشاعت کر سکتے تھے کیونکہ ایک اَن پڑھ انسان ہی جاہلوں کی ضروریات کے بارے میں زیادہ جانتا ہے اور ان کی احتیاجات کی زیادہ معرفت رکھتا ہے اور وہی بہتر طریقے پر انھیں راہِ راست پر چلا سکتا ہے۔ بہر حال آپ خواہ امی ہوں یا نہ ہوں اس امر میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ آپؐ بہترین فہم و فراست و ذکاوت سے بہرہ مند تھے۔"

یہ بات کچھ پسندیدہ نہیں ہے کہ گوستاف لی بون نے مفاہیم و مطالبِ قرآنی کا مطالعہ تو بالاستیعاب کیا نہیں اور اپنے مادی افکار کو ایک دوسرے رخ پر ڈال دیا ہے جس کی وجہ سے اسے آیاتِ قرآنی میں ربط کا ادراک حاصل نہیں ہوا اور جاہلوں کی ضروریات سے ایک عالم کی لاعلمی کی منطق کے نقطۂ نظر سے اس نے اس کلام کو ہلکا گردانا ہے اور اس طرح قرآن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کا پہلو نکالا ہے۔ ان سب چیزوں کے باوجود وہ اعتراف کرتا ہے کہ نبی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں لکھنے پڑھنے کا کوئی تاریخی ثبوت اور علامت موجود نہیں ہے۔

فی الواقع ان عبارتوں کے نقل کرنے سے ہمارا مقصود یہ نہیں ہے کہ ہم غیر مسلموں کی باتوں سے استشہاد کریں حالانکہ مسلمان غیر مسلموں کی بہ نسبت تاریخِ اسلام پر اظہارِ رائے کے زیادہ حقدار ہیں بلکہ ہمارا مقصد یہ ہے کہ وہ لوگ جو بذاتِ خود تاریخ کا مطالعہ نہیں کرتے وہ جان لیں کہ اگر آنحضرتؐ کے لکھنے پڑھنے کے بارے میں کوئی علامت ہوتی تو وہ غیر مسلم ناقدین و معترضین کی نظروں سے اوجھل نہ ہوتی۔

ابتدائی دور میں ایک دفعہ آنحضرتؐ نے اپنے چچا ابو طالب کے ہمراہ مکہ سے شام تک کا سفر کیا اور راستے میں بحیری (یا بحیرا)[2]

---

[1] حقیقت یہ ہے کہ جو شخص کیفیتِ نزولِ قرآن کو نہیں سمجھتا اور قرآنِ کریم میں تصنیفی ترتیب اور کتابی اسلوب تلاش کرتا ہے اس کے احساسات اسی قسم کے ہوتے ہیں۔ لیکن قرآنِ کریم کتابِ دعوت ہے جو نبیؐ پر یک وقت نازل نہیں ہوئی بلکہ اس کتاب کو اللہ تعالیٰ نے آنحضرتؐ کی تیئیس سالہ تحریکی زندگی میں حق و باطل کی کشمکش کے دوران میں ہر منزل ہر مرحلے اور ہر موڑ پر مناسب رہنمائی کے لئے خطبوں کی شکل میں نازل فرمایا۔ اس کتاب میں آثارِ کائنات اور تاریخی قصوں سے استدلال کر کے دینِ حق کی طرف دعوت دی گئی ہے۔ اس میں اعتقادی مسائل، اخلاقی پند و نصائح، معاشی و معاشرتی ہدایات، سیاسی اصول اور شرعی احکام موجود ہیں لیکن معروف تصنیفی اسلوب کے مطابق مختلف ابواب و فصول کے تحت سلسلہ وار نہیں ہیں بلکہ بار بار ایک دوسرے کے بعد آتے ہیں اور ایک ہی مضمون داعیانہ حکمت کے ساتھ مختلف طریقوں سے مختلف الفاظ میں دہرایا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے مخالفانہ نقطۂ نظر سے دیکھنے والا اس پر اعتراض کرتا ہے اور جی۔ لی۔ بون صاحب بھی اسی بیماری کا شکار ہیں۔ (مترجم)

[2] پروفیسر ماسینیون جو ایک مشہور مستشرق اور علوم اسلامیہ کا ماہر ہے اس نے اپنی کتاب (سلمان الطاہر) میں اس قسم کے کسی شخص کو جس کی آنحضرتؐ سے اس طرح ملاقات ہوئی ہو در حقیقت مشکوک الوجود اور ایک افسانوی کردار قرار دیا ہے وہ کہتا ہے: (بقیہ حاشیہ ص آئندہ)

نامی ایک راہب کے ساتھ آں حضرتؐ کی ایک مختصر سی ملاقات ہوئی - اس مختصر ملاقات کو خصوصیت حاصل ہوگئی کیونکہ مستشرقین نے اسے بڑی اہمیت دی ہے، وہ بغلیں بجاتے ہوئے اس پر چھپٹ پڑے اور قیاس آرائیاں اور چہ میگوئیاں شروع کر دیں : کیا نبیؐ نے اس مختصر ملاقات کے علاوہ کوئی اور تعلیم بھی کسی سے حاصل کی؟ جب اس چھوٹے سے حادثے نے قدیم و جدید مخالفین کی نظروں کو اپنی طرف کھینچ لیا ہے تو اگر پہلے سے آنحضرتؐ کے لکھنا پڑھنا جاننے کی کوئی دلیل ہوتی تو وہ زیادہ مستعدی کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہوتے اور اس کو مخفی نہ رہنے دیتے بلکہ اس قسم کی کوئی سند موجود ہوتی تو وہ لازمی طور پر ان کی خوردبینوں میں نظر آجاتی اور وہ اسے مسلسل بڑھا چڑھا کر پیش کرتے۔

اس امر کی وضاحت کے لیے لازمی ہے کہ ہم اس بحث کو مندرجہ ذیل دو حصوں میں تقسیم کریں:۔

۱- بعثت سے قبل کا دور

۲- بعثت سے بعد کا دور

یہ بات ضروری ہے کہ ہم لکھنے پڑھنے کے بارے میں دورِ مابعد بعثت پر اپنی توجہ مرکوز کریں۔ پس ہمیں معلوم ہوجائیگا کہ مسلمان علماء کے نزدیک یہ امر قطعی اور مسلم اور متفق علیہ ہے کہ آنحضرتؐ کو بعثت سے قبل لکھنے پڑھنے کا کوئی علم نہ تھا لیکن دورِ رسالت کا معاملہ اس طرح نہیں ہے بلکہ وضاحت طلب ہے - اس دور میں یہ امر قرینِ واقعہ ہے کہ آنحضرتؐ نے کبھی نہیں لکھا لیکن جہاں تک عدمِ قرأت کا تعلق ہے اس میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ شیعہ حضرات کی بعض روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ زمانہ بعثت میں پڑھا کرتے تھے لیکن کتابت نہ کرتے تھے۔ شیعہ حضرات کی یہ روایات مختلف اور غیر متطابق ہیں۔

لیکن جملہ قرائن و دلائل سے یہی چیز حاصل ہوتی ہے کہ آنحضرتؐ دورِ رسالت میں نہ لکھا ہوا پڑھا کرتے تھے اور نہ لکھتے تھے۔

دورِ ماقبل بعثت سے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لئے ہمارے لئے لازم ہے کہ ہم جزیرہ عرب میں قرأت و کتابت کی عمومی صورتِ حال کے بارے میں بحث کریں۔

تواریخ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ظہورِ اسلام کے وقت معدودے چند افراد کے علاوہ کوئی بھی لکھنا پڑھنا نہ جانتا تھا۔

مورخ بلاذری اپنی کتاب "فتوح البلدان" کے آخر میں لکھنے کے رواج کی ابتدا کے بارے میں ہمیں بتاتا ہے اور کہتا ہے۔

"قبیلہ طے کے تین افراد مسمیان مرامر بن مرہ اور اسلم بن سدرہ اور عامر بن جدرہ موضع بقہ[1] میں اکٹھے ہوئے اور انہوں نے خط وضع کیا اور سریانی حروف تہجی کے نمونہ کے مطابق عربی حروف تہجی تیار کئے۔ ان سے اہلِ انبار نے لکھنا سیکھا۔ پھر اہل انبار سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) "کہ بحیرا سرجیوس اور تمیم داری وغیرہ جنکو راویوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد اکٹھا کر دیا ہے وہ افسانوی کردار ہیں اور ان کی اصلیت تلاش کرنا ممکن نہیں ہے۔ (مؤلف)

[1] بقہ، حیرہ کے نزدیک ایک بستی کا نام ہے۔ (مترجم بحوالہ منتہی الارب)

اہلِ حیرہ نے کتابت سیکھی اور اکیدر بن عبدالملک بن عبدالجن کندی ثم سکونی کے بھائی بشر بن عبدالملک والئے دومۃ الجندل جو مذہباً عیسائی تھا اس نے حیرہ میں کچھ عرصہ قیام کر کے اہل حیرہ سے عربی رسم الخط کی تعلیم حاصل کی۔

پھر وہ اپنے کسی کام کے سلسلے میں مکہ آیا۔ سفیان بن امیہ بن عبدشمس اور ابوقیس بن عبدمناف بن زہرہ بن کلاب نے اسے لکھتے ہوئے دیکھا اور اس سے گذارش کی کہ انھیں بھی لکھنا سکھا دیا جائے۔ چنانچہ بشر نے انھیں حروف تہجی سکھائے پھر انھیں لکھا ہوا دکھایا اور ان دونوں نے بھی لکھا۔ بعد ازاں بشر اور سفیان اور ابوقیس تجارت کے سلسلہ میں طائف گئے۔ غیلان بن سلمہ ثقفی نے ان کی معیت اختیار کی اور ان سے لکھنا سیکھا۔ بشر ان سے جدا ہو کر دیار مضر کی جانب چلا گیا۔ وہاں اس سے عمرو بن زرارہ بن عدس نے کتابت سیکھی اور اس کو عمر والکاتب کہا جانے لگا۔ پھر بشر نے شام کا رُخ کیا اور وہاں لوگوں نے اس سے لکھنا سیکھا۔

قبیلہ کلب کے ایک آدمی نے قبیلہ طے کے تین آدمیوں سے کتابت سیکھی اور پھر وادی القریٰ کے ایک آدمی کو اس نے تعلیم دی۔ وہ آمد و رفت کے کسی سلسلے میں وادی میں آیا اور وہاں کے رہنے والوں کو کتابت کی تعلیم دی۔

عربی رسم الخط کی ابتدا اس طرح ہوئی۔ ابن الندیم نے الفہرست کے مقالہ اولیٰ کے فن اول میں بلاذری کے مندرجہ بالا بیان کی نشاندہی کی ہے اور پھر ابن عباس سے یہ روایت نقل کی ہے کہ سب سے پہلے خطِ عربی جنہوں نے سیکھا وہ قبیلہ بولان کے تین اشخاص تھے اور یہ انبار کا ایک قبیلہ ہے۔ پھر اہلِ انبار سے اہل حیرہ نے لکھنا سیکھا۔

ابن خلدون نے بھی مندرجہ کلام کا کچھ حصہ ذکر کر کے اپنے مقدمہ میں اس کی تائید کی ہے (حوالہ کے لیے دیکھو فصل معنون بہ "خط و کتابت کا شمار انسانی صنائع میں ہوتا ہے۔")

بلاذری ایک روایت نقل کرتا ہے جس میں درج ہے کہ ظہورِ اسلام کے وقت قبیلہ قریش میں درجِ ذیل سترہ اشخاص لکھنا جانتے تھے:۔

عمرؓ بن خطاب، علیؓ بن ابی طالب، عثمانؓ بن عفان، ابوعبیدہؓ بن الجراح، طلحہؓ، یزیدؓ بن ابی سفیان، ابوحذیفہؓ بن عتبہ بن ربیعہ، حاطبؓ بن عمرو برادر سہیل بن عمرو عامری، ابوسلمہؓ بن عبدالاسد مخزومی، اباںؓ بن سعید بن عاص بن امیہ، خالدؓ بن سعید برادر ابان، عبداللہؓ بن سعد بن ابی سرح عامری، حویطبؓ بن عبدالعزیٰ عامری، ابوسفیانؓ بن حرب بن امیہ۔ معاویہؓ بن ابی سفیان، جہمؓ بن صلت بن مخرمہ بن مطلب بن عبدمناف۔ علاؓ بن حضرمی (حلیف قریش)

اس کے بعد بلاذری ایک ایسی قرشی خاتون کا ذکر بھی کرتا ہے جو دورِ جاہلیت میں ظہورِ اسلام کے وقت قرأت و کتابت سے آشنا تھی وہ (الشفاء) بنت عبداللہ عدوی ہے۔ اس نے اسلام قبول کیا اور مہاجرین اولین میں سے تھی۔ بلاذری نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ الشفاءؓ نے حضرت حفصہؓ (زوجۃ النبیؐ) کو بھی کتابت سکھلائی۔ اس روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا:

"تو نے حفصہ کو کتابت تو سکھلا دی ہے کیا تو اسے (رقیۃ النملۃ) چیونٹی کا تعویذ یعنی اطاعت گذاری اور فرمانبرداری نہیں سکھلائے گی؟"

اس کے بعد بلاذری بعض ایسی خواتین کا ذکر کرتا ہے جو عہدِ اسلامی میں لکھنا اور پڑھنا یا صرف پڑھنا جانتی تھیں مثلاً حضرت حفصہؓ پڑھنا

جانتی تھیں۔ اسی طرح اولیں مہاجر خواتین میں سے بنت عقبہ بن ابی معیط لکھا کرتی تھیں۔ اس نے بنت سعد کو بتلایا کہ اس کے باپ نے اسے کتابت کی تعلیم دی ہے۔ اسی طرح بنت مقداد لکھنا جانتی تھیں حضرت عائشہؓ (زوجۂ النبیؐ) پڑھ سکتی تھیں لیکن لکھنا نہ جانتی تھیں اور یہی کیفیت ام سلمہؓ کی تھی۔

بلاذری ان لوگوں کے ناموں کا ذکر بھی کرتا ہے جو آں حضرتؐ کے لئے کتابت کیا کرتے تھے پھر تاکید کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ ظہورِ اسلام کے وقت اوس و خزرج کے جو لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے ان کی تعداد گیارہ سے زیادہ نہیں تھی۔ بلاذری ان کے اسماء کا ذکر بھی کرتا ہے (اوس اور خزرج دو معروف قبیلے ہیں جو مدینہ منورہ میں آباد تھے)

مندرجہ بالا حوالہ جات سے ظاہر ہے کہ دیارِ حجاز میں لکھنے کی صناعت نئی نئی وارد ہوئی تھی۔ اس صورت حال میں جب کوئی شخص کتابت سیکھتا تو اس کی طرف انگلیاں اٹھائی جاتیں۔ مکہ اور مدینہ میں کتابت جاننے والوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی تھی۔ اسی لئے تاریخ نے ان کے ناموں کا ریکارڈ محفوظ کر دیا ہے۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان میں سے ہوتے تو آپؐ بھی یقیناً پہچانے جاتے۔ جب ان ناموں کی فہرست میں آپ کا ذکر ناپید ہے تو یہ چیز بالوضاحت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ آپؐ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔

عہدِ رسالتؐ بالخصوص قیامِ مدینہ کے دوران

جملہ قرائن کے ملاحظہ سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عہدِ رسالتؐ میں بھی قرأت و کتابت نہیں جانتے تھے۔ اگرچہ مسلمان علما کا اس بارے میں اختلاف ہے خواہ وہ اہلِ تشیع ہوں یا اہلِ سنت جبکہ بعض نے اس امر کو بعید از قیاس سمجھا ہے کہ وحی نے آپؐ کو ہر چیز کی تعلیم نہ دی ہو۔

شیعہ حضرات کی بعض روایات میں درج ہے کہ آنحضرتؐ عہدِ رسالتؐ میں پڑھا کرتے تھے لیکن لکھتے نہ تھے۔ انہی میں ایک روایت وہ ہے جسے صدوق نے اپنی کتاب (علل الشرائع) میں ابی عبداللہ سے روایت کیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ کا یہ احسان ہے کہ آپ پڑھتے تھے لیکن لکھتے نہ تھے۔ جب ابو سفیان نے احد کی جانب لشکر کشی کی تو حضرت عباسؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں خط لکھا۔ یہ مکتوب آپؐ کو اس وقت ملا جب آپؐ مدینہ سے باہر ایک باغ میں تھے۔ آنحضرتؐ نے خط پڑھا لیکن اس کی اطلاع صحابہؓ کو نہ دی اور انہیں مدینہ چلنے کا حکم دیا۔ جب صحابہؓ مدینہ تشریف لے آئے تو پھر انہیں اس بارے میں مطلع فرمایا۔[1]

حضرت عباسؓ کے خط کا واقعہ سیرت زینی دحلان میں جس طرح بیان کیا گیا ہے وہ علل الشرائع کی روایت کے مخالف ہے۔ منقول ہے:۔

"اور عباسؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خط تحریر کیا جس میں کفار کی جمعیت اور حملہ کرنے کی اطلاع

---

[1] بحار الانوار جلد ۶ا صفحہ ۱۳۲۔ [2] بحار الانوار جلد ۱۶ صفحہ ۱۳۳ (اس روایت کی سند ضعیف ہے)

دی۔ جب یہ مکتوب آنحضرتؐ کو وصول ہوا تو اس وقت آپؐ قبا میں تھے۔ عباسؓ نے یہ خط بنی غفار کے ایک آدمی کے ہاتھ ارسال کیا جسے عباسؓ نے اجرت دی اور اس کے ساتھ یہ شرط طے کی وہ تین شبانہ روز میں یہ خط مدینہ لے جائے۔ چنانچہ اس نے اسی طرح تعمیل کی۔ جب خط آیا تو آپؐ نے اس کی مہر توڑی اور اسے ابی بن کعبؓ کو دیا جنہوں نے پڑھ کر آپؐ کو سنایا۔ آپؐ نے ابیؓ کو فرمایا کہ اس خبر کو پوشیدہ رکھنا۔ پھر آنحضرتؐ سعد بن ربیع کے ہاں تشریف لائے اور عباسؓ کے خط کے بارے میں بتلایا اور فرمایا۔ "خدا کی قسم میں بھلائی کا امیدوار ہوں[1]"

آپؐ نے سعد کو بھی یہی حکم دیا کہ فی الحال اس خبر کو مخفی رکھا جائے۔

صورتِ احوال تو اس طرح پر تھی جبکہ بعض کا عقیدہ ہے کہ آنحضرتؐ عہد رسالتؐ میں لکھتے اور پڑھتے تھے۔ بحار الانوار نے سید مرتضیٰ کا یہ قول نقل کیا ہے[2] "شعبی اور اہل علم کی ایک جماعت کا قول ہے کہ آنحضرتؐ وفات سے قبل لکھنا پڑھنا جانتے تھے شاید ان کا استناد حدیث قرطاس و دوات پر ہے۔ کیونکہ ان کا بیان ہے:

"صحاح اور تواریخ میں آنحضرتؐ کا یہ قول مشہور ہے کہ دوات اور کاغذ لاؤ، میں تمہارے لئے ایک تحریر لکھ دوں جس کے بعد تم کبھی گمراہ نہ ہوگے۔"

لیکن حدیثِ دوات و قرطاس سے استناد صحیح نہیں ہے کیونکہ اس میں یہ صراحت نہیں ہے کہ آنحضرتؐ کا ارادہ اپنے ہاتھ سے لکھنے کا تھا۔ اگر ہم فرض کریں کہ آپؐ کچھ لکھانے کا حکم دینا چاہتے تھے جس پر حاضرین کو گواہ بنانا مقصود تھا تو پھر "میں تمہارے لئے ایک تحریر لکھ دوں" کی تعبیر صحیح ہے اور اپنی طرف یہ نسبت مجازی ہے۔ جیسا کہ اہل زبان کے ہاں رائج ہے اور اس طرح کا اسلوب بیان عربی زبان وغیرہ میں فصاحت و خوش بیانی کا حامل ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خط وکتابت

معتبر اسلامی قدیم تواریخ کی نصوص سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مدینہ منورہ میں کاتبوں کی ایک جماعت موجود تھی اور یہ لوگ وحی الٰہی اور احادیثِ نبوی آپس کے عہد و پیمان اور معاملات، مشرکین اور اہلِ کتاب کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معاہدات، صدقات اور ٹیکسوں کے رجسٹر، غنائم اور خمس کے دفاتر اور آنحضرتؐ کے ارسال کردہ کثیر التعداد مکاتیب لکھتے تھے۔ تاریخ ہمیں بتلاتی ہے کہ وحی الٰہی اور زبانی احادیث کے علاوہ آنحضرتؐ کے کثیر معاہدے اور مکاتیب ہیں۔

محمد بن سعد اپنی کتاب "طبقات کبیر" جلد ۲ صفحہ ۳۰ تا ۳۸ پر تقریباً ایک سو مکاتیب اور ان کے متن کا ذکر کرتا ہے۔ ان میں سے بعض مکاتیب شاہان و حکام عالم رؤسائے قبائل، اور خلیج فارس میں روم اور ایران کے ماتحت امراء اور دیگر شخصیات کی طرف ارسال کئے گئے تھے یا وہ فقہی استفسارات کے بارے میں جوابات کی شکل میں تھے اور مسائل شرعی وغیرہ

---

[1] سیرت زینی دحلان۔ جلد ۱۔ صفحہ ۲۲۹۔ طبع دار المعرفہ۔ بیروت۔

[2] بحار الانوار۔ جلد ۱۶ صفحہ ۱۳۵۔

کی عام تعلیم پر مشتمل تھے۔ ان میں سے اکثر مکتوبات کے کاتب معلوم ہیں۔ کیونکہ کاتب خط کے نیچے اپنا نام لکھا کرتے تھے اور سب سے پہلے جس نے مکتوب کے آخر میں کاتب کا نام لکھنے کے طریقے کو رواج دیا وہ مشہور صحابی ابی بن کعبؓ ہیں۔

واقعاتی صورت تو یہ تھی۔ لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان مکتوبات، معاہدات اور دفاتر میں سے ایک تحریر بھی اپنے ہاتھ سے نہیں لکھی اور کوئی ایسا موقع پیش نہیں آیا جس کے متعلق یہ کہا جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فلاں خط اپنے ہاتھ سے تحریر فرمایا تھا۔ بلکہ کوئی ایسا واقعہ بھی نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی وقت کوئی ایک آیت قرآنی بھی اپنے ہاتھ سے لکھی ہو۔ بلکہ کاتبوں میں سے ہر ایک آنحضرتؐ سے قرآن سن کر وحی کی کتابت اپنے ہاتھ سے کیا کرتا تھا۔

کیا یہ ممکن ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کتابت جانتے ہوں اور قرآن یا اس کی ایک سورت یا ایک آیت اپنے ہاتھ سے نہ لکھیں؟

تاریخ کی کتابوں میں کاتبانِ وحی کے اسماء بھی درج ہیں، یعقوبی اپنی تاریخ میں لکھتا ہے:

"آنحضرتؐ کے کاتب جو وحیِ الٰہی، مکتوبات اور معاہدے لکھا کرتے تھے ان کے نام یہ ہیں، علیؓ بن ابی طالب، عثمانؓ بن عفان، عمروؓ بن عاص بن امیہ، معاویہؓ بن ابی سفیان، شرجیل بن حسنہ، عبد اللہ بن سعد بن ابی سرح، مغیرہ بن شعبہ۔ معاذؓ بن جبل، زیدؓ بن ثابت، حنظلہؓ بن ربیع، ابیؓ بن کعب، جہیم بن صلت اور حصینؓ نمیری۔" [۱]

مسعودی اپنی کتاب "التنبیہ والاشراف" میں ایک حد تک تفصیل سے بیان کرتا ہے کہ ہر کاتب کے کیا فرائض تھے اور اس کا دائرۂ عمل کیا تھا اور اس کام کی تنظیم اور باہمی تقسیم کس طرح تھی۔ وہ لکھتا ہے:

"خالد بن سعید بن عاص بن امیہ بن عبد شمس بن مناف آنحضرتؐ کی خدمت میں پیش ہونے والے جملہ امور کے بارے میں لکھا کرتا تھا۔ مغیرہ بن شعبہ ثقفی اور حصین بن نمیر آپؐ کو پیش آمدہ حوائج وضروریات سے متعلق لکھتے تھے۔ عبد اللہ بن ارقم بن عبد یغوث زہری اور علاء بن عقبہ لوگوں کے مابین قرضوں کے لین دین اور دیگر عہد و پیمان اور معاملات کے بارے میں تحریر کرتے تھے۔ زبیر بن عوام اور جہیم بن صلت اموال صدقات کو منضبط کرتے تھے حذیفہ بن یمان حجاز کی زمینوں کی آمدن کے تخمینے کا ریکارڈ رکھتے تھے معیقیب بن ابی فاطمہ دوسی جو بنی اسد کا حلیف تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی غنیمتوں کو ضبطِ تحریر میں لاتا تھا۔ شاہانِ عالم کے ساتھ آنحضرتؐ کی مراسلت کا شعبہ زید بن ثابتؓ کے سپرد تھا۔ وہ آنحضرتؐ کے لیے فارسی، رومی، قبطی اور حبشی زبانوں

---

[۱] تاریخ الیعقوبی۔ جلد ۲ صفحہ ۸۰

[۲] جامع ترمذی میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زیدؓ بن ثابت کو سریانی زبان کی تعلیم حاصل کرنے کا حکم دیا۔ بلاذری نے بھی حضرت زید بن ثابتؓ کا یہ قول نقل کیا ہے: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے کتاب یہود سیکھنے کا حکم دیا۔ میرے باپ

کے ترجمہ کا کام بھی سرانجام دیتے تھے۔ انہوں نے مدینہ میں ان زبانوں کے جاننے والوں سے یہ زبانیں سیکھی تھیں مذکورہ کاتبوں میں سے اگر کوئی غیر حاضر ہوتا تو حنظلہ بن ربیع اس کا کام سرانجام دیتے تھے۔ وہ سب کاتبوں کے قائم مقام اور نائب تھے۔ وہ حنظلہ کاتب کے نام سے مشہور تھے۔ ان کی وفات حضرت عمر بن خطابؓ کے دورِ خلافت میں ہوئی۔ جب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لئے بلاد کی فتوحات کے دروازے کھول دئیے اور وہ دنیا میں پھیل گئے تو حنظلہ بھی دیارِ مصر کے بلاد "رہا" کی طرف کوچ کر گئے اور وہیں وفات پائی۔ عبداللہ بن سعد بن ابی سرح بھی آنحضرتؐ کا کاتب تھا وہ مرتد ہو کر مشرکین مکہ سے مل گیا۔ شرحبیل بن حسنہ طانجی بھی آپؐ کا کاتب تھا۔ ابان بن سعید اور علاء بن حضرمی بھی کبھی کبھی آپ کے پاس کتابت کیا کرتے تھے۔ آنحضرت کی وفات سے قبل حضرت معاویہؓ نے بھی چند ماہ آنحضرتؐ کے کاتب کی حیثیت سے کام کیا۔ ہم نے صرف ان کاتبوں کے ناموں کا ذکر کیا ہے جو آپؐ کی کتابت پر مامور تھے۔"

(تلخیص از "التنبیہ والاشراف" صفحات ۲۴۵-۲۴۶)

مسعودی نے اس موقعہ پر وحی الٰہی اور اسلامی معاہدوں کی کتابت کے ضمن میں امام علیؓ اور عبداللہ بن مسعود اور ابی بن کعبؓ کے اسمائے گرامی کا ذکر نہیں کیا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی مراد صرف ایسے اشخاص کے تذکرہ سے تھی جو کتابت وحی کے علاوہ دیگر شعبوں میں اضافی کام کرتے تھے۔

تواریخ اور اسلامی احادیث میں ہم دیکھتے ہیں کہ دور و نزدیک کے مسلمان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں نصیحت حاصل کرنے کے لیے آتے تھے اور آپؐ انھیں بلیغ اور حکیمانہ جواب دیتے تھے آنحضرتؐ کے ایسے بیشتر فیصلے محفوظ ہیں۔ تواریخ میں بصراحت موجود ہے کہ یہ واقعات اسی مجلس میں یا اس کے بعد ضبطِ تحریر میں لائے جاتے تھے۔ لیکن یہ چیز قابلِ ملاحظہ ہے کہ ان قضایا میں سے آنحضرتؐ نے کبھی ایک سطر تک اپنے ہاتھ سے رقم نہیں فرمائی۔ اگر آپؐ خود تحریر فرماتے تو مسلمان ان تحریروں کو تبرکاً محفوظ رکھتے اور ایسی تحریروں کو اپنے لئے اور اپنے قبیلوں کے لیے باعثِ افتخار سمجھتے۔ حضرت علیؓ اور دیگر ائمہ کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ ان کے ہاتھوں کے لکھے ہوئے خطوط سالہا سال بلکہ قرنوں تک ان کے گھروں اور ان کی جماعت کے گھروں میں محفوظ رہے اور اب تک بھی ایسے نسخے موجود ہیں جو ان کی جانب منسوب کیے جاتے ہیں۔

اس دعویٰ کے ثبوت کے لیے زید بن علی بن حسین اور یحییٰ بن زید کا واقعہ اور صحیفہ سجادیہ کی حفاظت کی کیفیت قابلِ ملاحظہ ہے۔

ابن ندیم اپنی کتاب "الفہرست" کے مقالہ دوم کے فنِ اول میں یہ عجیب و غریب واقعہ اس طرح نقل کرتا ہے:

"محمد بن اسحاق کا بیان ہے کہ مدینہ میں ایک آدمی تھا جس کا نام محمد بن حسین تھا وہ کتابوں کا اکٹھا کرنے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ :-)

نے مجھے کہا کہ یہود قابلِ اعتماد نہیں ہیں اور وہ مجھے سریانی لکھنا نہیں سکھلائیں گے لیکن میں نے صرف نصف ماہ میں زبان سیکھ لی۔ اور میں آنحضرتؐ کے لئے یہود کے ساتھ مراسلت کیا کرتا تھا اور آنحضرتؐ کو یہود کے مکتوب پڑھ کر سنا تا تھا۔ (فتوح البلدان صفحہ ۵۸۲ مطبوعہ مکتبہ النہضتہ۔ جامع ترمذی میں بھی اسی سے ملتا جلتا مضمون ہے)۔

والا ابن ابی بعرہ کے لقب سے مشہور تھا۔ اس کے پاس کتابوں کا بہت بڑا خزانہ تھا۔ عربی کتابوں کا اتنا بڑا ذخیرہ اور اتنی بڑی لائبریری میں نے کسی دوسرے شخص کے پاس نہ دیکھی تھی۔ اس لائبریری میں متعدد علوم مثلاً نحو، لغت اور ادب کی بیشمار کتابیں اور قدیم تحریریں تھیں لیکن جو عجیب و غریب اور سبق آموز اور نادر صنعت کی حامل بات تھی وہ یہ تھی کہ ہر جزو یا ہر ورق یا ہر کاغذ پر یکے بعد دیگرے متعدد علماء کے ہاتھوں کے لکھے ہوئے تصدیق نامے تھے۔ ایک عالم کے بعد دوسرے عالم کا یہ سرٹیفکیٹ ثبت تھا کہ یہ فلاں عالم کا خط ہے۔ اس طرح ایک دوسرے کے خط کے بارے میں پانچ یا چھ علما کی شہادتیں تھیں۔ ان تحریروں میں میں نے ایک مصحف دیکھا جو حضرت علیؓ کے رفیق کار خالد بن ابی ہیاج کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا اور ان کتابوں میں میں نے امام حسنؓ اور امام حسینؓ کی تحریریں بھی دیکھیں اور اس لائبریری میں میں نے امیر المومنین علیؓ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دیگر کاتبوں کے لکھے ہوئے امانت نامے اور معاہدے بھی دیکھے۔"

آثارِ مبارکہ اس طرح اور اس حد تک محفوظ رکھے جاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اگر آنحضرت نے کم از کم ایک سطر بھی لکھی ہوتی تو یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ محفوظ نہ رکھی جاتی جبکہ مسلمان آثارِ مبارکہ کی حفاظت کا اہتمام اس حد تک کیا کرتے تھے۔ قرائن اور قطعی دلائل کی رو سے دورِ رسالت میں آنحضرتؐ کی کتابت کے مسئلہ کا جواب نفی میں ہے۔ لیکن جہاں تک آنحضرتؐ کی قرأت کا مسئلہ ہے تو اس کا حتمی انکار ممکن نہیں ہے اگرچہ ہمارے پاس آں حضرتؐ کی قرأت کے بارے میں کوئی قطعی دلیل بھی نہیں ہے بلکہ اکثر قرائن اس کے خلاف ہیں۔

صلح حدیبیہ آنحضرتؐ کی حیاتِ مبارکہ میں ایسے واقعات پیش آئے جن سے یہ وضاحت ہوتی ہے کہ آنحضرتؐ مدینہ منورہ میں بھی لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ ان واقعات میں سے حدیبیہ کا مشہور واقعہ ہے جو تاریخی نتائج کے لحاظ سے اہمیت و شہرت کا حامل ہے اور باوجودیکہ تاریخ اور حدیث کی نقول اس بارہ میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن یہ واقعہ بڑی حد تک کتابت و قرأت کے مسئلہ کی وضاحت کرتا ہے۔

ذی القعدہ ۶ھ میں نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے حج و عمرہ ادا کرنے کے لئے مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ کا قصد کیا اور قربانی کے اونٹ ساتھ لے جانے کا حکم دیا جب آپ حدیبیہ پہنچے جو مکہ سے دو فرسنگ کے فاصلے پر واقع ہے تو قریش نے مسلمانوں کو مکہ میں داخل ہونے سے روک دیا۔ حالانکہ یہ مہینہ حرام مہینوں میں سے تھا اور جاہلی رواج کے مطابق کسی کو بھی بالخصوص قریش کو روکنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ وضاحت بھی کر دی تھی کہ آپؐ زیارتِ کعبہ اور ادائے مناسک کے بعد واپس چلے جائیں گے مگر قریش نے رکاوٹ پیدا کر دی اور مسلمانوں کے مکہ میں داخلے پر رضامند نہ ہوئے۔ مسلمانوں نے بھی دخولِ مکہ پر اصرار کیا خواہ قوت ہی کیوں نہ استعمال کرنی پڑے لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس طرزِ عمل پر راضی نہ ہوئے اور کعبہ کی حرمت کو پامال کرنا مناسب نہ سمجھا۔ چنانچہ معاملہ صلح پر ختم ہوا۔ صلحنامہ کا مسودہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے املا کرایا اور علیؓ نے تحریر کیا۔ آنحضرتؐ نے علیؓ کو فرمایا کہ "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" لکھا جائے قریش کے نمائندہ سہیل بن عمرو نے اعتراض کیا کہ یہ مسلمانوں کا

شعار ہے اور وہ یعنی مشرکین اس کلام سے ناآشنا ہیں اس لئے ان کے طریقہ کے مطابق "بسمک اللهم" لکھا جائے آنحضرتؐ نے اسے منظور کر لیا اور علیؓ کو حکم دیا کہ سہیل بن عمرو کی تجویز کے مطابق لکھا جائے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علیؓ کو یہ لکھنے کا حکم دیا:" یہ وہ معاہدہ ہے جسے محمد رسول اللہؐ اور سہیل بن عمرو نے تسلیم کیا"۔

سہیل نے کہا:" اگر میں آپؐ کو پیغمبر تسلیم کرتا تو آپؐ سے قتال نہ کرتا اس لئے آپ صرف اپنا نام اور اپنے باپ کا نام لکھوائیں"۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے علیؓ کو فرمایا کہ لکھو:" یہ وہ عہد نامہ ہے جس پر محمد بن عبداللہ اور سہیل بن عمرو کی مصالحت ہوئی ہے۔" اس موقعہ پر مخالفت اور اعتراضات پیش آئے اور اس ماجرا کے بارے میں تاریخی نقول باہم مختلف ہیں۔ سیرت ابن ہشام اور صحیح بخاری (اہل حرب کے ساتھ مصالحت اور جہاد کے باب) سے ظاہر ہے کہ قریش کا اعتراض کلمہ" رسول اللہ" لکھنے سے قبل تھا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کلمہ" محمد رسول اللہ" کی بجائے" محمدؐ بن عبداللہ" لکھے جانے پر رضامند ہو گئے لیکن اکثر نقول میں ہے کہ کلمہ" محمد رسول اللہ" کی کتابت کے بعد اعتراض پیدا ہوا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علیؓ کو فرمایا کہ کلمہ" رسول اللہ" مٹا دیا جائے۔ لیکن علیؓ نے اپنے ہاتھ سے یہ کلمہ مٹانے سے معذوری کا اظہار کیا۔ یہاں بھی نقول میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ شیعہ حضرات کی روایات اس بات پر متفق ہیں کہ جب علیؓ نے یہ کلمہ مٹانے سے انکار کر دیا تو آنحضرتؐ نے اپنے ہاتھ سے یہ کلمہ مٹا دیا۔ پھر علیؓ نے" محمد بن عبداللہ" تحریر کیا۔ اگرچہ اہل تشیع اور اہل السنت کی بعض روایات میں یہ تصریح ہے کہ آنحضرتؐ نے علیؓ کو فرمایا کہ مجھے وہ کلمہ دکھایا جائے اور اس جگہ پر انگلی رکھ دی جائے۔ علیؓ نے اس کلمہ کی نشاندہی کی اور آپؐ نے اپنے ہاتھ سے لفظ" رسول اللہ" مٹا دیا۔ علیؓ نے اس کی بجائے (ابن عبداللہ) لکھ دیا۔ کاتب علیؓ تھے نہ کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم۔ ان نصوص سے ظاہر ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ لکھنا پڑھنا مطلقاً نہیں جانتے تھے۔

ابوبکر عتیق نیشاپوری کی تفسیر القرآن پانچویں صدی میں فارسی زبان میں لکھی گئی تھی۔ اس سے کتاب" قصص القرآن" ماخوذ ہے جس میں یہ واقعہ نقل کیا گیا ہے۔ جب قریش کے مندوب سہیل بن عمرو نے کلمہ" رسول اللہ" کی کتابت پر اعتراض کیا تو اس مقام پر" قصص القرآن" کے بیان کا ترجمہ یہ ہے:

> "سہیل بن عمرو نے کہا کہ اس طرح لکھا جائے: یہ وہ معاہدہ ہے جو محمدؐ بن عبداللہ اور سہیل بن عمرو کے مابین طے پایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علیؓ کو حکم دیا کہ کلمہ" رسول اللہ" مٹا دیا جائے لیکن علیؓ کا دل اس کلمہ کو مٹانے پر آمادہ نہ ہوا۔ آنحضرتؐ نے دوبارہ فرمایا لیکن عالم محبت میں علیؓ سے تعمیل نہ ہو سکی۔ اس لئے آنحضرتؐ نے فرمایا کہ میری انگلی اس کلمے پر رکھ دو تا کہ میں اسے مٹا دوں کیونکہ آنحضرتؐ ناخواندہ تھے اور کتابت نہیں جانتے تھے۔ علیؓ نے آنحضرتؐ کی انگلی اس جگہ پر رکھ دی اور آنحضرتؐ نے یہ کلمہ مٹا دیا تا کہ سہیل کی تجویز کے مطابق لکھا جائے۔"

یعقوبی اپنی تاریخ میں لکھتا ہے:

" اور آنحضرتؐ نے علیؓ کو حکم دیا اور انہوں نے لکھا (باسمک اللہم من محمد بن عبداللہ) اور صحیح مسلم میں یہ تاکید ہے کہ جب علیؓ کلمہ (رسول اللہ) مٹانے پر آمادہ نہ ہوئے تو آنحضرتؐ نے علیؓ کو فرمایا کہ مجھے اس کلمہ کی جگہ تبلا دی جائے۔ انہوں نے نشاندہی کر دی تو آپؐ نے اسے مٹا دیا اور اس کی بجائے (ابن عبداللہ) لکھ دیا۔ اس روایت میں غور طلب یہ چیز ہے کہ ایک دفعہ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کلمہ کی جگہ معلوم کرنے کے لئے علیؓ سے امداد حاصل کی اور پھر یہ بھی مذکور ہے کہ آنحضرتؐ نے اس کو مٹا دیا اور (ابن عبداللہ) لکھ دیا جس سے بادی النظر میں ظاہر ہوتا ہے کہ لکھنے والے آنحضرتؐ تھے لیکن یہ امر مسلم ہے کہ حدیث نقل کرنے والے کا مقصود یہ نہ تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کلمہ کی جگہ معلوم کرنے کے لئے علیؓ سے امداد طلب کی اور اس کے بعد علیؓ نے لکھا اور یہی مضمون تاریخ طبری اور الکامل لابن الاثیر سے تقریباً صراحت کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے اور صحیح بخاری (باب شرائط) کی دیگر روایات میں ہے کہ دوسرا کلمہ آنحضرتؐ نے اپنے خط سے لکھا تھا۔ بخاری کے الفاظ یہ ہیں: "فاخذہ رسول اللہ وکتب "

طبری اور ابن الاثیر کی عبارتوں میں دوسرا جملہ یہ ہے:

"فاخذ رسول اللہ ولیس یحسن ان یکتب فکتب " — ترجمہ: رسول اللہؐ نے تحریر لے لی، آپؐ اچھی طرح کتابت نہیں کر سکتے تھے۔ پس آپ نے لکھا۔

اس سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ یہ کتابت استثنائی شکل میں تھی۔ اور اس سے دوسرے نظریہ کے قائلین کی تائید بھی ہوتی ہے کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم لکھنا چاہتے تو آپؐ لکھ سکتے تھے اور یہ اللہ تعالیٰ کی تعلیم سے تھا لیکن آپؐ نے کبھی نہیں لکھا۔ شعر کے معاملے میں بھی آپؐ کا یہی حال تھا آپؐ شعر خود نظم نہیں کر سکتے تھے اور کسی دوسرے کا شعر بھی پڑھ نہیں سکتے تھے۔ جب آپؐ کسی کا شعر پڑھنا چاہتے تو بہت کو غیر موزوں پڑھ جاتے تھے اور اس میں الفاظ کا الٹ پھیر ہو جاتا تھا یا الفاظ میں کچھ کمی بیشی کر دیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے شاعروں کی بہ نسبت آپؐ کو بہت بلند مقام عطا فرمایا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وما علمناہ الشعر وما ینبغی لہ ان ھو الا ذکر وقرآن مبین۔ (یٰسین - ۶۹)

ہم نے آپؐ کو شعر نہیں سکھایا ہے اور نہ شاعری آپؐ کو زیب دیتی ہے۔ یہ تو ایک نصیحت ہے اور صاف پڑھی جانے والی کتاب

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اس واقعہ کے بارے میں منقولہ روایات میں اختلاف پایا جاتا ہے اور بعض نے تاکید کی ہے کہ آنحضرتؐ نے کلمہ (ابن عبداللہ) اپنے ہاتھ سے لکھا جو آپ کی طرف سے بمنزلہ نشان تھا لیکن حقیقت نفس الامری یہ ہے کہ بظاہر اسے استثنائی عمل ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔

تمیم بن جراشہ ثقفی کے حالات کے ذیل میں "اسد الغابہ" میں ایک قصہ بیان ہوا ہے جس سے صراحت کے ساتھ اس امر کی وضاحت ہوتی ہے کہ آنحضرتؐ دورِ بعثت میں بھی لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے "اسد الغابہ" کا مضمون یہ ہے [1]

[1] اسد الغابہ۔ صفحہ ۲۱۶

"میں ثقیف کے وفد کے ہمراہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ہم نے اسلام قبول کیا اور آں حضرتؐ سے مطالبہ کیا کہ آپؐ ہمیں ایک تحریر لکھ دیں جس میں کچھ شرائط درج ہوں۔ آنحضرتؐ نے ہمیں فرمایا: "جو کچھ چاہتے ہو لکھ کر میرے پاس لے آؤ۔" ہمارا مطالبہ یہ تھا کہ آنحضرتؐ ہمیں ایسی تحریر لکھ دیں جس میں سود اور زنا ہمارے لئے حلال قرار دیا جائے۔ علیؓ نے ہمارے لیے ایسی تحریر لکھنے سے انکار کر دیا۔ ہم نے خالد بن سعید بن عاص سے فرمائش کی کہ وہ ہمیں تحریر لکھ دے۔ علیؓ نے اُسے کہا: "تم جانتے ہو کہ کیا لکھو گے؟" اس نے کہا: "جو کچھ یہ کہیں گے میں لکھوں گا کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم واجب الاطاعت ہے۔"

ہم یہ تحریر لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور پیش ہوئے۔ آپؐ نے فرمایا۔

یایھا الذین امنوا اتقوا اللہ و ذروا ما بقی من الربٰو ۰ (البقرہ ۲۷۸) — اے ایمان لانے والو خدا سے ڈرو اور جو کچھ تمہارا سود لوگوں پر باقی رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو

آپؐ نے اسے مٹا دیا ہمیں سکینت حاصل ہوگئی اور ہم نے اپنے مطالبے کو نہ دہرایا۔ جب زنا کا معاملہ پیش ہوا تو آپ نے تحریر پہ ہاتھ رکھ دیا اور فرمایا:

ولا تقربوا الزنا انہ کان فاحشۃ۔ — زنا کے قریب نہ پھٹکو۔ وہ بہت بُرا فعل ہے۔

(بنی اسرائیل - ۳۲)

آپؐ نے اسے بھی مٹا دیا اور فرمایا کہ اس دستاویز کو منسوخ کر دیا جائے۔

عجیب وغریب دعویٰ

ڈاکٹر سید عبداللطیف رئیس ادارہ تعلیمات ثقافتیہ بھارت و شرق ادنیٰ و رئیس اکادمی تعلیمات اسلامیہ حیدر آباد نے بھارت میں منعقدہ ایک اسلامی کانفرنس میں اس موضوع پر لیکچر دیا۔ اس کے اقتباسات چار سال قبل بعض ایرانی رسالوں میں شائع ہوئے اور بعد ازاں انگریزی زبان میں بھی اشاعت پذیر ہوئے۔ اس لیکچر میں ڈاکٹر صاحب مذکور نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عہد رسالت سے قبل لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔

ان اقتباسات کی اشاعت سے ایران میں تعلیم یافتہ حلقوں میں ہیجان برپا ہوا کثیر تعداد میں سوالات کئے گئے اور استفسارات کی بھرمار ہوئی۔ اس وقت میں نے اختصار کے ساتھ صورتِ حال کی وضاحت کی اور اب تفصیل کے ساتھ اس موضوع پر سیر حاصل لکھ رہا ہوں اور اس مسئلہ پر خصوصیت کے ساتھ بحث کر رہا ہوں" تاکہ ایک طرف حقیقت واضح ہو جائے اور دوسری طرف یہ مضمون ڈاکٹر سید عبداللطیف جیسے خال خال محققین کی طرف سے اٹھائے گئے بعید نقاط پر حاوی ہو۔

اس ضمن میں ڈاکٹر صاحب کے دعوے یہ ہیں کہ:۔

۱۔ آنحضرت کے بارے میں یہ قول کہ آپؐ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے مفسرین کی طرف سے لفظ "امی" کی غلط تفسیر کا نتیجہ ہے۔ یہ کلمہ سورہ اعراف کی درجِ ذیل آیات نمبر ۱۵۷، ۱۵۸ میں آیا ہے:۔

الذین یتبعون الرسول النبی الامی (۱۵۷)

ترجمہ: (پس آج یہ رحمت ان لوگوں کا حصہ ہے) جو اس پیغمبر نبی امی کی پیروی اختیار کریں۔

فامنوا باللہ و رسولہ النبی الامی (۱۵۸)

ترجمہ: پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے بھیجے ہوئے نبی امی پر۔

مفسرین نے اس لفظ "امی" کی تفسیر یہ کی ہے کہ جو لکھنا پڑھنا نہ جانتا ہو حالانکہ اس کا مفہوم یہ نہیں ہے۔

۲۔ قرآن میں ایسی دیگر آیات ہیں جن سے صراحت کے ساتھ یہ مفہوم حاصل ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرأت و کتابت کے ماہر تھے۔

۳۔ بعض معتبر احادیث اور تاریخی منقولات سے بالصراحت ثابت ہوتا ہے کہ آپؐ بہت اچھے قاری اور کاتب تھے۔

یہ ہے ان دعوؤں کا خلاصہ جن کی طرف ڈاکٹر صاحب موصوف نے اشارہ کیا ہے اور ہم اگلے صفحات میں ان پر نقد و نظر اور بحث و تمحیص کریں گے۔

پہلا دعویٰ کیا آنحضرتؐ کی ناخواندگی کے بارے میں اعتقاد لفظ امی کی تفسیر سے پیدا ہوا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر مذکور کا یہ تصور غلطی پر مبنی ہے اور اس کے دلائل یہ ہیں:۔

۱۔ ظہور اسلام کے وقت مکہ اور عرب کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ آپؐ نے لکھنا پڑھنا قطعاً نہیں سیکھا تھا۔ قبل ازیں ہم اس امر کی وضاحت کر چکے ہیں کہ حجاز کے علاقہ میں لکھنے پڑھنے کا رواج محدود پیمانے پر تھا اور صرف چند افراد لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ تاریخ نے ان کی ندرت و شہرت کی بنا پر ان کے ناموں کو محفوظ رکھا ہے۔ ان میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مذکور نہیں ہے۔ اگر قرآن کریم میں آنحضرتؐ کی ناخواندگی کے بارے میں خبر نہ ہوتی تو بھی مسلمان مذکورہ تاریخی شہادت کی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ناخواندگی کا عقیدہ رکھتے۔

۲۔ قرآن کریم میں ایک اور آیت بھی ہے جو سابقہ دو آیتوں سے جن میں لفظ "امی" آیا ہے صراحت کے اعتبار سے کم نہیں ہے۔ مفسرین کا لفظ "امی" کے مفہوم میں اختلاف ہو سکتا ہے لیکن مندرجہ ذیل آیت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لکھنا پڑھنا نہ سیکھنے پر قطعی طور پر دلالت کرتی ہے اور اس میں کسی کا کوئی اختلاف بھی نہیں ہے۔

وما کنت تتلوا من قبلہ من کتاب ولا تخطہ بیمینک اذا لارتاب المبطلون (العنکبوت - ۴۸)

ترجمہ: (اے نبیؐ) تم اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے اگر ایسا ہوتا تو باطل پرست لوگ شک میں پڑ سکتے تھے۔

یہ آیت اس بارے میں صریح ہے کہ رسول صلے اللہ علیہ وسلم عہد رسالتؐ سے قبل لکھتے پڑھتے نہیں تھے اور جمہور مفسرین نے اس کا یہی مفہوم لیا ہے۔

اس مقام پر ڈاکٹر صاحب مذکور کا بیان ہے کہ اس آیت کی تفسیر میں مفسرین کو اشتباہ ہوا کیونکہ کتاب سے مراد یہاں کتب

مقدسہ (مثلاً تورات اور انجیل) ہیں۔ ڈاکٹر مذکور کے نزدیک اس آیت کا مضمون یہ ہے کہ آپ کو کسی کتاب مقدس کے بارے میں معلوم نہیں تھا کیونکہ کتابِ مقدس عربی زبان میں نہیں تھی۔ اگر آپ ان کتابوں کو پڑھتے تو شک کرنے والوں کو شک اور اتہام کا موقع مل جاتا۔

لیکن یہ دعویٰ واقعہ کے خلاف ہے کیوں کہ عربی زبان میں ہر مکتوب کو کتاب کہتے ہیں خواہ وہ رسالہ ہو یا مقدس آسمانی یا غیر آسمانی کتاب ہو۔ قرآنِ کریم میں مختلف نوشتوں اور تحریروں کے لیے یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

کبھی اس لفظ کا استعمال دو شخصوں کے مابین خط و کتابت کے لئے ہوا ہے جیسا کہ ملکہ سبا کے قصے میں ہے:

یٰٓاَیُّھَا الْمَلَؤُا اِنِّیْٓ اُلْقِیَ اِلَیَّ کِتٰبٌ کَرِیْمٌ ... اِنَّہٗ مِنْ سُلَیْمٰنَ ..... (النمل ۲۹-۳۰)

ترجمہ: (اے اہل دربار۔ میری طرف ایک بڑا اہم خط پھینکا گیا ہے۔ وہ سلیمانؑ کی جانب سے ہے)

دوسرا مفہوم: کتاب کا لفظ معاملہ کرنے والے فریقین کے درمیان لکھے ہوئے وثیقہ یا دستاویز کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے مثلاً:

وَالَّذِیْنَ یَبْتَغُوْنَ الْکِتٰبَ مِمَّا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ فَکَاتِبُوْھُمْ (النور، ۳۳)

ترجمہ: (اور تمہارے مملوکوں میں سے جو مکاتبت کی درخواست کریں ان سے مکاتبت کر لو)

تیسرا مفہوم: لفظ کتاب غیبی الواح اور ملکوتی حقائق کے معنوں میں بھی مستعمل ہے جن سے اس دنیا کے حادثات مراد ہیں مثلاً:

وَلَا رَطْبٍ وَّلَا یَابِسٍ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ (الانعام، ۵۹)

ترجمہ: (خشک و تر سب کچھ ایک کھلی کتاب میں لکھا ہوا ہے)

جب "کتاب" کے ساتھ لفظ "اہل" کی اضافت ہو تو یہ ایک خاص قرآنی اصطلاح بن جاتی ہے جس سے مراد آسمانی کتابوں کے ماننے والے ہیں۔ سورہ نسا آیت ۱۵۳ قابلِ ملاحظہ ہے:

یَسْئَلُکَ اَھْلُ الْکِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَیْھِمْ کِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ

ترجمہ: (یہ اہل کتاب آج تم سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ تم آسمان سے کوئی تحریر ان پر نازل کراؤ)

اس آیت میں لفظِ کتاب دو مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ پہلے لفظ سے مراد آسمانی کتاب ہے کیونکہ اس کی طرف لفظ "اہل" کی اضافت ہے اور دوسرے لفظِ کتاب کا مفہوم عام تحریر ہے۔

سورۃ عنکبوت کی آیت ۴۸ میں (مَا کُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِہٖ مِنْ کِتٰبٍ) کے ساتھ جملہ (وَلَا تَخُطُّہٗ بِیَمِیْنِکَ) ملایا گیا ہے جس سے یہ قرینہ وجود میں آتا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ آپؐ لکھتے پڑھتے نہیں تھے اور اگر آپ نوشت و خواند کے ماہر ہوتے تو یہ آپ پر اتہام لگاتے کہ آپؐ کسی دوسری جگہ سے معلومات حاصل کرتے ہیں لیکن انھیں اس تہمت تراشی کا موقعہ نہ ملا کیونکہ آپ ناخواندہ تھے۔

اگر (الکتاب) سے مراد دوسری زبانوں میں لکھی ہوئی کتب مقدسہ ہوں تو آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ آپ دوسری زبانوں میں لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ اس مفہوم کا بطلان آپ سے آپ ہو جاتا ہے کیونکہ دوسری زبانوں میں لکھی ہوئی کتب مقدسہ کی قرأت ہی اس تہمت کو ثابت کرنے کے لئے کافی تھی اور یہ کافی تھا کہ آنحضرتؐ دوسری زبانوں میں قرأت پر قادر ہوتے اور ان کے مضامین کو نئے اسلوب

سے عربی زبان میں لکھنے کی قدرت رکھتے۔

اس آیت کے بین السطور میں ایک ایسا نکتہ ہے جو ممکن ہے کہ ڈاکٹر مذکور کی تفسیر کی تائید کرے اگرچہ اس کی طرف ڈاکٹر مذکور اور دیگر مفسرین نے توجہ مبذول نہیں کی۔ یہ نکتہ لفظ "تتلوا" کا وجود ہے جو مادہ "تلاوت" سے ماخوذ ہے۔ امام راغب اصفہانی کا قول ہے کہ تلاوت آیاتِ مقدسہ کی قرأت سے مختص ہے جبکہ لفظ (اقرأ) عام قرأت کے لئے مستعمل ہے اس بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ لفظ "تتلوا" کے قرینہ سے یہاں الکتاب سے مراد کتاب مقدس ہے

مگر ظاہر ہے کہ کلمہ "تتلوا" اس لئے استعمال کیا گیا ہے کہ یہاں موردِ بحث قرآن ہے اور "تتلوا" مشاکلت و موافقت کے طور پر استعمال ہوا ہے ایسا کرنا علم البدیع کی ایک معروف صناعت ہے چنانچہ تم یہ کہہ سکتے ہو کہ (انت تتلوا القراٰن فعلاً و لم تکن تتلوا قبلہ اسی کتابۃ اخریٰ) یعنی تو اس وقت قرآن تلاوت کرتا ہے اور اس سے قبل کوئی دیگر تحریر تلاوت نہ کرتا تھا۔

دوسری آیت | سورہ شوریٰ کی آیت (۵۲) بھی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عدم تعلّم پر دلالت کرتی ہے۔ آیت یہ ہے:۔

وکذالک اوحینا الیک روحاً من امرنا	اور اسی طرح ہم نے اپنے حکم سے ایک روح تمہاری طرف
ماکنت تدری ما الکتاب	وحی کی ہے تمہیں کچھ پتہ نہ تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور
ولا الایمان۔	ایمان کیا ہوتا ہے۔

یہ آیت اس بارہ میں موکدہ ہے کہ آنحضرتؐ نزولِ وحی سے قبل کتابت نہیں جانتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب مذکور نے اس آیت کا ذکر نہیں کیا اگر وہ اس کی طرف التفات کرتے تو شاید اس سے کتاب مقدس مراد لیتے جو غیر عربی زبان میں لکھی ہوئی ہو لیکن ہم اسے حسبِ سابق جواب دیتے۔

مفسرین نے ذکر کیا ہے یہاں الکتاب سے مقصود قرآن ہے اس تفسیر کی وجہ ہمیں معلوم نہیں ہے اور اس تفسیر کے مطابق یہ آیت موردِ استدلال سے خارج ہے

۳۔ لفظ "امّی" کی تفسیر میں مسلمان مفسرین کا نقطہ نظر ایک جیسا نہیں ہے اس کے علی الرغم ان کا اس بارے میں اتفاق ہے کہ آنحضرتؐ عہدِ رسالت سے قبل قرأت و کتابت کی مہارت نہیں رکھتے تھے بلکہ علمأ اسلام کا اس بات پر اجماع ہے اور یہ بذاتِ خود اس امر کی قطعی دلیل ہے کہ کتابت و قرأت کی عدم مہارت کے متعلق مسلمانوں کا اعتقاد لفظ "امّی" کی تفسیر پر مبنی نہیں ہے۔ بہر حال لفظ "امّی" کا مفہوم غور طلب ہے۔

لفظ "امّی" کا مفہوم | لفظ امّی کے بارے میں مسلمان مفسرین کی تین تفسیریں ہیں:۔

پہلی تفسیر: ناخواندہ اور خط و کتابت کو نہ جاننے والا۔

مفسرین کی اکثریت اس رائے کی تائید کرتی ہے اور اقلیت کے مقابلے میں اسے قابلِ ترجیح سمجھتی ہے۔ تائید کرنے والوں

کا بیان ہے کہ یہ لفظ (الام) سے منسوب ہے اور "امی" وہ شخص ہے جو کتابت اور انسانی معلومات کی اطلاع کے نقطہ نظر سے اپنی پیدائشی اور مادر زاد حالت پر قائم ہو۔ ان مفسرین کا ایک موقف یہ بھی ہے کہ یہ لفظ (الامت) کی طرف منسوب ہے اور "امی" وہ شخص ہے جو اکثر لوگوں کے طریقے پر ہو۔ ظاہر ہے کہ لوگوں کی اکثریت کتابت و قرأت کو نہیں جانتی اور لکھنا پڑھنا جاننے والوں کی تعداد قلیل ہی ہوتی ہے۔ اسی طرح "عامی" اس شخص کو کہتے ہیں جو عامۃ الناس کی روش پر ہو۔[1]

بعض کا قول ہے کہ 'امت' کا ایک معنی 'فطرت' بھی ہے اور "امی" وہ شخص ہے جو اپنی پیدائشی حالت اور عدم معرفت و اطلاع کی ابتدائی کیفیت پر ہو۔ اعشیٰ کا ایک شعر اس معنی کی وضاحت کرتا ہے اور ان مفسرین نے اسی سے استناد کیا ہے۔

لفظ "امی" (ام) سے مشتق ہو یا (امت) سے اور (امت) کا مفہوم کچھ بھی ہو بہر حال لفظ "امی" کا معنی غیر کاتب اور غیر قاری ہے۔

دوسری تفسیر: "امی" اسے کہتے ہیں جو ام القریٰ کے رہنے والوں میں سے ہو۔ اس تفسیر کی تائید کرنے والے لفظ "امی" کو (ام القریٰ) یعنی مکہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ سورۂ انعام آیت ۹۲ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "ولتنذر ام القریٰ ومن حولها" (ترجمہ: تاکہ اس کے ذریعے سے تم بستیوں کے اس مرکز یعنی مکہ اور اس کے اطراف میں رہنے والوں کو متنبہ کر دو)۔ قدیم کتابوں میں اس احتمال کا ذکر موجود ہے اور شیعہ حضرات کی بعض احادیث اس کی تائید کرتی ہیں اگرچہ وہ معتبر نہیں ہیں۔ جیسا کہ یہ کہا گیا ہے کہ اس کلمہ کی اصل اسرائیلی ہے۔

اس احتمال پر درج ذیل دلائل وارد کئے گئے ہیں:

ا۔ لفظ (ام القریٰ) مکہ کے لئے عَلَم خاص نہیں ہے۔ مکہ چونکہ ارد گرد کی بستیوں کا مرکز ہے اس لئے اسے بھی ام القریٰ کہتے ہیں اور "ام القریٰ" کا مفہوم "مرکز القریٰ" ہے۔ جس مقام کو بھی مختلف اطراف و نواح میں مرکزی حیثیت حاصل ہو اُسے ام القریٰ کہتے ہیں۔ قرآن کریم میں دوسری جگہ اس لفظ کے استعمال سے مفہوم ہوتا ہے کہ یہ مجرد وصفی عنوان ہے نہ کہ عَلَم۔ سورہ قصص آیت (۵۹) میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "وما کان ربک مھلک القریٰ حتی یبعث فی امھا رسولا" (ترجمہ: اور تیرا رب بستیوں کو ہلاک کرنے والا نہ تھا جب تک کہ ان کے مرکز میں ایک رسول نہ بھیج دیتا)۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی زبان میں ہر مرکز و مجمع کو (ام القریٰ) کہا جاتا ہے اس لئے وصفی عنوان کی طرف منسوب کرنا ایک مہمل بات ہے۔

(ب) قرآن کریم میں یہ کلمہ ایسے لوگوں کے لئے استعمال کیا گیا ہے جو مکی نہیں تھے جیسا کہ سورہ آل عمران (آیت ۲۰) میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ "وقل للذین اوتوا الکتاب والامیین ءاسلمتم" (ترجمہ: پھر اہل کتاب اور غیر اہل کتاب دونوں سے پوچھا "کیا تم نے بھی اس کی اطاعت و بندگی قبول کی؟") اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کے مطابق عصرِ قرآن میں کتب سماوی کے تابعین کے علاوہ عام عربوں کے لیے اس کلمہ کا اطلاق ہوتا تھا۔

---

[1] المفردات۔ لفظ (ام) اور مجمع البیان۔ سورہ بقرہ آیت ۷۸۔ مؤلف)

سابقہ بحث کے علاوہ یہ کلمہ عام یہودیوں کے لیے بھی مستعمل تھا جو ناخواندہ تھے باوجودیکہ وہ اہل کتاب میں شمار ہوتے تھے۔ سورہ بقرہ آیت ۷۸ میں ہے:۔

" ومنھم امیون لا یعلمون الکتاب الا امانی

ترجمہ: ان میں سے ایک دوسرا گروہ امیوں کا ہے جو کتاب کا تو علم رکھتے نہیں، بس اپنی بے بنیاد امیدوں اور آرزوؤں کو لیے بیٹھے ہیں)۔

ظاہر ہے کہ وہ یہود جنھیں قرآن نے (الامیین) کا نام دیا ہے وہ اہل مکہ میں سے نہ تھے بلکہ ان کی کثیر تعداد مدینہ اور اس کے نواح میں سکونت پذیر تھی۔

ج۔ ادبی قواعد کا اقتضا یہ ہے کہ اگر (ام القریٰ) کی طرف نسبت مقصود ہو تو علم صرف کے قاعدہ نسبت کی رو سے (قروی) کہنا چاہیے نہ کہ (امی) یہ مسلمہ اصول ہے کہ جب مرکب اضافی کی طرف نسبت ہو اور بالخصوص جبکہ مضاف (اب) یا (ام) یا (بنت) ہو تو یہ نسبت مضاف الیہ کی طرف ہوتی ہے نہ کہ مضاف کی طرف۔ ابی طالب کی طرف نسبت ہو تو ہم طالبی کہتے ہیں اور ابو حنیفہ اور بنی تمیم کی طرف نسبت ہو تو علی الترتیب حنفی اور تمیمی کہا جاتا ہے۔

تیسری تفسیر: امیوں سے مراد وہ عرب مشرکین ہیں جو کسی آسمانی کتاب کا اتباع نہیں کرتے تھے۔ مفسرین کے نزدیک یہ نظریہ قدیم ہے جیسا کہ مجمع البیان میں سورہ آل عمران کی آیت (۲۰) کے ذیل میں بیان ہوا ہے۔ یہ آیت (وقل للذین اوتوا الکتاب والامیین) بتاتی ہے کہ "امیین" اہلِ کتاب کے علاوہ ہیں۔ یہ رائے عظیم مفسر صحابی عبداللہ بن عباسؓ کی طرف منسوب کی گئی ہے۔ یہی رائے سورہ بقرہ کی آیت (۷۸) کے ذیل میں ابو عبیدہ کی طرف منسوب ہے۔ صاحب مجمع البیان (طبرسی مرحوم) نے اس رائے کو سورہ آل عمران کی آیت (۷۵) کے ذیل میں اختیار کیا ہے۔ زمخشری نے اپنی کشاف میں یہی رائے اس آیت اور سورہ آل عمران کی آیت (۷۵) کی تفسیر میں بیان کی ہے۔ رازی نے بھی اپنی تفسیر کبیر میں سورہ بقرہ کی آیت (۷۸) اور آل عمران کی آیت (۲۰) کے ذیل میں اسی احتمال کو نقل کیا ہے۔

فی الحقیقت یہ معنی تیسرا مستقل معنی نہیں ہے کیونکہ وہ تمام لوگ جو کسی سماوی کتاب کا اتباع نہیں کرتے انھیں امیین کا نام نہیں دیا جاتا۔ مشرکینِ عرب کی جہالت کی وجہ سے اس کا اطلاق صرف ان پر ہوتا ہے اور مشرکین عرب کے لیے اس لفظ کا استعمال اس وجہ سے نہیں ہے کہ وہ کتبِ سماویہ میں سے کسی کتاب کے متبع نہیں تھے بلکہ اس لفظ کے استعمال کا مدار علیہ ان کا ناخواندہ ہونا ہے۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ جب یہ کلمہ بصیغہ جمع آئے اور اس کا اطلاق مشرکین عرب پر ہو تو اس صورت میں کتب سماویہ میں سے کسی کتاب کا متبع نہ ہونے کا احتمال موجود ہے لیکن جب یہ کلمہ مفرد شکل میں استعمال ہو اور اس کا اطلاق نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ہو تو ایسی صورت میں کسی مفسر کے نزدیک بھی کتبِ سماویہ میں سے کسی کتاب کے عدمِ اتباع کا احتمال مقصود نہیں ہے۔ بلکہ اس آخری صورت میں مفسرین کو مندرجہ ذیل صرف دو احتمالات کے مابین تردد لاحق ہوتا ہے۔

اول - یہ کہ آپؐ خط و کتابت نہیں جانتے تھے

دوم - یہ کہ آپؐ اہل مکہ میں سے تھے۔

چونکہ دوسرا احتمال لفظ اُمّی کا صحیح مفہوم نہیں ہے اس لئے آنحضرتؐ کے لیے لفظِ اُمّی کا استعمال صرف اس وجہ سے ہے کہ آپؐ نے کسی سے علم حاصل نہیں کیا اور آپؐ خط و کتابت نہیں جانتے تھے۔

اس کلمہ کے مفہوم میں ایک چوتھا احتمال بھی موجود ہے وہ یہ کہ لفظ "امی" کتاب مقدس کے متون کی عدم اطلاع کے اظہار کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ یہ احتمال ڈاکٹر سید عبد اللطیف نے اپنی طرف سے اختراع کیا ہے۔ اور اس طرح اس نے اپنے اس مفہوم اور ہمارے بیان کردہ تیسرے مفہوم کو آپس میں گڈمڈ کر دیا ہے۔ ہم نے بیان کیا تھا کہ تیسرا مفہوم قدیم مفسرین کے ہاں معروف تھا لیکن ڈاکٹر مذکور کا بیان ہے کہ

"(اُمی) اور (امیون) کے الفاظ مختلف مقامات پر قرآن میں استعمال ہوئے ہیں لیکن ہر جگہ ان کی تفسیر ایک ہی بیان کی گئی ہے۔ لغت میں کلمہ (امی) کا اصلی معنی الطفل الولید (مولود بچہ) ہے اور زندگی کی اس حالت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہر ایسے شخص کو جو لکھنا پڑھنا نہ جانتا ہو ضمنی طور (امی) کہتے ہیں۔

"کلمہ (امی) اس شخص کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جو ام القریٰ یعنی ام المدن یا مرکزی بڑے شہر کا رہنے والا ہو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ریگستانی علاقہ کے عرب بدو مکہ کو اس صفت کا مصداق سمجھتے تھے اس لئے مکہ کے رہنے والے کو (امی) کہا جاتا تھا۔

"کلمہ (امی) کا استعمال اس شخص کے لیے بھی ہوتا ہے جو قدیم سماوی کتابوں کے متون سے ناواقف ہو اور یہودیت اور مسیحیت کا پیرو کار نہ ہو یہود اور عیسائیوں کو قرآن میں (اہل الکتاب) کا نام دیا گیا ہے۔ قرآن میں اسلام سے قبل کے عربوں کے لئے کلمہ (الامیین) اس اعتبار سے استعمال کیا گیا ہے کہ وہ کتاب مقدس نہیں جانتے تھے اور تورات و انجیل کا اتباع کرنے والوں کے زمرے میں نہیں تھے بلکہ اہل کتاب کے مقابلے میں تھے۔

"جب کلمہ (امی) کے مختلف معانی ہیں تو ہمیں معلوم نہیں کہ مفسرین و مترجمین قرآن - مسلمانوں اور غیر مسلموں — نے صرف ابتدائی معنی الطفل الولید (یعنی مولود بچہ جو کچھ نہ جانتا ہو) کو کیوں اختیار کیا اور اسکی یہ تعبیر کی کہ (امی) وہ شخص ہے جو قرأت و کتابت سے نابلد ہو اور اس کے نتیجے میں قبل اسلام کے اہل مکہ کو (الامیین) یا جاہل گروہ کے لقب سے کیوں ملقب کیا؟

کلام ہذا پر ناقدانہ نظر

۱- ہم نے دیکھا ہے کہ قدیم مفسرین نے لفظ (امی) اور (امیون) کی تین تفسیریں بیان کی ہیں یا تین احتمالات کا ذکر کیا ہے اور صرف ایک معنی اختیار نہیں کیا۔ یہ چیز ڈاکٹر موصوف کے دعویٰ کے خلاف ہے۔

۲- کسی ایک مفسر نے بھی یہ بیان نہیں کیا کہ لفظ (امی) کا معنی الطفل الولید (مولود بچہ) ہے جو کچھ نہ جانتا ہو اور اس طرح اس سے یہ ضمنی معنی مراد لیا جائے کہ (امی) وہ ہے جسے لکھنے پڑھنے کی استطاعت نہ ہو۔

واقعہ یہ ہے کہ اس لفظ کی بنیاد (الولید) پر نہیں بلکہ ان (کبار) عمر رسیدہ لوگوں پر ہے جو اپنی پیدائشی حالت پر قائم ہوں اور کسی

شخص پر لفظ (امی) کا اطلاق علمائے منطق کی اصطلاح میں عدم اور ملکہ کے باب سے ہے۔ (امی) صرف اس شخص کو کہتے ہیں جو سیکھنے کا ملکہ رکھتا ہو لیکن عدمِ تعلم کی راہ اختیار کرے۔ منطق کی کتابوں میں "ملکہ" و "عدم ملکہ" کی مثالوں کے بارے میں مسلمان علماء کی بحث و تمحیص موجود ہے۔

۳۔ ڈاکٹر موصوف کا یہ بیان (کہ کلمہ 'امی' کا استعمال اس شخص کے لئے بھی ہوتا ہے جو قدیم سماوی کتابوں کے متن سے ناواقف ہو) صحیح نہیں ہے۔ مفسرین اور علمائے لغت کے اقوال کا ماحصل یہ ہے کہ جمع کی صورت میں اس لفظ سے مراد اہلِ کتاب کے مقابلے میں مشرکین عرب ہیں کیوں کہ ان کی غالب اکثریت قرأت و کتابت سے ناواقف تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک حقارت آمیز لقب تھا جو یہود و نصاریٰ کی طرف سے انھیں عطا ہوا تھا۔

ہمارے لئے یہ سمجھنا ممکن نہیں ہے کہ وہ لوگ جنھیں (الامیین) کا نام دیا گیا ہے وہ صرف اس وجہ سے ہے کہ وہ کسی خاص کتاب کی لغت سے ناواقف تھے باوجودیکہ وہ اپنی خاص زبان لکھتے اور پڑھتے تھے۔

بہرحال اس تفسیر کی بنیاد یہ ہے کہ اس کلمہ کا ماخذ اور مصدر لفظ (ام) یا (امت) ہے اور ان دونوں لفظوں سے ابتدائی پیدائشی حالت پر قائم رہنے کا مفہوم نکلتا ہے۔

مفسرین نے اگرچہ اس کلمہ کو (ام القریٰ) کی طرف منسوب کرنے کے احتمال کا ذکر کیا ہے لیکن اس پر وہ اشکالات وارد ہوتے ہیں جو ہم بیان کر آئے ہیں اس لئے اسے (ام القریٰ) کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا۔

اس بحث کے بعد ہندی عالم کے لیے مجالِ تعجب نہیں ہے

روایات اور مورخین کی کتابوں میں اس لفظ کے استعمالات اس معنی کی تائید کرتے ہیں بلکہ جہاں بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے وہ اسی معنی یعنی ناخواندہ کے لئے استعمال ہوا ہے۔

بحار الانوار (جلد ۶ صفحہ ۱۱۹) میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک روایت منقول ہے آپؐ نے فرمایا: "نحن امة امية لا نقرأ ولا نكتب" (ترجمہ: ہم ایک ناخواندہ قوم ہیں اور لکھنے پڑھنے سے کورے ہیں)

ابن خلکان اپنی تاریخ کی جلد ۴ میں معتصم اور متوکل کے وزیر محمد بن عبدالملک المعروف بابن زیات کے حالات میں لکھتا ہے:

"وہ ابتداءً ان کاتبوں میں سے تھا اور احمد بن عمار بن شاذی بصری معتصم کا وزیر تھا معتصم کے پاس کسی گورنر کا خط آیا۔ وزیر نے وہ خط معتصم کو پڑھ کر سنایا! اس تحریر میں (الكلا) کا ذکر تھا۔ معتصم نے وزیر سے پوچھا کہ (الكلا) کیا ہوتا ہے۔ وزیر کو علم ادب میں اتنی دسترس حاصل نہ تھی اور اس نے اس بارے میں لاعلمی کا اظہار کیا۔

معتصم نے کہا، امی خلیفہ اور عامی وزیر' (خلیفہ معتصم زیادہ پڑھا لکھا نہ تھا) پھر اس نے کہا کہ وہ دیکھو دروازے پر کون ہے۔ وہ محمد بن زیات مذکور تھا۔ اسے خلیفہ کے حضور میں پیش کیا گیا۔ خلیفہ نے اس سے (الكلا) کے بارے میں استفسار کیا۔

اس نے کہا: (الكلا) مطلق گھاس کو کہتے ہیں۔ اگر وہ ہری ہو تو اسے خلا (ترگھاس) کہا جائے گا۔ اور جب سوکھ

جائے تو وہ حشیش بن جاتی ہے۔ اس طرح اس نے انواع و اقسام کی نباتات کا ذکر کیا... معتصم کو معلوم ہوا کہ ابن وحشیہ صاحبِ علم و فضل ہے۔ اس لیے اس نے اسے اپنا وزیر بنا کر حکومت کے کاروبار میں شریک کر لیا اور اس کا ہاتھ کشادہ کر دیا۔"

دوسرا دعویٰ

ڈاکٹر مذکور کا دعویٰ ہے کہ آیاتِ قرآنی سے صراحت کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم لکھتے اور پڑھتے تھے اور ایسی آیات میں سے سورہ آلِ عمران کی آیت (۱۶۴) میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

لقد من اللہ علی المومنین اذ بعث فیھم رسولاً منھم یتلوا علیھم آیاتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتٰب والحکمۃ و ان کانوا من قبل لفی ضلالٍ مبین ہ

درحقیقت اہلِ ایمان پر تو اللہ نے بڑا احسان کیا ہے کہ ان کے درمیان خود انہی میں سے ایک ایسا پیغمبر اٹھایا جو اس کی آیات انھیں سناتا ہے۔ ان کی زندگیوں کو سنوارتا ہے اور ان کو کتاب اور دانائی کی تعلیم دیتا ہے، حالانکہ اس سے پہلے یہی لوگ صریح گمراہیوں میں پڑے ہوئے تھے۔

اس آیت کے پیشِ نظر ڈاکٹر مذکور کہتے ہیں کہ قرآن نے جس بات کی صراحت کی ہے اس کی رو سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اولین فریضہ یہ ہے کہ وہ اپنے ماننے والوں کو قرآن کی تعلیم دے اور یہ امر مسلم ہے کہ جس شخص سے کتاب یا اس کے مضامین و مطالب کی تعلیم دینا مطلوب ہو اس کے لئے کم از کم شرط یہ ہے کہ وہ قلم کے استعمال یا بدرجہ آخر قلم سے لکھی ہوئی تحریر کی قرأت کی استطاعت رکھتا ہو۔

یہ استدلال بوجوہِ ذیل تعجب انگیز ہے:

۱۔ مسلمانوں کے ہاں جو چیز متفق علیہ ہے اور جس کی نفی ڈاکٹر مذکور کرنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بعثت سے قبل کبھی لکھنے پڑھنے نہیں تھے۔ اس مذکورہ استدلال سے بعید ترین جو نتیجہ متصور ہے وہ یہ ہے کہ آنحضرتؐ دورِ رسالت میں اچھی طرح لکھنا پڑھنا جانتے تھے جیسا کہ سید مرتضیٰ اور شعبی اور ایک دیگر جماعت کا عقیدہ ہے لیکن اس سے ڈاکٹر مذکور کا دعویٰ ثابت نہیں ہوتا۔

۲۔ یہ استدلال اس وقت تک پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچتا جب تک کہ اسے دورِ رسالتؐ سے منسوب نہ کیا جائے۔ اس معاملے کی وضاحت اس طرح بھی جا سکتی ہے کہ تعلیمات کی دو قسمیں ہیں۔ پہلی قسم کتابت، قرأت اور ریاضیات وغیرہ کی تعلیم ہے جس کے لئے معلم کو قلم و قرطاس اور تختہ سیاہ وغیرہ وسائلِ توضیح کی ضرورت لاحق ہوتی ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ معلم بذاتِ خود دھڑا ہو کر وہ عملی مشق بھی سرانجام دے تاکہ مطلوبہ تعلیم متحقق ہو جائے۔ تعلیم کی دوسری قسم حکمت و فلسفہ، اخلاق اور حلال و حرام کے قبیل سے ہے۔ یہ انبیاء علیہم السلام کا کام ہے۔ اس کے لئے قلم و قرطاس، نقشہ جات اور تختہ سیاہ کی مطلقاً حاجت نہیں ہے۔ ہمارے پیشِ نظر حکمائے مشائین کی مثال موجود ہے۔ ان کا نام مشائین صرف اس وجہ سے ہے کہ وہ اپنے تلامذہ کو چلتے چلتے دلائل اور علامتوں کے ذریعے سے

تعلیم دیتے تھے۔ ہاں تو کبھی کبھار تلامذہ کے لئے لازم ہو جاتا ہے کہ وہ فنِ کتابت سیکھیں اور اپنے اسباق کو مدون کرلیں تاکہ وہ نسیان کی دست برد سے محفوظ ہو جائیں۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہؓ کو علم کی حفاظت و تقیید کا حکم دیتے تھے اور فرماتے تھے (قیدوا العلم) یعنی علم کو مقید و محفوظ کر لو اور جب صحابہؓ آنحضرتؐ سے تقیید و حفاظتِ علم کا طریقہ دریافت کرتے تو آپؐ انہیں کتابت کا حکم فرماتے[1]

اور آنحضرتؐ فرماتے تھے "اللہ تعالیٰ اس بندے کو خوش و خرم رکھے جس نے میری بات کو سنا۔ اسے محفوظ کر لیا اور نہ سننے والوں تک اسے پہنچایا"[2] اور جب مسلمان آنحضرتؐ سے آپؐ کے خلفاء کے بارے میں پوچھتے تھے تو آپؐ انھیں جواب دیتے تھے کہ میرے خلفاء وہ ہیں جو میرے بعد میرے طریقے پر عمل کریں گے اور دوسروں کو بھی اس طریقہ کی تعلیم دیں گے[3] اور آنحضرتؐ یہ بھی فرماتے تھے کہ والد کے ذمہ اولاد کا یہ حق ہے کہ وہ ان کے اچھے نام تجویز کرے۔ انھیں کتابت سکھائے اور جب وہ بالغ ہو جائیں تو ان کا نکاح کرائے۔

قرآنِ کریم پوری صراحت کے ساتھ بیان کرتا ہے:

یاایھا الذین امنوا اذا تداینتم بدین الی اجل مسمیً فاکتبوہ ولیکتب بینکم کاتبٌ بالعدل"	اے ایمان والو! جب کسی مقررہ مدت کے لئے تم آپس میں قرض کا لین دین کرو، تو اسے لکھ لیا کرو فریقین کے درمیان انصاف کے ساتھ ایک شخص دستاویز تحریر کرے۔
(البقرہ ۲۸۲)	

اس طرح ہم سب مسلمانوں کو مکلف کر دیا گیا کہ ہم قرآن اور اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی تعمیل میں کتابت و قرأت کا علم ایک مبارک فن کی حیثیت سے حاصل کریں۔ اپنے دینی آثار کی حفاظت کریں، اپنی اولادوں کے حقوق ادا کریں۔ اور ان کے معاشی امور کو منظم شکل دیں۔ پس اس طرح تاریخ میں حرف و قلم کی ترقی کی ایک تحریک برپا ہوئی یہ تحریک ان لوگوں کے ہاتھوں پروان چڑھی جن میں سے پڑھنے والے انگلیوں پر گنے جاتے تھے۔ وہ علوم کی تحصیل کا پورا اہتمام کرتے تھے اور قرأت و کتابت کی نشر و اشاعت کرتے تھے یہاں تک کہ ان میں بعض نے کئی زبانیں سیکھیں تاکہ ان کے ذریعے اسلام کا آوازہ بلند کیا جاسکے اور پیغامِ اسلام اطرافِ عالم میں پہنچایا جاسکے۔

تاریخی کتابیں ہمیں بتاتی ہیں کہ جنگِ بدر کے بعض قیدی جو فدیہ ادا کرنے کی استطاعت سے محروم تھے انھیں یونہی رہا کر دیا گیا اور جو ان میں سے لکھنا جانتے تھے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے یہ معاہدہ کیا کہ وہ مدینہ کے دس دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں تو اس کے بعد وہ آزاد ہیں۔

ہاں تو نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں میں اس فن کو اس حد تک رواج دیا اور انھیں علم و معرفت کی تحصیل کا اس قدر گرویدہ

---

[1] البحار - جلد ۲ - ص ۱۵۱ -   [2] الکافی جلد ۱ ص ۴۰۳ -

[3] البحار - جلد ۲ - ص ۱۴۴ -

بنا دیا۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی تعلیم و تبلیغ کے سلسلے میں ذاتی سطح پر قرأت و کتابت کی محتاج ہو۔

سید عبد اللطیف کا بیان ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے قرآن کی پہلی نازل کردہ سورت میں قلم اور کتاب کا ذکر کیا ہے کیا یہ اس امر کی صریح اور واضح دلیل نہیں ہے کہ آنحضرتؐ قرأت و کتابت جانتے تھے ..... اور کیا یہ ممکن ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم دوسرے لوگوں کو تو علم اور قرأت و کتابت کا شوق و رغبت دلاتے ہوں اور بذاتِ خود قرأت و کتابت سے بے اعتنائی برتتے ہوں حالانکہ آنحضرتؐ ہر میدان میں پیش پیش تھے۔

یہ استدلال بھی عجیب ہے۔

منطقی نتیجہ کے طور پر۔ ڈاکٹر مذکور نے ان آیات کی یہ تعبیر کی ہے کہ اللہ تعالیٰ جو ان آیات کو اپنے ایک خاص بندے پر بندوں کی ہدایت کے لیے نازل کرنے والا ہے وہ جانتا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم جن کے قلبِ مقدس پر یہ آیات نازل کی گئی تھیں وہ بھی جانتے تھے کہ انسانی زندگی کے مختلف مراحل میں لکھنے پڑھنے کی اہمیت و قدر و قیمت کیا ہے۔ لیکن یہ اس امر کی دلیل نہیں بن سکتی کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم بذاتِ خود بھی قرأت و کتابت کرتے تھے اور قلم و قرطاس سے کام لیتے تھے۔

جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم لوگوں کو ایک چیز کا حکم کیوں دیتے تھے جبکہ خود اپنے مامور کے مطابق عمل نہیں کرتے تھے تو یہ ایسا ہی سوال ہے جس طرح یہ کہا جائے کہ طبیب اپنے مریض کے لیے جو نسخہ تجویز کرتا ہے اسے خود اپنے لیے استعمال کیوں نہیں کرتا۔ ہاں جب طبیب بذاتِ خود بیمار ہو جائے تو اگر ضرورت لاحق ہو تو وہ اس نسخے کے مطابق عمل کرے گا بلکہ اولیٰ یہ ہے کہ بیمار طبیب کسی دوسرے سے علاج کروائے۔ لیکن کیا یہ لازم ہے کہ جو کچھ وہ اپنے مریضوں کے لئے تجویز کرتا ہے اپنے لئے بھی وہ اسی پر عمل کرے جبکہ وہ ان جیسا مریض نہ ہو؟!

یہ چیز قابلِ ملاحظہ ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا انتہائی احساس تھا کہ دوسرے لوگوں کو کتابت و قرأت کی بہت زیادہ احتیاج لاحق ہے اور اس فن کی معرفت انکے لئے حصولِ کمال کا پیش خیمہ اور اس کا فقدان ان کے حق میں باعثِ نقصان ہے۔

بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عبادت، قربانی، تقویٰ، صداقت، نیکی، حسنِ اخلاق، مشاورت، تواضع اور جملہ اخلاق و آدابِ حسنہ میں پیش پیش تھے کیونکہ ان سب محاسن کا حصول آپؐ کے لیے باعثِ کمال اور ان کا فقدان آپؐ کے لیے نقصان شمار ہوتا ہے۔ لیکن کتابت و قرأت کا موضوع اس قبیل سے نہیں ہے۔

انسانیت کے لیے قرأت و کتابت کی بنیادی قدر و قیمت ان خدمات میں پوشیدہ ہے جو یہ فنون سرانجام دیتے ہیں۔ یہ دونوں فن انسان کو دوسروں کی زندگی میں پیش آمدہ حالات کی واقفیت بہم پہنچاتے ہیں اور ان کے ذریعے انسان کی اپنی زندگی میں رونما ہونے واقعات کی اطلاع دوسروں تک پہنچائی جاتی ہے۔ خط و کتابت ایسی رموز و علامات ہیں جن پر انسانوں کا اتفاق ہے اور ان کے ذریعے لوگوں کے افکار و مقاصد معلوم کئے جا سکتے ہیں اور خطوط کی پہچان ایک فرد سے دوسرے فرد تک ایک قبیلہ سے دوسرے قبیلے تک اور ایک نسل سے دوسری نسل تک معلومات منتقل کرنے کا ذریعہ ہے۔ نیز خط و کتابت کے ذریعہ انسان

اپنی معلومات کو فنا و نسیان کی دست برد سے بچا سکتا ہے۔ مزید برآں خط و کتابت کی مہارت بہم پہنچانا زباندانی کے مترادف ہے۔ اگر انسان ایک سے زائد زبانیں سیکھے تو اسے انسانیت کے بارے میں معلومات مہیا کرنے کے بیشتر ذرائع حاصل ہو جاتے ہیں۔

اس طرح ہمیں معلوم ہوا کہ کسی لغت اور قرأت و کتابت کی پہچان واقفیت کے اعتبار سے علم نہیں ہے بلکہ علم حاصل کرنے کا ذریعہ ہے اور علم تو کسی حقیقت اور قانونِ واقعی سے متعلق انسانی ادراک کا نام ہے جیسا کہ ہم علوم طبیعیات و منطق و ریاضیات میں ادراک حاصل کرتے ہیں۔ ان علوم میں انسان خارجی اور ذہنی اشیاء کے درمیان تکوینی اور واقعی روابط اور علت و معلول کا تعلق دریافت کرتا ہے اور اسی کا نام علم ہے۔

جہاں تک لغت اور اس کے قواعد وغیرہ کی معرفت کا تعلق ہے تو یہ علم نہیں ہے کیونکہ اس سے ہمیں اشیاء کے درمیان واقعی رابطے کا ادراک حاصل نہیں ہوتا بلکہ یہ وضعی، اعتباری اور تعاقدی امور کی کڑیاں ہیں جن کی حیثیت فرض و اتفاق سے متجاوز نہیں ہے اور ان کی پہچان علم نہیں ہے بلکہ حصولِ علم کا ذریعہ یا مفتاح ہے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان وضعی امور کے حصول کے دوران میں واقعی مظاہر رونما ہوتے ہیں یہ مظاہر لغات کے ہیر پھیر اور ان کی تصریفات و ترکیبات سے متعلق ہوتے ہیں اور کمالِ افکار اور قانونِ طبیعی کی مطابقت سے پیش آتے ہیں اور اس کے نتیجے میں فلسفہ اور علم کے ان طبیعی قوانین کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ جب صورتِ حال یہ ہے تو قرأت و کتابت کی قدر و قیمت اس بات میں مضمر ہے کہ انسان کے پاس دوسروں کے علوم کی چابیاں ہوں۔

لیکن کیا طرقِ معرفت اور اکتسابِ علم کا انحصار صرف اسی ذریعے پر ہے یعنی یہ کہ انسان دوسروں کے علمی ذخائر سے استفادہ کرے اور یہ مفتاح حاصل کرے جس سے دوسروں کے مشکل اور دشوار فہم علوم تک رسائی ہو؟ اور کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی یہ لازم ہے کہ آنحضرتؐ افرادِ انسانیت کے علوم سے استفادہ کریں؟ اگر معاملہ اسی طرح کا ہے تو پھر نبوغ و ابتکار اور اشراق و الہام کا محلِ وقوع کہاں ہے؟ اور نیچر (فطرت) سے براہِ راست علم حاصل کرنے کا مفہوم کیا ہو سکتا ہے؟

حقیقت تو یہ ہے کہ کتابت و قرأت کے ذریعے علم حاصل کرنا تحصیلِ علم کا ناقص ترین ذریعہ ہے کیونکہ انسانی تحریروں میں حقائق اور وہم و گمان خلط ملط ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں قرأت و کتابت کے ذریعے علم حاصل کرنے والے کا علم ناپختہ اور نامکمل ہوتا ہے اور اسے حصولِ علم کا ادراک نہیں ہوتا۔ مشہور فرانسیسی فلسفی ڈیکارٹ کے متعلق منقول ہے کہ اس نے بلند پایہ مقالات کا ایک سلسلہ نشر کیا اور اس کی آواز آفاق میں گونجی اور اس کے نئے نئے اور اچھوتے افکار و نظریات نے سب لوگوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف جیسے ایک تعجب کرنے والے نے گمان کیا کہ ڈیکارٹ کے پاس نسخوں اور علمی کتابوں کے انبار ہوں گے جن سے وہ اپنی معلومات اخذ کرتا ہوگا۔ چنانچہ وہ ڈیکارٹ کی ملاقات کے لئے گیا اور اس سے مطالبہ کیا کہ اسے لائبریری دکھائی جائے۔ ڈیکارٹ اسے ایک مکان میں لے گیا جہاں اس نے ایک بچھڑے کا جسم چیرا ہوا تھا۔ ڈیکارٹ نے اسے بچھڑا دکھلایا اور کہا: "یہ میرا مکتب ہے میں نے اپنی معلومات اس سے حاصل کی ہیں۔"

سید جمال الدین اسد آبادی مرحوم کہا کرتے تھے "میں بعض لوگوں سے متعجب ہوتا ہوں جو اپنے جیسے لوگوں کی کتابیں اور

تحریریں مدت العمر چراغ کی روشنی میں پڑھتے رہتے ہیں۔ کیا انھیں کبھی یہ خیال دامنگیر نہیں ہوتا کہ وہ چراغ کا مطالعہ کریں؟ اگر کسی رات وہ کتاب کو بند کردیں اور چراغ کا مطالعہ کریں تو انھیں کتاب کی بہ نسبت زیادہ وافر اور زیادہ وسیع معلومات حاصل ہوں گی"۔

یہاں کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو اس دنیا کی زندگی میں بحیثیتِ عالم داخل ہوا ہو۔ بلکہ تمام لوگ شروع میں جاہل ہوتے ہیں اور پھر ایک ایک کرکے چیزوں کا علم حاصل کرتے جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے ماسوا ہر شخص بذاتہٖ جاہل ہوتا ہے اور پھر اپنے قویٰ اور دیگر اسباب کے مطابق عالم بنتا ہے اور ہر انسان معلم یعنی الہامی قوت کا محتاج ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

الم یجدک یتیماً فاٰوی ٥ ووجدک ضالاً فھدٰی ٥ ووجدک عائلاً فاغنٰی ٥ (الضحیٰ ۶ - ۸)	کیا اس نے تم کو یتیم نہیں پایا اور پھر ٹھکانا فراہم کیا؟ اور تمہیں ناواقفِ راہ پایا اور پھر ہدایت بخشی اور تمہیں نادار پایا اور پھر مالدار کر دیا۔

ہماری ساری بحث معلّم کے بارے میں ہے اور یہ کہ معلّم کون ہو سکتا ہے؟

کیا یہ لازمی ہے کہ انسان اپنی معلومات دوسرے انسان سے حاصل کرے؟ اس صورت میں یہ ضروری ہے کہ انسان کے ہاتھ میں دوسروں کے علوم کی مفتاح ہو یعنی اسے چاہیئے کہ وہ قرأت و کتابت سیکھے۔ کیا انسان کے مقدور میں یہ نہیں ہے کہ وہ سحر خیزی کرے اور اللہ سے روشنی کا طالب ہو؟ کیا انسان اس پر قادر نہیں ہے کہ وہ دوسروں سے کنارہ کشی اختیار کرکے خلوت گزیں ہو جائے اور فطرت (نیچر) کی کھلی کتاب کا مطالعہ کرے؟ کیا انسان غیب اور ملکوت کے ساتھ رابطہ قائم نہیں کر سکتا کہ اللہ تعالیٰ براہِ راست اس کا معلم و ہادی ہو؟ قرآن کریم کی سورہ النجم (آیات ۳ - ۵) میں نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق فرمایا گیا ہے۔

وما ینطق عن الھوٰی ٥ ان ھو الا وحی یوحٰی ٥ علمہ شدید القوٰی ٥	وہ اپنی خواہشِ نفس سے نہیں بولتا یہ تو ایک وحی ہے جو اس پر نازل کی جاتی ہے۔ اسے زبردست قوت والے نے تعلیم دی ہے)

امام علیؓ آنحضرتؐ کے بارے میں فرماتے ہیں:

جب آپؐ کا دودھ چھڑایا گیا تو اسی وقت سے اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتوں میں سے ایک عظیم فرشتہ آپؐ پر متعین کر دیا جو آپؐ کو دنیا میں مکارم و محاسنِ اخلاق کے طریق پر چلاتا تھا"

فارسی کے عظیم شاعر کی مثنوی کے اشعار بھی اس موضوع پر ہیں۔

ادھر ابنِ خلدون اپنے معروف "مقدمہ" کی فصل "خط و کتابت کا شمار انسانی صنائع میں ہوتا ہے"۔ کے تحت اس امر پر بحث کرتا ہے کہ کتابت و تحریر اس جہت سے ایک کمال ہے کہ انسانی اجتماعی زندگی میں بعض لوگ بعض دوسروں کی معلومات کے محتاج ہوتے ہیں اور خط و کتابت یہ معلومات بہم پہنچانے کا ذریعہ ہے۔ وہ مختلف تہذیبوں میں کتابت و تحریر پر مکمل بحث کرنے کے بعد حجاز میں خط

کتابت کے بارے میں تحریر کرتا ہے :

" اوائلِ اسلام میں عربی رسم الخط نہ صرف یہ کہ پختگی و مضبوطی اور کمال و عمدگی کے نقطۂ نظر سے عروج کو نہ پہنچا تھا بلکہ متوسط درجے کا بھی نہیں تھا۔ کیونکہ اہلِ عرب دیہاتی اور وحشیانہ طرز کی زندگی گذار رہے تھے اور انھیں علوم و فنون سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اسی وجہ سے صحابہ کرامؓ نے جب اپنے مخصوص رسم الخط میں قرآن کریم کو لکھا تو یہ رسم الخط اصولِ کتابت کے لحاظ سے غیر مستحکم اور بعض مقامات پر مروجہ قواعدِ فن کے مخالف تھا۔ بہر حال اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ لکھا تابعین نے اُسے من وعن قائم رکھا اور اس سے انحراف نہ کیا ..." [1]

آخری قرآنی مقطع

جس پر ڈاکٹر مذکور نے انحصار کیا ہے وہ سورہ " البینہ " کی آیات ۳ - ۴ ہیں۔ ڈاکٹر مذکور کا بیان ہے :۔

" سب سے تعجب انگیز بات جس کی طرف مترجمین و مفسرین نے التفات نہیں کیا یہ آیت ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت اس طرح بیان کی گئی ہے :

رسولٌ من اللّٰہ یتلوا صحفاً مطہرۃ۔ (اللہ کی طرف ایک رسول جو صحیفے پڑھ کر سنائے)

یہاں قابلِ ملاحظہ یہ چیز ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں یہ نہیں فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مقدس صحیفے لوحِ قلب سے (یعنی حافظہ سے) نہیں پڑھتے تھے بلکہ یہ صراحت کی ہے کہ آپؐ ان صحیفوں کو پڑھتے تھے اور وہ آپؐ کے سامنے کھلے ہوئے تھے۔"

اس استدلال کے جواب کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ان دو الفاظ " یتلوا " اور " صحفا " کے مدلول کو دیکھا جائے۔

دصحیفہ کے معنی ورقہ ہے اور 'صحف' صحیفہ کی جمع ہے اور جب اس آیت کو اگلی آیت (فیھا کتب قیمۃ) کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو اس کا معنی یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے لیے پاک اور منزہ اوراق پڑھتے تھے جن میں بالکل راست اور درست تحریریں لکھی ہوئی ہیں اور صحف سے مقصود وہ چیزیں ہیں جن پر قرآنِ کریم لکھا جاتا تھا اور اس طرح اس کا مفہوم یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے لیے قرآن پڑھتے تھے۔

جہاں تک لفظ " یتلوا " کا تعلق ہے اس کا مادہ " تلاوت " ہے اور ہمیں کوئی ایسی سند معلوم نہیں جس کی بنا پر تلاوت کی یہ تفسیر کی جائے کہ اس کا مفہوم ورقہ کو دیکھ کر قرائت کرنا ہے۔ اہلِ لغت کے کلام اور دو الفاظ (قرائت) اور (تلاوت) کے مواقع استعمال کی طرف رجوع کرنے سے جو کچھ حاصل ہوتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ ہر تکلم کو قرائت یا تلاوت نہیں کہتے بلکہ تلاوت یا قرائت کی صورت یہ ہے کہ کسی متن سے تکلم (لوٹنے کا عمل) کیا جائے خواہ وہ متن کسی ورقہ سے ناظرہ پڑھا جائے یا لوحِ قلب (یعنی حافظہ) سے پڑھا جائے۔ قرآن کریم پڑھنے کے لیے قرأت اور تلاوت دونوں الفاظ مستعمل ہیں خواہ طبع شدہ قرآن کو دیکھ کر پڑھا جائے یا حافظہ کی امداد حاصل کی جائے باوجودیکہ ان دونوں لفظوں کے درمیان تفاوت پایا جاتا ہے۔ تلاوت متن مقدس کی قرأت سے مختص ہے لیکن قرأت' عام لفظ ہے اور یہ کہنا صحیح ہے کہ میں نے منطق کی کتاب کی قرأت کی اور یہ صحیح نہیں

---

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۳۲۲ ، طبع دار الفکر۔

ہے کہ میں نے اس کی تلاوت کی۔

بہر حال کسی لکھی ہوئی تحریر کے متن کی قرآت کے عنصر کو قرأت کے مفہوم اور تلاوت کے مفہوم میں کوئی عمل دخل حاصل نہیں ہے۔
اس بنا پر سابقہ آیت میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ صرف یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے لیے اس قرآن کی تلاوت کرتے تھے جو صفحات پر لکھا ہوا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ہمیں تو اس معاملہ میں پوچھ گچھ کرنی چاہیے کہ ہمارے لیے یہ فرض کر لینا کیوں لازم ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کی آیات کی تلاوت کے سلسلے میں کسی لکھی ہوئی چیز کو دیکھنے کی احتیاج تھی؟

بیشک ہم جانتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم قرآن حفظ کرتے تھے اور دوسرے سینکڑوں مسلمان بھی یاد کرتے تھے۔ قرآن نے آپؐ کے لئے اس حفاظت کی ضمانت اپنے اس بیان میں بہم پہنچائی ہے:

سنقرئک فلا تنسیٰ (الاعلیٰ-۶) (ہم تمھیں پڑھوا دیں گے پھر تم نہیں بھولو گے۔)

مذکورہ بحث سے معلوم ہوا کہ قرآنی آیات میں سے کسی آیت سے بھی کسی طرح یہ ثابت نہیں ہوتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لکھنا پڑھنا جانتے تھے بلکہ جو کچھ حاصل ہوتا ہے وہ اس کے برعکس ہے اور اگر ہم یہ فرض بھی کر لیں کہ قرآنی آیات سے یہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ آنحضرتؐ لکھتے اور پڑھتے تھے تو یہ مفروضہ صرف کسی وقت دورِ رسالت کے ساتھ مرتبط ہو سکتا ہے حالانکہ ڈاکٹر مذکور کا دعویٰ تو یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعثت سے قبل بھی بہت اچھی طرح لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔

تیسرا دعویٰ: ڈاکٹر سید عبد اللطیف دعویٰ کرتا ہے کہ احادیث و تواریخ اس کے مدعا کا ثبوت مہیا کرتی ہیں اور اس ضمن میں وہ دو واقعات کا ذکر کرتا ہے:۔

پہلا واقعہ:

انہیں مذکورہ کے ضمن میں بخاریؒ نے کتاب العلم میں ذکر کیا ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے داماد علیؓ کو ایک خفیہ تحریر دی اور خصوصیت کے ساتھ انھیں حکم دیا کہ اسے کھولا نہ جائے بلکہ مکتوب الیہ کا نام یاد رکھا جائے اور یہ تحریر مکتوب الیہ کو پہنچا دی جائے۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسی تحریر علیؓ کے سپرد کرتے ہیں اور علیؓ جو آپؐ کے داماد اور معتمد علیہ ہیں ان کو بھی اس کے مضمون کا علم نہیں تو ایسی صورت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے علاوہ اس تحریر کا کاتب اور کون ہو سکتا ہے؟

یہ پہلا واقعہ ہے جس کا ذکر ڈاکٹر مذکور نے کیا ہے۔

افسوس ہے کہ اس قبیل کی تحریر صحیح بخاری میں موجود تو ہے لیکن یہ مذکور نہیں کہ اس مکتوب کے حامل علیؓ تھے۔ اس طرح ڈاکٹر مذکور کا استدلال بے وزن ہو جاتا ہے کیونکہ وہ تو اپنی بحث کا مرکزی کردار علیؓ کی شخصیت کو قرار دیتا ہے۔ نیز علیؓ سے تحریر کو مخفی رکھنے کا مطلب یہ نہیں ہے اس تحریر کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بذاتِ خود لکھا تھا۔

بخاریؒ کا بیان یہ ہے:۔

"اور بعض اہلِ حجاز نے مناولہ[1] کے قابلِ اعتبار ہونے کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے استدلال کیا ہے جبکہ آپؐ نے ایک تحریر امیرِ لشکر کے لئے لکھی اور اس سے فرمایا کہ تم فلاں مقام پر پہنچ کر اس تحریر کو پڑھنا۔ جب وہ مذکورہ مقام پر پہنچ گئے تو امیرِ لشکر نے اسے لوگوں کو پڑھ کر سنایا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم جو اس تحریر میں تھا لوگوں کو بتلایا۔"[2]

لیکن بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کہیں یہ نہیں لکھا کہ اس لشکر کے امیر علیؓ تھے اور اس روایت کے مضمون سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس خط کو کھولنے والا اس کا حامل ہی تھا نہ کہ کوئی تیسرا شخص جیسا کہ سید عبداللطیف کا گمان ہے۔

بخاریؒ نے جس واقعہ کا ذکر کیا ہے وہ بطنِ نخلہ کے قصہ سے متعلق ہے جو سیرت و تاریخ کی کتابوں میں مذکور ہے۔

ابن ہشام نے "سریہ عبداللہ بن جحش" کے عنوان کے تحت ذکر کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تحریر عبداللہ بن جحش کو دی تھی اور اسے فرمایا تھا کہ دو دن کے سفر کے بعد اس تحریر کو کھولنا اور اس کے مضمون کے مطابق عمل کرنا۔ بحار الانوار میں بھی یہی منقول ہے۔ واقدی اپنے کتاب مغازی میں تصریح کرتا ہے کہ اس تحریر کے کاتب ابی بن کعبؓ تھے نہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ واقدی کا بیان ہے:۔

"عبداللہ بن جحش نے کہا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عشا کی نماز پڑھی تو مجھے بلا کر فرمایا: صبح کے وقت ہتھیار بند ہو کر آؤ میں تمہیں کسی طرف بھیجوں گا۔ عبداللہ کا بیان ہے کہ میں صبح کے وقت پہنچا۔ میرے پاس تلوار کمان، تیردان اور ڈھال تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کے ساتھ صبح کی نماز ادا کی اور چل دیے اور مجھے اپنے دروازے پر کھڑا پایا کیونکہ میں آپؐ سے پہلے مسجد سے نکل آیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ میرے ساتھ قریش کی ایک جماعت بھی کھڑی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابی بن کعبؓ کو بلایا وہ حاضرِ خدمت ہوا اور اس نے آنحضرتؐ کے حکم سے ایک تحریر قلمبند کی۔ پھر آنحضرتؐ نے مجھے بلایا اور خولانی چمڑے پر لکھی ہوئی ایک تحریر دی اور فرمایا: میں نے تمہیں اس جماعت کا امیر مقرر کیا ہے تم جاؤ اور جب دو راتوں کی مسافت طے کر لو تو میرے اس مکتوب کو کھولو اور اس میں جو حکم درج ہے۔ اس کی تعمیل کرو۔ میں نے عرض کیا۔ یا رسول اللہؐ کس طرف جاؤں۔ آپؐ نے فرمایا نجدی سمت میں جاؤ اور آپؐ نے ایک کنوئیں کی نشاندہی فرمائی۔ عبداللہ بن جحشؓ ساتھیوں سمیت روانہ ہو گیا۔ جب ابن ضمیرہ کے کنوئیں پر پہنچا تو خط کھولا اور اسے پڑھا۔ اس کا مضمون یہ تھا:۔ اللہ کے نام اور اس کی برکتوں سے برابر چلے جاؤ یہاں تک کہ بطنِ نخلہ پہنچ جاؤ۔ اپنے ساتھیوں

---

[1] محدثین کی اصطلاح میں مناولہ اس کو کہتے ہیں کہ ایک استاد اپنی کتاب اپنے کسی شاگرد کو عطا کرے اور یہ کہے کہ جو کچھ اس میں ہے اس کی روایت کی میں تمہیں اجازت دیتا ہوں (مترجم)

[2] صحیح بخاریؒ۔ جلد ۱ صفحہ ۲۵۔

میں سے کسی کو اپنے ساتھ آگے چلنے پر مجبور نہ کرنا۔ میرے حکم کے مطابق صرف ان کو ساتھ لے کر جانا جو تمہارے حکم کی پیروی اختیار کریں۔ اس طرح بطنِ نخلہ پہنچ جاؤ۔ وہاں قریش کے قافلوں کی دیکھ بھال کرتے رہو۔ جب عبداللہ بن جحش نے یہ خط اپنے ہمراہیوں کو پڑھ کر (سنایا) تو کہا: میں تم میں سے کسی کو آگے چلنے پر مجبور نہیں کرتا۔ تم میں سے جو کوئی شہادت کا طلبگار رہے اسے چاہئے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل کرے اور جو کوئی واپس جانا چاہے وہ اسی وقت چلا جائے۔ ان سب نے بیک زبان کہا کہ ہم اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تمہاری بات سننے والے اور اطاعت کرنے والے ہیں۔"

دوسرا واقعہ ڈاکٹر مذکور جس دوسرے واقعہ سے استدلال کرتا ہے وہ صلح حدیبیہ کا واقعہ ہے۔ اس کا بیان ہے:
"اور جس طرح بخاریؒ اور ابن ہشامؒ نے نقل کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے معاہدے کا ورق لیا اور اپنے ہاتھ سے لکھا۔"

ڈاکٹر مذکور کے استدلال کا جواب یہ ہے:

بخاریؒ نے اس کا ذکر ایک روایت میں کیا ہے لیکن دوسری روایت میں اس کے برخلاف ذکر کیا ہے۔ علماء سنّت کا اس بات پر تقریباً اجماع ہے کہ اگرچہ بخاریؒ کی عبارت سے بظاہر یہ گمان ہوتا ہے کہ کاتبِ معاہدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے لیکن راوی کا مقصود یہ نہیں ہے۔

صاحبِ سیرت حلبیہ بھی حسبِ عادت واقعہ بیان کرنے کے بعد یہی ذکر کرتا ہے اور تاکید کرتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ کلمہ جس پر کافر نمائندے کا اعتراض تھا اسے مٹانے کے لیے علیؓ کی امداد حاصل کی۔ وہ بخاریؒ کی روایت نقل کرنے کے بعد کہتا ہے کہ بعض کا یہ دعویٰ ہے کہ یہ آنحضرتؐ کا اعجاز تھا لیکن وہ اس قول کا تعاقب کرتے ہوئے محقق کا یہ قول بھی نقل کرتا ہے کہ اہلِ علم کے نزدیک اس طرح کی یہ روایت غیر معتبر ہے اور مقصود یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کتابت کا حکم دیا نہ کہ بذاتِ خود لکھا تھا۔

جہاں تک سیرتِ ابنِ ہشام کا تعلق ہے تو اس میں یہ مضمون نہیں ہے اور نہ معلوم ڈاکٹر مذکور نے یہ مضمون ابنِ ہشام کی طرف کیوں منسوب کر دیا ہے،

قبل ازیں ہم واضح کر چکے ہیں کہ اکثر تاریخی نقول سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جو کچھ بھی لکھا گیا وہ علیؓ نے اپنے ہاتھ سے لکھا۔ طبری اور ابن اثیر کی عبارت کا ماحصل یہ ہے کہ باوجود اس بات کے کہ آنحضرتؐ خود لکھتے نہیں تھے۔ آپؐ نے عہد کی پاسداری کی اور وہ کلمہ اپنے ہاتھ سے لکھ دیا۔

کچھ بھی ہو اس استدلال سے جو بعید ترین چیز بھی ثابت ہو سکتی ہے وہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دورِ رسالت

لہ مغازی الواقدی۔ جلد ۱ صفحہ ۱۳-۱۴

میں کسی وقت ایک دفعہ یا دو دفعہ لکھا لیکن ہمارے موضوع بحث کا تعلق زمانہ ماقبل بعثت سے ہے۔

اس مضمون کے شروع میں ہم لکھ چکے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کے دشمنوں نے آنحضرتؐ پر یہ اتہام لگایا کہ آپؐ دوسروں کی باتیں سن کر ان کی تعلیمات نقل کرتے تھے لیکن انہوں نے آپؐ پر یہ الزام تراشی کبھی نہیں کی کہ آپؐ لکھنا پڑھنا جانتے تھے اور اپنے پاس رکھی ہوئی کتابوں سے مضامین اخذ کرتے تھے۔

ممکن ہے کوئی ایسا شخص بھی نمودار ہو جائے جو کہہ دے کہ آپؐ کے دشمنوں نے آپؐ پر یہ اتہام بھی لگایا تھا جیسا کہ اس بارے میں قرآن کہتا ہے:-

وقالوا اساطیر الاولین اکتتبها فهی تملی علیه بکرة واصیلا" (الفرقان - ۵)	اور وہ کہتے ہیں یہ پرانے لوگوں کی لکھی ہوئی چیزیں ہیں جنہیں یہ شخص نقل کراتا ہے اور وہ اسے صبح و شام سنائی جاتی ہیں۔

لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ ان کے اتہامات تعصب اور حقارت کی وجہ سے تھے اور قرآن نے اس کو ظلم اور زُور یعنی بڑی بے انصافی اور سخت جھوٹ قرار دیا ہے۔ یہ آیت اس دعویٰ کے بارے میں صریح نہیں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بذات خود لکھا کرتے تھے کیونکہ "اکتتاب" کا لفظ 'کتابت' اور 'طلبِ کتابت' دونوں معنوں میں آتا ہے طلبِ کتابت کا مفہوم یہ ہے کہ کسی دوسرے شخص کو لکھنے کے لئے کہا جائے اور اس آیت کے ذیل میں ایک قرینہ موجود ہے کہ اس کا مقصود دوسرا معنی یعنی طلبِ کتابت ہی ہے۔ آیت کا مضمون یہ ہے کہ انہوں نے کہا کہ یہ پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں جسے اس نے لکھ لیا ہے (یا دوسروں نے اس کے لئے لکھا ہے) اور یہ اسے صبح و شام پڑھ پڑھ کر سنائی جاتی ہیں، 'اکتتاب' بصیغہ ماضی اور 'املاء' بصیغہ مضارع استمراری مذکور ہے جس کا معنی یہ ہے کہ یہ امور جن کو اس شخص نے پہلے سے لکھوا لیا ہے دوسرے لوگ جو قرأت جانتے ہیں وہ صبح و شام اسے پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور وہ انھیں سیکھ لیتا اور محفوظ کر لیتا ہے۔

جب ہم نے یہ فرض کر لیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم قرأت جانتے تھے تو کفار کا قول بے محل معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے لوگ آپؐ کے لئے صبح و شام تلاوت کرتے تھے اور آپؐ ان سے سیکھ کر یاد کر لیتے تھے بلکہ یہ ممکن تھا کہ صرف اتنا کہنے پر اکتفاء کیا جاتا کہ آپؐ ان مضامین کی طرف دوبارہ رجوع کرتے تھے اور انھیں یاد کر لیتے تھے۔

کافروں اور اتہام تراشی کرنے والوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر مختلف قسم کے اتہامات لگائے اور صرف ایک تہمت پر اکتفاء نہ کیا بلکہ جنون اور سحر اور دوسروں کی سنی سنائی باتوں سے استفادہ تک کے الزامات لگائے.... لیکن وہ آپؐ پر یہ الزام لگانے کی جسارت نہ کر سکے کہ آپؐ قرأت و کتابت جانتے تھے اور دوسری کتابوں سے اخذ کردہ مضامین اپنی ذات کی طرف منسوب کر کے کافروں کو سناتے تھے۔

آخری نتیجہ

تاریخ کے قطعی واقعات کی سراغ رسانی اور قرآن کی شہادت اور کثیر تاریخی قرائن کے فیصلہ سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی لوحِ ضمیر کسی فردِ بشر کی شاگردی سے مُبرا تھی۔ آں حضرتؐ نے صرف تعلیم الٰہی کی چھاؤں میں علم حاصل کیا اور صرف حق تعالیٰ سے کسب فیض کیا۔ آپؐ ایک پھول تھے جس کی خبر گیری و نگہبانی واجب الوجود جَلّ وعَلاَ کے دستِ قدرت نے کی۔ آں حضرتؐ نے بذاتِ خود قلم و قرطاس اور سیاہی کو استعمال نہ کیا اور قرأت و کتابت سے سروکار نہ رکھا۔ اس کے باوجود آپؐ کی کتاب مقدس قلم اور اس کے آثار کی قسم کھاتی ہے:

نٓ والقلم وما یسطرون۔ ن۔ قسم ہے قلم کی اور اس چیز کی جسے لکھنے والے لکھ رہے ہیں۔ (القلم۔۱)

اور اولین پیغامِ الٰہی میں آپؐ کو قرأت کا حکم دیا جاتا ہے اور استعمالِ قلم کے فن کو تخلیق کی نعمت کے بعد عظیم ترین نعمت تعبیر کیا گیا ہے:

اقرا باسم ربک الذی خلق۔ پڑھو (اے نبی) اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا۔ (العلق۔۱)

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ وہ انسان جس نے قلم کو کبھی ہاتھ نہیں لگایا تھا جب وہ مدینہ میں داخل ہوتا ہے تو قلم کے استعمال کی تحریک برپا کر دیتا ہے۔ ہم یہ بھی مشاہدہ کرتے ہیں کہ وہ انسان جس نے کبھی کسی معلم کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا تھا اور نہ ہی کسی دارالعلوم میں داخلہ لیا تھا وہ انسانیت کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرتا ہے اور انسانیت کی تاریخ میں جامعات و کلیات کا ایک وسیع نظام قائم کر دیتا ہے۔

امام رضا دیگر اہلِ ادیان کے ساتھ اپنے محاورہ دگفتگو میں کہتے ہیں:

"...... آنحضرتؐ کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ آپؐ یتیم، محتاج اور اجرت پر بکریاں چرانے والے تھے۔ آپؐ نے نہ کبھی کوئی کتاب مطالعہ کی اور نہ ہی کسی معلم سے رجوع کیا یہاں تک کہ آپ پر قرآن نازل ہوا جس میں انبیاء علیہم السلام کے قصے اور اُن کی حرف بحرف خبریں اور ماضی اور قیامت تک آنے والے زمانے کے بارے میں اخبار و احوال درج ہیں...."[1]

دراصل وہ بدیہی امر جو تمام لوگوں کے لئے تعجب انگیز ہے اور جو قرآن کریم کی عظمت کا سب سے بڑا مظہر ہے اور قرآن کے برحق آسمانی کتاب ہونے کا ثبوت مہیا کرتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ عظیم کتاب جو مبدأ و معاد اور انسانیت کے بارے میں نظریات نیز اخلاق، قانون، قصص اور پند و نصائح کے ابواب میں معرفت و حکمت سے لبریز ہے اور حسن و جمال اور ادبی فصاحت و بلاغت کا خزینہ ہے ایک ایسے ناخواندہ آدمی کی زبانِ فیض ترجمان پر جاری ہوئی جو کسی درس گاہ میں داخل نہ ہوا اور جس نے اپنے دور کے علماء میں سے کسی عالم سے فیض حاصل نہیں کیا اور اپنے عہد کی متداول کتابوں میں سے کوئی کتاب نہیں پڑھی۔

---

[1] عیون اخبار الرضا۔ ص ۱۳۶۔

بلاشبہ وہ نشانی اور معجزہ جو اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں ظاہر فرمایا وہ کتابی، تبلیغی اور حدیثی معجزہ ہے جس کا ارتباط فکر و احساس اور ضمیر سے ہے۔ اور اس معجزے اور اس کتاب نے اپنی معنوی خارقِ عادت قدرت کا عالمگیر ثبوت مختلف ادوار میں مہیا کیا ہے اور مرورِ زمانہ اس پر کہنگی کے اثرات مترتب نہیں کر سکا۔ بلکہ اس کتاب نے کروڑ دل اور اربوں قلوب کو اپنی طرف کھینچا ہے اور جب بھی اسلام کی تحریکی زندگی کی طاقت موجزن ہوتی ہے تو ہر دور میں یہ کتاب لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ کثیر دماغوں کو اس کتاب نے غور و فکر پر آمادہ کیا اور بیش از بیش قلوب اس کے معنوی ذوق و شوق سے فیض یاب ہوئے۔ سحر خیزوں اور شب زندہ داروں نے اس سے معنوی غذا حاصل کی اور اللہ تعالیٰ کی محبت اور خوف کے باعث بوقتِ سحر اور نیم شب کو اکثر لوگوں کے رخسار آنسوؤں سے تر ہو گئے اور متعدد قوموں نے اس کتاب کے طفیل استعمار اور ظلم و استبداد کے چنگل سے نجات حاصل کی۔

کیوں نہ ہو۔ . . . . عنایت الٰہی سے امید ہے کہ آئندہ بھی اللہ تعالیٰ قرآنی اعجاز کے کرشمے زیادہ سے زیادہ دکھلائے گا۔ یہ وہ قرآن ہے جو ایک ایسے اللہ کے بندے پر نازل ہوا جو یتیم تھا اور بکریاں چراتے ہوئے صحرا نوردی کیا کرتا تھا۔ جو اُمّی (نا خواندہ) تھا اور جس نے کبھی کسی تعلیمی مکتب میں داخلہ نہیں لیا۔

ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء　　　یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے دیتا ہے اور
واللہ ذو الفضل العظیم ہ　　　اللہ بڑا فضل فرمانے والا ہے

صلی اللہ علیہ وسلم

رسول نمبر

نقوش

۸

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب ....

- عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد آپ لوڈ (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹو کاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات نشرواشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

☆ تنبیہ ☆

- کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔
- ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی و شرعی جرم ہے۔

﴿اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں﴾

- نشرواشاعت، کتب کی خرید وفروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں۔

kitabosunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com

رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۱۲ ٹیلی فون نمبر ۵۲۵۲۵

زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمایندہ

نقوش

رسول نمبر

جلد ہشتم

شمارہ نمبر ۱۳۰

جنوری سنہ ۱۹۸۴ء

مُدیر:

محمد طفیل

ادارۂ فروغ اُردو • لاہور

قیمت لائبریری ایڈیشن: ۱۲۵ روپے
بار دوم

ترتیب

خطباتِ رسولؐ

اصحابِ بدر

(جو پہلی جنگ میں حضورؐ کے ساتھی تھے)

شہداء

واقعۂ ہجرت

فصاحت و بلاغت

اصحابِ صُفّہ

(جن کے بارے میں حضورؐ نے جنتی ہونے کی بشارت دی)

[۱] صفحہ ۱۲۳ سے صفحہ ۲۰۸ تک رسولِ اکرمؐ، خلفا اور باقی تمام شریکِ جنگ ہستیوں کا ذکر۔

علم و تہذیب

جوامع الکلم

نازک ترین لمحات

عقلی ثبوت

خاتم النّبیّین

○

محمد طفیل پرنٹر، پبلشر و ایڈیٹر نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر ادارۂ فروغِ اردو لاہور سے شائع کیا۔

طلوع

مدینہ کا شہر!

مسجدِ نبویؐ کے قریب ایک چھپر تلے کچھ لوگ رہتے ہیں مگر اُن کی حالت یہ ہے کہ تن ڈھانکنے کے لیے جو چادر ہے وُہ پھٹی ہُوئی اور چھوٹی ہے۔ ستر ڈھانپنا مشکل ہو رہا ہے۔ یہ حالت کسی ایک کی نہیں سبھی کی ہے۔

کسی نے پُوچھا: "یہ لوگ کون ہیں؟"

"اصحابِ صُفّہ۔"

"اصحابِ صُفّہ؟"

"ہاں، وہی لوگ جن کے بارے میں حضورؐ نے بتایا تھا: "یہ لوگ جنّتی ہیں۔"

"وہ لوگ چھپر تلے پڑے ہیں، قرآن کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں، احادیث پر غور کر رہے ہیں، حضورؐ کا دیدار کر رہے ہیں۔ بس ان کا اتنا ہی کام ہے۔

قرآن مجید میں ان کا ذکر یُوں آیا ہے:

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمَاهُمْ لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ؕ

(البقرۃ)

(صدقات کے مستحق وہ فقرا ہیں جو اللہ کے راستہ میں گھر کر رہ گئے ہیں۔ ملک میں چلنے پھرنے کے قابل نہیں (کہ روزی کما سکیں) مانگنے میں ان کی احتیاط کی وجہ سے ناواقف ان کو مالدار سمجھتا ہے تم ان کو ان کے چہرہ مہرہ سے پہچان سکتے ہو وہ لوگوں سے لپٹ کر سوال نہیں کرتے)

آج جب میں سیرتِ رسولؐ کے مطالعہ سے گزر رہا ہُوں دنیا کی ساری آسائشیں میری گود میں ہیں، پھر بھی میرا دل چاہتا ہے: کاش! میں بھی حضورؐ کے زمانہ میں ہوتا۔

میرا شمار بھی اصحابِ صُفّہ میں ہوتا!

محمد طفیل

اِس شمارے میں

مَیں اپنی تعریف خود کرنے کا عادی ہُوں۔ اگر ایسا نہ کروں تو مر جاؤں، کیونکہ گرہ سے رقم لگاتا ہوں، خُونِ جگر لٹاتا ہُوں۔ لیکن رسولؐ نمبر کے سلسلے میں ایسا کروں یا کہوں، میری توبہ! میں نے جو اس باب میں ایسے جملے لکھے کہ ٹھکانے کا کام کیا ہے تو گزارش میں تفاخرانہ انداز نہیں بلکہ صرف اپنے اطمینان اور اعتماد کا اظہار ہے۔ جہاں جبریل بھی مودب ہو وہاں بندۂ عاجز کی حیثیت کیا؟ کچھ نہیں! کچھ نہیں!

سیرت کی اُردو کتابوں میں اصحابِ صُفّہ پر چند ایک صفحات کے مضامین تو ملتے ہیں، وُہ بھی صرف اس عنوان سے کہ وُہ لوگ ان فضیلتوں کے مالک تھے۔ مگر وہ لوگ کون تھے، اُن پر یہ مضمون اضافہ کی حیثیت رکھے گا۔

واقعۂ ہجرت پر، سیرت کی کتابوں میں بہت کم مواد ہے۔ جیسے میں یہ فقرہ لکھ دُوں کہ رسول اللہؐ نے مکّہ سے مدینہ ہجرت کی۔ مگر یہ واقعہ اسلام کا وُہ بنیادی موڑ تھا کہ جس سے مذہب دنیا کے کونے کونے میں پہنچا، ورنہ مکّہ میں تو حضورؐ کے لیے حصارِ شعب والا قصہ بھی تھا۔ غرض یہ موضوع عالمگیر حیثیت کا حامل تھا، جس کا حق ادا کیا گیا ہے۔

حضورؐ کی فصاحت و بلاغت اور حضورؐ کے جوامع الکلم پر بھی کئی قیمتی مضامین کا اضافہ کیا جا رہا ہے۔ اگر حضورؐ کی باتوں میں اتنی تاثیر، جوامع الکلم میں اتنی اُڑان نہ ہوتی تو دنیا ششدر کیسے رہتی؟ بہرحال ان عنوانات کے تحت ہماری کارگزاری اہمیت رکھے گی۔

"سرورِ کائناتؐ نازک ترین لمحات کی میزان پر" بھی نیا موضوع ہے۔ اس موضوع پر بھی حضورؐ کے حوصلے اور تدبر کی بات زیادہ تفصیل کے ساتھ سامنے آئے گی۔

پھر "نبوتِ محمدیؐ کا عقلی ثبوت" پر چند مضامین، اہمیت کے تاثر کے ساتھ پڑھے جائیں گے کیونکہ اس موضوع پر اکّا دکّا مضامین ہی سامنے تھے، زیادہ مواد موجود نہ تھا۔ یہ سعی بھی شاید کسی قابل ہو۔

آخر میں "رسول اللہؐ مظہرِ ختمِ نبوت" کے عنوان سے بھی چند مضامین حاضر کیے جا رہے ہیں، وُہ بھی منطقی دلائل کے ساتھ۔ یہ موضوع سرسری نوعیت کا نہ تھا اس لیے آپ کو سیر حاصل مواد ملے گا۔

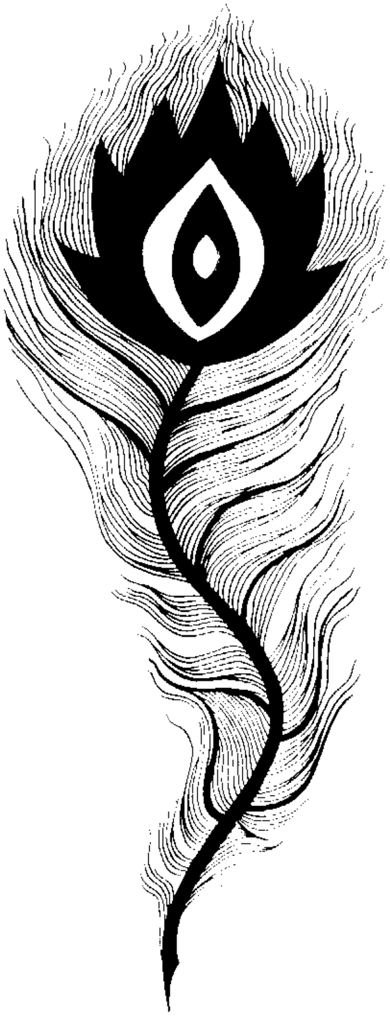
غرض مجھ سے جو کُچھ بَن پڑا وُہ حاضر ہے۔

محمد نقوش

وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ إِلَى اللّٰهِ

اور اس سے بہتر بات کس کی ہے جو دوسروں کو اللہ کی طرف بلائے

(حٰمٓ السجدة : ۳۳)



خطبات رسول صلی اللہ علیہ وسلم

خُطباتِ رسُولؐ

مرتّبہ

ڈاکٹر محمد رفیع الدین ہاشمی

ابتدائیہ

لغوی اعتبار سے "خطبہ" کے معنی وعظ و نصیحت کے ہیں۔ روایتی طور پر خطبے میں عموماً وعظ و تذکیر، نیکی کی تلقین اور نصیحت ہی کی جاتی ہے۔ خطیب اپنی بات کو موثر بنانے کے لیے حتی المقدور منطق و استدلال، جوش و جذبات اور زبان و بیان کے جملہ ذرائع سے کام لیتا ہے۔

انبیاء علیہم السلام نے، جو تاریخ کی عظیم الشان ہستیاں تھیں، اپنی اپنی قوم تک پیغام رسانی کے لیے خطابت ہی کو ذریعہ بنایا۔ حضرت موسیٰؑ کی زبان میں لکنت تھی یا یہ کہ وہ اپنے اندر خطابت کی صلاحیت نہ پاتے تھے اور ان کو اندیشہ لاحق تھا کہ اگر تقریر کی ضرورت آپڑی تو نبوت کے فرائض ادا کرنے میں طبعی جھجک مانع ہو جائے گی اس لیے انہوں نے باری تعالیٰ سے درخواست کی:

رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي ۝ وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي ۝	پروردگار! میرا سینہ کھول دے، اور میرے
وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّن لِّسَانِي ۝ يَفْقَهُوا قَوْلِي ۝	کام کو میرے لیے آسان کردے اور میری زبان کی گرہ
(طٰهٰ: ۲۵-۲۸)	سلجھا دے تاکہ لوگ میری بات سمجھ سکیں۔

حضرت موسیٰؑ کے بھائی حضرت ہارونؑ نسبتاً فصیح گفتگو فرماتے تھے۔ حضرت موسیٰؑ نے مناسب سمجھا کہ پیغام رسالت کی ترسیل و تکمیل میں بھائی کی اعانت بھی شامل ہو۔ چنانچہ بارگاہِ الٰہی میں التماس کیا:

وَأَخِي هَارُونُ هُوَ أَفْصَحُ مِنِّي لِسَانًا فَأَرْسِلْهُ	اور میرا بھائی ہارون مجھ سے زیادہ زبان آور ہے اسے
مَعِيَ رِدْءًا يُصَدِّقُنِي۔ (القصص: ۳۴)	میرے ساتھ مددگار کے طور پر بھیج تاکہ وہ میری تائید کرے

عربی معاشرے میں خطابت بہت بڑا وصف تھا۔ بحیثیت مجموعی اہلِ عرب کی خطابت مسلّم تھی، اسی بنا پر وہ غیر عربی اقوام کو عجمی (گونگا) کہتے تھے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اُمّی تھے، مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو تقریر و خطابت کی غیر معمولی صلاحیت عطا فرمائی تھی۔ بچپن میں آپ کی پرورش دائی حلیمہ کے ہاں بدوی ماحول میں ہوئی تھی۔ حلیمہ بنو سعد قبیلے سے تھیں اور یہ قبیلہ اپنے فصیح لہجے کے سبب عرب قبائل میں ممتاز حیثیت کا مالک تھا اس وجہ سے آپ کے لہجے میں عربی فصاحت و بلاغت کی بہترین خوبیاں جمع ہو گئی تھیں۔ بحیثیت ایک خطیب، آپؐ کی شخصیت پر نظر ڈالیں تو آپؐ کی خطابت میں بھی ایک انفرادی شان نظر آتی ہے۔

آپؐ کے خطبے کا کوئی مستقل یا مقررہ اسلوب نہ تھا۔ آپ زمین پر کھڑے ہو کر یا کسی درخت سے ٹیک لگا کر یا منبر پر بیٹھ کر یا اونٹ پر سوار ہو کر خطبہ دیتے۔ سواری پر خطبہ جنگ وغیرہ کے موقع پر دیتے۔ خطبہ دیتے وقت عموماً آپ کے ہاتھ میں ایک عصا ہوتا، کبھی کبھی آپؐ کے پاس کمان ہوتی تو آپؐ اس پر ٹیک لگا کر خطبہ ارشاد فرماتے۔ آپؐ کے اسلوبِ خطبہ کے بارے میں ابن ابی شیبہ کی

روایت میں بتایا گیا ہے کہ جمعہ کے دن حضورؐ منبر پر آتے ہی لوگوں کی طرف منہ کر کے السّلامُ علیکم کہتے [منبر پر تشریف فرما ہوتے [پھر حمدِ باری تعالیٰ سے اپنے خطبے کو شروع کرتے اور حمد و ثنا کے بعد قرآنِ کریم کی کوئی سُورت پڑھتے۔ پھر خطبہ ختم کر کے منبر پر سے اُتر آتے ——— خطبے کا یہ طریقہ محض جمعہ سے مخصوص نہ تھا بلکہ جمعہ کے علاوہ دیگر خطبوں میں بھی سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد بیان فرماتے۔ اس کے بعد حسبِ ضرورت صحابہؓ کو وعظ و نصیحت فرماتے۔ روایات میں ہے کہ آپؐ عورتوں سے علیحدہ خطاب فرماتے۔

خطبے کے دوران میں آپؐ کی آواز کم و بیش ہوتی تھی۔ جب آواز بلند ہوتی تو آپؐ کے چہرے پر جلال ہوتا۔ آپؐ جوش میں آجاتے اور بدن مبارک اِدھر اُدھر جھُومنے لگتا۔ ایسے موقعوں پر آپؐ ہاتھ کی حرکت سے بھی اپنی بات کی وضاحت فرماتے، مثلاً قیامت کے ذکر میں شہادت کی اور بیچ کی انگلی کو ذرا فرق سے دکھاتے اور فرماتے:

"مجھے اور قیامت کو اس طرح بھیجا گیا ہے۔"

خطبے کے دوران میں کوئی کام پڑ جاتا تو اسے پُورا کرتے اور پھر واپس آکر خطبہ شروع کر دیتے۔ "زاد المعاد" کی روایت ہے کہ ایک بار خطبہ کے دوران میں حضرتِ حسنؓ اور حسینؓ سُرخ قمیص پہنے تشریف لے آئے۔ آپؐ نے خطبہ بند کر دیا، منبر سے اُترے، دونوں کو گود میں اٹھایا پھر دوبارہ منبر پر تشریف فرما ہوئے اور قرآنِ حکیم کی یہ آیت پڑھی:

اِنَّمَا اَمْوَالُکُمْ وَ اَوْلَادُکُمْ فِتْنَۃٌ۔ بے شک تمہارے مال اور تمہاری اولاد تمہارے لیے باعثِ آزمایش ہیں۔

اس کے بعد فرمایا: میں نے ان دونوں کو قمیصوں میں لڑھکتے آتے دیکھا تو میں برداشت نہ کر سکا، خطبہ ختم کیا اور انھیں اٹھا لیا ———

ایک اور روایت میں ہے کہ ایک بار آپ خطبہ دے رہے تھے۔ اسی اثنا میں سلیک غطفانی حاضر ہوا، وہ بیٹھ گیا آپؐ نے فرمایا: "سلیک! اُٹھ، دو رکعت نماز پڑھ اور مختصر طور پر ادا کر" ——— بعد ازاں آپؐ نے حسبِ سابق لوگوں سے خطاب فرمایا۔ دورانِ خطبہ اگر کوئی ضرورت مند سوال کرتا تو خطبہ روک کر اس کی حاجت پُوری کرتے، اس کے بعد باقی خطبہ مکمل فرماتے، کبھی ایسا بھی ہوتا کہ خطبے کے دوران میں کسی کو بلاتے، مثلاً: اے فلاں! بیٹھ جا، اے فلاں! نماز پڑھ، وغیرہ۔ خطبے سے متعلق سامعین میں سے اگر کوئی شخص سوال کرتا تو اس کا جواب دیتے۔ آپؐ کے بعض خطبے تو ایسے ہیں جو شروع سے آخر تک سوالات و جوابات ہی پر مشتمل ہیں۔

مدینہ میں ابتدائی دَور میں آپؐ مسجد نبویؐ میں کھجور کے ایک تنے کے ساتھ ٹیک لگا کر خطبہ ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ روایات میں آتا ہے کہ آپؐ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ اب کھڑا رہنا مجھے تکلیف دیتا ہے۔ اس پر حضرت تمیم داریؓ نے مشورہ دیا کہ ایک منبر بنوا لیا جائے، جیسا کہ ملک شام میں ہوتا ہے۔ آپؐ نے دوسرے صحابہؓ کی رائے معلوم کی تو سب نے اتفاق کیا۔ حضرت عباسؓ نے کہا: میرا ایک غلام ہے جس کا نام کِلاب ہے، وہ بڑھئی کے کام میں بہت ہوشیار ہے۔ آپؐ نے فرمایا: اچھا، اس سے کہو کہ منبر تیار کر کے لائے۔ چنانچہ وہ جنگل سے لکڑی کاٹ لایا، اس کے تختے تیار کیے اور پھر اُن سے منبر بنایا۔ اس کے دو زینے تھے، اس کے بعد تیسری بیٹھنے کی جگہ تھی۔ یہ منبر مسجد نبویؐ میں لایا گیا، اور اس جگہ رکھ دیا گیا جہاں آپؐ خطبہ

ارشاد فرمایا کرتے تھے' اور وُہ خشک تنا وہاں سے ہٹا کر ایک طرف رکھ دیا گیا۔ آپؐ اس منبر پر تشریف فرما ہُوئے۔ روایات میں آتا ہے کہ جب آپؐ نے خطبہ شروع کیا تو لوگوں نے گریہ کی آواز سُنی۔ معلوم ہُوا وہ کھجور کا تنا رو رہا ہے، کیونکہ اب اسے رسول اللہؐ کا قُرب حاصل نہیں رہا۔ اس کے گریے میں بچّوں کی سی بے تابی تھی۔ آپؐ منبر سے اُترے اور اُسے چمٹا لیا۔ وہ خاموش ہوگیا۔ بعد ازاں آپؐ نے اسے منبر تلے دفن کرا دیا۔

آنحضورؐ کے خطبے عموماً مختصر ہوتے تھے۔ آپؐ کا فرمان ہے کہ عقلمندی یہ ہے کہ خطبہ مختصر اور نماز طویل ہو۔ مختصر خطبات سے آپؐ کی قادر الکلامی ظاہر ہوتی ہے، اسی لیے آپؐ نے فرمایا :

بُعِثْتُ بِجَوَامِعِ الْکَلِمِ ۝ مجھے جامع کلمات کے ساتھ بھیجا گیا ہے۔

آپؐ کے جامع کلمات اپنی بلاغت، معانی کی وسعت و ہمہ گیری اور حکمت و دانش کا مرقع ہیں اور اس اعتبار سے اقوال زرّیں کی حیثیت رکھتے ہیں ـــــ لیکن کبھی کبھی آپؐ طویل خطبہ بھی ارشاد فرماتے۔ مسلم شریف کی روایت ہے کہ حضرت عمرو بن اخطب انصاری فرماتے ہیں کہ رسول اللہؐ ایک دن صبح کی نماز پڑھاتے ہی منبر پر تشریف ہوئے اور مغرب تک نماز کے وقفوں کے علاوہ مسلسل خطبہ دیا اور اس میں وہ باتیں بتائیں جو قیامت تک پیش آنے والی ہیں۔

مجموعی حیثیت سے آپؐ کے طویل و مختصر خطبات فصاحت و بلاغت کا بہترین نمونہ ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ایک دفعہ فرمایا کہ میں نے عرب کے بہت سے لوگوں کی باتیں سُنی ہیں مگر حضورؐ سے زیادہ فصیح زبان والا مَیں نے نہیں دیکھا۔ خود آپؐ کا قول ہے :

اَنَا اَفْصَحُ الْعَرَب ۔ میں عرب کا فصیح ترین شخص ہُوں۔

یُوں تو آپؐ کا ہر خطبہ ہی فصاحت کا عمدہ نمونہ ہے لیکن بعض خطبے خصوصی طور پر یادگار حیثیت رکھتے ہیں، مثلاً فتحِ مکّہ کا خطبہ۔ اسی طرح حجۃ الوداع کا خطبہ وغیرہ ـــــ غزوۂ حُنین کے موقع پر مالِ غنیمت کا بیشتر حصّہ نومسلم مہاجروں کو دے دیا گیا تاکہ ان کی تالیفِ قلب ہو۔ اس پر بعض انصاری نوجوانوں کو کسی قدر رنج ہوا۔ آپؐ نے اس موقع پر ان کے سامنے ایسا پُر تاثیر خطبہ دیا کہ انصاریوں کی ڈاڑھیاں آنسوؤں سے تر ہوگئیں ـــ آپؐ کے اکثر خطبات کی اثر انگیزی کا یہ عالم تھا کہ صحابہؓ کے دل بھر آتے، اُن پر رقت طاری ہوجاتی اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہوجاتے۔ حضرت اسماؓ بنتِ ابی بکرؓ کا بیان ہے کہ ایک بار آنحضورؐ نے اپنے خطبے میں قبر کی آزمائشوں کو تفصیل سے بیان کیا، لوگ اس خطبے کو سُن کر چیخ اُٹھے ـــــ بعض اوقات جب فضا میں اشتعال ہوتا اور لوگ عداوت میں ایک دوسرے کو مرنے مارنے پر تُلے نظر آتے تو آپؐ مختصر خطاب فرماتے، جس سے پوری فضا بدل جاتی اور دلوں پر اشتعال کے بجائے اخوت و محبت کی کیفیت طاری ہوجاتی۔

آنحضورؐ کے یہ خطبات فصاحت و بلاغت اور تاثیر انگیزی سے قطع نظر اپنی معنوی اہمیت کی بنا پر بھی تاریخِ انسانی میں بہترین فکری ورثے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

آپؐ نے مختلف مواقع پر بے شمار خطبات ارشاد فرمائے، مگر یہ سب خطبے اوّل تا آخر، مکمل صورت میں کتابوں میں

نہیں ملتے۔ احادیث کے مجموعوں میں بالعموم خطباتِ نبویؐ کے متفرق اور مختلف ٹکڑے ملتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہر راوی نے اپنی اپنی پسند یا ضرورت کی بات بیان کی ہے۔

○

یہاں آنحضورؐ کے خطبات کا ایک انتخاب پیش کیا جا رہا ہے۔ خطباتِ نبویؐ کا یہ انتخاب آپؐ کے طویل و مختصر خطبوں پر مشتمل ہے۔ اور اس کا تعلق متنوع موضوعات و مسائل سے ہے ——— یہ خطبے مختلف کتابوں سے لیے گئے ہیں۔ عربی خطبات کے جو اردو ترجمے ملتے ہیں ان کی صحت کے بارے میں اطمینان نہ تھا۔ چنانچہ پروفیسر عبدالرشید ارشد صاحب نے آیندہ صفحات میں پیش کیے جانے والے جملہ خطبات کے اردو ترجمے پر نظرِ ثانی کی ہے، اور بعض خطبوں کا از سرِ نو ترجمہ کیا ہے۔

ڈاکٹر محمد رفیع الدین ہاشمی

———————

۱

کوہِ صفا کا خطبہ

سورہ شعراء کی یہ آیت نازل ہوئی :

وَ اَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ (اور اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈرائیے)

تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عربوں کی روایت کے مطابق کوہِ صفا پر چڑھ کر قریش کو پکارا "لوگو! دوڑو"۔ اہلِ مکہ گھبرا گئے اور اُس طرف لپکے۔ عموماً کسی ایمرجنسی کے موقع پر اس طرح لوگوں کو جمع کیا جاتا تھا۔ لوگ جمع ہو گئے تو آپؐ نے فرمایا:[1]

يَا بَنِيْ فُلَانٍ، يَا بَنِيْ فُلَانٍ، يَا بَنِيْ فُلَانٍ، يَا بَنِيْ عَبْدِ مُنَافٍ، يَا بَنِيْ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ اَرَاَيْتُكُمْ لَوْ اَخْبَرْتُكُمْ اَنَّ خَيْلًا تَخْرُجُ بِسَفْحِ هٰذَا الْجَبَلِ اَكُنْتُمْ مُصَدِّقِيَّ؟ قَالُوْا مَا جَرَّبْنَا عَلَيْكَ كَذِبًا فَقَالَ يَا بَنِيْ كَعْبِ ابْنِ لُوَيٍّ اَنْقِذُوْا اَنْفُسَكُمْ مِنَ النَّارِ ۝ يَا بَنِيْ مُرَّةَ ابْنِ كَعْبٍ اَنْقِذُوْا اَنْفُسَكُمْ مِنَ النَّارِ ۝ يَا بَنِيْ عَبْدِ شَمْسٍ اَنْقِذُوْا اَنْفُسَكُمْ مِنَ النَّارِ ۝ يَا بَنِيْ عَبْدِ مُنَافٍ اَنْقِذُوْا اَنْفُسَكُمْ مِنَ النَّارِ ۝ يَا بَنِيْ هَاشِمٍ اَنْقِذُوْا اَنْفُسَكُمْ مِنَ النَّارِ ۝ يَا بَنِيْ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ اَنْقِذُوْا اَنْفُسَكُمْ مِنَ النَّارِ ۝ يَا فَاطِمَةُ اَنْقِذِيْ نَفْسَكِ مِنَ النَّارِ ۝ فَاِنِّيْ لَا اَمْلِكُ لَكُمْ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا ۝ غَيْرَ اَنَّ لَكُمْ رَحِمًا سَاَبُلُّهَا بِبِلَالِهَا ۝ وَفِيْ رِوَايَةٍ يَا فَاطِمَةُ بِنْتَ مُحَمَّدٍ ۝ يَا صَفِيَّةُ بِنْتَ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ ۝ يَا بَنِيْ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ ۝ يَا عَبَّاسَ ابْنَ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ لَا اَمْلِكُ لَكُمْ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا ۝ سَلُوْنِيْ مِنْ مَالِيْ مَا شِئْتُمْ ۝ يَا مَعْشَرَ قُرَيْشٍ اِشْتَرُوْا اَنْفُسَكُمْ مِنَ اللّٰهِ لَا اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا ۝ اِنِّيْ نَذِيْرٌ لَكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ ۝ اِنَّمَا مَثَلِيْ وَمَثَلُكُمْ كَمَثَلِ رَجُلٍ رَاَى الْعَدُوَّ فَانْطَلَقَ يَرْبَاُ اَهْلَهٗ ۝ فَخَشِيَ اَنْ يَّسْبِقُوْهُ فَجَعَلَ يَهْتِفُ يَا صَبَاحَاهُ ۝

(اے فلاں کی اولاد، اے فلاں کی اولاد، اے فلاں کی اولاد، اے عبدِ مناف کی اولاد، اے عبد المطلب کی اولاد، کیا خیال ہے اگر میں تمھیں یہ بتاؤں کہ اس پہاڑ کے دامن میں سواروں کا ایک لشکر آ نکلا ہے تو تم مجھے سچا سمجھو گے؟ سب نے کہا ہمیں آپ سے کبھی جھوٹ کا تجربہ نہیں ہوا۔ اس پر آپ نے فرمایا:

---

[1] اس خطبے کے الفاظ مختلف حدیثوں میں بکھرے ہوئے ہیں، یہاں انھیں جمع کر دیا گیا ہے۔

اے کعب بن لوی کی اولاد! اپنے تئیں جہنم کی آگ سے بچالو۔ اے مرہ بن کعب! تم بھی خود کو دوزخ کی آگ سے بچالو۔ اے اولادِ عبد شمس! تم بھی خود کو آتشِ دوزخ سے بچالو۔ اے عبدِ مناف کے خاندان والو! تم بھی اپنے تئیں آگ سے بچالو۔ اے بنو ہاشم! تم بھی خود کو آگ سے بچاؤ، اے عبد المطلب کے اہلِ خاندان! اپنے آپ کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ۔ اے میری پیاری بچی فاطمہؓ! تم بھی اپنے تئیں دوزخ سے بچالو کیونکہ میں تمہارے لئے اللہ کی طرف سے کسی چیز کا مختار نہیں ہوں بجز اس کے کہ میری تم سے قرابت داری ہے تو میں اس کا حق ادا کرتا رہوں گا۔ ایک روایت میں ہے (آپ نے فرمایا) اے فاطمہ بنت محمد! اے صفیہ بنت عبد المطلب، اے بنی عبد المطلب، اے عباس بن عبد المطلب! میں تمہارے لئے اللہ کی طرف سے کسی چیز کا مختار نہیں ہوں بجز اس کے کہ میری تم سے قرابت داری ہے۔ سو میں اس کا حق ادا کرتا رہوں گا۔ البتہ میرے مال میں سے جتنا چاہو مانگ لو۔ اے گروہِ قریش! اپنی جانیں اللہ سے خرید لو، میں اللہ کی کسی چیز سے تمہیں مستغنی نہیں کر سکتا۔ میں تو ایک سخت عذاب سے پہلے تمہیں اس سے ڈرانے والا ہوں۔ میری اور تمہاری مثال اس شخص کی سی ہے جس نے دشمن کو دیکھ لیا ہو اور وہ اپنے اہلِ خاندان کا دیدبان بن جائے، اسے خدشہ محسوس ہو کہ وہ (اہلِ خاندان) دشمن کی طرف بڑھ جائیں گے۔ چنانچہ وہ پکارنے لگے، لوگو! ہوشیار ہو جاؤ)

اس مجمع میں ابولہب بھی موجود تھا، حضورؐ کے ارشادات سن کر وہ بہت سیخ پا ہوا آپؐ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا: تیرا برا ہو، تو ہلاک ہو، کیا تُو نے ہمیں اس لئے جمع کیا تھا!" اسی طرح اول فول بکتا ہوا وہ وہاں سے چلا گیا۔ آپؐ نے اس کا جواب نہیں دیا بعد ازاں سورۂ لہب نازل ہوئی جس میں ابولہب اور اس کی بیوی کو عذاب کی وعید سنائی گئی۔

۲

صفاتِ باری تعالیٰ

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ ایک بار رسولِ خدا کھڑے ہوئے اور آپؐ نے اللہ تعالیٰ کی پانچ صفات بیان کیں۔ فرمایا:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَنَامُ وَلَا یَنْبَغِیْ لَہٗٓ اَنْ یَّنَامَ یَخْفِضُ الْقِسْطَ وَیَرْفَعُہٗ یُرْفَعُ اِلَیْہِ عَمَلُ اللَّیْلِ قَبْلَ عَمَلِ النَّھَارِ وَعَمَلُ النَّھَارِ قَبْلَ عَمَلِ اللَّیْلِ حِجَابُہُ النُّوْرُ ؀ (وَفِیْ رِوَایَۃِ اَبِیْ بَکْرٍ النَّارُ) لَوْ کَشَفَہٗ لَاَحْرَقَتْ سُبُحَاتُ وَجْھِہٖ مَا انْتَھٰی اِلَیْہِ بَصَرُہٗ مِنْ خَلْقِہٖ۔ (مسلم شریف)

(اللہ تعالیٰ سوتا نہیں اور نہ یہ اس کے لیے مناسب ہے کہ وہ سوئے۔ وہ میزان کو جھکا دیتا ہے اور اونچا کر دیتا ہے (جس کے لئے چاہے) رات کے اعمال دن کے اعمال سے پہلے اس کے پاس پہنچائے جاتے ہیں اور دن کے اعمال رات کے اعمال سے پہلے اس کے پاس پہنچائے جاتے ہیں۔ اس کا حجاب نور ہے (ابوبکر کی روایت میں ہے کہ نار ہے) اگر وہ حجاب ہٹا دے تو اس کے چہرے کی تجلیاں جہاں جہاں تک اس کی نگاہ پہنچتی ہے تمام مخلوق کو جلا دیں)

۳

اسلام کیا ہے؟

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِنَّمَا هُمَا اثْنَتَانِ ٥ اَلْكَلَامُ وَالْهَدْيُ ٥ فَاَحْسَنُ الْكَلَامِ كَلَامُ اللهِ ٥ وَاَحْسَنُ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ ٥ اَلَا وَاِيَّاكُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْاُمُوْرِ ٥ فَاِنَّ شَرَّ الْاُمُوْرِ مُحْدَثَاتُهَا ٥ وَكُلُّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ ٥ وَكُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ ٥ اَلَا لَا يَطُوْلَنَّ عَلَيْكُمُ الْاَمَدُ فَتَقْسُوْا قُلُوْبُكُمْ ٥ اَلَا اِنَّ مَا هُوَ اٰتٍ قَرِيْبٌ ٥ اِنَّمَا الْبَعِيْدُ مَا لَيْسَ بِاٰتٍ ٥ اَلَا اِنَّمَا الشَّقِيُّ مَنْ شَقِيَ فِيْ بَطْنِ اُمِّهٖ ٥ وَالسَّعِيْدُ مَنْ وُّعِظَ بِغَيْرِهٖ ٥ اَلَا اِنَّ قِتَالَ الْمُؤْمِنِ كُفْرٌ ٥ وَسِبَابُهٗ فُسُوْقٌ ٥ وَلَا يَحِلُّ لِمُسْلِمٍ اَنْ يَّهْجُرَ اَخَاهُ فَوْقَ ثَلَاثٍ ٥ اَلَا وَاِيَّاكُمْ وَالْكَذِبَ ٥ فَاِنَّ الْكَذِبَ لَا يَصْلُحُ بِالْجِدِّ وَلَا بِالْهَزْلِ ٥ وَلَا يَعِدُ الرَّجُلُ صَبِيَّهٗ ثُمَّ لَا يَفِيْ لَهٗ ٥ فَاِنَّ الْكَذِبَ يَهْدِيْ اِلَى الْفُجُوْرِ ٥ وَاِنَّ الْفُجُوْرَ يَهْدِيْ اِلَى النَّارِ ٥ وَاِنَّ الصِّدْقَ يَهْدِيْ اِلَى الْبِرِّ ٥ وَاِنَّ الْبِرَّ يَهْدِيْ اِلَى الْجَنَّةِ ٥ وَاِنَّهٗ يُقَالُ لِلصَّادِقِ صَدَقَ وَبَرَّ ٥ وَيُقَالُ لِلْكَاذِبِ كَذَبَ وَفَجَرَ ٥ اَلَا وَاِنَّ الْعَبْدَ يَكْذِبُ حَتّٰى يُكْتَبَ عِنْدَ اللهِ كَذَّابًا ٥ (ابنِ ماجہ)

(اصل اور جڑ اسلام کی صرف دو چیزیں ہی ہیں، ایک کلام دوسرے طریقہ، سب سے عمدہ کلام اللہ کا کلام ہے اور سب سے بہتر طریقہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ہے۔ خبردار (دین میں) گھڑی ہوئی باتوں (پر عمل کرنے) سے بچو کیونکہ جو کام میرے دین میں نئے نکلیں وہ تمام بُرے کاموں سے زیادہ بُرے کام ہیں اور ہر نیا کام بدعت ہے اور ہر بدعت نری گمراہی ہے۔ دیکھو ایسا نہ ہو کہ زمانہ گزرنے کے ساتھ تمہارے دل سخت ہوتے جائیں۔ جو چیز آنے والی ہے وہ قریب ہے اور وہ دُور ہے جو آنے والی نہیں ہے۔ بُرا وُہ ہے جو ماں کے پیٹ سے ہی بُرا بن کر پیدا ہو۔ بھلا آدمی وُہ ہے جو دوسروں سے عبرت حاصل کرے۔ یاد رکھو مومن سے لڑنا کفر ہے اور مومن کو گالی دینا فسق ہے۔ کسی مومن کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے (مسلمان) بھائی سے تین دن سے زیادہ (بول چال) چھوڑے رکھے۔ خبردار! جھُوٹ سے بہرحال بچو کیونکہ جھوٹ بولنا ارادتاً درست ہے نہ مذاق میں۔ کوئی شخص اپنے بچے سے بھی ایسا وعدہ نہ کرے جسے وہ پورا نہ کرے کیونکہ جھوٹ گناہ کی طرف لے جاتا ہے اور گناہ جہنم کی طرف لے جاتے ہیں۔ سچ نیکی کی طرف لے جاتا ہے اور نیکی جنت کی طرف لے جاتی ہے۔ سچے شخص کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے سچ بولا اور نیکی کی۔ جبکہ جھُوٹے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے جھوٹ بولا اور گناہ کیا۔ خبردار! بندہ جھُوٹ بولتا چلا جاتا ہے حتّٰی کہ اللہ کے ہاں وہ کذّاب لکھ دیا جاتا ہے۔

۴

صراطِ مستقیم

رسولؐ خدا نے مدینہ میں داخل ہونے کے بعد وہاں کے پہلے جمعہ میں مندرجہ ذیل خطبہ ارشاد فرمایا :

الحمد للہ ○ احمدہ واستعینہ واستغفرہ واستھدیہ ○ واومن بہ ولا اکفرہ واعادی من یکفرہ ○ و
اشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ○ وان محمدا عبدہ ورسولہ ○ ارسلہ بالھدی والنور والموعظۃ ○
علی فترۃ من الرسل ○ وقلۃ من العلم وضلالۃ من الناس ○ وانقطاع من الزمان ودنو من الساعۃ ○ وقرب
من الاجل ○ من یطع اللہ ورسولہ فقد رشد ○ ومن یعصھما فقد غوی وفرط وضل ضلالا بعیدا ○ اوصیکم بتقوی
اللہ ○ فانہ خیر ما اوصی بہ المسلم المسلم ان یحضہ علی الاخرۃ وان یامر بتقوی اللہ ○ فاحذروا ما حذرکم اللہ
من نفسہ ○ ولا افضل من ذلک نصیحۃ ولا افضل من ذلک ذکرا ○ وان تقوی اللہ لمن عمل بہ علی وجل ومخافۃ
من ربہ عون صدق علی ما تبغون من امر الاخرۃ ○ ومن یصلح الذی بینہ وبین اللہ من امرہ فی السر والعلانیۃ
لا ینوی بذلک الا وجہ اللہ یکن لہ ذکرا فی عاجل امرہ ○ وذخرا فی ما بعد الموت ○ حین یفتقر المرء الی ما قدم ○
وما کان من سوی ذلک یود لو ان بینہ وبینہ امدا بعیدا ویحذرکم اللہ نفسہ واللہ رءوف بالعباد ○ والذی
صدق قولہ وانجز وعدہ لا خلف لذلک ○ فانہ یقول عز وجل ۔ ما یبدل القول لدی وما انا بظلام للعبید ○
فاتقوا اللہ فی عاجل امرکم واجلہ فی السر والعلانیۃ فانہ من یتق اللہ یکفر عنہ سیاتہ ویعظم لہ اجرا ○ ومن یتق
اللہ فقد فاز فوزا عظیما ○ وان تقوی اللہ یوقی مقتہ ویوقی عقوبتہ ویوقی سخطہ ○ وان تقوی اللہ یبیض الوجوہ
ویرضی الرب ویرفع الدرجۃ ○ خذوا بحظکم ولا تفرطوا بجنب اللہ ○ وقد علمکم اللہ کتابہ ○ ونھج لکم سبیلہ ○
لیعلم الذین صدقوا ویعلم الکاذبین ○ فاحسنوا کما احسن اللہ الیکم وعادوا اعداءہ ○ وجاھدوا فی اللہ حق
جہادہ ھو اجتبکم وسمکم المسلمین ○ لیھلک من ھلک عن بینۃ ویحیی من حی عن بینۃ ○ ولا قوۃ الا باللہ ○ فاکثروا ذکر اللہ ○
واعملوا لما بعد الیوم ○ فانہ من یصلح ما بینہ وبین اللہ یکفہ اللہ ما بینہ وبین الناس ○ ذلک بان اللہ
یقضی علی الناس ○ ولا یقضون علیہ ○ ویملک من الناس ○ ولا یملکون منہ ○ اللہ اکبر ○ ولا قوۃ الا باللہ
العظیم ○ (طبری ۔ قرطبی ۔ مواہب اللدنیہ)

(تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں میں اس کی تعریف کرتا ہوں اور اسی سے مدد اور بخشش اور رہنمائی چاہتا ہوں ۔ میرا ایمان اسی پر ہے ۔ میں اس کی نافرمانی نہیں کرتا اور نافرمانی کرنے والوں سے عداوت رکھتا ہوں ۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ سوا خدا کے

کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے وہ یکتا ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ محمدؐ اس کے بندے اور رسول ہیں جن کو اس نے ہدایت، نور اور نصیحت دے کر اس وقت بھیجا جب مدتوں سے نبیوں کی آمد کا سلسلہ بند تھا۔ علم گھٹ گیا تھا اور لوگ گمراہ ہو گئے تھے۔ طویل عرصہ گزر گیا تھا۔ قیامت قریب تھی اور اجل سر پر منڈلا رہی تھی۔ جس نے خدا اور رسول کی اطاعت کی وہ کامیاب ہوا اور جس نے ان دونوں کی نافرمانی کی وہی گمراہ ہوا، درجہ سے گرا اور دُور کی گمراہی میں مبتلا ہوا۔

میں تم کو اللہ سے ڈرنے کی وصیت کرتا ہوں اور بہترین تاکید وہ ہے جو ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو آخرت کے لئے آمادہ کرے اور اللہ سے ڈرتے کا حکم دے۔ حق تعالیٰ سے ڈرتے رہو، جیسے کہ خود اس نے تمہیں اپنی ذات سے ڈرتے رہنے کی ہدایت فرمائی ہے، نہ تو اس سے بڑھ کر کوئی نصیحت ہے، نہ اس سے افضل کوئی ذکر ہے، جان لو کہ آخرت کی جن بھلائیوں کے تم امیدوار ہو وہ سب موقوف ہیں اُن نیک اعمال پر جو تم خوفِ خدا اور تقوٰی سے بجالاؤ۔ اور جو شخص صرف رضائے الٰہی کی جستجو میں اپنے ان تمام کاموں اور ارادوں کی اصلاح کرے جو اُس کے اور خدا کے درمیان ہیں خواہ وہ پوشیدہ امور ہوں خواہ ظاہری۔ تو رب العالمین اُسے دنیا میں نیک نام نیک انجام کر دے گا اور آخرت میں بھی اُسے نیکیوں کا ذخیرہ عطا فرمائے گا۔ یہی وُہ وقت ہوگا جب انسان اپنی نیکیوں کا سخت ترمحتاج ہوگا اور نیکیوں کے سوا اور اعمال سے اُسے اس روز اس قدر نفرت ہوگی کہ کہے گا کاش کہ میرے اور ان نکمّے اعمال کے درمیان بعید و غایت فاصلہ اور دُوری ہوتی جناب باری تبارک و تعالیٰ تمہیں خود اپنی ذات گرامی سے ڈرا رہا ہے۔ اللہ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے۔ جس نے اس کی بات کو سچ جانا اور اس کا وعدہ پُورا کیا اس کے لئے اس کے خلاف نہ کیا جائے گا کیونکہ اللہ عزّوجلّ کا فرمان ہے کہ میرے ہاں کی باتیں بدلتی نہیں، اور نہ میں اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا ہوں۔ پس اللہ رب العزت سے ڈرو دنیوی معاملات میں بھی اور اُخروی معاملات میں بھی، پوشیدہ بھی اور اعلانیہ بھی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ سے جو ڈرے گا اللہ تعالیٰ اس کے گناہ معاف فرما دے گا اور اس کے اجر کو بڑھا دے گا۔ جو اللہ سے ڈرا اس نے عظیم کامیابی حاصل کر لی۔ اللہ کا ڈر، اس کی بیزاری، اس کے عذاب اور اس کی ناراضگی کو دُور کر دیتا ہے اور اللہ کا ڈر چہرے کو منور کر دیتا ہے رب کو راضی کر دیتا ہے درجات کو بلند کر دیتا ہے اپنا حصہ لے لو۔ خدا کی قربت حاصل کرنے میں کمی نہ کرو۔ اس نے اپنی پاک کتاب تمہیں سکھا دی۔ تمہارے لئے ہدایت کا راستہ کھول دیا؛ تاکہ وُہ جان لے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون ہیں۔ جس طرح خدا نے تمہارے ساتھ احسان و سلوک کیا ہے تم بھی احسان و سلوک کا رویہ اختیار کرو۔ اللہ کے دشمنوں سے دشمنی رکھو۔ راہِ خدا میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے۔ اسی نے تمہیں برگزیدہ بنایا ہے اسی نے تمہارا نام مسلم رکھا ہے، تاکہ ہر ہلاک ہونے والا دلائل دیکھ لینے کے بعد ہلاک ہو اور ہر زندگی حاصل کرنے والا بھی دلائل کے ساتھ زندہ رہے۔ قوت صرف اللہ ہی کی ہے۔ اللہ کا ذکر بکثرت کیا کرو۔ موت کے بعد کام آئیں وہ اعمال کر لو جو اللہ تعالیٰ کے اور اپنے درمیان کے تعلقات سنوار لے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے اور لوگوں کے تعلقات سنوار دے گا۔ کیونکہ خدائے بزرگ و برتر کی لوگوں پر چلتی ہے، لوگوں کی اس پر نہیں چلتی۔ وہ تمام مخلوق پر حاکم اور سب کا مالک ہے مگر وہ اس کی کسی چیز پر اختیار نہیں رکھتے۔ اللہ تعالیٰ سب سے بڑا ہے اور تمام قوتیں اور طاقتیں اسی خدائے بزرگ و برتر کی ہیں۔

۵

کلامِ الٰہی

حضرت محمد بن اسحاق رضؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا نے مدینہ پہنچنے پر مندرجہ ذیل خطبہ ارشاد فرمایا:

اِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰہِ اَحْمَدُہٗ وَاَسْتَعِیْنُہٗ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَاَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْكَ لَہٗ۔ اِنَّ اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ کِتٰبُ اللّٰہِ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَیَّنَہُ اللّٰہُ فِیْ قَلْبِہٖ وَاَدْخَلَہٗ فِی الْاِسْلَامِ بَعْدَ الْکُفْرِ وَاخْتَارَہٗ عَلٰی مَا سِوَاہُ مِنْ اَحَادِیْثِ النَّاسِ۔ اِنَّہٗ اَصْدَقُ الْحَدِیْثِ وَاَبْلَغُہٗ اَحِبُّوْا مَنْ اَحَبَّ اللّٰہَ۔ وَاَحِبُّوا اللّٰہَ مِنْ کُلِّ قُلُوْبِکُمْ وَلَا تَمَلُّوْا کَلَامَ اللّٰہِ وَذِکْرَہٗ وَلَا تَقْسُ عَنْہُ قُلُوْبُکُمْ اُعْبُدُوا اللّٰہَ وَلَا تُشْرِکُوْا بِہٖ شَیْئًا۔ اِتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقَاتِہٖ وَصَدِّقُوْا صَالِحَ مَا تَعْمَلُوْنَ بِاَفْوَاھِکُمْ وَتَحَابُّوْا بِرُوْحِ اللّٰہِ بَیْنَکُمْ۔ وَالسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ ۝ (اعجاز القرآن)

بے شک تعریف اللہ کے لئے ہے۔ میں اس کی تعریف کرتا ہوں اور اس سے مدد کا طالب ہوں اور ہم سب اس کے دامن میں اپنی نفسانی شرارتوں اور عمل کی خرابیوں سے پناہ چاہتے ہیں۔ جس کو اللہ ہدایت دے اسے کوئی گمراہ نہیں کر سکتا اور جسے اللہ راہِ راست پر نہ لائے اس کی راہنمائی کرنے والا کوئی نہیں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ وحدہٗ لاشریک ہے۔ سب سے بہتر کلام اللہ کی کتاب ہے جس کے دل میں اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کے محاسن آراستہ کئے۔ اور کفر کے بعد اس کو اسلام میں داخل ہونے کی توفیق دی اور انسانی باتیں چھوڑ کر اس نے اللہ کا کلام پسند کیا وہ بلا شبہ کامیاب ہوا کیونکہ اللہ کا کلام سب سے سچا اور زیادہ پُر اثر ہے۔ جو اُسے دوست رکھتا ہے اُسے تم بھی دوست رکھو اور اللہ کے ساتھ دلی محبت پیدا کرو اور اس کا کلام پڑھنے اور نام لینے سے ملول نہ ہو۔ نہ تمہارے دل اس کی طرف سے سخت ہوں۔ پس اللہ ہی کی عبادت کرو۔ کسی کو اس کا شریک نہ بناؤ۔ اس سے پورا پورا ڈرتے رہو اور اپنے نیک اعمال کی تصدیق زبان سے کیا کرو (زبان کو قابو میں رکھو) اور رحمتِ خداوندی کے واسطہ سے آپس میں پیار و محبت سے رہو۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔

۶

نماز

حضرت اشعریؓ کہتے ہیں کہ ایک بار رسولِ خدا نے ہمیں خطاب فرمایا، جس میں سُنتوں کی تعلیم دی اور نماز (کے طریقے) کی وضاحت فرمائی۔ آپؐ نے اس خطبے میں ارشاد فرمایا:

إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلٰوةِ فَاَقِيمُوا صُفُوفَكُمْ۔ ثُمَّ لِيَؤُمَّكُمْ اَحَدُكُمْ۔ فَإِذَا كَبَّرَ فَكَبِّرُوا۔ وَإِذَا قَالَ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ٥ فَقُولُوا اٰمِيْن۔ يُجِبْكُمُ اللّٰهُ ٥ ثُمَّ إِذَا كَبَّرَ وَرَكَعَ فَكَبِّرُوا وَارْكَعُوا۔ فَإِنَّ الْإِمَامَ يَرْكَعُ قَبْلَكُمْ وَيَرْفَعُ قَبْلَكُمْ۔ قَالَ نَبِيُّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَتِلْكَ بِتِلْكَ وَإِذَا قَالَ سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ۔ فَقُولُوا اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ ٥ فَإِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ قَالَ عَلٰى لِسَانِ نَبِيِّهٖ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ۔ ثُمَّ إِذَا كَبَّرَ وَسَجَدَ فَكَبِّرُوا وَاسْجُدُوا فَإِنَّ الْإِمَامَ يَسْجُدُ قَبْلَكُمْ وَيَرْفَعُ قَبْلَكُمْ۔ قَالَ نَبِيُّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَتِلْكَ بِتِلْكَ وَإِذَا كَانَ عِنْدَ الْقَعْدَةِ فَلْيَكُنْ مِنْ قَوْلِ اَحَدِكُمْ اَنْ يَقُولَ اَلتَّحِيَّاتُ الطَّيِّبَاتُ الصَّلَوَاتُ لِلّٰهِ اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلٰى عِبَادِ اللّٰهِ الصَّالِحِيْنَ ٥ اَشْهَدُ اَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُولُهٗ ٥
(النسائی)

جب تم نماز کے لیے کھڑے ہو تو صفیں درست کر لو۔ پھر تم میں سے کوئی تمہیں نماز پڑھائے۔ وہ جب اللہ اکبر کہے تم بھی کہو جب وُہ ولا الضالین کہے تم آمین کہو اللہ تمہاری دعا قبول فرمائے گا۔ پھر جب امام تکبیر کہے اور رکوع میں جائے تم بھی تکبیر کہو اور رکوع میں جاؤ۔ امام تم سے پہلے رکوع میں جائے گا اور تم سے پہلے ہی رکوع سے سر اُٹھائے گا یہ برابر سرابر ہو جائے گا، جب وُہ سمع اللہ لمن حمدہ کہے تم اللھم ربنا لک الحمد کہو، اللہ عز وجل کا بزبانِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وعدہ ہے کہ جو حمدِ خدا کرے گا اللہ اس کی سُنے گا۔ پھر جب وہ تکبیر کہے اور سجدہ کرے تو تم بھی تکبیر کہو اور سجدہ کرو۔ امام تم سے پہلے سجدہ کرے گا اور تم سے پہلے سجدہ سے اُٹھے گا، یہ ادلا بدلا ہو جائے گا۔ جب وہ قعدہ میں بیٹھے تو تم التحیات آخر تک پڑھو۔

۷

اللہ کا ذکر اور نمازِ جمعہ

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خطبے میں ارشاد فرمایا:

یَآ اَیُّهَا النَّاسُ تُوْبُوْا اِلَی اللّٰهِ قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا ۝ وَبَادِرُوْا بِالْاَعْمَالِ الصَّالِحَةِ قَبْلَ اَنْ تُشْغَلُوْا ۝ وَصِلُوا الَّذِیْ بَیْنَكُمْ وَبَیْنَ رَبِّكُمْ بِكَثْرَةِ ذِكْرِكُمْ لَهٗ ۝ وَكَثْرَةِ الصَّدَقَةِ فِی السِّرِّ وَالْعَلَانِیَةِ تُرْزَقُوْا وَتُنْصَرُوْا وَتُجْبَرُوْا ۝ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ افْتَرَضَ عَلَیْكُمُ الْجُمُعَةَ فِیْ مَقَامِیْ هٰذَا ـ فِیْ یَوْمِیْ هٰذَا ـ فِیْ شَهْرِیْ هٰذَا ـ مِنْ عَامِیْ هٰذَا ـ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ ۝ فَمَنْ تَرَكَهَا فِیْ حَیَاتِیْ اَوْ بَعْدِیْ ـ وَلَهٗ اِمَامٌ عَادِلٌ اَوْ جَآئِرٌ ـ اِسْتِخْفَافًا بِهَا وَجُحُوْدًا بِهَا فَلَا جَمَعَ اللّٰهُ شَمْلَهٗ وَلَا بَارَكَ لَهٗ فِیْ اَمْرِهٖ اَلَا وَلَا صَلٰوةَ لَهٗ ۝ اَلَا وَلَا زَكٰوةَ لَهٗ ۝ اَلَا وَلَا حَجَّ لَهٗ ۝ اَلَا وَلَا صَوْمَ لَهٗ ۝ اَلَا وَلَا بِرَّ لَهٗ ۝ حَتّٰی یَتُوْبَ ۝ فَمَنْ تَابَ تَابَ اللّٰهُ عَلَیْهِ ۝ (ابنِ ماجہ)

لوگو! اللہ کی طرف رجوع کر لو قبل اس کے کہ تمہیں موت آجائے۔ اور نیک اعمال کی طرف بڑھو قبل اس کے کہ تمہیں فرصت نہ ملے۔ تمہارے اور تمہارے رب کے درمیان جو تعلق ہے اسے بکثرت ذکرِ خدا سے اور خفیہ اور علانیہ بکثرت صدقہ دینے سے جوڑو۔ اس سے تمہیں (زیادہ) رزق دیا جائے گا۔ (دشمن کے خلاف تمہاری مدد کی جائے گی اور تمہارے نقصانات کی تلافی کر دی جائے گی۔ جان رکھو اللہ نے میری اس جگہ میں، آج کے دن، اس سال کے اس مہینے میں قیامت تک کے لئے تم پر جمعہ فرض کر دیا ہے۔ جس نے میری زندگی میں یا میرے بعد اسے حقیر سمجھ کر اور اس کا انکار کرتے ہوئے چھوڑا، اللہ اس کا شیرازہ جمع نہ کرے اور نہ اس کے کاموں میں برکت ڈالے گا۔ آگاہ رہو کہ نہ اس کی نماز قبول ہے، آگاہ رہو کہ نہ اس کی زکوٰۃ قبول ہے، آگاہ رہو کہ نہ اس کا حج قبول ہے، آگاہ رہو کہ نہ اس کا روزہ قبول ہے، آگاہ رہو کہ نہ اس کی کوئی نیکی قبول ہے جب تک وہ توبہ نہ کرے۔ پس جو توبہ کرے اللہ اس کی توبہ قبول فرما لیتا ہے۔

۸

تاکیدِ جمعہ

غزوۂ اُحد کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کے سامنے حسب ذیل خطبہ ارشاد فرمایا:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّهُ قُذِفَ فِي قَلْبِي أَنَّ مَنْ كَانَ عَلَى حَرَامٍ فَرَغِبَ عَنْهُ ابْتِغَاءَ مَا عِنْدَ اللّٰهِ غُفِرَ لَهُ ذَنْبُهُ ۔ وَمَنْ أَحْسَنَ مِنْ مُسْلِمٍ وَكَافِرٍ وَقَعَ أَجْرُهُ عَلَى اللّٰهِ فِي عَاجِلِ دُنْيَاهُ أَوْ فِي آجِلِ آخِرَتِهِ وَمَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَعَلَيْهِ بِالْجُمُعَةِ يَوْمَ الْجُمُعَةِ ۔ إِلَّا صَبِيًّا أَوِ امْرَأَةً أَوْ مَرِيضًا أَوْ عَبْدًا مَمْلُوكًا مَنِ اسْتَغْنَى عَنْهَا اسْتَغْنَى اللّٰهُ عَنْهُ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَمِيدٌ ٥

(مجمع الزوائد)

لوگو! ابھی ابھی مجھے وحی کی گئی ہے کہ جو شخص کسی حرام کام میں مبتلا ہو پھر ثواب حاصل کرنے کی نیت سے اسے چھوڑ دے اس کے گناہ خداوند کریم معاف فرما دیتا ہے اور جو شخص کسی مومن یا کافر سے نیکی کرے وہ اپنا بدلہ ضرور پاتا ہے جلدی حاصل ہونے والی دُنیا میں یا دیر سے آنے والی آخرت میں۔ اللہ پر اور قیامت پر ایمان رکھنے والوں پر جمعہ کے دن جمعہ کی نماز فرض ہے، ہاں بچّوں پر، عورتوں پر، بیماروں پر اور غلاموں پر فرض نہیں (وہ ظہر پڑھ لیں) یاد رکھو جو جمعہ کی نماز سے بے پروائی کرے اللہ تعالیٰ بھی اس سے منہ موڑ لے گا اور اللہ تعالیٰ (سارے جہان سے) بے نیاز بے پروا اور غنی ہے اور وہی تعریفوں والا اور مستحقِ تعریف ہے۔

۹

برکاتِ جُمعہ

حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ ایک روز ہم سب صحابہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپؐ نے حسب ذیل خطبہ ارشاد فرمایا:

اَتَانِیْ جِبْرِیْلُ وَفِیْ یَدِہٖ کَالْمِرْآۃِ الْبَیْضَآءِ فِیْ وَسْطِہَا کَالنُّکْتَۃِ السَّوْدَآءِ۔ قُلْتُ یَا جِبْرِیْلُ مَا ھٰذَا قَالَ ھٰذَا یَوْمُ الْجُمُعَۃِ یَعْرِضُ عَلَیْکَ رَبُّکَ لِیَکُوْنَ لَکَ عِیْدًا وَّلِاُمَّتِکَ مِنْ بَعْدِکَ۔ قُلْتُ یَا جِبْرِیْلُ فَمَا ھٰذِہِ النُّکْتَۃُ السَّوْدَآءُ؟ قَالَ ھٰذِہِ السَّاعَۃُ وَھِیَ تَقُوْمُ فِیْ یَوْمِ الْجُمُعَۃِ وَھُوَ سَیِّدُ اَیَّامِ الدُّنْیَا وَنَحْنُ نَدْعُوْہُ فِی الْجَنَّۃِ یَوْمَ الْمَزِیْدِ۔ قُلْتُ یَا جِبْرِیْلُ وَلِمَ تَدْعُوْنَہٗ یَوْمَ الْمَزِیْدِ؟ قَالَ لِاَنَّ اللّٰہَ عَزَّ وَجَلَّ اتَّخَذَ فِی الْجَنَّۃِ وَادِیًا اَفْیَحَ مِنْ مِّسْکٍ اَبْیَضَ۔ فَاِذَا کَانَ یَوْمُ الْجُمُعَۃِ یَنْزِلُ رَبُّنَا عَلٰی کُرْسِیِّہٖ اِلٰی ذٰلِکَ الْوَادِیْ۔ وَقَدْ حُفَّ الْعَرْشُ بِمَنَابِرَ مِنْ ذَھَبٍ مُّکَلَّلَۃٍ بِالْجَوْھَرِ وَقَدْ حُفَّتْ تِلْکَ الْمَنَابِرُ بِکَرَاسِیَّ مِنْ نُّوْرٍ ثُمَّ یَاْذَنُ لِاَھْلِ الْغُرُفَاتِ فَیُقْبِلُوْنَ یَخُوْضُوْنَ کُثْبَانَ الْمِسْکِ اِلَی الرُّکَبِ عَلَیْھِمْ اَسْوِرَۃُ الذَّھَبِ وَالْفِضَّۃِ وَثِیَابُ السُّنْدُسِ وَالْحَرِیْرِ۔ حَتّٰی یَنْتَھُوْا اِلٰی ذٰلِکَ الْوَادِیْ فَاِذَا اطْمَاَنُّوْا فِیْہِ جُلُوْسًا بَعَثَ اللّٰہُ عَزَّ وَجَلَّ عَلَیْھِمْ رِیْحًا یُقَالُ لَھَا الْمُثِیْرَۃُ فَثَارَتْ یَنَابِیْعُ الْمِسْکِ الْاَبْیَضِ فِیْ وُجُوْھِھِمْ وَثِیَابِھِمْ۔ وَھُمْ یَوْمَئِذٍ جُرْدٌ مُّرْدٌ مُّکَحَّلُوْنَ اَبْنَاءُ ثَلَاثٍ وَّثَلَاثِیْنَ یَضْرِبُ جَمَالُھُمْ اِلٰی سُرَرِھِمْ عَلٰی صُوْرَۃِ اٰدَمَ یَوْمَ خَلَقَہُ اللّٰہُ عَزَّ وَجَلَّ فَیُنَادِیْ رَبُّ الْعِزَّۃِ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی رِضْوَانَ وَھُوَ خَازِنُ الْجَنَّۃِ۔ فَیَقُوْلُ یَا رِضْوَانُ ارْفَعِ الْحُجُبَ بَیْنِیْ وَبَیْنَ عِبَادِیْ وَزُوَّارِیْ۔ فَاِذَا رُفِعَ الْحُجُبُ بَیْنَہٗ وَبَیْنَھُمْ فَرَاَوْا بَھَآءَہٗ وَنُوْرَہٗ ھَبُّوْا لَہٗ سُجَّدًا فَیُنَادِیْھِمْ عَزَّ وَجَلَّ بِصَوْتِہٖ ارْفَعُوْا رُءُوْسَکُمْ۔ فَاِنَّمَا کَانَتِ الْعِبَادَۃُ فِی الدُّنْیَا۔ وَاَنْتُمُ الْیَوْمَ فِیْ دَارِ الْجَزَآءِ۔ سَلُوْنِیْ مَا شِئْتُمْ۔ فَاَنَا رَبُّکُمُ الَّذِیْ صَدَقْتُکُمْ وَعْدِیْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ فَھٰذَا مَحَلُّ کَرَامَتِیْ فَسَلُوْنِیْ مَا شِئْتُمْ۔ فَیَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا وَاَیُّ خَیْرٍ لَّمْ تَفْعَلْہُ بِنَا؟ اَلَسْتَ الَّذِیْ اَعَنْتَنَا عَلٰی سَکَرَاتِ الْمَوْتِ؟ وَاٰنَسْتَ مِنَّا الْوَحْشَۃَ فِیْ ظُلُمَاتِ الْقُبُوْرِ؟ وَاٰمَنْتَ رَوْعَتَنَا عِنْدَ النَّفْخَۃِ فِی الصُّوْرِ؟ اَلَسْتَ اَقَلْتَنَا عَثَرَاتِنَا؟ وَسَتَرْتَ عَلَیْنَا الْقَبِیْحَ مِنْ فِعْلِنَا؟ وَثَبَّتَّ عَلٰی جِسْرِ جَھَنَّمَ اَقْدَامَنَا؟ اَلَسْتَ الَّذِیْ اَدْنَیْتَنَا فِیْ جِوَارِکَ؟ وَاَسْمَعْتَنَا مِنْ لَّذَاذَۃِ مَنْطِقِکَ؟ وَتَجَلَّیْتَ لَنَا بِنُوْرِکَ؟ فَاَیُّ خَیْرٍ لَّمْ تَفْعَلْہُ بِنَا؟ وَیَعُوْدُ عَزَّ وَجَلَّ فَیَسْاَلُھُمْ بِصَوْتِہٖ فَیَقُوْلُ اَنَا رَبُّکُمُ الَّذِیْ صَدَقْتُکُمْ وَعْدِیْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ فَسَلُوْنِیْ۔ فَیَقُوْلُوْنَ نَسْاَلُکَ رِضَاکَ۔ فَیَقُوْلُ رِضَایَ عَنْکُمْ۔ اَقَلْتُکُمْ عَثَرَاتِکُمْ۔ وَسَتَرْتُ عَلَیْکُمُ الْقَبِیْحَ مِنْ اُمُوْرِکُمْ۔ وَاَدْنَیْتُ مِنِّیْ جِوَارَکُمْ۔ وَاَسْمَعْتُکُمْ لَذَاذَۃَ مَنْطِقِیْ وَتَجَلَّیْتُ لَکُمْ بِنُوْرِیْ فَھٰذَا مَحَلُّ کَرَامَتِیْ فَسَلُوْنِیْ فَیَسْاَلُوْنَہٗ حَتّٰی تَنْتَھِیَ مَسْاَلَتُھُمْ۔ ثُمَّ یَقُوْلُ عَزَّ وَجَلَّ سَلُوْنِیْ فَیَسْاَلُوْنَہٗ حَتّٰی تَنْتَھِیَ رَغْبَتُھُمْ

ثُمَّ يَقُولُ عَزَّ وَجَلَّ سَلُونِي فَيَقُولُونَ رَضِينَا رَبَّنَا وَسَلَّمْنَا ۔ فَيَزِيدُهُمْ مِّنْ مَّزِيدِ فَضْلِهٖ وَكَرَامَتِهٖ وَيَزِيدُ زَهْرَةُ الْجَنَّةِ مَا لَا عَيْنٌ رَأَتْ وَلَآ اُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَتْ عَلٰى قَلْبِ بَشَرٍ ۔ وَيَكُونُ كَذٰلِكَ حَتّٰى مِقْدَارَ تَفَرُّقِهِمْ مِّنَ الْجُمُعَةِ ۔ قَالَ اَنَسٌ فَقُلْتُ بِاَبِيْ وَاُمِّيْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا مِقْدَارُ تَفَرُّقِهِمْ ؟ قَالَ كَقَدْرِ الْجُمُعَةِ اِلَى الْجُمُعَةِ ۔ قَالَ يَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّنَا الْعِلِّيُّوْنَ مَعَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالنَّبِيُّوْنَ ثُمَّ يُؤْذَنُ لِاَهْلِ الْغُرُفَاتِ فَيَعُوْدُوْنَ اِلٰى غُرَفِهِمْ ۔ وَهُمْ غُرْفَتَانِ زُمُرَّدَتَانِ خَضْرَاوَانِ ۔ وَلَيْسُوْا اِلٰى شَيْءٍ اَشْوَقَ مِنْهُمْ اِلٰى يَوْمِ الْجُمُعَةِ ۔ لِيَنْظُرُوْا اِلٰى رَبِّهِمْ وَلِيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ وَكَرَامَتِهٖ ۔ (دارقطنی)

جبریلؑ آئے ان کے ہاتھ میں ایک سفید آئینہ سا تھا جس کے درمیان میں ایک سیاہ نقطہ سا تھا۔ میں نے پوچھا: اے جبریلؑ! یہ کیا ہے؟ فرمایا: یہ جمعہ کا دن ہے جو تم پر تمہارے رب نے پیش فرمایا ہے تاکہ یہ آپؐ کے لیے اور آپؐ کی امت کے لیے عید کا دن ہو۔ میں نے پوچھا: اے جبریلؑ! اس کے بیچ میں یہ سیاہ نکتہ سا کیا ہے؟ فرمایا: یہ قیامت ہے جو جمعہ کے دن قایم ہو گی۔ یہ جمعہ دنیا کے تمام دنوں کا سردار ہے۔ جنت میں اس کا نام انعام کا دن رکھ چھوڑا ہے۔ میں نے پوچھا: اے جبریلؑ! تم اس کو انعام کا دن کیوں کہتے ہو؟ فرمایا: اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے جنت میں ایک وادی کو منتخب اور پسند کیا ہے جو سفید کستوری سے زیادہ خوشبو دار ہے جمعہ کے دن اللہ تعالیٰ اس وادی کی طرف ایک کرسی پر نزول فرماتا ہے اور عرش سونے کے جواہر لگے منبروں سے گھرا ہوتا ہے اور یہ منبر نور کی کرسیوں سے گھرے ہوتے ہیں پھر اللہ تعالیٰ جنتی بالاخانے والوں کو اجازت دیتا ہے وہ مشک کے ٹیلوں میں سے گھٹنوں تک دھنستے ہوئے تشریف لاتے ہیں۔ سونے چاندی کے کنگن پہنے ہوئے ریشمی اعلیٰ لباس زیب تن کیے ہوئے حتیٰ کہ اس وادی میں پہنچ جاتے ہیں۔ یہاں پہنچ کر جب بآرام بیٹھ جاتے ہیں تو مثیرہ نامی بادِ صبا چلتی ہے ان کے کپڑوں اور جسم سے سفید مشک کے فوارے پھوٹ نکلتے ہیں۔ ان کے چہرے صاف ہوتے ہیں ان کی آنکھیں سرمگیں ہوتی ہیں۔ یہ تینتیس۳۳ سالہ نوجوان ہوتے ہیں۔ ان کی صورتیں حضرت آدمؑ کی اس صورت پر ہوتی ہیں جو صورت ان کی اس دن تھی جب اللہ تعالیٰ نے انہیں پیدا کیا تھا۔ اب جناب باری تبارک و تعالیٰ رضوان کو جو داروغۂ جنت ہے بلاتا ہے اسے حکم دیتا ہے کہ میرے اور میرے بندوں اور میری زیارت کرنے والوں کے درمیان سے حجاب اٹھا دو۔ حجاب کے دُور ہوتے ہی خداوندی نور اور تازگی انہیں نظر آتی ہے چاہتے ہیں کہ سجدے میں گر پڑیں۔ اسی وقت جناب باری تعالیٰ فرماتا ہے بس سجدہ سے سر اٹھاؤ عبادت کی جگہ دنیا تھی اب یہ آخرت تو بدلے کا گھر ہے تمہیں جو کچھ مانگنا ہو مجھ سے مانگو میں تمہارا رب ہوں میں نے اپنے وعدے تم سے سچ کر دئے۔ تم پر اپنی بھرپور نعمتیں عطا فرمائیں۔ یہ تمہاری عزت افزائی کا مقام ہے اب جو تم چاہو مجھ سے مانگو۔ جنتی حضرات جواب دیتے ہیں کہ پروردگار! کون سی بھلائی ہے جو تُو نے ہمارے ساتھ نہیں کی! تُو نے ہم پر سکراتِ موت آسان کر دی، تُو نے ہماری قبر کی تنہائی اور اندھیروں میں ہماری وحشت دُور کر دی۔ صور کے پھونکنے کے وقت تُو نے ہمیں گھبراہٹ اور پریشانی سے نجات دی۔ ہماری لغزشوں سے درگزر فرمایا۔ ہمارے عیوب کی پردہ پوشی کی۔ پل صراط پر ہمیں ثابت قدم رکھا، اپنا قرب نصیب فرمایا، اپنے پاک کلام سے ہمیں لذت آشنا کیا، اپنا نور ہم پر ظاہر فرمایا۔ کون سی بھلائی تو نے ہمارے ساتھ نہیں کی! لیکن پھر بھی انہیں اپنی آواز میں پکار کر جناب باری عزّ و جلّ یہی فرمائے گا کہ میں نے اپنے وعدے تم سے سچے کئے۔ تم پر اپنی نعمتیں بھرپور کیں۔ اب تم مجھ سے مانگو کیا مانگتے ہو؟ وہ کہیں گے: الٰہی! ہم تیری رضامندی کے طالب ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرمائے گا یہ تو تمہیں مل چکی، تمہاری لغزشیں معاف کیں۔ تمہاری برائیوں کی پردہ پوشی کی۔ تمہیں اپنا قرب نصیب فرمایا۔ تمہیں اپنی باتیں سُننے کا شرف بخشا۔ تم پر اپنے نور کا پرتو ڈالا۔ یہ ہے تمہاری عزّت افزائی کی جگہ جو میں نے تمہیں عنایت فرمائی ہے پس تم مجھ سے مانگو۔ اب یہ جنّتی اللہ تعالیٰ سے مانگیں گے اور اللہ تعالیٰ اُنہیں دے گا یہاں تک کہ اُن کی تمنّائیں سب پُوری ہو جائیں گی۔ پھر بھی اللہ عزّ وجل ان سے فرمائے گا اور مانگو۔ یہ پھر مانگیں گے حتیٰ کہ ان کی رغبت ختم ہو جائے گی۔ پھر بھی ان سے کہا جائے گا اور مانگو۔ یہ کہیں گے بس ہم راضی ہیں لیکن جناب باری تعالیٰ اپنے فضل خاص سے انہیں اور بھی مرحمت فرمائے گا اور جنّت کی تر و تازگی اس قدر بڑھا دے گا جو نہ کسی آنکھ نے دیکھی نہ کسی کان نے سُنی نہ کسی انسانی دل پر ان نعمتوں کا وہم گزرا۔ الغرض جمعہ کے دن ان کے الگ ہونے تک مزید لطف و کرم اور یہ مجلس اسی طرح ہوتی رہے گی۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: یا رسولؐ اللہ! میرے ماں باپ آپؐ پر قربان، ان کے الگ ہونے کی مقدار کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ایک جمعہ سے دوسرے جمعہ تک کے برابر۔ رب العالمین کا عرش بلند درجے کے فرشتے اٹھائے ہوئے ہوں گے جن کے ساتھ بڑے بڑے فرشتے اور انبیاء علیہم السلام ہوں گے۔ پھر ان بالاخانوں والوں کو اجازت دے دی جائے گی اور وہ اپنے زمردیں اور سبز بالاخانوں کی طرف لوٹ جائیں گے۔ انھیں جمعہ کے دن سے زیادہ کسی چیز کا شوق نہ ہوگا کہ وہ اپنے رب کی زیارت کریں تاکہ وہ ان پر مزید اپنا فضل فرمائے اور ان کی عزت افزائی فرمائے۔

۱۰

رمضان المبارک

حضرت سلمان فارسیؓ سے روایت ہے کہ ایک بار آپؐ نے ماہِ شعبان کے آخری روز خطبہ دیا جس میں آپؐ نے فرمایا:

یَا اَیُّهَا النَّاسُ قَدْ اَظَلَّکُمْ شَهْرٌ عَظِیْمٌ۔ شَهْرٌ مُّبَارَکٌ شَهْرٌ فِیْهِ لَیْلَةٌ خَیْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ جَعَلَ اللّٰهُ صِیَامَهٗ فَرِیْضَةً وَّقِیَامَ لَیْلِهٖ تَطَوُّعًا مَّنْ تَقَرَّبَ فِیْهِ بِخَصْلَةٍ مِّنَ الْخَیْرِ کَانَ کَمَنْ اَدّٰی فَرِیْضَةً فِیْمَا سِوَاهُ وَمَنْ اَدّٰی فَرِیْضَةً فِیْهِ کَانَ کَمَنْ اَدّٰی سَبْعِیْنَ فَرِیْضَةً فِیْمَا سِوَاهُ وَهُوَ شَهْرُ الصَّبْرِ وَالصَّبْرُ ثَوَابُهُ الْجَنَّةُ وَشَهْرُ الْمُوَاسَاةِ وَشَهْرٌ یُّزَادُ فِیْهِ رِزْقُ الْمُؤْمِنِ فَمَنْ فَطَّرَ فِیْهِ صَائِمًا کَانَ لَهٗ مَغْفِرَةً لِّذُنُوْبِهٖ وَعِتْقُ رَقَبَتِهٖ مِنَ النَّارِ وَکَانَ لَهٗ مِثْلُ اَجْرِهٖ مِنْ غَیْرِ اَنْ یَّنْقُصَ مِنْ اَجْرِهٖ شَیْئٌ۔

لوگو! تمہارے پاس عظمت اور برکت والا مہینہ آرہا ہے اس میں ایک ایسی رات ہے جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تم پر اس مہینہ کے روزے فرض کر دئے ہیں اور رات کا قیام نفل قرار دیا ہے۔ اس میں نفلی عبادت کا ثواب اور دنوں کی فرض عبادت کے برابر ہے اور اس میں فرض ادا کرنے والے کو اور دنوں کے ستر فرضوں کے برابر ثواب ملتا ہے۔ یہ مہینہ صبر کا ہے اور صبر کا ثواب جنت ہے۔ یہ مہینہ باہمی غمخواری اور ہمدردی کا ہے اس میں مومن کا رزق بڑھتا ہے۔ جس نے کسی روزہ دار کو افطار کرایا اُس کے گناہ بخشے جائیں گے اور آتشِ دوزخ سے نجات پائے گا اور اسی روزہ کے برابر ثواب پائے گا، بغیر اس کے کہ اس (غریب) کے ثواب سے کچھ گھٹا دیا جاتے۔

ہم نے کہا: یا رسولؐ اللہ! ہم میں سے ہر ایک کو اتنا میسّر نہیں ہوتا کہ اپنے پاس سے کسی کو افطار کرا سکیں۔ آپؐ نے فرمایا:

یُعْطِی اللّٰهُ هٰذَا الثَّوَابَ مَنْ فَطَّرَ صَائِمًا عَلٰی مُذْقَةِ لَبَنٍ اَوْ تَمْرَةٍ اَوْ شَرْبَةٍ مِّنْ مَّاءٍ۔ وَمَنْ اَشْبَعَ صَائِمًا سَقَاهُ اللّٰهُ مِنْ حَوْضِیْ شَرْبَةً لَا یَظْمَاُ حَتّٰی یَدْخُلَ الْجَنَّةَ وَهُوَ شَهْرٌ اَوَّلُهٗ رَحْمَةٌ وَّاَوْسَطُهٗ مَغْفِرَةٌ۔ وَاٰخِرُهٗ عِتْقٌ مِّنَ النَّارِ وَمَنْ خَفَّفَ عَنْ مَّمْلُوْکِهٖ فِیْهِ غَفَرَ اللّٰهُ لَهٗ وَاَعْتَقَهٗ مِنَ النَّارِ ٥ (مشکوٰۃ)

اور اللہ تعالیٰ یہ ثواب ہر اس شخص کو دے گا جو کسی روزہ دار کو فقط لسی، کھجور یا پانی کا ایک گھونٹ پلا دے۔ اور جس نے روزہ دار کو کھلا کر سیر کیا اللہ تعالیٰ اُس کو میرے حوض میں سے ایسا پانی پلائے گا کہ دخولِ جنت تک پیاسا نہیں ہوگا۔ اس مہینے کا اوّل حصہ رحمت، درمیانی حصہ مغفرت اور آخری حصہ جہنم سے چھٹکارا حاصل کرنے کا ہے۔ جو اُس مہینہ میں اپنے غلام کا کام ہلکا کرے اللہ تعالیٰ اسے بخش دے گا اور آگ سے نجات دلا دے گا۔

۱۱

انفاق فی سبیل اللہ

حضرت عدی بن حاتم بیان کرتے ہیں کہ ایک بار میں رسولِ خدا کی خدمت میں بیٹھا تھا اتنے میں کچھ لوگ آئے، جنھوں نے بالوں کے کمبل اوڑھے ہوئے تھے، وہ امداد کے مستحق معلوم ہوتے تھے۔ اُن کی غربت کے پیشِ نظر آپؐ نماز کے خطبے کے لئے کھڑے ہوئے اور ذیل کا خطبہ ارشاد فرمایا:

اَيُّهَا النَّاسُ اِرْضَخُوْا مِنَ الْفَضْلِ وَلَوْ بِصَاعٍ وَلَوْ بِنِصْفِ صَاعٍ وَلَوْ بِقَبْضَةٍ وَلَوْ بِنِصْفِ قَبْضَةٍ يَقِيْ اَحَدُكُمْ وَجْهَهٗ حَرَّ جَهَنَّمَ اَوِ النَّارِ وَلَوْ بِتَمْرَةٍ وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ ۔ فَاِنْ لَّمْ يَجِدْ بِكَلِمَةٍ طَيِّبَةٍ فَاِنَّ اَحَدَكُمْ لَاقِيَ اللّٰهَ وَقَائِلٌ لَهٗ مَا اَقُوْلُ لَكُمْ كَمَا جَعَلَ لَكَ مَالًا وَّ وَلَدًا ۔ فَيَقُوْلُ بَلٰى ۔ فَيَقُوْلُ اَيْنَمَا قَدَّمْتَ لِنَفْسِكَ فَيَنْظُرُ قُدَّامَهٗ وَخَلْفَهٗ وَعَنْ يَّمِيْنِهٖ وَعَنْ شِمَالِهٖ ثُمَّ لَا يَجِدُ شَيْئًا يَّقِيْ بِهٖ وَجْهَهٗ حَرَّ جَهَنَّمَ ۝ لِيَتَّقِ اَحَدُكُمْ وَجْهَهُ النَّارَ وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ فَاِنْ لَّمْ يَجِدْ فَبِكَلِمَةٍ طَيِّبَةٍ فَاِنِّيْ لَا اَخَافُ عَلَيْكُمُ الْفَاقَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ نَاصِرُكُمْ وَمُعْطِيْكُمْ حَتّٰى تَسِيْرَ الظَّعِيْنَةُ مَا بَيْنَ يَثْرِبَ وَالْحِيْرَةِ اَكْثَرَ مَا نَخَافُ عَلٰى مَطِيَّتِهَا السَّرَقَ ۝ (زادالمعاد)

لوگو! بچے ہوئے مال سے غریبوں کی امداد کرو۔ زیادہ نہ ہو تو ایک صاع غلہ ہی سہی، یا آدھا صاع، ورنہ ایک مٹھی یا آدھی مٹھی۔ تم میں سے ہر ایک اپنے آپ کو آتشِ دوزخ سے بچائے، خواہ ایک کھجور یا آدھی کھجور ہی کے ساتھ کیوں نہ ہو۔ اگر اتنا بھی نہ مل سکے تو اچھی بات کے ساتھ سہی۔ کیونکہ تمہیں خدا کے سامنے پیش ہونا ہے وہ تم سے یہی کہے گا جو میں تم سے کہتا ہوں کہ کیا میں نے تمہیں مال اور اولاد نہیں دیئے تھے؟ بندہ عرض کرے گا ہاں۔ خداوند تعالیٰ فرمائے گا: کہاں ہے وہ جو تُو نے اپنے لیے آگے بھیجا ہے۔ اس وقت بندہ آگے پیچھے، دائیں اور بائیں دیکھے گا مگر دوزخ کی گرمی سے بچنے کے لئے کوئی چیز نہ پائے گا۔ پس کم از کم نصف خرما دے کر دوزخ سے بچنے کا سامان کرو۔ اگر وہ بھی نہ ہو تو ملائم جواب دے دیا کرو۔ کیونکہ مجھے یہ خوف بالکل نہیں کہ تم فاقہ کشی کا سامنا کرو گے کیونکہ خدا تمہارا ناصر ہے اور وہی دینے والا ہے۔ حتّٰی کہ تنہا ایک عورت مدینہ اور حیرہ کے درمیان سفر کرے گی اور اس کو اپنی سواری پر چور چکار کا کوئی خطرہ نہ ہوگا۔

حضرت عدیؓ فرماتے ہیں کہ جس وقت میں نے یہ ارشادِ مبارک سُنا تو مجھے خیال ہوا کہ اُن دنوں بنو طے کے چور کہاں گئے ہوں گے؟ (یعنی جو کچھ ہو، مگر وہ چوری اور ڈاکہ زنی سے باز نہیں آئیں گے) مگر میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ ایک عورت قادسیہ سے سفر کر کے حرم تک آتی ہے اور اس کو کسی کا ڈر نہیں ہوتا۔ (بخاری)

۱۲

اسلام اور رہبانیت

ایک بار آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کو جمع ہونے کا حکم دیا، پھر اُن کے سامنے حسب ذیل خطبہ ارشاد فرمایا:

مَا بَالُ اَقْوَامٍ حَرَّمُوا النِّسَآءَ وَالطَّعَامَ وَالطِّیْبَ وَ شَهَوَاتِ الدُّنْیَا ۔ فَاِنِّیْ لَسْتُ اٰمُرُکُمْ اَنْ تَکُوْنُوْا قِسِّیْسِیْنَ وَرُهْبَانًا ۔ فَاِنَّهٗ لَیْسَ فِیْ دِیْنِیْ تَرْكُ اللَّحْمِ وَالنِّسَآءِ وَلَا اتِّخَاذُ الصَّوَامِعِ ۔ وَاِنَّ سِیَاحَةَ اُمَّتِیْ الصَّوْمُ وَرَهْبَانِیَّتُهُمُ الْجِهَادُ ۔ اُعْبُدُوا اللّٰهَ ہ وَلَا تُشْرِکُوْا بِهٖ شَیْئًا ہ وَحُجُّوْا وَاعْتَمِرُوْا وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّکٰوةَ وَصُوْمُوْا رَمَضَانَ وَاسْتَقِیْمُوْا یَسْتَقِمْ لَکُمْ ۔ فَاِنَّمَا هَلَكَ مَنْ کَانَ قَبْلَکُمْ بِالتَّشْدِیْدِ شَدَّدُوْا عَلٰی اَنْفُسِهِمْ فَشَدَّدَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ ہ فَتِلْكَ بَقَایَاهُمْ فِی الدِّیَارِ وَالصَّوَامِعِ ۔ (معالم التنزیل)

لوگوں کو کیا ہوگیا ہے کہ وہ عورتوں کو، کھانے کو، خوشبو کو اور دنیا کی لذیذ چیزوں کو اپنے اوپر حرام کرنے لگے ہیں میں تمہیں صوفی اور درویش اور راہب و تارکِ دنیا بننے کا حکم دینے نہیں آیا کیونکہ گوشت کو اور عورتوں کو چھوڑ دینا اور خانقاہوں میں بیٹھ جانا میرے دین میں نہیں ہے ۔ میری اُمت کی سیاحت روزہ ہے ۔ ان کی رہبانیت جہاد ہے ۔ اللہ کی عبادت کرتے رہو، اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، حج اور عمرہ ادا کرتے رہو، نماز، روزہ اور زکوٰۃ کی ادائیگی اور پابندی کرو ۔ اور استقامت دکھاؤ تاکہ تمہارے معاملات بھی درست کر دیے جائیں ۔ تم سے اگلے لوگ انھی سختیوں کی وجہ سے تباہ ہو گئے ۔ جوں جوں وہ اپنے اوپر سختی کرتے گئے اللہ تعالیٰ بھی ان پر سختی کرتا گیا ۔ ان کے بچے کھچے اب گرجوں اور عبادت گاہوں میں باقی رہ گئے ہیں ۔

اس خطبے کے بعد یہ آیت نازل ہوئی:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَیِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَکُمْ ۔۔۔۔۔

(اے ایمان والو! جو پاک چیزیں اللہ نے تم پر حلال کی ہیں انھیں حرام نہ کرو ۔۔۔۔۔)

۱۳

خطبۂ بدر

ہجرت کے بعد کفار سے مسلمانوں کا پہلا معرکہ میدانِ بدر میں برپا ہوا۔ رسولِ خدا تین سو نیرہ صحابہؓ کو لے کر میدانِ بدر میں اُترے۔ مسلمانوں کی صفوں کو مرتب کر کے اللہ تبارک وتعالیٰ کی حمد وثنا کی، پھر یہ خطبہ ارشاد فرمایا:

فَإِنِّي أَحُثُّكُمْ عَلَى مَا حَثَّكُمُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ وَأَنْهَاكُمْ عَمَّا نَهَاكُمُ اللّٰهُ عَنْهُ۔ فَإِنَّهُ جَلَّ وَعَلَا عَظِيمٌ شَأْنُهُ
يَأْمُرُ الْحَقَّ۔ وَيُحِبُّ الصِّدْقَ۔ وَيُعْطِي عَلَى الْخَيْرِ أَهْلَهُ أَعْلَى مَنَازِلِهِمْ عِنْدَهُ بِهِ يُذْكَرُونَ وَبِهِ يَتَفَاضَلُونَ
وَإِنَّكُمْ قَدْ أَصْبَحْتُمْ بِمَنْزِلٍ مِنْ مَنَازِلِ الْحَقِّ۔ لَا يَقْبَلُ فِيهِ اللّٰهُ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا مَا ابْتُغِيَ فِيهِ وَجْهُهُ وَإِنَّ الصَّبْرَ
فِي مَوَاطِنِ الْبَأْسِ مِمَّا يُفَرِّجُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ بِهِ الْهَمَّ وَيُنْجِي مِنَ الْغَمِّ وَتُدْرِكُونَ النَّجَاةَ فِي الْآخِرَةِ فِيكُمْ نَبِيُّ
اللّٰهِ۔ يُحَذِّرُكُمْ وَيَأْمُرُكُمْ فَاسْتَحْيُوا الْيَوْمَ أَنْ يَطَّلِعَ اللّٰهُ تَعَالَى عَلَى شَيْءٍ مِنْ أَمْرِكُمْ يَمْقُتُكُمْ عَلَيْهِ۔ فَإِنَّهُ تَعَالَى
يَقُولُ لَمَقْتُ اللّٰهِ أَكْبَرُ مِنْ مَقْتِكُمْ أَنْفُسَكُمْ۔ اُنْظُرُوا الَّذِي أَمَرَكُمْ بِهِ مِنْ كِتَابِهِ وَأَرَاكُمْ مِنْ آيَاتِهِ وَأَعَزَّكُمْ
بَعْدَ الذِّلَّةِ فَاسْتَمْسِكُوا بِهِ۔ يَرْضَ رَبُّكُمْ عَنْكُمْ وَاسْتَلُوا رَبَّكُمْ فِي هٰذَا الْمَوْطِنِ أَمْرًا تَسْتَوْجِبُوا الَّذِي وَعَدَكُمْ
بِهِ مِنْ رَحْمَتِهِ وَمَغْفِرَتِهِ۔ فَإِنَّ وَعْدَهُ حَقٌّ وَقَوْلَهُ صِدْقٌ وَعِقَابَهُ شَدِيدٌ وَإِنَّمَا أَنَا وَأَنْتُمْ بِاللّٰهِ الْحَيِّ الْقَيُّومِ
الَّذِي إِلَيْهِ لَجَأْنَا وَبِهِ اعْتَصَمْنَا وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا وَإِلَيْهِ الْمَصِيرُ۔ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَنَا وَلِلْمُسْلِمِينَ۔

لوگو! میں تمہیں اسی چیز کی طرف رغبت دلاتا ہوں جس کی رغبت خود اللہ عزوجل نے دلائی ہے۔ اسی طرح میں تمہیں انہی چیزوں سے روکتا ہوں جن سے اللہ عزوجل نے تمہیں روکا ہے۔ وہ جلال وبلندی والا عظیم الشان خدا حق باتوں کا ہی حکم فرماتا ہے وہ سچائی کو پسند کرتا ہے، بھلائیاں کرنے والوں کو وہ اپنے پاس بڑے مرتبے عطا فرماتا ہے اسی لئے ان کا ذکر مذکور رہتا ہے اور اسی طرح انہیں فضیلتیں ملتی ہیں۔ سُنو حق کی منزلوں میں سے ایک منزل پر آج تمہارے قدم آ پہنچے ہیں۔ یہاں صرف وہی کام مقبول ہوگا جو اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے ارادے سے کیا جائے گا۔ جنگ کے موقع پر صبر ہی وہ چیز ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ رنج وغم کو دُور کر دیتا ہے اور ان سے نجات دیتا ہے، ساتھ ہی آخرت کی نجات بھی میسر ہو جائے گی۔ تم میں خدا کا پیغمبر موجود ہے، جو تمہیں ڈراتا بھی ہے اور حکم بھی دیتا ہے (امر ونہی کر رہا ہے) دیکھو آج ایسی غلطی نہ کر بیٹھنا جس سے اللہ تعالیٰ تم سے ناخوش ہو جائے۔ فرمانِ خدا ہے کہ اللہ کی ناراضگی کا وبال اُس سے بہت زیادہ ہے جو تمہاری آپس کی ناراضگی کا ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے احکام جو اپنی کتاب میں تمہیں دے چکا ہے اور جو نشانیاں وہ تمہیں دکھلا چکا ہے، ذلّت کے بعد اس نے تمہیں جو عزت عطا فرمائی ہے اُس کو پیشِ نظر رکھو۔ پس تم احکامِ خدا پر صبر وعزم کے ساتھ جم جاؤ۔ رب العالمین تم سے راضی ہو جائے گا

اللہ تعالیٰ سے اس جہاد کے موقعہ پر ایسی دُعائیں کرو کہ جنت و مغفرت کا وعدہ جو اس نے تمہارے ساتھ کر رکھا ہے پورا ہو جائے۔ بیشک وعدہ خداوندی اٹل ہے، بیشک کلامِ خدا راست ہے، بیشک اس کے عذاب بڑے ڈراؤنے اور نہایت سخت ہیں۔ خود میں بھی اور تم سب بھی اُسی حیّ و قیوم زندہ و قایم خدا پر بھروسا رکھتے ہیں جس کی طرف ہم پناہ کے لیے جھکتے ہیں اور جس کا ہم سہارا لیتے ہیں۔ اسی پر ہم توکل کرتے ہیں اور اسی کی طرف ہمیں لوٹ کر جانا ہے۔ اللہ ہماری اور جملہ مسلمانوں کی مغفرت فرمائے۔

۱۴

"الجماعت"

حضرت معاویہؓ سے روایت ہے کہ ایک بار حضورِ اکرمؐ نے حسبِ ذیل خطبہ دیا:

اَلَا اِنَّ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ افْتَرَقُوْا عَلٰى ثِنْتَيْنِ وَ سَبْعِيْنَ مِلَّةً ٥ وَاِنَّ هٰذِهِ الْاُمَّةَ سَتَفْتَرِقُ عَلٰى ثَلَاثٍ وَّ سَبْعِيْنَ ٥ ثِنْتَانِ وَ سَبْعُوْنَ فِى النَّارِ ٥ وَ وَاحِدٌ فِى الْجَنَّةِ ٥ وَهِىَ الْجَمَاعَةُ ٥ وَ اِنَّهٗ سَيَخْرُجُ فِىْ اُمَّتِىْ اَقْوَامٌ تَتَجَارٰى بِهِمُ الْاَهْوَآءُ كَمَا يَتَجَارَى الْكَلَبُ بِصَاحِبِهٖ ٥ لَا يَبْقٰى مِنْهُ عِرْقٌ وَّ لَا مَفْصَلٌ اِلَّا دَخَلَهٗ۔ (مسند احمد۔ ابوداؤد)

لوگو! سنو، تم سے پہلے کے اہلِ کتاب بہتّر فرقوں میں تقسیم ہو گئے اور میری یہ امت تہتّر فرقوں میں بٹ جائے گی، جن میں سے بہتّر جہنمی ہیں اور ایک جنتی۔ یہی جنتی گروہ "الجماعت" ہے۔ سنو اور باور کر لو کہ میری امت میں ایسی قومیں بھی نکلنے والی ہیں جن کے رگ و پے میں خواہشیں اس طرح سرایت کر جائیں گی جیسے باؤلے کتّے کے کاٹے کا زہر اُس شخص کے رگ و پے میں رچ جاتا ہے جسے وہ کاٹ لے کہ اس کا زہر ہر ہر ہڈی اور ہر ہر جوڑ میں داخل ہو جاتا ہے۔

۱۵

ضابطۂ حیات

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ شام کا سفر کر رہے تھے۔ اس سفر میں ایک روز صحابہ کے سامنے تقریر کے لیے کھڑے ہوئے اور کہا: ایک بار رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے حسب ذیل خطبہ ارشاد فرمایا:

اِسْتَوْصُوْا بِاَصْحَابِیْ خَیْرًا۔ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَهُمْ۔ ثُمَّ یَفْشُوا الْکَذِبُ حَتّٰی اِنَّ الرَّجُلَ لَیَبْتَدِئُ بِالشَّهَادَةِ قَبْلَ اَنْ یُّسْئَلَهَا۔ فَمَنْ اَرَادَ مِنْکُمْ بُحْبُحَةَ الْجَنَّةِ فَلْیَلْزَمِ الْجَمَاعَةَ۔ فَاِنَّ الشَّیْطَانَ مَعَ الْوَاحِدِ وَهُوَ مِنَ الْاِثْنَیْنِ اَبْعَدُ لَا یَخْلُوَنَّ اَحَدُکُمْ بِامْرَاَةٍ فَاِنَّ الشَّیْطَانَ ثَالِثُهُمَا وَ مَنْ سَرَّتْهُ حَسَنَتُهٗ وَسَآءَتْهُ سَیِّئَتُهٗ فَهُوَ مُؤْمِنٌ۔ (مسند احمد)

میرے صحابہؓ کے ساتھ بھلائی (سے پیش آنے) کی (میری) نصیحت قبول کرو۔ پھر ان کے بارے میں جو ان کے بعد ہوں۔ پھر ان کے بارے میں جو ان کے بعد ہوں۔ پھر جھوٹ پھیل جائے گا۔ یہاں تک کہ لوگ خود بخود بن بلائے (جھوٹی) شہادتیں دینے لگیں گے۔ پس تم میں سے جو بھی جنّت کے بہترین مقام کا مالک بننا چاہے اُسے لازم ہے کہ جماعت کو چمٹے رہے۔ شیطان تنہا کے ساتھ ہے اور وہ دو سے بہت دُور رہتا ہے۔ خبردار کوئی شخص کسی اجنبی عورت کے ساتھ تنہائی میں نہ بیٹھے اس لیے کہ ان دونوں کے ساتھ تیسرا شیطان ہوتا ہے جسے اس کی نیکی اچھی لگے اور بُرائی بُری لگے وہ مومن ہے۔

۱۶

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

حضرت علقمہ بن سعیدؓ سے روایت ہے کہ ایک روز رسولِ خدا نے ایک خطبہ ارشاد فرمایا، اس میں بعض مسلمان قبیلوں کی تعریف کی۔ پھر فرمایا :

مَا بَالُ اَقْوَامٍ لَّا يُفَقِّهُوْنَ جِيْرَانَهُمْ وَلَا يُعَلِّمُوْنَهُمْ وَلَا يَعِظُوْنَهُمْ وَلَا يَأْمُرُوْنَهُمْ وَلَا يَنْهَوْنَهُمْ وَمَا بَالُ اَقْوَامٍ لَّا يَتَعَلَّمُوْنَ مِنْ جِيْرَانِهِمْ وَلَا يَتَفَقَّهُوْنَ وَلَا يَتَّعِظُوْنَ۔ وَاللّٰهِ لَيُعَلِّمَنَّ قَوْمٌ جِيْرَانَهُمْ وَيُفَقِّهُوْنَهُمْ وَيَعِظُوْنَهُمْ وَيَأْمُرُوْنَهُمْ وَيَنْهَوْنَهُمْ وَيَتَعَلَّمَنَّ قَوْمٌ مِّنْ جِيْرَانِهِمْ وَيَتَفَقَّهُوْنَ وَيَتَّعِظُوْنَ اَوْ لَاُعَاجِلَنَّهُمُ الْعُقُوْبَةَ۔ (طبرانی کبیر)

لوگوں کو کیا ہوگیا ہے کہ وہ نہ تو اپنے پڑوسیوں کو (دین) سمجھاتے ہیں نہ انھیں علم سکھاتے ہیں نہ انھیں نصیحت کرتے ہیں نہ انھیں بھلائیوں کا حکم کرتے ہیں نہ انھیں برائیوں سے روکتے ہیں۔ اور کیا حال ہے ان لوگوں کا جو اپنے پڑوسیوں سے نہ (دین) سیکھتے ہیں نہ علم سیکھتے ہیں، نہ پند و نصیحت سنتے ہیں۔ واللہ! لوگ یا تو اپنے آس پاس والوں کو سکھائیں، سمجھائیں، نصیحت کریں، نیکی کا حکم دیں اور برائی سے روکیں اور لوگ آس پاس والوں سے سیکھیں سمجھیں وعظ و نصیحت حاصل کریں ورنہ میں دنیا میں ہی انھیں سخت سزا دوں گا۔

۱۷

سنّت اور بدعت

حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ (ایک روز) رسولِ خدا نے ایسا (پُر تاثیر اور درد بھرا) خطبہ ارشاد فرمایا کہ ہمارے دل تھرا گئے اور ہم زار زار رونے لگے۔ ہم نے کہا: یا رسول اللہ! یہ تو آپ کا الوداعی خطبہ معلوم ہوتا ہے آپ ہمیں کچھ آخری نصیحت فرماتے جائیے۔ آپ نے فرمایا:

تَرَكْتُكُمْ عَلَى الْبَيْضَاءِ لَيْلُهَا كَنَهَارِهَا لَا يَزِيغُ عَنْهَا بَعْدِي إِلَّا هَالِكٌ مَنْ يَعِشْ مِنْكُمْ فَسَيَرَى اخْتِلَافًا كَثِيرًا۔ فَعَلَيْكُمْ بِمَا عَرَفْتُمْ مِنْ سُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ الْمَهْدِيِّينَ۔ عَضُّوا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ وَعَلَيْكُمْ بِالطَّاعَةِ وَإِنْ عَبْدًا حَبَشِيًّا۔ فَإِنَّمَا الْمُؤْمِنُ كَالْجَمَلِ الْأَنِفِ حَيْثُمَا قِيدَ انْقَادَ (وَفِي رِوَايَةٍ) عَلَيْكُمْ بِتَقْوَى اللّٰهِ ٥ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ ٥ وَإِنْ عَبْدًا حَبَشِيًّا ٥ وَسَتَرَوْنَ مِنْ بَعْدِي اخْتِلَافًا شَدِيدًا ٥ فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ الْمَهْدِيِّينَ عَضُّوا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ ٥ وَإِيَّاكُمْ وَالْأُمُورَ الْمُحْدَثَاتِ ٥ فَإِنَّ كُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ ٥ (ابن ماجہ)

میں نے تمہیں ایسے پاک صاف میدان میں چھوڑا ہے جہاں کی رات بھی دن کے برابر روشن ہے۔ میرے بعد تو وہی اِدھر سے اُدھر ہوگا جس کی قسمت پھُوٹ گئی ہو۔ میرے بعد تم میں سے جو زندہ رہے گا وہ بڑے بڑے اختلاف دیکھے گا۔ پس تم اختلاف کے وقت میری جانی پہچانی سُنّتوں اور ہدایت یافتہ خلفاء راشدین کے طریقوں سے وابستہ رہنا اور انھیں مضبوطی سے تھام لینا۔ تم فرمانبرداری کرتے ہی رہنا خواہ وہ کوئی حبشی غلام ہی ہو کیونکہ مومن کی مثال تو نکیل والے اونٹ کی سی ہے کہ جدھر نکیل مُڑی اُدھر گھوم گیا۔ اللہ تعالیٰ کا لحاظ اور ڈر خوف رکھو، سُنو اور اطاعت کرو خواہ وہ حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو۔ میرے بعد تم بہت سخت اختلاف دیکھو گے پس میری اور ہدایت یافتہ خلفاءِ راشدین کی سنّت پر عمل پیرا رہنا اور انھیں مضبوطی سے تھامے رکھنا (دین میں) گھڑی ہوئی باتوں (پر عمل کرنے) سے بچو کیونکہ ہر گھڑی ہوئی بات (بدعت) گمراہی ہے۔

۱۸

تصوّرِ دیانت

حضرت ابوحمید ساعدیؓ سے روایت ہے کہ نبی کریمؐ نے قبیلہ بنو اسد کے ایک شخص کو، جن کا نام ابن اللتبیہ تھا، قبیلہ بنو سلیم کے صدقات وصول کرنے کے لیے عامل بنا کر بھیجا۔ وہ واپس آئے تو انھوں نے کچھ مال تو آنحضورؐ کے حوالے کر دیا اور کچھ مال یہ کہہ کر رکھ لیا کہ یہ مجھے بطور ہدیہ اور تحفہ کے ملا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: خوب، اگر تم اپنے گھر میں بیٹھے رہتے تو پھر دیکھتے کہ کون آ کر تمہیں یہ تحفے تحائف دیتا ہے — ابوحمید ساعدیؓ کا بیان ہے کہ اس کے بعد رسولِ خدا اٹھ کھڑے ہوئے۔ پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی، پھر فرمایا:

فَإِنِّیْ اَسْتَعْمِلُ الرَّجُلَ مِنْکُمْ عَلَی الْعَمَلِ مِمَّا وَلَّانِی اللّٰہُ فَیَأْتِیْنِیْ فَیَقُوْلُ ھٰذَا مَالُکُمْ وَھٰذَا ھَدِیَّۃٌ اُھْدِیَتْ لِیْ اَفَلَا جَلَسَ فِیْ بَیْتِ اَبِیْہِ وَاُمِّہٖ حَتّٰی تَأْتِیَہٗ ھَدِیَّتُہٗ اِنْ کَانَ صَادِقًا وَ اللّٰہِ لَا یَأْخُذُ اَحَدٌ مِّنْکُمْ شَیْئًا بِغَیْرِ حَقِّہٖ اِلَّا لَقِیَ اللّٰہَ تَعَالٰی یَحْمِلُہٗ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ فَلَاَعْرِفَنَّ اَحَدًا مِّنْکُمْ لَقِیَ اللّٰہَ یَحْمِلُ بَعِیْرًا لَہٗ رُغَاءٌ اَوْ بَقَرَۃٌ لَّھَا خُوَارٌ اَوْ شَاۃٌ تَیْعِرُ۔

جب میں تم میں سے کسی شخص کو تحصیلدار بنا کر بھیجتا ہوں تو وہ واپس آ کر کہتا ہے کہ یہ آپ کا مال ہے اور یہ تحفے ہیں جو مجھے دئے گئے۔ اگر وہ سچ کہتا ہے تو کیوں اپنے ماں باپ کے گھر نہیں بیٹھتا جہاں لوگ اسے تحفے بھیجتے رہیں۔ خدا کی قسم جو شخص ناجائز طور پر کوئی چیز لے گا قیامت کے دن اسے اٹھاتے ہوئے دربارِ خداوندی میں حاضر ہوگا میں تم میں سے ان شخصوں کو پہچانوں گا جو ایک بڑبڑاتے ہوئے اونٹ یا آواز دینے والی گائے یا ممیاتی ہوئی بکری اٹھائے خدا کے سامنے پیش ہوں گے۔

پھر آپ نے دونوں ہاتھ بلند کر کے فرمایا:

اَللّٰھُمَّ ھَلْ بَلَّغْتُ۔ (مسلم شریف)

یاالٰہی! کیا میں نے حقِ تبلیغ ادا کر دیا!

۱۹

خیانت اور طمع

حضرت حرماس بن زیاد سے روایت ہے کہ ایک بار رسولِ خدا نے اپنی ناقہ پر بیٹھے بیٹھے خطبہ دیا، جس میں فرمایا:

اِیَّاکُمْ وَالْخِیَانَۃَ فَاِنَّھَا بِئْسَتِ الْبِطَانَۃُ۔ وَ اِیَّاکُمْ وَالظُّلْمَ فَاِنَّہٗ ظُلُمَاتٌ یَّوْمَ الْقِیَامَۃِ وَاِیَّاکُمْ وَالشُّحَّ فَاِنَّمَا اَھْلَکَ مَنْ کَانَ قَبْلَکُمُ الشُّحُّ حَتّٰی سَفَکُوْا دِمَآءَھُمْ وَقَطَّعُوْا اَرْحَامَھُمْ۔

(طبرانی اوسط و کبیر)

خیانت سے بچو کہ وہ بدترین ساتھی ہے۔ ظلم سے بچو کہ وہ قیامت کے دن اندھیروں کا باعث ہوگا۔ طمع اور لالچ سے بچو کہ اسی چیز نے تم سے پہلوں کو غارت کر دیا حتّٰی کہ وہ ایک دوسرے کا خون بہانے لگے اور انہوں نے اپنے رشتے ناتے توڑ ڈالے۔

۲۰

خیانت سے اجتناب

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ کے دور میں دو تین بار ایسے واقعات پیش آئے کہ کسی شخص نے دشمن کی فوج سے کوئی چیز چھین لی، مگر بیت المال میں جمع نہ کرائی۔ اس پر ایک روز آپ نے حسب ذیل خطبہ دیا:

لَا اُلْفِيَنَّ اَحَدَكُمْ يَجِیْءُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰى رَقَبَتِهٖ بَعِيْرٌ لَّهٗ رُغَاءٌ يَقُوْلُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَغِثْنِیْ فَاَقُوْلُ لَا اَمْلِكُ لَكَ شَيْئًا قَدْ اَبْلَغْتُكَ ٥ لَا اُلْفِيَنَّ اَحَدَكُمْ يَجِیْءُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰى رَقَبَتِهٖ فَرَسٌ لَّهٗ حَمْحَمَةٌ فَيَقُوْلُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَغِثْنِیْ فَاَقُوْلُ لَا اَمْلِكُ لَكَ شَيْئًا قَدْ اَبْلَغْتُكَ ٥ لَا اُلْفِيَنَّ اَحَدَكُمْ يَجِیْءُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰى رَقَبَتِهٖ شَاةٌ لَهَا ثُغَاءٌ يَقُوْلُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَغِثْنِیْ فَاَقُوْلُ لَا اَمْلِكُ لَكَ شَيْئًا قَدْ اَبْلَغْتُكَ ٥ لَا اُلْفِيَنَّ اَحَدَكُمْ يَجِیْءُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰى رَقَبَتِهٖ نَفْسٌ لَهَا صِيَاحٌ فَيَقُوْلُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَغِثْنِیْ فَاَقُوْلُ لَا اَمْلِكُ لَكَ شَيْئًا قَدْ اَبْلَغْتُكَ لَا اُلْفِيَنَّ اَحَدَكُمْ يَجِیْءُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰى رَقَبَتِهٖ رِقَاعٌ تَخْفِقُ فَيَقُوْلُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَغِثْنِیْ وَاَقُوْلُ لَا اَمْلِكُ لَكَ شَيْئًا قَدْ اَبْلَغْتُكَ لَا اُلْفِيَنَّ اَحَدَكُمْ يَجِیْءُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰى رَقَبَتِهٖ صَامِتٌ فَيَقُوْلُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَغِثْنِیْ فَاَقُوْلُ لَا اَمْلِكُ لَكَ شَيْئًا قَدْ اَبْلَغْتُكَ ٥ (مسلم شریف)

میں تم میں سے کسی کو اس حال میں نہ پاؤں کہ قیامت کے دن تم میں سے کسی کی گردن پر (خیانت کا) بڑبڑاتا ہوا اونٹ سوار ہو اور کہے یارسول اللہ میری مدد فرمائیں اور مجھے کہنا پڑے کہ اب میں کچھ نہیں کر سکتا میں نے تو (صحیح بات) تجھ تک پہنچا دی تھی۔ میں تم میں سے کسی کو اس حال میں نہ پاؤں کہ قیامت کے دن تم میں سے کسی کی گردن پر ہنہناتا ہوا گھوڑا سوار ہو اور کہے یارسول اللہ میری مدد کریں اور مجھے یہ کہنا پڑے کہ میں کچھ نہیں کر سکتا میں نے تو (صحیح بات) تجھ تک پہنچا دی تھی میں تم میں سے کسی کو اس حال میں نہ پاؤں کہ قیامت کے دن تم میں سے کسی کی گردن پر چیخنے والی بکری سوار ہو اور کہے یارسولؐ اللہ میری مدد کریں، اور میں کہوں کہ اب میں کچھ نہیں کر سکتا، میں نے تو (صحیح بات) تجھ تک پہنچا دی تھی میں تم میں سے کسی کو اس حال میں نہ پاؤں کہ قیامت کے دن تم میں سے کسی کی گردن پر واویلا کرتا ہوا کوئی غلام یا مقتول سوار ہو اور وہ (اٹھانے والا) کہے یارسول اللہ میری مدد کریں اور مجھے کہنا پڑے کہ میں کچھ نہیں کر سکتا میں نے تو (صحیح بات) تجھ تک پہنچا دی تھی میں تم میں سے کسی کو اس حال میں نہ پاؤں کہ ایسا نہ ہو کہ قیامت کے دن کسی کی گردن پر چیتھڑے اُڑ رہے ہوں اور کہے یارسول اللہ میری مدد کریں اور مجھے کہنا پڑے کہ میں کچھ نہیں کر سکتا میں نے تمہیں سمجھا دیا تھا کہ قیامت کے دن تم میں سے کسی شخص کے ذمے خیانت کا مال ہو اور کہے یارسول اللہ میری مدد کریں اور مجھے کہنا پڑے کہ میں کچھ نہیں کر سکتا میں نے تو (صحیح بات) تم تک پہنچا دی تھی۔

۲۱

دُنیا کا فتنہ

حیاتِ طیبہ کے آخری دَور میں حجۃ الوداع سے واپسی پر ایک روز آپ شہدائے اُحد کے مقابر پر تشریف لے گئے۔ رقت آمیز انداز میں ان کے لیے دُعا فرمائی۔ پھر مسجد میں آکر منبر پر تشریف فرما ہوئے اور حسب ذیل خطبہ ارشاد فرمایا:

اِنِّیْ فَرَطٌ لَّکُمْ، وَاَنَا شَہِیْدٌ عَلَیْکُمْ وَاِنِّیْ وَاللّٰہِ لَاَنْظُرُ اِلٰی حَوْضِی الْاٰنَ۔ وَاِنِّیْ قَدْ اُعْطِیْتُ مَفَاتِیْحَ خَزَآئِنِ الْاَرْضِ۔ اَوْ مَفَاتِیْحَ الْاَرْضِ۔ وَاِنِّیْ وَاللّٰہِ مَآ اَخَافُ عَلَیْکُمْ اَنْ تُشْرِکُوْا بَعْدِیْ۔ وَلٰکِنِّیْ اَخَافُ عَلَیْکُمْ اَنْ تَنَافَسُوْا فِیْھَا۔ (بخاری شریف)

میں تمہارے لیے سامانِ آخرت تیار کرنے کے لیے تم سے آگے جانے والا ہوں۔ میں تم پہ گواہ ہوں۔ قسم خدا کی میں اس وقت بھی اپنے حوضِ کوثر کو دیکھ رہا ہوں۔ مجھے رُوئے زمین کے خزانوں کی کنجیاں عطا فرمائی گئی ہیں یا فرمایا زمین کی چابیاں (عطا فرمائی گئی ہیں) واللہ مجھے تمہارے بارے میں یہ خدشہ نہیں کہ تم شرک کرنے لگو گے۔ ہاں البتہ یہ کھٹکا ہے کہ تم دُنیا میں رغبت کرنے اور ایک دوسرے سے آگے بڑھنے لگو گے۔

۲۲

دنیا اور نیکی

حضرت عمروؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خداؐ نے ایک روز اپنے خطبے میں ارشاد فرمایا:

اَلَا اِنَّ الدُّنْیَا عَرَضٌ حَاضِرٌ ، یَاْکُلُ مِنْہُ الْبَرُّ وَالْفَاجِرُ ، اَلَا وَاِنَّ الْاٰخِرَۃَ اَجَلٌ صَادِقٌ ، وَیَقْضِیْ فِیْھَا مَلِکٌ قَادِرٌ (وَفِیْ رِوَایَۃٍ وَاِنَّ الْاٰخِرَۃَ وَعْدٌ صَادِقٌ ، وَیَحْکُمُ فِیْھَا مَلِکٌ عَادِلٌ قَادِرٌ) یُحِقُّ فِیْھَا الْحَقَّ وَیُبْطِلُ الْبَاطِلَ ، کُوْنُوْا مِنْ اَبْنَاءِ الْاٰخِرَۃِ ، وَلَا تَکُوْنُوْا مِنْ اَبْنَاءِ الدُّنْیَا ، فَاِنَّ کُلَّ اُمٍّ یَتْبَعُھَا وَلَدُھَا ، اَلَا وَاِنَّ الْخَیْرَ کُلَّہٗ بِحَذَافِیْرِہٖ فِی الْجَنَّۃِ ، اَلَا وَاِنَّ الشَّرَّ کُلَّہٗ بِحَذَافِیْرِہٖ فِی النَّارِ ، اَلَا فَاعْمَلُوْا وَاَنْتُمْ مِّنَ اللّٰہِ عَلٰی حَذَرٍ ، وَاعْلَمُوْآ اَنَّکُمْ مَّعْرُوْضُوْنَ عَلٰی اَعْمَالِکُمْ ، فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ خَیْرًا یَّرَہٗ ، وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَّرَہٗ ، (الشافعی)

سُن لو! دنیا اسی موجودہ سازوسامان کا نام ہے، جسے نیک و بد سب کھا رہے ہیں اور آخرت ایک حقیقی وقتِ مقرر ہے جس میں قدرتوں والا بادشاہ (اللہ رب العالمین) خود فیصلہ کرے گا (ایک روایت میں ہے کہ آخرت ایک سچا وعدہ ہے جس میں عادل اور قدرت والا بادشاہ فیصلے فرمائے گا) جن میں حق کو ثابت کر دے گا اور باطل کو باطل۔ آخرت والے بنو، دنیا والے نہ بنو، ہر اولاد اپنی ماں کے پیچھے چلتی ہے۔ تمام کی تمام بھلائی اپنے پیروکاروں کے ساتھ جنت میں داخل ہو گی اور تمام کی تمام برائی اپنے پیروکاروں کے ساتھ جہنم میں داخل ہو گی۔ پس تم عمل کرو اور خدا سے ڈرتے رہو اور اس بات کا یقین رکھو کہ تمہیں (ایک دن) تمہارے اعمال کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ چنانچہ جس نے ایک ذرّے کے برابر بھی نیکی کی ہو گی وہ اسے دیکھ لے گا، اور جس نے ایک ذرّے کے برابر بدی کی ہو گی وہ بھی اسے دیکھ لے گا۔

۲۳

اللہ سے عافیت طلب کرو

ایک بار حضرت ابوبکر صدیق رضؓ خطبے کے لئے منبر پر کھڑے ہُوئے اور رونے لگے۔ پھر فرمایا: پہلے ہی سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں خطبہ سنانے کے لیے منبر پہ کھڑے ہوئے اور رو پڑے۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا:

سَلُوا اللّٰهَ الْعَفْوَ وَالْعَافِيَةَ فَإِنَّ أَحَدًا لَمْ يُعْطَ بَعْدَ الْيَقِينِ خَيْرًا مِنَ الْعَافِيَةِ۔

(ترمذی)

اللہ تعالیٰ سے معافی اور عافیت طلب کرو کیونکہ ایمان کے بعد کسی کو کوئی نعمت عافیت سے بہتر عطا نہیں کی گئی۔

۲۴

قرابت داروں کے لئے صدقہ

عبداللہ بن طارق کا بیان ہے کہ ایک بار میں کھجوریں خریدنے مدینہ گیا ہم لوگ شہر سے باہر ٹھہرے ہوئے تھے اتنے میں ایک شخص آکر ہمارا حال احوال پوچھنے لگا، اس نے دو پرانی چادریں پہنی ہوئی تھیں، پھر اس نے ہمارے سُرخ اُونٹ کی طرف اشارہ کر کے پُوچھا: کیا تم اس کو بیچو گے؟ ہم نے جواب دیا: ہاں اتنی کھجوروں کے عوض۔ (اس نے سودا منظور کیا اور) وہ اونٹ لے کر چلا گیا۔ ہم نے آپس میں کہا: یہ ہم نے کیا کیا! بغیر جانے ہم نے اونٹ کیسے دے دیا ہے۔ ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ ایک شخص بہت سی کھجوریں لیے ہُوئے آیا اور کہا: یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھجوریں دی ہیں ان میں یہ تو اُونٹ کی قیمت ہیں اور یہ تمہاری مہمانی کی ہیں۔ عبداللہ بن طارق کہتے ہیں کہ ہم نے کھجوریں وصول کر لیں پھر مسجد نبوی میں پہنچے ہم نے دیکھا ہمارے اونٹ کا وہی مقدس خریدار ذیل کا خطبہ دے رہا ہے ہم نے اس کو سُنا اور ہمارے دل پر اس عمدہ سلوک اور ایسی بہترین تعلیم کا یہ اثر ہوا کہ ہم بلا تامل حلقۂ اسلام میں داخل ہوگئے۔ خطبہ کے الفاظ یہ ہیں:

تَصَدَّقُوْا فَإِنَّ الصَّدَقَةَ خَيْرٌ لَّكُمْ اَلْيَدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِّنَ الْيَدِ السُّفْلٰى اُمَّكَ وَاَبَاكَ وَاُخْتَكَ وَاَخَاكَ وَاَدْنَاكَ اَدْنَاكَ۔ (زاد المعاد)

لوگو! خیرات دیا کرو، خیرات دینا تمہارے حق میں بہتر ہے۔ دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔ ماں کو، باپ کو، بہن کو، بھائی کو، پھر قریبی رشتہ داروں کو دیا کرو۔ جو جس قدر زیادہ قریب ہے اس کا حق اسی قدر زیادہ ہے۔

۲۵

ایک مبارک خواب

حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ ایک روز نمازِ فجر کے لیے آنحضورؐ دیر سے تشریف لائے۔ معلوم ہوتا تھا گویا سورج نکلنے ہی والا ہے۔ بہرحال آپ نے نماز پڑھائی اور سلام پھیرتے ہی ہماری طرف رُخ کیا، پھر بلند آواز سے ہدایت کی کہ سب لوگ اپنی جگہ بیٹھے رہیں۔ بعدازاں حسب ذیل خطبہ ارشاد فرمایا:

أَمَا إِنِّي سَأُحَدِّثُكُمْ مَا حَبَسَنِي عَنْكُمُ الْغَدَاةَ ۔ إِنِّي قُمْتُ مِنَ اللَّيْلِ فَتَوَضَّأْتُ وَصَلَّيْتُ مَا قُدِّرَ لِي فَنَعَسْتُ فِي صَلَاتِي حَتَّى اسْتَثْقَلْتُ فَإِذَا أَنَا بِرَبِّي تَبَارَكَ وَتَعَالَى فِي أَحْسَنِ صُورَةٍ فَقَالَ يَا مُحَمَّدُ قُلْتُ لَبَّيْكَ رَبِّ ۔ قَالَ فِيمَ يَخْتَصِمُ الْمَلَأُ الْأَعْلَى؟ قُلْتُ لَا أَدْرِي ۔ قَالَهَا ثَلَاثًا ۔ قَالَ فَرَأَيْتُهُ وَضَعَ كَفَّهُ بَيْنَ كَتِفَيَّ حَتَّى وَجَدْتُ بَرْدَ أَنَامِلِهِ بَيْنَ ثَدْيَيَّ فَتَجَلَّى لِي كُلُّ شَيْءٍ وَعَرَفْتُ فَقَالَ يَا مُحَمَّدُ قُلْتُ لَبَّيْكَ رَبِّ ۔ قَالَ فِيمَ يَخْتَصِمُ الْمَلَأُ الْأَعْلَى؟ قُلْتُ فِي الْكَفَّارَاتِ م قَالَ وَمَا هُنَّ؟ قُلْتُ مَشْيُ الْأَقْدَامِ إِلَى الْجَمَاعَاتِ ۝ وَالْجُلُوسُ فِي الْمَسَاجِدِ بَعْدَ الصَّلَوَاتِ ۝ وَإِسْبَاغُ الْوُضُوءِ حِينَ الْكَرِيهَاتِ ۝ قَالَ ثُمَّ فِيمَ؟ قُلْتُ فِي الدَّرَجَاتِ ۝ قَالَ وَمَا هُنَّ؟ قُلْتُ إِطْعَامُ الطَّعَامِ ۝ وَلِينُ الْكَلَامِ ۝ وَالصَّلَاةُ وَالنَّاسُ نِيَامٌ ۝ قَالَ سَلْ ۔ قُلْتُ اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ فِعْلَ الْخَيْرَاتِ ۝ وَتَرْكَ الْمُنْكَرَاتِ ۝ وَحُبَّ الْمَسَاكِينِ ۝ وَأَنْ تَغْفِرَ لِي وَتَرْحَمَنِي وَإِذَا أَرَدْتَ فِتْنَةً فِي قَوْمٍ فَتَوَفَّنِي غَيْرَ مَفْتُونٍ ۝ وَأَسْأَلُكَ حُبَّكَ ۝ وَحُبَّ مَنْ يُحِبُّكَ ۝ وَحُبَّ عَمَلٍ يُقَرِّبُنِي إِلَى حُبِّكَ ۝ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّهَا حَقٌّ ۔ فَادْرُسُوهَا ثُمَّ تَعَلَّمُوهَا۔

(مُسند احمد، ترمذی شریف)

میں تمہیں بتلاتا ہوں کہ آج صبح مجھے دیر کیوں لگی۔ میں رات کو اُٹھا، وضو کر کے جتنی نماز مقدر میں تھی ادا کی، نماز میں ہی مجھ پر اونگھ جیسی کیفیت طاری ہوگئی بدن بوجھل ہوگیا ناگہاں میں دیکھتا ہوں کہ اللہ عزّ و جلّ بہترین صورت میں میرے سامنے ہے اور فرما رہا ہے اے محمد! میں نے کہا اے میرے رب میں حاضر ہوں۔ فرمایا بتلاؤ بلند درجے کے فرشتے اس وقت کس امر میں گفتگو کر رہے ہیں؟ میں نے عرض کیا پروردگار میں نہیں جانتا۔ تو میں نے دیکھا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنا ہاتھ میرے مونڈھوں کے درمیان رکھا یہاں تک کہ اس کی

پوریوں کی ٹھنڈک مَیں نے اپنے سینے میں پائی۔ پھر ہر چیز میرے سامنے کھل گئی اور میں نے ہر چیز پہچان لی۔ اب پھر فرمایا کہ اے محمدؐ۔ میں نے پھر لبیک اے پروردگار کہا۔ فرمایا بتلاؤ بلند رتبہ فرشتے کس امر میں گفتگو کر رہے ہیں؟ میں نے عرض کیا کفّاروں کے بارے میں۔ پوچھا بتلاؤ کفّارے کیا ہیں؟ میں نے کہا چل کر نماز کی جماعتوں میں جانا، نمازوں کے بعد مساجد میں بیٹھے رہنا، تکلیف کے وقت کامل وضو کرنا۔ اللہ تعالےٰ نے دریافت فرمایا: ان فرشتوں کی بات چیت اور کس امر میں ہو رہی ہے؟ میں نے کہا: درجوں کے بارے میں۔ پُوچھا: وُہ کیا ہیں؟ میں نے عرض کیا: کھانا کھلانا، نرم کلامی کرنا، لوگوں کے سونے کے وقت نماز ادا کرنا۔ فرمایا: کچھ مانگ۔ تو میں نے کہا: اے اللہ! میں تجھ سے نیکیوں کے کرنے اور برائیوں سے بچنے کی توفیق اور مسکینوں کی محبت کا سوال کرتا ہُوں اور یہ کہ تُو مجھے بخشے اور مجھ پر رحم فرمائے اور یہ کہ جب تو کسی قوم کو فتنے میں ڈالنا چاہے تو مجھے اس فتنے میں پڑنے سے پہلے ہی وفات دے دے۔ الٰہی! میرا سوال ہے کہ مجھے اپنی محبت عطا فرما اور اُن کی محبت بھی دے جن سے تُو محبت کرتا ہے اور ان اعمال کی چاہت دے جو تیری محبت سے نزدیک کرنے والے ہیں۔ پھر حضورؐ نے اپنے مقتدیوں سے فرمایا: سُنو یہ سب حق اور سچ ہے، تم اسے سیکھو اور دوسروں کو سکھاتے رہو۔

۲۶

دوزخ سے بچو

حضرت ابوبکر صدیقؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسولِ خداؐ کو منبر پر یہ خطبہ دیتے ہوئے سُنا، آپ نے فرمایا:

اِتَّقُوا النَّارَ وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ - فَاِنَّهَا تُقِيْمُ الْعِوَجَ - وَتَدْفَعُ مِيْتَةَ السُّوْءِ وَتَقَعُ مِنَ الْجَائِعِ مَوْقِعَهَا مِنَ الشَّبْعَانِ - (ابویعلیٰ)

آتشِ دوزخ سے بچو گو آدھی کھجور سے ہی ہو، کیونکہ وہ (صدقہ) کجی کو درست کر دیتا ہے، بری موت کو دُور کر دیتا ہے اور وہ بھوکے کے لئے بھی اتنا ہی کام کرتا ہے جتنا سیر شدہ کے لیے۔

۲۷

نیکی اور بدی کے راستے

حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ ایک روز صحابہؓ بیٹھے تھے کہ رسولِ خدا تشریف لائے اور مندرجہ ذیل خطبہ ارشاد فرمایا:

يَا مَعْشَرَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝ اِتَّقُوا اللّٰهَ ۝ وَصِلُوْا اَرْحَامَكُمْ ۔ فَاِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ ثَوَابٍ اَسْرَعَ مِنْ صِلَةِ الرَّحِمِ وَاِيَّاكُمْ وَالْبَغْيَ ۔ فَاِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ عُقُوْبَةٍ اَسْرَعَ مِنْ عُقُوْبَةِ الْبَغْيِ وَاِيَّاكُمْ وَعُقُوْقَ الْوَالِدَيْنِ فَاِنَّ رِيْحَ الْجَنَّةِ تُوْجَدُ مِنْ مَّسِيْرَةِ اَلْفِ عَامٍ ۔ وَاللّٰهِ لَا يَجِدُهَا عَاقٌّ وَّلَا قَاطِعُ رَحِمٍ وَّلَا شَيْخٌ زَانٍ وَّلَا جَارٌّ اِزَارَهٗ خُيَلَاءَ اِنَّمَا الْكِبْرِيَاءُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ۝ وَالْكِذْبُ كُلُّهٗ اِثْمٌ ۔ اِلَّا مَا نَفَعْتَ بِهٖ مُؤْمِنًا وَّدَفَعْتَ بِهٖ عَنْ دِيْنٍ ۔ وَاِنَّ فِي الْجَنَّةِ لَسُوْقًا مَّا يُبَاعُ فِيْهَا وَلَا يُشْتَرٰى ۔ لَيْسَ فِيْهَا اِلَّا الصُّوَرُ ۝ فَمَنْ اَحَبَّ صُوْرَةً مِّنْ رَّجُلٍ اَوِ امْرَاَةٍ دَخَلَ فِيْهَا ۔ (طبرانی)

اے جماعتِ مسلمین! اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، رشتہ داروں سے حُسنِ سلوک سے پیش آتے رہو کیونکہ کسی نیک کام کا ثواب صلہ رحمی کے ثواب سے جلدی ملنے والا نہیں۔ ظلم و زیادتی، بغاوت و سرکشی سے بچتے رہو، کیونکہ کسی گناہ پر اس قدر جلد سزا نہیں ملتی جتنی سرکشی اور بغاوت پر۔ لوگو! ماں باپ کی نافرمانیوں سے بچو کیونکہ جنّت کی خوشبو ایک ہزار سال کے فاصلے سے آجاتی ہے مگر خدا کی قسم ماں باپ کے نافرمان، رشتوں ناتوں کو توڑنے والے، بڑھاپے میں زناکاریاں کرنے والے اور فخر و تکبّر سے اپنے تہمد یا پاجامے کو ٹخنے سے نیچے لٹکانے والے اسے نہ پا سکیں گے۔ یاد رکھو کبریائی اور بڑائی صرف اللہ ہی کے لیے ہے جو سب کا پالنہار ہے۔ جھوٹ سرتاپا گناہ کی چیز ہے سوائے اس کے جس سے تو کسی مومن کو نفع پہنچائے یا اس سے اپنے دین سے کسی نقصان کو دُور کرے۔ جنّت میں ایک بازار ایسا ہے جہاں کوئی خرید و فروخت نہیں ہوتی۔ اُس میں صرف صورتیں ہیں جو مرد و عورت جس صورت کو پسند کرے وہی صورت اُس کی ہو جائے گی۔

۲۸

جہاد کی فضیلت

حضرت قتادہؓ سے روایت ہے کہ ایک بار رسولِ پاکؐ نے صحابہؓ کے مجمع میں کھڑے ہو کر خطبہ پڑھا، جس میں ارشاد فرمایا:

اَنَّ الْجِهَادَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَالْاِیْمَانَ بِاللّٰهِ اَفْضَلُ الْاِیْمَانِ فَقَامَ رَجُلٌ فَقَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَرَأَیْتَ اِنْ قُتِلْتُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ یُکَفِّرُ عَنِّیْ خَطَایَایَ؟ فَقَالَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ نَعَمْ. اِنْ قُتِلْتَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَاَنْتَ صَابِرٌ مُّحْتَسِبٌ مُّقْبِلٌ غَیْرُ مُدْبِرٍ. ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ کَیْفَ قُلْتَ؟ فَقَالَ اَرَأَیْتَ اِنْ قُتِلْتُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَیُکَفِّرُ عَنِّیْ خَطَایَایَ؟ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ نَعَمْ وَاَنْتَ صَابِرٌ مُّحْتَسِبٌ مُّقْبِلٌ غَیْرُ مُدْبِرٍ. اِلَّا الدَّیْنَ فَاِنَّ جِبْرَئِیْلَ قَالَ لِیْ ذٰلِكَ. (مسلم شریف)

جہاد فی سبیل اللہ اور ایمان باللہ ایمان کی افضل ترین صورتیں ہیں۔ یہ سُن کر ایک صحابی کھڑے ہوئے اور دریافت کیا کہ یا رسولؐ اللہ! اگر میں راہِ خدا میں قتل کر دیا جاؤں تو کیا یہ میرے تمام گناہوں کا کفارہ ہو جائے گا؟ آپؐ نے فرمایا، ہاں، بشرطیکہ تُو راہِ خدا میں اس حال میں قتل کیا جائے کہ تُو صبر کرنے والا، ثوابِ آخرت کی جستجو کرنے والا اور آگے بڑھنے والا ہو نہ کہ پیچھے ہٹنے والا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم نے کیا کہا تھا؟ ان صحابی نے کہا: اگر میں راہِ خدا میں قتل کر دیا جاؤں تو کیا یہ میرے تمام گناہوں کا کفارہ ہو جائے گا؟ آپؐ نے فرمایا، ہاں، بشرطیکہ تُو راہِ خدا میں اس حال میں قتل کیا جائے کہ تُو صبر کرنے والا، ثواب کی جستجو کرنے والا اور آگے بڑھنے والا ہو نہ کہ پیچھے ہٹنے والا، سوائے قرض کے (کہ وہ معاف نہ ہوگا) کیونکہ جبریلؑ نے (ابھی ابھی) یہ بات مجھے بتائی ہے۔

۲۹

جہاد

جنگِ اُحد کے موقع پر جب مسلمان، کفار کے بالمقابل صف آرا ہوئے تو آپؐ نے ان کے سامنے حسبِ ذیل خطبہ ارشاد فرمایا:

اَیُّهَا النَّاسُ اُوْصِیْکُمْ بِمَآ اَوْصَانِیْ بِهِ اللّٰهُ فِیْ کِتَابِهٖ مِنَ الْعَمَلِ بِطَاعَتِهٖ - وَالتَّنَاهِیْ عَنْ مَحَارِمِهٖ - ثُمَّ اَنْتُمُ الْیَوْمَ بِمَنْزِلِ اَجْرٍ وَّ ذِکْرٍ لِّمَنْ ذَکَرَ الَّذِیْ عَلَیْهِ ثُمَّ وَطَّنَ نَفْسَهٗ عَلَی الصَّبْرِ وَالْیَقِیْنِ وَالْجِدِّ وَالنَّشَاطِ - فَاِنَّ جِهَادَ الْعَدُوِّ شَدِیْدٌ کَرِیْهٌ - قَلِیْلٌ مَّنْ یَّصْبِرُ عَلَیْهِ اِلَّا مَنْ لَّهٗ عَزْمٌ عَلٰی رُشْدِهٖ - اِنَّ اللّٰهَ مَعَ مَنْ اَطَاعَهٗ - وَ اِنَّ الشَّیْطَانَ مَعَ مَنْ عَصَاهُ - فَاسْتَفْتِحُوْآ اَعْمَالَکُمْ بِالصَّبْرِ عَلَی الْجِهَادِ - وَالْتَمِسُوْا بِذَالِكَ مَا وَعَدَکُمُ اللّٰهُ - وَعَلَیْکُمْ بِالَّذِیْ اٰمُرُکُمْ بِهٖ فَاِنِّیْ حَرِیْصٌ عَلٰی رُشْدِکُمْ - اِنَّ الْاِخْتِلَافَ وَ التَّنَازُعَ وَالتَّثَبُّطَ عَنْ اَمْرِ الْعَجْزِ وَالضُّعْفِ - وَهُوَ مِمَّا لَا یُحِبُّهُ اللّٰهُ - وَلَا یُعْطِیْ عَلَیْهِ النَّصْرَ وَالظَّفَرَ - الخ

اے لوگو! میں تمہیں وہی وصیت کرتا ہوں جو وصیت جناب باری نے اپنی کتاب میں کی ہے یعنی یہ کہ تم اس کی اطاعت بجالاتے رہو اور اس کی حرام کردہ چیزوں سے اجتناب کرتے رہو۔ سُنو آج تم اجر و ذکر کی جگہ ہو۔ جو شخص ذکر پر جم جائے صبر و یقین، پختگی اور خوش نفسی سے جہاد کرے وُہ خدا کے ہاں اجر پائے گا۔ اس کا نام دونوں جہان میں بلند ہو جائے گا کیونکہ دشمن سے جہاد کرنا سخت اور مشکل کام ہے۔ اس پر صبر بہت کم لوگوں سے ہوتا ہے وہی یہاں ثابت قدم رہتے ہیں جنہیں اپنے ہدایت یافتہ ہونے پر پختہ یقین ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ ہوتا ہے جو اس کی اطاعت کرے اور جو اس کی نافرمانی کرے اس کے ساتھ شیطان ہوتا ہے اپنے اعمال کو جہاد کی سختیوں پر صبر کرنے سے شروع کرو۔ اس کے ذریعے ان چیزوں کو تلاش کرو جن کا اللہ نے تم سے وعدہ کر رکھا ہے۔ میرے حکموں کی فرمانبرداری کو لازم پکڑے رہو کیونکہ میں تمہاری ہدایت پر حریص ہوں اختلاف جھگڑا اور جنگ سے جی چرانا عجز اور ضعف ایسی چیزیں ہیں جن کو اللہ ناپسند کرتا ہے اور ان پر فتح و نصرت عطا نہیں فرماتا۔

۳۰

کبائر سے اجتناب

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ایک بار منبر پر چڑھے اور دو مرتبہ قسم کھائی ۔ پھر منبر سے اُتر آئے ۔ پھر فرمایا :

اَبْشِرُوْا اَبْشِرُوْا ۔ مَنْ صَلَّی الصَّلَوَاتِ الْخَمْسِ وَاجْتَنَبَ الْکَبَائِرَ ۔ دَخَلَ مِنْ اَیِّ اَبْوَابِ الْجَنَّۃِ شَآءَ ۔

خوش ہو جاؤ ، خوش ہو جاؤ ، بشارت سُن لو ، جو پانچ وقت نماز ادا کرتا ہے اور کبیرہ گناہوں سے بچتا ہے وہ جنت کے جس دروازے سے چاہے گا ، جنت میں داخل ہو جائے گا ۔

مطلب کہتے ہیں میں نے ایک شخص کو عبداللہ بن عمرو سے پوچھتے سنا کہ کیا آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان (کبیرہ گناہوں) کا ذکر کرتے سُنا تھا ؛ اُنھوں نے کہا : ہاں (حضورؐ کے فرمان کے مطابق وہ گناہ یہ ہیں) :

عُقُوْقُ الْوَالِدَیْنِ وَالشِّرْکُ بِاللّٰہِ وَقَتْلُ النَّفْسِ وَقَذْفُ الْمُحْصَنَاتِ وَاَکْلُ مَالَ الْیَتِیْمِ وَالْفِرَارُ مِنَ الزَّحْفِ وَاَکْلُ الرِّبَا ۔ (طبرانی)

ماں باپ کی نافرمانی ، اللہ کے ساتھ شرک ، ناحق کا قتل ۔ پاک دامن عورتوں پر تہمت ۔ مالِ یتیم کا کھا جانا ۔ میدانِ جہاد سے بھاگ کھڑا ہونا ۔ سُود کھانا ۔

۳۱

خطبۂ تبوک

۹ھ ہجری میں غزوۂ تبوک پیش آیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تیس ہزار صحابہؓ کو ساتھ لے کر تبوک کے مقام پر پہنچے اور مجاہدین کے سامنے حسب ذیل خطبہ ارشاد فرمایا :

فَإِنَّ أَصْدَقَ الْحَدِيْثِ كِتَابُ اللهِ ۞ وَأَوْثَقُ الْعُرٰى كَلِمَةُ التَّقْوٰى ۞ وَخَيْرُ الْمِلَلِ مِلَّةُ
إِبْرَاهِيْمَ ۞ وَخَيْرُ السُّنَنِ سُنَّةُ مُحَمَّدٍ ۞ وَأَشْرَفُ الْحَدِيْثِ ذِكْرُ اللهِ ۞ وَأَحْسَنُ الْقَصَصِ
هٰذَا الْقُرْاٰنُ ۞ وَخَيْرُ الْأُمُوْرِ عَوَازِمُهَا وَشَرُّ الْأُمُوْرِ مُحْدَثَاتُهَا ۞ وَأَحْسَنُ الْهَدْيِ هَدْيُ الْأَنْبِيَاءِ ۞ وَأَشْرَفُ
الْمَوْتِ قَتْلُ الشُّهَدَاءِ ۞ وَأَعْمَى الْعَمٰى الضَّلَالَةُ بَعْدَ الْهُدٰى ۞ وَخَيْرُ الْأَعْمَالِ مَا نَفَعَ ۞
وَخَيْرُ الْهُدٰى مَا اتُّبِعَ ۞ وَشَرُّ الْعَمٰى عَمَى الْقَلْبِ ۞ وَالْيَدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِّنَ الْيَدِ السُّفْلٰى ۞
وَمَا قَلَّ وَكَفٰى خَيْرٌ مِّمَّا كَثُرَ وَأَلْهٰى ۞ وَشَرُّ الْمَعْذِرَةِ حِيْنَ يَحْضُرُ الْمَوْتُ ۞ وَشَرُّ النَّدَامَةِ
يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۞ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ لَّا يَأْتِي الْجُمُعَةَ إِلَّا دُبُرًا ۞ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّا يَذْكُرُ اللهَ إِلَّا هُجْرًا ۞
وَمِنْ أَعْظَمِ الْخَطَايَا اللِّسَانُ الْكَذَّابُ ۞ وَخَيْرُ الْغِنٰى غِنَى النَّفْسِ ۞ وَخَيْرُ الزَّادِ التَّقْوٰى ۞ وَرَأْسُ
الْحِكَمِ مَخَافَةُ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ ۞ وَخَيْرُ مَا وَقَرَ فِي الْقُلُوْبِ الْيَقِيْنُ ۞ وَالْإِرْتِيَابُ مِنَ الْكُفْرِ ۞
وَالنِّيَاحَةُ مِنْ عَمَلِ الْجَاهِلِيَّةِ ۞ وَالْغُلُوْلُ مِنْ حَرِّ جَهَنَّمَ ۞ وَالسُّكْرُ كَيٌّ مِّنَ النَّارِ ۞ وَالشِّعْرُ
مِنْ إِبْلِيْسَ ۞ وَالْخَمْرُ جِمَاعُ الْإِثْمِ ۞ وَشَرُّ الْمَأْكَلِ مَالُ الْيَتِيْمِ ۞ وَالسَّعِيْدُ مَنْ وُّعِظَ بِغَيْرِهِ ۞
وَالشَّقِيُّ مَنْ شَقِيَ فِيْ بَطْنِ أُمِّهِ ۞ وَإِنَّمَا يَصِيْرُ أَحَدُكُمْ إِلٰى مَوْضِعِ أَرْبَعَةِ أَذْرُعٍ ۞ وَالْأَمْرُ
إِلَى الْاٰخِرَةِ ۞ وَمَلَاكُ الْعَمَلِ خَوَاتِمُهُ ۞ وَشَرُّ الرُّؤْيَا رُؤْيَا الْكَذِبِ ۞ وَكُلُّ مَا هُوَ اٰتٍ قَرِيْبٌ ۞
وَسِبَابُ الْمُؤْمِنِ فُسُوْقٌ ۞ وَقِتَالُهُ كُفْرٌ ۞ وَأَكْلُ لَحْمِهِ مِنْ مَّعْصِيَةِ اللهِ ۞ وَحُرْمَةُ مَالِهِ
كَحُرْمَةِ دَمِهِ ۞ وَمَنْ يَّتَأَلَّ عَلَى اللهِ يُكَذِّبْهُ ۞ وَمَنْ يَّغْفِرْ يُغْفَرْ لَهُ ۞ وَمَنْ يَّعْفُ يَعْفُ اللهُ
عَنْهُ ۞ وَمَنْ يَّكْظِمِ الْغَيْظَ يَأْجُرْهُ اللهُ ۞ وَمَنْ يَّصْبِرْ عَلَى الرَّزِيَّةِ يُعَوِّضْهُ اللهُ ۞ وَمَنْ يَّتَّبِعِ
السُّمْعَةَ يُسَمِّعِ اللهُ بِهِ ۞ وَمَنْ يَّتَصَبَّرْ يُضْعِفِ اللهُ لَهُ ۞ وَمَنْ يَّعْصِ اللهَ يُعَذِّبْهُ اللهُ ۞ وَ
أَسْتَغْفِرُ اللهَ ۞ وَأَسْتَغْفِرُ اللهَ ۞ وَأَسْتَغْفِرُ اللهَ ۞ (زاد المعاد)

سب سے زیادہ سچی بات کتاب خدا قرآن کریم ہے اور سب سے مضبوط سہارا تقویٰ کا کلمہ ہے۔ سب سے بہتر

ملت، ملتِ ابراہیمیؑ ہے۔ سب طریقوں سے بہترین طریقہ خدا کے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ہے تمام باتوں میں بہتر بات اللہ کا ذکر ہے۔ سب قصّوں میں سے بہتر یہ قرآن ہے۔ بہترین کام وہ ہیں جو انسان پُوری تن دہی اور عزمِ راسخ سے کرے۔ اور بدترین کام وہ ہیں (جو دینِ خدا میں) از خود وضع کر لئے جائیں۔ تمام راہوں میں سب سے عمدہ راہ پیغمبروں کی راہ ہے سب سے بہتر موت جامِ شہادت پینا ہے سب سے بُرا نابینا پن، ہدایت کے بعد گمراہی ہے۔ بہتر عمل وہ ہے جو نفع دے اور بہتر ہدایت وہ ہے جس پر عمل کیا جائے، بدترین اندھاپن دل کا اندھا پن ہے۔ اُوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔ جو چیز کم ہو مگر کافی ہو وہ اس سے بہتر ہے جو ہو تو زیادہ مگر غافل کرنے والی ہو۔ بدترین معذرت موت کے وقت کی معذرت ہے۔ بدترین ندامت قیامت کے دن ہوگی۔ سُنو بعض ایسے لوگ ہیں جو بہت دیر کر کے جمعہ میں آتے ہیں اُن میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو خدا کا ذکر لاتعلقی سے کرتے ہیں۔ بڑے بڑے گناہوں میں سے ایک جھُوٹی زبان ہے۔ بہترین تونگری دل کی تونگری ہے۔ اصلی کار آمد توشہ تقویٰ ہے۔ دانائیوں کا سرتاج اللہ عزّ و جل کا ڈر ہے۔ دلوں کی سب سے پسندیدہ چیز یقین ہے۔ شک کفر کا ایک جزو ہے۔ میّت پر چیخنا چلاّنا جاہلیت کا عمل ہے۔ خیانت دوزخ کی آگ ہے۔ شراب کا پینا دوزخ کی آگ سے داغے جانے کے مترادف ہے (بُرے) شعر ابلیس کی طرف سے ہیں۔ شراب تمام گناہوں کا منبع ہے۔ سب سے بُری خوراک یتیم کا مال ہے۔ سعادت مند انسان وہ ہے جو دُوسروں سے نصیحت حاصل کرے اور بدنصیب انسان وہ ہے جو ماں کے پیٹ میں ہی بُرا لکھ دیا گیا ہو۔ تم میں سے ہر ایک کو چار ہاتھ کے گڑھے میں جانا ہے اور معاملہ آخرت پر منحصر ہوگا۔ عمل کا مدار انجام کار پر ہوگا۔ سب سے بُرا خواب جھُوٹا خواب ہے۔ ہر آنے والی چیز قریب ہے۔ مومن کو گالی دینا فسق ہے اور اس سے لڑنا کفر ہے۔ اس کا گوشت کھانا (اس کی غیبت کرنا) خدا کی نافرمانی ہے۔ اس کے مال کی حرمت اس کے خون کی حرمت کی طرح ہے۔ جو اللہ کے مقابلے میں قسم کھائے گا اور اس کو جھٹلاوے گا، جو (دوسروں کی خطائیں) بخش دے گا اسے بخش دیا جائے گا۔ جو (دوسروں کو) معاف کر دے گا اللہ اس کے گناہ معاف کر دے گا۔ جو غصہ پی جائے گا اللہ اسے اس کا اجر دے گا۔ جو مصیبت پر صبر کرے گا اللہ اسے اس کا بدلہ دے گا۔ جو سُنی سنائی باتیں پھیلائے گا اللہ اس کو رُسوا کرے گا۔ جو شخص تکلیف سے صبر ظاہر کرے گا اللہ اس کی تکلیف کو بڑھا دے گا اور جو اللہ کی نافرمانی کرے گا اللہ اس کو عذاب دے گا۔ میں اللہ سے مغفرت کا طلبگار رہوں، میں اللہ سے مغفرت کا طلب گار رہوں، میں اللہ سے مغفرت کا طلب گار رہوں۔

۳۲

بہتر اور بدتر انسان

حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ جنگِ تبوک کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اونٹنی سے ٹیک لگائے ہوئے مندرجہ ذیل خطبہ دیا :

اَلَآ اُخْبِرُکُمْ بِخَیْرِ النَّاسِ ؟ وَشَرِّ النَّاسِ ؟ اِنَّ مِنْ خَیْرِ النَّاسِ رَجُلاً عَمِلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ عَلٰی ظَھْرِ فَرَسِہٖ اَوْ عَلٰی ظَھْرِ بَعِیْرِہٖ اَوْ عَلٰی قَدَمِہٖ حَتّٰی یَاْتِیَہُ الْمَوْتُ ۔ وَاِنَّ مِنْ شَرِّ النَّاسِ رَجُلاً فَاجِرًا یَقْرَاُ کِتَابَ اللّٰہِ لَا یَرْعَوِیْ اِلٰی شَیْءٍ مِّنْہُ ۔ (نسائی)

میں تمہیں بتلاؤں کہ بہتر لوگ کون ہیں اور بدتر کون ہیں ، سُنو بہتر انسان وُہ ہے جو راہِ خدا میں کام (یعنی جہاد) کرے اپنے گھوڑے کی پیٹھ پر یا اپنے اونٹ کی پیٹھ پر یا اپنے پاؤں پر، یہاں تک کہ اسے موت آجائے اور بدتر انسان وُہ فاسق و فاجر انسان ہے جو قرآن تو پڑھتا ہو لیکن اس کی کسی چیز کی طرف توجہ نہ کرے ۔

۲۳

سورج اور چاند گہن

آنحضورؐ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم کا انتقال ہوا تو اُسی روز سُورج گہن لگا۔ آپؐ نے اعلان کرایا کہ سب لوگ نماز کے لئے مسجد میں جمع ہو جائیں۔ لوگ اکٹھے ہُوئے تو آپؐ نے دو رکعت نماز پڑھائی جس میں آپؐ نے طویل قرأت کی۔ نماز میں مرد اور عورتیں شریک تھیں۔ حضرت اسماؓ بنت ابوبکرؓ کو غشی آگئی۔ نماز اس وقت ختم ہُوئی جب سورج گہن سے آزاد ہو چکا تھا۔ نماز کے بعد آپؐ نے ایک خطبہ دیا، جس میں فرمایا :

إِنَّ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَا يَنْكَسِفَانِ لِمَوْتِ أَحَدٍ مِّنَ النَّاسِ وَلَا لِحَيَاتِهِ وَلٰكِنَّهُمَا آيَتَانِ مِنْ آيَاتِ اللّٰهِ يُخَوِّفُ اللّٰهُ بِهِمَا عِبَادَهُ، فَإِذَا رَأَيْتُمُوهَا فَقُومُوا فَصَلُّوا وَادْعُوا اللّٰهَ وَكَبِّرُوا وَتَصَدَّقُوا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ حَتّٰى يُكْشَفَ مَا بِكُمْ يَا أُمَّةَ مُحَمَّدٍ وَاللّٰهِ مَا مِنْ أَحَدٍ أَغْيَرَ مِنَ اللّٰهِ أَنْ يَزْنِيَ عَبْدُهُ أَوْ تَزْنِيَ أَمَتُهُ۔ يَا أُمَّةَ مُحَمَّدٍ وَاللّٰهِ لَوْ تَعْلَمُونَ مَا أَعْلَمُ لَضَحِكْتُمْ قَلِيلًا وَّلَبَكَيْتُمْ كَثِيرًا۔ مَا مِنْ شَيْءٍ كُنْتُ لَمْ أَرَهُ إِلَّا وَقَدْ رَأَيْتُهُ فِي مَقَامِي هٰذَا۔ حَتَّى الْجَنَّةِ وَالنَّارِ۔ وَلَقَدْ أُوحِيَ إِلَيَّ أَنَّكُمْ تُفْتَنُونَ فِي الْقُبُورِ۔ قَرِيبًا مِّنْ فِتْنَةِ الدَّجَّالِ۔ يُؤْتٰى أَحَدُكُمْ فَيُقَالُ لَهُ مَا عِلْمُكَ بِهٰذَا الرَّجُلِ؟ فَأَمَّا الْمُؤْمِنُ (أَوْ قَالَ الْمُوْقِنُ) فَيَقُولُ هُوَ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ جَاءَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَالْهُدٰى فَأَجَبْنَا وَآمَنَّا وَاتَّبَعْنَا۔ فَيُقَالُ لَهُ نَمْ صَالِحًا۔ فَقَدْ عَلِمْنَا أَنْ كُنْتَ لَمُوْقِنًا وَأَمَّا الْمُنَافِقُ أَوِ الْمُرْتَابُ فَيَقُولُ لَا أَدْرِي سَمِعْتُ النَّاسَ يَقُولُونَ شَيْئًا فَقُلْتُهُ۔ ثُمَّ أَمَرَهُمْ أَنْ يَتَعَوَّذُوا مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ ۝ قَالُوا يَا رَسُولَ اللّٰهِ رَأَيْنَاكَ تَنَاوَلْتَ شَيْئًا فِي مَقَامِكَ ثُمَّ رَأَيْنَاكَ تَكَعْكَعْتَ؟ فَقَالَ إِنِّي رَأَيْتُ الْجَنَّةَ وَتَنَاوَلْتُ عُنْقُودًا وَّلَوْ أَصَبْتُهُ لَأَكَلْتُمْ مِنْهُ مَا بَقِيَتِ الدُّنْيَا وَأُرِيتُ النَّارَ فَلَمْ أَرَ مَنْظَرًا كَالْيَوْمِ قَطُّ أَفْظَعَ۔ وَرَأَيْتُ أَكْثَرَ أَهْلِهَا النِّسَاءَ قَالُوا بِمَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ؟ قَالَ بِكُفْرِهِنَّ قِيلَ أَيَكْفُرْنَ بِاللّٰهِ؟ قَالَ يَكْفُرْنَ الْعَشِيرَ وَيَكْفُرْنَ الْإِحْسَانَ لَوْ أَحْسَنْتَ إِلٰى إِحْدَاهُنَّ الدَّهْرَ كُلَّهُ، ثُمَّ رَأَتْ مِنْكَ شَيْئًا قَالَتْ مَا رَأَيْتُ مِنْكَ خَيْرًا قَطُّ ۝ (متفق علیہ)

سورج اور چاند کو نہ کسی کے پیدا ہونے سے گہن لگتا ہے نہ کسی کی موت سے۔ بلکہ وُہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں جن سے اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کو ڈراتا ہے۔ اے اُمتِ محمدؐ! تم جب اُنھیں دیکھو

تو نماز کیلیے کھڑے ہو جاؤ۔ اللہ سے دعائیں کرو، تکبیریں کہو، صدقہ دو، اللہ کا ذکر کرو، اللہ تعالیٰ سے استغفار کرو، یہاں تک کہ گہن کھل جاتے۔ اے اُمتِ محمدؐ! خدا کی قسم اللہ تعالیٰ سے زیادہ اس معاملے میں غیرتمند کوئی نہیں کہ اس کا کوئی بندہ یا اس کی کوئی لونڈی زنا کرے۔ اے امتِ محمدؐ! اگر تم وہ کچھ جانتے ہوتے جو میں جانتا ہوں تو بخدا تم بہت کم ہنستے اور بہت زیادہ روتے۔ ہر وُہ چیز جس کو میں نے پہلے نہیں دیکھا تھا، وہ میں نے اب اسی جگہ دیکھ لی ہے حتیٰ کہ جنت اور دوزخ بھی۔ مجھے بذریعہ وحی خبر دی گئی ہے کہ تمہیں قبروں میں آزمایا جاتے گا دجّال کے فتنے کے قریب (قریب یا اسی کی طرح) تم میں سے کسی کو لایا جائے گا اور اس سے کہا جائے گا: اس شخص کے بارے میں تمہیں کیا کچھ معلوم ہے؟ صاحبِ ایمان (یا فرمایا صاحبِ یقین) کہے گا: یہ اللہ کے رسول محمدؐ ہیں، ہمارے پاس واضح دلائل اور ہدایت لے کر تشریف لائے تھے۔ چنانچہ ہم نے تسلیم کر لیا، آپ پر ایمان لے آئے اور آپ کی اتباع کی۔ پس اس سے کہا جائے گا: آرام سے سو جاؤ ہم نے جان لیا ہے کہ تم صاحبِ یقین تھے مگر منافق یا شک کا مارا انسان کہے گا: مجھے کچھ معلوم نہیں، لوگوں کو کچھ کہتے سنا تو میں نے بھی وہی کہہ دیا تھا۔ پھر آپؐ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ عذابِ قبر سے خدا کی پناہ مانگیں۔ صحابہؓ نے عرض کیا: یا رسولؐ اللہ! ہم نے دیکھا آپ اپنی جگہ سے کوئی چیز پکڑنے لگے، پھر ہم نے دیکھا کہ آپؐ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئے۔ آپؐ نے فرمایا: میں نے جنّت دیکھی تو ایک خوشے کو پکڑنا چاہا۔ اور اگر میں اسے پکڑ لیتا تو تم اس میں سے رہتی دنیا تک کھاتے رہتے۔ پھر مجھے دوزخ دکھائی گئی سا اتنا بھیانک منظر میں نے کبھی نہیں دیکھا، میں نے دیکھا کہ اس میں اکثریت عورتوں کی ہے۔ لوگوں نے پُوچھا: یا رسولؐ اللہ! کس بناء پر؟ آپؐ نے فرمایا: ان کے کفر و ناشکری کی وجہ سے۔ پُوچھا گیا: کیا وہ اللہ کے ساتھ کفر کرتی ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: وُہ اپنے شوہروں کی ناشکری کرتی ہیں اور احسان فراموشی کرتی ہیں۔ اگر تم کسی عورت سے عمر بھر احسان کرو، پھر وُہ کوئی ذراسی کمی دیکھ لے تو کہے گی: میں نے تجھ سے کبھی کوئی بھلائی نہیں دیکھی۔

۳۴

خُطبۂ نکاح

حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ حضرت فاطمۃ الزہراؓ کے نکاح کے موقع پر رسولؐ خدا نے حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کو بلوایا۔ اسی طرح انصار کے کچھ لوگوں کو بھی دعوت دی۔ سب لوگ آ گئے تو آپؐ نے حسب ذیل خطبۂ نکاح ارشاد فرمایا:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الْمَحْمُوْدُ بِنِعْمَتِهٖ الْمَعْبُوْدُ بِقُدْرَتِهٖ الْمُطَاعُ بِسُلْطَانِهٖ الْمَرْهُوْبُ مِنْ عَذَابِهٖ وَسَطْوَتِهٖ اَلنَّافِذُ اَمْرُهٗ فِیْ سَمَآئِهٖ وَاَرْضِهٖ الَّذِیْ خَلَقَ الْخَلْقَ بِقُدْرَتِهٖ وَمَيَّزَهُمْ بِاَحْكَامِهٖ وَاَعَزَّهُمْ بِدِيْنِهٖ وَاَكْرَمَهُمْ بِنَبِيِّهٖ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ تَبَارَكَ اسْمُهٗ وَتَعَالَتْ عَظَمَتُهٗ جَعَلَ الْمُصَاهَرَةَ سَبَبًا لَاحِقًا وَّاَمْرًا مُّفْتَرَضًا اَوْشَجَ بِهِ الْاَرْحَامَ وَاَلْزَمَ بِهِ الْاَنَامَ فَقَالَ عَزَّ مِنْ قَائِلٍ وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيْرًا ۝ فَاَمْرُ اللّٰهِ يَجْرِیْ اِلٰى قَضَائِهٖ وَقَضَاۗؤُهٗ يَجْرِیْ اِلٰى قَدَرِهٖ وَلِكُلِّ قَدَرٍ اَجَلٌ وَّلِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ وَعِنْدَهٗ اُمُّ الْكِتَابِ ۝ ثُمَّ اِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ اَمَرَنِیْ اَنْ اُزَوِّجَ فَاطِمَةَ مِنْ عَلِیِّ بْنِ اَبِیْ طَالِبٍ فَاشْهَدُوْا اِنِّیْ زَوَّجْتُهٗ عَلٰى اَرْبَعِ مِأَتِهٖ مِثْقَالِ فِضَّةٍ اِنْ رَضِیَ بِذَالِكَ عَلِیٌّ۔

تمام تعریفیں ہیں اس خدا کی جو اپنی نعمتوں کی بدولت محمود ہے اپنی قدرتوں کی وجہ سے معبود ہے۔ اس کی طاقت اور قوت کی بدولت اس کی اطاعت کی جاتی ہے جس کے عذاب اور جلال سے ہر وقت ڈرا جاتا ہے جس کا حکم اس کے زمین اور اس کے آسمان میں نافذ ہے۔ اس نے اپنی قدرت سے مخلوقات کو پیدا کیا اور ان کو اپنے احکام کی تمیز کرا دی اور اپنے دین کے ذریعے ان کو عزّت بخشی اور اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل ان کو بزرگی عطا کی اور اللہ تبارک و تعالیٰ نے ازدواجی رشتہ کو قرابت کا ذریعہ مقرر کیا ہے اور اسے ایک ضروری چیز قرار دیا ہے جس سے رشتہ مضبوط ہو جاتا ہے۔ اور تمام لوگوں کو فطرتاً اس کی طرف راغب کیا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وہی ذات ہے جس نے پانی سے انسان کو پیدا کیا اور نسب اور دامادی کے رشتے مقرر فرمائے اور تیرا پروردگار بڑی طاقت والا ہے۔ پس اللہ کے حکموں کا تعلق قضاءِ الٰہی سے ہے، اور قضاءِ الٰہی کا سلسلہ تقدیر پر ختم ہوتا ہے۔ ہر قضا کے لئے قدر ہے اور ہر قدر کے لئے ایک خاص وقت

مقرر ہے اور ہر کام کا وقت لکھا جا چکا ہے۔ جس کو خدا چاہتا ہے مٹاتا ہے اور جس کو چاہتا ہے رہنے دیتا ہے اور اسی کے پاس تمام تحریروں کی جڑ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو حکم دیا ہے کہ میں فاطمہ کا نکاح علی بن ابی طالب کے ساتھ کر دوں۔ پس تم سب گواہ رہو کہ میں نے ۴۰۰ مثقال چاندی کے عوض ان کا عقد کر دیا بشرطیکہ علی رضامند ہوں۔

۳۵

ضابطۂ حیات

حضرت عیاض بن حمار المجاشعی سے روایت ہے کہ ایک بار غالباً مدینہ منورہ کے ابتدائی زمانے میں آپؐ نے حسب ذیل خطبہ ارشاد فرمایا:

أَلَا إِنَّ رَبِّي أَمَرَنِي أَنْ أُعَلِّمَكُمْ مَا جَهِلْتُمْ مِمَّا عَلَّمَنِي يَوْمِي هٰذَا كُلُّ مَالٍ نَحَلْتُهُ عَبْدًا
حَلَالٌ وَإِنِّي خَلَقْتُ عِبَادِي حُنَفَاءَ كُلَّهُمْ وَإِنَّهُمْ أَتَتْهُمُ الشَّيَاطِينُ فَاجْتَالَتْهُمْ عَنْ دِينِهِمْ
وَحَرَّمَتْ عَلَيْهِمْ مَا أَحْلَلْتُ لَهُمْ وَأَمَرَتْهُمْ أَنْ يُشْرِكُوا بِي مَا لَمْ أُنْزِلْ بِهِ سُلْطَانًا ط وَإِنَّ اللّٰهَ
نَظَرَ إِلَى أَهْلِ الْأَرْضِ فَمَقَتَهُمْ عَرَبَهُمْ وَعَجَمَهُمْ إِلَّا بَقَايَا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَقَالَ إِنَّمَا بَعَثْتُكَ
لِأَبْتَلِيَكَ وَأَبْتَلِيَ بِكَ وَأَنْزَلْتُ عَلَيْكَ كِتَابًا لَا يَغْسِلُهُ الْمَاءُ تَقْرَؤُهُ نَائِمًا وَيَقْظَانَ ٥
وَإِنَّ اللّٰهَ أَمَرَنِي أَنْ أُحَرِّقَ قُرَيْشًا فَقُلْتُ رَبِّ إِذًا يَثْلَغُوا رَأْسِي فَيَدَعُوهُ خُبْزَةً ٥ فَقَالَ
اسْتَخْرِجْهُمْ كَمَا أَخْرَجُوكَ وَاغْزُهُمْ نُغْزِكَ وَأَنْفِقْ فَسَنُنْفِقَ عَلَيْكَ وَابْعَثْ جَيْشًا نَبْعَثْ
خَمْسَةً مِثْلَهُ وَقَاتِلْ بِمَنْ أَطَاعَكَ مَنْ عَصَاكَ ٥ وَأَهْلُ الْجَنَّةِ ثَلَاثَةٌ ذُو سُلْطَانٍ مُقْسِطٌ
مُتَصَدِّقٌ وَمُوَفَّقٌ وَرَجُلٌ رَحِيمٌ رَقِيقُ الْكَلْبِ لِكُلِّ ذِي قُرْبَى وَمُسْلِمٍ وَعَفِيفٌ ذُو عِيَالٍ ٥
وَأَهْلُ النَّارِ خَمْسَةٌ الضَّعِيفُ الَّذِي لَا ذَبْرَ لَهُ الَّذِينَ هُمْ فِيكُمْ تَبَعًا لَا يَتْبَعُونَ أَهْلًا وَلَا
مَالًا وَالْخَائِنُ الَّذِي لَا يَخْفَى لَهُ طَمَعٌ وَإِنْ دَقَّ إِلَّا خَانَهُ وَرَجُلٌ لَا يُصْبِحُ وَلَا يُمْسِي إِلَّا
وَهُوَ يُخَادِعُكَ عَنْ أَهْلِكَ وَمَالِكَ وَذَكَرَ الْبُخْلَ أَوِ الْكَذِبَ وَالشِّنْظِيرُ الْفَحَّاشُ (وَفِي رِوَايَةٍ)
إِنَّ اللّٰهَ أَوْحَى إِلَيَّ أَنْ تَوَاضَعُوا حَتَّى لَا يَفْخَرَ أَحَدٌ عَلَى أَحَدٍ وَلَا يَبْغِيَ أَحَدٌ عَلَى أَحَدٍ ٥

(مسلم شریف)

آگاہ ہو جاؤ میرے پروردگار نے مجھے حکم دیا ہے کہ جو باتیں آج مجھے سکھائی گئی ہیں وہ تمہیں بتا دوں (خدا نے فرمایا ہے) کہ جو مال میں نے اپنے بندے کو اپنی مہربانی سے عطا کیا ہے وہ اس کے لئے حلال ہے، میں نے اپنے بندوں کو راہِ حق پر پیدا کیا تھا مگر شیطان ان کے پاس آئے اور اُنھوں نے ان کو دینِ حنیف سے دُور کر دیا اور میری حلال کردہ چیزوں کو ان کے لیے حرام کر دیا اور ان کو شرک کرنے کی ہدایت کی جس کے لیے میں نے کوئی سند نہیں اُتاری تھی۔ پھر فرمایا اللہ تعالیٰ نے اہلِ زمین کی طرف دیکھا تو باقی اہلِ کتاب کے سوا تمام انسانوں کو

خواہ وہ عرب ہوں یا عجم ناپسند فرمایا اور کہا: میں نے تمھیں اس لیے بھیجا ہے کہ تم کو اور تمہارے ذریعے دوسروں کو آزماؤں اور تم پر ایسی کتاب اتاری جو پانی سے محو نہیں ہو سکتی (بلکہ سینوں میں محفوظ ہے) تم اسے سوتے جاگتے پڑھ سکتے ہو۔ اور اللہ نے مجھے حکم دیا کہ قریش کو جلا ڈالو۔ میں نے کہا الٰہی! وہ بڑی طاقتور قوم ہے مجھے توڑ کر رکھ دے گی۔ خدا نے فرمایا: ان کو ایسا نکال دو جیسا انہوں نے تجھ کو نکال دیا ہے ان سے لڑو اسباب ہم فراہم کریں گے، تم خرچ کرو ہم دیں گے، تم ایک لشکر روانہ کرو ہم اس کا پنج گنا بھیج دیں گے اور اپنے مطیع اور فرمانبردار لوگوں کو لے کر نافرمانوں سے خدا کی راہ میں غزوہ کرو۔ (پھر فرمایا) تین قسم کے لوگ جنتی ہیں: منصف[۱]، سخی اور نیک حاکم۔ رشتہ داروں[۲] اور عام مسلمانوں کے ساتھ مہربانی کرنے والا نرم دل آدمی۔ عیالدار[۳] باعفت سوال سے بچنے والا شخص۔ پانچ قسم کے لوگ دوزخی ہیں: (۱) کمزور بے شعور، آوارہ گرد جو دوسروں پر بوجھ ہو اور بال بچوں کے جھمیلے سے الگ رہے۔ (۲) وہ جو خیانت کے کسی موقع سے نہیں چوکتا۔ (۳) وہ شخص جو تمہیں تمہارے مال و منال اور اہل و عیال کے بارے میں دھوکہ دیتا ہے۔ (۴) آپؐ نے بخل یا جھوٹ کا ذکر کیا۔ (۵) بدگو فحش بکنے والا اور لعنت ملامت بکثرت کرنے والا بدخلق بدزبان (ایک اور روایت میں ہے کہ) اللہ تعالیٰ نے میری طرف وحی فرمائی کہ تم تواضع اختیار کرو اور کوئی شخص دوسرے پر فخر نہ کرے اور نہ کوئی شخص دوسرے کے خلاف بغاوت اور سرکشی اختیار کرے۔

۳۶

اسلام اور جاہلیت

قبیلہ بنو مراد کا ایک وفد آنحضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وفد میں شامل ایک مقرر طلیبان نے تقریر کی جس میں قدیم تاریخ کے حوالے سے بتایا کہ طائف اور اس کا نواحی علاقہ کسی زمانے میں بنو مراد کی ملکیت تھا، پھر دشمنوں نے بہ جبر ہم سے چھین کر ہمیں ساحلی علاقوں کی طرف ہجرت پر مجبور کر دیا۔ آخر میں اس نے حضورؐ کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اسلام ظالم کے خلاف مظلوم کی مدد کا حامی ہے، آپ ہمارا حق دلوائیے۔

اسی محفل میں مخالف بنو ثقیف قبیلے کے سردار اخنس بن فریق اور اسود بن مسعود ثقفی بھی موجود تھے۔ انھوں نے کھڑے ہو کر جوابی تقریر کی اور صورتِ حال کا دوسرا نقشہ پیش کیا اور طائف پر اپنا حق جتلایا۔ فریقین کی تقریروں سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ ایک بے معنی جھگڑا ہے اور ان لوگوں کے اندر ابھی تک حُبِّ دُنیا اور جاہلیت کے اثرات موجود ہیں۔ اس موقع پر رسولِ خدا نے حسب ذیل خطبہ ارشاد فرمایا:

إِنَّ نَعِيمَ الدُّنْيَا أَقَلُّ وَأَصْغَرُ مِنْ ذَرِّ بَصِيصَةٍ وَلَوْ عَدَلَتْ عِنْدَ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ جَنَاحَ ذُبَابٍ لَمْ يَكُنْ لِمُسْلِمٍ كَاحٌ ؟ وَلَا لِكَافِرٍ فِيهَا بَرَاحٌ وَلَوْ عَلِمَ الْمَخْلُوقُ مِقْدَارَ يَوْمِهِ لَضَاقَتْ عَلَيْهِ بِرَحْبِهَا وَلَمْ يَنْفَعْهُ جُبُورٌ وَلَا خَفْضٌ وَلٰكِنَّهُ غُمَّ عَلَيْهِ الْأَجَلُ وَمُدَّ لَهُ فِي الْأَمَلِ ٥ وَإِنَّمَا سُمِّيَتِ الْجَاهِلِيَّةُ بِضُعْفِ أَعْمَالِهَا وَجَهَالَةِ أَهْلِهَا فَمَنْ أَدْرَكَهُ الْإِسْلَامُ وَفِي يَدِهِ خَرَابٌ وَعِمْرَانٌ فَهُوَ لَهُ عَلَىٰ وُظُفِ رَحَاتِهِ لِكُلِّ مُؤْمِنٍ خِلْصِيٍّ وَمُعَاهِدٍ ذِمِّيٍّ ٥ إِنَّ أَهْلَ الْجَاهِلِيَّةِ عَبَدُوا غَيْرَ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ وَلَهُمْ أَعْمَالٌ يَنْتَهُونَ إِلَىٰ مُدَّتِهَا وَيَصِيرُونَ إِلَىٰ نِهَايَتِهَا مُؤَخَّرٌ عَنْهُمُ الْعِقَابُ إِلَىٰ يَوْمِ الْحِسَابِ أَمْهَلَهُمْ بِقُدْرَتِهِ وَجَلَالِهِ وَعِزَّتِهِ فَغَلَبَ الْأَعَزُّ مِنْهَا الْأَذَلَّ وَأَكَلَ الْكَثِيرُ مِنْهَا الْأَقَلَّ وَاللهُ الْأَعْلَى الْأَجَلُّ فَمَا كَانَ فِي الْجَاهِلِيَّةِ فَهُوَ مَوْضُوعٌ مِنْ سَفْكِ دَمٍ وَانْتِهَاكِ مُحَرَّمٍ عَفَا اللهُ عَمَّا سَلَفَ وَمَنْ عَادَ فَيَنْتَقِمُ اللهُ مِنْهُ وَاللهُ عَزِيزٌ ذُو انْتِقَامٍ

(مواہب الفتحیہ)

دنیوی نعمتیں خدائے تعالیٰ کے نزدیک ریت کے چمکدار ذرات سے بھی کمتر اور ذلیل ہیں اور اگر خدا کے پاس مکھی کے برابر بھی ان کی توقیر ہوتی تو کوئی مسلمان محتاج نہ رہتا نہ کوئی کافر یہاں عیش کرتا۔ اگر لوگوں کو اپنی اجل مقرر معلوم ہو جائے تو ان پر عرصۂ حیات تنگ ہو جائے اور عیش و عشرت انہیں بالکل راس نہ آئے۔ لیکن اجل مخفی

رکھی گئی ہے اور خواہشات پھیلائی گئی ہیں۔ زمانۂ جاہلیت کو اس نام سے اسی لیے نامزد کیا گیا ہے کہ اُن لوگوں کے اعمال بے بنیاد تھے اور وہ مذہب سے کورے تھے۔ پس جو کوئی شخص اسلام کے عہدِ میمون سے مشرف ہوا۔ اس کے قبضہ میں جو بنجر یا آباد زمین ہو وہ شریعت کا مقررہ حصہ ادا کرنے کے بعد اُس کی سمجھی جائے گی۔ یہ حصہ (عُشر یا خراج) ہر مسلمان اور معاہد ذمّی پر مقرر ہو چکا ہے۔ جاہلیت والے غیر اللہ کو پُوجتے رہے، وہ اپنے اعمال کی سزا ضرور بھگتیں گے۔ ان کا عذاب روزِ قیامت تک مؤخر کیا جا چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت، جلال اور غلبہ کے باوجود ان کو موقع دیا۔ سوطا قتور لوگ کمزوروں پر غالب آئے اور بڑی قوموں نے چھوٹی جماعتوں کو ہڑپ کر لیا۔ خدا بہت بڑا اور بزرگ ہے۔ زمانۂ جاہلیت کے تمام خون بہا اور ناجائز معاملات ملیا میٹ ہو چکے جو گزر چکا وہ اللہ نے معاف کر دیا اور جو کوئی آئندہ ایسا کرے، اللہ اس کو سزا دے گا۔ اللہ غالب اور سزا دینے والا ہے۔

۳۷

پانچ بُرائیاں

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک بار رسولِ خداؐ نے مندرجہ ذیل خطبہ ارشاد فرمایا:

يَا مَعْشَرَ الْمُهَاجِرِيْنَ ٥ خَمْسُ خِصَالٍ إِذَا ابْتُلِيْتُمْ بِهِنَّ وَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ أَنْ تُدْرِكُوْهُنَّ۔ لَمْ تَظْهَرِ الْفَاحِشَةُ فِيْ قَوْمٍ قَطُّ حَتّٰى يُعْلِنُوْا بِهَا إِلَّا فَشَا فِيْهِمُ الطَّاعُوْنُ وَالْأَوْجَاعُ الَّتِيْ لَمْ تَكُنْ مَضَتْ فِيْ أَسْلَافِهِمُ الَّذِيْنَ مَضَوْا۔ لَمْ يَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ إِلَّا أُخِذُوْا بِالسِّنِيْنَ وَشِدَّةِ الْمُؤْنَةِ وَجَوْرِ السُّلْطَانِ عَلَيْهِمْ۔ وَلَمْ يَمْنَعُوْا زَكٰوةَ أَمْوَالِهِمْ إِلَّا مُنِعُوا الْقَطْرَ مِنَ السَّمَآءِ۔ وَلَوْلَا الْبَهَائِمُ لَمْ يُمْطَرُوْا۔ وَلَمْ يَنْقُضُوْا عَهْدَ اللّٰهِ وَعَهْدَ رَسُوْلِهٖ إِلَّا سَلَّطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ عَدُوًّا مِّنْ غَيْرِهِمْ فَأَخَذُوْا بَعْضَ مَا فِيْ أَيْدِيْهِمْ۔ وَلَمْ تَحْكُمْ أَئِمَّتُهُمْ بِكِتَابِ اللّٰهِ وَيَتَخَيَّرُوْا فِيْمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ إِلَّا جَعَلَ اللّٰهُ بَأْسَهُمْ بَيْنَهُمْ۔ (ابنِ ماجہ)

اے گروہِ مہاجرین! میں خدا سے تمہارے لیے پانچ باتوں میں پڑنے سے پناہ مانگتا ہوں۔ جب کسی قوم میں برملا فحش کام ہونے لگتے ہیں تو وہ لوگ طاعون اور دوسری ایسی گوناگوں بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں جن سے ان کے اسلاف محض ناآشنا اور بے خبر تھے۔ اور جب کوئی قوم ناپ تول میں کمی کرنے لگتی ہے تو وہ قحط سالی، سخت مصائب اور حکمرانوں کے مظالم میں پھنس جاتی ہے۔ اور جب کوئی قوم زکوٰۃ ادا نہیں کرتی تو ان پر بارش بند ہو جاتی ہے۔ اگر ان کے چوپائے نہ ہوں تو ان پر مینہ کی ایک بوند بھی نہ برسے۔ اور جب کوئی قوم اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ عہد شکنی کرتی ہے تو اللہ ان پر دشمن مسلط کر دیتا ہے جو ان کے اموال چھین لیتا ہے۔ اور جب کسی ملک کے حکام احکامِ خداوندی کے مطابق فیصلے کرنا چھوڑ دیتے ہیں اور احکامِ خداوندی میں اپنی مرضی برتتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کی قوم میں لڑائی ڈال دیتا ہے۔

۳۸

فتح مکّہ کے موقع پر

فتح مکہ کے موقع پر رسولِ خدا نے جو کچھ ارشاد فرمایا، اسے مختلف راویوں نے بیان کیا ہے (بخاری، مسلم) - ابوداؤد، ابن ماجہ اور ابن کثیر میں مذکور آپؐ کے ارشادات ذیل میں یکجا پیش کیے جا رہے ہیں۔

حمد و ثنا کے بعد فرمایا :

اِنَّ مَكَّةَ حَرَّمَهَا اللهُ وَلَمْ يُحَرِّمْهَا النَّاسُ فَلَا يَحِلُّ لِامْرِءٍ يُؤْمِنُ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يَّسْفِكَ بِهَا دَمًا وَّ لَا يَعْضُدَ بِهَا شَجَرَةً - فَاِنْ اَحَدٌ تَرَخَّصَ بِقِتَالِ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْهَا فَقُوْلُوْا لَهٗ اِنَّ اللهَ قَدْ اَذِنَ لِرَسُوْلِهٖ - وَلَمْ يَاْذَنْ لَكُمْ - وَاِنَّمَآ اَذِنَ لِيْ فِيْهَا سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ - وَقَدْ عَادَتْ حُرْمَتُهَا الْيَوْمَ كَحُرْمَتِهَا بِالْاَمْسِ وَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ۔

(مُتَّفَقٌ عَلَيْہِ)

اس شہر مکہ کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے خود ہی ذی حرمت باعزّت متبرک اور مبارک بنایا ہے نہ کہ لوگوں نے۔ جو اللہ پر اور قیامت پر ایمان رکھتا ہو اُسے یہاں خُون بہانا حلال نہیں، نہ یہاں کا درخت کاٹنا حلال ہے۔ اگر کوئی میرے آج کے جہاد کو دلیل بنا کر رخصت نکالنا چاہے تو تم اسے جواب دینا کہ اللہ نے اپنے رسول کو اجازت دے دی تھی لیکن تمہیں اس نے اجازت نہیں دی۔ مجھے بھی اللہ نے دن میں بس گھڑی بھر کے لیے رخصت دی تھی اس وقت مکہ کی حرمت ویسی ہی لوٹ آئی ہے جیسی کل تھی تم میں سے جو موجود ہیں ان پر فرض ہے کہ جو حاضر نہیں ان تک میرا یہ خطبہ پہنچا دیں۔

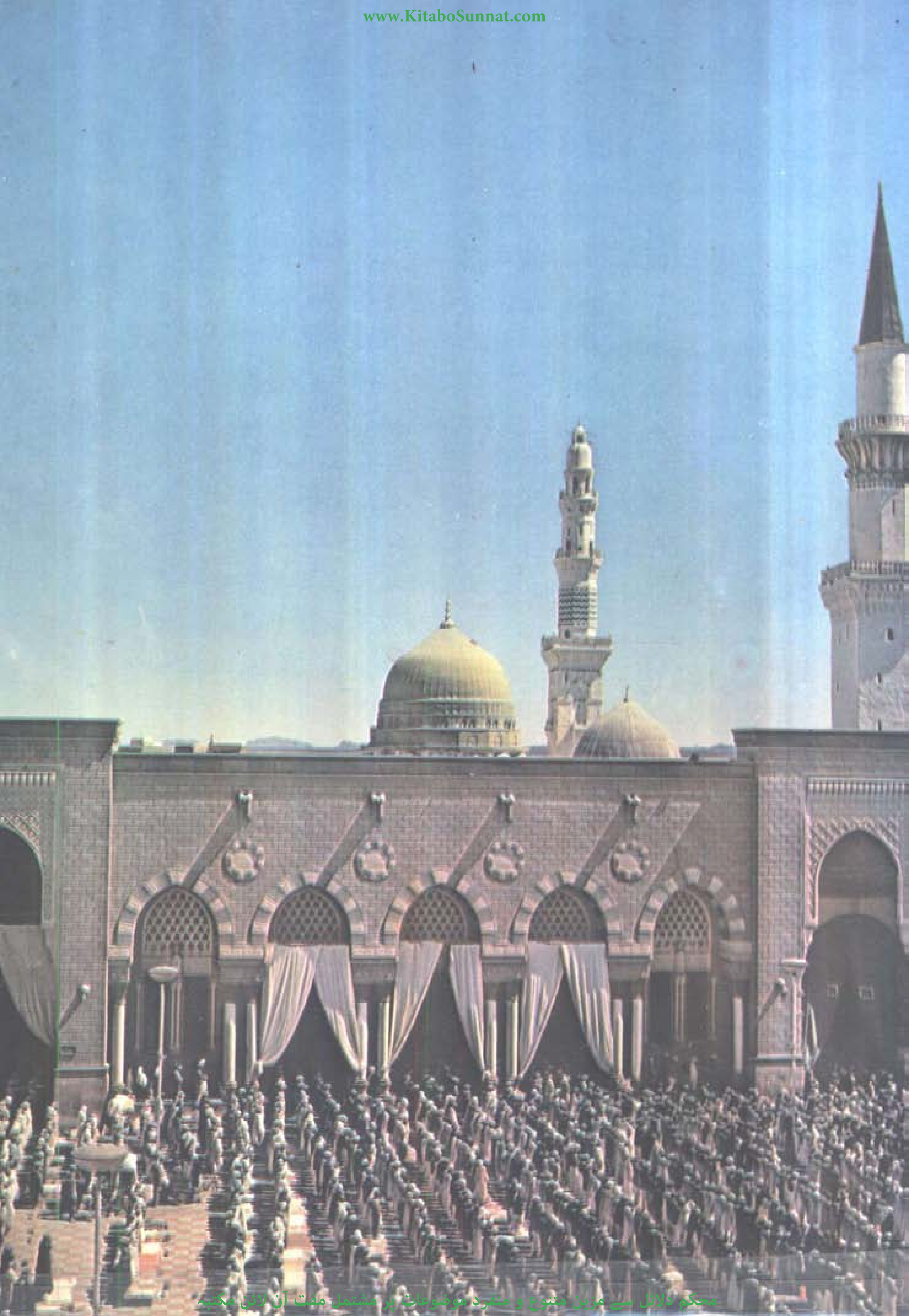
○

اِنَّ اللهَ حَرَّمَ بَيْعَ الْخَمْرِ وَالْمَيْتَةِ وَالْخِنْزِيْرِ وَالْاَصْنَامِ۔

اللہ تعالیٰ نے شراب کی، مُردار کی، سُور کی اور بتوں کی تجارت حرام کر دی ہے۔

اس پر کسی نے سوال کیا، حضورؐ! مردار کی چربی کی بابت کیا حکم ہے؟ اس سے کشتیاں روغن کی جاتی ہیں، کھالوں پر لگائی جاتی ہے، اور لوگ اس سے چراغ جلاتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا :

لَا هُوَ حَرَامٌ - قَاتَلَ اللهُ الْيَهُوْدَ اِنَّ اللهَ حَرَّمَ عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهَا اَجْمَلُوْهُ ثُمَّ بَاعُوْهُ فَاَكَلُوْا ثَمَنَهٗ۔



نہیں ، وہ بھی حرام ہے ۔ اللہ تعالیٰ یہود کو غارت کرے ، جب اللہ تعالیٰ نے اُن پر چربیاں حرام کیں تو انھوں نے اسے پگھلایا ، پھر اسے بیچ ڈالا اور اس کی قیمت کھا گئے ۔

○

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ اللهَ تَعَالَى قَدْ أَذْهَبَ عَنْكُمْ عُبِّيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ وَتَعَظُّمَهَا بِآبَائِهَا ۔ فَالنَّاسُ رَجُلَانِ ۔ رَجُلٌ بَرٌّ تَقِيٌّ كَرِيمٌ عَلَى اللهِ تَعَالَى ۔ وَرَجُلٌ فَاجِرٌ لَا يَتَّقِي هَيِّنٌ عَلَى اللهِ تَعَالَى ۔ إِنَّ اللهَ عَزَّ وَجَلَّ يَقُولُ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللهِ أَتْقَاكُمْ ۔ إِنَّ اللهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ○ (ثُمَّ قَالَ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) أَقُولُ قَوْلِي هٰذَا ۔ وَأَسْتَغْفِرُ اللهَ لِي وَلَكُمْ ۔ (ابن کثیر)

لوگو! جاہلیت کی بڑائی اور باپ دادوں پر فخر کرنے کی بُرائی تم سے دُور کر دی ہے ۔ انسانوں کی اب دو ہی قسمیں ہیں یا تو وہ نیک اور پرہیزگار ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ہاں معزز ۔ یا بد اور غیر متقی ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ہاں ذلیل ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے : اے لوگو! ہم نے تم سب کو ایک ہی مرد و عورت سے پیدا کیا ہے اور تمہیں شاخوں اور قبیلوں میں تقسیم کر دیا ہے تاکہ ایک دُوسرے کی شناخت اور پہچان رہے ۔ تم میں سے اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ شریف اور معزز وُہ ہے جو تم میں سے زیادہ پرہیزگار رہو ۔ اللہ تعالیٰ باعلم اور باخبر ہے (پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا) لوگو! مجھے یہی کہنا تھا میں اللہ تعالیٰ سے اپنے لیے اور تمہارے لیے استغفار کرتا ہوں ۔

○

لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَحْدَهُ صَدَقَ وَعْدَهُ وَنَصَرَ عَبْدَهُ ○ وَهَزَمَ الْأَحْزَابَ وَحْدَهُ ○ أَلَا إِنَّ كُلَّ مَأْثُرٍ فِي الْجَاهِلِيَّةِ تُذْكَرُ وَتُدْعَى مِنْ دَمٍ أَوْ مَالٍ تَحْتَ قَدَمَيَّ ۔ إِلَّا مَا كَانَ مِنْ سِقَايَةِ الْحَاجِّ وَسِدَانَةِ الْبَيْتِ ۔ أَلَا إِنِّي قَدْ أَمْضَيْتُهُمَا لِأَهْلِهِمَا كَمَا كَانَ ۔ ثُمَّ قَالَ أَلَا إِنَّ دِيَةَ الْخَطَاءِ شِبْهِ الْعَمْدِ مَا كَانَ بِالسَّوْطِ وَالْعَصَا مِائَةٌ مِنَ الْإِبِلِ ۔ مِنْهَا أَرْبَعُونَ فِي بُطُونِهَا أَوْلَادُهَا ۔ (ابو داود ، ابن ماجہ)

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ۔ وہ اکیلا ہے ، اس نے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا ۔ اپنے بندے کی مدد فرمائی اور مخالف طاقتوں کو اُسی اکیلے نے شکست دی ۔ سُنو! جاہلیت کے کُل شعبے جو خُون اور مال کے بارے میں مذکور ہیں اور کیے جاتے ہیں سب کو آج اپنے پاؤں تلے روند رہا ہوں ۔ ہاں زمزم کا پانی پلانا اور بیت اللہ کی پاسبانی کرنا اپنی جگہ باقی ہے ان دونوں کو میں پہلے کی طرح ان کے لیے جن کے پاس یہ ہیں باقی رکھتا ہوں ۔ خطا اور غلطی سے کوئی کسی کو مار ڈالے مثلاً کوڑا مارا ، لکڑی ماری اور وُہ مرگیا یہ مشابہ ارادی قتل کے ہے ۔ اس کی دیت

ایک سو اونٹ ہے جن میں سے چالیس گابھن اونٹنیاں ہوں۔

○

اَلْمَرْأَةُ تَرِثُ مِنْ دِيَةِ زَوْجِهَا وَمَالِهٖ وَهُوَ يَرِثُ دِيَتَهَا وَمَالَهَا مَا لَمْ يَقْتُلْ اَحَدُهُمَا صَاحِبَهٗ فَاِذَا قَتَلَ اَحَدُهُمَا صَاحِبَهٗ خَطَأً وَّرِثَ مِنْ مَالِهٖ وَلَمْ يَرِثْ مِنْ دِيَتِهٖ۔ (ابن ماجہ)

عورت اپنے خاوند کی دیت اور مال میں سے میراث پائے گی اور خاوند بھی عورت کی دیت اور مال میں سے میراث پائے گا جب تک انہی میں سے کوئی دوسرے کو قتل نہ کر دے جب ان میں سے ایک دوسرے کو غلطی سے قتل کر دے تو وہ اس کے مال کا وارث تو ہو گا مگر دیت کا وارث نہ ہو گا۔

○

اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّهٗ لَا حِلْفَ فِي الْاِسْلَامِ وَمَا كَانَ فِي الْحِلْفِ فِي الْجَاهِلِيَّةِ فَاِنَّ الْاِسْلَامَ لَا يَزِيْدُهٗ اِلَّا شِدَّةً۔ اَلْمُؤْمِنُوْنَ يَدٌ عَلٰى مَنْ سِوَاهُمْ يُجِيْرُ اَدْنَاهُ وَيَرُدُّ عَلَيْهِمْ اَقْصَاهُمْ يَرُدُّ سَرَايَاهُمْ عَلٰى قَعِيْدَتِهِمْ۔ لَا يُقْتَلُ مُؤْمِنٌ بِكَافِرٍ۔ دِيَةُ الْكَافِرِ نِصْفُ دِيَةِ الْمُسْلِمِ۔ لَا جَلَبَ وَلَا جَنَبَ وَلَا يُؤْخَذُ صَدَقَاتُهِمْ اِلَّا فِي دُوْرِهِمْ۔ (ابوداؤد)

اے لوگو! اسلام میں جتھہ بنانے کے لیے معاہدہ کرنے کی اجازت نہیں ہے البتہ جو معاہدے جاہلیت میں ہو چکے ہیں (اور اب دونوں طرف کے لوگ مسلمان ہو گئے ہیں)، تو اسلام انھیں (توڑتا نہیں بلکہ انھیں) اور بھی مضبوط کر دیتا ہے۔ مومن غیروں کے مقابلے میں ایک ہاتھ کی طرح متفق ہیں۔ کوئی ادنیٰ مسلمان بھی کسی کافر کو پناہ دے سکتا ہے دور والوں کے مالِ غنیمت میں ان کا بھی حصہ ہے۔ ان کے لشکری ان کے گھر بیٹھے ہوؤں کو حصہ دیں گے۔ مسلمان کافر کے بدلے قتل نہ کیا جائے گا۔ کافر کی دیت مسلمانوں کی دیت سے نصف ہو گی۔ زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے مالداروں کو اپنی جگہ نہ بلواؤ۔ نہ مالدار اپنی جگہ سے دور چلے جائیں بلکہ زکوٰۃ ان کے گھروں، ان کے باڑوں، ان کے جانوروں کے رہنے سہنے کی جگہ پر ہی لی جائے۔

۳۹

جنگ کے اصول

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مجاہدین کو کسی مہم پر روانہ فرماتے، تو سردارِ لشکر کو خاص طور پر پرہیزگار رہنے اور اپنے رفقاء کے ساتھ نیک سلوک کرنے کی ہدایت فرماتے۔ پھر تمام فوج کی طرف مخاطب ہو کر اسلامی اصولِ جنگ کے متعلق ہدایات صادر فرماتے۔ ذیل میں آپ کا خطبہ اسی نوعیت کا ہے۔ فرمایا:

اُغْزُوْا بِسْمِ اللّٰهِ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ قَاتِلُوْا مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ۔ اُغْزُوْا وَلَا تَغْدِرُوْا وَلَا تَغُلُّوْا وَلَا تُمَثِّلُوْا وَلَا تَقْتُلُوْا وَلِيْدًا وَاِذَا اَنْتَ لَقِيْتَ عَدُوَّكَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ فَادْعُهُمْ اِلٰى اِحْدٰى ثَلَاثِ خِلَالٍ اَوْ (قَالَ) خِصَالٍ فَاَيَّتُهُنَّ اَجَابُوْكَ اِلَيْهَا فَاقْبَلْ مِنْهُمْ وَكُفَّ عَنْهُمْ ۝ اُدْعُهُمْ اِلَى الْاِسْلَامِ فَاِنْ اَجَابُوْكَ فَاقْبَلْ مِنْهُمْ وَكُفَّ عَنْهُمْ۔ ثُمَّ ادْعُهُمْ اِلَى التَّحَوُّلِ مِنْ دَارِهِمْ اِلٰى دَارِ الْمُهَاجِرِيْنَ وَاَخْبِرْهُمْ اِنْ فَعَلُوْا ذٰلِكَ اَنَّ لَهُمْ مَا لِلْمُهَاجِرِيْنَ وَاِنْ اَبَوْا فَاَخْبِرْهُمْ اَنَّهُمْ يَكُوْنُوْنَ كَاَعْرَابِ الْمُسْلِمِيْنَ يَجْرِيْ عَلَيْهِمْ حُكْمُ اللّٰهِ الَّذِيْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَلَا يَكُوْنُ لَهُمْ فِي الْفَيْءِ وَالْغَنِيْمَةِ شَيْءٌ اِلَّا اَنْ يُّجَاهِدُوْا مَعَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝ فَاِنْ هُمْ اَبَوْا اَنْ يَّدْخُلُوْا فِي الْاِسْلَامِ فَسَلْهُمْ اِعْطَاءَ الْجِزْيَةِ فَاِنْ فَعَلُوْا فَاقْبَلْ مِنْهُمْ وَكُفَّ عَنْهُمْ فَاِنْ هُمْ اَبَوْا فَاسْتَعِنْ بِاللّٰهِ عَلَيْهِمْ وَقَاتِلْهُمْ ۝ فَاِنْ حَاصَرْتَ حِصْنًا فَاَرَادُوْكَ اَنْ تَجْعَلَ لَهُمْ ذِمَّةَ اللّٰهِ وَذِمَّةَ نَبِيِّكَ فَلَا تَجْعَلْ لَهُمْ ذِمَّةَ اللّٰهِ وَلَا ذِمَّةَ نَبِيِّكَ وَلٰكِنِ اجْعَلْ لَهُمْ ذِمَّتَكَ وَذِمَّةَ اَبِيْكَ وَذِمَّةَ اَصْحَابِكَ فَاِنَّكُمْ اِنْ تُخْفِرُوْا ذِمَّتَكُمْ وَذِمَّةَ اٰبَائِكُمْ اَهْوَنُ عَلَيْكُمْ مِنْ اَنْ تُخْفِرُوْا ذِمَّةَ اللّٰهِ وَذِمَّةَ رَسُوْلِهٖ ۝ وَاِنْ حَاصَرْتَ حِصْنًا، فَاَرَادُوْكَ اَنْ يَّنْزِلُوْا عَلٰى حُكْمِ اللّٰهِ فَلَا تُنْزِلْهُمْ عَلٰى حُكْمِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ اَنْزِلْهُمْ عَلٰى حُكْمِكَ فَاِنَّكَ لَا تَدْرِيْ اَتُصِيْبُ فِيْهِمْ حُكْمَ اللّٰهِ اَمْ لَا ۝ (ابن ماجہ)

خدا کا نام لے کر خدا کی راہ میں کفار سے لڑنا۔ بدعہدی اور خیانت نہ کرنا۔ مُردوں کے ناک کان نہ کاٹنا۔ بچوں کو قتل نہ کرنا۔ اور جب کافر دشمنوں سے مقابلہ ہو تو ان کے سامنے (یکے بعد دیگرے) تین باتیں پیش کیا کرنا، جن میں سے کسی ایک کو بھی مان لیں تو ان سے ہاتھ روک لینا۔ پہلے ان کو اسلام کی دعوت دینا، اگر منظور کر لیں تو ان سے ہاتھ روک لینا۔ پھر ان سے کہہ دینا کہ اپنا ملک چھوڑ کر مہاجرین کے پاس آ کر سکونت اختیار کر لیں اور ان کو بتا دینا کہ ایسا کرنے پر ان کے ساتھ مہاجرین جیسا سلوک کیا جائے گا۔ اگر وہ ایسا کرنے کے لیے تیار نہ ہوں

تو ان کو بتلا دینا کہ وہ دُوسرے دیہاتی مسلمانوں کی طرح سمجھے جائیں گے اور مسلمانوں کی طرح اللہ تعالیٰ کے تمام احکام ان پر جاری ہوں گے۔ لیکن مالِ غنیمت میں سے اس وقت تک حصّہ نہیں پا سکیں گے جب تک خود جہاد میں مسلمانوں کے ساتھ شریک ہو کر نہ لڑیں۔ پس اگر وہ اسلام میں داخل ہونے کے لیے تیار نہ ہوں تو ان سے جزیہ کا مطالبہ کرو۔ اگر مان جائیں تو ان سے ہاتھ روک لو ورنہ خدا کا نام لے کر اُن کے خلاف لڑائی شروع کر دو۔

اور جب کسی قلعہ کا محاصرہ کرو اور وُہ لوگ اللہ اور رسول کو ذمہ دار ٹھہرا کر تم سے امان طلب کریں، تو اس بات کو قبول نہ کرنا بلکہ اپنے باپ دادا اور رفقاء کی ذمہ داری پر پناہ دیا کرنا کیونکہ اگر کسی وقت عہد شکنی ہو جائے تو آباؤ اجداد اور رفقاء کار کی عہد شکنی اللہ و رسول کا ذمّہ توڑ دینے سے آسان ہے۔ اسی طرح اگر قلعہ کے محصورین خدائی فیصلہ کی شرط پر صلح کرنے پر آمادہ ہو جائیں تو راضی نہ ہونا، بلکہ ہمیشہ اپنے فیصلہ کی شرط پر امان دیا کرنا۔ کیونکہ معلوم نہیں تم ان کے متعلق صحیح خدائی فیصلہ معلوم کر بھی سکتے ہو کہ نہیں۔

۴۰

تین اہم باتیں

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لائے (ہمیں حکم دیا کہ ہم منبر کے پاس جمع ہو جائیں۔ جب ہم سب منبر کے پاس بیٹھ گئے تو) آپؐ منبر پر چڑھنے لگے۔ پہلے زینے پر آمین کہا۔ پھر دوسرے پر آمین کہا۔ پھر تیسرے پر آمین کہا۔ پھر ہم سے فرمایا: جانتے بھی ہو کہ خلافِ عادت آج میں نے ان تینوں زینوں پر تین مرتبہ آمین کیوں کہا؟ ہم نے کہا، حضورؐ کو علم ہوگا اور اللہ جانتا ہے ہم بے خبر ہیں۔ اس پر آپؐ نے ارشاد فرمایا:

جَاءَنِیْ جِبْرِیْلُ عَلَیْہِ السَّلَامُ فَقَالَ اِنَّہٗ مَنْ ذُکِرْتَ عِنْدَہٗ فَلَمْ یُصَلِّ عَلَیْکَ فَاَبْعَدَہُ اللّٰہُ وَاَسْحَقَہٗ۔ قُلْتُ اٰمِیْنَ۔ قَالَ وَمَنْ اَدْرَکَ اَبَوَیْہِ اَوْ اَحَدَھُمَا فَلَمْ یَبِرَّھُمَا دَخَلَ النَّارَ فَاَبْعَدَہُ اللّٰہُ وَاَسْحَقَہٗ قُلْتُ اٰمِیْنَ وَمَنْ اَدْرَکَ رَمَضَانَ فَلَمْ یُغْفَرْلَہٗ دَخَلَ النَّارَ فَاَبْعَدَہُ اللّٰہُ وَاَسْحَقَہٗ فَقُلْتُ اٰمِیْنَ ٥ (طبرانی)

حضرت جبریل علیہ السلام میرے پاس آئے اور اُنھوں نے کہا: جس کے پاس آپؐ کا نام لیا جائے اور وہ درود نہ پڑھے تو اللہ اسے غارت و برباد کرے۔ میں نے کہا، آمین۔ پھر اُنہوں نے کہا، جس نے اپنے ماں باپ کے یا ان دونوں میں سے ایک کے بڑھاپے کے زمانے کو پایا پھر بھی ان کی خدمت نہ کی اور جہنم میں داخل ہو گیا، اللہ اسے برباد کرے۔ میں نے کہا: آمین۔ پھر انہوں نے کہا: جو رمضان المبارک کو پائے اور پھر بھی بخشش خدا سے محروم رہ کر جہنم میں جائے۔ اللہ اسے بھی اپنی رحمت سے دُور کر دے۔ میں نے کہا: آمین۔

۱۴۱

آخری دور کے فتنے

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے روایت ہے کہ ہم ایک مرتبہ رسولِ خدا کے ہمسفر تھے۔ ایک جگہ قیام کیا۔ سب لوگ قیام وطعام کے انتظام میں مشغول ہو گئے۔ اتنے میں آنحضورؐ نے سب لوگوں کو جمع ہونے کا حکم دیا۔ لوگ اپنے کام کاج چھوڑ کر ایک جگہ جمع ہو گئے۔ اس موقع پر آپؐ نے حسب ذیل خطبہ دیا۔ حمد و ثنا کے بعد فرمایا:

اِنَّهٗ لَمْ يَكُنْ نَبِيٌّ قَبْلِيْ اِلَّا كَانَ حَقًّا عَلَيْهِ اَنْ يَّدُلَّ اُمَّتَهٗ عَلٰى خَيْرِ مَا يَعْلَمُهٗ لَهُمْ وَيُنْذِرَهُمْ شَرَّ مَا يَعْلَمُهٗ لَهُمْ۔ وَاِنَّ اُمَّتِيْ هٰذِهٖ جُعِلَ عَافِيَتُهَا فِيْ اَوَّلِهَا وَسَيُصِيْبُ اٰخِرَهَا بَلَاءٌ وَّ اُمُوْرٌ تُنْكِرُوْنَهَا وَتَجِيْءُ فِتْنَةٌ فَيُرَقِّقُ بَعْضُهَا بَعْضًا وَتَجِيْءُ الْفِتْنَةُ فَيَقُوْلُ الْمُؤْمِنُ هٰذِهٖ مُهْلِكَتِيْ۔ ثُمَّ تَنْكَشِفُ وَتَجِيْءُ الْفِتْنَةُ فَيَقُوْلُ الْمُؤْمِنُ هٰذِهٖ هٰذِهٖ فَمَنْ اَحَبَّ اَنْ يُّزَحْزَحَ عَنِ النَّارِ وَيُدْخَلَ الْجَنَّةَ فَلْتَاْتِهٖ مَنِيَّتُهٗ وَهُوَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ۔ وَالْيَاْتِ اِلَى النَّاسِ الَّذِيْ يُحِبُّ اَنْ يُّؤْتٰى اِلَيْهِ وَمَنْ بَايَعَ اِمَامًا فَاَعْطَاهُ صَفْقَةَ يَدِهٖ وَثَمَرَةَ قَلْبِهٖ فَلْيُطِعْهُ اِنِ اسْتَطَاعَ۔ فَاِنْ جَاءَ اٰخَرُ يُنَازِعُهٗ فَاضْرِبُوْا عُنُقَ الْاٰخَرِ ٥

(مسلم شریف)

مجھ سے پہلے بھی ہر پیغمبر پر یہ مقرر تھا کہ جو بھلائی بھی وہ ان کے لیے جانتا ہے اس کی طرف اپنی اُمت کی رہنمائی کرے اور جو برائی بھی وہ ان کے لیے جانتا ہے اس سے انہیں ڈرائے۔ اور میری اُمت کی ابتداء میں آرام و عافیت ہے اور آخری حصہ میں فتنے اور ایسے معاملات آنے والے ہیں جنھیں تم سخت ناپسند کرتے ہو۔ جن میں سے ہر پچھلا فتنہ پہلے کی نسبت زیادہ سخت ہوگا۔ جب ایک فتنہ آئے گا تو مومن کہیں گے یہ فتنہ ہم کو ہلاک کر دے گا۔ پھر وہ کھل جائے گا اور دوسرا فتنہ آجائے گا۔ تو مومن لوگ اسی کو آخری فتنہ سمجھ لیں گے۔ پس جو یہ چاہے کہ دوزخ سے بچ کر جنت میں داخل ہو جائے، چاہیے کہ اُسے موت اس حال میں آئے کہ وہ اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتا ہو اور لوگوں سے وہی سلوک کرے جس کی ان سے توقع رکھتا ہے۔ جس نے ایک امام کی بیعت کر لی اُس نے جان و مال اُس امام کے ہاتھ میں دے دیے۔ پس حتی الوسع اس کی متابعت کرے۔ اگر کوئی دُوسرا اُس کے مقابلہ پر نکل کر بغاوت کرے تو اس کی گردن مار دو۔

۴۲

دُنیا کی مہلت غنیمت ہے

ایک بار جمعہ کے خطبے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

یَاأَیُّهَا النَّاسُ إِنَّ لَکُمْ عَلَمًا فَانْتَهُوا إِلٰی عَلَمِکُمْ۔ وَإِنَّ لَکُمْ نِهَایَةً فَانْتَهُوا إِلٰی نِهَایَتِکُمْ فَإِنَّ الْمُؤْمِنَ بَیْنَ مَخَافَتَیْنِ بَیْنَ أَجَلٍ قَدْ مَضٰی لَا یَدْرِیْ کَیْفَ صَنَعَ اللّٰهُ فِیْهِ وَبَیْنَ أَجَلٍ قَدْ بَقِیَ لَا یَدْرِیْ کَیْفَ اللّٰهُ بِصَانِعٍ فِیْهِ۔ فَلْیَتَزَوَّدِ الْمُؤْمِنُ مِنْ نَفْسِهِ لِنَفْسِهِ۔ وَمِنْ دُنْیَاهُ لِآخِرَتِهِ وَمِنَ الشَّبَابِ قَبْلَ الْهَرَمِ۔ وَمِنَ الصِّحَّةِ قَبْلَ السُّقْمِ۔ فَإِنَّکُمْ خُلِقْتُمْ لِلْآخِرَةِ وَالدُّنْیَا خُلِقَتْ لَکُمْ۔ وَالَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِیَدِهٖ مَا بَعْدَ الْمَوْتِ مِنْ مُسْتَعْتَبٍ وَمَا بَعْدَ الدُّنْیَا دَارٌ إِلَّا الْجَنَّةُ وَالنَّارُ۔ وَأَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِیْ وَلَکُمْ۔ (دُرِّ المنثور)

اے لوگو! تمہارے لیے نشان ہیں وہیں ٹھہر جایا کرو۔ تمہارے لیے ایک انتہائی حد ہے اپنی اس حد پر رک جایا کرو۔ مومن دو خوف کے درمیان ہے۔ گزری ہوئی عمر کے بارے میں بھی اُسے کھٹکا ہے کہ نہ جانے اللہ پاک نے اس میں اس کے لیے کیا کیا ہے۔ اسی طرح باقی عمر کے بارے میں بھی اسے ڈر ہے کہ نہیں معلوم اللہ اس کے بارے میں کیا کرنے والا ہے۔ پس مومن کا فرض ہے کہ اپنی ذات سے اپنے لیے توشہ جمع کرلے۔ اپنی دُنیا سے اپنی آخرت کا توشہ لے لے۔ اپنی جوانی سے اپنے بڑھاپے کا توشہ لے لے۔ اپنی تندرستی سے اپنی بیماری کا توشہ لے لے۔ تم آخرت کے لیے پیدا کیے گئے ہو اور دنیا تمہارے لیے بنائی گئی ہے۔ مسلمانو! اس خدا کی قسم جس کے قبضے میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے۔ موت کے بعد رضا جوئی کا کوئی موقعہ نہیں پھر تو ہر انسان کا گھر یا تو جنت ہے یا دوزخ۔ میں اللہ تعالیٰ سے اپنے لیے اور تمہارے لیے استغفار کرتا ہوں۔

۴۳

رسولِ خدا کی حکمت

عمروؓ بن تغلب سے روایت ہے کہ رسولِ خدا کے پاس مال آیا۔ آپؐ نے اسے تقسیم کر دیا۔ پھر آپ کو معلوم ہوا کہ جنہیں مال نہیں ملا وہ بگڑ رہے ہیں۔ اس پر آپؐ نے ایک خطبہ دیا جس میں آپؐ نے حمد وثنا کے بعد فرمایا:

فَوَاللهِ اِنِّیْ اُعْطِی الرَّجُلَ وَاَدَعُ الرَّجُلَ۔ وَالَّذِیْ اَدَعُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِنَ الَّذِیْ اُعْطِیْ وَلٰکِنْ اُعْطِیْ اَقْوَامًا لِمَا اَرٰی فِیْ قُلُوْبِهِمْ مِنَ الْجَزَعِ وَالْهَلَعِ۔ وَاَکِلُ اَقْوَامًا اِلٰی مَاجَعَلَ اللهُ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مِنَ الْغِنٰی وَالْخَیْرِ فِیْهِمْ عَمْرُو بْنُ تَغْلِبَ ٥ (بخاری شریف)

میں مال کی تقسیم کے وقت بعض کو دیتا ہوں اور بعض کو نہیں بھی دیتا، حالانکہ جنھیں میں نہیں دیتا وہ مجھے ان سے زیادہ پیارے ہوتے ہیں جنھیں دیتا ہوں۔ بعض لوگوں کو میں صرف اس لیے دیتا ہوں کہ اُن کے دلوں میں جزع فزع اور بے اطمینانی سی ہوتی ہے۔ اور جنھیں نہیں دیتا اُنھیں سپردِ خدا کرتا ہوں، اس لئے کہ جانتا ہوں اُن کے دلوں میں غنا اور خیر ہے۔ انھیں میں عمرو بن تغلب ہیں۔

حضرت عمروؓ فرمایا کرتے تھے کہ حضورِ اکرمؐ کے اس فرمان سے جس قدر میں خوش ہوا ہوں، قسم خدا کی اگر ساری دنیا بھی حضورؐ مجھے دے دیتے تو میں اتنا خوش نہ ہوتا۔

۴۴

انصار سے خطاب

غزوۂ حنین میں جو مالِ غنیمت حاصل ہوا اس کی تقسیم ہوئی تو اہلِ مکہ کو نسبتاً زیادہ حصہ ملا۔ اس سے بعض نوعمر انصاریوں نے کہا کہ آنحضورؐ قریشیوں کو زیادہ مال دے رہے ہیں حالانکہ ہماری خدمات اُن سے زیادہ ہیں۔ بخاری شریف کی روایت ہے کہ آپؐ نے یہ باتیں سُنیں تو انصار کو طلب کر کے پُوچھا تمہاری طرف سے جو بات مجھے پہنچی ہے، اس کی حقیقت کیا ہے؟ انصار نے عرض کیا، یا رسول اللہ! ہم میں سے بڑے آدمیوں میں سے تو کسی ایک نے لفظ بھی زبان سے نہیں نکالا، البتہ بعض نوجوانوں نے یہ کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو بخشے، آپ قریشیوں کو دے رہے ہیں اور ہمیں چھوڑ رہے ہیں حالانکہ ہماری تلواروں سے ان کا خون اب تک ٹپک رہا ہے۔ اس پر آنحضورؐ نے ارشاد فرمایا:

فَإِنِّي أُعْطِي رِجَالًا حَدِيثِي عَهْدٍ بِكُفْرٍ أَتَأَلَّفُهُمْ۔ أَمَا تَرْضَوْنَ أَنْ يَذْهَبَ النَّاسُ بِالْأَمْوَالِ وَ تَذْهَبُونَ بِالنَّبِيِّ إِلَىٰ رِحَالِكُمْ فَوَاللّٰهِ لَمَا تَنْقَلِبُونَ بِهِ خَيْرٌ مِمَّا يَنْقَلِبُونَ بِهِ۔

سُنو! میں انھیں اس لیے دے رہا ہوں کہ وہ تازہ تازہ کفر کو چھوڑ کر آئے ہیں میں چاہتا ہوں کہ ان کے دل اسلام کی طرف اور جھک جائیں۔ کیا تم اس بات سے خوش نہیں ہو کہ لوگ مال لے کر جائیں اور تم اللہ کے رسولؐ کو لے کر اپنے وطن کو لوٹو۔ خدا کی قسم وہ جس چیز کو لے کر جائیں گے اس سے وہ بہتر ہے جسے تم لے کر لوٹو گے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

أَمَا وَاللّٰهِ لَوْ شِئْتُمْ لَقُلْتُمْ فَلَصَدَقْتُمْ وَلَصُدِّقْتُمْ أَتَيْتَنَا مُكَذَّبًا فَصَدَّقْنَاكَ ٥ وَ مَخْذُولًا فَنَصَرْنَاكَ ٥ وَطَرِيدًا فَآوَيْنَاكَ ٥ وَعَائِلًا فَوَاسَيْنَاكَ ٥ لَوَجَدْتُمْ عَلَيَّ يَا مَعْشَرَ الْأَنْصَارِ فِي أَنْفُسِكُمْ فِي لُعَاعَةٍ مِنَ الدُّنْيَا تَأَلَّفْتُ بِهَا قَوْمًا لِيُسْلِمُوا وَ وَكَلْتُكُمْ إِلَىٰ إِسْلَامِكُمْ۔

تم اگر چاہو تو کہہ سکتے ہو اور واقعی سچ کہتے اور میں بھی تمہاری تصدیق کرتا کہ جب سب لوگ آپ کو جھٹلا رہے تھے اس وقت ہم نے آپ کی تصدیق کی۔ جب کوئی آپ کا اپنا نظر نہیں آتا تھا اس وقت ہم نے آپ کی مدد کی۔ آپ جلا وطن تھے اس وقت ہم نے آپ کو پناہ دی جبکہ آپ بے زر تھے اس وقت ہم نے آپ کی مدد کی۔ اے گروہِ انصار! محض دنیا کا خسیس مال نہ ملنے پر تم مجھ سے بگڑنے لگے۔ اس مال کے ذریعے میں نے ایک گروہ کی دلداری کی ہے کہ ان کے ایمان محفوظ رہیں اور تمھیں میں تمہارے اسلام کے سپرد کرتا ہوں۔

ایک اور روایت میں ہے کہ اس موقع پر آپ نے فرمایا:

يَا مَعْشَرَ الْاَنْصَارِ اَلَمْ اَجِدْكُمْ ضُلَّالًا ؟ فَهَدَاكُمُ اللّٰهُ بِيْ وَكُنْتُمْ مُتَفَرِّقِيْنَ فَاَلَّفَكُمُ اللّٰهُ بِيْ وَعَالَةً فَاَغْنَاكُمُ اللّٰهُ بِيْ ـ كُلَّمَا قَالَ شَيْئاً قَالُوْا اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَمَنُّ ـ قَالَ لَوْ شِئْتُمْ قُلْتُمْ جِئْتَنَا كَذَا وَكَذَا ـ اَتَرْضَوْنَ اَنْ يَّذْهَبَ النَّاسُ بِالشَّاةِ وَالْبَعِيْرِ ـ وَ تَذْهَبُوْنَ بِالنَّبِيِّ اِلٰى رِحَالِكُمْ ؟ لَوْلَا الْهِجْرَةُ لَكُنْتُ اِمْرَأً مِّنَ الْاَنْصَارِ وَلَوْ سَلَكَ النَّاسُ وَادِيًا وَّ شِعْبًا لَسَلَكْتُ وَادِيَ الْاَنْصَارِ وَ شِعْبَهَا اَلْاَنْصَارُ شِعَارٌ ـ وَالنَّاسُ دِثَارٌ ـ اِنَّكُمْ سَتَلْقَوْنَ بَعْدِيْ اُثْرَةً فَاصْبِرُوْا حَتّٰى تَلْقَوْنِيْ عَلَى الْحَوْضِ (بخاری شریف) وَفِيْ زَادِ الْمَعَادِ ، ثُمَّ دَعَا لَهُمْ فَقَالَ اَللّٰهُمَّ ارْحَمِ الْاَنْصَارَ ○ وَاَبْنَاءَ الْاَنْصَارِ وَاَبْنَاءَ اَبْنَاءِ الْاَنْصَارِ ○

اے گروہِ انصار! کیا میں نے تمہیں گمراہیوں میں نہیں پایا؟ پھر اللہ تعالیٰ نے میرے ذریعے تمہیں ہدایت دی۔ تم آپس میں ایک دُوسرے سے جُدا تھے۔ میرے ذریعے اللہ تعالیٰ نے تم سب کو متحد کر دیا۔ تم مفلس تھے۔ میرے ذریعے اللہ تعالیٰ نے تمہیں مالدار اور تونگر کر دیا۔ جب آپؐ کوئی بات کہتے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے احسان اس سے بھی زیادہ ہیں۔ اب آپ نے فرمایا تم اگر چاہو تو کہہ سکتے ہو کہ آپ ہمارے پاس اِس اِس حال میں آئے تھے (اب ہماری مدد سے ایسے ہو گئے) کیا تم اس سے راضی نہیں ہو کہ لوگ بکریاں اور اونٹ لے کر اپنے گھروں کو لوٹیں اور تم اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو لے کر اپنے گھروں کو واپس جاؤ۔ اگر ہجرت نہ ہوتی تو میں انصار ہی کا ایک فرد ہوتا۔ اگر سب لوگ ایک گھاٹی میں یا ایک وادی میں چلیں اور انصار کسی اور راستے پر چل رہے ہوں تو میں انصار کے راستے پر ہی چلوں گا۔ تم لوگ تو مثل اس کپڑے کے ہو جو جسم سے لگا کر پہنا جائے اور دوسرے لوگ گویا اس کے اُوپر کے کپڑے ہیں میرے بعد یقیناً تمہیں کشادگی اور فراخی حاصل ہو گی۔ اس وقت تک صبر و سہار سے کام لینا یہاں تک کہ حوضِ کوثر پر تمہاری مجھ سے ملاقات ہو۔ الٰہی! انصار پر رحم فرما۔ اُن کی اولاد پر بھی رحم فرما اور ان کی اولاد کی اولاد پر بھی رحم فرما۔

روایات میں آتا ہے کہ آنحضورؐ کا یہ خطبہ اس قدر مؤثر تھا کہ انصاری چیخ اُٹھے اور رونے لگے۔ ان کی ڈاڑھیاں آنسوؤں سے تر ہو گئیں۔ وہ پکار اُٹھے:

ہم اس پر بہت خوش ہیں کہ ہمارے حصہ میں اللہ کے رسول آئے ہیں۔[1]

---

[1] یہ خطبہ بخاری شریف، زاد المعاد اور قسطلانی کی مختلف روایات کو جمع کر کے مرتّب کیا گیا ہے۔

۴۵

دعا کی تاثیر

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ ایک بار لوگوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے قحط سالی کا شکوہ کیا۔ اس پر آپؐ نے منبر عیدگاہ میں رکھنے کا حکم دیا اور وعدہ فرمایا کہ میں فلاں دن آؤں گا لوگ جمع ہو جائیں۔ اس روز آپؐ سورج طلوع ہوتے ہی گھر سے نکلے اور عیدگاہ پہنچ کر منبر پر تشریف فرما ہوئے۔ حمد و ثنا کے بعد فرمایا:

اِنَّكُمْ شَكَوْتُمْ جَدْبَ دِيَارِكُمْ وَاسْتِئْخَارَ الْمَطَرِ عَنْ اِبَّانِ زَمَانِهٖ عَنْكُمْ وَقَدْ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ اَنْ تَدْعُوْهُ وَوَعَدَكُمْ اَنْ يَّسْتَجِيْبَ لَكُمْ ○ (ثُمَّ قَالَ) اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ○ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ○ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ۔ اَللّٰهُمَّ اَنْتَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ الْغَنِيُّ وَنَحْنُ الْفُقَرَآءُ۔ اَنْزِلْ عَلَيْنَا الْغَيْثَ وَاجْعَلْ مَآ اَنْزَلْتَ لَنَا قُوَّةً وَّبَلَاغًا اِلٰى حِيْنٍ ○

تم لوگوں نے خشک سالی کی شکایت کی ہے اور یہ کہ اس سال وقت پر بارش نہیں ہوئی۔ ایسے موقعوں پر خداوند تعالیٰ نے تم کو دعا مانگنے کا حکم دیا ہے اور یہ وعدہ کیا ہے کہ وہ تمہاری دعا قبول کرے گا۔ (پھر فرمایا) سب تعریف خدا کی ہے جو مخلوق کا پالنے والا رحمٰن و رحیم ہے، قیامت کے دن کا مالک ہے۔ خدا کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ الٰہی! تو ہی خداوند ہے، تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔ تُو غنی ہے اور ہم محتاج ہیں، ہم پر رحمت کی بارش نازل فرما اور اسے ایک مقررہ وقت تک ہمارے لیے قوت اور روزی کا وسیلہ قرار دے۔

پھر آپؐ نے دُعا کے لیے ہاتھ اتنے اوپر اٹھائے کہ بغلوں کی سپیدی نظر آنے لگی۔ پھر لوگوں کی طرف پیٹھ پھیر کر

تحویلِ ردا کی، پھر لوگوں کی طرف منہ کیا۔ اُترے اور دو رکعت نماز پڑھائی۔ اسنے میں بادل آیا، گرجا، چمکا اور خدا کے حکم سے برسا۔ ابھی آپؐ مسجد تک نہیں پہنچے تھے کہ نالے بہہ پڑے۔ جب آپؐ نے لوگوں کو جلدی جلدی سے گھروں کی طرف جاتے دیکھا تو (انسانی فطرت پر) مسکرا پڑے اور فرمایا:

أَشْهَدُ أَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ وَّ أَنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ وَ رَسُوْلُهٗ ۝ (ابوداؤد)

میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا ہر چیز پر قادر ہے اور میں اُس کا بندہ اور رسول ہوں۔

۴۶

فتنۂ دجّال

سنہ ۱۰ھ کا واقعہ ہے۔ سورج گہن لگا۔ اس موقع پر نمازِ کسوف ادا کی گئی۔ نماز سے فارغ ہوکر رسولِ خدا نے ایک خطبہ دیا جس میں حمد وثنا کے بعد اپنی رسالت کا ذکر فرمایا۔ پھر آپؐ نے حاضرین سے دریافت فرمایا:

اَیُّھَا النَّاسُ! اَنْشُدُکُمْ بِاللّٰہِ ھَلْ تَعْلَمُوْنَ اَنِّیْ قَصَّرْتُ
عَنْ شَیْءٍ مِّنْ تَبْلِیْغِ رِسَالَاتِ رَبِّیْ۔ لَمَّآ اَخْبَرْتُمُوْنِیْ
بِذٰلِكَ ٥

لوگو! میں تمہیں خدا کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں کہ اگر میں نے پیغامِ
الٰہی کے پہنچانے میں کسی قسم کی کوتاہی کی ہو تو مجھے تبلادو۔

ایک آدمی نے کھڑے ہوکر کہا: "ہم گواہ ہیں کہ آپ نے اللہ تعالیٰ کا پیغام ہم تک پہنچا دیا ہے اور اپنی اُمّت کی ہر طرح خیر خواہی کی ہے اور آپ نے حق ادا کردیا ہے۔" آپؐ نے فرمایا:

اَمَّا بَعْدُ۔ فَاِنَّ رِجَالًا یَزْعُمُوْنَ اَنَّ کُسُوْفَ ھٰذِہِ الشَّمْسِ
وَخُسُوْفَ ھٰذَا الْقَمَرِ وَزَوَالَ ھٰذِہِ النُّجُوْمِ عَنْ مَطَالِعِھَا
لِمَوْتِ رِجَالٍ عُظَمَآءَ مِنْ اَھْلِ الْاَرْضِ وَقَدْ کَذَبُوْا
وَلٰکِنَّھَآ اٰیَاتٌ مِّنْ اٰیَاتِ اللّٰہِ تَبَارَكَ وَتَعَالٰی یَعْتَبِرُ بِھَا
عِبَادُہٗ فَیَنْظُرُ مَنْ یُّحْدِثُ مِنْھُمْ تَوْبَۃً وَاَیْمُ اللّٰہِ لَقَدْ
رَاَیْتُ مُنْذُ قُمْتُ اُصَلِّیْ مَآ اَنْتُمْ لَاقُوْہُ مِنْ اَمْرِ دُنْیَاکُمْ
وَاٰخِرَتِکُمْ وَاِنَّہٗ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ لَا تَقُوْمُ السَّاعَۃُ حَتّٰی یَخْرُجَ
ثَلَاثُوْنَ کَذَّابًا اٰخِرُھُمُ الْاَعْوَرُ الدَّجَّالُ مَمْسُوْحُ الْعَیْنِ
الْیُسْرٰی کَاَنَّھَا عَیْنُ اَبِیْ یَحْیٰی لِشَیْخٍ مِّنَ الْاَنْصَارِ بَیْنَہٗ وَ
بَیْنَ حُجْرَۃِ عَائِشَۃَ وَاِنَّہٗ مَتٰی یَخْرُجُ فَاِنَّہٗ یَزْعَمُ اَنَّہُ
اللّٰہُ فَمَنْ اٰمَنَ بِہٖ وَصَدَّقَہٗ وَاتَّبَعَہٗ لَمْ یَنْفَعْہُ صَالِحٌ مِّنْ
عَمَلِہٖ سَلَفَ ٥ وَمَنْ کَفَرَ بِہٖ وَکَذَّبَہٗ لَمْ یُعَاقَبْ بِشَیْءٍ مِّنْ

عَمَلٍ سَلَفَ وَاَنَّهٗ سَيَظْهَرُ عَلَى الْاَرْضِ كُلِّهَا اِلَّا الْحَرَمَ
وَبَيْتَ الْمَقْدِسِ فَاِنَّهٗ يَحْصُرُ الْمُؤْمِنِيْنَ فِيْ بَيْتِ
الْمَقْدِسِ فَيَتَزَلْزَلُوْنَ زِلْزَالًا شَدِيْدًا ثُمَّ يُهْلِكُهُ
اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ وَجُنُوْدَهٗ حَتّٰى اَنَّ اَصْلَ الْحَائِطِ لَيُنَادِيْ
يَا مُسْلِمُ يَا مُؤْمِنُ هٰذَا يَهُوْدِيٌّ اَوْ قَالَ هٰذَا كَافِرٌ
فَتَعَالَ فَاقْتُلْهُ ٥ وَلَنْ يَّكُوْنَ ذٰلِكَ حَتّٰى تَرَوْا اُمُوْرًا
يَتَفَاقَمُ بَيْنَكُمْ هَلْ كَانَ نَبِيُّكُمْ ذَكَرَ لَكُمْ مِّنْهَا ذِكْرًا حَتّٰى
تَزُوْلَ جِبَالٌ عَنْ مَّرَاتِبِهَا ثُمَّ عَلٰى اِثْرِ ذٰلِكَ لِلْقَبْضِ ٥

(زاد المعاد)

اما بعد! بعض لوگ گمان کرتے ہیں کہ سورج اور چاند کو جو گرہن لگتا ہے یا جو ستارے ٹوٹتے ہیں یہ کسی بڑے آدمی کی موت سے تعلق رکھتے ہیں حالانکہ گمان قطعًا غلط ہے۔ یہ تو خدا کی نشانیاں ہیں جس سے اس کے سمجھدار بندے عبرت حاصل کرتے ہیں اور ان کے ذریعہ اللہ تبارک و تعالیٰ دیکھنا چاہتا ہے کہ کون گناہوں سے توبہ کرتا ہے۔

اور خدا کی قسم جب سے میں نماز میں کھڑا ہوں، میں نے وہ تمام امور دیکھے جو تمہیں دنیا اور آخرت میں پیش آنے والے ہیں۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ قیامت اس وقت تک نہیں آئے گی جب تک تیس[30] جھوٹے (مدعیانِ نبوّت) ظاہر نہ ہوں۔ ان میں آخری کذّاب یک چشم دجّال ہوگا، جس کی بائیں آنکھ چوپٹ ہوگی۔ ابو تحیہ کی آنکھ کی طرح ہے۔ ابو تحیہ ایک انصاری بڑھا تھا جو اس وقت آپؐ کے اور حضرت عائشہؓ کے حجرہ کے درمیان بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ظاہر ہو کر خدائی کا دعویٰ کرے گا۔ سو جس نے اس کی تصدیق اور پیروی کی اس کے تمام پچھلے اعمالِ حسنہ ضائع ہو جائیں گے، اور جس نے اس دعویٰ کو جھٹلایا اس کے تمام پچھلے گناہ معاف کر دئے جائیں گے۔ وہ حرم اور بیت المقدس کے سوا تمام زمین پر غالب آئے گا۔ وہ بیت المقدس میں تمام مسلمانوں کو محصور کرلے گا جہاں انہیں سخت مصیبتیں جھیلنی پڑیں گی۔ پھر اللہ تعالیٰ اسے اور اس کے لشکر کو ہلاک کر دے گا حتّٰی کہ اس وقت ہر دیوار سے آواز آئے گی کہ اے مسلمان، اے مومن! دیکھو یہاں ایک یہودی (یا کافر) ہے جلدی آؤ اُسے قتل کر دو۔ دجّال کے خروج سے پہلے تم میں بڑے بڑے فتنے برپا ہوں گے، جن کے متعلق تم ایک دوسرے سے دریافت کرو گے کہ کیا نبی کریمؐ نے اس کی بابت کچھ ارشاد فرمایا تھا یا نہیں! ان فتنوں کی وجہ سے پہاڑ (جیسے اولوالعزم لوگ بھی) اپنی جگہوں سے ٹل جائیں گے۔ اس کے بعد نوعِ انسانی کا بس خاتمہ ہے۔

۴۷

پھر دجال کا ذکر

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ رسولِ خدا لوگوں کو خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے ، اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کی ، پھر دجّال کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا :

اِنِّیْ اُنْذِرُکُمُوْہُ وَمَا مِنْ نَّبِیٍّ اِلَّا وَقَدْ اَنْذَرَ قَوْمَہٗ ۔ لَقَدْ اَنْذَرَ نُوْحٌ قَوْمَہٗ ۔ وَلٰکِنِّیْ سَاَقُوْلُ لَکُمْ فِیْہِ قَوْلًا لَّمْ یَقُلْہُ نَبِیٌّ لِقَوْمِہٖ تَعْلَمُوْنَ اَنَّہٗ اَعْوَرُ وَاَنَّ اللّٰہَ لَیْسَ بِاَعْوَرَ ۝

(متفق علیہ)

میں تمہیں اس سے ڈرا رہا ہوں ہر نبی نے اپنی قوم کو (دجّال سے اور اس کے فتنے سے) ڈرایا ہے ۔ یہاں تک کہ حضرت نوح علیہ السلام بھی اپنی قوم کو اس سے متنبہ فرماتے رہے لیکن میں تمہیں اس کی ایک ایسی علامت بتلاتا ہوں جو کسی نبی نے اپنی اُمت کو نہیں بتلائی ۔ تم جان لو کہ وہ کانا ہوگا ۔ اور اللہ تعالےٰ کانا نہیں (وہ ہر نقص سے پاک ہے) ۔

۴۸

آخرت یقینی ہے

مندرجہ ذیل خطبہ نبوّت کے ابتدائی دور کا ہے جو قریشِ مکّہ کے سامنے دیا گیا۔ حمد و ثنا کے بعد آپؐ نے فرمایا:

اِنَّ الرَّائِدَ لَا یَکْذِبُ اَھْلَہٗ وَاللّٰہِ لَوْکَذَبْتُ النَّاسَ جَمِیْعًا مَّا کَذَبْتُکُمْ وَلَوْغَرَرْتُ النَّاسَ جَمِیْعًا مَّا غَرَرْتُکُمْ وَاللّٰہِ الَّذِیْ لَآاِلٰہَ اِلَّاھُوَ اِنِّیْ لَرَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ خَاصَّۃً وَّاِلَی النَّاسِ کَآفَّۃً وَّاللّٰہِ لَتَمُوْتُنَّ کَمَا تَنَامُوْنَ وَلَتُبْعَثُنَّ کَمَا یَسْتَیْقِظُوْنَ وَلَتُحَاسَبُنَّ بِمَا تَعْمَلُوْنَ وَلَتُجْزَوُنَّ بِالْاِحْسَانِ اِحْسَانًا وَّبِالسُّوْءِ سُوْٓءً وَّاِنَّھَا لَجَنَّۃٌ اَبَدًا اَوْلَنَارٌ اَبَدًا ○

(جمہرۃ الخطب)

قافلے کا سالار اپنے ہی ساتھیوں کو جھوٹی خبر کبھی نہیں دیتا۔ خدا کی قسم، اگر میں سب لوگوں سے جھوٹ کہنے پر تیار ہو جاتا تب بھی تم سے خلافِ واقعہ بات نہ کرتا۔ اور اگر سب لوگوں کو دھوکا دینے پر بھی آمادہ ہوتا تو تم کو ہرگز دھوکے میں نہ ڈالتا۔ اُس خدا کی قسم جو وحدہٗ لاشریک ہے کہ میں تمہاری طرف خصوصاً اور باقی تمام لوگوں کی طرف پیغمبر بنا کر بھیجا گیا ہُوں، بخدا تم کو ضرور ایک دن مرجانا ہے بالکل اسی طرح جیسا کہ روز سوتے ہو، اور پھر بلاشبہ زندہ ہونا ہے جیسا کہ روز خواب سے بیدار ہوتے ہو۔ اور تمہارے اعمال کا ضرور محاسبہ ہوگا، نیکی کا بدلہ نیکی اور بُرائی کا بدلہ بُرائی مل کر رہے گا۔ اس وقت یا ہمیشہ کے لیے جنّت ملے گی یا ابدی جہنّم۔

۴۹

فکرِ آخرت

رسولِ خدا مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ کی طرف روانہ ہوئے۔ مدینہ میں وارد ہونے سے پہلے قبا میں قیام فرمایا، اور یہاں ایک مسجد کی بنیا د رکھی۔ پھر یہاں سے روانہ ہو کر قبیلہ بنو سالم بن عوف کے ہاں بطنِ وادی میں قیام پذیر ہوئے۔ حضرت ابو سلمہ بن عبد الرحمٰنؒ کا بیان ہے کہ ذیل کا خطبہ یہیں ارشاد فرمایا:

اَیُّهَا النَّاسُ فَقَدِّمُوا لِاَنْفُسِكُمْ تَعْلَمُنَّ وَاللّٰهِ لَيُصْعَقَنَّ اَحَدُكُمْ ثُمَّ لَيَدَعَنَّ غَنَمَهٗ لَيْسَ لَهَا رَاعٍ۔ ثُمَّ لَيَقُوْلَنَّ لَهٗ رَبُّهٗ لَيْسَ لَهٗ تَرْجُمَانٌ وَّلَا حَاجِبٌ يَّحْجُبُهٗ دُوْنَهٗ۔ اَلَمْ يَاْتِكَ رَسُوْلِیْ فَبَلَّغَكَ، وَاٰتَيْتُكَ مَالًا وَّاَفْضَلْتُ عَلَيْكَ۔ فَمَا قَدَّمْتَ لِنَفْسِكَ، فَلَيَنْظُرَنَّ يَمِيْنًا وَّشِمَالًا فَلَا يَرٰى شَيْئًا۔ ثُمَّ لَيَنْظُرَنَّ قُدَّامَهٗ فَلَا يَرٰى غَيْرَ جَهَنَّمَ فَمَنِ اسْتَطَاعَ اَنْ يَّتَّقِیَ بِوَجْهِهٖ مِنَ النَّارِ وَلَوْ بِشِقٍّ مِّنْ تَمْرَةٍ فَلْيَفْعَلْ وَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَبِكَلِمَةٍ طَيِّبَةٍ۔ فَاِنَّهَا تُجْزَى الْحَسَنَةُ بِعَشْرِ اَمْثَالِهَا اِلٰى سَبْعِ مِائَةِ ضِعْفٍ۔ وَالسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ۔ (زاد المعاد)

اے لوگو! مرنے سے پہلے اپنے لئے کچھ سامان کر لو تم کو معلوم ہو جائے گا، بخدا تم میں سے ہر ایک شخص پہ موت کی بے ہوشی طاری ہو جائے گی۔ اور اپنی بکریوں (مال مویشی) کو بغیر نگہبان کے چھوڑ جائے گا۔ پھر خدا اس سے پُوچھے گا جس کو نہ ترجمان کی ضرورت ہے نہ دربان کی حاجت۔ کیا میرے رسولؐ نے آ کر تمہیں میرے احکام نہیں پہنچائے تھے اور میں نے تم کو دولت نہیں دی تھی اور اپنے فضل و کرم سے نوازا نہیں تھا؟ پس بتاؤ تم نے اپنے لیے کیا آگے بھیجا ہے؟ اُس وقت وُہ حیران ہو کر دائیں بائیں دیکھے گا کچھ نظر نہ آئے گا۔ پھر سامنے کی طرف آنکھ اٹھائے گا تو صرف دوزخ ہی دکھائی دے گا۔ پس جس کو توفیق ہو وہ اپنے آپ کو اس آگ سے بچا لے، گو کھجور کے ایک ٹکڑے ہی سے کیوں نہ ہو۔ اور جس کو یہ بھی میسر نہ ہو تو اچھی بات کہہ کر اپنے آپ کو عذابِ الٰہی سے بچا لے۔ کیونکہ ایک نیکی کا بدلہ دس گنا سے لے کر سات سو تک دیا جائے گا۔

والسلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ۔

۵۰

آخرت کی تیاری

حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ ایک روز نمازِ عصر کے بعد رسولِ خدا خطبہ دینے کو کھڑے ہوئے اور اس میں قیامت تک پیش آنے والے واقعات بیان کیے۔ آپؐ نے فرمایا:

اِنَّ الدُّنْیَا حُلْوَۃٌ خَضِرَۃٌ وَّاِنَّ اللّٰہَ مُسْتَخْلِفُکُمْ فِیْھَا فَنَاظِرٌ کَیْفَ تَعْمَلُوْنَ ۰ اَلَا فَاتَّقُوا الدُّنْیَا ۰ وَاتَّقُوا النِّسَآءَ ۰ وَذَکَرَ اَنَّ لِکُلِّ غَادِرٍ ۰ لِوَآءً یَّوْمَ الْقِیَامَۃِ بِقَدْرِ غَدْرَتِہٖ فِی الدُّنْیَا ۰ وَلَا غَدْرَ اَکْبَرُ مِنْ غَدْرِ اَمِیْرِ الْعَامَّۃِ ۰ یُغْرَزُ لِوَآءُہٗ عِنْدَ اِسْتِہٖ ۰ قَالَ وَلَا یَمْنَعَنَّ اَحَدًا مِّنْکُمْ ھَیْبَۃُ النَّاسِ اَنْ یَّقُوْلَ بِحَقٍّ اِذَا عَلِمَہٗ۔

یقیناً دنیا ایک ہری بھری اور شیریں چیز ہے۔ اللہ عنقریب اس میں تم کو اپنا خلیفہ بنانے والا ہے۔ پھر دیکھے گا کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔ پس تم دنیا سے اور عورتوں سے بچتے رہنا۔ اور آپ نے ذکر فرمایا ہر عہد شکن کے لیے قیامت میں دنیا میں ان کی عہد شکنی کے بقدر ایک جھنڈا ہو گا۔ اور کوئی عہد شکنی حکمران کی عہد شکنی سے بڑھ کر نہ ہوگی اس کا جھنڈا اُس کی سرین کے پاس ہوگا۔ آپؐ نے فرمایا: تم میں سے کسی کو لوگوں کی ہیبت حق بات کہنے سے جبکہ اسے معلوم ہو نہ روکے۔

ایک روایت میں ہے کہ اگر برائی کو دیکھے تو اُسے بدل ڈالے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ (آپؐ نے فرمایا:)

اَلَا اِنَّ اَفْضَلَ الْجِھَادِ کَلِمَۃُ حَقٍّ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَابِرٍ۔

خبردار! سب سے بہتر جہاد یہ ہے کہ انسان ظالم بادشاہ کے سامنے کلمۂ حق کہے۔

یہ سُن کر ابوسعید (راوی) رونے لگے اور کہا ہم نے (خلافِ شرع) بات دیکھی اور لوگوں کی ہیبت نے اس کے بارے میں ہمیں کچھ کہنے سے باز رکھا۔ (راوی کہتے ہیں کہ حضورؐ نے مزید فرمایا:)

اَلَا اِنَّ بَنِیْ اٰدَمَ خُلِقُوْا عَلٰی طَبَقَاتٍ شَتّٰی ۰ فَمِنْھُمْ مَنْ یُّوْلَدُ مُؤْمِنًا وَّیَحْیٰی مُؤْمِنًا وَّیَمُوْتُ مُؤْمِنًا ۰ وَمِنْھُمْ مَّنْ یُّوْلَدُ کَافِرًا وَّیَحْیٰی کَافِرًا وَّیَمُوْتُ کَافِرًا ۰ وَمِنْھُمْ مَّنْ یُّوْلَدُ مُؤْمِنًا وَّیَحْیٰی مُؤْمِنًا وَّیَمُوْتُ کَافِرًا ۰ وَمِنْھُمْ مَّنْ یُّوْلَدُ کَافِرًا ۔ وَّیَحْیٰی کَافِرًا ۔ وَّیَمُوْتُ مُؤْمِنًا ۰ قَالَ وَذَکَرَ الْغَضَبَ فَمِنْھُمْ مَّنْ یَّکُوْنُ سَرِیْعَ الْغَضَبِ ۔ سَرِیْعَ الْفَیْئِ فَاِحْدٰھُمَا بِالْاُخْرٰی ۰ وَمِنْھُمْ مَّنْ یَّکُوْنُ بَطِیْءَ الْغَضَبِ بَطِیْءَ الْفَیْئِ فَاِحْدٰھُمَا بِالْاُخْرٰی ۰ وَخِیَارُکُمْ مَّنْ یَّکُوْنُ بَطِیْءَ الْغَضَبِ سَرِیْعَ الْفَیْئِ

وَشِرَارُكُمْ مَنْ يَكُوْنُ سَرِيْعَ الْغَضَبِ بَطِيْئَ الْفَيْئِ، قَالَ اِتَّقُوا الْغَضَبَ فَاِنَّهٗ جَمْرَةٌ عَلٰى قَلْبِ ابْنِ اٰدَمَ ۝ اَلَا تَرَوْنَ اِلَى انْتِفَاخِ اَوْدَاجِهٖ وَحُمْرَةِ عَيْنَيْهِ، فَمَنْ اَحَسَّ بِشَيْئٍ مِّنْ ذٰلِكَ فَلْيَضْطَجِعْ وَلْيَتَلَبَّدْ بِالْاَرْضِ ۝

جان لو، لوگ مختلف طبقات میں پیدا کیے گئے ہیں ان میں بعض تو مومن پیدا ہوتے ہیں، مومن جیتے ہیں اور مومن ہی مرتے ہیں۔ اور بعض کافر پیدا ہوتے ہیں، کافر جیتے ہیں اور کافر ہی مرتے ہیں۔ بعض مومن پیدا ہوتے ہیں مومن جیتے ہیں اور کافر مرتے ہیں اور بعض کافر پیدا ہوتے ہیں کافر جیتے ہیں اور مرتے مومن ہیں۔ راوی کا بیان ہے کہ پھر آپؐ نے غصہ کا ذکر کیا اور فرمایا کہ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں، جن کو جلدی غصہ آتا ہے اور جلدی رفع بھی ہو جاتا ہے تو یہ ایک دوسرے کا بدلہ ہو گیا۔ بعض لوگ ایسے ہیں جن کو دیر میں غصہ آتا ہے اور دیر میں جاتا ہے تو یہ بھی ایک دوسرے کا بدلہ ہو گیا۔ تم میں سب سے اچھے وہ لوگ ہیں جنہیں غصہ دیر سے آئے اور جلدی دُور ہو جائے۔ اور بدترین لوگ وہ ہیں جن کو غصہ جلدی آئے اور دیر سے دُور ہو۔ فرمایا تم غصہ سے بچتے رہو وہ بنی آدم کے دل پر ایک چنگاری ہے کیا تم نہیں دیکھتے کہ آدمی کی گردن کی رگیں پھول جاتی ہیں اور آنکھیں سُرخ ہو جاتی ہیں۔ بس جس کسی کو غصہ آئے اس کو چاہیے کہ لیٹ جائے اور زمین پر بیٹھ جائے۔

پھر آپؐ نے قرض کی ادائیگی کا ذکر کیا اور فرمایا:

مِنْكُمْ مَنْ يَكُوْنُ حَسَنَ الْقَضَاءِ وَاِذَا لَهٗ اَفْحَشَ فِي الطَّلَبِ فَاِحْدٰهُمَا بِالْاُخْرٰى ۝ وَمِنْهُمْ مَنْ يَكُوْنُ سَيِّئَ الْقَضَاءِ وَاِنْ كَانَ لَهٗ اَجْمَلَ فِي الطَّلَبِ فَاِحْدٰهُمَا بِالْاُخْرٰى ۝ وَخِيَارُكُمْ مَنْ اِذَا كَانَ عَلَيْهِ الدَّيْنُ اَحْسَنَ الْقَضَاءَ وَاِنْ كَانَ لَهٗ اَجْمَلَ فِي الطَّلَبِ وَشِرَارُكُمْ مَنْ اِذَا كَانَ عَلَيْهِ الدَّيْنُ اَسَاءَ الْقَضَاءَ وَاِنْ كَانَ اَفْحَشَ فِي الطَّلَبِ۔

تم میں سے بعض ایسے ہیں جو ادائیگی میں اچھے ہوتے ہیں لیکن اگر ان کا کوئی مقروض ہوتا ہے تو تقاضے میں سختی کرتے ہیں۔ پہلی صفت دوسرے کے معاوضہ میں ہے (یعنی کوئی خوبی نہیں ہے) تم میں سے بعض ایسے ہیں جو ادائیگی میں بُرے ہوتے ہیں۔ لیکن اگر ان کا کوئی مقروض ہوتا ہے تو تقاضے میں نرمی اختیار کرتے ہیں۔ پہلی صفت دوسرے کے معاوضے میں ہے۔ تم میں بہترین شخص وُہ ہے جب وُہ کسی کا مقروض ہو تو بھلے طریقے سے ادا کر دے۔ اور اس کا قرض اگر کسی پہ ہو تو تقاضا میں نرم تر ہو۔ اور تم میں سے بدترین شخص وُہ ہے جب وہ کسی کا مقروض ہو تو بُرے طریقے سے ادا کرے اور اس کا قرض کسی پر ہو تو تقاضے میں سختی برتے۔

حتّٰی کہ جب دُھوپ کھجور کے درختوں کی چوٹیوں پر اور دیواروں کے پہلوؤں پر رہ گئی تو آپؐ نے فرمایا:

اَمَا اِنَّهٗ لَمْ يَبْقَ مِنَ الدُّنْيَا فِيْمَا مَضٰى فِيْهَا اِلَّا كَمَا بَقِيَ مِنْ يَوْمِكُمْ هٰذَا فِيْمَا مَضٰى مِنْهُ۔ (ترمذی، مسند احمد)

سارے دن کے مقابلے میں جتنا وقت اب باقی رہ گیا ہے اتنا ہی زمانہ ابتدائے دنیا سے اب تک کے وقت کے مقابلے میں قیامت آنے میں باقی رہ گیا۔

۵۱

شرعی حدود

ایک موقع پر آپؐ نے صحابہؓ کے سامنے حسب ذیل خطبہ ارشاد فرمایا جس کا موضوع دنیا کی بے ثباتی اور آخرت کی لازوال زندگی ہے:

اَیُّھَا النَّاسُ اِنَّ لَکُمْ مَعَالِمَ فَانْتَھُوْا اِلٰی مَعَالِمِکُمْ وَاِنَّ لَکُمْ نِھَایَۃً فَانْتَھُوْا اِلٰی نِھَایَتِکُمْ - اِنَّ الْمُؤْمِنَ بَیْنَ مَخَافَتَیْنِ - بَیْنَ اَجَلٍ قَدْ مَضٰی لَا یَدْرِیْ مَا اللّٰہُ صَانِعٌ بِہٖ وَبَیْنَ اَجَلٍ قَدْ بَقِیَ لَا یَدْرِیْ مَا اللّٰہُ قَاضٍ فِیْہِ - فَلْیَاْخُذِ الْعَبْدُ مِنْ نَفْسِہٖ لِنَفْسِہٖ وَمِنْ دُنْیَاہُ لِاٰخِرَتِہٖ وَمِنَ الشَّبِیْبَۃِ قَبْلَ الْکِبَرِ وَمِنَ الْحَیٰوۃِ قَبْلَ الْمَوْتِ فَوَالَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِیَدِہٖ مَا بَعْدَ الْمَوْتِ مِنْ مُسْتَعْتَبٍ وَّلَا بَعْدَ الدُّنْیَا دَارٌ اِلَّا الْجَنَّۃُ اَوِ النَّارُ ۔ (مواہب اللدنیہ)

لوگو! تمہارے لئے شرعی حدود مقرر ہو چکی ہیں بس ان تک پہنچ کر تم کو رک جانا چاہیے اور تمہارے لیے (عالم آخرت) ایک منتہیٰ ہے۔ پس تم (عمل صالح کر کے) وہاں پہنچو۔ مسلمان دو خوفناک حالتوں کے درمیان ہے - ایک گزری ہوئی حالت، نہ معلوم خداوند تعالیٰ اس کا کیا کرنے والا ہے۔ ایک آنے والی حالت، معلوم نہیں اللہ اس کے بارے میں کیا فیصلہ کرنے والا ہے۔ پس چاہیے کہ انسان اپنے لیے اپنا توشہ تیار کرے اور دنیا میں رہ کر اپنی عاقبت سنوار لے۔ بڑھاپے سے پہلے جوانی میں اور موت سے پہلے زندگی میں عمل صالح کرے۔ پس قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضے میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے کہ مر چکنے کے بعد عتاب اور خجالت دور کرنے کا کوئی موقع نہ ملے گا۔ نہ دنیا کے بعد جنت یا دوزخ کے سوا کوئی تیسرا ٹھکانا ہوگا۔

۵۲

موت کی یاد

یہ خطبہ کسی میت کو دفن کرنے کے موقع پر ارشاد فرمایا گیا ہے اس میں موت کی یاد دلا کر مسلمانوں کو نیک عمل کی نصیحت کی گئی ہے۔ حمد و ثنا کے بعد فرمایا:

اَیُّھَا النَّاسُ کَاَنَّ الْمَوْتَ فِیْھَا عَلٰی غَیْرِنَا قَدْ کُتِبَ وَ کَاَنَّ الْحَقَّ فِیْھَا عَلٰی غَیْرِنَا قَدْ وَجَبَ وَ کَاَنَّ الَّذِیْ نُشَیِّعُ مِنَ الْاَمْوَاتِ سَفْرٌ عَمَّا قَلِیْلٍ اِلَیْنَا رَاجِعُوْنَ نُبَوِّئُھُمْ اَجْدَاثَھُمْ وَ نَاْکُلُ مِنْ تُرَاثِھِمْ کَاَنَّا مُخَلَّدُوْنَ بَعْدَھُمْ وَنَسِیْنَا کُلَّ وَاعِظَۃٍ وَّ اَمِنَّا کُلَّ جَائِحَۃٍ۔ طُوْبٰی لِمَنْ شَغَلَہٗ عَیْبُہٗ عَنْ عُیُوْبِ النَّاسِ طُوْبٰی لِمَنْ اَنْفَقَ مَالًا اِکْتَسَبَہٗ مِنْ غَیْرِ مَعْصِیَۃٍ۔ وَ جَالَسَ اَھْلَ الْفِقْہِ وَ الْحِکْمَۃِ وَ خَالَطَ اَھْلَ الذُّلِّ وَ الْمَسْکَنَۃِ۔ طُوْبٰی لِمَنْ زَکَتْ وَ حَسُنَتْ خَلِیْقَتُہٗ وَطَابَتْ سَرِیْرَتُہٗ۔ وَ عَزَلَ عَنِ النَّاسِ شَرَّہٗ۔ طُوْبٰی لِمَنْ اَنْفَقَ مِنْ مَّالِہٖ وَ اَمْسَکَ الْفَضْلَ مِنْ قَوْلِہٖ وَ وَسِعَتْہُ السُّنَّۃُ وَلَمْ تَسْتَھْوِہِ الْبِدْعَۃُ ○ (کنز العمال)

لوگو! (ہماری غفلت کا یہ حال ہے) گویا موت ہمارے لئے نہیں، بلکہ فقط دوسروں کے لئے مقرر ہو چکی ہے، اور گویا حقوق کی ادائیگی ہم پر نہیں، بلکہ تنہا دوسرے لوگوں پر واجب ہے، اور جن مُردوں کے ساتھ ہم قبرستان تک آتے ہیں، گویا وہ چند دن کے مسافر ہیں جو واپس ہو کر ہم سے ملیں گے، ہم ان کو تو قبر میں دفن کر دیتے ہیں، اور ان کا مال ایسے اطمینان سے کھاتے ہیں گویا ہم کو ان کے بعد دنیا میں ہمیشہ ہمیشہ رہنا ہے۔ نصیحت کی ہر بات ہم بھلا بیٹھے،

اور ہر آفت کی طرف سے مطمئن ہو چکے۔ مبارکباد ہے اس شخص کے لیے
جو اپنے عیوب پر نظر کر کے دُوسروں کی عیب جوئی سے بچ رہا۔ مبارکباد ہے
اس کے لیے جس نے حلال کی کمائی خدا کی راہ میں خرچ کی، علماً اور
عقلمندوں کی ہمنشینی اختیار کی، اور غریبوں اور مسکینوں کے ساتھ
ملتا جلتا رہا۔ مبارک ہے وہ شخص جس کے اخلاق اچھے ہوں، دل
پاکیزہ ہو اور لوگوں کو اپنے شر سے محفوظ رکھے۔ مبارک ہے وہ شخص
جو ضرورت سے بچا ہُوا مال خدا کی راہ میں خرچ کرے اور فضول گفتگو
سے پرہیز رکھے۔ راہِ شریعت پر عمل کرنا اس کے لیے آسان ہو،
اور بدعت اُسے اپنی طرف راغب نہ کر سکے۔

۵۳

جنگِ موتہ

جنگِ موتہ کے موقع پر اسلامی لشکر جہاد پر جا چکا تھا۔ اسی اثنا میں ایک روز آنحضورؐ نے صحابہؓ کو جمع ہونے کا حکم دیا۔ لوگ جمع ہوئے تو آپؐ منبر پر تشریف فرما ہوئے اور ارشاد فرمایا:

بَابُ خَيْرٍ بَابُ خَيْرٍ بَابُ خَيْرٍ۔ أُخْبِرُكُمْ عَنْ جَيْشِكُمْ هٰذَا الْغَازِي۔ إِنَّهُمْ انْطَلَقُوْا فَلَقُوا الْعَدُوَّ وَقُتِلَ زَيْدٌ شَهِيْدًا (وَاسْتَغْفَرَ لَهٗ) ثُمَّ أَخَذَ اللِّوَآءَ جَعْفَرٌ فَشَدَّ عَلَى الْقَوْمِ حَتّٰى قُتِلَ شَهِيْدًا (فَشَهِدَ لَهٗ بِالشَّهَادَةِ وَاسْتَغْفَرَ لَهٗ) ثُمَّ أَخَذَ اللِّوَآءَ عَبْدُ اللّٰهِ ابْنُ رَوَاحَةَ فَأَثْبَتَ قَدَمَيْهِ حَتّٰى قُتِلَ شَهِيْدًا (فَاسْتَغْفَرَ لَهٗ) ثُمَّ أَخَذَ اللِّوَآءَ خَالِدُ بْنُ وَلِيْدٍ وَلَمْ يَكُنْ مِّنَ الْأُمَرَآءِ مِثْلُهٗ هُوَ قَرَّ نَفْسَهٗ ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَللّٰهُمَّ إِنَّهٗ سَيْفٌ مِّنْ سُيُوْفِكَ فَأَنْتَ تَنْصُرُهٗ فَمُنْذُ يَوْمَئِذٍ سُمِّيَ خَالِدٌ سَيْفُ اللّٰهِ۔ ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَكِّرُوْا فَأَمِدُّوْا إِخْوَانَكُمْ وَلَا يَتَخَلَّفَنَّ مِنْكُمْ أَحَدٌ فَنَفَرُوْا مُشَاةً وَّرُكْبَانًا۔ وَذٰلِكَ فِيْ حَرٍّ شَدِيْدٍ۔

خیر کا دروازہ، بھلائی کا دروازہ، نیکی کا دروازہ۔ سنو! میں تمہارے غازی لشکر کی (جو موتہ کی طرف گیا ہے) خبر دیتا ہوں وہ گئے اور دشمن سے ان کی مڈبھیڑ ہوئی۔ (سردارِ لشکر) حضرت زیدؓ شہید کر دیئے گئے (آپؐ نے ان کے لیے دعائے مغفرت کی) پھر حضرت جعفرؓ نے سرداری کا جھنڈا بلند کیا اور بڑے زور کا حملہ کیا حتّٰی کہ وہ بھی شہید ہو گئے۔ (آپؐ نے ان کی شہادت کی گواہی دی اور ان کے لیے دعائے مغفرت کی) پھر عبداللہ بن رواحہؓ نے جھنڈا تھاما۔ قدم جما کر خوب جہاد کیا یہاں تک کہ وہ بھی شہید ہو گئے (آپؐ نے ان کے لیے بھی دعائے مغفرت فرمائی) پھر جھنڈا خالدؓ بن ولید نے تھام لیا۔ دادِ شجاعت میں امرا میں سے کوئی ان جیسا نہ تھا۔ انہوں نے مستقل مزاجی دکھائی۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: الٰہی وُہ تیری تلواروں میں سے ایک تلوار ہے تو ہی اس کی مدد فرمائے گا۔ اسی دن سے ان کا نام خالد سیف اللہ ہو گیا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: صبح ہی صبح اپنے ان بھائیوں کی مدد کے لیے آگے بڑھ جاؤ۔ دیکھو کوئی ایک بھی تم میں پیچھے نہ رہ جائے۔ پس پیدل اور سوار، سب لوگ روانہ ہو گئے۔ یہ موسم شدید گرمی کا تھا۔

۵۴

آخری وصیتیں

رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع کے بعد مدینہ واپس آئے تو منبر پر تشریف فرما ہوئے۔ اللہ تعالےٰ کی حمد وثنا بیان کی۔ پھر یہ خطبہ ارشاد فرمایا:

اَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ رَاضٍ عَنْ اَبِیْ بَکْرٍؓ فَاعْرِفُوْا لَہٗ ذٰلِکَ۔ اَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ رَاضٍ عَنْ عُمَرَ وَعُثْمَانَؓ وَعَلِیٍّؓ وَّ طَلْحَۃَ وَالزُّبَیْرِؓ وَسَعْدٍ وَ سَعِیْدٍؓ وَّ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍؓ وَّ اَبِیْ عُبَیْدَۃَؓ فَاعْرِفُوْا لَھُمْ ذٰلِکَ۔ اَیُّھَا النَّاسُ اِنَّ اللّٰہَ غَفَرَ لِاَھْلِ بَدْرٍ وَّالْحُدَیْبِیَّۃِ۔ اِحْفَظُوْنِیْ فِیْٓ اَصْحَابِیْ وَاَصْھَارِیْ وَاَخْتَانِیْ لَا یُطَالِبَنَّکُمْ اَحَدٌ مِّنْھُمْ بِمَظْلِمَۃٍ فَاِنَّھَا مَظْلِمَۃٌ لَّا تُوْھَبُ فِی الْقِیَامَۃِ غَدًا ؀ (طبرانی)

لوگو! میں ابوبکرؓ سے راضی ہوں۔ تم ان کا یہ حق ہمیشہ مانتے رہنا۔ اے لوگو! میں عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ، طلحہؓ، زبیرؓ، سعدؓ، سعیدؓ، عبدالرحمٰنؓ بن عوف اور ابوعبیدہ سے خوش ہوں تم ان کا بھی لحاظ رکھنا۔ اے لوگو! بدر اور حدیبیہ میں شمولیت کرنے والے میرے تمام اصحاب کو خدا نے بخش دیا ہے۔ لوگو! میرے اصحاب کے معاملہ میں، میری سسرال کے معاملہ میں اور میرے دامادوں کے معاملہ میں میری حفاظت کرنا یعنی ان میں سے کسی کو بُرا نہ کہنا۔ ان کے حقوق تسلیم کرنا، ان کی عزت کرنا۔ دیکھو ان میں سے کسی کو تم ایذا نہ دینا۔ یہ وہ جرم ہے جس کا مطالبہ وہ بروزِ قیامت کریں گے اور خدا کی طرف سے معافی نہ ہوگی۔

۵۵

حکمرانوں کی اطاعت

حضرت ابی سعیدؓ سے روایت ہے کہ رسولِ پاکؐ نے ہمیں خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

اَلَا اِنِّیْ اُوْشِكُ اَنْ اُدْعٰی فَاُجِیْبُ ـ یَلِیْكُمْ عُمَّالٌ مِّنْ بَعْدِیْ یَعْمَلُوْنَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ وَیَعْمَلُوْنَ بِمَا تَعْرِفُوْنَ وَطَاعَۃُ اُولٰٓئِكَ طَاعَۃٌ ـ فَتَلْبَثُوْنَ كَذٰلِكَ زَمَانًا فَیَلِیْكُمْ عُمَّالٌ مِّنْ بَعْدِهِمْ یَعْمَلُوْنَ بِمَا لَا تَعْلَمُوْنَ وَیَعْلَمُوْنَ بِمَا لَا تَعْرِفُوْنَ ـ فَمَنْ قَادَهُمْ وَنَاصَحَهُمْ فَاُولٰٓئِكَ قَدْ هَلَكُوْا وَاَهْلَكُوْا وَخَالِطُوْهُمْ بِاَجْسَادِكُمْ وَزَایِلُوْهُمْ بِاَعْمَالِكُمْ وَاشْهَدُوْا عَلَی الْمُحْسِنِ اَنَّهٗ مُحْسِنٌ وَّعَلَی الْمُسِیْٓءِ ـ (طبرانی)

ممکن ہے میں جلدی خدا کے پاس بُلا لیا جاؤں اور اس بلاوے پر لبیک کہوں۔ میرے بعد تمہیں ایسے حکمران ملیں گے جو وہی کام کریں گے جو تم کرو گے اور جن کے اعمال وہ ہوں گے جنہیں تم جان پہچان لو گے۔ ان کی اطاعت اطاعت ہے کچھ عرصہ تم اسی طرح رہو گے پھر ان کے بعد تمہیں ایسے حکمران ملیں گے جو ایسے کام کریں گے جنہیں تم نہیں جانتے اور ایسے کام کریں گے جنہیں تم نہیں پہچانتے۔ پس جو ان کی قیادت کرے اور ان کی خیر خواہی کرے پس یہ لوگ ہلاک ہو گئے اور دوسروں کو بھی ہلاکت میں ڈال دیا۔ ان سے جسمانی رابطہ رکھو مگر عملی زندگی سے دُور رہو اور جو بھلا آدمی ہے اس پہ گواہی دو کیونکہ وہ محسن ہے اور گناہ گار و خطا کار کی برائی کے گواہ رہو۔

۵۶

آخری نصیحتیں

آخری علالت کے دوران میں جب آپؐ کو افاقہ ہوتا تھا نماز کے لیے مسجد میں تشریف لاتے اور کبھی کبھی وعظ بھی کیا کرتے تھے۔ حضرت فضل بن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک دن آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم بخار کی حالت میں سر پہ پٹی باندھے ہوئے میرے پاس تشریف لائے اور فرمایا: "اے فضل! میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے مسجد لے چلو۔" آپؐ مسجد میں رونق افروز ہوئے تو لوگ حاضر ہوئے۔ آپؐ نے منبر پہ چڑھ کر فرمایا:

اَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ اَحْمَدُ اِلَیْکُمُ اللّٰہَ الَّذِیْ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ وَاِنَّہٗ قَدْ دَنَا مِنِّیْ حُقُوْقٌ مِنْ بَیْنِ اَظْھُرِکُمْ فَمَنْ کُنْتُ جَلَدْتُ لَہٗ ظَھْرًا فَھٰذَا ظَھْرِیْ فَلْیَسْتَقِدْ مِنْہُ ۔ وَمَنْ کُنْتُ شَتَمْتُ لَہٗ عِرْضًا فَھٰذَا عِرْضِیْ فَلْیَسْتَقِدْ مِنْہُ ٥ وَمَنْ اَخَذْتُ لَہٗ مَالًا فَھٰذَا مَالِیْ فَلْیَاْخُذْ مِنْہُ وَلَا یَخْشَ الشَّحْنَآءَ مِنْ قِبَلِیْ فَاِنَّھَا لَیْسَتْ مِنْ شَاْنِیْ ٥ اَلَا وَاِنَّ اَحَبَّکُمْ اِلَیَّ مَنْ اَخَذَ مِنِّیْ حَقًّا اِنْ کَانَ لَہٗ اَوْ حَلَّلَنِیْ فَلَقِیْتُ رَبِّیْ وَاَنَا طَیِّبُ النَّفْسِ ۔ وَقَدْ اَرٰی اَنَّ ھٰذَا غَیْرُ مُغْنٍ عَنِّیْ حَتّٰی اَقُوْمَ فِیْکُمْ مِرَارًا ٥

لوگو! میں تمہارے سامنے اس خدائے واحد کی تعریف کرتا ہوں جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، اور (کہتا ہوں کہ) میں تم سے غائب ہونے والا ہوں۔ تو جس کی پُشت پر مَیں نے کوڑا مارا ہو یہ میری پشت حاضر ہے اس لیے بدلہ لے لے، اور جس کو نامناسب بات کہی ہو وہ بھی اپنا بدلہ لے لے۔ اگر کسی سے مال لیا ہو تو وہ آج اپنا حق میرے مال میں سے وصول کرلے، اور میری طرف سے کینہ جوئی کا وہم نہ کرے، کیونکہ یہ میری عادت نہیں۔ تم میں سے وہ شخص مجھے زیادہ محبوب ہے جو مجھ سے اپنا حق وصول کرلے یا معاف کردے تاکہ میں خوش و خرم اپنے پروردگار سے جا ملوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس قدر کہنا کافی نہیں ہے۔ مجھے چند مرتبہ یہ اعلان کرنا پڑے گا۔

پھر منبر سے اُتر کر آپؐ نے ظُہر کی نماز پڑھائی۔ نماز کے بعد دوبارہ منبر پہ رونق افروز ہوئے اور اسی مضمون کو دُہرایا۔ ایک شخص نے کھڑے ہو کر عرض کی: یارسولؐ اللہ! ایک دفعہ جنابؐ نے مجھ سے تین درہم قرض لیے تھے جواب تک ادا نہیں ہوئے۔ آپؐ نے اُس کو وہ درہم دے دیے۔ پھر فرمایا:

اَیُّھَا النَّاسُ! مَنْ کَانَ عِنْدَہٗ شَیْءٌ فَلْیُؤَدِّہٖ وَلَا یَقُلْ فُضُوْحُ الدُّنْیَا ۔ اَلَا وَاِنَّ فُضُوْحَ الدُّنْیَا اَھْوَنُ مِنْ فُضُوْحِ الْاٰخِرَۃِ ٥ (طبری ج ۲ ص ۱۹)

لوگو! جس کے پاس کسی کی کوئی چیز ہو تو اسے ادا کرے اور دنیا کی فضیحت سے نہ ڈرے کیونکہ دنیا کی رسوائی آخرت کی رسوائی

سے بہت ہلکی ہے۔

پھر شہدائے اُحد کے لیے مغفرت طلب کر کے آپؐ نے فرمایا:

اِنَّ عَبْدًا خَيَّرَهُ اللّٰهُ بَيْنَ الدُّنْيَا وَبَيْنَ مَا عِنْدَهُ فَاخْتَارَ مَا عِنْدَهُ ۔

ایک بندہ کو خدا تعالیٰ نے اختیار دیا ہے کہ دُنیا لے لے یا وُہ جو اللہ کے پاس ہے، تو اس نے وہی پسند کیا جو خدا کے پاس ہے۔

یہ سُن کر حضرت ابوبکر صدیقؓ رو پڑے اور کہا: ہم اور ہمارے والدین آپؐ پر فدا ہوں۔ حاضرین کو تعجب ہوا کہ آنحضرتؐ تو کسی شخص کا واقعہ بیان کرتے ہیں اس میں رونے کی کون سی بات ہے! لیکن صدیقِ اکبرؓ کے ذہنِ رسا نے تاڑ لیا تھا کہ وہ شخص خود سرورِ عالمؐ ہیں۔ پھر آپؐ نے تقریر کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا:

اِنَّ مِنْ اَمَنِّ النَّاسِ عَلَيَّ فِيْ صُحْبَتِهٖ وَمَالِهٖ اَبُوْبَكْرٍ وَلَوْ كُنْتُ مُتَّخِذًا خَلِيْلًا غَيْرَ رَبِّيْ لَاتَّخَذْتُ اَبَابَكْرٍ خَلِيْلًا وَّلٰكِنْ اُخُوَّةُ الْاِسْلَامِ وَمَوَدَّتُهٗ ۝ لَا يُبْقَيَنَّ فِي الْمَسْجِدِ بَابٌ اِلَّا سُدَّ اِلَّا بَابُ اَبِيْ بَكْرٍ۔

(بخاری شریف)

میں سب سے زیادہ جس کے مال اور صحبت کا ممنون ہُوں وُہ ابوبکرؓ ہیں۔ اگر میں اپنے رب کے سوا کسی شخص کو دوست بناتا تو ابوبکرؓ کو بناتا لیکن اسلامی برادری کافی ہے۔ ابوبکرؓ کے دریچہ کے سوا مسجد کے رُخ کوئی دریچہ باقی نہ رکھا جائے۔

02068

۵۷

موت کی دعوت قبول

حیاتِ مبارک کے آخری ایام میں جب آپؐ مرض الموت میں گرفتار ہوئے، زید بن ارقمؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے حسبِ ذیل خطبہ ارشاد فرمایا:

اَلَا اَیُّهَا النَّاسُ فَاِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ یُوْشِكُ اَنْ یَّاْتِیَ رَسُوْلُ رَبِّیْ فَاُجِیْبَ وَاَنَا تَارِكٌ فِیْكُمْ ثَقَلَیْنِ اَوَّلُهُمَا كِتَابُ اللهِ هُوَ حَبْلُ اللهِ فِیْهِ الْهُدٰی وَالنُّوْرُ مَنِ اسْتَمْسَكَ بِهٖ وَاَخَذَ بِهٖ كَانَ عَلَی الْهُدٰی وَمَنْ اَخْطَاَهٗ ضَلَّ فَخُذُوْا بِكِتَابِ اللهِ وَاسْتَمْسِكُوْا بِهٖ فَحَثَّ عَلٰی كِتَابِ اللهِ وَرَغَّبَ فِیْهِ ثُمَّ قَالَ وَاَهْلُ بَیْتِیْ اُذَكِّرُكُمُ اللهَ فِیْ اَهْلِ بَیْتِیْ۔ اُذَكِّرُكُمُ اللهَ فِیْ اَهْلِ بَیْتِیْ۔ اُذَكِّرُكُمُ اللهَ فِیْ اَهْلِ بَیْتِیْ۔ (مسلم شریف)

اے لوگو! میں ایک انسان ہوں، عنقریب میرے پاس میرے رب کا بھیجا ہوا ملک الموت آنے والا ہے اور میں اس کی دعوت قبول کر کے یہاں سے وہاں جانے والا ہوں۔ لیکن میں تم میں دو مؤثر چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں۔ ان دونوں میں سے پہلی تو کتاب اللہ قرآن کریم ہے، یہی اللہ تعالیٰ کی رسّی ہے۔ اس میں ہدایت اور روشنی ہے۔ جو اس کو مضبوطی سے تھامے گا اور اس پر عامل رہے گا وہ ہدایت پر ہوگا اور جو اسے چھوڑ دے گا وہ گمراہ ہو جائے گا۔ پس تم کتاب اللہ کو پکڑے رہو، مضبوط تھامے رہو۔ آپ نے کتاب اللہ پر عمل کرنے پر ابھارا اور اس کی رغبت دلائی۔ اس کے بعد فرمایا: (دوسری چیز) میرے اہلِ بیت ہیں۔ میں اپنے اہل بیت کے بارے میں تمہیں خدا کی یاد دلاتا ہوں، میں اپنے اہلِ بیت کے بارے میں تمہیں خدا کی یاد دلاتا ہوں، میں اپنے اہلِ بیت کے بارے میں تمہیں خدا کی یاد دلاتا ہوں۔

۵۸

حوضِ کوثر

بیماری کے ایام ہی میں ایک روز آپؐ منبر پر تشریف فرما ہوئے اور حسبِ ذیل خطبہ ارشاد فرمایا:

اَیُّھَا النَّاسُ بَلَغَنِیْ اَنَّکُمْ تَخَافُوْنَ مِنْ مَّوْتِ نَبِیِّکُمْ ہَلْ خَلَفَ نَبِیٌّ قَبْلِیْ فِیْمَنْ بُعِثَ اللّٰہُ ٥ فَاَخْلُدَ فِیْکُمْ ؟ اَلَآ اِنِّیْ لَاحِقٌ بِرَبِّیْ ٥ وَاِنَّکُمْ لَاحِقُوْنَ بِیْ ٥ فَاُوْصِیْکُمْ بِالْمُھَاجِرِیْنَ الْاَوَّلِیْنَ خَیْرًا ٥ وَاُوْصِی الْمُھَاجِرِیْنَ فِیْمَا بَیْنَھُمْ ٥ فَاِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی یَقُوْلُ وَالْعَصْرِ ٥ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ٥ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ٥ وَاِنَّ الْاُمُوْرَ تَجْرِیْ بِاِذْنِ اللّٰہِ ٥ وَلَا یَحْمِلَنَّکُمُ اسْتِبْطَاءُ اَمْرٍ عَلٰی اِسْتِعْجَالِہٖ ٥ فَاِنَّ اللّٰہَ عَزَّوَجَلَّ لَا یُعَجِّلُ بِعُجْلَۃِ اَحَدٍ ٥ وَمَنْ غَالَبَ اللّٰہَ غَلَبَہٗ ٥ وَمَنْ خَادَعَ اللّٰہَ خَدَعَہٗ ٥ فَہَلْ عَسَیْتُمْ اِنْ تَوَلَّیْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْآ اَرْحَامَکُمْ ٥ وَاُوْصِیْکُمْ بِالْاَنْصَارِ خَیْرًا ٥ فَاِنَّھُمُ الَّذِیْنَ تَبَوَّؤُا الدَّارَ وَالْاِیْمَانَ مِنْ قَبْلِکُمْ ٥ اَنْ تُحْسِنُوْآ اِلَیْھِمْ اَلَمْ یُشَاطِرُوْکُمْ فِی الثِّمَارِ ٥ اَلَمْ یُوَسِّعُوْا لَکُمْ فِی الدِّیَارِ ٥ اَلَمْ یُؤْثِرُوْکُمْ عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ وَبِھِمُ الْخَصَاصَۃُ ٥ اَلَا فَمَنْ وَّلِیَ اَنْ یَّحْکُمَ بَیْنَ رَجُلَیْنِ فَلْیَقْبَلْ مِنْ مُّحْسِنِھِمْ وَلْیَتَجَاوَزْ عَنْ مُّسِیْئِھِمْ ٥ اَلَا فَلَا تَسْتَاْثِرُوْا عَلَیْھِمْ ٥ اَلَا وَاِنِّیْ فَرَطٌ لَّکُمْ ٥ وَاَنْتُمْ لَاحِقُوْنَ بِیْ ٥ اَلَا فَاِنَّ مَوْعِدَکُمُ الْحَوْضُ ٥ اَلَا فَمَنْ اَحَبَّ اَنْ یَّرِدَہٗ عَلَیَّ غَدًا فَلْیَکْفُفْ یَدَہٗ وَلِسَانَہٗ اِلَّا فِیْمَا یَنْبَغِیْ ٥ یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّ الذُّنُوْبَ تُغَیِّرُ النِّعَمَ فَاِذَا اَبَرَّ النَّاسُ بَرَّتْھُمْ اَئِمَّتُھُمْ وَاِذَا فَجَرَ النَّاسُ عَقُّوْآ اَئِمَّتَھُمْ ۔ (سیرت النبویہ والآثار المحمدیہ از سید احمد الزینی)

اے لوگو! مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم اپنے نبی کی موت سے ڈرتے ہو۔ کیا مجھ سے پہلے کوئی نبی اپنی اُمت میں ہمیشہ رہا جو میں رہتا۔ میں اپنے رب سے ملنے والا ہوں اور تم مجھ سے ملنے والے ہو۔ میں تمہیں پہلے پہل ہجرت کرنے والے مہاجرین کے ساتھ بھلائی کی وصیت کرتا ہوں، اور خود ان مہاجرین کو بھی آپس میں ایک دُوسرے کے ساتھ خیرخواہی کی وصیت کرتا ہوں۔ جناب باری جل وعلا کا فرمان ہے، قسم ہے زمانے کی، انسان سب گھاٹے اور نقصان میں ہیں بجز اُن لوگوں کے جو ایمان دار اور نیک کار ہیں اور ایک دُوسرے کو حق اور صبر کی تلقین کرتے ہیں۔ تمام کام اللہ تعالیٰ کی اجازت سے ہوتے ہیں۔ کسی کام کی دیر تمہیں اُس کی جلدی پر آمادہ نہ کر دے۔ اللہ تعالیٰ کسی کی جلدی پر جلدی کرنے پر مجبور نہیں جو اللہ پر غالب ہونے کی کوشش کرے وہ خود ہی مغلوب ہو جاتا ہے اور جو خدا کو دھوکا دینے کی کوشش کرے وُہ خود دھوکا کھا جاتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ تم اُلٹے پھر جاؤ اور زمین میں

فساد پھیلاتے اور رشتہ داریاں توڑتے رہو۔ میں تمہیں انصار کے ساتھ بھی بھلائی سے پیش آنے کی وصیت کرتا ہوں یہی ہیں جنہوں نے تم سے پہلے (تمہارے لیے) گھر تیار کیا اور ایمان لائے تم ان کے ساتھ احسان وسلوک ہی کرتے رہنا۔ کیا انہوں نے تمہیں اپنے پھلوں میں شریک نہیں کر لیا؛ کیا انہوں نے اپنے گھروں میں تمہارے لیے وسعت نہیں کر دی؛ کیا باوجود اپنی ضرورتوں کے انہوں نے تمہیں خود پر ترجیح نہیں دی؛ تم میں سے جو شخص دو انسانوں کے درمیان فیصلہ کرنے پر مامور ہوا ہے چاہیے کہ وہ ان میں سے بھلائی کرنے والے کی بھلائی کو قبول کرے اور ان میں سے بُرائی کرنے والے کی برائی سے تجاوز کرتا رہے۔ دیکھو ان پر کسی اور کو اختیار نہ کرنا۔ میں تم سے آگے جا رہا ہُوں تم بھی میرے بعد میرے پیچھے ہی آرہے ہو۔ ہمارے ملنے کی جگہ حوضِ کوثر ہے تم میں سے جو چاہتا ہو کہ وہ کل (قیامت کو) مجھ سے حوضِ کوثر پر ملے اُسے چاہیے کہ اپنے ہاتھ اور اپنی زبان کو اپنے قبضے میں رکھے سوائے نیک کاموں کے اُن سے کوئی اور کام نہ لے۔ لوگو! گناہوں سے خدا کی نعمتیں ہٹ جاتی ہیں متغیر ہوجاتی ہیں۔ لوگ جب تک نیک رہتے ہیں ان کے حکمران ان کی فرمانبرداری کرتے رہیں گے مگر جب لوگ گناہ کرنے لگیں گے تو ان کے حکمران ان کے نافرمان ہو جائیں گے۔

———

۵۹

آخرت

حضرت ابو سعید خدریؓ راوی ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلّم مرض الموت میں مسجد میں تشریف لائے اور آپؐ کے سر میں پٹی بندھی تھی۔ ہم سب اس وقت مسجد ہی میں تھے۔ آپؐ منبر کی طرف گئے اور اس پر تشریف فرما ہوئے۔ ہم منبر کے اردگرد بیٹھ گئے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا:

وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ - اِنِّیْ لَاَنْظُرُ اِلَی الْحَوْضِ مِنْ مَّقَامِیْ هٰذَا - ثُمَّ قَالَ اِنَّ عَبْدًا عُرِضَتْ عَلَيْهِ الدُّنْيَا وَزِيْنَتُهَا فَاخْتَارَ الْاٰخِرَةَ - (دارمی)

خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے میں ٹھیک یہاں سے اپنے حوضِ کوثر کو برابر دیکھ رہا ہوں۔ سُنو ایک بندے پر دنیا اور اس کی زینت اور آخرت پیش کی گئی لیکن اُس نے آخرت کو اختیار کیا۔

راوی کا بیان ہے اس فرمان کے نکتے تک کسی کی رسائی نہ ہوئی سوائے حضرت ابوبکرؓ کے۔ ان کی آنکھیں ساون بھادوں برسانے لگیں۔ اور زبان کہنے لگی کہ اللہ کے رسولؐ! نہیں نہیں، بلکہ ہم آپ پر اپنی ماؤں کو، اپنے باپوں کو، اپنی جانوں کو اور اپنے مال کو فدا کردیں گے پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر سے اُتر آئے اس وقت سے لے کر آخری دم تک پھر کبھی آپؐ منبر پر کھڑے نہیں ہوئے۔

۶۰

موت کا وقت

دمِ نزع انسان کی کیا کیفیت ہوتی ہے، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خطبے میں اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ ارشاد فرمایا:

إِنَّ الْعَبْدَ الْمُؤْمِنَ إِذَا كَانَ فِي انْقِطَاعٍ مِّنَ الدُّنْيَا وَإِقْبَالٍ مِّنَ الْآخِرَةِ نَزَلَ إِلَيْهِ مَلٰئِكَةٌ مِّنَ السَّمَآءِ بِيْضُ الْوُجُوْهِ كَأَنَّ وُجُوْهَهُمُ الشَّمْسُ مَعَهُمْ كَفَنٌ مِّنْ أَكْفَانِ الْجَنَّةِ وَحَنُوْطٌ مِّنْ حَنُوْطِ الْجَنَّةِ۔ حَتّٰى يَجْلِسُوْا مِنْهُ مَدَّ الْبَصَرِ۔ وَيَجِيْءُ مَلَكُ الْمَوْتِ عَلَيْهِ السَّلَامُ حَتّٰى يَجْلِسَ عِنْدَ رَأْسِهٖ۔ فَيَقُوْلُ أَيَّتُهَا النَّفْسُ الطَّيِّبَةُ أُخْرُجِيْ إِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٍ۔ قَالَ فَتَخْرُجُ فَتَسِيْلُ كَمَا تَسِيْلُ الْقَطْرَةُ مِنْ فِي السِّقَآءِ فَيَأْخُذُهَا فَإِذَا أَخَذَهَا لَمْ يَدَعُوْهَا فِيْ يَدِهٖ طَرْفَةَ عَيْنٍ حَتّٰى يَأْخُذُوْهَا فَيَجْعَلُوْهَا فِيْ ذٰلِكَ الْكَفَنِ وَفِيْ ذٰلِكَ الْحَنُوْطِ۔ وَيَخْرُجُ مِنْهُ كَأَطْيَبِ نَفْحَةِ مِسْكٍ وُجِدَتْ عَلٰى وَجْهِ الْأَرْضِ۔ قَالَ فَيَصْعَدُوْنَ بِهَا فَلَا يَمُرُّوْنَ عَلٰى مَلَاءٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ إِلَّا قَالُوْا مَا هٰذَا الرُّوْحُ الطَّيِّبُ؟ فَيَقُوْلُوْنَ فُلَانُ ابْنُ فُلَانٍ بِأَحْسَنِ أَسْمَآئِهِ الَّتِيْ كَانَ يُسَمّٰى بِهَا فِي الدُّنْيَا۔ حَتّٰى يَنْتَهُوْا بِهَا إِلَى السَّمَآءِ الدُّنْيَا۔ فَيَسْتَفْتِحُوْنَ لَهٗ فَيُفْتَحُ لَهٗ۔ فَيُشَيِّعُهٗ مِنْ كُلِّ سَمَآءٍ مُقَرَّبُوْهَا إِلَى السَّمَآءِ الَّتِيْ تَلِيْهَا۔ حَتّٰى يُنْتَهٰى بِهَا إِلَى السَّمَآءِ السَّابِعَةِ فَيَقُوْلُ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ۔ اُكْتُبُوْا كِتَابَ عَبْدِيْ فِيْ عِلِّيِّيْنَ وَأَعِيْدُوْهُ إِلَى الْأَرْضِ فِيْ جَسَدِهٖ (ثُمَّ ذَكَرَ سُؤَالَ الْمَلَائِكَةِ وَغَيْرَهٗ كَمَا مَرَّ) قَالَ وَيَأْتِيْهِ رَجُلٌ۔ حَسَنُ الْوَجْهِ حَسَنُ الثِّيَابِ طَيِّبُ الرِّيْحِ فَيَقُوْلُ أَبْشِرْ بِالَّذِيْ يَسُرُّكَ۔ هٰذَا يَوْمُكَ الَّذِيْ كُنْتَ تُوْعَدُ فَيَقُوْلُ مَنْ أَنْتَ؟ فَوَجْهُكَ الْوَجْهُ الْحَسَنُ يَجِيْءُ بِالْخَيْرِ۔ فَيَقُوْلُ أَنَا عَمَلُكَ الصَّالِحُ۔ فَيَقُوْلُ رَبِّ أَقِمِ السَّاعَةَ رَبِّ أَقِمِ السَّاعَةَ۔ حَتّٰى أَرْجِعَ إِلٰى أَهْلِيْ وَمَالِيْ ٥ وَإِنَّ الْعَبْدَ الْكَافِرَ إِذَا كَانَ فِي انْقِطَاعٍ مِّنَ الدُّنْيَا وَإِقْبَالٍ مِّنَ الْآخِرَةِ۔ نَزَلَ إِلَيْهِ مَلَائِكَةٌ سُوْدُ الْوُجُوْهِ مَعَهُمُ الْمُسُوْحُ۔ فَيَجْلِسُوْنَ مِنْهُ مَدَّ الْبَصَرِ۔ ثُمَّ يَجِيْءُ مَلَكُ الْمَوْتِ حَتّٰى يَجْلِسَ عِنْدَ رَأْسِهٖ۔ فَيَقُوْلُ أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْخَبِيْثَةُ أُخْرُجِيْ إِلٰى سَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ وَغَضَبٍ۔ فَتَفَرَّقُ فِيْ جَسَدِهٖ فَيَنْتَزِعُهَا كَمَا يُنْتَزَعُ السَّفُّوْدُ مِنَ الصُّوْفِ الْمَبْلُوْلِ فَيَأْخُذُهَا۔ فَإِذَا أَخَذَهَا لَمْ يَدَعُوْهَا فِيْ يَدِهٖ طَرْفَةَ عَيْنٍ۔ حَتّٰى يَجْعَلُوْهَا فِيْ تِلْكَ الْمُسُوْحِ۔ وَيَخْرُجُ مِنْهَا كَأَنْتَنِ جِيْفَةٍ وُجِدَتْ عَلٰى وَجْهِ الْأَرْضِ۔ فَيَصْعَدُوْنَ بِهَا۔ فَلَا يَمُرُّوْنَ بِهَا عَلٰى مَلَاءٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ إِلَّا قَالُوْا مَا هٰذِهِ الرِّيْحُ الْخَبِيْثَةُ؟ فَيَقُوْلُوْنَ فُلَانُ ابْنُ فُلَانٍ۔ بِأَقْبَحِ أَسْمَآئِهِ الَّتِيْ كَانَ يُسَمّٰى بِهَا فِي الدُّنْيَا۔ حَتّٰى يُنْتَهٰى بِهٖ إِلَى السَّمَآءِ الدُّنْيَا۔ فَيُسْتَفْتَحُ لَهٗ فَلَا يُفْتَحُ لَهٗ۔ ثُمَّ قَرَأَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔

لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ - فَيَقُوْلُ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ اُكْتُبُوْا كِتَابَهٗ فِيْ سِجِّيْنٍ فِي الْاَرْضِ السُّفْلٰى ثُمَّ تُطْرَحُ رُوْحُهٗ طَرْحًا - ثُمَّ قَرَاَ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ o فَتُعَادُ رُوْحُهٗ فِيْ جَسَدِهٖ (ثُمَّ ذَكَرَ سُؤَالَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَجَوَابَهٗ وَعَذَابَ الْقَبْرِ عَلَيْهِ كَمَا مَرَّ) وَيَاْتِيْهِ رَجُلٌ قَبِيْحُ الْوَجْهِ قَبِيْحُ الثِّيَابِ مُنْتِنُ الرِّيْحِ - فَيَقُوْلُ اَبْشِرْ بِالَّذِيْ يَسُوْؤُكَ اَبْشِرْ بِهَوَانٍ مِّنَ اللّٰهِ وَعَذَابٍ مُّقِيْمٍ - هٰذَا يَوْمُكَ الَّذِيْ كُنْتَ تُوْعَدُ فَيَقُوْلُ بَشَّرَكَ اللّٰهُ بِالشَّرِّ مَنْ اَنْتَ؟ فَوَجْهُكَ الْوَجْهُ الْقَبِيْحُ - يَجِيْئُ بِالشَّرِّ فَيَقُوْلُ اَنَا عَمَلُكَ الْخَبِيْثُ كُنْتَ بَطِيْئًا فِيْ طَاعَةِ اللّٰهِ سَرِيْعًا فِيْ مَعْصِيَتِهٖ - فَجَزَاكَ اللّٰهُ شَرًّا - فَيَقُوْلُ رَبِّ لَا تُقِمِ السَّاعَةَ -

بندۂ مومن کا جب دُنیا سے جانے اور آخرت سے قریب ہونے کا وقت ہوتا ہے۔ اس کے پاس آسمان سے فرشتے آتے ہیں چمکتے ہُوئے نورانی سفید چہروں والے گویا کہ ان کے چہرے سورج کی طرح منوّر ہیں۔ اُن کے ساتھ جنّت کے کفن اور جنت کی خوشبوئیں ہوتی ہیں۔ یہ سب اس سے حدِ نگاہ کے فاصلے پر بیٹھ جاتے ہیں۔ اسی وقت ملک الموت علیہ السلام تشریف لاتے ہیں اور مرنے والے کے سرہانے بیٹھ جاتے ہیں اور کہتے ہیں اے پاک رُوح نکل اور چل اللہ کی مغفرت اور اس کی رضامندی کی طرف۔ آپ نے فرمایا یہ سُنتے ہی اس کی رُوح (آسانی کے ساتھ) جسم سے باہر ہو جاتی ہے جیسے مشک سے پانی کا قطرہ ٹپک جائے اور ملک الموت اسے تھام لیتے ہیں۔ جب ملک الموت اس کو پکڑتے ہیں تو دُوسرے فرشتے اسے ایک لمحہ کے لیے بھی ان کے ہاتھ میں نہیں رہنے دیتے وُہ اسے لے کر اس کفن اور اس خوشبو میں لپیٹ لیتے ہیں روئے زمین پر پائی جانے والی عمدہ ترین کستوری جیسی خوشبو اس سے نکلتی ہے۔ اب یہ فرشتے اسے لے کر آسمان کی طرف چڑھتے ہیں اور فرشتوں کی جس جماعت کے پاس سے بھی گزرتے ہیں وہ ان سے دریافت کرتے ہیں کہ یہ پاک رُوح کس کی ہے؟ یہ اُس کا وہ بھلا نام بتلاتے ہیں جس سے وُہ دنیا میں مشہور تھا۔ اسی طرح آسمانِ اوّل تک پہنچتے ہیں۔ اُسے کھولنے کو کہتے ہیں چنانچہ وہ اس کے لیے کھول دیا جاتا ہے۔ ہر آسمان کے مقرب فرشتے اگلے آسمان تک اس کے ساتھ چلتے ہیں حتّٰی کہ (اسی طرح) اسے ساتویں آسمان پر پہنچایا جاتا ہے - پھر جناب باری عزّ وجلّ فرماتا ہے میرے اس بندے کی کتاب علیین میں لکھ لو اور اسے اس کے جسم میں زمین کی جانب لوٹا دو (اس کے بعد آپ نے فرشتوں (منکر نکیر) کے ان سوالوں وغیرہ کا ذکر کیا ہے (جن کا بیان پہلے گزر چکا ہے) اس کے پاس ایک بہت ہی خوب صورت، بہترین لباس پہنے ہوئے، خوشبُو سے مہکتا ہوا ایک شخص آتا ہے اور اس سے کہتا ہے بشارت ہو تجھے ہر اس چیز کی جس سے تُو خوش ہو یہی وُہ دن ہے جس کا تجھ سے وعدہ کیا جاتا تھا یہ اس سے پُوچھتا ہے تُو کون ہے؟ تیرا خوب صورت چہرہ اچھی خبر لایا ہے۔ وُہ جواب دیتا ہے کہ میں تیرا نیک عمل ہوں۔ اب تو یہ (مارے خوشی کے) کہنے لگتا ہے کہ الٰہی! قیامت جلدی قائم کر دے۔ الٰہی قیامت جلدی

قائم کردے تاکہ میں اپنے گھر والوں میں جا بیٹھوں اور اپنے مال کو پاؤں۔ کافر بندہ جب دُنیا سے جانے والا اور آخرت سے قریب ہونے والا ہوتا ہے تو (خوفناک) سیاہ چہروں والے فرشتے (جہنمی) ٹاٹ لیے ہوئے آتے ہیں اور اس حدِ نگاہ کے فاصلے پر بیٹھ جاتے ہیں پھر ملک الموت آکر اس کے سرہانے بیٹھ کر فرماتے ہیں۔ اے ناپاک خبیث روح نکل اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور غضب و غصّہ کی طرف چل۔ یہ سنتے ہی وہ رُوح جسم میں اِدھر اُدھر چھپنے لگتی ہے۔ ملک الموت علیہ السلام اسے اس طرح کھینچ لیتے ہیں جس طرح بھیگی ہُوئی اُون میں سے گوشت بھُوننے کی سیخ کھینچی جاتی ہے۔ پس وہ اس کو پکڑ لیتے ہیں۔ جب وہ اس کو پکڑتے ہیں (دوسرے) فرشتے ایک لمحہ بھی اسے ان کے پاس نہیں چھوڑتے اور اس جہنمی ٹاٹ میں اسے لپیٹ لیتے ہیں اور رُوئے زمین پر پائے جانے والے کسی مردار کی بدترین بدبو جیسی بدبُو اس سے نکلتی ہے (فرشتے) اب اسے لے کر اوپر چڑھنے لگتے ہیں۔ فرشتوں کی جس جماعت کے پاس سے بھی وہ گزرتے ہیں وُہ ان سے پُوچھتی ہے کہ یہ اتنی بُری بُو کیسی ہے ؟ یہ اس کا وہ بدترین نام بتا دیتے ہیں جس نام سے یہ دنیا میں مشہور تھا۔ اسی طرح وہ اسے لے کر آسمانِ دنیا تک پہنچ جاتے ہیں۔ دروازہ کھلوانا چاہتے ہیں لیکن کھولا نہیں جاتا۔ پھر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے قرآنِ کریم کی یہ آیت تلاوت فرمائی۔ ان کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جاتے اور نہ یہ جنّت میں جا سکتے ہیں جب تک کہ سُوئی کے ناکے میں اونٹ نہ چلا جائے۔ اسی وقت جنابِ باری کا فرمان صادر ہوتا ہے کہ اس کی کتاب سب سے نیچے کی زمین سجّین میں لکھ لو۔ پھر وہیں سے اس کی رُوح پھینک دی جاتی ہے۔ پھر آپؐ نے یہ آیت تلاوت فرمائی : خدا کے ساتھ جس نے شرک کیا گویا کہ وُہ آسمان سے گر گیا۔ اب خواہ اسے راستے میں سے ہی پرندے اُچک لیں یا ہوا اڑا کر کسی خطرناک دُور دراز کے گڑھے میں پھینک دے۔ اب اس کی رُوح اس کے جسم میں لوٹائی جاتی ہے (پھر آپؐ نے فرشتوں کے سوال اور اس کے جواب اور عذابِ قبر کا بیان فرمایا جیسا کہ اس سے پہلے گزر چکا ہے) پھر اس کے پاس نہایت ہی خوفناک سیاہ شکل والا بدترین لباس پہنے ہوئے اور بدبو کے بھبکے اڑاتا ہوا ایک شخص آتا ہے اور اس سے کہتا ہے : خوشخبری ہو تجھے ہر اس چیز کی جو تجھے بُری لگے، خوشخبری ہو تجھے اللہ کی طرف سے ذلت و رسوائی اور مستقل عذاب کی۔ آج وہی دن ہے جس کا تجھ سے وعدہ کیا جاتا تھا۔ وہ شخص کہتا ہے : برائی کی بشارت تجھی کو ہو، تُو ہے کون ؟ تیرا چہرہ بہت بدصورت ہے جو بُری چیز لے کر آیا ہے۔ وہ کہے گا : میں تیرا بُرا عمل ہُوں۔ تُو اللہ کی اطاعت میں دیر کرنے والا اور اس کی نافرمانی میں تیز تھا۔ اللہ تجھے اس کی بُری جزا دے۔ اس پر وہ شخص کہے گا : الٰہی ! قیامت کو قایم نہ کر۔

۶۱

موت کے بعد، قبر میں

ایک مرتبہ رسولِ خدا نماز کے لیے مسجد میں تشریف لائے۔ صحابہؓ اس وقت کسی بات پر ہنس رہے تھے۔ چونکہ مسجد تھی اور سب لوگ نماز کے لیے جمع ہُوئے تھے، اس لیے آپؐ کو یہ ہنسی ناگوار گزری۔ اس موقع پر آپؐ نے حسب ذیل خطبہ ارشاد فرمایا:

اَمَا اِنَّكُمْ لَوْ اَكْثَرْتُمْ ذِكْرَهَا ذِمِ اللَّذَّاتِ لَشَغَلَكُمْ عَمَّا اَرٰى فَاَكْثِرُوْا مِنْ ذِكْرِهَا ذِمِ اللَّذَّاتِ الْمَوْتِ فَاِنَّهٗ لَمْ يَاْتِ عَلَى الْقَبْرِ يَوْمٌ اِلَّا تَكَلَّمَ فَيَقُوْلُ اَنَا بَيْتُ الْغُرْبَةِ اَنَا بَيْتُ الْوَحْدَةِ۔ وَاَنَا بَيْتُ التُّرَابِ۔ وَاَنَا بَيْتُ الدُّوْدِ۔ فَاِذَا دُفِنَ الْعَبْدُ الْمُؤْمِنُ قَالَ لَهُ الْقَبْرُ مَرْحَبًا وَّاَهْلًا۔ اَمَا اِنْ كُنْتَ لَاَحَبَّ مَنْ يَّمْشِيْ عَلٰى ظَهْرِيْ اِلَيَّ فَاِذْ وُلِّيْتُكَ الْيَوْمَ وَصِرْتَ اِلَيَّ فَسَتَرٰى صَنِيْعِيْ بِكَ فَيَتَّسِعُ لَهٗ مَدَّ بَصَرِهٖ وَيُفْتَحُ لَهٗ بَابٌ اِلَى الْجَنَّةِ وَاِذَا دُفِنَ الْعَبْدُ الْفَاجِرُ اَوِ الْكَافِرُ قَالَ لَهُ الْقَبْرُ لَا مَرْحَبًا وَّلَا اَهْلًا اَمَا اِنْ كُنْتَ لَاَبْغَضَ مَنْ يَّمْشِيْ عَلٰى ظَهْرِيْ اِلَيَّ۔ فَاِذْ وُلِّيْتُكَ الْيَوْمَ وَصِرْتَ اِلَيَّ فَسَتَرٰى صَنِيْعِيْ بِكَ فَيَلْتَئِمُ عَلَيْهِ حَتّٰى يَلْتَقِيَ عَلَيْهِ وَتَخْتَلِفَ اَضْلَاعُهٗ فَاَدْخَلَ بَعْضَهَا فِيْ جَوْفِ بَعْضٍ ○

اگر تم لذتوں کا قلع قمع کرنے والی موت کو پیش نظر رکھتے تو یہ موت تمہیں اس چیز سے ہٹا دیتی جو میں تم میں دیکھ رہا ہُوں۔ ان لذتوں کا قلع قمع کر دینے والی موت کو کثرت سے یاد کرو۔ کیونکہ قبر سے ہر روز آواز آتی ہے کہ میں غربت اور تنہائی کا گھر ہُوں، یہ خاک (میں ملا کر خاک بنا دینے) والا مکان ہوں۔ میں کیڑوں والا مسکن ہُوں پس جب کوئی مومن قبر میں دفن کیا جاتا ہے تو اس سے کہتی ہے: مرحبا! آنا مبارک ہو، میری پُشت پر چلنے پھرنے والوں میں سے تم مجھے زیادہ محبوب تھے، آج جبکہ تم مجھے ملے ہو میرا سلوک دیکھ لوگے۔ پھر اس کے لیے حدِ نظر تک فراخ ہو جاتی ہے۔ اور اس کے لیے جنت کی طرف ایک دروازہ کھول دیا جاتا ہے اور جب کوئی بدعمل یا کافر دفن ہوتا ہے تو قبر اسے دھتکار کر کہتی ہے: تجھے فراخی اور اکرام نصیب نہ ہو، میری پُشت پر چلنے والوں میں تُو مجھے سب سے زیادہ مبغوض تھا، آج جبکہ تو میرے قابُو میں آیا ہے تجھے میرا سلوک معلوم ہو جائے گا۔ پھر قبر سمٹ کر اسے بھینچتی ہے حتّٰی کہ اس کی پسلیاں توڑ پھوڑ کر ایک دُوسری میں داخل کر دیتی ہے۔

راوی بیان کرتا ہے کہ اس موقعہ پر آپؐ نے ہاتھوں کی اُنگلیاں ایک دُوسری میں ڈال کر بتایا کہ اس کی پسلیاں ایک دُوسری میں اس طرح داخل ہو جائیں گی۔ پھر آپؐ نے فرمایا:

وَيُقَيَّضُ لَهٗ سَبْعُوْنَ تِنِّيْنًا لَوْ اَنَّ وَاحِدًا مِّنْهَا نَفَخَ فِي الْاَرْضِ مَا اَنْبَتَتْ شَيْئًا مَّا بَقِيَتِ

الدُّنْیَا فَیَنْھَشْنَہٗ وَیَخْدِشْنَہٗ حَتّٰی یُقْضٰی بِہٖ اِلَی الْحِسَابِ ٥

اور اس کے لیے ستّر ایسے زہریلے اژدہے مقرر کیے جاتے ہیں کہ ان میں کا ایک بھی اگر دنیا میں پھنکار مار جائے تو رہتی دنیا تک زمین پر کوئی چیز نہ اُگے۔ حشر تک وہ اژدہے اُسے ڈستے اور نوچ نوچ کر کھاتے رہیں گے۔

پھر آپؐ نے فرمایا:

اِنَّمَا الْقَبْرُ رَوْضَۃٌ مِّنْ رِیَاضِ الْجَنَّۃِ اَوْ حُفْرَۃٌ مِّنْ حُفَرِ النَّارِ ٥ (ترمذی)

قبر یا تو جنّت کے باغیچوں میں سے ایک باغیچہ ہے یا دوزخ کے گڑھوں میں کا ایک گڑھا ہے۔

الدُّنْیَا فَیَنْھَشْنَہٗ وَیَخْدِشْنَہٗ حَتّٰی یُقْضٰی بِہٖ اِلَی الْحِسَابِ ۝

اور اس کے لیے ستّر ایسے زہریلے اژدہے مقرر کیے جاتے ہیں کہ ان میں کا ایک بھی اگر دنیا میں پھنکار مار جائے تو رہتی دنیا تک زمین پر کوئی چیز نہ اُگے۔ حشر تک وہ اژدہے اُسے ڈستے اور نوچ نوچ کر کھاتے رہیں گے۔

پھر آپؐ نے فرمایا:

اِنَّمَا الْقَبْرُ رَوْضَۃٌ مِّنْ رِّیَاضِ الْجَنَّۃِ اَوْ حُفْرَۃٌ مِّنْ حُفَرِ النَّارِ ۝ (ترمذی)

قبر یا تو جنّت کے باغیچوں میں سے ایک باغیچہ ہے یا دوزخ کے گڑھوں میں کا ایک گڑھا ہے۔

۶۲

عذابِ قبر

حضرت براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک انصاری صحابی کا انتقال ہوگیا۔ ہم ان کے جنازے میں گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہمارے ساتھ تھے۔ قبرستان پہنچے تو ابھی (لحد) قبر تیار نہیں ہوئی تھی۔ حضورؐ بیٹھ گئے ہم بھی آپؐ کے اردگرد بیٹھ گئے۔ ہم سب یوں خاموش اور بے حس و حرکت بیٹھے تھے۔ گویا ہمارے سروں پر پرندے بیٹھے ہیں۔ جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ایک تنکا تھا جسے آپؐ زمین پر پھیر رہے تھے۔ سر جھکا ہوا تھا۔ ذرا سی دیر بعد آپ نے سر اُٹھایا اور فرمایا: لوگو! عذابِ قبر سے خدا کی پناہ مانگو۔ دو یا تین مرتبہ یہ حکم دیا، پھر مندرجہ ذیل وعظ بیان فرمایا:

إِنَّ الْمَيِّتَ يَسْمَعُ خَفْقَ نِعَالِهِمْ إِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ٥ حِيْنَ يُقَالُ لَهُ يَا هٰذَا مَنْ رَّبُّكَ وَمَا دِيْنُكَ وَمَنْ نَّبِيُّكَ؟ وَفِي رِوَايَةٍ وَيَأْتِيْهِ مَلَكَانِ مُنْكَرٌ وَّنَكِيْرٌ فَيُجْلِسَانِهِ فَيَقُوْلَانِ لَهُ مَنْ رَّبُّكَ؟ فَيَقُوْلُ رَبِّيَ اللّٰهُ۔ فَيَقُوْلَانِ لَهُ وَمَا دِيْنُكَ؟ فَيَقُوْلُ دِيْنِيَ الْإِسْلَامُ۔ فَيَقُوْلَانِ لَهُ مَا هٰذَا الرَّجُلُ الَّذِيْ بُعِثَ فِيْكُمْ؟ فَيَقُوْلُ هُوَ رَسُوْلُ اللّٰهِ۔ فَيَقُوْلَانِ لَهُ وَمَا يُدْرِيْكَ؟ فَيَقُوْلُ قَرَأْتُ كِتَابَ اللّٰهِ وَاٰمَنْتُ وَصَدَّقْتُ زَادَ فِيْ رِوَايَةٍ فَذَالِكَ قَوْلُهُ يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ۔ فَيُنَادِيْ مُنَادٍ مِّنَ السَّمَاءِ أَنْ صَدَقَ عَبْدِيْ۔ فَافْرُشُوْهُ مِنَ الْجَنَّةِ۔ وَالْبِسُوْهُ مِنَ الْجَنَّةِ۔ وَافْتَحُوْا لَهُ بَابًا إِلَى الْجَنَّةِ۔ فَيَأْتِيْهِ مِنْ رَّوْحِهَا وَطِيْبِهَا۔ وَيُفْسَحُ لَهُ فِيْ قَبْرِهِ مَدَّ بَصَرِهِ۔ وَإِنَّ الْكَافِرَ فَذَكَرَ مَوْتَهُ۔ قَالَ فَتُعَادُ رُوْحُهُ فِيْ جَسَدِهِ ٥ وَيَأْتِيْهِ مَلَكَانِ مُنْكَرٌ وَّنَكِيْرٌ فَيُجْلِسَانِهِ فَيَقُوْلَانِ مَنْ رَّبُّكَ؟ فَيَقُوْلُ هَاهْ هَاهْ لَا أَدْرِيْ۔ فَيَقُوْلَانِ مَا دِيْنُكَ؟ فَيَقُوْلُ هَاهْ هَاهْ لَا أَدْرِيْ۔ فَيَقُوْلَانِ لَهُ مَا هٰذَا الرَّجُلُ الَّذِيْ بُعِثَ فِيْكُمْ؟ فَيَقُوْلُ هَاهْ هَاهْ لَا أَدْرِيْ فَيُنَادِيْ مُنَادٍ مِّنَ السَّمَاءِ أَنْ قَدْ كَذَبَ فَافْرُشُوْهُ مِنَ النَّارِ وَالْبِسُوْهُ مِنَ النَّارِ وَافْتَحُوْا لَهُ بَابًا إِلَى النَّارِ۔ فَيَأْتِيْهِ مِنْ حَرِّهَا وَسَمُوْمِهَا وَيُضَيَّقُ عَلَيْهِ قَبْرُهُ حَتّٰى تَخْتَلِفَ فِيْهِ أَضْلَاعُهُ زَادَ فِيْ رِوَايَةٍ۔ ثُمَّ يُقَيَّضُ لَهُ أَعْمٰى أَبْكَمُ مَعَهُ مِرْزَبَّةٌ مِّنْ حَدِيْدٍ لَّوْ ضُرِبَ بِهَا جَبَلٌ لَّصَارَ تُرَابًا۔ فَيَضْرِبُهُ بِهَا ضَرْبَةً يَّسْمَعُهَا مَنْ بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ إِلَّا الثَّقَلَيْنِ فَيَصِيْرُ تُرَابًا ثُمَّ تُعَادُ فِيْهِ الرُّوْحُ۔

لوگ جب میّت کو دفن کر کے لوٹتے ہیں ابھی ان کی جوتیوں کی آہٹ وہ سُن ہی رہا ہوتا ہے کہ اسے کہا جاتا ہے: اے شخص! بتلا تیرا رب کون ہے؟ تیرا دین کیا ہے؟ تیرا نبی کون ہے؟ ایک روایت میں ہے کہ اس کے پاس

دو فرشتے منکر اور نکیر آتے ہیں، اسے بٹھاتے ہیں اور اس سے کہتے ہیں: تیرا رب کون ہے؟ وہ کہتا ہے: میرا رب اللہ ہے۔ فرشتے اس سے کہتے ہیں: تیرا دین کیا ہے؟ وہ کہتا ہے: میرا دین اسلام ہے۔ فرشتے کہتے ہیں: یہ شخص جو تمہاری طرف بھیجا گیا کون ہے؟ وہ شخص کہتا ہے: وہ اللہ کے رسولؐ ہیں۔ فرشتے اس سے پوچھتے ہیں: یہ تجھے کیسے معلوم ہوا؟ وہ کہتا ہے: میں نے اللہ کی کتاب پڑھی اس پر ایمان لایا اور اسے سچا جانا۔ ایک روایت میں مزید یہ ہے کہ یہی مطلب ہے اس آیت کا، جس میں فرمانِ خداوندی ہے کہ اللہ پاک ایمان والوں کو سچی اور مضبوط بات کے ساتھ ثابت قدم رکھتا ہے دُنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت کی زندگی میں بھی۔ اسی وقت آسمان سے پکارنے والا پکارتا ہے کہ میرے اس بندے نے سچ کہا ہے اس کے لیے جنتی فرش بچھا دو۔ اسے جنتی لباس پہنا دو۔ اس کی قبر میں سے جنت کی طرف دروازہ کھول دو۔ چنانچہ جنت کی تازہ ہوا اور خوشبو اُسے پہنچنے لگتی ہے اور حدِ نگاہ تک اس کی قبر کشادہ ہو جاتی ہے۔ کافر کی موت اور اس موت کی سختی اور بُرائی بیان فرما کر آپ نے فرمایا کہ قبر میں اس کی روح اس کے جسم میں لوٹائی جاتی ہے اور اس کے پاس بھی دو فرشتے منکر نکیر آتے ہیں اُسے بٹھاتے ہیں اور اس سے سوال کرتے ہیں کہ تیرا رب کون ہے؟ وہ (گھبرا کر) کہتا ہے: ہائے ہائے میں تو نہیں جانتا۔ پھر پوچھتے ہیں: تیرا دین کون سا ہے؟ وہ پھر کہتا ہے: ہائے ہائے میں تو نہیں جانتا۔ فرشتے پھر پوچھتے ہیں: ان کے بارے میں تو کیا کہتا ہے جو تم میں بھیجے گئے تھے؟ وہ کہتا ہے: ہائے ہائے میں یہ بھی نہیں جانتا۔ اسی وقت آسمان سے آواز آتی ہے کہ یہ جھوٹا ہے اس کے لیے جہنم کا بستر بچھا دو اسے جہنمی لباس پہنا دو۔ اور اس کے لیے جہنم کی طرف دروازہ کھول دو۔ چنانچہ جہنم کی حرارت اور گرم ہوا اسے پہنچنے لگتی ہے اور اس کی قبر اتنی تنگ ہو جاتی ہے کہ دائیں جانب کی پسلیاں بائیں پسلیوں میں اور بائیں طرف کی دائیں طرف گھس جاتی ہیں۔ پھر اس کی قبر میں ایک فرشتہ مقرر کیا جاتا ہے جو نابینا اور بہرہ ہوتا ہے اس کے ہاتھ میں لوہے کا ایک گھن (بڑا ہتھوڑا) ہوتا ہے کہ اگر وہ اسے کسی پہاڑ پر مار دے تو وہ مٹی بن جائے۔ اس سے وہ اسے مارتا ہے جس کی آواز مشرق و مغرب والے سب سُنتے ہیں سوائے انسانوں اور جنوں کے۔ اس سے وہ مٹی بن جاتا ہے لیکن پھر اس میں رُوح لوٹائی جاتی ہے، (اور یہی عذاب اسے ہوتا رہتا ہے)۔

۶۳

قبر کی آزمائش

اُم المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس ایک یہودیہ عورت اللہ واسطے کچھ مانگنے کے لیے آئی اور کہا کہ مجھے کھلا دو، اللہ تعالیٰ تمہیں دجال کے فتنے سے اور قبر کے عذاب سے بچائے۔ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ مجھے ایک خیال سا بندھ گیا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو میں نے بطور تعجب اس یہودیہ عورت کا یہ قول نقل کیا۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسی وقت (واپس لوگوں کے مجمع میں جا کر) کھڑے ہو کر (خطبہ دینے لگے پہلے تو) آپؐ نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر اللہ تعالیٰ سے فتنۂ دجال اور عذاب قبر سے پناہ مانگی۔ پھر یہ ارشاد فرمایا:

اَمَّا فِتْنَةُ الدَّجَّالِ فَاِنَّهٗ لَمْ يَكُنْ نَبِيٌّ اِلَّا حَذَّرَ اُمَّتَهٗ وَسَاُحَدِّثُكُمْ بِحَدِيْثٍ لَمْ يُحَدِّثْهُ نَبِيٌّ اُمَّتَهٗ اِنَّهٗ اَعْوَرُ۔ وَاِنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِاَعْوَرَ۔ مَكْتُوْبٌ بَيْنَ عَيْنَيْهِ كَافِرٌ يَقْرَؤُهٗ كُلُّ مُؤْمِنٍ فَاَمَّا فِتْنَةُ الْقَبْرِ فَبِيْ يُفْتَنُوْنَ۔ وَعَنِّيْ يُسْاَلُوْنَ فَاِذَا كَانَ الرَّجُلُ الصَّالِحُ اُجْلِسَ فِيْ قَبْرِهٖ غَيْرَ فَزِعٍ وَّلَا مَشْعُوْفٍ۔ ثُمَّ يُقَالُ لَهٗ فِيْمَا كُنْتَ تَقُوْلُ فِي الْاِسْلَامِ؟ فَيُقَالُ مَا هٰذَا الرَّجُلُ الَّذِيْ كَانَ فِيْكُمْ؟ فَيَقُوْلُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ جَآءَنَا بِالْبَيِّنَاتِ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ فَصَدَّقْنَاهُ فَتُفْرَجُ لَهٗ فُرْجَةٌ قِبَلَ النَّارِ فَيَنْظُرُ اِلَيْهَا يَحْطِمُ بَعْضُهَا بَعْضًا۔ فَيُقَالُ لَهٗ اُنْظُرْ اِلٰى مَا وَقَاكَ اللّٰهُ ثُمَّ تُفْرَجُ لَهٗ فُرْجَةٌ اِلَى الْجَنَّةِ فَيَنْظُرُ اِلٰى زَهْرَتِهَا وَمَا فِيْهَا۔ فَيُقَالُ لَهٗ هٰذَا مَقْعَدُكَ مِنْهَا وَيُقَالُ عَلَى الْيَقِيْنِ كُنْتَ وَعَلَيْهِ مُتَّ وَعَلَيْهِ تُبْعَثُ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ وَاِذَا كَانَ الرَّجُلُ السُّوْٓءُ اُجْلِسَ فِيْ قَبْرِهٖ فَزِعًا مَشْعُوْفًا فَيُقَالُ لَهٗ فِيْمَا كُنْتَ تَقُوْلُ فَيَقُوْلُ سَمِعْتُ النَّاسَ يَقُوْلُوْنَ قَوْلًا فَقُلْتُ كَمَا قَالُوْا فَيُفْرَجُ فُرْجَةٌ اِلَى الْجَنَّةِ فَيَنْظُرُ اِلٰى زَهْرَتِهَا وَمَا فِيْهَا۔ فَيُقَالُ لَهٗ اُنْظُرْ اِلٰى مَا صَرَفَ اللّٰهُ عَنْكَ ۔ ثُمَّ يُفْرَجُ لَهٗ فُرْجَةٌ قِبَلَ النَّارِ فَيَنْظُرُ اِلَيْهَا يَحْطِمُ بَعْضُهَا بَعْضًا۔ وَيُقَالُ هٰذَا مَقْعَدُكَ مِنْهَا۔ عَلَى الشَّكِّ كُنْتَ وَعَلَيْهِ مُتَّ ۔ وَعَلَيْهِ تُبْعَثُ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ ثُمَّ يُعَذَّبُ۔

(ابوداؤد ۔ بیہقی)

جہاں تک فتنۂ دجال کا تعلق ہے، ہر نبی اپنی اُمّت کو اس فتنے سے ہوشیار کرتا رہا۔ میں تمہیں اس کے بارے میں ایک ایسی بات بتاتا ہوں جو کسی اور نبی نے اپنی اُمّت سے بیان نہیں کی، وہ نشانی یہ ہے کہ دجّال کانا ہے اور اللہ تعالیٰ اس عیب سے پاک ہے، اور اس کی آنکھوں کے درمیان "کافر" لکھا ہوا ہے جسے ہر مومن پڑھ لے گا۔ رہا فتنۂ قبر، تو وہاں میری ذات سے ان کی آزمائش کی جائے گی۔ اور میری بابت ان سے سوال کیا جائے گا

نیک شخص کو اس کی قبر میں بٹھایا جاتا ہے آرام اور اطمینان سے، بغیر گھبراہٹ اور پریشانی کے۔ پھر اس سے پوچھا جاتا ہے کہ تو اسلام کے بارے میں کیا کہتا تھا؟ پھر کہا جاتا ہے: یہ صاحب جو تمہارے درمیان تھے کون ہیں؟ وہ جواب دیتا ہے کہ آپ خدا کے رسول محمدؐ ہیں، ہمارے پاس خدائی دلیلیں لے کر آئے تھے۔ ہم نے آپؐ کی تصدیق کی۔ اس پر اس کی قبر میں سے ایک کھڑکی دوزخ کی طرف کھل جاتی ہے اور وہ دیکھتا ہے کہ اس کا بعض حصہ بعض کو کھائے جا رہا ہے۔ اُسے کہا جاتا ہے کہ دیکھ اس کی طرف جس سے اللہ تعالیٰ نے تجھے نجات دی پھر اس کی قبر میں سے ایک دروازہ جنّت کی طرف کھل جاتا ہے اور یہ خود اس کی تروتازگی اور جو کچھ اس میں ہے دیکھتا ہے، اس وقت اسے کہا جاتا ہے کہ تیرا ٹھکانا یہ ہے۔ تو یقین پر ہی زندہ تھا، یقین پر ہی مرا۔ اور ان شاء اللہ یقین پر ہی تو اٹھایا جائے گا۔ ہاں جب انسان بُرا ہوتا ہے اُسے اس کی قبر میں بٹھایا جاتا ہے تو وہ گھبراہٹ اور پریشانی میں بے ہوش سا ہوتا ہے۔ اس سے پُوچھا جاتا ہے تُو کیا کہتا تھا؟ وُہ جواب دیتا ہے کہ میں نے لوگوں کو کچھ کہتے سُنا تھا وہی میں بھی کہتا تھا۔ اب اس کی قبر میں جنت کی طرف کھڑکی کھولی جاتی ہے، یہ اس کی نعمتوں اور راحتوں کو دیکھتا ہے تو اس سے کہا جاتا ہے دیکھ ان چیزوں کو جو اللہ نے تجھ سے دُور کر دیں۔ پھر اس کی قبر کا ایک دروازہ جہنم کی طرف کھولا جاتا ہے یہ اسے دیکھتا ہے کہ پانی کے تلاطم کی طرح آگ اُوپر تلے ہو رہی ہے تو اُسے کہا جاتا ہے کہ اب تیرا ٹھکانا یہی ہے۔ تُو شک پر تھا، شک میں مرا اور ان شاء اللہ تعالیٰ شک ہی پر قبر سے بھی اُٹھے گا۔ پھر اُسے عذاب شروع ہو جاتا ہے۔

۶۴

حشر میں احتساب

حضرت ابنِ عباسؓ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسولِ خدا نے کھڑے ہو کر مندرجہ ذیل خطبہ ارشاد فرمایا، جس میں آپؐ نے مسلمانوں کو افتراق اور دنیوی عیش و عشرت میں منہمک ہونے سے بچنے کی تلقین کی ——— حمد و ثنا کے بعد فرمایا :

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّكُمْ مَحْشُورُونَ إِلَى اللّٰهِ حُفَاةً عُرَاةً غُرْلًا كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُعِيدُهُ وَعْدًا عَلَيْنَا إِنَّا كُنَّا فَاعِلِينَ ٥ أَلَا وَإِنَّ أَوَّلَ الْخَلَائِقِ يُكْسٰى يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِبْرَاهِيمُ عَلَيْهِ السَّلَامُ ٥ أَلَا وَإِنَّهُ سَيُجَاءُ بِرِجَالٍ مِنْ أُمَّتِي فَيُؤْخَذُ مِنْهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ فَيُقَالُ يَا رَبِّ أَصْحَابِي فَيُقَالُ إِنَّكَ لَا تَدْرِي مَا أَحْدَثُوا بَعْدَكَ فَأَقُولُ كَمَا قَالَ الْعَبْدُ الصَّالِحُ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَا دُمْتُ فِيهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتَ أَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ وَأَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ـ إِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَإِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ـ فَيُقَالُ لِي إِنَّهُمْ لَمْ يَزَالُوا مُرْتَدِّينَ عَلٰى أَعْقَابِهِمْ مُنْذُ فَارَقْتَهُمْ ٥

(مسلم شریف)

اے لوگو! تم اللہ کے پاس ننگے پیر، برہنہ تن، بے ختنہ ہوئے زندہ ہو کر جمع ہو گے (جیسا کہ فرماتا ہے) جس طرح ہم نے پہلی پیدائش شروع کی تھی ہم اسے دوبارہ پیدا کریں گے یہ وعدہ ہے کہ ہم ضرور کریں گے۔ آگاہ ہو جاؤ، قیامت کے دن سب سے پہلے حضرت ابراہیمؑ کو لباس پہنایا جائے گا۔ آگاہ رہو، میری اُمّت کے کچھ لوگ بائیں طرف سے لائے جائیں گے، تو میں کہوں گا: اے پروردگار! یہ میرے ساتھی ہیں۔ جواب ملے گا: تو نہیں جانتا کہ انہوں نے تیرے بعد کیا کچھ کیا ہے۔ تو میں بھی وہی کہوں گا جو اللہ کا نیک بندہ (حضرت عیسٰیؑ) کہے گا کہ جب تک میں ان میں موجود تھا اُن کے اعمال دیکھتا رہا۔ جب تُو نے مجھے ان سے بالکل جُدا کر لیا پھر تُو ہی ان کا نگہبان تھا اور تُو ہر چیز پر شاہد ہے۔ اگر ان کو عذاب دے تو یہ تیرے ہی بندے ہیں اور اگر بخش دے تو تُو غالب حکمت والا ہے۔ مجھے جواب ملے گا کہ تیرے بعد یہ لوگ برابر ایڑیوں کے بل پیچھے کو پھر گئے تھے۔

۶۵

حشر میں شفاعتِ رسولؐ

حضرت ابوبکر صدیقؓ فرماتے ہیں: ایک روز رسولِ خدا نے نمازِ فجر پڑھائی اور وہیں بیٹھے رہے۔ جب خوب دن چڑھ آیا تو آپؐ ہنسے، لیکن وہیں بیٹھے رہے، یہاں تک کہ ظہر کی نماز پڑھی۔ پھر عصر، مغرب اور عشاء کی نمازیں ادا کیں مگر کسی سے کوئی بات نہیں کی۔ گھر جانے لگے تو صحابہؓ نے مجھ سے کہا: آپ حضورؐ سے پوچھیں آج کیا بات ہے؟ اس طرح تو کبھی نہیں ہوا ———— حضورؐ نے یہ سنا، تو قبل اس کے کہ صدیق اکبرؓ کچھ سوال کرتے، آپؐ نے ارشاد فرمایا:

عُرِضَ عَلَیَّ مَا هُوَ كَائِنٌ مِنْ اَمْرِ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ۔ فَجُمِعَ الْاَوَّلُوْنَ وَالْاٰخِرُوْنَ فِیْ صَعِیْدٍ وَّاحِدٍ۔ حَتّٰی انْطَلَقُوْا اِلٰی اٰدَمَ عَلَیْهِ السَّلَامُ۔ وَالْعَرَقُ یَكَادُ یُلْجِمُهُمْ فَقَالُوْا یَا اٰدَمُ اَنْتَ اَبُو الْبَشَرِ۔ اِصْطَفَاكَ اللّٰهُ اِشْفَعْ لَنَا اِلٰی رَبِّكَ۔ فَقَالَ قَدْ لَقِیْتُ مِثْلَ الَّذِیْ لَقِیْتُمْ۔ اِذْهَبُوْا اِلٰی اَبِیْكُمْ بَعْدَ اَبِیْكُمْ اِلٰی نُوْحٍ۔ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰی اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرَاهِیْمَ وَاٰلَ عِمْرَانَ عَلَی الْعَالَمِیْنَ ٥ فَیَنْطَلِقُوْنَ اِلٰی نُوْحٍ عَلَیْهِ السَّلَامُ۔ فَیَقُوْلُوْنَ اِشْفَعْ لَنَا اِلٰی رَبِّكَ فَاَنْتَ اصْطَفَاكَ اللّٰهُ وَاسْتَجَابَ لَكَ فِیْ دُعَائِكَ فَلَمْ یَدَعْ عَلَی الْاَرْضِ مِنَ الْكَافِرِیْنَ دَیَّارًا۔ فَیَقُوْلُ لَیْسَ ذَاكُمْ عِنْدِیْ فَانْطَلِقُوْا اِلٰی اِبْرَاهِیْمَ فَاِنَّ اللّٰهَ اتَّخَذَهٗ خَلِیْلًا فَیَنْطَلِقُوْنَ اِلٰی اِبْرَاهِیْمَ عَلَیْهِ السَّلَامُ۔ فَیَقُوْلُ لَیْسَ ذَاكُمْ عِنْدِیْ فَانْطَلِقُوْا اِلٰی مُوْسٰی فَاِنَّ اللّٰهَ كَلَّمَهٗ تَكْلِیْمًا۔ فَیَنْطَلِقُوْنَ اِلٰی مُوْسٰی عَلَیْهِ السَّلَامُ۔ فَیَقُوْلُ لَیْسَ ذَاكُمْ عِنْدِیْ وَلٰكِنِ انْطَلِقُوْا اِلٰی عِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ فَاِنَّهٗ كَانَ یُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَیُحْیِ الْمَوْتٰی۔ فَیَقُوْلُ عِیْسٰی لَیْسَ ذَاكُمْ عِنْدِیْ وَلٰكِنِ انْطَلِقُوْا اِلٰی سَیِّدِ وُلْدِ اٰدَمَ فَاِنَّهٗ اَوَّلُ مَنْ تَنْشَقُّ عَنْهُ الْاَرْضُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ۔ اِنْطَلِقُوْا اِلٰی مُحَمَّدٍ فَلْیَشْفَعْ لَكُمْ اِلٰی رَبِّكُمْ قَالَ فَیَنْطَلِقُوْنَ اِلَیَّ وَاٰتِیْ جِبْرِیْلَ فَیَاْتِیْ جِبْرِیْلُ رَبَّهٗ۔ فَیَقُوْلُ اُئْذَنْ لَهٗ وَبَشِّرْهُ بِالْجَنَّةِ قَالَ فَیَنْطَلِقُ بِهٖ جِبْرِیْلُ۔ فَیَخِرُّ سَاجِدًا قَدْرَ جُمُعَةٍ۔ ثُمَّ یَقُوْلُ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰی یَا مُحَمَّدُ ارْفَعْ رَأْسَكَ وَقُلْ تُسْمَعْ وَاشْفَعْ تُشَفَّعْ فَیَرْفَعُ رَأْسَهٗ۔ فَاِذَا نَظَرَ اِلٰی رَبِّهٖ خَرَّ سَاجِدًا قَدْرَ جُمُعَةٍ اُخْرٰی۔ فَیَقُوْلُ اللّٰهُ یَا مُحَمَّدُ ارْفَعْ رَأْسَكَ۔ وَقُلْ تُسْمَعْ وَاشْفَعْ تُشَفَّعْ فَیَذْهَبُ لِیَقَعَ سَاجِدًا فَیَأْخُذُ جِبْرِیْلُ بِضَبْعَیْهِ وَیَفْتَحُ اللّٰهُ عَلَیْهِ مِنَ الدُّعَاءِ مَا لَمْ یَفْتَحْ عَلٰی بَشَرٍ قَطُّ۔ فَیَقُوْلُ اَیْ رَبِّ جَعَلْتَنِیْ سَیِّدَ وُلْدِ اٰدَمَ وَلَا فَخْرَ وَاَوَّلَ مَنْ تَنْشَقُّ عَنْهُ الْاَرْضُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ وَلَا فَخْرَ۔ حَتّٰی اِنَّهٗ لَیَرِدُ عَلَیَّ الْحَوْضَ اَكْثَرُ مَا بَیْنَ صَنْعَاءَ وَاَیْلَةَ۔ ثُمَّ یُقَالُ اُدْعُوا الصِّدِّیْقِیْنَ فَیَشْفَعُوْنَ ثُمَّ یُقَالُ اُدْعُوا الْاَنْبِیَاءَ۔ فَیَجِیْءُ النَّبِیُّ مَعَهُ الْعِصَابَةُ وَالنَّبِیُّ مَعَهُ الْخَمْسَةُ وَالسِّتَّةُ وَالنَّبِیُّ لَیْسَ

مَعَهُ اَحَدٌ۔ ثُمَّ يُقَالُ ادْعُوا الشُّهَدَآءَ فَيَشْفَعُوْنَ فِيْ مَنْ اَرَادُوْا فَاِذَا فَعَلَتِ الشُّهَدَآءُ ذَالِكَ۔ يَقُوْلُ اللّٰهُ جَلَّ وَعَلَا۔ اَنَا اَرْحَمُ الرَّاحِمِيْنَ اَدْخِلُوْا جَنَّتِيْ مَنْ كَانَ لَا يُشْرِكُ بِيْ شَيْئًا۔ فَيَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ ثُمَّ يَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰى اُنْظُرُوْا فِي النَّارِ هَلْ فِيْهَا مِنْ اَحَدٍ عَمِلَ خَيْرًا قَطُّ۔ فَيَجِدُوْنَ فِي النَّارِ رَجُلًا۔ فَيُقَالُ لَهٗ عَمِلْتَ خَيْرًا قَطُّ فَيَقُوْلُ لَا غَيْرَ اَنِّيْ كُنْتُ اُسَامِحُ النَّاسَ فِي الْبَيْعِ فَيَقُوْلُ اللّٰهُ اَسْمِحُوْا لِعَبْدِيْ كَاِسْمَاحِهٖ اِلٰى عَبِيْدِيْ۔ ثُمَّ يُخْرِجُ مِنَ النَّارِ اٰخَرُ۔ فَيُقَالُ لَهٗ هَلْ عَمِلْتَ خَيْرًا قَطُّ۔ فَيَقُوْلُ لَا غَيْرَ اَنِّيْ كُنْتُ اَمَرْتُ وَلَدِيْ اِذَا مِتُّ فَاَحْرِقُوْنِيْ بِالنَّارِ۔ ثُمَّ اطْحَنُوْنِيْ حَتّٰى اِذَا كُنْتُ مِثْلَ الْكُحْلِ اِذْهَبُوْا بِيْ اِلَى الْبَحْرِ فَذَرُوْنِيْ فِي الرِّيْحِ۔ فَقَالَ اللّٰهُ لِمَ فَعَلْتَ ذَالِكَ؟ قَالَ مِنْ مَّخَافَتِكَ فَيَقُوْلُ اُنْظُرُوْا اِلٰى مُلْكِ اَعْظَمِ مُلْكٍ۔ فَاِنَّ لَكَ مِثْلَهٗ وَعَشَرَةَ اَمْثَالِهٖ۔ فَيَقُوْلُ لِمَ تَسْخَرُ بِيْ؟ وَاَنْتَ الْمَلِكُ۔ فَذَالِكَ الَّذِيْ ضَحِكْتُ مِنْهُ مِنَ الْفَجْرِ۔ (مُسند احمد)

دنیا کے بارے میں جو کچھ ہونے والا ہے وہ اور آخرت آج میرے سامنے پیش کی گئی سارے اگلے پچھلے انسان ایک چٹیل میدان میں جمع کیے گئے۔ پسینے اُن کے مُنہ تک پہنچنے کو تھے کہ وُہ حضرت آدم علیہ السلام کے پاس گئے اور کہا کہ اے آدمؑ! آپ انسانوں کے باپ ہیں آپ کو خدا تعالیٰ نے برگزیدہ بنایا۔ آپ خدا کے پاس ہماری سفارش کے لیے تشریف لے جائیے۔ لیکن حضرت آدمؑ نے فرمایا کہ آج میں بھی تمہاری طرح مبتلا ہُوں تم اپنے اس باپ کے بعد کے باپ حضرت نوح علیہ السلام کے پاس جاؤ۔ اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو، نوحؑ کو اور آلِ ابراہیمؑ کو اور آلِ عمران کو برگزیدہ بنایا ہے اور سارے جہان پر انھیں عزت دی ہے۔ اب یہ سب حضرت نوحؑ کی طرف جائیں گے اور ان سے کہیں گے: آپ خدا سے ہماری سفارش کیجئے کیونکہ آپ خدا کے پیارے ہیں آپ کی دعا قبول فرما کر جناب باری نے روئے زمین پر کوئی کافر نہ چھوڑا۔ لیکن وُہ بھی یہی جواب دیں گے کہ میں اس قابل نہیں تم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس جاؤ انھیں اللہ تعالیٰ نے اپنا خلیل بنایا ہے۔ چنانچہ سب لوگ حضرت خلیل اللہ علیہ السّلام کے پاس جائیں گے، لیکن وُہ بھی یہی جواب دیں گے کہ میں اس قابل نہیں تم حضرت مُوسیٰ علیہ السلام کے پاس جاؤ جن سے اللہ تعالیٰ نے (بے واسطہ) بات چیت کی تھی۔ سب اہلِ محشر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئیں گے وُہ بھی یہی جواب دیں گے کہ میں اس منصب کے لائق نہیں تم حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کے پاس جاؤ وُہ مادر زاد گونگے کو اور کوڑھیوں کو (بحکمِ خدا) اچھا بھلا کر دیتے تھے اور مُردوں کو (بحکمِ خدا) زندہ کر دیتے تھے۔ لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی یہی جواب دیں گے اور فرمائیں گے: تم اولادِ آدم کے سردار کے پاس جاؤ وہی ہیں جو سب سے پہلے اپنی قبر سے نکلے ہیں جاؤ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤ کہ وہ تمہارے رب کے ہاں تمہاری سفارش کریں۔ چنانچہ سب لوگ میرے پاس آئیں گے میں جبریلؑ کے پاس جاؤں گا۔ جبریل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے پاس جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا؛ جاؤ انھیں شفاعت کی اجازت دو اور جنت کی خوشخبری بھی سنا دو۔ حضرت جبریلؑ سے یہ خوشخبری سُن کر میں سجدے

میں گر پڑوں گا۔ تقریباً ایک ہفتے تک سجدے میں پڑا رہوں گا پھر اللہ تبارک و تعالیٰ مجھ سے فرمائے گا اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ! اپنا سر اٹھاؤ، کہو تمہاری سُنی جائے گی، سفارش کرو قبول کی جائے گی۔ آپ اپنا سر اٹھائیں گے اور جناب باری کی طرف نظر کرکے پھر سجدے میں چلے جائیں گے بقدر جمعہ سے جمعہ تک پھر سجدے میں پڑے رہیں گے۔ پھر اللہ تبارک و تعالیٰ فرمائے گا: اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ! سر اٹھائیے، کہیے آپ کی بات سُنی جائے گی، شفاعت کیجئے آپ کی شفاعت قبول کی جائے گی۔ میں اس نعمت پر پھر سجدے میں جانا چاہوں گا لیکن حضرت جبریل علیہ السلام میرے بازو تھام لیں گے۔ اب اللہ تعالیٰ مجھے وہ دعائیں سکھائے گا جو کسی انسان کو نہیں سکھائیں۔ پس آپ کہیں گے اے اللہ! تُو نے مجھے تمام اولادِ آدم کا سردار بنایا اور مجھے اس پر کوئی فخر نہیں، مجھے تُو نے سب سے پہلے قبر سے اٹھانے والا بنایا اس پر بھی مجھے کوئی فخر نہیں (چنانچہ اب میں شفاعت کروں گا) اس کے بعد میرے حوض پر لوگ آنے شروع ہوں گے جو صنعاً سے لے کر ایلہ سے بھی زیادہ وسعت والا ہوگا۔ پھر کہا جائے گا کہ صدیق لوگوں کو بلاؤ وہ بھی شفاعت کریں۔ پھر کہا جائے گا نبیوں کو بلاؤ۔ انبیاً آنے شروع ہوں گے۔ کسی کے ساتھ تیس چالیس آدمی ہوں گے، کسی کے ساتھ پانچ کسی کے ساتھ چھ کسی نبی کے ساتھ ایک بھی نہ ہوگا۔ پھر کہا جائے گا، شہیدوں کو بلاؤ کہ جس کی چاہیں شفاعت کریں۔ جب شہید یہ کر لیں گے تو جناب باری جل وعلا فرمائے گا: میں ارحم الراحمین ہوں (حکم دیتا ہوں کہ) جن لوگوں نے میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں کیا ان سب کو جنت میں پہنچا دو۔ چنانچہ ایسے لوگ جنت میں داخل ہو جائیں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا، دیکھو جہنم میں کوئی ایسا بھی ہے جس نے کبھی بھی کوئی بھلا کام کیا ہو؟ دیکھیں گے تو ایک شخص کو پائیں گے اس سے سوال ہوگا کہ تُو نے کبھی کوئی نیکی کی ہے؟ وہ کہے گا ہاں صرف یہ کہ میں بیوپار میں بہت نرمی کرتا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: میرے اس بندے سے بھی نرمی کرو جیسے یہ میرے بندوں سے نرمی کیا کرتا تھا۔ اتنے میں ایک اور آدمی دوزخ سے نکلے گا اس سے پُوچھا جائے گا: تُونے بھی کبھی کوئی نیک عمل کیا تھا؟ وہ کہے گا نہیں سوائے اس کے کہ میں نے اپنی اولاد سے کہا تھا کہ جب میں مرجاؤں تو تم مجھے جلا دینا پھر میری خاک کو پیس ڈالنا حتیٰ کہ جب میں سُرمے کی طرح ہو جاؤں تو سمندر کے کنارے جا کر تیز ہوا میں مجھے اڑا دینا۔ اللہ تعالیٰ دریافت فرمائے گا: تُونے ایسا کیوں کیا؟ وہ کہے گا: فقط تیرے ڈر سے۔ جناب باری فرمائے گا: دیکھو سب سے بڑا ملک دیکھ لو تیرے لیے وُہ ہے اور ویسے ہی دس ملک اور۔ تو وُہ کہے گا کہ الٰہی! تُو مجھ سے مذاق کیوں کر رہا ہے؟ تُو تو مالک ہے۔ اسی چیز نے صبح مجھ کو ہنسا دیا تھا۔

۶۶

شفاعتِ رسولؐ

قریش کے بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ آنحضورؐ کے رشتہ دار ہیں اور اس سبب سے آخرت میں وہ شفاعتِ رسولؐ کے مستحق ہوں گے۔ اس تصور کے پیشِ نظر ایک دن رسول اللہؐ نے اپنے قریبی رشتہ داروں، اہلِ خاندان اور بعض قریبی قبائل کو جمع کیا اور ان کے سامنے حسب ذیل خطبہ ارشاد فرمایا:

یا معشر عبد مناف انقذوا انفسکم من النار فانی لا املک لکم من اللہ ضرّاً و لا نفعاً۔ یا معشر بنی قصی انقذوا انفسکم من النار فانی لا املک لکم من اللہ ضراً ولا نفعاً۔ یا معشر بنی عبد المطلب انقذوا انفسکم من النار فانی لا املک لکم ضرّاً و لا نفعاً۔ یا صفیہ عمۃ محمد انقذی نفسک من النار فانی لا املک من اللہ ضرّاً و لا نفعاً۔ یا فاطمۃ بنت محمد انقذی نفسک من النار فانی لا املک لک ضرّاً و لا نفعاً ان لک رحماً و سابلھا ببلالھا۔ (ترمذی)

اے عبد مناف کے بیٹو! تم اپنے کو خدا کی آگ سے نکالنے کا انتظام کر دیں تم کو خدا کے سامنے کچھ بھی نفع اور نقصان نہ پہنچا سکوں گا۔ اے قصی کی اولاد، اے عبد المطلب کی، تم بھی اپنے کو آگ سے بچاؤ میں خدا کے سامنے تمہارے لیے کچھ نہ کر سکوں گا۔ اور اے صفیہ رسولِ خدا کی پھوپھی، اور اے فاطمہ رسولِ خدا محمدؐ کی بیٹی! تم بھی اپنے کو آگ سے بچاؤ کہ میں خدا کے ہاں تمہارے لیے کچھ نہ کر سکوں گا۔ ہاں دنیا میں تو میری رشتہ داریاں ہیں اس کا حق ادا کرتا ہوں۔

۶۷

شفاعتِ رسولؐ

حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار منبر پر خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

مَا بَالُ رِجَالٍ يَقُوْلُوْنَ اِنَّ رَحِمَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَنْفَعُ قَوْمَهٗ بَلٰى وَاللّٰهِ اِنَّ رَحِمِيْ مَوْصُوْلَةٌ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاِنِّيْ اَيُّهَا النَّاسُ فَرَطٌ لَكُمْ عَلَى الْحَوْضِ فَاِذَا جِئْتُمْ قَالَ رَجُلٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَنَا فُلَانُ بْنُ فُلَانٍ وَقَالَ اَخُوْهُ اَنَا فُلَانُ بْنُ فُلَانٍ قَالَ لَهُمْ اَمَّا النَّسَبُ فَقَدْ عَرَفْتُهٗ وَلٰكِنَّكُمْ اَحْدَثْتُمْ بَعْدِيْ وَارْتَدَدْتُّمُ الْقَهْقَرٰى۔ (مسند احمد)

لوگوں کا کیا حال ہے کہ وہ کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رشتے داری آپؐ کی قوم کو کچھ نفع نہ دے گی؟ ہاں سنو، میری رشتے داری دنیا آخرت میں ملی ہوئی ہے۔ لوگو! میں حوضِ کوثر پر تم سب کا میرساماں ہوں۔ جب تم آؤ گے تو لوگ مجھ سے کہیں گے کہ یا رسولؐ اللہ! میں فلاں کا بیٹا ہوں، یا رسولؐ اللہ! میں فلاں بن فلاں ہوں۔ میں جواب دوں گا کہ ہاں نسب تو پہچان لیا لیکن تم نے میرے بعد بدعتیں نکال لی تھیں اور پچھلے پیروں لوٹتے گئے تھے۔

۶۸

حوضِ کوثر پر

اُمّ المؤمنین حضرت اُمّ سلمہؓ فرماتی ہیں کہ میں لوگوں سے حوضِ کوثر کے متعلق سُنا کرتی تھی لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے اس بارے میں سننے کا موقع نہیں ملا تھا۔ ایک دن مشاطہ میرے بال گوندھ رہی تھی کہ مجھے آپؐ کی آواز سنائی دی:

اَیُّهَا النَّاس (اے لوگو!)

میں نے مشاطہ سے کہا چھوڑ دو کہ آپؐ کا وعظ سن سکوں۔ میں نے کان لگا کر سُنا تو آپؐ فرما رہے تھے:

اِنِّیْ لَکُمْ فَرَطٌ عَلَی الْحَوْضِ فَاِیَّایَ لَا یَاْتِیَنَّ اَحَدُکُمْ فَیُذَبُّ عَنِّیْ کَمَا یُذَبُّ الْبَعِیْرُ الضَّالُّ فَاَقُوْلُ فِیْمَ هٰذَا فَیُقَالُ اِنَّکَ لَا تَدْرِیْ مَا اَحْدَثُوْا بَعْدَكَ فَاَقُوْلُ سُحْقًا ○ (مسلم شریف)

میں حوض (کوثر) پر تمہارا پیشرو ہوں۔ خبردار! تم ایسے نہ بنو کہ میرے پاس آنا چاہو تو اس طرح دُور ہٹا دیے جاؤ جیسے پرایا اُونٹ، اور جب میں دریافت کروں کہ ان سے یہ سلوک کیوں ہو رہا ہے، تو مجھے جواب دیا جائے کہ آپ کے بعد انہوں نے جو وطیرہ اختیار کیا تھا آپ کو معلوم نہیں۔ اور میں بھی کہوں کہ ہلاک ہو جائیں۔

۶۹

کتاب اللہ

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مندرجہ ذیل خطبہ ارشاد فرمایا:

يَآ اَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ فَرَطُكُمْ وَاِنَّكُمْ وَارِدُوْنَ عَلَيَّ الْحَوْضَ اَعْرَضَ مَا بَيْنَ صَنْعَآءَ وَ بُصْرٰى فِيْهِ عَدَدُ النُّجُوْمِ قَدْحَانٌ مِّنْ فِضَّةٍ وَاِنِّيْ سَآئِلُكُمْ حِيْنَ تَرِدُوْنَ عَلَيَّ عَنِ الثَّقَلَيْنِ ۔ فَانْظُرُوْا كَيْفَ تَخْلُفُوْنِيْ فِيْهِمَا الثِّقْلُ الْاَكْبَرُ كِتَابُ اللّٰهِ ۔ سَبَبٌ طَرَفُهٗ بِيَدِ اللّٰهِ وَطَرَفُهٗ بِاَيْدِيْكُمْ ۔ فَاسْتَمْسِكُوْا بِهٖ وَلَا تَضِلُّوْا وَلَا تَبَدَّلُوْا وَعِتْرَتِيْ اَهْلُ بَيْتِيْ ۔ فَاِنَّهٗ قَدْ نَبَّاَنِيَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ۔ اَنَّهُمَا لَنْ يَّتَفَرَّقَا حَتّٰى يَرِدَ عَلَيَّ الْحَوْضَ ۔ (کنز العمال)

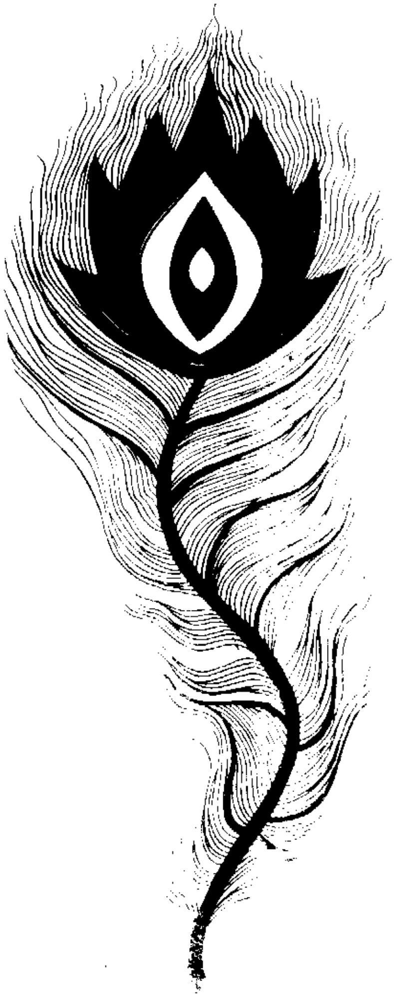
اے لوگو! میں تم سب کے لیے (قیامت کے دن کا انتظام کرنے کے لیے) آگے جانے والا ہوں۔ میرے حوض کوثر پر تم سب آنے والے ہو، جس کی چوڑائی صنعاً سے لے کر بصرہ تک کی ہے۔ اس میں آسمان کے ستاروں جتنے چاندی کے کٹورے تیر رہے ہیں۔ جب تم حوضِ کوثر پر میرے پاس آؤ گے میں اس وقت تم سے دو اہم چیزوں کے بارے میں سوال کروں گا۔ پس نگاہ رکھو تم اُن دونوں کے بارے میں میرے بعد کیسی کارروائی کرتے ہو؟ سب سے بڑی اہم اور وزنی چیز تو کتاب اللہ قرآن کریم ہے (جو خدائی رسّی ہے) جس کا ایک سرا خود خدا کے ہاتھ میں ہے اور دوسرا سرا تمہارے ہاتھوں میں ہے۔ پس تم کتاب اللہ کو مضبوط تھامے رہو، اس سے اِدھر اُدھر نہ ہونا، نہ اس میں کوئی تبدیلی کرنا۔ اور (دوسری چیز) میرا خاندان اور میرے اہلِ بیت ہیں، اللہ تعالیٰ جو باریک بین اور باخبر ہے مجھے خبر دے چکا ہے کہ یہ دونوں (یعنی کتاب اللہ اور میرے اہلِ بیت) الگ الگ نہ ہوں گے یہاں تک کہ میرے پاس میرے حوضِ کوثر پر آئیں۔

نوٹ: خطبہ حجۃ الوداع رسولؐ نمبر ۴ میں آچکا ہے۔

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّ أَنْتُمْ أَذِلَّةٌ

اور یقیناً اللہ نے تمہاری نصرت کی بدر میں، حالانکہ تم بے سروسامان تھے

(آل عمران: ۱۲۳)



أصحاب بدر

رضي الله عنهم

اصحابِ بدر

قاضی محمد سلیمان منصور پوری

غزوات نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں سے یہ غزوہ نہایت مشہور، نہایت متبرک ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بطور اظہارِ احسان فرمایا ہے۔
وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ اللہ نے تو تمہاری مدد بدر میں بھی کی جبکہ تم بہت دبے ہوئے تھے۔
دوسرے مقام پر اسی غزوہ کو یوم الفرقان بھی فرمایا گیا ہے اس غزوہ کا فضل و شرف جملہ غزوات سے برتر ہے اور حدیبیہ اس سے درجہ دوم پر ہے۔

یہ بیان کی گئی ہے کہ یہاں بدر بن یخلد بن النضر بن کنانہ آباد ہوا تھا۔ اسی کے نام سے مقام کا نام ہو گیا۔ بعض کہتے ہیں کہ بدر بن حارث نے یہاں کنواں لگوایا تھا۔ بیر بدر کی وجہ سے اس جگہ کو بھی بدر کہنے لگے۔

جب سے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مہاجرین صادقین مکہ کو چھوڑ کر مدینۃ النبیؐ میں آ گئے تھے تب سے قریش نے ارادہ کر لیا تھا کہ فوجی طاقت سے مسلمانوں کی اجتماعی قوت کو فنا کر دیا جائے اور ایسا ناگہانی حملہ کیا جائے جو مسلمانوں کو پامال ہی کر دے۔

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اُن کی طبائع سے واقف اور اُن کے ارادوں سے باخبر تھے اس لئے تھوڑے تھوڑے دنوں کے بعد ہر اُس راستہ کی طرف جدھر سے اہل مکہ کا اقدام حملہ ہو سکتا تھا۔ سرورِ کائنات مسلمانوں کے جتھے روانہ کرتے اور اُس طرف کے قبائل کے ساتھ ناطرفدار رہنے کے معاہدات کرتے رہتے تھے۔

رمضان سلہ میں امیر حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ تیس سواروں کے ساتھ سیف البحر کی طرف گشت لگانے گئے تھے اُن کو ابوجہل کا لشکر جس میں تین سو سوار تھے مل گیا۔ ابوجہل نے دیکھا کہ مسلمان ہوشیار ہیں اور ناگہانی حملہ ناممکن ہے لہٰذا وہ واپس چلا گیا۔

شوال سلہ میں عبیدہ بن الحارث الہاشمی ساٹھ سواروں کو لے کر مدینہ منورہ سے گشت کو نکلے تو اُن کو بھی ابوسفیان دو سو سواروں کے ساتھ ثنیۃ المرہ کے راستہ پر آ تا مل گیا۔ ابوسفیان نے دیکھا کہ مسلمان اس راہ سے بھی غافل نہیں وہ واپس چلا گیا۔

ذیقعد سلہ میں سعد بن ابی وقاص اسّی سواروں کے ساتھ مدینہ سے گشت کو نکلے او جحفہ تک انہوں نے چکر لگایا۔ دشمن نہیں ملا۔

اس سے تین ماہ بعد بماہ صفر سٹہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود ستر سواروں کے ساتھ ابوا تک نہضت فرما ہوئے اور اس سفر میں عمرو بن مخشی الضمری سے معاہدہ ہوا کہ وہ غیر جانب دار رہے گا۔

ربیع الاوّل سٹہ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر بواط تک سفر فرمایا۔ یہ مقام ینبوع بندرگاہ کے قریب ہے۔ راہ میں قافلہ قریش ملا جس کا سردار امیہ بن خلف تھا۔ اس کے ساتھ صرف ایک سو اشخاص تھے اور حضور کے ہمرکاب دو سو۔ چونکہ مسلمانوں کا مقصد خود کسی کر

چھیڑنا نہ تھا۔ اس لئے قافلہ نکل گیا اور حضور مدینہ منورہ تشریف فرما ہوئے ۔

اسی مہینے میں کرز بن جابر الفہری نے مکّہ سے نکل کر مدینہ تک کامیاب حملہ کیا اور اہل مدینہ کے مویشی کو مدینہ کے چراگاہ سے لوٹ کر لے گیا۔ اُس کا تعاقب بھی مقام سفوان تک کیا گیا مگر اسلامی لشکر ناکام رہا۔ سفوان بدر کے قریب ہے اسس لئے اس کا نام بدر اولیٰ بھی مؤرخین نے لکھا ہے ۔

اس حملہ کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ضرورت محسوس ہوئی کہ بنو مدلج اور بنو ضمرہ کے ساتھ ایک استوار معاہدہ غیر جانبدار رہنے کا کیا جائے۔ جمادی الآخر ۲ھ کو حضور ادھر نہضت فرما ہوئے اور معاہدہ ہو گیا ۔

اسی ماہ جمادی الآخر کے آخر میں بارہ سواروں کا ایک جتھا عبداللہ بن جحش ؓ کی سرداری میں بھیجا گیا۔ اُن کو قریش کا قافلہ مل گیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے خلاف مسلمانوں نے تیر چلائے۔ قریش کا ایک آدمی مارا گیا اور دو کس قید ہوئے ۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قیدیوں کو چھوڑ دیا اور مقتول کا خون بہا قریش کو ادا کر دیا اور یہ بھی ظاہر فرمایا کہ مسلمانوں نے یہ کام اجازت سے بڑھ کر کیا تھا ۔

قریش نے تاوان تو وصول کر لیا مگر انہوں نے مسلمانوں کی معذرت کی کچھ قدر نہ کی اور یہ ارادہ کر لیا کہ اب مسلمانوں پر علانیہ حملہ کیا جائیگا۔

قوم کو جوش دلانے کے لئے ابوجہل نے یہ بھی مشہور کر دیا کہ قریش کے اس قافلہ کو جو ابوسفیان کی ماتحتی میں شام سے آرہا ہے جس کا سرمایہ تجارت پچاس ہزار دینار ہے مسلمان لوٹنا چاہتے ہیں لہذا قافلہ کی حفاظت کے لئے جلد آگے بڑھنا چاہیئے اس کی تدبیر پر نزد پر سریع الاثر ثابت ہوئی اور ایک ہزار کا لشکر جو خوب مسلح تھا اور تین سو گھوڑے اور سات سو اونٹ ان کے ساتھ تھے فراہم ہو گیا۔ قریش کے پندرہ سردار لشکر میں شامل ہو گئے اور ہر ایک نے وعدہ کیا کہ یکے بعد دیگرے تمام لشکر کی خوراک کے متکفل ہوں گے۔

ابوجہل مکّہ سے چار پانچ منزل پر پہنچا تھا کہ اُسے اطلاع مل گئی کہ ابوسفیان والا قافلہ مع الخیر مکّہ پہنچ گیا ہے۔ اہل لشکر نے ابوجہل سے کہا کہ اب ہم کو واپس چلنا چاہیئے کیونکہ ہمارا قافلہ بلا کسی گزند کے گھر پہنچ چکا ہے۔ ابوجہل نے کہا۔ ہاں یہ تو اچھا ہوا لیکن بہتر یہ ہے کہ یثرب کے قرب و جوار تک پہنچیں اور وہاں جشن شادی مرتب کریں۔ اس کا اثر گرد و نواح کے قبائل پر یہ پڑے گا کہ وہ مسلمانوں سے ہم عہد ہونا پسند نہ کریں گے اور مسلمان ہماری کثرت اور شوکت اور جشن کے حالات سن کر مرعوب ہو جائیں گے ۔

اہل لشکر نے اس رائے سے اتفاق کر لیا اور اب یہ لشکر سمندر کا ساحل چھوڑ کر جدھر سے قافلہ کے لئے جا رہے تھے مدینہ کے رُخ کو بدل لے ۔

جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ابوجہل کی اس گفتگو کی اطلاع ہوئی تو حضور نے حکم دیا کہ جو اصحاب اس وقت جلد سے جلد چلنے پر تیار ہو سکتے ہیں وہ ہم رکاب نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چل پڑیں۔ تین سو چودہ بزرگ جو اُس وقت روئے زمین پر بہترین بزرگ تھے۔ حضور کے ساتھ روانہ ہو گئے اس تعداد میں مہاجرین ۸۳ اور انصار ۱۵۲، اوس ۶۱ خزرج ۹۱ اور متعلقین ہر دو قبائل ۹، ۷ تھے بعض روایات میں تعداد ۳۱۹ بعض میں ۳۱۵ بیان کی گئی ہے، ۳۱۹ کی روایت مسلم غالباً اُن بزرگوں سمیت ہے جو میدان جنگ میں تھے مگر بوجہ صغر سن اُن کو اجازت جنگ، نہ دی گئی چونکہ ان بزرگوں کو بھی واقعات کی تفصیلی اطلاع نہ تھی اس لئے ان میں سے بھی اکثر کا گمان یہی تھا کہ حضور قافلہ پر حملہ آور ہونے

کو جا رہے ہیں ۔ وہ دل ہی میں خوش تھے کہ قافلہ ہی سے مڈبھیڑ ہو۔ کیونکہ مسلمان بلحاظ جنگی ساز و سامان کے مکمل نہ تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ ہی میں مطلع فرما دیا تھا کہ حملہ آور دشمن سے جنگ کے لئے جانا ہے ۔

مجلس شوریٰ

سرداران مہاجرین و انصار کی مجلس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے طلب فرمائی اور اس معاملہ کو شوریٰ میں پیش کر دیا ۔

سب سے پہلے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اور بعدازاں عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے گفتگو فرمائی ۔ دونوں تقریریں نہایت دلچسپ تھیں ۔

بعدازاں مقداد بن عمرو انصاری نے کہا۔ یارسول اللہ جو حکم آپ کو اللہ تعالیٰ سے ملا ہے اس کے لئے سوار ہو جائیے۔ ہم لوگ بنی اسرائیل کی طرح یہ نہیں کہیں گے کہ تو اور تیرا خدا جاؤ۔ اور لڑو ہم تو بیٹھے ہیں ۔قسم ہے اُس ذات کی جس نے آپ کو حق و صداقت کیساتھ بھیجا ہے کہ اگر آپ برک الغماد (اقصائے یمن کا ایک مقام ہے) تک جائیں گے تو ہم ساتھ ساتھ ہوں گے اور حضور کو درمیان میں لیتے ہوئے آگے پیچھے۔ دائیں بائیں، جنگ کریں گے ۔نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک اس تقریر پر روشن ہو گیا ۔انصار کے لئے شمولیت جنگ کا یہ پہلا موقعہ تھا اور انصار میں سے کوئی کوئی ایسا بھی تھا جو جنگ کو پسند نہ کرتا تھا ۔نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مکرر انصار کی طرف رُخ فرما کر دریافت کیا کہ کیا رائے ہے تو سعد بن معاذ نے عرض کیا۔ کیا حضورؐ کو ہماری رائے کی ضرورت ہے ؟

”بخدا ہمارا حضور پر ایمان ہے ۔ہم نے حضور کی تصدیق کی ہے اور شہادت دی ہے کہ حضور جو کچھ فرماتے ہیں وہ حق ہے ہم نے قبل ازیں سمع و طاعت کے معاہدات بھی حضور سے کئے ہیں لہٰذا ہماری عرض یہ ہے کہ حضور کا جو ارادہ ہے اُسی کے مطابق عمل فرمایا جائے“۔

دوسری روایت میں سعد بن معاذ کے یہ الفاظ بھی ہیں ۔کیا حضور کا یہ خیال ہے کہ انصار حضور کا ساتھ صرف اپنے ہی وطن دیا کرینگے میں اس وقت انصار ہی کیطرف سے اور انہی کی عرض کو پیش کر رہا ہوں کہ حضور کا جو منشا ہو اس پر عمل فرمائیں ۔جس کا رشتہ ملانا ہو۔ ملا دیجئے۔ جس کا رشتہ توڑ دینا ہو توڑ دیجئے جسے موجودہ حالت پر رکھنا ہو۔ اُسے اس کی حالت پر چھوڑ دیجئے۔ ہمارے اموال حاضر ہیں جس قدر منشا ہو قبول فرمائیے۔ اور جس قدر منشا ہو ہمیں بطور عطیہ چھوڑ دیجئے ۔لیکن حضور کا قبول فرمانا ہم کو زیادہ پسند ہوگا اور جو ہمارے پاس رہ جائے گا وہ ناپسند ہوگا۔ ہمارا معاملہ بالکل حضور کے ہاتھ میں ہے۔ حضور برک الغماد تک چلیں ۔ہم سب ہمرکاب ہیں ۔

اُس خدا کی قسم جس نے حضور کو سچی نبوت کے ساتھ بھیجا ہے کہ اگر ہم کو سمندر چیر کر نکل جانے کا حکم ہوگا تو ہم سب حضور کیساتھ ساتھ چلیں گے اور ہم میں سے ایک شخص بھی پیچھے نہ رہ جائے گا ۔

یارسول اللہ ہم لوگ جنگ میں جم جانے والے ہیں اور مقابلہ میں اپنی بات کو پورا کر دکھلاتے ہیں ۔مجھے اُمید ہے کہ ہماری خدمات حضور کی آنکھوں کی ٹھنڈک ثابت ہوں گی ۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تقریر پر نہایت سرور و نشاط کا اظہار فرمایا ۔

یہ بات اس طرح واضح ہو جاتی ہے کہ قافلہ شام سے آ رہا تھا ۔شام مدینہ سے جانب شمال اور مکہ سے جانب جنوب ہے ۔قافلہ کا راستہ مدینہ سے جانب مغرب ہے ۔

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارادہ اگر قافلہ کے لئے جانے کا ہوتا تو حضور مدینہ سے جانب مغرب سفر فرماتے حالانکہ حضورؐ مدینہ سے جانب

جنوب نہضت فرما ہوئے تھے۔

اسلامی لشکر میں صرف ستر شتر اور تین گھوڑے سواری کے لئے تھے۔ تین تین سواریوں کے لئے ایک ایک اونٹ مقرر کیا گیا تھا۔ ان تین میں سے ایک پیدل چلتا اور دو سوار ہوتے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری میں بھی سیدنا علیؓ المرتضیٰ و ابولبابہؓ شامل تھے۔ ابولبابہ راستہ میں سے حاکم مدینہ بنا کر واپس کئے گئے تو زید بن حارثہؓ نے اُن کی جگہ لی۔ باقی سب غازی بالکل پیدل تھے۔

میدان جنگ

مسلمانوں کو کفار کے مقابلہ میں جہاں اُترنا پڑا۔ وہاں پر ریت بہت تھی۔ آدمیوں کے پاؤں دھنس جاتے تھے اور پانی موجود نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ایسی زور کی بارش بھیجی کہ ریت دب گیا اور مسلمانوں نے ریت ہٹا کر جوہڑ بنالیا جو پانی سے بھر گیا۔

کفار صاف زمین پر اُترے تھے۔ ادھر سخت کیچڑ ہو گیا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا عریش

لشکر سے پیچھے ایک بلند ٹیلہ پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایک چھپر بنا دیا گیا تاکہ حضور اس بلندی سے دونوں لشکروں کے محاربہ کو ملاحظہ کر سکیں۔ صرف سیدنا ابوبکر صدیق اس چھپر کے سایہ میں حضور کے ساتھ تھے۔ ان کا کام حضورؐ کی خدمت بجالانا اپنے لشکر کی حالت عرض کرتے رہنا حضور کے احکام لشکر تک پہنچانا تھا۔ زمانہ حال میں ایسے افسر کو چیف آف سٹاف کہتے ہیں جو سپہ سالار اعظم کے ماتحت اور ساری فوج کا نگران حال ہوتا ہے۔ سعد بن معاذ سید الانصار نے عرض کیا تھا کہ یا رسول اللہ یہ مناسب ہے کہ عریش سے پچھلی طرف حضورؐ کی سواری ہر وقت موجود رہے کیونکہ اگر اسلامی لشکر کو شکست بھی ہوئی۔ اور ہم سب خاک و خون میں مل گئے تب بھی حضورؐ کو مدینہ منورہ جانے کا موقعہ رہے گا۔ وہاں حضورؐ کے جاں نثار اور صدق شعار ابھی تک موجود ہیں جو صدق و خلوص میں ہم سے ہرگز کم نہیں۔ گو تنگی وقت کی وجہ سے وہ ہمرکاب حاضر نہ ہو سکے۔ حضورؐ نے اُن کے حق میں دعائے خیر فرمائی۔

ملاحظہ میدان جنگ

جنگ سے ایک روز پیشتر حضورؐ نے میدان جنگ کا ملاحظہ فرمایا۔ صحابہؓ ساتھ تھے۔ حضورؐ پُر نور جگہ جگہ ٹھہر کر فرماتے جاتے تھے کل یہاں فلاں کافر کی لاش ہو گی اور یہاں فلاں کافر کی۔ جملہ سرداران قریش کے نام اسی طرح حضورؐ نے گنوا دیئے۔

جنگ کے لئے صف بندی

یوم الجمعہ ۱۷ رمضان ۲ھ کو صف بندی ہوئی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ملاحظہ کیلئے صفوں کے سامنے سے گزرے کیا دیکھا کہ ایک انصاری صف سے آگے بڑھے ہوئے ہیں۔ حضورؐ کے ہاتھ میں پتلی سی چھڑی تھی ..... انصاری کے پیٹ پر چھڑی لگا کر کہا کہ برابر ہو جاؤ۔

اُس نے کہا یا رسولؐ اللہ مجھے تو اس سے سخت تکلیف ہوئی۔ حضورؐ عدل و انصاف کے پیغام رساں ہیں میں تو بدلہ لوں گا۔ حضورؐ نے فرمایا اچھا۔ کہا حضورؐ کُرتہ اٹھائیں۔ حضورؐ نے کُرتہ اٹھایا تو اس نے آگے بڑھ کر جھٹ حضورؐ کے بطن اطہر کو چوم لیا۔ حضورؐ نے پوچھا یہ کیا۔ وہ بولا حضور دنیا میں یہ آخری گھڑیاں ہیں اور آخری سانس ہے۔ میں نے چاہا کہ اس شرف سے مشرف ہو جاؤں۔ حضور نے اُسے دعائے خیر دی۔ اور بعد ازاں یہ دعا فرمائی۔ یا اللہ یہ وہ اہل ایمان ہیں کہ آج ان کو تو نے ہلاک کر دیا تو روئے زمین پر تیری عبادت کرنے والا کوئی نہ رہے گا۔

اپنی فوج کے ملاحظہ سے فارغ ہوئے تو دشمن کی فوج کی طرف دیکھا اور زبان مبارک سے فرمایا۔ "الٰہی یہ قریش ہیں جو فخر و تکبر سے بھرپور ہیں۔ تیرے نافرمان، تیرے رسولؐ سے جنگ آور الٰہی تیری نصرت تیری مدد کی ضرورت ہے جس کا تو نے وعدہ فرمایا ہے۔

عریش اور دعا

بعد ازاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم عریش میں داخل ہوئے اور دو رکعت نماز کی نیت باندھی۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ شمشیر برہنہ لے کر پہرہ پر کھڑے ہو گئے (نماز کے اندر) حضورؐ نے یہ دعا پڑھی۔

اَللّٰھُمَّ لَا تُخْذِلْنِیْ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَنْشُدُکَ مَا وَعَدْتَنِیْ (الٰہی مجھے ندامت سے بچائیو۔ یا اللہ میں تجھے تیرا وعدہ حتماً یاد دلاتا ہوں)

بعد نماز حضورؐ نے لمبا سجدہ فرمایا۔ اور سجدہ میں یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ بِرَحْمَتِکَ اَسْتَغِیْثُ پڑھتے رہے۔ سجدہ کے بعد بھی لمبی دعا میں مصروف رہے۔ دعا ایسے تضرع و ابتہال کے ساتھ تھی کہ حضورؐ کی چادر مبارک بھی کندھوں سے گر گئی تھی اور حضورؐ کا ابتہال بڑھتا جاتا تھا۔ ابوبکرؓ صدیق نے عرض کیا یا رسول اللہؐ، حضورؐ اپنے آپ کو اتنا ہلکان نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ حضورؐ سے فتح و ظفر کا وعدہ فرما چکا ہے۔

اتنے میں حضورؐ پر اونگھ سی طاری ہوئی اور اُدھر ساری فوج بھی اونگھ گئی۔ حضورؐ نے آنکھ کھولتے ہی فرمایا۔ ابوبکرؓ! تجھے بشارت ہو کہ نصرت الٰہی آ پہنچی۔ جبرئیل بھی آ گئے ہیں۔

فوج نے آنکھ جھپک جانے کے بعد دشمن کی طرف دیکھا تو معلوم ہوا کہ اُن کی تعداد بہت کم ہے اور مسلمان تعداد میں بڑھے ہوئے ہیں۔ اس تیقن نے ان کے حوصلے بڑھا دیئے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم میدان جنگ میں تشریف لائے تو فوج سے فرمایا۔ اپنی جگہ پر قائم رہنا۔ دشمن حملہ کی شکل میں آگے بڑھے تو اُسے آگے آنے دینا۔ جب وہ تمہارے تیروں کی زد میں آ جائے تب تیر خوب برسانا۔ دشمن اور ہی قریب آ جائے تو نیزوں کا استعمال کرنا۔ تلوار کا استعمال سب سے بعد ہو۔

اس وقت کفار کی طرف سے عتبہ بن ربیعہ بن عبد شمس بن عبد مناف اپنی فوج کے سامنے تقریر کیلئے نکلا اور ادھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قوم میں یہ شخص سمجھدار ہے۔ اگر لوگوں نے اس کی بات مان لی تو سیدھی راہ پر ہو جائیں گے۔

عتبہ بولا۔ محشر قریش! محمدؐ کے ساتھ جنگ کرنے کا کوئی نفع معلوم نہیں ہوتا۔ اگر تم غالب بھی آ گئے۔ تب بھی کیا ہو گا۔ ہم اپنے بھائیوں سے ہمیشہ آنکھ چراتے رہیں گے کوئی چچا زاد کو، کوئی خالہ زاد کو قتل کرے گا۔ کوئی اپنے قبیلہ کے بھائی کو مار ڈالے گا چلو واپس چلو۔ عرب والے خود محمدؐ سے سمجھ لیں گے۔ اگر کوئی اور قبیلہ ان پر غالب آ گیا تو تمہارا مقصد پورا ہو گیا۔ اور اگر وہ بھی غالب نہ آیا۔ تو تم ندامت و عار سے بچے رہے۔

بعد ازاں یہی پیغام ابوجہل کے پاس بھی بھجوا دیا۔ ابوجہل نے عامر بن حضرمی کو بلایا۔ کہا دیکھو یہ عتبہ۔ تیرا رقیب ہے اور تجھے بھائی کا انتقام لینے سے محروم کرنا چاہتا ہے۔ اس کی یہ وجہ بھی ہے کہ اُس کا بیٹا مسلمانوں کی طرف ہے۔ اب تم کو لازم ہے کہ آگے بڑھو اور فوج کو گرما دو۔ اس نے اپنے بھائی کے نام کی دہائی دی اور فوج میں جوش پیدا ہو گیا۔

اسود مخزومی کفار میں سے نکلا اور کہا کہ سب سے پہلے میں بڑھتا ہوں۔ مسلمانوں کے حوض کا پانی پی کر آؤں گا۔ یا وہیں مر جاؤں گا۔ وہ حوض کی طرف چلا تو سیدنا حمزہ نے اُس کا تعاقب کیا اور اس کی پیٹھ پر ایسی ضرب لگائی کہ وہ وہیں رہ گیا۔

اب اپنی صف سے عتبہ نکلا (غالباً یہ ابوجہل کے طعن کا جواب تھا) اس کا بھائی شیبہ اور فرزند ولید بھی اُس کے ساتھ تھے اس نے نعرہ لگایا کہ کوئی مقابلہ کو نکلے یہ سن کر معاذ اور معوذ پسران حارث باہر نکلے (ان کی ماں عفراء انصاریہ ہیں اس خاتون کے سات فرزند دو شوہروں حارث اور بکیر سے تھے اور ساتوں فرزند میدانِ جنگ میں حاضر تھے۔ کوئی خاتون ان کی اس فضیلت کو نہ پاسکی) عبداللہ بن رواحہ انصاریؓ جو نقیب محمدی اور شاعر زبان آور تھے اُن کے ساتھ ساتھ تھے۔

عتبہ نے کہا تم کون ہو۔ انہوں نے بتایا کہ ہم انصار ہیں۔ عتبہ بولا ہاں آپ ذی عزت ہیں۔ برابر کے جوڑ ہیں لیکن میں تو اپنی قوم کے اشخاص چاہتا ہوں یہ سن کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ عبیدہ بن حرث تم چلو۔ حمزہؓ تم چلو، علیؓ تم چلو (تینوں ہاشمی ہیں) حمزہؓ نے شیبہ کا اور علیؓ نے ابیار کا شکار جاتے ہی کر لیا۔

عبیدہ اور عتبہ ایک دوسرے پر شمشیر زنی کر رہے تھے کہ حمزہ وعلی نے بھی عتبہ پر حملہ کر دیا اور اُسے بھی خاک وخون میں سلادیا۔

اسی جنگ میں راس الکفر اُمیہ بن خلف جو بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کلمہ توحید پڑھنے پر ستایا کرتا تھا قتل ہوا۔ بلال رضی اللہ عنہ نے حملہ کیا۔ معاذ بن عفراء وغیرہ بھی بلال کی مدد کو پہنچ گئے اور اُس ناپاک کا خاتمہ کر دیا۔

ابوبکر صدیقؓ نے اس شعر میں بلال رضی اللہ عنہ کو مبارکباد دی

هَنِيئًا زَادَكَ الرَّحْمٰنُ فَضْلَهُ   فَقَدْ أَدْرَكْتَ ثَأْرَكَ يَا بِلَالُ

قتل ابوجہل لعنہ اللہ

سیدنا عبدالرحمٰن بن عوف کہتے ہیں کہ صف بندی میں میرے دائیں بائیں نوجوان لڑکے تھے۔ میں نے دل میں کہا کہ میرے برابر کوئی آموزدہ کار ہوتا تو خوب ہوتا یہ دونوں نوجوان معاذ ومعوذ پسران عفراء تھے۔

ایک نے چپکے سے مجھے کہا کہ چچا آپ ابوجہل کو جانتے ہیں۔ جب ہمارے سامنے آئے تو مجھے بتانا۔ دوسرے نے بھی یہی بات آہستہ سے پوچھی میں نے کہا تم کیا کرو گے اگر اُسے دیکھ لوگے۔ انہوں نے کہا۔ ہم نے سنا ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دیا کرتا ہے۔ ہم نے عہد کر لیا ہے کہ اُسے ضرور قتل کریں گے یا اپنی جان دیدیں گے۔ اتنے میں ابوجہل چکر لگاتا ہوا لشکر کے سامنے آیا۔ میں نے دونوں لڑکوں سے کہا۔ دیکھو ابوجہل وہ ہے۔ یہ سنتے ہی وہ دونوں ایسے جھپٹے جیسے شہباز کوّے پر گرا کرتا ہے۔ دونوں نے اپنی اپنی تلواریں اُس کے پیٹ میں بھونک دیں۔ وہ گر پڑا۔ جان توڑ رہا تھا کہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی پہنچ گئے۔ انہوں نے اس کی چھاتی پر پاؤں رکھا۔ سر کاٹا اور داڑھی سے پکڑ کر سر اٹھا لیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہر سہ کی خدمات کو منظور فرمایا۔ نیز ارشاد کیا کہ اس امت کا فرعون یہی ابوجہل تھا۔

جذبات جاں نثاری و جوش صداقت دین

الف: جب کفار کے لشکر سے عبدالرحمٰن بن ابوبکر صدیق مبارز طلب نکلا تو اس کے مقابلہ کو ابوبکر صدیق آمادہ ہو گئے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو روک لیا۔

ب: جب لشکر کفار سے جرّاح باہر آیا تو اس کے محاربہ کو ابوعبیدہ عامر اُن کے فرزند لشکر اسلام سے روانہ ہو گئے ہر دو واقعہ سے ظاہر ہے کہ ان مجاہدین فی سبیل اللہ کی نگاہ میں نہ باپ کی عظمت باقی رہی تھی اور نہ فرزند کی محبت۔ ان کو ایک وحدہ لاشریک لہ کی ذات ہی

کبریائی و عظمت کی مستحق نظر آتی تھی اور ایک ذات حمیدہ صفات محمدؐ رسول اللہ ہی کی واجب الاحترام والمحبت دکھلائی دیتی تھی اور بس۔

ج۔ ایک انصاری نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ الفاظ کہتے ہوئے سن لیا کہ "جو کوئی آج اللہ کی راہ میں شہید ہوا، اس کے لیے جنت واجب ہے"۔ اُن کے ہاتھ میں انگور کا گچھا تھا۔ انگور کھا رہے تھے۔ انہوں نے حضورؐ کے ارشاد کو سنا اور پھر انگوروں کی طرف دیکھا اور کہا۔ اوہ یہ انگور نوبت ہیں۔ ان کے ختم کرنے میں تو دیر لگے گی۔ میں جنت میں جانے سے اتنی دیر کیوں کروں۔ یہ کہہ کر انگور پھینک دیئے۔ آگے بڑھے اور اپنا فرض ادا کرتے ہوتے فردوس کو سدھار گئے۔

لڑائی گھمسان کی ہو رہی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ملائک کو بھی اہل ایمان کی مدد و نصرت اور ثبات و اطمینان کے لئے نازل فرمایا۔ مسلمان فرشتوں کو انسانوں کی صورت میں چلتے پھرتے دیکھتے تھے اور فرشتے ہر ایک مومن سے کہہ رہے تھے کہ بہادر بنو، مضبوط رہو، فتح اور نصرت الٰہی تمہارے ساتھ ہے جب مسلمین و کافرین کا ہر شخص جنگ میں مصروف تھا۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کنکریوں کی ایک مٹھی کفار کی جانب پھینک دی اور زبان مبارک سے فرمایا۔ شَاهَتِ الْوُجُوهُ اللَّهُمَّ اَرْعِبْ قُلُوْبَهُمْ وَزَلْزِلْ اَقْدَامَهُمْ

کنکریوں کا پھینکنا تھا اور کفار کا دل توڑ کر بھاگنا، مسلمانوں نے تعاقب کیا اور ستر اشخاص کو قید بھی کر لیا۔

معرکہ میں کافروں کے ستر آدمی ہلاک ہوئے تھے اور مسلمانوں کے صرف چودہ شخص۔ اس روز جنگ میں پہلا شہید ہونے والا مہجع رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھا۔ جو عمر فاروقؓ کا غلام تھا۔ اہل دنیا اسے غلام سمجھتے تھے مگر مساوات کے حامی۔ عدل کے مربی۔ اخوت کے بانی سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے "سید الشہدا" کا خطاب عطا فرمایا۔

قیدیوں سے حسن سلوک

ستر قیدیوں میں چند ہاشمی بھی تھے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے قرابت قریبہ رکھتے تھے۔

۱۔ انہی میں عباس بن عبد المطلب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا تھے۔

۲۔ انہی میں سیدنا علی مرتضٰےؓ کے برادر کلاں بھی تھے۔

۳۔ اور نوفل بن حارث نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھی۔

۴۔ اور انہی میں حضورؐ کی دختر کلاں زینب رضی اللہ عنہا کے شوہر ابو العاص بھی۔

لیکن یہ سب عام قیدیوں کی طرح بند و سلاسل میں تھے رات کو ایک انصاری نے دیکھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خواب راحت نہیں فرماتے، ادھر اُدھر کروٹیں لے رہے ہیں۔ اس نے پوچھا کہ حضور کو کچھ تکلیف ہے۔ فرمایا نہیں۔ مجھے تو عباسؓ کے کراہنے کی آواز آ رہی ہے اور وہی آواز مجھے نہیں سونے دیتی۔ انصاری اٹھا اور عباس کی مشک بندھی کھول آیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب عباس کی آواز نہ سنی تو انصاری سے پوچھا کہا میں ان کی مشک بندھی کھول آیا ہوں۔ فرمایا۔ جاؤ۔ اور سب اسیروں کے ساتھ یہی سلوک کرو۔

مشرکین کی مُردہ لاشوں سے سلوک

کفار ایسے بھاگے تھے کہ انہوں نے اپنی فوج کے مُردوں کا بھی کچھ انتظام نہ کیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طبعاً عادت مبارک یہ تھی کہ جہاں کسی انسان کی لاش کو بلا تدفین دیکھ لیتے۔ دفن کرنے کا حکم دیتے۔ بدر میں بھی حضورؐ نے ایسا ہی کیا۔

۲۴ سرداران قریش کو ایک گڑھے میں الگ۔ اور باقی کفار کو ایک گڑھے میں الگ زیر خاک کر دیا گیا[۱]

تیسرے روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم اُس قلیب (گڑھے) کے کنارہ تک تشریف لے گئے۔ جہاں سرداران قریش کے ناپاک جُثے گرائے گئے تھے اور باآواز بلند فرمایا۔ اے عتبہ بن ربیعہ! اے شیبہ بن عتبہ! اے امیہ بن خلف! اے ابوجہل بن ہشام! اے فلاں! اے فلاں۔ اللہ نے جو تمہاری بابت کہا تھا۔ کیا اُس کو تم نے ٹھیک پایا۔ مجھے تو جو اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا تھا میں نے اُسے بالکل درست دیکھ لیا۔

عمر فاروقؓ نے استفہامیہ لہجہ میں عرض کیا۔ کیا آپ ان لاشوں سے جن میں روح نہیں تین روز کے بعد خطاب فرما رہے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اِنَّھُمُ الْاٰنَ لَیَسْمَعُوْنَ (بخاری عن عروہ عن ابن عمر) ہاں یہ لوگ اس وقت سن رہے ہیں۔ یہ الفاظ جب ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کے سامنے روایت کیے گئے تو انہوں نے فرمایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ مبارک تو یہ تھے اِنَّھُمُ الْاٰنَ لَیَعْلَمُوْنَ ہاں وہ اس وقت خوب جان گئے ہیں۔

اسیرانِ بدر اور فدیہ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معاملہ کو کہ اسیروں کے ساتھ کیا کیا جائے۔ شوریٰ میں پیش کر دیا۔ عمر فاروقؓ نے کہا۔ یہ لوگ کافروں کے پیش رو ہیں۔ میری رائے میں ان کی گردنیں اڑا دی جائیں۔ فلاں شخص جو میرا قریبی ہے اس کی گردن میں اڑا دوں اور عقیل جو علیؓ کا بھائی ہے۔ علیؓ اس کی گردن اڑا دے۔ اسی طرح حمزہؓ اپنے قریبی کی تاکہ اللہ تعالیٰ جان لے کہ ہمارے دل میں مشرکین کی موّدت ذرا بھی نہیں۔

ابوبکر صدیقؓ نے عرض کیا۔ میری رائے ہے کہ ان کو معاف کر دیا جائے اور ان سے فدیہ لیا جائے۔ فدیہ سے ہم اپنی جنگی حالت کو درست کرلیں گے اور بعد ازاں ممکن ہے کہ ان میں سے کسی کو اسلام کی نعمت و ہدایت مل جائے اور وہ خود بھی ہمارا قوت بازو ثابت ہو۔

عبداللہ بن رواحہ انصاری نے کہا۔ میری رائے ہے کہ جس جنگل میں لکڑی بہت ہو۔ وہاں ان کو داخل کر کے آگ لگا دی جائے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم عریش میں چلے گئے اور تھوڑی دیر کے بعد پھر باہر تشریف لائے اور یوں ارشاد فرمایا۔

اللہ تعالیٰ بعض کے دلوں کو نرم کر دیتا ہے حتیٰ کہ وہ دودھ سے زیادہ نرم ہو جاتے ہیں بعض کے دلوں کو سخت کر دیتا ہے حتیٰ کہ وہ پتھر سے زیادہ سخت ہو جاتے ہیں۔

اے ابوبکرؓ! تو ملائکہ میں میکائیل جیسا ہے جو رحمت کے ساتھ نازل ہوتا ہے۔

اے ابوبکرؓ! انبیاء میں تیری مثال ابراہیم علیہ السلام جیسی ہے جنہوں نے فرمایا۔

مَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ وَمَنْ عَصَانِیْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ

---

[۱] ان چودہ میں سے چار کے نام بروایت مسلم عن انس ہم نے اوپر لکھ دیئے ہیں بعض نے باقی نام اور بھی لکھے ہیں (۵) حنظلہ بن ابوسفیان (۶) ولید بن عتبہ (۷) حرث بن عامر (۸) طعیمہ بن عدی (۹) نوفل بن عبد (۱۰، ۱۱) زمعہ و عقیل پسران اسود (۱۲) عاصی برادر ابوجہل (۱۳) ابوقیس برادر خالد بن ولید (۱۴، ۱۵) بنیہ و منبہ پسران حجاج (۱۶) علی بن امیہ بن خلف (۱۷) عمرو بن عثمان (۱۸) مسعود بن ابوامیہ برادر ام سلمہ (۱۹) قیس ابن فاکہ (۲۰) اسود برادر ابوسلمہؓ (۲۱) عاصی بن قیس بن عدی (۲۲) امیہ بن رفاعہ (۲۳، ۲۴) بنیہ و عاصی بن ابواحیحہ ۱۲ منہ

اے ابوبکرؓ! انبیاء میں تیری مثال عیسیٰ علیہ السلام جیسی ہے جنہوں نے کہا تھا۔ اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ

اے عمرؓ! تیری مثال ملائکہ میں جبرائیل جیسی ہے جو شدت اور باس کے ساتھ نازل ہوتا ہے۔

اے عمرؓ! تیری مثال انبیاءؑ میں نوحؑ کی سی ہے جنہوں نے کہا تھا۔ رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكَافِرِيْنَ دَيَّارًا۔

اے عمرؓ! تیری مثال انبیاءؑ میں موسیٰ علیہ السلام ہیں جنہوں نے کہا تھا۔ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰى اَمْوَالِهِمْ الآیتہ

اے ابوبکرؓ و عمرؓ! اگر تمہارا اتفاق ہوتا تو میں کچھ اور حکم نہ دیتا۔ اچھا ان سے فدیہ لیا جائے ورنہ ضرب عنق ہوگا۔

بہت لوگوں نے اپنا اپنا زرفدیہ وہیں ادا کر دیا اور جو رہ گئے تھے اُن کو مدینہ میں لے گئے۔ قیدیوں میں بعض پڑھے لکھے تھے اُن کو انصار کے بچے سپرد کر دیئے گئے کہ زرفدیہ کے عوض میں ان کو تعلیم دیا کریں۔

اسیروں کو مدینہ میں ایسے آسائش و آرام سے رکھا گیا کہ وہ مکہ میں واپس آکر کہا کرتے تھے خدا اہل مدینہ پر رحم کرے خود کھجوروں پر گزارہ کیا کرتے اور ہمیں روٹی کھلایا کرتے تھے۔

فدیہ و غنیمت کے لینے میں اشتباہ

بعض صحابہ کو یہ بھی شبہ تھا کہ کیا زرفدیہ و مال غنیمت کا استعمال مسلمانوں کو جائز بھی ہے لیکن اللہ پاک نے سورہ انفال میں یہ حکم نازل فرما کر اُن کو بھی مطمئن کر دیا۔

"کہ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہلے سے اس بارہ میں نوشتہ موجود نہ ہوتا تب فدیہ اور غنیمت کے متعلق تم پر عذاب بھی نازل ہوتا لیکن ایسا مال تو طیب و حلال ہے کھاؤ، پیو، اللہ کا شکر کرو کہ تم کو آسان احکام دیئے گئے ہیں۔"

فضیلت اہل بدر

صحیح بخاری میں رفاعہ بن رافع الزرقی صحابی بن صحابی سے روایت ہے

جَاءَ جِبْرِيْلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ مَا تَعُدُّوْنَ اَهْلَ بَدْرٍ فِيْكُمْ قَالَ مِنْ اَفْضَلِ الْمُسْلِمِيْنَ قَالَ وَكَذٰلِكَ مَنْ شَهِدَ بَدْرًا مِنَ الْمَلَائِكَةِ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ

جبرئیل علیہ السلام نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے۔ پوچھا تم اہل بدر کو مسلمانوں میں کیسا سمجھتے ہو۔ رسول اللہ نے فرمایا۔ سب مسلمانوں سے افضل سمجھتا ہوں۔ جبرئیل نے بتایا کہ فرشتوں میں سے جو فرشتے بدر میں حاضر ہوئے ان کا درجہ ملائکہ میں بھی ایسا ہی سمجھا جاتا ہے۔

وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِطَّلَعَ اللّٰهُ عَلٰى اَهْلِ بَدْرٍ فَقَالَ اعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ فَقَدْ غَفَرْتُ لَكُمْ (ابوداؤد)

ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا فرمایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے، اللہ تعالیٰ نے اہل بدر کو دیکھا اور فرمایا اب تم جو چاہو۔ کرو میں تمکو بخش چکا ہوں۔

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنَا مِنَ التَّابِعِيْنَ لَهُمْ بِاِحْسَانٍ وَصَلَّى اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَاٰلِهٖ وَبَارِكْ وَسَلَّمْ

فہرست اسماء مبارکہ

شہدائے غزوہ بدر۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم و رضوا عنہ

۱۔ مہجع بن صالح رضی اللہ عنہ

قوم عک سے تھے۔ سیدنا عمر فاروقؓ کے آزاد کردہ غلام۔ اس غزوہ میں سب سے پہلے یہی شہید ہوئے تھے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ یَوْمَئِذٍ مَھْجَع سَیِّدُ الشُّھَدَاء

یہ اسلام ہی کی انسانیت نوازی ہے کہ ایک غلام کو سید الشہداء کا خطاب عطا فرمایا گیا۔

۲۔ عبیدہ بن حارث بن مطلب بن عبد مناف بن قصی

قرشی المطلبی۔ ابوالحارث یا ابومعاویہ کنیت کرتے تھے سب سے اولین سریہ اسلامی کے سردار بھی بنائے گئے تھے۔ غزوہ بدر میں جب سرور عالم نے اپنے گھرانے کے تین سرداروں کو جنگ میں جانے کا حکم دیا تو امیر حمزہ اور علی مرتضیٰ کے ساتھ تیسرے بزرگ یہی تھے عمر بوقت شہادت ۶۳ سال تھی۔

۳۔ عمیر بن ابو وقاص (مالک) بن اُہیب بن عبد مناف

قرشی الزہری ہیں اور حضرت سعد بن ابو وقاص (احد العشرۃ المبشرہ) اور فاتح ایران کے برادر خورد ہیں ۱۶ سال کی عمر میں جام شہادت نوش فرمایا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بوجہ صغر سنی واپس کرنا چاہا۔ تو یہ رو پڑے۔ اس لیے اجازت دی گئی۔ حوصلہ کے ساتھ لڑے اور خنداں خنداں روضۂ رضواں کو سدھارے۔

۴۔ عاقل بن بکیر بن عبد یالیل

قبیلہ بنو لیث سے ہیں ان کے بھائی کا نام خالد تھا۔ وہ بھی غزوہ رجیع میں شہید ہوئے۔

۵۔ عمیر بن عبد عمیر بن نقلہ

ذوالشمالین لقب۔ ابومحمد کنیت۔ بنو زہرہ کے حلیف تھے۔

۶۔ عوف یا عوذ بن عفراء

انصاری بخاری تھے عفراء ان کی والدہ کا نام ہے۔ اس خاتون بلند پایہ کے ساتوں فرزند غزوہ بدر میں حاضر تھے والد کا نام حارث ہے۔

۷۔ معوذ بن عفراء

صحابی اور والدین بھی صحابی نمبر ۶ کے سگے بھائی

۸۔ حارث (یا حارثہ بن سراقہ بن حارث)

انصاری، ان کی والدہ انس بن مالک کی پھوپھی ہیں حلق پر تیر لگا اور جان بجاں آفریں کو سپرد کر گئے۔

۹۔ **یزید بن حارث یا حرث بن قیس بن مالک**

انصاری، بخاری، مواخات میں نمبر ۵ کے دینی بھائی

۱۰۔ **رافع بن معلی بن لوذان**

انصاری ہیں۔

۱۱۔ **عمیر بن حمام بن جموح بن زید بن حرام**

انصاری اسلمی مواخات میں حضرت عبیدہ مہاجر نمبر ۴ کے دینی بھائی۔ دونوں زندگی میں بھی اکٹھے رہے اور بہشت بریں میں بھی ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوئے رونق افروز خلد ہوئے۔ میدانِ جنگ میں ان کا رجز یہ تھا۔

رَکْضًا عَلَی اللہِ بِغَیْرِ زَادٍ — اِلَّا التُّقٰی وَعَمَلَ الْمَعَادِ

وَالصَّبْرُ فِی اللہِ عَلَی الْجِہَادِ — وَکُلُّ زَادٍ عُرْضَۃُ النَّفَادِ

غَیْرُ التُّقٰی وَالْبِرِّ وَالرَّشَادِ

۱۲۔ **عمار بن زیاد بن سکن بن رافع**

انصاری الاشہلی۔ ان کے بھائی عمارہ بن زیاد اور ان کے چچا یزید بن سکن غزوہ احد میں شہید ہوئے تھے۔

۱۳۔ **سعد بن خثیمہ الانصاری الاوسی**

ابو عبد اللہ کنیت۔ سعد الخیر لقب۔ النقیب محمدی تھے۔ باپ نے کہا تم ٹھہرو۔ میں جاتا ہوں انہوں نے کہا۔ ابا۔ مجھے بہشت میں جانے سے نہ روکو۔ اُن کے والد خثیمہ غزوہ احد میں شہید ہوئے پس شہید بن شہید اور صحابی بن صحابی ہیں۔

۱۴۔ **مبشر بن عبد المنذر بن زبیر بن زید**

انصاری الاوسی ہیں۔ زرقانی میں ہے۔ اُسْتُشْہِدَ یَوْمَ بَدْرٍ مِّنَ الْمُسْلِمِیْنَ اَرْبَعَۃَ عَشَرَ رَجُلًا ج ا ص ۴۲۲

فہرست بالا کے نام زرقانی اور الاستیعاب کے متفق علیہ ہیں بعض نے شہدائے بدر کی تعداد ۲۲ بتلائی ہے۔

مجھے بروایت بعض تین نام اور بھی ملے (۱) سعد بن خولی (۲) صفوان بن بیضا فہری (۳) عبد اللہ بن سعید بن عاص اُموی۔

اس طرح فہرست ہذا میں ۱۷ نام درج کئے جا سکتے ہیں۔

اَللّٰہُمَّ ارْزُقْنِیْ شَہَادَۃً فِیْ سَبِیْلِکَ وَاجْعَلْ مَوْتِیْ فِیْ بَلَدِ حَبِیْبِکَ[1]

---

[1] "قاضی صاحب مرحوم کی یہ دعا میں نے آپ کی اکثر تحریرات میں دیکھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو بھی صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کی طرح شہادت کا بہت شوق تھا اور بیت اللہ الحرام کا جذبہ بھی آپ کے دل میں کار فرما رہتا تھا چنانچہ بکم محرم الحرام ۱۳۴۹ھ کو ایک حد تک آپ کی یہ دعا قبول ہو گئی آپ حج بیت اللہ الحرام سے واپس آرہے تھے کہ جدہ کے قریب ہی جہاز میں انتقال فرما گئے۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

ثُمَّ السَّلَامُ عَلَی النَّبِیِّ فَاِنَّهٗ
یُبْدِیْ بِهِ الذِّکْرُ الْجَمِیْلُ وَیُخْتَمُ

پٹیالہ۔ یکم رمضان ۱۳۴۸ھ

محمد سلیمان منصورپوری
کان اللہ لہ

مہاجرین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ سیدنا و مولانا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

ولادت مبارک بروز دوشنبہ ۹ ربیع الاوّل کو مکہ معظمہ میں بعد صبح صادق وقبل از طلوع آفتاب ہوئی۔

دنیا کے مروّجہ ومشہور سنین کی مطابقت تاریخ ولادت حضور سے حسب ذیل ہے۔

۹ ربیع الاوّل	۱ سنہ	عام الفیل	۱۰ ماہ ایار	۴۳۳۱ سنہ	عبرانی
۸ ماہ مے	۴۰ سنہ	نوشیروانی	۱۹ اپریل	۵۲۸۴ سنہ	جولیانی (جوایڈن پیری اڈ)
۲۵ ماہ برموده	۲۸۷ سنہ	قبطی جدید	یکم جیٹھ	۳۶۷۲ سنہ	کل جگ
۲۲ اپریل	۵۷۱ سنہ	عیسوی	۸ ماہ توت	۱۳۱۹ سنہ	بخت نصری
۲۰ ماہ ہفتم	۲۵۸۵ سنہ	ابراہیمی	۲۰ ماہ نیسان	۸۸۲ سنہ	سکندری
۱۱ ماہ بیشنس	۳۶۷۵ سنہ	طوفان نوحؑ	یکم جیٹھ	۶۲۸ سنہ	بکرمی شمس

اکتالیسویں سال کے پہلے دن بعثت نبوت ہوئی۔ ۱۳ سال مکہ معظمہ میں تبلیغ نبوت فرمائی بروز دوشنبہ، ۲۷ ویں شب ماہ رجب ۱۳ سنہ نبوت کو

(بقیہ صفحہ گزشتہ سے)
شہید گناہوں سے ایسا پاک ہوتا ہے کہ اس کے جنازہ کی بھی ضرورت نہیں[1] اسی طرح حدیث شریف میں ہے حاجی جب حج سے فارغ ہو جائے تو گناہوں سے ایسا پاک ہو جاتا ہے جیسے آج ہی پیدا ہوا۔ تو یہ بھی ایک گونہ شہادت ہی سمجھیے نعم ما قال

سہ غوطہ خوردو غریق رحمت گشت ــــ مورد لطف خاص رحماں بود
سال تاریخ ہم بہ بحر سخن ــــ "غرق موج" از وفات سلماں بود
۱۳۴۹ھ

[1] یہ امام شافعی کا مذہب ہے۔ اہل سنت والجماعت کے نزدیک شہید کی نماز جنازہ ادا کی جائے گی بحوالہ مجموعہ خانی جلد اوّل (ادارہ)

معراج ہوا۔

شب جمعہ، ۲۷ صفر ۱۳ سنہ نبوت کو مکہ بعزم ہجرت چھوڑا۔

دوشنبہ ۸ ربیع الاول ۱۳ سنہ نبوت کو قبا رونق افروز ہوئے۔

دوشنبہ ۲۲ ربیع الاول ۱۳ سنہ نبوت کو قبا میں ۱۴ یوم قیام کے بعد نور افزائے مدینہ منورہ ہوئے۔ دس سال مدینہ منورہ میں قیام فرمایا۔

۶۳ سال ۴ یوم کی عمر میں وصال فرمایا۔ تاریخ وصال دوشنبہ وقت چاشت ۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ ہے۔

عالم دنیوی میں حضورؐ نے ولادت سے لیکر وفات تک ۲۲۳۳۰ دن ۶ گھنٹے قیام فرمایا۔ یہ ۶ گھنٹے اکتیسویں دن کے تھے۔

مذکورہ بالا ایام میں سے ۸۱۵۶ دن تبلیغ رسالت و نبوت کے ہیں۔ حضورؐ کے ممتاز اسماء محمدؐ، احمدؐ، ماحی، حاشر، عاقب ہیں۔

حضور کے ممتاز خطابات میں سے جو قرآن میں بکثرت ہیں۔ خطابات ذیل بڑی شان کے ہیں۔ عبد اللہ، رحمۃ للعالمین

خاتم النبیین، امام الانبیاء۔ سید ولد آدم۔ شفیع المذنبین

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔ اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔

حضورؐ کا مختصر نسب نامہ یہ ہے

آدم علیہ السلام سے نوح علیہ السلام تک (ہر دو اسماء بھی شمار میں داخل ہیں) ۱۰ پشت

سام بن نوح سے ابراہیم خلیل الرحمٰن تک (ہر دو اسماء شامل ہیں) ۹ پشت

اسمٰعیل بن ابراہیم علیہ السلام سے اُدد تک (ہر دو اسماء شامل ہیں) ۴۰ پشت

عدنان بن اُدد سے عبداللہ والد بزرگوار آنحضرتؐ تک (ہر دو اسماء شامل ہیں) ۴۱ پشت

میزان ۱۰۰ پشت

ذیل میں عدنان تک کا نسب نامہ مکمل درج ہے کیونکہ اس نسب نامہ کے بعض اسماء کا ذکر مہاجرین کی تاریخ میں بھی آئے گا۔

(۱) عبداللہ بن (۲) عبدالمطلب بن (۳) ہاشم بن (۴) عبد مناف بن (۵) قصی بن (۶) کلاب بن (۷) مرّہ بن (۸) کعب بن (۹) لوی بن (۱۰) غالب بن (۱۱) فہر الملقب بہ قریش بن (۱۲) مالک بن (۱۳) نضر بن (۱۴) کنانہ بن (۱۵) خزیمہ بن (۱۶) مدرکہ بن (۱۷) الیاس بن (۱۸) مضر بن (۱۹) نزار بن (۲۰) معد بن (۲۱) عدنان

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جن غزوات میں شریک ہوئے ان کی تعداد ۲۷ رہے۔

(۱) غزوہ ودان یا ابواء (۲) غزوہ بواط (۳) غزوہ صفوان (۴) غزوہ ذو العشیرہ (۵) غزوہ بدر الکبریٰ (۶) غزوہ قینقاع (۷) غزوۃ السویق (۸) غزوہ قرقرۃ الکدر (۹) غزوہ ذی امر یا غطفان یا انمار (۱۰) غزوہ احد (۱۱) غزوہ حمراء الاسد (۱۲) غزوہ بنو نضیر (۱۳) غزوہ بدر الآخری (۱۴) غزوہ دومۃ الجندل (۱۵) غزوہ بنو مصطلق (۱۶) غزوہ احزاب یا خندق (۱۷) غزوہ بنو قریظہ (۱۸) غزوہ بنو لحیان (۱۹) غزوہ ذی قردہ یا غابہ

(۲۰) غزوہ حدیبیہ (۲۱) غزوہ خیبر (۲۲) غزوہ وادی القریٰ (۲۳) غزوہ ذات الرقاع (۲۴) غزوہ مکہ (۲۵) غزوہ حنین (۲۶) غزوہ طائف (۲۷) غزوہ تبوک ۔

غزوہ بدر و حنین کا نام بھی قرآن مجید میں ہے ۔

حضور پرنور کے حالات مبارکہ بچوں کو ہماری کتاب مہر نبوۃ میں اور اہل علم کو کتاب رحمت للعالمین میں مطالعہ کرنے چاہئیں ۔

۲۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

عبداللہ بن عثمان نام، ابوبکر کنیت، صدیق خطاب، عتیق علم، صاحب الغار لقب ہے ۔

طاہرہ خدیجۃ الکبریٰ کے بعد سب سے پہلے اسلام لائے اس وقت ان کی عمر ۳۸ سال کی تھی اور مکہ معظمہ کے مشہور اور نامی تاجروں میں آپ کو شمار ہوتا تھا اور مقدمات دیت کا انفصال انہی کے فیصلہ پر ہوتا تھا ۔

آپ کے والدین کا نسب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب میں مُرّہ نمبر ۷ میں شامل ہو جاتا ہے ۔ زبیر بن العوام اور طلحہ، اور عثمان غنی اور عبدالرحمٰن بن عوف، یہ چاروں بزرگ عشرہ مبشرہ میں داخل ہیں ۔ یہ چاروں حضرت صدیقؓ کی تبلیغ پر داخل اسلام ہوئے

حضرتؓ صدیق نے سات ایسے بزرگوں کو کفار کی تعذیب سے اپنا مال خرچ کر کے رہا کرایا جو اسلام میں بلند تر درجہ رکھتے ہیں ۔ انہی سات میں بلال اور عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہما بھی ہیں ۔

حضرتؓ صدیق ہی ہیں جنہوں نے اسلام میں سب سے پہلے مسجد اپنی زمین پر اس وقت تیار کی جبکہ کفار مکہ مسلمانوں کو حرم میں عبادت نہ کرنے دیتے تھے ۔

حضرتؓ صدیق ہی وہ ہیں جن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر ہجرت کی رفاقت کے لئے منتخب فرمایا تھا ۔

حضرتِ صدیق ہی وہ ہیں جو غار ثور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مقیم تھے قرآن مجید نے وَاِذْ هُمَا فِی الْغَارِ کہہ کر ان کی تخصیص فرما دی ہے ۔

حضرتؓ صدیق ہی وہ ہیں جن کو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنگ بدر میں اپنے عریش میں اپنے ساتھ ٹھہرایا تھا ۔ اس وقت حضرت صدیقؓ وہی فرائض ادا کر رہے تھے جو جنرل اور فوج کے درمیان چیف آف سٹاف کو ادا کرنے پڑتے ہیں ۔

حضرتؓ صدیق ہی کو غزوہ تبوک میں جبکہ سب سے زیادہ فوج کا اجتماع ہوا تھا ۔ نشان اعلیٰ عطا فرمایا تھا ۔

حضرتؓ صدیق ہی کو فرضیت حج کے بعد پہلے ہی سال امیر الحاج مقرر فرمایا گیا تھا ۔

حضرتؓ صدیق ہی کو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی مرض الموت کے ایام میں اپنی جگہ امام مسجد نبوی قائم فرمایا تھا ۔

انہوں نے سترہ نمازیں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی پاک میں صحابہ کرام کو پڑھائیں ۔ ایک نماز (یعنی نماز ظہر یوم یکشنبہ) میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی شامل ہوئے تھے اور نبی و صدیق ایک مصلّے پر جلوہ گر تھے ۔ یوم دوشنبہ کی نماز صبح کا وہ نظارہ جبکہ صدیق امام تھے اور امت کے سب چھوٹے بڑے مقتدی تھے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حجرہ مبارک سے خود ملاحظہ فرمایا تھا اور اس کامیابی کی اعلیٰ مسرت کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پانچ گھنٹے کے بعد عالم فانی سے کوچ فرمایا ۔

رحلت نبوی کے بعد حضرت صدیق ہی نے اَلْاَئِمَّۃُ مِنَ الْقُرَیْشِ کا اصول دنیا سے تسلیم کرایا تھا اور اسی اصول پر انصار نے اپنے دعوئے خلافت اور امارت مشترکہ کو واپس لے لیا تھا۔ ہر سہ خلفاء کی خلافت راشدہ اور ان کے بعد سلطنت ہائے دمشق و بغداد و سپین و مصر و مراکو وغیرہ نے اسی اصول محکم کے استمساک پر دنیا میں حکومت کی۔

خلفاء راشدین میں سے حضرت صدیق ہی کو خلیفہ رسول اللہ کہا گیا۔ دیگر ہر سہ خلفاء تو امیر المومنین کے لقب سے ملقب ہوئے۔

حضرت صدیق کو اپنی خلافت میں جن مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑا۔ وہ دیگر خلفاء کے سامنے نہیں آئیں۔ ارتحال نبوی سے اہل ایمان ایسے غمزدہ تھے کہ اکثر ہوش و حواس کھو بیٹھے تھے۔ اکثر حیرت زدہ تھے اور ساں کام نہ کرتے تھے۔ اسی حالت میں منافقین علانیہ اعداء سے جا ملے۔ اور حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم کی کامیابی دیکھ کر جھوٹے نبی بھی دعوی دار نبوت بن گئے۔ اسود عنسی، مسیلمہ کذاب اور طلیحہ اسدی اور مسماۃ سجاح کا شمار ان جھوٹے نبیوں میں ہے جنہوں نے پچاس پچاس ہزار سے زیادہ فوج جمع کر لی تھی اور ان سب کا عزم مجتمعہ مدینہ کو برباد اور اسلام کو تباہ کر دینا تھا۔ حضرت صدیق نے ان سب امور کا انتظام کیا۔ اہلِ ایمان کو اتنا مستعد بنایا کہ وہ اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کے نشان کے نیچے موتہ پر (جو ملک شام کی سرحد پر، اور سلطنت روما کا مشہور قلعہ بند مقام تھا) لڑے اور انہوں نے ان ظالموں کو سزا دی۔ جنہوں نے حضرت زید کو لوٹا اور شہید کیا تھا۔ منافقین کو تادیب کی گئی اور وہ پھر بدستور آئین اسلام کی اطاعت کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے لگے۔ اسود اور مسیلمہ اور طلیحہ و سجاح کے مقابلہ میں الگ الگ لشکر روانہ کئے گئے اور ان سب کی شان و شوکت اور دعویٰ نبوت کو خاک میں ملا دیا گیا۔ حتیٰ کہ اسلام کا بول بالا ہو گیا اور احکام اسلام کی تعمیل حجاز و نجد، یمن و حضرموت اور عمان تک ہونے لگی۔ امن بسیط کے قیام اور استحکام کے بعد صدیق اکبرؓ نے اپنی توجہ عراق کی طرف کی۔ یہ ملک اس وقت سلطنت روما کا ایک صوبہ تھا۔ حجاز سے اس کی حد ملحق تھا۔ شہنشاہ روما نے عراق کو عرب پر حملہ کرنے اور اسلام کو تباہ کرنے کے لئے بیس (میدان جنگ) بنایا تھا۔ اطراف ممالک سے روما کی فوجیں چپ چاپ جمع ہو رہی تھیں اور ذخائر جنگ فراہم ہو رہے تھے۔ صدیق اکبر جیسا دور رس خلیفہ ان سب حرکات کو دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے یہ قرار دیا کہ عرب کو جنگ سے بالکل محفوظ رکھا جائے اور اس لیے خود آگے بڑھ کر دشمن کی حملہ آوری کی تدابیر کو اُلٹ دیا جائے اس رائے کے بعد انہوں نے اپنے پانچ جرنیلوں کے ماتحت پانچ فوجیں دے کر اُن کو عراق پر مختلف راستوں سے حملہ آور ہونے کے لئے روانہ کر دیا۔ ہر ایک جرنیل کو بتا دیا گیا تھا کہ اس نے کہاں تک بڑھنا ہے اور کس مقام پر دوسرے جرنیل سے مل جانا ہے۔ اعلیٰ جرنیل کا مرکز بھی قرار دے دیا تھا یہ ایسی جنگی تدابیر تھیں جن کے جواب میں سلطنت روما بالکل ششدر رہ گئی اور اسلامی افواج ہر جگہ منظفر و منصور ہوئیں۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ سارا عراق فتح ہو گیا پھر سپہ سالاروں کو ملک شام کی فتح کے لیے مامور کیا گیا۔ شام کا کچھ حصہ فتح ہوا تھا کہ حضرت صدیق کا انتقال ہو گیا جب دیکھا جاتا ہے کہ حضرت صدیق کی مدت خلافت صرف دو سال چار ماہ تھی تو یہ سب ایسے کارنامے ہیں جن کی نظیر دنیا کی کوئی سلطنت کوئی فاتح پیش نہیں کر سکتا۔

اندرون ملک میں حضرت صدیق نے اشاعت علم پر سب سے پہلے توجہ فرمائی اور اسی لیے قرآن مجید کو جو اب تک متفرق کاغذوں اور ہڈیوں اور جھلیوں وغیرہ پر لکھا ہوا تھا ایک جگہ جمع کرایا اور جمع شدہ جلد کا نام مصحف پاک ہوا۔

انہوں نے اپنے احکام و فرامین اور خطبات میں نبوت اور خلافت کے جداگانہ شان اور حقوق کو واضح کیا۔ انہوں نے خلافت کی بنیاد

کو استبداد یا وراثت یا شخصی ملکیت سے علیحدہ رکھ کر جمہوریت پر جس کا حکم قرآن پاک میں موجود تھا بلند کیا اور اس عمارت کو اس اصول کو ایسا مستحکم کیا کہ خلافت راشدہ میں ہمیشہ اسی اصول پر حکومت کی گئی اور اسی لیے ہر چہار بزرگان دین خلفائے راشدین المہدیین کے لقب صحیح سے روشناس عالم ہوئے۔

حضرت صدیق کی مرویات حدیث کی تعداد ہے۔ صحیح بخاری میں صحیح مسلم[1] میں متفق علیہ دیگر کتب میں۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ اکابر صحابہ سے جو ذمہ داریوں کی خدمات میں اکثر مامور رہا کرتے تھے روایات کی تعداد کمتر ملتی ہے اور ان صحابہ سے جو ملکی خدمات سے سبکدوش رہے، روایات کی تعداد زیادہ ملتی ہے اور اس کی وجہ مذکورہ بالا فقرات ہی سے واضح ہو جاتی ہے۔ اس بات کو مثال کے طور پر سمجھنا چاہیئے کہ کسی یونیورسٹی کا اعلیٰ امتحان پاس کرنے کے بعد دو طالب علم نکلے۔ ہر ایک کی قابلیت و لیاقت علمی مسلمہ ہے ان میں سے ایک تو وزیر سلطنت ہو گیا اور دوسرا پروفیسر (معلم) بنا۔ ظاہر ہے کہ وزیر کو تلامذہ سے سابقہ نہیں پڑا۔ اور اس نے اس کے بتائے ہوئے نوٹ لکھوائے ہوئے حواشی ظاہر کیے ہوئے علمی نکات، دائرہ درس و تدریس میں بہت کم موجود ہوں گے۔

دوسری وجہ وہ مدت روائت بھی ہے جو روائت کرنے والے کو ملی۔ یہ مسلمہ ہے کہ روایت احادیث کا طریق بعد از رحلت نبوی جاری ہوا۔ ابوبکر صدیق کو صرف سوا دو سال اور عمر فاروق کو بارہ سال اور علی مرتضیٰ کو ۲۹ سال کا عرصہ مل گیا تھا یہی حال ابوہریرہ و جابر وغیرہم رضی اللہ عنہم کا ہے۔ ہر دو امور کو پیش نظر رکھنے سے ایک جویائے حقیقت کو قلت روایات کی وجہ روشن ہو جائے گی۔

۲۔ امیر المومنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ

ان کا نسب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کعب میں شامل ہو جاتا ہے۔ نسب نامہ یہ ہے عمر بن خطاب بن نفیل بن عبدالعزیٰ بن رباح بن عبداللہ بن قرط بن ازاح بن عدی بن کعب القرشی العدوی

ام المومنین حفصہ ان کی بیٹی ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی کنیت ابوحفص تجویز فرمائی تھی ان کی والدہ حنتمہ بنت ہاشم بن مغیرہ ہیں۔ نسب میں غلطی کرنے والوں نے حنتمہ کو ابوجہل کی بہن سمجھ لیا حالانکہ ابوجہل کے باپ کا نام ہشام ہے ہاشم نہیں۔

فاروق کے نانا ہاشم عرب کے مشہور شاہسواروں میں سے تھے اور ان کا لقب "المحنبین" تھا۔

ولادت: عام الفیل سے ۱۳ سال بعد مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے۔

قومی عہدہ: قبل از اسلام قوم کی طرف سے "درجہ سفارت" ان کو ملا ہوا تھا۔ معاہدات اور مناقشات اور معاملات جنگ کا فیصلہ انہی کی وساطت سے اور انہی کی رائے کے موافق ہوا کرتا تھا اسلیے قریش کے اندر اور دیگر قبائل کے اندر ان کو خاص طور پر وقار اور وجاہت حاصل تھی۔

حلیہ: بلند بالا، سخت گندم گون، پُر بدن، اصلع (چندیا کے بال صاف)، سُرخ چشم، محنّی یا سفید ریش۔

اسلام: ۶ سنہ یا ۵ سنہ نبوت کو مکہ مکرمہ میں دار ارقم بن ارقم کے گھر میں امیر حمزہ بن عبدالمطلب سے تین یوم بعد مسلمان ہوئے۔ ان کے

---

[1] افسوس ہے کہ یہاں قاضی صاحب تعداد لکھنا بھول گئے اب آئندہ ایڈیشن میں صحیح تعداد لکھی جائے گی۔ خادم

صدیق اکبر از سعید احمد اکبر آبادی میں مرویات صدیق کی تعداد بحوالہ تاریخ الخلفاء از جلال الدین سیوطی ۱۴۲ لکھی ہے البنۃ العتیق از مولوی عبدالحفیظ میں ۱۵۰ بیان کی گئی ہے۔ (ادارہ)

بھائی زید بن خطاب اور ان کی ہمشیرہ فاطمہ بنت خطاب قبل ازیں مسلمان ہو چکی تھی۔ فاطمہ خاتون کی سعی سے اُن کے شوہر زید بن سعید بھی اسلام میں داخل ہوئے تھے اور فاروق کو بھی انہی کے مبارک گھر میں قرآن مجید سننے کا موقعہ ملا۔ قرآن پاک کے سنتے ہی یہ اسلام پر پختہ ہوئے اور اُسی وقت نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فاروق کے سینہ پر ہاتھ رکھا اور یہ دعا پڑھی۔

اَللّٰھُمَّ اَخْرِجْ مَا فِیْ صَدْرِہٖ مِنْ غِلٍّ وَاَبْدِلْہُ اِیْمَانًا — یا اللہ اس کے سینے میں جو کچھ بھی میل کچیل ہو دور کر دے اور اس کے بدلے ایمان بھر دے۔

ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول تھا کہ اسلام عمرؓ کے بعد ہم دین اسلام کو اس نوجوان سے مشابہ سمجھا کرتے جس کے قویٰ کا نشو و نما روز بروز ترقی پذیر ہو۔ شہادت عمرؓ کے بعد ہم سمجھا کرتے تھے کہ اب اس شخص کے قویٰ میں انحطاط شروع ہو گیا ہے عمر بوقت اسلام ۳۳ سال تھی

فاروق کا خطاب ملا نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

اِنَّ اللّٰہَ جَعَلَ الْحَقَّ عَلٰی لِسَانِ عُمَرَ وَقَلْبِہٖ وَھُوَ الْفَارُوْقُ فَرَّقَ اللّٰہُ بِہٖ بَیْنَ الْحَقِّ وَالْبَاطِلِ — اللہ تعالیٰ نے سچ کو عمر کے دل و زبان میں رکھ دیا ہے وہ فاروق ہے حق اور باطل کے درمیان اللہ تعالیٰ نے اُس کے ذریعہ سے فرق کر دیا ہے۔

اسلام سے چند یوم کے بعد ہی ان کو حضورؐ نے اپنا وزیر بنا لیا۔ ترمذی نے بروایت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

وَزِیْرَایَ مِنْ اَھْلِ السَّمَآءِ جِبْرَائِیْلُ وَمِیْکَائِیْلُ وَاَمَّا — میرے دو وزیر آسمان والوں میں سے ہیں وہ تو جبرائیل و میکائیل ہیں
وَزِیْرَایَ مِنْ اَھْلِ الْاَرْضِ فَاَبُوْبَکْرٍ وَعُمَرُ — اور میرے دو وزیر زمین والوں میں سے ہیں وہ ابوبکر و عمر ہیں۔

ہجرت مدینہ علی مرتضےٰ فرماتے ہیں۔ مکہ سے ہجرت کرنا ایسا مشکل تھا کہ سب نے چھپ چھپ کر ہی ہجرت کی۔ لیکن عمرؓ نے سفر ہجرت کے دن دشمنوں کی آنکھوں کے سامنے طواف کعبہ کیا۔ پھر دو رکعت نماز پڑھی اور پھر قریش کے مجمع میں جا کھڑے ہوئے اور کہا۔ اے روسیاہو جو کوئی تم میں سے اپنی ماں کو بے اولادی کا۔ اپنے بیٹے کو یتیمی کا اپنی جورو کو رنڈاپے کا داغ دینا چاہے وہ میرا تعاقب کرے۔ سب نے سنا اور کسی کو بھی عمرؓ کا تعاقب کرنے کا حوصلہ نہ ہوا۔

ہجرت کرنے والوں نے ان کی معیت کو غنیمت سمجھا (۱) زید بن خطاب (۲) سعید بن زید (۳، ۴) عمرو عبداللہ فرزندان سراقہ (۵) خنیس بن حذافہ (۶) واقد بن عبداللہ (۷، ۸) خولی و بلال فرزندان ابوخولی (۹) عیاش بن ابوربیعہ (۱۰-۱۱-۱۲) خالد و ایاس و عاقل فرزندان بکیر (۱۳) سالم مولیٰ ابوحذیفہ رضی اللہ عنہم اور کس دیگر اصحاب نے ان کے ساتھ ہجرت کی۔

فضائل نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کے فضائل کے متعلق متعدد احادیث ہیں جو بلحاظ صحت اعلیٰ درجہ کی ہیں۔

(۱) ابوموسیٰ اشعری کی حدیث طویل میں جسے صحیحین میں روایت کیا گیا ہے

لہ تہذیب الاسماء امام نووی صہ

ارشادِ نبوی ہے اِفْتَحْ لَهُ وَبَشِّرْهُ بِالْجَنَّةِ باغ کا دروازہ عمرؓ کے لئے کھول دے اور اُسے بشارت جنت سنا دے۔

۲۔ بخاری و مسلم بروایت سعد بن ابو وقاص ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ مَا لَقِیَكَ الشَّیْطَانُ سَالِكًا فَجًّا اِلَّا سَلَكَ فَجًّا غَیْرَ فَجِّكَ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے جس راستہ پر شیطان تجھے چلتا دیکھ لے گا۔ اُسے چھوڑ کر دوسرے راہ پر ہو جائے گا۔

۳۔ بخاری و مسلم میں طیبہ عائشہ صدیقہ کی روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

لَقَدْ كَانَ فِیْمَا قَبْلَكُمْ مِنَ الْاُمَمِ نَاسٌ مُحَدَّثُوْنَ فَاِنْ یَكُنْ فِیْ اُمَّتِیْ اَحَدٌ فَاِنَّهٗ عُمَرُ پہلی اُمتوں میں ایسے لوگ ہوتے تھے جن سے فرشتے باتیں کیا کرتے اگر کوئی میری امت میں ہے تو وہ عمرؓ ہے۔

۴۔ بخاری و مسلم میں ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میں نے خواب دیکھا کہ میں ایک چاہ کے اُوپر ہوں۔ میں نے اُس میں سے ڈول نکالے جتنے منشاء الٰہی تھا۔ پھر ڈول ابوبکرؓ نے لیا اور ایک یا دو ڈول ضعف کے ساتھ نکالے۔ اللہ تعالیٰ نے اُس کے ضعف کو معاف کر دیا۔ پھر وہ ڈول عمرؓ نے لے لیا۔ ڈول تو چرسہ بن گیا۔ میں نے کوئی ایسا عجیب شخص نہیں دیکھا کہ اس زور و طاقت کے ساتھ چرسہ نکالتا ہو۔ اُس نے تو سب لوگوں کو سیراب کر دیا حتیٰ کہ اُن کی تونڈ نکل آئی۔ علماء نے بیان کیا ہے کہ اس کی تعبیر فتوحات اسلامیہ ہیں

۵۔ محمد (حنفیہ) رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ میں نے اپنے والد بزرگوار علی مرتضےٰ سے پوچھا کہ رسول اللہ کے بعد بہتر شخص کون ہے۔ فرمایا ابوبکر میں نے کہا اُس کے بعد فرمایا عمر یہ روایت صحیح بخاری میں موجود ہے۔

۶۔ بخاری و مسلم میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ میں عمر فاروقؓ کے جنازے پر کھڑا ہوا تھا اور بھی بہت لوگ تھے۔ اتنے میں ایک شخص میرا کندھا پکڑ کر آگے بڑھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ علی مرتضیٰ ہیں۔ انہوں نے عمرؓ کے لئے دعائے رحمت کی اور پھر کہا۔ اب تیرے بعد کوئی شخص ایسا نہ رہا جس کے اعمال کو رکھ کر میں اللہ کی ملاقات کو پسند کروں۔ واللہ میں تو یہ پہلے ہی سمجھے ہوئے تھا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ان دونوں رفیقوں سے ملا دے گا۔ کیونکہ میں بسا اوقات سنا کرتا تھا کہ رسول اللہ فرماتے ہیں اور ابوبکر و عمر گئے۔ میں اور ابوبکر و عمر آئے ہیں اور ابوبکر و عمر وہاں سے نکلے۔

۷۔ عمرو بن العاص کی روایت بخاری و مسلم میں ہے کہ جب وہ جنگ ذات السلاسل سے واپس آئے تو انہوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ حضور کو سب سے پیارا کون ہے فرمایا عائشہ۔ میں نے کہا مردوں میں سے فرمایئے۔ فرمایا ابوبکرؓ۔ پھر عمرؓ کا نام لیا۔ پھر کئی نام اور بھی شمار کئے۔

۸۔ بخاری میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم احد پر چڑھے۔ حضور کے ساتھ ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمان آئے تھے پہاڑ کو زلزلہ آیا۔ فرمایا احد ٹھہر جاؤ۔ تجھ پر تو ایک نبی ایک صدیقؓ اور دو شہید موجود ہیں۔

۹۔ سنن ترمذی میں عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

لَوْ كَانَ بَعْدِیْ نَبِیٌّ لَكَانَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ۔ اگر میرے بعد کسی نے نبی ہونا ہوتا تو عمر ہوتا

۱۰۔ ترمذی میں حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اِقْتَدُوْا بِالَّذِیْنَ مِنْ بَعْدِیْ اَبُوْبَكْرٍ وَعُمَرَ

میرے بعد ان دونوں ابوبکرؓ و عمرؓ کا اقتدا کیا کرنا۔

۱۱۔ انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکرؓ و عمرؓ کی بابت فرمایا۔

هٰذَانِ سَيِّدَا كُهُولِ أَهْلِ الْجَنَّةِ مِنَ الْأَوَّلِينَ وَالْآخِرِينَ إِلَّا النَّبِيِّينَ وَالْمُرْسَلِينَ

انبیاء و مرسلین کو چھوڑ کر ابوبکرؓ و عمرؓ جنت کے سب اگلے پچھلے اُمت کے ادھیڑ عمر کے لوگوں کے سید اور سردار ہیں (ترمذی)

خلافت جب ابوبکر صدیقؓ نے محسوس کر لیا کہ وہ وفات پانے والے ہیں۔ تب انہوں نے مہاجرین و انصار کے مجمع میں اپنے جانشین کا سوال پیش کیا۔ عبدالرحمٰن بن عوف، عثمان بن عفان، سعید بن زبیر اور اُسید بن حضیر انصاری وہ بزرگ ہیں جنہوں نے اس مسئلہ پر گفتگو ئیں کیں اور باتفاق انہوں نے عمر فاروق کو شایان خلافت قرار دیا۔ اس مشورت کے بعد ابوبکر صدیق نے عمر فاروق کے استخلاف کی تحریر لکھ دی۔ یہ تحریر ابوبکر صدیق نے مجمع عام میں سنا دی اور سب نے اس تجویز کو بلا اختلاف احدے پسند کر لیا۔ تب ابوبکر صدیق نے عمر کو طلب کیا اور مجمع کے سامنے یہ دعا پڑھ کر اس معاملہ کو ختم کیا۔

اللّٰهُمَّ إِنِّي لَمْ أُرِدْ بِذٰلِكَ إِلَّا صَلَاحَهُمْ وَخِفْتُ عَلَيْهِمُ الْفِتْنَةَ فَعَمِلْتُ فِيْهِمْ بِمَا أَنْتَ أَعْلَمُ بِهِ فَوَلَّيْتُ عَلَيْهِمْ خَيْرَهُمْ وَأَقْوَاهُمْ عَلَيْهِمْ وَأَحْرَصَهُمْ عَلٰى مَا أَرْشَدَهُمْ. وَقَدْ حَضَرَنِي مِنْ أَمْرِكَ مَا حَضَرَنِي فَاخْلُفْنِي فِيْهِمْ فَهُمْ عِبَادُكَ وَنَوَاصِيْهِمْ فِي يَدِكَ وَأَصْلِحْ لَهُمْ وُلَاتَهُمْ وَاجْعَلْهُ مِنْ خُلَفَائِكَ الرَّاشِدِيْنَ يَتَّبِعُ هُدٰى نَبِيِّ الرَّحْمَةِ وَأَصْلِحْ لَهُ رَعِيَّتَهُ

یا اللہ میرا مقصود اس کارروائی سے خلق اللہ کی بہبودی ہے کیونکہ مجھے اُن کی حالتوں کو دیکھتے ہوئے (جسے تو خوب جانتا ہے) فتنہ کا اندیشہ ہوا لہذا میں نے ان پر اس شخص کو والی کر دیا جو ان میں زیادہ بہتر اور بہت قوی اور بہبود و سود خلائق پر بہت زیادہ حریص ہے۔ الٰہی تو جانتا ہے کہ یہ میرا آخری وقت ہے۔ اس لئے اب تو ہی ان کو سنبھالیو یہ تیرے بندے ہیں۔ ان کی پیشانیاں تیرے ہاتھ میں ہیں۔ یا اللہ مسلمانوں کے سب حکام کو درست فرما دیجو اور عمرؓ کو خلفاء راشدین میں سے بنائیو۔ جو نبی الرحمۃ کی ہدایت پر چلے۔ الٰہی اس کی رعیت کو بھی درست رکھیو

خلافت عمرؓ پر کسی ایک مسلمان کو بھی اختلاف نہ تھا آپکو خلافت ۲۲ جمادی الآخری ۱۳ھ کو ملی۔

مدت خلافت فاروق دس برس ۶ ماہ ۸ یوم

شہادت ام المومنین حفصہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں۔ ایک دفعہ میرے سامنے عمر فاروق نے یہ الفاظ ادا کئے

اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِي شَهَادَةً فِي سَبِيْلِكَ وَاجْعَلْ مَوْتِي فِي بَلَدِ حَبِيْبِكَ "الٰہی مجھے تیرے راہ میں شہادت بھی ملے اور میری موت تیرے پیارے نبی کے شہر ہی میں ہو"۔ میں نے دل میں کہا کہ یہ دونوں باتیں کیونکر ہونگی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے مخلص صادق کی دعا کو ٹھیک انہی الفاظ میں منظور فرما لیا۔

۲۶ ذی الحجہ ۲۳ھ کی نماز صبح کا وقت تھا۔ مسلمان نماز میں تھے کہ ابولولو مجوسی نے دو دھاری خنجر سے فاروق پر حملہ کیا اور چند زخم

کاری لگائے وہاں سے بھاگا تو ۱۳ کس دیگر کو بھی زخمی کیا۔

فاروق نے اسی وقت نماز کے لئے ابن عوف کو امام مقرر کر دیا اور پھر مجروح اٹھا کر لائے گئے شنبہ یکم محرم ۲۴ھ کو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پہلو میں صدیقہ عائشہ طیبہ کے گھر میں اُن کی اجازت سے دفن کیے گئے۔ انتقال بعمر ۶۳ سال ہوا۔

علم عمر رضی اللہ عنہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے ان کی وفات پر کہا کہ آج ۹/۱۰ علم جاتا رہا۔

صحیحین میں ہے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں نے خواب میں دیکھا کہ دودھ کا ایک پیالہ میرے سامنے پیش کیا گیا میں نے پیا۔ اس کی طراوت مجھے اپنے ناخنوں کی جڑ تک معلوم ہوتی۔ پھر جس قدر بچ رہا وہ میں نے عمر کو دے دیا۔ صحابہ نے عرض کیا کہ حضورؐ اس کی تاویل (حقیقت اصلیہ) کیا ہے فرمایا علم۔

یہ حدیث بہت بڑی شان کی ہے اور صحت کے لحاظ سے ذروۂ اعلیٰ پر ہے۔

ہم لوگ امیر المومنین علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو شان علم کے لحاظ سے بلند ترین ذروہ پر تسلیم کرتے ہیں مگر جو الفاظ حدیث اس بارہ میں زبان زد عوام ہیں وہ بلحاظ سند بالکل غیر ثابت ہیں۔ وہ الفاظ یہ ہیں۔ اَنَا مَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ وَعَلِیٌّ بَابُہَا

امام ترمذی نے اس روائت کو منکر بتلایا۔

امام بخاری نے منکر کہنے کے ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اس کے لیے کوئی بھی وجہ صحیح نہیں پائی جاتی۔

امام ابن معین نے کہا یہ کذب ہے اس کی اصل کچھ بھی نہیں

ابن الجوزی اور ذہبی نے اس کا شمار موضوعات میں کیا ہے۔

فاروقؓ اور مرتضےٰؓ کے تعلقات مسلمانوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جو ہر دو بزرگواروں کے تعلقات کو بھیانک اور گھنونی صورت میں دکھلایا کرتے ہیں۔ لیکن اس کی کچھ اصلیت نہیں۔

علیؓ مرتضےٰ جناب فاروق کے مشہور وزیر اعظم اور معتمد علیہ تھے۔ فاروق اعظمؓ نے دوبار بجانب شام سفر کیا اور ہر دو موقع پر اپنی جگہ علی مرتضیٰ کو قائم مقام بنایا۔

فاروق اعظمؓ نے جن چھ اشخاص کو شایان خلافت شمار کیا تھا اُن میں سے سب سے پہلے انہوں نے جناب مرتضٰی کا اسم گرامی بتایا تھا۔ علی مرتضٰی نے اپنی دختر ام کلثوم از بطن سیدہ زہرہ کا نکاح فاروقؓ اعظم کے ساتھ ۱۷ھ خلافت فاروقی میں کر دیا تھا۔ اُن کے بطن سے زید فرزند اور رقیہ دختر عمرؓ فاروق پیدا ہوئی۔ مشیر اعظم ہونے کے ثبوت میں علی مرتضٰی کے خود الفاظ موجود ہیں۔

نہج البلاغہ جناب امیر ہی کی کتاب ہے اور اس لئے فرقہ امامیہ نے اس کی حفاظت و نگہداشت میں بہت اہتمام کیا ہے۔ کتاب مذکور میں درج ہے کہ جب عمر فاروقؓ نے سلطنت ایران میں بذات خود جہاد کرنے کا مشورہ لیا تو جناب مرتضےٰؓ نے فرمایا:

إِنَّ هٰذَا الْأَمْرَ لَمْ يَكُنْ نَصْرُهُ وَلَا خِذْلَانُهُ بِكَثْرَةٍ وَّلَا بِقِلَّةٍ وَهُوَ دِيْنُ اللّٰهِ الَّذِيْ أَظْهَرَهُ وَجُنْدُهُ الَّذِيْ أَعَدَّهُ وَأَمَدَّهُ حَتّٰى بَلَغَ مَا بَلَغَ وَطَلَعَ حَيْثُ مَا طَلَعَ وَنَحْنُ عَلٰى مَوْعُوْدٍ مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ مُنْجِزٌ وَعْدَهُ وَنَاصِرٌ جُنْدَهُ وَمَكَانُ الْقَيِّمِ بِالْأَمْرِ مَكَانُ النِّظَامِ مِنَ الْخَرَزِ يَجْمَعُهُ وَيَضُمُّهُ فَإِذَا انْقَطَعَ النِّظَامُ تَفَرَّقَ الْخَرَزُ وَذَهَبَ ثُمَّ لَمْ يَجْتَمِعْ بِحَذَافِيْرِهِ أَبَدًا۔

وَالْعَرَبُ الْيَوْمَ وَإِنْ كَانُوْا قَلِيْلًا فَهُمْ كَثِيْرُوْنَ بِالْإِسْلَامِ عَزِيْزُوْنَ بِالْاِجْتِمَاعِ فَكُنْ قُطْبًا وَاسْتَدِرِ الرَّحٰى بِالْعَرَبِ وَأَصْلِهِمْ دُوْنَكَ نَارَ الْحَرْبِ۔

فَإِنَّكَ إِنْ شَخَصْتَ مِنْ هٰذِهِ الْأَرْضِ انْتَقَضَتْ عَلَيْكَ الْعَرَبُ مِنْ أَطْرَافِهَا وَأَقْطَارِهَا حَتّٰى يَكُوْنَ مَا تَدَعُ وَرَاءَكَ مِنَ الْعَوْرَاتِ أَهَمَّ إِلَيْكَ مِمَّا بَيْنَ يَدَيْكَ۔

إِنَّ الْأَعَاجِمَ إِنْ يَّنْظُرُوْا إِلَيْكَ غَدًا يَقُوْلُوْا هٰذَا أَصْلُ الْعَرَبِ فَيَكُوْنُ ذٰلِكَ أَشَدَّ لِكَلَبِهِمْ عَلَيْكَ وَطَمَعِهِمْ فِيْكَ۔

فَأَمَّا مَا ذَكَرْتَ مِنْ مَسِيْرِ الْقَوْمِ إِلٰى قِتَالِ الْمُسْلِمِيْنَ فَإِنَّ اللّٰهَ سُبْحَانَهُ هُوَ أَكْرَهُ لِمَسِيْرِهِمْ مِنْكَ وَهُوَ أَقْدَرُ عَلٰى تَغْيِيْرِ مَا يُكْرَهُ۔

وَأَمَّا مَا ذَكَرْتَ مِنْ عَدَدِهِمْ فَإِنَّا لَمْ نَكُنْ نُقَاتِلُ فِيْ مَا مَضٰى بِالْكَثْرَةِ وَإِنَّمَا كُنَّا نُقَاتِلُ بِالنَّصْرِ وَالْمَعُوْنَةِ[114]

ترجمہ، ہماری حکومت کی کامیابی وناکامی کثرت یا قلت پر نہیں یہ تو وہ دین الٰہی ہے جسے خدا نے ظہور بخشا ہے اور وہ الٰہی لشکر ہے جسے اسی نے تیار کیا اور پھیلایا ہے حتیٰ کہ جہاں تک پہنچنا تھا وہاں پہنچا جہاں سے نور افگن ہونا تھا ہوا۔

ہمارے ساتھ تو اللہ کا وعدہ موجود ہے اللہ تعالیٰ اپنا وعدہ پورا فرمائے گا اور اپنی فوج کی مدد بھی کرے گا۔

حکومت کو تھامنے والے صاحب الامر کا درجہ ایسا ہے جیسا موتیوں کی مالا میں ڈور کا ہوتا ہے اگر ڈور ٹوٹ جائے تو موتی بکھر جائیں گے اور پھر وہ سب کے سب کبھی فراہم نہ ہوسکیں گے۔

ہاں عرب والے آج گو تعداد میں کم ہیں مگر وہ اسلام کے طفیل بڑے ہیں اور جمعیت کی وجہ سے عزت اور وقار والے ہیں۔ اب آپ تو قطب بنے رہیں، عرب کی چکّی آپ کے گرداگرد گھوما کرے۔ دشمنوں میں آپ یہیں رہ کر آتش جنگ کو تیز کرسکتے ہیں لیکن اگر آپ یہاں سے چلے گئے، عرب اور اس کے حدود آپ کے وجود سے محروم رہ گئے تو وہ حالت ہوجائے گی کہ پیچھے (اپنے وطن) کا سنبھالنا اگلے (متوقع ملک کے سنبھالنے سے زیادہ ضروری ہوجائے گا۔

یہ بھی ہے کہ جب عجمی آپ کو دیکھ لیں گے اور معلوم کرلیں گے کہ عرب کی بیخ و بنیاد یہی شخص ہے تو ان کے حملے زیادہ سخت ہوجائیں گے اور وہ بلند حوصلگی کے ساتھ آپ کی مخالفت میں مستعد ہوجائیں گے۔

آپ نے کہا کہ سارا فارس مسلمانوں سے جنگ کے لئے آرہا ہے سو آپ یاد رکھیں کہ جو چیز آپ کو ناپسند ہے وہ خدا کو اور بھی زیادہ ناپسند ہے اور جسے وہ پسند نہیں کرتا اُسے دور کرنے کی قدرت بھی اس میں بہت زیادہ ہے۔

رہی کثرت تعداد سو ہم زمانِ ماضی میں بھی کبھی کثرت تعداد سے جنگ آور نہیں ہوئے ہماری لڑائی تو نصرت الٰہی اور معونت ربانی پر منحصر رہی ہے

علی مرتضیٰ کی اس تقریر پر غور مزید ضروری ہے۔

۱۔ انہوں نے فتوحات فاروقی کو وعدۂ الٰہی انجاز فرمایا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اس وعدہ سے کلام اللہ کی آیت استخلاف ہی کی جانب اشارہ ہے۔ علی مرتضیٰ کی طرف سے یہ اقرار واضح ہے کہ خلافت فاروق منجانب اللہ ہے۔

۲۔ اس تقریر میں خالد اور ابوعبیدہ اور فیروز دیلمی وغیرہ قائدین عساکر کو جُند اللہ کہا گیا ہے اور ان کی فتوحات کو نصرت الٰہی اور معیّت ربانی کا نتیجہ قرار دیا ہے اور یہی روشن علامت خلیفہ راشد کی قرآن پاک میں ہے۔

۳۔ فاروق اعظم کو قیم بالامر کے لفظ سے یاد فرمایا ہے۔ حدیث شریف میں اللہ تعالیٰ کو قَیِّمُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فرمایا ہے یعنی لفظ قیّم اقتدار نام کے معنے بھی رکھتا ہے اور اقتدار حق کا لزوم بھی اس معنے میں ہے۔

۴۔ پھر اس مثال پر غور کرو جو مالائے مروارید اور رشتہ مالا کی اسلوب میں پیش کی گئی ہے۔

۵۔ فاروقؓ کو قطب فرمایا ہے۔

ان الفاظ اور اسالیب سے ثابت ہو جاتا ہے کہ فاروق و مرتضیٰ میں مصادقت و موافقت اور اتحاد کی کس قدر تھا۔

علی ہٰذا سلطنت روما کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے جانے کا بھی ارادہ فاروق اعظم نے کیا اور علیؓ مرتضے سے مشورہ لیا تو انہوں نے ان الفاظ میں مشورہ پیش کیا تھا۔

وَقَدْ تَوَكَّلَ اللّٰهُ لِاَهْلِ هٰذَا الدِّيْنِ بِاِعْزَازِ الْحَوْزَةِ وَسَتْرِ الْعَوْرَةِ وَالَّذِيْ نَصَرَهُمْ وَهُمْ قَلِيْلٌ لَا يَنْتَصِرُوْنَ وَمَنَعَهُمْ وَهُمْ قَلِيْلٌ لَا يَمْتَنِعُوْنَ حَيٌّ لَا يَمُوْتُ اِنَّكَ مَتٰى تَسِرْ اِلٰى هٰذَا الْعَدُوِّ بِنَفْسِكَ فَتَلْقَهُمْ فَتُنْكَبْ لَا تَكُنْ لِلْمُسْلِمِيْنَ كَانِفَةٌ دُوْنَ اَقْصٰى بِلَادِهِمْ لَيْسَ بَعْدَكَ مَرْجِعٌ يَرْجِعُوْنَ اِلَيْهِ

اس دین والوں کا اللہ خود کارساز بن گیا ہے اسی نے اندرون ملک کو عزت دی اور اسی نے بیرونی کمزوری سے ہماری حفاظت کی۔ اسی نے ہماری مدد کی جبکہ ہم کم تھے اور ہمارا کوئی مددگار نہ تھا۔ اسی نے ہم سے مدافعت کی جبکہ ہماری تھوڑی تعداد مدافعت بھی نہ کر سکتی تھی ــ اللہ تعالیٰ زندہ ہے لایموت ہے۔ جب آپ اس دشمن کی طرف خود جائیں گے اور اس کی طاقت توڑ دیں گے۔ اس وقت مسلمانوں کے لیے ملک کے انتہائی کنارہ تک کوئی پناہ نہ رہے گی اور کوئی مرجع نہ رہے گا جس کی طرف وہ رجوع لا سکیں۔

فَابْعَثْ اِلَيْهِمْ رَجُلًا مِحْرَبًا وَاحْفِزْ مَعَهُ اَهْلَ الْبَلَاءِ وَالنَّصِيْحَةِ فَاِنْ اَظْهَرَ اللّٰهُ فَذٰلِكَ مَا تُحِبُّ وَاِنْ تَكُنِ الْاُخْرٰى كُنْتَ رِدْءًا لِلنَّاسِ وَمَثَابَةً لِلْمُسْلِمِيْنَ (نہج البلاغۃ صفحہ ۱۱ چھاپ تبریز)

آپ کسی جنگ آزمودہ کو بھیج دیجئے اور اس کے ساتھ امتحان اور خلوص والے لوگوں کو بھیج دیجئے۔ اگر خدا نے فتح دے دی تب تو آپ کی آرزو پوری ہوگئی اور اگر صورت دگرگوں ہوئی تب لوگوں کے لیے قوت و شوکت اور مسلمانوں کے لیے ملجا و ماویٰ تو آپ موجود ہی ہوں گے۔

قابلِ غور یہ ہے کہ علی مرتضیٰ نے اس تقریر میں عمر فاروق کو کانفۃ للمسلمین اور مرجع المسلمین ردءا للناس اور مثابۃ

للمسلمین کے اوصاف سے یاد کیا ہے لفظ ردءا کا استعمال قرآن مجید میں بحوالہ درخواست موسیٰ ہارون علیہ السلام کے متعلق فرمایا گیا ہے۔ ارسلہ معی ردءاً یصدقنی اور مثابۃ للناس خانہ کعبہ کو فرمایا ہے۔ یہاں فاروق کو مرتضیٰ نے ردءاً اور مثابۃ قرار دیا ہے اور یہ عجیب نکتہ ہے کہ لفظ ردءا اور لفظ مثابۃ کا استعمال صرف ایک ایک مقام پر حضرت ہارون اور بیت اللہ کے لئے ہوا ہے اور کسی کے لئے ان کا استعمال قرآن مجید میں نہیں ہے۔ اب علی مرتضیٰ نے فاروقؓ کے حق میں فرمایا۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ علی مرتضیٰ اپنے دل سے فاروق اعظم کی کس قدر عزت کرتے تھے اور ان کی شان میں کیسے لاثانی الفاظ کا استعمال کرتے تھے۔

یہ مختصر رسالہ اس مسئلہ کو بالاستیعاب بیان کرنے کے لئے موزوں نہیں۔

جناب فاروق ہی کی برکت تھی کہ عراق و فلسطین دمشق حمص۔ حماۃ۔ جزائر آذربیجان، مصر اور فارس کے ممالک داخل اطاعت اسلام ہو گئے۔

پارسیوں نے تو فتح فارس کا انتقام بھی فاروق سے پورا پورا لے لیا وہ مسلمانوں میں ملے اور انہی میں سے بعض نے عقائد میں فاروق کو بھلا برا کہنا داخل ایمان کر دیا۔

انہی کے حکم سے بصرہ و کوفہ آباد کیے گئے انہی نے جملہ ممالک مفتوحہ کا قانونی بندوبست کیا۔

فتوحات ملکی کے بعد فاروق اعظم کی فتوحات علمی بھی بہت زیادہ ہیں دواوین احادیث میں مرویات فاروق کی تعداد ۵۲۹ ہے از انجملہ متفق علیہ ۲۶ انفرد بہ البخاری ۳۴، انفرد بہ المسلم ۲۱ ہیں۔

علی مرتضیٰ کی مرویات کی تعداد جملہ کتب احادیث میں ۵۸۶ ہے یعنی عمرؓ سے ۵۷ زیادہ جب یہ غور کیا جاتا ہے کہ علی مرتضیٰ عمر فاروق کے بعد قریباً ۱۷ سال تک زندہ رہے تو مرویات عمر کی تعداد کی وقعت بڑھ جاتی ہے۔

ان صحابہ کے نام جنہوں نے فاروق اعظم سے روایت حدیث کی ہے

۱۔ عثمان ذوالنورین ۲۔ علی مرتضیٰ ۳۔ طلحہ بن عبید اللہ ۴۔ سعد بن ابی وقاص ۵۔ عبدالرحمٰن بن عوف۔ یہ پانچوں عشرہ مبشرہ میں سے ہیں، ۶۔ ابن مسعود فقیہہ کامل ۷۔ ابوذر زاہد کامل ۸۔ عبداللہ بن عمرؓ ۹۔ حبر الامۃ ابن عباس ۱۰۔ ابن الزبیر ۱۱۔ ابوموسیٰ اشعری ۱۲۔ انس بن مالک خادم الرسول ۱۳۔ جابر بن عبداللہ ۱۴۔ عمرو بن العاص ۱۵۔ ابولبابہ ۱۶۔ براء بن عازب ۱۷۔ ابوسعید خدری ۱۸۔ ابوہریرہ ۱۹۔ ابن السعدی ۲۰۔ عقبہ بن عامر ۲۱۔ نعمان بن بشیر ۲۲۔ عدی بن حاتم ۲۳۔ یعلی بن امیۃ ۲۴۔ سفیان بن وہب ۲۵۔ عبداللہ بن سرجس ۲۶۔ فلتان بن عاصم ۲۷۔ خالد بن عرفطہ ۲۸۔ اشعث بن قیس ۲۹۔ ابوامامۃ الباہلی ۳۰۔ عبداللہ بن انیس ۳۱۔ بریدہ بن حصیب الاسلمی ۳۲۔ فضالہ بن عبید ۳۳۔ شداد بن اوس ۳۴۔ سعید بن العاص ۳۵۔ کعب بن عجرہ ۳۶۔ مسعود بن مخرمہ ۳۷۔ صائب بن یزید ۳۸۔ عبداللہ بن ارقم ۳۹۔ جابر بن سمرہ ۴۰۔ حبیب بن مسلمہ ۴۱۔ عبدالرحمٰن بن ابزی ۴۲۔ عمرو بن حریث ۴۳۔ طارق بن شہاب ۴۴۔ معمر بن عبداللہ ۴۵۔ مسیب بن حزن ۴۶۔ سفیان بن عبداللہ ۴۷۔ ابوالطفیل ۴۸۔ ام المومنین عائشہ صدیقہ ۴۹۔ ام المومنین حفصہ رضی اللہ تعالیٰ اجمعین۔

اگر پڑھنے والے کے سامنے ان صحابہ کے حالات ہوں اور رأسے ان کے علمی کمالات سے اطلاع ہو۔ تب یہ انکشاف بہترین معلومات کا ذریعہ ہوگا کہ صحابہ کرام کی جماعت میں سے ۴۹ مقدسین نے فاروق کے علوم سے استفادہ کیا ہے اور ان علوم کو خلائق تک پہنچایا ہے۔ صحابہ کی

اتنی جماعت کا مستفیض ہونا فاروق کے کمالات علمی پر شاہد عدل ہے ۔

ان تابعین کے نام جنہوں نے فاروق اعظم سے روایت حدیث کی ہے

تابعین کی جماعت کثیرہ نے بھی حضور سے روایت کی ہے ۔ اُن کا احصا دشوار ہے صرف چند نام لکھ دیئے جاتے ہیں ۔

۱ ۔ عاصم بن عمر ۲ ۔ مالک بن اوس ۳ ۔ علقمہ بن وقاص ۴ ۔ ابو عثمان نہدی ۵ ۔ اسلم ۶ ۔ قیس بن ابو حازم ان بزرگوں کی روایات کتب احادیث میں بکثرت ہیں ۔

فاروق اعظم سے کیاست وفراست عدل وسیاست جود وسخا ۔ زہد ورع ۔ صلابت فی الدین ، اور شفقت علی الخلق کے متعلق اس قدر روایات صحیح موجود ہیں کہ اُس کے لیئے ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے ۔

ان کے خطبات اور فتاوے اور فرامین کا اتنا بڑا مجموعہ ہے جو ایک جلد میں جمع نہیں ہوسکتا ۔

اوّلیات عمرؓ

۱ ۔ یہ پہلے خلیفہ راشد ہیں جنہوں نے دیوان مرتب کیا ۔ یعنی باقاعدہ دفتر قائم کیا

۲ ۔ یہ پہلے خلیفہ ہیں جن کے ہاں نشست میں اور ملاقات میں ترتیب علی قدر مراتب ملحوظ رہتی تھی ۔ یعنی سب سے اوّل اہل بدر ہوتے تھے ۔ اور اُن میں بھی نشست اوّل پر علی مرتضیٰ رونق افروز ہوتے تھے ۔

۳ ۔ یہ پہلے خلیفہ راشد ہیں جنہوں نے جملہ اہل اسلام کا بیت المال سے وظیفہ مقرر کیا اس فہرست کی تیاری میں قرابت رسولؐ کو تقدیم دی گئی تھی ۔

یعنی سب سے پہلے بنی ہاشم کا اندراج ہوا ۔ پھر بنو مطلب کا ۔ چند وظائف کی شرح بھی درج ہے عباس عم رسولؐ ممت ہزار ۔ ام المومنین عائشہ صدیقہ و حسنین علیہم السلام ہر یک ہزار دیگر ازواج النبی فی کس ہزار اصحاب بدر فی کس ہ ہزار ۔ اصحاب احد و بیعۃ الرضوان فی کلمہ ہزار ۔ اہل قادسیہ و شام لہ ہزار اہل یرموک ا ہزار دیگر مسلمانان اطراف فی کس صما سے ڈھائی سو سے کم کسی کا سالانہ وظیفہ نہ تھا ۔

۴ ۔ انہی کے عہد میں ابی بن کعب سید القراء نے نماز تراویح کی امامت شروع کی ۔

۵ ۔ یہی پہلے خلیفہ راشد ہیں جن کا لقب امیر المومنین ہوا ۔ سب سے پہلے اس خطاب سے عدی بن حاتم طائی اور لبید بن ربیعہ نے جناب فاروق کو مخاطب کیا پھر عمرو بن العاص اور مغیرہ بن شعبہ نے بھی تب جناب فاروق نے اس مسئلہ کو شوریٰ میں پیش کر دیا ۔ اس وقت فاروق کو خلیفہ خلیفہ رسول اللہ کہا کرتے تھے آپ نے فرمایا کہ آئندہ جانشینوں کے وقت میں یہ فقرہ اور بھی لمبا ہو جائے گا ۔ اس لیئے اس پر غور ضروری ہے غور کے بعد قرار پایا کہ سب اہل ایمان مومنین ہیں اور آپ سب برابر ہیں ۔ اس لیئے امیر المومنین ہی موزوں اور صحیح لقب ہے ۔ اسی پر عملدرآمد ہوا ۔ خلفاء راشدین عثمان و علی و حسن علیہم السلام بھی اسی لقب سے بجا طور پر ملقب ہوئے مگر بعد میں ہر ایک تخت نشین دخواہ بنو امیہ بنو عباس حکمران سپین و مصر نے بھی اس لقب کو اپنے نام کا جزو قرار دے لیا ۔

۶ ۔ یہ پہلے خلیفہ راشد ہیں جنہوں نے اپنے دوران حکومت میں ہر سال حج کیا ۔ اور حج ہی کے مواقع پر جملہ ولات ممالک اور حکام علاقجات اور قائدین عساکر کو جمع کیا کرتے تھے اُن کے جملہ افعال و اعمال کا تجسس کیا جاتا تھا ۔

۷۔ یوم الفتح کو بیعت کرنے والوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں یہی پیش کرنے والے تھے

قرض مرض الموت میں انہوں نے اپنے قرض کا حساب کرایا تو معلوم ہوا کہ ۸۶ ہزار روپیہ قرض کا دینا ہے۔ یہ قرض اُن کے جود و سخا۔ اور صرف فی سبیل اللہ کا نتیجہ تھا۔ ابن عمر کو اس کی ادائیگی کا ذمہ دار ٹھہرایا۔

حکومت پر عام رائے دس سال تک ایسی خلافت کی کہ بقول علی مرتضیٰ بعد کے جانشینوں کے لئے انہی کے نقش قدم پر چلنا دشوار تر تھا۔

اسم عمر کی اہلبیت میں قبولیت اور نفاذ

۱۔ علی مرتضیٰ نے اپنے ایک فرزند کا نام (جو ام البنین بنت حزام کے بطن سے ہیں اور عباس علمدار شہید کربلا کے مات بھائی بھی ہیں) عمر رکھا تھا جو علماء نسب میں عمر (اطراف) کے پتہ سے معروف ہیں۔

۲۔ امام زین العابدین کے ایک فرزند کا نام (جو زید شہید کے مات بھائی ہیں) عمر ہے اور علماء نسب میں وہ عمر اشرف کے پتہ سے معروف ہیں

۳۔ امام زین العابدین کے ایک پوتے کا نام (جو حسین بن علی اصغر بن زین العابدین کے فرزند ہیں) عمر تھا۔

۴۔ امام زین العابدین کے ایک نواسہ کا نام (جو خدیجہ خاتون بنت زین العابدین کے بطن اور محمد بن عمر بن علی کی نسل سے ہیں) عمر ہے اور ان کی نسل بلخ و خراسان میں بکثرت موجود ہے۔

۵۔ نسبط الرسول حسن علیہ السلام کے بارہ فرزندوں میں سے ایک کا نام عمر ہے۔

اس سے صاف طور پر واضح ہو جاتا ہے کہ آل رسول میں اسم عمر کس قدر مقبول و متبرک تھا۔ آج لوگ اگر علی مرتضیٰ، حسن مجتبےٰ اور سجاد زین العابدین کے عمل پر عمل نہ کریں تو اُن کی اپنی مرضی ہے۔

مشاہد غزوات

جملہ مشاہد و غزوات میں ملتزم رکاب نبوی تھے۔ کسی ایک مشہد میں بھی حضور سے علیحدہ نہیں ہوئے۔ احد و حنین کے غزوات میں اُن بزرگواروں میں سے تھے جنہوں نے میدان جنگ میں شہادت و استقلال کا کامل نمونہ دکھلایا۔ رضی اللہ عنہ

۴۔ امیر المومنین عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ

سرور عالم کے ساتھ نسب میں علی مرتضےٰ کے بعد سب سے اقرب عثمان ذوالنورین ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی ان کی نانی ہیں یہ دوہری قرابت ہے۔

ولادت ۶ سنہ عام الفیل۔ خلافت یکم محرم ۲۴ھ مدت خلافت ۱۲ سال سے ۱۲ روز کم۔ شہادت ۱۸ ذی الحجہ یوم الجمعہ ۳۵ھ عمر ۸۲ سال

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دختر رقیہ اور اُن کی وفات کے بعد ام کلثوم کے شوہر بنے اور اسی سے ذوالنورین کے لقب سے ملقب ہوئے۔

ذوالحجرتین ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

الذی نفسی بیدہ اِنّہ لَاَوّلُ مَنْ هَاجَرَ بَعْدَ اِبْرَاهِیْمَ وَلُوْطٍ (الحدیث)	اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ ابراہیم و لوطؑ کے بعد یہ سب سے پہلے شخص ہجرت کرنے والے ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے انہوں نے ۱۴۶ مرویات بیان کی ہیں متفق علیہ ۳ انفراد بخاری ۸ انفراد مسلم ۵۔

اللہ تعالیٰ نے ان کی خلافت میں امصار و بلدان کی فتوحات عظیمہ اہل اسلام کو ارزانی فرمائیں۔ فتح فارس کو مکمل کیا۔ خراسان و سجستان و مرو و کابل کو فتح کیا۔ افریقہ و بربر شامل ممالک اسلامیہ ہوئے۔ جزائر مالٹا، کریٹ، طرابلس فتح کیے۔ انہی کے عہد میں قوت بحری قائم کی گئی جس نے جزائر کو بھی فتح کیا۔ مشرق میں سائیبریا تک ان کی حکومت پہنچ گئی تھی۔

یہ جہاد بالمال میں سب سے پیش پیش تھے۔ جنگ تبوک میں انہوں نے ۹۵۰ شتر مکمل سامان کے ساتھ، ۵۰ فرس اور ایک ہزار دینار چندے میں دیئے تھے۔ ہر جمعہ کو ایک غلام آزاد کیا کرتے تھے۔ باغیان مصر نے جب ان کو محصور کیا تب بھی ۲۰ غلام آزاد کئے۔ ایام محاصرہ میں ان سے سوال کیا گیا کہ آپ تو امام الخلق ہیں۔ پھر باغیوں کے خلاف حکم کیوں نہیں دیتے۔ فرمایا میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک عہد کر چکا ہوں اور اسی عہد پر قائم ہوں جس روز آپ کو شہید کیا گیا اُسی روز انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا۔ فرماتے تھے، عثمان آج کا روزہ تم ہمارے پاس افطار کرو گے۔ روزہ سے تھے اور قرآن مجید کی تلاوت فرما رہے تھے جب باغیان نابہنجار نے آپ کو شہید کیا اس گناہ عظیم کا وبال اُمت محمدیہ پر ایسا پڑا کہ اس تاریخ سے محبت اور الفت اور اخوت و مصادقت اُڑ گئی۔ آج تک ہزاروں، لاکھوں مسلمان خود مسلمانوں کلمہ خوانوں کے ہاتھ سے قتل ہو چکے ہیں۔

وہ خاص شرف جو حضرت عثمان کو صحابہ میں امتیاز خاص عطا کرتا ہے خدمت قرآن پاک ہے آج جملہ عالم اسلام قرأت عثمانی اور ترتیب عثمانی پر متفق ہے۔ آج جو کوئی بھی قرآن مجید ہاتھ میں لیتا ہے وہ زیر بار احسان عثمان ذوالنورین ہے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۵۔ امیر المومنین علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ

سرور عالم کے ساتھ نسب میں اقرب جملہ صحابہ سے علی مرتضیٰ ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور علی مرتضیٰ کے دادا عبد المطلب ہیں اور علی مرتضیٰ کے والد ابو طالب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے والد عبد اللہ کے برادر شقیق (ایک ماں باپ سے) ہیں۔

عمر بوقت اسلام دس سال کی تھی۔ اسلام میں یوم نبوت کے پہلے ہی دن داخل ہوئے اور اسی روز طاہرہ خدیجۃ الکبریٰ اور عتیق ابو بکر صدیق بھی اسلام میں داخل ہوئے تھے۔

مواخات مکہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنا بھائی بنایا تھا یہ خصوصیت حضور کو دیگر بنی اعمام سے ممتاز کر دیتی ہے۔

علی مرتضیٰ اُن چار خلفاء میں سے ایک جو راشدین المہدیین کے لقب سے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان مبارک سے موصوف کئے گئے۔

اُن چھ میں سے پہلے ہیں جن کو فاروق نے اپنے آخری کلام میں شایان خلافت بتلایا۔

اُن دس میں سے ہیں جن کو نام بنام بشارت جنت اس زندگی میں ہی دے دی گئی تھی۔

آپ سیّدہ فاطمہ زہرا علیہا السلام جگر گوشہ رسولؐ کے زوج ہیں۔ ابو السبطین ہیں۔ امام حسن و امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے والد ہیں۔ جملہ مشاہدات میں ملتزم رکاب نبوی رہے۔ تبوک میں اس لئے حاضر نہ تھے کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو مدینہ منورہ میں چھوڑ دیا تھا۔

اسی سفر میں اَمَا تَرْضٰی اَنْ تَکُوْنَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَۃِ ھَارُوْنَ مِنْ مُوْسٰی غَیْرَ اَنَّہٗ لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ (صحیحین عن سعید بن ابی وقاص) کے شرف سے آپ کو مشرف فرمایا گیا۔

۔ بدر میں حضور نے شاندار کارنامے دکھلائے کفار کے نو سرداروں کو یکے بعد دیگرے حیدر کرار ہی نے خاک و خون میں سلا دیا اور جہنم میں پہنچا دیا۔

آپ بماہ ذی الحجہ ۳۵ھ خلیفہ ہوئے اور بامداد ۱۷ رمضان ۴۰ھ یوم جمعہ کو اشقی الناس ابن ملجم کے ہاتھ سے زخمی ہو کر بعمر ۶۳ سال یوم الاحد کو وصال رفیق اعلیٰ سے خورسند و کامیاب ہوئے۔

سیدہ زہرا فاطمہ بتول کے بطن سے دو فرزند (حسن و حسین)، دو دختران (ام کلثوم و زینب)، اور دیگر آٹھ ازواج سے ۱۸ بیٹے ۱۶ بیٹیاں حضور کی اولاد ہیں۔

ابوالحسن کنیت فرماتے تھے اور ابوتراب کنیت پر جو عطیۂ رسولؐ ہے مفتخر و شادماں ہوتے تھے۔

علم و عمل، زہد و ورع، شجاعت و مروّت میں حضور امام الخلق تھے۔

حلیہ مبارک

سفید سرخ، میانہ قد، اصلع، سر اور ریش مبارک کے بال سفید، تناور، شگفتہ رُکشادہ جبین، خنداں رُخ، حسین و جمیل، قوی بازو آہنی پنجہ۔

ترمذی میں ابوسعید خدری سے روایت ہے کہ منافقین کی شناخت ہم بُغض علیؓ سے کر لیتے ہیں۔

نہج البلاغت میں امیر المومنین نے فرمایا۔

سَیَھْلِکُ فِیَّ صِنْفَانِ مُحِبٌّ مُفْرِطٌ یَذْھَبُ بِہِ الْحُبُّ اِلٰی غَیْرِ الْحَقِّ وَمُبْغِضٌ مُفْرِطٌ یَذْھَبُ بِہِ الْبُغْضُ اِلٰی غَیْرِ الْحَقِّ وَخَیْرُ النَّاسِ فِیَّ حَالًا النَّمَطُ الْاَوْسَطُ

میرے بارہ میں دو گروہ ہلاک ہوں گے۔ محب جو افراط تک پہنچ جائے اسے محبت ہی غیر حق کی طرف لے جائے گی اور مبغض جو تفریط پر ہو۔ اُسے بغض ہی غیر حق کی طرف لے جائے گا۔ میرے متعلق سب میں بہتر وہ ہے جو درمیانی راہ پر چلنے والا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے حضور نے ۵۸۶ روایات بیان کی ہیں۔ ان میں سے ۔ متفق علیہ اور ۹ صرف بخاری اور ۱۵ صرف مسلم میں ہیں۔

صحابہ میں سے بزرگوارانِ ذیل نے حضور سے روایت حدیث کی ہے۔ امام حسن، امام حسین محمد بن الحنفیہ، ابن مسعود ابن عمر، ابن عباس ابوموسیٰ اشعری، عبداللہ بن جعفر طیار، عبداللہ بن زبیر، ابوسعید، زید بن ارقم، جابر بن عبداللہ، ابوامامہ، صہیب۔ ابورافع، ابوہریرہ، جابر بن سمرہ، حذیفہ بن اسید، سفینہ، عمرو بن حریث، ابویعلی، براء بن عازب، طارق بن شہاب۔ طارق بن اشیم۔ جریر بن عبداللہ، عمارہ بن رویبۃ، ابوالطفیل، عبدالرحمٰن بن ابزی، بشر بن سحیم، ابوجحیفہ،

تابعین میں سے خلائق کثیر نے حضور سے روایت کی ہے۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں ہم لوگ کہا کرتے تھے کہ اہل مدینہ میں سب

سے بڑے قاضی (جج) علی مرتضیٰ ہیں۔

علی کو ۹/۱۰ حصے علم کے ملے تھے اور دسویں حصہ میں بھی وہ دوسروں کے ساتھ شریک تھے۔ ابن عباس کہا کرتے کہ جب کوئی مسئلہ ہم کو علی مرتضیٰ سے مل جاتا تو پھر دوسرے سے اس کی بابت پوچھنے کی ضرورت نہ رہتی۔

ابن المسیب رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ علی مرتضیٰ کے سوا اصحابہ میں سے اور کوئی بھی نہیں کہا کرتا تھا سلونی (مجھ سے پوچھ لو جو پوچھنا ہے)

آپ کے فضائل میں سے صحیحین کی حدیث عن سہل بن سعد ہے کہ نبی اللہ نے خیبر میں فرمایا تھا۔

لَاُعْطِیَنَّ الرَّایَۃَ غَدًا رَجُلًا یَفْتَحُ اللّٰہُ عَلٰی یَدَیْہِ یُحِبُّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ یُحِبُّہُ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ — میں کل نشان فوج اُس شخص کو دوں گا جس کے ہاتھ پر اللہ تعالیٰ فتح دے گا۔ وہ اللہ اور رسولؐ سے محبت رکھتا ہے اور اللہ رسول اس سے محبت رکھتے ہیں

اگلے روز یہ رایت لشکر علی مرتضیٰ کے سپرد کیا گیا۔

آپ کے کمال زہد میں سے یہ تھا کہ کبھی آپ نے اپنے لئے کوئی عمارت نہیں بنائی اور ہزاروں کی آمدنی ہونے پر بھی کبھی کچھ جمع نہیں کیا۔ بوقت شہادت آپ کے خزانہ میں صرف ۶۰۰ درہم پائے گئے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۵۔ ارقم بن ابو الارقمؓ

(عبد مناف) بن اسد بن عبد اللہ بن عمرو بن مخزوم بن یقظہ بن مرہ بن کعب بن لوی القرشی المخزومی

ان کی والدہ بنو سہم میں سے ہیں۔ ابو عبد اللہ کنیت۔ قدیم الاسلام اور مہاجرین اوّلین میں سے ہیں۔ یہ اسلام میں ساتویں یا گیارھویں ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے گھر کو دار التبلیغ بنایا تھا۔ یہ گھر کوہ صفا پر تھا۔ اس گھر میں جماعت کثیرہ داخل اسلام ہوئی۔

عمر فاروق اُن میں سے آخری ہیں۔

یہ حلف الفضول کے قائم کرنے والوں میں سے ہیں۔

ان کا انتقال اسی روز ہوا جس روز ابوبکر صدیق کا انتقال ہوا تھا۔

بعض نے ان کا سن وفات ۵۵ھ بتایا ہے اور اندریں صورت بیوم وفات صدیق ان کے والد کا انتقال ہونا سمجھا جاتا ہے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۶۔ ایاس بن البکیر رضی اللہ عنہ

یہ قبیلہ بنو لیث سے ہیں، بنو عدی (قبیلہ عمر فاروق) کے حلیف تھے۔

ایاس بدر واحد اور خندق اور دیگر جملہ مشاہد میں ہمرکاب نبوی حاضر ہوئے۔

جن دنوں نبی صلی اللہ علیہ وسلم ارقم بن ابی ارقم رضی اللہ عنہ کے گھر میں چپکے چپکے تبلیغ اسلام فرمایا کرتے تھے انہی دنوں میں ایاس معہ برادر خود خالد کے داخل اسلام ہوئے تھے اور غزوہ بدر میں معہ ہرسہ برادران خود خالد، عامر اور عاقل حاضر ہوئے تھے۔

یہ شاعر بھی تھے ان کا بیٹا محمد بن ایاس ابن عباس و ابن عمر و ابو ہریرہ سے حدیث مَنْ طَلَّقَ اِمْرَاَتَہٗ ثَلَاثًا قَبْلَ اَنْ یَّمَسَّہَا اَنَّہَا لَا تَحِلُّ لَہٗ روایت کیا کرتا تھا۔ ترجمہ حدیث یہ ہے کہ جس نے اپنی عورت کو ہاتھ لگانے سے پہلے پہلے تین طلاق دیدی ہو پھر وہ اسے حلال نہیں رہتی

۷۔ بلال حبشی رضی اللہ عنہ

حبشی النسل ہیں، لمبا قد، چھریرا بدن، رنگ گہرا سانولا۔ موضع سراۃ (ریا مکہ) میں پیدا ہوئے۔ یہ اُن سات سابقین میں سے ہیں جو ابتدا اسلام ہی میں مسلمان ہو گئے تھے۔ اسلام کے لئے ان پر سخت سخت ظلم ہوئے۔ ایذائیں دی گئیں۔ شریر لڑکے ان کو جانور کی طرح لئے پھرتے تھے اور یہ احد احد ہی کے نعرے لگاتے یا اللہ ہی پکارا کرتے تھے۔ ایک روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھ پایا کہ اُن کو سخت ایذا دی جاتی ہے۔ ابوبکر صدیق سے فرمایا کہ اگر روپیہ ہوتا تو بلالؓ کو خرید لیا جاتا۔ صدیق نے حضرت عباس سے جا کر کہا کہ مجھے بلال خرید دو۔ حضرت عباس نے پانچ یا سات یا ۹ چھٹانک چاندی کے بدلے ان کو خرید لیا۔ صدیق نے ان کو آزاد کر دیا۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مؤذن اور ابوبکرؓ کے خازن تھے۔ ابو عبداللہ یا ابو عبد الکریم۔ یا ابو عبدالرحمٰن ان کی کنیت تھی۔

ان کے والد کا نام رباح، ماں کا نام حمامہ بھائی کا نام خالد، بہن کا نام عفرہ تھا۔ وفات صدیقؓ کے بعد یہ جہاد شام میں شریک ہوئے اور دمشق میں ۲۰ھ کو بعمر ۶۳ سال وفات پائی اور باب صغیر کی طرف مدفون ہوئے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۸۔ حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ

قبیلہ لخم بن عدی سے تھے اور زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کے حلیف تھے۔ یہ عبداللہ بن حمید کے غلام تھے۔ اپنی قیمت ادا کر کے انہوں نے آزادی حاصل کر لی تھی۔ غزوات بدر اور حدیبیہ میں حاضر ہوئے۔

۶ھ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مقوقس شاہ مصر و اسکندریہ کے پاس اپنا سفیر بنا کر بھیجا تھا۔ ایک دن بادشاہ نے جو عیسائی المذہب تھا کہا کہ اگر محمد نبی اللہ ہیں تو قوم نے ان کو مکہ سے کیونکر نکال دیا۔ حاطب نے فرمایا مسیح کی بابت تو تمہارا عقیدہ بہت کچھ ہے۔ پھر قوم نے ان کو کیونکر پھانسی پر چڑھا دیا۔ بادشاہ اور پادری جواب سے عاجز رہ گئے۔ ابوبکر صدیقؓ نے بھی ان کو بار دوم مقوقس کے پاس سفیر بنا کر بھیجا تھا۔

انہوں نے ۳۰ھ میں مدینہ منورہ کے اندر وفات پائی اور امیر المومنین حضرت عثمانؓ نے ان کی نماز جنازہ ادا کی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۹۔ امیر المومنین حمزہ بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ہیں۔ ۶ نبوت کو اسلام لائے۔ یہ آنحضرتؐ کے برادر رضاعی بھی ہیں۔ یعنی ہر دو نے ثویبہ کا دودھ پیا تھا جنگ بدر میں شجاعت و مردانگی کے اعلیٰ جوہر دکھلائے۔ جنگ احد میں بھی بڑے بڑے دشمنوں کو خاک و خون میں سلایا۔ وحشی غلام نے ایک پتھر کے پیچھے چھپ کر بزدلانہ حملہ ان پر کیا۔ زخم ناف کے قریب ہوا شہید ہو گئے۔ دشمنوں نے ان کا جگر نکالا۔ کان کاٹے، چہرہ بگاڑا، پیٹ چاک کر ڈالا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حال دیکھا تو سخت اندوہگین ہوئے اور سید الشہدا اور اسد اللہ و رسولہ کا خطاب عطا فرمایا۔ ان کے دو فرزند عمارہ اور یعلی تھے۔ عمارہ کا ایک فرزند حمزہ ہوا اور یعلی کے ۵ فرزند ہوئے یہ نسل آگے نہ چلی۔

امیر حمزہ کی دو لڑکیاں تھیں۔ امُ الفضل جن سے عبداللہ بن شداد نے ایک حدیث روایت کی ہے۔

امامہ جس کا نکاح سلمہ فرزند ام المومنین ام سلمہ کے ساتھ ہوا تھا۔ اُسی کے حق حضانت کے متعلق سیدنا علی و سیدنا جعفر و سیدنا زید رضی اللہ عنہم نے اپنے اپنے دلائل بارگاہ نبوی میں پیش کئے تھے۔

۱۰۔ خنیس بن حذافہ رضی اللہ عنہ

یہ قرشی السہمی ہیں۔ ام المومنین حفصہ کا نکاح اوّل انہی کے ساتھ ہوا تھا۔ انہوں نے ہجرت حبشہ بھی کی تھی اور وہاں سے واپس آکر جنگ بدر میں شامل ہوئے تھے۔ جنگ احد میں مجروح ہوئے اور انہی زخموں سے مدینہ میں وفات پائی۔ مہاجرین آولین میں ان کا شمار ہے۔

عبداللہ بن حذافہ السہمی ان کے حقیقی بھائی ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان کسریٰ ایران کے پاس لے کر گئے تھے ابوالاخنس تیسرے بھائی ہیں یہ سب مہاجرین اولین میں سے ہیں۔

۱۱۔ ربیعہ بن اکثم بن سخبرۃ الاسدی

یہ بنو اسد بن خزیمہ کے قبیلہ سے ہیں۔ خزیمہ کا نام نسب نامہ نبوی میں نمبر ۱۵ پر ہے

یہ بنو عبد شمس کے حلیف بھی تھے۔ پست قامت مگر بلند ہمت۔ ۳۰ سال کی عمر تھی جب بدر میں شامل ہوئے پھر احد، خندق اور حدیبیہ میں بھی حاضر تھے۔ جنگ خیبر میں قلعہ نطاۃ پر حارث یہودی کے ہاتھ سے مقتول ہو کر درجہ شہادت کو فائز ہوئے رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۱۲۔ زاہر بن حرام الاشجعی رضی اللہ عنہ

حجاز کے رہنے والے تھے مگر بادیہ نشین تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جب آتے تو کوئی نہ کوئی تحفہ لے کر آتے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر ایک شہری کا کوئی نہ کوئی جنگل کا رہنے والا دوست ہوتا ہے آلِ محمد کا جانگلی دوست زاہر بن حرام ہے۔

ایک روز بازار مدینہ میں کھڑے تھے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پیچھے سے آ گئے۔ اس کی آنکھوں پر اپنے دست مبارک رکھ دیئے اور فرمایا اس غلام کو کون خریدتا ہے وہ بولا کہ حضور تب تو میں بہت ہی کم قیمت ثابت ہوں گا فرمایا نہیں تو بارگاہ الٰہی میں بہت قیمتی ہے۔

آخر عمر میں یہ کوفہ میں جا آباد ہوئے تھے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۱۳۔ زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ

زبیر رضی اللہ عنہ ام المومنین خدیجۃ الکبریٰ کے برادر زادہ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پھوپھیرے بھائی۔ یعنی صفیہ بنت عبدالمطلب کے بیٹے۔ ابوبکر صدیق کے داماد یعنی اسماء بنت ابوبکر کے شوہر ہیں۔ امام عروہ بن زبیر کی روایت میں ہے کہ زبیر کی ۱۶ سال کی عمر تھی جب داخل اسلام ہوئے۔ یہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے راہ خدا میں شمشیر کو میان سے نکالا اور دو دفعہ (احد و قریظہ) میں ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فَدَاكَ اَبِیْ وَاُمِّیْ فرمایا۔ ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا حواری فرمایا ہے اور علی مرتضیٰ ان کو اشجع العرب کہا کرتے تھے۔ حسان بن ثابت نے ان کو جملہ صحابہ پر ترجیح دی ہے جیسا کہ جعفر طیار کی نسبت ابوہریرہؓ نے ایسا ہی کہا ہے۔ یہ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں۔ یہ اُن چھ میں سے ہیں جن کو فاروقؓ نے اپنے بعد شایانِ خلافت بتایا یا یہ بہت بڑے امیر اور بہت بڑے سخی تھے۔ ان کے پاس ایک ہزار غلام تھے جن کی سب آمدنی راہ خدا میں صرف ہوتی تھی۔

ان سے غلطی یہ ہوئی کہ جنگ جمل میں امیر المومنین علی مرتضیٰ سے مقابلہ میں نکلے۔ مگر جناب امیر نے ان کو ایک حدیث نبوی یاد دلائی تو تائب و نادم ہو کر جنگ سے علیحدہ ہو گئے۔ عمرو ابن جرموز نے فریب دے کر ان کا سر کاٹا اور علی مرتضیٰ کے پاس لایا فرمایا مجھے رسول اللہ نے فرمایا تھا کہ قاتل زبیر کو دوزخ کی بشارت دے دینا۔ یہ جملہ مشاہد میں ملتزم رکاب نبوی رہے۔ ان کی قبر بصرہ کے متصل ہے۔

عبداللہ بن زبیر امیر معاویہ کے بعد والی حجاز ہوئے اور گیارہ سال تک سلطنت کی اور بالآخر حجاج بن یوسف کے حملہ میں شہید ہوئے۔

عروہ بن زبیر ائمہ حدیث میں سے ہیں حضرت زبیر کے کل دس فرزند تھے۔

ان کی شہادت ۱۰ جمادی الاوّل ۳۶ یوم الخمیس کو بعمر ۶۷ سال ہوئی رضی اللہ عنہ

۱۴۔ زید بن خطاب القرشی العدوی

عمر فاروق کے بھائی ہیں۔ زید کی والدہ اسماء بنت وہب ہے اور عمر کی والدہ حنتمہ بنت ہاشم۔

زید قد کے بہت لانبے تھے ان کا اسلام حضرت عمر کے اسلام سے پہلے کا ہے۔ بدر، احد، خندق بیعت الرضوان اور جملہ مشاہد میں ہمرکاب نبوی رہے۔

یہ اُس لشکر کے علمبردار تھے جو مسیلمہ کے مقابلہ میں حضرت صدیق نے روانہ کیا تھا۔ دشمن کے ایک حملہ میں ان کا لشکر متفرق ہوگیا تو انہوں نے کہا کہ اب مرد مرد نہیں رہے پھر بلند ترین آواز سے کہا۔ الٰہی میں اپنے ساتھیوں کے فرار کا تیرے حضور میں عذر پیش کرتا ہوں اور مسیلمہ اور محکم بن طفیل کی سازشوں سے برات کا اظہار کرتا ہوں۔

یہ آگے بڑھے حملہ کیا اور مرتدین و کافرین کو قتل کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ ان سے دو حدیثیں مروی ہیں۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۱۵۔ زیاد بن کعب بن عمرو

یہ بنو کلیب جہنی ہیں۔ بدر و اُحد میں حاضر ہوئے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۱۶۔ سالم بن معقل رضی اللہ عنہ

یہ اصلی باشندے اصطخر کے تھے بعض نے ان کا وطن موضع کرمد (علاقہ فارس) بھی لکھا ہے۔ ثبیتہ بنت تعار انصاریہ کے غلام تھے۔ یہ خاتون ابو حذیفہ بن عتبہ بن ربیعہ بن عبد شمس بن عبد مناف کی زوجہ ہیں۔ انہوں نے ان کو آزاد کر دیا اور ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ نے ان کو اپنی تربیت میں لے لیا حتیٰ کہ متبنیٰ بنا لیا جب تنسیخ تبنیت کا حکم اُترا۔ تو اپنی برادر زادی فاطمہ بنت ولید بن عتبہ قرشیہ کا نکاح ان سے کر دیا۔

حضرت سالم کو انصاری اس لئے کہتے ہیں کہ وہ انصاریہ کے آزاد کردہ تھے اور مہاجر اس لئے شمار کرتے ہیں کہ انہوں نے مکّہ میں ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ کے ہاں پرورش پائی اور مکّہ سے ہجرت کر کے اُس قافلہ میں مدینہ منورہ پہنچے جس میں عمر فاروق بھی شامل تھے۔

ان کا شمار فضلاء الموالی اور خیار الصحابہ اور کبار الصحابہ میں کیا جاتا ہے۔

ان کو عجمی اصل وطن کے لحاظ سے کہا جاتا ہے۔ قرآن مجید کے جید قاری تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے معلمین قرآن میں ان کے نام کا تعین فرمایا تھا۔ بدر میں حاضر تھے۔

۱۲ھ کو جنگ یمامہ میں یہ اور ان کے مربی ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ شہید ہوئے۔

سالم کا سر ابو حذیفہ کے پاؤں کی جانب تھا۔ رضی اللہ عنہ

۱۷۔ سائب بن مظعون القرشی الجمحی رضی اللہ عنہ

سائب بن مظعون بن حبیب بن حذافہ بن جمح

عثمان بن مظعون کے برادر حقیقی ہیں۔ ہجرت حبشہ و ہجرت مدینہ کی وجہ سے ذوالہجرتین ہیں۔ بدر میں شامل تھے۔ سال وفات معلوم نہیں ہو سکا۔

سائب اور عثمان ہر دو بھائیوں کی نسل منقطع ہو گئی۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۱۸۔ سائب بن عثمان بن مظعون القرشی الجمحی

یہ سائب بن مظعون کے برادر زادے ہیں۔ ان کے والد عثمان بن مظعون اور ان کے چچاؤں قدامہ عبداللہ اور سائب نے ہجرت حبشہ کی تھی، یہ بھی حبشہ کی ہجرت دوم میں شامل تھے۔

یوم الیمامہ کو شہید ہوئے اس وقت ان کی عمر تیس سال سے اوپر تھی رضی اللہ تعالیٰ عنہم

۱۹۔ سبرہ بن فاتک الاسدی

ان کا شمار باشندگان شام میں ہوتا ہے یہ اور ان کے بھائی خریم بن فاتک دونوں بدری ہیں۔ بشر بن عبداللہ اور جبیر بن نصیر نے ان سے روایت حدیث کی ہے۔ رضی اللہ عنہ

۲۰۔ سعد بن ابی وقاص قرشی الزہری

سعد بن مالک بن اہیب بن عبد مناف بن زہرہ بن کلاب

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب نامہ میں کلاب کے ساتھ شامل ہو جاتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کو ماموں کہا کرتے تھے۔ اسلام میں یہ ساتویں ہیں ان سے پہلے صرف چھ کس مسلمان ہوئے تھے۔ بوقت اسلام ان کی عمر ۱۹ سال کی تھی۔ یہ اُن دس میں سے ہیں جن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت کی بشارت دی۔ اُن چھ میں سے ہیں جن کو عمرؓ نے شایان خلافت بتلایا۔ یہ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے راہ خدا میں تیر اندازی کی۔

فاتح ایران اور بانی کوفہ بھی یہی ہیں۔ خلافت فاروقی میں یہ دوبارہ امارت کوفہ پر متمکن ہوئے۔ اور ایک بار خلافت عثمانیہ میں بھی امیر کوفہ بنائے گئے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے حق میں دعا فرمائی تھی اَللّٰھُمَّ اَجِبْ دَعْوَتَہٗ وَسَدِّدْ رَمْیَہٗ الٰہی اس کی دعا قبول فرمایا کر۔ اور اس کی تیر اندازی درست رہے۔

ایک بار حضورؐ نے فرمایا تھا "میرے ماں باپ تجھ پر قربان تیر چلاؤ" یہ ایسا فقرہ ہے جو زبیر بن العوام اور ان کے سوا حضورؐ نے کسی دوسرے کو نہیں فرمایا۔

ایام فتنہ میں یہ سب سے الگ رہے وادی عقیق میں انہوں نے مدینہ سے دس میل کے فاصلہ پر محل بنا رکھا تھا وہیں رہتے۔ سب سے کہہ دیا تھا کہ مسلمانوں کے اختلاف اور جنگ کی کوئی بات مجھے نہ سنایا کرو۔

ان سے مرویات حدیث کی تعداد ۲۷۰، متفق علیہ ۱۵ بخاری ۵ مسلم ۸ ہیں۔

۵۵ھ میں بعمر ۸۷ سال وفات پائی۔ مدینہ میں دفن ہوئے۔ جملہ مشاہد میں ہم رکاب نبوی رہے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۲۱۔ سعد بن خولی رضی اللہ عنہ

یمن کے باشندے تھے اور بنو عامر بن لوئی کے حلیف تھے ان کا شمار مہاجرین اولین میں ہے۔ بدر میں حاضر تھے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۲۲۔ سعید بن زید بن عمرو بن نفیل قرشی العدوی رضی اللہ عنہ

عمر فاروق کے چچیرے بھائی ہیں اور فاطمہ اخت عمر کے شوہر ہیں۔ فاطمہ ہی کے ذریعہ سے عمر فاروق اسلام تک پہنچے تھے۔ یہ مہاجرین اولین سے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بدر کے موقعہ پر کسی خدمت کے لئے بجانب شام بھیجا تھا۔ غنیمت بدر میں سے ان کو حصہ دیا گیا۔ دیگر جملہ مشاہد میں یہ ملتزم رکاب نبوی رہے یہ اُن دس میں سے ہیں جن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بشارت جنت عطا فرمائی تھی۔

ان کے والد زید بن عمرو بن نفیل اُن بزرگوں میں سے ہیں جنہوں نے دین ابراہیمی کی تلاش میں موصل، شام وغیرہ کے سفر کئے تھے۔ ایک راہب نے اُن سے عیسائی ہو جانے کو کہا یہ بولے کہ مجھے ابراہیم علیہ السلام کا خالص دین مطلوب ہے مگر وہ بولا کہ جہاں سے تم آئے ہو۔ یہ دین وہیں کا ہے بعثت نبوی سے پیشتر ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ یہ بزرگ بتوں اور استھانوں کے چڑھاوے کا گوشت نہیں کھایا کرتے تھے۔

سعید رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے والد کے حالات جتا کر درخواست کی کہ حضورؐ ان کے لیے دعائے مغفرت عطا فرمائیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے دعا فرمائی تھی۔

حضرت سعید بن زید کو امیر المومنین عثمان رضی اللہ عنہ نے کوفہ میں ایک جاگیر عطا فرمادی تھی جو دیر تک ان کی اولاد کے پاس رہی۔

حضرت سعید بن زید نے ۵۱ھ میں بمقام وادی عقیق وفات پائی اور مدینہ میں مدفون ہوئے۔

۲۳۔ سلیط بن عمرو القرشی العامری

سلیط بن عمرو بن عبد شمس بن عبدود بن نصر بن مالک بن حسل بن عامر بن لوی

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نسب نامہ میں لوی میں شامل ہو جاتے ہیں۔

مہاجرین اولین میں سے ہیں ہجرت حبشہ وہجرت مدینہ سے مشرف ہوئے موسیٰ بن عقبہ کہتے ہیں کہ بدر میں شامل ہوئے۔

ابن اسحٰق کا بیان ہے کہ ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہوذہ بن علی حنفی کے پاس اپنا سفیر بنا کر بھیجا تھا۔ ابن ہشام کہتے ہیں کہ ثمامہ بن اثال رئیس نجد کے پاس بھی بطور سفارت گئے تھے۔

۱۲ھ میں شہید ہوئے رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۲۴۔ سوید بن مخشی الطائی

ابو مخشی کنیت سے مشہور ہیں بدر میں شامل ہوئے رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۲۵۔ سویبط بن سعد القرشی العبدری

سویبط بن سعد بن حرملہ بن مالک بن عمیلہ بن سباق بن عبدالدار بن قصی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کا نسب قصی میں شامل ہو جاتا ہے یہ مہاجرین حبشہ میں سے بھی ہیں۔ بڑے خوش مذاق اور خوش طبع تھے۔

بدر میں شامل ہوئے رضی اللہ عنہ

۲۶۔ سہیل بن بیضاء القرشی الفہری

سہل بن وہب بن ربیعہ بن عمرو بن عامر بن ربیعہ بن ہلال بن اہیب بن مالک بن ضبہ بن حارث بن فہر

ان کی والدہ بیضاء کا نام دعد ہے اور اس کا نسب بھی ضبہ بن الحارث میں شوہر کیساتھ جا ملتا ہے۔ سہل کا نسب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کیساتھ فہر ملا میں جا ملتا ہے۔

سہیل و صفوان ان کے دونوں بھائی بھی صحابی ہیں۔

سہل ان بزرگوں میں سے ہیں جو مکہ میں اسلام لائے تھے مگر یہ اپنے ایمان کو چھپاتے تھے۔ بدر میں کفار ان کو اپنے ساتھ لے گئے تھے ابن مسعود نے شہادت دی کہ انہوں نے سہل کو نماز پڑھتے دیکھا، حضور نے ان کو اسیری سے رہائی فرمائی تھی۔

سہل ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے صحیفہ قریش کی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ہاشمیہ کے خلاف لکھا گیا تھا۔ مخالفت کی تھی۔ ان کے نام یہ ہیں۔

۱۔ ہشام بن عمرو بن ربیعہ ۲۔ مطعم بن عدی بن نوفل ۳۔ زمعہ بن اسود بن مطلب بن اسد ۴۔ ابوالبختری بن ہشام بن حارث بن اسد ۵۔ زہیر بن ابو امیہ بن مغیرہ۔

ان کا انتقال مدینہ میں ہوا۔ یہ باصطلاح علماء بدری نہیں گو اس وقت مسلمان ہی تھے۔

۲۷۔ شجاع بن ابی وہب الاسدی

شجاع بن ابی وہب (ابن وہب)، بن ربیعہ بن اسد بن صہیب بن مالک بن کثیر (کبیر) بن غنم بن دودان بن اسد بن خزیمہ

ان کا نسب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خزیمہ میں شامل ہو جاتا ہے یہ بھی حبش کو ہجرت ثانیہ میں گئے تھے اور پھر یہ سن کر کہ اہل مکہ مسلمان ہو گئے ہیں حبش سے واپس آ گئے تھے۔

یہ اور ان کے بھائی عقبہ بن ابی وہب بدر اور دیگر جملہ مشاہد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حاضر رہے۔ مواخات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ابن خولی کا بھائی بنایا تھا۔

یہی وہ بزرگ ہیں جو حارث بن ابی شمر غسانی اور جبلہ بن ایہم غسانی کے پاس سفیر نبوی ہو کر گئے تھے۔ یہ لانبے قد اور چھریرے بدن کے انسان تھے۔

یوم یمامہ کو شہید ہوئے اسوقت ان کی عمر چالیس سال سے کچھ اوپر تھی رضی اللہ عنہ

۲۸۔ شقران حبشی

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے غسل میت میں حاضر تھے۔

ان کی نسل ہارون الرشید کے عہد میں ختم ہو گئی تھی۔ ان کا نام صالح ہے رضی اللہ عنہ

۲۹۔ شماس بن عثمان بن شرید القرشی المخزومی

شماس ان کا لقب ہے۔ اصلی نام عثمان تھا لقب سے ہی مشہور ہیں۔ ان کی والدہ صفیہ بن ربیعہ بن عبد شمس ہے۔ مہاجرین حبشہ میں سے ہیں بدر میں حاضر ہوئے۔ احد میں سخت زخمی ہوئے۔

میدان جنگ سے ان کو مدینہ میں بھیج دیا گیا۔ وہاں ایک دن رات زندہ رہے ام سلمہ رضی اللہ عنہا ان کی تیمارداری کرتی رہیں۔ پھر جب جاں بحق ہوئے تو مدینہ سے حسب الحکم نبوی احد میں لائے گئے اور شہیدان احد کے ساتھ مدفون ہوئے۔

جنگ احد میں اتنی جان توڑ کر لڑے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم چپ و راست جدھر نظر مبارک اٹھا کر دیکھتے شماس ہی تلوار چلاتا ہوا نظر آتا تھا۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۳۰۔ صفوان بن بیضاء القرشی الفہری

صفون بن بیضاء (کانت امہ) وہو صفوان بن وہب بن ربیعہ بن ہلال بن وہب بن ضبہ بن حارث بن فہر بن مالک

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ نسب میں فہر کے ساتھ جا ملتے ہیں۔

یہ اور اُن کے بھائی سہیل بن وہب دونوں بدر میں حاضر تھے۔ ان کی وفات پر اختلاف ہے بعض نے لکھا ہے کہ رمضان ۳۸ھ میں انتقال ہوا۔ اور بعض نے لکھا ہے کہ وہ بدر میں شہید ہوئے یہ مواخات میں رافع بن عجلان کے بھائی تھے اور دونوں بدر میں شہید ہوئے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۳۱۔ صہیب بن سنان الرومیؓ

بلحاظ نسل یہ عرب تھے اور نمر بن قاسط سے ان کا سلسلہ کنیت جا ملتا ہے ان کا والد سنان بن مالک یا ان کا چچا سلطنت ایران کی طرف سے حاکم ابلہ تھا ان کی رہائش موصل کے متصل تھی۔

اہل روما نے اس علاقہ پر حملہ کیا۔ اس وقت صہیب بہت ہی کم عمر تھے پکڑے گئے پھر قبیلہ کلب میں سے کسی نے ان کو خرید کر مکہ میں فروخت کر دیا۔ عبداللہ بن جدعان تیمی نے ان کو آزاد کر دیا۔ یہ مکہ ہی میں رہنے لگ گئے۔ ان کا چہرہ بہت سرخ رنگ کا تھا۔ رومی زبان خوب جانتے تھے۔ یہ اور عمار بن یاسر ایک ہی دن داخل اسلام ہوئے تھے۔ ان سے پیشتر تیس اور چند کس مسلمان ہو چکے تھے۔ حمران بن ابان جو حضرت عثمانؓ کے آزاد کردہ غلام ہیں صہیب کے چچیرے بھائی گنتے ہیں انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہجرت کی۔ قریش نے کہا کہ تم خود بھی چلے اور اپنا مال بھی جو یہاں بیٹھ کر کمایا ہے لیتے چلے صہیب رضی اللہ عنہ نے اپنا مال قریش کے حوالہ کر دیا کہتے ہیں کہ آیت وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّشۡرِیۡ نَفۡسَہُ ابۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِ اللّٰہِ کا نزول انہی کے واقعہ پر ہوا ہے۔ صہیب کی نشست و برخاست قبل از نبوت بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہتی تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صہیب کو سابق الروم، سلمان کو سابق فارس اور بلال کو سابق الحبشہ فرمایا ہے۔ ایک حدیث میں ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو کوئی اللہ پر اور قیامت پر ایمان رکھتا ہے وہ صہیب سے محبت کیا کرے۔ ایسی محبت جیسی والدہ کو اپنے بچہ سے ہوتی ہے سفر ہجرت میں یہ اور علی مرتضیٰ دونوں ہمسفر تھے ان کے مزاج میں ظرافت تھی۔ ایک روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کھجور کھا رہے تھے صہیب بھی شامل ہو گئے۔ حضور نے فرمایا تیری آنکھ دکھتی ہے پھر بھی کھجور کھاتا ہے۔ انہوں نے عرض کیا کہ میں تو دوسری طرف کے جبڑے سے کھا رہا ہوں جس طرف کی آنکھ نہیں دکھتی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کھل کھلا کر ہنس پڑے

حضرت فاروق نے زخمی ہو جانے کے بعد حضرت صہیب کو امام نماز مقرر فرمایا تھا۔ فرمایا کہ جب تک کسی خلیفہ کا تقرر نہ ہو صہیب نماز پڑھایا کریں۔

ان کا انتقال شوال ۳۹ھ میں بعمر (۷۳) سال مدینہ میں ہوا۔ ان کی سخاوت بہت بڑھی ہوئی تھی۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۳۲۔ طفیل بن حارث القرشی المطلبی رضی اللہ عنہ

طفیل بن حارث بن مطلب بن عبد مناف بن قصی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سلسلہ نسب میں عبدمناف میں شامل ہوجاتے ہیں۔

بدر میں طفیل اور حصین اور عبیدہ تینوں بھائی شامل تھے۔ عبیدہ رضی اللہ عنہ تو بدر ہی میں شہید ہو گئے تھے۔ طفیل اور حصین جملہ مشاہد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب رہے۔

دونوں بھائیوں نے ۳۲ھ میں انتقال کیا طفیل پہلے اور حصین ان سے چار ماہ بعد جنت کو سدھارے تھے۔ رضی اللہ عنہم

۴۳۔ طلحہ بن عبید اللہ القرشی التیمی رض

طلحہ بن عبید اللہ بن عثمان بن عمرو بن کعب بن سعد بن تیم بن مرہ بن کعب بن لؤی بن غالب

نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ ان کا سلسلہ نسب کعب بن لوی میں شامل ہوجاتا ہے یہ از عشرہ مبشرہ ہیں۔

جنگ بدر سے پیشتر ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سرحد شام میں ادھر کے حالات معلوم کرنے کے لیے بھیجا تھا اس لیے غزوہ بدر میں شامل نہ تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حصہ شمولیت بھی دیا اور اجر کے عطیہ کی بشارت بھی دی۔ ان کو طلحۃ الخیر اور طلحۃ الفیاض کہتے ہیں۔ جنگ احد میں انہوں نے شجاعت اور ایثار کے بڑے بڑے جوہر دکھلائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت میں خود سامنے سپر بنے رہے۔ ایک ہاتھ سے دشمن کے نیزہ کا وار روکا۔ وہ ہاتھ شل ہوگیا۔ دیگر جملہ مشاہد میں بھی یہ ملتزم رکاب مصطفوی رہے۔ یہ اُن چھ میں سے ایک ہیں جن کو عمر فاروق نے شایان خلافت قرار دیا تھا۔

یہ جنگ جمل میں حضرت علی مرتضیٰ کے مقابلہ میں اترے علی مرتضیٰ نے میدان جنگ میں اُن کو بلایا اور واقعات سابقہ یاد دلائے اور یہ جنگ سے علیحدہ ہوگئے اس وقت مروان نے ان کے سینہ میں تیر مارا اور اُسی زخم سے ان کا انتقال ہوا۔ یہ صف جنگ سے علیحدہ ہوئے تو یہ شعر پڑھ رہے تھے۔

ندامۃ السعی لما شربت رضی بن جرم فیہ عمی

علی مرتضیٰ نے فرمایا مجھے اُمید ہے کہ میں اور عثمان اور طلحہ اور زبیر اس آیت کے مصداق بنیں گے وَنَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیْنَ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دیکھ کر ایک بار فرمایا تھا جو کوئی زندہ شہید کو دیکھنا چاہے وہ طلحہ کو دیکھ لے۔ بوقت شہادت ۶۲ سال کی عمر تھی۔ ان کے لنگر میں ہر روز ایک ہزار دینار کے وزن کا غلہ پکا کرتا تھا۔

مرویات حدیث ۳۸ متفق علیہ ۲ بخاری میں ۴ مسلم میں تین ہیں رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۴۴۔ طلیب بن عمیر بن وہب القرشی العبدری رض

طلیب بن عمیر بن وہب بن ابی کثیر بن عبد بن قصی۔

نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ قصی ۵ میں شامل ہوجاتے ہیں۔ ان کی والدہ اروی بنت عبدالمطلب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی ہیں دارارقم میں داخل اسلام ہوئے تھے مسلمان ہو کر والدہ کو اطلاع دی تو انہوں نے کہا کہ بہترین شخص جس کی امداد واعانت تجھے کرنا چاہیے۔ وہ بھی تیرے ماموں زاد بھائی ہیں اگر عورتیں بھی مردوں کے سے کام کر سکتیں تو ہم خود اس کی حمایت کیا کریں۔

یہ مہاجرین حبشہ میں سے بھی ہیں اور حاضرین بدر میں سے بھی۔ اجنادین یا یرموک کی جنگ میں شربت شہادت نوش فرمایا۔ رضی اللہ عنہ

۲۵۔ عاقل بن بکیرؓ

بن عبد یا لیل ہونا نسب بن غیرت بن سعد بن لیث بن بکر بن عبد مناۃ بن کنانہ۔

یہ بنو عدی بن کعب بن لوی کے حلیف تھے دار ارقم میں سب سے پہلے اسلام لانے والے یہی ہیں۔ ان کا نام غافل تھا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عاقل تجویز فرمایا۔

غزوہ بدر میں خود بھی حاضر تھے اور ان کے بھائی عامر، ایاس و خالد بھی حاضر تھے۔

۲۶۔ عامر بن حارث الفہریؓ

بعض نے ان کا نام عمر بھی بتایا ہے موسیٰ بن عقبہ کا بیان ہے کہ یہ بدر میں حاضر ہوئے تھے۔

۲۷۔ عامر بن ربیعہ العنزی العدوی رضی اللہ عنہ

ان کا سلسلہ نسب نزار بن معد بن عدنان تک منتہی ہوتا ہے عدوی ان کو اس لئے کہتے ہیں کہ خطاب بن نفیل نے ان کو متبنیٰ بنا لیا تھا یہ قدیم الاسلام ہیں۔ اسلام کے بعد حبشہ کو ہجرت کر کے چلے گئے۔ ان کی بیوی بھی مہاجرات حبشہ میں سے ہے پھر بدر اور جملہ مشاہد میں خدمت نبوی کا شرف حاصل کیا۔ ان کے بیٹے سے روایت ہے کہ جس شب باغیوں نے امیر المومنین عثمان پر حملہ کیا تھا۔ یہ اُس شب مسجد میں نماز پڑھ رہے تھے۔ درمیان میں ذرا سے سو گئے۔ انہوں نے خواب دیکھا کہ کوئی شخص کہہ رہا ہے کہ اللہ تعالےٰ سے اُس فتنہ کی پناہ کا سوال کرو جس فتنہ سے اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو بچالے گا۔ انہوں نے اُسی طرح دعا مانگی گھر گئے تو بیمار ہو گئے۔ شہادت عثمان سے چند روز بعد ان کا جنازہ ہی ان کے گھر سے نکلا۔ رضی اللہ عنہ

۲۸۔ عامر بن عبداللہ بن جراح القرشی رضی اللہ عنہ

عامر بن عبداللہ بن جراح بن ہلال بن اہیب بن ضبہ بن حارث بن فہر
نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کا نسب فہر ما میں شامل ہو جاتا ہے۔

قدیم الاسلام ہے۔ سابقین اوّلین میں داخل فضلاء و کبراء صحابہ میں شامل تھے۔ بدر اور جملہ مشاہدات نبوی میں حاضر رہے حبشہ کی ہجرت دوم سے مشرف تھے۔

جنگ احد میں ان کے اگلے دونوں دانت ٹوٹ گئے تھے۔ اس طرح کہ خود آہنی کی جو مینخیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرق مبارک میں کھب گئی تھیں اُن مینخوں کو انہوں نے دانتوں سے پکڑ کر نکالا تھا پہلی مینخ نکالی اور دانت ساتھ نکل گیا دوسری مینخ نکالی تو دوسرا دانت نکل گیا۔ کہتے ہیں کہ پھر بھی یہ نہایت حسین تھے لانبا قد، چھریرا بدن، ہلکا چہرہ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو کبھی امین حق امین فرمایا۔ کبھی امین الامۃ فرمایا۔ علاقہ نجران پر حکومت کے لیے اور یمن میں تعلیم اسلام کے لیے ان کو سرور عالم نے بھیجا تھا۔ عمر فاروق نے ان کو ملک شام کا سپہ سالار اعظم بنایا تھا۔

ش۱ھ کے طاعون عمواس میں ان کا انتقال بعمر ۵۸ سال ہوا۔ ان کے فضائل بہت ہیں یہ یکے از عشرہ مبشرہ ہیں۔ ابوبکر صدیق نے انکو اپنے انتخاب سے پیشتر مستحق خلافت بتایا تھا رضی اللہ عنہ

۳۹ - عامر بن فہیرہ ازدیؓ

قوم ازد سے تھے ، سیاہ چہرہ ۔ ابوعمر کنیت تھی ۔ شروع میں طفیل بن عبداللہ کے غلام تھے ۔ ابوبکر صدیق نے ان کو خریدا اور راہ خدا میں آزاد کردیا
یہ بکریاں چرایا کرتے تھے ۔

بوقت ہجرت جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صدیق غار ثور میں آرام گزین ہوئے تو یہ رات کو اپنا ریوڑ غار پر لے جاتے ۔ حضور میں دودھ پہنچاتے اور اسماء و عبدالرحمٰن وغیرہ خاندان صدیق کے آنے والوں کے نشان قدم ریوڑ پھرا کر معدوم کر جاتے اور ہجرت میں رسول اللہؐ و صدیق کے خدمت گزار بھی تھے ۔ بدر و احد میں حاضر تھے ۔ واقعہ بیر معونہ ۴ھ میں شہید ہوئے ۔

عامر بن طفیل قاتل کا بیان ہے کہ میں نے نیزہ لگایا تو ان کے بدن سے ایک نور نکلا ۔ بعد ازاں دیکھا کہ اُن کی لاش کو اوپر اٹھا لیا گیا حتیٰ کہ آسمان اس سے نیچے رہ گیا ۔ امام ابن المبارک اور امام عبدالرزاق کی روایات میں ہے کہ مقتولین میں ان کی لاش نہیں ملی تھی ۔

ان کا اسلام دارالارقم کی تبلیغ گاہ سے پیشتر کا ہے ۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۴۰ - عبداللہ بن جحش بن رباب الاسدی

ان کا نسب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خزیمہ میں جا کر مل جاتا ہے ۔ یہ حرب بن اُمیہ کے حلیف تھے ان کی والدہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی امیمہ بنت عبدالمطلب ہیں ۔

یہ مہاجرین اوّلین میں سے ہیں ہجرت حبشہ بھی کی اور ہجرت مدینہ بھی ۔ ان کا اسلام اس وقت کا ہے کہ ابھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دارارقم میں تعلیم و تبلیغ کو شروع نہ فرمایا تھا ۔

ان کے بھائی ابو احمد عبد بن جحش بھی ذوالہجرتین ہیں ۔ ام المومنین ام حبیبہ رضی اللہ عنہا ان کے تیسرے بھائی عبیداللہ کی بیوہ ہیں ۔

ام المومنین زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا ان کی ہمشیر ہیں ان کا لقب المجدع فی اللہ ہے ۔ بدر میں حاضر ہوئے احد میں شہید ہوئے
سعد بن ابی وقاص کہتے ہیں کہ عبداللہ بن جحش نے مجھے میدان احد میں کہا آؤ تنہا ہو کر اللہ تعالیٰ سے ہم کچھ دعا کر لیں ۔ ہم دونوں سب سے الگ جا بیٹھے ۔ میں نے دعا کی "الٰہی کل میرا مقابلہ ایک بہادر تلوریئے دشمن کے ساتھ ہو ہم خوب لڑیں پھر میں اُسے گراؤں عبداللہ نے کہا آمین ۔ پھر اس نے یوں دعا کی ۔ الٰہی کل ایک بہادر تلوریئے دشمن کے ساتھ مقابلہ ہو ۔ ہم خوب لڑیں بالآخر وہ مجھے گرا لے اور قتل کر ڈالے ۔ میری ناک کان کاٹے میں اسی شکل میں تیرے سامنے حاضر ہوں ۔ یا اللہ تو مجھ سے پوچھے کہ عبداللہ تیرے ناک کان کیوں کاٹے گئے میں عرض کروں کہ تیری راہ میں تیرے رسول کی راہ میں اور تو فرمائے کہ سچ ہے" ۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۴۱ - عبدالرحمٰن بن سہل الانصاریؓ

بیان کیا گیا ہے کہ یہ بدر میں حاضر تھے ابوعمر کہتے ہیں کہ یہ عبداللہ مقتول خیبر کے بھائی ہیں ۔ حویصہ و محیصہ ان کے چچا ہیں ۔

ایک دفعہ ان کو اثنائے راہ میں ایک قافلہ ملا جو مشکوں میں شراب لئے جاتا تھا ۔ انہوں نے سب مشکوں میں نیزہ سے چھید کر دیئے ۔ پھر کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو منع فرمایا ہے کہ ہم شراب کو اپنے گھروں میں داخل کریں ۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۴۲ - عبداللہ بن سراقہ القرشی العدویؓ

عبداللہ بن سراقہ بن معتمر بن عبداللہ بن قرط بن رزاح بن عدی بن کعب القرشی العدوی

عمر فاروق کے ساتھ نسب نامہ میں عبداللہ بن قرط میں شامل ہو جاتے ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کعب میں۔

ابن اسحق نے ان کو اور ان کے بھائی عمرو بن سراقہ کو اہل بدر میں شمار کیا ہے۔

گر موسیٰ بن عقبہ اور ابو معشر کا قول ہے کہ یہ بدر میں شامل نہ تھے۔ احد اور مشاہد بعد میں برابر حاضر رہے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۴۳۔ عبداللہ بن سعید القرشی الاموی رض

عبداللہ بن سعید بن عاص بن اُمیہ بن عبد شمس بن عبد مناف

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عبد مناف میں سلسلہ نسب جا ملتا ہے۔ یہ عمدہ خوشخط۔ انشار نگار تھے۔ ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مدینہ کی کتابت آموزی پر مقرر فرمایا تھا۔

ان کے مقام شہادت میں اختلاف ہے کسی نے بدر، کسی نے موتہ، کسی نے یوم یمامہ تحریر کیا ہے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۴۴۔ عبداللہ بن سہیل بن عمرو القرشی العامری رض

عبداللہ بن سہیل بن عمرو بن عبد شمس بن عبد ود بن نصر بن مالک بن حسل بن عامر بن لوی

یہ ابو جندل مشہور صحابی کے بڑے بھائی ہیں۔ قدیم الاسلام حبش کی ہجرت ثانیہ میں شامل تھے پھر مکہ میں لوٹ آئے تھے۔ باپ نے ان کو پکڑ کر قید کر دیا تھا پھر جنگ بدر میں لشکر کفار کے ساتھ مل کر میدان جنگ میں آئے اور پھر موقعہ پاکر کفار میں سے جا نکلے اور صحابہ میں جا ملے اور کفار سے نبرد آزما ہوئے اور دیگر جملہ مشاہد میں ملتزم رکاب محمدی رہے۔ ان کا شمار فضلائے صحابہ میں ہے۔ عہد نامہ حدیبیہ پر ان کے بھی دستخط بطور گواہ ہوئے تھے۔ فتح مکہ کے دن انہوں نے ہی اپنے باپ سہیل کے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے امان حاصل کی تھی۔

سہیل بن عمرو وہی مشہور شخص ہیں جو حدیبیہ میں منجانب کفار بطور کمشنر معاہدہ کام کرتے تھے حضور نے فرمایا کہ سہیل کو اللہ کی امان ہے، اُسے ظاہر ہو جانا چاہیئے۔

پھر فرمایا سہیل میں ایسی عقل و شرف موجود ہے کہ حقیقت اسلام سے بے خبر نہیں رہ سکتا اور اسے پتہ بھی لگ گیا کہ اس کی سابقہ حالت نے اُسے کیا نفع دیا۔ عبداللہ نے باپ کو سارا واقعہ سنا دیا۔

وہ بولا۔ واللہ حضور لڑکپن ہی سے احسان دوست رہے ہیں۔

عبداللہ یوم یمامہ میں ۱۲ھ کو بعمر ۳۸ سال شہید ہوئے تھے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۴۵۔ عبداللہ بن عبدالاسد بن ہلال القرشی المخزومی رض

ان کا سلسلہ نسب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کعب بن لوی میں شامل ہو جاتا ہے۔ ان کی والدہ برہ بنت عبدالمطلب ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پھوپھیرے بھائی یہ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حمزہ سید الشہداء دودھ کے بھائی بھی ہیں۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا پہلے انہی کے نکاح میں تھیں۔

انہوں نے اول ہجرت حبشہ معہ زوجہ خود ام سلمہ کی تھی پھر بدر میں آ شامل ہوئے تھے۔ جمادی الاخری ۳ھ میں وفات پائی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے نابالغ بچوں سلمہ، عمر اور دختر زینب کی تربیت کی غرض سے ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کر لیا۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔

۴۶۔ عبداللہ بن مخرمہ رض

بن عبدالعزیٰ بن ابی قیس بن عبدود بن نصر بن مالک بن حسل بن عامر بن لوی القرشی العامری

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کا نسب نمبر ۱ا میں شامل ہو جاتا ہے۔ ان کی والدہ ام نہیک بنت صفوان ہیں۔

یہ مہاجرین اوّلین میں سے ہیں اور نیز سے ذوالہجرتین بھی ہیں۔

مواخات میں یہ اور فروہ بن عمرو بن ودقہ البیاضی دینی بھائی تھے۔

جنگ یمامہ میں بعمر ۴۱ سال شہید ہوئے۔

انہوں نے دعا کی تھی کہ الٰہی مجھے اُس وقت تک موت نہ آئے جب تک میں اپنے بند بند کو تیری راہ میں زخم رسیدہ نہ دیکھ لوں جنگ یمامہ میں ان کے جسم کا زخموں سے یہی حال تھا کہ جملہ مفاصل پر ضربات موجود تھیں۔

ابن عمر کہتے ہیں کہ جب میں ان کے پاس آخری وقت پہنچا تو انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ روزہ داروں نے روزے کھول لیے ہیں۔ کہا۔ ہاں۔ کہا میرے منہ میں پانی ڈال دو۔ ابن عمر حوض پر گئے اور ڈول میں پانی لے کر آئے آکر دیکھا تو وہ سانس پورے کر چکے تھے رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۴۷۔ عبداللہ بن مسعود الھذلی رض

عبداللہ بن مسعود بن غافل بن حبیب بن شمخ بن فار بن مخزوم بن صاہلہ بن کاہل بن حارث بن تمیم بن سعد بن ہذیل بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر

ان کے والد مسعود ایام جاہلیت میں عبداللہ بن الحارث بن زہرہ کے حلیف بن گئے تھے ان کی والدہ ام عبد بنت عبدود بھی صاہلہ بن کاہل کی نسل سے ہیں اور ان کی نانی قیلہ بنت الحارث بن زہرہ (زہریہ) ہیں۔

یہ قدیم الاسلام ہیں عمر فاروق سے کچھ پہلے مشرف باسلام ہوئے۔ ان کی اہلیہ فاطمہ بنت الخطاب ہیں انہوں نے بیان کیا ہے کہ یہ عقبہ بن ابی معیط کا ریوڑ چرایا کرتے تھے۔ ایک روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم معہ ابوبکر وہاں سے گزرے۔ پوچھا لڑکے دودھ ہے انہوں نے کہا ہاں۔ مگر میرا نہیں۔ میں تو امانت دار ہوں۔ فرمایا ایسی بکری لے آؤ جس پر نر نہ چڑھا ہو۔ یہ لے آئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تھن کو بسم اللہ کہہ کر ہاتھ لگایا۔ دودھ نکال لیا خود بھی پیا۔ ابوبکر صدیق رض کو بھی پلایا۔ بکری کا تھن پھر خشک ہو گیا۔ انہوں نے عرض کی کہ مجھے بھی یہ کلام سکھلا دیا جائے فرمایا۔ ہاں تم تو معلم جوان ہو۔

بعدازاں ابن مسعود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہنے لگے۔ حضور کو جوتا پہنانے۔ آگے آگے چلا کرتے خواب سے جگایا کرتے تھے امام ابن عبدالبر نے ایک روایت بیان کی تھی جس میں ان کا نام بھی عشرہ مبشرہ میں آجاتا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ قرآن چار شخصوں سے سیکھو۔ ابن مسعود۔ معاذ بن جبل ابی بن کعب اور سالم مولیٰ ابو حذیفہ

ایک بار انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنی یہ آرزو پیش کی اَللّٰھُمَّ اِنِّیْٓ اَسْئَلُکَ اِیْمَانًا لَّا یَرْتَدُّ وَنَعِیْمًا لَّا یَنْفَدُ وَمُرَافَقَۃَ نَبِیِّکَ مُحَمَّدٍ فِیْٓ اَعْلٰی جَنَّاتِ الْخُلْدِ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دعا کی قبولیت کی بشارت عطا فرمائی

ابن مسعود رضی اللہ عنہ قد کے ناٹے تھے لمبے قد کا آدمی بیٹھا ہوا اور یہ کھڑے ہوئے برابر برابر نظر آیا کرتے تھے اللہ تعالیٰ نے جنگ بدر کے دن ابوجہل کو انہی کے ہاتھ سے قتل کرایا۔

حذیفہ رضی اللہ عنہ بحلف بیان کرتے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق روائت اور عمل کا واقف ابن مسعود سے بڑھ کر ہم کو کوئی معلوم نہیں ابن مسعود کہتے ہیں لوگ جانتے ہیں کہ میں ان سب میں سے کتاب اللہ کا خوب عالم ہوں۔ قرآن مجید میں کوئی سورۃ یا آئت نہیں مگر میں جانتا ہوں کہ وہ کب اُتری اور کہاں اُتری۔ ابو وائل راوی کہتا ہے کہ ان کے اس بیان کا کسی نے انکار نہیں کیا۔ عمر فاروق ان کو علم کی تھیلی کہہ کرتے تھے۔

عمر فاروق نے جب عمار بن یاسر اور ابن مسعود کو کوفہ کا منصب دار کر کے بھیجا تو اپنے فرمان میں اہل کو یہ الفاظ لکھے تھے۔

"میں عمار بن یاسر کو امیر اور ابن مسعود کو معلم و وزیر بنا کر بھیجتا ہوں یہ دونوں اصحاب رسول میں سے نجبا میں شامل ہیں۔ اہل بدر ہیں ان کی اقتداء کرو اور ان کی بات سنو۔ ابن مسعود کے متعلق تو میں نے اپنی جان پر ایثار کیا ہے"۔

حضرت عثمان کے عہد میں یہ کوفہ سے مدینہ واپس پہنچ گئے تھے اسی جگہ ۳۲ھ کو وفات پائی اور حسب وصیت رات ہی میں البقیع کے قبرستان میں دفن کیے گئے۔

مواخات مکہ میں ان کو زبیرؓ کا بھائی بنایا گیا تھا۔

ان کی زندگی میں باغیان عثمانی کے فتنوں کی ابتداء شروع ہو گئی تھی۔ ابن مسعود نے فرمایا۔ اگر لوگوں نے ان کو قتل کر دیا تو پھر ان کو ایسا خلیفہ نہ ملے گا۔

مرویات حدیث ۸۴۸ از انجملہ متفق علیہ ۶۴ صرف صحیح بخاری میں ۲۱ صرف صحیح مسلم میں ۳۵ ہیں۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۴۸۔ عبداللہ بن مظعون قرشی الجمحیؓ

عبداللہ بن مظعون بن حبیب بن وہب بن حذافہ بن جمح نہایت قدیم الاسلام ہیں۔

ان کے تین بھائی اور تھے عثمان، سائب، قدامہ چاروں بھائی قدیم الاسلام ہیں۔ چاروں نے اوّل ہجرت حبشہ کی اور پھر ہجرت مدینہ پھر شامل بدر ہوئے۔

عبداللہ بن مظعون نے ۳۰ھ میں بعمر ۶۰ سال وفات پائی رضی اللہ عنہ وعن اخوانہ۔

۴۹۔ عبیدہ بن حارث بن مطلب بن عبد مناف قرشی المطلبیؓ

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ان کا نسب عبد مناف میں شامل ہو جاتا ہے۔ مطلب و ہاشم حقیقی بھائی تھے یہ دونوں اور ان کی اولاد ہمیشہ متحد و متفق رہے۔

بزرگوار عبیدہ قدیم الاسلام ہیں یعنی دار ارقم کے تعلیم گاہ بنائے جانے سے پیشتر مشرف باسلام ہو چکے تھے۔ ہجرت مدینہ کے وقت طفیل اور حصین ان کے دونوں بھائی بھی رفیق سفر تھے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کی قدر و منزلت خاص طور سے فرمایا کرتے تھے۔ اہل بدر میں سب سے زیادہ عمر کے یہی تھے۔ ان کی پیدائش حضورؐ سے دس سال پہلے کی ہے۔

اسلام میں پہلا سردار جو اسی مہاجرین کے لشکر کے ساتھ دشمن کے تجسس میں بھیجا گیا یہی ہیں۔

غزوہ بدر میں انہوں نے عناء عظیم برداشت کی اور مشہد کریم حاصل کیا۔

دشمن کے مقابلہ میں ان کا پاؤں کٹ گیا تھا۔ بدر سے ایک منزل پر واپس ہوتے ہوئے ان کا انتقال ہوا اور راہ ہی میں دفن ہوئے ایک بار نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس راہ سے گزرے ہمراہیوں نے عرض کیا کہ ادھر سے کستوری کی خوشبو آ رہی ہے۔ حضور نے فرمایا ہاں کیوں نہ ہو، یہاں ابومعاویہ کی قبر بھی تو ہے (ان کی کنیت ابومعاویہ تھی) خوش اندام، خوب رو تھے۔ بوقت شہادت ۶۳ سال کی عمر تھی۔ رضی اللہ عنہ

۵۰۔ عبدالرحمٰن بن عوف القرشی الزہری رضؓ

عبدالرحمٰن بن عوف بن عبد عوف بن عبد بن حارث بن زہرہ بن کلاب بن مرہ بن کعب بن لوئی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نسب میں کلاب نمبر ۶ میں شامل ہو جاتے ہیں۔

ان کی والدہ شفاء بنت عوف بھی قرشیہ زہریہ ہیں۔ واقعہ فیل سے دس سال بعد پیدا ہوئے۔ قدیم الاسلام ہیں۔ دار ارقم میں آغاز تعلیم سے پیشتر مسلمان ہو چکے تھے۔

یہ اُن دس میں سے ہیں جن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بشارت جنت عطا فرمائی تھی۔

یہ اُن چھ میں سے ہیں جو خلافت کے اصحاب شوریٰ ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو اَنْتَ اَمِیْنٌ فِیْ اَھْلِ السَّمَآءِ وَاَمِیْنٌ فِیْ اَھْلِ الْاَرْضِ فرمایا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دومۃ الجندل کی طرف بنوکلب کی جانب بھیجا تھا اور اپنے ہاتھ سے ان کے سر پر عمامہ باندھا تھا اور فرمایا تھا کہ بسم اللہ جاؤ۔ جب فتح ہو جائے تو وہاں کے حکمران کی بیٹی سے شادی کر لینا۔ بدر میں حاضر تھے۔

جنگ احد میں ان کے جسم میں اکیس زخم آئے تھے ایک زخم ٹانگ پر تھا جس کی وجہ سے یہ لنگڑانے لگے تھے قریش میں سب سے زیادہ مالدار اور سخی بھی اعلیٰ درجہ کے تھے۔

ایک روز تیس غلام راہ خدا میں آزاد کیے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امہات المومنین کے مصارف کے کفیل یہی تھے۔

ابن عیینہ نے بیان کیا ہے کہ جب ان کی میراث تقسیم ہونے لگی تو ان کی مطلقہ عورت کو جسے مرض الموت میں طلاق دی تھی، ۸/۱ کے حصہ سوم میں سے ۸۳ ہزار روپیہ آیا تھا یعنی کل نقد ۱۹۹۳۰۰۰ روپیہ

نقدی کے علاوہ ایک ہزار اونٹ تین ہزار بکریاں ایک سو گھوڑا ورثہ میں چھوڑا تھا

انہوں نے ۳۱ھ یا ۳۲ھ میں بعمر ۷۲ سال مدینہ منورہ میں انتقال کیا تھا۔

ان کی اولاد حسب ذیل ہے۔

نام زوجہ	اولاد
تماضر بنت الاصبغ	ابوسلمہ فقیہہ
ام کلثوم بنت عقبہ	محمد و سالم و ام القاسم
ام کلثوم بنت عقبہ	ابراہیم، حمید، اسماعیل

نام زوجہ	اولاد
بحیرہ بنت ہانی	عروہ جو افریقہ میں شہید ہوئے
سہلہ بنت سہیل بن عمرو العامری	سالم اصغر
ام حکم بنت قارظ بن خالد	ابو بکر
بنت انس بن رافع الانصاری	عبداللہ اکبر (شہید افریقہ) قاسم
اسما بنت سلامت بن مخزمہ	عبداللہ اصغر۔ عبدالرحمٰن بن عبدالرحمٰن
نفیسہ	مصعب
مجد بنت یزید بن سلامت	سہیل
غزل بنت کسریٰ (مدائن میں گرفتار ہوئی)	عثمان
بادیہ بنت غیلان	جویریہ (زوجہ مسور بن مخرمہ)
سہلہ صغریٰ بنت عاصم بن عدی	محمد، محسن، زید

حضرت عمرؓ نے خلافت کے لیے ۶ بزرگوں کو شوریٰ میں داخل کیا اور ان ہر شش کو مستحق خلافت فرمایا تھا۔ علی، عثمان، طلحہ، زبیر، سعد بن وقاص، عبدالرحمٰن بن عوف

زبیر نے علی کو، طلحہ نے عثمان کو، سعد بن ابو وقاص نے عبدالرحمٰن کو اپنی اپنی رائے کا وکیل کر دیا۔ اب چھ میں سے علی، عثمان، عبدالرحمٰن رہ گئے۔ عبدالرحمٰن نے فرمایا۔ ھل لکوان اختار لکم وانتفی منہا۔

میں تو الگ ہوتا ہوں اور اگر تم کہو تو تمہارا فیصلہ بھی کر دیتا ہوں۔ حضرت علیؓ نے فرمایا انا اول من رضی فانی سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول انت امین فی اھل السماء وامین فی اھل الارض

سب سے پہلے میں رضامندی کا اظہار کرتا ہوں کیونکہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ عبدالرحمٰن آسمان والوں میں بھی امین ہے اور زمین والوں میں بھی۔

اس کے بعد انہوں نے امیر المومنین عثمان کو ترجیح دی اور ان کے ہاتھ پر سب کی بیعت ہو گئی۔

مرویات حدیث ۶۵ متفق علیہ ۲۔ صحیح بخاری میں ۵ ہیں رضی اللہ عنہ

۵۱۔ عبد یالیل بن ناشب اللیثی رضؓ

بنو سعد بن لیث کے قبیلہ سے ہیں۔ بنو عدی بن کعب کے حلیف تھے۔ بدر میں حاضر ہوئے۔ خلافت فاروقی میں وفات پائی۔ بوڑھے کھوسٹ تھے۔ رضی اللہ عنہ

۵۲۔ عمرو بن الحارث بن زہیر القرشی الفہری رضؓ

عمرو بن ربیا عامر، ابن حارث بن زہیر بن ابی شداد بن ربیعہ بن ہلال بن مالک بن ضبہ بن حارث بن فہر

ان کا نسب سرورِ کائنات کے ساتھ فہر نمبر ۱۱ کے ساتھ شامل ہو جاتا ہے۔ قدیم الاسلام ہیں مکہ میں اسلام لائے اور حبشہ کو ہجرت دوم میں ہجرت فرمائی۔

عقبہ نے ان کو اہل بدر میں شامل کیا ہے رضی اللہ عنہ

۵۳۔ عمرو بن سراقہ القرشی العدوی رض

یہ عبداللہ بن سراقہ کے بھائی ہیں جن کا نسب نامہ لکھا جا چکا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مرۃ نمبر ۷ میں شامل ہو جاتے ہیں۔ بدر، احد اور دیگر جملہ مشاہد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں حاضر رہے۔ امیر المومنین عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت میں وفات پائی۔

رضی اللہ عنہ

۵۴۔ عمرو بن ابی عمرو بن شداد القرشی الفہری

ابو شداد کنیت کرتے تھے۔ بنو ضبہ میں سے اور اولاد حارث بن فہر میں سے ہیں۔

۳۲ سالہ تھے جب غزوہ بدر میں شامل ہوتے ۳۶ سالہ تھے جب گیتی ناپائیدار سے انتقال فرمایا۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۵۵۔ عمرو بن ابی سرح بن ربیعہ القرشی الفہری

عمرو بن ابی سرح بن ربیعہ بن ہلال بن اہیب بن ضبہ بن حارث بن فہر

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ فہر نمبر ۱۱ میں شامل ہو جاتے ہیں۔ ابو سعید کنیت ہے یہ اور ان کے بھائی وہب بن ابی سرح مہاجرین حبشہ میں سے ہیں دونوں بھائی بدری ہیں۔ احد و خندق و دیگر مشاہد میں بھی انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب رہنے کا شرف حاصل کیا ہے۔

۳۰ھ کو مدینہ منورہ میں انتقال فرمایا رضی اللہ عنہ

۵۶۔ عثمان بن مظعون القرشی الجمحی رض

عثمان بن مظعون بن حبیب بن وہب بن حذافہ بن جمح بن عمرو بن مصیص

ابو السائب کنیت کرتے تھے ان کی اہلیہ خیلہ بنت الحکیم کا نسب بھی جمح میں جا کر شامل ہو جاتا ہے۔ حضرت عثمان رض ۱۳ کس کے بعد داخل اسلام ہوئے۔

ہجرت حبشہ و مدینہ کا شرف حاصل کیا۔ بدر میں حاضر ہوتے۔ بدر کے بعد ان کا انتقال داخلہ مدینہ سے ۲۲ ماہ بعد ہوا۔ مہاجرین میں سے پہلے شخص ہے جو مدینہ میں فوت ہوئے اور پہلے شخص ہیں جو جنت البقیع میں مدفون ہوئے۔ غسل و کفن کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی پیشانی کو چوم لیا تھا۔ ایک عورت نے یہ دیکھا تو کہا کہ عثمان کو جنت مبارک ہو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُدھر تیز نگاہوں سے دیکھا اور پوچھا کہ تجھے اسکا پتہ کیونکر ہوا۔ اس حدیث میں یہ تعلیم دی گئی کہ کسی شخص کو قطعی جنتی کہنے کا منصب صرف اللہ اور رسول کو ہے۔ دوسرا شخص قرائن یا قیاس سے ایسا حکم نہیں لگا سکتا۔

حضرت عثمان فضلاء صحابہ میں سے تھے۔ انہوں نے ایام جاہلیت ہی میں شراب کو چھوڑ دیا تھا کسی نے ان سے وجہ پوچھی کہا میں کیوں ایسا کام

کروں کہ اپنی عقل کو کھو بیٹھوں اور ادنیٰ ادنیٰ درجہ کے شخص کو ہنسنے کا موقع دوں۔ بیٹی بہن کی تمیز سے بھی جاتا رہوں۔

انہوں نے ازراہ زہد خصی بننے کا ارادہ کر لیا تھا۔ آنحضرت نے منع فرمایا روزے یاد رکھا کرو۔

ان کی موت پر ان کی بیوی کے یہ اشعار ہیں۔

یا عین جودی بدمع غیر ممنون ۔۔۔ علی رزیة عثمان بن مظعون

علی امرئ کان فی رضوان خالقه ۔۔۔ طوبیٰ له من فقید الشخص مدفون

طاب البقیع له سکنیٰ وغرقده ۔۔۔ اشرقت ارضه من بعد تفتین

واورث القلب حزنا لا انقطاع له ۔۔۔ حتی الممات دما ترقی له شئونی

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی قبر پر ایک پتھر کھڑا کروا دیا تھا شناخت کے لئے

جب ابراہیم بن رسول اللہ کا انتقال ہوا تو ان کو بھی حضرت عثمان کے برابر ہی دفنایا تھا۔ رضی اللہ عنہ

۵۷۔ عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ

ان کے والد یاسر رضی اللہ عنہ کا نسب عنس بن مالک سے جاملتا ہے یہ عربی قحطانی۔ مذحجی الاصل ہیں۔ یاسر کا ایک بھائی گم ہو گیا تھا اُس کی تلاش میں یاسر اور حارث اور مالک تینوں بھائی مکہ پہنچے۔ حارث اور مالک تو یمن کو واپس چلے گئے اور یاسر مکہ میں ٹھہر گئے اور ابوحذیفہ بن مغیرہ بن عبداللہ بن عمرو بن مخذوم کے حلیف بن گئے ابوحذیفہ نے اُن کا نکاح اپنی لونڈی سمیہ بنت خیاط سے کر دیا۔ جب عمار پیدا ہوئے تو سمیہ کو آزاد کر دیا گیا اس مناسبت سے آپ کو مخزومی بھی کہتے ہیں۔

یاسر اور سمیہ اور عمار تینوں اسلام میں ابتدا ایام ہی میں داخل ہو گئے تھے سمیہ و عامر نے اسلام کے لئے سخت ترین تکالیف کو برداشت کیا۔ خاتون سمیہ پہلی خاتون ہیں جو اسلام کے لئے شہید کی گئیں۔

حضرت عمار بن یاسر مہاجرین اوّلین سے ہیں۔ ذوالہجرتین اور نماز گزار قبلتین ہیں۔ جنگ بدر میں حاضر تھے اور سخت امتحان ان کو دینا پڑا تھا۔ جنگ یمامہ میں بھی خصوصیت کے ساتھ انہوں نے تکالیف شاقہ کو برداشت کیا تھا اسی جنگ میں ان کا ایک کان اڑ گیا تھا۔

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ جنگ یمامہ میں حضرت عمار زخم خوردہ ایک پتھر پڑے ہوئے تھے خون جاری تھا اور وہ بآواز بلند کہہ رہے تھے مسلمانوں کدھر جا رہے ہو۔ کیا جنت سے بھاگتے ہو۔ ادھر آؤ۔ میں عمار یاسر ہوں۔

عمار بن یاسر کہتے تھے کہ میں عمر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ہم سن ہوں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ عمار قدموں تک (کانوں تک) ایمان سے بھرپور ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں اَوَمَنْ کَانَ مَیْتًا فَاَحْیَیْنٰہُ وَجَعَلْنَا لَہٗ نُوْرًا یَّمْشِیْ بِہٖ فِی النَّاسِ کے مصداق عمار بن یاسر ہیں۔ امیر المومنین علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ عمار آئے۔ اندر ہونے کی اجازت مانگی حضور نے فرمایا مرحبا بالطیب المطیب

عبدالرحمن بن ابزی کہتے ہیں کہ جنگ صفین میں امیر المومنین علی کے ساتھ بیعت الرضوان والے ۸۰۰ بزرگوار تھے جن میں سے ۶۳ شہید ہوئے تھے۔ عمار بھی شہداء میں تھے۔

امیر المومنین عمر فاروق نے ان کو گورنر کوفہ بنایا تھا اور اپنے فرمان میں لکھا تھا کہ میں عمار کو حاکم اور ابن مسعود کو وزیر و معلم بنا کر بھیجتا ہوں۔ ان کی اطاعت و اقتدا کرو۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمار کو فرمایا تھا تَقْتُلُكَ الْفِئَةُ الْبَاغِيَةُ تجھے گروہ باغی قتل کرے گا۔

صفین میں داد شجاعت دے رہے تھے کہ انہوں نے پانی مانگا ان کے سامنے دودھ پیش کیا گیا دودھ پی کر کہا اَلْيَوْمَ أَلْقَى الْأَحِبَّةَ آج پیاروں سے دوستوں سے ملاقات ہو گی کیونکہ رسول اللہ نے فرمایا تھا کہ تیری آخری خوراک دودھ ہو گا۔ ایک اور عورت دودھ لے آئی وہ بھی پیا تو فرمایا مُحَمَّدٌ إِلَى الْجَنَّةِ تَحْتَ الْأَسِنَّةِ جنت تو نیزوں کے نیچے ہے۔

ایک حدیث میں ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر ایک نبی کو وزراء و رفقاء و نجباء سات سات ملتے رہے ہیں۔ مجھے چودہ ملے ہیں۔ حمزہ، جعفر، ابو بکر، عمر علی، حسن، حسین، عبداللہ بن مسعود، سلمان، عمار، ابوذر، حذیفہ، مقداد، بلال، رضی اللہ تعالیٰ عنہم

جنگ صفین بماہ ربیع الآخر ۳۷ھ کو ہوئی عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کی عمر بوقت شہادت قریب نو سال تھی۔ حضرت عمار کی اس روایت سے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم سن ہیں ان کی عمر ۸۹ سال شمار میں آتی ہے رضی اللہ عنہ

مرویات حدیث ۶۲ متفق علیہ ۲ صرف بخاری میں ۳ صرف مسلم میں ایک ہے۔

۵۸۔ عمیر بن ابی وقاص القرشی الزہری رض

حضرت سعد بن ابو وقاص (احد العشرۃ المبشرہ) کے بھائی ہیں۔ بدر میں حاضر ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو چھوٹا سمجھا اور واپس کر دینے کا ارادہ فرمایا یہ رونے لگ گئے حضور نے اجازت جہاد عطا فرمائی لڑے اور شہید ہو گئے اسوقت عمر مبارک ۱۶ سال کی تھی رضی اللہ عنہ

۵۹۔ عمیر بن عوف مولیٰ سہیل بن عمر العامری رض

مکہ میں پیدا ہوئے سہیل بن عمرو کے مولیٰ آزاد کردہ غلام تھے بدر، احد، خندق اور دیگر مشاہد نبوی میں حاضر تھے خلافت فاروقی میں وفات پائی۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۶۰۔ عقبہ بن وہب رض

ابن وہب بھی مشہور ہیں اور ابن ابی وہب بھی۔ ان کا سلسلہ نسب اسد بن خزیمہ سے جا ملتا ہے۔ بدر میں خود بھی حاضر تھے اور ان کے بھائی شجاع بن وہب بھی حاضر تھے یہ دونوں بنو عبد شمس کے حلیف تھے رضی اللہ تعالیٰ عنہما

۶۱۔ عوف بن اثاثہ قرشی المطلبی

عوف بن اثاثہ بن عباد بن مطلب بن عبد مناف بن قصی مسطح کے عرف سے زیادہ مشہور ہیں ان کی والدہ سلمہ بنت ابو رہم بھی مطلبی ہیں۔ ان کی نانی ریطہ بنت صخر بن عامر حضرت ابو بکر صدیق کی خالہ ہیں۔ بدر میں حاضر تھے ۳۴ھ میں بعمر ۵۶ سال انتقال کیا۔ رضی اللہ عنہ

۶۲۔ عیاض بن زہیر بن ابو شداد القرشی الفہری

ابو سعید کنیت مہاجرین حبشہ میں سے ہیں۔ ان کا نسب یہ ہے عیاض بن زہیر بن ابو شداد بن ربیعہ بن ہلال بن وہب بن ضبہ بن حارث بن فہر۔

یہ عیاض بن غنم کے چچا ہیں اور ابن غنم کے کارنامے فتوحات شام میں بہت مشہور ہیں۔

عیاض بن زہیر کا انتقال ۳۰ھ کو شام میں ہوا۔ رضی اللہ عنہ

۶۳۔ قدامہ بن مظعون القرشی الجمحیؓ

قدامہ بن مظعون بن حبیب بن وہب بن حذافہ بن جمح۔ ابو عمرو کنیت کرتے تھے۔ مہاجرین حبشہ میں سے ہیں اپنے برادران عثمان و عبداللہ کی معیت میں ہجرت کی تھی۔

ام المومنین حفصہ و عبداللہ بن عمر کے ماموں بھی یہی ہیں ان کی ماں بھی بنو جمح میں سے تھی۔

بدر اور جملہ مشاہد میں برابر حاضر رہے۔

ان کی بہن حضرت عمر کے گھر میں اور حضرت عمر کی بہن صفیہ بنت الخطاب ان کے گھر میں تھی۔ عمر فاروق نے ان کو حاکم بحرین بنا دیا تھا پھر وہاں سے معزول کر کے عثمان بن ابو العاص کو ان کا جانشین بنایا تھا۔ وجہ معزولی یہ بیان کی جاتی ہے کہ جارود سید قبیلہ عبدالقیس نے عمر فاروق سے آکر عرض کیا کہ قدامہ نے شراب پی ہے اور میں نے اس کی اطلاع کا آپ تک پہنچانا فرض شرعی سمجھا ہے۔ فاروق نے پوچھا کوئی دوسرا آدمی گواہ، کہا ابوہریرہ ہیں ابوہریرہ نے آکر یہ شہادت دی کہ میں نے اُسے پیتے نہیں دیکھا میں نے اسے نشہ میں دیکھا اور وہ قے کر رہا تھا۔ فرمایا تم تو گہرے لفظوں میں شہادت دیتے ہو بعد ازاں قدامہ کو حاضری کا حکم دیا گیا۔ قدامہ آگئے تو جارود نے کہا کہ اس پر حد جاری کی جائے۔ فاروق نے فرمایا تم مدعی ہو یا گواہ ہو۔ جارود نے کہا گواہ ہوں۔ فرمایا تم اپنی گواہی دے چکے۔ جارود چپ کر گیا۔ اگلے روز جارود نے پھر کہا کہ اس پر حد جاری کی جائے عمر فاروق نے کہا تم مدعی معلوم ہوتے ہو اور گواہ ایک ہی رہ جاتا ہے جارود نے کہا کہ میں آپ کو اللہ کی قسم دیتا ہوں عمر نے کہا زبان بند کرو۔ ورنہ اچھا نہ ہوگا۔ جارود بولا بخدا یہ تو ٹھیک نہیں کہ آپ کا ابن العم تو شراب پیئے اور شامت ہماری آئے۔ ابوہریرہ نے کہا کہ اگر آپ کو ہماری شہادت میں شک ہے تو دختر ولید سے یعنی اہلیہ قدامہ سے دریافت کر لیجئے۔ حضرت عمر نے ہند بنت الولید کے پاس معتبر شخص کو بھیجا اور قسم دے کر دریافت کیا اس نے شوہر کے خلاف شہادت دے دی۔

اب فاروق نے قدامہ سے کہا تم پر حد جاری کی جائے گی۔ قدامہ بولے اچھا۔ اگر یہی بات ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ میں نے شراب پی تب بھی مجھ پر حد نہیں لگائی جا سکتی فاروق نے پوچھا کیوں؟ قدامہ نے کہا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فاروق نے کہا کہ تم نے اس کے معنے میں غلطی کھائی ہے۔ اگر تو تقویٰ اختیار کرتا تو حرام شے سے پرہیز کرتا۔

بعد ازاں عمر فاروق نے شوریٰ کیا اور دریافت کیا کہ قدامہ پر حد جاری کرنے میں ان کی رائے کیا ہے۔ سب نے کہا کہ جب تک وہ بیمار ہے اس پر حد نہ لگنی چاہیئے۔

حضرت عمر چند روز خاموش رہے پھر عمر نے شوریٰ میں پوچھا اور لوگوں نے کہا کہ ابھی اُسے درد کی شکایت ہے حد نہ چاہیئے۔ حضرت عمر نے فرمایا اگر وہ کوڑے کھاتا ہوا خدا سے جا ملے تو مجھے زیادہ اچھا معلوم ہوتا ہے اس سے کہ میں خدا کے سامنے حاضر ہوں اور اس کی جوابدہی میری گردن پر ہو۔ اچھا کوڑا لاؤ۔ پورا، پورا بعد ازاں قدامہ کو حد لگائی گئی۔ قدامہ نے اس روز سے فاروق کے ساتھ بولنا چھوڑ دیا۔

بعد ازاں حضرت عمر حج کو گئے قدامہ بھی ساتھ تھے حضرت عمر خواب سے اُٹھے تو کہا قدامہ کو لاؤ مجھے اس خواب میں کہا گیا ہے کہ قدامہ سے صلح کر لو۔ قدامہ کو بلوایا اور بات چیت کی گئی اور بالآخر صفائی ہو گئی۔

قدامہ ۳۶ھ کو بعمر ۶۸ سال فوت ہوتے۔ رضی اللہ عنہ

۶۴۔ کثیر بن عمرو السلمیؓ

یہ خلفاء بنو اسد میں سے ہیں۔ ابن اسحٰق کہتے ہیں کہ بدر میں کثیر بن عمرو اور ان کے دونوں بھائی مالک بن عمرو اور ثقیف بن عمرو بھی شریک ہوئے تھے۔

ابن عبدالبر کہتے ہیں کہ کثیر کا نام صرف ایک ہی روایت میں آیا ہے اور ممکن ہے کہ کثیر ہی کا لقب ثقب ہو۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۶۵۔ کناز بن حصین ابو مرثد الغنویؓ

ان کا نسب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مضر میں شامل ہو جاتا ہے۔

کناز اور ان کے فرزند مرثد دونوں بدری ہیں اور ابو مرثد امیر حمزہ بن عبدالمطلب کے حلیف ہیں اور کبار صحابہ میں سے ہیں۔

مرثد یوم الرجیع کو شہید ہوئے اور ان کے والد ابو مرثد نے ۱۲ھ کو خلافت ابوبکر میں بعمر ۶۶ سال انتقال کیا مواخات میں یہ عبادہ بن صامت کے بھائی تھے ان کے پوتے اُنیس بن مرثد بھی صحابی ہیں۔

۶۶۔ مالک بن اُمیہ بن عمرو السلمیؓ

یہ بنو اسد بن خزیمہ کے حلیف ہیں بدر میں حاضر ہوئے اور جنگ یمامہ میں شہید ہوئے رضی اللہ عنہ

۶۷۔ مالک بن ابو خولی الجعفیؓ

مالک بن ابو خولی بن عمر بن خثیمہ بن حارث بن معاویہ بن عوف بن سعد بن جعف (مذحج) یہ بنو عدی بن کعب کے حلیف ہیں۔ بدر میں حاضر ہوئے ان کے بھائی خولی بن ابو خولی بھی بدری ہیں رضی اللہ عنہ

۶۸۔ مالک بن عمرو السلمیؓ

یہ بنو عبد شمس کے حلیف ہیں بدر میں حاضر تھے۔ جنگ یمامہ میں شہید ہوئے۔ ان کے بھائی ثقف بن عمرو اور مدلج بن عمرو بھی بدری ہیں رضی اللہ عنہم

۶۹۔ مالک بن عمیلہ بن السباق

یہ بنو عبدالدار میں سے ہیں امام موسیٰ بن عقبہ نے ان کو بدریوں میں شمار کیا ہے۔ رضی اللہ عنہ

۷۰۔ محرز بن نضلہ الاسدیؓ

محرز بن نضلہ بن عبداللہ بن مرہ بن کثیر بن غنم بن دودان بن اسد

یہ بنو اسد بن خزیمہ میں سے ہیں۔ بنو عبد شمس کے حلیف تھے۔ بنو عبدالاشہل اُن کو اپنا حلیف بتایا کرتے تھے۔

بدر، احد، خندق میں حاضر تھے غزوہ ذیقعد ۶ھ میں انہوں نے بڑے کارنامے دکھلائے اور مسعدہ بن حکم کے ہاتھ سے شربت

شہادت نوش فرمایا۔ اس وقت ان کی عمر ۴۲ سال کی تھی۔ ان کا لقب احزم ہے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۱۷۔ مدلاج بن عمرو السلمیؓ

مدلاج (یا مدلج) بنو عبد شمس کے حلیف ہیں۔ بدر میں معہ برادران خود مالک بن عمرو و ثقیف بن عمرو حاضر تھے۔ بدر کے علاوہ مدلج دیگر مشاہد میں بھی ہمرکاب نبوی حاضر تھے ۵۰ھ میں انتقال کیا رضی اللہ عنہ

۷۲۔ مرثد بن ابو مرثد الغنویؓ

مرثد بن ابو مرثد (کناز ابن حصین) ان کا نسب غیلان بن مضر تک جاملتا ہے۔

مرثد مواخات میں اوس بن صامت کے بھائی تھے۔ بدر و احد میں حاضر تھے۔ واقعہ رجیع ۳ھ میں شہید ہوئے اس واقعہ کی بھی ابتدا یوں ہوئی کہ عضل اور قارہ اور لحیان کے اشخاص نے سرور عالم سے التماس کی کہ ہمارے قبائل کی تعلیم اور تبلیغ کے لیے چند اہل علم کو مامور فرمایا جاوے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے چند صحابہ کو جس میں مرثد اور عاصم ابن ثابت اور حبیب بن عدی اور خالد بن بکیر اور زید بن وثنہ اور عبداللہ بن طارق شامل تھے مامور فرما دیا۔ مرثد یا بقول بعض عاصم ان کے سردار تھے جب یہ صحابہ اور یہ غدار لوگ ہذیل کے علاقہ میں پہنچ گئے تو انہوں نے ہذیل سے جمعیت حاصل کر کے صحابہ پر حملہ کر دیا۔ مرثد و عاصم و خالد تو مقابلہ کرتے کرتے شہید ہو گئے اور حبیب و زید و عبداللہ اسیر ہوئے۔ عبداللہ راہ میں سے بھاگ گئے اور بالآخر کفار کے پتھراؤ سے شہید ہوئے اور حبیب و زید پھانسی پر لٹکائے گئے۔

حضرت مرثد بڑے بہادر پہلوان تھے ان کی عادت تھی کہ مدینہ منورہ سے چھپ چھپا کر آتے اور اُن مسلمان اسیروں میں سے جن کو کفار نے صرف جرم اسلام میں قید کیا ہوا تھا۔ ایک قیدی کو جیل سے نکال کر لے جاتے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ یہ مکہ میں اسی غرض سے آئے ان کو راستہ میں عناق مل گئی۔ یہ ایک بدچلن عورت تھی اور قبل از اسلام اس کے تعلقات مرثدؓ کے ساتھ بہت گہرے رہے تھے۔

ان کو دیکھ کر پہچان گئی بولی مرثد ہو۔ انہوں نے کہا ہاں۔ بولی خوب۔ میرے ساتھ چلو۔ وہیں رات کو آرام کرنا۔ مرثد نے کہا عناق تو کس خیال میں ہے میں مسلمان ہوں اور اسلام میں زنا حرام ہے۔ یہ جواب سنتے ہی عورت کے تیور بدل گئے۔ لگی چلانے۔ لوگو آؤ۔ تمہارا ملزم موجود ہے۔ جو قیدیوں کو نکال لے جایا کرتا ہے۔ یہ سنکر آٹھ آدمی ان کے پیچھے بھاگے۔ یہ ایک غار میں جا چھپے دشمن بھی وہاں تک پہنچ گیا مگر وہ ان کو نہ دیکھ سکے وہ واپس چلے گئے تو یہ کچھ عرصہ سستا کر پھر مکہ میں گئے اور بھاری بھرکم قیدی کو جیل سے اپنے کندھے پر اٹھا کر نکال لائے اور بخیریت تمام مدینہ منورہ پہنچ گئے۔

ان کا بیان ہے کہ میں نے مدینہ پہنچ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے التماس کی کہ میں عناق سے نکاح کر لوں۔ اس وقت تو حضور نے جواب نہ دیا مگر بعد میں آیت اتری اَلزَّانِیْ لَایَنْکِحُ اِلَّا زَانِیَۃً اَوْ مُشْرِکَۃً نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بلا کر یہ آیت بھی سنائی اور یہ بھی ارشاد فرمایا کہ تم اس سے نکاح نہ کرنا۔

اس قصہ میں اُن لوگوں کے لیے سخت عبرت ہے جو غیر عورتوں کی محبت کا یقین کر لیا کرتے ہیں۔ ان لوگوں کو یاد رکھنا چاہیئے کہ غیر عورت کی چاہت اور لگاوٹ اُسی وقت تک رہتی ہے جب تک اُسے یہ گمان رہتا ہے کہ وہ اس مرد سے عیش کر سکے گی جہاں عورت کو یہ پتہ لگ جائے کہ اب وہ اس کام سے دور رہے گا۔ اس وقت عورت کی ساری محبت فوراً ہی غصہ اور انتقام اور کینہ کشی سے مبدل

ہوجاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سیدنا یوسف علیہ السلام کے قصہ میں بھی یہی بات سکھلائی ہے۔ کہاں تو امراۃ العزیز کی وہ شیفتگی وہ عشق اور کہاں حضرت یوسف کو پاک باز معلوم کرنے کے بعد یہ نفرت کہ شوہر کو کہہ کہہ کر اُن کو جیل میں بھجوایا اور پھر کبھی بات بھی نہ پوچھی۔ فقط رضی اللہ عنہ

۷۳۔ مسعود بن الربیع القاریؓ

ان کے والد کا نام ربیع اور ربیعہ بیان کیا گیا ہے ان کو قاری اس لئے کہتے ہیں کہ بنوقارہ میں سے تھے۔ یہ قبیلہ خزیمہ بن مدرکہ کی شاخ ہے یہ اس وقت اسلام لائے کہ ابھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دار الارقم میں خفیہ تعلیم کا آغاز نہ فرمایا تھا۔ مواخات میں یہ عبید بن تیہان کے بھائی ہیں۔

۳۰ھ کو بعمر زائد از ساٹھ سال انتقال فرمایا۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۷۴۔ سیدنا مصعب بن عمیر القرشی العبدریؓ

مصعب بن عمیر بن ہاشم بن مناف بن عبدالدار بن قصی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نسب میں قصی میں شامل ہو جاتے ہیں۔

نوجوانانِ مکہ میں حضرت مصعب جوانی و رعنائی، خوش پوشی و ناز پروردگی میں مشہور تھے ماں باپ کے لاڈلے تھے۔ ماں کو ہمیشہ یہ خیال رہتا کہ مکہ بھر میں انہی کا لباس سب سے قیمتی ہو اور ان ہی کا عطر سب سے زیادہ خوشبودار ہو۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے مَارَأَیْتُ بِمَکَّۃَ اَحْسَنَ لِمَّۃً وَلَا اَرَقَّ حُلَّۃً وَلَا اَنْعَمَ نِعْمَۃً مِنْ مُصْعَبِ بْنِ عُمَیْرٍ

ان کا اسلام دار ارقم میں ہوا ماں باپ کے خوف سے اظہار اسلام نہ کرتے تھے آخر ایک روز عثمان بن طلحہ نے ان کو نماز پڑھتے دیکھ لیا اور انہوں نے قوم کو ان کا مسلمان ہونا بتا دیا۔ ماں باپ اور قوم سب بگڑ گئی ان کو قید کر دیا۔ ان کو موقعہ ملا تو زندان سے نکلے اور حبشہ کے مہاجرین اولی میں شامل ہو گئے۔ اور کچھ عرصہ بعد پھر مکہ معظمہ میں واپس آ گئے۔

عقبہ ثانیہ کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مدینہ جا کر تعلیم قرآن اور تدریس دین کے لئے مامور فرمایا۔ سعد بن عبادہ اور سعد بن معاذ انہی کی تبلیغ سے مسلمان ہوئے بنو عبد الاشہل کا سارا قبیلہ انہی کے ہاتھ پر اسلام لایا۔ مدینہ منورہ میں گھر گھر اسلام پہنچ گیا اور ہر طرف سے قرآن کریم کی آواز آنے لگی۔

جنگ بدر میں اسلام کا نشان اعظم انہی کے ہاتھ میں تھا جنگ احد کے نشان بردار بھی یہی تھے ان کی شہادت کے بعد یہ نشان علی مرتضٰے نے سنبھالا تھا۔

ابو عبداللہ ان کی کنیت تھی اور مدینہ منورہ میں القاری المقری کے لقب سے یاد کئے جاتے تھے۔ بزرگ ترین صحابہ اور فاضل ترین صحابہ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

شہادت غزوہ احد میں ہوئی اس وقت اُن کی عمر پورے چالیس سال کی تھی یا کچھ زیادہ۔ تکفین کے وقت ان پر ایک لنگی سیاہ سفید

دعاریوں والی ڈالی گئی۔ وہ اتنی چھوٹی تھی کہ سر چھپاتے تھے تو پاؤں ننگے رہ جاتے تھے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سر پر کپڑا اور قدموں پر گھاس ڈال دو۔ یہ ان بزرگوں میں سے ہیں جن کی شان میں رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ نازل ہوئی۔ ان کے زہد و ورع کو صحابہ ہمیشہ یاد کیا کرتے تھے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۷۵۔ معتب بن حمراء الخزاعی السلولی رضؓ

معتب بن عوف بن عمر بن عامر بن فضل بن عفیف بن کلیب بن حبشہ بن سلول بن کعب بن عمرو بنو مخزوم کے حلیف ہیں۔ ابوعوف کنیت تھی

یہ مہاجرین حبشہ میں سے ہیں۔ آپ ابن الحمراء کے نام سے مشہور تھے جو آپ کی والدہ تھیں۔

مواخات میں یہ ثعلبہ بن حاطب انصاری کے بھائی تھے۔ بدر میں حاضر ہوئے بوقت انتقال ۸، سال کی عمر تھی۔ طبری نے وفات ۵۷ھ بتایا ہے رضی اللہ عنہ

۷۶۔ معمر بن ابی سرح بن ابی ربیعہ القرشی رضؓ

معمر بن ابی سرح بن ابی ہلال بن اہیب بن ضبہ بن حارث بن فہر القرشی الفہری

بدر میں حاضر تھے ۳۰ھ میں وفات پائی بعض نے ان کا نام بجائے معمر کے عمر تجویز کیا ہے رضی اللہ عنہ

۷۷۔ مہجع بن صالح المہاجر

مہجع بن صالح یمن کے باشندے ہیں یا بقول ابن ہشام قوم عک سے ہیں پکڑے گئے اور غلام بنا کر فروخت کئے گئے۔ عمر فاروق نے ان کو خریدا اور راہ خدا میں آزاد کر دیا تھا۔

جنگ بدر کے دن مسلمانوں میں سے پہلے شہید یہی ہیں تیر کی زد سے شہید ہوئے رضی اللہ عنہ

۷۸۔ واقد بن عبداللہ تمیمی الیربوعی

یہ خطاب بن نفیل کے حلیف تھے قدیم الاسلام ہیں۔ اس وقت اسلام لائے جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دار ارقم میں تعلیم و تبلیغ شروع نہ فرمائی تھی

سلسلہ مواخات میں بشر بن براء بن معرور انصاری ان کے بھائی تھے۔

واقد اس سریہ میں شامل تھے جو امیر المومنین عبداللہ بن جحش کی ماتحتی میں بھیجا گیا تھا۔

عمرو بن الحضرمی کے قاتل بھی یہی ہیں۔ قریش نے قتل حضرمی پر اس لئے احتجاج کیا تھا کہ اس روز یکم رجب تھی اور رجب کا احترام مسلمان بھی کرتے ہیں اسی واقعہ کی نسبت يَسْئَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ (الآیۃ) کا نزول ہوا تھا۔

حضرمی پہلا شخص تھا جو مشرکین میں سے قتل کیا گیا تھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی دیت ادا کی تھی اس بارہ میں عمر فاروق کا شعر ہے ؎

سَقَيْنَا مِنِ ابْنِ الْحَضْرَمِيِّ رِمَاحَنَا
بِنَخْلَةَ لَمَّا أَوْقَدَ الْحَرْبَ وَاقِدُ

واقد رضی اللہ عنہ بدر و احد اور دیگر جملہ مشاہد میں ملتزم رکاب مصطفوی رہے۔ خلافت فاروقی میں وفات پائی۔ رضی اللہ عنہ

۷۹۔ وہب بن محصن الاسدیؓ

یہ بنو خزیمہ میں سے ہیں عکاشہ بن محصن کے بڑے بھائی ہیں بنو عبد شمس کے حلیف تھے۔ اپنی کنیت ابوسنان الاسدی سے معروف ہیں۔ بالاتفاق مسلم ہے کہ بیعت الرضوان میں سب سے پیشتر ابتدا انہوں نے کی تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کس بات کی بیعت کرتے ہو۔ عرض کیا جس بات کی بیعت حضور کو مطلوب ہے۔ ۴۰ سال کی عمر تھی جب انہوں نے دنیائے ناپائدار کو ترک فرمایا۔ اس وقت محاصرہ بنی قریظہ جاری تھا رضی اللہ عنہ۔

۸۰۔ وہب بن ابی سرح القرشی الفہریؓ

وہب بن ابی سرح ربیعہ بن ہلال بن مالک بن ضبہ بن حارث بن الفہر بن

بدر میں معہ برادر خود عمرو بن ابی سرح حاضر تھے۔ رضی اللہ عنہ

۸۱۔ وہب بن سعد بن ابی سرح القرشیؓ

وہب بن سعد بن ابی سرح بن حارث بن حبیب بن جذیمہ بن مالک بن حسل بن عامر بن لوی

یہ عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کے بھائی ہیں۔ حدیبیہ، بدر، احد، خندق، خیبر میں موجود تھے۔ جنگ موتہ میں شہید ہوئے۔ مواخاتؓ میں یہ اور سوید بن عمرو بھائی بھائی تھے۔ دونوں ہی موتہ کے دن شہید ہوئے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۸۲۔ ہلال بن ابی خولیؓ

ہلال بن ابی خولی (عمرو) بن زہیر بن خیثمہ الجعفی۔ یہ خطاب بن نفیل کے حلیف ہیں۔ بدر میں حاضر تھے۔

ان کے دو بھائی خولی اور عبیداللہ بھی بدری ہیں رضی اللہ عنہ

۸۳۔ یزید بن رقیشؓ

بن رباب بن یعمر، یہ قبیلہ بنو اسد بن خزیمہ سے ہیں۔ بدر میں حاضر تھے۔ بعض نے ان کا نام اُرید بن رقیش لکھا ہے جو صحیح نہیں ہے رضی اللہ عنہ

۸۴۔ ابوحذیفہ بن عتبہؓ

ابوحذیفہ بن عتبہ ربیعہ بن عبدشمس بن عبدمناف قرشی العبشمی

ان کا نام ھشم یا ہشیم یا ہاشم بیان کیا گیا ہے۔ لانبا قد، خوبرو، احول اثعل تھے۔ اثعل اُسے کہتے ہیں جس کے دانت کی جڑ میں دوسرا دانت نکلا ہوا ہو۔

فضلاء صحابہ میں سے ہیں۔ ابھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم دار ارقم میں داخل نہ ہوئے تھے کہ یہ اسلام لا چکے تھے اول ہجرت حبشہ کی پھر مکہ میں آ گئے۔ پھر مکہ سے ہجرت مدینہ کی۔ ان کی بیوی سہلہ بنت سہیل بن عمرو نے ہجرت حبشہ میں ساتھ دیا تھا۔

بدر، احد، خندق، حدیبیہ غرض جملہ مشاہد میں ہمرکاب نبوی رہے۔ جنگ یمامہ میں بعمر ۵۳ سال شہادت پائی۔ رضی اللہ عنہ

۸۵۔ ابوسبرہ قرشی العامریؓ

ابوسبرہ بن ابورہم بن عبدالعزیٰ بن ابوقیس بن عبدود بن نصر بن مالک بن حسل بن عامر بن لوی

ہجرت حبشہ و ہجرت مدینہ سے مشرف ہوئے۔ یہ اُم کلثوم بنت سہیل بن عمرو کے شوہر ہیں۔ ان کی والدہ برہ بنت عبدالمطلب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی ہیں۔ بدر و اُحد اور جملہ مشاہد میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمرکاب رہے۔

خلافت عثمان میں انہوں نے انتقال کیا۔

مواخات میں سلمہ بن سلامت بن انس انصاری ان کے بھائی تھے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۸۶۔ ابوکبشہ مولیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

یہ فارسی النسل ہیں۔ مکہ میں پیدا ہوئے غلام تھے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو خریدا اور آزاد کر دیا۔ ان کا نام سلیم تھا۔

بدری ہیں جملہ دیگر مشاہد میں بھی نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ساتھ حاضر رہا کرتے تھے۔ ۱۳ھ میں وفات پائی۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۸۷۔ ابوواقد اللیثیؓ

بنولیث بن بکر بن عبدمناۃ میں سے ہیں حارث نام ہے قدیم الاسلام ہیں۔

بدر میں حاضر تھے اور یوم الفتح کو بنولیث وحمزہ وسعد بن بکر کا نشان ان کے ہاتھ میں تھا۔ ۸۵ سال کی عمر میں ۶۸ھ کو مکہ معظمہ میں وفات پائی۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

الانصار

۱۔ ابی بن ثابت الانصاریؓ

یہ حسان بن ثابت کے بھائی یا برادرزادہ ہیں۔ ابوالشیخ کنیت ہے۔ بدر میں شامل ہوئے اور بیر معونہ کے غزوہ میں شہید ہوئے

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۲۔ ابی بن کعبؓ

ابی بن کعب بن قیس بن عبید بن زید بن معاویہ بن عمرو بن مالک بن النجار (وہو تیم اللات) بن ثعلبہ بن عمرو بن الخزرج الاکبر الانصاری المعاوی۔

بنو معاویہ بنو جدیلہ کے پتہ سے معروف ہیں نحات جدیلہ معاویہ کی اہلیہ تھی۔ تیم لات کو نجار اس لیے کہتے ہیں کہ انہوں نے ایک شخص کے چہرہ پر تیشہ مار کر اس کا گوشت چھیل دیا تھا۔

ابی بن کعب عقبہ کی ہجرت ثانیہ سے مشرف ہوئے تھے اور پھر بدر و دیگر مشاہد میں بھی حاضر ہوتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انکو سب سے بڑا قاری فرمایا ہے۔

ایک بار سرورِ عالم نے ان کو بلایا اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے کہ میں تجھے اپنا قرآن سناؤں ابی نے عرض کیا میرا نام بھی اللہ تعالیٰ نے لیا ہے فرمایا ہاں۔ یہ سن کر وہ رونے لگے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سورہ بینہ پڑھ کر سنائی۔

ایک بار نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو فرمایا تھا لِیَهْنِئْكَ الْعِلْمُ تجھے علم مبارک ہو۔ یہ کاتب وحی بھی تھے اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے پیشتر خدمت کتابت وحی انہی کے سپرد تھی۔

عمر فاروقؓ نے جب تراویح کی جماعت قائم فرمائی تو انہی کو امام تراویح مقرر فرمایا تھا یہ بیس یوم تک تراویح پڑھایا کرتے اور عشرہ آخر میں نہ پڑھاتے۔

ان کا انتقال ۱۹ یا ۲۰ھ کو خلافت فاروقی میں ہوا۔ بعض نے خلافت عثمانی میں انتقال کا ہونا بھی تحریر کیا ہے۔ رضی اللہ عنہ

کتب احادیث میں ان سے ۱۶۴ مرویات پائی جاتی ہیں جن سے متفق علیہ ۳ صرف صحیح بخاری میں ۳ صرف صحیح مسلم میں ۷ ہیں۔

۱۴۔ اسعد بن یزید بن فاکہؓ

بن یزید بن خالدہ بن زریق بن عبد حارثہ الانصاری الزرقی۔

موسیٰ بن عقبہ نے ان کا نام اہل بدر میں تحریر کیا ہے مگر کتاب ابن اسحٰق میں ان کا نام درج نہیں۔ رضی اللہ عنہ

۴۔ اسید بن حضیر بن سماکؓ

بن سہیک بن رافع بن امرء القیس بن زید بن عبد الاشہل الانصاری الاشہلی۔

ان کی مشہور کنیت ابو یحییٰ ہے۔ اسلام میں سعد بن معاذ سے بھی پیشتر داخل ہوئے اور مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر ایمان لائے بیعت عقبہ ثانیہ سے مشرف ہوئے۔ بدر، احد اور جملہ مشاہد میں برابر حاضر رہے (صرف ابن اسحٰق نے ان کا نام بدریین میں درج نہیں کیا) احد میں سات زخم ان کے جسم پر تھے یہ ان لوگوں میں سے تھے جو احد میں ثابت القدم رہے یہ عاقل کامل صاحب فہم ورائے مسلّمہ تھے۔

مواخات میں زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے بھائی تھے۔ قرآن مجید نہایت ہی خوش الحانی سے پڑھا کرتے تھے۔ روایت صحیحہ میں ہے کہ ملائکہ ان کی قرأت کی سماعت کے لئے اترے۔

۲۰ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ امیر المومنین عمر فاروقؓ کو انہوں نے اپنا وصی بنایا تھا۔ فاروقؓ نے ان کی وفات کے بعد معلوم کیا کہ چار ہزار دینار کا قرض چھوڑ گئے ہیں۔ فاروقؓ نے ان کا نخلستان چار سال کے لئے چار ہزار میں فروخت کر دیا اور اس طرح قرض پورا چکا دیا۔ رضی اللہ عنہ

۵۔ اسیرہ بن عمرو الانصاری النجاریؓ

بنو عدی بن النجار میں سے ہیں۔ ابو سلیط کنیت سے زیادہ مشہور ہیں۔ ان کے والد عمرو بھی ابو خارجہ کنیت سے معروف ہیں۔ بدر اور مشاہد مابعد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ساتھ حاضر رہے ان کی والدہ برّہ ہیں جو کعب بن عجرۃ العلوی کی بہن ہیں۔ ابو سلیط کے فرزند عبداللہ نے ان سے روایت کی ہے۔ رضی اللہ عنہ

۶۔ انس بن مالک بن نضرؓ

بن ضمضم بن زید بن حرام بن جندب بن عامر بن غنم بن عدی بن نجار بن ثعلبہ بن عمرو بن خزرج بن حارثۃ الانصاری الخزرجی النجاری۔

ان کی کنیت ابو حمزہ ہے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف لائے تو یہ دس سال کے تھے ان کی والدہ ام سلیم بنت ملحان الانصاریہ نے ان کو حضور میں پیش کیا کہ یہ حضور کی خدمت کیا کرے گا۔ چنانچہ دس سال تک برابر خدمت نبوی میں شب و روز حاضر رہے سفر و حضر میں کبھی علیحدہ نہیں ہوئے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دعا دی تھی اَللّٰھُمَّ ارْزُقْہُ مَالًا وَّ وَلَدًا وَّ بَارِکْ لَہٗ۔ الٰہی اسے مال و اولاد دے اور برکت عطا فرما۔

کہتے ہیں کہ ان کی پشت سے ۸۰ فرزند اور دو دختران حفصہ و ام عمرو پیدا ہوئیں۔ آخر عمر میں بصرہ میں جا آباد ہوتے وہیں ۹۲ھ یا ۹۳ھ کو وفات پائی اس حساب سے ان کی عمر ۱۰۲ یا ۱۰۳ سال کی ہوتی ہے۔ رضی اللہ عنہ

ان سے کسی نے پوچھا کہ انس تم بدر میں شامل تھے۔ انہوں نے کہا تیری ماں مرے میں حضور کی خدمت چھوڑ کر کہاں جا سکتا تھا۔

دواوین حدیث میں ان سے ۲۲۸۶ مرویات موجود ہیں از انجملہ ۱۶۸ متفق علیہ ۸۳ صرف صحیح بخاری میں ۷۱ صرف صحیح مسلم میں موجود ہیں۔

۷۔ انس بن معاذ بن انس بن قیسؓ

بن عبید بن زید بن معاویہ بن عمرو بن مالک بن النجار الانصاری۔ سب کا اتفاق ہے کہ بدر میں حاضر تھے اور واقعہ بیر معونہ میں شہید ہوئے۔

واقدی اس بیان میں منفرد ہیں کہ وہ انس بن معاذ۔ بدر و احد و خندق اور جملہ مشاہد میں ملتزم رکاب نبوی تھے اور خلافت عثمانی میں وفات پائی رضی اللہ عنہ

۸۔ انیس بن قتادہؓ

بن ربیعہ بن خالد بن حارث بن عبید بن زید بن مالک بن عوف بن عمرو بن عوف بن مالک بن اوس الانصاری۔

بدر میں حاضر ہوئے اور احد میں شہادت پائی۔ خنساء بنت خدام الاسدیہ کے شوہر یہی تھے رضی اللہ عنہ

۹۔ انسہ مولیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

ابو مسروح کنیت بمقام سراۃ پیدا ہوئے جب حضور رونق افروز مجلس ہوتے اُس وقت دربانی کی خدمت سر انجام دیا کرتے تھے۔ بدر و اُحد میں حاضر تھے۔ خلافت ابوبکر صدیق میں انتقال ہوا۔ رضی اللہ عنہ

۱۰۔ اوس بن ثابت الانصاریؓ

اوس بن ثابت بن منذر بن حرام بن عمرو بن زید مناۃ بن عدی بن عمرو بن مالک بن النجار۔

حسان بن ثابت شاعر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی بھائی ہیں۔ عقبہ و بدر میں شریک ہوئے اور احد میں شہادت پائی۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۱۱۔ اوس بن خولی بن عبداللہؓ

بن حارث بن عبید بن مالک بن سالم الحبلی الانصاری الخزرجی

بدر، احد، خندق اور جملہ مشاہد نبوی میں برابر حاضر رہے۔ مواخات میں یہ شجاع بن وہب الاسدی کے بھائی ہیں۔ انصار میں سے غسل نبوی میں شریک ہونے کی فضیلت انہی کو حاصل ہوئی۔ یہ اس طرح ہوا کہ انصار تو بوقت غسل جمع ہو گئے۔ اندر سے دروازہ بند تھا انہوں نے شور کرنا شروع کیا کہ ہم آنحضرت کے ننھیال میں سے ہیں ہم کو ضرور شریک کرو۔ کہا گیا کہ تم اپنے میں سے ایک کو منتخب کرلو چنانچہ اوس بن خولی پر انصار نے اتفاق کر لیا اور یہی بزرگ تدفین مبارک میں برابر شامل رہے۔ ان کا انتقال مدینہ میں خلافت عثمانیہ میں ہوا۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۱۲۔ اوس بن صامت الانصاریؓ

اوس بن صامت بن قیس بن احرم بن فہر بن ثعلبہ بن غنم بن سالم بن عوف بن الخزرج

بدر، احد اور جملہ مشاہد میں بمعیت رسول پاک حاضر ہوتے رہے۔ امیر المومنین عثمان کی خلافت میں وفات پائی۔

یہ وہی ہیں جنہوں نے اپنی بیوی سے ظہار کیا تھا اور پھر قبل از کفارہ ہم بستری کر لی تھی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حکم دیا تھا کہ ۶۰ مساکین کو ۱۵ اصاع جو تقسیم کریں۔ یہ عبادہ بن صامت کے بھائی ہیں اور مندرجہ ذیل شعر انہی کا ہے ؎

انا ابن من یقیا عمرو جدے　　البو عامن ماء السماء

۱۳۔ ایاس بن ودقہ الانصاری الخزرجیؓ

بنو سالم بن عوف بن خزرج سے ہیں۔ بدر میں حاضر ہوئے اور جنگ یمامہ میں شہادت پائی رضی اللہ عنہ

۱۴۔ بشر بن براء بن معرور الانصاری الخزرجیؓ

بنو سلمہ میں سے ہیں۔ بیعت عقبہ سوم کا شرف حاصل کیا۔ بدر، احد، خندق میں شجاعانہ خدمات انجام دیں۔ بمقام خیبر یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دستر خوان پر تھے جب یہودیہ کا مسموم گوشت پیش ہوا۔ انہوں نے اس میں سے لقمہ کھا لیا اور زہر سے شہید ہو گئے ان کا بیان ہے کہ لقمہ کا مزہ مجھے بھی خراب معلوم ہوا تھا مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لقمہ اگلنا ادب کے خلاف سمجھا۔ ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو ساعدہ کا سردار مقرر فرمایا تھا۔

ان کے والد بزرگوار براء بن معرور نقبائے محمدیہ میں سے ہیں عقبہ اولیٰ کو بیعت کا شرف حاصل کیا تھا یہ پہلے بزرگوار ہیں جنہوں نے کعبہ کو سمت نماز ٹھہرایا تھا اور پہلے بزرگوار ہیں جنہوں نے قبلہ رُخ لحد میں آرام کیا تھا۔ ان کا انتقال قدوم نبوی سے بیشتر مدینہ منورہ میں ہو گیا تھا۔ رضی اللہ عنہ

۱۵۔ بشیر بن سعد بن ثعلبہؓ

بن خلاص بن زید بن مالک بن ثعلبہ بن کعب بن خزرج بن حارث بن خزرج الانصاری۔

ابو نعمان کنیت تھی۔ عقبہ و بدر میں حاضر تھے سماک بن سعد ان کے بھائی ہیں۔ وہ بھی بدری ہیں۔ بشیر احد اور جملہ مشاہد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کیساتھ ساتھ حاضر رہے تھے۔

یوم سقیفہ کو ابو بکر صدیق کے ہاتھ پر انصار میں سے سب سے پہلی بیعت کرنے والے یہی بزرگ ہیں۔ جنگ عین التمر میں زیر سیادت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سرگرم پیکار تھے کہ جاں بجاں آفریں سپرد فرمائی یہ واقعہ خلافت صدیقی کا ہے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۱۶۔ ثابت بن اخرم رضؓ

بن ثعلبہ بن عدی بن العجلان البلوی ثم الانصاری

انصار کے حلیف ہیں۔ بدر اور جملہ مشاہد میں داد شجاعت دینے والے۔ جنگ موتہ میں جب سردار سوم عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ بھی شہید ہو چکے تو نشان قیادت ان کو سپرد کر دیا۔ انہوں نے یہ نشان خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی خدمت میں یہ کہہ کر پیش کر دیا کہ آپ مجھ سے بڑھ کر ماہر جنگ ہیں۔

ان کا انتقال سنہ ۱۲ھ میں ہوا۔ طلیحہ بن خویلد اسدی نے ایام ردۃ میں ان کو قتل کیا بعد ازاں طلیحہ بھی داخل اسلام ہو گئے تھے رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۱۷۔ ثابت بن جذع (ثعلبہ) رضؓ

بن زید بن حارث بن حرام بن کعب بن غنم بن کعب بن سلمہ الانصاری

عقبہ میں حاضر ہوئے بدر اور جملہ مشاہد میں جوہر مردانگی دکھلائے۔ غزوہ طائف میں شہادت کا شرف حاصل کیا۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۱۸۔ ثابت بن خالد بن نعمان بن خنساء الانصاری رضؓ

بنو مالک بن النجار میں سے ہیں بدر و اُحد میں حاضر ہوئے اور جنگ یمامہ میں شہید ہوئے۔ بعض نے ان کا شمار شہدائے بئر معونہ میں کیا ہے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۱۹۔ ثابت بن عامر بن زید الانصاری

بدر میں حاضر تھے رضی اللہ عنہ

۲۰۔ ثابت بن عبید الانصاری

بدر میں حاضر تھے اور صفین میں علی المرتضیٰ کی جانب موجود۔ اسی جگہ شہادت یاب ہوئے رضی اللہ عنہ

۲۱۔ ثابت بن عمرو بن زید بن عدی رضؓ

بن سواد بن مالک بن النجار الانصاری

بدر میں حاضر ہوئے اور احد میں شہید ہوئے۔ موسیٰ بن عقبہ ابو معشر اور واقدی و ابن سعد کا متفقہ بیان یہی ہے۔ ابن اسحٰق نے ان کا ذکر بدریین میں اور موسیٰ بن عقبہ نے ان کا ذکر شہدائے احد میں نہیں کیا۔ رضی اللہ عنہ

۲۲۔ ثابت بن ہزال بن عمرو الانصاری رضی اللہ عنہ

جو عمرو بن عوف میں سے ہیں۔ بدر اور جملہ مشاہد میں حاضر رہے۔ جنگ یمامہ میں شہید ہوئے رضی اللہ عنہ

۲۳۔ ثعلبہ بن حاطب بن عمرو رضی اللہ عنہ

بن عبید بن امیہ بن زید بن مالک بن عوف بن عمرو بن عوف الانصاری

بدر و احد میں حاضر تھے۔ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کثرت مال کے متعلق دعا کرنے کی بابت التماس کی تھی حضور نے فرمایا "قلیلٌ تُؤدِّی شُکرَہٗ یا ثعلبۃُ خیرٌ من کثیرٍ لا تُطِیقُہٗ" اے ثعلبہ وہ تھوڑا مال جس کا شکرانہ ادا کیا جا سکے اس زیادہ مال سے بہتر ہے جسے سنبھال نہ سکو جس کا شکر ادا نہ کر سکو۔ رضی اللہ عنہ

۲۴۔ ثعلبہ بن عمرو بن عامر رضی اللہ عنہ

بن عبید بن محصن بن عمرو بن عتیک بن مبذول (اسد) بن مالک بن نجار الانصاری

بدر، احد، خندق اور دیگر جملہ غزوات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ساتھ حاضر رہتے تھے۔ انہوں نے بیان کیا ہے کہ ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں آکر بیان کیا کہ اس نے فلاں لوگوں کا اونٹ سرقہ کیا ہے اس پر وہ لوگ بھی طلب ہوئے۔ اثبات جرم کے بعد مجرم کا ہاتھ کاٹا گیا۔ ہاتھ کٹ جانے کے بعد مجرم بولا۔ الحمد للہ الذی طہرنی منک اللہ کا شکر ہے جس نے جسم کا یہ ناپاک حصہ مجھ سے علیحدہ کر دیا۔

ان کے سال وفات میں اختلاف ہے غالباً جسر ابو عبیدہ کے جنگ میں بعہد خلافت فاروقی شہادت یاب ہوئے۔ رضی اللہ عنہ

۲۵۔ ثعلبہ بن غنمہ بن عدی رضی اللہ عنہ

بن نابی بن عمرو بن سواد بن غنم بن کعب بن سلمۃ الانصاری۔

یہ بھی ان بزرگ ستر انصار میں سے ہیں جنہوں نے عقبہ پر آخری بیعت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دست اقدس پر کی تھی۔

یہ ان بزرگوں میں سے ہیں جنہوں نے بنو سلمہ کے بتوں کو توڑا پھوڑا تھا۔ معاذ بن جبل اور عبداللہ بن انیس اس سنت ابراہیمی میں ان کے شریک کار تھے۔ یوم خندق کو شہید ہوئے رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۲۶۔ جابر بن عبداللہ بن رباب

بن نعمان بن سنان بن عبید بن عدی بن غنم بن کعب بن سلمۃ الانصاری السلمی

یہ انصار میں پہلے بزرگوار ہیں جنہوں نے عقبہ اولیٰ سے بھی ایک سال پیشتر اسلام قبول کر لیا تھا۔ صحابی ابن صحابی ہیں۔ بدر، احد، خندق اور جملہ مشاہد مصطفوی میں بالالتزام حاضر ہوتے رہے رضی اللہ عنہ

دواوین احادیث میں ان سے ۱۵۴۰ مرویات موجود ہیں۔ از انجملہ متفق علیہ ۶۰ صرف صحیح بخاری میں ۲۶ صرف صحیح مسلم میں ۱۲۶ ہیں۔

۲۷۔ جابر بن عتیک الانصاری المعاوی الاوسی رضی اللہ عنہ

یہ قبیلہ بنو معاویہ بن مالک سے ہیں۔ بدر میں اور جملہ مشاہد مابعد میں حاضر ہونے کی عزت حاصل کی ہے۔ عام الفتح کو بنو معاویہ کا نشان انہی کے

ہاتھ میں تھا۔

حارث بن عتیک ان کے بھائی ہیں اور وہ بھی صحابی ہیں ۶۱ھ کو بعمر ۷۱ سال انتقال کیا۔ ابو عبداللہ کنیت تھی۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۲۸۔ <u>حارثہ بن سراقہ رضی اللہ عنہ</u>

یہ بخاری و انصاری ہیں جنگ بدر میں شہید ہوئے۔ یہ انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے پھوپھیرے بھائی ہیں۔ بوقت شہادت نوجوان ہی تھے۔ لشکر کا پہرہ دے رہے تھے پانی پینے لگے کہ دشمن کا تیر حلق پر آ لگا کر گئے۔ اُن کی والدہ نے عرض کیا کہ حضور جانتے ہیں حارثہ کی منزلت میرے دل میں کیا تھی اگر وہ جنت میں گیا ہے تو میں صبر کروں گی اور اگر نہیں تو حضور ہی دیکھ لیں گے کہ میں کیا کچھ کرتی ہوں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جنت صرف ایک تو نہیں۔ جنان بہت ہیں اور حارثہ جنت الفردوس میں ہے۔

بدر کے دن انصار میں یہ سب سے پہلے شہید ہوئے تھے۔ رضی اللہ عنہ

۲۹۔ <u>خبیب بن عدی الانصاری رضی اللہ عنہ</u>

قبیلہ بنو جحجبی سے تھے۔ بدر میں حاضر ہوئے اور ۳ھ کو سریہ رجیع میں کفار نے دھوکہ دے کر ان کو اور زید بن دثنہ رضی اللہ عنہما کو گرفتار کر لیا۔

جنگ بدر میں حضرت خبیب نے حارث بن عامر کو قتل کیا تھا۔ اس لیے اسیری کے بعد عقبہ بن حارث نے ان کو خرید لیا اور مقتول باپ کا انتقام لینے کے لئے ارادہ کر لیا گیا کہ اُن کو قتل کیا جائے۔ جنگ بدر میں جن خاندانوں کے لوگ قتل ہوئے تھے وہ سب حضرت خبیب کے قتل کو ایک بڑا کارنامہ سمجھتے تھے۔

پہلے ان کو چند روز تک قید رکھا گیا۔ عقبہ کی عورت پر اُن کی اعلیٰ سیرت کا ایسا اثر ہوا کہ وہ بایام قید ان کو آرام سے رکھا کرتی تھی۔ اُسی کا بیان ہے کہ خبیب کا سا نیک قیدی میرے دیکھنے میں نہیں آیا۔ اس کے پاس انگوروں کے خوشے ہم دیکھا کرتے تھے۔ حالانکہ مکہ میں اُن دنوں انگور کا نام و نشان بھی نہ تھا۔

قتل کے دن کفار اُن کو حرم مکہ سے باہر لے گئے اور میدان تنعیم میں لے جا کر بماہ صفر ۴ھ اُن کو پہلے قتل کیا اور پھر صلیب پر لٹکا دیا ان کا لاشہ برابر لٹکتا رہا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرو بن اُمیہ الضمری کو مامور فرمایا کہ لاش اتار لائیں اُن کا بیان ہے کہ میں نے لکڑی پر چڑھ کر لاش کو نیچے گرایا جب خود نیچے اُترا تو لاش موجود نہ تھی۔ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ وہ پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے قتل سے پہلے دو رکعت نماز پڑھی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آئندہ کے لیے اُسے سنت ٹھہرا دیا۔

جو اشعار انہوں نے پھانسی کے نیچے جا کر فی البدیہہ تصنیف کیے تھے وہ کتاب رحمۃ للعالمین میں درج ہیں ان اشعار سے ان کی بشر دلی اور قوت ایمانیہ اور استقلال طبع کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔ اشعار بالا میں سے یہ دو شعر نہایت مشہور ہیں۔

فَلَسْتُ اُبَالِیْ حِیْنَ اُقْتَلُ مُسْلِماً — عَلٰی اَیِّ جَنْبٍ کَانَ فِی اللّٰہِ مَصْرَعِیْ

وَذٰلِکَ فِیْ ذَاتِ الْاِلٰہِ وَاِنْ یَّشَاْ — یُبَارِکْ عَلٰی اَوْصَالِ شِلْوٍ مُّمَزَّعِ

جب میں مسلمان ہو کر قتل کیا جا رہا ہوں تو مجھے قتل کی پروا نہیں۔ خدا کی راہ میں گرنا خواہ کسی کروٹ پر ہو ذات الٰہی کی یہ قدرت میں ہے

کہ میرے جسم کے ایک ایک ٹکڑے کو برکت عطا فرمائے۔ رضی اللہ عنہ

۳۰۔ خلاد بن رافع ؓ

رفاعہ بن رافع کے بھائی ہیں۔ بدر میں شامل ہوئے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۳۱۔ ربیع بن ایاس

بن عمرو بن غنم بن اُمیہ بن لوذان الانصاری۔ خود معہ اپنے بھائی کے حاضر بدر تھے۔ رضی اللہ عنہ

۳۲۔ رفاعہ بن حارث بن رفاعہ ؓ

بنو عفراء سے ہیں ابن اسحٰق نے ان کا شمار بدریئین میں کیا ہے۔ واقدی کو انکار ہے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۳۳۔ رفاعہ بن رافع رضی اللہ عنہ

رفاعہ بن رافع بن مالک بن العجلان بن عمرو بن عامر بن زریق الانصاری الزرقی۔ ابو معاذ کنیت ابی بن سلول کے نواسہ ہیں جنگ بدر میں مع اپنے ہر دو برادران خلاد و مالک کے شریک ہوئے۔

احد اور دیگر جملہ مشاہد میں بھی ہمرکاب نبوی تھے واقعہ جمل وصفین میں حضرت علی مرتضیٰ کی جانب تھے۔ امارت معاویہ کے ابتدائی ایام میں وفات پائی۔

یہ ۲۴ حدیثوں کے راوی ہیں جن میں سے صحیح بخاری میں ۳ ہیں۔

۳۴ ابولبابہ رفاعہ بن عبدالمنذر الانصاری رضی اللہ عنہ

بن نسّاب وابن ہشام و خلیفہ نے ان کا نام بشیر لکھا ہے مگر امام احمد وابن معین وابن اسحٰق سے ثابت ہے کہ ان کا نام رفاعہ تھا۔ یہ انصاری اوسی ہیں سلسلہ نسب یہ ہے۔

رفاعہ بن عبدالمنذر بن زبیر بن زید بن اُمیہ بن زید بن مالک بن عوف بن عمرو بن مالک بن الاوس۔

عقبہ میں حاضر تھے اور بارہ نقیبوں میں سے ایک تھے جنگ بدر میں حضور کے ساتھ نکلے تھے۔ راہ ہی سے حضورؐ نے ان کو مدینہ کا نگران مقرر فرما کر واپس کر دیا تھا اور غنیمت میں حصہ عطا فرمایا تھا۔ غزوہ سویق میں بھی ان کو نگرانی مدینہ کا عہدہ دیا گیا تھا۔ احد اور جملہ مشاہد مابعد میں بھی مستلزم رکاب نبوی رہے غزوہ تبوک میں پیچھے رہ گئے تھے۔ پھر ان کو اپنے اس ترک سعادت کا خیال پیدا ہوا تو خود کو مضبوط زنجیر کے ساتھ ستون مسجد سے بندھوا دیا۔ اُن کے بیٹے نماز اور ضروریات بشری کے وقت اُن کو کھول دیتے اور پھر باندھ دیتے سات دن بھوک کے پیاسے اسی طرح کاٹے اسی عرصہ میں شنوائی کم ہو گئی بینائی کو بھی صدمہ پہنچا ایک روز بوجہ ضعف غش کھا کر گر پڑے آخر اللہ تعالیٰ نے اُن کی توبہ قبول کر لی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو رہائی بخشی، یہ روایت اس روایت سے زیادہ معتبر و صحیح ہے جس میں بنو قریظہ کے اشارہ کا ذکر کیا گیا ہے۔

قبولیت توبہ کے شکرانہ میں کل مال اور مکان صدقہ کرنا چاہا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ثلث مال کافی ہے۔

غزوہ فتح مکہ میں قبیلہ بنو عمرو بن عوف کا نشان ان کے ہاتھ میں تھا۔ امیر المومنین حضرت علی کے ایام خلافت میں انتقال کیا۔

رضی اللہ عنہ

۳۵- رفاعہ بن عمرو بن زید الخزرجی الانصاریؓ

بیعت عقبہ میں داخل اور بدر میں شامل تھے۔ غزوہ احد میں شہید ہوئے ان کی کنیت ابو الولید ہے مگر یہ ابن ابی الولید کے نام سے اس لئے معروف ہیں کہ ان کے دادا زید بن عمرو کی کنیت بھی ابو الولید تھی۔ؓ

۳۶- رفاعہ بن عمرو الجہنیؓ

ابو معشر کہتے ہیں کہ بدر و احد میں حاضر تھے ابن اسحٰق و واقدی نے ان کے نام کی تصحیح ودیعہ بن عمرو کی ہے۔ رضی اللہ عنہ

۳۷- زید بن اسلم بن ثعلبہ بن عدی العجلانیؓ

یہ قبیلہ بلی میں بھی رہے اس لئے بلوی بھی کہتے ہیں پھر بنو عمرو بن عوف کے حلیف بن گئے تھے اس لئے انصاری ہیں۔ ثابت بن اکرم ان کے چچا ہیں۔

موسیٰ بن عقبہ نے ان کو بدریین میں شمار کیا ہے جنگ احد میں بھی حاضر تھے۔ رضی اللہ عنہ

۳۸- زید بن دثنہ الانصاری البیاضیؓ

زید بن دثنہ بن معاویہ بن عبید بن عامر بن بیاضہ۔ بدر و احد میں شریک ہوئے اور یوم الرجیع میں خبیب بن عدی کے ساتھ کفار کی قید میں اسیر ہوئے۔ صفوان بن امیہ نے ان کو مکہ میں خریدا اور قتل کر دیا۔ یہ واقعہ ۳ھ کا ہے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۳۹- زید بن سہل الانصاری

زید بن سہل بن اسود بن حرام بن عمرو بن زید بن مناۃ بن عدی بن عمرو بن مالک بن النجار الانصاری النجاری

ان کی کنیت ابو طلحہ ہے اور زیادہ کنیت ہی سے مشہور ہیں۔ انس بن مالک کی والدہ ام سلیم بنت ملحان انہی کے نکاح میں تھیں ایک روز انہوں نے یہ آیت پڑھی انفروا خفافاً و ثقالاً "جہاد کرو خواہ سامان ہو یا نہ ہو پڑھ کر کہا یا اللہ اس کا مطلب تو معلوم نہیں۔ البتہ جوانی و پیری تو جہاد ہی میں پوری کی ہے۔ پھر اپنی اولاد سے کہا کہ میں جہاد کو جاؤں گا۔ سامان درست کر دو۔ وہ بولے بابا جی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں نیز عہد صدیقی میں نیز عہد فاروقی میں جہاد کر چکے ہو۔ اب آرام کرو۔ بولے نہیں آخر بحری فوج میں داخل ہوئے اور جہاز ہی پر جان دی۔ ان کی لاش کو سات یوم جہاز پر بانتظار جزیرہ رکھا گیا۔ لاش میں ذرا تغیر نہ آیا تھا کہتے ہیں کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد چالیس سال تک متواتر روزے رکھے۔

مدائنی نے سنہ وفات ۵۱ھ تحریر کیا ہے۔ رضی اللہ عنہ

۴۰- زید بن عاصم المازنی الانصاریؓ

بیعت عقبہ میں شامل تھے۔ بدر میں حاضر۔ غزوہ احد میں خود اور ان کی زوجہ ام عمارہ اور ان کے ہر دو فرزند حبیب و عبداللہ نبرد آزما ہوئے ان کی کنیت بظن غالب ابو الحسن بھی ہوئی ہے۔ رضی اللہ عنہ وعن اہل بیتہ

۴۱- زید بن المزین الانصاری البیاضیؓ

بدر و احد میں حاضر تھے۔ یوم الرجیع کو حبیب بن عدی رضی اللہ عنہ کے ساتھ کفار کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے۔ صفوان بن امیہ نے ان کو خریدا اور قتل کیا تھا۔ واقدی نے ان کا نام بجائے زید کے یزید لکھا ہے۔

مواخات مہاجرین و انصار میں مسطح بن اثاثہ ان کے بھائی بنائے گئے تھے۔ رضی اللہ عنہ

۴۲۔ زید بن ودیعہ الانصاری رضی اللہ عنہ

یہ بنو عوف بن خزرج میں سے ہیں۔ موسیٰ بن عقبہ نے ان کا صرف بدر میں شامل ہونا تحریر کیا ہے مگر دیگر مؤرخین نے ان کو بدر و احد کے حاضرین میں درج کیا ہے۔ رضی اللہ عنہ

۴۳۔ زیاد بن لبید بن ثعلبہ انصاری البیاضی رضی اللہ عنہ

یہ بنو بیاضہ بن عامر بن زریق سے ہیں۔ ابو عبداللہ کنیت۔ یہ اسلام کے بعد مکہ معظمہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ رہے تھے۔ پھر جب حضورؐ نے ہجرت کی تو انہوں نے بھی ہجرت کی۔ لہذا ان کو مہاجری انصاری کہا جاتا تھا۔ عقبہ، بدر، احد، خندق اور دیگر جملہ مشاہد میں ہمرکاب نبوی رہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حاکم حضر موت مقرر فرمایا تھا۔ آغاز حکومت معاویہ میں انتقال فرمایا۔

۴۴۔ سالم بن عمیر الانصاری رضی اللہ عنہ۔

سالم بن عمیر بن ثابت بن نعمان بن امیہ بن امرء القیس بن ثعلبہ بن عمرو بن عوف الانصاری۔

بدر، احد، خندق اور دیگر جملہ مشاہد میں مستلزم رکاب نبوی رہے۔ سلطنت معاویہ کے عہد میں وفات پائی۔ یہ ان بزرگوں میں سے ہیں جو کثرت گریہ کے لئے مشہور تھے۔ رضی اللہ عنہ

۴۵۔ سبیع بن قیس بن عیشہ الانصاری الخزرجی رضی اللہ عنہ

بدر میں شامل تھے ان کے بھائی عباد بن قیس بھی بدری ہیں۔ احد میں بھی شامل ہوئے۔ رضی اللہ عنہ

۴۶۔ سراقہ بن عمرو بن عطیۃ الانصاری رضی اللہ عنہ

سراقہ بن عمرو بن عطیۃ بن خنساء بن بذول بن عمرو بن غنم بن مالک بن النجار۔ الانصاری

بدر، احد، خندق، حدیبیہ، خیبر اور عمرۃ القضاء میں ہمرکاب مصطفوی تھے۔ یوم موتہ کو شہید ہوئے۔ رضی اللہ عنہ

۴۷۔ سفیان بن بشر بن حارث الانصاری الخزرجی رضی اللہ عنہ

ان کے والد کو چند مؤرخین نے بشر (با و شین کے ساتھ) اور چند مؤرخین نے نون و سین کے ساتھ لکھا ہے بدر و احد میں خدمت نبوی میں حاضر تھے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۴۸۔ سراقہ بن کعب الانصاری رضی اللہ عنہ

سراقہ بن کعب بن عمرو بن عبد العزیٰ بن غزیہ بن عمرو بن عبد عوف بن غنم بن مالک بن النجار

بدر، احد اور دیگر جملہ مشاہد میں حاضر ہوئے اور سلطنت امیر معاویہ میں وفات پائی۔ رضی اللہ عنہ

۴۹۔ سعد بن خولی الانصاری رضی اللہ عنہ

یہ حاطب بن ابی بلتعہ کے غلام آزاد کردہ تھے۔ کوئی ان کو مذحجی، کوئی کلبی، کوئی فارسی النسل بیان کرتا ہے۔ بدر میں شامل تھے بہیں شہید

ہوئے بعض نے ان کی شہادت غزوہ احد کی بیان کی ہے۔ رضی اللہ عنہ

۵۰۔ سعد بن خیثمہ الانصاری الاوسیؓ

بنو عوف بن عمرو میں سے ہیں۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر پر چلنے کے لئے فرمایا تو ان کے والد نے کہا کہ میں جاؤں گا اور تم گھر پر ٹھہرو۔ سعد بولے باوا جان یہ بہشت کا معاملہ ہے اس لئے مجھے ہی جانے دیجئے کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ اس جنگ میں مجھے شہادت ضرور نصیب ہو جائے گی۔ آخر قرعہ اندازی ہوئی قرعہ میں بھی ان کا نام نکل آیا۔ خوشی خوشی گئے۔ شہادت پاکر خوشی خوشی جنت کو سدھارے یہ عقبی بھی ہیں اور بدری بھی ابو خیثمہ یا ابو عبد اللہ کنیت کرتے ہیں۔ ان کے والد سال آئندہ جنگ احد میں فائز بہ شہادت ہوئے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہما

۵۱۔ سعد بن ربیع الانصاری الخزرجیؓ

سعد بن ربیع بن عمرو بن ابی زہیر بن مالک بن امراء القیس بن مالک الاغر بن ثعلبہ بن کعب بن خزرج بن حارث۔

عقبی بھی ہیں اور بدری بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دوازدہ نقیبوں میں سے ہیں ایام جاہلیت میں بھی کاتب تھے۔ عقبہ کی بیعت اولیٰ و ثانیہ میں حاضر، بدر میں شامل تھے۔ احد میں شہید ہوئے۔ غزوہ احد کا ذکر ہے کہ جنگ کے خاتمہ پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سعد کی خبر کون لائے گا میں نے دیکھا تھا کہ نیزہ برداروں کا ایک گروہ اسے گھیرے ہوئے ہے۔ ابی بن کعب خبر لانے کو اٹھے۔ دیکھا کہ شہیدوں کے ڈھیر میں پڑے ہیں۔ ابھی سانس چلتی ہے اور آنکھ جھپکتی ہے مجھے دیکھ کر کہا۔ کیا دیکھتے ہو۔ میں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے تمہاری خبر کو بھیجا ہے۔ سعد نے کہا حضورؐ سے میرا سلام عرض کر دینا اور کہہ دینا کہ مجھے نیزہ کے بارہ زخم آئے ہیں مگر میں نے بھی اپنے حملہ آور کو جانے نہیں دیا۔

قوم کو بھی میرا اسلام کہہ دینا اور کہنا اللہ، اللہ۔ وہ عہد نہ بھول جائیں جو انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے شب عقبہ میں کیا تھا۔ وہ یہ سمجھ لیں کہ اگر تم میں سے ایک شخص کی زندگی میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ذرا سی آنچ لگی تو تم اللہ کے سامنے کچھ جواب نہ دے سکو گے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سنا تو فرمایا اللہ تعالیٰ سعد پر رحم فرمائے زندگی اور موت اللہ اور رسول کی خیر خواہی میں پوری کر گیا۔

یہ سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ وہی ہیں جن کی اولاد کو سب سے پہلے ترکہ عصبہ شرعی ملا۔ ان کی دو دختروں کو ۲/۳ حصہ ملا تھا۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۵۲۔ سعد بن زید زرقی الانصاریؓ

سعد بن زید بن فاکہ بن زید بن خلدہ بن عامر بن زریق۔ بدر میں حاضر ہوئے رضی اللہ عنہ

۵۳۔ سعد بن سہل الانصاریؓ

سعد بن سہل بن عبد الاشہل بن حارثہ بن دینار بن النجار، بدر میں حاضر ہوئے رضی اللہ عنہ

۵۴۔ سعد بن عبید الانصاری الاوسیؓ

سعد بن عبید بن نعمان بن قیس بن عمرو بن زید بن امیہ بن ضبیعہ بن زید بن مالک بن عوف بن عمرو بن عوف

ابو زید ان کی کنیت ہے بدر میں حاضر ہوئے اور ۱۵ھ کو بعمر ۶۴ سال جنگ قادسیہ میں شہید ہوئے۔

یہ "سعد القاری" کے نام سے معروف ہیں اور ان بزرگوں میں سے ہیں جنہوں نے عہد نبوی میں قرآن مجید کو حفظ کر لیا تھا۔ ان کے فرزند عمیر بن سعد کو فاروق اعظم نے شام کا والی بھی بنا دیا تھا۔ رضی اللہ عنہما

۵۵۔ سعد مولیٰ عتبہ بن غزوان رضؓ

غزوہ بدر میں اپنے مولیٰ عتبہ بن غزوان رضی اللہ عنہ کے ساتھ حاضر ہوئے تھے رضی اللہ عنہ

۵۶۔ سعد بن عثمان بن خلدہ الانصاری الزرقی رضؓ

سعد بن عثمان بن خلدہ بن مخلد بن عامر بن زریق الانصاری

ابو عبادہ کنیت ہے بدر میں حاضر ہوئے۔ یہ ان تین اشخاص میں سے ہیں جو جنگ احد میں بھاگ کھڑے ہوئے تھے دوسرا ان کا بھائی عقبہ بن عثمان تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی معافی کو قرآن میں نازل فرمایا رضی اللہ عنہ

۵۷۔ سعد بن معاذ الانصاری سید الاوس رضؓ

سعد بن معاذ بن نعمان بن امرء القیس بن زید بن عبد الاشہل بن جشم بن حارث بن خزرج بن مبنیت (عمرو) ابن مالک بن اوس

عقبہ اول وثانیہ کے درمیان (سلسلہ نبوت) کو مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر ایمان لائے تھے۔ بدر، احد، خندق میں حاضر ہوئے۔ جنگ خندق میں ان کے ایک تیر گھٹنے کی آنکھ پر لگا تھا۔ رگ کٹ گئی۔ جب خون بند کرتے تو ورم ہو جاتا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا خیمہ مسجد نبوی میں لگوایا تھا خود تیمارداری فرمایا کرتے تھے۔ جنگ خندق کے بعد قریظہ کا غزوہ شروع ہو گیا۔ انہوں نے دعا مانگی کہ الٰہی جب تک میں بنی قریظہ کا فیصلہ نہ دیکھ لوں۔ اس وقت تک مجھے موت نہ آئے۔ خون بند ہو گیا حتیٰ کہ ایک قطرہ بھی نہ نکلا۔

اسی اثنا میں بنو قریظہ نے ان کو اپنا حکم تسلیم کر لیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کو حکم مان لیا۔

قبل از اسلام اوس اور بنو قریظہ کا اتحاد تھا اور یہودیوں کا یہ خیال تھا کہ اس خاندانی اتحاد کی بنیاد پر سعد بن معاذ ہماری ہی اعانت کریں گے۔

سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے فیصلہ یہ کیا کہ جنگ آوروں کو قتل کر دیا جائے اور اُن کی زن و بچہ کو اسیر کر کے اُن کی قیمت سے مسلمانوں کی حالت درست بنائی جائے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فیصلہ سنکر فرمایا أَصَبْتَ حُكْمَ اللَّهِ فِيهِمْ تم نے اُس حکم کے مطابق کہا جو اللہ تعالیٰ کا اُن کے حق میں تھا۔

اس فیصلہ کے بعد پھر زخم سے خون جاری ہو گیا اور اسی عارضہ میں جنگ خندق سے ایک ماہ بعد فائز بہ شہادت ہوئے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سعد کے لیے عرش الرحمٰن بھی جھوم گیا۔

فرمایا کہ ان کے جنازہ میں ستر ہزار فرشتے ایسے شامل ہوئے جو کبھی زمین پر نہ اترے تھے۔

حضرت سعد بڑے کڑیل لانبے جوان تھے مگر جنازہ میں ذرا بوجھ نہ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جنازہ کو فرشتے اٹھائے ہوئے ہیں۔

ایک بار حضرت سعد نے فرمایا کہ میں تو معمولی شخص ہوں لیکن تین باتیں مجھے ضرور حاصل ہیں۔

۱۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کچھ فرماتے تو مجھے یقین ہو جاتا کہ ٹھیک منجانب اللہ فرما رہے ہیں۔

۲۔ نماز میں اوّل سے آخر تک مجھے کوئی وسوسہ پیدا نہیں ہوتا۔

۳۔ جب کسی جنازہ کے ساتھ جاتا ہوں تو موت اور مرنے والے کے سوا اور کوئی خیال میرے دل میں واپسی تک پیدا نہیں ہوتا۔

سعید بن مسیب فرماتے ہیں کہ یہ خصلتیں انبیاء کی سی ہیں۔

ان کی والدہ کبشہ بنت رافع بھی صحابیہ ہیں رضی اللہ تعالیٰ عنہا

۵۸۔ سعید بن سہیل الانصاری الاشہلی رضی اللہ عنہ

سعید بن سہیل بن مالک بن کعب بن عبد الاشہل بن حارثہ بن دینار

ابن اسحٰق اور ابو محشر نے ان کو بدر و احد میں حاضر ہونے والا بتلایا ہے ابو محشر ان کی کنیت ہے رضی اللہ عنہ۔

۵۹۔ سفیان بن بشیر رضی اللہ عنہ

انصاری ہیں بدر میں حاضر ہوتے رضی اللہ عنہ

۶۰۔ سلمہ بن اسلم الانصاری الحارثی رضی اللہ عنہ

سلمہ بن اسلم بن حریش بن عدی بن مجدعہ بن حارثہ بن حارث بن خزرج بن عدی بن مالک بن اوس

بدر و احد اور دیگر جملہ مشاہد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب رہے۔

۱۴ھ کو جسر ابو عبیدہ والی جنگ میں شہید ہوئے۔ عمر بوقت شہادت بعض نے ۳۸ بعض نے ۶۳ سال درج کی ہے۔ جنگ بدر میں سائب بن عبید اور نعمان بن عمرو کو انہی نے اسیر کیا تھا رضی اللہ عنہ

۶۱۔ سلمہ بن ثابت بن وقش الانصاری الاشہلی

سلمہ بن ثابت بن وقش بن زغبہ بن زعوراء بن عبد الاشہل الانصاری الاشہلی

بدر میں حاضر ہوئے اور احد میں شہادت پائی۔ ابن اسحٰق نے بیان کیا ہے کہ ان کے والد ثابت اور چچا رفاعہ بھی غزوہ احد میں شہید ہوئے تھے۔

ان کے بھائی عمرو بن ثابت بھی شہدائے احد ہیں۔ رضی اللہ عنہم

۶۲۔ سلمہ بن حاطب انصاری

سلمہ بن حاطب بن عمرو بن عتیک بن امیہ بن زید

بدر و احد میں حاضر ہوتے رضی اللہ عنہ

۶۳۔ سلمہ بن سلامت بن وقش

بن زغبہ بن زعوراء بن عبد الاشہل الانصاری الاشہلی۔

ان کی والدہ سلمیٰ بنت سلمہ بھی انصاریہ حارثیہ ہیں ابو عوف کنیت ہے۔ عقبہ اولیٰ و ثانیہ میں حاضر تھے۔ بدر اور مشاہد مابعد میں ہمرکاب مصطفوی رہے فاروق اعظم نے ان کو حاکم یمامہ بھی مقرر کر دیا تھا ستر سال کی عمر میں ۴۵ھ کو مدینہ منورہ میں انتقال کیا رضی اللہ عنہ

۶۴۔ سلیط بن قیس الانصاری رضی اللہ عنہ

سلیط بن قیس بن عمرو بن عبید بن مالک بن عدی بن عامر بن غنم بن عدی بن النجار

بدر میں حاضر ہوئے اور مابعد کے جملہ مشاہد میں بھی حاضر تھے جسرالی بعید کے دن شہید ہوئے۔

ان کے فرزند عبداللہ بن سلیط نے ان سے روایت کی ہے۔ رضی اللہ عنہ

۶۵۔ سلیم بن حارث الانصاری رضی اللہ عنہ

سلیم بن حارث بن ثعلبہ بن کعب بن عبدالاشہل بن حارثہ بن دینار بن النجار

بدر میں حاضر ہوئے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ضحاک اور نعمان فرزندان عمرو بن مسعود بن عبدالاشہل بن حارثہ بن دینار ان سلیم بن حارث، کے ماں شریک بھائی ہیں اور وہ بھی بدر میں حاضر تھے۔ رضی اللہ عنہم

۶۶۔ سلیم بن قیس بن فہد الانصاری رضی اللہ عنہ

سلیم بن قیس بن فہد (خالد) بن قیس بن ثعلبہ بن عبید بن ثعلبہ بن غنم بن مالک بن النجار

بدر، احد، خندق اور جملہ مشاہد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے خلافت عثمان ذوالنورین میں وفات پائی ان کی ہمشیرہ خولہ بنت قیس امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کی اہلیہ ہیں۔

ان کے والد بھی صحابہ میں معدود ہیں۔ رضی اللہ عنہ

۶۷۔ سلیم بن عمرو الانصاری السلمی رضی اللہ عنہ

سلیم بن عمرو بن حدیدہ بن عمرو بن سواد بن غنم بن کعب بن سلمہ

عقبہ اور بدر میں حاضر تھے یوم احد کو شہید ہوئے۔ ان کا آزاد کردہ غلام عنترہ بھی اسی روز شہید ہوا تھا۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہما

۶۸۔ سلیم بن ملحان الانصاری رضی اللہ عنہ

سلیم بن ملحان (مالک) بن خالد بن زید بن حرام بن جندب بن عامر بن عبد بن غنم بن عدی بن النجار

بدر اور اُحد میں یہ بھی اور ان کے بھائی حرام بن ملحان بھی حاضر تھے اور دونوں بھائی بیر معونہ کے واقعہ میں شہید بھی ہوتے انکی نسل نہیں چلی۔

ام سلیم بنت ملحان ان کی ہمشیرہ ہیں رضی اللہ عنہم

۶۹۔ سماک بن خرشتہ الانصاری رضی اللہ عنہ

سماک بن خرشہ بن لوذان بن عبدود بن ثعلبہ بن خزرج بن ساعدہ بن کعب خزرج الاکبر

آپ کی کنیت ابودجانہ ہے اور اپنی کنیت ہی سے مشہور ہیں۔

ان کا شمار چیدہ اور برگزیدہ بہادروں میں ہوتا ہے مغازی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ساتھ رہا کرتے تھے، بدر میں حاضر تھے۔ جنگ یمامہ میں شہید ہوئے۔ رضی اللہ عنہ

۷۰۔ سماک بن سعد الانصاری رضی اللہ عنہ

سماک بن سعد بن ثعلبہ بن خلاص بن زید بن مالک بن ثعلبہ بن کعب بن الخزرج

بدر و اُحد میں حاضر تھے ان کے بھائی بشیر بن سعد بھی حاضر بدر تھے۔ رضی اللہ عنہما

۷۱۔ **سنان بن ابی سنان رضؓ**

سنان بن ابی سنان ودھب بن محصن بن حرثان بن قیس بن مرہ بن کثیر بن غنم بن دودان بن اسد بن خزیمہ۔

بدر میں۔ یہ اور ان کے بھائی اور اُن کے والد اور ان کے چچا عکاشہ بن محصن حاضر تھے۔

یہ جملہ بزرگوار جملہ مشاہد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ساتھ حاضر رہے۔

بیعت رضوان سب سے پہلے سنان نے کی یا بقول واعظ ان کے والد ابو سنان سے ابتداء ہوئی۔ رضی اللہ عنہم

۷۲۔ **سنان بن صیفی رضؓ**

بن فخر بن خناد الانصاری

یہ بنو مسلمہ میں سے ہیں عقبی بھی ہیں اور بدری بھی۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۷۳ **سہل بن حنیف الانصاری الاوسی رضؓ**

سہل بن حنیف بن وہب بن عکیم بن ثعلبہ بن مجدعہ بن حارث بن عمر بن خناس

ابو سعید کنیت ہے بعض نے کنیت میں اختلاف بھی کیا ہے بدر اور جملہ مشاہد میں ملتزم رکاب رہے۔ یہ اُن بزرگوں میں سے ہیں جو احد کے دن پہاڑ کی طرح جم کر رہے۔

حضرت سہل دشمن پر برابر تیر برساتے رہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرمارہے تھے کہ سہل کو تیر دیئے جاؤ۔ یہ سہل ہے۔

خلافت مرتضوی میں یہ حضرت علی کے رفقا میں سے تھے بصرہ کو جاتے ہوئے حضرت علی مرتضیٰ انہی کو والی مدینہ بنا گئے تھے اور انہی کو حاکم فارس بھی کیا تھا۔ مگر اہل فارس نے ان کو نکال دیا۔ تب زیاد کو جناب امیر نے حاکم فارس بنایا۔

سہل بن حنیف کا کوفہ میں ۳۸ھ کو انتقال ہوا۔ ان کے فرزند اور ایک جماعت نے ان سے روایت حدیث کی ہے۔

ان کے جنازہ کی نماز علی مرتضیٰ نے پڑھائی اور ۶ تکبیرات سے پڑھائی۔ یہ امتیاز اہل بدر کی نماز جنازہ میں قائم رکھا جاتا تھا۔

ان سے چالیس حدیثیں مروی ہیں از انجملہ متفق علیہ ۴ صرف صحیح مسلم میں ۲۔ رضی اللہ عنہ

۷۴۔ **سہل بن عتیک الانصاری رضؓ**

سہل بن عتیک بن نعمان بن عمرو بن عتیک بن عمرو بن عامر (مبذول) بن مالک بن نجار

عقبی بھی ہیں اور بدری بھی۔

ان کی نسل آئندہ نہیں چلی۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۷۵۔ **سہل بن قیس الانصاری السلمی رضؓ**

سہل بن قیس بن ابی کعب بن قیس بن کعب بن سواد بن غنم بن کعب بن سلمہ الانصاری

بدر میں حاضر ہوئے اور غزوہ احد میں جام شہادت نوش فرمایا۔ رضی اللہ عنہ

۷۶۔ سہیل بن عمرو بن ابی عمرو الانصاریؓ

بدر میں شامل ہوئے۔ واقعہ صفین ۳۷ھ کو شہید ہوئے لشکر مرتضوی میں تھے رضی اللہ عنہ

۷۷۔ سہیل بن رافع الانصاریؓ

سہیل بن رافع بن ابی عمرو بن عائذ بن ثعلبہ بن غنم بن مالک بن النجار

بدر، احد، خندق اور جملہ مشاہد میں ہمرکاب نبوی رہے۔

جس زمین پر مسجد نبوی تعمیر ہوئی ہے اسی جگہ ان کے کھلیان کی زمین تھی جس پر کھجوروں کو خشک کیا کرتے تھے اسے ابوبکر صدیقؓ نے خرید کر شامل مسجد نبوی کر دیا تھا۔

خلافت فاروقی میں وفات پائی رضی اللہ عنہ

۷۸۔ سواد بن غزیہ الانصاریؓ

یہ بنو عدی بن النجار میں سے ہیں۔ بدر، احد، خندق اور جملہ مشاہد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ساتھ حاضر تھے۔

انہی کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے امیر خیبر بنایا تھا یہی وہ بزرگ ہیں جن کی کمر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے چھڑی کی نوک چبھو دی تھی اور انہوں نے بدلہ لینے کو کہا تھا اور حضورؐ نے اسے بدلہ لینے کی اجازت فرما دی تھی۔

اس طرح یہ بزرگوار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عدل بے عدیل کے شاہد صادق ٹھہرے تھے رضی اللہ عنہ

۷۹۔ سواد بن یزید الانصاری السلمیؓ

سواد بن یزید (یا ابن رزق۔ یا ابن رزین، یا ابن رزیق) بن ثعلبہ بن عبید بن معدی بن غنم بن کعب بن سلمہ

بدر اور احد میں حاضر تھے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۸۰۔ ضحاک بن حارثہ الانصاری السلمیؓ

ضحاک بن حارثہ بن زید بن ثعلبہ بن عبید بن عدی بن غنم بن کعب بن سلمہ

بیعت عقبہ سے مشرف ہوئے اور غزوہ بدر میں شامل۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۸۱۔ ضحاک بن عبد عمرو الانصاریؓ

ضحاک بن عبد عمرو بن مسعود بن کعب بن عبد الاشہل بن حارثہ بن دینار بن النجار

بدر و احد میں حاضر تھے بدر میں اپنے بھائی نعمان بن عبد عمرو کی معیت میں تھے۔ رضی اللہ عنہ

۸۲۔ حمزہ بن عمرو الانصاریؓ

یہ بنی طریف کے (جو خزرجی ہیں) حلیف تھے بدر میں شامل ہوئے اور احد میں شہادت پا کر جنت میں داخل ہوئے۔ رضی اللہ عنہ

۸۳۔ طفیل بن مالک الانصاری السلمیؓ

طفیل بن مالک بن نعمان بن خنساء بنو سلمہ میں سے ہیں عقبی بھی ہیں اور بدری بھی۔ احد میں مردانہ وار لڑے تھے اور ۱۳ زخم ان کے جسم پر آئے تھے

غزوہ خندق میں بھی شامل ہوئے اور اُسی روز راہی عالم بقا ہوئے رضی اللہ عنہ

۸۴۔ عاصم بن بکیر الانصاریؓ

بنو عوف بن خزرج کے حلیف تھے موسیٰ بن عقبہ نے ان کا نام اہلِ بدر میں تحریر کیا ہے رضی اللہ عنہ

۸۵۔ عاصم بن ثابت الانصاری الاوسیؓ

عاصم بن ثابت بن ابوالا فلح قیس بن عصمت بن نعمان بن مالک بن اُمیہ بن ضبیعہ بن زید بن مالک بن عوف بن عمر بن عوف بن مالک بن اوس۔

ابو سلیمان کنیت ہے۔

غزوہ بدر میں حاضر تھے۔یہی واقعہ رجیع کے سردار تھے۔عاصم بن عمر فاروق کے نانا بھی یہی ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مختصر وفد کو قوم ہذیل کی تعلیم وہدایت کے لئے بھیجا تھا۔خود قوم کے سرداران کو مدینہ سے اپنے ساتھ لے گئے تھے جب یہ لوگ مکہ اور عسفان کے درمیان پہنچ گئے تو بنو لحیان کے ایک سو اشخاص نے ان کے دس شخصوں کو گھیر لیا۔یہ سب ایک پہاڑی کے ٹیلہ پر پہنچ گئے۔دشمنوں نے کہا کہ تم سب نیچے اتر آؤ عہد و میثاق یہ ہے کہ تم کو قتل نہ کیا جائے گا۔

عاصم بولا کہ میں تو کافر کی پناہ لینا پسند نہیں کرتا۔الہٰی ہماری خبر اپنے رسول کو پہنچا دے۔سات صحابہ کو جس میں عاصم بن ثابت تھے دشمنوں نے تیروں سے شہید کر دیا۔زید بن دثنہ ، خبیب بن عدی ایک اور صاحب رہ گئے جن کو پکڑ لیا ان کا حال حضرت خبیب کے تذکرہ میں ہے ۔

عاصمؓ نے بدر میں کفار کا ایک سردار قتل کیا تھا دشمن نے چاہا کہ ان کا سر کاٹ لے جب لاش کے قریب گئے تو شہد کی مکھیوں نے لاش کے پاس اُن کو نہ جانے دیا واپس آگئے کہا رات کو آئیں گے جب مکھیاں آرام کریں گی رات کو بارش آئی پانی کی رَو میں لاش بہہ گئی کفار کو نہ ملی رضی اللہ عنہ

حسان بن ثابت کے اشعار ہیں۔

لَعَمْرِیْ لَقَدْ شَابَتْ هُذَیْلُ بْنُ مُدْرِكٍ ... اَحَادِیْثَ كَانَتْ فِیْ خُبَیْبٍ وَّعَاصِمِ
اَحَادِیْثَ لَحْیَانَ صَلَّوْا بِقَبِیْحِهَا ... وَلَحْیَانُ رَكَّابُوْنَ شَرَّ الْجَرَائِمِ

۸۶۔ عاصم بن قیس بن ثابتؓ

بن نعمان بن اُمیہ بن امرالقیس بن ثعلبہ بن عمرو بن عوف الانصاری

بدر میں حاضر تھے اور احد میں بھی شریک تھے رضی اللہ عنہ

۸۷۔ عامر بن اُمیہؓ

بن زید بن حسماس بن مالک بن عدی بن عامر بن غنم بن عدی بن النجار

یہ ہشام بن عامر کے والد ہیں۔بدر میں حاضر ہوئے اور احد میں شہید۔

ام المومنین حضرت عائشہؓ کی خدمت میں ان کے فرزند ہشام ایک روز حاضر ہوئے تھے تو انہوں نے فرمایا تھا کہ عامر خوب انسان تھا رضی اللہ عنہ

۸۸۔ عامر بن ثابت انصاریؓ

یہ عاصم بن ثابت کے بھائی ہیں۔واقعہ بدر کے بعد انہی نے عقبہ بن ابی معیط ملعون کی گردن تلوار سے اڑا دی تھی۔رضی اللہ عنہ

۸۹ عامر بن سلمہ بن عامر البلوی رضؓ

انصار کے حلیف ہیں۔ موسیٰ بن عقبہ نے ان کو اہل بدر میں شمار کیا ہے۔ بعض نے ان کو عمرو بن سلمہ بھی لکھا ہے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۹۰ عامر بن عبد عمرو الانصاری رضؓ

ان کے نام میں اختلاف ہے اور کنیت کے تلفظ میں بھی اختلاف ہے ان کا نام کسی نے ثابت اور کسی نے مالک بتایا ہے مگر صحیح عامر ہے۔ کنیت ابو حبہ (بالباء) ہے بعض نے بالنون بتائی ہے۔ ان کی والدہ ہند بنت اوس بن عدی ہیں اور یہ سعد بن خیثمہ کے ماں جائے بھائی ہیں۔ سب کا اتفاق ہے کہ یہ بدر میں شامل تھے۔ ابن اسحٰق نے ان کو شہید احد لکھا ہے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۹۱ عامر بن مخلد بن الحارث الانصاری رضؓ

عامر بن مخلد بن حارث بن سواد بن مالک بن غنم بن مالک بن نجار

بدر میں شجاعت دکھلائی اور احد میں شہادت پائی۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۹۲ عائذ بن ماعض الانصاری رضؓ

عائذ بن ماعض بن قیس بن خلدہ بن عامر بن زریق

یہ اور ان کے بھائی معاذ بن ماعض بدر میں حاضر تھے۔ مواخات میں ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سویبط بن حرملہ کا بھائی بنایا تھا۔ بیر معونہ یا بقول بعض یوم یمامہ میں شہید ہوئے۔ رضی اللہ عنہ

۹۳ عبد اللہ بن ثعلبہ البلوی الانصاری

بن خزمہ بن اصرم۔ یہ بنو عوف بن خزرج کے حلیف تھے۔ بدر میں حاضر ہوئے ان کے بھائی بحاث بن ثعلبہ بھی بدری ہیں رضی اللہ عنہما

۹۴ عبد اللہ بن جبیر بن النعمان الانصاری رضؓ

عقبی بھی ہیں اور بدری بھی۔ غزوہ احد میں تیر اندازوں کے سردار یہی تھے۔ مقابلہ کرتے ہوئے اپنے مقام متعینہ پر شہید ہوئے۔ خوات بن جبیر ان کے حقیقی بھائی ہیں۔ رضی اللہ عنہما

۹۵ عبد اللہ بن الجد رضی اللہ عنہ

یہ بنو سلمہ میں سے ہیں بدر و احد میں حاضر تھے رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۹۶ عبد اللہ بن الحمیر الاشجعی رضؓ

یہ بنو خنساء بن سنان کے حلیف ہیں اور اس لئے انصاری شمار ہوتے ہیں۔ بدر میں حاضر تھے ان کے بھائی خارجہ بھی بدری ہیں یہ احد میں بھی حاضر ہوئے۔ رضی اللہ عنہما۔

۹۷ عبد اللہ بن ربیع بن قیس الانصاری الخزرجی رضؓ

عقبی بھی ہیں اور بدری بھی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۹۸ عبد اللہ بن رواحہ الانصاری الخزرجی رضؓ

عبداللہ بن رواحہ بن ثعلبہ بن امرء القیس بن عمرو بن امرء القیس الاکبر

بارہ نقبائے محمدی میں سے ہیں۔ بدر، احد، خندق، حدیبیہ، عمرۃ القضاء میں حاضر تھے فتح مکہ سے پیشتر فردوس نشین ہو چکے تھے۔

اُن کا شمار شعراء نبویہ میں ہے۔ حسان بن ثابت اور کعب بن مالک اور عبداللہ بن رواحہ اُن شعرائے برگزیدہ میں سے ہیں جن کو آیت إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ نے شعراءِ عام سے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔

ان کو فی البدیہہ کہنے میں مہارت خاص تھی ایک روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اسی وقت کوئی شعر بنا کر سناؤ۔ ابن رواحہؓ نے کھڑے ہو کر فوراً عرض کر دیا۔

إِنِّي تَفَرَّسْتُ فِيكَ الْخَيْرَ أَعْرِفُهُ — وَاللهُ يَعْلَمُ أَنْ مَا خَانَنِي الْبَصَرُ
أَنْتَ النَّبِيُّ وَمَنْ يُحْرَمْ شَفَاعَتَهُ — يَوْمَ الْحِسَابِ لَقَدْ أَزْرَى بِهِ الْقَدَرُ
فَثَبَّتَ اللهُ مَا آتَاكَ مِنْ حَسَنٍ — تَثْبِيتَ مُوسَى وَنَصْرًا كَالَّذِي نُصِرُوا

جنگ موتہ کو جب فوج روانہ ہونے لگی تو اس وقت سالار فوج زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ تھے، سرور کائنات نے فرمایا۔ اگر زید شہید ہو جائے تو جعفر طیار کمان گری کرے گا۔ وہ بھی شہید ہو جائے تو عبداللہ بن رواحہ سردار بنے گا۔

روانگی کے وقت الوداع کہنے والوں نے ابن رواحہ سے کہا کہ اللہ تم کو بخیر و عافیت واپس لائے۔ انہوں نے ان کے جواب میں یہ اشعار انشاد کئے

لَكِنَّنِي أَسْأَلُ الرَّحْمٰنَ مَغْفِرَةً — وَضَرْبَةً ذَاتَ فَرْغٍ تَقْذِفُ الزَّبَدَا
وَطَعْنَةً بِيَدَيْ حَرَّانَ مُجْهِزَةً — بِحَرْبَةٍ تُنْفِذُ الْأَحْشَاءَ وَالْكَبِدَا
حَتّٰى يَقُولُوا إِذَا مَرُّوا عَلٰى جَدَثِي — يَا أَرْشَدَ اللهُ مِنْ غَازٍ وَقَدْ رَشَدَا

جب میدان جنگ میں زید اور جعفر رضی اللہ عنہما شہید ہو چکے اور ابن رواحہ سردار فوج بن گئے اور شہادت کے لئے نفس کو تیار کرنے لگے، تو یہ اشعار فرمائے

يَا نَفْسُ إِنْ لَمْ تُقْتَلِي تَمُوتِي — هٰذَا حِمَامُ الْمَوْتِ قَدْ صَلِيتِ
وَمَا تَمَنَّيْتِ فَقَدْ أُعْطِيتِ — إِنْ تَفْعَلِي فِعْلَهُمَا هُدِيتِ

اس کے بعد حملہ کر دیا۔ حملہ سے واپس آئے تو ان کے چچیرے بھائی نے یخنی لا کر پیش کی کہا یہ تھوڑی سی پی لو۔ ذرا تکان اترے گی اور طاقت آئے گی۔ دو گھونٹ پیے تھے کہ فوج میں سے شور کی آواز آئی۔ یخنی کا برتن ہاتھ سے پھینک دیا اور بولے افسوس۔ میں ابھی تک دنیا ہی میں ہوں پھر یہ شعر پڑھے۔

أَقْسَمْتُ بِاللهِ لَتَنْزِلَنَّهْ — طَائِعَةً أَوْ لَتُكْرَهِنَّهْ
مَالِي أَرَاكِ تَكْرَهِينَ الْجَنَّةْ — وَقَبْلَ ذَا مَا كُنْتِ مُطْمَئِنَّةْ

پھر حملہ کیا اور جنت کو سدھار گئے۔ ان کی شہادت جمادی الاوّل ۸ھ کو بمقام موتہ ہوئی۔ رضی اللہ عنہ

۹۹ - عبداللہ بن زید بن ثعلبہ بن عبداللہ الانصاری الحارثی رضؓ

یہ بنوالحارث بن الخزرج میں سے ہیں عقبی بھی ہیں اور بدری بھی۔ جملہ مشاہد میں ملتزم رکاب نبوی رہے۔

ان کو صاحب الاذان بھی کہتے ہیں کیونکہ انہی کو خواب میں اذان سکھائی گئی تھی۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے بلال رضی اللہ عنہ نے یاد کر لی تھی یہ واقعہ بناء مسجد نبوی کے بعد سلہ کا ہے۔

فتح مکہ کے دن بنوالحارث بن خزرج کا رایت انہی کے ہاتھ میں تھا۔ ۳۲ھ کو بعمر ۶۴ سال مدینہ میں وفات پائی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

انہوں نے تین احادیث کی روایت کی ہے از انجملہ ایک متفق علیہ ہے۔

۱۰۰ - عبداللہ بن سعد بن خثیمہ الانصاری الاوسی رضؓ

ان کے والد سعد اور دادا خثیمہ بھی صحابی ہیں ان کے والد غزوہ بدر میں اور دادا غزوہ احد میں شہید ہوئے تھے۔ عبداللہ کے متعلق بدر میں شامل ہونے کی بابت اختلاف ہے۔

ابن المبارک نے جو روایت مغیرہ بن حکیم سے کی ہے اس میں یہ ہے کہ عبداللہ بن سعد نے بتلایا کہ وہ احد میں شامل ہوئے اور عقبہ میں بھی اپنے والد کے ساتھ تھے۔

فاکہانی نے مغیرہ بن حکیم سے روایت کرتے ہوئے بتلایا ہے کہ وہ بدر اور عقبہ میں حاضر ہوئے۔

محدثین کے نزدیک ابن المبارک احفظ و اضبط ہیں۔ رضی اللہ عنہ

یہ تین احادیث کے راوی ہیں۔

۱۰۱ عبداللہ بن سلمۃ العجلانی البلوی الانصاری رضؓ

ان کے والد کا نام سلمہ بفتح سین وکسر لام ہے بلی کے بنو عجلان سب کے سب بنو عمرو بن عوف کے حلیف تھے اس لئے یہ بلوی و انصاری ہیں۔ بدر میں شریک ہوئے احد میں شہید ہوئے رضی اللہ عنہ

۱۰۲ - عبداللہ بن سہل الانصاری رضؓ

ابن اسحاق و ابن عقبہ نے ان کو بدری بتلایا ہے اور بنو عبد الاشہل کا حلیف تحریر کیا ہے۔

ابن ہشام نے ان کو بنو زعورا کا بھائی بتلایا ہے اور بعض نے ان کو غسانی الاصل بھی تحریر کیا ہے۔

غزوہ خندق میں شہید ہوئے تھے۔ رضی اللہ عنہ

۱۰۳ - عبداللہ بن سہل الانصاری رضؓ

بیان کیا گیا ہے کہ یہ بدر میں شامل تھے۔ یہ صاحب علم و فہم تھے۔ عبداللہ مقتول خیبر بھی انہی کا بھائی تھا۔

حویصہ و محیصہ ان کے چچا ہیں جب ان کی موجودگی میں انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کرنے میں ابتدا کی تھی تو انہی کو حضور نے کَبِّر کَبِّر فرمایا تھا۔

ایک سفر میں ان کو شراب مشکیزوں میں بھری ہوئی ملی۔ انہوں نے مشکیزوں کو اپنے نیزہ سے چھید دیا۔ انہوں نے فرمایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم

۹۹ ۔ عبداللہ بن زید بن ثعلبہ بن عبداللہ الانصاری الحارثی رضی اللہ عنہ

یہ بنو الحارث بن الخزرج میں سے ہیں عقبی بھی ہیں اور بدری بھی۔ جملہ مشاہد میں ملتزم رکاب نبوی رہے۔
ان کو صاحب الاذان بھی کہتے ہیں کیونکہ انہی کو خواب میں اذان سکھائی گئی تھی۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے بلال رضی اللہ عنہ نے یاد کر لی تھی یہ واقعہ بناء مسجد نبوی کے بعد سنہ ۱ھ کا ہے۔

فتح مکہ کے دن بنو الحارث بن خزرج کا رایت انہی کے ہاتھ میں تھا۔ سنہ ۳۲ھ کو بعمر ۶۴ سال مدینہ میں وفات پائی رضی اللہ تعالیٰ عنہ
انہوں نے تین احادیث کی روایت کی ہے از انجملہ ایک متفق علیہ ہے۔

۱۰۰ ۔ عبداللہ بن سعد بن خثیمہ الانصاری الاوسی رضی اللہ عنہ

ان کے والد سعد اور دادا خثیمہ بھی صحابی ہیں ان کے والد غزوہ بدر میں اور دادا غزوہ احد میں شہید ہوئے تھے۔ عبد اللہ کے متعلق بدر میں شامل ہونے کی بابت اختلاف ہے۔

ابن المبارک نے جو روایت مغیرہ بن حکیم سے کی ہے اس میں یہ ہے کہ عبداللہ بن سعد نے بتلایا کہ وہ احد میں شامل ہوئے اور عقبہ میں بھی اپنے والد کے ساتھ تھے۔

فاکہانی نے مغیرہ بن حکیم سے روایت کرتے ہوئے بتلایا ہے کہ وہ بدر اور عقبہ میں حاضر ہوئے۔
محدثین کے نزدیک ابن المبارک احفظ و اضبط ہیں۔ رضی اللہ عنہ
یہ تین احادیث کے راوی ہیں۔

۱۰۱ عبداللہ بن سلمۃ العجلانی البلوی الانصاری رضی اللہ عنہ

ان کے والد کا نام سلمہ بفتح سین و کسر لام ہے بلّی کے بنو عجلان سب کے سب بنو عمرو بن عوف کے حلیف تھے اس لئے یہ بلوی و انصاری ہیں۔ بدر میں شریک ہوتے احد میں شہید ہوئے رضی اللہ عنہ

۱۰۲ ۔ عبداللہ بن سہل الانصاری رضی اللہ عنہ

ابن اسحاق و ابن عقبہ نے ان کو بدری بتلایا ہے اور بنو عبد الاشہل کا حلیف تحریر کیا ہے۔
ابن ہشام نے ان کو بنو زعورا کا بھائی بتلایا ہے اور بعض نے ان کو غسانی الاصل بھی تحریر کیا ہے۔
غزوہ خندق میں شہید ہوئے تھے۔ رضی اللہ عنہ

۱۰۳ ۔ عبداللہ بن سہل الانصاری رضی اللہ عنہ

بیان کیا گیا ہے کہ یہ بدر میں شامل تھے۔ یہ صاحب علم و فہم تھے۔ عبداللہ مقتول خیبر بھی انہی کا بھائی تھا۔
حویصہ و محیصہ ان کے چچا ہیں۔ جب ان کی موجودگی میں انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کرنے میں ابتدا کی تھی تو انہی کو حضور نے کَبِّر کَبِّر فرمایا تھا۔
ایک سفر میں ان کو شراب مشکیزوں میں بھری ہوئی ملی۔ انہوں نے مشکیزوں کو اپنے نیزہ سے چھید دیا۔ انہوں نے فرمایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم

۹۹ - عبداللہ بن زید بن ثعلبہ بن عبداللہ الانصاری الحارثی رضؓ

یہ بنو الحارث بن الخزرج میں سے ہیں عقبی بھی ہیں اور بدری بھی۔ جملہ مشاہد میں ملتزم رکاب نبوی رہے۔

ان کو صاحب الاذان بھی کہتے ہیں کیونکہ انہی کو خواب میں اذان سکھائی گئی تھی۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے بلال رضی اللہ عنہ نے یاد کر لی تھی یہ واقعہ بناء مسجد نبوی کے بعد سلسہ کا ہے۔

فتح مکہ کے دن بنو الحارث بن خزرج کا رایت انہی کے ہاتھ میں تھا۔ ۳۲ھ کو بعمر ۶۴ سال مدینہ میں وفات پائی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

انہوں نے تین احادیث کی روائت کی ہے ازانجملہ ایک متفق علیہ ہے۔

۱۰۰ - عبداللہ بن سعد بن خثیمہ الانصاری الاوسی رضؓ

ان کے والد سعد اور دادا خثیمہ بھی صحابی ہیں ان کے والد غزوہ بدر میں اور دادا غزوہ احد میں شہید ہوئے تھے۔ عبداللہ کے متعلق بدر میں شامل ہونے کی بابت اختلاف ہے۔

ابن المبارک نے جو روائت مغیرہ بن حکیم سے کی ہے اُس میں یہ ہے کہ عبداللہ بن سعد نے بتلایا کہ وہ احد میں شامل ہوئے اور عقبہ میں بھی اپنے والد کے ساتھ تھے۔

فاکہانی نے مغیرہ بن حکیم سے روائت کرتے ہوئے بتلایا ہے کہ وہ بدر اور عقبہ میں حاضر ہوئے۔

محدثین کے نزدیک ابن المبارک احفظ و اضبط ہیں۔ رضی اللہ عنہ

یہ تین احادیث کے راوی ہیں۔

۱۰۱ عبداللہ بن سلمۃ العجلانی البلوی الانصاری رضؓ

ان کے والد کا نام سلمہ بفتح سین وکسر لام ہے بلّی کے بنو عجلان سب کے سب بنو عمرو بن عوف کے حلیف تھے اس لئے یہ بلوی و انصاری ہیں۔ بدر میں شریک ہوئے احد میں شہید ہوئے رضی اللہ عنہ

۱۰۲ - عبداللہ بن سہل الانصاری رضؓ

ابن اسحاق و ابن عقبہ نے ان کو بدری بتلایا ہے اور بنو عبد الاشہل کا حلیف تحریر کیا ہے۔

ابن ہشام نے ان کو بنو زعورا کا بھائی بتلایا ہے اور بعض نے ان کو غسانی الاصل بھی تحریر کیا ہے۔

غزوہ خندق میں شہید ہوئے تھے۔ رضی اللہ عنہ

۱۰۳ - عبداللہ بن سہل الانصاری رضؓ

بیان کیا گیا ہے کہ یہ بدر میں شامل تھے۔ یہ صاحب علم و فہم تھے۔ عبداللہ مقتول خیبر بھی انہی کا بھائی تھا۔

حویصہ و محیصہ ان کے چچا ہیں۔ جب ان کی موجودگی میں انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کرنے میں ابتدا کی تھی تو انہی کو حضورؐ نے کَبِّر کَبِّر فرمایا تھا۔

ایک سفر میں ان کو شراب مشکیزوں میں بھری ہوئی ملی۔ انہوں نے مشکیزوں کو اپنے نیزہ سے چھید دیا۔ انہوں نے فرمایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم

نے ہم کو شراب پینے سے بھی روکا ہے اور گھروں میں داخل کرنے سے بھی منع فرمایا ہے۔ رضی اللہ عنہ

۱۰۴۔ عبداللہ بن طارق بن عمرو بن مالک البلوی الانصاری رض

قوم بلی میں سے ہیں اور انصار کے قبیلہ بنو ظفر کے حلیف ہیں۔ یہ اُس گروہ میں سے ہیں جن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم قرآن اور تفقہ دین کے لئے عضل اور قارہ کے ساتھ روانہ کیا تھا۔

رجیع پر (جو ہذیل کے ایک جوہڑ کا نام ہے) عضلیوں نے اظہار غدر کیا۔ مرثد، خالد، عاصم رضی اللہ عنہم نے تلواریں کھینچ لیں اور مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔

عبداللہ اور زید بن دثنہ اور خبیب بن عدی کو انہوں نے گرفتار کر لیا۔ عبداللہ بن طارق نے کسی طرح رسی میں سے خود کو چھڑا لیا مگر کفار نے ان کو پتھر مار مار کر ہلاک کر دیا۔

حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے اشعار میں ان کا نام نظم کیا ہے۔ یہ واقعہ آخر ۳ھ کا ہے رض

۱۰۵۔ عبداللہ بن عامر البلوی الانصاری رض

قوم بلی سے ہیں اور انصار کے قبیلہ بنو ساعدہ کے حلیف بدر میں شامل تھے۔ رضی اللہ عنہ

۱۰۶۔ عبداللہ بن عبد مناف الانصاری رض

عبداللہ بن عبد مناف بن نعمان بن سنان بن عبید بن عدی بن غنم بن کعب بن سلمہ

ابو یحییٰ ان کی کنیت تھی۔ بدر و احد میں جوہر شجاعت دکھلائے رضی اللہ عنہ

۱۰۷۔ عبداللہ بن عبس الانصاری رض

یہ بنو عدی بن کعب بن الخزرج میں سے ہیں۔ بدر میں حاضر تھے اور جملہ دیگر مشاہد میں بھی نبرد آزما رہے ان کے والد کا نام بعض نے عبیس بھی لکھا ہے رضی اللہ عنہ

۱۰۸۔ عبداللہ بن عبیس الانصاری رض

یہ بنو الحارث بن خزرج کے حلیف تھے اسی لئے انصاری کہلائے ان کا نسب بیان نہیں کیا گیا غزوہ بدر میں شامل تھے۔ رضی اللہ عنہ

۱۰۹۔ عبداللہ بن عبداللہ بن ابی بن سلول الانصاری الخزرجی رض

یہ بنو عوف بن خزرج میں سے ہیں ان کا قبیلہ مدینہ بھر میں مشہور تھا۔ انہی کو ابن الحبلی بھی کہتے ہیں کیونکہ ان کا سالم بن غنم اپنی بڑی توند کی وجہ سے حبلی مشہور تھا۔

سلول عبداللہ منافق کی دادی کا نام ہے اُبی اپنی ماں کی نسبت سے مشہور ہے۔

حضرت عبداللہ کے باپ کو اہل یثرب اپنا بادشاہ بنانے لگے تھے اُس کے لئے تاج تیار کرنے کی تجویزیں ہو رہی تھیں کہ سرور عالم رونق افروز مدینہ ہو گئے۔ خزرجی مسلمان ہو گئے۔ ابن ابی کا اقتدار خاک میں مل گیا۔ رشک و حسد نے اُسے راس المنافقین بنا دیا۔

لیخرجن الاعز منها الاذل کے فقرہ کا گویا یہی مطلب ہے۔ حضرت عبداللہ نے سنا کہ اس گستاخی کی سزا میں اُس کے باپ کو

قتل کا حکم ہونے والا ہے۔ یہ نہایت مخلص تھے۔ حضور میں گئے اور عرض کیا کہ اگر ارشاد ہو تو اپنے نالائق باپ کا سر کاٹ کر حاضر کر دوں۔ فرمایا نہیں تم اپنے باپ سے حسن سلوک رکھو۔

الغرض ابن ابی رأس المنافقین کے گھر میں حضرت عبداللہ صدق و اخلاص کا نمونہ تھے ایمان اور محبت رسول اللہ کے مدارج میں ترقی یافتہ تھے۔ ان کا شمار خیر صحابہ اور فضلائے صحابہ میں ہوتا ہے۔ بدر، احد اور دیگر جملہ مشاہد میں ملتزم رکاب نبوی رہے۔

سنہ ۱۲ھ کو جنگ یمامہ میں شربت شہادت سے شیریں کام ہوئے۔ رضی اللہ عنہ

۱۱۰۔ **عبداللہ بن عرفطہ الانصاری رضؓ**

بن عدی بن امیہ بن خدارہ بن عوف بن نجار بن خزرج

یہ مہاجر بھی ہیں۔ سیدنا جعفر طیار کے ساتھ ہجرت حبشہ کی تھی اور بنو الحارث بن خزرج کے حلیف بھی ہیں اس لئے انصاری ہیں۔ بدر میں حاضر تھے۔ رضی اللہ عنہ

۱۱۱۔ **عبداللہ بن عمرو بن حرام الانصاری رضؓ**

عبداللہ بن عمرو بن حرام بن ثعلبہ بن حرام بن کعب بن غنم بن کعب بن سلمہ

ان کی کنیت ابوجابر ہے۔ جابر صحابی ہیں جن سے روایات حدیث بکثرت ہیں۔ انہی کے نامور فرزند ہیں

حضرت عبداللہ عقبی بھی ہیں، بدری بھی اور نقیب محمدی بھی۔ یوم احد کو شہید ہوئے تھے ان کے ناک کان کاٹے گئے تھے۔

جابر کہتے ہیں کہ میری پھوپھی وہاں پہنچ گئیں۔ وہ بھائی کی لاش کی بے حرمتی دیکھ کر رونے لگیں۔ میں بھی رونے لگا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ روؤ یا نہ روؤ فرشتوں نے اپنے پروں سے اس کی لاش پر سایہ کر رکھا ہے۔

ایک روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جابر سے فرمایا تجھے بتا دوں کہ تیرے باپ کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے کیا انعام کیا میں نے عرض کی ہاں۔

فرمایا اُسے سامنے بلایا اور گفتگو فرمائی اور دوں سے پس پردہ وہ ہی گفتگو ہوئی تھی اور حکم ہوا اے میرے بندے! جو تمنا ہو بیان کر۔ انہوں نے عرض کیا کہ مجھے پھر دنیا میں بھیج دیا جائے تاکہ میں بار دیگر شہادت حاصل کر سکوں۔ حکم ہوا یہ تو قطعی ہے کہ مر کر کوئی شخص دنیا میں واپس نہیں جائیگا۔ عرض کیا کہ ہمارا حال پسماندگان تک پہنچا دیا جائے اس پر آیت وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ کا نزول ہوا۔

عمرو بن الجموح ان کے بہنوئی تھے۔ وہ بھی شہید احد ہیں۔ دونوں ایک ہی قبر میں آرام فرما ہیں۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔

۱۱۲۔ **عبداللہ بن عمیر بن عدی الانصاری الخزرجی رضؓ**

عبداللہ بن عمیر بن عدی بن امیہ بن خدارہ بن عوف بن حارث بن الخزرج

سب کا اتفاق ہے کہ یہ غزوہ بدر میں شامل تھے مگر ابن عمارہ نے ان کا ذکر اصحاب انصار میں نہیں کیا۔

۱۱۳۔ **عبداللہ بن قیس الانصاری رضؓ**

عبداللہ بن قیس بن خالد بن حارث بن سواد بن مالک بن غنم بن مالک بن نجار

بدر میں حاضر تھے ابن سعد کا قول ہے کہ وہ احد میں شہید ہوئے مگر دیگر مورخ کہتے ہیں کہ جملہ مشاہد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ

حاضر ہوئے اور حضرت عثمان کے عہد میں وفات پائی۔ رضی اللہ عنہ

۱۱۴۔ عبداللہ بن قیس الانصاری رضی اللہ عنہ

عبداللہ بن قیس بن صخر بن حرام بن ربیعہ بن عدی بن غنم بن کعب بن سلمہ

ابن اسحاق وغیرہ کا قول ہے کہ عبداللہ اور ان کے بھائی معبد بن قیس ہر دو غزوہ بدر میں حاضر تھے مگر ابن عقبہ نے ان کا ذکر اہل بدر میں نہیں کیا۔

آگے چل کر سب متفق ہیں کہ یہ احد میں حاضر تھے رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۱۱۵۔ عبداللہ بن کعب الانصاری المازنی رضی اللہ عنہ

عبداللہ بن کعب بن عمرو بن عوف بن مبذول بن عمرو بن غنم بن مازن بن النجار

بدر میں حاضر ہوئے اور غنائم بدر کے تحویلدار بھی یہی تھے۔ دیگر جملہ مشاہد نبوی میں بھی برابر حاضر ہوتے رہے اور خمس نبوی کے تحویلدار یہی تھے۔

ابو یعلیٰ مازنی ان کے بھائی ہیں ۳۳ھ کو مدینہ میں وفات پائی۔ عثمان غنی امیر المومنین نے نماز جنازہ پڑھائی رضی اللہ تعالیٰ عنہما

۱۱۶۔ عبداللہ بن نعمان بن بلذمہ الانصاری رضی اللہ عنہ

ابو قتادہ انصاری کے چچیرے بھائی ہیں بدر اور احد میں حاضر ہوئے رضی اللہ عنہ

۱۱۷۔ عبدالرحمٰن بن جبر الانصاری رضی اللہ عنہ

عبدالرحمٰن بن جبر بن عمرو بن زید بن جشم بن حارثہ بن حارث بن خزرج بن عمرو بن مالک بن اوس۔

ابو عبس کنیت تھی اور یہی کنیت نام پر غالب آگئی تھی۔ غزوہ بدر میں ان کی عمر ۴۸ سال کی تھی۔ کعب بن اشرف یہودی کے قتل میں بھی یہ شامل تھے ۳۴ھ کو بعمر ستر سال انتقال کیا۔

یہ ان اشخاص میں سے ہیں جو قبل از اسلام نوشت و خواند سے واقف تھے۔ رضی اللہ عنہ

۱۱۸۔ عبدالرحمٰن بن عبداللہ البلوی الانصاری رضی اللہ عنہ

یہ فراز بن بلی کی نسل اور بنو قضاعہ میں سے ہیں بنو جحج کے حلیف تھے ان کا نام عبدالعزیٰ تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نام عبدالرحمٰن بن سرد الاذان تجویز فرمایا بدر میں حاضر تھے جنگ یمامہ میں شہید ہوئے۔

۱۱۹۔ عبدالرحمٰن بن کعب المازنی الانصاری رضی اللہ عنہ

ابو یعلیٰ لقب کرتے تھے بدر میں حاضر ہوئے اور ۲۳ھ کو انتقال فرمایا۔

یہ بھی ان بزرگوں میں سے ہیں جن کو غزوہ تبوک میں سواری نہ ملی تھی اور وہ جہاد میں شامل نہ ہونے کی حسرت میں گریہ و زاری کرتے تھے ان کا مذکور اس آیت میں ہے۔

تَوَلَّوا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ

۱۲۰ ۔ عبدِ ربہ بن حق الانصاری الساعدیؓ

بن اوس بن ثعلبہ بن طریف بن الخزرج بن ساعدہ ۔ مورخین نے نام میں تھوڑا سا اختلاف کیا ہے۔ کسی نے عبد رب کسی نے عبداللہ لکھا ہے۔ بدر میں حاضر تھے۔ رضی اللہ عنہ

۱۲۱ ۔ عباد بن بشر بن وقش الانصاری الاشہلیؓ

عباد بن بشر بن وقش بن زغبہ بن زعورا بن عبدالاشہل الانصاری الاشہلی۔

یہ قدیم الاسلام ہیں۔ مدینہ میں مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے تھے بدر، اُحد اور دیگر جملہ مشاہد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ فضلاء صحابہ میں سے ہیں۔ انس بن مالک نے روایت کی ہے کہ شب تاریک میں ان کا عصا روشن ہو جایا کرتا تھا۔

یہ اُن چھ بزرگوں میں سے ہیں جو کعب بن اشرف یہودی کے قتل میں شامل تھے۔ یہ یہودی ہمیشہ غیر اقوام کو حضور کے خلاف اور اسلام کے خلاف آمادۂ جنگ و اذیت کرتا رہتا تھا اس واقعہ کے متعلق ان کے اپنے اشعار بھی ہیں۔

صَرَخْتُ بِهٖ فَلَمْ یَعْرِضْ لِصَوْتِیْ ... وَاَوْفٰی طَالِعًا مِنْ رَاْسِ جُدْرٍ
فَعُدْتُ لَهٗ فَقَالَ مَنِ الْمُنَادِیْ ... فَقُلْتُ اَخُوْكَ عَبَّادُ بْنُ بِشْرٍ
وَهٰذِیْ دِرْعُنَا رَهْنًا فَخُذْهَا ... لِشَهْرٍ اِنْ وَفٰی اَوْ نِصْفِ شَهْرٍ
فَقَالَ مَعَاشِرٌ سَغَبُوْا وَجَاعُوْا ... وَمَا عَدِمُوا الْغِنٰی مِنْ غَیْرِ فَقْرٍ
فَاَقْبَلَ نَحْوَنَا یَهْوِیْ سَرِیْعًا ... وَقَالَ لَنَا لَقَدْ جِئْتُمْ بِاَمْرٍ
وَفِیْ اَیْمَانِنَا بِیْضٌ حِدَادٌ ... مُجَرَّدَةٌ بِهَا الْكُفَّارَ نَفْرِیْ
فَعَانَقَهُ ابْنُ مَسْلَمَةَ الْمُرْدِیْ ... بِهَا الْكُفَّارَ كَاللَّیْثِ الْهِزَبْرِ
وَشَدَّ بِسَیْفِهٖ صَلْتًا عَلَیْهِ ... فَقَطَّرَهٗ اَبُوْ عَبْسِ بْنُ جَبْرٍ
فَكَانَ اللّٰهُ سَادِسَنَا فَاُبْنَا ... بِاَنْعَمِ نِعْمَةٍ وَاَعَزِّ نَصْرٍ
وَجَآءَ بِرَاْسِهٖ نَفَرٌ كِرَامٌ
هُمُوْ نَاهِیْكَ مِنْ صِدْقٍ وَّبِرٍّ

یوم الیمامہ کو مردانہ لڑتے مارتے ہوئے بعمر ۴۵ سال شہید ہوئے۔ رضی اللہ عنہ

۱۲۲ ۔ عباد بن الخشخاش بن عمرو الانصاریؓ

واقدی نے خشخاش کو بسین ہائے مہملہ بیان کیا ہے قوم بلّی (قضاعہ) سے تھے۔ انصار کے حلیف تھے بدر میں حاضر ہوئے اور احد میں شہید ہوئے۔

مجذر بن زیاد ان کے چچیرے اور ماں جائے بھائی تھے۔ ابن اسحاق کا قول ہے کہ نعمان بن مالک اور مجذر بن زیاد اور عبادہ بن خشخاش ہر سہ ایک قبر میں سلائے گئے تھے۔ رضی اللہ عنہم

۱۲۳۔ عباد بن عبید بن التیہان رضؓ

طبری نے ان کو حاضرین بدر میں تحریر کیا ہے۔

۱۲۴۔ عباد بن قیس رضؓ

بن عامر بن خلدہ بن عامر بن زریق الانصاری الزرقی عقبی بھی ہیں اور بدری بھی۔ غزوہ احد میں بھی حاضر تھے۔ رضی اللہ عنہ

۱۲۵۔ عباد بن قیس الانصاری رضؓ

عباد بن قیس بن علبہ بن اُمیہ بن مالک بن عامر بن عدی بن کعب بن خزرج بن حارث بن خزرج

یہ اور ان کے بھائی سبیع بن قیس بدر میں حاضر تھے انہوں نے یوم موتہ شہادت پائی۔ رضی اللہ عنہ

۱۲۶۔ عبادہ بن الصامت الانصاری السالمی رضؓ

عقبہ اولی، ثانیہ اور ثالثہ میں حاضر تھے بارہ نقبائے محمدی میں سے آپ ایک ہیں۔ مواخات میں یہ ابومرثد الغنوی کے بھائی تھے۔ بدر اور جملہ مشاہد نبوی میں حاضر رہے۔ امیرالمومنین عمر فاروقؓ نے ان کو شام کا قاضی و معلم بنا کر بھیجا تھا حمص میں قیام رکھا کرتے تھے۔ پھر فلسطین گئے وہیں انتقال کیا۔ بعض نے مقام وفات رملہ و بیت المقدس بھی تحریر کیا ہے۔ ۳۴ھ کو بعمر ۷۲ سال انتقال فرمایا۔ رضی اللہ عنہ

۱۲۷۔ عبادہ بن قیس الانصاری رضؓ

عبادہ بن قیس بن زید بن اُمیہ (الخزرجی)

بدر، اُحد، خندق، حدیبیہ اور خیبر میں حاضر تھے جنگ موتہ میں شہید ہوئے۔ رضی اللہ عنہ

۱۲۸۔ عبید بن ابوعبید الانصاری رضؓ

ان کا تعلق قبیلہ بنو عمرو بن عوف بن مالک بن اوس سے ہے۔ بدر، احد، خندق میں برابر حاضر تھے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۱۲۹۔ عبید بن اوس الانصاری الظفری رضؓ

عبید بن اوس بن مالک بن سواد بن کعب۔ ابوالنعمان کنیت تھی قبیلہ اوس میں سے تھے۔

جنگ بدر کے دن انہی نے عقیل بن ابی طالب اور عباس و نوفل کو اسیر کیا تھا اور ان تینوں کو مع ایک اور رفیق کے ایک ہی رسی سے باندھ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں پیش کیا تھا۔ حضور نے فرمایا لَقَدْ اَعَانَکَ عَلَيْهِمْ مَلَكٌ كَرِيْمٌ (ان کی گرفتاری کرانے میں ایک بزرگ فرشتہ نے تیری معاونت کی ہے) اسی بات پر اُن کو مُقرّن کا خطاب بھی عطا ہوا۔

امام ابن اسحاق کہتے ہیں کہ عباس کو کعب بن عمرو نے گرفتار کیا تھا۔ رضی اللہ عنہ

۱۳۰۔ عبید بن تیہان الانصاری رضؓ

یہ ابوالہیثم بن تیہان کے بھائی ہیں۔ بعض مؤرخین نے ان کو نفس انصار میں شمار کیا ہے اور بعض نے ان کو قبیلہ بلی کا بتلا کر حلیف انصار بتلایا ہے۔

یہ اُن ستر میں سے ہیں جنہوں نے عقبہ میں بیعت نبوی کی تھی۔ غزوہ بدر میں بھی حاضر تھے اور غزوہ احد میں شہید ہوئے تھے۔ رضی اللہ عنہ

۱۳۱۔ عبید بن زید الانصاری الزرقی رضؓ

عبید بن زید بن عامر بن عجلان بن عمر بن عامر بن زریق۔ بدر اور احد ہر دو مقامات شرف میں حاضر تھے۔

۱۳۲۔ عبس بن عامر الانصاری رضؓ

عبس بن عامر بن عدی بن نابی بن عمرو بن سواد بن غنم بن کعب بن سلمہ

بیعت عقبہ کی عزت حاصل کی غزوہ بدر اور غزوۂ احد میں داد شجاعت دی رضی اللہ عنہ

۱۳۳۔ عتبہ بن ربیعہ البہرانی الانصاری رضؓ

یہ بہرانی یا بہزی ہیں۔ انصار کے حلیف تھے۔ بدر میں حاضر ہوئے بعض کو اس بارہ میں اختلاف بھی ہے

۱۳۴۔ عتبہ بن عبداللہ بن صخر بن خنسار الانصاری رضؓ

عقبہ میں بھی بیعت سے مشرف ہوئے اور بدر میں بھی حاضر ہوئے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ وعن الصحابۃ اجمعین

۱۳۵۔ عتبہ بن غزوان بن جابر المازنی رضؓ

ان کا نسب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اٹھارویں پشت میں مضر بن نزار میں شامل ہو جاتا ہے۔

یہ بنو نوفل بن عبد مناف بن قصی کے حلیف بھی ہیں ان کی کنیت ابو غزوان اور ابو عبداللہ ہے ان کا اسلام چھ صحابہ کے بعد تھا۔ انہوں نے اوّل ہجرت حبشہ کی تھی پھر مکہ میں آرہے۔ پھر مقداد بن عمرو کی رفاقت میں ہجرت مدینہ فرمائی اس وقت ان کی عمر ۴۰ سال کی تھی۔ امیر المومنین عمر فاروق نے ان کو تسخیر حیرہ پر مامور فرمایا تھا اور فرما دیا تھا کہ مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ تجھ کو اس علاقہ کا فاتح بنائے گا میں نے علاء بن حضرمی اور عرفجہ بن خزیمہ (یا ہرثمہ) کو لکھ بھیجا ہے کہ وہ تیری ماتحتی میں کام کریں گے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کی مدد فرمائی فتح ابلہ اور فتح حیرہ انہی کے دست و بازو پر ہوئی۔ انہی نے بصرہ کو بسایا اور انہی کے حکم سے محجن بن ادرع نے بصرہ کی مسجد اعظم کی بنیاد رکھی تھی۔

۱۵ھ کو بعمر ۵۷ سال انہوں نے انتقال کیا مدینہ یا ربذہ میں مدفون ہوئے ان کا ایک خطبہ محدثین کے نزدیک محفوظ ہے جو ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔

حمد و ثنا کے بعد فرمایا اِنَّ الدُّنْیَا قَدْ اٰذَنَتْ بِصَرْمٍ وَّ وَلَّتْ حَذَّاءَ وَاِنَّمَا بَقِیَ مِنْهَا صُبَابَةٌ کَصُبَابَةِ الْاِنَاءِ وَاِنَّکُمْ مُنْتَقِلُوْنَ مِنْهَا اِلٰی دَارٍ لَا زَوَالَ لَهَا فَانْتَقِلُوْا بِخَیْرِ مَا بِحَضْرَتِکُمْ

۱۳۶۔ عتبان بن مالک الانصاری السلمی رضؓ

یہ بنو عوف بن خزرج میں سے ہیں۔ بدر میں شامل ہوئے۔ ان کی بینائی شروع ہی سے کمزور تھی آخر میں بینائی بالکل بند ہو گئی تھی حکومت امیر معاویہ تک زندہ رہے تھے۔ رضی اللہ عنہ

۱۳۷۔ عدی بن الزغباء الجہنی الانصاری رضؓ

عدی بن سنان (زغبا) بن سبیع بن ثعلبہ بن ربیعہ، قوم جہینہ سے ہیں انصار بنو النجار کے حلیف تھے بدر و احد و خندق اور جملہ مشاہد

میں ملتزم رکاب محمدی رہے۔

واقعہ بدر میں ان کو اور بسبس بن عمرو جہنی کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو سفیان کی خبر لانے کو مامور فرمایا تھا۔

خلافت فاروق میں انتقال فرمایا۔ رضی اللہ عنہ

۱۳۸۔ **عصمت الانصاریؓ**

بنو مالک بن نجار کے حلیف ہیں اور قوم اشجع میں سے تھے موسیٰ بن عقبہ نے ان کو بدریین میں شمار کیا ہے۔ رضی اللہ عنہ

۱۳۹۔ **عصمۃ بن الحصین الانصاریؓ**

عصمت بن الحصین بن وبرہ بن خالد بن العجلان۔ یہ قبیلہ بنو عوف بن خزرج میں سے ہیں۔

یہ اور ان کے بھائی ہبیل بن وبرہ (نسبت بہ جد) بدر میں شامل ہوئے تھے۔

موسیٰ بن عقبہ۔ واقدی۔ ابن عمارہ کی یہی تحقیق ہے۔ عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی ایک روائت بھی اسی کی مؤید ہے۔

البتہ ابن اسحاق و ابو معشر نے ان کا ذکر اہل بدر میں نہیں کیا۔ رضی اللہ عنہ

۱۴۰۔ **عصیمۃ الاسدیؓ**

یہ بنو اسد بن خزیمہ میں سے ہیں بنو مازن بن نجار کے حلیف تھے۔ بدر میں حاضر تھے رضی اللہ عنہ

۱۴۱۔ **عصیمۃ الاشجعیؓ**

یہ بنو سواد بن مالک بن غنم کے حلیف تھے۔ بدر، احد اور جملہ مشاہد مابعد میں حاضر ہوتے رہے۔ امارت امیر معاویہ میں انتقال فرمایا۔ رضی اللہ عنہ

۱۴۲۔ **عطیہ بن نویرہؓ**

بن عامر بن عطیہ بن عامر بن بیاضۃ الانصاری الزرقی البیاضی۔

بدر میں حاضر تھے۔ رضی اللہ عنہ

۱۴۳۔ **عقبہ بن عامر الانصاری الخزرجی السلمیؓ**

بیعت عقبہ اولیٰ سے مشرف تھے بدر و احد میں حاضر۔ یوم احد کو خود آہنی پر سبز عمامہ سجا رکھا تھا۔ اور دور سے نمایاں ہوتے تھے۔

خندق اور دیگر مشاہد نبوی میں بھی بالالتزام حاضر رہے۔ جنگ یمامہ میں شہید ہوئے رضی اللہ عنہ

۱۴۴۔ **عقبہ بن ربیعہ الانصاریؓ**

بنو عوف بن خزرج کے حلیف ہیں موسیٰ بن عقبہ نے ان کو اہل بدر میں سے بتلایا ہے۔ رضی اللہ عنہ

۱۴۵۔ **عقبہ بن عثمان بن خلدہؓ**

بن مخلد بن عامر بن رزیق الانصاری

بدر میں یہ اور ان کے دونوں بھائی ابو عبادہ و سعد بن عثمان حاضر تھے عقبہ و سعد اور عثمان بن عفان یوم احد کو دامان کوہ اعوص تک بھاگ گئے تھے وہاں پہنچ کر پھر سنبھلے اور پھر جنگ میں آ شامل ہوئے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کی معافی قرآن مجید میں نازل فرمائی۔ یہ بھی اصحاب مصطفویہ کا خاص شرف ہے کہ اُن کی زلات کی معافی کلام الٰہی میں فرمائی گئی۔ جیساکہ ابوناآدم و یونس علیہما السلام کے عفو کا اعلان فرمایا گیا۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔

۱۴۶۔ عقبہ بن عمرو بن ثعلبہ ابومسعود الانصاری رض

یہ اپنی کنیت سے زیادہ مشہور ہیں بنوحارث بن خزرج سے ہیں ابومسعود بدری کے عرف سے مشہور ہیں۔ ابن اسحٰق کا قول ہے کہ انہوں نے بمقام بدر سکونت اختیار کرلی تھی اس لئے بدری کہلائے۔ ورنہ غزوہ بدر میں شامل نہ تھے ہاں بیعت عقبہ میں حاضر تھے اور اس روز سب سے چھوٹے بھی تھے۔

امام بخاری اور ایک جماعت کی تحقیقات یہ ہے کہ یہ غزوہ بدر میں بھی شامل تھے۔ احد اور مشاہد مابعد کی حاضری پر سب کا اتفاق ہے۔ جنگ صفین کو جاتے ہوئے علی مرتضیٰ نے انہی کو امیر کوفہ بنایا تھا۔ ان کا انتقال ۴۱ھ یا ۴۲ھ میں مدینہ یا کوفہ میں ہوا رضی اللہ عنہ

۱۴۷۔ عقبہ بن وہب بن کلدۃ الغطفانی رض

بنوسالم بن غنم بن عوف بن خزرج کے حلیف ہیں بیعت عقبہ اولیٰ و ثانیہ میں حاضر تھے بدر و احد میں نمایاں کام کئے۔ یہ پہلے بزرگوار ہیں جو انصار میں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں مکہ ہی میں حاضر ہوگئے تھے۔ پھر جب حضور نے ہجرت فرمائی تو انہوں نے بھی ہجرت کی اسی لئے آپ کو مہاجری انصاری کہا جاتا ہے۔

جنگ اُحد کے دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ مبارک میں خود آہنی کے حلقے کھب گئے تھے ان کے نکالنے میں یہ بھی ابوعبیدہ عامر بن جراح رضی اللہ عنہ کے ساتھ شامل تھے۔ رضی اللہ عنہ

۱۴۸۔ علیفہ بن عدی بن عمرو الانصاری البیاضی رض

علیفہ بن عدی بن عمرو بن مالک بن عمر بن مالک بن علی بن بیاضہ

اصحاب بدر میں سے ہیں۔ ان کے نام میں مؤرخین کو التباس ہوا ہے۔ ابن اسحاق نے ان کا نام خائے معجمہ (علیخہ) سے تحریر کیا ہے رضی اللہ عنہ

۱۴۹۔ عمرو بن ایاس بن زید الیمنی الانصاری رض

یہ یمن کے باشندے اور انصار کے حلیف تھے بدر اور احد میں حاضر تھے۔ ربیع بن ایاس اور ورقہ بن ایاس ان کے بھائی ہیں اور دونوں صحابی رضی اللہ عنہم۔

۱۵۰۔ عمرو بن ثعلبہ بن وہب الانصاری رض

عمرو بن ثعلبہ بن وہب بن عدی بن مالک بن عدی بن عامر بن غنم بن عدی بن النجار

ابوحکیم یا ابوحکیمہ کنیت تھی اور کنیت ہی پر زیادہ مشہور تھے بدر اور اُحد میں حاضر تھے رضی اللہ عنہ

۱۵۱۔ عمرو بن الجموح الانصاری السلمی رض

عمرو بن الجموح بن زید بن حرام بن کعب بن غنم بن کعب بن سلمہ

ایام جاہلیت میں یہ انصار کے دیوتاؤں بتوں کے پجاری تھے۔ عقبہ میں بیعت سے مشرف ہوئے۔ بدر میں حاضر ہوئے۔ احد میں فائز بہ شہادت

ہوئے۔ یہ اعرج تھے بیٹوں نے کہا کہ آپ گھر ٹھہریں آپ معذور ہیں، کہا مجھے امید ہے کہ میں بھی لنگڑاتا ہوا جنت میں پہنچوں گا جب گھر سے چلے تو ان الفاظ میں دعا مانگی اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِي الشَّھَادَۃَ وَلَا تَرُدَّنِي إِلٰی أَھْلِي خَائِبًا

احد کے دن جب مسلمانوں کی صفیں ٹوٹ گئیں تو یہ اور ان کے فرزند خلاد دونوں آگے بڑھے اور مشرکین پر جا پڑے اور اتنا لڑے کہ وہیں شہید ہو گئے۔ رضی اللہ عنہما۔

۱۵۲۔ عمرو بن عتمہ بن عدی الانصاری الخزرجی رضی اللہ عنہ

عمرو بن عتمہ بن عدی بن نابی بنو سلمہ میں سے ہیں۔ یہ اور ان کے بھائی بیعت عقبہ سے مشرف ہوئے بدر میں حاضر تھے۔

یہ اُن رونے والوں میں سے ایک ہیں جن کے حق میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تھی وَلَا عَلَی الَّذِینَ إِذَا مَا أَتَوْكَ لِتَحْمِلَھُمْ رضی اللہ عنہ

۱۵۳۔ عمرو بن عوف الانصاری رضی اللہ عنہ

یہ بنو عامر بن لوی کے حلیف ہیں۔ مدینہ ہی میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ابن اسحٰق کی تحقیق یہ ہے کہ یہ سہیل بن عمرو کے مولیٰ ہیں۔ بدر میں حاضر تھے۔

نسل گم ہو گئی مسور بن مخرمہ نے ان سے ایک حدیث یہ روایت کی ہے إِنَّ رَسُولَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ أَخَذَ الْجِزْیَۃَ مِنْ مَجُوسِ الْبَحْرَیْنِ رضی اللہ تعالٰی عنہ

۱۵۴۔ عمرو بن غزیہ بن عمرو الانصاری المازنی رضی اللہ عنہ

عمرو بن غزیہ بن عمرو بن ثعلبہ بن خنساء بن مبذول بن عمرو بن غنم بن مازن بن النجار

عقبی بھی ہیں اور بدری بھی۔ ان کے فرزند کلاں حارث کو بھی صحابی ہونے کا شرف حاصل تھا۔ حارث کے دوسرے بھائی صحابی نہیں رضی اللہ عنہم

۱۵۵۔ عمرو بن قیس بن زید الانصاری النجاری رضی اللہ عنہ

جمہور کی رائے ہے کہ بدر میں حاضر تھے۔ سب متفق ہیں کہ اُحد میں یہ اور ان کے فرزند قیس دونوں شہید ہوئے تھے۔ رضی اللہ عنہما

۱۵۶۔ عمرو بن معاذ بن النعمان الانصاری الاشہلی رضی اللہ عنہ

مشہور صحابی سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے برادر خورد ہیں۔ بدر میں حاضر تھے احد میں بعمر ۳۲ سال شہید ہوئے رضی اللہ عنہ

۱۵۷۔ عمارہ بن حزم الانصاری الخزرجی رضی اللہ عنہ

عمارہ بن حزم بن زید بن لوذان بن عمرو بن عبد عوف بن غنم بن مالک بن النجار

یہ اُن ستر بزرگواروں میں سے ہیں جنہوں نے شب عقبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی تھی۔ مواخات میں یہ محرز بن نضلہ کے بھائی تھے۔

بدر، اُحد، خندق اور جملہ مشاہد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ غزوہ فتح میں بنو مالک بن النجار کا نشان انہی کے ہاتھ میں تھا۔

قتال اہل الردہ میں خالد رضی اللہ عنہ کے ساتھ گئے تھے۔ یمامہ میں شہید ہوئے ان کے بھائی عمرو بن حزم اور معمر بن حزم بھی صحابی ہیں معمر کی اولاد میں سے ابو طوالہ عبداللہ بن عبدالرحمٰن امام مالک کے شیخ ہیں۔ رضی اللہ عنہم

۱۵۸۔ عمرو بن معبد رضی اللہ عنہ

عمرو بن معبد بن ازعر بن زید بن عطاف بن ضبیعہ بن زید بن مالک بن عوف بن عمرو بن عوف بن مالک بن اوس الانصاری الضبیعی بدر میں حاضر ہوئے تھے بعض نے ان کا نام عمیر بھی تحریر کیا ہے۔ رضی اللہ عنہ

۱۵۹۔ عمیر بن عامر بن مالک الانصاری المازنیؓ

ابو داؤد کنیت ہے غزوہ بدر میں حاضر ہوئے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۱۶۰۔ عمیر بن حارث بن ثعلبہ الانصاریؓ

یہ بنو حرام میں کعب سے ہیں عقبی و بدری ہیں احد میں حاضر تھے رضی اللہ عنہ

۱۶۱۔ عمیر بن حرام بن عمرو بن الجموح الانصاریؓ

واقدی و ابن عمارہ کا بیان ہے کہ بدری ہیں مگر موسیٰ بن عقبہ اور ابن اسحٰق و ابو معشر نے ان کا نام اہل بدر میں تحریر نہیں کیا۔ رضی اللہ عنہ

۱۶۲۔ عمیر بن الحمام بن الجموح الانصاری السلمیؓ

مواخات میں یہ عبیدہ بن الحارث مطلبی کے بھائی تھے۔ یہ انگور کھا رہے تھے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خطبہ فرمایا۔
وَالَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِیَدِہٖ لَا یُقَاتِلُھُمُ الْیَوْمَ رَجُلٌ صَابِرًا مُّحْتَسِبًا مُّقْبِلًا غَیْرَ مُدْبِرٍ اِلَّا اَدْخَلَہُ اللہُ الْجَنَّۃَ
عمیر بولے۔ خوب خوب۔ بس جنت میں جانے کی صرف اتنی ہی دیر ہے کہ کفار میں سے مجھ کو کوئی قتل کر دے یہ کہہ کر انگور پھینک دیئے اور یہ رجز پڑھتے ہوئے آگے بڑھے۔

رَکْضًا اِلَی اللہِ بِغَیْرِ زَادٖ — اِلَّا التُّقٰی وَعَمَلَ الْمَعَادٖ
وَالصَّبْرَ فِی اللہِ عَلَی الْجِھَادٖ — وَکُلُّ زَادٍ عُرْضَۃُ النَّفَادٖ
غَیْرَ التُّقٰی وَالْبِرِّ وَالرَّشَادٖ

تلوار چلاتے ہوئے شہید ہوئے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۱۶۳۔ عمیر بن معبد بن ازعر الانصاریؓ

یہ بنو ضبیعہ بن زید میں سے ہیں۔ بعض نے ان کا نام عمرو بھی لکھا ہے۔ بدر، احد، خندق اور جملہ مشاہد میں ملتزم رکاب نبوی تھے ان کا شمار ان ایک سو صابرین کے اندر ہوتا ہے جو یوم حنین میں صابر رہے تھے۔ رضی اللہ عنہ

۱۶۴۔ عمیر الانصاریؓ

ان کا پتہ اسی قدر درج ہے کہ یہ سعید بن عمیر انصاری کے والد ہیں۔ بدر میں حاضر تھے۔ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث نقل کی ہے
مَنْ صَلّٰی عَلَیَّ مِنْ اُمَّتِیْ صَلٰوۃً مُخْلِصًا مِنْ قَلْبِہٖ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ عَشْرًا (جو کوئی میری امت میں سے مجھ پر بصدق دل ایک بار درود بھیجے گا اللہ تعالیٰ اس پر دس بار بھیجے گا)

۱۶۵۔ عمار بن زیاد بن سکن الانصاریؓ

بدر میں حاضر ہوئے اور شہید ہوئے۔ رضی اللہ عنہ

۱۶۶۔ عنترہ السلمی ثم ذکوانی رضی اللہ عنہ

کسی نے ان کو انصار کا مولیٰ اور کسی نے بنو سلمہ انصار کا حلیف تحریر کیا ہے۔ سب متفق ہیں کہ بدر میں حاضر تھے۔ جمہور کا اتفاق ہے کہ احد میں شہید ہوئے اور قول شاذہ ہے کہ جنگ صفین میں شہید ہوئے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۱۶۷۔ عوف بن عفراء الانصاری رضی اللہ عنہ

عوف بن حارث بن رفاعہ بن حارث بن سواد بن مالک بن غنم بن مالک بن نجار۔

بدر میں حاضر ہوئے ان کے بھائی معاذ و معوذ بھی بدری ہیں۔ عوف بن عفراء کی بابت یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اُن چھ میں تھے جنہوں نے عقبہ پر بیعت کی بعد ازاں عقبہ کی دوسری و تیسری بیعت میں بھی شامل تھے۔ رضی اللہ عنہ

عفراء ان کی والدہ کا نام ہے والد کا نام حارث ہے۔

۱۶۸۔ عویم بن ساعدہ بن عائش رضی اللہ عنہ

یہ بنو قضاعہ میں سے ہیں بنو امیہ کے حلیف تھے عقبہ کی بیعت میں یکے از ہفتاد تھے۔

بدر و احد اور خندق میں حاضر تھے۔ عہد نبوی میں انتقال کیا یا بقول بعض عہد فاروقی میں بعمر ۶۵ / ۶۶ سال مدینہ میں وفات پائی۔ رضی اللہ عنہ

۱۶۹۔ عویمر بن اشقر بن عوف الانصاری رضی اللہ عنہ

ان کو بنو مازن میں سے بیان کیا گیا ہے۔ اہل مدینہ میں ان کا شمار ہوتا ہے بدر میں حاضر تھے رضی اللہ عنہ

۱۷۰۔ غنام رضی اللہ عنہ

ان کو رجلٌ مِنَ الصحابہ بتلایا گیا ہے اہل بدر میں شامل ہیں ابن غنام صحابی اور راویان حدیث میں سے ہیں۔ رضی اللہ عنہ

۱۷۱۔ فروہ بن عمرو الانصاری رضی اللہ عنہ

فروہ بن عمرو بن عبید بن عامر بن بیاضۃ الانصاری البیاضی

عقبی بھی ہیں اور بدری بھی اور مشاہد مابعد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ساتھ حاضر رہا کرتے تھے۔ مواخات میں عبداللہ بن مخرمۃ العامری کے بھائی ہیں۔ رضی اللہ عنہ

۱۷۲۔ فاکہہ بن بشیر الانصاری الزرقی رضی اللہ عنہ

فاکہہ بن بشیر بن فاکہہ بن زید بن خلدہ بن عامر بن زریق

یہ بنو جشم بن الخزرج میں سے ہیں۔ بدر میں حاضر تھے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۱۷۳۔ قتادہ بن نعمان بن زید الانصاری الظفری رضی اللہ عنہ

قتادہ بن نعمان بن زید بن عامر بن سواد بن کعب (المسمیٰ ظفر) ابن خزرج بن عمرو بن مالک بن اوس۔

ابو عمرو کنیت تھی اور ابو عبداللہ بھی عقبی ہیں اور بدری بھی۔ جملہ مشاہد میں حاضر ہونے والے جنگ اُحد میں ان کی آنکھ نکل پڑی تھی۔ لوگ قطع کرنے لگے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ڈیلے کو آنکھ میں رکھ دیا اور ہتھیلی سے دبا دیا اور زبان سے فرمایا اَللّٰھُمَّ اَکْسِھَا جَمَالًا الٰہی اس آنکھ کو

صاحب جمال بنا دے یہ آنکھ عمر بھر کبھی نہ دکھی۔ فتح مکہ کے دن قبیلہ بنو ظفر کا نشان انہی کے ہاتھ میں تھا۔

حضرت قتادہ کا شمار فضلائے صحابہ میں ہوتا ہے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ سخت تاریکی تھی۔ بجلی چمک رہی تھی۔ ابر تھا قتادہ نماز عشاء کے لئے مسجد نبوی میں حاضر ہوئے سرور عالم نے ان کو دیکھا تو فرمایا قتادہ ہے۔ یہ بولے ہاں۔ پھر کہا میں نے سمجھا کہ آج نماز میں حاضر ہونے والے کم ہوں گے میں ضرور چلوں۔ فرمایا واپس جاؤ تو مل کر جانا۔ پھر حضور نے اُن کو کھجور کی ایک شاخ دے دی جو تاریکی میں روشنی دیتی تھی دس دس قدم آگے دس دس قدم پیچھے۔

ان کا انتقال ۲۳ھ بعمر ۶۵ سال ہوا۔ عمر فاروقؓ نے نماز جنازہ پڑھی اور ابوسعید خدریؓ جوان کے مات بھائی تھے قبر میں اترے رضی اللہ عنہ

۱۷۴۔ قطبہ بن عامر بن جدیدۃ الانصاری الخزرجیؓ

قطبہ بن عامر بن حدیدہ بن عمرو بن سواد بن غنم بن کعب بن سلمہ

بیعت عقبہ اولیٰ وثانیہ میں حاضر تھے۔ بدر، احد اور جملہ مشاہد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ساتھ چلنے والے تھے۔ جنگ اُحد میں ۹ زخم ان کے جسم پر آئے تھے ایک پتھر ان کے جسم پر آکر گرا۔ یہ بولے کہ جب تک یہ پتھر نہیں بھاگے گا میں بھی نہ بھاگوں گا۔ فتح مکہ کے دن بنو سلمہ کا نشان انہی کے ہاتھ میں تھا ابو زید کنیت تھی۔ امیر المومنین عثمانؓ کے عہد میں وفات پائی۔ رضی اللہ عنہ

۱۷۵۔ قیس بن السکن الانصاری الخزرجیؓ

قیس بن سکن بن قیس بن زعوراء بن حرام بن جندب بن عامر بن غنم بن عدی بن النجار

ابو زید کنیت ہے اور کنیت ہی سے زیادہ مشہور ہیں۔ ان کی نسل باقی نہیں رہی۔ بدر میں حاضر تھے ۱۵ھ کو جنگ جسر ابو عبید کے دن شہید ہوئے۔

یہ انصار کے ان چار بزرگوں میں سے ہیں جو عہد نبوی میں جامع قرآن تھے یعنی زید بن ثابت معاذ ابن جبل ابی بن کعب۔ چوتھے خود یہ۔ مہاجرین میں حافظ و جامع قرآن مجید عہد نبوی یہ ہیں۔ عثمان بن عفان، علی، عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عمرو بن العاص، سالم مولیٰ ابو حذیفہ رضی اللہ عنہم۔

۱۷۶۔ قیس بن عمرو بن سہل الانصاری المدنیؓ

قیس بن عمرو بن سہل بن ثعلبہ بن حارث بن زید بن ثعلبہ بن غنم بن مالک بن النجار

بدر میں حاضر تھے یہ بزرگوار یحییٰ و سعید و عبد ربہ فقہاء مدینہ کے جد اعلیٰ ہیں

۱۷۷۔ قیس بن محصن بن خالد بن مخلد الانصاری الزرقیؓ

بدر و اُحد میں شریک ہوئے تھے ان کے والد کا نام بعض نے حصن بھی لکھا ہے۔ رضی اللہ عنہ

۱۷۸۔ قیس بن مخلد الانصاری المازنیؓ

قیس بن مخلد بن ثعلبہ بن صخر بن حبیب بن الحارث بن ثعلبہ بن مازن بن النجار

بدر میں شامل ہوئے اور احد میں شہید ہوئے۔ رضی اللہ عنہ

۱۷۹۔ قیس بن ابی صعصعہ الانصاری المازنی رضی اللہ عنہ

قیس بن ابی صعصعہ عمرو بن زید بن عوف بن مبذول بن عمرو بن غنم بن مازن بن النجار

عقبی بھی ہیں اور بدری بھی۔ بدر میں پیدل نوجوانوں کے سردار تھے۔ بعدازاں احد میں بھی حاضر ہوئے۔ وقت وفات معلوم نہیں ہو سکا رضی اللہ عنہ

۱۸۰۔ کعب بن جماز الانصاری رضی اللہ عنہ

یہ قوم غسان میں سے ہیں مگر بنو ساعدہ کے حلیف تھے اس لئے انصاری ہیں۔ کعب بدری ہیں اور ان کے بھائی سعد غزوہ احد میں تھے۔ جنگ یمامہ میں شہید ہوئے۔

دار قطنی نے ان کے والد کا نام حسان تحریر کیا ہے مگر ابن عبدالبر جماز ہی کو صحیح بتاتے ہیں۔ رضی اللہ عنہ

۱۸۱۔ کعب بن زید الانصاری رضی اللہ عنہ

کعب بن زید بن قیس بن مالک بن کعب بن حارثہ بن دینار بن النجار

بدر میں حاضر ہوئے اور یوم الخندق کو شہید ہوئے۔ یہ بیر معونہ کے بزرگوں میں سے ہیں جہاں ان کے ساتھی سب کے سب مارے گئے تھے اور صرف یہی ایک جان بر ہو سکے تھے۔ رضی اللہ عنہ

۱۸۲۔ کعب بن عمرو بن عباد الانصاری السلمی رضی اللہ عنہ

بنو سلمہ میں سے ہیں۔ ابوالیسر کنیت ہے اور کنیت ہی سے زیادہ مشہور ہیں۔ عقبہ میں حاضر ہوئے، پھر بدر میں بعمر بست سال شامل ہوئے۔ یہ قد کے چھوٹے تھے انہوں نے عباس بن عبدالمطلب کو جو بلند بالا اور ذوی الجثہ شخص تھے بدر میں اسیر کیا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اَعَانَکَ عَلَیْہِ مَلَکٌ کَرِیْمٌ بزرگ فرشتہ نے تیری مدد کی۔ انہی نے مشرکین کا جھنڈا بھی جو ابن عمیر کے ہاتھ میں تھا چھین لیا تھا۔

صفین میں علی مرتضیٰ کی جانب تھے۔ مدینہ منورہ میں ۵۵ھ کو انتقال فرمایا۔ رضی اللہ عنہ

۱۸۳۔ مالک بن تیہان

بن مالک بن عبید بن عمرو بن عبدالاعلم البلوی الانصاری

ابوالہیثم کنیت ہے عقبہ کے ہر سہ مواقع میں حاضر تھے اور بنو عبدالاشہل کا گمان ہے کہ سب سے پہلے بیعت عقبہ کرنے والے بھی یہی تھے۔

بعض نے ان کو قوم بلی بن صاف بن قضاعہ سے بتایا اور بنو عبدالاشہل کا حلیف تحریر کیا ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ یہ خود انصاری الاوسی ہیں۔ بدر و احد اور جملہ مشاہد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب رہے۔

۲۰ھ کو بعہد فاروقی انتقال ہوا۔ بعض کا قول ہے کہ یہ صفین میں منجانب علی مرتضیٰ تھے وہیں شہید ہوئے لیکن صفین میں ان کے بھائی عبید کا شہید ہونا محقق ہے۔ رضی اللہ عنہ

۱۸۴۔ مالک بن دخشم الانصاری رضی اللہ عنہ

ابن اسحٰق و موسیٰ کا بیان ہے کہ انہوں نے بیعت عقبہ بھی کی تھی مگر واقدی و ابومعشر کو اختلاف ہے۔

سب متفق ہیں کہ یہ بدر اور جملہ مشاہد مابعد میں حاضر رکاب مصطفوی تھے۔

ایک بار ان کا ذکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں آیا۔ ایک شخص نے جوان کو نفاق آلود سمجھتا تھا ان کو گالی دی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
لَا تَسُبُّوْا اَصْحَابِی (میرے صحابی کو گالی نہ دو) رضی اللہ عنہم

۱۸۵۔ مالک بن رافع بن مالک الانصاری رضؓ

یہ اور ان کے والد رافع اور ان کے بھائی خلاد اور رفاعہ چاروں بدری ہیں۔ رضی اللہ عنہم

۱۸۶۔ مالک بن ربیعہ الانصاری الساعدی رضؓ

ان کی کنیت ابو اسید ہے اور کنیت ہی سے زیادہ مشہور ہیں۔ بدر، احد اور جملہ مشاہد نبوی میں حاضر ہوئے۔ آخری عمر میں بینائی بند ہو گئی تھی ۶۰ھ میں مدینہ میں انتقال کیا۔ اہلِ بدر میں سے یہ آخری شخص ہیں۔ ان کی وفات کے بعد کوئی بدری زندہ نہ رہا تھا۔ رضی اللہ عنہ

۱۸۷۔ مالک بن قدامہ الانصاری الاوسی رضؓ

مالک بن قدامہ بن عرفجہ بن کعب بن نحاط بن کعب بن حارثہ بن غنم بن سلم بن امرء القیس، ابن مالک بن الاوس۔ بدر میں حاضر تھے ان کے بھائی منذر بن قدامہ بھی بدری ہیں۔ رضی اللہ عنہ

۱۸۸۔ مالک بن مسعود بن البدن الانصاری الساعدی رضؓ

مالک بن مسعود بن بدن بن عامر بن عوف بن حارثہ بن عمرو بن الجموح بن ساعدہ
سب کا اتفاق ہے کہ یہ بدر و احد میں شامل ہوئے۔ ابو اسید الساعدی ان کے چچیرے بھائی ہیں رضی اللہ عنہ

۱۸۹۔ مالک بن نمیلہ مزنی الانصاری رضؓ

نمیلہ ان کی والدہ کا نام ہے والد کا نام مالک بن ثابت ہے۔ قوم مزنیہ سے ہیں۔ وہ انصار اوس کے حلیف تھے بدر میں حاضر ہوئے اور غزوہ احد میں شہید ہوئے۔ رضی اللہ عنہ

۱۹۰۔ مبشر بن عبد المنذر الانصاری رضؓ

مبشر بن عبد المنذر بن زنبیر بن زید بن امیہ بن زید بن مالک بن عوف بن عمرو بن عوف بن مالک بن اوس
بدر میں معہ برادر خود ابو لبابہ بن عبد المنذر حاضر ہوئے اور بدر ہی میں مبشر حاضر ہوئے بعض نے ان کو شہید خیبر بتلایا ہے رضی اللہ عنہ

۱۹۱۔ المجذر بن زیاد البلوی الانصاری رضؓ

مجذر (عبد اللہ) بن زیاد بن عمر بن زمزمہ بن عمرو بن عمارہ۔ بدر میں حاضر تھے۔ یہ قوم بلی سے تھے۔ جاہلیت میں انہوں نے سوید بن صلت کو قتل کیا تھا۔

جنگ احد میں حارث بن سوید نے باوجود خود مسلمان ہو جانے کے مجذر کو پس پشت سے حملہ کر کے قتل کر دیا اور پھر مکہ میں مرتد ہو کر چلا گیا۔
فتح مکہ کے بعد پھر حارث مسلمان ہو کر آ گیا۔ اس پر قتل مجذر کا مقدمہ چلایا گیا اور قصاص لیا گیا۔
جنگ بدر میں مجذر ہی نے ابو البختری عاص بن ہشام بن حارث کو قتل کیا تھا۔ ابو البختری لشکر کفار میں تھا۔ لیکن اس نے مسلمانوں کے خلاف کوئی حصہ نہ لیا تھا بلکہ قریش نے جو عہد نامہ بنو ہاشم و بنو مطلب کے خلاف لکھ کر خانہ کعبہ سے آویزاں کر دیا تھا۔ ابو البختری نے اس کے منسوخ

کرانے میں سعی کی تھی لہٰذا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دے دیا تھا کہ جس کسی کی مڈ بھیڑ ابوالبختری سے ہو جائے وہ اُسے قتل نہ کرے۔

ابوالبختری انہی کو مل گیا مجذر نے کہا کہ ہم کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم یہ ہے کہ تجھے قتل نہ کیا جائے۔ ابوالبختری نے کہا کہ ایک شخص جنادہ بن ملیحہ قوم بنو لیث کا ہے وہ میرا ہم عہد ہے اور میرے ساتھ ہے۔ تم اُسے بھی چھوڑ دو۔ مجذر بولا کہ اور کسی کے چھوڑنے کی اجازت نہیں آخر لڑے اور ابوالبختری مارا گیا۔

مجذر نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ بھی عرض کیا تھا کہ میں نے اُسے اسیر ہو جانے کو کہا تھا مگر وہ اس پر رضامند نہ ہوا اور آخر مجھے لڑنا پڑا۔ رضی اللہ عنہ

۱۹۲۔ محرز بن عامر بن مالک الانصاری رضؓ

محرز بن عامر بن مالک بن عدی بن عامر بن غنم بن عدی بن النجار۔ بدر میں حاضر ہوئے ان کی وفات ٹھیک اُس دن بوقت صبح ہوئی جس روز جنگ احد واقع ہوئی تھی۔ نسل نہیں چلی۔ رضی اللہ عنہ

۱۹۳۔ محمد بن مسلمہ الانصاری الحارثی

محمد بن مسلمہ بن سلمہ بن خالد بن عدی بن مجدعہ بن حارثہ بن حارث بن خزرج بن عمرو بن مالک ابن اوس۔

بنو عبدالاشہل کے حلیف ہیں بدر اور جملہ مشاہد میں ملتزم رکاب مصطفوی رہے۔ تا زندگی مدینہ ہی میں آباد رہے۔ ۴۳ھ بعمر ۷۷ سال انتقال کیا۔

گندم گوں لانبا قد پُر بدن تھے۔ کعب بن اشرف یہودی کے قتل میں شامل تھے ان کا شمار فضلائے صحابہ میں ہوتا ہے ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بار ہا حاکم مدینہ مقرر فرمایا جبکہ حضور غزوات کو باہر تشریف لیجایا کرتے تھے۔

یہ ان بزرگواروں میں سے ہیں جو مسلمانوں کی باہمی جنگ کے وقت سب سے الگ تھلگ رہے اور زندہ میں جا ٹھہرے تھے۔

سعد بن ابی وقاص، عبداللہ بن عمر، محمد بن مسلمہ اور اسامہ بن زید وہ بزرگ ہیں جو جمل و صفین سے علیحدہ رہے۔ انہوں نے ان دنوں میں لکڑی کی تلوار ہاتھ میں لے لی تھی اور کہا جاتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے ان کو ایسا کرنے کا حکم دیا تھا۔ دس بیٹوں اور ۶ بیٹیوں کے والد ہیں رضی اللہ عنہ

۱۹۴۔ مرارہ بن ربیعہ العمری الانصاری رضؓ

مرارہ بن ربیعہ قبیلہ بنو عمرو بن عوف میں سے ہیں۔ بدر میں حاضر ہوئے یہ ان تین صحابہ میں سے ہیں جو غزوہ تبوک میں پیچھے رہ گئے تھے اور قرآن مجید میں ان کی قبولیت توبہ کا فرمان اترا۔ رضی اللہ عنہ

۱۹۵۔ مسعود بن اوس بن زید الانصاری رضؓ

قبیلہ مالک بن النجار سے ہیں غزوہ احد اور مشاہد مابعد میں حاضر ہوئے تھے ابن اسحاق نے ان کا نام اہل بدر میں نہیں تحریر کیا۔ خلافت فاروقی میں انتقال کر گئے تھے۔ کلبی کا بیان ہے کہ جنگ صفین تک زندہ تھے اور منجانب علی مرتضیٰ لڑے تھے۔

ان کا مذہب تھا کہ وتر واجب ہیں عبادہ بن صامت اس کی تکذیب کرتے تھے۔ رضی اللہ عنہم۔

۱۹۶۔ مسعود بن خلدہ بن عامر بن زریق الانصاری الزرقی رضؓ

بدر میں حاضر تھے اور احد میں بھی۔ بیر معونہ پر شہادت پائی بعض نے ان کو شہید جنگ خیبر بتلایا ہے۔ رضی اللہ عنہ

۱۹۷۔ مسعود بن ربیع القاری رضی اللہ عنہ

قوم قارہ سے تھے اس لئے قاری مشہور ہوئے مواخات میں عبید بن تیہان کے بھائی تھے ۳۰ھ کو بعمر زائد از شصت ۶۰ سال وفات پائی۔ ابو عمیر کنیت ہے۔ رضی اللہ عنہ

۱۹۸۔ مسعود بن سعد

مسعود بن سعد بن قیس بن خالد بن عامر بن زریق الانصاری الزرقی۔ واقدی کا قول ہے کہ بدر و احد میں حاضر تھے اور بیر معونہ پر شہید ہوئے۔ رضی اللہ عنہ

۱۹۹۔ مسعود بن عبد سود الانصاری رضی اللہ عنہ

قبیلہ اوس میں سے ہیں صرف ابن اسحٰق نے ان کو خزرجی بتلایا ہے بدر میں حاضر تھے اور خیبر میں شہید ہوئے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۲۰۰۔ امام العلماء معاذ بن جبل الانصاری الخزرجی رضی اللہ عنہ

معاذ بن جبل بن عمرو بن اوس بن عائذ بن کعب بن عمرو بن ادی بن سعد بن علی بن اسد بن ساردہ بن یزید بن جشم بن الخزرج الانصاری

ابو عبدالرحمٰن کنیت ہے دراز قد، خوب رو، سفید رنگ، دانت سفید و روشن، بزرگ چشم، انہوں نے بیعت عقبہ ستر صحابہ کی شمولیت میں کی تھی اور مواخات میں ان کو عبداللہ بن مسعود کا بھائی بنایا گیا تھا بعض نے بیان کیا کہ جعفر بن ابی طالب ان کے دینی بھائی تھے۔ بدر اور جملہ غزوات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب برابر حاضر ہوئے۔ سرور عالم نے انتقال سے کچھ عرصہ پہلے ان کو یمن کے ایک حصہ کا حاکم بنا کر بھیج دیا تھا۔ رخصت کے وقت فرما دیا تھا کہ تم مجھے اب اس دنیا میں نہ ملو گے۔

حضور نے ملک یمن کو پانچ قسمتوں پر تقسیم فرما دیا تھا۔

۱۔ صنعاء یہاں کا حاکم خالد بن سعید مقرر فرمایا

۲۔ کندہ " " حاکم مہاجرین ابو امیہ

۳۔ حضرموت " " حاکم زیاد بن لبید

۴۔ زبیدہ، رمعہ، عدن اور ساحل یہاں کا حاکم ابو موسیٰ اشعری

۵۔ جند یہاں کا حاکم معاذ بن جبل

شرائع اسلام کی تعلیم اور قرآن مجید کی عام تدریس اور مقدمات عامہ کی نگرانی اور جملہ عمال یمن کے اموال کی فراہمی بھی معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ ہی کے متعلق تھی۔

ان کی مدح میں ایک تو یہ ارشاد نبوی ہے اعلمہم بالحلال والحرام معاذ بن جبل حرام حلال کے جاننے میں سب سے زیادہ عالم معاذ بن جبل ہے۔

دوسری یہ حدیث یاتی معاذ بن جبل یوم القیامۃ امام العلماء قیامت کے دن معاذ بن جبل جملہ علماء کے پیش پیش چلتے ہوئے حاضر ہوں گے۔

فروہ اشجعی کی روایت ہے کہ میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھا ہوا تھا تو انہوں نے بآواز بلند یہ الفاظ پڑھے۔ اِنَّ مُعَاذًا کَانَ اُمَّۃً قَانِتًا لِلّٰہِ حَنِیْفًا وَلَمْ یَکُ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ میں نے کہا کہ قرآن مجید میں تو اِنَّ اِبْرَاھِیْمَ ہے ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے مکرر اِنَّ مُعَاذًا کَانَ اُمَّۃً پڑھا میں سمجھ گیا کہ یہ دانستہ پڑھ رہے ہیں بعد ازاں ہم سے ابن مسعود نے پوچھا تو جانتا ہے کہ "اُمّت" اور "قانت" کے معنے کیا ہیں۔ میں نے کہا خدا ہی خوب جانتا ہے۔

ابن مسعود نے کہا اُمّت وہ ہے جو خیر کا معلم ہو اور اس کی اقتدا کی جائے اور قانت کے معنے اللہ کی اطاعت کرنے والا ہیں۔ معاذ بن جبل اسی صفت کے تھے کہ وہ معلم للخیر بھی تھے اور اللہ و رسول کی اطاعت کرنے والے بھی تھے۔

عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن کعب نے اپنے باپ سے روایت کی ہے کہ معاذ بن جبل امور خیر میں بہت خرچ کرنے والے تھے حتیٰ کہ ان کے سر بہت قرضہ ہو گیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی جائیداد کو زیر نگرانی خود لے کر جملہ قرضداروں کا قرضہ چکا دیا۔ معاذ کے پاس کچھ نہ رہا۔

فتح مکہ کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یمن جا کر تجارت کرنے کے لئے بھیج دیا اور بیت المال سے امداد روپیہ عنایت فرمایا۔ جب معاذ بعد از انتقال نبوی مدینہ میں آئے تو فاروق نے ابوبکر صدیق سے کہا کہ معاذ سے وہ روپیہ واپس لینا چاہیئے ابوبکر نے فرمایا میں تو کچھ نہ لوں گا وہ خود واپس کریں تو ان کی مرضی ہے کیونکہ یہ روپیہ اُن کو رسول اللہ نے دیا تھا۔ پھر عمر فاروق معاذ بن جبل سے خود علیحدہ ملے اور اُن کو واپسی رقم کے لئے کہا معاذ نے کہا کہ یہ رقم تو رسول اللہ ہی نے میری حالت کو درست کرنے کے لئے دی تھی۔ اب میں کیوں واپس کروں۔

عمر واپس آگئے۔ پھر معاذ حضرت عمر سے ملے۔ کہا میں تمہاری بات مان لینے کو تیار ہوں کیونکہ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں پانی کے گڑھے میں ہوں اور ڈوبنے لگا ہوں تم نے مجھے وہاں سے نکالا۔ بعد ازاں معاذ ابوبکر صدیق کے پاس آئے اور تمام ماجرا سنایا اور حلفیہ کہا کہ میں کوئی رقم چھپا کر نہ رکھوں گا۔

ابوبکر نے فرمایا میں تم سے کچھ واپس نہ لوں گا بلکہ تمام رقم کو ہبہ کر دیتا ہوں عمر نے کہا یہ بہت خوب ہے۔ بعد ازاں معاذ جہاد شام کو چلے گئے ان کا انتقال طاعون عمواس میں ۱۸ھ کو ہوا۔ بوقت انتقال ان کی عمر ۳۳ یا ۳۸ سال کی تھی دواوین احادیث میں ان سے ۱۵۷ مرویات ثبت ہیں متفق علیہ ۲ صرف صحیح بخاری میں ۳ صرف صحیح مسلم میں ایک۔

۲۰۱۔ معاذ بن عفراء الانصاری رضی اللہ عنہ

یہ قبیلہ بنو مالک بن النجار سے ہیں۔ عفراء ان کی والدہ کا نام ہے جس کی طرف منسوب ہیں۔ ان کے والد حارث بن سواد بن مالک ہیں۔ یہ انصار میں سے ایمان لانے میں اُن اوّلین میں سے ہیں جن پر کسی انصاری کو تقدم حاصل نہیں جنگ بدر میں معاذ بھی حاضر تھے اور ان کے دونوں بھائی عوف و معوذ بھی یہ دونوں تو بدر ہی میں شہید ہو گئے تھے مگر معاذ رضی اللہ عنہ دیر تک زندہ رہے۔

ابوجہل کی پنڈلی پر انہی نے تلوار ماری تھی۔ ابوجہل کے بیٹے نے ان کے شانہ پر تلوار لگائی ہڈی کٹ گئی مگر بازو شکستہ لیے اسی طرح مصروف جہاد رہے۔

جب اس مجروح ہاتھ کو انہوں نے مانع سعی جہاد سمجھا تو کٹے ہوئے ہاتھ کو پاؤں کے نیچے دبا کر اور جھٹکا دے کر علیحدہ کر دیا اور پھر بفراغت تمام دن بھر مصروف جہاد رہے۔

ان کے سن وفات میں اختلاف ہے بعض نے بتلایا ہے کہ یہ خلافت علی مرتضیٰ تک زندہ رہے تھے۔ رضی اللہ عنہ

۲۰۲۔ معاذ بن عمرو بن الجموح الانصاری السلمی رضی اللہ عنہ

ان کے والد عمرو بن الجموح اور معاذ دونوں بدر میں شامل تھے۔ عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب بدر میں صف بندی ہوئی تو میں نے دیکھا کہ میرے چپ و راست انصار کے دو نوجوان لڑکے ہیں۔ میں نے دل میں کہا کہ میرے برابر بلکہ پورے جوان ہوتے تو خوب ہوتا۔ ان میں سے ایک بولا، چچا تم ابوجہل کو پہچانتے ہو۔ میں نے کہا ہاں۔ تم کیا چاہتے ہو۔ کہا سنا ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دیا کرتا ہے۔ دیکھ پاؤں تو اسے قتل ہی کر کے چھوڑوں دوسرے لڑکے نے بھی مجھے آہستگی یہی بات کہی اتنے میں مجھے سامنے ابوجہل نظر پڑ گیا میں نے دونوں سے کہا تمہارا مطلوب وہ ہے دونوں شہباز کی طرح جھپٹ پڑے معاذ بن عمرو کے بیان میں بھی بازو کٹ جانے اور جھپٹ کر گرا دینے کا واقعہ اسی طرح بیان ہوا ہے جس طرح معاذ بن عفراء کے بیان میں ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تلواروں کو دیکھ کر فرمایا تھا کہ ہاں تم دونوں نے ابوجہل کو ضربات لگائی ہیں۔ معاذ بن عمرو بدر ہی میں شہید ہو گئے تھے۔ رضی اللہ عنہ

۲۰۳۔ معاذ بن ماعص الانصاری الزرقی رضی اللہ عنہ

معاذ بن ماعص بن قیس بن خلدہ بن عامر بن زریق۔ بدر و احد میں حاضر تھے۔ یہ شہسوار تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بدر میں ابوعیاش زرقی کا گھوڑا دلا دیا تھا جبکہ ابوعیاش گھوڑے سے گر پڑے تھے۔

واقدی اس قول میں منفرد ہیں کہ بیر معونہ کے واقعہ میں شہید ہوئے۔ رضی اللہ عنہ

۲۰۴۔ معبد بن عبادہ الانصاری السالمی رضی اللہ عنہ

معبد بن عبادہ بن قشیر۔ یہ قبیلہ بنو سالم بن عوف سے ہیں۔ ابوحمیصہ ان کی نسبت ہے اور کنیت ہی سے زیادہ مشہور بھی ہیں۔ رضی اللہ عنہ

۲۰۵۔ معبد بن قیس بن صخر الانصاری رضی اللہ عنہ

معبد بن قیس بن صخر بن حرام بن ربیعہ بن عدی بن غنم بن کعب بن سلمی

بدر میں حاضر تھے۔ ان کے بھائی بھی بدری ہیں دونوں بھائی احد میں بھی حاضر ہوئے رضی اللہ عنہما

۲۰۶۔ معبد بن وہب العبدی بن عبدالقیس رضی اللہ عنہ

بدر میں حاضر تھے اور دونوں ہاتھوں میں تلواریں لے کر چلا رہے تھے۔ ام المومنین سودہ کی بہن بریرہ بنت زمعہ ان کے نکاح میں تھیں رضی اللہ عنہ

۲۰۷۔ معتب بن بشیر بن ملیل الانصاری رضی اللہ عنہ

معتب بن بشیر (قشیر) بن ملیل بن زید بن عطاف بن ضبیعہ بن زید بن مالک بن عوف بن عمرو بن عوف۔

عقبی بھی ہیں اور بدری بھی۔ احد میں بھی حاضر تھے رضی اللہ عنہ

۲۰۸۔ معتب بن عبید بن ایاس البلوی الانصاری رضی اللہ عنہ

انصار بنو ظفر کے حلیف تھے۔ بدر میں حاضر تھے بعض نے ان کا نام معتب بتلایا ہے۔ رضی اللہ عنہ

۲۰۹۔ معقل بن منذر بن سرح الانصاری رضی اللہ عنہ

معقل بن منذر بن سرح بن خناس بن سنان بن عبید بن عدی بن غنم بن کعب بن سلمہ
عقبی بھی ہیں اپنے بھائی زید بن منذر کے ساتھ بدر میں بھی حاضر تھے۔ رضی اللہ عنہ

۲۱۰۔ **معمر بن حارث القرشی الجمحی**

معمر بن حارث بن معمر بن حبیب بن وہب بن حذافہ بن جمح
حاطب کے بھائی اور عثمان بن مظعون کے ہمشیر زادہ ہیں والدہ کا نام قتیلہ تھا مواخات میں معاذ بن عفراء کے بھائی ہیں، بدر، احد اور جملہ مشاہد میں شامل ہوئے اور خلافت فاروقی میں وفات پائی۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۲۱۱۔ **معن بن عدی بن جد بن عجلان بن ضبیعۃ البلوی الانصاریؓ**

انصار بنو عمرو بن عوف کے حلیف تھے۔ عاصم بن عدی کے برادر حقیقی ہیں۔ مواخات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن خطاب کو ان کا بھائی بنایا تھا
عقبہ میں بھی حاضر ہوئے اور بدر و احد و خندق اور دیگر جملہ مشاہد میں ہمرکاب محمدی تھے۔
جب سرورِ عالم کا انتقال ہوا تو لوگ کہنے لگے کاش ہم حضور سے پہلے مر گئے ہوتے۔ معن بن عدی نے کہا میں تو یہ پسند نہیں کرتا کہ حضور سے پہلے مر گیا ہوتا اس لئے کہ میں حضورؐ کی تصدیق حضورؐ کے انتقال کے بعد بھی ویسے ہی کرنا چاہتا ہوں۔ جیسا کہ زندگی میں حضورؐ کی تصدیق کرتا رہا۔
مسیلمہ کی جنگ میں شہید ہوئے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۲۱۲۔ **معن بن یزید بن اخنس بن خباب السلمیؓ**

معن اور یزید اور اخنس تینوں صحابی ہیں۔ بدر میں حاضر تھے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم

۲۱۳۔ **معن بن عفراء الانصاریؓ**

یہ معاذ بن عفراء کے بھائی ہیں ابوجہل پر حملہ کرنے میں بھائی کیساتھ شامل تھے بدر میں حاضر تھے وہیں سے خلد بریں کو سدھارے رضی اللہ عنہما

۲۱۴۔ **معوذ بن عفرا بن الجموح الانصاریؓ**

معاذ بن عمرو کے بھائی ہیں بھائی کے ساتھ ہی بدر میں شامل تھے ابن اسحٰق نے ان کا نام اہلِ بدر میں ذکر نہیں کیا۔ رضی اللہ عنہ

۲۱۵۔ **ملیل بن وبرہ بن خالد بن عجلان الانصاریؓ**

یہ قبیلہ بنو عوف بن خزرج سے ہیں بدر و احد میں حاضر تھے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۲۱۶۔ **منذر بن قدامہ الانصاری الاوسیؓ**

بنو غنم میں سے ہیں۔ بدر میں شامل ہوئے۔ رضی اللہ عنہ

۲۱۷۔ **منذر بن عرفجہ الاوسی الانصاریؓ**

یہ بنو غنم میں سے ہیں۔ بدر میں حاضر ہوئے رضی اللہ عنہ

۲۱۸۔ **منذر بن محمد بن عقبہ الانصاریؓ**

یہ قبیلہ مالک بن اوس میں سے ہیں بدر و احد میں حاضر ہوئے اور بیر معونہ پر شہید ہوئے رضی اللہ عنہ

۲۱۹۔ نحاث بن ثعلبہ بن حزمہ البلوی رضی اللہ عنہ

نحاث بن ثعلبہ بن حزمہ بن اصرم بن عمرو بن عمارہ۔ قوم بلی سے ہیں۔ انصار کے حلیف تھے بعض نے ان کا نام بائے موحدہ سے لکھا ہے۔ بدر میں حاضر تھے۔ رضی اللہ عنہ

۲۲۰۔ نصر بن حارث بن عبید بن رزاح بن کعب الانصاری الظفری رضی اللہ عنہ

بدر میں حاضر تھے اور ان کے والد حارث کو بھی صحابی ہونے کا شرف ہے۔ رضی اللہ عنہ

۲۲۱۔ نعمان بن ابی خزمہ الانصاری الاوسی رضی اللہ عنہ

بعض نے خزمہ بن نعمان نام لکھا ہے بن امیہ بن برک (امرء القیس) بن ثعلبہ۔ بدر میں حاضر تھے۔ ابن اسحق لکھتے ہیں کہ احد میں بھی موجود تھے۔ رض

۲۲۲۔ نعمان بن سنان الانصاری رضی اللہ عنہ

یہ بنو سلمہ کے مولی ہیں۔ بدر و احد میں حاضر ہوئے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۲۲۳۔ نعمان بن عبد عمرو نجاری الانصاری رضی اللہ عنہ

نعمان بن عبد عمرو بن مسعود بن عبد الاشہل بن حارثہ بن دینار بن النجار

بدر میں اپنے بھائی ضحاک بن عبد عمرو کی معیت میں حاضر تھے۔ یوم احد کو شہید ہوئے۔ رضی اللہ عنہ

۲۲۴۔ نعمان بن اعقر بن الربیع البلوی الانصاری رضی اللہ عنہ

یہ انصار بنو معاویہ بن مالک کے حلیف تھے۔ بدر، احد اور خندق و جملہ مشاہد میں حاضر ہوئے اور جنگ یمامہ میں شہید ہوئے رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۲۲۵۔ نعمان بن عمرو بن رفاعہ الانصاری رضی اللہ عنہ

مالک بن النجار کے قبیلہ سے ہیں ان کو نعیمان بھی کہا جاتا ہے یہ ان ہفتاد تن میں سے ہیں جو بیعت عقبہ سے مشرف ہوئے تھے۔ بدر میں حاضر ہوئے اور دیگر جملہ مشاہد میں بھی حاضر تھے سلطنت امیر معاویہ میں وفات پائی۔

۲۲۶۔ نعمان بن قوقل (بن ثعلبہ)

موسیٰ بن عقبہ نے ان کا شمار اہل بدر میں کیا ہے اور تحریر کیا ہے کہ احد میں بھی حاضر تھے۔ رضی اللہ عنہ

۲۲۷۔ نعمان بن مالک بن ثعلبہ الانصاری رضی اللہ عنہ

نعمان بن مالک بن ثعلبہ بن دعد بن فہر بن ثعلبہ بن غنم بن عوف بن خزرج۔

ثعلبہ بن دعد کو قوقل بھی کہا کرتے تھے اور ان کی اولاد کو دیوان فاروقی میں بنو قوقل کے پتہ سے تحریر کیا گیا تھا۔ بدر میں حاضر ہوئے اور احد میں شہید ہوئے۔

مورخ محمد بن عمارہ کا قول ہے کہ بدر میں حاضر ہونے والے نعمان الاعرج بن مالک تھے۔ یہ نعمان بن مالک وہی ہیں جنہوں نے میدان احد کی طرف جاتے ہوئے کہا تھا یا رسول اللہ بخدا میں جنت میں ضرور داخل ہوں گا۔ فرمایا کیونکر عرض کیا کہ کلمہ شہادت پر میرا ایمان ہے اور جنگ میں سے فرار ہونا میں نہیں جانتا فرمایا سچ کہتے ہو۔ چنانچہ میدان احد ہی میں شہید ہوئے۔ رضی اللہ عنہ

۲۲۸۔ نعیمان بن عمرو بن رفاعہ الانصاریؓ

نعیمان بن عمرو بن رفاعہ بن حارث بن سواد بن مالک بن غنم بن مالک بن نجار

ان کا شمار کبار صحابہ اور قدماء صحابہ میں ہوتا ہے۔ بدر میں حاضر تھے۔ ان کی ظرافت و خوش طبعی کی حکایات بہت سی ہیں ازاں جملہ ایک یہ ہے۔

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تجارت کے لیے بصریٰ کو روانہ ہوئے نعیمان بن عمرو اور سویط بن حرملہ (دونوں بدری ہیں) بھی ان کے ہمراہ تھے باورچی خانہ کا انتظام سویط کے سپرد تھا۔ نعیمان نے ان سے کہا کہ مجھے کھانا کھلاؤ۔ سویط نے کہا ابوبکر کو آلینے دو۔ نعیمان بولے کہ اچھا تمہاری خبر لوں گا۔ نعیمان پاس کے گاؤں میں چلے گئے لوگوں سے کہا کہ میرے پاس عربی غلام ہے زبان دراز ہے خریدنا ہو تو خرید لو لیکن وہ کہے گا کہ میں آزاد ہوں اگر تم نے خریدنا ہو تو اس کی بات نہ سننا ورنہ وہ اور زیادہ خراب ہو جائے گا

آخر سودا دس اونٹنیوں پر پختہ ہو گیا۔ اونٹنیاں لے لیں اور ان لوگوں کو ساتھ لے کر کیمپ میں آئے اور سویط کی طرف اشارہ کر دیا کہ غلام وہ ہے یہ لوگ آگے بڑھے اور انہوں نے سویط سے کہا کہ ہم نے تجھے خرید لیا ہے وہ بولے کہ وہ جھوٹ بولتا ہے میں تو آزاد ہوں لوگوں نے کہا کہ ہمیں تیری بات پہلے ہی سے معلوم ہو چکی ہے غرض سویط کو وہ باندھ کر لے گئے جب ابوبکر صدیق وہاں پہنچے اور انہوں نے ماجرا سنا تب انہوں نے سویط کو چھڑایا اور اونٹنیاں واپس کرائیں۔

انہی کی عادت تھی کہ جب کوئی نیا پھل یا نئی چیز مدینہ میں آتی تو رسول اللہ کی خدمت میں لے آتے اور عرض کرتے کہ یہ ہدیہ ہے۔ پھر جب قیمت کا اُن پر مطالبہ ہوتا تو دوکاندار کو حضور کے سامنے لاتے کہ حضور اس کی قیمت دی جائے۔ حضورؐ ہنستے اور فرماتے وہ تو ہدیہ تھا۔ نعیمان عرض کرتے کہ یارسول اللہ میرے دل نے چاہا کہ حضورؐ کے سوا اور کوئی نیا پھل نہ کھائے مگر قیمت میرے پاس موجود نہیں۔ حضورؐ ہنسا کرتے اور قیمت ادا فرما دیتے

کہتے ہیں کہ عہد معاویہ تک یہ زندہ رہے۔ رضی اللہ عنہ

۲۲۹۔ نوفل بن ثعلبہ الانصاری السالمی الخزرجیؓ

یہ بنو سالم بن عوف بن عمرو بن عوف بن خزرج میں سے ہیں۔ بدر میں حاضر ہوئے اور یوم احد کو شہید ہوئے رضی اللہ عنہ

۲۳۰۔ ہانی بن نیار رضی اللہ عنہ

ہانی بن نیار بن عمرو بن عبید قوم بلی اور بنو قضاعہ میں سے ہیں۔ انصار کے حلیف تھے۔ ابوبردہ کنیت۔ کنیت ہی سے زیادہ مشہور ہیں عقبی بھی ہیں اور بدری بھی، دیگر مشاہد میں بھی برابر حاضر رہے۔

براء بن عازب مشہور صحابیؓ کے ماموں ہیں ۴۵ھ میں انتقال فرمایا۔ رضی اللہ عنہ

۲۳۱۔ ہبیل بن وبرۃ الانصاری

یہ بنو عوف بن الخزرج سے ہیں۔ یہ بھی بدری ہیں اور ان کے بھائی عصمت بن وبرہ بھی بعض نے کہا کہ وبرہ ان کے دادا کا نام ہے اور باپ کا نام حصین بن وبرہ ہے۔ رضی اللہ عنہما

۲۳۲۔ ہلال بن امیہ الانصاری الواقفیؓ

یہ انصار کے قبیلہ بنو واقف سے ہیں۔ یہ اُن تین میں سے ہیں جو غزوہ تبوک میں سے پیچھے رہ گئے تھے اور قرآن مجید کی آیت وَعَلَى الثَّلٰثَةِ

الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا میں جن کا ذکر ہے۔ ان ہرسہ کے نام یہ ہیں۔ کعب بن مالک از بنو سلمہ، مرارہ بن ربیع از بنو عمرو بن عوف، ہلال بن اُمیہ از بنو واقف رض

۲۳۳۔ ہلال بن معلی الانصاری الخزرجی رض

ہلال بن معلی بن لوذان بن حارثہ۔ یہ بنو جشم بن الخزرج میں سے ہیں۔ بدر میں معہ برادر خورد رافع بن معلی کے حاضر تھے۔ رضی اللہ عنہما

۲۳۴۔ ہمام بن حارث بن ضمرہ رض

بدر میں حاضر تھے ان سے کسی روایت کا ہونا نہیں پایا گیا۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۲۳۵۔ ودقہ بن ایاس الانصاری رض

ودقہ بن ایاس بن عمرو بن غنم بن امیہ بن لوذان، بدر، احد، خندق اور جملہ مشاہد میں سرورِ عالم کی خدمت میں حاضر رہے تھے۔ جنگ یمامہ میں شہید ہوئے۔ رضی اللہ عنہ

۲۳۶۔ ودیعہ بن عمرو بن جراد بن یربوع الجہنی رض

انصار کے قبیلہ بنو سواد کے حلیف ہیں، بدر و اُحد میں حاضر تھے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۲۳۷۔ یزید بن اخنس السلمی رض

یہ ملک شام کے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ معہ والد خود و پسر خود معن غزوہ بدر میں حاضر تھے مگر اہل بدر میں ان کا نام معروف نہیں۔ البتہ یہ تینوں بیعت نبوی سے مشرف ضرور ہوئے۔

کثیر بن مرہ اور سلیم بن عامر نے ان سے روایات بیان کی ہیں۔ رضی اللہ عنہم

۲۳۸۔ یزید بن ثابت بن الضحاک الانصاری رض

یہ مشہور صحابی زید بن ثابت کے بھائی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ غزوہ بدر میں بھی شامل تھے۔ احد میں ان کی شمولیت اور جنگ یمامہ میں ان کا شہید ہونا تو مسلّم ہے۔ زید بن ثابت نے ان سے روایت کی ہے رض

۲۳۹۔ یزید بن ثعلبہ بن خزمہ رض

قبیلہ بلی سے ہیں انصار بنو سالم بن عوف کے حلیف تھے بیعت عقبہ یا عقبتین میں حاضر تھے۔ بدر میں بھی احد میں بھی حاضر تھے ابوعبدالرحمٰن کنیت سے مشہور تھے۔ رضی اللہ عنہ

۲۴۰۔ یزید بن حارث الانصاری رض

یزید بن حارث بن قیس بن مالک بن احمر بن حارثہ بن ثعلبہ بن کعب بن الحارث بن الخزرج

انہی کو یزید بن قسحم بھی کہتے ہیں۔ مواخات میں ذوالشمالین مہاجر ان کا بھائی تھا۔ بدر میں حاضر ہوئے اور اسی روز شہید بھی ہوئے۔ رضی اللہ عنہ

۲۴۱۔ یزید بن عامر بن حدیدۃ انصاری رض

بنو سواد بن غنم میں سے ہیں۔ سب متفق ہیں کہ یہ بیعت عقبہ میں شامل تھے۔ موسیٰ بن عقبہ نے ان کا نام اہل بدر میں لیا ہے اور اکثر مورخین نے ان کو بدر و احد میں شمار کیا ہے۔ ابوالمنذر کنیت سے معروف ہیں۔ رضی اللہ عنہ

۲۴۲۔ یزید بن منذر الانصاری رضی اللہ عنہ

یزید بن منذر بن سرح بن خناس بن سنان بن عبید بن عدی بن غنم بن کعب بن سلمہ

عقبہ، بدر، احد میں حاضر تھے۔

سلسلہ مواخات میں عامر بن ربیعہ حلیف بنو عدی المہاجران کے بھائی تھے رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۲۴۳۔ ابو سرمہ الانصاری المزنی رضی اللہ عنہ

ان کے نام میں اختلاف ہے مالک بن ابی بن انس یا مالک بن اسعدان کا نام بتایا گیا ہے۔

یہ اپنی کنیت ہی سے مشہور ہیں سب کا اتفاق ہے کہ غزوہ بدر میں حاضر ہوئے اور دیگر مشاہد مابعد میں بھی ملتزم رکاب محمدی تھے ان کا شمار عمدہ شاعروں میں کیا جاتا ہے۔ نمونہ کلام درج ہے۔

لنا صرم یزول الحق فیہا ۔۔۔ واخلاق یسود بہا الفقیر

ونصح للعشیرۃ حیث کانت ۔۔۔ اذا ملئت من الغش الصدور

وحلم لا یسوغ الجہل فیہ ۔۔۔ واطعام اذا قحط الصبیر

بذات یہ علی ماکان فیہا ۔۔۔ نجود بہ قلیل اوکثیر

ان سے احادیث کی بھی روایت ہوئی ہے رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۲۴۴۔ ابو الضیاح الانصاری الاوسی رضی اللہ عنہ

ان کا نام نعمان یا عمیر بتایا گیا ہے۔ بن نعمان بن اُمیہ بن امرء القیس ہیں اور کنیت کے ساتھ معروف، بدر و احد و خندق و حدیبیہ میں حاضر تھے۔

جنگ خیبر میں آپ شمشیر سے شربت شہادت پیا۔ رضی اللہ عنہ

۲۴۵۔ ابو عیلی الحارثی الانصاری رضی اللہ عنہ

بدر میں حاضر تھے خلافت عثمان رضی اللہ عنہ میں انتقال کیا۔ امیر المومنین حضرت عثمان ان کی عیادت کو بھی تشریف لے گئے تھے۔ محمد بن کعب قرظی اور صالح نے ان سے روایت حدیث کی ہے۔ رضی اللہ عنہ

۲۴۶۔ ابو فضالہ انصاری رضی اللہ عنہ

بدر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اور صفین میں امیر المومنین علی کے ساتھ حاضر تھے۔

ان کے فرزند فضالہ بن ابو فضالہ نے بیان کیا ہے کہ ایک بار علی مرتضیٰ ینبوع میں سخت بیمار ہو گئے حالت خطرناک ہو گئی۔ میرے والد نے کہا بہتر ہے کہ ہم آپ کو مدینہ میں لے چلیں۔ یہاں تو قوم جہینہ کے سوا اور کوئی جنازہ پڑھنے بھی آنے والا نہیں۔ مرتضیٰ نے فرمایا میں اس معرض میں فوت نہ ہوں گا۔ کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بتایا ہے کہ میری موت اس وقت ہو گی جبکہ میرے سر کے خون سے میری داڑھی رنگین ہو گی۔ رضی اللہ عنہ

۲۴۷۔ ابو قتادہ انصاری السلمی رضی اللہ عنہ

یہ اپنی کنیت سے زیادہ مشہور ہیں "فارس رسول اللہ" ان کا لقب تھا۔

ان کے نام میں سخت اختلاف ہے۔ حارث یا نعمان یا عمرو بن العبسی کہا گیا ہے بعض نے نعمان بن عمرو بتایا ہے اور بعض نے بلدمہ بن خناس یہ مسلم ہے کہ اُن کی والدہ کبشہ بنت مطہر بن حرام ہیں۔ ابن عقبہ و ابن اسحٰق نے ان کا نام اہل بدر میں نہیں لکھا لیکن واقدی کی تحریر اور دیگر روایات سے ثابت ہے کہ بدر میں حاضر تھے سب کا اتفاق ہے کہ امیر المومنین علی نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی تھی۔ نماز جنازہ میں سات یا چھ تکبیریں ادا کی تھیں۔ اہل بدر کی نماز جنازہ اسی طرح پڑھی جایا کرتی تھی۔

غزوہ احد میں اور دیگر مشاہد میں ہمرکاب نبوی رہے اور خلافت علی مرتضیٰ میں بھی جملہ مشاہد میں جناب مرتضوی کی طرف حاضر رہے۔

۳۸ھ میں انتقال فرمایا۔ رضی اللہ عنہ

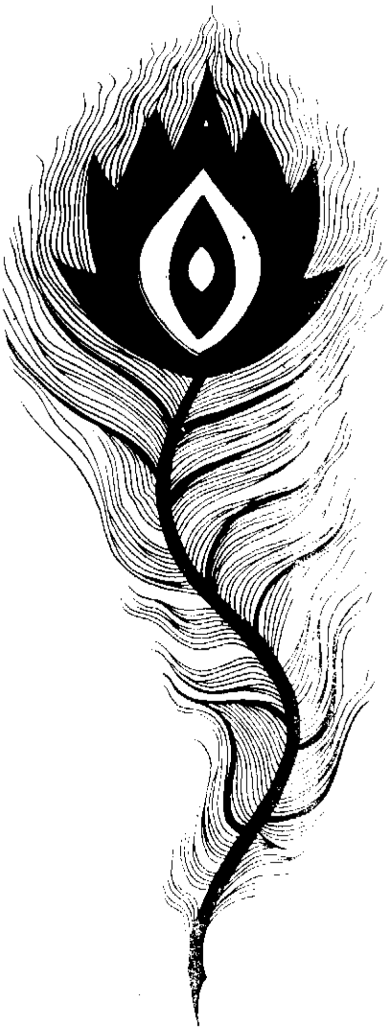
۲۴۸۔ ابو ملیل الانصاری الضبعی رضی اللہ عنہ

ابو ملیل بن ازعر بن زید بن عطاف بن ضبیعہ

بدر و احد میں حاضر تھے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِينَ كَفَرُوا السُّفْلَىٰ ۗ وَكَلِمَةُ اللَّهِ هِيَ الْعُلْيَا ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ (التوبۃ: ۴۰)

اور اللہ نے کافروں کی بات نیچی کر دی، اور اللہ کی بات اونچی رہی، اور اللہ بڑا قوت والا ہے، بڑی حکمت والا ہے۔



واقعۂ ہجرت کی عالمگیر اہمیت

واقعۂ ہجرت کی عالمگیر اہمیّت

تحریر:- ڈاکٹر سیّد مطلوب حسین

ہجرت عربی زبان کا لفظ ہے، جس کا مادہ ھَجَرَ، یَھْجُرُ، ھَجْرًا ہے۔ اس کے لغوی معنی ترک کرنا، چھوڑنا، قطع تعلق کرنا، الگ ہونا، نیند میں بڑبڑانا، خواہشات کا ترک کرنا اور جذبات پر قابو پانا ہیں۔ لیکن ادب اور تاریخ میں انہی مفاہیم سے جدائی، خانہ بدوشی، ترک وطن اور نقل مکانی کے مطالب اخذ کئے گئے ہیں۔

اگر مؤخر الذکر دو معنوں کو سامنے رکھا جائے تو تمام انسانی زندگی ہجرت سے عبارت معلوم ہوتی ہے۔ ہجرت افراد نے بھی کی ہے اور قبائل و اقوام نے بھی۔ اس کے اسباب و مقاصد بہر حال مختلف رہے ہیں۔ کسی نے دشمن کے خوف سے وطن چھوڑا، کسی نے قحط کے ڈر سے، کسی نے حصولِ ملازمت کے لئے دیارِ غیر کا سفر کیا تو کسی نے سیاحت کی غرض سے۔ کوئی سیلاب میں بہہ کر دوسری ولایت پہنچ گیا تو کوئی غلام بنا کر فروخت کر دیا گیا۔ کسی نے کشور کشائی کے لئے بلاد و امصار پیروں تلے روند ڈالے تو کسی نے گدائی میں "ملکِ خدا تنگ نیست پائے گدا لنگ نیست" کہتے ہوئے ہر روز ایک نیا وطن آباد کیا۔

ان ہجرتوں نے مثبت و منفی دونوں قسم کے اثرات مرتب کئے۔ افراد نے افراد کو اور اقوام نے اقوام کو متاثر بھی کیا اور تباہ و برباد بھی۔ لیکن اس کے باوجود نسل انسانی کو تجربات حاصل ہوئے جس سے حیاتِ انسانی کو ارتقاء کی طرف اپنا سفر جاری رکھنے میں مدد ملی۔ اس توڑ پھوڑ، خوف و ہراس، تباہی و بربادی سے بھرپور ہجرتوں کے ساتھ ساتھ بعض ایسی ہجرتیں بھی ہوئیں جنہوں نے ہر دور میں انسان کی صلاح و فلاح اور تہذیب و تمدن کے ارتقاء میں خاص طور پر مثبت کردار سرانجام دیا۔ یہ ہجرتیں منشائے ایزدی کے تحت، انبیاء اور مرسلین علیہم السلام نے کیں، مبلغین اور مصلحین نے کیں۔ کبھی انفرادی طور پر اور کبھی اجتماعی طور پر۔ اِن کے نتائج تاریخ پر ہمیشہ مفید اور گہرے نقش ہوئے ہیں۔

ان میں سرفہرست ہجرت آدم علیہ السلام کا واقعہ ہے، جسے مذہبی کتابوں اور تاریخ میں ہبوط کا نام دیا گیا ہے۔ مذہبی روایات کے مطابق جب اللہ تعالےٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے حضرت آدم علیہ السلام اور حوا علیہا السلام کو خلق کیا تو انہیں خلا میں سکونت اختیار کرنے کا حکم دیتے ہوئے شجرِ ممنوعہ کو چھونے یا اس کے قریب جانے سے روکا۔ لیکن شیطان نے ان کے دل میں وسوسہ ڈالا اور وہ اس حکم کی تعمیل نہ کر سکے یہ فعل سرزد ہوتے ہی اللہ تعالےٰ نے انہیں بہشت کی بلندیوں سے زمین کی پستیوں کی طرف ہبوط کا حکم دیا جو تخلیق آدم سے قبل وجود میں آ چکی تھی۔ دونوں ساتھی زمین پر مختلف مقامات پر اترے۔ جب اُنہوں نے آنکھ کھولی ہو گی تو ہر طرف حُسن ہی حُسن بکھرا ہوا نظر آیا ہو گا دن کو سورج کی روشنی اور حرارت، رات کو ستاروں کی سُبک خرامی، چاند کی ملگجی روشنی، فضائے آسمانی کی وسعت اور اُس کی نیرنگیاں، زمین پر سمندر کا منظر اور دریاؤں کی روانی، پہاڑوں کی بلندیاں اور نشیب و فراز، نباتات کی صورت آرائیاں، پھولوں کی رعنائیاں، پرندوں کی نغمہ سنجیاں، غرضیکہ تمام تماشا گاہِ ہستی میں حسن کی نمائش، نظر افروزی اور رنگ و نور کی جلوہ آرائی کے باوجود انہیں کوئی رعنائی اور زیبائی مسحور نہ کر سکی

دوسری طرف بادلوں کی گرج، بجلی کی کڑک، آتش فشاں پہاڑوں کا انفجار، زمین کا زلزلہ، دریاؤں کا سیلاب، ہواؤں کا طوفان، صحرا کا گرد و غبار اور تخریب کی دوسری ہولناکیاں انہیں ڈرانہ سکیں اور نہ ہی تنہائی کے احساس نے اُن میں مایوسی اور قنوطیت پیدا کی۔ البتہ جنت گم گشتہ کے تصور اپنے کئے کا پچھتاوے اور ساتھی سے جدائی کے غم نے انہیں مُوسفر رکھا حتیٰ کہ وادی عرفات میں اللہ تعالیٰ نے دونوں کی ملاقات کا اہتمام کیا۔

یہ انسان کی پہلی ہجرت تھی جو اقطار السمٰوات سے زمین کی سطح پہ آکر رکی اور پھر زمین کے کونوں سے اُس کے مرکز پہ آکر اختتام پذیر ہوئی بہر حال جب حضرت آدم اور حوّا کو ہجر و فراق کے صدمے سے نجات ملی تو زندگی ایک ڈگر پہ چل نکلی۔ اس کے بعد اولاد آدم پھلی پھولی اور زمین کی مختلف سمتوں میں پھیل گئی۔

اس ہجرت کی سب سے اہم خصوصیت یہ تھی کہ اس کے نتیجہ میں انسان کی شکل میں ایک ایسی مخلوق زمین پہ آباد ہوئی جسے عقل، نطق، علم ارادہ، جذبات واحساسات کی وجہ سے کائنات میں اشرف المخلوقات ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ پھر زمین کی تمام اشیاء جمادات، نباتات اور حیوانات میں اُس کے لئے افادہ و فیضان کی ایسی صورت پیدا کی کہ انسانی زندگی کے ہر گوشہ کو ہر طرح کی دلبستگی، تسکین اور آسودگی میسّر ہو۔ شروع میں چونکہ ان اشیاء کا حصول آسان نہ تھا اس لئے انسان کو بڑی تگ و دو کرنا پڑی۔ اور اس کی یہی دوڑ دھوپ اور محنت انسانی تمدن کے ارتقاء کا سبب بنی ان مادی ترقیوں کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس کی معنوی ہدایت کے لئے بھی فیضان کا سلسلہ جاری رہا۔ پہلے دور کے انسان کے لئے خود حضرت آدم علیہ السلام کا وجود چشمۂ فیض تھا۔ جس سے ابتدائی انسان نے اپنی معنوی پیاس بجھائی۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ اُس پر یا تو فکرِ معاش کا زیادہ غلبہ رہا یا پھر اُس نے مادی تسکین و راحت کے حصول کی طرف میلان رکھا۔ جس کے نتیجہ میں اُس کی روحانی اور اخلاقی حالت بد سے بدتر ہونے لگی۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے وصال کے بعد حضرت نوح علیہ السلام کی وفات سے قبل صرف ۷۰۰ سال کی قلیل مدت میں آٹھ انبیاء علیہم السلام مبعوث فرمائے گئے۔ گویا تقویم کی کوئی بھی صدی کسی نبی کی بعثت سے خالی نہ تھی۔ لیکن اس کے باوجود انسان کی طبیعت سرکشی کی جانب مائل رہی حتیٰ کہ وفات آدم علیہ السلام کے صرف ۱۰۵۶ سال بعد حضرت نوح علیہ السلام پیدا ہوئے اور اُنہوں نے کئی سو سال تک اپنی قوم کو دعوت حق دی اُن کی قوم نے اُس کے جواب میں نہ صرف یہ کہ احکامِ الٰہی کی کھلی نافرمانی کی بلکہ حضرت نوح علیہ السلام اور اُن کے چند ماننے والوں پر ظلم و ستم کی انتہا کر دی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں سزا دینے کے لئے ایک زبردست طوفان بھیجا۔

اس تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی سالہا سال کی رشد و ہدایت کے باوجود جب اُن کی قوم راہِ راست پہ نہ آئی تو اللہ تعالیٰ نے اُن پہ وحی نازل کی اور فرمایا کہ اب اس قوم پر محنت فضول ہے جو ایمان لا چکے سو لا چکے غرقابی اس کا مقدر بن چکی ہے۔ تم ایک کشتی بنانا شروع کرو۔ اُنہوں نے حکمِ الٰہی کی تعمیل میں کشتی بنانا شروع کی۔ منکرین میں سے جو کوئی بھی گزرتا وہ اُن کا تمسخر اڑاتا اس کے باوجود وہ انہیں سمجھاتے رہے کہ تم اپنی نازیبا حرکتوں سے باز آ جاؤ۔ عنقریب ایک طوفان آنے والا ہے۔ یہ مذاق تمہارے لئے سامان عبرت بنے گا۔ مگر وہ باز نہ آئے اور طوفان کا وقت آ گیا۔ حضرت نوح نے فرمانِ خداوندی کے مطابق اپنے اہل و عیال، مٹھی بھر مومنین اور تمام جاندار مخلوق کا ایک ایک جوڑا لے کر انہیں کشتی میں سوار کر لیا۔ ایک طرف زمین سے چشمے ابلنے لگے اور دوسری طرف آسمان سے چھاجوں پانی برسنے لگا۔ کشتی اس طوفان میں روانہ ہو گئی۔ اسرائیلی ایک روایت کے مطابق یہ طوفانِ باد و باراں چالیس روز تک جاری رہا جبکہ دوسری روایت کے مطابق اس کی مدت ڈیڑھ سو ایام بتائی گئی ہے۔

بارش تھم گئی، طوفان رُک گیا اور پانی اتر گیا تو قرآن کریم کے بیان کے مطابق کشتی کوہِ جودی پر جا ٹھہری۔ جہاں سے نیچے اتر کر حضرت نوح علیہ السلام اور اُن کے ساتھیوں نے آکر ایک بستی آباد کی۔ ایک روایت کے مطابق اس بستی کا نام "سُوق الثمانین" رکھا گیا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ طوفان سے بچنے والے کل افراد کی تعداد اسّی تھی۔

یہ دوسری عظیم ہجرت تھی۔ جس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انجیل کے باب پیدائش کے مطابق اس طوفان سے تمام مخلوقِ خدا متاثر ہوئی اور سوائے کشتی نوح پر سوار افراد اور حیوانات کے روئے زمین پر زندگی کے تمام آثار مٹ گئے۔ اس کے بعد حضرت نوح نے اہلِ ایمان کی مدد سے دنیا کی از سرِ نو تعمیر کی۔ اسی بنا پر حضرت نوح علیہ السلام کو آدم ثانی بھی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ انہیں تقریباً وہی کام سرانجام دینا پڑا جو حضرت آدم علیہ السلام نے ہبوط کے بعد دیا۔ لیکن دونوں میں ایک نمایاں فرق تھا۔ حضرت آدم علیہ السلام نے جس انسان کو تربیت دی وہ ذہنی لحاظ سے بالکل بچہ تھا جبکہ حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھی ہر لحاظ سے عاقل و بالغ تھے۔ اسی وجہ سے موخر الذکر نے نسبتاً ایک اعلیٰ اور ارفع تمدن کی بنیاد رکھی۔ اس کا ثبوت ہمیں یوں ملتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی وفات کے تین سو سال بعد جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے شعور کی آنکھ کھولی تو اُنہوں نے عراق کے ایک علاقے میں ایسا معاشرہ دیکھا جو ہر لحاظ سے ترقی یافتہ اور مہذب تھا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت آدم علیہ السلام کی وفات کے ۱۹۴۸ سال بعد عراق میں پیدا ہوئے اُن کا سلسلہ نسب حضرت نوح علیہ السلام کے ذریعہ حضرت آدم علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔ جب اُنہوں نے ہوش سنبھالا تو ہر طرف بُت پرستی اور شرک کا دور دورہ تھا۔ بلکہ گھر میں تو بُت گری اور بُت فروشی باقاعدہ ایک پیشہ تھا۔ جب اُنہوں نے بت پرستی کے خلاف آوازۂ حق بلند کیا تو اپنے پرائے سب دشمن ہو گئے۔ باپ نے گھر سے نکال دیا۔ اسی عالم میں نمرود کے دربار میں حاضری دینا پڑی۔ بُت شکنی کے جرم میں آتشِ نمرود میں جھونکے گئے۔ حق غالب آیا لیکن عراق چھوڑنا پڑا۔ اپنی بیوی حضرت سارہؑ، اپنے برادر زادہ حضرت لُوط اور اُن کی اہلیہ کو لے کر فلسطین کی طرف ہجرت کی۔ پھر اہل و عیال کو چھوڑ کر تبلیغ دینِ حنیف کی خاطر مصر کی طرف ہجرت کی۔ جہاں کے بادشاہ نے اپنی بیٹی حضرت حاجرہ کو اُن کے نکاح میں دے دیا جن کے بطن سے حضرت اسمٰعیل پیدا ہوئے۔ پہلی بیوی کی آزردگی کے سبب ماں بیٹے کو ساتھ لیا اور ایک اور ہجرت کی۔ یہ کاروانِ ہجرت صرف تین افراد پر مشتمل تھا۔

خدا کا قافلہ جو مشتمل تھا تین جانوں پر
مسلط جن کو ہونا تھا زمین و آسمانوں پر

یہ ہجرت صرف افراد کی ہجرت تھی لیکن تاریخ ہجرت میں اس کی بہت اہمیت ہے۔ کیونکہ اس کے نتیجہ میں۔ حضرت حاجرہ اور اُن کے بیٹے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے وادیٔ غیر ذی زرع کو اپنا وطن بنایا۔ جو بعد میں مکہ کے نام سے عالمگیر شہرت کا حامل ہوا۔ یہ وادی سنگلاخ چٹانوں اور بے آب و گیاہ اراضی پر مبنی تھی لیکن ان دو مقدس ہستیوں کے قدموں کی برکت سے ہر طرح سے آباد ہو گئی۔ پانی بھی میسر آ گیا۔ کھانے کا بندوبست بھی ہو گیا۔ چشمۂ شیریں (زمزم) کے جاری ہوتے ہی قافلے بھی قیام کرنے لگے۔ ادھر اُدھر سے آکر کچھ لوگ بھی آباد ہو گئے۔

جب حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سنِ بلوغت کو پہنچے تو شفقتِ پدری نے زور مارا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کا رخ کیا۔ پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے دونوں باپ بیٹے نے مل کر بیت اللہ کی تعمیر کی جو آنے والے تمام زمانوں کے لئے آلِ ابراہیم اور پھر تمام عالم اسلام کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مرکز قرار پایا۔ آلِ اسمٰعیل یہیں پر آباد رہی۔ اُنہیں ہر دور میں اہلِ عرب کی سیادت کا شرف حاصل رہا۔ اس حقیقت کے باوجود

کہ جزیرہ نما عرب میں حکومت، سلطنت، ریاست، مملکت وغیرہ کا کوئی تصور نہ تھا، بدو قبیلے کے لوگ اپنے قبائلی معاملات اور باہمی جنگ و جدل کے فیصلوں کے لئے اہلِ مکہ ہی سے رجوع کرتے تھے۔ اسی مقصد کے تحت اُن کے ایک بزرگ قصی نے مکہ میں دارالندوہ کی تعمیر کی تھی جس میں مختلف امور کے لئے مختلف قبائل قریش کو قیادت سونپی گئی تھی۔ مکہ کے تقدس اور کشش میں سب سے بڑا محترک خانہ کعبہ کا وجود تھا۔ جہاں تمام اہلِ عرب ہر دور میں زیارت کے لئے آتے، حج کرتے اور اپنے جھگڑوں کو حل کر کے صحراؤں میں پھیل جاتے مکہ کی یہ عظمت اس پر ابرہہ کے عظیم لشکر کی حملہ آوری کا سبب بنی۔ اُس کے لشکریوں کا جو حشر ہوا وہ سب کو معلوم ہے ابرہہ نہ صرف اپنے مذموم عزائم میں ناکام ہوا بلکہ اُس کا ایسا عبرت ناک انجام ہوا کہ اُس کے بعد بھی کسی کو اہلِ مکہ پر حملہ کرنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ یہ روایت آج تک قائم ہے۔ ارضِ مقدس کے کناروں سے روم و فارس کی فوجیں ایک دوسرے کے خلاف بار بار گزریں، یہ سرزمین گھوڑوں اور جنگی رتھوں سے بار بار روندی گئی لیکن کسی کی ارضِ حجاز کی طرف نگاہ بھی نہ اُٹھ سکی۔ اور یہ علاقہ اپنی مقدس روایات کے ساتھ تمام عالم کے اثر و نفوذ سے محفوظ رہا۔

جس طرح حضرت ابراہیم کے بڑے بیٹے حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام کی اولاد وادی طیبہ میں پھلی پھولی بالکل اسی طرح اُن کے دوسرے فرزند حضرت اسحٰق علیہ السلام کی اولاد فلسطین کے علاقے میں آباد و خوشحال ہوئی۔ یہیں پر حضرت یعقوب علیہ السلام کی ولادت ہوئی جو حضرت اسحٰق کے بیٹے تھے۔ اسرائیل انہی کا لقب تھا۔ جو عبرانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں "عبداللہ"۔ یہ لقب اللہ تعالےٰ نے اُن کی بندگی سے خوش ہو کر دیا تھا۔ اُن کی چار بیویاں تھیں۔ ان میں سے دو چھوٹے بیٹے حضرت یوسف علیہ السلام اور بن یمین ایک ماں کے بطن سے تھے اور باقی دس دوسری ماؤں سے تھے۔ دونوں چھوٹے بیٹوں کی والدہ کا چونکہ انتقال ہو چکا تھا اس لئے حضرت یعقوب علیہ السلام ان دونوں کا خاص خیال رکھتے تھے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو اللہ تعالےٰ نے حسن و جمال کی دولت سے مالا مال کیا تھا۔ نیز اُن کی عادات و خصائل احسن تھیں۔ اُن کے دوسرے بڑے بھائی گھر کے کام کاج میں مشغول رہتے جبکہ حضرت یوسف اپنے والد کی آنکھوں کا تارا بنے ہمہ وقت اُن کی صحبت و نگرانی میں رہے اس وجہ سے دوسرے بھائی اُن سے حسد کرنے لگے۔ اُنہوں نے سازش کر کے اُنہیں اندھے کنوئیں میں ڈال دیا۔ جہاں سے ایک قافلے نے انہیں نکال لیا اور مصر میں ایک سردار کے پاس بطور غلام فروخت کر دیا۔

اس طرح یوسف علیہ السلام کی فلسطین سے مصر کو جبری ہجرت فردِ واحد کی ہجرت تھی اس واقعہ نے مصر کی تاریخ پر گہرے اثرات مرتب کئے ہیں۔ حضرت یُوسف نے ایک غلام کی حیثیت سے سزائے زنداں بھی برداشت کی، لیکن پھر ترقی کرتے ہوئے، پہلے عزیزِ مصر کے مشیر و وزیر مقرر ہوئے اور پھر وہاں کے حکمران (عزیز) متعین ہوئے۔ دونوں حیثیتوں میں اُنہوں نے مصر کی تہذیب و اصلاح اور خوشحالی و فارغ البالی میں نمایاں کردار ادا کیا۔ حضرت یُوسف علیہ السلام کے دورِ حکومت میں اُن کے والدین اور سب بھائی بھی نقل مکانی کر کے مصر میں یوسف علیہ السلام کے پاس آکر آباد ہو گئے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے بعد ایک طویل عرصہ تک آلِ اسرائیل مصر میں خوشحالی اور فارغ البالی کی زندگی بسر کرتے رہے۔ پھر جب مصر پر قبطیوں کی حکومت ہوئی اور یکے بعد دیگرے فراعین عنانِ حکومت سنبھالتے رہے تو اُن کا سلوک آلِ اسرائیل کے ساتھ بدلتے بدلتے ایسا ہو گیا کہ اُن کی حیثیت مصر میں غلاموں کی سی رہ گئی۔ پھر کتاب سفر کے مطابق ایک فرعون نے آلِ اسرائیل کی افرادی قوت کو کم کرنے کے لئے ایک حکم ناطق جاری کیا کہ آئندہ تمام نومولود لڑکوں کو پیدا ہوتے ہی قتل کر دیا جائے۔ اسی زمانے میں حضرت موسیٰ علیہ

السلام کی ولادت ہوئی وہ کسی نہ کسی طرح اس واردات سے محفوظ ہو کر فرعون کے محل میں پرورش پانے لگے۔ وہیں ان کی والدہ بھی دودھ پلانے کے لئے پہنچ گئیں۔ اس طرح وہ اپنی والدہ کے سایۂ عاطفت میں فرعون کے محل میں پرورش حاصل کرتے ہوئے جوانی کو پہنچے۔ انہوں نے بنی اسرائیل کی ناگفتہ بہ حالت دیکھی تو ان کی مدد کے لئے کھڑے ہو گئے اِس بنا پر انہیں مصر کو خیرباد کہنا پڑا۔ اور مدین میں قیام پذیر ہوئے ایک مدت تک وہاں رہنے کے بعد جب اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا کہ وہ اپنی قوم کو فرعون کے عذاب سے بچائیں تو وہ اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کی معیت میں مصر پہنچے اور رشد و ہدایت کا کام شروع کیا۔ اپنی قوم کو ایک مرکز پر جمع کیا۔ فرعونِ مصر کے جادوگروں سے مقابلے بھی کئے لیکن فرعون پر کوئی اثر نہ ہوا اور وہ آلِ اسرائیل کے درپئے آزار رہا۔ ان حالات سے پریشان ہو کر حضرت موسیٰ اپنی قوم کو لے کر ہجرت کے لئے نکل پڑے۔ "کتاب سفر" کے مطابق مہاجرین کی تعداد عورتوں اور بچوں کو چھوڑ کر چھ لاکھ بتائی جاتی ہے۔ جو ممکن ہے مبالغہ آمیز ہو۔ لیکن اس سے یہ اندازہ ضرور لگایا جا سکتا ہے کہ اس ہجرت میں ایک بہت بڑی تعداد نے حصہ لیا۔

فرعون کو پتہ چلا تو اپنے لشکر کے ساتھ ان کے تعاقب میں نکل کھڑا ہوا۔ راستے میں سمندر تھا۔ حضرت موسیٰ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اپنا عصا سمندر پر مارا۔ پانی دو حصوں میں تقسیم ہو گیا اور حضرت موسیٰ کی قوم حفاظت کے ساتھ دوسرے کنارے پر پہنچ گئی۔ فرعون نے ان کے تعاقب میں لشکر کو اتار دیا۔ ابھی وہ سمندر کے درمیان ہی میں تھے کہ پانی کے دونوں حصے مل گئے اور فرعون اپنے لشکر سمیت پانی میں غرق ہو گیا۔

پانی سے نکل کر حضرت موسیٰ کی قوم صحرائے سینائی میں اس عالم میں پہنچی کہ نہ ان کے پاس دھوپ سے بچنے کے لئے کوئی خیمہ تھا اور نہ ہی سایہ میسّر تھا۔ نہ ہی کھانے پینے کے لئے اشیاء دستیاب تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے زمانۂ مہاجرت کے دوران میں چالیس سال تک آسمان کو ابر آلود رکھا ان کے کھانے کے لئے منّ و سلویٰ عطا کیا۔ پانی کی احتیاج ہوئی تو ضرب کلیمی سے ایک چٹان میں سے بارہ پانی کے چشمے جاری ہو گئے اور تمام قبائل نے اپنے لئے الگ الگ چشمہ مخصوص کر لیا۔

آخر ان کی صحرا نوردی کا دور ختم ہوا اور وہ ارضِ فلسطین میں داخل ہو گئے۔ ویسے تو فلسطین کا علاقہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسحٰق علیہما السلام کے زمانے میں خاص اہمیت حاصل کر چکا تھا۔ آلِ اسرائیل کی ہجرت سے اس کی عظمت و تقدس میں مزید اضافہ ہوا۔ خاص طور پر بیت المقدس کا مقام تو زیادہ احترام کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔ کیونکہ یہیں پر قبۃ الصخرا تھا جس کی تعمیر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کرائی تھی۔ یہ تابوت سکینہ جس میں حضرت یوسف علیہ السلام کے آثار تھے، اور جو حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر سے اپنے ساتھ لائے تھے۔ اس مقام پر محفوظ کیا گیا۔

بنی اسرائیل کی آمد سے اس شہر کی شہرت اور عزت کو چار چاند لگ گئے۔ ابتداء میں انہوں نے فلسطین میں امن امان قائم رکھا اور دینِ حنیف کی روح برقرار رکھی۔ پھر مقامی لوگوں کے ساتھ مِل کر وہ بھی شرک و کفر کی رسومات میں مبتلا ہو گئے اور اللہ تعالیٰ کی ہدایت کو پس پشت ڈال دیا چنانچہ تھوڑے عرصے میں ان پر فلسطیوں نے حملے شروع کر دئے اور وہ تابوتِ سکینہ بھی چھین لیا جس میں تبرکات محفوظ تھے۔ جالوت بادشاہ کے دور میں ان پر مظالم کی انتہا ہو گئی۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص کرم سے ان کے درمیان طالوت کو پیدا کیا جس نے رفتہ رفتہ آلِ اسرائیل کی کھوئی ہوئی اور منتشر طاقت کو جمع کیا اور جالوت کے لشکر کے ساتھ نبرد آزمائی شروع کر دی۔ ان جنگوں میں ایک نوجوان داؤد نے بہادری کے جوہر دکھائے جالوت انہی کے ہاتھوں قتل ہوا اور پھر ایک بار فلسطین میں بنی اسرائیل کی حکومت قائم ہو گئی۔

ایک خاص وقت پر اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو بیک وقت نبوت اور بادشاہت کے مناصب پر فائز کیا۔ ان کے دور میں آلِ اسرائیل نے صرف فلسطین اور اس کے قرب و جوار میں ہی سلطنت قائم نہیں کی بلکہ اس کی سرحدیں دور دراز علاقوں تک پھیل گئیں۔

حضرت داؤد علیہ السلام کے بعد اُن کے بیٹے حضرت سلیمان علیہ السلام نبوت سے سرفراز ہوئے وراثت میں بادشاہت بھی ملی۔ اُنہوں نے اپنے دور میں بیت المقدس میں عظیم ہیکل سلیمانی کی تعمیر بھی کروائی۔ اور آلِ اسرائیل کو اتنی شہرت و توقیر دی کہ اُس کی نظیر اس سے پہلے تھی اور نہ ہی بعد کے ادوار میں ملتی ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد اُن کی طاقت پھر زوال پذیر ہونے لگی اور وہ بداخلاقیوں اور شرک و کفر میں مستغرق ہو گئے حضرت الیاس اور حضرت الیسع علیہما السلام نے اُنہیں بہت سمجھانے کی کوشش کی مگر بے سود حتیٰ کہ بخت نصر نے اُن پر حملہ کر کے انہیں تاراج کر ڈالا مقاماتِ مقدس تباہ و برباد کر دئے اور اُنہیں ملک بدر کر دیا البتہ ایران کے خسرو نے ۵۲۹ قبل مسیح میں بابل فتح کرنے کے بعد بنی اسرائیل کو دوبارہ فلسطین جانے کی اجازت دے دی۔ بیت المقدس بھی آباد ہوا اور ہیکل سلیمانی کو از سرِ نو تعمیر کیا۔ اس زمانے میں حضرت عزیر علیہ السلام نے تجدید شریعت کا بہت کام کیا اور تورات مرتب کی لیکن اُنہوں نے اس سے کوئی فائدہ نہ اُٹھایا۔ بلکہ شمالی فلسطین کے اسرائیلیوں نے تو بیت المقدس کے مقابلے میں اپنا الگ قبلہ بھی مقرر کر لیا۔

پھر ایرانی سلطنت کے زوال اور سکندرِ اعظم کی فتوحات اور یونانیوں کے عروج نے اُن کو خاصا نقصان پہنچایا۔ اس کے ردِ عمل کے طور پر اُن میں ایک زبردست تحریک اُٹھی جو مکابی تحریک کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے نتیجے میں اُن کی ایک آزاد مذہبی ریاست قائم ہو گئی جو ۶۳ قبل مسیح تک موجود رہی۔ پھر یہ علاقہ رومتہ الکبریٰ کی حدود میں شامل کر لیا گیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی تبلیغ کا مرکز اسی علاقے کو بنایا۔ لیکن بنی اسرائیل نے رومی گورنر کو اُن کے خلاف بغاوت اور ملک دشمنی کی شکایات کر کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صلیب پر چڑھانا چاہا۔ جب رومی قیصر قسطنطین نے عیسائی مذہب قبول کیا اور قسطنطنیہ کو مشرقی رومی سلطنت کا پایہ تخت بنایا تو فلسطین بھی عیسائیوں کے اثر و نفوذ میں آ گیا۔ حضرت عمرؓ کے عہدِ حکومت میں اسے اسلامی قلمرو میں شامل کر لیا۔

اس کے بعد بھی اس علاقے نے متعدد نشیب و فراز دیکھے۔ اور آج یہ پھر آلِ اسرائیل کے قبضے میں ہے غرضیکہ اس علاقے پر جتنے اثرات دیکھنے میں آئے، سب حضرت موسیٰ علیہ السلام اور اُن کی قوم کی ہجرت کے بعد شروع ہوئے

ابھی تک ہم نے جن ہجرتوں کا ذکر کیا ہے اُن کا تعلق ایک مخصوص سرزمین۔ شام، فلسطین، بابل، عراق اور مصر و عرب تک محدود رہا ہے۔ ان کے علاوہ دُنیا کے دوسرے ممالک میں بھی ہجرتیں ہوئی ہوں گی انفرادی اور اجتماعی بھی، لیکن تاریخ میں جتنا اہم کردار اِن ممالک نے ادا کیا ہے، دوسرے ممالک نے نہیں کیا۔ ازمنۂ قدیم کی تاریخی جنگیں یہیں پر لڑی گئیں۔ نئی تہذیب و تمدن کو انہی علاقوں نے جنم دیا۔ زیادہ تر انبیاء علیہم السلام انہی علاقوں میں پیدا ہوئے، اُنہی علاقوں کو اُنہوں نے تبلیغ دین کا مرکز بنایا اور یہیں پر مدفون ہوئے۔

یہ تمام ہجرتیں مذہبی نوعیت کی تھیں۔ ان کے پیچھے ہمیشہ کسی نہ کسی برگزیدہ پیغمبر کا ہاتھ تھا۔ ان میں سے آدم اور نوح علیہما السلام کو چھوڑ کر باقی سب کا تعلق انبیائے بنی اسرائیل سے تھا۔ اس لئے ان ہجرتوں کا حال یہود و نصاریٰ کی مذہبی کتابوں۔ توریت اور اناجیل میں تفصیل سے ملتا ہے اس لئے یہ دونوں قومیں نہ صرف انبیاء کی صداقت و عظمت کی قائل ہیں بلکہ ان ہجرتوں کو دینی تحریکوں کی حیثیت دیتے ہیں۔ اور ان کی کامیابی کو ایک حد تک اُن کی نبوت کی صداقت کی دلیل کے طور پر بیان کرتے ہیں۔

ہمارا موقف یہ ہے کہ ان ہجرتوں کی طرح ایک اور ہجرت ۶۲۲ء میں مکہ سے مدینہ کی طرف کی گئی۔ یہ ہجرت جو پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کی، تمام سابقہ ہجرتوں سے زیادہ اہمیت کی حامل تھی، کیوں؟ اس کا جواب ہم مناسب مقام پر دیں گے۔ لیکن فی الحال اس قدر بیان

کرنا ضروری ہے کہ جس طرح سابقہ ہجرتیں انبیائے آل اسرائیل کی نبوت کی دلیل ہو سکتی ہیں۔ اسی طرح حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی کامیاب ہجرت بھی آپ کی نبوت کی صداقت کے لئے ایک دلیل ضرور ہے۔

لیکن اس کے برعکس مستشرقین کی ایک جماعت جن میں کیتانی، پسر نگر، جرجی زیدان، بیکیر، فلپ ہٹی وغیرہ سر فہرست ہیں، نیز جن کا تعلق ان دونوں مذاہب۔ یہود و نصاریٰ سے ہے، نے اس ہجرت کی اہمیت کو کم کرنے اور پیغمبر اسلام کی نبوت کے خلاف بطور دلیل پیش کرنے کے لئے ایک نظریہ دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب ابتدائی عربوں نے صحرا کو بطور وطن اپنایا تو رفتہ رفتہ اُن کی تعداد میں اس قدر اضافہ ہوا کہ صحرا کی بے رحم آب و ہوا اور قلیل پیداوار اُن کی کفالت نہ کر سکی۔ اس لئے اُن کی کثیر تعداد نے ہلالِ زرخیز کی طرف ہجرت کی۔ اُن کا کہنا ہے کہ اس قسم کی ہجرت ہر ہزار سال بعد ہوتی تھی۔ اُنہوں نے تاریخ سے اس قسم کی چار پانچ مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مکہ سے مدینہ اور پھر ہلالِ زرخیز کی طرف توسیع دراصل سامی ہجرت کا آخری دور تھا۔ ان دونوں میں صرف یہ فرق تھا کہ یہ ہجرت زیادہ منظم، توانا اور عسکری نوعیت کی تھی۔

مستشرقین کے نظریے کی تردید یا تائید سے قبل اُن ہجرتوں کا بیان ضروری معلوم ہوتا ہے تاکہ صحیح نتیجہ اخذ کیا جا سکے۔

۱۔ سامی النسل عربوں کی پہلی ہجرت ۳۵۰۰ قبل مسیح میں ہوئی جس میں فاضل آبادی نے جزیرہ نمائے عرب کے مغربی ساحل کے ساتھ ساتھ شمال مغرب کی جانب سفر کرتے ہوئے وادیٔ نیل میں قدم رکھا یا پھر مشرقی افریقہ کا شمالی راستہ اختیار کرتے ہوئے مصر میں رہائش اختیار کی۔ مقامی آبادی اور مہاجرین کی باہمی آمیزش نے مصر کی تاریخ پر بڑا اثر ڈالا ان دونوں عناصر نے ہمارے تمدن کو مضبوط بنیاد فراہم کی۔ انہی لوگوں نے مل کر عمارت سازی کے فن کو بھی ترقی دی اور شمسی تقویم کی ارتقاء میں حصہ لیا۔

۲۔ تقریباً اسی دور میں ایک متوازی ہجرت بھی ہوئی جس میں مہاجرین نے مشرقی راستہ اختیار کرتے ہوئے وادیٔ دجلہ و فرات میں قدم رکھا۔ اُس زمانے میں یہ سرزمین سمیریوں کے قبضۂ قدرت میں تھی جو خاصے مہذب اور متمدن لوگ تھے۔ اہلِ عرب خانہ بدوش وحشیوں کی طرح سے وادی میں داخل ہوئے تھے۔ لیکن وہاں کے مقامی لوگوں سے اُنہوں نے مکانات بنانے اور آبپاشی کے طریقے سیکھے۔ سمیریوں کا سامی نسل سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ان دونوں کے امتزاج سے ایک مخلوط نسل پیدا ہوئی جو تاریخ میں اہلِ بابل کے نام سے مشہور ہے۔ اس نئی قوم نے اہلِ مصر کی طرح تہذیبی ورثے کو مضبوط بنیادیں فراہم کیں دوسری ایجادات کے علاوہ اُنہوں نے فنِ تعمیر میں محراب سازی اور قوسی چھتیں بنانے کی ابتداء کی۔ اُنہوں نے پہیوں والی گاڑیاں استعمال کیں اور وزن اور ناپ کے پیمانے ایجاد کئے۔

۳۔ تقریباً ۲۵۰۰ قبل مسیح میں سامی النسل لوگوں کی ایک اور ہجرت ہلال زرخیز کی طرف ہوئی۔ ان کی اور اہلِ کنعان کی آمیزش سے جو نسل تیار ہوئی وہ عمورین کہلاتے تھے جبکہ اہلِ یونان انہیں فونیقی کہتے تھے اس مخلوط نسل نے بنی نوع انسان کو حروف ابجد سے آشنا کرایا جو تعداد میں بائیس تھے۔

۴۔ ۱۵۰۰ ق م اور ۱۲۰۰ ق م کے درمیان عبرانیوں نے جنوبی شام، فلسطین اور آرمینیہ کی طرف ہجرت کی۔ یہ سب سے پہلے لوگ ہیں جنہوں نے انسان کو توحید کا تصور دیا جو دنیا کے تین بڑے مذاہب۔ یہودیت، عیسائیت اور اسلام کا طرۂ امتیاز ہے۔

۵۔ تقریباً پانچویں صدی قبل مسیح میں اہلِ انباط نے جزیرہ نما سینائی کے شمالی مشرقی علاقے کی طرف ہجرت کر کے وہاں کی وطنیت اختیار کی۔ اُنہوں نے رومی اقتدار کے زیر اثر شاندار ترقی کی جس کی مثال بطرا (PETRA) کے کھنڈرات ہیں۔ یہ مقام سبا اور بحیرہ روم کے درمیان کاروان تجارت کی گزرگاہ پر کلیدی شہر کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کا موجودہ نام وادیٔ موسیٰ ہے۔

مندرجہ بالا ہجرتوں کے تذکرے کے بعد جب مستشرقین پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعہ ہجرت کی طرف اپنا اشہب قلم موڑتے ہیں تو سطحی طور پر ذکر کرتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ وہ یہ لکھتے ہیں کہ یہ واقعہ تاریخ اسلام میں ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس ضمن میں معروف مستشرق فلپ ہٹی اپنی کتاب تاریخ اہل عرب میں یوں رقمطراز ہے۔

"یہ واقعہ (ہجرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زندگی میں ایک اہم موڑ ثابت ہوا۔ اپنی جائے پیدائش کو ایک غیر پسندیدہ نبی کی حیثیت سے چھوڑ کر آپ نئے شہر (مدینہ) میں ایک معزز رئیس کی حیثیت سے داخل ہوئے۔ آپ کی مذہبی ضمیری پس منظر میں چلی گئی اور ایک عملی سیاسی شخصیت ابھر کر سامنے آئی۔ بالفاظ دیگر نبوت پر حکمت عملی غالب آگئی۔"

یہی بات ایک دوسرے مستشرق منٹگمری واٹ نے دوسرے انداز سے کہی ہے۔

"آپ نے مکہ کو ایک نبی کی حیثیت سے چھوڑا اور مدینہ میں ایک بادشاہ کی حیثیت سے داخل ہوئے۔"

لیکن مستشرقین کا یہ تجزیہ ٹھیک نہیں ہے۔ اس کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے ہمیں پیغمبر اسلام کی مکی زندگی پر نظر ڈالنا ہوگی۔ آپ اپنی زندگی کے ابتدائی چالیس برس تک مکہ کی باوقار اور محترم شخصیت تصور کئے جاتے تھے۔ قبیلہ قریش کی معزز شاخ بنو ہاشم کے معزز فرزند۔ الصادق اور الامین کے القاب سے معروف جو اس دور جہالت میں مفقود صفات تھیں۔ تاہم اس سے ایک حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ اس زمانے میں بھی زندگی کی بنیادی اقدار۔ نجابت، شرافت، صداقت، دیانت، شجاعت بلکہ اہل عرب کی لغت کے مطابق "مروّۃ" پر نہ صرف یقین تھا بلکہ ان اقدار کے حامل افراد واقعی عزت و تکریم کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ رسول اللہ میں چونکہ یہ خوبیاں بدرجہ اتم موجود تھیں اس لئے آپ لاریب سب سے زیادہ معزز تھے۔ اس حقیقت کا ادراک ہمیں عمارت کعبہ میں سنگ اسود کی تنصیب کے واقعہ سے بھی ہوتا ہے۔ یہ آپ کی بصیرت اور حکمت کا کمال تھا کہ آپ کے احسن فیصلے کی وجہ سے قریش کے قبائل میں ایک خونی جنگ ہوتے ہوتے رہ گئی۔

آپ کی عزت و وقار کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ جب سیدہ خدیجۃ الکبریٰ کو اپنے کاروبار تجارت کے لئے ایک باصلاحیت اور دیانتدار منتظم کی ضرورت محسوس ہوئی تو ان کی نگاہ انتخاب بھی آپ پر ہی پڑی۔ اس کام کو آپ نے جس خوش اسلوبی کے ساتھ سرانجام دیا نیز اس دوران میں آپ کی خوبیوں بھلائیوں اور نیکیوں کا پرتو جمیل جو سیدہ طاہرہ خدیجۃ الکبریٰ کے قلب و ذہن پر پڑا اس نے انہیں آپ سے شادی کے لئے سوچنے پر مجبور کیا حالانکہ حضور کے مقابلے میں قریش کے دیگر رؤسا بھی اس رشتہ کے لئے درخواست گزار تھے۔

ایسی مثالیں اور بھی بہت سی مل سکتی ہیں۔ ان سے بہرحال یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ چالیس سال کی عمر تک جو عزت و شرف اور مقام حضور کو حاصل تھا وہ مکہ کے رؤسا اور شیوخ کو بھی میسر نہ تھا۔

لیکن جب آپ نے نبوت کا اعلان فرمایا اور تمام اہل مکہ کو حق کی دعوت دی تو مخالفتوں کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا اور کون سا ظلم و ستم ایسا تھا جو آپ کے لئے روا نہ رکھا گیا۔ ان حوادث کے باوجود بعض ایسی سعید طبیعت شخصیتیں تھیں جنہوں نے نہ صرف آپ کی تعلیمات کو سنا بلکہ آپ کے کردار و افعال اور پاکیزگی سے متاثر ہو کر اسلام بھی قبول کیا اور راہ حق میں تمام مصائب اور مشکلات کا خندہ پیشانی کے ساتھ مقابلہ کیا۔ جب قریش کا ظلم و ستم انتہا کو پہنچ گیا تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک تجربہ کیا اور اپنے صحابہ میں سے ایک جماعت کو تیار کیا کہ وہ سمندر پار جا کر حبشہ کے عوام، بادشاہ اور حکومت کے طور طریقے اور مزاج کو سمجھیں اور اسلام کی مقبولیت کے لئے لائحہ عمل مرتب کریں۔ اس لئے یہ سمجھنا کہ یہ ہجرت

اہل مکہ کے مظالم سے تنگ آکر کی گئی تھی غلطی ہو گی۔ اگر یہی مقصد پیش نظر ہوتا تو کمزور اور مفلس قسم کے صحابہ ہجرت کرتے جبکہ ہم دیکھتے ہیں، کہ مہاجرین کی فہرست میں صرف معززین اور بڑے بڑے گھرانے کے افراد کے نام شامل ہیں جو مکہ میں رہ کر بھی اپنی حفاظت کر سکتے تھے۔

یہ مختصر سی جماعت جو گیارہ مردوں اور چار عورتوں پر مشتمل تھی، صرف تین ماہ کا عرصہ گزار کر وطن واپس آگئی۔ اس میں اگرچہ کفار مکہ کی باقاعدہ منصوبہ بندی کو دخل تھا تاہم جس مقصد کے لئے حضور علیہ السلام نے انہیں وہاں روانہ کیا تھا وہ پورا ہو چکا تھا۔ اس لئے آپ نے کچھ عرصہ بعد ایک باقاعدہ جماعت ترتیب دے کر دوبارہ حبشہ بھیجی۔ اس کی راہ میں اہل مکہ نے بہت سی رکاوٹیں پیدا کیں مگر کارواں روانہ ہو کر حبشہ پہنچ گیا۔ یہ گروہ ۱۰۳ افراد پر مشتمل تھا۔

اس صورتِ حال نے کفار مکہ کو پریشان کیا۔ انہوں نے قیمتی تحائف دے کر ایک وفد شاہ حبشہ کے دربار میں بھیجا۔ حضور شاہ تحائف نذر کرنے کے بعد مہاجرین حبشہ کی شکایت کی اور ان کی واپسی کے لئے عرض کیا۔ اس پر مسلمانوں کو دربار میں طلب کیا گیا اور صورتِ حال کی وضاحت چاہی اس پر مہاجرین کے قائد جناب جعفر بن ابی طالب نے یہ جواب دیا۔

"اے بادشاہ! ہم ایک جاہل قوم تھے۔ بتوں کی پرستش کرتے تھے۔ مردار کا گوشت کھاتے تھے، بدکاری کا ارتکاب کرتے تھے، ہمسایوں کو تنگ کرتے تھے، طاقتور لوگ کمزوروں کا حق غصب کر جاتے تھے۔ پھر ہم میں ایک نبی مبعوث ہوا۔ جس کی شرافت، دیانت، امانت اور پاکدامنی کے سب معترف تھے۔ اس نے ہمیں اسلام کی دعوت دی اور یہ تعلیم دی کہ ہم بتوں کو پوجنا ترک کر دیں، سچ بولیں، خونریزیاں چھوڑ دیں، صلہ رحمی کریں، یتیموں کا مال نہ کھائیں، عورتوں پر تہمت نہ لگائیں۔ پڑوسیوں سے نیک سلوک کریں۔ ایک خدا کی عبادت کریں۔"

"ہماری قوم کو یہ باتیں گوارا نہ تھیں۔ وہ ہم پر ستم کرنے لگے۔ جب ان کا ظلم و ستم حد سے زیادہ ہو گیا تو ہم آپ کے ملک میں آگئے۔ ہمیں امید ہے کہ یہاں کوئی زبردستی نہ ہو سکے گی۔" اور واقعی شاہ نجاشی نے ان کے ساتھ کوئی زبردستی نہ کی۔ لیکن مشرکین قریش نے ایک دوسری ترکیب سوچی اور دوسرے روز دربار میں رسائی حاصل کر کے بادشاہ سے کہا کہ وہ مسلمانوں سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ان کا عقیدہ معلوم کریں۔ اس پر مہاجرین کی دوبارہ طلبی ہوئی اور ان سے دریافت کیا گیا۔ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ان کا کیا عقیدہ ہے۔ اس پر مسلمانوں کے قائد۔ حضرت جعفر طیار نے جواب دیا۔

"وہ (حضرت عیسیٰ) اللہ کے بندے، اس کے رسول، روح الٰہی اور کلمۃ اللہ ہیں جو اللہ تعالے نے حضرت مریم کو مرحمت فرمایا"

اس پر شاہ نجاشی نے زمین سے ایک تنکا اٹھایا اور کہا کہ تمہارے اور ہمارے عقیدے میں اس تنکے کا بھی فرق نہیں۔

اس پر دربار میں موجود فوجی سرداروں اور مذہبی رہنماؤں کی تیوریوں میں بل پڑ گئے۔ لیکن بادشاہ نے کہا کہ مجھے تمہارے تیوریوں کی کوئی پروا نہیں۔ پھر مسلمانوں کی طرف رخ کیا اور فرمایا۔

"آپ لوگ میرے ملک میں اطمینان سے رہ سکتے ہیں جو آپ لوگوں کو برا کہے گا سزا پائے گا جو بھی ناسزا کہے گا اسے جرمانہ ہوگا جو کوئی اس کرے گا سزا بھگتے گا۔ آپ کو دکھ دینے کے عوض اگر سونے کا پہاڑ بھی ملے تو میں قبول نہیں کروں گا۔ خدا کا شکر ہے کہ مجھے اس رسول کا زمانہ نصیب ہوا خدا کی قسم اگر میں شاہی ذمہ داریوں میں نہ گھرا ہوتا تو ان کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کی جوتیاں سیدھی کرتا اور اپنے ہاتھوں سے ان کو وضو کراتا"

اس کے بعد کے حالات کی تفصیل تو نہیں ملتی۔ البتہ اس بات کا ثبوت ضرور ملتا ہے کہ:

۱۔ [illegible] ان مہاجرین سب تک حبشہ میں مقیم رہے انہیں کوئی دکھ اور تکلیف نہیں ہوئی۔

۲۔ خدا کے رسولؐ کی تعلیمات کا چرچا سُن کر حبشہ کے عیسائی پادریوں نے تحقیق حال کے لئے بیس تیس علماء پر مشتمل ایک وفد مکہ بھیجا جنہوں نے حضورؐ کی نشست و برخاست اور آداب و اطوار کا جائزہ لیا اور قرآن کریم کی چند آیات سے حضرت عیسٰی کے بارے میں اپنا عقیدہ درست کیا۔ مثلاً

"جس دن اللہ تعالٰے رسُولوں کو جمع کرے گا پھر پُوچھے گا کہ تمہیں لوگوں کی طرف سے دعوت حق کا کیا جواب ملا تھا۔ وہ کہیں گے کہ ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ یقیناً غیب کی باتیں تو ہی جاننے والا ہے جبکہ اللہ فرمائے گا اے عیسٰی ابن مریم! مَیں نے تم پر اور تمہاری ماں پر جو احسانات کئے ہیں اُنہیں یاد کرو۔ جب میں نے تمہاری روح القدس کے ذریعہ مدد کی۔ تم پنگوڑے سے لے کر آخر عمر تک لوگوں سے باتیں کرتے رہے۔ اور جب ہم نے تمہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دی اور تورات و انجیل۔ اور جب تم نے میرے حکم سے مٹی سے چڑیا بنائی اور میرے حکم سے اُس پر دم کیا تو وہ طائر بنی اور تم میرے حکم سے مادر زاد اندھوں اور کوڑھیوں کو شفا دیتے تھے اور جب تم میرے حکم سے مردوں کو زندہ کر کے قبروں سے نکالتے تھے اور جب تم بنی اسرائیل کے پاس معجزے لے کر آئے اور اُس وقت میں نے اُن کو تم پر دست درازی کرنے سے روکا تو اُن میں سے بعض کفار بولے یہ تو صریحاً جادو ہے۔" (سورۃ المائدہ ۱۰۹تا۱۱۱)

روایت ہے کہ ان آیات کو سُن کر عیسائی رہنما شدتِ اثر سے رونے لگے۔ اُنہوں نے قرآن کریم کی تصدیق کی اور رسُول کریم کو سچا جانا۔ پھر یہ لوگ خانہ کعبہ سے اُٹھ کر آگے بڑھے تو ابوجہل کے آدمیوں نے اُنہیں روک کر بہت بُرا بھلا کہا۔ مگر اُنہوں نے مطلقاً پروا نہیں کی۔

۳۔ شاہ نجاشی نے اسلام قبول کیا اور تا حیات اس عقیدے پر قائم رہا۔ اُس نے اپنے بیٹے کا نام (محمد) رکھا اُس نے رسُول کریم کی خدمت میں تحائف روانہ کئے۔ اس کا بھیجا ہوا ایلچی حضور علیہ السلام کی خدمت میں رہا اور پھر حضرت علی کی اراضی اور چشموں کی نگرانی کرتا رہا۔

اس کے باوجود مستشرقین نے ہجرت حبشہ کو ناکام قرار دیا ہے۔ مؤرخین اسلام بھی اس واقعہ کا سطحی طور پر تذکرہ کرتے ہیں۔ لیکن اگر بنظر غائر اس کا مطالعہ کیا جائے تو یہ ہجرت انقلاب اسلام کی جانب پیش قدمی اور سفر کی ایک اہم منزل تھی۔ اس موضوع پر ملک کے مشہور عالم اور ممتاز مفکر و دانشور سید مرتضٰی احسین صدر الافاضل نے نہایت معقول اور سیر حاصل بحث کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"ہجرت حبشہ قریش کے منصوبوں کے لئے ناکامی کا سبب ہوئی۔ مسلمانوں کو ایک سیاسی طاقت سے کمک ملی کر مکہ کے عیسائی اُن کی مخالفت میں وہ نہ کر سکے، جو اُن سے متوقع تھا۔ مسلمان دشمنوں کی اذیت رسانی سے بچے، دوسرے براعظم میں اسلام کی تبلیغ شروع ہوئی۔ عرب و عجم، سیاہ و سفید کا فرق مٹا اور عوام پر یہ ثابت ہو گیا کہ اسلام تمام انسانوں کی مساوات و آزادی کا حامی ہے۔"

"آپؐ نے مصائب سے گھبرا کر لوگوں کو ترک وطن کا حکم نہیں دیا۔ بلکہ مصائب سے مقابلہ کرنے کے واسطے، ترک وطن کی مشقت پر آمادہ کیا تاکہ اسلام کا بول بالا ہو۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ خود بنفس نفیس اس میدان میں کھڑے رہے اور مقابلہ کے سخت ترین امتحانوں کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرتے رہے۔"

"آپؐ کی زندگی تضاد کے سائے سے دُور تھی آپؐ خود پریشانیاں برداشت کرتے رہے مگر دوسروں کو آرام پہنچانے کی سعی میں کمی نہ کی، اگر حضور خود حبشہ تشریف لے جاتے تو یقیناً زیادہ عظمت و راحت حاصل کرتے مگر یہ بات حضور کی فطرتِ بلند کے خلاف تھی۔"

ہجرت حبشہ نے حضور کی بلندی، مستقبل پر نظر رکھنے والی بصیرت اور حال سے نپٹنے کی قوت، دشمن کو شکست دینے کی طاقت، سرد جنگ فتح کرنے کی صلاحیت کا جو ثبوت مہیا فرمایا ہے، اس پر مؤرخ و مفکر حیران اور آپؐ کو نبی آخرالزمان ماننے والے شادمان ہیں" (نقوش رسُول نمبر جلد سوم، شمارہ نمبر ۱۳۰۔ جنوری ۱۹۸۲ء/۵۹۵)

حقیقت یہ ہے کہ اس واقعہ نے مسلمانوں کے عزم و یقین اور ایمان و ایقان میں مزید اضافہ کیا اور اُنہیں یہ احساس ہوا کہ جس اللہ تعالٰے کی راہ

مسلمانوں نے اپنا وطن گھر اور عزیز رشتہ داروں کو چھوڑا ہے وہ ان کو بے یار و مددگار رہنے نہیں دے گا۔ نیز یہ کہ اسلام دنیا میں ختم ہونے کے لئے نہیں آیا بلکہ سرفراز ہونے اور ترقی کرنے کے لئے آیا ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک یہ ہجرت ایک تجربہ تھی جس پر آپ کو وسیع طور پر عمل کرنا تھا اور بین الاقوامی سطح تک وسعت دینا تھا۔ ادھر کفار مکہ کو مسلمانوں کے ثبات و استحکام اور ان کی بیرون عرب کامرانیوں نے مزید پریشان کیا جس کے نتیجہ میں انہوں نے مسلمانوں پر مکہ میں ظلم و ستم کی انتہا کر دی اس میں سب سے زیادہ تکلیف دہ زمانہ شعب ابی طالب میں نظر بندی کے تین سال تھے جس دوران میں آپؐ اور آپؐ کے خاندان کے افراد نے اس قدر صعوبتیں برداشت کیں جنہیں احاطۂ تحریر میں لانا ممکن نہیں مگر ہمارا مقصد یہاں پر نہ تو ان تکالیف و مصائب کے ذکر کا اعادہ ہے اور نہ ہی اُن حالات و واقعات کا تذکرہ کرنا مقصود ہے کہ جس کے تحت آپؐ اور آپ کے صحابہ نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ ہم اس واقعہ کو اس قدر اہمیت دینے پر بھی اکتفا نہیں کر سکتے کہ حضورؐ کی مکی زندگی کے زمانے میں اسلام صرف گنتی کے لوگوں تک محدود تھا اور ہجرت مدینہ کے بعد چونکہ مسلمانوں کو اہلِ مکہ کے ہاتھوں کسی قسم کا خوف نہ تھا اس لئے انہیں دین پھیلانے میں آسانی ہوئی جہاں رفتہ رفتہ انہوں نے اتنی طاقت اور جمعیت فراہم کر لی کہ اہلِ مکہ کے لئے وہ چیلنج بن گئے حتیٰ کہ اسلام غالب آیا اور مشرکین کی باطل قوت مٹ گئی۔

نہیں نہیں یہ واقعہ صرف ان چند الفاظ، چند سطور اور چند صفحات کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت مدینہ تاریخ عالم کا نہایت اہم واقعہ ہے جس کے بیان کے لئے ایک دفتر درکار ہے اس حقیقت کے ادراک کے لئے ماضی کے اوراق الٹنے کی ضرورت ہے۔ زیادہ تفصیل میں مت جائیے صرف اس بات کا جائزہ لیجیے کہ حضورؐ کے اعلانِ نبوت سے قبل تمام عالم میں انسان کس مقام پر تھا؟

آئیے ذرا وادئ نیل کی حالت ملاحظہ فرمائیے یہ جگہ انسانی تہذیب کی ابتدا ہمیں یہیں سے ہوئی۔ یہاں کے عالی دماغ لوگوں نے آج سے چھ ہزار سال قبل تقویم کے علم کو رواج دیا فنِ تعمیر، طب، جراحت اور مصوری میں مہارت حاصل کی لیکن ایک عام انسان کے حصہ میں کیا آیا؟ غلامی، ظلم و ستم، افلاس و غربت، بھوک، بیماری اور خدمت و محنت!

روما الکبریٰ جس کی تہذیب و ثقافت، عظمت و شرف، حکمت و تدبر، علوم و فنون اور سیاسی و فوجی برتری کا چار دانگ عالم میں شہرہ تھا مختلف معاشی اور معاشرتی طبقات میں بٹا ہوا تھا۔ سوائے شاہی خاندان کے افراد، فوجی سرداروں اور کلیسا کے ذمہ دار اور با اثر اسقفوں، پادریوں اور زمینداروں کے روم دیوتاؤں کے تمام شہری تقریباً غلامی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ رہے مفتوحہ علاقوں کے لوگ، انہیں وہ وحشی اور بربر سمجھتے تھے۔ غلامی کو سوسائٹی کا لازمی جزو سمجھتے تھے۔ اس کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ ارسطو جیسا مدنی اور حکیم کہتا ہے کہ فطرت کا مقصد یہی ہے کہ تمام غیر یونانی یونانیوں کے غلام ہوں۔ چھٹی صدی عیسوی میں اگرچہ روم کا سرکاری مذہب عیسائیت تھا لیکن اس نے بھی انسان کی عزت و وقار میں کوئی اضافہ نہ کیا۔ انسانیت کی ذلت و رسوائی جو پہلے تھی اس میں سر مو فرق نہ آیا تھا۔ امیر اسی طرح امیر رہا غریب غریب اور غلام اپنی سرپرستی کا، غلامی پر شاکر و صابر۔

بیزنطینی حکومت کے بعد دوسری بڑی طاقت ایران کی تھی۔ اس نے ایک زمانے میں بڑے بڑے کارنامے سرانجام دئے لیکن ظہورِ اسلام کے وقت اس عظیم الشان سلطنت کی شوکت و سطوت کے صرف افسانے باقی رہ گئے تھے۔ اس تہذیب کے زوال کا سبب ان میں سب سے اہم برسرِ اقتدار طبقے کے لوگوں کا اخلاقی انحطاط ہے۔ عوام کی پست حالی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے بادشاہوں اور کاسریٰ کے سامنے سجدہ ریز ہوتے، ان کی الوہیت کے گیت گاتے اور انہیں اپنا رازق و مالک سمجھتے تھے۔ کھیتوں میں شبانہ روز کام کرتے پھر بھی نانِ شبینہ کو محتاج رہتے۔ امراء اور رؤسا کی

عیش پرستی کا تمام تر دارو مدار اسی غریب طبقہ پر تھا جو اپنے آقاؤں کے ہاتھوں غلاموں سے بدتر زندگی بسر کرتے تھے۔

مشرق میں قدیم تہذیب کے لئے چین کا نام ہمیشہ مشہور رہا ہے۔ یہاں سب سے پہلے لاؤتزے اور کانگ فوتسی (کنفوشس) نے لوگوں کو معاشرتی حقوق و فرائض کا ایک ضابطہ دیا۔ جس کی وجہ سے عوام نے کسی حد تک سکھ کا سانس لیا لیکن مذہب اور اخلاقی ضابطے کے فقدان کی وجہ سے اُن کی یہ حالت زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکی چنانچہ قدیم مذہبی رسم و رواج کو مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی، قربانیاں دینے کی روایت اُسی طرح جاری رہی۔ نتیجتاً دیانت، شریت اور خشک فلسفہ سیات کے رواج نے ایک خاص طبقے کے لوگوں کے علاوہ عوام کی اخلاقی، مذہبی اور معاشرتی حالت میں کوئی اضافہ نہ کیا۔

ہندوستان بھی قدیم تہذیب کا گہوارہ رہا ہے۔ یہاں کی تاریخ عجیب و غریب وہم پرستیوں، پُراسراریت اور دیو مالا سے بھری ہوئی ہے۔ اس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ قدیم زمانے سے ہندی سوسائٹی متعدد طبقات میں منقسم تھی، جن میں سے ایک کی حیثیت تو دیوتاؤں اور اوتاروں جیسی تھی، جبکہ سب سے پست طبقے کے لوگوں کو حیوانوں سے بھی کم تر درجہ دیا جاتا تھا۔ اس ضمن میں ہم مشہور ہندو مؤرخ، آر۔ سی۔ دت کی کتاب A HISTORY OF CIVILIZATION IN ANCIENT INDIA سے اقتباس پیش کرتے ہیں۔

"ذات پات کی تقسیم نے برہمنوں کے وقار کو بہت بلند کیا، جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ ہر قسم کی صنعت و حرفت اور تجارت تباہ ہو گئی۔ صرف برہمنوں کی تجارت باقی رہ گئی۔ اس تقسیم نے ہندو قومیت کو ہی ٹکڑے ٹکڑے نہیں کیا بلکہ باہمی نفرتوں اور کدورتوں میں بھی اضافہ کیا۔ صرف برہمنوں کی عزت و عظمت کی خاطر تمام قوم کو ذلیل کر دیا... امیر لوگوں کی جائیداد میں سب سے زیادہ قیمتی اور انمول چیز غلام سمجھے جاتے تھے۔ گھر کے غلام بکتے تھے۔ قرضہ لینے والے اپنی لونڈیاں ساہوکاروں کے پاس رہن رکھ دیتے تھے۔ غلاموں کی سات اقسام میں سے، جنگی قیدی، غلاموں کی اولاد اور زرخرید غلام زیادہ اہم تھے۔"

عورت بھی سوسائٹی کا ایک حصہ ہے، اگر ہندوستان میں اس صنف کی حالت کا جائزہ لیا جائے تو سب سے زیادہ مظلوم مخلوق یہی تھی، خواہ اُس کا تعلق اونچی ذات یعنی برہمن یا کشتری سے تھا خواہ چھوٹی ذاتوں یعنی ویش یا شودر سے ہو۔ اگر کوئی بڑی ذات کا مرد پست ذات کی عورت سے زنا کا مرتکب ہوتا تو کوئی جرم نہ تھا اور اگر کوئی چھوٹی ذات کا مرد بڑی ذات کی استری کو چھو لے تب بھی وہ سزائے موت کا مستحق ہوتا تھا۔ اگر کوئی کم ذات بڑی ذات والے کو مارے تو اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیتے تھے، گالی دے تو زبان کاٹ لیتے اور اگر تعلیم حاصل کرتے تو گرم گرم تیل اُس کے منہ میں انڈیل دیتے تھے۔ عورتیں جوئے میں بھی ہاری جاتی تھیں۔ ایک عورت کے بیک وقت متعدد شوہر ہوتے تھے۔ مہابھارت شہرت کے پانڈو بھائی بیک وقت ایک استری سے تصرف کرتے تھے۔ حالانکہ قانونی اور سماجی طور پر وہ استری اُن کے سب سے بڑے بھائی ارجن نے سوئمبر میں یدھ کر کے جیتی تھی۔ اگر کسی استری کا پتی مر جاتا، تو اُس پر دنیا کا سکھ چین حرام ہو جاتا اسی ڈر سے پتی ورتا استریاں اپنے مرحوم شوہر کے ساتھ چِتا میں زندہ جلنے کو ترجیح دیتی تھیں۔ لڑائی میں شکست کے خوف سے ناریوں کے بھائی یا باپ قتل کر دیتے تھے۔ عورتیں مردوں کو اور مرد عورتوں کو ننگا کر کے پوجا کرتے تھے۔ مذہبی تہواروں کے موقعوں پر لوگ شراب میں اتنے بدمست ہو جاتے تھے کہ ماں، بہن اور بیٹی کی تمیز نہیں رہتی تھی۔ غرضیکہ دیوتاؤں، اوتاروں اور رشیوں منیوں کی جنم بھومی بھی انہی مذہبی، اخلاقی، تمدنی اور معاشرتی بداخلاقیوں میں مبتلا تھی جس کا شکار فارس، روم، چین، جاپان اور دنیا کے دیگر ممالک تھے۔ (سوامی دیانند ستیارتھ پرکاش، باب گیارہ)

البتہ جزیرہ نما عرب میں صورتِ حال ذرا مختلف تھی۔ قطع نظر اس کے کہ غلامی وہاں بھی رائج تھی، عربوں کے ہاں ایسے قوانین یا زیادہ صحیح طور پر رسم و رواج تھے جن کے تحت غلام کبھی نہ کبھی آزادی حاصل کر سکتا تھا۔ مثلاً جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کی خبر اُن کے چچا ابولہب نے سُنی تو اس نے اس خوشی کے موقع پر اپنی کنیز حضرت ثوبیہؓ کو آزاد کر دیا تھا۔ ایسی اور بھی بہت سی مثالیں ہیں جن میں متعدد غلاموں نے مختلف مواقع پر آزادی حاصل کر کے موالیوں کا درجہ حاصل کیا جو مکمل طور پر آزاد تو نہ ہوتے تھے، تاہم دوسرے درجے کے شہریوں کی طرح تقریباً آزادانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ویسے بھی قبائلی نظام میں قبیلے کے تمام افراد اپنے سردار اور شیخ سے برابر کی حیثیت سے ملتے تھے اور قبیلہ کے مسائل پر کھل کر آزادانہ رائے دیتے تھے جس کا احترام کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ بھی اُن میں بعض ایسی خصوصیات اور صفات پائی جاتی تھیں، جو عام طور پر دُنیا کے کسی خطّے کے لوگوں میں موجود تھیں۔ عورت کو بھی یہاں کی سوسائٹی میں اس قدر حقارت اور نفرت سے نہ دیکھا جاتا تھا۔ یہ تسلیم کہ بنو تمیم اور چند دیگر قبائل میں لڑکیوں کو زندہ دفن کرنے کا رواج بھی تھا، تاہم ایسی بھی مثالیں ملتی ہیں جن سے عورتوں کی قدر و منزلت اور اُن کی حیثیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مثلاً سیدہ۔ طاہرہ۔ خدیجۃ الکبریٰ کی مثال لیجیے وہ مالدار عورت تھیں۔ آزادانہ طور پر تجارت کرتی تھیں۔ مکّہ میں اُن کی بہت عزت تھی۔ خانسہ ہندو یمن کی ایک مشہور شاعرہ تھی ظہورِ اسلام سے قبل سوق عکاظ میں ایک بار اُسے مشاعرہ کا جج مقرر کیا گیا تھا۔ تاریخ میں ایسی اور بھی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ غالباً عربوں کی انہی خصوصیات کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اسلام کی ابتدائی تجربہ گاہ کے لئے ارضِ حجاز کو منتخب کیا اور یہیں سے وہ پُرامن عالمگیر انقلاب شروع ہوا جس کے اثرات آج تک ظاہر ہو رہے ہیں۔

یہ بھی غالباً اہلِ مکّہ کی خصوصیت ہی تھی کہ اُنہوں نے اس نئے دین، نئے عقیدہ، نئی تہذیب اور نئے انقلاب کی دل کھول کر مخالفت کی اور اسے ختم کرنے کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ وہ کون سا ستم تھا جو اہلِ ایمان کے خلاف روا نہ رکھا۔ ان حالات میں اگر حضور علیہ السلام چاہتے تو بہت پہلے ترکِ وطن کر جاتے۔ خاص طور پر حبشہ میں جہاں مسلمانوں کو اپنے مذہب پر عمل کرنے اور تبلیغ و اشاعت کی پوری آزادی تھی۔ لیکن اس کے برعکس آپؐ نے ان تمام مصائب کا خندہ پیشانی کے ساتھ مقابلہ کیا حالانکہ اس دوران میں حضورؐ کو اُن مسلمانوں کی طرف سے جو مکّہ کے اطراف اور دُور دراز علاقوں میں رہا کرتے اور اپنے قبائل میں بہت اثر و نفوذ رکھتے تھے، مسلسل دعوت نامے بھی موصول ہو رہے تھے کہ آپ مکّہ چھوڑ کر اُن کے پاس مہمان کی حیثیت سے رہیں۔ نیز انہی دنوں صدیق اکبرؓ نے کئی بار حضورؐ سے ہجرت کی اجازت چاہی تھی لیکن آپؐ نے ہر بار یہی جواب عطا فرمایا تھا اے ابوبکرؓ! جلدی نہ کرو۔ شاید اللہ تعالیٰ کوئی رفیقِ سفر پیدا کر دے۔

اس سے مترشح ہوتا ہے کہ حضورؐ کو ہجرت کی اتنی عجلت نہ تھی۔ آپ کسی غیبی اشارے کے منتظر تھے۔ چنانچہ جب سورہ عنکبوت کی یہ آیت نازل ہوئی تو حضورؐ نے ہجرت کی تیاریاں شروع کر دیں۔

"یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِیْ وَاسِعَةٌ فَاِیَّایَ فَاعْبُدُوْنِ"

"اے میرے بندو جو ایمان لا چکے ہو۔ میری زمین وسیع ہے۔ (سو تم جہاں بھی رہو) میری عبادت کرو"

اور اپنے رفیقِ سفر حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ سفر کرتے ہوئے چند روز کے بعد مدینہ منوّرہ پہنچے۔ اور انبیائے سلف کی سنت ادا کرتے ہوئے ہجرت فرمائی جیسا کہ ہم وضاحت کر چکے ہیں کہ حضور علیہ السلام کی ہجرت سے قبل تمام انبیاء علیہم السلام کی ہجرتیں بامقصد تھیں۔ اور اُن کی وجہ سے نہایت دور رس نتائج برآمد ہوئے، بالکل اسی طرح حضورؐ کی یہ ہجرت بھی بامقصد تھی اور نتائج کے اعتبار سے اُن سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے

جس کے ذریعے دو قسم کے اثرات مرتب ہوئے۔ فوری اثرات اور دُور رس اثرات۔

فوری اثرات

۱۔ اسلامی اخوت کا درس

ہم بیان کر چکے ہیں کہ ظہورِ اسلام سے قبل تمام دنیا رنگ، نسل، خون اور علاقائی عصبیتوں میں مبتلا تھی بلکہ ایک نسل اور رنگ کے لوگوں میں بھی امتیاز تھا۔ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی مکی زندگی میں بھی مسلمانوں کی شیرازہ بندی کر رکھی تھی مگر چونکہ وہ ایک عبوری اور بحرانی دور تھا اس لئے اس قسم کی یگانگت اور یکجہتی کا پیدا ہو جانا کوئی تعجب خیز بات نہ تھی۔ آپ نے مدینہ منورہ پہنچ کر سب سے پہلا کام یہی کیا کہ تمام امتیازات و مفاخرات کو ختم کیا اور مہاجرین و انصار کے درمیان رشتہ اخوت پیدا کیا۔ آپؐ نے دونوں گروہوں کے افراد کو یکجا کیا اور ایک مہاجر کا ہاتھ پکڑ کر ایک انصار کے ہاتھ میں دیا اور اُن دونوں کو آپس میں بھائی بنا دیا۔ یہ رشتہ صرف نظریاتی اور زبانی طور پر نہیں تھا بلکہ انصار نے اپنے مہاجر بھائیوں کے لئے اتنا ایثار کیا کہ جس کے پاس دو مکان تھے اُس نے ایک اپنے بھائی کو دے دیا، نصف دولت مہاجر بھائی کو دے دی، باغات تقسیم کئے، زمین کی تقسیم حتیٰ کہ بعض حالات میں انصار نے اس حد تک قربانی دی کہ جن کے پاس ایک سے زیادہ بیویاں تھیں اُنہوں نے ایک کو طلاق دے کر اس کی شادی اپنے بھائی سے کرا دی۔ یہی نہیں بلکہ آپؐ نے انصار کے دو مشہور قبائل اوس و خزرج جو ہمیشہ سے آپس میں برسرِ پیکار رہتے تھے انہیں بھی رشتہ محبت و اخوت میں ایسا پرو دیا کہ مدینہ منورہ اور اس کے قرب و جوار کے تمام مسلمان ایک جماعت۔ حزب اللہ کے نام سے مشہور ہو گئی۔

۲۔ یہودِ مدینہ کے ساتھ معاہدہ امن

انصار کے علاوہ، مدینہ منورہ میں دوسرا گروہ یہودیوں کا تھا جن میں تین قبائل، بنو نضیر، بنو قینقاع اور بنو قریظہ زیادہ اثر و رسوخ اور اقتدار کے مالک تھے۔ ان کا کاروبار تمام ملک میں پھیلا ہوا تھا بلکہ علاقے کی معاشی زندگی کا تمام تر دارومدار اُن پر تھا یہی وجہ ہے کہ اوس و خزرج اُن کے ہاتھوں بہت پریشان رہتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین و انصار کے درمیان مواخاۃ کے بعد گروہِ یہود کی طرف توجہ مبذول فرمائی اور اُن کے ساتھ ایک معاہدہ طے کیا جس کی اہم شقیں مندرجہ ذیل تھیں:

۱۔ یہود یا مسلمانوں کے ساتھ کسی بھی بیرونی حملہ کی صورت میں دونوں جماعتیں ایک دوسرے کی مدد کریں گی۔

۲۔ کوئی فریق قریش کو امان نہیں دے گا۔

۳۔ مدینہ پر حملے کی صورت میں دونوں مل کر دفاع کریں گے۔

۴۔ اگر ایک فریق کسی دشمن کے ساتھ معاہدہ صلح و امن طے کرے تو دوسرے کو اس کا ساتھ دینا ہو گا لیکن مذہبی جنگ اس سے مستثنیٰ ہو گی۔

۵۔ ایامِ جنگ میں یہودی بھی اخراجاتِ جنگ برداشت کریں گے۔

۶۔ فریقین کے درمیان فساد یا جنگ کی صورت میں حتمی فیصلہ اللہ تعالیٰ کے رسول محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم صادر فرمائیں گے۔

یہ معاہدہ حضور علیہ السلام کی ابتدائی مدنی زندگی کے زمانے کے لئے نہایت اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اس کی وجہ سے ایک تو یہودیوں کا

خطرہ ٹل گیا دوسرے معاہدے کی آخری شق کی وجہ سے مسلمانوں کی حیثیت اور مرتبہ زیادہ بلند ہو گیا. لیکن چونکہ غزوۂ خندق کے ایام میں ان قبائل نے اس معاہدے کا احترام نہ کیا، اس لئے معاہدے کی شرائط کے مطابق انہیں مدینے سے جلا وطن ہونا پڑا تورات کی مقررہ سزا کے طور پر جان سے ہاتھ دھونا پڑے۔ مسلمانوں کو بہرحال یہ فائدہ ہوا کہ ان کی توجہ صرف دوسرے بڑے دشمن قریش کی جانب مرتکز ہو گئی۔

۳ - اہلِ مکہ کے ساتھ نبرد آزمائی اور جزیرہ نمائے عرب میں اسلام کا نفاذ

مکہ حضور علیہ السلام اور تمام مہاجرین کا آبائی اور پیدائشی وطن تھا، جہاں انہیں بے شمار مصائب کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ مدینہ میں بھی انہیں اہلِ مکہ سے ہر دم خطرہ رہتا تھا اس لئے مدینہ کے تحفظ کے ساتھ ساتھ اسلام کے اس سب سے بڑے دشمن کے ساتھ جنگ ناگزیر تھی جس کی ابتدا بھی انہی کی طرف سے ہوئی اور معرکہ بدر پیش آیا۔ مسلمانوں نے بے سروسامانی کی حالت میں نہ صرف اس جنگ میں فتح حاصل کی بلکہ اور بھی کئی معرکوں میں انہیں شکستِ فاش دی جس کی وجہ سے کفارِ مکہ خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔ اس لئے چھ ہجری میں حضور کو حج کرنے کا خیال ہوا۔ صحابہ سے تذکرہ ہوا اور چودہ سو فرزندانِ توحید کی ایک جماعت تیار ہو کر سوئے مکہ عازم سفر ہوئی۔ کفارِ مکہ کو خبر ہوئی تو انہوں نے جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ حضور جب حدیبیہ کے مقام پہنچے تو آپ کو اہلِ مکہ کی سرگرمیوں کا پتہ چلا۔ آپ نے انہیں کہلوا بھیجا کہ ہم حج کی غرض سے آئے ہیں، انہوں نے حقیقتِ حال جاننے کے لئے ایک وفد حدیبیہ روانہ کیا۔ جس نے اس سال تو حج کی اجازت نہ دی البتہ مسلمانوں کے ساتھ ایک معاہدہ طے کیا جو تاریخ میں صلح نامہ حدیبیہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس معاہدے کی شرائط سے بظاہر مسلمانوں کی شکست کا اظہار ہوتا ہے، لیکن قرآن کریم نے اسے فتح مبین کے نام سے یاد کیا۔ اور واقعی یہ بعد میں فتح مبین ثابت ہوئی کیونکہ اس کی وجہ سے ملک کی دو اہم جماعتوں میں صورتِ جنگ ختم ہو گئی ملک میں امن و امان قائم ہو گیا اہلِ مکہ کو مدینہ آنے اور مسلمانوں کے حالات کا مطالعہ کرنے اور ان سے روابط بڑھانے کا موقع ملا، جس کے نتیجہ میں مسلمانوں کی تعداد میں دن رات اضافہ ہونے لگا نیز اس معاہدہ کی سب سے زیادہ ہتک آمیز شرائط فتح مکہ کا پیش خیمہ ثابت ہوئیں، جس کے بعد صرف دو سال کے عرصے میں تقریباً تمام جزیرہ نمائے عرب پر نہ صرف مسلم اقتدار قائم ہو گیا بلکہ لوگوں کی اکثریت نے مذہب اسلام قبول کر لیا۔

عالمگیر اثرات

۱ - تصورات کی دنیا میں انقلاب

اسلام سے قبل عقائد، نظریات اور افکار و تصورات کی دنیا پر جمود چھایا ہوا تھا۔ کہیں پتھروں کو معبود سمجھا جاتا تھا کہیں درختوں کے سامنے سجدہ ریزی ہوتی تھیں، کوئی ناگ کا پجاری تھا تو کوئی غیر معمولی انسانوں کو پوجتا تھا، کہیں سورج کی پرستش ہوتی تھی اور کہیں چاند کو الٰہ سمجھا جاتا تھا، کہیں آتش پرستی تھی تو کہیں اوہام پرستی۔ کسی نے محض خشک فلسفہ کے ذریعہ زمانے کو خدا جانا، کسی نے مادہ کو ہی سب کچھ مانا، کوئی تثلیث کا پجاری تھا تو کوئی ثنویت کا حامی۔ کسی نے خدا سے بیٹے اور بیٹیاں منسوب کر رکھی تھیں کوئی خود کو دیوتا کہلواتا تھا۔ کسی نے اگر خدا کو ایک جانا بھی تو اس کا درجہ ایک شوہر یا باپ کے برابر متعین کیا، اکثر جگہ دیومالائی تصورات کی عملداری تھی، غرضیکہ تمام عالم ایک قسم کے مذہبی طلسم ہوشربا میں گرفتار تھا، جہاں سے رستگاری اور نجات کی کوئی سبیل نہ تھی۔

تمام دنیا میں اسی قسم کے افکار و نظریات کا دور دورہ تھا کہ ایسے میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم دُنیا میں تشریف لائے۔ آپؐ نے انسان کو جو پیغام اور دعوت دی اُس سے عقائد کے تمام ایوانوں میں زلزلہ آ گیا۔ آپؐ نے بتایا کہ اس ساری کائنات کا مالک خالق اور رازق خدائے واحد ہے جس کا نہ کوئی شریک ہے اور نہ ثانی، اس لئے وہی عبادت کے لائق ہے۔ آپؐ نے یہ بھی سکھایا کہ پیغمبر اسلام ہی تمام انسانیت کا پیغمبر اور نجات دہندہ ہے۔ تمام انسانی عظمتوں، سعادتوں اور شرافتوں کا معیار آپؐ ہی کی ذاتِ گرامی ہے۔ آپؐ نے یہ بھی بتایا کہ اس فانی دُنیا کے بعد ایک اور بھی دنیا ہے، جہاں موت کے بعد ہر ایک ذی روح کو اُٹھایا جائے گا اور اس کے اعمال و افعال کا محاسبہ ہوگا۔ ان تصورات کی بدولت ایک طرف بین الاقوامی اخوت کا تصور اُبھرا اور دوسری طرف انسانی مساوات کا نظریہ اجاگر ہوا۔ نیز حیات بعد الموت کے تصور نے ایک ایسا ضابطہ اخلاق دیا جسکے سامنے تمام مصلحین، معلمین اور فلسفیوں کے اخلاقی ضابطے ہیچ تھے

جب تک آپؐ کا قیام مکہ میں رہا حضورؐ کی تعلیمات کا اثر محدود پیمانے پر ظاہر ہوا لیکن جب آپؐ نے مکہ سے مدینہ کی جانب ہجرت کی تو یہ تعلیمات عالمگیر حیثیت اختیار کر گئیں۔ مدینہ منورہ میں آمد کے بعد چونکہ حالات خاصے بدل گئے تھے۔ نیز صلحنامہ حدیبیہ کے بعد امن و امان کی صورت مزید بہتر ہو گئی تھی، اس لئے آپ نے اس وقت کو اپنی تعلیمات کی تبلیغ و اشاعت کے لئے استعمال کیا۔ چنانچہ آپؐ نے مبلغین کی ایک جماعت کو عرب کے قبائل کی طرف بھیجا، جہاں انہیں بہت کامیابی حاصل ہوئی، اور رفتہ رفتہ مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتے ہوتے آپؐ کی حیاتِ طیبہ کے اندر ہی تقریباً تمام اہلِ عرب نئے دین میں شامل ہو گئے۔ آپؐ کا مشن چونکہ عالمگیر تھا اس لئے آپؐ نے عرب سے ملحقہ ممالک، ایران، شام، مصر اور حبشہ میں سفارتیں بھیجیں اور وہاں کے بادشاہوں اور حکمرانوں کو اسلام کی دعوت دی۔ یہ صحیح ہے کہ آپؐ کی زندگی میں پُوری طرح کامیابی تو نہ ہوئی، لیکن یہ بھی حقیقت کہ آپ کا پیغام بہر حال، مقامی سطح سے نکل کر بین الاقوامی سطح تک پہنچنا ضروری گیا۔ چنانچہ جب آپؐ کی رحلت کے بعد خلفائے راشدین کے زمانہ میں مسلمان، صحرائے افریقہ کو عبور کر کے بلادِ زرخیز میں داخل ہوئے تو انہیں مفتوحہ اقوام کو اسلامی نظریات و عقائد سمجھانے میں آسانی ہوئی اور وہ جوق در جوق دائرہ اسلام میں داخل ہونے لگے یہ سلسلہ اسلام کے دورِ اقتدار ہی میں جاری نہیں رہا بلکہ آج بھی جاری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مشرقِ بعید کے بعض ممالک مثلاً چین، جاپان، برما، فلپائن، ویت نام، تھائی لینڈ وغیرہ، جہاں مسلمان فاتح کی حیثیت سے داخل نہیں ہوئے وہاں بھی خاصی بڑی تعداد میں مسلم آباد ہیں۔

یہ تو خیر اشاعت اسلام کی بات تھی، جس کی متعدد وجوہات ہیں جن کا تذکرہ یہاں پر ضروری نہیں۔ بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ ہجرت مدینہ کے بعد مختلف ذرائع اور مختلف ادوار میں اسلام کے عقاید و نظریات جو غیر مسلم اقوام تک پہنچے اُن کی وجہ سے ان کے اور مختلف نظریات میں بھی لچک پیدا ہوئی۔ مثلاً سب سے پہلے یونان، مصر اور ہندوستان کے دیو مالائی تصورات کا خاتمہ ہوا۔ اگرچہ اب بھی یہ تصورات موجود ہیں لیکن ان پر یقین رکھنے والوں کی تعداد زیادہ نہیں۔ اسلام کی وجہ سے عیسائیت کے عقیدہ تثلیث میں بھی ایک حد تک اصلاح ہوئی اوّل تو یہ کہ اُن کے کلیسا میں اب حضرت عیسیٰ کے بُت نصب نہیں کئے جاتے دوسرے یہ کہ اُن میں ایسے معقول لوگوں کی کمی نہیں ہے۔ جو حضرت عیسیٰ کو اللہ تعالیٰ سے کمتر درجہ دیتے ہیں۔ بنیادی عقیدہ میں اس حد تک اصلاح بھی خوش آئند تصور کی جا سکتی ہے کیونکہ انسان میں اصلاح کی گنجائش ہمیشہ رہتی ہے۔

ہندومت اگرچہ نوعیت کے لحاظ سے ایک گورکھ دھندہ ہے لیکن اسلام کی وجہ سے اُن کے بنیادی عقیدہ میں بھی فرق واقع ہوا۔ سکھ مت کے بانی، گورو نانک کا نظریہ توحید دراصل اسلام ہی کے بنیادی عقیدے کی صدائے بازگشت تھی۔ اس تحریک کی وجہ سے پنجاب کے ہندوؤں کی بہت بڑی کثرت بُت پرستی چھوڑ کر ایک خدا کی عبادت کرنے لگی۔ سکھ تحریک پر اسلامی تصورات کی گہری چھاپ تھی۔ اس کے علاوہ بھی ہندوؤں میں کئی ایک تحریکیں اُٹھیں جن کے ذریعے اُن کے بنیادی عقائد میں اصلاح ہوئی۔ اس کی زندہ مثال "آریہ سماج" ہے جو باوجود اپنی ہندوانہ روش اور عبادت

ریاضت کی روایتی رسوم ورواج کے تمام دیوی دیوتاؤں سے بلند تر تصور اللہ کے قائل ہیں جسے پرمیشر اور ایشور جیسے الفاظ سے یاد کیا جاتا ہے ویسے بھی سوامی دیانند جیسی بعض ہستیاں اُن کے درمیان پیدا ہوئیں جنہوں نے دیومالائی تصورات کے خلاف جہاد کیا بعض ایسے بھی لوگ اُبھرے جنہوں نے اواگون جیسے مسئلے پر خالص فلسفیانہ انداز میں بحث کرکے اس کی نامعقولیت کے خلاف لکھا۔ بعض نے اس کے خلاف نظریۂ ارتقاء کے حق میں براہین و دلائل فراہم کئے۔ غرضیکہ نظریات و عقائد میں گزشتہ چند صدیوں میں جو دنیا کے ہر گوشے میں اصلاح کی صورت پیدا ہوئی۔ اس کا تمام تر سہرا اسلام کے سر ہے ورنہ اس سے قبل دُنیا ایک ہی ڈگر پر چل رہی تھی۔

۲۔ احترامِ آدمی

گزشتہ صفحات میں یہ بات وضاحت کے ساتھ بیان کی جا چکی ہے کہ اسلام سے قبل دُنیا کے تمام ممالک اور علاقوں میں ہر سوسائٹی مختلف معاشی مذہبی اور سیاسی طبقات میں بٹی ہوئی تھی جس میں نچلے طبقے کے لوگ اعلیٰ درجے کے افراد کے ہاتھوں غربت، افلاس اور غلامی کی زندگی بسر کر رہے تھے اس سے پہلے اگر کسی جرأت مند انسان نے اس کے خلاف آواز بلند بھی کی تو اُسے یا تو زہر کا پیالہ پینا پڑا، یا صلیب پر چڑھنا پڑا یا خشت زنی کا شکار ہونا پڑا۔

اسلام نے پہلی بار صحیح معنوں میں حقوقِ انسانی کی بات کی۔ اور بتایا کہ انسان اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کی حکمت و صنعت کا شہکار ہے۔ اس لئے یہ اُس کے وقار و شرف کے منافی ہے کہ وہ اپنے خالق کے علاوہ کسی انسان، دیوتا یا بُت کے سامنے سرِ نیاز خم کرے اور دستِ طلب دراز کرے۔ اس سادہ سے اعلان نے انسان کو اُس کے خود ساختہ خداؤں، آقاؤں اور دیوتاؤں کے چنگل سے نجات دِلوائی۔ لیکن چونکہ یہ آواز سب سے الگ، منفرد اور سوسائٹی کے اعلیٰ طبقے کے مزاج کے خلاف تھی، اس لئے مکہ میں آپؐ کی اشاعت نہ کر سکے۔ ہجرتِ مدینہ نے آپؐ کے لئے زبردست موقعہ فراہم کیا تاکہ آپؐ اس پیغام کو تمام عالمِ انسانیت تک پہنچا سکیں اس پیغام کا نقطۂ آغاز مہاجرین اور انصار کے درمیان رشتہ مواخاۃ کا اعلان تھا جس کا تذکرہ کیا جا چکا ہے اور نقطۂ انتہا۔ خطبہ حجۃ الوداع ہے، جسے دنیائے انسانیت کا پہلا منشور کہا جا سکتا ہے۔

یہ خطبہ اپنی سلاست، بلاغت، جامعیت اور معنویت کے لحاظ سے عربی ادب کا شہ پارہ ہے اور اپنے مندرجات کے اعتبار سے ایک ایسی دستاویز ہے، جس سے گزشتہ چودہ سو سال سے استفادہ کیا جاتا رہا ہے اور آئندہ قیامت تک استفادہ کیا جاتا رہے گا۔ اس کے مخاطب کسی خاص مذہب، فرقے، ملک، معاشرے اور نسل کے لوگ نہیں ہیں بلکہ تمام دنیا کے لوگ ہیں۔

یہ خطبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کے اُس دور میں دیا جب آپؐ کو اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ اب اسلام کا پیغام تمام بنی نوع انسان تک پہنچ سکے گا۔ آپ نے سب سے پہلے، ذات پات، رنگ نسل اور قبائلی اور علاقائی عصبیتوں کو غلط قرار دیتے ہوئے فرمایا" لوگو! اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "انسانو! ہم نے تمہیں ایک ہی مرد و عورت سے پیدا کیا۔ اور تمہیں جماعتوں اور قبائل میں بانٹ دیا کہ تم الگ الگ پہچانے جا سکو۔ تم میں زیادہ عزت والا وہی ہے جو زیادہ متقی ہے" چنانچہ نہ کسی عرب کو کسی عجمی پر کوئی فوقیت حاصل ہے، نہ کسی عجمی کو عرب پر۔ نہ کالا گورے سے افضل ہے، نہ گورا کالے سے۔ ہاں بزرگی اور فضیلت کا معیار ہے تو تقویٰ"۔

" انسان سارے ہی آدم کی اولاد ہیں اور آدم کی حقیقت یہ ہے کہ وہ مٹی سے بنائے گئے تھے۔ اب فضیلت و برتری کے سارے دعوے خون و مال کے سارے مطالبے اور سارے انتقام میرے پاؤں تلے روندے جا چکے ہیں"۔

یہ محض نظریاتی بات نہیں تھی، حضور علیہ السلام نے اس پر عمل کر کے بھی دکھایا۔ کیا سیدنا بلال، حضرت زید بن حارثؓ، اسامہ بن زید اور بہت سے صحابہ کرام کالے رنگ کے نہ تھے جن کا اسلام سے قبل عرب سوسائٹی میں کوئی مقام نہ تھا۔ لیکن دائرہ اسلام میں داخل ہونے کے بعد اُن کی عزت و توقیر میں جو اضافہ ہوا۔ سب کو معلوم ہے۔ آپؐ کے صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور عامۃ المسلمین نے ہر دور میں حضور کے ارشاد پر عمل کیا۔ آج بھی مساجد میں اس کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ اور اگر بین الاقوامی سطح پر اس کے اثرات دیکھنے ہوں تو حج کے لئے تشریف لے جائیے، جہاں ہر ملک، ہر علاقے، ہر رنگ، نسل اور مرتبے کے لوگ بیک وقت، ایک ہی لباس میں ملبوس، ایک ہی صف میں استادہ مناسکِ حج ادا کرتے ہوئے نظر آئیں گے۔

اسلامی معاشرے کا تو یہ طرۂ امتیاز رہا ہے ہی، لیکن جب مسلمان عساکر، تاجر، صوفیہ اور مبلغین دوسرے ممالک میں پہنچے اور اُنہوں نے اخوت و مساوات کا مظاہرہ کیا تو اس کا اثر دوسری اقوام پر بھی پڑا۔ صرف ہندوستان کی مثال لے لیجئے کیونکہ ذات پات کی تقسیم میں یہ سرفہرست تھا کیا آج ہندو معاشرہ میں شودر کا وہی مقام ہے۔ جو ہندوستان میں اسلام سے قبل تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اُن کے ہاں اب بھی ذہنوں اور خیالوں میں یہ امتیاز باقی ہے لیکن عملی طور پر اس میں بہت فرق واقع ہو چکا ہے۔ یہی صورت حال دوسرے مشرق و مغرب سب معاشروں کی ہے۔ اُن کے نقطہ ہائے نظر میں جو انسانی عظمت کے سلسلہ میں واضح تبدیلی رونما ہوئی ہے اس میں براہِ راست یا بالواسطہ اسلام کا ہاتھ کارفرما ہے۔

قبل اسلام دُنیا کی ہر سوسائٹی میں سب سے مظلوم طبقہ غلاموں کا تھا۔ حضورؐ نے ان کے بارے میں اپنے اِس بصیرت افروز خطبے میں ارشاد فرمایا اُس کے الفاظ یہ ہیں۔ "لوگو! ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور سارے مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں اپنے غلاموں کا خیال رکھو۔ ہاں غلاموں کا خیال رکھو۔ اُنہیں وہی کھلاؤ جو خود کھاتے ہو۔ ایسا ہی پہناؤ جیسا تم پہنتے ہو۔"

یہ الفاظ ممکن ہے آج اتنے زیادہ حوصلہ افزا اور حیرت انگیز محسوس نہ ہوں۔ لیکن اگر ہم تاریخی تناظر میں اس کا جائزہ لیں تو ان کی اہمیت واضح ہو جائے گی۔ خاص طور پر جب ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام کی ابتدائی چند صدیاں اسلامی غلبہ اور مسلمانوں کی فتوحات کا زمانہ تھا جس کے نتیجہ میں مفتوحہ اقوام میں سے لاکھوں کی تعداد میں غلام آئے کیونکہ اسلام میں غلام صرف جنگی قیدی کی صورت ہی میں اس درجہ کو پہنچ سکتا ہے غلامی کی باقی تمام صورتیں ناجائز ہیں۔ بہرحال کیا دورِ فتوحات میں مسلمان حکومتوں کے ہاتھ آنے والے سب غلام، ہمیشہ غلامی کی زندگی بسر کرتے رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے غلاموں کو آزاد ہونے کے اتنے مواقع فراہم کئے کہ وہ اسلامی معاشرے میں جلد ہی نہ صرف آزادی حاصل کر لیتا تھا بلکہ اکثر اوقات اعلیٰ مقام تک جا پہنچتا تھا۔ مثلاً بعض غلام فدیہ دے کر آزاد ہو جاتے تھے۔ بعض "تدبیر، مکاتبت" اور "ام الولد" کے معروف طریقوں کے ذریعے آزادی حاصل کر لیتے تھے۔ اسلامی ریاست خود صدقات میں سے اُن کی قیمت چکا کر انہیں آزاد کراتی تھی۔ بعض مخیرّ اور خدا ترس مسلمان محض حصولِ تقویٰ کی غرض سے غلاموں کو آزاد کرتے رہتے تھے۔ بعض گناہوں کے کفارہ کے طور پر غلاموں کو آزاد کرتے تھے، بعض مسلمان سورج اور چاند گرہن کے اوقات میں غلاموں کو خرید کر آزاد کرتے تھے۔ ان تمام طریقوں کے بعد غلامی صرف برائے نام رہ جاتی تھی۔ اس پر طرّہ یہ کہ مسلمان گھرانوں میں بھی غلاموں کے ساتھ جو حسن سلوک کیا جاتا تھا اُس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اُن گھرانوں کے افراد متصوّر ہوتے تھے۔ جو دوسرے افراد خانہ کی طرح گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹاتے تھے۔ پھر جب دَورِ فتوحات ختم ہو گیا تو اسلامی معاشرے میں غلاموں کے اضافہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں نے غلاموں کے مرتبے اور حیثیت میں اس قدر اضافہ کیا کہ جس کا تصور دنیا کا کوئی معاشرہ کر ہی نہیں سکتا تاریخ اسلام میں کم از کم دو حکمران خاندان ایسے گزرے ہیں جن کا تعلق غلام نسل سے تھا۔ یعنی "مملوک مصر" اور ہندوستان کا "خاندانِ غلامان" کیا اس کی مثال کسی دوسرے مہذب، معاشرے اور ریاست

میں ملتی ہے۔

یہ تو تصویر کا ایک رخ تھا دوسرا رخ یہ ہے کہ جب دوسری قوموں کا مسلمانوں کے ساتھ ربط و ضبط بڑھا تو انہوں نے بھی غلامی کے مسئلہ پر نظر ثانی کی جس کی وجہ سے اُن کی سماجی اور معاشی حیثیت میں فرق واقع ہوا۔ البتہ اس ادارہ کا خاتمہ ڈنمارک میں ۱۷۹۲ء امریکہ میں ۱۷۹۴ء برطانیہ میں ۱۸۱۱ء میں اور فرانس میں ۱۸۴۵ء میں ہوا جبکہ اسلامی ممالک میں اسے ختم ہوئے زمانہ گزر چکا تھا۔ (انسائیکلو پیڈیا برطانیکا جلد ۲۰ عنوان "غلامی")

اسلام سے قبل دوسرا مظلوم طبقہ عورتوں کا تھا جن کے حالات کا مختصر سا جائزہ لے چکے ہیں۔ ان کے بارے میں حضورؐ نے خطبہ حجۃ الوداع میں جو کچھ ارشاد فرمایا اُس کے الفاظ یہ ہیں:۔

"لوگو! تمہارے اوپر تمہاری عورتوں کے کچھ حقوق ہیں۔ اُن سے بہتر سلوک کرو۔ کیونکہ وہ تمہاری پابند ہیں اور خود اپنے لئے کچھ نہیں کر سکتیں چنانچہ اُن کے بارے میں خدا کا لحاظ رکھو کیونکہ تم نے انہیں خدا کے نام پر حاصل کیا اور اُسی کے نام پر وہ تمہارے لئے حلال ہوئیں۔"

اس کے عملی پہلو کا اندازہ لگانا ہو تو رسالتماب صلی اللہ علیہ وسلم، آپ کے صحابہؓ اور عامۃ المسلمین کی خانگی زندگی کا مطالعہ کیا جائے معلوم ہوگا کہ دورِ فتوحات میں بالخصوص اور عام حالات میں بالعموم جن مسلمانوں نے متعدد شادیاں کیں، انہوں نے اپنی تمام بیویوں کے ساتھ کیسا سلوک کیا یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ اسلامی معاشرے میں ہر دور میں عورتوں کو ہر شعبۂ زندگی میں برابر کے حقوق دیئے گئے۔ والدین، خاوند اور اولاد کی جائداد میں عورتوں کا حصہ بھی مخصوص کیا گیا، نکاح میں اُن کی رضامندی ضروری رکھی گئی۔ زندگی کے مختلف شعبوں میں انہیں حصہ لینے کی اجازت دی گئی۔ طلاق کی صورت میں اگرچہ اصل فیصلہ مرد کے ہاتھ میں ہے، تاہم بعض ناگزیر حالات میں اُسے خلع کی اجازت دی گئی۔ اصل بات یہ ہے کہ یہاں ہمارا مقصد اسلام میں حیثیت نسواں کا تعین کرنا نہیں ہے۔ صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ اسلام نے جو حقوق اور مراعات اس صنف کو دیئے ہیں وہ کسی اور معاشرے نے نہیں دی نیز ماں، بہن، بیٹی اور بیوی کی حیثیت سے جو اس کا مقام ہے اُس کا مقابلہ مہذب دنیا کی عورتیں بھی نہیں کر سکتیں۔

اسلام کا یہ احسان صرف مسلمان عورتوں پر ہی نہیں ہے۔ بلکہ تمام عالم نسواں پر ہے کیونکہ جب مجاہدین دوسرے بلاد و امصار میں گئے اور وہاں کی غیر مسلم رعایا نے اُن کا سلوک عورتوں کے ساتھ دیکھا تو اس کا اثر اُن پر بھی پڑا۔ ہندوستان میں ستی کی رسم اگرچہ بالکل ختم تو نہ ہو سکی تاہم مسلمانوں کے دورِ اقتدار میں اس میں بہت حد تک کمی واقع ہوئی۔ بیوہ عورتوں کی شادی بھی ہونے لگی۔ غرضیکہ اسلام کے سایۂ عاطفت میں ہی ہندی عورت نے بھی سکھ کا سانس لیا۔ مسلمانوں کے دیکھا دیکھی یورپ اور مشرق بعید کے ممالک میں بھی عورتوں کی آزادی اور تحفظ کے لئے تحریکیں اٹھیں اور انہیں خاصی حد تک کامیابی ہوئی۔

رسولِ رحمت نے جب منشورِ انسانی دیا اُس کے بعد سے دنیا کے مختلف ممالک میں انسانی حقوق کے تحفظ کے لئے بڑی بڑی تنظیمیں قائم ہوئیں ادارے وجود میں اور انجمنیں بنائی گئیں، انہوں نے کسی حد تک اس مقصد میں کامیابی حاصل کی حقوق انسانی کے تحفظ کا سب سے زیادہ دعویدار "اقوامِ متحدہ" ہے۔ اُس نے اپنے منشور کی شق نمبر ایک میں یہ بات کہی ہے "تمام انسان آزاد پیدا ہوئے ہیں اور اپنے رتبے اور حقوق میں مساوی ہیں"

اول تو ان الفاظ میں اجمال و ابہام ہے دوسرے یہ کہ شاید اسی ابہام کی وجہ سے یہ ادارہ بھی انسانوں کو اُن کے اصل حقوق دلوانے میں زیادہ مؤثر ثابت نہیں ہوا۔ تاہم اس کی کوشش کو سراہا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ بات بھی کہی جا سکتی ہے کہ اس ادارے کے سامنے بھی "حقوق انسانی کے سب سے بڑے مؤید" سیدنا محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خطبہ حجۃ الوداع کا متن رہا ہوگا جس میں تمام طبقات کے انسانوں کے حقوق کے تحفظ کی ضمانت دی

گئی ہے۔

اسلام سے قبل مذہب بھی انسانی احترام کے راستے میں ایک بہت بڑی رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ کسی جگہ کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ سوادِ اعظم کے ہاتھوں اقلیتوں نے بڑے دکھ اٹھائے۔ آلِ اسرائیل کے زمانۂ اقتدار میں غیر اسرائیلی اقوام نے ہر علاقے میں ظلم ڈھائے۔ یونانی اور رومی یہودیوں پر مظالم ڈھاتے رہے۔ پھر جب شاہ قسطنطین نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا تو مشرقی رومی سلطنت میں رہنے والے یہودی، نصاریٰ کے ہاتھوں تختۂ مشق بنے رہے۔ اور سب سے برا حال تو ہندو معاشرے میں رہنے والے افراد کا تھا، جس نے اپنے ہی مذہب اور عقیدے کے ایک طبقہ کے لوگوں کا عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا۔

اسلام مذہب کے نام پر کسی قسم کے ظلم و ستم کی اجازت نہیں دیتا۔ صدرِ اسلام میں عرب میں یہودی، عیسائی، سبائی، بت پرست وغیرہ مختلف عقائد و نظریات کے لوگ آباد تھے۔ انہیں ہر طرح کی آزادی حاصل تھی۔ اگر ان کے ساتھ کوئی ناروا سلوک کیا بھی گیا تو اس کی ذمہ داری بھی ان پہ عائد ہوتی ہے۔ ورنہ عام حالات میں سب غیر مسلم سکون و امن سے رہتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے وصال سے تھوڑی دیر قبل مسلمانوں کو وصیت فرمائی تھی کہ آپؐ کے بعد اہلِ ذمہ (غیر مسلم رعایا) کا خاص خیال رکھا جائے اور یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ آپؐ کے ماننے والوں نے اس پر پوری طرح عمل کیا۔ حضرت عمر فاروق نے اپنی شہادت کے وقت یہ فرمایا کہ میں اپنے بعد ہونے والے خلیفہ کو یہ وصیت کرتا ہوں کہ وہ ذمیوں کے حقوق کی نگہداشت کرے اور اگر ضرورت پڑے تو ان کے حقوق کے تحفظ کے لئے جدال بھی کرے۔

مجموعی طور پر مسلمان حکمرانوں نے اپنی اقلیتوں کے ساتھ نہایت عادلانہ اور فراخدلانہ سلوک کیا۔ بلکہ بعض ادوار میں تو ان کی حالت مسلمانوں سے بھی بہتر تھی۔ ان کے اپنے معاملات کے لئے ان کی عدالتیں الگ تھیں جہاں ان کے قوانین کے مطابق فیصلے ہوتے تھے۔ سیکرٹریٹ اور فوجی شعبہ میں بھی غیر مسلم رعایا کے ناموں کا ثبوت ملتا ہے۔ خاص طور پر مالیات کے شعبہ میں ان کا عمل دخل بہت زیادہ تھا۔

اس حسن سلوک نے غیر اقوام کو بھی متاثر کیا۔ اور جہاں جہاں غیر مسلم حکومتیں قائم ہوئیں انہوں نے بھی اپنی اقلیتوں کو کسی حد تک مراعات دینے کی کوشش کی۔ آج تقریباً ہر مملکت میں اقلیتی امور سے متعلق وزارتیں یا محکمے قائم ہیں جن کا بنیادی مقصد یہی ہے کہ وہ اپنے زیرِ اقتدار اقلیتوں کو انصاف دیں اور ان کے حقوق کی دیکھ بھال کریں۔

۳۔ معراجِ علم و تحقیق

انسان بنیادی طور پر جاہل پیدا ہوا ہے، لیکن تجسس اس کی فطرت میں ہے۔ یہی جذبہ اسے اشیاء کی حقیقت، ماہیت اور حکمت کو جاننے کے لئے مجبور کرتا ہے۔ اسی کی وجہ سے اس کے دل و دماغ میں کیا؟ کیوں؟ اور کیسے؟ وغیرہ جیسے سوالات پیدا ہوتے ہیں اور پھر یہی جذبہ ان سوالات کے جواب کا ذریعہ بنتا ہے۔ جب ابتدائی دور کے انسان نے کرۂ ارضی پر آنکھ کھولی تو اس نے اپنے اردگرد کائنات کی بیکراں وسعتوں کو بکھرے ہوئے دیکھا جو لاتعداد حقائق اور حکمتوں کو اپنے اندر سموئے ہوئے تھی۔ اس نے ان سب پر غور و فکر کیا اور وقت کے ساتھ ساتھ اس پراسرار کائنات کے کھلتے گئے جسے وہ اپنے دماغ میں محفوظ کرتا رہا اور اسے آنے والی نسلوں کے سینوں میں منتقل کرتا رہا حتیٰ کہ اس نے شعور و آگہی کی وادی میں قدم رکھا۔ اس منزل پر انسان نے اپنی قوتِ مشاہدہ کو اور تیز کیا اور مزید تجربات کر کے علم کو محفوظ کرنے کا فن ایجاد کیا۔ یہی تجربات اس کے علم کی اساس و بنیاد

ٹھہرے۔گویا علم ہر دَور میں موجود تھا مگر اس کے حامل چند لوگ تھے۔

اس بنا پر ہم یہ بات نہیں کہہ سکتے کہ اسلام سے قبل انسان مکمل طور پر جہالت اور تاریکی میں بھٹک رہا تھا۔حقیقت یہ ہے کہ علم کسی نہ کسی شکل میں موجود تھا لیکن اس کا افادہ محدود تھا۔اس پر صرف ایک خاص طبقہ کے لوگوں کی اجارہ داری تھی۔یورپ میں اہل کلیسا اس پر قابض تھے عوام کو اس کی نہ ضرورت تھی اور نہ ہی اُن کے پاس اس کے اکتساب کے ذرائع تھے۔ہندوستان میں اس پر صرف برہمنوں کا تصرف تھا۔چھوٹی ذات کے لوگ اسے حاصل تو کیا کرتے انہیں تو ہندومت کی بنیادی کتابوں کے اشلوک اور شبد سننے کی بھی اجازت نہ تھی۔عرب میں چند کاہن اور عارف اس کے دعویدار تھے۔بلاذری کی ایک روایت کے مطابق ظہور اسلام کے وقت مکہ میں صرف سترہ افراد پڑھے لکھوں میں شمار ہوتے تھے۔یہی صورتِ حال دوسرے ممالک کی تھی۔ایک زمانے میں روم اور یونان میں اس کا چرچا ضرور تھا لیکن وہ بھی صرف چند حکماء اور فلاسفہ کی حد تک۔

مکہ میں جب حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان نبوت فرمایا تو آپؐ نے تبلیغ دین کے ساتھ علم کے حصول پر بھی زور دیا۔باوجودیکہ آپؐ کا مکی دَور تمام تر صعوبتوں اور مصائب میں بسر ہوا پھر بھی آپؐ نے علم کی اشاعت کی مقدور بھر کوشش کی۔اس زمانے میں مندرجہ ذیل مقامات تعلیمی اور تدریسی مراکز کی حیثیت اختیار کر گئے تھے۔

۱۔ دارِ رسول۔یہاں پر اکثر مسلمان جمع ہوتے تھے اور حضور خود تعلیم دیا کرتے تھے۔

۲۔ دارِ ارقم۔مشہور جگہ تھی یہاں مسلمان اکثر جمع ہو کر علم و حکمت کی باتیں کرتے تھے۔

۳۔ دارِ اُم ہانی۔حضور کی پھوپھی کا گھر تھا۔واقعۂ معراج یہیں پیش آیا۔یہاں بھی علمی اور تبلیغی سرگرمیاں رہتی تھیں۔

۴۔ دارِ ابوطالب۔آپؐ کے چچا کا گھر تھا۔

۵۔ قبہ ابوبکر۔یہاں صدیق اکبر تعلیم دیا کرتے تھے۔

جب حضورؐ مکہ سے ہجرت کر کے اپنے صحابہ کے ساتھ مدینہ منورہ تشریف لائے تو دعوت حق کے لئے آپؐ کے سامنے صرف ایک بستی، ایک آبادی اور ایک شہر کے لوگ نہ تھے بلکہ آپؐ کے مخاطب تمام بنی نوع انسان تھے۔اس لئے آپؐ نے اپنے مشن کا آغاز اسی نقطۂ نظر سے کیا۔جہاں آپؐ نے انسان کو زندگی کی مختلف جہتوں اور حقائق سے آگاہ کیا۔اس کے ساتھ ہی آپؐ نے علم کی اشاعت کے لئے بھی اُسی خلوص اور جذبہ کے ساتھ انتظام کیا۔چنانچہ آپؐ نے سب سے پہلے علم کے لیے اجارہ داری کو ختم کر کے اسے پوری انسانیت کے لیے عام کیا اور فرمایا:

"طلب العلم فریضۃٌ علیٰ کل مسلمٍ و مسلمۃٍ"

یعنی طلبِ علم ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے۔

اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ مسلمانوں میں علم صرف کسی خاص طبقہ، خاص نسل، خاص رنگ، خاص علاقے کے لوگوں میں محدود ہو کر نہیں رہا بلکہ عربوں کے علاوہ، موالیوں، غلاموں، مردوں، عورتوں حتیٰ کہ مفتوحہ اقوام کے افراد تک پھیل گیا۔اس کی وجہ سے علم کا فیضان اور افادہ تمام انسانوں کو یکساں پہنچا۔اور اُس پر سے اہل کلیسا اور مذہبی طبقہ کی اجارہ داری ختم ہو گئی۔آج پوری دنیا کے لوگ بلا امتیاز، نسب ملت اور رنگ و نسل جو اکتساب علم کر رہے ہیں اور اس کا جو ثمر عام انسان کھا رہا ہے تو یہ اسلام ہی کا فیض ہے۔

دوسرا اہم کارنامہ جو علم کے سلسلے میں اسلام نے سرانجام دیا وہ ہے خود آگاہی۔اس سے قبل جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔انسان اپنی

حیثیت، مرتبہ اور کائنات میں اپنے مقام سے آگاہ نہ تھا۔ جس کی وجہ سے وہ غلامی کی کڑی زنجیروں میں بندھا ہوا تھا۔ جس سے مر کر ہی نجات حاصل ہو سکتی تھی۔ ہجرت کے بعد پیغمبر اسلام نے اپنے ماننے والوں کو یہ تعلیم دی کہ انسان جملہ مخلوقات میں اللہ تعالیٰ کا شاہکار ہے۔ اس کی وضاحت ہم "احترام آدمی" کے عنوان سے گزشتہ صفحات میں کر چکے ہیں اس لئے یہاں پر اعادہ کی ضرورت نہیں۔

تیسرا کارنامہ جو اسلام نے علم کے ذریعے سر انجام دیا وہ ہے خدا آگاہی۔ کیونکہ اُس کے نزدیک ہر وہ علم جو خدا شناس نہ ہو جہل مرکب کے مترادف ہے یہی وجہ ہے کہ صدر اسلام میں سب سے زیادہ زور قرآن کریم کے معانی، تفسیر اور احادیث نبوی کی تشریح و توضیح پر دیا گیا، کیونکہ علم کے یہ دو مصادر خدا شناسی کی صحیح ترجمانی کر سکتے تھے۔ تاہم ایسی روایات بھی ملتی ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ آپؐ نے اپنے صحابہ کو علم کی دوسری شاخوں پر توجہ دینے کی تلقین بھی فرمائی تھی۔ مثلاً زید بن ثابت سے یہ کہا گیا کہ وہ عبرانی، فارسی اور یونانی زبانیں سیکھیں کیونکہ اُس دور میں علم و فنون کی تحصیل کا سب سے اہم ذریعہ یہی زبانیں تھیں۔ اس فرمان پر حضرت زید بن ثابتؓ نے کماحقہٗ عمل کیا اور ایک روایت کے مطابق اُنہوں نے صرف سترہ ایام کے اندر عبرانی زبان سیکھی جس تعلیمی نظام کی اساس حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات طیبہ میں رکھی تھی، اس پر عہد خلفائے راشدین میں مزید اضافے ہوئے اور قرآن و حدیث کی حفظ و کتابت اور فقہی مسائل کی تعلیم و تدریس کے علاوہ اخلاقی شعار، اشال عرب اور ادب کو بھی نصاب تعلیم کا جزو بنایا گیا۔

یہ دور چونکہ برق رفتار فتوحات کے لئے خاص طور پر شہرت رکھتا ہے، اس لئے مسلمانوں کا واسطہ مفتوحہ اقوام سے بھی پڑا۔ جن کا کچھ نہ کچھ علمی ورثہ موجود تھا۔ مسلمانوں نے اُن سے بھی علم سیکھنے میں کوئی عار محسوس نہیں کی اور انتظامی امور، طریق جنگ، بین الاقوامی تجارت، تاریخ، سوانح نویسی طب اور دوسرے علوم میں اکتساب کیا۔ یہ صحیح ہے کہ اس دور نے کوئی بہت بڑا دانشور پیدا نہیں کیا، لیکن اس نے مسلمانوں میں وہ روح بیدار کی جس کے نتیجہ میں آنے والی صدیوں نے لاتعداد علماء فضلا دانشور اور محقق پیدا کئے اس دور نے تحقیق کے اصولوں کی بنیاد رکھی اور علم و تحقیق کی صحیح قدر و منزلت کی شناخت کروائی اس کی وجہ سے مسلمانوں میں علوم و فنون کے سیکھنے کی ایسی تڑپ اور لگن پیدا ہوئی جس نے اُنہیں دنیا کے مختلف خطوں اور علاقوں میں پھیلنے اور انھیں فتح کرنے کا عزم پیدا کیا تاکہ وہ مختلف مقامات پر اللہ تعالیٰ کی حکمت اور صنعت کو دیکھیں، پرکھیں، ضروری سمجھیں تو اُس میں ترمیم کر کے اپنائیں اور اضافہ کریں۔ اس کے نتیجہ میں بنو امیہ کے دور زوال اور بنو عباس کے عہد شباب و عروج میں تین قسم کی علمی تحریکات اُٹھیں۔ ۱۔ حرکت دینی۔ ۲۔ حرکت تاریخ و قصص و سیر نویسی اور ۳۔ حرکت فلسفیہ، منطق، کیمیا اور طب وغیرہ۔ ان تحریکوں کی وجہ سے مسلمانوں کے تمام طبقات میں علم و تحقیق کا زبردست شوق پیدا ہوا۔ ان کا نقطۂ آغاز مسجد نبوی تھا، جہاں اپنی حیات طیبہ میں حضور خود درس دیا کرتے۔ پھر یہیں سے عاشقان علم کی ایک جماعت پیدا ہوئی جنہیں اصحاب صفہ کہا جاتا ہے۔ ان کی بدولت علم مدینہ منورہ کے علاوہ قبائل عرب میں بھی پھیلا۔ رفتہ رفتہ تمام امصار میں مساجد میں مکاتب کھل گئے ان مکاتب میں بلے رضا کارانہ تعلیم و تدریس دی جاتی تھی۔ حضرت عمر بن عبد العزیز کے دور میں باقاعدہ معلمین اور مدرسین مقرر کئے گئے جنہیں سرکاری خزانہ سے تنخواہ ملتی تھی۔

خلفائے بنو عباس کے زمانے میں مساجد تعلیم کے لئے ناکافی ثابت ہونے لگیں تو مدارس کے لئے الگ عمارتیں بنانے کی ضرورت محسوس ہوئی اس کا رواج عام ہو گیا۔ مساجد میں بھی حسب سابق تعلیم دینے کا رواج جاری رہا۔ اصل بات یہ ہے کہ اس وقت تک دور فتوحات ختم ہو چکا تھا اس لئے خلفاء، سلاطین اور امراء وزراء کی توجہ علوم و فنون کی ترویج و اشاعت کی طرف مبذول ہوئی۔ علم کے لئے کتاب کی ضرورت تھی، اُس زمانے میں چھاپہ خانہ تو نہ تھے، اس لئے حکومت کی سرپرستی اور عوام کے شوق کی وجہ سے تمام ممالک اسلامیہ میں کتب خانے قائم ہوئے، جہاں ہر علم پہ اور ہر بڑے مصنف کی تصانیف محفوظ کر لی جاتی تھیں۔

مسلمانوں نے دورِ حاضر کے انسان پر ایک احسان یہ بھی کیا کہ دنیائے قدیم کے ممتاز دانشوروں، حکماء اور فلاسفہ کی نگارشات کو بھی منظرِ عام پر لائے۔ اس ضمن میں خلفائے بنوامیہ اور بنوعباس نے اسلامی مملکت کے بڑے بڑے شہروں میں لائبریریوں کے ساتھ دارالتراجم قائم کئے اور ماہرین کی خدمات حاصل کیں، جنھوں نے تھیلز (THALES) سے لے کر بطلیموس تک کی تصانیف عربی زبان میں منتقل کیں، اُن پر شرحیں لکھیں، اُن کی غلطیاں نکالیں اور اُن پر نہایت معقول اضافے کئے۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو آج کا انسان سقراط، افلاطون، ارسطو، جالینوس اور ایسے متعدد مصنفین کے کارناموں سے ناآشنا رہتا اور جن علوم پر اُنہوں نے کام کیا اُنہیں ابتداء سے شروع کرنا پڑتا۔

جب تشنگانِ علم کی پیاس اِن اداروں سے بھی نہ بجھی تو علم دوست مسلم خلفاء، سلاطین اور ملوک نے اپنی حدودِ خلافت، سلطنت اور مملکت میں بڑی بڑی یونیورسٹیاں قائم کیں، جہاں تمام مدارس و مکاتب کے فارغ التحصیل ماہرین اپنے شوق کے علوم میں تخصص کا درجہ حاصل کرتے تھے۔

مسلمانوں کے عہدِ زریں میں اس قسم کی جامعات کے لئے بغداد، قرطبہ، اشبیلیہ، غرناطہ، قاہرہ، بخارا، سمرقند وغیرہ خاص شہرت کے حامل رہے۔ ان اداروں میں علومِ نقلیہ کے علاوہ، تمام علومِ عقلیہ مثلاً طبیعیات، میکانیات، بصریات، فلکیات، ریاضی، ہندسہ، نباتیات، حیوانیات، طب، جراحت، کیمیا اور علم الادویہ وغیرہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔

ہمارا مقصد یہاں پر مسلمانوں کے علمی کارنامے بیان کرنا نہیں۔ یہ موضوع بہت طویل ہے اس کے لئے دفتر درکار ہوں گے۔ اصل مقصد یہ ہے کہ ان تمام علمی سرگرمیوں کا فائدہ صرف مسلمانوں ہی کو نہیں پہنچا بلکہ ان یونیورسٹیوں سے غیر مسلم طلبہ بھی یکساں مفید ہوتے تھے۔ ان میں سے اکثریت کا تعلق تو مقامی آبادیوں سے تھا تاہم بعض غیر مسلم طلبہ بیرونی ممالک سے آکر علم کے ان سرچشموں سے فیض حاصل کرتے تھے اور اپنے ممالک میں واپس جاکر اپنے ہم وطنوں کو اس سے روشناس کرتے تھے۔ غرضیکہ مسلمانوں نے اپنے دورِ عروج میں علم کے ذریعے انسانی تہذیب و تمدن کو وہ ترقی دی کہ وہ ویرانۂ عالم چمن زار بن گیا۔ اس حقیقت کا اعتراف اکثر مستشرقین نے کیا ہے۔ ہم یہاں پر صرف ایک بیان پر اکتفاء کرتے ہوئے رابرٹ بریفالٹ کا حوالہ پیش کرتے ہیں جو اپنی مشہور کتاب (MAKING OF THE HUMANITY) میں لکھتے ہیں۔

"مغربی ثقافت میں ایسا کوئی شعبہ نہیں جس میں عربی ثقافت کا رنگ نہ جھلکتا ہو لیکن ایک شعبہ تو ایسا ہے جس میں یہ اثر بالکل کھل کر سامنے آجاتا ہے اور یہی وہ شعبہ ہے جو درحقیقت عصرِ حاضر کی حقیقی قوت کا باعث اور اس کی فتوحات کا ذریعہ ہے۔ یعنی علم الاشیاء۔ سائنس کی روح، ہماری سائنس عربوں کی صرف اس حد تک مرہونِ منت نہیں کہ اُنہوں نے ہمیں عجیب و غریب نظریات و اکتشاف سے روشناس کیا بلکہ ہماری سائنس کا وجود اُنہی کا شرمندۂ احسان ہے۔"

اب تک جو کچھ بیان کر چکے ہیں، اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر دور اور ہر خطے کے انسان نے مختلف اسباب و وجوہات کی بنا پر انفرادی اور اجتماعی ہجرت کی جس کا اثر افراد اور اقوام پر پڑا لیکن جو ہجرتیں، انبیاء علیہم السلام نے منشائے ایزدی کے تحت کیں اُن کی وجہ سے انسانی تاریخ پر گہرے اثرات مرتب ہوتے رہے۔ جہاں تک سامی النسل قبائل کی ہجرتوں کا تعلق ہے۔ ان کے اثرات کو بھی ہم کسی حد تک تسلیم کرتے ہیں لیکن ان ہجرتوں کی پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے ساتھ کسی طرح کی مطابقت اور مماثلت نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اوّل الذکر ہجرتیں صرف معاشی نوعیت کی ضروریات پوری کرنے کے لئے کی گئی تھیں جن کا اثر بھی صرف مقامی لوگوں تک محدود رہا۔ جبکہ مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی جانب حضور علیہ السلام اور آپ کے صحابہ کی ہجرت کی نوعیت صرف مذہبی اور معاشرتی تھی۔ نیز یہ ہجرت صرف مدینہ جاکر ختم نہیں ہوئی بلکہ اس کے بعد اس کی ابتداء ہوئی اور ایک عالمی معاشرتی انقلاب

کا پیش خیمہ ثابت ہوئی جس نے اقوام و ملل، مذاہب و ادیان اور انسانی تہذیب و تمدّن کے ہر گوشہ کو متاثر کیا۔ تاریخ میں یہ عمل آج بھی جاری ہے اور جب تک یہ دنیا قائم رہے گی، جاری رہے گا حقیقت یہ ہے کہ ہجرت مدینہ کے بعد ہی آپؐ نے اپنے مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ اور وہ مشن یہ تھا کہ انسان کا اس کائنات میں کیا مقام ہے اور مختلف حیثیتوں سے اُن کے باہمی تعلقات کس طرح ہونے چاہئیں اور کائنات کے خالق کے ساتھ اُس کا کیا تعلق ہے؟ اس کے لئے آپ نے حقوق و فرائض پر مبنی ایک ضابطہ عطا فرمایا جس میں حقوق اللہ اور حقوق العباد کی حدود کا تعین کیا۔ حقوق اللہ کی بجاآوری کے لئے آپؐ نے تصورات اور عبادات کا جامع نظام دیا اور حقوق العباد کے لئے اپنا اسوہ بطور نمونہ پیش کیا اس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقعہ نہیں ہے۔ البتہ اس کی ضروری وضاحت کے لئے صرف اس قدر بیان کر دینا کافی ہو گا کہ انسان کی معاشرے میں مختلف حیثیتیں ہوتی ہیں وہ حاکم بھی ہوتا ہے اور شہری بھی۔ وہ باپ بھی ہوتا ہے اور بیٹا اور بھائی بھی۔ وہ تاجر بھی ہوتا ہے اور گاہک بھی۔ آجر بھی ہوتا ہے اور مزدور بھی۔ سپہ سالار بھی ہو سکتا ہے اور معمولی سپاہی بھی۔ آپ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کا مطالعہ کیجئے آپؐ کی زندگی ایک کھلی کتاب کی طرح ہے۔ آپؐ کی زندگی کا کوئی گوشہ انسانی آنکھ سے اوجھل نہیں ہے۔ آپؐ نے جس انداز سے زندگی بسر کی اور مختلف شعبوں، پیشوں، طبقات اور حیثیتوں کے لوگوں کے ساتھ جس طرح روابط و تعلقات کا مظاہرہ فرمایا اُس سے حقوق العباد کی حدود کا تعین مشکل نہیں ہے آپ نے یہ معیار صرف مسلمانوں کے لئے ہی نہیں پیش کیا بلکہ آپؐ کی ذات گرامی تمام بنی نوع انسان کے لئے ایک معیار ثابت ہوئی۔ جس سطح کا انسان چاہے آپؐ کی حیات طیبہ سے روشنی حاصل کر سکتا ہے غرضیکہ آپؐ نے افراد کو حقوق و فرائض کی زنجیر پہنا کر ایک ایسا مثالی معاشرہ قائم کیا جو نہ صرف آپؐ کے دَور مبارک میں مثالی تھا۔ بلکہ آنے والے تمام ادوار کے لئے ایک مثال بنا۔

معاشرے کے متعدد و اہم وظائف میں سے ایک ریاست بھی ہے۔ یہ معاشرے کے متمدن اور مہذب ہونے کی دلیل ہے ریاست اگرچہ نبوت کے مقاصد جلیلہ میں سے نہیں ہے تاہم یہ اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ ہجرت کے بعد مدینہ کی نئی سوسائٹی میں ایک منظم ادارہ وجود میں آیا جس کے وظائف میں انتظامیہ، عدلیہ اور مقننہ شامل تھے، اسی تنظیم کو مفکرین اور مؤرخین نے ریاست نبویہ یا ریاست مدینہ کا نام دیا ہے یہ ریاست وسعت اور رقبہ کے اعتبار سے اتنی بڑی نہ تھی لیکن اس کے تحت اس میں رہنے اور بسنے والوں کی خوشحالی، فارغ البالی، مرفہ الحالی حریت اور دیگر بنیادی شہری حقوق کا جتنا خیال رکھا گیا اُس کی مثال ہمیں آج کی مہذب ریاستوں کے منشوروں میں بھی نہیں ملتی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد اسی چھوٹی اور محدود ریاست کی بنیادوں پر مسلمانوں نے نہایت پُرشکوہ خلافتوں، سلطنتوں اور مملکتوں کی تعمیر کی۔ جس کے نتیجہ میں مہذب ممالک کے لوگ بھی مفتوحہ اقوام کی حیثیت سے داخل ہوئے یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ان اسلامی حکومتوں کے تحت جس قدر خوشحالی اور مذہبی اور سیاسی آزادی سے مفتوحہ اقوام لطف اندوز ہوئیں اُس کا عشر عشیر بھی اُنہیں اپنے ہم مذہب اور ہم وطن بادشاہوں اور حکمرانوں کی عملداری میں نصیب نہ تھا اس کا بیّن ثبوت یہ ہے کہ بعض اوقات جب کسی سیاسی یا فوجی حکمت عملی کے تحت مسلمانوں کو مفتوحہ مقامات سے اپنی فوجیں واپس بلانا پڑیں تو وہاں کی مقامی رعایا کی اکثریت نے اس پر آنسو بہائے اور اُن کے واپس آنے کی دُعائیں مانگیں۔

ان کوائف و حقائق کی روشنی میں ہم اگر ہجرت نبوی کا تجزیہ کریں تو بلا جھجک یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ یہ واقعہ تاریخ اسلام ہی کا عظیم واقعہ نہ تھا کہ جس کے بعد اسلام کی شوکت و عظمت میں بے پناہ اضافہ ہوا بلکہ تاریخ انسانی میں بھی اس کی اہمیت و خصوصیت کسی طرح کم نہیں ہے اس واقعہ نے انسانی تاریخ کو دو واضح ادوار میں تقسیم کر دیا۔ ایک انسان کی پیدائش سے لے کر ہجرت سے پہلے کا دور اور دوسرا ہجرت کے بعد کا دور اور

جو ابھی تک ختم نہیں ہوا۔ پہلے دَورِ طویل میں انسان نے صرف گھٹنوں کے بل چلنا سیکھا۔ جب کہ دوسرے دور کے انسان نے نہ صرف بھاگنا بلکہ فضا میں اُڑنا سیکھا۔ پہلے دور کا انسان سورج، چاند، ستاروں کے بارے میں غور و فکر کی منزل سے آگے نہ بڑھ سکا۔ دوسرے دور کا انسان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عطا کردہ فکر کے بل بوتے پر تسخیرِ ماہ و پروین کر رہا ہے اور جیسے جیسے وہ تسخیرِ کائنات میں کامیابیاں حاصل کرتا جائے گا۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ کیونکہ یہ چاند ستارے اور کہکشاں تو آپؐ کے پاؤں کی گرد ہے کیونکہ شب اسریٰ تمام کائنات آپؐ کے قدموں تلے تھی اور آپؐ کا جسم اطہر تمام افلاک کی بلندیوں سے گزرتا ہوا، سدرۃ المنتہیٰ پر اپنے رب کے حضور سجدہ ریز تھا۔

شب معراج عروج تو از افلاک گذشت
بمقامیکہ رسیدی نرسد ہیچ نبی

ہجرتِ مدینہ کے اسباب و محرکات

ڈاکٹر نثار احمد

قرآن اور سیرت رسول اللہ لازم و ملزوم ہیں۔ دینی و شرعی لحاظ سے بھی اور تاریخی و واقعاتی اعتبار سے بھی! دین کی تکمیل کے لئے بھی دونوں کی یکساں ضرورت و اہمیت ہے اور تاریخ اسلامی کیلئے بھی یہ دونوں اولین مآخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن سیرت رسول اللہ کا پہلا سرچشمہ اور مستند[1] مرجع ہے اگرچہ حضرت عائشہ نے یہ فرما کر "کَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآن" اس بات کی کافی وضاحت کر دی ہے کہ جو کچھ قرآن میں موجود ہے اس کا عملی نمونہ رسول اللہ کی زندگی میں پایا جاتا ہے۔ تاہم تاریخی طور پر بھی ہم دیکھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کریم کا نزول[2]، یکبارگی نہیں ہوا[3]۔ بلکہ آہستہ آہستہ[4] تیئیس سال کے عرصہ میں مکمل ہوا۔ اور یہ واقعہ[5] ہے کہ اس تیئیس سال کے عرصہ میں وقت، ضرورت اور حالات نے جو رخ بھی اختیار کیا اسی کے مطابق وحی الٰہی میں احکام و ہدایت کا اجراء ہوا۔ نزول وحی کا آغاز اس وقت سے ہوا جب کہ رسول اللہ کی عمر چالیس سال تھی اور وفات سے پہلے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ رسول اللہ کی حیات طیبہ کی آخری تیئیس سالہ سرگرمیوں پر قرآن شاہد عادل ہے اور اس عرصہ میں رسول اللہ کے اسوۂ حسنہ، افعال و کردار، اور مختلف حیثیتوں میں آپ کے طرز عمل کو صراحتاً یا کنایتاً بیان کرتا ہے جب کہ ابتدائی چالیس سالہ زندگی کے بارے میں بھی قرآن خاموش نہیں ہے بلکہ آپ کی ابتدائی زندگی، یتیمی، غربت، نشو و تربیت، تلاش حق، مشاغل و کردار، اور بعثت و نبوت کے مقدمات پر بھی نہ صرف پوری روشنی ڈالتا ہے۔ بلکہ آپ کی قبل بعثت کی زندگی کو بطور دلیل حجت کے لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے "فقد لبثت فیکم عمراً من قبلہ افلا تعقلون" اور "وانک لعلیٰ خلق عظیم" کہہ کر مجموعی طور پر آپ کی پوری مکی زندگی پر تبصرہ بھی کر دیتا ہے۔ مختصر یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے تمام نقوش و تاثرات قرآن حکیم میں جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔

۱۔ کیونکہ یہ جس عبارت میں اترا تھا۔ اسی میں آج تک محفوظ ہے۔ جس میں کسی قسم کی کمی بیشی تحریف و تحفیف اور نقصان و اضافہ کا امکان نہیں ہے دیکھئے سورہ حجر ۹) کہف (۱، ۲، ۲۷)، شعراء (۱۹۲، ۱۹۳، ۲۱۰، ۲۱۱) نجم ۳، ۴) حٰم سجدہ (۴۱، ۴۲) سبا ۶) الحاقہ (۵۱) بقرہ (۲)، یونس ۱۵۔

۲۔ شعراء ۱۹۳، بقرہ (۹۹)، مائدہ (۴۸) نحل (۴۴، ۶۴) طٰہٰ ۲، عنکبوت ۴۸، زمر (۲، ۴۱)

۳۔ کفار کا تو اعتراض ہی اس بات پر تھا کہ قرآن یکبارگی نازل کیوں نہ ہو گیا اسکا جواب سورہ فرقان میں دیا گیا دیکھئے سورہ فرقان ۳۲

۴۔ سورہ دہر ۲۳، انا نحن نزلنا علیک القرآن تنزیلا۔

۵۔ اسکی حکمت یہ بیان ہوئی کہ ولا یاتونک بمثل الا جئنٰک بالحق و احسن تفسیرا۔ (فرقان ۳۳)

اور دوسری تفصیلات کے دوش بدوش قرآن واقعات سیرت کا بھی حسین مرقع ہے اور یہاں یہ کہنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ چونکہ قرآن غیر متبدل صحیفہ اور لافانی کتاب ہے۔ اس لئے بیان سیرت کے لئے یہ کتاب وہ میزان بھی فراہم کر دیتی ہے جس کے پیش نظر واقعات سیرت کی چھان بین، تحقیق و تفتیش اور تجسس و تفحص آسان بن جاتی ہے کیونکہ یہ بات مسلّمہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عمل کا محرک صرف قرآن تھا۔ اور زندگی کے کسی گوشہ میں بھی آپ نہ اس سے تجاوز کر سکتے تھے نہ انحراف![1]

قرآنی نقطہ نظر سے اگرچہ تمام واقعات سیرت کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس وقت صرف واقعہ ہجرت کے ایک پہلو پر بحث کرنا مناسب ہے۔ ہجرت رسول کا واقعہ[2]، سیرت کا ایک انتہائی اہم باب ہے۔ تاریخی لحاظ سے اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور اس کے اسباب کی تعیین کی بھی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن غالباً قرآن کی روشنی میں ہجرت کے واقعات و اسباب کا قابل ذکر مطالعہ نہیں کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس مختصر سے مقالے میں ہجرت رسول کے اسباب و محرکات کا قرآنی جائزہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ہجرت کے لغوی معنی جدائی، علیحدگی اور ترک تعلق کے ہیں[3] جبکہ قرآن کی متعدد آیات[4] میں لغوی معنی کی رعایت رکھتے ہوئے مہاجرت سے مراد گھر بار ملک و وطن (دار الکفر) چھوڑ کر کسی دوسری جگہ (دار الاسلام) منتقل ہو جانے کے ہیں۔ مثلاً سورۃ نساء میں ایک مقام پر یہ ارشاد فرمایا گیا کہ ومن یھاجر فی سبیل اللہ یجد فی الارض مراغماً کثیراً وسعۃ ومن یخرج من بیتہ مھاجراً الی اللہ ورسولہ ثم یدرکہ الموت فقد وقع اجرہ علی اللہ[5] اور پھر بطور ایک مستقل اصطلاح قرآن

۱۔ سورہ یونس (۱۵)، نجم (۴،۳)

۲۔ ہجرت مدینہ کے لئے رسول اللہ کی مکہ سے روانگی کی تاریخ کو مورخین عام طور پر بیان نہیں کرتے ہیں لیکن سب کے نزدیک روانگی کا دن دوشنبہ کا تھا۔ اس وجہ سے غالباً یہ مقدس سفر یکم ربیع الاول مطابق ۱۳ ستمبر ۶۲۲ء بروز پیر شروع ہوا۔ پھر جملہ مورخین اور سیرت نگار اس بات پر متفق ہیں کہ قبا میں آپ کا ورود مسعود ۸ ربیع الاول مطابق ۲۰ ستمبر ۶۲۲ء بروز دوشنبہ ہوا۔ قبا میں رسول اللہ کا قیام چار روز رہا جیسا کہ مورخین اور اصحاب سیر کا اس پر اتفاق پایا جاتا ہے۔ البتہ صحیح بخاری کی ایک روایت ۱۴ دن کی ہے اور جسے علامہ شبلی نے بھی بغیر کسی دلیل کے صحیح مان لیا ہے۔ (سیرۃ النبی ج ۱ ص ۲۷۵) لیکن یہ ناقابل فہم بات ہے۔ کیونکہ قبا میں رسول اللہ کی آمد ۸ ربیع الاول کو ہوئی جس کا اعتراف علامہ شبلی نے بھی کیا ہے اور اس تاریخ کو دوشنبہ تھا۔ جیسا کہ خود علامہ شبلی نے حاشیہ میں تحریر کیا ہے کہ جدید حساب سے دوشنبہ کا دن آیا ہے تو جمعہ کا دن چار دن بعد ہی آئے گا۔ چودہ دن بعد تو اتوار ہوگا جبکہ یہ امر بھی مسلّم ہے کہ مدینہ میں آپ کا داخلہ جمعہ کے دن ہوا (جس کی صراحت طبری کے یہاں موجود ہے۔) خلاصہ یہ ہے آپ مکہ سے ہجرت فرما کر ۱۲ ربیع الاول بروز جمعہ مدینہ میں داخل ہوئے۔

۳۔ ہجرت لفظ ہجر سے ماخوذ ہے۔ یہ وصل کی ضد ہے۔ (ابن درید جمھرۃ اللغۃ ج ۲ ص ۸۰۔ دکن ۱۳۴۵ھ)

۴۔ قرآن نے لفظ ہجر اور اس کے مشتقات کو ۳۱ مقامات پر استعمال کیا ہے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔ المعجم المفہرس لالفاظ القرآن الکریم از محمد فواد عبد الباقی۔ مکتبہ وھبیہ۔ عابدین ۱۳۷۸ھ ص ۷۳۰، ۷۳۱، نیز قرآن کی یہ آیات خاص ہیں۔ بقرہ (۲۱۸)، نساء (۸۹)، حشر (۸)

۵۔ نساء (۱۰۰) ترجمہ: اور جو شخص اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گھر بار چھوڑ جائے، تو وہ زمین میں بہت سی جگہ کشائش پائے گا اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کر کے گھر سے نکل جائے اور پھر اس کو موت آ پکڑے تو اس کا ثواب اللہ کے ذمہ ہے۔

یہ بھی وضاحت کر دیتا ہے کہ اللہ کی راہ کے علاوہ کسی اور راہ یا مقصد کے لئے نقل مکانی ہجرت نہیں کہلاتی یہی وجہ ہے کہ جہاں کہیں ہجرت کا ذکر آیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ "فی سبیل اللہ" کے الفاظ بھی استعمال کئے گئے ہیں[1]۔ تاکہ یہ امر ثابت ہو جائے کہ ہجرت وہی معتبر ہے جو ایمان، اخلاص نیت اور فی سبیل اللہ کی شرائط کے ساتھ ہو۔ اس کی تشریح رسول اللہ نے اس طرح فرمائی ہے کہ "الاعمال بالنیات" فمن کانت ھجرتہ الی دنیا یصیبھا او امرأۃ ینکحھا فھجرتہ الی ما ھاجر الیہ ومن کانت ھجرتہ الی اللہ و رسولہ فھجرتہ الی اللہ و رسولہ[2]

یہ رسول اللہ کا صرف ارشاد ہی نہ تھا بلکہ آپ اور آپ کے صحابہ نے ہجرت بالفعل پورے اخلاص کے ساتھ اور رضائے الٰہی کے لئے کی تھی چنانچہ حضرت خباب کا بیان ہے کہ۔ کنا ھاجرنا مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نبتغی وجہ اللہ۔

قرآن ایک طرف تو وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون[3] کہکر انسان کے مقصد تخلیق کو متعین کر دیتا ہے۔ اور دوسری طرف یہ تعلیم دیتا ہے کہ اگر ایک جگہ خدا کی بندگی میں مشکلات درپیش ہوں اور زمین اس کے لئے تنگ ہو گئی ہو تو وہ جگہ وہ زمین اور وہ ملک چھوڑ دیا جائے کیونکہ اصل چیز قوم، وطن اور ملک نہیں ہیں بلکہ اللہ کی بندگی ہے اور ظاہر ہے کہ عبادت و اطاعت اور بندگی و غلامی رب کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے نئی دنیا آباد کرنی ہوگی، کہ خدا کی زمین تنگ نہیں ہے۔ اس مضمون کو سورہ عنکبوت میں ایک ہی جملے میں اسطرح سمیٹ کر رکھ دیا گیا ہے کہ:

یٰعبادی الذین امنوا ان ارضی واسعۃ فایای فاعبدون[4] اور سورۃ نساء کا انداز بیان یہ ہے کہ:

قرآن انسانی فطرت کی تمام باریکیوں اور اس کی طبیعت کے تمام تقاضوں پر نظر رکھتے ہوئے۔ بجا طور پر یہ محسوس کرتا ہے کہ ہجرت فی الواقع بڑا مشکل کام ہے[6] اس لئے جو لوگ اپنی عزیز ترین اشیاء کو چھوڑ کر، گھر بار لٹا کر ملک و وطن کو خیرباد کہہ کر عزیز و اقارب سے ترک تعلق کر کے بے سہارا، وبے یار و مددگار ہو کر، ہجرت کے لئے قدم اٹھاتے ہیں وہ فی الحقیقت اس بات کے مستحق ہیں کہ انہیں اجر و ثواب بھی ان کی ان قربانیوں کے شایان شان دیا جائے چنانچہ قرآن مہاجرین کے لئے اجر عظیم کی بشارت سناتے ہوئے متعدد انعامات کا ذکر کرتا ہے قرآن کہتا ہے انہیں اللہ کا فضل اور خوشنودی حاصل ہوگی[7]۔ وہی لوگ بلند مرتبہ اور کامیاب و

۱۔ بقرہ (۲۱۸)، نساء (۸۹، ۱۰۰)

۲۔ بخاری باب ہجرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم واصحابہ الی المدینہ

۳۔ ترجمہ: اعمال کا دارومدار نیت پر ہے۔ پس جس کی ہجرت دنیا کے لئے یا کسی عورت سے شادی کی نیت سے ہوگی تو یہ انہی چیزوں کیلئے ہوگی اور جو ہجرت اللہ اور رسول کے لئے ہوگی تو اسکی ہجرت انہی کی طرف ہوگی۔ (اور اس کا اللہ اور رسول کی خوشنودی میں شمار ہوگا)۔ ۳: ذاریات (۵۶)

۴۔ آیت (۵۶) ترجمہ: اے میرے بندو! جو ایمان لائے ہو! میری زمین فراخ ہے۔ تو میری ہی عبادت کرو!!!

۵۔ آیت (۹۷) ترجمہ: کیا خدا کا ملک فراخ نہیں تھا کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے۔

۶۔ جاء اعرابی الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فسألہ عن الھجرۃ فقال ویحک ان الھجرۃ شانھا شدید (بخاری)

۷۔ حشر (۸)

کامران ہونے والے ہیں۔ انہیں دائمی آسائش حاصل ہوگی [1] اللہ ان کی برائیوں اور سیئات کو مٹا دے گا اور دنیا میں بھی اچھا ٹھکانہ عطا فرمائے گا [2] اور وہ لوگ بالآخر آخرت میں بھی فائز المرام ہوں گے [3]

مہاجرین کے لئے قرآن میں جس اجر و ثواب کی بشارت سنائی گئی ہے اور جس کا خلاصہ ہم نے اوپر نقل کر دیا ہے ان سے اگرچہ مثبت طور پر ہجرت کی تحریک ہوتی ہے اور تسلی و تشفی کا سامان بہم پہنچتا ہے۔ لیکن ضرورت اس بات کی تھی کہ منفی طور پر ان موانعات کو بھی دور کر دیا جائے جو ہجرت کی راہ میں ہر مہاجر کو پیش آتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ایک آدمی متعدد وجوہ سے ہجرت کرنے سے رک سکتا ہے۔ مثلاً

(ا) اسے اپنے وطن میں آرام و آسائش حاصل ہے۔ دنیاوی لذتیں بہم ہیں اور زندگی کی دلچسپیاں اس کا دامن مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہیں اور اس کی ساری تگ و دو، شب و روز کی سعی و جہد اسی دنیا کی دولت و ثروت اور خوش حالی اور فارغ البالی کے حصول کیلئے وقف ہے تو ایسی صورت میں وہ پسند نہ کریگا کہ ان تمام چیزوں سے دامن جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہو۔

(ب) یہ بھی خدشہ لاحق ہو سکتا ہے کہ ایک ٹھکانہ اجاڑ کر نکل جائیں گے تو پھر دوسرا ٹھکانہ میسر بھی آئے گا یا نہیں۔ پھر ہجرت کے بعد کی زندگی، ذلت و محکومی کی نذر ہوگی یا واقعی بہتر انجام اور رفعت و سربلندی کی امید رکھی جا سکتی ہے؟

(ج) تمام مال و متاع سے اغماض برت لینے کے باوجود ہجرت کے بعد یہ مسئلہ سب سے زیادہ پریشان کن ہے کہ کھانے پینے اور رہنے سہنے کی کیا ضمانت ہے؟

یہ موانعات ہجرت کے باب میں فی الواقع بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ لہٰذا قرآن ان موانعات کو دور کرنے کیلئے جو ہدایات و تعلیمات پیش کرتا ہے۔ ان کا خلاصہ (حسب ترتیب بالا) یہ ہے:-

ا:- یہ دنیا اور اس کی تمام لذتیں، بے حقیقت، اس کی ترقی و خوشحالی، بے وقعت اور اس کا عروج و فروغ بے مایہ ہے اس سلسلے میں قرآن کی متعدد مکی سورتوں [4] میں مختلف انداز سے یہی مضمون دہرایا گیا ہے۔ مثلاً سورۂ یونس میں حیات دنیاوی کی مثال بارش سے دیتے ہوئے فرمایا گیا۔ انما مثل الحیاۃ الدنیا کماء انزلناہ من السماء فاختلط بہ نبات الارض مما یاکل الناس والانعام حتی اذا اخذت الارض زخرفہا و ازینت وظن اھلہا انہم قدرون علیہا اتہا امرنا لیلا او نہارا فجعلنٰہا حصیدا کان لم تغن بالامس کذالک نفصل الایات لقوم یتفکرون [5]

اسی طرح سورہ انعام میں ارشاد ہوا۔ وما الحیاۃ الدنیا الا لعب ولہو وللدار الاخرۃ خیر للذین یتقون، افلا تعقلون [6] سورہ کہف کا انداز تخاطب بڑا سخت ہے۔ قل ھل ننبئکم بالاخسرین اعمالا۔ الذین ضل سعیہم فی الحیاۃ الدنیا وھم یحسبون انہم یحسنون صنعا۔ اولٰئک الذین کفروا بایات ربہم ولقائہ فحبطت اعمالہم فلا نقیم لہم یوم القیامۃ وزنا۔ [7] اور سورۂ حجر میں رسول اللہ کو یہ ہدایت

ا۔ توبہ (۲۰، ۲۱) ۲ آل عمران (۱۹۵) نحل (۴۱)

۳۔ نحل (۴۱)، عنکبوت (۶۰)

۴۔ دیکھئے اعراف (۵۱)، نحل (۳۰)، کہف (۲۹)، سبا (۳۷)، وغیرہ

(بقیہ حواشی صفحہ آئندہ پہ ملاحظہ فرمائیں)

۶ت حکم سنایا گیا کہ لا تمدن عینیک الیٰ ما متعنا بہ ازواجاً منہم ولا تحزن علیہم[۱] ان تعلیمات کا مقصد یہ تھا کہ ہجرت کرنے والوں کے سامنے ان چیزوں کی قدر و قیمت کھل جائے جنہیں وہ بہت عزیز رکھتے ہیں اور جن کو چھوڑنے میں وہ اپنا سراسر نقصان تصور کر رہے ہیں، جبکہ ہجرت کرنے کی صورت میں انہیں اس مال و متاع سے زیادہ قیمتی چیز اللہ کی رضا اور خوشنودی اور آخرت میں اجر انہیں مل رہی ہے۔

چنانچہ ہجرت مدینہ کے سلسلے میں اس تعلیم کا عملی مظاہرہ دیکھنے میں آیا۔ مثلاً حضرت صہیب رضؓ رومی جب ہجرت کرنے لگے تو کفار قریش نے ان سے کہا کہ یہاں خالی ہاتھ آئے تھے اور اب خوب مالدار ہو گئے ہو۔ تم جانا چاہتے ہو تو خالی ہاتھ ہی جا سکتے ہو اپنا مال نہیں لے جا سکتے۔ حضرت صہیب رضؓ دامن جھاڑ کر کھڑے ہو گئے اور سب کچھ اہل مکہ کے حوالے کر کے اس حال میں مدینہ پہنچے کہ تن کے کپڑے کے سوا ان کے پاس کچھ نہ تھا۔ اسی طرح حضرت ام سلمہ اور ان کے شوہر ابو سلمہ اپنے دو ماہ کے بچے کے ہمراہ ہجرت کیلئے نکلے تو بنی مغیرہ (ام سلمہ کے خاندان) نے رستہ روک لیا اور ابو سلمہ سے کہا کہ تمہارا جی جہاں چاہے چلے جاؤ مگر ہماری لڑکی کو نہیں لیجا سکتے۔ مجبوراً حضرت ابو سلمہ بیوی کو چھوڑ کر چل دیئے۔ اسی اثناء میں بنی عبدالاسد (ابو سلمہ کے اہل خاندان) نے انہیں روک لیا، اور کہا کہ بچہ ہمارے قبیلہ کا ہے۔ اسے ہمارے حوالے کر دو۔ اس طرح بچہ بھی چھن گیا۔ لیکن حضرت ابو سلمہ کے عزم میں کوئی فرق نہ آیا اور وہ مدینہ روانہ ہو گئے۔ جبکہ ان کی اہلیہ حضرت ام سلمہ تقریباً ایک سال تک بچے اور شوہر کے غم میں تڑپتی رہی اور آخر کار بڑی مصیبت سے اپنے بچے کو حاصل کر کے مکے سے اس حال میں روانہ ہوئیں کہ اکیلی عورت گود میں بچہ لئے اونٹ پر سوار تھی اور ان راستوں پر جا رہی تھی جن سے مسلح قافلے بھی گذرتے ہوئے خطرہ محسوس کرتے تھے

(ب) دوسرے خدشہ کو دور کرنے کے لئے قرآن اپنے مخاطبین کے سامنے پچھلی تاریخ کے تمام اہم حوالے نقل کر کے اور انبیاء و رسل کے اہم واقعات سنا کر یہ حقیقت پیش کرتا ہے کہ ہجرت کی وجہ سے تمہیں پریشان و ہراساں ہونے کی ضرورت نہیں ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ۵ آیت (۲۴) ترجمہ: ” دنیا کی زندگی کی مثال مینہ کی سی ہے۔ کہ ہم نے اس کو آسمان سے برسایا، پھر اس کے ساتھ سبزہ جسے آدمی اور جانور کھاتے ہیں، مل کر نکلا۔ یہاں تک کہ زمین سبزے سے خوشنما اور آراستہ ہو گئی اور زمین والوں نے خیال کیا کہ وہ اس پر پوری دسترس رکھتے ہیں۔ ناگہاں رات کو یا دن کو ہمارا حکم (عذاب) آپہنچا تو ہم نے اس کو کاٹ (کر ایسا کر) ڈالا کہ گویا کل وہاں کچھ تھا ہی نہیں۔ جو لوگ غور کرنے والے ہیں، ان کے لئے ہم (اپنی قدرت کی) نشانیاں اسی طرح کھول کھول کر بیان کرتے ہیں۔

۶- آیت (۳۲) ترجمہ: ” اور دنیا کی زندگی تو ایک کھیل اور مشغلہ ہے اور بہت اچھا گھر تو آخرت کا گھر ہے (یعنی) ان کے لئے جو اللہ سے) ڈرتے ہیں۔ کیا تم سمجھتے نہیں؟“

۷- آیت (۱۰۳) تا (۱۰۵) ترجمہ: کہ دو کہ ہم تمہیں بتائیں جو اعمال کے لحاظ سے بڑے خسارے پر ہیں۔ وہ لوگ جن کی سعی دنیا کی زندگی میں برباد ہو گئی اور وہ یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ اچھے کام کر رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے پروردگار کی آیتوں اور اس کے سامنے جانے سے انکار کیا تو ان کے اعمال ضائع ہو گئے اور ہم قیامت کے دن ان کے لئے کچھ بھی وزن قائم نہیں کریں گے۔“

(حاشیہ صفحہ ہذا) ۱- آیت (۸۸) ترجمہ: ”اور ہم نے کفار کی کئی جماعتوں کو (جو فوائد دنیاوی سے) متمتع کیا ہے تم ان کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھنا اور نہ انکے حال پر تاسف کرنا۔“

کیونکہ ہجرت کے بعد کی زندگی میں تمہیں سرفرازی، رفعت و سربلندی اور کامیابی و کامرانی حاصل ہوگی جس طرح تم سے پہلے کی امتوں کو ملی تھی۔ واورثنا القوم الذین کانوا یستضعفون مشارق الارض ومغاربھا التی بٰرکنا فیھا[1]۔ اور کہا گیا کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں ہجرت کریں گے انہیں اللہ تعالیٰ اچھا ٹھکانا بھی فراہم کرے گا۔ انہیں خوشحالی و فارغ البالی بھی عطا کرے گا اور انہیں زمین کی خلافت و تمکنت بھی بخشے گا۔ والذین ھاجروا فی اللہ من بعد ما ظلموا لنبوئنھم فی الدنیا حسنۃ ولاجر الآخرۃ اکبر لو کانوا یعلمون۔ الذین صبروا وعلیٰ ربھم یتوکلون[2]۔ سورۂ انبیاء میں ارشاد ہوا: ولقد کتبنا فی الزبور من بعد الذکر ان الارض یرثھا عبادی الصالحون[3] سورۂ قصص کا پیرایۂ لطیف یہ ہے۔ وقالوا ان نتبع الھدیٰ معک نتخطف من ارضنا اولم نمکن لھم حرماً اٰمناً یجبیٰ الیہ ثمرات کل شئی رزقاً من لدنا ولکن اکثرھم لا یعلمون[4]۔ سورۂ ھود میں فرمایا گیا۔ ویستخلف ربی قوماً غیرکم[5]۔ یہاں ایک انتہائی اہم اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ قرآن نے صرف استخلاف فی الارض کی بالواسطہ یا بلاواسطہ پیشین گوئیوں پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ ایک طرف تو کھلی تاریخی صداقتوں کو دہراتے ہوئے حضرت موسیٰ کے حوالے سے یہ کہا کہ: قال موسیٰ لقومہ استعینوا باللہ واصبروا ان الارض للہ یورثھا من یشاء من عبادہ والعاقبۃ للمتقین۔ قالوا اوذینا من قبل ان تاتینا ومن بعد ما جئتنا قال عسیٰ ربکم ان یھلک عدوکم ویستخلفکم فی الارض فینظر کیف تعملون[6] مکہ کے مخصوص حالات میں ظاہر ہے حضرت موسیٰ کی اپنی قوم سے یہ گفتگو نہ صرف معنی خیز بلکہ حقیقت سے انتہائی قریب ہے۔ کیونکہ یہ تاریخی واقعہ سب کو معلوم ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سیاسی اقتدار و اختیار، غلبہ و تمکن اور خلافت ارضی کے مواقع ہجرت کے بعد ظہور آئے تھے اور مکی صورتوں میں سے ہی ایک سورۂ ابراہیم میں یہ فرما کر بلاغت کا اہتمام و اکمال کر دیا گیا کہ الم تر کیف ضرب اللہ مثلاً کلمۃ طیبۃ کشجرۃ طیبۃ اصلھا ثابت

۱۔ اعراف (۱۳۷) ترجمہ: اور جو لوگ کمزور سمجھے جاتے تھے۔ انکو زمین (شام) کے مشرق و مغرب کا جس میں ہم نے برکت دی تھی، وارث بنا دیا۔"

۲۔ نحل (۴۱، ۴۲) ترجمہ: "اور جن لوگوں نے ظلم سہنے کے بعد خدا کے لئے وطن چھوڑا، ہم ان کو دنیا میں اچھا ٹھکانہ دیں گے اور آخرت کا اجر تو بہت بڑا ہے۔ کاش وہ (اسے) جانتے۔ یعنی وہ لوگ جو صبر کرتے ہیں اور اپنے پروردگار پر بھروسہ رکھتے ہیں۔

۳۔ آیت (۱۰۵) ترجمہ: "اور ہم نے نصیحت (کی کتاب یعنی تورات) کے بعد زبور میں لکھ دیا تھا کہ میرے نیکوکار بندے ملک کے وارث ہوں گے۔"

۴۔ آیت (۵۷) ترجمہ: "اور کہتے ہیں اگر ہم تمہارے ساتھ ہدایت کی پیروی کریں تو اپنے ملک سے اچک لئے جائیں۔ کیا ہم نے ان کو حرم میں جو امن کا مقام ہے، جگہ نہیں دی۔ جہاں ہر قسم کے میوے پہنچائے جاتے ہیں۔ (اور یہ) رزق ہماری طرف سے ہے۔ لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے۔"

۵۔ آیت (۵۷) ترجمہ: "اور میرا پروردگار تمہاری جگہ اور لوگوں کو لا بسائے گا۔

۶۔ اعراف (۱۲۸، ۱۲۹) ترجمہ: "موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ خدا سے مدد مانگو اور ثابت قدم رہو۔ زمین تو خدا کی ہے اور وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے۔ اس کا مالک بناتا ہے۔ اور آخر کار بھلا تو ڈرنے والوں کا ہے۔ وہ بولے کہ تمہارے آنے سے پہلے بھی ہم کو اذیتیں پہنچتی رہیں اور آنے کے بعد بھی۔ موسیٰ نے کہا تمہارا پروردگار تمہارے دشمن کو ہلاک دے اور اس کی جگہ تمہیں زمین میں خلیفہ بنائے پھر دیکھے کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔

وفرعہا فی السمآء۔ توتی اکلہا کل حین باذن ربہا ویضرب اللہ الامثال للناس لعلہم یتذکرون [1]

اس آیت کا لفظی مفہوم کچھ ہی ہو یہ زبان حال سے نشو و نمائے دعوت اور فروغ اسلام کی نقیب ہے اور اس کے غلبہ و تمکن کی پیشین گوئی کر رہی ہے۔ بہر حال مندرجہ بالا آیات اور اسی قسم کی دوسری آیات کے مضامین مسلمانوں کو یہ سمجھانے کے لئے کافی ہیں کہ ہجرت کے بعد کی زندگی یقیناً ہجرت سے پہلے کی زندگی سے بہتر ہے۔ اور اللہ تعالیٰ مہاجرین کو ضرور ٹھکانا عطا فرمائے گا چنانچہ ان آیات کے نزول پر زیادہ عرصہ نہ گزرا ہو گا کہ دنیا نے ان کی مادی تعبیر دیکھ لی۔ کہ خود اہل مدینہ متعدد بار مکہ حاضر ہوئے اسلام لائے اور پھر مسلمانوں اور رسول اللہ کو اپنے یہاں آنے کی اجتماعی دعوت دی۔ بلکہ ہجرت سے کچھ ماہ پیشتر بیعت عقبہ ثانیہ کے موقع پر انہوں نے رسول اللہ سے جو معاہدہ کیا ہے۔ اس نے مسلمانوں کو ہجرت مدینہ کے لئے آمادہ کرنے کے ساتھ ساتھ رسول اللہ کو بھی ذہنی و نفسیاتی طور پر تیار کر دیا چنانچہ یہی موقعہ تھا کہ جس کے بعد مسلمانوں نے بھی مدینہ جانا شروع کر دیا۔ اور رسول اللہ نے بھی سفر مدینہ کی تیاریاں شروع کر دیں۔

(ج) ہجرت کے بعد سب سے اہم مسئلہ کھانے پینے، رہنے سہنے کی ضمانت کا ہے تو اس بارے میں قرآن کا سیدھا اور صاف بیان یہ ہے کہ [2] وکاین من دآبۃ لا تحمل رزقہا، اللہ یرزقہا وایاکم [3]۔ گویا یہ کہا جا رہا ہے کہ ہجرت کرنے پر فکر جان کی طرح فکر روزگار سے پریشان نہ ہونا چاہیئے، آخر بے شمار چرند و پرند اور آبی حیوان بھی تو ہیں جو سب کی آنکھوں کے سامنے، ہوا، خشکی اور پانی میں پھر رہے ہیں۔ بھلا ان میں سے کون اپنا سامان رزق اٹھائے پھرتا ہے؟ ظاہر ہے۔ اللہ ہی سب کو پال رہا ہے۔ جہاں جاتے ہیں، اللہ کے فضل و کرم سے ان کو کسی نہ کسی طرح رزق مل ہی جاتا ہے۔ لہٰذا یہ سوچ کر ہجرت سے منہ نہ موڑنا چاہیئے۔ کہ اگر ایمان کی خاطر چھوڑ کر نکل گئے تو کھائیں گے کہاں سے؟ اللہ تعالیٰ جہاں اپنی بے شمار مخلوق کو رزق دے رہا ہے۔ ان مہاجرین کو بھی ضرور دے گا۔ اگر بائبل کا بیان صحیح مانا جائے تو حضرت عیسیٰ نے بھی ایک موقع پر اپنے حواریوں سے گفتگو کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ "کوئی آدمی دو مالکوں کی خدمت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یا تو ایک سے عداوت رکھے گا۔ اور دوسرے سے محبت یا ایک سے ملا رہے گا۔ اور دوسرے کو ناچیز سمجھے گا۔ تم خدا اور آقا دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے۔ اس لئے میں تم سے کہتا ہوں کہ اپنی جان کی فکر نہ کرنا کہ ہم کیا کھائیں گے، کیا پئیں گے اور نہ اپنے بدن کی کہ کیا پہنیں گے۔ کیا جان خوراک سے اور بدن پوشاک سے بڑھ کر نہیں؟ ہوا کے پرندوں کو دیکھو کہ بوتے ہیں نہ کاٹتے ہیں نہ کوٹھیوں میں جمع کرتے ہیں پھر بھی تمہارا آسمانی باپ ان کو کھلاتا ہے۔ کیا تم ان سے زیادہ قدر و وقعت نہیں رکھتے؟ [4] قرآن کی اس ضمانت کی شہادت بھی

۱۔ آیت ۲۴، ۲۵، ترجمہ: "کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے کلمہ طیبہ کی کیسی مثال بیان فرمائی ہے (وہ ایسا ہے) جیسے پاکیزہ درخت جس کی جڑ مضبوط (یعنی زمین کو پکڑے ہوئے) ہو اور شاخیں آسمان میں ہوں اپنے پروردگار کے حکم سے ہر وقت پھل لاتا اور میوے دیتا ہو۔ اور خدا لوگوں کے لئے مثالیں بیان فرماتا ہے تاکہ وہ نصیحت پکڑیں۔" ۲۔ عنکبوت (۶۰) ۳۔ مزید دیکھئے: قصص (۵۷)

۴۔ ملاحظہ ہو۔ متی باب ۶ آیت ۲۴ تا ۲۷۔ کتاب مقدس
پاکستان بائبل سوسائٹی لاہور ۱۹۵۹ء

تاریخ نے اس وقت دیدی جب کہ رسول اللہ اور مسلمان ہجرت کر کے مدینہ پہنچے اور اہلِ مدینہ نے نہ صرف انہیں ٹھکانہ عطا کیا، اپنا گھر بار پیش کیا ان کے قیام و طعام کی ذمہ داری لی بلکہ دل و جان نذر کر کے رکھ دیئے اور اسی لئے ان کا نام "انصار" رکھا گیا۔

مندرجہ بالا مباحث سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن نے ہجرت کے لئے سامان ترغیب فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ راہِ ہجرت کی تمام رکاوٹوں کو بھی دور کر دیا تاکہ لوگوں کو ہجرت کرتے وقت کسی ذہنی کشمکش یا نفسیاتی الجھن کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ لیکن ہجرت کب اور کیسے کی جائے۔ اس کا تعین لازمی طور پر حالات ہی کر سکتے تھے۔ اس سلسلے میں قرآن حالات کا انتہائی حقیقت پسندانہ جائزہ لیتا ہے اور آہستہ آہستہ حالات کی رفتار اور تحریکِ اسلامی کا رخ دیکھ کر تعلیم و ہدایت کا اجراء کرتا ہے۔ چنانچہ ابتدائی مکی دور میں رسول اللہ کی دعوت و تبلیغ کے جواب میں کفار و مشرکین نے جو مخالفانہ اور معاندانہ رویہ اختیار کیا تھا۔ اس کے ضمن میں قرآن یہ کہتا ہے کہ دین کی دعوت و اشاعت ایک صبر آزما کام ہے اور تاریخ میں ہمیشہ یہی ہوتا رہا ہے کہ لوگوں کے سامنے جب اس قسم کی دعوت پیش کی گئی تو انہوں نے اسے قبول کرنے کے بجائے انکار، غرور، تضحیک و استہزاء، افواہ طرازی، اور الزام تراشی سے کام لیا اور بالآخر انبیاء و رسل پر ظلم و ستم ڈھانے بلکہ انہیں قتل کرنے میں بھی منکرینِ حق نے کسی تکلف سے کام نہیں لیا۔ کذبت قبلھم قوم نوح و اصحاب الرس و ثمود۔ وعاد و فرعون و اخوان لوط و اصحاب الایکۃ و قوم تبع کل کذب الرسل فحق وعید [۱]۔ مطلب یہ تھا کہ رسول اللہ اور مسلمانوں کے سامنے ایک طرف تو یہ حقیقت آ جائے کہ ایمان و اسلام کا دعویٰ کرنا کن کن قربانیوں کا متقاضی ہے۔ دوسری طرف یہ بتلا دیا جائے کہ سخت کٹھن حالات میں صبر و استقامت ضروری ہے۔ اس انداز بیان سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ قوم کی طرف سے محض تکذیب و تردید اور انکار و تمرد، ہجرت کا جواز معقول نہیں ہے۔ ہاں مکی دور متوسط میں جب ظلم و ستم کی چکی چلنی شروع ہو گئی اور لوگوں کو ایمان و اسلام کی خاطر سخت آزمائشوں سے گزرنا پڑا تو عارضی حکمت عملی کے طور پر ہجرت حبشہ کی اجازت دی گئی۔ ہجرت حبشہ سے غالباً یہ اندازہ بھی ہو گیا کہ ہجرت کی صورت میں کفار کا طرز عمل کیا ہو گا اور آئندہ مستقل ہجرت کی صورت میں کن کن ضروریات کا لحاظ کرنا ہو گا۔ پھر حالات نے جیسے جیسے شدت اختیار کی اور مکہ کی سرزمین مسلمانوں کے لئے "تنگ سے تنگ تر ہوتی چلی گئی تو اسی کی مناسبت سے قرآن حکیم کا انداز تخاطب بھی بدلتا چلا گیا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مکی دور کے آخری دو تین سالوں میں نازل ہونے والی سورتوں میں ایک طرف تو ایسے انبیاء و رسل کی زندگیوں کے واقعات کو خاص طور پر دہرایا گیا۔ جنہوں نے معنوی طور پر کفر و شرک سے جدائی اور طاغوت کی بندگی و اطاعت سے اظہار برأت کیا تھا اور ظاہری طور پر بھی ایک جگہ خدا کی زمین تنگ ہو جانے کے بعد دوسری جگہ ہجرت فرمائی تھی اور تاریخی تسلسل سے یہ بھی ثابت کر دیا گیا کہ ہجرت سنتِ انبیاء رہی ہے۔ سورۂ ابراہیم میں ارشاد ہوا وقال الذین کفروا لرسلھم لنخرجنکم من ارضنا او لتعودن فی ملتنا فاوحیٰ الیھم ربھم لنھلکن الظلمین ولنسکننکم الارض من بعدھم [۲] اور سورۂ اعراف میں فرمایا گیا: قال الملاء الذین استکبروا من قومہ لنخرجنک یشعیب والذین

۱۔ ق (۱۲، ۱۳، ۱۴) ترجمہ: "ان سے پہلے نوح کی قوم اور کنوئیں والے اور ثمود جھٹلا چکے ہیں اور عاد اور فرعون اور لوط کے بھائی، اور بن کے رہنے والے اور تبع کی قوم (غرض) ان سب نے پیغمبروں کو جھٹلایا تو ہمارا (عذاب کا) وعید بھی پورا ہو کر رہی ۲۔ آیت ۱۳، ۱۴ (ترجمہ اگلے صفحہ پر)

آمنوا معک من قریتنا او لتعودن فی ملتنا[1]۔ نیز جن انبیاء و رسل کی زندگیوں کو مثال اور نمونہ کی حیثیت سے پیش کیا گیا انہی سے خاص پر حضرت ابراہیم کا تذکرہ مختلف پیرائے میں بار بار کیا گیا ہے بلکہ قرآن رسول اللہ سے ایک جگہ تو اتباع ابراہیمی کا مطالبہ کرتا ہے[2]۔ اور دوسری جگہ ان کے اسوہ کو مسلمانوں کے لئے واجب الاتباع قرار دیتا ہے چنانچہ سورہ ممتحنہ میں دو مقامات پر اس کا حکم دیا گیا ہے پہلے یہ کہا گیا ہے کہ قد کانت لکم اسوۃ حسنۃ فی ابراھیم والذین معہ اذ قالوا لقومھم انا برءٰؤا منکم و مما تعبدون من دون اللہ[3] اور کچھ آگے فرمایا۔ لقد کان لکم فیھم اسوۃ حسنۃ[4] اور یہ سب بتاتے ہیں کہ اسوہ ابراہیمی کی سب سے بڑی خصوصیت ہجرت ہی ہے۔ حضرت ابراہیم نے معنوی طور پر کفر و شرک بت پرستی اور صنم پرستی سے ترک تعلق اختیار کیا پھر ظاہری طور پر اپنے باپ آزر اور اپنی قوم کو چھوڑ کر ہجرت کی اور مختلف دیار و امصار کا سفر کرتے ہوئے بالآخر مکہ (وادی غیر ذی زرع) تشریف لائے۔ یہی حال حضرت موسیٰ کی ہجرت کا ہے۔ حضرت موسیٰ کی ہجرت کے سلسلے میں سورہ بنی اسرائیل میں یہ ارشاد فرمایا گیا کہ فاراد ان یستفزھم من الارض فاغرقنٰہ ومن معہ جمیعا وقلنا من بعدہ لبنی اسرائیل اسکنوا الارض[5]۔ سورۂ بنی اسرائیل واقعہ معراج کے بعد ہجرت سے تقریباً ایک سال قبل نازل ہوئی۔ اس زمانے میں حضرت موسیٰ کی ہجرت کا جس انداز بلکہ جن الفاظ کے ساتھ تذکرہ کیا گیا ہے وہ بڑا معنی خیز ہے۔ کیونکہ اسی سورہ میں رسول اللہ سے بھی خطاب فرما کر کم و بیش یکساں الفاظ و معانی کے ذریعہ تاریخ دہرائی گئی ہے۔ وان کادوا لیستفزونک من الارض لیخرجوک منھا واذاً لا یلبثون خلفک الا قلیلا[6]۔ یعنی یہ لوگ اس بات پر بھی تلے ہوتے ہیں کہ تمہارے قدم اس سرزمین سے اکھاڑ دیں اور تمہیں یہاں

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) اور جو کافر تھے انہوں نے اپنے پیغمبروں سے کہا کہ (دیا تو) ہم تم کو اپنے ملک سے باہر نکال دیں گے یا ہمارے مذہب میں داخل ہو جاؤ تو پروردگار نے ان کی طرف وحی بھیجی کہ ہم ظالموں کو ہلاک کر دیں گے۔ اور ان کے بعد تم کو اس زمین میں آباد کریں گے۔"

۱ آیت (۸۸) ترجمہ: (تو) ان کی قوم میں جو لوگ سردار اور بڑے آدمی تھے وہ کہنے لگے کہ شعیب (یا تو) ہم تم کو اور جو لوگ تمہارے ساتھ ایمان لائے ہیں ان کو اپنے شہر سے نکال دیں گے یا تم ہمارے مذہب میں آ جاؤ۔"

۲۔ نحل (۱۲۳) الفاظ یہ ہیں ثم اوحینا الیک ان اتبع ملۃ ابراھیم حنیفا۔"

۳۔ آیت (۴) ترجمہ: "تمہارے لئے ابراہیم اور ان کے رفقاء کا اسوہ حسنہ واجب ہے۔ جب انہوں نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ ہم تم سے اور ان (بتوں) سے جن کو تم خدا کے سوا پوجتے ہو اظہار برأت کرتے ہیں"۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی حضرت ابراہیم کی طرح ہجرت ظاہری سے بہت پہلے اس ہجرت معنوی کا اتباع کرتے ہیں چنانچہ زبان رسالت سے یہ کہلایا گیا کہ اور اگر یہ تمہاری تکذیب کریں تو کہہ دو کہ مجھ کو میرے اعمال کا (بدلہ ملے گا) اور تم کو تمہارے اعمال (کا)، تم میرے اعمال پر جواب دہ نہیں ہو اور میں تمہارے اعمال کا جواب دہ نہیں ہوں۔

۴ آیت (۶) ترجمہ: تم (مسلمانوں کے لئے) ابراہیم اور ان کے رفقاء کا طرز عمل عمدہ نمونہ ہے۔

۵۔ آیت (۱۰۳ و ۱۰۴) ترجمہ: تو اس (فرعون) نے چاہا کہ ان کو سرزمین (مصر) سے نکال دے تو ہم نے اسکو اور جو اس کے ساتھ تھے سب کو ڈبو دیا۔ اور اس کے بعد بنی اسرائیل سے کہا کہ تم اس ملک میں رہو سہو۔ ۶ آیت (۷۶)

سے نکال باہر کریں۔ لیکن اگر یہ ایسا کریں گے تو تمہارے بعد یہ خود یہاں کچھ زیادہ دیر نہ ٹھہر سکیں گے۔ یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ جب بھی اللہ کی راہ میں ہجرت کی جاتی ہے اور مومن عبادت رب کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے ایک جگہ چھوڑ کر دوسری جگہ جاتے ہیں تو اس کے نتیجہ میں بالآخر حق غالب ہوتا ہے اور کفر مغلوب، مہاجرین فتح یاب ہوتے ہیں اور منکرین و متخلفین مفتوح جیسا کہ حضرت موسیٰ کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے۔ یہ آیت ہجرت کے آنے والے قریب ترین وقت کا درپردہ اعلان بھی کر رہی ہے، اور ہجرت کی صورت پر اس کے انجام کی تاریخی شہادت بھی پیش کر رہی ہے۔ چنانچہ پھر ایسا ہی ہوا کہ وہ سرزمین مکہ جہاں سے مسلمانوں اور رسول اللہ کو نکالا گیا تھا چند سال بعد ہی رسول اللہ کے پائے مبارک سے پامال ہوئی۔ مسلمان فاتحانہ مکہ میں داخل ہوئے اور خدا کا کلمہ بلند ہوا۔

(۲) دوسری طرف حالات کے پس منظر میں بعض اہم باتوں کو بظاہر معمولی الفاظ کے ساتھ پیش کیا گیا۔ حالانکہ مسلمانوں کے لحاظ سے ان کی معنویت بے انتہا تھی۔ اور ان کا مقصد خاموشی کے ساتھ مسلمانوں کو ذہنی و نفسیاتی طور پر تیار کرنا تھا مثلاً اسی سلسلے میں سیروا فی الارض، کے فقرہ کی متعدد سورتوں میں تکرار کی گئی ہے[۱]۔ اس کے لفظی ترجمے (ملک میں چلو پھرو) سے زیادہ قابل غور بات اس فقرہ کا مدعا ہے۔ چنانچہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مطلب سورہ عنکبوت کی آیت " ان ارضی واسعۃ[۲] "، اور زمر کی آیت " وارض اللہ واسعۃ[۳] " سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔ یعنی ان تمام فقرات میں " ہجرت کی ترغیب و تحریک " تاریخی حالات کی عینک سے بخوبی دیکھی جاسکتی ہے۔ اسی طرح سورۃ انبیاء کا ابتدائی جملہ اقترب للناس حسابھم[۴] (لوگوں کے حساب کا وقت قریب آپہنچا) بادی النظر میں آخرت سے متعلق ہے اور لوگوں کی غفلت اور قرب قیامت پر دلالت کر رہا ہے لیکن اگر ہم یہ سامنے رکھیں کہ سورۂ انبیاء ہجرت مدینہ سے اندازاً دو ڈھائی سال قبل نازل ہوئی اور دو ڈھائی سال کا عرصہ قوموں کی زندگی میں لمحات سے زیادہ نہیں ہے تو آیت کی شائد اس معنویت کو بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ اہل مکہ کے حساب کا وقت بھی قریب آگیا ہے ان کی قسمت کے فیصلے کا وقت دور نہیں ہے۔ یعنی ہجرت کا مرحلہ آنے میں اب کچھ ہی عرصہ درکار رہ گیا ہے اس مفہوم کو تقویت اسی سورت کی بعض دوسری آیات سے بھی ملتی ہے۔ ارشاد یہ ہوا کہ ولقد کتبنا فی الزبور من بعد الذکر ان الارض یرثھا عبادی الصالحون۔ ان فی ھذا لبلاغاً لقوم عابدین وما ارسلنٰک الا رحمۃ للعالمین[۵] ان آیات کے عام معنی اور تفسیر میں کسی کو کلام نہیں ہوسکتا۔ لیکن جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں۔ حالات اور تاریخ کی روشنی میں ان آیات کا تیکھا پن اس بات کو مترشح کر رہا ہے کہ یہ سرزمین مکہ ہی سب کچھ نہیں ہے۔ اللہ کی زمین وسیع ہے اور زمین کی وراثت اللہ کے نیک بندوں کا حق ہے

۱۔ سورہ انعام (۱۱)، نحل (۳۶)، نحل (۶۹)، عنکبوت (۲۰)

۲۔ آیت (۵۶) ترجمہ: "میری زمین فراخ ہے"

۳۔ آیت (۱۰) ترجمہ: "اور خدا کی زمین کشادہ ہے"

۴۔ انبیاء (۱)

۵۔ انبیاء آیت (۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷)

اس لئے اب اپنی صلاحیتوں کے دائرہ اور تبلیغ و سعی کے حلقہ کو صرف مکہ تک محدود رکھنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ آپ کی بعثت تو تمام کائنات ارضی و سماوی کے لئے ہوئی ہے اس لئے ابر رحمت کو وادی بطحا کی اس سنگلاخ زمین سے آگے بڑھ کر اب دوسرے مقامات پر بھی برسنا چاہیئے۔ اس موقع پر قرآن کی ان آیات کو بھی پیش نظر رکھا جائے تو مناسب ہوگا کہ حضرت موسیٰ نے بھی ہجرت سے پہلے اپنی قوم سے گفتگو کرتے ہوئے کچھ اس قسم کا اظہار کیا تھا کہ قال موسیٰ لقومہ استعینوا باللہ واصبروا ان الارض للہ یورثھا من یشاء من عبادہ والعاقبۃ للمتقین. قالوا اوذینا من قبل ان تاتینا ومن بعد ما جئتنا قال عسیٰ ربکم ان یھلک عدوکم ویستخلفکم فی الارض فینظر کیف تعملون ۱۔

ہمارا اب تک کا مطالعہ یہ صراحت کر دیتا ہے کہ قرآن حکیم اپنے ماننے والوں کو ذہناً ہجرت کے لئے آمادہ کرتا رہا اور عملی طور پر ان کے اندر ایسی اخلاقی صفات کو جلا بخشتا رہا جو ہجرت کے سخت مرحلہ کو آسان بنانے والی اور ہجرت کے بعد خلافت و تمکن کی اہم ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ضروری تھیں۔

پھر قرآن نے صرف ذہنی تیاری نفسیاتی آمادگی، اور نفوس کے تزکیہ پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ وظیفہ ہجرت کی تکمیل ادائیگی کے لئے پوری رہنمائی بھی فراہم کی اور حالات کی مناسبت سے تلقین و ہدایت کا سلسلہ جاری رکھا، یہاں تک کہ رسول اللہ اپنے مولد و وطن کو خیرباد کہہ کر مدینہ تشریف لے گئے۔ چنانچہ جب مکہ کے حالات مسلمانوں کے لئے انتہائی نزاکت اختیار کر گئے اور کفار و مشرکین کے لئے مسلمانوں کا وجود ناقابل برداشت بن گیا اور وہ یہ سمجھنے لگے کہ شجر اسلام کی بیخ کنی اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک کہ شمع رسالت کو ہی گل نہ کر دیا جائے اور اس غرض سے انہوں نے خفیہ طور پر دارالندوہ میں اپنا خاص اجلاس منعقد کر کے رسول اللہ کو شہر بدر کرنے یا قید کرنے کی تجاویز رد کر کے یہ طے کر لیا کہ آپ کو قتل کر دیا جائے۔ کفار و مشرکین کی طرف سے یہ اتنا جرأت انگیز فیصلہ تھا۔ جس کا نوٹس لیا جانا ضروری تھا چنانچہ وحی اللہ کے یہ الفاظ ان کی اس سازشی کردار کی نقاب کشائی کر رہے ہیں کہ ام ابرموا امرا فانا مبرمون - ام یحسبون انا لا نسمع سرھم ونجواھم بلیٰ ورسلنا لدیھم یکتبون ۲۔ ایسا موقع آ گیا تھا کہ جب اہل مکہ کا طرز عمل اس بات کی شہادت دے رہا تھا کہ قبول حق کی مزید سکت ان میں باقی نہیں رہی ہے اور اب ان کے سامنے دعوت حق پیش کرنا لاحاصل ہے۔ لقد حق القول علیٰ اکثرھم فھم لا یؤمنون انا جعلنا فی اعناقھم اغلالا فھی الی الاذقان فھم مقمحون۔ وجعلنا من بین ایدیھم سدا ومن خلفھم سدا فاغشینھم فھم لا یبصرون وسواء علیھم ءانذرتھم ام لم تنذرھم لا یؤمنون ۳۔ کفار و مشرکین کی آخری ناکام کوشش، صورت حالات اور مدینہ کی سربرآوردہ جماعتوں کے قبول اسلام اور دعوت نے بالآخر رسول اللہ کے لئے رخت سفر باندھنے کا موقع فراہم کر دیا اور فی الحقیقت ان اسباب و مقاصد کی تکمیل کا وقت آ گیا جنہیں قرآن میں متعدد مقامات پر

۱۔ سورۂ اعراف (۱۲۸، ۱۲۹)۔ ان آیات کا ترجمہ پہلے آ چکا ہے۔

۲۔ زخرف (۷۹، ۸۰) ترجمہ: "کیا انہوں نے کسی بات کا فیصلہ کر لیا ہے؟ (بقیہ اگلے صفحہ ملاحظہ ہو)

بیان کیا گیا ہے [۱]۔ یعنی بندگی و عبادت رب کے تقاضے پورے کرنے، ایمان کو بچانے اور اسلام کے غلبہ و تمکن کے لئے ہجرت ناگزیر ہو گئی۔ چنانچہ پہلے دوسرے مسلمانوں نے مدینہ ہجرت فرمائی اور سب سے آخر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عازم مدینہ ہوئے یہ ہے ہجرت مدینہ کے اسباب و محرکات کا مختصر سا قرآنی جائزہ۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ) تو ہم بھی فیصلہ کئے دیتے ہیں۔ کیا یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم ان کی پوشیدہ باتوں اور سرگوشیوں کو سنتے نہیں ہیں۔ ہاں ہاں (سب سنتے ہیں) اور ہمارے فرشتے ان کے پاس (ان کی سب باتیں لکھ لیتے ہیں۔"

۳۔ یاسین (۷ تا ۱۰) ترجمہ "ان میں سے اکثر پر (خدا کی) بات پوری ہو چکی ہے۔ سو وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ ہم نے ان کی گردنوں میں طوق ڈال رکھے ہیں۔ اور وہ ٹھوڑیوں تک پھنسے ہوئے ہیں تو ان کے سر اٹھ رہے ہیں اور ہم نے ان کے آگے بھی دیوار کھینچ دی اور ان کے پیچھے بھی پھر ان پر پردہ ڈال دیا تو یہ دیکھ نہیں سکتے۔ اور تم ان کو نصیحت کرو یا نہ کرو۔ ان کے لئے برابر ہے وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

۴۔ عنکبوت (۵۶)، نساء (۹۷) آل عمران (۱۹۵) وغیرہ

ہجرتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

سید اسعد گیلانی

اسلامی انقلاب کی جد وجہد میں ہجرت کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ افسوس کہ اس مقام کی اہمیتوں کو بہت کم اجاگر کیا گیا ہے۔ اور اسے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے ایک مختصر سے مرحلے کی حیثیت سے ذرا سا بیان کر کے چھوڑ دیا گیا ہے۔ زیادہ وقت سیرت کے دوسرے پہلوؤں اور غزوات پر صرف کیا گیا ہے۔ یا دعوتِ حق کی دوسری مشکلات کو بیان کیا گیا ہے۔ بعض مورخین نے تو ہجرت کو صرف مسلمانوں پر کفار کے ظلم وستم کے نتیجے میں ایک مجبورانہ افتاد کی حیثیت دے دی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ ہجرت اس سے بہت زیادہ اہم ہے جس قدر اسے اب تک اہمیت دی گئی ہے۔

ہمیں یاد ہے کہ جب سید احمد شہید نے اپنی تحریک مجاہدین کی بنیاد رکھی اور ہندوستان میں مسلمانوں کی مظلومیت کو رفع کرنے اور افرنگ کے جابر طاغوت کو دفع کرنے کے لیے جدو جہد کا آغاز کیا تو اس وقت بھی انہوں نے ہندوستان سے ہجرت کر کے آزاد علاقہ سرحد میں جا کر اپنی جہادی سرگرمیوں کا آغاز کیا تھا اور جب ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف مسلمانوں کی تحریک آزادی ایک خاص مرحلے میں داخل ہوئی، اس وقت بھی بعض لوگوں نے ہندوستان سے ہجرت کر کے افغانستان جانے اور وہاں سے انگریزوں کے خلاف جنگ آزما ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔ ریشمی رومال کی تحریک اسکی تاریخی یادگار ہے۔ جہاں جہاں مسلمانوں نے جہادی سرگرمیوں کا آغاز کیا ہے وہاں وہاں ہجرت کے مراحل بھی در پیش رہے ہیں۔

یوں تو جب سے حق و باطل کی کش مکش کا ریکارڈ تاریخ کے سینے میں محفوظ ہے ہمیں اس میں بے شمار ہجرتیں دکھائی دیتی ہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام کا اپنے مقام دعوت سے ہجرت کر کے دوسرے علاقے میں جانا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا عراق سے ہجرت کر کے شام، مصر اور فلسطین میں سے ہوتے ہوئے حجاز میں آنا اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے ذریعے اسے اپنی دعوت کا مرکز بنانا، حضرت یعقوبؑ اور حضرت یوسفؑ کی ہجرت مصر کی طرف، حضرت لوط علیہ السلام کی ہجرت علاقہ سدوم کی طرف، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پہلی ہجرت مدین کی طرف اور پھر دوسری ہجرت ارض فلسطین کی طرف اور حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی طرف، غرض اسلامی دعوتوں کے ساتھ ہجرتوں کا سلسلہ مربوط چلا آتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مقامِ دعوت کو چھوڑنے کے لیے بے شمار شرائط ہیں اور جب تک اتمام حجت کی حد تک اسلامی دعوت معاشرے کے سامنے پیش نہ کر دی جائے اور پورا معاشرہ کھنگال کر اس کا دعوتی اور ایمانی مکھن سمیٹ نہ لیا جائے، ہجرت کی اجازت عام نہیں ہے۔ لیکن کسی معاشرے کا مکھن کب نکل چکا ہے، اس بات کو تو خدا کا نبی وحی سے اور ایک عام داعیٔ دعوتِ حق اپنے اجتہاد اور ساتھیوں کے مشورے سے ہی معلوم کرے گا۔ ہجرت نہ اتنی عام ہے کہ جب کسی کا دل اپنے علاقے کے بام و در سے گھبرائے اور

اس کے ماحول میں ذرا پریشانی پیش آئے تو ہجرت اس کے لئے لازم ہو جائے اور نہ اس کی شرائط ایسی کٹھن گھاٹی ہیں کہ ان کا پورا پورا ہونا کسی صورت ممکن ہی نہ ہو جب تک کہ پورا معاشرہ واقعی دو حصوں میں ٹھیک تقسیم نہ ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے بعد بھی ایمان لانے والوں کا سلسلہ جاری رہا تھا اور وہ لوگ بھی بالآخر ایمان لے آئے تھے جو اپنے ظلم وستم کے باعث مسلمانوں کی ہجرت کا باعث ہوئے تھے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہجرت کا موضوع دعوتِ دین اور اس کے طریقِ کار میں ایک اہم مقام رکھتا ہے اور ہجرت اور جہاد کا چولی دامن کا ساتھ ہے لیکن حیرت کی بات ہے کہ جہاں ہمارے اسلامی لٹریچر میں جہاد کے موضوع پر کافی ذخیرہ موجود ہے وہاں ہجرت کے موضوع پر سرے سے کوئی سنجیدہ جامع تالیف موجود نہیں ہے۔ شاید اس لیے کہ ایک طویل عرصے سے نفاذِ نظامِ اسلامی کی جدوجہد کا سلسلہ معطل ہے۔ بہرحال میں نے اپنے طور پر اس موضوع کو سامنے رکھ کر اپنے خیالات کو یہاں ذرا تفصیل کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس مضمون کو دینی لٹریچر کا مطالعہ کرنے والے احباب کے لیے مفید اور مؤثر بنائے اور نفاذِ دین کے مراحل کا شعور اُجاگر کرنے میں مدد دے۔

میں نے ہجرت کے موضوع پر سیر حاصل بحث کے لئے اسے نو عنوانات پر تقسیم کیا ہے جو یہ ہیں:

۱۔ ہجرت کا پس منظر	۲۔ فلسفۂ ہجرت	۳۔ احکامِ ہجرت
۴۔ واقعاتِ ہجرت	۵۔ اثراتِ ہجرت	۶۔ مقامِ ہجرت
۷۔ فوائدِ ہجرت	۸۔ نتائجِ ہجرت	۹۔ ہجرت اور اسلامی انقلاب

اس مضمون میں ہم انھیں عنوانات کے تحت بالترتیب گفتگو کریں گے۔

۱۔ ہجرت کا پس منظر

وادیِ ہاجرہ اور شہرِ اسماعیل کے غارِ حرا سے دعائے ابراہیمؑ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم دعوتِ اسلامی کا علم لے کر بستی والوں کے درمیان تشریف لے آئے تھے۔ جب تک دعوتِ اسلامی سامنے نہ آئی تھی قریش کے لیے ممکن تھا کہ جاہلیت کے اندر لپٹے ہوئے عربوں پر مسجدِ کعبہ کے متولی ہونے کی حیثیت سے مذہبی اجارہ داری کا سکہ چلائیں اور حاجیوں کو پانی پلانے اور کعبے کی حفاظت کرنے کے سبب عرب کے سردار کہلائیں۔ لیکن جب مالکِ کائنات کی طرف سے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم خود پیغامِ حق لے کر آگئے اور صفا و مروہ کے درمیان کھڑے ہو کر انھوں نے بستی والوں کو اللہ کے پیغام سے آگاہ کر دیا تو پھر اس کے بعد کوئی چارہ نہ رہا کہ باطل حق کے لیے مکمل طور پر جگہ خالی کر دے۔ اور جب تک یہ مرحلہ نہ آئے پیغامِ حق پر لبیک کہنے والے آگے بڑھ کر اپنے عزم و استقامت کا ثبوت دیتے رہیں۔

قریش کی رعونت

قریش نے اپنی رعونت اور سرداری کے کبر کے سبب اپنے حقیقی سردار کو پہچان لینے کے باوجود ہٹ دھرمی سے کام لیا اور مخالفت و مزاحمت کا بازار گرم کر دیا۔ بستیوں والے آپ کی امانت،

صداقت، شرافت، دیانت اور کردار کی بلندی، اخلاقی برتری کے پہلے سے قائل تھے لیکن پیغامِ حق آنے کے بعد اُن کے لیے جرأت سے اعتراف حق مشکل ہوگیا تھا۔ مختلف عصبیتوں نے راستہ روک لیا تھا۔ البتہ جن میں حق کے سوا دوسری کوئی عصبیت نہ تھی، جن کی نظامِ غالب سے کوئی لاگ اور وفاداری نہ تھی جن کے مفاد اور چودھراہٹ کے ناطے باطل سے استوار نہ تھے اور جو طاغوت کے آلۂ کار نہ تھے اُن کے لیے نعرۂ حق لگا کر میدان میں آجانا قطعاً مشکل نہ تھا۔ وہ جان ہتھیلی پر رکھ کر نکل آئے خباب رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ آگئے، آلِ یاسر اور صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ آگئے۔ لیکن جن کے مفاد و عصبیت کے رشتے باطل سے استوار تھے ان کے لیے ان تعلقات کو منقطع کر کے دار و رسن کی اس وادی میں اپنی صلیب خود اٹھائے ہوئے نکل آنا آسان نہ تھا۔ وہ آزمائش کی بھٹی کا ایندھن بننے کے لیے تیار نہ تھے۔ اس لیے وہ باطل کے طرف دار بنے رہے اور برسوں یہ سلسلہ جاری رہا۔

اس کشمکش حق و باطل نے مختلف صورتیں اختیار کیں جس شخص کے پاس اپنی بات کے لیے دلیل موجود نہ ہو لیکن مادی قوت موجود ہو وہ ہمیشہ قہر اور ظلم کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ چنانچہ قریش کے سرداروں اور امیروں نے دعوتِ اسلامی کی مزاحمت کے لیے تشدد اور ظلم و ستم کا راستہ اختیار کیا۔ مسلمان ظلم و ستم سہتے سہتے بے حال ہوئے جاتے تھے اور بعض اوقات خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی اپنے ساتھیوں پر ایسے ظلم کا نظارہ قابلِ برداشت نہ ہوتا تھا۔ مکہ میں دعوتِ اسلامی کا کھرا مال تیار کرنے کے لیے آزمائش کی بھٹی اتنی سخت گرم تھی کہ لوگ تڑپ تڑپ جاتے تھے اور رحمت للعالمین کے لیے ان کا یہ حال دیکھا نہ جاتا تھا۔

چنانچہ ایک اجتماعِ مسلمین میں حضور اکرمؐ نے فرمایا:-

لَوْ خَرَجْتُمْ اِلٰی اَرْضِ الْحَبَشَةِ فَاِنَّ بِهَا مَلِکًا لَا یُظْلَمُ عِنْدَهٗ اَحَدٌ وَ هِیَ اَرْضُ صِدْقٍ۔ حَتّٰی یَجْعَلَ اللّٰهُ لَکُمْ فَرَجًا مِمَّا اَنْتُمْ فِیْهِ ۔"

ترجمہ: "اچھا ہو کہ تم لوگ نکل کر حبش چلے جاؤ وہاں ایک ایسا بادشاہ ہے جس کے ہاں کسی پر ظلم نہیں ہوتا اور بھلائی کی سرزمین ہے جب تک اللہ تمہاری اس مصیبت کو رفع کرنے کی کوئی صورت پیدا نہ کرے تم لوگ وہاں ٹھہرے رہو۔"

یہ مسلمانوں کی اپنے وطنِ مالوف سے پہلی ہجرت تھی۔

ظاہر ہے کہ مکہ مکرمہ میں یہ لوگ مسلمان ہونے سے پہلے بھی رہ رہے تھے اور قریش کے سرداروں اور امراء کو ان پر کوئی اعتراض نہ تھا وہ مکہ کے باشندے تھے اور وہاں پُر امن طور پر رہنے کا حق رکھتے تھے۔ وہ خود قریش میں سے تھے اور ان کے حقوق مساوی تھے وہ آزاد لوگ تھے اور اس نعمتِ آزادی سے وہ پوری طرح بہرہ ور تھے جو وہاں ہر کسی کو حاصل تھی۔

ہر شے سے بالا، نعمتِ ایمان

پھر یہ لوگ اپنے وطن آزادی، قبیلے اور عزیز و اقربا کو چھوڑ کر حبش جیسے پردیس کی طرف کیوں نکل رہے تھے؟ اس لیے کہ ان کے پاس ایک اور ایسی نعمت آگئی تھی جو ان کی مکی شہریت، قریشی نسلیت، عربی قومیت اور وطنِ عزیز میں آزاد زندگی سے بھی زیادہ قیمتی تھی۔ جسے بچانے کے لیے یہ سب کچھ قربان کیا جا رہا تھا نعمتِ ایمان

تھی جس کے لئے زندگی قربان ہوسکتی تھی لیکن زندگی اور آرام و راحت کے لیے یہ نعمت قربان نہیں کی جاسکتی تھی۔
زندگی کی دیگر نعمتوں کا تو کیا تذکرہ، ان سب میں انسان کو سب سے عظیم دو ہی نعمتیں حاصل ہوتی ہیں۔ زندگی اور مقصدِ زندگی یا حیات اور ایمان جو شخص حیات کے لیے ایمان چھوڑ دیتا ہے وہ اسفل السافلین میں گر جاتا ہے۔ اور ہمیشہ کی موت کا شکار ہو جاتا ہے۔ اور جو شخص زندگی کو ایمان پر قربان کر دیتا ہے وہ اپنا احسن تقویم ہونا ثابت کر دیتا ہے۔ اور ہمیشہ کی زندگی پا کر موت سے ناآشنا ہو جاتا ہے۔

غرض مکہ میں دعوت اسلامی کے پانچویں سال میں یہ مسئلہ مسلمانوں کے سامنے آ گیا کہ انھیں ایمان پر دنیا کی ہر متاعِ عزیز کو قربان کرنا ہوگا اور انہوں نے خوشی خوشی یہ امتحان دینے کے لیے اپنے آپ کو پیش کر دیا۔ اسلام کے راستے میں اس سلسلے کا پہلا قدم اٹھانے کے لیے پہلی کھیپ میں ۱۴ افراد مرد و زن نکلے اور پھر دوسرے ہی سال دوسری بڑی ہجرت حبشہ کی طرف ہوئی اس میں کم و بیش ۱۰۳ افراد مرد و زن کا نام لیا جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ عظیم ہجرت تھی جس کا کھلا حکم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ذی الحجہ ۱۳ نبوی میں تمام مسلمانوں کو دے دیا تھا اور اب نام لے کر بتا دیا گیا تھا کہ یہ ہجرت مدینہ منورہ کی طرف ہوگی۔

سب سے پہلے مشہور صحابی ابوسلمہ اپنی اہلیہ اور بچے کے ساتھ ہجرت کے لیے نکلے اور پھر تو تانتا ہی لگ گیا یہاں تک کہ مرکزِ تحریک مکہ سے مدینہ منتقل ہو گیا اس کے بعد ہجرت تاریخ اسلام میں ایک درخشاں نشانِ ایمان بن گئی۔

ہجرت مدینہ ہی کیوں؟

تبدیلیِ مرکز کی بنیادی ہجرت حبشہ کی طرف کیوں نہ ہوئی جبکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم وہاں کی حکومت کے بارے میں نہایت اچھی رائے رکھتے تھے اور مدینہ منورہ کی طرف ہی کیوں ہوئی۔ اس امر پر غور کرنے سے یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ حبشہ اس معاشرے سے مختلف معاشرہ تھا جس کی طرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عالمی دعوت اسلامی کے علمبردار اور پوری انسانیت کی طرف مبعوث ہوئے تھے لیکن دعوت کو بنیادی طور پر کامیابی کے مراحل تک پہنچاتے، ایک اسلامی انقلاب برپا کرتے اور اس معاشرے میں مثالی اسلامی ریاست قائم کرنے کی فطری ابتدائی ذمہ داری حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر عرب معاشرے کے بارے میں ہی عائد ہوتی تھی۔ اور درحقیقت جس معاشرے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پرورش پائی تھی اسلام کا ابتدائی عملی مظاہرہ اس معاشرے میں ہی ممکن اور ضروری تھا۔ اس سے مختلف کسی معاشرے میں اتمام حجت کے بغیر اس کے منتقل ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور منتقل ہونے کے بعد پہلا معاشرہ تباہی سے بچ نہیں سکتا اور دوسرا معاشرہ حقیقی اور فطری مخاطب نہ ہونے کے سبب حقیقی اسلامی انقلاب برپا کرنے سے معذور رہتا ہے۔ اسی لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقی ہجرت عرب کے ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف ہی ہوئی نہ کہ ایک ملت سے دوسری ملت کی طرف۔ قدرت کی فطری تدبیر یہی تھی کہ اسلامی انقلاب اسی معاشرے میں برپا ہو جہاں دعوتِ اسلامی برپا ہوئی تھی اور یہیں سے عالمگیر دعوت اٹھے اس لیے مدینہ ہی دار الہجرت بنایا گیا۔

ہجرت۔ تقویم اسلامی کی بنیاد

مسلمانوں کی تقویم کا آغاز ولادتِ نبوی سے ہوتا یا رحلت نبوی سے ہوتا یا نزول وحی کی تاریخ سے ہوتا تو کوئی تعجب کی بات نہ ہوتی، بلکہ فتح مکہ کی تاریخ سے بھی ہوتا تو

عین زمانے کے دستور کے مطابق ہوتا۔ لیکن حیران کن بات یہ ہے کہ اس کا آغاز انتہائی مظلومیت کے دن سے ہوتا ہے جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام اُلٹے مکہ کرمہ سے اپنا گھر بار چھوڑ کر مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ہجرت کا واقعہ منفرد اور تاریخ اسلام میں اپنی اہمیت کے لحاظ سے تاریخ ساز واقعہ ہے جسے زمانے نے لوحِ تاریخ پر لکھ دیا ہے۔

دنیا کی مختلف قومیں اپنی تقویم مختلف انداز سے شروع کرتی ہیں۔ ان میں کسی کے سال کا آغاز کسی بادشاہ کی پیدائش سے ہوتا ہے، تو کوئی موسمی تغیر سے اپنے سال کا آغاز کرتا ہے۔ کسی معاشرے میں کسی بڑی شخصیت کی نسبت اس کا باعث بنتی ہے لیکن مسلمان پوری دنیا میں ایک منفرد اور نظریاتی گروہ ہے جس کی تقویم کا آغاز ایک انقلابی نظریاتی جدوجہد کے ایک اہم اقدام سے ہوتا ہے۔ اس کا تعلق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعہ ہجرت سے ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظیم اسلامی تحریک کی جدوجہد میں واقعہ ہجرت بظاہر تو ایک ناخوشگوار واقعہ ہے لیکن حقیقتاً یہ اسلامی انقلاب کی منزل کی طرف ایک اہم پیشقدمی ہے۔ مسلمانوں نے اسی لئے اپنی تقویم کو کسی شخصیت خاندان یا قوم کی طرف نسبت دینے کی بجائے اسے ایک نظریہ کی جدوجہد کے ایک مخصوص مرحلے سے نسبت دی ہے۔ مسلمانوں کا سن، سنِ ہجری ہے یعنی جو سن ہجرت کے واقعہ سے شروع ہوتا ہے۔ چنانچہ ہر دفعہ جب مسلمان اپنے سالِ نو کا آغاز کرتے ہیں تو وہ اپنی تاریخ کی عظیم ترین اسلامی تحریک کی بھرپور جدوجہد کے ایک ایسے مرحلے کی یاد تازہ کرتے ہیں جب وہ کس مپرسی اور جبر و تشدد کے ماحول سے نکل کر ایک اسلامی ریاست کے قیام کے مرحلے میں قدم رکھ رہے تھے۔

سنِ ہجری، قمری مہینوں کا سال ہے۔ یہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے واحد تقویم ہے جس کا سال چاند کی تاریخوں سے بننے والے بارہ مہینوں پر مشتمل ہے۔ دنیا بھر میں تمام لوگوں کے سال شمسی مہینوں سے وجود میں آتے ہیں۔ لیکن مسلمانوں کا سال قمری مہینوں سے وجود میں آتا ہے اور اس کی خوبی یہ ہے کہ اسلام کی ساری عبادات سال کے بارہ مہینوں میں آنے والے موسموں کے اندر گردش کرتی رہتی ہیں۔ مسلمان سردی میں بھی روزے رکھتے ہیں اور پھر گرمیوں میں بھی رکھتے ہیں۔ اور انھیں اس امر کا حتمی احساس ہو جاتا ہے کہ گرمی میں بھوکا رہنا کیسا ہوتا ہے۔ اور سردی میں بھوکا رہنا کیسا ہوتا ہے۔ اور ان موسموں میں جو لوگ بھوکے رہتے ہیں ان کا داخلی احساس کیسا ہوتا ہے۔ وہ گرمی میں بھی سفرِ حج کرتے ہیں اور پھر سردیوں میں بھی یہ سفر کرتے ہیں۔ مختلف چاند کی بدلنے والی تاریخوں کے ساتھ مسلمانوں کی تمام عبادات، تمام تہوار اور سارے اجتماعی پروگرام سال کے سارے ہی موسموں میں سے گزرتے رہتے ہیں۔ اس طرح مسلمان سفر و حضر اور عبادات و مشاغل میں موسمی تغیرات کی ہر کیفیت سے آشنا ہوتے رہتے ہیں۔

یہ اللہ کی حکمت ہے کہ ہجرت کی تاریخ نئے سال کی یکم تاریخ کے ساتھ اس طرح منطبق ہو گئی ہے کہ ہجرت ہی مسلمانوں کے سالِ نو کا موضوع بن کر رہ گئی ہے۔

ہجرت کے واقعہ نے ماہِ ہجرت کو بھی نہایت اہم بنا دیا ہے۔ اسی ماہ میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفہ راشد ثانی کی شہادت ہوئی اور اسی مہینہ میں نواسہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی میدانِ کربلا میں شہادت

ہوئی۔ ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے نزدیک اہم ترین واقعہ وہی ہے۔ جس سے ان کی تقویم کا آغاز ہوتا ہے۔ اس طرح ہجرت کا واقعہ مسلمانوں کی تاریخ میں اہم ترین واقعہ کی حیثیت سے ثبت ہو گیا ہے۔ اس طرح جب مسلمان اپنے سالِ نو کا آغاز کرتے ہیں تو وہ اپنے آپ کو ایک نظریاتی انقلابی گروہ کی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ بلاشبہ ہجرتِ مدینہ کا واقعہ اپنی تاریخی اہمیت کے لحاظ سے فتح مکہ سے کسی صورت کم نہیں ہے بلکہ شاید کچھ زائد ہی ہے۔ اس لیے جس روز ہجرت کر کے مکہ چھوڑا جا رہا تھا اسی روز تاریخ کے ایوان میں مکہ کی فتح کا سنگِ بنیاد بھی رکھا جا رہا تھا۔

مکہ کی تربیت گاہ

مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت اپنے مفہوم کے اعتبار سے محض نقل مکانی ہی نہیں ہے۔ بلکہ یہ باطل کے مدِ مقابل حق پرستوں کی مورچہ بندی ہے۔ اس مورچہ بندی سے پہلے ان کی ابتدائی نظریاتی تربیت ضروری تھی۔

جب تک مسلمانوں کی ابتدائی تربیت کی ضرورت تھی حضورؐ کا قیام مکہ میں رہا جو شخص بھی مسلمان ہونے کا اعلان کرتا تھا اس پر مصائب اور مظالم کا ایک پہاڑ ٹوٹ پڑتا تھا۔ چاروں طرف سے باطل پرست ہمسائے اور اقربا اس پہ یورش کرتے اور اسے جینے دینے کی تنگ و دو کرتے تھے۔ کلمہ طیبہ کا اظہار ہوتے ہی اس کا معاشی مقاطعہ اور معاشرتی بائیکاٹ ہو جاتا تھا۔ اسے سماجی لحاظ سے اچھوت بنا کر رکھ دیا جاتا تھا۔ اس کی جان و مال و آبرو سب کفار کے لیے مباح ہو جاتی تھی۔ اور اگر نیا نیا ایمان لانے والا شخص اپنے ایمان میں کچا ہوتا تھا تو اس مار اور رگڑ سے گھبرا کر پسپائی اختیار کر لیتا تھا۔ اس طرح اسلامی تحریک کچے لوگوں کی کمزوری سے بچ جاتی تھی اگرچہ ایسا بہت کم ہی ہوتا تھا۔

جو لوگ اسلامی گروہ میں شامل ہوتے تھے ان کو چاروں طرف سے اتنا مارا، رگڑا، پیسا، روندا اور بھنبھوڑا جاتا تھا کہ کمزور ارادے کے آدمی کے لیے ایسی کھکھیڑ سہنا ممکن نہ ہوتا تھا۔ چنانچہ ایسی سخت تربیت سے گزرنے کے بعد مسلمان انتہائی مضبوط، عقیدے میں سخت، عمل میں نڈر، جدوجہد میں ثابت قدم اور نظریے میں پختہ ہو جاتے تھے۔ پھر اس کے بعد ان کی تعلیمی اور اخلاقی تربیت تھی جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی صحبت، وحی کی تعلیمات اور عبادات و اعمال میں انہماک کے ذریعے کرتے تھے۔ اس طرح تیرہ سال تک مکہ میں اسلامی تحریک کی ایک ایسی قیمتی تربیت گاہ قائم رہی جس میں سونا کندن بن بن کر نکلتا اور کھوٹ ایک طرف ہو جاتا رہا۔

مکہ مکرمہ کی اس ابتدائی تربیت گاہ نے اسلامی تحریک کو جو حیرت ناک، جامع صفات، نیا نظریاتی انسان بنا کر دیا اسی تربیت یافتہ انسان نے خلافتِ راشدہ کو چار دوانگ آسمانی تعلیمات کے عین مطابق چلا کر دکھایا۔ جس تربیت گاہ میں ایسے ایسے لوگ تیار ہو گئے جو معرکوں میں اعلیٰ پائے کے دیانت دار سپاہی، فوجوں کے سالار، عدالتوں کے جج، ولایتوں کے گورنر اور خلقِ خدا کے معلم اور استاد ثابت ہوئے۔

ہجرت سے پہلے مکہ کی یہ تربیت گاہ اسلامی تحریک کی جدوجہد کا وہ قیمتی حصہ ہے جس کے بغیر پختہ عقائد کے حامل اور صالح اعمال کے عامل افراد تیار نہ ہو سکتے تھے۔ ہر تحریک کو ایسے ساتھیوں اور موزوں افراد کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کے لیے ریڑھ کی ہڈی ثابت ہوں۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ قبل ہجرت مکہ کے تشدد آمیز ماحول نے وہ تربیت گاہ فراہم کر دی جس کا

مزہ کڑوا لیکن جس کا پھل میٹھا تھا اس تربیت گاہ سے اخلاقی اور دینی تربیت حاصل کر کے ہجرت کے بعد جب لوگ مدینہ میں پہنچے تو ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ پرتو رسول صلی اللہ علیہ وسلم بن کر سامنے آئے۔ عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ مثل نبی صلی اللہ علیہ وسلم شخصیت کے حامل ثابت ہوئے۔ عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ مسلمانوں کے لئے شفقت و محبت اور جود و سخا کا خزانہ اور علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے شہر علم کا عظیم الشان باب بن کر نمودار ہوئے۔ اس عظیم الشان تربیت گاہ کے بعد پھر ہجرت مدینہ انسانی صلاحیتوں کو چمکانے اور انھیں اسلامی تحریک کے لیے استعمال کرنے کا بہترین ذریعہ ثابت ہوئی۔

قریش کے خوفناک منصوبے

مکہ معظمہ کے تیرہ سالہ دور نبوت میں قریش کے ظالمانہ طرز عمل نے ہجرت کے سوا دوسرا کوئی راستہ کھلا نہیں چھوڑا تھا۔ شعب ابی طالب کے تین سالہ جبری قید و بند اور معاشی ناکہ بندی نے قریش کے ظالمانہ عزائم کو بے نقاب کر دیا تھا حضرت ابوطالبؓ اور ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے انتقال کے بعد تو مکہ کی بستی اسلامی دعوت کے لئے اور بھی تنگ ہوگئی تھی مسلمان پہلے بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے ایک بار حبشہ کی طرف ہجرت کر کے جا چکے تھے۔ ظاہر ہے کہ کوئی شخص آسانی سے اپنے گھر بار، کاروبار، عزیز و اقربا، دوست احباب اور اپنے دیس کی پر محبت گلیاں چھوڑنے پر راضی نہیں ہوتا۔ جس طرح زمین میں درختوں کی جڑیں مضبوط ہوتی ہیں اسی طرح اپنے اپنے وطن میں انسانوں کی بھی پائیدار جڑیں ہوتی ہیں اور یہ جڑیں اکھاڑنے سے سارا انسانی وجود دہل جاتا اور بے سہارا ہو جاتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی کوئی ظلم ان سب باتوں سے بھی زیادہ سخت ہو جاتا ہے اور بعض انسان اپنے بھائیوں کے لیے اتنے ظالم ہو جاتے ہیں کہ مظلوم اپنا گھر بار اور دیس چھوڑ کر بےگھر اور پردیسی ہو جانے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ قریش نے مکہ کے آخری ایام میں مسلمانوں کے لیے بالعموم اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بالخصوص کچھ ایسی ہی فضا بنا دی تھی۔

اب تو انہوں نے ایک ایسی بات سوچی تھی کہ اگر پہاڑوں پر رکھی جاتی تو وہ بھی لرز جاتے اور پتھروں سے کہی جاتی تو وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے اور درختوں کے سامنے آتی تو وہ جل کر راکھ ہو جاتے۔ اب وہ ظالم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے درپے ہو گئے تھے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کو مدینہ کی طرف ہجرت کی عام اجازت دے دی تھی۔ وہاں کے باشندوں نے عہد و پیمان کر کے مسلمانوں کو مدینہ میں آنے کی دعوت دی تھی۔ انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے وعدہ کیا تھا کہ اگر ہمارے اشراف قتل بھی کیے جائیں اور ہمارے اہل و عیال پہ تلواریں بھی برسیں اور ہمیں تباہی میں جھونک دیا جائے اور سارا عرب بھی دشمن بن کر ہم پہ پل پڑے تو ہم آپ کا ساتھ دیں گے۔ اہل مدینہ نے حضور اکرم کے ساتھ بیعت کر کے یہی عہد کیا تھا اور وہ اس پر مضبوطی سے قائم تھے۔

اس پیمان وفا کے بعد مسلمانوں کی کثیر تعداد ایک ایک کر کے مدینے چلی گئی تھی۔ ہر مہاجر ایک دکھ بھری داستان تھا۔ ہر شخص کی کہانی آنسوؤں اور خون سے مکمل ہوئی تھی اور اب مکہ میں صرف تھوڑے سے مسلمان ہی باقی رہ گئے تھے۔ بیشتر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پہ سب کچھ قربان کر کے مدینہ جا چکے تھے۔ یہی ایام تھے جب قریش نے ایک اجلاس طلب کیا۔

"محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کا اس سے بہتر موقع کبھی میسر نہ آئے گا" مجلس کی یہ متفقہ رائے تھی۔ اس مجلس میں قریش کے

بشیتر بوڑھے سردار جمع تھے اور قتل کی تدابیر پر غور کر رہے تھے۔

ایک بولا "بہتر ہے کہ اسے پکڑ کر گلے میں زنجیر ڈالو اور ایک مکان میں قید کر دو اور باہر سے دروازہ بند کر کے دیوار چن دو۔ بس خود ہی تڑپ تڑپ کر مر جائے گا۔"

دوسرا بولا "نہیں نہیں یہ تدبیر ٹھیک نہیں ہے اس کی رہائی کا خطرہ پھر بھی موجود رہے گا اس کے قید ہونے کی خبر سن کر مسلمان جان کی بازی لگا دیں گے اور اسے چھڑا لے جائیں گے۔"

اور ایک اور بولا "میری رائے تو یہ ہے کہ ایک سرکش اونٹ پر بٹھا کر ہم اُسے شہر سے باہر نکال دیں ہماری بلا سے پھر وہ جیسے یا کہیں جائے۔"

پھر ایک اور نے کہا "نہ بھئی یہ رائے ٹھیک نہیں ہے تم اس کی دلآویز باتوں سے واقف نہیں ہو وہ تو جس سے ملتا ہے اس کا دل موہ لیتا ہے۔ وہ جہاں جائے گا وہاں کے باشندوں کو اپنے ساتھ ملا لے گا اور بالآخر وہ لوگ تم سے بدلہ لے کر چھوڑیں گے۔"

آخر میں ابوجہل کہنے لگا "یہ سب بیکار باتیں ہیں اصلی تدبیر وہ ہے جو میں بتاتا ہوں۔" سنو "عرب کے ہر ایک قبیلے سے ایک ایک جوانمرد کا انتخاب کرو وہ سب رات کی تاریکی میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کو گھیر لیں۔ جب وہ صبح کی نماز کے لیے باہر نکلے اس وقت یہ سب بہادر بیک وقت اس پر حملہ کر کے اسے ختم کر دیں۔" اس نے مزید کہا "اس تدبیر سے بنو ہاشم محمد کے قتل کا بدلہ نہ لے سکیں گے اور خون بہا لے کر خاموش ہو جائیں گے۔"

بس اس کی اس شیطانی تدبیر پر سب راضی ہو گئے۔ لیکن اللہ کی تدبیر مختلف تھی اور اس تدبیر نے ہی قریش کے تمام لشکروں کو بالآخر شکست دے دی۔

اہلِ مدینہ کی دعوت

ہجرت سے کچھ ہی عرصہ پہلے اور نبوت کے تیرھویں سال مدینہ سے حاجیوں کے قافلے کے ساتھ مدینے کے وہ مسلم بھی آئے جن کو حضرت مصعبؓ بن عمیر نے اپنی تبلیغ و تعلیم کے ذریعے دین اسلام میں داخل کیا تھا۔ یہ سب ۷۳ مرد اور دو عورتیں یعنی کل ۷۵ افراد تھے۔ مدینے میں تعلیمات قرآنی خوشبو کی مانند پھیل رہی تھیں۔ وہاں حضرت مصعب بن عمیرؓ کی تبلیغی سرگرمیاں بہت نتیجہ خیز ثابت ہوئی تھیں کبھی وہ باغوں میں پہنچ کر لوگوں کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کرتے تھے اور کبھی کھیتوں میں کبھی چوپالوں میں اور کبھی گھروں میں۔ قبیلہ اوس کے سردار سعد بن معاذ کو جب ان تبلیغی سرگرمیوں کا علم ہوا تو اس نے قبیلے کے چند نوجوانوں کو بلا کر کہا۔

"تم کس غفلت میں پڑے ہوئے ہو تم دیکھتے نہیں ہو کہ تمہارے گھروں میں آ کر وہ تمہیں بے وقوف بنا رہا اور بہکا رہا ہے۔ جاؤ اس کو جھڑک دو کہ خبردار ہمارے محلوں میں آ کر ہمیں پریشان نہ کرے۔"

لیکن جب خود انہوں نے حضرت مصعبؓ بن عمیر کی باتیں سنیں۔ قرآن سنا تو فوراً اسلام قبول کر لیا اور اپنے قبیلے کے لوگوں کو جمع

کر کے کہا ۔

"اے بنی عبدالاشہل تم لوگوں کی میرے بارے میں کیا رائے ہے ؟"

سب نے کہا " آپ ہمارے سردار ہیں ۔ آپ کی رائے بہتر اور آپ کا فیصلہ درست ہوتا ہے ۔"

یہ سن کر سعد بن معاذ بولے :

"تو سنو ! خواہ کوئی مرد ہو یا عورت ہو تم میں سے کسی سے بات کرنا حرام سمجھتا ہوں جب تک تم خدا پر اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لے آؤ ۔"

بس اتنی سی بات ہوئی اور پورا قبیلہ اسی کلمہ طیبہ پڑھ کر مسلمان ہو گیا ۔

مدینے کے ۷۵ مسلمانوں کا قافلہ رات کی تاریکی میں اس مقام پر پہنچا جہاں ان کے ساتھیوں نے پہلے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی تھی وہ اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ چلنے کی دعوت دینے آئے تھے اس بار حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آپ کے چچا حضرت عباس بھی تھے ۔

حضرت عباس نے اس گروہ سے مخاطب ہو کر کہا :

"یثرب کے لوگو ! تمھیں پتہ ہے کہ قریش مکہ محمدؐ کے جانی دشمن ہیں ۔ اگر تم ان سے کوئی عہد و پیمان کرو تو پہلے یہ سمجھ لینا کہ یہ بڑا نازک اور مشکل کام ہے تم سرخ و سیاہ لڑائیوں کو دعوت دو گے جو کچھ کرو سوچ سمجھ کر کرو ورنہ کچھ نہ کرو ۔"

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں خدا کا کلام سنایا اور اسلام کی تعلیمات سے آگاہ کیا اس پر سب لوگوں نے حضور اکرمؐ کو اپنے شہر یثرب چل کر ان کے پاس رہنے کی دعوت دی تاکہ وہ سب لوگ آپ سے فیض حاصل کر سکیں ۔

آپؐ نے فرمایا :

۱۔ کیا تم دین حق کی اشاعت میں میری پوری پوری مدد کرو گے ؟

۲۔ کیا تم میری اور میرے ساتھیوں کی حمایت اپنے اہل و عیال کی طرح کرو گے ؟

مدینے والوں نے کہا :

"اے خدا کے رسولؐ ۔ اس کا ہمیں کیا صلہ ملے گا ؟

حضورؐ نے فرمایا :

"جنت اور خدا کی خوشنودی ۔"

ان لوگوں نے کہا :

"یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں یہ منظور ہے ۔"

پھر ان میں سے ایک نوجوان اسعد بن زرارہؓ اٹھا جو سب میں کم سن تھا ۔ اس نے کہا :

"ٹھہرو اے یثرب والو! ہم لوگ ان کے پاس یہ سمجھ کر آئے ہیں کہ یہ اللہ کے رسولؐ ہیں۔ ان کو یہاں سے نکال لے جانا پورے عرب سے دشمنی مول لینا ہے۔ اس کارروائی کے نتیجے میں تمہارے نونہال قتل ہوں گے اور تم پر تلواریں برسیں گی۔ اگر تم میں برداشت کی قوت ہے تو ان کا ہاتھ پکڑو۔ بخدا یہ بڑی سعادت ہے اور اگر تم کو اپنی جانیں اور مال عزیز ہیں تو ابھی عذر کر دو۔ اس وقت کا عذر خدا کے نزدیک زیادہ قابلِ قبول ہے۔"

ایک دوسرا شخص اٹھا جس کا نام عبادہؓ بن نضلہ تھا۔

اس نے کہا: "تم جانتے ہو کہ کس چیز پر بیعت کر رہے ہو؟"

آوازیں آئیں: "ہاں ہم خوب جانتے ہیں۔"

اس نے کہا "سنو تم یہ دعوت دے کر دنیا بھر سے لڑائی مول لے رہے ہو۔ اگر تم نے ہلاکت اور تباہی دیکھ کر ان کا ساتھ چھوڑ دیا تو بخدا یہ دنیا اور آخرت کی رسوائی ہے اور اگر تم نے اپنے اموال کی تباہی اور اپنے اشراف کی ہلاکت کے باوجود اپنا وعدہ نبھایا تو بخدا یہ دنیا و آخرت کی بھلائی ہے۔"

اس پر سارے وفد نے بہ آوازِ بلند کہا "ہم اپنے اموال کی تباہی اور اپنے اشراف کی ہلاکت کے خطرے قبول کرنے کو تیار ہیں۔"

اس پر حضور اکرمؐ نے فیصلہ کر دیا کہ وہ مدینہ والوں کی دعوت کو قبول کرتے ہیں۔

تب چند افراد نے اُٹھ کر کہا:

"اے خدا کے رسولؐ یہ تو ہماری تسلی کرا دیجیے کہ پھر آپ ہم کو چھوڑ نہ دیں گے۔"

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"مدینہ والو! مطمئن رہو کہ میرا جینا اور میرا مرنا تمہارے ساتھ ہوگا۔"

حضورؐ کے اس ارشاد پر وفد میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مدینہ کی طرف ہجرت کا فیصلہ ہو گیا۔

۲۔ فلسفہ ہجرت

دعوتِ اسلامی کے مختلف مراحل میں سے ایک مرحلہ ہجرت بھی ہے۔ دعوت و تبلیغ، انشارت و تنبیہ، تعلیم و تربیت، اصلاح و تزکیہ، نظم و تنظیم کے سارے مراحل سے گزر کر ہم مقصد، ہم خیال اور ہم ذوق افراد ایک لڑی میں پروئے جاتے ہیں اور نظامِ غالب کے مدمقابل ایک مخالف اجتماعی قوت وجود میں آتی چلی جاتی ہے۔ جو نظریہ اور مقصد کے دشمنوں سے اذیتوں اور تکالیف کا راس بنی ہے معاشی تنگی اور معاشرتی مقاطعہ کا حصہ وصول کرتی اور ظلم و ستم کے مقابلے میں صبر و تحمل، قناعت و عزیمت اور برداشت و بردباری

کا سبق حاصل کر کے ایک توانائی اور طاقت بنتی چلی جاتی ہے ۔کھولتے جذبات پر قابو پانے ، مصائب پر صبر کرنے اور تکالیف پر اف نہ کرنے سے جو مثبت طاقت پیدا ہوتی ہے وہی قوت ہے جو حق کا اصلی اور موثر ہتھیار ہوتی ہے ۔ یہ ہتھیار باطل قوتوں کے پاس کبھی نہیں ہوتا ۔ یہ غیر مرئی منفرد ہتھیار حق کو بے سرو سامانی اور قلت تعداد کے باوجود میدان فتح کرنے میں خالقِ کائنات کی غیبی امداد کا ذریعہ بن جایا کرتا ہے ۔

لیکن غیبی امداد لانے میں بے وطنی اور بے سرو سامانی بھی بہت کارگر ہوتی ہے جب مومن اپنے بنے بنائے خوب صورت گھر ، بستی اور وطن سے ہجرت کر کے خالص مالک الملک کا مہمان بن جاتا ہے اور صرف اسی پہ تکیہ کرنے کا راستہ اختیار کر لیتا ہے ۔ اسی کے در کا درویش اور اسی کے راستے کا قلندر ہو جاتا ہے جب وہ سارے سرو سامان سے دست بردار ہو کر صرف مالک کے غیبی سرو سامان پہ تکیہ کر لیتا ہے تو مالک کی غیبی امداد جوق در جوق اور فوج در فوج آتی ہے اور اپنے لڑکھڑاتے ہوئے بندے کو تھام کر اس کے سر پہ عزیمت و استقامت کا سایہ تان دیتی ہے ۔

انقلابی سیرت سازی کا ذریعہ

ہجرت مالک کے راستے کی فقیری ہے ۔ یہ لامکاں کے مسلک کی پیروی اور اس کے منشا کی تکمیل ہے اس میں استغنا توانائی پیدا کرتا ہے ، توکل اعتمادِ ربانی اور صبر قوت روحانی پیدا کرتا ہے جس سے ضرب کلیمی وجود میں آتی ہے جو میدانِ بدر میں پہنچ کر ضربت حیدری بن جاتی ہے ہجرت کی بے سرو سامانی سے بدر کی ضربت حیدری تک کے فاصلے کو اقبال نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے ۔ ؏

شبانی سے کلیمی دو قدم ہے

شبانی سے کلیمی دو قدم اس وقت ہوتی ہے جب انسان طاغوت کے مصر (یا مکہ) سے حالت بے سرو سامانی میں نکل کر مدین (یا مدینہ) کا راستہ پکڑتا ہے اور اپنے سارے معاملات اللہ کے حوالے کر دیتا ہے پھر جس طرح کلیم اللہ حالت سفر او رغربت میں یہ بات کہتا ہے کہ

رَبِّ اِنِّی لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ

"پروردگار جو خیر بھی تو مجھ پہ نازل کرے میں اس کا حاجت مند ہوں"

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اللہ کے راستے کے فقر پہ فخر کرتے دکھائی دیتے تھے ۔ الفقر فخری " اللہ کی راہ کا فقر میرے لیے فخر ہے ۔"

غرض ہجرت دعوتِ اسلامی کی منازل مقررہ میں سے ایک دائمی اور حقیقی منزل ہے ۔ یہ نفسِ امّارہ سے للہیت کی طرف ، بے صبری اور اشتعال سے صبر و حکمت کی طرف ۔ غیر اللہ پر توقعات سے توکل علی اللہ کی طرف ہجرت ہے ۔ یہ دنیوی سہاروں سے غیبی امداد کی طرف ہجرت ہے ۔ ہجرت دعوت اسلامی کے مراحل میں سے ایک عظیم الشان مرحلہ ہے ۔

لیکن ذیر دعوت قوم پر اتمامِ حجت کے بغیر ہجرت کی اجازت نہیں ہے ۔ اسی لیے مکہ کی ایک چھوٹی سی بستی پہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ۱۳ برس صرف کرنے پڑے تھے تاکہ وہاں کا ایک فرد بھی دعوت کی خبر ، اس کی نوعیت ، حقیقت ، نتائج اور قبولیت سے

بے خبر نہ رہے۔

کسی قوم کی طرف سے دعوت اسلامی کے راستے میں معمولی درجے کی مزاحمت و مخالفت ہجرت کے لئے کافی عذر نہیں ہوتا ہے۔ حضرت یونس علیہ السلام کی بستی میں دعوت اسلامی اور ہجرت کے مراحل کا واقعہ سب کے سامنے ہے۔ اگر کسی گروہ میں قبولیتِ حق کے بیے دور کا شائبہ بھی موجود ہو تو اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ کسی بستی سے داعیٔ حق کا نکل جانا کوئی معمولی واقعہ نہیں ہوتا۔ وہ بستی غضبِ الٰہی کی براہِ راست زد میں آجاتی ہے۔ وہ ناکارہ کوڑے کا ایک ایسا ڈھیر شمار ہونے لگتی ہے جو بزمِ ہستی میں ناقابلِ برداشت بوجھ کی مانند ہوتا ہے۔ پھر مالک کو حق ہوتا ہے کہ وہ اس بستی کو انسانی آبادیوں میں سے اٹھا دیے جانے اور صاف کر دینے کا حکم کارکنانِ قضا وقدر کو دے دے۔ اس کے بعد تو جو کچھ مہلت ہوتی ہے وہ صرف مالک کے رحم و کرم پر ہی منحصر ہوتی ہے۔

اس لئے کسی قوم میں سے داعیانِ حق کے ہجرت کر جانے کا مسئلہ کوئی معمولی مسئلہ نہیں ہے کہ جب دل گھبرایا تو بوریا بستر اٹھا کر رخصت ہو گئے۔ جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ اب دعوت کے مخاطب لوگوں میں صالحیت اور صلاحیت کی مقدار صفر کے مقام پر پہنچ گئی ہے۔ انہیں صفحۂ ہستی پر رہنے کی مہلت دی جاتی ہے۔ یہ اللہ کی سنت ہے کہ وہ اپنے بندوں کو مہلت پر مہلت دیتا اور سدھرنے کے مواقع دیتا چلا جاتا ہے کسی ایک بھٹکے ہوئے انسان کا بھی اپنے مالک کے دامنِ رحمت میں پناہ لینے کے لیے لوٹ آنا مالک کو بے حد پسند ہے۔

ایران کے انقلابی مفکرین یہ کہتے ہیں کہ ہجرت بطورِ حکمت انقلاب بھی اختیار کی جاتی ہے۔ جو تحریک کو دور دراز تک متعارف کرانے، نئے افراد کو متوجہ کرنے، کھلی اور آزاد فضا میں پہنچ کر طاغوت وقت کے خلاف جد وجہد کرنے میں مددگار ہوتی ہے اس لئے ہجرت کے لیے منصوبہ بندی بھی کی جا سکتی ہے۔ گویا لاچاری اور مجبوری کی ہجرت کے علاوہ رضاکارانہ ہجرت کا تصور بھی موجود ہے۔

ہجرت دعوت اسلامی کے لیے ناسازگار ماحول کی طرف سے سازگار ماحول کی طرف کی جاتی ہے۔ جیسے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرتِ حبشہ کا حکم دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ وہاں کا حاکم خدا ترس اور وہاں کی حکومت امن پسند ہے۔ وہاں چلے جاؤ اور یا پھر مدینہ کی ہجرت کہ جسے بقول ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ قرآن نے پہلے ہی فتح کر لیا تھا اور سارا مدینہ تیزی سے مسلمان ہوتا چلا جا رہا تھا اور عملاً وہاں کے دونوں مقتدر قبائل اسلام قبول کر کے مدینہ کو شہر اسلام بنا چکے تھے۔ ایک ناسازگار ماحول سے دوسرے ناسازگار ماحول میں ہجرت کرنے کی نہ کوئی مثال موجود ہے اور نہ اس کی اجازت ہے۔ اس سے دعوت اسلامی کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔

یہ لازم نہیں ہے کہ ہجرت ایک ملک سے کسی دوسرے ملک کی طرف ہی کی جائے۔ جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام یا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کی تھی بلکہ ملک کے ایک حصے یا علاقے سے دوسرے حصے و علاقے کی طرف بھی کی جا سکتی ہے۔ جیسے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی۔

ہجرت داعیانِ حق کے قلبی اور باطنی احساسات کی جغرافیائی تکمیل کرتی ہے اللہ کے وہ بندے جو دعوتِ دین کا کام کرتے ہیں وہ باطل کے ماحول، حالات، فضا، معاملات اور پورے معاشرے سے باطنی طور پر متنفر اور بیزار تو پہلے ہی ہوتے ہیں اور جسمانی طور پر اس ماحول میں رہنے کے باوجود روحانی طور پر اس سے علاحدہ اور ممتاز رہتے ہیں پھر جب وطنی ہجرت ہوتی ہے تو یہ ہجرت ان کی باطنی ہجرت

کی ظاہری تکمیل کا ہی ذریعہ بنتی ہے ۔ اس طرح باطنی مہاجر پھر وطنی مہاجر بھی بن جاتے ہیں اور یہ ہجرت تکالیف و شدائد کی افراط کے باوجود ان کی آرزوؤں کی تکمیل کا ذریعہ بنتی ہے ۔

ہجرت نفاق کا شافی علاج

ہجرت نفاق کا شافی علاج اور تزکیہ اہل ایمان کا ذریعہ ہے ۔ مخلص و غیر مخلص کے درمیان یہ حدِ فاصل ہے ۔ ہجرت کی پل صراط پر سے غرض مند اور مفاد پرست آدمی نہیں گزر سکتا۔ اس کی کاٹ تلوار سے زیادہ تیز ہوتی ہے جو مفاد پرستی میں مبتلا دل کے ٹکڑے کر دیتی ہے اور وہ بال سے زیادہ باریک ہوتی ہے جو غیر مخلص دل کو بھینچ کر رکھ دیتی ہے ۔ ایک غیر مخلص شخص یہ جرأت نہیں کر سکتا کہ مخلصینِ دعوت کے دوش بدوش اور ہم قدم چلنے کا زیادہ عرصہ ڈھونگ رچا سکے ۔ مفاد پرستی اور غرض مندی کا روگ لے کر اگر کوئی اسلامی تحریک کے ساتھ چند قدم چلنے کا مظاہرہ کرتا بھی ہے تو ہجرت کا مرحلہ اس کا پول کھول کر رکھ دیتا ہے ۔

ہجرت انقلابی افراد کی تیاری میں اہم درسگاہ کا کام دیتی ہے ۔ کوئی انقلاب بھی کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک اس کے پاس جان نثار کارکنوں اور بابصیرت پُرعزیمت قائدین کی ایک مؤثر ٹیم موجود نہ ہو ۔ ہجرت اسلامی تحریک کی اس ضرورت کو احسن طریقے سے پورا کرتی ہے ۔ ہجرت کے بعد اہلِ حق کی تعلیم و تربیت و تنظیم کا کام بہتر طور پر کیا جا سکتا ہے اور صالح سوسائٹی ۔ نظریاتی معاشرے کی ابتدائی تشکیل کے ذریعے ذمہ داریاں سنبھالنے اور مناصب کے فرائض ادا کرنے کی تربیت دینے کا ذریعہ بنتی ہے ۔

ظاہر ہے کہ حق پرستی کا پودا باطل کی پابند سلاسل متعفن فضاؤں میں پرورش نہیں پا سکتا ۔ اس کے لیے سیاسی آزادی، حریتِ فکر، شورائیت اور ضمیر و ایمان کی عملی آزادی درکار ہوتی ہے ۔ جو شے صرف زبان سے تسلیم کی جائے اور اس پر عملدرآمد کے لئے ماحول موجود نہ ہو وہ ایک خاص مدت تک تو جذبہ عمل کو ابھارنے اور قربانیاں پیش کرنے کا ذریعہ بن سکتی ہے لیکن زمانہ کی دست برد کی زد میں آنے کے بعد جب عقیدہ عمل سے مختلف ہو، عمل حالات کا پابند، اور اس سے متصادم ہو کر رہ جاتا ہے، تو غیر محسوس طور پر انسانی ضمیر میں نفاق و منافقت اور ضعف و گریز کے جراثیم پرورش پانے لگتے ہیں اور بتدریج صورت حال یہ بن جاتی ہے کہ جو بات عقیدے کا جزو تھی وہ رسم کا موضوع اور جو عمل و کردار کے لیے برحق تھی وہ موضوع سخن بن کر رہ جاتی ہے اور انسانی ضمیر اس تضاد میں اضطراب تلاش کرتا چھوڑ دیتا ہے ۔ یہ فضا کسی انقلابی تحریک کے لیے سم قاتل سے کسی صورت کم نہیں ہوتی اس لیے ایسی فضا سے نکلنے کی تدبیر ضروری ہوتی ہے تاکہ فضا بدلے، حالات بدلیں، ماحول بدلے، اور بندۂ مومن صرف مالک و خالق کی بندگی کے لئے آزاد ہو جائے چاہے اسے مکہ کی پیاری گلیاں چھوڑنی پڑیں یا بازارِ مصر کی رونقوں سے نکل کر دشت و صحرا کی خاک چھاننی پڑے ۔

ہجرت ہی اس بات کی ضمانت دیتی ہے کہ جذبہ کو بیدار کرے، ماحول کو سازگار کرے، حالات کو تبدیل کرے اور تحریک کی جدوجہد کے لیے نئی فضا اور نئے حالات پیدا کرے ۔ حق کا شجرِ طیبہ باطل کے شجرِ خبیثہ کے سائے میں پرورش نہیں پا سکتا ۔

ہجرت، اسلامی تحریک کو ایک زوردار پیش قدمی کا موقع فراہم کرتی ہے ۔ ایک بہت بڑی چھلانگ جو باطل کے سر کے اوپر سے نکل جاتے اور سازگار فضا میں خیمے گاڑ دینے کا کام دیتی ہے اس لیے کہ حق ایک نظامِ زندگی بن کر ہی نکھرتا اور سنورتا ہے ۔ اس کے شیریں پھل، خوشنما پھول، سایہ دار شاخیں، دلکشا کلیاں، دلفریب غنچے، پُرکیف خوشبو، ٹھنڈا سایہ اور رنگ بہار

کیفِ زندگی اس کے مکمل نفاذ کے بعد ہی اپنی حقیقی صورت میں رونما ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایک مکان کے کاغذی نقشے اور اس کی حقیقی عمارت میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے کاغذی نقشہ کسی کو نہ سردی گرمی سے بچا سکتا ہے اور نہ بارش اور دھوپ سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔ کسی نظام کے حقیقی نفاذ کا مرحلہ ہجرت کے بعد ہی سنورتا ہے اور ایک آزاد فضا میں ہی اس کی خوبیاں دل کو بھاتی اور برکات زندگی کو سنوارتی ہیں۔ اگر کسی نظام زندگی کو عملی نفاذ میسر نہ آئے، تو اس کے سارے خواب ادھورے رہ جاتے ہیں اور اس کی حقانیت پر عملی دنیا کے لوگوں کو مطمئن کرنا بہت دشوار ہو جاتا ہے۔ ہجرت نفاذ نظام کے لیے ایک شاہراہ کا کام دیتی ہے۔

باطل کے مقابل مورچہ بندی

جب تک اسلامی تحریکِ نظام طاغوت کے دائرۂ اثر کے اندر رہے۔ اس کا مقابلہ طاغوتی طاقتوں سے برابر کا مقابلہ نہیں ہوتا لیکن جب مومنین ہجرت کر کے نظام طاغوت سے باہر کوئی آزاد ٹھکانہ بنا لیں تو پھر اس طاغوت سے مومنین کی ٹکر مقابلے کی ٹکر بن جاتی ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ معظمہ میں اپنی تعلیمات و افکار و تربیت کے ذریعے ایک ایسا گروہ تیار کر دیا تھا جو دنیوی حرص وہوا سے ماورائے اسلام کے انقلابی عقائد کا حامل تھا، توحید کی قوت سے آپ نے اس کے ایمان کو مضبوط کیا حقیقت رسالت کے چشمے سے آپ نے اسے سیراب کیا۔ آخرت کی جواب دہی کے خوف سے آپ نے اس لوہے کو موم بنایا، اسلامی تعلیمات و کردار کے سانچے میں اُسے ڈھالا اور تعلق باللہ اور توکل علی اللہ کے آب سے آپ نے اس گروہ کو فولادی گروہ بنا دیا۔

جب آپ نے ایک ایسا گروہ تیار کر دیا جو اپنی نفسانی اغراض سے بے نیاز اور دنیوی مفاد و مقاصد سے بالاتر ہو کر صرف خدا کی رضا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی کے لیے جان پر کھیل سکتا تھا۔ مال لٹا سکتا تھا، گھر بار قربان کر سکتا تھا، چلتے ہوئے کاروباروں اور تجارتوں پہ لات مار سکتا تھا۔ جو خدا کے سوا دوسرے کسی کا وفادار اور پرستار نہ تھا اور رسول اکرم کے سوا دوسرے کسی کا تابع اور جاں نثار نہ تھا۔ تب آسمان سے حکم ہوا کہ اب یہ گروہ پختہ کار اور مقبول بارگاہ تھا اور اسے باطل کے مقابلے میں میدان جنگ میں اتارا جا سکتا تھا۔ ایمانی پختگی کے اس مقام پر پہنچ کو ہجرت عام کا حکم ہوا تھا۔ اب یہ سونا کندن بن گیا تھا اور اب اسے بازارِ آزمائش میں لایا جا سکتا تھا۔ اسلامی تحریک اب عدم تشدد اور ظلم برداشت کرنے کے دور سے گزر کر قوت آزمائی اور مخالفانہ جدوجہد کے دور میں داخل ہو گئی تھی۔ ہجرت کا اعلان یہی ثابت کرتا تھا۔ اب اس کے سوا دوسرا کوئی چارہ نہ تھا کہ دونوں کشمکش کرنے والے گروہ مخلوط نہ رہیں بلکہ مدِمقابل ہو جائیں۔ آمنے سامنے آ جائیں اور ہر شخص اپنے نظریات کی صداقت و حقیقت کا امتحان میدان جنگ میں دینے کے لیے تیار ہو جائے۔

ہجرت کے بعد باطل سے دست بدست کش مکش کا مرحلہ سامنے آ گیا تھا۔ یہ کش مکش اگر کافر و مسلم کے مخلوط معاشرے میں ہوتی تو اس کی نوعیت خانہ جنگی سے زیادہ نہ قرار پاتی اور اس کے نتائج ایک منظم حکومت اور مہذب معاشرے کی صورت میں نمودار نہ ہوتے۔ ظاہر ہے کہ باہمی دست و گریبان خانہ جنگی میں مبتلا کسی معاشرے میں سے بھی کوئی صالح اور پاکیزہ شورائی نظام نمودار نہیں ہو سکتا۔ اول تو ایسی کشمکش کی نوعیت مسلم اور غیر مسلم فسادات سے زیادہ مختلف نہ بنتی اور دونوں گروہوں کے کردار کی امتیازی خصوصیات بھی کھل کر سامنے نہ آ سکتی تھیں۔ اس کے علاوہ بے پناہ خون خرابہ ہونے کے باوجود کسی منظم مہذب اور قانون و آئین کی پابند حکومت کے برسرِ اقتدار

آنے کے امکانات کم سے کم تر ہو جاتے بلکہ ملک کسی غیر ملکی مداخلت اور مہم جُو جابر حکمران کی آماجگاہ بننے کے لیے نرم چارہ بن جاتا۔

حضور اکرمؐ کی حکمت دینی و سیاسی اس امر کی متقاضی تھی کہ ایک واضح نصب العین کو حاصل کرنے اور ایک با مقصد انقلاب برپا کرنے کے لیے کشمکش کرنے والے مسلم و کافر دونوں گروپوں کی مورچہ بندی باقاعدہ ہو، علیحدہ علیحدہ ہو اور کسی ٹھوس اور واضح نتیجے کی حامل ہو۔ اس کے علاوہ ہر غیر جانبدار گروہ یا قبیلے کو دونوں میں سے کسی ایک کے ساتھ حلیف بن کر تعاون کرنے یا حریف بن کر جنگ آزما ہونے کے واضح مواقع موجود ہوں، اس طرح ہجرت کے اس واقعہ سے کافر و مسلم گروہوں کے درمیان نظریاتی کے ساتھ ساتھ جغرافیائی، سیاسی اور معاشرتی لکیریں بھی کھنچ گئیں اور ہجرت کے بعد جس کسی نے اس کش مکش میں حصہ لیا، معروف اور معلوم طریقے سے لیا۔ ہجرت سے دوست و دشمن میں امتیاز قائم ہو گیا۔ اپنے اور بیگانے نمایاں ہو گئے۔ غرض حکمتِ ہجرت کے ذریعے اسلامی تحریک کو تنظیم و وحدت کے علاوہ نظم و ضبط اور معاشرتی قربت کا موقعہ بھی میسر آ گیا۔ اس سے ایک اسلامی سوسائٹی وجود میں آ گئی جو پہلے نہیں تھی۔ اس یکجائی نے مسلمانوں کی اخلاقی اور اجتماعی قوت میں کئی گنا اضافہ کر دیا۔

ہجرت اجتماع قوت کا ذریعہ

طاغوتِ وقت کے خلاف مورچہ بندی کے علاوہ ہجرتِ اسلامی تحریک کے لیے اجتماعِ قوت کا ذریعہ بھی ہوتی ہے۔ مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کر کے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی جماعت کی بکھری ہوئی قوت کو سمٹ کر ایک معاشرتی ٹیم اور ایک دفاعی ہتھیار کی صورت میں تبدیل کر لیا۔ مخلوط سوسائٹی میں نظریاتی اقلیت کا گروہ کمزور اور زیر دست گروہ ہوتا ہے اور جب مخلوط اجتماعیت سے گزر کر جداگانہ ممتاز اجتماعیت کا اصول وجود میں آتا ہے تو اس سے نظم و ضبط، اجتماعی ارادہ، اجتماعی قوتِ فیصلہ اور اقدام وجود میں آتا ہے۔ معاشرتی اعتبار سے تعلیم و تربیت کا نظام حرکت میں آ جاتا ہے اور کردار سازی اور انسان سازی کا نظریاتی کارخانہ اپنے بہترین نتائج دکھانے کے قابل ہو جاتا ہے۔

حضرت موسیٰؑ کے دور میں مصر کی مخلوط سوسائٹی نے بنی اسرائیل کو اپنے عقائد میں کمزور اور کردار میں مضمحل کر کے ان کے نظریاتی موقف سے بہت کچھ دور کر دیا تھا چنانچہ حضرت موسیٰؑ نے جہاں ایک طرف اللہ کے دین کی دعوت فرعون اور اس کی رعایا کے سامنے پیش کی، وہاں بنی اسرائیل کو مصر کی قبطی سوسائٹی سے علیحدہ اور آزاد کر دینے کا مطالبہ بھی کیا اور وہیں یہ اہتمام بھی فرمایا کہ جماعتی سطح پر بنی اسرائیل کے علیحدہ علیحدہ بستیوں میں جداگانہ حلقے قائم کیے تاکہ وہ اپنی فلاح اور اجتماعی جدوجہد کے لیے مشورے کر کے نظم، ارادہ اور قوتِ اقدام پیدا کر سکیں۔ اس کام میں ان کے نوجوانوں نے بہت بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ بنی اسرائیل کو بھی جہاد کا حکم اس وقت دیا گیا تھا جب وہ مصر کی مخلوط سوسائٹی سے ہجرت کر کے ایک مہاجرانہ اجتماعیت بن چکے تھے۔ جہاد کے لیے طاغوت کے تعین کے علاوہ تنظیم و اجتماع بہت ضروری شرائط ہیں۔

حضور اکرمؐ نے ہجرت کے ذریعے اپنی اسلامی قوت کو سمیٹنے اور اس سے اجتماعی جدوجہد میں مؤثر کام لینے کا اہتمام فرمایا۔ ہجرت کے ذریعے دوست و دشمن علیحدہ علیحدہ ہو گئے۔ جاں نثار رفیق سمٹ کر ایک نقطہ پر جمع ہو گئے۔ باہمی مشورہ کرنا آسان ہو گیا باہمی کام کا نقشہ بنانا ممکن ہو گیا اس طرح کام تقسیم کار اور منصوبہ بندی کے ذریعے ہونے لگا اور ہر کام کے لیے اہل تر افراد موجود اور میسر آنے لگے۔

ظاہر ہے کہ انبیاء کرامؑ کا کام تو اللہ کا ہی کام ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ فتنہ و فساد کو پسند نہیں کرتا۔ وہ نظامِ باطل پہ ضرب لگا کر نظامِ حق برپا کرنا چاہتا ہے لیکن اگر کوئی ضرب صرف فتنہ و فساد اور قتل و غارت کا ساماں تو کر دے اور خلقِ خدا کی عزت و آبرو اور جان و مال کو بڑے پیمانے پہ خطرے میں تو ڈال دے لیکن نتائج واضح طور پہ حق کے مخالف نکلنے کا خطرہ ہو تو یہ ضرب باطل کی بجائے مخلوقِ خدا پہ پڑ جاتی ہے جو خدا کا کنبہ ہے اور یہ چیز اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں ہے۔

ہجرت قوت و اجتماع فراہم کرتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی حکمت کا یہ تقاضا ہوتا ہے کہ اس کی مخلوق کو فساد فی الارض سے بچایا جائے۔ اگرچہ سب سے بڑا فساد خود نظامِ باطل ہے لیکن اس کے خلاف بھی عملی جد و جہد میں حرب و ضرب کا مقام تب آتا ہے جب کامیابی اور اصلاح کے امکانات بہت واضح موجود ہوں ظاہر ہے کہ ایسی ضرب لگانے کا موقعہ اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب دوست اور دشمن آمنے سامنے ہوں اور فریقین کی قوت اور حالات کا تخمینہ کارکنوں کے سامنے ہو۔

ہجرت دوست اور دشمن کو ممتاز کر دیتی ہے ان کو آمنے سامنے کر دیتی ہے ان میں معاشرتی اور معاشی تعلقات منقطع کر دیتی ہے ان کے مشترک مفادات جو کمزوری کا باعث ہوا کرتے ہیں ختم کر دیتی ہے اور منظم و متحد ہو کر ایک نظریاتی گروہ کی حیثیت سے جد و جہد کے میدان میں کامیابی کی طرف پیش قدمی کا موقعہ فراہم کرتی ہے۔ ہجرت اجتماعِ دوستاں کا ذریعہ ہے اور قوت و توانائی کا منبع ہے۔ اسی میں اسلامی تحریک کی کامیابی کا راز مضمر ہے۔

(۱۳)

ہجرت، اپنے پرائے کی شناخت کا ذریعہ

ہجرت دراصل اپنے پرائے کی شناخت کا بہترین ذریعہ ہے حضور اکرمؐ نے تیرہ سال تک مکہ مکرمہ میں دعوتِ اسلامی کا مرکز قائم رکھا۔ یہ دعوت صرف قریش تک ہی محدود نہ تھی بلکہ شہر مکہ سے نکل نکل کر اطرافِ عرب کے قبائل اور آبادیوں میں بھی پھیل رہی تھی۔ لوگ قریش سے کاروبار کرنے شہر آتے تھے تو حضور اکرمؐ کی دعوتِ اسلامی سے روشناس ہو کر واپس جاتے تھے۔ لوگ حج کے لیے ملک کے طول و عرض سے آتے تھے تو حضور اکرمؐ ان کی قیام گاہوں پر جا جا کر ان کے سامنے دعوتِ اسلام پیش کرتے تھے۔ طوافِ بیت اللہ، دورانِ قیامِ حرم، منیٰ کا کیمپ، عرفات کا قیام، مزدلفہ کا ڈیرہ غرض ایامِ حج میں حضور اکرمؐ کا دعوتی مشن بہت سرگرم اور بھرپور ہوتا تھا اور آپ سارے حاجیوں پر اسلام کی تعلیمات واضح کرتے تھے۔ اس طرح اسلام کے ماننے والے صرف مکہ میں ہی نہیں تھے بلکہ بادیہ کے قبائل اور دور دراز کی بستیوں میں بھی موجود تھے۔

سب اپنے اپنے علاقوں میں اور لوگوں میں کہیں کھلم کھلا اور کہیں چپکے چپکے منتشر طور پہ مصروفِ کار تھے۔ پھر ہجرت کا حکم ہوا تو اسلام کے ہر نام لیوا کے سامنے یہ سوال آ گیا کہ کیا وہ اسلام کی خاطر گھر بار، قبیلہ و خاندان معیشت و تجارت چھوڑ کر دار الہجرت مدینۃ الرسول میں چلا جائے یا اس حکم کو ٹال دے۔ چنانچہ جس جس کے دل میں اسلام کی محبت، خدا کی خشیت اور رسولؐ کی رسالت کا نقش گہرا تھا اس کا راستہ بہت واضح تھا۔ اسے خدا اور اس کے رسول نے پکارا تھا تو وفاداری کے لیے اس پکار پہ بیٹھے۔ جو ایمان کے منافی تھا، جو دامن جھاڑ کر چل پڑا وہ امتحان میں پاس ہو گیا اور جو بیٹھا رہ گیا تو اس کا دین و ایمان ہی بیٹھ گیا۔ بس اس وقت صاحبِ ایمان کا یہی نشانِ شناخت قرار پایا۔ اسی سے معلوم ہوا کہ کس کس میں ایمان کی جڑیں پائیدار اور مضبوط ہیں اور کون کون کچا یا جھوٹا دعویدار ہے بلکہ

ہیں اللہ کی محبت کے مقابلے میں جان، مال، تجارت گھر بار اور بیوی بچوں کی محبت زیادہ ہے۔ کون ہے جو رسولؐ کی محبت پر جہانِ آرزو کو نثار کرتا ہے اور کون ہے جو زمین سے چمٹ کر رہ جاتا ہے اور اس کے لیے دینِ حق کی عظیم الشان منازل کی طرف گامزن ہونا بوجھل ہے۔ کون اللہ کے راستے میں نکلتا ہے چاہے ہلکا ہو یا بوجھل، اور کس کے پاؤں بوجھل اور دل مضمحل ہو کر رہ گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہجرت نے وفادار اور غیر وفادار اپنے اور پرائے، حقیقی مومن اور کھوکھلے دعویدار کے درمیان امتیاز قائم کر کے دکھا دیا۔ ہجرت سے پہلے ایمان کے دعویداروں کے لیے ممکن تھا کہ اپنی اپنی جگہ بیٹھ کر صرف دعاگوئی کا فرض سرانجام دیتے ہیں، لیکن ہجرت کے ذریعے سے جب مومنوں اور کافروں کے درمیان مسافت کی دیوار اور ایثار و قربانی کی باڑ لگ گئی تو پھر ہر مدعی کے لیے دار و رسن کا اعزاز حاصل کرنا ممکن نہ رہا۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہجرت نے کھرے کھوٹے اور سونے تانبے میں امتیاز کرنے والی ایک ایسی کسوٹی کا کام کیا جس کے بعد مومنین کی منتشر جمعیت نے ایک منظم جماعت کی حیثیت اختیار کر لی۔ ہجرت کا یہ طریقِ کار انقلابی بھی تھا اور نظریاتی بھی۔ اس اقدام نے ایک متعین منزل کی طرف پیش قدمی کا ایک مضبوط عمل سرانجام دیا۔

ہجرت، جہاد کا دروازہ

ہجرت نے مکہ میں مسلمانوں کی مظلومیت کے دور کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔ اللہ کے دین کی حکمت جہاں مسلمانوں کی مظلومی سے ان کی پختگی اور عقائد و ایمان کی مضبوطی کا کام لے رہی تھی وہاں نوجوان جاں نثار مسلمانوں میں کفار کے مقابلے میں عدم تشدد کا رویہ اختیار کرنے پر اضطراب بھی موجود تھا۔ وہ دعائیں کرتے تھے کہ انھیں بھی میدانِ مقابلہ میں ان دشمنانِ خدا و رسولؐ سے تلوار کا مقابلہ کرنے کا موقعہ ملے تو وہ انھیں بتائیں کہ مومن اللہ کے راستے میں جان دینے کا کیسا سلیقہ اور دشمنانِ خدا اور رسولؐ کو سزا دینے کا کتنا حوصلہ رکھتا ہے۔

لیکن ایامِ مظلومیت میں مسلمانوں کو ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہ تھی۔ ابوجہل کے مظالم بہت بڑھ گئے تھے۔ عقبہ اور ولید کی گستاخیاں حد سے آگے نکل گئی تھیں۔ بیکس اور لاچار مسلمانوں پر جبر و تشدد کی انتہا ہو گئی تھی۔ ابولہب کانٹے بچھاتے بچھاتے دعوتِ اسلامی کے راستے کا کانٹا بن گیا تھا۔ ابوجہل مظلوم مومنہ حضرت سمیہ کو شہید کر کے اپنے آپ کو تیس مار خان سمجھنے لگا تھا۔ شعب ابی طالب کے تین سالوں میں مسلمان مظلومیت کا سخت ترین دور گزار چکے تھے۔ یہ وہ امتحان تھا جسے حضور اکرمؐ اور آپ کے خاندان نے مشکل ترین حالات میں پاس کیا تھا۔ اور مسلمانوں کا پیمانۂ صبر بار بار ان مظالم کے مقابلے میں چھلکنے لگتا تھا۔

ایک بار ابوجہل نے حالت نماز میں حضور اکرمؐ کے گلے میں کپڑا ڈال کر اتنے بل دیے کہ نماز کے دوران حضورؐ گھٹنے کے بل گر پڑے اور حضرت ابوبکر صدیقؓ نے آگے بڑھ کر اس ناہنجار کو دھکا دے کر پیچھے ہٹایا اور فرمایا۔

"کیا تم ایک شخص کو اس لیے ہلاک کیے دیتے ہو کہ وہ ایک اللہ کو اپنا رب کہتا ہے اور صلہ رحمی کا حکم دیتا ہے۔"

حضرت حمزہؓ کو معلوم ہوا تو وہ غصے سے لال پیلے ہو گئے انھوں نے مجلس میں آ کر ابوجہل کے سر پر اپنی کمان اتنے زور سے ماری کہ اس کا سر زخمی ہو گیا اور پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جا کر کہا:

"اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے ابوجہل سے آپ کا انتقام لے لیا ہے۔"

حضورؐ نے بہت پرسکون لہجے میں فرمایا :

"چچا میں انتقام لینے کے لیے تو نہیں آیا مجھے تو تب خوشی ہوگی جب تم ایمان لے آؤ گے۔"

اور حضرت حمزہؓ کلمہ طیبہ پڑھ کر وہیں مسلمان ہو گئے۔

اس طرح مسلمانوں کی صفوں میں نوجوانوں، صف شکن مجاہدوں، بہادر سپاہیوں اور رزم آرا شمشیر زنوں کا اضافہ ہوتا جاتا تھا اور آہستہ آہستہ مسلمانوں کی ننھی جماعت اس مقام کو پہنچ رہی تھی کہ اگر اسے اپنے دین کا دفاع اور اپنی عزت و آبرو کا تحفظ کرنے کے لئے جان و مال کی قربانیاں دینی پڑیں تو وہ مثالی قربانیاں دے سکیں۔

مسلمان جہاد کا حکم ملنے کے لیے دعائیں کرتے تھے۔ اور دشمنان دین سے انتقام حق لینے کی آرزوئیں کرتے تھے۔ تب ان کو ہجرت کا حکم ہوا تاکہ ان کا یہ شوقِ جہاد پایۂ تکمیل کو پہنچ سکے اور وہ اللہ کے راستے میں جنگ آزمائی کا شوق پورا کر سکیں۔ اب ان کی طلب صادق اور ان کی آرزوئے اقامت دین پختہ ہو چکی تھی اس لئے اب انھیں مزید روکنا مناسب نہ تھا اب انھیں جہاد کے مدنی مورچے پر پہنچنے کا حکم ہو گیا۔ یہی وہ مورچہ تھا جس سے انہوں نے باطل کے خلاف مسلح جدو جہد کا آغاز کرنا تھا۔ ہجرت پُر امن تبلیغی سرگرمیوں سے مسلح انقلابی جدوجہد کی طرف پیش قدمی کی پہلی منزل ہے۔ ہجرت جہاد کا آتشیں دروازہ ہے جہاں سے شہدائے کے سرخرو قافلے گزرا کرتے ہیں۔

ہجرت، انقلابِ اسلامی کا نقطۂ آغاز

ہجرت سے پہلے حضور اکرمؐ کو مکہ میں اسلام کی دعوت دیتے ہوئے ۱۳ سال گزر گئے تھے۔ لیکن قریش کی مزاحمت دن بدن بڑھتی ہی چلی گئی تھی اب ان کے درمیان مزید رہنا تضیع اوقات تھا۔ اب اللہ کے کلمے کو بلند کرنے، دینِ اسلام کو اپنی زندگی کا سب سے قیمتی اثاثہ ثابت کرنے اور اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لیے داعیانِ حق کے سامنے ہجرت ایک فیصلہ کن مرحلہ بن کر آ گئی تھی۔ ظاہر ہے کفر کے علاقے کو چھوڑ کر اللہ کی خاطر دینِ اسلام کے علاقے کی طرف سفر کر جانے کا نام ہی تو ہجرت ہے۔ اللہ کے لئے، اس کے دین کے لئے اور اپنے ایمان کے لیے اپنے گھر بار، عزیز و اقربا، تجارت و کاروبار چھوڑ کر خالی ہاتھ پردیس کی طرف نکل جانے کا نام ہی ہجرت ہے۔ اقامت دین کی منزل کا ایک مرحلہ یہ ہجرت بھی ہے۔

غلبۂ اسلام کے لیے فرد کی اصلاح پہلا قدم ہے تو معاشرے کی اصلاح دوسرا قدم ہے اور دیارِ کفر سے دارالاسلام کی طرف ہجرت کرنا تیسرا قدم ہے۔ ان مراحل سے گزر کر ہی تو اسلام کا حیات آفرین اور زندگی بخش نظام قائم ہوتا ہے۔

مکہ میں دعوتِ اسلامی پیش کرتے ۱۳ برس بیت گئے تھے اور حضور اکرمؐ کی عمر ۵۳ سال کی ہو گئی تھی۔ آپ طائف کی دعوتی مہم سے زخمی ہو کر واپس تشریف لے آئے تھے۔ آپ کے مشفق چچا ابوطالب اور غمگسار اہلیہ خدیجۃ الکبریٰؓ کا انتقال ہو چکا تھا۔ قریش اب حضورؐ کی جان کے درپے تھے ان کی مجالس میں حضورؐ کے قتل کے منصوبے زیرِ غور آتے تھے۔ حضورؐ کے گرد کفار کا نرغہ شدید سے شدید تر ہو گیا تھا۔ یہی موقعہ تھا جب مدینہ کے چند افراد نے حج کے موقعہ پر اسلام قبول کیا تھا اور دوسرے سال ۷۵ افراد نے اسلام

قبول کرکے آپ کو مدینے منتقل ہونے کی پُرزور دعوت دی اور جان نثاری کے عہد و پیمان کیے تھے۔ مدینہ والوں پر اللہ کی رحمت ہو جنہوں نے تاریخ اسلام کے دھارے کا رُخ مکہ سے مدینے کی طرف موڑ کر پوری انسانیت پر احسان کیا۔

مدینہ والوں سے پختہ عہد و پیمان ہونے کے بعد ہجرت کے لئے حضورؐ کو صرف یہ انتظار تھا کہ اللہ کی طرف سے کب اذنِ سفر ہوتا ہے اور آپ کے ساتھ رفاقتِ سفر کا کسے شرف حاصل ہوتا ہے۔

جو رات قریش نے حضورؐ پر حملے کے لیے مقرر کی تھی وہی خاص رات آپ کے لئے ہجرت کی رات بھی مقرر کی گئی تھی۔ حضرت علیؓ کو اپنے بستر پر سلا کر اسی رات حضورِ اکرمؐ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے مکان پر تشریف لے گئے۔ گھر میں تخلیہ کرا دیا گیا اور ابوبکرؓ کو ہجرت کا حکم آجانے کی خبر سنائی گئی۔

"کیا مجھے بھی آپ کے ساتھ سفر کی اجازت ہے؟" حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کانپتی ہوئی آواز میں عرض کیا۔

"ہاں تمہیں بھی میرے ساتھ سفرِ ہجرت کرنا ہوگا۔" حضورؐ نے فرمایا۔

ام المومنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ یہ بات سن کر ابا جان زار و قطار رو پڑے تب میں نے پہلی بار جانا کہ انسان غم میں ہی نہیں خوشی میں بھی روتا ہے۔

یوں ہجرت کا حکم آیا، ہجرت ہوئی۔ پہلا پڑاؤ غارِ ثور تھا جہاں تین دن قیام فرمایا گیا اور جب تعاقب کرنے والوں کے پاؤں بھی نظر آنے لگے تو حضرت ابوبکر صدیقؓ جو اس غار میں دو میں کے دوسرے تھے بہت گھبرائے اور عرض کیا:

"یا رسول اللہ اگر وہ ذرا جھک کر دیکھ لیں تو ہم پکڑ لیے جائیں گے۔"

حضورؐ نے جواب میں فرمایا:

"ابوبکر! لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا۔ (اللہ ہمارے ساتھ ہے غم نہ کرو)۔"

اور بلاشبہ ہجرت کرنے والے پاک نبیؐ کے ساتھ اللہ تھا اور جب وہ پاک نبی مدینہ پہنچا تو گویا وہاں کامیابیوں کا چاند طلوع ہو گیا۔ اس میں کیا شک ہے کہ ہجرت اسلامی انقلاب کا نقطۂ آغاز ہے۔ ہجرت اسلام کی کامیابیوں کی طرف پہلا مضبوط قدم ہے۔ ہجرت کفر و اسلام کے درمیان سفرِ مفارقت ہے۔ ہجرت مسلمانوں اور کافروں کے درمیان قوت آزمائی کا وسیع میدان جنگ ہے۔ ہجرت اسلام کی فتح کا دروازہ ہے۔ ہجرت کے پیچھے کفر کی ناکامیوں کا ہجوم ہے اور ہجرت کے آگے اسلام کی کامیابیوں کا دروازہ کھل جاتا ہے۔

طاغوت سے برابر کی ٹکر

حضورِ اکرمؐ نے ہجرت کے ذریعے تحریکِ اسلامی کو مظلومیت سے اٹھا کر قریش کے مدِمقابل لا کھڑا کیا۔ ہجرت کے ذریعے مسلمانوں کو موقع مل گیا کہ وہ ظلم و ستم سہنے کی کمزوری سے نجات پائیں اور دشمن کا مقابلہ میدان میں کرنے کا مقام حاصل کریں۔ ہجرت کے ذریعے اسلام کی چاروں طرف بکھری ہوئی طاقت سمٹ کر ایک مرکز پر جمع ہو گئی اور ایک قائد کے زیرِ نگرانی اور زیرِ ہدایت ایک صف میں آگئی۔ ہجرت کے ذریعے افراد کی شناخت ہو گئی۔ جو شخص خدا اور رسولؐ کے حکم پر دامن جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوا وہ اسلام میں صفِ اول کا آدمی قرار پایا اور جو زمین و مکان سے چمٹ کر رہ گیا وہ آخری صف میں چلا گیا۔ اس کے ذریعے مسلمانوں کو اسلام کے راستے میں قربانیاں پیش کرنے کا موقع مل گیا۔ ہجرت کے ذریعے کفر کو

چیلنج کرکے اسے میدان میں قوت آزمائی کی خاطر اترنے کے لیے للکارا گیا اور مدمقابل ہونے کی حیثیت سے اسلام کے لئے کفر پہ ضرب لگانے کی گنجائش پیدا ہوگئی۔ اس کے بعد اس کش مکش کا آغاز ہوا جس کے نتیجے میں فتح و نصرت کا نزول ہوا کرتا ہے۔

ہجرت نے تمام قبائلِ عرب کو بھی موقعہ دے دیا کہ وہ چاہیں تو کفار کے حلیف بن جائیں اور چاہیں تو اسلام کے حلیف بن کر سامنے آئیں۔ ہجرت سے باشندگان مدینہ کو بھی قربانیاں دے کر اپنے ایمان کا امتحان دینے کا موقعہ ملا اور نئے آنے والوں کی میزبانی اور ان کی آباد کاری میں مدد کے ذریعے اسلام میں مقامِ انصار قائم کرنے کا فخر حاصل ہوا۔ ہجرت نے وہ میدان مقابلہ قائم کر دیا جس کے بعد اللہ تعالیٰ کی مدد اپنے مخلص بندوں کے حق میں اترا کرتی ہے اور بلاشبہ پھر وہ غیبی مدد اتری اور کفار کو تباہ کرنے میں مسلمانوں کا دستِ غالب بن گئی۔

ہجرت کا حکم ملنے کے بعد سارے مسلمانوں کو بار بار ہجرت کرنے پر ابھارا گیا تاکہ وہ سمٹ کر دارالاسلام مدینہ میں جمع ہو جائیں اور کفر کے خلاف معرکہ برپا کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ اسی لیے جو مسلمان ہجرت سے پہلو تہی کرتے تھے انھیں ضعیف اور کمزور مسلمان شمار کیا گیا اور جن کا اخلاص بھی ثابت نہ تھا انھیں تو منافق کہا گیا اور ان کے بارے میں حکم ہوا کہ اگر وہ مجبوری سے بھی کفار کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے خلاف معرکہ آرائی کریں گے تو ان کا قتل جائز ہے اور ان کے ساتھ وہی کارروائی کی جائیگی جو دوسرے کفار کے ساتھ ہوگی۔

ہجرت دو رنگی کو چھوڑ کر یک رنگ ہونے کا عمل ہے۔ یہ مصلحت پرستی کی بجائے عزیمت کا راستہ ہے یہ دنیا کے مقابلے میں آخرت کو ترجیح دینے کا فیصلہ ہے ظاہر ہے کہ بیٹھ رہنے والے جہاد کرنے والوں کے برابر نہیں ہو سکتے۔ ہجرت سے جی چرانا بیٹھ رہنا اور ہجرت کرنا میدان جہاد میں جانے کے مترادف ہے۔ جہاد کا عمل ہجرت سے کچھ بھی دور نہیں ہے۔ ہجرت کے بعد دوسرا اقدام جہاد ہی ہوا کرتا ہے۔ ہجرت سے جی چرانے والوں کے بارے میں ہی قرآن نے بتایا ہے کہ جب ان کی جانیں فرشتوں نے قبض کیں تو ان سے کہا گیا۔

"کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے۔"

اس لیے کہ حقیقی عمل تو اسلامی نظام حیات ہے۔ اگر کسی جگہ اس پر عمل کرنا ہی ممکن نہ ہو تو پھر اس سرزمین میں بیٹھے رہنے سے بہتر ہے کہ انسان جنگلوں کو آباد کرے۔ صحراؤں میں نکل جائے اور خدا کی وسیع زمین میں جہاں کفر سے آزادی ہو وہاں جا کر ڈیرے ڈال دے۔ ہجرت کا مقصد غلبۂ کفر سے نکل کر اسلامی قوانین پر عمل کے لیے آزادی کا راستہ اختیار کرنا ہے۔

حضورؐ نے ہجرت کے اقدام کے ذریعے دعوت اسلامی کی تحریک کو پرامن انقلاب کے راستے سے گزار کر مسلح انقلاب کے مقام پر لا کھڑا کیا اور بالآخر ہجرت کے ذریعے حضورؐ کی پرامن دعوتی جدوجہد قوت و شوکت کے مسلح مرحلے میں داخل ہوگئی۔ اس طرح حضور اکرمؐ نے اپنی انقلابی حکمت کا ایک اہم مرحلہ طے کر لیا جس کے بعد باطل کے سامنے زندگی اور موت کا کھلا چیلنج رکھ دیا گیا۔ ہجرت کے ذریعے دعوت اسلامی کی تحریک جنگ و جہاد کے مرحلے میں داخل ہوگئی۔ وہ جہاد جس کے بارے میں حضورؐ نے فرمایا تھا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ میں اللہ کے راستے میں لڑوں اور مارا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں۔ پھر لڑوں اور مارا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں یوں اللہ کے راستے

میں زندگی اور موت کا یہ سلسلہ اللہ کی رضا کی خاطر پیہم جاری رہے۔ زندگی کو موت کے سر پہ ضرب لگانے کے لیے استعمال کرنا ہی دراصل جہاد ہے۔ اور جہاد ہی اسلامی انقلاب کا سب سے قوی اور مؤثر ہتھیار ہے۔

ہجرت، کامیابی کا زینہ

ہجرت، اسلامی انقلاب کی عظیم الشان جد و جہد میں ایک ناگزیر مرحلہ ہے۔ دعوت اسلامی کی تاریخ میں اللہ کے نبیوں کو اللہ کے دین کی دعوت کے دوران بالعموم ہجرت کے مرحلے سے بھی گذرنا پڑا ہے۔ اللہ کی زمین پر خلافت ربانی کا فریضہ ادا کرنے اور اللہ کی مرضی کو زمین پر نافذ کرنے کے لیے حضرت آدم کا نزول بھی جنت سے زمین کی طرف ہجرت کا ہی ایک مرحلہ ہے۔ انسان کی زمین پر آمد، ایک ہجرت ارضی و سماوی کا ہی کرشمہ ہے۔ نسل انسانی سے پہلے جوڑے نے بھی ہجرت کے ذریعے ہی زمین پر اپنی آباد کاری کا آغاز کیا تھا۔

ان کی آمد کے بعد ہی اس زمین پر انسان کی آباد کاری کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ زمین پر اپنی آمد کے دن سے آج کے دن تک انسان مسلسل ہجرت مکانی و زمانی کر رہا ہے۔ اگر انسان ہجرت کرنے پر آمادہ نہ ہوتا تو زمین کے ان براعظموں میں یوں انسان کا پھیلا ہوا تمدن اور چھایا ہوا تہذیبی قافلہ ہر جگہ خیمہ زن نہ ہوتا۔ اور لوگ جس جگہ پیدا ہوتے اگر اسی جگہ ٹھکانہ بنا کر بیٹھے رہتے تو دنیا کی آبادی، ترقی، تہذیب و تمدن، علوم و فنون اور قافلہ ہائے رنگ و بو کی یہ چہل پہل موجود نہ ہوتی اور دنیا یوں آباد نہ ہوتی جس طرح یہ آج آباد ہے اور نہ ہی اس میں وہ تنوع، وہ رنگا رنگی اور وہ خوبصورتی اور رعنائی ہوتی جو آج ہجرت مکانی کے پیہم اور مسلسل عمل کے ذریعے پائی جاتی ہے۔

دعوتِ اسلامی دینے والی پاکباز ہستیاں بھی اپنے اپنے دور میں ہجرت کے مرحلوں سے دوچار ہوتی رہی ہیں۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی اپنے شہر اور ملک سے ہجرت اور متعدد ملکوں اور علاقوں کا سفر۔ کہیں فلسطین میں ان کے قافلے کا پڑاؤ اور کہیں صفا و مروہ کی پہاڑیوں کے دامن میں ان کے اہل و عیال کا ٹھکانہ، حضرت یوسفؑ کی کنعان سے مصر تک جبری ہجرت، حضرت موسیٰ کلیم اللہ کی مصر سے جبل طور اور جبلِ طور سے ارض مقدس تک ہجرت، حضرت لوطؑ کی وادی سدوم سے ہجرت، حضرت یونسؑ کی اپنے زیرِ دعوت علاقے سے ہجرت، حضرت عزیرؑ کی بابل سے فلسطین کی طرف ہجرت، حضرت یعقوب کی فلسطین سے مصر تک ہجرت، حضرت ہاجرہؑ کی مصر سے مکہ تک ہجرت اور حضور اکرمؐ کی مکہ سے مدینہ تک ہجرت۔ ہجرت تو دعوتِ اسلامی کی گاڑی کا ایک خود کار پہیہ ہے۔ ہجرت اسلام کی کامیابی کا نشان ملتِ اسلامیہ کی روایت اور سنتِ ابراہیمیؑ ہے۔

اللہ کے دین کے لیے اس کے بندوں کو ہمیشہ ہجرت سے دوچار ہونا پڑتا رہا ہے۔ اللہ کا دین ہجرت کے مرحلے سے گزر کر ہی کامیابی کے مرحلے میں داخل ہوتا ہے اللہ کا دین اپنی دعوت کے دوران جس اصلاحی راستے سے گزرتا ہے اس کے چار مرحلے ہیں۔

۱۔ فرد کی اصلاح کا مرحلہ ہے یعنی تزکیہ نفسِ انسانی اور افراد کی تیاری۔

۲۔ معاشرے کی اصلاح کا مرحلہ ہے یعنی اصلاح یافتہ افراد کی تنظیم و تربیت اور ان کے اجتماعی اخلاق کی تیاری۔

۳۔ ہجرت کا مرحلہ ہے یعنی دشمنوں اور دوستوں کے درمیان مخلوط حالت سے نکل کر اسلامی جماعت کا ایک مرکز پر جمع ہو جانا۔

۴۔ جہاد اور فتح کا مرحلہ ہے یعنی دشمنانِ اسلام کے خلاف جاں گسل کش مکش کر کے اللہ کے دین اور اس کی حاکمیت کو تمام دوسرے

نظاموں پر غالب کرنا۔

اس طرح ہجرت دعوتِ اسلامی کا ایک ایسا ناگزیر مرحلہ ہے جس سے گزرے بغیر کوئی اسلامی دعوت کامیابی کی منزل میں قدم نہیں رکھ سکتی ہجرت ہی کامیابی کا زینہ ہے۔

ہجرت، طریقِ کار میں تبدیلی کا اعلان

ہجرت دعوتِ اسلامی کے طریقِ کار میں تغیر کا اعلان اور اس میں نمایاں تبدیلی کا نشان ہے۔ ہجرت سے پہلے مسلمانوں کا طریقِ کار ایک تھا اور ہجرت کے بعد دعوت اسلامی کا طریقِ کار تبدیل ہو کر دوسرا ہو گیا۔ پہلے طریقِ کار میں حضرت علیٰؑ کی دعوت کا انداز پایا جاتا تھا تو دوسرے طریقِ کار میں حضرت موسیٰؑ کا طریقِ دعوت دکھائی دینے لگا۔ ان دونوں نبیوں کی دعوت کے طریقے اسلام کی دعوت کے ان دونوں ادوار۔ ہجرت سے پہلے اور ہجرت کے بعد، میں بہت نمایاں نظر آتے ہیں۔ دونوں طریق ہائے کار سے اسلام کو تقویت پہنچی ہے۔ ایک طریقہ ضعف اور کمزوری کے دور کا ہے اور دوسرا قوت و توانائی کے دور کا۔ پہلے طریقِ کار سے کردار سازی اور تزکیہ و تربیت کا اہتمام ہوتا ہے تو دوسرے طریقِ کار سے فتح و کامرانی حاصل ہوتی ہے۔

ہجرت بتاتی ہے کہ نظامِ کفر کے ساتھ سازگاری مسلمان کی فطرت کے خلاف ہے۔ وہ نظامِ کفر کے تحت زندگی بسر کرنا گناہ سمجھتا ہے۔ اس کا اسلامی قانون نظامِ کفر کے تحت معطل ہو جائے تو اس کی ساری اسلامی زندگی معطل ہو جاتی ہے۔ ولیم ہنٹر نے مجاہدین کی تحریک کے اسباب بیان کرتے ہوئے یہی بات کہی تھی کہ "مسلمان اپنے عقیدے کی رُو سے کفر کے نظام کے تحت مصالحت نہیں کر سکتے اسی لئے اسلامی قوانین کی غیر موجودگی میں وہ جہاد پر مجبور ہوتے ہیں"۔ درحقیقت ایک مسلمان صرف دو ہی نوعیتوں کا تعلق کفر کے ساتھ رکھ سکتا ہے۔

۱۔ وہ دارالکفر میں رہتے ہوئے اسلام کو غالب کرنے اور کفر کو مغلوب کرنے کے لیے جد و جہد کرتا رہے۔

۲۔ جب تک کفر کے نرغے سے نکلنے کی راہ میسر نہ آئے وہ شدید ناگواری کے ساتھ وہاں رہے اور وہاں رہ کر بھی اپنی دعوت کو پیش کرنے کا فریضہ مسلسل ادا کرتا رہے۔

نظامِ کفر کے تحت رہنا، اس کے تحت مناصب اور منافع حاصل کرنا اور کبھی اس کے وجود کی تلخی تک اپنے ضمیر میں محسوس نہ کرنا یہ کیفیت تو ایمان کے منافی ہے اس لیے کہ جہاں خدا کے احکام کی خلاف ورزی ہو رہی ہو اور مسلمان اس میں خود بھی مبتلا ہو رہا ہو وہاں مسلمان کے لئے یہ صورت ایسے ہی ہے جیسے کوئی انسان متعفن گندگی کے گہرے کھڈ میں گرا ہوا ہو اور وہاں پڑے رہنے پر اسے کراہت کا احساس بھی نہ رہ گیا ہو۔

کہا جاتا ہے کہ فتح مکہ کے بعد اب ہجرت نہیں ہے۔ بلاشبہ کفر کا زور ٹوٹ جانے کے بعد جب سارا علاقہ خدا کے قانون کے لیے آزاد ہو جائے تو ہجرت کر کے کہیں جانے کی مسلمان کو کوئی مجبوری باقی نہیں رہ جاتی لیکن یہ حالت ہمیشہ قائم رہنا ضروری نہیں ہے۔ عین ممکن ہے کہ ایسی صورت پھر کہیں پیدا ہو جائے، کفر کا غلبہ ہو جائے اور خدا کے احکام پر عمل ممکن نہ رہے۔ اس صورت میں دعوت اسلامی، تنظیم و تربیت، جماعت بندی پھر ہجرت اور جنگ و جہاد کے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ہجرت

کرنے والوں کو یہ خوشخبری دی ہے۔

فرمایا گیا:۔

"جو لوگ ظلم سہنے کے بعد اللہ کی خاطر ہجرت کر گئے ہیں ان کو ہم دنیا میں بھی اچھا ٹھکانہ دیں گے اور آخرت کا اجر تو بہت بڑا ہے کاش جان لیں وہ مظلوم جنہوں نے صبر کیا ہے اور جو اپنے رب کے بھروسے پر کام کر رہے کہ کیسا اچھا انجام ان کا منتظر ہے۔"

ظاہر ہے کہ یہ اچھا انجام دنیا میں اسلام کی فتح کی صورت میں حاصل ہوتا ہے اور آخرت میں اجر عظیم کی صورت میں۔

ہجرت، معیارِ وفاداری

ہجرت مدینہ ایک طرف اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے تحت کی گئی، دوسری طرف انصارِ مدینہ کے ساتھ ایک تاریخی معاہدہ کے نتیجے میں وجود میں آئی۔ ۱۳ نبوی کو حضورِ اکرمؐ نے باضابطہ انصار کے ساتھ ایک معاہدے کے ذریعے مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ یہ ایک عظیم ہجرت تھی۔ ہجرت حبشہ کے مقابلے میں بہت بڑی ہجرت ہمہ گیر، ہمہ پہلو اور وسیع الاطراف ہجرت۔ تمام اہلِ ایمان کے لیے لازم تھا کہ وہ ہجرت کریں۔ کوئی مدعیٔ ایمان جو اس ہجرت میں شریک نہ ہوا اس سے خدا اور اس کے رسولؐ کا ذمہ اٹھا لیا گیا تھا۔ مدینے کی ہجرت ہمہ گیر ہجرت تھی۔ ہر چیز چھوٹ رہی تھی۔ مکان کھیت، دکان، دوست، عزیز، وطن اور شہر غرض یہ کہ ہر چیز سے کل ہجرت تھی۔ یہ بڑی آزمائش تھی چنانچہ اس موقع پر اہلِ ایمان کو تسلی دی گئی اور واضح ہدایت دی گئی۔

- جان کی فکر نہ کریں کہ جان تو کبھی نہ کبھی جانی ہی ہے۔ مکہ میں گئی یا مدینے میں گئی یا راہِ حق کے کسی مقام پر گئی۔ بس یہ دیکھیں کہ جان ایمان کے ساتھ جائے اور ایمان پر ہی قربان ہو۔
- دنیا کی نعمتوں کی فکر نہ کریں کہ جس نے یہ نعمتیں دی تھیں، اس کے راستے میں جب جا رہے ہیں تو وہ دوبارہ ان سے بہتر نعمتیں دے سکتا ہے۔
- اپنے کاروبار، جائیدادوں، کنبوں اور قبیلوں کی فکر نہ کریں کہ ان کا اجر آخرت میں بیش بہا محفوظ ہے اور دنیا میں بھی بہتر بدلہ دینے والا خدا موجود ہے۔
- روزگار کی فکر نہ کریں کہ رازق تو اپنی حقیر ترین مخلوق کو بھی بھرپور رزق دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ دعوتِ حق میں ایک ایسا مرحلہ ضرور آتا ہے۔

جب ایک اللہ کے بندے کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا کہ وہ سارے اندیشہ ہائے سود و زیاں اور غم ہائے دور دراز کو چھوڑ کر بس اللہ کی راہ میں جان و مال کی بازی لگا دے اور تمام دنیوی سہاروں سے یکسر قطع نظر کرے اور اپنے مقصد کے لیے اپنی پوری ہستی کو لگا دے یہ وہ انقلابی جذبہ ہے جو زمانے میں تغیرات لاتا ہے اور کسی نصب العین کو کامیاب کرتا ہے۔ جو لوگ نفع و نقصان کے حساب لگاتے رہتے ہیں اور کامیابی و ناکامی کے امکانات پر غور و فکر کرتے رہتے ہیں وہ کبھی ایسے اقدامات نہیں کر سکتے جن سے کوئی انقلاب رونما ہو۔ ہر چہ بادا باد کہہ کر اپنے مقصدِ زندگی کے لیے سب کچھ نچھاور کر دینے والوں کی جد و جہد سے ہی وہ انقلاب رونما ہوتا ہے جس کے سامنے سارے

باطل کے کلمے پست ہو جاتے ہیں اور صرف اللہ کا کلمہ بلند ہو کر رہتا ہے۔

ہجرت کے ذریعے ایک بندہ مومن یہ ثابت کر دیتا ہے کہ وہ صرف خدا کا بندہ ہے۔ وطن، خاندان، قبیلے، روزگار اور نسل کا بندہ نہیں ہے۔ اس طرح جو شخص اپنا کلمہ حق اپنے وجود معنوی و مادی پر طاری کرتا ہے وہی کلمہ انقلاب آفرین اور انقلاب انگیز ہوتا ہے ایسے ہی لوگوں سے اللہ تعالیٰ کے خوش آئند وعدے ہیں:

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ
فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۭ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ط
الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰي رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۔ (النحل ۴۱-۴۲)

ترجمہ: "جو لوگ ظلم سہنے کے بعد اللہ کی خاطر ہجرت کر گئے ہیں ان کو ہم دنیا میں بھی اچھا ٹھکانہ دیں گے اور آخرت کا اجر تو بہت بڑا ہے کاش جان لیں وہ مظلوم جنہوں نے صبر کیا ہے اور جو اپنے رب کے بھروسے پر کام کر رہے ہیں کہ کیسا اچھا انجام ان کا منتظر ہے۔"

لیکن جو لوگ خدا کی راہ میں حکم ملنے کے بعد بھی ہجرت نہ کریں ان کا شمار منافقین میں ہوتا ہے۔ انقلابی جد و جہد میں جو لوگ اپنے طرزِ عمل سے ثابت کر دیں کہ انھیں اسلام کے احکام اور خدا و رسولؐ کے مقابلے میں اپنے گھر بار، کھیتی باڑی، کاروبار اور دوسرے دنیوی رشتے زیادہ عزیز ہیں۔ ان کے اس صریح اظہارِ نفاق کے بعد پھر مسلمانوں کے ذمے ان کا کوئی حق باقی نہیں رہتا۔ البتہ ان لوگوں کا معاملہ دوسرا ہوتا ہے جو شرعی مجبوریوں کی بنا پر ہجرت پر عملاً قادر نہ ہوں۔ جان بوجھ کر ہجرت سے باز رہنے والے لوگوں کے بارے میں قرآن نے بڑے سخت الفاظ استعمال کئے ہیں۔

فرمایا گیا ہے:

"جو لوگ اپنے نفس پر ظلم کر رہے تھے ان کی روحیں جب فرشتوں نے قبض کیں تو ان سے پوچھا کہ تم کس حال میں مبتلا تھے انھوں نے جواب دیا کہ ہم زمین پر کمزور و مجبور تھے۔ فرشتوں نے کہا کہ خدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بڑا ہی برا ٹھکانہ ہے۔ ہاں جو مرد اور عورتیں واقعی بے بس ہیں اور نکلنے کا کوئی راستہ نہیں پاتے۔ بعید نہیں کہ اللہ انھیں معاف کر دے۔ اللہ بڑا معاف کرنے والا اور درگزر فرمانے والا ہے۔"

(النسأ آیت ۹۷، ۹۸، ۹۹)

حقیقت یہ ہے کہ جب ہجرت کا حکم آ جاتا ہے تو پھر وہی ایمان کا معیار بن جاتا ہے۔

۳۔ احکامِ ہجرت

ہجرت اسلامی انقلاب کے لیے دعوتِ اسلامی کی جد و جہد کا ایک اہم مرحلہ ہے جو اپنے اندر دستوری اور قانونی اثرات رکھتی

ہے اس کے منقطع ہونے سے شہریت کے حقوق، معاشرتی حقوق و فرائض اور قانونی اور دستوری نتائج مرتب ہوتے ہیں اور بہت سی باتوں کے احکام تغیر حالات سے بدل جاتے ہیں اس لئے کسی اسلامی تحریک کا کسی مقام سے ہجرت کر جانا کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے جسے معمولی درجے کے حالات کی سنگینی اور کسی فرد کی کیفیتِ اشتعال پر منحصر کیا جاسکتا ہو۔ یہ اقدام پوری تحریک کے مستقبل پر دوررس اثرات ڈالتا ہے اس لئے یہ بہت گہرے سوچ بچار اور بصیرت افروز مشاورت و اجتماع کے متفقہ فیصلے سے ہی ہو سکتا ہے۔

حضورِ اکرم کی اسلامی دعوت کی رہنمائی چونکہ خود اللہ تبارک و تعالیٰ کی خصوصی نگرانی و حفاظت میں ہو رہی تھی اس لیے حالات کی مکمل پختگی، تحریک کے کارکنان کی مظلومیت کے نقطہ عروج اور مخالفینِ دعوتِ اسلامی کی ہٹ دھرمی کے آخری حد تک پہنچنے کے بعد ہی ہجرت کا حکم دیا گیا تھا وہ بھی اس حالت میں کہ جس مقام کی طرف ہجرت کی جا رہی تھی وہاں تحریک کے پاؤں جمانے کے لیے پہلے سے ضروری سازگار حالات میسر ہو چکے تھے اور تحریک کے کسی اور ابتلاء میں پڑ جانے یا بالکل منتشر ہو جانے کا خطرہ نہیں رہ گیا تھا۔

ہجرت روٹی، کپڑے اور مکان کی خاطر نہیں کی جاتی۔ ہجرت جان بچانے کے لیے کرنا بھی شیوۂ مومن نہیں ہے۔ مومن کے لئے دنیا کی سب سے قیمتی متاع وہ اصول ہوتے ہیں جن پر ایمان لا کر وہ دائرہ اسلام میں داخل ہوتا ہے۔ اللہ کی حاکمیت اور رسولِ اکرمؐ کی سنت کا اتباع اور آخرت میں مالک الملک کی رضا مندی پا لینے کا ذوق و شوق بس مومن کی یہی متاع بے بہا ہے۔ اگر یہ اصول خطرے میں پڑ جائیں تو پھر مومن کے لئے اپنا پیارا وطن بھی ناقابلِ قبول اور قابلِ ترک ہو جاتا ہے۔ مومن کے لیے جان کو قربان کر دینا آسان کام ہوتا ہے لیکن وہ اپنے ایمان کی قربانی کبھی گوارا نہیں کر سکتا۔

قرآن کا اشارۂ ہجرت

مکہ میں جب مسلمانوں پر مظالم کی انتہا ہوگئی اور انھیں اسلامی دعوت کے اصولوں کے مطابق زندگی گذارنا دوبھر کر دیا گیا تو ہادیٔ برحقؐ کی معرفت انھیں ہجرت کے لئے تیار ہونے کا اشارہ کیا گیا اور انھیں ہجرت کے کٹھن حالات کے لیے نفسیاتی طور پر تیار کرنے کے احکام بھی دیے جانے لگے۔ فرمایا گیا۔

> "اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو میری زمین وسیع ہے پس تم میری بندگی بجا لاؤ۔ ہر متنفس کو موت کا مزا چکھنا ہے۔ پھر تم سب ہماری طرف ہی پلٹا کر لائے جاؤ گے۔ جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جنھوں نے نیک عمل کیے ہیں ان کو ہم جنت کی بلند و بالا عمارتوں میں رکھیں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ وہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ کیا ہی عمدہ اجر ہے عمل کرنے والے کے لئے ...... ان لوگوں کے لیے جنھوں نے صبر کیا ہے اور جو اپنے آپ پر بھروسا کرتے ہیں اور کتنے ہی جاندار ہیں جو اپنا رزق اٹھائے اٹھائے نہیں پھرتے۔ اللہ ہی ان کو رزق دیتا ہے اور وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔"
>
> (العنکبوت ۵۶ تا ۶۰)

ان ارشادات میں ہجرت کی طرف اشارہ ہے اور فرمایا گیا ہے کہ اگر مکہ میں خدا کی بندگی مشکل ہو رہی ہے تو خدا کی زمین بہت وسیع ہے تم اسے چھوڑ کر کسی ایسی جگہ جا سکتے ہو جہاں خدا کی بندگی میں کوئی رکاوٹ نہ ہو تمھیں قوم اور وطن کی نہیں صرف خدا کی بندگی کرنی چاہیے اور مومن کا شیوہ یہی ہے کہ وہ صرف خدا کی بندگی ہی کرتا ہے اور اگر وطن اور قوم بھی اس کی بندگی میں حائل ہوں تو وہ ان سے قطع تعلق کرنا

بھی ضروری سمجھا ہے۔

گھر بار چھوڑنے سے اندیشہ رزق کی تنگی کا بھی ہو سکتا ہے چنانچہ اس کے بارے میں بھی فرمایا گیا کہ تمھیں رزق قوم اور وطن نہیں دیتے خدا جو سب کا رازق ہے وہی رزق دیتا ہے اس لیے اسی پر تکیہ کرنا چاہیے جس کی خاطر تم ملک و قوم کو چھوڑو گے وہ تمھیں اپنے رزق سے محروم نہیں کرے گا وہ تو کیڑے مکوڑوں تک کو رزق دیتا ہے تو اپنی اشرف المخلوقات کو رزق کیوں نہیں دے گا۔

اللہ کے راستے میں مومن جان جانے کی فکر کبھی نہیں کرتا۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ جان نے تو کبھی نہ کبھی جانا ہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ کس جدوجہد میں گئی؟ اور کس حالت میں گئی۔ اگر وہ اللہ کی راہ میں نکلنے پر گئی تو اس سے بہتر اس کا مصرف اور کوئی نہ ہو سکتا تھا اس لیے کہ وہ اسی کی دی ہوئی تھی اور اسی کی خاطر اسے جانا چاہیے تھا۔

اسی طرح ہجرت کے ذریعے کاروبار اور جائیدادوں کا چھوٹ جانا بھی بظاہر بہت بڑا نقصان ہے۔ لیکن خدا کی رضا ان سب چیزوں سے قیمتی متاع ہے۔ جو اگر حاصل ہو جائے تو بقول حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سارے جہان کی دولت دے کر بھی سے حاصل کرنا مومن کی عین تمنا ہونی چاہیئے۔

ہجرت کے احکام قرآنی

اللہ تعالیٰ نے مکہ میں قریش کے مظالم اور مزاحمت کی شدت کو مسلمانوں سے دُور کرنے اور مسلمانوں کو دین کے راستے میں آزمانے کے لیے بالآخر مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کا حکم دے دیا۔ فرمایا گیا:

وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ
وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا ○ (بنی اسرائیل)

"اور اے نبی دعا کیجیے کہ اے میرے رب مجھے داخل کر سچائی کے ساتھ داخل ہونے کی جگہ اور مجھے نکال سچائی کے ساتھ نکلنے کی جگہ سے اور کسی طاقت کو میرا مددگار بنا دے۔"

اس طرح ہجرت کا دروازہ کھل گیا اور مسلمان گھر بار چھوڑ چھوڑ کر مدینہ کی طرف جانے لگے۔

اللہ کے دین کی خاطر ہجرت کرنے والے کے لیے اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت اکرام و اعزاز ہے۔ ان کے لئے مالِ غنیمت تک میں حصہ مخصوص کیا گیا۔ فرمایا گیا:

"مالِ غنیمت میں ان حاجت مند مہاجرین کا بھی حصہ ہے جو اپنے وطن سے نکالے گئے اور اپنی جائیداد اور دولت سے محروم کر دیے گئے۔" (حشر ۱)

ایسے لوگوں کے لیے اللہ کی رضا، نصرت، رحمت اور درجات کی بلندی کا پہلے سے اعلان فرمایا گیا۔

"جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور جان و مال سے اللہ کے راستے میں جہاد کیا۔ یہ لوگ اللہ کے نزدیک بہت بلند مرتبہ ہیں، یہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔ ان کا رب ان کو اپنی خوشنودی اور رحمت اور دائمی آسائش کے باغوں کی خوشخبری دیتا ہے جہاں یہ ہمیشہ

رہیں گے۔"

(توبہ رکوع ۲)

اللہ تعالیٰ نے مہاجرین سے بخشش اور مغفرت اور خطاؤں سے صرفِ نظر کا وعدہ بھی فرمایا ہے:

"جن لوگوں نے اللہ کے راستے میں ہجرت کی۔ وطن سے نکلے اور تکلیفوں سے دوچار ہوئے پھر راہِ حق میں لڑے اور مارے گئے ہم ان کی خطاؤں کو محو کر کے انھیں ہمیشہ کی جنت میں داخل کر دیں گے۔"

(آل عمران ع ۲)

مومنین کو ہجرت پر ابھارتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ان سے بہتر ٹھکانے دینے کا وعدہ بھی فرمایا:

"جن مسلمانوں نے مظلومیت کے سبب ہجرت کی ان کو ہم دنیا میں اچھا ٹھکانہ دیں گے اور آخرت کا اجر اس سے بھی بڑا ہے۔ کاش وہ اس کو جانتے۔"

(نحل ع ۶)

ہجرت کو اخلاص فی الاسلام کی کسوٹی بھی قرار دیا گیا ہے جس سے مومن و منافق میں امتیاز ہوتا ہے۔ فرمایا:

"جب تک یہ لوگ خدا کی راہ میں ہجرت نہ کر جائیں اس وقت تک ان میں سے کسی کو دوست نہ بناؤ۔"

(النساء ع ۱۱)

دوستی کا معیار ایمان اور اخلاص فی الاسلام ہے اور اخلاص فی الاسلام کا معیار ہجرت قرار دیا گیا:

"جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور راہِ خدا میں اپنے جان و مال سے جہاد کیا اور جن لوگوں نے اُن کو جگہ دی اور ان کی مدد کی بس یہی لوگ ایک دوسرے کے دوست ہیں"۔ (انفال ع ۱۰)

ایک وقت آیا کہ ایمان کا انحصار ہجرت پر ہی ہو گیا۔ فرمایا گیا:

"وہ لوگ جو ایمان تو لائے لیکن ہجرت نہیں کی تو تم کو ان کی وراثت سے کوئی تعلق نہیں جب تک وہ ہجرت نہ کر جائیں۔"

ایمان کی پختگی کا دارومدار ہجرت اور جہاد فی سبیل اللہ پر رکھا گیا۔

"جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور خدا کے راستہ میں جہاد کیا اور جن لوگوں نے ان کو جگہ دی اور ان کی مدد کی۔ یہی لوگ پکے ایمان والے ہیں اور ان کے لیے نصرت اور عزت کی روزی ہے۔"

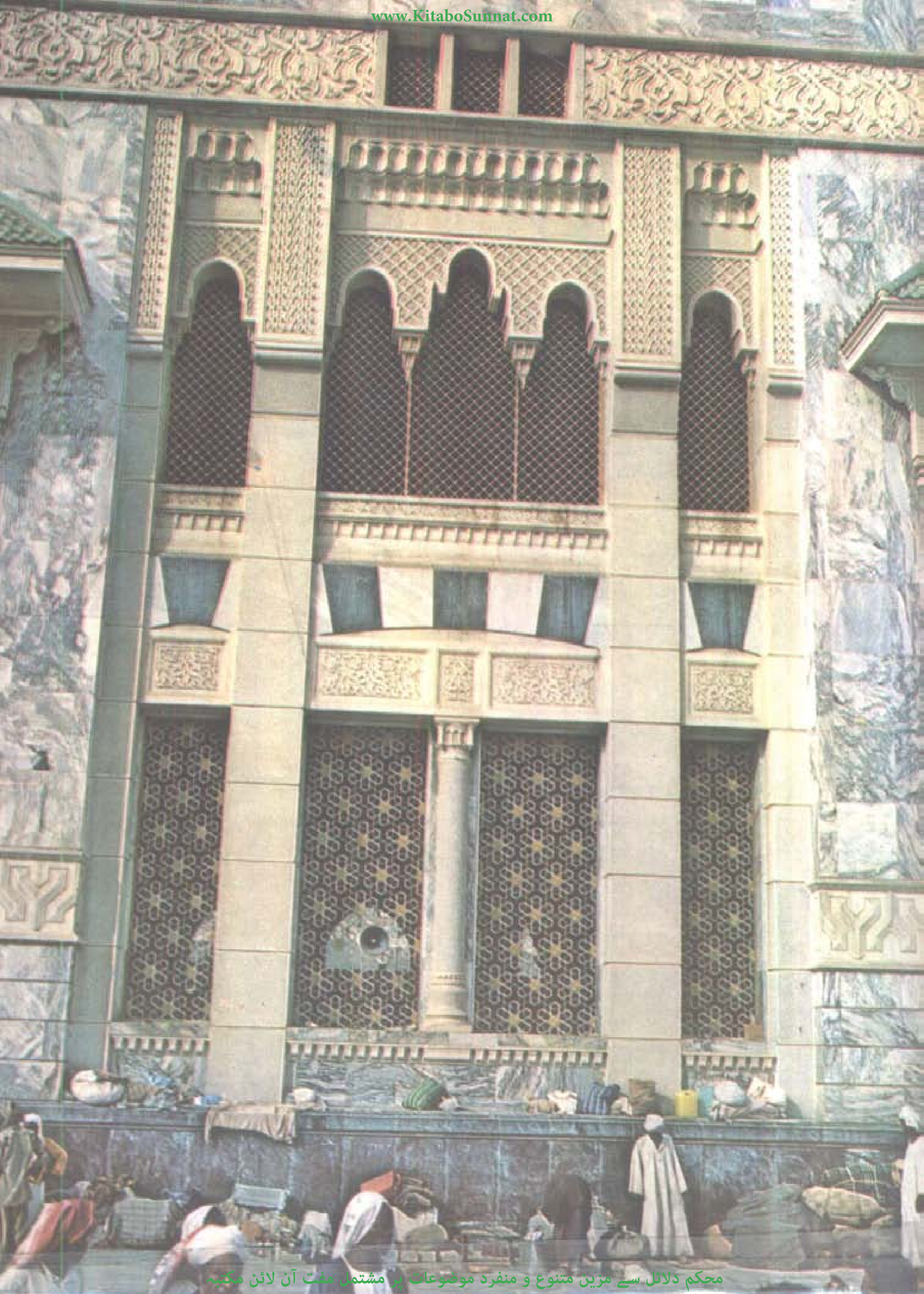
(انفال ع ۱۰)

ارشادِ نبی ہجرت کی اس امتیازی شان کے ذکر میں انصار مدینہ سے اپنی محبت کا اظہار کرتے ہوئے حضور نے فرمایا:

"اگر ہجرت نہ ہوتی تو میں بھی انصار میں سے ایک فرد ہوتا۔"

ہجرت کی اہمیت بیان کرتے ہوئے حضرت عمرؓ نے اس کا دارومدار نیت پر رکھا کہنے لگے:

"میں نے حضور اکرمؐ کو فرماتے سنا کہ اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے پس جس کی ہجرت دنیا کے لیے یا کسی عورت سے شادی کے لئے ہوگی تو وہ اسی کے لئے ہوگی اور جو ہجرت خدا و رسولؐ کی خوشنودی کے لیے



ہو گی اس کا خدا و رسول کی خوشنودی میں شمار ہو گا۔"

ہجرت صحابہ کرامؓ میں سرمایہ فخر و ایمان بھی جاتی تھی چنانچہ حضرت عثمانؓ فخریہ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے دو ہجرتیں کی ہیں۔

حضرت ابن عمرؓ ذکر فرماتے ہیں کہ حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ خدا اور رسولؐ کی خوشنودی کے لیے ہجرت کرنے والے قیامت کے دن سورج کی مانند چمکنے والے نور کے ساتھ اٹھیں گے۔ یہ بھی فرمایا کہ فقراء مہاجرین، دوسرے اہل ایمان کے مقابلے میں چالیس سال پہلے جنت میں داخل ہوں گے۔

اسی لیے تو امام احمد بن حنبل نے فرمایا تھا کہ مہاجرین میں نفاق ممکن نہیں ہے اس لیے کہ جو خدا کے راستے میں نکلتا ہے اس کا سارا کھوٹ نکل جاتا ہے۔ وہ کھرا سونا بن جاتا ہے۔ مکی سورتوں میں نفاق کا ذکر نہیں ہے۔ مہاجر منافق نہیں ہو سکتا۔

یہ ہیں وہ سعادتیں جو ہجرت کے نتیجے میں ایک مومن کو حاصل ہوتی ہیں اور انھیں خوبیوں اور سعادتوں کے لیے دورِ اول کے مسلمان جان ہتھیلی پر رکھ کر باطل سے ٹکرایا کرتے تھے۔

ہجرت جہاد کا دروازہ ہے جو ہجرت کے راستے پر چلتا ہے۔ وہ بالآخر باطل کے خلاف جنگ آزما ہونے کے لیے تلوار لے کر میدان جہاد میں ضرور آتا ہے۔ اسی لیے ہجرت ایمان کی کسوٹی ہے اس لیے کہ جہاد میں کوئی شخص نہیں جا سکتا جس کے پاس ایمان کا وافر سرمایہ موجود نہ ہو۔

غرض یہی وہ ہجرت ہے جو مومنین مکہ کو اللہ اور اسکے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کے تحت میسر آئی تھی اور مسلمان ایک ایک کر کے مکہ سے مدینے کے لیے رخصت ہو رہے تھے۔ سارے ہی مسلمان جا چکے تھے۔ اب تو صرف حضور اکرمؐ اور آپ کے ساتھ چند رفقا ہی رہ گئے تھے اور خود حضور اکرمؐ بھی مالک کی طرف سے حکم سفر کے منتظر تھے۔

رسولِ اکرمؐ کو ہجرت کا حکم

حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ "ایک دوپہر حضور اکرمؐ منہ ڈھانکے ہوئے ہمارے ہاں تشریف لائے جو خلاف معمول وقت تھا اس پر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا میرے ماں باپ آپؐ پر قربان ضرور کوئی بات ہے جس کی وجہ سے آپ اس وقت تشریف لائے ہیں۔" حضورؐ نے تشریف لانے کے بعد تخلیہ کرایا اور پھر فرمایا:

"ابوبکر مجھے نکلنے (ہجرت کرنے) کی اجازت دے دی گئی ہے۔"

"حضرت ابوبکرؓ صدیق نے عرض کیا۔" میرے ماں باپ آپ پر قربان۔ مجھے تو معیت کا شرف نصیب ہوگا؟"

آپؐ نے فرمایا۔" ہاں۔"

حضرت ابوبکر صدیقؓ پر حضورؐ کی رفاقت کی خبر سن کر خوشی سے رقت طاری ہوگئی پھر کہنے لگے۔" یارسول اللہؐ میری ان دو اونٹنیوں میں سے ایک آپ لے لیں۔"

آپ نے فرمایا۔" مگر قیمت دے کر لوں گا۔"

اُس کے بعد روانگی کے انتظامات مکمل کر لیے گئے۔

اسی ہجرت کے ایام کو یاد دلا کر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی مدد کا ذکر اس طرح فرمایا ہے:

"اگر تم (مسلمان) اس کی (یعنی اللہ کے نبی کی) مدد نہ کرو گے تو تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ اس کی مدد اس وقت کر چکا ہے جب اسے کافروں نے نکال دیا تھا جب وہ دو میں کا ایک تھا جب وہ دونوں غار میں تھے۔ جب وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا کہ "غم نہ کرو اللہ ہمارے ساتھ ہے"

(توبہ - ۴۰)

پھر ہجرت کرنے کے عظیم کارنامہ ایمان کا اجر بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا۔

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ قُتِلُوْٓا اَوْ مَاتُوْا لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ رِزْقًا حَسَنًا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۝

(توبہ - ۱)

"اور جن لوگوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی پھر قتل کر دیئے گئے یا مر گئے اللہ ان کو اچھا رزق دے گا یقیناً اللہ ہی بہترین رازق ہے۔"

مزید فرمایا گیا۔

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۭ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۔

(النحل - ۴۱)

"جو لوگ ظلم سہنے کے بعد اللہ کی خاطر ہجرت کرتے ہیں ان کو ہم دنیا ہی میں اچھا ٹھکانہ دیں گے اور آخرت کا اجر تو بہت بڑا ہے کاش جان لیں، وہ مظلوم جنہوں نے صبر کیا ہے اور جو اپنے رب کے بھروسے پر کام کر رہے ہیں (کہ کیا اچھا انجام ان کا منتظر ہے)"۔

وہ لوگ جو اپنے نصب العین کے لیے ظلم سہنے کی قوت اور برداشت رکھتے ہیں اور دشمنوں کے مظالم اور تشدد کے باوجود اپنے مسلک حق سے نہ روگردانی کرتے ہیں اور نہ اس سے انحراف کرتے ہیں ان میں بالآخر قوت مزاحمت بڑھتے بڑھتے جرأت و شجاعت و تہور کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ پھر جب وقت آتا ہے تو وہ اپنے دشمنوں سے پوری جانبازی اور جذبہ و جوش کے ساتھ نپٹتے اور اپنی مظلومیت کی قوت سے مجرم ضمیر ظالموں کو پچھاڑ دیتے ہیں۔

سورۃ النحل میں ہی ایمان کی خاطر ہجرت کرنے والوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا۔

"کافروں اور منافقوں کے مقابلے میں مومنین کا حال یہ ہوتا ہے کہ جب انہیں دین کی خاطر ستایا جاتا ہے تو وہ نہ گڑگڑاتے ہیں نہ شکست قبول کرتے ہیں اور نہ اپنے مسلک حق سے باز آتے ہیں بلکہ اپنے مسلک کی خاطر اپنے گھر بار عزیز و اقربا اور کاروبار تک چھوڑنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔"

فرمایا گیا: ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ثُمَّ جٰهَدُوْا وَصَبَرُوْٓا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

(النحل - ۱۱۰)

ترجمہ: "جن لوگوں کا حال یہ ہے کہ جب (ایمان لانے کی وجہ سے) وہ ستائے گئے تو انہوں نے گھربار چھوڑ دیے، ہجرت کی، راہِ خدا میں سختیاں جھیلیں اور صبر سے کام لیا۔ ان کے لیے یقیناً تیرا رب غفور رحیم ہے۔"

غرض ہجرت حضور اکرمؐ کی اسلامی دعوت کے مراحل میں سے ایک نہایت ہی اہم مرحلہ ہے۔ جب دعوت اسلامی کے کارکنوں کی تعلیم و تربیت اس مقام کو پہنچ جاتی ہے کہ وہ اپنے مقصد کی خاطر گھر بار چھوڑ سکتے ہیں تو ان سے گھر بار چھڑوا کر دینِ حق کے لئے قربانیاں دینے والے گروہ کی حیثیت سے یکسو اور نامزد کر لیا جاتا ہے تاکہ کفار اور مومنین میں ایک واضح امتیاز پیدا ہو جائے۔ ساتھ ہی مومنین کی مظلومیت اور کفار کا ظلم و ستم بھی اظہر من الشمس ہو جائے۔ اس طرح وہ اتمام حجت ہوتی ہے جس کے بعد پھر نصرتِ الٰہی کے نزول کا مرحلہ آتا ہے۔

ہجرت حبشہ بھی ایسے ہی دلگداز حالات تھے جن میں حضور اکرمؐ نے اپنے مظلوم صحابہ اور صحابیات کو ظالموں کی بستی سے نکل جانے کی اجازت دی تھی اور پھر وہ حالات سخت سے سخت تر ہوتے چلے گئے تھے۔ یہاں تک کہ لوگوں کے لئے مکہ کی اس بستی میں امن کا سانس لینا دوبھر ہو رہا تھا۔ عورتوں، بچوں اور بوڑھوں پر بھی رحم نہیں کیا جا رہا تھا اور شعبؓ ابی طالب کی جبری اقتصادی اور معاشرتی ناکہ بندی کے بعد قریش کے مظالم اپنی انتہا کو پہنچ گئے تھے چنانچہ حضور اکرمؐ نے اپنے ساتھیوں کو مدینہ کی طرف ہجرت کی اجازت دے دی۔ حضورؐ نے فرمایا کہ "مجھے وہ بستی دکھائی گئی ہے جو میرے لیے دار الہجرت بنائی گئی ہے۔ وہ دو سنگلاخ پہاڑیوں کے درمیان ہے۔"

حضرت جریر بن عبداللہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:

"خداوند تعالیٰ نے میری طرف وحی بھیجی ہے کہ ان تین شہروں میں سے تم جس میں ہجرت کر جاؤ گے وہی تمہارا دار الہجرت ہو گا۔ مدینہ، بحرین اور قنسرین۔"

(ترمذی، مشکوٰۃ شریف)

اور پھر حضرت جریر بن عبداللہؓ ہی سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"میں بیزار ہوں ہر اس مسلمان سے جو مشرکوں کے اندر اقامت اختیار کرے۔" (ابوداؤد)

نیز حضرت سمرہ بن جندبؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا:۔

"مشرکوں کے ساتھ سکونت مت رکھو اور نہ ان کے ساتھ مل جل کر رہو جو ایسا کرے گا وہ انہیں کے مثل ہے۔"

قرآن کی اس آیت نے حکمِ ہجرت کی اہمیت کو پوری طرح واضح کر دیا ہے۔ فرمایا گیا:۔

"بے شک جن لوگوں کی روحیں فرشتے اس حالت میں قبض کرتے ہیں کہ وہ کافروں میں رہ کر ہجرت نہ کر کے اپنے نفسوں پر ظلم کر رہے تھے۔ فرشتے ان سے پوچھیں گے کہ تمہیں اس حق پر عملدرآمد سے کس چیز نے روکا تھا وہ کہیں گے ہم کمزور تھے۔ فرشتے کہیں گے کیا اللہ کی زمین کشادہ نہ تھی کہ تم ہجرت کر جاتے۔"

فرمایا اللہ تعالیٰ نے :-

وَمَنْ یُّهَاجِرْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ یَجِدْ فِی الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِیْرًا وَّسَعَةً ؕ

ترجمہ :" جو شخص اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا وہ اپنے لیے زمین میں کشادگی اور وسعت پائے گا "

قرآن نے حکم دیا :

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَایَتِهِمْ مِّنْ شَیْءٍ حَتّٰی یُهَاجِرُوْا - (توبہ)

ترجمہ : جو لوگ ایمان لائے لیکن ہجرت نہیں کی ان کی دوستی کسی کام کی نہیں جب تک وہ ہجرت نہ کریں "

نیز ہجرت کو اتنا بڑا ثواب قرار دیا گیا کہ جو شخص ہجرت کی نیت سے گھر سے نکلا لیکن راستے میں ہی فوت ہو گیا تو اسے ہجرت کا کامل ثواب ملے گا۔

چنانچہ حضور اکرمؐ نے صحابہؓ کو مدینہ کی طرف ہجرت کی عام اجازت دے دی اس کے نتیجے میں شب و روز مسلمان مدینہ کی طرف روانہ ہونے لگے ۔ تنہا بھی اور گروہ در گروہ بھی۔ تمام مزاحمتوں کے باوجود اور تمام رکاوٹوں کے علی الرغم قربانیاں دینے والے قربانیاں دیتے رہے اور گھر بار، کاروبار لٹا کر مدینہ کی طرف ہجرت کرتے رہے ۔ ابو سلمہؓ گئے ، عمرؓ گئے ، سلمانؓ فارسی گئے ، ابو عبیدہؓ گئے ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا ۔ بقول حضرت براؓ بن عازب انصاریؓ " ہمارے پاس سب سے پہلے ہجرت کر کے مصعب بن عمیرؓ اور ابن ام مکتومؓ آئے اور آ کر لوگوں کو قرآن پڑھانے لگے پھر بلالؓ ، سعدؓ ، عمار بن یاسرؓ اور حضرت عمر بن خطابؓ آئے اور پھر یکے بعد دیگرے مکہ سے مہاجرین آتے چلے گئے "۔

یہ سلسلہ اتنا پھیلا کہ بیشتر مسلمان مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ پہنچ گئے ۔ قریش کو یہ بات کھٹک رہی تھی بستی بھر میں غم و اندوہ کی عام لہر گھر گھر میں پھیلی ہوئی تھی جب قریش کے سرداروں نے اپنے جرگے کا اجلاس دار الندوہ میں کیا اور وہ خونیں فیصلہ کیا جس نے انھیں ایک معتوب قوم بنا دیا ۔ جس نے بار بار مار کھانے کے بعد بالآخر راہِ راست پر آنا تھا ۔ انہوں نے اجتماعی شب خون مار کر رسول اللہؐ کو قتل کر دینے کا فیصلہ کر لیا ۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو ان کے اس خونیں مشورے سے آگاہ بھی کر دیا اور ساتھ ہی اسلامی تحریک کی کشتی کے اس عظیم قائد کو بھی ہجرت کر جانے کی اجازت دے دی اس اجازت کا انتظار آپؐ کو کئی دن سے تھا ۔ اجازت ملتے ہی آپؐ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے مکان پر پہنچے ۔

روداد ہجرت بزبان حضرت عائشہ صدیقہؓ

ان حالات کی روداد حضرت عائشہ صدیقہ نے خود بیان فرمائی ہے ۔

" ایک دن ہم گھر میں دوپہر کے وقت بیٹھے ہوئے تھے دیکھا کہ رسول اکرمؐ سر پر چادر ڈالے تشریف لا رہے ہیں ۔ وہ ایسا وقت تھا کہ آپ کبھی اس وقت ہمارے ہاں نہیں آتے تھے ۔ اس پر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کہا کہ خدا کی قسم کوئی ضروری بات ہی ہوگی ۔ پھر حضورؐ تشریف لے آئے اور اندر آنے کی اجازت طلب کی ۔ اجازت کے بعد آپ نے تشریف لاتے ہی حضرت ابوبکرؓ سے فرمایا " جو لوگ تمہارے پاس ہوں ان کو ہٹا دو "

ابوبکرؓ نے کہا " یا رسول اللہؐ بس میرے اہل خانہ ہی ہیں "

اس پر آپ نے فرمایا " سنو ابوبکر مجھے ہجرت کی اجازت دے دی گئی ہے ۔

حضرت ابوبکرؓ نے کہا "یا رسول اللہؐ کیا مجھے بھی رفاقت کی اجازت ہوگی"۔
آپؐ نے فرمایا "ہاں"۔
اس پر ابوبکرؓ نے کہا "تو پھر میری ان دو اونٹنیوں میں سے ایک آپؐ لے لیجیے"۔
رسول اکرمؐ نے فرمایا "ہم تو قیمت سے لیں گے"۔
حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ "پھر ہم تیزی سے انھیں تیار کرنے میں لگ گئے"۔

قریش کی انہی خونیں سرگرمیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے قرآن نے فرمایا تھا:۔

"یاد کرو اس گھڑی کو جب کفار تدبیریں کر رہے تھے کہ آپ کو قید میں ڈالیں یا قتل کر دیں یا باہر نکال دیں، وہ اپنی سی تدبیریں لڑاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنی تدبیر کرتا ہے اور اللہ تدبیر کرنے میں سب سے بڑھ کر ہے۔" (الانفال - ۳۰)

حضور اکرمؐ نے حرم کعبہ سے وداع ہوتے ہوئے اس پر آخری نگاہ ڈالی اور فرمایا۔

"خدا کی قسم تو اللہ کی سب سے بہتر زمین ہے اور اللہ کی نگاہ میں سب سے بڑھ کر محبوب ہے۔ اگر مجھے یہاں سے نہ نکالا جاتا تو میں کبھی نہ نکلتا"۔ (ترمذی)

قریش کی انہی زیادتیوں کا نتیجہ تھا کہ جب معرکہ بدر میں قریش کے ستر سے زائد اکابرین مارے گئے تو اسلامی تحریک کے لیے راستہ صاف ہوگیا۔ تب حضور اکرمؐ ان کی لاشوں کے ڈھیر پر تشریف لے گئے اور ان سے مخاطب ہو کر فرمایا:۔

"اے سرداران قریش، کسی نبی کے لئے اس کے قرابت دار جس درجہ بُرے ہو سکتے تھے۔ تم اپنے نبی کے حق میں اتنے ہی بُرے ثابت ہوئے تم نے مجھے جھٹلایا اور دوسرے لوگوں نے میری صداقت کی تصدیق کی تم نے مجھے وطن سے نکالا اور دوسرے لوگوں نے مجھے اپنے پاس جگہ دی تم میرے خلاف لڑنے آئے اور دوسرے لوگوں نے مجھے تعاون پیش کیا"۔

ایسے ہی تھے وہ سرداران قریش جن کے ظلم و ستم سے تنگ آکر مسلمان مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت پر مجبور ہوئے تھے اسی لئے مہاجرین کو مکہ میں جاکر دوبارہ آباد ہونے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔

حضرت علا بن حضرمیؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا:۔

"مہاجرین کو معروف وداع کے بعد مکہ میں بس تین دن رہنے کی اجازت ہے"۔ (بخاری)

۴۔ واقعاتِ ہجرت

اکابرین قریش نے اپنے کبر و غرور اور عصبیت جاہلیہ کے سبب اول روز سے اسلامی دعوت کے ساتھ معاندانہ روش اختیار کر لی تھی۔

جن لوگوں نے اسلامی دعوت کو دل و جان سے قبول کیا، اُن کی بڑی تعداد ضعفا، غربا و مساکین، غلام، مجبور و بے کس مظلوم و بے سہارا اور بے نوا لوگوں پر مشتمل تھی۔ مظلوموں نے اس نظام جبر و تکبر میں اسلام کی دعوت کو اپنے دل کی آواز سمجھا اور لپک کر اسے قبول کر لیا۔ گویا اسلام ان کی دست گیری کے لیے ہی نازل ہوا تھا اور جو مالدار، قوی سردار اور متکبر لوگ تھے، انہوں نے اس دعوت پر غور کرنا بھی ضروری نہ سمجھا اور صرف اپنے جبر و تشدد اور ظلم و ستم سے ہی اسے دبانے کی کوشش کی۔ حالانکہ اسلام کے دامن میں ان کے لیے بھی فلاح کا پیغام تھا۔

کمزور مظلوم مسلمانوں کو علاقۂ امن میں جانے کی ہدایت

۵ نبوی مطابق ۴۰ عام الفیل میں حضورؐ نے حالات کی تنگی، کفار کی شدت ظلم و ستم اور نومسلموں کی پریشانی اور مظلومیت کے پیش نظر اپنے اصحاب کا اجتماع بلا کر ان سے فرمایا:

"اچھا ہو کہ تم لوگ نکل کر حبش چلے جاؤ۔ وہاں ایک ایسا بادشاہ ہے جس کے ہاں کسی پر ظلم نہیں ہوتا اور وہ بھلائی کی سرزمین ہے جب تک اللہ تعالیٰ اس مصیبت کو رفع کرنے کی کوئی صورت پیدا نہ کرے تم لوگ وہاں ٹھہرے رہو۔"

حضورؐ کے اس ارشاد کے نتیجے میں حبش کی طرف مسلمانوں کی پہلی ہجرت ہوئی جس میں ۱۱ مردوں اور چار خواتین نے حصہ لیا۔ قریش نے اُن کا تعاقب کیا لیکن مہاجرین کی کشتی قریش کے تعاقب کرنے والوں سے پہلے روانہ ہو گئی۔ اس طرح وہ گرفتار ہونے سے بچ گئے۔

اس کے بعد تو ظلم شدید سے شدید تر ہوتا چلا گیا۔ قریش کی حبش کے مہاجرین کو واپس لانے کی ناکامی نے انہیں اور بھی جھنجلا دیا اور ان کے ظلم و تشدد کی بھٹی زیادہ شدت سے بھڑکنے لگی۔ چنانچہ دوسرے ہی سال ۶ نبوی میں دوسری ہجرت بھی حبش کی طرف ہی ہوئی جس میں قریش کی مزاحمتوں کے باوجود ۸۰ سے زائد مرد اور ۱۸، ۱۹ خواتین نے شرکت کی۔ پھر اسی طرح کچھ لوگ یمن سے اسلام قبول کر کے بذریعہ کشتی مکہ جانے کے لیے روانہ ہوئے لیکن شدید ہواؤں نے ان کی کشتی کو بھی حبش میں پہنچا دیا۔ یہ کشتی تقریباً ۵۲، ۵۳ افراد پر مشتمل تھی۔ یہ لوگ بھی جا کر حضرت جعفر بن ابی طالب امیر مہاجرین حبشہ سے مل گئے۔

مہاجرین کے حبش میں جا کر پرامن حالات میں رہنے کے سبب قریش کا غصہ اور بھی بھڑک اٹھا اور وہ اس مقام پر پہنچ گئے کہ اس دعوت کو ظلم و جور سے ختم کر دیا جائے اور اس کے داعی کی زندگی لے لی جائے۔ یہ صورتِ حال اس حد تک پہنچی کہ رسول اکرمؐ پر قریش نے دست درازیاں شروع کر دیں۔ شعب ابی طالب کا واقعہ پیش آیا۔ حضورؐ پر گندگی اچھالنے کے علاوہ گندگی ڈالنے کے واقعات بھی ہوئے۔ گلے میں کپڑا ڈال کر ختم کرنے کا قاتلانہ حملہ بھی ہوا۔ طائف کا دردناک سفر بھی پیش آیا۔ یہاں تک کہ طائف سے واپسی پر حضور اکرمؐ کو ایک سردار قریش کی پناہ حاصل کر کے شہر میں داخل ہونا پڑا۔

یوں ظلم و تشدد اس مقام تک پہنچا کہ پھر حضور اکرمؐ کے قتل کے منصوبے باقاعدہ قریش کی مجالس میں باندھے جانے لگے۔

اس وقت مسلمانوں کو مدینہ کی طرف ہجرت کا عام حکم مل گیا تاکہ اس نئے مرکزِ دعوت کی طرف آہستہ آہستہ رجوع ہو اور دعوتِ اسلامی کو ایک نئے مرکز میں لے جا کر قوت و توانائی کے ساتھ کفار کے سامنے پیش کیا جائے۔ یہی حالات تھے جب مسلمان حضورؐ کے حکم سے

مدینہ کی طرف ہجرت کرنے لگے تھے اور مسلمانوں کے لئے مدینہ ہی آخری طور پر دارالہجرت قرار دیا گیا تھا۔

ہجرت کیلئے مدینہ کا انتخاب

ہجرت تاریخ دعوت اسلامی میں ایک ناقابل فراموش واقعہ اور ایک عظیم الشان دعوتی مرحلہ ہے۔ بلاشبہ حضورؐ اکرم کی دعوت اسلامی کی توسیع اور فروغ میں ہجرت نے ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ آپ نے اسلامی انقلاب برپا کرنے اور اپنے نصب العین تک پہنچنے کے لئے جو عملی تدابیر اختیار کیں ان میں ایک ہجرت بھی ہے۔ کسی نصب العین کی خاطر اس کے پیروکاروں کی سب سے بڑی قربانی یہ ہوتی ہے کہ وہ اس کے لیے اپنے گھر بار، عزیز و اقارب کھیتی باڑی، کاروبار تعلقات اور تمام رشتے ناطے چھوڑ سکیں اور اس آزمائش پر پورے اتریں جس آزمائش میں اترے بغیر کوئی گروہ سند وفاداری اور تمغہ ایمان حاصل نہیں کر سکتا۔ یہ آزمائش اپنے نصب العین کی خاطر، دارالکفر کے محبوب وطن سے ایمان کی سلامتی کے پردیس کی طرف ہجرت ہے۔ اس ہجرت کا اجر جنت فرمایا گیا ہے

ہجرت کے بغیر وفادار اور بے وفا، کھوٹے اور کھرے، اصلی اور نقلی، حقیقی اور غیر حقیقی دعویدارانِ ایمان میں تمیز نہیں ہو سکتی۔ اگر کسی تحریک کے پیش نظر ایک زبردست انقلابی کش مکش اور جان لیوا جدوجہد ہو تو اس کے لئے اپنے پیروکاروں کو ہجرت کی کسوٹی سے گزار کر پرکھنا اور میدان میں لانے سے پہلے بے وطنی کی کسمپرسی کی بھٹی میں تیار کر کے ان کا انقلابی کھرا پن معلوم کرنا اشد ضروری ہے۔ ہجرت انقلاب اسلامی کی ایک ناگزیر ضرورت ہے۔

اللہ تعالیٰ جو حضور اکرمؐ کی اسلامی دعوت کا نگہبان و نگران اور پاسبان و ہادی تھا۔ اس نے اسلام کے غلبے کے لیے برپا کی جانے والی جدوجہد میں جو ترتیب و تدریج قائم فرمائی اس میں ہجرت کا مرحلہ بھی شامل تھا۔ اس ہجرت کے بغیر اہل ایمان کا محاذ اہل کفر کے مقابل نہ کھل سکتا تھا۔ اسلامی تحریک کے لیے یہ جاننا ضروری تھا کہ مدعیان ایمان میں انقلابی روح کے ساتھ تن من دھن کی بازی لگا کر کون کون آگے بڑھنے کی ہمت و جرأت کر سکتا ہے۔

ہجرت مدینہ سے پہلے ہجرت حبشہ ہوئی تھی سو ہجرت حضورؐ کی اسلامی تحریک کی پہلی آزمائش تھی۔ اس سفر پر جاتے ہوئے حضورؐ نے حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت رقیہؓ بنت رسول اللہؐ کو مخاطب کر کے فرمایا تھا کہ حضرت ابراہیم کے بعد راہ خدا میں تم پہلا جوڑا ہو جو گھر بار سے ہجرت کی نیت سے نکلے ہو۔ اس وقت مسلمانوں کو اپنی بستی سے باہر ایک غیر ملک کی طرف اسلام کی خاطر سفر کرنے کا پہلا تجربہ حاصل ہوا تھا۔ وہاں جاکر وہ نئے حالات سے دوچار ہوئے اور ان حالات سے عہدہ برآ ہونے کا حوصلہ اور فہم بھی ان میں پیدا ہو گیا تھا۔ ان میں وہاں اپنے ملک سے باہر جاکر ایک نظریاتی معاشرتی گروہ ہونے کا احساس پہلی بار ابھرا۔ یکساں نوعیت کے مصائب سے دوچار ہونے کے سبب ان میں یکجہتی، یکسانیت اور یکتائی کی خوبیاں اُجاگر ہوئیں۔ انھیں عربوں کے علاوہ غیر ملکی لوگوں کے سامنے بھی دعوت اسلامی پیش کرنے کا موقع ملا۔ انھیں مشکل حالات پر قابو پانے کا تجربہ ہوا۔ مشرکوں کی بجائے اہل کتاب کے سامنے ایک نئے انداز میں دعوتِ اسلامی پیش کرنے کا طریقہ سیکھا اور اس طرح دعوتِ اسلامی کو مکہ کی بستی سے نکال کر عرب سے باہر حبش کے ملک میں پہنچا دینے کی سعادت نصیب ہوئی۔ اس طرح ہجرت حبشہ کے ذریعہ اسلامی دعوت اپنے ملک کی سرحدات پار کر کے ایک دوسرے ملک کی سرحدوں میں داخل ہو گئی تھی۔ اس طرح اس دعوت میں بین الاقوامیت کا رنگ پیدا ہو گیا۔ ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ انھیں کچھ دنوں کے لیے مشرکین مکہ کے ظلم و ستم سے بچ کر عیسائی اہل کتاب کے ساتھ رہنے ملنے جلنے

اور اپنی بات کہنے کا موقعہ میسر آ گیا۔ ان کے ہاتھ دعوتِ دین کا ایک نیا میدان اور ایک نیا راستہ کھل گیا۔

پہلی ہجرت میں بھی کفار نے مہاجرین کا حبشہ تک تعاقب کیا تھا وہ ایک سفارت شاہ حبش کے دربار میں لے کر گئے تاکہ مہاجرین مسلمانوں کو واپس لاکر ان پر ظلم و ستم کا عمل بے دریغ جاری رکھا جا سکے۔ اس وقت مہاجرین مسلمانوں کو پہلی بار ایک بے لاگ مباحثے میں ایک بادشاہ کے دربار میں اسلام کا حقیقی موقف پیش کرنے کا موقعہ ملا۔ مباحثے میں کفار کے سفیروں کو سخت ہزیمت اٹھانی پڑی۔ درباریوں میں تقسیم کی ہوئی ان کی رشوتیں اور ہدیے کسی کام نہ آئے اور وہ سفارت خائب و خاسر اور محروم واپس آئی۔ اس مباحثے میں کامیابی سے مسلمانوں میں احساس فتح اور اطمینانِ قلب اور اپنے موقف کی صداقت کا یقین پیدا ہوا اور ان کا دل بڑھ گیا۔ پھر انھیں یہ بھی محسوس ہوا کہ ان کی بات اگر معقولیت کے ساتھ سنی جائے تو اس کی صداقت کے وزن کو ہر غیر جانبدار مبصر محسوس کر سکتا ہے اور ان کا موقف اگر بڑی سے بڑی مجالس میں بھی زیرِ بحث آئے تو اس کی معقولیت بہت زیادہ قابلِ قبول اور قابلِ تسلیم سمجھی جاتی ہے۔

مہاجر مسلمانوں کو یہ بھی پہلی بار تجربہ ہوا کہ اپنی بات بے لاگ انداز میں کسی ہیر پھیر کے بغیر، ہر جگہ پیش کرنے کی جرات دکھانا ہی ان کے شایانِ شان اور ان کے دین کے تقاضوں کے مطابق ہے۔ انھیں یہ بھی پتہ چلا کہ اگر وہ مخالفین کے مروجہ عقائد کی پروا کئے بغیر پورا پورا بے لاگ حق بیان کریں تو اس میں بہت زیادہ قوت اور وزن ہوتا ہے جسے سننے والا اچھی طرح محسوس کرتا ہے۔

حضور اکرمؐ نے ہجرت کے لیے پہلی بار جو علاقہ منتخب کیا وہ حبش کا ملک تھا جو ایک عیسائی مملکت تھی وہ ملک بیشتر اہلِ کتاب کی آبادی پر ہی مشتمل تھا۔ اہلِ کتاب اپنے عقائد اور اقرارِ خدا اور ایمان رسالت و آخرت کے بارے میں مسلمانوں سے قریب تر تھے۔ اس وقت کے عیسائی بالعموم یہود کے مقابلے میں زیادہ خدا ترس اور خدا خوف تھے ان میں ابھی تک حضرت عیسٰیؑ کی اچھی تعلیمات کے اثرات بھی باقی تھے۔ حضرت عیسٰیؑ کی تعلیمات نے ان میں خدا خوفی، ہمدردی، رحم اور مسافر نوازی کی خوبیاں پیدا کر دی تھیں۔ چنانچہ پہلی ہجرت کے موقع پر حضورؐ کی نظر نے مظلوم مسلمانوں کے لیے جو علاقہ تجویز کیا وہ ملک حبش کا علاقہ تھا غالباً اس وقت وہ موزوں ترین ملک تھا۔

غرض حبشہ کی طرف مظلوم مسلمانوں نے دو بار ہجرت کی جس کے نتیجے میں حضورؐ کے ساتھ مکہ میں صرف تھوڑے سے افراد ہی باقی رہ گئے۔ جن لوگوں نے حبش اور مدینے کی طرف دو ہجرتیں کیں انھوں نے بلاشبہ اپنے رب کے بہترین انعام و اکرام کا وعدہ حاصل کیا۔ ہجرت کے لیے پہلی بار حبش کا انتخاب حضورؐ کی دانش و حکمت کا عمدہ نمونہ تھا۔ اس سے مسلمانوں نے خدا کی راہ میں نکل کر بہت سے ایمانی فوائد حاصل کیے۔ پہلی ہجرت حبشہ کا زمانہ پانچ نبویؐ کا زمانہ تھا ہجرت مدینہ اس کے سات سال بعد ہوئی اور درحقیقت یہ ہجرت مدینہ ہی تھی جس نے تاریخِ اسلام کا رخ کامیابی کی طرف موڑ دیا۔

ہجرت کی تیاری

مدینہ کی طرف ہجرت کے لیے مسلمانوں کو عام حکم مل چکا تھا۔ مسلمان مرد اور عورتیں وقفہ وقفہ سے ایک ایک دو دو کر کے مدینے کی طرف جا رہے تھے۔ آہستہ آہستہ مکہ خالی ہوتا جا رہا تھا جیسے جہاز کے مسافر اترتے چلے جا رہے ہوں اور اب جہاز کا کپتان اور اس کے چند ساتھی ہی باقی رہ گئے ہوں خود حضور اکرمؐ بھی ہجرت

کے لیے پوری طرح تیار تھے ۔ بس اللہ کی طرف سے اذن سفر کا انتظار تھا ۔ دشمن بھی غافل نہیں تھا ۔ قریش دیکھ رہے تھے کہ مسلمان ان کے ہاتھ سے نکلے جا رہے تھے ۔ ان کی نگاہیں رسول اکرمؐ پر تھیں ۔ انہوں نے اپنی مخفی تدبیر طے کر لی تھی وہ حضورؐ پر بیک وقت اجتماعی قاتلانہ حملہ کر کے آپ کو ختم کر دینا چاہتے تھے یہ وہی قریش تھے جن کی بے شمار امانتیں حضور اکرمؐ کے پاس جمع تھیں ۔ وہ اس شدید دشمنی میں بھی شہر بھر میں اپنے اس مغضوب ترین دشمن کو ہی بہترین امانت دار اور دیانت دار انسان سمجھتے تھے ۔ حضورؐ کا گھر ان دشمن قریش کی مختلف امانتوں سے بھرا ہوا تھا ۔ حضور اکرمؐ کو یہ امانتیں واپس کرنے کی بےحد فکر تھی ۔

کوئی دوسرا ہوتا تو ایسے دشمنوں کی امانتوں کو ایسے وقت میں تلف کر دینا یا اپنے ہمراہ سمیٹ کر لے جانا ہی دانشمندی قرار دیتا اور اپنے دشمنوں کو مال کے ان ذرائع سے محروم کرنا بھی اپنی تدبیر کا ایک حصہ سمجھتا ۔ آخر بنی اسرائیل جب مصر سے ہجرت کر کے چلے تھے تو اپنے اعتراف کے مطابق امانتیں ہی نہیں بلکہ جان بوجھ کر اپنے دشمن قبطی ہمسایوں سے مال و سامان مانگ مانگ کر بھی اپنے ہمراہ لے گئے تھے جیسا کہ ان کے سفر ہجرت کے بارے میں ان کا عہدنامہ قدیم بیان کرتا ہے لیکن حضور اکرمؐ کو سب سے بڑی فکر اس بات کی تھی کہ انکی ذات پر جن لوگوں نے اعتماد کر کے اپنی امانتیں آپ کے پاس رکھوائی تھیں ان امانتوں کو ان تک کیسے پہنچایا جائے ۔ خود واپس کریں تو ہجرت کا راز کھلتا ہے جو حکمت کے خلاف اور سخت خطرناک بات تھی اور اگر واپس نہیں کرتے تو دعوت اسلامی کے دامن پر بدنما دھبہ لگتا ہے ۔ حضور اس مسئلے کے حل پر مسلسل غور فرما رہے تھے

بالآخر آپ نے اس مسئلے کا یہی حل نکالا کہ اپنے گھر کے انتہائی قابل اعتماد فرد کو اپنی طرف سے ان امانتوں کو واپس کرنے کے لیے مامور کر دیا ۔ یہ آپ کی شخصی ذمہ داری تھی جسے پورا کرنے کے لیے کوئی آپ کا اہل خانہ ہی موزوں ہو سکتا تھا ۔

”علی ۔ تم میرے بستر پر میری چادر اوڑھ کر سو رہو ۔ کوئی تمہارا بال بیکا نہ کر سکے گا ۔“ حضور اکرمؐ نے فرمایا ۔

حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ جتنی میٹھی نیند مجھے اس رات اس بستر پر آئی اتنی میٹھی نیند مجھے عمر بھر پھر کبھی نہیں آئی ۔ یہ اپنے آقا ، اپنے نبیؐ اور اپنے قائد پر اعتماد و ایمان کا کمال تھا ۔ وہ بستر جس پر سارے قریش کے منتخب جوانوں کی برہنہ تلواروں نے برسنا تھا ۔ وہ بستر جس پر اس رات موت کا سایہ منڈلا رہا تھا ۔ وہ بستر جس پر حملے کی تدبیریں سوچی جا چکی تھیں ۔ وہ بستر جس پر مکہ کے خونخوار سرداروں کی خون آلود نگاہیں تھیں ۔ حضرت علیؓ اس بستر پر اتنی میٹھی نیند سوئے کہ انھیں وہ میٹھی نیند عمر بھر یاد رہی اور وہ تب اٹھے جب مکہ کے خونخوار قاتلوں نے چادر کھینچ کر انھیں اٹھایا ۔

رات کے وقت حضور اکرمؐ وقت مقررہ پر اٹھے اور پہرہ دینے والے ان بے نور دیدے والوں اور دل کے اندھوں کی آنکھوں میں خاک ڈالتے ہوئے محاصرے سے باہر نکل گئے ۔ کسی نے بھی آپ کو جاتے ہوئے نہ دیکھا ۔ آپؐ اس محاصرے سے نکل کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر تشریف لے گئے حضرت ابوبکرؓ ہجرت کی رفاقت کے لیے پہلے سے تیار تھے ۔

صبح قریش کے خونخواروں نے حضرت علیؓ سے سوال کیا ۔

”بتاؤ محمد کہاں ہیں ؟“ انہوں نے بگڑ کر کہا ۔

”مجھے کیا خبر کیا میں ان پر پہرہ دے رہا تھا ؟“ حضرت علیؓ نے طنزیہ کہا ۔

وہ جلے بھنے خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے اور حضرت علی رضی اللہ علیہ کو پکڑ کر خانہ کعبہ تک لے گئے اور وہاں لے جا کر کچھ دیر کے لیے حبس بے جا میں رکھا پھر مایوس ہو کر انھیں چھوڑ دیا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش اور تعاقب میں لگ گئے۔

اہل مدینہ کا ایمان

آغاز میں حضور اکرم کو یہ معلوم نہیں تھا کہ مدینہ ہی آپ کا دار الہجرت ہوگا۔ کسی اسلامی تحریک کے لیے دار الہجرت وہی مقام ہو سکتا ہے جو اپنے معاونین کے لحاظ سے سب سے زیادہ مضبوط اور محل وقوع کے لحاظ سے تحریک اور دعوت دونوں کے لیے موزوں ترین ہو اور جس کے باشندے ہر لحاظ سے قابل اعتماد اور بھروسے کے لوگ ہوں آہستہ آہستہ یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ ان خوبیوں کے لحاظ سے موزوں ترین مقام مدینہ ہی تھا۔

یہ حقیقت ہے کہ مدینہ کے لوگوں نے نبوت کے گیارہویں سال حضور اکرم کی نبوت سے آشنا ہونے کے بعد اپنے ایمان کا ایسا زبردست ثبوت دیا جو بے مثال ہے۔ اس وارفتگیٔ عشق رسولؐ میں وہ سب سے آگے نکل گئے اور حضورؐ اکرم کے اولین انصار و اعوان قرار پائے تاریخ نے بھی انھیں انصار رسول کا ہی خطاب دیا ہے۔

حج کا موسم تھا اور حضور اکرمؐ حسب معمول اللہ کے دین کی دعوت حاجیوں کے ایک کیمپ میں پہنچاتے پھر رہے تھے۔ جب رات کی تاریکی میں منیٰ کے علاقے عقبہ کے مقام پر حضورؐ نے بعض لوگوں کو آپس میں باتیں کرتے سنا تو حضورؐ ان لوگوں کے پاس پہنچے یہ مقام منیٰ اور غار حرا کے درمیان واقع تھا۔ جب حضورؐ ان کے پاس گئے تو وہ کل ۶ آدمی تھے اور یثرب کے رہنے والے تھے۔ اس زمانے میں مدینہ کا یہی نام تھا۔ اللہ کے نبی نے اسلام کی دعوت ان کے سامنے پیش کی۔ ان کے دل میں خدا کی محبت کو گرمایا ان کو بتوں سے نفرت دلائی۔ ان کو پاکیزگی اور طہارت کا سبق دیا۔ ان کو گناہوں سے بچنے کی تلقین کی اور انھیں نیکیوں کا حکم دیا۔ آپ نے قرآن پاک کی تلاوت کر کے ان کے دلوں کو منور اور ان کے ذہنوں کو روشن کر دیا۔

یہ لوگ اگرچہ بت پرست تھے لیکن ان کے ہمسائے یہودی تھے جن سے انہوں نے سن رکھا تھا کہ ایک نبیؐ ظاہر ہونے والا ہے جو لوگوں کو خدا کا کلام سنائے گا بدیوں سے روکے گا اور نیکیوں کی تلقین کرے گا۔ انھیں قرآن کی پر وقار تلاوت میں خدا کا کلام بولتا ہوا نظر آیا اور حضورؐ کی تلقین میں انھیں نبیوں کا سا انداز محسوس ہوا۔ وہ یہودیوں سے بھی پہلے اس نبی پر ایمان لانا چاہتے تھے جن پر ایمان لانے اور بت پرستی کو مٹانے کا اعلان اور دعویٰ یہودی کیا کرتے تھے۔ چنانچہ یہودیوں پر سبقت لے جانے اور نبی کی تعلیم پر سب سے پہلے ایمان لانے کے خیال سے سرشار ہو کر وہ حضور اکرمؐ پر اسی وقت ایمان لے آئے اور جب وہ اپنے وطن کو واپس گئے تو وہ ان تعلیمات نبویؐ کے معلّم مبلغ اور دین اللہ کے نقیب بن کر گئے۔ مدینہ پہنچ کر وہ ہر کسی کو یہ خوشخبری سناتے پھرتے تھے کہ جس نبیؐ کا سارے جہان کو انتظار تھا وہ نبیؐ آگیا ہے۔ ہم اس سے مل کر آئے ہیں۔ ہم اس پر ایمان لے آئے ہیں اور اس کی تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے کہ خدائے واحد پر ایمان لاؤ۔ شرک اور بت پرستی چھوڑ دو۔ زنا کے قریب نہ جاؤ۔ خلق خدا کے ساتھ رحم و ہمدردی سے پیش آؤ، نیکی کرو، بدیوں سے بچو، ہر شخص ان کے پاس آ کر نبی کے بارے میں معلومات حاصل کرتا تھا اور وہ ہر کسی کو بڑے ذوق و شوق سے بتلاتے تھے کہ ہم نے اس نبی کا کلام خود اپنے کانوں سے سنا ہے اور اس نبی کو اپنی آنکھوں سے خود دیکھا ہے اور اس نے

ہمیں ایک ایسے زندہ و پائندہ خدا سے آشنا کیا ہے جس پر ایمان لانے کے بعد ہمارے لیے دنیا کی زندگی اور موت کی منزل سب ہیچ ہے اور یہ دونوں منزلیں نہایت آسان ہو جاتی ہیں۔

حضور اکرمؐ پر مدینہ سے آ کر اوّلیں ایمان لانے والوں میں یہ چند خوش نصیب حضرات تھے۔ ابو امامہؓ سعد بن زرارہؓ عوف بن حارثؓ، رافع بن مالکؓ، قطبہ بن عامرؓ، عقبہ بن عامرؓ، سعد بن ربیعؓ۔

حج سے واپسی پر مدینہ میں ان کی آمد کے ساتھ ہی اس نبی عربیؐ اور اس کے نئے دین کا گھر گھر چرچا پھیل گیا اور اگلے سال کے حج میں اس نبیؐ سے ملاقات کرنے اور اس پر ایمان لانے کے لیے مدینے کے بارہ باشندے مکہ مکرمہ پہنچے۔ ان لوگوں نے حضور اکرمؐ کے ہاتھ پر ایمان لا کر بیعت کا معاہدہ جن باتوں پر کیا وہ پانچ باتیں تھیں انہوں نے عہد کیا کہ:

۱۔ وہ صرف خدائے واحد کی عبادت کریں گے اور کسی کو اس کا شریک نہیں بنائیں گے۔

۲۔ وہ چوری اور زناکاری نہیں کریں گے۔

۳۔ وہ اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گے۔

۴۔ وہ کسی پر جھوٹی تہمت نہیں لگائیں گے اور نہ کسی کی چغلی اور غیبت کریں گے۔

۵۔ اور وہ حضور اکرمؐ کی اطاعت ہر معروف کام میں کریں گے۔

ان باتوں کا عہد کر کے جب وہ مدینہ واپس جا رہے تھے تو حضور اکرمؐ نے حضرت مصعبؓ بن عمیر کو معلم بنا کر انکے ساتھ مدینہ بھیج دیا مدینے میں پہنچ کر ایک سال کے اندر اندر انہوں نے اہل مدینہ کی خاصی بڑی آبادی کو مسلمان کر لیا۔ اس طرح مدینہ ایمانی لحاظ سے حضور اکرمؐ کی آمد کے لیے تیار ہو گیا۔ اور اس شہر خوباں نے حضور اکرمؐ کے دار الہجرت کی خوبیاں اپنے اندر پیدا کر لیں۔ اسی لیے حضرت عائشہ صدیقہؓ نے خوب فرمایا تھا کہ مکہ مکرمہ کو حضور اکرمؐ نے اور مدینہ منورہ کو قرآن نے فتح کیا۔

مسلمان مہاجرین

اللہ کی طرف سے ہجرت کی اجازت کے بعد حضور اکرمؐ نے مسلمانوں کو مدینہ کی طرف ہجرت کا عام حکم تو دے ہی دیا تھا۔ مسلمان قریش کے شب و روز کے مظالم سے پہلے ہی پریشان تھے ان کے لیے مکہ کی زمین تنگ کر دی گئی تھی۔ اس لیے وہ آزادی اور کشادگی کی راہ تک رہے تھے جہاں وہ خدا کے دین کی پیروی آزادی اور اطمینان کے ساتھ کر سکیں اپنا ہی وطن ان کے لیے آگ کا کھیت بن کر رہ گیا تھا۔ وہ خوش تھے کہ اب انہیں اللہ کے دین کی پیروی اور خدائے واحد کی عبادت کی پوری آزادی ملنے والی تھی۔

آہستہ آہستہ سارے ہی مسلمان اپنی جگہ رختِ سفر باندھنے لگے تھے۔ صہیب رومیؓ چلنے تو کفار نے انہیں آ کر روک لیا۔ کہنے لگے، صہیب جب تم مکہ میں آئے، تو مفلس اور قلاش تھے یہ سارا اسباب و سامان لے کر تم کہاں جا رہے ہو؟

انہوں نے کہا "یہ سامان میں نے اپنی محنت اور حلال کمائی سے پیدا کیا ہے اور میں یہ سب لے کر مدینہ جا رہا ہوں چونکہ تم ہمیں یہاں رہنے نہیں دیتے۔"

کفار کہنے لگے "یہاں کا کمایا ہوا مال لے کر تم کہیں نہیں جا سکتے۔"

صہیب نے کہا:" اور اگر یہ سارا مال و متاع اور سامان تمہیں دیدوں پھر تو تم جانے دو گے نا؟"
انہوں نے کہا:" ہاں پھر تم جا سکتے ہو۔"

حضرت صہیبؓ نے سارا مال و متاع ان کے حوالے کیا اور خود خالی ہاتھ مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا تھا کہ صہیب نے جو کچھ کمایا ہے اس کی کوئی مثال نہیں ہے۔ ابدی آرام و راحت کا سامان۔

حضرت ابوسلمہؓ چلے اور ان کے ساتھ حضرت ام سلمہ بھی تھیں۔ وہ اپنا سفر ہجرت بیان کرتی ہیں کہ" ابوسلمہ نے مجھے اونٹ پر بٹھایا۔ میری گود میں میرا بچہ سلمہ تھا۔ جب ہم چلے تو بنو مغیرہ نے آکر ابوسلمہ کو گھیر لیا اور کہا:

" تم جہاں جا ہو جاؤ لیکن تم ہماری لڑکی کو اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتے۔"

پھر انہوں نے مجھے ابوسلمہ سے چھین لیا۔ پھر ابوسلمہؓ کے قبیلے والے بنو عبدالاسد بھی آ گئے انہوں نے کہا۔

" تم اپنی لڑکی کو لے جا سکتے ہو لیکن یہ بچہ تو ہمارے قبیلے کا ہے تم اسے نہیں لے جا سکتے۔"

اس طرح مجھے میرے خاندان والے اور میرے ننھے بچے کو ابوسلمہؓ کے خاندان والے چھین کر لے گئے اور ابوسلمہؓ جو دین کے لیے ہجرت کر رہے تھے وہ اپنا پیارا بچہ اور معصوم بیوی کو چھوڑ کر تنہا مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

حضرت عمر فاروقؓ کہتے ہیں کہ میرے ساتھ ہشامؓ اور عیاشؓ دو نوجوان صحابی سفر کر رہے تھے۔ عین روانگی کے وقت میرے ساتھی ہشام کو قریش نے گرفتار کر کے قید کر دیا اور وہ ہم سے بچھڑ گئے۔ عیاش میرے ساتھ مدینے پہنچ گئے لیکن ان کے گھر والوں کی طرف سے ابوجہل یہ پیغام لے کر آیا کہ اس کی ماں نے قسم کھائی ہے کہ جب تک عیاش خود آ کر اسے چھاؤں میں نہیں بٹھائے گا وہ دھوپ ہی میں بیٹھی رہے گی اور سر میں کنگھی بھی نہیں کرے گی۔ حضرت عمرؓ نے حضرت عیاشؓ کو سمجھایا کہ اس میں تو مجھے فریب کھائی دیتا ہے لیکن دوسروں نے کہا کہ جا کر اپنی ماں کی قسم پوری کرا دو۔ چنانچہ جب وہ مکہ گئے تو انہیں بھی وہیں قید کر لیا گیا۔

ابوجہل کہتا تھا" ہم ان احمق لونڈوں کو اسی طرح سزا دیا کرتے ہیں۔"

غرض ہجرت کوئی آسان کام نہیں تھا۔ بلکہ سب کچھ لٹا دینے کے باوجود یہ ہزار مزاحمتوں میں سے گزر جانے کا مرحلہ تھا۔ قبیلے اور گھر والے مزاحمت کرتے تھے۔ قریش قید کر لیتے تھے اور چونکہ بیشتر مسلمان قریشی خاندانوں کے نوجوان ہی تھے اور نوجوانوں میں ہی اسلام زیادہ تیزی سے پھیلا تھا۔ اس لیے ہر ہر گھر کا کوئی نہ کوئی نوجوان فرد چلا جا رہا تھا اور مکہ کے بیشتر خاندان اس ہجرت کی جدائی سے متاثر اور اداس تھے۔ ہر خاندان اپنے نوجوانوں پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ جبکہ ہجرت کا سودا ہر اہل ایمان کے سر میں سمایا ہوا تھا۔ ایک معلوم تکلیف دہ حال سے ایک نامعلوم سہانے مستقبل کی طرف ہجرت کی جا رہی تھی۔ ہجرت اپنی تمام تکالیف اور خوش آئند آزادی کے ساتھ کچھ میں موجود ہر ہر مسلمان کے دل کی آرزو تھی۔ ہر شخص آگے کی طرف دیکھ رہا تھا اور ان کے آگے ہجرت کے ساتھ وابستہ اسلامی دعوت کا درخشاں مستقبل موجود تھا۔

ہجرت کا سفر

خونخوار قریش کے جھرمٹ میں سے صحیح سلامت نکل کر حضورؐ صدیق اکبرؓ کے مکان پر تشریف لے گئے تھے۔ صدیق اکبرؓ نے پہلے ہی روانگی کا سامان تیار کر رکھا تھا۔ دونوں حضرات چند دنوں میں تیار ان کے ساتھ

ان کا رب کریم تھا۔ انتہائی خاموشی کے ساتھ مکہ کی بستی میں سے نکل گئے۔ مکہ سے پانچ میل کے فاصلے پر کوہ ثور ہے اس پہاڑ کی چڑھائی سخت اور راستہ سنگلاخ ہے۔ دونوں حضرات اس کے ایک غار میں جا کر ٹھہر گئے اور تین دن تک وہیں ٹھہرے رہے اس دوران میں قریش کی طرف سے ان کے تعاقب اور تلاش کا سلسلہ انتہائی سرگرمی سے جاری رہا۔

قریش نے حضور کی روانگی پر آپ کی گرفتاری کے لیے سو سرخ اونٹوں کا انعام مقرر کر دیا تھا جس انعام کو حاصل کرنے کے لیے متعدد لوگ آپ کی تلاش میں لگ گئے تھے۔

غار ثور کے قیام کے دوران حضرت ابو بکر صدیقؓ کا آزاد کردہ غلام عامر اپنی بکریاں چراتا ہوا انھیں غار کے قریب لے آتا اور آپ بکریوں کا دودھ دوہ لیتے صدیق اکبرؓ کے صاحبزادے عبداللہ مکہ میں قریش کی خبریں معلوم کرکے رات کو آ کر بیان کر جاتے۔ آپ نے پہلے سے عبداللہ بن اریقط کو مدینہ کا راستہ دکھانے کے لئے ملازم رکھ لیا تھا جو انتہائی قابلِ اعتماد شخص تھا۔ انہوں نے سفر کی سواری کے لیے اسے اونٹنیاں دے رکھی تھیں۔

تین دن کے بعد عبداللہ اریقط رہبری کے لیے اونٹنیاں لے کر آ گیا اور اپنے آزاد کردہ غلام عامر کے ہمراہ چار دن افراد کا یہ مختصر قافلہ ساحل ساحل مدینہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

قریش کی طرف سے حضورؐ کی گرفتاری کے لیے ۱۰۰ اونٹ کا انعام بہت سے لوگوں کے لیے لالچ کا باعث تھا اور کئی لوگ تلاش میں نکلے ہوئے تھے۔ ان میں ایک شخص سراقہ بن مالک بھی تھا وہ بھی گرفتاری کی دھن میں سرگرداں تھا۔ بار بار گھوڑے کے ٹھوکر کھانے کے باوجود وہ برابر تعاقب کرتا رہا یہاں تک کہ اسے حضورؐ کا مختصر قافلہ سامنے نظر آنے لگا۔ حضورؐ نے خطرے کو قریب محسوس کیا تو فرمایا۔

"الٰہی ہمیں اس کے شر سے بچا۔"

حضورؐ کا یہ کہنا تھا کہ اچانک سراقہ کے گھوڑے کے پاؤں زمین میں دھنس گئے اور زمین سے اتنا گرد و غبار اٹھ کہ ہر طرف دھواں دھار ہو گیا جس سے سراقہ گھبرا گیا۔ جب ذرا غبار کم ہوا تو اس نے اپنے گھوڑے کے پاؤں زمین میں دھنسے ہوئے دیکھے اس نے لاچار ہو کر دور سے آواز دی کہ "میں سراقہ بن مالک ہوں...... اور خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مجھ سے آپ کو کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔ خدا کے لئے میری بات سنتے جائیے۔" حضورؐ نے ارشاد فرمایا تو وہ قریب آ گیا اس نے کہا "میں آپؐ سے امن کی ایک نشانی چاہتا ہوں جو میرے اور آپؐ کے درمیان ہو۔"

حضورؐ کے ارشاد پر حضرت ابو بکر صدیقؓ نے ایک چمڑے پر تحریر لکھ دی اور وہ واپس چلا گیا۔

اس کے بعد حضورؐ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ساحل کی طرف چلے گئے اور پھر منزل بہ منزل مدینہ کی طرف روانہ ہوگئے۔ یہ مختصر قافلہ ایک چھوٹے سے صحرائی پڑاؤ کے قریب سے گزرا۔ جہاں بنو خزاعہ کی ایک بڑھیا ام معبد کا خیمہ تھا۔ ام معبد مسافروں کی خبر گیری اور خدمت میں مشہور تھی اور لوگوں کی تواضع کرتی تھی پانی پلاتی اور مسافر اس کے خیمے پر آرام کے لئے ٹھہرا کرتے تھے۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ نے بڑھیا سے کھانے کے لیے کچھ پوچھا تو وہ کہنے لگی:

"اگر کوئی شے موجود ہوتی تو آپ کے کہنے سے پہلے میں خود حاضر کر دیتی۔"

حضور اکرمؐ نے خیمے کے گوشے میں ایک دبلی پتلی بکری کھڑی ہوئی دیکھی۔ آپؐ نے بڑھیا سے پوچھا کہ وہ بکری کیوں کھڑی تھی ام معبد نے بتایا کہ وہ بہت کمزور تھی اور ریوڑ کے ساتھ چل پھر نہیں سکتی تھی۔

حضورؐ نے فرمایا "اگر اجازت ہو تو ہم اسے دوہ لیں۔"

بڑھیا نے کہا "اگر آپ کو دودھ نظر آتا ہے تو بے شک دوہ لیجیے۔"

حضورؐ نے بسم اللہ پڑھ کر بکری کے تھنوں کو ہاتھ لگایا اور دوھنے کے لیے برتن مانگا۔ برتن بھر کر اچھل گیا پھر دوسرا برتن بھر گیا۔ پھر تیسرا برتن بھر گیا یہاں تک کہ سب نے پیٹ بھر کر دودھ پیا اور بہت سا دودھ گھر والوں کے لیے چھوڑ کر مدینہ کے چار دن مسافر آگے کی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔

ہجرت کے پڑاؤ حضورؐ کے سفر ہجرت کے عجیب و غریب واقعات ہیں۔ خونخوار قریش پہریداروں کی آنکھوں کا اندھا پن رسول اکرمؐ کا ان کے سامنے بے تکلف نکل جانا۔ غار ثور تک کفار کے پہنچ جانے کے باوجود حضورؐ کا ان کی پہنچ سے باہر رہنا۔ غار ثور کے منہ پر کبوتروں کے جوڑے کا انڈے دینا اور مکڑی کا جالا تن دینا۔ سراقہ بن مالک کے گھوڑے کے پاؤں زمین میں دھنس جانا اور امان طلب کرنا۔ ام معبد کی نحیف و نزار بکری کے تھنوں میں دودھ کی نہر کا بہہ نکلنا جس سے گھر کے تمام برتن بھر گئے۔ مالک الملک اپنے جس بندے کا پشت پناہ ہوتا ہے اسے اسی طرح دشمنوں کے نرغے سے نکال لے جاتا ہے۔ مالک الملک کے انداز نرالے ہیں وہ بڑی قدرتوں والا ہے۔

ام معبد کے گھر میں دودھ کے برتن بھرے ہوئے تھے کہ ام معبد کا شوہر آ گیا۔ وہ برتنوں کو دودھ سے بھرے ہوئے دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ اس نے پوچھا "اتنا سارا دودھ کہاں سے آ گیا؟"

ام معبد نے کہا "ایک بابرکت شخص ہمارے خیمے میں آیا تھا بس یہ اسی کی برکت کا نتیجہ ہے۔"

وہ بولا "پھر تو مجھے یہ وہی صاحب قریش معلوم ہوتا ہے جس کی مجھے تلاش تھی اور جس کو دیکھنے کے لئے میرا دل ترستا تھا۔ ام معبد تم مجھے ذرا اس کا حلیہ تو بتاؤ۔"

اس خاتون نے حضور اکرمؐ کا حلیہ اپنے شوہر کے سامنے بیان کیا وہ بولی:

"ابو معبد میں کیا بیان کروں کہ وہ شخص کس توصیف کا مالک ہے۔ پاکیزہ رو، کشادہ چہرہ، پسندیدہ خو، نہ پیٹ باہر اور نہ سر کے بال گرے ہوئے زیبا، صاحب جمال، آنکھیں سیاہ و فراخ، بال لمبے اور گھنے آواز میں بھاری پن، بلند گردن، روشن مردمک سرگیں چشم، باریک و پیوستہ ابرو، سیاہ گھونگھریالے بال، خاموش اور باوقار، دور سے دیکھنے میں دلفریب، قریب سے نہایت شیریں اور کمال درجہ حسین، شیریں کلام، واضح الفاظ، گفتگو موتیوں کی لڑی، میانہ قد ایسا کہ کوتاہی نظر سے حقیر نظر نہیں آتا۔ نہ اتنا طویل کہ آنکھ اس سے نفرت کرے، زیبندہ نہال کی تازہ شاخ، رفیق ایسے جاں نثار کہ ہر وقت گرد و پیش جب وہ کچھ کہتا ہے چپ چاپ سنتے ہیں، حکم دیتا ہے تو تعمیل کے لیے جھپٹتے ہیں مخدوم، مطاع، نہ کوتاہ سخن نہ فضول گفتگو۔

یہ حلیہ ہے جو ام معبد نے حضور اکرمؐ کا حالت ہجرت میں اپنے شوہر کو بتایا یہ سن کر وہ کہنے لگا "پھر تو وہ ضرور ہی صاحب قریش

ہیں ۔ میں ضرور ان کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے ملوں گا ۔"

ایک اور قبیلے کا سردار بریدہ اسلمی بھی اپنے ستر ساتھیوں کے ہمراہ حضورؐ کا تعاقب انعام کے لالچ میں کر رہا تھا ۔ جب وہ حضورؐ کے سامنے ہوا اور آپؐ سے ہم کلام ہوا تو اپنے ستر ساتھیوں سمیت مسلمان ہو گیا ۔ اس نے اپنی سفید پگڑی اتار کر نیزے پر باندھ لی جس کا پھریرہ اس بات کا اعلان کرتا تھا کہ امن کا بادشاہ ، صلح کا علمبردار ، دنیا کو عدالت و انصاف سے بھر دینے والے سرکار دوعالم کی سواری آ رہی تھی ۔

اس طرح حضورؐ طویل سفر کر کے قبا کے قریب پہنچ گئے ۔ مدینہ کے انصار روزانہ آپ کا انتظار کرتے تھے اور صبح سے شام تک راہ دیکھتے رہتے تھے ۔ اُس روز بھی انتظار کر کے مسلمان واپس جا رہے تھے کہ اچانک ایک یہودی نے ایک ٹیلے پر سے آپ کی سواری دیکھ لی اور پکار کر کہا ۔

" اے مدینے والو تمہاری خوش بختی کا سامان آ پہنچا ہے ۔"

بس اس آواز کے ساتھ ہی مدینہ میں خوشیوں کی لہر دوڑ گئی ۔

آپؐ نے مدینے کے محلے قبا میں چودہ دن قیام فرمایا پھر شہر میں جانے کا فیصلہ کیا ۔ ہر شخص کی آرزو تھی کہ آپؐ اس کے پاس ٹھہریں لیکن جب آپؐ سوار ہوئے تو آپؐ نے فرمایا کہ میری اونٹنی مامور ہے وہ جہاں بیٹھے گی میں وہیں مقیم ہوں گا ۔ اونٹنی چلتے چلتے وہاں آ بیٹھی جہاں آج مسجد نبوی ہے اس جگہ کے متصل حضرت ابوایوب انصاری کا مکان تھا ۔ آپؐ نے مسجد نبوی اور اس کے حجروں کی تعمیر تک ابوایوبؓ انصاری کے مکان پر ہی قیام فرمایا ۔

اس طرح حضورؐ مکہ سے ہجرت کر کے مدینے میں مقیم ہو گئے اور مدینہ کو وہ فخر حاصل ہوا جو فخر پھر کسی دوسرے شہر کو کبھی حاصل نہ ہو سکا ۔ اس دن سے اس شہر کا نام مدینۃ النبی ہو گیا ۔

---

۵ ۔ اثراتِ ہجرت

مکہ کی مشرک سوسائٹی پر مسلمانوں کی ہجرت کے بے پناہ اثرات مرتب ہوئے ہر قبیلہ ، خاندان ، بلکہ ہر گھر کا کوئی نہ کوئی فرد ہجرت کر کے اپنی پیدائش کی بستی چھوڑ رہا تھا ۔ گھر گھر میں کہرام مچا ہوا تھا ۔ کہرام ہجرت حبشہ کے موقع پر بھی مچا تھا لیکن ہجرت مدینہ نے تو اسے انتہا تک پہنچا دیا ۔ کسی کا بھائی ، کسی کا بیٹا ، کسی کا ماموں ، کسی کا بھانجا ، کسی کا چچا اور کسی کا بھتیجا چلا جا رہا تھا ۔ مکہ کی بستی میں ہجرت نے ایک ایسا خلا پیدا کر دیا تھا جسے کسی صورت پُر نہیں کیا جا سکتا تھا ۔ گلیاں سونی ہو گئی تھیں اور بستی کی ہماہمی میں فرق آ گیا تھا ۔ پس ہر طرف مسلمانوں کی ہجرت کا ہی چرچا تھا ۔ اس کے سوا دوسری کوئی بات نہ تھی ۔

غم و اندوہ اور غور و فکر | اس کے نتیجے میں بعض لوگوں کے دل تو غم و غصہ سے اور زیادہ سخت ہو گئے اور انہوں نے مسلمانوں کی اس کارروائی کے بعد ظلم و ستم کو بڑھا دینے اور قتل و غارت

تک نوبت پہنچا دینے کا فیصلہ کر لیا لیکن بعض لوگوں پر ہجرت کے مثبت اثرات ہوئے وہ یہ بات سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ یہ کیوں ہو رہا تھا۔ کیا یہ ممکن نہ تھا کہ یوں بستی ویران نہ ہوتی۔ یوں گھر نہ اجڑتے، یوں گلیاں سونی نہ ہوتیں، یوں محبت و اخوت کے رشتے نہ ٹوٹتے۔ آخر جانے والے کیوں جا رہے تھے۔ اسلام کیا چیز تھا جو ان کو اس قربانی پر آمادہ کر رہا تھا۔

بعض لوگ ایسے بھی تھے جنہوں نے دین اسلام کے بارے میں کبھی سنجیدگی سے غور ہی نہ کیا تھا لیکن اب وہ اپنے دل کی گہرائیوں میں ایک کسک اور چبھن محسوس کرنے لگے تھے۔

حضرت عمرؓ کا پہلا تاثر

ہجرت حبشہ کے سلسلے میں تاثر کا ایک واقعہ طبری نے اپنی تاریخ میں بیان کیا ہے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے بھی اپنی کتاب سرورِ عالمؐ کے حصہ دوم میں اسے نقل کیا ہے۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ ایک خاتون لیلیٰ بنت ابی خثمہ حضرت عمرؓ کی قریبی رشتہ دار تھیں اور وہ اپنے شوہر حضرت عامر بن ربیعہؓ کے ساتھ حبش کی طرف ہجرت کر گئی تھیں انہوں نے بتایا کہ میں حبشہ کی طرف ہجرت کے لیے اپنا سامان باندھ رہی تھی اور میرے شوہر عامر بن ربیعہ کسی کام سے باہر گئے ہوئے تھے۔ اتنے میں عمر آئے حالانکہ وہ ابھی شرک پر قائم تھے اور ہم ان کے ہاتھوں بہت تکالیف اٹھا چکے تھے مگر اس وقت وہ کھڑے ہو کر چپ چاپ میری مشغولیت دیکھتے رہے۔ پھر وہ کہنے لگے۔

"عبداللہ کی ماں۔ کیا بس اب روانگی ہے؟"

میں نے کہا "ہاں تم لوگوں نے ہمیں بہت ستایا اور ظلم کیا ہے اب ہم خدا کی زمین میں کہیں بھی نکل جائیں گے۔ جہاں خدا ہمارے لیے اس مصیبت سے بچنے کی کوئی راہ نکال دے گا۔"

اس پر عمر نے کہا "اللہ تمہارے ساتھ ہو۔"

حضرت لیلیٰ کہتی ہیں کہ میں نے اس وقت ان پر وہ رقت دیکھی جو اس سے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ ہمارے وطن چھوڑنے پر غمگین ہو کر وہ واپس چلے گئے اس کے بعد جب عامر آئے تو میں نے کہا "عبداللہ کے ابا کاش تم اس وقت عمر کو دیکھتے ہمارے حال پر اس کی رقت اور رنج کو دیکھتے۔ ابھی ابھی وہ یہاں سے ہو کر گئے ہیں۔"

عامر نے کہا "کیا تمھیں اس کے مسلمان ہونے کی امید ہو گئی ہے؟"

میں نے کہا "ہاں۔"

عامر نے کہا "جس شخص کو تم نے دیکھا ہے وہ اس وقت تک مسلمان نہ ہو گا جب تک خطاب کا گدھا مسلمان نہ ہو جائے۔"

یہی تاثر تھا جس نے عمرؓ کو مایوسی اور ذہنی پراگندگی سے اس درجہ دوچار کیا کہ وہ حضور اکرمؐ کے قتل پر آمادہ ہو گئے تاکہ اس سارے تنازعے اور کشمکش کا خاتمہ ہو جائے لیکن اللہ تعالیٰ نے انھیں اسلام کے دروازے پر حضور اکرمؐ کے قدموں میں لا ڈالا۔ ان کے دل میں پہلا رقت انگیز تاثر اسی ہجرتِ حبشہ نے پیدا کیا تھا۔ تمام مورخین اس پر متفق ہیں کہ حضرت عمرؓ کے قبول اسلام میں مددگار پہلا تاثر ہجرت حبشہ تھا اور آخری تاثر ان کی ہمشیرہ فاطمہ کی پرعزیمت جرأت آمیز یہ بات تھی کہ "عمر جو چاہو کر لو اب اسلام دل سے نہیں نکالا جا سکتا۔"

خاندان ابو سلمہؓ کے مصائب

حضرت ابو سلمہؓ اور ان کی اہلیہ حضرت ام سلمہؓ کا واقعہ اور بھی زیادہ اثر انگیز تھا۔ انہوں نے حبشہ کی طرف بھی ہجرت کی اور پھر واپس آ کر مدینہ کی طرف ہجرت کرنے والے بھی وہ پہلے مسلمان تھے۔

حضرت ام سلمہ اپنی ہجرت کی داستانِ الم بیان کرتے ہوئے کہتی ہیں۔

" میرے شوہر ابو سلمہؓ مدینے جانے لگے تو میں بھی ان کے ساتھ اپنے بچے سلمہؓ کو گود میں لیے ہوئے نکلی اور وہ مجھے اونٹ پر بٹھا کر اس کی نکیل تھامے آگے چل پڑے۔ میرے میکے کے لوگوں نے انھیں جاتے ہوئے دیکھ لیا تو راستہ روک کر کھڑے ہوگئے اور کہنے لگے " تم خود جدھر جانا چاہتے ہو جاؤ لیکن ہم اپنی لڑکی کو تمہارے ساتھ مارا مارا پھرنے کے لیے نہیں چھوڑ سکتے " چنانچہ انہوں نے ابو سلمہؓ سے اونٹ کی نکیل چھین لی اور مجھے لے چلے۔ اس کے بعد ابو سلمہؓ کے خاندان والے آ گئے۔ انہوں نے کہا " تم نے جب ہمارے آدمی سے اپنی لڑکی چھین لی ہے تو پھر ہم اپنے لڑکے سلمہ کو اس کے پاس کیسے چھوڑیں " چنانچہ وہ بچے کو چھین کر چل دیے۔ اس چھینا جھپٹی میں بچے کا ہاتھ اتر گیا لیکن وہ ظالم لے ہی گئے۔ خاندان والوں نے مجھے گھر لے جا کر بند کر دیا اور ابو سلمہ تن تنہا مدینہ کی طرف روانہ ہوگئے۔ میں سال بھر تک روزانہ گھر سے نکل کر اس جگہ چلی جاتی جہاں یہ واقعہ پیش آیا تھا اور وہاں بیٹھ کر روتی رہتی۔ ایک روز ایک شخص کو بے حد ترس آیا تو اس نے جا کر میرے خاندان والوں سے کہا کہ تم اس مسکین کو کیوں نہیں جانے دیتے تم نے اسے شوہر سے بھی جدا کر دیا اور بچے سے بھی۔ یہ انصاف نہیں ہے چنانچہ میرے اہلِ خانہ نے مجھے اجازت دے دی کہ اگر تو اپنے شوہر کے پاس جانا چاہتی ہے تو چلی جا۔ ابو سلمہ کے خاندان والوں نے میرا بچہ بھی واپس کر دیا اور میں بچے کو لے کر اکیلی مدینے کے لیے روانہ ہوگئی "۔

حضرت ام سلمہؓ کی یہ داستان بتاتی ہے کہ اپنے دین میں ان کی استقامت نے بالآخر دونوں خاندانوں کے دل نرم کر دیے اور انہوں نے ایک خاتون پر مزید ظلم کرنے سے اجتناب کیا لیکن اپنے مشن میں پختہ ایک خاتون کی تنہا سفری کی عزیمت کا جو اثر ایک شریف انسان پر ہوا وہ بھی قابلِ دید ہے۔ ام سلمہؓ بیان کرتی ہیں۔

" جب میں تنعیم کے قریب پہنچی تو خاندان عبدالدار کے ایک بزرگ عثمان بن طلحہ راستے میں ملے "۔

انہوں نے کہا " بنو امیہ کی بیٹی کہاں جا رہی ہو؟"

میں نے کہا " اپنے شوہر کے پاس مدینہ جا رہی ہوں "۔

کہنے لگے " تمہارے ساتھ کوئی ہے؟"

میں نے کہا " خدا اور اس بچے کے سوا میرے ساتھ کوئی نہیں "۔

کہنے لگے " خدا کی قسم میں تمھیں تنہا نہیں جانے دوں گا " اور وہ میرے اونٹ کی نکیل تھام کر آگے آگے چلنے لگے۔ واللہ میں

نے ان سے زیادہ شریف آدمی کوئی نہیں دیکھا۔ جب کسی منزل پر پہنچتے تو اونٹ کو بٹھا کر خود دور ہٹ جاتے جب میں نیچے کو سے کر نیچے اتر آتی تو وہ اونٹ کو کسی درخت سے باندھ دیتے اور مجھ سے دور کسی درخت کے نیچے جا لیٹتے۔ پھر جب چلنے کا وقت آتا تو وہ اونٹ کو لاکر بٹھا دیتے پھر الگ ہٹ کر کھڑے ہو جاتے اور مجھ سے کہتے "سوار ہو جاؤ"۔ میرے سوار ہونے کے بعد وہ اونٹ کی نکیل تھام کر روانہ ہو جاتے۔ مدینے تک سارا راستہ انہوں نے یونہی طے کیا جب قبا کی بستی نظر آئی تو مجھ سے کہا:

"تمہارے شوہر وہاں ہیں ان کے پاس چلی جاؤ اللہ تمھیں برکت دے۔"

اس کے بعد جس طرح پیدل وہ آئے تھے اسی طرح پیدل مکہ کی طرف وہ روانہ ہو گئے۔

اس واقعہ سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ کفار قریش کے مظالم مسلمانوں پر زیادتیاں اور پھر ان کی ہجرت کو دیکھ دیکھ کر خود ان کے اندر بھی خدا ترس اور شریف النفس لوگوں میں اس ظلم سے بیزاری اور مسلمانوں سے ہمدردی پیدا ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اسلام سے عداوت رکھنے کے باوجود ان کے شرفا اور انسانیت پرور لوگوں میں ان مسلمانوں کی قدر و منزلت بڑھتی جا رہی تھی جو اپنے مقصدِ زندگی اور اصولوں کی خاطر ظلم سہہ رہے تھے اور گھر بار چھوڑ کر اپنے اصولوں کو بچانے کے لیے پردیس کی طرف چلے جا رہے تھے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ اور قبیلہ خارہ کا سردار

خود حضرت ابوبکر صدیقؓ نے بھی حالات سے پریشان ہو کر ایک بار ہجرت حبشہ کا ارادہ کر لیا اور واقعی وہ سفر پر روانہ بھی ہو گئے ابھی وہ مکہ سے ایک دو دن کا راستہ ہی طے کر پائے تھے کہ انھیں قبیلہ خارہ کا سردار ابن الدغنہ ملا۔

وہ کہنے لگا "ابوبکر کدھر کا ارادہ ہے؟"

ابوبکر کہنے لگے "میری قوم نے مجھے نکال دیا ہے سخت اذیتیں دی ہیں اور زندگی تنگ کر دی ہے۔"

وہ کہنے لگا "کیوں! ابوبکر تم جیسا آدمی نہیں نکل سکتا اور نہیں نکالا جا سکتا خدا کی قسم تم تو معاشرے کی زینت ہو نادار کو کما کر دیتے ہو صلہ رحمی کرتے ہو۔ عاجز و درماندہ کا بار اٹھاتے ہو۔ مہمان نوازی کرتے ہو اور نیک کاموں میں مدد کرتے ہو۔ واپس چلو میں تمھیں اپنی حفاظت میں لیتا ہوں۔ تم اپنے شہر ہی میں اپنے رب کی عبادت کرو۔"

اور وہ حضرت ابوبکرؓ کو واپس مکے میں لے آیا اور اس نے ایک ایک شخص کے پاس جا کر کہا کہ ابوبکرؓ جیسا آدمی نہیں نکالا جا سکتا تم ایسے آدمی کو نکالتے ہو جس میں ایسی ایسی خوبیاں ہیں۔

یہ مسلمانوں کے اخلاقی اثرات تھے اور ان کی ہجرت نے اس طرح گھر گھر میں ہر معقول انسان کو سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کتنے ہی دل ہجرت کی ضرب سے حق کے لیے نیم وا ہو گئے تھے۔

۶۔ مقامِ ہجرت

تاریخی پس منظر

مدینۃ الرسولؐ اور مرکزِ دعوتِ اسلامی بننے سے پہلے مدینہ یثرب کہلاتا تھا۔ جس میں یہودی اہلِ کتاب بھی آباد تھے جو ہر قل

کے فتح فلسطین کے بعد وہاں سے بھاگ کر مدینہ میں آباد ہو گئے تھے۔ یہ بستی مکہ معظمہ سے ۳۰۰ میل شمال کی طرف واقع ہے اور مکہ کے ساتھ اس کی کھجوروں اور اناج کی تجارت تھی۔ یہ جگہ سطح سمندر سے ۲۳۰۰ فٹ بلند ہے۔ یہ شہر تین طرف سے پہاڑیوں سے گھرا ہوا ہے جن میں پانچ میل سے ۱۱ میل تک کا فاصلہ موجود ہے۔ شہر کی میدانی آبادی جنوب کی طرف ہے۔ برساتی ندی نالے آس پاس سے آ کر اسے زرعی کاشت کے قابل اور شاداب بناتے ہیں۔

یہ نہایت زرخیز علاقہ ہے نخلستانی رقبہ ہے۔ کھجوروں کے باغات قدیم سے چلے آتے ہیں۔ آب و ہوا معتدل ہے۔ بیسیوں قسم کی کھجوروں کا مرکز ہے لیکن کھیتی باڑی بھی خوب ہوتی ہے۔ مدینہ کے خاص آباد کار اوس و خزرج کے قبائل تھے۔ یہ زراعت پیشہ لوگ تھے۔ یہودی تجارت کے زور سے زراعت پر بھی قابو یافتہ تھے ان کی اصل معیشت ساہوکاری تھی۔

اوس و خزرج کا قبیلہ بنی قحطان تھا۔ یہ بھی باہر سے ہی آ کر آباد ہوئے تھے۔ ان کی کشمکش باہمی بھی چلتی رہتی تھی۔ یہودیوں کے ساتھ بھی جنگیں جاری رہتی تھیں۔ یہودیوں کی انہی جنگوں کے دوران پھیلائی ہوئی یہ باتیں اوس و خزرج کو یاد تھیں کہ ایک نبیؐ آئے گا جس کے آنے پر وہ اس کے ساتھ مل کر اپنی شکستوں کا بدلہ اوس و خزرج سے لیں گے۔ چنانچہ مدینہ کے ان بت پرست قبائل کو بھی غیر محسوس طور پر اس نبی کا انتظار تھا۔ چنانچہ ان میں سے کچھ لوگ مکہ کے سالانہ میلے "جاہلیت کے دور کا حج" پر گئے تو حضور اکرمؐ سے ان کی ملاقات منیٰ کے مقام پر ہو گئی اور وہ مسلمان ہو کر واپس آئے۔ وہ یہ فخر یہود سے پہلے حاصل کرنا چاہتے تھے کہ آنے والے موعودہ نبی پر وہ ان سے پہلے آگے بڑھ کر ایمان لائیں اور انہیں ان کی رفاقت حاصل ہو جائے۔ انھیں بنی قحطان کے لوگوں نے حضور اکرم کو یثرب تشریف لانے کی محبت بھری دعوت دی تھی۔

اللہ کی قدرت سے یثرب کو دفاعی حیثیت سے پورے حجاز میں ایک مرکزی مقام حاصل تھا۔ یہ قافلوں کی گزرگاہ بھی تھی تجارتی منڈی بھی تھی اور اس دور کے تین مشہور تجارتی راستے اس کی زد میں آتے تھے۔ یہاں پانی اور اناج وافر تھا سایہ اور نخلستان تھے۔ قریش نے یثرب کے بعض قبائل کو بے جا طور پر ہراساں کر کے اپنا مخالف بھی بنا لیا تھا۔ اس لیے وہ اپنی روایات کے مطابق قریش سے ناراض بھی تھے یوں بھی حضور اکرمؐ کا مدینہ والوں سے ننھیالی رشتہ تھا جس کی وجہ سے فطرتاً وہ حضورؐ کے بارے میں اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتے تھے۔

مدینہ کے مرکز دعوت اسلامی بن جانے کے بعد قریش کے تجارتی راستے بھی حضورؐ کی زد میں آتے تھے اور مدینہ کے باشندوں کی یہود سے جذبہ سبقت کے سبب مدینہ کی فضا حضورؐ کے حق میں سب سے زیادہ سازگار تھی۔ اگر اتنے فاصلے پر قریش جنگ کے لیے آتے تو اُن کے لیے سامان رسد کی فراہمی اور پسپائی کی صورت میں دور دور تک پاؤں جمانے کی کوئی جگہ موجود نہ تھی۔

غرض حضور اکرمؐ کی مدینہ کی طرف ہجرت ایک ایسا دفاعی اقدام تھا جس کے بعد اسلامی جماعت خود بخود جنگی پوزیشن اختیار کر کے کامیابی تک پہنچ سکتی تھی۔ غرض ہجرت حضور اکرمؐ کی وہ حکمت عملی تھی جس کے ذریعے اسلامی تحریک نے یکایک اپنی حکمت دعوت بدل کر باطل اور طاغوت کو چیلنج کرنے کا لائحہ عمل طے کر لیا تھا۔

اس طرح ہجرت کا اقدام کوئی مجبوری اور بے چارگی کے تحت جلا وطنی اور فرار (FLIGHT) کا اقدام نہیں تھا بلکہ ایک سوچے

سمجھے منصوبے کے تحت حکمتِ تحریک میں تبدیلی، قوت کے استعمال سے باطل کو سرنگوں کرنے کے اقدامات کا فیصلہ اور طاغوت سے براہ راست پنجہ کشی کا اقدام تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دوسرے ہی سال جب اسلامی تحریک کے سامنے یہ مسئلہ آیا کہ وہ قریش کے تجارتی قافلے کو ہدف بنائے یا جنگی قوت کا سامنا کرے تو حضور اکرمؐ نے بے سروسامانی کے باوجود جنگی قوت کا سامنا کرنے کا فیصلہ کیا اس لیے کہ جنگی قوت کا مقابلہ کرنے سے وہ انقلابی نتائج برآمد ہوتے ہیں جو باطل نظام کو جگہ چھوڑنے پر مجبور کر دیتے ہیں حضورؐ نے اس انقلابی راستے کو ہجرت کے ذریعے اختیار کیا تھا۔

مدینہ۔ ہجرت سے پہلے اور بعد

مدینہ ہجرتِ رسولؐ کے وقت ایک معمولی بستی تھا اوس و خزرج کے دونوں قبائل اس میں آباد تھے۔ وہ مدتوں سے باہمی جنگ و جدل کرتے چلے آ رہے تھے۔ ان کے علاوہ مدینے کے مضافات و اطراف میں یہودیوں کے تین قبائل تھے۔ مشرقی حصے کی جانب بنو نضیر کی بستیاں اور ان کے باغات تھے۔ جنوب کی طرف بنو قریظہ اور ان کی آبادی تھی اور جنوب مغرب کی طرف بنو قینقاع تھے۔ ان یہودیوں کی مجموعی آبادی بھی اوس و خزرج کی مجموعی آبادی کے لگ بھگ تھی۔ یہ ساری آبادی مل کر ۵، ۶ ہزار سے زائد نہ تھی۔ مدینہ ایک چھوٹی سی بستی تھا جس کی معیشت کا انحصار زیادہ تر زراعت پر تھا۔ دوسرے درجے پر تجارت تھی جو بیشتر یہودیوں کے ہاتھ میں تھی۔ قبیلہ بنی قحطان کے دو خاندان اوس و خزرج دونوں کاشت کار تھے اور قریش ان کو جنگجو قبائل میں شمار ہی نہ کرتے تھے۔

مدینہ ایک غیر معروف چھوٹی سی بستی تھا۔ جب ہجرت کا عظیم واقعہ پیش آیا اور مکہ سے حضور اکرمؐ اور مہاجرین آئے تو ساری بستی کا معاشرتی، تجارتی اور اخلاقی نقشہ یکایک بدل گیا۔ بستی آہستہ آہستہ بڑھنے، پھیلنے اور ترقی کرنے لگی۔ جو قصبہ کاشتکار انصار اور مہاجن یہودیوں پر مشتمل تھا اب اس میں قریش کے تجارت پیشہ لوگ بھی آ گئے تھے اور ان کے آنے سے بازاروں اور تجارت کے کاموں میں چہل پہل ہو گئی تھی۔ شہر کی قوت کا توازن جو پہلے یہودیوں کے حق میں تھا اس لیے کہ مدینے کے باشندے ان کے اہل کتاب اور مالدار ہونے کے سبب ان سے کچھ مرعوب تھے۔ اب مہاجرین اور ایک رسولؐ کی آمد سے وہ توازن بدل کر مسلمانوں کے حق میں چلا گیا تھا جو یہودیوں کو بہت ناگوار تھا۔ نبوت پر ایمان لانے کے نتیجے میں یہودیوں کے اثرات انصار پر سے بھی دن بدن کم ہوتے چلے گئے۔ مدینہ نئی اسلامی ریاست کا دارالسلطنت بن گیا۔ وہاں سے فوجیں منظم ہو ہو کر دشمنِ کفار کے خلاف جانے لگیں۔ ہر طرف سے قبائل کے وفود آنے لگے۔ حکومتوں کے سفیر آنے لگے۔ قیدی آنے لگے۔ ہر طرف سے بے شمار مالِ غنیمت آنے اور مدینے کے باشندوں میں تقسیم ہونے لگا۔ جو لوگ پہلے صرف کاشتکار تھے۔ اب وہ اسلامی افواج کے مجاہد اور کمانڈر بن بن کر جانے لگے۔ جن لوگوں کی معاشی حالت سخت خستہ تھی اب ان کے پاس مالِ غنیمت لونڈی و غلام، قیدی اور مال آنے لگا۔ اس طرح دیکھتے دیکھتے کوہ احد کے دامن میں آباد ایک چھوٹی سی بستی جدید ترین خطوط پر قائم ایک اسلامی ریاست کا مرکزی مقام ہونے کی حیثیت سے دور دور تک متعارف ہوتی چلی گئی۔

اس شہر کی آبادی کی حیثیت بڑھ گئی اس کے باشندے نئی اسلامی ریاست کے اعوان و انصار بن گئے۔ اس کے نوجوان فوجوں کے مجاہد بن گئے۔ اس کے بزرگ ریاستی وفود کے رکن بن بن کر مختلف حکومتوں کی طرف جانے لگے اور ہجرت کے بعد صرف آٹھ یا نو سال کی مدت کے اندر اندر کوہ سلع اور کوہ احد کے درمیان یہ چھوٹی سی بستی کی آبادی اسلامی حکومت کا دارالسلطنت بن کر سارے

عالم میں مشہور ہوگئی۔ ہجرت کے واقعہ نے اس شہر کی قسمت آسمان تک پہنچا دی۔ یثرب کی بستی مدینہ منورہ کا شہر بن گئی۔ یہ ہجرت کے ثمرات تھے۔

مرکز اسلام اور داعی اسلام

مدینہ دفاعی نقطۂ نظر سے نہایت اہم مقام تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینے کو اپنی اسلامی دعوت کا مرکز منتخب کرنے میں بہت سے امور کو ملحوظ رکھا تھا۔

۱۔ سب سے اہم مسئلہ رفقائے کار کا تھا۔ ہجرت کے بعد حضورؐ کو جو ساتھی مدینے میں ملے ایسے ساتھی شاید ہی کسی نبی کو اپنی بعثت و نبوت میں ملے ہوں، ایثار پیشہ، جاں نثار اور حوصلہ مند

۲۔ دوسرا مسئلہ مدینے کے محل وقوع کا تھا جو ایسے مقام پر تھا کہ قریش کے لیے مسلمانوں کے ساتھ عناد اور دشمنی رکھ کر اپنی شام کی تجارت کو بحال رکھنا ممکن نہ تھا۔ لڑائی کی صورت میں انھیں ایک طویل راستہ اختیار کرنا پڑتا تھا جس میں خوراک کی قلت ہوتی اور نقل و حمل کی دشواریاں دوچند ہو جاتیں ۔

۳۔ تیسرا مسئلہ مکے کے لیے خوراک کا تھا۔ اگر وہ مدینے والوں سے لڑیں تو مدینے کے غلے اور کھجوروں سے محروم رہیں چنانچہ ایک بار تو مکہ میں قحط پڑ گیا تھا جس پر حضورؐ نے مکہ والے دشمنوں کو ہدیے کے طور پر غلہ ارسال کیا تھا۔

۴۔ چوتھا مسئلہ مدینے سے حضورؐ کا ننھیالی تعلق تھا۔ جس کی وجہ سے حضور کو ان کی طرف سے تائید کی زیادہ سے زیادہ امید تھی۔ اگر قریش مدینہ والوں سے لڑ کر شکست کھاتے تو وہ بالکل ہی تباہ ہو جاتے جیسے کہ چند لڑائیوں سے ہی وہ ایسے کمزور ہوئے کہ بالآخر حضور نے مکہ کو جنگ کے بغیر فتح کر لیا۔

غرض ہجرت کرکے مدینہ کو مرکز بنانے میں بہت سے مصالح تھے جن کا پورا پورا فائدہ اسلامی تحریک کو پہنچا۔

جب حضورؐ مدینے میں تشریف لائے تو اجتماعی زندگی سے مسلمانوں کے اخلاق کے جوہر بھی کھلے اور لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہونے لگے۔ جو شخص آتا حضورؐ کو دیکھ کر متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا تھا۔

عبداللہ بن سلام نے کہا "میں نے جونہی حضور کو دیکھا تو فوراً سمجھ لیا کہ آپ کا چہرہ کسی جھوٹے آدمی کا چہرہ نہیں ہو سکتا۔"

ابو رمثہ تمیمی نے کہا "میں اپنے بیٹے کے ساتھ حاضر ہوا تو لوگوں نے مجھے دکھایا کہ یہ ہیں خدا کے رسولؐ! دیکھتے ہی میں نے کہا واقعی یہ اللہ کے رسولؐ ہیں۔"

ایک قافلہ کی خاتون نے اپنے قافلہ والوں کو تسلی دیتے ہوئے کہا "مطمئن رہو میں نے اس شخص کا چہرہ دیکھا تھا جو چودھویں کے چاند کی طرح روشن تھا۔ وہ کبھی تمہارے ساتھ بدمعاملگی کرنے والا شخص نہیں ہو سکتا۔"

ایک بڑھیا نے دیکھا تو کہا "خدا کی قسم ہم نے ایسا خوبرو شخص کبھی نہیں دیکھا۔ ہم نے اس کے منہ سے روشنی نکلتی دیکھی ہے۔"

حضرت ابوہریرہؓ نے کہا "حضور سے زیادہ خوبرو اور کوئی نہیں۔ ایسا لگتا ہے گویا آفتاب چمک رہا ہے۔"

حضرت علیؓ نے کہا "دیکھنے والا پہلی نظر میں ہی مرعوب ہو جاتا تھا۔"

حضرت جابرؓ نے کہا "میں ایک مرتبہ چاندنی رات میں حضورؐ کو دیکھ رہا تھا۔ آپؐ اُس وقت سُرخ جوڑا پہنے ہوئے تھے میں کبھی چاند کو دیکھتا تھا اور کبھی آپؐ کو بالآخر میں اس فیصلے پر پہنچا کہ حضور اکرمؐ چاند سے کہیں زیادہ حسین ہیں"۔

کعب بن مالک کہتے ہیں "خوشی میں حضورؐ کا چہرہ ایسا چمکتا گویا چاند کا ٹکڑا ہے، اسی چمک کو دیکھ کر ہم آپؐ کی خوشی کو پہچان لیتے تھے"۔

یہ سب لوگ حضور اکرمؐ کے والا و شیدا تھے اور حضور اکرمؐ کو بھی ان کی دلداری مطلوب تھی۔ حضور اکرمؐ ان کی دلنوازی کا کتنا اہتمام فرماتے تھے اس کا ایک نقشہ جنگ حنین کے بعد مالِ غنیمت کی تقسیم پر بعض انصار نوجوانوں کی شکایت پر حضور اکرمؐ کے شاہکار خطاب سے بھی سامنے آیا۔ فتح مکہ کے بعد جنگ حنین میں مکہ کے بہت سے نومسلم نوجوان بھی شامل ہو گئے۔ فتح کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کے ان نومسلموں میں بہت فراخدلی سے مالِ غنیمت تقسیم کیا۔ اس پر انصار میں سے بعض نوجوانوں نے رنج محسوس کیا اور اس کا دبے لفظوں میں اظہار بھی کیا۔ حضور اکرمؐ کے علم میں آیا تو آپؐ نے ایک خیمہ نصب کرایا اور پھر تمام انصار کو اس میں جمع کر کے بات کی حقیقت معلوم کی۔ انہوں نے عرض کیا کہ یہ واقعہ تو سچا تھا لیکن ایسی بات سمجھدار لوگوں میں سے کسی نے نہیں کہی۔ بعض نوخیز نوجوانوں نے ایسا اظہارِ خیال کیا تھا آپ نے ان کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

"اے گروہ انصار، کیا یہ سچ نہیں ہے کہ تم پہلے گمراہ تھے اور اللہ نے میرے ذریعے تم کو ہدایت دی۔ تم منتشر اور پراگندہ تھے اور اللہ نے میرے سبب سے تم میں اتحاد اور اتفاق پیدا کیا تم مفلس اور نادار تھے۔ پھر اللہ نے میرے ذریعے تم کو آسودہ حال کیا۔ آپؐ یہ فرماتے جاتے تھے اور ہر فقرے پر انصار جواب دیتے جاتے تھے کہ "اللہ اور اس کے رسولؐ کا احسان ہم پر سب سے بڑھ کر ہے"۔

پھر اچانک آپ نے پلٹ کر فرمایا:

"لیکن اے انصار، تم یہ جواب کیوں نہیں دیتے کہ اے محمدؐ تجھ کو لوگوں نے جب جھٹلایا تو ہم نے تیری تصدیق کی۔ تجھ کو لوگوں نے جب چھوڑ دیا تو ہم نے تجھ کو پناہ دی۔ تو مفلس آیا تھا اور ہم نے ہر طرح تمھیں مدد بہم پہنچائی، تجھ کو جب لوگوں نے ذلیل کیا تو ہم نے تمھیں عزت دی"۔

یہ کہہ کر آپ نے فرمایا:

"اے گروہ انصار، تم یہ جواب دیتے جاؤ اور میں کہتا جاؤں گا کہ بے شک تم سچ کہتے ہو"۔

بس حضورؐ کا یہ پُر شفقت محبت بھرا اندازِ شکوہ تھا کہ انصار کی شدت جذبات سے چیخیں نکل گئیں اور روتے روتے ان کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

پھر حضورؐ نے فرمایا۔

"لیکن اے انصار کیا تم کو یہ پسند نہیں ہے کہ قریش تو اونٹ اور بکریاں اپنے گھروں کو لے جائیں اور تم محمدؐ کو اپنے گھر لے جاؤ"

اس پر سب انصار بے اختیار پکار اُٹھے اور کہنے لگے:

"اے اللہ کے رسولؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمیں صرف آپ درکار ہیں۔ ہمارے لئے اللہ کا رسولؐ کافی ہے۔ ہمارے لیے اللہ کا رسولؐ کافی ہے۔"

یہ تھے حضور اکرمؐ اپنے ساتھیوں کا دل موہ لینے والے رحمت للعالمین۔

پہلی اسلامی ریاست کا صدر مقام

مدینہ عرب میں پہلی اسلامی ریاست کے صدر مقام کی حیثیت سے ابھرا۔ یہ بات کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ ہو سکتی تھی کہ جو بستی شہر نبوت مکہ سے ساڑھے تین سو میل دور واقع تھی بالآخر وہی بستی اس امتیازی فخر کی حامل ثابت ہو گی کہ اسے پوری دنیا میں پہلی نظریاتی اسلامی مملکت اور تاحشر ایک مثالی اسلامی حکومت کے صدر مقام کا رتبہ حاصل ہو گا۔

اس فخر میں کتنے ہی عوامل نے حصہ لیا تھا۔ مدینہ ایک طرح سے نبیؐ کے ننھیال کا شہر تھا اور ننھیال کے دل اپنے نواسوں کے لئے ہمیشہ نرم اور فطری طور پر سوزِ محبت سے گداز پائے گئے ہیں۔ پھر اسی شہر میں حضور اکرمؐ کے والد مکرم دفن تھے اور اس بستی کی یہ خصوصیت بھی تھی کہ جاہلیت کے تمام جنگ و جدل کے باوجود دلوں کی نرمی اور طبائع کا گداز اس بستی کے باشندوں کی خصلت میں بہت نمایاں تھا۔ ان کی یہ خصوصیت بھی فراموش نہیں کی جا سکتی کہ جہاں مکہ میں برسوں تک دعوت دین کا کام ہوا اور تھوڑے سے افراد اسلام لائے وہاں فطری صالحیت کا مظہر مدینہ کے لوگ بات سنتے ہی ایمان لائے اور پھر جوق در جوق اسلام میں داخل ہو گئے اور اک مبلغ کی سرگرمیوں سے تقریباً سارا مدینہ مسلمان ہو گیا، اسی لیے ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ نے فرمایا تھا کہ مکہ فوج سے اور مدینہ قرآن سے فتح ہوا۔

غرض مدینہ والوں میں مسافر نوازی اور خدا خوفی بھی بہت پہلے سے موجود تھی۔ خود اوس و خزرج کے قبائل بھی یہاں مسافرانہ طور پر ہی آ کر آباد ہوئے تھے اور پہاڑوں کے درمیان شاداب وادی کی مٹی میں یہ شادابی موجود تھی کہ اسے نبی رحمت کا میزبان اور بالآخر صدر مقام بننا تھا۔ عرب آپس میں متصادم رہتے تھے اور یہی ان کے لئے خون گرم رکھنے کا ایک بہانہ تھا لیکن یہی عرب غیروں کے لیے بڑے مہربان اور مہمان نواز لوگ تھے ۔ مکے والوں کے لیے یہ بہت دشوار ہو گیا تھا کہ اپنی ہی بستی کے ایک آدمی کو جا ہے وہ اسے اپنے درمیان سب سے بہتر سمجھتے ہوں نبی تسلیم کر کے اس کے احکام کے مطابق اپنے رسوم و رواج بدل دیں۔ اپنے عادات و حرکات میں تبدیلی پیدا کر لیں اور اپنے نظریات و روایات اور تہذیب و تمدن میں رواج کی بجائے احکام الٰہی کی پیروی کریں۔ اسی مشکل سے ابوجہل دو چار ہوا تھا اور اسی مشکل سے قریش کے سارے بڑے بڑے سردار دو چار تھے۔ اس طرح اسلام کی دعوت کو سرداران قریش کے لیے نہ نگلنا ممکن رہا تھا اور نہ انھیں اگلنے کی ہمت تھی چنانچہ دباؤ میں اضافہ کرتے چلے جانا ہی ان کے لئے ممکن تھا تاکہ کوئی نتیجہ خود بخود سامنے آ جائے۔

وہ نتیجہ جو خود بخود سامنے آیا وہ مسلمانوں کی مدینہ سے ہجرت تھی لیکن یہ نتیجہ انجام کار کے لحاظ سے انھیں خطرناک نظر آتا تھا اس لیے وہ اسے بھی پسند نہ کرتے تھے۔ جب کسی معاشرے میں اسلامی دعوت کا آغاز ہو جاتا ہے تو پھر وہ معاشرہ آزمائش سے دوچار ہو جاتا ہے قریش بھی اسی آزمائش سے دوچار تھے۔ اسی آزمائش کی شدت میں وہ اپنے اندر اپنے بہترین بھائی اور پاکیزہ ترین انسان کو روکنے سے لاچار

ہو گئے تھے چنانچہ مکہ کا یہ پکا ہوا شیریں پھل جس کی شیرینی سے سارے عالم نے استفادہ کرنا اور جس کی خوشبو سے ساری دنیا نے مہکنا تھا مدینہ کی جھولی میں گرا اور مدینہ کے کاشت کار ساری دنیا کے اس بہترین پھل کو لے کر ساری دنیا کے رہنما اور اسلام کی دولتِ کونین کے امین بن گئے۔

اسلام جو باتیں سکھا رہا تھا، قریش اپنی دنیوی حشمت کا اس میں نقصان محسوس کرتے تھے۔ وہ نسب پر فخر کرتے تھے اور اسلام سارے انسانوں کو ایک باپ کی اولاد بتا کر عربوں کو عجمیوں کے بھی برابر قرار دے رہا تھا۔ وہ اعلیٰ و ادنیٰ کی تفریق میں مبتلا تھے اور اسلام غلاموں کو اٹھا کر حلقۂ رفاقت میں شامل کر رہا تھا۔

وہ لڑکیوں کو حقیر مخلوق اور عورتوں کو جانوروں کی طرح سمجھتے تھے اور اسلام عورتوں کو انسانی سطح پہ مردوں کے برابر اور لڑکیوں کو وراثت میں حصہ دار بنا رہا تھا۔ قریش یہ محسوس کرتے تھے کہ دعوتِ اسلامی اپنے دامن میں ایک ایسا انقلاب سمیٹے ہوئے چلی آ رہی تھی جس کی رو میں ان کے بہت سے جاہلی امتیازات بہ جانے والے تھے اور ان کا بہت سا جاہ و حشم جو انھیں ان کے بتکدۂ حرم کے سبب میسر تھا اس دعوت توحید سے اس کے چھن جانے اور پٹ جانے کا اندیشہ لاحق تھا۔ ان اندیشوں نے انھیں بالآخر مجبور کر دیا تھا کہ اپنے حقیقی فخر کا تاج جو نبوت کے ذریعے ان کے سر پہ رکھا جا رہا تھا خود ہی اٹھا کر مدینے کے چرواہوں کے سر پہ رکھ دیں اور انہیں نے کمال بیدردی سے یہ کام سرانجام دے دیا۔

اس طرح حضور اکرمؐ مدینہ کی گود میں سرورِ عالم بن کر تشریف لے آئے اور مدینہ جو ایک گمنام بستی اور قافلوں کا ایک سکونتی پڑاؤ تھا یکایک تاریخ انسانیت میں ابھر کر مہر درخشاں بن گیا۔ مدینہ کی یہ وہ سعادت ہے جس میں اس کے بخت رسا کا بہت حصہ ہے ؎

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

دعوت اسلامی کا صدر مقام بننے کے بعد بالآخر مدینہ عالم اسلام کا صدر مقام بن گیا اور پھر دنیا کے دور دراز گوشوں میں بسنے والے ہر مسلمان کے لئے اس کی مرکزیت کا یہ عالم ہوا کہ اس کا دل اس بستی کی محبت سے معمور ہو گیا۔ اسی محبت سے مجبور ہو کر شاعر نے کہا تھا ؎

سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

مدینہ محبوب بستی

حضور اکرمؐ کی آمد نے یثرب کے قصبے کو شہر محبوب بنا دیا اور اس کا مرتبہ بیت اللہ کے شہر کو چھوڑ کر دنیا کی تمام بستیوں سے بالا اور برتر ہو گیا۔ اب وہ محض پہاڑیوں کے درمیان ایک زرخیز و سرسبز و شاداب وادی کا زرعی شہر نہ رہا جس میں اوس و خزرج اور یہود کے قبائل آباد تھے بلکہ ہجرت کے بعد وہ حرم کی مانند محفوظ مقدس اور محترم شہر ہو گیا۔

اللہ کے رسولؐ کی زندگی ان دو شہروں نے دو حصوں میں تقسیم کر دی ہے جن میں سے ایک کی دور کہلاتا ہے، تو دوسرا مدنی

دور، مکی دور مصائب و عسرت کا دور اور مدنی دور فتح و نصرت کا دور بن کر تاریخ کے صفحات پر نقش ہوگیا ہے۔ اسی شہر کے بارے میں دنیا کے اہل ایمان شعراء نے لاتعداد قصیدے لکھے ہیں اور رسول اکرم کی محبت کا دم بھرنے والوں نے اس شہر کی مٹی کو اپنی آنکھوں کے لیے سرمہ قرار دیا ہے۔ اس شہر کو دیکھنے اور اس کی گلیوں میں محبت کا آوازہ بلند کرنے کے لیے لاکھوں اور کروڑوں اہلِ ایمان دنیا کے گوشے گوشے میں ترستے ہیں اور عمر بھر اس کی حسرتِ دیدار دل میں لیے رہتے ہیں۔

یہ بستی اب اہلِ ایمان کے لیے آنکھوں کا نور اور دل کا سرور بن گئی ہے۔ آخر اس کی محبوبیت میں کیا شبہ ہو سکتا ہے جس میں محبوب خدا نے اپنی زندگی کے دس کامیاب و کامران سال گزارے ہیں۔ جس شہر میں آپ کے ہاتھوں سے بنائی ہوئی آپ کی اپنی مسجد موجود ہے اور جس مسجد میں آپ اور آپ کے صحابہ کبار نمازیں پڑھتے، اجتماعات کرتے، انفرادی و اجتماعی اور ملکی و ملی مسائل پر شب و روز باتیں، مشورے اور فیصلے کرتے رہے ہیں۔ اس شہر کے شمال کی طرف احد کا وہ پہاڑ ہے جس کے بارے میں آپ نے فرمایا تھا کہ یہ ہمارا ہمسایہ ہے ہمیں اس سے محبت ہے اور اسے ہم سے محبت ہے۔ اسی کے دامن میں معرکہ ہائے جہاد برپا ہوئے۔ احد بھی اور خندق بھی اور اسی شہر میں وہ پاک روحیں خوابیدہ ہیں جن کے بارے میں اللہ کے رسولؐ نے دنیا میں ہی جنت کی بشارت دے دی تھی۔

غرض مدینہ محبوب جہاں بستی ہے اور یہی وہ بستی ہے جو رسول اکرم کے لیے جائے امن ثابت ہوئی۔ جب مکے والوں نے آپ کو نکالا تو اس بستی نے آپ کو پناہ دی۔ جب مکے کے باشندوں نے آپ پر ظلم کیا تو اس بستی کے باشندوں نے آپ کا محبت بھرا استقبال کیا، جب مکہ کی گلیاں مسلمانوں کے لیے خاک و خون کا سامان کرتی تھیں تو مدینہ کی گلیاں مسلمانوں کی میزبانی کا دم بھرتی تھیں۔ یہ شہر محبت و رحمت و شفقت کا شہر ہے۔ یہ رحمۃ للعالمین کا مدینۃ الرسولؐ ہے ؎

اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

۷۔ فوائدِ ہجرت

دعوتِ اسلامی کے لئے ہجرت سراسر حکمت دین کا حصہ اور اخلاقی اور روحانی فوائد سے معمور دینی اقدام ہے۔ اس سے مومن کی روحانی بلندی کا سامان ہوتا ہے۔ دنیوی سروسامان کی محبت سے نجات ملتی ہے۔ دنیوی بندھنوں کو نظر انداز کر کے راہِ حق میں قدم اٹھانے کا عملی تجربہ ہوتا ہے۔ اسلامی تحریک کو اجتماعیت یک جہتی اور آزادی کا ماحول میسر آتا ہے۔ کام کی منصوبہ بندی کے لیے بے خوف فضا مہیا ہوتی ہے۔ اللہ پر توکل بڑھ جاتا ہے اور مادی اسباب کے مقابلے میں مالک الملک کی مدد اور اس کی پشت پناہی پر اعتماد میں اضافہ ہوتا ہے۔ مسافر ہو کر مومن میں ہر چہ بادا باد کا جذبہ اور راہِ حق میں مر مٹنے کا داعیہ پیدا ہوتا ہے۔ اور اس سے وہ کردار نمودار ہوتا ہے جو دنیا کے لیے نمونے کا کام دے سکتا ہے۔

ہجرت کے تبلیغی فائدے

اللہ کی راہ میں ہجرت ایک ایسا اقدام ہے جو سراسر تبلیغ حق ہے۔ جس حق کے لئے انسان عزیز و اقربا، گھربار، دوست

احباب، مال جائیداد اور وطن عزیز چھوڑ کر ایک نامعلوم مستقبل کی طرف نکل کھڑا ہوتا ہے۔ وہ حق اگر کسی کے دل میں پوشیدہ بھی تھا تو اس علی الاعلان اقدام سے وہ کھل کر ساری دنیا کے سامنے آ جاتا ہے۔ اور ساتھ ہی یہ حقیقت بھی نمایاں ہو جاتی ہے کہ وہ حق کسی شخص کے لیے اتنا قیمتی سرمایہ ہے کہ اس کے لیے وہ دنیا کی ہر قیمتی متاع کو تج کر اور اپنے دامن کو جھاڑ کر اٹھ سکتا ہے۔ یہ کارروائی خود ایک عظیم الشان تبلیغ ہے جو حق کو اندھوں کے لیے قابلِ دید اور بہروں کے لیے بھی قابلِ شنید بنا دیتی ہے۔

رسول اکرمؐ کی ہجرت کے نتیجے میں اسلام کی تبلیغ کے لئے عالم عرب میں فوری طور پر ایک وسیع میدان کھل گیا اور دور و نزدیک کے عرب قبائل کے لیے قریش کی مزاحمت اور رکاوٹ ختم ہونے کے بعد یہ ممکن ہو گیا کہ اسلام کے بارے میں معلومات حاصل کریں مسلمانوں کے لیے بھی یہ ممکن ہوا کہ وہ تبلیغی وفود بنا کر مختلف قبائل کی طرف جائیں اور ان کے سامنے دعوتِ دین پیش کریں۔ تبلیغ کے سلسلے میں اگرچہ بعض قبائل کی غداری اور سازش کے چند حادثات بھی پیش آئے اور مبلغین اسلام کو تکالیف سے دوچار ہونا پڑا لیکن یہ حقیقت ہے کہ ایسے تبلیغی مواقع مکہ مکرمہ میں رہتے ہوئے کبھی میسر نہ آئے تھے جو مواقع ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں مسلمانوں کو میسر آ گئے۔

تبلیغ کا بنیادی تقاضا خود مبلغ کا اس نصیحت پر عمل پیرا ہونا ہے جو نصیحت وہ اپنے مخاطب کو کرنا چاہتا ہے۔ قول ایک ہوائی شل ہے اور عملِ صالح ایک ٹھوس حقیقت۔ اگر مبلغ کا عمل اس کے قول کی خود تردید کر رہا ہو تو پھر کوئی شخص اس کی بات پر کان نہیں دھر سکتا۔ درحقیقت قول ایک دعویٰ ہے اور عمل اس کی دلیل ہے۔

ہجرت اور حکمت تبلیغ

اسی لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی ایسے امر کی کبھی تبلیغ نہیں کی جس پر آپ نے خود عمل کر کے نہ دکھایا ہو یہ وہ عملی تبلیغ تھی جس سے لوگ اسلام کی حقیقت پر ایمان لے آتے تھے اور یہ بھی جان لیتے تھے کہ اس کام میں بھلائی اور خیر ہے اس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسے علمِ صحیح کی تبلیغ کرتے تھے جو زبان سے گزر کر دلوں میں جگہ پکڑ لیتا تھا۔

ہجرت سے پہلے اور بعد میں بھی ہمیشہ حضور اکرمؐ تبلیغ دین میں اس امر کا اہتمام فرماتے تھے کہ لوگوں کی سہولت اور توجہ کا لحاظ رکھیں۔ آپ موقع بے موقع تبلیغ نہیں فرماتے تھے اور نہ اتنی کثرت سے دعوت پیش کرتے تھے کہ لوگ گھبرا کر اکتا جائیں۔ اسی طرح آپ اس حال میں بھی تبلیغ نہ کرتے تھے کہ لوگ اپنے بعض دوسرے اہم کاموں میں مشغول ہوں حضورؐ کی تبلیغ بیشتر تعلیم قرآن پر مبنی ہوتی تھی۔ اپنی نوعیت کے اعتبار سے قرآن نہایت درجہ ناقابلِ مزاحمت مؤثر کلام تھا۔ آپ تبلیغ کی زبان ہمیشہ آسان اور عام فہم رکھتے اور اپنی بات مثالوں سے واضح فرمایا کرتے تھے۔ آپؐ بالعموم اپنی بات تین بار دہرایا کرتے تاکہ جن پر بات واضح نہ ہوئی ہوتی ان پر بھی بات واضح ہو جائے اور خوب اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے۔ حضورؐ کے رفیقِ تبلیغ حضرت علیؓ نے اپنی حکمتِ تبلیغ کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:۔

"دلوں میں کچھ خواہشات اور میلانات ہوتے ہیں اور کسی وقت وہ بات سننے کے لیے تیار رہتے ہیں اور کسی وقت اس کے لیے تیار نہیں رہتے تو لوگوں کے دلوں میں اس میلانات کے اندر داخل ہو اور اس

وقت اپنی بات کہو جب کہ وہ سننے کے لیے تیار ہوں اس لئے کہ دل کا حال یہ ہے کہ جب اس کو کسی بات پر مجبور کیا جاتا ہے تو وہ اندھا ہو جاتا ہے اور بات قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔"

(کتاب الخراج ابو یوسف)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تبلیغ دین میں لوگوں سے کبھی ترش روئی اور بے رخی بھی نہیں برتتے تھے کبھی دعوت پیش کرنے میں بے پروائی اور بے نیازی نہیں دکھلاتے تھے۔ خود اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو بھی ہدایات دے رکھی تھیں کہ ہر بندۂ خدا کی طرف مساوی توجہ کی جائے اور ہدایت پہنچانے کا کام بلا امتیاز جاری رکھا جائے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حضورؐ ان لوگوں کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے جو خدا سے برگشتہ، دنیوی وجاہت کے بھوکے اور متکبر و مغرور ہوتے تھے۔ آپ ایسے لوگوں کے سامنے بھی دعوت پیش کرنا پسند نہ کرتے تھے جو اسے سننے کے لیے تیار نہ ہوتے۔ جو لوگ حق سے بے نیازی کا رویہ اختیار کرتے۔ آپ بھی دفارِ دعوت کے پیش نظر ان کے پیچھے نہ پڑتے تھے البتہ دعوتِ عام پیش کرنے میں آپؐ کوئی کمی یا کوتاہی نہ کرتے تھے آپؐ ہمیشہ آسان ترین پیرائے میں اپنی دعوت پیش کرتے تھے۔ ہمیشہ اس بات پر نظر رکھتے تھے کہ کون دعوت سے فائدہ اٹھانے کے لئے تیار ہے اور کس میں راہ حق کی طرف گامزن ہونے کے لیے آمادگی پائی جاتی ہے۔ آپ جس میں ایسی آمادگی پاتے وہی سعید فطرت لوگ آپ کی نگاہِ التفات کے مستحق قرار پاتے اور پھر آپ ان کی تعلیم و تربیت پر زیادہ سے زیادہ توجہ مبذول فرماتے۔ آپ جس کے دل میں بھی خدا کا خوف محسوس فرماتے اس کی نصیحت اور ہدایت کی آپ زیادہ کوشش فرماتے حضورؐ کے اس طرزِ عمل کو قرآن نے اس طرح بیان فرمایا ہے۔

فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنْتَ مُذَكِّرٌ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ (۸۸: ۲۲)

ترجمہ: "بس اے نبی نصیحت کئے جاؤ۔ تم بس نصیحت ہی کرنے والے ہو کچھ ان پر جبر کرنے والے نہیں ہو۔"

چنانچہ حضور اکرمؐ اس حکم خداوندی کے مطابق مسلسل دعوت دین پیش فرماتے رہتے تھے۔ نہ آپ کبھی استکبار کرنے والوں کے کبر سے پریشان ہوئے اور نہ انکار کرنے والوں کے انکار سے بددل ہوئے اور نہ ان کی مخالفت سے مایوس ہو کر اپنا کام چھوڑا۔ اسی مستقل مزاجی کے نتیجے میں کلمہ حق بار بار سن سن کر کسی کے دل میں ایک وقت اور کسی کے دل میں دوسرے وقت اسلام اترتا چلا جاتا تھا۔ ہٹ دھرم ایک طرف ہوتے چلے جاتے۔ حضور اکرم نہایت خوبصورتی سے اللہ کی ان صفات کو بنیاد بنا کر جنہیں عام کفار بھی تسلیم کرتے تھے کہ وہ خالق اور رب ہے انھیں یہ بھی تسلیم کرا لیتے تھے کہ وہ اللہ وحدہ لا شریک، مسجود، حاکم اور بادشاہ بھی ہے۔

تبلیغ دین میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس صفت کا خود قرآن نے بھی آل عمران آیت ۱۵۹ میں ذکر فرمایا ہے:

"اے نبی یہ اللہ کی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لیے نرم خو ہو ورنہ اگر تم درشت خو اور سنگدل ہوتے تو یہ سب لوگ تمہارے گرد و پیش سے چھٹ جاتے۔"

دوسری جگہ فرمایا تھا:۔

ادْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ -

ترجمہ: "اے نبی اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے

طریقہ پر جو بہترین ہو۔"

گویا شیریں کلامی اور اعلیٰ درجے کے شریفانہ اخلاق اور معقول اور دل لگتے دلائل کے ساتھ دعوتِ حق پیش کرنے کی آپ کو تعلیم دی گئی تھی اور حضورؐ اسی پر عمل پیرا تھے۔

حضور اکرمؐ نے حکمت تبلیغ کے اس میدان میں اپنے آپ کو صرف مکے کی بستی تک ہی محدود نہیں رکھا تھا بلکہ سعید روحوں کی تلاش میں آپ ہجرت کے بعد بھی دین حق کی دعوت پہنچانے کی پیہم کوشش کرتے رہے۔ آپ لوگوں کے عام اجتماعات میں بھی جا کر فرداً فرداً دعوت دین ان کے سامنے پیش فرماتے۔ نئے افراد سے ملتے، جو لوگ بسلسلہ تجارت یا متفرق کاموں سے شہر میں آتے ان تک بھی دعوت حق پہنچاتے۔ میلوں اور بازاروں میں جہاں دور دور سے لوگ آئے ہوتے ان کے سامنے بھی دعوت کی تفصیلات رکھتے تاکہ دعوت اسلامی کی جڑیں بستی سے باہر تک بھی پھیل جائیں اور تحریک اسلامی کے دست و بازو دور دور تک پہنچ جائیں۔ اسی مقصد کے پیش نظر حضورؐ بیرونی قبائل تک دعوت پہنچانے کے لیے اکثر مشنری تبلیغی اور تعلیمی وفود بھی ارسال فرماتے رہتے تھے۔

تبلیغ دین کے لیے ہی جب حضور اکرمؐ نے مکہ مکرمہ کو تنگ اور مدینہ منورہ کو کشادہ پایا اور حضورؐ کے ارسال کردہ مبلغین کی مدینہ میں خوب پذیرائی اور کامیابی ہوئی تو ہجرتِ کامل کا فیصلہ ہو گیا۔ یہ بڑا کٹھن کام تھا لیکن مسلمانوں نے تبلیغ دین کی خاطر اور اپنے یا دقار نصب العین کے لیے ہجرت جیسے کٹھن مرحلے میں بھی قدم رکھ دیا۔ ظاہر ہے کہ ایک مضبوط قوت ارادی کا مالک ہی ہجرت کا اقدام کر سکتا ہے۔ ایک ایثار پیشہ شخص ہی ہر شے قربان کر کے اٹھ سکتا ہے۔

ہجرت کامرانی کا باب

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہجرت کامیابیوں، کامرانیوں اور فتح مندیوں کا سب سے بڑا باب ہے۔ یہ جہاں مشکل کام ہے وہاں اس میں دین و دنیا کے بھرپور فوائد بھی پوشیدہ ہیں۔ چنانچہ حضور اکرمؐ اور آپ کے صحابہ کرام کی ہجرت نے ہی دین اسلام کی مکمل کامیابی کے لیے راستے کھولے۔ حضور اکرمؐ کے اس ایک حکیمانہ اقدام سے اسلامی تحریک کے لیے اتنے تبلیغی اور دعوتی فوائد سامنے آتے کہ جنھیں شمار کرنا آسان نہیں ہے۔ ان فوائد میں سے چند ایک کا ذکر بہت ضروری ہے۔

۱۔ سب سے پہلا فائدہ یہ ہوا کہ" اسلامی تحریک کو مرکز تبلیغ فراہم ہو گیا۔ مدینہ جس کا صدر مقام تھا۔ اس مرکز تبلیغ میں تحریک کے داعی کی حیثیت سربراہ مرکز تبلیغ کی تھی۔

۲۔ اس کا دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ دعوت اسلامی کے لیے تبلیغ کا ایک وسیع و عریض میدان فراہم ہو گیا پہلے دعوت جن لوگوں کو دی جا رہی تھی وہ بدل گئے۔ اب ان کی جگہ نئے لوگوں کو دعوت دی جانے لگی۔ یہ تبدیلی تبلیغی توسیعی اور دعوتی لحاظ سے بہت مفید ثابت ہوئی اس کے بعد اسلام کی دعوت اور اس کی توسیع کے لیے واضح مواقع پیدا ہو گئے۔

۳۔ اس کا تیسرا فائدہ یہ ہوا کہ تحریک کے لیے جسمانی تشدد ختم ہو گیا اور صحابہ کرام کو دل جمعی کے ساتھ اسلام کے احکام پر عمل پیرا ہونے کا موقع مل گیا۔ مدینہ منورہ اسلامی دعوت کا مرکز بنا تو اس کے ساتھ ہی اسلام کے عروج کا دور بھی شروع اور کفار اور مشرکین کے زوال

کا آغاز ہو گیا اس کے بعد اسلام کا ہر قدم تبلیغی، تو سیعی اور دعوتی لحاظ سے آگے اور کفر کا ہر قدم پیچھے ہی ہٹتا چلا گیا۔

۴۔ پھر اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ ہجرت کے ذریعے کھرے کھوٹے مسلمانوں کی پہچان ہو گئی۔ میدانِ تبلیغ کا ناکارہ عنصر چھٹ کر پیچھے ہٹ گیا اور کھرا قوی اور طاقتور عنصر تحریک کی جھولی میں آگرا۔

۵۔ اور پانچواں فائدہ یہ ہوا کہ ہجرت کے اقدام نے مسلمانوں کو ضعف سے اٹھا کر قوت کے راستے پر ڈال دیا وہ ایک نئی ابھرنے والی اسلامی ریاست کے معاون اور مددگار بن گئے۔ اور یہ بات بھی عرب پر ثابت ہو گئی کہ اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایک برابر کی اجتماعی قوت ہیں جنھیں اکھاڑ پھینکنا کوئی آسان کام نہیں ہے اور یہ قوت اپنے اندر زبردست تبلیغی صلاحیت بھی رکھتی ہے۔

۶۔ پھر اس کا یہ بھی فائدہ ہوا کہ ہجرت کے بعد اسلامی معاشرہ اپنی ساری ضروریات اور خصوصیات کے ساتھ جداگانہ طور پر وجود میں آگیا جس سے نظریاتی اجتماعیت کی برکات کا ظہور ہوا اور آزاد اسلامی معاشرہ اپنے بہترین نتائج دکھانے کے قابل ہو گیا جس سے وہ معاشرہ مجسم تبلیغ بن گیا۔

۷۔ پھر ایک یہ فائدہ بھی ہوا کہ ہجرت سے سارے عرب میں بکھری ہوئی مسلمانوں کی جاندار اسلامی قوت سمٹ کر مدینے کے مرکز میں جمع ہو گئی جس سے اسلام کو تقویت حاصل ہوئی اور اسلام ایک مضبوط نظریاتی قوت بن کر ابھرنے لگا۔

۸۔ پھر یہ فائدہ بھی ہوا کہ مدینہ میں ہجرت کے بعد اسلام کے نظریاتی تصورِ قومیت کا عملی ظہور ہو گیا جس سے جاہلی تصوراتِ اجتماعیت دب گئے، نیز جاہلی تصورات نسلی، علاقائی اور لسانی قومیتوں کا بھی خاتمہ ہو گیا اور ان کے مقابلے میں اسلامی قومیت وجود میں آگئی۔

۹۔ پھر یہ فائدہ بھی ہوا کہ مدینے میں پہنچ کر مسلمانوں اور کفارِ مکہ میں باقاعدہ حالت جنگ قائم ہو گئی اور دونوں برابر کے فریق بن کر سامنے آگئے۔ مسلمانوں کا دورِ مظلومیت ختم ہوا۔ بالآخر ہجرت کے بعد پیدا ہونے والی کشمکش کا نتیجہ یہ نکلا کہ کفار کی واقعی اور آخری شکست ہوئی اور مسلمانوں کو کامل اور مکمل فتح حاصل ہوئی گویا ہجرت کے ذریعے جس سمت کی طرف دعوت انقلاب کا آغاز سفر ہوا تھا فتح مکہ اس کی آخری منزل تھی۔ اس کے نتیجے میں یہ بات ثابت ہو گئی کہ تمام اطاعتوں پر خالق اللہ کی بندگی ہے اور سب راستوں سے سیدھا راستہ اللہ کا راستہ ہے جس پر مومن کو چلنا چاہیے۔ بندگی اور اطاعت کا اللہ کے سوا اور کوئی حقدار نہیں ہے۔

۱۰۔ پھر ہجرت کا یہ فائدہ بھی ہوا کہ ہجرت کے ذریعے ایک عالمی غیر نسلی اور غیر نسبی برادری کی بنیاد رکھدی گئی جو خالص نظریاتی برادری تھی۔ جس برادری میں مساوات تھی اخوت تھی اور اس میں چھوٹے بڑے رنگ و نسل اور عرب و عجم کی قومیت کا کوئی امتیاز نہ تھا۔ وہ سب بھائی بھائی تھے اور اس سطح پر سب برابر تھے۔

غرض ہجرت کے اقدام نے اسلام کی کامیابی کے لیے اپنا بھرپور کردار ادا کیا اور بالآخر وہ وقت سامنے آگیا جس بارے میں فرمایا گیا تھا کہ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا۔ لوگ گروہ در گروہ اسلام کے دائرے میں داخل ہونے لگے اور اسلام ایک عالمگیر قوت اور برادری کی حیثیت سے دنیا کے سامنے آگیا۔ پھر اس کی صداقت کو تسلیم کرنے میں کسی کو کوئی دشواری باقی نہ رہی۔ اللہ کی حاکمیت اعلیٰ، رسول اکرم کی ختم نبوت اور آخرت میں جواب دہی کی بات ساری دنیا کی سمجھ میں آگئی اور دین اسلام کا کامل اور مکمل ہونا بھی سب پر ثابت اور روشن ہو گیا۔

ہجرت کے سیاسی فائدے

مکہ کرمہ میں حضور اکرمؐ کی دعوتِ اسلامی سخت ترین مزاحمت کے دور سے گزر رہی تھی۔ جب آپؐ کو ہجرت کا حکم ہوا۔ کچھ دن پہلے قریش نے متفقہ طور پر حضورؐ اور آپ کے اہل خاندان کو شعب ابو طالب کے شدید ظالمانہ قید و بند سے گزارا تھا اور آپؐ کے معاشرتی بائیکاٹ کے ساتھ آپ کا اقتصادی بائیکاٹ بھی پورے دو سال تک جاری رہا تھا۔ جب آپ طائف کی طرف دین اسلام کی دعوت لے کر گئے تو وہ پہاڑی علاقہ دعوت اسلامی کے لئے اور بھی زیادہ سنگلاخ ثابت ہوا وہاں کے سرداروں نے آپ پر پتھر برسائے اور آپؐ کے پیچھے شہر کے اوباشوں کو لگا دیا۔ انہوں نے آپؐ کو پتھر مار مار کر لہو لہان کر دیا اور شہر سے باہر دھکیل دیا۔ اہلِ طائف نے دعوتِ اسلامی کی طرف سے کان یکسر بند کر لیے چنانچہ آپؐ انتہائی دل شکستگی کی حالت میں مکہ واپس تشریف لائے تو آپؐ کو قریشِ مکہ نے شہر میں داخل ہونے سے روک دیا یہاں تک کہ آپؐ کو ایک شریف النفس قریشی کی حفاظت میں اپنے ہی گھر میں داخل ہونا پڑا۔

طائف سے واپسی پر قریش نے وہاں کے حالات سن کر اور بھی سختی شروع کر دی اور آپ کی جان لینے کے منصوبے بنائے جانے لگے۔ غرض جب کفر کی طرف سے مزاحمت اس مقام کو پہنچ گئی اور دعوت اسلامی نے جان ہتھیلی پر رکھ کر بتیس دانتوں کے درمیان زبان کی مانند اپنی طرف سے شہادتِ حق کا فریضہ پورے طور پر ادا کر دیا جب تبلیغ و تلقین میں کوئی کسر باقی نہ رہ گئی اور دعوتِ اسلامی نے اپنی طرف سے حجت تمام کر دی تو بالآخر آپ کو ہجرت کا حکم مل گیا جس کے لیے زمین پوری طرح تیار ہو گئی تھی اور مسلمان اس ظالمانہ ماحول اور اس کا فرانہ مزاحمت مظلومیت سے نکلنے کے لئے دعائیں کر رہے تھے جب ان کی آرزو تھی کہ انھیں اللہ کے راستے میں حفاظتِ دین کی خاطر کفار سے لڑنے اور انتقام حق لینے کا موقعہ دیا جائے تب انھیں موقعہ دے دیا گیا اور مسلمان ایک ایک کر کے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کرنے لگے

یہ ہجرت یونہی محافظت جان و مال کی خاطر راہِ فرار نہ تھی اس لیے کہ مال تو سارے کا سارا پیچھے ہی رہا جا رہا تھا اور وہ ایک نامعلوم معاشی مستقبل کی طرف کوچ کر رہے تھے۔ جان بچانے کا مسئلہ بھی درپیش نہ تھا اس لئے کہ جان لینے دینے کے مواقع تو اب پیدا ہونے والے تھے جو صاف دکھائی دے رہے تھے۔ یہ بزدلانہ راہِ فرار بھی نہ تھی جیسے کہ بعض عیسائی مستشرقین اس ہجرت کے لیے فلائٹ کا لفظ استعمال کر کے اپنی بدباطنی یا کم فہمی کا اظہار کرتے ہیں بلکہ ہجرت دعوتِ اسلامی کی طویل جد و جہد کے مختلف انقلابی مراحل میں سے ایک زبردست انقلابی مرحلہ تھی۔ اس ہجرت کے ذریعے اسلامی تحریک نے سیاسی حکمت عملی کا ایک ایسا پہلو اختیار کیا جس سے تحریک کو بے شمار سیاسی فائدے حاصل ہوئے۔ ہجرت کے اس ایک اقدام نے ہی تحریک اسلامی کو کامیابی کی بے شمار منزلیں طے کروا دیں۔ آپ اس دعوتی اور سیاسی اقدام کی اہمیت کا سیاسی تخمینہ اس بات سے لگائیں کہ تقویم اسلامی کا آغاز ابتدائے دعوت کی بجائے ہجرت سے کیا گیا۔ دعوت اسلامی کے اولیں داعیوں کے نزدیک واقعہ ہجرت کی سیاسی اہمیت ہر واقعہ سے زیادہ تھی۔

ہجرت کے جہاں بیشمار دیگر فوائد ہوئے وہاں سیاسی فائدے بھی اَن گنت ہوئے

ہجرت سے پہلے مسلمانوں کے گروہ کی حیثیت مظلوموں اور زیرِ تشدد افراد کی تھی جو اپنی قوم کے آبائی دین سے منحرف ہو کر نئے عقائد اختیار کرنے کے نتیجے میں مظالم کا نشانہ بن رہے تھے ان کی کوئی داد فریاد نہ تھی۔ ان کا کوئی حلیف اور ساتھی نہ تھا ان کی کوئی سیاسی اور مضبوط گروہی حیثیت نہ تھی۔ وہ دعوت دین پیش کرنے والا ایک ایسا گروہ تھا جو خود اپنے ہی علاقے اور شہر میں اختلافِ عقیدہ کی سزا بھگت رہا تھا لیکن ہجرت کے ذریعے مسلمانوں کو انصارِ مدینہ کی صورت میں دو بڑے حلیف قبیلے میسر آئے جو مسلمانوں کی مدد اور پشت پناہی از روئے معاہدہ کرنے کے پابند تھے۔ اس معاہدے نے مسلمانوں کو ایک مؤثر سیاسی قوت کی حیثیت سے ابھارا اور انھیں تبلیغی اور دعوتی قوت کے ساتھ ساتھ ایک سیاسی اور اجتماعی قوت کی حیثیت سے بھی عرب میں روشناس کرایا۔

اس ہجرت کا دوسرا سیاسی فائدہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کو ایک جگہ جمع ہو کر متحدہ قوت بنانے کا موقعہ مل گیا پہلے مسلمان منتشر تھے بکھرے ہوئے تھے کچھ مکہ مکرمہ کے دیار میں تھے۔ کچھ چند قبائل میں منفرد اور منتشر تھے۔ کچھ حضور اکرمؐ کی اجازت سے حبشہ چلے گئے تھے اور ہر جگہ ان کی حیثیت ایک مظلوم اقلیت کی تھی۔ ہجرت مدینہ کے ذریعے انھیں متحد اور یک جا ہو کر ایک مثبت قوت بننے کا موقعہ میسر آگیا۔

ہجرت مدینہ کے ذریعہ وہ بے شمار غلام اور مظلوم لوگ بھی جو جگہ جگہ دینِ اسلام قبول کرنے کے نتیجے میں سزائیں بھگت رہے تھے مظلومیت کی اس حالت سے نکل کر امن و امان کی حالت میں آگئے جس کی وجہ سے دعوت اسلامی مظلوموں، غلاموں، زیر دستوں، کمزوروں اور بے سہارا غریبوں کی تحریک بن گئی۔ اس دعوت نے سارے ہی زبردست لوگوں کی حمایت کی سارے ہی محروم طبقات کو حق انسانیت اور شرف انسانیت سے نوازا جس کے نتیجے میں اپنے اولین دور میں اسلام اس طرح ابھرا کہ جیسے وہ تمام ظالم آقاؤں کے مقابلے میں مظلوم غلاموں اور زیر دستوں کا مددگار اور دست گیر نظام فکر و عمل تھا اور غریبوں اور محتاجوں کا حاجت روا تھا اس طرح زیر دست لوگ اسلام کا دامن تھام کر ایک فعال اور متحرک اجتماعی قوت بن کر اُٹھے۔ اسلام نے معاشرتی مرتبے کو مال و دولت اور حسب و نسب کی بجائے تقویٰ اخلاق اور کردار سے وابستہ کر کے سب لوگوں کے لئے فضیلت اور بزرگی کے دروازے کھول دیے۔ اس طرح ہجرت کے بعد اسلام ایک ہمہ پہلو انقلابی اور ہمہ گیر انسانی قوت بن کر سامنے آیا۔

ہجرت نے دعوتِ اسلامی کو ایک مرکز فراہم کر دیا جس کی ابتدائی صورت ایک زیرِ تشکیل ریاست کی سی تھی۔ اس مرکز نے مسلمانوں کو وہ سیاسی قوتِ فراہم کی جس کی مدد سے مدینہ کی اولیں اسلامی ریاست کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ ہجرت نے ہی دینِ اسلام کو نفاذ قانون اسلامی کے لیے ایک ریاستی صورت فراہم کی۔

ہجرت کے نتیجے میں ہی وہ میثاقِ مدینہ وجود میں آیا جو اسلامی ریاست کا اولیں منشور اور اس کا نظریاتی سنگِ بنیاد ثابت ہوا۔ یہ معاہدہ حضور اکرمؐ اور یہودیوں کے درمیان تھا جو کاروبار یا رہائش کے محل وقوع کے سبب مسلمانوں کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔ یہ پہلا سیاسی معاہدہ تھا اس معاہدے کی رُو سے یہودی مسلمانوں کے دشمنوں کو اپنا دشمن اور ان کے دوستوں کو اپنا دوست سمجھنے کے پابند تھے۔ ان پر لازم تھا کہ اگر کوئی دشمن مسلمانوں پر حملہ کرے تو وہ اس کے خلاف مسلمانوں سے تعاون کریں ان کے تعلقات باہمی خیر خواہی خیر اندیشی اور فائدہ رسانی کے ہوں۔ ضرر اور گناہ کے نہ ہوں۔ جنگ کے دنوں میں یہودی مسلمانوں کے ساتھ مصارف میں

شریک ہوں۔ معاہدے میں یہ بھی طے ہوا کہ مظلوم کی مدد و نصرت کی جائیگی۔ مدینہ کے اندر کشت و خون کرنا جرم ہوگا۔ اگر معاہدے کے اندر کوئی اختلاف ہوگا تو اس کا فیصلہ خدا اور اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کریں گے۔

اس معاہدے کے ذریعے مسلمانوں کی ایک ایسی سیاسی مرکزی قوت وجود میں آگئی جو مسلمانوں کے لیئے آگے چل کر فتح و نصرت کے دروازے کھولنے والی تھی۔ اس سیاسی معاہدے سے بلا خون خرابہ، مسائل کو دانش و حکمت سے ترتیب دینے سے ایک اسلامی اقتدار وجود میں آگیا جس میں فیصلے کی آخری اتھارٹی خدا اور رسولؐ کو حاصل تھی۔

ہجرت کا ایک سیاسی فائدہ یہ بھی ہوا کہ مسلمانوں کو عرب کے دیگر قبائل سے معاہدات کرنے اور انھیں اپنا حلیف بنا کر اپنی سیاسی قوت میں اضافہ کرنے کے مواقع میسر آگئے۔ سیاسی حلیفوں کے درمیان تعاون کے دوسرے راستوں میں سے تبلیغ دین کا راستہ بھی نکلتا تھا۔ اس طرح مسلمانوں کو ہر قبیلے میں سے اپنے نظریاتی معاون بھی ملتے چلے گئے۔

ہجرت کے ذریعے مسلمانوں کو اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر زندگی کا میدان طے کرنے کا موقعہ میسر آیا چنانچہ مسلمانوں میں ایسے ایسے جوہر قابل تیار ہوئے کہ جن کے بارے میں ہجرت سے پہلے کسی نے خواب میں بھی ایسے کارناموں کا تصور نہ کیا تھا۔ حضرت علیؓ، حضرت ابوعبیدہؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت خالد بن ولیدؓ زبردست جنگی جرنیل بن کر نمودار ہوئے اور حضرت عمرؓ ایک عظیم منتظم فاتح، دانشور اور ایثار پیشہ حکمران کی حیثیت سے ظاہر ہوئے۔ غرض ہجرت نے صحابہ کرامؓ کے چھپے ہوئے جوہر کھول کر سارے زمانے پر عیاں کر دیے اور اسلام کے دامن میں ایسے ایسے قیمتی جواہر پیدا ہوئے جن کی مثال تاریخ انسانی پیش کرنے سے قاصر ہے۔

ہجرت نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ مسلمانوں کو اپنے دشمنوں سے باری باری سے نپٹنے کا سلیقہ بھی آتا ہے۔ جب انہوں نے مکہ فتح کیا تو ان کا یہود سے معاہدۂ صلح تھا اور جب انہوں نے خیبر کو فتح کیا تو ان کا قریش سے معاہدہ صلح تھا۔ مسلمانوں نے دشمنوں کے زغے اور یلغار میں آگے بڑھنے کی ترتیب اس انداز میں رکھی کہ وہ بیک وقت ایک ہی دشمن سے نبرد آزما ہوتے تھے۔ جنگ احزاب میں دشمنوں کا ہجوم گھر کر آ گیا تو اس میں ایک طرف حضورؐ کی جنگی حکمت عملی کام آئی دوسری طرف تدبیر خداوندی نے سارے ہجوم اعدا کو منتشر کر دیا۔ ورنہ عام حالات میں مسلمانوں کی جنگی حکمت عملی یہی تھی کہ وہ ایک وقت میں ایک محاذ پر نبرد آزما ہوتے تھے۔ ہجرت کے ذریعے مسلمانوں کے لیے ممکن ہوا کہ معاہدات کے ذریعے اس سیاسی حکمت عملی پر عمل پیرا ہو سکیں۔

ہجرت کے بعد مسلمانوں کے لیے اپنا ایک سیاسی نظام مملکت تشکیل دینا بھی ممکن ہو گیا۔ مختلف جنگی مہمات میں امرأ کا تقرر۔ مختلف کاموں کے لیے افراد کا انتخاب اور ان کی صلاحیت کے مطابق ان سے کام لینے کا اہتمام۔ تدبیر مملکت کے لیے مشاورتی اجلاس اور شورائی نظام کا ارتقا، قوانین ملکی کی تشکیل اور ان کا اجرا اور نفاذ، ریاست کے مساکین کے لیے بہبود فنڈ، زکوٰۃ کا قیام اور اس کے ذریعے معاشرے کے محروم طبقات کی دست گیری۔ اسلام کے سیاسی نظام کا ارتقا اور صورت گری۔ معاشرتی قواعد و قوانین کی تشکیل و تدوین غرض ہجرت کے بعد مسلمان ایک صالح معاشرے کی صورت اختیار کر گئے ان کی اجتماعیت نے ریاستی تشکل اختیار کر لی اور ایک نئے سیاسی معاشی اور معاشرتی نظام کی صورت گری ہونے لگی۔

ہجرت کے بعد عرب معاشرے میں مظلوم اور محکوم لوگ سمٹ سمٹ کر اسلام کے دامن میں پناہ لینے لگے تھے۔ اسلام معاشرتی مساوات

سیاسی پناہ اور اقتصادی تعاون کرنے والا ایک خدا ترس معاشرہ قائم کر رہا تھا اور وہ مظلوموں کا ملجا و ماویٰ بن گیا تھا۔ اسلام کے سیاسی نظام نے ان کی صلاحیتوں کو بیدار کر دیا۔ ان کی قوتوں کو دوچند کیا اور انھیں فلاح عامہ کے عمومی مشن پر لگا دیا۔ اس طرح اسلام ایک ابلتے ہوئے چشمے کی مانند نمودار ہوا جس سے ہر شخص استفادہ کر سکتا تھا پھر ہجرت کے بعد تو اس کا فیض عام ہو گیا۔

ہجرت کا ایک سیاسی فائدہ یہ بھی ہوا کہ حضور اکرمؐ کی اسلامی تحریک نے اپنا وہ عظیم منشور دنیا کے سامنے پیش کر دیا جو اسلام کے سیاسی خدوخال کو پوری طرح واضح کرتا اور دنیا کو اسلام کے حقیقی پروگرام سے روشناس کرتا تھا۔ وہ منشور چودہ[۱۴] واضح نکات پر مشتمل تھا۔ اسلام نے دُنیا کے سامنے انسانی مسائل کو حل کرنے کا یہ ۱۴ نکاتی فارمولا رکھا جو سورہ بنی اسرائیل میں بیان کیا گیا ہے وہ چودہ نکات کا منشور یہ ہے:

۱۔ صرف خُدا کی بندگی کی جائے اور اقتدار اعلیٰ میں اس کے ساتھ کسی کی شرکت تسلیم نہ کی جائے۔

۲۔ تمدن میں خاندان کی اہمیت ملحوظ رکھی جائے، اولاد والدین کی فرمانبردار اور خدمت گزار ہو اور رشتہ دار ایک دوسرے کے ہمدرد اور مددگار ہوں۔

۳۔ معاشرے میں جو لوگ غریب یا معذور ہوں یا جو لوگ وطن سے باہر مدد کے محتاج ہوں وہ بے وسیلہ نہ چھوڑ دیئے جائیں۔

۴۔ دولت کو فضول ضائع نہ کیا جائے جو مالدار دولت کو بری طرح فضول خرچ کرتے ہیں وہ شیطان کے بھائی ہیں۔

۵۔ لوگ اپنے اخراجات کو اعتدال پر رکھیں نہ بخل کر کے دولت کو روکیں اور نہ فضول خرچی کر کے اپنے لیے اور دوسروں کے لیے مشکلات پیدا کریں۔

۶۔ رزق کی تقسیم کا قدرتی انتظام کرنے والا ہی اپنی مصلحتوں کو زیادہ بہتر جانتا ہے۔ اس میں حتی الوسع مداخلت نہ کی جائے۔

۷۔ معاشی مشکلات کے خوف سے لوگ اپنی نسل کی افزائش نہ روکیں۔ جس طرح موجودہ نسلوں کے رزق کا انتظام خدا نے کیا ہے آنے والی نسلوں کے لیے بھی وہی انتظام کرے گا۔

۸۔ خواہش نفس کو پورا کرنے کے لیے زنا کا راستہ بُرا راستہ ہے لہٰذا نہ صرف زنا سے پرہیز کیا جائے بلکہ اس کے قریب جانے والے اسباب کا دروازہ بھی بند ہونا چاہیے۔

۹۔ انسانی جان کی حرمت خدا نے قائم کی ہے لہٰذا خدا کے مقرر کردہ قانون کے سوا کسی دوسری بنیاد پر آدمی کا خون نہ بہایا جائے۔ نہ کوئی اپنے آپ کو قتل کرے اور نہ کسی دوسرے کو قتل کرے۔

۱۰۔ یتیموں کے مال کی حفاظت کی جائے۔ جب وہ خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل نہ ہوں۔ ان کے حقوق کو ضائع ہونے سے بچایا جائے۔

۱۱۔ عہد و پیمان کو پورا کیا جائے۔ انسان اپنے معاملات کے لیے خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔

۱۲۔ تجارتی معاملات میں لین دین اور ناپ تول ٹھیک ٹھیک راستی پر ہونا چاہیے۔ اوزان اور پیمانے صحیح رکھے جائیں۔

۱۳۔ جس چیز کا تمھیں علم نہ ہو اس کی پیروی نہ کرو، وہم و گمان پر نہ چلو کیونکہ آدمی کو اپنی تمام قوتوں کے متعلق خدا کے سامنے جواب دہی

کرنی ہے کہ اس نے انھیں کس طرح استعمال کیا۔

۱۴۔ نخوت اور تکبر سے پرہیز کرو۔ غرور کی چال سے نہ تم زمین کو پھاڑ سکتے ہو اور نہ پہاڑوں سے اُونچے ہو سکتے ہو۔

ان چودہ اصولوں پر حضور اکرمؐ نے اسلامی معاشرے کو اجتماعی طور پر استوار کرنے کا اعلان فرمایا اور ہجرت کے بعد جب مسلمانوں کا معاشرہ اجتماعی طور پر ان اصولوں میں ڈھال دیا گیا تو دنیا نے دیکھ لیا کہ وہ ایک ایسا پاکیزہ معاشرہ تھا جس کی مثال نہ دنیا نے اس سے پہلے کبھی دیکھی تھی اور نہ ہی زمانہ اس کی مثال پھر اس کے بعد کبھی پیش کر سکا۔ اور جب تک ان اصولوں کو کسی معاشرے میں تعلیم و تربیت، قانون و حکمت اور اجتماعی سیاسی قوت کے ذریعے نافذ نہ کر دیا جائے اصلاحِ معاشرے کے حقیقی تقاضے کبھی پورے نہیں ہو سکتے۔

۸۔ نتائجِ ہجرت

حضور اکرمؐ کی ہجرت دعوتِ اسلامی کی کامیابی پر منتج ہوئی اور ہجرت کی یہ فطری خصوصیت ہے کہ وہ مومنین کو عزیمت اور کفار کو ہزیمت دیتی ہے۔ دعوتِ اسلامی پر سے کفار کا دباؤ اور تشدد کم ہوتے ہی دعوت ہمیشہ پوری قوت سے پھیلتی ہے اس لیے کہ اسلام کی فطرت ایں تیزیت ہے۔ وہ انسان کی اپنی فطرت کی پکار ہے۔ کفر خلافِ فطرت طرزِ زندگی ہے اور اس زمین پر نظامِ فطرت نظامِ اسلامی ہی ہے۔ جب تک حق و باطل اور کفر و اسلام کا مقابلہ نہ ہو غیر جانبدار اور بے نیاز دنیا نہیں جان سکتی کہ خالص حق کہاں ہے لیکن جب دونوں آمنے سامنے اور مدِمقابل بن کر آئیں تو باطل بھٹنے لگتا ہے اور اسلام پھیلنا شروع کر دیتا ہے۔ جب تک چراغ غار کے اندر رہے اندھیروں کے لیے آزادی ہوتی ہے کہ دنیا پر چھائے رہیں۔ لیکن جب مشعلِ حق بر سرِعام نمودار ہو جائے تو پھر اندھیرے اپنے ڈیرے ڈال نہیں سکتے خالص باطل کبھی پرورش نہیں پا سکتا۔ جب دعوتِ اسلامی میدانِ عمل میں نمودار ہوتی ہے تو اہلِ ایمان کی ضربوں سے مٹ جاتا ہے اور یا پھر اللہ تعالیٰ کی براہِ راست مداخلت سے فنا ہو جاتا ہے۔ البتہ حق کے نمودار ہونے کے بعد اس کا باطل کے مقابلے میں آنا ضروری ہے جب تک حق کو باطل سے ٹکرایا نہ جائے مطلوبہ نتائج برآمد نہیں ہو سکتے اور حق کو باطل سے ٹکرانے کے مرحلے سے پہلے کا مرحلہ ہجرت ہی ہوتا ہے۔

ہجرت، ایمان کا امتحان

ہجرت مسلمان کا امتحانِ ایمان ہے اور جب اس کا حکم ہوتا ہے تو سب کے لیے ہوتا ہے اس میں کسی کے لئے کوئی استثنا نہیں ہوتا ہے

یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

لیکن یہ اتنا آسان اس وقت تو بالکل نہیں تھا جب مکہ میں حضور اکرمؐ نے اسلام کی دعوت پیش کی تھی۔ صحابہ کرامؓ نے مکہ کے گلی کوچوں میں قریش کی تلواروں کے درمیان اسلام کو قبول کیا تھا۔ اسلام قبول کر کے قریش کے تشدد سے کوئی شخص بھی محفوظ نہ رہا تھا۔ حضرت عثمان غنیؓ جیسے بااثر اور متمول انسان کو بھی ان کے خاندان والوں نے چٹائی میں لپیٹ کر پیٹا اور چٹائی کو آگ سے سلگا کر انھیں دھوئیں اور آگ سے پریشان کیا تھا۔ وہاں تو عورتوں تک کی جان محفوظ نہ تھی۔ ابوجہل جیسے سنگ دل نے قریبی بی سمیہ کو نیزہ مار کر شہید ہی

کر دیا تھا کہ کی گلیاں روزانہ ایسے ہی مناظر پیش کرتی تھیں ۔ کہیں عمر بن خطابؓ اپنی بہن اور بہنوئی کو پیٹتے دکھائی دیتے تھے اور کہیں بلال حبشی تپتی ریت پر گھسیٹے جاتے تھے اور کہیں خباب بن ارت کوئلوں پر لٹائے جاتے تھے ۔ غرض مکہ کا شاید ہی کوئی مسلمان ہو گا جو ظلم و ستم کے دو پاٹوں کے درمیان گندم کی طرح پیسا نہ گیا ہو۔ ہجرت کرنے والے مسلمان ہجرت سے پہلے اپنے شہر میں برسوں تک اپنے ایمان کا امتحان دے چکے تھے اور اپنا مخلص و خالص ہونا پوری طرح ثابت کر چکے تھے ۔

ان جسمانی تشدد کے بعد ان پر دوسرا امتحان آیا اور یہ مال، تجارت گھربار، عزیزوا قربا، اور وطن کی محنت قربان کرنے اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اللہ کی راہ میں فقیر بن کر نکل جانے کا امتحان تھا۔ جب یہ امتحان سامنے آیا تو مکہ کے مسلمانوں نے یہ امتحان بھی درجہ اول میں پاس کیا۔ وہ اپنا سب کچھ چھوڑ کر اپنی پیدائشی بستی سے انجان بستی کی طرف نکل گئے ۔ حضرت ام سلمہ کا بچہ تک ظالموں نے چھین لیا کہ ہم اپنے قبیلے کا بچہ ساتھ جانے نہیں دیں گے ۔ حضرت سلمانؓ فارسی کے سارے مال و متاع پر قبضہ کر لیا گیا کہ تم یہ سب کچھ ہمارے شہر سے کما کر دوسرے شہر میں لے جانے کا کیا حق رکھتے ہو۔ غرض بیٹا، ماں باپ سے ایمان کی خاطر بچھڑ گیا اور شوہر بیوی سے الگ ہو گیا۔ والدین بچوں سے بچھڑ گئے اور بھائی بھائیوں سے جدا ہو گئے ۔ ہجرت نے گھر گھر میں مفارقت کے غم انگیز مناظر پیدا کر دیے۔ لیکن سب مسلمان اس امتحان میں پورے اترے کسی نے بھی گھربار والدین بچے، بھائی بہن عزیز و اقربا کو چھوڑتے ہوئے راہ حق میں کمزوری نہ دکھائی ہر مسلمان عزیمت کا پہاڑ ثابت ہوا۔

یہ امتحان ابھی اپنے نتائج سمیٹ نہ چکا تھا کہ معرکہ بدر کی صورت میں ایک اور امتحان سامنے آ گیا اب وہ جوان جاتے تھے، تلواریں لیے سامنے کھڑے تھے ۔ بھائی کے سامنے بھائی، چچا کے سامنے بھتیجا، باپ کے سامنے بیٹا، بھانجے کے سامنے ماموں، یوں ایک ہی تلوار کا وار دو جسموں کا ایک ہی خون بہا دینے کے لئے تیار تھا۔ بدر کے اس میدان میں سارے ہی رشتے شمشیر حق سے کٹ گئے تھے۔ حق کی تلوار بے لاگ چلتی ہے وہ اپنے مدمقابل خون کے رشتوں کو دیکھ کر بھی نہیں تھمتی۔ وہ دور کے لوگوں کو ساتھی اور رفیق بنا کر پہلو میں لا کھڑا کرتی ہے ۔ جہاد کا میدان جب رضائے الٰہی کی خاطر گرم ہوتا ہے تو اس میں تعلق باللہ اور اخلاص فی سبیل اللہ کا بھی امتحان ہوتا ہے۔ مہاجرین نے وہ امتحان اپنے پہلے ہی معرکے میں بدر کے مقام پر پاس کر لیا۔

جنگ کے بعد جب عبدالرحمان ابن ابوبکر صدیق مسلمان ہو گئے تو وہ اپنے والد سے مخاطب ہوئے ۔

"ابا جان جنگ کے میدان میں آپ میری تلوار کی زد میں آ گئے تھے لیکن میں نے والد سمجھ کر چھوڑ دیا۔"

بیٹے کے باپ حضرت ابوبکر صدیق بولے "بیٹا تم اپنے کفر میں بچ نکلے اگر تم میری تلوار کی زد میں ہوتے تو میں تمہیں کبھی نہ چھوڑتا۔"

انقلابی باپ نے جواب دیا۔

"ظاہر ہے کہ جن لوگوں نے ہجرت کا امتحان پاس کیا تھا ان کے لیے آگے کے امتحان آسان ہو گئے تھے چنانچہ جس نے ہجرت سے قوت حاصل کر لی پھر اس نے ہر آزمائش کا خندہ پیشانی سے استقبال کیا اور وہ ہر ابتلا سے ہنسی خوشی عہدہ برا ہوا۔ بلاشبہ ایمان جب انسان کے رگ و ریشے میں اتر جاتا ہے تو مومن ایسی کرامتیں دکھانے پر قادر ہو جاتا ہے ۔

ہجرت، خدا کی بادشاہت کی طرف سفر

ہجرت درحقیقت طاغوت وقت سے قطع تعلق کر کے خدا کی بادشاہت کی طرف سفر کا نام ہے۔ عربوں کے دورِ جاہلیت میں بھی سال کے چار مہینوں کو محترم سمجھا جاتا تھا جس میں جنگ وجدل کو حرام قرار دیا جاتا تھا کہ حج کے لئے آنے والے حاجیوں کو آمد و رفت میں پریشانی اور حج سے واپسی میں جنگ کا خطرہ موجود نہ رہے۔ حدود حرم میں تو ویسے بھی کسی کے ساتھ ظلم و زیادتی ایک سنگین جرم شمار ہوتا تھا۔ عربوں کی اس روایت نے ان محترم مہینوں میں لوگوں کے لیے عرب کے طول و عرض میں آمد و رفت تجارت اور بیت اللہ کے سفر کو آسان بنا دیا تھا۔

بالآخر یہی محترم مہینے مسلمانوں کی ہجرت کے یادگار مہینے بن گئے ہجرت سے اسلام کی تاریخ میں بھی ایک انقلابی تبدیلی واقع ہو گئی۔ ہجرت کے بعد اسلام کی مظلومیت اور بیچارگی کا دور گزر گیا ہجرت کے نتیجے میں اسلام کو مدینہ جیسی ایک محبوب بستی میسر آ گئی جس میں حضور اکرم داخل ہوئے تو وہاں کے باشندوں نے خوشیاں منائیں دور تک آگے پہنچ کر آپ کا استقبال کیا۔ بچوں اور بچیوں نے دف بجا کر اور نعت کے پر محبت گیت گا گا کر آپ کا خیر مقدم کیا۔

طلع البدر علینا من ثنیات الوداع

"اللہ کا شکر کہ ان جنوبی سمت کے ٹیلوں سے ہم پر چودھویں کا چاند طلوع ہو گیا ہے۔"

اور یہ چودھویں کا چاند مدینے کی بستی پر ہی نہیں ساری دنیا پر طلوع ہوا تھا اور اس کی روشنی نے صرف مدینے کی بستی کو ہی منور نہیں کیا تھا بلکہ سارا عالم انسانیت اس سے روشنی حاصل کرنے والا تھا اور اس کی روشنی صرف انھیں ایام کے لیے نہیں تھی جب وہ سب کے سامنے موجود تھا بلکہ اس کی تابانی اور تنویر تا قیامت بنی نوع انسان کو صراط مستقیم دکھانے والی تھی۔

مدینے کے لوگ کتنے خوش نصیب تھے اور اس وقت کے بچے کتنے خوش بخت تھے جو محسن انسانیت کا سرکار مدینہ کی حیثیت سے استقبال کر رہے تھے انھیں محترم مہینوں میں حضور نے ہجرت کی۔ انہی محترم ایام میں آپ نے تقریباً ساڑھے تین سو میل کا سفر مکمل کیا۔ یہ سفر ہجرت عالم بیچارگی سے عالم آزادی و حریت کی طرف سفر تھا۔ یہ سفر دنیا سے جاہلیت کے دور کا خاتمہ کر کے تہذیب نو کا آغاز کرنے والا سفر تھا۔ یہ سفر ہجرت ایک نئے انسان کی پیدائش اور نئے تمدن کا افتتاحی سفر تھا اس سفر کے ذریعے دنیا علم حقیقی سے آشنا ہوئی۔ مخلوق نے اپنے خالق کو پہچانا۔ انسان نے انسان کے حقوق کا علم حاصل کیا اس سفر کے بعد خالق کائنات اور حاکم حقیقی کا حکم بندوں پر اسی طرح جاری ہوا جس طرح اس کا حکم پانی ہوا بادل زمین چاند سورج موسم گل اور باد بہاری پر جاری ہوتا ہے جس حکم میں انصاف ہے ربوبیت ہے، رزاقیت ہے، خیر و عافیت ہے، دست گیری ہے، ظلم سے نجات اور جھوٹے خداؤں کی بندگی اور چاکری سے رہائی ہے۔ جس حکم میں مظلوم کی دست گیری ہے۔ ظالم پر گرفت ہے اور گرنے والوں کے لیے سہارا ہے۔ جس حکم میں غریب کی پشت پر حق پرستی کی قوت ہے اور ظالم کی گردن پر حق و انصاف کی مضبوط گرفت ہے۔ اللہ کے رسول کا یہ سفر ہجرت درحقیقت خدائی کے جھوٹے دعویداروں کی دنیا سے اللہ کی واحد اور سچی بادشاہت کی طرف سفر تھا۔ اس ہجرت نے نور کو ظلمت پر اور صداقت کو جھوٹ پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غلبہ دیا اور اس ہجرت کے ذریعے انسان اپنی مستقل اور پائیدار انسانی قدروں سے آگاہ ہوا۔ ہجرت بلاشبہ اللہ کی حاکمیت کے راستے کا

عظیم الشان سنگ میل ہے۔

بے وطنی کا علاج، اصول مواخاۃ

ہجرت کا حکم ہوا تو مکہ کی طرف سے مسلمان آبادی کا بہاؤ مدینہ کی طرف ہو گیا۔ مکہ کے علاوہ بھی مسلمان جہاں جہاں تھے وہ سب اس نئے مرکز کی طرف رجوع کرنے لگے ایک مرکز پہ جمع ہو جانے کے حکم نے سارے عرب قبائل میں منتشر مسلمانوں کو مدینہ کی طرف ہجرت کرنے اور ایک اسلامی معاشرے میں سمٹ آنے پہ آمادہ کر دیا۔

جو لوگ مکہ کے غلام کفار کے ظلم و ستم سے پریشان ہو کر حبش کی طرف ہجرت کر گئے تھے وہ بھی نئے دار الہجرت کی اطلاع ملتے ہی بتدریج سمٹ سمٹا کر اس مرکز میں جمع ہونے لگے جہاں اللہ اور اس کے رسول اکرم کے احکام پر عمل پیرا ہونا ممکن تھا۔ مدینہ ہجرت کے ذریعے اسلام کا مرکز اعصاب بن گیا۔

ہر طرف سے مہاجرین کے بہاؤ نے مدینہ کی چھوٹی سی بستی میں آبادکاری کے مسائل پیدا کر دیے۔ نئے آنے والے اپنے اپنے علاقوں سے کفار کے ظلم و ستم سے پریشان، چھپتے چھپاتے ہجرت کرتے چلے آ رہے تھے ان کے پاس کوئی ذرائع وسائل موجود نہ تھے۔ ذاتی سامان روزمرہ کے استعمال کے لئے بھی میسر نہ تھا۔ کوئی روزگار نہ تھا صرف ایک مقصد زندگی کا عشق اور دین کی محبت کا سودا ان کے دل و دماغ میں موجود تھا شہر میں آبادی یکایک بڑھ جانے اور آنے والوں کی بدحالی کے نتیجے میں معاشی، معاشرتی اور اجتماعی بے شمار نوعیت کے متفرق مسائل پیدا ہو گئے جن سے مدینے میں وجود میں آنے والی مفلوک الحال لیکن سب سے پہلی اسلامی ریاست کو سابقہ درپیش تھا۔ اس بے سروسامانی میں آئی بے گھر، بے روزگار آبادی کو اس کے پاؤں پہ کھڑا کرنا نہایت دشوار کام تھا مدینہ پہنچتے ہی سب سے پہلے حضورؐ کو یہی مسئلہ درپیش تھا۔ یعنی مہاجرین کی آبادکاری اور ان کے روزگار کا مسئلہ۔

حضورؐ کے کمالِ تدبر نے اس پیچیدہ مسئلے کو آسان ترین پیرائے میں نہایت خوب صورت طریقے سے حل کر دیا جس سے حکومت پر کوئی زاید بوجھ نہ پڑا حکومت اس وقت ابھی ایک تنکے کا بوجھ بھی سہار نہ سکتی تھی۔ خود سربراہ ریاست بھی مہاجر تھے۔ حضورؐ نے اس پیچیدہ انسانی مسئلہ کو باہمی اصول مواخات کے ذریعے حل کیا اور ساری نئی آبادی کا بوجھ ساری پرانی آبادی کے افراد کے ذمے تقسیم کر کے علیٰحدہ علیٰحدہ لگا دیا۔ مہاجرین کے فرد فرد کو انصار کے فرد فرد کے ساتھ بھائی چارے کے رشتے میں پرو دیا اور اس نئے رشتے کے حقوق مقرر کر دیے گئے اس نظریاتی برادری کے وجود میں آنے سے معاشرتی، معاشی اجتماعی، انفرادی اور اخلاقی سارے مسائل بیک وقت حل ہو گئے نئے آنے اور پرانے استقبال کرنے والوں کے لئے اجنبیت کی فضا محبت اور برادری کی فضا سے بدل گئی۔

بھائی بھائی بن جانے سے نئے آنے والوں کا بوجھ پرانی آبادی کے دلوں سے اتر گیا۔ اجتماعی فنڈ نہ ہونے کے سبب فرد فرد کا معاشی بوجھ فرد فرد پر پڑنے سے تقسیم ہو کر سارا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ جہاں چند افراد کی رہائش کا بندوبست پہلے سے موجود ہوتا ہے کہ وہاں تنگی ترشی سے چند مزید افراد کو سمویا جا سکتا ہے۔ جہاں چند افراد کے کھانے پینے کا انتظام پہلے سے موجود ہو وہاں چند افراد کو اپنے کھانے پینے میں مزید شامل کیا جا سکتا ہے۔ اس سے عصبیتیں دب گئیں مہمان اور میزبانی کی فضا پیدا ہو گئی گھر کے افراد کی طرح دل کھل گئے

اور جو نئے معاشی اور معاشرتی مسائل پیدا ہوئے تھے وہ حضور اکرم کی اس حیرت انگیز تدبیر سے سارے سُلجھ گئے۔ بھائیوں کی پُرانی آبادی نے نئے بھائیوں کی نئی آبادی کو سنبھال لیا اور مہاجرین مدینے میں نہایت آسانی سے یوں سما گئے جس طرح مٹی میں پانی سما جاتا ہے۔

معاشی مسئلے کا حل

یوں تو مکے کے مسلمان اللہ کی راہ میں اپنا گھر بار چھوڑنے، کاروبار لُٹانے اور عزیز و اقربا کو ترک کرنے پر پہلے سے تیار تھے۔ وہ کفار کی پیدا کردہ ظلم کی فضا اور تشدد کی چلتی ہوئی چکی سے نجات پانا چاہتے تھے۔ وہ دشمنانِ حق کو میدان مبارزت میں کھلم کھلا للکارنا چاہتے تھے لیکن ان لوگوں میں بعض ایسے بھی تھے جن کو ہجرت کے ساتھ کاروبار کا خاتمہ، پردیس میں بے سہارا ہونے کا اندیشہ، معاشی بے روزگاری سے دوچار ہونے کا خطرہ اور بھوکوں مرنے کا غم اندر ہی اندر کھائے جاتا تھا جن کے اندر ایمان نے پوری طرح ابھی گھر نہ کیا تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کے معاشی اندیشوں کو زائل کرتے ہوئے فرمایا:-

اَللّٰہُ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِہٖ وَ یَقْدِرُ لَہٗ اِنَّ اللّٰہَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۝

"اللہ ہی ہے جو اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے رزق کشادہ کرتا ہے اور جس کا چاہتا ہے تنگ کرتا ہے یقیناً اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔"

(العنکبوت ۶۲)

اس طرح اللہ نے ان لوگوں کو تسلی دی جو معاشی پریشانی کے اندیشوں سے پریشان اور اس کے غم میں غلطاں و حیران تھے۔ قرآن نے انھیں بتایا کہ تم جہاں جاؤ گے تمہارا رب تمہارے ساتھ ہوگا اور وہ تمہارے لیے رزق فراہم کرے گا۔ آخر جنگلوں کے جانور بھی ہیں جن کی خوراک اللہ تعالیٰ انھیں فراہم کرتا ہے سمندروں اور دریاؤں کے جانور بھی ہیں وہ بھی اپنے مالک سے رزق پلتے ہیں۔ آخر وہ مالک اپنے راستے میں گھر بار چھوڑ کر نکلنے والے مخلص بندوں کو رزق سے کیوں محروم کرے گا۔ اپنی مخلوقات کو پالنا تو خود اللہ نے ہی اپنے ذمے لے رکھا ہے اس کے پالنے سے ہی اربوں اور کھربوں حیوانات اپنی اپنی مطلوبہ غذا کے ساتھ پل رہے ہیں حضرت عیسیٰؑ نے اپنے حواریوں کو جو معاشی تفکرات میں غلطاں رہتے اور اپنے معاشی اندیشوں سے اللہ کے دین کا ساتھ دینے سے ہچکچایا کرتے تھے تسلی دیتے ہوئے فرمایا تھا۔

"دیکھو تم خدا اور دولت دونوں کی بیک وقت خدمت نہیں کر سکتے اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ اپنی جان کی فکر نہ کرنا کہ ہم کیا کھائیں گے یا کیا پئیں گے اور نہ اپنے بدن کی کہ کیا پہنیں گے، کیا جان خوراک سے اور بدن پوشاک سے بڑھ کر نہیں ہے۔ ہوا کے پرندوں کو دیکھو کہ نہ بوتے ہیں اور نہ کاٹتے ہیں اور نہ کوٹھیوں میں جمع کرتے ہیں اور پھر بھی تمہارا آسمانی باپ ان کو کھلاتا ہے کیا تم ان سے زیادہ قدر نہیں رکھتے۔

تمہارا آسمانی باپ جانتا ہے کہ تم کن چیزوں کے محتاج ہو۔ تم پہلے اس کی بادشاہی اور اس کی راستبازی کی تلاش کرو۔ یہ سب چیزیں بھی تمھیں مل جائیں گی۔ کل کے لیے فکر نہ کرو۔ کل کا دن اپنی فکر آپ کرے گا۔ آج کے لیے آج ہی کا دکھ کافی ہے ۔" (متی باب ۶)

اس سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ حق پرستوں کے راستے میں حق کی دعوت دیتے ہوئے ایک مرحلہ ایسا بھی آتا ہے جب ایک حق پرست انسان کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا کہ وہ مادی اسباب کے سارے سہارے توڑ کر اور انھیں نظر انداز کر کے صرف اور محض اللہ کے بھروسے پر حق کے لیے جان جوکھوں میں ڈال دے اور جان کی بازی لگا دے ۔ ظاہر ہے کہ فیصلہ کن مرحلے پر جو لوگ حساب کرنے بیٹھتے ہیں اور گن گن کر مستقبل کے نفع و نقصان کا جائزہ لیتے ہیں اور اپنے سارے مفادات کے پیشگی تحفظات تلاش کرتے ہیں ۔ وہ دنیا میں کوئی انقلابی قدم نہیں اٹھا سکتے اور نہ انھوں نے تاریخ میں اب تک کوئی انقلابی کام کیا ہے البتہ جو لوگ فیصلہ کن مرحلے میں جان ہتھیلی پہ رکھ کر اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور خطرے کو بے دھڑک برداشت کرتے ہیں ان کی قربانیوں سے ہی اللہ کا کلمہ بلند ہوتا اور اسلام کا جھنڈا لہراتا ہے۔

ہجرت ایسے ہی تاریخی مواقع میں سے ایک اہم موقعہ ہوتا ہے جب بندۂ مومن حق کے لیے کیے ہوئے اپنے دعوے کا عملی ثبوت پیش کرتا ہے اور جب وہ اللہ کے راستے میں سب کچھ لٹا کر نکل کھڑا ہوتا ہے تو پھر بدر سے لے کر فتح مکہ اور فتح خیبر تک کے سارے مراحل ایک ایک کر کے طے ہوتے چلے جاتے ہیں ۔ ہجرت بلاشبہ بندۂ مومن کی ایک بھاری آزمائش ہے اور اس میں سے گذر کر ہی وہ اللہ کی رضا حاصل کرتا اور دین کا پرچم لہراتا ہے ۔ اللہ کی راہ میں اقدام کرتے ہوئے مومن کے پیش نظر صرف یہ ہوتا ہے کہ جس کے دین کے لیے ہجرت کا اقدام ہے اس کے ذمے معاشی مسئلے کا حل بھی ہے ۔ بظاہر یہ امر مادی نقطۂ نظر سے مختلف ہے لیکن اسلام نے بھی تو مادہ پرستی کی بجائے خدا پرستی کا ہی حکم دیا ہے ۔

قانونی تعلقات اور ہجرت

مکہ سے مسلمانوں کی ہجرت کا سب سے بڑا نتیجہ یہ ہوا کہ مدینے میں ابتدائی طرز کی ایک اسلامی ریاست وجود میں آگئی جس کے ذریعے مسلمانوں کو ایک جائے پناہ فراہم ہو گئی ہجرت کے اس عمل نے تمام مسلمانوں کے لیے جو دور و نزدیک کے علاقوں میں پھیلے ہوئے تھے یہ مسئلہ پیدا کر دیا کہ اگر وہ ہجرت کر کے مدینہ میں پہنچ جاتے ہیں تو اُن کو اسلامی ریاست کے باشندے ہونے کی حیثیت سے اسلامی سوسائٹی کے محترم شہری کا ممتاز مقام حاصل ہو جاتا ہے لیکن اگر وہ ہجرت کر کے دارالاسلام میں نہیں پہنچتے تو ان کی حیثیت بالکل مختلف ہو جاتی ہے ان کی کوئی ذمہ داری اسلامی ریاست پر قائم نہیں ہوتی ان کا اخلاص اور ایمان بھی مشتبہ ہو جاتا ہے ۔ جب ہجرت کا حکم ہوا تو مسلمانوں میں بعض لوگوں کے لیے اس وقت ہجرت نہ کر سکنے کے متعدد وجوہ بھی ہو سکتے تھے یہ وجوہ بعد میں بھی ہر دور میں ہجرت کرنے والوں کو پیش آ سکتے ہیں اگر کسی کے ہجرت نہ کرنے کی یہ وجہ ہو کہ اس کے نیچے حکم رسول اور ارشاد خداوندی کے باوجود اپنے گھر بار، کاروبار، عزیز و اقربا، کھیتی باڑی، مال و اسباب اور شہر چھوڑنا مشکل ہو تو یہ صریحاً نفاق ہے جو ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کے بالکل منافی ہے ۔ قرآن ایسے مسلمان کہلانے والوں کو مسلمان تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہے بلکہ وہ ان کو منافق قرار دیتا ہے اس لیے کہ وہ کفار کے جبر سے مسلمانوں کے

خلاف وہ ساری کارروائیاں کرنے پر مجبور رہتے ہیں جو کفار مسلمانوں کے خلاف کرتے ہیں۔

ہجرت نہ کرنے والوں میں دوسری قسم ایسے لوگوں کی ہو سکتی ہے جو کفار میں گھر گئے ہوں وہ ہجرت تو کرنا چاہتے ہیں لیکن ہجرت کر نہیں سکتے۔ مجبور ہیں معذور ہیں، کمزور ہیں، دل سے ایمان رکھتے ہیں مسلمانوں کے خلاف کفار کی کارروائیوں سے اجتناب کرتے ہیں بلکہ حتی الوسع مسلمانوں کو ان سے آگاہ بھی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ کفار میں رہنے پر ہرگز راضی نہیں ہیں لیکن مجبور و معذور ہیں۔ ایسے مسلمانوں کو قرآن مستضعفین یعنی ضعفا اور کمزور مسلمان قرار دیتا ہے اور اسلامی حکومت کے ذمے یہ فریضہ لگاتا ہے کہ وہ انکی رستگاری کی کوشش کرے ان کو کفار کے نرغے سے چھڑائے ان کو پناہ فراہم کرے اور کفار سے مذاکرات یا جہاد کے ذریعے ان مسلمانوں کی امداد کر کے انھیں اسلامی فضا مہیا کرے۔

کافروں کے زیر غلبہ رہنے والے تیسری قسم کے وہ مسلمان ہو سکتے ہیں جو کافروں کے ساتھ اپنی مجبوریوں کے سبب رہتے ہیں ان کو کفار کے درمیان خوف و خطر تو کوئی نہیں ہوتا البتہ انھیں اخلاقی تحفظ کی ضرورت ہوتی ہے ایسی صورت میں اگر اسلامی حکومت کا اس کافر حکومت سے معاہدہ ہو تو اس معاہدے کی پابندی ضرور کی جائے گی البتہ انھیں اخلاقی تحفظ مہیا کرنے کے معاہدے کے اندر رہتے ہوئے کوشش بھی کی جائیگی۔

ظاہر ہے کہ اسلامی حکومت صرف ان شہریوں کی ذمہ داری ہی لے سکتی ہے جو اس کی حدود میں رہتے ہوں اس کی حدود سے باہر رہنے والے مسلمانوں کی ذمہ داری کا بار اس کے سر پر نہیں آ سکتا چنانچہ حضورؐ نے فرمایا تھا:

"میں کسی ایسے مسلمان کی حمایت و حفاظت کا ذمہ دار نہیں ہوں جو مشرکین کے درمیان رہتا ہو۔"

لیکن اس کے معنی یہ بھی نہیں ہیں کہ ایسے مسلمان جن کا اخلاص تو ثابت ہے لیکن ان کی کمزوری کی وجہ سے وہ کوئی بڑا قدم اٹھانے سے قاصر ہیں انھیں اسلامی حکومت کی اگر سیاسی حمایت حاصل نہیں ہو سکتی تو پھر اخلاقی حمایت بھی حاصل نہ ہو۔ عقل و ایمان و دلیل کا تقاضا یہ ہے کہ انھیں اخلاقی حمایت تو ضرور حاصل ہونی چاہیے اس لیے کہ دینی اخوت کے رشتے سے بہر حال وہ خارج نہیں ہوتے ہیں۔ اگر کہیں ان پر ظلم ہو رہا ہو اور وہ وہاں سے ہجرت کرنے پر بھی قادر نہ ہوں تو اسلامی برادری کے تعلق کی بنا پر دار السلام کی حکومت اور اس کے باشندے ان کی مدد کر سکتے ہیں البتہ ان کی مدد کا فریضہ اندھا دھند سر انجام نہیں دیا جا سکتا۔ اس سلسلے میں بین الاقوامی ذمہ داریوں معاہدات اور اخلاقی حدود کا لحاظ اور اہتمام ضرور رکھا جائے گا۔

معاہدات کو نبھانے کے بارے میں بھی اسلامی حکومت کی حدود کے اندر رہنے والے مسلمان ذمہ دار ہوں گے اس کی حدود سے باہر رہنے والے مسلمانوں پر اس کی ذمہ داری عائد نہ ہوگی۔ یہی سبب ہے کہ مدینہ کی طرف ہجرت کے ایام میں جو معاہدہ حضور اکرمؐ نے صلح حدیبیہ کی صورت میں کفار مکہ سے کیا تھا۔ اس کی کوئی ذمہ داری حضرت ابو بصیر اور ابو جندل پر عائد نہیں ہوئی تھی چونکہ وہ اسلامی حکومت کی رعایا نہیں تھے اس لیے انہوں نے اپنا آزاد کیمپ لگا کر کفار کا ایسا ناطقہ بند کیا کہ بالآخر قریش کو معاہدۂ حدیبیہ میں سے وہ شق خود ختم کرنی پڑی جو مسلمانوں کو بہت ناگوار تھی یعنی اگر کوئی مسلمان مدینہ سے مکہ چلا جائے تو اسے واپس نہ کیا جائے گا اور اگر کوئی کافر مکہ سے مدینہ چلا جائے تو اسے واپس کر دیا جائے گا۔

درحقیقت ہجرت ایک ایسا عظیم انقلابی اقدام ہے جس کے نتیجے میں بہت سی قانونی اور دستوری صورتیں بدل جاتی ہیں۔ ہجرت کرنے اور ہجرت نہ کرنے والے مسلمان میں زبردست قانونی اور دستوری فرق واقع ہو جاتا ہے۔ ہجرت کرنے والا مسلمان ہجرت نہ کرنے والے سے رتبے، حقوق اور حیثیت میں ممتاز اور ممیز مسلمان شمار ہوتا ہے۔

بالاتر مرکز وفاداری

ہجرت باطل کے تسلط سے بغاوت کرکے خدا کی بندگی اختیار کرنے کا کھلم کھلا اعلان ہے۔ ہجرت ملک و ملت، برادری نسل قبیلہ اور وطن خون کے رشتے اور گروہی عصبیتوں کے خلاف کامیاب اقدام ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ ہر شخص کے لیے اس کا ملک ایک عزیز خطہ زمین ہوتا ہے جس سے ایک انسان کو بے حد محبت ہوتی ہے۔ بلاشبہ ہر شخص کے لیے اس کی قوم ایک حد درجہ عزیز گروہ ہوتا ہے جس کے ساتھ انسان خون کا تعلق رکھنے کے سبب بے حد محبت کرتا اور اس سے جدا ہونا کبھی گوارا نہیں کرتا، بلاشبہ وطن کی بہتری اور بھلائی کے لئے انسان ہمیشہ بڑی بڑی قربانیاں دیتا رہا ہے۔ بے شک وطن انسان کے لئے ایک محبوب شے کا نام ہے اور اس کا نام آتے ہی ایک مسافر کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو جاتی ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ بھی مدینہ میں آکر مکہ کے شب و روز کو یاد کیا کرتے تھے۔ ایک مسافر کو اپنے وطن کی پگڈنڈیوں، کوؤں اور پرندوں تک سے محبت ہوتی ہے لیکن ہجرت کے ذریعے اسلام اپنے ماننے والوں کو محبت و الفت کا ایک بلند ترین معیار اور نصب العین عطا کرتا ہے وہ معیار خدا و رسولؐ کی محبت ہے۔ نظریے اور مقصد زندگی کی محبت ہے۔ دوسری چیزوں کی محبت اگر نظریے کی محبت کے ساتھ ساتھ چلے تو اسے زندہ رکھنے، پرورش کرنے اور پروان چڑھنے کا حق حاصل ہے لیکن اگر دوسری چیزوں کی محبت اسلام کے نظریے کی محبت سے ٹکرا جائے تو اسلام اپنی محبت کو دوسری ہر محبت سے زیادہ فائق اور لائق ترجیح قرار دیتا ہے۔ خدا و رسولؐ کی محبت کے لئے قوم کو چھوڑا جا سکتا ہے وطن اور ملک کو چھوڑا جا سکتا ہے۔ بلکہ اگر وہ خدا اور رسولؐ اور اسلام کی محبت میں رکاوٹ ڈالیں تو ان کو چھوڑنا اور اللہ کے راستے میں بے سروسامان نکل کھڑے ہونا فرض ہو جاتا ہے۔ یہی ہجرت کی حکمت اور اس کی شانِ ایمان ہے۔

دنیا میں لوگ ملکوں کے لیے جانیں قربان کرتے ہیں اور ملک و وطن کو خدا کی طرح پوجتے ہیں لوگ قوم اور ملت کی محبت کو نیشنلزم کا نام دے کر اسے ہر چیز سے بالاتر قرار دیتے ہیں اور اس کی محبت میں انسانیت کے خلاف خوفناک لڑائیاں لڑتے ہیں۔ لیکن ایک مسلمان خدا کے سوا کسی اور شے کو نہیں پوجتا اور رسول اکرمؐ کے سوا اور کسی کو اپنا رہنما اور ہادی قرار نہیں دیتا۔ وہ ہمیشہ انہی کے احکام کی پیروی کرتا ہے ہجرت نے ساری دنیا پر مسلمانوں کے اس مسلک کو پوری طرح واضح کر دیا ہے مسلمان ملک کا وفادار ہے، وطن کا دوست ہے قوم کا خیر خواہ ہے۔ لیکن جب تک یہ چیزیں اس کی بالاتر محبت خدا اور رسولؐ میں رکاوٹ نہ ڈالیں۔ اگر یہ چیزیں خدا کی محبت کے راستے میں رکاوٹ بن جائیں تو ایک مومن ان کو اپنے راستے سے روڑے کی طرح ہٹا دیتا ہے۔ یہ بات حضور اکرمؐ نے اپنے عمل سے اور صحابہؓ کرام نے حضورؐ کے حکم پر ہجرت کر کے ساری دنیا پر ہمیشہ کے لیے واضح کر دی ہے۔ چنانچہ ہر ملک، وطن اور ملت مسلمان کی حدِ وفاداری سے خوب آگاہ ہے مسلمان کے مذہب میں خدا کے سوا پرستش کسی کی بھی نہیں ہے۔ پرستش صرف خدا کی ہے اور پیروی صرف رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے اور سیدھا راستہ صرف دین اسلام ہے جس پر چل کر انسان خدا کی رضا کو پا سکتا ہے۔ یہ اٹل حقیقت ہجرت کے اقدام نے ساری دنیا کے سامنے پوری طرح بے نقاب کر دی ہے۔

جینے کا حق

ہجرت نے دعوتِ اسلامی کی ۱۳ سالہ صورتِ حال کو یکسر بدل دیا۔ جو لوگ مظلوم تھے انھیں مقام مظلومیت سے نکل جانے کا موقع مل گیا وہ کافروں کی دست بُرد اور جبر و تشدد سے آزاد ہو گئے۔ ہجرت کی برکت سے انہوں نے ایک آزاد اور اطمینان بخش فضا میں پہنچ کر آزادی کا سانس لیا۔ مدینے کے نئے مرکز میں پہنچ کر ان کے لیے ممکن ہو گیا کہ وہ سابقہ صورتِ حال میں اپنے طرزِ عمل پر غور کریں اور اب کوئی نیا لائحہ عمل سوچیں۔ اب ظلم و ستم سہنے اور اس پر خاموشی سے صبر کر لینے کا دور گزر گیا تھا ہجرت کے نتیجے میں اب مسلمان ظالموں کے خلاف ہاتھ اٹھا سکتے تھے اور حق و صداقت کے باغیوں سے انتقامِ حق لے سکتے تھے۔ ہجرت کے ذریعے اب انھیں کفر کا مقابلہ قوت کے ساتھ کرنے کی اجازت مل گئی تھی۔

قریش پہلے کی طرح ہجرت کے بعد بھی مسلمانوں کو شاید نرم چارہ سمجھتے تھے چنانچہ انہوں نے یکے بعد دیگر مسلمانوں کو دھمکیاں دینی شروع کیں۔ مدینے کے مضافات میں مسلمانوں کے مویشیوں پر ڈاکے ڈالے۔ مدینے کے اندر منافقین سے روابط پیدا کر کے انھیں مسلمانوں کے خلاف بھڑکایا۔ عبداللہ بن ابی جیسے دشمن اسلام کو کہلا بھیجا کہ تم نے ہمارے آدمیوں کو پناہ دی ہے انھیں نکال باہر کرو ورنہ ہم حملہ کر کے تمہاری عورتوں کو لونڈیاں بنائیں گے اور تمہارے مردوں کو قتل کریں گے۔ وہ منافق بھی قریش کی شہ پر یونہی سوچنے لگا لیکن حضورؐ نے موقعہ پر پہنچ کر دھمکایا جس سے وہ دبک گیا۔ اس کے بعد پھر کسی سازش کو بروئے کار لانے کی جرأت اسے نہ ہوئی۔ سازش کا قلع قمع، سازش کا انکشاف اور بزدل سازشیوں کے خلاف قوت کا مظاہرہ کرنے سے ہی ہوتا ہے۔

ہجرت کو ابھی پورا سال بھی نہ گزرا تھا اور مسلمان ابھی پوری طرح مدینہ میں جمنے بھی نہ پائے تھے کہ قریش نے مسلمانوں کو للکار دیا لیکن اب مسلمان مکہ کے مظلوم لوگ نہیں تھے اب ہجرت کے بعد وہ آزاد فضا میں پہنچ گئے تھے اور انھیں انتقامِ حق لینے کی اجازت مل گئی تھی شعبان دو ہجری میں قریش کا ایک قافلہ ۵ ہزار سے زیادہ اشرفی کا مال لے کر مدینے کے قریب سے گزرا جو ابو سفیان کی سرکردگی میں جا رہا تھا۔ ابو سفیان نے مسلمانوں کی زد میں ہونے کے خوف سے قریش کی طرف احتیاطاً ایلچی دوڑا دیا کہ وہ قافلہ کی حفاظت کے لیے پہنچ جائیں ایلچی کے دہشت ناک پیغام سے متاثر ہو کر ابو جہل ایک ہزار کے لگ بھگ جنگ جو آہن پوش لے کر مسلمانوں کے مقابلے کے لیے نکلا جس شان سے وہ لشکر آیا تھا اگر مسلمان اس کا نوٹس نہ لیتے تو پھر ان کی ایسی ہوا اکھڑتی کہ صحرائی قبائل اور یہودی اور منافقین مسلمانوں کو مدینہ میں بھی اطمینان سے نہ رہنے دیتے اور ان کے لیے پنپنا مشکل ہو جاتا۔ یہ ایسا موقع تھا کہ مسلمانوں اور اسلام کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ تھا مقابلے میں نہ نکلیں تو قبائل مسلمانوں کو مدینے میں سے اچک لے جائیں اور نکلیں تو مسلمان جس کس مپرسی اور غربت کی حالت میں تھے وہ حالت کسی سے پوشیدہ نہیں تھی۔ چنانچہ حضور اکرمؐ جیسے مدبّر اور بہادر قائد کا فیصلہ یہی تھا کہ میدان جنگ میں مقابلہ ہو گا اور تجارتی قافلے پر قبضے کی بجائے میدانِ جنگ گرم ہو گا۔ پھر اس کے بعد قدرت جس کو مہلتِ زندگی دے گی وہ زندہ رہے گا اور جس کے مقدر میں فنا ہو گی وہ اس سے دوچار ہو گا۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے معمول کے مطابق اس امر میں اپنے صحابہؓ سے بھی مشورہ لیا تو مہاجرین میں سے

حضرت مقداد بن عمرو رضی اللہ عنہ نے اُٹھ کر کہا:

"یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جدھر آپؐ کا ربّ آپؐ کو حکم دے رہا ہے اسی طرف چلئے ہم آپؐ کے ساتھ ہیں۔ ہم بنی اسرائیل کی طرح یہ کہنے والے نہیں ہیں کہ جاؤ تم اور تمہارا خدا دونوں لڑو ہم یہاں بیٹھے ہیں جب تک ہم میں ایک آنکھ بھی گردش کر رہی ہے۔ ہم آپؐ کا ساتھ دیں گے"۔"

پھر انصار میں سے حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ اُٹھے اور انہوں نے کہا:

"یا رسول اللہ ؐ ہم آپؐ پر ایمان لائے ہیں آپؐ نے جو کچھ ارادہ کر لیا ہے اسے کر گزریے۔ خدا کی قسم اگر آپؐ سمندر میں کود دیں گے تو ہم آپؐ کے ساتھ کود دیں گے بس اللہ کے بھروسے پر ہمیں لے چلیے۔"

اس کے بعد فیصلہ ہو گیا کہ کفار کا مقابلہ کیا جائے گا۔ میدانِ بدر کو گرم کیا جائے گا۔ اور جسے اللہ تعالیٰ جسے جینے کی مہلت دے گا بس وہی جئے گا چنانچہ ہجرت کے بعد اس پہلے ہی معرکے نے اسلام کے لیے جینے اور کفر کے لیے مٹ جانے کا فیصلہ سنا دیا۔

ہجرت، جہاد اور غلبہ

ہجرت کے نتائج میں ایک نہایت اہم نتیجہ دعوتِ اسلامی کے لیے جہاد بالسیف کے دروازے کا کھل جانا ہے یہ دروازہ مکہ مکرمہ میں بند تھا مسلمانوں کو سخت ترین اذیتوں میں سے گزرنا پڑتا تھا۔ چھپ چھپ کر اجتماعات کرنے پڑتے تھے۔ بچ بچ کر دعوتِ دین اور تبلیغِ دین کا کام ہوتا تھا۔ کفار کی دہشت گردی نے سارا ماحول دہشت زدہ کر دیا ہوا تھا

جو لوگ اسلام لائے ہوئے تھے وہ کمزور اور ضعیف تھے تعداد میں کم، دنیوی مال و حشمت میں کمزور اور معاشرتی رتبے میں غیر نمایاں تھے چنانچہ کمزوروں پر سے طاقتوروں کا غلبہ کسی صورت کم نہ ہوتا تھا۔ اور جب وہ دیکھتے تھے کہ مظلوموں کی مصلحت انھیں ہاتھ اٹھانے اور مقابلہ کرنے کی اجازت نہیں دیتی تو وہ اور بھی جری ہو جاتے تھے۔ شاید ہی کسی نبی اور اس کے ساتھیوں کو ان کی قوم نے ایسی سختیوں سے دوچار کیا ہو جیسے حضور اکرمؐ اور آپ کے بے بس اور کمزور ساتھیوں کو کیا گیا تھا۔ کون ہے جو تفریحاً اپنا آباد گھر چھوڑ کر بے وطن اور مہاجر ہوتا ہے لیکن مسلمان دو بار حبشہ کی طرف گئے اور بالآخر سب کے سب اپنا گھر بار چھوڑ کر حکم خداوندی سے مدینہ کی طرف ہجرت کر گئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کی تنگ فضا سے گھبرا کر طائف تک تشریف لے گئے تھے لیکن مکہ کی سنگلاخ چٹانوں کی سختی طائف کے پہاڑوں تک بھی جا پہنچی تھی اور حضورؐ وہاں سے بھی مایوس اور پریشان خاطر واپس تشریف لائے۔

مکہ نے جب اپنے پیارے اور صداقت شعار مکینوں پر اپنی سرزمین تنگ کر دی تو ہجرت کے حکم نے مظلوم مسلمانوں کے لئے مدینے کے راستے ہی نہیں بلکہ جہاد کے راستے بھی کھول دیے اور جو لوگ چپکے چپکے تبلیغ کرتے اور بے بسی سے مار کھاتے تھے اب وہ تلواریں سونت کر میدانِ بدر میں پہنچ گئے معرکہ بدر نے ثابت کر دیا کہ اب تک جو ظالم تھا اب اسے زمین پر مزید ظلم کرنے کا حق باقی نہ رہا

تھا اور یہ مظلوم اور صابر تھا اس کے لیے زمین کی وسعت اللہ کے دین کی تبلیغ کے لیے اور زیادہ کشادہ کی جانے والی تھی تاکہ وہ اپنے رب کا کلمہ بلند کرے اپنے مالک کے گھر کا طواف کرے اور دنیا کو سلامتی کا راستہ دکھائے۔

ہجرتِ مدینہ نے جہاد کا دروازہ کھول کر حقیقت میں مسلمانوں کے لئے غلبہ کا دروازہ کھول دیا اور ظاہر ہے کہ مومن جب اپنی جان ہتھیلی پر لے کر میدان جہاد میں اترتا ہے تو ظالم کے سر چھپانے کی جگہ باقی نہیں رہ جاتی یہ بات تو بدر کے پہلے معرکے نے ہی دنیا کے سامنے کھول کر رکھ دی تھی کہ تاریخ کا پلڑا اب کس کی طرف جھک جانے والا تھا لیکن جن لوگوں نے ۱۳ سال تک صبر و حکمت کی تعلیم و تربیت مکہ کی گلیوں میں حاصل کی تھی اس تعلیم و تربیت کے کچھ سبق ابھی باقی تھے جو اُحد خیبر اور طائف کے معرکوں میں دیے جانے والے تھے چنانچہ مکہ کے ۱۳ سالہ قیام میں جہاں ہجرت سے پہلے ایک بھی معرکۂ جہاد برپا نہیں ہوا تھا وہاں ہجرت کے بعد صرف ۹ سال کی مدت میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ۸۲ معرکے برپا فرمائے اور ۲۸ میں تو خود بہ نفسِ نفیس تشریف لے گئے گویا مدینہ کے قیام میں سال میں نو بار لشکر اسلام حرکت میں آتا تھا اور ہر تیسرے ماہ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم لشکر کی کمان خود اپنے ہاتھ میں لے کر کفار کا تعاقب کرتے اور اسلام کے غلبہ کی خاطر سر ہتھیلی پر لے کر نکلتے تھے۔

اس طرح ہجرت نے جہاد کا راستہ صاف کیا اور جہاد نے غلبہ دین کا راستہ ہموار کیا اس سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ دین کے غلبہ کے لیے سر ہتھیلی پر لے کر نکلنے کا نسخہ ہی وہ مجرب نسخہ ہے جو ہر دور میں کارگر ثابت ہوتا رہا ہے ساتھیوں کو جمع کرنے کے لیے جسے جتنی مدت درکار ہو وہ اتنی مدت عدم تعرض کی حکمت کے تحت معاشرے میں سے اپنی ضرورت کا انسانی مال چھانٹ سکتا ہے اور اس چھانٹ کے لیے وہ جس قدر مدت لے گا اس ذریعے سے وہ صرف اپنی ابتدائی قوت ہی مہیا کرے گا البتہ جب بھی وہ انقلاب اسلامی کے لیے اپنا آخری فیصلہ کرے گا تو اسے جہاد کا راستہ ہی اختیار کرنا ہوگا۔ جہاد کا راستہ ہی درحقیقت غلبہ حق کا راستہ ہے۔ رسولؐ اکرم کے انقلاب اسلامی نے حضور کی سنتِ اقدس کا یہی رُخ زمانے کے سامنے پیش کیا ہے۔ اور اسی رُخ نے زمانے کا رُخ بھی بدلا ہے تبلیغ دین اور اصلاح معاشرہ کی طویل سے طویل مدت جسے ساڑھے نو سو سال تک بھی کھینچا جا سکتا ہے ہجرت اور جہاد کے بغیر صرف تبلیغ دین کے مرحلے تک ہی محدود رہتی ہے غلبہ دین کا مرحلہ جہاد کے بغیر اس کی دسترس سے باہر رہتا ہے۔

ہجرت، تشکیل اجتماعیت کا ذریعہ

رسول اکرم کی ہجرت نے یہ موقع بھی مہیا کر دیا کہ مسلمان اپنی اجتماعیت کی تشکیل کر سکیں اور اسلام کے اجتماعی اور معاشرتی زندگی کے احکام کو اپنی انفرادی زندگیوں میں نافذ کر سکیں۔ ظاہر ہے کہ ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں مسلمانوں کی زندگی ایک اجتماعی اور معاشرتی زندگی تھی اب وہ سارے فرائض اور حقوق پوری وسعت کے ساتھ باہمی ایک دوسرے پر عائد ہوتے تھے جو اسلامی معاشرتی زندگی کا خاصہ ہیں۔ مدینہ میں مسلمانوں کو اسلامی معاشرتی زندگی کا پہلا اجتماعی تجربہ درپیش تھا ہجرت نے انہیں ایک نئے ماحول والے اسلامی معاشرے میں لا بٹھایا تھا اور ان کے لیے لازمی تھا کہ وہ اسلام کی معاشرتی زندگی سے آگاہ ہوں اس لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے مکان پر ہی مسلمانوں کو جمع کر کے ان سے خطاب فرمایا اور ان پر اسلامی معاشرہ میں اجتماعی زندگی کے باہمی حقوق واضح

فرمائے۔ آپؐ نے مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے حمد و ثنا کے بعد فرمایا ..... :

" ایہا الناس! میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے حقوق ادا کرو اور اس کے بندوں کے حقوق بھی ادا کرو۔ کیا تم جانتے ہو کہ بندوں کے حقوق کیا ہیں؟ یاد رکھو کہ ہر مسلمان کے دوسرے مسلمان پر چار حقوق ہیں :

۱۔ جب وہ بیمار ہو تو اس کی عیادت کرے۔

۲۔ جب وہ تکلیف میں ہو تو اس کی اعانت کرے۔

۳۔ جب وہ مدد چاہے تو اس کی مدد کرے۔

۴۔ اور جب وہ مر جائے تو اس کی تجہیز و تکفین میں شرکت کرے۔

اور کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے مسلمان بھائی کے لئے بھی وہی چیز پسند نہ کرے جو وہ اپنے لئے پسند کرتا ہے مسلمانو! ایک دوسرے کی مدد کرو اور ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو۔ ایک دوسرے کا مال لے جا غصب نہ کرو۔ ایک دوسرے کو بے عزت نہ کرو۔ یاد رکھو کہ اپنے غریب مسلمان بھائی کو حقارت سے دیکھنا سب سے بڑی برائی ہے۔"

پھر آپؐ نے اپنے اس خطبے میں اولاد کے حقوق والدین پر بیان فرمائے۔ آپؐ نے فرمایا :

"مسلمانو! تم پر تمہاری اولادوں کے بھی حقوق ہیں جس کسی کے اولاد پیدا ہو اسے چاہیے کہ اس کا نام اچھا رکھے اس کی بہتر تعلیم و تربیت کے لیے کوشش کرے۔ جب وہ بالغ ہو جائے تو اس کی شادی کرے اور کسی بے جا رسم کی وجہ سے شادی میں تاخیر نہ کرے۔ اولاد کو ادب سکھانا اور عقل و تمیز اور تہذیب و شائستگی کی تعلیم دینا والدین کا فرض ہے۔"

پھر آپؐ نے فرمایا:

"مسلمانو! جب تمہاری اولاد سات برس کی ہو جائے تو اسے نماز کی تاکید کرو جب دس برس کی ہو جائے تو نماز کے لیے تنبیہہ کرو۔ اس لیے کہ نماز عظیم الشان عبادت ہے جو شخص اخلاص کے ساتھ نماز پڑھتا ہے اس کی روح سنور جاتی ہے اور وہ اپنے مال کو مسکینوں اور محتاجوں کے لئے خرچ کرتا ہے مصیبت میں صبر و استقلال سے کام لیتا ہے اور راحت میں خدا کا شکر ادا کرتا ہے۔"

اس کے بعد حضورؐ نے ہمسائے کے حقوق کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا :

" اے مسلمانو تم پر ہمسائے کے حقوق بھی ہیں۔ اللہ نے فرمایا ہے کہ اپنے ہمسایوں سے حسن سلوک سے پیش آؤ ان کو تکلیف نہ دو جو انھیں تکلیف دیتا ہے وہ اپنے لیے آگ کا عذاب تیار کرتا ہے۔ جس شخص کی برائیوں سے اس کا ہمسایہ محفوظ نہیں وہ شخص مومن نہیں ہے جو خود سیر ہو کر کھائے اور اس کا ہمسایہ بھوکا رہے اس میں ایمان نہیں ہے۔ ہمسایوں میں زیادہ حق اس کا ہے جس کا دروازہ

تمہارے قریب ہے ۔ جو شخص عبادت تو کرے لیکن اس کا ہمسایہ اس سے تنگ ہو اور اس کے اخلاق اچھے نہ ہوں وہ دوزخ میں جائے گا ۔"

اس کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمان معاشرے میں والدین کے حقوق بیان کئے ۔

آپؐ نے فرمایا :

"اے حاضرین ! اولاً پر ماں باپ کے بھی حقوق ہیں خدا کے سوا کسی کو سجدہ جائز ہوتا تو والدین کو ہوتا جب وہ ضعیف ہوں تو تم اُن سے حسنِ سلوک سے پیش آؤ ۔ ان کے سامنے اُف بھی نہ کرو نہ ان سے سخت کلامی کرو ۔ جو کچھ کہنا ہو نہایت ادب کے ساتھ آہستہ آہستہ کہو ۔ ان کے حق میں دعا کرتے رہو کہ اے پروردگار جس طرح وہ میرے حال پر رحم کرتے رہے ہیں تو بھی ان کے حال پر رحم فرما ــــ والدین کو ہمیشہ آرام پہنچاؤ ۔ ان کی اطاعت کرو یاد رکھو کہ خدا کی رضا مندی باپ کی رضامندی سے وابستہ ہے اور خدا کا غصہ باپ کے غصے سے وابستہ ہے جو شخص ماں باپ کو خوش کرتا ہے ۔ اس کے لیے آخرت میں بھلائی ہے اور جو ان کو ناراض کرتا ہے اس کے لئے دنیا و آخرت کی برائی ہے یاد رکھو میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ والدین کی عزت کرو اور ان کی خدمت کرو ۔"

ان اجتماعی تعلقات کی ہدایات کے ذریعے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد مدینہ میں اسلامی معاشرہ کا آغاز فرمایا اور انہی تعلیمات کی بنیاد پر دنیا کا یہ مثالی اسلامی معاشرہ وجود میں آیا ۔

۹ ۔ ہجرت اور اسلامی انقلاب

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اسلامی کی ۲۳ سالہ جدو جہد میں ایک اہم موڑ ہجرت کا واقعہ ہے مؤرخین نے اس اہم واقعہ کی طرف کوئی قابلِ ذکر توجہ نہیں دی ہے ۔ بہت سے عملی پہلو جن کا تعلق حکمت انقلاب سے ہوتا ہے انہیں محض اتفاقی دائرے میں رکھ دینے سے عقیدت و تقدس کا ذوق تو پورا ہو جاتا ہے لیکن حضور اکرم جو رحمۃ للعالمین کے ساتھ ساتھ خاتم النبیین بھی ہیں اور آپؐ لایا ہوا دین ہی آخری دین اور پوری انسانیت کے لیے رہنمائی و ہدایت کا ذریعہ ہے اگر یہ دین بھی اپنی پوری شان اور خصوصیت کے ساتھ نافذ اور قائم نہ ہو تو پوری انسانیت گمراہی کا شکار ہو جاتی ہے ۔ اس پہلو کی طرف بہت کم توجہ کی گئی ہے ۔

دین اسلام ایک عملی نظام زندگی ہے یہ پوری انسانیت کا دین ہے یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آخری دینِ انسانیت ہے اسی کے قیام و نفاذ پر پوری انسانیت کے امن و سلامتی کا دارومدار ہے ۔ یہ قائم نہ رہے تو اسلام کا عملی نمونہ نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور پھر محض کتابیں اور دین حق کی عملی برکات سے محروم و مقہور مسلمان ہی باقی رہ جاتے ہیں جن کے پاس اپنے دین کی حقانیت کے لئے صرف کتابیں اور کلامی دلائل ہی ہوتے ہیں لیکن دنیا کی کتنی آبادی صرف کتابیں اور کلامی دلائل سے قائل ہو کر کسی شئے کو زندگی بھر کے لیے اختیار کر سکتی ہے اور اس لحاظ سے اپنے سابقہ ادیان کو چھوڑ سکتی ہے یہ بات قابلِ غور ہے جبکہ خود دین اسلام پر بھی اس کے نفاذ کے بغیر بہت کم حصے پر عمل کیا جا سکتا ہے ۔

دنیا سے اسلام کی حقانیت منوانے اور اس کی ابدیت ثابت کرنے کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ دنیا کے سامنے اسلام کا عملی نمونہ پیش کیا جائے اور عملی نمونہ اگر موجود نہ ہو تو تبلیغ اسلام کا ہی یہ سب سے بڑا شعبہ ہے کہ اس نمونے کو دنیا کے کسی نہ کسی خطے میں مہیا کر کے دنیا کے سامنے اسے رکھا جائے۔ اگر مسلمان اسلام کا عملی نمونہ دنیا کے سامنے نہ رکھیں نہ اپنی زندگیوں میں اسے رواں دواں دکھائیں نہ اپنے کسی معاشرے میں اسے نافذ و قائم کریں اور نہ اس کی اجتماعیت کی برکات کو دنیا کے سامنے پیش کر سکیں تو دنیا کو گمراہی سے بچانا جو مسلمانوں کا مذہبی فریضہ ہے یہ کبھی ادا نہیں ہو سکتا اور اگر مسلمان یہ فریضہ ادا نہ کر سکیں تو دنیا کی گمراہی کی ذمہ داری پہلے مسلمانوں پر اور پھر دوسرے درجے میں گمراہ ہونے والوں پر عائد ہوتی ہے۔

اس لیے دعوت اسلامی کا ہی یہ داخلی تقاضا ہے کہ اگر دین قائم و نافذ نہ ہو تو اُسے قائم کرنے کا طریقہ خود اس کی تعلیمات میں موجود ہو اور حضور اکرمؐ کی نسبت سے ثابت و معلوم ہو ورنہ اگر اسلام ایک دفعہ نافذ نہ رہے اور پھر مسلمان اسے کبھی بھی نافذ نہ کر سکیں اور نہ ہی ان کا دین انھیں اپنے نفاذ کے بارے میں کوئی رہنمائی دے سکے تو پھر ایسے دین کے بارے میں آخری اور کامل دین ہونے کا دعویٰ دنیا کیسے تسلیم کر سکے گی

حقیقت یہ ہے کہ رسول اکرمؐ کی سیرت پاک نفاذ اسلام کی جدوجہد کی ایک مکمل داستان ہے۔ حضور اکرمؐ کا طریق عمل نفاذ اسلام کا ہی طریق عمل ہے اور اس ۲۳ سالہ کشمکش میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حکمت و بصیرت کے ساتھ ساتھ عملی جدوجہد اور مشکلات راہ حق کو جرأت مندانہ انداز میں انگیز کرنے سے ہی وہ طریق کار واضح اور متعین ہوتا ہے۔

حضور اکرمؐ کی دعوت اسلامی کی جدوجہد میں فرد کی تیاری کا مرحلہ بڑا قابل غور ہے حضور اکرمؐ ایک عام عرب کو کلمہ توحید پڑھانے کے بعد وہ انسان بنا دیتے ہیں جسے ہم "صحابی رسول ﷺ" کہتے ہیں وہ شخص اسلام قبول کر کے اخلاق و کردار کا ہمالہ اور سیرت صالحہ کا بہترین نمونہ بن جاتا ہے۔ پھر اسے دنیا کی کسی بھی قوم کے بہتر سے بہتر فرد کے مقابلے میں پیش کر کے اخلاقی اور عملی لحاظ سے برتر ثابت کیا جا سکتا ہے۔ کلمہ پڑھتے ہی وہ ایثار و قربانی کا پتلا بن جاتا ہے۔ عزیز و اقربا دوست احباب سے اپنے کلمہ کی خاطر کشمکش ہوتی ہے تو وہ پوری برادری اور خاندان کو تج کر دولت ایمان سمیٹ لیتا ہے اور جب دشمنوں کی طرف سے اذیت کا سامان مہیا ہوتا ہے تو وہ گرم سلاخوں سے داغا جاتا ہے۔ پتھروں کے نیچے کچلنا، تپتی ریت پر لیٹنا اور برسر عام پٹتا جانا گوارا کرتا ہے لیکن جس چیز کو اس نے ایک بار حق جان لیا اور مان لیا ہے اس سے بے وفائی کرنا اسے کسی صورت گوارا نہیں ہوتا۔

یہی فرد اسلامی انقلاب کی عظیم الشان عمارت کی پہلی اینٹ ہے یہ پختہ اینٹ جب کسی انقلاب کو مہیا ہو جاتی ہے تو پھر کوئی طاقت اس انقلاب کو میدان جنگ میں ہرا نہیں سکتی۔ حضور اکرمؐ فرد کی تیاری کے ساتھ ساتھ ان میں تعلیم و تربیت کے ذریعے ایک حیرت انگیز اجتماعیت بھی پیدا فرماتے ہیں۔ وہ اجتماعیت جو ان کو جوڑ کر بنیان مرصوص بنا دیتی ہے جو انھیں باہم مل کر دنیا کا ہر دکھ سہہ جانے کے قابل کر دیتی ہے جس میں معروف میں اپنے سردار کی مکمل اطاعت ہے اور منکر میں اس کا احتساب و مواخذہ ہے جس اجتماعیت میں ایک فرد دوسرے کا دینی بھائی ہے جو خون کے بھائی سے زیادہ عزیز اور قریب ہے۔ یہ اجتماعیت ان کو مل کر رہنا، ایک دوسرے کے غم میں شریک ہونا، ایک دوسرے کے نقصان سے رنجیدہ اور نفع سے خوش ہونا سکھاتی ہے۔ یہ اجتماعیت انھیں باہمی حقوق و فرائض کی ایک ایسی لڑی میں پرو دیتی ہے کہ ایک کا حق دوسرے کا فرض ہے اور اگر ہر شخص اپنے فرض کو ادا کرے تو پوری اجتماعیت میں فرد فرد کے حقوق ادا ہو جانے میں اور جس اجتماعیت

میں باہمی حقوق کی ادائیگی کی ضمانت موجود ہو اس اجتماعیت کی قوت و استحکام کو متزلزل کرنا آسان کام نہیں ہے۔

پھر اس اجتماعیت کی تربیت کے لیے حضور اکرمؐ نے اپنی جدوجہد کے بین وسط میں ہجرت کی تدابیر اختیار کیں۔ یہ وہ وقت تھا جب دشمنوں پر ضرب کاری لگانے کی ضرورت تھی تاکہ تحریک آگے قدم بڑھا سکے اور دشمنوں نے دعوت اسلامی کا گھیراؤ کرنے کے لئے چاروں طرف سے جو اس کی ناکہ بندی کر رکھی تھی۔ یہ ناکہ بندی توڑے بغیر اب دعوت اسلامی آگے نہ بڑھ سکتی تھی اور یہی وقت تھا جب تحریک ہجرت کی پشت لگا کر دشمنوں کے مدِمقابل بن کر سامنے آ ئی۔

چنانچہ ہجرت کا حکم ملا۔ یہ ہجرت حبشہ کی طرف پہلے بھی دو بار ہو چکی تھی لیکن وہ مظلومیت میں اپنی قوت کو محفوظ کرنے کی ایک تدبیر تھی اور اب یہ تیسری ہجرت مدینہ، باطل کے مقابل میدانِ عمل میں آنے کی تدبیر تھی۔ یہ ہجرت دو دھاری تلوار تھی۔

باطل کی کثیر جماعت پر ضرب کاری لگانے کے لئے ایک ایسی جان نثار جماعت کی ضرورت تھی جو بے شک قلیل ہو لیکن اس کا ہر فرد قربانی کا مثالی نمونہ ہو اور وجود دنیا کے ہر فائدے، لالچ تعلق اور محبت کو تج کر صرف اسلامی دعوت کے لیے جان ہتھیلی پر لے کر میدان میں نکلنے کا داعیہ رکھتا ہو۔

ایسے ایثار و قربانی کے لئے زبانی اقرار کرنے کی حد تک بے شمار لوگ ہر جماعت میں حلف لینے کے لئے آگے بڑھ سکتے ہیں لیکن جب تک ایسے منتخب لوگ موجود نہ ہوں جن کی جانیں واقعی ہتھیلیوں پر ہوں، جو واقعی ہر عصبیت تعلق اور نفع کو چھوڑ کر آئے ہوں اس نوعیت کے منتخب لوگوں کی فراہمی ہجرت کے بغیر ممکن نہ تھی اس لیے کہ ہجرت ایسے تمام تعلقات پر میدانِ عمل میں قینچی کا کام کرتی ہے۔ اس طرح ہجرت کے لیے جو لوگ کھڑے ہوئے وہی لوگ بدر میں کفار کے مقابلے میں آئے اور وہی لوگ ہر نوعیت کے تعلق کو تلوار کی کاٹ سے منقطع کرنے پر قادر ہو سکے۔ اس ہجرت نے حضور اکرمؐ کو ایسے ساتھی فراہم کر دیے جن میں سے ایک ایک فرد پر آنکھیں بند کر کے کامل اعتماد کیا جا سکتا تھا اسی لیے ان دنوں جب کفر سے دو بدو جنگ تھی اور اسلام کے لیے مسئلہ زندگی اور موت کا تھا، تو یہی ہجرت اس وقت اسلام سے وفاداری اور ایمان میں استواری کا نشان بن گئی۔ اس سے لوگ اسلام کے ساتھی یا کفر کے ساتھی پہچانے جاتے تھے اور اسی ہجرت نے مسلمانوں کے لئے غلبہ اور نفاذ اسلام کے دروازے کھولے۔ در حقیقت انقلاب اسلامی کے لئے ہجرت ایک ناگزیر مرحلہ ہے ممکن ہے کہ کسی معاشرے کے خصوصی حالات میں اس کے بغیر بھی کام چل جائے۔ یہ تو نفاذ اسلام کے لئے جدوجہد کرنے والے مسلمانوں کی اجتماعی مشاورت ہی طے کر سکتی ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ مسلمان مجاہدین کے اندر یہ عقیدہ چلا آتا ہے کہ نفاذ اسلام کی جدوجہد میں ہجرت کا مرحلہ ناقابل فراموش ہے اور کفر کے خلاف عمل جہاد کے لئے ہجرت ہی دروازہ کھولتی ہے۔ یہی میدان جنگ فراہم کرتی ہے یہی چھانٹ کر کام کے آدمی تیار کرتی اور انہیں کفر کے خلاف اسلام کے حق میں میدان میں اتارتی ہے اور یہی ہجرت ہے جو اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے ہر دور میں کام آتی رہی ہے۔

ظاہر ہے کہ جہاد کے ساتھ ہجرت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اسلامی سپاہ بھی ایک مقام سے دوسرے مقام تک ہجرت کر کے ہی کفر کے علمبرداروں سے جنگ آزما ہوتی ہے اور یہ ہجرت وہ میدان ہے جس میں ڈھل جانے کے بعد مومن کا ایمان محکم اور اس کا اسلام پائیدار ہو جاتا ہے اور اس میں وہ توانائی پیدا ہو جاتی ہے جو اسے ہر معرکے میں کامیابی و کامرانی کا راستہ دکھاتی ہے ۔

ہجرتِ نبوی ؐ

(راہیں، قیام، منزلیں)

بقلم: عبد القدوس انصاری، ترجمہ و تلخیص: محمد مسعود مشہدی

"ان تمام مراحل و منازل کی محققانہ تفصیلات جنھیں ہجرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تاریخ ساز برکات سے نوازتے ہوئے ان چٹانوں، ریگ زاروں اور بستیوں کو شرف قدم بوسی بخشا۔"

ابتدائین الہامی اشاروں سے

"صحیح بخاری" میں محمد بن اسماعیل بن ابراہیم بن المغیرہ بن بردزبہ الجعفی البخاری نے ام المومنین خدیجۃ الکبری رضی اللہ عنہا کی روایت سے پہلے اشارہ کی نشاندہی یوں فرمائی ہے۔

غارِ حرا سے پہلی بار نزول وحی کے بعد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خدیجۃ الکبریٰؓ کے پاس لرزہ براندام تشریف لائے اور جبریل امین کی مہیب و محیر آمد، حکم اقرأ اور اپنے تاثرات و کیفیات کی تفصیل بیان فرمائی، تو وہ انہیں اُس وقت کے معمر و جید عالم اپنے چچیرے بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں۔ ورقہ بن نوفل نے تفصیلات سنیں اور کہا ھذا الناموس الذی نزل اللہ علی موسیٰ "یہ وہی ناموس (جبریل امین) ہے۔ جسے اللہ تعالےٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پہ نازل فرمایا۔ اس کے بعد ایک لحہ گہرے تفکر میں ڈوبے پھر دل کی حسرت بھری تمنا کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"افسوس اس وقت میں کسی کام آسکتا۔ ہائے . . . میری زندگی اس وقت تک وفا کرتی۔ جب تمہاری قوم تمہیں نکال دے گی۔ یالیتنی فیھا جذعا . . . لیتنی اکون احیا۔ پھر رکے اور کہا اذیخرجک قومک" جب تمہاری قوم تم کو نکال دے گی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حیرت و استعجاب سے استفسار فرمایا۔ اَوَمُخْرِجِیَّ . . . ھم . . . "کیا وہ مجھے . . . . نکال دیں گے" ورقہ بن نوفل نے کہا "ہاں تمہاری قوم تم کو نکال دے گی۔"

دوسرا الہامی اشارہ

اللہ کی وحدانیت کی طرح یہ بھی سچ ہے کہ اپنی ذات اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حوالے سے مشرکین اور کفار مکہ کی سرد مہری، تشدد، جبر و ستم پہ رحمتِ دو عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام کبھی دل برداشتہ نہ ہوئے، چشم مبارک کبھی نمناک نہ ہوئی۔ صبر و استقامت میں کبھی اضمحلال نہ آیا۔ لیکن رؤف و رحیم آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اپنی امت توحید و رسالت کے جان نثاروں پر انتہائی وحشتناک مظالم ہوتے ہوئے دیکھ کر قلب اطہر ضرور افسردہ ہوتا۔ قرآن مجید گواہ ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب بھی افسردہ ہوئے تو فوراً بارگاہِ الٰہی سے نزولِ حوصلہ افزائی ہوا۔ چنانچہ انہی دنوں میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اصحابہ کرامؓ کو اپنا ایک خواب سنایا "قَدْ اُرِیْتُ دارھجرتکم۔ ادیت سبخۃ ذات نخل بین لابتین"

"میں نے خواب میں مقامِ ہجرت دیکھا ہے۔ جو انتہائی سرسبز و شاداب مقام ہے" بحوالہ صحیح بخاری باب الہجرت، خیال تھا کہ یہ مقام یمامہ، بحرین یا مدینہ ہو سکتا ہے۔

تیسرا الہامی اشارہ منبع دانش و بینش، مصدرِ عرفان و ادراک، معلم دینِ قیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے صحابہ کرام کی ایک مختصر جماعت کو ملک حبشہ میں ہجرت کرنے کی اجازت مرحمت فرما کر اللہ سے ان کی امداد کے لیے خصوصی دعا فرمائی۔ شاہ حبشہ نجاشی نے ان مہاجرین سے نہ صرف بہترین سلوک کیا۔ بلکہ اپنے حسن سلوک کا مثالی مظاہرہ کرتے ہوئے ایسی استقامت دکھائی کہ کفارانِ مکہ دنگ رہ گئے جتنی بار دشمنی کے ہتھکنڈے استعمال کرنے کی کوشش کی اتنی ہی بار ان کو منہ کی کھانی پڑی، اور مہاجرین کی جماعت اپنے افعال و اقوال کی خوبیوں سے حبشہ میں چاروں طرف خوشبو پھیلاتی رہی۔ اندوہ والم سے بھرپور وقت گزرتا گیا۔ اس اثناء میں حضرت ابوبکر صدیقؓ جب کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کفارانِ مکہ کا دل شگاف سلوک دیکھتے تو انتہائی غم میں ڈوبی ہوئی آواز اور انتہائی ادب کے ساتھ بارگاہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے "ہجرت" کی التجا فرماتے! ارشادِ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہوتا" میں اللہ جل شانہ کے حکم کا منتظر ہوں"۔

آخر وہ عظیم شب آہی گئی وہ شب جسے امت مسلمہ کی عظیم الشان سیاسی، اقتصادی، معاشی اور آفاقی امن و سکون سے لبریز زندہ رہنے کے آداب کی تاریخ کا نقطۂ آغاز کہلانے کا شرف نصیب ہونا تھا۔ اُس شب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مسکن مکرم سے چند قدم کے فاصلے پر قصی بن کلاب کے گھر دارالندوہ کے بند دروازوں اور کھڑکیوں کے اندر قریش قبائل کے سردار ایک واردات قتل کو ایسی شکل دینے پر غور و خوض کر رہے تھے جو ایک تیر اور دو نشانوں کے مترادف ثابت ہو۔ وارداتِ قتل بھی کامیاب ہو، اور مقتول کا بدلہ لینے سے نہ صرف اُس کا خاندان بنو ہاشم بےبس و لاچار ہو، بلکہ اس کے جاں نثار بھی مجبور و بے اختیار ہو کر رہ جائیں۔

ہر ایک نے اپنی اپنی بساطِ عقل کے مطابق تدبیریں پیش کیں، لیکن جس پر سب نے متفقہ طور پر صاد کیا۔ وہ ابوجہل کی تدبیر تھی کہ تمام قریش اپنے اپنے قبیلہ سے ایک ایک نوجوان منتخب کریں اور یہ نوجوان ہاتھوں میں ننگی تلواریں لئے مسکن نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو رات گھیرے میں لے لیں۔ صبح کے وقت جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے لیئے گھر سے نکلیں تو ایک ساتھ حملہ آور ہو کر انہیں ختم کر دیں۔

مگر اس طریقۂ واردات پر صاد کرتے ہوئے انہیں اس بات کا احساس نہ ہوا کہ یہ سوچ اسی سوچ کا چربہ ہے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت العتیق میں "حجر اسود" کے نصب کرنے کے لیئے قوم کے سامنے پیش فرما کر انہیں اپنا معترفِ حکمت بنایا تھا۔

وہ یہ بھول گئے کہ لاشعوری طور پر نہ صرف ابوجہل نے اُسی حکمت کا سہارا لے کر آپ کی مدبرانہ عظمت کا اقرار کیا ہے۔ بلکہ اُس کے ساتھ وہ خود بھی اُسی اعتراف کا اظہار کر رہے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ اُس حکمت کا منبع سراپا خیر و برکت تھا۔ اس سوچ کا مخزن رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ اور اس سوچ کے دھارے اس دماغ سے پھوٹے تھے جو سراپا فساد و شر تھا۔

اللہ نے جاہل انسان کے اس " زعم عقلمندی " کا تجزیہ ان الفاظ میں فرمایا۔

" واللہ غالبٌ علیٰ امرہٖ ولکنّ اکثر الناس لا یعلمون "

" اللہ تعالےٰ اپنے امور کی تکمیل پر مکمل دسترس رکھتا ہے۔ لیکن بہت سے انسانوں کو اس کا علم نہیں "

ادھر تدبیر ابوجہل تشکیل دی جاتے لگی۔ ادھر قلب اطہرؐ کو جبرئیلؑ نے دستک دی اور فرمانِ خداوندی سنایا۔

دستک " واذ یمکر بک الذین کفروا لیثبتوک او یقتلوک او یخرجوک و یمکرون و یمکر اللہ و اللہ خیر الماکرین " " جب کافروں کا ایک گروہ تمہیں قید کرنے، قتل کرنے، یا جلا وطن کر دینے کی خفیہ تدبیریں سوچ رہا تھا۔ تو اللہ تعالےٰ بھی دنیا دل (خفیہ تدبیر طے کر چکا تھا۔ اور اللہ سے بہتر کوئی خفیہ (سربستہ راز) تدبیر نہیں کر سکتا۔

اس کے ساتھ اذن ہجرت کے علاوہ جبرئیل علیہ السلام نے کہا۔

" لا تبیت اللیلۃ علیٰ فراشک۔ الذی کنت تبیت علیہ "

" آج کی رات اپنے بستر پہ آپؐ استراحت نہ کریں "

اس کے بعد جبرئیل امینؑ گئے اور مینار ہدایت رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے انتہائی اطمینان کے ساتھ ۔ گھر کے باہر چاروں سمت نگاہ ڈالی۔ اس وقت تک مسکن نبوی صلی اللہ علیہ وسلم گھیرے میں لیا جا چکا تھا۔ آپؐ نے علی کرم اللہ وجہہ سے مخاطب ہو کر فرمایا۔

آج کی رات تم میرے بستر پہ چادر اوڑھ کر سو جاؤ۔ مطمئن رہو کوئی تمہارا بال بھی بیکا نہیں کر سکے گا۔ صبح ہوتے ہی یہاں کے لوگوں کی امانتیں انہیں لوٹا دینا۔ میری اور تمہاری ملاقات اب مدینہ میں ہوگی۔

گویا اس رات کو بستر نہیں بلکہ بظاہر تلواروں کی تیز دھاروں کا بچھونا تھا۔ جس پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ بلا حیل و حجت چادر اوڑھ کر لیٹے۔ اور اس طرح قیامت تک آنے والی امت مسلمہ کو محبت، وفا اور ایمان کے معرکۂ امتحان میں کس حوصلہ مندی سے داد شجاعت دے گئے۔

امت مسلمہ کی تاریخ کا " کل " اللہ کے محبوب محمدؐ احمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بعد اپنے مسکن سے نکلے۔ دروازے پہ ایک لمحہ توقف فرمایا۔ زمین سے مٹھی بھر خاک اٹھائی اور گھات میں بیٹھے ہوئے نوجوانوں کے چہروں پہ پھینکی۔ اور انتہائی اطمینان کے ساتھ سورۂ یٰسین کی آیات

یٰسٓ ۞ والقرآن الحکیم ۞ انک لمن المرسلین ۞ علیٰ صراط مستقیم ۞ تنزیل العزیز الرحیم ۞

یٰسین۔ قسم ہے قرآن کی جو حکمت سے بھرا ہے۔ محمدؐ بے شک تم پیغمبروں میں سے ہو۔ سیدھے راستہ پہ۔ یہ خدائے غالب اور مہربان نے نازل کیا ہے۔

لتنذر قوما ما انذر اباؤھم فھم غافلون ۞

تاکہ تم ان لوگوں کو جن کے باپ دادا کو تنبیہ نہیں کیا گیا تھا متنبہ کرو۔ کیونکہ وہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں

لَقَدۡ حَقَّ الۡقَوۡلُ عَلٰۤی اَکۡثَرِهِمۡ فَهُمۡ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ۝ اِنَّا جَعَلۡنَا فِیۡۤ اَعۡنَاقِهِمۡ اَغۡلٰلًا فَهِیَ اِلَی الۡاَذۡقَانِ فَهُمۡ مُّقۡمَحُوۡنَ ۝
ان میں سے اکثر پر اللہ کی بات پوری ہو چکی، سو وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ ہم نے ان کی گردنوں میں طوق ڈال رکھے ہیں۔ اور وہ ٹھوڑیوں تک پھنسے ہوئے ہیں۔

وَجَعَلۡنَا مِنۡۢ بَیۡنِ اَیۡدِیۡهِمۡ سَدًّا وَّمِنۡ خَلۡفِهِمۡ سَدًّا فَاَغۡشَیۡنٰهُمۡ فَهُمۡ لَا یُبۡصِرُوۡنَ ۝

اور ہم نے ان کے آگے بھی دیوار بنا دی اور ان کے پیچھے بھی، پھر ان پر پردہ ڈال دیا۔ وہ دیکھ نہیں سکتے۔
پڑھتے ہوئے ان کے سامنے سے مامون و محفوظ گزر گئے اور دشمنوں کی آنکھیں غنودگی کی دھند میں ڈوب کر رہ گئیں۔

آیات کے ابتدائی حصہ میں اللہ تعالٰی اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حقانیت کا اظہار کرتے ہوئے آپؐ کے حوصلوں کو بڑھا وا دے رہے ہیں اور دوسرے حصہ میں اس سچائی کے خلاف خود سر افراد کو جنہوں نے اس واردات قتل میں فکری اور عملی اشتراک کیا۔ شرف انسانی یعنی "ایمان" کی نعمت سے محروم کر دینے کا فیصلہ سنا رہے ہیں۔ احکم الحاکمین نے اپنے اس خصوصی اور غیر مرئی انداز حفاظت کا اظہار اپنے کلام بلیغ و مقتدر میں اس طرح فرمایا۔

وَیَاۡبَی اللّٰهُ اِلَّاۤ اَنۡ یُّتِمَّ نُوۡرَهٗ وَلَوۡ کَرِهَ الۡکٰفِرُوۡنَ ۝

نور اسلام کی سلامتی اللہ تعالٰی کا حتمی فیصلہ ہے۔ اگرچہ یہ بات کافروں کو بہت ہی ناپسند ہے۔

اب رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے قدمین شریفین جبل بوقبیس سے محلہ مسفلہ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ چلتے چلتے جب بیت اللہ شریف پہ نگاہیں پڑیں تو ایک لمحہ رکے اور فرمایا۔ میرا دل تم سے الگ ہونا نہیں چاہتا لیکن تیرے شہر کے لوگ مجھے یہاں رہنے نہیں دیتے۔ اس کے بعد پھر روانہ ہوئے اور محلہ مسفلہ میں واقع حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالٰی عنہ کے دروازے پر رُکے۔ دستک دی، ابوبکر رضی اللہ تعالٰی عنہ نے دروازہ کھولا۔ سامنے آئی ساعت گئے آفتاب رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا۔ آنکھیں فرش راہ کیں اور عرض کیا۔ اندر تشریف لائیے۔ آنحضرت نے دریافت فرمایا۔ گھر میں اور کون ہے ؟ ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالٰی عنہ نے عرض کی۔ آپ کے حرم کے سوا اور کوئی نہیں۔۔۔۔

آپؐ اندر تشریف لے گئے اور فرمایا۔ ان اللہ اذن لی فی الخروج والھجرۃ

"مجھے اللہ تعالٰی نے اذن خروج وہجرت دے دیا ہے۔

ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالٰی عنہ کی آنکھوں میں ہمرکابی کے وفور شوق سے آنسو چھلکے۔ عرض کیا۔ کیا مجھے بھی ؟۔۔۔ میرے ماں باپ آپ پہ قربان ؟ رحمت عالم نے تصدیق سعادت فرمائی۔

باہمی مشورہ سے ہجرت کی پہلی منزل مکہ مکرمہ سے تین میل دور داہنی جانب غارِ ثور طے پائی۔ لیکن ہجرت کے اولین مرحلہ کے آغاز سے قبل چند دوسرے امور کی جلد سے جلد اور محتاط تکمیل بھی ضروری قرار پائی۔

(۱) عبداللہ بن ابوبکر رضی اللہ تعالٰی عنہ کو ہجرت کے بعد کفار مکہ کی تمام سرگرمیوں کے بارے میں ہر شام تفصیلی خبریں پہنچانے کی ذمہ داری سونپنا۔

کی ذمہ داری سپرد کرنا۔

(۲) عامر بن فہیرہ (غلام) کو اس علاقہ میں بکریاں چراتے ہوئے عبداللہ بن ابوبکر کے نقوش کو مٹانے

(۳) اور غار ثور میں تین راتوں کے قیام کے درمیان طعام کا اہتمام کرنا۔

(۴) عبداللہ بن اریقط کو معقول معاوضہ دے کر دلالتِ راہ کے لئے مقرر کرنا۔

چنانچہ یہ سب کچھ انتہائی عجلت اور پُراسرار طریقہ سے بحسن و خوبی انجام پایا۔

حضرت اسماءؓ نے عجلت میں ناشتہ دان کا منہ بند کرنے کے لئے رسی، دھاگہ یا کپڑے کی تلاش میں وقت ضائع کرنے کے بجائے اپنے "نطاق" (کمر بند) کو دو ٹکڑے کرکے اسی سے ناشتہ دان کا منہ بند کر دیا۔ ان کے اسی عمل کے حوالے سے وہ بعد میں (ذات النطاقین) کے لقب سے پکاری جانے لگیں۔

حضرت ابوبکرؓ نے اندوختہ ساتھ لیا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جلو میں نکلے۔ اور جان نثارؓ کبھی پیچھے اور کبھی برابر میں ہم قدم ہو جاتے۔

گلیوں، محلوں، اور پھر شہر مکہ نے خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے رفیق صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنی آنکھوں سے اوجھل ہوتے دیکھا۔ تو بے ساختہ کہا! ہائے یہ مکہ کے لوگ کیسے ہیں! ایسے امین، ایسے سچے، ایسے مشفق و مہربان ایسے خوشخو ایسے خوش نفس سے ایسا سلوک! توبہ

مکہ والو! بے غیرتی، بے حیائی، بدکلامی، بے اصولی، وحشت و درندگی کی بدبودار بیماریوں میں سڑتے ہوئے جسموں کو شفا بخشنے والے مہربان حکیمؐ سے ایسا برتاؤ۔

اُف، بدنفس، بدصورت، بدسیرت معاشرہ کو اعلیٰ اخلاق اور انسانیت کا حسن و جمال بخشنے والے کمال محاسن انسانیتؐ سے ایسا رویّہ!

آہ! جہالت، کہانت، خباثت کی دلدل سے نکال کر علم و حکمت، توحید و رسالت، حق و صداقت کی جنت میں بسانے والےؐ سے ایسی بدسلوکی۔

توبہ! توبہ! ہمارا کیا بگڑا! تم اپنا ہی سب کچھ اپنے ہاتھوں لُٹا بیٹھے ہو۔ ہمارے ذرّوں نے تو اُس وقت بھی گواہی دی تھی۔ آج بھی گواہی دیتے ہیں

اللہ سچا — اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سچے!

غرض راہوں کے ذرّے الوداعی قدم بوسی کا شرف حاصل کرتے رہے۔ رات کا کافی حصہ گذر چکا تھا۔ صبح جاگنے کے لئے انگڑائیاں لے رہی تھی۔

ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رفیقِ ہجرت حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ساتھ جبل ثور کے دامن میں پہنچ گئے اور پھر جبل ثور کو اپنی بلند و بالا چوٹی کو عظمتِ انسانیت کے پیکرِ اوصاف کے قدموں میں بچھانے کا شرف نصیب ہوا۔ گھاٹیاں فرشِ راہ بنیں۔ نوکیلے پتھروں نے پھول بن کر قدموں کو چوما۔ سرورِ کونینؐ اللہ اکبر وردِ زبان فرماتے ہوئے۔ رہ حضور اکرم صلی اللہ -

علیہ وسلم کا معمول تھا۔ جب کسی بلند چوٹی پر چڑھتے تو زبان پر اللہ اکبر کا ورد ہوتا) جب ایک غار کے دہانہ پہ پہنچے تو رفیقِ سفر صدیق اکبرؓ نے آپؐ سے وہاں رکنے کی درخواست کی۔

حضرت صدیق اکبرؓ خود غار کی گہرائی میں اترے۔ غار کے کونہ کونہ کو نیچے، اوپر، دائیں، بائیں اچھی طرح ٹٹولا۔ کہیں کوئی بچھو، سانپ یا دوسرا موذی نہ ہو۔ اطمینان ہوا تو آپ سے اندر آنے کی التجا کی۔ آپ غار میں تشریف لے گئے۔

ہجرت کی پہلی منزل جبل ثور جبل ثور جو کل تک ایک عام پہاڑ تھا جسے آس پاس کے چرواہوں کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا۔ آج کائنات کے حاصل رحمت کل علیہ الصلوٰۃ والسلام اس کے دل کی گہرائیوں میں مہمان تھے۔ اس کی رگ رگ سے صدا بلند ہوئی الحمد للہ والشکر للہ آج اُسے عظمت بخشنے والے نے تاریخی عظمت بخش دی کیونکہ

"یسبح للہ ما فی السمٰوٰت والارض"

ان انسانوں سے میرا بے شعور پتھریلا جسم بھلا جسے اعانت رسول برحق نصیب ہوئی۔

جبل ثور کی یہ خوشی صحیح بھی تو تھی۔ آج صدیاں گزرنے کے بعد بھی اس کی دشوار گھاٹیاں اور کالے رنگ کے نوکیلے پتھر امت مسلمہ کی نگاہوں میں لازوال رنگ و جمال کا مخزن ہیں۔ اور تا قیامت رہیں گے۔

صبحِ اسلام شامِ کفر مقررہ وقت کے انتظار میں نوجوانانِ قریش گھات میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک شخص نے انہیں چونکایا "تم لوگ کس فریب میں ہو۔ تمہارا مقصود تو نکل گیا"

سب کو اپنی آنکھوں پہ یقین تھا۔ ایک ساتھ بولے۔ تم خود فریب نظر کا شکار ہو۔ ہم سب سانپ کی طرح آنکھ جھپکے بغیر گھات میں بیٹھے ہیں۔

انہیں اپنی بات پہ اتنا وثوق تھا کہ مخبر کو خود اپنی نظر پہ شبہ ہونے لگا۔ صبح نے ان کی حماقت پر مسکرانا شروع کیا۔ وقت نے تحقیر آمیز مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا مقررہ وقت گزرتے ہوئے محسوس کیا۔ تو اپنے قبائل کے متفقہ فیصلہ (رات کی تاریکی میں کسی کے گھر میں گھس کر حملہ آور ہونا بزدلی کے مترادف ہے) کو توڑتے ہوئے مسکن نبوی میں داخل ہوئے۔

بستر پہ چادر اوڑھے سوئی ہوئی شخصیت وفا، ایثار اور ایمان کی غیر فانی علامت حضرت علی کرم اللہ وجہہ پہ سرورِ عالم علیہ الصلوٰۃ کی موجودگی کا یقین لئے خون آشام تلواریں لے کر لپکے، چادر پہ جھپٹے تو سب پہ سکتہ کا عالم طاری ہو گیا۔

علی کرم اللہ وجہہ نے پر وجاہت نگاہوں سے انہیں دیکھا۔ روحِ شجاعتؓ کی ایک ہی نگاہ نے انہیں بدحواس کر دیا۔

پاگلوں کی طرح چلائے — محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کہاں ہے؟

علی کرم اللہ وجہہ نے بڑے اطمینان سے فرمایا۔ اس بات کا علم تمہیں ہونا چاہیئے جو رات بھر گھات لگائے بیٹھے رہے۔

اس کے بعد کئی آوازوں نے گھیرا — کعبہ شریف میں، گھر میں، ہر ایک آواز کا ایک ہی سوال تھا۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کہاں گئے۔

اور علیؓ کا ایک ہی جواب تھا۔ یہ جاننا تمہارا کام ہے میرا نہیں۔

اس طرح وہ صبح کفارانِ مکہ کے ناپاک ارادوں کی سیاہ قبر کی طرح تاریک رات تھی، اور ملت اسلامیہ کی سیاسی، معاشی اور تہذیبی سطح پر عظیم الشان تاریخ کی منور صبح!

موجودگی سے زیادہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا غیاب کفارانِ مکہ کے لئے سوہانِ روح بن گیا۔ مستقبل کے انجانے خوف نے ان کے دلوں میں بے چینی کے الاؤ جلا دیئے۔ جس کی روشنی میں انہیں اپنی جہالت اور جبر و استبداد کی تڑپتی ہوئی لاشیں نظر آنے لگیں گو بظاہر ان کی اکثریت اور طاقت کے ہوتے ہوئے اس بوکھلاہٹ کا کوئی جواز نہ تھا۔ لیکن ان کا اپنا خبث باطن غیر شعوری طور پر سچائی کی قوت سے خائف تھا۔ انہوں نے مختلف سمتوں میں کئی سواروں کو تعاقب کے لئے روانہ کیا۔

تعاقب کرنے والوں کا ایک گروہ غار ثور کے دہانے تک پہنچ گیا۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ ان کے پاؤں کی آہٹ سن کر خائف ہو گئے۔ مگر سرور کونین علیہ التحیۃ والسلام مطمئن تھے۔ فرمایا۔

"لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا" گھبراؤ مت اللہ ہمارے ساتھ ہے"۔

ٹھیک اسی وقت کفارانِ مکہ کی نگاہوں میں مدبر الامور نے مکڑی کے جالے اور کبوتر کے انڈوں کا تصور دے کر ان کے دلوں میں یقین پیدا کر دیا کہ اس غار میں کسی کا داخلہ ہی ناممکن ہے۔

ایک شاعر نے کہا ہے:۔ ظنوا الحمام وظنوا العنکبوت علی

خیر البریہ لم تنسج ولم تحم

وقایۃ اللہ اغنت من مضاعفۃ

من الدروع وعن عال من الاطم

اللہ جل شانہٗ نے اس واقعہ کو اپنے کلام قرآن مجید میں یوں بیان فرمایا۔

اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ۭ وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِىَ الْعُلْيَا ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ

تم اگر ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد نہیں کرو گے تو اللہ تعالےٰ اس کی مدد اس وقت ہی کر چکا ہے۔ جب کافروں نے جلا وطن ہوتے پر مجبور کر دیا اور اس وقت بھی مدد کی جب کہ غار (ثور) میں دو میں ایک آپؐ تھے۔ اور آپ نے اپنے ہم ہجرت رفیق غار سے کہا۔ غم نہ کرو اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ اس کے ساتھ اس کے دل میں اطمینان نے بسیرا کر لیا۔ پھر ہم نے تمہیں دکھائی نہ دینے والے بے حد و حساب لشکر سے اس کی مدد کی اور ثابت کر دیا۔ کافروں کی بات گھٹیا ہے اور اللہ کی بات بلند و بالا اور ہر حالت میں یہ بھی ثابت کر دیا۔ کہ اللہ تعالےٰ زبردست حکمت کا مالک ہے۔

تعاقب کرنے والوں کا یہ گروہ بھی ناکام لوٹا۔۔۔ تو شہر میں دو سو اونٹوں کے انعام کی منادی کرا دی گئی۔ تازہ دم تعاقب کرنے والے پھر نکل پڑے۔

ہجرت کا دوسرا مرحلہ

یہی وہ مرحلہ ہے جس کے واضح اور مصدقہ خطوط کی دریافت کرنا ان مراحل و منازل پہ صدیوں کے اندھیرے کی دبیز چادروں کا سینہ چاک کرنا ہمارے لئے جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔

ہم نے اس موضوع سے متعلق لکھی ہوئی قدیم متوسط اور دورِ حاضر میں لکھی ہوئی جو بھی کتاب دستیاب ہو سکی۔ اس کا ورق ورق چھانا۔ تاریخ، جغرافیہ، بلدانیات اسلامیہ، سیرۃ، احادیث، لغت سے رہنمائی حاصل کرنے کی کوشش کی بلکن کسی محقق نے مراحل کے ناموں کی مماثلت کی بنا پر غلطی کھائی تو کسی نے جغرافیائی حدود کے تعین میں گریز اختیار کرتے ہوئے نزول مدینہ پہ جست لگا دی۔

ہماری جستجو یہ تھی کہ ہم طریقِ ہجرت نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم میں جس بھی گھاٹی، پہاڑ، ریگزار، مرغزار، بستی یا ویرانے کی قسمت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش پا نصیب ہوئے۔ اس جگہ کا نام اور جغرافیائی ہیئت بالکل مصدقہ ہو۔ جہاں دن ہوا، دن ڈھلا شام ہوئی، رات آئی، قیام ہوا، سفر ہوا۔ سب کی نشاندہی بالکل درست ہو۔

آخر کار ہم نے اپنی اس دریافت کا انحصار انہی پہ ٹھہرایا۔ جو ان راہوں کے خود مسافر تھے۔

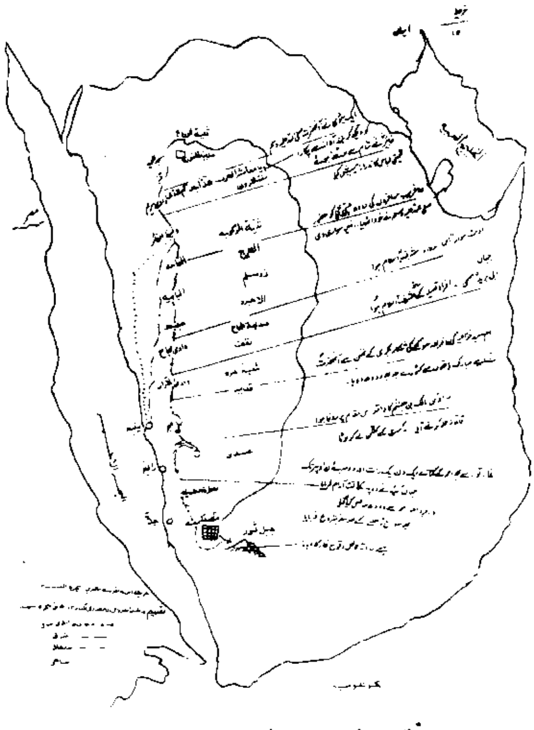
(۱) سرورِ کونین رحمت دو عالم محمد صلی اللہ علیہ وسلم

(۲) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالے عنہ

(۳) عبداللہ بن اریقط

(۴) غلام عامر بن فہیرہ

لہذا پہلے آپ ابتدا تا انتہا ــ مراحل کا نقشہ ملاحظہ فرمائیے۔ اس کے بعد مراحل کی تفصیل۔



(یہ نقشہ صفحہ ۳۳۶ پر بھی ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) مکہ مکرمہ میں مسکن نبوی سے" قدیم نام بنی جمع " محلہ مسفلہ میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ' کا گھر رات کے سناٹے میں گلیاں محلے گزرتے ہوئے اللہ کی عظمتیں بیان کرتے ہوئے۔

(۲) جبل ثور تک پہنچے۔ جبل ثور کے غار میں تین دن اور تین راتیں قیام ——اس کے بعد غار ثور سے رات دن پھر رات بحیرۂ احمر کے کنارے کی طرف عام راستے سے بچتے ہوئے۔

(۳) وادی عسفان کے نچلے حصہ کی طرف سے" صخرۃ الطویلہ" (طویل چٹان) میں دوپہر کے وقت استراحت فرمائی۔

سورج ڈھلنے کے بعد روانگی سے قبل کی مختصر تفصیل

"قافلہ ہجرت دن کا ایک حصہ چلا۔ پھر رات کو سفر کیا۔ پھر دوسرے دن اور رات کے سفر کے بعد تیسرے دن جب دوپہر کا وقت ہوا تو یہ قافلہ کڑکتی دھوپ میں بے آب وگیاہ چٹانوں کے طویل پیچ وخم سے گذر رہا تھا۔

ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ' نے چٹان کے کسی حصہ میں سایہ دار مقام تلاش کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے استراحت کی درخواست کرتے ہوئے چادر بچھائی۔ آپؐ نے قبول فرمائی۔ طویل سفر کی تھکان کے سبب آپؐ سو گئے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ' جاگتے رہے۔ پیاس کی شدت محسوس کی' اٹھے چٹان کے مختلف حصوں پہ دور دور تک تا حد نگاہ نظر ڈالی۔ دور ایک بدو بچہ بکریاں چراتا نظر آیا۔ صدیق اکبرؓ اس کے پاس گئے۔ کٹورا لیا۔ صاف کیا۔ بچہ کی اجازت سے اُس کی ایک بکری دوہی۔ دودھ بھرا کٹورا نبی رحمتؐ کی خدمت میں پیش کیا۔ آپؐ نے نوش جان فرمایا۔

اس طرح ایک گمنام بچے کو" بارگاہِ الٰہی میں اُس کے محبوبؐ کو دودھ پلانے کا تاریخی شرف نصیب ہوا۔ یہ صخرۃ الطویلہ آج بھی من وعن موجود ہے۔ اس کا محل وقوع جدہ کے قریب ہے۔ اس کی گھاٹیاں بڑی پر پیچ بھول بھلیاں ہیں جس کی وجہ سے عام مسافر یا قافلہ اس طرف کا رخ کر ہی نہیں سکتا۔ اس کی شکل اونٹ کی گردن کے مشابہ ہے۔



زمانۂ جہالت میں بنو کنانہ کا سعد نامی بت یہاں نصب تھا۔ ایک بدو اونٹ پر سوار ادھر سے آنکلا۔ اس کا اونٹ اس طویل چٹان کی سورت دیکھ کر بدکا۔ اعرابی نے کنکر اٹھا کر مارتے ہوئے یہ شعر پڑھے۔

اتینا الی سعد لیجمع شملنا فشتتنا سعد فلانحن من سعد

فھل سعد الاصخرۃ تی تنوفہ من الارض لایدعی لغی والارشد

یہاں سے عبداللہ بن اریقط وادی غران المعروف فی بلاد بنی سلیم کے جنوبی حصے (عام شاہراہ چھوڑ کر چلا) قافلہ بحیرہ احمر کا کنارہ لئے ہوئے جب قلعہ رابغ کے سامنے ریگزار میدان میں پہنچا تو بظاہر مختصر مگر حقیقت میں حاصل کائنات کا قافلہ ایک تعاقب کرنے والے کی زد میں آگیا۔ یہ متعاقب تھا "سراقہ بن مالک بن جشعم" تیر و تلوار سے لیس، گھوڑے پہ سوار

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالےٰ عنہٗ نے اسے اس طرف بڑھتے ہوئے دیکھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ڈھال بنتے ہوئے اس خطرے سے آگاہ کیا۔

لیکن پیارے اور سچے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے رخ منوّر پہ اطمینان تھا۔ نگاہوں میں سکون تھا — فرمایا "گھبراؤ مت اللہ ہمارے ساتھ ہے"

اس اثناء میں سراقہ نے تین بار حملہ کرنے کی کوشش کی۔ ایک بار گرا۔ دوسری بار۔ زمین میں دھنسا۔ تیسری بار پھر گستاخی کی تو پھر وہی حال ہوا۔ اب ہوش آیا تو معافی مانگی۔

جان کا دشمن — وہ بھی اتنا گھٹیا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ سرکار دو عالمؐ کے پاس نہ تلوار ہے نہ ڈھال۔ جان نثار ساتھی بھی مدافعت کے ہتھیاروں سے لیس نہیں ہے۔ پھر بھی دو سو اونٹوں کے لالچ میں حملہ آور رہا۔ لیکن کمالِ شفقت و مہربانی رؤف رحیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف معاف فرمایا۔ تحریر امان بخشی۔ بلکہ اس کے ہاتھوں میں شاہِ ایران کے بیش بہا کنگن پہننے کی بشارت بھی عطا فرمائی۔ جو عمر فاروقؓ کے زمانے میں سراقہ نے پہنے۔

سفر جاری رہا — ریگزار قدم بوسی کرتے رہے۔

(۴) وادی امج تک پہنچے — سفر اب بھی جاری ہے۔

(۵) وادی قدید بھی الوداعی سلام کہتے گزری

(۶) وادی خرار کی جانب عبداللہ بن اریقط — راستہ بتاتے ہوئے چل رہا تھا۔ پیاس اور بھوک محسوس ہوئی — قافلہ رکا۔ یہیں ایک بڑھیا عورت نے مسافروں کو پانی پلانے اور ستانے کے لئے خیمہ لگا رکھا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس سے سامانِ خورونوش قیمتاً حاصل کرنا چاہا۔ اس نے معذوری ظاہر کی "اتفاق کی بات نہ آج پانی تھا" نہ کھانے کی کوئی چیز۔ اس بڑھیا کا نام تھا "امّ معبد" خزاعیہ" قبیلہ کی اس بڑھیا کو کیا معلوم تھا آج اس کا مہمان کون ہے۔ آج کا مسافر کتنا عظیم ہے۔ وادی قدید کی حدیں ابھی ختم نہیں ہوئی تھیں۔ اس بڑھیا نے معذرت کی۔

ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالےٰ عنہٗ نے ایک بکری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ کیا اس بکری کا دودھ مل سکتا ہے۔

بڑھیا نے کہا۔ اس کے تھن سوکھ چکے ہیں۔ لاغر اور کمزور بکری میں دودھ کہاں؟
حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالےٰ عنہ خاموش ہوگئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا" ہمیں اجازت دو۔ ہم دودھ دوہ لیں گے
بڑھیا نے حیرانی سے کہا۔ تم ناکام کوشش کرکے دیکھ لو۔ اسے کیا معلوم تھا۔ سوال کرنے والی عظیم شخصیت علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دست مبارک خود خیر و برکت کا منبع ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تھن صاف فرما کر دودھ دوہنا شروع کیا تو اتنا دوہا کہ کٹورا بھر بھر کر ام معبد کو دیا۔

عبداللہ بن اریقط بھی سیراب ہوا۔

عامر بن فہیرہ نے بھی خوب پیاس بجھائی۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے بھی جی بھر کر پیا۔

خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی نوش جاں فرمایا۔

بڑھیا کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ اس پر تو جیسے سکتہ سا طاری ہوگیا ہو۔

ام معبد دل ہی دل میں سوچ رہی تھی۔ حیرت نے اس کے دل و دماغ اور رگ و ریشہ پہ پورا پورا قبضہ جما رکھا تھا۔ وہ کبھی رخ منور کو عقیدت کی نگاہوں سے دیکھتی، کبھی خیر و برکت والے ہاتھوں کو دیکھتی۔ غرض عجیب کیفیت تھی۔ وہ حیرت میں ڈوبی رہی اور خیر البشر علیہ الصلوٰۃ والسلام پھر سرگرم سفر ہوئے۔ شام تک بڑھیا پہ یہی کیفیت طاری رہی۔ جب شام کو اس کا شوہر لوٹا تو اس واقعہ کو سناتے ہوئے کبھی وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جمال کی تعریف کرتی تو کبھی آپ کی گفتار شیریں مقال کی تعریف، کبھی وجاہت جلال کی بات کرتی تو کبھی اخلاق جمیلہ بیان کرتی۔ بڑھاپے کی اس عمر تک اُسے جتنے اچھے سے اچھے لفظ ملے تھے وہ ختم کرنے کے باوجود آخر بولی۔ میں تو اس تعریف والے کی ذرا سی بھی تعریف نہیں کرسکی۔

شوہر نے بے ساختہ کہا۔ یہ تو وہی قریش کا گوہر بے بدل ہے۔ جوہر کل ہے۔ جس کے شرف نیاز کے لئے میں آج تک بے تاب ہوں۔

گویا —— ہر قدم پہ ابر رحمتؐ اپنی برکات پھیلاتے ہوئے سرگرم ہجرت تھے۔

جب وادی خرار سے آگے جحفہ کی سرحدوں سے ملتے ہوئے علاقہ میں رونق افروز ہوئے تو قبیلہ بنی سہم کے ۷۰ آدمیوں کے ساتھ ان کا ایک گھوڑ سوار سامنے آیا۔ آیا تو تھا ۱۰۰ سو اونٹوں کے لالچ میں لیکن رحمت عالم کی ایک نگاہ کرم افشاں نے اس کی جھولی دونوں جہانوں کی سعادتوں سے بھر دی۔ اور تھوڑی دیر پہلے جن نیزوں کی انی کو مقدس خون سے رنگنا چاہتا تھا۔ اب وہ اس پہ اپنی پگڑی کا علم بنائے آگے آگے چلتے ہوئے اپنے مسلمان ہونے اور عظمت دین قیم کا اعلان کرتے ہوئے چل رہا تھا" اس کا نام تھا بریدہ اسلمی"

راستوں کی نشاندہی کرنے والے عبداللہ بن اریقط نے اب ——

(۷) ثنیۃ المرۃ —— ہوتے ہوئے

(۸) لقف یا (لفت) ثنیۃ الغائر المعروف بہ دب الغائر کی طرف رخ کیا۔

(۹) وادی مدلجہ مجاح کے قریب پہنچا ہی تھا کہ ایک اور اونٹ سوار چہرے کو ڈھانپے ہوئے داسی لئے اس کو تاریخ میں (ابن الرواد) کہا گیا، بارگاہِ رسالتمآبؐ میں حاضر ہو کر مشرف باسلام ہوا۔

(۱۰) مرجح مجاح سے ہوتے ہوئے

(۱۱) الاجرد نقش پا ہوا۔

(۱۲) وادی تعہن (القاحہ اور سقیا کے درمیان) "جبل ثاقل" کے قریب سے گزرتے ہوئے۔

(۱۳) العبابید یا العبابیب کی منزلیں گذریں تو

(۱۴) القاحہ مدینہ منورہ سے تین شب و روز کی مسافت پر عبداللہ بن اریقط نے

(۱۵) العرج کا رخ اختیار کیا جو مدینہ منورہ سے ۱۲ فرسخ یعنی ۶۸ کلومیٹر ہے۔

یہیں پر دوران سفر دو غریب الوطن کا احوال امام احمد بن حنبلؒ نے مصعب بن عبداللہؓ کے حوالے سے ان کی زبانی یوں بیان کیا ہے۔ عبادل اور ابراہیم بن سعد کہتے ہیں۔ ہم دونوں پیدل جا رہے تھے۔ ہمارے ساتھ ایک کمسن بچی تھی۔ تھکن کے مارے ہم نڈھال ہو رہے تھے بچی کے لئے چلنا، اور ہمارے لیے اسے اٹھانا بہت مشکل ہو رہا تھا۔ اس اثناء میں ہمیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم ، اور ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ محو سفر ملے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری حالت دیکھ کر ہم سے نام پوچھا۔ ہم نے اپنی پریشانی بتاتے ہوئے عرض کیا۔ (نحن مھانان) ہم خدمت پیشہ غریب گھٹیا لوگوں میں سے ہیں۔

آپؐ نے فرمایا۔ نہیں "انتم المکرمان" "تم لوگ باعزت لوگ ہو"۔ اور ہماری منزل تک کے لئے ہمیں سوار کر لیا، اور کمسن بچی کو خود لے لیا۔ الصلوٰۃ والسلام علیہ۔

غرض نبی رحمتؐ ہر قدم ہر نفس یہاں کی بستی اور یہاں کے رہنے والوں کے لئے بارگاہ الٰہی سے خیر و برکت مانگتے ہوئے۔

(۱۶) ثنیۃ الغائر المعروف بدرب الغائر جلوہ فشاں ہوتے ہوئے مدینہ منورہ سے تین میل دور

(۱۷) وادی مریم میں داخل ہوئے۔ جہاں سر راہ شام سے لوٹتے ہوئے زبیرؓ زیارت سے مشرف ہوئے اور بہت سا قیمتی سامان اور لباس نذرانہ عقیدت پیش کیا اور روانہ ہو گئے۔

مریم کی وادی جبل عیر کی مشرقی جانب گھنے جنگل پر مشتمل تھی۔ جہاں اس وقت لومڑیاں اور دوسرے موذی جانوروں کا بسیرا تھا۔ اس کا ایک کنارہ وادی عقیق سے بغلگیر ہوتا ہے۔ اس کے جنوب کی طرف کھجوروں کے گھنے باغ اور لہلہاتے سبزہ کے کنارے کنارے شرف سفر بخشتے ہوئے بے حد و حساب موجودات کو عموماً اور انسان کو خصوصاً رحمت و محبت کی ٹھنڈک بخشنے والے نبی آخر زمان صلی اللہ علیہ وسلم قبا رکی طرف بڑھ رہے تھے۔ اتنا طویل اور انجانی راہوں کا سفر، ہر قدم پہ دشمنوں کی گھات کے خطروں سے مامون و محفوظ اپنی منزل مقصود پہ پہنچ کر جتنا انسان کو سکون پہنچتا ہے۔ اس سے کہیں زیادہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سکون تھا۔ عامر بن فہیرہ کو اطمینان تھا۔ اللہ کے اس احسان عظیم پہ بے حد حساب شکر بجالاتے ہوئے اپنے آقا محسن انسانیت علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ہر اس دعا پہ آمین کہہ رہے تھے جو کسی نئی بستی میں داخل ہونے سے پہلے نظر پڑتے ہی آپؐ پڑھا کرتے اور اپنی امت کو ایسا کرنے کی تلقین فرماتے۔

دعا۔ اللّٰھُمَّ بَارِکْ لَنَا فِیْھَا۔(تین بار) اے اللہ یہ بستی ہمارے لئے بابرکت بنا دے۔
اَللّٰھُمَّ اَرْزِقْنَا جَنَاھَا وَحَبِّبْنَا اِلٰی اَھْلِھَا۔ اے اللہ اس بستی کے پھل، فوائد سے ہمیں متمتع فرما۔ اس کے باشندوں کے دلوں میں ہماری محبت ڈال دے۔

وَحَبِّبْ صَالِحَ اَھْلِھَا اِلَیْنَا۔ اور ہمارے دلوں میں اُس کے نیک لوگوں کی محبت ڈال دے۔

جب سے مہاجرین اور انصار نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کا ذکر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی زبانی سنا تھا۔ ہر روز صبح و شام راہ تکتے اور پھر مایوس لوٹ جاتے۔

انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں محبت کرنے والوں سے کوئی پوچھے، انتظار میں کیا لذت اور کیا اذیت ہوتی ہے؟ انصار اور مہاجرین نے آنکھوں میں دن کاٹے راتیں گزاریں اور ٹھیک دوپہر کی چلچلاتی دھوپ

۱۲ ربیع الاوّل دوشنبہ کا دن جب ان کے محبوبؐ اللہ تعالےٰ کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم جلوہ افروز ہوئے تو اتفاق کی بات زیادہ تر انصار مایوس ہو کر مدینہ جا چکے تھے۔

سفید کپڑے زیب تن، چمکتا نورانی چہرہ — چہرہ بھی ایسا کہ اس جیسے خدوخال نہ کسی کو میّسر ہوئے، نہ قیامت تک ہوں گے۔

جوں ہی ایک یہودی کی نظر پڑی تو بے ساختہ پکارا۔

"یامعشر العرب ھذا اجدکم الذی تنتظرون"

اے عرب کے لوگو، یہی ہے تمہارا وہ بزرگ دیر ترجس کا تم شدت سے انتظار کر رہے تھے۔

(۱۸) وادی قباء — مدینہ منورہ کے جنوب کی طرف تین میل دور سے آواز نے لمحوں میں سفر کیا۔ اور انصار اور مہاجرین پروانوں کی طرح اڑ کر پہنچنے شروع ہوئے۔ فضا میں اللہ اکبر کی صدائیں گونجیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کھجور کے ایک درخت کے سایہ میں توقف فرمایا۔

احادیث صحیحہ سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہیں نماز ظہر ادا فرمائی۔

بعض انصار کو ابھی تک شرف زیارت نصیب نہیں ہوا تھا۔ اس لئے حضرت ابوبکر صدیقؓ اپنے آقا نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے سر مبارک پہ اپنی چادر کا سایہ تان کر کھڑے ہو گئے۔ انصار کے بچے، جوان، بوڑھے مرد اور عورتوں کے دل، دماغ، جسم اور زبانیں ہی نہیں بلکہ ان کی روحیں بھی والہانہ محبت، خلوص اور ادب بھری نگاہوں سے چہرۂ مبارک کا طواف کر رہی تھیں۔

سورج بالکل ڈھل گیا تو قباء کے ممتاز خاندانِ انصار کے ایک خوش نصیب انصاری کلثوم بن ہدم کو اپنے غریب خانہ میں شرف میزبانی نصیب ہوا۔ جہاں آپ سے پہلے کئی مہاجر ابوعبیدہؓ، مقدادؓ، خبابؓ، سہیلؓ، صفوانؓ، وہب بن سعدؓ، عیاشؓ، عبداللہؓ ابن مخرمہؓ، معمر بن ابی سرح اور عمیر بن عوفؓ قیام پذیر تھے۔

یہاں کتنے دن قیام رہا۔ مورخین نے اس سلسلہ میں ۴ دن اور ۱۴ دن کی میعاد کا ذکر کیا ہے۔ لیکن امام بخاری رحمتہ اللہ علیہ ۱۴ دن کی تصدیق کرتے ہیں۔ قیام کے درمیان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو سب سے پہلے کام سرانجام دیا۔ وہ نہ اپنا گھر تھا، نہ فوجی تشکیل تھی۔

تھی کوئی انجمن ۔ آپ نے سب سے پہلے اللہ کا گھر ۔۔ دار کلثوم بن ہدم کے ساتھ، وہ مسجد تعمیر کی جس کی عظمت اور تقدیس پہ خود اللہ تعالیٰ نے مہر تصدیق ان کلمات جلیلہ میں ثبت فرمائی لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ علی التقوی من اوّل یوماً۔

یوں تو ہجرت کے پہلے قدم سے لے کر آخری قدم تک ہر قدم ملّتِ اسلامیہ کی سیاسی، معاشی، اقتصادی، تاریخی، تہذیبی عمارت کے بنیادی پتھر کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن واضح اور ناقابل تردید "بنیاد" یہی مسجد ہے۔

مسجد قباء۔ تعمیر مسجد کے حوالے سے طبرانی روایت کرتے ہیں۔

ثم قال

یا اهل قباء

ائتونی باحجار من هذا الحرة

فجمعت عنده احجار کثیرة

ومعه عنزله له

فخط قبلتهم

فاخذ حجرا فوضعه

ثم قال یا ابو بکر خذ حجرا فضعه الی حجری

ثم قال یا عمر رضی اللہ عنہ

خذ حجرا فضعه الی جانب حجر ابو بکر رضی اللہ عنہ

ثم قال یا عثمان خذ حجرا

فضعه الی جنب حجر عمر رضی اللہ عنہ

ثم قال یا علی خذ حجرا

فضعه الی جنب عمر

ثم التفت الی الناس

لیضع کل رجل حجرة حیث احب علی ذلك الخط

پھر فرمایا

اے قبا کے لوگو!

پتھروں کے اس ڈھیر سے پتھر اٹھا کر لاؤ۔

سب نے آپ کے پاس بہت سے پتھر جمع کر دیئے۔

اس وقت آپ کے پاس (نیزہ نما) لکڑی تھی۔

آپ نے سمت قبلہ کی نشاندہی فرمائی۔

پھر سب سے پہلے خود ایک پتھر اٹھایا اور اسے تعمیر کے لئے رکھا۔

پھر ابو بکرؓ سے فرمایا۔ ایک پتھر اٹھا کر میرے پتھر کے برابر رکھو۔

پھر عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے فرمایا۔

ایک پتھر اٹھاؤ اور اسے ابو بکرؓ کے پتھر کے ساتھ رکھ دو۔

پھر حضرت عثمانؓ سے کہا۔ اے عثمانؓ تم بھی پتھر اٹھاؤ۔

اور اسے عمرؓ کے پتھر کے پہلو میں رکھ دو

پھر فرمایا۔ علیؓ تم بھی پتھر اٹھاؤ

اور اسے عمرؓ کے پتھر کے برابر میں رکھ دو۔

پھر تمام لوگوں سے متوجہ ہو کر فرمایا۔

تم سب ان خطوط پر جہاں چاہے پتھر رکھ دو۔

اس طرح یہ تقریب سعید تعمیر مسجد تمام ہوئی۔

۴ دن کے بعد قصواء پہ سوار تاجدار مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے دن صبح کی نماز کے بعد عازم مدینہ منورہ ہوئے۔ قصواء مدینہ منورہ کی شمالی سمت مدینہ منورہ کی طرف چلی تو جب ثنیۃ الوداع کے پاس پہنچی تو فضاؤں میں انصار عورتوں کے خوشی اور تشکر بھرے ترانے فضا میں گونجنے لگے۔

طلع البدر علینا من ثنیات الوداع

وجب الشکر علینا ما دعا للہ داع

اور چھوٹی چھوٹی بچیاں خوشی سے جھوم جھوم کر گا رہی تھیں۔

نحن جوار من بنی النجار یا حبذا محمد من جار

(۱۹) آپ مدینہ منورہ کی حدود میں اُس وقت پہنچے جب جمعہ کی نماز کا وقت ہو چکا تھا۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے جمعہ جہاں پڑھایا آج بھی وہاں مسجد جمعہ موجود ہے۔ نماز کے بعد روانگی ہوئی تو ہر انصاری کا دل چاہتا تھا شرف میزبانی اسے نصیب ہو۔ ہر شخص بلائیں لیتے ہوئے آگے بڑھتا اور جیسے قصواء کی التجا کر رہا ہو کہ یہیں رک جاؤ۔ تاکہ تاجدار مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کی میزبانی کا شرف مجھے مل جائے۔

مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے۔

"دعوها فانها مامورة" اسے چھوڑ دو — جہاں حکم ربی ہوگا۔ یہ خود بخود وہیں رکے گی"

چلتے چلتے بنی مالک بن نجار کے گھر کے سامنے بنی نجار کے دو یتیم بچوں کی جگہ کو چند لمحہ برکت نشست دی۔ پھر اٹھی، پھر چلی اور آخر کار بالکل قریب ہی ابو ایوب خالد بن زید انصاری کے گھر کے سامنے بیٹھ گئی گردن زمین پر بچھاتے ہوئے عرض کیا۔

"یہی منزل ہے آپ کی .... میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم۔

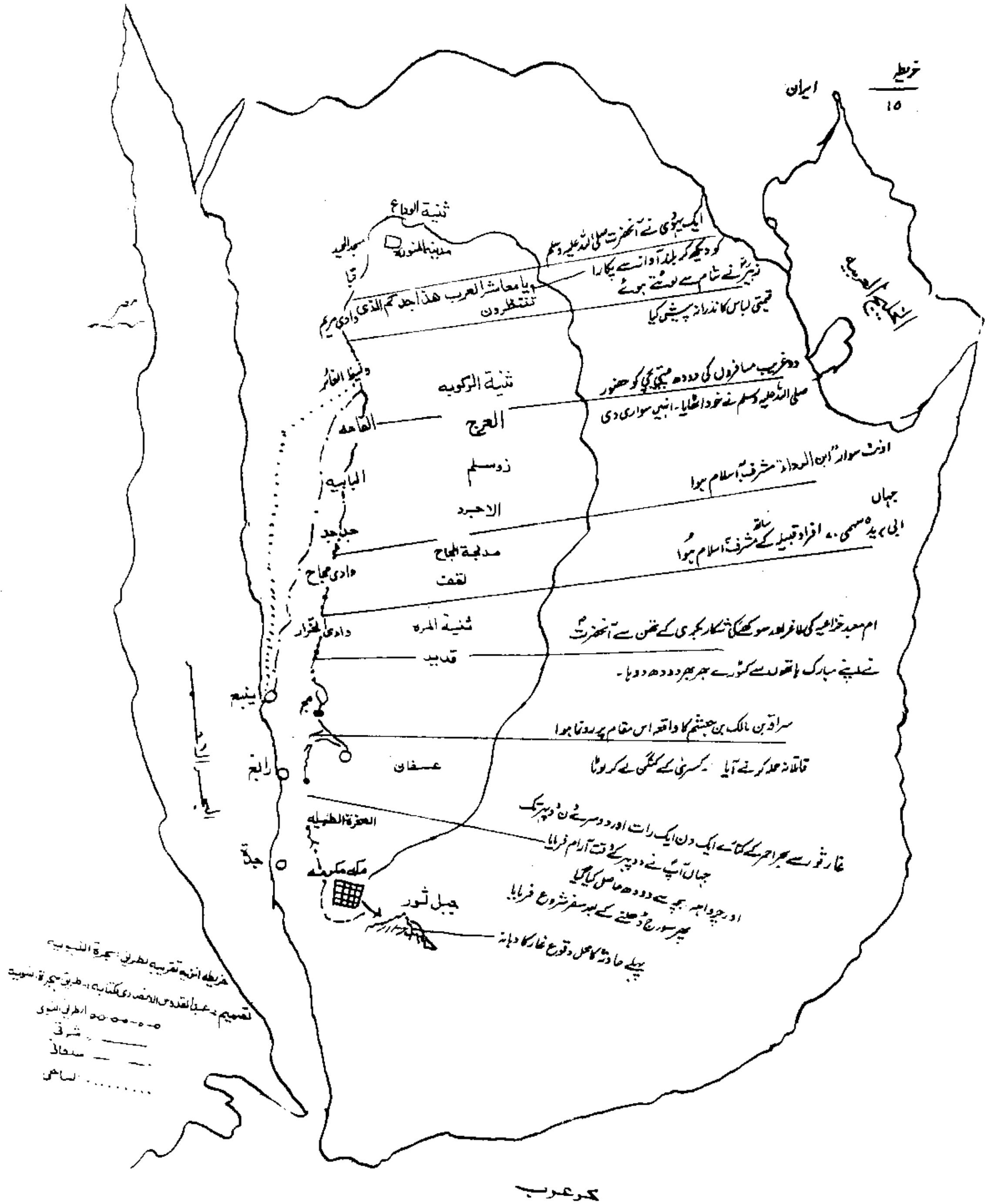
ہجرت کی آخری منزل مدینہ منورہ۔ جو اس سے پہلے دار یثرب کہلاتا تھا۔ آپؐ کی تشریف فرمائی کے بعد دار الرسول، دار الرحمت دار الایمان، دار الہجرت، مدینۃ الرسول، مدینہ منورہ، مضجع الرسول، مدینۃ المقدسہ، مدینۃ المقر، الناحیہ، النحر، العذراء، المختارہ المدخل صدق، المسکینۃ، المسلمۃ، المحرمۃ، المحفوظۃ، المحفوفۃ تقریباً ۹۹ دینی ناموں سے منسوب یہ دار ہجرت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خوابوں کی تعبیر۔

قد اریت دار هجرتکم اریت سبخة ذات نخل بین الابتین

میرے جان نثارو۔ میں نے خواب میں تمہارے دار ہجرت کو سرسبز و شاداب دیکھا ہے۔"

فہرست مراجع

۱ — القرآن الحکیم
۲ — تفسیر ابن کثیر
۳ — صحیح بخاری
۴ — سنن ترمذی
۵ — مسند امام احمد بن حنبلؒ
۶ — سیرۃ ابن اسحاق
۷ — سیرۃ ابن ہشام — از محمد بن سعد
۸ — الطبقات الکبریٰ — از ابی جعفر طبری
۹ — تاریخ طبری
۱۰ — دیوان حسان بن ثابت
۱۱ — معجم البلدان — از یاقوت الحموی
۱۲ — معجم الوسیط — از مجمع اللغۃ العربیہ مصریہ
۱۳ — جزیرۃ العرب — از ہمدانی
۱۴ — وفاء الوفا — از السمہودی
۱۵ — التوفیقات الالہامیہ فی مقابلۃ التاریخ الہجرہ — از محمد مختار پاشا
۱۶ — آثار مدینہ
۱۷ — تاریخ مدینہ دجدہ — از عبد القدوس انصاری
۱۸ — تاریخ بنو سلیم


خريطه
١٥
ايران
ثنية الوداع
مدينة المنورة
ثنية الركوبه
العرج
عسفان
ينبع
رابغ
جدة
جبل ثور
بحر عرب

خَلَقَ الْإِنْسَانَ ۙ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ۝

(اللہ نے) پیدا فرمایا انسان کو (اور) تعلیم دی اسے بیان کی

(الرحمٰن: ۳، ۴)

سرورِ کائنات ﷺ کی فصاحت و بلاغت



فصاحتِ نبویؐ

ڈاکٹر ظہور احمد اظہر

انبیاء کرام علیہم السلام کی تاریخ پر وسیع نظر ڈالنے سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ خطابت نبوت کے لوازمات میں ہمیشہ شامل رہی ہے۔ اور یہ منصب نبوت کا طبعی اور فطری تقاضا ہے۔ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس عہد اور جس قوم میں مبعوث ہوئے تھے۔ اس کا خاصہ ہی شعر وخطابت میں فصاحت و بلاغت تھی۔ اس لئے یہ بات بھی طبعی اور فطرتی تھی کہ نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کو فصاحت و بلاغت کے تمام خصائص لوازمات اور مظاہر پوری جامعیت وکمال کے ساتھ عطا کئے جاتے یہی وجہ ہے کہ نبی اُمّی افصح العرب صلی اللہ علیہ وسلم کو جو غیر فانی معجزہ عطا ہوا۔ وہ بھی فصاحت و بلاغت کے متعلق ہے۔ قرآن مجید پہلے بھی اور آج بھی اپنے لفظ ومعنی کے تمام خصائص و محاسن کے ساتھ عربوں اور تمام انسانیت کے لئے ایک کھلا چیلنج ہے اور رہے گا۔

فصاحت و بلاغت کا نبوت سے جو تعلق ہے اور انبیاء کرام علیہم السلام کے لئے خطابت کی جو اہمیت ہے وہ اس بات سے عیاں ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خطبہ حجۃ الوداع کے دوران بار بار اس لفظ کو دہرایا :- اَلَا هَلْ بَلَّغْتُ ؟ یعنی کیا میں نے بات کو واضح طور پر پہنچا دیا ہے ؟ ظاہر ہے پیغام حق کو واضح طور پر پہنچانا اور کھول کر بیان کرنا خطیب کے لئے ہی ممکن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کا منصب بھی یہی بیان فرمایا ہے[1] :

فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا عَلٰی رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ○

تو جان لو کہ ہمارے رسول کا منصب تو بات کو کھول کر واضح طور پر پہنچانا ہے۔

آپ کو حکم ربانی یہ تھا[2] :

"یٰٓاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ"

اے رسول! تیرے رب کی طرف سے جو کچھ تجھ پر نازل کیا گیا ہے۔ اسے واضح طور پر پہنچا دے۔ اور اگر تو نے ایسا نہ کیا تو گویا اس کے پیغام کو اچھی طرح نہیں پہنچایا!"

اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو منصب نبوت عطا فرمایا تو اس منصب کو نبھانے کے آداب بھی تلقین فرمائے۔ چنانچہ کہیں تو حکم ہوا کہ[3]

وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَّهُمْ فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًاۢ بَلِیْغًا۔

---

[1] المائدہ (۵/۹۲) [2] المائدہ (۵/۶۷) [3] النساء (۴/۶۳)

انہیں ایسا وعظ و نصیحت فرمایئے جو ان کے دلوں میں اتر جائے۔

بقول امام راغب اصفہانی قول بلیغ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ کلام بذاتہ فصیح و بلیغ ہو۔ جس کے لازمی اوصاف تین ہوتے ہیں
لغوی لحاظ سے کلام درست ہو۔
معنیٰ مقصود سے مطابقت رکھتا ہو۔
اور یہ کلام فی ذاتہ صحیح و صادق ہو۔

قول بلیغ کی دوسری قسم یہ ہے کہ بات کہنے والا بھی بلیغ ہو، اور مخاطب پر اس کا اثر بھی ہو تو کلام بلیغ کہلائے گا۔
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جس قول بلیغ کا حکم ہے۔ اس میں یہ ہر دو قسمیں شامل ہیں۔
داعیٔ حق کو جب دعوتِ اسلام کا منصب سپرد ہوا تو فصاحت و بلاغت کے ساتھ ساتھ حکمت و موعظت اور حسن استدلال کا بھی حکم ہوا۔

اُدْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ (۱۶-۱۲۵)

اے رسولؐ! اپنے رب کے رستے کی طرف دعوت دیجئے تو حکمت اور اچھے وعظ و نصیحت سے اور ان لوگوں سے اگر بحث و استدلال کی نوبت آئے تو احسن طریق سے استدلال فرمایئے!

فصاحت نبوی کے عناصر ترکیبی

اس پس منظر میں جاحظ کا یہ قول مناسب توجہ کا مقتضی ہے اور حقیقت حال کی تصویر بھی کہ[1]:-

وَالذین بعث فیهم اکثرما یعتمدون علیه البیان واللسان۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسی قوم میں مبعوث ہوئے تھے جس کے ہاں کمال کا معیار ہی بیان و بلاغت اور فصاحتِ لسانی تھی!

لیکن سرمایہ فصاحت و بلاغت کے ان قارونوں میں سے کسی کو نبی اُمّی صلی اللہ علیہ وسلم کی فصاحت و بلاغت کے بارے میں کبھی حرف گیری کا موقع نہ ملا۔ اس ضمن میں جاحظ کا یہ بیان ایک سند کی حیثیت رکھتا ہے[2]:-

لم یجد احدا من اعدائه شاهد هنالک طرقا من العجز، ولو کان ذلک من نیادم موت واحتیراد فی الملأ ولتناجرا به فی الخلاء ولتکلم به خصیهم ولقال فیه سلم ثم نقد عرف الناس کثرة خطبائهم وتسرع شعرائهم۔

آپؐ کے دشمنوں میں سے کسی کو آپؐ کی فصاحت و بلاغت میں کسی قسم کا عجز یا عیب نظر نہیں آیا تھا۔ اگر کوئی

---

[1] البیان والتبیین ۲/۲۸   [2] البیان والتبیین ۲/۲۸

ایسی بات دیکھنے یا سننے میں آئی ہوتی تو وہ لوگ مجالس میں اسے بطور دلیل پیش کرتے اور اپنی خلوت گاہوں میں اس کے متعلق سرگوشیاں کرتے۔ اس سلسلہ میں ان کے خطیب بات کرتے یا ان کے شعراء اس کا تذکرہ کئے بغیر نہ رہتے۔ کیونکہ دنیا کو معلوم تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں میں خطیب بھی بکثرت تھے اور ان کے شعراء تو ایسی باتوں میں بہت تیزی دکھایا کرتے تھے۔

افصح العرب نبی اُمّی صلی اللہ علیہ وسلم کی فصاحت اور خطیبانہ کمالات کے پس منظر میں متعدد عناصر کارفرما تھے۔ ان میں سے بعض کا تعلق ماحول سے ہے۔ اور بعض رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اور فیض ربانی سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن ان میں نمایاں تر فیض ربانی کا تھا؛ ارشاد ربانی ہے[1] کہ "اِنَّا کُلَّ شَیۡءٍ خَلَقۡنٰہُ بِقَدَرٍ۔ ہم ہی ہیں کہ ہر شئے کو اندازے سے پیدا کیا ہے"

اور بقول شاعر ؎

"ہر کسے را بہر کارے ساختند"

اور اِذَا اَرَادَ اللّٰہُ شَیْئًا ھَیَّأَ اَسْبَابَہٗ کہ جب اللہ تعالٰی کوئی کام انجام دینے کا ارادہ فرماتے ہیں تو اس کے لئے اسباب پیدا کر دیتے ہیں کہ وہی ذات مسبب الاسباب ہے۔ فصاحت نبوی کے لئے بھی خالق کون مکان نے چند در چند اسباب مہیا فرما دیئے تھے کہ انسانیت کی امامت آپؐ کے سپرد ہونے والی تھی۔ اور صحف سماویہ کا آخری نسخہ کیمیا آپؐ کے قلب اطہر اور زبان مقدس پر نازل ہونے والا تھا۔" قاضی عیاض اور بیہقی نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا[2] مَارَأَیْنَا الَّذِیْ ھُوَ اَفْصَحُ مِنْکَ ہم نے کہیں آپ سے بڑھ کر فصیح و بلیغ شخص کبھی نہیں دیکھا؟" آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا تھا۔

وَمَا یَمْنَعُنِیْ؟ وَاِنَّمَا اُنْزِلَ الْقُرْآنُ بِلِسَانِیْ لِسَانٍ عَرَبِیٍّ مُّبِیْنٍ، وَقَالَ مَرَّۃً اُخْرٰی:

اَنَا اَفْصَحُ الْعَرَبِ، بَیْدَ اَنِّیْ مِنْ قُرَیْشٍ وَنَشَأْتُ فِیْ بَنِیْ سَعْدٍ۔

میری فصاحت میں کیا چیز مانع آسکتی ہے؛ قرآن مجید میری زبان میں نازل ہوا جو لسانِ عربی مبین یا منجھی ہوئی عربی زبان ہے۔ پھر ایک اور موقع پر فرمایا:۔ میں افصح العرب ہوں مگر (اس پر مستزاد یہ ہے کہ) میں قبیلہ قریش سے تعلق رکھتا ہوں۔ اور میری نشوونما قبیلہ بنو سعد میں ہوئی ہے۔

طبرانی کے الفاظ یوں ہیں[3]

"اَنَا اَعْرَبُ الْعَرَبِ، وُلِدْتُّ فِیْ قُرَیْشٍ، وَنَشَأْتُ فِیْ بَنِیْ سَعْدٍ فَاَنّٰی یَأْتِیْنِیَ اللَّحْنُ"

میں تمام عربوں سے زیادہ کھول کر بات کرنے والا ہوں۔ میں قریش میں پیدا ہوا۔ میری پرورش بنو سعد میں ہوئی۔ تو اب میرے کلام میں لحن کہاں سے آئے؛ میری فصاحت و بلاغت میں نقص کہاں سے آئے۔

ایک موقع پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم دیکھتے ہیں کہ آپؐ تمام عرب

۱ے القمر ۵۴ / ۴۹ ۲ - الشفا ۱ / ۱۷۷ ۳ے علی ہامش الشفا ۱ / ۱۷۷

کے لہجے اور مقامی بولیاں سمجھ لیتے ہیں اور ہر قبیلے سے اس کی زبان میں گفتگو کرتے ہیں، یہ علم و ادب آپ کو کس طرح حاصل ہوا؟ آپؐ نے جواب میں فرمایا۔

اَدَّبَنِیْ رَبِّیْ فَاَحْسَنَ تَاْدِیْبِیْ!

میرے رب نے مجھے سلیقہ اور ادب سکھایا ہے اور میری خوب خوب تربیت فرمائی۔

ایک مرتبہ بلاد یمن کا ایک بدو حاضر ہوا، اور سوال کیا کہ آیا سفر میں روزہ رکھنا نیکی کا کام ہے۔ عربی مبین میں تو اسے یوں کہنا چاہیے تھا:- اَمِنَ الْبِرِّ الصِّیَامُ فِی السَّفَرِ! مگر اس کے قبائلی لہجے میں حرف تعریف الف لام کے بجائے الف میم تھا اَمْ بجائے اَلْ، چنانچہ کہنے لگا: اَمِنْ اَمْـبِرِّ اَمْصِیَامُ فِیْ اَمْسَفَرِ؟ تو آپ نے اسی کے لہجے میں جواب دیا:- نَعَمْ مِنَ اَمْـبِرِّ اَمْصِیَامُ فِی اَمْسَفَرِ! قبیلہ بنو سعد والے عین کو نون سے بدلتے تھے مثلاً اعطی کو انطی کہتے تھے۔ مُعْطِیْ کو منطی کہتے تھے۔ اس قبیلے کا ایک شخص عطیہ السعدی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے اسے اس کے قبیلے کی زبان اور لہجے میں نصیحت کرتے ہوئے فرمایا۔

مَا اَغْنَاكَ اللّٰهُ فَلَا تَسْـاَلِ النَّاسَ شَـيْئًا فَاِنَّ الْيَدَ الْعُلْيَا هِيَ الْمُنْطِيَـةُ وَالْيَـدَ السُّفْلٰى هِيَ الْمُنْطَـاةُ؛-

اگر اللہ تعالےٰ تجھے بے نیاز کر دے تو تو لوگوں سے کچھ بھی نہ مانگنا۔ کیونکہ اوپر والا ہاتھ عطا کرنے والا ہوتا ہے اور نچلا ہاتھ عطیہ لینے والا ہوتا ہے۔

اسی طرح لقیط بن عامر العامری آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور کچھ پوچھنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ تو آپؐ نے بنو عامر کے لہجے میں بات کرتے ہوئے اس سے فرمایا۔ سَلْ عَنْكَ جس کا عربی مبین میں مطلب ہے: اپنے آپ سے پوچھ۔ لیکن بنو عامر کا یہ محاورہ سَلْ مَا شِئْتَ:- جو پوچھنا چاہتا ہے پوچھ کی جگہ استعمال کیا جاتا ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں[۱]۔

كَانَ لَا يَسْـرُدُ الْكَلَامَ كَسَرْدِكُمْ هٰذَا كَانَ كَلَامُهٗ نَـزْرًا وَاَنْـتُمْ تَنْثُرُوْنَ الْكَلَامَ نَـثْرًا؛-

آپ کا کلام اس طرح نہ تھا جس طرح تم لوگ گفتگو کیا کرتے ہو۔ آپ بہت کم گو تھے۔ جب کہ تم اپنا کلام بکھیرتے رہتے ہو۔

آپؐ نے خود بھی ایک موقع پر فرمایا تھا[۲] کہ اِنَّا مَعْشَرَ الْاَنْبِيَاءِ بِكَاءٌ؛- ہم گروہ انبیاء کم گو ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اللہ تعالےٰ نے آپ کو جہیر الصوت اور شیریں آواز بنایا تھا۔ آپ کی آواز میں وہ شیرینی تھی کہ سننے والے ہمہ تن گوش ہو کر آپ کے خطبات میں محو ہو جایا کرتے تھے، اور بلند آواز اتنے تھے کہ دور دور تک بیٹھنے والے آپ کی آواز سنا کرتے تھے حضرت

---

[۱] احیاء علوم الدین ۲/۲۷۴ [۲] البیان والتبیین ۱/۳۰۴، ۲/۲۱

ام ہانی سے مروی ہے[1]

كُنَّا نَسْمَعُ قِرَاءَةَ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي جَوْفِ اللَّيْلِ عِنْدَ الْكَعْبَةِ وَأَنَا عَلَى عَرِيشِي۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آدھی رات کے وقت کعبہ کے پاس تلاوت فرماتے تھے اور ہم اپنی چھت پر آپ کی آواز سن لیا کرتے تھے۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں[2]

جَلَسَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ عَلَى الْمِنْبَرِ فَقَالَ لِلنَّاسِ:۔ اِجْلِسُوا فَسَمِعَهُ عَبْدُ اللهِ بْنُ رَوَاحَةَ وَهُوَ فِي بَنِي غَنْمٍ فَجَلَسَ فِي مَكَانِهِ۔

ایک دن جمعہ کو آپ منبر پر تشریف فرما ہوئے اور لوگوں سے کہا بیٹھ جاؤ! تو عبداللہ بن رواحہ آپ کی آواز سن کر اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ حالانکہ اس وقت بنو غنم کے علاقے میں تھے جو مسجد نبوی سے بہت فاصلے پر ہے۔

حضرت عبدالرحمن بن معاذ التمیمی روایت کرتے ہیں[3]

خَطَبَنَا رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمِنًى فَفَتَحَ اللهُ أَسْمَاعَنَا حَتَّى إِنْ كُنَّا لَنَسْمَعُ مَا يَقُولُ وَنَحْنُ فِي مَنَازِلِنَا۔

منیٰ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے سامنے خطبہ دیا تو اللہ تعالیٰ نے ہماری قوت سماعت بڑھا دی چنانچہ اپنے گھروں میں ہی آپ کی باتیں سنتے رہے۔

قاضی عیاض نے حضرت ام معبدؓ کا قول نقل کیا ہے جو آپ کے انداز بیان کی شیرینی اور بلند آواز کی کیفیت بیان کرتی ہیں[4]

حُلْوُ الْمَنْطِقِ فَصْلٌ لَا نَزْرٌ وَلَا هَذْرٌ كَأَنَّ مَنْطِقَهُ خَرَزَاتُ نُظِمْنَ، وَكَانَ جَهِيرَ الصَّوْتِ حَسَنَ النَّغْمَةِ

آپ کی زبان بڑی شیریں تھی، آپ ہر بات واضح طور پر بیان کرتے نہ قلیل الکلام تھے اور نہ کثیر الکلام تھے آپ کی گفتگو گویا موتی تھے جو لڑی میں پرو دیئے گئے ہوں۔ آپ کی آواز بہت بلند تھی۔ اور اس میں عمدہ نغمگی پائی جاتی تھی۔

قاضی عیاض فصاحتِ نبوی کا ایک جامع خاکہ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں[5]

---

[1] الخصائص الکبریٰ ۱/۶۶ [2] حوالہ سابق [3] حوالہ سابق [4] الشفا ۱/۱۶۸

[5] الشفا ۱/۱۶۸

فجمع له بذلك قوة عارضة البادية وجزالتها، ونصاعة ألفاظ الحاضرة ورونق كلامها إلى التأييد الإلهي الذي مدده الوحي الذي لا يحيط بعلمه بشري"

اس طرح (قریش میں پیدائش اور بنو سعد میں پرورش سے) آپؐ کی فصاحت و بلاغت میں صحرا نشینی کی قوت بیان و مقابلہ اور عمدہ لفظی اسلوب کے ساتھ شہری علاقے کے الفاظ کی چمک دمک اور انداز گفتگو کی رونق ایک ساتھ جمع ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ وہ تائید الٰہی بھی آپؐ کے شامل حال تھی جس کی امداد اس وحی ربانی سے ہوتی تھی جس کا احاطہ انسانی قدرت علم سے باہر ہے!

گذشتہ تفاصیل سے فصاحت نبوی کے جو عناصر ترکیبی نمایاں طور پر سامنے آتے ہیں۔ وہ چار ہیں۔ ان میں سے دو کا تعلق ماحول اور معاشرتی حالات سے ہے جبکہ دو عطیہ فطرت اور تائید الٰہی سے تعلق رکھتے ہیں۔

۱۔ قریشیت

رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کتب حدیث و سیرت کے علاوہ کتب ادب میں بکثرت نقل ہوا ہے۔ جس میں آپؐ فرماتے ہیںؐ "أنا أفصح العرب بيد أني من قريش۔ میں عربوں میں سب سے زیادہ فصیح ہوں۔ مگر میں قریش سے تعلق بھی رکھتا ہوں!" علمائے بلاغت و بدیع کے نزدیک اس جملے میں آپؐ نے اپنی فصاحت و بلاغت کا اظہار تو کیا ہی ہے۔ یہ جملہ بجائے خود علم بدیع کی ایک صنعت کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ (جسے مدح بما يشبه الذم:۔ مدح جو مذمت کے مشابہ نظر آتی ہے) میں عربوں میں سب سے زیادہ فصیح ہوں کے بعد بید (مگر)[۱] کا استعمال یہ شبہ ڈالتا ہے کہ مگر کے بعد والی بات آپؐ کی فصاحت میں کسی کمی کے اظہار کے لیے ہو گی۔ حالانکہ یہ تو پہلے والی بات سے بھی بڑھ کر آپؐ کی فصاحت و بلاغت کا ثبوت ہے کہ قریش سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ افصح العرب ہوتے اور قریش سے نہ ہوتے تو یہ بات ایک کمی کا باعث ہوتی کیونکہ قبیلہ قریش بحیثیت مجموعی لسانی فصاحت و بلاغت میں تمام عرب میں سب سے بلند مقام کا مالک تھا۔ ان کی زبان لسان عربی مبین' یعنی منجھی ہوئی عربی زبان میں نہ صرف قرآن کریم نازل ہوا۔ بلکہ تمام قبائل عرب کے خطباء و شعراء قریش کی سکہ بند زبان ہی کو اظہار کا قابل فخر ذریعہ تصور کرتے تھے۔ دور جاہلیت کے مشہور ترین مجموعہ قصائد "معلقات سبعہ" کے شعراء بھی اسی زبان میں شعر کہتے تھے۔ سوق عکاظ میں جمع ہونے والے خطباء اور شعراء کی بھی یہی زبان ہوتی تھی۔ تمام قبائل عرب قبیلہ قریش کی فصاحت و بلاغت کے سامنے سر تسلیم خم کرتے تھے۔ قریش کے باذوق لوگ شعرائے عرب کے کلام کے بارے میں جو رائے زنی کرتے تھے۔ اسے سند کی حیثیت حاصل ہوتی تھی۔ اس لئے رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ میں افصح العرب بھی ہوں اور قریش سے بھی تعلق رکھتا ہوں۔ آپؐ کی فصاحت و بلاغت کے انتہائی کمال کی طرف اشارہ ہے۔

طبرانی کی روایت کے مطابق اس ارشاد نبوی کے الفاظ یہ تھے۔ أنا أعرب العرب ولدت في قريش کہ میں

---

[۱] حوالہ سابق [۲] اس کا اصل مفہوم مزید براں یا انگریزی میں MOVROVER ہے۔

تمام عربوں میں سب سے عمدہ طریقے سے اظہار خیال پر قادر ہوں۔ اور میری پیدائش قبیلہ قریش میں ہوئی ہے۔ یہاں واضح طور پر اور عام فہم انداز میں آپؐ نے اپنی فصاحت و بلاغت کے عنصر اول یعنی قرشیت کی طرف اشارہ کر دیا ہے کہ قریش میں اور وہ بھی سادات بنی ہاشم میں آپؐ کی ولادت باسعادت افصح اللسان ہونے کی ضمانت ہے۔ جاحظ نے حضرت امیر معاویہؓ کے دربار کا ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ جس سے قبیلہ قریش کی فصاحت و بلاغت کا اندازہ ہوتا ہے۔ جاحظ لکھتا ہے۔

"وَقَالَ مُعَاوِيَةُ يَوْمًا: مَنْ أَفْصَحُ الْعَرَبِ؟ فَقَالَ قَائِلٌ: قَوْمٌ اِرْتَفَعُوا عَنْ لَخْلَخَانِيَّةِ الْفُرَاتِ وَتَيَامَنُوا عَنْ عَنْعَنَةِ تَمِيمٍ وَتَيَاسَرُوا عَنْ كَسْكَسَةِ بَكْرٍ، لَيْسَتْ لَهُمْ غَمْغَمَةُ قُضَاعَةَ وَلَا طُمْطُمَانِيَّةُ حِمْيَرَ، قَالَ مَنْ هُمْ؟ قَالَ قُرَيْشٌ."

معاویہؓ نے ایک دن سوال کیا۔ افصح العرب کون لوگ ہیں؟ تو کسی کہنے والے نے کہا، ایک ایسی قوم ہے جو اہل فرات (عراق) کے لخلخانیہ (گفتار کا عجمی انداز) سے بلند تر ہے۔ قبیلہ تمیم کے عنعنہ (ان میں الف کو عین سے بدلنا) سے دائیں طرف رہے اور بنو بکر کے کسکسہ (کاف کو سین سے بدلنا جیسے اَنْکَ سے (اِنْس) سے بائیں طرف رہے، نہ تو ان میں بنو قضاعہ کا غمغمہ (غیر واضح انداز گفتگو) تھا اور نہ قوم حمیر کا طمطمانیہ (غیر عربی الفاظ کی کثرت ہونا تھا) حضرت معاویہؓ نے فرمایا: تو یہ کون لوگ ہوئے: اس نے کہا: یہ قریش ہی تو ہیں! تو قریش کی یہ فصاحت آپ کو ورثے میں ملی؛

۲ ۔ بنو سعد اور دیگر قبائل کا ماحول

علمائے لغت و ادب کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فصاحت و بلاغت کا دوسرا سبب یہ تھا کہ اللہ تعالے نے لسان نبوت کو پاکیزہ اسلوب بیان اور شستہ انداز کلام سے مزین کرنے کے لئے آپؐ کی تربیت کا بندوبست قبیلہ بنی سعد میں فرمایا تھا۔ یہ بنو سعد بن بکر بن ہوازن عرب کے بدوی قبائل میں سب سے زیادہ فصیح اللسان تھے اور قریش کے شرفاء و سادات اپنے بچوں کی رضاعت اور پرورش کا بندوبست عموماً اسی قبیلے میں کرتے تھے۔ یہاں آپؐ نے حضرت حلیمہ سعدیہؓ کی گود میں پرورش پائی۔ اسی لئے آپ کے اس ارشاد میں جس کی تشریح اوپر گذری ہے۔ ان الفاظ کا اضافہ بھی ملتا ہے کہ "وَنَشَأْتُ فِي بَنِي سَعْدٍ" میری پرورش قبیلہ بنو سعد میں ہوئی ہے۔ طبرانی کے الفاظ میں۔

أَنَا أَعْرَبُ الْعَرَبِ وُلِدْتُ فِي قُرَيْشٍ وَنَشَأْتُ فِي بَنِي سَعْدٍ فَأَنَّى يَأْتِينِي اللَّحْنُ

میں عربوں میں سب سے بہتر اظہار خیال پر قادر ہوں، میری پیدائش قریش میں ہوئی اور میری پرورش بنو سعد میں ہوئی۔ تو اب میرے کلام میں لحن کہاں سے آتی؟

لہ البیان والتبیین ۳/۲۱۲۔ الروض الانف ۱/۱۰۹، جمہرۃ انساب العرب ص ۲۶۵

بنو سعد کے علاوہ آپ کے ننھیال بنو زہرہ اور آپ کے سسرال بنو اسد کی فصاحت و بلاغت بھی مسلم تھی۔ ان کا بھی آپ کی تربیت اور اسلوب کلام پر اثر پڑا۔ بنو اسد کی فصاحت کا اگر نمونہ دیکھنا ہو تو آپ کی زوجہ مطہرہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ان الفاظ پر غور فرمایئے۔ جو انہوں نے اپنے عظیم شوہر کی ذات کے بارے میں فرمائے تھے کہ:۔

کَلَّا لَا یُخْزِیْکَ اللّٰہُ اَبَدًا! اِنَّکَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ وَتَقْرِی الضَّیْفَ وَتَکْسِبُ الْمَعْدُوْمَ وَتَحْمِلُ الْکَلَّ۔

۳۔ قرآن کریم

قرآن مجید کے بارے میں ہمارا تو غیر متزلزل ایمان ہے کہ یہ اللہ کا آخری پیغام ہے جو نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم پر تمام انسانیت کی ہدایت کے لئے نازل ہوا۔ یہی نہیں بلکہ یہ تو نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کا زندۂ جاوید معجزہ ہے۔ جس کے چیلنج کا جواب گذشتہ چودہ صدیوں کے دوران دنیا نہیں دے سکی۔ اور کبھی نہیں دے سکے گی۔ قرآن مجید کا لفظی اسلوب بیان بھی ایک معجزہ ہے اور اس کی مختصر سے مختصر آیت میں معانی و مفاہیم کا جو بحر بیکراں موجود ہے وہ بھی ایک معجزہ ہے۔ گویا کتاب اللہ کے لفظی اور معنوی دونوں قسم کے محاسن اعجاز نبوت محمدی کی شہادت ہیں۔

فصاحت و بلاغت قرآنی تو ایک ایسا معجزہ ہے جس کے سامنے ہر عہد کے عرب فصحاء و بلغاء مسلم و غیر مسلم سر تسلیم خم کرتے رہے ہیں۔ بلکہ خطیب کے کلام کی زینت اور ادیب کی انشاء پردازی کی رونق آیات قرآنی کے اقتباس و استعمال پر موقوف سمجھی جاتی رہی ہے۔ جاحظ کہتا ہے[1]

"وَکَانُوا یَسْتَحْسِنُوْنَ اَنْ یَکُوْنَ فِی الْخُطَبِ یَوْمَ الْحَفْلِ وَفِی الْکَلَامِ یَوْمَ الْجَمْعِ آیٌ مِنَ الْقُرْآنِ فَاِنَّ ذٰلِکَ مِمَّا یُوْرِثُ الْکَلَامَ الْبَهَاءَ وَالْوَقَارَ وَالرِّقَّةَ وَسَلَسَ الْمَوْقَعِ:۔

عرب خطباء اس بات کو مستحسن تصور کرتے تھے کہ اجتماعات و محافل میں خطیب کے کلام میں قرآنی آیات ہوں۔ کیونکہ اس سے کلام میں رونق، وقار، نزاکت اور حسن تاثیر کی صورت پیدا ہوتی ہے۔

عمران بن حطان الخارجی عرب کے ان خطباء میں سے تھا۔ جو شعر پر بھی قدرت رکھتے تھے۔ وہ کہتا ہے کہ میں نے عبید اللہ بن زیاد کے ہاں سب سے پہلا خطبہ دیا۔ تو لوگوں نے اسے بہت پسند کیا۔ اس موقع پر میرے والد اور چچا بھی موجود تھے۔ پھر اس کے بعد جب میرا گزر عربوں کی ایک محفل پر ہوا۔ تو ایک بزرگ عرب کہہ رہا تھا[2]

هٰذَا الْفَتٰی اَخْطَبُ الْعَرَبِ لَوْ کَانَ فِیْ خُطْبَتِهٖ شَیْءٌ مِنَ الْقُرْآنِ۔

اگر اس نوجوان کے خطبے میں قرآن مجید کی کوئی آیت ہوتی تو یہ عرب کا سب سے بڑا خطیب ہوتا گویا قرآن مجید

[1] البیان والتبیین ۱/ ۱۱۸ [2] الشفا ۱/ ۱۷۸، الروض الانف ۱/ ۱۰۹

کی آیات و اقتباسات سے خطیب کے کلام کا خالی ہوتا ایک بہت بڑا عیب تھا۔ اسی لئے تو ایسے خطبے کو عرب اَشَنْوھَاءُ (بھدا) خطبہ قرار دیتے تھے

اگر کوئی معمولی عرب آیات قرآنی اور اقتباسات رحمانی حفظ کر لے اور اپنے کلام میں ان کا استعمال شروع کر دے تو اس کا انداز خطابت فصاحت و بلاغت کا رنگ اختیار کر لیتا ہے اور اس کے اسلوب بیان میں رونق و چاشنی پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر عام اور معمولی عرب کی یہ حالت ہو سکتی ہے تو وہ ذات اقدس جو مہبط وحی تھی جس کا قلب اطہر اور زبان شیریں کما ینطق عن الھویٰ کے ضمن میں آتی تھی۔ اس پر قرآن مجید کی معجزانہ فصاحت و بلاغت کے اثرات کی کیا حد ہو گی۔ یہی تو وجہ ہے کہ خطابات نبوی فصاحت و بلاغت میں بے مثال تھی۔ اور اسی لئے تو آپ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اس سوال کے جواب میں کہ میں نے عرب میں آپ سے بڑھ کر کوئی فصیح شخص نہیں دیکھا۔ فرمایا تھا۔

وَمَا یمنعنی؟ وانما انزل القرآن بلسانی لسان عربی مبین

تو اس میں مجھے کیا چیز مانع آ سکتی ہے؟ آخر قرآن کریم بھی تو میری زبان پر ہی نازل ہوا ہے جو لسان عربی مبین یعنی عرب کی صاف ستھری اور منجھی ہوئی ترقی یافتہ زبان ہے۔

۴۔ فطرت محمدی کا عطیۂ ربانی

کون و مکان کے خالق کی سنت یہ ہے کہ وہ ظرف کے مطابق مظروف عطا کرتا ہے۔ اس نے جس سے کچھ کام لینا ہوتا ہے۔ اس میں اس کی صلاحیت خود ودیعت کرتا ہے۔ وہ جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے لئے اسباب بھی خود پیدا کرتا ہے۔ وہ ہمیشہ نبوت و رسالت کے منصب کے لئے اپنے بندوں کو چنتا رہا ہے۔ کبھی آدمؑ کو، کبھی نوحؑ کو، کبھی آل ابراہیم کو، اور کبھی آل عمران کو منتخب کرتا رہا ہے۔ ظاہر ہے جب سب سے بڑی اور آخری ذمہ داری سونپنے کا وقت آیا تو اس کے لئے جس ذات کو چنا ہو گا اس میں ان تمام صلاحیتوں کو ودیعت کر دیا ہو گا جو اس ذمہ داری کا تقاضہ کرتی ہیں۔

سنت اللہ یہ رہی ہے کہ جس دور میں جس چیز کا زور ہوتا تھا۔ اسی کے متعلق انبیاء کو معجزہ عطا ہوتا تھا۔ حضرت موسےٰ کے عہد میں ساحری کا چرچا تھا۔ چنانچہ ید بیضا اور عصائے موسوی اس کا جواب تھا جس نے سب کو لاجواب کر دیا تھا۔ مسیحؑ کا عہد طب و حکمت کا عہد تھا۔ چنانچہ آپ کو بھی اعجاز مسیحائی عطا ہوا۔ لیکن فصاحت و بلاغت کے رسیا عربوں میں قرآن کریم کے اعجاز سے کام لیا گیا۔ اس لئے صاحب قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اطہر اور زبانِ قدس کو فصاحت و بلاغت کے تمام لوازمات کمال سے نوازا گیا۔ آپؐ کی فطرت و سرشت میں خطابت کا ملکہ اور جوامع الکلم کا کمال ودیعت کر دیا گیا۔ قدرت ربانی نے فطرت محمدی کو اپنی چشم بینا کے سامنے محفوظ و مامون رکھا فانک باعیننا کی بشارت کا مقصد یہی تو ہے! لالہ کی حنا بندی قدرت کا اپنا منصب ہے چنانچہ جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا تھا کہ

لقد طفت فی العرب وسمعت فصحاء ھم فما سمعت انصح منک فمن ادبک؟ قال

ادّبنی ربی فاحسن تادیبی :۔

یارسول اللہ! میں تمام عرب میں پھرا ہوں۔ ان کے فصیح و بلیغ خطباء کو سنا ہے۔ مگر آپؐ سے بڑا فصیح و بلیغ میں نے نہیں دیکھا، تو آپؐ کو یہ ادب کس نے سکھایا؟ آپؐ نے جواب میں فرمایا تھا کہ مجھے تو میرے رب نے ادب سکھایا ہے اور کیا خوب ادب سکھایا ہے!۔

تو یہ تھے فصاحت نبوی کے عناصر ترکیبی! اور جیسا کہ شروع میں عرض کیا جا چکا ہے۔ ان تمام عناصر میں قوی ترین یہی آخری عنصر تھا کہ یہ اللہ کا عطیہ تھا جس کے فیضان نے زبان نبوت کو پاکیزگی، طہارت اور شائستگی کے ساتھ ساتھ فصاحت و بلاغت کے تمام اعلیٰ اوصاف سے نوازا تھا۔ ورنہ ماحول کوئی چیز نہیں ہوتی! اگر قدرت کا عطیہ نہ ہو تو قریش و سعد کی فصاحت و بلاغت کا ماحول کوئی کمال پیدا نہیں کر سکتا! یہ کمال تو ازل سے فطرت محمدی میں قدرت کے دست اعجاز نے ودیعت کر دیا تھا۔

فصاحت و بلاغت کا نظریہ نبوی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم افصح العرب تھے۔ بے مثال خطیب تھے۔ اور آپؐ کی فصاحت و بلاغت اور اسلوب خطابت ایک نمونہ بنا۔ اس کے ساتھ ساتھ آپؐ سے جو ارشادات منقول ہیں۔ انہیں یک جا کر کے فن خطابت اور فصاحت و بلاغت کے متعلق ایک نقطۂ نظر بھی قائم کیا جا سکتا ہے۔ جسے ہم فن خطابت اور فصاحت و بلاغت کے نظریہ نبوی کا نام دے سکتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ تھا کہ آپ انداز کلام اور اسلوب خطابت میں ہمیشہ اعتدال و میانہ روی اختیار فرماتے تھے۔ حسب موقع اور بقدر ضرورت گفتگو فرماتے۔ جب تقریر فرماتے تو نہایت موزوں الفاظ اور جچا تلا مگر پر اثر انداز اختیار فرماتے۔ بات ختم کر چکتے تو سامعین کی تشنگی باقی نہیں رہتی تھی۔ آپ کے خطبات اکثر مختصر مگر جامع ہوتے تھے۔ البتہ اگر کوئی اہم اور بڑا اہم موقع ہوتا تو آپؐ اپنے خطبات کو طول بھی دیتے تھے۔ مگر یہ طول بیزاری کا باعث ہرگز نہ بنتا اور نہ کوئی بات حشو و زوائد میں شمار کی جا سکتی تھی۔

فصاحت و بلاغت اور فن خطابت کے متعلق آپؐ کے جو اقوال و ارشادات ملتے ہیں۔ وہ بھی آپؐ کے اسی عمل کی تفسیر ہیں۔ آپؐ کثرت کلام اور بسیار گوئی پن سے ہمیشہ اجتناب فرماتے تھے اور آپ کا ارشاد بھی یہی تھا کہ انا معشر الانبیاء بکاءٌ: ہم گروہ انبیاء کثرت کلام سے اجتناب کرنے والے اور کم گو ہوتے ہیں۔ آپؐ ہمیشہ موقع و محل کی مناسبت سے بات کہتے تھے اور آپؐ کا ارشاد بھی یہی ہے کہ

اِنَّا اُمِرْنَا مَعْشَرَ الْاَنْبِیَاءِ اَنْ نُکَلِّمَ النَّاسَ عَلٰی مَقَادِیْرِ عُقُوْلِهِمْ!

ہم گروہ انبیاء کو حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے ان کی ذہنی سطح کے مطابق بات کیا کریں۔

آپ اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی ہمیشہ یہی تلقین فرمایا کرتے تھے کہ کلّموا النّاس علیٰ قدرِ عقولِھم لوگوں سے ان کی ذہنی سطح کے مطابق گفتگو کیا کرو۔

فصاحت و بلاغت کی خوبی کو آپؐ انسانیت کا زیور قرار دیتے تھے۔ چنانچہ آپ کا ایک قول جاحظ، ابن قتیبہ اور قدامہ بن جعفر کے علاوہ اور علماء نے بھی نقل کیا ہے کہ[1]

"وسالہ العباس: فیم الجمال یا رسول اللہ! فقال:۔ فی اللسان

حضرت عباسؓ نے آپؐ سے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! حسن و جمال کا دارومدار کس چیز پر ہے؟

تو آپ نے فرمایا تھا۔ زبان پر!

جاحظ نے ابوالحسن المدائنی کی روایت سے بیان کیا ہے کہ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ نے ایک موقع پر تقریر کی اور بہت اختصار سے کام لیا۔ لوگوں نے عرض کیا کہ اگر آپ کچھ مزید ارشاد فرماتے تو کیا ہی اچھا ہوتا!

حضرت عمارؓ نے فرمایا[2]

"امرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باطالۃ الصلوٰۃ وقصر الخطب:۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم دیا ہے کہ نماز کو طول دیا کریں اور خطبات کو مختصر کیا کریں۔ کسی مجبور کی ترجمانی کے لئے گفتگو کرنے کو آپؐ نے صدقہ قرار دیا ہے[3]۔

"فضلُ لِسانِکَ تعبّرُ بِہٖ عن اخیکَ الّذی لا لِسانَ لہٗ صدقۃٌ

اگر تم اپنی فاضل قوت گویائی اپنے کسی ایسے بھائی کی ترجمانی میں صرف کردو۔ جو اظہار و بیان پر قادر نہ ہو تو یہ بھی صدقہ ہے۔"

اس کے برعکس کاہنوں کی سی مسجع و مقفیٰ لفاظی، زبان درازی، باچھیں کھول کر اور گلا پھاڑ کر تقریر کرنا، تکلف اور تصنع سے کام لینا بات کا بتنگڑ بنانا۔ آپؐ کو ہرگز پسند نہ تھا۔ ایک موقع پر آپ نے ارشاد فرمایا[4]

"اِنّ اللہ یبغض البلیغ الّذی یتخلّل بلسانہٖ تخلّل الباقرۃ بلسانھا۔

اللہ تعالیٰ کو وہ فصیح و بلیغ خطیب ناپسند ہے۔ جو اپنی زبان سے یوں چرتا ہے۔ جس طرح گائے چرتی ہے۔"

---

[1] ۔ نقد النثر ص ۹۱، البیان ۱۷۰، عیون الاخبار

[2] ۔ البیان ۱/۲۰۳ نقد النثر ص ۹۱

[3] البیان ۱/۲۵۸ [4] ۔ البیان ۱/۱۹۴

ابن الاعرابی نے اپنے بعض شیوخ سے نقل کیا ہے کہ ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں گفتگو کی تو دورانِ گفتگو احمقانہ اور بیہودہ باتیں کرتا چلا گیا۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا[1]

مَا اعطی العبدُ شرًّا مِنْ طلاقۃِ اللِّسانِ :۔

"انسان کو زبان کی تیزی سے بڑھ کر کوئی بری چیز نہیں دی گئی!"

ایک موقع پر کسی شخص نے آپ سے سوال دریافت کیا تو مسجع اور مقفی الفاظ میں بات شروع کر دی۔ آپ نے اسے سختی سے منع فرمایا۔ چنانچہ جاحظ اس واقعہ کو اپنے الفاظ میں یوں نقل کرتا ہے[2]

"یا رسولَ اللہ! أرأیت من لا شرب ولا أکل ولا صاح واستہل الیس مثل ذلک یُطَلّ؟ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم :۔ أسجعٌ کسجعِ الجاھلیۃِ :۔

اے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کیا آپ نے ایسے شخص کو دیکھا ہے جس نے نہ کھایا نہ پیا، نہ چلایا یا بس حرکت کی۔ تو کیا ایسے شخص کی بھی دیت لی جائے گی؟ (یعنی جنین یا نامکمل بچہ ضائع کرنے پر دیت ہے یا نہیں) کہ آپ نے جواب دینے کے بجائے اس کی سجع و قافیہ والی عبارت کو ناپسند فرمایا! اور کہا : کیا تم زمانہ جاہلیت کے کاہنوں کی سی مسجع عبارت میں بات کرتے ہو"

ارشاد نبوی یہ ہے کہ انسان پر بیشتر آفات زبان کی بدولت آتی ہیں۔ حتی کہ سب سے بڑی آفت یعنی جہنم میں داخل ہونا بھی زبان درازی کا نتیجہ ہوگا۔ آپ فرماتے ہیں[3]

"وھل یکبُّ الناسَ علی مَناخِرِھِم فی نار جھنم الا حصائدُ السنتھم :۔

کیا انسانوں کو ناک کے بل جہنم میں گرانے والا عمل ان کی زبانوں کے نتائج کے سوا کوئی اور بھی ہو سکتا ہے؟"

فصاحت و بلاغت کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نقطہ نظر جاحظ کے اس بیان سے زیادہ واضح ہو جاتا ہے[4]

"وما شک أنّہ علیہ السلام قد نھی عن المراءِ وعن التزید والتکلف وعن کل ما ضارع الریاء والسمعۃ والنفج والبذخ وعن التھاتر والتشاغب وعن المماتنۃ والمغالبۃ، فأما نفس البیان فکیف ینھی عنہ

ہمیں اس بات میں تو کوئی شبہ نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ریاکاری، تکلف سے تیاری کرنے اور ہر اس چیز سے منع فرمایا ہے جو دکھلاوے، شہرت حاصل کرنے، تکبر اور بڑائی دکھانے کے مشابہ ہو۔ اسی طرح ایک دوسرے کو جھٹلانے، جھگڑنے، مقابلہ کرنے اور ایک دوسرے پر غالب آنے کے لئے خطابت کو استعمال

---

[1] البیان ۱/۱۹۴ [2] البیان ۱/۲۸۷ نقد النثر ص ۹۱

[3] البیان ۱/۱۹۴ [4] البیان ۱/۲۷۲

کرنے سے منع فرمایا ہے، مگر جہاں تک نفس بیان و بلاغت کا تعلق ہے تو بھلا اس سے آپ کس طرح منع فرماتے ؟!"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فصحاء و بلغاء کی راست گوئی اور اپنی کوتاہی کا اعتراف بہت پسند تھا حتیٰ کہ ناراضگی خوشنودی میں بدل جاتی تھی۔ اور مقرر کی داد دیئے بغیر نہیں رہتے تھے۔ اس سلسلہ میں عمرو بن الاہتم اور زبرقان بن بدر کا واقعہ بطور شہادت کافی ہوگا۔ جو اس طرح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرو بن اہتم سے زبرقان بن بدر کے بارے میں پوچھا تو وہ کہنے لگا۔ مَانِعٌ لِحَوْزَتِهِ، مُطَاعٌ فِی اَدْنِیْہِ: کہ وہ اپنا مال دینے میں بخیل اور کنبہ پرور ہے۔ زبرقان نے یہ سن کر کہا کہ اس نے میرے بارے میں جو کچھ کہا ہے۔ اس سے کہیں زیادہ میرے متعلق جانتا ہے۔ مگر اسے میرے شرف و نسب پر حسد آگیا ہے۔ اس پر عمرو بن اہتم نے کہا۔

اما لئن قال ما قال فواللہ ما علمته إلا ضيق الصدر زمر المروة لئيم الخال حديث الغنى۔

تو اگر یہ اس طرح کہتا ہے تو پھر خدا کی قسم میں تو اس کے بارے میں سوائے اس کے اور کچھ نہیں جانتا کہ یہ تنگ سینے والا، بے مروت انسان ہے۔ ماموں کے ساتھ بخل کرنے والا ہے اور نو دولتیا ہے۔"

مگر عمرو کو یہ احساس ہو گیا کہ وہ پہلے تو اسے کنبہ پرور کہہ چکا ہے۔ اور اب اسے ماموں کے ساتھ بخل کرنے والا کہہ رہا ہے۔ جو پہلے قول کی تردید ہے۔ اور ساتھ ہی اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہوں میں ناپسندیدگی کے آثار بھی نظر آنے لگے تو فوراً بول اٹھا۔

یارسول اللہ! رَضِیْتُ فقلت احسن ما علمتُ وَغَضِبْتُ فقلت اقبح ما علمت وما كذبت فى الاولى ولقد صدقت فى الآخرة، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم عند ذلك: انّ من البيان لسحرا۔

اے اللہ کے رسول! میں خوشی کی حالت میں تھا تو اپنی معلومات کی بنیاد پر بہترین بات کہہ گیا۔ اور جب غصے کی حالت طاری ہوئی تو اپنی معلومات میں سے بدترین بات کہہ ڈالی، ورنہ پہلی بار بھی جھوٹ نہیں بولا! اور دوسری مرتبہ بھی سچ ہی بولا ہے۔؟

اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔ بلاشبہ بعض اوقات خطابت بھی جادو کا کام کرتی ہے:"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ خیر الامور اوسطھا کہ میانہ روی بہترین بات ہے۔ فصاحت و بلاغت اور فن خطابت کے متعلق بھی آپ کا معمول اور نقطۂ نظر یہی تھا۔ آپ کی طرف ایک قول منسوب کیا جاتا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ بیہودہ گوئی اور خطابت۔ نفاق کے شعبے ہیں، جبکہ حیا اور بات نہ کر سکنا۔ ایمان کے دو شعبے ہیں۔ جاحظ اس قول کی تشریح کرتے ہوئے لکھتا ہے:

لے البیان ۱/۵۳ ۔ ۲ے البیان ۱/۲۰۲

"وقد زعمتم ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال شعبتان من شعب النفاق البذاء والبیان وشعبتان من شعب الایمان الحیاء والعی، ونحن نعوذ باللّٰہ ان یکون القرآن یحث علی البیان ورسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یحث علی العی ونعوذ باللّٰہ ان یجمع رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم بین البذاء والبیان، وانما وقع النھی علی کل شیء تجاوز عن المقدار فالعی مذموم والخطل مذموم ودین اللّٰہ تبارک وتعالیٰ بین المقصر والغالی۔"

"اے شعوبیو! تم نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نفاق کے شعبوں میں سے دو شعبے یاوہ گوئی اور خطابت ہے۔ اور ایمان کے شعبوں میں سے دو شعبے ہیں حیا، اور بات نہ کر سکنے کی کیفیت یعنی تقریر کرنے سے عاجز رہنا اور ہم اس بات سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں کہ قرآن کریم تو اعجاز بیان اور بلاغت پر ابھارتا ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تقریر کرنے سے عاجز رہنے پر ابھارتے ہوں۔ نعوذ باللہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم یاوہ گوئی کو خطابت کے ساتھ ملا سکتے ہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہر اس چیز سے منع کیا گیا ہے جو حد مقدار سے بڑھ جائے۔ چنانچہ عیّ یا تقریر نہ کر سکنے کا اطلاق ہر اس شیٔ پر ہو گا۔ جو حد مقدار سے کم ہو۔ اسی لئے عیّ (تقریر نہ کر سکنا) بھی قابلِ مذمت ہے۔ اور یاوہ گوئی بھی مذموم ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کا دین تو قاصر رہنے والے اور حد سے تجاوز کرنے والے کے درمیان ہے جو اعتدال و میانہ روی کہلاتی ہے۔"

تو یہ ہے خلاصہ ان ارشادات نبوی کا جو فصاحت و بلاغت اور فن خطابت کے متعلق وارد ہوتے ہیں۔ ان سے صاف ظاہر ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فصاحت و بلاغت اور خطیبانہ صلاحیت کو قابلِ ستائش قرار دیا لیکن بات میں انتہائی بیہودہ گوئی اور مبالغہ آرائی کو ناپسند فرمایا۔ آپ نے ہمیشہ مُتَشَدِّقِیْن (باچھیں کھول کر بات کرنے والوں) اور ثَرْثَارُوْن (باتونی پن کا مظاہرہ کرنے والوں) کو ناپسند فرمایا۔ آپ فرمایا کرتے تھے: اِیَّایَ وَالتَّشَادُقَ مجھے بات کرتے وقت باچھیں کھولنے سے کوئی واسطہ ہی نہیں ہے!"

شعر افصح العربؐ کی نظر میں

ہمارا یہ باب نامکمل رہ جائے گا۔ اگر ہم نے شعر و شعراء کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مؤقف نہ بیان کیا کیونکہ لسانی فنون اور اصناف سخن میں اسے ایک نہایت اہم اور نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ عموماً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اسلام نے اس فن کی کوئی قدر نہیں کی بلکہ تحقیر کی ہے۔ لیکن حقیقت یہ نہیں ہے۔

کتاب اللہ کے بارے میں ارشاد ربانی ہے کہ

وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ قَلِيلًا مَا تُؤْمِنُونَ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ قَلِيلًا مَا تَذَكَّرُونَ (۶۹/۴۲)

یہ قرآن مجید کسی شاعر کا کلام نہیں مگر تم میں تھوڑے ہیں۔ جو ایمان لاتے ہیں، اور نہ یہ کسی کاہن کا قول ہے لیکن

تم میں نصیحت پکڑنے والے بہت کم ہیں ۔

یہاں پر اللہ تعالیٰ نے اس بات کی قطعی نفی فرما دی ہے کہ قرآن مجید نہ کسی شاعر کا کلام ہے اور نہ کسی کاہن کی کہانت ہے یہ تو کتاب اللہ کی بات ہے جو بہت بڑی بات ہے ۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ شاعری کی ہم نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو تعلیم ہی نہیں دی ۔ بلکہ یہ آپؐ کی شان کے خلاف ہے کہ آپ شعر و شاعری کرتے ، ارشاد ہے[1]

" وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ ۔

ہم نے تو اسے (اپنے رسول کو) شعر سکھلایا ہی نہیں اور نہ ہی یہ اس کے شایانِ شان ہے ۔ یہ تو صرف ذکر اللہ اور قرآن مبین ہے (آپؐ پر نازل ہوتا ہے اور آپؐ اس کی تلاوت فرماتے ہیں)

یہاں ضمنی طور پر اس حقیقت کی طرف توجہ دلاتے چلنا برمحل ہوگا کہ اس آیت میں یہ اشارہ بھی موجود ہے کہ نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کو جو کچھ سکھانا تھا یا آپؐ کو تعلیم کیا گیا ۔ وہ سب من جانب اللہ تھا خیر البشر کی زبان سے صرف وہی ادا ہوتا تھا اور ہوا ۔ جو رب العالمین نے بذریعہ وحی والہام آپؐ کے قلب اطہر پر نازل فرمایا ۔ یہاں سے آپؐ کے اس قول کی صداقت بھی اظہر من الشمس ہو جاتی ہے ۔ جو اس صادق و امینؐ نے صدیق اکبرؓ کے جواب میں فرمایا تھا کہ اَدَّبَنِيْ رَبِّيْ مجھے علم و ادب عطا فرمانے والا تو میرا رب ہے ۔ اور کوئی نہیں ! اسی لئے تو آپؐ کو یہ حکم تھا کہ علم و عرفان کی دعا صرف اسی قادر مطلق سے مانگتے رہا کریں اور کسی سے نہیں ! حکم ہوا کہ کہا کیجئے ۔

رَبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا اے میرے پروردگار ! میرے علم و عرفان میں اضافہ فرمایئے ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں بلاغت و خطابت کے متعلق فرمایا تھا کہ اِنَّ مِنَ الْبَيَانِ لَسِحْرًا (بعض اوقات خطابت جادو بن جاتی ہے) اسی طرح شاعری کے بارے میں ارشاد نبوی ہے کہ وَاِنَّ مِنَ الشِّعْرِ لَحِكْمَةً بعض اوقات شاعری سراپا حکمت ہوتی ہے ۔ گویا آپؐ کا موقف یہ ہے کہ خطابت تو بعض اوقات جادو کا اثر دکھاتی ہے ۔ ہمیشہ نہیں ، اسی طرح شاعری میں بعض اوقات حکمت و دانش کی بات ہوتی ہے مگر ہمیشہ نہیں تو خطابت تو زیادہ قابل تعریف ٹھہری ، صرف بعض صورتیں قابل مواخذہ ہیں ۔ جبکہ شاعری کا اکثر حصہ حکمت و دانش کے بجائے کچھ اور باتوں پر مشتمل ہونے کا آئینہ دار ہوتا ہے ۔

ایک موقع پر آپؐ نے ارشاد فرمایا[2]

الشعر كلام من كلام العرب جزل تتكلم به في بواديها وتسل به الضغائن من بينها

شعر کلام عرب کا ایک حصہ ہے ۔ جو پر مغز ہوتا ہے ۔ جسے عرب اپنے صحراؤں میں کہتے ہیں ۔ دل کی الائشوں کو اس کے ذریعے کھینچ نکالتے ہیں یا اپنی بھڑاس نکال لیتے ہیں !

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بھی مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا ۔

إنما الشعر كلام موزون فحسنه حسن وقبيحه قبيح ؛ ۔

---

[1] یٰس ۳۶/۹۶

[2] ۔ مقدمہ دیوان حسان ص ۴۴

شعر بھی ایک کلام ہی ہے۔ چنانچہ کلام میں سے بعض تو خبیث، اور نقصان دہ ہوتا ہے۔ جب کہ بعض طیب اور پاکیزہ ہوتا ہے:۔

آپ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ:۔

لَا تَدَعُ الْعَرَبُ الشِّعْرَ حَتّٰی تَدَعَ الْاِبِلُ الْحَنِیْنَ۔

عرب اس وقت تک شعر کو ترک نہیں کریں گے۔ جب تک اونٹنیاں اپنے بچوں کے لئے شفقت و اشتیاق کو نہیں چھوڑ دیتیں۔ (یہ دونوں باتیں محالات میں سے ہیں!)

شاعر دربار نبوت حضرت حسانؓ بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ آپؐ کی طرف سے شعراء قریش کو جواب دیتے تھے۔ آپؐ کا اور اہل اسلام کا دفاع کرتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے لئے ہمیشہ دعا فرماتے۔ اور ان سے کہا کرتے تھے۔ اجب عنی وروح القدس معک (میری طرف سے جواب دیتے جاؤ) روح القدس (حضرت جبرائیل تمہاری مدد کے لئے تمہارے ساتھ ہیں۔ آپ حضرت حسانؓ سے اکثر مسجد نبویؐ میں اشعار سنا کرتے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں مسجد نبوی میں داخل ہوا تو آپ ان سے اشعار سن رہے تھے میں نے عرض کیا۔ اَشِعْرٌ وَقُرْاٰن ؟ کیا شعر بھی اور قرآن بھی؟ تو آپؐ نے فرمایا: ھٰذَا مَرَّۃً وَّھٰذَا مَرَّۃً کبھی یہ اور کبھی یہ۔ [۱]

شعر میں اگر کذب بیانی اور معصیت کی بات نہ ہوتی تو آپ اسے یقیناً پسند فرماتے تھے۔ اسی طرح آپؐ شعراء کو عطیات سے بھی نوازتے تھے۔ اور ان کے لئے دعا بھی فرماتے تھے۔ نابغہ جعدی اسلامی دور کا شاعر تھا۔ ایک مرتبہ اس نے قصیدہ سنایا۔ تو آپ اس کے اشعار کی داد بھی دیتے گئے اور دعا بھی فرماتے گئے۔ نابغہ نے جب یہ شعر سنایا [۲]

سہ بلغنا السماء مجدنا وجدودنا ۔۔۔ وانا لنرجو فوق ذالک مظہرا

ترجمہ:۔ عزت و خوش بختی میں ہم آسمان پر پہنچ گئے ہیں۔ اور ہمیں اس سے آگے کے مرتبہ کی بھی امید ہے۔

یہ شعر سن کر آپؐ نے فرمایا۔ نابغہ! آگے کہاں کا ارادہ ہے؟ تو نابغہ نے جواب دیا۔ جنت کا یا رسول اللہ۔ آپ نے فرمایا ان شاء اللہ اور جب نابغہ نے یہ دو شعر پڑھے۔

ولا خیر فی حلم اذا لم یکن لہ ۔۔۔ بوادر تحمی صفوۃ ان یکدرا

ولا خیر فی جھل اذا لم یکن لہ ۔۔۔ حلیم اذا ما اورد الامر اصدرا

۱ - بردباری میں کوئی بھلائی نہیں۔ اگر اس کے صاف شفاف حوض کو گدلا ہونے سے بچانے کے لئے اقدامات کرنے والے موجود نہ ہوں۔

۲ - اکھڑپن میں بھی کوئی بھلائی نہیں۔ اگر ایسے لوگوں میں کوئی بردبار موجود نہ ہو جو بگڑتے ہوئے حالات کو سنبھالنے

---

[۱] مقدمہ دیوان حسان ص ۴۴

[۲] مقدمہ دیوان حسان ص ۴۴

کی صلاحیت رکھتا ہو!

تو آپ نے داد دیتے ہوئے دعا فرمائی۔ لَا فَضَّ اللّٰہ فَاکَ! اللہ تعالیٰ تیرے منہ کو چاک نہ کرے۔ اسی دعائے نبویؐ کا نتیجہ تھا کہ نابغہ ایک سو بیس سال کا ہو کر فوت ہوا۔ مگر اس کے منہ کے تمام دانت سلامت رہے اور چہرے کی رونق بھی قائم رہی۔

یہ بھی منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے موزوں انداز میں کبھی کوئی شعر زبان مبارک سے ادا نہیں فرمایا۔ جب بھی شعر پڑھتے ادھورا یا شکستہ طریقے سے۔ آپؐ نے حضرت لبیدؓ بن ربیعہ عامری کا ایک مصرعہ

الا کل شئی ما خلا اللّٰہ باطل

کہ اللہ کے سوا ہر شئی باطل ہے

پڑھا مگر مکمل شعر زبان سے ادا نہ فرمایا۔

طرفہ بن العبد کا مشہور شعر ہے

ستبدی لک الایام ما کنت جاھلاً　　ویاتیک بالاخبار من لم تزوّد

ترجمہ:۔ زمانہ تجھے وہ چیزیں دکھلا دے گا جن سے تو آشنا ہی نہ تھا۔ اور تیرے پاس خبر لے کر وہ شخص آجائے گا جسے تو نے اس مقصد کے لئے روانہ ہی نہ کیا تھا۔

جب آپؐ نے پڑھا تو پہلا مصرعہ تو ٹھیک پڑھا۔ مگر دوسرا مصرعہ کلمات آگے پیچھے کر کے پڑھا۔ پھر ایک موقع پر آپؐ نے حضرت عباسؓ بن مرداس کا یہ شعر پڑھا۔

اتجعل نھبی ونھب العبید　　بین عیینۃ والاقرع

تو دوسرے مصرعہ میں الاقرع وعیینۃ پڑھا۔ بعض صحابہؓ نے عرض کیا کہ بین عیینۃ والاقرع ہے۔ مگر آپؐ نے دوبارہ بھی بین الاقرع وعیینۃ ہی کہا۔

لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی مروی ہے کہ دو مختلف مواقع پر آپؐ کی زبان سے بے ساختہ بحر رجز کے دو شعر ادا ہوئے مثلاً۔

انا النبی لا کذب　　انا ابن عبد المطلب

(میں نبی ہوں اس میں جھوٹ نہیں، میں عبد المطلب کا پوتا ہوں)

اور دوسرا شعر نما قول نبویؐ یہ ہے۔

ھل انت الا اصبع دمیت　　وفی سبیل اللّٰہ مالقیت

تو ایک انگلی ہی تو ہے جس کا خون بہہ نکلا ہے اور اللہ کی راہ میں ہی تجھے یہ صورت پیش آئی ہے۔

سے　فی القرآن للمراغی ص ۲۳۹

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ رجز کے علاوہ دوسرے اشعار تو آپ نے کسی کے بھی پورے نہیں پڑھے تھے۔ لیکن رجز کے دو بیت خود اپنی زبان مبارک سے ادا فرمائے لوگ آپ کو رجز پڑھنے کی اجازت تھی اور اس کے علاوہ شعر پڑھنے کی اجازت نہ تھی ؟ اہل علم اس بات پر متفق ہیں کہ افصح العرب صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ کہنا کہ آپ معاذ اللہ وزن شعر سے واقف نہ تھے جو شعر کو صحیح الوزن پڑھ سکتے تھے۔ بالکل غلط ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ آپ کو شعر سے زبان آلودہ کرنے کی اجازت نہ تھی۔ مبادا آپ کی طبیعت شعر میں لگ جائے یا لوگ آپ کو بھی ایک شاعر ہی تصور کرنے لگیں۔ کیونکہ یہ بات منصب نبوت کے لئے مناسب ہی نہیں تھی۔ رہے دو رجز یہ بیت تو اول تو اہل عرب رجز کو شعر قرار ہی نہیں دیتے، بلکہ وہ تو اسے ہم قافیہ مسجع عبارت سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں دیتے اسی لئے رجز کہنے والے کو شاعر نہیں رجاز کہتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ دو بیت زبان نبوت سے قصداً ادا نہیں ہوئے بلکہ بحر رجز کے وزن پر پورے اترتے ہیں۔ اس سلسلے میں مصطفیٰ صادق الرافعی کا بیان قابل غور ہے لکھتے ہیں۔[1]

" ہمارے نزدیک جو مسلم ہے۔ وہ یہ ہے کہ شعر کو صحیح وزن کے ساتھ آپ نے صرف اس لئے نہیں پڑھا تھا کہ آپ کو شعر پڑھنے سے روک دیا گیا تھا۔ اگر آپ ایک بیت بھی صحیح الوزن ادا فرما دیتے تو ہو سکتا ہے کہ آپ کی فطرت تو یہ شعر پر غالب آجاتی اور آپ شعر پڑھتے رہتے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا کہ آپ شعر کہنے لگتے اور شاعر بن جاتے۔ اگر آپ شاعر بن جاتے تو ماحول کے مطابق عرب شعراء کی روش پر پڑ گئے ہوتے، شعر کہنے میں محنت کرنے لگتے، دوسروں کا مقابلہ کرتے۔ ان پر غالب آنے کی کوشش کرتے اور جذبہ حمیت عربی میں کسی سے پیچھے نہ رہتے۔ کیونکہ جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں۔ ایک بات سے دوسری بات کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ آپ دعوت حق سے معاذ اللہ۔ منہ پھیر لیتے۔ نبوت کے پاکیزہ مشن اور قرآن کے بلند ترین مقصد سے ہٹ جاتے۔ ایسی صورت میں یہ لازم ہوتا کہ آپ اس میدان میں عربوں کی خاطر دور تک نکل جاتے۔ چنانچہ کسی بات پر تو انہیں برقرار رہنے کو کہتے۔ اور کسی بات پر ان سے مقابلہ بھی کرتے۔ اور یوں آپ کی شاعری خدانخواستہ قرآن مجید کی ہر بات کو تورڈ کر رکھ دیتی یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرما دیا تھا کہ ہم نے اسے شعر سکھایا ہی نہیں۔ اور نہ یہ آپ کے شایانِ شان تھا۔ وحی محمدی تو بس ذکر اللہ اور قرآن مبین ہی ہے :

خلاصہ بحث یہ ہے کہ افصح العرب نہ صرف شعر فہمی اور شعر خوانی پر قادر تھے۔ بلکہ شعر گوئی پر بھی قادر تھے لیکن حکمت ربانی کا تقاضا یہ تھا کہ آپ کو اس سے دور رکھا جائے۔ کیونکہ یہ منصب نبوت کی شان کے خلاف ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف یہ کہ مفید اور پاکیزہ اشعار کو پسند کیا بلکہ ایسے شعر کہنے کی اجازت بھی عطا فرمائی اور حوصلہ افزائی بھی کی۔ حقیقت یہ ہے کہ شاعری کے متعلق اسلام کا نقطۂ نظر سورہ الشعراء کی ان آیات میں واضح طور پر پیش کر دیا گیا ہے :

" وَالشُّعَرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُونَ أَلَمْ تَرَ أَنَّهُمْ فِي كُلِّ وَادٍ يَهِيمُونَ وَأَنَّهُمْ يَقُولُونَ مَا لَا يَفْعَلُونَ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَذَكَرُوا اللَّهَ كَثِيرًا وَانْتَصَرُوا مِنْ بَعْدِ مَا ظُلِمُوا :-

---

[1] اعجاز القرآن للرافعی ص ۲۴۳

یہ جو شعراء ہیں ان کی پیروی گمراہ لوگ کرتے ہیں۔ کیا تو نے دیکھا نہیں کہ یہ ہر وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں وہ ایسی باتیں کہتے ہیں جو وہ کرتے نہیں۔ مگر وہ لوگ جو ایمان لائے، نیک کام کئے اور اللہ کو بکثرت یاد کیا اور مظلوم ہونے کے بعد فتح پائی۔

ان آیات کریمہ میں شعر و شاعری کی تین باتوں کو ناپسندیدہ اور مذموم قرار دیا گیا ہے۔

۱۔ یہ شاعر لوگ معاشرے میں گمراہی پھیلانے کا سبب ہیں، گویا انسانیت کو نفع پہنچانے کے بجائے نقصان اور تباہی سے دوچار کرتے ہیں۔ یہ بات منشائے ربانی کے خلاف ہے۔

۲۔ ان کے فن میں جھوٹ اور مبالغہ آمیزی پر زور ہوتا ہے۔ سچائی اور حقائق زندگی سے انہیں دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔

۳۔ ان کے قول اور فعل میں تضاد ہوتا ہے۔ وہ فن برائے فن کی رو سے شعر تو کہہ دیتے ہیں۔ مگر اپنے اشعار میں جو بلند بانگ دعوے کرتے ہیں، ان کا عمل اس کی تردید کرتا ہے۔

ان اوصاف ثلاثہ سے جو ادب متصف ہوگا۔ وہ مردود دستر د ہے۔ اسی شاعری کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے قے سے بھی زیادہ ناگوار قرار دیا ہے۔ ایسا فن انسانی معاشرے کے لئے مہلک ہے۔ اس لئے اس کی اجازت نہیں ہے۔ اس کے برعکس شعر و ادب کی ایک قسم کو ان آیات میں پسند کیا گیا ہے جس میں مندرجہ ذیل تین اوصاف ہوں گے۔

۱:۔ ایمان اور عمل صالح سے متصف شعرا کے کلام سے یقیناً ایمان اور عمل صالح کی ترغیب ہوگی۔ اس لئے شعر و ادب سے اگر انسان کے ضمیر میں ایمان کی دولت اور عمل صالح کی تلقین ہوتی ہو تو وہ قابل ستائش ہے اور پسندیدہ ہے۔

۲۔ اس ادب سے خالق حقیقی سے رشتہ کٹ جانے کے بجائے یہ رشتہ عبودیت مضبوط ہوتا ہو۔ اور اللہ کی عظمت و ربوبیت کا احساس زندہ ہوتا ہو۔

۳۔ یہ شعر و ادب حقیقت بیانی اور حق کی ترجمانی کا علمبردار ہو۔ اس سے ظلم کے خلاف جہاد کا جذبہ بیدار ہوتا ہو۔

اگر ایسا ادب اور شعر تخلیق ہو تو یہ نہ صرف یہ کہ اسلام اس کی اجازت دیتا ہے۔ بلکہ شریعت مصطفوی انسانی عظمت کے علمبردار ادب کی خود دعوت دیتی ہے۔

شعر و شاعری اور عربوں کے متداول علوم و فنون سے آپ کی زبان کو آلودہ ہونے سے جو محفوظ رکھا گیا تو اس کی حکمت جاحظ کے بیان سے اور بھی واضح ہو جاتی ہے، وہ اس ضمن میں سب سے پہلے تو ایک بصری بزرگ کا قول نقل کرتا ہے اور پھر اس پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے

" وكان شيخ من البصريين يقول :- ان الله انما جعل نبيه اُمّياً لا يكتب ولا يحسب ولا يخطب ولا يقرض الشعر ولا يتكلف ولا يتعمد البلاغة ليفرد

سنہ :- البیان والتبیین ۴ / ۲۲

الله بتعليمه الفقه واحكام الشريعة ويقصره على معرفة مصالح الدين دون ما تتباهى به العرب من قيافة الاثر والبشر ومن العلم بالانواع وبالخيل وبالانساب وبالاخبار وتكلف قول الشعر ليكون اذا جاء القرآن الحكيم وتكلم بالكلام العجيب كان ذلك أدل على أنه من الله ! وزعم أن الله تعالى لم يمنعه معرفة آدابهم واخبارهم واشعارهم ليكون أنقص حظا من الحاسب الكاتب ومن الخطيب الناسب ، ولكن ليجعله نبيا وليتولى من تعليمه ما هو أزكى وانمى فانما نقصه ليزيده ومنعه ليعطيه وحجبه عن القليل ليجلي له الكثير ا

"بصریوں میں سے ایک بزرگ کہا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کو امی صرف اس لئے بنایا (آپ حساب کتاب، نسب شناسی، شعرخوانی، خطابت کے تکلف اور بلاغت کے ارادے سے دور رہے) تاکہ اللہ تعالیٰ ہی آپؐ کو دین کی بھلائی کی معرفت تک محدود رکھتے ہوئے عرب کے ان فنون سے دور رکھے جن پر وہ باہم فخر و مباہات کرتے تھے۔ جیسے قیافہ شناسی، پتھروں کا علم، گھوڑوں، انساب اور احوالِ عرب کا علم اور شعر گوئی کا تکلف، تاکہ جب آپؐ پر قرآن حکیم نازل ہو اور عجیب و غریب کلام آپؐ کی زبان پر جاری ہو، تو یہ اس بات کی واضح ترین دلیل ہو کہ یہ منجانب اللہ ہے! بزرگ مذکور نے یہ بھی خیال ظاہر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو عربوں کے آداب، اخبار اور اشعار کی معرفت سے اس لئے نہیں روکا کہ آپؐ ایک حساب کتاب جاننے والے اور نسب شناس خطیب سے ناقص الحظ ہوں۔ بلکہ اس لئے کہ آپؐ کو اپنا نبی بنانا تھا۔ اور زیادہ پاکیزہ اور مفید تعلیم کا ذمہ لینا تھا۔ یہ کمی اس لئے تھی کہ آپؐ کو زیادہ دینا تھا۔ یہ روکنا عطا کرنے کے لئے اور تھوڑی شئی آپ سے چھپا کر بہت زیادہ کو آپؐ کے سامنے جلوہ گر کر دیا۔

جاحظ کو اس بزرگ کی یہ رائے جو نیک نیتی پر مبنی ہے۔ اور جو اس نے اپنے علم اور سمجھ کے مطابق کہی ہے۔ پسند نہیں ہے چنانچہ وہ لکھتا ہے۔

" ولو زعم ان اداة الحساب والكتابة واداة قرض الشعر ورواية جميع النسيب قد كانت نية تامة وافرة ومجمعة كاملة ولكنه صلى الله عليه وسلم صرف تلك القوى وتلك الاستطاعة إلى ماهو أزكى بالنبوة واشبه بمرتبة الرسالة فكان إذا احتاج إلى البلاغة كان ابلغ البلغاء وإذا احتاج الى الخطابة كان اخطب الخطباء وانسب من كل ناسب وأقوف من كل قائف ، ولو كان في ظاهره والمعروف من شأنه أنه كاتب حاسب وشاعر ناسب ومتفرس قائف ، ثم اعطاه الله برهانات الرسالة وعلامات النبوة ما كان ذلك بمانع من وجوب تصديقه ولزوم طاعته

والانقياد لأسره على سخطهم ورضاهم ومكروههم ومحبوبهم ولكنه أراد ألا يكون لشاغب متعلق عما دعا إليه حتى لا يكون دون المعرفة بحقه حجاب وإن رق وليكون ذلك أخف في المؤونة وأسهل في المحنة فلذلك صرف نفسه عن الأمور التي كانوا يتكلفونها ويتنافسون فيها فلما طال هجرانه لقرض الشعر وروايته صار لسانه لا ينطلق به والعادة توأم الطبيعة، فأما في غير ذلك فإنه إذا شاء كان انطق من كل منطيق وأنسب من كل ناسب وأقوف من كل قائف وكانت آلته أوفر وأداته أكمل إلا أنها كانت مصروفة إلى ما هو أرد!"

اگر یہ بزرگ یہ کہتے کہ حساب وکتاب، شعر خوانی اور تمام انساب کی روایت آپؐ کی ذات میں تمام دوافر تھی، اور کامل طور پر اکٹھی ہو گئی تھی۔ مگر آپؐ نے اپنی ان تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو ایسے امور کی طرف موڑ دیا تھا جو نبوت کے طفیل پاکیزہ تر اور مرتبہ رسالت کے مشابہ تر تھے۔ حالانکہ جب بھی آپؐ کو ضرورت ہوتی آپؐ سب سے بڑے بلیغ اور سب سے بڑے خطیب، سب بڑے نسب شناس اور سب بڑے قیافہ شناس تھے۔ اگر بظاہر یوں مشہور ہوتا کہ آپؐ حساب کتاب جاننے والے، غزل گو شاعر اور صاحب فراست قیافہ شناس ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ آپؐ کو براہین رسالت اور علامات نبوت عطا فرما دیتا تو بھی آپؐ کی تصدیق کے واجب ہونے، اطاعت کے لازم ہونے اور خوشی و ناخوشی اور پسند و ناپسند ہر صورت میں لوگوں کو آپؐ کا مطیع ہونا ہی پڑتا تھا مگر اللہ کا یہ منشا تھا کہ آپؐ شور و شغب اور تماشا آرائی کرنے والے کی پکار پر لبیک نہ کہیں۔ تاکہ آپ کی صداقت کو پہچاننے میں باریک سے باریک پردہ بھی حائل نہ ہو۔ ذمہ داری اٹھانے میں یہ بات خفیف تر اور کشمکش میں سہل تر ہو، اس لئے آپؐ نے اپنی توجہ کو ان امور سے ہٹا لیا تھا۔ جن میں وہ محنت و مشقت سے باہم مقابلہ کرتے تھے۔ چنانچہ شعر خوانی کو ترک کرنے اور اسے روایت کرنے سے اجتناب کی مدت طول پکڑ گئی تو یہ آپؐ کی زبان پر رواں نہ ہو سکا۔ اور عادت تو فطرت کے ساتھ جڑواں بچے کی حیثیت رکھتی ہے۔ ورنہ بصورت دیگر آپؐ جب چاہتے ہر بولنے والے سے زیادہ گویا اور ہر نسب شناس سے زیادہ نسب شناس اور ہر قیافہ شناس سے بڑے قیافہ شناس تھے۔ آپؐ کی صلاحیت بھی وافر تھی۔ اور وسائل بھی کامل ترین تھے۔ مگر وہ زیادہ نفع بخش باتوں کی جانب مبذول تھے؟

خطابت کا اسلوب نبویؐ اور اس کے خصائص

نبی امی افصح العرب صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور نبوت سے جس طرح قبائل عرب کو ایک امت ہونے اور مختلف لہجوں سے عبارت عربی زبان کو شہرت عام اور بقائے دوام رکھنے والی متحدہ زبان بننے کا موقع ملا۔ اسی طرح فصاحتؐ بلاغت اور خطابت عربی کو بھی ایک منفرد اور امتیازی مقام نصیب ہوا۔ عربی خطابت کو جو عروج و کمال اور مقبولیت و اہمیت بعثت نبوی

سے متبرّا ئی۔ وہ اسے عرب کے تمام خطباء سے بھی میسر نہ آسکی۔ جو حسن و رعنائی، صداقت و صفائی اور سلاست و روانی آپؐ کے اسلوب خطابت میں ہے۔ اسے عرب کے تمام خطباء کے کمالات کے ساتھ تولا جائے تو اسلوب نبوی کا پلڑا بھاری رہے گا۔

عرب کے تمام فصحاء و بلغاء نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فصاحت و بلاغت کی ستائش کی ہے۔ اور سب کا اس پر اتفاق ہے کہ عربی زبان و ادب کی تاریخ میں کلام اللہ کے بعد فصاحت و بلاغت میں کلام نبوی کا مقام ہے[1]۔ آپ کا اسلوب خطابت و بلاغت چونکہ فیضان الٰہی کا نتیجہ تھا اس لئے اس میں وحی الٰہی کے اثرات نمایاں تھے۔ آپؐ کے اسلوب تکلم و خطابت میں تکلف و تصنع نہیں تھا۔ بلکہ سادہ و سلیس مگر پرکشش اسلوب لفظی کے ساتھ نازک سے نازک معانی بیان فرماتے تھے۔ جاحظ نے لکھا ہے[2] کہ

ثم راوہ فی جمیع دھرہ فی غایۃ التسدید والصواب التام والعصمۃ الفاضلۃ والتائید الکریم، علموا أن ذلک من ثمرۃ الحکمۃ ونتاج التوفیق و ان تلک الحکمۃ من ثمرۃ التقوی ونتاج الإخلاص :۔

لوگوں نے آپؐ کو ہمیشہ انتہائی راست گو، صائب کامل، صاحب فضیلت و معصومیت اور شرف ربانی کی تائید سے متصف پایا تو وہ جان گئے کہ یہ حکمت کا پھل اور توفیق ایزدی کا نتیجہ ہے اور یہ حکمت تقویٰ کا پھل اور اخلاص کا نتیجہ ہے :۔

شعراء نے بھی فصاحت نبویؐ کا اعتراف کیا اور مدح سرائی کی ہے۔ عہد نبوت کے مشہور شاعر حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں[3]۔

لَوْلَمْ تَكُنْ فِيهِ آيَاتٌ مُبَيِّنَةٌ   كَانَتْ بَدَاهَتُهُ تُنْبِيكَ بِالْخَبَرِ

اگر آپؐ کے پاس اعجاز قرآنی کی واضح نشانیاں نہ بھی ہوتیں۔ تو آپؐ کی خطیبانہ بداہت گوئی تجھے حقیقت حال کی خبر دے دیتی۔

امام بوصیری فصاحت نبویؐ کا اعتراف کرتے ہوئے یوں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔

كَفَاكَ بِالْعِلْمِ فِي الْأُمِّيِّ مُعْجِزَةً   فِي الْجَاهِلِيَّةِ وَالتَّأْدِيبِ فِي الْيُتُمِ

نبی اُمی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی معجزہ کافی تھا کہ دور جاہلیت کی تاریکیوں کو علم سے روشناس کر دیا اور یتیم ہوتے ہوئے بھی آپ کو دست قدرت نے ادب سکھا دیا!

---

[1] الخطابۃ العربیۃ ص ۴۸، الادب العربی و تاریخ ص ۳۴

[2] البیان مع ۲/۳۱ [3] البیان ۱/۱۰، عیون الاخبار ۱/۲۲۴

مصری شاعر احمد شوقی خطابت نبوی کے اثر انگیز اسلوب کا نقشہ پیش کرتے ہوئے کہتا ہے۔

وَاِذَا خَطَبْتَ فَلِلْمَنَابِرِ هِزَّةٌ　　تَعْرُو النَّدِیَّ وَلِلْقُلُوْبِ بُکَاءٌ

جب آپ خطبہ ارشاد فرماتے تو منبر بھی جھوم اٹھتے تھے محفل پر لرزہ طاری ہو جاتا اور دل رونے لگتے۔

آپ کے اسلوب خطابت کی ایک خصوصیت یہ بھی کہ آپ کے کلام کی الفاظ کی تعداد کم ہوتی تھی مگر معانی کی مقدار زیادہ ہوتی تھی۔ الفاظ میں کفایت شعاری سے کام لینا، قادر کلام خطیب کے اہم خصائص میں سے مقصود ہوتا ہے۔ آپ کے کلام میں یہ کیفیت بدرجہ اتم موجود تھی۔ آپ کے خطبات میں تکلف و تصنع کا شائبہ تک نہیں ہوتا تھا۔ باچھیں کھول کر گفتگو کرنا۔ (تشدیق) گلے کی گہرائی سے آواز نکالنا (تقعیب) اور باتونی پن (ثرثرہ) سے آپ کو نفرت تھی۔ چہ جائیکہ ان چیزوں کا آپ کے خطبات میں کوئی شائبہ نظر آتا جہاں بات کو طول دینا اور تفصیل پیش کرنا ہوتا آپ شرح و بسط سے کام لیتے اور جہاں اجمال و اختصار مناسب ہوتا۔ وہاں موقع کے مطابق اختصار و جامعیت سے کام لیا جاتا آپ کے کلام میں نامانوس اور سوقیانہ الفاظ کبھی نہیں ہوتے تھے۔ آپ جب بھی تقریر فرماتے حکمت و دانش کے موتی برستے ہوئے نظر آتے تھے۔ آپ کی بات اس قدر واضح اور عام فہم ہوتی کہ کسی سطح ذہنی کے مالک انسان کو دوبارہ سننے کی حاجت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ آپ کا کلام ہر لغزش اور نقص سے پاک ہوتا تھا۔ خطابت میں ایسا مدلل انداز اختیار کرتے کہ بات سامعین کے دلوں میں اتر جاتی تھی۔ طویل تقریر بھی مختصر مگر پر مغز جملوں پر مشتمل ہوتی۔ ہمیشہ حق و صداقت کی بات کرتے۔ الفاظ کے ہیر پھیر کا سہارا کبھی نہ لیتے۔ اسلوب بیان میں نہ تو سست روی کا مظاہرہ ہوتا اور نہ تیزی و جلد بازی کا اس میں لفظ و معنی کا توازن بھی ہوتا تھا۔ اور اثر انگیزی و مقصد کی بلندی بھی۔ کلام نبوت سے سہل تر مگر ساتھ ہی فصیح ترین کلام کسی کا نہ ہوتا تھا محمد بن سلام نے یونس بن حبیب کا قول نقل کیا ہے کہ فصاحت و بلاغت کے جو اعلیٰ نمونے ہمیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام سے میسر آئے ہیں۔ وہ کسی اور خطیب کے کلام سے میسر نہ آسکے۔ جاحظ نے کیا خوب نقشہ پیش کیا ہے[1]

"اِنْ اَطَالَ الکلامَ قَصَّرَ عَنْهُ کل مطیلٍ وَاِن قصر القول اُتی علی غایة کل خطیب وما عدم منه الا الحفظ واقامة الشعر"

ترجمہ: اگر آپ تقریر کو طول دیتے تو اس انداز سے کہ کلام کو سر طول دینے والا اس سے عاجز تھا۔ اور جب اختصار سے کام لیتے تو ہر خطیب کے آخری درجہ کمال کو بھی شکست دے دیتے تھے۔ لکھنے اور شعر کو موزوں پڑھنے کے علاوہ کلام نبوت میں فصاحت و بلاغت کی ہر ایک خوبی موجود تھی۔"

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دوسرے لوگوں کی طرح جلدی جلدی نہیں بولتے تھے۔ بلکہ آپ کا کلام نہایت واضح اور صاف ہوا کرتا تھا۔ مجلس میں آپ کی باتیں سننے والا آسانی سے انہیں حفظ کر سکتا تھا[2]۔ امام بخاری کی روایت کے مطابق عام گفتگو میں آپ اپنی بات کو تین تین بار دہراتے تھے۔ تاکہ آپ کے الفاظ سننے والے کے ذہن نشین ہو جائیں۔ حتیٰ کہ اگر کوئی آپ

---

[1] البیان ۲/۳۳　　[2] الجامع الصحیح الترمذی

کی گفتگو کے الفاظ گننا چاہتا تو گن سکتا تھا۔ آپ کا کلام ہمیشہ سادہ اور بیساختہ ہوتا تھا جس میں ترتیب اور سلیقہ نمایاں ہوتا تھا[۱]

جاحظ کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اہم مواقع پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے طویل خطبات بھی ارشاد فرماتے لیکن محض بات بڑھانے یا طویل گفتگو پر اپنی قدرت کے اظہار کے لئے کبھی طویل خطبہ نہیں دیا۔ بعض اوقات کئی کئی گھنٹے بھی آپ نے خطبہ وعظ و نصیحت کا سلسلہ جاری رکھا۔ صحابہ کرامؓ سے منقول ہے کہ ایک موقع پر آپ نے اتنی طویل تقریر فرمائی کہ مسلسل کئی نمازیں تقریر میں وقفہ ڈال کر ادا فرمائیں۔ اور نماز سے فارغ ہوتے ہی بات کا سلسلہ جہاں سے چھوڑتے وہیں سے دوبارہ آغاز فرما دیتے اس خطبہ میں آپ نے ماضی و مستقبل (مَا كَانَ وَمَا هُوَ كَائِنٌ) کی تمام باتیں اپنے صحابہؓ کو سمجھا دیں۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک دن آپ نے نماز عصر کے بعد خطبہ ارشاد فرمانا شروع کیا اور غروب آفتاب تک جاری رکھا۔ اگر دیکھا جائے تو یہ وقفہ دو گھنٹے کے قریب بنتا ہے۔ جو آپ نے تقریر پر صرف کئے[۲]

شمائل ترمذی میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے حوالے سے ایک روایت[۳] ہے جس کے مطابق انہوں نے ہند بن ابی ہالہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انداز تکلم اور اسلوب بیان کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے بتایا کہ آپ مسلسل رنج و حزن اور ہمیشہ فکر میں رہتے۔ (متواصل الاحزان دائم الفکرۃ) آرام نہیں فرماتے تھے طویل مدت تک خاموش رہتے اور صرف ضرورت کے وقت بات کرتے تھے۔ بات کا آغاز کرتے یا بات ختم کرتے وقت ہی منہ کھولتے تھے۔ آپ کا کلام جوامع الکلم پر مشتمل ہوتا تھا جو واضح اور فیصلہ کن اسلوب کا رنگ لئے ہوئے ہوتے تھے۔ ان میں نہ تو فالتو بات ہوتی اور نہ کسی کمی یا کوتاہی کا احساس ہوتا، نہ تو آپ سخت طبیعت تھے، اور نہ ناقص مزاج۔ چھوٹی سی چھوٹی نعمت ربانی کی بھی قدر کرتے تھے اور کسی بھی نعمت کو برا نہ کہتے تھے۔ البتہ کھانے پینے کی چیز کی نہ تو اچھائی بیان کرتے اور نہ برائی۔ دنیا اور اس کی باتوں پر آپ کو کبھی غصہ نہ آیا۔ مگر جب حق و صداقت پر حرف آنے لگتا تو پھر آپ کے غیظ و غضب کو کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ جب تک حق کا بدلہ نہ لے لیتے چین سے نہیں بیٹھتے تھے۔ اپنی ذات کے لئے نہ تو آپ ناراض ہوتے اور نہ لڑتے جھگڑتے تھے۔ جب بات کرتے ہوئے اشارہ کرتے تو پورے ہاتھ سے اشارہ کرتے، جب تعجب اور حیرت کا اظہار کرتے تو ہتھیلی کو الٹ کر اشارہ کرتے۔ بات کرتے وقت دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو بائیں ہاتھ کے انگوٹھے کے اندرونی حصے سے ملاتے تھے۔ جب ناراض ہوتے تو منہ دوسری طرف کر لیتے۔ جب خاموشی کا اظہار مقصود ہوتا تو آنکھیں موند لیتے تھے۔ آپ کے ہنسنے کی انتہائی حد ایک مسکراہٹ تھی۔ آپ مسکراتے ہوئے یوں لگتے تھے جیسے بادل کی ٹھنڈک ہوتی ہے۔

خطابت میں آواز کو بڑا دخل ہے۔ سامعین کے لئے آواز کی کھنک کے ساتھ ساتھ حسن صوت یا خوش آواز ہونا بےحد اثر انگیز ہوتا ہے۔ انبیاء کرام علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ نے زور خطابت کے علاوہ حسن صوت سے بھی نوازا۔ نبی اللہ حضرت داؤد علیہ

---

[۱] صحیح البخاری کتاب العلم، احیاء العلوم الدین ۲/۴/۲۷ طبقات ابن سعد ۱/۲۷۵

[۲] ادب الحدیث النبوی ۱۰۶ [۳] شمائل ترمذی ص ۵ تا ۱۶

اسلام کا فصل خطاب سے متصف انداز خطاب بھی مشہور تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی لحن داؤدی کا پراثر و پر اسلوب بھی ایک عطیہ خداوندی تھا جس سے جن و انس، چرند و پرند کیا وحشت و در بھی جھوم اٹھتے تھے۔ نبی امی افصح العرب صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اللہ تعالٰی نے جوامع الکلم اور فیصلہ کن اسلوب خطابت کے ساتھ ہی حسن صوت سے بھی نوازا تھا۔ آپ جمیل الصوت (خوش آواز) بھی تھے۔ اور جہیر الصوت (بلند آواز) بھی تھے۔ چنانچہ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے[1] کہ اللہ تعالٰی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حسن صورت کے ساتھ ساتھ حسن صوت کی نعمت سے بھی نوازا تھا۔ اس لئے سامعین کو آپ سے فاصلے پر بھی آپ کی بات صاف سنائی دیتی تھی۔ اور آپ کی آواز کی شیرینی سے اہل ایمان کو حلاوت بھی نصیب ہوتی تھی۔ صحابہ کرام ہمہ تن گوش ہو کر آپ کے ارشادات سنتے رہتے اور محویت کے عالم میں دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو جاتے تھے۔

موقع کی مناسبت سے آگاہی اور اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانا خطیب کی حاضر جوابی اور کمال مہارت کی دلیل ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خطابت کی محفوظ روایات سے یہ عیاں ہے کہ موقع کی مناسبت سے بات کرکے اثر ڈالنے اور سامعین اور ان کے ماحول کو ہمیشہ پیش نظر رکھنے میں اللہ تعالٰی نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو کمال عطا کیا تھا۔ تقریر کو اثر انگیز بنانے کے لئے قدرت ربانی نے آپ کی طبیعت میں ایک خاص ملکہ ودیعت کیا تھا۔ مخاطبین کو اپنی طرف ہمہ تن متوجہ رکھنے اور اپنے پیغام کو ان کے دلوں کی گہرائیوں میں اتارنے میں کوئی خطیب آپ سا پیدا نہیں ہوا اور نہ ہوگا۔ ان شاء اللہ۔ مکہ کے لوگ آپ کی صداقت و امانت پر مکمل اعتماد رکھتے تھے۔ اپنے اولین خطبہ میں آپ نے اسی اعتماد کے سہارے پیغام ربانی کو ان کے دلوں میں اتارنے کی کوشش کی۔ غزوہ حنین کے موقع پر انصار مدینہ کی قناعت پسندی کو محور بنا کر سوال و جواب کے انداز میں اپنے خطبہ کو پر اثر بنایا۔ خطبہ حجۃ الوداع میں بھی کچھ اس قسم کی کیفیت نظر آتی ہے۔

موقع محل کی مناسبت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی بات کو مؤثر بنانے میں افصح العرب صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی نظیر نہیں۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ والی روایت ابھی گذری ہے جس کے مطابق آپ نے عصر کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو دنیا کی بے ثباتی اور قرب قیامت کے بارے میں وعظ فرمایا۔ تقریر کرتے کرتے جب نگاہِ نبوت نے ڈوبتے ہوئے سورج کو ملاحظہ فرمایا تو فوراً ارشاد ہوا۔

إنہ لم یبق من الدنیا فیما مضی الا کما بقی من یومکم ھذا فیما مضی:۔[2]

ترجمہ:۔ دنیا کی گزشتہ عمر کے مقابلے میں اب اس کی عمر کا حصہ اتنا ہی باقی رہ گیا ہے۔ جتنا آج کے دن کے گزشتہ وقت کے مقابلے میں اب غروب آفتاب کے وقت یہ وقفہ رہ گیا ہے۔"

قرب قیامت اور دنیا کی ناپائیداری کے متعلق یہ عمدہ ترین اور برمحل استدلال تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دیکھنے میں آیا۔

---

[1] البیان والتبیین ۳/ ۲۹۲ [2] طبقات ابن سعد ۱/ ۳۷۶

خطابت نبوی کے اسلوب بلاغت کے متعلق استاذ عباس محمود العقاد نے ایک انوکھا نکتہ پیدا کیا ہے کہ ابلاغ و تبلیغ آپ کے متن و منصب کا دوسرا نام تھا۔ اس لئے فصیح و بلیغ ہونا بھی آپ کے منصب کا حصہ ٹھہرا۔ اور اسی لئے بلاغت آپ کے کلام کی نمایاں خصوصیت تھی۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ خطبہ حجۃ الوداع میں آپ بار بار دہراتے چلے گئے الا ھل بلغت کیا میں نے پیغام حق واضح طور پر پہنچا دیا ہے[۱]۔

علامہ محمد عطیۃ الابراشی نے خطابت نبوی کے فصیح و بلیغ اسلوب پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسلوب خطابت، فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ مدارج پر تھا۔ جو واضح الفاظ اور عمدہ عبارات پر مشتمل ہوتا تھا جس میں تکلف نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ جوامع الکلم کا آئینہ دار ہوتا تھا۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے تمام قبائل عرب کی لغات و لہجات کا علم عطا فرمایا تھا اس لئے آپ ہر قبیلے کے لوگوں سے ان کے اپنے لب و لہجہ میں گفتگو کرتے تھے۔ قریش مکہ، انصار مدینہ اور اہل نجد و حجاز کے ساتھ آپ جو انداز تکلم اختیار کرتے تھے۔ وہ اس سے مختلف ہوتا تھا۔ جو آپ یمن و حمیر اور غطفانی عربوں کے ساتھ بات چیت کرتے ہوئے اختیار کرتے تھے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس پر حیرت اور تعجب کا اظہار کرتے تو آپ فرماتے۔

یہ تو میرے رب نے مجھے سکھایا ہے۔ اور قرآن مجید بھی میری زبان پر ہی نازل کیا گیا ہے[۲]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ تھا کہ جب کبھی میدان جہاد میں مجاہدین اسلام سے خطاب فرماتے تو اپنی قوس (کمان) کا سہارا لیتے تھے۔ کبھی یونہی فرش پر بغیر کسی سہارے کے بھی خطبہ ارشاد فرماتے اور کبھی اونٹنی پر سوار ہو کر خطاب فرماتے تھے۔ ہجرت کے بعد مسجد نبوی میں ایک عرصہ تک آپ کھجور کے ایک تنے کے سہارے تقریر فرماتے تھے۔ جب اہل اسلام کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔ تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ کے لئے ایک منبر بنوا دیا تھا۔ تاکہ خطبہ کے دوران رخ نبوی کو دیکھنے کی سعادت سب کو نصیب ہو۔ آپ نے مخصرہ (لاٹھی) اور قضیب (لکڑی) کے سہارے بھی خطبہ دیا۔ کبھی کبھی آپ عصا کے سہارے بھی خطبہ دیتے تھے۔ جاحظ نے لکھا ہے کہ یہی عصائے نبوی بعد میں خلفائے راشدین کو منتقل ہوتا رہا۔ اور وہ خطبہ کے دوران اسی سنت نبوی پر عمل کرتے رہے۔ یہ عصا بعد میں اموی، پھر عباسی اور سب سے آخر میں عثمانی خلفاء کو منتقل ہوتا رہا۔ کہا جاتا ہے کہ آخری اموی خلیفہ نے اپنا انجام دیکھ کر اپنے غلام کو حکم دیا کہ چادر نبوی اور عصائے نبوی کہیں دفن کر دے۔ مگر اس نے یہ دونوں چیزیں دفن کرنے کے بجائے عباسیوں کے سپرد کر دی تھیں[۳]۔

حدیث و سیرت کی کتابوں میں خطبہ کے دوران آپ پر جوش و جذبہ کی جو کیفیت طاری ہوتی تھی۔ اسے بھی راویوں نے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ موقع کی مناسبت سے جب آپ جوش میں آتے تو آنکھیں سرخ ہو جاتی تھیں۔ آواز گرجدار اور بلند ہوتی جاتی تھی۔ اللہ کی قدرت و جبروت اور اس کی ہیبت کے سامنے کائنات کی حقیر حیثیت کا ذکر ہوتا تو آپ کے چہرے پر غصے کے آثار نمایاں ہو جاتے

---

[۱] عبقریۃ محمد ص ۱۰۸ [۲] عظمۃ الرسول ص ۲۷۵، الشفا ۱/ ۱۷۷

[۳] سیرۃ النبی ۲/ ۲۳۴ [۴] طبقات ابن سعد ۱/ ۹۰، البیان والتبیین ۱/ ۶۹

تھے یہ جوشِ خطابت کے عالم میں انگلیاں اٹھتی جاتی تھیں۔ اور یوں لگتا تھا۔ جیسے آپ لشکر اسلام کو جہاد کے لئے ہاتھ کے اشاروں سے جوش دلا رہے ہیں۔ جسم مبارک جھومنے لگتا تھا۔ کبھی مٹھی بند کر لیتے۔ کبھی کھول دیتے تھے[1]۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے آپؐ کے ایک خطبے کے دوران جوشِ خطیبانہ کی تصویر پیش کرتے ہوئے بتایا ہے کہ میں نے ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بر سرِ منبر یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ خالق جبار اس زمین و آسمان کو اپنی مٹھی میں لے لے گا پھر ساتھ ہی آپؐ نے اپنی مٹھی کو بند کر لیا۔ پھر کبھی اپنی مٹھی کو بند کرنے کبھی کھول دیتے تھے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا۔ آپؐ منبر پر کبھی دائیں جانب جھکتے اور کبھی بائیں جانب جھک جاتے۔ حتیٰ کہ میں نے منبر نبویؐ کو لرزتے ہوئے دیکھا تو یوں محسوس ہونے لگا کہ یہ منبر دائیں یا بائیں گر پڑے گا[2]۔

فصاحت نبویؐ سلف اور خلف کی نظر میں

جس طرح قرآن مجید ایک اعجاز محمدی کی حیثیت سے چودہ صدیوں کے دوران نہ صرف دنیائے علم و دانش کے لئے ایک چیلنج رہا ہے۔ بلکہ اس کے الفاظ و معانی تشنگان حق کی پیاس بجھاتے رہے اور اس کے معجزانہ اسلوب کے سامنے فصحاء و بلغاء سربسجود رہے۔ اسی طرح فصاحتِ نبویؐ بھی چودہ سو سال سے ایک منفرد مثال رہی ہے۔ اور ہر دور میں اہل عرب نے افصح العرب صلی اللہ علیہ وسلم کے جوامع الکلم اور اسلوب بلاغت کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ جس سے آپؐ کی خطیبانہ عظمت اور عربی فصاحت و بلاغت کی تاریخ میں مقام کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

حضرت سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ کا علم و فضل کی دنیا میں بہت بلند مقام ہے۔ کسی علمی محفل میں ان سے سوال کیا گیا تھا۔

"مَنْ اَبْلَغُ النَّاسِ؟ قَالَ رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم

سب سے زیادہ فصیح و بلیغ کون ہے؟ تو انہوں نے فوراً جواب دیا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ فصیح و بلیغ تھے[3]؟

حضرت ام معبد رضی اللہ عنہا نے آپؐ کے بلیغانہ اندازِ تکلم اور اسلوب خطابت کی بہت خوبصورت الفاظ میں نہایت عمدہ تصویر پیش کی ہے۔ فرماتی ہیں[4]:- "حلو المنطق، فصل، لا نزر، ولا ھذر، کان منطقہ خرزات نظمن، وکان جہیر الصوت، حسن النغمۃ۔ آپؐ شیریں کلام تھے۔ ہر بات نہایت واضح ہوتی تھی۔ نہ قلیل الکلام تھے۔ نہ فضول الکلام تھے۔ آپؐ کا کلام معجز نظام تو موتی تھے۔ جو لڑی میں پروئے گئے ہوں۔ آپؐ کی آواز بلند و گرجدار تھی۔ جس میں خوبصورت نغمگی پائی جاتی تھی۔

---

[1] زاد المعاد ۱/۴۸، سیرۃ النبی ۱/۲۲۵، صحیح مسلم ۱/۲۸۴

[2] سنن ابن ماجہ ۲/۲۴۰ سیرۃ النبی ۲/۲۳۳

[3] البیان ۱/۲۱۴ [4] الشفا ۱/۱۷۸

قاضی عیاض الیحصبی رحمۃ اللہ علیہ نے سیرت نبویؐ کے موضوع پر ایک کتاب تصنیف فرمائی ہے جو نہایت خوبصورت اور بے حد پیاری کتاب ہے۔ جس کا نام ہے "الشفاء بتعریف حقوق المصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم" اس کتاب کی ایک فصل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فصاحت و بلاغت اور جوامع الکلم کے لئے مختص ہے اس میں قاضی عیاض فرماتے ہیں۔

"وأما فصاحة اللسان و بلاغة القول فقد كان صلى الله عليه وسلم من ذلك بالمحل الأفضل والموضع الذى لا يجهل، سلاسة طبع وبراعة منزع وإيجاز مقطع ونصاعة لفظ وجزالة قول وصحة معان وقلة تكلف اوتى جوامع الكلم و خص ببدائع الحكم وعلم السنة العرب، فكان يخاطب كل أمة منها بلسانها ويحاورها بلغتها ويباريها فى منزع بلاغتها حتى كان كثير من اصحابه يسألونه فى غير موطن عن شرح كلامه وتفسير قوله: من تأمل حديثه وسيره علم ذلك وتحققه، وليس كلامه مع قريش والانصار واهل الحجاز ونجد ككلامه مع ذى المشعار الهمدانى وطهفة النهدى وقطن بن حارثة العليمى والاشعث بن قيس ووائل بن حجر الكندى وغيرهم من أقيال حضرموت و ملوك اليمن"

جہاں تک فصاحت لسانی اور بلاغت زبانی کا تعلق ہے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس میدان میں افضل ترین مقام کے مالک تھے۔ آپؐ کا مرتبہ فصاحت کسی سے پوشیدہ نہ تھا۔ طبیعت کی سلاست و روانی، معانی پیدا کرنے کا کمال، جامع و مختصر جملے بولنا۔ ستھرے اور چمک دمک والے الفاظ، صحت معانی اور ہر بات بے تکان اور بے تکلف و تصنع بولنا۔ آپؐ کی فصاحت و بلاغت کا حصہ تھا۔ آپؐ کو جوامع الکلم عطا کئے گئے۔ انوکھی پُر حکمت باتیں آپؐ کے خصائص میں سے تھیں اور آپؐ کو عرب کی تمام زبانوں کا علم دیا گیا تھا۔ چنانچہ آپ ہر قبیلے سے اس کی اپنی زبان اور لہجے میں بات کرتے تھے۔ ان کی ہی زبان کے محاورات استعمال کرتے اور ان کی فصاحت و بلاغت کے مطابق معنی پیدا کر کے برتری ثابت کرتے تھے۔ حتیٰ کہ آپؐ کے بہت سے صحابہؓ اکثر مواقع پر آپؐ سے آپؐ کے کلام و اقوال کی تشریح و تفسیر دریافت کرتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث و سیرت کو دیکھنے والا اس بات کو معلوم کر سکتا ہے۔ اور اس کی حقیقت کو جان سکتا ہے، چنانچہ قریش، انصار، اہل حجاز اور اہل نجد کے ساتھ آپؐ کا انداز گفتگو اس سے مختلف ہوتا تھا۔ جو آپؐ ذی المشعار الہمدانی، طہفۃ النہدی، قطن بن حارثہ العلیمی، اشعث بن قیس، وائل بن حجر الکندی اور دیگر امراء حضرموت اور شاہان یمن کے ساتھ اختیار کیا کرتے تھے۔

صاحب "اعلام النبوۃ" علامہ ابو الحسن الماوردی لکھتے ہیں[1]

---

[1] علوم النبوۃ صفحہ ۱۰

"انه افصح الناس لساناً واوضحهم بياناً واوجزهم كلاماً واجزلهم الفاظاً واصحهم معانٍ لا يظهر فيه هجنة التكلف ولا يتخلله فيهقة التعسف ..... وان كلامه جامع لشروط البلاغة ومعرب عن نهج الفصاحة ولو مزج بغيره لتميز باسلوبه وليظهر فيه آثار التنافر فلم يلتبس حقه من باطله ولبان صدقه من كذبه هذا ولم يكن متعاطياً للبلاغة ولا مخالطاً لاهلها من خطباء او شعراء او فصحاء وانما هو من غرائز فطرته وبداهة جبلته وما ذاك الا لغاية تراد وحادثة تشاء!"

آپؐ سب سے زیادہ فصیح اللسان، واضح البیان، مختصر الکلام تھے۔ آپؐ کے الفاظ سب سے زیادہ وزنی ہوتے۔ اور آپؐ کے معانی بھی سب سے زیادہ صحیح ہوتے۔ نہ تو آپؐ کے انداز تکلم یا اسلوب خطابت میں تکلف کا عیب نظر آتا۔ اور نہ اس میں لفاظی کی زبردستی کا خلل ہوتا تھا..... آپؐ کا کلام بلاغت کی تمام شرائط کا مجموعہ تھا جس سے فصاحت کے ایک خاص اسلوب کا اظہار ہوتا تھا۔ اگر آپؐ کا کلام کسی اور کے کلام سے ملا دیا جائے تو دوسرے شخص کا اسلوب الگ نظر آنے لگے گا۔ اس میں باہم بے ربط ہونے کے آثار بھی نظر آئیں گے اور اس طرح اس کا حق اس کے باطل سے خلط ملط نہ ہو سکے گا۔ اور جھوٹ سچ کھل کر سامنے آجائے گا۔ اس کے علاوہ نہ تو آپؐ نے بلاغت سیکھی تھی۔ اور نہ اہل بلاغت خواہ خطباء و شعراء ہوں یا فصحاء و بلغاء سے آپؐ کا کبھی میل جول رہا تھا۔ آپؐ کی بلاغت تو وہی ہے۔ جو آپؐ کی فطرت کی خاصیت اور آپؐ کی جبلت کا نقطہ آغاز تھا۔ اور یہ صرف کسی غایت مقصود اور کسی اہم واقعہ کے ظہور کیلئے ہوتا رہا تھا۔

حجۃ الاسلام امام ابو حامد الغزالی رحمۃ اللہ علیہ نے فصاحت نبوی کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا ہے[1]

"کان صلی اللہ علیہ وسلم افصح الناس منطقاً واحلاهم کلاماً ویقول انا افصح العرب وان اهل الجنة یتکلمون فیها بلغة محمد صلی اللہ علیہ وسلم وکان نزر الکلام سمح المقالة اذا نطق لیس بمهذار وکان کلامه خرزات نظمن، قالت عائشة رضی اللہ عنها کان لا یسرد الکلام کسردکم هذا، کان کلامه نزراً وانتم تنثرون الکلام نثراً، قالوا وکان اوجز الناس کلاماً وبذالک جاءه جبریل وکان مع الایجاز یجمع کل ما اراد، وکان یتکلم بجوامع الکلم لا فضول ولا تقصیر، کانه یتبع بعضه بعضاً بین کلامه توقف یحفظه سامعه ویعیه وکان جهیر الصوت

---

[1] احیاء علوم الدین ۲/۳۴۷

أحسن الناس نغمۃ، وکان طویل السکوت لا یتکلم فی غیر حاجۃ، ولا یقول المنکر ولا یقول فی الرضا والغضب إلا الحق ولیعرض عمن تکلم بغیر جمیل و یکنی عما اضطرہ الکلام إلی ما یکرہ، وکان اذا سکت تکلم جلساؤہ ولا یتنازع عندہ فی الحدیث ولیعظ بالجد والنصیحۃ و یقول: لا تضربوا القرآن بعضہ ببعض فإنہ أنزل علی وجوہ۔"

" آپ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ فصیح تھے۔ آپؐ کا کلام سب سے زیادہ شیریں تھا۔ اور کہا کرتے میں افصح العرب ہوں۔ اہل جنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان میں گفتگو کریں گے۔ آپؐ کم بولنے والے آسانی سے گفتگو کرنے والے تھے۔ جب بھی بولتے تو نہ آپؐ فضول بات کرتے نہ بیکار، یوں لگتا تھا کہ آپؐ کا کلام موتی ہیں جو لڑی میں پرو دیئے گئے ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا فرماتی ہیں۔ آپؐ سب سے زیادہ مختصر کلام کرنے والے تھے۔ یہی کچھ آپؐ کے لئے جبریلؑ لاتے تھے۔ اختصار کے ساتھ آپؐ کا کلام حسب ضرورت جامع بھی ہوتا تھا۔ آپؐ جوامع الکلم کے انداز میں بات کرتے تھے۔ جس میں نہ فالتو بات ہوتی نہ کوئی نقص۔ یوں لگتا تھا جیسے الفاظ ایک دوسرے کے پیچھے چلے آرہے ہیں۔ آپؐ کے کلام میں وقفہ ہوتا تھا۔ جس سے سننے والا آپؐ کی بات کو حفظ کر لیتا۔ آپؐ بلند آواز اور سب سے زیادہ خوش آواز تھے۔ آپؐ کافی دیر تک خاموش رہتے تھے۔ بغیر ضرورت آپؐ بات نہ کرتے تھے۔ ناپسندیدہ بات آپ کبھی نہ کرتے۔ خوشی اور ناراضگی میں حق بات ہی کہتے تھے۔ جو شخص اچھی بات نہ کرتا۔ اس سے آپؐ کنارہ کشی اختیار کرتے۔ مجبوراً کسی ناپسندیدہ چیز کا نام لینا پڑتا تو کنایات سے کام لیتے تھے۔ آپؐ جب خاموش ہوتے تو آپؐ کے ہمنشین بات کرتے تھے۔ آپؐ کے سامنے گفتگو میں جھگڑا نہیں ہوتا تھا۔ وعظ فرماتے تو بڑی توجہ اور اخلاص سے۔ آپؐ فرمایا کرتے تھے۔ آیات قرآنی کو ایک دوسرے سے مت ٹکرایا کرو کیونکہ یہ تو متعدد طریقوں سے نازل ہوا ہے"۔

امام الادب العربی ابو عثمان عمرو بن بحر الجاحظ افصح العرب صلی اللہ علیہ وسلم کی فصاحت و بلاغت کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کرتا ہے[1]۔

" وھو الکلام الذی قل عدد حروفہ وکثر عدد معانیہ وجل عن الصنعۃ ونزہ عن التکلف، وکان کما قال اللہ تعالےٰ قل یا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) وَمَا أَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِينَ، فکیف وقد عاب التشدیق وجانب أصحاب التقعیب، و استعمل المبسوط فی موضع البسط والمقصور فی موضع القصر وھجر الغریب الوحشی و رغب عن الھجین السوقی فلم ینطق إلا عن میراث حکمۃ ولم یتکلم إلا بکلام قد حف

---

[1] البیان والتبیین ۲/ ۶ تا ۱۸

بالعصمة وشيد بالتائيد ويسر بالتوفيق، وهو الكلام الذى ألقى الله عليه المحبة وغشاه بالقبول وجمع له بين المهابة والحلاوة وبين حسن الافهام وقلة عدد الكلام مع استغنائه عن إعادته وقلة حاجة السامع إلى معاودته ثم تسقط له كلمة ولا زلت به قدم ولا بارت له حجة ولم يقم له خصم ولا افحمه خطيب، بل يبذ الخطب الطوال بالكلم القصار ولا يلتمس إسكات الخصم إلا بما يعرفه الخصم، ولا يحتج إلا بالصدق ولا يطلب الفلج إلا بالحق ولا يستعين بالخلابة ولا يستعمل الموارية ولا يهمز ولا يلمز ولا يبطئ ولا يعجل ولا يسهب ولا يحصر ثم لم يسمع الناس بكلام قط أعم نفعا ولا اقصد لفظا ولا أعدل وزنا ولا أجمل مذهبا ولا أكرم مطلبا ولا أحسن موقعا ولا أسهل مخرجا ولا أفصح معنى ولا أبين فحوى من كلامه صلى الله عليه وسلم كثيراً۔

ترجمہ:۔ کلام نبوی ایک ایسا کلام ہے جس کے حروف کی تعداد تو قلیل ہے مگر اس کے معانی کی مقدار کثیر ہے یہ تصنع سے بلند تر اور تکلف سے منزہ ہے۔ یہ کلام تو بالکل ایسا ہی ہے۔ جیسا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! کہہ دیجئے کہ میں تکلف کرنے والوں میں سے نہیں ہوں! بھلا کیوں نہ ایسا ہوتا۔ جبکہ آپؐ نے باچھیں پھاڑ کر بات کرنے کو معیوب قرار دیا۔ اور گلے کی گہرائی سے آواز نکالنے والوں سے کنارہ کشی کی ہے۔ آپؐ بات کو پھیلانے کے موقع پر بات کو پھیلاتے اور مختصر بات کی جگہ مختصر بات ہی کرتے تھے۔ آپؐ انوکھے اور نامانوس الفاظ کو ترک کرنے اور ردی و بازاری الفاظ سے نفرت کرتے تھے۔ آپؐ کا کلام کیا تھا۔ سراپا حکمت و دانش کی میراث تھی۔ آپؐ کی گفتگو کو حفاظت خداوندی اپنے جلو میں لئے ہوئے تھی۔ اس کلام کی تعمیر کو تائید الٰہی اور توفیق ربانی کی سہولت میسّر تھی۔ یہ کلام نبویؐ ایک ایسا کلام ہے۔ جس میں اللہ نے محبت کی رنگت نکھار دی ہے اور اسے شرف قبولیت سے سرفراز فرمایا ہے۔ اس میں ہیبت کے ساتھ شیرینی و حلاوت اور حسنِ افہام کے ساتھ قلتِ کلمات ایک ساتھ نظر آئے گی۔ یہ کلام دوہرانے یا اعادہ کرنے سے مستغنی ہے۔ اور اسے سننے والا بار بار دوہرانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا! اس کلام میں سے نہ تو کوئی لفظ ساقط نظر آتا ہے اور نہ اس میں خطیب کی کوئی لغزش پا نظر آتی ہے، نہ تو اس کی حجت باطل ہوتی: نہ اس کے مقابلے میں کوئی دشمن ٹھہرا۔ اور نہ اسے کوئی خطیب لاجواب کرسکا۔ بلکہ طویل خطبات مختصر جملوں سے برتری حاصل کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس کلام میں دشمن کو کسی ایسی بات سے لاجواب نہیں کیا۔ جسے وہ جانتا نہ ہو۔ اس کی دلیل سراپا صدق ہے اور اس کی کامیابی کا راز صرف حق ہے۔ اس میں نہ تو لطافت کلام سے دھوکہ دینے کی کوشش نظر آتی ہے اور نہ چالاکی کا سہارا لیا جاتا ہے۔ اس میں نہ تو کسی کی غائبانہ عیب جوئی پائی جاتی ہے۔

نہ موجودگی میں کسی کی نکتہ چینی نظر آتی ہے۔ اس میں نہ تو سست روی ہے۔ اور نہ جلد بازی، اس میں نہ اسہاب (اتنی باتیں کرنا کہ پلے کچھ نہ رہے) ہے اور نہ حصر (بالکل بات ہی نہ کر سکنا) ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کے علاوہ کوئی ایسا کلام کبھی نہیں سنا جو اس قدر زیادہ نفع بخش، لفظی لحاظ سے اس قدر معتدل، توازن میں اس قدر کامل اور روش کے لحاظ سے اس قدر حسین وجمیل، مقاصد کے لحاظ سے اتنا محترم اثر میں اتنا خوبصورت، ادائیگی میں اس قدر آسان، معنی کو اس قدر کھول کر بیان کرتا ہو، اور جس میں مدعا اس قدر واضح کیا گیا ہو!"

جاحظ کا یہ بیان اگرچہ طویل ہے۔ مگر افادیت و اہمیت کے لحاظ سے خصوصیت کا حامل ہے۔ وہ علم بلاغت کا ایک امام اور مستند صاحب فن ہے۔ بلکہ عربی بیان و بلاغت کا اولین مورخ ہے۔ وہی سب سے پہلے عربوں کی خطابت کے واقعات اور نمونوں کو ضبط تحریر میں لایا۔ جاحظ نے فن خطابت کا کوئی حسن نہیں چھوڑا۔ جو اس عبارت میں فصاحت نبوی کے لئے ثابت نہ کیا ہو، اور بلاغت کا کوئی عیب نہیں بچا۔ کلام نبوت میں جس کے وجود کی یہاں نفی نہ کی گئی ہو۔ اس لئے صاحب فن کا یہ بیان بہت اہمیت کا حامل ہے۔

استاذ عباس محمود العقاد اپنی کتاب "عبقریۃ محمدؐ" میں فصاحت نبویؐ کے بارے میں دلچسپ بات کہتے ہیں۔

"فصاحت ایک ایسی صفت ہے جو کلام کے لئے بھی ہو سکتی ہے۔ انداز گفتگو اور ہیئت تکلم کے لئے بھی استعمال ہو سکتی ہے۔ اور گفتگو یا کلام کے موضوع کے لئے بھی آ سکتی ہے۔ اس لئے ہو سکتا ہے کہ کوئی کلام فی ذاتہ تو فصیح ہو مگر ہیئت نطق و تکلم فصیح نہ ہو۔ یا ہو سکتا ہے کہ کلام بھی فصیح ہو۔ اور ہیئت گویائی بھی فصاحت کا رنگ لئے ہو۔ مگر موضوع میں فصاحت کا وصف موجود نہ جس سے کلام کانوں کے لئے حلاوت و شیرینی کا سامان کرتا ہے اور دلوں کے لئے ساحرانہ اثر انگیزی کا سماں باندھتا ہے۔ لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی فصاحت میں یہ تمام اوصاف بیک وقت مکمل شکل میں موجود ہیں۔ آپؐ کے کلام کی ہیئت نطق و تکلم اور موضوع کلام سب میں فصاحت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپؐ افصح العرب تھے۔ جیسا کہ آپؐ نے خود ارشاد فرمایا تھا کہ میں قریش سے ہوں اور بنو سعد بن بکر میں میں نے پرورش پائی ہے۔ آپؐ کے نطق و گویائی کا جمال فصاحت بھی آپؐ کے کلام بلیغ کے جمال فصاحت کی طرح پرکشش اور بے مثال تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپؐ کے نطق و گویائی کی تصور کشی کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ

ما کان رسول اللہ یسرد کسردکم ھذا ولکن کان یتکلم ببین فصل یحفظہ من جلس الیہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یونہی باتوں میں نہیں لگے رہتے تھے جس طرح تم لوگ باتیں کرتے چلے جاتے ہو۔ بلکہ وہ ایسے انداز میں کلام کرتے تھے، جو واضح، نکھرا نکھرا ہوتا تھا جسے آپؐ کے پاس بیٹھنے والا حفظ کر لیتا تھا۔

ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص نطق و گویائی بھی فصیح و بلیغ رکھتا ہو۔ اور اس کا کلام بھی فصاحت و بلاغت پر مبنی ہو۔ مگر موضوع کے اعتبار سے اس میں کوئی ایسی بات نہ ہو۔ جسے سننے والا قابلِ توجہ سمجھے۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فصاحت اس عیب سے بھی منزہ اور پاک تھی۔ آپ کا ہر محفوظ قول یا حدیث اس بات کی دلیل صادق ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے جوامع الکلم عطا فرمائے تھے اور آپ کو فصاحتِ لسان اور فصاحتِ کلام کی طرح فصاحتِ موضوع بھی عطا فرمائی تھی۔

استاذ عقاد کا یہ قول تو فصاحت نبوی کی تشریح کے سلسلے میں آب زر سے لکھنے کے قابل ہے کہ۔

واتفقت الروایات علی تنزیہ نطقہ من عیوب الحروف ومخارجہا وقدرتہ علی إیقاعہا فی أحسن مواقعہا۔

تمام روایات متفق ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نطق گویائی حروف اور ان کے مخارج کے عیوب سے پاک تھی اور یہ کہ آپ ان حروف کے خوبصورت ترین اور مؤثر ترین طریقے سے ادا کرنے پر قدرت کاملہ رکھتے تھے۔

مصر کے ممتاز عالم استاذ محمد عطیۃ الابراشی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصی عظمت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے لئے عظمۃ الرسولؐ کے نام سے ایک عمدہ کتاب تصنیف کی ہے۔ اس کی ایک فصل کا عنوان ہے "عظمۃ الرسول فی فصاحتہ" فصاحت میں آپ کی عظمت، اس کا آغاز کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں۔

"کان الرسول صلی اللہ علیہ وسلم فصیح اللسان بلیغ القول، ناصع اللفظ، جزل العبارۃ قلیل التکلف، أوتی جوامع الکلم وخص ببدائع الحکم وعلم ألسنۃ العرب، یخاطب کل قبیلۃ بلسانہا ویحاورہا بلغتہا ولہجتہا۔ لیس کلامہ مع قریش والانصار واہل الحجاز ونجد ککلامہ مع اہل قحطان، ولا نبالغ اذا قلنا إن الرسول الأمی کان انصح الفصحاء وأبلغ البلغاء واذکی الاذکیاء أسلوبہ سہل عذب جمیل یفہمہ کل من یسمعہ أو یقرؤہ ویعجب بما فیہ من فصاحۃ وبلاغۃ[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان فصیح تھی۔ کلام بلیغ تھا۔ الفاظ پر رونق، عبارت عمدہ اور تکلف نہ تھا۔ آپ کو جوامع الکلم عطا ہوئے۔ انوکھی حکمت بھری باتیں آپ کی خصوصیت تھی۔ عرب کی زبانوں کا آپ کو علم عطا ہوا تھا۔ آپ ہر قبیلے سے اس کی زبان میں بات چیت کرتے۔ اس کی اپنی زبان اور لہجہ میں سوال و جواب ہوتے تھے۔ چنانچہ قریش، انصار، اہل حجاز اور اہل نجد کے ساتھ گفتگو میں جو انداز بیان اختیار کرتے وہ اس اسلوب کلام سے مختلف ہوتا تھا۔ جو آپ قحطانی عربوں کے ساتھ بات چیت کے دوران اختیار کرتے تھے۔ اگر ہم یہ کہیں تو مبالغہ نہ ہوگا کہ نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم تمام فصحاء سے بڑے فصیح، تمام بلغاء سے بڑے بلیغ اور تمام ذکی لوگوں سے

[1] عظمۃ الرسولؐ ص ۲۷۵

زیادہ ذہین تھے۔ آپؐ کا اسلوب آسان، شیریں اور خوبصورت ہوتا تھا۔ جسے ہر سننے اور پڑھنے والا سمجھ لیتا اور اس کی فصاحت و بلاغت سے لطف اندوز ہوتا تھا۔

خطابت نبوی کے اثرات:

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور نزولِ قرآن سے عرب قوم اور عربی زبان و ادب پر وسیع اثرات مرتب ہوئے۔ قرآن مجید کی بدولت ہی عربی زبان کو ایک متحدہ زبان کا شرف حاصل ہوا۔ اور ساتھ ہی شہرت عام اور بقائے دوام بھی عربی زبان کا مقدر بن گیا۔ شیکسپیئر کے ادب کو انگریزی زبان کے توسط سے شہرت نصیب ہوئی۔ جیسے کہ پنجابی میں لکھنے کے سبب وارث شاہ کی ہیر آج تک گوشۂ گمنامی میں ہے۔ مگر عربی زبان منتشر قبائل کے متضاد لہجات کے درمیان سے ایک زندہ و پائندہ اور متحدہ زبان بن کر ابھری اور دنیا پر چھا گئی۔ صدیوں کی سیاسی و سماجی غلامی بھی اس زبان کا کچھ نہ بگاڑ سکی۔ اس زبان کو یہ شرف ایک کتاب نے دیا۔ قرآن مجید نے عربی زبان کو یہ عظمت و اہمیت عطا کی:

اسی طرح خطابت نبوی نے بھی عربی زبان پر نمایاں اثر ڈالا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس نے عربی خطابت کا رخ موڑ دیا۔ خطابت لفظوں کی ایک شعبدہ بازی تھی جس کا مظاہرہ، پانو کاہنوں کی ملمع سازی اور پُرتکلف سجع و قافیہ سے ہوتا تھا۔ اور یا اسے منافرت و مفاخرت کا ہتھیار سمجھا جاتا تھا۔ مگر بعثت محمدی اور خطابت نبوی نے اس صورت حال کو بدل کر رکھ دیا۔ سجع و قافیہ اور ابہام کی ملمع سازی کو یک قلم منسوخ و مسترد ٹھہرایا گیا[1] منافرت و مفاخرت کے ہتھیار کو معاشرے کا مفید اور پراثر تعمیری وسیلہ بنا دیا گیا۔ خطابت کا ایک ایسا اسلوب رواج پا گیا۔ جو سادگی و سلاست کے ساتھ رونق و رعنائی کا رنگ بھی لئے ہوئے تھا۔ یہی اسلوب خطابت منبر و مسجد کا خاصہ بن گیا۔ اور بندگانِ خدا کی ہدایت و رہنمائی، وعظ و نصیحت، تلقین جہاد اور احکام شریعت کی تعلیم کے لئے استعمال کیا جانے لگا۔ اس طرح خطابت نبوی نے قرآن مجید کے بعد عربی زبان پر سب سے زیادہ اثر ڈالا[2]۔ کیونکہ اثرات میں کتاب اللہ کے بعد ارشادات نبوی کا مقام ہے[3]:

"بعبارة هي الخطابة النبوية وجوامع الكلم في الفصاحة والبلاغة والايجاز والبيان بالدرجة الثانية بعد القرآن ولذلك كان تأثيرها في اللغة والأدب بالمنزلة التالية لكلام الله تعالى ولا سيما حكمه وجوامع كلمه التي هي القدوة الحسنة للأديب والحلية التي يزدان بها كلام الكاتب والخطيب"۔

خلاصہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خطابت اور جوامع الکلم فصاحت و بلاغت اور ایجاز و بیان میں قرآن کریم کے بعد دوسرے درجے پر ہیں۔ اسی لئے عربی زبان و ادب پر اثر ڈالنے کے لحاظ سے اس کا

---

[1] البیان ۱/ ۲۸۷ [2] الوسیط ص ۱۰۲ [3] الوسیط ص ۱۰۲

درجہ کلام اللہ کے بعد ہے بخصوصاً آپؐ کی حکمت بھری باتیں اور جوامع الکلم ہر ادیب کے لئے خوبصورت نمونہ ہیں اور ایک ایسا زیور ہیں جس سے ہر انشا پرداز اور خطیب کا کلام زینت پاتا ہے۔

مسجد نبوی میں جس منبر سے خطابت نبوی کا آغاز ہوا تھا۔ وہ اسلامی معاشرے میں مسجد کی ایک لازمی روایت بن گئی۔ منبر نبوی سے سیاسی و قومی احکام، فقہی و دینی مسائل کی تشریح، وعظ و نصیحت اور تزکیہ و تبلیغ کا کام خطابت سے لیا جاتا تھا۔ بعد میں یہ ایک روایت بن گئی جو اموی اور عباسی خلافتوں کے علاوہ دیگر اسلامی حکومتوں کا بھی لازمہ رہی۔ زوال و انحطاط کے باعث سیاسی و قومی کام کا رشتہ تو منبر سے منقطع ہو گیا۔ مگر باقی موضوعات آج تک منبر و محراب کی ایک لازمی روایت بنی چلی آ رہی ہے۔ دنیا کے کسی بھی گوشے میں مسجد ہو جہاں مسلمان جمعہ اور عیدین کے لئے جمع ہوتے ہوں، وہاں منبر بھی لازمی ہو گا۔ اور نماز جمعہ اور عیدین کا خطبہ بھی لازمی ہو گا۔ جو نماز جمعہ یا عیدین کے لئے جائے گا خطبہ سننا بھی اس کو لازم ہو گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے اللہ کی حمد و ثنا سے خطبہ کا آغاز نہیں ہوتا تھا۔ یہ روایت بھی آپؐ سے قائم ہوئی جو آج تک قائم و دائم چلی آتی ہے۔ ہر خطیب کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنی تقریر یا خطبے کا آغاز "الحمد للہ" سے ہی کرے۔ حمد و ثنا اور صلوٰۃ و درود کے بعد مدعا و مقصد کی طرف منتقل ہونے سے پہلے "اما بعد" کے الفاظ بھی خطابت کی تاریخ میں سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی استعمال فرمائے جو بعد میں اسلامی خطبات کی ایک لازمی روایت بن گئی اور آج بھی یہی معمول ہے۔ خطبہ عیدین کا آغاز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "اللہ اکبر" سے فرماتے تھے اور آج تک امت کا بھی یہی معمول ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ اپنے خطبات میں کتاب اللہ کے اقتباسات بکثرت استعمال فرماتے تھے۔ آج تک امت اسلامیہ کے خطباء بھی آیاتِ قرآنی کے علاوہ آپؐ کے جوامع الکلم، خطبات اور ارشادات کے اقتباسات بھی استعمال کرتے ہیں۔ بلکہ مکتوب نگار اور انشاء پرداز بھی اپنی تحریروں کو آیات و جوامع الکلم سے مزین کرتے ہیں۔ جاحظ نے مسلم خطباء کی متعدد مثالیں دی ہیں۔ جنہوں نے نبوت کے جوامع الکلم سے اپنے کلام کو مؤثر و مزین بنایا۔ یزید بن المہلب کے قتل کے موقع پر مشہور خطیب الحارث بن عبداللہ تقریر کرنے کے لئے کھڑا ہوا تو اس نے کہا تھا۔

"ایها الناس اتقوا الفتنة فانها تقبل بشبهة وتدبر ببيان وان المؤمن لا يلسع من جحر مرتين"

(اے لوگو! فتنے سے بچو! کیونکہ اس کا آغاز تو شبہ سے ہوتا ہے۔ مگر اس کا انجام بہت واضح ہوتا ہے اور مومن تو ایک سوراخ سے دو بار ڈسا نہیں جاتا!)

یہاں حارث نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جوامع الکلم میں سے ایک مشہور قول کو استعمال کیا ہے۔ اسی طرح کی اور مثالیں عرب فصحاء و بلغاء کے ہاں دستیاب ہیں۔

لے البیان و التبیین [illegible]

ابن عبدربہ نے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خطبات میں لوگوں کو تقویٰ اللہ، ذکر اللہ اور احکام الٰہی کی بجا آوری کی تلقین و توصیہ فرماتے تھے۔

"عباد اللہ! أوصیکم بتقوی اللہ وأحثکم علی طاعتہ"

"اے اللہ کے بندو! میں تمہیں اللہ کے تقویٰ کی وصیت کرتا ہوں اور اس کی اطاعت پر ابھارتا ہوں"۔

آج بھی اگر آپ عرب و عجم کے کسی اسلامی ملک کی کسی مسجد میں جمعہ یا عیدین کے لئے چلے جائیں تو خطیب کی زبان سے یہ الفاظ آپ ضرور سنیں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خطبات میں جن امور کا التزام فرمایا۔ ان سے انحراف کرنا اہل علم کے نزدیک خطبات کے عیوب میں شمار ہوتا ہے۔ بقول جاحظ[1]

"وعلی أن خطباء السلف الطیب وأھل البیان من التابعین باحسان مازالوا یسمون الخطبۃ التی لاتبتدأ بالتحمید وتستفتح بالتمجید: البتراء ویسمون التی ماتوشح بالقرآن وتزین بالصلاۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم: الشوھاء"

علاوہ ازیں خطبائے سلف صالحین اور بھلائی کے ساتھ اتباع کرنے والے بلغاء اس خطبے کو البتراء (دم کٹا، ناقص) کہتے رہے ہیں جو تحمید و تمجید سے شروع نہ کیا گیا ہو۔ اور جو خطبہ آیات قرآنی اور درود و صلاۃ سے مزین نہ ہو، اسے شوہاء (بگڑی ہوئی شکل والا) کہتے ہیں۔

دعوت اسلام میں کلام اللہ کی تاثیر کے بعد سب سے مؤثر طریقہ افصح العرب صلی اللہ علیہ وسلم کی خطابت تھی۔ وہی خطابت کا فن جو عرب میں پہلے سے موجود تھا۔ مگر اعلیٰ ترین اقدار زندگی کے لئے استعمال نہیں ہوتا تھا۔ مگر آپ نے اسے شرک و بت پرستی کی جڑیں کاٹنے اور انسانی معاشرے کی اصلاح کے لئے ایک کامیاب ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔ توحید و رسالت اور حق و صداقت کی تبلیغ، عمل صالح اصلاح ذات البین، تحریض علی الجہاد اور انسانیت کی فلاح دارین کے لئے آپ نے خطبات کو استعمال کیا۔[2]

"فکان العمل الاکبر لصاحب الدعوۃ العظمی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم بادئ امرہ، غیر تبلیغ القرآن، وارداً من طریق الخطابۃ، ولامر ماجعلھا الشارع شعار کل إمام فی حفل دینی أو سیاسی کالجمعۃ والعیدین وموسم الحج الأکبر، ولیوم الصف وکل أمر جامع لنشر فضیلۃ أو النھی عن رذیلۃ او اعلان عن نصر او تاکید وسیلۃ الی غیر ذلک من الامور ذوات البلال، ولذلک کان وعاۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم ورسلہ إلی الملوک وامراء جیوشہ وسرایاہ ثم خلفتہ ومن بعدہم وعمالھم

---

[1] البیان ۲/۶ [2] الوسیط ص ۱۰۵

کلهم خطباء مصاقع ولسنا مقاول[1]

چنانچہ صاحب دعوت عظمیٰ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا کام یہ تھا کہ تبلیغ قرآن مجید سے آغاز کرنے کے علاوہ آپؐ نے خطابت کو بھی ایک وسیلہ بنایا۔ اسی لئے شریعت نے خطابت کو تمام خلفاء کا شعار بنا دیا مجلس دینی ہو، یا سیاسی جیسے جمعہ، عیدین اور موسم حج اکبر، یوم صف آرائی ہو، یا کوئی اجتماعی کام جس سے فضائل کو عام کرنا اور رذائل سے روکنا، مقصود ہوتا۔ فتح کا اعلان ہوتا۔ وصیت کی تاکید مقصود ہوتی تو ایسے تمام اہم کام کے لئے خطابت کو ذریعہ بنایا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبلغ آپؐ کے خلفاء اور ان کے عامل وحکام سب فصیح وبلیغ خطیب اور ترجمان مدعا ہوتے تھے۔

اگر موضوع کو وسعت دیتے ہوئے ارشادات نبویؐ کی تمام انواع کے اثرات پیش نظر ہوں تو معلوم ہوگا کہ ان کے اثرات کا دائرہ بے حد وسیع ہے۔ محدثین نے احادیث کی شرحیں لکھیں اور ان میں حکمت وہدایت کے خزانوں کو عام کیا۔ فقہا نے احکام کا استنباط کیا۔ اہل لغت نے ان کے الفاظ وتراکیب سے فائدہ اٹھایا۔ اور علماء ادب وبلاغت کو ان میں فصیح محاورات اور زندۂ جاوید جملے اور کلمات کے بلند نمونے میسر آتے رہے۔

کلام اللہ اور کلام نبوی میں فرق

علمائے نقد وبلاغت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ فصاحت وبلاغت میں کلام اللہ کے بعد کلام نبوت کا مقام ہے۔ کتاب اللہ کا اسلوب معنوی ولفظی ایک اسلوب ہے۔ جس کی نظیر پیش کرنے سے زمانے عاجز ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ کسی انسان کا کلام نہیں۔ بلکہ قادر مطلق کا پیغام ہے۔ جو اس نے اپنے بندے پر اپنے آخری پیغام کے طور پر نازل کیا۔ تاکہ انسانیت کو جہالت اور معصیت کی تاریکیوں سے نکال کر علم وعرفان اور ایمان وتقویٰ اللہ کی روشن راہوں پر ڈال دیا جائے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ظہور قدسی اور اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ کا ورود ایک ایسا نقطہ ہے۔ جس کے پس منظر میں جائیں تو تاریکی ہی تاریکی ہے اور آگے کی طرف آئیں تو آفتاب نبوت کی کرنیں چہار دانگ عالم میں پھیلتی دکھائی دیتی ہیں۔ انسانی تمدن وتہذیب کا قافلہ روشن سے روشن تر میدانوں کی طرف بڑھتا ہوا نظر آتا ہے۔ ظہور قدسی ایک ایسی روشنی ہے جس کے بعد علم وسائنس کا بول بالا اور اجالا ہی اجالا ہے۔

معاندین اسلام یہ کہا کرتے ہیں کہ قرآن مجید کلام اللہ نہیں بلکہ معاذ اللہ۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا کلام ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا رہا ہے کہ جس ہستی نے اپنے تو اپنے دشمن کے ساتھ کذب وافتراء کو گناہ کبیرہ سمجھتے ہوئے ہمیشہ اجتناب کیا ہو، اور سب نے جسے صداقت وامانت کا تاج پہنایا ہو، اس نے اگر خدانخواستہ کذب وافتراء باندھا بھی تو اللہ رب العالمین پر!!

---

[1] ادب الحدیث النبوی ص ۱۰۴

جس پر نازل ہونے والی کتاب میں بار بار یہ کہا گیا ہو کہ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَبَ عَلَى اللهِ۔ اس سے بڑا ظالم کون ہوگا۔ جو اللہ پر جھوٹ بولے! وہ خود ہی اللہ پر اتنا بڑا افترا باندھنے لگے۔ معاذ اللہ۔ جب کہ عملی زندگی میں جس نے کسی موڑ پر کسی لمحے کسی دوست، دشمن سے کوئی معمولی سے معمولی وعدہ خلافی، دھوکہ، یا افتراء یا جھوٹ نہیں بولا جس نے اپنی نبوت کی صداقت کی دلیل میں اپنا بچپن، اپنا عہد شباب اور زندگی کا تمام دفتر عمل پیش کیا ہو۔ وہ اللہ رب العالمین پر کیسے افتراء باندھ سکتا ہے۔ وہ اللہ جس کی توحید کے لئے اس نے تن من دھن قربان کر دیا جس کا ذکر اس کی بہترین روحانی غذا تھا۔ وہ اللہ جسے وہ دم واپسیں بھی اپنا الرفیق الاعلیٰ کہہ کر پکارتا رہا۔ اور جس کے حضور پیش ہونے کے لئے اس کے اشتیاق، محبت اور عقیدت کی کوئی حد نہ تھی۔ وہ اس پر کذب و افتراء کی جسارت کر سکتا تھا؟ معاذ اللہ!

آخر اسے اس کی ضرورت کیا تھی؟ کیا وہ قرآن کو اپنا تخلیقی کمال کہہ کر فصحاء و بلغائے عرب کو اپنے سامنے جھکا نہیں سکتا تھا؟ اسے اپنے بجائے خدا کا کلام قرار دے کر معاذ اللہ اپنا کمال ضائع کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ عرب اس کے سامنے سربسجود ہوتے اس کے اشاروں پر چلتے، اسے اپنا آقا، ملک، دیوتا مانتے! اور تاریخی طور پر یہ صداقت ثابت ہے کہ عربوں نے ایسا کرنے کے لئے آپ سے کہا بھی تھا۔ مگر آپ نے پیغام حق اور توحید ربانی کو ترک کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ کیا صرف اس لئے کہ کانٹوں پہ چلیں۔ پتھر کھائیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جس خدا کی توحید اور پیغام حق کے لئے سب کچھ ٹھکرا رہے ہیں۔ اس پر کذب و افتراء باندھیں۔ معاذ اللہ۔

یورپ کے عالم نما پادری اور مستشرقین تو آج یہ بات کہتے ہیں کیونکہ ان کے ہاں تو وحی ربانی کا تصوّر ہے ہی نہیں۔ ان کے لئے تو خدا نے اپنا بیٹا دنیا میں انسانی روپ میں بھیجا اور اپنے حواریوں کو وعظ کرتا رہا جسے انہوں نے لکھ لیا۔ ان بے چاروں کو یہ کون سمجھائے یا ان سے پوچھے کہ جو خدا اپنا بیٹا دنیا میں انسانی روپ میں بھیج کر سولی پر چڑھوا سکتا ہے۔ کیا وہ کسی پیغمبر کے قلب اطہر پر یا اپنے مقربین کے توسط سے اپنا پیغام نہیں بھیج سکتا ہے۔ بے چارے مستشرقین کی طرح کفار عرب بھی وحی ربانی کے تصور سے عاری تھے۔ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت اور امانت کو تو مانتے تھے لیکن وہ پیغام ربانی کو افتراء علی اللہ تصور کرتے تھے۔ قرآن مجید نے پہلے دس سورتیں اور پھر ایک سورت گھڑ کر بنا لانے کا چیلنج دیا۔ پھر کہا کہ جن وانس مل کر بھی قرآن مجید کی نظیر لانے سے عاجز ہیں۔ ساری دنیا کو مثل لانے کا چیلنج دیا گیا جو آج بھی قائم ہے۔ چودہ صدیوں کے دوران میں بہت سے لوگوں نے بزعم خویش اس چیلنج کو قبول کیا۔ اور قرآن مجید کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی۔ ان میں بڑے بڑے شاعر اور فصیح و بلیغ ادباء و خطباء بھی شامل تھے۔ ان سب نے منہ کی کھائی۔ ان لوگوں نے جو کچھ کہا، یا لکھا۔ وہ محفوظ ہے۔ مقابلہ و موازنہ کر کے دیکھ لو۔ شان نبوت معلوم ہو جائے گی۔ نبی امی کا معجزہ آج بھی قائم ہے۔ تاکہ دنیا کو نبوت کی عظمت و حقیقت معلوم ہوتی رہے۔

مصر کے مشہور عالم ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے اعجاز قرآن کو ایک نہایت ہی سادہ انداز میں سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ دنیا کے تمام انسانوں نے اپنی اپنی زبان میں جو ادب تخلیق کیا ہے۔ وہ دو اصناف پر مشتمل ہے۔ نظم یا نثر۔ مگر عربی زبان کا ادب دو اصناف پر مشتمل نہیں ہے۔ بلکہ تین اصناف پر مشتمل ہے۔ ایک نظم، دوسری نثر۔ اور تیسرا قرآن مجید! چونکہ قرآن نہ نظم ہے نہ نثر

میں آتا ہے، نہ نثر کے دائرے میں، بلکہ یہ تو ایک الگ اور مستقل تیسری صنف ہے۔ جسے قرآن ہی کہا جا سکتا ہے۔ چونکہ انسانی کلام نظم میں ہوتا ہے یا نثر میں اور قرآن مجید تو نہ نظم میں ہے نہ نثر میں، تو ظاہر ہوا کہ یہ کسی بشر کا کلام تو ہے نہیں۔ پھر کس کا ہوا؟

قرآن مجید کے متعلق اللہ کا ایک ارشاد یہ بھی ہے کہ اس کے بارے میں نئی نئی باتیں انسانوں کو معلوم ہوتی رہیں گی۔ انہیں ایسی آیات و نشانیاں دیکھنے کو ملتی رہیں گی جن کے بعد انہیں اللہ وحدہٗ لاشریک کی ہستی اور قرآن مجید کے اعجاز ربانی ہونے کا یقین حاصل ہوتا رہے گا! لوگ تو کہتے ہیں نا کہ قرآن مجید، معاذ اللہ کلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ مگر قدرت کی ستم ظریفیاں بھی بڑی عجیب ہیں۔ لوگوں نے آپؐ کے اقوال جمع کرنا شروع کیے تو بعض کا خیال تھا کہ کبھی آپ خوش ہوتے ہیں، کبھی غصے میں۔ پھر انسان باتوں کو ضبط تحریر میں لاتے وقت بھی غلطی کر سکتا ہے۔ مگر حکمتِ خداوندی نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے کہلوایا کہ ان سے کہہ دیجئے کہ آپؐ کی تمام باتیں تحریر کر کے محفوظ کر لی جائیں۔ چنانچہ آپؐ کے خطبات، آپؐ کے جوامع الکلم، اقوال اور اعمال تک محفوظ کر دیئے گئے۔ جو آج بھی موجود ہیں اور سان سے کلام اللہ کا مقابلہ اور موازنہ کر لیں۔ آخر کہیں تو لفظ و معنی کی برابری ثابت ہو جائے گی۔ کیونکہ آدمی اپنے اسلوب سے پہچانا جاتا ہے! دوسرے لفظوں میں ایک ہی آدمی کی گفتار و نگارشات ایک جیسی ہوں گی! اب آپ خطبات نبوی، جوامع الکلم، آپؐ کے مکتوبات اور پھر صحیح احادیث کا مطالعہ کیجیے۔ آپ کو خطبات میں جوامع الکلم، جوامع الکلم میں خطبات اور احادیث میں خطبات اور جوامع الکلم کا رنگ واضح نظر آئے گا۔ افصح العرب صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام انواع کلام میں آپ کو ایک جیسی فصاحت و بلاغت، ایک جیسی سلاست و روانی اور سادگی و بے تکلفی نظر آئے گی۔ لیکن ان میں سے کسی ایک صنف کا قرآن مجید سے تقابل کر کے دیکھ لیجیے زمین و آسمان کا فرق نظر آئے گا۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کا تقابل کسی اور فصیح و بلیغ خطیب عرب سے کیجیے آپ کو انیس بیس کا فرق نظر آئے گا۔ آپؐ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسلوب بیان میں اور دوسرے خطیب کے اسلوب بیان میں آپ کو وہی فرق نظر آئے گا۔ جو دو خطیبوں، یا دو ادیبوں اور دو انشاء پردازوں کے اسلوب میں عادتاً پایا جا سکتا ہے۔ مثلاً حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا اسلوب خطابت کافی حد تک خطابت نبویؐ کے اسلوب سے ملتا ہے۔ آخر کیوں نہ ہو، نبوت کے فیض تربیت کا اثر تو ہونا تھا۔ جو کچھ مدینۃ العلم میں ہے وہ باب العلم سے ظاہر تو ہوتا ہے۔

لیکن جب آپ ان میں سے کسی بزرگ کے کلام سے کلام اللہ کا موازنہ کریں گے تو مساوات و برابری یا مشابہت تو رہی ایک طرف آپؐ کو زمین و آسمان کے فاصلے نظر آئیں گے۔ حتیٰ کہ کلام نبوت میں سے جوامع الکلم بے حد فصیح و بلیغ کلام ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اکثر تحدیث نعمت کے طور پر فرمایا کرتے تھے۔ نُصِرْتُ بِالصَّبَا وَاُوْتِیْتُ جوامع الکلم: اللہ نے مجھے باد صبا کے ذریعے فتح دلائی اور جوامع الکلم عطا فرمائے"۔ مگر ان کلمات حکمت کا جب قرآن مجید کی کسی آیت سے تقابل کریں گے تو لفظ و معنی کا اسلوب آپ پر کلام بشر اور کلام اللہ کا فرق واضح کر دے گا۔

اعجاز القرآن کے مصنف علامہ ابوبکر الباقلانی نے کسی زمانے میں کلام نبوت اور کلام اللہ میں فرق کرنے کی کوشش فرمائی تھی۔ وہ آج بھی ہماری توجہ کی اسی طرح مستحق ہے۔ جس طرح گزشتہ زمانوں میں تھی۔

باقلانی فرماتے ہیں کہ قرآن مجید کے اسلوب اعجاز اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال بلیغ میں جو لفظی اور معنوی

فرق ہے وہ بالکل واضح ہے۔ جو شخص عربی زبان کے قواعد کے ساتھ ساتھ فصیح و بلیغ ادب کے صوری و معنوی محاسن کا علم و ذوق رکھتا ہے۔ اس کے لئے یہ فرق معلوم کرنا کچھ مشکل نہیں ہے۔ اگر بلاغت قرآن اور بلاغت نبوی میں فرق کرنے کا کوئی واضح طریقہ مقصود ہو تو اس طرح ممکن ہے کہ خطبات نبوی اور اس عہد کے دیگر اہل علم کے خطبات کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو ان میں کوئی نمایاں فرق نظر نہ آئے گا۔ آپؐ کے خطبات اور خلفائے راشدین کے خطبات میں، یا اسی عہد کے دیگر خطباء کے خطبات میں وہی فرق نظر آئے گا جو کسی ایک عہد کے دو فصیح و بلیغ خطیبوں کے اسلوب میں پایا جا سکتا ہے۔ علامہ باقلانی کے الفاظ ہیں[1]۔

انما یقع بین کلامہ وکلام غیرہ من التفاوت مایقع بین کلام الفصحین و بین شعر الشاعرین۔

آپؐ کے کلام اور دوسروں کے کلام میں وہی فرق نظر آئے گا جو دو فصیح آدمیوں یا دو شاعروں کے کلام میں پایا جا سکتا ہے۔

جدید دور کے مصری علماء میں سے علامہ بکری شیخ امین نے حدیث نبوی کی ادبی حیثیت اور مقام کے متعلق ایک بہترین کتاب تصنیف کی ہے۔ اس میں انہوں نے کلام اللہ اور کلام نبوت میں فرق کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔

ڈاکٹر بکری شیخ امین نے کلام ربانی اور کلام نبویؐ کا فرق سمجھانے کے لئے جہاد کے متعلق آیات قرآنی اور احادیث نبویؐ کا ایک تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ لفظی و معنوی اعتبار سے احادیث نبوی اور آیاتِ قرآنی میں نمایاں فرق ہے۔ موضوع اگرچہ ایک ہے مگر موضوع سے تعرض کرتے، اس کی تفہیم و وضاحت اور تفصیل و تشریح کے لئے جو اسلوب بیان اختیار کیا گیا ہے۔ وہ دونوں جگہ بے حد مختلف ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی موضوع سے متعلق آیات اور احادیث جمع کر کے ان کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو نتیجہ وہی نکلے گا۔ جس پر ڈاکٹر بکری شیخ امین جہاد کے متعلق آیات اور احادیث کے تقابلی مطالعہ کے بعد پہنچے ہیں۔ توحید باری تعالےٰ قرآن مجید کا اہم ترین مضمون ہے۔ احادیث نبوی میں بھی اللہ کی وحدانیت کو ایک اہم مضمون کی حیثیت حاصل ہے۔ اس موضوع سے متعلق آیات و احادیث کا تقابلی مطالعہ کر کے دیکھ لیجئے۔ کلام ربانی اور کلام نبوی کا فرق معلوم ہو جائے گا۔ اسی طرح قیامت، جنت، دوزخ، عصیان و الحاد جنات و ملائکہ، قصص انبیاء، عبادات و عقائد، انسانی فطرت، اللہ اور بندے کا باہمی رشتہ، ذاتِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا فضل و مرتبہ وغیرہ ایسے موضوعات ہیں جو کتاب اللہ اور حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں مشترک ہیں مگر دونوں جگہ بیان کا انداز جدا ہے۔ ہر ایک کا اسلوب بلاغت الگ ہے۔

اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق قرآن مجید کی سورت الفتح کی آخری آیات میں اللہ تعالےٰ نے جو کچھ فرمایا ہے۔ اس کے اسلوب بیان، لفظی و معنوی محاسن اور نظامِ فصاحت و بلاغت کا تقابلی مطالعہ اس حدیث سے کیا جا سکتا ہے۔ جس میں آنحضرت صلی اللہ

---

[1] اعجاز القرآن ۱۶۴

علیہ وسلم نے اپنے صحابہ سے تعرض کرنے سے ممانعت فرماتے ہوئے انہیں نجوم ہدایت قرار دیا ہے یا مثلاً اخوت اسلامی کے موضوع کو ہی لے لیجئے۔ قرآن مجید کی سورت حجرات کی ایک چھوٹی سی آیت ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (۴۹/۱۰)

مومنین تو آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اس لئے اپنے دو بھائیوں میں (جھگڑا ہو) تو صلح کرا دیا کرو۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

کہنے کو تو یہ دس لفظ ہیں۔ مگر ان میں معانی کے چار ابواب جمع کر دیئے گئے ہیں۔ پہلی یہ کہ ایمان اخوت کی بنیاد ہے۔ اہل ایمان گئے گزرے حالات میں بھی اپنے بھائیوں کے لیے جو جذبات رکھتے اور ان کے لئے قربانیاں دیتے رہتے ہیں۔ وہ کسی پر مخفی نہیں۔ اخوت اسلامی دنیا کے لئے ایک سبق اور اہل فکر کے لئے دعوت مطالعہ ہے۔ دوسری بات بھائیوں کے اختلافات دور کرنے کا حکم، گویا اللہ تعالیٰ کو انسانی فطرت کا علم ہے وہ جانتا ہے کہ ایمان کا جذبہ کمزور پڑا تو جھگڑا ممکن ہے۔ اس لئے اخوت کے رشتے کو دائمی رکھنے کے لئے ایک مستقل مشینری مقرر کر دی گئی کہ دو بھائی اگر جھگڑیں تو باقی مومن فوراً صلح کرا دیں۔ اور غفلت نہ کریں۔ اہل ایمان نے یہ نقیہ پس پشت ڈال دیا۔ مگر اخوت اسلامی کے عملی مظاہرے اب بھی اہل ایمان کی بستیوں میں دیکھئے کو مل جاتے ہیں۔ پھر تیسری بات یہ ہے کہ اہل ایمان کی اخوت اور جھگڑے کی صورت میں مصالحت کا کام تقویٰ اللہ سے انجام پائے گا۔ لہٰذا تقویٰ کے لوازمات اور تقاضے بھی پورے کرو۔ اخوت، مصالحت اور تقویٰ اللہ پر عمل کا انعام چوتھی بات ہے۔ اور وہ ہے اللہ کی رحمت، جس کام کا اجر اللہ کی رحمت ہو۔ اس کی اہمیت کیا ہو گی۔ اور اس سے غفلت برت کر اللہ کی رحمت سے محرومی کا شکار ہو کر کتنا بڑا خسارہ ہو گا۔

یہ تو ان دس لفظوں کے معنی کی بات ہوئی۔ رہا لفظی اسلوب اور اس کے محاسن تو اس کا اندازہ اسی سے لگا لیجئے کہ دس لفظوں میں جو چار ابواب ہیں۔ انہیں موضوعات بنا کر کیا کچھ تصنیف کیا جا سکتا ہے۔ ؟ اس لطافت اور حلاوت کو جانے دیجئے۔ جو یہ دس لفظ زبان اور قوت سامعہ کو عطا کرتے ہیں۔

اب لیجئے اسی موضوع پر ایک حدیث نبوی۔

"المسلمون تتکافؤ دماؤھم ویسعی بذمتھم ادناھم وھم ید علی من سواھم"

اہل اسلام کی جانیں باہم ہم پلہ ہوتی ہیں۔ ادنیٰ مسلمان بھی ان کی ذمہ داری اٹھانے کی کوشش کرے گا۔ اور وہ دوسروں کے مقابلے میں ایک ہیں۔

حدیث نبوی گیارہ الفاظ پر مشتمل ہے۔ ان میں تین باتیں بیان ہوئی ہیں۔ سب مسلمانوں کا خون برابر ہے۔ کوئی مسلمان ذمہ داری لے تو وہ سب کو لازم ہے یا قریب ترین ان کی ذمہ داری لے گا۔ اور تیسری بات یہ کہ وہ دشمن کے مقابلے میں ایک ہیں لفظی اعتبار سے بھی الفاظ میں جمال محمدی تو ہے۔ مگر وہ لطافت رحمانی اور جلال ربانی نہیں جو آیت کریمہ میں ہے۔

زیادتی ہو گی اگر ہم ڈاکٹر بکری شیخ امین کے اس تقابلی مطالعہ سے صرف نظر کریں۔ جو انہوں نے جہاد سے متعلق آیات اور

احادیث کے ضمن میں پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"یؤمن کل من قرأ فی القرآن الکریم و فی الحدیث الشریف ان بینھما من الفرق القدر الکبیر، ولا سیما فی الخصائص الاسلوبیہ والتعبیریۃ والفنیۃ وان القرآن یختلف فی ھذا المستوی عن الحدیث، وان قائل ھذا غیر قائل ذاک، ولاثبات ھذہ الحقیقۃ نورد نموذجین احدھما من القرآن وثانیھما من الحدیث الصحیح کلاھما یدور حول موضوع واحد ولیکن الموضوع الجہاد فی سبیل اللہ۔

جو شخص بھی قرآن کریم اور حدیث شریف کا مطالعہ کرے گا۔ اسے یقین ہو جائے گا کہ ان دونوں میں جو فاصلے ہیں۔ ان کی مقدار بہت ہے خصوصاً اسلوب بیان، طریقۂ اظہار اور فنی پہلوؤں کے لحاظ سے اور یہ کہ اس معیار میں قرآن حدیث سے مختلف ہے۔ اور اس کا قائل اور ہے اور اُس کا قائل کوئی اور۔ اس حقیقت کو ثابت کرنے کے لیے ہم دو نمونے پیش کرتے ہیں۔ ایک قرآن سے اور دوسرا حدیث سے دونوں کا تعلق ایک ہی موضوع سے ہے اور یہ موضوع ہوگا جہادِ فی سبیل اللہ۔

اس کے بعد انہوں نے حسب ذیل سات آیات قرآن اور پھر ایک حدیث نبوی پیش کی ہے۔ اور اس کے بعد ان کا تقابل مطالعہ کر کے نتائج اخذ کیے ہیں۔

آیات قرآنیہ

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ یَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝ (البقرۃ / ۲۱۲)

بلاشبہ جو لوگ ایمان لائے اور جن لوگوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ وہی لوگ ہیں جو اللہ کی رحمت کی امید رکھتے ہیں۔ اور اللہ تو بخشنے والا ہے مہربان رحمت والا ہے

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا یَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِیْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَیَعْلَمَ الصّٰبِرِیْنَ ۝ (آل عمران / ۱۴۲)

کیا تم نے یہ خیال کر لیا کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔ حالانکہ ابھی اللہ نے تم میں سے ان لوگوں کو نہیں جانا جو جہاد کرتے ہیں۔ اور تاکہ وہ صبر والوں کو جان لے۔

لَا یَسْتَوِی الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ غَیْرُ اُولِی الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِیْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِیْنَ دَرَجَةً وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِیْنَ عَلَى الْقٰعِدِیْنَ اَجْرًا عَظِیْمًا (النساء / ۹۵)

وہ زن برابر نہیں ہو سکتے مومنوں میں سے بیٹھ رہنے والے جن کو کوئی دکھ نہیں، اور اپنے مالوں اور جانوں کے ذریعے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے، اپنے مالوں اور جانوں کے ذریعے جہاد کرنے والوں کو بیٹھ رہنے والوں پر اللہ نے فضیلت دی ہے۔ اور سب سے اللہ نے اچھائی کا وعدہ کیا ہے۔ اور اللہ نے جہاد کرنے والوں کو بیٹھ رہنے والوں پر اجرِ عظیم کے ساتھ فضیلت دی ہے۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ آوَوا وَّنَصَرُوا أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا ۚ لَّهُم مَّغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ (الانفال ۷۴)

اور جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی، اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ اور وہ لوگ جنہوں نے پناہ دی اور مدد کی، وہ لوگ ہیں جو سچے مومن ہیں۔ ان کے لئے بخشش ہے اور عزت والا رزق ہے۔

وَإِذَا أُنزِلَتْ سُورَةٌ أَنْ آمِنُوا بِاللَّهِ وَجَاهِدُوا مَعَ رَسُولِهِ اسْتَأْذَنَكَ أُولُو الطَّوْلِ مِنْهُمْ وَقَالُوا ذَرْنَا نَكُن مَّعَ الْقَاعِدِينَ رَضُوا بِأَن يَكُونُوا مَعَ الْخَوَالِفِ وَطُبِعَ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُونَ لَٰكِنِ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ جَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ ۚ وَأُولَٰئِكَ لَهُمُ الْخَيْرَاتُ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (التوبہ ۸۶ - ۸۸)

اور جب کوئی سورت نازل کی جاتی ہے کہ اللہ پر ایمان لاؤ، اور اس کے رسول کے ساتھ جہاد میں شریک ہو تو ان میں سے خوشحال لوگ تجھ سے اجازت طلب کرنے لگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں تو بیٹھ رہنے والوں کے ساتھ ہی چھوڑ جائیے۔ وہ اس بات پر راضی ہو گئے کہ وہ عورتوں کے ساتھ رہ جائیں۔ ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی! اس لئے وہ سمجھتے نہیں، لیکن رسول اور وہ لوگ جو ان کے ساتھ ایمان لائے وہ اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کرتے ہیں اور انہیں کے لئے سب بھلائیاں ہیں اور وہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ (الحجرات ۱۵)

پس مومن تو وہی لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے۔ پھر کسی قسم کا شک نہ کیا اور اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں کے ذریعے جہاد کیا یہی لوگ سچے ہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ تِجَارَةٍ تُنجِيكُم مِّنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ ۚ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ (الصف ۱۱)

اے ایمان والو! کیا میں تمہیں ایک ایسی تجارت کی نشان دہی کروں جو تمہیں دردناک عذاب سے نجات دلا دے گی؟ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ، اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کرو۔ یہی تمہارے

لئے سب سے بہتر ہے۔ اگر تم علم رکھتے ہو۔

اب رہا موضوع جہاد حدیث نبوی میں تو مسلم نے اپنی جامع صحیح میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تضمن اللہ لمن خرج فی سبیلہ لا یخرج الا جہاد فی سبیلی وایمان بی و تصدیق برسلی، فھو ضامن ان ادخلہ الجنۃ او ارجعہ الی منزلہ الذی خرج منہ نائلا ما نال من اجر او غنیمۃ"

والذی نفس محمد بیدہ، ما من کلم یکلم فی سبیل اللہ الا جاء یوم القیامۃ کھئیتہ یوم کلم لونہ لون دم وریحہ ریح مسک۔

والذی نفس محمد بیدہ لولا ان یشق علی المسلمین ما قعدت خلف سریۃ تغزو فی سبیل اللہ ابدا، ولکن لا اجد سعۃ فاحملھم ولا یجدون سعۃ، ویشق علیھم ان یتخلفوا عنی

والذی نفس محمد بیدہ، لوددت ان اغزو فی سبیل اللہ فاقتل ثم اغزو فاقتل ثم اغزو فاقتل"

جو اللہ کی راہ میں نکلے گا۔ اللہ نے اسے اس بات کی ضمانت دی ہے۔ بشرطیکہ وہ صرف میرے راستے میں جہاد کے لئے، مجھ پر ایمان رکھتے ہوئے اور میرے رسولوں کی تصدیق کرتے ہوئے کہ میں اسے یا تو جنت میں داخل کروں گا۔ یا اسے اس گھر میں لوٹاؤں گا جس سے وہ نکلا تھا اور جو ثواب یا غنیمت حاصل کرنا تھا۔ وہ بھی حاصل کر چکا ہوگا۔

اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جان ہے۔ کوئی زخم بھی ایسا نہیں جو اللہ کی راہ میں آتا ہے۔ مگر یہ کہ زخمی ہونے والا مجاہد قیامت کے دن اسی حالت میں آئے گا۔ جس حالت میں وہ زخمی ہوا تھا رنگ تو اس کا خون سا ہوگا اور بو اس کی مشک کی سی ہوگی۔

اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جان ہے۔ اگر یہ خدشہ نہ ہوتا کہ یہ مسلمانوں کے لئے شاق گزرے گی تو میں اللہ کی راہ میں نکلنے والے غازیوں کے کسی دستے سے کبھی پیچھے نہ رہتا لیکن نہ تو میرے پاس وسعت ہے کہ میں اسے ساتھ لے جاؤں اور نہ ان کے بس میں ہے اور ان کے لئے یہ بات شاق گزرتی ہے کہ وہ مجھ سے پیچھے رہ جائیں۔

قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جان ہے۔ میری یہ خواہش و آرزو ہے کہ میں اللہ کی راہ میں غازی بن کر نکلوں۔ شہید ہو جاؤں۔ پھر غازی بن کر نکلوں، شہید ہو جاؤں، پھر غازی بن کر نکلوں

تو شہید ہو جاؤں!

آیاتِ قرآنیہ اور حدیث نبوی پر غور کرنے اور تقابلی مطالعہ کے بعد ڈاکٹر ایمن مندرجہ ذیل نتائج پر پہنچتے ہیں۔

(۱) ۔ مندرجہ بالا آیات جہاد میں سے ہر ایک کے شروع میں ایسے ارشادات آئے ہیں جو ایمان پر دلالت کرتے ہیں۔ تو گویا جہاد کا ایمان کے ساتھ گہرا ربط ہے۔ گویا مجاہد مومن اور مومن مجاہد ہے۔ یا گویا ایمان اور جہاد دونوں برابر برابر ہیں ہر ایک آیت میں اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کے بعد جاھدوا ہے۔ المومنون کے ساتھ المجاہدون آیا ہے۔

حدیث نبوی بھی قرآن کریم کے تتبع میں جہاد کو ایمان کے ساتھ جوڑتی ہے۔ مگر فرق یہ ہے کہ قرآن مجید نے ایمان کو مطلق چھوڑا ہے۔ اور اس کے متعلق بیان نہیں کیا، اس اطلاق سے فائدہ یہ ہے کہ قاری خود بخود سمجھ لیتا ہے کہ اس ایمان میں اللہ اس کے رسولؐ، دعوت حق، عقیدہ اسلام اور ہر اس بات پر ایمان شامل ہے جو مومن کے دل میں حرارت ایمانی پیدا کر سکتی ہے۔ جبکہ حدیث میں "ایمان بی" کہہ کر ایمان کو صرف اللہ کی ذات تک محدود کر دیا گیا اور آیت کی طرح اس کا دائرہ وسیع نہیں رکھا گیا۔

(۲) ۔ بیشتر آیات میں جہاد بالنفس کے ساتھ جہاد بالمال کا ذکر ہے۔ جان کے ساتھ جہاد کرنے والے مومن کا اجر مال کے ذریعے جہاد کرنے والے کے برابر ہے۔ جان اور مال کو ہم پلہ تصور کیا گیا ہے۔ اس برابری کو انسانی طبیعت قابل تائید بھی تصور کرتی ہے۔ اسی طرح انسانی تصرفات، نفسیات اور حقائق زندگی بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔ تمام آیات میں جہاد بالنفس کے ساتھ جہاد بالمال کا بھی ذکر ہے۔

مگر حدیث نبویؐ میں جہاد بالنفس کو جہاد بالمال سے نہیں جوڑا گیا۔ بلکہ اس موضوع کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ شاید دیگر احادیث میں جہاد بالمال کا ذکر ہوگا۔ لیکن یہاں تو بالکل نہیں ہے۔ اس طرح آیات قرآن سے جہاد کا جو مفہوم سامنے آتا ہے۔ وہ حدیث کے مفہوم جہاد سے وسیع تر ہے۔ اور زیادہ گوشوں کو شامل ہے۔

(۳) ۔ آیات قرآنیہ میں مجاہد بالنفس والمال کا اجر بڑا ہے۔ جبکہ حدیث میں مذکور مجاہد کا اجر کم ہے۔ آیات میں مجاہد کے لئے کہیں اللہ کی رحمت ہے۔ کہیں اجر عظیم کا ذکر ہے۔ کہیں مغفرت اور رزق کریم ہے۔ کہیں خیرات اور فلاح کا ذکر ہے۔ کہیں عذاب الیم سے نجات دلانے والی تجارت کہا گیا ہے۔ اور کہیں خیر کا نام دیا گیا ہے۔

چنانچہ اللہ کی رحمت، اجر عظیم، ایمان بالحق، مغفرت، رزق کریم، خیرات، فلاح، صادقین کا لقب ملنا، نفع بخش تجارت اور خیر جہاد کا کچھ اجر اور معاوضہ ہے۔ اوصاف عام اور مطلق ہیں۔ ان کا عام اور مطلق ہونا مفسر کے لئے ایک ایسا موقع فراہم کرتا ہے کہ وہ ان کی وسیع الاحتمال تفسیر کرے۔ مثلاً مفسر اللہ کی رحمت اجر عظیم اور خیر کی تفسیر میں وسیع ترین روش اختیار کر سکتا ہے۔ جو دخول جنت، حصول ثواب یا غنیمت سے بڑھ کر ہوگا۔ جس کا کہ حدیث میں ذکر ہے۔

آیات میں بھی عطا کا ذکر ہے کہ اور حدیث میں بھی عطا کا ذکر ہے۔ مگر دونوں میں فرق یہ ہے کہ ایک بادشاہ یا شہنشاہ کی جانب سے ہے، جب کہ دوسری عطا اللہ کی مخلوق میں سے ایک فرد کی طرف سے ہے جو اپنی رسالت کی حدود میں وہ دے سکتا ہے۔

تو کیا دخول جنت، اللہ کی رحمت، اجر عظیم، اللہ کی مغفرت، اس کے رزق اور اس کی خیر کے برابر ہو سکتا ہے۔

اللہ کی رحمت تو جنت دنیا و جنت آخرت دونوں کو شامل ہے۔ اللہ کی طرف سے اجر عظیم تو انسان کے مقام کو جیسے

مرتبے یا قیامت کے دن بلند کر سکتا ہے۔ مگر دخول جنت اگرچہ ہر مومن کی امید ہے۔ مگر یہ اللہ کی رحمت، اس کے اجر عظیم، اس کے رزق کریم کا ایک حصہ ہے۔

۴ ۔ آہنگ صوتی جو آیات قرآنی میں رواں ہے۔ وہ بھی حدیث کے حسن صوت سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔

ایک تخیل کو مختلف اجزاء میں تقسیم کر دینا، فقروں کے درمیان توازن تراکیب کی نازک وسہل سی روانی، ایسے خواص پر اختتام جو موسیقیت پیدا کرتے ہیں جس خیال ومنصور کی بات ہو رہی ہے۔ اس کے ساتھ عضوی ارتباط، ضمائر کی ہم آہنگی، مفعول یا متعلقات فعل کا حذف کرنا، نکرہ کی جگہ نکرہ، معرفہ کی جگہ معرفہ، برمحل تقدیم، موزوں اور خوبصورت تاخیر، لفظی اور معنوی زینت ان آیات قرآنی کے چند نمایاں پہلو ہیں۔

رہی حدیث، تو اگرچہ اس میں اظہار معنی کا حسن وجمال موجود ہے۔ مگر وہ قرآن کریم کے فن تعبیر واظہار کی بعض باتوں تک رسائی نہیں پا سکی ہے!

اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد:۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللَّهِ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝

کے درمیان اور اس ارشاد نبوی کے درمیان کہ:۔

تضمن اللہ لمن خرج فی سبیلہ لا یخرجہ إلا جہاد فی سبیلی وإیمان بی وتصدیق برسلی فھو ضامن من أدخلہ الجنۃ أو أرجعہ إلی منزلہ الذی خرج منہ نائلا ما نال من أجر أو غنیمۃ "بہت بڑا فرق ہے۔

جو موسیقیت آیات سے برس رہی ہے۔ ضمائر کی روانی و ترتیب حدیث کی موسیقیت کی طرح نہیں ہے۔ ...آیات کی ضمیریں حدیث کی ضمیروں کی طرح ہیں۔

ہم حدیث نبوی میں بھی ایک موسیقیت موجود ہے مثلاً۔

لونہ لون دم، وریحہ ریح مسک" اور" لوددت أن أغزو فی سبیل اللہ فأقتل ثم أغزو فأقتل ثم أغزو فأقتل: مگر یہ نغمگی اس کے ہم پلہ نہیں ہے جو ان الفاظ آیات میں ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللَّهِ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ

اس لئے کہ حدیث کی موسیقیت تو دو چھوٹے چھوٹے جملوں سے پیدا ہوئی ہے۔ یا نکرہ کو نکرہ کی طرف مضاف کرنے سے یا عبارت کے آخر میں انہی الفاظ کی تکرار سے مگر آیت کی موسیقیت متعدد سوتوں سے پھوٹ رہی ہے۔ الذین، آمنوا، ھاجروا، جاھدوا، سبیل، اولئک، یرجون، غفور رحیم، اس کے علاوہ یہ موسیقیت مخارج حروف کی ہم آہنگی

اور بعد سے تنوین، تشدید، توازن اور بعض الفاظ کے تکرار سے بھی پیدا ہو رہی ہے۔

اور سب سے آخر میں ڈاکٹر امین کا اختتامی پیراگراف اور اس کا ترجمہ بھی پڑھ لیجیے۔

وَبعد فإن الَّذِيْنَ يقولون :- إن محمدا هو الذى أنشاء القرآن وصاغه ليسو ا كفرة فقط وإنما هم خالون من الذوق الفنى وفهم الاساليب وتمييز الفروق بينهما. وإن القول الذى يرددونه" الأسلوب هو الرجل" والذى يقصدون به أن أسلوب الرجل لا يتغير مهما اختلف الموضوع الذى يتحدث فيه كما لا تختلف بصمات الاصابع فى مختلف أدوار عمر الانسان، يقولون ذلك القول، ويؤمنون به نظريا ثم ينكرونه عمليا حين يلمسون الفروق الجوهرية الاصيلة بين اسلوب القرآن والحديث ويركبون رؤسهم ثم ليعدونها فى الرمال وليس لهم هدف إلا اخفاء الحقيقة والطعن فى الاسلام لمجرد الطعن، لا خدمة حقيقة ولا لجلاء حق، هذا إذا وقفوا على الفروق أما اذا اعجزوا فتلك هى المصيبة لانهم يقولون عن جهل وحقد وعمى بصيرة"۔

تو اب یہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی تھے۔ جنہوں نے قرآن تیار کیا اور اسے ڈھالا، وہ نہ صرف کافر ہیں۔ بلکہ فنی ذوق مختلف اسالیب کو سمجھنے اور ان میں امتیاز کرنے کی صلاحیت سے بھی عاری ہیں۔ ایک قول جسے وہ تکرار دہراتے رہتے ہیں کہ "اسلوب ہی آدمی ہے"۔ اور جس سے ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ گفتگو کا موضوع خواہ کتنا بھی مختلف ہو جائے آدمی کا اسلوب نہیں بدلتا جس طرح کہ انسان کی عمر کے مختلف ادوار میں اس کی انگلیوں کے نشانات نہیں بدلتے، وہ یہ بات کہتے تو ہیں اور نظریاتی طور پر اسے مانتے بھی ہیں۔ مگر جب انہیں اسلوب قرآن و حدیث میں حقیقی بنیادی فرق نظر آتے ہیں تو اس سے عملاً انکار کر دیتے ہیں۔ جدھر منہ آئے چل نکلتے ہیں۔ پھر اپنے سروں کو ریت میں دبا دیتے ہیں۔ حالانکہ ان کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا کہ وہ حقیقت کو چھپانا چاہتے ہیں۔ اور طعن برائے طعن کے مطابق اسلام پر طعنہ زنی کرنا چاہتے ہیں۔ نہ تو وہ حقیقت کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ اور نہ حق کو واضح اور روشن دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ اس وقت ہے جب وہ فرق سے آگاہ ہو جاتے ہیں۔ ہاں اگر وہ عاجز ہیں تب تو ایک اور مصیبت ہے۔ کیونکہ وہ جو کچھ کہتے ہیں۔ جہالت، عناد، حسد اور بصیرت کے اندھے پن سے کہتے ہیں۔

استاذ احمد حسن زیات مرحوم نے خوبصورت اختصار و جامعیت کے انداز میں فصاحت نبوی اور احادیث نبویہ کے امتیازی خصائص و محاسن کی وضاحت کی ہے۔ حدیث نبوی کے اسلوب اور معیار بلاغت کے متعلق لکھتے ہیں۔

ولكن احاديث الرسول، وان كانت فيض الخاطر وعفو البديهة، يبدو عليها اثر الالهام وسمة العبقرية وطابع البلاغة واسلوبها أقرب إلى عصر النبوة

منه إلى أسلوب القرآن:۔
مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث، اگرچہ فیضان قلب اور بیساختہ بداہت گوئی کا نتیجہ ہیں۔ اپنے اندر الہام کا اثر، عبقریت کی نشانی اور بلاغت کا رنگ لیے ہوئے ہیں۔ آپ کی ان احادیث کا اسلوب بیان قرآن کریم کے بجائے عہد نبوت کے عربی اسلوب بیان کے زیادہ قریب ہے۔"
"فصح العرب صلی اللہ علیہ وسلم کے جوامع الکلم کے اسلوب بیان اور تشبیہ و تمثیل پر قدرت کاملہ کی نشان دہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

وللرسول قدرة عجيبة على التشبيه والتمثيل وإرسال الحكمة وإجادة الحوار وتلك ميزة الرسل من قبل ولاسيما المسيح

کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تشبیہ و تمثیل کے استعمال، بیساختہ کلمات حکمت اور عمدہ انداز گفتگو پر عجیب غریب قدرت حاصل ہے۔ اور یہ انبیاء کرام خصوصاً مسیح کی امتیازی خصوصیت ہے۔"
فصاحت نبوی کے عناصر ترکیب اور محاسن کمال پر گفتگو کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ

تقلب رسول الله صلى الله عليه وسلم فى أخلص القبائل منطقا وأعذبها بيانا فولد فى بنى هاشم ونشأ فى قريش واسترضع فى بنى سعد، فكان افصح العرب لسانا بالفطرة وقد حدث بذلك عن نفسه فلم يزيف حديثه ولم يدفع قوله، وفصاحة الرسول صلى الله عليه وسلم أشبه بالإلهام والفيض فلم يعانها ولم يتكلفها ولم يرتض لها وإنما اسلست له الألفاظ واسمحت له المعانى فلم يند فى لسانه لفظ ولم يضطرب فى أسلوبه عبارة ولم يعزب عن علمه لغة ولم ينب عن خاطره فكرة وكان كلامه كما قال الجاحظ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بود و باش ایسے قبائل میں تھی جو خالص ترین زبان والے اور شیریں تحریں بیان والے تھے۔ چنانچہ آپ بنو ہاشم میں پیدا ہوئے، قریش میں بڑے ہوئے اور بنو سعد میں پرورش پائی۔ اس لیے آپ فطرۃً افصح العرب تھے۔ آپ نے خود بھی اس بات کا ذکر فرمایا جس میں کوئی کھوٹ نہیں اور آپ کی اس بات پر کوئی اعتراض نہ ہو سکا۔ آپ کی فصاحت الہام و فیضان کے مشابہ معلوم ہوتی ہے جس میں آپ نے مشقت یا تکلف سے کبھی کام نہیں لیا۔ نہ کبھی اس کے لئے آپ نے ریاض کیا تھا۔ بلکہ الفاظ آپ کے سامنے فرش راہ تھے اور معانی آپ کے حضور میں سرنگوں تھے۔ آپ کی زبان سے نہ تو کبھی کوئی ناگوار لفظ ادا ہوا۔ اور نہ آپ کے اسلوب بیان میں کبھی ناہمواری نظر آئی۔ عرب کا کوئی لہجہ آپ کے علم سے اوجھل نہ تھا۔ اور نہ کوئی فکر و خیال آپ کے ذہن سے دور ہو سکا۔ آپ کا کلام تو بالکل ایسا ہی تھا۔ جیسا کہ جاحظ نے اس کی تصویر پیش کی ہے۔"
استاذ محمود مصطفیٰ فصاحت نبوی کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

ولقد تجنب النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی قولہ ذلک السجع الذی کان یلتزمہ الکہان لیملکوا بہ النفوس ولیستہووا الالباب تأزری علیہم وحذر من افعالہم فقال: إیاکم و سجع الکہان! فجاء کلامہ علیہ الصلوۃ والسلام نقی اللفظ واضح الاسلوب عن الایجاز حسن الاطناب خالیا من السجع المستکرہ مشتملا علی المعانی السامیۃ فہو جدیر أن یجمع الفضل من أکنافہ لذلک کان ابلغ کلام عرفہ الناس بعد القرآن:۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کلام میں اس سجع سے اجتناب فرماتے تھے جس کا التزام کاہن کیا کرتے تھے۔ تاکہ لوگوں پر غالب آسکیں ۔ اور عقلوں کو اپنی طرف مائل کر سکیں۔ چنانچہ آپؐ نے ان کی تحقیر کی اور ان کے افعال سے خبر دار کرتے ہوئے فرمایا۔ کاہنوں کی سجع سے اجتناب کرو۔ اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام پاکیزہ الفاظ، واضح اسلوب خوبصورت اختصار اور حسین اطناب کا حامل تھا جو ناپسندیدہ سجع سے خالی تھا۔ اور بلند معانی پر مشتمل تھا۔ آپؐ کے ارشادات اس لائق ہیں کہ ان کے اکناف سے فضل و کمال کا اکتساب کیا جا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ آپؐ کا کلام قرآن مجید کے بعد سب سے زیادہ فصیح و بلیغ تھا"۔

استاذ محمود یہ بھی لکھتے ہیں کہ جب آپؐ کو اعلان نبوت کا حکم ہوا تو کوہ صفا پر چڑھ کر سب سے پہلا خطبہ یوں ارشاد فرمایا تھا۔

أ رأیتم لو أخبرتکم أن خیلا بالوادی ترید أن تغیر علیکم أ کنتم مصدقی؟! قالوا. نعم! ما جربنا علیک کذبا! قال: فانی نذیر لکم بین یدی عذاب شدید۔

کیا اگر میں تمہیں یہ بتاؤں کہ وادی میں کچھ شہسوار ہیں۔ جو غارت گری کے لئے تم پر حملہ کرنا چاہتے ہیں۔ تو کیا تم میری بات پر یقین کرو گے ، لوگوں نے کہا: ہاں کیوں نہیں۔ ہم نے تو جھوٹ بولتے آپؐ کو کبھی دیکھا ہی نہیں تھا آپؐ نے فرمایا! میں شدید عذاب سے تمہیں ڈرانے کے لئے بھیجا گیا ہوں!"

ڈاکٹر شوقی ضیف نے عربی زبان پر فصاحت و بلاغت نبویؐ کے وسیع اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے بتایا کہ عربی زبان میں متعدد الفاظ ایسے ہیں جن کا رواج و استعمال ارشادات نبویؐ کا مرہون منت ہے۔ مثلاً قمری سال کے پہلے مہینے کو صفر اول کہا جاتا تھا مگر آپؐ نے اسے محرم کا نام دیا۔ نسئی یعنی کبیسہ گری کو باطل کہا۔ فاحشہ عورت کے لئے "الزمارۃ" (یعنی بگل بجا کر عصمت فروشی کا اعلان کرنے والی) اور سرخ گارے والی عمارت کے لئے "مہرقۃ" کا لفظ صرف آپؐ ہی نے استعمال کیا تھا۔ وہ فصاحت نبوی کو خراج تحسین ادا کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

علی ہدی القرآن الکریم کان محمد صلی اللہ علیہ وسلم یخطب فی العرب لیخرجہم من ظلمات الوثنیۃ إلی نور الہدایۃ السماویۃ وقد أوتی

من اللسن والفصاحة ما ملك به أزمة القلوب وكأنما كانت المعاني و الأساليب موقوفة تشخو صهابين يديه ليختار منها ما تهش له الاسماع وتصغي له الأفئدة.

قرآن کریم کی ہدایت و رہنمائی میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم عربوں کے سامنے خطبات ارشاد فرمایا کرتے تھے تاکہ انہیں بت پرستی کی تاریکیوں سے نکال کر ہدایت سماویہ کی روشنی کی طرف لے آئیں۔ آپؐ کو اللہ تعالےٰ نے ایسی فصاحت و بلاغت عطا کی تھی جس کے طفیل آپؐ دلوں کی باگ ڈور کے مالک بن گئے تھے۔ اور یوں لگتا تھا کہ معانی و اسالیب آپؐ کے حضور میں حاضر ہونے کے لئے منتظر کھڑے ہوں، تاکہ ان میں سے آپ ایسا اسلوب و معنی منتخب کرلیں جس سے لوگوں کی قوت سامعہ کو مسرت و انبساط حاصل ہو، اور ان کے دل ہمہ تن گوش ہو جائیں۔

مصر کے ممتاز عالم دین و ادب استاذ سباعی بیومی قرآن کریم اور ارشادات نبوی کے عربی زبان و ادب پر گہرے اور وسیع اثرات کی طرف توجہ مبذول کراتے ہوئے کہتے ہیں۔

ولقد أمد القرآن الكريم والحديث الشريف للخطابة في هذا العصر بالمعون القوي والمدد الفياض فتلك هذا الخطباء أيما تقليد واقتبسوا منهما الالفاظ والاساليب و اتبعوهما في المعاني والأغراض وتاثروا بهما في سوق الأدلة والبراهين واكثروا الاستشهاد بهما كما كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يستشهد بالقرآن.

اس عہد (زمانہ نبوت) میں قرآن کریم اور ارشادات نبوی نے فن خطابت کے لئے ایک پرزور ساز و سامان اور فیاضانہ امداد مہیا کر دی تھی، چنانچہ خطباء نے ان کی بہت ہی پیروی کی۔ ان سے الفاظ و اسالیب حاصل کئے۔ معانی و مقاصد میں ان کے مطابق چلتے رہے۔ دلائل و براہین دینے میں ان سے متاثر ہوئے اور اپنے خطبات میں ان سے بکثرت استشہاد کرتے تھے۔ جس طرح کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خطبات میں قرآن مجید سے شواہد لاتے تھے۔

علامہ مصطفیٰ صادق الرافعی جدید عربی ادب میں قدامت پسند اور راسخ العقیدہ مصری ادباء و علماء کے سرخیل تھے۔ جدت پسندوں کے قائد ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے ساتھ ان کے بے شمار علمی معرکے برپا ہوتے رہے۔ قدیم اسالیب نگارش کے دفاع میں الرافعی نے بڑے زوردار دلائل دیئے۔ ان کا ایک عظیم الشان کارنامہ "اعجاز القرآن" ہے موضوع تو بلاغت و اعجاز قرآن ہے۔ مگر اس کتاب کی ایک فصل بلاغت نبوی کے لئے مختص ہے۔ جس میں انہوں نے افصح العرب صلی اللہ علیہ وسلم کے اسالیب بلاغت کے تمام پہلوؤں سے مفصل بحث کی ہے۔ وہ کلام نبوت کے جلال و کمال کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔

الفاظ النبوة يعمرها قلب متصل بجلال خالقه ويصقلها لسان نزل عليه القرآن بحقائقه فهي ان لم تكن من الوحي ولكنها جاءت من سبيله وان لم يكن لها منه دليل فقد كانت هي من دليله محكمة الفصول حتى ليس فيها عروة مفصولة. محذوفة

الفضول حتی لیس فیھا کلمۃ مفضولۃ وکانما ھی فی اختصارھا و إفادتھا نبض قلب یتکلم وانما ھی فی سموھا و اجادتھا مظھر من خواطرہ صلی اللہ علیہ وسلم ان خرجت فی الموعظۃ قلت أنین من فؤاد مقروح وان راعت بالحکمۃ قلت صورۃ بشریۃ من الروح فی منزع یلین فینفجر بالدموع ویشتد فینزو بالدماء واذا اراک القرآن أنہ خطاب السماء للأرض أراک ھذا أنہ کلام الارض بعد السماء"

الفاظ نبوت ایسے ہیں کہ انہیں ایک ایسے دل نے تعبیر کیا ہے۔ جو اپنے خالق کے جلال سے لگاؤ رکھتا ہے۔ ان الفاظ کو ایک ایسی زبان نے صیقل کیا ہے۔ جس پر قرآن کریم اپنے حقائق سمیت نازل ہوا تھا۔ یہ الفاظ اگرچہ وحی نہیں لیکن یہ آئے وحی کے راستے سے ہیں۔ انہیں اگرچہ وحی کی رہنمائی حاصل نہیں رہی۔ مگر یہ وحی ربانی کی تصدیق ہیں۔ یہ ایک پختہ انداز کا کلام ہے۔ جس کا کوئی حلقہ بھی ڈھیلا نہیں۔ اس میں سے فالتو باتوں کو حذف کر دیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ اب اس میں کوئی بھی لفظ فالتو نہیں۔ یہ کلام اپنے اختصار و افادیت کے لحاظ سے یوں لگتا ہے کہ جیسے کسی دل کی نبض ہے جو بول رہی ہے۔ بلندی اور عمدگی میں یہ کلام خواطر نبوت کا مظہر ہے۔ اگر یہ الفاظ وعظ کے لئے استعمال ہو رہے ہوں تو یوں لگتا ہے جیسے کسی زخمی جگر کی آہیں ہوں۔ اگر ان میں پنہاں حکمت کا لحاظ ہو تو یوں لگتا ہے جیسے روح بشریت کی تصویر ہے۔ ان کا رجحان ایسا ہے جو آنسوؤں کو روانی عطا کرتا ہے۔ اور اگر شدت اختیار کرے تو خون ٹپک پڑتا ہے۔ قرآن کریم اگر آپ کو یہ دکھاتا ہے کہ وہ زمین کے نام آسمان کا خطاب ہے تو کلام نبوت سے آپ کو پتہ چلے گا کہ یہ کلام زمین ہے۔ جس کا مرتبہ کلام آسمانی کے بعد آتا ہے۔

الرافعی کے نزدیک فصاحت نبوت کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تکلف اور تصنع نام کو بھی نہیں۔ بلکہ فطرت کا عطیہ اور فیض ربانی معلوم ہوتا ہے۔

بید ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان افصح العرب علیٰ أنہ لا یتکلف القول ولا یقصد إلی تزیینہ ولا یبغی إلیہ وسیلۃ من وسائل الصنعۃ ولا یجاوز بہ مقدار الابلاغ فی المعنی الذی یریدہ۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو افصح العرب تھے۔ علاوہ ازیں آپؐ کے کلام میں نہ تو تکلف تھا۔ نہ آپ اسے سجانے کا قصد فرماتے اور نہ تصنع کے وسائل میں سے کسی وسیلے کے متلاشی ہوتے۔ بلکہ مطلوبہ معنی ادا کرنے کی مقدار سے آپؐ کا کلام تجاوز نہیں کرتا تھا۔

کلام نبوت کے الفاظ و معانی کے توازن اور جامعیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

ان الکلام النبوی جامع مجتمع لا یذھب فی الأعم الاغلب إلی الإطالۃ بل ھو کالتمثال یاتی مقدار فی مادتہ ومعانیہ واسلوب الجمع بینھما دربطا

لصورته بالمعنى۔

کلام نبوی جامع وموزوں ہے۔ جو اکثر وبیشتر طوالت کا رنگ اختیار نہیں کرتا۔ بلکہ وہ تو ایک تمثال کی مانند ہے۔ جس میں موضوع اور معنی کی ایک مقدار ملحوظ رہتی ہے۔ اور موضوع ومعنی کے علاوہ لفظ ومعنی کے باہمی ربط کی صورت بھی ملحوظ رہتی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پختہ انداز گفتگو کے سلسلہ میں علامہ مصطفیٰ صادق الرافعی لکھتے ہیں۔

أنه صلی اللہ علیه وسلم کان ضلیع الفم یفتتح الکلام ویختمه بأشداقه وعلت من معنی ذلك أنه کان یستعمل جمیع فمه إذا تکلم ولا یقتصر علی تحریك الشفتین فحسب"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قوی دہن واقع ہوئے تھے۔ کلام کا آغاز اور انجام اس قدر واضح انداز میں ہوتا تھا کہ مخاطب کو معنی اچھی طرح معلوم ہو جاتے تھے۔ آپ جب گفتگو کرتے تو محض ہونٹوں کی تحریک کے بجائے واضح طور پر منہ کھولتے تھے۔

مگر آپؐ تکلف کے ساتھ باچھیں کھولنے کو معیوب قرار دیتے تھے۔ اس لئے آپؐ کے انداز کلام میں تصنع اور تکلف نام کو بھی نہیں ہوتا تھا۔ تاہم تمام اوصاف بلاغت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم میں بدرجہ اتم موجود تھے۔ رافعی کہتے ہیں۔

ولیس احکام الاداء وروعة الفصاحة وعذوبة المنطق وسلاسة النظم الاصفات کانت فیه صلی اللہ علیه وسلم عند أسبابها الطبیعیة لم یتکلف لها عملا ولا ارتاض من أجلها ریاضة بل خلق مستکمل الاداة فیها ونشأ موفر الاسباب علیها"

پختہ انداز ادا، شانِ فصاحت، شیریں کلام اور سلاست اسلوب کی کوئی ایسی صفت نہ ہوگی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں موجود نہ ہو۔ یہ سب اوصاف آپ کو فطرت نے عطا کئے تھے نہ تو ان کے لیے آپؐ نے محنت ومشقت اٹھائی اور نہ ان کی خاطر ریاضت کی تھی۔ بلکہ آپ تو ان اوصاف میں فطرۃً کامل پیدا ہوئے تھے اور قدرت نے آپؐ کو ان اوصاف کے لئے اسباب ووسائل مہیا کر دیئے تھے۔

مصطفیٰ صادق الرافعی نے امام الادب العربی ابوعمر الجاحظ کے اس نقطہ نظر کی پُرزور تائید کی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی فصاحت وبلاغت لسانی نے عربی زبان پر زبردست اثر ڈالا ہے۔ وضع اور اشتقاق الفاظ، ایجاد اور ابداع اسالیب بیان میں آپؐ کا ثانی یا نظیر پیدا نہ ہو سکا۔ آپؐ کی زبان معجز بیان سے ایسی تراکیب اور محاورات ادا ہوئے جو نہ تو عربوں نے پہلے کبھی سنے تھے اور نہ ان سے وہ آشنا تھے۔ لسان نبوت کے یہ محاورات وتراکیب بعد میں ضرب المثل کا درجہ حاصل کر گئیں۔ مثلاً مَاتَ حَتْفَ اَنْفِہٖ (وہ اپنی ناک کی موت مرا یعنی اپنی موت کا سامان خود کیا) کے محاورے کے بارے میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ میں نے یہ پہلے کبھی کسی سے نہیں سنا تھا۔[6] بُعِثْتُ فِیْ نَفَسِ السَّاعَۃِ (میں قیامت کے سانس میں مبعوث ہوا ہوں یعنی قیامت سانس لے

رہی ہے اور میں مبعوث ہوا ہوں) تہبند زمین پر گھسیٹتے ہوئے چلنے کے لئے المخیلۃ کا لفظ سب سے پہلے آپؐ ہی نے استعمال کیا۔ اِیَّاکَ وَالْمَخِیْلَۃَ (تکبر سے بچ) عورتوں کو شیشے سے تشبیہ سب سے پہلے آپؐ ہی نے دی اور فرمایا۔ رُوَیْدَکَ رِفْقًا بِالْقَوَارِیْرِ (شیشوں کے ساتھ نرمی کا سلوک کرو)۔ یوم بدر کو فیصلہ کن دن قرار دیتے ہوئے یہ محاورہ بھی سب سے آپؐ ہی نے استعمال فرمایا تھا۔ ھٰذَا الْیَوْمُ لَہٗ مَا بَعْدَہٗ (یہ ایسا دن ہے جو بعد میں آنے والے دنوں کے لئے فیصلہ کن ہوگا) صلح حدیبیہ کو آپؐ نے ایک ایسی صلح قرار دیا۔ جس کی بنیاد بدمزگی اور کدورت ہے اور یہ محاورہ استعمال کیا۔ جو بعد میں ضرب المثل بن گیا کہ ھُدْنَۃٌ عَلٰی دَخَنٍ (یہ وہ صلح ہے جو دھوئیں سے آلودہ کھانے پر قائم ہوتی ہے) کُلُّ اَرْضٍ بِسَمَائِھَا (ہر سرزمین کی اپنی مخصوص نشانیاں ہوتی ہیں) کا محاورہ بھی سب سے پہلے آپ ہی نے بولا تھا۔ جو بعد میں ضرب المثل بن گیا۔

قرآن کریم جو اللہ کا کلام ہے۔ کلامِ نبوی سے نمایاں طور پر مختلف ہے۔ یہ دلیل ہے۔ اس بات کی کہ قرآن مجید واقعی کلام اللہ ہے ورنہ خطبات و ارشادات نبوت میں اور آیاتِ ربانی میں اتنا زبردست فرق نہ ہوتا۔ علامہ باقلانی کا بیان اوراس کی توجیہات آپ نے ملاحظہ فرمائی ہیں۔ الرافعی نے بھی اس پہلو پر اظہار خیال کیا ہے۔

"على ان اعجب شئى انك اذا قرنت كلمة من تلك البلاغة الى مثلها مما في القرآن رايت الفرق بينهما في ظاهره كالفرق بين المعجز وغير المعجز سواء، ورايت كلامه صلى الله عليه وسلم في تلك الحال خاصة مما يطمع في مثله واحسست ان بين نفسك وبينه صلة تطوع لك القدرة عليه وتمد لك اسباب المطمعة فيه، بخلاف القرآن فانك تستيئس من جملته ولا ترى لنفسك إليه طريقا البتة اذ لا تحس منه نفسا إنسانيا فيه ولا اثرا من آثار هذه النفس ولا حالة من حالاتها حتى تأنس إلى ذلك على التوهم ثم تتوهم الطمع والمعارضة من هذه الآنسة فتمضي عزمك وتقطع سبوا بك وتثبت القول فيه كما يكون لك في قراءة الكلام والانسان فان جميعا هذا الكلام الآدمي منهاج ولجملته طريق وحدود البلاغة التي تفصل بعضه عن بعض كلها مما يوقف عليه بالحس والعيان، ولقد رفرق ما بين بعضها إلى بعض مهما بلغ من تفاوتها واختلافها في السبك والصنعة والغرابة، بيد ان ذلك مما لا يستطاع في القرآن ولا وجه إليه بحال من الاحوال فما هو الا ان تقرأ الآية منه حتى تراها قد خرجت من حد المألوف والسلت منه وفاتت سمت ما تقدرت لها من مطلع ومقطع فهما وجدت لا تجد سبيلا إلى حدها ومهما استطعت لا تستطيع أن تقرن بها كلاما تعرف حده في البلاغة ان لم يكن بالصنعة فبالحس"۔

تاہم عجیب ترین بات یہ ہے کہ آپ اس بلاغت نبوی کے کسی لفظ کا موازنہ جب اسی نوعیت کے قرآنی لفظ

سے کریں تو آپ کو فرق نظر آئے گا۔ جو معجزہ والے کلام کے درمیان ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں آپ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام ایسا نظر آئے گا جس کے مقابلے کی خواہش کی جا سکتی ہے۔ آپ محسوس کریں گے۔ آپ کے درمیان اور اس کلام کے درمیان ایک ایسا تعلق ہے جو آپ کو اس کلام پر قادر ہونے کی ترغیب دلاتا ہے۔ اور اس بات کی آپ کے دل میں خواہش بھی پیدا ہونے لگتی ہے۔ لیکن قرآن کریم کا معاملہ بالکل اس کے برعکس ہے۔ اس کے بارے میں آپ سراسر مایوس ہوں گے اور اس تک رسائی کا آپ کو ہرگز راستہ نظر نہ آ سکے گا۔ کیونکہ اس میں آپ کو کسی نفس انسانی کا احساس نہیں ہو پائے گا۔ اور نہ اس کے آثار ہی دکھائی دیں گے۔ نہ کوئی ایسی حالت نظر آئے گی کہ آپ میں ایک گونہ مانوسیت کا گمان ہونے لگے۔ پھر اس مانوسیت کے طفیل آپ میں خواہش یا مقابلہ کا گمان پیدا ہونے لگے۔ پھر آپ اپنے عزم کو پورا کرنے لگیں قطعی رائے قائم کریں۔ یا فیصلہ کن بات کر سکیں۔ جس طرح کہ انسانی کلام کے مطالعہ کے دوران ہوا کرتا ہے۔ کیونکہ بلاغت نبوی کا تمام کلام ایک انسانی اسلوب کا رنگ لیے ہوئے ہے۔ اس کے جملوں کا ایک اسلوب ہے اور بلاغت کی حدود ہیں۔ جو اس سے بعض حصوں کو بعض سے الگ کرتی ہیں۔ یہ سب باتیں ایسی ہیں۔ جن کی واقفیت حس اور مشاہدہ سے ممکن ہے۔ یہ کلام اپنے اسلوب، صنعت اور غرابت کے اختلاف و تفاوت میں کسی حد تک بھی پہنچ جائے۔ اس کے مختلف حصوں کے درمیان تفریق و امتیاز ممکن ہے۔ تاہم قرآن کریم کے سلسلہ میں یہ ممکن نہیں ہوگا۔ اور کسی حالت میں بھی اس کی صورت پیدا نہیں ہو سکے گی۔ آپ جونہی ایک قرآنی آیت کا مطالعہ کریں گے۔ آپ کو نظر آ جائے گا۔ کہ اس کا اسلوب جانے پہچانے اسالیب کی حد سے نکل گیا ہے اور مطلع و مقطع کا جو انداز آپ نے متعین کیا تھا۔ وہ مفقود ہو چکا ہے۔ آپ خواہ کتنی ہی جستجو کر لیں آپ اسے پا نہ سکیں گے آپ کتنی ہی کوشش کر لیں۔ آپ اس آیت کے ساتھ کسی کلام کا موازنہ نہیں کر سکیں گے جس کی تعریف آپ کو معلوم ہے۔ اگر صنعت کے ذریعے نہیں تو احساس کے ذریعے ہی سہی۔

بفرضِ محال آپ افصح العرب ہوتے ہوئے بھی اگر تصنع یا تکلف سے قرآنی اعجاز والی بلاغت کے الفاظ و تراکیب استعمال کریں۔ تب بھی کتاب اللہ کی حدود کو نہ پہنچ سکیں گے۔ اور بفرض محال آپ ان حدود تک پہنچ بھی جائیں۔ پھر بھی کتاب اللہ کے معجزانہ اسلوب کی طرح کلام نبوی میں معجزانہ انداز نہ پیدا ہو سکے گا۔

الرافعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بلاغت کے پانچ امتیازی خصائص بیان کرتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ کتاب اللہ کے بعد عربی فصاحت و بلاغت کی تاریخ میں کوئی ایسا خطیب نہیں ہوا جو آپؐ کی فصاحت و بلاغت کا ہم پلہ ہو سکے۔ یعنی قرآنی بلاغت کے بعد بلاغت نبوی کا ایک اعلیٰ و منفرد مقام ہے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ کلامِ نبوت میں ایسی تراکیب ہیں۔ جو قلتِ لفظ کے ساتھ ساتھ کثرتِ معنی کا رنگ لئے ہوئے ہیں۔ گویا کوزے میں دریا بند ہے۔ چند لفظ ہیں۔ جن میں خطابت کے وسیع سمندر ٹھاٹھیں مارتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ تیسری خصوصیت کو بلاغت کی اصطلاح میں خلوص سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یعنی کسی قسم کا ابہام غموض یا مغالطہ باقی نہیں رہتا۔ لفظ و معنی میں ایسی پختگی اور وضاحت ہے کہ سامع کو کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔ چوتھی خصوصیت ہے قصد و اعتدال یعنی لفظ و معنی میں ایجاز و اقتضا

اور ایسا توازن پایا جاتا ہے جسے اقتصادِ لفظی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور کلامِ نبوت کی پانچویں امتیازی خصوصیت ہے استیفاء یعنی سامع کے دل میں کوئی تشنگی یا طلب مزید کی خواہش باقی نہیں رہتی۔ لفظ و معنی اس کی تسلی کر دیتے ہیں۔

اس اندازِ بیان کی ایک مثال وہ جامع و مختصر جواب ہے جو صلح حدیبیہ کے موقع پر بدیل بن ورقاء کے اس قول پر زبانِ نبوت سے ادا ہوا تھا کہ قریش آپؐ کو روکتے اور جنگ کرنے کے لئے کیل کانٹے سے لیس ہیں۔ آپؐ نے فرمایا تھا۔

ان قریشاً قد نھکتھم الحرب فان شاءوا ماددتھم مدۃ و یدعوا بینی و بین الناس، فان أظھر علیھم فان شاءوا أن یدخلوا فیما دخل فیہ الناس والا فقد جموا وان ابوا فوالذی نفسی بیدہ لأقاتلنھم علی أمری ھذا حتی تنفرد سالفتی ھذہ ولینفذن اللہ أمرہ۔

قریش کو جنگ نے نڈھال کر ڈالا ہے۔ اس لئے اگر وہ چاہیں تو ہم انہیں کچھ مہلت دے دیتے ہیں۔ وہ میرے اور لوگوں کے درمیان حائل نہ ہوں۔ اگر میں غالب آگیا تو وہ بھی لوگوں کے ساتھ دینِ اسلام میں داخل ہو جائیں اور وہ اس اثناء میں آرام بھی کر چکے ہوں گے۔ اگر وہ اس سے انکار کریں تو پھر اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے۔ میں اس دین کی خاطر ان سے لڑوں گا۔ حتی کہ میری گردن الگ ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ اپنے حکم کو نافذ کر کے رہے گا۔

انواعِ کلامِ نبوی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان مبارک سے جو کچھ ارشاد فرمایا اور آپؐ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اسے امت تک پہنچایا۔ اس پر ایک مجموعی نظر ڈالی جائے تو کلامِ نبوی میں بے حد تنوع نظر آئے گا۔ اللہ کے آخری نبی کی حیثیت سے انسانیت کی رہنمائی کے لئے آپؐ نے مختلف حیثیتوں سے متعدد مواقع پر گفتگو فرمائی۔ آپؐ نے اپنے اعزہ و اقارب سے بھی گفتگو فرمائی۔ اپنے غلاموں اور موالی سے بھی باتیں ہوئیں۔ اپنے پرانے احباب و متعلقین سے تبادلہ خیالات ہوا۔ دشمنوں اور دوستوں سے کلام کیا۔ اپنے عقیدت کیش تلامذہ سے مخاطب ہوئے۔ مختلف النوع سوالات کے جوابات دیئے۔ اور مسائل حل کئے۔ عیدوں اور تہواروں پر امت سے خطاب فرمایا۔ مختلف اجتماعات و مجالس میں لوگوں کی رہنمائی فرمائی، وعظ و نصیحت اور تزکیۂ نفس کی محفلوں میں لوگوں کی روحانی تربیت فرمائی۔ اور متعدد مواقع پر تقاریر و خطبات ارشاد فرمانے کے علاوہ آپؐ کی طرف سے احکامات، معاہدات اور مکاتیب بھی جاری ہوئے۔

ان تمام مواقع پر آپؐ نے جو کچھ ارشاد فرمایا اس میں سے بیشتر ہم تک محفوظ صورت میں پہنچ گیا ہے۔ اور ہر قسم اور ہر موقع کی کوئی نہ کوئی بات کتب حدیث و سیرت میں بطور مثال مل جاتی ہے۔ انسان جب معمول کی زندگی سے کئی قدم آگے بڑھ کر عظمت کے زینے پر قدم رکھتا ہے تو گذشتہ باتیں قصہ پارینہ بن جاتی ہیں۔ گذشتہ صحبت کے لوگ پہچانتے بھی مشکل ہو جاتے ہیں۔ مگر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ

وسلم سے ایسا ممکن ہی نہ تھا۔ آپؐ کے ایک پرانے شریک کاروبار حضرت سائب بن صیفی تھے۔ ایک مرتبہ وہ حاضر ہوئے اور عرض کیا۔ "اتعرفنی یارسول اللہ"؟ اے اللہ کے رسولؐ! مجھے آپؐ پہچانتے ہیں؟ فرمایا "کیف لا اعرف شریکی الذی کان لایشادینی ولا یمادینی"! میں اپنے اس شریکِ کار کو کیوں نہ پہچانوں جو نہ تو میرے ساتھ برائی کرتا تھا اور نہ میرے ساتھ بے فائدہ جھگڑا کرتا تھا۔

کلامِ نبوتؐ کے تنوع، حفاظت اور ہم تک پہنچنے کے متعلق استاذ عباس محمود العقاد فرماتے ہیں:[1]

"وکلامه المحفوظ إما معاهدات ورسائل کتبت فی حینها وإما خطب وأدعیة ووصایا وأجوبة عن أسئلة کتبت بعد حینها وروعیت الدقة فی المضاهاة بین روایاتها جهد المستطاع"

آپؐ کا کلام محفوظ جو ہم تک پہنچا ہے۔ وہ یا تو معاہدے اور مکتوبات ہیں جو اسی وقت ضبط تحریر میں آ گئے تھے۔ اور یا آپؐ کے خطبات، دعائیں، وصیتیں اور سوالات کے جوابات ہیں۔ جو بعد میں ضبط تحریر میں لائے گئے اور حتی الامکان ان کی روایات میں باریکی وصحت کا لحاظ رکھا گیا ہے۔

بہر حال کلامِ نبوت خواہ معمول کی زندگی میں لسان نبوت سے ادا ہوا ہو، دینی مسائل و شرعی احکام کی تشریح و توضیح فرمائی گئی ہو۔ بات کو ذہن نشین کرانے اور سامان عبرت مہیا کرنے کے لئے قصص و تمثیلات بیان کی گئی ہوں۔ فرامین و مکتوبات ہوں۔ یا اقوال حکمت و دانش اور جواہر بلاغت جو جوامع الکلم کے ضمن میں آتے ہوں یا آپؐ کے خطبات و مواعظ ہوں جو مختلف مواقع پر لسان نبوت سے فصاحت و بلاغت کے آبدار موتی بن کر ادا ہوئے۔ اور مخاطبین کے تجسس و آرزومندوں کی گہرائیوں میں اتر کر محفوظ ہو گئے۔ یہ تمام اقسام اہل علم کو دعوتِ مطالعہ دیتی ہیں۔ غور و فکر، استفادہ اور استنتاج کے لئے بلاتی ہیں۔ ان میں زبان و ادب سے لے کر علم و حکمت اور شریعت و طریقت سے تعلق رکھنے والے سب ارباب ذوق کی تسکین کا سامان موجود ہے۔

وما توفیقی إلا باللہ۔

---

[1] عبقریہ ص۷۵

رسول اللہؐ کے کلام کی فصاحت و بلاغت

شمس بریلوی

ما طفلِ کم سواد، سبقِ قصہ ہائے دوست
صد بار خواندہ ایم، دگر از سر گرفتہ ایم

تاریخ عرب کے محققین نے واضح طور پر اس کا اعتراف کیا ہے کہ اسلام سے پیشتر کی کوئی "مکمل" تاریخ عرب دنیا میں موجود نہیں ہے، مورخین کو ایامِ عرب یا دورِ جاہلیت کے جو کچھ حالات معلوم ہوتے ہیں اُن کے مآخذ، تورات، انجیل اور قرآن مجید میں یا اہلِ عرب کی قومی روایات، اشعار (حماسہ وغیرہ) ہیں، جاہلیت میں قومی اجتماعات میں ان اشعار کو پڑھنے کا بہت رواج تھا، ہر وہ عرب نژاد فرد، لائق اور دوسرے افراد سے ممتاز گردانا جاتا تھا جو اپنے نسب، اپنے اسلاف کے احوال، اپنی قوم یا قبیلہ کی لڑائیوں کے حالات کا حافظ ہوتا تھا یعنی اپنے نسب اور اسلاف کے اقوال اور ان کی لڑائیوں کی تاریخ اور واقعات اس کو ازبر ہوتے تھے۔ اسلام نے نسبی تفاخر کو مٹانے اور اس احساسِ برتری کو رفع کرنے کی بہت زیادہ کوشش کی لیکن نسبی سلاسل (علم الانساب) کے تحفظ کا اہتمام اُن میں اسلام کی کئی صدیوں تک جاری وساری رہا یہاں تک کہ علومِ اسلامیہ میں علم الانساب کو بھی خاصی اہمیت حاصل ہوگئی اور عہدِ اسلام کی پہلی تین چار صدیوں میں علم الانساب کا ایک عظیم ذخیرہ بصورت "تالیفات" جمع ہوگیا، اس سے ایک عظیم فائدہ یہ برآمد ہوا کہ عہدِ جاہلیت کی کئی صدیوں کے احوال منضبط و محفوظ ہوگئے۔ یہ کام عہدِ جاہلیت کی شاعری سے اس قدر صحیح اور مربوط طریقہ پر انجام نہ پاسکا البتہ معاشرتی احوال پر اُن کے اشعار سے بہت کچھ روشنی پڑتی ہے مثلاً امرؤ القیس بن حجر بن عمرو کندی کے اس شعر ہی کو لے لیجئے۔

فظلّ طہاۃ اللحم من بین منضج
صفیف شواءٍ او قدیر معجّل

یعنی قوم کے شکار کردہ گوشت، پکانے والوں یا گرم پتھروں پر گوشت کو پھیلا کر کباب کرنے والوں یا ہانڈی میں جلد گوشت کو پکانے والوں میں تقسیم ہوگئے!

اُمرؤ القیس کے اس شعر نے معاشرتِ عرب کے اس پہلو کو روشن اور واضح کر دیا کہ ایامِ جاہلیت میں جب اُن کا دل کباب کھانے کو چاہتا تو وہ گوشت کو گرم تپتے ہوئے پتھروں پر ڈال دیتے تھے اور گوشت بھن کر کباب بن جاتا تھا۔

شعرائے جاہلیت کے اشعار کے علاوہ ایک تیسرا ماخذ ایامِ عرب کی تاریخ کے لئے وہ کتبات اور عمارتیں ہیں جو ملک یمن اور دوسرے تاریخی ممالکِ عرب میں پائی جاتی ہیں، عرب کے یہ کتبات، بہت کچھ پڑھ لئے گئے ہیں اور ابھی کچھ کا پڑھنا باقی ہے ان کتبات اور آثارِ صنادیدِ عرب کے ذریعہ جاہلیت عرب کی تاریخ کے بارے میں بہت سے انکشافات ہو چکے ہیں۔

چوتھا ماخذ مصر، اشوریہ اور بابل جیسے عظیم شہروں کے کھنڈروں میں پائے جانے والے آثار اور وہاں کے کتبات

ہیں جن سے عرب جاہلیت کے بہت سے حکمرانوں، شاہزادوں، شاہزادیوں اور اُن کی قوم کے نام اور مصریوں پر عربوں کی حکومت اور غلبہ کا حال ہی معلوم ہوتا ہے۔

پانچواں ماخذ، یونانیوں، رومیوں، ایرانیوں اور بنی اسرائیل کی تاریخ ہے، ان تاریخوں میں ایسے امور مندرج ہیں کہ خود عرب ان حقائق سے بے خبر تھے، اِن ہی تاریخوں سے اُن روابط کا پتہ چلتا ہے جو ایران، عراق و شام، فلسطین، مصر و یونان اور روم کی سلطنتوں سے عربوں کے قائم تھے اسی طرح اِس حقیقت کا بھی انکشاف ہُوا ہے کہ ملک عرب ہی بنی سام کا اصل مستقر تھا یعنی سام بن نوح (علیہ السلام) کی اولاد سب سے اوّل اسی عظیم صحرائی خِطّے میں آکر مقیم ہوئی تھی اور سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت سے تین ہزار پچاس سال قبل "بنی سام" کا ایک عظیم سیلاب اسی سرزمین سے بابل، نینوا، شام، ارضِ کنعان اور مصر میں اُمنڈ آیا تھا اور یہاں بنی سام نے زبردست سلطنتیں قائم کیں، مُلکی قوانین مرتب کئے اور دنیا کو توحید و خدا شناسی کا سبق دیا (ملاحظہ کیجیے تاریخ بابل از ولیم راجرس)

عربی مورخین نے جب اپنی تاریخ کی نگارش پر قلم اٹھایا تو اُس تاریخ کو ان تین طبقوں پر منقسم کیا۔ عرب بائدہ، عرب عاربہ اور عرب مستعربہ میں یہاں بہت ہی مختصر طور پر ان تینوں طبقات کا ذکر کروں گا۔

۱۔ عرب بائدہ کے معنی ہلاک ہو جانے والوں کے ہیں اس لئے اُس سے مراد سرزمین عرب کی وہ قدیم ترین قومیں ہیں جو سب سے پہلے ملکِ عرب میں آکر آباد ہوئیں اور قرآن حکیم کے اس ارشاد کے بموجب،

فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ ﴿ (اعراف)

یہ سب اپنے اپنے مقررہ وقت پر عرب ہی میں ختم ہوگئیں اگرچہ اُن کی محض شاخیں دوسرے ممالک میں مدت ہائے دراز تک باقی رہیں، یہ قومیں ہیں، عاد اوّل، عاد ثانیہ، ثمود اوّل، ثمود ثانیہ، جرہم، طسم، جدیس بنی لحیان اور بنی معین! میں یہاں ان قوموں کی تاریخ اور مختصر تاریخ بیان کرنے سے معذور ہوں کیونکہ اپنے موضوع سے بہت ہٹ جاؤں گا، قرآن پاک میں ان کے احوال مختلف سورتوں میں موجود ہیں۔

وَثَمُودَ الَّذِينَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ

اور

ذَاتِ الْعِمَادِ الَّتِي لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ

ان ہی کے بارے میں ارشاد ربانی ہے، عاد تمام عرب میں پھیلے ہوئے تھے، حضرت ہود علیہ السلام ان کی اصلاح کے لیے مامور ہوئے تھے قوم نے نافرمانی کی اور تباہ ہوگئی جو بچ رہے وہ عاد ثانیہ کہلائے جناب لقمان عاد ثانیہ کے نامور بادشاہ تھے۔ قوم عاد ثانیہ خدا پرست اور شریعت ہود علیہ السلام کی متبع تھی [۱]

۱۔ دیکھئے "ارض القرآن"۔

عاد بائدہ حضرموت سے جزیرہ نمائے عرب کے شرقی سواحل (خلیج فارس) کے کنارے کنارے عراق تک پھیلے ہوئے تھے

ثمود کا مرکز ارض حجاز تھا لیکن یہ بھی ارض حجاز سے حدود سینا تک یعنی عرب کے مغربی ساحل، بحر قلزم تک بسے ہوئے تھے، وادی القریٰ کا شہر "حجر" ان کا خاص مرکز تھا، پہاڑوں کو کاٹ کر قلعے اور مکانات بنانے میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ یہی قرآنی زبان میں "ذات العماد" یعنی ستونوں والے ہیں، اِن کی عمارتیں آج بھی زمانے کے لئے درسِ عبرت ہیں یہ حضرت صالح علیہ السلام کی نافرمانی کے باعث تباہ ہوئے۔

اہل معین کی آبادیاں یمن میں سمندر کے کنارے سبا اور حضرموت کے کنارے تھی یہ قوم سلطنت سبا کی ہمعصر تھی۔

جرہم: تمام حجاز میں پھیلے ہوئے تھے اور یہی وہاں کے حکمران تھے، ان کے علاوہ بھی عرب بائدہ کی چند قومیں تھیں لیکن وہ بالکل مجہول الحال قوموں کی طرح تاریخ کے صفحات پر صرف اپنا نام باقی چھوڑ گئی ہیں۔ عبیل عمیس، امیم، ارقم اور ادبار ان ہی مجہول الحال قوموں کے نام ہیں۔

عرب عاربہ: عاربہ کے معنی حضریت سے محروم صحرائی یعنی بدوی کے ہیں ممکن ہے کہ اس قوم کی ابتدا بدویت اور دشت نوردی سے ہوئی ہو حالانکہ ترقی کی راہ میں یہ بہت آگے نکل گئی تھی۔ عرب عاربہ میں بڑی بڑی متمدن قومیں پیدا ہوئیں اور ایسی متمدن کہ زبردست سلطنتوں کی مالک ہوئیں، عرب عاربہ، عرب بائدہ کے بعد جنوبی عرب میں نمودار ہوئے، یمن ان کا پہلا مستقر اور مرکز تھا، یہاں سے پھر یہ دوسرے ممالک میں پھیلے۔ عرب عاربہ کا مورث اعلیٰ قحطان ہے جو یمن کا پہلا بادشاہ گزرا ہے اسی نے سب سے پہلے تاج شاہی استعمال کیا۔ اس سے پہلے سلاطین تاجپوشی سے ناآشنا تھے، قحطان، سام بن نوح کی نسل سے ہے اور سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت سے دو ہزار دو سو برس پہلے مملکت یمن پر حکمرانی کرتا تھا۔ حضرموت کا وسیع ریگستانی علاقہ اسی قحطان کے فرزند حضارموت کے نام موسوم تھا جو آج بھی دنیا کے عظیم ریگزاروں میں شمار ہوتا ہے اور حضرموت کے نام سے جانی پہچانی چیز ہے، عصر حاضر کے عرب اس کو "ربع الخالی" سے بھی موسوم کرتے ہیں، اس کی نسل نے حضرموت کی سلطنت قائم کی، آخر میں یہ سلطنت، مملکت سبا کے تحت میں آگئی اور جنگ و جدل کے طویل سلسلے نے اِن کو برباد کر دیا۔ جو نسل باقی رہی وہ قبیلۂ بنی کندہ میں ضم ہو گئی۔

بنی قحطان کی سب سے نامور سلطنت "سبا" کی سلطنت تھی، سبا قحطان کا نبیرہ تھا اور اس کا نام عبد شمس تھا۔ لیکن سبا لقب پڑ گیا اور اصل نام ذہنوں سے محو ہو گیا، سبا بڑی متمدن اور مہذب سلطنت تھی اِن کی سلطنت اور حکومت کا دور ایک ہزار برس سے زیادہ مدت تک جاری وساری رہا۔

قوم سبا کا جب دوسرا دَور شروع ہوا تو انہوں نے اپنا مرکز اور مستقر، شہر مارب، کو بنا لیا شاہِ سبا تبع آمر نے ۸۰۰ ق م میں "سدِ مارب" تعمیر کی جس کو اہل یمن اپنی زبان میں "عرم" کہتے تھے، اس کے ذریعے ایک بہت بڑی وادی کا راستہ روک کر ایک عریض و عمیق تالاب بنایا گیا جو فن ہندسیہ کا ایک عظیم کارنامہ تھا اس کے ذریعہ تمام ملک سرسبز و شاداب ہو گیا، "سدِ مارب" یا "عرم" کو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے چھ سو برس قبل ایک عظیم سیلاب نے طوفانِ نوح (علیہ السلام) کا منظر پیش کرتے ہوئے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا اور ساری مملکت سبا تباہ و برباد ہو گئی!

سبا کی وسیع اقلیم میں یہ تین ممالک تھے یعنی حبش، یمن اور شمالی عرب کے بعض علاقے۔ ۶۸۶ سنہ قبل ولادت سرور کونین صلی اللہ

علیہ وسلم میں اس سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا اور حبش کی سلطنت پر "اکسومی خاندان" قابض ہو گیا اور شمالی عرب پر "بنی اسماعیل" کا تصرف ہو گیا اسی زمانے میں "ملوکِ حمیر" نمودار ہوئے یہ بھی اپنے آپ کو "ملوکِ سبا" ہی کہتے تھے اس لئے کہ یہ نسل "یعرب بن قحطان" سے تھی!

حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت سے چار سو سال قبل حبشیوں نے اس حمیری سلطنت پر یورشیں شروع کر دیں اور ساحلی مقامات نیز حضرموت متنقلاً ان کے تصرف میں آ گئے، حمیری سلاطین نے اپنا لقب "تبّع" رکھا تھا، جو حمیری اور سبائی زبان کا لفظ ہے۔ حمیری تبّع یا سلاطین، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے ۶۴ سال قبل تک اِن تمام علاقوں پر قابض رہے لیکن اس کے بعد حبشیوں کو ان علاقوں پر دوبارہ اقتدار حاصل ہو گیا۔ یہ تھا عرب عاربہ کا مختصر حال اور ان کی بہت ہی مختصر تاریخ۔

تیسرا طبقہ، "عرب مُستعربہ" یعنی عرب بن جانے والے لوگ! یہ وہ قوم ہے جو غیر عرب ممالک سے آ کر عرب میں آباد ہوئی اور پھر یہاں رہتے رہتے عرب بن گئی، اس قوم کی بنیادیں اُس وقت پڑیں جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے کمسن (شیر خوار) فرزند اسمٰعیلؑ اور اُن کی والدہ حضرت ہاجرہ کو اس "وادیٔ غیر ذی زرع" میں چھوڑ کر واپس چلے گئے، اسی میں شہر مکہ آباد ہے۔ یہ واقعہ سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے تقریباً تین ہزار چار سو سال قبل کا ہے اور تعمیر کعبہ ان ہی دو بزرگ ہستیوں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور عنفوانِ شباب میں قدم رکھنے والے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے مقدس ہاتھوں سے ہوئی۔ قرآن حکیم میں:

"وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ"

سے اسی تعمیر بیت اللہ کی جانب اشارہ ہے۔ تعمیرِ کعبہ حضرت ابراہیم کی پیری اور حضرت اسمٰعیل (علیہ السلام) کے عنفوانِ شباب کا واقعہ ہے، اس وادی میں بنی اسمٰعیل و بنی جرہم کی اولاد روز بروز بڑھتی گئی، ان کے علاوہ دو اور قومیں بھی اس علاقے میں آ کر آباد ہو گئیں ایک یہود اور دوسری صابئی، یہود تو ارضِ کنعان، عراق اور مصر سے یہاں آ کر آباد ہوئے اور "صابئی" عراق و بابل سے فرار ہو کر یہاں آ کر بس گئے رفتہ رفتہ یہود کی آبادی کا دائرہ وسیع ہونا شروع ہوا۔ یہ لوگ وادی القریٰ، خیبر، فدک، یثرب (مدینہ منورہ) اور بلاد یمن کے علاوہ خاص مکہ معظمہ میں بھی آباد ہو گئے، مہاجرین دین نے ان کی ساکھ بڑھا دی اور یہ معزز سمجھے جانے لگے۔ "صابئی" اطراف مکہ اور دوسرے قریبی علاقوں اور بلاد و امصار میں آباد ہو گئے، اِن دونوں فرقوں یا قوموں کے علاوہ مسیحیوں کے مختلف فرقے بھی تھے جو شمالی عرب میں آباد تھے۔ ان مختلف فرقوں کے مذہب کا اثر یہاں کے قدیم باشندوں پر بھی پڑا اور کچھ نے یہودیت، صابئیت اور عیسائیت کو قبول کر لیا باقی بدستور اپنے بُتوں کی پرستش میں لگے رہے، واضح رہے کہ دین یحییٰ اور یہودیت کو قبول کرنے والوں میں زیادہ تر وہی لوگ تھے جو باہر سے آئے تھے عربی النسل خاندانوں میں سے بہت ہی کم افراد نے اِن مذاہب کو قبول کیا، یہی حال مسیحیت قبول کرنے والوں کا تھا کہ اس جماعت میں زیادہ تر وہ عرب تھے جو پہلے عیسائی رہ چکے تھے اور پھر انہوں نے بُت پرستی کو اپنا شعار بنا لیا تھا اب پھر سے ماحول کے زیر اثر عیسائیت کی آغوش میں چلے گئے۔

آلِ اسمٰعیلؑ: حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے سردار جرہم مضاض کی بیٹی سے شادی کی تھی اور ان کے بطن سے خداوند تعالیٰ نے ان کو بارہ فرزند عطا فرمائے اور ان فرزندوں کی اولاد سے بارہ سبط، ابنائے اسمٰعیل بن گئے اِن میں سے دس اسباط گمنام ہو کر دُنیا سے ناپید ہو گئے صرف دو سبط باقی رہ گئے ایک نابتی منسوب بہ نابت اور دوسرا قیداری منسوب بہ قیدار، ان میں نابت خانہ کعبہ کے متولی ہوئے

کچھ عرصہ کے بعد نابت کی اولاد بعض وجوہ سے حجاز چھوڑ کر عرب کے شمال کی طرف چلی گئی، یہی نسل پھول پھل کر جزیرہ نمائے سینا سے حدود عراق تک اور ارض مقدس کے حدود سے یثرب تک پھیل گئی۔

قیدار از ابنائے اسماعیلؑ، بنی نابت کے چلے جانے کے بعد باوجود مکہ ہی میں رہے اور یہ لوگ اپنے نانا (مضاض) کے خاندان کے ساتھ مل جل کر رہنے لگے اور حرم الٰہی کی نگرانی اور نگہبانی کے فرائض انجام دیتے رہے۔ قیدار کی نسل برابر بڑھتی رہی اور اس کی شاخیں مکہ سے نکل کر سارے عرب میں پھیلتی رہیں مگر بنی قیدار کا ایک گروہ مکہ میں ضرور موجود رہتا اور حرم الٰہی کی خدمت کرتا۔ ہر سال موسم حج میں بنی اسماعیلؑ جو قریبی اور دور کے علاقوں اور ملکوں میں پھیلے ہوئے تھے جوق در جوق مکہ آتے اور کعبہ کی زیارت کرکے واپس چلے جاتے، اس وقت تک اُن میں بدویت سرایت کئے ہوئے تھی نہ انہوں نے مکانات بنائے تھے اور نہ حضریت کو قبول کیا تھا وہ تمدن کے جھمیلوں سے دور دور ہی رہے۔

حضرت اسماعیلؑ کی وفات کے تقریباً بارہ سو سال بعد بنی قیدار میں عدنان نامی بزرگ پیدا ہوئے۔ عدنان کے بہت سے فرزند تھے ان میں سے معد نامی فرزند کو اسرائیلی سردار بخت نصر کی مضرتوں سے محفوظ رکھنے کے لیے اُن کو اپنے ساتھ "حرّان" لے گئے۔ معد کی نسل کو اللہ تعالیٰ نے بڑی وسعت بخشی خصوصاً معد کے بیٹے "نزار" تمام عرب قبائل کے مورث اعلیٰ ہوئے، عرب کے تمام قیداری قبائل میں کوئی ایسا قبیلہ نہیں ہے جس کا سلسلہ نزار کے واسطے کے بغیر عدنان تک پہنچتا ہو، نزار کے پانچ فرزند ہوئے اور ان سے پانچ قبیلے وجود میں آئے، بنی انمار، بنی ایاد، بنی ربیعہ، بنی قضاعہ اور بنی مضر ان میں سے بنی ربیعہ اور بنی قضاعہ اور بنی مُضر کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ اسی مدت میں بحرین میں بنی عبدالقیس کی ریاست، نجد میں بنی بکر، بنی تغلب اور بنی کندہ کی ریاستیں اور حیرہ میں آل نعمان کی عظیم ریاستیں قائم ہوئیں یہ تمام ریاستیں اور اُن کی رعایا اپنی پانچوں متذکرہ آل نزار سے تھیں یعنی نسلاً یہ سب کے سب نزاری تھے۔ مضر کی تیسری پشت میں بنی مدرکہ موحد اور خدا پرست تھے بت پرستی کا ان میں شیوع نہیں ہوا تھا یہ سب دین حنیفی کے پیرو تھے۔ بنی خزاعہ مکہ کے حکمران اور خانہ کعبہ پر متصرف تھے اس خاندان کے ایک رئیس اور فیاض شخص نے جس کا نام عمرو بن لحی تھا، بت پرستی کو اپنا شعار بنایا، ملک شام سے ہبل نامی بُت لاکر کعبہ میں رکھ دیا اور اپنے اثر فیاضی کے اثرات سے دوسروں کو بھی بُت پرست بنا دیا۔

مدرکہ کی نسل میں پانچ پشتوں کے بعد فہر پیدا ہوئے اُن کو تمام نزاری قبائل کی سرداری کا شرف حاصل ہوا۔ ان ہی فہر کے چھ بطنوں کے بعد کلاب نامی سردار کے یہاں ایک عظیم ہستی پیدا ہوئی جو قصیٰ کے لقب سے مشہور ہوئی اگرچہ ان کا اصل نام زید تھا، قہر اپنی جوانی میں ہی بنی قضاعہ کے حاجیوں کے ساتھ مکہ آ گئے تھے اور یہیں اپنے بڑے بھائی کے ساتھ رہنے لگے تھے، مکہ کی تولیت اور حکومت کے لئے بنی خزاعہ اور بنی نضر بن کنانہ میں جنگ چھڑ گئی، اطراف مکہ میں جو چند قبائل آباد تھے وہ سب کے سب قصیٰ کے جھنڈے کے نیچے آکر جمع ہو گئے اس جنگ میں بنی خزاعہ کو ناکامی ہوئی اور قصیٰ مکہ کے حاکم اور کعبہ کے خادم مقرر ہو گئے!

قصیٰ نے تمام قبائل منتشرہ کو جو اب قریش کے معزز لقب سے ممتاز تھے مکہ ہی میں بسا لیا جو لوگ کعبہ کے قرب و جوار میں آباد ہوئے وہ قریش بطاح کہلائے اور جنہوں نے مکہ کے مضافات میں سکونت اختیار کی اُن کو "قریش ظواہر" کہا جانے لگا۔

حضریت میں بھی بدویت: اب تک شہر مکہ میں بھی لوگ خیموں کے اندر زندگی بسر کرتے تھے، قصیٰ پہلے شخص ہیں جنہوں نے متمدن دنیا کی اہم ضرورت کو پورا کیا اور ان لوگوں کے لئے مکانات تعمیر کرائے اور مکہ کو جداگانہ منطقوں یا محلوں میں تقسیم کیا اس طرح قوم قیدار بن اسماعیلؑ پہلی بار تمدن سے آشنا ہوکر متمدن اقوام کی صف میں شامل ہوئی۔ مکہ میں "دارالندوہ" کا قیام بھی قصیٰ ہی کی تجویز و تدبیر کا مرہونِ منت ہے۔ قریش کی جانب سے قصیٰ نے پانچ اہم اُمور کی ذمہ داریاں قبول کرلیں، اوّل دارالندوہ کی سربراہی دوم حجابہ یعنی خانہ کعبہ کی دربانی، سوم سقایہ یعنی حاجیوں کو پانی پلانے کا انتظام۔ چہارم "رِفادہ" یعنی حاجیوں کے طعام کا بندوبست پنجم لوا یعنی علم برداری کی نگہداشت، جنگ کے وقت فوجی دستوں کے لیے جھنڈوں کی تیاری اور ان کی سپردگی۔

قصیٰ کے دوسرے مشہور فرزند عبد مناف ہیں جو حضور سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے جدِ اعلیٰ یعنی عبدالمطلب کے دادا ہیں قصیٰ اور عبد مناف کی کوششوں سے عرب تمدن آشنا ہوئے اور شہری زندگی کی خصوصیات کو انہوں نے اپنایا لیکن قبائلی بدویت کا وہ خاتمہ نہ کرسکے اور نہ وہ ان کے جذبۂ مفاخرت کو دبا سکے، شعر و شاعری اور شاعری میں حسن و عشق کی داستانیں خصوصاً بنت عم سے معاشقہ اور اس پر تفاخر، شہ سواری اور نیزہ بازی ان کے محبوب مشاغل اور روزمرہ کی زندگی کی معروفیات تھیں۔ شاعری جو نسلی تفاخر اور عشقیہ جذبات کی ترجمانی و ابلاغ کا ذریعہ تھی ان کا ادب تھا اور اسی کو وہ ادبیات سے تعبیر کرتے تھے، اس وقت ساری زبانیں، سامی اقوام کی طرح دم توڑ چکی تھیں۔

یہ جو کچھ میں نے عرض کیا اور عربوں کی قدیم تاریخ کے کچھ ورق اُلٹے اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ آپ پر اُن انقلابات اور قوموں کے عروج و زوال کی کچھ نشاندہی ہوسکے جو اُس وقت کی زبانوں پر اثر انداز ہوئے۔ یہ اثرات اس قدر گہرے اور دیر تک قائم رہنے والے تھے کہ کچھ زبانوں کو تو دائرہ تاریخ سے یکسر ہٹا دیا اور بعض کے کچھ نشانات آثار و کتبات کی صورت میں موجود ہیں اور مدتوں سے ان کے پڑھنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور اب تک حسبِ دلخواہ اس میں کامیابی نہیں ہوئی ہے یا قوموں کے عروج و زوال کے ساتھ ان اقوام و ملل کی زبانوں کا عروج و زوال بھی وابستہ ہوتا ہے جنہوں نے کبھی عروج کے بلند میناروں کو چھوا، اور پھر زوال کی سَیل تُند رَو نے ان کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا، پاکستان میں "موہن جوڈرو" کی تہذیب ہزاروں سال پرانی (تحقیق و تفحص کے بعد) بتائی گئی ہے اور اس کے شواہد بھی موجود ہیں لیکن اس عہد کی زبان جو زیادہ تر "ٹھیکروں" پر کندہ ہے آج تک نہیں پڑھی گئی۔ ایران میں "ہخامنشی" دور کے کتبات اور خطِ میخی و بیکانی کی الواح موجود ہیں برسوں کی محنت کے بعد اُن کے پڑھنے میں کچھ کشود کار ہوئی ہے۔

معاشرہ بغیر زبان کے نہ نشوونما پا سکتا ہے اور نہ زندہ رہ سکتا ہے، افہام و تفہیم کے لیے زبان سے آوازیں نکالنا ہی پڑتی ہیں ان ہی آوازوں کو ایک مربوط اور منظم سلسلہ میں جب اُس عصر کے دانشور مرتب کر دیتے ہیں یا معاشرتی تعلقات اور سماجی ضروریات اُن کو منظم و مربوط کر دیتی ہیں تو صوت حرف کا اور حروف الفاظ کا جامہ پہن لیتے ہیں اور ان الفاظ کا باہمی ربط و ضبط، کلام کا روپ اختیار کرلیتا ہے، لغات یعنی اسماء وجود میں آتے ہیں اور پھر ان لغات کو قوتِ حافظہ اپنے اندر محفوظ کرلیتی ہے اور لغات سے تحفظ کی قلت یا کثرت، افراد پر علم و فضل کی چھاپ لگاتی ہے۔

مصر کی تہذیب بہت قدیم ہے لیکن وہ بھی لغات کا تحفظ سنگین الواح کے سوا اور کسی ظاہری صورت میں نہ کرسکے، الشوری، کلدانی، بابلی اور فنیقی تہذیبیں ایجاد و اختراع کی دنیا میں اپنا ایک مقام رکھتی ہیں اور ان میں سے بعض کو متمدن اقوام میں بھی شمار کیا جاتا ہے۔ ان تمام

ہیں بھی افہام و تفہیم کا ذریعہ یہی لغات تھے جو صوتیات سے بنائے گئے تھے، بابلی تہذیب میں کاغذ ایجاد ہوا جو زبان کی بقا کے لیے ایک اہم چیز تھا ورنہ عموماً عمدہ مدبوغ چمڑے اور جھلیوں کو لکھنے کے کام میں لایا جاتا تھا، بہرحال متمدن قوم ہو یا غیر متمدن زبان کی محتاج ہے اور زبان سے اس کا گریز ناممکن ہے چنانچہ "عرب" کی امم سابقہ کا ہی زبان سے رابطہ ناگزیر تھا یعنی ان میں سے ہر ایک قوم کی زبان تھی اور بہت ممکن ہے کہ ایک شاندار قوم کی زبان اس کی دوسری ہمسایہ قومیں بھی استعمال کرتی ہوں۔ اس طرح یہ دائرہ ایک قوم سے دوسری قوموں تک وسیع ہو کر پھیل گیا ہو۔

"ماہرینِ لسانیات" نے قدیم متمدن دنیا کے لیے دو اہم اور عظیم زبانوں کی نشاندہی کی ہے ایک "ہندار ریائی" اور دوسری "سامی"۔ ہندار ریائی میں وہ تمام زبانیں شامل ہیں جو غیر عرب (عجم، ہندار و یورپ) میں بولی جاتی ہیں، ستم جس کی شاخیں ہند میں پیا کا، پراکرت، سنسکرت اور غیر ہند میں بالتوسلادی۔ آرمینی اصبائیران میں پارسی پاستان، پہلوی اور موجودہ فارسی، اور دوسری شاخ "جو کنیشم" کہلاتی ہے اس میں اس کانڈینیوی، ڈنمارکی، انگلیسی، ہندی، لاطینی، یونانی، اشپانیائی، فرانسوی اور رہبانوی شامل ہیں۔

سامی زبانوں میں صرف دو زبانیں باقی ہیں عربی اور عبرانی، تورات و زبور و انجیل کی زبان عبرانی ہے اسی زبان میں یہ صحف نازل ہوئے لیکن آج ان کی صورت بہت کچھ بدل گئی ہے۔ تحریف نے ان کے اصلی خد و خال میں بہت کچھ تبدیلیاں کر دی ہیں۔

سنہ ۱۲۲۵ ق م میں جب عبرانی قبائل (بنی اسرائیل) صحرائے سینا اور نفود میں چالیس سال تک مقیم رہے اسی زمانے میں توراۃ کا صحیفۂ الٰہی نازل ہوا تھا، آج وہ اپنی اصل صورت میں نہیں ہے۔

عربی زبان جیسا کہ ابھی عرض کیا سامی الاصل ہے دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں ہے جو عربوں کے مقابل میں آ کر اظہار کی ان جیسی تیداری ہو اور شاید ہی کوئی زبان ایسی ہو جو عربی کی طرح اثر آفرینی میں اس جیسا درجہ رکھتی ہو، یہ تسلیم ہے کہ اصلی سامیوں کی طرح عرب کوئی عظیم آرٹ پیدا نہ کر سکے اور نہ انہوں نے اس کو نشوونما دی جس طرح عبرانیوں نے اپنے مذہبی گیتوں میں اپنی زباندانی کے کمال کے اظہار کا محل و موقع تلاش کر لیا تھا اور یونانیوں نے فنِ سنگ تراشی اور فنِ تعمیر کو اپنے کمال کا معیار قرار دیا تھا اسی طرح عربوں کی فن کارانہ فطرت نے اپنے اظہارِ کمال کا صرف ایک طریقہ ڈھونڈھ لیا تھا اور وہ تھا خطابت خواہ وہ نثر میں ہو یا نظم میں، خطابت میں ان کو ید طولیٰ حاصل تھا لیکن انہوں نے نثر سے زیادہ نظم کو اظہارِ خیال اور خطابت کا ذریعہ بنایا تھا، خطابت سے مراد پند و موعظت نہیں ہے بلکہ خطابت سے مراد، اپنی ذات اور اپنے آباد اجداد کے کمال کا اظہار تھا اور اس وصف میں عرب اپنا ثانی اور عدیل نہیں رکھتے تھے، ابھی میں نے عرض کیا ہے کہ عہد جاہلیت میں عربوں نے شاعری (نظم) کو اپنے اظہارِ کمال کا ذریعہ بنایا تھا، ان کے یہاں یہ ضرب المثل بہت زیادہ استعمال ہوتی تھی کہ "مرد کا حسن اس کی زبان کی فصاحت میں مضمر ہے" اسی قبیل کی ایک اور کہاوت ہے کہ "دو عقل چینیوں کے ہاتھوں پر اور عربوں کی زبان پر اُتری ہے"۔

فصاحت یعنی نظم و نثر میں قوت اور بانکپن کے ساتھ اظہار کی صلاحیت، تیر اندازی (جو ان کے قوتِ لایموت کا ہی ذریعہ تھی) اور شہسواری، یہی تین چیزیں عہد جاہلیت میں ایک مکمل انسان کا سرمایہ یا بنیادی خصوصیات تھیں اور اس پر وہ اس قدر نازاں تھے کہ ظہورِ اسلام سے کچھ قبل بدویت کی آغوش میں پرورش پاتے چند شعرائے عرب نے اپنی فکرِ شاعرانہ کے بہترین نمونے خانہ کعبہ

کے دروازے پہ آویزاں کر دیئے تھے جو عرب کے زبان دانوں اور اصحاب فصاحت و بلاغت کے لئے ایک دعوت مقابلہ تھی، عربی ادبیات میں یہ "سبعہ معلقات" یا "معلقات سبع" کے نام سے یادگار ہیں اور آج تک تاریخ ادب میں ان کے متون محفوظ ہیں، عہدِ جاہلیت کے یہ سات عظیم شعراء: (۱) امرؤ القیس بن حجر بن عمرو الکندی۔ (۲) طرفۃ بن عبید البکری۔
(۳) زہیر بن ابی سلمٰی المزنی۔ (۴) لبید بن ربیعۃ العامری۔
(۵) عمرو بن کلثوم التغلبی۔ (۶) عنترہ بن شداد العبسی
(۷) حارث بن حلزۃ الیشکری۔

تھے۔ ان میں بعض کے چند اشعار مع ترجمہ آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ لیکن اس سے قبل یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ شعرائے جاہلیت کی شعری خصوصیات میں یہ چند خصائص قدر مشترک تھے جن کو آپ خصوصیاتِ شعری یا اسالیبِ شعری سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

شعرائے جاہلیت کے اسالیب ان کی شاعری کی ابتدا منزل محبوب پر آہ و زاری، منزل محبوب کے کھنڈروں سے سوال اور ان سے تخاطب، کھنڈروں کو سلام، ان کھنڈروں کے لئے سیرابی کی دعا، برق سے التجا کہ وہ محبوب کے اس گھر کو جگمگائے جو کھنڈر بن گیا ہے، محبوب کی جدائی اور اس کے فراق کے صدمے، کرب و اضطراب درختوں سے تخاطب بنت عم سے معاشقہ کا اظہار یہ اُن کے قصائد کی تشابیب کا پسندیدہ اور رچا بسا اسلوب تھا جس سے کسی عظیم اور پسندیدہ شاعر کو گزیر ممکن نہیں تھا "معلقاتِ سبع" کے شعرائے یہاں اس تشبیہانہ اسلوب کو ملاحظہ کیجئے!

اُمرؤ القیس بن حجر بن عمرو الکندی عصر جاہلیت کا رئیس الشعراء اپنے معلقہ (قصیدہ) میں اپنی محبوبہ عُنیزہ کا ہمسفر ہونا بڑے ذوق و شوق سے بیان کرتا ہے لیکن اس قرب کے باوجود اور نشاطِ ہمدم کے باوصف وہ اس مخصوص شعری اسلوب کو ترک نہ کر سکا اور وہ قصیدہ کی تشبیب میں کہتا ہے!

قفا نبكِ من ذكرى حبيبٍ ومنزلِ بسقط اللوى بين الدخول فحوملِ

(اے دونوں دوستو! ذرا ٹھہرو! کہ ہم محبوب اور اس کے گھر کو یاد کر کے رولیں جو ریت کے ٹیلے کے اختتام پر مقامات دخول اور حومل پر ہیں۔)

فتوضح فالمقراة لم يعفُ رسمها لما نسجتها من جنوبٍ وشمألِ

(توضح اور مقراۃ کے درمیان وہ گھر واقع ہے جس کے نشانات اس وجہ سے نہیں مٹے کہ اس پر جنوبی اور شمالی ہوائیں برابر چلتی رہتی ہیں)۔

تشبیب میں یہی اسلوب معلقاتِ سبع کے دوسرے شاعروں کا ہے۔ طرفہ بن العبد البکری کہتا ہے۔

لخولة أطلالٌ ببرقة ثهمدِ تلوح كباقي الوشم في ظاهر اليدِ

(خولہ کے گھر کے نشانات ثہمد کی پتھریلی زمین پر اس طرح چمک رہے ہیں جیسے گودے ہوئے ہاتھ کی پشت پر باقی ماندہ نشانات)

وقوفاً بہا صحبی علی مطیہم یقولون: لا تہلک اسی و تجمل

"میرے احباب میری وجہ سے ان کھنڈروں پر اپنی سواریوں کو روکے کہہ رہے تھے کہ غم فراق سے ہلاک مت ہو اور صبر و ہمت سے کام لو"

اب زہیر بن ابی سلمی المزنی کی تشبیب ملاحظہ ہو کہتا ہے:

امن ام اوفی دمنۃ لم تکلم بحومانۃ الدراج فالمتثلم

"کیا یہ کوڑا گھر جس نے مجھ سے بات نہ کی "ام اوفی" کا گھر ہے جو دراج اور متثلم کی پتھریلی زمین پر واقع ہے"

بہا العین والآرام یمشین خلفۃ واطلاؤہا ینہضن من کل مجثم

ان مکانات میں نیل گائیں اور ہرن آگے پیچھے پھر رہے ہیں اور ان کے بچے ادھر ادھر سے دودھ پینے کے لئے اٹھتے ہیں:

لبید بن ربیعۃ العامری اپنے قصیدے کی تشبیب میں کہتا ہے:

عفت الدیار محلہا فمقامہا بمنی تابد .... غولہا فرجامہا

فمدافع الریان عری رسمہا خلقا کما ضمن الوحی سلامہا

"منیٰ میں تھوڑے دن اور زیادہ دن ٹھہرنے کے مکانات برباد ہو گئے اور کوہ غول و رجام کے مکانات خشت کدہ بن گئے ہیں۔ اسی طرح کوہ ریان کی نالیاں (ویرانی کے باعث) وحشت ناک ہو گئی ہیں جن کے نشانات اب بھی اسطرح باقی ہیں جس طرح پتھر پر کندہ نقوش کتابت کے ضامن ہوتے ہیں"!!

میں معلقات سبع کے تمام شعراء کے نسائی تشبیب پیش نہیں کروں گا، ان تشابیب کے پیش کرنے کا مقصد یہ تھا کہ آپ پر واضح ہو جائے کہ جاہلیت کی شاعری میں تشبیب ایک ضروری جزو تھا اور اس اسلوب اور رنگ شاعری کا اثر اس قدر گہرا ہوا کہ قرنوں تک عربی شاعری میں قصائد اسی قسم کی تشبیب سے آراستہ رہے گویا یہ اسلوب شاعری میں اس طرح رچ بس گیا تھا کہ جاہلیت ہی کی شاعری پر موقوف نہیں بلکہ اس کے بعد کی شاعری بھی بغیر تشبیب کے پھول پھل نہ سکی۔

شاعر جاہلیت زہیر بن ابی سلمی کے فرزند حضرت کعب جو فتح مکہ کے بعد اپنے مسلمان بھائی کی تحریک و ترغیب پر بارگاہ نبوت میں قبول اسلام کے لئے حاضر ہوئے تو انہوں نے بارگاہ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں جو قصیدہ پیش کیا وہ بھی اسی اسلوب سے آراستہ و پیراستہ تھا انہوں نے بھی عصر جاہلیت کی شعری تشبیب سے اپنی نعت پیش کی، یہ قصیدہ اپنی تشبیب ہی کے باعث "قصیدہ بانت سعاد" کے نام سے معروف ہے، حضرت کعبؓ کے اس قصیدے کی تشبیب سے دو اشعار پیش کروں گا: فرماتے ہیں!!

بانت سعاد فقلبی الیوم متبول متیم اثرہا لم یفد مکبول

وما سعاد غداۃ البین اذ رحلت الا اغن غضیض الطرف مکحول

یعنی: سعاد جدا ہو گئی اور میرا دل (اس کی فرقت میں) آج بیمار ہے جو اس کی محبت میں قید ہے عوض دے کر بھی اس قید سے رہائی نہیں مل سکتی۔

سُعاد کل صبح جدا ہو کر چلی گئی مگر اس کی سرمگیں چشم مجھے اس طرح اشارہ کرتی تھی جیسے ہرن مجھے دیکھ کر باریک اور خوش آئند آواز نکالتا ہے۔"

غور تو فرمائیے نعت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں قصیدہ ہے لیکن "سُعاد کے فراق" سے نعتیہ قصیدہ شروع کیا جا رہا ہے قصیدہ "بانت سعاد" میں تشبیب کے ۳۲ اشعار ہیں اور نعت مصطفوی میں ۳۰ سے بھی کم اشعار ہیں، یہ وہی قصیدہ ہے جس کو سماعت فرماتے ہوئے سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ ردائے مبارک حضرت کعبؓ کو عطا فرما دی تھی جو اس وقت آپؐ کے دوش اقدس پر تھی!!

حضرت کعبؓ ہی پر کچھ موقوف نہیں، عربی شاعری کے اسالیب میں یہ تشبیب اپنا ایک خاص مقام رکھتی تھی بعد کے نعت نگار شعرا، صاحب قصیدہ بُردہ امام بوصیریؒ اور دوسرے نعت گو شعرا، اس سرزمین پاک و ہند میں مشہور زمانہ عربی شاعر حضرت میر غلام علی آزاد بلگرامیؒ کے قصائد بھی اس تشبیب سے خالی نہیں ہیں ان تمام حضرات نعت نگار کے قصائد تشبیب ہی سے شروع ہوتے ہیں، یہ پاکیزہ اور مقدس نفوس اپنی عربی شاعری میں عہد جاہلیت کے پسندیدہ اسلوب کو ترک نہ کر سکے۔ حضرت امام محمد بن سعید بوصیری مصری رحمۃ اللہ علیہ اپنے مشہور قصیدہ بُردہ کو اس طرح شروع کرتے ہیں:

أَمِنْ تَذَكُّرِ جِيْرَانٍ بِذِي سَلَمٍ   مَزَجْتَ دَمْعاً جَرىٰ مِنْ مُقْلَةٍ بِدَمِ

یعنی   کیا اُن ہمسایوں کی یاد میں تری آنکھوں سے اشک ہائے خونیں رواں ہیں جو ذی سَلَم میں تھے

أَمْ هَبَّتِ الرِّيْحُ مِنْ تِلْقَاءِ كَاظِمَةٍ   اَوْ اَوْمَضَ الْبَرْقُ فِي الظُّلْمَاءِ مِنْ اِضَمِ

یا کاظمہ کی جانب سے ہوا آ رہی ہے یا کوہ اضم کی طرف سے برق چشمک زنی کر رہی ہے اِن اندھیروں میں: (اندھیری راتوں میں)

امام بوصیریؒ کے یہاں تشبیب کے ۱۲ اشعار ہیں۔ اس کے بعد اعتراف تقصیر و بیانِ نفس میں ۲۷ اشعار ہیں اس کے بعد نعت سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم میں سو۱۰۰ سے زیادہ اشعار ہیں۔

عہد جاہلیت کی شاعری کا جائزہ لیجئے آپ کو قُصی سے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تک عربی شاعری میں یہی اسالیب ملیں گے میں اس بحث کو طول دینا نہیں چاہتا آپ کے سامنے صرف چند شعرا کا کلام بطور نمونہ پیش کر دیا ہے جس سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا۔

ہاں مداح رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کا کلام جو نعت نبوی میں ہے وہ اِن تشابیب سے خالی ہے بطور مختصر یوں سمجھ لیجئے کہ عربی شاعری کا اسلوب خاص یہ ہے کہ اگر قصیدہ ہے تو وہ تشبیب سے خالی نہیں ہوگا اور اگر غیر مسلسل اشعار ہیں تو ان میں تشبیب نہیں ہوگی واضح رہے کہ عربی تشبیب ہی کو عجمیوں نے غزل قرار دے لیا تھا، عربی شاعری، غزل، مثنوی اور رباعی سے خالی ہے یہ سب عجم کی اختراع ہے جس کی اردو شاعری میں بھرپور تقلید کی گئی ہے۔

اسلام نے عربوں کی زبان کے اس اسلوب کو مکمل طور پر استعمال کیا اور اس کی نفسیاتی خصوصیات کو بھرپور طریقے پر پیش نظر رکھا جس کا بین ثبوت قرآن مجید کا اسلوب اس کی ترتیب کی نوعیت (نظم ترتیب) ہے جو ایک اعجاز ہے جس کا تفصیلی ذکر میں آئندہ کروں گا، ہاں یہ عرض کر دوں کہ قبل از اسلام یا عرب جاہلیت کے تفاخر کے اقانیم ثلاثہ میں تیر اندازی اور شہسواری کو ثانوی حیثیت حاصل تھی وہ اپنے نوک

ورثہ اور اس کے کمال کو تفاخر میں سب سے مقدم سمجھتے اور اسی کو اولیت حاصل تھی۔ چنانچہ عرب کے اس وسیع ریگ زار میں جہاں بدویت پرورش پاکر درجۂ کمال کو پہنچی تھی، کوئی قبیلہ ایسا نہ تھا جس میں شاعرانہ صلاحیت رکھنے والے اصحابِ کمال موجود نہ ہوں۔ شاعری ہی بدّویت کا کمال اور اس کا عظیم سرمایہ تھی اور شاعری سے محبت ہی ایک بدوی کا واحد ثقافتی سرمایہ تھا۔

قوم یا قبیلہ کا شاعر ایک عظیم ہستی سمجھی جاتی تھی جس کو قبیلے کی طرف سے متنوعہ فرائض تفویض کر دیئے جاتے تھے۔ میدانِ جنگ میں اس کی رَجز خوانی اس کے ہم قوموں کے لیے ایک مؤثر حربہ تھی جو اپنے رجز سے اُن کی شجاعت کے خوابیدہ جذبات کو بیدار کر دیتا تھا، زمانۂ امن میں اس کی شعلہ نوائی میں سے جنگ و جدال کی آگ بھڑک اٹھتی تھی اور امنِ عامہ کو وہ تہ و بالا کر دیتا تھا، ایک شاعر کی نظم، ایک آتش بیان مقرر کی طرح، قوم کے دلوں کو گرما دینے کے لیے کافی ہوتی تھی: اسی بنا پر شاعر کی خدمت میں بڑے بڑے عطیے پیش کیے جاتے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی شعلہ نوائی سے قوم محروم رہ جائے۔ بدّویت میں شاعر ہی رائے عامہ کو نئی راہوں پر ڈالتا تھا وہ اگر کبیدہ خاطر ہو جاتا تو اس کی ہجو اور مذمت کے ڈر سے اس کو زر و مال دے کر خوش کیا جاتا تھا اور ہجو گوئی سے باز رکھا جاتا تھا۔ ورنہ شاعر کی ایک ہجو، ایک قبیلہ کی اس عزت کو جو اس کی عمر بھر کی کمائی ہوتی تھی ذرا سی دیر میں خاک میں ملا دیتی تھی، قبیلہ یا قوم کا شاعر اس کا مؤرخ بھی ہوتا تھا چنانچہ شعراء جاہلیت کے بیشتر اشعار آج اس وقت تک فہم میں نہیں آ سکتے جب تک عہد جاہلیت یا ایامِ عرب کی تاریخ کے خد و خال آپ کے ذہن میں محفوظ نہ ہوں، آپ آج بھی شعرائے جاہلیت کے اشعار کو جمع کیجئے، غور و فکر کے بعد آپ اُن سے اُس عہد کی تاریخ مرتب کر سکتے ہیں۔

ابن اسحاقؒ اور ابنِ ہشامؒ کی تاریخوں میں "تاریخ قبلِ اسلام" ان ہی شعراء عرب کے اشعار سے مستنبط ہے اور شعراء جاہلیت کے اشعار ہی اُن کا مأخذ ہیں گویا جاہلیت کی شاعری ہی اُن کی تاریخ ہے۔ ایسی فصیح البیان قوم کی اصلاح کے لیے اللہ تعالیٰ نے جو کتاب ہدایت نازل فرمائی ظاہر ہے کہ اس خصوص میں اس کی رفعتیں اور بلندیاں کس منزل اور مرتبہ پر ہوں گی۔

فصاحت و بلاغت میں اس قوم کی زبان کی رفعتوں کا اندازہ اس سے کیجئے کہ شعرائے جاہلیت نے اپنے قصائد کو درِ کعبہ سے آویزاں کر کے حضریت میں پرورش پانے والوں کو للکارا تھا اور مدتوں تک وہ اپنی طلاقت زبان و بیان اور فصاحت کے دعوے کے جواب کا انتظار کرتے رہے، یہی نہیں کہ معلقاتِ سبع ہی کے باکمال شاعر، فصیح و بلیغ تھے یا عہدِ جاہلیت کے صرف یہی چند گنتی کے شاعر شعلہ زبان اور فصیح البیان تھے جی نہیں، قصیٰ سے لے کر ابو طالب تک حضریت و بدویت کے ماحول میں سینکڑوں شعراء تھے اپنی فصیح البیان زبانیں کھولیں اور سوق عکاظ (عکاز) اور دوسرے قومی اجتماعی مرکزوں میں انہوں نے دادِ فصاحت دی اور ان کا کلام محفوظ بھی ہے، یہ اور بات ہے کہ معلقاتِ سبع کی طرح اور دوسرے شعراء کو یہ جرأت نہیں ہو سکی، یہاں اِن صفحات میں اتنی گنجائش نہیں کہ میں قصیٰ سے لے کر ابو طالب تک جو نامور شعراء گزرے ہیں جیسے عباس بن مرداس، ابرص، خالد بن عبد العزیٰ، سبیعہ (شاعرہ) ذو رعین، ذو جدن حمیری، مطرود بن کعب خزاعی، ابن الذئبہ، عمرو بن قیس کنعانی، عکرمہ بن عامر، نفیل، مطرہ، ابن الزبعری، ابو قیس بن الاسلت، ابو طالب، طالب بن ابو طالب، اُمیہ بن ابی الصلت، ابن الزقیات، عدی بن زید الحیری اور ان کے علاوہ بہت سے شعرائے جاہلیت کا نمونۂ کلام پیش کر سکوں!

حضرت عبدالمطلب کے انتقال پر اُن کی صاحبزادیوں نے بہت ہی دردناک و حسرت آگیں مرثیے کہے ہیں یعنی حضرت صفیہ بنت عبدالمطلب، بُرّہ بنت عبدالمطلب، عاتکہ، ام حکیم البیضا بنت عبدالمطلب امیمہ، اور بنات عبدالمطلب شامل ہیں فرزندوں کا تو ذکر ہی کیا ان تمام شعرا و شاعرات کے دو دو اشعار بھی اگر پیش کروں تو ایک تذکرۃ الشعرا مرتب ہو جائے گا۔

ایسی قوم کی اصلاح کے لئے اللہ تعالیٰ نے جو رسولؐ مبعوث فرمایا، اس پر بارگاہِ احدیت سے ایسا کلام نازل ہوا جس نے ان زباندانوں اور فصیح البیان شعرا کو حیران و ششدر کر دیا اور اُس کلام کے مقابلہ میں اُن کی زبانیں گنگ و لال ہو گئیں۔ ولید بن مغیرہ قریش میں باعتبار علم و فضل اور بلحاظ فصاحت و بلاغت ایک مسلّمہ شخصیت تھی اس کو بھی کلامِ الٰہی کی فصاحت و بلاغت کے سامنے یہ کہنا پڑا۔ ع

"وَاللہ لَقد سمعت کلامًا ما ھو مِن کلام اِنس وَلا
کلام الجن وَانّ لہ لحلاوۃ وَانّ عَلیہ لطلاوۃ
وَانّ اعلاہ لمثمر وانّ اسفلہ لمغدق وانّہ
یعلو ولا یُعلیٰ علیہ۔"

اس اعتراف کے باوجود چونکہ وہ شقیِ ازل تھا، قبولِ اسلام کی سعادت سے محروم رہا، اس کے برعکس قبیلۂ ازدِ شنوہ کے رئیس ضمادؓ نے جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کلامِ الٰہی سُنا تو اس کی فصاحت و بلاغت کا اعتراف کرتے ہوئے دولت اسلام سے بہرہ ور ہوئے سربلندی و سرافرازی حاصل کی، ان کے ایمان لانے کا واقعہ اس طرح منقول ہے:

حضرت عباسؓ سے مروی ہے کہ ضماد نامی قبیلہ ازدِ شنوہ کا ایک فرد مکہ میں آیا وہ جھاڑ پھونک سے لوگوں کے مرضوں کا علاج کیا کرتا تھا۔ مکہ کے نادانوں اور جاہلوں اور دوسرے اوباشوں سے اُس نے سُنا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) معاذ اللہ دیوانے ہو گئے ہیں، ضماد نے کہا کہ میں اس شخص کو ضرور دیکھوں گا، شاید اللہ تعالیٰ میرے ہاتھ سے اُن کو شفا دے دے، پس اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی اور کہا کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میں تمہاری اس بیماری کا علاج کر دوں گا کیا آپ کو جنون ہو گیا ہے؟ یہ سن کر سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِنّ الحمدُ للہِ نحمدُہٗ ونستعینُہ مَن یّھدِہ اللہ فَلا مضِلّ لَہٗ وَمَن یُّضلِلہُ فلَا ھادِیَ لَہٗ وَاَشھَدُ ان لا اِلٰہ اِلّا اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ وَ اَشھَدُ انّ محمداً عبدہٗ ورسولہ، اَمّا بعد!!

یعنی: بیشک تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں ہم اس کی حمد بیان کرتے ہیں اور اسی سے مدد چاہتے ہیں، اللہ تعالیٰ جس کو ہدایت یاب فرما دے اس کو کوئی گمراہ نہیں کر سکتا اور جس کو وہ گمراہ کر دے اس کو کوئی ہدایت یاب نہیں بنا سکتا اور بے شک میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوائے کوئی

معبود نہیں ہے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ بے شک محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں اما بعد : پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چند آیات قرآن تلاوت فرمائیں (نا تمام)

ان آیات اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات گرامی کو سن کر ضماد نے اسی مجلس میں اسلام قبول کر لیا، ضماد نے اپنے قبول اسلام کے اس واقعہ کو خود بیان فرمایا ہے اور مسلم کی حدیث میں یہ تفصیل کے ساتھ موجود ہے :

جناب ضماد رضی اللہ عنہ تو کلام معجز نظام و بلاغت التیام سن کر مسلمان ہو گئے لیکن شقی ازل ولید بن مغیرہ با وصف اعتراف دولت ایمان حاصل نہ کر سکا!

اعجاز قرآن

قرآن پاک نے ان فصیحان عرب کو للکارا، قرآن مجید کی اس تحدی کے سامنے سوائے عجز نارسائی کے کسی میں تاب نہیں تھی کہ اپنی زبان کھول سکے معلقات سبع میں سے بعض شعرا بقید حیات تھے، زہیر کے فرزند کعب رضی اللہ عنہ جو اسلام لانے سے قبل مسلمانوں کی ہجو گوئی میں اپنی فصاحت زبان کو برباد کرتے رہتے تھے فتح مکہ کے بعد دولت اسلام سے سربلند ہوئے جب بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے تو نعت مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم میں اپنا مشہور قصیدہ "بانت سعاد" پڑھا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے انعام میں بُردِ یمانی حاصل کی ۔

عربی زبان میں اعجاز کا مادہ ہی قرآن حکیم کا اعجاز ہے اور یہی وہ اعجاز تھا جس کے باعث "عرب" قرآن پاک کی تحدی کے مقابلہ اور معارضہ میں اس کے سامنے نہ آ سکے بلکہ سر تسلیم خم کر دیا حالانکہ قرآن حکیم نے واضح طور پر ان کو للکارا تھا اور کہا تھا کہ "ایک سورۃ ہی قرآن کے مقابلہ میں بنا لاؤ"۔

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ (البقرہ ۲۴)

یعنی: "اگر تمہیں کچھ شک ہو اس میں جو ہم نے اپنے خاص بندے پر اتارا ہے تو اس جیسی ایک سورۃ تو لے آؤ اور اللہ کے سوا اپنے تمام حمائتیوں کو بلا لو اگر تم سچے ہو"۔

پھر خود ہی ان کو بتا دیا کہ نادانو! اگر تمام جن و انس بھی جمع ہو جائیں اور مشترکہ کوشش کریں تب بھی تم اس کا مثل پیش نہیں کر سکو گے :

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ○ (الاسرا)

ترجمہ: "تم فرما دو! اگر آدمی اور جن سب اس بات پر متفق ہو جائیں کہ اس قرآن کی مانند لے آئیں تو اس کا مثل نہ لا سکیں گے اگرچہ ان میں ایک دوسرے کا مددگار بھی ہو"۔

قرآن حکیم کے اس اسلوب اعجاز سے قبل عرب ہمیشہ ایک دوسرے کے مقابل میں فصاحت و بلاغت اور اعجاز کلام میں مسابقت اور

مقابلہ کیا کرتے تھے، ان کے یہاں فصاحت سے مراد سلاستِ کلام، معانی کا باہمی ارتباط، کلماتؑ حروف کا حسن نظم اور کلام کا فطرتِ انسانی کے موافق ہوتا تھا اور کلام کے آسانی سے ذہن نشین ہونے پر مبنی اور موقوف تھا!

چنانچہ اُن کی زبان پر صرف وہی الفاظ جاری ہوتے تھے جو معانیٔ مقصودہ کی افادت کے لئے موزوں ہوتے تھے اور جن سے وہ معانی ذہن نشین ہوسکتے تھے اور ان الفاظ کے علاوہ دوسرے الفاظ میں ان معانی کے اظہار کی صلاحیت موجود نہ ہو، مدت تک فصیحانِ عرب اسی اسلوب کو پیش کرتے رہے یہاں تک کہ قرآن مجید اپنے مخصوص اسلوب بیان میں نزول ہوا (جس قدر بھی آیات اور سورتوں کی صورت میں نزول ہوا تھا) قرآنِ حکیم نے اپنے برمحل الفاظ کلمات اور جملوں کے حسن و نظم ترکیب سے فصیحانِ عرب میں ہلچل برپا کردی اور پھر نتیجہ یہ نکلا کہ اُن کو اپنےؐ اسلوبِ فصاحتؐ سے دست بردار ہونا پڑا اور اپنے عجز کا اعتراف کرتے ہی بن پڑی! چنانچہ نزول قرآن کے بعد ان فصیح اللسان شعراٗ میں سے کسی کو یہ جرأت نہ ہوسکی کہ وہ معلقاتِ سبع کے شعراٗ کی طرف اپنے فصاحت و بلاغت کے مقابلہ میں کسی کو دعوت مقابلہ دیں۔

فصیحانِ عرب نے تصدیق کی کہ کلام کا یہ طرز جو قرآن لے کر آیا ہے ان کے اسلوب فصاحت سے بدرجہا بلند ہے اور آج تک اُن کے یہاں اس جنس کا کلام ان کے تصرف میں نہیں آیا اور زبان اس پر قادر نہیں ہوسکی، یہ اسلوبِ قرآن ہر اُس کمالِ معنوی کا سرمایہ دار ہے جو ذہن میں آسکتا ہے اور جہاں تک عقل کی رسائی ہوسکتی ہے، میں اس قول کی مزید وضاحت کے لئے علامہ مصطفیٰ رافعی مصری کی یہ توضیح پیش کروں گا، وہ "اعجاز القرآن" میں لکھتے ہیں کہ:

"ظاہر ہے کہ وہ اہلِ عرب خطابت و کلام میں باہم مقابلے بھی کیا کرتے تھے، شعرگوئی کے میدان میں بھی اُن کی مسابقت ہوتی تھی اور شعر پر اعراض و مقاصد کے اعتبار سے تنقید بھی کیا کرتے تھے اس وقت فصحائے عرب کے نزدیک کلام کے فن اور دوسرے فن کے درمیان فرق، معانی اغراض اور کلام میں وسعتِ تاثیر و تصرف کے علاوہ اور کچھ نہ تھا، کیوں کہ ان کا اسلوب کلام ایک ہی طرز اور ایک ہی قبیل سے ہوتا تھا جس میں یہ باتیں داخل نہیں یعنی گفتگو کا آزاد لہجہ، فصیحانہ خطاب، ترتیب و نظم، کلام میں سادگیٔ مضمون اور فکر پر پورا پورا زور، عبارت کی فصاحت اور ترکیب کی جزالت اور یہ احتیاط کہ ایک مبہم لفظ بھی درمیان میں نہ آنے پائے۔

وہ کسی خاص ترکیب کا اہتمام نہیں کرتے تھے اور نہ صنائع بدائع کی الجھنوں میں گرفتار ہوتے تھے اُن کے کلام میں آمد ہوتی تھی، آورد سے بچتے تھے اُن کی فطرت اور طبع سلیم اُن کے ادبی نظم و نثر کے شہ پاروں میں، اُن کی ممد و معاون ہوتی تھی اس لئے ان کی زبان پر بے تکلف الفاظ جاری ہو جاتے تھے، ان کے تخیل کی ہر حرکت کے ساتھ ایسے با معنی الفاظ اُن کی زبان پر آجاتے تھے جیسے یہ الفاظ اسی موقع اور محل کے لیے وضع ہوئے ہیں۔

لیکن جب ان کے سامنے اسلوبِ قرآن آیا تو انھوں نے اپنے الفاظ کو بعینہٖ اُسی اسلوب

میں مشتمل پایا جس کو وہ دن رات استعمال کیا کرتے تھے اور بالکل اسی انداز گفتگو اور طرز خطاب کے ساتھ پایا جس کے وہ عادی تھے اور اس سے مالوف و مانوس تھے جس میں کوئی پیچیدگی تصنع، تکلف اور اہتمام نہ تھا" (اعجاز القرآن)

علامہ رافعی کلام عرب کی ان خصوصیات کے بیان کے بعد ان خصوصیات کا قرآن حکیم کے اسلوب بیان اور اس کی خوبیوں سے تقابل کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں:

"لیکن جب ان کے سامنے اسلوب قرآن آیا تو نظم قرآن کے طرق، اس کے وجوہ ترکیب، اس کے کلمات میں حروف کی ترتیب اور پھر تمام قرآن میں ان سادہ جملوں کی بندش اور نشست ایسی تھی جس نے ان کو حیران کر دیا ان کے دلوں پر ہیبت بیٹھ گئی اور ایک پُر جلال خوف اُن پر مُسلط ہو گیا یہاں تک کہ عرب اپنی اس فطری قدرت زبان کو جسے وہ بہت قوی سمجھتے تھے ضعیف سمجھنے پر مجبور ہو گئے اور کلام و خطابت کے اس ملکہ کو جسے وہ بہت مستحکم سمجھتے تھے قرآنی بلاغت کے سامنے بہت پست خیال کرنے پر مجبور ہو گئے۔

قوم عرب کے بلیغوں کو یہ اعتراف کرنا پڑا کہ "اسلوب قرآنی بیان" کلام کی وہ جنس ہے جس تک نہ اُن کی پرواز ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔" (اعجاز القرآن)

قاضی ابی الفضل عیاض بن موسیٰ اندلسی "الشفا" نے بھی اپنی کتاب "الشفا" بتعریف حقوق المصطفیٰ" صلی اللہ علیہ وسلم میں وجوہ اعجاز القرآنی پر بڑی مدلل اور مبرہن انداز سے بحث کی ہے، انہوں نے "وجوہ اعجاز قرآنی" کے تحت عجیب عجیب نادر نکات پیدا کئے ہیں، اس سلسلہ میں "الوجہ الثانی کے تحت رقمطراز ہیں:۔

الوجہ الثانی، من اعجازہ صورۃ نظمہ العجیب والاسلوب الغریب المخالف الاسالیب کلام العرب ومناہج نظمہا ونثرہا الذی جاء علیہ ووقعت مقاطع آیاتہ وانتہت فواصل کلماتہ الیہ ولم یوجد قبلہ ولا بعدہ نظیرلہ ولا استطاع احد مماثلۃ شیء منہ بل حارت فیہ عقولہم وتدلہت دونہ احلامہم ولم یہتدوا الی مثلہ فی جنس کلامہم من نثر ونظم او سجع او شعر۔ (الشفا صفحہ ۱۷۱)

یعنی: قرآن کریم کے اعجاز کی دوسری وجہ اس کے نظم کی عجیب صورت (ترکیب و ترتیب کلام) اور اس کا انوکھا اسلوب بیان ہے جو کلام عرب کے مروجہ اسالیب سے مختلف ہے اور ان کی نظم و نثر کی ڈگر اور روش کے مخالف ہے۔ قرآن پاک کی آیات کا اختتام اور ہر آیت کے اختتام

پر جو وقفہ ہے اور اس کے کلمات میں جو "فواصل" ہیں اس کی نظیر نہ اس سے پہلے پائی گئی اور نہ اس کے بعد اور نہ کوئی اس جیسا کلام لانے پر قادر ہو سکا بلکہ اس کے اعجاز نے عقلوں کو مبہوت کر دیا اور ان کی عقلیں اس کو دیکھ کر حیران و ششدر رہ گئیں اس لیے کہ ان کی نظم و نثر میں، سجع اور شعر میں اس کے مثل کوئی چیز موجود نہیں ہے "۔

اعجاز قرآن اور اس کی فصاحت و بلاغت اُدبی اور مذہبی اعتبار سے مدتوں تک ماہرین ادبیات عربی اور علمائے متبحرین کا مور د تحقیق بنی رہی اور اُن کی توجہ اس نکتہ پر مرکوز رہی کہ علم معانی و بیان و بدیع (جن کے مجموعہ کو علم بلاغت کہتے ہیں) کی کون کون سی خصوصیات کا قرآن پاک حامل ہے اور اس کی اثر آفرینی میں بلاغت کے کون سے عوامل کار فرما ہیں۔ پھر ہماری بدبختی کہ جس طرح "خلق قرآن" کے مسئلہ نے اعتقادیات کی پُر سکون دنیا میں ایک تلاطم اور ہلچل برپا کر دی تھی اسی طرح تیسری صدی ہجری کے اوائل میں کج بحثوں اور گم کردہ راہوں نے یہ بحث چھیڑ دی کہ "اعجاز قرآن" بجائے خود ایسی چیز نہیں کہ اس کا جواب ناممکن ہو بلکہ اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں سے معارضہ اور جواب قرآن کی استعداد سلب کر لی تھی اور بس! اس لئے قرآن کی تحدی کے باوصف اس کا جواب پیش نہیں ہو سکا کہ لوگوں کی یہ استعداد قدرت کی طرف سے سلب کی جا چکی تھی۔

اس زعم باطل کے علمبردار بھی "مسئلہ خلق قرآن" کی طرح معتزلہ ہی تھے۔ اس لئے ارباب فضل و کمال نے شدت سے یہ ضرورت محسوس کی کہ اعجاز قرآن کو اُس کے تمام پہلوؤں کے ساتھ پیش کیا جائے اور دلائل و براہین سے ثابت کیا جائے کہ نظم قرآن اور اس کا اسلوب خود ایک معجزہ ہے اور ایسا معجزہ جس کا جواب نہیں ہو سکتا۔

چنانچہ اس موضوع پر مبسوط کتابیں لکھی گئیں جس میں معتزلہ کے اس قول کا اس طرح رد کیا گیا کہ پھر اُن کو اس سلسلہ میں منہ کھولنے کی جرأت نہ ہو سکی، ان تصنیفات کی میں یہاں تفصیلات پیش نہیں کروں گا کہ میرے موضوع سے اس کا تعلق نہیں ہے مختصراً یہ عرض کر دوں کہ محدث جلیل علامہ جاحظ نے سب سے پہلے اس سلسلہ میں قلم اٹھایا اور تیسری صدی ہجری میں اس موضوع پر گرانقدر تصنیف "نظم القرآن" کے نام سے پیش کی، اس صدی کے اواخر میں علامہ ابو عبداللہ محمد بن یزید الواسطی نے کتاب "اعجاز القرآن" تصنیف کی۔ علامہ واسطیؒ کی کتاب اعجاز القرآن کی شرح علامہ عبدالقاہر جرجانی نے "دلائل الاعجاز" کے نام سے لکھی اس کتاب نے بہت شہرت اور قبولیت حاصل کی۔

پانچویں صدی ہجری میں امام قاضی ابو بکر باقلانیؒ نے "اعجاز القرآن" کے نام سے ایک مبسوط اور بلند پایہ کتاب اس موضوع پر تصنیف کی چھٹی صدی ہجری میں امام فخر الدین رازیؒ نے اعجاز قرآن پر اس نام سے ایک کتاب تصنیف کی۔ چھٹی صدی ہجری ہی میں قاضی عیاضؒ مالکی اندلسی نے اپنی کتاب "الشفا" میں ضمناً اگرچہ اس موضوع پر قلم اُٹھایا ہے لیکن جو کچھ لکھا ہے وہ بڑے مدلل پیرایہ میں لکھا ہے، ان کے بعد اس موضوع پر قلم اٹھانے والے علامہ زملکانیؒ ہیں جن کا تعلق آٹھویں صدی ہجری سے ہے۔

نویں صدی ہجری میں محدث و فقیہ و مورخ اعظم علامہ سیوطیؒ نے بہت ہی مبسوط اور مدلل کتاب علوم القرآن پر "الاتقان" کے نام سے تصنیف فرمائی، علوم القرآن پر اب تک اس سے بہتر کتاب تصنیف نہیں ہوئی، علامہ سیوطیؒ نے الاتقان کی نوع شصت چہارم کے تحت اعجاز القرآن پر زبردست دلائل کے ساتھ قلم اٹھایا ہے اور اس سلسلہ میں علامہ سیوطیؒ نے عجیب عجیب نکات پیدا کئے ہیں۔ چند دوسرے

صدی ہجری میں مصری عالم علامہ مصطفیٰ رافعی نے اعجاز القرآن تصنیف کی اور قرآن کے اعجاز پر انہوں نے بہت ہی دیدہ وری اور شواہد کے ساتھ لکھا ہے :-

کلامِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فصاحت و بلاغت

حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کی فصاحت و بلاغت پر کچھ لکھنے سے پہلے یہ ضروری تھا کہ قرآنِ حکیم کی فصاحت و بلاغت اور اس کے اعجاز پر کچھ لکھا جائے خواہ وہ مختصر ہی کیوں نہ ہو۔ اعجاز قرآن کے سلسلہ میں یہ جو کچھ میں نے پیش کیا سمندر کی ایک بوند اور برق تاباں کی ایک چشمک سے زیادہ نہیں ہے، اس موضوع پر متعدد کتب علمائے متقدمین نے مرتب فرمائی ہیں لیکن " حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا" ان حضرات نے واضح طور پر یہ اعتراف و اقرار کیا ہے کہ ہم اعجاز قرآن کے حقائق تک نہیں پہنچ سکے اور ہماری عقلوں کی رسائی وہاں تک نہیں ہے " جب ضخیم کتب کے مؤلفین اور مصنفین کا یہ حال ہے تو یہ چند صفحات اس سلسلہ میں کیا سرمایہ فراہم کر سکتے اور ان سے اعجاز قرآن کی کیا رونمائی ہو سکتی ہے یہ تو اس سلسلہ کی ایک تمہید ہے کہ :

"رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کی فصاحت و بلاغت"

کس منزل پر تھی اور چونکہ قارئین کے سامنے اس موضوع کے تحت مجھے چند حقائق پیش کرنا ہیں۔ اس لئے یہ ابتدائیہ یا تمہیدی سطور بہت ضروری تھیں کہ یہی وہ آئینہ ہے جو سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام بلاغت نظام کے خد و خال کی رونمائی کر سکے گا۔

قرآنِ حکیم جو نظامِ حیات کے لئے ایک مکمل دستور العمل اور اسلام کے تشریعی احکام کا منبع و مآخذ ہے اس کی حیثیت ایک کلیات قانون کی ہے اور سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کو اس پر مامور کیا گیا تھا کہ وہ ان کلیات کی توضیح و تشریح فرمائیں چنانچہ قرآن حکیم میں ارشاد ہوا۔

وَ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الذِّکۡرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیۡھِمۡ

"اور ہم نے آپ پر ذکر (قرآن) نازل کیا تاکہ آپ لوگوں پر جو کچھ نازل کیا گیا ہے اس کی توضیح و تشریح فرمائیں"۔

اور اس بیان و وضاحت کے ساتھ ساتھ اُن کلیات سے مسائلِ خبر کی و احکام شرعی اخذ کر کے لوگوں کے لئے ہدایت و رہنمائی کا سرمایہ فراہم کریں، یہی وہ بیان ہے جو ارشاداتِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت میں ہم کو عطا ہوا اور ہمارے لئے دارین کی نجات کا سرمایہ بنا، اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ جو کچھ باری تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا وہ اپنے صوری اعتبار سے فصاحت و بلاغت کا کامل ترین مجموعہ ہے اور اپنے اسلوب بیان اور نہج کے لحاظ سے اس بلندی پر ہے کہ فہم انسانی اور اس کا نطق اس کا مثیل پیدا کرنے پر قادر نہ ہو سکا جب "مُبیّن" کی یہ شان ہے تو لازم ہے کہ اس کا بیان بھی اسی شان کا ہو، اگر بیان اس نہج اور اس اسلوب کی خصوصیات سے مالا مال نہیں ہے تو پھر کون کہہ سکتا ہے کہ وہ بیان " مبیّن" کے معیار پر پورا اُترتا ہے اسی لئے اس بیانِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں اس مبیّنُ (قرآن) کی تمام تر خصوصیات موجود تھیں۔ حضور سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس ارشادِ گرامی میں اسی طرف اشارہ فرمایا ہے :

اَلَا اِنِّیۡ اُوۡتِیۡتُ الۡقُرۡاٰنَ وَ مِثۡلَہٗ مَعَہٗ (ابوداؤد)

ترجمہ : آگاہ ہو کہ مجھے قرآن کے ساتھ اس کا مثل بھی دیا گیا ہے ۔

یہ "مثل" وہی بیان ہے یعنی کُلّیاتِ قرآن کی توضیح و تشریح لسانِ نبوت (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے، اس کے بارے میں بارگاہِ ایزدی سے یہ تاکید بھی نازل ہوگئی کہ :

مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ (الحشر آیت ۷)

ترجمہ : اور رسولؐ جو کچھ تم کو دیا کریں وہ لے لیا کرو اور جس چیز سے تم کو روک دیں اس سے تم رک جایا کرو !"

اور یہ بیان صرف ایک نہج کا نہیں ہے بلکہ اپنے محل و مخاطب کے اعتبار سے مختلف الانواع ہے، جس طرح آیاتِ قرآن اپنے محل اور مخاطب کے اعتبار سے مختلف الموضوع اور متباین الالفاظ ہیں، اصطلاحِ شرع میں اسی بیان کا نام "حدیث مبارکہ" ہے، میں یہاں حدیث کے سلسلہ میں وضاحت میں نہیں جاؤں گا صرف مختصراً یہ عرض کروں گا کہ حضور اکرمؐ کے اس بیان سے جس کو حدیث کہا جاتا ہے ان آیات کی وضاحت اور تشریح ہوتی ہے جن کو عقلِ بشری اپنی نارسائی کے اعتبار سے مبہم خیال کرتی ہے یہ بیان اُن [باتوں] کے لیے ایضاح ہے، اجمالات کے لیے توضیح ہے اور مشکلاتِ قرآنی کے لیے تفسیر ہے (جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ تفاسیر قرآنی کا منبع احادیث رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں،) اس طرح بیان کی متعدد انواع ہیں اور ان تمام انواع کا اطلاق حدیث نبوی [صلی] اللہ علیہ وسلم پر ہوتا ہے ۔

اصحابِ تحقیق و تدقیق نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ قرآنِ حکیم مختلف قبائل کے لغات کا حامل ہے اور ان مختلف قبائل کی زبان باوصف [اختلاف] لغات صرف عربی تھی ۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم "کافۃ للناس" کی ہدایت کے لیے مبعوث ہوئے تھے اس لئے ضروری تھا کہ قرآن میں ان تمام قبائل کے لغات ہوں اور جیسا کہ میں آئندہ تصریح کروں گا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان تمام قبائل کے لغات اور ان کے اسالیبِ بیان سے واقف تھے اور یہ وقوف و آگہی وہبی اور توفیقی تھی کسبی نہ تھی ۔

علامہ سیوطیؒ اپنی معتبر اور مشہور تصنیف "الاتقان" کی نوع سی و ہفتم میں علامہ ابوبکر واسطی کی کتاب "الارشاد فی القرات العشر" کے حوالہ سے تحریر کرتے ہیں کہ قرآن حکیم میں مندرجہ ذیل چالیس لغات ہیں انہی چالیس قبائل کی زبان کے لغات)

قریش ، ہذیل ، کنانہ ، خثعم ، خزرج ، اشعر ، نمیر ، قیس غیلان ،
جرہم ، ازدشنوہ ، کندہ ، تمیم ، حمیر ، مدین ، لخم ، سعد العشیرہ ،
حضرموت ، سدوس ، عمالقہ ، انمار ، غسان ۔ خزاعہ غطفان ،
مذحج ۔ اوس طے ، ثعلب ، عامر بن صعصعہ ، سبا ، عمان ۔ بنو حنفیہ ،
مزینہ ۔ جذام ۔ ہوازن ۔ عذرہ ۔ یمامہ اور تمر کی لغتیں ، ہیں
اغلب حصہ لغت قریش پر مشتمل ہے ۔

ان متعدد قبائل کے مرورِ زمانہ کے ساتھ بہت سے مخصوص لغات ، لغاتِ قریش میں ضم ہوگئے اور بعض علی حالہ باقی ہیں ۔

اس سلسلہ میں کچھ اختلاف رائے بھی موجود ہے ، میں یہاں ان اختلافی آرا کو پیش نہیں کروں گا لیکن تمام محققین نے اس بات

پر اتفاق کیا ہے کہ قرآن مجید مختلف اقوام (قبائل) عرب کے لغات پر نازل ہوا ہے، اختلاف بس اُن کی تعداد میں ہے۔

سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم جب کلیاتِ قرآن کی وضاحت فرماتے تو قرآن حکیم کی تمام بیانی خصوصیات جزالت، فصاحت، الفاظ و کلمات کی تالیف و ترکیب پر وہ بیان مشتمل ہوتا تھا اور حضور سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کو ان مختلف قبائل کے لغات، روزمرہ، محاورات اور اسالیبِ بیان سے اللہ تعالیٰ نے بہرہ ور فرما دیا تھا اور ان اسالیبِ مختلفہ میں آپ کو کمال کے درجے پر فائز کیا گیا تھا چنانچہ جو مختلف قبائل کشکل وفود آپ کی بارگاہ میں باریاب ہوتے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان سے ان ہی کے اسلوب بیان، روزمرہ اور لغات میں کلام فرماتے!

جس طرح قرآن حکیم کا نظم اور اسلوب قبائل عرب کی لسانی اور اس کی روح کے عین مطابق تھا اور مرتبہ میں اس سے کہیں افزوں اور برتر، تاثیر اور دلنشینی میں اس قدر بلند جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا اسی طرح سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کو بھی اللہ تعالیٰ نے یہ تمام خصائص ودیعت فرما دیتے تھے جس طرح کلام الٰہی میں معانی بیان کے تمام نکات اور اوصاف، علم بدیع کے تمام لوازم اس میں موجود تھے۔ اسی طرح اس کے بیان (کلام رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم) میں یہ خصوصیتیں موجود تھیں اور آج بھی وہ اسی طرح محفوظ و منضبط ہیں جس طرح منکرین وحی الٰہی یا اس کو سحر و شعر سے تعبیر کرنے والوں کو اس میں کبھی کوئی مقام باوصف سعیٔ بسیار نہ مل سکا جس کے ذریعے وہ قرآن حکیم پر باعتبار زبان و بیان حرف گیری کر سکتے اسی طرح ان فصیحان عرب کو کبھی یہ جرأت نہ ہو سکی کہ وہ کلام رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض یا کبھی انگلی رکھ سکیں۔ یہ صیانت و حفاظت اللہ تعالیٰ کی طرف سے امر توفیقی اور توقیفی تھا۔

حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کو جو مہبط وحی تھے۔ جن پر وہ قرآن نازل ہوا تھا جو قریش اور دوسرے قبائل عرب کے لغات کا حامل اور سرمایہ دار تھا، اللہ تعالیٰ نے وحی الٰہی کے ذریعہ لغات مختلفہ کے مواقع استعمال اور ان کے محل سے بھی آگاہ فرما دیا تھا جو آپ کا ایک عظیم معجزہ تھا اور جس کے سامنے فصیحانِ عرب سرِ عجز خم کئے ہوئے تھے (دیکھئے "تاریخ آداب العرب")

ظاہر ہے کہ ایسا کلام اور زبان پر ایسی دسترس اور قدرت، مختلف قبائل کے روزمرہ اور ان کے محاورات اور روزمرہ پر ایسا عبور اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جبکہ ایک زباندان اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ ہر قبیلے کے مخصوص انداز بیان اور زبان سے واقفیت کے لئے اُن کے ماحول اور معاشرت میں صرف کرے اور اس حقیقت سے کس کو انکار کی جرأت ہو سکتی ہے کہ سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کو حصول زبان و اسلوب بیان کے لئے نہ یہ کوشش کرنا پڑی اور نہ آپ کو اس کی ضرورت تھی، اللہ تعالیٰ نے ان مختلف قبائل کی زبانوں اور نہ صرف زبانوں بلکہ ان کے مختلف لب و لہجوں پر ایسی قدرت عطا فرما دی تھی کہ یہ وصف منجملہ خصائص نبوت آپ کی ایک خصوصیت بن گیا تھا اور عرب کی سرزمین میں وصف نبوت کی طرح اس وصف میں بھی کوئی آپ کا ثانی اور مثیل نہیں تھا:

حضرت رافعی فرماتے ہیں۔

"نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام ایسا ہوتا تھا کہ اس میں الفاظ کم ہوتے مگر معانی کی ایک دنیا لئے ہوئے ہوتے تھے۔ بناوٹ سے خالی اور تکلف سے آپ کا کلام پاک تھا:۔
جب بھی آپ کی زبان وحی ترجمان گویا ہوتی تو اس سے حکمت کے جواہر نکلتے اور آپ جب کلام فرماتے

تو تائید الٰہی اور توفیق ربانی سے وہ کلام ہر طرح کی خطا اور لغزش سے پاک ہوتا، دلکشی دلنشینی اور دل پذیری کا یہ عالم ہوتا کہ اس کی مٹھاس سے دشمنوں کے دل موہ لیتے تھے، جس طرح آپ کی ہیبت دلوں پر لرزہ طاری کر دیتی تھی اسی طرح آپ کی محبت، شفقت اور کلام کی اثر آفرینی سے دل آپ کے والہ و شیفتہ بن جاتے تھے۔"

(اعجاز القرآن از علامہ رافعی)

مختلف قبائل کی زبان پر قدرت کاملہ کا یہ عالم کہ بسا اوقات ایسا ہوا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک ایسی جماعت جن کا اکثر وقت شرف خدمت کی سعادت اندوزی میں بسر ہوتا تھا اور آپ کے کلام وحی ترجمان سے فردوس گوش کا لطف اٹھاتے حاضر خدمت ہوتے اسی اثنا میں کوئی وفد باریاب خدمت ہوتا تو آپ اسی وفد کی زبان اور اسی قبیلہ کے اسلوب بیان میں کلام فرماتے گویا ان ہی کے لب و لہجہ میں آپ گفتگو ہوتی، بعض اصحاب کسی مناسب موقع پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کرتے کہ "یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) فلاں موقع پر فلاں رئیس وفد یا ارکان وفد سے جو کلام آپ نے فرمایا اس میں بعض کلمات ایسے تھے کہ اس سے قبل ہم نے کبھی نہیں سنے" اور نہ عرب کے کسی کلام سابق میں وہ پائے جاتے ہیں تو آپ بطور تحدیث نعمت فرماتے "انا افصح العرب":

ایک بار جناب ابو تمیمہ الہجیمی حاضر خدمت ہوئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو جو نصائح فرمائیں اُن میں ایک جملہ یہ بھی ارشاد فرمایا "اِیَّاکَ وَالْمَخِیلَۃَ" انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! "مخیلہ" کیا ہے؟ ہم قوم عرب سے ہیں لیکن ہم یہ لفظ نہیں سمجھ سکے! تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ "مخیلہ ازار کا زمین پر گھسٹنا ہے" یعنی ازار کا اس قدر نیچا ہونا کہ وہ زمین پر گھسٹتا جائے کہ یہ تکبر کی علامت ہے، اس کے بعد یہ لفظ "مخیلہ" تکبر کے معنی میں استعمال ہونے لگا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو متعدد بار استعمال فرمایا!

حضرت ابو جری جابر بن سلیم رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث مروی ہے جس میں انہوں نے اپنے قبول اسلام کے موقع پر حضور والا کے چند نصائح کو بیان فرمایا ہے، اس حدیث میں سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح "مخیلہ" استعمال فرمایا ہے۔

"وارفع ازارکَ واسبال الازار فانّھا مِنَ المَخِیلَۃِ اِنّ اللہ لایحبّ المَخِیلَۃَ"

(ترمذی، ابو داؤد)

اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد الفاظ، مرکبات اور جملے ایسے استعمال فرمائے ہیں جن سے عام طور پر عربوں کے کان نا آشنا تھے، ایسے کلمات اور جملوں کا استعمال "بیان" کی ان خوبیوں میں سے ہے جن کی بلاغت میں نظیر نہیں ملتی!!

سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار حضرت علی رضی اللہ عنہ کے روبرو "مات حتف انفہ" ارشاد فرمایا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یا رسول اللہ! میں نے یہ ایسا جملہ سنا ہے کہ اس سے قبل کسی عرب کی زبان سے نہیں سنا۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ جب میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے معنی دریافت کئے تو معلوم ہوا کہ اس کے معنی ہیں کہ "وہ اپنی ناک کی موت مر گیا" جس طرح اردو میں ناک رگڑ رگڑ کر مرجانا مستعمل ہے، اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد یہ تھی کہ ایک مسلمان کو شہید کی موت مرنا پسند کرنا چاہیے نہ یہ کہ وہ بستر پر پڑے پڑے دم دے دے۔"

غزدہ اوطاس میں جب مسلمانوں نے کافروں پر پلٹ کر حملہ کیا اور اُن کے کشتوں کے پشتے لگنے لگے اس وقت حضور علیہ التحیۃ والثنا نے ارشاد کیا "الآن حمی الوطیس" تنور اب گرم ہو گیا یعنی اب گھمسان کا رن پڑا ہے غرض کہ عربوں کی لغت دانی، الفاظ کی تراش خراش یعنی اشتقاق کی صناعیاں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حسین و دلکش لغات اور مشتقات کی جامعیت سے بھرپور کلمات کے سامنے بالکل ماند پڑ گئی تھیں: اس قبیل کے نادر اور حسین کلمات آپ کے کلام میں بکثرت موجود ہیں اور ان ہتم بالشان الفاظ، کلمات اور جملوں سے سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا دامن مقدس مملو اور معمور ہے۔

اسی غزوہ اوطاس کا واقعہ ہے کہ جب تنگ وادی سے گزرنے والے مسلمانوں پر کافروں نے تیروں کی بوچھار شروع کر دی اور مجاہدین اضطراب اور انتشار کا شکار ہو گئے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک رجزیہ جملہ ارشاد فرما کر میدان جنگ کا نقشہ ہی بدل دیا، اس پریشانی اور اضطراب میں گرفتار مسلمانوں سے آپ نے فرمایا۔

"انا النبی لاکذب، انا ابن عبد المطلب"

میں نے سیرت کی بعض معتبر کتابوں میں بھی اس رجزیہ جملے کو بصورت شعر لکھا دیکھا ہے اس موقع پر میں یہ وضاحت کر دوں کہ یہ شعر نہیں ہے بلکہ ایک باوزن وا مسجع اور مقفیٰ کلمہ ہے، جن حضرات کا یہ خیال ہے کہ یہ شعر ہے ان کی خدمت میں معروض ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب لبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو شعر گوئی سے باز رکھا تھا۔

"وما علمناہ الشعر وما ینبغی لہ

"اور ہم نے آپ کو شعر گوئی نہیں سکھائی کہ وہ ان کے شایان شان نہیں !!

اس جملہ پر شعر کا اطلاق نہیں ہو سکتا کہ جملہ کا پہلا ٹکڑا "انا النبی لاکذب" کی وتد اور سبب کے اعتبار سے ترکیب و ترتیب یوں ہوتی ہے: وتد + وتد + سبب + وتد اور دوسرا ٹکڑا سبب اور وتد سے اس طرح مرتب ہے۔ وتد + سبب + سبب + سبب + وتد، چونکہ وتد اور سبب کی عروضی پابندی اس میں نہیں ہے اس لئے اس کو شعر نہیں کہا جا سکتا، پس "انا النبی لاکذب" ایک رجزیہ جملہ تھا جس کی ہیبت اور سطوت نے کافروں کے دلوں کو دہلا دیا اور مسلمانوں کے دلوں میں تازہ جوش اور ایمانی حرارت پیدا کر دی اور "اوطاس" کی جنگ فتح پر منتج ہوئی۔

ایک اور موقع پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بعثت کے سلسلہ میں خطاب فرما رہے تھے اثنائے کلام میں آپ نے فرمایا:

و بعثت فی نفس الساعۃ

"میں آخری زمانے میں مبعوث ہوا ہوں"

اس جملہ کی بلاغت کی کیا تعریف کی جائے یہ ایسی خصوصی تراکیب ہیں جو حضور سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے بہ توفیق الٰہی ابداع فرمائی تھیں اور آپ اُن کو بطور مجاز استعمال فرماتے تھے ہر چند کہ فصحائے عرب "مجاز" کے استعمال میں ید طولیٰ رکھتے تھے اور ان کو اس خصوصیت پر بڑا ناز تھا۔ لیکن پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ان مجازی تراکیب کے سامنے وہ شرمندہ و سرنگندہ تھے، حضور کے ارشادات مقدسہ میں اس قبیل کے جملے بکثرت ہیں یہاں میں چند ایسے ارشادات پیش کر رہا ہوں جو اپنے مجازی معنوں میں استعمال ہوئے ہیں۔

ھدنۃ علی دخن	صلح دھوئیں پر ہے
کل ارض سمانھا	ہر زمین اس کے تنومندوں کے ساتھ ہے۔
یا خیل اللہ ارکبی	اے اللہ کے سوارو! سوار ہو جاؤ!

لا ینتطح فیہا عنزان — اس میں دو ہم شاخ بکریاں نہیں ہو سکتی ہیں۔

رویدک رفقاً بالقواریر — ان آبگینوں کے ساتھ رفق و آرام سے کام لو (چلو)

ایک سفر میں خواتین محترم بھی ہودجوں میں سوار تھیں، انجشہؓ نے اپنی حُدی سے اونٹ کو جب گرم رفتار بنایا تو ان خواتین گرامی قدر میں اضطراب پیدا ہوا اور پریشان ہونے لگیں تو اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حدی خوان انجشہؓ سے فرمایا:

رویدک رفقاً بالقواریر! قواریر میں جو بلیغ کنایہ ہے اس کی تعریف سے زبان قاصر ہے۔

محدث عظیم ابی عبد اللہ حاکم نیشاپوریؒ نے اپنی مشہور تحقیقی کتاب "معرفۃ علوم الحدیث" میں اس موضوع پر نوع بست ودوم میں قائم کی ہے اور اس کے تحت ایسی احادیث کو جمع کیا ہے جن میں "غریب الفاظ" استعمال ہوئے ہیں اور ان کے استعمال میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی انفرادیت کی حامل ہے! علامہ حاکم نیشاپوری کے بعد بھی دوسرے محدثین کرام نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔

فصاحت و بلاغت کی یہ خوبیاں آپ کے ان بیمثال جزالت و سلاست سے آراستہ چھوٹے چھوٹے جملوں ہی تک موقوف نہیں ہیں بلکہ مبسوط اور طویل ارشادات میں بھی یہ تمام خوبیاں موجود ہیں اور نظم الفاظ اور حسن ترکیب ان خوبیوں پر مستزاد اور وہ ایسی خوبیاں ہیں جن کی نظیر کسی بشر کے کلام میں موجود نہیں ہے اور نہ کوئی کلام حادث اس کا حریف و مثیل ہو سکتا ہے۔ میں یہاں آپ کے ان مبسوط و مفصل ارشادات کو پیش کر کے ان کی جزالت، فصاحت اور بلاغت کو پیش کروں تو مجھے یہاں متعدد مفصل احادیث پیش کرنا ہوں گی جن کے لئے اس مضمون کی تنگ دامانی، محرومی کا باعث ہے۔ قارئین صحاح، مسانید اور معاجم میں ایسی احادیث شریفہ کے مطالعہ سے سعادت اندوز ہو سکتے ہیں!

کلام کی فصاحت و بلاغت کے اظہار کے لئے ضروری ہے کہ کلام پیش کر کے اس کے الفاظ اور جملوں سے جزالت سلاست اور فصاحت کا استدلال کیا جائے۔ اس کے بغیر اس ذمہ سے عہدہ برآ ہونا مشکل ہے اس لئے سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے چند ارشادات گرامی کو پیش کرنا ضروری ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

من ھم بحسنۃ ولم یعملھا کتبت لہ حسنۃ فان یعملھا کتبت لہ عشرا ومن ھم بسیئۃ ولم یعملھا لم یکتب علیہ فان عملھا کتبت علیہ سیئۃ واحدۃ ولا یھلک علی اللہ الا ھالک۔

جس نے ایک نیکی کا ارادہ کیا اور اس کو عمل جامہ نہ پہنا سکا تو اس کے لئے ایک نیکی لکھ دی جاتی ہے اور اگر اس نے وہ نیک عمل کیا تو اس کے لیے دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں اور اگر کسی نے بدی کا ارادہ کیا اور اس بدی پر عمل پیرا نہ ہوا تو اس کے لیے کچھ نہیں لکھا جاتا اور اگر اس بدی پر عمل کیا تو اس کے لیے ایک گناہ لکھا جاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے حضور سوائے تباہ کار کے اور کوئی تباہ نہیں ہوتا۔

اس حدیث مبارکہ میں "لا یھلک علی اللہ الا ھالک" عجیب و غریب لطافت اور فصاحت کا حامل ہے! حضور اکرم صلی اللہ

علیہ وسلم کی یہ فصاحت و بلاغت آپؐ کے ہر گونہ کلام میں موجود ہے، آئندہ اوراق میں اس کی مثالیں آپ کے مطالعہ سے گزریں گی!

قاضی عیاضؒ بن موسیٰ اندلسی "الشفا" میں سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی فصاحت زبان اور بلاغت کلام کے سلسلہ میں فرماتے ہیں:

"وقد كان صلى الله عليه وسلم من ذلك بالمحلّ الافضل وَالموضع الّذى لا يُجهل ملاحة الطبع وبراعة منزع وايجاز مقطعٍ ونصاعة لفظٍ وجزالة قولٍ وصحة معانٍ وقلّة تكلفٍ اُوتي جوامعَ الكَلِم وَخُصّ ببدائعِ الحِكَمِ وعلمِ ألسنة العرب فكان يخاطب كلَّ اُمّةٍ بلسانها ويحاورها بلغتها ويباريها في منزعِ بلاغتِها حتّى كان كثيرٌ من اصحابه يسألونه في غير موطنٍ عن شرح كلامه وتفسير قوله من تأمّل حديثه وسِيَرَهُ علِمَ ذلك وتحقّقَهُ وليس كلامهُ مَعَ قريشٍ وَالانصار وَاهل الحجاز ونجدٍ ككلامه مع ذي المشعار الهمداني وطهفة النهدي وقطنِ بن حارثة العُلَيمي وَالاشعث بن قيسٍ و وائل بن حُجرٍ الكندي وغيرهم من أقيال حضرموت وملوكَ اليمنِ:"

كتاب الشفاءَ

قاضی عیاضؒ ج ۱ ص ۴۴

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فصاحت زبان اور بلاغت کلام میں ایسے بلند و رفیع مقام پہ ایسے مرتبہ پر فائز تھے جہاں سلاست طبع، فصاحت کاملہ، ایجاز، موزوں الفاظ کا انتخاب، جزالت کلام، صحت معانی اور قلت تکلف، کوئی پوشیدہ بات نہیں ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کم الفاظ اور وسیع معانی کا وصف عطا کیا گیا تھا اور نادر حکمتوں کے ساتھ آپ مخصوص کئے گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو عرب کی تمام (مختلف) زبانیں سکھا دی تھیں۔ پس آپ ہر قوم سے اس کی ہی زبان میں خطاب فرماتے تھے اسی قوم (قبیلہ) کے محاورے اور اسی کے روزمرہ میں سے لغت استعمال فرماتے تھے اور اسی کے روزمرہ میں بلاغت کی رعایت مدنظر رکھتے تھے یہاں تک کہ بعض صحابہ کرام کسی اور موقع پر آپ سے اُس کلام کی شرح دریافت فرماتے اور آپ کے ارشاد گرامی کی توضیح کے خواستگار ہوتے۔ جس نے آپ کے اقوال گرامی (احادیث و سیرت) میں غور و فکر کیا ہے، اس پر یہ بات واضح ہو گئی ہے اور یہ حقیقت سامنے آ گئی ہے۔ آپ کا کلام جیسا قریش، انصار، اہل حجاز و اہل نجد کے ساتھ ہوتا تھا ویسا انداز کلام اس وقت نہیں ہوتا تھا جب آپ ذی المشعار ہمدانی طہفۃ النہدی قطن بن حارثہ اشعث بن قیس اور وائل بن الحجر الکندی سے گفتگو کے وقت اختیار فرماتے تھے جو امرأ و ملوک میں سے تھے۔

جناب علامہ قاضی عیاض صاحب الشفا نے محولہ بالا قول کی تائید میں سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ گرامی نامہ (متن) پیش کیا ہے

جو آپؐ نے بنی ہمدان کو رقم فرمایا تھا، قارئین نقوش بھی اس کے مطالعہ سے بہرہ اندوز ہوں، اس مکتوب گرامی میں فصاحت و بلاغت، جزالت الفاظ اور اُن کا نظم اپنے کمال پر ہے اور کمال یہ ہے کہ یہ گرامی نامہ ان ہی کی زبان، اُن ہی کے لغت اور اُن ہی کے روزمرہ میں ہے

اِن لکم فِراعَها ووِهاطَها وعزازها تأکلون علافها وترعون عفاءها لنا من دفئهم وصرامهم ما سلّموا بالمیثاق والامانة، ولهم من الصدقة الثلب والناب والفصیل والفارض الداجن والکبش الحوری وعلیهم فیها الصالغ والقارح!

(اقتباس از نامہ گرامی)

تمہارے لیے نشیب فراز اور سنگریزوں والی زمین ہے بس تم اس کی پیداوار کھاؤ اور اس میں (اپنے جانور) بے روک ٹوک چراؤ، ہمارے لیے ان کے مویشیوں اور غلّے کے خرمنوں سے وہی حصّہ ہے جو وہ عہد (کے مطابق) اور امانت سے ادا کریں گے ان کے لئے صدقے کا مال، بوڑھے اونٹ، اونٹنیاں، شتر بچے، عمر رسیدہ اور گھر پر گھرے رہنے والے (جن کی کھال سے نطع بنایا جاتا ہے) اور ان پر وہ بکری اور وہ گائے ہے جو چھ سال کی ہو اور وہ اونٹ جو پانچویں سال میں ہو۔

حضور سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے اُس گرامی نامہ سے میں نے چند متبرک سطور پیش کی ہیں جو آپ نے بنی فہد کو ان ہی کے روزمرہ اور ان ہی کے لغات میں تحریر فرمایا تھا۔ قریش کا روزمرہ اور زبان یہ نہیں تھی، اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمرائے حضرموت (اقیال) اور شاہان یمن کو بھی جو مکتوبات ارسال کئے یا اُن کی باریابی کے موقع پر اُن سے گفتگو فرمائی وہ انہی کی زبان اور ان ہی کے روزمرہ میں فرمائی، آپ اُن سے گفتگو میں ان ہی کا اسلوب بیان اور اُن ہی کے مخصوص لغات استعمال فرماتے تھے باوجودیکہ سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم نہ اُن قبائل میں کبھی تشریف لے گئے اور نہ اُن علاقوں اور قبائل کی زبان سیکھی یہ سب کچھ توفیقی اور توفیقی تھا۔

مندرجہ بالا مکتوب گرامی جو بنی ہمدان کو ارسال کیا گیا تھا، اس کی فصاحت، جزالت الفاظ، نظم و ترتیب، ایجاز اور بلاغت کی تعریف کس کا یارا ہے جو کر سکے۔ اس سجع اور تلازم لفظی پر نظر ڈالئے جو تکلف اور تصنع سے بالکل عاری ہے! سبحان اللہ! سبحان اللہ!!

"فِراعَها و وِهاطَها و عَزازَها۔ عِلافَها، عِفاءَها اور دِفئهم و صِرامهم میں جو بلاغت اور علم معانی و بیان و بدیع کے جو لوازم ہیں ان پر فصاحت زبان و بیان وجد کرتی ہے"

وَالثلب و الناب والفصیل والفارض

الداجن ... الصالغ والقارح جیسے الفاظ

جن میں کثیر و بسیط معانی پنہاں ہیں۔ ان میں جو ایجاز ہے وہ ظاہر ہے، زبان پر کامل قدرت، الفاظ کا حسنِ انتخاب اپنے کمال پہ ہے، کون سی زبان لائی جائے جو ان خوبیوں کی تعریف کر سکے!!

" وائل بن حجر" کو جو گرامی نامہ ارسال کیا گیا تھا اس میں یہ بھی ارقام فرمایا گیا تھا!

وَفِی التِّیعَۃِ شَاۃٌ لَا مُقَوَّرَۃُ الْاَلْیَاطِ وَلَا ضِنَاکٌ وَانْطُوا الثَّبَجَۃَ وَفِی السُّیُوبِ الْخُمُسُ وَمَنْ زَنٰی مِمْ بِکْرٍ نَاصْقَعُوْہُ مِائَۃً وَاسْتَوْفِضُوْہُ عَاماً وَمَنْ زَنٰی مِمْ ثَیِّبٍ فَضَرِّجُوْہُ بِالْاَضَامِیْمِ وَلَا تَوْصِیْمَ فِی الدِّیْنِ وَلَا غُمَّۃَ فِیْ فَرَائِضِ اللّٰہِ وَکُلُّ مُسْکِرٍ حَرَامٌ وَوَائِلُ بْنُ حُجْرٍ یَتَرَفَّلُ عَلَی الْاَقْیَالِ۔

یعنی اور چالیس بکریوں میں سے ایک بکری ہے جو نہ بہت دبلی ہو اور نہ بہت موٹی (درمیانی ہو) اور نہ اعلیٰ نہ ادنیٰ اور زمین کی پیداوار سے پانچواں حصہ ہے اور جو کوئی کنواروں میں سے زنا کا مرتکب ہو تو اس کو سو کوڑے مارو اور ایک سال کے لئے جلا وطن کر دو اور شادی شدہ زانی کو پتھروں سے رجم کرو کیونکہ دین میں ڈھیل نہیں ہے۔ اور اللہ کے فرائض میں اخفا نہیں ہے، ہر نشہ لانے والی چیز حرام ہے اور وائل بن حجر تمام امرا (اقیال) پر سرداری کرے۔"

اس مکتوبِ گرامی کا اسلوب، اس کے لغات اور تراکیب بھی وہی ہیں جو اس قبیلہ میں رائج تھا اور اسی قبیلہ کا اندازِ بیان حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار فرمایا، علامہ قاضی عیاض رح فرماتے ہیں۔

" اکثر استعمالھم ھذہ الالفاظ استعملھا معھم لتبیّن للناس ما نزل الیھم" وحدّث للناس بما یعلمون ۔

یعنی " آپ ان لوگوں سے گفتگو اور معاملہ کے وقت وہی الفاظ استعمال فرماتے جو بعینہٖ وہ لوگ استعمال کرتے تھے، قرآنِ حکیم کی آیات کا مفہوم اور اس کی وضاحت بھی ان ہی کی زبان میں فرماتے جس میں وہ لوگ کلام کرتے تھے اور پسند کرتے تھے۔"

جناب عطیہ السعدی والی حدیث میں ہے کہ آپ نے اُن سے فرمایا:

فَاِنَّ الْیَدَ الْعُلْیَا ھِیَ الْمُنْطِیَۃُ وَالْیَدَ السُّفْلٰی ھِیَ الْمُنْطَاۃُ

یعنی " بیشک اونچا ہاتھ تو دینے والا ہے اور لینے والا ہاتھ تو نیچا ہے۔"

مختلف قبائل کے یہ لوگ اعتراف کیا کرتے تھے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم جب ہم سے کلام فرماتے ہیں تو ہماری ہی زبان میں فرماتے ہیں۔ چنانچہ المنطیہ اور المنطاۃ" قریش کے لغات نہیں تھے بلکہ قبیلہ سعد سے مختص تھے:

" علامہ قاضی عیاض رح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی فصاحت و بلاغت پر مختصر گفتگو کرنے کے بعد اس بحث کو ان الفاظ پر ختم کرتے ہیں۔

واماَّ کلامہُ المعتادِ وَفصاحتہُ المعلومۃ :
جَوامِع کَلِمِہٖ وَحِکَمِہٖ مَاثُورَہ فَقَدْ اَلَّفَ النَّاسَ فِیھا دَوَاوِیْنَ وَجُمِعَت
فِی اَلْفاظِھا وَمَعَانِیھا الکُتُبُ وَفِیھَا مَالاَ یُوَازی فَصَاحَۃً وَلاَیُبَارِی بَلاَغَتَہٗ
یعنی "آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام معتاد، آپ کی فصاحت معلومہ، آپ کے جوامع الکلم اور احکام ماثورہ کے سلسلہ میں بہت سے لوگوں نے متعدد کتب لکھی ہیں اور دفتر کے دفتر تحریر کر دیئے ہیں جن میں اُن الفاظ (اور اُن کے معانی) کو جمع کیا گیا ہے، لیکن اگر غور کیا جائے تو فصاحت ان الفاظ کی برابری نہیں کر سکتی اور نہ بلاغت کو تاب مقاومت ہو گی"۔

علامہ قاضی عیاضؒ کے محولہ بالا قول کی مزید صراحت و وضاحت کے لیے میں یہاں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چند ارشادات گرامی پیش کر رہا ہوں، جو اپنی سلاست بیان، نظم الفاظ، فصاحت کلمات اور ایجاز کے نادر نمونے ہیں، ان حکمت آفریں کلمات اور جملوں میں معانی کا ایک سمندر موجزن ہے، آپ کے یہ کلمات طیبات کم سے کم الفاظ اور زیادہ سے زیادہ معانی کے حامل ہیں، ان کی جامعیت کا یہ عالم ہے کہ دوسرے فصیح و بلیغ انسان کے کلام میں اس کی مثال ملنی ناممکن ہے۔

آپؐ کی بارگاہ فلک رفعت میں ہر وقت کے حاضر باش اصحابؓ جو خود ہی زباں دان اور قریش کے فصیح و بلیغ اصحاب تھے، آپ کی اس فصاحت و بلاغت پر اکثر حیرت کا اظہار فرماتے، آپؐ نے ان کے تحیر کو دور کرنے کے لئے ارشاد فرمایا!!

"اَنَا اَفْصَحُ العَرَبِ بَیْدَ اِنِّیْ مِنْ قُرَیْشٍ وَنَشَأتُ فِی بَنِی سَعْدِ بنِ بَکْرٍ"۔
یعنی میں عرب میں فصیح ترین شخص ہوں جبکہ میں قریش سے ہوں اور بنی سعد بن بکر میں میری نشوونما ہوئی ہے۔

اسی طرح ایک دن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خدمت گرامی میں عرض کیا کہ
"یارسول اللہؐ! میں عرب کے تمام قبائل میں گھوما پھرا ہوں اور ان قبائل کے فصحا سے میں نے گفتگو کی ہے لیکن میں نے آپؐ سے زیادہ کسی کو فصیح نہیں پایا، یہ تعلیم آپؐ کو کس نے دی"۔
اس کے جواب میں حضور سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:
"اَدَّبَنِی رَبِّیْ فَاَحْسَنَ تَادِیْبِی"
میرے رب نے میری تعلیم و تادیب کی ہے اور خوب ہی ادب سکھایا ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر اس زمانے میں کوئی اور ماہر انساب نہیں تھا اور ممکن نہ تھا کہ کوئی فصیح و بلیغ شخص اس زمانے میں ہو اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس سے واقف نہ ہوں، اس وقت کا کوئی خطیب، کوئی شاعر اور لکھنے والا ایسا نہ تھا جو آپ کی نگاہوں سے چھپا ہو پس حضرت صدیق اکبرؓ کا آپؐ کی فصاحت و بلاغت پر اظہار حیرت ہی اس امر کی دلیل ہے کہ "دنیائے عرب میں سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ فصیح و بلیغ کوئی فرد نہیں تھا۔

یہاں جو چند کلمات طیبات اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادِ گرامی پیش کئے جا رہے ہیں یہ آپ کے کلام کا کوئی منتخبہ نمونہ نہیں بلکہ یہ ایسے کلمات طیبات ہیں جو اپنی معانی آفرینی اور جامعیت کے اعتبار سے زبان زد خواص و عوام ہیں، زبانوں پر بے تکلف جاری و ساری ہیں، غور کیجئے کہ نہ اِن کلماتِ طیبات میں اَدائے مقصود میں کہیں (معاذ اللہ) کوتاہی ہے نہ ضرورت سے زیادہ الفاظ استعمال کئے گئے ہیں، ہر ایک ارشادِ گرامی فصاحت و بلاغت اور جامعیت کا بہترین نمونہ ہے، تعقید سے خالی ہے۔ تکلف و تصنع کا کہیں نام و نشان بھی نہیں ہے، اسلوبِ بیان میں متانت رچی بسی ہے اور معانی کی وسعتوں کا کیا کہنا! دریا بکوزہ کا مصداق ہے، وضوح دلالت میں الفاظ کی کمی کے باوصف کامل ہے اور معانی و بیان کی صفات سے آراستہ ہے!!

یہ تو حقیقت کے اعتبار سے کہا گیا ہے کہ یہ موضوع حقیقت کی ترجمانی ہی چاہتا ہے ورنہ محبت و عقیدت تو ایک ایک لفظ پر سر خم کرتی ہے، ایمان تر و تازہ ہوتا ہے، روحِ ایقان وجد میں آتی ہے اور کیوں نہ ہو!

یتیمے کہ ناکردہ قرآں درست
کتب خانۂ چند ملت بہ شست (سعدیؒ)

کس کی زبان کا یارا ہے کہ اس کلام کی تعریف کر سکے جس کی خوبیوں کی خالق اکبر اس طرح قسم یاد فرمائے:

وَقِيلِهٖ يٰرَبِّ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ قَوْمٌ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ؁ "مجھے رسول کے اس کہنے کی قسم! کہ اے میرے رب یہ لوگ ایمان نہیں لاتے"۔ (الزخرف آیت ۸۸)

عقیدت و محبت نے لرزتے ہاتھوں، ترساں انگلیوں اور سر بتفکر قلم سے اِن چند کلمات طیبات کو زیب قرطاس بنانے کی جراُت کی ہے تاکہ دنیا کے ادیب اپنی فصاحت و بلاغت کے معیار پر اس زرِ کامل عیار کو اگر چاہیں تو کس لگا کر دیکھ لیں اگر اُن میں اتنی جراُت ہو لیکن ادب شرط ہے کہ یہ بارگاہ بڑی عالی وقار ہے:

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنیدؒ و بایزیدؒ ایں جا (عزت بخاری)

علم معانی و بیان تو یہاں خود سر افگندہ و سرنگوں ہیں کہ اِن علوم کا وجود تو خود حضور سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے وجودِ گرامی کا صدقہ ہے ان علوم کا مبنیٰ اور ان کی اساس تو خود قرآنِ حکیم اور اس کا بیان یعنی حدیث رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہے! علم فصاحت و بلاغت کو وجود تو خود حضورؐ کے کلامِ معرفت التیام نے بخشا ہے، صرف، نحو، معانی، بیان! ادب کے اصل قواعد تو خود قرآن و حدیث سے اخذ کئے گئے ہیں کہ حدیث رسول بھی تو اعجاز رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے اور وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى اسی کلام کے لئے تو فرمایا گیا ہے میں اس جسارت پر آمادہ نہ ہوتا لیکن دل نے کہا کہ اسلافِ کرام نے بھی شمائل نبوی اور ارشاداتِ مصطفوی (صلی اللہ علیہ وسلم) پر قلم اٹھایا ہے اور اپنی آبرو بڑھائی ہے اور اپنے کلام و بیان کو اس کے فیض سے سرمدی بنایا ہے تو میں بھی اُن ہی بزرگوں کا نام لیوا ہوں مانا کہ وہ آفتاب تھے میں ذرّہ ہوں، وہ سمندر تھے میں قطرہ ہوں وہ گلستاں تھے میں خار بندِ گلستاں ہوں، لیکن یہ خار بندِ گلستاں بھی کبھی کبھی پھولوں کا منہ چوم لیتا

ہے، قطرے کو ہی دریا کے توسط سے سمندر کی موجوں سے ہم آغوشی کا شرف حاصل ہو جاتا ہے۔ ذرہ بھی خورشید کے پرتو سے چمکنے لگتا ہے لہذا میں بھی اسلافِ کرام کے اس کوچے میں قدم رکھ رہا ہوں، الٰہی میری آبرو رہ جائے۔

حضور سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے بیحد و بے شمار حکمت آگیں، فصاحت نظام و بلاغت التیام کلام سے جو ان مذکورہ اوصاف سے کہیں زیادہ خوبیوں کے حامل ہیں، یہ چند لطیف، پاکیزہ، مقدس و معطر، معنی آفریں اور سبق آموز کلمات پیش کر رہا ہوں جو فصاحت و بلاغت اور اعجازِ کلام کے نادر نمونے ہیں۔

سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

۱ اَلنَّاسُ كَاَسْنَانِ الْمُشْطِ — لوگ کنگھی کے دندانوں کی طرح ہیں۔

۲ اَلْوَلَدُ لِلْفِرَاشِ — بیٹا اس کا ہے جس کے بستر پر پیدا ہو۔

۳ لَيْسَ الْخَبَرُ كَالْمُعَايَنَةِ — سنی ہوئی بات دیکھی ہوئی بات کی طرح نہیں ہے (شنیدہ کے بود مانندِ دیدہ)

۴ مَنْ لَا يَرْحَمُ لَا يُرْحَمُ — جو (مخلوق پر) رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جائے گا۔

۵ سَيِّدُ الْقَوْمِ خَادِمُهُمْ — قوم کا سردار وہ ہے جو اس کی خدمت کرے (ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد)

۶ تَرْكُ الشَّرِّ صَدَقَةٌ — شر (برائی) کا ترک کرنا بھی صدقہ (نیکی) ہے۔

۷ اَلْمَرْءُ مَعَ اَحَبَّ — انسان اس کے ساتھ ہے جس کو وہ محبوب رکھے۔

۸ اَلنَّاسُ مَعَادِنُ — لوگ کانیں ہیں۔

۹ اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ — جس سے مشورہ لیا جائے اس کے لیے امانت ضروری ہے۔

۱۰ هُوَ بِالْخِيَارِ مَالَمْ يَتَكَلَّمْ — انسان مختار ہے جب تک کلام نہ کرے۔

۱۱ مَا هَلَكَ امْرَءٌ عَرَفَ قَدْرَهٗ — وہ شخص ہلاک نہیں ہوتا جو خود شناس ہے۔

۱۲ رَحِمَ اللّٰهُ عَبْدًا قَالَ خَيْرًا فَغَنِمَ اَوْ سَكَتَ فَسَلِمَ — اللہ تعالیٰ نے اس بندے پر رحم فرمایا جس نے اچھی بات کہی تو فائدہ اٹھایا یا خاموشی اختیار کر کے محفوظ ہو گیا۔

۱۳ ذُوالْوَجْهَيْنِ لَا يَكُوْنُ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيْهًا۔ — منہ دیکھ کر بات کرنے والا، اللہ تعالیٰ کے حضور میں باعزت نہیں ہے۔

۱۴ خَيْرُ الْاُمُوْرِ اَوْسَطُهَا — میانہ روی (اعتدال) اچھی چیز ہے۔

۱۵ اَسْلِمْ تَسْلَمْ — اسلام قبول کر، محفوظ ہو جا!

۱۶ اِتَّقِ اللّٰهَ حَيْثُ كُنْتَ — اللہ سے ڈر تو جہاں کہیں بھی ہو۔

۱۷ اَحْبِبْ حَبِيْبَكَ هَوْنًا مَا عَسٰى اَنْ يَّكُوْنَ بَغِيْضَكَ يَوْمًا — اپنے دوست کو راز کم بتاؤ، ممکن ہے وہ تمہارا کسی روز دشمن ہو جائے!

مندرجہ بالا ارشادات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں اصولِ معاشرت، اجتماعی زندگی اور اخروی، زندگی کی کامیابی اور کامرانی پر فائز ہونے کے

جو اعلیٰ مقاصد اور اُن کی وسیع تعلیمات اپنے اندر لیے ہوئے ہیں اُن کی تشریح و توضیح کے لیے سیکڑوں صفحات درکار ہوں گے، میں نے قارئین کے استفادہ کے لیے ان چند ارشادات گرامی ہی پر اکتفا کیا ہے، سیر اور اخلاقیات پر لکھی جانے والی کتابوں میں ایسے کلمات حکمت و دانش بکثرت موجود ہیں اور اسی قبیل کے ہزاروں مخاطبات، مواثیق، محاضرات اور خطبات موجود ہیں جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں حضرات صحابہؓ کی زبانوں پر رواں اور حافظے میں محفوظ تھے، امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ ان کو کتابت کے توسط سے محفوظ کر لیا جائے، تدوین کا یہ کام دوسری صدی ہجری سے شروع ہوا، یہ سب کچھ نتیجہ ہے اس کاوش کا جو متقدمین اور متوسطین علمائے کرام نے تدوین حدیث کے سلسلہ میں انجام دی ہیں، ان مقدس احادیث میں احکام بھی ہیں اور معاملات بھی، خطبات بھی ہیں اور ادعیہ ماثورہ بھی، غرض وہ سب کچھ موجود ہے جس کی اسلامی معاشرے کو ضرورت ہو سکتی ہے، یہ سرمایۂ عظیم البرکتہ اس طرح ثقہ راویوں کے توسط سے ہم تک پہنچا ہے کہ ان حضرات نے کسی راوی سے روایت کے قبول کرنے میں بڑی کڑی شرطیں عائد کر دی تھیں! رُوات کے اوصاف متعین کئے راوی کو اس نقطۂ نظر سے جانچا اور پرکھا، مطاعن کی کسوٹی پر کسا تا کہ حدیث گرامی کی روایت میں کسی شک وشبہ کی گنجائش باقی نہ رہے غرض کہ محدثین کرام اور محققین عظام نے روایت کو درایت کے ہر ایک پہلو سے پرکھا ہے اور اس کو معیار صداقت پر جانچا ہے۔ تب کہیں سپرد قلم کیا ہے، صحاح ستہ، مسانید، معاجم، موطا کے یہ تمام مجموعے جن کی تعداد بے شمار ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قولی فعلی اور سکوتی احادیث کے مقدس مجموعے ہیں، اُن تمام احادیث مقدسہ میں جن کو احادیث قولی سے موسوم کیا جاتا ہے جن میں ادعیہ ماثورہ، خطبات و محاضرات شامل ہیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لسانی و بیانی اوصاف موجود ہیں یعنی فصاحت و بلاغت بھرپور طریقے پر موجود ہے میں نے سرور ذیشان (صلی اللہ علیہ وسلم) کے چند بہت ہی مختصر کلمات طیبات جن میں معانی کی پہنائیاں سمٹ کر آگئی ہیں، آپ کے سامنے پیش کئے ہیں، اب میں یہاں صرف ایک حدیث گرامی پیش کر رہا ہوں جس میں چند مقدس و پاکیزہ جملے ہیں لیکن اِن چند جملوں میں ایمان، اخلاق، حسنِ معاشرت، تدبیر منزل کے تمام مباحث پنہاں ہیں، صرف اسی ایک حدیث پر عمل کامیاب زندگی کا وسیلہ ہے اور یہ چند مقدس کلمات فلاح دارین کا دستور العمل ہیں، اس حدیث مبارکہ کا ایجاز اختصار بجائے خود ایک معجزہ ہے اور فصاحت و بلاغت کا ایک آئینہ ہے:

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رض قَالَ، قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَلْاِیْمَانُ بِضْعٌ وَّسَبْعُوْنَ شُعْبَةً فَاَفْضَلُهَا قَوْلُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَدْنٰهَا اِمَاطَةُ الْاَذٰی عَنِ الطَّرِیْقِ وَالْحَیَاءُ شُعْبَةٌ مِّنَ الْاِیْمَانِ ۔	حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ سے مروی ہے کہ "رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایمان کی ستر (۷۰) سے کچھ اوپر شاخیں ہیں اُن میں سب سے افضل لا الٰہ الا اللہ کہنا ہے اور سب سے ادنیٰ یہ کہ راستے سے اذیت رساں چیز کا ہٹا دینا اور حیا ایمان کا ایک شعبہ ہے۔
(متفق علیہ)	(یہ حدیث متفق علیہ ہے)
(رواہ بخاریؒ و مسلمؒ)	(اس کو بخاریؒ اور مسلمؒ نے روایت کیا ہے)

صحیح بخاری کے شارح علامہ حافظ ابن حجر عسقلانی شافعیؒ اپنی شرح صحیح بخاری موسومہ بہ فتح الباری میں اس حدیث مبارکہ کی توضیح و تشریح میں رقمطراز ہیں کہ:

"رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مذکورہ حدیث میں جن ستر سے کچھ زیادہ شعبوں کے سلسلہ میں ارشاد فرمایا ہے یہ تمام شعبے ہمارے دل، زبان اور ہمارے بدن کے اعمال ہیں جو ان شعبوں میں منقسم ہو جاتے ہیں، میں ان کی یہاں وضاحت کروں گا۔"

سب سے پہلے تو اعمالِ قلب کو لیجئے کہ اعتقادات اور نیت کا تعلق اسی قلب سے ہے۔

اس کے تحت یہ اعتقادات آتے ہیں :-

۱- ایمان باللہ۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور اس کی توحید پر ایمان لانا اور اس پر کہ کوئی چیز اس کے مثل نہیں ہے اور اس کے سوا کوئی قدیم نہیں اور ہم اس کے بندے ہیں۔

۲- اللہ کے فرشتوں پر ایمان لانا۔

۳- قرآن اور قرآن سے قبل نازل ہونے والی آسمانی کتب پر ایمان لانا (جس طرح وہ نازل ہوئیں یعنی غیر محرف پر)

۴- سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا اور آپ سے قبل مبعوث ہونے والے تمام پیغمبروں پر ایمان لانا۔

۵- اس بات پر ایمان لانا کہ تقدیر خیر و شر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔

۶- قیامت پر ایمان لانا۔

۷- محبت اللہ

۸- حُبّ فی اللہ (محض اللہ تعالیٰ کے لئے اس کے بندوں سے محبت کرنا)

۹- بغض فی اللہ (جو اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں رکھتا اور اس ذات میں دوسروں کو شریک بناتا ہے اس سے نفرت کرنا اور بغض رکھنا)

۱۰- سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرنا۔

۱۱- حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کا دل میں راسخ ہونا، آپ پر صلوٰۃ و سلام بھیجنا۔

۱۲- اتباع سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی نیت کرنا اور اس پر عمل پیرا ہونا۔

۱۳- اخلاص پر یقین واثق رکھنا یعنی ترکِ ریا اور ترک نفاق۔

۱۴- توبہ کرنا۔

۱۵- خوف الٰہی۔ ۱۶- امید و رجاء۔ ۱۷- شکر الٰہی بجا لانا۔

۱۸- ایفاء عہد۔ ۱۹- صبر بالقضا۔ ۲۰- توکل

۲۱- رضا بالقضا۔ ۲۲- ایثار۔ ۲۳- رأفت و رحمدلی

۲۴- تواضع (اس میں بہت سے فضائل اور ترک رذائل ضمناً داخل ہیں) ۲۵- صدق۔ ۲۶- کذب سے گریز۔

۲۷- خضوع و خشوع۔

ان تمام مذکورہ بالا امور کا تعلق قلب سے ہے اس لیے یہ سب کے سب اعمالِ قلب ہیں۔ اب اُن اعمال پر غور کیجئے جن کو "اعمالِ لسان" کہا جاتا ہے۔ اعمالِ لسان کے تحت یہ آٹھ امور آتے ہیں ۔

۱ ۔ زبان سے توحید و رسالت کا اقرار کرنا ۔

۲ ۔ تلاوت قرآن ۔ ۳ ۔ تحصیل علم ۔ ۴ ۔ تعلیم و تدریس (علوم دینیہ) ۵ ۔ ذکرِ الٰہی (توبہ استغفار)

۶ ۔ دُعا ۔ ۷ ۔ لغو اور مہمل گفتگو سے اجتناب ۔ ۸ ۔ صدق یعنی راست گوئی ۔

یہ تھے اعمالِ قلب اور اعمالِ لسان، اب اعمالِ بدن کو لیجیے آپ اُن کو ۳۸ فروع پر مشتمل پائیں گے اِن میں کچھ اعمال تو ذات سے تعلق رکھتے ہیں یعنی ذاتی ہیں اور انفرادی نوعیت کے ہیں اور کچھ عائلی اور اہلی زندگی سے متعلق ہیں ۔

ذاتی اور انفرادی اعمالِ بدن یہ ہیں :۔

۱ ۔ طہارتِ جسمانی (حسی اور حکمی دونوں) یعنی ظاہری اور باطنی ناپاکی اور نجاست سے طہارت حاصل کرنا ۔

۲ ۔ سترِ عورت ۔ ۳ ۔ فرض و سنن اور نفلی نمازوں کا ادا کرنا ۔

۴ ۔ زکوٰۃ اور صدقاتِ نافلہ کا ادا کرنا ۔ ۵ ۔ غلام آزاد کرنا ۔ ۶ ۔ فرض اور نفلی روزوں کا ادا کرنا ۔

۷ ۔ حج اور عمرہ کی ادائیگی ۔ ۸ ۔ اعتکاف ۔ ۹ ۔ مساکین کو کھانا کھلانا ۔

۱۰ ۔ مہمانداری یعنی میزبان بننا اور میزبان کے آداب کی بجا آوری ۔

۱۱ ۔ لیلۃ القدر کے پانے کے لئے شب بیداری کرنا ۔

۱۲ ۔ اپنے دین کے تحفظ کے لئے دار الشرک سے ہجرت کرنا ۔

۱۳ ۔ نذرِ معین کا بجا لانا ۔

۱۴ ۔ بہترین ایمان کے ثبوت کے لئے کوشش بجا لانا یعنی ایسی مساعی میں مصروف ہونا جس سے بہترین ایمان کے حامل ہونے کا ثبوت فراہم ہو ۔

۱۵ ۔ مفروضہ کفاروں کا ادا کرنا ۔

مذکورہ بالا تمام اعمالِ بدن ایسے ہیں جو ذاتی اور انفرادی ہیں۔ کچھ ایسے اعمالِ بدنی ہیں جن کا دائرہ فرد سے بڑھ کر چند دوسرے افراد و نفوس تک پہنچتا ہے یعنی بعض کا تعلق عائلی اور خاندانی زندگانی سے ہے اور وہ یہ ہیں :

۱ ۔ نکاح سے اپنی عفت کا تحفظ کرنا ، (وظیفۂ زوجیت بجا لانا)

۲ ۔ اہل و عیال کے حقوق ادا کرنا ۔

۳ ۔ والدین کے ساتھ احسان کرنا اور اُن کی نافرمانی سے بچنا ۔

۴ ۔ صلۂ رحمی (خاندان کے مستحق و نادار افراد کے حقوق بجا لانا)

۵ ۔ بزرگوں کی اطاعت کرنا اور چھوٹوں سے شفقت کے ساتھ پیش آنا ۔

۶۔ غلاموں کے ساتھ حسنِ سلوک۔

۷۔ اولاد کی پرورش کے ساتھ ساتھ ان کی دینی اور مذہبی تربیت کرنا۔

۸۔ کسی قضیہ میں اگر گواہی دینا ہو تو سچی گواہی دینا (تاکہ کسی فرد یا افراد کی حق تلفی نہ ہو)

یہ تھے وہ اعمالِ بدنی جن کا تعلق فرد کی ذات سے بڑھ کر عائلی زندگی تک پہنچتا ہے۔

اب اُن افعالِ بدن کا ذکر کیا جاتا ہے جن کا دائرہ اثر و نفوذ اجتماعی اور مدنی زندگی سے ہے۔ وہ یہ ہیں!!

۱۔ عدل کے ساتھ حکمرانی کرنا۔

۲۔ جماعت کے ساتھ منسلک رہنا۔

۳۔ اولوالامر کی اطاعت کرنا۔

۴۔ باہمی اختلاف اور رنجشوں کو دُور کرنا

۵۔ نیکی اور بھلائی کے کاموں میں دوسروں کے ساتھ تعاون کرنا اور عدوان و بدی میں عدم تعاون کرنا۔

۶۔ اسلامی تعزیرات یعنی حدود کا اجرا۔

۷۔ جہاد (باغیوں اور سرکشوں سے قتال اس میں داخل ہے)

۸۔ اَدائے امانت (بروقت قرض ادا کرنا بھی اس میں داخل ہے)

۹۔ پڑوسیوں کے حقوق ادا کرنا اور ان کا احترام کرنا۔

۱۰۔ حسنِ معاملت۔

۱۱۔ کسبِ حلال (حلال ذرائع سے روزی کا حصول)

۱۲۔ جائز مواقع پر مال خرچ کرنا۔

۱۳۔ بیجا خرچ سے احتراز اور ضرورت سے زیادہ خرچ کرنے (اسراف) سے بچنا۔

۱۴۔ سلام کرنا اور سلام کا جواب دینا اور دونوں کو اسلامی طریقے پر بجالانا۔

۱۵۔ چھینکنے والے کی چھینک پر یرحمک اللہ کہنا۔

۱۶۔ لوگوں کی ایذارسانی سے خود کو محفوظ رکھنا۔

۱۷۔ لہو و لعب سے احتراز کرنا۔

۱۸۔ بخل سے خود کو بچانا۔

۱۹۔ پورا تولنا اور پورا ناپنا۔

۲۰۔ نہ رشوت لینا اور نہ رشوت دینا

۲۱۔ راستہ سے ایذارساں چیز کو ہٹا دینا۔

(فتح الباری شرح بخاری)

اس طرح ایمان کی یہ ستر سے کچھ اوپر شاخیں ہیں جو صرف ایک ارشاد رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں موجود ہیں۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مجموعوں میں ایسا ایجاز اور وسعت سبع رکھنے والی احادیث بکثرت موجود ہیں۔ یہ ایجاز بھی بلاغت کا وصف ہے اسی لئے میں نے محض نمونے کے طور پر ایک حدیث شریف پیش کر دی ہے۔ احادیث شریفہ کی شروح میں ایسی تفصیلات معنوی بکثرت موجود ہیں وہاں اُن سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

حضور سرورِ کونینؐ کے گرامی مکتوبات

فصاحت و بلاغت کی تمام خوبیاں آپ کے کلام مبارک کی کسی ایک نوع اور شعبہ سے مختص اور مخصوص نہیں بلکہ جس طرح آپ کے خطبات، محاضرات، صحابہ کرامؓ سے گفتگو، وفود سے خطاب، اُن کو ہدایات اور نصائح جن کو اصطلاحاً حدیث شریف سے تعبیر کیا جاتا ہے، ہر ایک نوع کلام میں یہ خوبیاں اور کمال زباندانی اور اس کی خصوصیات یعنی بیان و معانی و بدیع موجود ہیں۔

یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے اور ایسی حقیقت ہے جو شارع علیہ السلام کے ارشاد گرامی

اَلَآ اِنِّیْ اُوْتِیْتُ الْقُرْاٰنَ وَمِثْلَهٗ مَعَهٗ

سے مبرہن ہے ظاہر ہے کہ جب وہ چیز مثل قرآن ہے تو اس کا موضوع اور قرآن کا موضوع ایک ہی ہوگا، پس حدیث کا موضوع اور اس کے مقاصد وہی ہیں جو قرآن کا موضوع اور مقاصد ہیں، اب جب تفحص کی نظر ڈالیں گے تو احادیث شریفہ کے مجموعے خواہ وہ صحاح ہوں یا مسانید یا معاجم وغیرہا جن احکام یا موضوعات پر مشتمل ہیں وہ عموماً یہ ہیں۔

۱۔ ان میں اُن امور کی تفصیل ہے جو قرآن پاک میں مجملاً بیان کئے گئے ہیں اور جن کی توضیح و تصریح کے سلسلہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد فرمایا گیا تھا۔

وَ اَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ

مثلاً نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، جہاد، مضاربت، نکاح، ایلا، ظہار اور اس سے متعلق احکام کی تفاصیل اور اُن کے اطلاقات، چونکہ مدنی اور معاشرتی زندگی حُسن و قبح سے خالی نہیں ہے اس لئے جرائم اور ان سے متعلقہ سزائیں (حدود) اشیاء کی حلت و حرمت یعنی کون سی چیزیں حلال ہیں اور کون سی حرام! ان کا دائرہ بہت وسیع ہے اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اس وسعت کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئی ہیں۔

۲۔ آپ ہی کی احادیث سے وحی کے نزول کی کیفیت بشرت وحی، اس کے مختلف مراحل و احوال کی تفصیلات علم میں آتی ہیں۔

۳۔ کفار کو آپ کی دعوتِ اسلام کہ یہی آپ کی بعثت کا مقصد اولیں تھا۔ اس دعوت حق میں شدائد و مصائب سے آپ کا دوچار ہونا۔

اس دعوتِ حق کے سلسلہ میں آپ کے دلائل و براہین جو حکمتوں اور بصیرتوں سے مالا مال ہیں۔

مخالفین سے آپ کی موعظت اور خطاب کا انداز۔
آپ کی ہجرت کے احوال۔ اصحابِ صُفّہ کا انتظام اور اُن کی معاشی زندگی کی بحالی کی تدابیر۔
معجزاتِ نبوی کی تفصیلات جو آپ کی نبوت اور رسالت پر دلالت کرتی ہیں۔
انبیا سابقین کے واقعات کی تفصیل یعنی قصص القرآن کی توضیحات۔
غزوات و سرایا کے سلسلہ میں اہتمام و انصرام کی کیفیت اور اُن کی تفصیلات۔
مبلغین اسلام کو ہدایات اور ان حضرات کا طرزِ تبلیغ اور دلائل۔
رذائم اخلاق سے اجتناب اور فضائل اخلاق کے اکتساب کے لیے تاکیدی ارشادات۔
غیر مسلم اقوام سے معاہدات کی تفصیلات اور ان معاہدوں کے متون۔
تدبیرِ منزل، تہذیبِ اخلاق اور سیاستِ مدن سے متعلق احکام اور اُن کی تفصیلات۔
آپ کے تحریر کردہ وثیقہ جات کے متون اور اُن میں مندرجہ احکام۔
دینی اور سیاسی معاہدے جو اسلام کے استحکام کے لئے ضروری تھے ان کے متون۔
آپ کے ان مکتوبات گرامی کے متون جو اُمرائے وقت اور سلاطین زمانہ کے نام تحریر کئے گئے۔

غرضکہ یہ تمام تفصیلی امور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا موضوع ہیں اور یہ ہماری خوش بختی ہے کہ حدیث شریف کے ان تمام موضوعات کے تحت احادیث مقدسہ کا گرانقدر اور وقیع سرمایہ آج بھی ہماری بصیرت، آگہی اور رہنمائی کے لئے موجود ہے، دوسری انواع کی طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اکثر و بیشتر ایسے مکتوبات گرامی کے متون جو اُمرائے معاصر اور سلاطین وقت کے نام تحریر کئے گئے، آج بھی تحریف سے پاک و منزہ محفوظ ہیں، یہ اہتمام صرف مسلمانوں ہی کی طرف سے نہیں ہوا بلکہ دیگر اقوام نے بھی اُن کو مذہبی رقیمہ کی طرح نہ سہی، ادبی شہ پاروں کے اعتبار سے محفوظ رکھا، صلیبی جنگوں اور اسلامی مملکتوں کے انقلاب نے ان مکتوبات گرامی میں سے اکثر مکتوبات کو مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکال کر غیروں کے ہاتھوں میں پہنچا دیا اور پھر یہ اُن کے قومی عجائب خانوں میں محفوظ ہو گئے۔ مکتوبات گرامی کے علاوہ متعدد فرامین، معاہدات و احکام وثیقہ جات ہیں جن کے متون مرورِ زمانہ کے باوصف ان غیروں کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں! اس وقت میرے سامنے عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم تا خلافت راشدہ کے سیاسی وثیقہ جات کا مجموعہ ہے جس کے مرتب و مؤلف مشہور زمانہ محقق ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب حیدر آبادی ہیں۔ صاحب موصوف نے اس سلسلہ میں بڑی کاوش کی ہے، آپ کا مستقل قیام پیرس (فرانس) میں ہے اور آپ کے ڈاکٹریٹ (پی ایچ ڈی) کے مقالہ کا چونکہ عنوان "فرامین نبوی وثیقہ جات" تھا لہٰذا اس سلسلہ میں انہوں نے کیا کچھ سعی نہ کی ہوگی۔

میں یہ نہیں کہتا کہ ڈاکٹر صاحب فرامین نبوی پر کام کرنے والی پہلی شخصیت ہیں ان سے صدیوں پہلے علامہ عبدالمنعم نے "رسالات نبویہ" کے نام سے عربی زبان میں ایک جامع کتاب مرتب کی تھی۔ علامہ عبدالمنعم کے علاوہ بھی عربی زبان میں اس موضوعِ وقیع پر بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے اس سلسلہ میں جو کاوش کی ہے وہ لائق تحسین ہے، ڈاکٹر صاحب کا یہ تحقیقی مقالہ فرانسیسی زبان میں تھا جس کا انگریزی

اور دوسری مغربی زبانوں میں ترجمہ ہوا اور پیشِ نظر کتاب انگریزی کا اردو ترجمہ ہے جو ابو یحییٰ امام خان نوشہروی کی کاوش کا نتیجہ ہے مجھے افسوس ہے کہ میں اپنے موضوع "کلام رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی فصاحت وبلاغت کے تحت اس اردو ترجمہ سے استفادہ نہیں کر سکوں گا کہ وثیقہ جات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اردو ترجمہ پیش کر کے اُن کی فصاحت وبلاغت پر کس طرح استدلال کیا جا سکتا ہے اور زبان وبیان کے اسالیب کی وضاحت کس طرح ہو سکتی ہے۔

دوسری صدی ہجری اور قرن ہائے مابعد کے محدثین کرامؒ اور مورخین ملتِ اسلامیہ نے البتہ حضور اکرمؐ کے فرامین، مراسلات والا کو مستند راویوں کی روایت سے ضبط کر کے ہم تک پہنچانے کا سامان فراہم کیا تھا مگر افسوس کہ صرف اسی موضوع پر قرن دوم اور قرن ہائے مابعد کے وہ علمی ذخیرے بھی معدوم ہو گئے، طبقات کی بعض کتب میں ان مراسلات کو بعض مؤلفین طبقات نے ضرور شامل کیا ہے لیکن ان سے زیادہ معتبر و مستند کتب حدیث کے وہ متون ہیں جو ثقہ راویوں کی روایت سے روایت کی معیار پر پرکھ لینے کے بعد ہمارے لیے چھوڑے گئے ہیں، میں یہاں چند ایسے ہی فرامین والا اور مراسلاتِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متون سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کی فصاحت وبلاغت' کے سلسلہ میں پیش کروں گا جن کو اربابِ سیر نے بکمال احتیاط ایک دوسرے سے نقل کرتے ہوئے ہم تک پہنچایا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامینِ والا کو پیش کرنے سے قبل یہ چند سطور ضروری تھیں تاکہ قارئین اس سلسلہ کے مالہ وماعلیہ سے کسی حد تک آگاہ ہو جائیں یہ واضح رہے کہ فرامین کا یہ سلسلہ ۶ھ ہجری سے شروع ہوا ہے۔

سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے مکتوباتِ گرامی دعوتِ اسلام کے سلسلہ میں

۱۔ سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کا نامہ گرامی

قیصر روم ہرقل عظیم کے نام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"من محمد عبد اللہ ورسولہ الی
ہرقل عظیم الروم، سلامٌ علیٰ
من اتبع الھدیٰ، اما بعد، فانی
ادعوک بدعایۃ الاسلام، اَسْلِم
تَسْلَمْ، یوتک اللہ اجرک مرتین
فان تولیت فعلیک اثم الاریسیین
ویا اھل الکتاب تعالوا الیٰ کلمۃ
سواءٍ بیننا وبینکم الا نعبد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ خط محمدؐ اللہ کے بندے اور اس کے رسول کی طرف سے
ہرقل عظیم الروم (بادشاہ روم) کی جانب ہے۔
اس پر سلام ہو جو ہدایت کی اتباع کرے، اما بعد میں تجھ
کو دعوت دیتا ہوں اُس کلمہ کی طرف جو اسلام کی طرف
بلانے والا ہے۔ تو اسلام قبول کرے
(تمام آفات سے) سلامت رہے گا اور اللہ تعالیٰ تجھے دُہرا
اجر عطا فرمائے گا، اگر تو اسلام سے روگردانی کرے گا تو تمام
رعایا کے اسلام نہ لانے کا گناہ تجھ پر ہوگا۔

إِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِأَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۔

اے اہلِ کتاب! ایک ایسی بات کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان مسلّمہ ہے یہ کہ سوائے اللہ کے کسی کی عبادت نہ کریں اور اللہ کے سوا ایک دوسرے کو اپنا رب اور معبود نہ بنائیں پس اگر وہ اسلام قبول نہ کریں تو کہہ دیجئے کہ تم گواہ رہو ہم اسلام قبول کر چکے ہیں ۔

یہ فرمان ذیشان دحیہ کلبیؓ کے ذریعہ محرم ۷ھ ہجری میں ارسال کیا گیا ۔ (بخاری)

مندرجہ بالا مکتوب میں جو فصاحت و بلاغت ہے یعنی کلمات کا ایجاز اور اُن کا نظم۔ " اَسْلِمْ تَسْلَمْ کی معنی آفرینی اور ان دو لفظوں میں معانی کی وسعتوں کا پنہاں ہونا، ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں ہے۔ سب سے اول "محمد عبداللہ" فرما کر عیسائیت کے بنیادی باطل عقیدے "عیسٰی ابن اللہ" کی تردید فرمائی۔ "اَسْلِمْ تَسْلَمْ" میں علم معانی اور بیان کی خوبیاں، اللہ اللہ دو لفظ ہیں لیکن ایک بسیط مطلب، مقصد اور بہت سے معانی ان میں پوشیدہ ہیں اور پھر "مقتضائے حال" کا اہتمام ہے جو کمالِ بلاغت ہے۔ "سلام" عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰی کی بلاغت ملاحظہ کیجئے کہ ہرقل اسلام نہیں لایا تو اس پر سلام کیسا! سلام تو اس پر ہے جو ہدایت کی پیروی کرے۔ تم پر سلام اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ تم ہدایت کی اتباع کرو۔ يُؤْتِكَ اللّٰهُ أَجْرَكَ مَرَّتَيْنِ ۔ اللہ تجھ کو دونا اجر دے گا، ایک اجر تو سابق نبی حضرت عیسٰی علیہ السلام پر ایمان لانے کا اور دوسرا حضرت محمد مصطفٰی نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کا، اسی طرح اس لطیف و مقدس جملے میں "فَإِنْ تَوَلَّيْتَ فَإِنَّ عَلَيْكَ إِثْمَ الْأَرِيْسِيِّيْنَ" جو خبر دے رہا ہے اس ارشادِ ربانی کی: وَلَيَحْمِلُنَّ أَثْقَالَهُمْ وَأَثْقَالًا مَّعَ أَثْقَالِهِمْ" (اور وہ ضرور اپنے بوجھ اٹھائیں گے اور اپنے بوجھوں کے ساتھ اور بوجھ بھی" سورہ العنکبوت آیت ۱۳) آپ کے اس ارشادِ گرامی کا مدلول ہے جو عین بلاغت ہے۔

۲۔ مکتوب گرامی رسامی بنام خسرو پرویز (کسرٰی)

(شاہِ ایران کے نام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مِنْ مُحَمَّدٍ رَّسُوْلِ اللّٰهِ إِلٰى كِسْرٰى عَظِيْمِ فَارِسَ :-

سَلَامٌ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى وَآمَنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَأَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَأَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محمد رسول کی طرف سے، کسرٰی شاہ فارس کی جانب!

سلام ہے اس پر جو ہدایت کی اتباع کرے اور اللہ اور اس رسول پر ایمان لائے اور گواہی دے کہ سوائے اللہ کے کوئی معبود نہیں ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں ہے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ میں تجھ کو اللہ کے

ادعوك بدعاية الله عزّ وجلّ، فانّی انا رسول الله الی الناس كلّهم لِاُنذر من كان حيًّا ويحقّ القول علی الكافرين۔ اَسلِم تسلَم فان تولّيت فعليك اثم المجوس۔

حکم کے مطابق دعوت دیتا ہوں کہ" میں اللہ کا رسول ہوں تمام لوگوں کی طرف تاکہ اس شخص کو ڈراؤں جس کا دل زندہ ہے اور کافروں پر اللہ کی حجت پوری ہو، اسلام لا، سلامت رہے گا اور اگر تو نے اس سے روگردانی کی تو تمام آتش پرستوں کا گناہ تجھ پر ہوگا۔

(تاریخ طبری۔ زرقانی)

کسریٰ آتش پرست تھا، اسی بنا پر گرامی نامہ کے آغاز میں "محمد رسول اللہ" فرمایا جبکہ ہرقل عظیم الروم کے نامہ میں "محمد عبداللہ" فرمایا گیا تھا، دونوں کلماتِ طیبات کا فرق اپنے اندر کتنی بلاغت رکھتا ہے!! اسلام کی عظیم دعوت چند مختصر جملوں میں دی گئی ہے جو مقتضائے حال کا تقاضا ہے اور کمالِ انشا۔ "لِاُنذر من كان حيًّا ويحقّ القول علی الكافرين" کی معنی آفرینی اور اس کا تاثر سبحان اللہ سبحان اللہ!! "من كان حيًّا" سے دل کے اندھوں اور مُردہ دلوں کی طرف بلیغ اشارہ ہے۔ چونکہ "يحقّ القول علی الكافرين" فرمایا گیا ہے اس لئے ہرقل کی طرح "اَجرك مرّتين" نہیں فرمایا کہ اس مجوس کا دامن تو بالکل اجر سے خالی تھا۔ پر اس ارشادِ گرامی کی معنی آفرینی اور اس کی وسعت، نظم الفاظ اور اُن کی جزالت!!

قلم میں یہ تاب و تواں کہاں کہ اس کی خوبیوں کی وضاحت کر سکے یہ چند جملے جو تحریر کئے یہ بھی آپ ہی کا کرم ہے کہ قلم کو یہ حوصلہ عطا فرمایا۔ اس جملے پر توجہ فرمائیے "فانّی انا رسول الله الی الناس كلّهم" بلیغ اشارہ ہے اس ارشادِ ربانی کی طرف "قُلْ يٰاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا" اور یہی آیہ کریمہ اس عظیم جملہ کی مدلول ہے: یہ گرامی نامہ حضرت عبداللہ بن حذافہ سہمی کے ذریعہ ارسال کیا گیا۔ زرقانی، تاریخ طبری۔

نجاشی شاہ حبشہ کے نام حضور سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کا نامۂ گرامی

بسم الله الرحمٰن الرحيم

من محمد رسول الله الی النجاشی ملك الحبشة، سلام عليك، اما بعد فانّی احمد اليك الله الذی، لا اله الا هو، الملك القدوس السلام المؤمن المهيمن واشهد ان عيسی ابن مريم روح الله وكلمته القاها الی مريم البتول الطيبة الحصينة فحملت بعيسی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محمدؐ، اللہ کے رسول کی جانب سے نجاشی شاہ حبشہ کی طرف، سلامتی ہو! اما بعد میں حمد و ثنا کرتا ہوں اس اللہ کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، وہی حقیقی بادشاہ ہے تمام عیوب سے پاک ہے امن دینے والا ہے اور سب کا نگہبان ہے میں گواہی دیتا ہوں عیسیٰ، مریم کے بیٹے، اللہ کی خاص روح اور اس کا کلمہ ہیں جو اللہ نے پاک، محصنہ بتول مریم میں ڈالا جس سے وہ حاملہ ہوئیں پس اللہ نے حضرت عیسیٰ

فخلقه الله من روحه ونفخه كما خلق
آدم بيده وإني أدعوك إلى الله وحده
لا شريك والموالاة على طاعته وأن
تتبعني وتومن بالذي جاءني فإني رسول
الله وإني أدعوك وجنودك إلى الله تعالى
فقد بلغت ونصحت فاقبلوا نصيحتي والسلام
على من اتبع الهدى۔

تاریخ طبری، زرقانی، زاد المعاد۔

کو اپنی روح اور نفخ سے پیدا فرمایا جس طرح حضرت آدم کو اپنے دست قدرت سے پیدا فرمایا تھا اور میں تم کو اللہ وحدہٗ لاشریک کی طرف بلاتا ہوں اور اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کی محبت کی جانب ا اور اپنے اتباع کی طرف ا اور اس بات کی طرف جو اللہ کی جانب سے میرے پاس آیا ہے (قرآن) اس پر ایمان لاؤ بیشک میں اللہ کا رسول ہوں میں تم کو اور تمہارے لشکر کو اللہ کی طرف بلاتا ہوں، میں اللہ کا پیغام پہنچا چکا اور نصیحت کر چکا پس میری نصیحت کو قبول کرو اور سلامتی ہو اس پر جو ہدایت کی اتباع کرے۔

بعض نسخوں میں "والموالاۃ ..... بالذی جاءنی" کے الفاظ نہیں ہیں:۔

یہ گرامی نامہ حضرت عمرو بن امیہ ضمری رضی اللہ عنہ کے ہاتھ ارسال کیا گیا تھا۔ ابن اسحاقؒ کہتے ہیں کہ یہ وہی نجاشی ہے جس کے جنازے کی نماز غائبانہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ادا فرمائی تھی۔ یہ گرامی نامہ بھی سنہ ۶ھ میں ارسال کیا گیا!

اس گرامی نامہ میں جزالت الفاظ، کلمات کا ایجاز اپنے کمال پر ہے "مریم البتول الطیبۃ الحصینۃ" میں جو نظم الفاظ اور ان کا در و بست اور اسلوب بیان ہے، وہ حد درجہ دلکش ہے پھر یہ کہ نامۂ گرامی ایک عیسوی کو لکھا گیا ہے۔ اس لئے مقتضائے حال کے اعتبار ان الفاظ کی بلاغت کیا کہنا!

"بلغت ونصحت فاقبلوا نصیحتی" میں جو وسعت معانی ہے وہ ظاہر ہے، اور الفاظ کی سلاست و جزالت آپ اپنی جگہ ہے

حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا مکتوبِ گرامی بنام مقوقس عظیم القبط

(شاہ مصر و اسکندریہ)

بسم الله الرحمن الرحيم

من محمد عبد الله ورسوله إلى المقوقس
عظيم القبط، سلام على من اتبع الهدى
أما بعد فإني أدعوك بدعاية الإسلام،
أسلم تسلم يؤتك الله أجرك مرتين
فإن توليت .... فعليك إثم أهل القبط،

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محمدؐ اللہ کے بندے اور اس کے رسول کی جانب سے مقوقس عظیم قبط کے نام۔ اس پر سلام ہو جو ہدایت کا اتباع کرے۔ میں تجھ کو اسلام کی دعوت دیتا ہوں اسلام قبول کر سلامت رہے گا اور اللہ تعالیٰ تجھ کو دوہرا اجر عطا فرمائے گا۔ اگر تو نے اس دعوت سے اعراض کیا تو

يا اَهل الكتاب تعالوا الٰى كلمة سواءٍ بيننا و بينكم الّا نعبد الّا الله ولا نشرك به شيئًا ولا يتّخذ بعضنا بعضًا اربابًا من دون الله فان تولّوا فقولوا اشهدوا بانّا مسلمون ٥

(زرقانی)

تمام قبط کے حق نہ قبول کرنے کا گناہ تجھ پر ہوگا۔

"اے اہل کتاب ایسی سیدھی بات کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان مسلّم ہے جو یہ ہے کہ ماسوائے حق تعالیٰ کے کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ بنائیں اور ہم میں سے بعض بعض کو سوائے خدا کے رب نہ بنائے" پس اگر وہ اس سے اعراض کریں تو کہہ دو کہ" گواہ رہو کہ ہم مسلمان اور اللہ کے فرمانبردار ہیں"۔

یہ گرامی نامہ حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ کی معرفت شاہ مصر و اسکندریہ کو سے ہجری میں ارسال کیا گیا۔ اس گرامی نامہ کا اسلوب بیان اور اس کے الفاظ اس گرامی نامہ سے مماثل ہیں جو "عظیم الروم" کو ارسال کیا گیا تھا جشکوہ الفاظ اور جزالت کلام میں یہ مکتوب گرامی بھی فصاحت کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام زیشان کی یہ ایک اہم خصوصیت تھی کہ آپ کا کلام مختصر مگر جامع ہوتا تھا۔ آپ نے حضور والا مرتبت کے یہ چند گرامی نامے ملاحظہ کیے یہ خصوصیت ہر والا نامہ میں موجود ہے۔ اور سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کا یہ ایجاز بھی ایک اعجاز تھا۔

خطبات میں چونکہ مکتوبات کے مقابلہ میں بسط سخن کا خاص محل ہوتا ہے اس لئے سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم اس موقع اور محل کے خاص اداشناس تھے لہٰذا حضور والا صلی اللہ علیہ وسلم نے گرامی قدر مکتوبات میں اس ایجاز کو ہمیشہ پیش نظر رکھا، مکتوبات اور خطبات کا یہ مابہ الامتیاز آپ کو خطبات والا کے مطالعہ کے بعد صاف نظر آئے گا۔ اس وصف خاص کی وضاحت کے لیے ضروری ہے کہ میں چند خطبات گرامی بھی پیش کروں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبات گرامی کی فصاحت و بلاغت

اس عنوان کے تحت مجھے سرور ذیشان صلی اللہ علیہ وسلم کے چند گرامی خطبات پیش کر کے اُن کی فصاحت و بلاغت اور ان کی بسط و تفصیل کے سلسلہ میں عرض کرنا ہے لیکن اس سے قبل میں چاہتا ہوں کہ مختصراً لفظ" خطبہ کے بارے میں کچھ عرض کر دوں۔ خطبہ کسی فرد یا افراد سے خطاب کرنا ہے جس میں حسب محل و موقع ضروری اُمور پیش کئے جاتے ہیں، آپ شاید یہ خیال کریں کہ خطبہ تو ہر جمعہ کی نماز سے قبل پڑھا اور سنا جاتا ہے پھر اس تصریح کی کیا ضرورت! آپ کا خیال بجا ہے مجھے یہاں یہی بتانا مقصود ہے کہ خطبہ جو جمعہ کی نماز سے قبل پڑھا اور سنا جاتا ہے، اپنے حقیقی معنوں میں خطبہ نہیں بلکہ علمائے کرام نے حمد و ثنا، نعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم، مناقب صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اور چند احکام دین پر مشتمل احکام الٰہی اور ارشادات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر مشتمل مضامین کو تالیف کر دیا ہے، چونکہ ان کا سننا موجب فلاح دارین ہے اس لیے عربی زبان میں اس حمد و نعت منقبت و

چند احکامِ دین کی مُستدل آیاتِ قرآنی و احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو جو مدتوں پہلے مدّون و مرتب ہوئے تھے علی حالہ ہمارے سامنے خطیب اُن کو پیش کرتا ہے اور ہم اُن کی سماعت سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں۔ چونکہ یہ خطیب کا حاضرینِ مسجد سے خطاب ہوتا ہے اس لئے اس کو خطبہ کہا جاتا ہے اور اس کا سننا واجب قرار دیا گیا ہے۔

عہدِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں خطبات اس مفہوم تک محدود و محصور نہیں تھے بلکہ حمد و ستائش ہی کے بعد سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم احوالِ حاضرہ پر تبصرہ فرماتے تھے۔ ضروریاتِ دین سے آگاہی عطا فرماتے: وحی الٰہی کے ذریعہ جو احکام دین و معاشرت اور اخلاق کے سلسلہ میں نزول فرماتے اُن سے مطلع فرماتے، تبلیغِ رسالت اور دعوتِ اسلام کے سلسلہ میں ضروری امور سے مستفیض فرماتے، غزوات و سرایا کی تیاری کے سلسلہ میں جو باتیں قابلِ ذکر ہوتیں یا جو ضروری احکام ہوتے وہ ارشاد فرماتے، مالی تعاون کی انصار و مہاجرین کو ترغیب دیتے اور اس کے اجر کی نوید سے شاد کام فرماتے، انصرامِ ملکی کے بارے میں ارشاد ہوتا، عاملین کے تقرر کی خبر دیتے! آج بھی حج کے موقع پر میدانِ عرفات کی مسجدِ خیف میں جو خطبہ دیا جاتا ہے اس میں بھی حمد و ثنا، نعت و منقبت کے بعد عالمِ اسلام کو پیش آمدہ مسائل اور اسلامی دنیا کو درپیش مشکلات کے حل کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے یہ خطبہ ہمارے مدونہ و مولفہ خطبات جمعہ سے بالکل جداگانہ چیز تھی، اگرچہ اسلوب اور نظمِ بیان میں قدرے مماثلت پائی جاتی ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس خطبات کے متضمنہ امور بھی کچھ ہوتے تھے (میں نے جن کو بہت مختصر طور پر بیان کیا ہے) اور یہ ضروری نہیں تھا کہ یہ خطبہ جمعہ کی نماز سے قبل حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے تھے بلکہ حسبِ موقع جہاں بھی ضرورت محسوس فرماتے تو نماز سے قبل یا نماز کے بعد سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم، اصحاب کرام رضؓ سے خطاب فرماتے۔ یہ خطبات بسیط و طویل بھی ہوتے تھے اور مختصر بھی!

حضرت ابو سعید خُدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن نماز عصر کے بعد خطبہ دیا جس میں آپ نے فرمایا:

> "سنو! دنیا بڑی تروتازہ اور شادات ہے، خبردار ہو کہ اللہ تعالیٰ تم کو اس میں (اہتمام و انصرام اور تنظیم حیات کے لیے) چھوڑنے والا ہے! ہوشیار رہنا اور دیکھنا کہ تم کیسے عمل کر رہے ہو، دنیا پرستی سے بچنا، عورتوں سے بھی بچتے رہنا اور خبردار! کسی کو حق بات کہنے میں۔ جبکہ وہ حق کو جان لے" لوگوں کا خوف مانع نہ ہو!

حضرت ابو سعید خدری فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح ارشاد فرماتے اور خطبہ دیتے رہے یہاں تک کہ دھوپ ختم ہو گئی اور اس کی وہ سرخی باقی رہ گئی جو کھجور کی شاخوں پر تھی، اس وقت (دن ڈھلتا دیکھ کر) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد کیا کہ

> "دنیا اب اتنی ہی باقی رہ گئی ہے جتنا کہ آج کے دن میں اب یہ وقت باقی رہ گیا ہے۔"

حضرت ابو سعید خُدری رضؓ فرماتے ہیں کہ اس وقت دن دو گھڑی سے بھی کم باقی رہ گیا تھا۔" اس طرح یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک

طویل خطبہ تھا۔ بعض اور مواقع پر بھی آپ نے طویل خطبے ارشاد فرمائے ہیں لیکن عموماً آپ کے خطبات مختصر ہوتے تھے، جمعہ کی نماز سے قبل دیئے جانے والے خطبہ کے سلسلہ میں تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ " نماز کو طویل کرو اور خطبہ کو مختصر"!!

میں یہاں سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے صرف دو خطبات پیش کروں گا اور ان کی فصاحت و بلاغت کی نشاندہی کروں گا، ایک خطبہ وہ ہے جو فتح مکہ کے دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خانہ کعبہ کے دروازہ پر ارشاد فرمایا اور دوسرا خطبہ وہ ہے جو "خطبہ حج الوداع" کے عنوان سے معنون ہے!

فتح مکہ کے دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کرتے ہوئے جب درِ کعبہ پر تشریف فرما ہوئے تو یہ خطبہ ارشاد فرمایا:

"لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰہ وَحْدَہٗ لَا شَرِیكَ
لَہٗ صَدَقَ وَعْدَہٗ وَنَصَرَ عَبْدَہٗ وَ
هَزَمَ الْاَحْزَابَ وَحدہ، اَلَا كُلُّ مَاثَرَۃٍ
او دم و ما یدعی فھو تحت قدمی ھاتین
الّا سدانۃَ البَیْتِ وسقایۃ الحاج
اَلا وَ قتیلِ الخطآءِ شبہ العَمد
بِالسَّوطِ والعصا ففیہ الدِّیت مُغلّظہ
من الابل اربعون فی بُطونِھا اولادِھا
یا معشرِ قریش! اِنَّ اللہ قَدْ اذھب
عنکم نخوۃ الجاھلیّۃ وتعظمھا بالاباءِ
النّاس من ادمَ و ادم مِن تراب ثم۔
تلا ھذا الآیۃ، یَآ یُّھَا النَّاسُ
اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى
وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا
اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ
اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ ہ ثُمَّ قال
یامعشر قریش ماترون انّی فاعل بِکُمْ
(قالوا خیرا اخ کریم وابن اخ کریم)
قال فانّی اقول لکم کما قال یوسف لِاخوتہٖ

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور کوئی اس کا شریک نہیں
ہے، اس نے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا اپنے بندے کی
مدد کی اور دشمن کی جماعتوں کو اس نے تنہا شکست
دی! آگاہ ہو جاؤ! تمام خصلتیں (جانی ہوں یا مالی) جس
کا دعوی کیا جائے وہ سب میرے قدموں کے نیچے ہیں
بجز ان دو کے یعنی بیت اللہ کی دربانی اور حاجیوں
کو پانی پلانا۔
آگاہ ہو جاؤ! جو شخص خطا سے شبہ اور عمداً
قتل کیا جائے یا کوڑے یا لاٹھی سے مارا جائے اس کی
دیت مغلظہ ہے یعنی سو اونٹ جن میں چالیس حاملہ اونٹنیاں ہیں
اے گروہ قریش! اللہ تعالیٰ نے جاہلیت کی نخوت اور
غرور اور آباؤ اجداد پر فخر کرنے کو باطل کر دیا ہے سب لوگ
آدم سے پیدا ہوئے ہیں اور آدم مٹی سے ہیں! پھر آپ نے یہ
آیت تلاوت فرمائی " اے لوگو! ہم نے تم کو مرد اور عورت
(کے ملاپ) سے پیدا کیا اور پھر تم کو شاخوں اور خاندانوں
میں تقسیم کر دیا تاکہ ایک دوسرے کو پہچانو اور حقیقت
میں اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ بزرگ وہی ہے
جو سب سے زیادہ متقی (خدا ترس) ہے اللہ تعالیٰ علیم
خبیر ہے "۔ اے گروہ قریش! تمہارا میری نسبت کیا خیال

ولا تثریب علیکم الیوم اذھبوا فانتم طلقاء۔

ہے کہ میں تم تمہارے ساتھ کیا معاملہ کروں گا؟ لوگوں نے کہا بھلائی کا۔ آپ شریف بھائی ہیں اور شریف بھائی کے بیٹے ہیں! آپ نے فرمایا، میں تم سے وہی کہتا ہوں جو یوسف (علیہ السلام) نے اپنے بھائیوں سے فرمایا تھا: "تم پر اب کوئی عتاب نہیں جاؤ، آج تم سب آزاد ہو!!

اس فصیح و بلیغ خطبہ میں جس کے الفاظ میں ایک روحِ انقلاب کروٹ لے رہی ہے اور مساوات انسانی کا اس میں ایک ایسا درس پنہاں ہے جو نخوت و جبروت کے بتوں پر ایک ضرب کاری ہے، غور کیجیے کہ کس قدر متانت ہے اور کیسے دھیمے لہجہ میں انسانیت کی تقدیس کا سبق دیا گیا ہے، چند الفاظ ہیں جن میں معانی کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ یہی خطابت کا کمال ہے۔ اس خطبہ نے ایک ایسی انقلابی روح کو بیدار کیا جو آج بھی زندہ و پائندہ ہے۔

"صدق وعدہٗ ونصر عبدہٗ وھزم الاحزاب وحدہٗ" میں وعدہ، عبدہ اور وحدہ کا تلازم لفظی اور صوتی ہم آہنگی کس قدر لطیف ہے معنی کے اعتبار سے ان تین کلمات کی وسعتوں پر غور کیجیے اور ان میں جو تاریخی پس منظر ہے وہ تاریخ اسلام کے صدہا صفحات پر مشتمل ہے۔ "نخوت الجاہلیۃ" فرما کر عصر جاہلیت کی اخلاقی تاریخ بیان فرمادی ہے اور صرف دو لفظ ہیں۔

"تعظمہا بالآباء" کے ارشاد گرامی سے فخر و مباہات کے وصف اضافی کا سر کچل دیا ہے جس نے نوعِ انسانی کو عظیم اور کم تر کے خود ساختہ درجات میں تقسیم کر دیا تھا۔ "شعوب و قبائل" کی تقسیم کا حقیقی مفہوم اور اسلامی مقصد اُن پر ظاہر فرما دیا۔

"لاتثریب علیکم الیوم" کی نوید درگزر سے ہزاروں سرکشوں اور باطل پرستوں کے سر ہائے پُر غرور کو خداوند تعالیٰ کے حضور میں سجدہ ریز فرما دیا، تاریخ شاہد ہے کہ اس عام معافی اور درگزر نے مکہ کی اجتماعی زندگی کا رُخ کس صحیح سمت میں موڑ دیا۔

الفاظ کا تلازم، ان کی سلاست اور جزائت، معانی اور بیان کے متعدد نکات اس خطبہ میں موجود ہیں جو فصاحت زبان و بیان کے لوازم ہیں۔

خطبہ حجۃ الوداع اور کمالِ فصاحت و بلاغت

سنہ ہجری کا یہ حج حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری حج تھا اور حضور نے جو خطبات یہاں دیئے وہ آخری خطبات تھے، میدان عرفات اور منیٰ کے مقام پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خطبات ارشاد فرمائے وہ اجتماعی خطبات تھے۔ حج سے واپسی پر ہی غدیر خُم کے مقام پر ایک خطبہ ارشاد فرمایا وہ صحابہ کرام کی مخصوص جماعت سے خطاب تھا، یہ عرفات اور منیٰ جیسا اجتماعی خطبہ نہ تھا۔ مصدقہ روایت کی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ عرفات کے میدان میں آپ نے قصویٰ پر تشریف رکھتے ہوئے جو خطبہ ارشاد فرمایا اس وقت ایک لاکھ سے زیادہ مسلمانوں کا اجتماع تھا اور یہاں جو احکام دین آپ نے مسلمانوں کی اجتماعی اور معاشرتی اور اسلامی مملکت کی فوز و فلاح کے لیے ارشاد فرمائے وہ آخری اجتماعی ارشادات تھے جس کا علم سرورِ ذیشان صلی اللہ علیہ وسلم کو تھا اور آپ نے بلیغ اشارے بھی عرفات اور منیٰ کے خطبات میں اس طرف فرمائے۔

میں یہاں اس گرامی اور عظیم خطبہ کی فصاحت و بلاغت کے اظہار کے لئے اگر اس کا متن پیش کروں تو مزید چند صفحات درکار ہوں گے اور اگر صرف ترجمہ پیش کروں تو مقصود حاصل نہیں ہوگا، اس لئے خطبہ کے متن گرامی کو پیش کرنے سے صرفِ نظر کرتے ہوئے صرف اتنا عرض کروں گا کہ اس خطبہ میں بھی کلام کی جامعیت اپنے نقطۂ کمال پر ہے۔ اس عظیم اجتماع میں صرف مدینہ منورہ کے مسلمان اور مکہ مکرمہ کے اصحاب ایمان ہی شامل نہیں تھے بلکہ دور دراز کے قبائل بھی شامل تھے تاکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں یہ سعادت حاصل کر سکیں، ان حضرات کے روبرو حضور اکرم ﷺ نے جو خطاب فرمایا اور طویل و بسیط خطبہ ارشاد کیا اس کی زبان ان تمام بطانتوں کی حامل تھی جو ایسے مختلف قبائل کے افراد کے لیے یسیر الفہم اور اثر آفریں ہو، چنانچہ آپ کے ارشادِ گرامی کی زبان، زبان کی تمام خوبیاں یعنی فصاحت و بلاغت، جزالت اور کلام کا نظم، ترتیب اپنے نقطۂ عروج پر تھا۔

حج الوداع کا خطبہ اسلامی قانون کا مغز، شریعت اسلامیہ کا خلاصہ، مدنی اور اجتماعی زندگی کی روح کو اپنے اندر سموئے ہوئے تھا۔ اس عظیم خطبہ کے چند جملے اپنے قول کی تائید میں ضرور پیش کروں گا، نسئی (لوند کا مہینہ۔ سال کے بارہ مہینوں میں اضافہ کر دینا) عرب جاہلیت کا قدیم دستور تھا، محض اس لیے چار واجب الاحترام مہینوں کی پابندیوں سے نجات مل سکے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح طور پر اس کی حرمت کا اعلان فرمایا اور ارشاد کیا:

یاایھا الناس! انما النسیٔ زیادۃٌ فی الکفر یضل بہ الذین کفروا یحلونہ عاما و یحرمونہ عاماً لیواطئوا عدۃ ما حرم اللہ فیحلوا ما حرم اللہ	اے لوگو! احترام والے مہینوں کا غیر احترام والے مہینوں سے اُدل بدل کرنا کفر ہے (جس میں مومن آلودہ نہیں ہو سکتا) جو ہر سال چار مہینوں میں سے ایک مہینہ آئندہ سال کے حساب میں ڈال دیتے ہیں اور آنے والے سال میں اس کو بدستور قائم رکھتے ہیں یہ بھی خداوند تعالیٰ کی طرف سے حرام کردہ امور کو حلال کر لینا ہی ہے۔

(سورۃ توبہ)

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ نسئی کے وسیع مفہوم کو کس انداز سلاست کے ساتھ " یحلونہ عاما و یحرمونہ عاماً " کے بلیغ الفاظ میں بیان فرمادیا ہے اور نسئی کے ذریعہ مہینوں میں جو الٹ پلٹ کی جاتی تھی اس کو " زیادۃ فی الکفر " کے جامع الفاظ سے ظاہر فرمادیا۔ اسی عظیم الشان خطبے میں آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا جس سے نسئی کا ابطال ہوتا ہے۔

و ان الزمان استدار کھیئتہ یوم خلق السموٰت والارض!	اور دیکھو! زمانہ ہر پھر کر آج اسی نقطہ پر آگیا جس پر اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا تھا۔

علمِ ہئیت اور فلسفہ زماں کے بہت سے نکات ہیں جو اس ارشادِ والا میں پنہاں ہیں اور ایک بلیغ اشارہ سے اس امر کی طرف کہ آج حج، ذی الحجہ کی ۹ تاریخ کو اپنے صحیح وقت اور تاریخ پر ادا ہو رہا ہے ورنہ اس سے قبل نسئی کے بہانے کفار اُلٹ پھیر کرکے ذی الحجہ کے علاوہ دوسرے مہینوں میں حج کر لیتے تھے اور مہینوں کی ترتیب کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتے تھے۔

اس عظیم خطبے میں معاشرتی، تمدنی، اخلاقی اور دینی مسائل عجیب جامعیت اور ایجاز کے ساتھ بیان ہوتے ہیں، اُن ہی خصوصیات

کے باعث حج الوداع کا خطبہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام خطبات میں بہت اہم سمجھا جاتا ہے لیکن میرا موضوع چونکہ خطبات کی مضمنات نہیں ہیں اس لیے میں تمام و کمال خطبۂ اور اس کے معانی و مطالب پیش نہیں کروں گا صرف ایک نکتہ کی وضاحت کے لیے گرامی قدر ارشادات سے یہ چند مقدس کلمات اده تحریر کر رہا ہوں۔

اس خطبہ کے افتتاحیہ کلمات یہ تھے:

فاعقلوا ایھا الناس قولی فانی قد بلغت وقد ترکت فیکم ما ان اعتصمتم بہ فلن تضلوا ابدا امراً بیناً کتاب اللہ و سنۃ رسولہ۔	اے لوگو! غور کرو۔ غور سے سنو! میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس کی تبیین و توضیح کے لئے میں جو چیزیں تم میں چھوڑے جا رہا ہوں اُس کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے رہو گے تو کبھی گمراہ نہیں ہوگے اور وہ چیز تو بجائے خود ایک کھلی چیز ہے یعنی خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت!!

میں نے ایک موقع پر عرض کیا ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاداتِ گرامی، اللہ تعالیٰ کے اِس گرامی فرمان کی توضیح و تصریح ہے۔ وَاَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْھِمْ ہ اس حکم کی توثیق اس آخری خطبے میں موجود ہے کہ خدا کی کتاب اور اس کی توضیح و تشریح سنّت رسول اللہ ہے اگر اس پر عامل رہو گے اور مضبوطی سے اس کو پکڑے رہو گے تو کبھی گمراہ نہ ہو گے حج الوداع کے طویل و بسیط خطبہ میں حکمت کے انمول موتی موجود ہیں فکر و تدبر کی ضرورت ہے، الفاظ کی سلاست و جزالت کے اعتبار سے دیکھیے قرآن میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو لوازم بلاغت ہیں! جو اقتباس میں نے بصیرت اندوزی کے لیے پیش کیا ہے وہ بظاہر چند الفاظ کا مجموعہ ہے لیکن معانی کی ایک وسیع دنیا اُن کے اندر موجود ہے۔

حج الوداع کے موقع پر اس خطبہ کا بسیط و مفصل ہونا بھی عین بلاغت ہے کہ مقتضائے حال یہی تھا، آپ کے اس قدر تفصیلی خطبات بہت کم ہیں، اس عظیم خطبہ کا اسلوب بیان بہت ہی سادہ اور سلیس ہے، کلام کے اغراض و مقاصد سے سرمو تجاوز نہیں فرمایا ہے بلکہ عوام کی فکر و نظر کو ایک ایسا راستہ دکھایا ہے جہاں اُن کے بھٹکنے کا کوئی خطرہ نہیں ہے!!

اَدعِیّہ ماثورہ اور اُن کی فصاحت و بلاغت

حکیمانہ احکام اور طبیبانہ ارشادات کے ساتھ ساتھ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعائیں بھی فصاحت و بلاغت کی دنیا میں ہی بلند مقام رکھتی ہیں! سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم بارگاہ بے نیاز میں جب دست دعا بلند فرماتے اور اس وقت خضوع و خشوع کے عالم میں لسان حقیقت ترجمان سے جو کلمات ادا ہوتے تو صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین کے سینوں میں یہ کلمات بھی اسی طرح محفوظ ہو جاتے جس طرح وہ ارشادات جو احکام یعنی اوامر و نواہی اور قرآن حکیم کے احکام کی تشریح و توضیح پر مشتمل ہوتے، اُن اصلاحی، معاشرتی اصلاح پر مبنی ارشادات کو جس طرح ان کے حافظے اپنے سینوں میں محفوظ کر لیتے تھے اور جن

کو احادیث کے مجموعوں کی شکل میں کچھ مدت کے بعد قید کتابت میں لے آیا گیا اسی طرح یہ ادعیہ ماثورہ بھی محفوظ کر لی گئیں، ان میں بہت سی دعائیں تو وہ ہیں جن کو نماز پنجگانہ کے بعد سرور ذیشان صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق بارگاہ ایزدی کے یہ نیاز مند بندے تا حیات اپنا ورد بنائے رہے اور اُن کو محفوظ کر کے ہمارے لئے بھی عجز و نیاز کا سرمایۂ وقیع فراہم کر دیا اور الحمد للہ کو آج بھی اُن ادعیۂ ماثورہ میں سے بہت سی دعائیں مسلمانوں کا ورد ہیں اور بارگاہ ایزدی میں حصول قرب اور مغفرت اور بخشش کی طلب کا سرمایہ ہیں۔

چونکہ فصاحت و بلاغت آپؐ کے بیان کے ایسے ظاہری و معنوی اوصاف تھے جو کسی حال میں اور کسی وقت بھی آپ کے کلام سے جدا نہیں ہوتے تھے گویا اس کا جزو لاینفک تھے، جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے کہ فصیحان عرب کے کلام کے مقابل میں ان خوبیوں کو اپنے کلام میں پیدا کرنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ غور و فکر سے کام لینے کی ضرورت پڑتی تھی اور نہ اُن کے لیے تکلف اور اہتمام کیا جاتا تھا۔ آپ کا رب کریم۔ آپ کی زبان اقدس سے بیساختہ ایسا کلام جاری کر دیتا تھا۔ یہ تمام ذخیرہ ارشادات و احکامات، توضیحات و تشریحات احکام الٰہی ربانی جو امور تشریعی کی حیثیت رکھتے ہیں، ایک الہامی چیز تھی اس لئے آپ کو اپنے کلام کی تزئین کی ضرورت کبھی پیش نہیں آئی، جو کچھ آپ جس وقت بھی ارشاد فرماتے وہ زبان و بیان کے تمام کمالات سے آراستہ ہوتا، اس لئے آپ کو بے معنی طریقوں کو اپنانے کی ضرورت کبھی پیش نہیں آئی اور نہ آپ نے کبھی کسی فصیح و بلیغ قبیلہ کی زبان کا خاص طور پر تتبع کیا، آپ کے ارشادات گرامی سے فن بلاغت کے مبانی و مبادیات، اصول و قواعد تو خود مرتب اور اخذ کے گئے، پر اس الہامی اور توفیقی کلام کو کسی خاص قبیلہ کی فصیح زبان کو اپنانے کی کیا ضرورت تھی۔ آپ کی زبان اور روزمرہ وہی تھا جو قریش کی زبان اور اُن کا روزمرہ تھا اور قبیلہ بنی سعد (جس میں آپ کی نشوونما ہوئی تھی) کا نہج و اسلوب تھا۔ البتہ کبھی ایسا ہوتا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے کوئی خاص لفظ موقع و محل کی مناسبت سے ادا ہوتا تو بعض سامعین کو یہ گمان گزرتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نیا لغت استعمال فرمایا ہے، اس موضوع پر جب صحابۂ کرام باہم گفتگو کرتے تو حاضرین میں سے کوئی نہ کوئی صاحب شعرائے قریش یا شعرائے عصر جاہلیت کے کلام سے اس کی سند پیش کر دیتے تھے، اس کے یہ معنی نہیں تھے کہ آپ کے الفاظ کا ماخذ کسی شاعر کا کلام ہوتا تھا بلکہ یہ ظاہر ہو جاتا تھا کہ اس لفظ میں غرابت نہیں ہے اور یہ نامانوس لغت نہیں ہے بلکہ فصیحان عرب اس کو استعمال کر چکے ہیں۔ آج بھی بہت سے عربی لغات کی سند شعراء کے کلام ہی سے پیش کی جاتی ہے

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام اقدس کا موضوع، ہر چند کہ مختلف اوقات اور مختلف احوال و مواقع پر متنوع ہوتا تھا لیکن کلام اقدس کی خوبیاں ہر حال میں اور ہر موقع پر علی حالہا قائم رہتی تھیں۔

فرامین ہوں یا مکتوبات، عہدنامے ہوں یا وثیقہ جات، خطبات ہوں یا دعائیں بیان و زبان کی یہ خصوصیتیں ہر نوع کے کلام اور ارشاد کے ساتھ مختص ہوتی تھیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب تبوک سے واپس مدینہ منورہ تشریف لائے تو بنی فزارہ کا ایک وفد حاضر خدمت ہوا۔ یہ وفد چوبیس افراد پر مشتمل تھا، خارجہ بن حصین اور حسن بن قیس بن حصین اس وفد کے قائدین میں سے تھے یہ سب حضرات دولت ایمان سے سربلندی حاصل کرنے کے بعد خدمت گرامی میں شرف اندوز سعادت ہوئے ان لوگوں نے اپنے علاقہ کی خشک سالی، باغات اور کھیتوں کی تباہی، جانوروں کی ہلاکت اور اہل و عیال کی فاقہ کشی کا حال بہت ہی اندوہناک انداز میں بیان کیا اور استدعا کی کہ ہمارے لیے بارش کی دعا فرمائیے ان کی استدعا پر سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر تشریف لے گئے اور دعائے استسقاء کے لیے دست ہائے مبارک بلند فرمائے

اور ان الفاظ میں دعائے استسقا فرمائی!!

اَللّٰھُمَّ اسقِی بلادکَ وبھائمکَ وَ انشر رَحمتکَ واحی بلادکَ المیّت ،
اَللّٰھُمَّ اسقنَا غیثاً مغیثاً مریحًا مریعًا طبقًا اسِعًا عاجلاً غیر اٰجلٍ، نافعًا
غیر ضارٍ، اَللّٰھُمَّ سقیا رحمۃ لا سقیا عذابٍ وَلا ھدمٍ ولاَ غرقٍ ولامحق
اَللّٰھُمَّ اسقنا الغیث وَ انصُرنا عَلَی الاعداء ۔

ان کلمات طیبات کی صوتی ہم آہنگی، ان کا مسجع اور مقفیٰ ہونا، ایک اعجاز ہے، "غیثاً مغیثاً مریحًا مریعًا طبقًا" کی جزالت اور ان کا زورِ تالیف، ان کے معانی کی وسعت، سبحان اللہ، زبان ان کی خوبیاں کس طرح ادا کر سکتی ہے "عاجلاً غیر اٰجلٍ" اور "نافعًا غیر ضار" جزالت و بلاغت، علم بدیع کی خوبیاں، صل علیٰ سبحان اللہ!! صرف اسی ایک دعا میں کلام کی یہ فصاحت محصور نہیں ہے، احادیث کی کتب میں متعدد ادعیہ ماثورہ محفوظ ہیں ہر ایک میں بیان کی یہ خوبیاں اور فصاحت کے یہ لوازم موجود ہیں۔

حضور ہادئ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا اُمت پر یہ لطف و کرم ملاحظہ کیجئے کہ صبح سے شام اور شام سے صبح تک ہر وظیفہ حیات کے لئے دعاؤں کا بیش بہا، گرانمایہ ذخیرہ موجود ہے جن سے عجزِ بندگی، اقرارِ عبدیت، خضوع و خشوع اور شکرِ الٰہی کی نعمتوں کا حصول ہوتا ہے میں ان دعاؤں میں سے چند بھی اگر یہاں پیش کروں تو اس مضمون کی طوالت ظاہر ہے جس کو میں کم سے کم صفحات میں محصور و محدود کرنا چاہتا ہوں پھر یہ کہ یہ ادعیہ ماثورہ زیادہ تجسس اور تلاش کی طالب نہیں ہیں ادعیہ ماثورہ کے نام سے ان کے مجموعے جداگانہ بھی شائع ہو چکے ہیں اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس اوراق میں بھی یہ تمام دعائیں محفوظ ہیں ۔ مجھے تو یہ سلسلۂ موضوع یہ عرض کرنا تھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب بارگاہِ الٰہی میں انعام و اکرام الٰہی پہ اظہارِ شکر اور خضوع و خشوع بندگی کے لیے جب دستِ دعا بلند فرماتے تو یہ دعائیہ کلمات بھی اُن خوبیوں سے عاری نہیں ہوتے تھے، اس کی وجہ یہ تھی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ وصف یعنی فصاحت آپ کی ایک امتیازی خصوصیت تھی جس میں آپ کا کوئی شریک و مثیل نہیں تھا اور اس کی بلندی کا یہ عالم کہ انسان کا فہم ناقص اس کی بلندی کا اندازہ نہیں لگا سکتا اور نہ اس کا تعلق اکتساب سے تھا۔ ہر چند کہ اہل عرب کلام کی تہذیب و تزئین میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے اور انہوں نے اپنے کلام کو محاسن سے آراستہ کرنے کے لیے بڑی جد و جہد کی تھی لیکن وہ اپنے اسلاف کی حدود سے آگے نہ بڑھ سکے ان کے غور و فکر سے ان کے لیے نئے راستے پیدا نہیں ہوئے اس لیے جو کچھ تھا وہ محض تقلیدی تھا! اصول اور قواعد کے تحت کچھ بھی نہ کر سکے، زیادہ سے زیادہ یہ کیا کہ تکلف اور تصنع کی ہمت میں اُن کے قدم کچھ آگے بڑھ گئے، زبان میں کچھ اور سلجھاؤ پیدا ہو گیا لیکن کلام میں پاکیزگیٔ خیال اور روحانی انداز چونکہ بالکل ناپید تھیں لہٰذا اپنی کاوشوں اور جد و جہد کے باوجود وہ اپنے کلام اور زبان کو انتشار و اضطراب سے نہ بچا سکے اور بسا اوقات ان کا کلام شانِ بلاغت سے بھی گر جاتا تھا یعنی مقتضائے حال کی پابندی کما حقہٗ نہیں ہوتی تھی، ان کے کلام میں ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ ایک کلمۂ خوب کو ان کے کلام سے ہٹا کر دوسرا کلمۂ خوب تر وہاں رکھا جا سکتا ہے یا ایک لفظ سے بہتر لفظ کا انتخاب اس محل کے لئے ہو سکتا ہے یہ نقص بھی منافی فصاحت ہے ۔

موضوع اور مضامین کے باب میں ان فصحائے عرب کے دامن خالی ہیں وہ زیادہ سے زیادہ یہ کرتے کہ اپنے تجربات کے اخذ کردہ نتائج

کو بیان کر دیتے یا ایک دوسرے سے جو کچھ اپنے اسلاف کے فضائل کے باب میں سُنا تھا اس کو بیان کر دیتے تھے، صرف اُن کی شاعری متنوعہ مضامین کا مجموعہ تھی جس کا پس منظر نفس پرستی اور عیش کوشی تھا اخلاقی زندگی کے اعلیٰ اقدار کی اُن کی شاعری کو ہوا بھی نہیں لگی تھی، میں عہد جاہلیت کے قصائد کی تشابیب کے سلسلہ میں اس کی وضاحت کر چکا ہوں۔

ان تشابیب کے لگے بندھے موضوعات پر وہ الفاظ کی ملمع سازی ضرور کر لیا کرتے تھے اور اس پر ان کے کلام (شاعری) کی بلند و بالا عمارت تعمیر ہوتی تھی، اس کے برعکس ہادیٔ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے متنوعہ موضوعات اس کثرت سے تھے کہ ۲۳ سال تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کلام فصاحت التیام کے ذریعہ مسلمانوں کی معاشی اور اخروی امور کی تربیت اور اصلاح فرماتے رہے یہ موضوعات اس کثرت سے ہیں کہ چند صفحات میں ان کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کی ضرورت بھی نہیں کہ ہر مسلمان معاش و معاد کے ان موضوعات سے آگاہی رکھتا ہے

تدبیر منزل، تہذیب اخلاق اور سیاست مُدن کے صدہا شعبے ہیں اور ہر شعبۂ حیات کی اصلاح و تربیت کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات گرامی موجود ہیں، اسی طرح معاد (حیاتِ اخروی) ہے یعنی حشر و نشر، صراط، میزان، جنت و دوزخ، فردِ اعمال حساب و کتاب، شفاعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے اخروی معاملات پر مشتمل وسیع موضوعات و امم سالقہ اور قصص القرآن کی تفصیلات زمان و مکان کے مباحث اور ان جیسے بیشمار موضوعات، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حکمت بالغہ کے روبرو تھے اس لیے ان کے بیان کے لیے نہ آپ کو غور و فکر کی ضرورت تھی اور چونکہ حضور سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم افصح العرب تھے اس لئے نہ کلام کی تزئین کے لیے آپ کو کسی تکلف کی ضرورت تھی اور نہ کسی فنی اصول اور قاعدے کو اپنانے کی!

آپ کا کلام مقتضائے حال کے عین مطابق ہوتا، اختصار کے موقع پر اختصار اور بسط و تفصیل کے محل پر بسط و تفصیل کلام میں نہ کوئی لفظ زیادہ نہ کوئی کم!

کلام کی لفظی نظافت و لطافت کا یہ عالم کہ کوئی کریہہ یا ناشائستہ لفظ بیان میں کبھی دخل نہ پا سکا اور نہ لسانی لغزش کا امکان! معنویت کے اعتبار سے اس میں وہ رفعت اور بلندی کہ روح وجد میں آ جائے، دلنشینی اور اثر آفرینی کا یہ عالم کہ کفارِ مکہ کا جب آپ سے سامنا ہوتا اور وہ آپ زبانی کسی کو سناتے ہوئے پاتے تو کانوں میں انگلیاں دے لیتے ان کو ڈر ہوتا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام اگر سن لیا تو پھر یقیناً آبائی دین کو ترک کرنا پڑے گا۔ عرب کے مشہور فصیح اور ادیب ولید بن مغیرہ کا قول اس سے قبل میں پیش کر چکا ہوں۔

کفار جب آپؐ کا کلام سنتے تو کلام کی اثر آفرینی اور دل نشینی ان کی کایا پلٹ دیتی تھی، آپ کے اسلوب بیان کی دلکشی اور اثر آفرینی کا یہ عالم تھا کہ الفاظ مقدس دل میں اترتے چلے جاتے تھے۔ آپ کا یہ اسلوب بیان مقتضائے حال اور ظاہری تقاضوں کے عین مطابق ہوتا تھا۔ بدویت کے ماحول میں پرورش پانے والوں کے سامنے جب آپؐ اسلام پیش فرماتے اور دین کے اغراض و مقاصد سے اُن کو آگاہ فرماتے تو ان بلند مطالب کو ذہن نشین کرانے کے لئے اُن کے ماحول سے مناسبت رکھنے والی تمثیلات و تشبیہات آپؐ استعمال فرماتے۔

آپ کا کلام والا صرف اُن مضامین و معانی کا حامل ہوتا تھا جو انتہائی عاقلانہ حکیمانہ اور الہامات نبوت اور وحی الٰہی سے ماخوذ ہوتے تھے اور ان خوبیوں پر مستزاد آپ کا دلنشین اور ایسا موثر انداز بیان جہاں تک دوسروں کی رسائی ناممکن! آپ کے کلام و بیان کے یہ تمام محاسن کسبی

نہیں تھے بلکہ وہبی اور توفیقی تھے جب ہی تو کسی کو یہ کہنے کا موقع نہیں ملا اور نہ کوئی یہ کہنے کی جرأت کر سکا کہ ایک اُمّی اور "ایسے حکیمانہ اور بلیغانہ ارشادات" ایسے محکم براہین اور ایسا زبردست استدلال کہ فصیحانِ عرب اور سرداران قریش اپنی اجتماعی کوششوں سے بھی اس استدلال کا بُطلان نہ کر سکے کسی کے سامنے زانوئے ادب نہ تہ کرنے والا ایسا دانشور اور زباندان کہ جزیرہ نمائے عرب کے تمام قبائل کے اسالیب بیان پر قادر، اُن کے روزمرہ سے آگاہ اور محاورات سے واقف، ایسا فصیح و بلیغ کہ فصیحانِ عرب کی زبانیں اس کے حضور میں گنگ و لال !!

زبان دانی کے یہ تمام کمالات آپ کی ذاتِ والا صفات میں ایک معجزہ بن کر نمایاں ہوئے تھے اور اس موہبتِ عظمیٰ کی عطا کے لئے اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی ذات والا کو انتخاب فرما لیا تھا۔ سابقہ اوراق میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کی اِن ہی خوبیوں کو میں نے مثالوں کے انطباق کے ساتھ پیش کیا ہے۔

وما توفیقی اِلّا باللہ

رسول اکرمؐ کے کلام کی فصاحت و بلاغت

محمد نصر اللہ خاں خازن مجددی

کسی انسان کی عظمت کا معیار محض اس کے افکار و نظریات کی ہمہ گیری، جامعیت اور فلاح انسانیت کے لیے ان کی افادیت ہی نہیں۔ بلکہ اس کی سیرت و کردار، اس کی عادات و اطوار اور اس کی رفتار و گفتار بھی اس کی عظمت جانچنے کا بہت بڑا ذریعہ ہوتی ہے۔ عام انسانوں کو افکار و نظریات سے بڑھ کر اس کی سیرت و کردار سے سابقہ پیش آتا ہے۔ جتنا ایک انسان اپنی روزمرہ زندگی میں بلند اخلاق ہوگا، جتنا اس کے معاملات پُر خلوص اور مبنی بر صداقت ہوں گے۔ جتنا وہ اپنی چال ڈھال اور نشست و برخاست میں پُر وقار اور اپنی بول چال اور گفتار میں فصیح و بلیغ ہوگا۔ اتنا ہی لوگ اس کے گرویدہ ہوتے چلے جائیں گے۔ ان کے قلب مفتوح ہوں گے۔ اور ان کے دلوں میں اس کی عظمت و جلالت شان کی دھاک بیٹھ جائے گی جب ہم آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ اس نقطۂ نظر سے لیتے ہیں تو آپ کی سیرت پاک کا ایک ایک پہلو آپ کی عظمت و بلندی کی شہادت دیتا ہے پوری سیرت کمال انسانیت کا بہترین۔ بلکہ ارفع ترین نمونہ نظر آتی ہے۔ جس کا اعتراف ان سیرت نگاروں نے بھی کیا ہے۔ جو آپ پر ایمان لائے اور ان سیرت نگاروں نے بھی جنہیں ایمان کی نعمت نصیب نہیں ہوئی۔

ہم اس وقت صرف آپ کی گفتار کو لے رہے ہیں۔ احادیث اور سیرت کی کتابوں میں آپ کے بے شمار ارشادات اور خطبات نقل ہوئے ہیں۔ زبان و ادب کے نقطۂ نظر سے جب ہم ان پر غور کرتے ہیں تو یہ فصاحت و بلاغت کے انمول موتی معلوم ہوتے ہیں۔ آپ کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے چھوٹے چھوٹے کلمات اپنے معنی و مفہوم میں نہایت جامع اور پُر مغز ہیں۔ گویا کوزے میں دریا بند کئے ہوئے ہیں۔ اور حکمت و دانائی کے شاہکار ہیں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بارے میں خود ارشاد فرمایا ہے۔ اُوْتِیْتُ جَوَامِعَ الْکَلِمِ (مجھے معنی و مفہوم کے لحاظ سے نہایت جامع کلمات عطا ہوئے ہیں) آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عربی زبان کے بعض ایسے محاورے استعمال کئے ہیں جن کا استعمال آپ سے پہلے کسی عرب ادیب و شاعر کے یہاں نہیں ملتا لیکن کچھ عرصہ کے بعد آپ کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے یہی کلمات ضرب الامثال کے طور پر استعمال ہونے لگے۔ ہم محض نمونتہً ایک مختصر سا "گلدستۂ فصاحت" آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔ جو عام قارئین کے لئے بالعموم اور شائقین عربی ادب کے لئے بالخصوص باعث سعادت و افادیت ہوگا۔

حکیمانہ ادب پارے

آپ نے ارشاد فرمایا۔

۱ ـ اِیَّاکُمْ وَخَضْرَاءَ الدِّمَنِ (تم کوڑا کرکٹ کے ڈھیر پر اُگے ہوئے سبزے سے بچو) مراد یہ ہے کہ انسانی زندگی کی ایسی ظاہری خوشنمائی اور چکاچوند سے بچنا چاہیئے۔ جس کی تہہ میں فکر و نظر اور اخلاق کی گندگی اور عفونت ہو۔

۲ ـ کُلُّ الصَّیْدِ فِیْ جَوْفِ الْفَرَا (سب شکار جنگلی گدھے کے پیٹ میں ہیں) جب کسی شخص کی بہت سی حاجتیں اور ضرورتیں ہوں اور ان میں سے سب سے بڑی حاجت پوری ہو جائے تو اس کے بارے میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ الفاظ استعمال فرمائے ہیں یعنی "ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں"۔

۳ ـ مَاتَ فُلَانٌ حَتْفَ اَنْفِہٖ (فلاں شخص اپنے بستر مرگ پر مرا) "ناک کی موت" مرنا سے مراد کسی جنگ میں جام شہادت نوش کئے بغیر طبعی موت مرنا ہے۔ جو شخص راہ خدا میں اس حالت میں بھی مرے اسے آنحضور نے شہید کہا ہے۔

۴ ـ لَا یَنْتَطِحُ فِیْھَا عَنْزَانِ (اس میں دو بکریوں کی کوئی لڑائی نہیں ہے) یعنی اس معاملے میں کسی کو مجال اختلاف نہیں ہے

۵ ـ ھُدْنَۃٌ عَلٰی دَخَنٍ وَّجَمَاعَۃٌ عَلٰی اَقْذَاءٍ ـ نیچے لڑائی کا دھواں سلگ رہا ہے اور اوپر صلح کی اوس، دلوں میں دشمنی کی کسک ہے اور بظاہر اتحاد و اتحاد کی رٹ۔ یعنی بغل میں چھری اور منہ میں رام رام۔

۶ ـ اِنَّ الْمُنْبَتَّ لَا اَرْضًا قَطَعَ وَلَا ظَھْرًا اَبْقٰی (سبزے نے نہ کوئی زمین چھوڑی ہے نہ کوئی سطح مرتفع باقی رہنے دی ہے) ہر طرف سبزہ ہی سبزہ ہے۔ یعنی جب ایمان کی فصل اُگتی ہے تو ہر طرف نیکی اور بھلائی کی ہریالی ہو جاتی ہے۔

۷ ـ اَلْاٰنَ حَمِیَ الْوَطِیْسُ (اب تنور بھڑکا ہے) یعنی معرکۂ کارزار اب گرم ہے۔

۸ ـ اَلْاِیْمَانُ قَیَّدَ الْفَتْکَ ایمان نے فتک کو روک دیا ہے یعنی کسی کو غفلت اور بے خبری کی حالت میں بیٹھے ہوئے یا سوتے ہوئے مار ڈالنے سے روک دیا۔

۹ ـ مِنٰی مُنَاخُ مَنْ سَبَقَ (منٰی اس شخص کی جائے قیام ہے جو وہاں پہلے پہنچے) یعنی اگر کوئی شخص وہاں پہلے آئے تو دوسروں کو اسے وہاں سے ہٹانا جائز نہیں ہے۔

۱۰ ـ اَلدُّعَاءُ سِلَاحُ الْاَنْبِیَاءِ (دعا انبیاء کا ہتھیار ہے) یعنی وہ اپنی مشکلات اور دشمنوں پر قابو پانے کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔

۱۱ ـ حَوَالَیْنَا وَلَا عَلَیْنَا (ہمارے گرد و پیش ہو لیکن ہم پر نہ ہو) آنحضور نے یہ الفاظ غیر متوقع بارش کو دور ہٹانے کے لئے دعائیہ انداز میں ارشاد فرمائے تھے۔ یعنی اے اللہ! یہ بارش ہم پر نہ برسے البتہ ہمارے گرد و پیش بیشک برس جائے۔

۱۲ ـ اَعْقِلْ وَتَوَکَّلْ (پہلے اونٹ کا گھٹنا باندھو پھر اللہ پر توکل کرو) یعنی ہر معاملے میں پہلے اپنی طرف سے پوری کوشش کرنی چاہیئے پھر اللہ پر بھروسہ کرنا چاہیئے۔

۱۳ ـ حَوَالَیْھَا یُدَنْدِنُ (اس کے اقربا بڑبڑا رہے ہیں) یعنی اظہار ناراضگی کر رہے ہیں۔

۱۴ ـ زُرْ غِبًّا تَزْدَدْ حُبًّا (تم کبھی کبھار ملنے جاؤ محبت میں اضافہ ہوگا) یعنی کبھی کبھار کی ملاقات سے باہمی محبت بڑھتی ہے)

۱۵ ـ سَلْمَانُ مِنَّا اَھْلَ الْبَیْتِ (سلمان ہمارے گھر والوں میں سے ہے) یعنی وہ ہمارا خیرخواہ ہے۔ ہمیں اس کی نصیحت قبول

کرنی چاہیئے۔

۱۶ ۔ لَا ضَرَرَ وَلَا ضِرَارَ (ابن ماجہ) نہ کسی کو نقصان پہنچانا روا ہے۔ نہ کسی کو انتقام کی خاطر تکلیف دینا روا ہے۔

۱۷ ۔ رِفْقًا بِالْقَوَارِیرِ۔ آبگینوں کو ٹھیس مت پہنچاؤ۔ یعنی عورتوں سے محبت اور شفقت کے ساتھ پیش آؤ۔

۱۸ ۔ سَبَقَكَ بِهَا عُكَّاشَةُ۔ اس معاملہ میں عکاشہ تم سے سبقت لے گیا ہے۔ کسی کا درجہ دوسرے سے کم ظاہر کرنے کے لئے یہ انداز بیان اختیار کیا گیا ہے تاکہ اسے ناگوار نہ ہو۔

۱۹ اَلنَّصْرُ مَعَ الصَّبْرِ۔ کامیابی صبر کے ساتھ وابستہ ہے۔

۲۰ اَلْمَرْءُ بِالْقَرِینِ۔ انسان دوست سے پہچانا جاتا ہے۔

۲۱ مَنْ جَدَّ وَجَدَ۔ جس نے کوشش کی وہ کامیاب ہوا۔

۲۲ مَنْ ضَحِكَ ضُحِكَ۔ جو دوسروں پر ہنستا ہے۔ دنیا اس پر ہنسے گی۔

۲۳ اَلْحَرْبُ خُدْعَةٌ۔ لڑائی ایک چال ہے۔ یعنی میدانِ جنگ میں چال چلنا بھی لڑائی ہے۔

۲۴ ۔ اَلْحَیَاءُ مِنَ الْاِیْمَانِ۔ حیاء ایمان میں سے ہے۔

۲۵ ۔ اَلصَّبْرُ مِفْتَاحُ الْفَرَجِ صبر راحت و فراخی کی کلید ہے۔

۲۶ ۔ اَلْمَجَالِسُ بِالْاَمَانَةِ مجلسیں امانت (رازداری) سے قائم ہیں۔

۲۷ ۔ حُسْنُ الْخُلُقِ حُسْنُ الْعِبَادَةِ اچھا خلق بہترین عبادت ہے۔

۲۸ ۔ اَلطِّیَرَةُ شِرْكٌ شگون لینا شرک ہے۔

۲۹ ۔ اَلصُّمْتُ اَرْفَعُ الْعِبَادَةِ خاموشی سب سے اعلیٰ درجے کی عبادت ہے۔

۳۰ ۔ اَمِنْتَ مَنْ عَتَبْتَ جس نے تم پر عتاب کیا تم اس کے شر سے (کینہ سے) محفوظ ہو گئے۔

۳۱ ۔ اِمْلِكْ یَدَكَ اپنے ہاتھ کو قابو میں رکھو یعنی تمہارا ہاتھ کسی پر ظلم و زیادتی نہ کرے۔

۳۲ ۔ اِمْلِكْ عَلَیْكَ لِسَانَكَ اپنی زبان کو قابو میں رکھو۔

۳۳ ۔ اِجْتَنِبِ الْغَضَبَ غصے سے اجتناب کرو۔

پُرحکمت تمثیلات

۳۴ ۔ اَلنَّاسُ مَعَادِنُ كَمَعَادِنِ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ خِیَارُهُمْ فِی الْجَاهِلِیَّةِ خِیَارُهُمْ فِی الْاِسْلَامِ اِذَا فَقِهُوْا۔ لوگ سونے چاندی کی کانوں کی مانند کانیں ہیں۔ جو لوگ ان میں سے زمانۂ جاہلیت میں بہتر تھے۔ جب انہوں نے اسلام کو سمجھ لیا تو وہی اسلام میں بھی بہتر ٹھہرے۔

۳۵ ۔ اَصْحَابِی كَالنُّجُوْمِ بِاَیِّهِمْ اِقْتَدَیْتُمْ اِهْتَدَیْتُمْ میرے اصحابؓ ستاروں کی مانند ہیں۔ ان میں سے جس کی

بھی تم پیروی کرو گے ہدایت پا جاؤ گے۔

۳۶ ۔ اَہْلُ بَیْتِیْ کَسَفِیْنَۃِ نُوْحٍ مَنْ رَکِبَ فِیْھَا نَجَا وَمَنْ تَخَلَّفَ عَنْھَا ھَلَکَ میرے اہل بیت کی مثال سفینۂ نوح کی ہے جو اس میں سوار ہو گیا۔ وہ پار ہو گیا جو پیچھے رہ گیا۔ وہ ہلاک ہو گیا۔

۳۷ ۔ لَا تَجْعَلُوْنِیْ کَقَدَحِ الرَّاکِبِ (مجھے سوار کے پیالے کی سی حیثیت مت دو) یعنی جس طرح ایک شتر سوار اپنا پیالہ لجاوے کے پیچھے باندھتا ہے۔ اس طرح میرا ذکر آخر میں نہ کرو۔ کیونکہ اس سے تمہاری بے رخی اور بے اعتنائی کا اظہار ہوتا ہے۔ جو ایمان کے خلاف بات ہے۔

۳۸ ۔ مَثَلُ الْجَلِیْسِ الصَّالِحِ کَالْعَطَّارِ، اِنْ اَصَابَکَ مِنْ طِیْبِہٖ وَاِنْ اَصَابَکَ مِنْ رِیْحِہٖ وَمَثَلُ الْجَلِیْسِ السُّوْءِ کَمَثَلِ کِیْرِ الْحَدَّادِ، اِنْ اَصَابَکَ مِنْ لَھَبِہٖ وَاِلَّا اَصَابَکَ مِنْ شَرَرِہٖ۔
نیکوکار ہمنشین کی مثال ایسی ہے۔ جیسے عطار، کہ اگر تمہیں اس کی خوشبو سے کچھ مل جائے۔ تو بہت خوب، ورنہ اس کی مہک تو آئے گی۔ اور برے ہمنشیں کی مثال لوہار کی بھٹی کی سی ہے کہ اگر اس کی آگ کی لپیٹ آئے تو جھلسا دے۔ ورنہ اس کی چنگاریاں تو تم پر پڑیں گی۔

۳۹ ۔ مَثَلُ اَبِیْ بَکْرٍ کَمَثَلِ الْغَیْثِ اَیْنَمَا حَلَّ نَفَعَ۔ ابوبکرؓ کی مثال بادل کی سی ہے کہ جہاں برستا ہے نفع پہنچاتا ہے۔

۴۰ ۔ اَعْمَالُکُمْ عُمَّالُکُمْ، کَمَا تَکُوْنُوْنَ یُوَلّٰی عَلَیْکُمْ۔ تمہارے اعمال ہی تمہارے حکمران ہیں۔ جیسے تم ہو گے۔ ویسے ہی والی تم پر مسلط کر دیئے جائیں گے۔

۴۱ ۔ مَا مَثَلِیْ فِیْکُمْ اِلَّا کَالنَّذِیْرِ الْعُرْیَانِ۔ تمہارے اندر میری مثال ایسی ہے۔ جیسے ننگا ڈرانے والا ہو۔ عربوں کے ہاں یہ دستور تھا کہ جب کوئی بہت بڑا خطرہ درپیش ہوتا تو ایک شخص پہاڑی پر چڑھ کر کپڑے اتار کر قوم کو بلاتا تو لوگ اس کی بات سننے کے لئے جمع ہو جاتے اور وہ انہیں خطرے سے آگاہ کر دیتا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد یہ ہے کہ میں بھی تمہیں ایک بہت بڑے خطرے سے آگاہ کر رہا ہوں۔ اللہ تعالےٰ کے انکار اور نافرمانی کی وجہ سے تم دوزخ میں پڑنے والے ہو، اس سے بچ جاؤ۔

۴۲ ۔ اُمَّتِیْ کَالْغَیْثِ لَا یُعْلَمُ اَوَّلُہٗ خَیْرٌ اَمْ اٰخِرُہٗ ۔ (میری امت کی مثال بارش کی سی ہے۔ جس کے بارے میں یہ علم نہیں ہوتا کہ اس کا ابتدائی حصہ بہتر ہے یا آخری حصہ)

۴۳ ۔ لَوْ تَوَکَّلْتُمْ عَلَی اللّٰہِ حَقَّ التَّوَکُّلِ لَغَذَاکُمْ کَمَا یَغْذِی الطَّیْرَ، تَغْدُوْ خِمَاصًا وَتَعُوْدُ وَتَرُوْحُ بِطَانًا۔ اگر تم اللہ پر توکل کرو۔ جیسا کہ توکل کرنے کا حق ہے۔ تو وہ تمہیں بھی اسی طرح روزی دے۔ جس طرح وہ پرندوں کو روزی دیتا ہے کہ وہ صبح کے وقت خالی پیٹ باہر جاتے ہیں اور شام کو پیٹ بھر کر واپس آتے ہیں۔

۴۴ ۔ اَلشِّتَاءُ رَبِیْعُ الْمُؤْمِنِ، قَصُرَ نَھَارُہٗ فَصَامَہٗ وَطَالَ لَیْلُہٗ فَقَامَہٗ۔ موسم سرما مومن کے لئے بہار کی مانند ہے۔ اس کا دن چھوٹا ہوتا ہے تو وہ دن کو روزہ رکھتا ہے۔ اور رات لمبی ہوتی ہے۔ تو وہ قیام اللیل میں

گذارتا ہے۔

۴۵ ۔ عِلْمٌ لَا يُنْتَفَعُ بِهٖ كَكَنْزٍ لَا يُنْفَقُ مِنْهُ ۔ وہ علم جس سے کوئی نفع نہ ہو، اس کی مثال اس خزانے کی ہے جس میں سے کچھ خرچ نہ کیا جائے۔

۴۶ ۔ كُنْ فِي الدُّنْيَا كَاَنَّكَ غَرِيْبٌ اَوْ عَابِرُ سَبِيْلٍ ۔ تم دنیا میں اس طرح رہو، جیسے تم پردیسی ہو، یا راہ چلنے والے مسافر ہو۔

۴۷ ۔ اَلنَّاسُ كَاِبِلٍ مِائَةٍ لَا تَجِدُ فِيْهَا رَاحِلَةً ۔ لوگوں کی مثال ان سو اونٹوں کی ہے جن میں سواری کے لائق ایک بھی نہ ہو یعنی عام لوگوں میں نیک و خدا پرست آدمی ایک بھی نہیں ملتا۔

۴۸ ۔ اَلْمُتَشَبِّعُ بِمَا لَا يَمْلِكُ كَلَابِسِ ثَوْبَيْ زُوْرٍ ۔ جو شخص اپنی تونگری ریا عبادت گذاری یا علم) اس چیز سے ظاہر کرے جس کا وہ مالک نہیں ہے۔ (یا جو اس میں موجود نہیں ہے) اس کی مثال اس شخص کی ہے۔ جو جھوٹ اور فریب کے دو کپڑے پہنے ہو۔

۴۹ ۔ اَلْعَائِدُ فِي هِبَتِهٖ كَالْعَائِدِ فِي قَيْئِهٖ ۔ کوئی چیز تحفہ دے کر واپس لینے والا ایسا ہے جیسے قے کر کے پھر اس کو چاٹ لینے والا۔

جواہر حکمت

۵۰ ۔ اَلْمُؤْمِنُ مِرْاٰةُ اَخِيْهِ ۔ مومن اپنے بھائی کے لئے آئینہ ہے۔

۵۱ ۔ نِعْمَ الْحِصْنُ الْقَبْرُ ۔ قبر ایک اچھا قلعہ ہے۔

۵۲ ۔ كَفٰى بِالسَّلَامَةِ دَاءً ۔ سلامت رہ جانا ہی بڑی بیماری ہے۔

۵۳ ۔ لَيْسَ الْعَمٰى عَمَى الْبَصَرِ ۔ اَلْعَمٰى عَمَى الْقَلْبِ اَوِ الْبَصِيْرَةِ ۔ اندھا پن آنکھوں کا اندھا ہونا نہیں ہے۔ بلکہ دل کا اندھا ہونا، یا بصیرت سے محروم ہونا ہے۔

۵۴ ۔ اِنَّ مِنَ الْبَيَانِ لَسِحْرًا ۔ بے شک بیان (خطابت) میں جادو ہے۔

۵۵ ۔ اَلشَّيْطَانُ مَعَ الْوَاحِدِ وَهُوَ مَعَ الْاِثْنَيْنِ اَبْعَدُ ۔ شیطان اکیلے انسان کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور دو سے وہ دور رہتا ہے۔

۵۶ ۔ حُفَّتِ الْجَنَّةُ بِالْمَكَارِهِ ۔ وَحُفَّتِ النَّارُ بِالشَّهَوَاتِ ۔ جنت تکلیفوں میں گھری ہوئی ہے۔ اور دوزخ کے گرد خواہشات نفسانی ہیں۔

۵۷ ۔ اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِهٖ وَيَدِهٖ ۔ مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔

۵۸ - اَلْمُؤْمِنُ مَنْ اَمِنَهُ النَّاسُ عَلٰی اَنْفُسِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ - مومن وہ ہے جس کے شر سے لوگوں کی جانیں اور مال امن میں رہیں۔

۵۹ - اَلْهَدِيَّةُ تُذْهِبُ السَّخِيْمَةَ - ہدیہ بغض و عناد کو دور کر دیتا ہے۔

۶۰ - اَلْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَا نَهَى اللّٰهُ عَنْهُ - مہاجر وہ ہے جو ان چیزوں کو چھوڑ دے۔ جن سے اللہ نے منع فرمایا ہے

۶۱ - اَلْحِكْمَةُ ضَالَّةُ الْمُؤْمِنِ فَحَيْثُ وَجَدَهَا فَهُوَ اَحَقُّ بِهَا - دانائی مومن کی گمشدہ چیز ہے۔ وہ جہاں اسے پائے وہی اسے لینے کا زیادہ حق دار ہے۔

۶۲ - اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ - آدمی اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ جس سے وہ محبت کرتا ہے۔

۶۳ - مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُّفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ - اللہ جس سے بھلائی کرنا چاہتا ہے۔ اس کو دین کی سمجھ عطا کر دیتا ہے۔

۶۴ - لَيْسَ الشَّدِيْدُ بِالصُّرَعَةِ اِنَّمَا الشَّدِيْدُ الَّذِيْ يَمْلِكُ نَفْسَهٗ عِنْدَ الْغَضَبِ - بہادر وہ نہیں جو پچھاڑ دے بلاشک بہادر وہ ہے جو غصے کی حالت میں اپنے نفس پر قابو رکھے۔

۶۵ - اَلنَّاسُ عَلٰی دِيْنِ مُلُوْكِهِمْ - لوگ اپنے حاکموں کی طرز زندگی پر ہوتے ہیں۔

۶۶ - جُبِلَتِ الْقُلُوْبُ عَلٰی حُبِّ مَنْ اَحْسَنَ اِلَيْهَا وَبُغْضِ مَنْ اَسَاءَ اِلَيْهَا - دلوں میں اس شخص کی محبت ڈال دی گئی جو ان پر احسان کرے اور اس شخص کے خلاف بغض و عناد ڈال دیا گیا ہے۔ جو ان سے برا سلوک کرے۔

۶۷ - اَرْوَاحُ الْمُؤْمِنِيْنَ جُنُوْدٌ مُّجَنَّدَةٌ فَمَا تَعَارَفَ مِنْهَا ائْتَلَفَ وَمَا تَنَاكَرَ مِنْهَا اخْتَلَفَ - اہل ایمان کی ارواح اکٹھے لشکروں کی مانند ہیں۔ جو ان سے جان پہچان کر لیتا ہے۔ وہ ان سے مل جاتا ہے۔ اور جو ان سے جان پہچان نہ کرے وہ ان سے جدا ہو جاتا ہے (یعنی جو روحیں تخلیق کے وقت ایک دوسری سے جان پہچان رکھتی تھیں۔ وہی دنیا میں ایک دوسری سے مل گئیں اور جو اس وقت ایک دوسری سے انجان تھیں۔ وہ دنیا میں بھی ایک دوسری سے متحد نہ ہو سکیں۔

کند ہم جنس با ہم جنس پرواز — کبوتر با کبوتر، باز با باز

۶۸ - اَلْمَرْءُ عَلٰی دِيْنِ خَلِيْلِهٖ فَلْيَنْظُرْ اَحَدُكُمْ مَنْ يُّخَالِلُ - آدمی اپنے دوست کے دین پر چلتا ہے۔ لہٰذا تمہیں یہ دیکھنا چاہیے کہ تم کسے اپنا دوست بناؤ۔

۶۹ - اَلْمُسْتَشِيْرُ مُعَانٌ وَالْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ - مشورہ طلب کرنے والے کو مدد دی جاتی ہے۔ اور جس سے مشورہ طلب کیا جائے۔ وہ امانت دار ہوتا ہے۔

۷۰ - مَا هَلَكَ امْرُؤٌ عَرَفَ قَدْرَهٗ - جس نے اپنی قدر پہچانی وہ ہلاک نہیں ہوا۔

۷۱ - اِيَّاكَ وَمَا يُعْتَذَرُ مِنْهُ - تم اس بات سے بچو جس سے عذر خواہی کرنی پڑے۔

۷۲ - اُطْلُبُوا الْخَيْرَ عِنْدَ صِبَاحِ الْوُجُوْهِ - بھلائی (مال) اس وقت مانگو جب چہرے ہشاش بشاش ہوں۔

۷۳ ۔ کُلٌّ مُیَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَهٗ ۔ جو کچھ کسی کے لئے پیدا کیا گیا ہے وہ اس کو مل کر رہے گا۔

۷۴ ۔ اَلْحُمّٰی رَائِدُ الْمَوْتِ ۔ بخار موت کا پیش خیمہ ہے یعنی بخار آئے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ موت قریب ہے ۔

۷۵ ۔ اِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَةً اِذَا صَلَحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ کُلُّهٗ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ کُلُّهٗ اَلَا وَهِیَ الْقَلْبُ ۔ انسان کے جسم میں گوشت کا لوتھڑا ہے۔ اگر وہ درست ہو جائے تو سارا جسم درست رہتا ہے۔ اور اگر وہ خراب ہو جائے تو سارا جسم خراب ہو جاتا ہے۔ خبردار سن لو! اور وہ "دل" ہے۔

۷۶ ۔ اِیَّاکُمْ وَالشِّبْعَةَ فَاِنَّهٗ مَسْقَمَةٌ وَاجْتَنِبُوا الْجُوْعَ اِنَّهٗ مَهْرَمَةٌ ۔ تم پیٹ بھر کر کھانے سے بچو۔ کیونکہ خوب پیٹ بھر کر کھانا آدمی کو بیمار کر دیتا ہے۔ تم بھوک سے بھی بچو کیونکہ یہ بڑھاپا لاتی ہے۔

۷۷ ۔ مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ دَاءً اِلَّا اَنْزَلَ لَهٗ دَوَاءً ، عَرَفَهٗ مَنْ عَرَفَهٗ وَجَهِلَهٗ مَنْ جَهِلَهٗ اِلَّا السَّامَ ۔ اللہ تعالٰے نے جو بیماری پیدا کی ہے اس کے ساتھ اس کی دوا بھی پیدا کی ہے۔ جو اسے جانتا ہے۔ سو جانتا ہے اور جو نہیں جانتا سو نہیں جانتا۔ لیکن موت کا علاج کوئی نہیں ہے۔

۷۸ ۔ اَلْحِمْیَةُ رَأْسُ الدَّوَاءِ وَالْمَعِدَةُ بَیْتُ الدَّاءِ ۔ پرہیز بہترین علاج ہے۔ اور معدہ بیماری کا گھر ہے یعنی اُم الامراض ہے۔

۷۹ ۔ دَاوُوْا مَرْضَاکُمْ بِالصَّدَقَةِ ۔ اپنے بیماروں کا علاج صدقہ کے ذریعے کرو۔

۸۰ ۔ دَعْ مَا یُرِیْبُكَ اِلٰی مَا لَا یُرِیْبُكَ ۔ تم اس چیز کو چھوڑ دو۔ جو تمہیں شک میں ڈالے۔ اس چیز کی خاطر جو تمہیں شک میں نہ ڈالے۔

۸۱ ۔ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ وَلِکُلِّ امْرِئٍ مَا نَوٰی ۔ بلاشک اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔ اور ہر شخص کے لیے وہی کچھ ہے جس کی اس نے نیت کی۔

۸۲ ۔ مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْکُهٗ مَا لَا یَعْنِیْهِ ۔ آدمی کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ آدمی وہ چیز چھوڑ دے جس کا کوئی مقصد نہیں ہے۔

۸۳ ۔ حُبُّكَ الشَّیْءَ یُعْمِیْ وَیُصِمُّ ۔ کسی چیز کے بارے میں تمہاری محبت تمہیں اندھا اور بہرہ کر دیتی ہے۔ یعنی اس طرح تمہارے اندر تعصب پیدا ہو جاتا ہے۔ اور تم دوسروں کی خوبیوں سے آنکھیں اور کان بند کر لیتے ہو۔

۸۴ ۔ اِنَّ الْبَیِّنَةَ عَلَی الْمُدَّعِیْ وَالْیَمِیْنَ عَلٰی مَنْ اَنْکَرَ ۔ ثبوت مہیا کرنا مدعی کے ذمے ہے۔ اور قسم اس پر ہے جو الزام سے انکار کر دے۔

۸۵ ۔ اِزْهَدْ فِی الدُّنْیَا یُحِبُّكَ اللّٰهُ وَازْهَدْ فِیْمَا اَیْدِی النَّاسِ یُحِبُّكَ النَّاسُ ۔ تم دنیا سے بے رغبتی اختیار کرو۔ اللہ تمہیں دوست رکھے گا۔ اور جو کچھ لوگوں کے پاس ہے۔ اس سے بے رغبتی اختیار کر لو۔ لوگ تم سے پیار کرنے لگیں گے۔

۸۶ - رَأْسُ الْحِكْمَةِ مَخَافَةُ اللّٰهِ - دانائی کا سرچشمہ اللہ کا ڈر ہے۔

۸۷ - اَلْخَيْرُ كَثِيْرٌ وَقَلِيْلٌ فَاعِلُهٗ بھلائی اور نیکی تو بہت زیادہ ہے لیکن اس کے کرنے والے تھوڑے ہیں۔

۸۸ - إِيَّاكُمْ وَمُشَارَّةَ النَّاسِ فَاِنَّهَا تُمِيْتُ الْغُرَّةَ وَتُحْيِي الْعُرَّةَ۔ تم لوگوں کے ساتھ برائی کرنے سے بچو۔ کیونکہ ایسا کرنا نیکیوں کو برباد کرتا اور برائی کو نمایاں کرتا ہے۔ یعنی لوگ ایسے شخص کی خوبیوں کو تو چھپا دیتے ہیں۔ اور عیب لوگوں کے سامنے کھول کر رکھ دیتے ہیں۔

۸۹ - ثَلَاثٌ مُنْجِيَاتٌ وَثَلَاثٌ مُهْلِكَاتٌ ۔ فَاَمَّا الْمُنْجِيَاتُ فَخَشْيَةُ اللّٰهِ فِي السِّرِّ وَالْعَلَانِيَةِ وَالْعَدْلُ فِي الرِّضَا وَالْغَضَبِ ۔
وَالْقَصْدُ فِي الْغِنٰى وَالْفَقْرِ ۔ وَاَمَّا الْمُهْلِكَاتُ فَشُحٌّ مُطَاعٌ وَهَوًى مُتَّبَعٌ وَاِعْجَابُ الْمَرْءِ بِنَفْسِهٖ
تین باتیں نجات دینے والی ہیں اور تین ہی ہلاک کرنے والی ہیں۔ نجات دینے والی یہ ہیں۔

۱ - چھپے اور کھلے میں اللہ کا خوف

۲ - خوشی اور ناراضگی کی حالت میں انصاف۔

۳ - تنگ دستی اور خوشحالی کے زمانہ میں میانہ روی۔

ہلاک کرنے والی یہ ہیں۔

۱ - ایسا بخل کہ آدمی جس کے پیچھے پڑا رہے۔

۲ - ایسی خواہش نفس کہ جس کی پیروی کی جائے۔

۳ - خود پسندی اور غرور نفس۔

۹۰ - خَيْرُكُمْ مَنْ تَوَاضَعَ عَنْ رِفْعَةٍ وَزَهَدَ عَنْ غُنْيَةٍ وَاَنْصَفَ عَنْ قُوَّةٍ وَحَلُمَ عَنْ قُدْرَةٍ ۔ تم میں بہتر وہ ہے جو بلند مرتبہ ہوتے ہوئے تواضع سے پیش آئے۔ جو دولت مند ہوتے ہوئے دولت سے بے رغبت رہے۔ جو طاقت کے باوجود دوسروں سے انصاف برتے۔ اور جو انتقام پر قادر ہونے کے باوجود درگزر کرے۔

۹۱ - لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَتَّاتٌ ۔ چغل خور جنت میں داخل نہ ہوگا

۹۲ - اِيَّاكُمْ وَالْحَسَدَ فَاِنَّ الْحَسَدَ يَاْكُلُ الْحَسَنَاتِ كَمَا تَاْكُلُ النَّارُ الْحَطَبَ ۔ تم حسد سے بچو۔ کیونکہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے۔ جس طرح آگ لکڑی کو بھسم کر دیتی ہے۔

۹۳ - اِيَّاكُمْ وَالدَّيْنَ فَاِنَّهٗ هَمٌّ بِاللَّيْلِ وَمَذَلَّةٌ بِالنَّهَارِ ۔ تم قرض سے بچو۔ کیونکہ یہ رات کا غم اور دن کی رسوائی ہے۔

۹۴ - اِيَّاكُمْ وَالظَّنَّ فَاِنَّ الظَّنَّ اَكْذَبُ الْحَدِيْثِ ۔ تم بدگمانی سے بچو کیونکہ بدگمانی سب سے جھوٹی بات ہے۔

۹۵ - اَلنَّاسُ بِزَمَانِهِمْ اَشْبَهُ مِنْهُمْ بِآبَائِهِمْ ۔ لوگ زمانے کے ساتھ ہوتے ہیں۔ اور اپنے حالات سے زیادہ

مشابہت رکھتے ہیں۔

۹۶ ۔ لَوْ تَكَاشَفْتُمْ مَا تَدَافَنْتُمْ ۔ اگر لوگوں کے مخفی حالات سے باخبر ہوتے تو ایک دوسرے کو دفن نہ کرتے۔

۹۷ ۔ اَفْضَلُ الصَّدَقَةِ جُهْدُ الْمُقِلِّ ۔ بہترین صدقہ وہ ہے جو ایک تنگدست آدمی اپنی طاقت کے مطابق کرے۔

۹۸ ۔ تَنْزِلُ الْمَعُوْنَةُ عَلٰی قَدْرِ الْمُؤْنَةِ ۔ جتنی ذمہ داری ہوگی۔ اتنی ہی مدد اترے گی۔ یعنی عیالداری کی وجہ سے نان و نفقہ کی جتنی ذمہ داری ہوگی۔ اللہ تعالےٰ کی طرف سے اسی کے مطابق روزی آئے گی۔

۹۹ ۔ يَرْحَمُ اللّٰهُ عَبْدًا قَالَ فَغَنِمَ اَوْ سَكَتَ فَسَلِمَ ۔ فان اللسان املک شیئ للانسان ۔ اللہ تعالےٰ اس بندے پر رحم کرے گا جو بولے تو کام کی بات کہے۔ یا خاموش رہے تو زبان کے شر سے محفوظ رہے۔ کیونکہ زبان ہی انسان کے زیادہ سے زیادہ قابو میں رکھنے کی چیز ہے۔

۱۰۰ ۔ دَفْنُ الْبَنَاتِ مِنَ الْمَكْرُمَاتِ ۔ لڑکیوں کو گھروں میں پابند کرنا عزت کی بات ہے۔ کیونکہ لڑکیوں کا گھروں سے آزادانہ نکلنا اور گھومنا پھرنا ان کے اخلاق کو تباہ کرتا ہے۔ اخلاقی تباہی باعثِ ذلت ہے۔

۱۰۱ ۔ مَنْ لَا يَرْحَمُ لَا يُرْحَمُ ۔ جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جائے گا۔

۱۰۲ ۔ اِرْحَمُوْا مَنْ فِي الْاَرْضِ يَرْحَمْكُمْ مَنْ فِي السَّمَاءِ ۔ جو زمین پر ہیں۔ تم ان پر رحم کرو جو آسمانوں میں ہے۔ وہ تم پر رحم کرے گا

۱۰۳ ۔ مَا عَالَ مَنِ اقْتَصَدَ ۔ جس نے میانہ روی اختیار کی وہ تنگدست نہیں ہوگا۔

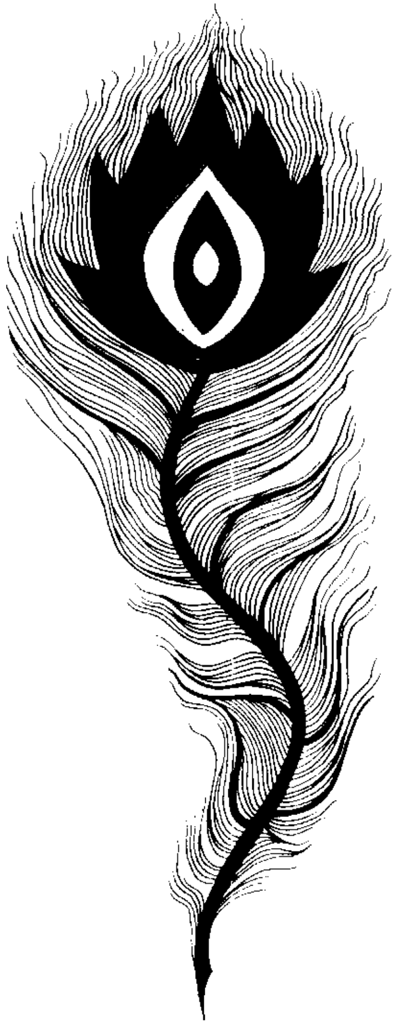
۱۰۴ ۔ حُسْنُ الظَّنِّ مِنْ حُسْنِ الْعِبَادَةِ (کسی کے بارے میں) اچھا گمان ایک اچھی عبادت ہے۔

۱۰۵ ۔ سِبَابُ الْمُسْلِمِ فُسُوْقٌ وَقِتَالُهٗ كُفْرٌ ۔ مسلمان کو گالی دینا گناہ اور اس کو قتل کرنا کفر ہے۔

۱۰۶ ۔ كُلُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ حَرَامٌ مَالُهٗ وَعِرْضُهٗ وَدَمُهٗ ۔ مسلمان کا مسلمان پر سب کچھ حرام ہے۔ اس کا مال بھی اس کی عزت بھی اور اس کا خون بھی۔

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَ الْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ (الانعام:۵۲)

اور ان لوگوں کو اپنے پاس سے نہ ہٹائیے جو اپنے پروردگار کو صبح و شام پکارتے ہیں خاص اُسی کی رضا کا قصد کرتے ہوئے۔



اصحابِ صُفّہ

رضی اللہ عنہم

اصحابِ صُفہ

تصنیف: حافظ ابونعیم احمد اصبہانی / ترجمہ: حافظ محمد سعد اللہ

حافظ ابونعیم اصبہانی المتوفی ۴۳۰ھ کہتے ہیں۔ ہم صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین میں سے ایک ایسی جماعت کا ذکر خیر کر رہے ہیں جو انتہائی عابد و زاہد، ہمہ وقت اپنے معبود حقیقی کی یاد میں مگن اور اسی ذات واحد کے ساتھ شغف ان کا مشغلہ تھا۔ وہ عارفانِ حقیقت، سالکانِ طریقت کے لیے بہت بڑے پیشوا اور مقتدا ہیں اور ان دنیا والوں کے لئے ایک حجت ہیں جنہیں اس فانی دنیا نے پاگل اور دیوانہ بنا رکھا ہے اب ہم اللہ تعالیٰ سے امداد چاہتے ہوئے ان اہلِ صفہ کی شان، ان کے اخلاقِ عالیہ، حالاتِ طیبہ اور وجہ تسمیہ کو بیان کرتے ہیں اس بیان میں ہماری بنیاد مشہور اسانید اور معروف دلائل پر ہوگی۔

اصحابِ صفہ صحابہ کرام میں ایک ایسا گروہ تھا جنہیں حق تعالیٰ نے مال و متاعِ دنیا کی طرف مائل ہونے اور مال و دولت کے فتنہ میں پڑ کر فرائض دینی سے غافل ہونے سے بچائے رکھا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ان لوگوں کے واسطے ایک بہترین نمونہ بنایا جو فارغ ہو کر اپنے رب کی عبادت کرنا چاہتے ہیں وہ اہل و عیال اور مال و اسباب کو مدعا نہیں بناتے تھے۔ خرید و فروخت یا کوئی دوسری مصروفیت اللہ کی یاد سے انہیں غافل نہیں کر سکتی تھی۔ دنیا کے ہاتھ سے جانے اور فوت ہونے پر کبھی انہیں غم نہ ہوا۔ وہ اسی بات پر راضی تھے کہ ان کے مالکِ ازلی نے انہیں آخرت سنوارنے کی توفیق عطا فرمائی ہے ان کی خوشی اپنے معبود کی یاد میں اور غم اس کی یاد سے غفلت میں تھا وہ ہی بلند مرتبہ لوگ تھے جن کے بارے میں قرآن کہتا ہے لَا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ۔ یعنی کوئی تجارت یا کسی بھی قسم کی خرید و فروخت انہیں اللہ کی یاد سے غافل نہیں کر سکتی۔ دنیا کے فوت ہو جانے پر انہیں کوئی افسوس نہ ہوا اور دنیا کے مل جانے پر انہیں کوئی خوشی نہ ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں منہمک ہو جانے اور دولت کی فراوانی سے ان کی حفاظت فرمائی تاکہ وہ تاثیرِ دنیا کی وجہ سے بغاوت اور سرکشی پر نہ آمادہ ہوں۔ کسی چیز کے فوت ہو جانے، چلے جانے، پراگندہ ہو جانے اور بالیدہ ہونے پر انہیں قطعاً کوئی ملال نہ تھا۔

مشہور راوی ابو ہانی کہتے ہیں۔ میں نے عمرو بن حریث اور دیگر کئی لوگوں سے سنا کہ یہ آیت اصحاب صفہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ وَلَوْ بَسَطَ اللَّهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهِ لَبَغَوْا فِي الْأَرْضِ: اگر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر رزق کو پھیلا دے تو وہ زمین میں بغاوت پر اتر آئیں اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک موقع پر انہوں نے دنیا کے حصول کی تمنا کی تھی

ابونعیم کہتے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے بچاؤ کی خاطر دنیا کو ان سے دور رکھا کہیں بغاوت نہ کر دیں۔ چنانچہ وہ دنیا کے تمام شغلوں سے محفوظ ہو کر اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آگئے ۔ اموال دنیا انہیں غافل نہ کر سکے اور حالاتِ زمانہ انہیں متغیر نہ کر سکے ۔

عبدالرحمٰن بن ابی بکر روایت کرتے ہیں کہ اصحاب صفہ کچھ فقیر لوگ تھے ۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا جس کسی کے پاس دو آدمیوں کا کھانا ہے وہ ان اصحابِ صفہ میں سے ایک تیسرے آدمی کو لے کر جائے جس آدمی کے پاس چار آدمیوں کا کھانا موجود ہو وہ ایک یا پانچویں کو بھی ساتھ ملا لے ۔ علیٰ ہذا القیاس چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق اصحابِ صفہ میں سے تین اور خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دس آدمیوں کو لے گئے ۔ یہ حدیث صحیح اور متفق علیہ یعنی بخاری و مسلم کی تخریج کردہ ہے ۔

حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس سے گزرے اور فرمایا ۔ اے ابو ہریرہ ! میں نے عرض کیا لبیک یا رسول اللہ ! فرمایا ۔ اہلِ صفہ کو جا کر بلا لاؤ ۔ ابوہریرہؓ وضاحت فرماتے ہیں کہ اہل صفہ اسلام کے مہمان تھے ۔ اہل وعیال اور کاروبار و مال کو چھوڑ کر ہر وقت مسجد نبوی میں پڑے رہتے ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جب کوئی صدقہ کی چیز آتی تو اہل صفہ کے ہاں بھجوا دیتے اور خود اس میں سے ذرہ بھر نہ لیتے اور جب کوئی ہدیہ یا تحفہ کی شے آتی تو خود بھی لیتے اور اہل صفہ کی طرف بھی بھیجتے اور اس چیز میں ان کو شریک فرماتے (متفق علیہ)

طلحہ بن عمرو کہتے ہیں ۔ جو شخص باہر سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتا ۔ مدینہ منورہ میں اگر کوئی اس کا جاننے والا ہوتا تو ادھر چلا جاتا ورنہ اہل صفہ کے ہاں ٹھہرا دیا جاتا ۔ طلحہ بتلاتے ہیں میں انہی لوگوں میں تھا جنہیں اہل صفہ کے ہاں ٹھہرایا گیا ۔ میں نے دیکھا کہ روزانہ ایک آدمی رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے اہلِ صفہ میں ایک مد کھجور (تقریباً آدھ سیر) ایک یا دو فی کس کے حساب سے تقسیم کرتا ۔

ابو رافع کہتے ہیں : جب حضرت امام حسینؓ کی ولادت ہوئی تو حضرت فاطمۃ الزہرا نے عرض کیا ۔ یا رسول اللہ کیا میں اپنے بیٹے کا عقیقہ کر دوں ؟ فرمایا نہیں ۔ البتہ یہ کرو کہ بچے کے سر کے بال اتروا کر ان کے وزن کے برابر چاندی یا سونا اوفاض میں صدقہ کر دو ۔ ”اوفاض“ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد اہل صفہ تھے ۔

فضالۃ بن عبید کہتے ہیں ۔ جب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھاتے تو کئی لوگ افلاس ، تنگی اور بھوک کی وجہ سے قیام میں کھڑے نہ ہو سکتے اور گر پڑتے ۔ یہ لوگ اہل صفہ تھے جن کے متعلق اعرابی کہتے کہ یہ مجنوں ہیں

حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں : اہل صفہ میں ستر آدمی ایسے تھے جن میں سے کسی ایک کے پاس چادر تک نہ تھی

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں ۔ میں اہل صفہ میں تھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری طرف عمدہ قسم کی کھجور بھیجی بھوک کی شدت کی وجہ سے ہم نے دو دو کھجوریں ملا کر کھائیں ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کوئی مضائقہ نہیں ایسا کر لو ۔ حضرت حسن بصریؒ کہتے ہیں ۔ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم اہلِ صفہ کی طرف تشریف لائے اور دریافت فرمایا

کیف اصبحتم ؟ تم کیسے ہو ؟ انہوں نے عرض کیا ہر طرح کی خیر و بھلائی ہے آپؐ نے فرمایا واقعی تم آج خیر و بھلائی میں ہو عنقریب وہ وقت آنے والا ہے جب تم میں سے ہر ایک کے پاس کھانے کے بڑے پیالے کے علاوہ دیگر کئی آسائش کی چیزیں ہوں گی۔ تمہارے گھروں پر اس طرح کے پردے ڈالے جائیں گے جس طرح کے کعبہ شریف پر ڈالے جاتے ہیں۔ (یعنی تم اپنے گھروں کی در و دیوار کو مزین آراستہ اور منقش بناؤ گے) انہوں نے استعجاباً عرض کیا یا رسول اللہ! کیا ہم ایسا کریں گے جبکہ ہم اپنے دین پر بھی ہوں ؟ فرمایا ہاں، عرض کرنے لگے پھر تو ہم صدقہ خیرات کریں گے غلاموں کو آزاد کرائیں گے۔ آپؐ نے فرمایا۔ اس وقت تم ایسا نہیں کرو گے جیسا کہ تمہارا خیال ہے بلکہ ہوگا یہ کہ تم ایک دوسرے کے ساتھ حسد کرنے لگو گے۔ ایک دوسرے کے ساتھ قطع تعلقی اور بغض وعناد میں پڑ جاؤ گے۔

ایک تابعی سنان بن سلیمن حضرت حسن بصریؒ سے یوں روایت کرتے ہیں۔ ضعفاء مسلمانوں کے واسطے ایک چبوترا التعمیر کیا گیا تمام مسلمان مقدور بھر ان کے ساتھ بھلائی اور تعاون کرتے۔ حضورؐ ان کے پاس تشریف لاتے اور السلام علیکم کہتے وہ بھی سلام کا جواب دیتے پھر آپ پوچھتے تم کیسے ہو؟ وہ عرض کرتے بہتر ہیں آپؐ فرماتے۔ واقعی تم اس وقت سے بہتر ہو جبکہ مختلف نعمتوں کی تمہارے اوپر بھرمار ہو جائے گی۔ تم صبح کو ایک اور شام کو دوسرا لباس زیب تن کرو گے۔ تم اپنے گھروں کو اس طرح ڈھانپو گے جس طرح خانہ کعبہ کو ڈھانپا جاتا ہے۔ اہل صفہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! یہ تو اور اچھا ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ کی عطاؤں پر شکر بجا لائیں گے۔ آپؐ نے فرمایا۔ نہیں بلکہ اب تم جس حال میں ہو یہ بہتر ہے۔

ابو نعیم کہتے ہیں: مختلف اوقات اور مختلف حالات میں صفہ میں مقیم لوگوں کی تعداد بھی بدلتی رہتی۔ رات کو آنے والے مہمان اور مسافر جب چلے جاتے تو تعداد کم ہو جاتی اور جب باہر سے وارد ہونے والوں اور وفود کا اجتماع ہوتا تو تعداد بڑھ جاتی۔ مگر اکثر حالات میں ان پر فقر کا غلبہ رہتا بلکہ وہ خود قلت و افلاس کو ترجیح دیتے تھے۔ ان کے پاس کبھی دو کپڑے جمع نہ ہوئے اور نہ کبھی دو قسم کا کھانا کھایا اس چیز پر حضرت ابوہریرہ کی وہ روایت دلالت کرتی ہے جس میں آپؐ نے فرمایا۔ میں نے ستر ایسے اہل صفہ کو دیکھا جو ایک ہی کپڑے میں نماز پڑھا کرتے وہ کپڑا بعض کے گھٹنوں تک اور بعض کو اس سے کچھ نیچے تک پہنچتا تھا ان میں سے جب کوئی رکوع میں جاتا تو کپڑے کو اپنے اوپر سمیٹ لیتا کہ کہیں قابل ستر جگہ ننگی نہ ہو جائے۔ حضرت واثلہ بن اسقعؓ فرماتے ہیں: میں اہل صفہ میں سے تھا۔ ہم میں سے کسی کے پاس پورا لباس نہ ہوتا تھا۔ پسینہ کی وجہ سے ہمارے کپڑوں میں میل اور غبار اٹا ہوا ہوتا۔ محمد بن سیرین کہتے ہیں۔ جب شام ہوتی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اہل صفہ کو صحابہ کے درمیان تقسیم فرما دیتے۔ کوئی ایک کو، کوئی دو کو، کوئی تین کو اور بعض صحابہ دس تک کو لے جاتے۔ حضرت سعد بن عبادہ ہر رات آٹھ اہل صفہ کو گھر لاتے اور ان کے ٹھہرانے کا بندوبست فرماتے۔ حضرت عقبہ بن عامر کہتے

ہیں رسول مقبولؐ ہم اہلِ صفہ کی طرف تشریف لائے اور پوچھا تم میں سے کون اس بات کو پسند کرتا ہے کہ وہ ہر روز "بطحان" اور "عقیق" (یا دو وادیوں کے نام ہیں) کی طرف جائے اور بغیر کسی گناہ اور قطع رحمی کے دو موٹی تازی اونٹنیاں لائے ؟ ہم نے عرض کیا۔ یارسول اللہ! یہ بات تو ہم میں سے ہر ایک کو پسند ہے فرمایا تو وہ کیوں نہیں مسجد کی طرف جاتا اور قرآن کریم کی دو آیات سیکھتا یا پڑھتا۔ کیونکہ قرآن مجید کی دو آیات سیکھنا یا پڑھنا دو اونٹنیوں سے تین آیتیں سیکھنا تین اونٹنیوں سے اور چار آیتیں سیکھنا چار اونٹنیوں سے بدرجہا بہتر ہے ۔

ابونعیم فرماتے ہیں عقبہ بن عامر کی یہ روایت اس چیز کی صراحت کرتی ہے کہ اہلِ صفہ کے دلوں میں جب کبھی طلبِ دنیا کا داعیہ پیدا ہوتا حضورؐ تشریف لاکر ان کے مناسب حال ذکر اذکار کرتے یا وعظ و نصیحت فرما کر اس داعیہ کا رد فرما دیتے چنانچہ اس طرح وہ دنیا کے مہلکات اور خطرات سے محفوظ اور نفوس میں خفیہ آرزوؤں کے وارد ہونے سے مامون رہے۔

حضرت انس بن مالک فرماتے ہیں۔ ایک دن ابوطلحہ آئے تو نبی اکرمؐ کھڑے ہو کر اہلِ صفہ کو پڑھا رہے تھے بھوک کی شدت کی وجہ سے آپؐ کے بطن مبارک پر پتھر بندھا ہوا تھا۔ جو آپ کی کمر کو سیدھا کئے ہوئے تھا۔ اہلِ صفہ کا شغل ہمہ وقت قرآن کو پڑھنا اور سمجھنا اور خواہش ہمیشہ یہی تھی کہ ان کے محبوبؐ اپنے شیریں خطاب سے ان کی روحوں کو بار بار تازہ کرتے رہیں۔ حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں۔ ایک مرتبہ رسول مقبولؐ ہم ضعفاء مسلمان یعنی اہلِ صفہ کے پاس تشریف لائے اتفاق سے ایک آدمی اس وقت ہمیں قرآن پڑھ کر سنا رہا تھا اور ہمارے لئے دعا کر رہا تھا۔ لباس کی قلت کی وجہ سے ہم ایک دوسرے کے ساتھ متصل بیٹھ کر ستر پوشی کر رہے تھے آپؐ نے ہاتھ کے اشارہ سے فرمایا کہ حلقہ کی صورت میں بیٹھ جاؤ چنانچہ آپ کے ارد گرد حلقہ میں سب لوگ بیٹھ گئے۔ آپؐ نے دریافت فرمایا تم کیا کر رہے تھے؟ انہوں نے عرض کیا یہ شخص ہمیں قرآن پڑھ کر سنا رہا تھا اور ہمارے لئے دعا کر رہا تھا آپؐ نے فرمایا تم اپنے کام میں دوبارہ مشغول ہو جاؤ۔ بعد ازیں آپؐ اپنے خالق و مالک حقیقی کا اس نعمت پر شکر بجا لائے کہ اس نے آپؐ کی امت میں ایک ایسا گروہ اور جماعت پیدا کر دی ہے جن کے ساتھ آپ کو بیٹھنے کا حکم ہوا ہے اس کے بعد آپؐ نے فقراء مسلمانوں کو بشارت دیتے ہوئے فرمایا۔ تمہیں خوشخبری سناتا ہوں اس بات کی کہ تم روزِ قیامت امراء سے پانچ سو سال قبل جنت میں داخل ہو گے۔ تم لوگ جنت کی نعمتوں سے لطف اندوز ہو رہے ہو گے جبکہ یہ امراء کا طبقہ ابھی حساب کتاب میں پھنسا ہو گا

ثابت بنانی روایت کرتے ہیں کہ حضرت سلمان ایک ایسی جماعت میں موجود تھے جو ذکر الٰہی میں مشغول تھی نبی کریمؐ پاس سے گزرے تو وہ ذکر سے رک گئے۔ آپؐ نے پوچھا تم کیا کہہ رہے تھے انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہم اللہ کا ذکر کر رہے تھے۔ آپؐ نے فرمایا تم ذکر جاری رکھو۔ میں نے تمہارے اوپر اللہ کی رحمت نازل ہوتے دیکھی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ میں بھی اس رحمت میں تمہارے ساتھ شریک ہو جاؤں پھر فرمایا اس ذات الٰہی

کا لاکھ لاکھ شکر ہے جس نے میری امت میں ایک ایسا گروہ بھی بنایا ہے جن کے ساتھ مجھے اپنے آپ کو روک رکھنے کا حکم ہوا ہے۔

ابو نعیم فرماتے ہیں: اصحاب صفہ اور تا قیامت ان کے پیروکاروں کی علامت فقر ہے سچائی ان کی شہرت ہے اور ان کے باطن مشاہدۂ حق سے ہمیشہ آباد ہیں کیونکہ ان کے محافظ و نگران حق تعالیٰ اور معلم و مودّب رسول ہیں۔ جس شخص نے مال اور اس کے غرور و دھوکہ دہی سے اعراض کر لیا۔ آخرت سنوارنے اور اخروی نعمتوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ زائل اور فانی دنیا سے اپنے آپ کو دور رکھا۔ مال و متاع دنیا اور رقص و سرود کی چیزوں سے دور ہو گیا۔ واحد حقیقی اور ہمیشہ باقی رہنے والی ذات کے کارخانۂ قدرت کے مشاہدہ میں غرق ہو گیا دائمی اخروی زندگی اور اس کی تر و تازگی، ہمیشہ اس سے لطف اندوز ہوتے، ملاء اعلیٰ کی حاضری اور سب سے بڑھ کر اپنے معبود کے دیدار پر راضی ہو گیا۔ ایسے شخص کے لئے لازم ہے کہ اس کے معبود نے جو فقر و تنگ دستی اس کے لئے مقدر کی ہے اس پر دل و جان سے راضی رہے۔ مال و متاع اور اسباب دنیا کے مفقود ہونے پر غم نہ کرے۔ باری تعالیٰ کے نزدیک جو افعال پسندیدہ ہیں ان کے لئے سعی کرے اور اپنے دل میں پیدا ہونے والے شیطانی وسوسوں اور خطرات کی نگرانی رکھے تاکہ وہ پاک ضعفاء و مساکین کے زمرہ میں شامل ہو سکے اور مقربین بارگاہ الٰہی کے نزدیک ہو سکے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے ہر لمحۂ زندگی کو غنیمت جانے، غلط لوگوں کی مجلس میں بیٹھنے سے گریز کرے اللہ تعالیٰ کے معاملات میں جد و جہد کرے اور تمام احوال میں سید المرسلینؐ کی اقتداء کرے۔

شیخ ابو نعیم مزید فرماتے ہیں۔ اہل صفہ نے مسجد نبوی کے چبوترے (صفہ) کو اپنا وطن بنایا تو باری تعالیٰ نے ان کے باطن کو پاک و صاف فرمایا۔ اغیار سے ان کی حفاظت فرمائی۔ نفسانی خواہشات اور نفس کے حملوں سے بچایا۔ ابرار کی صف میں شامل فرمایا جنت کے باغات میں نازل فرمایا اور جنت کے خاص چشموں سے پانی پلایا۔ ابو صالح کہتے ہیں جنت میں مقربین کے واسطے جو شراب ہوگی "تسنیم" اس میں سب سے بہتر شراب ہوگی۔

ابو نعیم فرماتے ہیں۔ اہل صفہ مختلف قبائل اور متعدد اطراف و اکناف کے بہترین لوگ تھے۔ انہوں نے انوار الٰہی کا لباس پہنا۔ ذکر الٰہی ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ باری تعالیٰ نے انہیں جو اپنی رضا اور نعمتیں عطا فرما رکھی تھیں ان سے ان کے باطن روشن تھے انہوں نے دنیا پر فریفتہ لوگوں سے منہ موڑ لیا تھا اور دنیا کے فانی اور ہلاک ہونے والے مال و اسباب کو جمع کرنے والوں سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ دشمن اور حاسد یعنی شیطان لعین کی مصالحت سے دور بھاگ گئے تھے جیسا کہ ایک محتاط آدمی بچا کرتا ہے۔ اللہ کی محبت اور اس کی رضا ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو وہ مرتبہ و مقام عطا فرمایا کہ ملائکہ بھی ان کی زیارت اور محبت کی خواہش کرنے لگے اور رسولؐ اللہ کو حکم دیا گیا کہ آپ ان کے ساتھ گفتگو اور مجالست اختیار کریں۔

حضرت خباب بن الارتؓ کہتے ہیں۔ اقرع بن حابس تمیمی۔ عیینہ بن حصین الفزاری وغیرہ رئیسان قریش

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ آپؐ اس وقت ضعفاء مومنین یعنی بلال، عمار، صہیب اور خباب کے ساتھ بیٹھے تھے جب انہوں نے ان ضعیف و مساکین صحابہ کو آپؐ کے پاس بیٹھے دیکھا تو حقارت کی نظر سے ان کے پاس نہ بیٹھے۔ علیحدگی میں انہوں نے حضورؐ سے کہا۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ آپؐ ہمارے واسطے ایک الگ مجلس تشکیل دیں۔ ہماری موجودگی میں یہ غرباء و مساکین نہ ہوں کیونکہ آپؐ کے پاس عرب کے مختلف وفود آتے ہیں اور ہم ان کے سامنے اس بات سے شرم محسوس کرتے ہیں کہ ان غلاموں کے ساتھ مل کر بیٹھیں۔ جب ہم فارغ ہو کر چلے جایا کریں تو آپؐ جن کے پاس جی چاہے بیٹھیں۔ آپ نے فرمایا ٹھیک ہے۔ رئیسانِ قریش نے کہا۔ آپؐ ہمیں یہ چیز لکھ کر دیں۔ آپؐ نے کاغذ قلم منگوایا اور حضرت علی المرتضیٰؓ سے فرمایا کہ لکھ دو۔ حضرت خباب بیان کرتے ہیں ہم لوگ ایک کونے میں بیٹھے تھے اور یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ حضرت علی المرتضیٰؓ نے لکھنے کا ابھی ارادہ ہی فرمایا کہ جبریل امین وحی لے کر نازل ہو گئے

ولا تطرد الذين يدعون ربهم بالغداة والعشي يريدون وجهه ما عليك من حسابهم من شئ وما من حسابك عليهم من شئ فتكون من الظلمين ۝ وكذالك فتنا بعضهم ببعض ليقولوا اهؤلاء من الله عليهم من بيننا اليس الله باعلم بالشاكرين ۝ واذا جاءك الذين يؤمنون بايتنا فقل سلام عليكم كتب ربكم على نفسه الرحمة (سورہ الانعام : ۵۲ تا ۵۴)

ترجمہ: اور اے پیغمبرؐ! جو لوگ صبح و شام اپنے پروردگار کی طرف رخ کر کے اس سے دعائیں مانگتے ہیں ان کو اپنے پاس سے مت نکالو۔ نہ تو ان کے اعمال کی جوابدہی کسی طرح تمہارے ذمے ہے اور نہ تمہاری جوابدہی کسی طرح ان کے ذمے ہے۔ پھر انہیں تم دور کرو تو یہ کام انصاف سے بعید ہے۔ اور اسی طرح اختلافِ حالت سے ہم نے بعض لوگوں کو بعض سے آزمایا تاکہ مقدور والے غریبوں کو دیکھ کر کہنے لگیں کہ کیا یہی ذلیل لوگ ہیں جن پر اللہ نے ہم میں سے اسلام کی توفیق دے کر اپنا فضل کیا ہے۔ ان کو اتنا تو سمجھنا چاہیئے تھا کہ کیا اللہ تعالیٰ اپنے شکر گزار بندوں کے حال سے بخوبی واقف نہیں۔ اور اے پیغمبر جو لوگ ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں جب تمہارے پاس آیا کریں تو تم ان کی دلدہی کرو اور کہو کہ خدا کی طرف سے تم کو سلامتی کی خوشخبری ہو اور تمہارے پروردگار نے بندوں پر مہربانی کرنا از خود اپنے اوپر لازم کر لیا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کاغذ قلم پھینک دیا اور ہمیں بلایا ہم حاضر ہوئے تو فرمانے لگے "سلام علیکم"۔ ہم آپؐ کے اتنے قریب بیٹھے کہ ہمارے گھٹنے آپؐ کے گھٹنوں سے لگنے لگے اس کے بعد رسول مقبولؐ ہمارے ساتھ بیٹھا کرتے اور جب جانے کا ارادہ ہوتا تو ہمیں چھوڑ کر تشریف لے جاتے پھر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

واصبر نفسك مع الذين يدعون ربهم بالغداة والعشي يريدون وجهه ولا تعد عيناك عنهم تريد زينة الحيوة الدنيا ولا تطع من اغفلنا قلبه عن ذكرنا

واتبع ھوٰہ وکان امرہٗ فرطا (الکھف : ۲۸)

اور اے پیغمبر جو لوگ صبح و شام اپنے پروردگار کو یاد کرتے اور اسی کی رضامندی چاہتے ہیں۔ ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے پر اپنے نفس کو مجبور کر دو اور تمہاری نظر التفات ان پر سے ہٹنے نہ پائے کہ لگو دنیا کی زندگی کے ساز و سامان کا پاس کرنے اور ایسے شخص کا کہا ہرگز نہ ماننا جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور وہ اپنی خواہش کے پیچھے پڑا ہے اور اس کی دنیاداری حد سے بڑھ گئی ہے۔ جن کے دل کو اللہ تعالیٰ نے غافل کر دیا تھا عیینہ بن حصین اور اقرع تھے اور فرطاً کا مطلب ہلاکت ہے اس کے بعد کی آیات میں باری تعالیٰ نے دو آدمیوں کی اور دنیا کی مثال بیان فرمائی ہے حضرت خباب کہتے ہیں اس کے بعد حضورؐ کا عالم یہ ہو گیا تھا کہ ہم آپ کے ساتھ بیٹھے رہتے جب آپ کے اٹھنے کا وقت ہوتا تو پہلے ہم آپؐ کو چھوڑ کر اٹھ جاتے بعد میں آپؐ تشریف لے جاتے جب تک ہم نہ اٹھ جاتے آپ ہمیشہ ہمارے ساتھ بیٹھے رہتے

حضرت سلمان فارسی فرماتے ہیں کہ مؤلفۃ القلوب (جن کی حضورؐ تالیف قلب فرماتے) عیینہ بن حصین اور اقرع وغیرہ رسول مقبولؐ کے پاس آئے اور کہنے لگے کتنا ہی اچھا ہو کہ آپؐ مسجد کے درمیان میں تشریف رکھا کریں اور ان لوگوں کو یعنی ان کے لباسوں کی بو کو ہم سے دور کر دیں (ان لوگوں سے ان کی مراد ابو ذر غفاری، سلمان فارسی وغیرہ ضعفا مسلمان تھے ان کے جسموں پر اون کے لباس ہوتے جن سے بوجہ پسینہ بو آتی تھی کیونکہ ان کے پاس ایک جوڑے سے زیادہ کپڑے نہ ہوتے تھے) تو ہم آپؐ کے پاس بیٹھا کریں گے اور دین سیکھا کریں گے تو باری تعالیٰ نے مذکورہ آیت کریمہ نازل فرما دی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فوراً ان ضعفاء مسلمانوں کی تلاش میں اٹھے اور مسجد کے ایک کونے میں ان کو پایا کہ ذکر الٰہی میں مشغول تھے۔ آپؐ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے میری امت میں کچھ ایسے لوگ پیدا کئے ہیں جن کے ساتھ مجھے بیٹھنے کا حکم فرمایا گیا۔ میری موت اور زندگی ان ہی لوگوں کے ساتھ ہے

حضرت سعد بن ابی وقاص کہتے ہیں کہ مذکورہ آیت چھ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے حق میں نازل ہوئی جن میں سے ایک حضرت عبداللہ بن مسعود ہیں۔ حضرت سعد کہتے ہیں۔ حضورؐ کے قریب بیٹھنے کی خاطر ہم ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔ یہ صورت حال دیکھ کر قریش کہنے لگے۔ یا رسول اللہ آپؐ ہماری نسبت ان کو زیادہ قریب بٹھاتے ہیں؟ آپؐ نے ابھی کچھ خیال کیا ہی تھا کہ آیت ولا تطرد الذین الخ نازل ہو گئی۔ انہی سعد بن ابی وقاص سے ایک دوسری روایت یوں منقول ہے

ہم چھ آدمی رسول مقبولؐ کے پاس حاضر تھے مشرکین نے کہا ان لوگوں کو ہٹا دیجئے یہ ایسے ویسے ہیں۔ سعد کہتے ہیں۔ ان چھ آدمیوں میں۔ میں عبداللہ بن مسعود قبیلہ ہذیل کا ایک آدمی، بلال اور دو آدمی دیگر تھے جن کا نام میں بھول گیا ہوں حضورؐ کے دل میں بھی کچھ خیال پیدا ہوا کہ اگر اس طرح مشرکین ایمان لائیں تو کوئی مضائقے کی بات نہیں۔ یہ سوچا ہی تھا کہ مندرجہ بالا آیت نازل ہو گئی۔

حضرت عبداللہ بن مسعود یوں روایت کرتے ہیں کہ سرداران قریش کی ایک جماعت حضورؐ کے پاس سے گزری اس وقت آپؐ کے پاس صہیب رومی، بلال حبشی۔ خباب بن الارت، عمار بن یاسر اور اس قسم کے دوسرے ضعفاء مسلمان موجود تھے۔ سرداران قریش نے کہا یا رسول اللہ! کیا آپ کو اپنی قوم میں سے یہی لوگ پسند آئے ہیں؟ کیا ہم ان کے تابع ہو کر رہیں کیا انہی لوگوں پر اللہ نے احسان کیا ہے؟ اگر آپ ان لوگوں کو اپنے پاس سے دور کر دیں تو شاید ہم آپ کی اتباع کریں جب انہوں نے ایسا کہا تو فوراً جبریل امین سورۃ انعام کی آیت نمبر ۵۱ اور نمبر ۵۲ لے کر نازل ہو گئے اور آپؐ کو ایسا کرنے سے سختی سے منع فرما دیا گیا۔

حضرت عائذ بن عمروؓ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ابوسفیان، سلمان فارسی، صہیب اور بلال کے پاس سے گزرا۔ ان لوگوں نے ابوسفیان کو دیکھ کر کہا۔ ابھی تلواریں اللہ کے دشمن (ابوسفیان) کی گردن کو نہیں پہنچیں۔ حضرت ابوبکر صدیق نے یہ کلمہ سنا تو کہنے لگے تم نے قریش مکہ کے بزرگ اور سردار کے حق میں ایسا کلمہ کہہ دیا یعنی ایسا نہیں کہنا چاہیئے تھا اس کے بعد حضرت ابوبکر نبی اکرمؐ کے پاس آئے اور سارا ماجرا کہہ سنایا۔ آپؐ نے پوچھا اے ابوبکر! تو نے ان کو ایسا کہہ کر ناراض تو نہیں کر دیا۔ خدا کی قسم اگر تو نے ان کو ناراض کیا ہے تو گویا اپنے رب کو ناراض کیا ہے۔ حضرت ابوبکر اسی وقت ان کے پاس دوبارہ گئے اور کہنے لگے بھائیو! میری بات پر تم ناراض تو نہیں ہو گئے؟ وہ کہنے لگے۔ اے ابوبکر اللہ تعالیٰ آپ کی مغفرت فرمائے اس میں کون سی ناراضگی کی بات ہے۔

حضرت انس حدیث بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ اس علم (علم دین) کے ذریعے بعض لوگوں کو رفعت و بلندی عطا فرماتا ہے حتیٰ کہ وہ امام و پیشوا بن جاتے ہیں۔ خیر کے امور میں ان کی اقتداء کی جاتی ہے ان کے نقش قدم پر چلا جاتا ہے اور ان کے اعمال کو بنظر عقیدت دیکھا جاتا ہے۔ ملائکہ ان کی دوستی کی رغبت کرتے اور ان کے پاؤں کے نیچے پر بچھاتے ہیں۔۔۔ عبداللہ بن عمرو بن العاص کہتے ہیں کہ رسول مقبولؐ نے صحابہ سے دریافت فرمایا: جانتے ہو جنت میں پہلے کون داخل ہو گا؟ صحابہ نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا وہ فقراء مہاجرین ہوں گے جنہیں ہمیشہ متعدد مشکلات اور فقر و تنگدستی درپیش رہی حتیٰ کہ بہت ساری خواہشات اور آرزوئیں وہ سینوں میں ہی لے کر راہئ آخرت ہوئے اور زندگی میں ان کو پورا نہ کر سکے۔ ملائکہ بارگاہ الٰہی میں کہیں گے کہ الہ العالمین! ہم تیرے ملائکہ، تیرے خزانچی اور آسمانوں پر رہنے والی مخلوق ہیں اس ارضی مخلوق کو ہم سے قبل جنت میں داخل نہیں ہونا چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ یہ میرے وہ بندے ہیں جنہوں نے میرے ساتھ کبھی کسی کو شریک نہیں ٹھہرایا۔ فقر و تنگ دستی کے باوجود راضی بہ قضا رہے بہت ساری نامکمل آرزوئیں سینوں میں ہی لے کر آخرت کو سدھارے جنت میں پہلے داخل ہونے کے یہی حقدار ہیں اس وقت ان پر جنت کے ہر دروازے وا ہوں گے اور کہیں گے:" سلام علیکم بما صبرتم فنعم عقبی الدار۔"

حضرت علی المرتضیٰ نے فرمایا۔ آیت : اولئک یجزون الغرفۃ بما صبروا ۔ (جنت کے بالاخانے انہیں صلہ میں دیئے جائیں گے اس صبر کے جو انہوں نے دنیا میں اختیار کیا) میں جن لوگوں کا ذکر ہے یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے دنیا میں فقر و تنگدستی پر صبر کیا۔

ابو نعیم اصبہانی فرماتے ہیں : میں نے متأخرین میں سے ایک صاحب کو دیکھا کہ اس نے اصحاب صفہ کے نام حروف تہجی کی ترتیب سے ذکر کئے ہیں۔ بعض احباب نے مجھے بھی اس کی پیروی کرنے کو کہا۔ ان صاحب کی کتاب میں بعض نام ایسے آگئے ہیں جو "اہل الصفہ" نہیں بلکہ "اہل القبہ" ہیں۔ بعض ناقلین سے یہ سہو ہو گیا ہے کہ انہوں نے قبہ کو صفہ بنا دیا۔ ہم انشاء اللہ اس کی وضاحت کریں گے اب تو کل الہیٰ اصحاب صفہ کا ذکر شروع ہوتا ہے۔

اوس بن اوس الثقفی

ان کا اسم اوس بن حذیفہ بھی بتایا گیا ہے۔ اہل صفہ کی طرف ان کی نسبت موہوم ہے کیونکہ یہ وفد ثقیف کے ساتھ رسول مقبولؐ کے آخری زمانہ میں آپؐ کے پاس آئے تھے ان لوگوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے "قبہ" میں ٹھہرایا تھا نہ کہ صفہ میں (قبہ سے مراد کوئی گنبد نما عمارت یا خیمہ ہے) اوس نے متعدد احادیث روایت کی ہیں۔ ایک مستند حدیث میں کہتے ہیں کہ ہم لوگ مسجد مدینہ میں قبہ کے مقام میں تھے کہ آپؐ ہمارے پاس تشریف لائے۔ ایک آدمی نے آکر آہستہ سے آپؐ سے کوئی بات کہی جس کو ہم نہیں سمجھ رہے تھے۔ آپؐ نے فرمایا۔ جا اور ان سے کہہ دے کہ اسے قتل کر دیں۔ پھر آپؐ نے پوچھا شاید وہ اس بات کی گواہی دیتا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں؟۔ اس نے کہا ہاں۔ آپؐ نے فرمایا جا اور ان سے کہہ دے کہ اسے چھوڑ دیں کیونکہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں کے ساتھ قتال کروں اس وقت تک جب تک کہ وہ لا الہ الا اللہ نہ کہیں جب وہ یہ کلمہ کہہ لیں تو ان کے خون اور اموال محفوظ اور معزز ہوں گے الا یہ کہ امر حق کا تقاضا ہو ان کا باقی حساب کتاب اللہ کے ذمہ ہے یعنی اس کے ہم ذمہ دار نہیں۔ اس روایت کو شعبہ اور ابو عوانہ نے ذکر کیا ہے۔ ایک روایت یوں بھی منقول ہے کہ ہم یعنی وفد ثقیف رسول مقبولؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے حلیف حضرات مغیرہ بن شعبہ کے پاس چلے گئے اور مالکیوں کو آپؐ نے "قبۃ" میں ٹھہرایا۔ اوس بتاتے ہیں کہ عشاء کے بعد آپؐ ہمارے پاس تشریف لاتے اور ہمیں گفتگو سے نوازتے آپؐ اکثر قریش کی یہ شکایت فرماتے کہ جب تک ہم مکہ میں تھے کمزور اور بے قدر تھے۔ یعنی قریش ہماری قدر نہیں کیا کرتے تھے پھر جب ہم مدینہ میں آئے تو ہم نے اپنی قوم سے انصاف کیا ان کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی یا بے قدری نہیں کی۔

اسماء بن حارثہ

اسماء بن حارثہ الاسلمی ہند کے بھائی تھے۔ حضرت ابوہریرہ فرماتے تھے۔ میں نے اسماء اور ہند کو ہمیشہ

آپؐ کی خدمت کرتے ہی دیکھا ہے۔ ہر دو صاحبان ہر وقت آپؐ کے دروازے پر ہی بیٹھے رہتے اور خدمت کا موقع تلاش کرتے رہتے۔ بعض متاخرین نے کہا کہ اسماء اہلِ صفہ میں سے تھے۔ عبداللہ بن محمد البغوی کہتے ہیں کہ انہوں نے محمد بن سعد الواقدی کی کتاب میں دیکھا کہ اسماء بن حارثہ نبی اکرمؐ کے صحابی اور اہلِ صفہ میں سے تھے۔ اسی سال کی عمر [illegible]ھ میں بصرہ کے اندر فوت ہوئے۔ حضرت اسماء بن حارثہ سے ایک روایت یوں مروی ہے کہ رسول مقبولؐ نے انہیں بھیجا اور فرمایا اپنی قوم سے جاکر کہہ دو کہ وہ آج دن کا روزہ رکھیں انہوں نے پوچھا یا رسول اللہ! اگر وہ کھانا کھا چکے ہوں تو؟ فرمایا تو بھی اب شام تک کھانا نہ کھائیں۔ یہ دن عاشورہ (دس محرم) کا دن تھا۔

الاغر المزنیؓ

موسیٰ بن عقبہ سے بلا سند ذکر کیا گیا ہے کہ الاغر المزنی اہلِ صفہ میں سے تھے الاغر المزنی سے بعض احادیث بھی مروی ہیں۔ ایک حدیث یہ بیان کرتے ہیں کہ رسول مقبولؐ نے ارشاد فرمایا "لیغان علی قلبی حتی استغفر اللہ مائۃ مرۃ" بعض اوقات میرا قلب غافل ہو جاتا ہے تو میں اللہ سے سو مرتبہ استغفار کرتا ہوں (تشریح: حضور صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت دیگر فرائض نبوت اور اصلاحِ امت کے امور میں مشغول ہو جاتے تو ذکرِ خداوندی سے توجہ ہٹ جاتی اس توجہ ہٹنے کو بھی آپ گناہ سے تعبیر فرما رہے ہیں یہ آپؐ کی غایت درجہ کی تواضع اور بندگی ہے حالانکہ وہ امور بھی ذکرِ الٰہی سے کم درجہ کے نہ تھے اسی لئے کہا جاتا ہے۔ حسنات الابرار سیئات المقربین۔ دوسرے یہ کہ تعلیم امت کے لئے ایسا فرمایا ورنہ آپؐ کے گناہ سے استغفار کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا)

حضرت الاغر المزنی سے ایک اور روایت بھی منقول ہے فرماتے ہیں کہ انہوں نے رسول کریمؐ کو یہ فرماتے سنا یاایھا الناس توبوا الی ربکم فانی اتوب الیہ فی الیوم مائۃ مرۃ "اے لوگو اپنے رب کی طرف اپنے گناہوں سے توبہ کرو کیونکہ میں روزانہ سو مرتبہ توبہ کرتا ہوں (یہ سب کچھ تعلیم امت کی خاطر تھا)

بلال بن رباحؓ

سیدنا بلال بن رباح کا شمار بھی اہلِ صفہ میں ہوتا ہے آپ انتہائی عبادت گزار، تجرد پسند، صدیق اکبرؓ کے آزاد کردہ، فضل و احسان کے دلدادہ، دین کی خاطر آزمائشوں اور ابتلاء میں پڑنے والوں کے سردار رسول امین و سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے خازن، اسلام میں سابق دین سے غایت درجہ کی محبت رکھنے والے۔ اللہ تعالیٰ پر سراسر توکل اور بھروسہ کرنے والے تھے۔

کہا گیا ہے کہ تصوف اس بات کا نام ہے کہ انسان تمام ذرائع اور وسائل کو چھوڑ کر (حضرت بلال کی طرح) محض اللہ تعالیٰ پر توکل و بھروسہ کرلے۔

حضرت جابر بیان کرتے ہیں کہ عمر فاروق رضی فرمایا کرتے تھے۔ ابوبکر ہمارے سردار ہیں اور انہوں نے ہمارے سردار حضرت بلال رضی کو آزاد کرایا۔۔۔ زید بن ارقم کہتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا نعم المرء بلال وھو سید المؤذنین بلال کس قدر اچھا آدمی ہے وہ تمام موذنوں کا سردار ہے۔

حضرت عروہ بن زبیر بیان کرتے ہیں کہ ورقہ بن نوفل حضرت بلال رضی کے پاس سے گزرے جبکہ انہیں اسلام کی پاداش میں اذیت دی جا رہی تھی اور وہ (بلال رضی) احد احد کہے جا رہے تھے۔ ورقہ بن نوفل امیہ بن خلف کی طرف متوجہ ہوئے جو حضرت بلال کو اذیت پہنچا رہا تھا اور فرمانے لگے۔ میں اللہ کی قسم اٹھا کر کہتا ہوں کہ اگر تم نے اسی طرح اذیت پہنچاتے ہوئے اس (بلال) کو قتل کر دیا تو میں اس پر توجہ کروں گا۔ ایک دن ابوبکر صدیق گزرے تو بھی یہ ظالم حضرت بلال کے ساتھ اسی طرح کر رہا تھا۔ آپ نے امیہ سے فرمایا کیا تو اس مسکین کے سلسلہ میں اللہ سے نہیں ڈرتا؟ کب تک تو اسے تکلیف پہنچاتا رہے گا؟ اس نے کہا: اگر آپ کو اس کی یہ حالت پسند نہیں تو اسے اس حالت سے نجات دلا دیں۔ آپ نے فرمایا۔" ہاں میرے پاس ایک سیاہ فام غلام ہے جو اس (بلال) سے زیادہ قوی ہے اور تیرے دین پر ہے وہ میں تجھے بلال کے بدلے میں دیتا ہوں۔ امیہ نے کہا مجھے یہ سودا منظور ہے۔ چنانچہ آپ رضی نے وہ غلام دے کر حضرت بلال کو آزاد فرما دیا۔ بلال کے ساتھ چھ اور غلاموں کو بھی آپ نے آزاد فرمایا۔

محمد بن اسحاق نے کہا۔ حضرت بلال رضی حضرت ابوبکر صدیق رضی کے آزاد کردہ غلام تھے۔ ان کی والدہ کا نام حمامہ تھا۔ اسلام میں سچے پکے اور پاکیزہ قلب والے تھے۔ آپ کا مالک امیہ آپ کو دوپہر کی گرمی میں مکہ کی تپتی ریت پر لٹا دیتا پھر آپ کے سینہ پر بھاری پتھر رکھ دیتا جس سے آپ ادھر ادھر حرکت نہ کر سکتے پھر کہتا تیرے ساتھ اسی طرح کیا جاتا رہے گا یہاں تک کہ تو مر جائے یا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا انکار کر کے "لات و عزیٰ" کی پوجا کرنے لگے مگر آپ تھے کہ اتنی تکلیف میں بھی احد احد کہے جا رہے تھے: حضرت عمار بن یاسر رضی حضرت بلال اور ان کے ساتھیوں کی آزمائش اور صدیق اکبر کے آزاد کرانے کا ذکر مندرجہ ذیل اشعار میں یوں فرماتے ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی کا نام عتیق بھی تھا۔

ترجمہ ۱۔ اللہ تعالیٰ نے بلال رضی اور اس کے ساتھیوں کی طرف سے عتیق (ابوبکر صدیق) کو جزائے خیر عطا فرمائی اور فاکہ و ابوجہل کو ذلیل وخوار فرمایا

۲۔ جب کہ ان دونوں نے بلال کے حق میں برائی کا ارادہ کیا اور نہ ڈرے جیسا کہ عاقل آدمی کو ڈرنا چاہیئے

۳۔ بلال کا قصور صرف اتنا تھا کہ اس نے تمام لوگوں کے رب کو ایک مان لیا تھا اور اس بات کی گواہی دی تھی کہ اللہ ہی ان کا پروردگار ہے۔

۴۔ بلال نے کہا! اگر تم مجھے قتل کرنے کے درپے ہو تو بیشک مجھے قتل کر دو میں قتل کئے جانے کے خوف سے رحمٰن کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراؤں گا۔

۵۔ اے ابراہیمؑ، یونسؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ علیہم السلام کے پالن ہار! مجھے ان ظالموں سے نجات فرما اور آزمائش میں نہ ڈال۔

حضرت عبداللہ کہتے ہیں پہلے پہل سات آدمیوں نے اسلام کا اظہار کیا۔ بذاتِ خود رسول مقبولؐ ابوبکر صدیقؓ عمار بن یاسرؓ ان کی والدہ سمیہ، صہیب رومی، بلال اور مقداد۔ آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم کی اللہ تعالیٰ نے آپ کے چچا ابوطالب کے ذریعے اور ابوبکر کی ان کی قوم کے ذریعہ حفاظت فرمائی۔ باقی تمام کو مشرکین پکڑ کر آہنی لباس پہنا دیتے پھر دھوپ میں ان کو پگھلاتے۔ حضرت بلال کو سب سے زیادہ تکالیف پہنچائی گئیں۔ اللہ کے راستے میں انہیں بہت ذلیل کیا گیا۔ کفار مکہ انہیں لڑکوں کے سپرد کر دیتے۔ لڑکے انہیں مکہ کی گلیوں میں گھماتے مگر وہ احد احد ہی کہے جاتے حضرت انس بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ بلال۔ حبشہ میں سب سے پہلے اسلام لانے والے ہیں۔

عبداللہ الموزنی کہتے ہیں۔ میں بلال سے ملا تو ان سے پوچھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخراجات کیسے چلتے تھے؟

حضرت بلال نے بتایا۔ آپؐ کے اخراجات کے انتظامات آپؐ کی وفات تک میرے سپرد تھے مگر کوئی مستقل ذریعہ آمدنی نہیں تھا۔ جب کوئی مسلمان شخص آتا اور اس کے جسم پر لباس نہ ہوتا تو مجھے حکم فرماتے۔ میں قرض لے کر کپڑے خریدتا اور اس کو پہنا دیتا اور اس کے کھانے کا بھی انتظام کرتا۔ حضرت عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بلال کے پاس تشریف لے گئے۔ ان کے پاس کھجور کا ایک ڈھیر رکھا تھا۔ آپؐ نے پوچھا۔ بلال! یہ کیا ہے؟ عرض کیا یا رسول اللہ یہ آپؐ اور آپؐ کے مہمانوں کی خاطر ذخیرہ کر رکھا ہے آپؐ نے فرمایا۔ کیا تو اس بات سے نہیں ڈرتا کہ یہ تیرے لئے آگ کا ایندھن بنے۔ اے بلال اسے خرچ کر ڈال اور عرش والے مہربان رب سے بھوک کا خوف نہ کر۔ ابوسعید خدری حضرت بلالؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول مقبولؐ نے فرمایا۔ "یا بلال مت فقیراً ولا تمت غنیاً۔ اے بلال فقیر ہو کر مرنا نہ کہ غنی ہو کر۔ میں (بلال) نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! یہ کس طرح ہوگا۔؟"

فرمایا تجھے جو کچھ رزق عطا کیا جائے اسے چھپا کر نہ رکھ اور جو کچھ تجھ سے مانگا جائے اسے روک نہ رکھ۔ میں نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! ایسا میرے واسطے کیسے ممکن ہوگا؟

آپؐ نے فرمایا۔ یہ چیز ہوگی یا پھر آگ

حضرت انس روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ کے راستے میں جتنی اذیت مجھے پہنچائی گئی۔ دنیا میں کسی کو نہیں پہنچائی گئی۔ پورا پورا مہینہ گزر جاتا تھا مگر میرے اور بلال رضؓ کے کھانے کے واسطے کوئی شے نہ ہوتی۔

حضرت جابر روایت کرتے ہیں کہ رسول مقبولؐ نے فرمایا۔ میں جنت میں داخل ہوا تو میں نے اپنے آگے پاؤں کی آہٹ سنی۔ میں نے جبریل سے پوچھا۔ یہ کون ہے؟ جبریل نے بتایا کہ یہ بلال ہے۔ حضرت بریدہ بیان کرتے

ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے جنت میں اپنے آگے آگے آہٹ سنی میں نے پوچھا یہ کون ہے؟ ملائکہ نے بتایا یہ بلال ہے اور اسے اس بات کی اطلاع کر دو۔ آپ نے بلال سے پوچھا: تو کس طرح جنت میں مجھ سے سبقت لے گیا؟ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ میں جب بھی بے وضو ہوتا ہوں وضو کر لیتا ہوں اور ساتھ ہی دو رکعات نفل بھی ضرور پڑھتا ہوں۔ اسی قسم کی ایک روایت ابو حیان نے ابوہریرہ سے بھی بیان کی ہے۔ حضرت قیس کہتے ہیں۔ ابوبکر صدیقؓ نے پانچ اواق کے عوض بلال کو خرید کر آزاد فرمایا بلال نے عرض کیا۔ اے ابوبکر! اگر آپ نے مجھے محض اللہ کی خاطر آزاد کرایا ہے تو مجھے چھوڑ دیں کہ میں اللہ کے لئے عمل کرتا رہوں اور اگر آپ نے مجھے اپنا خادم بنانے کے لئے آزاد کرایا ہے تو مجھے خادم بنا لیجئے۔ یہ سن کر حضرت ابوبکر رونے لگے اور فرمایا: میں نے تجھے اللہ کے لئے آزاد کرایا ہے جاؤ تم آزاد ہو اللہ کے لئے عمل کرو۔

سعید بن مسیب کہتے ہیں۔ خلافت ابوبکر صدیقؓ کے زمانے میں حضرت بلال شام کی طرف جانے کی تیاری فرمانے لگے۔ حضرت ابوبکر کو معلوم ہوا تو بلال سے فرمانے لگے: اے بلال تو ہمیں اس حال میں چھوڑ کر جا رہا ہے اگر تو یہاں رہ کر ہماری اعانت کرتا تو اچھا ہوتا۔

بلال کہنے لگے یا خلیفۃ الرسول! اگر آپ نے مجھے اللہ کے لئے آزاد کیا ہے تو مجھے جانے دیجئے اور اگر آپ نے اپنے لئے آزاد کرایا ہے تو بے شک مجھے اپنے پاس روک لیں۔ یہ سن کر حضرت ابوبکر نے اجازت دے دی بلال شام کی طرف روانہ ہو گئے اور پھر وہیں وفات پائی۔

حضرت بلال ایک روایت یوں بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک کڑاکے کی سردی والی رات میں صبح کی اذان دی مگر کوئی آدمی مسجد میں نہ آیا۔ میں نے دوبارہ اذان دی مگر پھر بھی کوئی نہ آیا۔ حضورؐ نے فرمایا! کیا ہو گیا ہے لوگوں کو؟ میں نے عرض کیا سردی نے انہیں روک رکھا ہے۔ آپؐ نے دعا فرمائی: اے اللہ! سردی کو توڑ دے۔ حضرت بلال کہتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ لوگ صبح کے وقت گرمی کی وجہ سے دستی پنکھوں سے ہوا حاصل کر رہے ہیں۔

البراء بن مالک

البراء بن مالک الانصاری حضرت انس بن مالک کے بھائی ہیں۔ محمد بن اسحاق نے کہا کہ براء اہل صفہ میں سے ہیں۔ براء غزوہ احد اور ما بعد کے تمام غزوات میں شریک رہے۔ "تستر" کی لڑائی میں شہید ہوئے۔ انتہائی نفیس القلب سماع کی طرف مائل، نرم پسند، بہادر اور شتر سوار تھے۔ حضرت انس بن مالک بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "بہت سارے بوسیدہ کپڑوں والے جنہیں کوئی اپنے ہاں ٹھہرانے کو تیار نہیں ایسے عالی مرتبہ ہیں کہ اگر وہ اللہ کو کسی فعل پر قسم دے دیں تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم ضرور پوری فرمائے گا۔ ایسے خوش نصیب لوگوں میں براء بن مالک بھی ہیں۔ تستر کے روز لوگ ان کے پاس آئے اور کہا اے براء! اپنے رب کو قسم دو، پھر انہوں نے کہا کہ

اے رب! جب تونے ہمیں ان پر غلبہ دے دیا تو مجھے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ملادے۔ راوی کا بیان ہے کہ اس کے بعد وہ شہید ہو گئے۔ حضرت انس بن مالک کہتے ہیں کہ براء بن مالک بڑے خوش آواز تھے۔ رسول مقبولؐ کے سامنے رجزیہ کلام پڑھتے۔ ایک سفر میں رجز کہتے کہتے عورتوں کے قریب چلے گئے۔ حضورؐ نے فرمایا۔ ایاک والقواریر۔ ایاک والقواریر ہے براء ان نازک آبگینوں سے بچو

حضرت انس بن مالک کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ براء بن مالک پیٹھ کے بل لیٹے خوش الحانی کے ساتھ کچھ کہہ رہے تھے حضرت انس کہتے ہیں۔ میں نے انہیں آواز دی اور اٹھ کر بیٹھ گئے اور فرمانے لگے، کیا تو خیال کرتا ہے کہ میں بستر پر مر رہا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے سو مشرکین کو کیفر کردار تک پہنچایا ہے خفیہ طور پر نہیں بلکہ للکارتے ہوئے اور ان کو قتل کرنے میں کوئی ایک میرا شریک نہ تھا۔

ثوبان مولیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

عمرو بن علی نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام ثوبانؓ اہل صفہ میں سے تھے۔ وہ انتہائی قناعت پسند، پاک دامن، وعدے کے پکے اور ظریف الطبع تھے۔ جب انہوں نے سوال نہ کرنے اور بادشاہوں کے پاس نہ جانے کا عہد کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے جنت کی ضمانت دی۔ یوسف بن عبدالحمید کہتے ہیں۔ میں حضرت ثوبان سے ملا۔ آپ نے میرے اوپر عمدہ قسم کے کپڑے اور انگوٹھی ملاحظہ فرمائی۔ فرمانے لگے۔ اے یوسف. تو ان کپڑوں اور خصوصاً انگوٹھی سے کیا کرتا ہے؟ یہ انگوٹھیاں تو بادشاہوں کے لئے ہوتی ہیں۔ یوسف بتاتے ہیں کہ انہوں نے اس کے بعد انگوٹھی پہننا چھوڑ دی۔ یہی یوسف بیان کرتے ہیں کہ حضرت ثوبان نے ان سے فرمایا کہ رسول مقبولؐ نے ایک مرتبہ اپنے اہل کے واسطے دعا فرمائی جس میں حضرت علی المرتضیٰ اور فاطمۃ الزہرا اور دیگر حضرات کا نام لیا۔ حضرت ثوبان کہتے ہیں۔ میں نے عرض کیا یا نبی اللہ! کیا میں بھی اہل بیت میں سے ہوں؟ فرمایا جب تک کہ تو کسی سے سوال نہ کرے۔ حضرت ثوبان کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا. کون ہے جو مجھے ایک چیز کی ضمانت دے میں اسے جنت کی ضمانت دوں گا۔ حضرت ثوبان نے عرض کیا یا رسول اللہ! میں ضمانت دیتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا کسی سے کوئی سوال نہ کر راوی کہتے ہیں کہ اونٹ پر سوار ہونے کی حالت میں بسا اوقات حضرت ثوبان کے ہاتھ سے کوڑا اگر جاتا تو کسی سے پکڑانے کو نہ کہتے خود اونٹ سے نیچے اترتے اور اٹھا لیتے۔ حضرت ثوبان سے ایک روایت یوں بھی مروی ہے کہ رسول مقبولؐ نے فرمایا جو شخص مجھے اس بات کی ضمانت دے کہ وہ لوگوں سے سوال نہ کرے گا تو میں اس کے لئے جنت کا ذمہ لیتا ہوں حضرت ثوبان نے ہامی بھر لی اس کے بعد آپ کسی سے کوئی سوال نہ فرماتے تھے۔

حضرت ثوبان کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے بلا ضرورت سوال کیا روز قیامت اس کا چہرہ بے رونق ہوگا۔ حضرت ثوبان کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص خزانہ چھوڑ کر مرا قیامت

کے دن وہ خزانہ گنجے اژدہے کی صورت میں اس کے سامنے پیش ہوگا اور کہے گا۔ تیرے لئے ہلاکت ہو۔ میں تیرا وہ خزانہ ہوں جسے تو چھوڑ کر مرا تھا اس کے بعد اژدہا اس کے ہاتھ کو پھر تمام جسم کو کاٹنا شروع کر دے گا حضرت ثوبان کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص سونا اور چاندی چھوڑ کر مرے گا بروز قیامت ایسی سونا چاندی سے اسے قدموں سے لے کر ٹھوڑی تک داغ دیا جائے گا۔ ابو عامر بیان کرتے ہیں کہ حضرت ثوبان نے ان سے فرمایا۔ اے ابو عامر! اگر تیرے پاس موجود بکری کا دودھ تیری ضرورت سے زیادہ ہو تو اس زائد از ضرورت مقدار کو خرچ کر ڈال۔ حضرت ثوبان بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عنقریب بہت ساری قومیں تمہارے اوپر ہر طرف سے یوں ہجوم کریں گی جس طرح لقمے کے پیالے پر ہجوم کر آتے ہیں۔ صحابہ نے عرض کیا یارسول اللہ! کیا ہم اس وقت تعداد میں بہت کم ہوں گے؟ آپؐ نے فرمایا تعداد کے اعتبار سے تو تم کم نہیں ہو گے مگر ہو گے سمندر کی جھاگ کی مانند، تمہارے دشمنوں کے دلوں میں تمہارا رعب و خوف نہیں رہے گا۔ علاوہ ازیں تمہارے اپنے قلوب میں "وہن" پیدا ہو جائے گی۔ صحابہ نے دریافت کیا وہن کیا چیز ہے؟ فرمایا دنیا کی محبت اور موت کی ناپسندیدگی۔ حضرت ثوبان بیان کرتے ہیں کہ ہم ایک سفر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے کہ مہاجرین کہنے لگے کاش ہمیں معلوم ہو جاتا کہ کون سا مال اچھا ہے کیونکہ سونا چاندی کی مذمت کے سلسلہ میں تو وحی الٰہی نازل ہو چکی ہے۔ حضرت عمر نے کہا اگر تم لوگ کہو تو میں اس ضمن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کرتا ہوں۔ مہاجرین نے کہا کیوں نہیں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مہاجرین کا مسئلہ پیش کیا۔ آپؐ نے فرمایا۔ بہترین مال یہ ہے کہ تم میں سے کسی کی زبان اللہ کا ذکر کرنے والی ہو۔ اس کا قلب شکر الٰہی بجالانے والا ہو اور اس کی بیوی ایسی ایماندار ہو کہ اس کے ایمان میں مددگار ثابت ہو۔ اعمش نے بھی سالم سے اسی قسم کی روایت نقل کی ہے۔ حضرت ثوبان کہتے ہیں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس موجود تھے کہ ایک یہودی عالم آپؐ کے پاس آیا اور کہنے لگا مجھے آپ سے ایک سوال کرنا ہے۔ آپؐ نے فرمایا پوچھو۔ کہنے لگا جب زمین و آسمان تبدیل کر دیئے جائیں گے تو اس وقت لوگ کہاں جائیں گے۔ آپؐ نے فرمایا لوگ تاریکی میں ایک پل کے نیچے ہوں گے۔ یہودی نے پوچھا۔ سب سے پہلے کون تاریکی سے نکلے گا؟ آپؐ نے فرمایا۔ فقراء مہاجرین۔ حضرت ثوبان کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سب سے افضل دینار وہ ہے جسے انسان اپنے اہل و عیال پر یا اللہ کے رستے میں اپنے چوپائے پر یا اللہ کے لئے اپنے ساتھیوں پر خرچ کرے۔

ثابت بن ضحاک

حضرت ثابت بن ضحاک بھی اہل صفہ میں سے بتائے جاتے ہیں۔ آپ ان خوش نصیب صحابہ میں سے ہیں جنہیں بیعت الرضوان کا شرف حاصل ہوا۔ آپ سے ایک روایت یوں مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص نے کسی مومن کو کافر کہا گویا اس نے اسے قتل کیا۔ حضرت ثابت سے ایک روایت یوں منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جس شخص نے ملتِ اسلام کی جھوٹی قسم اٹھائی تو وہ جھوٹا ہی ہے۔

ثابت بن ودلیعہ

ثابت بن ودلیعہ الانصاری بھی اہل صفہ میں شامل بیان کئے جاتے ہیں۔

ثقیف بن عمرو

ثقیف بن عمرو بن شمیط الاسدی بنی امیہ کے حلفاء میں سے تھے۔ غزوۂ خیبر میں شہید ہوئے بقول خلیفہ بن خیاط یہ بھی اہل صفہ میں سے ہیں۔

ابوذر غفاری (جندب بن جنادۃ)

حضرت ابوذر غفاریؓ انتہائی قدیم الاسلام ہیں یہاں تک کہ اسلام قبول کرنے والوں میں چوتھے نمبر پر آتے ہیں۔ آپ ظہور اسلام سے قبل کے توحید پرست اور عبادت گزار تھے آپ اہل صفہ کے ساتھ انس و محبت کی وجہ سے اکثر وقت انہی کے پاس گزارتے اس لئے یہاں اہل صفہ کی فہرست میں بھی ان کا نہایت مختصراً ذکر کیا جاتا ہے

حضرت اسماء بنت یزید روایت کرتی ہیں کہ ابوذر ہمیشہ خدمت نبوی میں مشغول رہتے جب فارغ ہوتے تو مسجد میں چلے آتے کیونکہ مسجد ہی آپ کا گھر تھا۔ مسجد میں آکر لیٹ جاتے۔ ایک رات رسول کریمؐ تشریف لائے آپؐ نے انہیں مسجد کے ریتلے فرش پر سوتے ہوئے پایا۔ آپؐ نے اپنے پاؤں مبارک سے ہلایا تو اٹھ کر بیٹھ گئے۔ آپؐ نے فرمایا۔ کیا تم مسجد میں سو رہے ہو؟ ابوذر نے عرض کیا یارسول اللہ میں اور کہاں لیٹوں مسجد کے سوا میرا کوئی گھر ہی نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ سن کر خود بھی انہی کے پاس جلوہ فرما ہوتے۔

حضرت ابوذر بیان فرماتے ہیں کہ میں اصحاب صفہ میں موجود رہتا۔ جب شام ہوتی تو ہم تمام حضورؐ کے در اقدس پر حاضر ہو جاتے آپؐ ہر آدمی کو حکم فرماتے کہ وہ اہل صفہ میں سے ایک کو لے جائے چنانچہ ہم میں سے دس افراد یا اس سے کچھ کم و بیش بچ رہتے۔ جب آپؐ کا کھانا آتا تو ہم سب مل کر آپؐ کے ساتھ کھاتے۔ جب ہم کھانے سے فارغ ہو جاتے تو آپؐ فرماتے۔ جا کر مسجد میں سو جاؤ۔ حضرت ابوذر بتاتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس سے گزرے جبکہ وہ منہ کے بل اوندھے سوئے ہوئے تھے۔ آپؐ نے انہیں پاؤں سے ٹھوکر ماری اور فرمایا: اے جندب (ابوذر کا نام ہے) اس طرح منہ کے بل لیٹنا شیطان کا لیٹنا ہے۔

جرہد بن خویلد

جرہد بن خویلد الاسلمی بھی ساکنان صفہ میں سے ہیں۔ وہ صلح حدیبیہ میں موجود تھے۔ موصوف بیان کرتے

ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف فرما ہوئے۔ اتفاق سے میری ران کھلی ہوئی تھی۔ آپؐ نے فرمایا کیا تجھے معلوم نہیں کہ ران کا ڈھانپنا ضروری ہے۔

جُعیل بن سراقہ

جعیل بن سراقہ الضمری بھی ساکنانِ صفہ میں شامل ہیں۔ محمد بن ابراہیم التیمی بیان کرتے ہیں کہ ایک صحابی نے حضورؐ کی خدمت میں عرض کی۔ یا رسول اللہ! آپ نے عیینہ اور اقرع کو تو سو سو (درہم یا دینار وغیرہ) عطا فرمائے اور جعیل بن سراقہ الضمری کو یوں ہی چھوڑ دیا؟ آپؐ نے فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے جعیل بن سراقہ۔ عیینہ اور اقرع جیسے تمام روئے زمین کے لوگوں سے بہتر ہے مگر میں نے ان کی تالیفِ قلب کی خاطر ایسا کیا ہے۔ حضرت ابوذر بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا جعیل کے متعلق تیرا کیا خیال ہے؟ میں نے عرض کیا جس طرح شکل کے اعتبار سے مسکین ہے طبیعت کے اعتبار سے بھی مسکین ہے۔ پھر آپؐ نے پوچھا۔ فلاں آدمی کے متعلق تیری کیا رائے ہے؟ میں نے عرض کیا سردار لوگوں میں سے ایک سردار ہے۔ آپؐ نے فرمایا جعیل روئے زمین کے ایسے تمام سرداروں سے بدرجہا بہتر ہے۔ میں نے عرض کی اگر فلاں ایسا ہے تو آپؐ اس کے ساتھ جعیل سے بہتر سلوک کیوں کرتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا دراصل بات یہ ہے کہ وہ (فلاں) اپنی قوم میں سردار ہے اور میں ان کی تالیفِ قلب کی خاطر ایسا کرتا ہوں۔

جاریہ بن جمیل

دارقطنی اور ابن جریر نے ذکر کیا کہ جاریہ بن جمیل بن شبۃ بن قرط اہل صفہ میں سے ہیں اور انہیں صحبت نبوی کا شرف حاصل تھا۔

حذیفہ بن الیمانؓ

حذیفہ چونکہ بہت سارا عرصہ اہلِ صفہ کے ساتھ رہے اس لئے ان کا ذکر بھی مختصراً یہاں کیا جاتا ہے۔ حضرت حذیفہ اور ان کے والد مہاجرین میں سے تھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں شرفِ ہجرت اور شرفِ نصرت کے درمیان اختیار دیا۔ انہوں نے شرفِ نصرت کو اختیار کر لیا۔ لہٰذا انصار کے حلیف اور انصار کے زمرہ میں شمار ہوئے۔ قربِ قیامت کے فتنوں اور آفات کے جاننے والے عالم، عبادت گزار اور دنیا سے منہ موڑنے والے تھے غزوہ احزاب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اکیلے انہیں دشمن کی خبر گیری کے لئے رات کے وقت بھیجا۔ جب واپس آئے تو ہوا اور سردی سے بچاؤ کے لئے آپؐ نے اپنی عبائے مبارک کا ایک حصہ انہیں اوڑھنے کو عطا فرمایا

ابراہیم تیمی اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ ہم حذیفہ بن الیمان کے پاس موجود تھے۔ حذیفہ نے بیان کیا کہ ہم غزوہ احزاب کے موقع پر ایک سخت آندھی اور ٹھنڈک کی رات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے کہ آپؐ نے فرمایا جو شخص اس وقت دشمن کی خبر لے آئے گا قیامت کے دن وہ میرے ساتھ ہوگا کسی نے کوئی جواب نہ دیا آپؐ نے دوبارہ اور پھر سہ بارہ اسی طرح فرمایا مگر کسی کی ہمت نہ پڑی بالآخر آپؐ نے فرمایا اے حذیفہ اٹھو اور دشمن کی خبر لے آؤ۔ حذیفہ کہتے ہیں اس کے بعد میرے واسطے اٹھنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ میں اٹھا تو آپؐ نے ارشاد فرمایا۔ دشمن کی صرف خبر لے آؤ کہ وہ کیا کر رہے ہیں انہیں ڈرانا دھمکانا نہیں حذیفہ بیان کرتے ہیں کہ وہ دشمن کی طرف یوں گئے جس طرح کوئی آدمی حمام میں چلتا ہے اور واپس بھی اسی طرح آئے دشمن کو احساس تک نہ ہونے دیا واپسی پر رسول کریمؐ کو دشمن کے حالات سے آگاہ کیا۔ حذیفہ کہتے ہیں مجھے سخت سردی محسوس ہو رہی تھی آپؐ نے اپنی عبا مبارک کا زائد حصہ مجھے پہنا دیا۔ میں صبح تک آپؐ کے پہلو میں سویا رہا جب صبح ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے نیند میں مست اٹھ۔

حذیفہ بن اُسید

حذیفہ بن اسید الغفاری اہلِ صفہ میں سے ہیں۔ بیعت رضوان میں شامل تھے۔ یہی حذیفہ روایت کرتے ہیں کہ رسول مقبولؐ ہمارے پاس تشریف لے آئے جبکہ ہم قیامت کا ذکر کر رہے تھے۔ آپؐ نے فرمایا قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک کہ یہ دس علامات ظاہر نہیں ہوں گی ۔ دخان (دھواں) دجال، دابۃ (چوپایہ) مغرب کی طرف سے طلوعِ سورج ۔ تین جگہ خسف (زمین کا دھنس جانا) ایک مشرق، ایک مغرب اور ایک جزیرۃ العرب میں یاجوج وماجوج کا نکلنا آگ جو قعرِ عدن سے نکلے گی اور لوگوں کو میدانِ حشر کی جانب ہانک لے جائے گی ابو نعیم کہتے ہیں میرے خیال میں راوی نے ایک علامت یہ بھی بتائی کہ حضرت عیسیٰ بن مریم آسمان سے نازل ہوں گے۔ یہی حذیفہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے لوگو! میں تم سے پہلے آگے جانے والا ہوں تم میرے پاس حوضِ کوثر پہ وارد ہو گے اس وقت میں تم سے دو چیزوں کے بارے میں سوال کروں گا۔ میرے بعد ان دونوں کا خیال رکھنا۔ ان میں بڑی اور اہم چیز کتاب اللہ (قرآنِ مجید) ہے جس کا ایک کنارہ اللہ تعالیٰ کے پاس اور دوسرا تمہارے ہاتھوں میں ہے اس کو مضبوطی سے تھامے رکھنا تم کبھی گمراہ نہ ہو گے اور دوسری چیز میرے اہل بیت ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے خبر دی ہے کہ یہ دونوں چیزیں (قرآن اور عترت) قیامت تک جدا نہیں ہوں گی ۔

حبیب بن زید

حبیب بن زید بن عاصم الانصاری قبیلہ بنی نجار سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ اہل صفہ اور اہل عقبہ (جن

لوگوں نے مدینہ منورہ سے آکر مکہ مکرمہ میں ایک گھاٹی پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ اقدس پر بیعت کی تھی) میں شامل ہیں۔ اتفاق ایسا ہوا کہ مسلیمہ کذاب کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے۔ وہ ملعون کہتا کیا تم اس بات کی شہادت دیتے ہو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں؟" آپ فرماتے ہاں پھر وہ پوچھتا کیا تم میرے اللہ کے رسول ہونے کی گواہی دیتے ہو؟ آپ فرماتے مجھے سنائی نہیں دے رہا۔ اس نے آپ کو شہید کر دیا آپ کی والدہ ماجدہ کا نام "نسیبہ" تھا۔ ابوبکر صدیقؓ کے زمانے میں مسلیمہ کذاب کی سرکوبی کے لئے جب افواجِ اسلامی نکلیں تو یہ بلند ہمت صحابیہ بھی لشکر میں شامل ہوئیں، اور بنفسِ نفیس جنگ میں شریک ہوئیں۔ مسلیمہ کو اللہ تعالیٰ نے ٹھکانے لگایا۔ یہ صحابیہ جب مدینہ واپس پہنچیں تو ان کے جسم پر تلوار و نیزوں کے دس زخم تھے

حارثہ بن نعمان

حارثہ بن نعمان الانصاری النجاری بھی اہل صفہ میں شامل ہیں۔ بدری ہیں اور ان آٹھ باہمت صحابہ میں سے ہیں جو غزوہ حنین میں ثابت قدم رہے آخری عمر میں آپ کی بصارت جاتی رہی تھی۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میں نے سوتے میں اپنے آپ کو جنت میں دیکھا۔ میں نے ایک قاری کی آواز سنی۔ میں نے پوچھا یہ کون ہے؟ ملائکہ نے بتایا یہ قاری حارثہ بن نعمان ہیں آپؐ نے فرمایا نیکی کا یہی اجر ہے حضرت حارثہ اپنی ماں کے ساتھ تمام لوگوں سے زیادہ نیکی اور حسنِ سلوک کرنے والے تھے۔

حضرت حارثہ کی بینائی جب چلی گئی تو جائے نماز سے اپنے حجرہ کے دروازے تک ایک دھاگہ باندھ لیا تھا اور اپنے پاس کھجوروں کا ایک ٹوکرا رکھتے جب کوئی مسکین آتا تو خود دھاگہ پکڑ کر جاتے اور مسکین کو کھجوریں پکڑا آتے اہلِ خانہ کہتے کہ اس خدمت کے لئے ہم سب حاضر ہیں آپ اتنی تکلیف نہ کیا کریں آپ فرماتے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ مسکین کو اپنے ہاتھ سے کوئی چیز پکڑانا موت کی سختی سے بچاتا ہے۔

حازم بن حرملہ

حازم بن حرملہ الاسلمی بھی اہل صفہ میں داخل ہیں۔ ان سے ایک روایت یوں منقول ہے کہ میں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے گزرا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بلایا میں حاضر ہوا تو فرمایا اے حازم! لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم، کے ورد کی کثرت کیا کرو کیونکہ یہ جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے۔

حنظلہ بن ابی عامر

حنظلہ بن ابی عامر الراہب الانصاری بھی اہل صفہ میں شامل ہیں۔ آپ وہ عظیم المرتبت صحابی ہیں جنہیں ملائکہ نے غسل دیا۔

حضرت حنظلہ اور ابوسفیان بن حرب کی غزوۂ احد میں مڈھ بھیڑ ہوئی تو حنظلہ ابوسفیان کو گرا کر اس کے اوپر چڑھ گئے۔ شداد بن الاسود جسے "ابن شعوب" کہا جاتا تھا نے دیکھ لیا اس نے بڑھ کر آپ پر تلوار کا وار کیا جس سے آپ نے جامِ شہادت نوش فرمایا۔

حضورؐ نے فرمایا۔ تمہارے ساتھی یعنی حنظلہ کو ملائکہ غسل دے رہے ہیں اس کی گھر والی سے دریافت کرو کیا معاملہ ہے ؟ ان کی زوجہ سے پوچھا گیا تو انہوں نے بتایا کہ وہ جنبی تھے جہاد کے واسطے پکارنے والے نے جب پکارا تو بلا نہائے گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہی وجہ ہے کہ ملائکہ نے انہیں غسل دیا۔[1]

حجاج بن عمرؓ

حجاج بن عمرؓ الاسلمی کی نسبت یہی کہا جاتا ہے کہ وہ اہل صفہ میں داخل ہیں۔

حکم بن عمیر

حکم بن عمیر الثمالی بھی اہل صفہ کی طرف منسوب ہیں۔ وہ شام میں رہائش پذیر تھے یہی حکم ایک حدیث یوں بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ دنیا میں مہمانوں کی طرح ہو جاؤ۔ مساجد کو اپنا گھر بناؤ۔ اپنے دلوں کو رقت کا عادی بناؤ۔ زیادہ رویا کرو، زیادہ خواہشات نہ کرو تم وہ مکانات بناتے ہو جن میں رہتے نہیں ہو وہ کچھ جمع کرتے ہو جو کھاتے نہیں ہو۔ ایسی ایسی امیدیں قائم کرتے ہو جن کو پا نہیں سکتے۔ آدمی کے دین میں نقص اور کمی کے لئے یہی بات کافی ہے کہ اس کی خطائیں زیادہ ہو جائیں اس کا حلم و بردباری اور معرفت کم ہو۔ رات کو مردوں کی مانند سونے والا ہو، دن کو بیکار رہنے والا ہو، سست ہو، بے صبر اور گھبرا جانے والا ہو، کنجوس ہو اور لہو و لعب میں مست ہو۔

انہی حکم سے ایک حدیث یوں منقول ہے کہ رسول مقبولؐ نے فرمایا اللہ تعالیٰ سے اس طرح حیا کرو جس طرح حیا کرنے کا حق ہے، سر اور سر میں پیدا ہونے والے خیالات، پیٹ اور پیٹ میں جمع ہونے والی خوراک کی حفاظت کرو۔ موت اور موت کے وقت کی آزمائش کو یاد رکھو۔ جس شخص نے ایسا کیا اس کا بدلہ جنت کا ٹھکانہ ہے۔

[1] اس لئے آپ کو غسیل الملائکہ کہتے ہیں (ادارہ)

حرملہ بن ایاس

خلیفہ بن خیاط کے مطابق حرملہ بن ایاس بھی اہل صفہ میں شامل ہیں ان کا نام حرملہ بن عبداللہ العنبری بھی بتایا گیا ہے حرملہ کے ایک پوتے ان سے روایت کرتے ہیں کہ میں (حرملہ) ایک قبیلہ کے وفد کے ساتھ نبی اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا جب میں واپس ہونے لگا تو میں نے عرض کیا یارسول اللہ! مجھے کوئی وصیت فرمائیے آپؐ نے فرمایا اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ ڈرتے رہو جب تم کسی مجلس میں بیٹھو اور وہاں ایسی باتیں سنو جو تمہیں پسند آئیں تو بعد میں دوسرے لوگوں کو بھی وہ باتیں سناتے رہو اور اگر مجلس میں ایسی گفتگو ہو جو تمہیں پسند نہ آئے تو اسے نہ دہراؤ ایک روایت اس طرح منقول ہے کہ حرملہ آپؐ کے پاس کئی دن ٹھہرے رہے جب واپس جانے لگے تو عرض کیا یارسول اللہ! مجھے کوئی حکم فرمائیے آپؐ نے فرمایا نیکی کرو اور بدی سے بچو۔ حرملہ کہتے ہیں واپسی میں مجھے خیال آیا کہ اگر میں کچھ مزید پوچھتا تو آپؐ مزید فرما دیتے چنانچہ میں نے دوبارہ لوٹ کر عرض کیا یارسول اللہ! مجھے کوئی وصیت فرمائیے آپؐ نے وہی ارشاد فرمایا کہ برائی سے بچو اور نیکی بجا لاؤ نیز یہ کہ لوگوں کی جو بات تیرے کانوں کو اچھی لگے بعد میں تم بھی کہتے رہو اور جو بات اچھی نہ لگے اسے مت دہراؤ

خبّاب بن الارت

خباب بن الارت بھی اہل صفہ میں شامل ہیں۔ آپ سابقین اولین اور مہاجرین میں سے ہیں آپ ان لوگوں میں بھی شامل ہیں جنہیں اللہ کے دین کو قبول کرنے کی پاداش میں تکالیف دی گئیں غزوۂ بدر اور باقی تمام غزوات میں شریک رہے مشہور راوی فضیل کہتے ہیں کہ میں نے حضرت کردوسؓ کو یہ کہتے سنا کہ خباب بن الارت، اسلام قبول کرنے والوں میں چھٹے نمبر پر ہیں۔ لیلیٰ کندی روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ خباب حضرت عمر فاروقؓ کے پاس آئے حضرت عمرؓ نے فرمایا اے خباب میرے قریب ہو کر بیٹھو۔ قریب بیٹھنے کا آپ سے زیادہ کوئی مستحق نہیں حضرت خبّاب نے عمر فاروقؓ کو اپنی پیٹھ کے وہ نشانات زخم دکھائے جو مشرکین کے انہیں سزا دینے کی وجہ سے بن گئے تھے۔ قیس بن ابی حازم کہتے ہیں کہ ہم خباب کے پاس ان کی عیادت کرنے کے لئے گئے ہم نے دیکھا کہ ان کے جسم پر داغ ہیں۔ حضرت خباب فرماتے لگے کہ ہمارے ساتھی دنیا سے اس حال میں رخصت ہو گئے کہ وہ دنیا میں ملوث نہ ہوئے اور ہمارے پاس اس قدر مال آگیا ہے کہ ہم اسے سوائے تعمیرات پر لگانے کے اور کوئی مصرف ہی نہیں پاتے۔ قیس بن ابی حازم کہتے ہیں کہ ہم پھر ایک مرتبہ ان کے پاس گئے تو وہ دیوار بنانے میں مصروف تھے فرماتے لگے مومن کو ہر عمل میں اجر ملتا ہے سوائے مکانات کے۔ اگر رسول مقبولؐ نے موت کی تمنا سے منع نہ فرمایا ہوتا تو میں موت کے لئے دعا کرتا۔ آپ کے بیٹے عبداللہ روایت کرتے ہیں کہ ایک رات حضرت خباب نے آپؐ کو دیکھا کہ آپؐ نے تمام رات نماز پڑھتے ہوئے گزار دی یہاں تک کہ فجر ہو گئی۔ خباب نے عرض کیا

یارسول اللہ! آج رات آپؐ نے ایسی نماز پڑھی کہ پہلے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ آپؐ نے جواب دیا۔ ہاں یہ امید و خوف کی نماز تھی۔ میں نے اپنے رب کریم سے تین چیزوں کا سوال کیا جن میں سے دو مجھے عنایت فرما دی گئیں اور ایک سے منع کر دیا گیا۔ میں نے سوال کیا تھا ایک تو میری امت اس طرح نہ ہلاک ہو جائے جس طرح دوسری امتیں ہلاک ہوئیں دوسرا میری امت پر اپنا یا دشمن نہ مسلط کر دے جو ان کو ہلاک کر دے تیسرا یہ کہ میری امت مختلف گروہوں میں نہ بٹ جائے۔ پہلے دو سوال منظور کر لئے گئے اور تیسرا روک لیا گیا۔ یحییٰ بن جعدہ بیان کرتے ہیں کہ کچھ صحابہ کرام حضرت خباب کی عیادت کے واسطے گئے صحابہ نے کہا اے خباب تجھے بشارت ہو کہ تو عنقریب نبی اکرمؐ کے پاس پہنچ جائے گا۔ خباب کہنے لگے یہ کیوں کر ممکن ہو سکتا ہے جبکہ میرا دو منزلہ مکان ہے حالانکہ رسول اللہؐ نے تو یہ فرمایا تھا کہ تمہارے واسطے دنیا کی اتنی مقدار کافی ہے جتنا کہ مسافر کے پاس زادِ راہ ہوتا ہے۔

خنیس بن حذافہ

خنیس بن حذافہ السہمی بھی اہل صفہ اور مہاجرین اولین میں سے ہیں۔ ام المومنین حضرت حفصہ بنت عمر فاروقؓ پہلے آپ کے عقدِ نکاح میں تھیں غزوۂ بدر میں شریک ہوئے تھے ابتدائے اسلام میں ہی فوت ہو گئے حضرت حفصہ سے آپ کی کوئی اولاد نہ ہوئی آپ کی وفات کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حفصہ سے نکاح فرمالیا۔ حضرت عمر خود بیان فرماتے ہیں کہ حفصہ کی خنیس سے کوئی اولاد نہ ہوئی جب وہ فوت ہو گئے تو میں حضرت ابوبکر سے ملا اور کہا اگر آپ چاہیں تو میں حفصہ کا نکاح آپ سے کر دوں مگر انہوں نے کوئی جواب نہ دیا کچھ دنوں کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیغام نکاح بھیجا تو میں نے حفصہ کا نکاح کر دیا۔ بعد میں ایک دن ابوبکر ملے تو مجھے کہنے لگے حفصہ کی پیشکش کے جواب میں میری خاموشی پر شاید آپ ناراض ہو گئے ہوں۔ میں نے کہا ہاں مجھے اس بات کا رنج ہے حضرت ابوبکر نے کہا سوائے اس کے اور کوئی چیز مانع نہ تھی کہ میں نے رسول کریمؐ کو حفصہ کا ذکر کرتے ہوئے سنا تھا اور میں آپ کا راز افشا نہیں کرنا چاہتا تھا اگر آپؐ حفصہ سے نکاح نہ فرماتے تو میں ضرور نکاح کر لیتا۔

خالد بن یزید (ابوایوب الانصاریؓ)

محمد بن جریر کے بیان کے مطابق خالد بن یزید المعروف ابوایوب انصاریؓ اہل صفہ میں شامل ہیں۔ یہ ابوایوب وہی خوش نصیب صحابی ہیں جن کے گھر میں ہجرت کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہوئے اور اس وقت تک ان کے گھر میں رہے جب تک کہ مسجد اور آپؐ کا حجرہ تعمیر نہ ہو گیا۔ ابوایوب کا مبارک مکان آج بھی مدینہ منورہ میں موجود ہے۔ غزوۂ بدر میں شریک ہوئے۔ مؤلف کہتے ہیں درحقیقت ابوایوب اہل عقبہ میں سے ہیں نہ کہ اہل صفہ میں سے۔ مکان ہونے ہوئے انہیں صفہ میں رہنے کی چنداں ضرورت نہ تھی

آپ قسطنطنیہ میں فوت ہوئے اور وہیں فصیل کے ساتھ دفن ہوئے۔ ابن شہاب زہری نے بھی آپ کا نام ان لوگوں میں گنوایا ہے جو عقبہ میں حاضر ہوئے تھے۔

آپ سے مروی روایات میں سے ایک یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ لمبا او قات یوں ہوتا ہے کہ دو آدمی اکھٹے مسجد میں جاتے اور نماز پڑھتے ہیں مگر جب لوٹتے ہیں تو ان میں سے ایک کی نماز دوسرے سے زیادہ وزنی ہوتی ہے اور دوسرے کی نماز ذرہ برابر بھی نہیں ہوتی۔ ابو حمید الساعدی نے عرض کیا یارسول اللہ یہ کیسے ہوتا ہے (حالانکہ نماز تو بظاہر دونوں کی ایک جیسی ہے) آپؐ نے فرمایا جبکہ ایک عقل کے اعتبار سے زیادہ اچھا ہو۔ عرض کیا گیا۔ وہ کس طرح؟ فرمایا جبکہ وہ اللہ کی حرام کردہ چیزوں سے بچنے والا اور بھلائی کے کاموں میں سبقت لے جانے پر حریص ہو اگرچہ وہ نوافل میں کم ہی ہو۔ ابوایوب بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نبی اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی یارسول اللہ! مجھے کوئی مختصر سی تعلیم دیجئے آپؐ نے فرمایا جب نماز پڑھنے لگو تو یوں پڑھو کہ گویا یہ تمہاری زندگی کی آخری نماز ہے ایسی بات نہ کرو جس سے بعد میں معذرت کرنا پڑے اور لوگوں کے پاس جو کچھ ہے اس سے مایوس ہو جاؤ یعنی لوگوں سے کسی چیز کی امید نہ کرو۔

مشہور تابعی ابورہم بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے حضرت ابوایوب انصاری کو یہ فرماتے سنا ایک دن نبی اکرمؐ گھر سے باہر صحابہ کے پاس تشریف لائے اور فرمایا میرے رب نے مجھے ان دو باتوں کے درمیان اختیار دیا ہے کہ ایک۔ کو منتخب کرلوں اپنی امت کے ستر ہزار افراد کو بغیر حساب کے جنت میں داخل کرالوں یا اللہ کے مٹھی بھر لوگوں کی بخشش قبول کرلوں۔ ایک آدمی نے استعجاباً پوچھا یارسول اللہ! کیا اللہ میاں آپؐ کو صرف ایک مٹھی دے گا؟ حضورؐ دوبارہ حجرہ اقدس میں داخل ہو گئے تھوڑی دیر کے بعد نکلے تو اللہ اکبر کہہ رہے تھے فرمایا اللہ تعالیٰ نے مزید مہربانی فرمائی ہے کہ وہ ستر ہزار میں سے ہر ہر ہزار کے ساتھ ستر ہزار اور لوگوں کی بھی مغفرت فرمائے گا اور مٹھی بھر بھی بخشش فرمائے گا۔ ابورہم نے ابوایوبؓ سے پوچھا حضرت! اللہ کی مٹھی کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔ لوگ مختلف قیاس آرائیاں کرتے ہیں۔ ابوایوبؓ نے فرمایا۔ اپنے تمام ساتھیوں کو بلاؤ میں تمہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مٹھی کے متعلق بتاتا ہوں۔ فرمایا نبی کریمؐ کے نزدیک مٹھی یہ ہے کہ تقریباً ہر وہ آدمی جس نے اس بات کی شہادت دی کہ معبود صرف اللہ ہی ہے وہ ایک ہے اس کا کوئی ساجھی نہیں اور محمدؐ اس کے بندے اور رسول ہیں پھر زبان کے ساتھ اس کے قلب نے بھی تصدیق کی تو اس کے لئے جنت واجب ہو گی۔

خریم بن فاتک

احمد بن سلیمان المروزی نے کہا کہ خریم بن فاتک الاسدی بھی اہل صفہ میں شامل ہیں غزوہ بدر میں شریک ہوئے انہیں رات کے وقت جبکہ یہ عراق میں تھے ایک ہاتف غیبی نے آواز دی اور کہا ہے

تیری ہلاکت ہو اللہ کی پناہ میں آجا۔ جو بڑی جلالت اور بزرگی والا ہے، نعمتیں عطا فرمانے والا اور تفضل فرمانے والا ہے۔ سورۃ انفال کی آیات کی تلاوت کر، اللہ کو ایک مان اور کسی کی پروا نہ کر۔

یہ غیبی آواز سن کر مدینہ منورہ کی طرف چل پڑے مدینہ پہنچے تو اس وقت نبی اکرمؐ منبر پر کھڑے خطبہ ارشاد فرما رہے تھے انہوں نے اسلام قبول کیا اور پھر آپؐ کے ساتھ بدر میں بھی شریک ہوئے۔ ان سے مروی احادیث میں سے ایک یہ ہے کہ نبی اکرمؐ نے ان (خریم) کی طرف دیکھا اور فرمایا اے اللہ کے بندے کاش تجھ میں دو عادات نہ ہوتیں انہوں نے عرض کیا یارسول اللہ کون سی؟ فرمایا چادر لٹکانا اور لمبے بال رکھنا۔ خریم نے فی الفور چادر کو اوپر کر لیا اور بال کٹوا دیئے۔

خریم بن اوس

بقول دار قطنی خریم بن اوس الطائی اہل صفہ میں سے ہیں اور مہاجرین سے بھی

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنے صحابہ کو اس بات کی خبر دی کہ "مقام حیرہ" آپ کے سامنے پیش کیا گیا ہے اور آپؐ نے اس میں شیماء بنت نفیلہ نامی عورت کو ملاحظہ فرمایا ہے کہ وہ سیاہی مائل سفید رنگ کے خچر پر سیاہ اوڑھنی پہنے ہوئے کھڑی ہے۔ خریم موصوف نے عرض کیا یارسول اللہ! اگر ہم اسے فتح کر لیں اور اسے اسی حالت میں پائیں جیسا کہ آپ نے ارشاد فرمایا ہے تو کیا وہ عورت میرے لئے ہوگی۔ آپؐ نے فرمایا ہاں وہ تیرے لئے ہوگی۔ بعد ازیں خالد بن ولید جب مسلیمہ کذاب کی سرکوبی کے لئے روانہ ہوئے تو یہ خریم بھی ساتھ تھے مسلیمہ کذاب کو جہنم رسید کرنے کے بعد لشکر اسلام الطف کی طرف متوجہ ہوا حتیٰ کہ حیرہ میں داخل ہو گیا۔ سب سے پہلے اسلامی لشکر کی جس شخص سے ملاقات ہوئی وہ وہی شیما نامی عورت تھی جس کے متعلق حضورؐ نے پیش گوئی فرمائی تھی۔ خریم نے اس کی ملکیت کا (بموجب فرمان نبوی) دعویٰ کیا۔ محمد بن مسلمہ اور عبداللہ بن عمر نے ان کے حق میں گواہی دی اور خالد بن ولید نے وہ عورت خریم کے سپرد کر دی۔ بعد ازاں اس عورت کا بھائی عبدالمسیح ان کے پاس آیا اور کہنے لگا اس عورت کو میرے ہاتھ بیچ دو خریم نے کہا ہزار سے کم میں نہیں دوں گا۔ اس نے ہزار دیا اور کہا اگر تو ایک لاکھ بھی کہتا تو تجھے دے دیتا۔ خریم نے کہا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ ہزار سے زائد بھی گنتی ہوتی ہے۔ ایک روایت میں خریم بن اوس بیان کرتے ہیں کہ میں ہجرت کرکے رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا آپ اس وقت تبوک سے واپس تشریف لا چکے تھے میں نے اسلام قبول کیا اور رسیدہ گیا حضرت عباس نے اس وقت آپؐ کی خدمت میں عرض کیا کہ یارسول اللہ! میں آپ کی مدح میں کچھ کہنا چاہتا ہوں فرمایا کہیے اللہ تعالیٰ تیرے دانتوں کو کبھی نہ گرائے (اہل عرب کے ہاں اچھے کلام کے جواب میں دعائیہ کلمات ہیں)

خبیب بن یساف

ابوعبداللہ الحافظ النیشاپوری کے بیان کے مطابق ابوعبدالرحمٰن خبیب بن یساف بن عتبہ اہل صفہ میں داخل ہیں اور ابوبکر بن ابی داؤد کے قول کے مطابق بدری ہیں۔

ان کے ایک پوتے انہی خبیب سے روایت کرتے ہیں کہ میں اور میری قوم کا ایک آدمی نبی اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ہم ابھی تک اسلام نہیں لائے تھے۔ آپؐ اس وقت ایک غزوہ میں جانے کی تیاری فرما رہے تھے۔ ہم نے عرض کیا یارسول اللہ! ہمیں اس بات سے شرم آ رہی ہے کہ ہم اپنی قوم کے لوگوں کے ساتھ جنگ میں شریک نہ ہوں آپ نے پوچھا۔ کیا تم مسلمان ہو؟ ہم نے عرض کیا نہیں تو آپؐ نے فرمایا ہم مشرکین سے مدد نہیں لیتے۔ یہ خبیب بتاتے ہیں کہ ہم نے اسلام قبول کیا اور آپؐ کے ساتھ جنگ میں شریک ہوئے۔ دوران جنگ ایک آدمی نے مجھے تلوار ماری جس سے مجھے زخم پہنچا یا گیا میں نے اس آدمی کو قتل کر دیا۔ بعد میں اسی مقتول کی لڑکی سے میری شادی ہوگئی۔ وہ لڑکی مجھے کہا کرتی تو نے ایسے آدمی کو ختم کیا ہے جس نے تجھے یہ زخم لگایا ہے۔ میں کہا کرتا ملکہ میں نے اس کو جہنم رسید کیا ہے۔

دکین بن سعید

دکین بن سعید المزنی یا بقول بعض الخثعمی بھی اہل صفہ میں سے بتائے گئے ہیں۔ کوفہ میں رہتے تھے وہاں سے چار سو افراد کے ساتھ نبی اکرمؐ کے پاس آئے۔

شیخ ابونعیم فرماتے ہیں۔ موصوف کے صفہ میں رہنے اور اترنے کے سلسلہ میں کوئی صحیح روایت مجھے معلوم نہیں ہو سکی۔

یہی دکین بن سعید ایک روایت بیان کرتے ہیں کہ ہم چار سو آدمی حضورؐ کے پاس آئے اور کھانا طلب کیا۔ آپؐ نے عمر فاروقؓ سے ارشاد فرمایا جاؤ ان لوگوں کو کھانا کھلاؤ اور ساتھ بھی انہیں کچھ دو۔ انہوں نے عرض کیا یارسول اللہ! میرے پاس تھوڑی سی کھجوروں کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ انہیں کھجوروں سے میرا اور میرے بال بچوں کا گزارا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا اے عمر! بلا سوچے سمجھے وہی کرو جو آپؐ فرما رہے ہیں۔ چنانچہ حضرت عمر کھجوروں والے کمرہ کی طرف گئے اس کا دروازہ کھولا اور ان چار سو آدمیوں سے فرمایا۔ داخل ہو جاؤ، کھاؤ بھی اور ساتھ بھی لے جاؤ یہ دکین بن سعید کہتے ہیں کہ کمرہ میں داخل ہونے والا میں آخری شخص تھا میں نے حسب ضرورت کھجوریں اٹھا لیں میں نے دیکھا کہ کھجوروں کا ڈھیر بالکل اسی طرح موجود ہے جس طرح پہلے تھا۔ یہ واقعہ بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں سے ہے۔

ذوالبجادینؓ (عبداللہ)

علی بن مدینی کے بیان کے مطابق عبداللہ ذوالبجادین بھی اہل صفہ میں سے ہیں۔ ذوالبجادین کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہ اپنے چچا کی زیر کفالت تھے وہ ان کی ہر طرح نگہداشت کرتا جب آپ نے اسلام قبول کر لیا اور اس کے اصرار کے باوجود اسلام پر قائم رہے تو اس نے آپ کے جسم سے لباس تک اتروا لیا۔ آپ کی والدہ نے آپ کو ایک دھاری دار کپڑا دیا جس کے آپ نے دو حصے کئے ایک کا تہہ بند بنا لیا اور دوسرے کو بطور چادر اوپر اوڑھ لیا۔ بعد ازیں نبی اکرمؐ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے۔ آپؐ نے پوچھا۔ تیرا نام کیا ہے؟ عرض کیا عبدالعزیٰ آپؐ نے فرمایا نہیں بلکہ تو عبداللہ ذوالبجادین ہے اس وقت سے آپ کو ذوالبجادین کہا جانے لگا۔ غزوۂ تبوک میں شہید ہوئے۔ حضورؐ ان کی قبر میں بنفس نفیس داخل ہوئے اور اپنے مبارک ہاتھوں سے دفن کرنے کے بعد فرمایا۔ اے اللہ! میں اس سے راضی ہوں تو بھی اس سے راضی ہو جا۔

رفاعہ ابولبابہ

ابوعبداللہ الحافظ النیساپوری کے بیان کے مطابق رفاعہ ابولبابہ الانصاری بھی اہل صفہ میں شامل ہیں۔ ان کا نام بشیر بن عبدالمنذر بھی بتایا گیا ہے۔ یہ رفاعہ بدری بھی تھے۔ انہی رفاعہ ابولبابہ سے ایک حدیث یوں منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جمعہ کا روز تمام ایام کا سردار ہے۔ اللہ کے ہاں اس کی عظمت عید قربان اور عیدالفطر سے بھی زیادہ ہے۔ جمعہ کے دن میں پانچ خصلتیں ایسی ہیں جو باقی ایام میں نہیں پائی جاتیں۔ حضرت آدم علیہ السلام کو اسی روز پیدا کیا گیا۔ اسی دن زمین پر اتارے گئے، اسی دن وفات پائی۔ اس دن میں ایک گھڑی ایسی ضرور آتی ہے جبکہ بندے کی دعا (سوائے حرام کے) لامحالہ قبول کی جاتی ہے۔ تمام ملائکہ، آسمان، زمین، پہاڑ، ہوائیں اور سمندر وغیرہ میں سے کوئی ایسی چیز نہیں جو جمعہ کے روز سے ڈرتی نہ ہو کہ کہیں اس میں قیامت نہ برپا ہو جائے۔

ابورزین

ابورزین کا شمار بھی اہل صفہ میں کیا گیا ہے اس کی دلیل وہ حدیث ہے جسے حضرت عبدالرحمٰن نے نبی اکرمؐ سے نقل کیا ہے کہ آپؐ نے اہل صفہ میں سے ایک آدمی جس کی کنیت ابورزین تھی سے فرمایا اے ابورزین! جب تو خلوت میں بیٹھے تو اپنی زبان کو ذکر الٰہی میں متحرک رکھ کیونکہ جب تک تو اپنے رب کے ذکر میں مشغول رہے گا۔ گویا نماز کے اندر رہے گا اگر علانیہ ذکر کرے گا تو علانیہ نماز میں اور اگر خلوت میں ذکر کرے گا تو خلوت کی نماز میں ہو گا۔ اے ابورزین جب لوگ رات کے قیام اور دن کے روزہ کی تکلیف اٹھا رہے ہوں تو تو عامۃ المسلمین کی خیر خواہی کی مشقت اٹھا۔ اے ابورزین جب

لوگ جہاد فی سبیل اللہ میں مشغول ہوں اور تو چاہے کہ تیرا اجر بھی ان کے برابر ہو تو مسجد کو لازم پکڑلے اور اس میں بغیر معاوضہ کے اذان دیا کر۔

یہی ابو رزین بیان کرتے ہیں کہ حضورؐ نے ان سے فرمایا! اے ابو رزین! کیا میں تجھے ایسی چیز نہ بتاؤں جس سے دنیا و آخرت کی بھلائی نصیب ہو؟ وہ یہ کہ ذکر الٰہی کرنے والوں کی مجالس میں بیٹھا کر۔ جب تنہائی میں ہو تو مقدور بھر اپنی زبان کو ذکر اللہ میں مشغول رکھا کر۔ کسی کے ساتھ محبت رکھے تو اللہ کی وجہ سے اور بغض رکھے تو بھی اللہ کی وجہ سے یعنی اللہ کی رضا کی خاطر۔ اے ابو رزین! کیا تو اس بات کو سمجھتا ہے کہ جب آدمی اپنے کسی بھائی کی زیارت کے لئے نکلتا ہے تو ستر ہزار فرشتے اس کو رخصت کرنے کے لئے اس کے ساتھ نکلتے ہیں اور اس کے لئے دعا کرتے ہیں۔ اے ابو رزین! اگر تجھ سے یہ عمل ہو سکے تو کیا کر۔

زید بن خطاب

ابو عبداللہ الحافظ النیشاپوری کے بیان کے مطابق حضرت زید بن خطاب بھی اہل صفہ میں شامل ہیں۔ آپ مسیلمہ کذاب کے مقابلے میں لڑی گئی جنگ میں شہید ہوئے۔ غزوہ بدر میں شریک ہوئے۔ کنیت ابو عبدالرحمٰن تھی۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ غزوہ احد کے دن والد محترم حضرت عمرؓ نے چچا جان حضرت زید سے کہا میری یہ زرہ پکڑ رکھو میں جنگ میں شریک ہوتا ہوں انہوں نے جواباً کہا جس طرح آپ شہادت کی تمنا رکھتے ہیں میں بھی رکھتا ہوں چنانچہ دونوں بھائی زرہ کو چھوڑ کر جہاد میں شریک ہو گئے۔

سلمان فارسی

حضرت سلمان فارسی کی کنیت ابو عبداللہ تھی۔ آپ کا شمار بھی اہل صفہ میں ہوتا ہے۔

حضرت انس بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرمؐ نے فرمایا۔ چار آدمی سبقت لے جانے والے ہیں میں اہل عرب سے صہیب اہل روم سے، سلمان اہل فارس سے اور بلال اہل حبشہ سے۔ آپ انتہائی عابد، زاہد، صابر، شاکر اور قلت و شدائد پر صبر فرمانے والے تھے۔ آپ سے متعدد روایات مروی ہیں مثلاً آپ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب مومن کا قلب اللہ کے راستے میں کانپتا ہے تو اس کے گناہ اس طرح جھڑتے ہیں جس طرح کھجور کے درخت سے کھجور کے خوشے گرتے ہیں۔

ایک حدیث میں بیان کیا کہ نبی اکرمؐ نے فرمایا میں ان ہر دو آدمیوں کے لئے قیامت کے دن شفاعت کروں گا جو محض اللہ کے واسطے ایک، دوسرے کے بھائی بنے رہے۔

سعد بن ابی وقاص

حضرت سعد ایک روایت میں بیان فرماتے ہیں کہ آیت۔ "ولا تطرد الذین یدعون ربھم بالغداۃ والعشی" ہمارے حق میں نازل ہوئی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ بھی اہل صفہ میں شامل رہے ہیں۔

حضرت سعد سابقین اولین اور مہاجرین میں سے ہیں۔ ایک روایت کے مطابق آپ تیسرے اور ایک روایت کے مطابق آپ ساتویں ایمان لانے والے ہیں۔ اسلام کی پاداش میں آپ کو متعدد شدائد و آلام سے دوچار ہونا پڑا۔ قبیلہ، برادری اور مال و جائیداد سے ہاتھ دھونا پڑے مگر آپ نے دامن اسلام کو نہیں چھوڑا۔ حضورؐ نے آپ کے لئے دعا فرمائی تھی کہ اللہ سعد کے نشانہ کو ٹھیک بیٹھنے والا بنا اور اس کی دعاؤں کو قبول کر یعنی اس کو مستجاب الدعوات بنا چنانچہ حضورؐ کی یہ دعا قبول ہوئی۔ بیماری کے دوران ایک مرتبہ انہیں اپنی موت کا خدشہ ہوا تو حضورؐ نے پیش گوئی فرمائی کہ ابھی تیری زندگی باقی ہے۔ بہت سارے لوگوں کو تجھ سے نفع اور بہت سارے لوگوں کو تم سے نقصانات بھی پہنچے گا چنانچہ عراق و مصر وغیرہ کے علاقے آپ ہی کے ہاتھوں فتح ہوئے

آپ سے متعدد احادیث بھی مروی ہیں مثلاً آپ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کن لوگوں کو سب سے زیادہ ابتلاء و آزمائش سے دوچار ہونا پڑا۔ آپؐ نے فرمایا انبیاء کرام اور پھر دین کے اعتبار سے ان کے مماثل لوگ پھر کلیے کے طور پر واضح فرمایا کہ ہر آدمی کو اس کے دین کے مطابق آزمایا گیا جو دین میں جتنا سخت تھا اتنے ہی سخت مصائب اس پر آئے۔ دین میں نرمی تھی تو آزمائش میں بھی نرمی برتی گئی۔ مومنین کے لئے ابتلاء و آزمائش اور تکالیف گناہوں سے کفارہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مصیبت میں گرفتار مومن پر ایک ایسا وقت بھی آتا ہے جبکہ اس کے تمام گناہ معاف ہو چکے ہوتے ہیں۔

حضرت سعد بتاتے ہیں کہ میں نے حضورؐ کو یہ فرماتے سنا۔ اللہ تعالیٰ نے اس بندے کو پسند فرمایا ہے جو پرہیزگار ہو غنی ہو اور صاحب علم و کرم ہو۔

سعید بن عامر

واقدی کے بیان کے مطابق سعید بن عامر بن حذیم الجمحی بھی اہل صفہ میں شامل تھے۔ مدینہ میں ان کی کوئی دکان نہیں تھی۔ دنیا سے انتہائی بے رغبت اور ایثار و قربانی کے پیکر تھے جو کچھ ہاتھ آتا فقراء و مساکین میں تقسیم فرما دیتے۔ ایک مرتبہ حضرت عمر فاروقؓ کو ان کی نقر و تنگ دستی کی حالت معلوم ہوئی تو ہزار دینار ان کی خدمت میں برائے ضروریات بھیجے۔ وہ دینار لے کر زوجہ محترمہ کے پاس گئے اور کہا عمرؓ نے یہ دینار ہمارے

واسطے بھیجے ہیں۔ بیوی نے کہا بہتر ہے کہ آپ تھوڑا سا کھانا اور سالن وغیرہ خرید لیں اور باقی پیسوں کو جمع کر کے رکھ لیں تاکہ بعد میں کام آئیں۔ فرمایا کیا میں اس سے بہتر طریقہ نہ بتاؤں وہ یہ کہ ساری رقم ایک ایسے شخص کے ہاں رکھ دیتے ہیں جو ہمارے لئے تجارت کرے گا۔ ہم اس کے منافع سے کھاتے رہیں گے اور راس المال محفوظ رہے گا۔ بیوی نے کہا۔ ٹھیک ہے چنانچہ آپ نے کھانا، سالن، دو غلام اور دو اونٹ خرید لئے باقی تمام رقم مساکین اور حاجتمند لوگوں میں تقسیم فرما دی۔

سفینہ ابو عبدالرحمٰن

یحییٰ بن سعید القطان کے بیان کے مطابق حضورؐ کے غلام حضرت سفینہ بھی اہل صفہ میں شامل ہیں۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے انہیں اس شرط پر آزاد کیا تھا کہ وہ ساری زندگی نبی کریمؐ کی خدمت کریں گے چنانچہ انہوں نے پورے دس برس آپؐ کی خدمت کی۔ حضرت سفینہ خود بیان کرتے ہیں کہ مجھے ام سلمہؓ نے خریدا اور مجھے اس شرط پر آزاد کیا کہ میں تادم حیات نبی کریمؐ کی خدمت میں رہوں چنانچہ میں نے زندگی بھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جدا ہونے کو پسند نہیں کیا۔

سعید بن جمہان کہتے ہیں کہ میں نے حضرت سفینہ سے ان کی وجہ تسمیہ پوچھی (یاد رہے سفینہ کا لغوی معنی کشتی ہے) آپ نے فرمایا میرا یہ نام یعنی سفینہ نبی اکرمؐ نے رکھا ہے۔ سعید کہتے ہیں۔ میں نے پوچھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کا یہ نام کیوں تجویز فرمایا؟ سفینہ نے بتایا کہ ایک دن حضورؐ مع دیگر اصحابہ کے ایک سفر پر نکلے تمام لوگوں کا ساز و سامان ان پر بھاری ہونے لگا۔ حضورؐ نے مجھ سے فرمایا! اپنی چادر پھیلاؤ۔ چنانچہ میں نے چادر پھیلا دی۔ آپؐ نے تمام لوگوں کا ساز و سامان اس میں رکھ دیا اور وہ گٹھڑی میرے سر پر رکھ دی اور فرمایا اس سامان کو لے کر چلو تم "سفینہ" ہو۔ حضرت سفینہ کہتے ہیں اگر اس دن چھ اونٹوں کا بوجھ بھی مجھ پر لاد دیا جاتا تو مجھے معلوم نہ ہوتا۔

حضرت سفینہ اپنا ایک واقعہ نقل فرماتے ہیں۔ وہ یہ کہ میں سمندر میں کشتی پر سوار ہوا۔ طغیانی موجوں کے طمانچوں سے کشتی ٹوٹ گئی۔ میں نے لکڑی کے ایک تختہ کو پکڑ لیا۔ اس تختہ نے مجھے ایک ایسی جگہ پہنچا دیا جہاں شیر رہا کرتا تھا۔ آدم زاد کو دیکھ کر شیر مجھ پر حملہ آور ہونے لگا تو میں نے کہا۔ اے ابوالحارث (شیر کی کنیت ہے) میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا غلام سفینہ ہوں۔ یہ سن کر شیر نے سر جھکا لیا اور مجھے اپنے کندھوں سے اشارہ کرتے ہوئے چلانے لگا۔ یہاں تک کہ مجھے رستے پر لا کھڑا کیا۔ جب مجھے رستہ پر پہنچا دیا تو اس وقت آواز نکالی۔ میں نے سمجھا کہ یہ مجھے الوداع کہہ رہا ہے۔

حضرت سفینہ ایک حدیث یوں بیان کرتے ہیں کہ حضرت علی المرتضیٰ کے ہاں ایک مرتبہ ایک مہمان ٹھہرا

اس کا کھانا تیار ہوا تو حضرت فاطمۃ الزہرا نے فرمایا اباجان صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھی درخواست کرو کہ آپ بھی کھانے میں شرکت فرمائیں۔ حضرت علیؓ نے خدمت نبوی میں عرض کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کسی بھی نبی کے لئے یہ مناسب نہیں کہ وہ مزین اور نقش و نگار والے گھر میں داخل ہو۔

(تشریح) یہ اس لئے کہ اس دن حضرت فاطمۃ الزہرا کے دروازے پر ایک ایسا پردہ پڑا ہوا تھا جس پر تصویر تھی۔

سعد بن مالک (ابوسعید الخدری)

ابوعبید القاسم بن سلام کے قول کے مطابق حضرت سعد بن مالک (المعروف) ابوسعید الخدری بھی اہل صفہ میں داخل ہیں۔ وہ اگرچہ انصاری تھے اپنا گھر بار تھا اس کے باوجود فقر اور پاکدامنی کو اختیار فرمایا۔

ابوسعید الخدری خود نقل کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ ان کے اہل و عیال نے ان سے تنگ دستی کی شکایت کی۔ وہ نبی اکرمؐ کے پاس حاضر ہوئے تاکہ آپؐ سے کوئی سوال کریں۔ جب آپ نبی اکرمؐ کے پاس پہنچے تو اس وقت آپؐ منبر پر بیٹھے یہ خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ اے لوگو! کسی سے کچھ مانگنے اور سوال کرنے سے بچو جو شخص سوال کرنے سے بچے گا اللہ تعالیٰ اسے بچائے گا جو شخص غنا چاہے گا اللہ تعالیٰ اسے غنی بنائے گا۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے انسان کو جو کچھ رزق دیا جاتا ہے اس میں صبر سے بڑی کوئی نعمت نہیں اس کے باوجود اگر تم مجھ سے سوال کرنے سے باز نہ آئے تو میں تمہیں وہی کچھ دے سکوں گا جو میرے پاس موجود ہوگا۔

ابوسعید خدری بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضورؐ کی خدمت میں عرض کیا۔ یا رسول اللہ! کن لوگوں کو سب سے زیادہ آزمایا گیا؟ فرمایا انبیاء کو۔ میں نے پوچھا اس کے بعد کن کو؟ فرمایا صالحین کو۔ فقر میں انہیں یہاں تک آزمایا گیا کہ ان کے پاس سوائے کھجور کے اور کوئی شے نہ ہوتی۔ اس کے باوجود وہ آزمائش کے دور میں زیادہ خوش ہوتے بہ نسبت فراخی کے ایام کے۔

ابوسعید ایک روایت یہ بھی نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا۔ جب اللہ کسی بندے پر راضی ہوتا ہے تو سات گنا بھلائی اس کی طرف موڑ دیتا ہے اور جب ناراض ہو تو سات گنا برائی۔

سالم مولیٰ ابی حذیفہ

حضرت سالم مولیٰ ابی حذیفہ بھی اہل صفہ میں سے ہیں۔ عبادات میں نہایت مخلص اور با توکل آدمی تھے

بہت بڑے حافظ اور بلند پایہ قاری تھے حتیٰ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ قرآن مجید ان چار آدمیوں سے سیکھو۔ عبداللہ بن مسعود، سالم مولیٰ ابی حذیفہ، ابی بن کعب، معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔ حضرت عبداللہ بن عمر بیان کرتے ہیں کہ مہاجرین اولین جب ہجرت کرکے مقام عصبہ (قبا کے نزدیک) میں ٹھہرے تو نبی اکرمؐ کی تشریف آوری سے قبل سالم مولیٰ ابی حذیفہ انہیں نمازیں پڑھاتے رہے کیونکہ وہ سب سے بہتر اور زیادہ قرآن پڑھے ہوئے تھے۔ ایک روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ان سالما شدید الحب للہ عزوجل۔" بے شک سالم اللہ تعالیٰ کی محبت میں بڑا سخت اور مضبوط ہے۔

جنگ یمامہ میں شہید ہوئے۔ جھنڈا ان کے ہاتھ میں تھا۔ دایاں ہاتھ کٹ گیا تو جھنڈا بائیں ہاتھ میں پکڑ لیا بایاں ہاتھ بھی کٹ گیا تو جھنڈے کو سینے کے ساتھ تھام لیا اور پڑھنے لگے۔ "وما محمد الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل افئن مات او قتل انقلبتم علیٰ اعقابکم۔" یہاں تک کہ شہید کر دیئے گئے۔ حضرت عائشہ صدیقہ بیان فرماتی ہیں کہ ایک رات مجھے نبی اکرمؐ کی خدمت میں پہنچنے میں تاخیر ہو گئی۔ جب میں حاضر ہوئی تو آپؐ نے تاخیر کی وجہ دریافت فرمائی۔ میں نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! آج میں نے مسجد میں ایک ایسے آدمی کو قرآن مجید پڑھتے سنا ہے جس کی مثل میں نے کبھی نہیں سنا۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ حضورؐ اس شخص کو دیکھنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں بھی آپؐ کے پیچھے ہو لی۔ حضورؐ نے پوچھا جانتی ہو یہ کون شخص ہے؟ میں نے عرض کیا نہیں۔ فرمایا! یہ ابو حذیفہ کا غلام سالم ہے پھر فرمایا: اللہ کا شکر ہے کہ اس نے میری امت میں ایسے افراد کو پیدا فرمایا۔

سالم بن عبید الاشجعی

سالم بن عبید الاشجعی بھی اہل صفہ میں سے ہیں۔ بعد میں صفہ سے نکل کر کوفہ میں مقیم ہو گئے تھے ایک حدیث ان سے یوں مروی ہے کہ نبی اکرمؐ کے مرض الوفات نے جب شدت اختیار کی تو آپؐ پر بے ہوشی طاری ہو گئی۔ جب آپؐ ہوش میں آئے تو فرمایا: بلال سے کہو کہ اذان دے اور ابوبکر سے کہو کہ نماز پڑھائے اس فرمان کے بعد پھر بے ہوشی طاری ہو گئی۔ جب ہوش میں آئے تو حضرت عائشہؓ نے عرض کیا۔ میرے باپ بہت زیادہ رقیق القلب ہیں وہ نماز نہیں پڑھا سکیں گے اگر آپؐ ان کے علاوہ کسی کو فرما دیں تو بہتر ہو گا۔ فرمایا تم وہی عورتیں ہو جنہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو بہکانا چاہا تھا۔ بلال سے کہو کہ اذان دے اور ابوبکر سے کہو کہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔

سالم بن عمیر

ابوعبداللہ الحافظ النیسا پوری کے بیان کے مطابق سالم بن عمیر بھی اہل صفہ میں داخل ہیں۔ قبیلہ اوس میں سے بنی ثعلبہ بن عمرو بن عوف سے متعلق تھے۔ غزوۂ بدر میں شہادت پائی۔ ان کے اور ان کے ساتھیوں کے حق میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی ۔" تولوا و اعینھم تفیض من الدمع" وہ اس حال میں لوٹے کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ حضرت عبداللہ بن عباس بیان کرتے ہیں کہ آیت (ولا علی الذین اذا ما اتوک لتحملھم قلت لا اجد ما احملکم علیہ تولوا و اعینھم تفیض من الدمع) (توبہ : ۹۲)

(ان لوگوں پر شرعاً کوئی مواخذہ نہیں جو آپ کے پاس حاضر ہوئے کہ آپ انہیں جہاد کے لئے مسلح کریں مگر آپ نے فرمایا کہ میرے پاس تمہارے مسلح کرنے کی کوئی شئے نہیں تو وہ واپس ہو گئے اس حال میں کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے سالم کے حق میں نازل ہوئی ۔

سائب بن خلاد

حافظ نیشاپوری کے قول کے مطابق سائب بن خلاد بھی اہل صفہ میں شامل ہیں۔ موصوف سے ایک حدیث یوں نقل ہوئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : جس شخص نے اہل مدینہ طیبہ کو خوفزدہ کیا۔ دریں صورت کہ وہ ان پر ظلم کرنے والا ہو تو اللہ تعالیٰ بھی اسے خوفزدہ کرے گا۔ اس پر اللہ تعالیٰ، تمام ملائکہ اور تمام لوگوں کی لعنت ہو گی۔ اس کا کوئی فرض اور کوئی نفل قابل قبول نہ ہو گا۔

شقران مولیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت جعفر صادق کے بیان کے مطابق رسول کریمؐ کے غلام "شقران" بھی اہل صفہ میں شامل ہیں ۔
موصوف سے ایک حدیث یوں منقول ہے کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ گدھے پر سوار خیبر کی طرف جا رہے ہیں ۔

شداد بن اسید

شداد بن اسید بھی اہل صفہ میں سے ہیں ان کے ایک پڑپوتے عمرو بیان کرتے ہیں کہ ان کے جد امجد حضرت شداد حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپؐ نے انہیں صفہ میں ٹھہرایا ۔
ان کے یہی پڑپوتے بیان کرتے ہیں کہ ہمارے جدِ امجد نبی اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپؐ کے دستِ

اقدس پر ہجرت کرنے کی بیعت کی لیکن بعد میں بیمار ہو گئے اور ہجرت نہ کر سکے۔ حضورؐ نے ایک دن ہجرت نہ کرنے کی وجہ پوچھی عرض کیا۔ یا رسول اللہ! میں بیمار ہو گیا ہوں اور اگر کچھ دن مزید وادی بطحان کا پانی پی لیتا تو ٹھیک ہو جاتا۔ آپؐ نے فرمایا تو اس میں تجھے کیا چیز مانع ہے یہ عرض کیا ہجرت آپؐ نے فرمایا۔ جاتو جہاں بھی رہے مہاجر ہی ہے۔

صہیب بن سنان بن مالک

حضرت ابوہریرہؓ کے ایک قول کے مطابق صہیب بن سنان بن مالک بھی اہل صفہ میں شامل ہیں۔ سابقین اولین اور مہاجرین میں سے تھے اپنے تن من دھن کو اللہ کے راستے پر لگانے والے تھے فقراء و مساکین کو کثرت سے کھلانے والے تھے سفر اور حضر میں آپؐ کے ساتھ رہے خود بیان فرماتے ہیں کہ حضورؐ نے کوئی ایسا غزوہ نہیں فرمایا جس میں میں حاضر نہ ہوں کوئی ایسی بیعت نہیں فرمائی جس میں میں شریک نہ ہوا ہوں کوئی ایسا سریہ آپؐ نے روانہ نہیں فرمایا جس کے اندر میں شامل نہ ہوا ہوں۔ شروع زمانہ سے لے کر آخر تک ہر غزوہ میں میں حضورؐ کی دائیں جانب ہوتا یا بائیں جانب اگر دشمن سامنے سے حملہ کرتا میں آپؐ کے آگے ہوتا اگر دشمن پیچھے سے حملہ آور ہوتا تو آپؐ کے پیچھے ہو لیتا غرض کبھی بھی میں نے اپنے اور دشمن کے درمیان میں رسول کریمؐ کو نہیں ہونے دیا یہاں تک کہ آپؐ وصال فرما گئے۔

سعید بن المسیب نقل کرتے ہیں کہ صہیب جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہجرت کرنے لگے تو قریش کے چند افراد نے ان کا پیچھا کیا۔ آپ سواری سے اتر آئے اور ترکش سے تیر نکال لئے اور فرمایا اے افراد قریش تم جانتے ہو کہ میں تم میں بہترین تیر انداز ہوں۔ خدا کی قسم جب تک میں اپنی ترکش کے تمام تیر تم پر پھینک نہ لوں گا تم مجھ تک نہیں پہنچ سکتے پھر جب تیر ختم ہوں گے تو میں تمہارے ساتھ تلوار کے ساتھ لڑوں گا تم جو کچھ کرنا چاہتے ہو کر لو میری طرف سے تمہیں چیلنج ہے اور اگر پسند کرو تو میں تمہیں اپنے مال اور کپڑوں وغیرہ کا پتہ بتا دیتا ہوں وہ مال و اسباب تم لے لو اور مجھے چھوڑ دو انہوں نے کہا ٹھیک ہے آپ نے اپنا مال و متاع ان کے سپرد کیا اور خود عازم مدینہ ہوئے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے تو آپؐ نے فرمایا۔ "ربح البیع ابا یحیٰی، ربح البیع ابا یحیٰی۔" اے ابو یحیٰی تیرا سودا بہت نفع بخش ہے اس موقع پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ ومن الناس من یشری نفسہ ابتغآء مرضات اللہ۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ کی رضا کی خاطر اپنی جانوں کو بیچ ڈالتے ہیں۔

حضرت صہیب لوگوں کو کثرت سے کھانا کھلایا کرتے تھے۔ ایک دن حضرت عمرؓ نے فرمایا یہ تو مال کی اسراف ہے آپ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرمایا کرتے تھے کہ تم میں بہتر شخص وہ ہے جو لوگوں کو کھانا کھلائے اور سلام کا جواب دے۔ بنا بریں میں لوگوں کو کھانا کھلاتا ہوں پھر حضرت عمر فاروقؓ خاموش ہو گئے۔

حضرت صہیب ایک حدیث یوں نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا فرمایا کرتے تھے اے اللہ تو ایسا معبود نہیں جیسے ہم نے پیدا کیا ہو اور نہ تو ایسا رب ہے جسے ہم نے گھڑا ہو۔ تجھ سے پہلے ہمارا کوئی معبود نہیں تھا کہ تجھے چھوڑ کر اس کی پناہ لیں۔ ہماری تخلیق میں تیری کسی نے اعانت نہیں کی کہ ہم اسے تیرے ساتھ شریک ٹھہرائیں۔ اے اللہ تو بہت، زیادہ بابرکت اور بڑا بلند ہے۔ کعب کہتے ہیں کہ اللہ کے نبی حضرت داؤد علیہ السلام بھی اسی طرح دعا کیا کرتے تھے۔

صفوان بن بیضاء

ابو عبداللہ الحافظ النیشاپوری کے بیان کے مطابق صفوان بن بیضاء بھی اہل صفہ میں شامل ہیں۔ بنی فہر سے تعلق رکھتے تھے غزوہ بدر میں شریک ہوئے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو سریہ عبداللہ بن جحش کے ساتھ بھیجا۔ اس سریہ میں شریک لوگوں کے حق میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

(ان الذین آمنوا والذین ھاجروا وجاھدوا فی سبیل اللہ اولئک یرجون رحمۃ اللہ) بے شک، جو لوگ ایمان لائے۔ ہجرت کی اور پھر اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کیا وہی لوگ رحمت الٰہی کے امیدوار ہیں۔

طخفہ بن قیس

طخفہ بن قیس الغفاری بھی اہل صفہ میں سے تھے مدینہ میں رہے اور صفہ میں وفات پائی۔ موصوف خود بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ سے فرمایا کہ اصحاب صفہ کو ساتھ لے جاؤ چنانچہ کوئی صحابی ایک کو اور کوئی دو کو لے گیا۔ آخر میں پانچ آدمی بچ گئے جن میں موصوف بھی شامل تھے۔ طخفہ بتاتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے فرمایا۔ "میرے ساتھ چلو چنانچہ ہم آپؐ کے ساتھ حضرت عائشہ کے پاس گئے۔ آپؐ نے حضرت عائشہ سے فرمایا ہمیں کچھ کھلاؤ پلاؤ۔ وہ ثرید لے آئیں ہم نے کھا لیا پھر وہ حلوہ لے آئیں ہم نے وہ بھی کھا لیا پھر وہ ایک پیالے میں دودھ لے آئیں ہم نے وہ بھی پی لیا۔ پھر آپؐ نے فرمایا اگر تم چاہو تو یہیں رات گزارو اور چاہو تو واپس مسجد میں چلے جاؤ۔ ہم نے عرض کیا ہم مسجد میں چلتے ہیں۔

یہ طخفہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں مسجد میں پیٹ کے بل یعنی اوندھا لیٹا ہوا تھا کہ کسی نے میرے پاؤں کو ہلایا اور کہا۔ اس طرح لیٹنے کو اللہ تعالیٰ ناپسند فرماتا ہے۔ طخفہ کہتے ہیں میں نے دیکھا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے تھے۔

طلحہ بن عمروؓ

طلحہ بن عمرو البصری بھی اہل صفہ میں شمار ہوتے ہیں طلحہ خود بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرمؐ کے پاس آنے والے آدمی کا مدینہ میں کوئی واقف ہوتا تو وہ اس کے پاس ٹھہرتا ورنہ اسے اصحاب صفہ کے پاس ٹھہرایا جاتا۔ طلحہ بتاتے ہیں میں انہی لوگوں میں سے تھا جنہیں صفہ میں ٹھہرایا گیا روزانہ ایک آدمی حضورؐ کی جانب سے دو دو آدمیوں میں ایک ایک مد (تقریباً آدھ سیر) کھجور تقسیم کرجاتا۔ ایک دن آپؐ نے نماز کا سلام پھیرا تو ایک آدمی کھڑا ہوگیا اور کہنے لگا یا رسول اللہ! کھجور نے ہمارے پیٹ جلا دیئے ہیں اور ہماری چادریں پھٹ گئی ہیں حضورؐ منبر پر تشریف فرما ہوئے حمد و ثنا کے بعد ان مصائب و آلام کا ذکر فرمایا جو آپؐ کو اپنی قوم کی طرف سے پہنچے تھے پھر فرمایا میں اور میرا ساتھی دس سے کچھ اوپر راتیں بغیر کھانے کے رہے سوائے پیلو کے درخت کے پھلوں کے اور کوئی چیز ہمارے کھانے کے لئے نہیں تھی جب ہم انصار بھائیوں کے پاس آئے تو ان کا بڑا کھانا کھجور تھا چنانچہ انہوں نے کھانے کے سلسلہ میں ہماری مدد کی۔ اگر میں تمہارے واسطے روٹی اور گوشت پاتا تو تمہیں ضرور کھلاتا گھبراؤ نہیں عنقریب وہ وقت آنے والا ہے جبکہ تم ایسا مزین اور منقش لباس زیب تن کرو گے جیسا کہ کعبہ کا غلاف ہے صبح شام تمہارے دسترخوانوں پر بڑے بڑے پیالے گردش کریں گے۔

الطفاوی الدوسی

ابونضرہ کے قول کے مطابق طفاوی الدوسی بھی اہل صفہ میں سے ہیں۔ طفاوی خود نقل کرتے ہیں کہ میں مدینہ منورہ میں آیا تو ایک ماہ تک حضرت ابوہریرہؓ کے پاس ٹھہرا رہا۔ مجھے سخت بخار ہو گیا۔ رسول کریمؐ مسجد میں تشریف لائے تو پوچھا دوسی لڑکا کہاں ہے؟ عرض کیا گیا اسے بخار ہے اور مسجد کے کونے میں پڑا ہوا ہے۔ حضورؐ تشریف لائے اور میری بیمار پرسی کی۔

عبداللہ بن مسعود

یحییٰ بن معین کے بیان کے مطابق حضرت عبداللہ بن مسعود بھی اہل صفہ میں شامل ہیں بہت بڑے فقیہ تھے کتاب اللہ کے متبحر عالم تھے سابقین اولین اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے رفقاء اور وزراء میں سے تھے۔

حضرت علقمہ بیان کرتے ہیں کہ ایک آدمی حضرت عمرؓ کے پاس آیا اور کہا میں ایک ایسے آدمی کے پاس سے آرہا ہوں جو اپنی تلاوت سے دلوں میں ہلچل مچا دیتا ہے حضرت عمر گھبرا کر غصہ میں آگئے فرمایا: ذرا دیکھو تو کیا

کہہ رہا ہے اس نے عرض کیا عالی جاہ! سچ کہہ رہا ہوں فرمایا: وہ شخص کون ہے ؟ اس نے عرض کیا وہ عبداللہ بن مسعود ہیں یہ سن کر آپ کا غصہ فرو ہو گیا اور فرمایا۔ میں ان کے سوا کسی ایک کو اس بات کا حقدار تصور نہیں کرتا۔ اس کے بعد اس شخص سے فرمایا میں تمہیں عبداللہ بن مسعود کے متعلق ایک اور بات بتاتا ہوں وہ یہ کہ ہم ایک مرتبہ رات گئے تک ابو بکر کے گھر میں نبی کریمؐ کے ایک کام کے سلسلہ میں بات چیت کرتے رہے۔ فارغ ہو کر جب ہم نکلے تو نبی اکرمؐ میرے اور ابو بکر کے درمیان چل رہے تھے۔ جب ہم مسجد کے قریب پہنچے تو ہم نے دیکھا کہ ایک آدمی کھڑا قرآن مجید پڑھ رہا ہے حضور کھڑے ہو گئے اور کان لگا کر سننے لگے۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپؐ رک گئے ہیں۔ آپؐ نے ہاتھ سے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ فرمایا۔ حضرت عمر بتاتے ہیں کہ اس آدمی نے قرأت قرآن کے بعد رکوع وسجود کیا اور دعا و استغفار کرنے لگا۔ حضورؐ نے اس سے فرمایا تو مانگ باری تعالیٰ تجھے عطا فرمائے گا اس کے بعد آپؐ نے فرمایا جس شخص کو یہ بات پسند ہو کہ وہ قرآن کو اسی طرح پڑھے جس طرح نازل ہوا تو وہ عبداللہ بن مسعود کی قرأت پڑھے۔ میں اور میرے ساتھی (ابو بکر) نے سمجھ لیا کہ یہ شخص عبداللہ بن مسعود ہے۔ جب صبح ہوئی تو میں عبداللہ کے پاس پہنچا تاکہ انہیں بشارت نبوی سناؤں انہوں نے مجھے بتایا کہ یہ بشارت پہنچانے میں ابو بکر مجھ سے سبقت لے گئے ہیں۔ حضرت عمر اعتراف کرتے ہیں کہ خیر کے کام میں جب بھی میں نے حضرت ابو بکر صدیق سے سبقت لے جانا چاہی نہ لے جا سکا۔ ابو بکر ہمیشہ مجھ سے بڑھ جاتے۔

عبداللہ بن مسعود خود بیان کرتے ہیں کہ میں نے اکیلے حضورؐ کی زبان اقدس سے ستر سورتیں سیکھیں درانحالیکہ میرا کوئی اور شریک نہ تھا حضرت عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ میں قریب البلوغ لڑکپن میں مکہ مکرمہ میں عقبہ بن ابی معیط کی بکریاں چرایا کرتا تھا۔ حضورؐ میرے پاس تشریف لائے ابو بکر بھی ان کے ہمراہ تھے۔ آپؐ نے فرمایا اے لڑکے کیا تو ہمیں دودھ پلائے گا؟ میں نے کہا یہ بکریاں میرے پاس امانت ہیں لہٰذا میں دودھ پلانے سے قاصر ہوں آپؐ نے فرمایا کیا تیرے پاس کوئی ایسی چھوٹی بکری ہے جسے ابھی تک نر نے نہ چھوا ہو چنانچہ میں ایک بکری کا بچہ پکڑ کر لایا ابو بکر نے اس کی ٹانگوں کو پکڑ رکھا۔ حضورؐ نے اس کے تھن کو پکڑ کر دعا فرمائی تو اس کا تھن دودھ سے بھر گیا آپؐ نے دودھ دوہا خود پیا اور ابو بکر کو بھی پلایا پھر آپؐ نے تھن سے مخاطب ہو کر فرمایا سکڑ جا چنانچہ وہ سکڑ گیا۔ میں یہ سارا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ کلام پاک مجھے بھی سکھائیے۔ آپؐ نے فرمایا "انک غلام معلم" بے شک تو تعلیم یافتہ لڑکا ہے اس کے بعد میں نے براہ راست آپؐ سے ستر سورتیں سیکھیں جن کے سیکھنے میں میرے ساتھ کوئی اور آدمی شامل نہیں تھا۔

عبداللہ بن شداد بن الہاد بیان کرتے ہیں کہ "ان عبداللہ کان صاحب الوساد والسواد والسواک والنعلین" (حضرت عبداللہ بن مسعود حضور کا تکیہ سامان حرب، مسواک اور جوتے مبارک سنبھالنے والے تھے)

حضرت عبداللہ بن مسعود خود بیان فرماتے ہیں کہ میں چھٹا مسلمان تھا۔ ہم چھ کے علاوہ روئے زمین پر اور کوئی کلمہ گو نہ تھا۔

حضرت عبداللہ بیان فرماتے ہیں کہ میں رسول کریمؐ کے واسطے مسواک بنایا کرتا تھا ایک مرتبہ میں مسواک کاٹنے کی خاطر پیلو کے درخت پر چڑھا تو لوگ میری پنڈلیوں کا دبلاپن اور کمزوری کو دیکھ کر ہنسنے لگے حضورؐ نے دریافت فرمایا کیوں ہنستے ہو؟ لوگوں نے بتایا کہ عبداللہ کی پنڈلیوں کے دبلے پن کی وجہ سے آپؐ نے قسم کھا کر بیان فرمایا کہ یہ پنڈلیاں جو تمہیں انتہائی لاغر اور ہلکی دکھائی دے رہی ہیں یہ میزان میں احد پہاڑ سے بھی زیادہ وزنی ہوں گی۔

حضرت عبداللہ بن مسعود سے متعدد احادیث اور اقوال منقول ہیں جن کے استقصاء کی یہاں گنجائش نہیں ہو سکتی۔

ابوہریرہ

مشہور صحابی ابوہریرہ کا اسم شریف عبد شمس اور ایک قول کے مطابق عبدالرحمٰن بن صخر الدوسی ہے آپ وہ خوش بخت اور بلند ہمت انسان ہیں کہ حضورؐ کی تمام ظاہری حیات میں صفہ کو ٹھکانہ بنائے رکھا اور اس سے کہیں دوسری جگہ منتقل نہ ہوئے۔ آپ صفہ میں منتقل مقیم اور مسافروں کو اچھی طرح جانتے تھے۔ حضورؐ جب کبھی کھانے یا کسی دوسری حاجت کے واسطے اہل صفہ کو جمع کرنے کا ارادہ فرماتے تو انہی کو بھیجتے کہ ان کو بلا لائیں کیونکہ یہ ان کے منازل اور مراتب سے بخوبی آگاہ تھے۔ ان مشہور فقراء و مساکین میں سے تھے جنہوں نے ہمیشہ سخت فقر و تنگ دستی میں بھی دامنِ صبر کو نہ چھوڑا۔ کھیتی باڑی اور اغنیاء اور تاجروں سے ہمیشہ دور رہے دنیائے فانی کو چھوڑ کر باقی اور ابدی زندگی کے ہمیشہ منتظر اور خواہشمند رہے۔ نرم و نازک اور ریشمی لباس کبھی پسند نہ فرمایا اس کے عوض اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکمت و دانائی اور فطانت و ذہانت عطا فرمائی۔

حضرت ابوہریرہ خود بیان فرماتے ہیں کہ ایک وقت وہ بھی تھا جب میں بھوک کی شدت کی وجہ سے پیٹ پر پتھر باندھا کرتا تھا ایک دن میں اس رستے پر بیٹھ گیا جہاں سے لوگ باہر نکلا کرتے تھے حضرت ابوبکر میرے پاس سے گزرے میں نے ان سے قرآن کریم کی ایک آیت کی بابت پوچھا میرے پوچھنے کا مقصد محض یہ تھا کہ وہ مجھے ساتھ لے جائیں گے اور کچھ کھلائیں پلائیں گے وہ میرا مدعا نہ سمجھ پائے اور یوں ہی گزر گئے پھر حضرت عمر گزرے وہ بھی میرا مطلب نہ سمجھ سکے اور گزر گئے بعد میں ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر ہوا۔ آپؐ نے مجھے دیکھتے ہی تبسم فرمایا کیونکہ آپؐ نے میری دلی خواہش کو جان لیا تھا فرمایا اے ابوہریرہ! میں نے عرض کیا لبیک یا رسول اللہ! فرمایا آؤ میرے ساتھ چلو چنانچہ میں آپؐ کے پیچھے ہو لیا آپؐ گھر میں داخل ہو گئے تو میں بھی اجازت لے کر اندر چلا گیا آپؐ نے ایک پیالہ میں دودھ دیکھا تو پوچھا یہ دودھ کہاں سے آیا ہے گھر والوں نے عرض کیا یہ فلاں آدمی نے بطور ہدیہ ارسال کیا ہے آپؐ نے فرمایا اے

ابوہریرہ! جاؤ اور تمام اہل صفہ کو بلالاؤ۔ حضرت ابوہریرہ بتاتے ہیں کہ اہل صفہ اسلام کے مہمان تھے ان کا کوئی مال اور جائیداد وغیرہ نہ تھی جب آپؐ کے پاس صدقہ کی کوئی شے آتی تو تمام کی تمام اہل صفہ کی طرف بھجوا دیتے اور خود اس سے کچھ نہ لیتے اور جب ہدیہ کی کوئی شے آتی تو خود بھی لیتے اور اہل صفہ کو بھی اس میں شریک کرتے۔

حضرت ابوہریرہ بیان فرماتے ہیں کہ میں ان ستر اصحاب صفہ میں سے تھا جن کے پاس سوائے ایک چادر کے اور کوئی کپڑا نہ ہوتا تھا جسے وہ گلے میں پہنے رکھتے۔

حضرت ابوہریرہ بیان فرماتے ہیں کہ تم لوگ تعجب کرتے ہو کہ ابوہریرہ دیگر تمام انصار و مہاجرین سے زیادہ نبی اکرمؐ کی احادیث بیان کرتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے مہاجر بھائی بازاروں کے اندر خرید و فروخت میں مشغول ہوگئے اور انصاری بھائی زمینداری میں مصروف ہو گئے۔ میں ایک مسکین آدمی تھا جو ہر وقت آپؐ کے ساتھ چمٹا رہتا تاکہ میرا پیٹ بھرتا رہے نتیجۃً جب تمام لوگ غائب ہوتے اس وقت بھی حضورؐ کے ساتھ ہوتا ہیں آپؐ کے فرمودات کو یاد رکھتا جبکہ دوسرے لوگ بھول جاتے۔

محمد بن سیرین بیان کرتے ہیں کہ ہم حضرت ابوہریرہؓ کے پاس حاضر تھے آپ کے جسم پر دو قیمتی منقش کپڑے تھے ناک صاف کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو انہی قیمتی کپڑوں سے صاف کرنے لگے پھر اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے کہ اے ابوہریرہ! آج تو ان قیمتی کپڑوں سے ناک صاف کرتا ہے ایک وقت وہ بھی تھا کہ تو بھوک کی شدت کی وجہ سے منبر رسولؐ اور حجرۂ عائشہ رضؓ کے درمیان پڑا رہتا تھا۔

مضارب بن حزن بیان کرتے ہیں کہ میں رات کے وقت چل رہا تھا اچانک میں نے سنا کہ ایک آدمی نے بلند آواز سے "اللہ اکبر" کہا میں نے اونٹ کو اس کے قریب کیا اور پوچھا کون مکبر ہے؟ اس نے بتایا ابوہریرہ میں نے کہا یہ تکبیر کیسی؟ فرمایا باری تعالیٰ کے شکرانے کی۔ میں نے پوچھا کس بات پر شکریہ؟ فرمایا اللہ کی اس نعمت پر کہ ایک وقت وہ تھا جبکہ میں بسرہ بنت غزوان نامی عورت کا نوکر تھا جب لوگ سوار ہوتے تو میں ان کے آگے آگے چلتا۔ جب وہ کسی جگہ پڑاؤ کرتے تو میں ان کی خدمت کرتا اللہ تعالیٰ نے یہ کرم فرمایا کہ اسی عورت کے ساتھ میرا نکاح کرا دیا اب وہ میری بیوی ہے لوگ جب سوار ہوتے ہیں تو مجھے بھی سواری پر بٹھایا جاتا ہے اور جب کسی جگہ اترتے ہیں تو میری خدمت کی جاتی ہے۔

محمد بن سیرین بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابوہریرہ اپنی بیٹی سے فرمایا کرتے بیٹی سونا نہ پہنا کرو۔ مجھے اس بات کا اندیشہ ہے کہ کہیں یہ سونا تمہارے حق میں بروز قیامت انگارے ہی نہ بن جائے۔

محمد بن سیرین ابوہریرہ سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے انہیں (ابوہریرہ) بلا کر عامل بنانے کی خواہش ظاہر کی انہوں نے عامل بننے سے انکار کر دیا حضرت عمر نے فرمایا ابوہریرہ کیا تو عامل بننے کو ناپسند کرتا ہے حالانکہ عامل بننے کا اس شخص نے مطالبہ کیا جو تجھ سے بہتر تھا ابوہریرہ نے پوچھا کون؟ عمر نے جواب دیا یوسف بن

یعقوب علیہ السلام - ابوہریرہ نے کہا- وہ تو خود نبی تھے اور نبی کے بیٹے تھے اور میں ابوہریرہ بن امیہ ہوں -

حضرت ابوہریرہ بیان کرتے ہیں کہ حضورؐ نے مجھ سے پوچھا : تو ان غنائم کا کیوں نہیں سوال کرتا جن کا تیرے دوسرے ساتھی سوال کرتے ہیں میں نے عرض کیا میری درخواست تو یہ ہے کہ آپ مجھے وہ علم سکھائیں جو اللہ نے آپؐ کو سکھایا ہے آپؐ نے فرمایا چادر پھیلاؤ- میں نے پیٹھ پر سے چادر اتار کر اپنے اور آپؐ کے درمیان پھیلا دی آپؐ مجھ سے احادیث بیان فرماتے رہے جب آپؐ کی گفتگو تمام ہوئی تو مجھ سے فرمایا چادر کو اکٹھی کر کے اپنے جسم کے ساتھ لگا لو اس کے بعد میرے حافظے کا یہ عالم تھا کہ آپؐ جو کچھ ارشاد فرماتے اس میں سے ایک حرف بھی نہ بھولتا -

یزید بن اصم کہتے ہیں کہ انہوں نے حضرت ابوہریرہ کو یہ فرماتے سنا - لوگ تعجب کرتے ہیں کہ ابوہریرہ بہت روایات بیان کرتے ہیں- خدا کی قسم اگر میں تمہیں وہ تمام کچھ بیان کر دوں جو میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے تو تم میرے اوپر کوڑا کرکٹ پھینکنے لگو اور اس کے بعد میری طرف دیکھنا بھی پسند نہ کرو- ایک حدیث میں بیان فرمایا کہ میں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پانچ برتن (مختلف علوم کے) حفظ کئے جن میں سے دو کو میں نے بیان کر دیا ہے اگر تیسری قسم کے علوم کو بھی بیان کر دوں تو تم مجھے سنگسار کر دو -

ایک روایت میں حضرت ابوہریرہ نے فرمایا- کیا میں تمہیں ٹھنڈی (آسان) غنیمت نہ بتاؤں ، لوگوں نے پوچھا وہ کیا فرمایا سردیوں میں روزہ رکھنا ابو عثمان النہدی کہتے ہیں کہ میں حضرت ابوہریرہ کے ہاں سات راتیں مہمان ٹھہرا رہا- میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کس طرح روزے رکھتے ہیں فرمایا میں ہر مہینے کے شروع میں تین روزے رکھ لیتا ہوں کیونکہ اگر مجھے کوئی حادثہ پیش آ جائے تو کم از کم اس مہینے تو روزوں کے ثواب میں لکھا جائے - سعید بن مسیب بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابوہریرہ صبح بازار میں چلے جاتے جب واپس آتے تو گھر والوں سے پوچھتے کہ کھانے کو کچھ ہے ؟ اگر وہ کہتے کہ کچھ نہیں تو آپ فرماتے آج میرا روزہ ہوگا- حضرت ابوہریرہ نے بیان فرمایا کہ میں روزانہ بارہ ہزار مرتبہ استغفار کرتا ہوں آپ کے ایک پوتے نقل کرتے ہیں کہ دادا جان کے پاس ایک دھاگا تھا جس میں ہزار گرہیں تھیں رات کو جب تک اس دھاگے پر پوری تسبیح نہ پڑھ لیتے نہ سوتے -

سالم بن بشر بیان کرتے ہیں کہ ابوہریرہ مرض الموت میں رونے لگے عرض کیا گیا آپ کیوں روتے ہیں ؟ فرمایا میں تمہاری اس دنیا کے فوت ہو جانے پر نہیں بلکہ اس بات پر رو رہا ہوں کہ اگلا سفر بہت طویل ہے اور زادِ راہ موجود نہیں معلوم نہیں کیا انجام ہوگا ؟ جنت یا دوزخ -

حضرت ابوہریرہ نے فرمایا جب تم مساجد کو منقش بنانے لگو اور مصاحف کو آراستہ کرنے لگو تو سمجھ لو کہ اب

تمہارے لئے ہلاکت ہے۔

ابو یزید المدنی کہتے ہیں حضرت ابوہریرہ مدینہ منورہ میں منبر رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوی سیڑھی سے نیچے والی سیڑھی پر کھڑے ہوئے اور فرمایا شکر ہے باری تعالیٰ کا کہ اس نے ابوہریرہ کو اسلام کی ہدایت دی شکر ہے اللہ تعالیٰ کا جس نے ابوہریرہ کو قرآن سکھایا۔ شکر ہے اس ذات کا جس نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے ابوہریرہ پر احسان فرمایا۔ سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جس نے مجھے خمیری روٹی کھلائی ریشمی یعنی قیمتی لباس پہنایا اور بنت غزوان سے شادی کرائی جس کا میں مزدور رہ چکا تھا پھر فرمایا عرب کے لئے ہلاکت و بربادی ہوگی اس شر و برائی کی وجہ سے جو قریب آن پہنچی ہے لڑکوں کی امارت و بادشاہی کی وجہ سے ان کی ہلاکت ہوگی جو خواہشات نفسانی سے فیصلے کریں گے اور ناراض ہونے کی حالت میں لوگوں کو قتل کریں گے۔ اے بنی فروخ تمہیں خوشخبری سناتا ہوں وہ یہ کہ علم دین اگر ثریا کے ساتھ بھی معلق ہوگا تو تم میں سے کچھ لوگ ایسے ہوں گے جو وہاں سے بھی علم پالیں گے۔

ابو المتوکل بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابوہریرہ کی ایک لونڈی حبشیہ تھی جس نے اپنی بری کارکردگی کی وجہ سے انہیں تکلیف میں ڈال رکھا تھا۔ ایک دن آپ نے اس پر کوڑا بلند کرتے ہوئے فرمایا اگر قصاص نہ ہوتا تو میں تمہیں مار مار کر بے ہوش کر دیتا مگر میں تمہیں اس ذات کے ہاتھ فروخت کرتا ہوں جو مجھے تیری پوری پوری قیمت دے گی اس کے بعد فرمایا جا تو اللہ کے لئے آزاد ہے۔

نبی اسود نقل کرتے ہیں کہ مدینہ منورہ میں ایک شخص نے نیا مکان تعمیر کرایا۔ مکان تیار ہو چکا تو اتفاق سے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا وہاں سے گزر ہوا۔ مالک مکان دروازے پر کھڑا تھا اس نے حضرت ابوہریرہ سے ٹھہرنے کو کہا اور پوچھا حضرت! میں اپنے دروازے پر کیا عبارت تحریر کروں۔ حضرت ابوہریرہ نے فرمایا دروازے پر یہ عبارت لکھو۔

"ابنِ للخراب، ولد للثکل و اجمع للوارث"

(مکان بنا ؤ برباد ہونے کے لئے، اولاد پیدا کرو کہ ان کی موت پر آنسو بہاؤ اور دولت جمع کرو کہ تمہارے بعد تمہارے وارثوں کو ملے)

پاس کھڑے ہوئے ایک اعرابی نے کہا۔ اے شیخ! تو نے کیسی بری بات کہی۔ مالک مکان نے اسے جھڑکتے ہوئے کہا۔ الیا مت کہو۔ یہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔

عبداللہ بن عبد الاسد المخزومی

عبداللہ بن مبارک کے قول کے مطابق عبداللہ بن عبدالاسد المخزومی بھی اہل صفہ میں شامل ہیں۔ ان صحابہ میں سے جنہیں دو ہجرتوں کا شرف حاصل ہوا۔ غزوہ احد میں جو زخم پہنچا وہ واپس آنے پر پھٹ پڑا۔ اسی سے وفات ہوئی۔

موصوف ایک حدیث بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ جو شخص کسی مصیبت کے پہنچنے یعنی کوئی چیز گم ہونے پر یہ کہے "انا للہ وانا الیہ راجعون اللھم عندک احتسب مصیبتی فاجرنی فیھا واعقبنی منھا خیرا" (ہم سب اور ہمارا سب کچھ اللہ کا ہے۔ اور ہمیں اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے اے اللہ میں تیرے ہاں اپنی مصیبت کو ثواب سمجھتا ہوں تو مجھے اس کا اجر عنایت فرما اور اس کے بدلہ میں بہتر چیز عطا فرما) تو اللہ اسے گم شدہ سے بہتر چیز عطا فرماتے ہیں۔

عبداللہ بن حوالہ الازدی

ابو عیسیٰ الترمذی کے بیان کے مطابق عبداللہ بن حوالہ الازدی بھی اہل صفہ میں سے ہیں۔ موصوف ان صحابہ میں سے ہیں جو شام میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔

عبداللہ موصوف ایک روایت یوں نقل کرتے ہیں کہ ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر تھے ہم نے آپ سے فقر و تنگدستی، کپڑے نہ ہونے اور قلت اشیاء کی شکایت کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اللہ کی قسم مجھے تم پر قلت سے زیادہ کثرت اشیاء کا خوف ہے۔ عنقریب فارس، روم اور حمیر کی زمین تم فتح کر لو گے اور تم تین لشکروں میں بٹ جاؤ گے۔ ایک لشکر شام میں، دوسرا عراق میں اور تیسرا یمن میں ہو گا۔ اس وقت تم میں سے کسی ایک کو جب سو دینار دیئے جائیں گے تو وہ اس گراں قدر عطیہ کو بھی کم سمجھے گا

عبداللہ بن ام مکتوم

ابو رزین کے قول کے مطابق عبداللہ بن ام مکتوم بھی اہل صفہ میں شامل ہیں۔ غزوہ بدر کے کچھ دن بعد مدینہ منورہ میں آئے اور اہل صفہ کے ساتھ صفہ میں اترے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں مخرمہ بن نوفل کے گھر میں ٹھہرایا۔ یہ وہی گھر ہے جس میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی "عبس وتولی ان جاءہ الاعمی" (پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم چین بجبین ہو گئے۔ اور متوجہ نہ ہوئے۔ جبکہ ان کے پاس ایک نابینا آیا۔

تشریح: ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعض رؤسا مشرکین کو سمجھا رہے تھے کہ اتنے میں عبداللہ بن ام مکتوم نابینا صحابی حاضر ہوئے۔ اور کچھ پوچھنا شروع کیا۔ یہ قطع کلام آپ کو ناگوار ہوا۔ اور آپ نے ان کی طرف التفات نہ فرمایا اور ناگواری

کی وجہ سے آپ چین بجبیں ہوئے۔ جب آپ اس مجلس سے اٹھ کر گھر جانے لگے تو یہ آیتیں نازل ہوئیں۔ اس کے بعد جب بھی حضرت عبداللہ بن ام مکتوم آپؐ کے پاس آتے تو آپ بڑی خاطر کرتے۔

عبداللہ بن ام مکتوم ایک روایت بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سورج چڑھنے پر ہمارے پاس تشریف لائے۔ تمام لوگ حجروں کے پاس موجود تھے۔ آپؐ نے فرمایا۔ اے اہل حجرات! آگ بھڑک اٹھی اور فتنے اس قدر اندھیرے کر آئے جس طرح کہ رات ہو۔ اگر تم ان چیزوں کو سمجھتے تو تھوڑا ہنستے اور زیادہ روتے

عبداللہ بن عمرو بن حرام الانصاری

احمد بن ہلال الشطوی کے قول کے مطابق عبداللہ بن عمرو بن حرام الانصاری السلمی ابوجابر بھی اہل صفہ میں شامل ہیں۔ یہ وہی صحابی ہیں جو غزوہ احد میں شہید ہوئے تو اللہ تعالےٰ نے انہیں دوبارہ زندہ فرمایا۔ اور اپنے سامنے ان سے کلام فرمایا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ کے بیٹے جابر سے فرمایا۔ اے جابر! میں تمہیں ایک بہتر بشارت سناتا ہوں۔ وہ یہ کہ اللہ تعالےٰ نے تمہارے باپ کو دوبارہ زندہ فرمایا۔ اور اپنے سامنے بٹھا کر فرمایا۔ اے میرے بندے جو کچھ تو چاہے مجھ سے تمنا کر، میں تمہیں عطا کروں گا۔

انہوں نے عرض کیا۔ اے میرے رب! میں تیری عبادت اس طرح نہ کر سکا جس طرح کہ عبادت کرنے کا حق ہوتا ہے میری تمنا یہ ہے کہ تو مجھے دوبارہ دنیا کی طرف لوٹا۔ تاکہ میں تیرے نبی کے ساتھ مل کر کفار مشرکین سے قتال کر سکوں۔ اور لڑتے لڑتے ایک مرتبہ پھر تیرے راستے میں شہید ہو جاؤں۔ باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ یہ تو میرا ازل سے فیصلہ ہو چکا ہے کہ کوئی شخص مرنے کے بعد دنیا کی طرف نہیں لوٹے گا۔

عبداللہ بن انیس

ابو عبداللہ الحافظ النیسابوری کے قول کے مطابق عبداللہ بن انیس بھی اہل صفہ میں داخل ہیں۔ قبیلہ جہینہ سے تعلق رکھتے تھے جو مدینہ سے باہر گاؤں میں رہا کرتا تھا۔ موصوف رمضان المبارک کے مہینہ میں رات کو مدینہ منورہ میں آجاتے اور مسجد نبوی کے اندر صفہ میں قیام کرتے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اپنا عصا مبارک عطا فرمایا تھا۔ تاکہ قیامت کے دن وہ عصا سمیت آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کریں۔

موصوف بیان کرتے ہیں کہ وہ حوالیٔ مدینہ میں رہا کرتے تھے۔ انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک مرتبہ درخواست کی کہ آپ ان کے لئے ایک رات مقرر فرما دیں۔ جس میں وہ مسجد نبوی میں حاضر ہوا کریں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں رمضان کی تئیسویں ۲۳ رات کو حاضر ہونے کا ارشاد فرمایا۔ چنانچہ جب وہ رات آتی تو تمام اہل مدینہ جمع ہو جاتے۔

عبداللہ مذکور خود بیان کرتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا! خالد بن نبیح سے کون نبٹے گا۔

یہ تبیلہ ہذیل کا ایک آدمی تھا جو ان دنوں عرفہ کی جانب مقام عرفہ میں ٹھہرا ہوا تھا۔ عبداللہ نے عرض کیا: میں یارسول اللہ! مجھے اس کی کوئی نشانی بتا دیجئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ اس کی پہچان یہ ہے کہ جب تو اسے دیکھے گا تو ڈر جائے گا۔ عبداللہ نے عرض کیا۔ یارسول اللہ! میں تو کبھی کسی شے سے نہیں ڈرا۔ چنانچہ عبداللہ نکل کھڑے ہوئے اور غروب شمس سے قبل عرفہ کے پہاڑوں میں اس شخص (خالد بن نبیح) سے ملے۔ عبداللہ بتاتے ہیں کہ میں جب اس سے ملا تو میرے اوپر ایک رعب طاری ہو گیا۔ اس سے میں نے وہ علامت جان لی جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی تھی۔ اس نے مجھ سے پوچھا تو کون آدمی ہے؟ میں نے کہا مجھے رات کو یہاں ٹھہرنا ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کے پاس ٹھہر جاؤں؟ کہنے لگا ضرور۔ آؤ میرے ساتھ چلو۔ میں اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ عصر کا وقت جا رہا تھا۔ میں نے جلدی جلدی دو رکعتیں عصر کی پڑھیں اور پھر اسے جا ملا۔ جاتے ہی تلوار سے اس کا سر قلم کر دیا اور بارگاہ نبوی میں حاضر ہو کر واقعہ کی اطلاع دی۔ محمد بن کعب بتاتے ہیں کہ اس جرأت پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اپنا عصا عطا فرمایا۔ اور کہا۔ اس عصا پر ٹیک لگایا کرو۔ تاکہ تو مجھے قیامت کے دن یہ عصا لئے ہوئے ملے۔ بہت کم لوگ ہوتے ہیں جنہیں شاہی عصا عطا کئے جاتے ہیں۔ محمد بن کعب بتاتے ہیں کہ عبداللہ بن انیس مذکور جب فوت ہونے کے قریب ہوئے تو وصیت فرمائی کہ عصا نبوی بھی ان کے ساتھ دفن کیا جائے۔ چنانچہ وہ عصا مبارک کفن میں ان کے پیٹ پر رکھ دیا گیا۔ اور انہیں عصا سمیت دفن کر دیا گیا۔

عبداللہ بن زید الجہنی

ابو عبداللہ الحافظ نیسابوری کی تحقیق کے مطابق عبداللہ بن زید الجہنی بھی اہل صفہ میں شامل ہیں۔ موصوف نے زمانۂ خلافت امیر معاویہ میں وفات پائی۔

عبداللہ مذکور ایک حدیث بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص کوئی سامان چرائے اس کا ایک ہاتھ کاٹ دو۔ دوبارہ چوری کرے تو ایک پاؤں کاٹ دو۔ سہ بارہ چوری کرے تو دوسرا ہاتھ کاٹ دو، اور اگر چوتھی مرتبہ بھی چوری کا مرتکب ہو، تو اس کا دوسرا پاؤں بھی کاٹ دو۔ اب بھی اگر باز نہ آئے اور چوری کا ارتکاب کرے تو اس کا سر قلم کر دو۔

عبداللہ بن الحارث بن جزء الزبیدی

عبداللہ بن الحارث بن جزء الزبیدی بھی اہل صفہ سے بتائے جاتے ہیں۔ جو بعد میں مصر کی طرف چلے گئے تھے۔ اخیر عمر میں موصوف کی بینائی جاتی رہی تھی۔ غالباً ذہاب بصر میں حکمت الٰہی یہ تھی کہ ذکر اور تقدیس الٰہی میں ہمہ وقت مشغول ہونے کی وجہ سے انہیں لوگوں کو دیکھنے کی چنداں حاجت ہی نہ تھی۔ ایک مرتبہ عبدالعزیز بن مروان نے عبداللہ موصوف سے کہا کہ انہیں ابھی نہیں مرنا چاہیئے۔ آپ نے فرمایا۔ اللہ کرے اسی طرح ہو۔ تاکہ مزید تکبیر و تسبیح خداوندی کر سکوں تکبیر و تسبیح جو میزان

عمل میں بہت زیادتی کا باعث ہوگی۔ مجھے سب سے زیادہ محبوب ہے۔ اس کی برکت سے بفضلہ تعالیٰ گناہوں کا بھی کفارہ ہو جائے گا۔

موصوف ایک حدیث یوں روایت کرتے ہیں کہ ایک دن ہم صفہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر تھے آپ نے ہمیں کھانا عنایت فرمایا۔ ہم کھا چکے تو جماعت کھڑی ہوگئی، چنانچہ ہم تمام نے نماز پڑھی اور کلی نہ کی۔

عبداللہ بن عمر بن الخطاب

ابو عبداللہ الحافظ النیسابوری کی تحقیق کے مطابق جلیل القدر صحابی حضرت عبداللہ بن عمر بھی اہل صفہ میں شامل ہیں۔ انتہائی زاہد، عابد، تہجد گزار، راتوں کو قیام کرنے والے، دنیا اور اقتدار سے قطعی بیزار تھے۔ ہمہ وقت مسجد نبوی میں پڑے رہتے۔

حکومت اور امارت کو سخت ناپسند فرماتے۔ آپ کے آزاد کردہ غلام حضرت نافع بیان کرتے ہیں کہ ایک آدمی آپ کے پاس آیا۔ اور کہنے لگا۔ اے ابو عبدالرحمٰن (آپ کی کنیت ہے) آپ حضرت عمر فاروقؓ کے صاحبزادے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہیں۔ علاوہ ازیں اور بہت سارے آپ کے مناقب بیان کئے پھر کہا حضرت! خلیفہ اور امیرالمومنین کا منصب قبول کرنے سے آپ کو کیا چیز مانع ہے؟ فرمایا۔ میرے لئے یہ بات مانع ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میرے اوپر کسی مسلمان کا خون حرام ٹھہرایا ہے۔ اس نے کہا اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے "قاتلوھم حتی لاتکون فتنۃ ویکون الدین کلہ للہ" (کفار و مشرکین سے جنگ کرو۔ حتیٰ کہ فتنہ و کفر کا خاتمہ ہو جائے اور تمام کائنات میں اللہ کا دین قائم ہو جائے) آپ نے فرمایا، ہم نے یہ کام کر دیا ہے اور بفضلہ تعالیٰ اللہ کا دین قائم ہو چکا ہے۔ اب تم لوگ یہ چاہتے ہو کہ قتل و غارت کے ذریعے دین غیر اللہ کا بنا دیں۔

حضرت حسن بصری بیان کرتے ہیں کہ امیر معاویہؓ کی وفات کے بعد جب ایک عام فتنہ اور ملک میں بدامنی پھیل گئی تو لوگ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے پاس آئے۔ اور کہا۔ آپ تمام لوگوں کے سردار اور سردار باپ کے بیٹے ہیں۔ اور پھر عوام آپ کو چاہتے بھی ہیں۔ آپ ہو کل الیٰ نکلیں۔ ہم آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا جب تک مجھ میں جان ہے۔ میری وجہ سے کسی کا خون نہیں بہایا جائے گا۔ انہیں دھمکی دی گئی کہ خروج کرو۔ ورنہ قتل کر دیئے جاؤ گے۔ آپ نے پھر بھی وہی بات ارشاد فرمائی۔ حسن کہتے ہیں کہ وہ لوگ آپ سے قطعی مایوس ہوگئے اور چلے گئے۔ آپ نے ساری زندگی اقتدار کو نہ قبول کیا اور نہ کبھی خواہش ہی کی۔ ایک موقعہ پر فرمایا کہ مجھے یہ بات ناپسند ہے کہ اس شخص سے قتال کروں جو "لا الہ الا اللہ" پڑھتا ہو۔ ایک دفعہ جب امارت المومنین قبول کرنے کی درخواست لوگوں نے کی تو فرمایا، اگر تم مجھے نماز کی دعوت دو تو ضرور قبول کروں گا۔ کسی اور خیر کے کام کی طرف بلاؤ ضرور آؤں گا جب تم ایک دوسرے سے جدا اور آپس میں افتراق و اختلاف کرو گے تو تمہارے ساتھ اتفاق نہیں کروں گا۔ اور جب ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جاؤ گے تو تم سے جدا نہیں ہوں گا۔ البتہ خلافت اور امارت کا بوجھ نہیں اٹھایا جا سکتا۔

مال دنیا سے قطعاً محبت نہ تھی جو کچھ آتا۔ اللہ کے راستے میں خرچ کر دیتے۔ ایک ایک مجلس میں ہزاروں درہم

تقسیم فرما دیتے۔ حضرت نافع آپ کا ایک معمول نقل کرتے ہیں۔ وہ یہ کہ جب کبھی کوئی چیز دل کو بھاتی تو اسے راہ للہ خرچ کر دیتے۔ آپ کے غلام آپ کی اس ادا کو سمجھتے تھے۔ بسا اوقات وہ یوں کرتے کہ مسجد میں جا کر ذکر و اذکار میں مشغول ہو جاتے حضرت عمران کو اس حالت میں دیکھتے تو آزاد کر دیتے۔ لوگوں نے کہا حضرت یہ غلام آپ کو محض دھوکا دینے کی خاطر مسجد میں بیٹھتے ہیں۔ ورنہ یہ تو اتنے عبادت پسند نہیں۔ فرمایا جو ہمیں اللہ کے نام سے دھوکا دیتا ہے ہم اس کا دھوکا کھانے کے لئے تیار ہیں

حضرت مجاہد نقل کرتے ہیں کہ جب آیت "لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون" (جب تک تم پسندیدہ چیز کو اللہ کے راستے میں خرچ نہ کرو نیکی کو ہرگز نہیں پا سکتے) نازل ہوئی تو آپ نے اپنی ایک لونڈی "رمیثہ" کو بلایا اور کہا میں تمہیں دنیا میں سب سے زیادہ پسند کرتا ہوں لہذا تو جا اللہ کے لئے آزاد ہے۔ حضرت میمون بن مہران بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر کے پاس بائیس ہزار دینار آئے۔ آپ اس وقت تک نہ اٹھے جب تک کہ ان کو تقسیم نہ فرما دیا۔

ایوب بن وائل راسبی بیان کرتے ہیں کہ میں مدینہ منورہ میں آیا تو ایک آدمی نے جو ابن عمر کا پڑوسی تھا مجھے خبر دی کہ ان (عبداللہ بن عمر) کے پاس چار ہزار درہم امیر معاویہ کی طرف سے' چار ہزار کسی اور آدمی کی طرف سے اور دو ہزار و ایک چادر مزید کسی دوسرے کی طرف سے آئے ہیں۔ اس کے باوجود وہ بازار میں اپنی سواری کی خاطر ایک درہم کا ادھار چارہ مانگ رہے ہیں۔ میں نے اصل معاملہ کو بھانپ لیا اور تصدیق کی خاطر حضرت عبداللہ بن عمر کی ایک لونڈی کے پاس آیا۔ اور کہا میں تجھ سے ایک چیز پوچھنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ کیا ابو عبدالرحمن (عبداللہ کی کنیت ہے) کے پاس چار ہزار امیر معاویہ کی جانب سے چار ہزار کسی دوسرے صاحب کی طرف سے اور دو ہزار کسی تیسرے صاحب کی طرف سے آئے تھے؟ اس نے بتایا! کیوں نہیں' آئے تھے۔ میں نے کہا تو وہ کہاں گئے؟ عبداللہ سواری کے لئے چارا بھی ادھار ڈھونڈ رہے ہیں۔ اس نے بتایا! کہ وہ تمام رقم انہوں نے رات کو سونے سے پہلے پہلے خرچ کر دی تھی۔ پھر چادر لی اور باہر چلے گئے۔ یہ سن کر میں بازار میں آیا اور پکار کر کہا۔ اے تاجرو! اس دنیا کو کیا کرو گے۔ ابن عمر کو دیکھو کہ کل رات کو اس کے پاس دس ہزار دراہم آئے۔ مگر اس نے کل ہی سارے تقسیم کر دیئے۔ اور آج سواری کے لئے چارا بھی ادھار پہ مانگ رہا ہے۔

حضرت نافع بتلاتے ہیں کہ ایک سال امیر معاویہ نے ان کی خدمت میں پورے ایک لاکھ درہم ارسال کئے۔ سال ختم ہونے تک ان کے پاس ایک درہم بھی نہ تھا۔

حضرت نافع بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ایک مرتبہ بیماری کے دوران انگور کھانے کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے ایک درہم کے بدلہ میں انگوروں کا ایک خوشہ خریدا اور لا کر آپ کے ہاتھ میں دے دیا۔ ابھی آپ نے کچھ کھایا نہیں تھا کہ دروازے پر ایک سائل آگیا۔ آپ نے فرمایا۔ یہ خوشہ سائل کو دے دو۔ میں نے کہا حضرت! کچھ چکھ تو لیں۔ فرمایا نہیں۔ اس کو دے دو۔ چنانچہ میں نے وہ خوشہ سائل کو دے دیا۔ اور آپ کی آنکھ بچا کر دوبارہ سائل سے ایک درہم کے بدلہ میں خرید لیا۔ اور تھوڑی دیر تک آپ کی خدمت میں پیش کیا۔ وہ سائل پھر آگیا۔ آپ نے بغیر چکھے اس کو دلوا دیا۔ میں (نافع) نے پھر پہلے کی طرح تدبیر کی۔ سائل تیسری مرتبہ پھر آن دھمکا۔ آپ نے سہ بارہ بھی وہ خوشہ اسی کو دلوا دیا۔ میں نے پھر وہی چال چلی۔ اب کے وہ سائل لوٹنے لگا تو میں نے کہا تجھے شرم نہیں آتی؟ چنانچہ چوتھی مرتبہ آپ نے وہ خوشہ کھایا۔

حضرت نافع بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ بیماری کے دوران مچھلی کی خواہش کی۔ میں نے ایک مچھلی خریدی اور بھون کر سامنے رکھ دی۔ ابھی لقمہ تک نہیں اٹھایا تھا کہ ایک سائل آگیا۔ فرمایا یہ مچھلی اٹھا کر اسے دے دو۔ اہل خانہ نے عرض کیا۔ ہم اسے مچھلی سے زیادہ قیمتی چیز دے دیتے ہیں۔ فرمایا نہیں۔ چنانچہ وہ مچھلی اس سائل کے سپرد کر دی گئی۔

جب کھانا کھاتے تو ہمیشہ مساکین کے ساتھ مل کر کھاتے۔ ایک مرتبہ رات کو کھانے بیٹھے تو فرمایا کہ فلاں مسکین کو بلاؤ۔ فلاں کو بلاؤ۔ آپ کی بیوی نے ان مساکین کو پہلے سے کہہ رکھا تھا کہ عبداللہ بلائیں تو بھی نہ آنا۔ چنانچہ وہ نہ آئے۔ آپ نے گھر والوں سے فرمایا کہ تم چاہتے ہو کہ میں آج رات نہ کھاؤں۔ چنانچہ اسی طرح ہوا۔ اور آپ نے اس رات بالکل نہ کھایا۔

آپ کا ایک آزاد کردہ غلام عراق سے آیا۔ اور عرض کیا۔ میں آپ کے لئے ایک تحفہ لایا ہوں۔ فرمایا کیا ہے؟ عرض کیا ایک معجون ہے۔ فرمایا۔ وہ کس کام کی ہے۔ عرض کیا کھانا ہضم کرنے میں اکسیر ہے۔ فرمایا چالیس سال ہو گئے میں نے تو کبھی پیٹ بھر کر کھانا ہی نہیں کھایا۔ میں اسے کیا کروں گا۔

میمون بن مہران بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر نے ایک غلام کو مکاتب بنایا اور مکاتبت کی رقم کو قسطوں میں ادا کرنا طے ہوا۔ مکاتب جب پہلی قسط ادا کرنے کے واسطے رقم لایا تو آپ نے پوچھا۔ یہ رقم تو نے کہاں سے لی؟ اس نے بتایا کچھ مزدوری کی اور کچھ بھیک مانگی۔ آپ نے فرمایا کیا تو ہمیں لوگوں کی میل کچیل (صدقات) کھلانا چاہتا ہے؟ جا تو اللہ کے لئے آزاد ہے۔ اور جو رقم لایا ہے۔ یہ بھی تیری ہی ہے۔

مشہور محدث قزعہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عمر کے جسم پر موٹے کھردرے کپڑے دیکھے تو میں آپ کے لئے ملائم کپڑے لایا۔ میں نے عرض کیا۔ حضرت! میں آپ کے لئے خراساں کا بنا ہوا ایک نفیس قسم کا کپڑا لایا ہوں۔ اگر آپ اسے زیب تن فرمائیں تو یہ امر میری آنکھوں کی ٹھنڈک کا باعث ہوگا۔ فرمایا دکھاؤ۔ جب آپ نے کپڑے کو مس کیا تو پوچھا۔ کیا یہ ریشم ہے؟ میں نے عرض کیا نہیں۔ یہ ایک روئی کی قسم ہے۔ فرمایا اس کپڑے کے پہننے میں مجھے یہ ڈر لگتا ہے کہ کہیں اترانے نہ لگوں اور باری تعالیٰ اترانے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

حضرت نافع بیان کرتے ہیں کہ کسی آدمی نے حضرت ابن عمر سے عرض کیا۔ حضرت یہ کیا معاملہ ہے کہ آپ ابن زبیر کے ساتھ بھی نماز پڑھ لیتے ہیں اور خوارج کے ساتھ بھی نماز پڑھ لیتے ہیں۔ حالانکہ یہ آپس میں ہمیشہ لڑتے رہتے ہیں؟ آپ نے فرمایا۔ جو بھی نماز اور نیکی کی طرف بلائے گا۔ اس کی دعوت ضرور قبول کروں گا۔ اور جو کوئی مجھے کسی مسلمان بھائی کے خون ضائع کرنے اور اس کے مال تلف کرنے کی طرف دعوت دے گا تو اس کی دعوت قطعاً قبول نہ کروں گا۔

حضرت نافع بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مسجد تعمیر کروائی تو ایک دروازہ عورتوں کے لئے مخصوص فرمایا۔ اور فرمایا۔ کوئی مرد اس دروازہ سے داخل نہ ہو۔ حضرت نافع بیان کرتے ہیں کہ میں نے کبھی بھی ابن عمر کو اس دروازہ میں نہ داخل ہوتے دیکھا اور نہ نکلتے دیکھا۔

حضرت عبداللہ بن عمر کے اخلاق و عادات کے متعلق چند چیزیں ذکر کی گئیں۔ آپ کے متعدد اقوال و احادیث

کتب حدیث اور کتب سیر میں منقول ہیں۔ جن کا استقصاء یہاں ممکن نہیں۔

عبدالرحمٰن بن قرط

عبدالرحمٰن بن قرط بھی اہل صفہ میں داخل ہیں۔ ان سے ایک روایت یوں منقول ہے کہ جس رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ اور پھر وہاں سے جبرائیل و میکائیل آپ کو آسمان کی طرف لے گئے۔ حتی کہ آپ ساتوں آسمان عبور کر کے لامکان تک پہنچے تو واپسی پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے آسمانوں کو بلند و برتر باری کی یہ تسبیح کرتے ہوئے سنا۔ سبحان العلی الاعلی سبحانہ و تعالیٰ۔

عبدالرحمٰن بن جبر بن عمرو

ابو عبداللہ الحافظ النیسابوری کے بیان کے مطابق عبدالرحمٰن بن جبر بن عمرو بھی اہل صفہ میں شامل ہیں۔ ان کے زیادہ حالات تو معلوم نہیں ہو سکے۔ البتہ ایک حدیث ان سے اس طرح منقول ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا۔

من اغبرت قدماہ فی سبیل اللہ حرمہ اللہ علی النار۔

جس شخص کے قدم اللہ کے رستے میں غبار آلود ہوئے۔ اللہ نے اس پر دوزخ کو حرام فرما دیا۔

عتبہ بن غزوان

محمد بن اسحٰق کی تحقیق کے مطابق ابو عبداللہ عتبہ بن غزوان بھی اہل صفہ میں شامل رہے۔ آپ ساتویں اسلام قبول کرنے والے خوش نصیب انسان تھے۔ انتہائی تارک الدنیا اور زاہد تھے۔ حکومت و سلطنت اور ولایت اور گورنری کو چھوڑ دیا تھا۔ انہیں بصرہ کا امیر مقرر کیا گیا تھا۔ مگر مسجد تعمیر کرنے اور اس میں منبر نصب کرنے کے بعد خود مستعفی ہو گئے۔ دنیا کی بے ثباتی اور اس فانی دنیا کو ہر حال میں چھوڑ جانے کے سلسلہ میں ان کا ایک مشہور خطبہ ہے۔ فرماتے ہیں۔

"اے لوگو! دنیا گھروں میں بٹ گئی ہے اور بہت جلد تبدیل ہو گئی ہے۔ دنیا سے اچھے لوگ اٹھ گئے ہیں اور اب صرف تلچھٹ باقی رہ گیا ہے۔ یاد رکھو تمہیں بھی اس دار فانی سے کوچ کرنا ہے۔ لہٰذا نیک اعمال کے ساتھ کوچ کرنا۔ میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔ اس بات سے کہ میں اپنے آپ میں تو بڑا بنوں اور اللہ کے ہاں چھوٹا۔ بخدا تم میرے بعد امراء کے ذریعے آزمائے جاؤ گے۔ اور بخدا ہمیشہ یہی ہوتا چلا آیا ہے کہ نبوت و خلافت بعد میں جا کر ملوکیت و آمریت میں تبدیل ہو جایا کرتی ہے۔ بلا شبہ میں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ساتواں مسلمان تھا۔ ہمارے لئے سوائے درختوں کے پتوں کے اور کوئی چیز کھانے کے واسطے نہ ہوتی۔ پتے کھاتے کھاتے ہماری باچھیں بھی زخمی ہو گئی تھیں۔ مجھے یاد ہے کہ میرے پاس صرف ایک

چادر تھی۔ جسے میں نے دو حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ ایک حصہ سعد بن مالک کو دیا۔ اور باقی آدھی خود پہنی۔ ان سات ابتدائی مسلمانوں میں سے آج کوئی شخص بھی ایسا نہیں جو کسی نہ کسی شہر کا امیر نہ ہو۔

عمار بن یاسر

سعید بن المسیب کی تحقیق کے مطابق ایمان سے بھرپور، ایقان سے پُر، آزمائش و امتحان اور افتنان میں ثابت قدم مذلت و رسوائی پر صابر، حضرت عمار بن یاسر بھی اہل صفہ میں شامل تھے۔ آپ کا شمار سابقین اولین میں ہوتا ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ظالموں کے ساتھ قتال میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔ باغیوں کے مقابلے میں حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے ساتھ رہے۔ دنیا کی زینت کو قطعی ترک کرنے والے نفس کی نخوت و غرور کا قلع قمع کرنے والے، دین پر مددگار کی عزت کرنے والے اور ہدایت کے امام کی پیروی کرنے والے تھے۔ اصحاب بدر میں سے تھے۔ حضرت عمر فاروق نے انہیں کوفہ کا امیر بنا کے بھیجا تو اہل کوفہ کی طرف لکھا کہ میں تمہارے اوپر ایک ایسے شخص کو امیر مقرر کر رہا ہوں جو برگزیدہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے ہے۔ اور ان چار آدمیوں میں سے ایک ہے۔ جن کے لیے جنت بھی مشتاق ہے۔ ہمیشہ تنگی اور محنت اور شوق سے اعمال جنت پر کاربند رہے۔ یہاں تک کہ اپنے پیارں، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھیوں سے جا ملے۔

حضرت ہانی بیان کرتے ہیں کہ ہم لوگ حضرت علی المرتضیٰ کے پاس موجود تھے کہ عمار بن یاسر آگئے۔ آپ نے فرمایا۔ اے طیب اور مطیب آپ کی آمد مبارک ہو۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ عمار کے اندر ہڈیوں تک ایمان بھرا ہوا ہے۔ حضرت ابن عباس بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ عمار سر سے لے کر پاؤں تک ایمان سے پُر ہے۔ حضرت عثمان بن عفان بیان کرتے ہیں کہ میں وادی بطحاء میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میں آپ کے ساتھ ہو لیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عمار اور ان کی والدہ کے پاس سے گزرے اس حال میں کہ انہیں اذیت دی جا رہی تھی۔ یہ دیکھ کر آپ نے فرمایا۔ اے یاسر کی آل صبر کا دامن تھامے رکھنا۔ بیشک تمہارا ٹھکانا جنت ہے۔ مجاہد نقل کرتے ہیں کہ سب سے پہلے ان سات آدمیوں نے اسلام کا اظہار کیا۔ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ابوبکر صدیق، خباب بن الارت، صہیب، بلال، عمار اور عمار کی والدہ۔ ان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت تو آپ کے چچا ابو طالب اور ابوبکر کی حفاظت ان کی قوم نے کی۔ باقی تمام کو اہل مکہ لوہے کی زرہیں پہنا دیتے اور پھر انہیں سخت دھوپ میں ڈال دیتے۔ لوہے اور سورج کی گرمی سے انہیں سخت تکلیف پہنچتی۔ جب شام ہوتی تو ابوجہل لعنہ اللہ ہاتھ میں نیزہ لئے ہوئے آتا۔ اور ان کو سب و شتم اور زیر و توبیخ کرتا۔ آپ کے ایک پوتے بیان کرتے ہیں کہ مشرکین مکہ نے حضرت عمار کو پکڑ لیا اور اس وقت تک نہ چھوڑا جب تک کہ ان کی زبان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں کلمات بد نکلوا لیے اور اپنے معبودوں کے حق میں اچھے کلمات نہ کہلوا لئے۔ جب وہاں سے جان چھوٹی تو دوڑ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا۔ تیرے پیچھے کیا چیز لگی ہوئی ہے؟ عرض کیا بہت بڑی برائی یا رسول اللہ! مجھے ان

ظالموں نے اس وقت تک نہیں چھوڑا جب تک کہ میں نے آپ کے حق میں نازیبا کلمہ اور ان کے معبودوں کے حق میں ذکر خیر نہیں کیا۔ آپ نے پوچھا۔ تیرے دل کی کیفیت کیسی ہے؟ (یعنی یہ کلمات صرف زبان سے کہے یا دلی تصدیق بھی شامل تھی) عرض کیا دل تو میرا بفضلہ تعالیٰ ایمان باللہ وایمان بالرسل کے ساتھ مطمئن ہے۔ آپ نے فرمایا: تو کوئی حرج نہیں۔ اگر آئندہ بھی وہ تیری تکلیف کے درپے ہوں اور اس قسم کا مطالبہ کریں تو جان بچانے کی خاطر ایسا کر لینا۔

حضرت علی المرتضیٰ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ عمار بن یاسر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اندر آنے کی اجازت چاہی۔ آپ نے عمار بن یاسر سے فرمایا: "ائذنوا له مرحبا بالطیب المطیب" اس کو اندر آنے دو، پاکیزہ انسان کا آنا مبارک ہو۔

حضرت عمار بن یاسر خود بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ جس شخص میں یہ تین عادات جمع ہو گئیں۔ اس میں ایمان کی تمام عادات جمع ہو گئیں۔ تنگی کے باوجود اللہ کے رستے میں خرچ کرنا۔ اپنے نفس سے بھی انصاف کرنا۔ اور تمام جہان میں سلامتی کو پھیلانا۔ ابوالبختری اور میسرہ بیان کرتے ہیں کہ جنگ صفین کے روز عمار بن یاسر کو دودھ کا پیالہ پیش کیا گیا۔ آپ نے نوش فرمانے کے بعد (کہا) کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی کے مطابق یہ پینا دنیا میں میرا آخری پینا ہے۔ اس کے بعد اٹھ کر جنگ میں شریک ہو گئے۔ اور بالآخر جام شہادت نوش فرمایا۔

حضرت علیؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عمار کا ذکر کیا۔ آپؐ نے فرمایا: وہ تیرے بہت سی جنگوں میں شریک ہوگا جن کا اجر بہت بڑا ہوگا۔ اور ان کا ذکر بھی کثرت سے ہوگا۔ حضرت انس بن مالک بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ کو یہ فرماتے سنا کہ بیشک جنت ان چار آدمیوں کے لئے مشتاق ہے۔ عمار، علی، سلمان اور مقداد

عثمان بن مظعون

ابوعیسیٰ الترمذی کے بیان کے مطابق عثمان بن مظعون بھی اہل صفہ میں شامل ہیں۔ حضرت عثمان خود بیان کرتے ہیں کہ جب انہوں نے دیکھا کہ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو طرح طرح کی تکالیف دی جا رہی ہیں اور وہ ولید بن مغیرہ کی امان میں ہونے کی وجہ سے امن و سکون سے مکہ میں پھرتے ہیں تو سوچا کہ ایک مشرک آدمی کی پناہ میں رہنا کچھ ٹھیک نہیں۔ دوسرے یہ کہ میرے دینی بھائیوں کو تو تکالیف پہنچ رہی ہیں۔ اور مجھے کوئی پوچھتا نہیں۔ یہ بہت بڑے نقص کی بات ہے کہ میرے ساتھی تو مصائب و آلام برداشت کریں۔ اور میں مزے سے رہوں۔ یہ خیال کر کے ولید بن المغیرہ کے پاس گئے اور کہا۔ اے ابا عبد شمس تو نے اپنے ذمہ کو پورا کیا۔ اب مجھے تیرے ذمہ اور تیری پناہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں تیری پناہ تیری طرف لوٹاتا ہوں۔ اس نے حیران ہو کر پوچھا بھتیجے کیا بات ہوئی؟ کیا میری قوم کے کسی فرد نے تجھے اذیت پہنچائی ہے؟ فرمایا نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ بلکہ اصل معاملہ یہ ہے کہ اب میں صرف اللہ کی پناہ میں رہنا چاہتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ اس کے علاوہ کسی اور سے پناہ مانگوں۔ اس نے کہا مسجد میں جا کر علانیہ تجھ سے اپنی امان واپس لیتا ہوں۔ جیسا کہ میں نے علانیہ تجھے پناہ دی تھی۔ چنانچہ ہم دونوں مسجد میں اہل مکہ کے پاس آئے۔ ولید نے کہا

یہ دیکھو عثمان ہے۔ اور میری ذمہ داری کو اب واپس لوٹا رہا ہے۔ میں نے کہا واقعی ولید ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میں نے انہیں وفادار اور بہترین پڑوسی پایا۔ مگر اب میں صرف اللہ کی امان میں رہنا چاہتا ہوں۔ لہٰذا میں اس کی امان اس کو لوٹاتا ہوں۔ حضرت عثمان جب یہاں سے لوٹے تو ایک مجلس میں بیٹھ گئے۔ جس میں لبید بن ربیعہ بن مالک بن کلاب القیسی قریش مکہ کو اپنا شاعرانہ کلام سنا رہا تھا۔ لبید نے ایک مصرعہ کہا۔

ع الا کل شئی ما خلا اللہ باطل

سن لو اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز باطل ہے۔ عثمان بولے تو نے سچ کہا۔ اس نے دوسرا مصرعہ پڑھا۔

وکل نعیم لا محالۃ زائل

ہر نعمت بالآخر زائل ہونے والی ہے۔ عثمان بولے یہ تو نے غلط کہا۔ اہل جنت کی نعمتیں کبھی زائل نہ ہوں گی۔ لبید بن ربیعہ نے غصہ میں کہا اے جماعت قریش ایسی جرأت تو کبھی کسی کو نہ ہوئی تھی۔ یہ اعتراض کیسے ہوا؟ ایک آدمی بولا۔ یہ بیوقوف لوگ ہیں۔ انہوں نے تو ہمارے دین کو بھی چھوڑ دیا ہے۔ لہٰذا آپ اس کی بات کو محسوس نہ کریں۔ حضرت عثمان اور اس شخص میں تو تو، میں میں ہونے لگی۔ وہ ملعون آدمی اٹھا اور آپ کی آنکھ پر ایسا سخت تھپڑ مارا کہ آپ کی بینائی جاتی رہی۔ ولید بن مغیرہ قریب ہی یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ وہ کہنے لگا۔ اے عثمان! جب تک تو میری پناہ میں تھا۔ تجھے کوئی تکلیف نہیں پہنچا پاتا تھا۔ فرمایا کوئی بات نہیں۔ اب میں اس کی امان میں ہوں جو تجھ سے زیادہ طاقت و قدرت والا ہے۔ پھر حضرت عثمان نے چند شعر کہے۔ جن کا ترجمہ یہ ہے۔

اگر میری آنکھ کو رب تعالیٰ کی رضا میں ایک بے دین، غیر ہدایت یافتہ کے ناپاک ہاتھ لگے ہیں تو کوئی مضائقہ کی بات نہیں۔ اس مصیبت کے عوض میں باری تعالیٰ مجھے ثواب عنایت فرمائے گا۔ اور اے قوم! جو شخص اللہ کی رضا پر راضی رہتا ہے۔ وہ بہت بڑا خوش نصیب ہے۔ تم جو کہتے ہو کہ یہ گمراہ، بیوقوف اور رسول محمدؐ کے دین پر چلنے والا ہے۔ تو بے شک کہتے رہو۔ میرا مقصود صرف اللہ اور اس کے سچے دین کو چاہتا ہے۔ چاہے آپ لوگ میرے اوپر زیادتی اور ظلم کرتے رہیں۔

ام علاء بیان کرتی ہیں کہ عثمان بن مظعون نے ہمارے گھر میں وفات پائی۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ عثمان کے لئے ایک چشمہ جاری ہو گیا ہے۔ یہ خواب میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا۔ فرمایا وہ چشمہ عثمان کے اعمال ہیں۔

عبداللہ بن سعید المدنی بیان کرتے ہیں کہ عثمان جب فوت ہوئے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ ان کی پیشانی کا بوسہ لیا اور فرمایا۔ اے عثمان! اللہ تعالیٰ تم پر رحم فرمائے۔ نہ تو نے دنیا کو چاہا اور نہ دنیا نے تجھ کو پایا۔

زید بن اسلم نقل کرتے ہیں کہ عثمان بن مظعون جب فوت ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تجہیز و تکفین کا حکم فرمایا۔ جب وہ قبر میں رکھ دیئے گئے تو ان کی بیوی کہنے لگی۔ اے ابو السائب جنت تجھے مبارک ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا۔ جنت کا تجھے کیسے علم ہوا؟ اس نے عرض کیا یا رسول اللہ، یہ دن کو روزہ رکھا کرتا تھا۔ اور رات کو ہمیشہ قیام کیا کرتا تھا۔ آپ نے فرمایا۔ اتنی بات تیرے لئے کافی تھی کہ تو کہتی۔ یہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو محبوب رکھتا تھا۔

اسحاق سبیعی بیان کرتے ہیں۔ عثمان بن مظعون کی بیوی ایک مرتبہ ازواج مطہرات کے پاس آئیں۔ پھٹے پرانے کپڑے پہن

رکھے تھے اور اچھی حالت نہ تھی۔ امہات المومنین نے پوچھا تجھے کیا ہوا ہے؟ کہنے لگی۔ میں نہا کر یا اچھے کپڑے پہن کر کیا کروں گی۔ وہ (عثمان) تو رات کو قیام میں اور دن کو روزہ کے ساتھ رہتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو عثمان کے متعلق یہ بات پہنچی تو آپ نے عثمان کو بلا کر سرزنش کی۔ اور فرمایا۔ کیا میری زندگی تمہارے لیے ایک نمونہ نہیں؟ عرض کیا۔ کیوں نہیں۔ میری جان آپ پر قربان ہو۔ اس کے بعد ان کی بیوی آئیں تو بہترین صورت اور اچھے لباس میں تھیں۔

عامر بن عبید اللہ (ابوعبیدہ بن الجراح)

ابوعبداللہ الحافظ النیسا پوری کے بیان کے مطابق ابوعبیدہ بن الجراح بھی اہل صفہ میں شامل ہیں۔ یہ وہی بلند پایہ صحابی ہیں جنہیں "امین الامۃ" کا خطاب ملا۔ مومنین کے ساتھ انتہائی محبت کرنے والے اور مشرکین پر چاہے وہ قریبی ہی کیوں نہ ہوں۔ بڑے سخت تھے۔ انہی کے حق میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

"لا تجد قوما یؤمنون باللہ والیوم الاخر یوادون من حاد اللہ ورسولہ ولو کانوا آباءھم او ابناءھم او اخوانھم او عشیرتھم اولئک کتب فی قلوبھم الایمان (سورۃ المجادلہ آیت ۲۲)

جو لوگ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔ آپ انہیں نہ پائیں گے کہ وہ ایسوں سے دوستی رکھیں۔ جو اللہ اور اس کے پیغمبر کے مخالف ہیں۔ خواہ وہ لوگ ان کے باپ یا ان کے بیٹے یا ان کے کنبے والے ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ (اللہ نے) ان کے دلوں میں ایمان ثبت کر دیا ہے۔

عبداللہ بن عمر بن الخطاب روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ان لکل امۃ امینا، وامین ھذہ الامۃ ابوعبیدۃ بن الجراح"

ہر امت کا ایک امین ہوا کرتا ہے۔ اس امت کا امین ابوعبیدہ بن الجراح ہے۔"

ابن شوذب بیان کرتے ہیں کہ غزوۂ بدر میں ابوعبیدہ کے والد مشرکین مکہ کی طرف سے جنگ میں شریک تھے۔ وہ ابوعبیدہ کی گھات میں تھے۔ مگر ابوعبیدہ ان سے کنی کتراتے رہے۔ جب دیکھا کہ ان کا والد اپنی حرکت سے باز نہیں آ رہا تو اسے قتل کر دیا۔ اس موقعہ پر سورہ المجادلۃ کی مذکورہ آیت نازل ہوئی۔

ہشام بن عروہ اپنے باپ سے نقل کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت عمر بن الخطاب ابوعبیدہ کے پاس آئے تو انہوں نے دیکھا کہ ابوعبیدہ اپنے کجاوہ کے کپڑے (محمل) پر لیٹے ہوئے ہیں اور ایک تھیلہ کو تکیہ بنایا ہوا ہے۔ حضرت عمر نے ان سے فرمایا۔ اے ابوعبیدہ کیا تو نے وہ ساز و سامان نہیں بنوایا جو تیرے دوسرے ساتھیوں نے بنوا رکھا ہے؟ عرض کیا امیر المومنین بس قیلولہ کا وقت آ گیا اور یونہی سو گیا۔ معمر کی روایت میں یوں ہے کہ حضرت عمر جب شام میں تشریف لائے تو عوام اور سرداران قبائل آپ سے ملنے گئے۔ حضرت عمر نے پوچھا۔ میرا بھائی کہاں گیا؟ لوگوں نے پوچھا کونسا بھائی؟ فرمایا ابوعبیدہ۔ لوگوں نے بتایا کہ ابھی آتے ہیں۔ جب وہ آئے تو حضرت عمر نے سواری سے اتر کر ان کے ساتھ معانقہ کیا۔ پھر ان کے گھر میں تشریف لے گئے۔ حضرت عمر نے دیکھا کہ ان کے گھر میں سوائے تلوار، ڈھال

اور کچا وہ کے اور کوئی چیز نہیں۔

زید بن اسلم اپنے باپ سے اور وہ حضرت عمر بن الخطاب سے نقل کرتے ہیں کہ ایک دن حضرت عمر نے اپنے پاس بیٹھنے والے لوگوں سے فرمایا۔ اپنی اپنی کوئی خواہش اور تمنا ظاہر کرو۔ ایک آدمی بولا۔ میری تمنا یہ ہے کہ اگر یہ مکان میرے لئے سونے سے بھر دیا جائے تو میں تمام سونے کو اللہ کے رستے میں خرچ کر دوں۔ حضرت عمر نے دوسرے لوگوں سے فرمایا۔ تم بھی کوئی تمنا کرو۔ ایک آدمی بولا میری خواہش ہے کہ یہ گھر موتیوں، زبرجد اور جواہرات سے بھرا ہوا ہو۔ اور میں اسے اللہ کے راستے میں صدقہ کر دوں۔ حضرت عمر نے سہ بارہ فرمایا کہ مزید تمنا کرو، تو لوگوں نے عرض کیا، یا امیرالمومنین۔ ہم نہیں سمجھتے کہ کس شے کی تمنا کریں۔ حضرت عمر نے فرمایا۔ میری تمنا تو یہ ہے کہ کاش یہ گھر ابو عبیدہ جیسے انسانوں سے بھرا ہوتا۔

ابوالحسن، ابو عبیدہ کا ایک قول نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے ایک لشکر میں چلتے ہوئے فرمایا۔ بہت سارے لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ بظاہر تو بڑے سفید پوش ہوتے ہیں مگر دین کے اعتبار سے انتہائی گدلے، بہت سے بظاہر تو اپنے نفس کی عزت و تکریم کر رہے ہوتے ہیں۔ مگر درحقیقت بے عزتی! لوگو! قدیم غلطیوں اور گناہوں کا ازالہ نئی نیکیوں سے کرو۔ اگر تم میں سے کسی آدمی کے گناہ اس قدر ہو جائیں کہ ان سے زمین اور آسمان کی درمیانی فضا بھر جائے۔ اس کے بعد وہ نیکی کرے تو وہ نیکی تمام گناہوں پر بھاری ہوگی۔ یعنی تمام گناہوں کا کفارہ بن جائے گی۔

حضرت ابو عبیدہ نے فرمایا، مؤمن کے دل کی مثال ایک چڑیا کی مانند ہے جو روزانہ کئی مرتبہ ادھر سے اُدھر پھدکتی پھرتی ہے۔

عویمر ابوالدرداء

ابوعبداللہ الحافظ النیسابوری کے بیان کے مطابق مشہور صحابی حضرت ابوالدرداء بھی اہل صفہ میں سے ہیں۔ عارف کائنات پر غور و فکر کرنے والے، عالم باعمل، شکرگزار، عبادت سے محبت رکھنے والے، تجارت کو ترک کرنے والے، عمل پر دوام اختیار کرنے والے اور صاحب علم و حکمت تھے۔ آپ سے متعدد احادیث اور حکیمانہ اقوال کتب سیر میں مذکور ہیں۔ جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں۔

۱ ۔ سالم بن ابی الجعد کہتے ہیں کہ اُم درداء سے پوچھا گیا کہ ابوالدرداء کا سب سے افضل عمل کونسا تھا۔ انہوں نے بتایا۔ کائنات میں تفکر۔

۲ ۔ معدان، ابوالدرداء کا ایک قول نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا۔ ایک گھڑی غور و فکر کرنا رات بھر کے قیام سے بہتر ہے۔

۳ ۔ ایک آدمی نے حضرت ابوالدرداء سے عرض کیا۔ حضرت! مجھے کوئی وصیت فرمائیے۔ آپ نے فرمایا۔ خوشحالی میں اللہ کو یاد رکھو وہ تجھے تنگی و سختی میں یاد رکھے گا۔ اور جب دنیا کی کسی چیز کے لئے اشتیاق ہو تو اس کے انجام کو دیکھ لے۔

۴ ۔ حضرت ابوالدرداء نے فرمایا۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی۔ اس وقت میں تاجر تھا۔ میں نے سمجھا کہ تجارت اور عبادت ایک جگہ جمع ہو جائیں گی۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ چنانچہ میں نے تجارت کو چھوڑ دیا۔ اور عبادت کو اپنا لیا۔ لہٰذا مجھے یہ بات بہت زیادہ پسند ہے کہ میری دکان مسجد کے دروازے پر ہو۔ اور اس طرح میری کوئی نماز فوت نہ ہو۔ دکان میں مجھے روزانہ چالیس دینار کا اضافہ ہو۔ اور اس رقم کو میں روزانہ اللہ کے رستے میں خرچ کر دوں۔

۵ ۔ حضرت ابوالدرداءؓ نے فرمایا۔ آدمی کی بصیرت اور دانائی یہ ہے کہ اس کا چلنا پھرنا۔ بیٹھنا، داخل ہونا اور نکلنا اہل علم کے ساتھ ہو۔

۶ ۔ فرمایا: لوگوں کو ان کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہ دو۔ ان کا زیادہ محاسبہ نہ کرو۔ اے ابن آدم! تجھے اپنی ذات کا محاسبہ کرنا چاہیئے۔ جو شخص لوگوں کی اتباع میں لگ جاتا ہے اس کا غم بڑھ جاتا ہے اور اس کا غصہ کبھی ٹھنڈا نہیں ہوتا۔

۷ ۔ فرمایا۔ اللہ کی عبادت یوں کرو۔ گویا تم اسے دیکھ رہے ہو، اپنے آپ کو مردوں میں شمار کرو۔ جان لو تھوڑا مال جو دوسروں سے بے نیاز کر دے۔ وہ بہتر ہے۔ اس زیادہ مال سے جو اللہ کی یاد سے غافل کر دے۔ جان لو نیکی کبھی بوسیدہ نہیں ہوتی اور گناہ کبھی بھلایا نہیں جاتا۔

۸ ۔ فرمایا: بھلائی یہ نہیں کہ تیرا مال اور تیری اولاد زیادہ ہو۔ بلکہ خیر یہ ہے کہ تیرا علم بڑا ہو۔ علم زیادہ ہو۔ اللہ کی عبادت میں لوگوں سے بڑھنے کی کوشش کرے۔ اگر تو اچھا کام کرے تو اللہ کا شکر کرے اور اگر کوئی گناہ کر بیٹھے تو استغفار کرے۔

۹ ۔ فرمایا علم سیکھو قبل اس کے کہ علم اٹھالیا جائے۔ علم کا اٹھ جانا یوں ہے کہ علماء فوت ہو جائیں گے۔ بیشک عالم اور متعلم اجر میں برابر ہیں۔ لوگ دو ہی قسم کے ہیں۔ عالم اور متعلم۔ ان کے علاوہ دوسرے لوگوں میں کوئی خیر نہیں۔

۱۰ ۔ فرمایا۔ میں کوئی نیک کام کسی سے کہوں اور خود نہ کر سکوں تو مجھے امید ہے کہ محض نیک کام کے کہنے پر بھی مجھے اجر دیا جائے گا۔

۱۱ ۔ فرمایا۔ آدمی کو اس بات سے بچنا چاہیئے کہ مسلمانوں کے قلوب میں اس کے متعلق بغض پیدا ہو جائے اور اسے معلوم بھی نہ ہو۔ پھر فرمایا کیا جانتے ہو۔ یہ کس طرح ہوتا ہے؟ مخاطب نے عرض کیا نہیں۔ فرمایا جب آدمی خلوت میں اللہ کی نافرمانیوں کا مرتکب ہوتا ہے تو باری تعالےٰ اس کے متعلق مومنین کے دلوں میں بغض پیدا فرما دیتا ہے اور اسے شعور بھی نہیں ہوتا۔

۱۲ ۔ فرمایا۔ کیا میں تمہیں ایسا عمل نہ بتاؤں جو اللہ تعالےٰ کے ہاں زیادہ پسندیدہ ہے۔ تمہارے درجات کو بڑھانے والا ہے میدان جنگ میں دشمنوں کے ساتھ قتال کرنے اور دراہم اور دنانیر صدقہ کرنے سے بہتر ہے۔ لوگوں نے عرض کیا۔ وہ کیا ہے؟ فرمایا۔ اللہ کا ذکر، اللہ کا ذکر بہت بڑی چیز ہے۔

۱۳ ۔ فرمایا جو شخص رات کی تاریکی میں مسجد کی طرف چلا۔ قیامت کے دن اللہ تعالےٰ اسے روشنی عطا فرمائے گا۔

عقبہ بن عامر الجہنی

عقبہ بن عامر الجہنی کا شمار بھی اہل صفہ سے ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ موصوف کچھ دن اہل صفہ کے ساتھ رہے تھے۔ بعد میں مصر تشریف لے گئے۔ اور وہیں وفات پائی۔ عقبہ کی درج ذیل ایک روایت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اہل صفہ میں شامل رہے۔

عقبہ بتاتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے۔ ہم اس وقت صفہ میں موجود تھے۔ آپ نے فرمایا۔ تم میں سے کون اس بات کو پسند کرتا ہے کہ دو بطحان یا عقیق کے بازار میں جائے۔ اور روزانہ دو موٹی تازی اونچی کوہان والی اونٹنیاں لائے۔ ہم نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! ہم میں سے ہر ایک اس بات کو پسند کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ اگر تم

روزانہ صبح کے وقت مسجد میں جاؤ۔ اور دو آیتیں قرآن مجید کی سیکھو تو یہ دو آیات کا سیکھنا دو اونٹنیوں سے بہتر ہے۔ تین آیات کا سیکھنا تین اونٹنیوں سے اور چار آیات کا سیکھنا چار اونٹنیوں سے علیٰ ہذا القیاس۔

عقبہ موصوف بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا۔ یا رسول اللہ! نجات کس طرح ممکن ہوگی؟ فرمایا: اپنی زبان کو (فضولیات ولغویات سے) روک رکھو۔ دوسرے یہ کہ تیرا گھر وسیع ہو۔ تیسرے یہ کہ اپنی خطا اور قصور پر آنسو بہاؤ

عقبہ ایک حدیث یوں بیان کرتے ہیں کہ ہم لوگ باری باری حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ جب میری باری آئی تو میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوا۔ آپ اس وقت خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ چنانچہ میں نے آپ کو یہ فرماتے سنا۔ تمام انسانوں کو ایک میدان میں جمع کیا جائے گا۔ پھر ایک پکارنے والا بلند آواز سے کہے گا کہ آج تمام لوگ جان لیں گے کہ عزت و کرامت اور بزرگی کس کے حصہ میں آتی ہے۔ یہ جملہ تین مرتبہ دہرایا جائے گا۔ پھر وہ کہے گا۔ کہاں ہیں وہ لوگ جن کے پہلو راتوں کو بستروں سے الگ ہو جاتے تھے۔ اور وہ اپنے رب کو امید و خوف کی میانی کیفیت میں پکارتے تھے۔ اس کے بعد منادی پھر تین مرتبہ پکارے گا کہ آج لوگ جان لیں گے کہ عزت و شرف کن لوگوں کے واسطے ہے۔ پھر کہے گا۔ کہاں ہیں وہ لوگ جنہیں تجارت، کاروبار اور خرید و فروخت اللہ کی یاد سے غافل نہیں کرتے تھے۔ پھر آواز دے گا۔ کہاں ہیں وہ لوگ جو دن رات اللہ کی حمد بیان کیا کرتے تھے۔

عقبہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا۔ میری امت میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو راتوں کو گرم گرم بستروں سے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اور پاک صاف ہو کر بارگاہِ ایزدی میں سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔ اس وقت اللہ تعالیٰ ملائکہ سے ارشاد فرماتا ہے کہ دیکھو میرے بندے کی طرف جو اٹھا ہے محض اس لئے کہ مجھ سے مانگے سن لو وہ جو کچھ مانگے گا اسے عنایت کیا جائے گا۔

عباد بن خالد الغفاری

واقدی کے بیان کے مطابق عباد بن خالد الغفاری بھی اہل صفہ میں شامل ہیں۔ واقدی نے کہا یہ وہی صحابی ہیں جو صلح حدیبیہ کے روز قرعہ اندازی سے کنویں میں اترے۔ ان سے ایک روایت یوں منقول ہے کہ بنی لیث کا ایک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور عرض کی۔ یا رسول اللہ! کیا میں آپ کو شعر نہ سناؤں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں۔ آپ کے منع کرنے کے باوجود اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح و ستائش میں چند شعر کہہ دیئے۔ آپ نے فرمایا۔ تو نے اچھے شعر کہے ہیں۔

عمرو بن عوف المزنی

ابو عبد اللہ الحافظ النیسابوری کے بیان کے مطابق عمرو بن عوف المزنی بھی اہل صفہ میں شامل ہیں۔ عمرو مذکور ایک روایت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک غزوہ میں شریک ہوئے۔ جب ہم مقام روحاء میں

پہنچے تو آپ ظبیہ کی پہاڑی پر اترے اور نماز پڑھی۔ پھر فرمایا۔ اس جگہ مجھ سے پہلے ستر نبیوں نے نماز پڑھی ہے۔ حضرت موسیٰ جب یہاں آئے تو وہ ستر ہزار بنی اسرائیل کے افراد کے درمیان خاکستری رنگ کی ایک اونٹنی پر سوار تھے۔ اور ان کے جسم پر روئی کے دو چغے تھے۔ اور اس وقت تک قیامت برپا نہ ہوگی۔ جب تک کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی حج یا عمرہ کو جاتے ہوئے یہاں سے گزر نہ لیں گے۔

عمرو مذکور کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا۔ مجھے اپنے بعد اپنی امت کے بارے میں تین اعمال کا ڈر ہے۔ صحابہ نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! وہ کون سے اعمال ہیں؟ فرمایا: عالم دین کی غلطی، حاکم کا ناجائز فیصلہ اور خواہش نفس کی پیروی۔

کثیر بن عبداللہ المزنی نے اپنے باپ سے روایت کیا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ بے شک دین اللہ کی ابتداء ہوئی تو اجنبی تھا۔ اور بالآخر اجنبی بن جائے گا۔ ان لوگوں کے لئے سعادت ہے جو میری ان سنتوں کی اصلاح کرتے ہیں۔

عمرو بن تغلب

حضرت عمرو بن تغلب اصحاب صفہ میں شامل تھے۔ آپ بعد میں بصرہ میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ حضرت عمرو بن تغلب فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن ایک ایسی بات ارشاد فرمائی جو مجھے بہت قیمتی سرخ اونٹوں سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ واقعہ یوں ہے کہ ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم اصحاب صفہ کے پاس تشریف لائے۔ اور فرمایا "میں بعض لوگوں کو ان کی بے صبری اور شکوہ و شکایت کے خوف سے کچھ دے دیتا ہوں۔ اور بعض دوسرے لوگوں کو جن کے دلوں کو اللہ تعالےٰ نے غنا عطا فرمائی ہے۔ ان کی سیر چشمی کی وجہ سے کچھ نہیں دیتا۔ ان دوسرے لوگوں میں عمرو بن تغلب بھی ہیں"۔

عویم بن ساعدہ الانصاری

عبداللہ النیسابوری کے بیان کے مطابق حضرت عویم بن ساعدہ الانصاری بھی اہل صفہ میں شامل ہیں۔ آپ بنی عمرو بن عوف کے حلیف تھے۔ بعض نے کہا ہے کہ آپ عمرو بن عوف میں سے تھے۔ آپ نے جنگ بدر میں بھی حصہ لیا۔ حضرت عویم بن ساعدہ ذکر کرتے ہیں کہ حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ اللہ تعالےٰ نے مجھے پسند فرمایا۔ اور میرے لئے ساتھی بھی منتخب فرمائے۔ جن میں سے کچھ تو میرے رشتہ دار ہیں۔ کچھ میرے مددگار ہیں۔ اور کچھ میرے وزراء ہیں۔ جس نے ان کو گالی دی۔ اس پر اللہ تعالےٰ کی لعنت ہے۔ اللہ کے فرشتوں کی لعنت ہے۔ اور تمام انسانوں کی لعنت ہے۔ قیامت کے دن ان سے کوئی فدیہ اور کوئی بدلا قبول نہ کیا جائے گا۔

نوٹ:۔ قیامت میں نظام عدل کا اصول یہ ہے کہ نیکی بدی کو دھوئے گی اور اگر نیکی بڑھ جائے گی تو مغفرت ہو جائے گی لیکن سب شتم صحابہ میں حضور نے فرمایا کہ کوئی فدیہ یا بدلا قبول نہ ہوگا۔ پس شاتم صحابہ اگرچہ نیک اعمال کا خزانہ بھی ساتھ لئے ہوئے ہوگا۔

اس جرم کے بدلے میں قبول نہ کیا جائے گا۔ اور اس جرم کی سزا اس کو ضرور ملے گی۔

عبید مولیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت عبید مولیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شمار اصحاب صفہ میں کیا گیا ہے۔ عبید کہتے ہیں کہ وہ ابو عامر الاشعری ہیں اور جنگ حنین میں مارے گئے تھے۔ اور ابو عامر وہ عبید نہیں جو رسول اللہ کے غلام تھے۔ حضرت عبید غلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ کیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرض نماز کے علاوہ کسی نماز کا حکم فرماتے تھے۔ آپ نے فرمایا۔ ہاں عشاء اور مغرب کے درمیان یہ روایت شعبہ اور ابن المبارک نے سلیمان التیمی سے بھی روایت کی ہے۔

عکاشہ بن محصن الاسدی

حضرت عکاشہ بن محصن الاسدی اصحاب صفہ میں سے تھے۔ آپ نے بلوائے بزاخہ میں شہادت پائی۔ آپ کو طلیحہ نے ایام فتنۂ ارتداد میں شہید کیا۔

حضرت عبداللہ ابن مسعود فرماتے ہیں کہ ہم ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے تھے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ مجھے سابقہ تمام انبیاء علیہم السلام اور ان کے متبع امتیں دکھائی گئیں۔ میں نے عرض کیا۔ یارب العالمین۔ میری امت کہاں ہے۔ آواز آئی کہ اپنی داہنی طرف دیکھو۔ میں نے دیکھا تو ایک ٹیلہ نظر آیا۔ جو لوگوں کے چہروں سے اٹا پڑا تھا۔ میں نے عرض کیا۔ یارب العالمین یہ کون ہیں۔ آواز آئی یہ تیری امت ہے۔ پھر آواز آئی کہ کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم خوش ہیں۔ میں نے عرض کیا۔ ہاں یارب العالمین۔ پھر آواز آئی کہ آپ اپنی بائیں جانب دیکھیں۔ میں نے دیکھا تو ایک بلندی پر لوگوں کے چہرے ہی چہرے تھے۔ میں نے عرض کیا یارب العالمین یہ کون ہیں۔ آواز آئی کہ یہ تیری امت ہے۔ پھر پوچھا گیا کہ کیا آپؐ خوش ہیں۔ میں نے عرض کیا۔ ہاں رب العالمین۔ میں خوش ہوں۔ اس کے بعد اللہ رب العزت نے فرمایا کہ ان لوگوں کے ساتھ ستر ہزار وہ افراد بھی آپ کی امت میں ہیں۔ جو بلا حساب کے جنت میں داخل ہوں گے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ حضرت عکاشہ بن محصن اٹھے۔ اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپؐ دعا فرمائیں کہ میں ان میں شامل کیا جاؤں۔ آپؐ نے دعا فرمائی۔ اس کے بعد ایک اور شخص اٹھا۔ اور عرض کرنے لگا کہ میرے لئے بھی اللہ کے رسولؐ دعا فرمائیں تو آپؐ نے فرمایا۔ عکاشہ تم سے سبقت لے گیا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ ان ستر ہزار کے بارے میں لوگوں میں چرچا ہونے لگا تھا۔ لوگوں کی یہ بات آپؐ تک بھی پہنچی۔ تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ وہ ستر ہزار وہ ہوں گے۔ جو نہ تو داغنے کا عمل کرتے ہیں۔ اور نہ ہی جادو ٹونہ، جھاڑ، پھونک کرتے ہیں۔ اور نہ ہی کرواتے ہیں۔ اور نہ ہی فال نکالتے ہیں۔ اور ہر معاملہ میں اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں۔

العرباض بن ساریہ

حضرت عرباض بن ساریہ کا شمار بھی اصحاب صفہ میں کیا گیا ہے۔ آپ بہت رقیق القلب تھے۔ آپ اور آپ جیسے

دیگر صحابہ کرام کی شان میں یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی۔ (ترجمہ:۔ وہ واپس ہوئے اس حال میں کہ ان کی آنکھوں میں اس سے آنسو جاری تھے کہ وہ (کوئی ایسی چیز) نہیں پاتے جو اللہ کی راہ میں خرچ کر سکیں)۔

عرباض بن ساریہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہلی صف پر تین مرتبہ اور دوسری صف پر ایک مرتبہ صلوٰۃ بھیجتے تھے۔ عبدالرحمٰن بن عمرو السلمی اور حجر بن حجر بیان کرتے ہیں کہ ہم عرباض بن ساریہ کے پاس آئے۔ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جن کے حق میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ (ترجمہ:۔ ان لوگوں پر کوئی مواخذہ نہیں جو اے محبوب (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کے پاس حاضر ہوئے تاکہ آپ انہیں سواری اور دیگر سامان حرب عنایت فرمائیں۔ مگر آپؐ نے فرمایا کہ میرے پاس کوئی ایسی سواری نہیں جس پر میں تمہیں سوار کروں) ہم نے سلام کیا اور عرض کیا ہم لوگ آپ کی زیارت کرنے، آپ کی عیادت کرنے اور آپ سے مستفید ہونے کے لئے آئے ہیں

حضرت عرباض بیان کرتے ہیں کہ جمعہ کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم اہل صفہ کی طرف تشریف لاتے تھے۔ آپؐ کے سر مبارک پر ایک مخصوص قسم کا عمامہ ہوتا اور ارشاد فرماتے۔ (اے اہل صفہ) اگر تم اس انعام و اکرام کو جانتے ہوتے جو باری تعالیٰ نے تمہارے لئے ذخیرہ کر رکھا ہے تو تم اس مال و اسباب پر غمگین نہ ہوتے جو تم سے جدا کر دیا گیا ہے۔ تم لوگ فارس اور روم کو فتح کرو گے۔

عروہ بن رویم بیان کرتے ہیں کہ اصحاب رسولؐ میں عرباض بن ساریہ بہت بوڑھے تھے۔ اور چاہتے تھے کہ باری تعالےٰ ان کی روح قبض کرے۔ چنانچہ یوں دعا کرتے تھے۔ اے اللہ! میری عمر بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ اور میری ہڈیاں کمزور ہو گئی ہیں۔ لہٰذا مجھے اپنے پاس بلا لے۔

عبداللہ بن حبشی الخثعمی

ابوسعید ابن الاعرابی کے ذکر کے مطابق عبداللہ بن حبشی الخثعمی بھی اہل صفہ میں داخل ہیں۔ موصوف یہ روایت بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا۔ کونسا عمل افضل ہے؟ فرمایا ایسا مضبوط ایمان جس میں کوئی شک نہ ہو۔ اور ایسا دیانتدارانہ جہاد جس میں کوئی خیانت نہ ہو۔ اور ایسا حج جس میں کسی خلاف شرع امر کا ارتکاب نہ ہو عرض کیا گیا۔ نماز کونسی افضل ہے؟ فرمایا جس میں قیام لمبا ہو۔ عرض کیا گیا۔ صدقہ کونسا افضل ہے؟ فرمایا۔ کم مال والے کا اپنی ہمت و طاقت کا خرچ کرنا۔

عتبہ بن عبد السلمی

ابوسعید ابن الاعرابی نے عتبہ بن عبد السلمی کو بھی اہل صفہ میں شمار کیا ہے۔ یہ عتبہ ایک حدیث یوں بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر آدمی ولادت سے لے کر مرنے تک کا درمیانی عرصہ محض اللہ کی خوشنودی کی

خاطر منہ کے بل گرا پڑا رہے۔ تو قیامت کے دن آتنی بڑی نیکی کو بھی حقیر خیال کرے گا۔

عتبہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے لباس عطا کرنے کی درخواست کی تو آپ نے مجھے کتان کے کپڑے کی دو چادریں پہنائیں۔ چنانچہ ان دو چادروں کو میں نے زیب تن کیا۔ اور میرے دوسرے ساتھیوں نے بھی بعض اوقات پہنیں

عتبہ بن الندر السلمی

ابو سعید بن الاعرابی نے عتبہ بن الندر السلمی کو بھی اہل صفہ میں شمار کیا ہے۔ ان عتبہ سے ایک حدیث یوں منقول ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ موسیٰ علیہ السلام نے حضرت شعیب علیہ السلام کی طرف سے ذکر کردہ دو مدتوں میں سے کونسی مدت کو پورا کیا تھا؟ فرمایا: جو اُن دونوں میں وفا اور نیکی کے زیادہ قریب تھی۔

عمرو بن عبسہ السلمی

ابو سعید ابن الاعرابی کی تحقیق کے مطابق عمرو بن عبسہ السلمی بھی اہل صفہ میں شامل ہیں۔ عمرو بن عبسہ خود بیان کرتے ہیں کہ میں چوتھا شخص اسلام قبول کرنے والا ہوں۔ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ اس معاملہ (دین قبول کرنے) میں کن لوگوں نے آپ کی پیروی کی ہے؟ فرمایا ایک آزاد نے اور ایک غلام نے یعنی ابوبکرؓ اور بلالؓ نے۔

عبادہ بن قرص

عبادہ کے والد کا نام قرص بھی بتایا گیا ہے اور قرط بھی۔ ابن الاعرابی نے انہیں اصحاب صفہ میں شمار کیا ہے۔ حمید بن ہلال عبادہ کا ایک قول نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا! لوگو! تم ایسے اعمال کرتے ہو۔ جو تمہاری نگاہ میں بال سے بھی زیادہ باریک یعنی بالکل معمولی حیثیت کے ہیں۔ مگر ہم لوگ ان اعمال کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ اقدس میں مہلکات میں سے شمار کرتے تھے۔

عیاض بن حمار المجاشعی

ابو سعید بن الاعرابی کے بیان کے مطابق عیاض بن حمار المجاشعی بھی اہل صفہ میں شامل ہیں۔ ان میں سے ایک حدیث یوں مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تین قسم کے لوگ جنتی ہیں۔ وہ صاحب اقتدار آدمی جو ہر معاملہ میں میانہ روی اختیار کرنے والا ہو۔ صدقہ کرنے والا ہو، اور پختہ یقین والا ہو۔ دوسرا وہ آدمی جو نہایت رحم دل ہو۔ رقیق القلب ہو، اور اپنے پرائے ہر مسلمان کے ساتھ بھلائی کرنے والا ہو۔ تیسرا وہ فقیر و تنگدست آدمی جو پاک دامن ہو، اور لوگوں کے سامنے دست سوال پھیلانے سے بچنے والا ہو۔ یہی عیاض روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیتے ہوئے

ارشاد فرمایا:- بلاشبہ باری تعالیٰ نے میری طرف وحی کی ہے کہ تم لوگ اس قدر تواضع و انکساری اختیار کرو کہ تم میں کوئی ایک دوسرے پر فخر نہ کرے۔

فضالۃ بن عبید الانصاری

ابن الاعرابی نے فضالۃ بن عبید الانصاری کو بھی اہل صفہ میں شمار کیا ہے۔ ان سے ایک روایت یوں مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب لوگوں کو نماز پڑھاتے تو بعض اہل صفہ بھوک سے نڈھال ہونے کی وجہ سے گر پڑتے۔ دیہاتی لوگ ان کے متعلق کہتے کہ یہ پاگل ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہو کر رخ انور اُن اہل صفہ کی طرف پھیرتے اور فرماتے اگر تمہیں معلوم ہو کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے واسطے کیا اجر و ثواب اور انعام و اکرام تیار کر رکھا ہے تو تم خواہش کرنے لگو کہ تمہیں اس سے زیادہ تنگی اور فاقہ کی نوبت پہنچے۔

حضرت فضالۃ بن عبید فرمایا کرتے تھے کہ اگر مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ باری تعالیٰ نے رائی کے دانے کے برابر میرا عمل قبول کر لیا ہے۔ تو یہ مجھے دنیا و ما فیہا سے زیادہ پسند ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے۔ اِنَّمَا یَتَقَبَّلُ اللّٰہُ مِنَ الْمُتَّقِیْنَ (بے شک اللہ تعالیٰ متقی لوگوں کی طرف سے (اعمال کو) قبول فرماتا ہے۔

فرات بن حیان العجلی

ابو عبدالرحمٰن السلمی نے فرات بن حیان العجلی کو حضرت سفیان ثوری کے حوالہ سے اہل صفہ میں گردانا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے قتل کا حکم فرمایا تھا۔ کیونکہ یہ ابوسفیان کا جاسوس اور حلیف تھا۔ مگر ایک مرتبہ یہ انصار کی ایک جماعت کے پاس سے گزرا تو کہنے لگا میں مسلمان ہوں۔ ایک صحابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک یہ بات پہنچائی کہ وہ کہتا ہے کہ وہ مسلمان ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ تمہارے اندر بعض ایسے لوگ موجود ہیں جنہیں ہم انہی کے ایمان کی طرف سپرد کرتے ہیں یعنی چونکہ وہ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں۔ اس لئے ہم انہیں مسلمان تصور کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک فرات بن حیان العجلی بھی ہے۔

ابو فراس الاسلمی

محمد بن عمرو بن عطا کے قول کے مطابق ابو فراس الاسلمی بھی اہل صفہ میں شامل ہیں۔ یہ وہ صحابی تھے جو ہمہ وقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہتے اور آپ کی خدمت و دیگر ضروریات کو پورا کرتے۔ ایک دن علیحدگی میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا "سلنی اعطک" مجھ سے (جو چاہو) مانگو۔ میں تمہیں عطا کروں گا۔ انہوں نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! آپ اللہ تعالیٰ سے دعا فرمایئے کہ وہ قیامت کے دن مجھے آپ کے پاس رکھے۔ فرمایا۔ میں یہ کر دوں گا مگر تم اپنے نفس کے خلاف (جہاد کرتے ہوئے) کثرت سجود کے ساتھ میری مدد کرنا۔

قرۃ بن ایاس المزنی

ابن الاعرابی کے بیان کے مطابق ابو معاویہ قرۃ بن ایاس، مزنی بھی اہل صفہ میں شامل ہیں۔ ان کے بیٹے معاویہ بیان کرتے ہیں کہ میرے والد نے فرمایا۔ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عمر کا ایک طویل حصہ گزارا ہے۔ ہمارے واسطے کھانے کو سوائے اسودان (دو سیاہ چیزیں) کے اور کوئی چیز نہ ہوتی۔ پھر فرمایا کیا جانتے ہو کہ" اسودان" کیا ہے؟ میں نے عرض کیا نہیں فرمایا۔ پانی اور کھجور۔

کناز بن الحصین

ابو عبدالرحمٰن السلمی نے واقدی، ابو عبداللہ الحافظ کے حوالہ سے کناز بن الحصین کو اہل صفہ میں شمار کیا ہے۔ غزوہ بدر میں شریک تھے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت حمزہ بن عبدالمطلب کے حلیف تھے۔ ان سے ایک حدیث یوں مروی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا۔ قبروں پر (یا قبروں کے سامنے) نماز نہ پڑھو، اور نہ ہی قبروں پر بیٹھو۔

کعب بن عمرو

ابو عبداللہ الحافظ النیساپوری کی طرف سے ابو الیسر کعب بن عمرو کو اہل صفہ میں داخل کیا گیا ہے۔ حضرت کعب بدری صحابہ میں سے ہیں۔

ابو الیسر کعب بن عمرو کہتے ہیں کہ غزوہ بدر کے دن میں نے عباس بن عبدالمطلب کو دیکھا کہ بت کی مانند کھڑے ہیں اور آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ میں نے یہ دیکھ کر کہا۔ اللہ آپ کو جزائے خیر دے۔ کیا آپ اپنے بھتیجے کے مقابلے میں اس کے دشمن کے ساتھ مل کر لڑتے ہیں؟ انہوں نے کہا۔ ان (حضور صلی اللہ علیہ وسلم) کا کیا بنا؟ کیا وہ قتل ہو گئے ہیں؟ میں نے کہا۔ اس چیز سے اللہ تعالیٰ ان کی امداد اور حفاظت فرمانے والا ہے۔ یعنی دشمن انہیں قتل نہیں کر سکتے۔ پھر انہوں نے مجھ سے پوچھا۔ تم میری طرف کس مقصد کے لئے آئے ہو؟ میں نے کہا آپ کو گرفتار کرنے کے واسطے۔ کیونکہ آپ کے قتل سے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔ کہا یہ ان کی پہلی صلہ رحمی نہیں۔ اس سے پہلے بھی متعدد بار صلہ رحمی کر چکے ہیں۔ چنانچہ میں ان کو قیدی بنا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لایا۔

حضرت ابو الیسر کعب بن عمرو بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا۔ جس شخص نے قرض وصول کرنے میں تنگدست کو مہلت دی یا بالکل ہی معاف کر دیا۔ اللہ تعالیٰ اسے اس دن سایہ عطا فرمائے گا۔ جس دن سوائے اس کے سایہ کے اور کوئی سایہ نہ ہو گا۔

ابوکبشہ (مولیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام حضرت ابوکبشہ بھی ابوعبداللہ الحافظ النیسابوری کی طرف سے اہل صفہ میں شمار کئے گئے ہیں۔

ایک حدیث ابوکبشہ یوں بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا۔ ثابت قدم اور ہمیشہ سیدھے رستے پر چلتے رہو۔ بے شک اللہ تعالیٰ اگر تمہیں عذاب میں مبتلا کرے تو اسے کوئی پروا نہیں عنقریب کچھ لوگ ایسے آئیں گے جو ذرہ بھر برائی سے اپنا دفاع نہیں کریں گے۔

مصعب بن عمیر الداری

محمد بن اسحاق کے بیان کے مطابق حضرت مصعب بن عمیر بھی اہل صفہ میں شامل ہیں۔ بہت بڑے قاری، اسلام کے اولین مبلغ اور داعی، متقی لوگوں کے سردار، نذر کو پورا کرنے والے، اترانے اور تساہل سے نفرت کرنے والے اور اللہ سے انتہائی ڈرنے والے تھے۔ غزوہ احد میں شہید ہوئے۔

حضرت عروہ بن زبیر بتاتے ہیں کہ انصار نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کو سنا اور آپ کی دعوت پر ان کے نفوس مطمئن ہو گئے۔ تو انہوں نے آپ کی تصدیق کی یعنی آپ پر ایمان لائے۔ انصار کا ایمان لانا بھلائی کے اسباب میں سے تھا۔ انہوں نے آپ سے وعدہ کیا کہ وہ آئندہ سال حج کے موقعہ پر پھر ملیں گے۔ جب وہ لوٹ کر اپنی قوم میں چلے گئے تو انہوں نے وہاں سے ایک آدمی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا کہ آپ اپنی طرف سے ایک مبلغ بھیجیں جو لوگوں کو قرآن کی طرف دعوت دے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف مصعب بن عمیر کو روانہ فرمایا۔ چنانچہ انہوں نے قبیلہ بنی غنم میں اسعد بن زرارہ کے ہاں قیام فرمایا۔ وہ لوگوں کو قرآن و حدیث سناتے۔ حضرت مصعب کی تبلیغ اور سعی سے انصار کا کوئی گھر ایسا نہ تھا۔ جس میں کوئی نہ کوئی مسلمان نہ ہو۔ بڑے بڑے سردار مسلمان ہو گئے۔ جن میں عمرو بن جموح بھی شامل تھے۔ تمام بت توڑ دیئے گئے مصعب جب لوٹ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تو انہیں "مقریٔ" (پڑھانے والا) کے لفظ سے بلایا جاتا تھا ابن شہاب کہتے ہیں کہ مدینہ منورہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے قبل مصعب نے ہی مسلمانوں کو جمعہ پڑھایا۔

غزوہ احد کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب فارغ ہو کر چلے تو رستے پر گزرتے ہوئے دیکھا کہ مصعب شہید ہوئے پڑے ہیں۔ اس وقت آپ نے یہ آیت کریمہ پڑھی (ترجمہ:- اہل ایمان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ انہوں نے اللہ سے جو عہد کیا تھا۔ اس میں پورے اترے۔ الاحزاب: ۲۳)

عبید بن عمیر کہتے ہیں کہ غزوہ احد کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مصعب کے پاس سے گزرے تو کھڑے ہو گئے

اور تمام شہداء کو مخاطب کر کے فرمایا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ تم لوگ اللہ کے ہاں زندہ ہو۔ لوگو! شہداء کی قبور کی زیارت کرو، اور انہیں سلام کہو۔ قسم بخدا قیامت تک جو بھی ان کو سلام کہے گا۔ یہ اس کے سلام کا جواب دیں گے۔

عمر بن الخطاب بیان کرتے ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مصعب کی طرف دیکھا۔ درانحالیکہ وہ مینڈھے کی کھال کا تہبند بنائے ہوئے تھے۔ آپؐ نے فرمایا۔ اس شخص کی طرف دیکھو جس کے دل کو اللہ تعالےٰ نے منور فرما دیا ہے۔ میں نے اسے دیکھا کہ اس کے والدین اس کو بہترین کھانا پینا دیتے تھے۔ مگر اللہ اور اس کے رسول کی محبت نے اسے اُس کام کی طرف بلایا جس کو تم دیکھ رہے ہو۔

المقداد بن الاسودؓ

محمد بن یحییٰ الذہلی کے بیان کے مطابق حضرت المقداد بن الاسود بھی اہل صفہ میں داخل ہیں۔ شیخ ابونعیم فرماتے ہیں کہ یہ مقداد دراصل عمرو بن ثعلبہ کے بیٹے ہیں۔ جو اسود بن عبد یغوث کے غلام تھے۔ یہ سابق الاسلام تھے۔ جنگ اور حملے کے وقت شہسوار تھے۔ ان کے سامنے نبوت کے دلائل اور نشانیاں ظاہر ہوئیں، عامل بننے سے اعراض کئے رکھا۔ آزمائش اور مصائب میں پڑنے کے بجائے جہاد اور عبادت کو ترجیح دی۔

حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے سات آدمیوں نے اسلام کا اظہار کیا۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ابوبکرؓ، عمار، عمار کی والدہ سمیہ، صہیب، بلال اور مقداد، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت اللہ تعالےٰ نے ان کے چچا ابوطالب کے ذریعے اور ابوبکر کی حفاظت ان کی قوم کے ذریعے کرائی۔ باقی مسلمانوں کو مشرکین مکہ پکڑ کر لوہے کی زرہیں پہنا دیتے اور گرم دھوپ میں پھینک دیتے۔

عبداللہ بن بریدہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: باری تعالےٰ نے مجھے چار آدمیوں کے ساتھ محبت رکھنے کا حکم فرمایا ہے۔ اور بتایا ہے کہ وہ خود بھی ان چاروں سے محبت رکھتا ہے۔ اے علیؓ اُن میں سے ایک تو ہے۔ باقی مقداد، ابوذر اور سلمان رضی اللہ عنہم ہیں۔

عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ مجھے کسی جنگ میں مقداد کا ساتھی بننا، دنیا کی تمام کائنات سے زیادہ پسند ہے۔ وہ بلا کے شہسوار تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم (غزوات کے موقعہ پر) جب کبھی غصہ میں آتے تو آپؐ کے رخسار مبارک سرخ ہو جاتے حضرت مقداد اس وقت حاضر ہوتے اور عرض کرتے۔ یا رسول اللہ! ناراضگی نہ فرمایئے۔ خدا کی قسم ہم آپؐ سے وہ بات ہرگز نہ کہیں گے جو بنو اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہی تھی کہ "آپ اور آپ کا رب جا کر جنگ کریں۔ ہم تو یہیں بیٹھے رہیں گے"۔ اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا۔ ہم آپ کے آگے پیچھے اور دائیں بائیں کٹ مریں گے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالےٰ آپ کو فتح عطا فرمائے۔

محمد ابن اسحاق نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب بدر کی طرف روانہ ہوئے تو صحابہ سے مشورہ فرمایا:

حضرت مقداد بن عمرو کھڑے ہوگئے۔ اور عرض کیا، یا رسول اللہ! باری تعالیٰ نے آپ کو جو حکم فرمایا ہے اسے کر گزریئے۔ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ بخدا ہم آپ سے وہ بات نہ کہیں گے جو بنو اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہی تھی۔ اس ذات کی قسم جس نے آپ کو سچا نبی بنا کر بھیجا ہے۔ اگر آپ ہمیں تلواروں کے سینہ کی طرف لے چلیں۔ تو ہم آپ سے قبل ان کے سامنے سینہ سپر ہوں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بہت خوب اور پھر ان کے حق میں دعا فرمائی۔

مقداد ایک حدیث یوں بیان کرتے ہیں کہ میں اور میرے دو ساتھی بھوک کی شدت کی وجہ سے اس حال میں تھے کہ ہماری قوتِ سامع اور بینائی چلی جا رہی تھی۔ ہم نے کئی صحابہ سے کہا کہ وہ ہماری میزبانی کریں۔ مگر ان سب کا خود اپنا یہی حال تھا۔ بالآخر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں اپنے دولت کدہ پر لے گئے۔ تمام آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے کل تین بکریاں تھیں۔ جن کے دودھ پر گزارہ ہوتا تھا۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم وہ دودھ تمام افراد میں تقسیم فرماتے۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم رات کو کبھی دیر سے تشریف لاتے تو ہم آپؐ کا حصہ رکھ لیتے جب آپؐ تشریف لاتے تو آہستہ آواز سے سلام کہتے کہ جاگنے والا سن لیتا اور سونے والے کی نیند میں خلل نہ پڑتا۔ ایک رات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کافی دیر ہو گئی۔ شیطان نے مجھے یہ پٹی پڑھائی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم انصار کے ہاں تشریف لے گئے ہیں۔ آپؐ وہاں سے کچھ نہ کچھ ضرور کھا کر آئیں گے۔ لہٰذا یہ دودھ جو آپؐ کے حصہ کا رکھا ہوا تھا۔ مجھے پی لینا چاہیئے۔ چنانچہ میں نے اسے پی لیا۔ جب پی چکا تو اس نے سخت ندامت دلائی اور کہا تجھ سے یہ کیسا فعل سرزد ہو گیا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائیں گے۔ اور جب اپنے حصے کا دودھ نہیں پائیں گے تو تجھے بد دعا دیں گے۔ خیر میرے دونوں ساتھی تو اپنے اپنے حصہ کا دودھ پی کر سو گئے۔ مگر مجھے اب کہاں نیند آتی۔ میرے اوپر جو چادر تھی وہ اتنی چھوٹی تھی کہ سر کی طرف کھینچتا تو پاؤں ننگے ہو جاتے اور پاؤں کی طرف کھینچتا تو سر ننگا ہو جاتا۔ اسی اثناء میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ آپ نے حسب منشا نماز پڑھی (نوافل) اس کے بعد دودھ والے برتن کی طرف دیکھا تو اس میں کوئی چیز نہ پائی۔ آپ نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو میں لرز کر رہ گیا کہ اب آپ بد دعا فرمانے لگے ہیں۔ پس میں تو ہلاک ہو جاؤں گا۔ مگر آپ تو رحمۃ للعالمین تھے۔ دعا یوں فرمائی "اے اللہ تو اس شخص کو کھلا جو مجھے کھلائے اور اس شخص کو پلا جو مجھے پلائے" یہ سن کر میں نے آہستہ سے چھری لی اور بکریوں کی طرف چل پڑا کہ جو موٹی ہو گی اسے آپ کے لئے ذبح کر کے لاؤں گا۔ جب بکریوں کے پاس گیا تو ان کے تھن دودھ سے بھرے ہوئے تھے۔ فوراً آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ برتن لیا جس میں دودھ دوہا جاتا تھا۔ میں نے دودھ دوہا تو برتن کناروں تک بھر گیا۔ میں وہ دودھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لایا۔ آپؐ نے کچھ دودھ نوش فرمایا پھر مجھے پینے کو دیا۔ میں نے پی کر دوبارہ آپؐ کی خدمت میں پیش کیا۔ آپؐ نے دوبارہ نوش فرمایا۔ آپؐ نے پھر وہ مجھے دے دیا اور میں نے بھی دوبارہ لیا۔ اس کے بعد مجھے اس قدر ہنسی آئی کہ میں زمین پر گر گیا۔ آپؐ نے فرمایا اے مقداد! یہ تو بری چیز ہے۔ میں اٹھا اور سارا قصہ کہہ سنایا۔ آپؐ نے فرمایا بس یہ اللہ کی رحمت تھی اگر تم اپنے دونوں ساتھیوں کو بھی جگا لئے ہوتے تو وہ بھی پی لیتے۔ میں نے عرض کیا۔ قسم بخدا میں یہ قطعاً پسند نہیں کرتا کہ آپ کا جھوٹا کسی اور کو دے دوں۔

حضرت مقداد بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عامل بنا کر بھیجا۔ جب میں واپس آیا تو

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا۔ تم نے امارت (گورنری) کو کیسا پایا؟ میں نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! میں نے یوں سمجھا کہ تمام لوگ میرے غلام ہیں۔ اللہ کی قسم آئندہ میں زندگی بھر عامل نہیں بنوں گا۔

مسطح بن اثاثہ ابو عباد

ابو عبداللہ الحافظ النیسا بوری کی تحقیق کے مطابق مسطح بن اثاثہ بھی اہل صفہ میں شامل ہیں۔ حدیث افک میں ان کا ذکر آتا ہے۔ یہ وہی شخص ہے جس پر حضرت ابوبکر بن کے فقر و تنگدستی کی وجہ سے خرچ کیا کرتے تھے۔ جب اس نے واقعہ افک میں دلچسپی لی تو حضرت ابوبکر نے قسم کھائی کہ وہ آئندہ اس پر خرچ نہیں کریں گے تو سورہ نور کی یہ آیت کریمہ نازل ہوئی (ترجمہ: انہیں چاہیئے کہ عفو و درگذر سے کام لیں۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تمہاری مغفرت فرمائے) حضرت ابوبکر دوبارہ ان پر خرچ کرنے لگے۔ اور فرمایا کیوں نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ باری تعالیٰ میری مغفرت فرمائے۔

مسعود بن ربیع القاری

ابو عبداللہ الحافظ النیسا بوری کے بیان کے مطابق مسعود بن ربیع القاری بھی اہل صفہ میں شامل ہیں۔ ان سے ایک حدیث یوں مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص بلا حاجت لوگوں سے سوال کرتا رہتا ہے۔ حالانکہ وہ سوال کرنے سے بے نیاز ہوتا ہے تو اس کا چہرہ بدصورت بن جاتا ہے اور عنداللہ اس کی کوئی حیثیت نہ ہوگی۔

معاذ ابو حلیمہ القاری

ابو عبداللہ الحافظ النیسا بوری کے قول کے مطابق معاذ ابو حلیمہ القاری بھی اہل صفہ میں شامل ہیں۔ ابوبکر بن محمد بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ عمرۃ بنت عبدالرحمٰن ہمارے ملنے کے لئے تشریف لائیں۔ رات میں اٹھ کر نماز پڑھنے لگا (تہجد) اور قرأت آہستہ آہستہ پڑھ رہا تھا۔ عمرۃ بولیں اے بھتیجے! قرآن مجید اونچی آواز سے کیوں نہیں پڑھتے۔ معاذ قاری اور افلح کے قرآن پڑھنے کو سنو کہ وہ کیسے سوتوں کو جگا دیتے ہیں۔

واثلہ بن الاسقع

واقدی اور یحییٰ بن معین کے مطابق واثلہ بن الاسقع اہل صفہ کے مستقل سکونت پذیروں میں سے تھے۔ واقدی نے یہ بھی لکھا کہ واثلہ اس وقت اسلام لائے۔ جب کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تبوک کی تیاری فرما رہے تھے۔

واثلہ بن الاسقع بیان کرتے ہیں کہ ہم اصحاب صفہ مسجد نبوی میں بیٹھے رہا کرتے۔ ہم میں کوئی ایسا فرد نہیں تھا۔ جس کے لئے تن ڈھانپنے کے لئے پورا لباس ہو۔ ہمارے اجسام اور کپڑوں پر پسینہ کی وجہ سے غبار اٹھ جاتا۔ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم

ہماری طرف تشریف لائے۔ اور تین مرتبہ فرمایا۔ فقراء مہاجرین کے لئے بشارت ہو۔

واثلہ بن الاسقع ایک روایت یوں بیان کرتے ہیں کہ رمضان المبارک آگیا ہم اہل صفہ نے روزے رکھنے شروع کر دیئے جب افطاری کا وقت ہوتا کوئی نہ کوئی آدمی آتا اور ہم اہل صفہ میں سے کسی نہ کسی کو ساتھ لے جاتا اور اسے رات کا کھانا کھلاتا۔ ایک شام ایسی آئی کہ کوئی آدمی نہ آیا۔ ہم نے دوسرے دن روزے پر روزہ رکھا۔ دوسرے دن بھی اتفاق ایسا ہوا کہ افطاری کے وقت کوئی آدمی نہ آیا۔ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سارا ماجرا کہہ سنایا۔ آپ نے ازواج مطہرات میں سے ہر ایک کی طرف پیغام بھیجا کہ ان کے پاس کھانے کو کچھ ہو تو بھیج دیں۔ تمام ازواج مطہرات نے قسمیہ کہلا بھیجا کہ ان کے گھروں میں کوئی شے ایسی نہیں جسے انسان کھا سکے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اصحاب صفہ سے فرمایا۔ اکٹھے ہو جاؤ۔ جب تمام لوگ ایک جگہ جمع ہو گئے۔ تو رحمتہ للعالمین نے یوں دعا فرمائی۔

اے باری تعالیٰ! ہم تیرے فضل اور تیری خصوصی رحمت کی تجھ سے درخواست کرتے ہیں۔ یہ دونوں چیزیں (فضل و رحمت) صرف اور صرف تیرے ہی پاس ہیں۔ تیرے علاوہ کوئی اور ہستی ان کی مالک نہیں۔ راوی بیان کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا مانگی ہی تھی کہ ایک آدمی نے باہر سے اندر آنے کی اجازت چاہی۔ اس کے پاس بھنی ہوئی ایک بکری اور بہت ساری روٹیاں تھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے وہ کھانا ہمارے سامنے رکھ دیا گیا۔ چنانچہ ہم نے خوب سیر ہو کر کھایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہم نے اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل اور رحمت کی درخواست کی۔ اور اس نے ہمیں اپنے فضل و رحمت سے نوازا البتہ اس کے ہاں ہمارے واسطے رحمت کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے۔

واثلہ بن الاسقع کہتے ہیں کہ میں اہل صفہ میں تھا۔ میرے ساتھیوں نے بھوک کی شکایت کی اور مجھ سے کہا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤں۔ اور آپؐ سے کھانا ان کے لئے مانگوں۔ چنانچہ میں خدمتِ نبوی میں حاضر ہوا۔ اور عرض کیا یا رسول اللہ! میرے ساتھی بھوک کی شکایت کرتے ہیں۔ آپؐ نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا: کیا تیرے پاس کوئی چیز ہے؟ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! صرف چند ٹکڑے روٹی کے ہیں۔ فرمایا انہیں کو لے آؤ۔ وہ چمڑے کے ایک برتن میں لے آئیں۔ آپؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بڑا پیالہ منگوایا۔ اور خود اس میں ٹکڑے ڈال کر اپنے دستِ مبارک سے ثرید بنانے لگے۔ وہ ثرید زیادہ ہونے لگا۔ حتیٰ کہ پیالہ لبالب بھر گیا۔ اس کے بعد فرمایا۔ اے واثلہ جاؤ اور اپنے سمیت دس ساتھیوں کو بلا لاؤ۔ میں گیا اور نو آدمی مزید بلا لایا۔ آپؐ نے فرمایا بیٹھ جاؤ۔ اور اللہ کا نام لے کر (بسم اللہ پڑھ کر) پیالے کے اردگرد سے کھانا شروع کر دو۔ اور درمیان پیالہ سے نہ کھانا۔ کیونکہ برکت درمیان برتن میں اترا کرتی ہے۔ چنانچہ دس آدمیوں نے اس پیالہ سے خوب سیر ہو کر کھایا۔ اور اٹھ گئے اُدھر پیالہ بالکل اسی طرح بھرا ہوا تھا۔ آپؐ نے واثلہ سے فرمایا جاؤ۔ اور دس آدمی مزید بلا لاؤ۔ چنانچہ میں گیا اور دس ساتھیوں کو بلا لایا۔ آپؐ نے فرمایا بیٹھو، چنانچہ دوسرے گروپ نے بھی خوب سیر ہو کر کھایا اور چلے گئے۔ پھر آپؐ نے مجھ سے فرمایا۔ جاؤ اور دس آدمیوں کو بلا لاؤ۔ چنانچہ تیسرے گروپ نے بھی خوب سیر ہو کر کھا لیا۔ اس کے بعد پوچھا۔ کیا کوئی ابھی باقی ہے؟ میں نے عرض کیا ہاں! دس آدمی ابھی اور ہیں۔ فرمایا۔ ان کو بھی بلا لاؤ۔ میں انہیں لے گیا۔ انہوں نے بھی خوب سیر ہو کر کھا لیا۔ اور کھا کر اٹھ

گئے۔ پیالہ اب بھی اسی طرح بھرا ہوا تھا۔ فرمایا واثلہ جاؤ اور یہ پیالہ عائشہ کو دے آؤ۔

حضرت واثلہ بیان کرتے ہیں کہ میں فقراء مسلمانوں یعنی اہل صفہ میں سے تھا۔ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے اور فرمایا۔ میرے بعد تمہاری حالت کیا ہوگی۔ جبکہ تم لوگ گندم اور زیتون کی پکی ہوئی روٹیوں کو خوب سیر ہو کر کھایا کرو گے۔ اور تم طرح طرح کے کھانے اور کپڑے زیب تن کرو گے۔ بتاؤ تم آج اس حالت میں بہتر ہو یا اس وقت بہتر ہو گے؟ ہم نے عرض کیا اس وقت فرمایا: نہیں۔ بلکہ تم اس وقت بہتر ہو۔ حضرت واثلہ فرماتے ہیں کہ ابھی زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ ہم نے انواع و اقسام کے کھانے کھائے۔ طرح طرح کے لباس پہنے اور کئی قسم کی سواریوں پر سوار ہوئے۔

وابصہ بن معبد الجہنی

وابصہ بن معبد الجہنی بھی اہل صفہ میں ذکر کئے جاتے ہیں۔ ایوب بن مکرز بتاتے ہیں کہ وابصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ اقدس میں اصحاب صفہ کے پاس بیٹھ جاتے اور کہتے یہ لوگ میرے بھائی ہیں۔

حضرت وابصہ ایک حدیث یوں بیان کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ خیال تھا آج کوئی ایسی نیکی اور گناہ نہ چھوڑوں گا۔ جس کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ نہ لوں۔ چنانچہ میں نے گردنیں پھلانگتے ہوئے آپ کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ لوگوں نے مجھے روکنا چاہا۔ تو میں نے کہا۔ مجھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ہونے دو۔ کیونکہ مجھے تمام دنیا سے زیادہ محبوب ہیں۔ اور میں آپ کے قریب بیٹھنا چاہتا ہوں۔ اتنے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اے وابصہ قریب ہو جاؤ۔ میں آپ کے اتنا قریب ہو کر بیٹھا کہ میرے گھٹنے آپ کے مبارک گھٹنوں سے مس کرنے لگے۔ آپ نے فرمایا: اے وابصہ کیا میں تمہیں اس امر کی بابت خبر دوں جس کے متعلق تم مجھ سے پوچھنے آئے ہو؟ میں نے عرض کیا کیوں نہیں۔ فرمایا تو مجھ سے ہر قسم کی نیکی اور ہر قسم کے گناہ کے بارے میں پوچھنے آیا ہے۔ میں عرض کیا جی ہاں۔ آپ نے اپنے ہاتھ کی انگلیوں سے میرا سینہ ٹٹولنے لگے۔ میرے دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے فرمایا: اے وابصہ اپنے دل اور اپنے نفس سے نیکی کا فتویٰ پوچھ لے۔ جس فعل پر تیرا دل اور تیرا نفس مطمئن ہو۔ وہ نیکی ہے اور گناہ وہ امر ہے جو تیرے دل اور نفس میں کھٹکے اور تردد پیدا کرے۔ لوگ تجھے جو بھی فتوی دیں نیکی اور گناہ کی حقیقت یہی ہے۔

ہلال مولی المغیرۃ بن شعبہ

مغیرۃ بن شعبہ کے آزاد کردہ غلام ہلال بھی اہل صفہ میں بتائے جاتے ہیں۔ ان کے متعلق حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اس دروازہ سے ایک ایسا آدمی داخل ہونے والا ہے۔ جس کی طرف باری تعالے رحمت کی نظر سے دیکھے گا۔ ابوہریرہ بتاتے ہیں کہ تھوڑی دیر بعد حضرت ہلال داخل ہوئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا اے ہلال! میرے لئے دعا کرو۔ عرض کیا حضور! آپ تو اللہ کے محبوب اور مکرم ہیں۔ میں آپ کے حق میں کیا دعا کروں گا۔

یسار ابو فکیہہ

محمد بن اسحاق کے قول کے مطابق صفوان بن امیہ کے غلام یسار ابو فکیہہ بھی اہل صفہ میں سے ہیں۔

محمد بن اسحاق کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مسجد میں تشریف فرما ہوتے تو آپ کے پاس غربا و مساکین خباب، عمار، ابو فکیہہ یسار جو صفوان بن امیہ کے غلام تھے۔ صہیب بن سنان اور ان جیسے دوسرے مسلمان بیٹھ جاتے۔ قریش مکہ ان کا مذاق اڑاتے اور ایک دوسرے سے کہتے۔ یہی لوگ اس (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھی ہیں۔ انہی لوگوں پر اللہ تعالیٰ نے ہدایت دے کر اور حق کی درستی دکھا کر احسان کیا ہے۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جو کچھ لائے ہیں۔ اگر وہ کوئی اچھی چیز ہوتی تو یہ لوگ ہم سے سبقت نہ لے جاتے اور اللہ تعالیٰ انہیں چھوڑ کر ایسے لوگوں کو خاص نہ کرتا۔ انہی ضعفاء و مساکین کے حق میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ ترجمہ: آپ ان لوگوں کو اپنے پاس سے نہ اٹھائیے جو صبح شام اپنے رب کی عبادت کرتے ہیں۔ اسی کی رضا چاہتے ہوئے۔ (سورۃ بنی اسرائیل)

نوٹ:۔ شیخ ابو نعیم اصبہانی (مؤلف کتاب ہذا) فرماتے ہیں کہ ہم نے اصحاب صفہ میں انہی لوگوں کو درج کیا ہے۔ جن کا ذکر شیخ ابو عبدالرحمٰن السلمی نے کیا ہے اور بتایا ہے کہ مذکورہ لوگ یا تو مستقل طور پر صفہ میں رہے یا چند دن صفہ میں ٹھہرے۔ ابو عبدالرحمٰن السلمی ان شیوخ میں سے ہیں۔ جن کے ساتھ ہم نے ملاقات کی ہے۔ وہ تصوف اور صوفیہ کے سلسلہ میں زبردست دلچسپی رکھتے تھے صوفیہ کے طریقوں کو لازم پکڑنے والے اور ان کے آثار پر چلنے والے تھے۔ ہوس پرست اور جاہل صوفیوں سے دور بھاگنے والے تھے۔ کیونکہ مذہب تصوف کی حقیقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت ہے۔ ان تمام امور میں جو آپ نے ہم تک پہنچائے یا مشروع فرمائے۔

اس کے ساتھ ساتھ میں (مؤلف) نے اُن ناموں کو بھی ملایا ہے۔ جن کا ذکر ابو سعید بن الاعرابی رحمہ اللہ تعالیٰ نے کیا ہے۔ وہ بھی ایک بلند مرتبہ راوی حدیث اور بہت بڑے صوفی ہیں۔ صوفیہ کرام کی سیرت، حالات، سیر و سیاحت اور ریاضت و مجاہدات کے سلسلہ میں موصوف کی بہت ساری تصانیف مشہور ہیں۔

علم وتہذیب کی ترقی میں معارف محمدیؐ کا حصہ

شبیر احمد خان غوری و رضاء اللہ انصاری

اسلام کی بعثت دنیا پر اللہ رب العالمین کا سب سے بڑا احسان تھی جس کے نتیجہ میں اس نے اسے حلیہ دینی و دنیوی برکتوں سے نوازا۔ ان میں سب سے عظیم برکت علم وحکمت کی نعمت تھی۔ جس سے بہرہ اندوز ہو کر اس نے کائنات کا نقشہ ہی بدل ڈالا۔ اس دین مبین کے پیروؤں نے عرصۂ قلیل میں ربع مسکون کے بڑے حصہ میں جو

ع۔ نیل کے ساحل سے لے کر تابخاک کاشغر

بلکہ خلیج بنگال سے اقصائے مغرب تک پھیلا ہوا تھا۔ ایک عظیم الشان سلطنت قائم کر لی۔ بے شک یہ تاریخ کا ایک عظیم اعجوبہ ہے لیکن اس سے بھی عظیم تر اعجوبہ یہ ہے کہ وہ قوم جس کا امتیازی وصف اسلام لانے سے پہلے "جہل" تھا اور جو انتہائی غرور وتکبر سے کہتی تھی۔

الا لایجہلن احد علینا　　　فنجہل فوق جہل الجاہلینا

مشرف باسلام ہونے کے بعد زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا کہ مشرق ومغرب کے علمی اندوختہ کی وارث وامین ہو گئی۔ جس کے بعد مال وزر کی اس کی نظروں میں کوئی وقعت نہ رہی۔ اب وہ بکمال طمانیت قلبی کہتی تھی۔

رضینا قسمۃ الجبار فینا　　　لنا علم وللجہال مال

یہی نہیں، بلکہ جہاں تک اس کے پیشرو نہیں پہنچے تھے۔ پہنچنے کی کوشش کی اور پہنچ کر ہی دم لیا اور اس طرح جو کچھ اپنے پیشروؤں سے لیا تھا۔ اس میں چار چاند لگا کر اپنے بعد آنے والوں کے لئے ایک بیش بہا ورثہ فراہم کر دیا۔

اور یہ سب کچھ اُس زمانہ میں کیا۔ جب کہ پوری دنیا، بالخصوص اس کا مغربی علاقہ (یورپ) جو آج علم وحکمت کی روشنی سے مشرق کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر رہا ہے ظلمت وجہالت کا تیرہ مغاک بنا ہوا تھا۔

یقیناً یہ ایک عظیم ترین اعجوبہ ہے۔ جسے مغرب کے مدعیان تحقیق اور ادعائی دانشوروں نے کبھی اس تاریخی حقیقت کا سرے سے انکار کر کے، کبھی اس کی عظمت کی تنقیص واستخفاف کر کے اور کبھی دور از کار تعلیلات وتاویلات کے ذریعے حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر ان مضحکہ خیز توجیہات سے مسئلہ سلجھنے کے بجائے اور الجھتا ہی چلا گیا۔ حالانکہ اس کی اہمیت ظاہر ہے۔ کیونکہ اسی کے اطمینان بخش حل پر اس تاریخی حقیقت کی سعی توجیہ سے زیادہ ایک عملی سوال کا جواب موقوف ہے کہ

"کیا آج کے سائنسی دور میں اسلام اپنے اصولوں پر کسی قسم کا سمجھوتہ کئے بغیر زندگی کے ترقی پذیر دھاروں کے ساتھ چل سکتا ہے یا نہیں؟"

لیکن حقیقت شناس نظروں میں اس لاینحل معما کا حل صاف ظاہر اور واضح ہے۔ اس کی رو سے اس اعجوبہ کا راز مضمر ہے۔ خود اسلام کے عقلیت

پسندانہ مزاج اور اس سماج کے ترقی پسند تقاضوں میں ہے جس کی اس نے بنیاد ڈالی تھی۔ اور اسی اجمال کی تفصیل اس مختصر عرضداشت کا موضوع ہے

(الف) اسلام کا عقلیت پسندانہ مزاج

اسلام نے پہلے دن سے "عقلیت" (RATIONALISM) کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ قرآن اپنے مخاطبین سے عقل و خرد اور فہم و تدبر کے استعمال کا بار بار مطالبہ کرتا ہے۔ "افلا تعقلون" "افلا یتدبرون" اور "اولم یتفکروا" اس کی دعوت کا عام انداز ہے۔ اسی معقولیت پسند تعلیم کا نتیجہ ہے کہ وہ کورانہ تقلید کو جو امم ماضیہ میں عام تھی "خدا سازی" (شرک) سے تعبیر کرتا ہے جو اس کے بیان ناقابل معافی گناہ ہے۔ چنانچہ قرآن پچھلی امتوں کے بارے میں کہتا ہے۔

اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ

انہوں نے (یہود و نصاریٰ نے) اپنے احبار (یہودی علماء) اور راہبوں کو اللہ کے سوا "خدا" بنالیا۔

اور ان مدعیان علم و حکمت (یہودی احبار اور مسیحی راہبوں) نے خدا کے بندوں کو اوہام باطلہ کا شکار بنا رکھا تھا جن کے بار گراں سے ان کی مضطرب انسانیت کچلی جا رہی تھی۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا انسانیت پر بڑا احسان ہے کہ انہوں نے اس کو اپنے ہی بنی نوع کی ذہنی غلامی سے نجات دلائی۔ قرآن کہتا ہے۔

ویضع عنھم اصرھم والاغلال التی کانت علیھم۔

اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان (مظلومین و مجبورین) کے اوپر سے ان کا بوجھ اور ان پر جو قیود عائد کی گئی تھیں اتارتے ہیں

۱ - اسلام کی آئیڈیالوجی

اسلامی آئیڈیالوجی (IDEOLOGY) کی رو سے خلاق کائنات نے انسان کو نعمت وجود سے نوازنے (خلق فرمانے) کے بعد سب سے پہلے "علم اسماء" کی دولت سے بہرہ اندوز کیا اور یہ وہ دولت تھی جس سے ملائکہ بھی تہی دامن تھے۔

وعلم آدم الاسماء کلھا ثم عرضھم علی الملئکۃ فقال انبئونی باسماء ھؤلاء ان کنتم صدقین ٥ قالوا سبحنک لا علم لنا الا ما علمتنا انک انت العلیم الحکیم ٥

اور اس نے (اللہ تعالیٰ نے) آدم کو سب (چیزوں کے) نام سکھائے، پھر ان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا، اور فرمایا اگر تم سچے ہو تو مجھے ان کے نام بتاؤ۔ انہوں نے کہا تو پاک ہے۔ جتنا علم تو نے ہمیں بخشا ہے۔ اس کے سوا ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ بے شک تو جاننے والا (دانا) اور (حکمت والا) ہے۔

۲ - اسلام کی اجتماعی تنظیم

اسلام سوسائٹی کی تقسیم "نسلی امتیاز" مال و دولت اور مفلسی کی بنیاد پر نہیں کرتا "صرف" دانائی اور نادانی" ہی کی

اساس پر معاشرہ کی طبقہ بندی کرتا ہے۔ قرآن کہتا ہے:

"قل هل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون۔" آپ کہہ دیجئے کہ کیا جو لوگ جانتے ہیں (عالم ہیں) اور جو لوگ نہیں جانتے (عالم نہیں ہیں) برابر ہیں۔

پھر اسلامی سماج میں بلند ترین مقام اشرافیہ (ARISTOCRATS) یا طبقہ اُمرا کو حاصل نہیں ہے۔ بلکہ صرف "متقیوں" (خدا سے ڈرنے والوں) کو ہے۔

"ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم۔" تم میں اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہے۔

اور "تقویٰ اور خوف وخشیت الٰہی" (اللہ تعالیٰ سے ہر دم ڈرتے رہنے کا وصف) صرف اہل علم ہی کا حصہ ہے۔

"انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء۔" بے شک اللہ کے بندوں میں سے صرف علما ہی اللہ سے ڈرتے ہیں۔

خود پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا تعارف کسی باشوکت وسطوت شاہنشاہ کی حیثیت سے نہیں کراتا بلکہ "معلم کتاب و حکمت" کی حیثیت سے کراتا ہے۔ اور اس "معلم کتاب و حکمت" کی بعثت کو مومنوں پر اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا احسان بتاتا ہے۔

"لقد من اللہ علی المومنین اذ بعث فیهم رسولا من انفسهم یتلوا علیهم آیاته و یزکیهم و یعلمهم الکتاب والحکمة و ان کانوا من قبل لفی ضلال مبین۔" اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر بڑا احسان کیا ہے کہ ان میں انہیں میں سے ایک پیغمبر بھیجا ہے جو انہیں اللہ تعالیٰ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے اور ان کو پاک کرتے اور (خدا کی) کتاب اور حکمت سکھاتے ہیں۔ اور پہلے تو یہ لوگ صریح گمراہی میں تھے۔

۳۔ اسلام کا نظام اقدار

اسلام نے اقدار حیات کا جو نقشہ پیش کیا ہے۔ اس میں علم و حکمت ہی کو "خیراً کثیراً" زندگی کی قدر اعلیٰ یا (SUMMUM BONUM) قرار دیا ہے۔

"ومن یوت الحکمة فقد اوتی خیراً کثیراً۔" اور جس کو حکمت ملی اس کو "خیراً کثیراً" (بہت بڑی نعمت) ملی

اس لئے جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے "حکمت" کو مرد مومن کی "متاع گم گشتہ" فرمایا ہے۔ جسے وہ جہاں پائے لے لینے کا سب سے زیادہ حقدار ہے۔

"کلمة الحکمة ضالة المومن اینما وجدها فهو احق بها۔"

۴ تسخیر کائنات کی ترغیب و تشجیع

ولیم ہنیسل نے لکھا ہے۔

" عیسائی خارجی فطرت کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔"

اس انداز فکر کا نتیجہ تھا کہ جب تک وہ اپنے مذہب کی اس مزعومہ تعلیم پر کاربند رہے۔ علم و حکمت میں کوئی ترقی نہ کر سکے۔ ان سے بدتر حال مشرک اقوام کا تھا۔ وہ مظاہر کائنات کے سامنے گڑگڑاتے ہوئے جاتے اور جو کچھ اتفاق سے مل جاتا۔ اسے مزعومہ دیوتاؤں کی بخشش سمجھتے اور جو کچھ نہ ملتا، اسے اُن کے قہر و غضب کا نتیجہ گردانتے۔ چنانچہ جب سکندر اعظم بحری مہم پر روانہ ہوا تو "سمندر کے دیوتا" کی خوشنودی کے لئے ایک سانڈ کی قربانی دی۔ آج بھی اس عہد تنویر میں جب کوئی جہاز سمندر میں اتارا جاتا ہے۔ تو سمندر دیوتا کو منانے کے لئے ناریل توڑے جاتے ہیں۔

لیکن اس کے برعکس اسلام اپنے پیروؤں کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ مظاہر کائنات کے سامنے بھکاری بن کر نہیں، بلکہ شکاری بن کر جائیں، بقول اقبال۔

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفیٰ سے مجھے   کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں

وہ بار بار ان کی ہمت افزائی کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات و ما فیہا کو ان کے لئے مسخر کر دیا ہے۔ اب یہ ان کا کام ہے کہ اس سے فائدہ اٹھائیں۔ قرآن کہتا ہے۔

"الم تروا ان اللہ سخر لکم ما فی السمٰوٰت وما فی الارض واسبغ علیکم نعمۃ ظاھرۃ وباطنۃ"

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے مسخر کر دیا تمہارے لئے جو کچھ آسمان میں ہے۔ اور جو کچھ زمین میں ہے اور پوری کر دیں۔ تمہارے اوپر اپنی نعمتیں کھلی ہوئی اور چھپی ہوئی۔

دوسری جگہ ارشاد فرمایا ہے۔

"اللہ الذی سخر لکم البحر لتجری الفلک فیہ بامرہ ولتبتغوا من فضلہ ولعلکم تشکرون ۝"

اللہ وہ ہے جس نے بس میں کر دیا تمہارے دریا کو کہ چلیں اس میں جہاز اس کے حکم سے۔ اور تاکہ تم تلاش کرو اس کے فضل سے اور تاکہ تم حق مانو (شکر ادا کرو)

ایک اور جگہ ارشاد باری ہے۔

"وسخر لکم ما فی السمٰوٰت وما فی الارض جمیعًا منہ ان فی ذلک لآیات لقوم یتفکرون۔"

اور مسخر کر دیا۔ تمہارے لئے جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے سب کچھ اپنی طرف سے۔ اس میں نشانیاں ہیں۔ ان لوگوں کے واسطے جو غور و فکر کرتے ہیں۔

لیکن کائنات کی جاندار اور بے جان قوتوں کی تسخیر ان سے براہ راست کشتی لڑ کر نہیں کی جا سکتی۔ ہاتھی کو اٹھا کر پٹکا نہیں جا سکتا صرف آنکس کے ذریعے قابو میں لایا جاتا ہے۔ دریا کے پُر زور بہاؤ کا رخ ہاتھیوں کی قوت سے نہیں موڑا جا سکتا۔ صرف ٹربائن کے ذریعے اس کی توانائی کو بجلی کی شکل میں ذخیرہ کیا جاتا ہے۔ پہاڑ کو گھونسوں سے نہیں توڑا جا سکتا۔ صرف ڈائنامیٹ کے ذریعے اڑا کر اس میں سرنگیں بچھائی جاتی ہیں۔ کھلے سمندر کو تیر کر پار نہیں کیا جا سکتا۔ صرف جہازوں کے ذریعے طوفانی سمندر میں بے خوف و خطر سفر کیا جاتا ہے۔ مگر یہ

سب کچھ کیا ہے ؛ صرف "تسخیر کائنات" یعنی اس کی پوشیدہ قوتوں سے واقف ہو کر انہیں اپنے حسب منشا استعمال کرنے کی قابلیت و لیاقت اور انہیں پوشیدہ قوتوں کی واقفیت کو باقاعدہ منظم کرنے کا نام "علم طبیعی" اور "نیچرل سائنس" ہے۔

۵ - سائنسی علوم کے حصول کے بارے میں اسلام کا رجحان

تمام طبیعی علوم کا اصل الاصول "مطالعہ فطرت" (NATURE STUDY) ہے اور قرآن فطرت کے مختلف مظاہر کے مطالعہ پر زور دیتا ہے۔ وہ اجمالی طور پر اپنے متبعین کو مامور کرتا ہے کہ وہ مظاہر کائنات کا مشاہدہ کریں۔ کیونکہ اس میں سوچنے اور سمجھنے والوں کی رہنمائی کے لئے کھلی ہوئی نشانیاں ہیں۔

" قل انظروا ماذا فی السمٰوٰت والارض وما تغنی الآیات والنذر عن قوم لا یومنون

آپ کہہ دیجئے کہ تم غور کرو، (اور دیکھو) کہ کیا کیا چیزیں ہیں آسمانوں میں اور زمین میں اور جو لوگ (عناداً) ایمان نہیں لاتے۔ ان کو دلائل اور دھمکیاں فائدہ نہیں پہنچاتیں۔

یہی نہیں بلکہ وہ اس فریضہ کی ادائیگی میں تساہل و تقاعد کو زجر و توبیخ کا مستوجب بتاتا ہے۔

" اولم ینظروا فی ملکوت السمٰوٰت والارض وما خلق اللہ من شیءٍ وان عسٰی ان یکون قد اقترب اجلھم فبایّ حدیث بعدہ لا یومنون "

اور کیا ان لوگوں نے غور نہیں کیا آسمانوں اور زمین کے عوالم میں اور (نیز) دوسری چیزوں میں جو اللہ تعالٰے نے پیدا کی ہیں۔ اور اس بات میں (بھی غور نہیں کیا) کہ ممکن ہے کہ ان کی اجل قریب ہی (آپہنچی) ہو۔ پھر قرآن کے بعد کونسی بات پر یہ لوگ ایمان لائیں گے۔

پھر ایمان کی تکمیل "ایمان بالآخرۃ" پر موقوف ہے اور اس کے لئے تخلیق کائنات کا مطالعہ اور اس مطالعہ کے لئے سیر و سیاحت ضروری ہے۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے۔

" قل سیروا فی الارض فانظروا کیف بدا الخلق ثم اللہ ینشئ النشاۃ الآخرۃ ان اللہ علٰی کل شیءٍ قدیر " (۲۹ : ۲۰)

آپ ان لوگوں سے فرما دیجئے کہ تم لوگ ملک میں چلو پھرو اور دیکھو کہ خدائے تعالٰے نے مخلوق کو کس طور پر اول بار پیدا کیا ہے پھر اللہ پچھلی بار بھی پیدا کرے گا۔ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے

۶ - مختلف سائنسی علوم کا سنگ بنیاد

قرآن حکیم اصولاً ایک منزل من اللہ ضابطہ ہدایت ہے۔ جو بنی نوع انسان کو فلاح دارین کا راستہ دکھانے کے لئے نازل کیا گیا تھا۔ لہذا جہاں وہ اخروی زندگی میں فلاح و نجاح کی تدبیریں سکھاتا ہے۔ دنیوی زندگی کو خوشحال بنانے کی بھی تعلیم دیتا ہے۔ اور اسی چیز کا دوسرا نام "تمتع بالکائنات" ہے۔ لہذا وہ ان تمام علوم کی ہمت افزائی کرتا ہے جو اس "تمتع بالکائنات" میں ممد و معاون ہو سکتے ہیں۔

۱۔ **فلکیات** :۔ دنیا کا قدیم ترین علم "فلکیات" یا علم الہیئت ہے اس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

متمدن زندگی کے لئے وقت کی اہمیت ایک ناقابل انکار حقیقت ہے۔ بلکہ کسی قوم کی تمدنی عظمت کا اندازہ ہی اس اہتمام سے لگایا جاتا ہے جو اس نے وقت کے استعمال اور اس مقصد کے لئے اس کی پیمائش کے باب میں ملحوظ رکھا۔ چنانچہ مشہور جرمن مورخ اسپنگلر پچھلی تہذیبوں پر یورپ کی تہذیب حاضر کی برتری کا راز اس کے شدید احساس زماں میں مضمر بتاتا ہے۔

زمانہ کے اس احساس شدید کی عملی شکل "وقت شناسی" اور "گاہ شماری" ہے جن کی سائنٹیفک اساس اجرام سماوی بالخصوص سورج اور چاند کی سیر و گردش پر ہے۔ اسی گردش کی پیمائش سے دن رات کے مختلف پہروں کے گزرنے کا علم ہوتا ہے۔ اور اسی کی شمار سے مہینوں اور سالوں کے مرور وانقضا کا اندازہ ہوتا ہے۔

یہ احساس صبح و شام اور مرور شہور و اعوام اتنا ہی قدیم ہے جتنا صفحۂ ارض پر انسان کا وجود

اور پھر جیسے جیسے انسانی ذہانت ترقی کرتی گئی۔ ان کواکب کی سیر و گردش اور اس سے رونما ہونے والے مظاہر فلکی (جیسے سورج گرہن اور چاند گرہن، ہلال و بدر وغیرہ) کو سائنٹیفک قوانین میں منضبط کرنے کی سعی پیہم کی گئی۔ یہی علم الہیئت تھا۔

اس طرح علم الہیئت اتنا ہی قدیم ہے جتنا خود انسان۔ مگر با ایں ہمہ قدامت یہ بھی ایک تکلیف دہ حقیقت ہے کہ یہ علم الہیئت ہمیشہ جوتش کے پاکھنڈوں کا آلۂ کار بنا رہا۔ یہ اسلام ہی کا فیضان تھا کہ اس نے اسے اس ذلت سے نکال کر صحیح معنوں میں سائنٹیفک علم الہیئت کی بنیاد ڈالی۔ کیونکہ :۔

ایک جانب اس نے فلکیاتی مشاہدات کے لئے اپنے متبعین کی ہمت افزائی کی۔ اور دوسری طرف اس نے نجوم اور جوتش کے ڈھکوسلوں کا فریب کھانے کی سختی سے ممانعت کی۔

احکام منصوصہ سے قطع نظر اسلام اور فلکیاتی مشاہدات میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ کیونکہ انہیں مشاہدات بالخصوص اجرام سماوی کے بزوغ و افول نے ہمارے جد امجد سیدنا حضرت ابراہیم علیٰ نبینا علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی چشم جہاں بین کو توحید کے کحل الجواہر سے روشن کیا۔ بقول اقبال ؎

وہ سکوت شام صحرا میں غروب آفتاب جس سے روشن تر ہوئی چشم جہاں بین خلیل

قرآن کریم نے اس "مشاہدۂ ابراہیمی" کی تفصیل یوں طور دی ہے۔

"فلما جن علیہ الیل رای کوکبا قال ھذا ربی فلما افل قال لا احب الافلین ۝ فلما رای القمر بازغا قال ھذا ربی فلما افل قال لئن لم یھدنی ربی لاکونن من القوم الضالین ۝ فلما رای الشمس بازغۃ قال ھذا ربی ھذا اکبر فلما

پھر جب ان پر رات کی تاریکی چھا گئی تو انہوں نے ایک ستارہ دیکھا آپ (ابراہیم علیہ السلام) نے فرمایا کہ (تمہارے زعم کے موافق) یہ میرا رب ہے۔ سو جب وہ غروب ہو گیا تو آپ نے فرمایا غروب ہو جانے والے سے میں محبت نہیں رکھتا۔ پھر جب چاند کو دیکھا چمکتا ہوا تو فرمایا (تمہارے زعم کے موافق) یہ میرا رب ہے۔ سو جب وہ غروب ہو گیا تو آپ نے فرمایا کہ اگر میرا رب (حقیقی) ہدایت نہ کرتا رہے تو میں گمراہ لوگوں میں شامل ہو جاؤں۔ پھر جب آفتاب کو دیکھا چمکتا ہوا تو

افلت قال یٰقوم انی برئ مما تشرکون ۝ انی وجہت وجہی للذی فطر السمٰوٰت والارض حنیفا وما انا من المشرکین ۝

فرمایا کہ (تمہارے زعم کے موافق) یہ میرا رب ہے۔ یہ تو سب میں بڑا ہے۔ سو جب وہ بھی (غروب ہو گیا تو آپ نے فرمایا۔ اے قوم بے شک میں تمہارے شرک سے بیزار ہوں" میں اپنا رخ اس (ذات) کی طرف (کرتا ہوں) تم سے ظاہر کرتا ہوں جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا۔ اور میں شرک کرنے والوں سے نہیں ہوں۔"

لہٰذا قرآن کریم نے بھی مظاہر فلکی کے بانتصد مشاہدہ کے لئے اپنے متبعین کی ہمت افزائی کی ہے۔ کیونکہ ان سے باری تعالیٰ کی توحید، اس کی عظمت و جلال، اس کی وسیع حکمت، اس کی قدرت جلیلہ اور اس کی صناعی کی نفاست و اتقان کا ثبوت ملتا ہے۔

"ان فی خلق السمٰوٰت والارض واختلاف الیل والنہار لآیات لاولی الالباب ۝

بیشک زمین اور آسمانوں کی پیدائش میں اور رات اور دن کے باری باری آنے میں ہوش مند لوگوں کے لئے بہت نشانیاں ہیں۔"

اس کے ساتھ اجرام سماوی کی سیر و گردش کا باقاعدہ مطالعہ زندگی میں نظم و انضباط پیدا کرنے کا واحد ذریعہ ہے۔ کیونکہ اس کے ذریعے انسان وقت پیمائی اور گاہ شماری کا اہم فریضہ انجام دینے کے قابل ہوتا ہے۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے۔

"ھو الذی جعل الشمس ضیاء والقمر نورا وقدرہ منازل لتعلموا عدد السنین والحساب ما خلق اللّٰہ ذلک الا بالحق ۝

وہی ہے (معبود برحق) جس نے سورج کو جگمگاتا بنایا اور چاند کو روشن اور اس کے لئے منزلیں ٹھہرائیں کہ تم سالوں کی گنتی اور (مہینوں، دنوں اور ساعتوں کا) حساب جانو۔ اللہ نے اسے نہ بنایا مگر حق (کہ اس) سے اس کی قدرت اور اس کی وحدانیت کے دلائل ظاہر ہوں"

اسی لئے جب آیت کریمہ:۔

"ان فی خلق السمٰوٰت والارض واختلاف الیل والنہار لآیات لاولی الالباب ۝ کا نزول ہوا تو جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ویل لمن لاکھا بین لحیتیہ ولم یتفکر فیھا" تباہی ہے اس کے لئے جو اس آیت کریمہ کی منہ سے تلاوت کرتا ہے۔ مگر اس کے معنی و مفہوم پر غور نہیں کرتا۔

اور پھر بعد کے علماء ربانیین نے بھی اس اُسوۂ رسول کا باحترام تمام اتباع کیا۔ چنانچہ حجۃ الاسلام امام غزالی کا قول ہے۔

"من لم یعرف الھیئۃ والتشریح فھو عنین فی معرفۃ اللّٰہ تعالیٰ"

جو شخص ہیئت اور تشریح کے علوم سے ناواقف ہے۔ وہ معرفت باری میں ناقص ہے۔

امام غزالی سے کچھ پہلے حکیم ابو الحسن انبیری تھے۔ وہ ایک دن مشہور فلسفی و ہیئت دان شاعر عمر خیام کو بطلیموس کی "کتاب المجسطی" پڑھا رہے تھے کہ وہاں سے کسی فقیہ کا گذر ہوا۔ اس نے پوچھا کیا پڑھا رہے ہو۔ حکیم ابو الحسن انبیری نے برجستہ جواب دیا۔" آیت کریمہ۔

• افلم ینظروا الی السمآء فوقھم کیف بنیناھا۔

اور کیا انہوں نے اپنے اوپر آسمان کو نہیں دیکھا کہ ہم نے اسے کس طرح بنایا ہے۔

کی تفسیر بیان کر رہا ہوں۔

لیکن جہاں اسلام نے اپنے متبعین کو تاکید تمام فلکیاتی شاہدات کے لئے مامور کیا ہے اور علم ہیئت کے منظم مطالعہ کی ہمت افزائی کی ہے۔ وہیں اس نے اسی شدت تاکید کے ساتھ نجوم اور جوتش کے ڈھکوسلوں کا فریب کھانے کی ممانعت بھی کی ہے۔ کیونکہ اجرام سماوی کا واقعات عالم کے رونما ہوتے یا انسان کی قسمت بنانے یا بگاڑنے میں کوئی دخل نہیں ہے۔ وہ تو خود امر الٰہی کے محکوم اور مسخر ہیں۔

• والشمس والقمر والنجوم مسخرات بامرہ الا لہ الخلق والامر۔

سورج، چاند اور ستارے اس کے "امر" (حکم) کے پابند ہیں۔ خبردار (یاد رکھو) "خلق" (پیدا کرنا) اور "امر" (حکم دینا) اسی کے لئے (حق) ہے۔

پھر ان اجرام سماوی کا ایک بندھے ٹکے نظام میں سیر و گردش کرنا اور اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے جو طریق کار متعین فرما دیا ہے۔ اس سے ان کا سر مو انحراف نہ کر سکنا۔ ان کے محکوم و مربوب اور عاجز و لاچار ہونے کی دلیل ہے۔ اسی کی طرف قرآن اشارہ کرتا ہے۔

• والشمس تجری لمستقر لھا ذلک تقدیر العزیز العلیم ○ والقمر قدرنٰہ منازل حتی عاد کالعرجون القدیم ○ لا الشمس ینبغی لھا ان تدرک القمر ولا الیل سابق النھار وکل فی فلک یسبحون ○

اور سورج چلتا ہے اپنے ایک ٹھہراؤ کے لئے یہ حکم ہے زبردست علم والے کا۔ اور چاند کے لئے ہم نے منزلیں مقرر کیں۔ یہاں تک کہ پھر ہو گیا جیسے کھجور کی پرانی ڈالی۔ سورج کو نہیں پہنچتا کہ چاند کو کپڑ لے۔ اور نہ رات دن پر سبقت لے جائے۔ اور ہر ایک، ایک گھیرے میں پھر رہا ہے۔

ظاہر ہے جو خود اس قدر پابند او رمجبور ہو کہ اپنے راستہ کو نہ بدل سکے۔ وہ دوسروں بالخصوص انسان کے معاملات میں کیا دخل دے سکتا ہے۔ اور جب کوئی دخل ہی نہیں دے سکتا تو پھر اس کے مستقبل کے بارے میں کیا بتا سکتا ہے۔

بقول علامہ اقبال :-

ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا   وہ خود فراخی افلاک میں ہے خوار و زبون

اور جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ان ادعائی پیشین گوئیوں پر یقین کو عہد جاہلیہ کی یادگار بتایا۔

"ثلث من امور الجاھلیۃ، الطعن فی الانساب والنیاحۃ والانواء"

تین باتیں عہد جاہلیہ کے امتیازی شعائر ہیں۔ نسب کا طعنہ، مردوں پر بین کرنا، اور نچھتروں (ستاروں کی پیشین گوئیوں) پر اعتقاد

اور اس ممانعت کو مزید موکد اور قطعی و حتمی بنانے کے لئے آپ نے نجومی پیشین گوئیوں کو در خور اعتنا سمجھنے کو

خارج از اسلام ہونے کا سبب قرار دیا۔

" من اتی منجماً فلیس منا " — جو منجم کے پاس (اس سے پیشین گوئی کرانے) جاتا ہے۔ وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

اور پھر خلیفہ چہارم حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اس ممانعت پر آخری مہر توثیق ثبت فرما دی اور اسے کفر کے مترادف قرار دیا۔ ہوا یہ کہ ایک مرتبہ آپ کسی مہم پر تشریف لئے جا رہے تھے کہ کسی ساتھی نے کہا۔ امیر المومنین اس وقت تشریف نہ لے جائیں۔ کیونکہ ستارے موافق نہیں ہیں۔ اس پر آپ انتہائی برافروختہ ہوئے اور فرمایا۔

" ایھا الناس ایاکم و تعلم النجوم الا ما یھتدی بہ فی بر او بحر، فانھا تدعو الی الکھانۃ المنجم کالکاھن والکاھن کالساحر والساحر کالکافر والکافر فی النار "

اے لوگو! خبردار نجوم نہ سیکھنا، سوائے اتنے حصہ کے جس سے خشکی اور سمندر میں رہنمائی ہو سکے۔ کیونکہ جوتش "کہانت" (غیب دانی کا ادّعا کرنا) کا سبب ہے۔ منجم کا حکم کاہن کا حکم سا ہے اور کاہن جادوگر کے مانند ہے۔ اور جادوگر کافر کی طرح ہے اور کافر دوزخی ہے۔

اس طرح جوتش کی غلامی سے چھٹکارا دے کر اسلام نے فلکیاتی مشاہدات کو خالص سائنسی بنیادوں پر استوار کیا اور اس طرح صحیح معنوں میں "سائنٹیفک علم الھیئت" کی بنیاد ڈالی۔

طبیعیاتی علوم:۔ علم ہیئت کے علاوہ قرآن کریم نے دیگر طبیعیاتی علوم حاصل کرنے کی طرف بھی توجہ دلائی ہے

" ان فی السمٰوٰت والارض لایات للمومنین و فی خلقکم وما یبث من دابۃ ایات لقوم یوقنون ○ واختلاف الیل والنھار وما انزل اللہ من السماء من رزق فاحیا بہ الارض بعد موتھا وتصریف الریاح ایات لقوم یعقلون "

آسمانوں اور زمین میں اہل ایمان کے (استدلال کے) لئے بہت دلائل ہیں۔ اور (اسی طرح) خود تمہارے اور ان حیوانات کے پیدا کرنے میں جن کو زمین میں پھیلا رکھا ہے۔ ان لوگوں کے لئے دلائل ہیں۔ جو یقین رکھتے ہیں (اسی طرح) رات اور دن کے یکے بعد دیگرے آنے میں اور اس مادہ رزق میں، جس کو اللہ تعالیٰ نے آسمان سے اتارا، پھر اس (بارش) سے زمین کو ترو تازہ کیا۔ بعد ازانکہ وہ خشک ہو چکی تھی (اور اسی طرح) ہواؤں کے بدلنے میں ان لوگوں کے لئے دلائل ہیں جو عقل سلیم رکھتے ہیں

قرآن کریم کا کہنا ہے کہ ان مظاہر کائنات میں معرفت باری تعالیٰ کی نشانیاں تو ہیں ہی۔ اس کے علاوہ بھی اور کچھ ہے۔ بشرطیکہ غور و فکر کے ساتھ ان کا مشاہدہ کیا جائے۔ کیونکہ یہ کائنات "وما فیھا" ان کی میراث ہے۔ اس لئے انہیں اس سے تمتع حاصل کرنے کا طریقہ جاننا چاہیئے۔

" والارض بعد ذلک دحاھا اخرج منھا — اور اس کے بعد زمین کو بچھایا۔ (اور بچھا کر) اس کا پانی اور چارہ

ماءها مرعاها والجبال ارساها متاعاً لکم ولانعامکم

نکالا، اور پہاڑوں کو اس پر) قائم کیا، تمہارے اور تمہارے مویشیوں کو فائدہ پہنچانے کے لئے

لہٰذا انسان کو "تمتع بالکائنات" کے ساتھ اس عملِ الٰہی پر بھی نظر رکھنا چاہیئے جو کائنات میں جاری و ساری ہے۔

" فلینظر الانسان الی طعامه انا صببنا الماء صباً ثم شققنا الارض شقاً فانبتنا فیها حباً و عنباً و قضباً و زیتوناً و نخلاً و حدائق غلباً و فاکهة و ابّاً متاعاً لکم ولانعامکم "

سو انسان کو چاہیئے کہ اپنے کھانے کی طرف نظر ڈالے کہ ہم نے عجیب طور پر) پانی برسایا، پھر عجیب طور پر) زمین کو پھاڑا۔ پھر ہم نے اس میں غلہ اور انگور اور ترکاری، اور زیتون اور کھجور اور گنجان باغ اور میوے اور چارہ پیدا کیا۔ (بعض چیزیں) تمہارے لئے اور بعض چیزیں) تمہارے مویشیوں کے فائدہ کے لئے۔

در مظاہر کائنات کے ساتھ ساتھ حیات حیوانی کے مطالعہ پر بھی زور دیتا ہے۔ کیونکہ اس یاد دہانی سے ایمان باللہ تک رسائی ہوتی ہے۔ جو اسلام کی بعثت کا مقصد وحید ہے۔

" افلا ینظرون الی الابل کیف خلقت والی السماء کیف رفعت والی الجبال کیف نصبت والی الارض کیف سطحت فذکر انما انت مذکر "

کیا وہ لوگ اونٹ کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح (عجیب طور پر) پیدا کیا گیا ہے اور آسمان کو (نہیں دیکھتے) کہ کس طرح بلند کیا گیا ہے۔ اور پہاڑوں کو (نہیں دیکھتے) کہ کس طرح کھڑے کئے گئے ہیں اور زمین کو (نہیں دیکھتے) کہ کس طرح بچھائی گئی ہے (جب یہ لوگ باری تعالٰی کی قدرت باہرہ کے دلائل پر غور کریں) تو آپ انہیں نصیحت کر دیا کیجئے۔

اسی طرح وہ "تاریخ طبیعی" (NATURAL HISTORY) اور "حیوانیات" (ZOOLOGY) کے مطالعہ کی بھی ترغیب دیتا ہے۔

" واللّٰه خلق کل دابة من ماءٍ فمنهم من یمشی علٰی بطنه ومنهم من یمشی علٰی رجلین ومنهم من یمشی علٰی اربعٍ یخلق اللّٰه ما یشاء ان اللّٰه علٰی کل شیءٍ قدیر "

اور اللہ (تعالٰی ہی) نے ہر چلنے والے جاندار کو (خشکی ہو یا بحری ہو) پانی سے پیدا کیا ہے۔ پھر ان میں سے بعضے تو وہ جانور ہیں جو اپنے پیٹ کے بل چلتے ہیں اور بعضے ان میں وہ ہیں جو دو پیروں پر چلتے ہیں اور بعضے ان میں وہ ہیں جو چار (پیروں) پر چلتے ہیں۔ اور اللہ تعالٰی جو چاہتا ہے بناتا ہے۔ بے شک اللہ تعالٰی ہر چیز پر پوری طرح) قادر ہے۔

ایک اور مقام پر قرآن حیوانات کے عضویاتی (PHYSIOLOGICAL) مطالعہ کی ہمت افزائی کرتا ہے۔

" وان لکم فی الانعام لعبرة نسقیکم مما فی بطونه من بین فرث ودم لبناً خالصاً سائغاً

اور تمہارے لئے مویشیوں میں بھی غور و فکر کرنا درکار ہے (دیکھو) ان کے پیٹ میں جو گوبر اور خون (کا مادہ) ہے۔ اسی

للشاربین " — کے درمیان میں سے صاف اور گلے میں آسانی اترنے والا دودھ (بناکر) ہم تم کو پینے کے لئے دیتے ہیں۔

دوسری جگہ وہ اڑنے والی مخلوقات کے تحقیقی مطالعے اور اُن کی قوت پرواز کے میکنزم کے مطالعہ کا مطالبہ کرتا ہے۔

" اولم یروا الی الطیر فوقہم صافاتٍ ویقبضن مایمسکھن الا الرحمٰن انہ بکل شئ بصیر " — کیا ان لوگوں نے اپنے اوپر پرندوں کی طرف نظر نہیں کی کہ پر پھیلائے ہوئے اڑتے پھرتے ہیں۔ اور کبھی (اسی حالت میں) پر سمیٹ لیتے ہیں۔ بجز (خدائے) رحمٰن کے ان کو کوئی تھامے ہوئے نہیں ہے۔ بے شک وہ ہر چیز کو دیکھ رہا ہے۔

عقلی علوم :- طبیعی علوم کے ساتھ ساتھ قرآن کریم عقلی علوم کے حصول کا بھی حکم دیتا ہے۔ مگر اس کی تفصیل موجب تطویل ہوگی۔ جس سے قلت وقت اور اس سے زیادہ کاغذ کی تنگ دامانی مانع ہے۔

ب :- اسلامی ثقافت کے ترقی پذیر تقاضے

امم سابقہ کے برخلاف اسلام اجتماعی زندگی اور متمدن معاشرے کے قیام پر زور دیتا ہے۔ "فرار عن الحیات" رہبانیت یا (MONASTICISM) اور ترک دنیا (ASCETICISM) خلاف فطرت پابندیاں ہیں جو ان قدیم مذاہب کے پیروؤں نے خود اپنے اوپر عائد کرلی تھیں۔ اور جن کا پروردگار عالم نے کبھی حکم نہیں دیا۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے۔

" ورھبانیۃ ن ابتدعوھا ماکتبنا ھا علیہم " (۵۷ : ۲۷)

چنانچہ جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مبہم طور پر فرمادیا کہ اسلام میں رہبانیت اور ترک دنیا کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔

"لا رھبانیۃ فی الاسلام "

اور متمدن زندگی کی تکمیل تعلیم سے ہوتی ہے۔ اور یہ وہ چیز ہے، جس کی ترقی و اشاعت پر اسلام نے شروع سے زور دیا ہے۔

تعلیم کا سنگ بنیاد، لکھنا پڑھنا ہے۔ اور یہ وہ دولت ہے جس سے پچھلی مذہبی برادریوں نے اپنے پیروؤں کی اکثریت کو محروم رکھا تھا۔ مگر اسلام نے اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کو مرد، عورت، امیر، غریب، شریف و وضیع سب کے لئے عام کردیا۔

خود وحی الٰہی کی ابتداء "لکھ" کے مقدس حکم سے ہوئی۔

" اقرا باسم ربک الذی خلق " — (پڑھیئے (اے نبی) اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا)

اس مقدس حکم کے ساتھ یہ بھی بتادیا گیا کہ "لکھنے کی صلاحیت" اللہ تعالیٰ کی دوسری بڑی نعمت ہے۔ جس کے ساتھ اللہ رب العزت نے انسان کو نوازا۔

"وربک الاکرم الذی علم بالقلم " — اور تمہارا رب بڑا کریم ہے۔ جس نے قلم کے ذریعے لکھنا سکھایا۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ عرب جہاں اسلام مبعوث ہوا، اسے علم کے بجائے اپنے جہل پر ناز تھا۔ بعثت اسلام کے وقت

پورے قبیلہ قریش میں صرف سترہ آدمی پڑھنا لکھنا جانتے تھے۔ مگر یہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فیض تھا کہ انہوں نے اللہ تعالٰی کی اس عظیم نعمت سے پوری امت مسلمہ کو بہرہ اندوز ہونے کا انتظام کیا۔ چنانچہ جنگ بدر میں جو قیدی ایثار زرفدیہ ادا کرنے سے قاصر تھے۔ انہیں کہا گیا کہ ان میں سے جو لوگ پڑھنا لکھنا جانتے ہیں۔ ہر شخص مدینہ منورہ کے دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دے۔ یہی اس کا فدیہ ہے۔

پڑھنے لکھنے کے بعد تعلیم کا اگلا مسئلہ "کتاب" ہے اور عرب جاہلیہ کی یہ بدنصیبی تھی کہ وہ "کتاب" کے تصور تک سے ناآشنا تھے۔ ہاں "کتیبہ" کو خوب جانتے تھے۔ جس کے معنی لشکر ہیں۔ اور یہ بھی خدائے کریم کی قدرت تھی کہ اسی وحشیانہ لفظ "کتیبہ" سے وہ لفظ "کتاب" بنا جو تہذیب و تمدن، بلکہ صلاحِ معاش و فلاحِ اُخری کی کلید ہے۔ چنانچہ قاضی ناصرالدین بیضاویؒ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے۔

"واصل الکتاب الجمع ومنہ الکتیبۃ" "کتب" کی اصل جمع کرنا ہے اور اسی لئے لشکر کو "کتیبہ" کہتے ہیں۔ (کیونکہ وہ ملا ہوا ہوتا ہے)

پھر یہ بھی تقدیر ربانی تھی کہ امتِ مسلمہ جس پہلی کتاب سے متعارف ہو۔ وہ اللہ کی کتاب ہو۔ لہذا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے مشورے سے سارا قرآن ایک کتاب میں جمع کیا گیا۔

کتاب اللہ کی تعلیم کے علاوہ صحابہ اور تابعین و تبع تابعین نے اپنے ہادی برحق کے ارشادات اور ان کی زندگی کی جزئیات کو بڑی ذمہ داری سے مدون کیا اور اس طرح "علم حدیث" کی بنیاد پڑی۔ جس نے آگے چل کر امت مسلمہ میں سب سے زیادہ حیثیت حاصل کر لی قرآن و حدیث ہی سے اُن صحابہ نے جو اس کے اہل تھے۔ حیاتِ انسانی کے لئے ضابطہ ہدایت مرتب کیا۔ یہ علم فقہ کہلایا۔ جس میں "تبحر" اللہ تعالٰی کی طرف سے دی جانے والی "خیر اعلیٰ" قرار دیا گیا۔

"ومن یرد اللہ بہ خیراً یفقہ فی الدین"

ان علوم دینیہ کی تفصیل دوسرے ارباب علم فرمائیں گے۔ اس عرضداشت کا موضوع "علم و تہذیب کی ترقی میں معارف محمدی کی کارفرمائی" ہے۔ اور گوناگوں علوم میں سے صرف ان علوم کی جو جدید اصطلاح میں علوم قطعیہ (EXACT SCIENCES) اور علوم طبعیہ (NATURAL SCIENCES) کہلاتے ہیں۔ ان کے ساتھ اعتنار و اہتمام خود اس سماج کے ترقی پذیر تقاضوں کا نتیجہ تھا۔ جس کی اسلام نے بنیاد ڈالی تھی۔

ان میں سب سے اہم دینی تقاضے تھے۔ یعنی احکام شرعیہ کی بجاآوری میں کماحقہ اہتمام اور ان دینی تقاضوں میں اولین اہمیت نماز کی ہے۔ جسے ہماری اقدار حیات میں علوم متعارفہ (AXIOM) کی حیثیت حاصل ہے۔

روز محشر کہ جاں گداز بود　　　　اولیں پرسش نماز بود

اس مقدس فریضہ کی بجاآوری کے لئے اخلاص و بے ریائی، حضورِ قلب اور خضوع و خشوع کے علاوہ کچھ اور بھی فرائض ہیں جن میں دو خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ وقت اور استقبال قبلہ۔ اول الذکر کے بارے میں قرآن کہتا ہے۔

"ان الصلوۃ کانت علی المؤمنین کتاباً موقوتاً"

(بے شک نماز ایسا فرض ہے جو پابندیٔ وقت کے ساتھ اہل ایمان پر فرض کیا گیا ہے)

اور ثانی الذکر کے بارے میں کہتا ہے۔

"فول وجھک شطر المسجد الحرام وحیث ما کنتم فولوا وجوھکم شطرہ"

(مسجد حرام (کعبہ) کی طرف رخ موڑ دو۔ اب جہاں کہیں بھی تم ہو اسی کی طرف منہ کرو۔ (منہ کر کے نماز پڑھو)

(۱) مذکورۃ الصدر آیت "توقیت" نے نماز کی فرضیت کے ساتھ اس بات کو فرض قرار دیا کہ اُسے ان کے متعلقہ اوقات میں ادا کیا جائے۔ اس آیت میں جو اجمال ہے۔ اُس کی تفصیل دوسری آیات میں کر دی گئی ——— اور ان اوقات پنجگانہ کی ابتداء اور انتہا کی تحدید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دی، بالخصوص حدیث "امامت جبرئیل" میں جسے اصحاب صحاح میں سے امام ترمذی اور امام نسائی نے اور دیگر محدثین کبار میں سے ابن حبان، حاکم، احمد بن حنبل اور اسحٰق بن راہویہ نے روایت کیا ہے۔ اس کا ماحصل حسب ذیل ہے۔

جبرئیل علیہ السلام (شب معراج کے اگلے دن) جب آفتاب (نصف النہار سے) ڈھلنے لگا۔ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تشریف لائے۔ اور آپ سے نماز پڑھنے کے لئے کہا اور آپ نے نماز ظہر ادا کی۔ پھر اس وقت تشریف لائے جب آدمی کا سایہ اس کی قامت کے برابر ہو گیا اور نماز پڑھنے کے لئے کہا۔ آپ نے نماز عصر ادا کی۔ پھر جب سورج بالکل غروب ہو گیا۔ تو آئے اور نماز پڑھنے کے لئے کہا آپ نے مغرب کی نماز ادا کی۔ پھر جب شفق غائب ہو گیا تو آئے اور عشار کی نماز پڑھنے کے لئے کہا۔ آپ نے نماز ادا کی۔ جب صبح کے وقت فجر (فجر ثانی یا صبح صادق) ظاہر ہونا شروع ہوئی تو پھر آئے اور کہا صبح کی نماز پڑھئے۔ اور آپ نے نماز فجر ادا کی۔

اگلے دن پھر اس وقت آئے۔ جب کہ آدمی کا سایہ اس کے برابر ہو گیا اور آپ سے نماز پڑھنے کے لئے کہا اور آپ نے نماز ظہر ادا کی۔ پھر اس وقت آئے جب آدمی کا سایہ اس کی قامت کا دگنا تھا۔ اور نماز پڑھنے کے لئے کہا۔ آپ نے نماز عصر ادا کی۔ پھر نماز مغرب کے لئے روز گذشتہ کی طرح اس وقت آئے جب کہ سورج غروب ہو چکا تھا۔ اور نماز پڑھنے کے لئے کہا اور آپ نے نماز مغرب ادا کی۔ پھر عشار کے لئے اس وقت آئے۔ جب کہ رات کی پہلی تہائی گزر چکی تھی۔ اور نماز پڑھنے کے لئے کہا۔ اور آپ نے نماز عشا ادا کی۔ پھر صبح کو اس وقت آئے۔ جب کہ اچھی طرح اُجالا ہو گیا تھا۔ اور نماز پڑھنے کے لئے کہا اور آپ نے نماز فجر ادا کی۔

اس طرح قرآن کریم اور حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے اوقات پنجگانہ کو متعین کر دیا۔ جنہیں فقہائے کرام نے باضابطہ کتب فقہ میں مدون کیا۔

فجر کی ابتداء فجر ثانی (صبح صادق) کے طلوع سے ہوتی ہے اور جب تک سورج طلوع نہ ہو۔ اس کا وقت رہتا ہے۔

ظہر کی ابتداء اس وقت ہوتی ہے جب آفتاب نصف النہار سے ڈھلنے لگے۔ اور انتہا اس وقت جبکہ ہر چیز کا سایہ اس کے برابر (یا دگنا) ہو جائے۔

عصر کی ابتداء ظہر کا وقت ختم ہونے کے بعد ہوتی ہے اور انتہا سورج کے غروب ہونے پر۔

مغرب کی ابتداء سورج کے غروب ہو جانے کے بعد ہوتی ہے اور انتہا شفق غائب ہونے پر۔

عشار کی ابتداء شفق غائب ہونے کے بعد ہوتی ہے اور انتہا فجر ثانی (صبح صادق) کے طلوع ہونے تک۔

(۲) دوسری اہم شرط استقبال قبلہ ہے۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ جب جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ پہنچے تو کچھ عرصہ

تک تو بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے۔ کیونکہ یہی انبیائے سابقین کا قبلہ تھا۔ مگر بیت المقدس سے بھی زیادہ مقدس کعبہ شریف تھا۔ جسے خود انبیائے سابقین کے جدامجد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بنایا تھا۔ اس لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اکثر خدمت اقدس میں عرض کیا کرتے تھے۔

"یارسول اللہ لو اتخذنا من مقام ابراھیم مصلّٰی"

(اے اللہ کے رسول کیا اچھا ہوتا اگر ہم مقام ابراہیم کو اپنا قبلہ قرار دیتے)

خود جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دلی خواہش تھی کہ کعبہ شریف کی طرف منہ کر کے نماز پڑھیں۔ اور اسی لئے آپ اکثر آسمان کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھا کرتے کہ شاید اس آرزو کی تکمیل کے لئے وحی الٰہی نازل ہو جائے۔ اور پھر اللہ رب العزت نے اپنے محبوب کی یہ دلی آرزو پوری کر دی۔ اور وحی نازل ہوئی۔

"قد نریٰ تقلب وجھك فی السماء فلنولینك قبلۃ ترضاھا فول وجھك شطر المسجد الحرام وحیث ما کنتم فولوا وجوھکم شطرہ"

یہ تمہارے منہ کا بار بار آسمان کی طرف اٹھنا ہم دیکھ رہے ہیں۔ تو ہم اس قبلے کی طرف تمہیں پھیرے دیتے ہیں۔ جسے تم پسند کرتے ہو مسجد حرام کی (کعبہ شریف) کی طرف رخ پھیر دو۔ اب جہاں کہیں تم ہو، اسی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کرو۔

یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جبکہ آپ نماز پڑھ رہے تھے۔ لہٰذا آپ نے نماز میں ہی رخ تبدیل کر دیا۔ اور کعبہ شریف کی جہت میں نماز پڑھنے لگے۔ ایک صحابی جنہوں نے یہ نماز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے پڑھی تھی، قوم انصار کے پاس سے گزرے، جبکہ وہ لوگ عصر کی نماز پڑھ رہے تھے۔ اور شہادت دی کہ اس نے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھی اور آپ نے کعبہ شریف کی طرف منہ کر کے اسے ادا کیا۔ یہ سننا تھا کہ شمع رسالت کے پروانوں نے اپنا رخ موڑ کر کعبۃ اللہ شریف کی طرف کر لیا۔

اس واقعہ سے "استقبال قبلہ" کی شرط کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ مگر "استقبال قبلہ" اہمیت صرف اتنی ہی نہیں ہے۔ بلکہ یہ شعائر اسلام میں سے ایک انتہائی اہم شعار ہے۔ چنانچہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جو شخص ہماری نماز پڑھے اور (نماز میں) ہمارے قبلہ کی طرف رخ کرے اور ہمارا ذبیحہ کھائے۔ وہی مسلمان ہے۔ جس کا اللہ اور اس کے رسول نے ذمہ لیا ہے۔"

دوسری حدیث میں ہے۔

"مجھے جہاد و قتال کا حکم دیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ لوگ لا الٰہ الا اللہ کا اقرار کریں۔ ہماری نماز پڑھیں ہمارے قبلہ کی طرف (نماز میں) منہ کریں۔ ہمارا ذبیحہ کھائیں۔ اس وقت ہم پر ان کا خون اور اسی طرح ان کا مال حرام ہے سوائے ان کی شرعی ذمہ داریوں کے۔"

اس طرح اوقات نماز کے لئے صبح صادق اور آفتاب کے طلوع ہونے، زوال (آفتاب کے نصف النہار سے ڈھلنے) سایہ کے برابر یا دگنا ہونے، غروب آفتاب اور شفق کے غائب ہونے کے صحیح اوقات کی پہچان، اسی طرح مکہ معظمہ میں رہنے والوں کے

لئے) کعبہ کی سمت (اور مکہ شریف سے باہر رہنے والوں کے لئے) مکہ معظمہ کی جہت کا جاننا مذہبی فریضہ ہے۔ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں (صحابہ کرام اور تابعین و تبع تابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین) کو کچھ تو عہدِ نبوی کی قربت سے جس " فراستِ مومن " سے خصوصیت کے ساتھ نوازا تھا۔ اس " فراستِ مومن " نے اور کچھ ملک کی جغرافیائی و طبیعی خصوصیات کی بنا پر صاف مطلع نے اس میں اہتمام کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے مزید زحمتوں سے بے نیاز کر دیا تھا۔

مگر بعد کے لوگوں بالخصوص دور دراز کے علاقوں کے باشندوں کو اس باب میں دقتوں کا ہونا فطری تھا۔ خصوصاً ان ملکوں میں جہاں، یا ان اوقات میں جبکہ مطلع صاف نہ ہو طلوع و غروب آفتاب یا فجر اول (صبح کاذب) اور شفق کے غائب ہونے کے صحیح اوقات کی معرفت دشوار تھی۔ اسی طرح صحیح اور حقیقی سمت قبلہ کی دریافت کے لئے پہلے صحیح اور حقیقی سموت اربعہ مشرق، مغرب اور شمال و جنوب کی معرفت شرط اولیں تھی۔ ظہر اور عصر کے وقت کے لئے سایہ کے برابر یا دگنا ہونے کی تحقیق سے پہلے اس بات کی تحقیق ضروری تھی کہ جس چیز کا سایہ ناپنا ہے۔ وہ بالکل عموداً قائم ہے یا کچھ ترچھی ہے۔

بہر حال " لا یکلف اللہ نفساً الا وسعھا " کے ارشادِ ربانی کے تحت لوگ اپنی اپنی " فراستِ مومن " کی مدد سے " تحری " کے ذریعے اوقات و جہات کو معلوم کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ بایں ہمہ ان کا جذبہ صحت پسندی و دقت نظری صحیح اوقات و جہات کی معرفت کے نئے نئے طریقوں کی تلاش میں رہا۔

خلافت راشدہ میں دو نئی چنوتیوں (CHALLENGE) کا سامنا کرنا پڑا۔ عہدِ نبوی میں حکومت کو جو آمدنی ہوتی تھی (خواہ مال غنیمت سے خواہ صدقات و زکوٰۃ سے) وہ فوراً ہی مستحقین میں تقسیم ہو جاتی تھی۔ عہدِ صدیقی میں بھی یہی طریقہ جاری رہا لیکن حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہدِ خلافت میں جب اسلامی فتوحات کا دائرہ زیادہ وسیع ہوا اور مالِ غنیمت زیادہ مقدار میں آنے لگا۔ تو بیت المال قائم کیا گیا۔ جس کی نگہداشت (MAINTENANCE) کیلئے علم الحساب سے واقفیت کی اشد ضرورت تھی۔ پھر لوگوں کی اقتصادی حالت بہت اچھی ہو گئی تھی۔ اور وہ ترکہ میں بڑی بڑی رقمیں چھوڑنے لگے۔ اسلام کے منصفانہ نظامِ وراثت کی رو سے یہ ترکہ زیادہ سے زیادہ ورثہ میں تقسیم ہونا تھا۔ اس سے مناسخہ کے پیچیدہ مسائل پیدا ہونے لگے۔ ان سے عہدہ برآ ہونا بھی ضروری تھا۔ ادھر صدرِ اسلام کے عربوں کی حساب دانی کا یہ عالم تھا کہ ان کی لغت میں اس کی کثرت و ثروت کے باوجود " الف " (ہزار) سے زیادہ بڑے عدد کی تعبیر کے لئے کوئی مستقل لفظ نہیں تھا۔ مگر ان مشکلوں پر قابو پانا ضروری تھا۔ ان تمام وجوہ کی بنا پر حساب میں تبحر و تمہر ناگزیر ہو گیا۔ اس وقت اسلامی سماج کے ترقی پسند تقاضے اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لئے سامنے آئے۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے کے لئے مسلمانوں سے اکثر کہا کرتے تھے۔

" اذا لھوتم فالھوا بالرمی واذا تحدثتم فتحدثوا بالفرائض "۔

(جب تم کھیلو تو تیر اندازی کا کھیل کھیلو، اور جب آپس میں بات چیت کرو تو مسائل وراثت کے بارے میں بات چیت کرو)

دوسری چنوتی مفتوحہ اراضی کی شکل میں سامنے آئی۔ ۱۶ھ میں سوادِ عراق کا علاقہ فتح ہوا۔ جسے حضرت عمر نے خراج پر مفتوحین ہی کے پاس رہنے دیا۔ تشخیص خراج کے لئے زمین کی پیمائش ضروری تھی۔ مگر عرب قدیم اقتصادی طور پر گلہ بانی کی منزل کو بھی کما حقہ طے نہ کر پایا تھا۔ زرعی

معیشت کا کیا سوال تھا۔ اور زرعی معیشت نہ ہو تو پیمائش زمین کا مسئلہ کیوں اٹھتا۔ عرب گنتی ہی ہزار تک جانتے تھے۔ پیمائش کے طریقے یا مساحت (MENSURATION) سے کیوں واقف ہوتے۔ مگر یہاں بھی ترقی پذیر سماج کے تقاضوں نے ان کی مشکل کو حل کر لیا۔ تشخیص خراج اور اس کے لئے مساحت زمین کی ذمہ داری حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک صاحب کو تفویض کی۔ جن کا نام عثمان بن حنیف تھا۔ انہوں نے یہ کام با حسن وجوہ انجام دیا۔ اور اس طرح اسلامی معاشرہ مساحت سے آشنا ہوا۔ جو علم ہندسہ (GEOMETRY) سے واقفیت کے لئے پہلا قدم ہے۔

اوپر ذکر آ چکا ہے کہ شروع میں مسلمان مجبوراً "تحری" اور اندازہ سے کام لیتے تھے۔ جو تقریباً صحیح ہوتا تھا۔ بایں ہمہ تمدنی ترقی کے نتیجے میں ثقافتی صحت پسندی (EXACTITUDE) تحدید و تدقیق کی متقاضی تھی اور ریاضیاتی صحت (METHEMATICAL EXACTITUDE) اور دقت نظری کی ضرورت کا احساس بڑھتا جا رہا تھا۔ لہٰذا ان تقاضوں اور ضرورتوں کی تکمیل کے ذرائع کی تلاش فطری تھی۔

مثلاً ظہر اور عصر کی نمازوں کے لئے زوال اور مثل و مثلین کی دریافت پہلا قدم کسی چھڑی کا زمین پر گاڑنا تھا۔ اندازہ کی حد تک تو چھڑی وغیرہ عمود ہی ہوتی ہوگی۔ لیکن کیا وہ عمودی ہے۔ اور جس زمین پر وہ گاڑی گئی ہے۔ وہ مستوی اور جو رس نیز دائرہ افق کے متوازی ہی ہے؟ اس کی تحقیق و تدقیق ثقافتی صحت پسندی کا دوسرا قدم تھی۔ اس کے لئے ماہرین کی تدبیروں سے فائدہ اٹھایا گیا۔ جو اس مقصد کے لئے ایک ہندسی تدبیر (GEOMETRICAL DEVICE) سے کام لیتے تھے۔ اور جسے متاخرین کے یہاں "دائرہ ہندیہ" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس کے لئے جس مقام پر چھڑی کھڑی کی گئی ہے۔ اسے مرکز مان کر ایک دائرہ کھینچا جاتا ہے۔ اس دائرے کے محیط پر تین نقطے لگائے جاتے تھے۔ اگر چھڑی کے بالائی سرے سے ان تینوں نقطوں کا فاصلہ برابر ہو تو چھڑی عمود ہوگی۔ ورنہ نہیں۔

جہاں تک ٹیکنالوجی (TECHNOLOGY) کا تعلق ہے۔ اہل فن کے مدت دراز کے تجربے ہی عمل کی صحت کے ضامن تھے۔ مگر "ولکن لیطمئن قلبی"۔

ورثہ ابراہیم علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والتسلیم ہے۔ یہ مسلمان اس جویائے تحقیق ہستی کے اخلاف تھے۔ جسے بارگاہ ایزدی میں بھی اپنی ذہنی خلش مٹانے کے لئے۔

"رب ارنی کیف تحی الموتیٰ"

(اے میرے رب تو کیسے مردوں کو زندہ کرتا ہے۔

کہتے میں باک نہ ہوا اور جب ندائے ربانی۔

"اولم تؤمن"

(کیا تو اس پر ایمان نہیں رکھتا)

سنی تو "ولکن لیطمئن قلبی" (لیکن صرف یہ چاہتا ہوں کہ میرا قلب مطمئن ہو جائے) کہہ کر اس بے باکی کی معذرت کر لی۔ لہٰذا اس کے اخلاف اپنے ہی جیسے انسانوں کے دریافت کئے ہوئے اصول و ضوابط پر کیوں ایمان لاتے۔ لہٰذا اہل فن کے بتائے ہوئے اصول و تدابیر کی صحت کے ثبوت کی تلاش فطری تھی۔

اسی اثناء میں خلافت راشدہ کے اختتام ۴۱ھ کے بعد اموی خلافت برسر اقتدار آ چکی تھی۔ اور دمشق ان کا دارالخلافہ تھا۔

جو کسی زمانہ میں بازنطینی سلطنت کے ایک اہم صوبے شام کا صدر مقام رہ چکا تھا۔ اس لئے مسلمانوں کا مسیحی علماء سے ارتباط و اختلاط ایک قدرتی امر تھا۔ انہیں نصرانی علماء نے ان کی توجہ یونانی علم و حکمت کے ذخیروں کی طرف دلائی جو قیصر روم کی مملکت کے غیر معروف کتب خانوں میں مقفل تھے۔ لہٰذا ان کی تلاش اور استفادے کی کوشش فطری تھی۔ اس کوشش نے عملی شکل پہلی مرتبہ خالد بن یزید بن معاویہ کے یہاں حاصل کی۔ اس نے اپنے جذبہ ازدیاد دولت کی آسودگی کے لئے کیمیا کی کتابوں کا یونانی زبان سے عربی میں ترجمہ کرایا اور کیمیا کے طفیل میں کچھ طب و نجوم کے رسالوں کا ترجمہ ہوا۔

مگر ظاہر ہے خالد کا یہ جذبہ بڑا گھٹیا تھا۔ کوئی علمی تحقیق اس کی محرک نہ تھی۔ مثلاً مساحت کے جو گر پیمائش زمین کے سلسلہ میں کام میں لائے جاتے تھے۔ ان کی صحت کا سائنٹیفک ثبوت۔ یا مثلاً "دائرہ ہندیہ" میں جو چھڑی گاڑی جاتی تھی اور اس کے عمود ہونے کے لئے جو اس کے بالائی سرے سے دائرہ کے محیط کے تین نقطوں کے فاصلے کی برابری کی شرط، اس کا ہندسی ثبوت۔ جن مسیحی علماء سے مسلمان اہل علم کا تبادلۂ خیال ہوتا تھا۔ انہوں نے مطلوبہ صحت کے ثبوت کے لئے اقلیدس کی اصول ہندسہ (ELEMENTS OF EUCLID) کے مطالعہ کا مشورہ دیا۔ لہٰذا مسلمانوں کو اس کتاب کے مطالعہ کا شوق دامنگیر ہوا۔

اموی جابرہ کو تو اس علمی و تحقیقی جذبے کی آسودگی کا انتظام کرنے کی توفیق ہوئی نہیں۔ البتہ جب عباسی خاندان برسر اقتدار آیا تو اس نے اس طرف توجہ کی۔ چنانچہ دوسرے عباسی خلیفہ ابوجعفر منصور (۱۳۶ – ۱۵۸ھ) نے اپنے ہم عصر بازنطینی بادشاہ کو لکھا کہ تمہارے ملک میں ریاضیات و طبیعیات کی جو کتابیں ہوں انہیں ترجمہ کرا کر بھیج دو۔ قیصر نے اس کے جواب میں جو کتابیں بھیجیں۔ ان میں "اصول اقلیدس" بھی تھی۔ جو حسب تصریح ابن خلدون پہلی یونانی کتاب ہے جو عربی میں ترجمہ ہوئی۔ مسلمانوں نے اسے پڑھا اور اس سے فائدہ اٹھایا مگر "خوب سے خوب تر کی تلاش" کے جذبے نے انہیں اس ترجمے (نقل منصوری) پر قناعت نہ کرنے دی۔ وہ زیادہ صحیح اور بہتر طور پر اس کتاب کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگے۔ اور ہارون الرشید کے عہد خلافت (۱۷۰ – ۱۹۳ھ) میں حجاج بن یوسف بن مطر نے اس کا نیا ترجمہ کیا۔ لیکن حجاج بھی اپنے ترجمہ سے مطمئن نہ ہوا، اور اس نے ہارون کے بیٹے المامون (۱۹۸ – ۲۱۸ھ) کے عہد میں اس کا دوبارہ ترجمہ کیا۔ پھر بھی اسلامی ذہن کا "خوب سے خوب تر کی تلاش" کا جذبہ مطمئن نہ ہوا۔ اور تیسری صدی کے آخر میں اسحاق بن حنین اور ثابت بن قرہ نے اس کتاب (اصول اقلیدس) کے ترجمے کئے۔ اور بھی لوگوں نے ترجمے کئے، جن کی تفصیل موجب تطویل ہوگی۔ آخر میں ساتویں صدی ہجری کے وسط میں محقق طوسی نے حجاج اور ثابت کے ترجموں کی مدد سے "تحریر اصول اقلیدس" کے نام سے اس کا ایک نیا ایڈیشن مرتب کیا۔ علمی افادیت کے لئے اس کے ملخص تیار کئے گئے جیسا کہ محمد بن اشرف سمرقندی کی "اشکال التاسیس" جس پر قاضی زادہ رومی (شارح ملخص چغمینی) نے شرح لکھی (۸۱۵ھ)۔

پھر اسلام کے اجتماعی ذہن کی حریت پسندی نے صرف ترجمہ ہی پر اکتفا نہیں کیا۔ اس فن کے دقائق و غوامض کے افہام و تفہیم کے لئے اس کی شروح لکھیں۔ اور مغلق مقامات کی توضیح کے لئے مستقل کتب و رسائل تصنیف کئے۔ جیسا کہ محقق طوسی نے "مسئلہ توازی خطوط" (PARALLEL POSTULATE) کی توضیح کے سلسلے میں اپنے پیشروؤں کی تحقیقات کے ساتھ اپنی تحقیق کو بھی "الرسالۃ الشافیہ" میں قلمبند کیا۔

اس تفصیل سے نہ صرف "اصول اقلیدس" کے ساتھ مسلمانوں کے اہتمام کا اندازہ ہوتا ہے۔ بلکہ امت مسلمہ کے اجتماعی ذہن کی "افادیت پسندی" کا بھی کہ یہ سب کچھ ذہنی عیاشی کے لئے نہیں تھا۔ بلکہ اسلامی سماج کے ترقی پسند تقاضوں کا نتیجہ تھا۔

یہ تھا اسلام کے اجتماعی ذہن کے حزب سے خوب تر کی تلاش کا ایک اجمالی جائزہ جو اس نے صرف چھڑی کو عموداً گاڑنے اور اس بات کا اطمینان کرنے کے سلسلہ میں کی کہ وہ سطح زمین پر عموداً قائم ہے' یا مساحت (MENSURATION) اور پیمائش زمین (LAND MEASUREMENT.) کے "گروں" (FORMULA) کی صحت کے ثبوت کے سلسلے میں کی۔ لیکن خود سطح زمین کا مسئلہ بھی کچھ کم کاوش کا مقتضی نہ تھا۔ یعنی یہ دیکھنا کہ وہ جگہ جہاں چھڑی گاڑی جا رہی ہے۔ سطح مستوی ہی ہے اور دائرہ افق (HORIZON) کی متوازی ہے۔ اس کے لئے "گونیا" اور "شاقول" (PLUMB LINE) کی استمداد تو قریباً قرن کے انسانی تجربے نے مہیا کر دی۔ مگر یہاں بھی اس کے جذبہ "ولکن لیطمئن قلبی" کا تقاضا سمت تحقیق پر تازیانہ بن گیا۔ اس کے لئے نہ صرف علم الحیل د میکانکس (MECHANICS) بلکہ طبیعیات (PHYSICS) کے اس جزیرہ وقوف حاصل کرنے کا سوال پیدا ہوا جو مدرسوں میں "ما لیعم الاجسام" اور کالجوں میں (GENERAL- PROPERTIES OF MATTER) کہلاتا ہے۔ اور پھر پوری ارسطاطالیسی طبیعیات پر۔

یہی وجہ تھی کہ عباسیوں کے برسر اقتدار آنے کے بعد اجتماعی ذہن کے "خوب سے خوب تر کی تلاش" کے جذبہ اور لیطمئن قلبی کے شوق فراوانی نے خلیفہ ابوجعفر منصور کے اس مطالبہ کی شکل اختیار کر لی۔ جو اس نے بازنطینی بادشاہ سے ریاضیات و طبیعیات کی کتابوں کو عربی میں ترجمہ کرا کر بھیجنے کے لئے کیا گیا تھا۔ اور جس سے متاثر ہو کر برامکہ نے سلام الابرش سے ارسطو کی طبیعیات کا ترجمہ کرایا۔

بات شروع ہوئی تھی اوقات نماز کی تحدید اور مکہ معظمہ کی سمت دریافت کرنے سے زوال (یا زیادہ واضح و متعین الفاظ میں آفتاب کے نصف النہار پر پہنچنے) کا تعین نسبتاً آسان تھا۔ "دائرہ ہندیہ" میں جب چھڑی کا سایہ کم ہو کر محیط پر پہنچے تو اس مقام پر ایک نشان لگا دیا جاتا ہے۔ اور جب وہ بالکل گھٹ کر بڑھنا شروع ہوتا ہے تو دوبارہ دائرہ کے محیط پر پہنچتا ہے۔ وہاں دوسرا نشان لگا دیا جاتا ہے۔ دونوں نشانوں کو مرکز سے ملا کر جو زاویہ بنتا ہے۔ اس کی تنصیف کی جاتی ہے۔ خط منصف (BISECTOR) خط شمال و جنوب (یا خط نصف النہار) ہوتا ہے۔ جب چھڑی کا سایہ اس خط پر منطبق ہو (یا خط استواء پر بالکل نابود ہو جائے) وہی زوال کا وقت ہوتا ہے۔ مگر غروب آفتاب کے وقت کا تعین جس پر نماز مغرب کے ساتھ روزہ افطار کرنے کا بھی مدار ہے۔ زیادہ مشکل ہے۔ حدید البصر اور تیز نگاہ عرب جسے اپنے ملک کے صاف مطلع کی سہولت حاصل تھی' بآسانی اس کا مشاہدہ کر لیتا تھا۔ لیکن دوسرے مقامات جہاں یہ سہولتیں نہ ہوں۔ اور جہاں شام کو کبھی کبھی ایسی گھنگھور گھٹا چھا جاتی ہے کہ دن اور رات کی تمیز ختم ہو جاتی ہے۔ اس وقت "فراست مومن" کی تائید و تصدیق کے لئے علم ہیئت کے متعلقہ مباحث سے واقفیت ناگزیر ہو جاتی ہے۔ جس کی شہادت خود قرآن نے

"والشمس والقمر بحسبان" — سورج اور چاند ایک حساب کے پابند ہیں

فراہم کر دی ہے۔ بلکہ جس سے استمداد کے لئے ہم بجوائے آیہ کریمہ

"لتعلموا عدد السنین والحساب" — تاکہ تم اس سے برسوں اور تاریخوں کے حساب معلوم کرو۔

مامور ہیں۔ یہ ضروری اور متعلقہ مباحث ہیں "قوس النہار" اور "تعدیل النہار" کی پیمائش نیز آفتاب کی حرکت وسطی (MEAN MOTION)

کی واقفیت جو ہمیشہ یکساں نہیں رہتی۔ بلکہ بدلتی رہتی ہے۔ اول الذکر کے لیے علم ہیئت کے متون، اور ثانی الذکر کے لیے زیجوں (ASTRONOMICAL TABLES) اور تقویموں (ALMANACS) کا مراجعہ ناگزیر ہے۔ تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ آفتاب "قوس النہار" کے اس جزکو جو نصف النہار اور مغربی افق کے درمیان میں واقع ہے کتنی دیر میں طے کرے گا۔ یہی غروب کا وقت ہے۔

اسی تلاش و جستجو کا نتیجہ تھا کہ مذکرالصدر خلیفہ ابوجعفر منصور کے عہد میں جہاں علم ہندسہ (GEOMETRY) کے کلاسیکی شاہکار "اصول اقلیدس" کا عربی میں ترجمہ ہوا۔ وہیں علم ہیئت کے عظیم شاہکار "کتاب المجسطی (ALMAGEST) کا بھی ترجمہ ہوا، جو نہ صرف یونان کی ہیئتی عبقریت کا ماحصل تھی۔ بلکہ جو علم ہیئت کی ادبیات عالیہ میں اپنا منفرد مقام رکھتی ہے۔

مگر بات "قوس النہار" کی پیمائش ہی پر ختم نہیں ہو جاتی کیونکہ علم ہیئت میں "غروب آفتاب" سے مراد قرص آفتاب (SOLAR DISC) کے مرکز کا افق مغرب کے نیچے چلے جانا ہے۔ حالانکہ شریعت میں جس غروب کا اعتبار ناگزیر ہے۔ وہ پورے قرص آفتاب کا غروب ہے یعنی جبکہ قرص آفتاب کا مشرقی کنارہ بھی افق مغرب کے نیچے چلا جائے۔ بالفاظ دیگر اس وقت پر جو آفتاب کے مرکز کو نصف النہار سے اُفق مغرب تک کا فاصلہ طے کرنے کے لیے درکار ہے۔ اس وقت کا بھی اضافہ کیا جائے جو قرص آفتاب کے نصف قطر کو جو آفتاب کے مرکز اور اس کے مشرقی کنارہ کا درمیانی فاصلہ ہے) اس حرکت دسطی سے طے کرنے کے لئے درکار ہوگا۔

اور اس کے لئے آفتاب کے نصف قطر یا قطر) کا جاننا شرط اولین ہے۔ لہذا "علم الابعاد والاجرام" پر وقوف لازم ہوگیا۔ یونانیوں میں اس موضوع پر مستند کتاب اسطرخس (ARISTARCHUS) کی "کتاب جرمے النیرین" تھی۔ مگر ماہرین کا (خواہ افاضل اسلام ہوں یا یورپی ہیئت دان) اتفاق ہے کہ اس کی دریافتیں ناقص ہیں۔ اور ہر چند کہ جو اصول اس نے استعمال کئے تھے۔ مناسب ہیں۔ مگر عملاً اس سے فروگذاشتیں ہوئی ہیں۔ لہذا ان کی تصحیح ضروری تھی۔

لیکن کس طرح؟ بتایا گیا کہ یہ پیمائش آلات رصدیہ (ASTRONOMICAL INSTRUMENTS) بالخصوص "ذات الشعبتین" کی مدد سے کی جا سکتی ہے۔ اس لئے آلات رصدیہ کی تیاری اور استعمال کے علم کی طرف توجہ فطری تھی۔

کچھ اسی طرح کی کاوش پیہم "استقبال قبلہ" کے سلسلہ میں کی گئی۔ اس کی ابتداء بھی "دائرہ ہندیہ" سے ہوئی۔ مگر "صحت اور مزید صحت" کی تلاش کا جذبہ اپنی تشنگی کی آسودگی کے لئے علم المثلثات الکرویہ (SPHERICAL TRIGNOMETRY) کی ترقی کے لئے ایک عامل قوی بن گیا۔ مگر اس کی تفصیل جیسا کہ بار بار معذرت کی جاچکی ہے۔ موجب تطویل ہوگی۔

یوں بھی قلت وقت اور اس سے زیادہ کاغذ کی تنگ دامانی، اُن فیوض و برکات کا احاطہ کرنے سے مانع ہیں جو علم و تہذیب کی ترقی کو معارف محمدی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہنچے ہیں۔

عملی سوال کا جواب

اس پیش کش کی ابتداء میں ایک عملی سوال اٹھایا گیا تھا۔

"کیا آج کے سائنسی دور میں اسلام اپنے اصولوں پر کسی قسم کا سمجھوتا کئے بغیر زندگی کے ترقی پذیر ھاروں

کے ساتھ چل سکتا ہے یا نہیں؟

اور اس سوال کا جواب ہمیں ایک دنیا دار کی حیثیت سے نہیں، بلکہ ایک دیندار مسلمان کی حیثیت سے دریافت کرنا ہے۔

اسلام کی بنیادی تعلیم محض اتنی ہے۔

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

یعنی اللہ (رب العزۃ) کے سوا اور کوئی معبود نہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔

اس بنیادی تعلیم کا پہلا جزو یعنی "اللہ کے سوا اور کوئی معبود نہیں" ایمان باللہ ہے۔ اور دوسرا جزو یعنی

"محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں" ایمان بالرسالہ ہے۔

"ایمان باللہ" کا ماحصل یہ ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ ہی کو اپنا معبود سمجھے اور صرف اسی کی عبادت کرے۔ لیکن قرآن اس "توحید ربوبیت" کو محض ایک تکوینی حقیقت بتلانے ہی پر اکتفا نہیں کرتا۔ یہ ایک تشریعی حقیقت بھی ہے اور اسے ایک "حکم قطعی CATEGORICAL (IMPERATIVE)" کی حیثیت حاصل ہے۔ چنانچہ حسب تصریح قرآن حکیم مرد مومن جس طرح اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے مامور ہے اسی طرح اسے غیر اللہ کی عبادت سے باز رہنے کا بھی حکم ہے۔

"وقضی ربک الا تعبدوا الا ایاہ"۔ اور حکم کر چکا تیرا رب کہ نہ پوجو اس کے سوا۔

اور یہ غیر اللہ کی عبادت (شرک) یعنی اللہ کے سوا، کسی دوسرے کے آگے سر جھکانا۔ اسلام کے نظام اقدار میں ایک ناقابل عفو و درگزر گناہ ہے۔

"ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ ویغفر ما دون ذلک لمن یشاء ومن یشرک باللہ فقد افتریٰ اثماً عظیماً"	بے شک اللہ نہیں بخشتا اس کو جو اس کا شریک ٹھہرائے۔ اس کے سوا جس کو چاہتا ہے بخش دیتا ہے۔ اور جس نے شریک ٹھہرایا اللہ کا وہ سخت گمراہ ہوا۔

یہ "توحید ربوبیت" اسلام کی تعلیمات کا سنگِ بنیاد ہے۔ اور یہی "توحید ربوبیت" اسلامی ثقافت اور "اسلامک کلچر" کا اصل الاصول ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ بالفاظ دیگر اللہ رب العزت کے سوا انسان کا کوئی آقا نہیں۔ سب اس کے محکوم ہیں۔ وہی کائنات کی سب سے افضل و اشرف مخلوق ہے۔

اس تعلیم کا منطقی نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا کہ پیروان اسلام کائنات کے سامنے بھکاری بن کر نہیں۔ بلکہ شکاری بن کر پہنچیں اور فطرت کی ظاہر اور پوشیدہ قوتوں کو تسخیر کر کے اپنے مقاصد کے مطابق استعمال کریں۔ اسی کا نام تسخیر کائنات ہے۔ جس کے لئے قرآن بار بار ہمت افزائی کرتا ہے۔ اس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔

اور اسی "تسخیر کائنات" اور ارض و سماء کی پوشیدہ قوتوں کی واقفیت کا نام "علم طبیعی" ہے۔ اور "نیچرل سائنس" ہے اور اس کے حصول کا محرک حقیقی "ایمان باللہ" یا توحید ربوبیت پر ایمان ہے۔

اسلام کی بنیادی تعلیم کا دوسرا جزو "ایمان بالرسالہ" ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ:-

"محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں"

لہٰذا آپؐ نے جو کچھ فرمایا۔ وہ حق ہے۔ اور جس بات کے کرنے کا حکم دیا، وہ اسی طرح واجب التعمیل ہے۔

جس طرح احکام الٰہی کی بجا آوری ۔ چنانچہ قرآن کریم جہاں اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجا آوری کا حکم دیتا ہے ۔ وہیں فرمودات نبوی کی بجا آوری پر بھی مامور کرتا ہے ۔

" اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول "

کے فرمان واجب الاذعان سے قرآن حکیم کے صفحات معمور ہیں، در خدا اور اس کے رسول کے احکام کی بجا آوری اسلام کا حکم ناطق ہے جس میں کسی کوتاہی و سرتابی کی گنجائش نہیں ہے ۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے ۔

" وما کان لمؤمن ولا مؤمنة اذا قضی اللہ ورسولہ امراً ان یکون لھم الخیرۃ من امرھم ومن یعص اللہ ورسولہ فقد ضل ضلالاً مبیناً "

اور نہ کسی مسلمان مرد، نہ مسلمان عورت کو حق پہنچتا ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کچھ فرما دیں تو انہیں اپنے معاملہ کا کچھ اختیار رہے اور جو حکم نہ مانے اللہ اور اس کے رسول کا" وہ بے شک صریح گمراہی میں پڑا ۔

اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیروؤں کو جس طرح اللہ تعالیٰ کی عبادت اور نیکو کاری اختیار کرنے اور برائیوں سے باز رہنے کا حکم دیا ہے اسی طرح ان کو یہ بھی حکم ہے کہ خود کو اوصاف حمیدہ سے متصف کریں اور ان اوصاف حمیدہ کے چندن ھار میں واسطۃ العقد "علم و حکمت" ہے ۔

لہٰذا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیروؤں کو حکم دیا کہ وہ علم حاصل کریں ۔ ہر چند کہ اس کے حاصل کرنے کے لئے انتہائی مشقت حتیٰ کہ اقصائے عالم کا سفر ہی کیوں نہ کرنا پڑے ۔

" اطلبوا العلم ولو کان بالصین "

علم کو تلاش کرو، خواہ وہ چین (اقصائے عالم) ہی میں کیوں نہ دستیاب ہو

پھر اس "حکم ناطق" کو مزید موکد بنانے کے لئے " " کے لفظ سے تعبیر کیا جس میں کوتاہی کی کوئی گنجائش نہیں ہے ۔

طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم ومسلمۃ

علم کو طلب کرنا ہر مسلمان مرد اور ہر مسلمان عورت پر فرض ہے ۔

یہی نہیں، بلکہ آپ نے علم و حکمت کی متاع گم گشتہ قرار دیا ۔ اور دوسروں کے مقابلے میں اسے حقدار بنا کر اسے اس کے حصول کی ہمت افزائی کی ۔

" کلمۃ الحکمۃ ضالۃ المؤمن اینما وجدھا فھو احق بھا "

اس طرح ایک جانب " توحید ربوبیت " کی تعلیم کا مقتضا تھا جو اسلامی تعلیمات کا اصل الاصول ہے ۔ اور دوسری جانب اپنے ہادی برحق کا ارشاد ہے جس کی بجا آوری صلاح معاش و فلاح معاد کی ضامن ہے ۔ نفسیاتی طور پر ان عوامل کا نتیجہ یہ ہوا کہ امت مسلمہ کا اجتماعی ذہن شروع ہی سے جہاں رموز دین کی شرح و ایضاح کی طرف متوجہ ہوا ۔ وہیں کائنات کے اسرار کی دانشگافی پر مرکوز ہو گیا جس کے نتیجے میں نبی امی کے امتیوں نے نہ صرف حکمائے سابقین افلاطون و ارسطاطالیس، اقلیدس، وبطلیموس اور بقراط و جالینوس کے اغلاط کی تصحیح کی ۔ بلکہ آنے والے عہد تنویر کے علمبرداروں کے لئے بھی سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کا راستہ ہموار کر دیا ۔

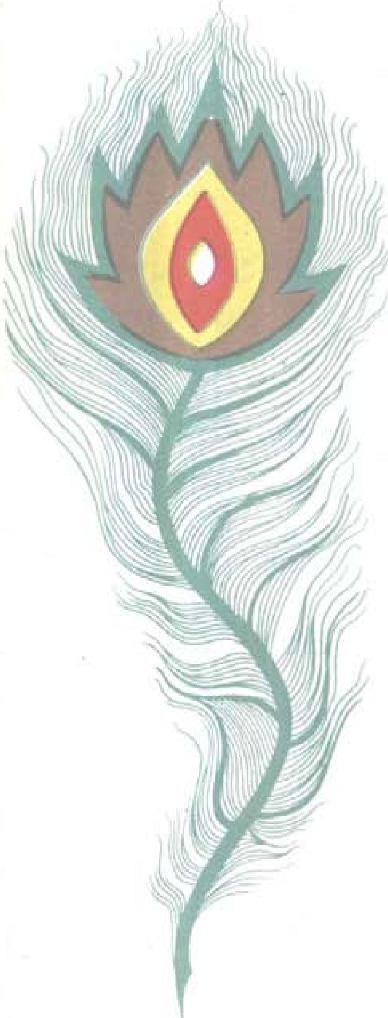
لہٰذا اگر ماضی میں یہ سب کچھ ہوا تو پھر مستقبل میں کیوں نہ ہو

وما ذلک علی اللہ العزیز

وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ

اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) تمہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتے ہیں

(البقرۃ: ۱۵۱)



حضور کے جوامع الکلم

حضورؐ کے جوامع الکلم

شرف الدین اصلاحی

جوامع الکلم کی لغوی تشریح

اصلاً جوامع الکلم عربی کا ایک مرکبِ اضافی ہے۔ اہلِ اُردو کے لئے یہ کسی قدر نامانوس ہے اس لیے اس کے صحیح تلفظ اور تفہیم کے لیے اس کی تھوڑی سی تشریح ضروری ہے اگرچہ یہ خشک بحث ذوق ادب پر گراں نہ گزرے۔

جوامع جمع ہے جامع کی، جس کا مادہ ج م ع (جمع) ہے۔ جامع اسم فاعل ہے جمع کا۔ جمع، جامع، اُردو میں بھی مستعمل ہیں۔ اس مادے سے بنے ہوئے اور بھی متعدد الفاظ ہیں جو اردو زبان کا جز ہیں۔ مثلاً جماعت، اجماع، اجتماع، جمعہ، جامعہ، مجموعہ، مجمع وغیرہ۔ کلم، کاف کے زبر اور لام کے زیر کے ساتھ، جمع ہے کلمہ کی، جس کا مادہ ہے ک ل م (کلم)۔ اس کی ایک جمع کلمات بھی آتی ہے۔ یہ اسم ہے اور اہل اردو اس سے اچھی طرح واقف ہیں "کلمہ طیبہ" اور "کلمہ خیر" ہیں، نیز قواعد کی ایک اصطلاح کی حیثیت سے یہ لفظ ہمارے لئے اجنبی نہیں۔ اس مادے سے بنے ہوئے متعدد دوسرے الفاظ بھی اردو میں آتے ہیں جیسے کلام، تکلم، کلیم، متکلم، مکالمہ وغیرہ۔ معنوی اعتبار سے مادہ جمع میں چیزوں کو اکٹھا کرنے اور سمیٹنے کا مفہوم پایا جاتا ہے اور مادہ کلم میں بات کرنے اور زبان سے کچھ کہنے کا۔

عربی زبان کی یہ خصوصیت معلوم ہے کہ مادے کے اصل معنی کسی نہ کسی شکل میں اس کے مشتقات فعلیہ و اسمیہ میں باقی رہتے ہیں۔ اس لئے باعتبار لغت جامع کے لفظی معنی ہوئے جمع کرنے والا اور کلمہ کے لفظی معنی بات یا لفظ جو زبان سے ادا کیا جائے یا قلم سے لکھا جائے۔ اس مرکب میں جو "جوامع الکلم" کی صورت میں اس وقت ہمارے زیر بحث ہے، اگرچہ نحوی اعتبار سے مضاف مضاف الیہ کا تعلق ہے، یعنی جوامع مضاف ہے اور کلم مضاف الیہ، لیکن معنوی اعتبار سے یہ آپس میں صفت اور موصوف ہیں یعنی کلم موصوف ہے اور جوامع اس کی صفت۔ گویا معناً یہ الکلم الجوامع ہے۔ عربی میں اضافت کی یہ شکل بہت عام ہے۔ جامع میں فاعلیت یا صفت کا جو مفہوم ہے وہ اپنے موصوف کے اعتبار سے ہی متعین کیا جاتا ہے۔ جیسے جامع بمعنی مسجد اور جامعہ بمعنی یونیورسٹی میں دیکھا جا سکتا ہے۔ جامع وہ مسجد جہاں جمعہ کے دن نمازیوں کی بہت بڑی تعداد اکٹھا ہوتی ہے۔ جامعہ وہ درسگاہ جہاں مختلف تدریسی علوم و فنون کو جمع کیا جاتا ہے۔ اور جہاں دور دراز کے طلبہ جمع ہو کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ان مثالوں میں صفت اپنے موصوف کے ساتھ کثرت استعمال کی وجہ سے اس طرح لازم ہو گئی ہے کہ موصوف کا ذکر نہیں کرتے تو بھی وہ سمجھ لیا جاتا ہے گویا صفت نے موصوف کی جگہ لے لی ہے۔ ایسا کہیں کہیں ہوتا ہے۔ ورنہ صفت ہمیشہ اپنے موصوف کے ساتھ آتی ہے۔ عام قاعدہ یہی ہے کہ صفت موصوف دونوں ساتھ ساتھ ہوتے ہیں جیسا کہ خود "جوامع الکلام" کے مرکب میں دیکھا جا سکتا ہے۔ لغت اور استعمال عام میں "الکلام الجامع" اور "جوامع الکلام"

مرکب صورت ہی میں نظر آتے ہیں

تاریخی جائزہ کلام عرب میں یہ لفظ میری نظر سے نہیں گزرا۔ قرآن مجید میں بھی بصورت ترکیب اس مفہوم میں اس کا ذکر نہیں ملتا۔ البتہ جوامع کی واحد جامع اپنے عام معنی میں تین مقامات پر استعمال ہوا ہے۔ اور کلم بصورت جمع چار جگہ اور بصورت واحد (کلمہ) تقریباً ۲۸ جگہ آیا ہے۔ جہاں تک حدیث کا تعلق ہے جوامع الکلم، اسی ترکیب اسی مفہوم اسی پس منظر کے ساتھ ایک سے زائد بار آیا ہے۔ بخاری مسلم ترمذی اور مسند احمد میں ۱۴ جگہ آنحضور کا یہ ارشاد وارد ہوا ہے "اعطیت جوامع الکلم" مجھے جوامع الکلم عطا کئے گئے ہیں۔ کہیں کہیں یہ روایت بھی ملتی ہے" اوتیت جوامع الکلم" مجھے جوامع الکلم دیئے گئے ہیں۔ ایک روایت یہ بھی ہے۔ "بعثت بجوامع الکلم" میں جوامع الکلم کے ساتھ مبعوث کیا گیا ہوں۔ یہ ایک صحیح اور مشہور حدیث ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضورؐ کے زمانے میں یہ لفظ موجود تھا اور اہل عرب اس سے واقف تھے۔ یہاں یہ دعویٰ تو نہیں کیا جا سکتا کہ یہ لفظ سب سے پہلے آنحضورؐ کی زبان مبارک سے ادا ہوا۔ لیکن اس سے پہلے کی کوئی شہادت مجھے ابھی تک نہیں ملی۔ خود یہ حدیث بھی "جوامع الکلم" کی ایک اچھی مثال بن سکتی ہے۔ یہ خیال کہ جوامع الکلم صرف آنحضور کے حکیمانہ اقوال کے لئے استعمال ہوتا ہے یا ہو سکتا ہے درست نہیں ہے۔ "جوامع الکلم" کے نام سے عربی زبان میں کتابوں کی موجودگی یہ ظاہر کرتی ہے کہ یہ لفظ آنحضور کے لئے مخصوص نہیں ہے۔ احمد فتحی زغلول پاشا نے ڈاکٹر گستاؤ لیبان کی ایک کتاب کا عربی میں ترجمہ کیا اور اس کا نام "جوامع الکلم" رکھا۔ یہ نہیں معلوم کہ اصل فرنچ میں اس کا نام کیا تھا۔ یقیناً جوامع الکلم کا ہم معنی کوئی لفظ رہا ہوگا۔ ڈاکٹر لیبان نے اس میں اپنی مختلف تصانیف سے ایسے اقوال اور جملے یکجا کر دیئے ہیں جو ان کے خیال میں جوامع الکلم کا درجہ رکھتے ہیں۔ احمد فتحی نے ڈاکٹر لیبان کے لکھے ہوئے مقدمہ میں ان کے لئے "قضایا جامعہ" اور "صیغ مختصرہ" کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ یہ عربی ترجمہ ۱۹۲۲ء میں مصر سے چھپ کر شائع ہوا۔ آنحضورؐ کے ملفوظات پر مشتمل بعض کتابوں کا ذکر سنا گیا مگر ایسی کوئی کتاب میری نظر سے نہیں گذری۔

معنوی ارتقا: اس صرفی نحوی اور تاریخی تجزیہ کے بعد اس کے لغوی اور اصطلاحی مفہوم کو سمجھنا چنداں دشوار نہیں رہا۔ چھوٹا بڑا ہر قابل ذکر لغت مرکب صورت میں اس کا ذکر کرتا ہے۔ لسان العرب کے مطابق جوامع الکلم ایسے مقولوں یا اقوال کو کہتے ہیں جو "کثیر المعانی اور قلیل الالفاظ" ہوں۔ منجد میں اس طرح آتا ہے۔ الکلام الجامع: ماقلت الفاظہ وکثرت معانیہ۔ گویا ایسے چھوٹے مختصر جملے جو "قلّ و دلّ" کے مصداق ہوں ان کو جوامع الکلم کہتے ہیں۔ انگریزی زبان میں جہاں تک میرا علم ہے اس کے ہم معنی کوئی لفظ موجود نہیں ہے۔ COMPREHENSIVE BUT CONCISE کے فقرے سے اس مفہوم کو ادا کرتے ہیں MAXIM، PROVERB، SAYING وغیرہ کو بھی اس کا متبادل نہیں قرار دیا جا سکتا۔

اردو اور فارسی بھی اس لحاظ سے تہی دامن ہیں۔ کہاوت، ضرب المثل، مقولہ، قول اردو فارسی کے ایسے الفاظ ہیں جو قریب تر ہونے کے باوجود اس مفہوم کو ٹھیک ٹھیک ادا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو اور فارسی لغات نے بھی عربی سے مستعار لے کر اس کمی کو پورا کیا۔ چنانچہ اب جوامع الکلم بھی ان زبانوں کے ذخیرہ الفاظ میں اسی طرح شامل ہے جس طرح عربی کے بے شمار دوسرے مستعار الفاظ ہیں۔ اور یہ لغات اس کے معنی بتانے کے لئے کوئی متبادل لفظ دینے کی بجائے تشریحی جملہ درج

کرتے ہیں -

"جوامع الکلم : وہ کلام جس کے لفظ تھوڑے ہوں اور مطلب بہت نکلے "۔

(نورا للغات)

"جوامع الکلم : چند احادیث اند کہ ہر یک از آں ہا باوجود اختصار الفاظ و عبارت، مطالب کثیر را مشتمل است"۔

(فرہنگ انندراج)

جوامع الکلم کا ابتدائی مفہوم بس اسی قدر ہے کہ کم الفاظ میں زیادہ معانی سمو دیے جائیں - اردو کے ایک محاورہ میں اسی کو "کوزے میں دریا بند کرنا" کہتے ہیں - مرزا غالب اس نکتے سے آشنا تھے - اپنے کلام کے بارے میں ان کا یہ دعویٰ ہے ؎

گنجینہ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

شاعرانہ تعلی کی ترنگ میں وہ کچھ زیادہ ہی آگے نکل گئے ہیں - لیکن یہ واقعہ ہے کہ غالب کے کلام میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے -

نطق یا کلام انسان کا نوعی خاصہ ہے - اسی لئے انسان کی منطقی تعریف یوں کی جاتی ہے - "الانسان حیوانٌ ناطق"۔ انسان حیوان ناطق ہے - جس طرح انسان اور حیوان میں نطق کے ذریعے فرق کیا جاتا ہے - اسی طرح سب انسان بھی نطق کے ایک درجے پر نہیں ہوتے اور ان کے مابین یہی نطق فرق مراتب کا سبب بنتا ہے - یہی حال مختلف طبقاتی گروہوں، مختلف خطوں میں بسنے والوں اور مختلف زبانیں بولنے والوں کا ہے - جملہ صفات حسنہ کا منبع اول اللہ تعالیٰ ہے اس لئے وہ صفات سب سے پہلے اور سب سے زیادہ اکمل اور اتم درجے پر اللہ تعالیٰ میں پائی جاتی ہیں - اس کے بعد انبیاء کا درجہ آتا ہے جن کو مبدأ فیاض سے براہ راست سب سے زیادہ حصہ ملتا ہے - اس کے بعد حکماء فلاسفہ، خطباء ادباء اور شعراء وغیرہ کا درجہ آتا ہے - جن کی صلاحیتیں کچھ وہبی اور کچھ کسبی ہوتی ہیں - سب سے آخر میں عام انسان آتے ہیں جن کا درجہ حیوانوں سے بہت بلند اور انبیاء وغیرہ سے بہت پست ہوتا ہے - ان مختلف طبقات کے افراد کے مابین بھی ان کے قوائے ذہنی و عقلی کے فرق کی وجہ سے نیز دوسرے خارجی عوامل کے باعث مدارج کا اختلاف ہوتا ہے - اور اسی نسبت سے ان افراد یا گروہوں میں نطق کی جبلت ظہور کرتی ہے - نطق محض بولنے کو نہیں کہتے - بولنا نطق کا ایک ادنیٰ مظہر ہے - نطق دل و دماغ کے اس پیچ در پیچ عمل کا نام ہے جس کے نتیجے میں کوئی فکر یا خیال تہذیب و ترتیب کے مراحل سے گذر کر موزوں اور متناسب الفاظ کا قالب اختیار کرتا ہے - حرف و صوت اسی فکر کے لئے فقط سواری کا کام دیتے ہیں - آواز جانور بھی نکالتے ہیں لیکن اس کی وجہ سے ان کو ناطق نہیں کہا جا سکتا - نطق دو چیزوں سے مرکب ہے - ایک فکر و خیال دوسرے صوتی اظہار - انہی کو معانی اور الفاظ بھی کہا جاتا ہے - انسان کی قوت گویائی کا کمال اس میں ہے کہ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معانی پہنچائے جائیں -

کلام کا یہ وصف بلاغت کے عناصر ترکیبی میں سے ایک اہم عنصر ہے اور جوامع الکلم کی تو بنیاد ہی اسی وصف یا عنصر پر ہے - جیسا کہ بیان کیا گیا نطق انسان کی خاصیت نوعی ہے - اس لیے ہمیشہ سے اس کے کمالات نطق کے کرشمے مختلف صورتوں

میں ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ جن میں سے ایک صورت جوامع الکلم کی ہے۔ ہر ملک ہر زبان ہر دور کے ادب میں جوامع الکلم کو مقبولیت حاصل رہی اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس قسم کے جامع اور مختصر فقرے آسانی سے دماغ کی گرفت میں آجاتے ہیں اور حافظے میں باقی رہتے ہیں۔ لیکن رسول اکرمؐ سے پہلے تاریخ تمدن کا یہ سرمایہ جو صدیوں میں جمع ہوا، گراں قدر ہونے کے باوجود زیادہ وقیع نہیں ہے۔ آنحضورؐ کا زمانہ جملہ کمالاتِ انسانی کا نقطۂ عروج ہے۔ آپ کے ظہور سے نبوت ہی کی تکمیل نہیں ہوئی بلکہ اس کے جلو میں جوامع الکلم کا گنجِ شائگاں بھی دنیا کو ملا۔ آپ سے پہلے کسی نبی کی سیرت میں یہ ذکر نہیں ملتا کہ اس نے کہا ہو کہ بعثت بجوامع الکلم یا اوتیت جوامع الکلم اور جریدۂ تاریخ پر اس کی نسبت یہ الفاظ ثبت ہوں۔ وصفتہ صلی اللہ علیہ وسلم انہ کان یتکلم بجوامع الکلم۔ (لسان العرب) آپ کی صفت یہ بیان کی جاتی ہے کہ آپ جوامع الکلم میں گفتگو فرماتے تھے۔
آپ سے دین ہی کی تکمیل نہیں ہوئی جملہ علوم و فنون اور مظاہر تہذیب و تمدن کی ترقی کا بھی سامان ہوا۔ نبی آخر الزماں ہونے کے علاوہ آپ کا تعلق ایک ایسی قوم سے تھا جو خود کو عرب یعنی فصیح اللسان کہتی تھی اور اپنے مقابلے میں ساری دنیا کو عجم یعنی گونگا سمجھتی تھی۔ عربی آپؐ کی مادری زبان تھی جو دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں میں اس لحاظ سے ممتاز تھی کہ اس کی فصاحت و بلاغت ضرب المثل تھی۔ آپ اس زبان کے بولنے والوں میں سب سے اعلیٰ و افضل تھے۔ صحیح حدیث ہے۔ انا افصح العرب ولا فخر۔ میں دنیائے عرب کا فصیح ترین انسان ہوں اور یہ فخر کی بات نہیں۔ ملک عرب کا عربی بولنے والا افصح اللسان پیغمبر جو مبدأ فیاض سے کسبِ فیض کرتا تھا اس کی زبان سے جوامع الکلم کے پھول جھڑے تو یہ عین اقتضائے فطرت تھا۔

باعتبار لغت "جوامع الکلم" ایسے کلام کو کہیں گے جو مختصر اور جامع ہو، یہ ضروری نہیں کہ اس کا مضمون بھی عمدہ ہو لیکن عرف عام میں اس کا استعمال شروع ہی سے ایسے کلام کے لیے ہوتا آیا ہے جس میں اس پہلو کو خصوصیت کے ساتھ مدنظر رکھا گیا ہو۔ چنانچہ عملاً اس کا اطلاق ایسے جامع اور مختصر کلام پر کیا گیا جس میں نصیحت، پند و موعظت، زندگی کے تجربات کا نچوڑ، علم و حکمت کی بات، کوئی آفاقی صداقت، کوئی عام الورود حقیقت، کوئی باریک نکتہ، فلسفۂ اخلاق کا کوئی قضیہ، کوئی درس ہدایت کوئی قاعدہ کلیہ، کوئی اچھوتا خیال، کوئی غیر معمولی فکر، کوئی نادر مضمون بیان کیا گیا ہو۔ اور اس کے لیے الفاظ ایسے جچے تلے رکھے گئے ہوں جو پہلودار ہوں اور تہ در تہ معانی کو متضمن ہوں۔ زندگی کے جس شعبے سے اس کا تعلق ہو اس کا جوہر اور ست نکال کر رکھ دیا گیا ہو۔ اس کو دیکھ کر آدمی سر دھنے لیکن خود کہنا چاہے تو کہہ نہ سکے۔ بلکہ اس کو سمجھنے میں بھی کاوشِ فکر سے کام لینا پڑے۔ زبان شعر میں جس چیز کو سہل ممتنع کہتے ہیں، وہ جوامع الکلم کے اجزائے ترکیبی کا فقط ایک جز ہے۔ دوسرے اجزاء کے ساتھ ملنے کے بعد جس کے خواص اور ہو جاتے ہیں۔ شاعری اور پیغمبری میں جو فرق ہے وہی فرق سہل ممتنع اور جوامع الکلم میں ہے۔ شعراء نے "شاعری جزویست از پیغمبری" کا دعوے باطل کیا لیکن انبیاء کو شاعری سے کیا نسبت ان کی طرف سے اعلان برأت کی شہادت خود قرآن میں موجود ہے۔ وما علمنٰہ الشعر وما ینبغی لہ۔ ہم نے اسے شعر نہیں سکھایا اور نہ یہ اس کی شان کے شایان ہے۔ محض نفی نہیں کی گئی بلکہ مرتبے سے فروتر قرار دیا گیا۔

جوامع الکلم کا سب سے بڑا خزانہ قرآن مجید میں جمع ہے اور جوامع الکلم کے اعلیٰ اور کامل نمونے اس خزانے میں

موجود ہیں۔ چیدہ چیدہ جملوں کے علاوہ قرآن مجید کی چھوٹی سورتیں اپنے الفاظ کے اختصار اور مطالب کی جامعیت کے اعتبار سے "جوامع السور" کہی جاسکتی ہیں۔ چنانچہ بخاری کی ایک حدیث میں سورہ اخلاص کے بارے میں آتا ہے کہ وہ "ثلث قرآن" یعنی ایک تہائی قرآن ہے۔ لیکن چونکہ قرآن اللہ کا کلام ہے اس لئے ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ البتہ اس قدر کہنا بے محل نہ ہوگا کہ رسول اکرمؐ کے ارشادات میں جوامع الکلم کا جو قدسی الاصل ذخیرہ ہے وہ دوسرے عوامل کے ساتھ قرآن مجید کے فیضان تربیت کا نتیجہ ہے۔ آپ مہبط وحی، حامل قرآن، داعی دین اسلام ہیں۔ ۲۳ سال تک برابر قرآن کا پیغام قرآن ہی کی زبان میں پہنچاتے رہے۔ آپ کی احادیث میں مطالب کا ہی نہیں انداز بیان کا بھی اثر ہے۔ جس میں صاف قرآن کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔ قبل اس کے کہ ہم مثال کے لئے احادیث رسولؐ سے ایسے منتخب فقروں کو درج کریں جو جوامع الکلم کے زمرے میں آتے ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آنحضورؐ کے جوامع الکلم کی بعض امتیازی خصوصیات مختصراً بیان کر دیں۔

ایجاز و اختصار جوامع الکلم کی ایک بنیادی خصوصیت ہے۔ جس کے بغیر جوامع الکلم کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن آنحضورؐ کے جوامع الکلم میں یہ وصف منتہائے کمال کو پہنچا ہوا نظر آتا ہے۔ حدیہ کہ بعض جملے مبتدا خبر، یعنی صرف دو لفظوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ یہ واضح رہے کہ جملہ یا کلام کے لیے کم سے کم دو لفظوں کا ہونا ضروری ہے۔ ایک لفظ پر جملے یا کلام کا اطلاق نہیں ہوتا۔ فعلیہ جملے کی بعض صورتوں میں بسا اوقات ایک ہی لفظ ہوتا ہے مگر وہاں فاعل محذوف ہوتا ہے مثلاً "جا" جو اصل میں "تو جا" ہے۔

جوامع الکلم کی دوسری بنیادی خصوصیت جامعیت ہے۔ آنحضورؐ کے جوامع الکلم اس لحاظ سے بھی اپنی نظیر آپ ہیں۔ ایک تو الفاظ کا انتخاب لاجواب ہوتا ہے، دوسرے الفاظ کی ترتیب اور بندش ایسی ہوتی ہے کہ وہ مطالب کی وسعتوں کو اپنے اندر سمیٹ لیتی ہے۔ ایک حرف ایک جملے کا کام کرتا ہے۔ یہ خوبی عربی زبان کی ہے مگر زبان اپنے کمال کے اظہار کے لیے محتاج ہے کسی بولنے والے کی۔ آنحضورؐ کے جوامع الکلم میں جامعیت کا ایک پہلو اور بھی ہے جس کا تعلق آپ کے منصب نبوت سے ہے۔ آفاقیت اور ابدیت کے علاوہ آپ کا دین ہر پہلو کو محیط ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اس لئے حکماً و فلاسفہ کے برعکس آپ کے جوامع الکلم میں اس لحاظ سے بھی جامعیت نظر آتی ہے۔

تعلیم حکمت آپ کی بعثت کے مہمات مقاصد میں سے ایک ہے۔ آپ نے اپنے پیروکاروں میں حکمت کو "خیر کثیر" کی حیثیت سے متعارف کرایا اور حکمت کو مومن کا گمشدہ مال قرار دیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ حکمت کے صحیح تصور سے روشناس کرایا۔ اس لئے آپ کے جوامع الکلم میں حکمت کے ایسے انمول موتی ہیں جو کسی حکیم یا فلسفی کے یہاں نظر نہیں آتے۔ آپ کے خزانے میں ایسے جوامع الکلم بھی ہیں جن کا عنوان ہی حکمت ہے۔ الحکمۃ ضالۃ المومن اور راس الحکمۃ مخافۃ اللہ، جیسے جوامع الکلم جہاں ہوں وہاں کی حکمتوں کا کیا ٹھکانہ۔

آپ کا لایا ہوا دین جن خصوصیات کا حامل ہے وہ تمام خصوصیات کم و بیش آپ کے جوامع الکلم میں بھی ملتی ہیں۔ وہ فطرت سے قریب ہیں، انسانی نفسیات سے ہم آہنگ ہیں، عقل کو اپیل کرتے ہیں، دل میں اتر جاتے ہیں، ان سے اعلیٰ جذبات انسانی کو تسکین حاصل ہوتی ہے، وہ روح کو بالیدگی بخشتے ہیں۔ وہ تہذیب و شائستگی سکھاتے ہیں، نفس کا تزکیہ کرتے ہیں۔ سفلی جذبات کو مغلوب کرنے میں مدد دیتے ہیں، فکر کی تعمیر کرتے ہیں، اخلاق کو سنوارتے ہیں۔ اچھے شعر کی طرح جلد یاد ہو جاتے

ہیں اور حافظے میں محفوظ رہتے ہیں۔ زندگی کے سفر میں تاریک راہوں کو روشن کرتے ہیں۔

جوامع الکلم ذیل میں رسول اکرم کی احادیث سے کچھ منتخب جوامع الکلم، بطور نمونہ مشتے از خروارے پیش کئے جاتے ہیں۔ پہلے متن حدیث پھر اردو ترجمہ اور اس کے بعد مختصر تشریح:

وانما الاعمال بالنیات ولکل امرءٍ ما نوی۔ (بخاری)

عمل کا مدار نیت پر ہے اور ہر شخص کے لئے وہی کچھ ہے جس کی اس نے نیت کی۔

نیت کا حال اللہ تو جانتا ہی ہے اور کوئی دوسرا کوئی نہیں جان سکتا مگر خود وہ شخص تو جانتا ہی ہے جو فعل کا فاعل ہے۔ اور یوں وہ اپنے عمل کے حسن و قبح کا بخوبی فیصلہ کر سکتا ہے۔

وانما الاعمال بالخواتیم۔ (بخاری و مسلم)

اعمال کا مدار انجام پر ہے۔

وانما الاعمال بالنیات کی طرح اس حدیث میں بھی ایک بنیادی اور اہم حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس میں زندگی اور اس کے اعمال پر ایک اور زاویے سے نظر ڈالی گئی ہے۔ اور وہ یہ کہ اصل شے انجام اور نتیجہ ہے۔ اسی لیے خاتمہ بالخیر کی دعا مانگی جاتی ہے۔ انگریزی کا ایک مقولہ ہے۔ ALL'S WELL THAT ENDS WELL اردو کا ایک مصرعہ ہے۔

ع "کام وہ اچھا ہے جس کا کہ مآل اچھا ہے۔"

لیکن ان کو آنحضورؐ کے اس ارشاد سے کیا نسبت۔ ان میں نہ لفظی اعتبار سے وہ اختصار ہے نہ معنوی اعتبار سے وہ جامعیت۔ ان فقروں میں صرف اچھے پہلو کا ذکر ہے جبکہ حدیث اچھے اور بُرے دونوں پہلوؤں کو محیط ہے۔ ارشادِ نبوت میں ترغیب و ترہیب تبشیر و انذار ساتھ ساتھ آتے ہیں۔ بلکہ انذار کو تبشیر پر من وجہ فوقیت حاصل ہے۔ بُرے انجام سے ڈرانا اچھے انجام کی خوشخبری سے بہتر ہے۔ انسان کے لیے اتنا ہی کافی نہیں کہ وہ نیک عمل کرے اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ بُرے کاموں سے بچے۔

الدین النصیحۃ (مسلم)

دین اخلاص و خیر خواہی کا نام ہے۔

انسان کا کوئی عمل دین کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ وہ خلوص، سچائی اور صفائی باطن پر مبنی نہ ہو۔ گویا دین کی روح اخلاص ہے۔

ان الدین یسر (بخاری)

بے شک دین آسانی ہے۔

زندگی کی مثال ایک صحرا یا جنگل کی ہے جس میں راستہ نہیں ہوتا۔ دین کی حیثیت راستہ کی ہے جس پر چل کر انسان منزل مقصود تک پہنچ جاتا ہے۔ اس صورتِ حال میں خود کو رکھ کر دیکھیں تو دین کا آسانی ہونا سمجھ میں آجاتا ہے۔ یہ واضح رہے کہ دین کے ایک معنی راستے کے بھی ہیں۔ بعض لوگ اس جملے کا ترجمہ "دین آسان ہے۔" کر دیتے ہیں۔ یہ ترجمہ صحیح نہیں۔ آسان یسیر کا ترجمہ ہے۔ یسر

آسانی کو کہتے ہیں۔

من حسن اسلام المرء ترکہ مالا یعنیہ۔ (ترمذی)

کسی آدمی کے اسلام کی اچھائی یہ ہے کہ وہ لایعنی باتوں کو چھوڑ دے۔
زندگی کی وہ تمام باتیں لایعنی کے حکم میں داخل ہیں جو غیر ضروری فضول، بے فائدہ، دور از کار اور غیر متعلق ہوں۔ قرآن میں مسلمانوں کی ایک خصوصیت یہ بھی بتائی گئی ہے کہ وہ لغویات سے منہ پھیرنے والے ہیں۔ ھم عن اللغو معرضون۔ لغو یا لایعنی کی شناخت انسان کی فطرت سلیمہ خود کر لیتی ہے۔ نفس لوامہ جسے ضمیر کہتے ہیں اگر مر گیا ہے تو اور بات ہے ورنہ انتباہ کے لیے وہ کافی ہے۔

الدال علی الخیر کفاعلہ

بھلائی کا راستہ بتانے والا اس کے کرنے والے کی طرح ہے۔
امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اسلام کی بنیادی تعلیمات میں سے ہے اور قرآن میں اس کا ذکر بار بار آتا ہے۔ لیکن نیکی کی ترغیب کے لئے یہ فقرہ کس قدر مؤثر ہے۔ اس سے ملتی جلتی ایک اور حدیث ہے۔

من سن سنۃ حسنۃ ومن سن سنۃ سیئۃ ...... الخ

جس کسی نے کوئی اچھی یا بری روایت قائم کی تو اسے نہ صرف اپنی بلکہ اس پر عمل کرنے والے دوسرے لوگوں کی بھی جزا یا سزا ملے گی۔

خیر الحدیث کتاب اللہ۔ خیر الھدی ھدی محمد، شر الامور محدثاتھا۔ وکل بدعۃ ضلالۃ۔ (مسلم)

سب سے اچھی بات اللہ کی کتاب ہے۔ سب سے اچھا طریقہ محمد کا طریقہ ہے۔ سب سے بُرا کام وہ ہے جو نیا نکالا گیا ہو اور ہر نئی بات گمراہی ہے۔
اس ایک حدیث میں چار جوامع الکلم یکجا ہیں جو باہم مربوط بھی ہیں اور مستقل بالذات بھی۔ ان میں سے ایک ایک فقرے کی شرح کے لیے ایک ایک دفتر درکار ہے۔

آیۃ المنافق ثلث اذا حدث کذب واذا وعد اخلف واذا اؤتمن خان (بخاری و مسلم)

منافق کی پہچان تین چیزیں ہیں۔ جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو اس کی خلاف ورزی کرے اور جب اس کو امانت سونپی جائے تو خیانت کرے۔
زندگی اور معاشرہ کی ان تین اخلاقی برائیوں کو تین مختصر ترین جملوں میں سمو کر ان کی شناعت کو جس طرح واضح کیا گیا ہے واقعہ یہ ہے کہ اس کی توفیق حامل قرآن نبی آخر الزماں ہی کو ہو سکتی تھی۔

کفی بالمرء کذبا ان یحدث بکل ما سمع۔ (مسلم)

جھوٹ کے ثبوت کے لیے یہ کافی ہے کہ انسان جو کچھ سنے اس کو بیان کرتا پھرے۔
قرآن مجید کی تعلیم ہے کہ اگر کسی بدکردار آدمی سے کوئی بات سنو تو اس کی تحقیق کر لو۔ ان جاءکم فاسق بنبأ فتبینوا ...

اس حدیث میں بھی ذرا مختلف انداز سے اسی تعلیم کو دہرایا گیا ہے۔

الفقر فخری۔

بے مانگی ہی میرا سرمایہ افتخار ہے۔

آنحضورؐ کا یہ ارشاد ان لوگوں کے لئے عبرت کا تازیانہ ہے جو دولت دنیائے دوں کا انبار جمع کرنے میں سرگرداں رہتے ہیں۔

ولکن الغنی غنی النفس۔ (بخاری و مسلم)

امیری دل کی امیری ہے۔

امیری دل کی اس کیفیت کا نام ہے جس کو سماحت اور سیر چشمی کہتے ہیں۔ شیخ سعدیؒ کا مصرعہ ہے۔

تونگری بدل است نہ بمال

شیخ سعدی ہی کا ایک اور مقولہ ہے:

"آناں کہ غنی تراند محتاج تراند"۔

والحیاء شعبۃ من الایمان۔ (بخاری و مسلم)

اور حیا بھی ایمان کا ایک شعبہ ہے۔

یہاں لفظ حیا اپنے وسیع معنی میں استعمال ہوا ہے اور اس کو ایمان کا ایک شعبہ قرار دینا بلاغت کی جان ہے۔

السوال ذل۔

مانگنا ذلت ہے۔

بھیک مانگنا، کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانا، کسی قسم کا کوئی سوال کرنا رسوائی کی بات ہے۔ یہاں تک کہ اگر کسی سوار کا کوڑا زمین پر گر گیا ہو تو اس کو چاہیے کہ سواری سے اتر کر خود اٹھائے۔ سوال کی کراہیت کو واضح کرنے اور دل میں بٹھانے کے لئے اس سے بہتر اسلوب نہیں اختیار کیا جا سکتا۔ ایک طرف اغنیاء اور اصحاب استطاعت کو یہ تعلیم دی گئی کہ اما السآئل فلا تنھر۔ دوسری طرف سائل کو سوال کی ذلت سے بچاکر اس کی عزت نفس کو محفوظ کرنے کا اہتمام کیا گیا۔

لیس منا من لم یرحم صغیرنا ولم یوقر کبیرنا (ترمذی)

وہ ہم میں سے نہیں جو ہمارے چھوٹوں پر رحم اور بڑوں کی عزت نہ کرے۔

فرق مراتب کے ساتھ حسن معاشرت کی اس سے بہتر تعلیم نہیں ہو سکتی۔

من لا یَرحم لا یُرحم (بخاری و مسلم)

جو رحم نہیں کرتا وہ رحم نہیں کیا جاتا۔

ایک حدیث کے الفاظ یوں ہیں: لا یرحم اللہ من لا یرحم الناس۔

اللہ اس پر رحم نہیں کرتا جو لوگوں پر رحم نہیں کرتا۔

اس بات کو اردو کے شاعروں نے نظم کر دیا ہے۔

؎ خدا رحم کرتا نہیں اس بشر پر
نہ ہو درد کی چوٹ جس کے جگر پر

؎ کرو مہربانی تم اہل زمین پر
خدا مہرباں ہوگا عرش بریں پر

من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ۔ (ترمذی)

جس نے لوگوں کا شکریہ ادا نہ کیا اس نے اللہ کا شکریہ بھی ادا نہ کیا۔

مطلب یہ کہ انسانوں کا شکریہ ادا کرنا ہی اللہ کا شکریہ ادا کرنا ہے۔ دنیا دار الاسباب ہے کوئی بات جس پر شکریہ واجب ہو کسی انسان کے ذریعے انجام پاتی ہے۔ اس لئے پہلے اس کا شکریہ ادا کرنا چاہیے اور اللہ تو اس سے بے نیاز ہے۔

انزلوا الناس منازلھم (ابوداؤد)

لوگوں کو ان کی حیثیت اور مرتبے کے مطابق جگہ دو۔

یہ بھی آداب معاشرت کا ایک ایسا مسئلہ ہے جس کو نظر انداز کرنے سے بہت سی معاشرتی خرابیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔

ید اللہ علی الجماعۃ، من شذ شذ فی النار (ترمذی)

اللہ کا ہاتھ جماعت کے اوپر ہوتا ہے۔ جو جماعت سے الگ ہوگا وہ آگ میں جا پڑے گا۔

مسلمانوں کی جماعت کے اوپر اللہ کے ہاتھ کا سایہ ہوتا ہے۔ وہ اس کی حفاظت کرتا ہے۔ جو مسلمانوں کو چھوڑ کر علٰحدہ ہوگا وہ اللہ کی حفاظت کا حقدار نہیں رہے گا۔ اس کا انجام تباہی اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ یہ اجتماعِ انسانی کا ایک بنیادی مسئلہ ہے اور زندگی کے مسلمات سے ہے۔ لیکن اسے حدیث میں جس اسلوب سے بیان کیا گیا ہے وہ مافوق البشر ہے۔

انصر اخاک ظالماً او مظلوما۔ (بخاری و مسلم)

اپنے بھائی کی مدد کرو وہ ظالم ہو یا مظلوم۔

بھائی سے مراد مسلمان بھائی ہے۔ ظالم کی مدد اس طرح کہ اُسے ظلم سے روکا جائے۔

الظلم ظلمات یوم القیامۃ۔ (بخاری و مسلم)

ظلم قیامت کے دن تاریکی ہی تاریکی ہوگا۔

ظلم اور ظلمت میں معنوی اشتراک کے علاوہ جو صوری مماثلت ہے اہلِ ذوق اُسے محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔

اتق دعوۃ المظلوم فانہ لیس بینھا و بین اللہ حجاب۔ (بخاری و مسلم)

مظلوم کی بد دعا سے ڈرو اس لئے کہ اس کی بد دعا اور اللہ کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہے۔

مظلوم کی آہ سیدھی جا کر عرشِ الٰہی سے ٹکراتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی فریاد خود سنتا ہے اس لیے ہر اس شخص کو اس سے ڈرنا چاہیے

جو بالواسطہ یا بلاواسطہ اس کا ذمہ دار ہو۔

المستشار موتمن (ترمذی)

جس سے مشورہ لیا جاتا ہے وہ امین ہوتا ہے۔

مبتدا خبر، دو لفظوں پر مشتمل یہ جملہ اپنے اندر نصیحتوں کا ایک دفتر لیے ہوئے ہے۔

لا یلدغ المومن من جحر واحد مرتین۔ (بخاری و مسلم) مومن ایک سوراخ سے دوبار نہیں ڈسا جاتا۔

اس کلمہ جامعہ میں فراست المومن کی طرف استعارہ کی زبان میں لطیف اشارہ ہے۔

ارشاداتِ نبویؐ (جوامع الکلم)

ڈاکٹر ظہور احمد اظہر

حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ ارشاداتِ گرامی ایسے ہیں جو حروف و الفاظ کے اعتبار سے تو مختصر اور موجز ہیں مگر معانی کے لحاظ سے بہت وسیع اور بعید جامع ہیں؛ محدثین اور عربی ادب کی اصطلاح میں اس نوع کے ارشاداتِ نبوی جوامع الکلم کہلاتے ہیں اور یہ اصطلاح آپؐ کے اپنے ایک ارشاد پر مبنی ہے [1]

نُصِرْتُ بِالصَّبَا وَأُوْتِيْتُ جَوَامِعَ الْكَلِمِ : اللہ نے (غزوہ خندق میں) میری بادِصبا کے ذریعے مدد فرمائی اور مجھے جامع کلمات بھی عطا کیے گئے ہیں۔

جاحظ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات "جوامع الکلم" کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے [2]

وَهُوَ (الكلام) القليلُ الجامعُ للكثير۔

"کلامِ نبوت کے جوامع الکلم سے مراد ایسا کلام ہے جو قلیل الالفاظ ہوتے ہوئے بھی کثیر المعانی ہوتا ہے"

گویا یہ ایک جامع کلام ہے جس کی امتیازی خوبی کوزے میں دریا بند کرنا ہے۔ الفاظ اور حروف کی تعداد تو بہت قلیل و مختصر ہوتی ہے مگر اس میں فکر و معنی کا بحرِ زخار پنہاں ہوتا ہے، چنانچہ علامہ محمد عطیۃ الابراشی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جوامع الکلم کے متعلق اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے: [3]

وَكلامُهُ الجامعُ الّذي لا يُجارىٰ فى فصاحتِهٖ ولا يُبارىٰ فى بلاغتِهٖ، والّذي هُوالنهايةُ في البيانِ والغايةُ في البرهانِ، المشتملُ على جوامعِ الكلمِ وبدائعِ الحِكَمِ، المتضمّنُ بقليلِ المباني كثيرًا من المعاني: آپؐ کا وہ جامع کلام جس کی فصاحت و بلاغت کا مقابلہ اور برابری کی ہی نہیں جا سکتی، جو بیان و بلاغت کا آخری درجہ اور بے انتہا مدلل بھی ہے، جو جامع کلمات اور انوکھی حکمت پر مشتمل ہوتا ہے، اس کے الفاظ و حروف کی تعداد تو قلیل ہوتی ہے لیکن معانی کی فراوانی ہوتی ہے۔

نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کے کلامِ معجز نظام کی یہ بھی ایک منفرد خصوصیت بن گئی ہے کہ آپؐ کے یہ جوامع الکلم ارشادات عربی ادب میں ضرب المثل بن گئے ہیں اور مختلف ادوار کے خطباء اور انشا پرداز اپنے خطبات اور نگارشات کو ان پرحکمت کلمات سے مزین کرتے اور ان کے اقتباسات پیش کرتے رہے ہیں، الشفا بتعریف حقوق المصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے مصنف قاضی عیاض تو یہاں تک کہہ گئے

---

[1] البیان والتبیین ۴/۲۹ [2] حوالہ سابق [3] عظمت الرسول ص ۲۷۷۔

ہیں کہ آپ کے ان جوامع الکلم سے لوگوں نے اپنے دفاتر انشاء کو سجایا اور ان کے الفاظ و معانی کے بارے میں کتابوں کی کتابیں جمع کر دی ہیں [۱]

اما کلامہ المعتاد و فصاحتہ المعلومۃ و جوامع کلمہ، حکمہ المأثورۃ فقد الف الناس فیھا الدواوین و جمعت فی ألفاظھا و معانیھا الکتب۔

"جہاں تک آپ کے معمول کے کلام، آپ کی مشہور فصاحت، جامع کلمات اور منقول کلمات حکمت کا تعلق ہے تو ان سے متعلق لوگوں نے دیوان و دفاتر تصنیف کر ڈالے ہیں اور ان کے الفاظ و معانی کے بارے میں کتابیں جمع کر دی گئی ہیں!"

یہ جامع کلمات حکمت نبوت محمدی کی ایک خصوصیت اور نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کا طرۂ امتیاز ہے، بقول قاضی عیاض [۲]

اوتی جوامع الکلم و خص ببدائع الحکم:

آپ کو جامع کلمات عطا کیے گئے اور انوکھی حکمت بھری باتیں آپ کے خصائص نبوت میں سے ہیں!

جاحظ نے تو آپ کی لسان معجز بیان سے صادر ہونے والے بعض کلمات حکمت ایسے بھی دیے ہیں، جن کا آپ سے پہلے عربی زبان میں کہیں وجود ہی نہ تھا، مگر بعد میں وہ ضرب المثل بن کر کلام عرب کی زینت بن گئے، وہ لکھتا ہے [۳]

وسنذکر من کلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مما لم یسبقہ الیہ عربی ولا شارکہ فیہ أعجمی ولم یدع لأحد ولا ادعاہ احد مما صار مستعملا و مثلا سائرا۔

ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام میں سے کچھ ایسے اقوال ذکر کریں گے، جو آپ سے پہلے کسی عرب نے کبھی نہیں بولے تھے، ان میں کوئی غیر عرب آپ کا شریک نہ تھا، نہ تو ان اقوال کی کسی کی طرف نسبت کی گئی ہے اور نہ ان کا کسی نے کبھی دعویٰ کیا ہے مگر اب یہ اقوال حکمت مستعمل ہیں اور مشہور ضرب الامثال کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں، مثلاً:

(۱) یَا خَیْلَ اللہِ ارْکَبِیْ: اے اللہ کے شہسوارو! سوار ہو جاؤ!

(۲) مَاتَ حَتْفَ أَنْفِہٖ: وہ اپنی ناک سے کھو کر مرا یعنی اپنی موت کا سامان خود کیا، اپنے پاؤں پر کلہاڑا خود مارا۔

(۳) لَا تَنْتَطِحُ فِیْہِ عَنْزَانِ: اس میں دو مینڈھے ایک دوسرے کو سینگ نہیں مارتے، یعنی اس بات میں کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔

(۴) اَلْاٰنَ حَمِیَ الْوَطِیْسُ: اب تنور گرم ہو گیا ہے یعنی اب معرکہ کارزار گرم ہو گیا ہے۔

یہ محاورات سب سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ادا ہوئے مگر اب شعر و نثر میں زبان زد خلائق ہیں۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جوامع الکلم کے بارے میں لکھا ہے کہ وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی کے مطابق آپ کے یہ کلمات حکمت روح القدس کے توسط سے فیض ربانی تھا۔ ان کے الفاظ ہیں [۴]

وَکَانَ أَوْجَزَ النَّاسِ کَلَامًا وَبِذٰلِکَ جَاءَہٗ جِبْرِیْلُ وَکَانَ مَعَ الْاِیْجَازِ یَجْمَعُ کُلَّ مَا اَرَادَ،

---

[۱] الشفا ۱/۱۶۳ [۲] الشفا ۱/۱۶۷ [۳] البیان والتبیین ۲/۱۶ تا ۱۷ [۴] احیاء علوم الدین ۲/۳۷۴

وکان یتکلم بجوامع الکلم لا فضول ولا تقصیر ۔

"آپؐ تمام انسانوں میں سب سے زیادہ موجز و مختصر بات کرنے والے تھے ۔ یہ فیض ربانی ان کے لیے جبریل امین لائے تھے ۔ اختصار کے ساتھ آپ جتنی جامع بات کرنا چاہتے تھے کر لیتے تھے ۔ آپ کا کلام جامع کلمات ہوتے تھے ۔ جن میں نہ فالتو بات ہوتی نہ کسی قسم کی کمی ہوتی تھی"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حسن بیان اور اعجاز کلام کے سلسلے میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا یہ قول بھی قابل ذکر ہے ۔

لقد طفت فی العرب وسمعت فصحاء ھم فما سمعت افصح منک فمن ادبک ؟ قال : ادبنی ربی فاحسن تادیبی :

یعنی میں نے قبائل عرب میں پھر کر ان کے فصحاء کو دیکھا ہے مگر آپؐ سے بڑھ کر فصیح میں نے کسی کو نہیں پایا آپ کو یہ ادب کس نے سکھایا آپؐ نے فرمایا : مجھے تو میرے رب نے سکھایا ہے اور خوب اچھے طریقے سے سکھایا ہے ۔

مگر علامہ مصطفٰے صادق الرافعی حضرت ابوبکرؓ کے اس قول سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ زمانہ صدر اسلام میں حضرت جبیر بن مطعمؓ سب سے بڑے ماہر انساب تھے ۔ مگر انہوں نے بھی یہ سب کچھ حضرت ابوبکرؓ سے سیکھا تھا جو اس عہد کے سب سے بڑے ماہر انساب تھے اور قبائل عرب سے پوری طرح آگاہ تھے ۔ فصاحت نبوی کے متعلق اُن کا یہ کہنا اس بات کی شہادت ہے کہ اس وقت عرب میں کوئی خطیب ایسا نہ تھا جو تمام قبائل کے لہجات سے واقف ہو اور ایسا منفرد انداز خطابت رکھتا ہو ۔ رافعی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جوامع الکلم کے متعلق لکھتے ہیں ۔

"ومن کمال تلک النفس العظیمۃ وغلبۃ فکرہ صلی اللہ علیہ وسلم علی لسانہ قل کلامہ وخرج قصدا فی الفاظہ محیطا بمعانیہ تحسب النفس قد اجتمعت فی الجملۃ القصیرۃ والکلمات المعدودۃ بکل معانیہا فلا تری من الکلام الفاظا ولکن حرکات نفسیۃ فی الفاظ وبھذا کثرت الکلمات التی انفرد بھا دون العرب وکثرت جوامع کلمہ وخلص اسلوبہ فلم یقصر فی شیئ ولم یبالغ فی شیئ واتسق لہ من ھذا الامر علی کمال الفصاحۃ والبلاغۃ مالو ارادہ مرید لعجز عنہ ولو ھو استطاع بعضہ لما تم لہ فی کل کلامہ لان مجری الاسلوب علی الطبع والطبع غالب مھما تشدد المرء وارتاض ومھما تثبت وبالغ فی التحفظ ۔

اس عظیم ہستی کے کمال اور زبان پر فکر کے غلبہ کے نتیجے میں آپؐ قلیل الکلام تھے ۔ اس کلام کے الفاظ معتدل انداز میں ادا ہوتے تھے اور اپنے اندر معانی کی گہرائی لیے ہوتے تھے ، دل یہ گمان کرتا ہے کہ مختصر سے جملے اور چند کلمات میں روح نبوت مجتمع ہو گئی ہے چنانچہ آپ کے کلام میں الفاظ نظر آنے کے بجائے الفاظ میں روحانی تحریکات رواں دواں ہیں یہی وجہ ہے کہ آپ کے کلام میں ایسے کلمات بکثرت ہیں ، جو عرب میں صرف آپؐ ہی نے منفردانہ انداز میں بولے ، آپؐ کے جوامع الکلم بےشمار ہیں ، پاکیزہ اسلوب ہے ، نہ کوئی کمی ، نہ کوئی مبالغہ ، اسی لیے آپؐ کے کمال فصاحت و بلاغت کو پانے کا ارادہ کرنے والا عاجز رہا ، اگر تھوڑا بہت کر بھی سکا مگر کسی کا تمام کلام ایسا نہ تھا ، کیونکہ اسلوب کا

دھارا فطرت کی بنیاد پر ہوتا ہے جس میں ریاضت اور محنت کو دخل نہیں ہوتا! "

فیضانِ نبوّت کے کچھ جوامع الکلم

۱۔ الناس کلھم سواء کأسنان المشط: یعنی سب لوگ کنگھی کے دندانوں کی طرح برابر ہیں۔

سب انسان ایک باپ کی اولاد ہیں۔ سب برابر ہیں حقوق اور فرائض سب کے مساویانہ ہیں۔ خاندانی یا نسلی وجاہت معتبر نہیں برتری اور فضیلت کا معیار صرف تقویٰ ہے۔ یہ تعلیم تاریخ انسانی میں سب سے پہلے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی دی اور اس پر عمل بھی کر کے دکھایا تھا۔ مصنوعی مساوات اور غریب طبقات کے مدعی تو صدیوں بعد پیدا ہوئے۔ اس موضوع کی تفصیل میں جانا ہمارا اس وقت مقصد نہیں۔ کہنے کی بات صرف یہ ہے کہ حضرت افصح العربؐ نے بندگانِ خدا کے مساویانہ حقوق و فرائض کو کنگھی کے دندانوں سے جو خوبصورت تشبیہ دی ہے۔ اس پر امام ادب ابو عثمان الجاحظ جھوم اٹھا تھا اور اس نے بعض عرب شعراء کے اشعار نقل کیے ہیں جن میں انسانی مساوات کو مختلف چیزوں سے تشبیہ دی گئی ہے مگر پست ہمت اور کوتاہ نظر افصح العرب صلی اللہ علیہ وسلم کی شاندار تشبیہ کو نہیں پہنچ پائے۔ ایک شاعر کہتا ہے :[۱]

سواء کأسنان الحمار فلا تری
لذی شیبۃ منھم علی ناشئ فضلا

یعنی اس قبیلے کے لوگ سب برابر ہیں، جیسے گدھے کے دانت ایک جیسے ہوتے ہیں۔ ان میں سے کسی بوڑھے کو کسی نوجوان پر کوئی فضیلت حاصل نہیں!

شعر نقل کرنے کے بعد جاحظ کہتا ہے :

"واذا حصلت تشبیہ الشاعر وحقیقتہ وتشبیہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم وحقیقتہ عرفت فضل ما بین الکلامین :

اگر آپ شاعر کی تشبیہ اور اس کی حقیقت کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشبیہ اور اس کی حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیں تو دونوں کلاموں کے درمیان وجہِ فضیلت آپ کو معلوم ہو جائے گی! "

۲۔ المرء کثیر بأخیہ : انسان اپنے بھائی کے سبب بہت کچھ بن جاتا ہے یعنی زیادہ لگتا ہے۔

۳۔ لاخیر فی صحبۃ من لا یری لک مثل ما تری لہ : ایسے شخص کی صحبت میں کوئی بھلائی نہیں ہو سکتی، جو تیرے بارے بھی اسی انداز میں نہ سوچے جس انداز میں تو اس کے لیے سوچتا ہے یعنی تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔

۴۔ الید العلیا خیر من الید السفلی والید (ہمین خیرا) : اوپر والا، (دینے والا) ہاتھ نیچے والے

---

[۱] البیان والتبیین ۲ : ۱۹۔

(لینے والے) ہاتھ سے بہتر ہے۔ اور سب سے پہلے اسے دو جس کی تم پر ذمہ داری آتی ہے۔

(۵) المسلمون تتکافأ دماؤھم ویسعی بذمتھم أدناھم ویرد علیھم اقصاھم وھم ید علی من سواھم:

یعنی مسلمانوں کے خون کی قدر و قیمت برابر ہے، ان میں سے چھوٹے سے چھوٹا اگر کسی کو امان دے دے تو اس کا پاس کرنا سب پر لازم ہے، ان میں سے دور کا فرد بھی ان کا جواب دے سکتا ہے۔ وہ غیروں کے مقابلے میں ایک ہاتھ کی طرح متحد ہیں۔

اس ارشادِ نبوی میں مسلم معاشرے میں فرد کی عظمت خودداری اور وحدتِ ملی کا خوب صورت تصور دیا گیا ہے۔

۶۔ الخیل معقود فی نواصیها الخیر إلی یوم القیامة [1] قیامت تک کے لیے گھوڑوں کی پیشانیوں پر بھلائی کے ہار سجا دیے گئے ہیں (یعنی گھوڑے ہمیشہ خیر و برکت کا باعث رہیں گے!)

۷۔ الناس کالإبل المائة لا تجد فیها الراحلة [2]: لوگ تو سو اونٹوں کے گلے کی مانند ہیں ان میں سواری کا اونٹ تجھے نہیں ملے گا (اتنی بڑی تعداد میں کام کا آدمی کم ہی نکلے گا!)

۸۔ ما قل وکفی خیر مما کثر وألهی [3] جو تھوڑا ہو مگر کافی ہو وہ اس بہت سے بہتر ہے جو غافل بنا دیتا ہے

۹۔ الخیر فی السیف والخیر مع السیف والخیر بالسیف: بھلائی تلوار میں ہے، بھلائی تلوار کے ساتھ رہتی ہے اور بھلائی تلوار کے ذریعے حاصل ہوتی ہے (تلوار یا قوت سراسر بھلائی ہے!)

۱۰۔ لیس منا من حلق أو صلق أو شق [4] جو مصیبت میں بال منڈوائے، واویلا کرے یا کپڑے پھاڑے وہ ہم میں سے نہیں ہے (صبر و ہمت مومن کی شان ہے!)

۱۱۔ لا تزال أمتی صالحاً أمرها ما لم تر الأمانة مغنماً والصدقة مغرماً [5] میری امت کا معاملہ اس وقت تک درست رہے گا جب تک وہ امانت کو مالِ غنیمت اور خیرات و زکوٰۃ کو تاوان تصور نہیں کریں گے۔

۱۲۔ رأس العقل بعد الإیمان باللہ مداراۃ الناس [6] اللہ پر ایمان کے بعد سب سے بڑی عقل کی بات لوگوں کا دل رکھنا ہے۔

۱۳۔ لن یھلک امرؤ بعد مشورۃ [7] مشورہ کر لینے کے بعد کبھی کوئی انسان تباہ نہیں ہو گا۔

۱۴۔ رحم اللہ عبداً قال خیراً فغنم أو سکت فسلم [8] اس بندے پر اللہ کی رحمت ہو جو بھلی بات کر کے غنیمت رہا یا چپ رہ کر سلامت رہا۔

۱۵۔ لا تجلسوا علی ظهر الطریق فإن أبیتم فغضوا الأبصار وردوا السلام واهدوا الضال وأعینوا الضعیف [9] راستوں میں مت بیٹھو! اگر بیٹھنا ہی ہو تو پھر نظریں جھکا کر رکھو، سلام کا جواب دو۔ بھٹکے ہوئے کو راستہ

---

[1] البیان ۲/۲۰، [2] البیان ۲/۲۰، [3] البیان ۲/۲۰، [4] البیان ۲/۲۰، [5] البیان ۲/۲۰ [6] البیان ۲/۲۰ [7] البیان ۲/۲۰ [8] البیان ۲/۲۱
[9] البیان ۲/۲۱

دکھاؤ اور کمزور کی مدد کرو!

۱۷- اِنَّ اللّٰہَ یَرْضٰی لَکُمْ ثَلَاثًا وَیَکْرَہُ لَکُمْ ثَلَاثًا: یَرْضٰی لَکُمْ: اَنْ تَعْبُدُوْہُ وَلَا تُشْرِکُوْا بِہٖ شَیْئًا، وَاَنْ تَعْتَصِمُوْا بِحَبْلِہٖ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا - وَاَنْ تُنَاصِحُوْا مَنْ وَلَّاہُ اللّٰہُ اَمْرَکُمْ، وَیَکْرَہُ لَکُمْ: قِیْلَ وَقَالَ، وَکَثْرَۃَ السُّوَالِ وَاِضَاعَۃَ الْمَالِ[1]

اللہ تعالیٰ تین باتیں تمہارے لیے پسند کرتا ہے اور تین باتیں ناپسند کرتا ہے، اللہ تمہارے لیے پسند یہ کرتا ہے کہ تم اس کی عبادت کرو اور کسی کو اس کے ساتھ شریک مت کرو، سب اس کی رسی کو تھام لو اور منتشر مت ہو اور جسے اللہ تعالیٰ تمہارا حکمران بنا دے اس کی خیر خواہی کرو، اور تمہارے لیے ناپسند کرتا ہے کہ تم بحث و مناظرہ میں الجھو، کثرت سے سوال کرو اور مال کو ضائع کرو۔

۱۸- یَقُوْلُ ابْنُ آدَمَ: مَالِیْ مَالِیْ - وَاِنَّمَا لَکَ مِنْ مَالِکَ مَا اَکَلْتَ فَاَفْنَیْتَ اَوْ لَبِسْتَ فَاَبْلَیْتَ اَوْ وَھَبْتَ، فَاَمْضَیْتَ (حوالہ سابق)

انسان کہتا ہے: میرا مال! میرا مال! حالانکہ تیرا مال تو صرف وہی ہے، جو تو نے کھا کر ختم کر دیا یا پہن کر بوسیدہ کر دیا، یا بخش دیا اور آگے بھیج دیا۔

۱۹- لَوْ اَنَّ لِابْنِ آدَمَ وَادِیَیْنِ مِنْ ذَھَبٍ لَسَاَلَ اِلَیْھِمَا ثَالِثًا (حوالہ سابق)

اگر انسان کے پاس سونے کی دو وادیاں بھی ہوں، تو وہ تیسری وادی کا طلب گار بن جائے گا۔

۱۹- لَا یَمْلَاُ جَوْفَ ابْنِ آدَمَ اِلَّا التُّرَابُ، وَیَتُوْبُ اللّٰہُ عَلٰی مَنْ تَابَ (حوالہ سابق) انسان کا پیٹ تو صرف خاک گور ہی بھرتی ہے! اور جو توبہ کر لے تو اللہ اس کی توبہ قبول کرلے گا۔

۲۰- اِنَّ الدُّنْیَا حُلْوَۃٌ خَضِرَۃٌ وَاِنَّ اللّٰہَ مُسْتَخْلِفُکُمْ فِیْھَا فَنَاظِرٌ کَیْفَ تَعْمَلُوْنَ (حوالہ سابق) دنیا شیریں اور پُر رونق ہے اور اللہ تمہیں اس میں کام سپرد کر کے یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ تم کیسے عمل کرتے ہو!

۲۱- اِنَّ اَحَبَّکُمْ اِلَیَّ وَاَقْرَبَکُمْ مِنِّیْ مَجَالِسَ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ اَحَاسِنُکُمْ اَخْلَاقًا الْمُوْطَؤُوْنَ اَکْنَافًا الَّذِیْنَ یَاْلَفُوْنَ وَیُؤْلَفُوْنَ وَاِنَّ اَبْغَضَکُمْ اِلَیَّ وَاَبْعَدَکُمْ مِنِّیْ مَجَالِسَ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ، الثَّرْثَارُوْنَ الْمُتَشَدِّقُوْنَ الْمُتَفَیْھِقُوْنَ[2]

قیامت کے دن تم میں سے میرے لیے سب سے زیادہ پسندیدہ اور مجلس میں زیادہ قریب وہ لوگ ہوں گے جو تم میں سب سے زیادہ خوش اخلاق، نرم مزاج، انس کرنے والے اور انس کے قابل ہوں گے اور سب سے زیادہ قابل نفرت اور مجلس میں مجھ سے دور وہ ان کے جو منہ پھٹ، باچھیں کھول کر بات کرنے والے اور گلا پھاڑ کر بات کرنے والے ہیں۔

۲۲- اِیَّاکُمْ وَالْمُشَارَّۃَ فَاِنَّھَا تُمِیْتُ الْغُرَّۃَ وَتُحْیِی الْعُرَّۃَ (حوالہ سابق) باہمی مخاصمت سے بچو کیونکہ اس سے

---

[1] البیان ۲/۲۱ [2] البیان ۲/۲۱، الکامل للمبرد ص ۱

خوبیاں مرجاتی ہیں اور عیوب زندہ ہوجاتے ہیں۔

۲۳۔ لا ینبغی لِصِدِّیْقٍ اَنْ یَکُوْنَ لَعَّانًا [1] صدیق کے لیے لعنت کرنے والا ہونا مناسب نہیں۔

۲۴۔ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ دُعَاءٍ لَا یُسْمَعُ وَمِنْ قَلْبٍ لَا یَخْشَعُ وَمِنْ عِلْمٍ لَا یَنْفَعُ (حوالہ سابق) ہم اللہ کی پناہ مانگتا ہوں اس دعا سے جو قبول نہیں ہوتی اور اس دل سے جو اللہ کا خوف نہیں رکھتا اور اس علم سے جو نفع نہیں دیتا۔

۲۵۔ وقیل لہ: یارسول اللّٰہ! ای الاعمال افضل؟ فقال: اجتناب المحارم ولا یزال فوك رطبًا من ذکر اللّٰہ (حوالہ سابق)

آپ سے پوچھا گیا کہ افضل ترین عمل کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: حرام چیزوں سے پرہیز کرتے رہنا اور ہمیشہ اپنی زبان کو اللہ کے ذکر سے تازہ رکھنا!

۲۶۔ وقیل لہ: ای الاصحاب افضل؟ قال الذی اذا ذکرت اعانک واذا نسیت ذکّرک (حوالہ سابق) آپ سے پوچھا گیا! کونسا ساتھی افضل ہے؟ تو فرمایا! وہ کہ اگر تیرا تذکرہ ہو تو تیری مدد میں رہے اور اگر تو بھول جائے تو تجھے یاد دلا دیا کرے۔

۲۷۔ وقیل لہ: ای الناس شر؟ قال: العلماء اذا فسدوا (حوالہ سابق) پوچھا گیا کہ بدترین انسان کون ہیں؟ تو آپؐ نے فرمایا! علما جب بگڑ جائیں!

۲۸۔ دبّ الیکم داء الامم من قبلکم: الحسد والبغضاء، والبغضاء ھی الحالقۃ، لا اقول حالقۃ الشعر، والذی نفس محمد بیدہ لا تؤمنون حتی تحابوا، اَوَ لا انبئکم بامر اذا فعلتموہ تحاببتم؟ فقالوا: بلی یارسول اللّٰہ! قال: افشوا السلام وصلوا الارحام [2]

تمہارے اندر بھی گزشتہ امتوں والی بیماری سرایت کرگئی ہے، حسد اور نفرت! نفرت تو مونڈ ڈالنے والی ہے، دین کو مونڈ ڈالنے والی، میں یہ نہیں کہتا کہ بالوں کو مونڈ دینے والی۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے تم اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتے، جب تک تم باہم محبت نہ کرو، کیا میں تمہیں ایسی بات نہ بتادوں اگر تم اُسے کرو تو ایک دوسرے سے محبت کرو گے؟ لوگوں نے کہا: ہاں اللہ کے رسولؐ! فرمایا: تو پھر سلام کو عام کرو، اور صلہ رحمی سے کام لیتے رہو!

۲۹۔ ما ھلک امرؤ عرف قدرہ [3] وہ شخص کبھی تباہ نہ ہوگا جس نے اپنی حیثیت پہچان لی۔

۳۰۔ لو تکاشفتم لما تدافنتم (حوالہ سابق) اگر تمہیں ایک دوسرے کے بھید معلوم ہو جایا کریں، تو تم ایک

---

[1] البیان ۲/۲۲ [2] البیان ۲/۲۲ [3] البیان ۲/۲۳ [4] البیان ۲/۲۴

دوسرے کے کفن دفن میں بھی شریک نہ ہُوا کرو!)

۳۱ - لَيْسَ مِنْ اَخْلَاقِ الْمُؤْمِنِ الْمَلَقُ اِلَّا فِيْ طَلَبِ الْعِلْمِ[1]

خوشامد مومن کے اخلاق میں سے نہیں الایہ کہ علم کی خاطر ہو (تو استاذ کی خوشامد جائز ہے)۔

۳۲ - اوصانی ربی بتسع : اوصانی بالاخلاص فی السر والعلانیۃ، وبالعدل فی الرضا والغضب، وبالقصد فی الغنی والفقر، وان اعفو عمن ظلمنی، واُعطی من حرمنی، واَصل من قطعنی، وان یکون صمتی فکرًا ونطقی ذکرًا ونظری عبرًا۔[2]

میرے رب نے مجھے نو باتوں کی وصیت کی ہے: مجھے وصیت فرمائی ہے کہ ظاہر و باطن میں اخلاص پر عمل کروں، خوشی اور غصے میں عدل کروں، امارت و غربت میں میانہ روی اختیار کروں، جو زیادتی کرے اس سے درگزر کروں، جو محروم کرے اسے عطا کروں، جو قطع تعلق کرے اس سے صلہ رحمی کروں، میری خاموشی فکر ہو، گویائی ذکر ہو اور میری نظر عبرتوں کے لیے ہو۔

۳۳ - اِنَّ قَوْمًا رَكِبُوْا سَفِيْنَةً فِي الْبَحْرِ فَاقْتَسَمُوْا فَصَارَ لِكُلِّ رَجُلٍ مَوْضِعٌ فَنَقَرَ رَجُلٌ مَوْضِعَهُ بِفَأْسٍ فَقَالُوْا: مَا تَصْنَعُ؟ قَالَ: هُوَ مَكَانِيْ أَصْنَعُ بِهِ مَا شِئْتُ فَاِنْ أَخَذُوْا عَلٰى يَدَيْهِ نَجَا وَنَجَوْا، وَاِنْ تَرَكُوْهُ هَلَكَ وَهَلَكُوْا۔[3]

کچھ لوگ ایک کشتی میں سمندری سفر پر روانہ ہُوئے، سب نے اپنی اپنی جگہ سنبھال لی (تقسیم کرلیا، ہر ایک کے لیے ایک ایک جگہ ہوگئی) ایک شخص نے کلہاڑے سے اپنی جگہ سوراخ کرنا شروع کیا، تو لوگوں نے کہا! یہ کیا کر رہے ہو؟ بولا! یہ تو میری جگہ ہے جو چاہوں کروں! اگر تو لوگوں نے اسے روک لیا تو وہ بھی بچ جائے گا اور لوگ بھی اور اگر اسے نہ روکا تو وہ بھی ہلاک ہو جائے گا اور لوگ بھی! (مختصر لفظوں میں کتنی بڑی تمثیل ہے! کتنی بڑی معاشرتی ذمہ داری کا احساس دلایا گیا ہے!)

۳۴ - اِرْحَمُوْا عَزِيْزًا ذَلَّ، ارحموا عالمًا ضاع بين جُهَّالٍ[4]

جو باعزت انسان ذلیل ہو جائے اس پر رحم کرو اور اس عالم پر بھی رحم کرو جو جاہلوں میں رہ کر ضائع ہو جائے۔

۳۵ - اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ[5] انسان اسی کے ساتھ ہوگا جس سے اس نے محبت کی (جس سے دل لگا ہوگا۔ قیامت میں اسی کے ساتھ اُٹھایا جائے گا۔)

۳۶ - مَنْ كَثُرَ طَعَامُهٗ كَثُرَ سِقَامُهٗ وَمَنْ قَلَّ غِذَاءُهٗ قَلَّ دَوَاءُهٗ

جس کا کھانا بہت ہُو اس کی بیماری بہت ہو اور جس کی غذا کم ہو اس کی دوا کم ہو۔[6]

۳۷ - الْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ وَهُوَ بِالْخِيَارِ مَا لَمْ يَتَكَلَّمْ[7]

---

[1] بیان ۲/۲۴ [2] البیان ۲/۲۳ [3] البیان ۲/۲۵ [4] البیان ۲/۲۸ [5] الشفا ۱/۱۷۴ [6] طبیر الاسلام ص ۵ [7] شفا ۱/۱۷۴، البیان ۲/۲۹۔

مشورہ دینے والے کی حیثیت امانت دار کی سی ہے، جب تک وہ راز مُنہ سے نہیں نکالتا، اسے اپنی بات پر اختیار رہتا ہے۔

۳۸۔ ذُوالْوَجْهَيْنِ لَا يَكُوْنُ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيْهًا [1]

دو چہروں والا (منافق) اللہ کے نزدیک کبھی معزز نہیں ہو سکتا۔

۳۹۔ اِتَّقِ اللّٰهَ حَيْثُ كُنْتَ وَاَتْبِعِ السَّيِّئَةَ الْحَسَنَةَ تَمْحُهَا وَخَالِقِ النَّاسَ بِخُلُقٍ حَسَنٍ [2]

جہاں بھی ہو اللہ سے ڈرتا رہ۔ برائی کے بعد نیکی کر جو اُسے محو کر دے گی، لوگوں سے حُسنِ سلوک سے پیش آ۔

۴۰ لَعَلَّهُ كَانَ يَتَكَلَّمُ بِمَا لَا يُغْنِيْهِ وَيَبْخَلُ بِمَا لَا يُغْنِيْهِ [3]

شاید وہ شخص لایعنی باتیں کرتا تھا اور بے فائدہ چیزوں میں بھی بخل سے کام لیتا تھا

۴۱ اَحْبِبْ حَبِيْبَكَ هَوْنًا مَّا، عَسٰى اَنْ يَكُوْنَ بَغِيْضَكَ يَوْمًا مَّا [4]

اپنے محبوب سے قدرے ہلکی محبت کر۔ ہو سکتا ہے وہ کسی دن تیرا مبغوض بھی بن جائے۔ (جذبہ محبت و نفرت میں اعتدال مناسب ہے)

۴۲۔ اَلظُّلْمُ ظُلُمَاتٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ [5]

ظلم قیامت کے دن کی تاریکیوں میں سے ہے۔

۴۳۔ بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ

مجھے بلند اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہے۔

۴۴۔ اَكْمَلُ الْمُؤْمِنِيْنَ اِيْمَانًا اَحْسَنُهُمْ اَخْلَاقًا

ایمان میں وہی کامل ترین ہے مومن جو اخلاق میں سب سے بہتر ہو۔

۴۵۔ اِنَّ مِنْ خِيَارِكُمْ اَحْسَنَكُمْ اَخْلَاقًا:

تم میں سے بھلے لوگ وہ ہیں جو تم میں سب سے زیادہ خوش اخلاق ہوں۔

۴۶ اِنَّ الْمُؤْمِنَ لَيُدْرِكُ بِحُسْنِ خُلُقِهِ دَرَجَةَ الصَّائِمِ الْقَائِمِ:

مومن تو اپنے حسن اخلاق سے روزہ دار اور نماز گزار کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔

۴۷۔ وَكَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَعَوَّذُ مِنْ سُوْءِ الْخُلُقِ وَيَقُوْلُ: اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الشِّقَاقِ وَالنِّفَاقِ وَسُوْءِ الْاَخْلَاقِ۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم بد اخلاقی سے خدا کی پناہ مانگتے تھے اور کہتے تھے: اے میرے اللہ! میں آپ کی پھوٹ، منافقت اور بد خلقی

---

[1] الشفا ۱/۱۷۵، [2] الشفا ۱/۱۷۵، [3] الشفا ۱/۱۷۵

[4] الشفا ۱/۱۷۵، [5] الشفا ۱/۱۷۵

سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔

۴۸۔ کُلُّ الصَّیْدِ فِیْ جَوْفِ الْفَرَا۔

تمام شکار فرا کے پیٹ میں ہوتا ہے (ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں!)

۴۹۔ اِذَا اَتَاکُمْ کَرِیْمُ قَوْمٍ فَاَکْرِمُوْہُ۔

جب کسی قوم کا معزز آدمی تمہارے پاس آئے، تو اس کی عزت کرو۔

۵۰۔ اَکْرِمُوْا عُلَمَاءَ اُمَّتِیْ فَاِنَّھُمْ نُجُوْمُ الْاَرْضِ

میری اُمت کے علما کی عزت کرو، کیونکہ وہ روئے زمین کے ستارے (برائے ہدایت) ہیں۔

۵۱ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ وَلِکُلِّ امْرِئٍ مَّا نَوٰی؛

اعمال کا دارو مدار نیتوں پر ہوتا ہے۔ اس لیے جو شخص جیسی نیت کرے گا، ویسی جزا پائے گا۔ (بخاری)

۵۲۔ مَنْ لَّمْ یَرْحَمْ صَغِیْرَنَا وَیَعْرِفْ حَقَّ کَبِیْرِنَا فَلَیْسَ مِنَّا؛

جس نے ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کھایا اور ہمارے بزرگوں کا حق نہ پہچانا، تو وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

۵۳۔ اَلْمُسْتَشِیْرُ مُعَانٌ وَالْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ

مشورہ لینے والا تو مدد لیتا ہے اور مشورہ دینے والا امانت دار ہوتا ہے۔

۵۴۔ الْمُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِ کَالْبُنْیَانِ یَشُدُّ بَعْضُہٗ بَعْضًا۔

مومن مومن کے لیے دیوار کی حیثیت رکھتا ہے جس کے حصے ایک دوسرے کو پختہ کرنے کا باعث ہوتے ہیں (اسی طرح ایک مومن دوسرے مومن کی تقویت کا سبب ہوتا ہے۔)

۵۵۔ لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یُحِبَّ لِاَخِیْہِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِہٖ؛

تم میں سے کوئی بھی اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے بھائی کے لیے وہی پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔

۵۶ کُلُّ مَعْرُوْفٍ صَدَقَۃٌ ہر نیکی صدقہ ہوتی ہے۔

۵۷ اَلتَّکَبُّرُ مَعَ الْمُتَکَبِّرِ صَدَقَۃٌ،

متکبر کے ساتھ تکبر کرنا صدقہ ہے۔

۵۸۔ اَلْعَاقِلُ اَلُوْفٌ مَاْلُوْفٌ

دانا انس کرنے والا ہوتا ہے اور لوگ اس سے انس کرتے ہیں۔

اسنٰی ۱/ ۱۰۵

۵۹ - لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَتَّاتٌ :
چغل خور جنت میں داخل نہیں ہوگا۔

۶۰ - الحیاءُ شعبۃٌ مِنَ الْاِیْمَانِ :
حیاء ایمان کا ایک شعبہ ہے۔

۶۱ - اِنَّ مِمَّا اَدْرَکَ النَّاسُ مِنْ کلامِ النبوۃِ الاُولٰی : اِذَا لَمْ تَسْتَحْیِ فَاصْنَعْ مَا شِئْتَ
پہلی نبوتوں کے کلام سے انسانوں کو جو کچھ حاصل ہُوا اس میں یہ بھی تھا کہ : جب تو حیا نہ کرے تو جو جی میں آئے کر۔

۶۲ - لَا یُلْدَغُ الْمُؤْمِنُ مِنْ جُحْرٍ مَرَّتَیْنِ :
مومن ایک سوراخ سے دوبار نہیں ڈسا جا سکتا (ایک بار نقصان اٹھانے سے سبق سیکھتا ہے۔)

۶۳ - لَیْسَ الشَّدِیْدُ بِالصُّرَعَۃِ، اِنَّمَا الشَّدِیْدُ الَّذِیْ یَمْلِکُ نَفْسَہٗ عِنْدَ الْغَضَبِ
سخت جان (قوی) وہ نہیں جو لوگوں کو کشتی میں پچھاڑ دیتا ہو۔ بلکہ وہ شخص قوی ہوتا ہے، جو غصہ کے عالم میں اپنے اوپر قابو رکھے

۶۴ - نِیَّۃُ الْمُؤْمِنِ خَیْرٌ مِنْ عَمَلِہٖ [۱]
مومن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے۔ (نیک نیتی سے مومن کا آغازِ کار کافی ہے۔ انجام بندے کے اختیار میں نہیں مولیٰ کے اختیار میں ہے۔!)

۶۵ - اِنَّا مَعْشَرَ الْاَنْبِیَاءِ اُمِرْنَا بِاَنْ نُکَلِّمَ النَّاسَ عَلٰی مَقَادِیْرِ عُقُوْلِھِمْ [۲]
ہم گروہ انبیاء کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ ہم لوگوں کی ذہنی سطح کے مطابق ان سے گفتگو کیا کریں۔

۶۶ - مَا اُعْطِیَ امْرُؤٌ شَرًّا مِنْ طَلَاقَۃِ اللِّسَانِ [۳]
زبان کی تیزی سے بڑھ کر انسان کو کوئی بری چیز نہیں دی گئی۔

۶۷ - وَسَأَلَہُ الْعَبَّاسُ : فِیْمَ الْجَمَالُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ؟ فَقَالَ : فِی اللِّسَانِ [۴]
حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے آپؐ سے پوچھا ، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ انسان کا حسن کس چیز میں پوشیدہ ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا : زبان میں۔

۶۸ - اَلْاِیْمَانُ عَقْدٌ بِالْقَلْبِ وَقَوْلٌ بِاللِّسَانِ وَعَمَلٌ بِالْاَرْکَانِ [۵]
ایمان نام ہے دل سے پختہ عقیدے، زبان سے اقرار اور اعضاء سے عمل کرنے کا!

۶۹ - اِنَّ مِنَ الْبَیَانِ لَسِحْرًا [۶] بعض خطبات جادو کا اثر رکھتے ہیں۔

---

[۱] نقد النثر ص ۹۴ - [۲] نقد النثر ص ۸۲، [۳] نقد النثر ص ۱۱۱ [۴] نقد النثر ص ۹
[۵] نقد النثر ص ۱۳ [۶] العقد ۴/۸۰

وقال فی الوحدة وراءها حزازات النفوس: جماعة على اقذاء وهدنة على دخن[1]

ایسی وحدت جس کے پس منظر میں دلوں کی جلن اور کدورت ہو اس کے بارے میں آپؐ نے فرمایا: کدورت پر قائم ہونے والی جماعت اور دھوئیں اور جلن پر قائم ہونے والا استارکہ جنگ ہے۔!

۷۱۔ وقال فی الدنیا وزینتها: إنَّ مما یُنبِتُ الربیعُ ما یقتل حبطًا أو یُلِمُّ[2]

دُنیا اور اس کی زینت کے بارے میں فرمایا، موسم بہار جو کچھ اُگاتا ہے، اس میں ایسے پودے بھی ہوتے ہیں جن کے کھانے سے جانوروں کے پیٹ پھول جاتے ہیں اور وہ مر جاتے ہیں۔

۷۲۔ وقال عن الغلو فی العبادة: إنَّ المنبتَّ لا أرضًا قطع ولا ظهرًا أبقى[3]

عبادت میں غلو کے بارے میں آپ نے فرمایا کہ دُنیا و مافیہا سے غافل ہونے والے زاہد نے نہ تو سفر طے کیا اور نہ پیچھے کچھ چھوڑا۔

۷۳۔ الإیمانُ قیَّدَ الفتکَ[4]

ایمان نے فتح کو مقید کر دیا ہے (قوتِ ایمانی فتحیاب ہوتی ہے!)

۷۴۔ اشتدّی یا أزمة تنفرجی[5]

بحران کا شدت اختیار کرنا اس کا حل ہوتا ہے۔ اے بحران شدت اختیار کر تو تو کھل جائے گا۔

۷۵۔ المؤمنُ هیّنٌ لیّنٌ کالجمل الأنِفِ إن قِیدَ انقادَ وإن أُنیخَ علی صخرةٍ استناخ[6]

مومن دھیما اور نرم مزاج ہوتا ہے وہ ایک خود دار اونٹ کی طرح ہے کہ اگر اسے باندھ دیا جائے تو مطیع ہو جاتا ہے اور اگر چٹان پر بٹھایا جائے تو بیٹھ جاتا ہے۔

۷۶۔ أمّتی کالمطر لا یُدری أوّله خیرٌ أم آخره[7]

میری اُمت بارش کی مانند ہے جس کے بارے میں یہ معلوم نہیں کہ اس کے آغاز میں زیادہ بھلائی ہے یا آخر میں۔

۷۷۔ مثلُ المؤمن کالنحلة لا تأکل إلّا طیّبًا ولا تطعم إلّا طیّبًا[8]

مومن کی مثال شہد کی مکھی سی ہے جو پاکیزہ کھاتی ہے اور شہد کی شکل میں پاکیزہ کھلاتی ہے۔

۷۸۔ المرأةُ کالضلع العوجاء إن قوّمتها کسرتها وإن داریتها استمتعتَ بها[9]

عورت کی مثال ٹیڑھی پسلی کی سی ہے، اگر تم اسے سیدھا کرنے لگو گے، تو اسے توڑ دو گے اور اگر اس کی دلداری کرو گے تو اس سے فائدہ اٹھاؤ گے

۷۹۔ الناسُ شرکاءُ فی ثلاثٍ: الماءُ والکلأُ والنارُ[10]

---

[1] العقد ۴/۸۷ [2] العقد ۳/۳ [3] العقد ۳/۳۔ [4] العقد ۳/۴ [5] النویری ۳/۳ [6] النویری ۳/۳ [7] النویری ۳/۲
[8] النویری ۲/۳ [9] النویری ۳/۲ [10] ادب الحدیث النبوی ص ۱۵

لوگ تین چیزوں میں برابر کے شریک ہیں، پانی، چارہ و راگ !

۸۰ - اَلَا اُخبِرُکُم عَلٰی خَیرِ مَا یَکنِزُ المَرءُ ؟ اَلمَرأَۃُ الصَّالِحَۃُ اِذَا نَظَرَ اِلَیھَا سَرَّتہُ وَ اِذَا غَابَ عَنھَا حَفِظَتہُ فِی مَالِہٖ وَعِرضِہٖ (حوالہ سابق)

کیا میں تمہیں ایک مرد کے بہترین خزانے کا پتہ نہ بتادوں وہ ہے نیک عورت کہ اگر وہ اس کی طرف دیکھے تو وہ اس کے لیے خوشی کا سامان ہو اور اگر وہ اس کے پاس نہ ہو تو اس کے مال اور عزت کی نگہبان رہے۔

۸۱ ۔ مَن کَانَ آمِنًا فِی سِربِہٖ مُعَافًی فِی بَدَنِہٖ عِندَہٗ قُوتُ یَومِہٖ کَانَ کَمَن حِیزَت لَہُ الدُّنیَا بِحَذَافِیرِھَا[۱]

اپنے گھر میں جو چین سے رہ رہا ہو، جسمانی صحت نصیب ہو، ایک دن کی خوراک بھی میسّر ہو تو گویا اس کے لیے دنیا کا سب کچھ جمع کر دیا گیا ہے۔

۸۲ مَن سَرَّہٗ اَن یَکُونَ اَعَزَّ النَّاسِ فَلیَتَّقِ اللّٰہَ وَمَن سَرَّہٗ اَن یَکُونَ اَغنَی النَّاسِ فَلیَکُن بِمَا فِی یَدِ اللّٰہِ اَوثَقَ مِنہُ بِمَا فِی یَدِہٖ وَمَن سَرَّہٗ اَن یَکُونَ اَقوَی النَّاسِ فَلیَتَوَکَّل عَلَی اللّٰہِ[۲]

جو اس بات پر خوش ہے کہ وہ سب سے زیادہ عزت والا ہو تو پھر اسے اللہ سے ڈرتے رہنا چاہیے اور جو اس بات پر خوش ہے کہ وہ سب سے بڑا دولتمند ہو تو پھر اسے اس بات پر پختہ ایمان ہونا چاہیے کہ جو کچھ اللہ کے قبضے میں ہے اس کا ملنا زیادہ یقینی ہے، بہ نسبت اس مال کے جو اس کے اپنے قبضے میں ہے ! اور جو اس بات پر خوش ہے کہ وہ سب سے زیادہ طاقتور ہو تو اُسے اللہ پر توکل کرنا چاہیے۔

۸۳ ۔ اَلَا اُخبِرُکُم بِشِرَارِکُم ؟ قَالُوا بَلٰی ! قَالَ : مَن اَکَلَ وَحدَہٗ ، وَمَنَعَ رِفدَہٗ ، وَضَرَبَ عَبدَہٗ ؛ اَلَا اُخبِرُکُم بِشَرٍّ مِن ذٰلِکُم ؟ مَن لَا یُقِیلُ عَثرَۃً وَلَا یَقبَلُ مَعذِرَۃً وَلَا یَغفِرُ ذَنبًا ، اَلَا اُخبِرُکُم بِشَرٍّ مِن ذٰلِکُم ! مَن یُبغِضُ النَّاسَ وَیُبغِضُونَہٗ[۳]

کیا میں تمہیں بتا نہ دوں کہ تم میں بُرے کون لوگ ہیں : لوگوں نے کہا ! ہاں ! فرمایا : جو اکیلے کھائیں، برتنے کی چیزیں دینے سے منع کریں اور اپنے غلام کو ماریں ! اس سے بھی بدتر شخص بتاؤں ؟ وہ جو لغزش سے درگزر نہ کرے معذرت قبول نہ کرے اور گناہ معاف نہ کرے ! اس سے بھی بدتر شخص بتاؤں ؟ جو لوگوں سے نفرت کرتا ہو اور لوگ اس سے نفرت کرتے ہوں !

۸۴ - مَن تَعَلَّمَ العِلمَ لِاَربَعَۃٍ دَخَلَ النَّارَ : لِیُبَاھِیَ بِہِ العُلَمَاءَ اَو یُمَارِیَ بِہِ السُّفَھَاءَ اَو یُمِیلَ بِہٖ وُجُوہَ النَّاسِ اَو یَاخُذَ بِہٖ مِنَ الاُمَرَاءِ[۴]

جس نے چار باتوں کے لیے علم حاصل کیا وہ جہنّم میں داخل ہوگا۔ علماء سے مباحات کر سکے۔ جاہل احمقوں سے مناظرہ کر سکے، لوگوں کو اپنی طرف مائل کر سکے یا امراء اور حکام سے کچھ صلہ پا سکے۔

---

[۱] الکامل للمبرد ص ۹۱ [۲] الکامل للمبرد ص ۱۱۹ [۳] الکامل ص ۲۹ [۴] عیون الاخبار ۲/۱۱۹

۸۵- اِذَا تَحَقَّقَتِ الْمَصْلَحَۃُ فَثَمَّ شَرْعُ اللہِ :
جب کہیں انسانی مصلحت (بہتری) ثابت ہوجائے تو وہی مصلحت اللہ کی شریعت بھی ہے۔

۸۶- خَیْرُ الْکَاسِبِ الْعَامِلُ اِذَا نَصَحَ :
بہترین کمائی کرنے والا وہ مزدور ہے جو نیک نیّت سے محنت کرے۔

۸۷- اِذَا عَمِلَ اَحَدُکُمْ فَلْیَتْقِنْ عَمَلَہٗ ۔
جب تم میں سے کوئی کام کرے تو اسے پختہ طریقے سے انجام دے۔

۸۸- اَفْضَلُ الْاَعْمَالِ عِنْدَ اللہِ اَدْوَمُھَا وَاِنْ قَلَّ :
اللہ کے نزدیک بہترین کام وہ ہے جس میں باقاعدگی ہو۔

۸۹- تَعَلَّمُوْا لُغَۃَ قَوْمٍ تَأْمَنُوْا شَرَّھُمْ
کسی قوم کی زبان سیکھ لو اس کے شر سے محفوظ ہوجاؤ گے

۹۰- اَلْمُؤْمِنُ الْقَوِیُّ خَیْرٌ مِنَ الْمُؤْمِنِ الضَّعِیْفِ :
طاقتور مومن کمزور مومن سے بہتر ہے۔

۹۱- اِنَّ الْمُؤْمِنَ مَنْ سَاءَتْہُ سَیِّئَتُہٗ وَسَرَّتْہُ حَسَنَتُہٗ [1]
مومن وہ ہے جسے اپنی بدی سے افسوس ہو اور اپنی نیکی سے مسرت حاصل ہو۔

۹۲- ھَلْ یَکُبُّ النَّاسَ عَلٰی مَنَاخِرِھِمْ فِیْ نَارِ جَھَنَّمَ اِلَّا حَصَائِدُ اَلْسِنَتِھِمْ [2]
انسانوں کو ناک کے بل دوزخ میں گرانے والی ان کی زبانوں کی پیداوار ہی تو ہے۔

۹۳- مَا مِنْ مُسْلِمٍ غَرَسَ غَرْسًا فَاَکَلَ مِنْہُ اِنْسَانٌ اَوْ دَابَّۃٌ اِلَّا کَانَ لَہٗ صَدَقَۃٌ ۔
جب کوئی مسلمان ایک درخت لگائے پھر اس سے کوئی انسان یا چوپایہ جب بھی کچھ کھائے گا، اُسے ثواب ملتا رہے گا۔

۹۴- طَعَامُ الْاِثْنَیْنِ کَافِی الثَّلَاثَۃِ وَطَعَامُ الثَّلَاثَۃِ کَافِی الْاَرْبَعَۃِ ۔
دو آدمیوں کا کھانا تین کے لیے اور تین کا کھانا چار کے لیے کافی ہوتا ہے۔

۹۵- جَنَّۃُ الرَّجُلِ دَارُہٗ
آدمی کی جنّت اس کا گھر ہوتا ہے۔

۹۶- اَلنَّدَمُ تَوْبَۃٌ
ندامت بھی توبہ ہے۔

---

[1] البیان ۱/ ۹۹ [2] البیان ۱/ ۲۵۶

۹۷ - اِنتِظَارُ الفَرَجِ عِبَادَةٌ

فراخی وخوشحالی کی اُمید رکھنا بھی عبادت ہے ۔

۹۸ - مِن حُسنِ اِسلَامِ المَرءِ تَرکُهٗ مَالَا یُغنِیهِ ؛

انسان کے اسلام کا حسن یہ بھی ہے کہ وہ فضول باتوں کو چھوڑ دے ۔

۹۹ - اِنَّکُم لَن تَسَعُوا النَّاسَ بِاَموَالِکُم، فَسَعُوا هُم بِاَخلَاقِکُم ؛

لوگوں کو تم دولت سے اپنا گرویدہ نہیں کر سکو گے، اس لیے انہیں اپنے اخلاق سے گرویدہ کرو

۱۰۰ - اِنَّ الصِّدقَ یَهدِی اِلَی البِرِّ وَاِنَّ البِرَّ یَهدِی اِلَی الجَنَّةِ وَاِنَّ الرَّجُلَ لَیَصدُقُ حَتّٰی یُکتَبَ عِندَ اللّٰهِ صِدِّیقًا ؛ وَاِنَّ الکَذِبَ یَهدِی اِلَی الفُجُورِ وَاِنَّ الفُجُورَ یَهدِی اِلَی النَّارِ وَاِنَّ الرَّجُلَ لَیَکذِبُ حَتّٰی یُکتَبَ عِندَ اللّٰهِ کَذَّابًا

سچ نیکی کی راہ دکھاتا ہے اور نیکی جنت کی، آدمی سچ بولتا رہتا ہے حتیٰ کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں صدیق لکھ دیا جاتا ہے، جھوٹ بدی کی راہ دکھاتا ہے اور بدی دوزخ کی، آدمی جھوٹ بولتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اللہ کے ہاں کذاب لکھ دیا جاتا ہے ۔

۱۰۱ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا : صِرَاطًا مُستَقِیمًا، وَعَلٰی جَنبَتَیِ الصِّرَاطِ سُورَانِ وَالاَبوَابُ مُفَتَّحَةٌ وَعَلَی الاَبوَابِ سُتُورٌ مُرخَاةٌ وَعَلٰی رَأسِ الصِّرَاطِ دَاعٍ یَقُولُ : اُدخُلُوا الصِّرَاطَ وَلَا تَعوَجُّوا، فَالصِّرَاطُ الاِسلَامُ وَالسُّورَانِ حُدُودُ اللّٰهِ وَالاَبوَابُ المُفَتَّحَةُ مَحَارِمُ اللّٰهِ وَالدَّاعِی القُرآنُ [1]

اللہ تعالیٰ نے صراطِ مستقیم کی مثال بیان کی ہے جس کے دونوں جانب دو دیواریں اور کھلے دروازے ہیں، دروازوں پر پردے لٹک رہے ہیں۔ راستے کے سرے پر ایک داعی بُلا رہا ہے کہ صراط پر چلو ٹیڑھے مت چلو، راستہ تو ہے اسلام، دیواریں اللہ کی حدود ہیں کھلے دروازے اللہ کی حرام کردہ اشیا ہیں اور داعی قرآن ہے ۔

۱۰۲ - تَرکُ الشَّرِّ صَدَقَةٌ ؛ [2]

شر کا دامن چھوڑ دینا بھی صدقہ ہے ۔

۱۰۳ - اَفضَلُ الصَّدَقَةِ جُهدُ المُقِلِّ (حوالہ سابق)

بہترین صدقہ کم سے کم کوشش کرنے والے کی کوشش ہے

۱۰۴ - الخَیرُ کَثِیرٌ وَقَلِیلٌ فَاعِلُهٗ (حوالہ سابق)

بھلائی تو بہت ہے مگر اسے کرنے والے بہت تھوڑے ہیں ۔

۱۰۵ - حُبُّکَ لِلشَّیءِ یُعمِی وَیُصِمُّ (حوالہ سابق)

---

[1] العقد ۳/۳ [2] اعلام النبوۃ ص۱۵۱

کسی شے کی محبت انسان کو اندھا اور بہرا بنا دیتی ہے۔

۱۰۶۔ اَلسَّعِیْدُ مَنْ وُعِظَ بِغَیْرِہٖ (حوالہ سابق)

نیک بخت وہ ہے جو دوسروں سے عبرت حاصل کرے۔

۱۰۷۔ ثَلَاثٌ مُنْجِیَاتٌ وَثَلَاثٌ مُهْلِكَاتٌ، فَاَمَّا الْمُنْجِیَاتُ: فَخَشْیَةُ اللّٰہِ تَعَالٰی فِی السِّرِّ وَالْعَلَانِیَةِ، وَالْاِقْتِصَادُ فِی الْغِنٰی وَالْفَقْرِ، وَالْحُکْمُ بِالْعَدْلِ فِی الرِّضٰی وَالْغَضَبِ، وَاَمَّا الْمُهْلِكَاتُ: فَشُحٌّ مُطَاعٌ، وَهَوًی مُتَّبَعٌ، وَاِعْجَابُ الْمَرْءِ بِنَفْسِهٖ[1]

تین باتیں باعثِ نجات اور تین باعثِ ہلاکت ہیں، نجات دینے والی یہ ہیں:

خفیہ اور ظاہر اللہ تعالیٰ سے ڈرنا، غریبی امیری میں میانہ روی اختیار کرنا اور خوشنودی اور ناراضگی میں عدل و انصاف کرنا، ہلاک کرنے والی تین باتیں ہیں۔ بخل و خست میں اپنے نفس کا غلام ہونا، ہوس کی راہ پر چلنا اور انسان کی خود پسندی۔

۱۰۸۔ نِعْمَتَانِ مَغْبُوْنٌ فِیْهِمَا كَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ: الصِّحَّةُ وَالْفَرَاغُ:

دو نعمتیں ایسی ہیں جن سے بہت سے لوگ محروم ہوتے ہیں، صحت و فراغت:

۱۰۹۔ خصلتان من كانتا فيه كتبه الله تعالٰی شاكرا صابرا ومن ما تكونا فيه لم تكتبه الله شاكرا ولا صابرا، من نظر فی دینه إلٰی من هُوَ فوقه فاقتدی به، وَنظر فی دنیاه إلٰی من دونه فحمد الله علٰی مافضله به علیه۔

دو عادتیں ہیں اگر کسی میں پائی گئیں، تو اللہ تعالیٰ اسے صابر و شاکر لکھ دیں گے اور اگر یہ دو عادتیں اس میں نہ پائی گئیں، تو اللہ تعالیٰ اسے صابر و شاکر نہیں لکھیں گے، جو دین کے معاملے میں اپنے سے بہتر و برتر کو دیکھے تو اسی کی اقتدار کرے، دنیا کے معاملے میں اپنے سے کمتر کو دیکھے، تو اللہ کا شکر ادا کرے کہ اس نے اسے اس پر بعض باتوں میں فضیلت عطا کی ہے!

۱۱۰۔ فضل لسانك تعبر به عن أخيكَ الذی لا لسان له صدقة:

اگر تم اپنی فاضل قوتِ گویائی اپنے اس بھائی کی ترجمانی میں صرف کرو، جو گفتگو پر قادر نہیں تو یہ بھی صدقہ ہے!

۱۱۱۔ إنَّ اللّٰهَ يُبْغِضُ البليغ الذی يتخلل بلسانه تخلل الباقرة۔

اللہ تعالیٰ اس خطیب بلیغ کو ناپسند کرتا ہے، جو اپنی زبان کو یوں مروڑ کر آواز نکالتے ہیں، جیسے گائے کی آواز ہوتی ہے۔

۱۱۲۔ وَهَلْ يكب الناس علٰی مناخرهم فی نار جهنم الا حصائد السنتهم

لوگوں کو نتھنوں کے بل جہنم میں زبان کے کارناموں کے سوا بھی کوئی اور چیز گراتی ہے۔

۱۱۳۔ شعبتان من شعب النفاق: البذاء والبيان وشعبتان من شعب الايمان الحياء والعی۔

---

[1] اعلام النبوۃ ص ۱۵۱۔

منافقت کے شعبوں میں سے دو شعبے فحش گوئی اور لفاظی ہیں اور ایمان کے شعبوں میں سے دو شعبے حیا اور کم گوئی ہیں۔

۱۱۴- قَالَ فِی معنی الاحسان ، ان تعبد الله کانک تراہ فان لم تکن تراہ فَإِنَّهُ یراک :

احسان یہ ہے کہ تو اللہ کی اس طرح عبادت کر کہ گویا تو اللہ کو دیکھ رہا ہے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو کم سے کم یہ تصور کر کہ اللہ تو ہر حال میں تجھے دیکھ رہا ہے۔

۱۱۵- آفۃ العلم النسیان واضاعتہ ان تحدث بہ غیر اھلہٖ۔

علم کے لیے سب سے بڑی آفت بھول ہے اور علم کا ضیاع یہ ہے کہ نا اہل کے سامنے اس کا اظہار کرو۔

۱۱۶- اَلْھَمُّ نِصْفُ الْھَرَمِ۔

غم آدھا بڑھاپا ہے۔

۱۱۷- عَلِّقْ سَوْطَكَ حَیْثُ یراہ اھلک :

اپنا کوڑا ایسی جگہ لٹکاؤ جہاں سے وہ تیرے گھر والوں کو نظر آتا رہے۔

۱۱۸- النَّاسُ بِاَزْمَانِھِمْ أَشْبَهُ مِنْھُمْ بِآبَائِھِمْ

لوگ اپنے آباء کی نسبت اپنے زمانے سے زیادہ مشابہ ہوتے ہیں۔

۱۱۹- شَرُّ العمیٰ عمیَ الْقَلْبِ

دل کا اندھا پن سب سے برا اندھا پن ہے۔

۱۲۰- اکثروا من ذکر ھادم اللذات :

لذات کو منہدم کرنے والی (موت) کو کثرت سے یاد کیا کرو۔

۱۲۱- الرغبۃ فی الدنیا تکثر الھم والحزن والبطالۃ تقسی القلب :

دنیا کی رغبت رنج و غم کو بڑھاتی ہے اور بیکاری انسان کو سنگدل بنا دیتی ہے۔

جوامع الکلم

جسٹس مفتی سید شجاعت علی قادری

دنیا میں جتنے انبیاء کرام و رسل عظام صلوات اللہ و سلامہ علیہم اجمعین جلوہ فرما ہوئے، سب کے سب "آیات بینات" و معجزات باہرات" سے موید و مصدق تھے۔ نبوت و رسالت کا تصور معجزہ کے بغیر قائم ہی نہیں ہوتا۔ قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُّوحِي إِلَيْهِمْ فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِن كُنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ (۴۳) بِالْبَيِّنَاتِ وَالزُّبُرِ۔

ترجمہ:- ہم نے آپ سے پہلے مردوں ہی کو رسول بنا کر بھیجا کہ ہم ان کی طرف وحی کرتے تھے۔ تو اگر تم علم نہیں رکھتے ہو تو اصحاب علم سے پوچھ لو۔ (اور ان کو) معجزات اور صحیفوں کے ساتھ بھیجا۔

اس آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ نبوت و رسالت مردوں ہی کے ساتھ خاص ہے کبھی کسی عورت کو نبوت نہیں دی گئی۔ دوسرے یہ کہ تمام انبیاء علیہم السلام معجزات اور صحیفوں کے ساتھ تشریف لائے تھے۔ اس آیت کے علاوہ قرآن کریم میں لاتعداد جگہ انبیاء کے ذکر کے ساتھ "بالبینات" کا لفظ موجود ہے۔ پھر وحی بذات خود "امر خارق للعادۃ" ہے اور معجزہ ہے۔ اور ظاہر ہے کہ کوئی نبی بغیر وحی نبوت کے نبی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس مشترک معجزہ کے علاوہ انبیاء علیہم السلام کو خصوصی معجزات سے بھی نوازا گیا۔ جب ہم معجزات انبیاء پر تفصیلی نگاہ ڈالتے ہیں تو یہ حکمت نظر آتی ہے کہ ہر نبی کو اسی قسم کا معجزہ عطا ہوا جس قسم کے کمال کا دعویٰ اس کی قوم کو تھا۔ تاکہ یہ ظاہر ہو جائے کہ ظاہری اسباب کو اختیار کر کے جو کچھ حاصل ہو سکتا ہے۔ وہ تم نے حاصل کر لیا۔ اب ہمارا نبی جو کچھ پیش کر رہا ہے وہ "مافوق الاسباب" ہے۔ اور یہ تائید الٰہی کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اب اگر یہ مدعی نبوت جھوٹا ہوتا تو تائید الٰہی کبھی اس کے شریک حال نہ ہوتی۔ یہی "تلازم" ہے معجزہ اور ثبوت نبوۃ میں مثلاً سیدنا داؤد علیہ السلام کی قوم "فن آہن گری" میں کمال رکھتی تھی تو آپ کو اسی قسم کا معجزہ عطا ہوا۔ یعنی آپ کے ہاتھ میں لوہا موم کی طرح نرم ہو جاتا تھا۔ اور زرہیں اور دوسری آہنی اشیاء ایسی عمدہ بنا لیتے تھے کہ پوری قوم اس سے عاجز تھی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قوم کو اپنے "فن طب" پر ناز تھا۔ مگر کوڑھیوں اور مادرزاد اندھوں کو شفا دینے سے وہ قاصر تھے۔ موت کا علاج ان کے پاس نہ تھا۔ قرآن کریم نے صراحتاً بیان کر دیا کہ عیسیٰ علیہ السلام کوڑھیوں، مادرزاد اندھوں کو شفا دیتے حتیٰ کہ مردوں کو بھی باذن الٰہی زندہ کر دیتے تھے۔

حضور اکرم، نور مجسم، نبی محترم رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم جس عہد میں تشریف لائے اور جس قوم کی طرف آپ کی اولین بعثت ہوئی۔ اس میں فصاحت و بلاغت اور زبان آوری کا چرچا تھا۔ اس قوم میں جو مقام شاعر و ادیب کو حاصل تھا۔ وہ کسی کو نہ تھا۔ شاعر یا خطیب خود

۱۔ النحل — ۴۳ : ۴۴

معزز تھا ہی جس قبیلہ میں وہ پیدا ہوتا۔ وہ قبیلہ بھی معزز ہو جاتا۔ لوگ اسے مبارک باد دیتے اور اس کی عزت کرتے۔ اس لئے آپ کو جو سب سے بڑا معجزہ عطا ہوا۔ وہ فصاحت و بلاغت سے متعلق ہے۔ تاکہ وہ قوم جو اپنی زبان آوری پر متفخر ہے۔ اپنی اجتماعی کوششوں کے باوجود اس نبی کی فصاحت و بلاغت کا مقابلہ نہ کر سکے۔ پھر یا تو ساکت و مبہوت ہو جائے یا حق و صداقت کا یقین کر کے دولت ایمان سے مالا مال ہو جائے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے معجزہ کا ذکر ایک حدیث میں کیا ہے۔ یہ حدیث صحیح مسلم میں اس طرح ہے۔

"عن ابی هریرة رضی اللہ عنه ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال فضلت علی الانبیاء بست اعطیت جوامع الکلم۔"[1]

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "مجھے دوسرے انبیاء علیہم السلام پر چھ چیزوں سے فضیلت دی گئی ہے۔ مجھے "جوامع الکلم" دیئے گئے ہیں۔

اس حدیث کی تشریح میں محدثین نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو فصیح و بلیغ بنایا۔ آپ مختصر عبارات سے دقیق اور غامض پر از حکمت مفاہیم و معانی کو بآسانی ادا فرما دیتے تھے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد قرآن عزیز ہے۔[2] مگر میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر اس سے بیک وقت دونوں چیزیں مراد لی جائیں تو کسی قسم کی قباحت لازم نہ آئے گی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ایک "وحی متلو" ہے اور دوسری "غیر متلو" وحی یعنی قرآن معجزہ ہے۔ اور اس کے اعجاز کی کئی وجوہ ہیں۔ چند یہ ہیں۔

۱ - اس کی تراکیب بہت منظم ہیں۔ کلمات وسیع ہیں۔ اور اس کی بلاغت نے فصحاء عرب کی فصاحت و بلاغت کو مات کر دیا۔

۲ - اس کا اسلوب بیان انوکھا اور انداز کلام نرالا ہے۔ یہ کلام عرب والوں کی نظم و نثر دونوں طریقوں سے الگ تھلگ ہے اس کی آیات کے فواصل اور اختتامیہ کلمات ان کے انداز بیان سے سراسر مختلف ہیں۔

۳ - اس میں آئندہ آنے والے واقعات کی جو خبریں دی گئی ہیں۔ جو بہو درست ثابت ہوئیں۔ اور اب بھی ہو رہی ہیں۔ نیز یہ سلسلہ تا قیامت جاری رہے گا۔ تاکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معجزہ زندہ و تابندہ رہے۔ اور دم بدم دعوت الی اللہ کا باعث ہو۔

۴ - گذشتہ واقعات کی صحیح ترین خبریں جو آپ نے نہ تو کسی معلم کے ذریعے حاصل کیں اور نہ ہی کسی کتاب سے ملیں۔ صرف معجزانہ انداز میں وحی ربانی سے حاصل ہوئیں۔

۵ - لوگوں کے دلوں کا حال بتا دیا۔ مثلاً "اذهمت طائفتان منکم ان تفشلا"[3] جب تم میں سے دو گروہوں نے بزدلی کا ارادہ کیا۔ اب یہ ایک قلبی واردات تھی جو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معجزانہ طور پر بتا دی۔

۶ - کفار مکہ اور یہود و نصاریٰ سب ہی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کے دشمن تھے۔ اور ان کو بار بار چیلنج کیا جاتا رہا

---

۱ - صحیح مسلم ۵/۵ طبع بیروت و زرقانی علی المواہب ۵/۲۶۱ و بیہقی

۲ - زادی علی صحیح مسلم ۵/۵ ۳ - القرآن

اور مستقل طور پر اعلان کیا گیا کہ تم سب مل کر ہی اس قرآن کی ایک چھوٹی سی سورت کے مقابل کوئی کلام بنا کر لاؤ۔ مگر ان میں سے کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ معارضہ کرے۔ یہ بھی ایک معجزہ ہے۔

۷ ۔ جب اس کی تلاوت کی جاتی ہے تو دلوں پر رعب طاری ہو جاتا ہے۔ تاریخ اسلام میں ایسے کئی واقعات موجود ہیں کہ جب قرآن کی تلاوت کی گئی تو کافر بھی مرعوب ہو گئے۔ حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو ابھی اسلام نہیں لائے تھے۔ بیان کرتے ہیں کہ نماز مغرب میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سورہ طور کی تلاوت فرما رہے تھے۔ جب اس آیت پر پہنچے" ام خلقوا من غیر شیئ ام هم الخالقون (۱) ترجمہ :۔ کیا وہ بلا کسی چیز کے پیدا کر دیئے گئے ہیں، یا وہ خود ہی اپنے خالق ہیں۔ جب میں نے اسے سنا تو میرا دل پھٹ جانے کے قریب ہو گیا۔ اسی دن سے عظمت اسلام میرے دل میں قائم ہو گئی۔

۸ ۔ اگر کسی کتاب کو خواہ وہ کتنی ہی دلچسپ کیوں نہ ہو آپ ایک دو مرتبہ پڑھ لیں تو پھر تیسری مرتبہ پڑھنے کو جی نہ چاہے گا۔ مگر یہ قرآن ہے کہ جتنی مرتبہ پڑھیئے۔ اس کی لذت و حلاوت میں اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے۔ نہ پڑھنے والا تھکتا ہے اور نہ سننے والا تنگ آتا ہے۔

۹ ۔ اس کی حفاظت کا وعدہ جو اسی کتاب میں کیا گیا ہے۔ درست ثابت ہوا اور قیامت تک یہ محفوظ رہے گی۔

۱۰ ۔ یہ تمام علوم کی جامع ہے۔ اس میں عقائد بھی ہیں۔ اعمال بھی، مواعظ بھی، حکم بھی قصص بھی ہیں۔ امثال بھی، علوم بھی فنون بھی۔ غرضیکہ سب کچھ موجود ہے۔ جیسا کہ فرمانِ الٰہی ہے " ونزلنا علیك الكتاب تبیانا لكل شئ (۲) انبیاء سابقین علیہم السلام کے صحیفوں اور کتابوں میں جو کچھ منتشر طور پر تھا۔ وہ اس مقدس کتاب میں اکٹھا کر دیا گیا۔ فرمان الٰہی ہے۔ ان هذا لفی الصحف الاولیٰ صحف ابراهیم و موسیٰ (۳) بلاشبہ یہ قرآن پہلے صحیفوں میں ہے۔ ابراہیم و موسیٰ کے صحیفوں میں۔

۱۱ ۔ ایک اور اعتبار سے دیکھیئے تو اس ایک معجزہ میں ہزاروں معجزات ہیں۔ اس لئے کہ قرآن میں جو چیلنج دیا گیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ " فاتوا بسورة من مثله (۴) تم اس قرآن کی ایک چھوٹی سی سورت کی مثل لاؤ۔ اب سب سے چھوٹی سورہ " والعصر" ہے۔ جس کی آیات تین ہیں۔ ظاہر ہے کہ صرف یہی سورۃ معجزہ نہیں۔ بلکہ قرآن کریم کی ہر وہ مقدار جو ان تین آیات کے برابر ہو۔ مستقل معجزہ ہے۔ اس سورۃ کے کلمات کی تعداد تقریباً ۱۹ ہے۔ جب کہ کل قرآن کے کلمات کی تعداد ستتر ہزار نو سو چونتیس ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ مقدار جو معجزہ ہے۔ تقریباً سات ہزار ہے (۵)

یہ تو چند وجوہ اعجاز ہیں جو قارئین کے لئے بطور اشارہ ذکر کی گئی ہیں۔ ورنہ امام جلال الدین السیوطی نے اپنی کتابوں" الاتقان" اور " اسرار التنزیل" میں وجوہ اعجاز کو جس تفصیل و بسط سے بیان کیا ہے۔ اس کو پڑھ کر انسان حیران رہ جاتا ہے۔ وہ ایک جگہ فرماتے

---

۱ ۔ الطور ۳۵ ۲ ۔ النحل ۸۹ ۳ ۔ الاعلیٰ (۱۸-۱۹) ۴ ۔ البقرہ ۲۳

۵ ۔ جلال الدین السیوطی الخصائص الکبری ۱/ ۱۴۸

ہیں۔ بیں نے قرآن کریم کی صرف ایک آیت سے بلاغت کی ایک سو بیس (۱۲۰) وجوہ کو ظاہر کیا ہے (۱)

دعاؤں میں جوامع الکلم

بارگاہ رب العزت جل مجدہٗ میں جب بندہ حاضر ہو کر عرض کرتا ہے تو اس پرشکوہ بارگاہ کا تقاضا ہوتا ہے کہ لب کشائی کم سے کم ہو۔ ادھر بندہ کی حاجات بے انتہا ہوتی ہیں۔ اب سوائے اس کے اور کوئی چارہ کار نہیں ہوتا کہ ایجاز و اختصار کے ساتھ بندہ اللہ کے حضور اپنی معروضات پیش کرے۔ اس لئے دعا میں جامع اور مختصر کلمات استعمال کئے جاتے ہیں۔ وہ دعائیں جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ماثور و منقول ہیں "جوامع الکلم" کی اعلیٰ مثال ہیں۔ چند دعائیں ملاحظہ ہوں۔

۱ ۔ اللھم اصلح لی دینی الذی ھو عصمۃ امری، واصلح لی دنیای التی فیھا معاشی، واصلح لی آخرتی التی الیھا معادی، واجعل الحیاۃ زیادۃ لی فی کل خیر، واجعل الموت راحۃ لی من کل شر (۲)

ترجمہ:۔ یا اللہ تو میرے دین کو درست رکھ جس کے باعث میرے تمام معاملات ٹھیک رہتے ہیں۔ اور میرے لئے میری دنیا کو درست فرما جس میں میری زندگانی ہے۔ اور میرے لئے میری آخرت کو درست فرما جس کی طرف مجھے لوٹنا ہے اور زندگی کو میرے لئے ہر بھلائی میں زیادتی کا باعث بنا اور موت کو ہر برائی سے نجات کا ذریعہ بنا۔

۲ ۔ اللھم انفعنی بما علمتنی وعلمنی ما ینفعنی وزدنی علما الحمد للہ علی کل حال۔ واعوذ باللہ من حال اھل النار (۳)

ترجمہ:۔ یا اللہ مجھے میرے علم سے نفع دے۔ اور وہ علم عطا فرما جو مجھے نفع دے۔ اور میرے علم میں اضافہ فرما۔ اللہ کا ہر حال میں شکر ہے۔ اور میں جہنمیوں کے حال سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔

۳ ۔ اللھم متعنی بسمعی وبصری واجعلھما الوارث منی وانصرنی علی من ظلمنی وخذ منہ بثاری (۴)

ترجمہ:۔ یا اللہ مجھ کو میرے کانوں اور آنکھوں سے نفع عطا فرما۔ اور ان کو تادیر باقی رکھ۔ اور جو مجھ پر ظلم کرے اس پر مجھے مدد دے اور میرا بدلہ اس سے لے۔

۴ ۔ رب اعنی ولا تعن علی وانصرنی ولا تنصر علی وامکر لی ولا تمکر علی واھدنی وانصرنی علی من بغی علی رب اجعلنی لک شاکرا لک ذاکرا لک راھبا مطواعا لک مخبتا الیک اواھا منیبا

---

۱ ۔ محمد بن عبدالباقی، زرقانی علی المواہب ۵/۳۶۶

۲ ۔ صحیح مسلم، کتاب الدعوات

۳ ۔ زرقانی علی المواہب، ۸/۳۲۱ و ترمذی

۴ ۔ ترمذی و بیہقی

رب تقبل توبتي، واغسل حوبتي واجب دعوتي ثبت حجتي وسدد لساني واهد قلبي واسلل سخيمة صدري (۱)

ترجمہ:- اے میرے رب میری مدد فرما۔ میرے خلاف کسی کی مدد نہ کر۔ میرے لئے تدبیر فرما۔ اور میرے خلاف تدبیر نہ فرما۔ اور مجھے ہدایت پر قائم فرما۔ اور جو مجھ پر زیادتی کرے۔ اس پر مجھے نصرت عطا فرما۔ میرے رب مجھے اپنا شکر گزار، ذکر کرنے والا بنا دے۔ اپنے سے ڈرنے والا بہت اطاعت گزار اپنے لئے متواضع گناہوں پر افسوس کنندہ اور رجوع کرنے والا بنا دے۔ میرے رب میری توبہ قبول فرما۔ میری خطاؤں کو دھو ڈال اور میری دعا قبول فرما۔ میری صحت کو ثابت رکھ۔ میری زبان کو درست فرما۔ میرے دل کو ہدایت پر ثبات عطا فرما۔ میرے دل کو کینہ سے پاک رکھ۔

۵ - اللهم لك اسلمت وبك امنت وعليك توكلت واليك انبت وبك خاصمت اللهم اني اعوذ بعزتك لا اله الا انت تضلني انت الحي لا تموت والجن والانس يموتون (۲)

ترجمہ:- اے اللہ میں تیرا فرمانبردار ہوگیا۔ تجھ پر ایمان لایا۔ اور تجھ پر ہی بھروسہ کیا۔ اور تیری طرف ہی رجوع، اور تیری مدد ہی سے دشمنوں سے مقابلہ کیا۔ اے اللہ میں تیری عزت کی پناہ لیتا ہوں۔ تیرے سوا کوئی معبود نہیں کہ تو مجھے گمراہ کر دے۔ تو زندہ ہے مرے گا نہیں۔ جب کہ جن و انس سب ہی مر جائیں گے۔

۶ - اللهم اني اسألك الهدى والتقى والعفاف والغنى (۳)

ترجمہ:- اے اللہ میں تجھ سے ہدایت، پرہیزگاری، پاک دامنی اور بے نیازی کا طالب ہوں۔

۷ - اللهم اني اسألك فعل الخيرات وترك المنكرات وحب المساكين واذا اردت بقوم فتنة فاقبضني اليك غير مفتون (۴)

ترجمہ:- اے اللہ میں تجھ سے نیک کاموں کے کرنے اور برائیوں سے بچنے کی توفیق طلب کرتا ہوں اور مسکینوں سے محبت کا طلبگار ہوں اور جب تو کسی قوم کو آزمائش میں مبتلا فرمائے تو مجھے اپنے پاس بلا آزمائش کے بلا لینا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بکثرت یہ دعا مانگتے تھے۔

۸ - اللهم اني اعوذ بك من العجز والكسل والجبن والهرم والبخل واعوذ بك من عذاب القبر واعوذ بك من فتنة المحيا والممات (۵)

---

۱ ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ عن ابن عباس

۲ - بخاری، کتاب التوحید و مسلم فی الدعوات

۳ - مسلم، ترمذی، ابن ماجہ فی الدعوات

۴ - موطا مالک ۵ - بخاری

ترجمہ:۔ اے اللہ میں عاجزی، کسلمندی، بزدلی، بڑھاپے اور بخل سے تیری پناہ مانگتا ہوں اور تیری پناہ مانگتا ہوں۔ عذاب قبر سے اور تیری پناہ مانگتا ہوں۔ زندگی اور موت کی آزمائشوں سے۔

۹۔ اللھم انی اعوذبك من قلب لا یخشع ومن دعاء لا یسمع ومن نفس لا تشبع ومن علم لا ینفع اعوذبك من ھٰؤلاء الاربع (۱)

ترجمہ:۔ اے اللہ میں تیری پناہ مانگتا ہوں۔ اس دل سے جس میں تیرا خوف نہ ہو۔ اس دعا سے جو مسموع نہ ہو۔ اور اس نفس سے جس میں قناعت نہ ہو۔ اور اس علم سے جو منفعت بخش نہ ہو۔ میں ان چاروں سے پناہ مانگتا ہوں

۱۰۔ اللھم انی اعوذبك من الشقاق والنفاق وسوٓء الاخلاق (۲)

ترجمہ:۔ یا اللہ میں تیری پناہ مانگتا ہوں جھوٹ سے اور نفاق سے اور بداخلاقی سے۔

یہ دس دعائیں، ان بے شمار دعاؤں میں سے ہیں جو فصاحت و بلاغت کی بلندیوں پر ہیں۔ اور جو اپنی جامعیت و ایجاز کے اعتبار سے گویا حد اعجاز تک پہنچی ہیں۔

جوامع الکلم بصورت امثال و حکم

آپ نے اپنی امت کی مثال میں فرمایا۔

۱۔ مثل امتی مثل المطر لا یدری اولہ خیر ام آخرہٗ (۳)

ترجمہ:۔ میری امت کا حال بارش کی طرح ہے کہ معلوم نہیں۔ اس کا ابتدائی حصہ بہتر ہے یا آخری حصہ۔

۲۔ ان من البیان سحرا، وان من العلم جہلا، وان من الشعر حکما (۴)

ترجمہ:۔ بلاشبہ بعض گفتگو جادو کی طرح ہوتی ہے۔ اور بعض علم جہل کی طرح ہوتا ہے۔ اور بعض اشعار پر از حکمت ہوتے ہیں۔

۳۔ ساقی القوم آخرھم شربًا (۵)

ترجمہ:۔ کسی قوم کا ساقی خود سب سے آخر میں پیتا ہے۔

اس کا لفظی ترجمہ تو یہی ہے۔ مگر اس کا مفہوم یہ ہے کہ جس شخص کو لوگوں کی فلاح و بہبود کے کام سونپے جائیں۔ اس کو چاہیئے کہ پہلے ان کی بھلائی کی سوچے۔ بعد میں اپنی فکر کرے۔ یہ نہ ہو کہ سب کچھ خود اپنی ہی جھولی میں ڈال لے اور سب بے چارے عوام محروم رہ جائیں۔

۱۔ ترمذی و نسائی ۲۔ ابوداؤد

۳۔ ترمذی باب الامثال

۴۔ ابوداؤد بروایت عبداللہ بن بریدہ عن ابیہ عن جدہ ۵۔ ترمذی

۴ ۔ رضا الرب فی رضا الوالد و سخط الرب فی سخط الوالد (۱)

ترجمہ :۔ رب کی خوشنودی والد کی خوشنودی میں مضمر ہوتی ہے۔ اور رب کی ناراضگی والد کی ناراضگی میں ہوتی ہے۔
یہاں والد سے مراد باپ ہی نہیں بلکہ یہ لفظ اپنے لغوی معنی میں مستعمل ہوا ہے۔ یہی حکم ماں کا بھی ہے۔ (۲) بلکہ طبرانی کی روایت میں "رضا الرب فی رضا الوالدین" کے الفاظ صریحاً موجود ہیں۔

۵ ۔ ان ابر البر ان یصل الرجل اھل ود ابیہ (۳)

ترجمہ :۔ بڑی نیکی یہ ہے کہ انسان اپنے باپ کے متعلقین سے تعلق قائم رکھے۔ اس میں باپ کے رشتہ دار دوست واحباب اور ماں کے رشتہ دار اور تمام متعلقین آ جاتے ہیں۔

۶ ۔ لیس الواصل بالمکافی، ولکن الواصل الذی اذا انقطعت رحمہ وصلھا (۴)

ترجمہ :۔ جو کسی کا بدلہ چکائے وہ صلہ رحمی کرنے والا نہیں۔ صلہ رحمی کرنے والا تو وہ ہے جو تعلق منقطع کرنے والوں کے ساتھ بھی تعلق قائم کرے۔

۷ ۔ من لا یرحم لا یرحم (۵)

ترجمہ :۔ جو دوسروں پر رحم نہیں کرے گا۔ اس پر بھی رحم نہیں کیا جائے گا۔

۸ ۔ لیس منا من لم یرحم، صغیرنا ولم یوقر کبیرنا (۶)

ترجمہ :۔ جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور ہمارے بڑوں کی تعظیم نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں۔

۹ ۔ المسلم اخو المسلم لا یخونہ ولا یکذبہ ولا یخذلہ کل المسلم علی المسلم حرام عرضہ وما لہ ودمہ (۷)

ترجمہ :۔ مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے۔ اس کو اپنے بھائی کے ساتھ نہ تو خیانت کرنی چاہیئے۔ نہ جھوٹ بولنا چاہیئے۔ اور نہ ہی بے مدد چھوڑنا چاہیئے۔ مسلمان پر دوسرا مسلمان کلی طور سے حرام ہے۔ اس کی عزت، اس کا مال اور اس کا خون سب حرام ہے۔

۱۰ ۔ المومن للمومن کالبنیان یشد بعضہ بعضا (۸)

ترجمہ :۔ مومن دوسرے مومن کے لئے عمارت کی طرح ہے جو ایک دوسرے کو تقویت پہنچاتی ہے۔

---

۱ ۔ ترمذی

۲ ۔ عبدالرحمٰن المبارکپوری تحفۃ الاحوذی شرح ترمذی ۶/۲۵

۳ ۔ ترمذی ۴ ۔ ترمذی ۵ ۔ ترمذی

۶ ۔ ترمذی ۷ ۔ ترمذی

۸ ۔ ترمذی

۱۱ ۔ ان احدکم مرآۃ اخیہ فان رای بہ اذیٰ فلیمطہ عنہ (۱)

ترجمہ :۔ تم میں سے ہر ایک اپنے بھائی کا آئینہ ہے تو اگر وہ اس میں کوئی گندگی دیکھے تو اسے دور کر دینا چاہیئے ۔

۱۲ ۔ لاتقاطعوا، ولاتدابروا ولا تباغضوا ولا تحاسدوا، وکونوا عباد اللّٰہ اخوانا ولا یحل للمسلم ان یھجر اخاہ فوق ثلاث (۲)

ترجمہ :۔ تم قطع رحمی نہ کرو۔ ایک دوسرے سے روٹھ نہ جاؤ۔ اور نہ ایک دوسرے سے دشمنی کرو ایک دوسرے سے حسد نہ کرو۔ خدا کے بندوا بھائی بھائی بن جاؤ۔ کسی مسلمان کو روا نہیں کہ وہ اپنے مسلمان بھائی سے تین دن سے زائد تک بول چال چھوڑے رکھے۔

کس قدر اختصار و جامعیت کے ساتھ ایک محبت بھرے اسلامی معاشرے کے قیام کی ہدایات اس حدیث شریف میں دی گئی ہیں۔ کیا ایک اچھے معاشرے کے لئے اس سے زائد کچھ اور کہا جا سکتا ہے۔

۱۳ ۔ من ضار ضار اللّٰہ بہ ومن شاق شاق اللّٰہ بہ (۳)

ترجمہ :۔ جو دوسروں کو تکلیف و نقصان پہنچائے گا اللہ اس کو تکلیف دے گا ۔ اور جو لوگوں کو مشقت میں ڈالے گا۔ اللہ اس کو مشقت میں ڈالے گا۔

۱۴ ۔ من لا یشکر الناس لا یشکر اللّٰہ (۴)

ترجمہ :۔ جو لوگوں کا شکریہ ادا نہیں کرتا ہے ۔ وہ اللہ کا بھی شکر ادا نہیں کرے گا ۔

ظاہر ہے کہ لوگوں کے انعامات اللہ کے انعامات کے مقابل میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے تو جو شخص معمولی انعام کا شکریہ ادا نہیں کر سکتا۔ وہ لاتعداد نعمتوں کا شکر گزار کس طرح ہو گا۔

۱۵ ۔ الجاھل السخی احب الی اللّٰہ من عابد بخیل (۵)

ترجمہ :۔ سخی جاہل اللہ کے نزدیک بخیل عابد سے زیادہ محبوب ہے ۔

اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ جو شخص بخل کرتا ہے وہ دنیا سے محبت رکھتا ہے ۔ اور مشہور ہے کہ "حب الدنیا راس کل خطیئۃ" دنیا کی محبت ہر گناہ کی جڑ ہے ۔ یہ دنیا کی محبت ہی ہے جو چوری، رشوت ، سود خوری اور حرام خوری کے راستے پر لوگوں کو ڈالے ہوئے ہے پھر شرعاً "بخل" وہ ہے جو اپنے اوپر عائد ہونے والے حقوق ادا نہیں کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص واجب کا تارک ہے ۔ اس شخص سے زیادہ برا ہے جس نے محض نفل کو (حصول علم) چھوڑا ہوا ہو ۔

۱۶ ۔ المومن غر کریم والفاجر خب لئیم (۶)

ترجمہ :۔ مومن بھولا بھالا سخی ہے اور فاجر بخیل کمینہ ہے ۔

---

۱ ۔ ترمذی ۲ ۔ ترمذی ۳ ۔ احمد ابوداؤد، نسائی ، ابن ماجہ ۴ ۔ ابوداؤد و ترمذی

۵ ۔ ترمذی و طبرانی ۶ ۔ ترمذی

۱۷ - لیس المومن بالطعان ولا اللعان ولا الفاحش ولا البذی (۱)

ترجمہ :- مومن عیب جو، لعنت کرنے والا، بیہودہ گو، اور بے حیا نہیں ہوتا۔

۱۸ - ایاکم والظن فان الظن اکذب الحدیث (۲)

ترجمہ :- تم گمان سے بچو کہ گمان سب سے زیادہ جھوٹی بات ہے۔

۱۹ - کفی بک اثما ان لاتزال مخاصما (۳)

ترجمہ :- تمہارے گناہگار ہونے کو اتنا ہی کافی ہے کہ تم ہر وقت جھگڑتے رہو۔

۲۰ - احبب حبیبک ھونا ما عسی ان یکون بغیضک یوما ما وابغض بغیضک ھونا ما عسی ان یکون حبیبک یوما ما (۴)

ترجمہ: تم جس سے محبت کرو۔ ایک حد تک کرو کہ شاید کسی دن وہ شخص تم کو ناپسندیدہ معلوم ہو۔ اور جس سے دشمنی کرو، ایک حد تک کہ شاید کسی دن وہ تمہارا دوست بن جائے۔

۲۱ - الحیاء من الایمان (۵)

ترجمہ :- حیاء ایمان کا جزو ہے۔

۲۲ - لایدخل الجنۃ قتات

ترجمہ :- جنت میں چغلخور داخل نہ ہوگا۔

۲۳ - الاعمال بالنیات (۶)

ترجمہ - اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔

۲۴ - المستشار موتمن (۷)

ترجمہ :- جس شخص سے مشورہ لیا جائے وہ امین ہے۔

یعنی جب آپ نے کسی شخص کو مشورہ کرنے کے لئے منتخب کیا ہے تو اسے چاہیئے کہ وہ دیانتداری سے جو بات صحیح سمجھتا ہے کہے۔ یہ نہیں کہ دوسرے کے اعتماد سے غلط فائدہ اٹھائے۔

۲۵ - المرء بالخیار مالم یتکلم (۸)

ترجمہ: جب تک انسان گفتگو نہ کرے اس کو اختیار رہتا ہے۔

یعنی انسان کو بولنے میں عجلت سے کام نہ لینا چاہیئے۔ اگر لوگ اس زریں قول کو بطور اصول زندگی اختیار کرلیں تو بلا وجہ

---

۱ - ترمذی ۲ - ترمذی، طبرانی، دارقطنی ۳ - ترمذی ۴ - ترمذی ۵ - ترمذی

۶ - بخاری ۷ - ترمذی ۸ - ترمذی

کی ندامت و خجالت سے ہمیشہ محفوظ رہیں ۔

۲۶ ۔ لاخیر فی صحبۃ من لا یری لک ما تری لہ (۱)

ترجمہ : اس شخص کی دوستی اچھی نہیں جو تمہارے حق میں وہ بات نہیں سوچتا جو تم اس کی بابت سوچتے ہو ۔

۲۷ ۔ الناس کاسنان المشط

ترجمہ ۔ لوگ کنگھی کے دندانوں کی طرح ہیں ۔

یہ مساوات محمدی کی حسین تعبیر ہے جس سے معاشرتی زندگی میں لوگوں کے حقوق و فرائض میں مساوات کا تصور ملتا ہے

۲۸ ۔ المرء مع من حب

ترجمہ ۔ انسان اس کے ساتھ ہوگا جس سے اس کو محبت ہے ۔

بظاہر اس کا مفہوم یہی ہے کہ جو شخص کسی سے محبت رکھتا ہے ۔ وہ اس کے طریقہ ہی کو اپنائے گا اور اس پر گامزن رہے گا پھر انجام آخرت میں اس کا ہوگا وہی اس کا بھی ہوگا ۔ لیکن اس کا مفہوم یہ بھی ہے کہ اس دنیاوی زندگی میں ہر شخص اس کے ساتھ رہتا ہے جس سے اس کو محبت ہوتی ہے ۔ اس طرح کسی انسان کی پہچان کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس کے دوستوں کو دیکھے کہ آیا اچھے لوگ ہیں ۔ یا برے لوگ ۔ اور ان دوستوں پر ہی اس شخص کو قیاس کریں ۔

کند ہم جنس با ہم جنس پرواز

۲۹ ۔ الید العلیا خیر من الید السفلی

ترجمہ ۔ اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے ۔

اس میں گداگری کی ممانعت ہے ۔ اور لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کی ترغیب ہے ۔

۳۰ ۔ خیر الامور اوساطہا

ترجمہ ۔ بہترین چیز درمیانہ درجہ کی ہے ۔

یہ اصول پوری زندگی کو محیط ہے ۔ انسان کو میانہ روی اختیار کرنی چاہیئے ۔

۳۱ ۔ لا یلدغ المومن من جحر مرتین ۔

ترجمہ ۔ مومن ایک سوراخ سے دو مرتبہ نہیں ڈسا جاتا ہے ۔

جب ایک مرتبہ مسلمان کو کسی چیز میں نقصان ہو جائے یا کسی شخص سے نقصان اٹھانا پڑے تو دوسری مرتبہ اس سمت کا رخ بھی نہ کرے ۔

۳۲ ۔ السعید من وعظ بغیر ۔

---

۱ ۔ ترمذی

ترجمہ ۔ نیک بخت وہ ہے جو دوسروں سے نصیحت حاصل کرے ۔

یعنی اگر انسان کی فکر صحیح ہے تو وہ نیکوں سے تو اچھی باتیں سیکھ ہی لے گا۔ بروں سے بھی سیکھ سکتا ہے۔ کیونکہ برے لوگوں کا انجام بد رہا۔ ہمارے سامنے اسی دنیا میں آتا ہے۔ اگر ہم اپنے دیدہ عبرت کو وا رکھیں تو نصیحت آموزی کے لئے کافی ہے ۔

۳۳ الوحدۃ خیر من جلیس السوء

ترجمہ۔ تنہائی برے ساتھی کی صحبت سے اچھی ہے ۔

۳۴ ۔ قل الحق وان کان مرا

ترجمہ۔ حق بات کہو خواہ کڑوی ہی کیوں نہ ہو۔

۳۵ ۔ حبك الشئ يعمى يصم ۔

ترجمہ۔ تمہارا کسی چیز سے محبت کرنا اندھا بہرہ کر دیتا ہے۔

یعنی محب محبوب کی برائی دیکھنے اور سننے سے اندھا بہرہ ہو جاتا ہے ۔ اس کو محبوب میں نہ تو کوئی عیب نظر آتا ہے اور نہ ہی وہ اس کے بارے میں کوئی بات بری سنتا ہے ۔

۳۶ ۔ خیر العمل ما قل ودام

ترجمہ۔ بہترین کام وہ ہے جو کم ہو اور ہمیشہ کیا جاتا رہے۔

۳۷ ۔ انزلوا الناس منازلهم

ترجمہ ۔ لوگوں کے ساتھ حسب مراتب سلوک کرو

۳۸ المسلمون تتکافؤ دماءهم

ترجمہ۔ مسلمانوں کے خون برابر ہیں ۔

یہ نہیں کہ امیر کا خون بمقابلہ غریب کے زیادہ قیمتی ہو۔ اور اگر امیر غریب کو قتل بھی کر دے تو قصاص نہ لیا جا سکے ۔

یہ چند "جوامع الکلم" ہیں جو بطور نمونہ ہدیہ قارئین ہیں ۔ یہی وہ پاکیزہ تعلیمات ہیں جن کی بدولت ایک وحشی، امی سنگ پرست قوم ذلت و ادبار کی پستی سے اٹھ کر عزت و عظمت کی چوٹیوں پر آ کھڑی ہوئی ۔ کاش کہ ہم جو نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کا کلمہ پڑھتے ہیں۔ ان انمول موتیوں کو اپنی جھولیوں میں سمیٹ سکیں۔ تاکہ دین و دنیا کی سربلندیاں ہمارا مقدر بن جائیں ۔

آمین بجاہ النبی الامین صلی اللہ علیہ وسلم

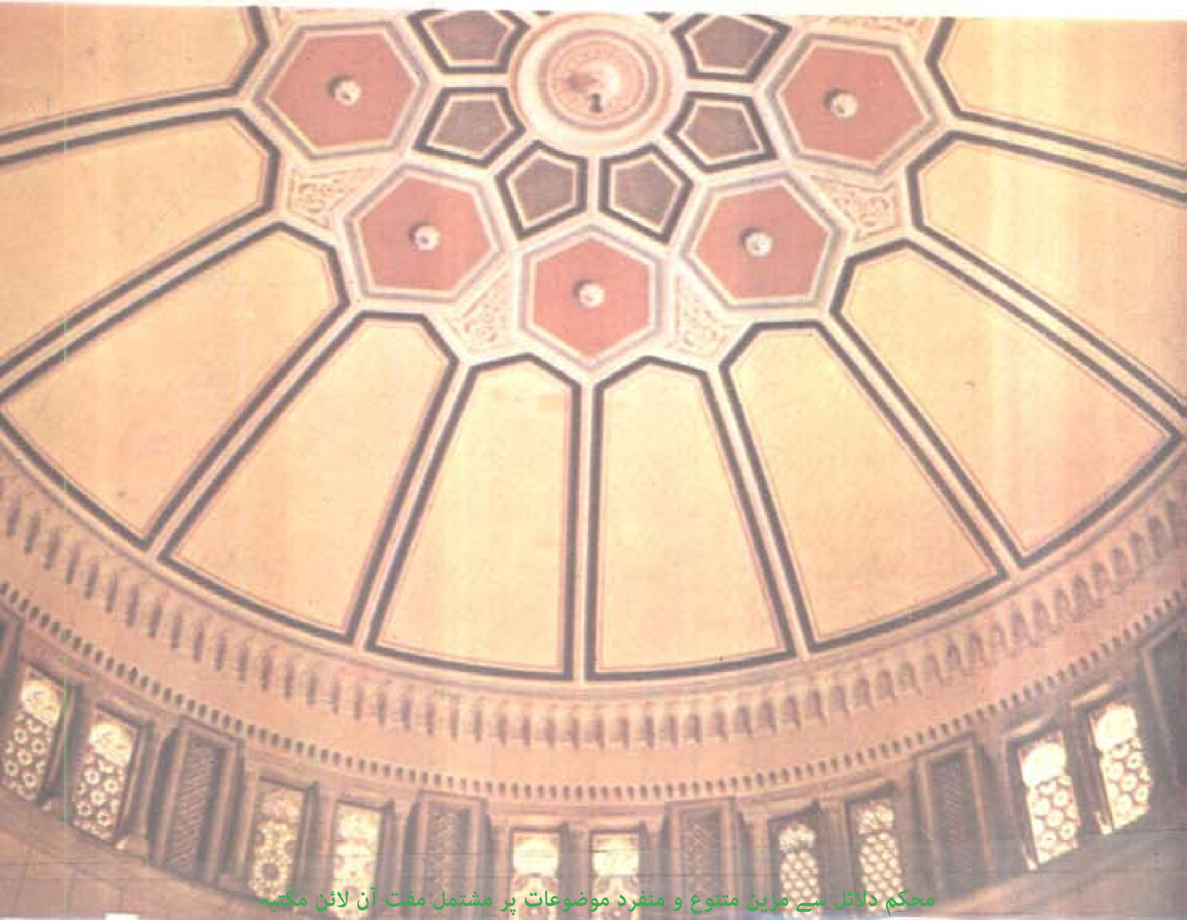
إِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ عَلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ

بے شک آپ پیغمبروں میں ہیں (اور) سیدھے رستے پر ہیں

(یٰس: ۳)

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم

نازک ترین لمحات کی میزان پر



سرورِ عالمؐ نازک ترین لمحات کی میزان پر

سید محمد ریاست علی فاروقی

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

الٓمّٓ ۝ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَكُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ ۝

پ ۲۰ ع ۱۳ : سورۃ العنکبوت

ترجمہ : کیا لوگ اس گھمنڈ میں ہیں کہ اتنا کہہ لینے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے، اور ان کی آزمائش نہ ہوگی،

یہ آیت مقدسہ مسلمانوں کو خبردار کر رہی ہے کہ صرف کلمہ گوئی اور زبانی ادعائے ایمانی کافی نہیں ہے بلکہ تمہیں آزمایا جائے گا اور یہ آزمائش متنوع ہوگی، ارشاد فرمایا گیا۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ

بقرۃ آیت ۱۵۵

یعنی "اور البتہ ہم تم کو آزمائیں گے خوف سے اور بھوک سے اور جانوں، مالوں اور پھلوں کے نقصان سے۔

اس آزمائش میں پورے اترو گے تو مسلمان ٹھہرو گے۔ ہر شی کی آزمائش میں یہی دیکھا جاتا ہے کہ جو باتیں اس کی حقیقت اور واقعیت کے لئے درکار ہیں وہ اس میں ہیں کہ نہیں ایمان کے حقیقی اور واقعی ہونے کے لئے یہ بات ضروری ہے کہ مسلمان آزمائش کی ہر گھڑی میں پورے اترے۔

انسان کی زندگی میں کوئی لمحہ ایسا نہیں جہاں اسے آزمائشوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے کوئی فیصلہ نہ کرنا پڑے۔ اس کا آزمائشوں سے دوچار ہونا ایک فطری امر ہے۔ زندگی قدم قدم پر فیصلے چاہتی ہے اور یہ فیصلے اگر صحیح سمت میں اور بروقت ہوں تو ان سے حاصل شدہ نتائج کی روشنی میں زندگی بامقصد اور پروقار ہوگی ورنہ بے معنی اور بے اثر یہ دنیا ابتدائے آفرینش ہی سے انسانی فیصلوں کی محتاج ہے۔ دراصل یہ فیصلے حیات انسانی کی تقدیر بنانے اور بگاڑنے میں نہایت اہم اور مرکزی کردار ادا کرتے ہیں یا بالفاظ دیگر زندگی کا سارا نظام ان ہی فیصلوں کا مرہون منت ہے۔ کائنات کی فضاء میں سانس لینے والا فرد عامی ہو یا آمر مصلح ہو یا قائد۔ یہاں تک کہ ہادئ انسانیت، جس سے میری مراد پیغمبر ہے۔ اس کو بھی ایسے لمحات سے گزرنا پڑتا ہے جس کو زندگی کے نازک ترین لمحات سے تعبیر کیا جا سکتا ہے

انسان کی زندگی میں کچھ ایسے نازک ترین لمحات ضرور آتے ہیں جن میں حسن تدبر اور کمال فراست سے نہ نمٹا جائے تو زندگی دا غدار ہو جانے کا خطرہ یقینی ہے اور اس سے نہ صرف اس کا وہ مرتبہ یا وہ عظمت جس پر وہ فائز ہے متاثر ہو گی جو اس کے لئے باعث ہلاکت ہے۔ بلکہ اس کے منفی اثرات کسی نہ کسی طرح انسانیت کو بھی مجروح و مکدر بنانے کا سبب بن جائیں گے۔ انسان کا کمال تدبر اور اخلاق یہ ہے کہ وہ ان لمحات میں کس حد تک ثابت قدم رہتا ہے اور کہاں تک صبر و برداشت، بردباری و تحمل مزاجی اور حقیقت پسندی سے کام لیتا ہے، کیسے اور کس درجہ حق و انصاف کا دامن ہاتھ میں لئے رہتا ہے۔ اور خوف الٰہی کا کتنا پاس و لحاظ رکھتا ہے۔ اس نے اگر ان عظیم اخلاقی قدروں کو برباد نہ ہونے دیا تو یہ ناممکن ہے کہ وہ زندگی کے نازک لمحات کی میزان پر پورا نہ اترے۔ چونکہ نفس کی سرکش قوتیں اسے مغلوب کرنے کے لئے ہمیشہ تاک میں لگی رہتی ہیں۔ اس لئے ان سے بکمال ہوشمندی نمٹنا اور ان کو زیر کرنا ہی معراج حیات ہے۔ یہ جب ہی ممکن ہے کہ انسان کا قول و فعل منشائے الٰہی کے زیر اثر اور اطاعت الٰہی کے تابع ہو۔ ورنہ نفس کی خودسری اس کو راستہ کے مناہج سے مراحل دور کر دے گی۔ درحقیقت انسانیت کا بھرم اسی طرح قائم رہ سکتا ہے۔ کہ انسان معاملات زندگی میں ثابت قدم رہے۔

تاریخ کے اوراق پر نظر ڈالیں تو اس میں ہمیں بڑی بڑی پرشکوہ، باوقار، صاحب سطوت اور اولوالعزم ہستیاں دکھائی دیں گی، کہیں شعلہ بیان مقرر نظر آئیں گے تو کہیں سحر البیان واعظ، کہیں پختہ کار مدبر ملیں گے تو کہیں بلند حوصلہ اکابر، فلسفی و حکیم، قائد و مصلح، مرشد و مبلغ، مفکر و دانا، عاقل و فاضل، عالم و پیشوا، حاکم و سپہ سالار، فاتح و سیاستداں اور ایسی بے شمار دیگر خصوصیات کی حامل ہستیاں نظر آئیں گی، جنہوں نے کارگاہ حیات کو بار بار زیر و زبر کیا ہے، نئے نئے مذاہب کی بنیاد ڈالنے والے، نئی نئی تہذیبوں کو جنم دینے والے اور اخلاقی قدروں کے داعی نظر آئیں گے لیکن جب ہم ان کے کارناموں اور ان سے پیدا شدہ نتائج پر غور کرتے ہیں تو اگر کہیں جزئی فلاح بھی دکھائی دیتی ہے تو اس کے اثرات یا تو زندگی کے ایک گوشہ پر نمایاں نظر آتے ہیں یا پھر زندگی کے چند پہلوؤں پر ان کی ایک ہلکی سی جھلک نظر آتی ہے اور پھر وہ کچھ عرصہ بعد آپ اپنی موت مر جاتے ہیں۔ یہ خصوصیت صرف انبیاء علیہم السلام کو حاصل ہے کہ وہ حیات انسانی پر ہر رخ سے اثر انداز ہوتے ہیں اور اس کو ایک مکمل انقلاب سے دوچار کر کے آن کی آن میں اس کی کایا پلٹ دیتے ہیں انبیاء علیہم السلام نے اپنے اپنے دور میں اپنی اپنی قوم، اور اپنے اپنے خطوں میں حیات انسانی کو اجتماعی صورت میں بدلنے کا جو طریقہ اور فریضہ سرانجام دیا وہ اپنی جگہ نہایت اہم اور مہتم بالشان ہے لیکن درحقیقت انسانیت کی تکمیل خاتم الانبیاء سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک ہاتھوں سے ہوئی آپ کی حیات مقدسہ کا ایک ایک گوشہ اپنی لامحدود اور گرانمایہ خوبیوں اور فضائل کا ایک ایسا جامع اور کامل نمونہ ہے جس پر انسانیت جتنا بھی فخر کرے کم ہے دنیا میں ایسے بہت سے ہادی و رہبر نظر آئیں گے جنہوں نے زندگی کے نازک لمحات میں صبر و تحمل،

عدل و انصاف، عزم و ہمت کا ایسا مظاہرہ کیا اور اپنی صلاحیت و ذہانت سے ایسے بروقت و برمحل فیصلے کئے جن سے وقتی طور پر تاریخ کے دھارے کا رخ تو مڑ گیا مگر ان کو دوام حاصل نہ ہو سکا یہی وجہ تھی کہ ان فیصلوں سے انسانیت کی وہ خدمت نہ ہو سکی جس کی اسے شدید ضرورت تھی۔ اس کے برعکس ہادی عالم، محسن انسانیت فخر کائنات سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی کے ہر موڑ اور ہر لحہ پر ایسے نتیجہ خیز، دوررس اور دوامی فیصلے کئے جو ہر اعتبار سے کامل تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ کے قول و فعل میں تضاد نہ تھا جو کچھ آپ فرماتے وہی کرتے جن چیزوں کو آپ نے برا کہا اور لوگوں کو ان سے منع کیا ان کا ادنیٰ سا شائبہ بھی آپ کی سیرت و کردار میں کہیں موجود نہ پایا گیا۔ اس طرح جن نیکیوں اور بھلائیوں کی طرف آپ نے لوگوں کو دعوت دی تو سب سے پہلے اور بڑھ چڑھ کر آپ خود ان پر عمل پیرا ہوئے۔ آپ کی زندگی فضائل اخلاق اور محبت و رافت کا ایک عملی نمونہ تھی سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن ہر قسم کے تعصّبات سے پاک و صاف تھا قبیلہ، قوم، وطن، زبان، رنگ اور نسل غرضیکہ ہر قسم کے تعصّب سے آپ دور تھے۔ آپ کو نہ خونی رشتے متزلزل کر سکے اور نہ ذاتی خواہشیں آپ کی راہ میں حائل ہو سکیں آپ کی بے نظیر شہامت و شجاعت ضرب المثل تھی۔ جو کسی بڑی سے بڑی طاقت سے مرعوب ہونا اور کسی بڑے سے بڑے خطرہ سے منہ پھیرنا جانتی ہی نہ تھی۔ صبر و تحمل، ضبط نفس اور بلند ہمتی آپ کا ایک ایسا خصوصی وصف تھا کہ مخالفین کی رکیک سے رکیک اور ناز یبا حرکتوں پر بھی آپ نے سر رشتۂ اعتدال کو ہاتھ سے کبھی نہیں چھوڑا اور نہ کسی کی بربھی پر ضبط نفس کا دامن ہاتھ سے چھوڑا، نہ کسی کو گالی کا جواب گالی سے دیا اور نہ آپ کی زبانِ اقدس سے کبھی ایک لفظ شائستگی سے گرا ہوا نکلا، دشمنوں نے بارہا ایسی حرکتیں کیں جو سخت دل آزار، بڑی توہین آمیز اور اشتعال انگیز تھیں۔ مگر آپ نے ان موقعوں پر تحمل و برداشت، عالی ظرفی اور کوہ ثباتی اور نبوی وقار کا وہ ثبوت دیا کہ تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ فتح مکہ کے موقعہ پر لرزہ براندام کافروں کے خوف اور اعتراف تقصیرات کے جواب میں " لا تثریب علیکم الیوم انتم الطلقاء" کا ارشاد آپ اپنی مثال ہے اور یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ آپ معلم اخلاق بنا کر بھیجے گئے تھے۔

سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ہر لمحہ تاریخ ساز تھا اور چونکہ آپؐ ہی کے مبارک ہاتھوں انسانیت کی تکمیل مقدر ہو چکی تھی۔ اس لئے انسانیت آپؐ پر جتنا بھی فخر کرے وہ کم ہے۔ آپ کی مقدس ہستی تو وہ ہے جسے انسانیت کی لاج کہیئے، آدمیت کی پہچان کہیئے۔ ایمان کی جان کہیئے۔ جو باعث تخلیق کائنات ہے۔ قدرت کا ایک عظیم عطیہ اور جامع صفات ہے جو زینت دو عالم ہے فخر موجودات ہے، اصل کائنات ہے اور سراپا شانِ رحمت ہے۔ جس کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے جس کی ہر بات وحی خدا، جو اوّل و آخر، یٰسین و طٰہٰ یعنی افضل صلوات، اکمل تحیات، سبب کائنات، خلاصۂ موجودات، سرور بنی آدم، روح روان عالم، وارث علوم اولین، مورث کمالات آخرین، حجۃ الیقین، صادق و امین، مفسر قرآن مبین، ذات و صفات خداوندی کے مظہر اتم، مختار کل، مالک ہر دو جہاں

محمد مصطفیٰ، احمد مجتبیٰ، خاتم النبیین، شفیع المذنبین، رحمت للعالمین، محبوب رب العالمین (صلی اللہ علیہ وسلم)

آیئے اب ہم سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی صدق آگیں و مقدس زندگی کے روز شب کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ آپ نے انسانیت کو بنانے، سنوارنے اور اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں کیا کردار ادا کیا؟ سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی آزمائشوں، مصائب و آلام اور عظیم مہمات سے معمور ہے۔ لیکن آپ نے ان سخت مراحل سے گذرنے میں انسانیت کی اعلیٰ صفات اور بلند قدروں کو کبھی مجروح نہیں ہونے دیا اور ثابت کر دیا کہ آپ ہی انسان کامل ہیں۔ زندگی کے ایک ایک موڑ پر جس جذبۂ قربانی، حق و صداقت، ایثار و خلوص کا عملی نمونہ آپ نے پیش کیا۔ اگر آپ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو نہ صرف یہ کہ ہمت ہار بیٹھتا بلکہ ان مصائب و آلام کی شدت و حدت سے دم توڑ دیتا۔

سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ سراپا رافت و رحمت تھے اس لئے مخلوق خدا سے آپ کو بے پناہ محبت تھی آپ کو انسانیت سے گہرا لگاؤ تھا آپ کی پوری حیات طیبہ تدبر، استقامت، شجاعت، رافت اور محبت کا عملی نمونہ تھی۔ ان خوبیوں کا اگر ہم اندازہ کرنا چاہیں جو سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ میں موجزن تھیں تو ہم ان واقعات و حالات کو پیش نظر رکھیں جن میں آپ نے اہم ترین فیصلے صادر فرمائے۔ ان فیصلوں کے دوران آپ پر ایسا وقت بھی آیا جہاں صبر و تحمل کا دامن انسان کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا اور رائے صائب جواب دے جاتی لیکن آپ نے کمال تدبر اور استقامت سے کام لیکر انسانیت کی لاج رکھ لی اور دنیا کو دکھایا کہ زندگی کے نازک لمحات کی میزان پر کس طرح انسانی وقار اور کمال کو بچایا جا سکتا ہے۔ آپ نے ان مواقع پر جس حوصلہ اور عالی ہمتی کا اظہار فرمایا تاریخ عالم میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ اگر آپ کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو شاید اسے زندگی سے فرار کرتے ہی بن پڑتی۔ دنیا میں ایسے نیک دل اور حساس طبع لوگ بہت سے پائے گئے۔ جنہوں نے بدی سے گھبرا کر اپنا راستہ ہی بدل لیا۔ ایسا شاذ و نادر ہی ہوا کہ وہ اس کے آگے سپر ڈال جاتے لیکن سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر برائی کا مقابلہ کیا، ہر بدی کو جب تک نیکی سے نہ بدل لیا آرام نہ فرمایا۔ اس وصف میں آپ کی ہمسری کا دعویٰ تو در کنار، دنیا کی کوئی ہستی آپ کے نقش پا تک نہ پہنچ سکی، آپ کی حیات طیبہ میں بے شمار ایسے نازک لمحات آئے جہاں بشریت کا تقاضا تھا۔ کہ آپ کوئی ایسا فیصلہ کر سکتے تھے جو ایک طرف قانونی، اخلاقی اور سیاسی نقطۂ نظر سے درست ہوتا لیکن آپ نے کبھی کوئی ایسا فیصلہ نہیں فرمایا۔ جس سے انسانیت کی اعلیٰ اقدار پر کسی طرح کا کوئی حرف آتا۔ عدل و انصاف کی ایسی روشن مثال کسی دوسری ہستی میں ہمیں نہیں ملتی۔

سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا عزم پختہ اور غیر متزلزل تھا۔ صبر و استقامت کا یہ عالم کہ جس کو مشکلات و مصائب اور ناموافق حالات کا عظیم سے عظیم تر طوفان بھی شکست نہ دے سکا جسے کوئی خوف نہ متزلزل کر سکا نہ کوئی لالچ راہ حق سے منحرف کر سکا اور نہ آپ کے سکون و استقامت اور لطف الٰہی کی امید کو مایوسی و دل شکستگی میں تبدیل کر سکا۔ اور وہ تھی آپ کی کوہ تمثال مستقل مزاجی جس سے ٹکرا کر ساری مخالف طاقتیں دم توڑ گئیں، اور

اس آرزو کی تکمیل سے مایوس ہوگئیں کہ وہ اپنے کسی حربہ، کسی طاقت کے مظاہرہ، متواتر ستم رانیوں اور کسی تحریص و ترہیب کسی افترا پردازی اور الزام تراشی کی مہم اور کسی بڑے سے بڑے ہتھکنڈہ سے آپ کو اس مشن عظیم سے باز رکھ سکیں گے جسے لیکر آپ اٹھے تھے۔ چنانچہ حیات طیبہ کے مقدس اوراق الٹیے، اوران لرزہ براندام کرنے والے واقعات کا اندازہ کیجئے جن سے سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو حق گوئی کے عوض مصائب و آلام سے دوچار ہونا پڑا۔

یوں تو سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ ان بے شمار نازک لمحات سے معمور ہے جہاں آپؐ نے تاریخ ساز فیصلے فرمائے کہ اگر ہم ان کو بیان کرنا چاہیں تو نہ صرف یہ کہ زبان و قلم جواب دے جائیں بلکہ ان میں سے اگر کسی ایک ہی فیصلہ کا تجزیہ کیا جائے تو عمر نوح بھی تمام ہو جائے مگر "حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا" بس اتنا ہی کافی ہے کہ آپ اور آپ کی حقیقت اللہ ہی جانتا ہے۔ لہٰذا میں اس مختصر سے مضمون میں صرف ان چند واقعات کو ہی پیش کرنے کی سعادت حاصل کروں گا۔ جن کو تاریخ اسلام نے بڑی درایت و احتیاط سے پیش کیا ہے۔

حجر اسود کی تنصیب

سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل حجر اسود کو کعبہ میں نصب کرنے کا واقعہ سیرت کی کتابوں میں مرقوم ہے بعض قبائل عرب نے کعبہ کی از سر نو تعمیر کرنے کے لیے مختلف حصے باہم تقسیم کر لیے تھے اور جب تعمیر کا کام مکمل ہو گیا، تو حجر اسود کے نصب کرنے کا موقع آیا۔ اس سعادت کو حاصل کرنے کے لیے ہر ایک قبیلے کی یہ خواہش تھی کہ حجر اسود کو اس کے مقام پر نصب کرنے کا شرف صرف اسی قبیلہ کو حاصل ہو۔ یہ ایک انتہائی اہم اور پیچیدہ مسئلہ تھا۔ جو بظاہر سلجھتا ہوا نظر نہیں آتا تھا۔ اس مقدس فریضہ کی ادائیگی کے لئے ہر قبیلہ بے چین تھا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ تلواریں نیام سے باہر آگئیں عرب کے دستور کے مطابق قبائل کے سرداروں نے خون سے بھرے ہوئے کٹورہ میں انگلیاں ڈبو ڈبو کر جان پر کھیل جانے کی قسم کھائی اور قریب تھا کہ خون کی ندیاں بہہ جائیں۔ یہ جھگڑا اتنا طول پکڑ گیا کہ اس کے نمٹنے میں کئی روز لگ گئے بالآخر انہیں قبائل کے ایک بزرگ سردار نے یہ تجویز پیش کی کہ کل صبح جو شخص سب سے پہلے حرم کعبہ میں داخل ہو اُسے حکم تسلیم کر لیا جائے اس رائے کو تمام قبائل نے تسلیم کیا اور اس طرح یہ سنگین جھگڑا دوسرے دن تک کے لئے ٹل گیا۔ قدرت کی کرشمہ سازی اور علو محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کا اعجاز دیکھیے کہ دوسری صبح سب سے پہلے جو شخص حرم کعبہ میں داخل ہوا وہ سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ باوجودیکہ بہت سرداروں نے یہ کوشش کی تھی۔

ہر چند کہ تجویز کے مطابق یہ شرف تنہا آپ کا حصہ تھا تاہم آپ کا حسن تدبر، معاملہ فہمی، آپؐ کی فراست کی انفرادیت اور دانائی کا انوکھا فیصلہ ملاحظہ ہو کہ آپؐ نے اس فضیلت و شرف میں تمام قبائل کو برابر کا شریک اس طرح بنا لیا کہ آپؐ نے ایک چادر منگوائی اور حجر اسود کو اس میں رکھوایا۔ پھر آپؐ نے ہر قبیلہ سے ایک ایک سردار منتخب کیا اور ان سے فرمایا کہ چادر کے کناروں کو تھام کر اوپر اٹھائیں۔ جب چادر مقام ابراہیم کے برابر آگئی تو پھر آپؐ نے حجر اسود کو اٹھا کر اس کے

اصل مقام پر نصب کر دیا۔ اللہ کے جس گھر کا سنگ بنیاد آپ کے جد امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے رکھا تھا۔ اسی کا یہ متبرک اور عظیم پتھر جو ایک عظیم خونریزی کا باب بننے والا تھا۔ آپ کے دست مبارک سے اس کے اصل مقام پر نصب ہو گیا اور اس نازک مرحلہ پر آپ کے تدبر نے میزان عدل کے تقاضوں کو پورا کر دیا۔

آج بھی وہ مقدس پتھر لاکھوں فرزندان توحید کے عقیدت سے بھرپور دلوں کی دھڑکنوں کا مرکز ہے اور جس کو بوسہ دیتے وقت آپ کے اس تدبر اور فراست کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، جس نے ایک عظیم خونریزی کا دروازہ بند کر دیا تھا۔

شعب ابو طالب

سرور دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم کی دعوت توحید سے کفار قریش کا وہ معیار زندگی جس کے وہ خوگر تھے، بری طرح مجروح ہو رہا تھا ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسلام نے ان کی مذہبی زندگی کے تار و پود بکھیر کر رکھ دیئے تھے۔ کفار قریش دیکھ رہے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریک ایک عظیم انقلاب کا پیش خیمہ ہے وہ سمجھ رہے تھے کہ اگر اس سیلاب کے آگے متحدہ کوششوں سے بند نہ باندھا گیا تو مستقبل قریب میں عربوں کی عہد جاہلیت کی ثقافت کا شیرازہ اس طرح منتشر ہو جائے گا کہ پھر اس کے منتشرہ اوراق کو یکجا کرنا ناممکن ہوگا۔

لوگ رفتہ رفتہ آپ کی تعلیم و تربیت سے متاثر ہو کر دامن اسلام کی روح پرور ٹھنڈی ہواؤں میں آکر ایک ابدی سکون حاصل کر رہے تھے کفار قریش نے جب یہ دیکھا کہ آہستہ آہستہ لوگ اسلام کی طرف راغب ہو رہے ہیں تو انہوں نے ہر ممکن طریقہ سے اس دعوت حق کی مخالفت کی، لوگوں کو ڈرایا، دھمکایا، لالچ دی اور طرح طرح کے حربے آزمائے۔ مگر اسلام جن نفوس کو پاکیزگی عطا کر چکا تھا وہ پھر اس گھناؤنی اور گندگیوں سے بھرپور زندگی کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کے بھی روادار نہ تھے۔ کفار قریش نے حبش میں جو سفارت بھیجی تھی وہ بھی بری طرح ناکام واپس آچکی تھی اس ناکامی نے ان کی آتش غضب میں اور بھی اشتعال پیدا کر دیا۔ اب انہوں نے ایک ہولناک حربہ سے کام لیا۔ مقاطعہ اور ترک تعلقات کی سزا اس زمانہ میں بڑی کڑی سزا تھی۔ جس کی وجہ سے مغضوب جماعت طرح طرح کی مصیبتوں سے زچ ہو کر قوم کا مطالبہ منظور کرنے پر مجبور ہو جاتی تھی - ورنہ مکمل تباہی کے علاوہ اور کچھ ہاتھ نہیں آتا تھا۔ نبوت کے ساتویں سال سرداران قریش نے اس باہمی معاہدہ پر بنی ہاشم کے مقاطعہ کا اعلان کر دیا اور خانہ کعبہ کے دروازہ پر یہ تحریری دستاویز آویزاں کر دی گئی کہ قبائل مکہ کا کوئی فرد کسی ہاشمی سے نہ خرید و فروخت کرے گا، نہ قرابت کے تعلقات کا پاس و لحاظ رکھیگا۔ اور نہ کسی قسم کے مشروبات و ماکولات اس کے ہاتھ فروخت کر سکے گا۔ اگر وہ بھوکوں مرتے ہیں تو مرا کریں۔ اس معاہدہ پر عملدر آمد سختی سے ہوا۔ حضرت ابو طالب جو خاندان کے سربراہ تھے مجبور ہو کر سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور بنی ہاشم کے دوسرے افراد کو لیکر ایک درّہ کوہ میں جو "شعب ابو طالب" کے نام سے مشہور ہے چار و ناچار اقامت گزیں ہو گئے۔ حضرت عباس بن عبد المطلب اگرچہ اس وقت ایمان کی سعادت سے محروم تھے۔ لیکن فرد خاندان ہونے کے باعث

اس جماعت میں شامل تھے۔ صرف ابولہب نے ساتھ نہ دیا اور بزعم خود اپنے گھرانہ کو اس ابتلا سے بچالیا۔ حوصلہ مندبنی ہاشم رسولِ برحق کی شہامت و شجاعت اور عزم و استقلال کی پشت گرمی سے ان شدائد کا تین سال تک بڑی پامردی سے مقابلہ کرتے رہے۔ باوجودیکہ اس خاندان پر ایسے روز و شب بھی گذر گئے کہ بھوک کی شدّت سے مجبور ہو کر اور بے قابو ہو کر درخت کی پتیاں اور سوکھی شاخیں کھا کر گزارا کرنا پڑا مگر اس حوصلہ شکن ماحول اور عزم و ثبات کو متزلزل کر دینے والے حالات نے سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا قدم اٹھانے پر متوجہ بھی نہ ہونے دیا۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا کہ خدانخواستہ آپؐ نے ہمت ہار دی۔ صبر و تحمل کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا اور باطل کی دسیسہ کاریوں کے سامنے مجبور اور بے لبس ہو گئے۔

"تین سال کا عرصہ کوئی معمولی عرصہ نہیں ہوتا جبکہ حال یہ ہو کہ نہ کسی سے ہمدردی کی امید، نہ کوئی پرسان حال، نہ کوئی معاون و غمگسار ہر طرف مایوسی اور ناامیدی لیکن آپؐ کے قلبِ سلیم میں نورِ نبوت کی جو جوت چمک رہی تھی اس نے ان مایوسیوں کے اندھیرے میں اجالا کر رکھا تھا، سامان آسائش تو درکنار، قوت لایموت کے لالے پڑے تھے زندگی کے لوازم میں سے معمولی سا معمولی سامان بھی دسترس سے بہت دور تھا ان حالات میں ثبات و قرار کا کون مدعی ہو سکتا تھا۔ بڑی بڑی کوہ وقار شخصیتیں ایسے موقع پر جی چھوڑ دیتیں۔ لیکن قربان جائیے اس پیکرِ عزم و ثبات کے کہ نہ زبان پر شکوہ نہ دوسروں سے معاونت ابرام نہ امداد کی التجا، صرف غم تھا تو یہ غم تھا کہ اس تین سال کی طویل مدت میں دعوتِ اسلام کا کام اس تیز رفتاری سے جاری نہ ہو سکا۔ جیسا کہ مقاطعہ سے قبل کے سالوں میں انجام پایا تھا۔

آپؐ کی حیات مبارکہ میں یہ ایک ایسا لمحہ تھا، جس میں آپؐ کے حوصلہ آپؐ کے عزم اور آپؐ کے ثبات قدم نے تمام باطل قوتوں کو شکست فاش دیکر انسانی عظمت کی لاج رکھ لی اور دنیا کو دکھا دیا کہ اللہ کی راہ میں بڑی سے بڑی قربانی بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ آپ کی اس مستقل مزاجی اور اعلیٰ کردار کا یہ اثر ہوا کہ دشمنوں نے تنگ آ کر خود ہی "عہدنامہ" کو چاک کر ڈالا اور استقلال و عزمِ نبوت کے سامنے سپرانداز ہو گئے۔

غم کا سال

اللہ تعالیٰ کی محبت کا دعویٰ بھی کیسی کٹھن منزل ہے کہ راہ میں کیسی کیسی دشواریاں آتی ہیں ایک سے ایک پرخار راستہ سے گذرنا پڑتا ہے۔ مصائب و آلام سایہ کی طرح ہر قدم ساتھ رہتے ہیں لیکن اللہ سے محبت کا دعویٰ کرنیوالا تمام مشکلات کو صبر و تحمل سے جھیل جاتا ہے اور اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہتا ہے سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اعلاء کلمۃ الحق کی راہ میں جن شدائد سے دوچار ہونا پڑا ان کو معرضِ تحریر میں لانا آسان کام نہیں۔ اگر ان کو بیان کیا جائے تو قلم لکھتے لکھتے تھک جائے لیکن اس لامتناہی شدائد کا سیلِ رواں کبھی ختم نہ ہو۔ تاریخ کے اوراق گواہ ہیں کہ انقلاب کے داعی، راستی و صداقت کے علمبردار، صدق و صفا کے پیکر، توحید الٰہی کے مبلغ اور عزم و استقامت کے جو دواعی اللہ تعالیٰ نے آپ کی ذات میں ودیعت فرما دیئے تھے۔ ان کی مثال پیش نہیں کی جا سکتی۔ شعب ابو طالب کے

شدائد اور سختیوں کے زخم ابھی پورے طور پر مندمل نہیں ہوئے تھے کہ نبوّت کے دسویں سال یعنی سنہ ۱۰ نبوت میں آپ کے مونس و غمخوار، شفیق و رفیق، معاون و مددگار و عم محترم حضرت ابو طالب عمر کی اسّی بہاریں دیکھ کر اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے۔ یہ وہ چچا تھے جنہیں بھتیجے سے بے پناہ محبت تھی اور جنہوں نے شفقت و محبت میں کبھی دریغ نہیں کیا۔ جب بھی آپ پر کوئی کٹھن وقت آیا تو حضرت ابو طالب آپ کے سینہ سپر ہوتے۔ کیا سفر اور کیا حضر، ہر حال آپ کے حامی و مددگار رہے۔ شعب ابو طالب کے پر مصائب ماحول اور زہرہ گداز روز و شب میں بھی آپ کا ساتھ نہ چھوڑا۔ آج وہی شفیق ہستی آپ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئی۔

آپ کی رحلت سے سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنا عظیم صدمہ پہنچا، کہ کئی روز تک گھر سے باہر نہیں نکلے۔ ابھی حضرت ابو طالب کا کفن بھی میلا نہیں ہوا تھا اور آپ اس صدمہ سے سنبھلنے بھی نہیں پائے تھے کہ آپ کی شریک حیات، غم گسار، مونس و ہمنوا حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ نے رحلت فرمائی۔ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مصائب اور کلفتوں میں وجہ تسکین اور پریشانیوں میں آپ کے صبر و استقامت کی سوید و ممد تھیں، آپؐ ایک وفادار اور غمگسار بیوی تھیں جنہوں نے آزمائش کی ہر گھڑی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دیا تھا۔ آپ صرف محرم راز ہی نہیں تھیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مصائب و آلام میں برابر کی شریک تھیں۔ وفا شعاری میں آپ کا کوئی ثانی نہ تھا اور آپ نے بعثت سے قبل بھی اس مؤانست اور شریک رنج و آلام ہونے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ اوّلین وحی کے نزول سے لیکر تا دمِ آخر تحریک حق اور راہِ حق میں صرف بذل اموال ہی نہیں بلکہ حضور کے ساتھ ہر حال میں دمساز و غمگسار رہیں قدم قدم پر مشورے بھی دیئے اور جذبۂ خلوص کی تمام تر صداقتوں کے ساتھ آپ کا ساتھ دیا۔

ان دونوں عزیز ترین غمگساروں اور ہمنواؤں کی مستقل جدائی سے آپ پر کیا بیتی ہو گی؟ اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ ایک کے بعد ایک کا اس طرح بچھڑ جانا آپ کی زندگی کا ایک عظیم سانحہ تھا۔ چنانچہ تاریخ اسلام میں یہ سال "عام الحزن" یعنی غم کا سال کہلاتا ہے۔ جو سانحہ موت سے اس وقت ادا ہوا تھا۔ بیشک سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم آگاہ تھے کہ منصب رسالت کی تفویض اور مصائب و آلام کا ہجوم ایک لازم و ملزوم چیز ہے اس لئے آپ ایسے زہرہ گداز مواقع پر بھی اللہ تعالیٰ ہی سے رجوع فرماتے اور ہر تکلیف و دشواری کے وقت اسی کا سہارا ڈھونڈتے تھے مگر عزیز ترین رشتہ داروں کی موت، کا غم تقاضائے بشریت کے عین مطابق ہے۔

مشیت ایزدی یہی تھی کہ اس کا یہ عظیم بندہ فاصبر کما صبر اولوا العزم من الرسل (احقاف: ۳۵) کے سانچے میں ڈھل جائے اور واصبر علی ما اصابک ان ذلک من عزم الامور (لقمان: ۱۷) کا ایک پیکر تقسیہ بن جائے تاکہ دنیا میں کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ پیغمبر آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابو طالب اور ام المؤمنین حضرت خدیجہ کی موت پر اس لئے مضطرب اور نالہ کناں ہیں کہ ان کی ظفر مندیاں اور کامرانیاں ان ہی دو

ہستیوں کے تعاون کا نتیجہ تھی۔ ان دو ہستیوں کا ایسے وقت میں جدا ہو جانا جبکہ قدم قدم پر آپ کو ان کی شفقت و رفاقت ، تسکین و تسلی و تعاون کی اشد ضرورت تھی۔ یہ ایک ایسا نازک لمحہ تھا جہاں بڑے سے بڑا کوہ استقامت بھی ہل جاتا لیکن آپ کی ہمت ، صبر و استقلال اور اولوالعزمی ملاحظہ ہو کہ مشیت ایزدی کے سامنے سر جھکا دیا اور ان ہر دو عظیم صدمات کو نہ صرف برداشت کر لیا بلکہ پہلے سے بھی زیادہ حوصلہ مندی مستعدی اور استقلال کے ساتھ دین حق کی تبلیغ کے مشن کو جاری رکھا۔ ہاں اکثر آپ حضرت ام المؤمنین خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کا ذکر بڑی دلسوزی کے ساتھ فرمایا کرتے تھے۔ تاریخ میں اس صبر و تحمل اور استقلال کی مثال ملنا مشکل ہے اور اس طرح کہ طبع نبوت کے اعتدال میں سر مو فرق نہیں آیا اور دامن عزم بالجزم ہاتھ سے نہیں چھوٹا۔

سفر طائف

حضرت ابوطالب ہاشمی سردار تھے۔ مکہ والوں پر آپ کی بڑی دھاک تھی۔ مکہ والے ان کی زندگی میں سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذارسانی میں کبھی کھل کر سامنے نہ آ سکے۔ ہاں غریب اور بیکس مسلمانوں پر جو ظلم بھی ڈھا سکتے تھے وہ ڈھائے۔ حضرت ابوطالب کے مقابلہ میں قریش اجتماعی طور پر اس وقت سامنے آئے جب اجتماعی مقاطعہ پر انہوں نے قدم بڑھایا لیکن اس اجتماعی ستم کوشی میں بھی حضرت ابوطالب ، سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے پشتیبان بنے رہے حضرت ابوطالب کی وفات کے بعد اہل مکہ کی مخالفت نے پہلے سے بہت زیادہ زور پکڑ لیا۔ اب وہ کھل کر سامنے آ گئے ان کی جھجک ختم ہو چکی تھی۔ حضرت ابوطالب کی دھاک ہزاروں من مٹی کے نیچے دفن ہو چکی تھی۔ اب آپ کو روز بروز شدید سے شدید تر مخالفت و مخاصمت ، جور و ستم ، سب و شتم اور کفار قریش کی اجتماعی ایذارسانی کا سامنا کرنا پڑا۔ تبلیغ اور اشاعت دین کے کاموں میں قریش نے ہر اس حربہ سے کام لیا جو ان کے خیال میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دعوت الی الحق میں مزاحم ہو سکتا تھا۔ مکہ والوں کی ان مزاحمتوں سے صرف نظر کرتے ہوئے آپ نے طائف کا قصد فرمایا جو مکہ سے تقریباً ساٹھ میل دور حجاز کا دوسرا بڑا شہر تھا کہ مکہ والے اگر آپ کی صدائے حق پر لبیک نہیں کہتے تو ممکن ہے کہ اطراف و اکناف مکہ میں بسنے والوں کے دلوں کو آپ کفر و ظلمت اور باطل کی کدورتوں سے صاف کر دیں۔ طائف اس وقت ایک سرسبز و شاداب علاقہ تھا اور آج بھی ہے۔ یہاں تک کہ مرغزار اور دلکش باغات اور آب سرد کی فراوانی تمام حجاز میں ضرب المثل تھی اور یہاں کے لوگ بیحد خوشحال تھے۔ یہاں کی سرزمین زرخیز تھی اور سود کا کاروبار اپنے عروج پر تھا۔ لوگ عام طور پر معاشی خوشحالی میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان اسباب کی بنا پر طائف امراء و رؤسائے عرب کا مامن و مسکن اور حجاز کی ایک عظیم تفریح گاہ بن گیا تھا۔ سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش تھی کہ اگر اہل طائف اسلام قبول کر لیں تو اس سے دعوت حق کی حمایت و تائید کے لئے بہتر سرزمین پیدا ہو جائے گی۔ پس آپ نے زید بن حارثہ کی معیت میں طائف کا سفر اختیار کیا اور منزل مقصود پر پہنچ

کہ آپ نے سب سے پہلے ثقیف کے سرداروں کے اس ٹولہ سے ملاقات کی جو تین بھائیوں پر مشتمل تھا آپؐ نے ان تینوں بھائیوں کو دعوت اسلام دی۔ ان کا طائف میں بہت زیادہ اثر ورسوخ تھا۔ ان شوریدہ بخت سرداروں نے اوّل تو آپؐ کی بات سننے ہی سے انکار کر دیا اور نہ صرف یہ کہ آپ کو اپنے حال پر چھوڑ دیتے بلکہ آپؐ کی شان میں نہایت زشت و نازیبا کلمات ادا کئے۔ کسی نے کہا کہ "خدا کو تیرے سوا رسول بنانے کے لئے کوئی اور نہ ملا" کسی نے کہا کہ اگر واقعی خدا نے تجھ کو بھیجا ہے تو بس پھر وہ کعبہ کا غلاف پھڑوانا چاہتا ہے، کسی نے کہا کہ "اگر خدا کسی کو رسول بناتا تو وہ کسی حاکم یا سردار کو بناتا، تجھے ہرگز نہ بناتا۔ کیونکہ تجھے تو سواری بھی میسر نہیں ہے"۔ یہ زہر میں بجھے ہوئے تیر تھے۔ جو آپ کے سینہ میں پے در پے پیوست ہوتے چلے گئے لیکن آپ نے صبر و استقامت کے ساتھ ان کو برداشت کیا اور ان سے کہا کہ اگر تم میری بات نہیں سنتے تو اتنا تو کرو کہ مجھے دوسروں تک یہ دعوت پہنچاتے دو اور اس میں مزاحمت نہ کرو، مگر انہوں نے آپ کی یہ بات بھی نہ مانی۔ صرف اسی پر بس نہیں کی بلکہ طائف کے اوباشوں، شہدوں، لفنگوں، بازاری لونڈوں، غلاموں اور خادموں کو آپ کے پیچھے لگا دیا کہ آپ کو گالیاں دیں، ماریں اور طائف سے باہر نکال دیں۔ ان سفلوں، رذیلوں اور شور بختوں نے شور مچا مچا کر لوگوں کو جمع کر لیا اور آپ پر سنگ باری شروع کر دی۔ یہاں تک کہ آپ لہولہان ہو گئے۔ یہ لوگ آپ کے ٹخنوں کی ہڈیوں کو نشانہ بنا رہے تھے تاکہ آپ چلنے سے بھی معذور ہو جائیں۔ جب آپؐ تکلیف سے نڈھال ہو کر بیٹھ جاتے تو پھر آپ کو بازو سے پکڑ کر دوبارہ اٹھاتے اور پھر ٹخنوں پر پتھر مارتے، تالیاں بجاتے ہضحکہ اڑاتے اور ٹھٹھے لگاتے۔ تھوڑی ہی دیر میں آپ کو پتھر مار مار کر انہوں نے خون میں رنگ دیا۔ آپ کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ پائے مبارک سے خون بے تحاشہ بہہ رہا تھا اور آپ کی نعلین مبارک خون سے بھر گئی تھیں۔ جسمانی اور روحانی تکلیف نے آپ کو نڈھال کر دیا تھا اور اس پر طرّہ یہ کہ زبانوں کے نشتروں کے کچوکے ان زخموں پر لگ رہے تھے جنہوں نے آپ کو بے حد ملول و رنجیدہ خاطر کر دیا تھا۔ کوئی کہتا تھا کہ میں ایسے خدا سے نہیں ڈر سکتا جو اپنے رسول کی حفاظت کرنے کے بھی لائق نہیں ہے۔ کوئی کہتا کہ ہم جو پتھر تجھے مار رہے ہیں وہ ہم پر پلٹ کر کیوں نہیں آتے؟ کوئی یہ کہتا کہ یہ آفت تجھ سے دور کیوں نہیں ہٹ جاتی؟ اور یہ زمین ہمارے اوپر پھٹ کیوں نہیں پڑتی؟ کہاں ہے تیرا خدا؟ وہ تیری مدد کو کیوں نہیں آتا؟ لیکن ان ناشائستہ کلمات کے جواب میں آپؐ نے اُف تک نہ کی۔ صرف صبر کا سہارا لئے خاموش رہے۔ زید بن حارثؓ جو آپ سے دشمنوں کی یلغار اور سنگباری میں بچھڑ گئے تھے۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے یہاں تک آ پہنچے۔ آپ کی حالت زار دیکھ کر لرز اٹھے، ان لفنگوں اور شہدوں کے نرغہ سے نکال کر آپ کو ایک باغ کی ایک چہار دیواری تک سہارا دیکر لائے۔ آپ کے زخموں سے خون صاف کیا اور آپ کی نعلین مبارک میں جو خون جم گیا تھا اس کو دھو دیا۔ جراحتوں پر پٹیاں باندھیں اور سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آپ ان جابروں اور ظالموں کے حق میں بد دعا کیوں نہیں فرماتے؟ اور بارگاہ الٰہی

میں اس جور و جفا کی شکایت کیوں نہیں کرتے؟ آپ نے زید کی یہ بات سن کر ارشاد فرمایا کہ "میں اس جہاں میں قہر و غضب بن کر نہیں آیا بلکہ تمام جہانوں کے لیے رحمت بن کر آیا ہوں یہ لوگ بے خبر اور نادان ہیں۔ مجھے اچھی پہچانتے نہیں"۔ اس کے بعد آپ نے ہاتھ اٹھا کر ان کی عافیت و سلامتی کی اس طرح دعا مانگی کہ "الٰہی تو ان پر اپنا فضل اور ان پر اپنا رحم فرما۔ ان پر کرم کر اور ان کی خطاؤں کو معاف فرما۔ ان کو سیدھی راہ دکھا۔ ان کی برائیوں کو اچھائیوں سے بدل دے۔ ان کو نیکی کی طرف راغب کر دے۔ یہ تیرے کرم کے محتاج ہیں۔ ان کے دلوں کو بدی سے پاک و صاف فرما کر نیکی کی طرف مائل کر دے، الٰہی ان کو چشم بصیرت عطا فرما دے، ان کو نور ہدایت بخش دے، ان کی جہالت کو ختم فرما دے، انھیں ظلمت کے اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آ، انھیں علم و فہم عطا فرما ان کے سینوں کو ایمان کی دولت سے معمور فرما دے اور ان کے قلوب کو اپنے رسول کی محبت سے لبریز فرما دے"

طائف میں جو کچھ آپ پر گذری اسے الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔ ایک مرتبہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے آپ سے دریافت فرمایا۔ یا رسول اللہ؟ کیا آپ پر احد کے دنوں سے بھی زیادہ سخت کوئی اور دن گذرا ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں، سب سے زیادہ سخت دن وہ تھا جب میں نے طائف میں لوگوں کے سامنے دعوت حق پیش کی اور انہوں نے اس کو رد کر دیا۔ مجھے اس وقت جو رنج پہنچا اور جو تکلیف ہوئی وہ اس یوم "احد" سے بھی زیادہ تھی"

طائف میں سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن تکالیف، مصائب و آلام اور درد و کرب کا سامنا کیا اور جو تکالیف پہنچیں انسانی تاریخ میں اس کی مثال ملنا محال ہے اور آپ نے صبر و برداشت، تحمل مزاجی، عالی ظرفی کا وہ ثبوت دیا جس کے آگے کوئی نہیں ٹھہر سکتا۔ اعتدال کی میزان پر آپ کے صبر و استقامت کی متاع گرانمایہ کے مقابل بڑے سے بڑے معتدل مزاج صابر اور عزم بالجزم رکھنے والی ہستی کی متاع، پاسنگ بھی نہیں ہے۔ اس موقع پر اگر کوئی بڑے سے بڑا کوہ وقار شخص بھی ہوتا تو ہمت ہار بیٹھتا۔ کروڑ درود سلام اس پیکر انسانیت محسن اعظم اور ہادی برحق پر جو عرصہ حیات میں کبھی مایوس و بددل نہیں ہوا۔ جس نے کبھی اور کسی حالت میں دامن صبر و امید نہیں چھوڑا۔ یہ تھی آپ کی شان رحمت یہ تھی آپ کی خلق خدا پر شفقت، یہ تھی مخلوق کی فلاح و بہبود کے لیے تڑپ پیغام حق کی صداقت پر پختہ یقین اور اس پیغام کو لوگوں تک پہنچانے کی لگن۔ عالم انسانیت میں کوئی دوسرا برگزیدہ وجود اس بلند ترین مقام تک پہنچنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ طائف کا یہی واقعہ ہا کہ توسیع دعوت حق کی اساس ثابت ہوا جس کے نتیجہ میں جلد ہی کرہ ارض کا بہت بڑا حصہ دعوت حق سے گونج اٹھا۔

اس سلسلہ میں تاریخ میں بہت سی روایات ہیں۔ ان تمام روایات کا حاصل یہی ہے کہ رحمت عالم و عالمیاں صلی اللہ علیہ وسلم نے ان جان کے دشمنوں کے لیے بددعائیں نہیں فرمائیں بلکہ لسان نبوت اور سراپا رحمت و رافت نے وہ الفاظ ادا فرمائے جو میں آپ کے سامنے پیش کر چکا ہوں۔

صلح حدیبیہ

ہجرت نبوی کو تقریباً چھ سال گذر چکے ہیں۔ اسلامی تحریک ایک اسلامی ریاست اور عالمگیر تحریک کے خدو خال سے آراستہ ہو رہی ہے۔ مسلمانوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ لیکن اس عرصہ میں بھی قریش مکہ نے ہر وہ تدبیر اختیار کی۔ اور ہر وہ حربہ آزمایا جس سے مسلمانوں کے ثبات و قرار میں رخنے پیدا ہوں اور نئی اسلامی ریاست ختم ہو جائے۔ کئی بار انہوں نے اپنی پوری قوت سے مدینۃ الرسول پر یورش کی۔ لیکن ہمیشہ ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اب تک قریش کا اتنا جانی و مالی نقصان ہو چکا تھا کہ ان کی کمر ٹوٹ گئی۔ ان کی ساری تدبیریں، ان کے تمام حربے اور سازشیں جب بیکار دکھائی دینے لگیں تو انہوں نے یہودیوں سے ساز باز شروع کر دی یہودی تو مدتوں سے اس موقعہ کی تلاش میں تھے۔ ان کے دل کی مراد بر آئی۔ اس طرح مسلمان اب دو دشمنوں میں گھرے ہوئے تھے ایک جانب خیبر کے قلعوں میں یہودی جنگی تیاریوں میں مصروف تھے جن کی سطوت، تجارتی برتری اسلام کے ہاتھوں خاک میں مل چکی تھی، دوسری جانب مکہ میں قریش اپنے منصوبوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔ سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی کوشش کے باوجود یہودی مصالحت کے لیے تیار نہ تھے اور انہوں نے مسلمانوں کے خلاف اپنے مذموم عزائم کو پورا کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ قریش کے اس معاندانہ رویہ نے یہودیوں کے حوصلے بڑھا دیئے تھے اس پس منظر میں سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے تدبر

کا یہ تقاضہ ہوا کہ مکہ والوں سے صلح کر کے اس دو رخی یورش کے سیلاب کے سامنے بند باندھ دیا جائے اور ساتھ ساتھ ایک ایسا راستہ پیدا کیا جائے اور ایک ایسی راہ ہموار کی جائے جو مسلمانوں اور اہل مکہ کے درمیان اس تنازعہ کا خاتمہ کر دے جس کے باعث مسلمان کعبہ دین و ایمان کے طواف اور حج کی سعادت سے محروم ہیں۔ کئی سال سے مسلمان خانہ کعبہ کی زیارت اور حج و عمرہ کی ادائیگی کی سعادت سے بہرہ اندوز ہونا چاہتے تھے۔ لیکن قریش نے مسلمانوں کو مکہ میں داخل ہونے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا تھا۔ ایک طرف مسلمان مہاجرین کی فطری طور پر یہ خواہش تھی کہ وہ مکہ میں جا سکیں۔ اس کے علاوہ خانہ کعبہ کی زیارت کا شوق اور قبائل، خاندانی اور مکہ والوں سے خونی رشتے اور ذاتی روابط کے اثرات نے بھی اس شوق میں تڑپ پیدا کر دی تھی۔ دوسری طرف خود اہل مکہ بھی مسلمانوں کے ساتھ بار بار کی جنگ سے سخت نالاں اور پریشان تھے۔ مسلمانوں سے ٹکرا کر اب تک وہ اپنا جانی و مالی بہت کچھ نقصان کر چکے تھے۔ جب بھی وہ مسلمانوں کے مقابلہ میں آئے ٹھوکر کھانی پڑی۔ شکست ان کا مقدر بن چکی تھی اور وہ خود چاہتے تھے کہ مصالحت کی کوئی صورت نکل آئے لیکن یہ سب کچھ

دل سے چاہنے کے باوجود سرداران قریش کا خوف ان پر طاری تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ مصالحت کی بات زبان پر لاتے ہوئے جھجکتے تھے۔

سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ دوربین نے دیکھ لیا تھا کہ موجودہ فضا مصالحت کے لیے پہلے سے زیادہ سازگار ہے آپ کی اس خواہش کو تائید ربانی بھی حاصل ہو گئی۔ ایک صبح جب مسلمان مسجد نبوی میں جمع تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی الٰہی اس بشارت کے ساتھ نازل ہوئی۔ لقد صدق اللہ رسولہ الرؤیا بالحق لتدخلن المسجد الحرام ان شاء اللہ آمنین محلقین رؤسکم ومقصرین لا تخافون ۔ (الفتح : ۲۷)

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کے اس رویا، صادقہ کو سچ کر دکھایا کہ تم مسجد حرام میں انشاء اللہ بے خوف و خطر داخل ہو گئے اس طرح کہ سر مونڈے اور مونچھ کے بال کترے ہوئے ہوں گے۔" گویا یہ مستقبل میں عظیم فتح کی اک نوید جانفزا تھی۔ اس نوید الٰہی کے نزول کے بعد ذیقعد ۶ھ میں سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ادائے عمرہ کا قصد فرمایا۔ حرم پاک کی عبادت کے سلسلہ میں عربوں نے چار مہینوں کو حرمت والے مہینے قرار دے رکھا تھا۔ تائید الٰہی بھی اس حرمت کی موید تھی۔ ان مہینوں میں جدال و قتال، قتل و غارت، فتنہ و فساد کی سرگرمیاں ٹھنڈی پڑ جاتی تھیں۔ سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ذیقعد کے مہینہ کا اس لیے انتخاب فرمایا تھا کہ یہ حرمت کا مہینہ ہے ورنہ ادائے عمرہ کے لیے کسی خاص مہینہ کی کوئی قید نہ تھی۔ چودہ سو جان نثاران اسلام کی معیت میں شعار ابراہیمی کو زندہ کرنیوالا خلیل اللہ کا در تابندہ قربانی کے ستر اونٹوں کو لیکر یکم ذیقعد ۶ھ کو بطحا سے روانہ ہوا۔ تیروں اور تلواروں کے سوا کسی کے پاس کوئی اور ہتھیار نہ تھا۔ تلواریں بھی نیام میں تھیں۔ چونکہ مقصد عمرہ ادا کرنا تھا نہ کہ جنگ میں الجھنا۔ مسلمانوں نے احرام باندھ لئے تھے صاف ظاہر تھا کہ ایمان والوں کا یہ قافلہ عمرہ و زیارت کے سوا کوئی اور عزم نہیں رکھتا۔

پاک طینت اور پاک فطرت مسلمانوں کا یہ کارواں رواں دواں تھا کہ خبر ملی کہ قریش مسلمانوں کی روانگی سے باخبر ہو گئے ہیں اور انہوں نے یہ عزم کر لیا ہے کہ وہ مسلمانوں کو حرم کعبہ تو حرم کعبہ۔ مکہ ہی میں داخل نہ ہونے دیں گے حدود مکہ سے پہلے ہی مسلمانوں کے اس کارواں کو روکنے کے لئے خالد بن ولید کی سرکردگی میں دو سو سواروں کا ایک دستہ بھی روانہ ہو چکا ہے۔ سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے عمومی راستہ پر سفر ترک کر دیا اور دوسرا مگر انتہائی دشوار گزار راستہ اختیار کیا اور بصد مشکل آپ مقام حدیبیہ کے قریب پہنچ گئے۔ اس مقام پر آپ کا ناقہ "قصوی" بیٹھ گیا۔ اٹھانے کی ہر چند کوششیں کی گئیں لیکن ناقہ نہ اٹھا۔ قصوی کا اس طرح بیٹھ جانا اس امر کا ایک بلیغ اشارہ تھا کہ اسی جگہ کاروان اسلام قیام کرے۔ قریش کو حدیبیہ میں سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے قیام کی اطلاع مل گئی تھی اگرچہ لوگوں کی اکثریت کسی لڑائی جھگڑے کے حق میں نہ تھی کیونکہ یہ حرمت والا مہینہ تھا۔ اہل مکہ چاہتے تھے کہ مسلمان زیارت کعبہ کے لئے آئے ہیں۔ لہٰذا انہیں اجازت ملنا چاہیئے۔ مگر وہ قریش کے سرداروں کی ضد اور ہٹ دھرمی کے سامنے مجبور تھے۔ قریش کے سرداروں کا خیال تھا کہ مکہ میں مسلمانوں کا داخلہ پر امن حالت میں ہی سہی لیکن عوام پر اس کا اثر

اچھا نہیں پڑے گا۔ اور بہت سے لوگ ان کے کردار اور حسن اخلاق سے متاثر ہوکر اسلام میں داخل ہو جائیں گے۔ وہ چاہتے تھے کہ جنگ بھی نہ ہو اور مسلمان کعبہ کی زیارت اور طواف کے بغیر واپس (یثرب) مدینہ منورہ کو لوٹ جائیں۔ سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس قریش کی جانب سے کئی وفود بھی آئے۔ یہ وفود مسلمانوں کی جماعتی تنظیم، اعلیٰ اخلاق اور پسندیدہ اطوار و روحانی جوش و جذبہ اور ان کی ایمانی قوت سے بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ انہوں نے واپس جا کر قریش کے سرداروں سے یہی کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھی جنگ کی غرض سے نہیں بلکہ زیارت کعبہ کے لئے آئے ہیں۔ ان کو حرم کعبہ میں داخلہ کی اجازت ملنی چاہیئے۔ لیکن سرداران قریش کسی طرح آمادہ نظر نہیں آتے تھے۔ بالآخر سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ایک قاصد قریش کی طرف روانہ کیا کہ معلوم کیا جائے کہ قریش کے عزائم کیا ہیں؟ حضرت امیّہ خزاعی قاصد کی حیثیت سے مکّہ گئے۔ قریش نے امیّہ خزاعی کو پکڑ لیا اور ان کی اونٹنی کو ہلاک کر دیا۔ قریش خود ان کو بھی مارنا چاہتے تھے کہ قبیلہ احابیش کے ایک سردار نے کہا کہ یہ میری امان میں ہے۔ اس طرح ان کی جان بچی اسی دوران قریش کے چالیس پچاس نوجوان حدیبیہ آئے اور مسلمانوں پر پتھراؤ کیا۔ مسلمانوں نے ان سب کو پکڑ لیا اور قیدی بنا کر سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا۔ آپؐ نہیں چاہتے تھے کہ قریش کو جنگ چھیڑنے کا کوئی موقع بھی دیا جائے لہٰذا آپ نے ان سب کی رہائی کا حکم دے دیا۔ ان لوگوں کی رہائی سے مکہ کی رائے عامہ اور بھی اس کے حق میں ہوگئی کہ مسلمانوں کو مکہ میں داخل ہونے دیا جائے

سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرا قاصد روانہ کیا۔ یہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ تھے۔ قریش نے ان سے کہا کہ اے عثمان: آپ ہم میں سے ہیں اگر چاہیں تو شوق سے بیت اللہ کا طواف کرلیں لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اجازت نہیں دی جائے گی۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے طواف میں سبقت نہیں کر سکتا۔ قریش نے کہا ہماری مجبوری یہ ہے کہ ہم نے قسم کھالی ہے کہ اس سال مکّہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) و داخل نہیں ہونے دیا جائے گا۔ اس طرح حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو مختلف سرداران قریش سے گفتگو میں زیادہ وقت لگ گیا۔ مسلمان یہ سمجھے کہ حضرت عثمان غنی شہید کر دیئے گئے۔ ورنہ وہ اب تک واپس آجاتے۔ مسلمانوں میں یہ خبر ہر طرف پھیل گئی اور مسلمانوں میں اضطراب کی ایک لہر دوڑ گئی۔ سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میں ان سے (حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ) کے خون کا بدلہ لیے بغیر پیچھے نہیں ہٹوں گا۔ اور آپ نے ایک درخت سے ٹیک لگا کر جہاد کے لئے مسلمانوں کو بیعت کی دعوت دی، حدیبیہ میں موجود ہر ایک مسلمان نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی کہ وہ جنگ میں موت کو زندگی پر ترجیح دیں گے۔ اس بیعت کا ذکر قرآن مجید میں اس طرح ہے،

"جب مسلمان درخت کے نیچے تمہارے ہاتھ پر بیعت کر
رہے تھے۔ خدا ان مسلمانوں سے خوش ہوا اور اس نے ان
کی ارادت و عقیدت کو جان لیا اور ان کو اطمینان عطا کیا

اور اس کے بدلہ میں ان کو سرِ دست (خیبر کی) فتح دی۔

"تاریخ اسلام میں اس بیعت کو "بیعت رضوان" کہا جاتا ہے۔ جب تمام مسلمان بیعت کر چکے تو انہوں نے تلواریں میان سے نکال لیں اور جنگ کے لئے بڑھنے ہی والے تھے کہ سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عثمان غنیؓ کے بعافیت وخیریت واپس آنے کی اطلاع ملی۔ یہاں پہنچ کر حضرت عثمان غنیؓ نے بتایا کہ سرداران قریش کہتے ہیں کہ اس بار تو نہیں ہاں آئندہ سال سے مسلمان حرمت والے مہینوں میں حج وعمرہ کے لئے مکہ آسکیں گے اس پیغام سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطمینان ہوا کہ قریش بہرحال آمادۂ مصالحت تو ہوئے۔ آپؐ نے مذاکرات جاری رکھنے کے لئے قریش کو پیغام بھجوایا کہ اپنا نمائندہ مصالحت کی گفتگو کے لئے بھیجیں۔ مکہ سے سہیل بن عمرؓ آئے اور ان سے مصالحت کے امور وشرائط پر بات چیت کا آغاز ہوا۔ چنانچہ ایک معاہدہ تیار کیا گیا۔ اس معاہدہ کی شرائط اور شقوں سے مسلمانوں کے دل ڈوب گئے اور ان کو یہ گمان گذرا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواہ مخواہ دب کر معاہدہ کیا ہے اور ایسی شرائط کو قبول کر لیا ہے جو شایان رسالت ونبوت نہیں ہیں اور مسلمانوں کے اقتدار ایمانی پر اس سے ضرب پڑ رہی ہے۔ اگرچہ انہیں یہ بھی یقین تھا کہ آپ اللہ کے رسولؐ ہیں اس لئے کوئی غلط قدم نہیں اٹھائیں گے تاہم معاہدہ کی شرائط بظاہر ایسی تھیں جن کو مسلمان اپنے لئے موجب ننگ وعار سمجھ رہے تھے اس موقع پر حضرت عمرؓ کے ضبط وصبر کے سارے بندھن ٹوٹ گئے اور آپ نے حضرت ابوبکرؓ سے پوچھا! کیا ہم مسلمان حق پر نہیں؟ اور دشمن باطل پر نہیں؟ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا بیشک مسلمان حق پر ہیں اور دشمن باطل پر! حضرت عمرؓ نے پھر پوچھا کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے رسول برحق نہیں حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ بیشک وہ خدا کے رسول برحق ہیں۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ پھر دین کے معاملہ میں یہ ذلت کیسی؟ حضرت ابوبکرؓ نے کہا اے عمرؓ! ضبط وتحمل سے کام لو۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ، سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور وہی سوالات کئے تو وہاں سے بھی یہی جواب ملا جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے دیا تھا۔

الغرض معاہدہ لکھا جانے لگا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا کہ معاہدہ کے آغاز میں لکھو "بسم اللہ الرحمن الرحیم" اہل مکہ نے اعتراض کیا کہ ہم رحمٰن، رحیم، کے قائل نہیں! صرف "باسمک اللھم" لکھا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے کہا کہ ایسا ہی لکھو جیسا یہ کہتے ہیں پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لکھو یہ معاہدہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اور سہیل بن عمرو کے درمیان ہے۔ سہیل نے حضرت علیؓ سے کہا قلم روک لو! ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو رسول اللہ مانتے تو جھگڑا ہی کیا تھا۔ صرف محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بن عبداللہ لکھا جائے اور رسول اللہ مٹایا جائے۔ حضرت علیؓ نے کہا میں یہ الفاظ نہیں مٹا سکتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ہی اپنے ہاتھ سے رسول اللہ کے الفاظ مٹا دیئے۔ معاہدہ میں تحریر

کے لئے جو شرائط طے ہوئیں، وہ یہ ہیں۔

۱: فریقین ایک دوسرے سے دس سال (بعض روایات میں دو سال) تک جنگ نہیں کریں گے۔

۲۔ قریش مکہ سے جو شخص مسلمان ہو کر اپنے ولی کی اجازت کے بغیر مدینہ پہنچ جائے تو مسلمانوں کو اسے واپس لوٹانا ہوگا۔

۳: مسلمانوں میں سے کوئی شخص مرتد ہو کر مکہ میں چلا آئے تو مکہ والے اسے واپس نہیں کریں گے۔

۴: اہل عرب ان فریقین میں سے جس سے چاہیں معاہدہ کر سکتے ہیں۔ دوسرا فریق اس میں حائل نہ ہوگا۔

۵: مسلمانوں کو اس مرتبہ طواف و زیارت کعبہ کئے بغیر ہی مدینہ واپس لوٹنا ہوگا۔

۶: مسلمان آئندہ سال مکہ میں ان شرائط کی پابندی کے ساتھ طواف کعبہ کے لئے آ سکتے ہیں کہ :-

الف : اسلحہ میں صرف تلوار ہو اور وہ بھی نیام میں۔

ب : مسلمان تین روز سے زیادہ مکہ میں قیام نہیں کر سکیں گے۔

معاہدہ کا سرنامہ لکھا جا چکا تھا اور دوسری شرائط معرض تحریر میں لائی جانے والی تھیں اور سہیل بن عمرو قریش کی طرف سے نمائندگی کے فرائض انجام دے رہے تھے کہ ان کے صاحبزادہ "ابو جندل" کفر سے بیزار ہو کر اس عالم میں اس جگہ آئے کہ بیڑیاں پاؤں میں پڑی تھیں۔ قریش نے انہیں اسلام لانے کے جرم میں قید کر رکھا تھا۔ وہ موقع پا کر بھاگ نکلے اور سیدھے حدیبیہ پہنچے۔ سہیل نے اپنے بیٹے ابو جندل کو دیکھا تو بے تحاشہ ان کو پیٹنے لگا اور سہیل نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے مطالبہ کیا کہ معاہدہ کی رو سے ابو جندل کو واپس کیا جائے۔ معاہدہ چونکہ ابھی تحریر میں نہیں لایا گیا تھا اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قانونی، اخلاقی اور سیاسی طور پر ابو جندل کو اپنے پاس روک سکتے تھے۔ ابو جندل کی حالت اور مسلمانوں کی چاہت کا تقاضہ بھی یہی تھا کہ انہیں واپس نہ کیا جائے۔ مسلمانوں کے دل ابو جندل کی حالت دیکھ کر ٹکڑے ٹکڑے ہوئے جا رہے تھے۔ ادھر ابو جندل نے بڑی دردمندی سے کہا کہ مسلمان بھائیو! میں بے پناہ تکلیفیں اٹھا چکا ہوں۔ مجھے دشمنوں کے حوالے نہ کرو۔ ان کی اس حالت سے مسلمان انتہائی مضطرب اور بے چین دکھائی دیتے تھے۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں کسی کو ہمت نہ تھی کہ کچھ کہہ سکے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یکا یک ارشاد فرمایا۔

"ابو جندل صبر کرو۔ اللہ بہت جلد تم لوگوں کے لئے کشائش کی کوئی سبیل نکال دے گا۔ قریش سے ہماری گفتگو مکمل ہو چکی ہے۔ اس میں فریقین نے اللہ کو ضامن قرار دیا ہے۔ میں بدعہدی نہیں کر سکتا۔ تمہیں واپس جانا ہوگا"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ سن کر مسلمانوں پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ مگر ان کو کیا خبر تھی کہ یہی فیصلہ دراصل مکہ کی فتح کا عنوان اور اس کی سرخی ہے۔ بہ نظر غائر دیکھا جائے تو ان شرطوں میں کوئی پریشان کن بات نہ تھی۔ البتہ

ظاہری الفاظ میں "سبکی" کا ایک پہلو تھا۔ اس موقع پر خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر فاروقؓ کے جواب میں فرمایا تھا۔

"میرا جو آدمی (ہم سے کٹ کر) مکہ جائے گا وہ ضرور منافق ہو گا۔ اس کا جانا ہی اچھا ہے۔ البتہ جس مسلمان کو ہم واپس کریں گے تو اس کے لیے خداوند کریم جلد ہی کشائش کا سامان کر دے گا۔"

ابو جندل کے واپس کیے جانے میں حکمت ملاحظہ ہو کہ انہوں نے زندان مکہ میں پہنچ کر اس طرح دین حق کی تبلیغ شروع کر دی کہ جو شخص بھی ان کی نگرانی پر مامور ہوتا ابو جندل اسے توحید کا سبق دیتے۔ اللہ کی قدرت کہ ابو جندل اپنے ارادہ اور سعی میں کامیاب ہو جاتے اور وہ شخص مسلمان ہو جاتا۔ قریش اس دوسرے ایمان لانے والے کو بھی ان کی طرح قید کر دیتے۔ اب یہ دونوں مل کر تبلیغ کا کام کرتے۔ الغرض اس ابو جندل کے قید ہو کر مکہ ہی میں رہ جانے کا یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ ایک سال کے اندر تقریباً تین سو اشخاص مسلمان ہو گئے۔

ایک اور واقعہ شرط نمبر ۲ کے ختم کرنے کا باعث بنا۔ ابو بصیرؓ مسلمان ہو کر مدینہ منورہ پہنچ گئے۔ قریش نے انہیں واپس لانے کے لیے دو آدمی بھیجے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب ان کے آنے کی (مدینہ) اطلاع ملی تو آپؐ نے فرمایا کہ ابو بصیر! تم واپس جاؤ، ہم معاہدہ کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالیٰ تمہارے لیے کوئی نہ کوئی بہتر راستہ پیدا کر دے گا۔ چنانچہ ابو بصیر واپس چلے گئے لیکن راستہ ہی میں موقع پا کر کافروں میں سے ایک شخص کو قتل کر دیا۔ دوسرا فریاد لیکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچا۔ فوراً ہی ابو بصیرؓ بھی حاضر ہو گئے اور عرض کیا کہ میں معاہدہ کی رو سے واپس چلا گیا تھا۔ میرے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک صورت نکال دی ہے اب میں مدینہ ہی میں رہوں گا۔ چنانچہ وہ "عمیص" چلے گئے جو مکہ اور شام کے راستہ میں ایک مشہور مقام ساحل سمندر کے قریب تھا۔ اس کے بعد ابو جندل اور دوسرے مسلمان بھی مکہ کی قید سے کسی نہ کسی طرح آزاد ہو کر رفتہ رفتہ ابو بصیر کے پاس پہنچ گئے۔

بظاہر یہ شرط مسلمانوں کے لیے سب سے زیادہ اذیت ناک معلوم ہوتی تھی لیکن مشیت الٰہی دیکھیے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واقف سر نہاں ہونے کی دلیل ہے کہ یہی شرط تبلیغ اسلام کے لئے سب سے زیادہ موزوں اور بکار آمد ثابت ہوئی اور انجام کار یہی شرط قریش کے لیے اس درجہ مصیبت کا باعث بن گئی کہ انہوں نے تنگ آکر خود ہی اس شرط کو ختم کر دیا گویا یہ شرط حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے دین حق کی تقویت و توسیع اور قریش کی پشیمانی کا باعث بنی۔

معاہدہ صلح حدیبیہ کی پہلی شق کے تحت ایک دوسرے سے جنگ نہ کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ یہ معاہدہ مسلمانوں کے لیے اس اعتبار سے مفید تھا کہ وہ یہودیوں سے فیصلہ کن طور پر اسی وقت نبرد آزما ہو سکتے تھے۔ جبکہ مکہ کے محاذ کی

طرف سے کوئی خطرہ نہ ہو۔ صلح حدیبیہ کے فوراً بعد مدینہ واپسی پر مسلمانوں نے خیبر کے قلعے فتح کر لئے جو یہودیوں کی طاقت کے اہم مرکز تھے۔ یہودیوں کے مسئلے سے قطع نظر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عامۃ الناس میں تبلیغ اسلام کیلئے امن وامان کی فضا درکار تھی۔ جنگ وجدل کی حالت میں نہ تو مؤثر اور کامل انداز میں تبلیغ ہو سکتی تھی اور نہ لوگ ٹھنڈے دل سے دین برحق کے حقائق پر غور وفکر کے لئے تیار ہو سکتے تھے امن وامان کی حالت ہی میں اور امن وامان کی فضا میں ہی باہمی تعلقات استوار بھی ہو سکتے ہیں اور نئے تعلقات پیدا بھی کئے جا سکتے ہیں اور دوسروں کو اپنے نقطۂ نظر سے متاثر بھی کیا جا سکتا ہے۔ تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ صلح حدیبیہ کے بعد تبلیغ اسلام کا کام ایک نئے ولولہ اور زور وشور کے ساتھ اس طرح شروع ہوا کہ دو سال کے عرصہ میں اسلام کی جس قدر اشاعت ہوئی وہ پچھلے اٹھارہ برس میں بھی نہ ہو سکی۔ عمرو بن العاص اور خالد بن الولید جیسی کئی مقتدر اور ممتاز شخصیتیں واقعہ حدیبیہ کے بعد ہی حلقۂ اسلام میں داخل ہوئیں۔ دوسری طرف اس امن وامان سے یہ فائدہ ہوا کہ سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو بیرونی ممالک کے امراء اور رؤساء کو بھی اسلام کی طرف دعوت دینے کا موقع مل گیا۔ چنانچہ معاصر سلاطین اور امراء کو تبلیغی دعوت نامے صلح حدیبیہ کے بعد ہی لکھے گئے اس کے علاوہ امن وامان کے اس عرصہ میں معاشرتی اصلاح کی طرف بھی بھرپور توجہ کی گئی۔ معاہدہ کی ایک شق یہ تھی کہ مسلمانوں میں سے جو شخص مرتد ہو کر مکہ چلا آئے۔ وہ واپس نہیں کیا جائے گا۔ غور سے دیکھا جائے تو یہ مرتد لوگ اسلام کے لئے بے مصرف ہی نہیں بلکہ مضرت رساں بھی تھے اس لئے یہ شرط مسلمانوں کے مفاد کے عین مطابق تھی کہ جسے اسلام پسند نہیں اس کا اسلامی معاشرہ میں کیا کام؟ معاہدہ کی ایک اہم شق یہ بھی تھی کہ عرب قبائل فریقین میں سے جس سے چاہیں معاہدہ کر سکتے ہیں۔ دوسرا فریق اس معاہدہ میں مزاحم نہیں ہوگا۔ اس شق کے ذریعہ پہلی بار اہل مکہ نے مسلمانوں کی سیاسی طاقت اور حیثیت کو باضابطہ طور پر تسلیم کیا ورنہ اب تک انہیں باغی وسرکش سے زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی تھی لیکن اب برابر کا حق تسلیم کیا گیا اور ایک ایسی طاقت تسلیم کر لیا گیا۔ جس سے دوسرے عرب قبائل معاہدہ کر سکتے ہیں اور یہ معاہدہ کی ایک بڑی اہم شق تھی کئی عرب قبائل ایسے تھے کہ وہ مسلمانوں سے جنگ وجدل نہیں چاہتے تھے اور ان کے ساتھ مصالحت سے رہنا ان کو زیادہ پسند تھا۔ لیکن قریش کی وجہ سے وہ اب تک مجبور تھے۔ اب ان قبائل کو یہ حق مل گیا کہ وہ مسلمانوں سے معاہدہ کر سکتے تھے چنانچہ صلح حدیبیہ ہی کے موقع پر قبیلہ خزاعہ نے مسلمانوں کے ساتھ دوستی کا معاہدہ کر لیا۔ معاہدہ کی ایک شق کی رو سے مسلمانوں کو یہ حق بھی مل گیا تھا کہ وہ آئندہ سال زیارت کعبہ کے لئے مکہ آ سکیں گے اور یہ واقعی فتح مبین تھی بلا شبہ اس سال وہ زیارت کعبہ سے محروم رہے لیکن وقتی محرومی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ ایک سال کا عرصہ قومی اور سیاسی زندگی میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا دوسرے سال ۷ھ میں مسلمان بڑی شان وشوکت سے مکہ آئے۔ اس منظر نے اہل مکہ کو بے حد متاثر کیا اور ان کے دلوں پر مسلمانوں کی عظمت کا نقش مرتسم ہو گیا۔ یہ اعلیٰ مقصد جنگ وجدل کی حالت میں حاصل نہیں ہو سکتا تھا اور مسلمانوں کے بلند کردار اور اعلیٰ سیرت کے نقوش ان کے دلوں پر مرتسم نہیں ہو سکتے تھے۔

غرض معاہدہ کی ہر شق جو بظاہر مسلمانوں کے حق میں نظر نہیں آ رہی تھی۔ دراصل مسلمانوں کی فتح کا ایک عنوان بن گئی اور تاریخ نے دیکھ لیا کہ کس طرح صلح حدیبیہ فتح مکہ یا فتح مبین پر منتج ہوئی۔

معاہدہ حدیبیہ سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی دور اندیشی، تدبر و فراست، حکمت اور پیش بینی کا ایک عظیم الشان کارنامہ ہے اور میزانِ اعتدال کا ایک شاہکار ہے جس کے دوررس نتائج اور شاندار کامرانیوں پر عقل حیران ہے اور تاریخ کے صفحات اس کی مثال پیش کرنے میں بالکل سادہ اور صاف ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اگر ابو جندل اور ابو بصیر جیسے خستہ تباہ حال مسلمانوں کی حالت ظاہری سے دوسرے مسلمانوں کی طرح متاثر ہو کر "میزانِ اعتدال" سے سرِ مو بھی انحراف فرماتے تو دلجوئی، دست گیری اور رحمدلی کی تاریخ میں اس کو ایک بلند مقام حاصل ہوتا۔ لیکن عقل و دانش، فراست و تدبر، دور بینی و دوررسی اور فہم رسالت و نبوت سے برآمد ہونے والے یہ شاندار نتائج کبھی تاریخ اسلام کے صفحات پر ثبت نہ ہوتے۔

فتح مکہ اور عام معافی

حدیبیہ کے معاہدہ کی چوتھی شق تھی کہ عرب کے قبائل میں سے ہر قبیلہ کو یہ اختیار ہوگا کہ فریقین میں سے جس کے ساتھ چاہے معاہدہ دوستی کر لے اور اس کا حلیف بن جائے۔ چنانچہ قبیلہ خزاعہ نے مسلمانوں کے ساتھ معاہدۂ دوستی کر لیا تھا اور بنو بکر قریش کے حلیف بن گئے تھے۔ یہ دونوں قبیلے مدت سے ایک دوسرے کے دشمن چلے آ رہے تھے۔ صرف مسلمانوں کی مخالفت نے انہیں ایک دوسرے کے مقابل کچھ عرصہ کے لیے برسرپیکار ہونے سے روک دیا تھا۔ ورنہ ان کی یہ دشمنی دیرینہ تھی۔ قریش مکہ اور مسلمانوں میں حدیبیہ کا صلح نامہ دس سال کے لیے تھا۔ اس طویل پرسکون دفعہ نے متحارب قبائل کے جنگی جذبات میں پھر ایک طوفان اور ہلچل پیدا کر دی اور ان دو جنگجو قبائل کو ایک بار پھر اپنی قدیم عداوتوں کو بروئے کار لانے کا موقع مل گیا۔ بنو خزاعہ کا مسلمانوں کا حلیف بن جانا، بنو بکر کو بہت شاق گذرا اور انہوں نے قریش مکہ کی مدد سے بنو خزاعہ پر حملہ کر دیا۔ بات بہت معمولی سی تھی مگر ان کی حیلہ جو طبیعت نے بازار کارزار گرم کر دیا۔ قریش کے امراء نے معاہدہ حدیبیہ کی اپنی پیش کردہ شرط کا لحاظ نہیں رکھا اور کھل کر بنو بکر کی مدد کرنے لگے۔ چونکہ تمام عربوں کے نزدیک حرم کعبہ کا امن کا مقام تھا اس لیے خزاعہ نے مجبور ہو کر حرم میں پناہ لے لی لیکن سردار نوفل کے اکسانے پر کر بنو خزاعہ کے قتل کا اس سے بہتر موقع ہاتھ نہ آئے گا۔ حرم میں ان کا بے دریغ خون بہایا گیا جو لوگ قتل ہونے سے کسی طرح بچ گئے وہ بھاگ نکلے اور مدینۃ الرسول میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور قریش کے ظلم و ستم سے بھری داستان سنائی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ سے بہت دکھ ہوا۔ چونکہ قریش نے معاہدۂ حدیبیہ کی کھلی خلاف ورزی کر کے مسلمانوں کو خود دعوتِ مبارزت دی تھی اس

لیے معاہدہ کے مطابق قریش کے خلاف اب تلوار اٹھانا بالکل درست تھا لیکن باینہمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی خوئے صلح جوئی کی بنا پر قریش کی جانب ایک قاصد ایک شرط نامہ کے ساتھ روانہ کیا جس میں قریش سے یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ وہ ان تین شرطوں میں سے کوئی ایک شرط منظور کرلیں۔ ورنہ پھر ہم مسلمان تلوار اٹھانے پر مجبور ہوں گے۔

۱: بنو خزاعہ کے مقتولین کا خون بہا ادا کیا جائے۔

۲: قریش بنو بکر کی حمایت سے الگ ہو جائیں۔

۳: اعلان کیا جائے کہ حدیبیہ کا معاہدہ ٹوٹ چکا ہے۔

اس کے جواب میں قرطہ بن عمر نے قریش کی طرف سے تیسری شرط جو بظاہر بہت معمولی سی بات نظر آ رہی تھی، منظور کرلی۔ مسلمان کا قاصد یہ جواب لیکر جب چلا گیا تو قریش کو احساس ہوا کہ انہوں نے تیسری شرط منظور کر کے سخت غلطی کی ہے فوراً ابوسفیان کو بھیجا کہ معاہدہ حدیبیہ کی تجدید کرا آئیں۔ مدینہ پہنچ کر ابوسفیان نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تجدید معاہدہ کی گذارش کی۔ لیکن آپ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ابوسفیان نے خود ہی اعلان کر دیا کہ میں نے معاہدہ حدیبیہ کی تجدید کر دی ہے یہ اعلان کر کے وہ واپس مکہ چلا آیا۔ ابوسفیان نے جب واپس جاکر قریش سے صورت حال بیان کی تو سب نے یہی کہا کہ یہ نہ تو صلح ہے جس پر ہم مطمئن ہو جائیں اور نہ جنگ کا اعلان ہے کہ جنگ کی تیاری کی جائے۔ چونکہ قریش نے معاہدہ حدیبیہ کو خود ہی فسخ کر دیا تھا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بنی خزاعہ کے مقتولین کا بدلہ لینا تھا لہٰذا سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ پر حملہ کی تیاری شروع کر دی اور اپنے حلیف اور دوست قبائل کو اطلاع بھیج دی کہ وہ آکر اسلامی لشکر سے مل جائیں۔ ۱۰ رمضان المبارک ۸ھ کو دس ہزار صحابہ کی مسلح فوج کے ہمراہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کی طرف روانہ ہوئے۔ قریش کے دل میں اپنی بدعہدی سے اس برے دن کے پیش آنے کا دھڑکا لگا ہوا تھا۔ اس لیے انہوں نے مسلمانوں کی فوجی طاقت اور تعداد معلوم کرنے کے لئے ابوسفیان اور بدیل بن ورقا کو بھیجا۔ ان جاسوسوں نے رات کے وقت اسلامی لشکر کو میلوں تک پھیلا ہوا دیکھا۔ جا بجا آگ روشن تھی اور یہ لوگ اس روشنی میں فوج کا جائزہ لے رہے تھے لیکن یہ دونوں جاسوس مسلمانوں کی نظروں سے نہ ہٹ سکے اور اسلامی لشکر کے ہاتھ آگئے۔ اس موقع پر ابوسفیان کو حضرت عباس رضی اللہ عنہ بن عبدالمطلب سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے بعجلت تمام ابوسفیان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیا تاکہ اس کے لئے طالب امان ہو سکیں۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو اندیشہ تھا کہ کوئی ابوسفیان کو قتل نہ کر دے۔ جب یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خیمہ کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تیزی سے بارگاہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جا رہے ہیں۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو اندیشہ ہوا کہ کہیں یہ پہلے سے پہنچ کر ابوسفیان کے قتل کی اجازت نہ لے لیں۔ اس لیے حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے بارگاہ نبوی میں جلدی سے پہنچ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بغیر کسی تمہید کے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میں نے ابوسفیان کو امان دے دی ہے۔ آپ نے فرمایا اسے تم اپنی قیام گاہ پر لیجاؤ اور صبح کو میرے پاس لانا۔ سلطان دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے

سلاطین زمانہ کی طرح یہ نہیں فرمایا کہ میرے حضور میں پیش کرنا۔

حضرت عباسؓ صبح کو ابوسفیان کو لیکر سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے ابوسفیان سے فرمایا۔ اے ابوسفیان کیا تمہارے لئے ابھی وقت نہیں آیا کہ سمجھ لو کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ ابوسفیان نے کہا خدا کی قسم! اگر اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود ہوتا تو آج میرے کام آتا۔ آپ نے فرمایا: اے ابوسفیان کیا ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ تم مجھے اللہ کا رسول تسلیم کر لو! ابوسفیان بولا! البتہ اس معاملہ میں ابھی میرے دل میں شک ہے اور شبہ باقی ہے۔

مسلمانوں نے مکہ میں فوج کے داخلہ سے پہلے ابوسفیان کو بہ لطائف الحیل اس طرح حراست میں رکھا کہ اسے محسوس تک نہ ہونے دیا کہ وہ حراست میں ہے۔ صبح کو مسلمان مکہ میں شاندار انداز سے داخل ہوئے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق حضرت عباسؓ، ابوسفیان کو ایک اونچے ٹیلہ پر لے گئے تاکہ وہ اسلامی فوج اور اسلام کی عظمت کا منظر دیکھ لے۔ اسلامی لشکر کے دستے بڑی آن بان سے اس کے سامنے سے گذر رہے تھے اور وہ حیرت زدہ حضرت عباسؓ سے ان کے متعلق سوالات کر رہا تھا۔ آخری دستہ سعد بن عبادہ کا جب گذرا تو انہوں نے بلند آواز میں کہا کہ آج گھمسان کی جنگ کا دن ہے آج کے دن کعبہ کا ماحول معرکہ کے لئے کھول دیا جائے گا۔ سب سے آخر میں سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری گذری۔ جس کے آگے زبیر بن العوام علم اٹھائے ہوتے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جب سعد بن عبادہ کے نعرہ کا علم ہوا تو فوراً ان سے علم لیکر ان کے بیٹے کے سپرد کر دیا اور فرمایا کہ نہیں! "آج کا دن کعبہ کی عظمت کے اظہار کا دن ہے۔ اور عفو و درگذر، وفا اور کرم کا دن ہے"

اس ایک فقرہ نے سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس فاتحانہ حکمت عملی کا اعلان کر دیا جو عفو و کرم پر مبنی تھی اور پھر یہ اعلان عام بھی کر دیا کہ جو کوئی بھی مسجد حرام میں داخل ہو گا یا ابوسفیان کے گھر میں چلا جائے گا یا جو شخص اپنے گھر کے دروازے بند کرلے گا اور جو کوئی بھی ہتھیار نہیں اٹھائے گا۔ اس کے لئے امن و امان ہے۔

ابوسفیان اسلام کا وہ دشمن ہے جس نے کئی بار مسلمانوں پر چڑھائی کی تھی۔ سارے عرب کو ان مظلوموں کے خلاف مشتعل کیا جو اللہ کی وحدانیت اور اس کے رسول کی رسالت برحق کا اعلان کرتے تھے بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی ناپاک سازشوں میں اپنی پوری قوت صرف کر دی تھی آج بے یار و مددگار لشکر اسلام کی حراست میں ہے اس کا ایک ایک جرم سزائے موت کا داعی ہے۔ لیکن سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اسے امان دے کر دعوت اسلام دیتے ہیں اس لئے کہ دعوت اسلام کی بنیاد قتل و غارت، خونریزی و انتقام، ظلم و بربریت اور جنگ و جدال پر نہیں تھی بلکہ محض احکام الٰہی کی اشاعت و تبلیغ اور حق کی اعانت و حمایت پر تھی۔ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک زندگی کے روز و شب کا یہی محور تھا اور عامۃ المسلمین کی زندگی اسی میں محصور و محدود تھی۔

حضور کے چچا حضرت عباسؓ نے ابوسفیان کو سمجھایا اور ترغیب دی اور کہا کہ ہٹ دھرمی چھوڑ دو اور اسلام قبول کرلو

ورنہ تم زندہ نہ بچ سکو گے۔ ابوسفیان اپنی سابقہ کوتاہیوں، ناانصافیوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دشمنی کی وجہ سے یہ سمجھ رہا تھا کہ آج کے دن اسے معافی ملنا محال ہے۔ ابوسفیان نے عالم یاس میں کہا کہ اگر معافی نہ ملی تو میں بال بچوں کو عرب کے آتشیں ریگستانوں میں لے جاؤں گا۔ جہاں ہم سب بھوکے پیاسے مر جائیں گے۔ حضرت علیؓ اور حضرت ام سلمہؓ نے مشورہ دیا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے الفاظ میں طلب عفو کی جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کہا "!

تاللہ لقد آثرک اللہ علینا وان کنا لخاطئین ۝ (سورہ یوسف) بخدا اللہ نے آپ کو برتری بخشی اور واقعی ہم خطاکار تھے"۔ اس کو سن کر سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی وہی جواب دیا جو حضرت یوسف علیہ السلام نے دیا تھا۔

لا تثریب علیکم الیوم ط یغفر اللہ لکم وھو ارحم الرحمین ۝

"تم پر آج کے دن کوئی گرفت نہیں ہے، خدا تمہیں معاف کرے وہ رحم کرنے والوں میں سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے"۔ سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف یہ کہ ابوسفیان کو معافی دی بلکہ اس کی قومی سرداری اور سرداری کا بھرم رکھنے کے لئے یہ بھی فرمایا کہ جو کوئی بھی ابوسفیان کے گھر میں پناہ لے لے۔ اسے بھی امان ہے"۔

عفو و درگذر کی ایسی عظیم مثال کیا تاریخ عالم کے کسی ورق پر ثبت ہے؟ نہیں واللہ نہیں !!!!

فتح مکہ سے کچھ ہی قبل ایک اور ایسا عجیب و غریب واقعہ رونما ہوا کہ اگر رحمت عالم و عالمیان صلی اللہ علیہ وسلم کی جگہ کوئی اور صاحب اقتدار یا رئیس قوم ہوتا تو یقیناً حاطب ابن ابی بلتعہ کو قتل کروا دیتا۔ ہوا یوں کہ حاطب کے اہل و عیال مکہ میں گھرے ہوئے تھے اور یہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے اور چونکہ ان کا کوئی قبیلہ حمایتی اور حلیف نہیں تھا۔ اس لئے انہوں نے اہل و عیال کی بہبود کے خیال سے مدینہ کے مسلمانوں کی تیاری کا حال ایک خفیہ خط کے ذریعہ قریش کو لکھ بھیجا تاکہ وہ اس احسان کی بنا پر ان کے اہل و عیال سے تعرض نہ کریں اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ اس اطلاع کے باوجود اسلامی فوج کی فتح یقینی ہے اور ان کا خط نتیجہ کے اعتبار سے کوئی بڑا نقصان اسلام کو نہ پہنچا سکے گا حالانکہ یہ ایک جاسوسانہ کارروائی اور دشمن دوستی کی دلیل تھی۔ ہم کو اس واقعہ سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ کس طرح خارجی حالات اور ذہنی تاثرات کے دباؤ میں اگر کبھی کسی صالح انسان سے بھی سخت ترین لغزش ہو جانا بعید از قیاس نہیں۔ سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس خفیہ خط کا علم ہو گیا لیکن آپ نے اتنی بڑی خطا سے بھی اس لئے چشم پوشی فرمائی کہ حاطب مخلص تھے۔ بدری صحابی تھے۔ ایمان اور حسن کردار رکھتے تھے۔ اور ان کی اسلام دوستی بہت سے معرکوں میں پرکھی جا چکی تھی۔ منافقت کا ان میں شائبہ بھی نہ تھا۔ یہ تقاضائے بشریت اور وفور محبت عیال میں ان سے یہ خطا سرزد ہو گئی تھی۔

آج کے دور جدید میں اگر اس قسم کا واقعہ رونما ہو جائے تو ایسا مجرم چاہے کتنا ہی با اخلاق، محب وطن اور

مخلص ہی کیوں نہ ہوتا سزائے موت سے نہیں بچ سکتا تھا، لیکن محسن انسانیت، سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا عفو و درگذر اور کرم تھا کہ انہیں معاف کر دیا۔ تاریخ انسانی عفو و درگذر اور اخلاص کی کیا کوئی ایسی مثال پیش کر سکتی ہے؟

اے مدبرین زمانہ! اے صبر و ثبات کی تاریخ لکھنے والو؟ تدبر اور معاملہ فہمی کا مظاہرہ دیکھنا ہو تو حجرِ اسود کے نصب کرنے کا واقعہ دیکھو۔ صبر و استقامت، عزم و ہمت کی عظمتیں دیکھنی ہوں تو شعب ابو طالبؓ کے تین سال سامنے رکھو!

اے عزم و استقلال کی بلند قدروں کی وضاحت کرنے والو؟ مستقل مزاجی اور صبر و رضا کی کیفیت دیکھنا ہو تو وہ وقت یاد کرو جب ایک ہی سال میں آپ کے رفیق و شفیق چچا حضرت ابو طالب اور ہمراز و دمساز حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ جو آپ کے غموں کے ساتھی اور دکھوں میں تسلی و تشفی دینے والی تھیں رخصت ہو گئیں۔ اور آپؐ نے ان پر صبر کیا۔ تحمل، نرم خوئی، غیرتِ ایمانی دیکھنا ہو تو آپ کے سفرِ طائف کا مطالعہ کرو۔ اس جگہ اگر پہاڑ بھی ہوتا تو اپنی جگہ سے سرک جاتا۔ اختیار دیا جاتا ہے کہ اگر ارشاد فرمائیں تو چند لمحوں میں پوری بستی کو تباہ کر دیا جائے۔ لیکن آپ کی رحمت و رافت اس کو گوارا نہیں کرتی۔ حکمت و دانائی، صلح جوئی، دور بینی، مصلحت کوشی اور بردباری کا نظارہ کرنا چاہو، تو صلح حدیبیہ کے موقع پر آپؐ نے جو تدبر دکھایا وہ سامنے رکھو۔ عفو و درگذر، شرافت و شجاعت، صلح جوئی اور نرم مزاجی کی مثال ڈھونڈنی چاہو تو فتح مکہ کے موقع پر اس فاتحِ عظیم کے کردار کو دیکھو! جس نے لوگوں کے دل جیتے اور اپنے سخت ترین دشمنوں کو معاف کر کے محبت و آشتی کا نہ صرف پیغام دیا بلکہ اس کے سرمدی اور ابدی نقوش تاریخِ عالم پر ثبت کر دیئے۔

(صلی اللہ علیہ وسلم)

———



سرورِ عالم ؐ نازک لمحات کی میزان پر

عبدالوہاب حجازی

روئے زمین پر نوعِ انسانی کی آفرینش کے آغاز ہی سے خالقِ عالم نے اس کو مقصدِ تخلیق سے مربوط رکھنے کے لئے رشد و ہدایت کا ایک منظم سلسلہ رکھا ہے۔ یہ منصبِ رسالت کا سلسلہ ہے جو ایک مقدس ترین فریضہ اور نوعِ انسانی کے لئے خالق کی طرف سے سب سے بڑا اعزاز ہے۔ یہ اپنی عظمت کے اعتبار سے اہم اور نازک بھی ہے نوعِ انسانی کی ہر قوم اور اس کا ہر دور منصبِ رسالت کے حامل برگزیدہ انسانوں سے فیض یاب ہوتا رہا ہے۔ یہ انبیاء و رسل اعلیٰ ترین بشری صفات کے حامل اور اپنے اپنے دور کے انسانِ کامل تھے۔ منصبِ رسالت کے حصول میں کسب کا قطعی دخل نہیں۔ یہ خالص وہبی اعزاز ہے جو خدا نے انہیں ان کے کمالِ ظاہر و باطن کے سبب عطا فرمایا۔ جملہ انبیاء و رسل ایک دین، ایک راہ یعنی اسلام کے داعی تھے۔ بعد کے آنے والے ہر نبی نے اپنے پیش روؤں کی گم گشتہ راہ پیرووں یا عام انسانوں کو اپنی دعوت کا مخاطب بنایا اور ان کے بگاڑ کی اصلاح کی سعی کی۔ اس سلسلہ کے سب سے آخری نبی اور رسول سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آپ کے منصب کا دائرہ بے حد وسیع ہے۔ آپ کے پیغام کی مخاطب پوری نوعِ بشر ہے جو رنگ و نسل، قوم و وطن اور جدید و قدیم کی ہر بندش سے آزاد ہے پیغام کو انسانی دنیا میں کمال بے غرضی سے آپؐ نے عملاً نافذ فرمایا۔ اعلیٰ انسانی اقدار کے بجائے پست و محدود اقدار پر یقین رکھنے والے انسانوں نے پیش رو انبیاء کی طرح آپؐ کے پیغام کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کیں۔ استہزاء و استخفاف، دشمنی و عداوت اور جنگ و جدل کے ہر ممکن وسائل آپؐ کے مقابلہ میں استعمال کئے گئے۔ قید و بند، سماجی، معاشی اور سیاسی مقاطعہ، قتل کی کوشش میں انتہا پسندانہ کارروائیاں آپؐ کے ساتھ انجام دی گئیں لیکن یہ ایک خدائی منصب کا فریضہ تھا جسے آپؐ کو لازماً ادا کرنا تھا اور آپؐ نے یہ فریضہ خدائی تحفظ کے ساتھ اپنی اعلیٰ ترین بشری صفات کے ذریعہ کامل طور پر ادا فرمایا۔

زیرِ نظر مقالہ میں یہ جائزہ مقصود ہے کہ آپؐ نے اپنی حیاتِ طیبہ کے سفر میں نازک ترین مواقع پر کس طرح اپنے منصب کو نبھایا اور حالات کا معتدل، راست اور نتیجہ خیز حل فرمایا۔ اس سلسلہ میں ہم سب سے پہلے محاصرہ شعب ابی طالب کا جائزہ لیں گے

زندانِ شعب ابی طالب

مشرکین کی طرف سے رسول اکرمؐ اور آپؐ کے اصحاب کی بے پناہ ایذا رسانی کے باوجود اسلام کی مقبولیت کا دائرہ روز بروز وسیع ہو رہا تھا۔ ابوبکرؓ و عثمانؓ کے علاوہ عمرؓ اور حمزہؓ جیسے بارعب قریشی اسلام لا چکے تھے۔ سرزمین مکہ کے تنگ ہونے پر پڑوسی ملک حبشہ میں مسلمانوں کو باطمینان جائے پناہ مل گئی تھی جسے قریشی سمت خطرہ تصور کرتے تھے اس لئے

رسول اکرم، آپؐ کے خاندان اور آپؐ کے اصحاب کو تباہ و برباد کرنے کے لئے تمام قبائل نے ایک بائیکاٹ کا معاہدہ لکھا اور اسے کعبہ میں آویزاں کر دیا۔ معاہدہ نامہ میں درج ذیل باتیں لکھی گئی تھیں

- محمدؐ کے خاندان بنی ہاشم سے کوئی رشتہ ناطہ قائم نہیں کیا جائے گا
- ان سے خرید و فروخت کا معاملہ نہیں کیا جائے گا۔
- نہ ان سے کوئی ملے گا اور نہ ہی ان کے پاس کھانے پینے کا سامان بھیجے گا۔

اس مقاطعہ کے سبب سے آپؐ اپنے اصحاب اور خاندان کے ساتھ شعب ابی طالب میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ جہاں مسلسل تین سال آپؐ کو رہنا پڑا۔ یہ مدت نظر بندی انتہائی صبر آزما اور مشکل تھی۔ اصحاب رسولؐ کہتے ہیں کہ ہم سوکھے چمڑے بھگو کر چوستے اور پتے کھا کھا کر اپنی گرسنگی بجھاتے تھے۔ بچے بھوک اور پیاس سے تڑپتے اور روتے تھے جس کی آواز گھاٹی سے باہر سنائی دیتی تھی جسے سنگ دل کافر سن کر خوش ہوتے تھے

حج کا زمانہ امن کا وقت ہوتا ہے عرب اس وقت اس طرح کی باتوں سے دست کش ہو جاتے تھے لیکن آپ کے ساتھ کافروں نے یہ سہولت بھی روا نہ رکھی۔ آپؐ تبلیغ کے لئے جاتے تو آپؐ کا چچا ابولہب آپؐ کے پیچھے پیچھے لگا رہتا اور آپؐ کے وعظ کے اثر کو ختم کرنے کی سعی کرتا اور مسلمانوں کے ساتھ لین دین سے دوسروں کو روکا جاتا۔

اس وحشیانہ برتاؤ سے بنو ہاشم کے کچھ قرابت مندوں ہشام عامری اور زہیر وغیرہ کے دلوں میں رحم کا جذبہ بیدار ہو گیا اور کچھ دوسرے لوگ جیسے مطعم بن عدی، ابوالبختری، ابن ہشام اور زمعہ بن الاسود بھی ان کے ہمنوا ہو گئے۔ یہ ہتھیار بند ہو کر معاہدہ چاک کرنے کے لئے خانہ کعبہ گئے، ابوجہل آڑے آیا لیکن معاہدہ چاک کر دیا گیا۔ قدرتی طور پر رہائی کی ایک شکل یہ بھی ظاہر ہو گئی کہ پورے معاہدہ کو اللہ کے نام کے سوا دیمکوں نے چاٹ لیا تھا ۱؎

محاصرہ و مقاطعہ پورے تین سال قائم رہا اور انتہائی جاں گسل مشکلات کے ساتھ لیکن آپؐ نے صلح کی کوئی دوسری سبیل تلاش نہیں کی بلکہ موسم حج میں اگر دوسروں سے ملنے کا موقعہ ملا بھی تو آپؐ نے ان سے تبلیغ اور دعوت دین ہی کی بات کی۔ اس سے آپؐ کی بے مثال عزیمت اور ناقابل تسخیر استقلال نمایاں ہے کیونکہ ایسے مواقع پر عام انسان صبر و استقلال سے دست کش اور کسی متبادل پر امن طریقہ کی تلاش میں لگ جاتا ہے۔ مقصد کیا ہے؟ مصائب کے سامنے اسے فراموش کر دیتا ہے۔ اس موقع پر آپؐ کے استقلال نے اسلام اور مسلمانوں کی روحانی عظمت کا پرچم وقار چپہ چپہ سارے عرب میں عام کر دیا اور لوگوں کے دل و دماغ کاروبار نبوت کی طرف متوجہ ہو گئے۔

۱؎ ابن ہشام ۲/۳،۷،۱۹، ابن سعد ۱/۲۰۸،۲۱۰، البدایۃ والنہایۃ ۳/۹۵،۹۷

طائف کا تبلیغی سفر

سنہ ۱۰ نبوت میں ابو طالب اور خدیجہؓ کے انتقال سے ایک بڑا مادی اور دنیاوی سہارا ٹوٹ گیا۔ کفار کی جرأتیں بڑھ گئیں۔ وہ کھلے بندوں آپ کو ستانے لگے لیکن اس سے آپؐ کے عزم و حوصلہ پر کوئی اثر نہ تھا۔ آپؐ مکہ سے طائف کی راہ میں مختلف قبائل کو دعوتِ اسلام دیتے ہوئے طائف تشریف لے گئے۔ سرد پہاڑی پر آباد اس سرسبز شہر کے اندر بڑے بڑے رئیس اور امیر بستے تھے لیکن ان میں غرور کی صفت پائی جاتی تھی۔ آپؐ وہاں کے معزز سردار مسعود، عبد یالیل اور حبیب سے ملے اور انہیں دعوت اسلام دی لیکن ان کے جواب بڑے حوصلہ شکن اور عبرت خیز تھے مزید یہ کہ آپؐ جب وہاں سے واپس ہونے لگے تو ان لوگوں نے آپؐ کے پیچھے شہر کے اوباشوں اور بدمعاشوں کو لگا دیا جو آپؐ کو پتھر مارتے تھے جس سے آپؐ کے جوتے خون سے بھر گئے آپؐ زخموں سے چور ہو کر بیٹھ جاتے تو یہ ظالم ہاتھ پکڑ کر کھڑا کرتے اور پھر پتھروں کی بارش ہونے لگتی۔ ایک بار آپؐ بیہوش ہو کر گر پڑے۔ زیدؓ بن حارثہ نے جو ساتھ میں تھے آپؐ کو پیٹھ پر اٹھایا۔ باہر لا کر پانی کے چھینٹے دیئے تو ہوش آیا۔

یہ اوباش گالیاں دیتے اور تالیاں پیٹتے تھے۔ ناچار آپؐ نے ایک باغ کے احاطہ میں پناہ لی۔ باغ کے مالک عتبہ بن ربیعہ نے از راہ شرافت ایک طشت میں اپنے عیسائی غلام عداس کے ہاتھ آپؐ کے پاس انگور بھجوائے۔ آپؐ نے عداس کے حالات پوچھے اس نے کہا میں نینوی کا عیسائی باشندہ ہوں۔ آپؐ نے فرمایا سرزمین یونسؑ کے باشندے ہو؟ عداس کو آپ کے اس علم پر بڑی حیرت ہوئی اس نے کہا یہ بات یہاں کوئی نہیں جانتا۔ آپؐ نے فرمایا۔ یونس میرے بھائی ہیں وہ اللہ کے نبی تھے۔ میں بھی اللہ کا نبی ہوں عداس نے جھک کر آپؐ کے ہاتھ پیر کو بوسہ دیا۔ عتبہ غلام کی یہ حرکت دیکھ رہا تھا اس نے بلا کر سرزنش کی۔ عداس نے کہا حضور آج روئے زمین پر اس سے بڑھ کر کوئی انسان نہیں ہے۔

اتنی جانکاہ اذیّتوں کے بعد آپؐ نے جو دعا مانگی وہ منصبِ رسالت کی ادائیگی کے جذبات سے لبریز ہے۔ آپؐ فرماتے ہیں: اے خدا میں اپنی کمزوری، بے سروسامانی اور تحقیر کا شکوہ تجھی سے کرتا ہوں۔ اے سب سے بڑھ کر رحم کرنے والے تو کمزوروں کا رب ہے۔ تو میرا رب ہے تو مجھے کس کے حوالے کرتا ہے۔ کسی بیگانہ یا دشمن کے جو مجھ پر قابو رکھتا ہے اگر تو مجھ سے ناراض نہیں تو مجھے کسی کی پروا نہیں لیکن تیری عافیت میرے لئے سب سے وسیع جائے پناہ ہے۔ میں تیرے روئے زیبا کے اس نور کے ذریعہ پناہ چاہتا ہوں جس سے تاریکیاں چھٹ جاتی ہیں اور دنیا و آخرت کے کام درست ہو جاتے ہیں۔ اس بات سے پناہ چاہتا ہوں کہ مجھ پر تیرا غضب نازل ہو۔ مجھے تیری ہی خوشی مطلوب ہے۔ ہر طرح کی قوت و طاقت تیرے ہاتھ میں ہے۔

حضرت جبریلؑ نے نازل ہو کر آپؐ سے عرض کیا خدا نے ہمیں آپؐ کے پاس بھیجا ہے کہ اہلِ طائف کے متعلق جیسا چاہیں حکم دیں اتنے میں پہاڑوں کا منتظم فرشتہ نازل ہوا اور عرض کیا آپؐ فرمائیں تو دونوں پہاڑوں کے درمیان اہلِ طائف کو پیس کر رکھ دیا جائے۔ رسول اکرمؐ نے فرمایا۔ اگر یہ لوگ ایمان نہیں لاتے تو توقع ہے کہ ان کی نسل اللہ اور رسولؐ

پر ایمان لائے گی۔ مسلم۔ ۲۸

ایک غریب الدیار انسان، ایک پیغمبر کے ساتھ مغرور اہلِ طائف کا یہ برتاؤ تحقیر و تذلیل اور اذیت کی حدوں کو پار کر چکا تھا۔ سرور عالمؐ نے خود اسے یوم غزوۂ احد سے بھی زیادہ سخت بتایا ہے لیکن سب کچھ آپؐ نے بغیر کسی پروا کے برداشت فرمایا۔ اس موقع پر آپؐ کی زبانِ مبارک سے جو کلام نکلے ان سے قطعاً یہ مترشح نہیں ہوتا کہ آپؐ اپنے منصب اور دین سے دل برداشتہ ہوئے ہوں یا جس قوم کی طرف سے آپؐ کو اس تذلیل اور اذیت کا سامنا کرنا پڑا اس کے حق میں فلاح دین و دنیا کے سوا کوئی اور بات آپؐ نے سوچی ہو۔ یہ سب کچھ آپؐ کے عدیم النظیر صبر و تحمل، انسانیت کی بے لاگ خیر خواہی، اللہ کی ذات پر یقین کامل کے نتیجہ میں آپؐ میں پائی جانے والی بے مثل روحانی طاقت کا آئینہ دار ہے۔

واقعۂ ہجرت

حب مسلمانوں کی اکثریت مکہ سے مدینہ ہجرت کر گئی صرف معدودے چند اور معروف صحابہ میں حضرت ابوبکرؓ و حضرت علیؓ ہی باقی رہ گئے مشرکین مکہ نے دیکھا کہ ہجرت کر کے مسلمانوں نے اوس و خزرج جیسے ذی شوکت قبائل کی پناہ حاصل کر لی ہے تو انہوں نے آپؐ کے ہجرت کر نکلنے کو اپنے لئے ایک بڑی افتاد کا پیش خیمہ تصور کیا حالانکہ رسول اکرمؐ ابھی ہجرت کے لئے اذنِ الہٰی کے منتظر تھے۔ کافروں نے اس موقع کو غنیمت سمجھ کر قصیٰ بن کلاب کے گھر۔ دار الندوہ۔ میں تمام قابلِ ذکر سرداران قریش کی مجلس مشاورت منعقد کی مختلف رایوں کے بعد ابوجہل کی رائے بالاتفاق منظور کی گئی کہ: قریش کے تمام قبائل سے جوانمرد منتخب کئے جائیں وہ بیک وقت محمدؐ پر حملہ کر کے اس کا کام تمام کر دیں اس سے خون کی ذمہ داری تمام قبائل پر آجائے گی اور بنی عبد المناف سب سے مقابلہ نہیں کر سکتے۔

جبریلؑ نے آپؐ کو اس فیصلہ کی خبر دی آپؐ نے ابوبکرؓ کے گھر جا کر انہیں ہجرت کے لئے اذنِ الہٰی کا مژدہ سنایا ابوبکرؓ نے دو اونٹنیوں جو اسی روز کے لئے تیار کی گئی تھیں میں سے ایک کو آپؐ کی خدمت میں پیش فرمایا لیکن آپؐ اسے قیمت سے لینے پر راضی ہوئے۔

ہجرت کی شب آپؐ نے علیؓ کو اپنے بستر پر سونے نیز مکہ میں اپنے پیچھے ٹھہر جانے کا حکم فرمایا تاکہ آپؐ کے پاس موجود اہلِ مکہ کی امانتیں انہیں واپس کر دیں۔ حسبِ فیصلہ قریشی جوانوں نے رات کو آپؐ کا گھر آگھیرا اور آپؐ کے باہر آنے کا انتظار کرنے لگے۔ رات کو رسول اکرمؐ باہر نکلے۔ دستِ مبارک میں خاک لی تھی اور زبان پر سورہ یٰس کا ورد تھا۔ آپؐ نے یہ خاک محاصر جوانوں کے چہروں پر اڑائی اور بغیر اس کے کہ ان کی نظر آپؐ پر پڑتی بسلامتی نکل گئے۔ یٰس ۹۔ آپؐ ابوبکرؓ کے مکان پر تشریف لے گئے۔ زادِ راہ درست کیا گیا۔ اسماء بنت ابوبکرؓ نے کمربند کے ٹکڑے کر کے

---

۲۸ ابنِ سعد ۱/۲۱۰، ۲۱۲ ابن ہشام ۲/۴۷، ۴۹ البدایۃ والنہایۃ ۳/۱۳۵، ۱۳۷

توشہ دان کا منہ باندھا اور شب کی تاریکیوں میں دونوں حضرات غارِ ثور کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہ ۱۳ نبوت ۲۷ صفر پنج شنبہ کا دن تھا۔ آپؐ نے مکہ کو الوداع کہتے ہوئے بڑی حسرت سے فرمایا تھا کہ اے مکہ مجھے تجھ سے بڑی محبت ہے لیکن کیا کروں تیرے باشندے مجھے رہنے نہیں دیتے۔

صبح نمودار ہونے پر دشمنوں نے علیؓ اور اسماءؓ سے استفسار کیا۔ دونوں نے لاعلمی کا اظہار کیا جس پر انہیں دشمنوں نے زدوکوب کیا۔

غارِ ثور مکہ سے جنوب میں چار یا پانچ میل کی مسافت پر ہے۔ اس غار تک چڑھائی بڑا ہی مشکل کام تھا۔ ابوبکرؓ نے آپؐ کو اپنے دوش پر سوار کر لیا اور غار کے دہانے پر پہنچ گئے۔ غار انتہائی تاریک و پرخطر جہاں کبھی کسی انسان کا قدم نہ پہنچا ہو۔ ابوبکرؓ پہلے اندر داخل ہوئے اسے صاف کیا اور پھر یارانِ غار اس میں پناہ گزین ہوئے برابر تین شب اس میں ٹھہرے۔ غار کے دہانے پر مکڑی نے جالا تن دیا اور کبوتر نے انڈے دے دیئے۔

عبداللہ بن ابوبکر دن کو مکہ میں رہتے، رات کو غار میں آجاتے اور مشرکین مکہ کی دن بھر کی کارروائیاں آپؐ کو سنا جاتے۔ اسماءؓ کھانا پکا کر رات کو غار میں پہنچا جاتیں۔ عبداللہ بن ابوبکر کا غلام عامر بن فہیرہ رات کو بکریوں کا ریوڑ غار کے پاس لا کر حسب ضرورت دودھ دیتا اور عبداللہ بن ابوبکر اور اسماءؓ کے نقوش قدم بکریوں کی کھروں سے مٹاتا ہوا چلا جاتا۔

قریشی جوان ننگی تلواریں، لاٹھیاں اور نیزے لئے ہوئے مکہ کا گرد و نواح چھان رہے تھے۔ ایک بار وہ غار کے دہانے پر پہنچ گئے۔ رسول اکرمؐ محوِ نماز تھے۔ ابوبکرؓ پر شدید خوف کا عالم طاری تھا۔ وہ آپؐ سے قریب سمٹ آئے۔ آپؐ نے کمال استقلال سے سرگوشی کی۔ غم نہ کرو اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ الغار۔ قریشی جوان بیت عنکبوت اور بیضۂ حمام کو دیکھ کر واپس ہو گئے کہ یہ چیزیں یہاں ان کے نہ ہونے کا پتہ دیتی ہیں۔

تیسرے روز جب محسوس ہوا کہ مشرکین سکون پذیر ہو گئے تو حسب وعدہ عبداللہ بن اریقط آ گیا۔ یہ ایک ماہر دلیل راہ تھا، تھا تو مشرک لیکن قابل اعتماد تھا۔ یہ چوتھی شب تھی دونوں اونٹنیاں اس کے ساتھ تھیں۔ ایک پر آپؐ اور ابوبکرؓ دوسری پر ابن اریقط اور ابن فہیرہ سوار ہوئے اور یکم ربیع الاول یوم دوشنبہ ۱۳ نبوت کو غار سے نکل کر آپ سوئے مدینہ روانہ ہوئے۔

قریش نے اعلان کر دیا تھا کہ جو شخص محمدؐ کو گرفتار کر کے لائے اسے سو اونٹ انعام میں دیئے جائیں گے۔ ایک آدمی نے آکر بتایا کہ میں نے تین سواروں کو جاتے ہوئے دیکھا ہے میرا خیال ہے وہ محمدؐ اور اس کے ساتھی ہیں۔ سراقہ بن جعشم نے آنکھوں سے اشارہ کیا کہ وہ فلاں قبیلے کے آدمی ہیں اور خود گھر جا۔ ہتھیار بند ہو کر انعام کے لالچ میں آپؐ کے تعاقب میں نکل کھڑا ہوا وہ اپنا برق رفتار گھوڑا دوڑاتا ہوا آپؐ کے قریب پہنچ گیا۔ اچانک گھوڑا ٹھوکر کھا کر زمین پر گر پڑا۔ اس نے گھوڑے کو کھڑا کیا دوبارہ سوار ہو کر پھر تعاقب کیا۔ آپؐ قرآن کی تلاوت کرتے بڑے اطمینان سے چلے جا رہے تھے کہ ابوبکرؓ نے دشمن کے تعاقب کی

اطلاع دی۔ آپؐ نے دعا فرمائی کہ خدایا ہمیں دشمن سے بچا۔ دفعتہً سراقہ کا گھوڑا گھٹنوں تک زمین میں دھنس گیا۔ سراقہ نے کہا میں سمجھ گیا کہ تمہاری دعاؤں سے میرا یہ حال ہو رہا ہے میرے لئے نجات کی دعا کرو کہ میں واپس جا کر قوم کو تمہارے تعاقب سے باز رکھوں۔ آپؐ نے دعا فرمائی اور سراقہ کو اس مصیبت سے نجات ملی۔ اس نے آپؐ سے پروانۂ امان لکھنے کی درخواست کی چنانچہ ابوبکرؓ نے ایک چمڑے پر نامۂ امان لکھا جو فتح مکہ تک اس کے پاس تھا۔

آپؐ کا دلیل راہ ابن اریقط معروف راستہ سے کترا کر ساحل سمندر کی راہ سے چل رہا تھا۔ تہامہ کے تپتے ہوئے ریتیلے میدان کا یہ سفر بڑا دشوار گزار تھا۔ یہاں ان کے لئے کوئی ملجا و ماویٰ نہ تھا۔ صرف اللہ کا تقویٰ اور حق پر ایمان کی طاقت انہیں کشاں کشاں منزل مقصود کی طرف لئے جا رہی تھی۔ مسلسل سات دن اس طرح گزر گئے۔ راستہ میں پہلے دن ام معبد اور پھر بنو سہم کے سردار بریدہ سے ملاقات ہوئی اور یہ آپؐ کے فیوض اور دولت ایمان سے بہرہ اندوز ہوئے۔ ۸ ربیع الاول کو آپؐ قبا میں وارد ہوئے۔ اہل یثرب نے جب سے یہ سنا تھا کہ آپؐ مکہ چھوڑ چکے ہیں وہ نماز صبح کے بعد سے لے کر دوپہر تک انتظار کرتے تھے پھر مایوس ہو کر لوٹ جاتے تھے۔ جس روز آپؐ قبا پہنچے یہ لوگ ابھی یثرب واپس گئے تھے۔ دفعتہً ایک یہودی نے بلند آواز سے پکارا۔ اے لوگو تمہیں جن کا انتظار تھا وہ آ گئے۔ چنانچہ انصار ہتھیار بند ہو کر نعرۂ تکبیر پڑھتے ہوئے آپؐ سے ملاقات کے لئے امڈ پڑے۔ قبا میں آپؐ نے تین روز قیام فرمایا اس عرصہ میں مسجد قبا کی بنیاد رکھی پھر ۱۲ ربیع الاول بروز جمعہ آپؐ یثرب میں داخل ہوئے۔ مدینہ میں آپؐ کا استقبال بڑا پرشکوہ تھا۔ پورا یثرب جوش و خروش سے آپؐ پر نثار ہو رہا تھا اور یثرب کے تمام باشندے نئے دور کی نوید سن رہے تھے [۱]

ہجرت کا یہ پرخطر اور زہرہ گداز مرحلہ آپؐ نے تقریباً نصف ماہ میں قطع کیا لیکن اس کشیدہ اور خون آشام فضا میں آپؐ نے جس حسن تدبیر، عزیمت و استقلال اور خود اعتمادی و خدا اعتمادی کا عملی نمونہ پیش فرمایا وہ ایک پیغمبر ہی کا کام ہے۔

آپؐ کو مکہ کے درو دیوار سے محبت تھی۔ خانہ کعبہ قبلہ عالم سے آپؐ کا شبانہ روز کا تعلق تھا۔ یہاں آپؐ کے خویش و اقارب اور بھائی بند رہتے بستے تھے۔ یہیں آپؐ بچے سے جوان ہوئے تھے اس لئے یہاں کے ہر ذرے اور ہر تنکے سے آپؐ کو تعلق خاطر تھا لیکن اہل مکہ کی تنگ نظری کے سبب اور پھر اذن الٰہی کی بجا آوری کے لئے آپؐ نے ان تمام محبتوں کو قربان کر دیا

اذن ہجرت مل جانے کے بعد آپؐ کی عالی ہمتی اور شجاعت دیدنی ہے کہ دشمن گھر کا محاصرہ کئے ہوئے ہیں کسی اور بات کے لئے نہیں بس قتل کرنے کے لئے لیکن آپ دشمن کے نرغے سے ان کے چہروں پر خاک اڑاتے ہوئے بے خوف و خطر نکل جاتے ہیں۔

ہجرت کا عظیم مرحلہ خون آشام فضاؤں میں درپیش ہے ابوبکرؓ سواری کے لئے ایک ناقہ کی پیش کش کرتے ہیں لیکن ایسے وقت میں بھی آپؐ قیمت ہی پہ لینے کے لئے تیار ہوتے ہیں شرف رسالت کے تحفظ کی یہ ایک اعلیٰ مثال ہے۔

---

[۱] ابن ہشام ۲/۹۰، ۹۸ ابن سعد ۱/۲۲۷، ۲۳۴ زاد المعاد ۳/۵۱، ۵۸۔

مشرکین کے مسلح جوان آپؐ کی تلاش میں مکہ کا گرد و نواح چھان رہے ہیں۔ ایسے خطرناک حالات میں عبداللہ بن ابوبکر کی سراغرسانی، غار کے گرد و نواح میں عامر کی گلہ بانی۔ اسماء کی خورد و نوش کے سلسلہ میں آمد و رفت اور ابن اریقط کی رہنمائی کے لئے تعیین آپؐ کے حسنِ تدبیر، فراست، مقصد کی لگن اور خدا کی ذات پر کامل اعتماد کا واضح ثبوت ہے۔

دشمنوں کے غار کے دہانے پر پہنچ جانے کے بعد ابوبکرؓ کی گھبراہٹ کے مقابلہ میں خدا کے دشمنوں سے آپؐ کی بے خوفی اور اللہ کی معیت کا یقین کامل رسولؐ کے غیر معمولی انسان ہونے پر دلالت کرتا ہے۔

ہجرت کی رات آپؐ کی شب خیزی، علیؓ کو اپنے بستر پر سونے کا حکم اور آپؐ کے پیچھے اہل مکہ کی امانتیں ادا کرنے کے لئے مکہ میں رک جانے کا فرمان، آپ کی غایت درجہ امانت داری اور دشمن سے عدم انتقام کا آئینہ دار ہے۔ ایسے مواقع پر عام انسان جو رویہ ساتھ کا کردار پیش کرتا ہے لیکن ایک پیغمبر کا کردار ملاحظہ کیجئے کہ قتل کے درپے شمشیر بکف دشمنوں کو ان کی امانتیں واپس کر رہا ہے۔ فداہ امی و ابی

غار سے نکلنے کے بعد کمال اطمینان سے تلاوت قرآن اور ساتھیوں سے پرسکون گفتگو کرتے ہوئے منزل مقصود کی طرف آپؐ کی جادہ پیمائی اور انعام قریش کے حصول کے لئے طاقتور دشمن کا برق رفتاری سے آپؐ کا تعاقب اور پھر اس کی طلب پر یادگار پروانہ امن کی تفویض آپؐ کی خدا اعتمادی اور خود اعتمادی، عالی ظرفی اور دور اندیشی کا واضح ثبوت ہے۔

غزوۂ بدر

مسلمانوں کی ہجرت کے بعد قریش نے مدینہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کر دیں انہوں نے عبداللہ بن ابی کو لکھا کہ تم محمدؐ کا خاتمہ کر دو ورنہ اس کے ساتھ تمہیں بھی برباد کر دیا جائے گا۔ جنگی نقل و حرکت کے بطور قریشی جوان مدینہ کے گرد و نواح میں گشت کرنے اور مدینہ کی چراگاہوں کو نقصان پہنچانے لگے۔ مصارفِ جنگ کے لئے ابوسفیان کی سرکردگی میں ایک بھاری تجارتی قافلہ شام کی طرف بھیجا گیا جس میں تمام اہل مکہ کے زر و مال شامل تھے۔ اسی اثناء میں ابوجہل نے یہ افواہ اڑائی کہ مسلمان اس تجارتی قافلہ کو لوٹنے کی تیاری کر رہے ہیں چنانچہ قریش نے ایک ہزار کا لشکر تیار کیا جس میں سات سو اونٹ، تین سو گھوڑے اور چھ سو زرہ پوش تھے۔ بدر کے قریب قریش کو معلوم ہوا کہ قافلہ سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا تو بنو زہرہ اور بنو عدی قریشی لشکر سے واپس ہو گئے لیکن بقیہ لشکر آخری فیصلہ کے لئے میدانِ بدر کے مناسب مقام پر اتر پڑا۔

آپؐ کو قریش کی تیاری کی جب اطلاع ہوئی تو صحابہ سے مشورہ فرمایا، تمام مہاجرین و انصار آپؐ کے اشارے پر جان کی بازی لگانے کے لئے تیار تھے چنانچہ تین سو تیرہ افراد پر مشتمل ایک معمولی لشکر لے کر آپؐ بدر تشریف لے گئے پورے لشکر میں دو گھوڑے اور ستر اونٹ تھے۔ یہ ۱۷ رمضان ۲ھ کا واقعہ ہے۔ مسلمانوں کا لشکر میدان کے جس حصہ میں اترا وہاں پانی کا چشمہ یا کنواں وغیرہ نہ تھا اور زمین بھی ایسی ریتلی تھی کہ پاؤں دھنس جاتے تھے۔ تائید غیبی سے بارش کا نزول ہو گیا۔ ریت جم گئی اور صحابہ نے پانی کے حوض بنا لئے — انفال ۲ — اس پانی سے آپؐ نے دشمنوں کو بھی فائدہ اٹھانے کی اجازت دی۔ تمام شب اصحاب کرام نے آرام کیا لیکن رسولِ اکرمؐ ساری رات مصروف دعا و عبادت رہے۔ نماز

فجر کے بعد آپؐ نے خطبہ جہاد سنایا اور میدان میں صفیں آراستہ کیں۔ اسی عرصہ میں دو صحابی کہیں سے آرہے تھے مشرکین نے انہیں روکا کہ محمدؐ کی مدد کے لئے جا رہے ہو انہوں نے انکار کیا اور عدمِ تعاون کا وعدہ کر لیا۔ وہ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سارا قصہ سنایا۔ آپؐ نے فرمایا وعدہ پورا کیا جائے گا۔ ہمیں صرف خدا کا تعاون مطلوب ہے۔ دو متقابل لشکروں میں کیا نقشہ عبرت ہے ایک خدا کی راہ میں مصروفِ جہاد ہے اور دوسرا منکرِ خدا ہے۔ قرآن۔ سرورِ عالمؐ میدانِ جنگ سے دور سپوس کے ایک سائبان میں مصروف دعا ہیں کہ "خدایا! یہ مٹھی بھر جماعت اگر آج تباہ ہو گئی تو قیامت تک تیری پرستش نہ ہو گی"۔ کمال خضوع سے چادر آپؐ کے کندھوں سے سرک جاتی تھی حضرت ابوبکرؓ نے رقت آمیز لہجے میں فرمایا! "اللہ کے رسولؐ خدا اپنا وعدہ ضرور پورا کرے گا"۔ آپؐ نے مسلمانوں کو حملہ میں پیش قدمی کرنے سے روکا۔

دعوتِ مبارزت مشرکین کی طرف سے دی گئی اور پھر گھمسان کی جنگ شروع ہو گئی۔ مشرکین کے بڑے بڑے سردار عتبہ ولید اور شیبہ باری باری میدان میں نکلے اور بالترتیب حمزہؓ، علیؓ اور عبیدہؓ کی تلواروں سے مارے گئے۔ عام جنگ شروع ہوئی تو ابوجہل دو انصاری بچوں معاذ اور معوذ کی تلواروں سے مارا گیا

آپؐ نے جنگ سے قبل یہ بتا دیا تھا کہ قریشی لشکر میں کچھ لوگ بجبر لائے گئے ہیں ان سے درگزر کیا جائے۔ ایسے لوگوں میں ابوالبختری بھی تھا۔ انصار کے ایک حلیف مجذر نے اسے دیکھ لیا۔ بولے تجھے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اس نے کہا اور میرے ساتھی کو بھی؟ مجذر نے کہا نہیں۔ بولا میں رفیق کا ساتھ چھوڑ کر طعنہ نہیں سننا چاہتا چنانچہ وہ خود مجذر پر حملہ آور ہو گیا اور بالآخر مارا گیا۔

عتبہ اور شیبہ جیسے سرداروں کے قتل سے مشرکین کے قدم اکھڑ گئے۔ مسلمانوں کے صرف چودہ اشخاص نے جام شہادت نوش کیا اور مشرکین کے تمام بڑے بڑے سرداروں سمیت ستر آدمی مارے گئے۔ تاریخ کا تصرف ملاحظہ ہو دارالندوہ میں جتنے سردار آپؐ کے قتل کی سازش میں شریک تھے۔ تین کے علاوہ سب قتل ہو گئے بقیہ تینوں بعد میں مسلمان ہو گئے۔ مشرکین کے ستر آدمی گرفتار بھی ہوئے۔

اسیرانِ جنگ صحابہ میں تقسیم کر دیئے گئے۔ آپؐ نے ہدایت فرمائی کہ ان کے ساتھ بہتر سلوک کیا جائے۔ ان اسیروں میں مصعب بن عمیر کے بھائی ابوعزیز بھی تھے ان کا بیان ہے کہ مجھے انصاریوں نے قید کیا تھا۔ جب یہ لوگ کھانا لاتے تو ہمیں روٹی پیش کرتے اور خود کھجوریں کھاتے تھے۔ میں شرم سے روٹی انہیں دے دیتا لیکن وہ کھائے بغیر مجھے واپس کر دیتے۔ سہیل بن عمرو بڑا زور آور خطیب تھا۔ آپؐ کے خلاف شعلہ بیانی کرتا رہتا تھا اسیروں میں یہ بھی تھا۔ حضرت عمرؓ نے آپؐ سے کہا اس کے دانت اکھڑوا دیجئے۔ آپؐ نے فرمایا اگر میں اس کے اعضا بگاڑ دوں گا تو اللہ تعالیٰ میرے اعضا کو بگاڑ دے گا۔

تمام اسیرانِ جنگ سے چار چار ہزار درہم فدیہ لے کر چھوڑ دیا گیا جو نادار تھے وہ یونہی چھوڑ دیئے گئے ان میں جو لکھنا جانتے تھے انہیں آپؐ نے حکم دیا کہ وہ دس دس بچوں کو لکھنا سکھا دیں۔

اسیروں میں آپؐ کے چچا عباس بھی تھے۔ انصار نے قرابت کے سبب ان کی معافی کی بات کہی۔ لیکن آپؐ نے

اسے ناپسند فرمایا چنانچہ انہیں بھی فدیہ دینا پڑا لیکن دوسرے پہلو سے ان سے آپؐ کی محبت کا یہ عالم تھا کہ ان کے کراہنے کے سبب آپؐ کی نیند اچاٹ ہوگئی۔ جب بندش کی گرہ ڈھیلی کی گئی تو سرورِ عالمؐ کو نیند آئی [۱]

- جنگ بدر جس وقت لڑی گئی رسولِ اکرمؐ کے پاس اجتماعی طاقت قریش کے مقابلہ میں نہ ہونے کے برابر تھی۔ خود مدینہ میں مشرکین اور منافقین کا ایک بڑا گروہ موجود تھا۔ مدینہ کے گرد و نواح کے بیشتر قبائل قریش کے زیرِ اثر تھے۔ یہود بھی آپؐ کے مخالف تھے۔ ہجرت کے بعد سے جنگ بدر تک آپؐ نے گرد و پیش کے قبائل کو حلیف بنانے یا غیر جانبدار رہنے کی سعی کی تھی۔ یہود اور مشرکینِ مدینہ سے بھی آپؐ نے معاہدۂ امن کیا تھا لیکن یہ کوشش ابھی ابتدائی مرحلہ میں تھی۔ عام مسلمان معاشی اور سیاسی حیثیت سے بالکل بے بس تھے۔ قریش کا مقصد جنگ بدر سے یہ تھا کہ مسلمانوں کو زور پکڑنے سے پہلے برباد کر دیا جائے لیکن رسولِ اکرمؐ قریش جیسی زبردست طاقت سے نبرد آزما ہونے کے لئے میدان میں اتر پڑے۔ آپؐ کا یہ عزم و حوصلہ اور جرأت و شجاعت انسانی تاریخ میں ایک نادرالوجود شے ہے۔
- قریش کے آمادہ جنگ ہونے کی خبر پاکر آپؐ نے اصحابِ کرامؓ سے مشورہ طلب کیا اور اس کی روشنی میں قدم اٹھایا شوریٰ کا لحاظ منصبِ رسالت کے مقاصد سے گہرا ربط رکھتا ہے۔ آپؐ نے مشورت کی راہ ترک کر کے آمریت کی راہ نہیں اپنائی۔
- میدانِ جنگ میں جو خطہ آپؐ کو حاصل تھا وہ جنگی مصالح کے اعتبار سے ناسازگار تھا۔ وہاں پانی کا بھی بندوبست نہ تھا۔ تائیدِ غیبی سے بارش نازل ہوئی تو مشکلات حل ہوئیں ساقیٔ کوثر کا فیضانِ عام دیکھئے کہ اس پانی سے مستفید ہونے کی اجازت ان دشمنوں کو بھی دیتے ہیں جو میدانِ جنگ میں آپؐ اور آپؐ کے بے سرو سامان ساتھیوں کو نیست و نابود کرنے کے لئے اترے تھے جانی دشمنوں کے ساتھ آپؐ کا یہ برتاؤ، فیاضی اور کشادہ دلی کا ایک بے مثال اسوہ ہے۔
- میدانِ جنگ میں مسلمانوں کی قلت تعداد اور بے سرو سامانی کا یہ عالم تھا کہ ایک نہتے مسلمان کے مقابلہ میں تین تین ہتھیار بند مشرک تھے۔ اس عالم میں دو صحابیوں کی آمد مزید تقویت کا باعث تھی لیکن کہیں ان دونوں نے مشرکین سے آپؐ کے ساتھ عدمِ تعاون کا وعدہ کر لیا۔ آپؐ کو جب معلوم ہوا تو فرمایا کہ وعدہ ضرور وفا کیا جائے گا اور اس یقین کا اظہار فرمایا کہ ہمیں اللہ کے تعاون پر بھروسہ ہے۔ میدانِ جنگ میں انفرادی وعدہ کی پاسداری سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ عہد و میثاق کے غایت درجہ وفا کرنے والے تھے جبکہ جنگ کا دوسرا نام دھوکہ اور فریب ہے۔
- میدان جنگ سے دور پھوس کے سائبان میں مصروف دعا ذاتِ رسالت دشمنانِ دین و انسانیت کے لہو سے بھی اپنے ہاتھ رنگین نہیں کرنا چاہتی تھی، رسولؐ کی عصمت، پاکیزگی اور تقدس کی اس سے بڑھ کر اور کیا مثال ہوگی۔
- آپؐ کو معلوم تھا کہ لشکرِ قریش میں بہت سے لوگ جبراً لائے گئے ہیں آپؐ نے ان سے درگزر کرنے کا حکم فرمایا اس

---

[۱] ابن ہشام ۲/۱۸۲، ۷۵ب زاد المعاد ۳/۱۷۱، ۸۸ا البدایۃ والنہایۃ ۳/۲۵۶ ص ۳۰۵ طبقات ابن سعد ۲/۱۱/۲۶۰

سے معلوم ہوتا کہ آپؐ کو حالات سے گہری واقفیت ہوتی تھی اور ایسے مواقع پر آپؐ فراست اور حسن تدبر کے نادر کارنامے انجام دیتے تھے

- اسیروں سے حسنِ سلوک کی آپؐ نے تاکید فرمائی۔ جس سے مسلمانوں نے ایسے بے مثال برتاؤ کا مظاہرہ کیا کہ اسیروں کی نگاہیں شرم سے جھک گئیں۔ زرِ فدیہ کی ادائیگی کی سکت نہ رکھنے والے قیدیوں کو بلاعوض چھوڑ دیا گیا بین الاقوامی قوانین کے لئے آپؐ کا یہ اسوہ قیامت تک کے لئے چراغ راہ ہے۔
- انصار نے عباس کو بلاعوض چھوڑنے کا مشورہ دیا اس لئے کہ وہ انصار اور آپؐ دونوں کے قرابت دار تھے لیکن آپؐ نے قبول نہ فرمایا۔ دیگر اسیروں کی طرح انہیں بھی زرِ فدیہ ادا کرنا پڑا۔ یہ اسلام اور پیغمبر اسلام کا اصول مساوات ہے جس میں خویش و بیگانے اور کہ و مہ یکساں ہیں جبکہ عام انسان دورِ اقتدار میں نسلی، نسبی اور خویش نوازی میں عموماً گرفتار ہو جاتا ہے۔

غزوۂ احزاب

یہودی قبیلہ بنو نضیر مدینہ سے نکلنے کے بعد خیبر میں آباد ہوا لیکن انہوں نے مسلمانوں کے استیصال کے لئے تمام عرب قبائل کو متحد کر کے مدینہ پر حملہ کی تیاری شروع کر دی اس غرض سے وہ قریشیوں سے ملے جو پہلے سے تیار بیٹھے تھے پھر لالچ دے کر بنو غطفان کو تیار کیا جس کے ساتھ اس کا حلیف قبیلہ بنو اسد بھی تیار ہو گیا۔ بنو سلیم قریش سے قرابت کی بنا پر تیار تھے اور بنو سعد پہلے سے یہود کے حلیف تھے۔ ان سب پر مشتمل دس ہزار کا لشکر مدینہ کی سمت بڑھا۔

یہ خبریں آپؐ کو موصول ہوئیں تو صحابہ سے مشورہ فرمایا۔ سلمان فارسیؓ نے خندق کھودنے کی رائے دی جسے پسند کیا گیا۔ مدینہ تین سمتوں سے نخلستانوں اور مکانات سے محصور تھا اس لئے شام کے رخ پر مدینہ کے گرد تین ہزار صحابہ کے ساتھ آپؐ نے خندق کھودنے کا کام شروع فرمایا۔ بیس دن میں پانچ گز گہری خندق دس آدمیوں پر دس گز کے حساب سے کھودی گئی۔ یہ ذی قعدہ ۵ھ کا واقعہ ہے تین تین دن کے فاقے، سرما کی شدید سردی کے باوجود عام مسلمانوں کے ساتھ سرورِ عالمؐ بھی شبانہ روز مٹی پھینک رہے تھے۔

میدانِ جنگ میں صف آرائی ہوئی سلع پہاڑی کو آپؐ نے پشت کی جانب کیا۔ عورتوں کو شہر کے محفوظ قلعہ میں رکھا گیا۔ یہودی قبیلہ بنو قریظہ سے آپؐ کا معاہدہ تھا لیکن اس موقع پر انہوں نے معاہدہ توڑ دیا اس سے مشرکین کی طاقت میں زبردست اضافہ ہو گیا۔ اس جنگ میں مشرکین کی طرف سے قریش، یہودی اور دیگر جنگجو عرب قبائل سب شریک تھے سب نے مل کر مدینہ پر تین سمتوں سے حملہ کیا۔ تقریباً ایک ماہ تک مدینۃ النبی سخت محاصرہ اور سنگین خطرے میں گھرا رہا۔ صحابہ فاقہ سے بے تاب ہو کر آپؐ کو اپنا شکم کھول کھول کر دکھانے لگے جن پر پتھر بندھے ہوئے تھے رسول اکرمؐ نے اپنا شکم صحابہ کو دکھایا تو اس پر ایک کی جگہ تین پتھر بندھے ہوئے تھے۔

محاصرین خندق پار نہ کر سکتے تھے اس لئے دور سے تیر اور پتھر چلاتے تھے اس کے مقابلہ کے لئے آپؐ نے فوجی ٹکڑیاں تقسیم کر دی تھیں جن میں سے ایک کی قیادت آپؐ خود فرما رہے تھے اس سے تنگ کر مشرکین نے عام حملہ کی تیاری کی

ایک جگہ سے خندق تنگ تھی۔ تمام سردار آگے بڑھے اور ان کے گھوڑوں نے خندق کے اس پار چھلانگ لگا دی۔ ان میں نوے سالہ عمرو بن عبدہ بھی تھا جسے ایک ہزار سواروں کے برابر مانا جاتا تھا اس نے حسب دستور دعوت مبارزت دی۔ اس کا قول تھا کہ دنیا میں کوئی بھی مجھ سے تین باتوں کا سوال کرے تو ایک بات ضرور مانوں گا۔ حضرت علیؓ مقابلہ کے لئے آگے بڑھے بولے میں تم سے اسلام قبول کرنے کی درخواست کرتا ہوں اس نے کہا یہ قبول نہیں جنگ سے واپس چلے جاؤ اس نے کہا قریشی عورتوں کا طعنہ نہیں سنوں گا۔ حضرت علیؓ نے کہا تو پھر جنگ کرو وہ ہنسا اور بولا۔ میں نہیں سمجھتا تھا کہ دنیا میں کوئی مجھ سے یہ سوال بھی کرے گا۔ اس نے گھوڑے سے اتر کر اس کے پیر کاٹ دیئے اس لئے کہ حضرت علی پا پیادہ تھے پھر زبردست حملہ کیا جس سے علی مرتضیٰ کی پیشانی پر ہلکا سا زخم آگیا اس کے بعد حضرت علی نے وار کیا تو تلوار اس کے شانہ کو چیرتی ہوئی نیچے اتر گئی۔ یہ سخت جنگ کا دن تھا اس میں رسول اکرمؐ کی مسلسل چار نمازیں قضا ہوگئیں ادھر سے بنو قریظہ نے عورتوں کے قلعے پر حملہ کر دیا جس میں وہ ناکام رہے۔

ساتھ ہی محاصرہ کی طوالت مشرکین کے لئے بڑی مہنگی تھی۔ دس ہزار لشکریوں کو رسد مہیا کرنا امر مشکل تھا اور موسم سخت سردی کا تھا۔ اس اثنا میں ایک سیاہ آندھی کڑک، چمک اور سردی کے ساتھ طوفانی شکل میں آئی جس سے ان کے خیمے اکھڑ گئے۔ اور سارا ساز و سامان تہ و بالا ہو گیا۔ ابو سفیان نے لشکر سے کہا چونکہ ہمیں نوع بنوع مشکلات درپیش ہیں اس لئے اب محاصرہ اٹھا لیا جاتا ہے۔

غطفان کی شاخ الشجع کے ایک شخص نعیم بن مسعود جو خفیہ طور پر مسلمان تھے آپؐ کے پاس آئے اور کوئی خدمت طلب کی آپؐ نے فرمایا "الحرب خدعتہ" جنگ میں فریب درست ہے تم دشمنوں میں پھوٹ کی تدبیر کرو۔ وہ بنو قریظہ کے پاس گئے جن سے نعیم کے بڑے گہرے تعلقات تھے ان سے کہا قریشی محاصرہ سے اکتا کر واپس جا سکتے ہیں لیکن تمہیں تو مسلمانوں ہی کے ساتھ رہنا ہے۔ ان کے چلے جانے کے بعد تمہارا حال ٹھیک نہیں ہوگا۔ میرے خیال سے ان کے کچھ آدمی یرغمال رکھ کر ہی تم جنگ میں شرکت کرو۔ بنو قریظہ کو یہ بات بہت پسند آئی۔ نعیم قریش اور غطفان کے پاس گئے اور بولے بنو قریظہ جنگ سے پہلو تہی کر رہے ہیں ہو سکتا ہے وہ تم سے کچھ آدمی یرغمال طلب کریں اور پھر انہیں محمدؐ کے حوالے کر کے اپنا معاملہ ٹھیک کر لیں۔ اب ان لوگوں نے قریظہ کے پاس خبر بھیجی کہ محاصرہ کے بجائے ہمیں فیصلہ کن جنگ کرنی ہے۔ بنو قریظہ نے کہا جب تک یرغمال کے طور پر تم ہمیں اپنے کچھ آدمی نہیں دیتے ہم جنگ میں شریک نہ ہوں گے۔ قریش کو نعیم کی بات درست معلوم ہوئی۔ انہوں نے یرغمال دینے سے انکار کر دیا ادھر بنو قریظہ نے نعیم کے مشورہ کو بہت کامیاب گردانا اس جنگی چال سے دشمنوں میں پھوٹ پڑ گئی۔

چنانچہ قریش بنو قریظہ اور بنو غطفان وہاں سے روانہ ہوگئے اور اللہ نے کافروں کو ان کے غیظ و غضب کے ساتھ واپس کر دیا انہیں کچھ نہ حاصل ہوا اور اللہ نے جنگ سے مومنوں کی حفاظت فرمائی۔ الاحزاب ۳۔ رسول اکرمؐ نے فرمایا آج کے بعد سے قریش تم سے جنگ نہیں کریں گے لیکن تمہیں ان سے جنگ کرنی ہوگی ۱۳۶

---

۱۳۶ ابن ہشام ۳/۱۲۷، ۱۴۰ زاد المعاد ۳/۲۶۹، ۲۷۴، ۲۷۰ البدایہ والنہایۃ ۴/۹۲، ۱۱۵ طبقات ابن سعد ۲/۶۵، ۷۳

- خندق کھودنے کے لئے سلمان فارسیؓ کی رائے کو پسند کرنے اور میدانِ جنگ کے مناسب انتخاب سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کو امورِ جنگ کی بڑی گہری بصیرت تھی۔
- خندق کھودنے میں بنفسِ نفیس شرکت فرما کر اور کسی سے نہ ٹوٹنے والی چٹان کو پارہ پارہ کر کے آپؐ نے حکمران طبقہ کے لئے حُسنِ عمل، سادگی، مساوات اور زبردست جسمانی قوت کے مظاہرہ کا بے مثال اسوہ چھوڑا ہے۔
- فاقہ اور موسم کی ناسازگاری میں بھی مسلسل بیس ایام تک ان تھک محنت سے خندق کی کھدائی سے آپؐ کے مداومتِ عمل، استقلال و پامردی اور زبردست قوتِ کارکردگی کا غیر معمولی اظہار ہوتا ہے۔
- جنگ میں ایک فوجی دستہ کی قیادت سرورِ عالمؐ نے خود فرمائی اس سے آپؐ کی جرأت و شجاعت عیاں ہے۔
- نعیم بن مسعود کے ذریعہ دشمن کی صفوں میں انتشار پیدا کر کے آپؐ نے مسلمانوں اور مدینۃ النبی کو درپیش ایک بہت بڑے خطرہ سے بچا لیا اس سے آپؐ کی فراست اور حسنِ تدبیر و تصرف کا واضح ثبوت ملتا ہے۔
- بنو قریظہ کے معاہدہ سے پھرنے کی خبر جب آپؐ کو لگی تو انہیں معاہدہ پر قائم رکھنے کے لئے کچھ مسلمانوں کو ان کے پاس بھیجا۔ نیز بنو غطفان سے جنگ کے بدلہ میں آپؐ نے مدینہ کی تہائی پیداوار پر صلح کا معاہدہ کرنا چاہا۔ یہ آپؐ کی موقع شناسی کی روشن دلیل ہے۔
- محاصرہ اٹھنے کے بعد رسول اکرمؐ نے فرمایا! قریش اب تم سے جنگ نہیں کریں گے لیکن تمہیں ان سے جنگ کرنی ہوگی یہ آپؐ کی دور اندیشی، حالات کے صحیح علم و تجزیہ اور منصب رسالت کی ادائیگی کے لئے عزمِ مصمم کی روشن دلیل ہے

غزوۂ بنی قریظہ

مدینہ آنے کے بعد رسول اکرمؐ نے یہودِ مدینہ سے معاہدہ امن کر کے انہیں جان مال اور مذہب ہر نوع کی آزادی عطا کر دی تھی۔ قریش کے ورغلانے سے یہودی معاہدہ سے پھر گئے۔ آپؐ نے دوبارہ معاہدہ کرنا چاہا لیکن یہودی قبیلہ بنو نضیر اس کے لئے تیار نہ ہوا جس کے سبب اسے مدینہ سے نکال دیا گیا البتہ بنو قریظہ نے دوبارہ معاہدہ کر لیا۔ لیکن غزوۂ احزاب کے موقع پر بنو نضیر کے سردار حی بن اخطب کے ورغلانے سے وہ لوگ دوبارہ معاہدہ سے پھر گئے اور مشرکین کے ساتھ مسلمانوں کے خلاف شریکِ جنگ ہوئے۔ غزوہ احزاب کے موقع پر ابن اخطب نے بنو قریظہ سے یہ وعدہ کیا تھا کہ قریش اگر بغیر جنگ کئے واپس ہو گئے تو میں تمہارے یہاں رک جاؤں گا چنانچہ احزاب کی ناکامی کے بعد بنو قریظہ اسے اپنے یہاں لائے جو مسلمانوں کا بدترین دشمن اور جنگِ احزاب کا بانی تھا۔ بدعہدی کے بعد یہ قریظہ کی دوسری سرکشی تھی۔

قریظہ سے کئی بار معاہدہ کے علاوہ رسول اکرمؐ نے ان کے ساتھ ایک زبردست احسان یہ کیا تھا کہ آپؐ کی آمد سے قبل ان کا رتبہ بنو نضیر سے کم تر تھا۔ اگر کوئی نضیری شخص کسی قریظی کو قتل کر دیتا تو اسے آدھا خون بہا دینا پڑتا تھا لیکن اگر کوئی قریظی کسی نضیری کو قتل کر دیتا تو اسے پورا خون بہا ادا کرنا ضروری تھا۔ آپؐ نے بنو قریظہ کو بنو نضیر کا ہم رتبہ قرار دیدیا تھا ان سب احسانات کے بعد بھی یہ لوگ غزوۂ احزاب میں رسول اکرمؐ کے خلاف جنگ میں شریک ہوئے اس لئے اب اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ باقی

نہ تھا کہ ان کا دو ٹوک فیصلہ کر دیا جائے۔

آپؐ نے احزاب سے فراغت کے بعد صحابہ کو حکم دیا کہ کوئی ہتھیار نہ کھولے اور بنو قریظہ کی طرف پیش قدمی کی جائے وہ اب بھی صلح کی درخواست کر سکتے تھے لیکن ان کے شامتِ اعمال نے ایسا نہ ہونے دیا مسلمان جب ان کے قلعہ کے قریب پہنچے تو انہوں نے مسلمانوں اور رسول اکرمؐ کو گالیاں دیں اور سخت گستاخی کے کلمات کہے اس حرکت پر ان کا محاصرہ کر لیا گیا جو ایک مہینہ تک برقرار رہا اس کے بعد انہوں نے درخواست کی کہ سعد بن معاذ ہمارے متعلق جو فیصلہ کر دیں ہم اس پر راضی ہوں گے۔ ان کا قبیلہ اوس بنو قریظہ کا حلیف تھا۔ سعدؓ نے غور و فکر کے بعد فیصلہ سنایا کہ قریظہ کے جنگ کرنے والے مرد قتل کر دیئے جائیں عورتوں اور بچوں کو گرفتار کر لیا جائے اور ان کے مال و جائیداد کو مالِ غنیمت بنا لیا جائے۔

رسول اکرمؐ نے سعد کے اس فیصلہ کو فیصلہ آسمانی سے تعبیر فرمایا۔ یہودی بھی اسے فیصلہ آسمانی ہی سمجھتے تھے چنانچہ حی بن اخطب یہودیوں کو مخاطب کر کے کہتا ہے۔ لوگو اللہ کے فیصلہ کے آگے کوئی چارہ نہیں۔ یہ بنی اسرائیل کے حق میں اللہ کا نوشتہ تقدیر اور اس کی سزا ہے [۱۸]

رسول اکرمؐ نے عام یہودِ مدینہ کو اور خصوصیت سے بنو قریظہ کو ہر نوع کی آزادی دے رکھی تھی بنو قریظہ پر تجدید معاہدہ کے علاوہ اور کئی بڑے احسانات فرمائے تھے گو اس کا جواب وہ ہمیشہ الٹا ہی دیتے تھے اس سے اہل کتاب کے ساتھ آپؐ کے حسنِ سلوک، رواداری اور امن پسندی کا واضح ثبوت ملتا ہے۔

بنو قریظہ کی دو دو بار معاہدہ شکنی، آپؐ کے خلاف جنگ میں شرکت، مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن کو اپنے یہاں ٹھہرانے اور آپؐ کو گالیاں دینے کے باوجود جب انہوں نے اپنے حلیف سعد بن معاذ کو حکم ماننے کی درخواست کی تو آپؐ نے بلا تردد اسے قبول فرما لیا۔ یہ آپؐ کے کمال حلم، رواداری اور کشادہ دلی کی روشن دلیل ہے۔ جبکہ یہود کی تاریخ اس نوع کی رواداریوں اور حلم و بردباری سے یکسر خالی ہے۔

حادثۂ افک

شعبان ۶ھ میں رسول اکرمؐ کو معلوم ہوا کہ بنو المصطلق جو قبیلہ خزاعہ کی ایک شاخ ہے آپؐ کے خلاف جنگ کی تیاری کر رہے ہیں۔ آپؐ ان کی سرکوبی کے لئے ایک لشکر لے کر روانہ ہوئے۔ اس میں منافقوں کے ایک بڑے گروہ کے ساتھ رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی بن سلول بھی شریک تھا۔ معمولی سی جنگ کے بعد پورا قبیلہ گرفتار کر لیا گیا۔ اس غزوہ سے واپسی پر ابن ابی نے افک کا فتنہ کھڑا کیا۔ یہ ام المومنین حضرت عائشہؓ پر تہمت کا فتنہ تھا اس کی تفصیلات خود حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں۔

سفر پر جاتے ہوئے رسول اکرمؐ کا دستور تھا کہ ازواجِ مطہرات کے درمیان قرعہ ڈالتے تھے جن کا نام آجاتا وہ سفر میں آپؐ کے ساتھ جاتی تھیں۔ غزوۂ بنو المصطلق میں قرعہ کے مطابق میں آپؐ کے ساتھ تھی۔ غزوہ سے واپسی پر مدینہ سے کچھ فاصلہ

۱۸۔ البدایۃ والنہایۃ ج ۴/۱۱۶، ۱۲۶، ابن سعد ۲/۴، ۷۷، ابن ہشام ۳/۱۴۰، ۱۵۳، زاد المعاد ۳/۲۷۵

پر آپؐ نے شب میں قیام فرمایا اور صبح ہونے سے کچھ پہلے ہی وہاں سے روانگی کی تیاری شروع ہو گئی۔ میں ضرورت سے فراغت کے لئے پڑاؤ سے کچھ دور چلی گئی۔ صبح کی سفیدی جب کچھ نمودار ہوئی اور میں لوٹ کر پڑاؤ کے قریب پہنچی تو مجھے معلوم ہوا کہ میرا گلے کا ہار کہیں گر گیا۔ میں اسے تلاش کرنے لگی۔ اتنے میں لشکر وہاں سے کوچ کر گیا۔ اس وقت غذائی قلت کے سبب ہم عورتیں بہت ہلکی پھلکی تھیں۔ ہودج اٹھا کر اونٹ پر رکھنے والوں کو اس کا احساس نہ ہوا کہ میں اس میں نہیں ہوں۔ واپس آنے پر میں نے پڑاؤ خالی پایا اس لئے وہیں لیٹ گئی کہ آگے جب مجھے نہیں پائیں گے تو تلاش کرتے پر میں یہاں مل جاؤں گی۔ صبح کو صفوان بن معطل سلمی کا میرے قریب سے گزر ہوا جو فوج کے پیچھے صبح تک اس لئے رک جایا کرتے تھے کہ مبادا کوئی سامان چھوٹ گیا ہو۔ انہوں نے مجھے پہچان لیا اس لئے کہ حکم حجاب کے نزول سے قبل وہ مجھے بارہا دیکھ چکے تھے ان کی زبان سے نکلا! انا للہ وانا الیہ راجعون۔ رسول اکرمؐ کی حرم محترم یہیں چھوٹ گئیں۔ اس آواز سے میں بیدار ہو گئی۔ وہ میرے قریب اپنا اونٹ بٹھا کر دور کھڑے ہو گئے اور مجھ سے کوئی گفتگو نہیں کی۔ میں اونٹ پر سوار ہو گئی اور وہ نکیل پکڑ کر پیدل چلنے لگے لشکر نے ابھی ایک جگہ قیام کیا ہی تھا کہ ہم لوگ پہنچ گئے۔ کسی کو ہمارے پیچھے چھوٹنے کی خبر بھی نہ تھی کہ کچھ تہمت تراشوں نے جن میں رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی بن سلول سب سے آگے تھا تہمت کا فتنہ کھڑا کر دیا۔

مدینہ پہنچنے کے بعد مجھے بخار آگیا۔ ایک ماہ تک صاحب فراش رہی۔ مدینہ میں بہتان کا فتنہ بہت تیزی سے گردش کر رہا تھا۔ رسول اکرمؐ کو بھی معلوم ہو گیا تھا مگر مجھے کوئی خبر نہ تھی البتہ یہ بات مجھے کھٹکتی تھی کہ بیماری کے موقع پر میرے ساتھ آپؐ کا برتاؤ پہلے جیسا نہ تھا۔ گھر والوں سے خیریت دریافت فرما لیتے۔ مجھ سے کچھ نہ پوچھتے تھے بالآخر آپؐ سے اجازت لے کر میں والدہ کے گھر چلی گئی کہ وہاں اچھی طرح تیمارداری ہو سکے گی۔

ایک رات ضرورت سے باہر گئی ساتھ میں والدہ کی خالہ زاد بہن مسطح بن اثاثہ کی ماں بھی تھیں ان سے مجھے معلوم ہوا کہ میرے خلاف بہتان کے قصے پھیلائے جا رہے ہیں۔ رات کو ایک انصاری عورت نے بھی ساری تفصیل سنائی۔ یہ سن کر میرا خون خشک ہو گیا جس ضرورت کے لئے آئی وہ بھی بھول گئی پوری رات رو کر گزاری اور مسلسل روتی رہتی تھی معلوم ہوتا تھا کہ میرا کلیجہ شق ہو جائے گا مارے غیرت کے ایک بار سوچا کہ کنوئیں میں گر کر جان دے دوں۔

ادھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے پوچھ گچھ شروع کی۔ علیؓ اور اسامہ بن زیدؓ سے استفسار کیا۔ اسامہ نے کہا یا رسول اللہ ہم نے آپ کی بیوی میں خیر ہی خیر پایا ہے جو کچھ اڑایا جا رہا ہے افتراء ہے۔ علیؓ نے کہا۔ اللہ کے رسول عورتوں کی کمی نہیں آپؐ دوسری عورت سے نکاح کر سکتے ہیں اور تحقیق حال کے لئے لونڈی سے دریافت کر لیجئے لونڈی کو بلا کر آپؐ نے پوچھا تو اس نے کہا میں نے ان میں کوئی کمی نہیں دیکھی ہاں گندھا ہوا آٹا رکھا رہتا ہے وہ سو جاتی ہیں اور بکری آکر آٹا کھا جاتی ہے۔ زینب ان کی مدمقابل کی سوکن تھیں۔ آپؐ نے ان سے بھی دریافت فرمایا انہوں نے کان پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ میں ان میں بھلائی کے سوا کچھ نہیں جانتی۔

اسی روز آپؐ نے مسجد نبوی میں خطبہ دیا اور فرمایا۔ مسلمانو! ایسے شخص سے میری آبرو کون بچائے گا جس نے میرے اہل پر

تہمت لگا کر مجھے غایت درجہ اذیت پہنچائی ہے واللہ میں نے اپنی بیوی اور جس سے متعلق تہمت لگائی گئی ہے دونوں میں کوئی کمی نہیں دیکھی۔ وہ میرے نہ رہتے پر کبھی میرے گھر تک نہیں آیا اس پر اُسید بن حضیر کھڑے ہوئے اور بولے یا رسول اللہ اگر وہ ہمارے قبیلہ کا آدمی ہے تو ہم اسے قتل کر دیں گے اور اگر وہ ہمارے بھائی خزرج میں سے ہے تو آپؐ جیسا حکم فرمائیں ہم حاضر ہیں۔ خزرج کے رئیس سعد بن عبادہ کھڑے ہو گئے اور بولے تم اسے نہیں مار سکتے۔ تم اسے مارنے کی بات اس لئے کر رہے ہو کہ وہ خزرج کا آدمی ہے اُسید نے کہا تم منافقوں کی طرفداری کر رہے ہو اس لئے منافق ہو۔ رسول اکرمؐ منبر پر تشریف فرما تھے۔ مسجد میں ایک ہنگامہ برپا تھا۔ آپؐ نے انہیں سمجھایا اور منبر سے نیچے تشریف لائے۔

اس کے بعد میرے پاس تشریف لائے۔ میرے والدین بیٹھے ہوئے تھے اور ایک انصاری عورت بھی تھی۔ میں زار زار رو رہی تھی۔ اللہ کی حمد و ثنا کے بعد آپؐ نے فرمایا عائشہ تمہارے متعلق لوگوں کی جو باتیں ہوئیں سو ہوئیں اب سے اللہ سے ڈرو۔ اگر لوگوں کے کہنے کے مطابق تم سے خطا ہوئی تو اللہ سے توبہ کرو وہ بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے۔ اس بات پر میرے آنسو تھم گئے۔ میں انتظار کرنے لگی کہ میرے والدین کچھ جواب دیں گے لیکن انہوں نے کچھ نہ کہا۔ بخدا میں خود کو اس سے کمتر سمجھتی تھی کہ اللہ میری برات میں قرآن نازل فرمائے گا جسے مسجدوں اور نمازوں میں تلاوت کیا جائے گا۔ ہاں یہ خیال تھا کہ خواب میں اللہ تعالیٰ آپؐ کو میری برأت دکھلا دے گا۔ میں نے جب والدین کو خاموش دیکھا تو یوں گویا ہوئی۔ خاندان ابوبکر پر جو مصیبت آئی ہے بخدا میں نہیں جانتی کہ کسی اور پر آئی ہو گی واللہ میں توبہ نہیں کروں گی اس لئے کہ اللہ جانتا ہے کہ میں بری ہوں اور اگر میں صاف انکار کر دوں تو آپ لوگ میری تصدیق نہیں کریں گے اس لئے میں وہی کہوں گی جو یوسف کے باپ نے کہا تھا یعنی "فصبر جمیل واللہ المستعان علی ماتصفون۔" اسی اثنا میں آپؐ پر وحی کی کیفیت طاری ہوئی۔ آپؐ کے سر کے نیچے چمڑے کا تکیہ لگا دیا گیا۔ بخدا میں ذرا نہیں گھبرائی اس لئے کہ میں جانتی تھی کہ اللہ میرے ساتھ ظلم نہیں کرے گا کیونکہ میں بری ہوں لیکن میرے والدین کا برا حال تھا کہ مبادا لوگوں کے قول کے مطابق اللہ کی طرف سے تائید نہ آ جائے۔

جب وحی کی کیفیت دور ہوئی تو آپؐ نے موتی جیسے پسینے کے قطرے جبین مبارک سے صاف فرمائے اور فرمایا عائشہ خوش ہو جاؤ اللہ نے تمہاری برأت نازل فرما دی۔ میں نے اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ آپؐ نے لوگوں میں جا کر خطبہ دیا۔ برأت کی آیات تلاوت فرمائیں پھر مسطح، حسان اور حمنہ بنت جحش وغیرہ پر حد تہمت یعنی اسی اسی کوڑے لگائے گئے۔

ابو ایوبؓ سے ان کی اہلیہ نے دریافت کیا کہ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ لوگ عائشہؓ کے متعلق کیا کہتے ہیں، کہا ہاں سنا ہے سب جھوٹ ہے۔ اے ام ایوب کیا تم ایسا کر سکتی تھیں انہوں نے کہا بخدا ہرگز نہیں ابو ایوب نے کہا واللہ عائشہ تم سے بدرجہا بہتر ہیں۔

حسانؓ نے اس جرم کے کفارہ میں حضرت عائشہؓ کی مدح میں کچھ اشعار کہے جن میں ایک شعر یہ ہے ؎

حصان رزان ماتزن بریبۃ
وتصبح غرثی عن لحوم الغوافل

پاکدامن باوقار ہیں اور شبہ سے پاک ہیں۔ پاکباز عورتوں کے بدن کا گوشت نہیں کھاتیں حضرت عائشہ نے کہا یہ درست ہے لیکن تم ایسے نہیں ہو اس سے تہمت میں ان کے شریک ہونے کی طرف اشارہ ہے ۔[۱]

- قلت تعداد، ناداری، زر و مال اور ریاسی کمزوری کے باوجود رسول اکرمؐ کی مسلسل فتوحات سے عرب بوکھلائے ہوئے تھے ان پر واضح ہو گیا کہ مسلمانوں کی برتری کا راز ان کی اخلاقی بلندی، سیرت کی پاکیزگی اور اللہ کے نام پر اجتماعی اتحاد ہے اس لئے مسلمانوں کے مقدس ترین گھرانے اہل بیت نبی اور خاندان صدیق اکبر پر یہ تہمت اچھال کر مسلمانوں کو کمزور کرنے کا نیا حربہ استعمال کیا گیا لیکن رسول اکرمؐ نے اس سنگین مسئلہ کو جس صبر و ضبط اور حزم و احتیاط سے حل فرمایا وہ آپؐ کا ایک زبردست اور بے مثال اخلاقی کارنامہ ہے۔
- بیوی کی سیرت کا شوہر سے زیادہ واقف کار اور کون ہو سکتا ہے لیکن اس کے باوجود آپؐ نے عائشہؓ سے متعلق زیادہ واقفیت رکھنے والوں اور قریب تر رہنے والوں سے استفسار فرمایا۔ ان میں وہ عورتیں بھی تھیں جن سے سوکناپے کی چشمک بھی رہتی تھی لیکن سب نے آپ کی پاکیزہ سیرت کا واضح الفاظ میں اقرار کیا۔ اس سے آپؐ کی حق پسندی، عدل پروری اور قانون مساوات پر عمل پیرائی روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ وقت پر عدالت کے کٹہرے میں خاندان نبوت کو بھی بلا امتیاز کھڑا کیا جا سکتا ہے۔ تاریخ شہنشاہی اور حکمرانی دور جمہور کے ارباب اقتدار ہمیشہ اس معیار سے بالاتر رہے ہیں۔
- عبداللہ بن ابی کے نام پر مسلمانوں کے دو عظیم الشان انصاری قبیلوں میں باہم جھگڑے کی نوبت آ گئی لیکن حامل رسالت نے اتنا سب کچھ ہو جانے کے باوجود امت کے اتحاد کو مقدم رکھا اور اپنے ذاتی صدمات و مصائب کو فراموش کر دیا۔ اتحاد امت کے لئے سرور عالم کی یہ بہت بڑی قربانی ہے
- اس قضیہ کو حل فرمانے کے لئے کوئی عاجلانہ اقدام کرنے کے بجائے آپؐ نے ایک ماہ تک وحی الٰہی کا انتظار فرمایا اور رہ سر تو ربح کا رنج اور قلق انتہائی صبر و استقلال سے جھیلتے رہے کہ جس واقعہ کا کوئی عینی شاہد نہ ہو نبی کی حیات میں اللہ اس کا شاہد ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرمؐ اپنے ذاتی معاملہ میں بھی فرمانِ الٰہی کے سب سے بڑھ کر تابعدار تھے۔
- نیک سرشت انسانوں کی شہادت کے ساتھ اللہ کی یقینی شہادت کے بعد حق واضح ہو گیا اس لئے تہمت تراشوں پر آپؐ نے حدِ قذف جاری فرمائی۔ یہ آپؐ کی حق پروری اور عدل گستری کی جرأت مندانہ مثال ہے۔

صلح حدیبیہ

مکہ سے ایک منزل کے فاصلہ پر حدیبیہ نامی ایک گاؤں میں ۶ھ میں رسول اکرمؐ نے مشرکین مکہ کے ساتھ صلح کا معاہدہ فرمایا تھا جو ظاہر میں مغلوبانہ لیکن واقع میں بعد

---

[۱] ابن ہشام ۲/۱۸۷، ۱۹۶، زاد المعاد ۳/۲۵۸، ۲۶۸، البدایۃ والنہایۃ ۷/۱۶۰، ۱۶۲

کی حملہ کامیابیوں کا فتح باب تھا۔ اس سال آپؐ نے زیارت کعبہ کا ارادہ فرمایا۔ عمرہ کا احرام باندھا اور قربانی کے جانور ساتھ لئے مسلمانوں کو عربوں کے سفر کے ایک جز کی حیثیت سے تلوار لیکن زیر نیام لے کر چلنے کا حکم فرمایا۔ آپؐ نے ایک خزاعی کو اہل مکہ کے ارادوں کا پتہ لگانے کے لئے روانہ فرمایا۔ اس نے آکر خبر دی کہ قریش نے تمام قبائل کو بہ حکم سنا دیا ہے کہ محمدؐ کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دیا جائے گا چنانچہ مشرکین نے حملہ قبائل پر مشتمل ایک لشکر تیار کیا۔ خالد بن ولید مشرکین کے مقدمۃ الجیش کے قائد تھے۔ انہوں نے جا کر بتایا کہ لشکر اسلام غمیم تک پہنچ گیا ہے۔ آپؐ نے مقام حدیبیہ میں قیام فرمایا۔ خزاعی رئیس اعظم بدیل بن ورقا نے خبر دی کہ قریش آمادہ جنگ ہیں وہ مکہ میں آپؐ کو داخل نہیں ہونے دیں گے۔ آپؐ نے فرمایا ان سے جا کر یہ کہو کہ ہم جنگ کے لئے نہیں بلکہ عمرہ کی غرض سے آئے ہیں اور جنگ نے تو قریش کو بھی زبردست نقصان پہنچایا ہے اس لئے بہتر ہے کہ ایک معین مدت کے لئے صلح کر لیں اگر اس پر وہ راضی نہیں ہوتے تو میں اخیر دم تک ان سے لڑوں گا یہاں تک کہ خدا اپنا فیصلہ نافذ کر دے۔ بدیل نے جا کر قریش کو آپؐ کا فیصلہ سنایا۔ قریش کی طرف سے عروہ بن مسعود آپؐ کی خدمت میں آیا اور کچھ گفتگو کے بعد واپس چلا گیا اس نے جا کر رسول اکرمؐ اور صحابہ کے تعلقات کی نوعیت کا نقشہ قریش کے سامنے اس طرح کھینچا کہ میں نے قیصر و کسریٰ جیسے شہنشاہوں کے دربار دیکھے ہیں لیکن وہ وارفتگی کہیں نہیں دیکھی جو اصحاب محمدؐ کو محمدؐ کے ساتھ ہے۔ وہ جب گفتگو کرتے ہیں تو سناٹا چھا جاتا ہے ان کے وضو کا پانی اور تھوک حاصل کرنے کے لئے لوگ مسابقت کرتے ہیں اور اسے چہرہ پر مل لیتے ہیں

آپؐ نے پھر خراش بن امیہ کو قریش کے پاس بھیجا۔ قریشیوں نے ان کے اونٹ کو مار ڈالا البتہ وہ خود کسی طرح جان بچا کر نکل آئے پھر قریش نے مسلمانوں پر حملہ کے لئے ایک فوجی دستہ بھیجا جسے آپؐ نے گرفتار کرا لیا لیکن پھر رہا کر دیا آپؐ نے پھر عثمان غنیؓ کو قریش کے پاس بھیجا۔ جنہیں قریش نے ایک گھر میں قید کر دیا لیکن آپؐ کو جو خبر پہنچی وہ یہ تھی کہ عثمان قتل کر دیئے گئے۔ آپؐ نے فرمایا عثمانؓ کے خون کا بدلہ ضرور لیا جائے گا۔ چنانچہ ایک درخت کے نیچے آپؐ نے اصحاب کرام سے جاں نثاری کی بیعت لی۔ صحابہ کرام نے کمال جوش و خروش سے آپؐ کے ہاتھ پر بیعت کی جسے بیعت رضوان کہا جاتا ہے۔ اللہ نے ایسے مسلمانوں سے اپنی رضامندی کی بشارت دی ہے ۔ فتح ۳۰ ۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ خبر صحیح نہیں تھی۔

قریش نے سہیل بن عمرو کو جو بڑا فصیح و بلیغ مقرر تھا یہ پیغام دے کر بھیجا کہ صلح اس بنیاد پر ممکن ہے کہ محمدؐ اس سال واپس چلے جائیں ۔ سہیل شرائط صلح سے متعلق دیر تک آپؐ سے گفتگو کرتا رہا۔ بالآخر آپؐ نے علیؓ کو صلح نامہ لکھنے کے لئے طلب فرمایا۔ حضرت علیؓ نے اس کی ابتدا بسم اللہ الرحمن الرحیم سے کی۔ سہیل نے اس پر اعتراض کیا چنانچہ آپؐ نے علی کو عرب کے دستور کے مطابق لکھنے کا حکم فرمایا۔ انہوں نے آگے لکھا: یہ وہ معاہدہ ہے جسے محمد رسول اللہ نے تسلیم کیا۔ سہیل نے کہا اگر ہم تمہیں اللہ کا نبی تسلیم کرتے تو پھر تنازعہ ہی کیا تھا۔ آپؐ نے فرمایا تم تسلیم نہ کرو لیکن بخدا میں اللہ کا نبی ہوں پھر علیؓ سے فرمایا صرف میرا نام لکھو حضرت علیؓ نے کہا میں اسے ہرگز مٹا نہیں سکتا بالآخر آپؐ نے قلم ہاتھ میں لیا اور علیؓ کے بتانے پر اسے خود مٹا دیا۔

صلح کے شرائط یہ تھے

۱۔ مسلمان اس سال واپس مدینے چلے جائیں

۲۔ آئندہ سال آ سکتے ہیں لیکن مکہ میں قیام کی اجازت صرف تین یوم ہو گی۔

۳۔ زیر نیام تلوار کے سوا کوئی دوسرا ہتھیار نہیں لا سکتے۔

۴۔ مکہ میں رہنے والے مسلمانوں میں سے کسی کو مدینہ نہیں لے جا سکتے۔

۵۔ کافروں یا مسلمانوں میں سے کوئی اگر مدینہ چلا جائے تو مسلمانوں کو اسے واپس کرنا ہو گا لیکن اگر کوئی مسلمان مکہ آ جائے تو قریش اسے واپس نہیں کریں گے

۶۔ عرب قبائل کو اختیار ہے کہ فریقین میں سے کسی کے ساتھ معاہدہ میں شریک ہو سکتے ہیں۔

مسلمان بظاہر اس مغلوبانہ معاہدہ سے غایت درجہ شکستہ خاطر اور آزردہ تھے چنانچہ اصحاب کرام کا بیان ہے کہ بیعت جاں نثاری کے بعد جہاد کیلئے ہمارا خون جوش مار رہے تھے لیکن اس کے بعد اس صلح سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہماری کمریں شکستہ ہو گئیں۔

معاہدہ ابھی زیر تحریر تھا کہ سہیل کے بیٹے ابو جندل جو حلقہ اسلام میں داخل ہو چکے تھے۔ کفار کے قید و بند اور اذیتوں سے بچ نکل کر آ گئے۔ سہیل نے کہا معاہدہ پر عمل کا یہ پہلا موقع ہے اسے واپس کرنا ہو گا۔ آپ نے فرمایا ابھی تو معاہدہ مکمل نہیں ہوا ہے۔ آپؐ کے کمال اصرار پر بھی سہیل راضی نہ ہوا اس لئے چار و ناچار انہیں واپس کرنا پڑا۔ رسول اکرمؐ نے ابو جندلؓ کی طرف دیکھا اور فرمایا ابو جندل صبر سے کام لو اللہ تعالیٰ تمہارے لئے کوئی راستہ پیدا کرے گا۔ اب صلح ہو چکی ہے اس لئے ہم اس سے پھر نہیں سکتے۔ ابو جندل نے مسلمانوں کو اپنے زخم دکھائے اور کہا تم مجھے دوبارہ ان کافروں کے ہاتھ میں لوٹا دو گے۔ تمام مسلمان اس صورت حال سے بے قرار ہو گئے۔ حضرت عمرؓ سے رہا نہ گیا۔ آپؐ کی خدمت میں آ کر عرض کیا: یا رسول اللہ کیا آپؐ خدا کے سچے نبی نہیں ہیں؟ آپؐ نے فرمایا یقیناً ہوں۔ عمرؓ نے کہا کیا ہم لوگ برحق نہیں ہیں، آپؐ نے فرمایا ہم حق پر ہیں۔ عمرؓ نے کہا پھر یہ ذلت ہم کیوں اٹھائیں؟ آپؐ نے بڑے اعتماد سے فرمایا۔ میں اللہ کا رسول ہوں، اس کی نافرمانی نہیں کر سکتا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنی اس بے محابا گفتگو پر اخیر عمر تک پشیمانی رہی۔

آپؐ نے مسلمانوں کو وہیں قربانی کرنے کا حکم دیا لیکن لوگوں کی شکستہ دلی کا یہ عالم تھا کہ آپؐ کے تین دفعہ فرمانے پر بھی کوئی نہ اٹھ سکا۔ آپؐ خیمہ میں تشریف لے گئے اور امّ سلمہؓ سے سارے احوال سنائے۔ ام المومنین نے کہا۔ آپؐ کہنے کے بجائے خود قربانی ذبح فرمائیں اور سر منڈائیں چنانچہ آپؐ نے ایسا ہی کیا۔ مسلمانوں نے جب دیکھا کہ آپؐ کا فیصلہ بالکل اٹل ہے تو بالآخر سب نے قربانیاں کیں اور احرام کھولے۔

صلح کے بعد تین ایام آپؐ حدیبیہ میں ٹھہرے پھر مدینہ روانہ ہوئے۔ راستہ میں سورۃ فتح کی معروف آیت انا فتحنا لک

فتحامبینا فتح ۱ - ہم نے تم کو کھلی فتح عطا کر دی' نازل ہوئی' جملہ مسلمان جسے ذلت اور خسارہ سمجھتے تھے اللہ نے اسے فتح سے تعبیر فرمایا - آپؐ نے حضرت عمرؓ کو بلا کر فرمایا اس آیت کا نزول ہوا ہے - عمرؓ نے حیرت سے پوچھا کیا یہ فتح ہے ؟ آپؐ نے فرمایا ہاں کافر اور مسلمان اب تک آپس میں ملتے جلتے نہ تھے لیکن صلح کے بعد ایک دوسرے کے یہاں آمد و رفت شروع ہو گئی - کافروں کو زیادہ قریب سے اور امن کی فضا میں مسلمانوں کو دیکھنے کا موقع ملا جس کے نتیجے میں فتح مکہ تک اتنی زیادہ تعداد میں لوگ مسلمان ہوئے کہ اس سے پہلے کبھی نہ ہوتے تھے - خالد بن ولید اور عمرو بن عاص جیسے لوگ اسی دور میں اسلام لائے تھے -

معاہدہ کی یہ شرط کہ اگر کوئی مسلمان مکہ سے مدینہ چلا جائے تو مسلمانوں کو اسے واپس کرنا ہوگا قریش کے لئے بڑی مہنگی ثابت ہوئی - اس قسم کے مسلمانوں نے سمندر کے کنارے مقام عیص میں سکونت اختیار کی اور کچھ ایام کے بعد خاصا گروہ ہو گیا جو قریش کے تجارتی قافلوں کو زک لیا کرتا تھا - نتیجتہً قریش نے اس شرط سے آپؐ کے حق میں دستبرداری کا پیغام بھیج دیا اور کہا کہ جو مسلمان چاہے مدینہ جا کر آباد ہو سکتا ہے [1]

- حج اسلام کا بنیادی رکن ہے اس کی کلی اور جزئی تعلیمات کو برت کر دکھا دینا آپؐ کی ذمہ داری ہے - محض اس ارادہ سے آپؐ نے مکہ کا سفر کیا لیکن قریش کے آمادۂ جنگ ہونے کی خبر جب آپؐ کو لگی تو آپؐ نے انہیں امن کا پرخلوص مشورہ دیا اور گزشتہ خون خرابہ اور بربادی کی یاد دلائی اس سے آپؐ کی امن پسندی' انسانیت نوازی اور دور اندیشی کا واضح ثبوت ملتا ہے -
- طرفین سے سفیروں کے تبادلہ میں فریقین کا موقف نمایاں ہے قریش آمادۂ جنگ تھے مکہ میں مسلمانوں کا داخلہ انہیں گوارا نہ تھا مسلمان سفیروں کو انہوں نے گزند پہنچائی اور قید تک کر دیا جو بین الاقوامی قانون کے خلاف ہے انہوں نے مسلمانوں پر حملہ کے لئے فوجی دستہ بھی بھیجا جسے آپؐ نے گرفتار کرانے کے بعد رہا کر دیا - دوسری طرف آپؐ کے سفیر پیام امن ہی لے کر جاتے رہے اس سے آپؐ کے صبر و تحمل' حزم و احتیاط حسن تدبیر اور عفو و درگذر کی اعلیٰ صفات کا واضح ثبوت ملتا ہے
- شہادت عثمان کی خبر پا کر آپؐ نے اصحاب کرام سے بیعت جاں نثاری لی - یہ آپؐ کی پیغمبرانہ شان جلالی جرأت و شجاعت اور عزم و حوصلہ کا آئینہ دار ہے
- مکہ جو آپؐ کا آبائی وطن ہے کعبہ جو خدا کا گھر ہے جس کے تعمیر کرنے والے خدا کے دو جلیل القدر پیغمبروں کے آپؐ جانشین ہیں جس کا حج اسلام کا اہم فریضہ ہے اس سے محرومی کی قیمت پر آپؐ نے قریش سے معاہدہ صلح کیا - خون ریزی سے بچنے اور امن برپا کرنے کی راہ میں یہ آپؐ کی بہت بڑی قربانی اور صلح جوئی کی

---

[1] زاد المعاد ۳/۲۸۶' ۳۰۰ البدایۃ والنہایۃ ۷/۱۶۷' ۱۷۷ طبقات ابن سعد ۲/۹۵' ۱۰۵ ابن ہشام ۳/۱۹۶' ۲۰۸

اعلیٰ ترین مثال ہے۔

- معاہدہ کے شرائط بظاہر مغلوبانہ تھے لیکن چشم نبوت اس کے نتائج پر محیط تھی احوال وظروف کے فریم میں اسے فتح کی کامل تصویر نظر آرہی تھی جیسا کہ بعد کی تاریخ نے اسے ثابت کر دکھایا اس سے رسول اکرمؐ کی دوراندیشی حالات کے صحیح تجزیہ و رستگی رائے، محکم فیصلہ اور استقلال و ثبات قدمی کی بلند ترین صفات آئینہ کی طرح روشن ہیں۔
- اس صلح سے مسلمانوں کی شکستہ دلی کا عالم یہ تھا کہ مقام حدیبیہ پر قربانی کر لینے اور احرام کھول دینے پر کوئی آمادہ نہ تھا بالآخر آپؐ نے خود بڑھ کر یہ کام انجام دیا۔ اس سے اپنی ذات اور اپنے فیصلہ پر اعتماد اور آپؐ کے جوش عمل کا اندازہ ہوتا ہے۔
- اس صلح سے مسلمانوں اور کافروں میں میل ملاپ کا دروازہ کھل گیا جس سے کثرت سے لوگ حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ بیعت رضوان اور اس سے کچھ پہلے سے لے کر صلح واقع ہونے تک کی صورت حال بے انتہا نازک تھی لیکن آپؐ نے منصب رسالت کا سفینہ جس دوراندیشی، حسن تدبیر، قربانی اور جرأت واستقلال کے ساتھ ساحل گیر کیا۔ اللہ نے اس پر آپؐ کو فتح کامل عطا کی۔ یہ شان رسالت کی عظمت اور خدائی اعزاز کی واضح دلیل ہے۔

فتح مکہ

صلح حدیبیہ سے امن وامان ضرور قائم ہو گیا جس سے اسلام اور مسلمانوں کو زبردست تقویت ملی لیکن قریش معاہدۂ صلح کو نبھا نہ سکے۔

قبیلہ خزاعہ آپؐ کا حلیف بن چکا تھا اور ایک مدت دراز سے اس کا حریف قبیلہ بنو بکر قریش کا حلیف بن گیا تھا۔ صلح سے جب ایک امن واطمینان کی فضا قائم ہوئی تو بنو بکر نے خزاعہ سے انتقام کے لئے اس کو سنہرا موقع تصور کیا چنانچہ انہوں نے قبیلہ خزاعہ پر حملہ کر دیا۔ قریش نے کھل کر بنو بکر کی حمایت کی اور عین حدود حرم میں خزاعہ کی سخت خونریزی کی۔ حلیف ہونے کے تعلق سے چالیس خزاعی جوان آپؐ کے پاس اس سانحہ کی فریاد لے کر آئے سارے حالات سن کر آپؐ کو نہایت دکھ ہوا قریش نے کھل کر معاہدہ شکنی کا ارتکاب کیا تھا پھر بھی آپؐ نے ان کے پاس درج ذیل شرائط ارسال فرمائیں

- خزاعی مقتولوں کا خوں بہا ادا کیا جائے
- اہل قریش بنو بکر کی پشت پناہی سے دستبردار ہو جائیں
- صلح حدیبیہ کے ختم ہو جانے کا اقرار واعلان کریں۔

قریش نے اس کا جواب یہ دیا کہ ہمیں تیسری شرط قبول ہے۔

رسول اکرمؐ نے حلیف قبائل کو اطلاع فرما کر سوئے مکہ روانگی کی مخفی تیاری شروع کر دی ایک جلیل القدر

بدری صحابی حاطب بن بلتعہ نے خفیہ طور پر اس کی اطلاع قریش کے پاس بھیجی لیکن آپؐ کو اس کا علم ہوگیا اور ان کا خط راستہ ہی میں پکڑ لیا گیا جسے صحابہؓ نے آپؐ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ مسلمانوں کو حاطب کی اس حرکت پر سخت حیرت تھی چنانچہ حضرت عمرؓ نے انہیں قتل کرنے کے لئے آپؐ سے اجازت طلب کی۔ آپؐ نے کمال رحمت سے فرمایا اللہ نے اہل بدر سے عدم مواخذہ کا وعدہ کیا ہے۔ حاطب نے آپؐ کی خدمت میں یہ عذر پیش کیا کہ میرے اعزہ مکہ میں ہیں اس لئے قریش پر یہ احسان کر کے میں ان سے اپنے اقرباء کا تحفظ چاہتا تھا۔

۱۰ رمضان المبارک ۸ھ کو رسول اکرمؐ دس ہزار کا لشکر لے کر سوئے مکہ روانہ ہوئے اور مرالظہران میں قیام فرمایا، جو مکہ سے ایک منزل کی دوری پر ہے۔ قریش کو جب اس کی خبر لگی تو انہوں نے حالات معلوم کرنے کے لئے حکیم بن حزام، ابوسفیان اور بدیل بن ورقاء کو روانہ کیا۔ حضرت عمرؓ کی نظر جب ابوسفیان پر پڑی تو آپؐ سے کہا کہ دشمن خدا و رسولؐ کو ختم کرنے کا وقت آگیا ہے یہ ابوسفیان وہی ہیں جنہوں نے مسلمانوں کے خلاف مشرکین کی بیشتر جنگوں کی قیادت کی تھی آپؐ کے قتل کے سازشی اور مسلمانوں کے بہت بڑے دشمن تھے لیکن آپؐ کے چچا عباسؓ نے ان کے لئے معافی کی درخواست کی۔

رسول اکرمؐ نے ابوسفیان سے پوچھا۔ ابوسفیان کیا تمہیں اب بھی اللہ کے اکیلا معبود ہونے کا یقین نہیں آیا؟ ابوسفیان نے کہا اگر اور معبود ہوتے تو ہماری مدد کرتے۔ آپؐ نے فرمایا کیا تمہیں اب بھی میرے رسول ہونے میں شک ہے؟ ابوسفیان نے کہا اس میں ابھی شک ہے یہ ابوسفیان کے ناپختہ ایمان کا پہلا اظہار تھا۔

لشکر اسلام جب مکہ کی طرف روانہ ہوا تو آپؐ نے حضرت عباسؓ سے فرمایا کہ ابوسفیان کو پہاڑ کی چوٹی سے اس لشکر کا منظر دکھاؤ۔ لشکر اسلام کے تمام فوجی دستے یکے بعد دیگرے اپنے اپنے علم لے کر پوری شان و شوکت سے ابوسفیان کی متحیر نگاہوں کے سامنے سے گزرے۔ بعد میں انصار کا دستہ نہایت تزک و احتشام کے ساتھ گزرا ابوسفیان نے حیرت سے معلوم کیا کہ یہ کن لوگوں کا گروہ ہے اتنے میں سعد بن عبادہ کی نظر ابوسفیانؓ پر پڑ گئی۔ یہ اپنے دستہ کے قائد اور علمبردار تھے بولے آج کشت و خون کا دن ہے، آج حرمت کعبہ حلال ہو جائے گی۔ سب سے بعد میں رسول اکرم گزرے ابوسفیان نے سعد بن عبادہ کی یہ بات نقل کی تو آپؐ نے فرمایا۔ سعد نے غلط کہا آج کعبہ کی سربلندی کا دن ہے پھر حکم فرمایا کہ سعد سے علم لے کر ان کے بیٹے قیس کو دے دیا جائے۔

آپؐ نے مکہ میں اعلان کرا دیا کہ جو شخص ہتھیار ڈال دے گا یا ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے گا یا دروازہ بند کرلے گا یا خانۂ کعبہ میں داخل ہو جائے گا اسے ہر طرح کا امن ہے اس کے باوجود ایک مقام پر قریش کے ایک فوجی دستہ نے حضرت خالدؓ کے فوجی دستہ پر تیر اندازی کی جس سے تین مسلمان شہید ہو گئے۔ جواب میں حضرت خالدؓ نے حملہ کیا جس سے مشرکین کے تیرہ آدمی مارے گئے رسول اکرمؐ نے خالدؓ سے اس کے متعلق باز پرس کی معلوم ہوا کہ ابتدا مشرکین نے کی تھی تو آپؐ نے فرمایا اللہ کا حکم ایسا ہی تھا۔

مسجد حرام میں تین سو ساٹھ بت نصب تھے۔ رسول اکرمؐ ایک لکڑی سے انہیں ٹھوکتے ہوئے یہ آیت پڑھتے جاتے تھے۔ جاء الحق و زھق الباطل ان الباطل کان زھوقاً حق آگیا اور باطل مٹ گیا اور باطل کو مٹنا ہی تھا۔ کعبہ کے اندر بت اور تصویریں تھیں آپؐ نے انہیں بھی نکلوا دیا اور کعبہ کو نئے سرے سے پاک و صاف کر دیا اس کے بعد آپؐ اندر داخل ہوئے اور نماز ادا فرمائی پھر آپؐ نے خطبہ ارشاد فرمایا:

ایک اللہ کے سوا میرا کوئی معبود نہیں اس نے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا اور اپنے بندے کی مدد کی اور دیگر تمام گروہوں کو شکست دی سنو تمام مفاخر، سارے خون اور ان کے مطالبات میرے پاؤں کے نیچے ہیں ہاں بیت اللہ کی پاسبانی اور حاجیوں کی سقایت اس سے الگ ہیں۔

اے اہل قریش اللہ نے تمہارا جاہلی غرور اور نسبی تعلی مٹا دی۔ سارے لوگ آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے بنائے گئے ہیں۔

خطبہ کے بعد آپؐ نے مجمع پر نظر ڈالی تمام سرداران قریش بیٹھے ہوئے تھے جو آج سے پہلے مسلمانوں کے جانی دشمن اور رسولؐ کے خون کے پیاسے تھے۔ آپؐ نے پوچھا تم جانتے ہو کہ میں تمہارے ساتھ کیا معاملہ کروں گا؟ یہ ظالم آپؐ کی شانِ رحمت سے واقف تھے بولے۔ آپؐ شریف بھائی ہیں اور شریف بھائی کے بیٹے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا۔ آج تم پر کسی طرح کا الزام نہیں جاؤ تم سب آزاد ہو۔ یوسف۔

آپ ایک بلند مقام پر فروکش ہوئے۔ بیعت کے لئے مردوں اور پھر عورتوں کی باری آئی آپؐ ان سے اسلامی ارکان کی ادائیگی اور حسن اخلاق کا اقرار لیتے تھے

فتح مکہ کی اصل غرض اقامت توحید اور اعلاء کلمۃ اللہ تھی اور یہ غرض پوری ہوگئی۔ تمام بت توڑ دیئے گئے بلالؓ نے کعبہ کی چھت پر چڑھ کر اذان دی اور خدائے واحد کے لئے عبادت کو مخصوص کر دیا گیا [۱۳]

- خزاعہ کے خلاف قریش نے اپنے حلیف قبیلہ بنو بکر کو کھلا تعاون دے کر معاہدہ حدیبیہ کی صریح خلاف ورزی کی تھی لیکن رسولِ اکرمؐ نے اس کے باوجود ان کے پاس کچھ شرائط بھیج کر معاہدہ کی یک طرفہ پاسداری کی سعی فرمائی یہ آپؐ کی پابندیٔ عہد اور ضبط و تحمل کی اعلیٰ مثال ہے۔
- حاطب کا افشاء راز حیرت انگیز ہونے کے ساتھ اسلام اور مسلمانوں کے حق میں ایک خطرناک لغزش تھی جسے بعض صحابہ نے گردن زدنی قرار دیا لیکن آپؐ نے ان کی اسلامی خدمات کے پیش نظر کمال عفو و درگذر سے کام لیا اس سے آپؐ کی نرم خوئی، عدم تشدد اور اپنے اصحاب کے ساتھ حسن معاملت کی اعلیٰ صفات کا مظاہرہ ہوتا ہے۔

---

[۱۳] زاد المعاد ۳/۷۹۳، ۱۰۰، البدایہ والنہایہ ۴/۲۸۷، ۳۲۱، ۳۰۱، ابن سعد ۲/۱۳۷، ۱۴۲، ابن ہشام ۲/۴، ۵، ۲۲

- ابوسفیان جیسے عظیم دشمن کو غیر محسوس طور پر حراست میں رکھنے، لشکرِ اسلام کی شکل میں جلالِ الٰہی کا ان کو نظارہ کرانے اور ان کے گھر کو دارالامن قرار دینے سے دشمن کے ساتھ آپؐ کے اعلیٰ برتاؤ، دوسروں کی منزلت شناسی اور اسلام کے حق میں اسے استعمال کرنے کے لئے آپؐ کی فراست و پیش بینی کی صفات نمایاں ہیں
- ابوسفیان کو دیکھ کر سعد بن عبادہ کا یہ کہنا کہ آج خونریزی کا دن ہے آج کعبہ کی حرمت حلال ہو جائے گی فتح مکہ کے مقصد سے متصادم تھا جس کی آپؐ نے فوراً تردید کی کہ نہیں آج کعبہ کی سربلندی کا دن ہے پھر آپؐ نے علم قیادت ان سے چھین کر ان کے بیٹے قیس کو دلا دیا اس سے آپؐ کی بلند نگاہی اور جرأت مندانہ اصول پسندی کے ساتھ دلنوازی اور پاس خاطری عیاں ہے کہ علم کسی غیر کو نہیں بلکہ سردار کے بیٹے ہی کو عطا فرمایا
- ایک موقع پر کافروں کی پہل سے تین مسلمان شہید اور تیرہ مشرک مقتول ہوئے جس پر آپؐ نے خالدؓ سے باز پرس فرمائی پھر اصل صورت حال معلوم ہونے پر آپؐ نے اسے قضاء الٰہی قرار دیا اس سے یہ بات عیاں ہے کہ فتح مکہ کے موقع پر حرمت کعبہ آپؐ کی نظر میں سب سے بڑی متاع تھی اور وہاں کسی انسان کا خون بہانا آپؐ کو سخت ناپسند تھا۔
- مسجد حرام میں داخلہ اور بتوں کی صفائی کے بعد آپؐ نے جو خطبہ دیا اس میں فتح کی ہر نوع کی کامیابی کو آپؐ نے ذاتِ خدا سے وابستہ فرمایا اس سے منصبِ رسالت کے عظمت و تقدس، رسول کی بے غرضی و اطاعت کیشی اور اس کی بلند زندگی کی شان ہویدا ہے۔
- خطبہ کے مجمع میں تمام سرکش اور جبار سرداران قریش موجود تھے جو بیسیوں سال سے آپؐ اور آپؐ کے اصحاب کے خون کے پیاسے تھے آپؐ نے بغیر کسی سرزنش اور تعذیب کے انہیں معاف فرما دیا فاتح اقوام اور حکمرانوں کیلئے فاتح پیغمبر کا یہ اسوۂ عفو و درگذر ایک لازوال نشان راہ ہے۔
- فتح کے بعد اہل مکہ سے آپؐ نے جو بیعت لی وہ ارکانِ اسلام کی بجا آوری اور اخلاق حسنہ کے اختیار کرنے کا معاہدہ تھا۔ فتح کی نخوت میں سرشار ہو کر دشمنوں، ان کی عورتوں اور بچوں کی خون آشامی اور آبرو ریزی اور شہر کی غارت گری کی بجائے آپؐ نے اہل مکہ کے سامنے وہی باتیں پیش فرمائیں جو روزِ اول سے دور نبوت کی مکی زندگی میں ان سے کہتے آئے تھے یہاں رسولؐ فاتحانہ حیثیت سے بھی اپنی قبائے رسالت ہی میں جلوہ گر رہے جس کا مقصد انسان کو اس کے مقصد تخلیق سے مربوط کرنا اور دنیا و آخرت میں سعادت مندی اور امن و آبرو مندی سے ہمکنار کرنا ہے۔

غزوہ حنین و طائف

فتح مکہ کے بعد عام عربوں کو آپؐ کی نبوت کا یقین آگیا اور لوگ جوق در جوق حلقہ بگوش اسلام ہونے لگے البتہ عرب

کے نہایت جنگجو قبائل ہوازن اور ثقیف پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا بلکہ انہوں نے فتح مکہ کے موقع پر مسلمانوں کے اوپر حملہ کرنے کا مشورہ کیا۔ ان کے جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ میدان جنگ میں عورتوں اور بچوں کو بھی لے کر آئے تاکہ لوگ ان کی خاطر جان کی بازی لگا دیں۔ اس جنگ میں کعب اور کلاب کے علاوہ ہوازن اور ثقیف کی تمام شاخیں شریک تھیں۔ ہوازن کا تیس سالہ رئیس اعظم مالک بن عوف لشکر کا سپہ سالار تھا۔

رسول اکرمؐ کو جب اس کی خبر پہنچی تو تحقیق کے بعد بارہ ہزار کا لشکر بڑے ساز و سامان کے ساتھ لے کر شوال ۸ھ کو حنین کی طرف روانہ ہوئے۔ بعض اصحاب رسول کی زبان سے اس موقع پر یہ کلمہ نکل گیا کہ آج ہم کو کون مغلوب کر سکتا ہے۔ اللہ کو یہ بات ناپسند آئی جس کا تذکرہ قرآن میں اس طرح آیا ہے۔ حنین کا دن یاد کرو جب تمہاری کثرت نے تمہیں عُجب میں مبتلا کر دیا لیکن وہ کچھ بھی تمہارے کام نہ آئی اور زمین کشادگی کے باوجود تمہارے لئے تنگ ہو گئی پھر تم پیٹھ پھیر کر بھاگ کھڑے ہوئے پھر اللہ نے اپنے رسولؐ اور مومنوں پر سکینت نازل کی اور ایسے لشکر اتارے جنہیں تم نہیں دیکھ سکے اور کافروں کو عذاب دیا۔ توبہ۔

قبیلہ ہوازن تیر اندازی میں سارے عرب میں معروف تھا۔ میدان جنگ کے بہتر حصہ پر کافروں نے پہلے سے قبضہ کر لیا تھا اور تیر اندازوں کو پہاڑ کی مختلف گھاٹیوں میں بٹھا دیا تھا۔ ادھر خالد بن ولیدؓ کی قیادت میں جو مقدمۃ الجیش تھا وہ جوشِ جوانی میں مست، اسلحۂ جنگ سے بے پروا اور عاری نو اسلام نوجوانوں اور تقریباً دو ہزار ایسے لوگوں پر مشتمل تھا جنہیں فتح مکہ کے موقع پر آزادی دے دی گئی تھی اور ابھی وہ حلقہ بگوش اسلام نہ ہوئے تھے اسلامی لشکر نے جوش میں صبح کے جھٹ پٹے ہی میں حملہ کر دیا۔ لشکر اسلام میدانِ جنگ کے انتہائی نشیبی حصہ میں تھا۔ اونچے حصہ سے جب تیروں اور ہزاروں حملہ آوروں کی باڑھ چلی تو مقدمۃ الجیش میں انتشار برپا ہو گیا بارہ ہزار کا لشکر پارہ پارہ ہو گیا صرف رسول اکرمؐ میدان میں رہ گئے۔ آپؐ نے یا معشر الانصار کہہ کر آواز دی تو انصار نے کہا اے اللہ کے رسول ہم آپؐ کے ساتھ ہیں۔ آپؐ نے سواری سے اتر کر پرجلال آواز میں فرمایا۔ انا النبی لا کذب، انا ابن عبد المطلب میں لاریب خدا کا نبی ہوں۔ میں عبد المطلب کا بیٹا ہوں۔ آپؐ نے اپنے چچا حضرت عباسؓ سے فرمایا جو بڑے بلند آواز تھے مہاجرین اور انصار کو پکارو، انہوں نے زور سے آواز دی "یا معشر الانصار یا اصحاب الشجرہ" اے گروہ انصار اے بیعت رضوان والے لوگو! اس آواز پر لشکر اسلام پلٹ پڑا اور پھر جنگ کا نقشہ بدل گیا۔ گھمسان کا رن پڑا کافر میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے جو بچے وہ گرفتار ہو گئے۔

کافروں کی فرار شدہ فوج اوطاس اور طائف میں پناہ گزیں ہوئی عرب کا شعلہ بیان شاعر دُرید بن صمہ جس کی عمر سو سال سے متجاوز تھی کئی ہزار کا لشکر لے کر اوطاس میں آیا جسے ربیعہ بن رفیع نے قتل کیا اور اوطاس کا میدان بھی مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔

اس جنگ میں ہزاروں آدمی گرفتار ہوئے جن میں آپؐ کی رضاعی بہن شیما بھی تھیں انہوں نے کہا میں تمہاری

نبیؐ کی بہن ہوں۔ لوگ انہیں آپؐ کے پاس لائے انہوں نے بطور نشان اپنی پیٹھ کھول کر دکھائی کہ بچپن میں آپؐ نے یہاں کاٹا تھا۔ آپؐ کی آنکھوں میں محبت کے آنسو چھلک پڑے ان کے لئے اپنے ہاتھوں سے چادر بچھائی اور محبت سے باتیں کرتے رہے انہیں اونٹ اور بکریاں عنایت فرمائیں اور کہا اگر چاہو تو میرے گھر چل کر رہو' انہوں نے قبیلہ کی محبت میں گھر جانا پسند کیا۔

حنین کی فرار شدہ فوج نے طائف میں ایک محفوظ قلعہ کے اندر ایک سال کا رسد جمع کیا اور قلعہ کے چاروں طرف منجنیقیں اور تیرانداز مقرر کر دیئے۔ طائف پہاڑی پر آباد ایک محفوظ شہر تھا جس کے چاروں طرف شہر پناہ بھی تھی۔ یہاں آباد قبیلہ ثقیف فن حرب وضرب سے بہت واقف تھا۔ یہ قبیلہ قریش کا ہمسر مانا جاتا تھا۔ یہاں کے رئیس عروہ بن مسعود سے ابوسفیان کی لڑکی منسوب تھی۔ عروہ دبابہ اور منجنیق چلانے اور بنانے کے فن سے بھی واقف تھا۔

رسول اکرمؐ نے حنین اور اوطاس سے نمٹنے کے بعد طائف کا رخ کیا اور قلعہ کا محاصرہ کر لیا گیا۔ محاصرہ بیس دن سے زیادہ مدت تک جاری رہا۔ کفار طائف قلعہ کے اندر سے مسلمانوں کے دیا بہ پر گرم سلاخیں برساتے تھے جس سے مسلمان کثرت سے زخمی ہوئے۔ شہر فتح نہ ہوسکا۔ آپؐ نے مشورہ فرمایا تو نوفل بن معاویہ نے کہا: لومڑی بھٹ میں ہے کوشش جاری رہے تو پکڑی جاسکتی ہے اور چھوڑ دی جائے تو کوئی اندیشہ بھی نہیں۔ صحابہؓ نے کہا یارسول اللہ آپؐ ان کے حق میں بددعا فرمائیں۔ آپؐ نے فرمایا: اے اللہ ثقیف کو ہدایت دے اور انہیں میرے پاس پہنچا دے اور پھر محاصرہ اٹھا لیا گیا۔

غزوہ حنین میں بے پناہ مال غنیمت حاصل ہوا تھا جسے آپؐ نے مکہ اور دیگر مقامات کے نو اسلام لوگوں کو خصوصیت سے عطا فرمایا۔ اس پر کچھ انصاری بولے کہ رسول اکرمؐ نے قریش کو انعام سے نوازا اور ہمیں محروم رکھا حالانکہ ہماری تلواروں سے اب بھی خون کے قطرے ٹپک رہے ہیں۔ آپؐ کو یہ بات معلوم ہوئی تو انصار کو طلب فرمایا۔ انہوں نے اس سبب سے کہ جھوٹ نہ بولتے تھے۔ صاف صاف اقرار کر لیا آپؐ نے اس موقع پر انتہائی بلیغ خطبہ دیا' فرمایا

کیا یہ سچ نہیں کہ تم پہلے گمراہ تھے اللہ نے میرے ذریعے تمہیں ہدایت دی۔ تم غیر متحد تھے اللہ نے میرے ذریعہ تم میں اتحاد پیدا کیا۔ تم مفلس تھے اللہ نے میرے ذریعہ تمہیں ذی ثروت بنایا۔

آپؐ کی ہر بات پر انصار کہتے: اللہ ورسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا احسان سب سے بڑھ کر ہے۔ آپؐ نے فرمایا نہیں تم یہ کہو کہ:۔

اے محمدؐ جب لوگوں نے تمہیں جھٹلایا تو ہم نے تمہاری تصدیق کی۔ جب لوگوں نے تمہیں چھوڑ دیا تو ہم نے تمہیں پناہ دی۔ تم مفلس ہو کر آئے تھے ہم نے تمہیں ہر طرح کی مدد دی۔ تم یہ سب کہتے جاؤ اور میں کہتا جاؤں گا کہ تم سچ کہتے ہو لیکن اے انصار کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ لوگ مال غنیمت لے کر جائیں اور تم محمدؐ کو اپنے گھر لے جاؤ۔

انصار بیک زبان پکار اٹھے ہمیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم درکار ہیں بہت سے انصار زار زار رو رہے تھے آپؐ نے انہیں سمجھایا کہ یہ نو اسلام لوگ ہیں انہیں ان کا حق نہیں بلکہ بطور تالیف قلب کے دیا گیا ہے۔

حنین کے تمام قیدی مقام جوانہ میں رکھے گئے تھے۔ غزوہ طائف سے واپسی تک کوئی کا فراہنیں رہا کرانے کے لئے نہ آیا البتہ ایک وفد آپ کی رضاعی ماں حلیمہ سعدیہ کے خاندان کا آیا۔ رئیس قبیلہ نے آپ کے پاس تقریر کرتے ہوئے کہا جو عورتیں قبضہ میں ان میں تمہاری پھوپھیاں اور رضاعی بہنیں ہیں۔ سلاطین عرب میں سے کسی نے اگر ہمارے خاندان کا دودھ پیا ہوتا تو ہمیں اس سے توقع رہتی لیکن تم سے توسب سے زیادہ امیدیں والستہ ہیں۔ آپؐ نے فرمایا خاندان عبدالمطلب کا حصہ آزاد ہے لیکن عام رہائی کے لئے نماز کے بعد مسلمانوں کے سامنے درخواست پیش کرو انہوں نے نماز کے بعد اپنی درخواست رکھی۔ آپؐ نے فرمایا مجھے اپنے خاندان کے حصہ کا اختیار ہے مگر تمام مسلمانوں سے میں اس کے لئے سفارش کرتا ہوں اس پر تمام مہاجرین اور انصار بول اٹھے کہ ہمارا حصہ بھی حاضر ہے اس طرح تھوڑی دیر میں چھ ہزار افراد رہا کر دیئے گئے۔ [ملے]

- جنگ حنین میں جب بارہ ہزار کا اسلامی لشکر پارہ پارہ ہوگیا اور مسلمان میدان چھوڑ کر بھاگ گئے تو میدانِ جنگ میں کافروں کے تیروں کی برسات میں رسول اکرمؐ کھڑے رہے اس سے آپؐ کی جرأت و شجاعت اور عزیمت و پامردی کی بے مثال تصویر سامنے آتی ہے۔
- پھر آپؐ کی پُرجلال آواز پر انصار اور پھر اسلامی لشکر یک لخت پلٹ پڑا۔ یہاں رسول اکرمؐ کی بے مثال شجاعت نے، جنگ کا نقشہ بدلنے میں محوری کردار ادا کیا اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اصحاب کرامؓ کے نزدیک آپؐ کی ذات کس قدر قابل اعتماد، لائق جاں نثاری اور مقدس و محترم تھی کہ ایک آن پہلے جان بچا کر بھاگنے والے آپؐ کی ایک آواز پر اپنی اصلی فطرت پر عود کر آئے اور سر دھڑ کی بازی لگانے کے لئے آپؐ کے گرد اکٹھا ہوگئے۔
- جنگ حنین میں اسیر اپنی رضاعی بہن شیما کو دیکھ کر آپؐ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے ان کی بڑی عزت و تکریم کی اونٹ اور بکریاں عنایت فرمائیں اور مدینہ میں کاشانۂ نبوی میں چل کر رہنے کی فرمائش کی اس سے آپؐ کی محبت اور صلہ رحمی کے بلند ترین اوصاف کا اظہار ہوتا ہے۔
- مسلمانوں نے اہل طائف کے حق میں بددعا کرنے کی درخواست کی تو آپؐ نے ان کے لئے ہدایت کی دعا فرمائی۔ یہ وہی طائف ہے جس کے ظالم باشندوں نے گیارہ سال قبل آپؐ کو پتھر مار مار کر بے ہوش کر دیا تھا اور ذلیل و خوار کرنے میں کوئی حد نہ باقی چھوڑی تھی ایسے موقع پر بھی آپؐ نے ان کے لئے ہدایت ہی کی دعا فرمائی تھی اور آج گیارہ سال بعد ایک فاتح کی حیثیت سے آپؐ نے اس شہر کا محاصرہ کر رکھا تھا اور زبان اطہر سے ان کے لئے دعائے ہدایت ہی نکل رہی تھی۔ یہ ایک رسول کا بلند کردار ہے جو اسے منصب رسالت کا اہل بناتا ہے ایسے موقع پر عام انسان جوشِ انتقام میں سارے شہر کو تاخت و تاراج اور جان و مال اور عزت و آبرو کو برباد کر دیتا ہے۔ فداہ امی و ابی
- حنین کا مال غنیمت آپؐ نے دل کھول کر نو اسلام لوگوں میں تقسیم فرمایا۔ انصار میں سے کچھ لوگوں نے اسے دوسرے،

ملے زادالمعاد ۳/۴۹۵، ۷ ۹ م ابن سعد ۲/۱۴۹، ۱۶۰، ابن ہشام ۲/۶۰، ۱۰۶، البدایۃ والنہایۃ ۴/۳۲۲، ۳۵۶

پہلو سے سوچا اور پس پشت اس پر چہ میگوئی کی۔ رسول اکرمؐ کو جب خبر لگی تو آپؐ نے ایک خطبہ دیا جو اپنی بلاغت کے لحاظ سے ایک نادر الوجود شے ہے اس خطبہ نے انصار کو اتنا متاثر کیا کہ وہ زار زار رونے لگے اور آپؐ کی یافت کو دنیا کی سب سے بڑی متاع تصور کرنے لگے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کے اندر فصاحت و بلاغت اور خطابت و بیان کا ملکہ عام انسانی معیار سے بلند تر تھا۔

حلیمہ سعدیہ آپؐ کی رضاعی ماں کے خاندان کا وفد اسیروں کی رہائی کے لئے جب آپؐ کی خدمت میں آیا تو آپؐ نے اپنے خاندان کے حصۂ اسیراں کے رہا کرنے کی بات کی اور مسلمانوں سے ان کے عام قیدیوں کی رہائی کی سفارش فرمائی جس سے ان کے چھ ہزار قیدی فوراً رہا ہو گئے جنگی قیدیوں کے بارے میں رسول اکرمؐ کا یہ عفو و کرم اور شان رحمت، حکمرانانِ عالم کے لئے لازوال اسوۂ عام ہے۔ آج قیدیوں سے بدسلوکی اور ان کی تعذیب کے نت نئے طریقے اختیار کئے جاتے ہیں جس سے انسانیت رسول اکرمؐ کے اسوۂ مبارک سے فریاد کناں ہے۔

ولقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ ۔ قرآن

بے شبہ تمہارے لئے رسول اللہ کی ذات میں بہترین اسوہ ہے۔

سرورِ عالم کی حیات طیبہ کے نازک لمحات کی یہ ایک جھلک ہے ان اوصاف کے مجموعہ سے جو تصویر بنتی ہے وہ ایک ایسے انسان کی ہے جو درحقیقت منصب رسالت کے عظیم ترین فریضہ کا حقدار تھا جس کا مقصد انسان کو اس کے مقصد تخلیق سے مربوط کرنا ہے دوسری طرف آپؐ کے یہ اوصاف اور آپؐ کا یہ اسوہ عام انسانوں کے لئے ایک دائمی عیار ہے جس پر بے کم و کاست آدمی اپنے کھرے کھوٹے کو پرکھ سکتا ہے۔

رسالتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کا عقلی ثبوت

مولانا ارشد القادری

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آسان اور واضح سے واضح بات بھاری بھرکم الفاظ کے نیچے کچھ اس طرح دب جاتی ہے کہ مدتوں ہم اس کی ہیبت سے مرعوب رہتے ہیں اور خواہ مخواہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ یہ کوئی بہت باریک اور پیچیدہ بات ہے، کچھ ایسا ہی حال ہمارے ذہن کا اس مسئلے میں بھی ہے۔

ورنہ واقعہ یہ ہے کہ عقلِ سلیم کے لیے رسالتِ محمدی کا ثبوت دنیا کی سب سے واضح اور مانوس حقیقت ہے۔ زحمت نہ ہو تو چودہ سو برس پیچھے پلٹ کر دیکھیے اس تاریک دور میں قدم رکھیے جبکہ خدائے واحد کا ایک بھی پرستار روئے زمین پر نہیں تھا۔

پھر انسانوں پر ابدی سعادتوں کا دروازہ کھلا، رحمتوں کا سویرا ہوا۔ روح کی بہاروں کا موسم آیا۔ گلِ قدس کی خوشبو اڑی اور بہزاراں جاہ و جلال فاران سے خورشیدِ رسالت کی پہلی کرن چمکی۔

صدیوں کے بعد پھر حرم کی سرزمین سجدوں سے آباد ہوگئی۔ کہاں تو روئے زمین پر ایک بھی خدا کا ماننے والا نہیں تھا اور اب صرف عرفات کے میدان میں ایک لاکھ فرزندانِ توحید اپنی پیشانیوں میں سجدۂ بندگی کا اضطراب لیے کھڑے تھے اور خدا کا آخری رسولؐ اُن پر رحمتوں کے پھول برسا رہا تھا۔

رسالتِ محمدی کو عقل کی کسوٹی پر جانچنے والے صرف اتنی بات تاریخ سے دریافت کرنے کی زحمت فرمائیں کہ ماننے والوں نے پہلے خدا کو مانا یا اس کے رسولؐ کو؟

تاریخ واضح طور پر شہادت دے گی کہ پہلے سیدِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے لوگوں کے دل جھکے، اس کے بعد اُن کے سروں کو خدا کا سجدہ نصیب ہوا۔ ماننے والوں نے پہلے رسالتِ محمدی کا اقرار کیا اس کے بعد توحیدِ الٰہی کی شہادت سے سرفراز ہوئے۔

اب یہ بات محتاجِ ثبوت نہیں ہے کہ پہلے پہل جن لوگوں نے رسالت کا اقرار کیا، حق کی شناخت کے لیے اُن کے پاس سوائے عقلِ سلیم کے اور کوئی مشعل نہیں تھی۔

اور یہ حقیقت بھی اپنی جگہ پر صحیح ہے کہ عقل کی ساری رہنمائی رسولؐ کو رسولؐ ماننے تک تھی۔ رسولؐ کے مان لینے کے بعد عقل کو درمیان سے ہٹ جانا پڑا۔ اب ماننے والوں کے سامنے صرف رسولؐ کی زبان تھی۔ وہ جب بھی حرکت میں آئی یقین کا سر جھک گیا۔ اس لیے یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ انسان کو رسالتِ محمدی کی شناخت سب سے پہلے عقل ہی کے ذریعے ہوئی۔ عقل ہی کے مشورے پر دل جھکے اس کے بعد اعترافِ حق کے لیے زبان کھلی۔

اب رہ گیا یہ سوال کہ عقل کے پاس وہ کون سا معیار ہے جس پر وہ رسالت و نبوت کا دعویٰ پرکھتی ہے اور پورا اترنے کے بعد دل

کی ساری کائنات کو قدموں میں ڈال دیتی ہے، تو اس کی تشریح مفصل طور پر ذیل میں ملاحظہ فرمائیں۔

عقلِ سلیم کا کہنا ہے کہ رسولؐ کی صحیح شناخت تین باتوں کے ذریعہ ہوتی ہے۔ ان تین باتوں کے ثابت ہو جانے کے بعد کسی دور کی عقل بھی رسولؐ کو رسولؐ ماننے سے ہرگز انکار نہیں کر سکتی۔

رسولؐ کی شناخت کا پہلا عقلی ذریعہ

یہ ہے کہ عام انسانی زندگیوں کے درمیان رسولؐ کی زندگی ماحول کی تاثیرات سے اس درجہ بالاتر اور معصوم و ممتاز ہوتی ہے کہ اسے دیکھتے ہی دنیا کو اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ یہ کسی معمولی انسان کی زندگی نہیں ہے، اس کے پیچھے ضرور کوئی آسمانی طاقت ہے جو پس پردہ کارساز ہے۔

اس رُخ سے جب ہم محمدِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا جائزہ لیتے ہیں، تو عقل دنگ رہ جاتی ہے، ہوش اُڑنے لگتا ہے اور عالمِ حیرت میں آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتی ہیں۔

زندگی کا پہلا رُخ

تاریخ کی گہرائی میں اُترنے کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ ہونے والا رسولؐ ایک ایسے خاندان میں جنم لیتا ہے جہاں ہر طرف بتوں کی فرماں روائی ہے۔ پجاریوں کی سیادت و افسری کا منصب ہی گھر کا پیشہ ہے۔ آنکھیں کھولتا ہے تو سارا ماحول اخلاقی رذائل، روحانی کثافت اور شر و فساد کی غلاظتوں میں ڈوبا ہوا ہے کہیں بھی قدم رکھنے کی کوئی صاف جگہ نظر نہیں آتی۔ بچپن ہی میں سر سے والدین کا سایہ اُٹھ چکا ہے۔ گرد و پیش شائستہ تربیت کا کوئی چشمۂ صافی نہیں ہے جہاں وہ اپنا حلق بھی تر کر سکے۔ کسی درس گاہ سے بھی اس کا کوئی تعلق نہیں ہے کہ اکتسابی علم کے ذریعے خیر و شر کے سمجھنے کی صلاحیت بیدار ہو۔

ایسے پُر آشوب بلاخیز اور تاریک ماحول میں وہ ایامِ طفلی کا معصوم دور گزارتا ہے۔ شعور کی منزل سے آشنا ہوتا ہے۔ شباب کی خار زار وادی میں قدم رکھتا ہے۔

یہاں تک کہ چالیس سال کی طویل مدت وہ صحراؤں، غاروں اور ویرانوں کی بے خطر تنہائیوں میں نہیں، گمراہوں، غارت گروں، ستم شعاروں، مے نوشوں، بدکاروں، فتنہ پروروں اور جرائم پیشوں کی بھیڑ میں بسر کرتا ہے لیکن عقل اور تاریخ دونوں محوِ حیرت ہیں کہ پانی میں رہتے ہوئے بھی نہ اس کا جسم بھیگتا ہے نہ جیب و دامن میں کہیں نمی نظر آتی ہے۔

نشست و برخاست، رفتار و گفتار، سیرت و اطوار، اخلاق و عادات، افکار و خیالات اور عبادات و معاملات میں چالیس سال کی طویل صحبتوں کا اُس پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

لاکھوں زندگیوں کے بیچ میں وہ تنہا ایک نرالی، منفرد، بے مثل اور عام سطح سے بالاتر زندگی گزار کر لوگوں کو حیرت میں ڈال دیتا ہے رفتہ رفتہ اس کی اخلاقی برتری، کردار کی راستی اور معنوی تقدس کے آگے ماحول کی گردنیں جھکنے لگتی ہیں اور بالآخر ایک دن وہ سارے قبائل کی نگاہوں

کا مرکزِ عقیدت بن جاتا ہے۔

یہاں تک کہ چالیس سال گزر جانے کے بعد اچانک ایک پیغمبر کی حیثیت سے وہ اپنے آپ کو لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔

وہ لوگوں سے یہ نہیں کہتا کہ مجھے سجدہ کرو، میری عظمتوں کے آگے جھک جاؤ وہ بار بار صرف یہ کہتا ہے کہ پتھر کے تراشے ہوئے بت تمہارے خدا نہیں ہیں۔ خدا وہ ہے جو ان پتھروں، درختوں اور دریاؤں کا خالق ہے پرستش کا وہی مستحق ہے۔ پیشانی کے سجدے اسی کو زیب دیتے ہیں۔ اپنی انسانیت کا سب سے اونچا اعزاز رذائل کے قدموں میں رائیگاں مت کرو۔

بس اتنی سی بات پہ ہر طرف آگ لگ جاتی ہے۔ سارا ماحول سلگنے لگتا ہے جان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔ اب گھر سے نکلنا مشکل ہے رات کی تنہائی کے سوا کوئی انیسِ زندگی نظر نہیں آتا۔

رفتہ رفتہ حالات کی برہمی نقطۂ انتہا پہ پہنچ جاتی ہے۔ تلواریں اٹھتی ہیں وار خالی جاتا ہے، قتل کی سازش ہوتی ہے تار بکھر جاتے ہیں قید کرتے ہیں، زنجیریں ٹوٹ جاتی ہیں۔ ہزار مخالفت اور ہزار رکاوٹوں کے باوجود سیلِ نور کی طرح حقیقت کا دائرہ دن بدن وسیع ہوتا جاتا ہے۔

چڑھتے ہوئے سورج کا فروغ دیکھ کر جب مرعوب ہو جاتے ہیں تو کفر کے نمائندے خوشامد کی راہ اختیار کرتے ہیں۔

"محمد! تم اپنی ذات سے سارے قبیلوں میں ہر دلعزیز ہو، ہمارے معبودوں کے خلاف آواز اٹھا کر اپنی ہر دلعزیزی کو صدمہ مت پہنچاؤ۔ تم اگر حکومت کا اقتدار چاہتے ہو تو سارا عرب تمہیں اپنا بادشاہ تسلیم کرنے کے لئے تیار ہے۔ تمہیں اگر دولت کی خواہش ہے تو سارے قبائل کا سونا ہم تمہارے قدموں میں ڈھیر کر دیں گے۔

اور اگر تم اجازت دو تو عرب کی سب سے حسین اور زہرہ جمال دوشیزہ تمہارے حرم سرا کی زینت بنا دی جائے۔ محمد! یہ سب کچھ ایک لمحے میں ہو سکتا ہے لیکن شرط یہ کہ تم اپنے دعویٰ پیمبری سے دستبردار ہو جاؤ اور نئے دین کی تبلیغ بند کر دو۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ناقابلِ شکست عزم و یقین کے تیور میں جواب دیتے ہیں۔

"پیغمبر اپنے منصب کی دیانت کو کسی قیمت پہ نہیں بیچتا۔ مجھے جادۂ حق سے ہٹانے کے لئے جو معاوضہ تم نے پیش کیا ہے اس کی تو وقعت ہی کیا ہے تم اگر میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند بھی لا کر رکھ دو جب بھی میں دینِ حق کی تبلیغ اور اپنے منصب کے فرائض سے قدم پیچھے نہیں ہٹا سکتا۔ خدا میرے ساتھ ہے۔ میں اکیلا نہیں ہوں۔ میری آواز پہ فتح پانا انسانوں کے بس کی بات نہیں ہے۔

چونکہ اس وقت میرا موضوعِ سخن تاریخ اسلام بیان کرنا نہیں ہے اس لئے آگے کے واقعات کسی دوسرے لمحہ فرصت پر چھوڑتا ہوں۔

اس وقت مجھے صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ اس پوری داستان میں دراصل یہ نکتہ سب سے زیادہ قابلِ غور ہے کہ پیغمبر کی دعوت کو شکست دینے کیلئے اہلِ مکہ نے ایک سے ایک حربہ استعمال کیا، بائیکاٹ کی مہم چلائی، وطن سے بے وطن کیا، ایذائیں دیں، پتھر برسائے، جنگ کی۔ خون بہائے، خود بھی قتل ہوئے، دوسروں کو بھی شہید کیا، یہ سب کچھ ہوا۔ لیکن کسی مائی کے لال کی یہ جرأت نہ ہو سکی کہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بھری مجلس میں کہہ دیتا۔

"محمد! تمہاری پیغمبری کا یہ ڈھونگ ملک شام، فارس اور ان دور دراز علاقوں میں تو چل سکتا ہے جہاں لوگ تمہاری اخلاقی کمزوریوں، بشری فروگزاشتوں اور کردار کی خامیوں سے ناواقف ہیں۔

لیکن یہ مکہ ہے! یہاں تمہاری زندگی کا ایک ایک خد و خال نظر میں ہے ہم تمہاری ان تمام کمزوریوں سے پوری طرح باخبر ہیں جن کا

پیوند ایک پیغمبر کی زندگی کے ساتھ کسی طرح نہیں جوڑا جا سکتا۔ ہم نہ بھی تمہیں جھٹلائیں جب بھی تمہاری زندگی کے سیاہ دھبّے بجائے خود تمہاری تکذیب کے لئے کافی رہیں۔ اور سن لیا جائے کہ اعترافِ صداقت کی یہ آخری منزل نہیں ہے۔ اس کے آگے ایک اور منزل بھی ہے جہاں جلالتِ حق کی ہیبت سے عقل کو پسینہ آنے لگتا ہے اور وہ یہ ہے کہ دشمنی میں انسان صحیح اور غلط الزام کا فرق اُٹھا دیتا ہے تاکہ میرے سرکار کی زندگی ایک روشن آئینے کی طرح بالکل بے داغ و بے غبار تھی۔ اور یہ بھی تسلیم کہ بشری کمزوریوں کا کوئی واقعہ دشمنوں کے علم میں نہیں تھا لیکن اپنے حریف کو شکست دینے اور رسوا کرنے کے لئے کیا واقعہ تراشا نہیں جاتا؟ کیا من گھڑت الزامات نہیں بیان کئے جاتے؟ اور خاص کر ایسی حالت میں جبکہ پیغمبر کو مجروح کرنے کے لئے الزام تراشی تلوار اُٹھانے سے زیادہ آسان تھا۔ عرب کے سخنوروں کا سارا گروہ ہمزبان ہی تھا۔ آن کی آن میں پیغمبر کے خلاف فرضی داستانوں کا دفتر تصنیف ہو سکتا تھا۔ لیکن عظمتِ خداداد کو عقیدوں کا خراجِ عقیدت پیش کر دو کہ سیّد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی طیّب و طاہر زندگی کا آفتاب اُس نقطۂ عروج پر تھا کہ سیاہی کا پیوند جوڑنے کے لئے کہیں سے بھی کوئی گہنائی ہوئی کرن انھیں نہیں مل سکی۔

دیئے اُڑانے کے لئے خاک اُڑا سکتے تھے لیکن دشمن اُس کے لئے کبھی تیار نہیں تھے کہ اپنی ہی آنکھیں غبار سے بھر جائیں

زندگی کا دوسرا رُخ

سرکار مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ایک پہلو تو یہ ہے جو سپردِ قلم ہوا۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ فطرتِ انسانی کے جس رُخ سے دیکھو میرے سرکار کی زندگی اتنی جامع اور مکمل نظر آئے گی کہ ہر دور کے انسانوں کے لئے وہ بہترین نمونۂ عمل بن سکتی ہے

نہیں میں نے غلط کہا! بلکہ زندگی کی نجات کے لئے اُس کے سوا کوئی اور نمونہ ہی نہیں ہے۔

چودہ سو برس کی طویل مدّت گزر جانے کے بعد بھی انسانی زندگی کے لئے اس سے بہتر سانچہ نہ آج تک تیار ہو سکا ہے نہ آئندہ ہو سکتا ہے۔

اور حیرت انگیز تماشا یہ ہے کہ زمانہ کے انقلابات نے ہزاروں کروٹیں بدلیں طبیعتوں اور مزاجوں کے پیمانے بنتے اور بگڑتے رہے۔ خطۂ ارضی مختلف رنگ و روپ، مختلف تہذیب و تمدن اور مختلف اندازِ معاشرت میں تقسیم ہوتا رہا لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تنہا زندگی سب کو راس آئی۔ سب کی ضرورتوں کی کفیل ہوئی۔ سب کے لئے سازگار رہی اور اپنی رہنمائی میں سب کو زندگی کی منزلِ مقصود تک پہنچا آئی۔

ایک گدا سے لے کر بادشاہ تک، سپاہی سے لے کر سالار تک۔ عورت سے لے کر مرد تک، بچے سے لے کر بوڑھے تک، غلام سے لے کر آقا تک، عربی سے لے کر عجمی تک، دیہقانی سے لے کر شہری تک اور چھوٹے سے لے کر بڑے تک سب ہی اپنی اپنی جگہ یہ سمجھتے رہے کہ زندگی کا یہ پیمانہ میرے ہی لئے تراشا گیا ہے۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا یہ نقشہ سامنے رکھ کر اب میں عقلِ سلیم سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ ایسی محیّر العقول اور جامع و کامل زندگی کیا خدا کے رسول کے سوا کسی اور عام بشر کی ہو سکتی ہے؟

کیا عالمی تاریخ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کسی کی ایسی زندگی پیش کی جا سکتی ہے؟

لا میں جانتا ہوں کیا دھکے گی جواب میں

رسولؐ کی شناخت کا دوسرا عقلی ذریعہ

رسولؐ کی شناخت کا دوسرا عقلی ذریعہ یہ ہے کہ خدا کے ساتھ اُس کے تعلقات کی سطح عام انسانوں سے بہت اونچی ہوتی ہے وہ کائنات میں خدا کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے عام بندوں کی طرح بے اختیار نہیں ہوتا بلکہ اس کارخانۂ قدرت میں تصرفات کی قدرت بھی اپنے ہمراہ لے کر آتا ہے۔

تصرفات کی قدرت سے مسلح ہو کر آنا رسُول کے لئے دو وجہوں سے ضروری ہے۔

پہلی وجہ یہ ہے کہ اُصولِ فطرت کے مطابق کوئی انسان اپنے برابر اور ہمسر کی اطاعت نہیں کرتا اطاعت اُسی کی کرتا ہے جس میں برتری اور بڑائی کی کوئی وجہ ہوتی ہے یا جسے وہ اپنا بڑا سمجھتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ رسُول کو ایسے کمالات اور قدرت و اختیار سے مسلح کر کے بھیجا جائے کہ کوئی انسان اس کی ہمسری کا دعویٰ نہ کر سکے اور اس کے آگے جھک کر اس کی اطاعت کرنے میں اُسے کوئی عار محسوس نہ ہو۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ خداشناسی کی راہ میں سب سے بڑا حجاب مادی طاقتوں سے مرعوبیت کا ہے کیونکہ دنیا میں پہلے پہل انسان کی نظر انہیں طاقتوں سے روشناس ہوتی ہے۔

مثال کے طور پر آنکھ کھولتے ہی انسان نے سورج کو دیکھا، چاند کو دیکھا دریاؤں کی قیامت خیز لہروں کو دیکھا، پہاڑوں کی ہیبت ناک چوٹیوں کو دیکھا، پتھروں کی سخت چٹانوں کو دیکھا، قدآور اور گھنے درختوں کو دیکھا، آگ کے ہولناک شعلوں کو دیکھا، بادشاہوں کے جلال و جبروت کو دیکھا اور ہیبت سے مرعوب ہو گیا۔ احساسِ کمتری میں اُنہیں طاقتوں کو کائنات کی اصل سمجھ بیٹھا اور بالآخر اُنہی کے آگے اپنا ماتھا ٹیک دیا۔

حالانکہ یہ تمام طاقتیں جس طاقت کا کرشمہ تھیں وہ حجابات کے پیچھے تھی لیکن چونکہ وہ پیکرِ محسوس میں نہیں تھی اس لئے انسان کی نظر اُسے نہیں دیکھ سکی۔

ان حالات میں خدا کا رسول آتا ہے۔ آمد کا مقصد یہ ہے کہ انسان کو ان مادی طاقتوں کی پرستش سے روک دے اور اُس کا سر اُس طاقت کے آگے جھکائے جو پسِ پردہ ان تمام طاقتوں کی خالق اور پروردگار ہے۔

عقل کہتی ہے کہ جب تک ذہن کی غیر واقعی ہیبت اور دلوں کی غلط گرویدگی کا طلسم نہیں ٹوٹ جاتا پیشانیوں کا کسی مانوس آستانۂ عقیدت سے ہٹانا آسان کام نہیں ہے۔

اس لئے ضروری ہے کہ ایک رسُول اپنے ساتھ ایسی کائنات گیر قدرت لے کر آئے جس کے ذریعہ وہ ان مصنوعی خداؤں کی طاقت کا بھانڈا پھوڑ دے جب چاہے ان کا طبعی نظام بدل دے ان کی قوتِ تاثیر سلب کر لے اور اُنہیں اپنی مرضی کا غلام بنا کر رکھے۔

پرستار بھی اپنے خداؤں کی بیچارگی، بے بسی و بے طاقتی اور گھٹنا ٹیک فرماں برداری کا تماشا دیکھ کر یہ سوچنے پر مجبور ہو جائیں کہ جب رسُول کی قدرت و طاقت کا یہ حال ہے تو اس کے بھیجنے والے کی کیا شان ہوگی؟

اس لئے دراصل پرستش کے قابل وہی طاقت ہے۔ جس کی نمائندگی رسُول کر رہا ہے۔ مغلوب طاقت پُوجنے کے قابل نہیں ہو سکتی۔

زندگی کا تیسرا رُخ

اتنی تمہید کے بعد یہ حقیقت ہم ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں کہ اس رخ سے بھی جب سرور کائنات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ہم جائزہ لیتے ہیں تو اُن کی پیمبرانہ طاقت وقدرت کے نہایت حیرت انگیز اور دلربا مناظر سامنے آتے ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے اشارے پر ساری کائنات گردش کر رہی ہے نگاہ اُٹھ جاتی ہے تو مادی طاقتوں کو پسینہ آجاتا ہے کرۂ زمین پر کھڑے ہو کر انگلی کا اشارہ کرتے ہیں تو آسمان کا سیارہ دو ٹکڑے ہو جاتا ہے لبوں کو جنبش دیتے ہیں تو ڈوبا ہوا سورج منزل سے پلٹ آتا ہے، راہوں سے گزرتے ہیں تو پتھروں کی بے جان دنیا درود وسلام کا خراج عقیدت پیش کرتی ہے درختوں کو آواز دیتے ہیں تو وہ ایک اطاعت شعار خادم کی طرح دوڑتے ہوئے چلے آتے ہیں اشارہ کر دیتے ہیں تو واپس ہو جاتے ہیں چٹانوں پہ قدم رکھ دیتے ہیں تو کفِ پا کا نقش اتر آتا ہے۔ پہاڑوں پہ تشریف لے جاتے ہیں تو کہسار کا دل خوشی سے جھومنے لگتا ہے زمین کی طرف اشارہ کرتے ہیں تو وہ حملہ آور کے لئے پاؤں کی زنجیر بن جاتی ہے۔ کھارے کنوئیں میں لعابِ دہن ڈال دیتے ہیں، تو ہمیشہ کے لیے وہ چشمہ شیریں بن جاتا ہے۔ سنگریزوں کو ہاتھ لگا دیتے ہیں، تو جان پڑ جاتی ہے، اشارہ فرما دیتے ہیں کہ کلمہ پڑھنے لگتے ہیں۔

کبھی برہم ہو کر مشتِ غبار اُڑا دیتے ہیں، تو ہر طرف طوفان اُمنڈنے لگتا ہے اور جب کبھی مائل بکرم ہوتے ہیں، تو ایک قطرۂ آب چشمۂ سیال بن جاتا ہے۔

مُسکراتے ہیں تو نور کی کرن پھوٹتی ہے، چلتے ہیں تو راستوں میں عطر برستا ہے۔ کسی کو چھو دیتے ہیں تو مہکنے لگتا ہے، ہاتھ رکھ دیتے ہیں تو شفا ہو جاتی ہے۔

نظر پڑ جاتی ہے تو دلوں کے آئینے چمک اُٹھتے ہیں، زبان حرکت میں آتی ہے تو غیب کے اسرار کھلتے ہیں، رُخ پھیر لیتے ہیں، تو پیٹھ پیچھے کی خبر رکھتے ہیں، جو چاہتے ہیں ہو جاتا ہے، جو سوچتے ہیں ڈھل جاتا ہے، جو کہہ دیتے ہیں، مُہر لگ جاتی ہے، جو کہہ دیتے ہیں دستور بن جاتا ہے، ادا ادا سے، بات بات سے ایک کائنات گیر اقتدار، ایک آسمانی بادشاہت، ایک با اختیار نمائندگی اور ایک محبوب و دلآویز شخصیت کا جلال وجمال برستا ہے۔

ایک شُبہ اور اس کا ازالہ

رسولِ عربی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف وکمالات کی یہ نا تمام فہرست جو ہم نے پیش کی ہے، ان کے متعلق زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ روایات ہیں اور روایات کا واقعہ کے مطابق ہونا کوئی ضروری نہیں ہے۔

اس سلسلے میں ہم صرف اتنا کہیں گے کہ عقل انسانی کے پاس اگر کوئی کسوٹی ہے جس پر وہ روایات کو پرکھتی ہے اور پورا اترنے کے بعد صحت کا حکم لگاتی ہے تو ہم یہ مرحلہ طے کرنے کے لئے بھی نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ تیار ہیں عقل پرکھے اور حکم لگائے۔

ہمیں فخر ہے کہ جن وسائل وذرائع سے ہم تک یہ روایات پہنچی ہیں ان سے زیادہ قابلِ اعتماد اور ثقہ ذرائع آج تک دنیا کی کسی روایت یا کسی واقعہ کو میسر نہیں ہیں لیکن یہ دعویٰ بہرحال اپنی جگہ پر ناقابلِ تردید ہے کہ ان واقعات اور روایات کو صحیح مان لینے کے بعد عقل یہ تسلیم کرنے

پر مجبور ہوگی کہ اس نشان کا آدمی سوائے رسولؐ کے کوئی عام انسان ہرگز نہیں ہو سکتا۔

رسولؐ کی شناخت کا تیسرا عقلی ذریعہ

رسولؐ کی شناخت کا تیسرا عقلی ذریعہ یہ ہے کہ اُس کے ساتھ خدا کی کوئی "آسمانی کتاب" ہوتی ہے۔ رسولؐ کے ساتھ آسمانی کتاب کا ہونا دو وجہوں سے ضروری ہے۔

پہلی وجہ یہ ہے کہ رسولؐ، خدا کی طرف سے بندوں کی ہدایت کے لئے آتا ہے اس لئے ظاہر ہے کہ اُس کے پاس ایک ہدایت نامے کا ہونا ضروری ہے جس کے مطابق وہ بندوں کی رہنمائی کرے اُنہیں راہ راست پر چلائے اور خدا کے احکامات اور اُس کی مرضی سے اُنہیں روشناس کرائے۔

عقل کہتی ہے کہ آسمان سے نازل شدہ کسی بھی الہامی کتاب میں درج ذیل امور کا ہونا ضروری ہے۔

کیوں ضروری ہے؟ یہ ایک مستقل موضوع بحث ہے لیکن آنے والے مباحث کی روشنی میں ذرا بھی ذہن پر زور دیا جائے تو کیوں کا جواب خود بھی معلوم کیا جاسکتا ہے۔

ان اُمور کی نشاندہی جن کا کسی بھی الہامی کتاب میں ہونا ضروری ہے۔

۱. عبادات اور جملہ شعبہ ہائے زندگی سے متعلق احکام و قوانین اور مفید ہدایات جن کا تعلق عمل اور جوارح سے ہے۔

۲. عقائد، اصول اور ایمانیات جن کا تعلق قلبی تصدیق سے ہے۔

۳. خدا کی ذات و صفات سے متعلق واضح بیانات۔

۴. عالم آخرت اور جزا و سزا کی تفصیلات۔

۵. گزشتہ نبیوں، رسولوں اُن کی کتابوں اور قوموں کے تذکرے۔

۶. جس رسول پر کتاب نازل ہوئی اُس کے متعلق ہدایات۔

۷. خود اُس نازل شدہ آسمانی کتاب کے متعلق تذکرہ۔

۸. جس دور میں وہ کتاب نازل ہوئی اُس دور اور اُس دور کے لوگوں کے متعلق تذکرہ۔

۹. آئندہ کے واقعات اور اسرارِ غیب کی اطلاع۔

۱۰. کائنات کی تخلیق، آفرینش کی حکمت و مصلحت، آغاز و انجام اور درمیانی مراحل کا بیان۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ رسولؐ اس ظاہری دنیا میں موجود نہ رہے جب بھی بندوں کو ایک مستند ذریعہ ... اپنے متعلق خدا کی مرضی اور اس کی ہدایات و احکامات کا علم ہوتا رہے۔

اور خدا شناسی کے لئے بیک واسطہ اس کی ایک نشانی کائنات کے ہر دور میں انسانوں کے درمیان موجود رہے

زندگی کا تیسرا رُخ

اتنی تمہید کے بعد مدعائے نگارش یہ ہے کہ اس رخ سے جب بھی ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں ان کے ہمراہ قرآن نامی ایک الہامی کتاب نظر آتی ہے۔

ایک جامع اور مکمل آسمانی کتاب کے لئے عقل جن امور کی نشان دہی کرتی ہے وہ سارے امور قرآن میں واضح طور پر موجود ہیں۔

اُن امور میں سے بعض امور تو وہ ہیں جو ہدایت و قانون کی کسی بھی کتاب کے لازمی اجزا کی حیثیت سے ضروری ہیں اور جن کے بغیر اس موضوع کی کوئی کتاب بھی جامع اور مکمل نہیں کہی جاسکتی۔

اور بعض اُمور وہ ہیں جو سوائے خدا کی کتاب کے کسی بھی انسانی کتاب میں نہیں مِل سکتے اور جہاں کسی طرح بھی انسانی عقل کی رسائی ناممکن ہے مثال کے طور پر آئندہ واقعات کی اطلاع اور اسرارِ غیب کی نقاب کشائی زمانہ ماقبل تاریخ کی تخمینی نہیں چشم دید خبریں، کائنات کی کیفیت تخلیق آفرنیش کے رموز و اسرار اور عالم ہستی کے آغاز و انجام کی تفصیلات۔ خدا کی ذات و صفات کے متعلق واضح اطلاعات۔ عالم آخرت کی مفصل نشاندہی۔ قدرتی بناوٹوں کی طرح قرآن کا اندازِ بیان۔

یہ ہیں وہ اُمور جو انسان کی دسترس سے باہر ہیں اور جن کا کسی انسانی کتاب میں ہونا تو درکنار اُس کا علم ہی کا انسان کے پاس، سوائے خدا کے اور کوئی ذریعہ نہیں ہے

واضح رہے کہ یہی وہ منزل تھی جہاں سخنورانِ عرب کو پسینہ آگیا اور وہ سب مل کر بھی قرآن کی ایک مختصر سے مختصر سورت کی مثال پیش کرنے سے قطعاً عاجز و قاصر رہے۔

قرآن انہیں چیلنج پہ چیلنج کرتا رہا کہ اگر تمہارا یہ گمان صحیح ہے کہ میں خدائے برتر کی کتاب نہیں کسی انسان کی بنائی ہوئی کتاب ہوں تو تم بھی انسان ہو میری زبان بھی وہی ہے جس میں تم بہت بڑے ادیب اور مانے ہوئے سخنور ہو۔ بنالاؤ میری آیتوں کی طرح کوئی بھی عربی عبارت۔

انسان خدائی بناوٹوں کی نقل نہیں اتار سکتا۔ انسانی بناوٹوں کی نقل اتارنا اس کے لئے کیا مشکل ہے؟

لیکن تاریخ شاہد ہے کہ نہ اُس وقت کے سخنورانِ عالم اِس چیلنج کا جواب دے سکے۔ چودہ سو برس کی طویل مدت میں "ربع مسکون" پر کوئی جواب دینے والا پیدا ہوا اور پھر نہ صرف یہ کہ "قرآن ثانی" پیش کرنے سے دنیا عاجز رہی بلکہ قرآن کے حرم میں کہیں سے نقب لگانے کی بھی کوئی گنجائش نہیں مل سکی کیونکہ قرآن صرف سفینوں میں نہیں، سینوں میں بھی محفوظ رہا اور قیامت تک محفوظ رہے گا

ہزار محاسن، ہزار اوصاف اور ہزار معجزانہ کمالات کے باوجود یہ عین ممکن ہے کہ کوئی قرآن پر ایمان نہ لائے لیکن یہ قطعاً ناممکن ہے کہ اس کے معجزانہ کمالات معجزانہ محاسن اور معجزانہ اوصاف کی موجودگی میں کوئی اس کے خدا کی کتاب ہونے سے انکار کر دے۔

اسی طرح از روئے عقل یہ بھی ذہن و فکر کا کھلا ہوا تضاد ہے کہ اتنی بات تو تسلیم کرلی جائے کہ دنیا کو خدا کی یہ کتاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ملی لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا رسُول تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جائے۔ حالانکہ دونوں باتیں قطعاً ایک ہیں۔ صاحبِ کتاب ہونے اور رسُول ہونے میں کوئی فرق نہیں ہے۔

پھر میں اس بات کا اعادہ کرنا چاہتا ہوں کہ عقلِ انسانی کے لیے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا انکار آسان نہیں ہے۔

یا تو وہ ثابت کرے کہ قرآن جیسی کتاب انسان تصنیف کر سکتا ہے، یا یہ ثابت کرے کہ معاذاللہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ کتاب نازل ہی نہیں ہوئی ہے۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ عقل نہ وہ ثابت کر سکتی ہے نہ یہ ثابت کر سکتی ہے، وہ اگر کچھ کر سکتی ہے، تو صرف یہ کہ رسالتِ محمدی کی روشن حقیقت کے آگے اپنا سرِ نیاز خم کر دے۔

نبوت و رسالت دلائل عقلیہ سے

مولانا سید لعل شاہ بخاری

الحمد للہ الذی خلق الارض والسمٰوٰت وبیدہ الموت والحیاۃ والسلام علی من

ہدی الناس الی سواء الصراط اما بعد۔

نبوت محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے اثبات کے لئے عقلی دلائل پیش کرنے سے پہلے چند امور بطور تمہید مقدمہ پیش کرنے ضروری ہیں۔

. وجود ذات باری پر عقلی دلیل

قرآن عزیز نے متعدد آیات میں اصحاب عقل اور ارباب بصیرت کو نظام عالم میں غور و فکر کرنے کی دعوت دی ہے۔ مثلاً دیکھئے مندرجہ ذیل آیت

ان فی خلق السمٰوٰت والارض واختلاف اللیل والنہار . . . لاٰیٰت لقوم یعقلون

بے شک آسمان و زمین کے پیدا کرنے میں، اور رات دن کی ادل بدل میں جہازوں میں جو لوگوں کے فائدے کی چیزیں لے کر سمندر میں چلتے ہیں اور مینہ میں جس کو اللہ آسمان سے برساتا ہے پھر اس کے ذریعے زمین اس کے مرنے کے بعد زندہ کرتا ہے۔ اور ہر قسم کے جانوروں میں جو خدا نے روئے زمین پر پھیلا رکھے ہیں اور ہواؤں کے درخ پھیرنے میں اور بادلوں میں جو خدا کے حکم سے آسمان و زمین کے درمیان گھرے رہتے ہیں۔ ان سب میں عقل رکھنے والوں کے لئے نشانیاں ہیں (البقرۃ - ۱۶۴)

مقصد یہ ہے کہ عقل سلیم تفکر و تدبر سے اس نتیجہ پر پہنچ جائے گی کہ اس کائنات کا کوئی موجد بھی ہے۔ اور نظام عالم کا چلانے والا کوئی منتظم مدبر بھی ہے۔ بلکہ کائنات ہستی کو عالم کہا ہی اس لئے جاتا ہے کہ اس سے صانع کے وجود کا سراغ ملتا ہے۔ نیز یہ ایک عقلی بات ہے کہ ممکنات کا تسلسل محال ہے۔ لامحالہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ان کا وجود ایک علت فاعلی کے ساتھ وابستہ ہے جو واجب الوجود اور قدیم ہے۔

کتابوں میں ایک اعرابی کا مقولہ ملتا ہے کہ اس نے کہا تھا۔

بعرۃ تدل علی البعیر وآثار الاقدام ایک مینگنی اونٹ کے وجود پر دلالت کرتی ہے اور قدموں

على المسير فكيف لا تدل السماء ذات ابراج والارض ذات فجاج والبحر ذات امواج على ذات اللطيف الخبير

کے نشانات کسی رہگذر کا پتہ دیتے ہیں۔ پس کیوں دلالت نہیں کرتا۔ برجوں والا آسمان، درون والی زمین اور موجوں والے سمندر اس ذات لطیف وخبیر پر۔

بے شک ایک ذات لطیف وخبیر ہے۔ جو ان سب کی خالق ہے۔ اسی طرح امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کی طرف بھی ایک حکایت منسوب ہے کہ ایک دہریہ کو جواب دیا تھا کہ تمہارے نزدیک ایک درخت کاٹنے والے کے بغیر نہیں کٹ سکتا اور ایک بڑھئی کے بغیر اس کے تختے نکال کر کشتی نہیں بنائی جا سکتی اور بغیر ناخدا کے کشتی دریا عبور نہیں کر سکتی تو کیا اتنا بڑا نظام عالم بغیر چلانے والے کے چل سکتا ہے؟ ہرگز نہیں! اسی طرف قرآن عزیز نے اشارہ کیا ہے۔

والشمس تجری لمستقر لها ذلك تقدير العزيز العليم

سورج جو ایک مستقر پر چل رہا ہے۔ ویسے ہی نہیں چل رہا بلکہ اس ذاتِ عزیز علیم کی تقدیر سے ہے۔

ایک صاحب عقل سلیم نے جب قرآن عزیز کی وہ آیت سنی۔ جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

ام خلقوا من غير شيئ ام هم الخالقون

کیا وہ بغیر پیدا کرنے والے کے پیدا ہو گئے یا انہوں نے اپنے نفسوں کو خود پیدا کیا ہے۔

تو وہ ایمان لے آیا۔ اسی طرف قرآن نے اشارہ فرمایا۔

وفی انفسکم افلا تبصرون

اگر تم بصیرت رکھتے ہو تو وجود باری کی دلیل تمہارے نفسوں میں بھی موجود ہے۔

۲ - خالق کائنات اور نظام عالم کا منتظم واجب الوجود، قدیم، حکیم اور قدیر ہے اور جملہ صفات کمالیہ کے ساتھ متصف ہے۔ مقدمہ اولیٰ کے تسلیم کر لینے کے بعد دوسرا مقدمہ محتاج دلیل نہیں رہتا۔ کیونکہ یہ پہلے مقدمہ کی فرع ہے۔

۳ - جو خالق ہے وہی مالک ہے۔

اگر صانع اپنی مصنوعات کا مالک ہے تو خالق اپنی مخلوقات کا بطریق اولیٰ مالک ہوگا۔ تاہم فرق ہے۔ صانع اپنی مصنوعات کی سرگزشت اور ان پر طاری ہونے والے حوادثِ مستقبلہ سے آگاہ نہیں ہوتا اور خالق اپنی مخلوقات کی سرگزشت اور آئندہ حوادث کا علم رکھتا ہے۔ قرآن عزیز نے اسی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

الا يعلم من خلق وهو اللطيف الخبير

بھلا ہو سکتا ہے کہ خدا، جو پیدا کرے (وہی اپنی مخلوقات کے احوال) سے ناواقف ہو، حالانکہ وہ بڑا باریک بین اور باخبر ہے۔

۴ - انسان اشرف المخلوقات ہے خلاصہ کائنات ہے۔ یہ ایک مسلم حقیقت ہے۔

قرآن عزیز نے تصریح فرمائی ہے کہ:-

هو الذی خلق لكم ما فی الارض جميعا ثم

اسی اللہ نے تمہارے نفع کے لئے ہر وہ چیز پیدا فرمائی ہے

استوی الی السمآء فسوٰھن سبع سمٰوٰت — جو زمین میں ہے اور سات آسمان بنائے ۔

اور پھر آسمانی مخلوق کو انسان کے سامنے جھکا دیا ہے ۔

۵ ۔ خالق کائنات چونکہ حکیم ہے ۔ اور حکیم کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا فعل الحکیم لا یخلو عن الحکمۃ اس لئے تسلیم کرنا پڑے گا کہ اللہ تعالےٰ نے اس کائنات کو عبث اور باطل نہیں پیدا کیا چنانچہ قرآن عزیز نے متعدد آیات میں اس طرف توجہ دلائی ہے ۔

افحسبتم انما خلقنٰکم عبثا وانکم الینا لا ترجعون فتعالی اللہ الملک الحق لا الٰہ الا ھو رب العرش الکریم — کیا تم ایسا خیال کرتے ہو کہ ہم نے تم کو یونہی بیکار پیدا کر دیا ہے اور یہ کہ تم کو ہماری طرف پھر لوٹ کر آنا نہیں تو اللہ جو بادشاہ برحق ہے (بے فائدہ کام کرنے سے بری) اور بالاتر ہے ۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہی عرش بزرگ کا مالک ہے

اصحاب بصیرت جب نظامِ عالم میں فکر کرتے ہیں تو بے ساختہ پکار اٹھتے ہیں ۔

ربنا ما خلقت ھذا باطلا سبحٰنک فقنا عذاب النار — اے ہمارے پروردگار تو نے یہ کارخانہ عالم بے فائدہ نہیں بنایا ۔ تیری ذات (ایسے فعل عبث کے کرنے سے) پاک ہے (اور یہ کارخانہ آخرت کی خبر دے رہا ہے) تو ہمارے پروردگار ہم کو دوزخ کے عذاب سے محفوظ رکھیو ۔

۶ ۔ جب عقلاً ثابت ہو گیا کہ ساری کائنات انسان کی خاطر پیدا کی گئی ہے تو ظاہر ہے کہ انسان کی پیدائش کا بھی کوئی مقصد ہو گا ۔ اسی مقصد کی طرف اللہ کریم نے قرآن عزیز میں تصریح فرمائی ہے ۔

(ا) ۔ خلق الموت والحیٰوۃ لیبلوکم ایکم احسن عملا — موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ تم لوگوں کو آزمائے کہ تم میں کون اچھے عمل کرتا ہے ۔

(ب) افحسبتم انما خلقنٰکم عبثا وانکم الینا لا ترجعون ۰ فتعلی اللہ الملک الحق لا الٰہ الا ھو رب العرش الکریم (المومنون ۱۱۵، ۱۱۶) — لوگو! کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ ہم نے تم کو بیکار پیدا کیا ہے اور یہ کہ تم کو ہماری طرف پھر لوٹ کر آنا نہیں تو خدا بادشاہ برحق ہے (فضول کام کرنے سے بری) اس کے سوا کوئی معبود نہیں ۔ وہی عرش بزرگ کا مالک ہے ۔

(ج) ما خلقت الجن والانس الا لیعبدون — اور ہم نے جنوں اور انسانوں کو اسی غرض سے پیدا کیا ہے کہ وہ ہماری عبادت کریں (الذاریات :- ۵۶)

۷ ۔ چونکہ یہ دنیا دار الابتلاء ہے تو ضرور ہے کہ ایک دار الجزاء بھی ہو ۔ جہاں مطیع کو جزا اور مجرم کو سزا دی جائے ۔ کیونکہ مطیع اور مجرم مساوی نہیں ہو سکتے ۔

افنجعل المتقین کالمجرمین مالکم کیف تحکمون

۸ - مطیع خالق کا فرمانبردار اور عاصی خالق کا نافرمان ہوتا ہے۔

۹ - احکام خداوندی بندوں کو کس طرح معلوم ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالےٰ براہِ راست ہر بندے کو تو حکم نہیں دیتا یہ تو شانِ شہنشاہی کے خلاف ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ تحریر فرماتے ہیں

"بالجملہ در بارۂ احکام انتظارِ اظہارِ خداوندی ضرور ہے۔ مگر جب سلاطین دنیا اپنے احکام بذاتِ خود ہر مکان دہر جا کر ہر کسی کو نہیں سناتے۔ وہ خداوند احکم الحاکمین جس کی شوکت اور حکومت کے سامنے سلاطین دنیا کی حکومت اور شوکت کو کچھ نسبت ہی نہیں۔ کیونکر ہر کسی سے کہتا پھرے گا۔ جیسے بادشاہان دنیا اپنے مقربوں سے اپنے احکام کہا کرتے ہیں اور وہ اوروں کو پہنچایا کرتے ہیں۔ خداوند کریم بھی اپنے احکام مقربوں کے ذریعے سے اوروں کو پہنچائے گا۔ مگر جیسے یہاں کے بادشاہوں کے مقرب وہی ہوتے ہیں جو بادشاہوں کی موافق مرضی اور خیرخواہ ہوتے ہیں۔ اور بجز اطاعت بوئے سرتابی بھی ان میں نہیں ہوتی۔ ورنہ مقرب نہ رہیں۔ معتوب ہو جائیں۔ ایسے ہی خدا تعالےٰ کے مقرب بھی وہی ہو سکتے ہیں۔ جو سراپا اطاعت ہوں اور شائبۂ انحراف بھی ان میں نہ ہو۔ اتنا فرق ہے کہ بادشاہانِ دنیا کو موافق مرضی اور خیرخواہ اور سراپا اطاعت وغیرہ کے سمجھنے میں غلطی بھی ہو جاتی ہے۔ اس لئے عزل و نصب عنایت خنایت ہوتی رہتی ہے۔ اور خداوند علیم و خبیر سے کسی بات کے سمجھنے میں غلطی نہیں ہو سکتی۔ ورنہ اس کے علم کو در بارۂ توضیح حقیقت ایسا کہنا پڑے گا۔ جیسا قمر و کواکب کے نور سے بوجہ نقصان بہت باریک چیزیں اور باریک فرق محسوس نہیں ہوتے اور ظاہر ہے کہ جس کا وجود کامل ہو۔ اس کی کسی بات میں نقصان متصور نہیں۔ ورنہ وجود میں نقصان لازم آئے گا کہ جب اس کا علم کامل ہو۔ اور اس وجہ سے اُس کو کسی کے موافق مرضی اور ظاہر و باطن مطیع سمجھنے میں غلطی ممکن الوقوع نہ ہوئی تو جن کو اُس نے اپنا مقرب بنایا ہوگا۔ ان کا معزول ہونا اور اپنے عہدۂ احکام رسانی سے موقوف ہو جانا بھی خلاف عقل ہوگا۔

الحاصل انبیاء میں کوئی ایسی بات نہ ہوگی جو ناپسندیدۂ خداوندی ہو۔ اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں ان کے تمام اخلاق حمیدہ کا ہونا اور تمام قوائے علمیہ کا گزیدہ ہونا لازم آئے گا۔ جس سے ان کی معصومیت کا اقرار کرنا پڑے گا۔"

(واقعہ میلہ خدا شناسی صفحہ ۱۴، ۱۵)

سلسلہ نبوت آدم صفی اللہ سے شروع ہوتا ہے اور جناب محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوتا ہے۔ قرآن عزیز کا دعویٰ ہے۔

ان اللہ اصطفیٰ آدم ونوحا وآل ابراھیم وآل عمران علی العالمین ذریۃ بعضھا من بعض

یعنی یہ سب بعض بعض کی اولاد ہیں۔ ان میں سے ایک نبی بھی ایسا نہیں ہے۔ جو اللہ تعالےٰ کی جزء ہو۔ انبیاء سارے کے سارے اللہ کے عباد ہیں۔ اولاد نہیں۔ یہ اجتباء اور اصطفاء کا سلسلہ جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم تک پہنچا تو خالق کائنات نے فرمایا۔

ما کان محمد ابا احد من رجالکم ولکن رسول اللہ — لوگو! محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں وہ تو اللہ

وَخاتم النبین — کے رسول ہیں اور سب پیغمبروں کے آخر (الاحزاب ۴۰)

مندرجہ بالا تمہیدی امور کے بعد ہم نبوت محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر عقلی دلائل پیش کرتے ہیں۔

آج سے تقریباً ۱۴۰۵ سال قبل مکہ معظمہ میں خاندان بنی ہاشم میں عبداللہ ابن عبدالمطلب کے گھر آمنہ خاتون کے بطن سے ایک یتیم بچے کی ولادت باسعادت ہوئی یعنی حضرت عبداللہ اپنے بچے کی ولادت سے پہلے ہی وفات پا چکے تھے۔ اس مولود مسعود کا نام محمد رکھا گیا جو اسم بامسمیٰ ثابت ہوا۔ پھر ماں کا بھی جلد ہی انتقال ہو گیا۔ پھر دادا عبدالمطلب بھی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ یتیم بچہ کی پرورش اس کے چچا ابوطالب نے کی۔

تقریباً چالیس سال کی عمر میں آپ نے ادعا نبوت کیا اور فرمایا کہ میں اللہ کا فرستادہ رسول ہوں اور تمام دنیا کے انسانوں تک احکام پہنچانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے مجھے مصطفیٰ فرمایا۔

کچھ لوگوں نے آپ کے دعوے کو سچا سمجھا، تصدیق کی اور ایمان لے آئے۔ کچھ نے سختی سے انکار کیا۔ اذیت کے درپے ہوئے قتل کی سازشیں کیں۔ آپ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئے۔ کشمکش پیدا ہوئی۔ بالآخر آپ کو غلبہ نصیب ہوا۔ کچھ اعداء ہلاک ہوئے بہت سے لوگ مطیع ہو گئے۔ ان کی عداوت مودت میں تبدیل ہو گئی۔ اور ان کے قلوب الفت و محبت سے معمور ہو گئے۔

آپ کی سوانح حیات پر بڑی بڑی ضخیم کتابیں لکھی گئیں۔ غیر مسلموں نے بھی آپ کی ذات اور سیرت پر تبصرے کئے۔ ان اوراق میں آپ کی سیرت اور سوانح حیات کو پیش کرنا مقصود نہیں۔ مقصود یہ ہے کہ نبوت محمدی کے اثبات کے لئے عقلی دلائل پیش کئے جائیں یعنی اس قضیہ کو عقل سلیم کی عدالت میں پیش کرنا ہے کہ عقل سلیم آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دعوائے نبوت میں صادق قرار دیتی ہے یا کاذب اور منکرین نبوت کے شبہات کو درست قرار دیتی ہے یا باطل۔ اگر عقل سلیم آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دعوے رسالت میں صادق قرار دیتی ہے تو وہ دلائل کیا ہیں جن کی بنا پر عقل سلیم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سچائی کا فیصلہ کیا ہے۔

نبوتِ محمدیؐ کے دلائل عقلیہ

دلیل ۱۔ صداقت رسولؐ

یہ وہ دلیل ہے جسے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بطور کسوٹی اہل مکہ کے سامنے پیش کیا تھا۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ادعائے نبوت سے قبل بھی کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ اہل مکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو صادق اور امین کہتے تھے اور آپ کی عدالت پر اعتماد کرتے ہوئے اپنے قضایا یا تنازعہ میں آپ کو حکم تسلیم کرتے تھے۔ تعمیر کعبہ کے وقت وضع حجر اسود کے بارے میں جو اختلاف پیدا ہوا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مدبرانہ فیصلہ سے ختم ہوا۔

آپ نے کوہ صفا پر کھڑے ہو کر اہل مکہ کو آواز دی۔ جب لوگ جمع ہو گئے تو آپ نے فرمایا۔

لقد لبثت فیکم عمرا من قبلہ افلا تعقلون

ہیں نے تمہارے اندر عمر کا ایک طویل حصہ گذارا ہے۔ تم نے مجھے اس طویل مدت میں آزمایا۔ بتاؤ سچا پایا، یا جھوٹا؟

قوم نے جواب دیا۔ ماجربنا علیک کذبا (صحیح بخاری)

پھر آپ نے فرمایا

ایہا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعاً قولوا لا الہ الا اللہ تفلحوا

قوم بھر گئی۔ آپؐ کے چچا عبدالعزیٰ نے جس کی کنیت ابولہب تھی کہا۔ تبالک یا محمد الھذا جمعتنا۔ جس پر سورہ لہب نازل ہوئی تبت یدا ابی لھب وتب الخ

دلیل ۲۔ استقامتِ رسولؐ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ظاہری اسباب وعلل سے تہی دست تھے۔ عالم اسباب میں کوئی ان کا پشت پناہ بھی نہ تھا۔ چچا ابولہب کی دشمنی کا حال تو آپ کو معلوم ہو چکا۔ جس چچا کی سرپرستی میں آپ نے پرورش پائی۔ وہ بھی آپ کے نظریہ کے خلاف تھا البتہ حمایت کرتا تھا۔ تاہم ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اس نے بھی حمایت سے دستبرداری کا اظہار کر دیا۔ مناظر احسن گیلانی لکھتے ہیں۔

> اور اب سلبی آزمائشوں کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ قریش کے گھاگھوں کی مجلس نے طے کیا کہ اس کے لئے زیادہ لمبی چوڑی کوششوں کی حاجت نہیں۔ بلکہ ان کی ظاہری آنکھوں کے سامنے اس کی سب سے جو بڑی چٹان تھی جس پر وہ اگرچہ خود ٹیک لگائے ہوئے نہیں تھا۔ لیکن وہ یہی باور کرتے تھے کہ اس کی سب سے بڑی ٹیک اس کا چچا ابوطالب ہے طے کیا گیا کہ بس اسی چٹان کو جس طرح بن پڑے کسی طرح اس کے قدموں کے نیچے سے سرکا لو۔ یقین تھا کہ اسی کے ساتھ وہ اور اس کا دعوے دونوں ہی سربسجود ہو جائیں گے۔ جو کچھ ممکن تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے انہوں نے کیا۔ ابتداء میں انہیں کچھ مایوسیاں ہوئیں اور اچھی خاصی مایوسیاں ہوئیں لیکن واقع میں وہ کس پر کھڑا ہے۔ اس کے عینی شاہد کس طرح پیدا ہوتے اگر ابوطالب اپنی چالیس سال کی محنت ومحبت کو برباد کرنے پر آمادہ نہ ہو جاتے۔ تاریخ نے اس دردناک مرقع کی تصویر محفوظ رکھی ہے جس وقت اپنے گودوں کے پالے ہوئے یتیم بھتیجے کو لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں ابوطالب کہہ رہے تھے۔
>
> لا تحملنی مالا اطیق (مجھ پر اتنا نہ لادو۔ جسے میں اٹھا نہ سکوں)
>
> قریش کامیاب ہو گئے، چٹان لڑھک گئی۔ لیکن قریش ہی نے نہیں بلکہ دنیا نے دیکھا کہ جس کو گرانے کے لئے یہ کیا گیا تھا وہ جہاں تھا۔ وہاں سے ہلا بھی نہیں، صرف آواز آرہی تھی کہ کہنے والا کہہ رہا ہے۔
>
> "خدا کی قسم میرے داہنے ہاتھ پر آفتاب اور بائیں میں ماہتاب اگر اس لئے رکھ دیا جائے کہ میں اس امر کو اپنے ہاتھ سے چھوڑ دوں تو یہ نہیں ہو سکتا۔"

یہ تو ان کی ایجابی کوششوں کی امید کی دبی چنگاریوں کو آخری طور پر بجھانے کے لئے فرمایا گیا۔ اور اس کو تو وہ دیکھ بھی چکے تھے

آفتاب و ماہتاب تو ان کے پاس تھے نہیں لیکن جو کچھ بھی تھا سب کو دے کر وہ مایوس ہو چکے تھے۔ باقی اب جن سلبی اور ایذائی مضمون کا انہوں نے آغاز کیا تھا اس کے متعلق بھی قطعی لفظوں میں اعلان کر دیا گیا۔

"یہ کام پورا ہوگا، یا میں اس میں مر جاؤں گا"

کام تو پورا ہی ہونے والا تھا۔ اور اس میں شک کی گنجائش ہی کیا تھی لیکن دے کر تو دیکھ چکے اب لے کر دیکھو اچھی طرح دیکھو۔ اس سلبی امتحان کی راہ میں جان تک کی بازی لگا دی گئی اور یہی مطلب تھا۔

او اھلك فیه الی آخرہ (یا میں اس میں مر جاؤں گا یا مارا جاؤں گا۔ النبی الخاتم صد ۴۹ ۔ ۵۰)

ظاہر ہے کہ چھوٹا آدمی اس قدر صاحبِ استقامت نہیں ہو سکتا۔

امر استقامت اتنا گراں، ثقیل اور وزن دار ہے کہ حضرت ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ دربار رسالت میں عرض کیا تھا۔

شیبت یا رسول اللہ ۔ یا رسول اللہ آپ بوڑھے ہو گئے کہ آپ کی کنپٹیوں کے چند بال سفید ہو گئے تھے)

مقصد یہ تھا کہ پیغمبر کے قویٰ تو بہت زیادہ مضبوط ہوتے ہیں۔ بڑھاپا اتنی سرعت سے نہیں آسکتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب میں ارشاد فرمایا تھا۔

شیبتنی ھود کہ مجھے سورہ ہود نے بوڑھا کر دیا۔

سورہ ہود میں کیا چیز ہے جس نے آپ کو بوڑھا کر دیا تو بعض علماء نے تصریح کی ہے کہ وہ امر استقامت ہے جو نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو سورہ ہود میں دیا گیا۔ فاستقم کما امرت

یوں معلوم ہوتا ہے انا سنلقی علیك قولا ثقیلا (المزمل) سے مراد بھی امر استقامت ہے۔ جس شخص کا اللہ تعالیٰ کی ذات پر مکمل بھروسہ اور توکل نہ ہو۔ اس سے اس درجہ کی استقامت کا ظہور ناممکن ہے۔

دلیل ۳ صحابہ کرام کی پاکیزہ جماعت بھی نبوتِ محمدیؐ کی دلیل ہے

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک ایسی جاہل، وحشی اور بت پرست قوم میں نشوونما پایا جو علوم عقلیہ و نقلیہ سے بالکل بے بہرہ تھی۔ اس کے باوجود آپ کے اخلاق عظیمہ، خصائل حمیدہ اور اوضاع پسندیدہ اس کمال درجہ کے تھے کہ زبان اُن کے بیان سے قاصر اور قلم اُن کی تحریر سے عاجز ہے۔ صفحۂ قرطاس میں ان کی جامعیت کی وسعت نہیں۔

صرف اتنا ہی نہیں۔ بلکہ جو جماعت آپ کی دعوت و تبلیغ سے دائرہ اسلام میں داخل ہوئی مجموعی حیثیت سے اس کی نظیر تاریخ عالم میں نہیں پائی گئی اور نہ آئندہ پائی جا سکتی ہے۔

آپؐ نے انہیں کتاب اللہ کی تعلیم دی، حکمت سکھائی اور اپنے تزکیہ سے اُن کے کردار کو بلند کیا۔ اور اُن کے افکار کو پاکیزہ کیا۔ ان کے قلوب خوفِ خدا سے معمور ہو گئے۔ ان کی آنکھیں شرم و حیا سے بھرپور ہو گئیں۔ وہ لوگ یعنی صحابہ کرام جب حق بات

آشنا ہوئے تو آپؐ کے اس قدر گرویدہ ہو گئے کہ آپؐ کو یا رسول اللہ فداک ابی و امی کہہ کر پکارتے۔ شرافت ان کے چہروں سے ٹپکتی تھی۔ اور نجابت ان کی جبینوں سے نمایاں تھی۔ شجاعت اُن کی صفات لازمہ سے تھی اور سخاوت ان کا نمایاں جوہر تھا۔ ایثار اور آپس میں محبت و پیار اُن کی خصوصیات میں شمار ہوتا تھا۔ صحابہ کرام کی اس پاکیزہ جماعت کی انہی صفات کے پیش نظر ایک شاعر نے کہا ہے ؎

بھلا کیا بات ہے کہ نہ ایران سے نہ روما سے ڈرے — چند بے تربیت اونٹوں کے چرانے والے
بھلا بات کیا جو آپس میں نہ ملتے تھے کبھی — بن گئے مشرق و مغرب کے ملانے والے
بھلا بھید کیا کہ جن کو ہوتا تھا کافور پہ نمک کا دھوکا — بن گئے خاک کو اکسیر بنانے والے

اسی جماعت کی طہارت، مروت اور خلق عظیم سے متاثر ہو کر سفانہ بنت حاتم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کی قائل ہوئی اور اپنے بھائی عدی ابن حاتم کو دربار رسالت میں حاضری کی ترغیب دی اور انہی وجوہ کی بنا پر عدی ابن حاتم بھی حلقہ بگوش اسلام ہو گیا تھا۔ حالانکہ اس سے پہلے اُس کے دل میں سخت منافرت تھی۔ یہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تربیت اور تزکیہ کا نتیجہ تھا جس نے ؎

وفا کی خاک سے مانجھا دلوں کے آبگینوں کو — مثالی کر دیا بھٹکے ہوئے صحرا نشینوں کو
کتاب اس پر وہ اتری تھی جسے قرآن کہتے ہیں — تمدن کی، تدبر کی وفا کی جان کہتے ہیں

اسی طرف قرآن عزیز نے اشارہ فرمایا۔

هو الذی بعث فی الامیین رسولا منهم یتلوا علیهم آیاته ویزکیهم ویعلمهم الکتاب والحکمة وان کانوا من قبل لفی ضلل مبین (الجمعة : ۲)

وہ خدا ہی تو ہے جس نے ان پڑھ (عربوں) میں ان ہی میں سے پیغمبر بنا کر بھیجا کہ وہ ان کو اللہ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے اور اُن کو پاک صاف کرتے اور اُن کو کتاب الٰہی اور حکمت سکھاتے ہیں۔ ورنہ اس سے پہلے تو یہ لوگ صریح گمراہی میں مبتلا تھے۔

کما ارسلنا فیکم رسولا منکم یتلوا علیکم آیتنا ویزکیکم ویعلمکم الکتاب والحکمة ویعلمکم مالم تکونوا تعلمون (البقرة : ۱۵۱)

جیسے ہم نے تم ہی میں سے ایک رسول بھیجے جو ہماری آیتیں تم کو پڑھ کر سناتے اور تمہاری اصلاح کرتے اور تم کو کتاب اور حکمت، سکھاتے اور تم کو ایسی ایسی باتیں بتاتے ہیں جو پہلے سے تم کو معلوم نہ تھیں

دلیل ۴ صحابہؓ کی استقامت

صحابہؓ کی استقامت بھی نبوت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی دلیل ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی استقامت کی ایک جھلک تو گذشتہ سطور میں قارئین نے دیکھ ہی لی۔ اب آپؐ کے صحابہ کی استقامت کے بعض واقعات بلاحظہ

فرمائیں۔ استقامت کا یہ درجۂ کمال بغیر یقینِ محکم اور اعتقادِ جازم کے میسر نہیں آسکتا۔

مکہ کی سرزمین میں ایمان لانے والے غریب مسلمانوں کو جو اذیتیں دی گئیں۔ اس کے نظائر تاریخ عالم میں کم ہی ملتے ہیں بلال حبشی کے دردانگیز واقعات تاریخوں میں ثبت ہیں۔ کیا اہل مکہ کا انتہائی تشدد اور ظلم وستم کسی ایک مومن کو بھی ایمان سے برگشتہ کرسکا؟ صحابہ تین سال شعب ابی طالب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معیت میں محصور رہے مشرکین مکہ نے سوشل بائیکاٹ کر دیا تھا صحابہ نے صبر واستقلال کا ثبوت دیا اور ان میں کوئی لچک پیدا نہ ہوئی۔

سمیہ والدۂ عمار ابن یاسر رضی اللہ عنہما کی شرمگاہ میں نیزہ مار کر ابوجہل نے انہیں ہلاک کر دیا۔ کیا زمانے میں اس ظلم وستم کی نظیر بھی پائی گئی ہے؟ کیا آل یاسر کے پائے استقامت میں لغزش آئی؟ نہیں! ہرگز نہیں!!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ان پر گذر ہوتا تو آپ فرماتے:۔

اصبروا آل یاسر فان لکم الجنۃ — اے یاسر کے گھرانے صبر کرو۔ تمہارے لئے اس کا اجر جنت ہے

جریدۂ عالم میں ہزاروں واقعات ثبت ہیں۔ یہاں صرف ایک واقعہ درپیش کیا جاتا ہے۔

حضرت عبداللہ ابن حذافہ السہمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جلیل القدر صحابی تھے۔ ایک غزوہ میں رومیوں نے انہیں بعض دوسرے ساتھیوں کی معیت میں گرفتار کرلیا۔ اسے شاہ روم نے کہا اگر تو نصرانی ہو جائے تو میں تجھے اپنا نصف ملک تقسیم کر دیتا ہوں۔ اور اپنی بیٹی بھی نکاح کئے دیتا ہوں۔ انہوں نے انکار کیا۔ اس نے کہا۔ ورنہ میں تجھے جلتے ہوئے تیل کے کڑھاؤ میں ڈال کر جلا دوں گا۔ وہ پھر بھی مستقیم رہے۔ جب جلاد انہیں کڑھاؤ میں ڈالنے گیا تو رو پڑے۔ انہیں طمع ہوئی کہ رو جو رہا ہے تو شاید مان جائے۔ بادشاہ نے کہا۔ اگر تو شرط پوری کر دے۔ تو میں اپنے عہد پر قائم ہوں۔ انہوں نے کہا کہ آپ لوگوں نے میرے رونے سے غلط اندازہ لگایا۔ میں موت سے ڈر کر نہیں رو رہا۔ میں تو اس لئے رو رہا ہوں کہ اللہ تعالے نے مجھے صرف ایک نفس دیا جو میں اُس کی راہ میں قربان کر رہا ہوں۔ کاش اللہ مجھے اتنے نفوس عطا کرتا۔ جتنے میرے بدن پر بال ہیں کہ میں یکے بعد دیگرے انہیں قربان کرتا۔ بادشاہ حیران رہ گیا۔ اس نے کہا اچھا تو میرے سر کو چوم لے تو بھی میں تجھے رہا کر دوں گا۔

حضرت عبداللہ ابن حذافہ نے فرمایا کہ لا افعل میں یہ بھی کرنے کے لئے تیار نہیں۔ بادشاہ نے کہا۔

قبل راسی اطلقک واطلق معک ثمانین من المسلمین۔ اگر تو میرے سر کو چوم لے تو میں تجھے بھی رہا کر دوں گا اور تیرے ساتھ اسی دیگر مسلمانوں کو بھی رہا کر دوں گا۔

فقال نعم۔ فرمایا ہاں میں ایسا کرنے کو تیار ہوں

جب رہا ہو کر مدینہ طیبہ واپس ہوئے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جب سنا تو کھڑے ہو گئے۔ حضرت عبداللہ کا سر چوما اور تمام مسلمانوں کو حکم دیا کہ اُس کا سر چومیں۔

استقامت کا یہ مرتبہ بھی ہر کس و ناکس کا مقدر نہیں۔ اور نہ یہ جوہر بغیر یقین کامل کے پیدا ہو سکتا ہے ؎

یہ انہی کا کام ہے جن کے حوصلے ہیں زیاد

یہ سب کچھ انھوں نے صحبتِ نبوی سے پایا۔ اگر آپ اپنے دعوے میں سچے نہ ہوتے تو آپ کے صحابہ میں یہ کمالات کیسے پیدا ہو گئے صحابہ معصوم نہ تھے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض صحابہ سے گاہے گاہے بتقاضائے نفسانی معصیت کا صدور بھی ہو گیا۔ مگر کیا چشم فلک نے کبھی یہ منظر بھی دیکھا ہے کہ مجرم دربارِ رسالت میں اپنے آپ کو تطہیر کے لئے پیش کرے۔ اور اپنے جرم کے اعتراف پر اس حد تک اصرار کرے کہ بالآخر اس پر حد جاری کر دی جائے۔

دلیل ۵

قیصر شاہ روم نے جس کسوٹی پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پرکھ کر آپ کی صداقت کا اعتراف کیا تھا۔ وہ بھی نبوت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے ثبوت کی قوی دلیل ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اتمام حجت کے لئے مختلف ممالک کے حکمرانوں اور مختلف قبائل کے سربراہوں کو خطوط لکھے تھے۔ ان میں سے ایک خط کا تذکرہ اس جگہ کیا جاتا ہے جو آپ نے ہرقل شاہ روم کو لکھا تھا۔ اور اُسے دعوت اسلام دی تھی۔ جب خط قیصر روم کو پہنچا تو اس نے اپنے عمال کو کہا کہ دیکھو تلاش کرو۔ مکہ کے لوگ تجارت کے لئے آتے رہتے ہیں۔ اگر کوئی مل جائے تو میرے پاس لے آؤ۔ چنانچہ ابوسفیان اپنے کچھ قریشی ساتھیوں کے ساتھ دربار شاہی میں حاضر کئے گئے۔

قیصر نے ایک ترجمان کے ذریعے اُن سے سوال کیا کہ تم میں سے اُس مدعی نبوت کے ساتھ نسب میں کون زیادہ قریب ہے ابوسفیان نے کہا کہ میں ہوں۔ قیصر نے ابوسفیان کو قریب ہونے کا حکم دیا اور اُس کے ساتھیوں کو اس کے پیچھے کھڑا کیا گیا اور کہا میں ابوسفیان سے سوال کروں گا۔ اگر یہ جھوٹ بولے تو تم اُسے جھٹلا دینا۔ پھر سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہ مکالمہ سیرت اور حدیث کی کتابوں میں مفصل مذکور ہے۔ ہم اس مکالمہ کا اردو ترجمہ مکتوبات نبویؐ سے نقل کرتے ہیں۔

اسلام کے بارے میں قیصر اور ابوسفیان کا مکالمہ

قیصر :۔ "مدعی نبوت کا خاندان کیسا ہے؟"

ابوسفیان :۔ "نہایت شریف"۔

قیصر :۔ "پیغمبر ہمیشہ اچھے خاندان سے ہوتے ہیں۔ تاکہ اُن کی اطاعت سے کسی کو عار نہ ہو"
"کیا اس کے خاندان میں کسی اور نے بھی کبھی نبوت کا دعوےٰ کیا ہے؟ یا اُس میں کوئی بادشاہ گزرا ہے؟"

ابوسفیان :۔ "کبھی نہیں"

قیصر :۔ "اگر ایسا ہوتا تو میں سمجھتا کہ یہ خاندانی خیال کا اثر ہے۔ اس کو بادشاہت کی ہوس ہے! اور باپ دادا کی سلطنت حاصل کرنا چاہتا ہے"۔ "جن لوگوں نے اس کا مذہب قبول کیا ہے وہ کمزور ہیں یا صاحب اثر؟"

ابوسفیان :۔ "کمزور لوگ ہیں"

قیصر : "پیغمبروں کے ابتدائی پیرو ہمیشہ غریب لوگ ہی ہوا کرتے ہیں۔" اچھا اُس کے پیرو بڑھتے جا رہے ہیں یا گھٹتے جاتے ہیں؟

ابوسفیان : "اس کے پیروؤں کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔"

قیصر : "ایمان کی کشش کا یہی عالم ہے۔ اس میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے۔"

"کیا کچھ لوگ اس کے دین سے بیزار ہو کر اس کو چھوڑ بھی بیٹھے ہیں؟"

ابوسفیان : "اب تک تو کسی نے ایسا نہیں کیا۔"

قیصر : "ایمان کی خوبی یہی ہے کہ وہ جبر و اکراہ سے نہیں، بلکہ اپنی صداقت کے ساتھ دل نشین ہوتا ہے۔ ایمان کی لذت کی یہی تاثیر ہے کہ جب وہ دل میں بیٹھ جاتی ہے اور روح پر اپنا اثر کر لیتی ہے تو پھر جدا نہیں ہوتی۔"

"اس کے دعوئے نبوت سے قبل تم اُسے سچا سمجھتے تھے یا کبھی اس کے جھوٹ کا بھی تمہیں تجربہ ہوا ہے۔"

ابوسفیان : "نہیں اس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔"

قیصر : "جو شخص لوگوں سے جھوٹ نہ بولے۔ وہ خدا پر کیونکر جھوٹ باندھ سکتا ہے! پیغمبر نہ کبھی جھوٹ بولتے ہیں۔ اور نہ کسی کو دھوکا دیتے ہیں۔"

"کیا کبھی وہ عہد و پیمان کی خلاف ورزی بھی کرتا ہے۔"

ابوسفیان : "ابھی تک تو کبھی ایسا نہیں ہوا۔ لیکن اب جو معاہدۂ صلح ہوا ہے۔ اُس میں دیکھنا ہے کہ وہ اپنے عہد پر قائم رہتا ہے یا نہیں۔"

قیصر : "پیغمبر عہد شکن نہیں ہوتے۔"

"کبھی اس کے ساتھ تمہاری جنگ ہوئی ہے؟"

ابوسفیان : "جی ہاں! کئی مرتبہ ہو چکی ہے۔"

قیصر : "جنگ کا نتیجہ کیا رہا؟"

ابوسفیان : "کبھی وہ غالب آئے اور کبھی ہم۔"

قیصر : "خدا کے پیغمبروں کا یہی حال ہوتا ہے۔ لیکن آخر کار کامیاب وہی ہوتے ہیں۔"

"وہ تعلیم کیا دیتا ہے؟"

ابوسفیان : "وہ کہتا ہے کہ ایک خدا کی عبادت کرو۔ کسی اور کو خدا کا شریک نہ بناؤ۔ پاک دامنی اختیار کرو۔ سچ بولو۔ لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ باپ دادا کے مشرکانہ طریقے کو چھوڑ دو، نماز پڑھو۔"

قیصر : "نبی موعود کی یہی علامتیں ہمیں بتلائی گئی ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ عنقریب ایک نبی کا ظہور ہونے والا ہے۔ مگر میرا یہ خیال نہ تھا کہ وہ عرب میں ہوگا۔"

"اگر تم نے جھوٹ نہیں بولا تو ایک روز وہ اس جگہ کا جہاں میں بیٹھا ہوں۔ ضرور مالک ہو جائے گا۔ اے کاش! میں ان کی خدمت میں پہنچ سکتا تو اُن کے پاؤں دھوتا۔"

اس گفتگو کے بعد حکم دیا کہ نامۂ مبارک پڑھا جائے۔ فرمانِ رسالتؐ میں لکھا تھا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محمدؐ کی جانب سے جو خدا کا بندہ اور رسول ہے — ہرقل قیصر روم کے نام۔ اس پر سلامتی ہو جس نے راہ راست اختیار کی ۔! بعدازاں میں آپ کو اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔ بس اگر سلامتی منظور ہے تو اسلام قبول کر لیجیے۔ اگر آپ نے اسلام قبول کر لیا تو اللہ تعالیٰ آپ کو دوہرا اجر عطا فرمائے گا۔ اور اگر آپ نے انکار کیا تو ساری قوم کی گمراہی کی ذمہ داری بھی آپ ہی کے اوپر ہو گی۔

اے اہل کتاب! اختلاف و نزاع کی ساری باتیں نظر انداز کر کے ایک ایسی بات پر متفق ہو جاؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان میں یکساں طور پر مسلّم ہے۔ وہ یہ کہ ہم خدا کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کریں اور نہ کسی کو اس کا شریک ٹھہرائیں۔ اور نہ ہم اللہ کے سوا کسی دوسرے کو اپنا رب بنائیں! اگر تمہیں اس بات سے انکار ہے تو تمہیں معلوم رہنا چاہیئے کہ ہم بہر حال خدا کی یکتائی کا عقیدہ رکھتے ہیں!

محمد رسولُ اللہ

قیصر نے ابوسفیان سے جو گفتگو کی تھی۔ اہل دربار اس سے سخت مشتعل تھے۔ فرمانِ رسالت کے پڑھے جانے پر اور بھی برہم ہو گئے۔ قیصر نے یہ رنگ دیکھ کر حضرت دحیہؓ سے کہا کہ:۔

"اگر مجھے اپنے لوگوں سے اپنی جان کا خوف نہ ہوتا تو میں ضرور تمہارے نبی کا اتباع کرتا۔ وہ بلاشبہ وہی نبی ہیں۔ جن کے ہم منتظر تھے"۔

ہر چند قیصر کے دل میں نورِ اسلام جلوہ افگن ہو چکا تھا۔ مگر تخت و تاج کی محبت میں وہ روشنی بجھ کر رہ گئی۔

۶۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا اُمی ہونا

نبوت محمدیہؐ کے ثبوت کے لئے نہایت قوی دلیل ہے۔ یہ ایک مسلّم حقیقت ہے کہ آپ اُمی تھے۔ یعنی آپ نے کسی ایک استاد سے بھی تعلیم حاصل نہیں کی۔

امی انسان تین باتیں نہیں کر سکتا۔

۱ - لکھ نہیں سکتا۔

۲ - لکھے ہوئے کو پڑھ نہیں سکتا۔

۳ - حروف تہجی کا اجرا اپنی زبان پر نہیں کر سکتا۔

پہلی دو چیزوں سے خود قرآن عزیز نے آپ کی نبوت پر استدلال فرمایا ہے۔ چنانچہ قرآن عزیز کہتا ہے۔ میرے پیغمبر! وما کنت تتلوا من قبلہ من کتاب ولا تخطہ قرآن سے پہلے نہ تو تم کوئی کتاب ہی پڑھتے تھے۔ اور نہ تم

بیمینک اذا لارتاب المبطلون — کو اپنے ہاتھ سے لکھنا ہی آتا تھا کہ ایسا ہوتا تو یہ بے دین شبہ کرتے۔
(العنکبوت ۱ ۴۸)

اگر ایسا ہوتا تو باطل کاروں کو شک کی گنجائش ہوتی۔ جب ایسا نہیں ہے تو آپؐ بلاریب نبی ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ:۔
کیا ایک امی انسان کے بس میں ہے کہ تخلیق آدمؑ اور ملائکہ کی گفتگو اور ملائکہ کا سربسجود ہونا۔ ابلیس کا اباء عن السجود، آدم صفی اللہ کا اپنی زوجہ کی معیت میں جنت میں سکونت اختیار کرنا۔ پھر ہبوط الی الارض کے واقعات کو اس تفصیل سے بیان کرے، جیسے قرآن عزیز نے بیان کیا ہے پھر اس کے بعد انبیاء کے واقعات نوح علیہ السلام کا تفصیلی واقعہ، قوم ہود و ثمود کی ہلاکت خیزیاں۔ ابراہیم علیہ السلام کا اسکا بت شکنی، قوم کے سامنے ستارہ پرستی پر تنقید، وقت کے جابر بادشاہ کے سامنے حق گوئی، آگ میں ڈالا جانا، ہجرت، حضرت اسمٰعیل اور حضرت اسحٰق کی پیدائش، بیت اللہ کی تعمیر کے واقعات کی تفصیل، سورۂ یوسف میں حضرت یوسف علیہ السلام اور ان کے بھائیوں کا مفصل قصہ۔ کیا ایک امی انسان کا علم اس کا احاطہ کر سکتا ہے۔ جب کہ خود قرآن عزیز کہتا ہے۔

وان کنت من قبلہ لمن الغافلین — اور تم اس سورۃ کے نازل ہونے سے پہلے ان باتوں سے یقیناً بے خبر تھے۔
(یوسف - ۳)

پھر قرآن کا یہ بیان۔

لقد کان فی یوسف واخوتہ آیات للسائلین — اے پیغمبر! امتحاناً سوال کرنے والے یہودیوں کے لئے یوسف اور ان کے بھائیوں کے حالات میں بڑی نشانیاں ہیں۔
(یوسف : ۷)

پھر وہ سب نشان ایک ایک کر کے پورے بھی ہوئے۔ جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام کے خلاف بھائیوں نے قتل کی سازش کی۔ اور اللہ تعالےٰ نے اپنی رحمت سے بچا لیا۔ پھر جس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو مصر کی حکومت عطا کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالےٰ نے مدینہ طیبہ میں حکومت عطا فرمائی۔ اور جس طرح ایک وقت آیا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی اُن کے دربار میں مضطر اور عاجز ہو کر پیش ہوئے اور معافی کی درخواست کی حضرت یوسف علیہ السلام نے لاتثریب علیکم الیوم کہہ کر معاف کر دیا۔ اسی طرح فتح مکہ کے موقعہ پر اہل مکہ مضطر، عاجز اور لاچار ہو کر معافی کے خواستگار ہوئے اور آپ نے لاتثریب علیکم الیوم کہہ کر معاف کر دیا۔

فاعتبروا یا اولی الابصار

پھر موسیٰ کلیم اللہ اور فرعون کے واقعات، فرعون اور اُس کے عساکر کا غرق ہونا۔ بنی اسرائیل کی سرکشیاں اور ان کی ناشکری کے واقعات، اصحاب سبت کا واقعہ، ملکۂ سبا کا قصہ، ذوالقرنین، یونس علیہ السلام اور اصحاب کہف کے واقعات جس تفصیل سے قرآن عزیز میں ہیں۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، اللہ کے نبی نہ ہوتے اور قرآن منزل من اللہ کتاب نہ ہوتی تو کیا امی ہونے کی حیثیت سے آپؐ ان واقعات کو اس تفصیل سے بیان کر سکتے تھے۔ جب کہ آپ نے تورات اور دیگر صحف سماوی کا مطالعہ نہ کیا تھا، اور نہ کر سکتے تھے۔ اور نہ ان کی زبان سے آشنا تھے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے بارہ میں قرآن عزیز کا تفصیلی بیان بالخصوص سورہ مریم کی مندرجہ ذیل آیات۔

قال انی عبد اللہ اٰتٰنی الکتاب وجعلنی نبیا ○ وجعلنی مبارکا این ماکنت (مریم - ۳۰ - ۳۱)

عیسیٰ روح اللہ نے مہد میں تکلم کیا۔ اور کہا:۔ میں اللہ کا بندہ ہوں۔ اللہ نے مجھے کتاب عطا فرمانے اور نبی بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ اور کہیں بھی رہوں مجھ کو بابرکت کیا ہے۔

کتنے معجزات پر مشتمل ہیں۔ آغوش مادر میں حضرت عیسیٰ علیہ وعلی نبینا السلام کا کلام کرنا، اپنی عبودیت کا اعتراف اور والدہ کی صفائی میں اس شان سے گویا ئی جس میں یہود اور نصاریٰ کے بکواسیات کی تردید ہوتی ہے۔

مقصد یہ ہے کہ (وجعلنی نبیا) میں تورات کتاب استثناء ب ۲۳ آیت ۲ کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں "کوئی حرامزادہ میری جماعت میں نہ آئے"

مقصد یہ ہے کہ اے یہودیو! اٹھا کر دیکھو اپنی کتاب تورات کو جب کوئی حرامزادہ خدا کی جماعت میں داخل نہیں ہو سکتا تو مجھے اللہ تعالےٰ نے نبی بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ تم میری والدہ پر کیسے زنا کی تہمت لگا سکتے ہو۔

اور (وجعلنی مبارکا) میں اشارہ ان مزعومات باطلہ کی طرف ہے جو نصاریٰ نے اپنی طرف سے تراش کر اناجیل میں داخل کر دیئے ہیں۔ عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ جو سولی پر لٹکایا گیا وہ لعنتی موت مرا عیسیٰ علیہ السلام بھی العیاذ باللہ ثم العیاذ باللہ لعنتی موت مرے۔ دیکھئے گلیتون ب ۳ آیت ۱۳

"مسیح جو ہمارے لئے لعنتی بنا۔ اُس نے ہمیں مول لے کر شریعت کی لعنت سے چھڑایا۔ کیونکہ لکھا ہے کہ جو کوئی لکڑی پر لٹکایا گیا وہ لعنتی ہے۔ گلیتوں ب ۳ ع ۱۳

اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالےٰ کے سچے نبی نہ ہوتے اور قرآن اللہ تعالےٰ کی طرف سے نازل کی گئی کتاب نہ ہوتی تو آپ کے لئے کیسے ممکن تھا کہ امی ہونے کے باوجود آپ ان حقائق سے پردہ اٹھاتے عقل سلیم کا فیصلہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے سچے نبی ہیں اور اللہ تعالےٰ کے بتلانے سے آپ نے یہ سب کچھ بتلایا ورنہ ایک امی انسان جس نے تورات و انجیل کا مطالعہ نہیں کیا۔ یہ آیت پیش نہیں کر سکتا۔

اہل مکہ اللہ تعالےٰ کے اسماء میں سے رحمٰن نام سے ناآشنا تھے۔ لیکن اہل کتاب کے ہاں یہ نام مشہور تھا۔ قرآن عزیز میں اس نام کو بار بار دہرایا گیا بلکہ پہلی آیت (بسم اللہ الرحمٰن الرحیم) میں اسم اللہ کی پہلی صفت رحمٰن کو قرار دیا گیا ہے۔ اہل مکہ نے اس سلسلہ میں کچھ اعتراضات بھی کئے جس کا قرآن عزیز نے تسلی بخش جواب دیا۔ بھلا ایک امی انسان جس نے تورات و انجیل کا مطالعہ نہ کیا ہو۔ وہ اس لفظ کا استعمال کر سکتا ہے؟ کیا وہ (انہ من سلیمان وانہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم) کی آیت مقدس پیش کر سکتا ہے؟ الحاصل قرآن عزیز کی پہلی آیت ہی شہادت دیتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالےٰ کے نبی ہیں۔

قرآن کہتا ہے۔

انا ارسلنا الیکم رسولا شاھدا علیکم کما

لوگو! ہم نے تمہاری طرف رسول بھیجا ہے۔ جو قیامت

ارسلنا الی فرعون رسولا o (المزمل :- ۱۵) کے دن) تمہارے مقابلے میں گواہی دیں گے جس طرح ہم نے فرعون کی طرف رسول بھیجا تھا۔

اس آیت میں اشارہ ہے تورات کی مندرجہ ذیل آیات کی طرف :-

"خداوند تیرا خدا تیرے لئے تیرے ہی درمیان سے یعنی تیرے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا کرے گا۔ تم اس کی سننا یہ تیری اس درخواست کے مطابق ہو گا۔ جو تو نے خداوند اپنے خدا سے مجمع کے دن جواب میں کی تھی کہ مجھ کو نہ تو خداوند اپنے خدا کی آواز پھر سننی پڑے۔ اور نہ ایسی بڑی آگ ہی کا نظارہ ہو، تاکہ میں مر نہ جاؤں"۔ اور خداوند نے مجھ سے کہا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں۔ سو ٹھیک کہتے ہیں"۔ میں ان کے لئے ان ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا۔ اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اُسے حکم دوں گا۔ وہی وہ ان سے کہے گا۔ (استثناء ب۱۸ :- ۱۵ تا ۱۸)

نیز دیکھیے :- اعمال ب۳ :- ۲۲، ۲۳، ۲۴ ایضاً اعمال ب۷ :- ۳۷

نیز حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق بشارت دی تھی۔ جو مختلف اناجیل میں مذکور ہے۔

یوحنا ب۱۴ :- ۱۷ میں ہے۔

"میں باپ سے درخواست کروں گا کہ وہ تمہیں دوسرا مددگار بخشے گا۔ کہ ابد تک تمہارے ساتھ رہے"

یوحنا ب۱۶ :- ۷ میں ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں -

میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لئے فائدہ مند ہے۔ کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار تمہارے پاس نہیں آئے گا۔

یوحنا ب۱۴ :- ۳۰ "کیونکہ دنیا کا سردار آتا ہے۔

مددگار اور سردار کا مطلب نبی ہے اور "ابد تک ساتھ رہے گا" کا مطلب یہ ہے کہ وہ خاتم النبیین ہو گا۔ اور اس کے احکام ابدی ہوں گے۔

نوٹ :- ہمارے علمائے کرام کی تحقیق یہ ہے کہ انجیل کا اصل لفظ فارقلیط تھا جس کا عربی ترجمہ "احمد" ہے۔ عیسائیوں نے اسے پیراکلیٹ اور مددگار سے بدل دیا ہے۔ تاہم پیشگوئی ثابت ہے اور قرآن عزیز نے اس پیشگوئی کا تذکرہ سورہ صف آیت ۶ میں کیا ہے۔

ومبشرا برسول یاتی من بعدی اسمہ احمد (الصف :- ۶) اور تم کو ایک رسول کی خوشخبری سناتا ہوں جو میرے بعد آئیں گے ان کا نام ہو گا احمد

بھلا ایک آدمی جس نے اناجیل متذکرہ بالا کا مطالعہ نہ کیا ہو۔ وہ اس صراحت کے ساتھ دعویٰ کر سکتا ہے۔ ہرگز نہیں!

پس ثابت ہوا کہ لاریب محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اللہ تعالیٰ کے سچے برگزیدہ نبی ہیں۔ اور خاتم النبیین ہیں۔ لا نبی بعدہٗ

تورات کتاب الاستثناء ۱۸ آیت ۲۰ میں ہے۔

"لیکن وہ نبی گستاخ بن کر کوئی ایسی بات میرے نام سے کہے۔ جس کے کہنے کا میں نے اس کو حکم نہیں دیا ... تو وہ نبی قتل کیا جائے۔"

قرآن عزیز نے سورۃ الحاقہ آیت ۴۴ تا ۴۶ میں اس کو بیان فرمایا۔

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ (الحاقہ ۴۴، ۴۵، ۴۶)

اور اگر پیغمبر اپنی طرف سے کوئی بات ہماری جانب منسوب کرتا تو اس کا داہنا ہاتھ پکڑ کر ہم نے ان کی گردن اڑا دی ہوتی۔

اہل کتاب ایک نبی کے منتظر تھے۔ اور اسے "وہ نبی" کہہ کر ذکر کرتے تھے۔ جیسے یوحنا کی مختلف آیات میں ہے۔ قرآن عزیز نے انہی آیات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ۭ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَھُمْ يَعْلَمُوْنَ ؀ (البقرۃ: ۱۴۶)

جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی وہ اس پیغمبر کو اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں اور ان میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو حق بات کو چھپاتے ہیں۔

فَلَمَّا جَاۗءَھُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ (البقرۃ: ۸۹)

جس پیغمبر کو وہ اچھی طرح جانتے پہچانتے تھے۔ جب وہ پیغمبر آموجود ہوا تو لگے انکار کرنے۔

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰھُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ (البقرۃ ۱: ۱۲۱)

جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے۔ وہ اس کو پڑھتے ہیں جس طرح پڑھنے کا حق ہے۔

اگر قرآن عزیز اللہ کی کتاب نہ ہوتی اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے نبی نہ ہوتے تو پھر اُمّی ہو کر کس طرح یہ دعویٰ کر سکتے تھے۔ جس کی تکذیب کی اہل کتاب کو ہمت نہ ہوئی۔ معلوم ہوا کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اللہ تعالیٰ کے سچے نبی ہیں۔ اور قرآن عزیز منزل من اللہ کتاب ہے۔

جس شخص نے کبھی کسی استاد کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہ کیا ہو۔ ان حقائق پر کیسے مطلع ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں! پس تسلیم کرنا پڑے گا کہ آپ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبعوث رسول ہیں اور اللہ تعالیٰ ہی کے تلانے پر آپ نے جملہ حقائق پیش کئے جن کی تکذیب کی کبھی کسی کو ہمت نہیں ہوئی۔

پھر قرآن عزیز کی بعض سورتوں کے اوائل میں حروف مقطعات آئے مثلاً صٓ، قٓ، طٰهٰ، یٰسٓ، حٰمٓ، الٓمٓ، الٓرٰ، حٰمٓ، عٓسٓقٓ، کٓهٰیٰعٓصٓ

یہ دعوے مع الدلیل ہے کہ یہ سورتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی ہیں۔ ورنہ ایک اُمّی کی زبان پر حروف مقطعات کا اجراء ناممکن ہے۔

۷۔ معجزات کا وقوع

معجزات کا وقوع نبوت محمدیؐ کے ثبوت کے لئے نہایت قوی دلیل ہے۔

نبی کے لئے معجزے کا ہونا ایک عقلی بات ہے۔ اس لئے کہ معجزہ اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے۔ جو مدعی نبوت کے ہاتھ پر بطور دستاویز کے ظاہر ہوتی ہے تاکہ لوگ یقین کر لیں کہ یہ واقعی نبی ہے۔

کوئی حکومت اپنا سفیر دوسرے ملک میں بھیجتی ہے تو اسے دستاویز دی جاتی ہے کہ دوسرے ملک کے حکمران تسلیم کر لیں کہ یہ واقعی سفیر ہے۔ تو رب العزۃ ایک شخص کو رسالت کے لئے منتخب فرماتے ہیں تو کیا کوئی نشان مرحمت نہیں فرمائیں گے کہ لوگ یقین کر لیں کہ یہ اللہ کا رسول ہے۔ ہر نبی کو معجزات دیئے گئے۔ اور جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سب سے زیادہ معجزات عطا ہوئے۔ اور پہلے انبیاء کے معجزات کی نسبت اتم واکمل معجزات عطا ہوئے۔

مولانا محمد قاسم نانوتوی بانیٔ دارالعلوم دیوبند نے میلہ خدا شناسی میں اس مضمون کو اس خوبی سے بیان فرمایا کہ ہندو، سکھ اور عیسائی بھی حیرت زدہ ہوگئے۔ بلکہ بعض ہندوؤں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ مولوی قاسم کی زبان پر دیوتا بولتا ہے۔

سب سے بڑا معجزہ جو خاتم النبیینؐ سید المرسلین کو عطا ہوا۔ وہ قرآن مبین ہے جو فصاحت، بلاغت، لطافت اور حلاوت میں لاجواب ہے۔ چنانچہ قرآنِ عزیز نے خود چیلنج کیا۔

وان کنتم فی ریب مما نزلنا علی عبدنا فأتوا بسورۃ من مثلہ وادعوا شھداءکم من دون اللہ ان کنتم صدقین (البقرۃ : ۲۳)	اور وہ جو ہم نے اپنے بندے پر (قرآن) اتارا ہے۔ اگر تم کو اس میں شک ہو اور اپنے اس دعوے میں سچے ہو تو اس جیسی ایک سورت تم بھی بنالاؤ۔ اور اللہ کے سوا اپنے حمایتیوں کو بھی بلالو۔

لیکن عرب کے شعراء، فصحاء اور بلغاء دم بخود رہ گئے۔ قرآن کریم کے اس چیلنج کا جواب نہ آج تک منکرین نبوت دے سکے اور نہ قیامت تک دے سکتے ہیں۔

نبوت و رسالت دلائل عقلیہ سے

مولانا محمد عبد المالک

الحمد للہ الذی ارسل رسولہ بالھدی و دین الحق لیظہرہ علی الدین کلہ وکفی باللہ شہیدا

خدا نے اپنی معرفت کے لیے انسان کو عقل دی۔ تاکہ اس کے ذریعہ اس کی وحدانیت اور واجب الوجود ہونے پر ایمان لائے۔ سب سے پہلے عقل یہ قیاس مرتب کرتی ہے کہ ہر نشان کے لیے کوئی نشان قائم کرنے والا ضرور ہے جاہل سے جاہل چرواہا جنگل میں سراغ سے اپنے مال مویشی ڈھونڈ لیتا ہے گم کردہ راہ شب تاریک میں چراغ کو دور دیکھ کر سمجھتا ہے کہ کوئی آبادی ضرور ہے۔ دھوئیں کو دیکھ کر آگ کا اور دھوپ کو دیکھ کر آفتاب کا یقین ہوتا ہے۔ اسی طرح بڑھتے بڑھتے یہ اذعان ہوتا جاتا ہے کہ زمین و آسمان، سورج اور ستاروں کا ضرور کوئی پیدا کرنے والا ہے۔ کیونکہ کوئی چیز خود بخود پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس لئے ایک ہستی مطلق کا ہونا ضروری ہے۔ اگر ہم اپنے وجود کے عالم کو دیکھیں اور اس کی بناوٹ اور ترتیب و تناسب اعضا پر غور کریں تو لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم کا اقرار کرنا پڑتا ہے۔ ان ہی معنوں میں کہا گیا ہے من عرف نفسہ فقد عرف ربہ جو اپنے نفس کی حقیقت پر آگاہ ہوا۔ وہ خدا کی ذات سے بھی واقف ہوا۔

پس خدا کی نعمت راہ نمائی ہر ایک انسان کے لیے بالتعمیم ہے۔ جو کوئی اپنی عقل سے کام لیتا ہے۔ وہ منزل مقصود پر پہنچ جاتا ہے لیکن جو عقل سے کام نہیں لیتا وہ گمراہ رہتا ہے۔

بایں ہمہ قدرت حق نے اپنے بندوں کے لئے سوائے عقل کے ہدایت کے اور بھی راستے پیدا کر دیے ہیں اور اتمام حجت کا کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا۔ جب خدا دیکھتا ہے کہ بندے عقل سے کام نہیں لیتے اور گمراہ ہوتے جاتے ہیں تو انہیں میں سے ان کے سمجھانے کے لئے اپنے خاص بندے کو مقرر کرتا ہے جو ان کو وعظ اور تلقین کرتا ہے اور خدا کے احکام سناتا ہے۔ یہ نبی اور رسول کہلاتا ہے۔ رسول اور نبی خاص طاقت رکھتا ہے اور اس کی دماغی و روحانی کیفیت خاص ہوتی ہے۔ اگرچہ مثل عام لوگوں کے یہ بھی ایک بشر ہوتا ہے۔ لیکن اس کو خدا کے ساتھ واسطہ قرب و خطاب ہوتا ہے اور اسی قرب و خطاب کی وجہ سے وہ افضل الناس کہلاتا ہے اس کی طاقت اور قوت کا نام نبوت و رسالت ہے۔

میں کوشش کروں گا کہ نبوت اور رسالت کے معنی کو عام فہم مثالوں کے پیرایہ میں سمجھاؤں اور انسان میں ظاہری اور باطنی بے شمار طاقتیں ہیں۔ لیکن جس طرح آئینہ کو جس قدر جلا دی جاتی ہے۔ اسی قدر روشن ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر ایک

قوت یا طاقت انسانی کار آمد کرنے سے قوی اور طاقت ور ہوتی ہے اور معطل کرنے سے زائل ہو جاتی ہے
دایاں اور بایاں بازو بناوٹ اور شکل میں ایک سے ہیں مگر چونکہ ہم دائیں بازو سے زیادہ اور بائیں سے کم کام لیتے ہیں۔ اسی لئے وہ قوی اور یہ کمزور ہے۔ آنکھوں کو اگرچہ ہم کچھ دن بند رکھیں تو ان کی بینائی کم ہو جاتی ہے۔
اسی طرح ذہنی اور روحانی طاقتوں کا حال ہے۔ جوڑے کے دو بھائی جو ایک ہی وقت پیدا ہوتے ہیں اور ان کا باپ اور ماں ایک ہی ہے اور وہ ایک ہی قسم کی غذا کھاتے ہیں اور ایک ہی فرش پر سوتے ہیں۔ ایک بکریاں چراتا ہے اور دوسرا اقلیدس اور الجبرے کی شکلوں اور اصول کو ثابت کرتا ہے وجہ یہ ہے کہ ایک نے قوت ذہنی کو معطل کر دیا، اور دوسرے نے اس کو ریاضی کی تعلیم و تعلم میں بڑھایا۔

ایک اور مثال سنو۔ جس قدر کوئی انسان کسی خاص فن یا اصول میں زیادہ فکر و غور کرتا ہے اسی قدر اس میں مہارت کرتے کرتے یکتائی کا رتبہ پاتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک زمانہ میں کہا جا سکتا ہے کہ فلاں اس وقت اس درجہ کا ادیب ہے کہ اس کی نظیر نہیں ہے۔ فلاں اس قدر ریاضی دان ہے کہ اس کی مثال نہیں۔ اسی طرح اور علوم و فنون کا حال ہے۔
الغرض کوئی شخص مشق یا غور و فکر سے کسی علم و فن میں ایسا برتری کا رتبہ حاصل کر سکتا ہے کہ دوسرے وہاں تک پہنچ نہیں سکتے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ ان کے وجود میں خدا نے ایسی قوت رکھ دی ہے۔ جو استعمال سے اپنی فطرت کو پہنچتی ہے۔ دنیا کی ایجادوں اور علوم کی ترقی کو دیکھو تو ایک عالم حیرت نظر آئیگا۔ یہ سب کچھ ذہنی طاقتوں کو غور اور فکر میں لانے کا نتیجہ ہے:

ان مثالوں سے آپ انکار نہیں کر سکتے۔ کہ نبوت اور رسالت بھی قوتیں ہیں۔ ان قوتوں کی تکمیل کے لئے خدا اپنے خاص بندوں کو مقرر کرتا ہے جو رفتہ رفتہ اس کو مکمل کرتے ہیں اور نبی اور رسول کہلاتے ہیں۔
مثال مذکور میں اگر آپ جاہل بھائی کا انکار فاضل بھائی کی ہندسہ دانی کی نسبت فضول اور بیہودہ خیال کرتے ہیں تو بہتر ہے کہ آپ اپنے انکار کو در بارہ نبوت و رسالت لایعنی و لاطائل سمجھیں۔ کیونکہ جو شخص روحانیت سے ایسا بے خبر ہے جیسا کہ چرواہا ریاضی سے تو وہ کس طرح نبوت اور رسالت کے انکار کا حق رکھتا ہے۔
میں ایک اور مثال دیتا ہوں۔ جس شخص نے چشموں سے پانی ابلتا نہیں دیکھا اگر وہ چشموں کے وجود ہی سے انکار کر دے تو کیا وہ احمق نہیں کہلائے گا۔ اسی طرح جو شخص نبوت اور رسالت کی حقیقت اور علم سے انکار کرتا ہے وہ ان لوگوں کے نزدیک جو انسانی طاقتوں کے کمالات اور اس کی ترقی سے واقف ہیں جاہل اور گمراہ ہے۔

آپ روزمرہ کے جلسوں میں دیکھتے ہیں کہ بعض شاعر اور لیکچرار رفتہ رفتہ اس درجہ کی فصاحت اور بلاغت، اور اسلوب کلام پر پہنچ جاتے ہیں کہ مجلس ان کے ایک ایک مصرع اور ایک ایک فقرہ پر تڑپ اٹھتی ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو پھر یہ بھی سچ ماننا پڑے گا کہ خداوند تعالیٰ اپنے خاص آدمیوں کو فصاحت و بلاغت و استدلال کا یہ درجہ دیتا ہے کہ وہ تمام دنیا کو خدا کی ہستی کا قائل کر دیتے ہیں۔ پس جو شخص ایک لحظہ کے لئے انسان کی روحانی قوتوں پر غور کرتا

ہے وہ نبوت و رسالت سے کبھی انکار نہیں کر سکتا کیونکہ کم سے کم اس کا قائل ہونا پڑتا ہے کہ انسان کے وجود میں علیٰ حسب مراتب بیشمار قوتیں ودیعت ہیں جن کی انتہا نبوت اور رسالت ہے۔

آپ نے دیکھا ہے کہ عدالت کسی بڑے سے بڑے رئیس کی شہادت پر اعتبار نہیں کرتی۔ مگر کسی فقیر کے بیان کو قابل وقعت خیال کرتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس رئیس کا خلق بہت گرا ہوا ہوتا ہے۔ مگر فقیر کی نسبت ہر ایک کا اعتقاد ہے کہ یہ جھوٹ نہیں بولتا۔ اس لئے کہ اس نے راست گوئی میں ایسا ملکہ پیدا کیا ہے کہ اس کی نسبت کبھی وہم و گمان نہیں ہو سکتا کہ یہ جھوٹ بولے گا پس اخلاق حسنہ کا اختیار کرنا اور خصائل رذیلہ سے مجتنب رہنا روحانی طاقت کی ترقی کی ابتدا ہے۔

جس طرح کسی فن میں فاضل ہونے کے لیے اس فن کے مبادی اور اصول کی تعلیم ضروری ہے اسی طرح نبوت اور رسالت کے لیے اخلاق حسنہ کا حاصل کرنا لازمی ہے۔ کیونکہ نبی اور رسول اخلاق اور اوصاف کاملہ کا ایک نمونہ ہوتا ہے خداوند تعالیٰ اس کے لیے پیدائش کے وقت ہی سے ایسے اسباب اور ذرائع پیدا کر دیتا ہے جو نبوت اور رسالت کی تکمیل کے لیے مقدر ہوتے ہیں۔

نبی و رسول۔ صداقت، تحمل۔ بذل و کرم۔ عفو۔ محبت۔ شفقت۔ حلم و حیا وغیرہ اوصاف کا مجموعہ ہوتا ہے اور انہیں اوصاف کے مدارج کے لحاظ سے ایک دوسرے سے نسبتاً برتر سمجھا جاتا ہے تلک الرسل فضلنا بعضھم علی بعض اس پر شاہد ہے حضرت ابراہیم مجاہدہ اور بذل و کرم میں کامل تھے حضرت نوحؑ تکلیفات میں صابر۔ علیٰ ہذا القیاس حضرت اسحاقؑ و یعقوبؑ و ایوبؑ صبر میں حضرت داؤد و سلیمانؑ شکر میں اور حضرت یوسفؑ شکر اور صبر دونوں میں اور حضرت موسیٰؑ معجزات میں اور حضرت زکریاؑ۔ یحییٰؑ۔ عیسیٰؑ۔ الیاسؑ زہد و تقویٰ میں۔ حضرت اسماعیلؑ صداقت میں۔ حضرت یونسؑ تضرع میں مشہور تھے۔ خدا نے ان کے بعد سب کے تمام اوصاف کا مجموعہ ایک ذات اقدس کو عطا کیا۔ جس کے حق میں کہا جاتا ہے۔

حسن یوسفؑ دم عیسیٰ ید بیضا داری آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

انبیاء اور رسل کی سوانح عمری پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ طبقہ اعلیٰ کس طرح اخلاق حسنہ کا اکتساب۔ اور عادات رذیلہ سے اجتناب کرتا ہے اور اس منزل کے بعد انکی زندگی شبہات اور توہمات سے اس طرح مبرا ہوتی ہے جس طرح ان کا دامن عفت خطا اور معصیت سے پاک ہوتا ہے ان کے دنیوی اور دنیاوی مشورے صائب ہوتے ہیں اور جو کچھ وہ کہتے ہیں حقیقت کا ترجمہ ہوتا ہے۔ عقل کی روشنی میں ان کی ذہنی اور روحانی قوتیں الہیات کے اعلیٰ منازل کی سیر کرتی ہیں۔ اس لیے ان کے قیاسات کا نتیجہ بلا شبہ صحیح اور ان کے فکر کا حکم بلا شک مسلم ہوتا ہے۔

حتیٰ کہ وہ خواب میں آنے والے واقعات کو اس طرح دیکھتے ہیں۔ جس طرح ہم بیداری میں کسی چیز کو آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ ان کی آنکھیں خدا کی آنکھیں اور ان کے کان خدا کے کان ہو جاتے ہیں اور پھر وہ بیداری میں خدا کے ارشاد کو اس طرح سنتے ہیں جس طرح ہم ایک دوسرے کی بات چیت سنتے ہیں۔ بایں ہمہ ان کی مثال بارگاہ خداوندی

ہیں ایسی ہے جسطرح بادشاہ کی بارگاہ میں وزراء کی۔ وہ خدا کے تلطف آمیز خطاب سے خوش ہوتے ہیں اور قہرآگین عتاب سے کانپتے ہیں۔ جس قدر ان کی قوتیں تیز ہوتی ہیں اسی قدر انہیں احساس زیادہ ہوتا ہے۔ یہ سب ایک مفہوم اور مدلول لوگوں کو سمجھاتے ہیں اور مختلف محسوسات کی مثالوں میں اپنے مدعا کو بیان کرتے ہیں۔ ان کا طرز بیان تمام سا ایک ہی سا ہوتا ہے۔ ان کے بیان میں اعجاز ان کی تقریر میں اثر ہوتا ہے۔ جس طرح کوئی فوجی افسر پہاڑ کی بلندی پر چڑھ کر دشمن کی فوج کی نقل و حرکت سے اپنی فوج کو آگاہ کرتا ہے۔ اسی طرح رسول اپنی امت کو ایسے امور کی اطلاع دیتا ہے۔ جس پر اس کی امت خود مطلع نہیں ہو سکتی۔

جس طرح کہ فوج کو اپنے افسر کے حالات بیان کردہ پر حق الیقین ہوتا ہے۔ اسی طرح وہ لوگ جو انبیاء کی حقیقت اور عظمت اور فضیلت سے واقف ہوتے ہیں ان کے احکام پر سر تسلیم خم کرتے ہیں۔

انبیا اور رسل تبلیغ احکام میں کوئی اجرت نہیں لیتے۔ بلکہ یہ ان کا ذاتی مقصد ہے کہ وہ شفقت اور تلطف سے لوگوں کو راہ راست پر لائیں اور یہی فطرت الٰہی کا منشا ہے جس کے پورا کرنے کے لئے وہ بھیجے جاتے ہیں۔ جب ان کی نصیحت کارگر نہیں ہوتی تو ان کو بڑے بڑے نشان دیئے جاتے ہیں تاکہ لوگ ان کی صداقت پر ایمان لائیں۔ یہ نشان صرف انہیں لوگوں کے لئے ہیں جو ظاہر بین اور مادہ پرست ہیں ورنہ جو فہم رسا رکھتے ہیں وہ رسل اور انبیا کے اخلاق اور طرز معاشرت اور طریق تمدن سے سمجھ جاتے ہیں کہ یہ مرسل من اللہ ہیں۔

معجزات اور خوارق کا جو لوگ انکار کرتے ہیں وہ جہل مرکب میں مبتلا ہیں اور ان کی جہالت کی یہ وجہ ہے کہ انہوں نے یہ فرض کر لیا ہے کہ ان کے ظاہری حواس اور باطنی قوتیں ہر ایک امر کی کنہ کو پہنچ سکتی ہیں اور انہوں نے یہ بھی سمجھ رکھا ہے کہ ان کا زمانہ زندگی ازل تا ابد کا مجموعہ ہے اور ان کے معلومات ازل اور ابد کے معلومات ہیں۔ حالانکہ یہ جنون ہے۔

ان کو اپنی ذہنی قوت اور احساس ظاہری پر غور کرنا چاہیئے کہ ان کا مبلغ ادراک کہاں تک ہے۔ ہم بعض وقت دور سے دیکھتے ہیں کہ فلاں چیز ہے کہ فلاں چیز ہے جب نزدیک جاتے ہیں تو کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ بسا اوقات ہمارے لئے آوازوں کی تشخیص اس قدر مشکل ہو جاتی ہے کہ ہم کچھ سے کچھ سمجھنے لگ جاتے ہیں ہم بارہا معاملات کی نسبت مشورہ کرتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ اس طریق پر چلنے سے اپنے مقصد پر پہنچ جائیں گے اور ہمیں کسی طرح اپنے مقاصد و مطالب کی کامیابی میں بظاہر شبہ نہیں ہوتا۔ حالانکہ سخت غلطی ہوتی ہے۔ یہ لوگ علم ہیئت کے مسائل کی تحقیقات میں تو زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ہیں مگر اپنے گھر کا حال معلوم نہیں ہوتا۔

تو براوج فلک چہ دانی چیست ۔۔۔ چوں ندانی کہ در سرائے تو کیست

ہمارے پیٹ میں اگر درد ہوتا ہے تو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ کس جگہ اور کیوں ہے۔ جب ہم اپنے بدن کی خبر نہیں رکھتے تو ملاء الاعلےٰ کے کارخانہ قدرت میں کیوں دخل در معقولات دیتے ہیں۔ ان کے ذہن ناقص میں یہ بطلان سمایا ہے

کہ جو کچھ ہوتا ہے۔ اسباب اور ذرائع سے ہوتا ہے اور اسباب اور ذرائع وہی ہیں جن کو خارج میں ہم دیکھتے ہیں مگر وہ یہ نہیں سمجھتے کہ ہم روحانی اسباب اور معلومات پر احاطہ نہیں کر سکتے۔ اگرچہ ٹیوب ویل نکلنے کے کنوئیں کو دیکھ کر یہ تسلیم کرتے ہیں کہ پانی اپنے دباؤ سے قدرتی چشمہ کی طرح جاری ہو سکتا ہے لیکن یہ نہیں مانتے کہ کوئی پیغمبر پہاڑ سے عصا مار کر چشمہ جاری کر سکتا ہے۔ زمانہ کے مختلف حادثات کی تواریخ کے پڑھنے سے اس امکان کے تو قائل ہو جاتے ہیں کہ کسی سیارے کا کوئی ریزہ زمین پر گرے۔ مگر یہ تسلیم کرنے میں تامل ہے کہ چاند دو ٹکڑے ہو جائے۔

ایروپلین کی فلک پیمائی اور باد رفتاری تو تسلیم کرتے ہیں مگر تخت سلیمانی کی پرواز کو نہیں مانتے۔

اس سے تو انکار نہیں کر سکتے کہ انسان قطرہ آب سے پیدا ہوتا ہے۔ مگر اس سے انکار ہے کہ حشر اجساد ہو گا۔

وہ کہتے ہیں جب انسان کا وجود مرنے کے بعد مٹی یا خاکستر ہو جاتا ہے اور ہوا مٹی کے ریزوں کو ایسا منتشر کر دیتی ہے کہ وہ تمام روئے زمین پر پھیل جاتے ہیں اور کچھ دریاؤں اور سمندروں میں تہ نشین ہو جاتے ہیں تو ان سب ذرات کا جمع ہونا کس طرح ممکن ہے۔ مگر وہ نہیں دیکھتے کہ جو غذا ہم کھاتے ہیں جس سے مادہ تولید پیدا ہوتا ہے وہ بھی تمام روئے زمین سے ریزہ ریزہ جمع کر کے مہیا کیا جاتا ہے۔ کیونکہ غذا مٹی سے پیدا ہوتی ہے اور مٹی کے ذرے مختلف اور دور دراز مقامات سے آکر جمع ہوتے ہیں۔ پس جب ذروں سے انسان کی پیدائش کا امکان ثابت ہے تو حشر اجساد محال کیوں ہے۔

ہمارے حواس ایک حد مقررہ تک کام کرتے ہیں اور اس سے غیر محدود کام لینا چاہتے ہیں۔ میں تھوڑا سا نظام شمسی کا حال لکھتا ہوں۔ جس سے نظام شمسی کی وسعت کے مقابلہ میں انسانی فہم و فراست کی کم مائگی ظاہر ہو گی ؎ چہ نسبت خاک را با عالم پاک

زمین اور آفتاب میں فاصلہ ۹ کروڑ تیس لاکھ میل ہے۔

سنٹوری سیارے اور آفتاب کا فاصلہ (بمقابلہ زمین و آفتاب) دو لاکھ دس ہزار گنا زیادہ ہے اور اس کی روشنی تین سال میں ہم تک پہنچتی ہے۔

یعنی اگر ہم فاصلہ زمین و آفتاب کو ایک فرض کریں تو فاصلہ سنٹوری اور آفتاب کا دو لاکھ دس ہزار ہو گا اور جو شعاع اس کی ہم دیکھتے ہیں اس نے تین سال کے عرصہ میں زمین اور سنٹوری کا درمیانی فاصلہ طے کیا ہے۔

اسی طرح سگنی (جس کو عربی میں ذنب کہتے ہیں) کا فاصلہ آفتاب سے تین لاکھ بیاسی ہزار گنا ہے اور اس کی روشنی ۶ سال میں پہنچتی ہے۔

ویگا کا فاصلہ سات لاکھ ترانوے ہزار گنا ہے اور اس کی روشنی ۱۲ سال میں زمین تک آتی ہے۔

سیریس جس کو عربی میں کلب کہتے ہیں اس کا فاصلہ آفتاب سے تیرہ لاکھ پچھتر ہزار گنا ہے اور اس کی روشنی ۲۱ سال میں زمین تک پہنچتی ہے۔

آرکٹس کا فاصلہ آفتاب سے سوا لاکھ چوبیس ہزار گنا ہے۔ اور اس کی روشنی ۲۶ سال میں زمین تک پہنچتی ہے۔ علی ہذا القیاس پولرس قطب شمالی کا ۱۹ لاکھ چھتیس ہزار گنا ہے اور ۴۱ سال میں اس کی روشنی زمین تک آتی ہے۔

ہیلی کامٹ: (دمدار سیارہ) تم نے سب سے پہلے ۱۹ اپریل ۱۹۱۰ء کو دیکھا تھا۔ وہ اپنا دورہ ۷۶ سال میں پورا کر کے ۱۹۸۶ء میں پھر نظر آئے گا۔

یہ سیارے وہ ہیں جو ہزاروں سال کی مدوجہد سے دریافت کئے گئے ہیں لیکن اس سے اوپر ثوابت کا حال نہیں کھلا اور نہ یہ معلوم ہے کہ اس میں کون آباد ہے۔ وما یعلم جنود ربك الا هو کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت این معمارا۔ پس جب ہماری ذہنی اور ظاہری حواس کی کمزوری اور زمین و آسمان کی وسعت کا یہ حال ہے تو پھر یہ کہنا کہ جس چیز کو ہم نہیں دیکھتے یا اس کے اسباب اور علل سے بے خبر ہیں اس کا وجود ہی نہیں ہے۔ غلط ہے کیونکہ محدود غیر محدود کا احاطہ کر ہی نہیں سکتا۔

پس اس کمزوری اور ناتوانی حواس کی حالت میں ضرور تھا کہ خدا ہم کو اپنے خاص بندوں کے ذریعہ اپنی ذات سے آگاہ اور اپنی عظمت اور جبروت کو آشکار کرتا۔ اس نے اس وجہ سے کہ ہم بندگان خاص (رسل و انبیاء) کی نسبت بدگمانی نہ کریں۔ ان کو اعلیٰ درجہ کے اخلاق جمیلہ اور اعمال حسنہ دیئے۔ جس سے ایک صحیح فطرت کا انسان یقین کرتا ہے کہ وہ خاص طاقت رکھتے ہیں اور ایسے خاص طاقت کے پاک نفوس مرسل من اللہ ہوتے ہیں۔

احکام الٰہی اور اس کی جزئیات کی تفصیل کے لئے قدرت کا یہ منشاء تھا کہ وہ انبیاء اور رسل کو بھیجے اور اپنی حجت کو پورا کرے۔

فطرت نے جس طرح نظام دنیا کی رفتہ رفتہ تکمیل کی اسی طرح نظام دین کو بھی بالتدریج مکمل کیا کیونکہ ایسا کرنا فطرت کا خاصہ تھا۔ فطرت نے پہلے ایک کو بھیجا کہ وہ مکان کا بنیادی پتھر رکھے۔ پھر دوسرے کو بھیجا کہ وہ دیواروں کو اٹھائے پھر تیسرے کو بھیجا کہ وہ چھت ڈالے۔ پھر چوتھے کو بھیجا کہ وہ پلستر کرے۔ علی ہذا القیاس یکے بعد دیگرے آتے گئے اور اضافہ کرتے رہے مگر اخیر میں ایک بھیجا گیا۔ جس نے باقی حصہ مکان کو مکمل کیا اور مکان کی پیشانی پر سنگ مرمر کا کتبہ لگا کر بانی کا نام اور سال تعمیر لکھ دیا اس آنے والے نے مکان کو خس و خاشاک سے پاک اور صاف کر کے اس میں اعلیٰ سے اعلیٰ سامان کو باقرینہ رکھ دیا تو اب کہا جائے گا کہ اس اخیر آنے والے نے مکان کو مکمل اور مختتم کر دیا اور ان فروگذاشتوں کو پورا کیا جو پہلے چھوڑ گئے تھے اسی طرح نبیوں اور رسولوں کا حال ہے۔ انہوں نے رفتہ رفتہ یکے بعد دیگرے اصول دین اور شرائع کو مکمل کیا اور سب سے بعد آنے والے نے شریعت کو بہمہ وجوہ مرتب اور مختتم کیا اور ملت کے جہانگیر اور گیتی ستان علم پر الیوم اکملت لکم دینکم کا پھریرا لگا دیا۔ جس کے صلہ میں فطرت الٰہی نے خاتم النبیین کا سہرہ اس کے سر پر باندھا پیغمبروں، شریعتوں اور اصول کے مقابلہ کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ جب شرائع اور اصول مکمل ہو جاتے ہیں تو پھر کسی اور نبی کی ضرورت نہیں رہتی۔ اگر ضرورت ہوتی ہے تو صرف ایسے بندوں

کی ہوتی ہے جو اس کی شریعت کی وقتاً فوقتاً توضیح اور تجدید کریں۔ اس لئے سب سے اخیر آنیوالا خاتم النبیین کے لقب کا مستحق ہے۔ جس طرح ایک سکول کے تعلیم یافتوں کا بالعموم ایک ہی مذاق ہوتا ہے اسی طرح اس طبقہ علیا انبیاء و رسل کے اصول بھی یکساں ہوا کرتے ہیں۔ ایک کے بعد دوسرے آنیوالے کو یہی ہدایت ہوتی ہے کہ وہ پہلے کے قائم کردہ اصول کی توضیح کرے اور ان پر اضافہ کرے جس کے لئے وہ مامور ہے یا خداوند تعالیٰ اس کے ذریعہ کسی آیت کو منسوخ کر کے اس کی جگہ بحالات زمانہ دوسری آیت کو بھیجے۔ اس اصول فطرت نے سب سے اخیر والے کو حکم دیا۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ

ترجمہ: "یہ گروہ پیغمبران وہ ہیں۔ جن کو خدا نے ہدایت دی۔ آپ بھی انکے اصول اور شرائع کی اقتدا کریں"

جس طرح انبیا کو دوسرے انبیا کے اصول اور شرائع کی پیروی واجب ہے۔ اسی طرح ہر ایک فرد امت کو پیمبر وقت کی پیروی لازم ہے۔ چونکہ پیمبر کے عادات اور خصائل اور روزمرہ کی زندگی خود عامۃ الناس کے لئے ایک ہدایت ہے۔ اس لئے ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم ہر ایک پیغمبر کی معاشرت اور تمدن کے حالات پڑھیں اور ان حالات سے خود اپنی ذات میں وہ صفتیں پیدا کریں۔ جن سے کہ وہ ممتاز تھے۔

پس میں افضل الرسل اور خاتم النبیین حضور علیہ السلام کے اخلاق، معاشرت اور تمدن کا ایک نمونہ پیش کرتا ہوں اور اس سے بہتر موعظت اور تعلیم نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ خاتم النبیین منجمع صفات الانبیاء والمرسلین ہیں اور آپ امت کے لئے اسوہ حسنہ (بہترین مثالی انسان ہیں) قرآن میں ہے لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ لمن کان یرجوا اللہ والیوم الاٰخر وذکر اللہ کثیراً ۝ ترجمہ: تم میں سے جو اللہ اور آخرت پر امید رکھتے ہیں اور خدا کو بہت یاد کرتے ہیں ان کے لئے حضور علیہ السلام بہترین نمونہ اخلاق ہیں۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ سے حضور علیہ السلام کے اخلاق کی تفصیل جب دریافت کی گئی تو انہوں نے فرمایا: خلقہ القرآن یغضب بغضبہ ویرضٰی برضائہ ترجمہ "آپ کا خلق قرآن ہے۔ جس قدر قرآن میں اوصاف حمیدہ بیان کئے گئے ہیں آپ ان سے متصف اور جس قدر خصائل ذمیمہ اس میں مذکور ہیں، مجتنب تھے"

پس حضور علیہ السلام کے جمیع اخلاق پر اطلاع پانے کے لئے قرآن کافی ہے۔ گویا حضور علیہ السلام کے اخلاق کی تفسیر اور تفصیل ہے اور جب تک اخلاق کی تفاصیل سے آگاہی نہ ہو۔ قوت اخلاقیہ حاصل نہیں ہو سکتی۔ اسلئے قرآن کی تلاوت واجب ہے۔

علماء کا اختلاف ہے کہ اخلاق جبلی ہیں یا کسبی۔ صحیح خیال یہ ہے کہ تمام اخلاق جبلی ہیں اور ریاضت و مجاہدہ سے ان کی کیفیت اور کمیت میں ترقی ہوتی ہے۔ اس لئے قرآن شریف کی تلاوت سے رفتہ رفتہ انسان کو ایک ملکہ حاصل ہوتا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان سے کبھی افعال مذمومہ سرزد نہیں ہوتے۔

قرآن میں حضور علیہ السلام کے شان میں آیا ہے۔ وکان بالمؤمنین رحیماً وانک لعلٰی خلقٍ عظیمٍ

وبالمومنین رؤف رحیم وغیرہ وغیرہ مختلف آیات ہیں۔ صحیح حدیثوں سے جو حضور علیہ السلام کے خلق کے بیان میں آئی ہیں۔ کچھ انتخاب پیش کرتا ہوں۔

آپ بہت مجاہد تھے۔ حتیٰ کہ نفل پڑھتے پڑھتے آپ کے پاؤں پر ورم ہو جاتا۔ خلوت میں یاد خدا اور جلوت میں تبلیغ احکام فرماتے۔ کوئی سائل آپ کے در دولت سے محروم نہ جاتا اگر کچھ پاس نہ ہوتا تو فرماتے کہ میرے نام قرض لیکر حاجت پوری کرو۔ میں ادا کر دوں گا۔ آپ اچھے برے سے پوری التفات سے پیش آتے بلکہ بروں کیساتھ زیادہ التفات کرتے تاکہ وہ راہ ہدایت پر آئیں نہ کسی کی غیبت و مذمت کرتے، نہ عیب جوئی۔ آپ نہ تو کسی کے ساتھ جھگڑا کرتے۔ نہ مطلب کے بغیر کوئی بات کہتے۔ بار بار سوال کرنے سے ناراض نہ ہوتے۔ ہر وقت خندہ رو اور کشادہ پیشانی رہتے اور بے جا خوشامد سے نفرت کرتے۔ آپ سوائے اس کے کہ کوئی ہتک دین کرے۔ کسی سے انتقام لینے کی کوشش نہ کرتے اور نہ کسی کے درپے آزار ہوتے۔ آپ اس شخص سے جو سختی سے پیش آتا نرمی سے گفتگو فرماتے۔ ہر ایک کی بات کو غور سے سنتے اور بیچ میں دخل نہ دیتے۔ ہاں اگر کوئی خلاف شرع کہتا تو اس کو روک دیتے یا مجلس سے اٹھا دیتے۔ آپ بہت سخی تھے۔ خصوصاً ماہ رمضان میں جو کچھ پاس ہوتا فقرا کو دیدیتے آپ بادشاہوں کی طرح بخشش کرتے اور فقیروں کی طرح رہتے۔ یہاں تک کہ کئی روز آپ کے ہاں کھانا نہ پکتا اور پیٹ پر پتھر باندھتے۔ جب وحی آتا تو شکرانہ میں جو کچھ پاس ہوتا مساکین کو دیدیتے۔ آپ کسی چیز کو بطور ذخیرہ آئندہ کے لئے جمع نہ رکھتے۔ جب آپ کوئی بات کرتے تو اصحاب آپ کے حضور میں سب کے سب سرنگوں رہتے اور کسی دوسری طرف التفات نہ کرتے۔ آپ بچوں سے دلجوئی اور عورتوں کے ساتھ رفق و تلطف سے بات چیت کرتے السلام علیکم کہنے میں مبادرت فرماتے۔

آپ حوادث میں ثابت قدم اور دنیا سے مستغنی رہتے۔ آپ ہر ایک کام میں خدا پر بھروسہ رکھتے۔ آپ لوگوں کے مقدمات کو انصاف و عدل سے فیصلہ فرماتے آپ ریا اور سمعت سے پاک تھے۔ آپ برقعہ پوش کنواری عورت سے زیادہ حیا مند تھے۔ اگر کسی مکروہ چیز کا ذکر آپ کے سامنے ہوتا تو کراہت کے آثار چہرہ مبارک پر ظاہر ہوتے۔

آپ حد درجہ متواضع۔ حلیم۔ متقی۔ رحیم۔ صابر اور شاکر تھے۔ آپ کے اوصاف کا بیان کرنا احاطہ طاقت بشری سے باہر ہے جسکی تعریف خدا نے خود کی ہو۔ اس کی تعریف کوئی کس طرح اور کہاں تک کر سکتا ہے۔

ارى كل مدح فى النبى مقصرا ‏ وان بالغ المثنى عليه واكثر

اذا الله اثنى بالذى هو اهله ‏ عليه فما مقدار ما يمدح الورى

ترجمہ: میں ہر ایک مدح کو خواہ ثناخواں کتنا ہی مبالغہ کرے یا کثرت سے بیان کرے۔ حضور علیہ السلام کے شان سے کم پاتا ہوں۔

جب خدا آپ کی تعریف ان الفاظ سے کرتا ہے جس کے آپ اہل ہیں تو اس کے مقابلہ میں خلق خدا کی تعریفی الفاظ کی کیا قدر و قیمت ہو سکتی ہے۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلَٰكِن رَّسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں البتہ اللہ کے رسول ہیں اور خاتم النبیین ہیں۔

(الاحزاب: ۴۰)



رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

مظہرِ ختمِ نبوّت

رسولِ اکرمؐ بہ حیثیت مظہرِ ختمِ نبوّت

چیف جسٹس شیخ آفتاب حسین

قرآن کریم کی یہ آیت کریمہ:۔

"ماکان محمدٌ أبا أحد من رجالکم ولکن رسول الله وخاتم النبیین"

اس بات کا بدیہی ثبوت ہے کہ محمد رسول اللہ کی ذات گرامی سے تکمیل رسالت و نبوت ہو چکی ہے۔ اور آئندہ کسی مرسل، رسول یا نبی۔ تشریعی یا غیر تشریعی کی آمد و بعثت کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہو چکا ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہے۔

"الیوم أکملت لکم دینکم وأتممت علیکم نعمتی" (ق - ۵ - ۳)

اس آیت کریمہ کی تشریح اگر اس حوالہ سے کی جائے کہ اسلام ایک آفاقی دین ہے جس کا مخاطب کوئی خاص قبیلہ، قوم یا ملک نہیں ہے تو "لکم دینکم" و "علیکم" کی ضمائر کی مخاطب یوم قیامت تک کی کل مخلوق ہے نہ کہ صرف مسلمان کیونکہ فرمانِ الٰہی ہے ۔۔۔

"وما أرسلناک إلا کافة للناس بشیراً ونذیراً ولکن أکثر الناس لا یعلمون"

(ق ۳۴ — ۲۸)

ترجمہ:۔ "اور (اے نبی) ہم نے آپ کو سب لوگوں کے لئے بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔ لیکن اکثر آدمی (اس بات کو) نہیں جانتے"

اگر اس آیت کریمہ کی وسعت کو مدنظر رکھا جائے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ "اکملت لکم دینکم" بشارت ہے تکمیل دینِ اسلام کی ساری دنیا کے لیئے اس طرح اگر رسول اللہ خاتم النبیین ہیں تو قرآن خاتم الکتب الٰہیہ اور اسلام خاتم الادیان ہے۔

اخی مکرم و محترم جسٹس پیر کرم شاہ صاحب نے ضیاء القرآن میں آیت "والذین یؤمنون بما أنزل إلیک وما أنزل من قبلک" (ق ۲ — ۴) (اور وہ جو ایمان لاتے ہیں۔ اس پر جو اتارا گیا ہے۔ آپ پر اور جو اتارا گیا ہے آپ سے پہلے) کی تفسیر میں ایک عمدہ نکتہ بیان فرمایا ہے کہ اس آیت میں آئندہ کی وحی کا ذکر نہیں ہے "اگر نبوت کا سلسلہ جاری ہوتا تو حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی وحی نازل ہوتی، اور اس پر ایمان لانا ضروری ہوتا اور اس صورت میں یہ آیت یوں ہوتی "ما أنزل من قبلکم وما ینزل من بعد" لیکن میں اس سلسلہ میں یہ کہنے کی جسارت کروں گا کہ سورۃ البقرہ کی اس آیت کی یہ تعبیر مرہونِ منت ہے اس قرآنی اعلان کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں۔ اور ان کی شریعت خاتم الشرائع ہے۔ ورنہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک وحی الٰہی کے تسلسل کا تقاضا ہی یہ ہے کہ ہر آنے والا نبی سابقہ نبیوں اور ان کی شرائع کی تصدیق کرے

حدیث میں بھی خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کی عمارت میں خود کو آخری اینٹ سے تشبیہ دی ہے جس سے عمارت کی تکمیل ہو گئی۔ جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں یہ بھی ہے کہ مجھ پر نبوت کا سلسلہ ختم کر دیا گیا ہے (مسلم کتاب الفضائل)

یہ تو ہے اس بات میں قرآن و حدیث کی شہادت، جس سے بہتر شہادت ممکن نہیں ہو سکتی، اور جس کے بعد مسئلہ کے ثبوت کے لئے کسی شہادت کی ضرورت نہیں رہتی۔ لیکن کوتاہ علمی کے باوجود میری یہ کوشش ہے کہ اس اجمال کی تفصیل قرآن و حدیث کی روشنی میں بیان کروں، کہ ہزاروں سال نبوت کا سلسلہ جاری رہنے کے بعد قرآنی فلسفہ کے مطابق اس کے اختتام کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی اس کا مختصر جواب تو اصول ارتقاء ہے یعنی سوسائٹی کی ارتقائی حالت جس میں اولاً ـ یکے بعد دیگرے انبیاء کی بعثت کی ضرورت تھی اور بالآخر انسانیت عقلی نشو و نما اور بلوغ کی اس منزل تک پہنچ گئی جب وہ وحی کی کامل ترین صورت کے تحمل کے قابل ہو گئی جس کے بعد ضرورت صرف ایسے قوانین کی تھی جو دائمی ہوں یا ضرورت ایسے رہنما اصولوں کی تھی۔ جن کی بنا پر ہمیشہ زمانہ کے مطابق قانون وضع کئے جائیں۔

اس سلسلہ میں اگر مذاہب سابقہ و اسلام کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو تکمیل دین کی ضرورت کی کماحقہ وضاحت ہو سکتی ہے۔ اس کی اولین مثال انبیاء سابقین کی تبلیغ میں معجزوں پر انحصار ہے جس کی کوئی نظیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق تبلیغ میں نہیں ملتی۔ انبیاء سابقین کو ترغیب و ترہیب کے لئے تبلیغ کے ساتھ معجزات بطور لازمۂ نبوت عطا کئے گئے۔ چنانچہ جب اصحاب الثمود نے نشانی کا مطالبہ کیا تو ان کو اونٹنی دی گئی۔ حضرت یوسف کو تاویل الاحادیث اور خواب کی تعبیر کا علم دیا گیا۔ حضرت موسیٰ کو عصا اور ید بیضاء کے معجزات دیئے گئے۔ بعد کو قوم فرعون پہ ٹڈیاں اور چچڑیاں اور مینڈکیں اور خون کا عذاب بھیجا گیا (ق ۷ - ۱۳۳)

بنی اسرائیل کو سرکشی اور نافرمانی سے روکنے کے لئے متعدد معجزے بروئے کار آئے۔ حضرت عیسیٰ نے مردوں کو زندہ کیا۔ مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو مرض سے پاک کیا۔ مٹی کے بنائے ہوئے پرندے کو جاندار بنایا (ق ۳ - ۴۹)

لیکن باوجود اس کے موجودہ اناجیل کے مطابق جب ان کو گرفتار کیا گیا تو ان کے قریبی حواری ان کے جاننے سے منکر ہو گئے۔

برعکس اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس بات میں منفرد ہیں کہ انہوں نے ترغیب و ترہیب کے لئے معجزہ کا سہارا نہ لیا کفار نے بار بار اعتراض کیا کہ ان پر کوئی نشانی کیوں نہ اتاری گئی۔ (ق ۱۷ :- ۹۰ تا ۹۳)

تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ بے شک وہ اس پر قادر ہے۔ (ق ۶ - ۳۷)

لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا (اے نبیؐ) فرما دیجئے کہ میں تو بس اسی پر چلتا ہوں جو میرے پروردگار کی طرف سے مجھ پر وحی کی جاتی ہے یہ (وحی یا قرآن) تمہارے پروردگار کی طرف سے سمجھنے کی باتیں ہیں۔ اور ایمانداروں کے لئے ہدایت و رحمت جب قرآن تلاوت کیا جائے تو اسے کان لگا کر غور سے اور خاموشی سے سنو۔ (ق ۷ - ۲۰۴)

نیز حکم دیا کہ (اے نبی) فرما دیجئے کہ علم غیب تو اللہ ہی کے پاس ہے۔ (ق ۱۰ - ۲۰)

آپ تو ڈرانے والے ہیں۔ (ق ۱۳ - ۷)

آپ کہہ دیجئے کہ نشانیاں تو بس اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہیں۔ میں تو صرف کھول کر ڈرانے والا ہوں۔ (ق ۲۹ - ۵۰)

اور کیا انہیں یہ نشانی کافی نہیں کہ ہم نے آپ پر کتاب اتاری جو ان پر پڑھی جاتی ہے۔ بے شک جو لوگ ایمان لاتے ہیں۔ ان کے لئے اس میں رحمت اور نصیحت ہے۔ (ق ۲۹ - ۵۱ تا ۵۲)

واضح طور پر ان آیات کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم ہی ایک ایسی نشانی اور ایسا معجزہ ہے۔ جس کے علاوہ کسی اور نشانی کی

ضرورت نہیں رہتی۔

یہی نہیں بلکہ اس کی وجہ بھی بتائی گئی کہ مزید کوئی نشانی اب کیوں نہیں بھیجی گئی۔ وجہ یہ تھی کہ پہلے زمانہ کے کفار معجزوں کو جادو سے تعبیر کرتے اور باوجود معجزہ اور خرق عادت دیکھنے کے پیغمبروں کی تکذیب کرتے اور ان کو قتل کرتے تھے

(ق ۳ - ۱۸۲، تا ۱۸۴)

اس لئے اگر نشانی بھیج بھی دی جائے جب بھی وہ ایمان نہ لائیں گے (ق - ۶ - ۲۵)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے نشانیاں اس لئے بند کیں کہ پہلے لوگ ان کی تکذیب کرتے تھے (ق ۱۷ - ۵۹)

یہ تو ظاہر ہے کہ نشانیاں وہ لوگ مانگ سکتے ہیں جو قرآن میں شک کرتے ہوں۔ چنانچہ اس لئے اللہ تعالیٰ نے تنبیہاً فرمایا کہ یہ قرآن ایسا نہیں ہے کہ خدا کے سوا کوئی اس کو اپنی طرف سے بنا لائے۔ یہ رب العالمین کی طرف سے نازل ہوا ہے۔

(ق ۱۰ - ۳۷)

اس دعوے کا اس سے بہتر کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ شک کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے چیلنج دیا کہ اگر وہ کہتے ہیں کہ یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے بنایا تو وہ اس جیسی دس سورتیں بنا کر دکھا دیں۔ (ق ۱۱ - ۱۳)

بلکہ ایک ہی سورت بنا کر دکھا دیں (ق ۱۰ - ۳۸)

یا ایسا کلام تو بنائیں (ق ۱۷ - ۳۸) (ق ۵۲ - ۳۴)

یہ دعوے قرآن کے اعجاز بلکہ اس کے معجزہ ہونے کا ثبوت ہیں۔ کیونکہ معجزہ تو وہ ہے جس سے انسان عاجز ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہم نے قرآن میں سب باتیں طرح طرح سے بیان کر دی ہیں۔ مگر اکثر لوگوں نے انکار کرنے کے سوا قبول نہیں کیا۔

(ق ۱۷ - ۸۹)

یہ ارشاد اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن پر اگر غور کیا جائے اور اس کے دلائل میں تدبر کیا جائے تو کوئی شخص اس کو قبول کرنے سے انکار نہیں کر سکتا۔

ان آیات سے جو نتیجہ برآمد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ معجزہ کی نشانیوں کو ذریعہ تبلیغ بنانے کا وقت گزر گیا۔ آئندہ کے لئے ایمان کی کسوٹی علم قرآن استعمال عقل اور تدبر فی القرآن ہیں۔

یہاں اس بات کی وضاحت کر دینا ضروری ہے کہ ان آیاتِ قرآنی سے یہ لازم نہیں آتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے معجزہ پر قادر نہیں فرمایا تھا۔ حبیب خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ایسی بات سوچنا بھی غلط ہے۔ کفار تو مختلف قسم کے مطالبے کرتے تھے۔ جو ان کی بدنیتی کی دلیل تھی۔ کبھی کہتے پانی کا فوارہ پیدا کر دو کہ زمین سے پانی ابلتا ہوا ہو۔ (ق ۱۷ - ۸۰)

کبھی کھجوروں اور انگوروں کے ایسے باغ کا مطالبہ کرتے جس کے درمیان دریا بہتا ہو (ق ۱۷ - ۹۱)

کبھی کہتے کہ آسمان ٹکڑے ٹکڑے کر کے لے آؤ یا خدا اور فرشتوں کو ہمارے روبرو کر دو۔

(ق ۱۷ - ۹۲)

کبھی کہتے کہ آپ کے پاس سونے کا گھر ہو، آپ آسمان پر چڑھ جائیں اور ایک مکمل کتاب لے آئیں جو ہم پڑھ لیں۔
(ق ۱۷ - ۹۳)

کبھی قربانی کے گوشت کو جلانے والی آگ مانگتے۔ یہ مہمل مطالبات مقصد الٰہیہ کی نفی کرتے ہیں۔ کیونکہ منشاء ایزدی تو یہ تھا کہ قرآن کریم کے دلائل سے بھٹکے ہوئے لوگوں کو روشنی دکھائی جائے۔ چونکہ قرآن کا دین ہمیشگی کا اور رہتی دنیا تک قائم رہنے والا دین ہے۔ اس لیے اس کی بنیاد دلائل پر رکھی گئی۔ تاکہ ہر دور میں لوگ اس کی حقانیت کے قائل رہیں اور دولت ایمان سے مالا مال ہوتے رہیں۔ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معجزوں کو ترغیب و ترہیب کے لئے استعمال نہیں کیا۔ ورنہ حضور غلامانِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالےٰ خرقِ عادت پر قادر فرماتے رہے ہیں۔ تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر قادر نہ ہوں۔ احادیث نبویؐ صلی اللہ علیہ وسلم میں اس قدرت کی بہت مثالیں ملتی ہیں۔

یہ بات قابلِ غور ہے کہ اگر معجزہ یا خرق عادت کی تکذیب مقصود ہو تو اس کو جادو، یا نظر بندی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے لیکن دلیل کا رد تو اس قسم کی سوقیانہ باتوں سے ممکن نہیں ضروری ہے کہ اس کے رد کے لیے یا دلیل لائی جائے۔ یا بصورت عجز ایمان لے آیا جائے۔ چنانچہ قرآن کریم نے کفار و مشرکین کے ہر اعتراض کا جواب دیا۔ اور اس سلسلہ میں کسی اخفا کی ضرورت نہ سمجھی۔ لیکن قبل اس کے کہ ان دلائل کا خلاصہ پیش کیا جائے۔ پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے متعلق اور ان کے پیغام کی صداقت کے متعلق قرآن کی شہادت اور دلائل پیش کرنا ضروری ہے۔

ارشاد باری تعالےٰ ہے کہ آپؐ نے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھی اور نہ اپنے ہاتھ سے کچھ تحریر فرمایا
(ق ۲۹ - ۴۸)

نہ آپؐ نے کسی اور کی پرستش کی۔ (ق ۱۰۹ - ۴)

نہ آپؐ بہکے اور نہ بے راہ ہوئے۔ (ق ۴۳ - ۲)

نہ آپؐ مجنون ہیں (ق ۷ - ۱۸۳)

۳۴ - ۴۶ /// ۵۲ - ۲۹ /// ۶۸ - ۲ /// ۸۱ - ۲۲

نہ کاہن ہیں (ق ۵۲ - ۲۹)

نہ آپ شعر کہنا جانتے ہیں اور نہ وہ ان کے شایان ہے (ق ۳۶ - ۶۹)

بلکہ آپ تو خلق عظیم پر پیدا ہوئے

ان سب شہادتوں سے جو دلیل مرتب ہوتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ خود قرآن ایک معجزہ ہے۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ جو نبی نہ پڑھتا ہے نہ شاعری کی قافیہ بندی کرتا ہے۔ ایسی زبردست بے نظیر کتاب مرتب کر سکے۔ علاوہ ازیں بعثت سے قبل بھی کفار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی امانت، صداقت، بت پرستی اور ہر قسم کی برائیوں اور گناہوں سے بیزاری کے خود گواہ ہیں۔ پھر وہ ان کو کیونکر جھٹلا سکتے ہیں۔ اسی لیے بحیثیت حاصل الامران تفصیلی دلائل کا اجمال اس پر فرمایا۔

"قل لو شاء الله ما تلوته عليكم ولا ادراكم به فقد لبثت فيكم عمراً من قبله افلا تعقلون"۔

"کہہ دو اگر اللہ چاہتا تو میں نہ پڑھتا۔ اس کو تمہارے سامنے اور نہ اللہ تمہیں خبر کرتا۔ اس کی کیونکہ میں رہ چکا ہوں۔ تم میں ایک عمر اس سے پہلے کیا تم نہیں سوچتے"۔

(ق ۱۰ — ۱۶)

اس آیت کریمہ کی تفسیر مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ میں سنیئے جو اس دلیل کے قوی ترین اور لاجواب ہونے کا ثبوت ہے۔

"یعنی جو خدا چاہتا ہے۔ وہی میں تمہارے سامنے پڑھتا ہوں اور جتنا وہ چاہتا ہے۔ میرے ذریعے سے تم کو خبردار کرتا ہے۔ اگر وہ اس کے خلاف چاہتا تو میری کیا طاقت تھی کہ خود اپنی طرف سے ایک کلام بنا کر اس کی طرف منسوب کر گزرے۔ اس قدر طویل مدت میں تم کو میرے حالات کے متعلق ہر قسم کا تجربہ ہو چکا ہے۔ اخلاق و عفاف، امانت و دیانت، وعدہ، اخلاق حسنہ میں ضرب المثل رہے۔ میرا امی ہونا اور کسی ظاہری علم کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہ کرنا ایک معروف و مسلم واقعہ ہے۔ پھر چالیس برس تک جس نے نہ تو کوئی قصہ لکھا ہو نہ مشاعروں میں شریک ہوا ہو، نہ کتاب کھولی ہو، نہ قلم ہاتھ میں لیا ہو، نہ کسی درس گاہ میں بیٹھا ہو، دفعتاً ایسا کلام بنا لائے جو اپنی فصاحت و بلاغت، شوکت و جزالت جدت اسلوب اور سلاست و روانی سے جن و انس کو عاجز کر دے۔ اس کے علوم و حقائق کے سامنے تمام دنیا کے معارف ماند پڑ جائیں۔ ایسا مکمل اور عالمگیر قانونِ ہدایت نوعِ انسانی کے ہاتھوں میں پہنچائے جس کے آگے سب پچھلے قانون ردی ہو جائیں۔ بڑی بڑی قوموں اور ملکوں کے مردہ قالب میں روح تازہ پھونک کر ابدی حیات اور نئی زندگی کا سامان بہم پہنچائے۔ یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آسکتی ہے۔ تم کو سوچنا چاہیئے کہ جس پاک سرشت انسان نے چالیس برس تک کسی انسان پر جھوٹ نہ لگایا ہو۔ وہ ایک دم ایسی جسارت کر سکتا ہے کہ معاذ اللہ خداوند قدوس پر جھوٹ باندھے اور افترا کرنے لگے ناچار ماننا پڑے گا۔ جو کلام الٰہی تم کو سناتا ہوں۔ اس کو بنانے یا پہنچانے میں مجھے اصلاً اختیار نہیں خدا جو کچھ چاہتا ہے میری زبان سے تم کو سناتا ہے۔ ایک نقطہ یا زیر و زبر تبدیل کرنے کا کسی مخلوق کو حق حاصل نہیں"۔

کیا قرآن کریم کی اس دلیل کا کوئی جواب ممکن ہے کہ اگر تم رسول اللہ پر نعوذ باللہ کذب کا الزام لگاؤ۔ تو یہ کیونکر سچ ہوگا جب ان کی سابقہ پوری زندگی کا باب تمہارے سامنے کھلا ہوا ہے کہ انہوں نے کبھی جھوٹ نہ بولا۔ تم نے ان کو صادق ہی نہیں بلکہ امین بھی کہا۔ اگر کوئی کہے کہ قرآن کریم رسول اللہ کا اپنا لکھا ہوا ہے تو تم جانتے ہو کہ وہ تو امی ہیں یعنی پڑھے لکھے نہیں۔ انہوں نے تو کبھی شعر بھی نہیں کہا۔ جو قرآن کی جیسی عبارت کے متعلق ظن کر لیا جاتا کہ یہ قدرت ان کو شاعری کی وجہ سے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ تو ایک روشن چراغ ہیں۔ جو اللہ کی طرف بلاتے ہیں۔

(ق ۳۳ — ۴۶)

"اور جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنا رسول بنا کر ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اس دین کو سب دینوں پر غالب کر دے"

(ق ۴۸ — ۲۸)

"وہ اپنی خواہش نفس سے نہیں بولتے۔ بلکہ وہ تو وحی پہنچاتے ہیں۔ جو ان کی طرف بھیجی جاتی ہے"۔

(ق ۵۳ — ۱۰ تا ۴)

وہ صراط مستقیم پر ہیں
(ق ٣٦ -- ٣ تا ٤ // ٩٣ -- ٧)

اور ان کا کام صراط مستقیم کی طرف بلانا ہے ۔۔
(ق ٢٢ -- ٦٧ // ٤٢ -- ٥٢ // ٤٣ -- ٤٣)

ان کا کام اللہ کی آیتیں پڑھنا، تمہیں پاک کرنا، اور ایسی علم و حکمت سکھانا ہے جو تم پہلے سے نہیں جانتے تھے ۔
(ق ٢ -- ١٥١ // ٣ -- ١٦٤ // ٦٢ -- ٢)

یہ بات قابل غور ہے کہ مشرکین بھی موجودہ زمانے کے مستشرقین کی طرح متضاد خیال کے شکار تھے ۔ ایک طرف تو کتاب اللہ کو رسول ﷺ کی تصنیف بتاتے تھے دوسری طرف الزام عائد کرتے تھے کہ رسول اللہ کو قرآن ایک اور شخص سکھاتا ہے ۔ قرآن میں اس کا بھی رد اللہ تعالیٰ نے دلیل سے فرمایا کہ وہ شخص تو عجمی ہے اور یہ قرآن فصیح عربی زبان میں ہے ۔ (ق ١٦ -- ١٠٣)

جس پر اس عجمی شخص کو قدرت نہیں قرآن کریم نے مشرکین کے جملہ خرافات پر مبنی اعتراضات کا ذکر کیا اور ان کو احسن طریقہ سے رد فرمایا ۔ اب ایسے اعتراضات کی کیا وقعت ہو سکتی ہے ۔ "یہ نبی تو فرشتہ نہیں، یہ تو بازاروں میں چلتا ہے ۔ یہ تو کھانا پیتا بھی ہے ۔ قرآن کسی اور پر کیوں نہیں اترا ۔ اس کے پاس امیرانہ ٹھاٹ کیوں نہیں ۔ اس کو موسیٰ جیسے معجزات کیوں نہیں ملے ۔ وغیرہ وغیرہ ۔ لیکن پھر بھی قرآن نے ان کو بطریق احسن دلیل سے رد فرمایا کہ بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بشر ہیں ۔ ان کے کام بشریت کے ہیں لیکن ان کا اسوہ نہ صرف قابل تقلید ہے بلکہ اس کی تقلید لازم ہے ۔ اسی وجہ سے اطیعوا اللہ کے ساتھ اطیعوا الرسول کا حکم قرآن میں متعدد بار نازل ہوا ۔
(ق ٣ -- ٣٢ // ٤ -- ٥٩ // ٥ -- ٩٢ // ٨ -- ١ // ٢٤ -- ٥٤ // ٦٤ -- ١٢)

جس سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منصب صرف شارح کا ہی نہیں بلکہ شارع کا بھی ہے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ کی تقلید کا حکم تقاضا کرتا ہے کہ متبعین سب کچھ وہ کریں جو رسول اللہ نے کیا ہو ۔ اگر تبلیغ مذہب کے لئے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم خرق عادت کو بنیاد بناتے جس پر دوسرے مسلمان قادر نہیں ہو سکتے ۔ تو پھر اسوہ رسول قابل پذیرائی کیونکر ہوتا ۔ نقل و تقلید تو اس چیز کی ہو سکتی ہے جس پر ناقل اور مقلد خود قادر ہو ۔

عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ کے اٹھائے جانے کے بعد یونانی فلسفہ کی سرپرستی اور توہمات سے متاثر ہو کر ایک غلط مذہب کی عمارت قائم کر لی جس میں انہوں نے اللہ کی وحدانیت کو تثلیث سے تعبیر کیا اور تثلیث کو وحدانیت کہا ۔ حضرت آدم بغیر ماں باپ کے پیدا کئے گئے تو ان کو تو معصیت اولی کا مرتکب قرار دیا اور جو ماں سے بغیر باپ پیدا کئے گئے ۔ ان کو اللہ کا بیٹا بنا دیا ۔ اس کی تردید کے لئے فرمایا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ان مثل عیسیٰ عند اللہ کمثل ادم خلقہ من تراب ثم قال لہ کن فیکون ۔

ترجمہ : عیسیٰ کا حال خدا کے نزدیک آدم کا سا ہے کہ اس نے مٹی سے ان کا قالب بنایا پھر فرمایا (انسان) ہو جا تو وہ (انسان) ہو گئے
(ق ٣ -- ٥٩)

عیسائیوں کے الزام کے رد کے لئے اس سے بہتر دلیل ممکن نہیں کہ تم آدم اور عیسیٰ میں کیسے فرق کر سکتے ہو ۔ جبکہ دونوں

بغیر باپ کے پیدا ہونے بلکہ حضرت آدم کی تو ماں بھی نہ تھیں سواس لئے محض پیدائش کے معجزہ سے یہ نتیجہ کیسے نکالا جا سکتا ہے کہ حضرت عیسیٰ خدا کے بیٹے اور اس کی خدائی میں شریک ہیں۔ اس طرح ایک غلط عقیدہ کی تردید بھی دلائل سے کی گئی۔ نہ صرف یہ بلکہ ذات باری تعالیٰ کا وجود بھی دلیل سے ہی ثابت کیا گیا۔ اس طرح قرآن کریم اولین کتاب الٰہی ہے۔ جس میں تبلیغ کی بنیاد دلیل پر رکھی گئی۔

قرآن کریم میں دلائل کا سلسلہ اس قدر وسیع ہے کہ قوانین الٰہیہ کے متعلق بھی قبولیت کے لئے دلائل دیئے گئے۔ عہد نامہ قدیم میں قانون صرف احکام کی شکل میں ہیں۔ قتل نہ کرو۔ زنا نہ کرو۔ چوری نہ کرو۔ کسی پر جھوٹا الزام نہ لگاؤ۔ دوسرے کے مکان، اس کی بیوی یا مویشی یا گدھوں یا کسی ایسی چیز کی جو اس کی ملکیت ہو، خواہش نہ کرو۔ اس کے بعد جو قوانین کی شکل دی گئی۔ اس میں صرف سزاؤں کے احکام ہیں۔ جس میں قصاص، جلا وطنی، غلام بنانا، ضمان، قتل کرنا، رجم کرنا وغیرہ سزائیں شامل ہیں۔ لیکن قرآن کریم نے کئی جگہ برائی کے قبیح اور بھلائی کے حسن پر بھی روشنی ڈالی ہے تاکہ لوگ خود اچھائی اور برائی کا فرق کر سکیں۔ چنانچہ قصاص کے حکم کے ساتھ اس کے فائدے پر بھی روشنی ڈالی۔

"ولکم فی القصاص حیٰوة یا اولی الالباب لعلکم تتقون۔"

ترجمہ:- اے عقل مندو قصاص میں تمہارے لئے زندگی ہے۔ تاکہ تم (قتل سے ڈرو)" (ق ۲ - ۱۷۹)

زنا سے منع کیا تو اس حکم کی وجہ سے بھی خبردار فرما دیا . . .

"ولا تقربوا الزنیٰ انہ کان فاحشة وساء سبیلا" (ق ۱۷ - ۳۲)

ترجمہ :- اور زنا کے قریب بھی نہ جاؤ۔ بے شک وہ بے حیائی ہے اور بری راہ"

چوری کی سزا کے ذکر کے بعد اس کی خرابی ظاہر کرنے کے لئے اس کو ظلم سے تعبیر فرمایا۔

"فمن تاب من بعد ظلمہ"

ترجمہ (پھر جس نے ظلم کے بعد توبہ کر لی) (ق ۵ - ۳۹)

قذف کے سلسلہ میں ارشاد ہوا کہ اس سے دوسرے کو بے جا ایذا پہنچتی ہے۔ (ق ۳۳ - ۵۸)

شراب خوری اور قمار بازی کے سلسلہ میں لوگوں کی عقلوں سے اپیل کی کہ جہاں ان میں کچھ فائدے ہیں۔ وہاں نقصان بھی ہیں لیکن ان کے نقصانات نفع سے بہت زیادہ ہیں۔ (ق ۲ - ۲۱۹)

اور یہ کہ شراب تمہارے درمیان عداوت اور نفرت ڈالتی ہے۔ اور تم کو اللہ کی یاد اور نماز سے روک دیتی ہے۔ (ق ۵ - ۹۱)

عہد نامہ قدیم میں قوانین کا ذکر کافی تفصیل سے موجود ہے۔ لیکن قرآن کریم میں ماسوا معدودے چند حدود کی تفصیلات سے اجتناب فرمایا گیا۔ یہ امر تسلیم شدہ ہے کہ معاشرہ کی حالت ہمیشہ رد و بدل اور تغیر رہتی ہے۔ اور اس کو صحیح نہج پر رکھنے کے لئے قوانین کی اہمیت اولیت اور ثانویت میں بھی فرق ہوتا ہے۔ نیز نئے مسائل سے عہدہ برآ ہونے کے لئے نئے قوانین کی ضرورت رہتی ہے۔ نئے تقاضے اور نئے مسائل ایسے ہوں تو ان کو پورا کرنے کے لئے اور نئے مصالح ہوں تو ان کی تنفیذ کے لئے جدید قوانین و قواعد وضع کرنا پڑتے ہیں۔ عہد نامہ قدیم میں تاریخی جزئیات کی تفصیل اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ قوانین دائمی نہیں ہو سکتے۔ بلکہ صرف اس وقت تک کے لئے، وضع کئے گئے تھے۔ تاآنکہ کسی اور

رسولؐ کی بعثت نئی شریعت کے ساتھ ہو۔ اور خدائی قوانین کی تنسیخ و ترمیم آنے والے رسولؐ کے زمانہ کی ضروریات کے مطابق ہو۔ قرآن کریم میں ان تفصیلات و جزئیات کا نہ ہونا اور عام طور پر صرف اصول کی تعلیم دینا اس بات کا بدیہی ثبوت ہے کہ اب وہ دور علم و عقل و تہذیب و حضارت آچکا ہے کہ لوگ اپنے پیروں پر کھڑے ہوسکیں۔ اور ان اصولوں کی روشنی میں دنیا اور معاشرہ کے متغیر حالات کے مطابق ہمیشہ خود ہی اپنے لئے قواعد وضع کرسکیں۔ اب وہ ابتدائی، قدیم غیر ترقی یافتہ دور ختم ہوا۔ جب تفصیلی احکام کی ضرورت تھی۔ اب انسانیت ایک ایسے متمدن دور میں داخل ہوچکی ہے کہ اس کو ناقابل ترمیم احکام کی کم، اور رہنما اصولوں کی زیادہ ضرورت ہے۔ آئندہ علم و فضل کا ایک عظیم دور آنے والا ہے۔ جب انسان تسخیر کائنات پر قادر ہو جائے گا۔ ایسے انسان کے لئے جزئیات فراہم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ کبھی بھی اپنے پیروں پر کھڑا نہ ہوسکے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ طفلگی اور لڑکپن میں اس بات کی ضرورت رہتی ہے کہ ماں باپ بچے کی مکمل دیکھ بھال رکھیں۔ اور اس کی ہر ہر حرکت پر تادیب کی نظر رکھیں۔ تاکہ وہ بھٹک نہ جائے۔ جب جوانی میں انسان اپنے پیروں پر کھڑا ہو جاتا ہے تو اس کی ضرورت نہیں رہتی۔ بلکہ وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ ان اصولوں کی روشنی میں جو اس کے والدین اور بزرگوں نے سالہا سال کی ریاضت اور دیکھ بھال سے اس کے دل پر مرتسم کردیئے ہیں۔ وہ تقویٰ کی زندگی گزار سکے۔ پرانی کتب دینیہ کو اس لحاظ سے ہم جوانی تک کی تربیت گاہ پر منطبق کرسکتے ہیں۔ نتیجتاً ہم کو کہنا پڑے گا کہ قرآن کریم کے فراہم کردہ اصول انسانیت کی عقل بالغ کے لئے دائمی شمع فراہم کرتے رہیں گے۔ جس طرح بالغ النظر انسان کے لئے تولیت کی اور ہر قدم اٹھانے کے لئے مزید سبق کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس طرح بالغ النظر انسانیت کے لئے بھی اب تفصیل کی ضرورت نہیں رہی۔ ضرورت صرف رہنما اصولوں کی تھی۔ جو دائمی حیثیت سے حیات انسانیت پر منطبق رہ سکیں۔ ان اصولوں کے ہوتے ہوئے اب کسی نئی شریعت کی ضرورت نہیں رہی۔ یہی معانی ہیں باری تعالیٰ کے اس ارشاد کے . . .

"الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی" (ق ۵ - ۳)

پہلے ادیان میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا سبق بلا دلیل تھا۔ لیکن جب مختلف مراحل سے گذر کر انسانیت ایک ایسی منزل تک پہنچ گئی کہ لوگ خود اپنی عقل سے سوچنے سمجھنے کے قابل ہو جائیں اور سرپرست کے بجائے دلیل و استدلال سے ذات باری تعالیٰ کو سمجھ سکیں۔ تو وحدانیت کے لئے بھی دلیل سے کام لیا گیا۔ اس سلسلہ میں میں صرف دو مذاہب کا تفصیلاً ذکر کروں گا۔ عہدنامہ قدیم کی رو سے یہواہ (JEHOVA) کے وجود کا ثبوت صرف اس حد تک ہے کہ وہ اسرائیلیوں کو مصریوں کے قبضہ سے نکال لایا اور ملی وحدت کی حیثیت سے ان کو ایک نئے ملک پر قابض کردیا۔ حضرت عیسٰیؑ کے دور میں بھی ان کے معجزوں کو بہت دخل تھا۔ جس میں ان کی معجزانہ پیدائش بھی شامل ہے۔ لیکن ان کے ارتفاع کے بعد جو مذہب ان کے نام پر ایجاد کیا گیا۔ اس میں یونانی اصنام پرستی کی سرپرستی کو زیادہ دخل تھا۔ حضرت عیسٰیؑ نے جیسا کہ اناجیل سے ثابت ہے خود کو پیغمبر کہا۔ پدر انسان کہا۔ رہا اللہ کا بیٹا تو یہ فقرہ تو مختلف انبیاء کی شان میں عہد نامہ قدیم میں متعدد بار استعمال ہوا ہے۔ اس سے نبوت کی نفی نہیں ہوتی۔ اناجیل میں ان کی حیات دنیاوی کے دوران نہ ابتدائی معصیت کا ذکر ہے اور نہ سوائے اشاروں کے صلیب اور دوبارہ زندہ کئے جانے کا ذکر لیکن ان کے ارتفاع کے بعد عیسائیت کی بنیاد ان اصولوں پر قائم کی گئی۔ جس کا تعلق ان کی تعلیمات سے کچھ نہ تھا۔ اس نئے مذہب کی بنیاد پال نے رکھی۔ جو نہ صرف یہودی کتب کا عالم تھا۔ بلکہ وہ یونانی فلسفہ و اصنام پرستی اور دیو مالائی قصوں کا بھی ماہر تھا۔ ساتھ ہی ساتھ رومن شہری ہونے کی وجہ سے رومیوں کے علم میں بھی دستگاہ رکھتا تھا۔ اسی

وجہ سے عیسائیت کی بنیاد اس نے یونانی سرشت پر رکھی جس کو عقل قبول کرنے سے قاصر ہے۔

چنانچہ مذہب عیسوی ان قوموں میں پھیلتا چلا گیا جو یونانی سرشت سے متاثر تھیں۔ ورنہ عقلیت سے تثلیث کی دوری کا ثبوت سینٹ آگسٹین کے ایک مشہور مقولے سے ہی مل جاتا ہے

"ایمان لاتا ہوں (اس پر) کیونکہ یہ ناقابل یقین ہے" (۱)

لیکن اب ذرہ قرآن پر غور فرمائیں تو اس میں عقلیت ہی کار فرما ملتی ہے۔ عقل کے استعمال کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہے۔ ان کا اہتمام قرآن میں ہر جگہ ہے۔ یعنی علم اور تدبر کا چنانچہ قرآن کا پہلا حکم ہی اقراء ہے۔ تعلیم کی خوبیوں کے متعلق قرآن و حدیث میں کثرت التزام کا تقاضا ہے کہ اس موضوع پر بھی کچھ بحث کی جائے۔ کلام پاک نے علم کی بلندی و درجات کے متعلق جو کچھ فرمایا۔ اس کی چند مثالیں پیش کرنا ضروری ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے اپنے اسماء میں سے ایک نام ہے "علیم" اللہ تعالیٰ نے چونکہ اپنی صفات سے ایک حد تک انسان کو بہرہ ور فرمایا۔ اس لئے اس صفت سے بھی متصف کیا۔ یہی سبب ہے کہ نزول قرآن کی ابتداء بھی اقراء کو بنایا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی معبودیت کی تصدیق میں جہاں اپنی اور اپنے فرشتوں کی گواہی کا ذکر فرمایا۔ وہاں علم والوں کو بھی گواہ بنایا جو انصاف پر قائم ہیں۔

(ق ۳ - ۱۸)

فرمایا بھلا جو لوگ علم رکھتے ہیں اور جو نہیں رکھتے برابر ہو سکتے ہیں۔ (ق ۳۹ - ۹)

فرمایا خدا سے ڈرو، اس کے بندوں میں وہی ڈرتے ہیں جو صاحب علم ہیں۔ (ق ۳۹ - ۹)

جو مثالیں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی ہیں۔ ان کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ ان کو تو اہل دانش ہی سمجھتے ہیں۔

(ق ۲۹ - ۴۳)

بلکہ یہ روشن آیتیں ہیں جو ان لوگوں کے سینوں میں (محفوظ) ہیں۔ جن کو علم دیا گیا ہے۔ (ق ۲۹ - ۴۹)

جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور جن کو علم دیا گیا۔ خدا ان کے درجات بلند کرے گا (ق ۵۸ - ۱۱)

اس سلسلہ میں قرآن کریم میں تعلیم محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور امت محمدیہ کا جو یہود سے موازنہ کیا گیا ہے۔ اس سے اس موضوع پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ ارشاد ہوا۔

"وہی ہے۔ جس نے ان پڑھوں میں انہی میں سے پیغمبر بنا کر بھیجا۔ جو ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھتے اور ان کو پاک صاف کرتے اور کتاب اور دانائی سکھاتے ہیں۔

(ق ۶۲ - ۲)

برعکس اس کے ....

"جن لوگوں پر تورات اتاری گئی۔ انہوں نے اس کو نہ اٹھایا۔ ان کی مثال گدھے کی سی ہے۔ جس پر بڑی بڑی کتابیں لادی ہوں"۔

(ق ۶۲ - ۵)

---

(۱) CREDO QUIA ABSURDUM EST

قرآن نے علم و فہم کی جس روشنی سے انسانیت کو منور فرمایا۔ اس کی وضاحت گدھوں پر کتاب والی مثال سے ہو جاتی ہے۔ یہ بات تو عہد نامہ قدیم کی پہلی چند کتابوں سے ہی ثابت ہے کہ یہود اپنی سرکشی کی وجہ سے ذلیل و خوار ہوتے رہتے تھے۔ وہ اپنی عبادات اور قربانیوں کے لئے اپنے پجاریوں کے پابند تھے جو تنفیذ احکام کے ذمہ دار تھے۔ یہ پجاری نہ صرف مذہبی تعلیمات کو اکثر مخفی رکھتے تھے۔ بلکہ غالباً حسب منشا ان میں ترمیم و تنسیخ کے بھی مرتکب ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ تورست میں بت پرستی کی ممانعت کے باوجود بنی اسرائیل اس قبیح حرکت کا ارتکاب کرتے تھے۔ اور یہوواہ کے مجسمے کی پرستش کرتے تھے۔

(2 KINGS 18 : 4 ; I KING 12 : 28-32 ; HOS 8:6 ; ISAM, 19:13-16 JUDGES 8 : 22 - 27 , JUDGES 17-18)

تاریخ میں کہیں بھی یہ ترشح نہیں ہوتا کہ کسی پجاری نے کبھی تورات کو یاد کرنے یا حفظ کرنے کی کوشش کی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ تورات ضائع ہو جانے کے کئی صدیوں بعد اگر کسی کو اس کتاب کے صرف چند اوراق مل گئے تو ان کو تاریخی حیثیت حاصل ہو گئی۔ عہد نامہ قدیم کی موجودہ چند کتب کے متعلق یہ کسی کا دعویٰ نہیں ہے۔ کہ یہ حضرت موسیٰ کی اصل تورات ہے۔ زیادہ سے زیادہ اس کا سہرا عُزیر کے سر ہے کہ انہوں نے الہام سے اس کو حاصل کیا۔ اس کے برخلاف قرآنی علم کے سلسلہ میں اوّل دن سے قرأ اور حفاظ کا سلسلہ لامتناہی دوام کے لئے شروع ہو گیا۔ اور پجاریوں کا دخل نہ ہونے کی وجہ سے علم کسی ایک طبقہ کی میراث ہونے سے بچ گیا۔ بلکہ علم کی خوبیاں مومنین کے قلوب میں جاگزیں کر کے ہر شخص کی حصول علم کی طرف رہنمائی کی گئی۔ لیکن ایک بات کی وضاحت ازلبس ضروری ہے کہ یہ علم جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے مشروط بہ عدل ہے یعنی حصول علم کے بعد اگر کسی عالم کو غلط خواہشوں پر چلنے کی ترغیب ہو تو یہ اس کی جہالت سے تعبیر کیا جائے گا۔

"أعوذ بالله ان أكون من الجاهلين"۔

ترجمہ: "میں خدا مجھ کو پناہ میں رکھے کہ میں جاہل یا نادان ہوں"۔ (ق ۲ - ۶۷)

علم کی شان تقویٰ یا اللہ سے ڈرنا ہے۔ جو اس کے مصداق نہیں۔ عالم بھی نہیں۔ ہوائے نفس اور خواہشات سے ماورا رہ کر بھی کوئی شخص عالم کہلانے کا مستحق ہے۔ جیسا کہ اس آیت کا مفہوم ہے۔"

"انما يخشى الله من عباده العلماء"

ترجمہ: "اللہ سے تو اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں"۔

علم کی تعریف میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات زبان زد خلائق ہیں۔ چنانچہ اجتماعی حیثیت سے لوگوں کی تعلیم کے انتظام کے سلسلہ میں چند مثالیں یہ ہیں کہ بدر کے بعد مشرکین مکہ میں سے جو قیدی مال دے کر رہائی حاصل نہیں کر سکتے تھے اور پڑھنا لکھنا جانتے تھے۔ ان کا فدیہ مسلمانوں کو تعلیم دینا قرار پایا۔ اصحاب صفہ طلب علم کے لئے ہر وقت حاضر رہتے تھے۔ اس لحاظ سے یہ مسلمانوں کی ابتدائی یونیورسٹی کہی جا سکتی ہے۔ حفاظ اور قراء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ ہی سے تعلیم قرآن دینے کے لئے مختلف قبائل میں متعین کئے جاتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے تورات پڑھی۔ صحابہ میں سے چند اصحاب کو دوسری زبانیں سیکھنے کا حکم دیا۔ یہ حکم لمحہ فکریہ ہونا چاہئے۔ ہمارے علماء کے لئے جو مغربی زبانیں سیکھنے سے اس لئے محترز ہیں کہ یہ کفار کی زبانیں ہیں۔

یہ اسی علمی کاوش کی بدولت تھا کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ باب علم بنے۔ ان کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ میں اس قدر گہرائی ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمر رضی اللہ عنہما صاف ستھری سیاست کے ماہر ثابت ہوئے۔ انتظام ملکی میں آج جن چیزوں کا بہت چرچا ہے یعنی معاشی بدحالی کا علاج "مشاریع العمرانیہ" عوام کی بہبود ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام ان سب کے بانی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نظر آتے ہیں۔ عبداللہ بن مسعود و عبداللہ بن عمرو، عبداللہ بن عمرؓ عبداللہ بن عباسؓ ابوہریرہ جیسے حضرات نظر آتے ہیں۔ جن میں کوئی مفسر، محقق و فقیہہ ہے تو کوئی محدث۔

علم پر اصرار اس بات کا متقاضی ہے کہ غور و فکر اور اس کے استعمال کا بھی تذکرہ کیا جائے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ایک طرف تو ان پاک کتاب۔ کو عربی میں نازل کرنے اور نشانیاں کھول کھول کر بیان کرنے کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ لوگ ان کو سمجھ سکیں۔

(ق ۱۲ - ۲ /// ۲ - ۲۱۹ اور ۲۶۶ /// ۵۸ // ۲۹)

دوسری طرف ارشاد فرمایا کہ یہ عقل والے ہی سمجھ سکتے ہیں۔

(ق ۳۸ - ۲۹ /// ۳۰ - ۲۹ اور ۲۹ - ۴۳)

کیونکہ وہی فکر کر سکتے ہیں۔ فکر کی ضرورت اس لئے ہے کہ ان آیتوں کا بیان ہی دعوت فکر ہے۔

(ق ۷ - ۱۷۶ /// ۱۰ - ۲۴ /// ۳۸ - ۲۹ /// ۵۹ - ۲۱)

اس مضمون کی وضاحت قرآن کریم میں مختلف طرز کلام سے کی گئی ہے۔ کسی جگہ فرمایا گیا "لعلکم تعقلون" تاکہ تم سمجھو۔ یا "لیدبروا آیاتہ" تاکہ وہ اس کی آیات پر غور کریں۔

"ولیتذکر اولوا الالباب"

"اور تاکہ عقل والے نصیحت پکڑیں۔"

مسلمانوں کو زور دے کر ہدایت کی گئی۔

"افلا یتدبرون القرآن"

ترجمہ:۔ "تو کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے۔"

(ق ۴ - ۸۲ /// ۲۳ - ۶۸)

"کذالک نفصل الآیت لقوم یعلمون"

(جو لوگ عقل رکھتے ہیں۔ ان کے لئے آیتوں کو اسی طرح کھول کھول کر بیان کرتے ہیں)

یہی وجہ ہے کہ جماعت مومنین میں سے جن لوگوں کے ذمہ آئندہ ہدایت کو جاری رکھنے کا کام سونپا گیا۔ ان کی صفت یہ مقرر کی گئی کہ وہ دین میں سمجھ پیدا کریں۔ چنانچہ ارشاد ہوا۔

"اور یہ تو ہو نہیں سکتا کہ مومن سب کے سب نکل آئیں تو یوں کیوں نہ ہوا کہ ہر ایک جماعت میں سے چند اشخاص نکل آتے۔ تاکہ دین میں سمجھ پیدا کرتے اور علم سیکھتے اور اپنی قوم کی طرف واپس آتے تو ان کو ڈر سناتے۔" (ق ۹ - ۱۲۲)

برعکس کتب ادیان سابقہ کے اللہ تعالیٰ کی اس آخری کتاب میں استعمال عقل، غور و فکر یا تدبر کی برکات پر اس قدر اصرار کیوں ہے؟ اس کا جواب قرآن ہر بات کو دلیل کی روشنی میں بیان کر کے فراہم کرتا ہے۔ حتیٰ کہ باری تعالیٰ کے وجود کے لئے بھی عقلی ثبوت دیتا ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ آئندہ دین کا ملجا و ماوا صرف قرآن اور تدبر فی القرآن ہے۔ آئندہ کے لئے سماوی کتب کے نزول کا اور نبوت کا دروازہ بند ہو گیا۔

"ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین"

حصول علم اور تدبر فی القرآن کے احکام کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام پادریت اور مسیحیت سے محفوظ ہو گیا۔ ہر مذہب میں بطریق پادری ربی، پنڈت جیسا ایک مذہبی طبقہ ہوتا ہے۔ جس کے ذمہ پرستش کرانا اور مذہبی رسوم ادا کرنا ہوتا ہے۔ عہد نامہ عتیق میں تو اس کے متعلق خاص احکام ہیں۔ یہ عہدہ پہلے حضرت ہارون کی اولاد در اولاد کو ودیعت کیا گیا عیسائی مذہب کو عیسائیت کا نام حضرت عیسیٰ کے ارتفاع کے بعد دیا گیا۔ برعکس اس کے اسلام کا نام قرآن نے عطا فرمایا "ورضیت لکم الاسلام دینا" لیکن اس سے پہلے عیسائیت میں باقاعدہ چرچ کی بنیاد ڈالی گئی۔ ہندو مذہب میں برہمن کو اسی عہدے کی وجہ سے باقی جملہ قوموں پر ترجیح ہے۔ لیکن اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس میں نہ چرچ کی گنجائش ہے نہ پادری کی۔ مسجد میں جو چند نمازی جمع ہو جائیں۔ ان میں سے کوئی ایک امامت کے فرائض انجام دے سکتا ہے۔ کسی عالم دین کو امام مقرر کرنے کی ضرورت نہیں۔ نکاح میں خطبہ نکاح پڑھنے کے لئے کسی مولانا یا مولوی کی ضرورت نہیں۔ نماز جنازہ کوئی مسلمان پڑھا سکتا ہے۔ اسلام ہی وہ مذہب ہے۔ جس نے کسی پادری کو پیدا نہیں کیا۔ کیونکہ اس کی چنداں ضرورت ہی نہ تھی۔ دیگر مذاہب میں علم دین پر پنڈت، پروہت، پادری، ربی کی اجارہ داری ہوتی ہے۔ پرستش کرانے کے لئے بھی اس کے حقوق کئی مذہبوں میں مقرر ہیں۔ اس طبقہ سے ان مذاہب میں جتنے فتنے پیدا ہوئے وہ اظہر من الشمس ہیں۔ لیکن قرآن ایک ایسی منفرد کتاب ہے جس پر غور کرنے کے آفاقی حکم کا اطلاق ہر مسلمان پر ہوتا ہے۔ علماء اور صلحاء کا اگر طبقہ پیدا بھی ہوا تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑا، کیونکہ اس طبقہ کی گردن میں فرائض کا بوجھ تو ہو سکتا ہے۔ لیکن کسی اضافی حقوق سے وہ بہرہ ور نہیں ہیں۔ اجتہاد کا حق بے شک علم کے ساتھ ہے۔ لیکن علم کسی طبقے کی میراث نہیں۔ نہ وہ کسی مدرسے کی ڈگری یا کسی استاد کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنے پر منحصر ہے۔

اسلام کا ایک زریں اصول یہ ہے "لا اکراہ فی الدین" اسی اصول کی بنا پر ہی مسلمان ہر دور میں اپنی رواداری کا لوہا منواتے رہے ہیں۔ جس کو غیر مسلم مؤرخین بھی خراج عقیدت پیش کرنے پر مجبور ہیں۔ اس نظریئے اور اصول کی بنیاد ہی اس پر ہے "جیو اور جینے دو" لیکن اس کے برعکس عہد نامہ قدیم کی کتب کے مطابق (یہ ان کتابوں کے صحیح تورات نہ ہونے کی دلیل ہے) حضرت موسیٰ اور حضرت یوشع کے زمانہ میں جب یہودی غیر یہودیوں سے برسرپیکار تھے۔ تو وہ جو شہر یا بستی فتح کرتے۔ اس کے سب باشندوں کو مع زن، بچہ، بوڑھا، کمزور اور بیمار قتل کر دیتے۔ چنانچہ اسرائیل میں یہودیوں کی عربوں کے خلاف موجودہ پالیسی اس رواداری کے دور میں بھی انہیں سابقہ روایات کی آئینہ دار ہے۔ فلسطینیوں پر مظالم کے سلسلہ میں انہوں نے نازیوں کو مات کر دیا۔ زمانہ قدیم کی سوسائٹی میں اس قسم کا قتل و غارت اور ایسے مظالم عام تھے۔ اسلام پہلا مذہب ہے۔ جس نے لا اکراہ کا سبق دے کر رواداری کی بنیاد رکھی۔ بغور کیا جائے تو یہ بات ثابت ہو جائے گی کہ رواداری دور عقلیت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اور اس صدی نے اس کا سبق مغرب میں بھی دیا جانے

لگا ہے۔ لوگ اپنی روایات اور بعض اوقات اپنی قبائلی، شہری یا ملکی جبلت یا پالیسی کی وجہ سے خود مظالم و کشت و خون پر کیوں نہ اتر آئیں۔ لیکن پھر علم کا اور عقلیت کا اس قدر اثر ضرور رہے کہ اگر دنیا سائنسی تحقیقات و معلومات کی برکت سے سمٹ کر رہ گئی ہے تو بین الاقوامی سطح پر اگر موانست نہ سہی تو کم از کم عوامی سطح پر رواداری کا مظاہرہ ضرور ہونے لگا ہے۔ اس کی بنیاد خدا کے آخری پیغام نے اس وقت رکھی۔ جب لوگوں میں نہ اس کا چرچا تھا نہ رواج، اس پیغام کی افادیت جس کا مظاہرہ دور عالم میں اب کسی حد تک چودہ صدی کے بعد ترقی عالم کے انتہائی دور میں ہو رہا ہے۔ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ پیغام نوع انسانی کے لئے آخری پیغام تھا۔ جس میں صرف اس زمانہ کی ہی ضروریات کا جب وہ نازل کیا گیا تھا۔ خیال نہیں رکھا گیا تھا۔ بلکہ اس میں ہر آئندہ زمانہ کی ضروریات کے لئے ہدایت دینا مقصود تھا

اسلام کا مقصد انسان میں ترقی کا شعور پیدا کرنا ہے۔ یہ وہ ترقی نہیں جس کے مظاہر رومن یونانی چینی مصری ایرانی اور ہندی تہذیبیں تھیں۔ نہ اس کا مقصد ملت کی امنگوں کو افلاطون اور نیو افلاطونی فلسفے میں محبوس رکھنا تھا جس میں گہرائی فکر کو مابعد الطبیعیات کی لفظی بحثوں میں الجھا دیا گیا تھا۔ نہ ہی توحید الٰہی کے سیدھے سادے اور دلکش و دلنشین مسئلہ کو کسی فلسفیانہ موشگافی کی ضرورت تھی۔ اسلام ایک ایسا دین ہے جو ہر قسم کی مادی اور روحانی ترقی کی نشو و نما کا ضامن ہے۔ انسانی نفس کو اللہ کی رضا کے تابع بنانے کی تعلیم دیتا ہے اور اس کو فلاح کی طرف بلاتا ہے "حی علی الفلاح" اس مقصد کے لئے وہ انتہائی دلنشین انداز میں اللہ کی حاکمیت کا سکہ اس کے دل اور دماغ پر بٹھاتا ہے۔ اور اس کو بتاتا ہے "ان الحکم الا للہ" (حکومت سوائے اللہ کے کسی کی نہیں)

(ق ۶ — ۵۷ اور ۱۲ //// ۱۲ — ۴۰ //// ۱۲ — ۶۷)

"الا لہ الخلق والامر"

ترجمہ (پیدا کرنا اور حکم کرنا اسی کے لئے مخصوص ہے) (ق ۷ — ۵۴)

"بل للہ الامر جمیعا"

ترجمہ۔ (بلکہ تمام کام اللہ ہی کے قبضہ میں ہے) (ق ۱۳ — ۳۱)

"ان اللہ یحکم ما یرید"

ترجمہ (بے شک اللہ جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے) (ق ۵ — ۱)

لیکن ساتھ ہی وہ اللہ کی صفات کا تذکرہ کرتا ہے جن میں سے ایک صفت عدل کی ہے۔ اور وہ اعادہ کرتا ہے . . .

"واللہ یقضی بالحق"

ترجمہ: (اللہ حق کے ساتھ حکم کرتا ہے) (ق ۴۰ — ۲۰)

انسان کی فلاح رضاء الٰہی میں ہے۔ رضاء الٰہی کی تلاش میں مسلمان کو اللہ کا خوف دل میں رکھنا اور مالک حقیقی کا حکم ماننا ضروری ہے یہی منزل ہے جس کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "موتوا قبل ان تموتوا" یہی روحانی سربلندی کا راستہ ہے جس پر چل کر انسان روحانی اقدار کو نہیں بھلا سکتا۔

دوسری طرف دین کے احکام انسانی زندگی کی ہر منزل کے لئے ہدایت فراہم کرتے ہیں۔ بقول پکتھال دین کے اوامر و نواہی

انسان کی روزانہ زندگی کی ہر مصروفیت اور شغل کا اس کی معاشی اور سیاسی زندگی کا بلکہ اس کے دماغ اور روح کی ہر تحریک کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ یہ اوامر و نواہی ایک مکمل معاشی اور سیاسی نظام میں مدون ہیں۔ جو ایک ایسا قابل عمل نظام ہے جس پر کامیاب عمل درآمد تاریخ کا زبردست حیران کن کارنامہ ہے۔ اکثر محققین نے اس حیران کن کامیابی کو خارجی اسباب کا مرہون منت ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً گردوپیش کی اقوام کی کمزوری، تلوار کا استعمال، زمانے کی خوش اعتقادی وغیرہ، لیکن وہ اس کی کس طرح توضیح کریں گے کہ جب تک مسلمان اپنے پاکیزہ قانون کی کامل پابندی کرتے رہے۔ وہ اس حکم کے ذیل میں کامیاب رہے۔ اور حکم سے روگردانی کا نتیجہ ان کی ناکامی پر منتج ہوا۔ نیز اس کی کیا تاویل ہوگی کہ غیر مسلم ان احکام پر عمل کرکے جو مسلمانوں کے لئے نازل ہوئے۔ ان احکام کے سلسلہ میں ہمیشہ کامیابیاں حاصل کرتے رہے۔ اس کا جواب اس کے علاوہ نہیں ہے کہ قرآن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کل انسانیت کے لئے ہیں۔ یہ قوانین فطرت ہیں جس سے تجاوز کرنا اپنے لئے اور اپنی قوم کے لئے خطرہ مول لینا ہے۔

(کلچرل سائڈ آف اسلام ص ۵)

لیکن یہ قوانین فطرت جو اسلام نے انسانیت کو ودیعت فرمائے ہیں۔ محض اس کی معاشی اور سیاسی زندگی کی ہی نگرانی نہیں کرتے۔ بلکہ اس کو تسخیر کائنات کی رغبت دلاتے ہیں۔ روحانی ترقی کے ساتھ ساتھ اس کو دنیا میں ترقی اور حصول علم کا بھی راستہ دکھاتے ہیں۔

اللہ تعالےٰ نے اپنی کتاب مبین میں تخلیق کائنات کے سلسلہ میں اور اپنے خالق ہونے کی دلیل میں متعدد چیزوں کا تذکرہ کیا ہے جس میں زمین، آسمان، سورج، چاند، تاروں، پہاڑ، سمندر پیدا کرنے کے علاوہ ان چیزوں کی پیدائش کا بھی ذکر ہے۔ جن کو ہم اپنی زندگی میں روز دیکھتے ہیں۔ اور جن سے ہر وقت فیض یاب ہوتے رہتے ہیں۔ ان گوناگوں عطیات میں پانی، ہوا، زمین میں سبزہ، پھل اور دیگر اشیاء کی پیدائش شامل ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی وضاحت ہے کہ یہ دنیا یا کائنات بلا مقصد پیدا نہیں کی گئی۔

(ق ۴۴ – ۳۸ /// ۳۸ – ۲۷)

انسان کو مسجود ملائک بنایا اور جو سجدہ کرنے والے تھے۔ ان کو معبود حقیقی نے جتا دیا کہ ان کے پاس اسی قدر علم ہے جو اس نے خود عنایت فرمایا۔ اور جو علم آدم کو عطا فرمایا گیا۔ وہ کہیں زیادہ ہے۔ چنانچہ اس کے ثبوت میں آدم سے مختلف چیزوں کے نام کہلوائے بلکہ عالم بسیط کی ہر چیز اس کے لئے پیدا کی۔

ان گوناگوں برکات کی تخلیق کے ذکر کے ساتھ انسان کو یہ بھی جتایا کہ ان میں اس کے لئے نشانیاں ہیں تاکہ عقل استعمال کرے۔ اور غور و فکر کو مہمیز دے۔ . . .

بے شک آسمان اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات اور دن کے ایک دوسرے کے پیچھے آنے میں اور کشتیوں میں جو دریا میں لوگوں کے فائدے کے لئے رواں ہیں۔ اور بارش میں جس کو خدا آسمان سے برساتا اور اس سے زمین کو مرنے کے بعد زندہ کر دیتا ہے اور ہواؤں کے پھرنے میں اور بادل میں جو آسمان کے درمیان میں گھرے رہتے ہیں۔ ان میں نشانیاں ہیں ان کے لئے جو عقل رکھتے ہیں۔

(ق ۲ – ۱۶۴)

یہی حکم کی شکل میں بھی موجود ہے۔

"دیکھ خدا کی رحمت کی نشانیوں کی طرف کہ وہ کس طرح زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ کرتا ہے۔"
(ق ۳۰ - ۵۰)

چاند سورج کے حوالہ سے بعض فوائد کا قرآن میں مثالاً ذکر ہے جو ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔ مثلاً چاند کا گھٹنا بڑھنا لوگوں کے (کاموں کی میعادیں) اور حج کے اوقات معلوم کرنے کا ذریعہ ہیں۔ (ق ۲ - ۱۸۹)

پہاڑ زمین کو جھکنے سے بچاتے ہیں۔ نیز دریا اور راستے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے کام آتے ہیں۔
(ق ۱۵ - ۱۶)

ستارے راستے معلوم کرنے کے کام آتے ہیں۔ (ق ۶ - ۱۶)

تاکہ جنگلوں اور دریاؤں کے اندھیرے میں راستہ کا پتہ چلایا جا سکے (ق - ۹۷)

چاند کی منزلوں سے برسوں کا شمار اور حساب معلوم ہو سکتا ہے۔ (ق ۱۰ - ۵)

لیکن ان سب کے علاوہ ایسی معلومات بھی قرآن نے مہیا فرمائیں۔ جس پر زمانہ قدیم سے آج تک علوم یا سائنس کا دارو مدار رہا ہے۔ جیسے والشمس والقمر کل فی فلک یسبحون (چاند اور سورج آسمان میں اپنے دائروں میں چکر لگا رہے ہیں)
(ق ۲۱ ۳۳)

"لا الشمس ینبغی لہا ان تدرک القمر و کل فی فلک یسبحون۔"
(نہ سورج سے ہو سکتا ہے کہ چاند کو جا پکڑے۔ سب اپنے دائرہ میں تیر رہے ہیں (چکر لگا رہے ہیں)
(ق ۳۶ - ۴۰)

علم عقل فکر تخلیق کائنات کی غرض و غایت جیسے ایمان افروز معاملات کے بعد اب ان آیات کا ذکر مناسب ہوگا۔ جو تسخیر کائنات کے متعلق ہیں۔ کچھ آیات تو وہ ہیں جن میں صرف تسخیر الٰہی کا ذکر ہے جیسے سخر الشمس والقمر (سورج اور چاند کو اپنے اپنے کام پر لگا دیا)
(ق ۱۳ - ۲ /// ۱۴ - ۳۳
۳۱ - ۲۹ /// ۳۹ - ۵ /// ۳۵ - ۱۳)

لیکن کچھ آیات میں وضاحت سے درج ہے کہ سب کچھ تمہارے لئے یا انسان کے لئے ہے۔ جیسے ...
"اس نے دریا کو تمہارے اختیار میں کیا تاکہ اس میں سے تازہ گوشت کھاؤ" اور اس سے زیور نکالو۔ جسے تم پہنتے ہو
(ق ۱۶ - ۱۴)

اور تمہارے لئے کشتیوں کو مسخر کیا۔ تاکہ سمندر میں اس کے حکم سے چلیں۔ (ق ۱۴ - ۳۲)

"کیا تم نہیں دیکھتے جتنی چیزیں زمین میں ہیں (سب) خدا نے تمہارے زیر فرمان کر رکھی ہیں۔"
(ق ۲۲ - ۶۵)

اللہ ہی تو ہے جس نے تمہارے قابو میں سمندر کر دیا۔ (ق ۴۵ - ۱۲)

طرزِ کلام کا اختلاف سہی لیکن معنی یکساں ہیں کہ جو بھی تسخیر ہے۔ وہ انسانیت کی فلاح کے لئے ہے۔ اللہ کی ہر تخلیق اللہ کی مخلوق کے لئے ہے۔

عقلِ انسانی کے ادراک کی حد محض قوانین و آیات سن لینے یا نشانیاں دیکھ لینے سے ختم نہیں ہوتی۔ یہ تو ابتداء ہے۔ یہاں سے اس حد کا آغاز ہوتا ہے۔ اگر پہلے استعمال عقل اور غور و فکر کی دعوت ہو، اور پھر حکمت کا بیان فرمایا جائے تو مخاطب کی ذمہ داری سماعت پر ہی ختم ہو جاتی۔ اس کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ حکمت کو سمجھنے کے لئے ہر چیز کی ماہیت اثرات اور نتائج کا بذریعہ علم، و تجرباتی، مشاہدات و تدبر احاطہ کرنے کا قادر ہو، ورنہ وہ حکمت کو کیسے سمجھ سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جس چیز کو خود حکمت اور نشانی سے تعبیر فرمایا ہو۔ وہ حسبِ ذیل آیت سے ثابت ہے۔

اگر انسان اس حکمت کو نہ پا سکے تو وہ نشانی کو کیسے سمجھے گا۔ اور مقصدِ الٰہی کی تکمیل اس سے کیونکر ممکن ہوگی۔

"خدا نے آسمان اور زمین کو حکمت کے ساتھ پیدا کیا۔ کچھ شک نہیں کہ ایمان والوں کے لئے اس میں نشانی ہے۔"

(ق ۲۹ - ۴۴)

قرآنِ کریم کے فہم حکمت اور تسخیر کائنات کے دو طریقے ممکن ہیں۔ ایک طریقہ تو وہ جو اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو عنایت فرمایا اور جس کے متعلق حضرت داؤد اور حضرت سلیمان کے سلسلہ میں قرآن میں واضح اشارہ ہے۔

(ق ۳۴ - ۱۰) ق ۲۱ - ۷۹ اور ۸۱

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ انسان خود اپنے علم محنت، تحقیق مشاہدہ وغیرہ کے ذریعے اس پر قدرت حاصل کرے۔ عام انسانیت کے لئے یہ دوسرا طریقہ ہی ممکن العمل ہے۔ اس کی جانب قرآن نے کسی جگہ اس کے فوائد کی طرف اشارہ کر کے اور کسی جگہ تاکیدی انداز میں حکم فرما کر علمی تحقیقات کا دروازہ کھول دیا۔ اس روشنی میں دیکھا جائے تو مسلمان پر فرض ہے کہ زمین اور آسمان بلکہ اللہ کی پیدا کی ہوئی جملہ کائنات کو انسانیت کے فائدے کے لئے استعمال کرے۔ اور اس طرح بالواسطہ اور بلاواسطہ ہر طرح تسخیر کائنات کا فریضہ انجام دے۔

یہ مفہوم ہے اس دعائے کریمہ کا " قل رب زدنی علما " میرے پروردگار مجھے اور زیادہ علم دے۔

(ق ۲۰ - ۱۱۴)

یہ دعا اس علم کی ہے جس سے ماہیت اشیاء کا پتہ چلے جس کی معرفت حضرت آدم میں پیدائش کے وقت سے ہی رکھ دی گئی تھی۔ اور جو علم ملکوتی سے یقیناً مستزاد تھا

"وعلم آدم الاسماء كلها ثم عرضهم على الملٰئكة فقال انبئونی باسماء هٰؤلآء ان كنتم صٰدقين ۝ قالوا سبحانك لا علم لنا الا ما علمتنا انك انت العليم الحكيم ۝ قال يٰآدم انبئهم باسمآئهم فلما انبأهم باسمآئهم"

(ق ۲ - ۳۱ تا ۳۳)

اس علم کے استعمال کے لئے ہی تو یہ چیلنج ہے . . . .

"اس نے سات آسمان اوپر تلے بنائے کیا تو رحمان کی آفرینش میں کچھ نقص دیکھتا ہے ؟ ذرا آنکھ اٹھا کر دیکھ بھلا تجھ کو آسمان میں کوئی شگاف نظر آتا ہے ۔ پھر دوبارہ، سہ بارہ نظر کر تو نظر (ہر بار) تیرے پاس ناکام اور تھک کر لوٹ آئے گی ۔"

(ق ۶۷ - ۳ - ۴)

یہاں مجھ جیسے بے علم کے لئے نظر کے معنی محض آنکھ سے دیکھنے کے ہو سکتے ہیں ۔ لیکن سات آسمانوں کا متعین کرنا پھر ان میں سے ہر آسمان کو دیکھنا جس کے متعلق یہ تحدیہ ہے ۔ ارض و سماء خلا اور سیاروں کے بسیط علم کے بغیر کیونکر ممکن ہے ۔ بلا شبہ یہ امعان نظر بغیر سائنسی علم، اس کی روز افزوں ترقی اور تحقیق بسیط کے ممکن نہیں ۔

سورہ لقمان میں ارشاد ہے ۔

"کیا تم نے نہیں دیکھا کہ جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے سب کو خدا نے تمہارے قابو میں کر دیا ہے ۔ اور تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں پوری کر دی ہیں ۔" (ق ۳۱ - ۲۰)

اسی طرح سورۃ الجاثیہ میں ہے . . . .

"اور جو کچھ آسمان میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب کو تمہارے کام میں لگا دیا ۔ جو لوگ غور کرتے ہیں ۔ ان کے لئے اس میں قدرت کی نشانیاں ہیں ۔" (ق ۴۵ - ۱۳)

یعنی ان کی قوتیں اور تاثیریں اس طرح تصرف میں دے دی گئی ہیں کہ جس طرح چاہو، کام لے سکتے ہو ۔

(ترجمان القرآن، جلد اول، صفحہ ۱۰۱)

ظاہر ہے کہ جو چیز کسی کے لئے بنائی جاتی ہے اور اسی کی خدمت کے لئے مقرر کی جاتی ہے تو اس شخص کو مکمل اختیار حاصل ہونا چاہئیے کہ اس سے ہر ممکن استفادہ کر سکے ۔ یہ سب مختلف طریقے ہیں جو خالق کائنات نے اپنی کتاب میں اختیار فرمائے ۔ انسان کے لئے اس بات کی توضیح کے لئے کہ تسخیر کائنات نہ صرف اس کا حق ہے بلکہ فرض ہے ۔ اس کے لئے کیا کیا کاوشیں کرنا پڑتی ہیں ۔ اس پر اس دور میں روشنی ڈالنے کی ضرورت نہیں جب انسان خلا میں چھلانگیں لگاتا پھرتا ہے ۔ چاند پر جھنڈا گاڑ چکا ہے ۔ اس کے بنائے ہوئے سٹیلائٹ حصول علم و تحقیق کے لئے مختلف اور دور دور دراز سیاروں کے گرد چکر لگا رہے ہیں ۔ دنیا میں انسان کا معیار زندگی روز افزوں ہے ۔ غربت پر فتح پانے میں گو مکمل نہیں ۔ لیکن ترقی یافتہ ممالک میں کافی کامیابی حاصل ہو چکی ہے ۔ فاصلے سمٹ چکے ہیں ۔ نظام قبائلیت میں صرف قریبی قبائل کو جاننے کے لئے وہ ذرائع نہ تھے ۔ جو آج کرہ ارض کی کل انسانیت کو جاننے اور اس سے ملنے اور ملاقات کرنے کے لئے موجود ہیں ۔ آرام دہ چیزوں کی ایجادات کا کوئی شمار نہیں ۔ آج سمندر سے وہ دولت برآمد کی جا رہی ہے ۔ غواص اور پانی کے اندر مستقل طور پر کام کرتے رہنے کے وہ طریقے ایجاد ہو چکے ہیں کہ ذوق کے ساتھ تحت فضا اور سمندر کے ساتھ تحت الارض تک انسان کی پہنچ ہے ۔ لیکن افسوس ہے تو یہ ہے کہ جن کو سبق دیا گیا ہے تسخیر کائنات کا وہی اس کو فراموش کر چکے ۔ جو اس سلسلہ میں محسن انسانیت بن کر ابھرے تھے اور جن کا نام اب بھی سائنس کے مقدمہ یا طلایہ کی حیثیت سے مشہور ہے ۔ وہ اپنا سب کچھ اغیار کو دے کر قعر مذلت میں گر گئے اور ان سے یہ سب کچھ حاصل کرنے والے کائنات کو مسخر کرنے کی لا انتہا تگ و دو میں

مصروف ہوکر کامیاب ہوگئے۔ قانون قدرت ہے۔ ۔ ۔ ۔
" اور خدا نے آسمان وزمین کو حکمت سے پیدا کیا ہے۔ تاکہ ہر شخص کو اس کی جزا ملے، جو اس نے کمایا ۔"
(ق ۴۵ — ۲۲)

اس لئے جس نے علم تسخیر کائنات حاصل کیا۔ وہ کامران ہوا۔ مسلمان نے اس سے بے توجہی برتی۔ وہ ان فوائد سے محروم رہا جو تسخیر سے میسر آسکتے ہیں۔

اس موضوع کو ایک اور طریقہ سے بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ حکم الٰہی ہے ۔ ۔ ۔

" واعدوا لهم ما استطعتم من قوة "

ترجمہ: جہاں تک ہوسکے ان کے مقابلے کے لئے قوت سے تیار رہو)

یہ موضوع چونکہ وضاحت طلب ہے۔ اس لئے پوری آیت کا جس کے الفاظ مذکورہ ایک حصہ ہیں۔ ترجمہ پیش کرنا ضروری ہے۔
" اور جہاں تک ہوسکے قوت سے (زور سے) اور گھوڑوں کے تیار رکھنے سے ان کے (مقابلے کے) لئے مستعد رہو کہ اس سے خدا کے دشمنوں اور تمہارے دشمنوں اور ان کے سوا اور لوگوں پر جن کو تم نہیں جانتے اور خدا جانتا ہے، ہیبت بیٹھی رہے گی۔
(ق ۸ — ۶۰)

اس آیت کریمہ سے واضح ہے کہ حصول قوت جنگ کی مسلسل تیاری اور غیر مسلموں پر قیام ہیبت یہ سب مسلمان کی شان بھی ہے اور ان کا فرض بھی چنانچہ جب تک وہ اس فرض کی اہمیت سمجھتا رہا۔ اس کا ڈنکا اس وقت کی معلوم دنیا میں ہر جگہ بجتا رہا۔

قرآن کا حکم تو یہ ہے قوت حاصل کرو۔ جنگ کے لئے تیار رہو۔ اور دوسروں پر ہیبت قائم رکھو۔ کیا اس کا طریقہ اس کے علاوہ کوئی تھا کہ وہ اسلحہ کی تیاری کے لئے نئی نئی ایجادات کریں۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ ایٹم بم بنانے کے قابل بھی وہی ہوتا اور کوئی نہ ہوتا۔ لیکن قرآن کا حکم نہ مان کر یہ نعمتیں اس نے دوسروں کی جھولی میں ڈال دیں جس سے اسلام کے فروغ اور اس کی ترقی کا راستہ بند ہوگیا۔

مغرب نے مسلمانوں کے تسلط کو کیونکر پامال کیا۔ اس کا جواب کسی بڑی تقریر، دلیل یا وضاحت کا محتاج نہیں۔ جب تک حصول قوت کے لئے جنگی ٹیکنالوجی، فن حرب اور فوجی حکمت عملی میں مسلمان کا جوش اور ولولہ قائم رہا۔ ان کو آگے بڑھنے سے کوئی نہ روک سکا۔ جب وہ جنگی مہارت نئے ہتھیاروں کی دریافت میں بہت پیچھے رہ گیا، تو پھر بتدریج معذور ہوگیا۔ اس کی تنزل کی راہ کھل گئی، اور یہ راہ وسیع سے وسیع تر ہوگئی۔

اگر غور کیا جائے تو اسلحہ میں مغرب کی یہ ترقی صنعت، علم سائنس اور تسخیر کائنات کا ہی نتیجہ ہے۔ علم و تسخیر کائنات کے سلسلہ میں جملہ آیات کریمہ کا مطلب ان واقعات کی روشنی میں واضح ہو جاتا ہے کہ مسلسل جدوجہد حصول علم تسخیر کائنات یہ سب مسلمان کا مشن ہونا چاہیئے تھا۔ اسی غفلت کی وجہ سے وہ تبلیغ دین کا فریضہ بھی ادا نہ کر سکا۔ وہ جس ملک میں جاتا تھا اس کو فتح تو وہ فوجی قوت سے کرتا تھا لیکن یہ اس کا کارنامہ صرف ذریعہ کی حیثیت سے اہم تھا۔ غلبہ ملکی اس ملک کے باشندوں تک پہنچنے اور ان تک اللہ کا پیغام پہنچانے کا ایک ذریعہ تھا۔ مسلمان کا اصل کارنامہ وہ تھا جس سے رعایا کے قلوب مفتوح ہوتے تھے۔ ان کو اسلام سے واقفیت ہوتی تھی۔ اور ان میں قبول اسلام

کی رغبت پیدا ہوتی یا بڑھتی تھی۔ یہ کامیابی مرہونِ منت تھی اس قرآنی سلوک کی جس میں عدل، توسط اور احسان ہی کی گنجائش ہے اور جس میں ظلم عدوان اور بے انصافی سے کھلی بیزاری کا سبق ہے۔ مسلمان نے یہ سبق بھلایا تو انگلستان، ہالینڈ، اسپین، پرتگال، فرانس اور امریکہ نے اس پر عمل کیا۔ مغرب نے دنیا کے ہر براعظم پر نہ صرف تسلط قائم کیا۔ بلکہ ان کے مشنریوں اور پادریوں نے ہر جگہ پھیل کر عیسائیت کی وہ تبلیغ کی کہ براعظم افریقہ کے اکثر ممالک میں نو دریافت شدہ ممالک، مناطق اور براعظموں میں جیسے شمالی امریکہ، وسطی امریکہ، جنوبی امریکہ، نیوزی لینڈ، آسٹریلیا بلکہ فلپین، جہاں اسلام کے فیوض و برکات نہیں پہنچ سکتے تھے۔ غرضیکہ ایک بڑے خطۂ ارض کے لوگوں نے عیسائی مذہب قبول کر لیا۔

تخلیق کی اگلی منزل کا نام ارتقاء ہے بلکہ خود بھی ارتقائی فعل ہے۔ چنانچہ نہ صرف عہد نامہ قدیم بلکہ قرآن کریم سے ثابت ہے کہ تخلیقِ کائنات میں چھ دن صرف ہوئے۔ حالانکہ اللہ کو تو قدرت ہے کہ وہ حکم فرماتے اور سب کچھ ہو جاتا ہے۔ ان میں سے دن کی مدت کوئی جانتا کہ کتنے ہزار سال کی تھی۔ انسانیت کی ارتقائی منازل سے تاریخ کے صفحات بھرے ہوئے ہیں۔ جن میں پتھر کے زمانے سے لے کر تہذیب کے مختلف ادوار کا ذکر ہے۔ نبوت، رسالت اور کتب الٰہیہ اسی طرح ارتقاء کی منزل سے گزرے۔ حتیٰ کہ ایک دور آیا کہ مزید رسولوں، نبیوں اور کتابوں کی ضرورت نہیں رہی۔ قانون میں اس ارتقاء کی واضح مثال قانونِ قصاص و دیت ہے۔ حضرت موسیٰ کی شریعت میں صرف قانونِ قصاص تھا۔ جو ان کی سوسائٹی کے مدارج کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کے لئے موزوں تھا۔ لیکن جب کسی قانون میں کسی دور میں ایسی سختی اور تشدد ہو تو اس کا ردعمل بالکل اس کے برعکس کی طرف پلٹنے پر مجبور کرتا ہے۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ کی شریعت میں عفو پر زور تھا۔ انتہائی سختی کا ردعمل اگر عفو ہے تو انتہائی نرمی یعنی عفو کا ردعمل توسط ہو سکتا ہے۔ کیونکہ انتہائیت کے تجربہ کے بعد یہ آخری منزل ہے۔ جس پر اطمینان ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اسلام میں قصاص کے ساتھ عفو اور دیت پر زور ہے۔ ان تینوں کی اپنی اپنی اہمیت ہے۔ قصاص جبلی انتقام کے تقاضا کی تکمیل کے لئے عفو انسان کی فطرت احسان کی تشفی کے لئے اور دیت، مکافات اور عوض کے طور پر، توسط کی منزل پا لینے کے بعد اس سلسلہ میں کسی مزید قانون کی کیا ضرورت باقی رہے گی ماعتدال تو خود انتہائیت کے خلاف ردعمل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس کے خلاف کسی ردعمل کا کیونکر سوال پیدا ہو سکتا ہے۔ یہی وہ منزل ہے جس پر پہنچ کر کسی مزید تجربہ کی ضرورت نہیں رہتی۔ یہی وہ مقام ہے جہاں عدل کی حکمرانی ہے اول عدل اور آخر عدل جس دین سے دنیا کو یہ منزل مل جائے وہاں کسی اور دین کی ضرورت کیونکر ہوگی۔ امت مسلمہ امت وسطیٰ ہے۔ عدل و توسط دین اسلام کا ستون ہیں۔ کون سی ایسی چیز ہے جو عدل سے وقیع تر ہے۔ جس کے لئے کسی آئندہ دین کی ضرورت ہو، یہی وجہ ہے کہ دین اسلام ارتقاء ادیان کی آخری منزل ہے۔ اور نبوت کی عمارت میں رسول اللہ آخری اینٹ ہیں۔ یہ یاد رہے کہ یہ عمارت تشریعی اور غیر تشریعی ہر قسم کی نبوت کی عمارت ہے۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ نبوت بتدریج درجۂ آسمان کو پہنچ گئی اور اب اس تکمیل پر کوئی اضافہ ممکن نہیں۔ کیونکہ اضافہ تو تکمیل کی نفی ہے۔

یہ بات قابلِ غور ہے کہ حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے چند صدی قبل سے ہی یونانی فلاسفہ باوجود اپنی سریت پسندی، ضعیف الاعتقادی، اصنام پرستی جادو، ٹونے، ٹوٹکے پر یقین اور انحصار اور دیومالائی قصوں پر اعتماد اور اعتبار کے عدل کے قائل ہو چکے تھے اور اس کی اہمیت و ضرورت پر بیش بہا کتابیں لکھ چکے تھے۔ لیکن عملاً ان کے اعتقادات و خیالات اس کی نفی کرتے تھے۔ ان کا فلسفہ

تجربیت سے گریزاں تھا۔ حالانکہ عملی علوم کی بنیاد تجربیت پر ہے۔ اس مضمون کو علامہ اقبال نے جس طرح ادا فرمایا ہے۔ یہاں اس کا مختصر اعادہ کرنے سے یہ ثابت ہو جائے گا کہ باوجود یونانی فلسفہ کی موشگافیوں اور مفروضہ کی گہرائیوں کے وہ فلسفہ علوم متداولہ کی بنیاد نہ بن سکتا تھا۔ ان علوم کی بنیاد تو مسلمان نے رکھی۔ کیونکہ علم و تحقیقات متداولہ کی بنیاد تجربیت ہے۔ جس کو مسلمانوں نے قرآنی تعلیمات کے اثرات کے تحت اپنایا۔ جیسا کہ انظر (دیکھو) کے حکم سے ثابت ہے۔ (ق ۳۰ – ۵۰)

علامہ اقبال (مرحوم) نے اپنے مضمون "اسلام میں دینی فکر کے احیاء" کے پانچویں باب میں اس موضوع پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کے کہنے کے مطابق .....

"انسانیت کے عدم علمی کے دور میں وہ روحانی قوتیں پھلتی پھولتی ہیں جن کو نبوت کا شعور کہا جا سکتا ہے جو ایک طریقہ ہے۔ جس سے اقرار کے لیے فکر و تحکم کی ضرورت نہیں رہتی۔ بلکہ ان کے طے شدہ فیصلے سے ان کے لئے موضوع انتخاب اور طرزِ عمل وضع اور مقرر کر دیا جاتا ہے۔ لیکن عقل اور شعور کے اضافے اور دقیقہ شناسی کی استعداد اور صلاحیت پیدا ہو جانے کے بعد انسان میں جہاں غیر عقلی شعور کا رواج تھا اور انسان جذبات اور جبلت کی رو میں بہہ جاتا تھا۔ وہاں استقرائی اسباب سے اپنے گرد و نواح کا غلبہ حاصل کرنا اس کے لئے ایک معرکہ سے کم نہیں اور ایک مرتبہ یہ شعور پیدا ہو جائے تو اس میں مختلف النوع علوم سے اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ زمانہ قدیم میں فلسفہ کو کافی ترقی ہوئی۔ حالانکہ انسان اس وقت مقابلۃً بہت شعور کا مالک نہیں تھا۔ لیکن فلسفے کا یہ دور قائل بالغیث اور غیاثی خیالات پر ارتکاز کے لئے مشہور تھا۔ جو مبہم مذہبی عقائد اور روایات کو ایک ڈھنگ دے سکتا تھا۔ لیکن عملی زندگی کے حادثات کے لئے اس سے کوئی مدد نہیں ملتی۔ اس نظریہ سے دیکھا جائے تو پیغمبر اسلام قدیم و جدید کے درمیان پل کی حیثیت رکھتے ہیں۔"

پیغمبر اسلام دنیائے قدیم اور دنیائے جدید کے درمیان کھڑے ہیں۔ الہام کے سرچشمے سے جب آپ کا رشتہ جوڑا جاتا ہے تو دنیائے قدیم سے آپ کا تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔ اور جب روح الہام کو بروئے کار لایا جاتا ہے تو دنیائے جدید سے آپ کا ربط قائم ہو جاتا ہے زندگی نے آپ کی ذات میں معرفت کے وہ دوسرے سرچشمے دریافت کئے ہیں جو اس (زندگی) کے نئے سفر کے لئے موزوں ہیں۔ اسلام کا ظہور دراصل استدلالی اور استقرائی عقل کا وجود میں آنا ہے۔ ظہورِ اسلام کے ساتھ رسالت خود نبوت کے اختتام پذیر ہونے کی ضرورت کے نتیجے میں حد کمال کو پہنچ جاتی ہے۔ جس میں لازماً یہ دانش مندانہ نتیجہ نکلتا ہے کہ زندگی ہمیشہ کم سنی کے مرحلے میں اور باہر سے رہنمائی کی محتاج نہیں رہ سکتی۔ اسلام میں کاہنی (فالگیری) اور موروثی سلطنت کی نفی اور قرآن میں عقل اور تجربہ پر دائمی توجہ اور اس کتاب مبین کا فطرت اور تاریخ کو معرفت بشری کے سرچشموں کی حیثیت دینا اصل ختم نبوت کے واحد عقیدے کے مختلف خد و خال ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ روحانی تجربے کا جو بلحاظ صفت نبوت کے تجربہ سے کوئی مختلف چیز نہیں ہے۔ اب حیاتی وجود نہیں رہا۔ قرآن کے نزدیک انفس (ذات) اور آفاق (دنیا) دونوں ہی ذرائع علم ہیں۔ اللہ تعالےٰ اپنی نشانیاں باطنی اور عارضی ہر قسم کے تجربات سے منکشف فرماتے ہیں۔ انسان کا فرض ہے مشاہدہ کی ہر ہیئت سے جس میں علم بہم پہنچانے کی استعداد ہو فائدہ اٹھائے۔ اس لئے ختم نبوت کے یہ معنی لینا صحیح نہیں ہوگا کہ زندگی کی انتہا یہ ہے کہ عقل کامل روحانیت کی کمل قائم مقام ہو جائے یہ بات نہ تو ممکن ہے اور نہ ہی مطلوب ہے۔"

علامہ صاحب کے قول کے مطابق چونکہ تاریخ اور فطرت انسانی علم کے دو زبردست ذرائع ہیں۔ جن کی بنیاد ہی مشاہدہ اور

تجربہ ہے۔ اس لئے مسلم فلاسفہ کے نزدیک یونانی فلسفہ کی رعنائی کا اثر بہت جلد کم ہوگیا۔ پہلے انہوں نے بڑے جوش و خروش سے قرآن کا مطالعہ یونانی فلسفہ کی روشنی میں شروع کیا۔ لیکن ان کی یہ کوشش جلد ناکام ہوگئی۔ کیونکہ عالم محسوسات کی طرف توجہ دلانے کی قرآنی تعلیم یونانی فلسفہ کی قیاسیت اور واقعات سے فرار کی کوشش سے کبھی ہم آہنگ نہ ہوسکتی تھی۔ اس ناکامی کا ہی نتیجہ ہے جس سے اسلامی ثقافت کی حقیقی روح کو جلا ملی۔ اور یہ ثقافت بالآخر کئی لحاظ سے تہذیب جدید کی بنیاد بنی۔

پہلے نظام نے تشکیک کو علم کا مبدا قرار دینے کا اصول وضع کیا۔ غزالی نے احیاء علوم الدین میں اس اصول کی وضاحت کی اور اس طرح ڈیکارٹ کے اسلوب (DESCORT'S METHOD) کے لیے راستہ صاف کیا۔ ابو بکر رازی پہلے شخص تھے جنہوں نے ارسطو کی ہئیت اوّل پر نکتہ چینی کی۔ اور ان کے اعتراض کو ہمارے زمانہ میں جان اسٹوارٹ مل نے استقرائی روح کا جامہ پہنا کر ایک نئی شکل عطا کی۔ ابن حزم نے ذریعہ علم شعور ادراک اور احساس کے ہونے پر زور دیا۔ تیمیہ کے نزدیک استقرائی استدلال ہی قابلِ وثوق دلیل فراہم کرسکتا ہے اس طرح مشاہدہ اور تجربہ کا اسلوب دریافت ہوا۔

سائنس کے میدان میں اس اسلوب پر عمل کرکے جو کام مسلمان علماء (سائنسدانوں) نے انجام دیئے۔ علامہ صاحب نے اس کا بڑی شرح و بسط سے تذکرہ کیا ہے۔ لیکن اس مضمون کی تفصیل میں جانا چنداں ضروری نہیں۔ مقصد صرف اس بات پر زور دینا ہے کہ عقلیت کا دور مسیحی دور سے پہلے پیدا ہو جانے کے باوجود یہ عقلیت ابھی خام تھی اور فلسفہ اور عالم محسوسات کی راہوں میں زبردست بعد تھا۔ یہی بعد جو یونانی اور عیسائی مذہبی سریت اور انسانی عقل و تجربہ میں تھا۔ دین اسلام اوّلین مذہب ہے جس نے عقیدوں میں سریت کی نفی کی اور احساس شعور تجربہ عقل اور سلم کی ترجمانی کی مسلم علماء (سائینٹسٹ) نے قرآن کی تعلیمات کو سمجھ کر مشاہدہ تجربہ اور استقرائی استدلال پر سائنسی علوم کی بنیاد رکھی اور یہی اسلوب موجودہ عظیم الشان سائنسی علوم کی ترقی کی روح رواں ہیں۔ یہی معنی ہیں۔ علامہ صاحب کے اس قول کے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قدیم و جدید کے درمیان ایک پل کی حیثیت رکھتے تھے۔

عدل و احسان کی مثالوں سے رحمۃ للعالمین کی حیات مبارکہ کے واقعات بھرے پڑے ہیں۔ مشرکین مکہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس اور دوسرے مسلمانوں پر مظالم اس بات کے مقتضی تھے کہ فتح مکہ کے بعد ہر بدکردار کو کیفر کردار تک پہنچا دیا جاتا جس نے ہجرت کے بعد مسلمانوں کے مال و جائداد پر قبضہ کر لیا تھا۔ ان کے مال و جائداد پر تصرف کیا جاتا لیکن کیا دنیا کی تاریخ ایک مثال پیش کرسکتی ہے کہ ایک مظلوم نے فاتح ہو کر بھی مغلوب ظالموں کو نہ صرف معاف کر دیا ہو، بلکہ ان سے کوئی بازپرس تک نہ کی ہو۔ مسلمانوں کی جائیداد بھی واپس نہ لی ہو۔ اور کیا دنیا کی جنگوں کی تاریخ کسی فوج کی اطاعت و فرمانبرداری اور نظم و ضبط کی ایک مثال پیش کرسکتی ہے کہ پوری فوج میں جس میں وہ لوگ بھی شامل تھے جن کی جائیدادوں پر مشرکین مکہ قابض تھے۔ بطیب خاطر اس فیصلہ کو قبول کیا ہو۔ رسول اللہ دشمنوں کے لئے بھی غضب کے بجائے رحمت ثابت ہوئے اور صحابہ کرام اس رحمت مجسم کے حقیقی مؤید۔

اس موضوع کے سلسلہ میں تقابلی مطالعہ کے لئے ان واقعات کا اعادہ ضروری ہے کہ جب کبھی کسی امت پر عذاب آیا تو انبیاء معجزانہ طور پر بچا لئے گئے۔ بلکہ عذاب انبیاء کی بد دعا پہ نازل ہوا۔ چنانچہ حضرت نوحؑ، حضرت لوطؑ، حضرت ہودؑ کا بچنا اسی قبیل سے تھا۔ حضرت صالح سے ثمود نے نشانی مانگی۔ چنانچہ اللہ کی اونٹنی نشانی کے طور پر دی گئی۔

(ق ۷-۷۳ ،،، ۱۱ - ۶۴)

یعنی ثمود عذاب الٰہی کی نذر ہو گئے۔ (ق ۵۳ — ۵۱ /// ۵۴ — ۳۱)

مگر حضرت صالح اور ان کے ایماندار ساتھیوں کو کوئی گزند نہیں پہنچا۔ (ق ۴۱ — ۱۸-۹ ق ۱۱ — ۶۶)

حضرت نوح نے قوم کے لئے بد دعا کی۔

"فافتح بینی و بینھم فتحاً و نجنی ومن معی من المومنین

ترجمہ:۔ "میرے اور ان کے درمیان کھلا فیصلہ کر دے اور مجھے اور جو مومن میرے ساتھ ہیں ان کو بچا لے"۔

(ق ۲۶ — ۱۱۸)

"وقال نوح رب لا تذر علی الارض من الکافرین دیاراً ٥

ترجمہ:۔ "اور نوح نے کہا کہ اے میرے پروردگار زمین پر کافروں سے کوئی گھر میں بسنے والا نہ چھوڑ"۔

(ق ۷۱ — ۲۶)

حضرت صالح نے قوم سے ان کی بد اعمالی اور اونٹنی کی کوچیں کاٹنے کے واقعہ کے بعد ان سے منہ موڑ لیا۔

(ق ۷ — ۷۹)

حضرت لوط نے بھی مجبور ہو کر اپنی مفسد قوم کے مقابلہ میں پروردگار کی مدد مانگی (ق ۲۹ — ۳۰)

"قال رب انصرنی علی القوم المفسدین"۔

حالانکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ سے "لوط کی قوم کے بارے میں (نرم دلی کی وجہ سے) بحث کرنے لگے۔

"یجادلنا فی قوم لوط"

حضرت موسیٰ نے فرعون کے حق میں دعا کی۔

ربنا اطمس علی اموالھم واشدد علی قلوبھم فلا یومنوا حتی یروا العذاب الالیم"۔

ترجمہ:۔ "اے ہمارے پروردگار ان کے مال کو ملیا میٹ کر دے اور ان کے دل سخت کر دے کہ جب تک دردناک عذاب نہ دیکھ لیں ایمان نہ لائیں (ق ۱۰ — ۸۸)

اس کے برعکس رحمۃ للعالمین نے قریش کے طرح طرح کے مظالم برداشت کئے اور اپنے متبعین کو بھی برداشت کا سبق دیا لیکن مشرکین کے لئے کبھی بد دعا آپ نے نہ کی۔ برعکس اس کے آپ کی وجہ سے اللہ نے ان کو عذاب سے مصئون و مامون رکھا۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

"وما کان اللہ لیعذبھم وانت فیھم"

ترجمہ:۔ "اللہ ایسا نہیں کہ آپ ان میں موجود ہوں اور وہ انہیں عذاب دے۔ (ق ۸ — ۳۳)

اللہ تعالیٰ نے اس مایوسی کا بھی سدباب کر دیا۔ جس سے بد دعا منہ سے نکلتی ہو۔ فرمایا۔۔۔۔

"ان علیک الا البلاغ"

ترجمہ: "آپ کے ذمہ تو صرف پیغام پہنچا دینا ہے اور بس"
(ق ۴۲ - ۴۸ //// ۵ - ۹۲ /// ۱۳ - ۴۹ /// ۱۶ /// ۸۲ - ۱۶ /// ۶۴ - ۱۲)
نیز فرمایا۔۔۔۔

"لیس لک من الامر شیئ او یتوب علیھم او یعذبھم فانھم ظالمون"
ترجمہ: "اس معاملہ میں آپ کو کچھ دخل نہیں، یا اللہ ان کو توفیق دے کر قبول کرے یا انہیں عذاب دے کہ یہ ظالم لوگ ہیں"
(ق ۳ - ۱۲۸)

اس آیت کے شان نزول کے متعلق ضیاء القرآن سے اقتباس پیش کیا جاتا ہے جس سے اس موضوع پر روشنی پڑتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود انور مسلمانوں کے لئے ہی نہیں بلکہ کفار و مشرکین کے لئے بھی باعث رحمت تھا۔ اسی لئے آپ نے رحمۃ العالمین کا لقب پایا۔

"احد کے دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دندان مبارک شہید کئے گئے۔ رخ انور زخمی کیا گیا تو حضور نے فرمایا۔ وہ قوم کیونکر نجات پا سکتی ہے جس نے اپنے نبی کے سر کو مجروح کیا۔ اور دانت شہید کئے۔ جو انہیں اللہ کی طرف بلاتا ہے۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔

"وقیل استاذن فی ان یدعو فی استئصالھم فلما نزلت ھذہ الآیۃ علم ان منھم من سیسلم وقد آمن کثیر منھم خالد بن ولید" (قرطبی)

یعنی حضور نے ان لوگوں کے حق میں بددعا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ سے اجازت طلب کی۔ تو یہ آیت نازل ہوئی۔ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو معلوم ہو گیا کہ ان میں سے کئی لوگ مسلمان ہوں گے۔ چنانچہ ایک کثیر تعداد اسلام لائی۔ انہی میں حضرت خالد بھی تھے۔ حضرت فاروق اعظم کے یہ کلمات کتنے حقیقت افروز اور ایمان پرور ہیں۔۔۔۔

"بابی انت وامی یا رسول اللہ لقد دعا نوح علی قومہ فقال رب لا تذر علی الارض من الکافرین دیارا ولو دعوت علینا مثلھا لھلکنا من عند آخرنا فلقد وطئ ظھرک وادمی وجھک وکسرت رباعیتک فابیت ان تقول الا خیرا فقلت رب اغفر لقومی فانھم لا یعلمون۔

ترجمہ: "اے اللہ کے پیارے رسول۔۔۔ میرے ماں باپ حضور پر قربان ہوں۔ نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کے لئے بددعا کی کہ اے رب زمین پر کسی کافر کو سلامت نہ رہنے دے۔ اگر حضور بھی ہمارے لئے بددعا کرتے تو ہم سب کے سب ہلاک ہو جاتے۔ لیکن راسے سراپا کرم آپ کی پشت پر قدم رکھے گئے۔ رخ انور زخمی کیا گیا۔ دندان مبارک توڑے گئے۔ بایں ہمہ آپ نے دعائے خیر ہی فرمائی۔ اور یہی عرض کیا کہ اے رب میری قوم بے علمی سے یہ کر رہی ہے تو اس کو معاف فرما دے۔"

دنیا میں انبیاء کی نافرمانی کی وجہ سے اگر عذاب کا سلسلہ جاری رہتا اور قوم ختم ہو جاتی تو پیغام الوہیت و رسالت دنیا کو کس طرح

پہنچا۔ لیکن چونکہ ختم رسالت مقصد الٰہی تھا۔ اس لئے مایوسی کو امید، سختی کو نرمی اور عذاب کو رحمت سے بدل دیا گیا۔

رحمت و عفو کی یہ شان اس لئے تھی کہ سرکار دو عالم مظہر ختم نبوت تھے۔ ان کا لایا ہوا دین ہمیشہ کے لئے ہدایت کا دین ہے۔ اس میں وہ صلاحیتیں اور خوبیاں مجتمع ہونا چاہئیں جو ہمیشہ کے لئے شمع ہدایت کا کام دے سکیں۔ وہ ہادی برحق جو خاتم نبوت ہوا اس میں نہ صرف وہ خوبیاں ہوں جو کفار و مشرکین کا زندگی میں دل جیت لیں بلکہ جن پر عمل کر کے ان کے متبعین ہر زمانہ میں کفار اور مشرکین کے بالمقابل اپنے حسن سلوک کے سلسلہ میں منفرد مقام حاصل کرتے رہیں۔ تاکہ تبلیغ دین کا سلسلہ جاری رہے۔ قرآن میں عدل، احسان اور عفو پر جو زور دیا۔ اس کی تفسیر نبی برحق صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی پاک ہے۔

بعض مستشرقین اسلامی تعلیم کی خوبیاں ماننے کے باوجود کہہ دیتے ہیں کہ محبت کا سبق جو عیسائیت نے دیا۔ وہ اسلام نے نہیں دیا۔ لیکن کیا عیسائیت نے اس محبت کا کوئی ثبوت کبھی فراہم کیا۔ اس پر کسی کو روشنی ڈالنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ بلکہ عیسائیت کی تاریخ مسلمان اور یہود پر مظالم اور ان کے متعلق بد دیانتی اور کذب سے بھری ہوئی ہے۔ آج بھی مسلمان انہیں مظالم کا شکار ہے۔ اور اب یہودی اور عیسائی دونوں مشترک دشمن کی طرح مسلمان پر حملہ آور ہیں۔ فلسطین کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ عیسائی اور یہودی سیکولر کے پردے میں عیسائی اور یہودی ہیں لیکن مسلمان، رواداری، محبت، عفو اور رحمت میں کچھ نہ کچھ رحمت دو عالم کی پیروی کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ یہ مسلمان کی نہیں ختم نبوت کی شان ہے۔

اختتام سے قبل میں ان چند مسائل کی طرف توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں جو فی زمانہ قدیم اور جدید کی آویزش سے ابھر رہے ہیں۔ ایک طرف جدید ذہن ہے جو دینی علم نہ میسر ہونے کی وجہ سے مادیت سے متاثر ہے اور اپنے محدود علم سے عقل کی پہنائیوں میں دوڑ لگانے کی وجہ سے ہر قدیم چیز سے بیزار نظر آتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ پاکستان میں ایسے اصحاب کی تعداد بہت کم ہے۔ اس کی چند وجوہ ہیں۔ اول وجہ تو تعلیم یافتہ طبقہ میں جو زیادہ تر طبقہ متوسط سے متعلق ہے۔ مذہبی خانگی ماحول ہے۔ دوسری وجہ علی گڑھ کی قدیم و جدید کو سمو دینے کی تحریک۔ تیسری وجہ غیر منقسم برصغیر ہند میں آج سے تین چوتھائی صدی کی احیاء اسلام کی وہ تحریک جس کے نتیجہ میں پاکستان برصغیر کے آزاد ممالک کے ظہور میں آیا۔۔۔۔ چوتھی وجہ ملک میں شریعت مطہرہ کے قیام کے مواعید کا اعادہ۔ پانچویں حکومت کی وہ پالیسیاں ہیں۔ جن کا مقصد پاکستان اور عرب اور دیگر مسلم ممالک کا جذباتی اتحاد اور دین کے اشتراک کی وجہ سے ایک دوسرے کی امداد اور تعاون کو فروغ دینا ہے۔ اس ضمن میں باوجود کچھ فروعی اختلافات کے کچھ جماعتوں کی منظم کوششوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں سے جماعت اسلامی اور تبلیغی جماعت (جس کا صدر دفتر رائے ونڈ ہے) قابل ذکر ہیں۔

دوسری طرف قدیم تعلیم سے بہرہ ور اصحاب کے اذہان جو ہر نئی اختراع کا فائدہ اٹھانے میں تو حرج نہیں سمجھتے لیکن یہ اختراعات اور معلومات جن علوم متداولہ کا نتیجہ ہیں۔ ان سے ان کی بیزاری کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ ان کی تعلیم کا محور صرف تفسیر قرآن، حدیث اور اس نقطہ خیال کی فقہ ہے۔ جس سے ان میں سے ہر ایک وابستہ ہے۔ فقہی اختلافات کی وجہ سے مساجد اور مدرسوں کو ان صاحبان نے الگ الگ بنا رکھا ہے۔ جس کی وجہ سے ان میں باہمی اشتراک کا امکان ہمیشہ محل نظر رہا ہے۔ یہ ایک خاص وجہ ہے۔ جس سے ان میں اور جدید ذہن میں بعد میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ مذکورہ بالا علوم کو دینی علم کی تعریف میں محدود کرنے والے ان اصحاب نے ایک خاص ذہنیت اس طبقہ میں پیدا کر دی ہے کہ وہ ہر جدید ذہن کو شبہ کی نظر سے دیکھنے کا عادی ہو گیا ہے۔ چنانچہ وہ بلا وجہ ایسے ذہن کے لوگوں کو منکرین حدیث و مجددین بلکہ ملحدین کے القاب

سے نوازا جاتا ہے۔ یہ الفاظ کوئی حریف اپنے باغیوں کی شان میں ہی استعمال کر سکتا ہے۔

ہم نے سرکارِ دو عالم کے مظہر ختم نبوت کے سلسلہ میں جو کچھ عرض کیا ہے۔ اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ ہمارے علماء کے ان دو طبقات (یعنی قدیم اور جدید) کا بعد علمی محرومی کا نتیجہ ہے۔ اگر جدید علوم سے آراستہ علماء علوم قرآن و حدیث سے بھی مشرف ہوتے تو ان میں انتہا پسندی کے بجائے اعتدال پیدا ہو جاتا۔ موجودہ علماء دین کی روش کو نظر انداز کر کے اگر وہ قبل از تقلید کے دور کے ائمہ محدثین اور مفسرین کی کاوشوں کا براہِ راست مطالعہ کریں تو ان کو اسلامی علوم کی پہنائیوں کا علم ہو گا کہ کس طرح اس دور کے ائمہ نے قرآن و حدیث سے عمرانی اور قانونی مسائل اخذ کئے تھے کہ ان کے اخذ کردہ نتائج اور ان کے بیش بہا دلائل آج کے دور میں بھی ہماری مشکلات کا حل معلوم کرنے کے لئے مشعل راہ ہو سکتے ہیں۔

علماء دین کی جدید علمی کاوشوں سے محرومی اور خود کو اپنے تیار کردہ ایک خول میں بند کر لینے کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ زمانہ موجودہ سے بہت دور نظر آتے ہیں۔ یہ وہ روش ہے کہ جس پر آج سے سینکڑوں سال قبل بھی نکتہ چینی ہوتی رہی ہے۔ چنانچہ احیاء العلوم میں امام غزالی نے اس ذیل میں بھی علماء کو ہدف تنقید بنایا۔ اور تعجب ظاہر کیا کہ ان صاحبان نے علم کو تفسیر حدیث فقہ علم کلام تک بالعموم اور علم مناظرہ تک بالخصوص مقید کر دیا۔ انھوں نے دیگر علوم متداولہ پر بحث کی۔ اور ناپسندیدگی کا اظہار صرف طلسم سے علم نجوم کی اس قسم سے جس کا تعلق قسمت کا حال بتانے سے ہے اور کچھ اس زمانے کی دنرکس کے متعلق کیا۔ یونانی فلسفہ کے متعلق ان کے افکار اظہر من الشمس ہیں۔ باقی علوم کا حصول ان کی رائے میں ضروری تھا علماء علم قرآن نے اس آیت حکم میں متعدد علوم کی نشاندہی کی ہے۔ چنانچہ الاتقان فی علوم القرآن میں کئی ایسے علوم کا تذکرہ موجود ہے۔ جیسے علم طب، جدل علم ہیئت علم ہندسہ جبر و مقابلہ نجوم وغیرہ (جلد اول ص ۱۳۸۶۔ اردو مطبوعہ نور احمد کارخانہ تجارت کتب) پھر ان علوم کے حصول کے اغراض کو دیکھا جائے۔ تو ان علوم کی بنیاد میں ہی زمانہ موجود کے علوم کی عمارت تعمیر ہوئی ہے۔ کلام پاک میں جگہ جگہ تاکید ہے کہ دنیا میں گھوم پھر کر دیکھو کہ سابقہ قوموں کا کیا حشر ہوا۔ کیا اس ضمن پر عمل علم آثار قدیمہ کے بغیر ممکن ہے؟ کیا یہ علم حاصل کرنا مسلمان کے فرائض میں شمار نہیں ہو گا۔ قرآن جیسا علم کا سبق سکھاتا ہے۔ تو اس علم کا منبع صرف چند علوم تک نہیں ہے۔ جو مدارس میں پڑھائے جاتے ہیں۔ بلکہ وہ ان جملہ علوم پر حاوی ہے۔ جس سے اسلام کو قوت ہو۔ جس سے اسلام کی ہیبت اغیار پر چھائی رہے۔ جس سے انسان کی فلاح ہو۔ لئے تسخیر کائنات میں مدد ملے۔ جس سے مظاہر قدرت اور اللہ تعالیٰ کی تخلیق کی برکات خود اپنے آپ پر بھی ظاہر ہوں اور دوسروں پر بھی ظاہر کی جا سکیں۔

دوسری طرف محض علم جدید بھی کافی نہیں۔ جب تک قرآن و حدیث کی تعلیم اس کے ساتھ نہ ہو۔ اگر علم جدید سے بیزاری جدید معاشرے کا کار آمد فرد ہونے سے روکتی ہے۔ تو قرآن و حدیث کے علم کے بغیر جدید علم مادیت پیدا کرتا ہے۔ اور تقویٰ اور روحانیت کی نفی کرتا ہے۔ جس کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ دنیائے اسلام میں بالعموم اور پاکستان میں بالخصوص تعلیم کا نصاب ایسا مرتب ہو کہ ہمارے طلبہ ہر قسم کے علم دین کی تعلیم سے مزین ہوں۔ اگر ایسا ہو سکے تو تکمیل نبوت کی منشاء بھی پوری ہو سکے گی۔ اور مسلمان ایک مرتبہ پھر دنیا میں اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر سکیں گے۔ وما علینا الا البلاغ۔

نوٹ:۔ اس مضمون کی تیاری میں قرآن مجید (ق) اور دیگر کتب کے علاوہ ختم نبوت، مصنفہ مرتضیٰ مطہری شہید (مطبوعہ دفتر تبلیغات اسلامیہ) سے مدد لی گئی ہے۔ اس لئے اس کا اعتراف ضروری ہے۔

کائنات، انسان، ضرورتِ نبوت اور ختمِ نبوت کی اہمیت

ڈاکٹر سید مطلوب حسین

ابتدائے آفرینش ہی سے یہ مسئلہ انسان کی پریشانی کا سبب بنا رہا ہے کہ وہ کیا ہے؟ کہاں سے آیا؟ اس کا خالق کون ہے؟ اور اس کائنات میں اس کا مقام کیا ہے۔ اس کے نتیجہ میں ایک طرف اوہام پرست لوگوں میں یونانی اور ہندی دیومالا نے جنم لیا اور دوسری طرف اہل علم و دانش نے فلسفہ جیسے ادق اور خشک مضمون کی داغ بیل ڈالی جس میں دیگر پیچیدہ عنوانات کے علاوہ "مابعد الطبیعاتی" موضوعات بھی زیر بحث لائے گئے تھے۔ جن کا تانا بانا صرف انسانی عقل کا مرہون منت تھا۔ استدلال علمی اور توجیہات سائنسی اور منطقی تھیں۔

ایک زمانے تک علمی دنیا میں انہی فلسفیانہ افکار و خیالات کی عملداری رہی حتیٰ کہ جزیرہ نمائے عرب سے اسلام کا نیر تاباں طلوع ہوا جس کے ساتھ ایک نیا دین، نئی تہذیب، نیا نظام حیات اور نئی علمی تحریک نے جنم لیا۔ صدر اسلام میں اسلام پر سادگی اور بداوت کا رنگ غالب تھا لیکن خلفائے راشدین کے زمانے میں جب برق رفتار فتوحات کے نتیجے میں اہل عرب "صحرائے نفود" سے نکل کر ہلال زرخیز میں داخل ہوئے اور ان کا سابقہ مفتوحہ اقوام کے ساتھ پڑا تو جہاں اہل عرب نے انہیں متاثر و مسحور کیا بعض معاملات میں ان کا تاثر قبول بھی کیا۔ اہل عجم ہر مسئلہ کی عقلی توجیہہ پیش کرتے تھے۔ جب کہ اہل عرب کا مدار زیادہ تر وحی و الہام پر تھا لیکن جب دونوں اقوام میں رابطہ اور تعلق استوار ہوا تو اس باہمی امتزاج و ارتباط کا اثر نہ صرف اسلامی معاشرت پر پڑا بلکہ اسلامی عقائد بھی اس کی زد میں آئے بغیر نہ رہ سکے۔

جدید افکار اور فلسفہ کی یلغار کا علمی اور عقلی رد کرنے کے لئے مسلمان علماء اور دانشوروں نے مغربی فلسفہ کا مطالعہ کیا اور اس کے مقابلہ میں علم کلام ایجاد کیا جس میں "مابعد الطبیعاتی" مسائل پر بحث کی گئی تھی۔ ان مسائل میں انسان کی ذات بھی زیر بحث آئی۔ اس موضوع پر خالص سائنس اور عقلی انداز میں حکمائے اسلام اور متکلمین میں سے جس شخص نے سب سے پہلے قلم اٹھایا۔ وہ ابن مسکویہ ہے جس نے چوتھی صدی ہجری میں علوم فلسفہ میں بڑا نام پیدا کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ فارابی اور ابن رشد کے سوا فلسفہ یونانی پر اس سے بڑا اور کوئی مفکر نہیں گزرا۔ اس نے جو "نظریہ ارتقاء" پیش کیا۔ اس کا خلاصہ یہ ہے۔

"کائنات میں عناصر موجود تھے۔ جب انہوں نے باہم ترکیب پائی تو سب سے پہلے جمادات وجود میں آئے۔ جمادات سے ترقی کر کے نباتات کا درجہ آیا۔ اس میں بھی ارتقائی عمل کارفرما نظر آتا ہے۔ یعنی سب سے پہلے گھاس پیدا ہوئی جو تخم سے پیدا نہیں ہوتی۔ بلکہ خود رو ہوتی ہے۔ پھر درخت پیدا ہوئے۔ ان میں بھی بتدریج ترقی ہوئی حتیٰ کہ ایسے اشجار پیدا ہوئے۔ جن میں تنا، شاخ، پھل اور پھول پیدا ہوتے ہیں۔ ان میں ترقی ہوئی تو ایسے درخت وجود

ہیں آئے جن کی سرحد حیوانات کے بالکل قریب ہوگئی۔ مثلاً کھجور وغیرہ جن میں حیوانات کی طرح نر اور مادہ ہوتے ہیں۔ اور ان کی باہمی مباشرت سے مادہ درخت ثمر بار ہوتے ہیں۔ اسی بنا پر ایک حدیث بیان کی جاتی ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ "اپنی پھوپھی کھجور کی عزت کرو کہ یہ اس مٹی سے پیدا ہوئی ہے جو حضرت آدمؑ کی خاک سے بچ رہی تھی۔"

"نباتات ترقی کر کے جب حیوان کے درجہ پر پہنچے تو سب سے پہلے کیڑے وجود میں آئے۔ جن میں حرکت اختیاری کے سوا اور کوئی صفت نباتات سے بڑھ کر نہیں۔ رفتہ رفتہ ان میں ترقی ہوئی تو ایسے حیوانات پیدا ہوئے جن میں خواص خمسہ موجود تھے ان میں ترقی کی رفتار قائم رہی اور ذہین اور زود فہم انواع نے لیا۔ یہاں تک کہ ترقی کرتے ہوئے انسان کی سرحد تک پہنچے جیسے بندر وغیرہ۔ اس مرتبہ سے بھی جب آگے بڑھے تو انسان کی طرح ان کا قد بھی سیدھا ہوگیا۔ اور ان کے قوائے عقلیہ بھی کچھ انسان سے مشابہ ہوگئے یہ مرتبہ حیوانیت کا انجام اور انسانیت کا آغاز تھا۔ ارتقار کا یہ عمل بنی نوع انسان میں بھی قائم رہا۔ حتیٰ کہ قوائے عقلیہ، ذہن ذکا، صفائی، باطن اور پاکیزہ خوئی میں ترقی کرتے کرتے انسان ملکوتیت کی حد تک جا پہنچا۔ یہی مرتبہ ہے جسے ہم نبوت اور رسالت سے تعبیر کرتے ہیں۔"

ابن مسکویہ کے علاوہ مشہور مسلمان صوفی شاعر مولانا جلال الدین رومی بھی موجودہ انسان کو ارتقاء ہی کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ میرا ارتقار ایسی حالت سے ہوا جو ذرات کی صورت ہوا میں منتشر تھے۔ اس کیفیت میں میں ہزارہا سال تک رہا

صد ہزاراں سال بودم در مطار　　　　ہمچو ذرات ہوا بے اختیار

اس عالم سے نکل کر میں نے جمادی حالت اختیار کی۔ اس کے بعد میں اعلیٰ تنظیم میں آیا جو نباتاتی حالت ہے۔ جد و جہد میں آگے بڑھتا رہا۔ اور پیچھے کی منزلوں کی کیفیت بھولتا گیا۔ نباتی شعور کی کیفیت بھی مجھے یاد نہیں۔ لیکن موسم بہار میں سبزہ و گل کی طرف جو میرا میلان ہوتا ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ غیر شعوری طور پر اپنی پہلی کیفیت کا ایک دھندلا سا احساس اور ایک مبہم سی یاد ہوتی ہے۔ اس سے ترقی کی تو حیوانیت کے درجے میں آیا جس میں نشو و نما کے علاوہ حرکت ارادی بھی ہے۔ اور نقل مکان کی صلاحیت بھی۔ حیوانیت کی منزل کو عبور کر کے میں انسانیت کی طرف بڑھا۔

ہم چنیں اقلیم تا اقلیم رفت　　　　تا شد اکنوں عاقل و دانا و زفت

اس طرح مختلف منازل و مراحل طے کرتے ہوئے عقل و دانش اور شعور و آگہی کی وادی میں قدم رکھا۔ ایک لحاظ سے مولانا روم کا یہ تصور، ابن مسکویہ کے نظریہ ارتقاء کے مشابہ ہے۔ لیکن مولانا عالمگیر ارتقاء کے قائل ہیں۔ وہ موجودہ انسان کو ارتقاء کی آخری حد نہیں تسلیم کرتے۔ بلکہ زندگی کو ارتقائے مسلسل سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس لئے وہ جسم و نفس کی موت سے بھی خوفزدہ نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے کئی بار موت کا ذائقہ محسوس کر چکے ہیں۔ ان کے نزدیک ادنیٰ درجے سے عروج دراصل ادنیٰ درجہ کی موت ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ موت کی صورت میں جسم کثیف سے آزاد ہو کر میرا بوجھ ہلکا ہو جائے گا اور میں کثافت سے لطافت کی طرف ترقی کروں گا اور ملائکہ کی طرح آلائشوں سے پاک و صاف ہو جاؤں گا۔ میں اس حالت میں بھی نہیں ٹھہروں گا۔ اس سے برتر حالت کیا ہے؟ وہ وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتی۔ لیکن اس کے ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ اس کے بعد ایسی حالت میں پہنچوں گا۔ جس پر زمان و مکان اور عقل و وجود

کا بھی گمان نہیں ہو سکتا۔ وہ اس سفر کو اللہ تعالیٰ تک رسائی کی صورت میں ختم کرنے کے متمنی ہیں۔ کیونکہ اس ترقی کا منتہی اللہ تعالیٰ کی ہستی ہے۔ "وَاِلٰی رَبِّکَ الْمُنْتَھٰی" مولانا اس عقیدے کو بار بار دہراتے ہیں کہ "منزل ما کبریا ست" کیا ایسا ممکن ہے؟ مولانا یہ سمجھتے ہیں کہ منزل و منتہیٰ تو بے شک خدا ہے لیکن ارتقاء لا متناہی عمل ہے جو حیات دنیوی میں بھی جاری رہتا ہے اور حیات اخروی میں بھی۔

مولانا نظریہ ارتقاء پر ایمان رکھنے کے باوجود ہنود کے عقیدہ تناسخ اور آواگون کے قائل نہیں جس کے مطابق جسم فانی ہے اور روح امر، جو جسم سے صرف موت ہی کی شکل میں نہیں بلکہ بے ہوشی اور نیند کے عالم میں بھی الگ ہو سکتی ہے۔ اسے قرار نہیں۔ بلکہ سفر میں رہتی ہے۔ کبھی ایک جسم میں کبھی دوسرے میں، اس کا انحصار اعمال پر ہے۔ اگر کوئی روح کسی جنم میں اچھے کرم کرتی ہے تو دوسرے جنم میں بہتر قالب اختیار کرتی ہے اور اگر وہ برے کرم کرتی ہے تو گھٹیا درجے کی جون میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس طرح وہ سانپ، چوہا، ریچھ، مینڈک، مچھلی بندر وغیرہ کے روپ اختیار کرتی ہوئی انسانی جامہ میں ظہور پذیر ہوتی ہے۔ اگر انسان اپنی زندگی میں نیک اعمال کرے تو اس کا ایک چکر ختم ہو سکتا ہے۔ اور اسے مُکتی حاصل ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ مُکتی عارضی نوعیت کی ہوتی ہے۔ یعنی موت اور دوبارہ زندگی کے درمیان ایک دفعہ جہاں سے ارواح کسی غلطی کے سبب دوبارہ زمین پر کسی شکل میں زندگی کا دوسرا سفر شروع کرتی ہیں۔ ہندو عقیدہ کے مطابق اصلی مکتی شاذ و نادر ہوتی ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے دیوتا بھی مختلف جونوں میں جنم لیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کی تثلیث کے ایک مشہور دیوتا "وشنو" نو روپ اختیار کر چکے ہیں۔ پہلے جنم میں وہ مچھلی تھا۔ دوسرے میں کچھوا۔ تیسرے میں ریچھ، چوتھے میں شیر، پانچویں میں برہمن وداوت جس نے ظالم بالی کو شکست فاش دی۔ چھٹے میں وہ پرسو رام تھا جس نے برہمنوں کی سیادت اور برتری کا لوہا منوا لیا۔ ساتویں میں وہ رام تھا۔ آٹھویں میں وہ کرشن کا بھائی بالا رام اور نویں میں گوتم بدھ، جبکہ اسے دسواں جنم بحیثیت کالی ابھی لینا ہے۔ بھگوت گیتا میں کرشن جی نے دعویٰ کیا ہے کہ وہ کئی جنم لے چکے ہیں۔

ارتقاء کی ایک شکل ہندو عقیدے میں ضرور موجود ہے۔ لیکن مولانا ارتقائے معکوس کو تسلیم نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ زندگی پلٹ کر پیچھے کی طرف نہیں جاتی۔ بلکہ ٹھوکریں اور چکر کھا کر آگے ہی بڑھتی ہے۔

ارتقائے مسلسل کی بہتر توضیح مولانا روم سے کئی صدیاں پہلے شیخ اکبر بھی کر چکے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ رجعت الی اللہ یا واصل باللہ سے مراد اللہ تعالیٰ کی جامعیت سے قریب سے قریب تر ہونا ہے۔ یا اس کی ذات کا صحیح ادراک ہے۔ اس لئے کہ "الرب رب وان تنزل والعبد عبد وان ترقی" یعنی اللہ تعالیٰ اپنی قدرت اور تجلی سے اگر طبقات حیات میں نزول بھی کرے تب بھی وہ رب لایزال میں رہتا ہے اور عبد خواہ کس قدر ترقی کرتا جائے۔ وہ عبد ہی رہتا ہے۔

مسلمان مفکرین، متکلمین، حکما اور صوفیہ کے افکار و نظریات کا اثر غیر مسلم دانشوروں، ماہرین، حیاتیات اور فلاسفہ پر بھی پڑا۔ مگر انہوں نے روحانی یا ذہنی ارتقاء کی بجائے مادی ارتقاء پر زیادہ زور صرف کیا اور اس کے لئے سائنسی توجیہات پیش کیں۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اشیاء میں فطری ارتقاء کی صلاحیت کے نتیجہ میں نباتات، حیوانات حتیٰ کہ خود انسان ہمیشہ سے ایک صورت پر قائم نہیں ہیں۔ بلکہ اپنی نوع کے تحفظ اور حصول تکمیل کے لئے جماد سے لے کر انسان تک ترقی کی جانب مائل رہے ہیں۔ اس کی صراحت ۱۸۵۹ء میں ڈارون نے اپنی کتاب (ORIGIN OF SPECES) میں پیش کی۔ وہ کہتا ہے کہ زندگی فقط نباتی

یا حیوانی یعنی مادی زندگی ہے۔ اس میں توقلمونی اور ارتقاء اپنے تحفظ اور بقاء کی جدوجہد کے نتیجہ میں ہوئی ہے۔ جس کا مقصد مادی ماحول سے توافق پیدا کر کے اپنی بقا کا سامان مہیا کرنا ہے۔ زندگی کے جوہر میں کوئی اقدار نہیں۔ کوئی میلان، عروج و کمال نہیں محض اتفاق سے بعض حیوانات کی ساخت میں کوئی انوکھی چیز پیدا ہو جاتی ہے جو زندگی کی کشمکش میں مفید ثابت ہونے کی وجہ سے باقی رہ جاتی ہے اور آئندہ نسلوں کو ورثے میں مل جاتی ہے۔ تمام تنظیم حیات اور تمام حسن و جمال انہی اتفاقی حوادث کا رہین منت ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان دراصل ایک ترقی یافتہ جانور ہے اور اپنے ہزاروں سال کے نوعی سفر میں درجہ بدرجہ منزل بمنزل امویبا (AMOEBA) سے جیلی فش اور جانے کتنی دیگر شکلوں میں تبدیل ہوتا ہوا بندر تک پہنچا۔ جو حیوانات میں سب سے زیادہ ذکی اور ہوشیار ہے۔ اس لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ انسان کی موجودہ ساخت بندر ہیں۔ کسی اچانک عضوی تبدیلی کے نتیجہ میں مرتب ہوئی ہے۔

ڈارون کی اس میکانکی اور مادی توجیہہ کے بعد مغربی مفکرین نے ارتقاء کے عمل کو تسلیم کر لیا۔ لیکن اس کی توجیہہ کو محل نظر سمجھتے ہوئے اس نظریے کے دوسرے پہلوؤں پر غور کیا۔ اس کی سب سے زیادہ حکیمانہ تردید فرانس کے یہودی فلسفی برگساں نے کی اور تخلیقی ارتقاء کا نظریہ پیش کیا۔ اس کے مطابق زندگی آگے بڑھتے ہوئے نئے اندازوں کی تخریب کرتی رہتی ہے۔ لیکن اس کا کوئی معین نصب العین نہیں۔ کوئی ایسا نقشہ یا منصوبہ نہیں جو پہلے سے تیار کر کے رکھا گیا ہو جس کے مطابق نئی تبدیلیوں کو ڈھالا جا سکے۔ بلکہ یہ عمل از خود جاری ہے اور جاری رہے گا۔ لیکن مشہور جرمنی فلسفی کانٹ اسے تسلیم نہیں کرتا اور انسان کو مادی کائنات کا نتیجہ نہیں سمجھتا۔ وہ کہتا ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو یہ لامحدود کائنات سمٹ کر اس کے احاطۂ ادراک میں کیسے آ جاتی۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اپنی کوتاہ بینی اور کائنات کی وسعتوں سے مغلوب ہو کر اپنی حیثیت کو بھول گیا ہے۔ حالانکہ مرکز کائنات وہ خود ہے نہ زمین، نہ شمس و قمر اور نہ دیگر اجرام فلکی، اس کے نزدیک یہ کائنات بے معنی نہیں بلکہ با مقصد ہے۔ اور اس میں انسان کی حیثیت جسم میں قلب کی طرح ہے۔

مغربی فلاسفہ میں، جرمنی کا حکیم نطشے بھی ارتقائے مسلسل کا قائل ہے۔ بلکہ وہ موجودہ نوع انسان سے اس قدر بیزار ہے کہ اس سے اعلیٰ ایک نئی نوع کا تصور پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ موجودہ انسان کو اب ختم ہو جانا چاہئے تاکہ ارتقاء کی جانب ایک اور قدم اٹھ سکے۔

جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں سب ہندو نظریہ ویدانت اور عقیدہ اواگون کی شکل میں زندگی یا روح کے سفر کے قائل ہیں۔ لیکن ان کا فلسفہ ارتقاء کو آگے بڑھانے میں مدد معاون ثابت نہیں ہوتا۔ تاہم مسلم متکلمین کے افکار نے بعض ہندو مفکرین کو بھی متاثر کیا ہے۔ اس ضمن میں ان کے زمانہ حال کے سب سے بڑے مفکر ارابندو گھوش کا نام لیا جا سکتا ہے جس نے حیات الٰہیہ پر تین ضخیم اور جامع جلدیں لکھی ہیں۔ وہ ہندو عقیدہ تناسخ سے ہٹ کر نظریہ ارتقاء کا قائل ہے۔

اب تک کی بحث کا لب لباب یہ ہے کہ فلاسفہ، متکلمین، مفکرین اور ماہرین حیاتیات کے نزدیک اشیاء کا وجود ارتقائی عمل کا نتیجہ ہے جو ایک گروہ کے مطابق جمادات سے ترقی کرتے ہوئے محض حادثاتی طور پر نباتات، حیوانات اور انسان تک پہنچ کر ختم ہو گیا ہے۔ جبکہ دوسرا گروہ اس بات کا دعویدار ہے کہ جسمانی ارتقاء کی آخری حد غالباً موجودہ نوع انسانی ہے لیکن اس کی موت کے بعد روحانی

ارتقاء کا عمل جاری رہتا ہے جو اسے خالق حقیقی تک پہنچانے میں مدد دیتا ہے۔ جس سے وہ ادراک الٰہی یا قرب الٰہی مراد لیتے ہیں
ان نظریات کی تردید و تائید کئے بغیر ہم اس کو بنیاد بنا کر بحث کو آگے بڑھاتے ہیں تخلیق کس قسم کی ہو۔ اس کے لئے اسباب و عناصر کی ضرورت ہوتی ہے۔ ماہرین کے مطابق کائنات میں ذرات ہوا سے مشابہ عناصر موجود تھے جنہوں نے باہم ترکیب پائی تو جمادات وجود میں آئے۔ لیکن کیا اس نظریے کا اطلاق ہم حیات پر بھی کر سکتے ہیں۔ عالم موجودات میں سب سے آخر میں انسان وجود میں آیا۔ یہ بھی تسلیم کہ انسان مٹی کا پتلا ہے۔ اس کا پیکر تخلیق کرنے کے لئے مٹی کی ضرورت محسوس ہوئی جو جمادات سے حاصل کر لی گئی۔ مٹی کو گوندھنے کے لئے پانی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ وہ بھی موجود ہوگا۔ کیونکہ اس کے بغیر نباتات پروان نہیں چڑھ سکتے تھے۔ جو جمادات کے بعد وجود میں آچکے تھے۔ ان کی نشوونما اور تحفظ کے لئے ہوا۔ اور توانائی کی ضرورت تھی۔ جو سورج کی روشنی اور حرارت سے حاصل کی گئی۔ غرضیکہ حیات کی بقا اور نشوونما کے لئے جن عناصر کی ضرورت تھی۔ وہ ارتقاء کے نتیجے میں ظہور پذیر ہو چکے تھے۔ لیکن اس کے باوجود کیا یہ بات ممکن ہے کہ بعض عناصر اربعہ کے ذریعے مٹی کے پیکر میں زندگی سرایت کر جائے۔ کیا پانی اور مٹی کے مرکب سے تیار کردہ پیکر "آدم" تھا۔ کیا محض اس پیکر میں ہوا اور حرارت کے ذریعے سانس اور توانائی داخل کر کے پہلے پیکر انسانی کو حیات بخشی گئی؟ یہ دونوں باتیں ناممکن ہیں۔ نہ تو وہ مٹی کا پتلا آدم تھا۔ اور نہ ہی سورج اور ہوا کے ذریعے اسے حیات بخشی گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ سورج اور ہوا زندگی کو برقرار رکھنے اور ترقی دینے میں معاون ہوتے ہیں۔ زندگی کی تخلیق میں ان کا کوئی حصہ نہیں۔

زندگی ایک ایسا غیر مادی جوہر لطیف ہے جو نور عطا کرتا ہے' ذائقہ دیتا ہے۔ قوت و توانائی فراہم کرتا ہے بصارت اور بصیرت بخشتا ہے۔ خواہشات اور آرزوؤں کو جنم دیتا ہے۔ احساسات و جذبات کی دولت سے نوازتا ہے۔ غرضیکہ ہر وہ چیز جس کا تعلق حواس خمسہ اور عالم محسوسات سے ہو۔ اس کا ادراک بخشتا ہے۔ اس لئے جوہر زندگی کے بغیر عناصر اربعہ سے ترکیب پانے والے وجود محض مٹی کا بے جان پتلہ کہلانے کا مستحق ہو سکتا ہے۔ جس میں نہ تو سانس کی روانی تھی' نہ ہی گردش خون' نہ اس کا دل دھڑکتا تھا۔ نہ ہی دماغ میں افکار کی لہریں موجزن تھیں۔ نہ ہی اس میں ارادہ تھا۔ اور نہ ہی حرکت۔ بالفاظ دیگر حضرت آدم علیہ السلام' اس وقت آدم کہلوانے کے مستحق ٹھہرے۔ جب ان کے پیکر خاکی میں جوہر حیات کی نمود ہوئی۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس جوہر لطیف کا خالق کون ہے؟ یہ بات انسانی فہم و ادراک سے بالا ہے۔ یوں اس کے بارے میں متعدد نظریات پیش کئے گئے ہیں۔ لیکن وہ سب مفروضوں پر مبنی ہیں اور مفروضے حقیقت نہیں بن سکتے۔ کیونکہ مادے کو اگر قدیم بھی تسلیم کر لیا جائے تب بھی اس کے کسی ایک عنصر میں بھی یہ صلاحیت نہیں کہ وہ اشیاء میں حرکت کا سبب بن سکے۔ حرکت اور ارادے کے لئے وہ جوہر حیات کا محتاج ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ انسانی جسم کے مختلف اعضاء ہاتھ، ناک، کان، ٹانگیں اور زبان وغیرہ کے مختلف افعال ہیں۔ زبان بولتی ہے۔ کان سنتے ہیں۔ ہاتھ کام کرتے ہیں اور ٹانگوں سے جسم کو حرکت دی جاتی ہے۔ یہ تمام اجزاء اپنی جگہ مکمل اور مفید ہونے کے باوجود کسی دوسرے کے لئے کام کر رہے ہیں۔ ان سب پر کوئی حاکم ہے جو ان سے کام لیتا ہے۔ ہاتھ جو کچھ چھوتا ہے۔ آنکھیں جو کچھ دیکھتی ہیں۔ زبان جو کچھ بولتی یا ذائقہ محسوس کرتی ہے۔ یہ احساسات ان کے اپنے کام نہیں آتے۔ بلکہ ایک اور قوت ہے جو ان کے نتائج سے فیض یاب ہوتی ہے۔ اگر ان اجزاء کو انسانی جسم سے الگ کر دیا جائے تو وہ بے کار ہو جاتی ہیں۔ نہ پاؤں چل سکتے ہیں۔ نہ ہاتھ چھو سکتے ہیں۔ اور نہ دانت خوراک کو چبا سکتے ہیں

اور نہ ہی ان اعضاء میں کٹنے کے بعد کوئی تکلیف اور درد محسوس ہوتا ہے۔ اس کے برعکس انسان کا باقی جسم ان کے کٹنے کی وجہ سے درد محسوس کرتا ہے۔ آنکھیں روتی ہیں اور دل بے چین ہو جاتا ہے۔ ان کی شدید خواہش اور کوشش ہوتی ہے کہ ان کٹے ہوئے اعضاء کو حاصل کر کے دوبارہ جسم کا حصہ بنا لیا جائے۔ گویا جو چیز جسمانی ہے اور جسم کا حصہ ہے۔ اس کی حیثیت آلہ سے بڑھ کر نہیں ہے۔ اس لئے وہ جوہر جو ان تمام اعضاء اور قواء سے کام لیتا ہے۔ وہ ان سب سے بالاتر ہے اور وہ مادی نہیں ہے۔ کیونکہ اگر وہ مادی ہوتا تو اس کی حیثیت ایک آلہ سے زیادہ نہ ہوتی اور اس کا ایک خاص اور محدود وظیفہ یا فعل ہوتا۔ یہی وہ قوتِ عاملہ ہے جسے روح اور نفس ناطقہ کہا جاتا ہے۔

یہ جوہر روح، عالم حیوانات کو، جمادات اور نباتات سے ممتاز کرتا ہے۔ جب تک یہ اجسام میں باقی رہتا ہے۔ ان کی نشو و نما ہوتی رہتی ہے۔ اور جیسے ہی اس کا ناطہ ٹوٹتا ہے۔ نہ صرف ان کی آئندہ ترقی رک جاتی ہے۔ بلکہ ان کے تمام وظائف و افعال اور جبلتِ فطرت ختم ہو جاتی ہے۔ بالفاظ دیگر اجسام پر موت طاری ہو جاتی ہے۔ اور روح اپنے سفر پر روانہ ہو جاتی ہے۔ اس لئے روح عرض نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ عرض ہر وقت بدلتا رہتا ہے اور یہ وہ لطیف غیر مرئی چیز ہے۔ جو تمام تغیرات کے ساتھ قائم بھی رہتی ہے۔ تمام اشیاء کا تصور کر سکتی ہے۔ تمام کیفیات کو محسوس کر سکتی ہے۔ اور ہر صورت کے ادراک اور قبول کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اس لئے یہ جوہر کے ساتھ ساتھ بسیط بھی ہے۔ نہ اس کی تحلیل ہو سکتی ہے۔ نہ ہی اس کے اجزاء بدل سکتے ہیں! ور نہ ہی وہ فنا ہو سکتی ہے۔

اب ہم پھر اپنے اصل موضوع کا اعادہ کرتے ہوئے پہلے انسان (حضرت آدمؑ) کی تخلیق پر توجہ مرکز کرتے ہیں۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ حضرت آدمؑ اس وقت، آدم کہلوائے جب ان کے پیکرِ خاکی میں روح کے جوہر لطیف نے نفوذ کیا۔ ان کا خمیر چونکہ مٹی سے تھا جو عناصر اربعہ میں سب سے زیادہ کثیف عنصر ہے۔ اس لئے "کل شئ یرجع الی اصلہ" کے مصداق انہوں نے کثافت جسمی کی وجہ سے اقطار سمٰوٰت سے روح کی توانائی کی مدد سے نفوذ کر کے کرہ ارض پر ہبوط کیا۔ گویا پہلا خلائی سفر جو بلندی سے پستی کی جانب ہوا۔ حضرت آدم علیہ السلام نے اپنے مادی جسم کے ساتھ کیا جو ہر لحاظ سے ایک مکمل انسان تھے نہ انہوں نے ہبوط سے قبل ارتقائی منازل طے کیں۔ اور نہ ہی اس کے بعد، بلکہ انسانی جسم کی ساخت اور بناوٹ آج بھی وہی ہے جو ظہور آدم کے وقت تھی۔ اور نہ ہی اس میں آئندہ کسی قسم کی تبدیلی کا امکان ہے۔ یہ بات تو اکثر متکلمین اور جدید ماہرین علم حیاتیات نے بھی تسلیم کر لی ہے کہ موجودہ انسان ارتقائے وجود کی آخری کڑی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کائنات میں ہر لحاظ سے شاہکار تخلیق ہے اور شاہکار میں کوئی نقص نہیں ہوتا۔ اگر ایسا ہوتا تو عصر حاضر کے انسان نے اسے ضرور دریافت کر لیا ہوتا اور اس نقص کو دور کرنے کا تدارک کرتا۔ نیز اگر اس میں مستقبل میں کسی تبدیلی کا امکان ہوتا تو آج کے ترقی یافتہ دور میں اس کا پتہ لگانا ناممکن نہ ہوتا۔ نیز انسان کے علاوہ، دوسرے اجسام میں نظریہ ارتقاء کے مطابق ارتقائی عمل کو محسوس کر لیا ہوتا۔

رہا یہ مسئلہ کہ کائنات کی ہر چیز میں ذوقِ نمود، اور ترقی کا میلان ہے تو اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ایک نوع کا اپنی نوع میں ترقی کرنا۔ نہ کہ ایک جسم سے ترقی کر کے دوسرے جسم میں منتقل ہونا۔ یعنی ایک دانا بیج، ذوق طلب اور مذاق ترقی میں، بڑھ کر پہلے پودے کی شکل رونما ہو۔ پھر ترقی کرتے ہوئے، تنومند درخت بن جائے۔ جس میں شاخیں، پتے، پھل اور پھول ظاہر ہوں۔ اور اسی طرح گل سے چمن اور چمن سے چمنستان بن جائے، یا خاک کے ذرات باہمی ارتباط سے تودہ بنیں اور

بڑھتے بڑھتے پہاڑ کی شکل اختیار کرلیں۔ بارش کے قطرے اکٹھے ہوں تو ندی نالے، دریا اور بے پایاں سمندر کی صورت موجزن ہوں۔ لیکن یہ ممکن نہیں کہ ذرات اور جمادات میں ارتقائی عمل سے حیوانات وجود میں آجائیں۔

اس کرہ ارض پر انسان کو رہتے ہوئے ہزارہا برس گزر چکے ہیں۔ لیکن تاریخ کے کسی دور میں بھی انسان نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ اس نے جمادات سے نباتات، یا حیوانات سے انسان بنتے ہوئے دیکھے ہوں۔ یا ان میں ایسی تبدیلیوں کا مشاہدہ کیا ہو، جو مستقبل میں ان کی ساخت پر اثر انداز ہونے والی ہوں۔ اگر یہ کلیہ درست ہوتا تو آج کے سائنسی دور میں تجرباتی طور پر ہی بندر کو انسان بنا کر پیش کر دیا جاتا۔ یہ صحیح ہے کہ انسان نے بندروں سے خاصے عقل کے کام لئے ہیں لیکن یہ کارنامہ بھی انسان کا ہے نہ کہ ارتقائی عمل کا۔ نیز اس تربیت کے نتیجہ میں بندر کے بنیادی اعضاء و جوارح میں کوئی فرق نمودار نہیں ہوا۔ وہ اپنی ابتدائے آفرینش سے لے کر آج تک بندر ہے۔ یہی خصوصیات دوسری انواع میں موجود ہیں۔ ویسے بھی اگر ہم موجودات کا مشاہدہ مطالعہ کریں تو ہمیں ان میں ارتقاء کا وہ پہلو نظر نہیں آتا جس کی نشاندہی ماہرین حیاتیات کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں عالم جمادات کا تذکرہ اس لئے ضروری نہیں ہے کہ یہ عالم ترکیب کا سب سے ادنیٰ درجہ ہے۔ اور اس میں کوئی ایسا عنصر موجود نہیں جو ارتقاء کا سبب بن سکے۔ البتہ مختلف وجوہات سے ان میں ٹوٹ پھوٹ ضرور ہوتی رہتی ہے۔ جس کی وجہ سے ان کی ہیئت تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ اس کے عناصر میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ جمادات بہرحال جمادات رہتے ہیں۔ جہاں تک عالم نباتات اور حیوانات کا تعلق ہے تو یہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ اشیاء پیدا ہوتی ہیں۔ خوشگوار ماحول، موزوں آب و ہوا اور مناسب دیکھ بھال سے یہ پروان چڑھتی ہیں۔ پھلتی پھولتی ہیں اور اپنی عمر طبعی کو پہنچ کر ختم ہو جاتی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ عالم وجود میں آنے کے بعد ہر چیز اپنی انتہا کو پہنچ کر ختم ہو جاتی ہے۔ عالم ارتقاء میں نہیں رہتی۔ صرف پیوند کاری سے بعض تبدیلیاں واقع ہو سکتی ہیں۔ یہ عمل انسانی مہارت سے بھی ہوتا ہے۔ اور فطری طور پر بھی ہوتا رہتا ہے۔ لیکن اس کی وجہ سے اشیاء کی بنیادی خاصیت نہیں بدلتی۔ آم ۔ آم رہتا ہے اور کھجور ۔ کھجور۔ یہی صورت حال، حیوانات اور انسانوں کے ضمن میں بھی نظر آتی ہے۔ کراس بریڈنگ کے نتیجہ میں یہ تو ممکن ہو گیا کہ ایک سیاہ فام عورت کے بطن سے سفید رنگ کا بچہ پیدا ہو، یا ہرن اور بکری کے باہمی اختلاط سے بکری کی ایک اور قسم وجود میں آگئی ہو۔ لیکن اس کے باوجود وہ شکل و صورت اور خصوصیات کی بنا پر بکری ہی کہلائے گی۔

اس بنا پر ماہرین حیاتیات اور مابعد الطبیعیات کے مفروضہ "نظریہ ارتقاء" پر ایمان نہیں لایا جا سکتا۔ زیادہ سے زیادہ اس بات کو تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ کرۂ ارض کا وجود ذرات کی باہمی آمیزش سے ہوا ہو۔ پھر نباتات وجود میں آئے ہوں اور اس کے بعد حیوانات کی تخلیق ہوئی ہو گویا پہلے اسفل درجہ کی چیزیں وجود میں آئی ہوں پھر کسی خاص مقصد کے تحت اعلیٰ تر مخلوق پیدا کی گئی ہو، اور یہ اعلیٰ مقصد اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ کرۂ ارض پر شاہکار قدرت یعنی حضرت آدم کا ظہور ہو۔ اگر آیہ "اِنّی جاعلٌ فی الارض خلیفہ" پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے قبل زمین اپنی جملہ آرائش و زیبائش کے ساتھ وجود میں آچکی تھی۔ کائنات میں بعض دوسری مخلوقات کا بھی پتہ چلتا ہے۔ مثلاً ملائک اور جنات وغیرہ۔ مشہور مفسر قرآن ابن جریر طبری نے لفظ خلیفہ سے نائب خدا مراد نہیں لیا ہے۔ بلکہ اس کے لفظی معنوں کی نسبت سے "بعد میں آنے والا" متعین کیا ہے۔ یعنی حضرت آدم یا ان کی نسبت سے بنی نوع انسان جو ملائکہ، جنات بلکہ حشرات و حیوانات کے بعد خلق کئے گئے ہیں۔ یہ بعد میں ظاہر ہونے والی تخلیق ہر

لحاظ سے ارفع و اعلیٰ تھی۔ اس لئے زمین پر ہبوطِ آدم سے قبل نوعِ انسان کے آرام و آسائش اور فوائد کے لئے بے شمار چیزیں عالم وجود میں آ چکی تھیں۔ انسان نے کرۂ ارض پر اپنے طویل زمانۂ قیام کے دوران میں ان تمام اشیاء کو استعمال کیا۔ فائدہ اٹھایا بلکہ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ان سے مزید کارآمد، مفید اور حسین و جمیل ایجادات، تعمیرات اور مصنوعات تخلیق کر کے اعلیٰ تمدن کو جنم دیا اور ہر میدان میں عام موجودات پر اپنی عظمت اور برتری کا سکہ بٹھایا۔ اس نے سمندر کا رخ کیا تو اس کی تہوں کو چھو لیا۔ چٹانوں اور پہاڑوں پر آزمائش کی تو ان کے سنگلاخ سینوں کو پھاڑ کر رکھ دیا اور ان کی پُرغرور چوٹیوں کو پاؤں تلے روند کر رکھ دیا۔ زمین کو تختۂ مشق بنایا تو پاتال کی خبر لایا آج کا انسان خلا کی وسعتوں کو عبور کر کے چاند اور ستاروں پر کمندیں ڈال رہا ہے۔ انسان کو یہ فوقیت عقل و علم کے سبب ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ دونوں قوتیں کہاں سے آئیں؟ کیا مادے سے؟ نہیں! کیونکہ مادہ بذاتِ خود نہ حرکت ہے نہ اس میں حیات کے عناصر ہیں۔ نہ وہ سوچ سکتا ہے۔ نہ وہ محسوس کر سکتا ہے۔ اس کے لئے وہ ایک دوسری قوت کا محتاج ہے۔ جسے ہم روح کہتے ہیں تو کیا یہ دونوں قوتیں، عقل و علم، روح کی تخلیق ہیں؟ یہ بھی ممکن نہیں۔ کیونکہ روح صرف انسانوں ہی میں موجود نہیں۔ بلکہ چرند، پرند، حشرات اور جمیع حیوانات میں بھی موجود ہے۔ تو پھر عقل و علم بلکہ نطق بھی صرف انسان ہی کی تخصیص کیوں؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ روح کے علاوہ کوئی اور ہستی بھی موجود ہے جو ان سب کی خالق ہے۔ جس کی نہ کوئی علت ہے نہ صورت ہے۔ جو واحد مطلق ہے اور ہمیشہ سے ہے، اور ہمیشہ رہے گا۔ غرضیکہ مادہ ہو، یا روح، جسم ہو، یا جوہر لطیف، مادی اشیاء ہوں، یا غیر مادی، ان سب کی کوئی نہ کوئی علت ہوتی ہے۔ اس لئے یہ خدا نہیں ہو سکتیں۔ اسی بنا پر متکلمین نے خدا کے مندرجہ بالا اوصاف یعنی توحیدِ مطلق، ازلی اور غیر جسمانی ہونا ثابت کئے اور ان سب کے ثبوت کا مدار حرکت کی نفی پر رکھا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے۔

۱ ۔ وحدت :۔ اگر خدا متعدد ہوں تو ضرور ہے کہ ان میں باہم کوئی جزو مشترک ہو۔ جس وجہ سے وہ سب خدا کہلائیں اور کوئی جزو غیر مشترک جس کی وجہ سے ان میں باہم فرق اور امتیاز ہو جو فساد کون و مکان کی صورت میں ظاہر ہو۔

۲ ۔ ازلیت :۔ جو شے ازلی نہ ہو گی۔ وہ متحرک ہو گی۔ کیونکہ عدم سے وجود میں آنا ایک قسم کی حرکت ہے جبکہ خدا میں حرکت نہیں۔

۳ ۔ غیر جسمانی ہونا :۔ خدا کا اگر جسم ہو گا تو ضرور متحرک ہو گا۔ کیونکہ جسم کو ہر وقت کسی نہ کسی قسم کی حرکت رہتی ہے۔

مندرجہ بالا استدلال سے قطع نظر بھی اگر ہم اشیاء کی ماہیت، ان کی صوری و معنی ہیئت، ان کی ترتیب و تاثیر، ان کا حسن و جمال، مظاہرِ فطرت، کے مقاصد و مصالح اور ان سے مستنبط فوائد پر غور و فکر کریں تو ہر ذی عقل انسان کو وجدانی طور پر اس حقیقت کا ادراک ہو جاتا ہے کہ اس تمام نظام کے پیچھے یا ایک پروردگارِ عالم ہستی موجود ہے اور وہ ان تمام صفات سے متصف ہے جن کے بغیر نظامِ ربوبیت کا یہ بے نقص کارخانہ وجود میں نہیں آ سکتا تھا۔ کیا انسان کا وجدان یہ باور کر سکتا ہے کہ یہ کارخانہ کائنات خود بخود وجود میں آ جائے اور اس میں کوئی زندگی، کوئی ارادہ، کوئی قدرت، کوئی حکمت کارفرما نہ ہو۔ کیا یہ ممکن ہے کہ اس کائنات میں ترتیب موجود ہو، اور مرتب نہ ہو۔ زندگی موجود ہو، کوئی خالق نہ ہو۔ نظم موجود ہو اور کوئی ناظم نہ ہو۔ صنعت موجود

ہو، کوئی صانع موجود نہ ہو۔ موت موجود ہو ——— کوئی مارنے والا موجود نہ ہو۔ غرضیکہ سب کچھ موجود ہو، مگر موجد موجود نہ ہو۔ انسان کا وجدان پکارتا ہے کہ ایسا ہونا ممکن نہیں۔ اس کی فطرت، اپنی بناوٹ ہی میں ایک ایسا سانچہ لیکر آئی ہے جس میں ایمان و یقین ہی ڈھل سکتا ہے۔ شک اور انکار کی گنجائش نہیں۔

جب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ اس تمام کائنات کا خالق اللہ تعالےٰ ہے جو ہر مخلوق کا پالنے والا بھی ہے۔ کیونکہ دنیا میں ہر چیز ایسی ہے کہ اسے پرورش کی احتیاج ہے۔ اور اسے پرورش مل رہی ہے۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ کوئی پرورش کرنے والا بھی موجود ہو۔ یہ پرورش کرنے والا کون ہوسکتا ہے؟ یقیناً وہ نہیں جو خود پروردہ اور محتاج ہو۔ اس نکتے میں دراصل تمام موجودات، جمادات، نباتات اور حیوانات کی تدریجی اور ارتقائی تخلیق کا راز مضمر ہے۔ قبل اس کے کہ خالق کائنات، عالم نباتات کو وجود میں لاتا۔ اس نے ذرات کی باہمی آمیزش سے فرش زمین بنایا۔ اور اس کی سطح پر پہلے کوہ و صحراء اور دیگر عالم جمادات کے لنگر ڈالے اور پھر ہوا اور پانی کی تخلیق کرکے ماحول پیدا کیا۔ جس کی مدد سے نباتی مخلوق پروان چڑھ سکتی تھی۔ اس طرح اس نے حیوانی مخلوق کی پرورش کا سامان مہیا کر دیا۔ اور یہ پرورش کا سامان ایک ایسے عجیب و غریب نظام کے ساتھ کیا کہ ہر حیوانی وجود کو زندگی اور بقاء کے لئے جو کچھ درکار تھا۔ ہر حالت کی رعایت اور ہر ضرورت کے لحاظ سے ملنے لگا۔ چیونٹی کو اپنے بل میں کیڑے مکوڑے کو کوڑا کرکٹ میں، مچھلیوں کو پانی میں، پرند کو ہوا میں، چرند کو سبزہ زار میں، اور درندے کو جنگل بیابان میں، یہاں تک کہ ہر حیوان کو اس کے اپنے ماحول اور مقام پر ہر چیز میسر ہونے لگی۔

اب ذرا چشم تصور وا کیجئے اور ہبوط آدم سے قبل کائنات کے حسن اور فطرت کے جمال و خوبی پر ایک نگاہ ڈالیے، ستاروں کی دمک اور ان کی گردش شمس و قمر کی توانائی اور روشنی، بارش کا سماں اور اس کے تغیرات، سمندر کا منظر، دریاؤں کی روانی، پہاڑوں کی بلندیاں اور وادیوں کا نشیب و فراز، نباتات کی ہریالی اور بار داشجار قطار اندر قطار، پرندوں کی پرواز اور ان کی نغمہ سنجی، مرغزاروں اور سبزہ زاروں میں غزالوں، بکریوں، گھوڑوں اور دیگر حیوانات کی سبک خرامی اور پھر لطف کی بات یہ کہ ان تمام موجودات میں افادہ اور فیضان کی موجودگی، ایک اعلیٰ اور ارفع نوع کی پرورش، نشو و نما اور حفظ و بقاء کی متحمل ہو سکتی تھی۔ یہی وہ گھڑی تھی۔ جب خالق کائنات نے، اس پیکر خاکی کو زمین پر اترنے کا حکم دیا۔ جس کی تعمیر و ساخت پر نہ جانے کتنے زمانے صرف ہوئے ہوں گے۔ اور جس کے اندر، اس نے اپنی روح پھونک کر، حرارت زندگی اور توانائی بخشی تھی اور جسے آدم کا نام دیا گیا تھا۔ اب ذرا سوچیے کہ آیا خالق حقیقی نے حضرت آدم علیہ السلام کی عضوی تشکیل اور اس کے اندر اپنی روح پھونک کر اسے حیات بخشنے پر ہی اکتفا کیا ہوگا۔ یا اس کی تعلیم و تربیت کا بھی بندوبست کیا تھا۔ اس حقیقت کا ادراک حاصل کرنے کے لئے ہمیں قرآن کریم کی آیت "وعلم آدم الاسماء کلھا" سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے زمین پر ہبوط سے قبل یہاں تک معنوی ترقی کی کہ تعلیم الہٰی سے تمام چیزوں کے نام معلوم کر لئے۔ اس سے مراد صرف اشیاء کے نام ہی نہیں ہیں بلکہ ان کی شناخت، ماہیت، غرض و غایت، نفع و نقصان، ان کے خواص، ان کے استعمال کے طریقے، ضرر رساں ہونے کی صورت میں ان سے بچنے کی تراکیب، نقصان پہنچنے کی صورت میں اس کا تدارک، علاج معالجہ، غرضیکہ وہ تمام علوم اور فنون جو ظہور آدم سے لے کر قیامت تک وجود میں آنے والے تھے حضرت آدمؑ

کو سکھلائے گئے۔ یہی وجہ ہے کہ جب یہ تمام حقائق اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے سامنے رکھے اور ان کے بارے میں سوال کیا، تو انہوں نے اپنے عجز کا اعتراف کیا اور حضرت آدم علیہ السلام کی برتری کو تسلیم کر لیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت آدم زمین پر مکمل انسانی تشکل کے علاوہ منظم اور جامع علوم کے ساتھ نازل ہوئے۔

اس بیان کو صحیح تسلیم کرنے سے ایک اشتباہ ضرور پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ دورِ اول کے انسان کو بھی عقل و شعور اور علم و دانش میں اس قدر دانا و بینا ہونا چاہیئے، جس قدر کہ حضرت آدم علیہ السلام خود تھے یا جس قدر عصر حاضر کا ترقی یافتہ انسان ہے یا مستقبل کا انسان ہوگا۔ لیکن تاریخی طور پر اس کا ثبوت نہیں ملتا۔ اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ انسان فطری طور پر جاہل پیدا ہوتا ہے۔ ولادت کے وقت اسے کسی چیز کا ادراک نہیں ہوتا۔ سب سے پہلے اس میں لمس کا خاصہ پیدا ہوتا ہے جس کے ذریعے وہ ان اشیاء کو محسوس کر سکتا ہے۔ جو ٹھوس یا دی، جسم رکھتی ہوں، یا گرمی، سردی اور مائع چیزیں۔ لمس کے بعد اس میں بصارت کا احساس پیدا ہوتا ہے جس کے ذریعے وہ شکلوں اور رنگوں کا ادراک کر سکتا ہے۔ پھر وہ سماعت سے کام لینے لگتا ہے اور پھر قوت ذائقہ کے ذریعے اسے لذت کا احساس ہونے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ محسوسات کا دور ختم ہو جاتا ہے اور عقل کا زمانہ آتا ہے۔ اب وہ اپنے ماحول سے متاثر ہو کر سیکھنا شروع کرتا ہے۔ یہ خدمت والدین، عزیز اقارب اور گھر کے دوسرے افراد سرانجام دیتے ہیں۔ اور اسے اشیاء کی زشت و خوب، نفع و نقصان ان کا طریق استعمال، ان کو محفوظ رکھنے کے طریقے اور خود کو اشیاء کے ضرر سے بچنے کی تراکیب سمجھاتے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ شعور کی منزلیں طے کرتا ہوا اپنے ماحول اور اساتذہ سے علم حاصل کرتے ہوئے عالم فاضل بن جاتا ہے۔ اور اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ فطرت کے فیضان سے زیادہ سے زیادہ افادہ حاصل کرے۔ لیکن جس خدا نے اس کارخانۂ حیات میں ہر سو افادہ و فیضان کے چشمے جاری کر رکھے ہیں۔ یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ انسان کی معنوی ہدایت کے لئے کوئی سامان نہ کرتا اور اسے ہلاکت کے لئے چھوڑ دیتا۔ جس رحمت کا مقتضا یہ ہے کہ دنیا میں "بقاء انفع" کا قانون نافذ ہو۔ کیونکر ممکن تھا کہ وہ انسانی اعمال کی طرف سے غافل ہو جاتی اور نافع اور غیر نافع اعمال میں امتیاز نہ کرتی؟ اس لئے مادیات کی طرح معنویات میں بھی یہ قانون نافذ ہے اس رحمت اور معنوی ہدایت کو عام کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے انسانوں میں سے ایک ایسا گروہ منتخب کیا۔ جن کی تربیت خود کی اور پھر انسانوں کی طرف انہیں مبعوث کیا تاکہ وہ صرف مادیت اور نفسانی خواہشات کے غلام ہو کر نہ رہ جائیں۔ بلکہ وہ فطرت کے فیضان اور افادہ سے متمتع ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی معنوی اور روحانی ترقی بھی حاصل کر سکیں اور دنیا میں فساد برپا نہ کریں۔

یہ منتخب گروہ انبیاء علیہم السلام کا ہے۔ ان میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو زمین پر مبعوث کیا۔ جن کی تعلیم و تربیت پر نہ جانے کتنے زمانے صرف ہوئے ہوں گے کہ وہ اس قابل ہوئے کہ معلومات کے سلسلہ میں انہوں نے ملائکہ کو بھی لاجواب کر دیا۔ چنانچہ جس وقت حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی بیوی حضرت حوا کا زمین پر ہبوط ہوا۔ اور ان کی پشت سے نسل انسانی نے جنم لیا۔ اور وہ پھیلنے لگی تو ان کی حالت حیوان یا ایک بچہ کی طرح محسوسات کی منزل سے آگے نہ تھی۔ انہیں تو یہ بھی علم نہ تھا کہ مردہ جسم کو کس طرح دفن کیا جاتا ہے؟ گویا ایک عام انسان پہلے محسوسات کا ادراک کرتا ہے۔ جو حیوانات کا درجہ ہے۔ پھر محسوسات سے تخیل، تخیل سے فکر اور فکر سے عقلیات کے ادراک تک پہنچتا ہے۔ ان میں بعض خاص انسان، کسی اعلیٰ روحانی شخصیت کے دامن تربیت میں پرورش پا کر کسی حد تک روحانیت بھی حاصل کر لیتے ہیں۔ اس کے برعکس انبیاء علیہم السلام کو ان معلومات، حقائق اور روحانیت کے ادراک

میں تدریجی ترقی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ کیونکہ انہیں یہ معرفت بذریعہ وحی والہام حاصل ہوتی ہے۔ اور وہ روحانیت کے اعلےٰ درجہ پر فائز ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں بنی نوع انسان کی رشد و ہدایت اور معنوی تربیت و ترقی کے لئے روحانیت و معقولات سے ضرورت کے مطابق محسوسات کی طرف آنا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اولادِ آدم کو یہ خصوصیت حاصل نہ تھی۔ کیونکہ بقول خلیل جبران "تم بچے تو پیدا کر سکتے ہو لیکن انہیں اپنے افکار نہیں دے سکتے۔" اسی لئے حضرت آدم علیہ السلام کو ان کی تربیت کے لئے ترقی سے منزل کی طرف آنا پڑا۔ اور ایسی تعلیم دینا پڑی۔ جو اس دور کے انسان کی عقل و فہم میں آسکتی تھی۔ اور یہی حقیقت اس بات کا ثبوت ہے کہ دورِ اوّل کے انسانوں کو وہ عقل و شعور نہیں تھا۔ جو حضرت آدم علیہ السلام کو تھا۔ اس بات سے انبیاء علیہم السلام کی بعثت اور وحی کی ضرورت اور اہمیت کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔

اس تمام تر گفتگو کا ماحاصل یہ ہے کہ پوری کائنات کا خالق خدائے برتر ہے۔ جو اس وقت بھی موجود تھا۔ جب کچھ نہ تھا۔ اور اب بھی موجود ہے۔ جب سب کچھ ہے۔

جب کچھ نہ تھا تو خدا تھا جو نہ ہوتا تو خدا ہوتا ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

اس خدائے لم یزل اور علیم و خبیر و حکیم نے کوئی چیز بے مقصد تخلیق نہیں کی۔ اس نے ذرّات کو ذوقِ نمو دیا تو جمادات وجود میں آئے۔ پھر ان جمادات کے سینہ پر نباتات اگائے۔ نباتات سے افادہ حاصل کرنے کے لئے حیوانات کو زندگی بخشی۔ ان تمام مخلوقات سے متمتع ہونے کے لئے حضرتِ انسان کو خلق کیا۔ اسے عقل دی، نطق دیا۔ اور علم سے نوازا۔ پھر ان کی معنوی اور روحانی ترقی کے لئے انبیاء علیہم السلام کو مبعوث فرمایا۔ غرضیکہ مروجہ نظریہ ارتقار کو تسلیم نہ کرتے ہوئے بھی کائنات کی ہر چیز میں ارتقار کا عمل جاری و ساری رہا ہے۔ جو مادی اور جسمانی صورت میں وجودِ انسانی پر آکر ختم ہو گیا۔ اس کے بعد ذہنی ارتقاء کا دور شروع ہوا۔ اور ایک طول طویل مدت گزر گئی اور ہزار ہا برس کے اجتماعی اور ذہنی ارتقاء کے بعد وہ انسان ظہور پذیر ہوا۔ جو کرہ ارض کے تاریخی دور کا متمدن و مہذب اور عاقل و بالغ نظر انسان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں مختلف ادوار میں تشریف لانے والے انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات میں بھی تدریج نظر آتی ہے۔ تاریخی اور مذہبی مآخذ کے مطالعہ سے ہمیں جو بات معلوم ہوتی ہے۔ اس کے مطابق آدم ثانی (حضرت نوح علیہ السلام) کے زمانے میں جا کر تہذیب و تمدن کے کچھ آثار ملتے ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے دور کا انسان پانیوں پر حکمرانی کے لئے کشتیاں بھی تعمیر کر سکتا تھا۔ اس نے نہ صرف زمین سے فائدہ اٹھایا۔ بلکہ سمندر کے اندر موجود افادہ رکھنے والی اشیاء سے بھی تمتع حاصل کیا۔ پھر ایک زمانہ گزر گیا۔ ذہن انسانی رفتہ رفتہ ترقی کرتا گیا۔ حتیٰ کہ ابوالانبیاء (حضرت ابراہیم علیہ السلام) کے زمانے کا انسان ہمیں منظم اور اجتماعی زندگی بسر کرتے ہوئے نظر آتا ہے۔ وہ وادی غیر ذی زرع (مکہ) کو آباد کرتا ہے۔ عمارت سازی سے بھی شناسا نظر آتا ہے۔ پھر انہی پیغمبر علیہ السلام کی اولاد سے آل اسرائیل کا سلسلہ چلتا ہے۔ جو حضرتِ اسحاق علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک ہزار ہا سال کی مدت پر محیط ہے۔ اس دوران میں آل اسرائیل میں لاتعداد انبیاء و رسل کے نام ملتے ہیں۔ جن میں سے کئی ایک نے پرشکوہ سلطنتیں، حکومتیں اور بادشاہتیں قائم کر کے انسان کو فلاحی اور رفاہی ریاستیں قائم کرنے اور چلانے کے گر سکھائے۔

ان انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات میں تدریج و ارتقار کے باوجود ایک تصوّر مشترک نظر آتا ہے۔ یعنی توحید پرستی، یا خدا پرستی کا

تصور۔ یہ بات ہر دور کے انسان کے فہم و ادراک میں آ سکتی تھی۔ کیونکہ خدا پرستی کا جذبہ انسانی فطرت کا خمیر ہے۔ وہ بت پرستی، مظاہر فطرت پرستی اور دیوتا پرستی میں بھی درحقیقت خدائے واحد کا جلوہ دیکھتا ہے اور کسی مادی وجود کی عبادت سے تسکین و راحت محسوس کرتا ہے۔ انبیاء کرام نے انسان کے اس غلط رویے کی خوبصورتی کے ساتھ تردید کی۔ ان کے فطری وجدان کو بیدار کر کے انہیں خدا پرستی کی طرف مائل کیا۔ یہ بھی اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ ہر نبی کو اپنی قوم کی اصلاح کے لئے ان کے ذہنی معیار تک آنا پڑا۔ یعنی حضرت آدم علیہ السلام کو معقولات سے محسوسات تک آنا پڑا۔ جب کہ حضرت نوح علیہ السلام کو تخیل تک، حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی نسل سے پیدا ہونے والے انبیاء کو فکر تک نیچے آنا پڑا لیکن سب سے مشکل کام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو ادا کرنا پڑا۔ کیونکہ ان کے زمانے کا انسان، ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے عقل و شعور کی اس منزل پر پہنچ چکا تھا جہاں سابقہ ادوار کے انسان کا طائر خیال پر بھی نہیں مار سکتا تھا۔ سقراط، افلاطون، ارسطو اور ان کے شاگردوں کے افکار موجود تھے۔ انہوں نے مادہ روح وجود باری اور دیگر مابعد الطبیعیاتی مضامین پر اتنا کچھ لکھا تھا کہ اس دور کا انسان ان کے علم و فکر کی روشنی میں ادق سے ادق مسئلے پر گفتگو کر سکتا تھا۔ اور یہی روشنی طبع دراصل کسی لطیف نکتے کو سمجھنے میں حائل بھی ہوتی ہے۔ کیونکہ جاہل آدمی اپنے عجز کا جلد اعتراف کر لیتا ہے۔ جبکہ پڑھا لکھا اور باکمال آدمی ایک ایک نکتے پر کج بحثی کرتا ہے۔

اگر اسلام کی مقبولیت اور اثر انگیزی کا مطالعہ مندرجہ ذیل نقطہ نظر سے کیا جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آجائے گی کہ اسے سادہ طبیعت لوگوں نے جلد قبول کیا۔ اہل مغرب نے اسے قبول کم کیا اور بہت زیادہ کی کیونکہ وہ معقولات کی منزل میں تھے اور ہر بات کی مادی توجیہہ کرتے تھے۔ اس کے برعکس مصر، شام، عراق وغیرہ نے اسے جلد قبول کیا۔ کیونکہ ان کے قلوب و اذہان فلسفہ زدہ نہ تھے۔ سواحل ہند پر رہنے والے لوگوں پر اس کا اثر بہت جلد ہوا۔ جبکہ وسط ہند کے لوگوں نے اسے قبول نہیں کیا۔ کیونکہ ان میں بھی خدا اوتار، فلسفہ و یدانت اور دیگر مابعد الطبیعیاتی افکار موجود تھے۔ اسلام کسی حد تک ان کی معاشرتی رسوم، ان کی تہذیب و تمدن اور مذہبی خیالات پر اثر انداز ضرور ہوا۔ لیکن ایک ہزار سال تک غالب طاقت رہنے کے باوجود بہت کم لوگوں کو اپنے اندر ضم کر سکا۔ جزائر مالدیپ، انڈونیشیا، ملائیشیا وغیرہ حالانکہ مرکز اسلام سے بہت دور تھے۔ نیز وہاں مسلمانوں نے تبلیغ کا کام بہت دیر بعد شروع کیا۔ تاہم وہاں اسلام کو نہایت سرعت کے ساتھ مقبولیت حاصل ہوئی۔

جب یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ گئی کہ اس کائنات میں ایک حی و قیوم ذات قدیم موجود ہے۔ جو رب الارباب، احکم الحاکمین اور احسن الخالقین بھی ہے۔ جس نے اپنی قدرت کاملہ سے تمام عالم خلق کئے۔ اور ان سے افادہ فیضان پہنچانے کے لئے اپنا شاہکار ــ انسان تخلیق کیا۔ اور پھر اس کی معنوی تعلیم کے لئے وقتاً فوقتاً انبیاء علیہم السلام کو مختلف قبائل علاقوں اور بلاد و امصار میں مبعوث کیا۔ جنہوں نے اپنی عقلی سطح سے نیچے آکر اپنے اپنے دور کے انسان کے ذہنی معیار تک پہنچ کر اپنے پیغمبرانہ فرائض سرانجام دیئے تو اس سے دو مزید باتیں ثابت ہوتی ہیں۔

ا۔ یہ کہ سب سے پہلے نبی ــ حضرت آدم علیہ السلام کو سب سے نچلی سطح پر آکر اپنا مفہوم سمجھانا پڑا لیکن چونکہ ان کا زمانہ انسان کا دور طفولیت تھا۔ اس لئے انہیں زیادہ مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑا ہوگا۔

۲ - لیکن اس کے برعکس سب سے آخری نبی — حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ انسان کا دورِ بلوغت تھا۔ اس لئے آپ کو اگرچہ نسبتاً کم دورِ حیات پیچھے آنا پڑا۔ تاہم اپنے مشن کے سلسلہ میں سب سے زیادہ دشواریاں برداشت کرنا پڑیں۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ جس پیغمبر کو زیادہ ذہین انسان سے واسطہ پڑا۔ اس کی تعلیم و تربیت پر بھی زیادہ زمانہ صرف ہوا ہوگا لیکن ہم یہ بات لکھ چکے ہیں کہ سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام کی خلقت ہوئی۔ کیا ایسا ممکن نہیں کہ سب سے آخری پیغمبر کی خلقت تو سب سے پہلے ہوئی ۔ اور ظہور سب سے آخر میں ہوا ہو۔ اس کا شافی جواب دیکھنے کے لئے ہمیں تستری کی "تفسیر القرآن" کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔

ابو محمد سہیل بن عبداللہ التستری نویں اور دسویں صدی عیسوی کے ایک مسلمان صوفی اور سنی مفکر گزرے ہیں۔ جنھوں نے صوفی تفسیر میں ایک نظریہ بعنوان "پیغمبر اسلام، پہلے اور آخری نبی" پیش کیا۔ جس کی تشریح و توضیح ابو طالب بن محمد مکی (وفات ۹۹۶ء) ابو عبدالرحمان محمد بن الحسین سلومی (وفات ۱۰۱۱ء) کی تصانیف "علم القلوب" اور "حقائق التفسیر" میں بھی ملتی ہے۔

تستری کے نزدیک انسانی زندگی کی ابتداء یوم میثاق ہے اور انتہا یوم القیامہ ہے اور ان دو اہم ایام کے دوران میں وہ انسانی تاریخ کے عمل کو حیات و موت کی مدد سے زمان و مکان کے تانے بانے کو علامت نور سے تعبیر کرتا ہے جس سے توحید باری تعالےٰ کا ناقابل فہم مفہوم واضح ہوتا ہے۔ وہ انسان کے اندر دو پوشیدہ عناصر فطرت و جدانی رجحان اور اس کی ذات کو فعال رکھنے والی قوت کو "روح" اور "نفس" کا نام دیتا ہے۔

ان علامات کی واضح شکل اس کے نزدیک ذات "محمد صلی اللہ علیہ وسلم" ہے جو سراپا نور ہے جس کی شعاعوں سے انسان کی خلقت واقع ہوئی ہے۔ انسان کا مقصود قلب محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ رہا نور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) وہ تو یوم المیثاق ہی سے پوری آب و تاب سے جلوہ گر ہے۔ لیکن قلب محمد سے وہ تمام حالات و واقعات صورت پذیر ہوئے ہیں۔ جو یوم المیثاق سے لے کر یوم القیامۃ تک رونما ہوتے رہیں گے۔

اس سے مترشح ہوتا ہے کہ نظریہ "نور محمد" اور قلب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) حضورؐ کے خاتم المرسلین ہونے کے اس اسلامی اصول کا آئینہ دار ہے۔ جسے تصوف کی رو سے پہلی اور آخری خلقت کہا جاتا ہے۔ بلکہ واضح الفاظ میں پہلے اور آخری نبی کا تصور۔

تستری نظریہ نور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا استخراج، قرآن کریم کی ایسی آیات سے کرتا ہے جن میں نور سے متعلق اشارات ہیں۔ خاص طور پر وہ سورہ نجم کی ان آیات کو بطور دلیل پیش کرتا ہے۔

"اللّٰہ نور السمٰوٰت والارض مثل نورہ کمشکوٰۃ فیھا مصباح المصباح فی زجاجۃ الزجاجۃ کانھا کوکب دری یوقد من شجرۃ مبارکۃ زیتونۃ لاشرقیۃ ولا غربیۃ یکاد زیتھا یضیٔ ولو لم تمسسہ نار نور علی نور یھدی اللّٰہ لنورہ من یشآء ویضرب اللّٰہ الامثال للناس ۔ واللّٰہ بکل شیئٍ علیم ○

اللہ تو آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ اس کے نور کی مثال ایسی ہے۔ جیسا کہ طاق ہے جس میں ایک چراغ

ہے - اور چراغ ایک شیشہ میں ہے اور شیشہ ایسا ہے گویا ایک روشن ستارہ - اس میں ایک مبارک درخت کا تیل جلتا ہے - یعنی زیتون جو نہ شرقی جانب ہے نہ غربی جانب - اس کا تیل خود بخود جل اٹھنے کو ہے - خواہ اس کو آگ نہ بھی چھوئے - نورٌ علیٰ نور ہے - اللہ تعالیٰ اپنے اس نور تک جس کی چاہتا ہے - رہنمائی کرتا ہے اور لوگوں کے لئے مثالیں بیان کرتا ہے - اللہ تعالیٰ ہر بات کا جاننے والا ہے "

اللہ تعالیٰ بقول تستری' اپنی وحدت مطلقہ اور حقیقت باہرہ میں ایک ناقابل رسائی سراپا نور ہے - جو اپنے نور کی مانند ازلی شہود میں از خود ناطق ہے - یعنی وہ نور محمد کا 'مماثل ہے - جس کی ابتداء ازل سے بھی پہلے ایک درخشاں ہیولے کی صورت ہوئی جس نے بارگاہ الٰہی میں سب سے پہلے حمد و ثنا ادا کی اور ایک شفاف عمادی نور الٰہی کی شکل اختیار کر لی - اس طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی تخلیق کا جوہر اول بننے کا شرف حاصل ہوا - اصطلاح نور کی تفسیر بیان کرتے ہوئے تستری لکھتا ہے :

"جب اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تخلیق کرنا چاہا ' تو اس نے اپنے نوروں سے ایک نور کو ظاہر کیا - جب وہ حجاب الاعظم پر پہنچ گیا تو بارگاہ الٰہی میں سجدہ ریز ہوا - تو اللہ تعالیٰ نے اس کے سجدے سے ایک زبردست "عماد النور" تخلیق کیا جو ظاہر و باطن میں شفاف آبگینے کی طرح روشن تھا "

تستری کے ان خیالات کی تائید' ابو طالب مکی' ابوالحسن علی بن محمد الویلامی اور ہمدانی کی تصریحات سے بھی ہوتی ہے - جن کے افکار کا خلاصہ مندرجہ ذیل ہے -

"جب اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پیدا کرنا چاہا تو اس نے اپنے نور سے ایک ٹکڑا الگ کیا اور اسے کائنات کی پہنائیوں میں پھیلا دیا - اور یہ مملکت ازلی کی لامحدود وسعتوں پر محیط ہوتا گیا - جب وہ عظمت کی بلندیوں تک پہنچ گیا تو سجدے میں جھک گیا - اللہ تعالیٰ نے اس کے سجدے سے نور کثیف پر مبنی ایک ایسا ستون تخلیق کیا - جس کی پہنائی ساتوں آسمانوں جتنی تھی - اور وہ ظاہر و باطن میں ایک شفاف شیشے کی مانند تھا - یہ نور اللہ تعالیٰ کے حضور ایک لاکھ سال تک رہا جسے وہ ہر روز و شب میں ۷۰ ہزار مرتبہ دیکھتا اور ہر نظر میں اسے ایک نیا نور عطا کرتا اور اس سے تمام موجودات کو خلق کیا "

تستری نے اپنے نظریہ "نور محمدؐ" کے لئے سورہ نجم کی آیات ۱۳ تا ۱۸ سے بھی استنباط کیا ہے -

" ولقد راٰہ نزلۃ اخری عند سدرۃ المنتھٰی عندھا جنۃ الماوٰی اذ یغشی السدرۃ ما یغشٰی - ما زاغ البصر وما طغٰی لقد راٰی من اٰیات ربہ الکبرٰی ٥

آپ نے اسے ایک بار پہلے بھی دیکھا تھا - سدرۃ المنتھٰی کے قریب جس کے پاس ہی جنۃ الماوٰی ہے جس وقت کہ وہ سدرۃ المنتھٰی پر چھا رہا تھا - اس کی آنکھ نے نہ غلطی کی' نہ اسے دھوکا دیا - بے شک اس نے اپنے رب کی اہم نشانیوں میں سے نشانی دیکھی -

تستری نے قرآن کریم کی ان آیات کی تشریح و توضیح مندرجہ ذیل انداز میں کی ہے۔

۔ بے شک اس نے پہلے بھی اسے ایک بار دیکھا۔ یعنی ابتداء میں جب خدا تعالیٰ نے اس (محمدؐ) کو عمود النور کی مانند پیدا کیا۔ تخلیق کائنات سے لاکھوں برس قبل۔ تو وہ اس کے سامنے طبع الایمان کے ساتھ پرستش کے لئے کھڑا ہوگیا اور اس کے سامنے سدرۃ المنتہیٰ کے مقام پر مکاشفات غیب عیاں کر دیئے۔ یہ ایک ایسا مقام ہے۔ جہاں پہنچ کر ہر ایک کا علم اختتام کو پہنچ جاتا ہے۔

۲ ۔ سدرۃ المنتہیٰ حضورؐ کی عبادت کے دوران میں نور محمدی کی زد میں سے سنہری ادا کی طرح ڈھکا رہا۔ جسے حق تعالیٰ نے اپنے اسرار و عجائب سے حرکت میں رکھا۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی ثابت قدمی میں اضافہ کے لئے ایسا کیا۔

۳ ۔ اس (محمدؐ) کی آنکھ نے نہ غلطی کی، نہ دھوکا کھایا۔ اس نے نہ تو شواہد ذات کی طرف توجہ کی اور نہ ہی مشاہدات کی طرف بلکہ کلی طور پر اپنے رب کے نظارہ میں محو رہا۔ اور صفاتِ الٰہی جن کی وجہ سے اس میں ثابت قدمی کا جوہر پیدا ہوا۔ ان کا مشاہدہ کرتا رہا۔

۴ ۔ بے شک اس نے اپنے رب کی اہم ترین نشانیوں یعنی ان صفات کو دیکھا جو اس کی نشانیوں سے ظاہر تھیں۔ اگرچہ اس نے ان نشانیوں کو دیکھا لیکن وہ اپنے شہود کے استغراق میں رہا۔ اور اپنے محبوب کے قرب سے الگ نہیں ہوا۔ اس کی محبت شوق اور قوت میں لگاتار اضافہ ہوتا رہا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے تجلیات الٰہی اور انوار عظیم کو برداشت کرنے کی قوت و صلاحیت عطاء فرمائی۔

اس طرح تستری نے ایک طرف اللہ تعالیٰ کی وحدت مطلقہ کے تصور کو بھی قائم رکھا ہے۔ اور دوسری طرف حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیکر نور کو کائنات کی پہلی تخلیق کے طور پر ثابت کیا ہے۔ اور اس کو تمام مخلوقات کی پیدائش کا ذریعہ بتایا ہے۔ اس کو مزید واضح کرنے کے لئے وہ سورہ اعراف کی آیت نمبر ۱۷۲ اور سورہ احزاب کی آیت نمبر ۷ کو بطور کلید پیش کرتا ہے۔

" واذ اخذ ربك من بني آدم من ظهورهم ذريتهم واشهدهم على انفسهم الست بربكم قالوا بلى شهدنا ان تقولوا يوم القيامة انا كنا عن هذا غافلين "

" اور جب آپ کے رب نے بنی آدم سے ان کی نسل کو نکالا اور ان کو انہیں پر گواہ بنایا اور دریافت کیا۔ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ تو سب نے کہا کیوں نہیں؟ ہم اس پر شاہد ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ قیامت کے دن تم یہ کہنے لگو کہ ہم تو اس سے بے خبر تھے۔

" واذ اخذنا من النبيين ميثاقهم ومنك ومن نوح وابراهيم وموسى وعيسى ابن مريم واخذنا منهم ميثاقا غليظا ○

"اور جب ہم نے تمام نبیوں سے اور آپؐ سے اور نوحؑ وابراہیمؑ وموسیٰؑ وعیسیٰؑ ابن مریم سے عہد لیا۔ تھا۔ اور ان سے عہد بھی پکا لیا تھا۔

ان آیات میں سے پہلی آیت میں لفظ "ذریت" (یعنی بیج) اور اس سے ملتے جلتے لفظ "ذر (یعنی ذرہ) کو اپنے بڑے مقصد کے لئے کلید بنایا ہے۔ جس کے دونوں مفاہیم سامنے رکھیں۔

۱ ۔ اور جب آپؐ کے رب نے بنی آدم سے اُن کی نسل "ذُرّیت" کو نکالا۔

۲ ۔ اور جب آپؐ کے رب نے بنی آدم کو "ذرات" سے نکالا۔

اس طرح تستری تخلیقِ نور یا خلقتِ انسان کے تین امتیازی مراحل پیش کرتا ہے۔ یعنی محمدؐ، آدمؑ اور نسل انسانی (ذریت) یا ذراتِ نور، جن سے نسل انسانی کی بنیادی تخلیق ہوئی۔

موضوع کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے ایک بار پھر تستری کے خیالات کا اعادہ کیا جاتا ہے۔ جس کے مطابق یوم میثاق سے قبل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تخلیق نور الٰہی سے ہوئی۔ جبکہ وہ اس کی بارگاہ میں علوم زمانے تک مینارِ نور کی مانند ایستادہ اس کی حمد وثنا میں مصروف رہا۔ پھر اس کے نوری ذرات سے حضرت آدمؑ بلکہ تمام کائنات اور تمام نسلِ انسانی کی تخلیق ہوئی۔ تستری کا ایمان ہے کہ نور الانبیاء آپؐ ہی کے نور کا پرتو ہیں ہے۔ مملکتِ بہشت کا نور آپؐ ہی سے ہے۔ دنیا کا نور آپؐ ہی کے دم سے ہے اور نور آخرت بھی آپؐ ہی کی بدولت ہے۔ حتٰی کہ بنی نوع انسان کی غائیت بھی نور محمدؐ سے ہے۔

بالآخر جب حضور علیہ السلام کی ذات گرامی اور روحانی کائنات تکمیل کے تمام مراحل طے کر چکے تو آپؐ کے جسد مبارک کی مادی اور روحانی تشکیل حضرت آدمؑ کی مٹی سے کی جو بنیادی طور پر حضورؐ ہی کے نور سے حاصل کی گئی تھی۔ اس طرح سب سے پہلا انسان نور محمدؐ کی چاندی میں ڈھلا رہا۔ اور پھر بنی نوع انسان کو نور محمدؐ سے چمکدار ذروں کی صورت میں ظاہر کیا گیا جس نے پہلے آدمی (حضرت آدمؑ) کی شکل اختیار کی۔ پھر اللہ تعالےٰ نے تمام انبیاء علیہم السلام کو حضرت آدم کی پشت (ظہر) سے نکالا۔ اور ہر نبی کی پشت سے اس کی اولاد (ذرّیت) کو بشکل ذراۃ نکالا جنہیں عقل ودیعت کی گئی۔

اس مرحلہ پر اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء کے سامنے اپنے احکامات اوامر ونواہی رکھ کر اُن سے سوال کیا کہ میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ اور اُن کے سامنے اپنی قدرت کاملہ کا اظہار فرمایا۔ قرآنی آیات کے مطابق اُن کے جواب قالوا بلیٰ شھدنا پر اللہ تعالےٰ نے اپنی تمام مخلوق کو جمع کیا اور انہیں ابتدا اور انتہا سے آگاہ کیا۔ اس مرحلہ میں انبیاء سے ایک دوسرے کی تصدیق کا اقرار بھی لیا۔ اور پھر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کا حکم صادر فرمایا۔ اسی طرح تمام بنی نوع انسان کو ان کے اپنے پیغمبروں کی پشتوں سے نکالا اور ان سے خطاب کرتے ہوئے ان کے سامنے احکامات ربانی رکھے اور پھر انہیں عقل و دانش سے نوازا۔ پھر اللہ تعالےٰ نے ہر نبی کی پشت میں سے اس کی "ذریت" کو نکالا۔ اور ہر نبی سے ان کی تصدیق کروائی۔ اس کے بعد ان تمام (ذرّیات) کو صلب آدم میں منتقل کر دیا۔ جہاں سے وہ ظہور آدم کے بعد سے آج تک انسانی شکلوں میں پیدا ہوتے چلے آ رہے ہیں)۔ یہ عمل اس وقت تک جاری رہے گا۔ جب تک کہ وہ جملہ ارواح جن سے یوم میثاق اپنی ربوبیت کا اقرار لیا تھا۔ اس دنیا میں

زندگی حاصل کر کے فنا نہیں ہو جائیں گی اور یہی وہ معینہ ساعت ہے۔ جسے قیامت کہا جاتا ہے۔

بالفاظ دیگر پیدائش دنیوی سے قبل تمام انسان ایک بار پہلے بھی بشکل "ذراتِ نور" جنم لے چکے ہیں۔ اور پھر اس دنیا کے حُسن اور ترتیب کو قائم رکھنے کیلئے انہیں مختلف ادوار اور زمانوں میں پیدا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ جو انسان پہلے پیدا ہوئے۔ ان کی عقل و فہم اور علم و دانش کم تھی جو بعد میں پیدا ہوئے وہ نسبتاً زیادہ باشعور ہوتے گئے۔ حتیٰ کہ حضور علیہ السلام کے زمانہ بعثت تک انسان کا دور بلوغت شروع ہو گیا۔ نیز آپؐ کا واسطہ جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔ نسبتاً بہت زیادہ ذہین انسانی گروہ سے پڑا۔ اس لئے آپؐ کی تعلیم و تربیت پر بھی زیادہ مدت صرف ہوئی۔ اس لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ آپؐ کی خلقت سب سے پہلے ہوئی اور بعثت سب سے آخر میں۔

متکلمین کے دلائل و براہین، فلاسفہ کی موشگافیوں، حکماء کی نکتہ آفرینیوں، مفکرین کی فکر سامانیوں، شارحین کی تشریحات و توضیحات، متصوفین کے اشارات و انکشافات اور ماہرینِ حیاتیات کی توجیہات و تصریحات کے تجزیے سے جو حقائق کھل کر سامنے آتے ہیں۔ ان کا خلاصہ یہ ہے کہ اس کائنات میں ایک ذات مطلق ہے۔ جسے خدا کہیئے یا اللہ تعالیٰ یا کوئی اور نام لیجیے جس نے اپنی حکمت اتم اور قدرت کاملہ سے تمام عالم پیدا کئے اور پھر ان سے افادہ و فیضان حاصل کرنے کے لئے انسان کو وجود عطا کیا۔ پھر اس کی معنوی تربیت کے لئے ایک ایک کر کے نبی اور رسل مبعوث کئے۔ جن کی آخری کڑی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ جن پر نبوت ختم بھی ہوئی اور تمام بھی۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ہر دور کے انسان کی رشد و ہدایت اور تعلیم و تربیت کے لئے انبیاء علیہم السلام بھیجے تو پھر عصرِ حاضر کی رہنمائی کے لئے کوئی نبی، کوئی رسل یا پیغمبر کیوں نہیں آیا۔ کیا وحی و الہام کے سوتے خشک ہو گئے تھے۔ یا دورِ حاضر اور مستقبل کے انسان کو کسی ہدایت کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔

اس حقیقت کو جاننے کے لئے بنی نوع انسان کے مختلف عہود و ادوار کی تاریخ کا مطالعہ کرنا پڑے گا۔ جس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام علم بیک وقت نازل نہیں کیا۔ بلکہ ہر دور کے انسان کی عقلی سطح کے مطابق اس کی تعلیم و تربیت کی گئی۔ چونکہ دورِ اول کے انسان کے پاس علم کو محفوظ رکھنے کا کوئی طریقہ نہ تھا۔ نیز اس کی ذہنی سطح میں اضافہ ہوتا رہا۔ اس لئے وہ اصل تعلیمات کو بھلا دیتا اور اپنی عقل و دانش سے شرائع کے پیمانے وضع کر لیتا۔ یہی بات دراصل انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا سبب بنی۔ یہ سلسلہ جانے کب تک جاری رہا۔ اور انسان کو اتنا شعور حاصل ہوا کہ وہ علم کی اہمیت کا صحیح اندازہ لگا سکا۔ یہ بات تدوین و تحفظِ علم کا نقطہ آغاز بنی۔ گویا اس سے پہلے کی تمام تر تعلیمات کا کوئی ریکارڈ نہیں ملتا۔ اور جب انسان نے اس کا احساس کر لیا۔ تب بھی اس کے پاس کوئی ایسی چیز موجود نہ تھی کہ وہ علمی یادداشتوں کو لکھ کر محفوظ کر لیتا شروع میں زیادہ تر کاروبار قوت حافظہ کے بھروسے پر چلتا رہا۔ جس میں وقت کے ساتھ ساتھ دستاویزات کے متن میں کمی یا بیشی ہوتی رہی پھر انسان نے اپنے دماغ سے کام لے کر لکڑی کی چھال، چمڑے، پتھر اور اس قسم کی اشیاء پر کوئلے سے لکھنا شروع کیا، یا کسی نوکیلی چیز کی مدد سے کندہ کر کے بعض اہم دستاویزات کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی۔ لیکن قبائلی جنگوں یا فاتحین اور کشور کشاؤں کے حملوں کے دوران میں ایسی اہم نگارشات تباہ ہو جاتیں۔ اور دنیا پھر اندھیرے میں بھٹکنے لگتی۔ اس کے باوجود جب انسان نے

قلم، قرطاس اور روشنائی جیسی چیزیں ایجاد کرلیں۔ اور باہم نگارشات کو محفوظ کرنے لگا تو اس کی فطرت آڑے آئی۔ اور اس نے الہامی کتابوں تک میں تحریف کرڈالی۔ چنانچہ آج اکثر صحائف کے نام تک باقی نہیں۔ بعض کے صرف ناموں کا پتہ چلتا ہے۔ بعض کتابوں کے صرف حوالے ہی ملتے ہیں۔ توریت اور انجیل کی اصلی شکل مسخ ہو چکی ہے۔ یہ تو الہامی کتابوں کا حال ہے۔ رہی دوسری مذہبی کتابیں، جیسے پارسیوں کی ژند اوستا، اہل ہنود کے وید گیتا، بدھ مت کے "ترپی پٹک" وغیرہ بھی اپنی اصل اہمیت اور افادیت کھو چکے ہیں۔ اس کا اندازہ ان کے مندرجات سے لگایا جاسکتا ہے۔ اگرچہ سب مذہبی کتابیں تحریف کی نظر ہو چکی ہیں تاہم انسان اب شعور کی ایسی منزل پہ پہنچ چکا تھا کہ وہ ہر آنے والے دور کے لئے کسی بھی شخصیت کے خیالات و افکار، عقائد و نظریات، تعلیمات و اشارات محفوظ رکھ سکتا تھا۔

اگر ہم تاریخ انسانیت کا مطالعہ کریں تو ہم اسے دو واضح ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل کا دور، دوسرا آپ کی بعثت کے بعد کا دور۔ پہلے دور کو بجا طور پر دور جاہلیہ کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس طویل عرصے میں ہزارہا سال کے ارتقائی سفر کے باوجود، انسان کے پاس کوئی منشور ہدایت نہ تھا جس کی روشنی میں وہ کوئی صحت مند معاشرہ قائم کر سکتا۔ اس دور کے آخری حصے میں بظاہر بڑی بڑی تہذیبوں نے جنم لیا۔ پرشکوہ سلطنتیں قائم ہوئیں۔ بڑے بڑے بلاد و امصار بسائے گئے۔ بے نظیر قصور و محلات تعمیر کئے گئے۔ ان ایوانوں سے دور کہیں کہیں نئے افکار و خیالات کی قنادیل بھی روشن نظر آتی ہیں۔ لیکن اول تو ان تہذیبوں کے تمام نقش و نگار ملوک و سلاطین کی باہمی جنگ و جدال کے ہاتھوں مٹ گئے۔ دوسرے ان میں کوئی ایسا عنصر نظر نہیں آتا جو انسان کی معنوی ترقی میں ممد و معاون ثابت ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دور بحیثیت مجموعی انسان کی مفلوک الحالی، ذہنی اور جسمانی غلامی اور معاشرتی و اخلاقی پستی کا دور تھا۔ جس میں صرف چند گنتی کے انسان پورے انسانی معاشرے کے سیاہ و سفید کے مالک نظر آتے ہیں۔ غرضیکہ جس وقت دوسرے دور کا آغاز ہوا تو قرآن کریم کے الفاظ میں تمام بحر و بر میں فساد برپا تھا۔ اور انسان کو ادوار ماضی کی طرح ہدایت و رہنمائی کی ضرورت تھی۔ جو حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کی خلقت و بعثت کی صورت میں اس عالم مادی میں ظہور پذیر ہوئی۔ اور اس کے ساتھ ہی تاریخ انسانی کا دوسرا دور شروع ہوا۔ جس کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں۔ یہ بنی نوع انسان کی خوش قسمتی تھی کہ آپؐ نے جس آسمانی وحی کی روشنی میں انسان کی تہذیب و اصلاح کی۔ اس کا ایک ایک لفظ آج بھی اپنی اصل شکل اور ترتیب کے ساتھ موجود ہے۔ جس میں نہ کوئی تحریف ہو سکی۔ اور نہ ہی اس کا کوئی حصہ کوئی آیت یا لفظ اس کتاب ۔۔ قرآن کریم سے محو ہو سکا۔ جب تک اسے باقاعدہ منضبط نہیں کیا گیا تھا۔ یہ لوگوں کے سینوں میں محفوظ تھا اور اب سینوں کے ساتھ سفینوں میں بھی موجود ہے۔ اس کی صحت اور سند کے بارے میں طویل بحث سے قطع نظر صرف ایک ہی ثبوت کافی ہے کہ اس کے بعد دنیا میں اور بھی بہت سی کتابیں مختلف زبانوں میں لکھی گئیں۔ وہ بھی صحیح حالت میں موجود ہیں۔ گویا کہ اس دوسرے دور تک پہنچتے پہنچتے انسان نے علم کو صحت کے ساتھ مدون کرنے اور محفوظ رکھنے کا فن سیکھ لیا تھا

اس بات کی پہلے بھی وضاحت کی جا چکی ہے کہ جب بھی ربانی تعلیم دنیا سے ختم ہو جاتی تو اللہ تعالیٰ اپنے

کسی نبی، رسول یا پیغمبر علیہ السلام کے ذریعے اسے دوبارہ زندہ کرکے انسانوں تک پہنچایا۔ لہذا جب قرآن کریم کی شکل میں آخری کتاب پوری صحت کے ساتھ موجود ہے تو اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کا جو سلسلہ شروع کیا تھا۔ اس کا اختتام اور اتمام کر دیا۔

اب صرف ایک بات کا جواب باقی رہ جاتا ہے کہ وہ کونسی تعلیم ہے جو قرآن کریم کے نزول اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل دنیا سے مفقود تھی۔ اور اسے اس قدر کمال اور اتمام کے ساتھ زندہ کیا گیا کہ اس کے بعد اب مزید کسی تعلیم کی ضرورت باقی نہ رہی؟ اس سوال اور استفسار کا مدلل جواب ذیل میں دیا جاتا ہے۔

۱ - تصورِ الٰہ

اگر "تخلیق" سے لے کر آج کے ترقی یافتہ انسان کی تکمیل تک کے حالات کا مطالعہ کیا جائے تو دو باتیں سامنے آتی ہیں۔ ایک یہ کہ جو کچھ آج تک گذر چکا ہے۔ اور جو کچھ بنتا سنورتا رہا ہے۔ یہ تمام تو انسان کی پیدائش و تکمیل کی سرگزشت ہے۔ دوسرے یہ کہ اس تمام تر عمل کے پیچھے ایک ایسی ہستی کار فرما رہی ہے جو اس کائنات کی خالق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا پرستی ہمیشہ انسان کی فطرت و جبلت میں داخل رہی ہے۔ اور یہی تصور انسان کی روحانی اور اخلاقی زندگی کا محور و مرکز رہا ہے۔ اگر ہم اس نقطۂ نظر سے نوع انسانی کے مختلف ادوار اور مراحل کا جائزہ لیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے مادی تصورات کی طرح اس کے الٰہ پرستی کے تصور میں بھی ایک طرح کے تدریجی ارتقاء کا سلسلہ جاری رہا ہے۔ اور بتدریج ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ترقی ہوتی رہی۔ اس کی ابتدائی کڑیاں اگرچہ ملنا ممکن نہیں۔ تاہم اس بات کا اندازہ ضرور لگایا جا سکتا ہے کہ انسان نے اپنے عالم طفلی میں خدا کا وہی تصور قائم کیا ہوگا جس کا ادراک اس کی قوتِ حس نے کیا۔ کیونکہ اس کا ادراک محسوسات کے دائرہ میں ہی محدود تھا۔ اس کی نظر خوگر پیکر محسوس تھی۔ وہ کسی ایسی ہستی ہی کو اپنا معبود تسلیم کر سکتا تھا جس کا ادراک اس کی قوت لمس اور بینائی سے باہر نہ ہو۔ یہی بات دراصل اصنام پرستی اور مظاہر فطرت کی پرستش کا سب سے بڑا محرک بنی۔ وہ خود ہی بت بناتا اور عالم امکان میں اچھا برا جو کچھ بھی ظہور میں آتا۔ اپنے خود تراشیدہ بتوں یا پسندیدہ مظاہر فطرت کی طرف منسوب کرتا پھر جب انسان نے ذہنی ترقی کرکے عالم تخیل میں قدم رکھا تو اس نے خدا کی صورت بھی اپنے خیال کے مطابق وضع کر لی۔ جس کے نتیجہ میں ہندی اور یونانی دیو مالا نے جنم لیا۔ اس دور کا انسان تخیلات اور اوہام میں گرفتار نظر آتا ہے۔ پُر اسرار اور ہوشربا طلسماتی خیالات اس کے محبوب مضامین ہیں۔ خیالی دیوی، دیوتاؤں کے قصے کہانیوں میں وہ تسکین محسوس کرتا ہے۔ یہ عنصر اس کے مزاج میں اتنا غالب نظر آتا ہے کہ اس کی چھاپ آنے والے دور پر بھی گہری نظر آتی ہے۔ حتیٰ کہ اقلیم سخن کا شہنشاہ "ہومر" بھی اپنی مشہور نظم ایلیڈ میں دیوتاؤں کی مجلس آراستہ کرتا ہے تو ان میں سر فہرست مشتری اور اس کی بیوی جنون ہیں کہیں اپالو، روشنی کے دیوتا کے روپ میں نظر آتا ہے۔ منروا حکمت کی دیوی ہے۔ مریخ جنگ کا دیوتا ہے۔ زہرہ حسن کی دیوی ہے۔ کیوپڈ عشق کا دیوتا ہے۔ یونانی دیو مالا کے مطابق اہل ٹرائے اور سپارٹا کی مشہور جنگ کیوپڈ کے تیر عشق کا کرشمہ تھی جس

کے چلاتے ہی ٹرائے کی ملکہ ہیلن، سپارٹا کے شہزادے پیرس کی محبت میں ایسی گرفتار ہوئی کہ دونوں نے تمام اخلاقی اور سیاسی روایات و اقدار کو پامال کر کے رکھ دیا جو دو پڑوسی ممالک کے درمیان ہلاکت خیز اور تباہ کن جنگ کی صورت میں ظاہر ہوئی جو اٹھارہ سال کے طویل عرصے پر محیط ہے۔

ہندوؤں کے ہاں تو مفروضہ دیوی دیوتاؤں کی تعداد اور بھی زیادہ ہے جن میں سے ہر ایک کے ذمے کوئی نہ کوئی فرض عائد ہے۔ کوئی حیات کا دیوتا ہے تو کوئی تباہی کا۔ ... طاقت کا دیوتا ہے تو دوسرا حفاظت کا۔ آگ کا دیوتا اگنی ہے اور پانی اور بارش کا دیوتا۔ الگ۔ آگے چل کر ان میں سے بعض کی بیویاں بھی تلاش کر لی گئیں جیسے پاربتی، لکشمی، کالی وغیرہ۔ ان کی تسلی جب اصنام سے نہ ہو سکی تو بعض دیوتاؤں کو انسان کے روپ میں پیدا کر دیا۔ اور ان کی پرستش شروع کر دی گئی۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خدا کی ہستی کا تصور تو ہمیشہ سے انسان کے وجدان اور فطرت میں موجود رہا۔ لیکن اس کی صفات کا تصور، انسان کی ذہنی نشو و نما کے ساتھ ہمیشہ بدلتا رہا۔ جوں جوں اس کا معیار فکر اور ماحول بدلتا گیا۔ اس کے مطابق خدا کی صفات کا تصور بھی بدلتا رہا۔ اس دوران میں انبیاء علیہم السلام بھی مبعوث ہوتے رہے۔ انہوں نے نوع انسانی کو خدا کی صفات کے بارے میں جو کچھ بھی سکھایا وہ اس کی ذہنی استعداد کے مطابق تھا۔

مولانا ابوالکلام آزاد اس سلسلہ ارتقاء کی تمام کڑیوں پر نظر ڈالتے ہوئے اور ان کے فکری عناصر کی تحلیل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اگرچہ ان کی مختلف نوعیتیں قرار دی جاسکتی ہیں لیکن ارتقائی عناصر ہمیشہ تین ہی رہے ہیں یعنی۔

۱ ۔ تجسم سے تنزیہہ کی طرف

۲ ۔ تعدد و اشراک سے توحید کی طرف

۳ ۔ صفات قہر و جلال سے صفات رحمت و جمال کی طرف۔

ذیل میں ہم ان تینوں عناصر کی وضاحت کرتے ہوئے ظہور اسلام کے وقت چار اہم مذاہب۔ ہندمت، مجوسیت، یہودیت اور عیسائیت۔ میں ان نکات کی تلاش کرتے ہیں۔ اور پھر اس کی وضاحت کریں گے جو حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن و احادیث کے ذریعے پیش کیا۔

تجسم سے مراد یہ ہے کہ خدا کی نسبت ایسا تصور قائم کرنا کہ وہ انسان کی طرح جسم اور صورت رکھتا ہے۔ اور اس کی صفات بھی ویسی ہیں جیسی انسان کی۔ جبکہ تنزیہہ سے مقصود یہ ہے کہ ان تمام خواص اور اوصاف سے خدا کو انسان سے مشابہ کرتے ہیں۔ یا اس کی عظمت و جبروت اور قدوسی و کبریائی کے خلاف ہوں۔ اسے ان سے مبرا یقین کرنا۔ تعدد و اشراک کا مطلب یہ ہے کہ خدائے مطلق کی بجائے متعدد خدا ماننا، یا اس کی ذات میں کسی دوسرے کو شریک ٹھہرانا۔

مندرجہ بالا مذاہب میں سے ہندومت کی تعلیمات کا قدیم ترین ماخذ اپنشد ہیں۔ جن میں وحدۃ الوجود کا تصور پیش کیا گیا ہے۔ جس کے تحت ہر وجود کو خدا قرار دیا گیا ہے۔ یہ تصور اپنی نوعیت کے اعتبار سے اس درجہ فلسفیانہ تھا کہ یہ صرف نظریہ کے طور پر تسلیم کیا گیا۔ عملی طور پر اسے عوام میں کبھی مقبولیت حاصل نہ ہوئی۔ اس کے برعکس خدا کے بارے میں تجسم اور تعدد دونوں

نظریات زیادہ مقبول ہوئے۔ تجسّم کی مثال اصنام پرستی ہے اور تعدد کے سلسلہ میں پہلے یہ مانتا کی تین شکتیوں۔ برہما۔ وشنو اور شو، کو دیوتاؤں کے طور پر پیش کر کے ان کی پوجا کی گئی اور پھر ان دیوتاؤں کی تعداد بڑھتے بڑھتے سینکڑوں تک جا پہنچی۔ اگر ہم ھنود کے مختلف دیوتاؤں کی صفات کا جائزہ لیں تو ان میں زیادہ تر قہر و جلال، شورش و طوفان، رعب و ہیبت اور تباہی و بربادی کا پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہنود ہر طاقتور علامت کے سامنے سر جھکا دیتے تھے۔

ظہور اسلام سے قبل ہندوستان میں بدھ مت نے خاص مقبولیت حاصل کی۔ اس میں سرے سے خدا کی ہستی کا کوئی تصور موجود ہی نہیں ہے۔ یہ دنیا کا واحد مذہب ہے جس نے فلسفیانہ نظریات کو مذہب کی قباء پہنائی۔ اس کے نزدیک مادہ ازلی ہے۔ جیسے طبیعت اور نفس حرکت میں لاتے ہیں۔ اور جہاں تک فطرت کائنات کی صفات کا تعلق ہے۔ گوتم بدھ کو دنیا میں سوائے درد، اذیت اور رنج و الم کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔

مجوسیت میں بیک وقت خیر و شر کی دو طاقتوں کو الگ الگ الٰہ کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ جن میں یزدان خیر اور نور کا خدا ہے۔ اور اہرمن ظلمت اور بدی کا۔ عبادت کی بنیاد آتش پرستی اور آفتاب پرستی پر رکھی گئی۔ کیونکہ یہ یزدانی صفات کے سب سے بڑے مظاہر ہیں۔

یہودیت میں ایک خدا کا تصور موجود تھا۔ لیکن اس کی حیثیت ایک باپ یا شوہر سے زیادہ نہ تھی۔ جو کبھی فرشتوں سے کشتی کرتے ہوئے نظر آتا ہے کبھی انسانی شکل میں ظاہر ہو کر خطاب کرتا دکھائی دیتا ہے۔ گویا کسی حد تک تجسیم اور تنزیہ کے بین بین، اس کی صفات میں قہر و جلال کا عنصر زیادہ نمایاں تھا۔ نصرانیت نے البتہ خدا کی صفات میں رحم و محبت کے جذبات ضرور تلاش کئے لیکن تجسیم اور تنزیہ کے لحاظ سے اس نے کوئی قابل ذکر ترقی نہیں کی۔ نصرانی عقیدۂ تثلیث کی وجہ سے یہ مذہب تجسّم اور تعدد دونوں کا قائل تھا۔

ان تصورات کے علاوہ، فلاسفہ یونان نے بھی، اللہ کا ایک تصور پیش کیا تھا جو عوام میں زیادہ مقبولیت حاصل نہ کر سکا۔ اس کے مطابق تجسم سے انکار اور تنزیہہ کا اقرار ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کی تعلیمات بحیثیت مجموعی اللہ تعالیٰ کی صفات حسنہ کا کوئی اعلیٰ تصور پیش نہ کر سکیں۔ کیونکہ خیر و شر کے بارے میں ان کا اعتقاد تھا کہ دنیا میں شر غالب ہے۔ جب کہ اللہ تعالیٰ شر کا خالق نہیں ہو سکتا۔ اس لئے انسانی افعال کا غالب حصہ خدا کے دائرہ تصرف سے باہر ہے۔

اس بیان سے ظاہر ہے کہ ذات باری تعالیٰ کا اجمالی اعتراف تو تمام مذاہب عالم میں پایا جاتا رہا ہے۔ لیکن اس کا صحیح اور مکمل تصور اسلام نے پیش کیا۔ اس سلسلہ میں قرآن کریم نے سب سے پہلے خدا کے تصور میں تعدد کے عنصر کو ختم کر کے توحید مطلق کا عقیدہ پیش کیا کیونکہ دوسرے مذاہب، میں جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں یا تو یہ تصور سرے سے ہی مفقود تھا۔ یا تھا تو اس کی شکل مکمل نہ تھی۔ مجوسیوں عیسائیوں اور یہود کے ہاں اس عقیدہ کے باوجود تعدد موجود رہا ہے حالانکہ کوشش ان کی بھی رہی کہ تعدد کے باوجود توحید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے جیسا کہ عیسائی تثلیث کے بجائے ہونے کے باوجود تینوں کو ایک ہی ظاہر کرتے ہیں علیٰ ہذا القیاس بعض مذاہب کے ماننے والے خدا کی صفات میں اس کے شریک ٹھہراتے تھے۔

اسلام نے توحید کا ایسا جامع تصور پیش کیا کہ شرک کا شائبہ تک نہ رہا۔ اور یہ منجملہ ان تکمیلوں میں سے ہے۔ جس کی وجہ سے اسلام کے بعد کسی مذہب کی ضرورت باقی نہیں رہتی، نہ پیغمبر اسلام کے بعد کسی دوسرے نبی کی حاجت رہتی ہے۔ کیونکہ کمال کے بعد پھر کوئی درجہ

نہیں۔ توحید کامل کے یہ معنی ہیں کہ جس طرح خدا کی ذات میں کوئی شریک نہیں۔ اس طرح اس کی صفات میں بھی کوئی شریک نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ ہر طرح کی عبادت اور نیاز کے لائق صرف خدا ہی کی ذات ہے۔ وہی پیدا کرتا ہے۔ وہی زندہ رکھتا ہے۔ وہی مارتا ہے اور پھر اسی میں یہ قدرت ہے کہ وہ موت کے بعد زندگی عطا کرے گا۔ اس لئے اگر عجز و نیاز کے ساتھ کسی دوسری ہستی کے سامنے سر جھکایا تو سمجھئے کہ شرک کی حد شروع ہو گئی۔ وہ کہتا ہے کہ یہ ایسی ہستی لم یزال کی ذات ہے جو ہماری دعاؤں کو استجاب کا درجہ بخشتی ہے۔ اس لئے اگر اپنی دعاؤں میں کسی دوسری ہستی کو شامل کر لیا تو اس کی خدائی میں اسے شریک کر لیا۔ وہ کہتا ہے کہ یہ دعا و استعانت، رکوع و سجود، عجز و نیاز، اطاعت و تابعداری، اعتماد و توکل، اخلاص و استقلال، صدق و خلوص، ایمان و ایقان ایسے جوہر ہیں جو عقیدہ توحید کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتے۔ علیٰ ہذا القیاس عظمت و کبریائی، کارسازی و بے نیازی اور موت و حیات کا جو اعتقاد انسان کے دل میں خدا کی ہستی کا تصور پیدا کرتا ہے۔ وہ صرف اسی کے لئے ہی مخصوص ہے۔

اس ضمن میں سب سے زیادہ نازک مسئلہ انبیاء علیہم السلام کے مقام و حیثیت کی حد بندی کا تھا۔ کیونکہ اکثر مذاہب نے یہیں پر آکر ٹھوکر کھائی۔ کسی نے خدا کو اوتار بنایا۔ کسی نے ابن اللہ ٹھہرایا۔ کسی نے اس کی عظمتوں میں شریک و سہیم پیدا کیا۔ اس عقیدہ کی جڑ کاٹنے کے لئے اسلام نے اپنی تعلیم کے بنیادی کلمہ میں اللہ تعالےٰ اور نبی کے درمیان فرق کو اس طرح واضح کیا۔

"اشھد ان لا الٰہ الا اللہ واشھد ان محمداً عبدہ ورسولہ" یعنی میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے بندے اور رسول ہیں۔ اس اقرار کے بعد عبدیت کی جگہ معبودیت اور رسالت کی جگہ الوہیت کے تصور کا امکان ختم ہو جاتا ہے۔ اس حقیقت کا سب سے بڑا عملی ثبوت حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اس وقت پیش کیا۔ جب حضور علیہ السلام کے وصال کے بعد مسلمان اس بات کا یقین کرنے کو تیار نہیں تھے کہ آپ کی وفات ہو گئی ہے۔ صدیق اکبر کے سنہری الفاظ یہ ہیں:

> "تم میں سے جو کوئی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پرستش کرتا تھا۔ سمجھ لے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) وفات پا چکے ہیں۔ اور جو کوئی تم میں سے اللہ کی پرستش کرتا تھا۔ جان لے کہ اللہ ہمیشہ زندہ ہے اسے موت نہیں۔"

اس حقیقت کا انکشاف قرآن کریم کی آیۂ ذیل سے بھی ہوتا ہے جو اس موقع پر حضرت ابو بکر نے اپنی دلیل کی تائید میں پیش کی تھی۔

وما محمد الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل افان مات . . . . . .

اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو رسول ہیں۔ آپؐ سے پہلے بھی رسول پیدا کئے گئے۔ کیا اگر وہ وفات پا جائیں یا قتل کر دیئے جائیں تو تم اپنی ایڑیوں پر گھوم جاؤ گے۔ (یعنی اسلام سے پھر جاؤ گے)

دوسرا بڑا تصور جو اسلام نے اللہ تعالےٰ کے بارے میں پیش کیا۔ وہ تجسّم کا ابطال تھا۔ اسلام سے قبل بت پرستی، شخصیت،

پرستی اور مظاہر فطرت کی پرستش عام تھی یا اگر تنزیہہ کا سب سے بڑا مرتبہ جو الہامی مذاہب کے باقیات میں سے تھا۔ وہ صرف اتنا تھا کہ اصنام پرستی کی جگہ ایک ان دیکھے خدا کی عبادت کی جائے۔ لیکن صفات الٰہی کے لحاظ سے انسانی کمالات و جذبات کی مشابہت اور جسم و صورت کی تمثیل سے کوئی تصور بھی خالی نہ تھا۔ غیر الہامی مذاہب کی تو بات ہی الگ ہے کہ ان کے ہاں تو بغیر جسم و شکل کے معبود کا کوئی تصور تھا ہی نہیں۔ الہامی مذاہب میں بھی یہ کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے۔ مثلاً ایک طرف زبور کے ترانوں اور تورات کی امثال میں اللہ تعالیٰ کے لئے شائستہ اوصاف کا تخیل موجود ہے۔ لیکن دوسری طرف خدا کا کوئی تصور ایسا نہیں جس میں انسانی صفات موجود نہ ہوں۔ اسی طرح اناجیل میں رحمت الٰہی کا تصور دکھانے کے لئے خدا کے لئے باپ کی شفقت سے تشبیہہ دی گئی۔ جو بعد میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ابن اللہ ہونے کا عقیدہ ٹھہری۔

لیکن ان تصورات کے برعکس جب ہم قرآن کریم کی طرف رجوع کرتے ہیں تو تجسیم کا کوئی شائبہ تک باقی نہیں رہتا۔ اور تنزیہہ درجہ کمال تک پہنچ جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام صفات جمال و کمال کا مالک ہے۔ وہ حی ہے۔ وہ قیوم ہے۔ وہ قادر مطلق ہے۔ وہ رب الارباب ہے۔ وہ رحیم ہے کریم ہے۔ سمیع ہے۔ بصیر ہے۔ لیکن اس کے ساتھ کائنات میں کوئی چیز اس کی مثل نہیں ہے۔ "لیس کمثلہ شیئ" تمہاری نگاہ اسے پا نہیں سکتی۔

"لا تدرکہ الابصار" اس کی تنزیہہ کی مکمل تصویر ہمیں سورہ اخلاص میں ملتی ہے۔ جس کے مطابق اللہ واحد مطلق ہے بے نیاز ہے۔ نہ تو اس نے کسی کو جنا اور نہ ہی اس کو کسی نے جنا۔ اور نہ ہی کوئی ذات اس کی برابری کر سکتی ہے۔

تعدد و تجسیم کی نفی اور تنزیہہ کے کمال کی طرح اوصاف رحمت و جمال کے لحاظ سے بھی اسلام کے تصور پر نظر ڈالی جائے تو اس میں بھی شان تکمیل نمایاں ہے۔ کیونکہ حضور علیہ السلام کی بعثت سے قبل خدائی صفات میں یا تو قہر و جلال اور غیظ و غضب کا عنصر غالب تھا۔ یا مساوی تھا، یا پھر رحمت و محبت آئی تو ایسے کہ عدالت کے لئے جگہ باقی نہ رہی۔ اسلام نے اس افراط و تفریط کو ختم کر کے رحمت و جمال کا ایسا کامل تصور پیش کیا کہ قہر و جلال کے لئے کوئی گنجائش ہی نہ رہی۔ چنانچہ صفات الٰہی کے بارے میں یہ عام اعلان ہے

"قل ادعوا اللہ او ادعوا الرحمٰن، ایا ما تدعوا فلہ الاسمآء الحسنیٰ"

"کہہ دیجئے اے پیغمبر! تم اسے اللہ کے نام سے پکارو، یا رحمٰن کہو اس کے تمام نام اچھے ہیں۔"

قرآن کریم کی مندرجہ بالا آیت سے اس کی تمام صفات "اسماء الحسنیٰ" کے ضمن میں آتی ہیں۔ ان سب کا تذکرہ قرآن کریم کی مختلف آیات میں موجود ہے۔ ان میں اگرچہ بعض صفات مثلاً قہار و جبار، جلال و متکبر وغیرہ، قہر و غضب کی علامت ہیں۔ لیکن یہ بھی قرآن کریم کے مطابق "اسماء الحسنیٰ" میں شمار ہوتی ہیں۔ کیونکہ ان سے ڈرانا اور دھمکانا مقصود نہیں۔ بلکہ اپنے بندوں میں خدا ترسی اور عدل گستری کی صفات پیدا کرنا ہیں۔ سورہ حشر کی آیات میں اللہ تعالیٰ کی صفات جلال و جمال ایک ساتھ بیان ہوئی ہیں

"ھو اللہ الذی لا الٰہ الا ھو۔ عالم الغیب و الشھادۃ۔ ھو الرحمٰن الرحیم۔ ھو اللہ الذی لا الٰہ الا ھو۔ الملک القدوس السلٰم المؤمن المھیمن العزیز الجبار المتکبر سبحان اللہ عما یشرکون ○ ھو اللہ الخالق الباری المصور لہ الاسمآء الحسنیٰ۔ یسبح لہ ما فی

السمٰوٰت والارض ۔ وھو العزیز الحکیم ؁

وہ اللہ ہے۔ جس کے سوا کوئی معبود نہیں جو حاضر و غیب کا جاننے والا ہے۔ وہی رحمٰن ہے۔ اور وہی رحیم ہے
وہ اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ الملک ہے۔ القدوس ہے۔ سلام ہے۔ المومن ہے۔ المھیمن ہے۔ غالب ہے۔ الجبار ہے۔ المتکبر ہے۔ اللہ ہر قسم کے شرک سے پاک ہے۔ وہ پیدا کرنے والا ہے۔ الباری ہے۔ اور مصور ہے۔ اس کے تمام نام حسین ہیں۔ آسمانوں اور زمین کی تمام مخلوقات اس کی پاکی بیان کرتی ہیں۔ اور وہ غالب اور حکیم ہے۔

مندرجہ بالا آیات میں صرف تین صفات ــ عزیز، جبار، متکبر ایسی ہیں۔ جن میں قہر و جلال کا عنصر ہے۔ لیکن ان کا مقصد خوف و ہراس پیدا کرنا نہیں۔ بلکہ ظالموں، غاصبوں اور جابروں کو تنبیہ کر کے انہیں اعتدال و توازن سکھانا ہے۔ کیونکہ زندگی کو حسین بنانے کے لئے ان اقدار کا اختیار کرنا اور پھیلانا نہایت ضروری ہے۔

اسلام سے قبل، مذہبی عقائد میں خاص و عام کا امتیاز ملحوظ رکھا جاتا تھا۔ اور خیال کیا جاتا تھا کہ خدا کا ایک تصور تو حقیقی ہے جو خواص کے لئے ہے۔ اور ایک تصور عملی ہے جو عوام کے لئے ہے۔ اس کی مثال ہندوستان اور یونان کے عقاید میں ملتی ہے۔ جس کے مطابق غیر مرئی اور غیر مجسم خدا کا تصور صرف اہل علم و حکمت یا سوسائٹی کا باوقار طبقہ ہی کر سکتا ہے۔ اس لئے عوام کے لئے بہتر یہی ہے کہ وہ دیوی دیوتاؤں کی پرستش میں مگن رہیں۔ قرآن نے اس امتیازی تصور کو ختم کر کے سب کو خدا پرستی کی ایک ہی راہ دکھائی۔

اسلام نے تصور الٰہی کی بنیاد بنی نوع انسان کے عالمگیر وجدانی احساس پر رکھی ہے جو یہ ہے کہ یہ کائنات خود بخود عالم وجود میں نہیں آئی۔ بلکہ اسے پیدا کیا گیا ہے۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ اس کا کوئی خالق بھی ہو۔ جو تمام صفات سے متصف ہو۔ اور نقص و زوال کی تمام باتوں سے منزہ ہو۔

مندرجہ بالا حقائق سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام نے خدا کی ذات اور صفات کا جو مکمل تصور پیش کیا۔ اس سے قبل کسی مذہب کی تعلیم میں اس جامعیت اور کمال کے ساتھ نہیں ملتا۔ اور یہ اسلام اور دائمی اسلام کا فیض ہے کہ اس مکمل اور جامع تصور کی وجہ سے ایک انسان کو دوسرے انسان کی غلامی سے نجات ملی۔ دور کی جبہ سائی اور ناصیہ فرسائی سے چھٹکارا ملا۔ غرضیکہ آزادی اور حریت کا ایک ایسا ضیا بار سورج طلوع ہوا جس نے تمام امتیازات کو ختم کر کے انسان کو ایک ہی رشتہ انسانیت میں پرو دیا۔ یہ تصور اتنا زندہ اور فعال ہے کہ اس کے بعد کسی اور عقیدہ اور نظریہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ یہ بات ختم نبوت پر دلالت کرتی ہے۔

۲ ۔ تصورِ نبوت

ہم اس امر کی صراحت کر چکے ہیں کہ اللہ تعالےٰ نے انسانوں کی رہنمائی اور معنوی ترقی کے لئے وقتاً فوقتاً انبیاء اور مرسل بھیجے۔ اس کے باوجود امم سابقہ کی تعلیمات میں اس تصور کا عکس نہایت دھندلا دکھائی دیتا ہے۔ حضور علیہ السلام کی بعثت کے وقت غیر الہامی مذاہب میں یہ تصور تقریباً مفقود تھا۔ تمام رشیوں، منیوں اور اوتاروں کی شکل میں اس سے ملتا جلتا نظریہ ضرور تخلیق کر لیا

گیا تھا۔ جس کے ڈانڈے الوہیت تک ملائے گئے تھے۔ الہامی مذاہب یعنی یہودیت اور نصرانیت میں نبوت کا تصور ضرور ملتا تھا لیکن اس کے متعلق ایک عالمگیر غلطی پھیلی ہوئی تھی کہ انبیاء بشریت کے درجہ سے بالاتر ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے حضرت عزیرؑ اور سیدنا مسیح علیہ السلام کو عین خدا یا کم از کم مظہر خدا ضرور بنا دیا تھا۔ اسلام نے نہایت شد و مد کے ساتھ اس کا رد پیش کیا اور کہا۔

"قل انما انا بشر مثلکم یوحیٰ الی انما الٰھکم اللہ واحد"

"اے نبی کہہ دیجئے کہ میں تو تمہاری طرح بشر ہوں۔ مجھ پر وحی آتی ہے۔ اور تمہارا معبود تو اللہ واحد ہے۔

"لن یستنکف المسیح ان یکون عبداً للہ"

"حضرت عیسیٰ کو اس بات سے عار نہیں کہ وہ خدا کے بندے ہیں"

"قل لا اقول لکم عندی خزائن اللہ ولا اعلم الغیب ولا اقول لکم انی ملک ان اتبع الا ما یوحیٰ الی"

"اے نبی کہہ دیجئے کہ میں یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس خدا کے خزانے ہیں۔ نہ میں یہ کہتا ہوں کہ میں غیب کی باتیں جانتا ہوں میں تو صرف وحی کی بات کرتا ہوں جو مجھ پر آتی ہے"

مندرجہ بالا آیات کے علاوہ بھی قرآن کریم میں متعدد مقامات پر انبیاء علیہم السلام کی حیثیت، ان کی ضرورت، اہمیت اور تعلیمات پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ انسانوں میں سے ایک جماعت ہے۔ جن کی تربیت خاص طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کی جاتی ہے۔ جن کی بعثت کا مقصد یہ ہے کہ وہ بھولے بھٹکے انسانوں کو راہ راست دکھائیں۔ انہیں اپنے خالق کی معرفت بخشیں، ان کو اللہ تعالےٰ کی آیات پڑھ کر سنائیں۔ ان کا تزکیہ کریں اور انہیں علم و حکمت کی باتیں سکھائیں۔ ان وظائف اور فرائض میں سے آخری فریضہ یعنی علم و حکمت کے بارے میں کسی دوسرے مقام پر تفصیل سے بحث کی جائے گی۔ کیونکہ اس ضمن میں وہ تمام علوم و فنون اور حقائق و اصول آجاتے ہیں جو پہلی نسل انسانی سے ارتقاء کی منازل طے کرتے ہوئے دور حاضر تک پہنچے اور جو آئندہ نسلوں تک گزشتہ مشاہدات و تجربات کی روشنی میں پہنچتے رہیں گے۔ حتیٰ کہ یہ تمام علوم اپنے اوج کمال کو پہنچ جائیں۔ اس کے بعد ہمارے لئے یہ ثابت کرنا نہایت آسان ہو گا کہ جس طرح ہر نوع کی ابتداء اور انتہاء ہے۔ اسی طرح نبوتؐ کی بھی ابتداء اور انتہاء ہے۔

نبوت کے موضوع پر مسلم مفکرین، متکلمین، حکماء اور فلاسفہ نے نہایت تفصیل سے لکھا ہے۔ اس موقع پر امام رازی کی بحث کا خلاصہ یقیناً مفید ہو گا۔ وہ لکھتے ہیں۔

"انسان میں دو قوتیں ہوتی ہیں۔ نظری اور عملی۔ انسان کا کمال یہ ہے کہ اس کی دونوں قوتیں کامل ہوں۔ قوت نظری کے کمال کے یہ معنی ہیں کہ اس کو حقائق اشیاء کا صحیح علم ہو یعنی اس کے ذہن میں جس شے کا تصور آئے اصل صورت میں آئے۔ قوت عملی کے کمال کے یہ معنی ہیں کہ نفس میں ایسا ملکہ پیدا ہو جائے کہ خود بخود اچھے کام سرزد ہوں۔ اس لحاظ سے دنیا میں تین قسم کے آدمی ہوتے ہیں۔ اوّل ناقص یعنی جن کی دونوں قوتیں ناقص ہوں۔ یہ عوام الناس ہوتے ہیں۔ (وہ ان میں بھی درجات کے قائل ہیں) دوسرے وہ جو خود کامل ہوں لیکن دوسروں کو کامل نہ بنا سکتے ہوں۔ یہ اولیاء اور صلحاء ہوتے ہیں۔ تیسرے وہ جو خود کامل ہوں اور دوسروں کو بھی کامل بنا سکتے ہوں

یہ انبیاء علیہم السلام ہوتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ انسانوں میں کمال اور نقص کے درجات نہایت متفاوت ہوتے ہیں۔ بعض دفعہ نقائص کے خواص بڑھتے بڑھتے اس حد تک پہنچ جاتے ہیں کہ انسان اپنی عادات کی وجہ سے حیوانیت کے درجہ تک پہنچ جاتا ہے۔ جب نقص کی جانب یہ حال ہو تو ضروری ہے کہ کمال کی جانب بھی یہی حالت پیدا ہو یہاں تک کہ انسان ملکوتیت سے جا ملے"۔

اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ملائکہ کا درجہ انسان سے اعلیٰ ہے۔ حالانکہ ہم اس بات کی صراحت کر چکے ہیں کہ انسان' اللہ جانے کا شاہکار اور اشرف المخلوقات ہے۔ یہاں امام رازی کا مقصد غالباً عصمت انبیاء کا ثبوت فراہم کرنا ہے۔ کیونکہ مخلوق میں یہ نوع معصوم ہوتی ہے۔ اس نکتے کو امام غزالی نے بہتر طریقے سے پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"نبوت کے مفہوم سمجھنے کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ اس کی حد تام بیان کی جائے۔ کیونکہ سینکڑوں ہزاروں چیزیں ایسی ہیں۔ جن کی جنس و فصل اور ماہیت و حقیقت ہم کو معلوم نہیں۔ مگر ہم ان کے مفہوم کو جانتے ہیں۔ جیسے عقل' روح اور بہت سی غیر مادی اشیاء کا ہم تصور تو کرتے ہیں۔ لیکن ان کی حقیقت کو ہم بالکل نہیں جانتے نبوت ایک وصف ہے جو انسانیت سے بالاتر ہے۔ جس طرح انسانیت حیوانیت سے بالاتر ہے۔ انسان حیوانات کو مسخر کرکے ان سے فائدہ حاصل کرتا ہے۔ لیکن حیوانات یہ عذر نہیں پیش کرتے کہ جب تک ہم کو انسان کی حقیقت اور ماہیت نہ بتائی جائے۔ ہم انسان کی اطاعت نہ کریں گے۔ عام انسان اور پیغمبر میں یہی نسبت ہے۔"

اس کا مزید ثبوت فراہم کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں۔

" انسانوں میں تین قسم کی قوتیں پائی جاتی ہیں۔ فکری' قولی اور عملی۔ ان قوتوں سے جو افعال سرزد ہوتے ہیں۔ وہ اچھے بھی ہوتے ہیں اور برے بھی۔ ان دو متضاد حالتوں کے لحاظ سے ہر ایک کا الگ نام ہوتا ہے۔ فکر کو حق و باطل سے موسوم کرتے ہیں۔ قول کو صادق و کاذب کہتے ہیں۔ اور عمل کو خیر و شر سے تعبیر کرتے ہیں۔ لیکن حق و باطل' صادق و کاذب اور خیر و شر میں ہر آدمی تمیز نہیں کر سکتا یا بعض معاملات میں بعض انسان کسی حد تک یہ تمیز کر سکتے ہیں۔ لیکن بعض انسان ایسے ہوتے ہیں جو ان حدود کو متعین کر سکتے ہیں کہ فلاں افعال قابل عمل ہیں اور فلاں نہیں۔ یہی لوگ پیغمبر اور بانی شریعت ہوتے ہیں"۔

ان دونوں حکمائے اسلام کے دلائل کی روشنی میں نظریہ ارتقاء کے حوالے سے ہم نبوت کے موضوع پر مزید بحث کرنے کی جسارت کرتے ہیں۔ بعض متکلمین کے مطابق مادی ارتقاء کی انتہائی حد انسان ہے۔ اور عقلی ارتقاء کی حد نبی ہے۔ لیکن انبیاء علیہم السلام کی حد ملائکہ نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ وہ تخلیق آدم کے بعد اپنے علم کی کمی کے سبب اپنے عجز کا اعتراف کر چکے تھے۔ گویا کائنات میں اب ایک ہی ایسی ہستی رہ جاتی ہے۔ جس کے صحیح ادراک پر انبیاء کی حد ختم ہو سکتی ہے۔ اور وہ ہستی اس کائنات و موجودات کی خالق ہے۔ جسے ہم اللہ کے اسم ذات سے پکارتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ مخلوق اپنی انتہائی معراج و ترقی کے باوجود خالق نہیں بن سکتی۔ البتہ اس کا ادراک ضرور حاصل کر سکتی ہے۔ ہم گزشتہ صفحات میں اس بات کو پایۂ ثبوت تک پہنچا چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں جتنے بھی تصورات حضور علیہ السلام کی بعثت کے وقت اقوام و ملل میں پائے جاتے تھے۔ سب غیر واضح' مبہم' نامکمل اور ناقابل یقین تھے۔ انسان کو سب سے پہلے جس

نبی نے اللہ تعالیٰ کا جامع اور مکمل تعارف کرایا۔ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس ہے۔ اور یہ تصور آج بھی بنی نوع انسان کے سواد اعظم میں زندہ اور موجود ہے۔ اس لئے اب کسی دوسرے نبی یا مرسل کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اس کا مزید ثبوت اس ناقابل تردید حقیقت سے بھی فراہم کیا جاسکتا ہے کہ آپؐ سے قبل ہر دور میں بنی نوع انسان کی رہنمائی کے لئے انبیاء علیہم السلام تشریف لاتے رہے بلکہ بعض اوقات تو بیک وقت مختلف امصار و دیار میں کئی کئی انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوئے لیکن آپؐ کے بعد آج تک نہ تو کسی نبی کی ضرورت تھی، اور نہ ہی کوئی اور نبی پیدا ہوا۔ اگر بعض نے جھوٹی نبوت کا دعوےٰ کیا بھی تو ان کے نام ونشان اور افکار و خیالات لفظ غلط کی طرح سے صفحہ ہستی سے مٹ چکے ہیں۔ دور حاضر میں بعض ایسے مدعی ضرور پیدا ہوئے اور ان کے ماننے والے بھی دنیا میں موجود ہیں۔ لیکن انہوں نے بھی حضور کی ختم نبوت کا کبھی انکار نہیں کیا، بلکہ ظلی یا غیر تشریعی نبی کے الفاظ استعمال کئے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضور محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کا وہ عملی اور جامع تصور پیش کیا کہ اس کے بعد کسی اور نبی کی ضرورت باقی ہی نہیں رہتی۔ آپؐ نے تمام انبیائے سابقہ کی تصدیق کی، ان کو تاریخ مذہب میں صحیح حیثیت دی اور ساتھ ہی اس بات کا انکشاف بھی کیا کہ آپؐ کے بعد اب کوئی نبی آنے والا نہیں۔ جبکہ باقی تمام انبیاء نے ایسا کوئی اعلان نہیں کیا۔ بلکہ بعض الہامی کتابوں میں آپؐ کی آمد کی بشارت بھی ملتی ہے۔ زبور کے نغموں میں آپؐ کا زمزمہ ہے۔ توریت کی آیات میں آپؐ نمایاں ہیں۔ انجیل مقدس میں بھی آپؐ کا ذکر ہے۔ کہیں آپؐ کو محمد کہا گیا ہے۔ کہیں فارقلیط (PROCLETE) انجیل برنباس میں حضور علیہ السلام کے بارے میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے۔

۱ - ایک شتر سوار

۲ - اللہ تعالیٰ کا بندہ (عبدہٗ)

۳ - اللہ تعالیٰ کا منتخب (مصطفیٰ)

۴ - شہزادہ کیدار ابن اسمٰعیل کی بستی کا رہنے والا۔

۵ - اس کے مذہب کا نام شلوہ (SHILOH) ہوگا۔ جس کے معنی ہیں سلامتی یعنی اسلام

۶ - وہ فاران کی چوٹیوں سے جلوہ گر ہوگا۔

۷ - اس کے پاس عصائے یہودا ہوگا۔

۸ - اللہ تعالیٰ اسے وحی سے نوازے گا۔

۹ - وہ ناکام نہیں ہوگا۔ نہ ہی اسے شکست ہوگی۔

۱۰ - اس کا نام (پروسلیٹ) یعنی احمد ہوگا۔

اس تفصیل کے بعد اس حقیقت میں کوئی شبہ باقی نہیں رہ جاتا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم صرف نبی ہی نہیں تھے بلکہ خاتم الانبیاء بھی تھے۔

۳ - تصور سزا و جزا

حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت دنیا میں حیات بعدالموت کے بارے میں مختلف عقاید تھے۔ جن میں سے ایک تو تھا کہ زندگی ہے تو بس اس دنیا کی زندگی اس

کے بعد کچھ نہیں ہوگا۔ دوسرا تصور یہ تھا کہ خدا کو گناہ پر عذاب اور نیکی پر انعام دینے کا کیا حق حاصل ہے؟ سزا یا انتقام کا حق تو اسے پہنچتا ہے جسے کسی نے نقصان یا تکلیف پہنچائی ہو۔ ان کے مطابق اہل مذہب نے خدا کا تصور انسانی حیثیت سے کیا ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ دنیا کے حکمرانوں کو احکام کی نافرمانی سے سخت طیش اور ملال آتا ہے اور وہ مجرم کو نہایت سزائیں دیتے ہیں۔ یا ان کے احکام کی بجا آوری پر خوش ہو کر انعام و اکرام سے نوازتے ہیں۔ اس لئے وہ خدا کے بارے میں بھی یہی سمجھتے ہیں کہ وہ ناراض ہو کر سزا دے گا اور خوش ہو کر انعام دے گا۔ نصاریٰ کے اگرچہ مختلف فرقے تھے لیکن ان سب کا کفارہ پر عقیدہ تھا۔ ان کا عام خیال یہ تھا کہ حضرت مسیح علیہ السلام اس دنیا میں گناہ گاروں اور معصیت کاروں کی بخشش کے لئے تشریف لائے تھے۔ انہوں نے صلیب پر چڑھ کر مسیحی عقیدہ کے حامل لوگوں کی نجات کا سامان فراہم کر دیا۔ اس لئے نیکیوں کی زیادہ فکر نہیں کرنی چاہیئے۔ اگر انسان سے کوئی خطا سرزد ہو جائے تو اسے چاہیئے کہ اہل کلیسا کے سامنے اس کا اعتراف کرے، اسے گناہ سے نجات مل جائے گی۔ یہ عقیدہ عیسائیوں کے ہاں آج بھی رائج ہے۔ ہنود کا آواگون پر اعتقاد تھا۔ جس کے مطابق روح اپنے اعمال کے مطابق مختلف قالب اختیار کرتی رہتی ہے۔ اگر وہ اچھے کرم کرے تو آئندہ زندگی میں اچھے انسان کے روپ میں پیدا کیا جائے گا۔ اور اگر وہ برے افعال کرے تو حقیر حیوانات کی جون میں پیدا ہوں گے۔ اس طرح ایک لامتناہی چکر میں گرفتار ہو کر روح مختلف قالبوں اور روپوں میں ظاہر ہوتی رہے گی۔ تب کہیں جا کر اس کا ایک چکر پورا ہوگا۔ اور وہ سورگ میں جائے گی۔ جہاں سے اس کے اعمال کی نیکی میں کمی کے باعث وہ دوبارہ اس دنیا میں کسی روپ میں ظاہر ہو کر آواگون کے چکر میں گرفتار ہوگی۔

یہود کے ہاں آخرت کا تصور ضرور موجود تھا لیکن اتنا ناکمل کہ اس سے کوئی سودمند نتائج مرتب نہیں ہو سکتے تھے۔ ان کا یہ عام عقیدہ تھا کہ خدا نے ہم پر دوزخ کی آگ حرام کر دی ہے۔ اگر ہم میں سے کوئی آدمی جہنم میں ڈالا بھی جائے گا تو محض اس لئے کہ گناہ کے داغ دھبوں سے پاک کر دیا جائے اور پھر جنت میں داخل ہو۔ رہے بدھ مت وغیرہ، ان کے ہاں تو تمام تر زور مادی زندگی پر دیا گیا تھا یا مکتی کے لئے تپسیا اور بنی نوع انسان سے صلہ رحمی کی طرف توجہ دی گئی تھی۔ پارسی شر اور نیکی کے خداؤں کے درمیان باہمی جنگ و جدل کے تصور میں مبتلا تھے۔ غرضیکہ کہیں بھی ایسا تصور موجود نہ تھا جو انسانی زندگی کی تہذیب و اصلاح اور فوز و فلاح کا ضامن ہو۔

ان سب کے برعکس اسلام نے عوام کے سمجھانے کے لئے ایک سیدھا سادا پیرایہ اختیار کیا کہ یہ دنیا دار العمل ہے۔ اس لئے ضروری نہیں کہ انسان کو اس کے اعمال کی سزا اور جزا یہیں مل جائے۔ بلکہ اس عارضی دنیوی زندگی کے بعد بھی ایک زندگی ہے۔ جس میں اس کے اعمال کا محاسبہ ہوگا۔ اور اللہ تعالیٰ نافرمانوں کو ان کے کفر اور عصیان کی وجہ سے سزا دے گا۔ اور جن لوگوں نے اس کی اطاعت اور فرمانبرداری اختیار کی ان کو انعام و اکرام سے نوازے گا جیسا کہ کفار، مشرکین اور گنہگاروں کیلئے دوزخ بنائی گئی ہے۔ بالکل ایسے ہی اہل ایمان اور نیکوکاروں کیلئے جنت بنائی گئی ہے جس میں وہ ہمیشہ امن سکون کی زندگی بسر کریں گے۔ اسی لئے حضور علیہ السلام نے اس دنیا کو آخرت کی کھیتی کہا ہے۔ یعنی اس جہان میں عمل کے جیسے بیج بوئے گا۔ ویسی ہی فصل کاٹے گا۔ یعنی اسے بدی کے بدلے میں برائی ملے گی اور نیکی کے بدلے میں نیکی۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ کو سورہ فاتحہ میں "مالک یوم الدین" یعنی بدلے کے دن کا مالک کہا گیا ہے۔ لیکن مسلم فلاسفہ اور حکماء کے نزدیک عذاب و ثواب کی یہ اصل حقیقت نہیں ہے۔ بلکہ اصل حقیقت کے عام فہم کرنے کا ایک پیرایہ ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ ہر وجود رکھنے والی شے اپنا کوئی نہ کوئی اثر رکھتی ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے اجسام میں خواص اور اثرات رکھے ہیں۔ اسی طرح اعمال میں بھی اثرات و نتائج ہیں۔ جس طرح جسمانی مؤثرات جسم پر

مرتب ہوتے ہیں۔ روحانی اثرات سے روح متاثر ہوتی ہے۔
قرآن کہتا ہے کہ فطرت کے ہر گوشہ میں مکافات کا قانون ہے۔ اس میں تغیر ممکن نہیں۔ مثلاً زہر سے موت واقع ہوگی۔ آگ جلائے گی۔ پانی تپش بجھائے گا۔ اکسیر سے شفا ہوگی۔ غذا سے توانائی ملے گی۔ یہ زندگی کے محکمات ہیں۔ اسی طرح اعمال کے بھی مکافات ہیں۔ یہ ممکن نہیں کہ ایک کمزور اور ناتواں انسان ایک ظالم اور جابر حکمران کے پنجۂ ظلم و استبداد میں تمام عمر تڑپتا اور سسکتا رہے۔ اور اسے سزا نہ ملے۔ نہ یہ بات قانون فطرت کے مطابق ہے۔ اور نہ ہی کوئی سلیم الطبع انسان اسے تسلیم کر سکتا ہے۔ اس کی صراحت قرآن کریم میں اس طرح کی گئی ہے۔

"ام حسب الذین اجترحوا السیات ان نجعلھم کالذین امنوا وعملوا الصلحت سواء محیاھم ومماتھم ساء ما یحکمون ٥ وخلق اللہ السمٰوٰت والارض بالحق ولتجزی کل نفس بما کسبت وھم لا یظلمون ٥

"جو لوگ برائیاں کرتے ہیں کیا وہ سمجھتے ہیں۔ ہم انہیں ان لوگوں جیسا کر دیں گے۔ جو ایمان رکھتے ہیں۔ اور جن کے اعمال اچھے ہیں۔ کیا وہ زندگی اور موت میں بھی برابر ہو جائیں گے؟ افسوس ان کے فیصلے پر! اللہ تعالیٰ نے آسمان اور زمین کو مصلحت اور حکمت کے ساتھ بنایا ہے۔ تاکہ ہر نفس کو اس کی کمائی کے مطابق اجر ملے اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ گویا سزا اور جزا کا انحصار انسان کی کمائی پر ہے۔ اگر کسی انسان نے اچھے عمل کر کے اچھی کمائی کر لی ہے تو اس کے لئے اچھائی ہے۔ اور اگر کسی نے برائی کر کے بری کمائی کر لی ہے۔ تو اس کے لئے برائی ہے۔

"کل امری بما کسب رھین" یعنی ہر انسان اس نتیجہ کے ساتھ جو اس کی کمائی ہے بندھا ہوا ہے۔ "لھا ما کسبت وعلیھا ما اکتسبت" ہر انسان کے لئے وہی ہے۔ جیسی کچھ اس کی کمائی ہوگی۔

اس کے علاوہ قرآن میں اس حقیقت کی بھی صراحت کی گئی ہے۔ کہ اگر دین اسلام، معروف کا حکم دیتا ہے اور منکر سے روکتا ہے۔ تو یہ صرف اس لئے کہ انسان نقصان و ہلاکت سے بچے اور نجات و سعادت حاصل کرتے نہ یہ کہ خدا کا قہر و غضب سے عذاب دینا چاہتا ہے۔ اور اس سے بچنے کے لئے مذہبی ریاضتوں اور عبادتوں کی ضرورت ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام کیلئے مذہب کی جگہ "دین" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ کیونکہ اس کا بنیادی عقیدہ بھی مکافات کا اعتقاد ہے اس طرح اللہ تعالیٰ کی صفات قہاری و جباری، صفت عدل میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ جس کے معنی اعتدال و توازن کے ہیں اور یہ اس وقت ممکن ہے۔ جب ظالم کا ہاتھ روکا جائے اور مظلوم کی دستگیری کی جائے۔ ظاہر ہے کہ ظالم کا ہاتھ روکنے کے لئے طاقت کا استعمال کرنا پڑے گا۔ گویا طاقت و غلبہ بذاتہ بری چیز نہیں۔ بلکہ اس کا غلط استعمال برا ہے۔ اگر کوئی حکمران اپنی قوت و طاقت کو ظالموں کے خلاف استعمال کرتا ہے تو اسے ہم عادل کہیں گے۔ بالکل اسی طرح اگر اللہ تعالیٰ اپنی صفات جلیلہ کا مظاہرہ کرے گا۔ تو یہ اس کے عدل کا تقاضا ہوگا۔

اگر دیکھا جائے تو دنیا کے تمام مذاہب ایک صحت مند اور توانا معاشرہ تشکیل کرنا چاہتے ہیں جس میں بسنے والے

لوگ امن و سلامتی اور صلح آشتی کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں۔ لیکن معاشرہ کے کچھ بنیادی ستون ہوتے ہیں۔ کچھ اقدار ہوتی ہیں، روایات ہوتی ہیں۔ ان کے بغیر معاشرہ میں فتنہ وفساد برپا رہے گا۔ اسلام کے نزدیک معاشرہ کی سب سے بڑی قدر "عدل" ہے۔ اس کا مظاہرہ جتنا زیادہ اور عام ہوگا۔ اتنا ہی وہ معاشرہ صحت مند اور متوازن ہوگا۔ عدل صرف کہنے اور تبلیغ کرنے سے پیدا نہیں ہوسکتا! اسلام نے عدل کو عقیدہ بنا دیا۔ جس قدر آخرت اور سزا و جزا کے تصور پر انسان کا اعتقاد ہوگا۔ اسی قدر وہ خدا ترس اور متقی ہوگا۔ جس معاشرہ کے جتنے زیادہ افراد صفت عدل کا مظاہرہ کریں گے۔ اسی قدر وہ معاشرہ پھلے پھولے گا۔ بالکل اسی طرح عقیدہ توحید افراد میں حریت اور مساوات کی اقدار پیدا کرتا ہے۔ خدائے مطلق کے ماننے والے در در کی جبہ سائی سے بچ جاتے ہیں۔ وہ خدا کے سوا کسی اور کے سامنے نہ تو دست سوال دراز کرتے ہیں اور نہ ہی جھکتے ہیں۔ علیٰ ہٰذا القیاس عقیدہ نبوت ان میں "اخوت" کا بے پناہ جذبہ پیدا کرتا ہے۔ ایک نبی کے ماننے والے آپس میں رحیم اور مہربان ہوتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ تین عقاید — توحید، رسالت اور آخرت ---- ایسے ہیں جن کا تعلق بظاہر مابعد الطبیعیاتی نظریات سے ہے۔ اسی لئے بنی نوع انسان کے لئے ہمیشہ فکر و بحث کا سبب بنتے رہے ہیں۔ لیکن مذاہب عالم کے مبادیات یہی ہیں۔ ان کی نوعیت پر اگر غور کیا جائے تو ان کی مکمل اور جامع تصویر جو حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کی ہے۔ آپ کی بعثت سے قبل کسی اور مذہب نے نہیں کی۔ اور اگر کی بھی ہے تو وہ موجود نہیں۔ پھر یہ کہ ان تصورات وعقائد پر دنیا کی بڑا حصہ آبادی کا آج بھی یقین اور عمل ہے۔ جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی اور نبی کی ضرورت نہیں۔

عقاید و تصورات نظریاتی چیزیں ہیں۔ ان کا مظاہرہ اعمال و افعال سے ہوتا ہے۔ اور جب یہ اعمال و افعال، کسی مذہب یا مسلک کے احکام کے نتیجے میں مرتب ہوتے ہیں اور ان پر عمل پیرا ہونا کسی خاص عقیدے، مذہب یا فرقہ کی شناخت اور شعار بن جاتے ہیں تو انہیں عبادات کا نام دیا جاتا ہے۔ دنیا کا کوئی مذہب ایسا نہیں جس نے اپنے ماننے والوں کو ایک مخصوص عقیدے کی بنا پر عبادت کا تصور نہ پیش کیا ہو۔ جس طرح انسان کی ذہنی اور روحانی ترقی کے ساتھ ساتھ تصور الٰہ ترقی کرتا رہا ہے۔ بالکل اسی طرح اللہ پرستی میں بھی ہمیں ایک قسم کا ارتقاء ملتا ہے۔ اسی سلسلہ میں بیان کیا جا چکا ہے کہ اللہ کے بارے میں تجسیم اور صفات قہر و جلال کا تصور اس کا ابتدائی درجہ تھا۔ اس کی وجہ دراصل یہ تھی کہ فطرت کائنات کی تعمیر، تخریب میں پوشیدہ ہے۔ ابتدائی انسان کی عقل تعمیر کا حسن نہ دیکھ سکی تخریب کی ہولناکیوں سے ڈر گئی۔ چنانچہ جب اس نے شعور کی پہلی آنکھ کھولی تو کائنات کے اس پہلو کا اثر اس پر فوری طور پر مرتب ہوا۔ بادلوں کی گرج، بجلی کی چمک اور کڑک، دریاؤں کا تلاطم، آتش فشاں۔ پہاڑوں کی سنگباری کھولتا ہوا لاوا۔ اور زلزلوں اور سیلابوں سے تباہی اور ہلاکت میں اس کی چشم ظاہر بیں، صرف ہیبت و جلال کے عنصر کو دیکھ سکی اور اس سے مغلوب ہو کر انسان مظاہر طاقت کے سامنے اپنا سرنگوں کرنے لگا۔ کبھی اس نے پہاڑوں کو سجدہ کیا۔ کبھی سورج دیوتا کی پرستش کی کبھی ہیبت و جلال کے فرضی دیوتاؤں کی پوجا کی۔ اور جب اس طرح بھی اس کی تسکین نہ ہوئی تو اس نے خیالی دیوتاؤں کے بت تراشے اور ان کے سامنے سجدہ ریزی کی۔ اگر قدیم اقوام کے صنم پرست تصورات کا مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ان کی تشکیلیں عام طور پر ایسی تھیں کہ ان کو دیکھ کر قلوب پر دہشت و وحشت طاری ہو۔ اس دور کا انسان خدا کے صفت، قہر و غضب سے

اس قدر مرعوب و مغلوب نظر آتا ہے کہ وہ غیر معمولی حالات، سماوی آفات اور فطری انقلابات کے وقت خدا کے قہر و غضب کو کم کرنے اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے انسانی جانوں کو اس کی بھینٹ چڑھا دینے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتا تھا۔ بہت سے لوگ خود اپنے آپ کو قربان کر دیتے تھے۔ بعض اپنی اولاد کی قربانی پیش کرتے تھے۔ بعد میں اگرچہ قہر و ہلاکت کے دیوتاؤں اور قوتوں کے ساتھ زندگی، رزق، دولت و حسن وغیرہ کے دیوتاؤں کی پرستش بھی شروع ہوئی۔ لیکن انسانی ذہن اصنام کو ہی خدا سمجھ کر ان کی پرستش کرتا رہا۔ الہامی مذاہب۔ یہودیت و نصرانیت نے عبادت کے تصور میں یقیناً ایک خوشگوار تبدیلی پیدا کی۔ اور انسان کو بت پرستی سے روکا۔ اور اپنے حلقہ ہائے اثر و نفوذ میں ایک ان دیکھے خدا کی عبادت کا تصور پیدا کیا۔ لیکن اس کے باوجود ہمیں ان کے ہاں ایک کلیسائی نظام نظر آتا ہے جس کے مطابق مذہب صرف ایک خاص طبقہ کے افراد کی اجارہ داری نظر آتا ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسا کہ ہندوستان میں مندر اور مذہبی عبادت گاہوں میں برہمنوں کا راج تھا۔ یہاں پر ان کی عبادت کی تفصیل بیان کرنا مقصود نہیں۔ البتہ یہ بتانا ضروری ہے کہ حضور علیہ السلام کی بعثت کے وقت تمام مذاہب کے نزدیک عبادت، بندگی یا پرستش خود ایک مقصود بالذات چیز تھی اور اس کا مقصد خدا یا خود ساختہ خداؤں کی خوشنودی حاصل کرنا تھی جس کے لئے ترک لذات ترک دنیا وغیرہ ضروری خیال کیا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں دنیا کے تقریباً تمام مذاہب میں رہبانیت کا عنصر نمایاں نظر آتا ہے۔ اور ایک خاص گروہ، شہر اور بستی سے دور، جنگل میں، کسی پہاڑ کی کھوہ میں، یا کسی دریا کے کنارے عزلت میں۔ بھوکے، پیاسے، ننگے سر، ننگے جسم، موسم کے اثرات سے بے نیاز رات رات بھر کھڑے، یا کئی کئی روز ایک ہی آسن میں بیٹھے ہوئے آنکھیں بند کئے، یکسوئی کے ساتھ مراقبہ یا گیان دھیان میں مشغول نظر آتے تھے۔ روزہ رکھتے پر آئے تو کئی کئی روز اناج اور پانی چھوا تک نہیں، تمام عمر شادی نہیں کی۔ چالیس چالیس روز تک چلہ کشی کی۔ رات رات بھر سوئے نہیں۔ نفس کشی کا یہ عالم کہ تمام عمر شادی نہیں کی۔ اگر بت پرستی کا عنصر نکال دیا جائے تو معلوم ہوگا کہ کم و بیش تمام مذاہب عالم میں عبادت کے طریقے۔ مشقیں اور ریاضتیں ایک ہی جیسی نظر آتی ہیں۔ جن سب کا مقصد اپنے جسم کے اعضاء کو زیادہ سے زیادہ اذیتوں اور تکالیف میں مبتلا کرنا تھا۔ اور اس کے پس منظر میں ایک ہی جذبہ اور ایک ہی مقصد کار فرما تھا کہ اس طرح انسان خدا کی خوشنودی نجات اور نروان حاصل کر سکتا ہے۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بنیادی عقاید و نظریات کی طرح عبادت کا تصور بھی اس طرح پیش کیا جو ایک دین فطرت کے شایان شان ہے۔ سب سے پہلے وحی کے الفاظ کے ذریعے اس بات کا اعلان فرمایا کہ اس کائنات میں ہر چیز بے مصرف اور بے مقصد پیدا نہیں کی گئی۔ اسی طرح انسان کی خلقت کا بھی ایک مقصد رکھا گیا ہے۔ اور وہ مقصد یہ ہے۔

"وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون ٥"

یعنی میں نے جنات اور انسانوں کو صرف اپنی عبادت اور بندگی کے لئے پیدا کیا ہے۔ اس آیت کی وضاحت کے لئے بھی تمام عالم موجودات پر غور کرنا ہوگا جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ دنیا کا ذرہ ذرہ ایک خاص قانون قدرت کے مطابق کام کر رہا ہے۔ اس کے خالق و مالک نے روز آفرینش سے اسے جو حکم دیا ہے۔ وہ اس کی تعمیل کر رہا ہے۔ آسمان سے زمین تک ہر چیز اپنے کام میں مشغول ہے۔ آفتاب ماہتاب دنیا کو روشنی، حرارت اور توانائی دینے پر مامور ہیں۔ آسمان کے ستارے فضا میں معلق گردش کناں ہیں، نہ ان کی رفتار میں کمی آتی ہے

اور نہ ہی ان میں تصادم ہوتا ہے۔ زمین کو سبزہ اور شادابی کا کام سونپا گیا ہے۔ ابر کو سیرابی اور گوہر باری کا حکم ہے۔ اشجار پھل پھول اور سایہ میسر کرتے ہیں۔ حیوانات انسان کی سواری اور خوراک کا سامان فراہم کر رہے ہیں۔ سمندر سے لولو اور مرجان کے علاوہ مچھلی دستیاب ہو رہی ہے۔ غرضیکہ جسے دیکھو وہ اپنے فرائض بطریق احسن سرانجام دے رہا ہے۔ یہی ان کی عبادت ہے۔ یہی فریضہ ہے اور یہ ان کی اطاعت ہے۔ اگر یہ سب اپنی عبادت صحیح طور پر نہ کریں تو کون و مکاں میں فساد برپا ہو جائے۔ بالکل اسی طرح انسان کے لئے فرائض ہیں جنہیں بجا طور پر ادا کرنا عبادت ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اللہ کے رسول نے اس بات کی وضاحت فرمائی کہ اسلام میں عبادت خود مقصود بالذات چیز نہیں ہے۔ بلکہ حصول مقصد کا ذریعہ ہے۔ پھر کلی طور پر یہ بتایا کہ عبادات سے خود انسان کو فائدہ پہنچتا ہے۔ ورنہ خدا ہر چیز سے بے نیاز ہے۔

"من جاھد فانما یجاھد لنفسہ ان اللہ لغنی عن العالمین ○"

جو شخص جدوجہد کرتا ہے۔ اپنے لئے کرتا ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ تمام جہانوں سے بے نیاز ہے۔

"من عمل صالحاً فلنفسہ ومن اساء فعلیھا ما یرید اللہ لیجعل علیکم فی الدین من حرج ولکن یرید لیطھرکم ولیتم نعمتہ علیکم"

جو شخص اچھے اعمال کرتا ہے اپنے لئے کرتا ہے اور برا کرتا ہے تو اپنے لئے۔ اللہ تعالیٰ یہ نہیں چاہتا کہ دین کے معاملے میں تمہارے لئے دقت پیدا کرے بلکہ وہ چاہتا ہے کہ تم کو پاک کرے اور تم پر اپنی نعمت کو تمام کرے۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ عبادات کے ذریعے انسان کا تزکیہ کرنا چاہتا ہے۔ اور اس کی بجا طور پر اطاعت کے صلے میں اسے اپنی نعمت سے نوازنا چاہتا ہے۔ اس نعمت سے مراد دنیا اور آخرت کی کامیابی ہے۔ اس کامیابی و کامرانی سے ہمکنار کرنے کے لئے اللہ کے رسول نے جو نظام العبادات پیش کیا۔ اس میں پابندی تو ضرور رکھی۔ لیکن ایسی سختی اور دشواری نہیں رکھی کہ اس کے لئے جان جوکھوں میں ڈالنا پڑے۔ رہبانیت اختیار کرنا پڑے اور اپنے اوپر عیش و آرام حرام کرنا پڑے۔ چنانچہ ارشاد ہوا۔

"یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر"

"خدا تم سے آسانی چاہتا ہے نہ کہ دشواری"

"ما یرید اللہ لیجعل علیکم فی الدین من حرج یرید اللہ ان یخفف عنکم"

"اللہ تعالیٰ یہ نہیں چاہتا کہ دین میں تم پر کسی قسم کی دقت واقع ہو۔ بلکہ وہ تمہارا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا ہے"

"لا یکلف اللہ نفساً الا وسعھا"

"اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی سکت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا"

پھر یہ کہ دوسرے مذاہب کی طرح عبادت کو کسی خاص طبقہ اور جماعت تک محدود نہیں کیا۔ بلکہ تمام مسلمان مرد اور

عورتوں کو اس کا مکلف بنایا۔ یوں تو عبادت کے لیے مسجد کا وجود رکھا گیا۔ لیکن وسیع تر مفہوم میں تمام زمین کو سجدہ گاہ بنا دیا۔ عبادت گھر میں بھی ہو سکتی ہے۔ گھر سے باہر عالم مسافرت پر کسی بھی پاک صاف جگہ پر سجدہ کیا جا سکتا ہے۔ کھیل کا میدان ہو، یا کھیت، میدان جنگ ہو، یا کار، ریل اور بحری جہاز کہیں بھی زمین بوس ہو کر اللہ تعالیٰ کے حضور اپنے عجز کا نذرانہ پیش کیا جا سکتا ہے۔

ذیل میں ہم مختصر طور پر صرف فرض عبادات کا جائزہ پیش کرتے ہیں۔ جس سے یہ نتیجہ نکالنا آسان ہو گا کہ ایسے معقول و قابلِ عمل نظام العبادات کی موجودگی میں کوئی اور بہتر طریقہ ممکن ہی نہیں۔

۱۔ صلوٰۃ

اسلام نے جس طرح سب سے زیادہ زور عقیدہ توحید پر دیا۔ اس قدر نماز کی ادائیگی کا حکم دیا۔ کیونکہ یہ ایسی عبادت ہے۔ جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی عظمت اور انسان کی عبدیت اور خاکساری کا اظہار ہوتا ہے۔ کیونکہ انسان اس وقت سب سے زیادہ حقیر اور چھوٹا نظر آتا ہے۔ جب وہ کسی کے سامنے جھکے۔ اور سجدہ ریز ہو جائے۔ نماز میں یہ عنصر سب سے زیادہ غالب ہوتا ہے۔ اب ذرا نماز کی تیاری سے لے کر اس کے اختتام تک مختلف مراحل پر غور فرمایئے۔ سب سے پہلے اذان دی جاتی ہے۔ جس کے ذریعے انسان کو یہ دعوت دی جاتی ہے کہ اس طرف آئے۔ کیونکہ یہ سعادت اور فلاح کا راستہ ہے۔ پھر وضو کیا جاتا ہے۔ جس سے انسان کی بدنی طہارت مقصود ہے۔ ایک امام کی اقتدا میں سب محمود و ایاز صف آرا ہو جاتے ہیں۔ جس سے مساوات کا عملی مظاہرہ ہوتا ہے۔ غرضیکہ اس عبادت سے متعدد فائدے مرتب ہوتے ہیں۔ جن کا یہاں بیان کرنا مقصود نہیں۔ سب سے بڑا فائدہ یہ ہے۔

"ان الصلوٰۃ تنھی عن الفحشآء والمنکر" یعنی نماز برائیوں اور لغویات سے روکتی ہے" یہ مقصد سب سے عظیم ہے۔ کیونکہ اگر دنیا سے برائیوں کو ختم کر دیا جائے تو ایک صحت مند اور متوازن معاشرہ وجود میں آ سکتا ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کے ذریعے قائم کرنا چاہتا ہے۔

۲۔ الزکوٰۃ

یہ اسلام کی دوسری بڑی عبادت ہے۔ اس کے ذریعے معاشی طبقات میں ہمواری پیدا کی جا سکتی ہے۔ یہ معاشرے کے صرف فارغ البال اور امیر افراد پر فرض ہے۔ اس کے فوائد محتاج بیان نہیں۔ البتہ یہ یقینی بات ہے کہ اگر اس کا صحیح نفاذ عمل میں لایا جا سکے تو انسانی معاشرے سے غربت، افلاس، بھوک، ننگ اور ان کے نتیجے میں پیدا ہونے والی تمام برائیوں پر قابو پایا جا سکتا ہے۔

۳۔ الصوم

سال بھر میں رمضان کے مہینے میں روزے رکھنا فرض قرار دیئے گئے ہیں۔ اس کا مقصد انسان کو بھوکا اور پیاسا رکھنا

نہیں ہے۔ بلکہ یہ احساس دلوانا ہے کہ بھوک اور پیاس کی تکلیف کیا ہوتی ہے۔ ظاہر ہے انسان کسی حالت و کیفیت کو اس وقت ہی محسوس کر سکتا ہے جب وہ خود ان حالات سے گزر چکا ہو۔ یہ روزہ بھی ایک ایسا ہی عمل ہے جس کے ذریعے باہمی تکلیف اور دشواریوں کا ازالہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ قرآن کی رو سے اس کا سب سے بڑا مقصد " لعلکم تتقون " ہے۔ یعنی تم تقویٰ اختیار کرو۔ اور تقویٰ سے مراد خدا ترسی اور برائیوں سے اجتناب ہے۔ اگر کوئی معاشرہ خدا ترس اور پرہیزگار افراد پر مشتمل ہوگا۔ تو وہ دنیا میں جنت کا نمونہ پیش کر سکتا ہے۔

۴ - الحج

زندگی میں ایک بار صرف ایسے افراد پر فرض ہے جو ذہنی اور جسمانی طور پر صحت مند ہوں۔ اور اپنے وطن سے ارض حجاز مقدس تک آنے جانے، قیام کرتے اور وطن میں اپنے گھر کے افراد کے لئے اخراجات کے متحمل ہو سکیں۔ اس کے متعلق فرمایا گیا: " لیشھدوا منافع لھم " تاکہ اپنے فائدے کی جگہ حاضر ہوں۔ یہاں سے عالمی، روحانی اور ہر قسم کے فوائد مراد ہیں۔ جن کا احاطہ ضروری نہیں۔

۵ - الجہاد

یہ فرض کفایہ ہے۔ اس کا مقصد ملک گیری یا کشور کشائی نہیں۔ بلکہ برائیوں کے خلاف جدوجہد ہے۔ اس کے لئے بنیادی طور پر تبلیغ کا حکم ہے۔ لیکن اگر معاشرہ میں کسی جگہ بنیادی اقدار پامال کی جا رہی ہیں! اعلیٰ اخلاقی بنیادوں کو تباہ و برباد کیا جا رہا ہو۔ اور یہ خطرہ محسوس ہو کہ یہ برائی پھیل کر دوسرے مقامات کو بھی متاثر کرے گی تو پھر ایک مسلمان پر فرض عاید ہوتا ہے کہ وہ اسے ہاتھ سے روکے اگر یہ ممکن نہ ہو تو اسے زبان سے روکے اور اگر ایسا بھی نہ ہو سکے تو اسے دل میں برا جانے۔ یہ صورت حال تو انفرادی ہے۔ من حیث الجماعت مسلمانوں پر یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ ایسی برائیوں کو طاقت سے روکیں۔ ان تمام عبادات پر غور فرمایئے تو اس سے ایک ہی بات ظاہر ہوتی ہے کہ یہ سب مقصود بالذات نہیں ہیں۔ کسی کا مقصد برائی سے روکنا ہے۔ کسی کا تقویٰ اور پرہیزگاری پیدا کرنا ہے۔ کسی سے مساوات اور اخوت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ غرضیکہ ہر عبادت حکمت اور فوائد سے بھرپور ہے۔ گویا ان کو روح و جوہر میں اپنے اوپر نافذ کرنے سے انسان بہت سے فوائد حاصل کر سکتا ہے۔

عبادت کا یہ تصور تو روائتی ہے۔ جس کی اپنی اہمیت ہے۔ لیکن اسلام نے اس سے برتر بھی ایک تصور پیش کیا۔ وہ کہتا ہے کہ ان عبادات کے علاوہ انسان کی تمام زندگی عبادت میں گزرتی ہے۔ اس کا ہر لمحہ، ہر قدم اور ہر کام عبادت ہے۔ بشرطیکہ وہ اپنے تمام مشاغل حیات دیانت داری، خلوص، محنت اور لگن سے سرانجام دے۔ یہی نہیں بلکہ ضروریات زندگی کو بجا طور پر پورا کرنا بھی عبادت ہے۔ نکاح کرنا، امور خانہ داری کے کاموں کو انجام دینا۔ کسب معاش کرنا۔ علم حاصل کرنا۔ اس کا پھیلانا، کھانا پینا، سونا، چلنا پھرنا۔ سب عبادت کے زمرے میں آتے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف یہ تصور ہی نہیں دیا۔ بلکہ اس پر عمل بھی کر کے دکھایا۔ جو آج تمام بنی نوع انسان کے لئے

نمونہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عبادت کا ایک ایسا جامع اور مکمل تصور نہ مذاہب سلف ہی میں تھا۔ اور نہ ہی کسی دوسرے مذہب میں آج ہے۔ اسلام کے دامن میں اس کی آج بھی کمی نہیں۔ یہیں بہت سے ایسے انسان مل جائیں گے۔ جن کی تمام زندگی سراپا عبادت ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اسلام نے دوسرے مذاہب عالم کی طرح مذہب اور دنیا میں کوئی حد امتیاز نہیں کھینچی۔ بلکہ یہ بتایا کہ زندگی کے کاروبار کو ایک توازن اور حسن کے ساتھ ادا کرنا ہی دین ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ اس کے ماننے والے اس دنیا میں رہیں اور اس میں اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں پیدا کی ہیں ان سے پوری طرح متمتع ہوں۔

"وسخر لکم ما فی السمٰوٰت و ما فی الارض جمیعا اسبغ علیکم نعمہ ظاہرۃ و باطنہ"

اور تمہارے لئے زمین اور آسمانوں کی تمام چیزوں کو مسخر کر دیا اور تم پر اپنی تمام نعمتیں ظاہری اور باطنی پوری کر دیں۔

وھو الذی سخر البحر لتاکلوا منہ لحما طریا و تستخرجوا منہ حلیۃ تلبسونھا و تری الفلک فیہ و تبتغون من فضلہ ٥

اور وہ اللہ وہی ہے جس نے سمندر کو اس لئے مسخر کر دیا کہ اس سے گوشت کھاؤ۔ اور اس سے زیور نکالو جس کو تم پہنتے ہو، اور تو کشتیوں کو دیکھتا ہے۔ کہ پھاڑتی ہوئی چلی جاتی ہیں۔ تاکہ تم خدا کا فضل (روزی) تلاش کرو۔"

"وما ذرا لکم فی الارض مختلفا الوانہ ینبت لکم الزرع والزیتون والنخیل والاعناب ومن کل الثمرات"

اور بہت سی چیزیں تمہارے لئے زمین میں پیدا کیں۔ جن کے رنگ مختلف ہیں۔ اور وہی تمہارے لئے پانی سے کھیتی زیتون، کھجور، انگور اور ہر طرح کے پھل پیدا کرتا ہے۔"

ان آیات کریمہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس کائنات میں جو کچھ بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے انسان کے لئے مسخر کر دیا ہے۔ تاکہ وہ اسے حاصل کر کے اس سے لطف اندوز ہو سکے۔

لیکن انسان کی سرشت میں چونکہ ہوا و ہوس بھی ہے۔ اس لئے وہ حصول انعام میں اپنی حد سے تجاوز کر جاتا ہے اور دوسروں کے حقوق و مراعات پر ڈاکہ ڈالنے سے گریز نہیں کرتا۔ اس لئے اسے ظلم و طغیان سے روکنے اور حسن و اعتدال پیدا کرنے کے لئے اللہ کے رسولؐ نے ہمیں ایسا زریں اصول دیا۔ جسے اپنا کر تمام زیادتیوں کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔ اور وہ اصول ہے۔

"امر بالمعروف و نہی عن المنکر" یعنی معروف (نیکی) کا حکم دینا اور منکر (برائی) سے منع کرنا۔

دنیا میں جتنے بھی کام ہیں، یا وہ اچھے (معروف) ہیں یا برے (منکر) ہیں۔ اب اگر معاشرے میں معروف پھیلایا جائے اور منکر سے روکا جائے تو ایک پاک صاف اور متوازن معاشرہ وجود میں آئے گا۔ یہ کام یوں تو تمام مصلحین، حکما اور بانیانِ مذاہب نے سرانجام دیا۔ لیکن ان کے ہاں یہ تعلیمات کی شکل میں ہے۔ مثلاً کسی جاندار کو ایذا مت پہنچاؤ۔ جھوٹ مت بولو۔ چوری مت کرو۔ کسی کا حق غصب نہ کرو وغیرہم۔

اسلام کی بھی یہ تعلیمات ہیں۔ لیکن اس نے ان سب کو "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" کے ایک زریں

اصول میں سمو کر رکھ دیا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ بتایا گیا کہ معروف کیا ہے؟ معروف کے لغوی معنی پہچانا گیا اور پسندیدہ ہے۔ لیکن بطور اصطلاح اس میں وہ تمام کام شامل ہیں جنہیں نسل انسانی کے طویل تجربے نے ثابت کیا ہو کہ یہ پسندیدہ ہیں، اچھے ہیں، مفید ہیں، اسلام اس تعریف (DEFINITION) کو رد نہیں کرتا۔ بلکہ وہ ان تمام نیکیوں کو اپنے معیار پر پرکھتا ہے۔ اور پھر اس کی منظوری دیتا ہے۔ اسی طرح منکر میں وہ تمام برائیاں آجاتی ہیں جنہیں تمام مذاہب نے برا کہا ہے۔ اور اسلام نے اپنی کسوٹی پر جانچ کر اس کی ممانعت کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ اسلام نے اپنی تعلیم اور دعوت، حضور علیہ السلام کی امت کے قیام و بقا اور تمام دنیا میں امن و سلامتی کے قیام کے لئے "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" کو اساس و بنیاد بنا کر ہر مسلمان کو یہ حکم دیا کہ سب سے پہلے وہ اسے اپنی ذات پر نافذ کرے پھر اپنے گھر پر، پھر اپنے پڑوس میں علیٰ ہذا القیاس پھر تمام معاشرے پر نافذ کرے۔ تاکہ کہیں بھی ننگ، بھوک، افلاس اور بیماری نہ رہے اگر وہ اپنے ارد گرد، برائیوں اور بیماریوں کو پنپتا ہوا دیکھتا ہے اور وہ غیر متعلق رہتا ہے تو وہ گنہگار ہے۔ اس سلسلہ میں صرف ایک حدیث بیان کرنا کافی ہوگی جس کے مطابق حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص خود پیٹ بھر کر سوتا ہے۔ اور اس کا پڑوسی بھوکے پیٹ رہتا ہے تو اللہ تعالےٰ اس کی عبادت قبول نہیں کرے گا

من حیث الجماعت بھی مسلمانوں پر اس اصول کو پھیلانا فرض ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا۔

ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر و یامرون بالمعروف و ینھون عن المنکر	تم میں ایک جماعت ہونی چاہیئے جو دعوت خیر دے اور نیکی (معروف) کا حکم دے اور برائی (منکر) سے روکے۔

پھر آگے چل کر دوسری آیت میں فرمایا۔

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر	تم سب سے بہتر امت ہو کہ تم اچھے کاموں (معروف) کا حکم دیتے ہو۔ اور برائی (منکر) سے روکتے ہو۔

ایک تیسری جگہ اس فرض کو اور نمایاں طور پر بتلایا گیا ہے۔

وکذلک جعلناکم امۃ وسطا لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا ؕ	اور اس طرح ہم نے تم کو امت وسطیٰ بنایا۔ تاکہ تم لوگوں کے لئے گواہ رہو، اور تمہارے لئے تمہارا رسول گواہ ہو۔

ان آیات میں اللہ تعالےٰ نے خاص طور پر مسلمانوں کا اصلی مشن، مقصد تخلیق اور شرف خصوصی اس چیز کو قرار دیا ہے۔ کہ وہ دنیا میں خیر کے داعی ہوتے ہیں۔ نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی کو جہاں کہیں گھر میں، محلہ میں اور معاشرے میں دیکھتے ہیں۔ اسے روکتے ہیں۔ اور اسی لئے تمہیں امت وسطیٰ قرار دیا کہ تم اولین و آخرین کے لئے گواہ بن سکو کہ تم نے اپنا فرض دعوت بجا طور پر ادا کیا یا کیونکر؟ اور تمہارا رسول اللہ کے آگے تمہارے اس کام کا گواہ بنے۔ اخلاق کے تمام دفتر کا متن یہی اصول (امر بالمعروف و نہی عن المنکر) ہے۔ اور دنیا میں آداب و قانون کا احتساب بھی اسی اصل عظیم (امر بالمعروف و نہی عن المنکر) پر قائم ہے۔

قبل اس کے کہ ہم ان آیات سے کسی حتمی نتیجہ پر پہنچیں۔ یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس امر کی نشاندہی کریں کہ وہ کونسا ایسا گروہ ہے جو دعوت الی الخیر کی ذمہ داری پوری کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں مختلف قسم کے معاشی، معاشرتی اور ہنرمند گروہ ہیں۔ پھر انسانوں کا باہمی تعلق ہے۔ جو خون یا کسی اور جذبے کے تحت ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہیں۔ ان سب کے اپنے فرائض و حقوق ہیں۔ اسلام چاہتا ہے کہ کوئی کسی کا حق غصب نہ کرے۔ اور ہر کوئی اپنے فرائض و حقوق کو بجا طور پر ادا کرے۔ اگر انسانی معاشرہ میں یہ توازن و اعتدال قائم رہے تو "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" کا اصول صحیح طور پر نافذ ہو سکتا ہے۔ اور اس سے صحیح نتائج اخذ ہو سکتے ہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے حضور علیہ السلام نے دنیائے انسانیت کو حقوق و فرائض کا ایک نظام اور لائحہ عمل دیا۔ اور تمام انسانوں کے حقوق و فرائض متعین کر دیئے۔ مثلاً ایک مزدور کا یہ فرض ہے کہ وہ دیانت داری کے ساتھ اپنا کام کرے اور ایک سرمایہ دار یا کارخانہ دار کا یہ فرض ہے کہ وہ اس کا پسینہ خشک ہونے سے قبل اس کی مزدوری ادا کر دے۔ اولاد کا یہ فرض ہے کہ اپنے والدین کی اطاعت کریں اور والدین کا یہ فرض ہے کہ وہ ان کی صحیح تربیت کریں۔ ایک طالب علم کا یہ فرض ہے کہ وہ حصول علم کے لئے محنت کرے اور اپنے اساتذہ کی عزت کرے۔ استاد کا یہ فریضہ ہے کہ وہ اپنے طالب علم کو دیانت کے ساتھ علم منتقل کرے۔ غرضیکہ عورت کے حقوق و فرائض، خاوند کے حقوق و فرائض، غیر قوموں کے حقوق، غیر مسلموں کے حقوق حتیٰ کہ اپنی جان اور نفس کے حقوق بھی متعین ہیں۔ جن پر عمل پیرا ہونا تمام افراد کا فرض ہے۔

یہ حقوق و فرائض انسانوں میں باہمی طور پر قائم ہوں تو آداب و معاملات کہلاتے ہیں۔ اور جب یہی نظام کسی حکومت کے توسل سے قائم کیا جائے تو قوانین وجود میں آتے ہیں۔ جن کا مقصد معاشرے میں امن و عدل کا قیام ہے۔ اس طرح اسلام نے ایک طرف حکومت کو معاشرے کے لئے ضروری قرار دیا۔ اور دوسری طرف اس کا مقصد بھی واضح کر دیا۔ اور ساتھ ہی اس بات کی بھی صراحت ہو گئی کہ اسلام میں دین یا مذہب ایک وسیع تر مفہوم رکھتا ہے جس میں معاشرت، معیشت، اخلاق، سیاست، غرضیکہ جملہ امور دینوی شامل ہیں۔ اور آپس میں اس طرح مربوط ہیں کہ ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کر سکتے۔ مجموعی طور پر اسلام ایک وحدت کا نام ہے۔ جس کے مختلف وظائف و فرائض ہیں۔ جن سب کا مقصد "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" ہے۔

الذین ان مکنٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر وللہ عاقبۃ الامور"

"اگر ہم ان لوگوں کو زمین پر متمکن کریں تو وہ نماز قائم کریں گے۔ اور زکوٰۃ ادا کریں گے۔ اور معروف کا حکم دیں گے۔ اور برائی سے روکیں گے۔ اور سب کا انجام کار اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ ہے۔"

اس بیان سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام نے اپنے ماننے والے تمام افراد پر اپنے اپنے حلقہ نفوذ و دائرہ میں "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" فرض قرار دیا۔ اس تعلیم کو اصولاً تمام تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن اصل مسئلہ عمل کا ہے۔ اسلام "عمل" کا مذہب ہے۔ مذہبی تاریخ میں اصول و عقیدہ سے عمل کی جانب جو انقلابات ظاہر ہوئے۔ اس کی ابتدائی حالت بدھ مت میں نظر آتی ہے۔ اور آخری صورت سیدنا مسیح علیہ السلام کی زندگی اور تعلیم میں ملتی ہے۔ اسلام اس کے انقلاب آخری کا نام ہے جس کے بعد مذہب ایک خاص عملی قانون کی شکل میں تبدیل ہو گیا۔ اس کے مطابق "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" کی جو تبلیغ و تعلیم امم سابقہ میں انبیاء علیہم السلام

کے ذمہ فرض تھی۔ وہ امت محمدیہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میں ہر مسلمان پر فرض ہو گئی۔ خواہ اس کا تعلق حکومت سے ہو۔ کسی مذہبی یا تعلیمی ادارے سے، کسی صنعتی ادارے کا کارکن ہو، یا تجارتی تنظیم کا سربراہ، باپ ہو، یا بیٹا، استاد ہو، یا شاگرد، رعایا ہو، یا سربراہ مملکت۔ گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر امتی کو انبیائے سلف کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ جس کا صاف مطلب نکلتا ہے کہ آپ کے بعد اب کسی اور نبی کی نہ تو گنجائش ہے۔ اور نہ ضرورت۔ آیت "الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا" میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

یہ آیہ کریمہ اس وقت نازل ہوئی جب آپ حجۃ الوداع کے موقع پر تمام بنی نوع انسان کو آخری منشور عطا فرما رہے تھے۔ اس عظیم خطبہ کے الفاظ پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اس سے بہتر دستور نہ تو پہلے کسی نے دیا اور نہ ہی آج تک کوئی ادارہ تنظیم یا حکومت و شخصیت پیش کر سکی ہے۔ آپ نے فرمایا۔

لوگو! خوب سن لو کہ میں نہیں جانتا کہ شاید پھر میں آپ لوگوں سے اس سال کے بعد اس جگہ مل سکوں۔ لوگو! بیشک تمہارا رب ایک ہے۔ اور تمہارا باپ ایک ہے۔ ہاں عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر، سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کے سبب"

"ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور مسلمان باہم بھائی بھائی ہیں۔ تمہارے غلام، تمہارے غلام، جو خود کھاؤ، وہی ان کو کھلاؤ۔ دور جاہلیت کا سب کچھ میں نے اپنے پاؤں تلے روند ڈالا"

"جاہلیت کے تمام "خون" باطل کر دیئے گئے اور سب سے پہلے میں اپنے خاندان کا خون! ربیعہ بن الحارث کا خون! باطل کرتا ہوں جاہلیت کے تمام سود بھی باطل کر دیئے گئے۔ اور سب سے پہلے اپنے خاندان کا سود۔ عباس بن عبدالمطلب کا سود باطل کرتا ہوں۔

عورتوں کے معاملے میں خدا سے ڈرو۔ تمہارا عورتوں پر اور عورتوں کا تم پر حق ہے۔

تمہارا خون اور تمہارا مال تا قیامت اسی طرح حرام ہے۔ جس طرح یہ دن اس ماہ اور اس شہر میں حرام ہے میں تم میں ایک چیز چھوڑتا ہوں۔ اگر تم اس کو مضبوطی سے تھام لو۔ تو تم گمراہ نہیں ہو گے۔ وہ کیا چیز ہے؟ "اللہ کی کتاب" اور ہاں دینی معاملات میں غلو سے بچنا کہ تم سے پہلے کہ لوگ اپنی باتوں کے سبب ہلاک کر دیئے گئے۔"

"جان لو کہ مجرم خود ہی اپنے جرم کا ذمہ دار ہو گا۔ اور اب نہ باپ کے بدلے بیٹا پکڑا جائے گا۔ اور نہ بیٹے کا بدلہ باپ سے لیا جائے گا۔"

"قرض قابل ادائی ہے۔ عاریتاً لی ہوئی چیز واپس کرنا چاہیئے۔ تحفے کا بدلہ دینا چاہیئے اور جو کسی کا ضامن بنے وہ تاوان ادا کرے۔"

یہ خطبہ اسلام کے انفرادی اور اجتماعی اخلاقیات اور اصول شریعت کا ایک جامع ضابطہ ہے۔ اور حقوق انسانی کے ایک عالمی منشور کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسے جاری ہوئے اب چودہ سو سال گزر چکے ہیں۔ مگر اس سلسلے میں اس میں دی ہوئی ہدایات ہیں،

اب تک دنیا کے کسی قانون اور ضابطہ میں اضافہ نہیں کیا جا سکا۔ اور نہ ہی آئندہ ممکن ہے۔ اسی لئے اس کی حیثیت دائمی ہے۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ انسان کو جو کچھ مراعات اور حقوق ملنا تھے۔ اسلام کے سایۂ عاطفت میں مل گئے آئندہ جو کچھ بھی ہو گا اس کی روشنی میں ہو گا۔

اب تک جو کچھ ہم بیان کر چکے ہیں۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اسلام کا مقصد انسان کی معنوی اور روحانی تربیت ہی نہیں۔ بلکہ مادی تہذیب و اصلاح اور ترقی بھی ہے۔ یہ ایک طرف انسانی نفس کو اللہ تعالیٰ کی رضا کے تابع بنانے کی تعلیم دیتا ہے۔ اور اس کو صلاح و فلاح کی طرف دعوت دیتا ہے۔ دوسری طرف اسلام کے احکام، اوامر و نواہی۔ معروف و منکر، انسانی زندگی کی ہر منزل اور ہر حالت کے لئے ہدایت و رہنمائی فراہم کرتے ہیں۔ یہ احکام ایک مکمل معاشی اور معاشرتی نظام میں مدون ہیں جو ایک ایسا قابلِ عمل نظامِ حیات ہے۔ جس پر عمل پیرا ہو کر تاریخ کا زبردست اور حیران کن کارنامہ سرانجام دیا جا سکتا ہے جس کا مظاہرہ ہمیں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں آج سے چودہ سو برس قبل ملتا ہے۔ اور اسی کا عکس جمیل نہیں آپؐ کے صحابہ کرام میں بھی نظر آتا ہے۔ بلکہ بعد کی چند صدیوں میں بھی ملتا ہے۔

یہاں پر ایک اور نکتہ کی وضاحت کر دی جائے کہ یہ اسلام کی سیاسی قوت و طاقت نہیں تھی۔ جس کے آگے قیاصرہ و اکاسرہ اپنے پُر غرور سروں کو جھکانے پر مجبور ہوئے۔ بلکہ یہ اسلام کے ان اخلاقی اصولوں، معاشرتی اقدار اور روحانی و مذہبی اساسات کے کمالات کا فیضان تھا جس کے نتیجہ میں تاریخ میں پہلی بار عرب کے بادیہ نشین بحیثیت ایک قوم اور مذہبی عصبیت بن کر ابھرے اور بساطِ تاریخ پر چھا گئے۔

جن اصولوں اور قوانینِ فطرت کی طرف اسلام نے بنی نوعِ انسان کی رہنمائی کی۔ وہ محض انسان معاش اور معیشت ہی کی نگرانی نہیں کرتے۔ بلکہ اس کو تسخیرِ کائنات کا درس بھی دیتے ہیں اس کی روحانی پاکیزگی اور اخلاقی سربلندی کے ساتھ ساتھ دنیا میں ترقی اور حصولِ علم و حکمت کا راستہ بھی دکھاتے ہیں۔ یہ اصول یوں تو تمام انبیاء علیہم السلام نے سکھائے۔ لیکن چونکہ حضورؐ کی بعثت کے وقت دنیا سے ناپید ہو چکے تھے۔ اس لئے انہیں زندہ رکھنا مقصود تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر آپؐ کے مشن کا مقصد یہی رکھا۔ سب سے پہلے ہمیں اس کا اشارہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی دعا میں ملتا ہے۔ جو قرآن کے الفاظ میں اس طرح محفوظ ہے۔

"ربنا وابعث فیھم رسولاً منھم یتلوا علیہم ایاتک ویعلمھم الکتاب والحکمۃ ویزکیھم انک انت العزیز الحکیم ۝"

"اے رب ہمارے! ان کے درمیان ان ہی میں سے ایک رسول بھیج جو ان کو تیری آیات پڑھ کر سنائے اور کتاب و حکمت سکھائے۔ اور ان کو پاک کرے۔ بیشک تو غالب حکمت والا ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس دعا کو شرف قبولیت بخشا اور آپؐ کو مبعوث فرمایا۔

"کما ارسلنا فیکم رسولاً منکم یتلوا علیکم ایتنا ویزکیکم ویعلمکم

الکتاب والحکمۃ ویعلمکم مالم تکونوا تعلمون"

"جیسا کہ ہم نے تمہارے درمیان تم ہی میں سے رسول بھیجا۔ جو تم کو ہماری آیات پڑھ کر سناتا ہے۔ اور تم کو پاک کرتا ہے۔ اور تمہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ اور تمہیں وہ کچھ سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے۔"

یہ مضمون قرآن کریم میں متعدد مرتبہ آیا ہے۔ ہم یہاں صرف ایک آیت پر اکتفا کرتے ہیں۔

"لقد من اللہ علی المؤمنین اذ بعث فیھم رسولاً من انفسھم یتلوا علیھم آیاتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ وان کانوا من قبل لفی ضلال مبین"

"یقیناً اللہ تعالیٰ نے مومنین پر احسان فرمایا کہ ان کے درمیان انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کو اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے۔ اور ان کو پاک کرتا ہے۔ اور ان کو کتاب و حکمت سکھاتا ہے۔ اگرچہ وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔"

اس آیت میں ایک خاص نکتہ پوشیدہ ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان پر ہزارہا نعمتیں نازل فرمائیں اس کے کھانے، پینے، پہننے، آرام، بصارت، بصیرت، غرضیکہ ہر مقصد کے لئے ایسی ایسی چیزیں عطا فرمائیں کہ جس سے انسان کو تسکین و اطمینان ملتا ہے۔ اس کے باوجود اس نے انسان پر احسان نہیں جتلایا۔ پھر اس کی معنوی تربیت کے لیے انبیاء علیہم السلام مبعوث فرمائے۔ مگر احسان نہیں جتلایا لیکن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرما کر اپنے احسان کا اعلان فرمایا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک ایسی خصوصیت حاصل ہے۔ جو صرف آپ کی ذات ستودہ صفات کے لیے مختص ہے۔ اور وہ ہے آپ کی شان رحمت للعالمین، اللہ تعالیٰ نے یہ لفظ کسی نبی، کسی مرسل اور کسی پیغمبر کے لئے استعمال نہیں کئے۔ اس طرف آپ کی صفت رحمت تمام عالمین، عالم جمادات، عالم نباتات، عالم حیوانات، عالم جنات و ملائک اور عالم انسانیت پر محیط ہے۔ اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ لیکن اگر تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات بڑی آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے کہ آپ نے ہر مخلوق کو اپنی شفقت و محبت اور رحمت و برکت سے نوازا۔ مثلاً زمین کا تعلق عالم جمادات سے ہے۔ رسول رحمت نے فرمایا۔ اس پر اکڑ کر مت چلو۔ نباتات کی پرداخت، تحفظ اور آبیاری کے لئے آپ نے بہت سی نصیحتیں فرمائیں حیوانات کے متعلق فرمایا کہ ان پر ظلم نہ کرو۔ ان سے فائدہ اٹھاؤ۔ ان کی دیکھ بھال کرو۔ ان کی خوراک اور چارے کا خیال رکھو۔ ان کی برداشت سے زیادہ ان پر بوجھ نہ ڈالو۔ اسی طرح بہت سی ایسی روایات بھی تاریخ و سیر اور احادیث کی کتابوں میں ملتی ہیں جن سے تمام مخلوقات پر آپ کی رحمت و شفقت کا پتہ چلتا ہے۔

لیکن آیت بالا میں یہ احسان صرف مومنین پر جتلایا گیا۔ مفسرین نے اس کی متعدد وجوہات بیان کی ہیں۔ ہماری سمجھ میں جو بات آتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ ان کی سب سے بڑی سعادت ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں پیدا کیا۔ یہ خیر الامت ہے اور جس میں پیدا ہونے کی بڑے بڑے جلیل القدر اور برگزیدہ انبیاء علیہم السلام نے آرزو کی تھی۔ کیا یہ مومنین

پر احسان عظیم نہیں کہ جس منصب کے لئے اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں اور رسولوں نے دعا کی۔ وہ انہیں بغیر محنت اور طلب کے حاصل ہوا۔

عقاید و نظریات، نظام العبادات، ضابطۂ اخلاق و آداب اور اسلوب معاملات جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے عطا فرمائے۔ ان سب کا مقصد ایک نفیس، معتدل اور صحت مند معاشرے کا قیام تھا۔ معاشرے میں یہ اقدار و تصورات دو طریقوں سے نافذ ہوتی ہیں۔ ایک تبلیغ و عمل کے ذریعے سے اور دوسرے طاقت کے ذریعے سے۔ پہلا طریقہ عام طور پر انبیاء اور مصلحین استعمال کرتے ہیں۔ اور دوسرا ریاستیں اور حکومتیں جن کے پاس ہر قسم کی مادی طاقت ہوتی ہے۔ حضور علیہ السلام نے دونوں طریقے استعمال کئے۔ پہلے طریقے کا مظاہرہ آپؐ کی مکی زندگی میں خاص طور پر ملتا ہے۔ جبکہ آپؐ کے پاس کوئی طاقت اور وسائل موجود نہ تھے۔ اس کا مقصد یہ نہیں کہ مدنی زندگی میں آپؐ کی حیات طیبہ میں یہ عنصر نمایاں نہ تھا۔ یقیناً تھا۔ لیکن اس دوران میں چونکہ آپؐ کے مشن کی تبلیغ کے لئے دائرہ بہت وسیع ہو گیا تھا۔ جیسے جیسے آپؐ کے بعد اور وسیع ہوتا تھا۔ جیسا کہ بعد کی صدیوں میں ہوا۔ اس لئے آنے والے ادوار میں اسلام کی بنیادی معاشرتی اقدار پر مشتمل ایک وسیع معاشرے کے مستقل قیام کے لئے آپؐ نے ایک بے نظیر قابل تقلید ریاست۔ ریاست مدینہ کی تنظیم کی جو نبوت کے عظیم مقاصد میں سے تو نہ تھی۔ لیکن آئندہ نسلوں کے لئے بطور نمونہ ضروری سمجھی گئی۔ اس طرح ہمیں آپؐ کی حیات طیبہ میں معاشرتی اقدار، اصول حکمرانی، نظام سیاست و عمل، معاشی نظریات، تعلیم و تربیت کی اہمیت غرضیکہ زندگی کے تمام شعبوں سے متعلق ہدایات ملتی ہیں۔ جو اپنی جگہ ناقابل تبدیل حقائق ہیں۔ نہ ان میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ نہ کمی۔ زندگی کے یہ اصول و مبادیات آج بھی موثر اور قابل عمل ہیں۔ اس لئے یہ بات بلاخوف و تردید کہی جا سکتی ہے کہ ان ہمہ گیر مستقل ہدایات کی موجودگی میں اب کسی اور نبی کی ضرورت نہیں۔

حرف آخر

اس سے قبل گزشتہ صفحات میں اس بات کی وضاحت کی جا چکی ہے کہ تاریخ انسانیت کو دو واضح ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ یعنی ایک آدمؑ سے لے کر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل اور دوسرا بعثت کے بعد سے تا قیامت۔ دوسرے دور کو اب چودہ سو برس سے اوپر گزر چکے ہیں۔ اس عرصے میں انسان نے جو مادی اور عقلی ترقی کی ہے۔ پہلے دور میں اس کے عشر عشیر کے برابر بھی نہیں ہوئی۔ گزشتہ صفحات میں ہم تقریباً زندگی کے تمام اہم شعبوں پر تفصیلاً یا اجمالاً حسب ضرورت روشنی ڈال چکے ہیں۔ البتہ علم کا شعبہ ابھی تک ہماری بحث کا موضوع نہیں بن سکا ہے۔ حالانکہ دوسرے دور میں حیرت انگیز ترقی اسی شعبہ میں ہوئی۔ اسلام اور داعیٔ اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عظیم احسان ہے کہ آپؐ نے علم کے تمام شعبوں کو قرآن پاک کی معرفت روشناس کرایا۔ اللہ کی یہ کتاب تمام عجائبات قدرت کو جو آیات اللہ کے نام سے تعبیر کرتی ہے۔ اور ان کے اسرار و خواص پر غور و فکر کرنے کی دعوت دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جہاں اپنی کتاب میں تخلیق کائنات اور اپنے خالق ہونے کے ثبوت میں متعدد اشیاء کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کے ساتھ ان کی غرض و غایت اور مصلحت بھی نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کی ہے۔ ان میں زیادہ تر ایسی اشیاء کا تذکرہ کیا گیا ہے جو روزمرہ کے مشاہدے میں آتی ہیں، مثلاً زمین کی ساخت، آسمان کی وسعت، سورج، چاند، ستاروں کی چمک دمک، ضیاء باری اور حرارت و توانائی

پھر ایسی چیزوں کا بھی بیان ہے جن سے انسان ہمہ وقت فیض یاب ہوتا رہتا ہے۔ ان میں پانی، ہوا، گرمی، سردی، دھوپ، سایہ اور روشنی وغیرہ شامل ہیں۔

قرآن کریم پہ غور کریں تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان سب اشیاء میں فعل اور تاثیر کی نسبت اللہ تعالےٰ نے خود اپنی طرف کی ہے۔ جس کا یہ مطلب ہے کہ ان مسببات کے اسباب وعلل اس نے اپنی مشیت اور ارادہ اور اپنے امر اور حکم سے بنائے ہیں۔ نیز ان تمام مظاہر و فطرت میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہے اور تمام اشیاء میں حکمت وافادہ ہے۔ تاکہ انسان ان سے فیضیاب بھی ہو سکے اور علوم و فنون کا استنباط بھی کر سکے۔ مثلاً زمین کے بارے میں ارشاد ہے۔

"وفی الارض آیت للموقنین وفی انفسکم افلا تبصرون ٥	"ان لوگوں کے لئے جو یقین رکھنے والے ہیں زمین میں نشانیاں ہیں اور خود تمہارے وجود میں بھی پھر کیا تم نہیں دیکھتے؟"

زمین کی ہر چیز ہی میں نہیں۔ بلکہ آسمان کے ہر منظر میں، زندگی کے ہر تغیر میں فکر انسانی کے لئے معرفت حقیقت کی نشانیاں ہیں۔ بشرطیکہ وہ غفلت سے کام نہ لے۔

"وکاین من ایۃ فی السمٰوٰت والارض یمرون علیہا وھم عنہا معرضون ٥	"اور آسمان اور زمین میں کتنی ہی نشانیاں ہیں۔ لیکن لوگ ان پر نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے اور گزر جاتے ہیں"

اگر انسان عقل وبصیرت سے کام لے اور کائنات میں تفکر کرے تو اس پر یہ حقیقت واضح ہو گی کہ اس کی ہر چیز میں حسن ترتیب اور توازن ہے۔ وہ ایک خاص نظام اور قانون کی پابند ہے۔ اور وہ حکمت ومصلحت کے ساتھ بندھی ہوئی ہے۔

"خلق السمٰوٰت والارض بالحق ان فی ذلک لایۃ للمومنین ٥ (۲۹: ۴۴)	"اللہ تعالےٰ نے آسمان اور زمین حکمت ومصلحت کے ساتھ پیدا کئے۔ بے شک ایمان والوں کے لئے ان میں بڑی نشانیاں ہیں"۔

پھر فرمایا:

"وما خلقنا السماء والارض وما بینہما باطلا (۳۸: ۲۷)	اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے بغیر حکمت ومصلحت کے نہیں بنایا

ایک اور جگہ فرمایا:

"وما خلقنا السمٰوٰت والارض وما بینہما لعبین۔ ما خلقنہما الا بالحق ولکن اکثرہم لا یعلمون (۴۴: ۳۸-۳۹)	اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے محض کھیل تماشے کے طور پر نہیں بنایا بلکہ انہیں حکمت اور مصلحت کے ساتھ بنایا ہے لیکن

ان میں سے اکثر اس کا ادراک نہیں رکھتے۔

پھر جا بجا اس کے اندر پوشیدہ حکمت و مصلحت کی تشریح کی ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا کہ کائنات کی ہر چیز میں افادہ ہے اور فطرت چاہتی ہے کہ جو کچھ بنائے اس طرح بنائے کہ اس میں وجود اور زندگی کے لئے نفع اور راحت ہو۔

"خلق السموٰت والارض بالحق یکور الیل علی النھار و یکور النھار علی الیل و سخر الشمس والقمر کل یجری لاجل مسمی" (۳۹ : ۵)

اس نے آسمانوں اور زمین کو مصلحت کے ساتھ پیدا کیا (اس نے رات اور دن کے اختلاف اور ظہور کا ایسا انتظام کیا) کہ رات دن پر لپٹی جاتی ہے اور دن رات پر۔ اس نے سورج اور چاند کو مسخر کر دیا ہے۔ یہ سب اپنے مقررہ وقت کے لئے حرکت میں ہیں۔

ایک دوسرے موقع پر خصوصیت کے ساتھ اجرام فلکی کے افادہ و فیضان کی طرف توجہ دلائی۔

"ھو الذی جعل الشمس ضیآء والقمر نورًا وقدرہ منازل لتعلموا عدد السنین والحساب ما خلق اللہ ذلک الا بالحق" (۱۰ : ۵)

وہ جس نے سورج کو درخشندہ اور چاند کو روشن بنایا پھر (چاند) کی گردش کے لئے منزلیں ٹھہرا دیں۔ تاکہ تم برسوں کی گنتی اور اوقات کا حساب معلوم کرو۔ بے شک اللہ نے یہ سب کچھ حکمت و مصلحت کے ساتھ پیدا کیا۔

پھر ایسی چیزوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ جن سے انسان روزمرہ فائدہ اٹھاتا ہے اور انہیں بقائے زیست کے لئے استعمال کرتا ہے۔

"فلینظر الانسان الی طعامہ انا صببنا الماء صبا ثم شققنا الارض شقا فانبتنا فیھا حبا و عنبا و قضبا و زیتونا و نخلا و حدائق غلبا و فاکھۃ و ابا متاعا لکم ولانعامکم" (۸۰ : ۲۴ - ۳۲)

انسان اپنی غذا پر نظر ڈالے۔ پہلے ہم زمین پر پانی برساتے ہیں۔ پھر اس کی سطح شق کرتے ہیں۔ پھر اس روئیدگی سے طرح طرح کی چیزیں پیدا کرتے ہیں۔ اناج کے دانے، انگور کی بیلیں، کھجور کے خوشے، سبزی ترکاری، زیتون کا تیل، درختوں کے جھنڈ، قسم قسم کے پھل، طرح طرح کا چارہ، تمہارے اور تمہارے جانوروں کے فائدے کے لئے۔

سورہ نحل میں یہی استدلال ایک دوسرے پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔

"اور ان تمہارے مویشیوں میں بھی تمہارے لئے عبرت ہے۔ ان کے اجسام سے ہم خون و کثافت کے درمیان خالص دودھ پیدا کرتے ہیں۔ جو پینے والوں کے لئے مشروب ہوتا ہے۔ پھلوں میں کھجور اور انگور پیدا ہوتے ہیں۔ جن سے نشہ اور عرق اچھی غذا دونوں حاصل کرتے ہیں۔ بلاشبہ اس بات میں ارباب عقل کے

لیے بڑی نشانی ہے۔ اور پھر تمہارے پروردگار نے شہد کی مکھی کی جبلت میں یہ بات ڈال دی کہ وہ پہاڑوں درختوں اور بیلوں میں اپنے لیے گھر بنائے۔ ہر طرح کے پھولوں سے رس چوسے اور پھر اپنے رب کے ٹھہرائے ہوئے طریقوں پر کامل فرمانبرداری کے ساتھ گامزن ہو۔ اس کے شکم سے مختلف رنگوں کا رس نکلتا ہے جس میں انسان کے لیے شفا ہے۔ بے شک اس میں اہل فکر کے لیے بڑی نشانی ہے (۱۶ : ۶۸ - ۷۲)

ان آیات اور ان سے ملتی جلتی اور متعدد آیات قرآنی میں عقل انسانی کے لیے ایک کھلی ہوئی دعوت ہے۔ اور وہ دعوت یہ ہے کہ انسان ظواہر عالم پر نظر ڈال کر اللہ تعالیٰ کی حکمت و مصلحت معلوم کرے۔ اس دعوت و تبلیغ نے عربوں کی حیاتِ عقلیہ کی نشوونما میں بڑا کام کیا۔ اس سے ان کا عقلی معیار بلند ہوا۔ اور ان میں علوم سیکھنے اور تدوین کرنے کی خواہش و صلاحیت فطرۃً پیدا ہوئی۔ قرآن کریم میں دوسری قوموں کی تاریخ اور حالات جستہ جستہ بیان ہوئے ہیں۔ اس سے مسلمانوں میں ان قوموں کے معاشرتی، سیاسی اور ثقافتی حالات معلوم کرنے کی تڑپ پیدا ہوئی۔ اس طرح علم تاریخ کی بنیاد پڑی۔ پھر انہوں نے قرآن و سنت کو مرجع قرار دے کر جزوی و تفصیلی احکامات مستنبط کئے۔ اس سے ایک وسیع تحریک تشریع کی بنیاد پڑی۔ اس طرح اسلام کی دوسری تحریکات سے لسانی و لغوی تحریکات پیدا ہوئیں۔

علمی لحاظ سے اوائل اسلام میں قرآن کے عطا کردہ فکر نے سب سے پہلے حرکت دینی کو جنم دیا جس کے نتیجہ میں تفسیر، اصول تفسیر، حدیث، اصول حدیث، مصطلحات الحدیث، اسماء الرجال فن تجوید و قرات، اصول درایت و روایت، غرضیکہ وہ تمام علوم جن کا تعلق براہِ راست مذہب سے تھا۔ اس تحریک کی بدولت پیدا ہوئے۔ دوسری تحریک، حرکت فلسفہ تھی۔ جس کے نتیجہ میں فلسفہ، منطق، علم کلام، طب کیمیا وغیرہ علوم پیدا ہوئے۔ اسی طرح اوائل اسلام میں منظم علم تو نہیں۔ البتہ وہ بنیادیں فراہم ہوگئی تھیں جن پر انسان تمام علوم عقلی و نقلی کی نشوونما کرسکتا تھا حقیقت یہ ہے کہ آج تک جتنے علوم بھی انسان کے نفع کے لیے وجود میں آئے ہیں یا آئیں گے۔ ان سب کے بارے میں قرآن کریم بنیاد فراہم کرتا ہے بشرطیکہ صرف آیات قرآنی پر غور و فکر کا ہے۔ ماضی میں، یہ کام مسلم ماہرین اور سائنس دانوں نے سرانجام دیا تو علم ان کی میراث تھا۔ لیکن جب مسلم اساتذہ اور مسلم دانش گاہوں بغداد، قرطبہ، غرناطہ، قاہرہ، نیشاپور وغیرہ سے تمام علوم مردیہ سیکھ کر اہل مغرب نے اپنے ایوانوں کو ان کی روشنی سے منور کیا تو علوم کے مراکز یورپ و امریکہ میں منتقل ہو گئے۔

بات مشرق یا مغرب کی نہیں علم کسی کی میراث نہیں۔ یہ تو جام معرفت ہے۔ جسے جو بھی بڑھ کر اٹھالے۔ یہ اسی کا حصہ ہے۔ جو بھی اس کا کسب کرے یہ اسی کا مقدر ہے۔ علم بہرحال انسان کی میراث ہے۔ یہ حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ زمین پر نازل ہوا۔ اور انسان کی ذہنی اور عقلی ارتقاء کے ساتھ ترقی کی منازل طے کرتا رہا۔ یہ کبھی بھی ایک قوم یا ملک میں محدود نہیں رہا بلکہ اپنے پانے والوں کے ساتھ محو سفر رہا۔ یہ کبھی اہل مصر کے پاس تھا۔ کبھی وادی دجلہ و فرات میں اس کی علمداری رہی کبھی اہل بابل اس کے مالک رہے۔ کبھی فینیقیوں نے اس کی سرپرستی کی۔ کبھی اہل یونان نے اس سے اپنی بزم آرائی کی کبھی رومۃ الکبریٰ نے اس سے اپنے قصور و ایوان روشن کئے اور کبھی اہل چین نے اس کے ذریعے طرح طرح کی حکمت آفرینیاں اور نکتہ چینیاں کیں۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے بعد یہ مسلمانوں میں منتقل ہوگیا جنہوں نے اسے عظمت کی انتہائی بلندیوں تک پہنچا دیا۔ آج دنیا میں جو کچھ بھی ہے ۔ اور جہاں کہیں بھی ہنر و کمال دیکھنے میں آرہے ہیں ۔ یہ سب انہی کا فیض ہے ۔ انہی کی خوشہ چینی ہے آج کا انسان جو چاند ستاروں پر کمندیں ڈال رہا ہے یہ بھی انہی کا کرشمہ ہے ۔ ممکن ہے کہ ہمارا یہ آخری جملہ ہمارے بعض قارئین کو چونکا دے کیونکہ بظاہر تو روس اور امریکہ چاند ستاروں کی تسخیر میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں ۔ لیکن سب سے پہلے یہ تصور اسلام نے ہی دیا کہ "ہم نے تمہارے لئے سورج اور چاند کو مسخر کر دیا"۔ اصل بات نظریہ ہوتا ہے ۔ پھر اس نظریہ پر کسی لیبارٹری یا تجربہ گاہ میں تجربہ کیا جاتا ہے ۔ اس میں کامیابی کے بعد اس کا اطلاق ہوتا ہے ۔ یہ بات تو ہم نے بتا دی کہ تسخیر کائنات کا نظریہ سب سے پہلے اسلام نے دیا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس کا پہلا تجربہ اسلام نے کس طرح کیا۔

اس حقیقت کے ادراک کے لئے ہم آپ کو سن ۱۱ نبوی میں لئے چلتے ہیں ۔ رجب المرجب کا بابرکت مہینہ تھا ۔ اور ستائیسویں شب پر سوتاریکی کا راج تھا ۔ تمام شہر مکہ محو خواب تھا ۔ حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم بھی حرم کعبہ کے مقام حطیم میں محو استراحت تھے کہ اللہ تعالیٰ کا برگزیدہ فرشتہ حضرت جبرائیل علیہ السلام دربار نبوت میں حاضر ہوا ۔ اور آیت مبارکہ "ان الذی فرض علیک القرآن لرادک الی معاد" (۲۸ : ۸۵) کی تکمیل کی درخواست کی ۔ آپ نے حکم ربانی کی تعمیل میں سر تسلیم خم کر دیا اور حضرت جبرائیل کے ہمراہ براق جیسی برق رفتار سواری کے ذریعے مسجد اقصیٰ تک جا پہنچے ۔ اور تمام انبیاء علیہم السلام کی نماز میں امامت ادا فرمائی پھر آپ عالم بالا کی طرف روانہ ہوئے اور سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچے ۔ حتیٰ کہ آپ کو وہ عروج حاصل ہوا کہ آپ قاب قوسین او ادنیٰ کی بلندیوں تک جا پہنچے اور اپنے رب سے محو کلام ہوئے ۔

اس واقعہ پر مسلم مفسرین، سیرت نگاروں، مؤرخین، متکلمین، دانشوروں کے علاوہ غیر مسلم ادیبوں، شاعروں اور مذہبی حلقہ کے لوگوں نے بہت کچھ لکھا ہے ۔ اس سے متعدد روحانی اور مادی فوائد بھی مستنبط کئے ہیں ۔ بعض نے اسے جسمانی معراج لکھا ہے اور بعض نے روحانی ۔ غیر مسلموں میں کثرت نے اس پر اعتراض کئے ہیں اور بعض نے اس واقعہ سے متاثر ہو کر خیالی نظمیں بھی قلمبند کی ہیں ۔ جیسا کہ دانتے (DANTE) کی (DIVINE COMEDY) ہمیں نہ ان فوائد کا احاطہ کرنا ہے اور نہ ہی معترضین کے اعتراضات میں زیادہ طویل دلائل پیش کرنا ہیں ۔ بلکہ موضوع کے اعتبار سے صرف دو باتیں عرض کرنا ہیں ۔ ایک تمام مسلمانوں سے اور دوسری تمام عالم انسانیت سے مسلمانوں سے یہ کہنا ہے کہ وہ معراج شریعت کا تذکرہ کرتے وقت ہبوط آدم علیہ السلام کا واقعہ کیوں بھول جاتے ہیں ۔ یہ تمام مسلمانوں بلکہ اہل کتاب کا عقیدہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی بیوی حضرت حوا علیہا السلام اپنے مادی اجسام کے ساتھ خلاء سے کرۂ ارض پر نازل ہوئے ۔ گویا کہ انہوں نے سب سے پہلا خلائی سفر کیا ۔ جو بلندی سے پستی کی جانب تھا ۔ اگر یہ ممکن ہے تو یہ کیسے ممکن نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مادی جسم کے ساتھ پستی سے بلندی کی جانب تشریف لے گئے ۔ لہٰذا یہ بات یقینی اور حتمی ہے کہ معراج جسمانی تھا ۔

عام معشر الناس میں زیادہ تعداد ان لوگوں کی ہے ۔ جو ہبوط آدم پر یقین رکھتے ہیں ۔ ان کی خدمت میں اور ان کے ساتھ ساتھ ماہرین نظریہ ارتقاء کی خدمت میں یہ عرض کرنا ہے کہ ہبوط آدم علیہ السلام سے لے کر معراج مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک یہ طویل فاصلہ وقت ایک عقلی ارتقاء کا سفر ہے ۔ خلد میں حضرت آدم کے دل میں شیطان کا وسوسہ ڈالنا، شجر ممنوعہ کو چھونا اور اس کی پاداش میں زمین پر اترنا

ایک تاریخی حقیقت کے باوجود کیا اس کا یہ فعل انسان کے جذبۂ تجسس وارتقاء کی طرف اشارہ نہیں کرتا؟ اگر دیکھا جائے تو تجسس کیا؟ کیوں اور کیسے سے پیدا ہوتا ہے۔ اور یہی الفاظ یا جذبۂ تجسس تمام علوم کی کلید ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام انسانی جبلت کی وجہ سے شجر ممنوعہ یا اصل حقیقت کا ادراک چاہتے تھے۔ اس کے لئے انہیں اپنا مسکن چھوڑ کر زمین کو مسکن بنانا پڑا۔ جہاں ان کی اولاد زندگی کے سر دور میں دوسرے مشاغل حیات کے ساتھ ساتھ اصل حقیقت کی تلاش میں رہی۔ یہاں تک کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی پر اس راز کا انکشاف ہوا۔ اسی حقیقت کے اظہار کے لئے آپ کو معراج حاصل ہوا جو انسانی عظمت و ترقی کی انتہا ہے۔ یہی وہ تجربہ تھا جو حجاز مقدس کی لیبارٹری میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا جس کا مظاہرہ آج کل روس اور امریکہ خلائی سیاروں کے ذریعے کر رہے ہیں۔ ان کے خلائی سفر سے واقعہ معراج کی تصدیق ہوتی ہے۔ علامہ اقبال نے اپنے ایک شعر میں اسی جانب اشارہ کیا ہے۔

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفےٰ سے مجھے ۔۔۔ کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں

یہی واقعہ معراج دراصل ختم نبوت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ کیونکہ جس اصل حقیقت کو جاننے کے لیے حضرت آدم علیہ السلام کو باغ بہشت سے کرہ ارض کا سفر کرنا پڑا۔ اس حقیقت کا ادراک حضور علیہ السلام کو سفر معراج کے ذریعے ہوا۔ اس واقعہ کے بعد حضورؐ پر تمام رازہائے سربستہ افشا ہو گئے۔ انسانیت اپنے بلوغ کو پہنچ گئی۔ کمال کی انتہا ہو گئی۔ علم و معرفت کی نعمت تمام ہوئی۔ اب نہ کوئی نبی آئے گا۔ نہ کوئی شریعت، نہ کوئی نیا منشور حیات وضع ہو گا۔ جو کچھ بھی ہو گا حضور علیہ السلام کی سنت اور آپؐ کے اسوۂ حسنہ کا پرتو جمیل ہو گا۔ اب تمام انسانیت کو آپؐ سے ہی رہنمائی ملے گی۔ ہر شعبہ حیات میں، ہر حیثیت میں، ہر علم خیر میں زندگی کے ہر موڑ پر، ہر منزل اور ہر گام پہ آپؐ کی ذات ستودہ صفات، مینارہ نور کی طرح رہنمائی کرتی ہوئی نظر آئے گی۔ الصلوٰۃ والسلام علیک یاسیدی یارسول اللہ۔ وعلیٰ آلک واصحابک یاحبیب اللہ۔

حضورؐ بحیثیت مظہرِ تکمیلِ نبوّت و رسالت

سابق چیف جسٹس قدیر الدّین احمد

عنوان کا تجزیہ

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات بابرکات کے بہت سے پہلو ہیں۔ ان میں سے ہر ایک پہلو پر مقالے بلکہ کتابیں لکھی جائیں تو لکھنے والا اپنا تھوڑا سا ہی حق ادا کر پائیں گے ختم نبوت پر سیکڑوں بلکہ ہزاروں مقالے اور بہت سی کتابیں تالیف کی جا چکی ہیں۔ مگر سالویں قومی سیرت کانفرنس کے لئے "وزارت مذہبی امور نے جو عنوان تجویز کیا تھا وہ میرے خیال میں عام عنوانات سے بڑی حد تک مختلف ہے۔ عنوان یہ ہے کہ "آنحضرت مظہر تکمیل نبوت و رسالت تھے" اس کے تحت یہ عیاں کرنا لازم آتا ہے کہ خود اس ذات والا صفات سے یہ حقیقت کس طرح ظاہر ہے کہ نبوت و رسالت تکمیل کو پہنچ گئی اس زاویہ نگاہ کی خصوصیت یہ ہے کہ پیشین گوئیوں اور اقوال کی مدد سے یہ مقصد پورا نہیں ہو سکتا کیونکہ پیشین گوئیوں اور اقوال کی حیثیت تو زیادہ سے زیادہ معتبر گواہیوں کی ہے۔ ان سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آنحضرت خود مظہر تکمیل نبوت و رسالت تھے۔ بلکہ اگر گواہیوں کی ضرورت ہو تو نتیجہ الٹا نکلتا ہے۔ چنانچہ مشہور ہے کہ "عیاں را چہ بیان" یا یہ کہ "مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید" اس کے علاوہ اس عنوان کے تحت کہ یہ بحث بھی زیادہ کارآمد نہیں ہو سکتی کہ اسلام کے اصول دیگر ادیان کی اصولی ہدایات سے بہتر ہیں۔ کیونکہ مقصد مقابلہ نہیں ہے جو چیز بمقابلہ دیگر اشیاء بہتر ہو اس کا خود کامل بھی ہونا ضروری نہیں ہے تیسری بات جو اہم ہے وہ یہ ہے کہ تکمیل اور اختتام میں فرق ہے ایسی تعلیم ہو سکتی ہے جو ختم تو ہو جائے مگر مکمل نہ ہوئی ہو (مثلاً ہمارے ملک میں طالب علموں کی بہت بڑی تعداد تیسری چوتھی جماعت کی تعلیم کے بعد تدریس سے محروم ہو جاتی ہے یعنی ان طلبہ کی تعلیم تکمیل کو نہیں پہنچتی۔ انسان کی بہت سی نسلیں بھی ایسی گذری ہیں جن کو محض ابتدائی اخلاقی تعلیم میسر آئی اور اس کے بعد ان کی تعلیم وہیں ختم ہو گئی۔ ایسی نسلیں دنیا کے ہر ملک میں گذری ہیں۔ علم الانسان (AN THRO POLOGY) کی تحقیق اس زمانے میں بھی خاص کر افریقہ اور آسٹریلیا کی ایسی اقوام کی نشاندہی کرتی ہے جو باعتبارِ اخلاق نہایت پسماندہ ہیں۔ کیونکہ جہاں ان کی تعلیم رک گئی اس سے بہتر تعلیم ان کو نصیب نہیں ہوئی یہی اختتام اور تکمیل کا فرق ہے۔ یہ فرق افراد کی تعلیم میں بھی پایا جاتا ہے اور اقوام کی تعلیم میں بھی۔ جب ہم اللہ تعالیٰ کی جانب سے انسانیت کی تعلیم کا ذکر کرتے ہیں تو سارے کرۂ ارض کا تصوّر ہمارے ذہن میں آ جاتا ہے۔ اسی طرح ان تمام اقوام کا بھی خیال آ جاتا ہے جو اس زمانے میں روئے زمین پر موجود ہیں۔ یا آج سے پہلے تاریخ کے مختلف ادوار میں یہاں آباد تھیں۔ نبی اور رسول اللہ

کی طرف سے انسانیت کے معلم ہوتے ہیں چنانچہ خاتم النبیینؐ کا ذکر کر کے ہم نے انسانیت کی تعلیم کا ذکر کیا ہے۔ کسی مدرسہ، کالج یا قوم کی تعلیم کا نہیں۔ اس طرح ہمارے مضمون کی وسعت قوموں کے وجود اور ممالک کی حدود سے وسیع تر ہے۔

تعلیم کے لوازمات

مندرجہ بالا امور کو ذہن میں رکھنے کے بعد آگے بڑھیں تو یہ دکھائی دیتا ہے کہ تعلیم کی بہت سی صفات اور خصوصیات ہوتی ہیں جن کا تعلق ہر قسم کی تعلیم سے ہے۔ مثلاً ہر قسم کی تعلیم کی ابتدا اور انتہا ضروری ہوتی ہے کوئی طریقۂ تعلیم ایسا ذہن میں نہیں آسکتا جس کی ابتدا و نہ ہو اسی طرح تدریس کا کوئی ایسا منصوبہ بنانا ممکن ہی نہیں ہے جس کی کوئی آخری حد ہی نہ ہو البتہ یہ تو ممکن ہے کہ اختتام کی ایک حد کی بجائے متعدد حدود ہوں جیسا کہ آج کل تعلیم کے مدارج مقرر ہونے سے تعلیم کی ایک حد ابتدائی دوسری حد ثانوی پھر اسی طرح اور حدود مقرر ہو گئی ہیں مگر ایسا نظام تعلیم عقل سے بعید ہے جس میں شاگرد عمر بھر شاگردی ہی کرتے رہیں اور کبھی اس قابل نہ ہوں کہ اس علم کی مدد سے، جو انہوں نے حاصل کیا ہو، خود آگے بڑھ سکیں ایسی شاگردی جب ہوتی ہے تو اس کا اصل نام معلم کی محتاجی ہے۔ البتہ شاگردی اور طالب علمی ایک ہی چیز نہیں ہے شاگردی کے لئے استاد کی ضرورت ہوتی ہے لیکن طالب علم کے لئے مدرس کی موجودگی لازمی نہیں ہے۔ بلکہ ہر شخص کے لئے یہ ممکن بھی ہے اور مناسب بھی کہ ساری عمر خود علم حاصل کرتا رہے کیونکہ تدریس کے بعد علم تجربے اور از خود تحقیق و تدقیق کرنے سے بھی حاصل ہوتا ہے۔ غور و فکر سے بھی ہوتا ہے۔ لوگوں کو دیکھ کر اور سن کر بھی ہوتا ہے لیکن کسی باشعور شخص کے لئے عمر بھر شاگردی کرنا نہ تو عام طور پر ممکن ہوتا ہے اور نہ ہی مناسب ہوتا ہے ممکن اس وجہ سے نہیں ہوتا کہ عمر بھر کی شاگردی تھوڑے ہی انسان کر سکتے ہیں۔ مناسب اس لئے نہیں ہوتا کہ جو شخص ایسا کرتا ہے اس میں خود اعتمادی باقی نہیں رہتی اور نہ وہ شاگرد کہلانے کا مستحق رہتا ہے۔ کیونکہ یہ تو محض استاد سے عقیدت مندی اور اس کی پیروی ہو جاتی ہے۔ حقیقی شاگردی حصول علم سے زیادہ صلاحیتوں کی تربیت کے لئے ہوتی ہے تاکہ شاگرد اپنے علوم کی حدود میں توسیع کرتا رہے اور جو کچھ اس نے سیکھا ہے اس میں چار چاند لگائے محض پیروی، اور نقالی کا نام شاگردی رکھنا درست عمل نہیں ہے جو استاد محض نقالی سکھاتے ہیں۔ ان کے شاگردوں میں عادات و اطوار خیالات بلکہ طینت تک میں انجماد پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ کیفیت بہترین تعلیم کے تصور کے قطعی منافی ہے۔ بہترین تعلیم دماغ کو معلومات سے پر ہی نہیں کرتی بلکہ زیادہ تر یہ کرتی ہے کہ ہر قسم کی صلاحیتوں میں بہتر قابلیت پیدا ہو جائے۔ اس بہتری میں سوچنا، سمجھنا، غور کرنا، نتائج نکالنا، حصول مقصد کے لئے نئے راستے تلاش کرنا اچھے برے کو سمجھنا، باریک اور نازک جو فرق ہوتے ہیں ان کو پہچاننا، اصل اور فرع میں تمیز کرنا، بکھرے ہوئے واقعات اور متفرق تجربات کو اصولوں کے رشتوں میں پرونا، دل و دماغ میں چمک اور دمک کا پیدا ہونا شامل ہے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ انسان بدلتے ہوئے حالات کے سامنے بے بس نہیں ہوتا بلکہ ان کو اچھی صلاحیتوں کے ذریعے اپنے قابو میں کرتا ہے۔

بنی نوع انسان کی تعلیم کا انتظام

طریقۂ تعلیم کے مندرجہ بالا کوائف اور خصوصیات کے بیان کے بعد جب ہم بنی نوع انسان کی تعلیم کی طرف نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی تعلیم کا انتظام روزِ آفرینش سے کر دیا تھا۔ چنانچہ سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۳۱ میں ارشاد ہوا ہے کہ اللہ نے آدم کو ساری چیزوں کے نام سکھائے پھر انہیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا۔

بہت سے مفسرین کا خیال ہے کہ ساری چیزوں کے ناموں کا علم سکھانے سے مراد علم اشیاء کی تعلیم دینا ہے۔ جس میں رفتہ رفتہ دنیا کی ہر چیز کا علم شامل ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد جب حضرت آدمؑ کی لغزش معاف فرما کر انہیں اور ان کی بیوی کو جنت سے نکال کر زمین پر بھیج دیا تو یہاں کے لیے بنی نوع انسان کی تعلیم کا ایک اور خاطر خواہ منصوبہ تیار کر دیا تھا۔ بلکہ سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۳۸ کے بموجب ان کو بھی مطلع فرما دیا کہ دیا:

"پھر جو میری طرف سے کوئی ہدایت تمہارے پاس پہنچے تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے۔ ان کے لئے کسی خوف اور رنج کا موقعہ نہ ہوگا۔"

تعلیم کا یہ منصوبہ بموجب مشیت ایزدی اسی وقت سے پورا ہوتا رہا۔ جب سے انسان کرۂ ارض پر بطور ایک اعلیٰ ترین مخلوق خدا یا خلیفہ ظاہر ہوا۔ اسی دوران اللہ تعالیٰ نے ہزاروں ہادی، نبی اور پیغمبر روئے زمین پر بھیجے اور ہم کو کلام پاک کے ذریعے بتا دیا کہ ان کا ورود ہر زمانے، ہر ملک اور ہر قوم میں ہوتا رہا ہے۔ مثال کے طور پر چند آیات ملاحظہ کیجئے۔ سورۂ یونس کی آیت نمبر ۴۷ میں ارشاد الٰہی ہے کہ:

"ہر امت کے لئے ایک رسول ہے پھر جب کسی امت کے پاس اس کا رسول آ جاتا ہے۔ تو اس کا فیصلہ پورے انصاف کے ساتھ چکا دیا جاتا ہے۔"

سورۂ رعد کی آیت نمبر ۷ میں مزید خبر دی گئی ہے کہ:

"اے نبی! تم تو محض خبردار کر دینے والے ہو۔ اور ہر قوم کے لئے ایک رہنما ہے۔"

ہر ایک رہنما نے اپنی قوم کو تعلیم دی ہے لیکن سوائے رسول خدا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی اور رہنما کی نظر کل بنی نوع انسان کی تدریس پر اور خدا کے اس تعلیمی منصوبے پر نہیں تھی جس سے آنحضرت نے عالم انسانیت کو آگاہ کیا ہے کسی اور رہنما نے یہ نہیں بتایا کہ خدائے تعالیٰ جو کائنات کا پرورش کرنے والا ہے۔ ہر زمانے کے انسانوں کی تعلیم اور ساری انسانیت کی بتدریج تعلیم کا ذمہ بھی لے چکا ہے۔ دیگر مذاہب کے محدود طرز کے برعکس سورۂ فاطر کی آیت نمبر ۲۴ تا ۲۵ میں صاف فرمان موجود ہے کہ:

"اے نبی! تم تو بس ایک خبردار کرنے والے ہو۔ ہم نے تم کو حق کے ساتھ بھیجا ہے۔ بشارت دینے والا اور تنبیہ کرنے والا بنا کر، اور کوئی ایسی امت نہیں گذری جس میں کوئی تنبیہہ کرنے والا نہ آیا ہو۔

اب اگر یہ لوگ تمہیں جھٹلاتے ہیں تو ان سے پہلے گذرے ہوئے لوگ بھی جھٹلا چکے ہیں۔ ان کے پاس ان کے رسول کھلے دلائل اور صحیفے اور روشن ہدایات دینے والی کتاب لیکر آئے تھے۔"

فقط اسلام ہی نے بتایا ہے کہ انسان کی تعلیم کا ایک عظیم اور ہمہ گیر انتظام خداوندی ہزاروں برس سے روئے زمین پر جاری ہے۔ جتنے نبی اور رسول دنیا میں آئے ہیں ان سب کے نام اور ان کی پوری تعداد ہم کو بتائی نہیں گئی ہے۔ بہت سے ایسے ہیں جن کا ذکر تک نہیں کیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے کہ :۔

"اے نبی! تم سے پہلے ہم بہت سے نبی بھیج چکے ہیں جن میں سے بعض کا ذکر ہم نے تم سے کیا ہے اور بعض کا نہیں کیا۔" (المومن نمبر ۴۰ - آیت ۷۸)

تاہم جتنی خبر ہم کو دے دی گئی ہے اس سے یہ ظاہر ہے کہ کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس میں ہادی اور رہبر نہیں آئے اس لئے یہ بھی ظاہر ہے کہ ان کی تعداد ہزاروں کی ہوگی وہ سب اپنے وقت اور اپنے ملک کے حالات اور اپنی قوم کی استعداد کے مطابق ابتدائی تعلیم بھی دیتے ہوں گے اور ثانوی بھی اور اعلیٰ بھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو سارے رسولوں کی شریعت ایک ہی ہوتی۔ شاہ ولی اللہؒ نے اس حقیقت کو اپنی معرکۃ الآرا کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" کی جلد نمبر ایک، کے سولہویں باب میں اپنے انداز خاص سے یوں بیان فرمایا ہے کہ :

"کُلَّ یَوْمٍ ھُوَ فِیْ شَان" (اللہ تعالیٰ کا اعلان ہے کہ) ہر دن وہ ایک نرالے رنگ میں جلوہ فرما ہوتا ہے اس شان سے میری مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ کے تقاضے سے ادوار عالم میں تغیر آتا رہتا ہے اور ہر ایک دور کے احکام دوسرے سے جداگانہ ہوتے ہیں۔ ہر دور میں حق تعالیٰ اسی دور کی مناسبت سے اپنے احکام نافذ فرماتا ہے۔"

"...... اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک نئی شریعت نازل ہوتی ہے جو اس وقت کے حالات حاضرہ کے لحاظ سے عین مصلحت ہوتی ہے۔"

اس میں شک نہیں ہو سکتا کہ جب دنیا کے حالات بدل رہے تھے تو شریعتیں بھی بدلتی رہتیں تاکہ انسان کو اس کی حسب ضرورت ہدایات مہیا کریں اس میں بھی شک نہیں کہ مجموعی طور پر انسان کے دنیاوی اور روحانی حالات بہتر سے بہتر ہو رہے تھے دنیاوی ترقی کی شاہد تاریخ عالم ہے اور روحانی ترقی کا ثبوت یہ ہے کہ صنم پرستی کی طرف سے انسان خدا پرستی کی طرف آرہا تھا چنانچہ شریعتوں میں بھی تغیرات کے لحاظ سے تبدیلیاں ہو رہی تھیں جیسا کہ کہاں تدریس کا مانا ہوا اصول ہے۔ خدائے عزوجل نے تدریس انسانیت میں بھی تعلیم کی وہ ساری صفات اور شان برقرار رکھی ہے جو تعلیم کا حق ہے مثلاً یہ بھی اعلان کیا کہ :

"اے نبی! ان سے کہو کہ میں تمہیں بس ایک نصیحت کرتا ہوں۔ خدا کے لئے تم اکیلے اکیلے اور دو دو مل کر اپنا دماغ لڑاؤ اور سوچو۔" (سبا (۳۴) آیت نمبر ۴۶)

سچی اطاعت کے نتیجہ میں تکمیل تعلیم کا وعدہ بھی ان الفاظ میں فرمایا گیا ہے کہ :

"جو ظالم ہیں ان کی زبان کسی حال میں بند نہ ہوگی تو تم ان سے نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو تاکہ میں تم پر اپنی نعمت پوری کر دوں۔" سورۃ البقر (۲) آیت ۱۵۰)

ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ تکمیل نعمت کا یہ وعدہ فریب داستان کے لئے نہیں تھا بلکہ اس کو پوری احتیاط کے ساتھ پورا کیا گیا۔

بنی نوع انسان کی تعلیم میں ارتقاء کا تصور

یہ بنی نوع انسان کی تعلیم کا ایک عالمگیر انتظام تھا جس میں ارتقاء کا تصور موجود تھا۔ دراصل ہر تعلیم میں ارتقاء کا تصور لازم ہے کیونکہ تعلیم کی ابتداء ہمیشہ سادہ اور مختصر ہوتی ہے۔ ہر ایک بچہ پہلے ا ب ت پڑھتا ہے۔ اس کا علم بڑھتا جاتا ہے۔ بنی نوع انسان نے بھی اسی طرح سے پہلے "علم اشیاء" حاصل کیا اور دریائے علم میں آگے بڑھتا رہا۔ جدید مؤرخین متفق ہیں کہ انسان کا علم بہت ہی کمتر درجے سے شروع ہو کر برابر بڑھتا رہا ہے۔ اس کے لئے ہر قسم کے رہبر بھی اس کو ہر زمانے کے تمدن کے معیار کے مطابق ملتے رہے۔ روحانی تعلیم بھی اس کے ذہن اور اس کی صلاحیت کے لحاظ سے اس کو فطرت یا قدرت کی طرف سے بتدریج ملتی رہی۔ انسانی تہذیب کی تاریخ بہت سے مؤرخین نے لکھی ہے جن میں سے ہم بآسانی ابن خلدون، لوبکی، اور کردبر کی لکھی ہوئی تاریخوں کا مطالعہ کر سکتے ہیں اور دیکھ سکتے ہیں کہ نسل انسانی نے کس طرح علم، ہنر، معاشرت، اور صنعت و حرفت میں ترقی کی ہے۔ دنیا کا وجود لاکھوں برس سے ہے لیکن انسان کی محض پانچ ہزار برس کی تاریخ کا ہم کو علم ہے اس سے پہلے کی تاریخ ایک خیالی کہانی ہے۔ جسے اہل علم نے سوچ بچار کے بعد تیار کیا ہے۔ اور اپنے گمان سے ابتدائی تاریخ کو پتھر، تانبے اور لوہے کے زمانوں میں تقسیم کیا۔ اس کے بعد کی تاریخ میں مختلف قسم کے واقعات کا بیان ہے۔ پہلے قدیم ممالک۔ جیسے مصر، بابل، چین ہند، یونان اور روم کا ذکر ہوتا ہے۔ پھر تاریخی لحاظ سے مغرب کے تاریک زمانوں کا، جبکہ مشرق وسطی میں اس وقت اسلام کی بدولت روز روشن کا سماں تھا۔ انسانی تہذیب و تمدن کی جو تاریخیں ہمیں ملتی ہیں۔ ان کے ابتدائی حصے خیال آرائی۔ دفن شدہ عمارتوں، ٹوٹے پھوٹے برتنوں، زیورات اور ہتھیاروں کے ٹکڑوں اور مذاہب کی کتابوں کی مدد سے تیار کئے گئے ہیں انہی تاریخوں میں انسان نے جو دینی اور دنیاوی علوم حاصل کئے ہیں ان کی تاریخ بھی شامل ہے اللہ تعالیٰ نے انسان کو ابتداء سے اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ جو تعلیم دی اس کی تاریخ بھی اسی میں ہے اور نہایت نامکمل حالت میں میسر ہے ابتداء میں جو نبی اور رسول آئے اور اللہ کی طرف سے ہدایات لائے ان کی اصل کتابیں انسان نے ضائع کر دی ہیں۔ ابھی تک یہ معلوم نہیں ہے کہ شروع میں انہوں نے کیا کیا ہدایات اور کیا کیا تعلیمات دیں۔ ان میں ایسی

کا کیا فرق تھا اور ہر ہر ہادی کے زمانے میں کیا ترقی ہوتی رہی۔

ان کا ایک سلسلہ تو مشرقِ وسطیٰ میں ظاہر ہوا جو حضرت آدمؑ کے عہد سے شروع ہوتا ہے۔ لیکن بہت سے دیگر سلسلے دوسری اقوام، ممالک اور زمانوں میں پائے جاتے ہیں کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ کوئی گوشۂ ارض ایسا نہیں رہا جہاں ہادی پیدا نہ ہوئے ہوں۔ اس میں کوئی تعجب کی بات ہی نہیں کیونکہ باشعور انسان میں روحانی تلاش یا کم از کم امنگ اور اپج پائی جاتی ہے۔ یہ آرزو خوف اور امید کے زیرِ اثر بڑھتی رہتی ہے۔ ان احساسات اور جذبات کی رہبری کرنا انسان کی روح اور اس کے ضمیر کی مدد کرنا تھا۔ جس کی ذمہ داری اللہ تبارک تعالیٰ نے لے لی تھی اور جسے اس نے ہزاروں ہادی اور رہبر بھیج کر پورا کیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر زمانہ میں جو بھی قوم کسی ملک میں نمودار ہوئی اس کا رہبر ضرور رہا۔

ایشیا، یورپ اور افریقہ میں تو بڑے بڑے رہبر اور ہادی پیدا ہوئے ہیں۔ لیکن امریکہ اور آسٹریلیا کے اصلی باشندوں کو وہ روحانی عروج حاصل نہیں ہوا وہاں جو یورپین جا کر آباد ہوئے وہ اپنے اپنے اعتقادات میں مصروف رہے جب وہاں کی روحانی تاریخ لکھنے کا وقت آیا تو ان مصنفین کی دلچسپی روحانیت سے ہٹ کر علم البشریت اور حیاتیات کی طرف منتقل ہو گئی تھی اس کے برخلاف ہم مشرقِ وسطیٰ میں روحانی تاثرات اور ان کی گہرائی کے لحاظ سے حضرت ابراہیمؑ، حضرت یعقوبؑ حضرت داؤدؑ، حضرت سلیمانؑ حضرت موسیٰؑ حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جیسی عظیم اور برگزیدہ شخصیتوں کی کارفرمائی دیکھتے ہیں، چین میں کنفیوشس، ہندوستان میں گوتم بدھ سری کرشنا اور رام چندر، ایران میں زرتشت، یونان میں ارسطو، سقراط اور بقراط کے اثرات موجود ہیں یہ ان چند بزرگوں میں سے ہیں جن کے ناموں کے ساتھ عظیم کتب الٰہی کے ظہور کا یا بڑے بڑے مکاتبِ خیال کی وابستگی کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔ مگر تعجب یہ ہے کہ نہ بدھ مت اور نہ ہندو مت، نہ زرتشت یا پارسی مت نہ صحیفہ ابراہیمی نہ داؤدی نہ سلیمانی نہ موسوی، نہ عیسوی اب دنیا میں اصلی حالت میں موجود ہے۔ صحیفہ ابراہیمی، داؤدی اور سلیمانی تو قطعی مفقود ہیں۔ بعض کے اجزاء تیار کر کے اور ان کو ادل بدل کر جو کتب بنا دی گئی ہیں ان ہی کو ابتدائی کتابیں سمجھا جاتا ہے۔ ہندو مت کی کتب مثلاً وید اور اپنشد کے متعلق تو یہ بھی معلوم نہیں کہ ان کو کس نے تیار کیا یا کرایا تھا توریت اور انجیل کے متعلق بھی پورے یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ ان کی اصلی شکل کیا تھی اور وہ کس زبان میں تھیں۔ یہ بھی خبر نہیں کہ اصلی کتابیں گئیں کہاں۔ مختصر یہ کہ ساری کائنات اور سارے مذاہب کی تاریخ میں فقط ایک کتاب "قرآن" ہے۔ جس کو شروع سے خدا کی کتاب کہا گیا۔ اور جو اصلی زبان میں بلا رد و بدل اس وقت بھی موجود ہے۔ بس اس کے متعلق پورے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہ وہی کتاب ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تھی اور جس کو آنحضرت نے خدا کا پیغام فرما کر ہمارے درمیان چھوڑا ہے۔

یہ تو ان مذاہب کا ذکر ہے جو دنیا کے سب سے زیادہ مشہور مذاہب ہیں جو مذاہب مٹ گئے اور ان کا

نام و نشان تک باقی نہیں رہا ان کا ذکر ہی بیکار ہے وحشیوں کے وہ مذاہب جو محض توہمات اور رسوم کا مجموعہ ہیں وہ بھی قابل ذکر نہیں ہیں یہ ایک دلچسپ بحث ہے کہ اعلیٰ ترین مذاہب کون سے ہیں۔ اور پچھلے درجے کے کون سے سمجھنے چاہئیں۔ کیونکہ اس کی پہچان آسان ہونے کے باوجود اختلافات سے مفر نہیں ہے۔ بعض مذاہب ایسے ہیں۔ جن میں جادو ٹونے، لمبے لمبے رسوم، توہمات، ہر بات پر کفارے، ہر بات پر نذرانے، سزا اور جزاء کی بے یقینی کی وجہ سے اس قدر خوف و ہراس کہ کسی اچھے عمل کے نتیجہ کی امید نہیں رہتی، روح کو کارخانہ قدرت سے ہم آہنگی نصیب نہیں ہوتی اس لیے نہ دل کو سکون ہوتا ہے اور نہ قادر مطلق سے ہم رشتگی پیدا ہوتی ہے۔ ایسے مذاہب اعلیٰ درجے کے مذاہب کے زمرے میں نہیں آتے بلکہ توہمات اور بے اصولی طریق زندگی کے نمونے ہوتے ہیں۔ ان کے برعکس جدید دنیا سائنسی رجحان رکھتی ہے اور اسباب و علل نیز دینی اور دنیاوی منازل کی تلاش میں رہتی ہے اس خواہش اور ضرورت کو اہل مذاہب میں سے مغرب کے یہودیوں نے اور مشرق بعید میں بدھ مت کے جدید پیروکاروں نے سب سے زیادہ سمجھا ہے۔ اس زمانے میں یہ بات کھل کر سامنے آچکی ہے کہ اب روحانی تسکین کی تکمیل کے لئے دنیاوی عمل بھی ضروری ہے کیونکہ مشیت ایزدی اپنے بنائے ہوئے قانون یعنی قوانین قدرت کے مطابق ہوتی ہے اس کے برعکس وہم اور وسواس، ٹونے اور ٹوٹکے قوانین قدرت کی وقعت کو کھو دیتے ہیں۔ آنے والے زمانے میں ان کا مقام کم سے کم تر ہونا لازمی ہے آج کل کی دنیا نے قوانین قدرت کی جو کرامات دیکھی ہیں ان سب سے بڑھ کر کوئی منی یا رشی کیا دکھائے گا۔ ریڈیو اور ٹی وی کے کمالات چاند پر چل پھر کر واپس آجانا۔ پانی کو اس طرح گرم کرنا کہ برتن ٹھنڈا ہی رہے۔ بڑے بڑے حسابات کی الجھی ہوئی یادداشتوں کے خلاصے ایک بٹن دبا کر بنا دینا۔ ان کے علاوہ ایسی بے پناہ طاقت جس کے آگے سینکڑوں دیو اور جن مجبور اور عاجز ہوں یکسر موجود ہیں۔ صدیوں پہلے کچھ بھی ہوا ہو اس زمانے میں کوئی مذہب خصوصاً کوئی نیا مذہب کسی بازیگر یا نظر بندی کے کمالات سے کامیاب نہیں ہو سکتا اب وہ طریقے قابل غور نہیں ہیں۔ آج کل اور آنے والے وقتوں میں جو چیزیں غور طلب ہو سکتی ہیں وہ اصل دین اور مقصد دین ہے۔

فی الوقت غور و خوض کے لئے جو مانے ہوئے اعلیٰ درجے کے مذاہب ہیں ان کی تعداد تین ہے۔ یہودیت، عیسائیت اور اسلام لیکن ہندو مت اور بدھ مت کے پیروؤں کی اس قدر کثیر تعداد ان کو سچا مذہب مانتی ہے کہ ان کو بھی بڑے بڑے مذاہب میں شامل کر لینا مناسب ہے۔ بعض لوگ سنتو طریقوں کو بھی مذہب کہتے ہیں مگر اس میں روحانیت سے زیادہ دیومالا پایا جاتا ہے اور وطنیت کا تصور ہے۔ پارسی مذہب یا مجوسیت کا اثر دنیا کے اعتقادات پر بہت گہرا پڑا ہے۔ اس لئے اس کو میں نے اپنی فہرست میں شامل کر لیا ہے اس طرح کل چھ عظیم ترین مذاہب اس وقت دنیا میں رائج سمجھے جاتے ہیں۔

۱: ہندو مت جو ۳۵۰۰ برس ہوئے کہ دنیا میں آیا۔

۲: یہودیت " ۳۴۰۰ " " " " " " ۔

۳ : پارسی مذہب جو ۲۶۰۰ برس ہوئے کہ دنیا میں آیا۔
۴ : بدھ مت " ۲۵۰۰ " " " " " " "۔
۵ : عیسائیت " ۲۰۰۰ " " " " " " "۔
۶ : اسلام " ۱۴۰۰ " " " " " " "۔

آخری پیغام ہونیکا دعویٰ اور اس کی نوعیت

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا اور نہ کرتا ہے کہ اسلام دنیا کے اعلیٰ ترین مذاہب میں سے ہے بلا مبالغہ ہر ایک فلسفی، ماہر مذہبیات اور مؤرخ اس حقیقت کا قائل ہے کوئی انسائیکلوپیڈیا، کوئی مستند تاریخ عالم یا تاریخ مذاہب عالم اٹھا کر دیکھ لیجئے۔ اس میں آپ کو یہ امر تسلیم شدہ ملے گا کہ اسلام دنیا کا ایک عظیم ترین مذہب ہے۔ یہ بات بھی صاف ظاہر ہے کہ ابتدائے آفرینش سے لے کر اب تک سینکڑوں چھوٹے بڑے مذاہب دنیا کے مختلف خطوں اور گردوں میں ظاہر ہوئے جو تھوڑے تھوڑے انسانوں کے گروہوں اور محدود علاقوں میں اثر پذیر رہ کر مفقود ہو گئے۔ فی زمانہ دنیا میں جن مذاہب کا بول بالا ہے۔ ان میں مغربی اطلاعات کے مطابق معتقدین کی تعداد میں پہلا نمبر عیسائیت کا ہے دوسرا اسلام، تیسرا نمبر ہندو مت کا اور چوتھا نمبر بدھ مت کا ہے باقی مذاہب کے پیروؤں کی تعداد مقابلتاً کم ہے۔ لیکن مؤتمر اسلامی کی تحقیق کے مطابق مغربی اطلاعات اس معاملہ میں ناقابل اعتبار ہیں کیونکہ جو تعداد ان سے ظاہر ہوتی ہے اس سے مسلمانان عالم کی اصلی تعداد بھی بہت زیادہ ہے۔ اتنی زیادہ کہ مسلمانوں کی تعداد عیسائیوں کی تعداد کے لگ بھگ ہے

جوش و خروش کے لحاظ سے آج کل یہودیت اور اسلام سب سے آگے ہیں۔ یہودی صدیوں تک سرنگوں رہنے کے بعد اب یکا یک سیاست کے میدان میں ایک عیسائی ملک یعنی امریکہ کے ایجنٹوں کے طور پر کارنامے دکھا رہے ہیں۔ عیسائیوں نے مذہبی تعلقات سے درگزر اختیار کر لی ہے۔ کیونکہ اب ان کو مذہب سے زیادہ اپنی صنعت و حرفت میں کمال حاصل کرنے اور اپنے جمہوری طرز حکومت پر فخر ہے۔ بدھ مت سوائے چند فعال پیروؤں کے عام طور پر صدیوں سے خاموش تماشائی ہے اور ہندو مت کا تعلق آج کل سوائے چند اقسام کے سماجی مسائل کے جیسے گاؤ کشی اور فرقہ وارانہ فسادات، باقی سب طرح سیکولرازم کو مناسب حال گردانتا ہے۔ یہودی مذہب مقابلے میں کسی کا مد مقابل نہیں ہے کیونکہ ان کے عقائد میں مذہب کی تبدیلی کا اصول ہی نہیں ہے۔ کوئی شخص جو یہودی نسل سے نہیں وہ یہودی نہیں بن سکتا۔ اس کے برعکس اسلام مذہبی لحاظ سے بھی سارے دیگر مذاہب کا مد مقابل ہے اور سیاست کے میدان میں بھی تمام مذاہب سے زیادہ سرگرم عمل ہے بظاہر سیاست میں سب سے زیادہ کامیاب عیسائی ہیں۔ مگر انکے نزدیک اور باقی ساری دنیا کی نظر میں یہ کامیابی عیسائیت کی نہیں بلکہ مغربی تہذیب کی ہے۔ جس میں ان کے قریب ہی اشتراکی روس بھی ہے مغربی تہذیب کی بنیاد مذہب نہیں بلکہ صنعت کاری ہے۔

مندرجہ بالا خصوصیات کے ساتھ تاریخی لحاظ سے اسلام سب سے آخر کا عظیم مذہب ہے اور اس نے یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ وہ اللہ کا آخری پیغام ہے یہ دعویٰ کھلے الفاظ میں کیا گیا ہے اور اس پر مسلمان فخر کرتے ہیں یہاں تک کہ جب علامہ اقبالؒ انہیں عمل پر آمادہ کرنا چاہتے ہیں تو ان سے کہتے ہیں کہ

بے خبر تو جوہر آئینہ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

جب کسی مسلمان کو خداوند تعالیٰ کی یہ آخری امانت یاد آجاتی ہے تو اس کے دل میں احساس تشکر اور فخر کے جذبات ابھرنے لگتے ہیں اور وہ اپنی ہستی کو دنیا پر اللہ کا احسان سمجھنے لگتا ہے اس کی زبان پر بے ساختہ وہ کلمے آکر الفاظ کی کمیابی سے رک جاتے ہیں جن کو اقبال کی نوا سنجی اس کے اپنے ہی دل کی آواز بنا دیتی ہے وہ جھوم جھوم کر پڑھتا ہے کہ:

۱۔ دہر میں غارت گر باطل پرستی میں ہوا
۲۔ حق تو یہ ہے حافظ ناموس ہستی میں ہوا
۳۔ میری ہستی پیرہن عریانی عالم کی ہے
۴۔ میرے مٹ جانے سے رسوائی بنی آدم کی ہے

اس سے پہلے کہ اس دعویٰ کی اسناد پیش کی جائیں یا وجوہ افتخار کو بیان کیا جائے یہ جتا دینا ضروری ہے کہ کسی اور مذہب نے جو دنیا میں آیا کبھی اعلانیہ یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ بنی نوع انسان کے لئے اللہ کا آخری پیغام لے کر آیا ہے۔ کسی کے لئے اب سے چودہ سو برس پہلے یہ دعویٰ کرنا بھی ناممکن تھا کیونکہ ہر قدوقامت کے مذاہب کی کثرت دیکھ کر کس کو ایسا خیال آسکتا تھا کہ اس کا مذہب آخری ہے۔ اگر کوئی یہ دعویٰ کرتا بھی تو جلد ہی دنیا کے واقعات اس کی تردید کر دیتے۔ بڑے سے بڑا مذہب بھی ایسا دعویٰ کرتا تو خود اسلام کا ظہور اس کو مٹا دیتا۔ ان سب باتوں کے علاوہ آخری مذہب ہونے کا دعویٰ کرنے سے کسی کو فائدہ بھی کیا تھا جبکہ آخری ہونے کے اوصاف ہی کی مدعی کو خبر نہ تھی۔ میں نے ہنود کو سب سے پرانے مذہب کے پیرو ہونے پر فخر کرتے دیکھا ہے یہودی اس پر فخر کرتے ہیں کہ عیسائیت اور اسلام جیسے عظیم مذاہب اسی سرچشمہ سے سیراب ہوئے اسلام اس سے کلیتہً انکار نہیں کرتا، مگر اللہ کا آخری پیغام ہونے کو اس سے بہت بڑا وصف سمجھتا ہے۔ یہ ایک حیرت انگیز قسم کا جرأت مندانہ اقدام تھا کہ آج سے ایک ہزار چار سو برس پہلے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اسلام نے یہ اعلان کر دیا کہ اب کبھی اللہ کا پیغام انسان کے لئے بذریعہ وحی نہیں آئے گا۔ کوئی دعویٰ اپنی سچائی کا خود ثبوت نہیں ہوتا۔ لیکن بعض دعوے نادر و نایاب ہونے کی حیثیت سے حیرت انگیز ہوتے ہیں یقین نہیں آتا کہ ایسا دعویٰ کرنے کی جرأت جو ایک پیش گوئی بھی ہے بغیر کسی مضبوط بنیاد کے کی گئی ہوگی۔ اگر تائید غیبی شامل نہ ہوتی تو اس دعویٰ کے کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ ہاں ضرورت تھی تو اس لئے کہ مشیت ایزدی کو نوع انسان کے واسطے ایک آخری چارٹر اور خوشخبری کا اعلان کرنا تھا۔ ورنہ خود رسول خدا کو تو ان

سے کے معتقد سارے گذرے ہوئے بڑے بڑے نبیوں اور رسولوں کی امتوں کی طرح سب سے بڑا ہادی مانتے ہی رہتے
یہ حقیقت اس حد تک عیاں ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے حضرت عیسیٰؑ کے آنے کی خبر دیدی تھی پھر بھی یہودی اپنے ہی پیغمبر
کو آخری رسول تسلیم کرتے ہیں۔ اسی طرح حضرت عیسیٰؑ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی اطلاع دیدی تھی۔ پھر بھی
عیسائی اپنے ہی نبی کو آخری نبی گردانتے ہیں ان حالات میں پہلا سوال یہ اٹھتا ہے کہ آیا قرآن کریم نے واقعی اپنے متعلق
آخری پیغام خدا ہونے کا دعویٰ کیا بھی تھا کہ نہیں اس سوال کا جواب یہ ہے کہ بیشک یہ دعویٰ کیا تھا اور صاف صاف الفاظ
میں کیا تھا۔ سورہ نمبر ۳۳ (الاحزاب) کی آیت نمبر ۴۰ میں ارشاد الٰہی ہے کہ:

"محمدؐ اللہ کے رسول اور آخری نبی ہیں۔"

کتاب احادیث میں بموجب متعدد روایات خود رسول اللہؐ کی زبانی ایسے کلمات موجود ہیں جو اسلام کے اس مرتبہ کی تائید کرتے ہیں۔
ایک بہت صاف اور صریح روایت ترمذی شریف میں یہ ہے کہ:

"بیشک رسالت اور نبوت منقطع ہو چکی۔ میرے بعد نہ کوئی رسول اور نہ کوئی نبی ہے۔"

مفتی محمد شفیع صاحب مرحوم و مغفور نے اپنی تالیف "ختم نبوت کامل" میں ننانوے آیات قرآنی اور دو سو دو
احادیث ختم نبوت کی تائید میں نقل کر کے دعویٰ احمدیت کی تردید فرمائی ہے۔ احمدیت کے خلاف ان کا طریقہ تکلم اس وجہ
سے صحیح ہے کہ احمدی عقیدے کے لوگ کلام پاک اور رسالت دونوں کو سچا مانتے ہیں مگر اپنے نبی کو مستثنیٰ اقرار دیتے ہیں
لیکن ان اسناد کو زیر نظر تحریر میں دہرانے کی اس وجہ سے ضرورت نہیں ہے کہ دعوے کی تائید میں مدعی کے اپنے
کلمات دعویٰ کی تکرار سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے کلام پاک اور احادیث ہی میں تو ختم نبوت کا دعویٰ کیا گیا ہے
اس کی تائید میں انہی احکام اور اقوال کو پیش کرنے سے بات آگے نہیں بڑھتی اس وقت ہمارا مقصد عقل اور تاریخ
کی مدد سے یہ ثابت کرنا ہے کہ اسلام کا یہ دعویٰ ہے اور سچا ہے کہ انسانیت کے لئے قرآن اللہ کا بھیجا ہوا مکمل دستور
ہے جس کو اس کا سب سے بڑا اور آخری سفیر لیکر آیا۔ اس کے بعد اللہ کا کوئی اور پیامبر نہ آیا اور نہ آئے گا۔ اس بیدھڑک
دعویٰ کو دیکھ کر ایک تعجب خیز حقیقت یہ سامنے آتی ہے کہ ایسا دعویٰ اسلام سے پہلے کسی اور مذہب یا اس کے رہبر نے
کیا تھا ترک کیا ہی کہ وجہ یہ نہیں ہوسکتی کہ آخری پیغام کی جو صفات ہیں ان کا تصور بھی پہلے کے ادوار میں ودیعت نہیں ہوا
تھا؟ نہ ایسے پیغام کی اہمیت کا احساس پیدا ہوا تھا نہ گذشتہ معتقدات واقعتاً انسان کے لئے آخری مذاہب تھے، نہ
ان کے ماننے والوں کو ہی ایسا خیال آیا تھا۔

آخری پیغام کی چند خصوصیات

یہ کہنا تو آسان ہے کہ گذشتہ ادوار میں اس کی خبر ہی کسی کو نہ تھی کہ آخری پیغام کی کچھ صفات بھی ہوتی ہیں
لیکن ان صفات کو پوری طرح سے پہچاننا اب بھی آسان کام نہیں ہے کیونکہ کوئی انسان اس سے زیادہ نہیں سمجھ
سکتا کہ جو وہ دیکھتا ہے، جانتا ہے، قیاس کر سکتا ہے، اندازہ کر سکتا ہے اور تصور کر سکتا ہے نیز ان ذرائع کی مدد سے
جو نتیجے نکالے جاتے ہیں ان کی صحت کا بھی تو یقین نہیں ہوتا۔ مثلاً ہر مذہب کے اب بھی ایسے پیرو موجود ہیں جو

سختی سے قواعد کی پابندی کروانے کو اپنے مذہب کی بقاء کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کو اس سے سروکار کم ہے کہ قواعد میں کوئی روح باقی بھی رہی ہے یا نہیں۔ حالانکہ رسوم اور الفاظ پر اس قسم کا اصرار اعلیٰ روحانیت کی گواہی نہیں دیتا۔ جتنے ابتدائی مذاہب تھے ان میں لفظی اور رسمی پابندیوں کی فراوانی تھی وہ رسم و رواج، جادو ٹونے، الفاظ کو اس طرح اور اس طرح دہرانے کے قائل تھے بلکہ اس کام میں بھی مشین کی طرح الفاظ اور رسوم کے اول و آخر کی پابندی قائم رکھنے کو اصل مذہب سمجھتے تھے۔ اسلام کا ظہور ہوا تو اس افتاد فکر میں یکسر انقلاب آگیا۔ معبود حقیقی نے بتایا کہ اس کی پرستش کی روح ظواہر نہیں بلکہ پاک زندگی ہے۔ آج سے چودہ سو برس پہلے خدائے علیم نے حتمی اعلان فرما دیا کہ:

اللہ کو تمہاری قربانی کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا بلکہ تمہاری نیکیاں پہنچتی ہیں۔

(الحج (۲۲) آیت نمبر ۳۷)

"نیکی یہ نہیں ہے کہ تم (نماز کے لئے) اپنے چہرے مشرق کی طرف کرو یا مغرب کی طرف۔

(البقرہ (۲) آیت نمبر ۱۷۷)

اسلام کی یہ شعاعیں ہر ایک نمائش اور بناوٹ کو جلا دینے والی ہیں۔ دنیا اور عقبیٰ میں عزت اور احترام حاصل کرنے کا واحد ذریعہ نیک اور پاک زندگی ہے۔ رنگ، پیشہ، نسل، جاہ، منصب، وطن اور طرح طرح کی گروہ بندیوں سے جو امتیازات پیدا ہوتے ہیں وہ اللہ کے حکم سے ٹوٹ کر پارہ پارہ ہو جاتے ہیں کس قدر مختصر اور کھلا ہوا ارشاد ہے:

"اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ معزز وہ انسان ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے"

(سورہ نمبر ۴۹ آیت نمبر ۱۳)

تقویٰ کو اصطلاحی جکڑوں سے بلند کرنے کے لئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد ہمیشہ بلند ترین تصور پیش کرتا رہے گا جس کو معتبر راویوں نے آنحضرتؐ سے منسوب کیا ہے اور جو بہ الفاظ مولانا حالی یہ ہے کہ:

تورع کا ہے ذات میں جن کے جوہر
نہ ہوں گے کبھی عابدان کے برابر
کرو ذکر اہل ورع کا جہاں تم
نہ لو عابدوں کا کبھی نام واں تم

تورع کے معنی ہیں وہ پارسائی جس کا تعلق ارادوں سے اور باطنی کیفیت سے لیکر ظاہری اطوار تک ساری زندگی سے ہوتا ہے اس کے مقابلے میں عبادت بندگی کے آداب احکام کو پورا کرنے کا نام ہے۔ عبادت کا تعلق عمل سے زیادہ ہے اور باطنی کیفیات سے مقابلتاً کم۔

غور فرمایئے کہ نیک اور پاک زندگی کا تصور بلند سے بلند تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ رسوم، رواج، لفظی، اصلاحی اور ظاہری پابندیاں کم سے کمتر ہوتی چلی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ پاکی کا تصور زمان و مکان کی حدود سے بلند تر نظر آنے لگتا ہے۔ سب منزلیں اور مقاصد اسی نقطہ کی طرف راجع ہیں۔ جس طرف بڑھنے سے اختلافات مٹتے چلے جاتے ہیں اور

اور راہیں سمٹ کر تفصیلات سے گذرتی ہوئی اس مرکز پر پہنچتی ہیں جہاں انسان اللہ کی مرضی سے بلا ظاہری رکاوٹوں کے قریب ترین ہو جاتے۔

تعجب یہ ہوتا ہے کہ مذاہب کی اصطلاحی کشمکش اور جذباتی نفرتوں کے درمیان رسم و رواج کی تقلید الفاظ پر اصرار اور حرکات و سکنات کی پابندیوں پر زور دینے کی دھوم دھام کے عالم میں ایک ایسا ہادی بھی اس دنیا میں ظاہر ہوا جس کی تعلیم نے مذہب کی روح اور اس کے جسم میں صاف صاف تمیز کر کے دکھا دیا، جتا دیا کہ دین ایک چیز ہے اور شریعت دوسری چیز دین اصل ہے۔ شریعت شارح، دین مقصود ہے شریعت منہاج، دین حاصل مطلب ہے شریعت طریقۂ اظہار دین کعبہ دل ہے شریعت رہروی کا رخ، اس فرق کو یہ بتا کر واضح کر دیا کہ روئے زمین پر ازل سے جتنے دین آئے۔ خواہ دنیا کے کسی خطہ میں آئے اور کسی قوم کے لئے آئے اور کسی بھی زمانے میں وہ سب سرتاسر ایک ہی لڑی میں پروئے ہوئے ہیں۔ ارشاد ہوا کہ:

"بلاشبہ یہ بات (جو کلام پاک میں ہے) اگلے صحیفوں میں تھی یعنی ابراہیمؑ اور موسیٰؑ کے صحیفوں میں"۔

(سورہ نمبر ۸۷ (اعلیٰ) آیت نمبر ۱)

"اور یہی سارے پیغمبروں کی کتابوں میں تھا" (سورہ نمبر ۲۶ (شعراء) آیت نمبر ۱۱)

(اے محمدؐ) تجھ سے (اس کتاب میں) وہی کہا گیا ہے جو تجھ سے پہلے آنیوالے نبیوں سے کہا گیا تھا

(سورہ نمبر ۴۱ (حم السجدہ) آیت نمبر ۵)

مندرجہ بالا مضمون کی بہت سی آیات کلام مجید میں موجود ہیں جن سے عیاں ہے کہ روز اوّل سے اللہ تبارک تعالیٰ نے بنی نوع انسان کو ایک ہی پیغام بھیجا ہے لیکن ہزاروں برس تک اس حقیقت کی خبر بنی نوع انسان کو پختہ طریقہ سے نہ ہو سکی اور نہ پہلے ہادی، نبی یا رسول اس کو صاف صاف بتا سکے کیونکہ وہ تو اپنے وقتوں اور خطوں میں جزوی خدمت انجام دینے کے لئے بھیجے گئے تھے۔ جب اللہ کے آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم آئے تو ایسا مصحف لائے جس نے اس کل حقیقت کو جو ہزاروں برس سے اور سارے کرۂ ارض پر پھیلی ہوئی تھی آشکار کر دیا ان ساری کڑیوں کو جو ہدایات انسانی کی تاریخ میں بکھری ہوئی تھیں ملا کر ان کا ایک سلسلہ قائم کر دیا بلکہ ان کا خلاصہ بھی کر کے دیدیا۔ وہ خلاصہ بلاشبہ وہی دین ہے جو سارے ادیان میں مشترک ہے۔ اللہ نے حکم دیا ہے کہ۔

"اے مسلمانو! تم کہو کہ ہم خدا پر اور جو کچھ ہماری طرف اتارا گیا اس پر اور جو کچھ ابراہیمؑ، اسمعیلؑ، اسحٰقؑ یعقوبؑ، اور خاندان یعقوب کی طرف اتارا گیا اس پر اور جو کچھ موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا گیا اس پر اور جو سب پیغمبروں کو ان کے پروردگار کی طرف سے دیا گیا ہم ان سب پر ایمان لائے

(سورہ نمبر ۲ (البقرہ) آیت نمبر ۱۳۶)

اگر دنیا کے مذاہب کی مشترک تعلیمات کا خلاصہ تیار کیا جائے اور ہر طرح کے دیگر اعلانات کو نظر انداز کر دیا جائے پھر اس خلاصے کو مختصر کر کے اس کا بھی عطر لیا جائے تو بس دو بنیادی ہدایات برآمد ہوتی ہیں۔

ایک یہ کہ کل کائنات ایک ہی اعلیٰ ترین طاقت کے عمل کا نتیجہ ہے اور دوسرے یہ کہ اچھی زندگی بسر کرنے پر انسان کو آمادہ کرنا ساری تعلیمات کا واحد مقصد ہے ان ہی دو عقائد کا نام توحید خداوندی اور تقویٰ کی زندگی ہے۔ یہ آفاقی نظریہ، یہ سعتِ خیال یہ بلند نگاہی اور تعلیمات کی غرض و غایت کی ایسی مختصر اور سچی کسوٹی انسان کو بخشنا کسی ایسے مذہب کے لئے ناممکن تھا جو ساری انسانیت کے واسطے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نہ آیا ہو توحید اور تقویٰ ہی اصل دین ہے اس مقصد کو حاصل کرنے اس کو قائم رکھنے اور اس کو ترقی دینے کے لئے ہر زمانے میں حالات کے لحاظ سے مختلف راستے اور طریقے بتائے گئے ہیں وہ طریقے ان خاص مذاہب کی شریعتیں ہیں۔ ان کا درجہ دین واحد کے مقابلے میں دوسرے نمبر پر ہے۔

دین کے ایک ہونے کی تائید میں چند آیات اوپر درج کی جا چکی ہیں۔ مزید آیات جو اس اصلیت کی تائید کرتی ہیں اس قسم کی ہیں جیسی سورہ بقرہ (۲) کی آیت نمبر ۶۲ جس میں مختلف شریعتوں کی جو اصل ہے اس کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ الفاظ میں تاکید اور بیان میں جو پختگی نمایاں کی گئی ہے وہ غور و فکر سے تعلق رکھتی ہے۔ حکم ہوا ہے کہ:

"یقین جانو کہ نبی عربیؐ کے ماننے والے ہوں یا یہودی عیسائی ہوں یا صابی جو بھی اللہ اور روزِ آخر پر ایمان لائے اور نیک عمل کرے گا اس کا اجر اس کے رب کے پاس ہے اور اس کے لئے کسی خوف اور ملال کی وجہ نہیں ہے۔"

غور فرمایئے کہ کوئی کسر اس بات کو جتا دینے میں نہیں چھوڑی گئی ہے کہ مقصد اوّل خدا کی پرستش اور نیک زندگی ہے۔ اس منزل کو حاصل کرنے کے لئے جو اختلافات راستوں میں ملتے ہیں ان کی وہ اہمیت نہیں ہے جو منزل مقصود کی ہے چنانچہ مذکورہ بالا سورہ کی آیات نمبر ۱۱۱ اور ۱۱۲ میں جو صاف صاف اعلان ہے اس پر توجہ کی ضرورت ہے۔ ایک سرے سے دوسرے سرے تک سب اہلِ مذہب کو جتایا گیا ہے۔

"ان کا یعنی (یہودیوں کا اپنی بابت اور عیسائیوں کا ان کی بابت) کہنا ہے کہ سوائے یہودیوں کے یا عیسائیوں کے کوئی جنت میں نہیں جائے گا، محض (ان کے دل کی) خواہشات ہیں۔ ان سے کہو کہ اپنی دلیل پیش کرو اگر تم سچے ہو۔ (دراصل نہ تمہاری کچھ خصوصیت ہے نہ کسی اور کی) حق یہ ہے کہ جو بھی اپنے آپ کو اللہ کی اطاعت میں مصروف کر دے اور عملاً نیک روش پہ چلے۔ اس کے رب کے پاس اس کا اجر ہے اور ایسے لوگوں کے لئے کسی خوف و ملال کی وجہ نہیں ہے۔"

مندرجہ بالا ارشادات نے دین کی اصل یا جڑ کو نمایاں کر دیا ہے۔ مختلف شریعتیں اس درخت کی شاخیں ہیں جو عالم وجود کے تغیر و تبدل کی ان سے جو نسبت ہے اس کو ظاہر کرتی ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اللہ کے سارے اور ہر زمانے کے بندوں کی ایک ہی شریعت ہوتی۔ ان کی کتب مقدسہ میں کہیں فروعی اختلاف تک نہ ہوتا ان میں جو فرق ہے ان کی فروعی حقیقت کو نہ پہچاننے سے آپس میں سخت اختلافات بلکہ دشمنیاں پیدا ہو گئی ہیں اس بھول کی وجہ یہ ہے کہ بسا اوقات دین اور شریعت کو برابر گردان لیا گیا حالانکہ دین روح ہے اور شریعت اس کا جسم ہے۔ جسم کو مجرد روح نہیں

کیا جا سکتا۔ مگر اللہ نے ایک جان اور متعدد قالب پیدا کئے کیونکہ اس میں مصلحت جسم کے ارتقاء کی تھی۔

دین کے ایک ہونے میں کوئی شک و شبہ نہ ہوتا اگر اہل مذاہب نے بلکہ ان کے قائدین نے انہیں تبدیلیاں کر کے اپنے اپنے مذاہب کو اپنی حسب مرضی مسخ نہ کر دیا ہوتا اس زمانے میں کوئی با خبر شخص اس واقعہ سے انکار نہیں کر سکتا کہ ہندومت، بدھ مت، یہودیت اور عیسائیت کی وہ دینی کتابیں اب اصلی حالت میں موجود نہیں ہیں جن کو ان مذاہب کے اولین بانیوں نے ان کو دیا تھا۔ قدیم ترین مذاہب کی اصلی کتابوں کی تو پوری طرح خبر تک نہیں ہے بعد کے مذاہب کی کتب۔ جیسے بائبل کو جس میں توریت اور انجیل شامل ہیں۔ جان بوجھ کر بدلا گیا ہے۔ بلکہ یہ عمل اب تک جاری ہے جو کتابیں ان مذاہب کی اب تک موجود ہیں ان میں سینکڑوں تبدیلیوں کا ہونا تاریخ مذاہب سے ثابت ہے۔ اور یہی کلام پاک کا ارشاد بھی ہے۔ ارشاد ربانی ہے کہ:

"ابتداً سارے انسان ایک ہی امت تھے بعد میں انہوں نے مختلف عقیدے اور مسلک بنا لئے۔"

(سورہ نمبر ۱۰ یونس، آیت نمبر ۱۹)

سارے انسان ایک امت اس طرح تھے کہ سب کسی نہ کسی صورت سے ایک ہی حاکم اعلیٰ کو ظاہر و باطن کا مالک وفادار تسلیم کرتے تھے اور نیک زندگی بسر کرنے ہی کو صحیح طریقہ حیات جانتے تھے۔ بعد میں جب کچھ تفصیلات کے ساتھ ہدایات آئیں تو ان کے خیالات میں تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ ان تبدیلیوں کی اصلیت یہ تھی کہ ہدایات میں طرح طرح کی بحثیں نکالی گئیں جو ان ہدایات میں آمیزش کا سبب بن گئیں۔ چنانچہ کلام اللہ نے اپنے آخری رسول کو اطلاع دی کہ:

"اور اے محمدؐ! تم سے پہلے ہم نے نہ کوئی رسول ایسا بھیجا ہے نہ نبی (جس کے ساتھ یہ ماجرا نہ گذرا ہو) کہ جب اس نے ہدایت دی تو سرکش مخلوق نے اس میں خلل ڈال دیا ہو۔ اسطرح جو خرابیاں ڈالی جاتی تھیں ان کو اللہ (مزید رسول بھیج کر) درست کر دیتا (سورہ نمبر ۲۲) الحج آیت نمبر ۵۲)

تعجب کی بات ہے کہ اختلافات نادانوں نے نہیں بلکہ توضیحیت پانے والوں نے پیدا کئے۔ یہ حقیقت بھی خدا پر خوب روشن ہے۔ اسی کا یہ اعلان ہے کہ:

"اختلاف ان لوگوں نے کیا جنہیں حق کا علم دیا جا چکا تھا انہوں نے روشن ہدایات پا لینے کے بعد محض اس لئے حق کو چھوڑ کر مختلف طریقے نکال لئے کہ وہ آپس میں زیادتی کرنا چاہتے تھے۔"

(سورہ نمبر ۲ (البقرہ) آیت نمبر ۲۱۳)

یہ خرابیاں سارے عالم انسانیت میں پیدا ہو گئیں چنانچہ ان کی درستی کے لئے ایک نبی اخیر میں بھیجا گیا اس نے کسی ایک قوم، ایک ملک یا ایک مذہب کی بات نہیں کی بلکہ ساری دنیا کو مخاطب کر کے ہدایات کی اصل اور فروعات بتا دیں۔ جس سے وحدت دین کی استقامت اور شرائع میں تغیر و تبدل کا راز کھل گیا اور اسی کے ساتھ کل بنی نوع انسان کی

تدریس کی حقیقت معلوم ہو گئی۔ اسلام سے پہلے یہ روحانیت کی تاریخ اور تصور انسانیت کے بڑے گہرے راز تھے۔

اختتام تدریس

یہ انکشافات اس منزل تک پہنچنے کی تیاری تھی جہاں ساری گذشتہ تعلیمات کا جائزہ لیکر ان میں جو جو خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ ان کی نشاندہی کر دی جائے بلکہ ان خرابیوں کے جو اسباب تھے ان کو بھی جتا دیا جائے۔ یہ بات صاف صاف بتا دی جائے کہ دین کا خلاصہ ازل سے اب تک اور ہمیشہ کے لئے اللہ کی وحدانیت پر ایمان رکھنا ہے تاکہ پاک اور اعلیٰ زندگی دنیا کا تسلیم شدہ طریق ہو جائے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے بہت سے راستے مختلف زمانوں میں مختلف اقوام اور ممالک کے لئے حسب ضرورت اور حسب موقع بہت سے نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ متعین فرمائے تھے ممکن ہے کہ اس کے بھیجے ہوئے رسولوں نے بعض اقوام کو بھی حالات میں وحدانیت کا سبق ظاہری علامات کے ذریعے بھی دیا ہو۔ کیونکہ ابتدا میں انسان کا ذہن ایسے خیالات کو اخذ کرنے کے قابل نہیں تھا جو قطعی بے اندام تھے جیسا کہ خدائے تعالیٰ کا وجود حقیقت میں ہے اور ممکن ہے کہ علامتی ہدایت کو اہل شر نے مسخ کرکے بت پرستی اختیار کر لی ہو۔ اس بداندیشی سے یہ حقیقت نہیں بدلتی کہ بنی نوع انسان کو ہمیشہ وحدانیت اور تقوی اہی کی تلقین کی گئی اس تلقین کی شہادت اب باقی نہیں رہی۔ کیونکہ سارے پرانے مذاہب کی آسمانی کتابیں برباد اور مسخ ہو گئیں۔ آخر کار اب اللہ تعالیٰ نے خود یہ ذمہ لیا کہ قرآن مجید کو محفوظ رکھے گا۔ یہ وعدہ سورہ (حجر) نمبر ۱۵ کی آیت نمبر ۹ اور سورۂ انعام (نمبر ۵)، کی آیت نمبر ۱ میں کل کلام اللہ کے ساتھ اس وقت تک محفوظ ہے اور گذشتہ چودہ سو برس سے آپ اپنی سچائی کا ثبوت ہے جس کو سچے مخالف بھی نہیں جھٹلا سکتے۔

وحدانیت کی تائید کے لئے جو تیاری پہلے سے ہو چکی تھی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آمد اسلام کے بعد وہ ازلی اور ابدی سبق اپنی صاف، ستھری اور خالص حالت میں نوع انسان کو ازبر ہو گیا بقول مولانا سلیمان ندوی:

> "خود تاریخ انسانی گواہ ہے کہ بعثت محمدی کے بعد سے دنیا کی حالت بدل گئی۔ متفرق قومیں (تخلیق تعلیم اور انجام کے رشتوں سے) پیوستہ ہو گئیں۔ زمین کے کونے ایک دوسرے سے مل گئے اور توحید کامل کا غلغلہ عرش سے فرش تک بلند ہو گیا۔ (بتوں کے پوجنے والے بھی وحدت پرست ہوکر بتوں کو فقط توجہ کا مرکز کہنے لگے) اور خدا کے تمام رسولوں کو سچا اور صادق ماننے کا ولولہ (عام ہوکر) ترقی پانے لگا۔ یہاں تک کہ ان قوموں نے بھی جو مسلمان نہیں ہوئیں۔ ان دونوں صداقتوں کو اصولاً تسلیم کر لیا۔" (سیرۃ النبیؐ جلد چہارم صفحہ ۶۲۸)

سبق یہ وہی ہے جو شروع سے دیا گیا تھا۔ اسلام دین بھی وہی ہے جو ابراہیمؑ۔ اسمٰعیلؑ، داؤدؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دیا جا چکا ہے۔ ان کی تعلیمات میں فرق اس قسم کا سمجھنا چاہیئے کہ جیسا فرق تاریخ کی ان کتابوں میں ہوتا ہے جو

ایک ہی ملک کے متعلق چھٹی جماعت سے لیکر ایم اے تک کے طالب علموں کو پڑھائی جاتی ہیں۔ مضمون کی وسعت اور بلندی بدلتی رہتی ہے گو کہ مضمون وہی رہتا ہے۔ تعلیم اسلام کی بلندی سر بفلک ہے۔

یہ فرق اہل ذوق اور اہل علم آسانی سے سمجھ سکتے ہیں اس کی چند مثالیں یہ ہیں کہ سب سے اوّل غور فرمایئے کہ اسلام سے قبل احکام کی بجا آوری کا معیار الفاظ کی پابندی تھا۔ مگر اسلام کا مزاج یہ ہے کہ بڑے سے بڑے مسائل جیسے دین اور دنیا کے فرق کو بھی نیت کے فرق پر چھوڑتا ہے۔ یہ ایک مشہور حدیث ہے کہ "الاعمال بالنیات" ان مختصر سے دو الفاظ کا معنوی اثر طریقۂ حیات پر بہت ممد رس پڑتا ہے اسی طرح اسلام میں سزا اور جزا کا تعلق عالم غیب کی بے وجہ خفگی یا ناراضی سے نہیں بلکہ اعمال کی نوعیت سے ہے۔ مالک مطلق کا ہی بتایا ہوا یہ اصول بھی ہے کہ جو جیسا کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ ویسا ہی مرتب ہوتا ہے۔ (سورہ ۱۷ آیت ۱۴۷)

اس کے علاوہ یہ بھی دین اسلام کی خاص تعلیم ہے کہ سارے انسان خدا کے بندے ہونے کی حیثیت سے حقوق انسانی میں برابر ہیں۔ ان میں برتری ہے تو بس اس کی کہ وہ کس قدر تقوی کی زندگی بسر کرتے ہیں (سورہ ۴۹ آیت ۱۳) اس قسم کی مساوات اور انسانی برتری کی اس واحد صفت کا کسی اور مذہب میں تصور تک نہیں ہے ایک اور حیرت کی بات یہ ہے کہ دین اسلام میں جبر و اکراہ کی ممانعت اس حد تک ہے کہ اس بارے میں اللہ تعالیٰ نے خود اپنے حبیب سے مندرجہ ذیل انداز میں خطاب کیا۔ آنحضرتؐ سے ارشاد ہوا کہ:

"اگر تیرے رب کی یہ مشیت ہوتی کہ (زمین میں سب مومن اور فرمانبردار ہی ہوں) تو سارے اہل زمین ایمان لے آئے ہوتے، پھر کیا تو (اے محمدؐ) لوگوں کو مجبور کریگا کہ وہ مومن ہو جائیں؟"

(سورہ نمبر ۱۰، آیت نمبر ۱۰۰)

انصاف کی اس قدر تاکید ہے کہ دشمنوں اور دشمن قوموں سے بھی انصاف ہی کرنے کی تنبیہہ ہے۔ (سورہ نمبر ۴، آیت ۱۲۵۔ اور سورہ ۵ آیت ۸) حکم ہے کہ تم کو دشمنوں پر غصہ ہو تو بھی ان پر ناروا زیادتیاں نہ کرو (سورہ نمبر ۵ آیت نمبر ۲) کسی مذہب کی خدا پرستی کی نشانیوں کی بھی بے حرمتی نہ کرو (سورہ نمبر ۵ آیت نمبر ۲) اس روحانی گہرائی کے ساتھ قدم قدم پر غور و فکر کرنے کا حکم ہے۔ تفکر اور تدبر کی طرف سے بے پروائی برتنے والوں کے لیے ذات باری کی خفگی ان الفاظ میں موجود ہے کہ:

"ان کے پاس دل ہیں مگر وہ ان سے سوچتے نہیں۔ ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر وہ ان سے دیکھتے نہیں۔ ان کے پاس کان ہیں مگر وہ ان سے سنتے نہیں۔ وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گئے گذرے یہ لوگ وہ ہیں جو غفلت میں کھوئے گئے ہیں" (سورہ نمبر ۷، آیت نمبر ۱۷۹)

غور و فکر کرنے کی تاکید حالات زندگی کے متعلق ہی نہیں ہے۔ کائنات کے متعلق بھی ہے بلکہ خود کلام اللہ کے متعلق بھی ہے اور اس قدر شدت سے ہے کہ اس کا خیال کرنے سے خوف آتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے کہ:

"(مومن وہ ہیں کہ) جنہیں اگر رب کی آیات سنا کر نصیحت کی جاتی ہے تو وہ ان پر اندھے اور بہرے بن کر نہیں گر پڑتے۔" (سورہ نمبر ۲۵ آیت نمبر ۷۳)

غور و فکر کرنے پر یہ اصرار اگر حصولِ علم کو فرائض کا درجہ نہیں دیتا تو اور کیا ہے؟

یہ سب اور اس کے علاوہ بہت کچھ سکھانے، جتانے اور بتا دینے کے بعد آنحضرتؐ نے ۱۰ھ مطابق ۶۳۲ء میں حج وداع ادا فرمایا۔ متعدد روایات ہیں کہ حضورؐ کو اندازہ ہو رہا تھا کہ تلقینِ دین کا کام انجام کو پہنچ رہا ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے رب کے پاس جانے کا وقت آ رہا ہے۔ چنانچہ آپ نے اس موقع پر جو خطبہ ارشاد فرمایا اس میں ارشاد کر دیا کہ شاید آنحضورؐ کو دوسرے حج کا موقع نہ ملے۔ اسی خطبہ میں سامعین کے جمِ غفیر کو گواہ بنایا کہ میں نے تم تک اللہ کا پیغام پہنچا دیا ہے۔ تو جواب میں صحابہؓ نے عرض کی کہ ہم اللہ کے حضور میں کہیں گے کہ آپ نے خدا کا پیغام ہم تک پہنچا دیا۔ اسی حج کے موقع پر عین عرفات کے میدان میں خدائے عزوجل نے محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خوشخبری سنائی کہ:-

"آج میں نے تمہارا دین کامل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی اور تمہارے لئے اسلام کا دین پسند کیا۔" (سورہ نمبر ۵ (مائدہ) آیت نمبر ۳)

اس آیت کریمہ کے نزول کا وقت عصر کا تھا تاریخ ذی الحجہ کی ۹ اور سنہ ۱۰ھ تھا۔ رسول اللہ کے سب رفقاء کو جو اس وقت موجود تھے۔ اس اعلانِ الٰہی کا علم ہو گیا۔ ان میں حضرت عمر فاروقؓ بھی تھے اس وحی کو سن کر ان کے آنسو نکل آئے اس پر لوگوں نے ان سے پوچھا کہ یہ تو خوشی کا وقت ہے کہ اللہ نے آج اپنی ساری نعمتیں ہم پر مکمل کر دی ہیں انہوں نے جواب میں فرمایا کہ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم میں نہیں رہیں گے۔ کیونکہ ان کے فرائض منصبی انجام کو پہنچ گئے ان کے یہ نتیجہ نکالنے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ سب کو حضور اقدس کی حیات بس ایک خدمت کی انجام دہی سے وابستہ نظر آتی تھی، سب کو معلوم تھا کہ وہ دنیا میں کسی اور غرض سے نہیں آئے تھے۔ عمر فاروقؓ کا صحیح اندازہ نکلا کیونکہ آنحضرتؐ اس کے بعد کل ۸۱ روز اس دنیا میں رہے۔ بعض علماء کا یہ خیال بھی ہے کہ اس وحی کے بعد پھر کوئی آیت احکام سے متعلق نہیں آئی خود آنحضرتؐ اپنے کام کی تکمیل سے مطمئن ہو گئے تھے۔ سنن ابن ماجہ میں حدیث مروی ہے کہ:

"میں تم کو ایک روشن راستے پر چھوڑ جاتا ہوں جس کی روشنی کا یہ حال ہے کہ اس کی رات بھی دن کے مانند ہے۔"

یقیناً اس زمانے کا امن امان آپس کی محبت اور خلوص، پراثر حکومت، امتِ مسلمہ کا دنیا بھر میں وقار، اللہ سے لوگوں کے دلوں کا لگاؤ، افراد میں اطمینان، ہر طرح کی روز افزوں بہتری اسلام اور مسلمانوں کو ہر طرح کا عروج یہ محسوس ہوتا ہوگا کہ سب کے سب ایک اعلیٰ درجے کی کشتی میں سوار ہیں وہ ایک سمندر میں رواں ہے جس کا پانی پرسکون اور ٹھنڈا ہے فضا میں چڑھتے ہوئے آفتاب کی ضیاء سے روشن ہے۔ اطراف کے سبزہ زاروں کے رنگ نکھر گئے ہیں اور

پھولوں کی خوشبو سے ہوا معطر ہے اس کشتی کو دنیا حیرت سے دیکھ رہی ہے۔ اب آنحضرتؐ کو اس دنیا میں رہنے کی خواہش نہ تھی اب وہ وقت بھی نہ تھا کہ بدر کے میدان میں آپ نے دونوں ہاتھ پھیلا کر دعا مانگی تھی کہ:

"خدایا تونے مجھ سے جو وعدہ (فتح کا) کیا ہے۔ آج پورا کر...... اگر مسلمانوں کے یہ چند نفوس آج مٹ گئے تو پھر قیامت تک تو نہ پوجا جائیگا۔"

اب وقت ایسا تھا کہ مولانا شبلی نعمانی اس کے متعلق سیرت النبیؐ کے حصہ دوم میں کہتے ہیں کہ:۔

"آج پہلا دن تھا کہ اسلام اپنے جاہ و جلال کے ساتھ نمودار ہوا۔ جاہلیت کی تمام بے ہودہ مراسم کو مٹا دیا۔"

اور آنحضرت نے اپنے خطبہ میں فرمایا کہ:۔

"ہاں جاہلیت کے تمام دستور میرے دونوں پاؤں کے نیچے ہیں۔"

ختم نبوت کی ضرورت اور اثرات

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ تعلیم اور تدریس میں فرق ہے۔ تدریس کے لئے استاد کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو شخص استاد سے پڑھتا ہے وہ شاگرد ہوتا ہے۔ شاگردی کے بعد بھولنے کا زمانہ نہیں بلکہ خود اپنی کوشش سے علم حاصل کرنیکا زمانہ آنا چاہیئے۔ یہ شرط ضرور ہے کہ اتنی تعلیم اور قابلیت حاصل کرلی ہو کہ پھر اپنے آپ غور و فکر کرسکیں کہ اور راستوں کا کوئی نقشہ روایتی یا درایتی ذہن میں ہو۔ اسلام کی راہ میں یہ شرط اس طرح پوری ہو چکی ہے کہ کائنات کے پیدا کرنیوالے نے انسان کو فارغ التحصیل ہونے کا اعلان فرما دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ:۔

"آج میں نے تمہارا دین مکمل کر دیا۔"

راستوں کا نقشہ بھی اسی پروردگار نے سمجھا دیا متعدد بار جتا دیا کہ:۔

"کتاب ہم نے نازل کی ہے، یہ برکت والی ہے۔ پس تم اس کی پیروی کرو اور تقویٰ کی روش اختیار کرو۔" (سورہ نمبر ۶ آیت نمبر ۱۵۶)

کوئی ہدایت اور کوئی سبق کافی نہیں ہوسکتا اگر انسان میں سوچنے سمجھنے اور غور و فکر کرنے کا شعور نہ ہو۔ اس شعور کو پیدا کرنا طرزِ تعلیم کا اور استاد کا کام ہے۔ جو شعور استادِ ملت نے پیدا کیا اس کی روشن ترین مثال مسلمانوں کے عہد اول کی چمک دمک اور بے پایاں صلاحیتیں ہیں۔ اس سے زیادہ عظیم کارنامہ اس استاد امت، معلم انسانیت اور رسول خدا کا یہ ہے کہ اس نے خدا کی مرضی سے استاد اور تدریس کی ضرورت ہی کو ختم کر دیا۔ تدریس کا یہ کمال ہے کہ حد تدریس تک تعلیم دیکر خالق عالم نے وحی کا وہ پرانا مدرسہ ہی برخاست کر دیا جو ہزاروں برس سے جاری تھا۔ اب نہ وحی آئے گی اور نہ مزید رسول آئیں گے اس لاجواب صفت کی حقیقت کا کچھ بیان ڈاکٹر اقبالؒ کی زبانی سنیئے۔ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ کے

پانچویں باب میں فرماتے ہیں کہ:۔

اسلام میں نبوت چونکہ اپنے معراج کو پہنچ گئی لہٰذا اس کا خاتمہ ضروری ہوگیا۔ اسلام نے خوب سمجھ لیا تھا کہ انسان ہمیشہ سہاروں پر زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ اس کے شعور ذات کی تکمیل ہوگی تو یونہی کہ وہ خود اپنے وسائل سے کام لینا سیکھے ۔۔۔۔۔۔ اگر ہم نے ختم نبوت کو مان لیا تو گویا عقیدۃً یہ بھی مان لیا کہ اب کسی شخص کو اس دعویٰ کا حق نہیں پہنچتا کہ اس کے علم کا تعلق چونکہ کسی مافوق الفطرت سرچشمے سے ہے۔ اس لئے ہم پر اس کی اطاعت لازم آتی ہے اس لحاظ سے دیکھا جائے تو خاتمیت کا تصور ایک طرح کی نفسیاتی قوت ہے۔"

اختتام نبوت کے تصور سے ایک حسین آزادی اور عظیم ذمہ داری امت مسلمہ کو ودلیت ہوئی ہے۔ اب امت محمّدی کا اپنا فرض ہے کہ اس علم کو جسے خدائے قدوس نے آنحضرتؐ کے توسط سے اس کو بخشا ہے۔ خود سوچ سمجھ کر استعمال کرے۔ نئی راہیں تلاش کرے۔ نئی نئی بلندیوں پر گامزن ہو تاکہ نظر وسیع سے وسیع تر ہوتی جائے۔ تدریس کی اس آزادی کی مدد سے جو اپنے آپ پر اعتماد اور ہمت خاص پیدا کرتی ہے دنیا کے لئے مثال بنے، یہ مثال ایمان میں، کردار میں علم و ہنر کی قیادت میں، طرز حکومت میں، حصول طاقت میں، انصاف گستری اور تسخیر فطرت میں کارفرما ہو۔

ایک نظر بازگشت ڈالیے اور دیکھیے کہ جس رسولؐ نے خدا کے حکم سے یہ سب کچھ بخشا، بے مانگے بخشا، بے معاوضہ بخشا، مایوسی کو ناجائز قرار دیا اور قانون قدرت پر بھروسہ کرنے کی تلقین کی۔ مزید یہ کہ ان کاموں کے لئے جس خود اعتمادی کی ضرورت تھی اس کو بہم پہنچانے کے واسطے ہر طرح کے سبق دیئے پھر خدا نے عزوجل سے تدریس کے مکمل ہو جانے کی سند بھی دلوادی۔ اس طرح انسانوں کو سبق آموزی کی پابندیوں سے آزادی دلا کر پوری طرح ذمہ دار بنا دیا اور اسکو ہی ہر چیز کا چارج دلوایا اور خود عالم اعلیٰ کو اپنے رب کی طرف روانہ ہوگیا جاتے وقت خود امت ہی کو گواہ بنایا کہ میں نے اپنا کام پورا کردیا۔ اگر وہ رسول مظہر تکمیل نبوت نہیں ہے تو اور کیا ہے۔

تاریخی ثبوت

تکمیل نبوت اور رسالت کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ختم نبوت بھی ساتھ ہی ہو جائے۔ تکمیل نبوت کا ثبوت تو معرض بحث میں لایا جاسکتا ہے۔ کیونکہ اس کا تعلق معیار سے ہے۔ مگر ختم نبوت ایک واقعہ ہے۔ وہ تو بعد میں آنیوالے نبیوں اور رسولوں کی عدم موجودگی سے سامنے آجاتا ہے۔ ثبوت یہ ہے کہ عظیم مذاہب کی تعداد جتنی اس دن تھی جس دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی۔ اتنی ہی تعداد آج بھی ساری دنیا مانتی ہے۔ نبوت اور رسالت کے بہت سے دعویدار پیدا ہوئے۔ بہت سے دعویدار ہندو بت اور مسیح موعود ہونے کے بھی نمودار ہوئے بہت سوں نے اسلام اور دیگر اعلیٰ مذاہب میں بھی فرقے بنا دیے اور جو بھی ان کے دائروں سے باہر رہا ان کو کافر و مرتد کہا لیکن پچھلے ایک

ہزار چار سو سال میں کسی نے کوئی ایسا نیا مذہب قائم کر کے نہیں دکھایا کہ آج دنیا اس کو مذکورہ بالا عظیم مذاہب کے زمرہ میں گن کر ساتواں عظیم مذہب تسلیم کر لیتی۔ یہ کام اگر ہو سکتا تو اس کے لیے وقت کم نہ تھا۔ کیونکہ مذکورہ چھ مذاہب کے ظہور میں کسی دو کا آپس کا وقفہ کبھی چودہ سو سال کا نہیں ہوا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ حالات بالکل بدل گئے ہیں اب تو فاشزم اور کمیونزم جیسے مادیت پسند عقیدے جنم لے سکتے ہیں کوئی نیا روحانی مذہب وجود میں نہیں آ سکتا۔ کیونکہ روحانیت کی جو بلندیاں انسان کے لیے مہیا کی جا سکتی تھیں وہ سب میسر ہیں اور دین و دنیا کی حدود کو جس قدر ملایا جا سکتا تھا اس قدر اسلام نے ملا دیا ہے۔ اقبال کے بقول ؎

در دنیا از کلید دیں بکشاد

اس حکمت میں اب کسی قسم کی اصلاح کی گنجائش نہیں ہے گنجائش ہے تو اس کی کہ انسان اپنی عقل اور تجربہ سے روحانیت اور مادیت کے توازن کو سمجھے اور اس کو قائم رکھے۔ یہ توازن حالات کے مطابق بگڑتا اور سنورتا رہتا ہے اس کو قائم رکھنا یا نہ رکھنا دور اندیشی اور بد اندیشی کا کام ہے۔ ہر لحظہ استاد کی ہدایت کا نہیں۔ اب تدریس نہیں بلکہ خود اپنی تعلیم اور طالب علمی درکار ہے اس کا پورا موقع اسلام نے بخشا ہے۔

آزادیٔ عمل

تکمیل نبوت، ختم رسالت، نوع البشر کو شاگردی سے کامل فراغت اور فقط چند اصولوں کے ماتحت انسان کے لیے پوری آزادی عمل، یہ سب نعمتیں اسی ایک رسول اور نبی آخر کی بدولت میسر ہوئیں۔ جس نے دنیا سے جاتے وقت ہم کو کسی پادری یا پروہت کے سپرد نہیں کیا بلکہ رہ قرآن دکھا کر ہمارا ہاتھ براہ راست اللہ کے ہاتھ میں دیدیا۔ ہم سے ہمارے رب نے کہا ہے کہ:

"لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت آگئی ہے۔ یہ چیز وہ ہے جو دلوں کے امراض کی شفا ہے۔ اور جو اسے قبول کر لیں ان کے لئے رہنمائی اور رحمت ہے۔"

(سورہ نمبر ۱۰ (یونس) آیت نمبر ۵۷)

امت محمدی نے بڑے بڑے کارنامے سرانجام دیئے ہیں اب پھر کلام پاک اپنے ہاتھوں میں لیے ہوئے زیر آسمان کھڑی ہے اب خود اسی پر منحصر ہے کہ کس طرف بڑھے، کس انداز اور کس رفتار سے بڑھے۔ خدا اور اس کے حبیب نے اس کا مستقبل خود اسی کے عمل پر چھوڑ دیا ہے۔ یہی سب سے بڑا ثبوت تکمیل رسالت اور سب سے بڑی نعمت ختم نبوت ہے۔ ہاں یہ ضرور صحیح ہے کہ آزادی عمل بڑی ذمہ داری

صلی اللہ علیہ وسلم

رسول نمبر

نقوش

۹

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب..........

- عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد اَپ لوڈ (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹو کاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات نشرواشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

☆ تنبیہ ☆

- کسی بھی کتاب کو تجارتی یامادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔
- ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی وشرعی جرم ہے۔

﴿اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں﴾

- نشرواشاعت، کتب کی خرید وفروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں۔

kitabosunnat@gmail.com
www.KitaboSunnat.com

رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۱۲ ٹیلی فون نمبر ۵۲۵۱۵

زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمایندہ

نقوش

رسولؐ نمبر

جلد نہم

شمارہ نمبر ۱۳۰

جنوری ۱۹۸۴ء

مدیر:

محمد طفیل

ادارۂ فروغِ اُردو ، لاہور

قیمت لائبریری ایڈیشن : ۱۲۵ روپے
بار دوم

ترتیب

سیرت اور مطالعہ سیرت

آثار

متعلقات سیرت

(۲)

جان نثارانِ محمدؐ [خلفاء]

محمد طفیل پرنٹر پبلشر و ایڈیٹر نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر ادارہ فروغِ اردو لاہور سے شائع کیا

طلوُع

جب کفار نے حضورؐ کو تنگ کیا اُس میں شدّت اختیار کی تو ناچار سعد بن ابی وقاصؓ نے ایک مشرک کو اونٹ کی ہڈی کھینچ ماری، جس سے اس کا سر پھٹ گیا۔ خون بہنے لگا۔ مورخین کے نزدیک اسلام کی حمایت میں وہ پہلی خُونریزی تھی۔

دُوسرے ابوسفیان سے ایک مُٹھ بھیڑ میں حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے ایک تیر چلا ہی دیا، حالانکہ جانبین میں سے کسی کا ارادہ جنگ کا نہ تھا۔

یہ ذکر ایک صحابی کا تھا، مگر یہ جلد اُن جلیل القدر خلفاءؓ کے بارے میں ہے کہ جن کے علم پر ساری دنیا نثار تھی، جن کے دبدبہ پر ساری دنیا لرزاں تھی، جن کی سخاوت پر ساری دنیا حیران تھی، جن کے علم پر ساری دنیا ششدر تھی۔ بس یہاں اس نکتہ پر غور فرمائیے، تربیت یافتہ کس کے تھے؟

میں نے بھی سیرت پر کام کا آغاز کیا (آج بھی آغاز ہی ہے) نامور سیرت نگاروں سے کسبِ فیض کیا اپنی بے بضاعتی کے باوجود میں نے اپنی سوچ اور اپنے انداز کا الگ سا کام کیا۔ میرے پیش کردہ موضوعات میں ایسے عنوانات متعدد ہیں جن پر پہلے کام نہ ہوا تھا۔ اگر ہُوا تھا تو اتنی تفصیل سے نہ ہوا تھا یا کسی ایک سیرت کی کتاب میں موجود نہ تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو میرا اس موضوع پر کام کرنے کا کوئی جواز نہ تھا جہاں کہ ہر لفظ پر درُود پڑھ کر دوسرا لفظ لکھنا پڑے۔

ذرا رُکو، یہ کیا کہہ رہے ہو؟

چُپ رہتا ہُوں تو مافی الضمیر کا اظہار نہیں کرسکتا۔ کچُھ کہتا ہُوں تو ڈر لگتا ہے۔ مجھے کچھ کہنا چاہیے، ورنہ جو تلاطم میرے سینے کے اندر ہے وہُ مجھے بکھیر دے گا۔

خاتم النّبیّینؐ کے صحابی سعد بن ابی وقاصؓ کے جذبات ذہن پر مسلّط ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ کہہ رہا ہُوں، جذبہ سلامت ہو تو کوئی بھی پہلا تیر چلا سکتا ہے۔

محمد طفیل

اِس شمارے میں

آٹھ جلدیں حاضر کر چکا ہُوں۔ یہ نویں جلد ہے۔ میری پہلے لفظ سے لے کر آخری لفظ تک یہ کوشش رہی کہ کوئی ایسی بات درج نہ ہو، جو کسی بھی دوست کو کھٹکے۔ اس ریاضت میں مجھے کس حد تک کامیابی ہوئی، وُہ مجھے آپ بتائیں گے۔ میں تو اتنا جانتا ہُوں نیّت کا ثواب ملے گا۔

یہ جلد جو ہے، یہ تو چمن میں سیر کے مترادف ہے۔ ایسے چمن کی سیر، جہاں گلاب کے ہر رنگ کے پھُول کھلے ہوں۔ یعنی یہ جلد جملہ جلدوں کی خوشبوؤں کا مجموعہ ہے۔ اس جلد میں وُہ مضامین ہیں جو اپنی جلدوں سے بچھڑ گئے تھے۔ مگر کچھ مضامین ایسے ہیں جو اس جلد کے لیے مخصوص تھے۔

میرا ارادہ تھا کہ میں خلفا پر ایک الگ جلد پیش کرتا۔ کیونکہ حضورؐ کے بعد ہمارے خلفا کا، دین کے پھیلانے میں بڑا ہاتھ ہے۔ کیونکہ اُنھوں نے خدا کے احکامات کو پُورے طور پر مانا، حضورؐ کے ارشادات کی روشنی میں اپنے آپ کو ڈھالا، پھر اُن پر عمل کیا بھی، کرایا بھی!

اس جلد کے آخر میں خلفا پر مضامین ملیں گے۔ اُن سے خلفا کے کارناموں کی جھلک سامنے آئے گی کہ وُہ اُٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، کہتے سنتے، رسولؐ کی پیروی کرتے تھے۔ یعنی رسولؐ کی زندگی سے، جتنا گہرا اثر خلفا نے قبول کیا، وہ کم کسی کے حصّہ میں آیا۔ ہر وقت خدا کا دھیان، ہر وقت خدا کا خوف!

دس جلدیں آپ کے سامنے آ رہی ہیں۔ اس کے باوجود ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ کرنے کا کچھ کام، ابھی اور بھی ہے!

میرے ایک دوست نے کہا تھا: سیرت پر خدمت گزاری، ہر ایک کو راس نہیں آتی۔ شبلی نعمانی نے کام شروع کیا۔ وُہ مر گئے۔ قاضی سلیمان منصور پوری کا، مفصّل کتاب لکھنے کا ارادہ تھا۔ وہ مر گئے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا بہ اطمینان لکھنے کا ارادہ تھا۔ وہ مر گئے۔ لہٰذا تم بچو!

میرا جواب تھا: زہے نصیب!

[محمد نقوش]

سیرتِ طیبہ حضورؐ کے اسمأ و القاب کے آئینہ میں

ڈاکٹر سید محمد عبد اللہ

آنحضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ پاک اور اسوۂ حسنہ کے بارے اِتنا کچھ لکھا گیا ہے اور آپؐ کے فضائل و شمائل کی جزئیات و تفصیلات کو جمع کرنے کے لیے اتنی توجہ اور محنت صرف کی گئی ہے کہ کسی دوسرے فرد واحد کے لیے آج تک نہیں ہوئی۔ یہ بات مرحومہ ہزاسپرنگرا اور مارگولیتھ نے لکھی تھی، اس قول پر ایک صدی کے قریب گزر گئی ہے اور اس عرصے میں وافر ذخیرہ مزید بھی جمع ہو گیا ہے لہٰذا اب اس کی صداقت کا وزن اور بھی بڑھ گیا ہے۔

برصغیر میں قیامِ پاکستان کے بعد خصوصاً ماضی قریب میں سیرت کے مختلف پہلوؤں پر تفصیلی بحثیں ہوئی ہیں اور ابھی بہت کچھ ہے جو توجہ طلب ہے۔

موجودہ شذرے میں میرا موضوع ہے: آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اوصاف و منصب، حضور صلعم کے اسمائے مبارکہ و القاب کے آئینے میں، ممکن ہے میرے علاوہ بھی کسی نے اس پر قلم اٹھایا ہو لیکن...... ؎

اگر گفتہ را باز گویم رواست

مرا معنی "تازہ" مدعا است

اس سلسلے میں ایک عمدہ کتاب الصالحی شامی (م ۹۴۲ھ) کی سُبُلُ الھُدیٰ وَالرّشاد فِی سِیرَۃِ خَیرِ العِبَاد ہے مصنف کا پورا نام محمد بن یوسف الصالحی الشامی ہے (کتاب قاہرہ میں دکتور مصطفیٰ عبدالواحد نے ۱۹۷۲ء/۱۳۹۲ھ میں چھپوائی ہے۔ ۱۲ جلدوں میں ایک ہزار ابواب پر مشتمل ہے) اس ضخیم کتاب میں آج کے موضوع کے قریب، ایک باب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسمأ و القاب کے بارے میں ہے جو پہلی جلد کے آخر میں (ص ۵۰۰) حروفِ تہجی کے اعتبار سے مرتب کر کے تشریح کی گئی ہے، اور اس سے قبل ایک فصل میں پانچ خاص اسمائے مبارکہ کا تذکرہ اور تشریح ہے۔ (ص ۴۹۴) جن کے متعلق یہ حدیث ہے:

انا محمد وانا احمد، وانا الماحی الذی یمحو اللہ بی الکفر وانا الحاشر الذی یحشر الناس علی قدمی، وانا العاقب الذی لیس بعدہ نبی۔

ترجمہ:

"میں ہی محمد (صلعم) ہوں (میں ہی) احمد ہوں، میں ہی مٹانے والا ہوں کہ جس کے ذریعے خدا تعالیٰ کفر کو ختم کریں گے میں ہی جمع کرنے والا ہوں کہ لوگوں کو میرے (نقش) قدم پر جمع کیا جائے گا اور میں سب سے بعد آنے والا ہوں کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔"

مگر یہ خاص اسماء اپنے خاص وجوہ سے ہیں۔ القاب اور ناموں کی کثیر تعداد ایسی ہے جو قرآن و حدیث میں ہیں اور ان کو سامنے رکھ کر حضورؐ کی مکمل سیرۃ مرتب کی جا سکتی ہے۔

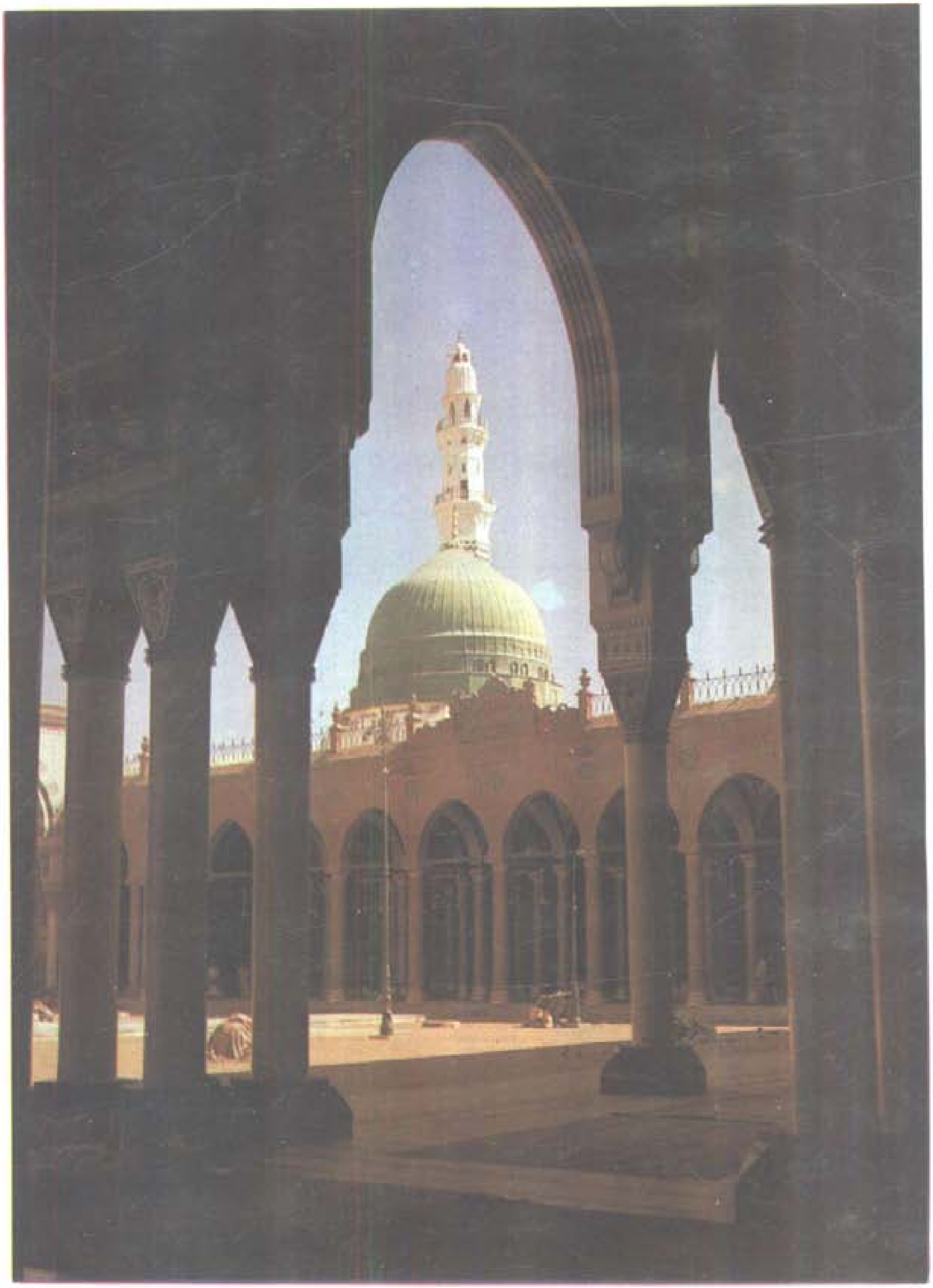
حضورؐ کے اسمائے مبارکہ کی فہرست مجمل بھی ہے اور مفصل بھی۔ لیکن میرے مدِّنظر صرف وہ اسماء ہیں جو قرآن مجید اور حدیث میں مذکور ہوتے ہیں۔ یہ فہرست طویل ہے (ملاحظہ ہو ضمیمہ الف) اسم خاص محمدؐ کے علاوہ احمدؐ محمودؐ اور حامدؐ بھی معروف ہیں اور قرآن سے ثابت ہیں اور القاب میں رَحْمَۃٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ بھی قرآن مجید میں موجود ہے۔ میں اس وقت ان میں سے صرف چند القاب کو موضوع بحث بنا رہا ہوں۔ یہ بتانے کے لیے کہ سیرۃ رسولِ پاکؐ کے بنیادی مآخذ کا مستند ترین حصہ قرآن و حدیث میں اسماء و القاب کی صورت میں موجود ہے۔

سب سے پہلے وہ القاب آرہے ہیں جو درج ذیل آیت میں ہیں:

یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰکَ شَاھِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا وَّدَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا (الاحزاب ۴۵، ۴۶)

اسمائے مبارکہ کی اس فہرست میں، میں ایک اہم خصوصیت کی بناء پر دو القاب شَاھِدٌ اور سِرَاجًا مُّنِیْرًا کی اپنے مقصد خاص کے تحت تشریح کرتا ہوں۔ حضورؐ کو شاہد کا لقب کیوں دیا گیا ہے۔ تفاسیر میں بہت سی تعبیریں ملتی ہیں۔ امام رازیؒ سے لے کر مفتی محمد شفیع تک تقریباً سبھی یہ فرماتے ہیں کہ حضورؐ قیامت کے روز اپنی اُمّت اور امم سابقہ کے اعمال کے بارے میں بلکہ انبیائے سابقہ کے بارے میں شہادت دیں گے کہ پیغام پہنچا دیا گیا اور کس نے کیا کیا عمل کیا۔ ظاہر ہے کہ یہ تعبیر بھی درست ہے۔ لیکن سیرت کے نقطۂ نظر سے اگر ہم شَاھِدٌ اور مُصَدِّق دو القاب کو یکجا کر کے تعبیر کریں تو ہمیں دو نکات ملیں گے، ایک تو یہ آپؐ قدیم اور جدید دُنیا کے درمیان ایک رابطِ اتصال کا درجہ رکھتے تھے۔ عقبیٰ کے علاوہ حیات موجودہ میں بھی آپؐ ایک معیارِ حقیقی ثابت ہوئے۔ یعنی پچھلی تاریخ نے انسانوں کے لیے جو اسباق اور عبرتیں مہیا کیں، ان کی شہادت آپؐ نے دے کر دُنیا کے لیے ایک اخلاقی و روحانی معیار کی تصدیق کی۔ جس کے سوا انسان نہ فوز و فلاح پا سکتے ہیں نہ سعادت سے بہرہ یاب ہو سکتے ہیں۔ لقب مصدق اَلْحُجَّۃُ الْبَالِغَہ کے بھی یہی معنی ہیں کہ حق و باطل اور کامیابی کے اصولوں کی کمی کامیابی کے معیار مطلق کی آپؐ نے شہادت بھی دی اور اس کی تصدیق بھی آنے والی انسانیت کے لیے پیش کی۔ علامہ طنطاوی ـــــ نے اپنی کتاب "رسول اللّٰہ فی القرآن الحکیم" میں بھی کچھ اس قسم کا اشارہ کیا ہے۔ آجکل واضح ہے کہ ان دو لفظوں کے اِرد گرد پوری سیرت اور پورے احکامِ قرآنی لپیٹے جا سکتے ہیں۔

امام الصالحی شامی نے القاب کی جو طویل فہرست دی ہے اس میں سے قرآن و حدیث کے مزید القاب، نبی الرَّحْمَۃ، رسولٌ مِّن انفسکم، داعی اِلَی اللّٰہ باذنہٖ، ارجح النّاس عقلاً، الاعلم باللّٰہ، اشجع النّاس، الامینؐ، صدق، الحکیم، سید ولد آدم، الفاتح، الکامل، القیّم المقوی اور دیگر درحقیقت سیرۃ رسولِ پاکؐ کے وہ آئینے ہیں جن کے اندر حضورؐ کی مکمل حیاتِ پاک منعکس ہے اور ان القاب میں سے ہر لقب کو واقعات و شمائل کے جو کھٹے میں محکم رکھا جا سکتا ہے۔ لیکن اس وقت میں صرف مزید دو القاب کے تجزیے پر اکتفا کر سکوں گا۔ یہ القاب ہیں قرآنی لقب سِرَاجًا مُّنِیْرًا اور حدیث کا ایک لقب سَیِّدُ النَّاس



گنبدِ خضریٰ

پہلے سراجاً منیراً کو لیجئے۔ سراج کے معنی ہیں چراغ اور منیر کے معنی ہیں روشنی دینے والا۔ مفسرین کی اکثریت نے سراج کے معنی چراغ لیے ہیں جو لغوی طور سے صحیح ہیں۔ لیکن قرآن مجید ہی میں آفتاب کو بھی سراج کہا گیا ہے اور چاند کو بھی اور منیر کا لفظ دونوں کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اس کے باوجود مجموعی طور سے دیکھا جائے تو خود قرآن مجید ہی کی شہادت کی بناء پر سراج کا خصوصی اطلاق شمس پر ہوتا ہے۔ جیسا کہ قاری محمد طیب نے اپنی کتاب آفتاب نبوت میں لکھا ہے۔ درج ذیل آیت سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے:

اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ۙ وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا وَّ جَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا ۝ (نوح، ۱۵ تا ۱۶)

ترجمہ:

کیا دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ نے کس طرح سات آسمان تہہ بہ تہہ بنائے اور ان میں چاند کو نور اور سورج کو سراج بنایا۔

قرآن مجید میں دوسری جگہوں میں چاند اور سورج اگرچہ دونوں سراج اور منیر بتائے گئے ہیں، مگر خصوصیت سے سراج منیر آفتاب ہی ہے اور اس کا یہ مفہوم اور بھی واضح ہوتا ہے جب سب متعلقہ آیتوں کے ساتھ اس آیت کو ملا کر پڑھتے ہیں۔

وَّبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا ۙ وَّجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا (سورۃ النبا، ۱۲ تا ۱۳)

وہاج کے معنی ہیں روشنی بھی اور شدید گرم بھی ــــ اور ظاہر ہے کہ یہ صفت صرف سورج کی ہے۔

چاند تو صرف روشنی دینے والا جرم ہے ــــ اور وہ بھی سورج سے مستعار لے کر۔

یہاں تک تو ہم یہ فیصلہ کر سکے کہ قرآن مجید میں سِرَاجًا مُّنِيْرًا معنی آفتاب ہیں اور سِرَاجًا مُّنِيْرًا آپؐ ہی کا خصوصی لقب ہے۔ لیکن اہم سوال یہ ہے کہ یہ لقب حضورؐ کے لیے کیوں مخصوص ہوا؟

ظاہر ہے کہ یہ حضورؐ کے بنیادی اور مرکزی کمالات و فیوض کی بناء پر ہے کیونکہ سورج (اور نظام شمسی) بھی کائنات میں ایک مرکزی افادیت و وسعت اثر کا منبع ہیں۔ لہٰذا سورج سے تشبیہ دے کر یہ ثابت کیا گیا ہے کہ انبیاء و رسل کے نظام نبوت و رسالت نیز کائنات (ارضی و سماوی) میں آپؐ کا وجود عظیم ترین مرکز فیوض و کمالات ہے۔ حضورؐ کے روحانی فیوض و کمالات کی پوری تفصیل کتاب آفتاب نبوت (از قاری محمد طیب) میں دیکھی جا سکتی ہے لیکن حضورؐ کی ذاتِ پاک کے فیوض ہماری اس مادی دنیا کے لیے بھی مکمل و کامل ہیں سورج سے بھی زیادہ ہیں۔

تھوڑی سی وضاحت کی خاطر یہاں ہم سورج کے متعلق فلکیاتی اور طبیعاتی حوالے سے، کچھ اشارے کرنے پر مجبور ہیں۔

طبیعیات میں یہ امر ثابت شدہ ہے کہ سورج ہماری تمام تر زندگی کا سرچشمہ ہے، زندگی کے سب لوازم سورج کی برکت سے مہیا ہوتے ہیں مثلاً آب رواں ہی کو لیجئے۔ اس کی تخلیق و تشکیل برف کی رہینِ منت ہے جس سے چشمے دریا وغیرہ بنتے ہیں، سورج کی حرارت سے بخارات، پھر بادل، پھر پانی، پھر برف ــــ لیکن اسی برف کو سورج کی حرارت پانی بنا کر آبِ رواں میں تبدیل کر دیتی ہے اور سب کو معلوم ہے کہ پانی سے دنیا کو کیا کیا فائدے پہنچتے ہیں، انسانی حیوانی خوراک کے علاوہ زراعت و باغبانی وغیرہ میں اس کا جو فیض ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں مگر اسی پانی سے ہم بجلی بھی حاصل کرتے ہیں جو آگے صدہا فوائد کا وسیلہ ہے۔

سورج کے فیوض کی اس صف میں پتھر کا کوئلہ، پٹرول اور خود ہمارا لباس، ہماری خوراک، پھل پھول، کشا نتوں کی صفائی، پھولوں کی رنگت غرض ہزار ہا فائدے ہیں جن کی تفصیل نظام شمسی کی کتابوں سے حاصل ہو سکتی ہے شمسی توانائی سے ہم شمسی مقطر، شمسی چولھے، شمسی بھٹیاں وغیرہ بے شمار وسائلِ آرائش پیدا کر سکتے ہیں۔ یہ ایک ہمہ گیر قوت و برکت ہے (ملاحظہ ہو کتاب شمسی توانائی از ڈاکٹر سلطان علی مشمولہ سائنسی موضوعات نمبر ۴، مطبوعہ مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی لاہور ص ۹، نیز مقالہ نظام شمسی از میجر شبیر احمد قادری، محولہ کتاب میں)

اس وضاحتی گفتگو سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ قرآن مجید کی اس تشبیہ یا لقب سے، حیات پاک کے وسیع و محیط فیوض کو سمجھنے میں کتنی مدد ملتی ہے جن کے عملی نمونوں سے آپؐ کی سیرۃ پاک لبریز ہے۔ القاب کی اس طویل فہرست میں سے جو میں نے ضمیمہ الف میں درج کی ہے میں وقت کی مناسبت سے ایک اور لقب کا انتخاب کر کے اس پر مجمل بحث کرتا ہوں۔ یہ لقب ہے سید الناس (جو حدیث میں آیا ہے اور بدلی ہوئی صورتوں میں سید ولد آدمؑ، سید الثقلین اور سید الکونین کی شکل میں بھی دہرایا گیا ہے۔)

عام ترجمے کے لحاظ سے اس کے معنی اُردو میں بنی آدم کے سردار اور انگریزی میں LEADER OF HUMANITY کے آتے ہیں اور کبھی کبھی HERO (جیسا کہ امیر حسن صدیقی نے اپنی انگریزی کتاب HEROES OF ISLAM میں اور کارلائل نے اپنے مقالہ HERO AS PROPHET میں اختیار کیا ہے) لیکن حق یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو محض LEADER یا HERO قرار دینا زیادتی ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ ترجمہ کرنے والے حضرات کو اس معاملے میں احتیاط سے کام لینا چاہیئے۔ کیونکہ یہ دونوں اصطلاحات اپنے جدید مفہوم میں (خصوصاً جدید عمرانیات میں) بعض ایسے کرداری مفہوم رکھتی ہیں جو نبی اور رسول کے رُتبے سے فروتر ہیں۔ آپؐ کا رتبہ تو بطور نبی اور رسولؐ کے بھی دوسرے انبیاء سے ارفع ہے۔ چہ جائیکہ عام انسانوں کے حوالے سے ہو۔ اسی لیے آپؐ کو سید الانبیاء و خاتم النبیینؐ بھی کہا گیا ہے۔ لیکن مغربی مصنفین اور ان کی تقلید میں ملکی سیرۃ نگار حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو محض لیڈر یا ہیرو کہہ کر اپنی کم فہمی کا ثبوت دیتے ہیں۔ نبی اور رسولؐ کی شان فضیلت اور ہے اور محض لیڈر اور ہیرو کی حیثیت یا فوقیت دوسری طرح کی شے ہے۔

یہاں میں ایک بار پھر ایک وضاحتی تجزیہ کر دوں۔

عمرانیات کی کتابوں میں لیڈر کے کئی اوصاف بیان ہوتے ہیں۔ عموماً اور قدرے ماضی میں، لیڈر شپ، اعلیٰ نسب و حسب یا اقتدار یا کثرت مال و دولت پر منحصر سمجھی جاتی تھی، یہ منفرد شخصیتوں پر مبنی نظریہ تھا لیکن رفتہ رفتہ اجتماعی نفسیات میں (خصوصاً وہ جس کا تعلق مادی تصورات زندگی اور گروپ کی فلاسفی سے ہے) لیڈر وہ شخص قرار پایا جو کسی جماعت یا گروہ یا اجتماع کے مادی فوائد کا علمبردار ہو کر، جماعت یا اجتماع کو مجتمع رکھنے یا اس کی رہنمائی کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، اس تصور کا نمائندہ مفکر (۱۹۰۶، ۱۹۰۷) یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ لیڈر شپ ہے۔

"CENTRALISATION OF EFFORT IN ONE PERSON
AS AN EXPRESSION OF THE POWER OF ALL"
(LLADBOOK OF LEADERSHIP BY R.M. STRGDILL,
1974).

میں نے جس کتاب کا حوالہ دیا ہے اس میں لیڈر کے اوصاف کے متعلق کم و بیش تیس بیانات موجود ہیں ۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں PROPHET کے یہ عجیب و غریب معنی نظر آتے ہیں کہ PROPHET IS A LEADER BUT WITH NO OFFICE لیکن حضورؐ کے بارے میں یہ قطعاً غلط ہے ، حضورؐ کی جامعیت اور اکملیت تو اتنی مکمل تھی کہ دین کے علاوہ دنیا کے تمام مناصب بھی آپؐ کی ذات میں مرکوز تھے جیسا کہ سیرۃ النبیؐ اور خطبات مدراس میں سید سلیمان ندوی نے بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے بہرحال دنیوی لیڈر (میں لیڈر کا افادی) تصور پایا جاتا ہے جو اپنی شخصیت کی مقناطیسیت سے یا اجتماع کے مفادات کی کامیاب وکالت سے لیڈر بن جاتا ہے لیکن نبی کے خصوصاً رسول اکرمؐ کے سلسلے میں تو یہ حقائق امر واضح ہے کہ آپؐ خدا تعالیٰ کے فرستادہ تھے اور داعیاً الی اللہ باذنہٖ تھے اور ایک ایسے اجتماع میں آپؐ نے رسالت کا آغاز کیا جس کے خیالات و عقائد آپؐ سے مختلف تھے ۔ اور ان میں سے اکثر نے ابتداء میں آپؐ کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا ، لیکن حضورؐ اللہ تعالیٰ کی تائید سے کامیاب ہوئے پس آپؐ ایک معنی میں لیڈر ضرور ہوئے مگر وہ عام عمرانیاتی تصور کے لیڈر نہ تھے ۔ اللہ کے رسولؐ تھے اور انھیں پیغام رسالت کے سوا کوئی دنیوی غرض یا دنیوی فائدہ (INTEREST) مدِ نظر نہ تھا

تو مقصود اس وضاحت سے یہ ہے کہ آپؐ محض لیڈر نہ تھے اور سید الناس کے وہ معنی نہیں جو اکثر ترجمہ کرنے والوں نے لکھے ہیں ۔

یہی حال لفظ ہیرو کا ہے ۔ جس کا کردار غیر معمولی تو ہوتا ہے لیکن ہمہ گیر اور ہمہ جہت تو نہیں ہوتا اور اب تو فن ڈراما یا زندگی کو ڈراما سمجھنے کے تصور نے لفظ ہیرو کی وہ شان بھی گھٹا دی ہے جو کبھی ہوا کرتی تھی ۔ کارلائل نے حضورؐ کو محبت سے ہیرو کا لقب دیا ہو گا ، لیکن اس کی کتاب نے بعض کم درجے کے ابطال کے ساتھ حضورؐ کو رکھا ہے جو ہمیں منظور نہیں ۔

آخر میں دو گذارشات بے محل نہ ہوں گی ۔ اول یہ کہ میرے تجویز کردہ موضوع کو قابلِ توجہ سمجھ کر حضورؐ کے اسماء و القاب کو سیرۃ کے ساتھ مربوط کر کے اس جگہ سے آگے بڑھانا مناسب ہو گا جس جگہ تک صالحی شامی نے اور بعد ازاں القسطلانی اور اس کے شارح الزرقانی (صاحب شرح المواہب ، جلد سوم) نے اُسے پہنچایا ہے ۔ کوئی نوجوان فاضل اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے کر ثواب اور اجرِ عظیم کا مستحق بنے ۔

دوسری گذارش یہ ہے کہ حضورؐ کی سیرۃ پر لکھنے والے یا ترجمہ کرنے والے تصنیف اور ترجمے کے وقت تقدّس کی ان باریکیوں کو ضرور مدِ نظر رکھیں جن کی طرف میں نے اپنے مقالے میں اشارہ کیا ہے کیونکہ انگریزی اور مغربی زبانوں کا علمی محاورہ یا پس منظر سیرۃ پاک کی ارفع فضا سے مختلف ہے ۔

اور اب ان سطور پر میں اپنی گذارش کو دُرود و سلام کے ساتھ ختم کرتا ہوں اور سامعین (قارئین) کا شکریہ ادا کرتا ہوں ۔

فقط :

(نوٹ : اسمائے قرآنیہ باعتبار حروف تہجی اگلے صفحہ سے ملاحظہ فرمائیں)

اسمائے قرآنیہ باعتبار حروف تہجی

(الف)

اسم مبارک	مفہوم	حوالہ
۱۔ اَلْآخِذُ الصَّدَقَاتَ	لوگوں سے صدقات وصول کرنے والے (اور انھیں راہِ حق میں خرچ کرنے والے)	۹ (التوبہ) : ۱۰۳
۲۔ اَلْآمِرُ وَالنَّاھِی	لوگوں کو نیکی کا حکم دینے اور برائی سے منع کرنے والے	ماخوذاز، (الاعراف) : ۱۵۷
۳۔ احمد	سب سے زیادہ تعریف کیا ہوا	۶۱ (الصف) : ۶
۴۔ اذن خیر	بھلائی کے کان	۹ (التوبۃ) : ۶۱
۵۔ الاُمّی	ناخواندہ	۷ (الاعراف) : ۱۵۸
۶۔ اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْن	سب سے پہلے مسلم	۶ (الانعام) : ۱۶۳

(ب)

اسم مبارک	مفہوم	حوالہ
۷۔ اَلْبُرْھَان	لوگوں کے لیے اللہ کی دلیل وحجت	۴ (النساء) : ۱۷۴
۸۔ بَشَرٌ	انسان (کامل)	متعدد مرتبہ مثلاً ۱۷ (بنی اسرائیل): ۹۳
۹۔ بُشْرٰی عِیْسٰیؑ	بشارت عیسیٰ (کے مصداق)	۶۱ (الصف) : ۶، نیز مستدرک حاکم ۲/۶۰۰
۱۰۔ بَشِیْرٌ	اہل ایمان کو خوشخبری دینے والے	متعدد بار، مثلاً ۲ (البقرۃ) : ۱۱۹
۱۱۔ بَیِّنَۃ	(اللہ تعالیٰ کی لوگوں پر حجت اور دلیل	۹۸ (البینۃ) ۱، ۲ (بقول بعض)

(ت)

اسم مبارک	مفہوم	حوالہ
۱۲۔ اَلتَّالِی	بعد میں آنے والے، مُتَاخِّر یا تلاوت کرنے والے	۱۶ (النحل) : ۱۲۳ ۲ (البقرۃ) : ۱۵۱
۱۳۔ تَذْکِرَۃٌ	یاددہانی (کا ذریعہ) (بقول بعض)	۶۹ (الحاقۃ) : ۴۸

(ث)

اسم مبارک	مفہوم	حوالہ
۱۴۔ ثَانِیَ اثْنَیْن	دو میں دوسرا	۹ (التوبۃ) : ۴۱

(ح)

اسم مبارک	مفہوم	حوالہ
۱۵۔ حَاکِمٌ	نفاذ حکم کرنے والے یا فیصلہ کرنے والے	۴ (النساء) : ۱۰۵

۱۶۔ حُجَّةُ الْبَالِغَه	(خدا تعالیٰ) کی حجت غالب	۶ (الانعام) ۱۴۹ بقول بعض
۱۷۔ حَرِیْصٌ عَلَیْکُمْ	لوگوں کے ایمان پر حریص، اہل ایمان کے فائدے اور خیر خواہی پر حریص	۹ (التوبۃ) : ۱۲۸
۱۸۔ اَلْحَکِیْم	دانا اور صاحب حکمت و فراست	ماخوذ از ۶۲ (الجمعہ) : ۲
	(خ)	
۱۹۔ خَاتَمُ النَّبِیِّیْن	نبیوں کی مہر نبوت	۳۳ (الاحزاب) : ۴۰
۲۰۔ خَافِضٌ	جابر و ظالم لوگوں کی گردنیں جھکانے والے	
	یا	
	اہل ایمان کے لیے اپنے رحمت کے پَر بچھانے والے	ماخوذ از ۲۶ (الشعراء) : ۲۱۵
	(د)	
۲۱۔ دَاعِیٌ اِلَی اللہ	اللہ کی طرف دعوت دینے والے	۳۳ (الاحزاب) : ۴۶
۲۲۔ دَانِیٌ	حق کا قرب پانے والے	ماخوذ از ۵۳ (النجم) : ۸
۲۳۔ دَعْوَةُ اِبْرَاهِیْم	دعائے ابراہیم (کا مصداق)	۲ (البقرۃ) : ۱۲۹ کے مصداق، مستدرک حاکم، ۲ / ۶۰۰،
	(ذ)	
۲۴۔ الذَّاکِر	ہر وقت خدا تعالیٰ کو یاد رکھنے والے	ماخوذ از ۷ (الاعراف) : ۲۰۵
۲۵۔ ذُوالْخُلُقِ الْعَظِیْم	عظیم اور بے مثال اخلاق والے	ماخوذ از ۶۸ (القلم) : ۴
۲۶۔ ذُوالسَّکِیْنَه	صاحب سکینہ (= رحمت خداوندی کا نزول)	ماخوذ از ۴۸ (الفتح) : ۲۶
۲۷۔ ذُوالْفُتُوْح	فتح و کامرانی والے	ماخوذ از ۴۸ (الفتح) : ۱
۲۸۔ ذُوالْقُوَّة	صاحب قوۃ و استطاعت	۸۱ (التکویر) (بقول بعض) : ۱۹ - ۲۰
۲۹۔ ذُوالْمَقَامِ الْمَحْمُوْد	مقام محمود پر نائز ہونے والے	ماخوذ از ۱۷ (بنی اسرائیل) : ۷۵
	(ر)	
۳۰۔ رَاضِیٌ	راضی برضائے الٰہی	ماخوذ از ۹۳ (الضحیٰ) : ۵
۳۱۔ رَاغِب	پروردگار کی طرف متوجہ ہونے والے	ماخوذ از ۹۴ (الانشراح) : ۸
۳۲۔ رَحْمَةٌ لِّلْعٰلَمِیْن	تمام جہانوں کے لیے ذریعہ رحمت	۲۱ (الانبیاء) : ۱۰۷
۳۳۔ اَلرَّسُوْل	رسول کامل	متعدد مرتبہ مثلاً ۵ (المائدہ) : ۶۷

۳۴ - رَسُولُ اللّٰہ	اللہ کے رسول (کامل)	مستند و مرتبہ مثلاً ۴۸ (الفتح) : ۲۹
۳۵ - رَفِیْعُ الذِّکْر	بلند ذکر	ماخوذ از ۹۴ (الانشراح) : ۴
۳۶ - رَفِیْعُ الدَّرَجَات	بلند درجات والے	ماخوذ از ۶ (الانعام) : ۱۶۵

(س)

۳۷ - السَّاجِد	خدا کے حضور جھکنے والے	ماخوذ از ۷۶ (الدہر) : ۲۶
۳۸ - اَلسِّرَاجُ الْمُنِیْرُ	روشن چراغ (= آفتاب)	۳۳ (الاحزاب) : ۴

(ش)

۳۹ - شَاھِدٌ	گواہ	۳۳ : (الاحزاب) : ۴۵

(ص)

۴۰ - صَابِر	راہِ حق و صداقت میں پامردی دکھانے اور مصائب پر صبر کرنے والے	ماخوذ از ۱۶ (النحل) : ۱۲۷ ، ۵۲ (الطور) : ۴۸ ؛
۴۱ - صَاحِبِ کوثر	صاحبِ خیرِ کثیر (یا) حوضِ کوثر والے	۱۰۸ (الکوثر) : ۱
۴۲ - صَاحِبُ الْاِسْرَاء	شب میں سفر (اسراء) کرنے والے	۱۷ (بنی اسرائیل) : ۱

(ظ)

۴۳ - الظَّاھِر	غالب و قوی	ماخوذ از ۴۸ (الفتح) : ۲۸

(ع)

۴۴ - عابِد	عبادت گزار	ماخوذ از ۱۵ (الحجر) : ۹۹
۴۵ - عامِل	عمل کرنے والے	۳۹ (الزمر) : ۳۹
۴۶ - عَائِلًا	اللہ تعالیٰ کی مدد کے محتاج	۹۳ (الضحیٰ) : ۸
۴۷ - العَبْد یا عبدہٗ	عَبْدِ کامل	۱۷ (بنی اسرائیل) : ۱
۴۸ - عَبْدُ اللّٰہ	اللہ کے عبد (کامل)	۷۲ (الجن) : ۱۹
۴۹ - عَزِیْزٌ	غالب و قوی	ماخوذ از ۶۳ (المنافقون) : ۸
۵۰ - عَزِیْزٌ عَلَیْهِ مَا عَنِتُّمْ	تمہارا مشقت میں پڑنا آپ پر گراں ہے۔ یعنی تم پر مہربان	۹ (التوبۃ) : ۱۲۸

(غ)

۵۱ - غَنِی	دوسروں کی مدد سے بے پروا	ماخوذ از (الضحیٰ) : ۸

	(ف)	
۵۲ - الفاتح	فتح و کامرانی سے ہمکنار	ماخوذ از ۴۸ (الفتح) : ۱
	(م)	
۵۳ - المؤیّد	تائیدِ ایزدی سے بہرہ ور	ماخوذ از ۹ (الانفال) : ۶۲
۵۴ - المؤمن	اللہ پر کامل ایمان رکھنے والے	ماخوذ از ۷ (الاعراف) : ۶۲
۵۵ - المبشّر	اہل ایمان کو رحمتِ حق کی بشارت دینے والے	۹ - (التوبۃ) : ۲۴
۵۶ - المبلّغ	تبلیغ کرنے والے	۵ (المائدۃ) : ۶۷
۵۷ - المتبتّل	اپنی عبادت کو خالص اللہ کے لیے کرنے والے	۷۳ (المزمل) : ۸
۵۸ - المتّبع	اتباع کیے گئے	ماخوذ از ۷ (الاعراف) : ۱۵۸
۵۹ - المتربّص	امرِ خداوندی کا انتظار کرنے والے	ماخوذ از ۵۲ (الطور) : ۳۱
۶۰ - المتہجّد	شب بیداری کرنے والے	ماخوذ از ۱۷ (بنی اسرائیل) : ۷۹
۶۱ - المتوکّل	ذاتِ حق پر ہمیشہ توکل کرنے والے	۲۵ (الفرقان) : ۵۸
۶۲ - المجاہد	راہِ حق میں کوشش بلیغ صرف کرنے والے یا	
	کفار سے جہاد کرنے والے	ماخوذ از ۹ (التوبۃ) : ۷۳
۶۳ - المحرّض	دوسروں کو جہاد (اور دیگر احکام خداوندی کی تعمیل)	
	پر آمادہ کرنے والے اور رغبت دینے والے	۸ (الانفال) : ۶۵
۶۴ - مخلص	صاحب خلوص و للّٰہیّت	۳۹ (الزمر) : ۱۴
۶۵ - المدّثّر	چادر اوڑھ کر استراحت فرمانے والے	۷۴ (المدّثّر) : ۱
۶۶ - المذکّر	دوسروں کو نصیحت اور یاد دہانی کرانے والے	۸۳ (الغاشیۃ) : ۲۱
۶۷ - المزّمّل	چادر میں لپٹ کر لیٹنے والے	۷۳ (المزمّل) : ۱
۶۸ - المرتّل	قرآن کو ترتیل سے پڑھنے والے	۷۳ (المزمّل) : ۴
۶۹ - المرسل	خدا کی جانب سے فرستادہ	۱۳ (الرعد) : ۴۳
۷۰ - المزکّی	تطہیرِ قلوب کرنے والے	۲ (البقرۃ) : ۱۲۹
۷۱ - المسبّح	تسبیح پڑھنے والے	ماخوذ از ۱۱۰ (نصر) : ۳
۷۲ - المستغفر من غیر اثم	باوجود گناہ نہ ہونے کے خدا سے مغفرت مانگنے والے	(ایضاً)
۷۳ - المستقیم	راہِ حق پر سیدھا رُخ رکھنے والے	ماخوذ از ۱۰ (ہود) : ۱۱۲

۷۴۔ اَلْمُطَاع	اطاعت کیے گئے	ماخوذ از ۴ (النساء) : ۸۰
۷۵۔ اَلْمَعْصُوْم	گناہوں سے پاک و صاف یا لوگوں کے شر سے محفوظ	۵ (المائدہ) : ۶۷
۷۶۔ مُتَلَقِّی الْقُرْاٰن	قرآن حکیم کی نعمت عطا کیے جانے والے	۲۷ (النمل) : ۶
۷۷۔ اَلْمُنَادِی	حق کی آواز بلند کرنے والے	۳ (آل عمران) : ۱۹۳
۷۸۔ اَلْمُنْذِر	لوگوں کو عذابِ الٰہی کی وعید سے ڈرانے والے	۱۳ (الرعد) : ۷
۷۹۔ اَلْمَهْدِی	ہدایت یافتہ	ماخوذ از ۴۸ (الفتح) : ۲۔ حسان بن ثابتؓ کا شعر ہے: جزعًا علی المهدیّ اصبح ثاویًا یا خیر من وطئ الحصا لا تبعد
۸۰۔ اَلْمولی	مومنوں کے آقا	۳۳ (الاحزاب) : ۶، البخاری ۴/۱۳۵، کتاب الفرائض

(ن)

۸۱۔ نذیر	عذابِ الٰہی کا ڈر سنانے والے	متعدد مرتبہ مثلاً ۳۳ (الاحزاب) : ۴۵
۸۲۔ نعمة الله	اللہ کا عظیم احسان	۱۶ (النحل) : ۸۳ نیز ۳ (آل عمران) : ۱۶۴
۸۳۔ النور	حق کی روشنی	۶ (المائدة) : ۱۵

(ھ)

۸۴۔ ھادی (اعظم)	ہدایت دینے والے	۴۲ (الشوریٰ) : ۵۲
۸۵۔ یتیم	بے باپ پرورش پانے والے یا گوہرِ نایاب	۹۳ (الضحیٰ) : ۶

(ی)

۸۶۔ یٰسٓ		۳۶ (یٰسٓ) : ۱

اسمائے مبارکہ مذکورہ کتب احادیث و سیر

(ب)

اسم مبارک	ترجمہ	حوالہ
۱۔ الابرّ	سب سے زیادہ نیکوکار اور سچا	سُبل الهُدیٰ، ۱ : ۵۱۶

۲ - الاَبطَحِی	ابطح (وادی مکہ) کی طرف نسبت	سبل الھدیٰ، ۱ : ۵۱۶
۳ - اَلاَبلَجُ	خندہ رو یا صاحب جود وکرم وغیرہ	ایضاً ۵۱۷
۴ - اَلاَبیَضُ	سفید رنگ، دریا دل سخی۔ ابوطالب کے قصیدے کا مشہور شعر ہے :- وَاَبیَضُ یُستَسقَی الغَمَامُ بِوَجھِہٖ ثمال الیتامی عصمۃ للاَرَامِل	ایضاً
۵ - الاَتقیٰ	سب سے زیادہ متقی اور پرہیزگار	مسلم شریف (مرفوعاً)
۶ - الاَجود	جوّاد اور سخی	
اور اَجوَدُ النَّاسِ	لوگوں میں سے سب سے زیادہ سخی	البخاری، (کتاب بدء الوحی)
۷ - اَلاَجَلّ	جلیل وعظیم	سبل الھدیٰ، ۱ : ۵۲۰
۸ - الاَحسَنُ	متناسب الاعضاء، جامع صفات کمال حسان بن ثابت کے قصیدے کا ایک شعر ہے : وَاَحسَنُ مِنكَ لَم تَرَقَطّ عَینِی واجمل مِنكَ لَم تَلِدِ النِّسَاءُ	حدیث انس، البخاری ومسلم
۹ - الاٰخِذُ الحُجُزَات	آتشِ جہنم میں گرنے والوں کو کپڑوں سے پکڑ کر پیچھے کو کھینچنے اور روکنے والا۔	متفق علیہ
۱۰ - الاخشی لِلّٰہِ	خدا تعالیٰ سے سب سے زیادہ ڈرنے والا	سنن ابی داؤد، کتاب الصوم، باب ۳۶، ومسلم، کتاب الصیام، حدیث ۷۴، ۷۹۔
۱۱ - الاَدعَج	آنکھ کی کالی سیاہ پتلیوں والا	سبل الھدیٰ، ۱ : ۵۲۴
۱۲ - اَلاَدوَم	(اللہ کی اطاعت پر) مداومت کرنے والا	ماخوذ از صحیح البخاری ۴/۱۰۲، (مطبوعہ مطبع الامیریہ) ومسلم، کتاب صلوٰۃ المسافرین، حدیث ۲۱۷۔
۱۳ - اَلاَرجَعُ	دوسروں پر اپنے علم وفضل کی وجہ سے بڑھا ہوا	ماخوذ از حدیث عبداللہ بن عتبہ، سبل الھدیٰ، ۱ : ۵۲۵، ۵۲۶

۱۴۔ اَلْاَرْحَمُ	لوگوں میں سب سے زیادہ رحم کرنے والا	سبل الہدای، ۱ : ۵۲۷
۱۵۔ اَلْاَزْکیٰ	لوگوں میں سب سے زیادہ پاک و صاف	حوالۂ مذکور
۱۶۔ اَلْاَزْھَرُ	جسمانی رونق اور آب و تاب والا	ماخوذ از مسلم، کتاب الفضائل، حدیث ۱۱۳۔
۱۷۔ اَلْاَسَدُّ	لوگوں میں سب سے زیادہ سیدھا اور مستقیم	سبل الہدای، ۱ : ۵۲۷
۱۸۔ اشجع النّاس	لوگوں میں سب سے زیادہ بہادر	متفق علیہ
۱۹۔ الاشدّ حیاءً	لوگوں میں سب سے زیادہ شرم و حیا والے	البخاری
۲۰۔ اَلْاَصْدَقُ	حق پرستی ہو کر ثابت قدم رہنے اور سب سے زیادہ سچ بولنے والے۔	سبل الہدای، ۱ : ۵۲۸
۲۱۔ اَلْاَطْیَبُ	لوگوں میں سب سے فضیلت، شرف اور خوشبو والے	سبل الہدای، ۱ : ۵۲۸
۲۲۔ اَلْاَعَزُّ	کثیر العزہ، کثیر الغلبہ اور کثیر القوہ	ایضاً
۲۳۔ اَلْاَعْظَمُ	اپنی ذات اور صفات میں درجۂ عظمت پر فائز	ایضاً
۲۴۔ اَلْاَعْلیٰ	لوگوں میں سب سے زیادہ بلند مرتبہ	سبل الہدای، ۱ : ۵۲۹
۲۵۔ اَلْاَعْلَمُ بِاللّٰہِ	ذات و صفاتِ الٰہیہ کا سب سے زیادہ علم رکھنے والا	البخاری
۲۶۔ اَلْاَغَرّ	شریف، کریم اور برگزیدہ	ماخوذ از قصیدہ حسان بن ثابت دیوان، ۴۷
۲۷۔ اَفْصَحُ الْعَرَب	اہل عرب میں سب سے زیادہ فصیح اللسان	سبل الہدای، ۱ : ۵۲۹
۲۸۔ اکثر الانبیا تبعاً	انبیاء کرام میں سب سے زیادہ متبع رکھنے والے	مسلم، کتاب الایمان، حدیث ۲۳۹، البخاری، کتاب الاعتصام، کتاب فضائل القرآن
۲۹۔ اَلْاَکْرَمُ	دوسروں سے زیادہ جود و کرم والے	الترمذی، ۲ / ۲۸۳، الدارمی، سنن، ۱ / ۲۶،
۳۰۔ اَکْرَمُ وُلْدِ آدم	اولادِ آدمؑ میں سب سے زیادہ معزز و مکرم	
۳۱۔ اَلْاِمَامُ	جس کی بھلائی وغیرہ کے امور میں متابعت کی جائے قصیدہ حسان بن ثابت کا ایک شعر ہے :	امام تھم یھدیھم الحق جاھداً معلم صدق ان یطیعوہ یھتدوا دیوان، ص ۵۵

۳۲ ۔ إمَامُ الخَیرِ	بھلائی کے امام	ابن ماجہ حدیث : ۹۰۶
۳۳ ۔ امام العالمین	جہانوں کے پیشوا	سبل الہدٰی ، ۱ : ۵۳۳
۳۴ ۔ امام المُتَّقِین	پرہیزگاروں کے امام	ایضاً
۳۵ ۔ امام النّاس	تمام لوگوں کے رہنما	ایضاً
۳۶ ۔ الآمِنُ	صاحب امن و عافیت	سبل الہدٰی ، ۱ : ۵۳۵
۳۷ ۔ اَلاَمِیْنُ	صاحب قوّت اور پاسدار امانت	مسلم ، کتاب الزکوٰۃ حدیث ۱۴۳ ، ۱۴۴
۳۸ ۔ اَلمأمُونُ	امانت دار	سبل الہدٰی ، ۱ : ۵۳۶
۳۹ ۔ اَوْفَی النَّاسِ ذِمامًا	اپنی ذمہ داری کو لوگوں میں سب سے زیادہ ادا کرنے والے ۔	قصیدہ حسان بن ثابت کا شعر ہے: وما حملت من ناقۃٍ فوق رحلھا ابرّ واوفیٰ ذمۃً من محمّدٍ
۴۰ ۔ اَلاَوْسَطُ	صاحب عدل و انصاف یا ہر چیز سے برتر و برگزیدہ	سبل الہدٰی ، ۱ : ۵۳۷ کسی شاعر نے کہا ہے : یا اوسط النّاس طُرًّا فی تفاخرِھم وفی تفاضلھم یا اشرف العرب
۴۱ ۔ اَلاَوَّلُ	دوسروں پر سابق اور متقدم	سبل الہدٰی ، بحوالہ بیہقی
۴۲ ۔ اَوّل شافع	سب سے پہلے بارگاہِ ایزدی میں شفاعت کرنے والے	مسلم، کتاب الفضائل، حدیث ۳
۴۳ ۔ اوّل مُشَفَّع	سب سے پہلے شفاعت قبول کیے جانے والے	ایضاً
۴۴ ۔ اَوَّلُ مَن تَنْشَقُّ عَنہُ الاَرضُ	جس کے لیے سب سے پہلے زمین شق ہوگی	ایضاً

(ب)

۴۵ ۔ اَلبَارِعُ	اپنے ہم عصروں میں علم و فضل کے اعتبار سے ممتاز	سبل الہدٰی ، ۱ : ۵۴۰
۴۶ ۔ اَلبَارقلیط	حق اور باطل میں امتیاز پیدا کرنے والے یا تعریف کرنے والے	سبل الہدٰی ، بحوالہ انجیل
۴۷ ۔ اَلبَاہِر	منوّر و روشن	سبل الہدٰی ، ۱ : ۵۴۱
۴۸ ۔ اَلبَرّ	سرچشمہ نیکی ، احسان ، طاعت اور سچائی وغیرہ ۔	سبل الہدٰی ، ۱ : ۵۴۲

(ت)

۴۹ ۔ التِّهَامِي	وادی تہامہ (سرزمین مکہ) کے رہنے والے	سبل الہدیٰ ، ۱ : ۵۴

(ث)

۵۰ ۔ الثِّمَال	لوگوں کا ماوای وملجا ، مددگار وغیرہ	ابوطالب کے حسب ذیل شعر سے ماخوذ: وَاَبْيَضَ يُسْتَسْقَى الغَمَامُ بِوَجْهِهٖ ثِمَالُ اليَتَامٰى عِصمَةٌ لِلاَرَامِلِ (ابن ہشام ، ۱ : ۲۹۵)

(ج)

۵۱ ۔ اَلْجَلِيْل	صاحب جلالت وعظمت	سبل الہدیٰ ، ۱ : ۵۴۷
۵۲ ۔ اَلْجَوَاد	صاحب جود وکرم	ایضاً

(ح)

۵۳ ۔ اَلْحَاشِرُ	جس کے پیچھے لوگوں کو جمع کیا جائے	مسلم کتاب الفضائل
۵۴ ۔ اَلْحَامِدُ	اللہ تعالیٰ کی ، جیسا کہ وہ ہیں ، تعریف بیان کرنے والے	سبل الہدیٰ ، ۱ : ۵۴۹
۵۵ ۔ حَامِلُ لِوَاءِ الْحَمْدِ	روز محشر میں علم حمد اٹھانے والے	الترمذی ، ۲ / ۲۸۲
۵۶ ۔ حَبِيْبُ اللهِ	اللہ تعالیٰ کے محبوب	سبل الہدیٰ ، ۱ : ۵۵۰ تا ۵۵۱
۵۷ ۔ اَلْحِجَازِيُّ	سرزمین حجاز کے باشندے	ایضاً ۵۵۲
۵۸ ۔ حُجَّةُ اللهِ عَلَى الْخَلَائِقِ	لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی حجت	ایضاً
۵۹ ۔ حِذرالاُمِّيِّيْن	لوگوں کو برائی سے روکنے والے اور ان کے امین ومحافظ	البخاری ۲۰/۱۲ ، کتاب البیوع ۔
۶۰ ۔ اَلْحَلِيْمُ	حلیم اور بردبار	ابوطالب کے حسب ذیل شعر سے ماخوذ: حليم رشيد عادل غير طائش يوالى اِلهاليس عنه بغافل (ابن ہشام ، ۱ / ۲۹۹)
۶۱ ۔ اَلْحَمِيْدُ	تعریف کرنے والے یا تعریف کیے جانے والے	سبل الہدیٰ : ۵۵۷
۶۲ ۔ خَطِيْبُ النَّبِيِّيْنَ	خطیب الانبیاء	الترمذی ، ۲ / ۲۸۲

۶۳ ۔ خَلِیْلُ اللّٰہِ	اللہ کے خاص دوست	مسند احمد ، ۲ / ۲۶۲
۶۴ ۔ خَلِیْفَۃُ اللّٰہِ	اللہ کے اس دنیا میں نائب	سبل الہدای ، ۱ : ۵۶۲ تا ۵۶۳
۶۵ ۔ خَیْرُ الْاَنَامِ	لوگوں میں سب سے بہتر	ایضاً
۶۶ ۔ خَیْرُ الْاَنْبِیَاءِ	انبیاء میں سب سے بہتر	ایضاً ۵۶۳ تا ۵۶۴
۶۷ ۔ خَیْرُ الْبَرِیَّہِ	مخلوقِ خدا میں سب سے بہتر	ایضاً ۵۶۴
۶۸ ۔ خَیْرُ النَّاسِ	لوگوں میں سب سے بہتر	ایضاً
	(د)	
۶۹ ۔ دَعوۃُ اِبراھِیْمَ	ابراہیم کی دُعا	مستدرک حاکم ، ۲ / ۶۰۰
	(ذ)	
۷۰ ۔ ذَکَّاراً	کثرت سے ذکر کرنے والے	مسند احمد بن حنبل ، ۱ / ۲۲۷
۷۱ ۔ ذُوطَیْبَہ	ارضِ طیبہ والے	سبل الہدای ، ۱ / ۵۶۹
	(ر)	
۷۲ ۔ اَلرَّاجِیْ	اُمیدوں کا ماوٰی	ایضاً ۵۷۱
۷۳ ۔ رَاکِبُ البراق	شبِ معراج میں براق کے سوار	ایضاً ۵۷۲
۷۴ ۔ اَلرَّجِلُ	گھنگھریالے بالوں والے	سبل الہدای ، ۱ : ۵۷۲
۷۵ ۔ رحمۃٌ مھداۃ	ہدایت کا ذریعہ بننے والی رحمت	الجامع الصغیر، للسیوطی ، ۱ : ۳۴۸
۷۶ ۔ اَلرَّشِیْدُ	راہِ مستقیم کی ہدایت دینے والے	سبل الہدای ، ۱ : ۵۷۰
۷۷ ۔ رَھَّاب	خدا تعالیٰ سے بہت زیادہ ڈرنے والے	ابن ماجہ ، حدیث ۳۸۳۰
	(ز)	
۷۸ ۔ زَعِیْمُ الاَنبیاء	سردارِ انبیاء	ابوداؤد ۲/ ۸۷ا،کتاب الادب فی حسن الخلق
	(س)	
۷۹ ۔ سابق العرب	عربوں کا پیشرو	الجامع الصغیر للسیوطی ، ۱ / ۳۶۳
۸۰ ۔ سدید	راہِ مستقیم پر گامزن	سبل الہدای ، ۵۷۹
۸۱ ۔ السُّلطان	قوی اور غالب	ایضاً ، ص ، ۵۸۱
۸۲ ۔ السیِّد	سردار رئیس ، جس کی طرف لوگ ضرورت کے وقت رجوع کریں	ایضاً ۵۸۲

۸۳ ۔ سَیِّدُ الثَّقَلَین	جنّ و انس کے سردار	سبل الہدیٰ ، ۵۷۹
۸۴ ۔ سیّد الکونین	دونوں جہانوں کے سردار	ایضاً
۸۵ ۔ سَیِّدُ وُلْدِ آدم	اولادِ آدمؑ کے سردار	الترمذی ، ۲/۲۸۲
۸۶ ۔ سَیِّدُ النَّاسِ	لوگوں کے سردار	مسلم، کتاب الایمان، حدیث ۳۲۷
	(ش)	
۸۷ ۔ الشَّارع	احکام خداوندی کا جاننے والا ، یا دین قیم کو بیان کرنے والا	سبل الہدیٰ ، ۵۸۴
۸۸ ۔ الشَّفِیع	شفاعت کنندہ	ایضاً
۸۹ ۔ شَکَّارًا	اللہ تعالیٰ کا بہت زیادہ شکر ادا کرنے والے	ابن ماجہ حدیث ۳۸۳۰، کتاب الدُّعا
۹۰ ۔ شَکُورًا	شکرگذار بندہ	البخاری، ۱/۱۴۷، باب التہجد
۹۱ الشَّمس	سورج	سُبُل الہُدیٰ ، ۱ : ۵۸۷
۹۲ صاحبُ الآیات المعجزات	معجزات اور آیات بینات والے	سُبل الہدیٰ ، ۱ : ۵۹۰
۹۳ ۔ صاحبُ التَّاج	صاحب تاج	ایضاً
۹۴ ۔ صاحبُ الرِّداء	چادر (رحمت) والے	ایضاً ، ۵۹۱
۹۵ ۔ صاحبُ السَّیف	صاحب سیف	مسند احمد حدیث ، ۵۶۶۷
۹۶ ۔ صاحبُ الشَّفاعة العظمیٰ	شفاعت عظمیٰ پر فائز	سبل الہدیٰ ، ۱ : ۵۹۲
۹۷ ۔ صاحبِ محشر	محشر والے	ایضاً
۹۸ ۔ صاحبُ المِعراج	معراج والے	ایضاً ، ۵۹۳
۹۹ ۔ الصَّادق	ہمیشہ سچ بولنے والے	البخاری
۱۰۰ ۔ الصَّبُور	مصائب پر صبر کرنے والے	سبل الہدیٰ ، ۱ : ۵۹۴ - ۵۹۵
۱۰۱ ۔ الصَّدُوق	بار بار صدق اور اخلاص کا مظاہرہ کرنے والے	ایضاً ، ۵۹۵
۱۰۲ ۔ الصَّفوح	عفو و درگذر کرنے والے	ابن ماجہ ، حدیث ، ۴۱۵۳ ، کتاب الزہد

۱۰۳ ۔ الضِّیاء	پُر زور اور ہمہ گیر نور	عمرو بن معدیکرب آپ کی شان میں کہتے ہیں : حکمۃ بعد حکمۃ و ضیاء قد ھدینا بنورھا مَن عمانا

(ط)

۱۰۴ ۔ الطَّاھر	پاک وصاف ہستی	سبل الہدای ، ۱ : ۵۹۸ (طہارت کے دس معنوں کے لیے دیکھئے کتاب مذکور)
۱۰۵ ۔ الطبیب	جسم اور نفس کا علاج کرنے والے	ایضاً ، ۵۹۸
۱۰۶ ۔ الطَّھُور	بہت زیادہ پاک وصاف	ایضاً
۱۰۷ ۔ العَارِف	اللہ کو صحیح طور پر پہچاننے والے یا صبور	سبل الہدای ، ۱ : ۶۰۰ تا ۶۰۱
۱۰۸ ۔ اَلعَالِمُ	دنیوی اور اخروی حقائق سے آگاہ	ایضاً ، ص ، ۶۰۲
۱۰۹ ۔ اَلعَلِیْمُ	(عالم کی صفت مبالغہ)	سبل الہدای ۱ : ۶۰۲
۱۱۰ ۔ اَلعَدْل	مجسمہ عدل و انصاف	ایضاً ، ۶۰۳
۱۱۱ ۔ اَلعِصْمَۃُ	ہر قسم کے گناہ سے محفوظ	الخصائص الکبری للسیوطی، ۱/۳۱۰ حسان بن ثابت کے حسب ذیل شعر سے ماخوذ : عطوف علیھم لا یثنی جناحہ الی کنف یحنو علیھم و یمھد (ابن ہشام ، ۴ / ۳۱۸)
۱۱۲ ۔ العظیم	بہت بلند مرتبہ	سبل الہدای ، ۱ : ۶۰۶
۱۱۳ ۔ العفوّ	بہت زیادہ معاف کرنے والے	حسّان بن ثابت کا شعر ہے : عفو عن الزلّات یقبل عذرھم وان احسنوا فا اللہ بالخیر اَجْوَدَ (سیرۃ ابن ہشام ، ۴ / ۳۱۸)
۱۱۴ ۔ اَلعَفِیْف	لوگوں میں سب سے زیادہ عفت و عصمت والے	سبل الہدای ، ۱ : ۶۰۷
۱۱۵ ۔ العِمَاد	مصائب اور ضرورت کے وقت لوگوں کی پناہ گاہ	ایضاً

۱۱۶ ۔ الغالب	غالب و قاہر	سبل الہدیٰ، ۱ : ۶۰۹
۱۱۷ ۔ الفائق	بلند و برتر	ایضاً، ۶۱۱
۱۱۸ ۔ الفرط	پانی تلاش کرنے کے لیے آگے بھیجا ہوا، مقدمۃ الجیش	البخاری ۴ / ۱۱۵
۱۱۹ ۔ الفہیم	سریع الفہم	سبل الہدیٰ ۱/ : ۶۱۳
۱۲۰ ۔ فئۃ المسلمین	مسلمانوں کی جماعت	ابوداؤد، ۱ / ۲۶۱، کتاب الجہاد الترمذی، ۱ / ۳۲۰

(ق)

۱۲۱ ۔ القاری	سخی اور فیاض	البخاری، ۱/ ۳، مسلم حدیث ۲۵۳ کتاب الایمان
۱۲۲ ۔ القاسم	تقسیم کنندہ	البخاری
۱۲۳ ۔ القائد	قائد، سردار	الترمذی، ۲ / ۲۸۲
۱۲۴ ۔ قائد الخیر	قائد خیر	ابن ماجہ
۱۲۵ ۔ القرشی	قریش کی طرف نسبت	سبل الہدیٰ، ۱ : ۶۱۷
۱۲۶ ۔ الکریم	شریف اور سخی	سبل الہدیٰ، ۱ : ۶۱۹
۱۲۷ ۔ اللبیب	ذہین و فطین	ایضاً، ۶۲۰
۱۲۸ ۔ الماحی	کفر کو مٹانے والے	بخاری و مسلم
۱۲۹ ۔ المامون	قابل اعتبار و امانت	سبل الہدیٰ، ۱ : ۶۲۱
۱۳۰ ۔ المبارک	صاحب برکت و خیر	حسّان بن ثابت کا شعر ہے : صلی الالٰہ ومن یحف بعرشہ والطیّبون علی المبارک احمد دیوان : ۵۸
۱۳۱ ۔ المبتہل	اللہ کے حضور عاجزی اور تضرع اختیار کرنے والے	سبل الہدیٰ، ۱ : ۶۲۳
۱۳۲ ۔ المبعوث بالحق	پیغام حق دے کر بھیجے جانے والے	ایضاً
۱۳۳ ۔ المتقن	حاذق، عقلمند، ذکی وغیرہ	ایضاً، : ۶۲۵
۱۳۴ ۔ المتقی	پرہیزگار	سبل الہدیٰ، ۱ : ۶۲۵
۱۳۵ ۔ المتمم لمکارم الاخلاق	اخلاق حسنہ کی تکمیل کرنے والے	موطا، باب حسن الخلق، مسند احمد ابن حنبل وغیرہ ۔

۱۳۶۔ المجتبٰی	منتخب اور برگزیدہ	سبل الہدٰی ، ۱ : ۶۲۷
۱۳۷۔ المجتہد	مقاصد معلومہ کے لیے جدوجہد کرنے والے	ایضاً
۱۳۸۔ المحمود	بے پناہ تعریف کئے ہوئے	حسّان بن ثابت کا شعر ہے : فاصبح محمود الی اللہ راجعاً یبکیہ حق المرسلات و یحمد (دیوان حسان، ص : ۴۷)
۱۳۹۔ المختصّ بالقرآن	دوسروں پر قرآن کی بناء پر فضیلت رکھنے والے	سبل الہدٰی ، ۱ : ۶۲۹
۱۴۰۔ المدنی	صاحب مدینہ	ایضاً ۶۳۰
۱۴۱۔ مدینۃ العلم	شہر علم	الترمذی ، ۲/۲۹۹ کتاب المناقب
۱۴۲۔ اَلْمُرْتَجٰی	لوگوں کی اُمیدگاہ	سبل الہدٰی ، ۱ : ۶۳۱
۱۴۳۔ اَلْمُرْتَضٰی	اپنے رب کے محبوب اور پسندیدہ	ایضاً ۶۳۲
۱۴۴۔ اَلْمُرْشِد	ہادی	ایضاً
۱۴۵۔ اَلْمَصْدُوْق	سچے تسلیم شدہ	ایضاً ۶۳۸
۱۴۶۔ اَلْمُصْطَفٰی	منتخب و برگزیدہ	ایضاً
۱۴۷۔ اَلْمُعَلِّم	خیر اور بھلائی کی تعلیم دینے والے	الدارمی، ابن ماجہ، حدیث ۲۲۹
۱۴۸۔ اَلْمُعِیْن	ضعیفوں اور بے آسرا لوگوں کی مدد کرنے والے	البخاری ، ۱/۳
۱۴۹۔ اَلْمُقْسِط	انصاف کرنے والے	سبل الہدٰی ، ۱ : ۶۴۳
۱۵۰۔ اَلْمُقَفّٰی	جس کے بعد اور کوئی نبی نہ آسکے	کتاب فضائل الصحابہ حدیث ۱۲۱
۱۵۱۔ اَلْمُوْقِن	دعوتِ اسلام پر پختہ یقین رکھنے والے	سبل الہدٰی ، ۱ : ۶۵۰
۱۵۲۔ اَلنَّاسِخ	سابقہ شرائع کو منسوخ کرنے والے	ایضاً ۶۵۲
۱۵۳۔ نَبِیُّ الرَّاحَۃ	آرام و آسائش والے نبی	ایضاً ۶۵۴
۱۵۴۔ نَبِیُّ الرَّحْمَۃ	رحمت والے نبی	ایضاً
۱۵۵۔ نجی اللہ	اللہ تعالیٰ سے مناجات (سرگوشی) میں گفتگو کرنے والے	ایضاً ۶۵۵
۱۵۶۔ ہاشمی	خاندان بنی ہاشم کے چشم و چراغ	ایضاً ۶۵۹
۱۵۷۔ الہدٰی	سرچشمۂ ہدایت	ایضاً ۶۶۰
۱۵۸۔ اَلْوَافِی	اپنی ظاہری اور باطنی صفات میں مکمل	ایضاً ۶۶۱

ادب قبل از اسلام میں ذکرِ رسولؐ

سید آلِ احمد رضوی

جب سے انسان نے اس عالمِ رنگ و بو میں قدم رکھا ہے۔ اس وقت سے دنیا کے تمام خطوں، معاشروں اور قبائل اور بلاد و امصار میں مختلف اوصاف و کمال کے لوگ پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ ان میں سے کچھ نے اپنے کارناموں کی وجہ سے تاریخ انسانیت پر گہرے نقوش ثبت کیے۔ بعض نے مقامی طور پر شہرت حاصل کی اور بعض اپنی تمام تر خوبیوں کے باوصف وقت کے دھارے کے ساتھ بہہ گئے۔ کہ ان کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔ بہرحال یہ سب عظیم شخصیتیں تھیں۔ جنہوں نے زندگی کے مختلف شعبوں میں کارہائے نمایاں سرانجام دیئے۔ ان میں بعض کا تعلق سائنس سے تھا بعض کا فنون سے۔ بعض مصلح تھے اور بعض محض کاروباری۔ بعض نے سوزنِ عقل سے چاک گریبانوں کی رفوگری کا کام کیا بعض نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا۔ بعض نے آسمانی بجلی، قوت اور خیرگی سے متاثر ہو کر پانی کی سیلابی قوت کو تسخیر کر کے بجلی کے قوی ہیکل دیو کو انسان کی خدمت پر مامور کر دیا۔ جس کے دم قدم سے آج عالم انسانیت بقعۂ نور بنا ہوا ہے اور انسانی ضروریات کی لاتعداد اشیاء پیدا ہو رہی ہیں۔ کسی نے طب کی دنیا میں انقلاب برپا کیا۔ کسی نے جراحت میں بڑا نام پایا۔ کسی نے شعر و ادب سے انسانی جذبات کی ترجمانی کی۔ کسی نے شعر کو نغمے میں ڈھال کر موسیقی کو جنم دیا۔ جو ہمارے اذہان اور پژمردہ قلوب کے لئے اکسیر کا کام کرتی ہے۔ غرضیکہ زندگی کے مختلف شعبوں میں مختلف باہنر اور باصلاحیت لوگوں نے انسان کی خدمت کی اور لوگ ان سے ان شعبوں کی حد تک متاثر بھی ہوتے رہے لیکن ان تمام مادی ترقیوں اور آسائشوں کے باوجود انسان کو ہر دور میں ایسی شخصیت کی ضرورت رہی جو اسے ذہنی سکھ، قلبی اطمینان اور روحانی بالیدگی دے سکے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان تمام شخصیتوں اور کیفیتوں کے درمیان ہر دور میں ایسی شخصیات جنم لیتی رہی ہیں۔ جنہوں نے انسان کی آسودگی اور رفاہیت کے لئے کام کیا۔ یہ مصلحین اور انبیاء علیہم السلام کی جماعت تھی۔

اس مقدس جماعت کے سامنے بہت سی مشکلات رہیں۔ خاص طور پر ازمنہ قدیم میں جب عقل انسانی محدود تھی، ذرائع حمل و نقل اور ابلاغ مسدود تھے۔ دنیا کا رقبہ وسیع لیکن آبادی کم اور منتشر تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا پیغام نہ تو آفاقی تھا اور نہ عالمگیر ان سب نے اپنی اپنی جگہ پیغام حق سنایا اور انسانیت کی رہنمائی کی۔ تاہم ان برگزیدہ شخصیتوں نے ایک آفاقی اور عالمگیر شخصیت کی آمد کی نشاندہی ضرور کی۔

مذاہب عالم میں سب سے قدیم مذہب تاریخی طور پر ہندومت ہے جو تقریباً چھ ہزار سال پرانا ہے۔ ہنود کی یوں تو مختلف مذہبی کتب ہیں لیکن ان میں زیادہ مشہور چار وید یعنی "رگ وید" سام وید" یجر وید" اور "اتھر وید" جو اپنی نوعیت اور اہمیت کے لحاظ سے آج بھی مقدس اور محترم مانے جاتے ہیں ان ویدوں میں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کیطرف

خاص واضح اشارات ملتے ہیں۔ مثلاً سام وید کے ایک منتر میں اس کا اظہار یوں ہوتا ہے۔

احمد نے اپنے پرماتما سے سندر آورش اور پرکار دیکھا میں سورج کی طرح روشن ہو رہا ہوں (رشی وتسہ کنو)

(سام وید پرپھاٹک ۲ رشتی ۶ منتر ۸)

اس اشلوک میں ایک تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام "احمد" کے متعلق واضح طور پر لکھا گیا۔ دوسرے آپ کی حکمت سے لبریز شریعت کا تذکرہ اور تیسرے آپ کو (رشی وتسہ کنو) یعنی سورج کی مانند روشن جو دراصل "سراجاً منیرا" کا متبادل لفظ ہے، سے تعبیر کیا گیا ہے۔

یجروید میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت مبارکہ کی طرف اشارہ یوں ملتا ہے۔

الانک نج الوجان محمد الانک کرمان حان تیجان نند مانی حبان حبان منماجے

جیوسان کحبان۔ (شہادۃ الاقوام)

اتھروید کے بعض منتروں میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق جو اشارات ملتے ہیں وہ یہ ہیں

اے لوگو! بڑے زور شور سے سنو! مہامت لوگوں میں ظاہر ہوگا۔ ہم ہجرت کرنے والے کو ساٹھ ہزار اور نوے دشمنوں سے پناہ دیں گے۔ اس نے مامح رشی کو سینکڑوں سونے کے سکے، دس حلقے، تین سو عربی گھوڑے اور دس ہزار گائیں دیں۔

(اتھروید کانڈ۔ ۲۰۔ سوا گت ۱۲۷۔ منتر ۱ تا ۳)

یہاں مہامت اور مامح رشی سے مراد حضرت محمدؐ کی ذات گرامی ہے۔ زبان اور لہجے کے اختلاف کی وجہ سے لفظ "محمدؐ" کو مہامت بنا دیا گیا ہے۔ معنوں کے اعتبار سے بھی اس کا اطلاق حضورؐ ہی کی ذات پاک سے ہوتا ہے۔ مفہوم کے اعتبار سے بھی اس کا اشارہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کی طرف ہے۔ ان منتروں سے جو بات ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ مہامت رشی (حضرت محمدؐ) پہلے ہجرت کریں گے اور پھر ان کو فتح حاصل ہوگی۔ دس حلقے سے مراد عشرہ مبشرہ ہیں تین سو عربی گھوڑوں سے مراد اصحاب بدر ہیں اور دس ہزار گائیں سے مراد وہ دس ہزار صحابہ کرامؓ ہیں جو فتح مکہ کے روز حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تھے۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ وہ دس ہزار قدسیوں کے ساتھ آئے گا۔ (کتاب استثنا باب ۳۳ آیت ۱) اور حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا! دس ہزار آدمیوں کے درمیان جھنڈے کی مانند کھڑا ہوگا۔

(غزل الغزلات باب : ۵)

بھگوت گیتا میں سری کرشن مہاراج کی تعلیمات میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق واضح اشارات موجود ہیں مثلاً ایک جگہ وہ فرماتے ہیں۔

جب دھرم کی ہانی ہوتی ہے اور ادھرم بڑھ جاتا ہے، تب خدا ایسے شخص کو کھڑا کرتا ہے جو نیک لوگوں کی رکشا کرتا ہے اور پاپوں کا ناس کر کے دھرم کو قائم کر دیتا ہے۔

(گیتا باب چہارم)

اس تحریر میں اگرچہ وضاحت کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام نامی نہیں بتایا گیا تاہم جو حالات بیان کئے گئے ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ بین السطور آپ ہی کی ذات گرامی ہے۔

مہابھارت بھی ہندوؤں کی مقدس کتاب ہے اس میں بھی بعض مقامات پر حضور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تذکرہ ملتا ہے۔ ایک جگہ درج ہے۔

کل جگ کے آخر میں کلنکی اوتار پیدا ہونے والا ہے۔

(مہابھارت شانتی پرو دھانیہ : ۳۴۰)

کل جگ سے مراد وہی زمانہ ہے جو قرآن کی زبان میں ظهر الفساد فی البر والبحر سے تعبیر کیا گیا ہے یعنی حضورؐ کی بعثت کے وقت انبیاء ماسبق کی تعلیمات کو یا تو بھلا دیا گیا تھا یا ان سے بگاڑ پیدا کر دیا گیا تھا۔ افق عالم پر اندھیری راتوں اور طاغوتی طاقتوں کے حصار نے اچھے اور برے کی تمیز ختم کر دی تھی۔ لوگ خود تراشیدہ بتوں کی پوجا کرنے لگے تھے۔ وہ سچائی کو بھول بیٹھے تھے۔ حلال و حرام کی تمیز ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ عرب کا یہ حال تھا کہ وہاں نہ کوئی ضابطۂ حیات تھا اور نہ وہاں کے رہنے والوں میں اطاعت امیر کا تصور تھا۔ بتوں کی خوشنودی کے لئے انسانوں کو بھینٹ چڑھانا۔ لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے اور انہیں مار ڈالنے کا بھی رواج تھا۔ غرض ہر طرف جنگل کا قانون جاری تھا۔ دھرتی کا گوشہ گوشہ انسانوں کے لہو سے لالہ زار بنا ہوا تھا۔ ایسے لوگوں میں جہاں معاشرتی برائیاں عام تھیں۔ رہزنی، لوٹ کھسوٹ اور قتل و غارت گری کا بازار گرم تھا اور پورا معاشرہ انتشار اور فساد کی آماجگاہ بن چکا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی و رسول محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث کیا۔ کلنکی اوتار سے مراد آپ ہی کی ذات اقدس ہے کیونکہ یہ "نشکلنک اوتار" بھی ہوگا جو دنیا کی حالت درست کرنے کے لئے پیدا ہوگا۔

بھوشیہ پران حصہ ۴ پرتی سرگ پروباب ۲۵ صفحہ ۵۹۷، اشلوک ۸ - ۱۰ اس کا تذکرہ ان الفاظ میں بھی کیا گیا ہے۔

گئے دیوتاؤ! سنبل گرام میں یہ کنٹب پیدا ہوگا۔ وہ وشنو ایشیا کے نام سے مشہور ہوگا۔ وشنو کیرتی اس کی چہیتی بیوی ہوگی۔

یعنی عرب میں وہ پیغمبر پیدا ہوں گے اور رسول اللہ کے نام سے مشہور ہوں گے۔ ان کی چہیتی بیوی کا نام خدیجۃ الکبریٰ (وشنو کیرتی) ہوگا۔

ایک سمرتی میں لکھا ہے کہ کلنکی اوتار (یعنی دنیا کا سب سے بڑا اوتار) کی جائے پیدائش کی نشانی یہ ہے کہ اس ملک میں دست آور پتی بہت ہوتی ہے اور یہ حقیقت ہے کہ سناء مکی جس کی خاصیت یہی ہے مکہ معظمہ میں کثرت سے پیدا ہوتی ہے۔

اسی مفہوم کی عبارت ہندوؤں کی مقدس کتب میں اور بھی کئی جگہوں پر لکھی ہیں۔ پستک بہادروں کے دسویں اسکنڈ میں آپ کے بارے میں جو معلومات ملتی ہیں وہ یہ ہیں۔

"زمین کے بیچوں بیچ سورج کی طرف، بڑے خاندان میں خدا کا اوتار ہوگا۔ اس ملک کا پتہ یہ ہے کہ وہاں دست لانے والی پتی ہوگی۔ لوگ اس کے وسیلہ سے پاک ہوں گے۔ گناہوں سے نجات حاصل کریں گے اس

کا دامن پکڑ کر بڑے دریا کے پار اتریں گے۔ اس سرزمین پر جہاں پیارا لڑکا خدا کے قدموں کو چھوڑ کر ظہور کریگا ان پہاڑوں پر گھاس نہ ہوگی اس کا قول یہ ہوگا کچھ دیا کرو نہیں تو لڑو یا ہماری بات مانو۔ خدا کا نام ہوگا اس کے پاس وہ ایک دفعہ خدا کے پاس جائے گا۔ پھر اترے گا۔ کاٹنے والا گناہوں کا۔

(سمرت وسما اسکنت ۔ شہادت الاقوام)

اس عبارت کا اگر تجزیہ کیا جائے تو اس کا مفہوم یہ نکلتا ہے کہ زمین کی ناف (مکہ) جہاں سنا دکی کی بوٹی پیدا ہوتی ہے۔ وہاں ایک عالی وقار رسولؐ کا ظہور ہوگا جن کے وسیلے سے لوگوں کو گناہوں سے نجات ملے گی۔ اور ان کے پیروکار سمندر پار کے علاقے تسخیر کریں گے۔ اور انہیں بارگاہ الٰہی میں معراج کی سعادت حاصل ہوگی۔ آپؐ دعوت حق اس طرح دیں گے کہ اسلام قبول کرو، یا جزیہ دو اور ہم تمہاری حفاظت کا ذمہ لیتے ہیں۔ ورنہ تلوار تمہارے درمیان فیصلہ کرے گی۔

اس تحریر سے صاف، واضح ہو جاتا ہے کہ زیر غور شخصیت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اقدس ہے۔ آپؐ کے اصحاب نے سلطنت روم اور سلطنت ایران میں پرچم اسلام لہرایا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سفر معراج پر لیجایا گیا۔ قرآن کریم میں ارشاد ربانی ہے۔

سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ (سورۃ بنی اسرائیل آیت ۱)

پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندہ (محمدؐ) کو شب کے وقت مسجد حرام (کعبہ) سے مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) تک جس کے گرداگرد ہم نے برکتیں کر رکھی ہیں لے گئی تاکہ ہم ان کو اپنے کچھ عجائبات قدرت دکھلا دیں۔ بیشک اللہ تعالیٰ بڑا سننے والا اور بڑا دیکھنے والا ہے۔

ہندوؤں کی ایک اور مقدس کتاب پوتھی رامائن رام مصنفہ بیاس جی و مترجمہ تلسی داس کانڈ ۱۲ اسکنڈ ۲۱۲ میں ہے۔

دید پران ست مت ، بھاکوں ۔۔۔ نہ پر نہ کچھ بات میں راکھوں
برکھ سس وس سے ندرم ہوئی ۔۔۔ نہ کی بعد نہ پاوے کوئی
عرب دیش بھرکتا سہائی ۔۔۔ سو تھل بھوم گت سکھ رائی
سمجھو ست ، تاکو ، ہوئی ۔۔۔ سندرم دیش تستہ کوئی
سمبت بکرم دودان کا ۔۔۔ مہاکوک سنس چیتر پتنگا
راج نیتی بھو پریت دھکارے ۔۔۔ ان مت سب کو سمجھا دے
چیتر سندرم ست پیاری ۔۔۔ تنکے ہتلش ہوا دے بہو بہاری ،
تب لگ سندرم چھپچھ کرئی ۔۔۔ بنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پار نہ ہوئی
تب ہوئے سنگ لنگ اوتارا ۔۔۔ مہدی کہے سکل سنسارا

سندرم تمام پھر نہیں ہوئے
تلسی بچن ست مت کوئی

یعنی جو ویدوں اور پرانوں میں لکھا ہے وہی کہوں گا۔ طرف داری اور جانبداری میں کچھ نہیں کہوں گا۔ دس ہزار برس تک ولائت ختم ہوگی۔ اس کے بعد پھر یہ مرتبہ کسی کو نہ ملے گا۔ (نبوت ختم ہو جائے گی) ملک عرب میں ایک خوشنما ستارہ ہوگا۔ اچھی شان کی زمین ہوگی اس سے معجزات کا ظہور ہوگا۔ سمت بکرماجیت میں سمندروں کی تعداد کے برابر صدی میں پیدا ہوگا۔ سمندر سات ہیں اس لئے کہ ساتویں صدی بکرمی میں اندھیری رات میں آفتاب کی مانند چمکے گا۔ بہت عمدہ حکمرانی کرے گا۔ اپنا عقیدہ (دین) سب کو سمجھاتے گا۔ اس کے چار خلفاء ہوں گے۔ اس کی نسل سے بڑا رعب پیدا ہوگا۔ اس کے دین کے جاری ہونے سے جو کوئی خدا تک پہنچے گا۔ وہ بغیر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وسیلے سے پار نہ ہوگا۔ پھر ایک کامل شخص ہوگا۔ (اس کی اولاد سے) جسے تمام دنیا اس کو مہدی کہے گی۔ اس کے بعد پھر ولایت نہ ہوگی۔ یعنی وہ قریب قیامت کے نزدیک آئیں گے۔ تلسی داس سچ کہتا ہے۔

ہندوستان بلکہ ایشیائے قدیم کا سب سے وسیع مذہب بدھ مت ہے۔ اس کے بانی گوتم بدھ تھے۔ جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ سنہ ۶۴۲ ق م میں پیدا ہوئے اور سنہ ۵۶۲ ق م میں اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ گوتم بدھ کے پرستار آج بھی دنیا کے مختلف علاقوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ بدھوں کے پاس کوئی روحانی کتاب نہیں جو کچھ بھی ہے وہ گوتم بدھ کے مکالموں اور خطبات کی صورت میں ہے۔ گوتم بدھ کے بارے میں ایک مشہور واقعہ ہے کہ جب ان کا وقت رحلت آ پہنچا تو ان کے ایک بھکشو نے ان سے عرض کیا کہ ان کے بعد دنیا کو کون تعلیم دے گا؟ اس کے جواب میں گوتم بدھ نے فرمایا۔

نندہ! "میں پہلا بدھ نہیں ہوں جو زمین پر آیا۔ نہ میں آخری بدھ ہوں۔ اپنے وقت پر دنیا میں ایک بدھ آئے گا۔ پوتر، مندر، پردے والا، کرم کار، بے مثال، جو زندگی کے حقائق میں ظاہر کرتا ہوں وہ بھی ظاہر کریگا اور میری طرح ایک مکمل نظریہ حیات کا پرچار کرے گا۔"

بھکشو نندھ نے پوچھا! اس کو کس طرح پہچانیں گے؟ مہاتما بدھ نے فرمایا:۔ کہ "مترییا" کے نام سے موسوم ہوگا۔

(اقتباس اخبار لیڈر الہ آباد - ۱۶ اکتوبر سنہ ۱۹۳۰ء)

مترییا سنسکرت کا لفظ ہے۔ جس کے لغوی معنی ہیں۔ دوستی، خیر خواہی، رحم والا، محبت والا، ہمدردی والا، شفقت والا مخلوق کی خیر خواہی کرنے والا اور رحمت والا۔ یہ تمام صفات ہادی اعظم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔ رحمت والا۔ جو حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک لقب ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ

(سورۃ الانبیاء: ۱۰۷)

اور ہم نے (اے محمدؐ) آپؐ کو تمام عالموں کے لئے رحمت تمام بنا کر بھیجا۔ اس کے علاوہ بھی اس پیشین گوئی میں جو الفاظ ہیں وہ آپؐ پر پوری طرح صادق آتے ہیں۔ نیز مکمل نظام حیات آپؐ ہی نے دیا۔ جبھی تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اقوام عالم کو وہ پیغام دے چکے۔ جس سے ان کی دنیوی اور اخروی فلاح وابستہ تھی اور یہ پیغام مکمل نظام حیات کی صورت میں تھا۔ تو یہ آیت نازل ہوئی۔

اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا

آج ہم نے آپؐ کیلئے دین کو مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت آپؐ پر تمام کر دی اور آپؐ کیلئے دینِ اسلام کو پسند کرلیا ہے۔
گوتم بدھ کی ایک اور پیشن گوئی حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی آمد سے متعلق ملتی ہے۔ کتاب "چکا دتی سنگھ ناد" سنتاڈی (۳ : ۷۶) میں لکھا ہے۔

بھائیو! اس وقت دنیا میں ایک اعلیٰ ہستی مبعوث ہو گی۔ اس کا نام برگزیدہ "میتریا" ہو گا۔ کامل معرفت والا حکمت، نیکی اور سردر مطلق والا۔ تمام عالمین کا عالم بے نظیر۔ ہدایت کے مستحق لوگوں کا ہادی، ملائکہ اور انس کا معلم ایک بدھ اعظم جیسا میں اس وقت ہوں۔ وہ کامل طور پر جانے گا۔ اور دیکھے گا گویا کہ یہ کائنات اس کی رو برو اپنی ساری ارواح عرفاجن و شیاطین، برہمنوں، کشتریوں، ویشوں کے ساتھ موجود ہے۔ جیسا کہ میں برای العین اسے دیکھ اور جان رہا ہوں۔ صداقت اپنی اصل پیاری کامل اپنی اٹھتی ہوئی خوبصورتی میں ہو گی اور اعلیٰ زندگی کی معرفت مع اپنے کمال وصفائی اصلی روح اور الفاظ دونوں کی وساطت سے ظاہر کی جائے گی جیسا کہ میں اب ظاہر کرتا ہوں۔ اس کے ساتھ ہزاروں صحابہ کی جماعت ہو گی جیسا کہ میرے ساتھ چند سو کی جماعت ہے۔

(اردو ترجمہ کتاب مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ از چوہدری غلام رسول صفحہ ۸۰)

گوتم بدھ کی یہ پیشن گوئی بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی آمد کی طرح واضح اشارہ کر رہی ہے جن صفات کا گوتم بدھ نے تذکرہ کیا وہ سب کی سب ہادی عالم محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں پائی جاتی ہیں۔ پیشن گوئی کے آخری الفاظ کہ آپؐ کے ساتھ ہزاروں صحابہ کی جماعت ہو گی، سے بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے صحابہ مراد ہیں۔ فتح مکہ کے وقت آپ کے ساتھ دس ہزار اصحاب تھے اور آخری خطبہ حجۃ الوداع کے وقت آپ کے سامنے ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابہ کا جمِ غفیر تھا۔

ایشیاء کے قدیم ترین مذاہب میں پارسی مذہب کا شمار بھی ہوتا ہے۔ جس کے بانی زرتشت تھے۔ انہوں نے اپنی تبلیغ کا آغاز قفقاز شہر سے کیا پھر ان کے پیروکاروں کا سلسلہ بڑھتے بڑھتے آذربائیجان اور ایران تک جا پھیلا۔ زرتشت کے زمانہ کے بارے میں محققین میں شدید اختلاف ہے۔ کچھ کے نزدیک زرتشت کا زمانہ ایک ہزار سال قبل مسیح ہے اور کچھ کے نزدیک گیارہ سو سال قبل مسیح۔ موجودہ تحقیق کے مطابق وہ سنہ ۶۶۰ ق م میں پیدا ہوئے اور سنہ ۵۸۶ ق م میں ان کا انتقال ہوا۔ جناب زرتشت کی تعلیمات ان کی مشہور زمانہ کتابوں "ژنداوستا" اور دساتیر (یعنی شرح دقوانین کی کتاب) میں ملتی ہیں۔ ان کتابوں میں بھی پیغمبر اعظم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور دینِ اسلام کی بشارت کا ذکر ہے۔ ژنداوستا میں جو پیشین گوئی ہے اس کا مفہوم یہ ہے۔

عنقریب عرب میں ایک عظیم نبی مبعوث ہو گا۔ اس کا نام سوالیش کنیت (لوگوں کو فائدہ پہنچانے والا) ہو گا۔ اس کی سب سے بڑی صفت یہ ہو گی کہ وہ استوت اریتا ہو گا۔ اسے تمام بنی نوع انسان کی رہنمائی اور بہتری کے لئے بھیجا جائے گا اور جب اس کی شریعت پر ایک ہزار سے زیادہ عرصہ گذر جائے گا تو اس دین میں ایسی باتیں پیدا ہو جائیں گی کہ یہ پہچاننا مشکل ہو جائے گا کہ یہ دین وہی ہے جو قرنِ اوّل میں تھا۔"

یہ پیشین گوئی ایسی روشن ہے جیسے سورج کی چمک۔ اس کا اطلاق واضح طور پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات پاک پر ہوتا ہے۔ پیشین گوئی میں "سوالیش بینت" کے معنی ہیں لوگوں کو فائدہ پہنچانے والا جبکہ "استوت ارینا" کا مطلب ہے تمام قوموں کو یکجا کرنے والا، حامی، مددگار اور دست گیری کرنے والا۔ اسے تمام بنی نوع انسان کی رہنمائی اور بہتری کے لئے بھیجا جائے گا۔ قرآن میں اس کی تصدیق یوں کی گئی ہے۔

وَمَا أَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاس (سورۃ سبا : ۲۸)

ہم نے آپ کو تمام بنی نوع انسان کی طرف بھیجا۔ بلاشبہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت پورے عالم کے لئے تھی اور اس سے ہر قوم اور ہر ملک کے لوگ یکساں مستفید ہو سکتے ہیں۔

پارسیوں کی دوسری مذہبی کتاب "دساتیر" جو ان کے نزدیک مستند کتاب ہے اس کے دو حصے ہیں "خورد دساتیر" اور "کلاں دساتیر"۔ ان دساتیر کی جلدوں میں ۱۶ مخطوط ہیں۔ جو علیحدہ علیحدہ پارسیوں کے پیشواؤں کی طرف منسوب ہیں۔ اس میں سلسان اوّل کے نامۂ مبارک میں یہ لکھا ہے۔

نامہ شت ساسان نخست آئینہ (۵۴) (بہ زبان ژند) کے مطابق:

۱ : چم چم کا جام کند ہرنوار جیام درتارہ ہنبال ہلور چوں چنیں (۵۴)

۲ : یو ہزار لسا مام ہوتاک دنیز تاک دمیراک سردم ارند کہ از پیردان (۵۵)

۳ : بیرن فرشائے نیجار دبیمار وگوار آبادلی جوار بدہ سنابنید۔ بجائے پیکر (۵۶، ۵۷)

۴ : دندرا ہند شائے بیمارام مدیر دانغورام ہام دنیفوو تیواک دشابام شما در باز سنانند جائے آتش کدہ ہائے وگرد ہائے ان ترس دبلخ وبابائے دبابائے بزرگ (۵۸، ۵۹)

اس نامہ مبارک کا فارسی میں بھی ترجمہ ہوا۔ جو یوں ہے۔

چوں ایرانیاں چنیں کارہا کنند از تازیان مردے پیدا شود۔ از پردان او دیہیم و تخت و کشور و آئین ہمہ برا فتد۔ دشوند سرکشاں زیر دستان بنید۔ بجائے پیکرگاہ آتش کدہ آباد سے بے پیکر شدہ نماز بردں سو۔ دباز ستانند جائے آتش کدہ ہائے مدائن دگردہائے آں دطوس دبلخ دجائے بزرگ۔

یعنی جب ایرانیوں میں خرابیاں پیدا ہوں گی اور وہ بڑے افعال کریں گے تو عرب میں ایک مرد کامل (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پیدا ہوگا۔ جن کے پیروکار ایران کے تاج و تخت اور قوانین کو مٹا دیں گے اور بڑے بڑے سرکش زبردست لوگ زیر دست ہو جائیں گے۔ تم دیکھو گے کہ بت خانہ اور آتش کدہ کی جگہ پر بے تصویر خانہ کعبہ ہوگا اور اس کی جانب نماز پڑھی جائے گی۔ یہی نہیں (لوگ) (مسلمان) شہروں کے آتش کدے اور ان کے قریب وجوار میں اور طوس اور بلخ اور بڑے بڑے مقامات اپنے قبضہ میں کرلیں گے۔

(سفرنگ دساتیر صفحہ ۱۸۸ مطبوعہ ۱۲۸۰ھ آیت ۵۴ تا ۶۰)

زرتشت مذہب کے ایک بڑے عالم حکیم جاماسپ نامی گذرے ہیں۔ جنہیں ستارہ شناسی میں خاص ملکہ حاصل تھا۔ انہوں نے

گشتاسپ شاہ ایران کے حکم سے نجوم کی ایک کتاب "جاماسپ نامہ" تیار کی اس کتاب میں وہ لکھتے ہیں۔

"جب ستارے خانہ آتشی، برج حمل میں جمع ہو جائیں گے۔ زہرہ برج حمل میں ہوگا۔ آفتاب برج ثور اور برج جوزا دونوں میں اور مریخ برج دلو میں ہوگا تو اس وقت، ایک مرد کامل، سرزمین عرب سے نکلے گا جو نسل ہاشمی سے ہوگا۔ بزرگ سر مقدس وجود جو اپنے جد کے مذہب پر ہوگا۔ اور سیاہ کثیر کے ہمراہ ایران پر حملہ کرے گا اور گویا ایران کو از سر نو آباد کرے گا۔ زمین اس کے انصاف سے بھر جائے گی۔ حتیٰ کہ بھیڑیے بکری کے ساتھ پانی پئیں گے۔"

اس سے زیادہ واضح الفاظ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت مبارکہ کی پیشین گوئی اور کیا ہو سکتی ہے اوپر ہم نے صرف ان رہنماؤں اور کتابوں کا تذکرہ کیا ہے جن کا تعلق غیر الہامی مذاہب میں ہوتا ہے۔ الہامی مذاہب میں اسلام کے علاوہ یہودیت اور عیسائیت دو مذاہب قابل ذکر ہیں۔ ان کے تمام انبیاء و رسل امت مسلمہ کے نزدیک محترم ہیں۔ اور وہ انہیں اللہ کے رسولوں اور پیغمبروں میں شمار کرتے ہیں قبل اس کے کہ ہم ان انبیاء علیہم السلام کی پیشین گوئیوں کا تذکرہ کریں۔ بہتر ہوگا کہ ان برگزیدہ پیغمبروں کی پیشین گوئیاں تحریر کی جائیں جن کا تذکرہ تینوں الہامی مذاہب کی کتب میں ملتا ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام جو ابوالبشر ہونے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر پیغمبر بھی تھے۔ تاریخ و سیر کی کتب میں ولادت رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے متعلق ان کی بہت سی پیشین گوئیوں کا ذکر ملتا ہے۔ صحف آدم علیہ السلام میں بہت سی ایسی بشارتیں ملتی ہیں۔ محققین کے مطابق اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو یوں مخاطب کیا۔

اے آدمؑ! جو شخص میرے اس گھر (خانہ کعبہ) کی زیارت سے مشرف ہوگا۔ اسے میری زیارت نصیب ہوگی اور وہ میرے ہی خوان احسان پر مہمان ہوگا اور میرے ہی کرم و احسان سے محفوظ ہوگا۔ اور اسے میں اپنے وصال سے مشرف فرماؤں گا۔ ایک وقت آئے گا کہ تیری اولاد میں سے ایک سلیم القلب اور کریم النفس انسان آئے گا جس کا نام ابراہیم ہوگا۔ وہ میرے گھر کی تعمیر کرے گا۔ اسے ظاہری عمارت کی شکل دیگا۔ آب زمزم کا چشمہ اسی حرم کی حدود میں ظاہر ہوگا۔ میں ابراہیم کو حرم کے تمام مناسک اور شعائر سکھا دوں گا۔ پھر دنیا کے ہر گوشے سے روسا اور مخصوص لوگوں کو اس سرزمین میں آباد کروں گا۔ یہ لوگ میرے گھر کا احترام کریں گے اور اس کی عزت و توقیر میں اضافہ کرتے رہیں گے۔ حتیٰ کہ یہ سلسلہ تیرے فرزند ارجمند تک جو تیری اولاد میں افضل ترین ہوگا پہنچے گا۔ اس کا نام نامی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہوگا۔ وہ حسن و جمال میں بدر کامل ہوگا اور اوصاف و کمال میں انسانوں کا امام اور پیشوا ہوگا۔ اس شہر کی امامت اور پیشوائی اسی پیغمبر اور عالی ہمت ہستی کو بخشی جائے گی۔ وہ اس گھر کے احترام کو زندہ کرے گا۔ اور روز محشر تک اسے میری عبادت گاہ اور زیارت گاہ بنا دے گا۔ وہ برگزیدہ پیغمبر خاتم الانبیاء ہوگا۔ رسول آخر الزمان ہوگا۔ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

حضرت شیث علیہ السلام حضرت آدم علیہ السلام کے فرزند تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بھی نبوت سے سرفراز کیا۔

"خلاصۃ الحقائق" میں لکھا ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام زمین پر اترے تو اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے حضرت آدمؑ کو فرمایا کہ اپنے بیٹے شیث (علیہ السلام) سے عہد لو اور وصایا و مواثیق پر کاربند کرو کہ وہ نور کامل السرور الانبیاء اور گوہر از ہر سند الاصفیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کسی صورت بھی ناراض نہ کریں اور یہ وصایا نسلاً بعد نسلٍ جاری رہیں۔ چنانچہ حضرت شیث علیہ السلام جب تک زندہ رہے ان کی زبان پر درود مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جاری رہا۔

"شرح تعرف" میں لکھا ہے کہ ایک دن حضرت آدمؑ اپنے فرزند حضرت شیث سے گفتگو کر رہے تھے کہ میں نے عرش پر کوئی ایسی چیز نہیں دیکھی جس پر نام محمدؐ نہ ہو۔ حتیٰ کہ عرش و کرسی، لوح و قلم، مدارج جنان رضوان کو اسم محمدؐ سے مزین اور آراستہ پایا۔ حضرت شیثؑ نے اپنے والد سے پوچھا۔ آیا آپ بلند مرتبت ہیں یا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ حضرت آدم خاموش رہے۔ مگر تیسری بار دریافت کرنے پر آدمؑ نے فرمایا۔ بیٹا! محمدؐ رسول اللہ کی تعریف میں ایک ہی بات یاد رکھ لو جو مجھے اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہے اے آدمؑ! یہ اجرام علویہ اور اجسام سفلیہ تو تمہاری خاطر بنائے گئے ہیں مگر تم میرے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے ہو۔

حضرت ادریس علیہ السلام جن کا شمار حضرت آدم علیہ السلام کی ساتویں پشت میں ہوتا ہے اور جو قرآن کریم کے مطابق ایک سچے نبی تھے جن کا درجہ اللہ رب العزت نے بلند کیا۔ (سورۃ مریم آیت ۵۵، ۵۶) میں ہے۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ۝ وَّرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا ۝

اور اس کتاب میں ادریسؑ کا ذکر بھی کیجئے۔ بیشک وہ بڑے راستی والے نبی تھے اور ہم نے ان کو (کمالات میں) بلند مرتبہ پہنچایا۔ حضرت ادریس علیہ السلام نے سرورِ دوعالم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق مندرجہ ذیل الفاظ میں یہ پیشن گوئی فرمائی۔

دیکھو! ہمارا آقا اپنے دس ہزار نیک ہمراہیوں کے ساتھ آ رہا ہے تاکہ سب لوگوں کا انصاف کرے اور ان میں سے جو گمراہی کی وجہ سے خدا سے منحرف ہو چکے تھے۔ انہیں یقین دلایا جائے کہ وہ کام جو ان سے سرزد ہوئے وہ ناجائز ہیں اور ان تمام سخت کلامیوں کے متعلق جو وہ منکر گنہگار ان کے متعلق کہتے رہے ہیں انہیں تلقین کریں۔

(کتاب یہودہ باب ۱ آیت ۱۴-۱۵)

حضرت ادریس علیہ السلام کی یہ واضح پیشن گوئی پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر صادق آتی ہے۔ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب فتح مکہ کے موقع پر شہر مکہ میں داخل ہوئے تو آپ کے ہمراہ دس ہزار صحابہ کرام کا لشکر تھا۔ اسی موقع پر نبی اکرمؐ نے کفار مکہ کے متعلق فیصلے بھی فرمائے اور انہیں بتایا کہ ان کے تمام عقائد اور افعال محض سیاہ کارنامے تھے۔ آپؐ نے اس موقع پر کفار مکہ کے لئے عام معافی کا اعلان بھی فرمایا۔

حضرت نوح علیہ السلام انبیاء علیہم السلام کے سلسلے کی ایک اہم کڑی ہیں جنہیں آدم ثانی بھی کہا جاتا ہے وہ تمام بڑے مذاہب کے نزدیک محترم ہیں، حتیٰ کہ ان کا تذکرہ ہنود کی مقدس کتابوں، ویدوں اور شاستروں میں اور پارسیوں کی "ژند اوستا" اور دساتیر میں بھی ملتا ہے۔ ان کی وجہ شہرت طوفان اور کشتی ہے۔ طوفان! جو نافرمانوں کے لئے آیا اور کشتی! جس نے فرمانبرداروں کو طوفان سے

بچایا۔ اس نسبت سے جو پیشین گوئی حضرت نوحؑ کی زبانی حضور علیہ السلام کے بارے میں کی گئی اور جس کا حوالہ عہد نامہ عتیق میں بھی ملتا ہے ۔ اس کے الفاظ کچھ یوں ہیں ۔

"اب میں اپنی کمان کو بادلوں میں رکھ دیتا ہوں۔ میری یہ نشانی اس عہد و پیمان کی ہوگی جو میرے اور زمین پر بسنے والوں کے درمیان قرار پایا ہے۔ ایک زمانہ ایسا آئے گا جب میں زمین کے اوپر ایک بادل کو لاؤں گا۔"

یہ عبارت یوں تو مبہم ہے لیکن اگر اس کے اشارات کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا جب تمام دنیا اندھیرے اور گمراہی میں غرق ہو جائے گی۔ لیکن خدا بنی نوع انسان سے ہمدردی سے پیش آئے گا کیونکہ اس زمانے کے دوران اس سحاب رحمت کا ظہور ہوگا جو رحمت للعالمین کے نام سے موسوم ہوگا۔ اس کا مفہوم یہی نکلتا ہے ۔

حضرت نوح علیہ السلام کے بعد متعدد انبیاء اور مرسل دنیا میں تشریف لائے جو اپنے اپنے وقت اور اپنے اپنے مقام پر رشد و ہدایت کی تعلیم دیتے رہے۔ ان برگزیدہ شخصیتوں میں سب سے زیادہ ممتاز ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذات گرامی ہے۔ جو دنیائے قدیم اور جدید کے درمیان ایک اہم کڑی ہیں۔ بائبل میں ایک جگہ ان کی اہلیہ حضرت ہاجرہ کی طرف خطاب کرتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں ان الفاظ سے اشارہ کیا گیا ہے۔

"حضرت ہاجرہ کو اللہ تعالیٰ کے فرشتے نے بتایا تھا: "میں تمہارے بیج اولاد کو بہت پھیلاؤں گا اس قدر کہ اس کا گروہ گنتی میں لانا مشکل ہو جائے گا۔"

فرشتے نے مزید کہا۔

دیکھو تم حاملہ ہو اور تم سے ایک لڑکا پیدا ہوگا اور اس کا نام اسماعیل ہوگا۔ کیونکہ خدا نے تمہاری تکلیفوں کو سن لیا ہے۔ اس کی اولاد میں سے ایک نبی ہوگا جو اُمّی ہوگا۔

(کتاب پیدائش باب ۱۰ آیت ۱۲)

اس پیشین گوئی کے الفاظ اگرچہ زیادہ واضح نہیں ہیں تاہم اس سے یہ اندازہ لگانا زیادہ مشکل نہیں ہے کہ اس میں جس شخصیت کی طرف اشارہ ہے وہ ذات گرامی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہے۔ کیونکہ آپ حضرت اسماعیلؑ کی اولاد میں سے ہیں اور آپ کے ذریعے حضرت ابراہیم اور حضرت ہاجرہؑ کی آل اس قدر پھیلی جس کا کوئی شمار نہیں۔ اگرچہ یہ پیشین گوئی توریت سے ماخوذ ہے۔ لیکن اس کا تعلق ابوالانبیاء اور ان کی اولاد سے متعلق ہے ۔

تعمیر کعبہ کے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام نے جو دعا مانگی تھی۔ ان میں بھی نبی اکرم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد کی پیشین گوئی ہوئی ہے ۔

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِن ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۖ إِنَّكَ أَنتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ۝ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۚ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝

(سورۃ البقرۃ آیت ۱۲۸-۱۲۹)

اے رب! ہمیں اپنا مسلمان (فرمانبردار) بنائے اور ہماری اولاد میں سے ایک اُمّت مسلمہ کا قیام ہو اور ہمیں حج کے طریقے بتا دے اور ہماری توبہ قبول فرما۔ بیشک تو بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے اور نہایت رحم والا ہے۔

الٰہی! اور اٹھا ان میں ایک رسول انہی میں سے جو ان پر تیری آیات پڑھے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور انہیں پاک کرے تو ہی اصل زبردست حکمت والا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی یہ دعا بارگاہِ ایزدی میں قبول ہوئی۔ نسلِ اسماعیل سے ملتِ اسلامیہ کی نمود ہوئی اور پھر انہی میں سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ظہور ہوا۔

حضرت حبقوق علیہ السلام جن کا صحیفہ بائبل کے عہد عتیق میں شامل ہے۔ انہوں نے پیغمبر اسلام محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تشریف آوری کی پیشین گوئی یوں فرمائی۔

خدا تیمان سے آیا اور وہ جو قدوس ہے کوہ فاران سے ظاہر ہوا اس کے جلال نے آسمان کو ڈھانپ لیا اور اس کی حمد سے زمین معمور ہو گئی۔ اس کی تجلی نور کی مانند تھی۔ اس کے ہاتھ سے کرنیں نکلیں اور وہاں اسکی قدرت مستور تھی۔ وبا اس کے آگے چلے اور اس کے قدموں پر دہکتا ہوا انگارہ روانہ ہوا۔ وہ کھڑا ہوا ہے اور اس نے زمین کو لرزا دیا۔ اس نے نگاہ کی اور قوموں کو پراگندہ کر دیا۔ قدیم پہاڑ ریزہ ریزہ ہو گئے اور پرانی پہاڑیاں اس کے آگے دھنس گئیں۔

(باب ۳ آیت ۳ تا ۶ وکتاب سیرت الرسول از انتظام اللہ شہابی صفحہ ۹۔ ۱۰)

حضرت حبقوق علیہ السلام کی اس بشارت کی تصدیق تورات نے یوں کی ہے کہ پروردگار فاران کی پہاڑیوں سے قوت بیان کے ساتھ آیا تو نام احمد کی تسبیح سے آسمان معمور ہو گئے اور اس کی امت کا سمندروں پر تصرف ایسا ہی ہو گا۔ جیسا خشکی پر۔ وہ ایک ایسی کتاب لے کر آئے گا جس کا تعارف بیت المقدس کی تخریب کے بعد ہو گا۔

(شواہد النبوت از مولانا جامی صفحہ ۳۰۔ ۳۱)

حضرت ملاکی علیہ السلام جو آلِ اسرائیل میں مبعوث ہوئے۔ انہوں نے بھی ہادی اعظم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد کی بشارت ان الفاظ میں سنائی۔

وہ خداوند جس کی تم تلاش میں ہو۔ ہاں عہد کا رسول۔ جس سے تم خوش ہو وہ اپنی ہیکل میں ناگہاں آئے گا۔ دیکھو وہ یقیناً آئے گا۔ رب الافواج فرماتا ہے۔ لیکن اس کے آنے کے دن میں کون ٹھہر سکے گا اور جب وہ منودار ہو گا۔ کون کھڑا رہے گا۔

(ملاکی نبی کی کتاب باب : ۳)

اس پیشین گوئی میں فتح مکہ کی طرف واضح اشارہ ہے۔ نبی کریم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے لشکر کے ساتھ یوں مکہ پہنچے کہ کفار مکہ کو خبر تک نہ ہوئی۔ وہ حیران رہ گئے۔ کسی نے بھی لشکر اسلام سے مقابلہ کی جرأت

نہ کی اور مکہ مکرمہ فتح ہو گیا۔

حضرت اشعیاء علیہ السلام بھی آل اسرائیل میں مبعوث ہوئے۔ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ ہجرت کی یوں پیشین گوئی فرمائی۔

عرب کے صحراؤں میں رات کاٹو گے۔

اے ددانیو کے قافلو!

پانی لیکر پیاسوں کے استقبال کو آؤ!

اے تیما کے باشندو!

روٹی لیکر بھاگنے والوں سے ملنے آؤ۔ کیوں کہ وہ ننگی تلواروں سے کھینچی ہوئی کمانوں سے اور جنگ کی شدت سے بھاگے ہیں

یہ پیشین گوئی کتاب اشعیاء باب ۲۱ میں مذکور ہے۔ جسے مولانا طاہر حسن امروہی نے اپنی کتاب پیغمبر اعظم حصہ اول میں مرقوم کیا ہے۔ اس پیشین گوئی میں ددانیو اور تیما کا ذکر ہے۔ ددان حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پرپوتے کا نام ہے۔ جبکہ تیما حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بیٹے کا نام ہے۔ انصار مدینہ انہی کی اولاد میں سے تھے۔ ددانی مدینہ کے باشندے کہلاتے تھے جبکہ تیما نواح مدینہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس پیشین گوئی میں انصار مدینہ کی طرف سے مہاجرین مکہ کی نصرت وحمایت کا تذکرہ ہے جو کفار مکہ کے ظلم وستم سے مجبور ہو کر مدینہ منورہ ہجرت کر کے آئے۔ لہذا حضرت اشعیاء کی یہ پیشین گوئی "ہجرت" کی نشاندہی کرتی ہے۔

بخاری شریف کے مطابق حضرت احبار جو ایک ممتاز یہودی عالم کے فرزند تھے۔ دولت ایمانی سے سرفراز ہوئے اور جب ان سے کتب سابقہ میں پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے متعلق سوال کیا گیا تو انہوں نے حضرت اشعیاء کی پیشین گوئیاں بیان فرمائیں۔

ابونعیم، شہر بن حوشب کے حوالے سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت کعب نے کہا کہ ان کے باپ تورات کے بڑے عالم تھے۔ انہوں نے مجھ سے کبھی کوئی بات نہیں چھپائی۔ جب ان کا وقت رحلت آیا تو مجھے بلا کر کہا! میں نے اپنے علم میں کوئی بات تم سے پوشیدہ نہیں رکھی۔ ہاں دو صفحات میں نے چھپا لئے تھے جن میں آنے والے نبی کا تذکرہ تھا جن کی آمد کا وقت قریب آ چکا ہے۔ میں نے تمہیں یہ دو صفحات اس لئے نہیں بتلائے کہ کبھی تم کسی جھوٹے نبی کے پیچھے نہ لگ جاؤ۔ میں نے یہ صفحات طاقچے میں رکھ کر اوپر سے لپائی کر دی ہے۔ تم انہیں ابھی نہ نکالنا۔ کیونکہ اگر تعالیٰ کو تمہاری بھلائی مقصود ہوئی اور آخری نبی کا ظہور ہو گیا۔ تو تم ان کے پیروکار بن جاؤ گے پھر میرے والد کا انتقال ہو گیا۔ ان کو دفنانے کے بعد مجھے ان دو صفحات کو دیکھنے کا اشتیاق ہوا۔ چنانچہ میں نے انہیں نکال لیا۔ ان میں یہ تحریر درج تھی۔

"محمد رسول اللہ خاتم النبیین ہیں۔ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ آپ کی جائے پیدائش مکہ اور جائے ہجرت مدینہ ہے۔ آپ نہ بدمزاج ہیں اور نہ سخت ہیں۔ نہ بازاروں میں چیختے ہیں۔ برائی کا بدلہ اچھائی سے دیتے ہیں معاف کرتے ہیں اور درگزر کرتے ہیں۔ آپ کی امت اللہ کی بہت حمد کرنے والی ہے۔ یہ لوگ ہر حال میں اللہ کی ثنا کرتے

ہیں اور ان کے نبی کی اللہ کی جانب سے ہر حال میں مدد ہوگی۔ یہ لوگ اپنی شرمگاہوں کو دھوتے ہیں۔ اپنی کمر کے درمیان تہمد باندھتے ہیں۔ ان کی انجیلیں (قرآن) ان کے سینے میں محفوظ ہے۔ وہ آپس میں ایک دوسرے پر اس طرح رحم کرتے ہیں جیسے ایک ماں کی اولاد میں محبت ہوتی ہے۔ یہ امت سب سے پہلے جنت میں داخل ہوگی۔"

کعب احبارؓ کا کہنا ہے کہ ان صفحات کے مطالعے کے کچھ ہی عرصہ بعد مجھے خبر ملی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مبعوث ہو گئے میں نے تاخیر کی تاکہ اچھی طرح ثبوت مل جائے پھر آپ کی رحلت ہوئی اور آپ کے خلیفہ متعین ہو گئے اور ان کے لشکر ہم تک پہنچے۔ میں نے اپنے دل میں عہد کیا کہ میں اس دین میں اس وقت تک داخل نہیں ہوں گا جب تک ان لوگوں کی سیرت نہ دیکھ لوں۔ اسی طرح میں تاخیر کرتا رہا۔ یہاں تک کہ حضرت عمرؓ کے عمال آگئے۔ جب میں نے ان لوگوں کا وفائے عہد دیکھا اور دشمنوں کے مقابلے میں خدائی مدد دیکھی تو مجھے یقین ہو گیا کہ یہی وہ لوگ ہیں جن کا میں منتظر تھا۔ ایک رات میں نے اپنے مکان کی چھت پر کسی کو یہ آیات کریمہ پڑھتے ہوئے سنا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ آمِنُوا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِمَا مَعَكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ نَطْمِسَ وُجُوهًا۔ (سورۃ نساء آیت ۴۷)

"اے کتاب والو! مان لو اس کتاب (قرآن) کو جو ہم نے اب نازل کی ہے اور جو اس کتاب کی تائید و تصدیق کرتی ہے جو تمہارے پاس پہلے سے موجود تھی اس پر ایمان لے آؤ قبل اس کے کہ ہم چہرے بگاڑ کر پیچھے پھیر دیں۔"

میں یہ آیات سن کر اس قدر ڈرا اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ صبح ہونے سے پہلے اللہ تعالیٰ میرا چہرہ گدی کے بل پھیر دے گا چنانچہ صبح ہوتے ہی میں اسلام لانے کے لیے مسلمانوں کی جانب لپکا۔

اسی روایت کو ابن عساکر نے سعید بن رافع اور دوسرے بہت سے اصحاب سے نقل کیا ہے۔

آل اسرائیل میں حضرت شعیب علیہ السلام ایک بلند مقام رکھتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو آپ کی دامادی کا شرف حاصل ہوا حضرت شعیبؑ نے بھی اپنی قوم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد کی بشارت سنائی۔ حضرت شعیب علیہ السلام کے کلام میں ہے کہ میں نے دو سوار دیکھے جن کے نور سے زمین روشن ہو گئی۔ ان میں ایک خچر سوار تھا اور دوسرا شتر سوار۔ خچر سوار ماہتاب و آفتاب کے حسن کا مالک تھا اور یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تھے۔ جبکہ شتر سوار آفتاب و ماہتاب کے حسن کو شرمارہا تھا یہ حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے۔

(معارج النبوت: ملا واعظ کاشفیؒ صفحہ ۴۷، ۴۸)

انبیائے آل اسرائیل میں حضرت لیسعیاؑ علیہ السلام ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَإِسْمَاعِيلَ وَالْيَسَعَ وَيُونُسَ وَلُوطًا وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعَالَمِينَ (سورۃ الانعام: ۸۶)

یعنی اسمٰعیل کو اور لیسعیا کو اور یونس کو اور لوط کو اور سب کو ہم نے بزرگی دی سارے جہاں والوں پر۔ دیگر انبیاءؑ کی طرح حضرت لیسعیا علیہ السلام نے بھی حضورؐ کی آمد کی پیشین گوئی فرمائی۔

"سمندر کی فراوانی تیری طرف پھرے گی اور قوموں کی دولت تیرے پاس فراہم ہو گی۔ اونٹنیاں کثرت سے تجھے آکر چھپالیں گی۔ مدیان اور عیفہ کے اونٹ وہ سب جو سبا کے ہیں آویں گے وہ سونا اور لوبان لائیں گے اور خدا کی بشارت سنائیں گے۔

قیدار کی بھیڑیں تیرے پاس جمع ہوں گی۔ نبیط کے مینڈھے تیری خدمت میں حاضر ہوں گے وہ میری منظوری کے واسطے میرے مذبح پر چڑھائے جائیں گے اور میں اپنے شوکت کے گھر کو بزرگی دوں گا۔

(کتاب لیسعیاہ باب: ۶۰ بحوالہ کتاب پیغمبر اعظم مولانا طاہر امروہی)

اگرچہ یہ عبارات مبہم ہیں لیکن ان کے اشارات کو دیکھا جائے تو اس سے جو مطلب واضح ہوتا ہے وہ کچھ یوں ہے کہ سرزمین عرب میں ایک نبی مبعوث ہوں گے جو لوگوں کو راہ ہدایت دکھائیں گے قیدار اہل قریش کی ساری حشمت خاک میں مل جائے گی سرزمین عرب ہی نہیں اس کے ساتھ دور دور تک پیغام حق پہنچے گا۔ لوگ جوق در جوق دین اسلام میں داخل ہوں گے۔ خانہ کعبہ کو بتوں سے پاک کیا جائے گا۔ وہاں لوگ اللہ کی عبادت کریں گے۔ دنیا کے کونے کونے سے زائرین آئیں گے۔ فریضہ حج ادا کریں گے اور جانوروں کی قربانی دیں گے۔

حضرت وھب بن منبہ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت لیسعیاہ علیہ السلام جو انبیائے بنی اسرائیل میں سے تھے وحی کی کہ اپنی قوم میں تبلیغ کرو تاکہ میں اپنی روح سے تیری زبان میں فصاحت و روانی پیدا کر دوں۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس اور تحمید و تہلیل بیان کی اور فرمایا۔

"اے آسمان! بگوش ہوش سن لے۔ اور اے کوہ و زمین! خاموش ہو جاؤ اور میرے ہم آواز بن جاؤ۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ بنی اسرائیل جنہیں اس نے اپنی نعمتوں سے پالا اور جہاں میں بزرگی بخشی اور اپنے انعام و اکرام کے لئے مخصوص فرمایا۔" یہ کہہ کر حضرت لیسعیاہ علیہ السلام نے رب العزت کے حکم سے عتاب آمیز کلمات کہنے شروع کئے آپ کے اختتامیہ الفاظ یہ تھے

"میں اس روز سے جس دن سے میں نے زمین و آسمان پیدا کئے یہ مقدر کر چکا ہوں کہ نبوت بنی اسرائیل کے علاوہ کسی اور کو دیدوں اور ان سے ملک و حکومت بھی واپس لے لی گئی اور بھیڑ بکریاں چرانے والی جماعت کو اس کا محل ٹھہراؤں گا اور ایک ایسی جماعت کو عزت و توقیر بخشوں گا جو چشم عالم میں خوار ہو گی اور ایک ایسی جماعت کو طاقت بخشوں گا جو ضعیف و نزار ہو گی اور ایک ایسے طائفہ کو دولت و ثروت سے نوازوں گا جو فقیر و نامراد ہو گا اور ان میں سے ایک ایسا پیغمبر مبعوث کروں گا جو بہروں کو کان عطا کرے گا۔ اندھوں کو آنکھیں عطا کریگا۔ اور دلوں کے پردے اتار دے گا۔ اس کا مقام پیدائش مکہ معظمہ ہو گا اور اس کی ہجرت گاہ مدینہ منورہ ہو گی۔

اور اس کا ملک شام ہوگا۔ وہ بندہ متوکل و برگزیدہ ہوگا۔ بدی کا بدلہ بدی سے نہ دے گا بلکہ عفو و درگزر سے کام لے گا۔ مومنوں پر رحیم و کریم ہوگا۔ جانوروں پر بوجھ کی زیادتی دیکھ کر افسوس و گریہ کرے گا۔ اور بیوہ عورتوں اور یتیموں کو آغوش شفقت میں لے گا۔ پہلو میں جلتا ہوا چراغ (دل) تو بجھ سکتا ہے۔ مگر اس کے دامن کی ہوا سے جلا ہوا چراغ نہیں بجھے گا۔ اور اگر بانس کی خشک لکڑی کو آپ زیر قدم رکھیں گے تو اس میں سے آواز نہیں آئے گی۔ اس کے اہل بیت سے سابقین، صدیقین، شہداء اور صالحین ہوں گے اور اس کے بعد اس کی امت حق و صداقت کی طرف لوگوں کی رہنمائی کرے گی۔ امر معروف اور نہی منکر کا حکم دے گی۔ نماز و زکوٰۃ ادا کرے گی اور ایفاء عہد کرے گی اور جس چیز کا میں نے آغاز کیا ہے۔ اسی پر ختم کروں گا اور یہ سب کچھ ان کے لئے میرے فضل و عنایت سے ہے اور میں جسے چاہوں جو چاہوں عطا کر دوں میں ہی فضل عظیم والا ہوں۔

(شواہد النبوۃ : مولانا عبدالرحمٰن جامی)

حضرت یسعیاہ علیہ السلام کی یہ پیشین گوئیاں بالکل واضح ہیں۔ آپؐ مکہ میں پیدا ہوئے۔ مدینہ منورہ کو ہجرت فرمائی۔ سرزمین شام پر مسلمانوں نے فتح و کامرانی کے جھنڈے گاڑے۔ آپؐ کی ایک بڑی صفت یہ تھی کہ آپؐ رحیم و کریم تھے۔ ہر ایک سے شفقت اور ہمدردی سے پیش آتے۔ یتیموں، بیواؤں اور مساکین کی تکالیف پر غمگین ہو جاتے ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

لقد جاءکم رسول من انفسکم عزیز علیہ ما عنتم حریص علیکم بالمؤمنین رؤف رحیم۔

یعنی تمہارے پاس خود تم میں سے ایسا رسول آیا ہے۔ جسے ہر وہ چیز شاق گذرتی ہے جو تمہیں نقصان پہنچانے والی ہے۔ جو تمہاری فلاح کا حریص ہے اور اہل ایمان کے لئے نہایت شفیق و رحیم۔

آل اسرائیل میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شان بہت بلند ہے۔ آپ ایک اولوالعزم، صاحب کتاب پیغمبر تھے۔ ان کی کتاب توریت میں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر ان الفاظ میں ملتا ہے۔

"ہمارا آقا۔ ہمارا خدا۔ تیرے لئے تیرے ہی خاندان سے ایک پیغمبر اٹھائے گا۔ تمہارے بھائیوں میں سے میرے جیسا۔ تم نے اس کو کان لگا کر سننا ہے۔ ان تمام باتوں کے مطابق جن کی خواہش تم اپنے مالک خدا سے کرتے ہو۔"

ہوریب میں ایک جگہ جمع ہونے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا۔

"میں یہ نہیں چاہتا کہ میں اپنے خداوند کی آواز کو دوبارہ سنوں یہ کہتے ہوئے اور نہ ہی کبھی میں اس بھاری آگ کو دیکھوں کہ میں کبھی نہیں مروں گا اور خداوند نے مجھے کہا۔ جو کچھ انہوں نے کہا۔ انہوں نے بہت ٹھیک کہا۔ میں ان کے لئے ایک پیغمبر پیدا کروں گا۔ انہی کے بھائیوں میں سے۔ تیرے جیسا اور میں اپنے الفاظ اس کے منہ میں ڈالوں گا۔ پھر وہ لوگوں سے باتیں کرے گا۔ صرف وہ جن کا میں اسے حکم دوں گا۔

اس بشارت کو یہودیوں نے حضرت یوشع علیہ السلام اور عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے منسوب کرنا چاہا۔ جو

کسی طرح درست نہیں۔ کیونکہ پیشین گوئی کے الفاظ یہ ہیں کہ موعود، بنی اسرائیل کے بھائیوں میں سے مبعوث ہوگا۔ بنی اسرائیل کے بھائی بنو اسماعیل تھے۔ اس لئے بشارت کا مطلب یہ ہے کہ وہ پیغمبر، نسل اسماعیل سے ہوں گے قرآن کریم میں ارشاد خداوندی ہے۔

اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا ۝

ہم نے تمہاری طرف ایک پیغمبر کو بھیجا ہے جو تم پر گواہ ہے۔ جس طرح ہم نے فرعون کے پاس ایک پیغمبر بھیجا تھا۔

حضرت یوشع صاحب کتاب پیغمبر نہ تھے بلکہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب کی پیروی کرتے تھے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی تمام امور میں حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے نہیں تھے۔ دوسرے بقول نصاریٰ :

حضرت عیسیٰ علیہ السلام (نعوذ باللہ) خدا ہیں اور مخلوق کو پیدا کرنے والے خالق ہیں۔ مگر حضرت موسیٰؑ محض خدا کے بندے ہیں عیسائیوں کے نزدیک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو لوگوں کے گناہوں کا بوجھ برداشت کرنا پڑا تا کہ انہیں دوزخ کے عذاب سے بچایا جائے۔ انہوں نے صلیب پر چڑھ کر لوگوں کو دوزخ کے عذاب سے نجات دلائی۔ لیکن حضرت موسیٰؑ نے ایسی کوئی سزا نہیں پائی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کے سردار تھے اور انہوں نے اپنی پوری طاقت سے ان پر حکمرانی کی لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے احکامات کی تعمیل ایک مختصر سے گروہ نے کی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی پیشین گوئی میں یہ واضح طور پر فرمایا تھا کہ اس پیغمبر کا وصف یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالے گا۔ قرآن پاک اس کی تصدیق یوں کرتا ہے۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝

اور وہ اپنی خواہش سے کلام نہیں کرتے بلکہ وہی کہتے ہیں جو انہیں خدا کی طرف سے کہا جاتا ہے۔

اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس پیشین گوئی کے متن پر غور کیا جائے۔ تو یہ بات ظاہر ہوگی کہ اس کا اطلاق صرف نبی کریم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی پر ہوتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیشین گوئی کے الفاظ کے مطابق چند خصوصیات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بڑی مماثلت رکھتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے دونوں کو ان کے دشمن سے نجات دی۔ فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا حکم نہ مانا وہ اپنی فوج سمیت دریا میں غرق ہوا جبکہ حضور کے مخالفین جنہوں نے آپ کی نافرمانی کی اور آپ کے خلاف فوج کشی کی وہ ان لڑائیوں میں تباہ و برباد ہوئے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دونوں کو ہجرت کرنا پڑی۔ ہر دو کو جو ساتھی ملے وہ ان کے خسر تھے۔ جنہوں نے اس ہجرت کے دوران ان کی مدد کی حضرت شعیبؑ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اور حضرت ابو بکر صدیقؓ نے حضور علیہ السلام کا ساتھ دیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے میڈین میں جا کر پناہ لی جو بعد میں یثرب کے نام سے مشہور ہوا۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ مکرمہ سے ہجرت فرمائی اور مدینہ منورہ میں پناہ لی تو یہ وہی یثرب تھا۔ اس کا نام حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ رکھا۔ ہر دو کی جائے پناہ ایک ہی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دس برس تک میڈین (مدینہ) میں تبلیغ کی جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی

مدینہ میں یہی فریضہ سر انجام دیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایک ضخیم ضابطہ حیات توریت کی صورت میں ملا جبکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی ایک مکمل ضابطہ حیات قرآن حکیم کی شکل میں عطا ہوا جو ہر عہد، ہر ملک اور ہر قوم کے لیے قیامت تک کے لیے ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی جہاد کرنا پڑا۔ دونوں نے نکاح کیے۔ دونوں کے ہاں اولاد ہوئی اور سب سے بڑی بات یہ کہ دونوں ہی خدا سے ہم کلام ہوئے۔ ایک کوہ طور پر۔ اور دوسرے عرش عظیم پر۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تجرد کی زندگی بسر کی۔ پس اس سے ثابت ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نہیں بلکہ رہبر انسانیت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مانند ہیں۔

آل اسرائیل کے انبیاء علیہم السلام میں دو شخصیتیں ایسی گزری ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے نبوت کے ساتھ ساتھ پرشکوہ حکومت و بادشاہت بھی عطا کی۔ یہ دونوں شخصیتیں حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی ہیں۔ ان دو برگزیدہ ہستیوں نے بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد کی پیشین گوئی فرمائی۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے جو کتاب دی وہ زبور ہے اس کے باب ۴۵ میں جو اشارات ملتے ہیں ان کا خلاصہ درج ذیل ہے:۔

۱. تو صداقت کا دوست اور شرارت کا دشمن ہے۔

۲. تیرے سارے لباس سے عود عنبر کی خوشبو آتی ہے۔

۳. بادشاہوں کی بیٹیاں تیری عزت والیوں میں ہیں۔

۴. تیرے بیٹے، تیرے باپ دادوں کے قائم مقام ہوں گے۔ تو انہیں تمام زمین کے لیے سردار مقرر کرے گا۔

۵. میں ساری پشتوں کو تیرا نام یاد دلاؤں گا پس سارے لوگ ابدالآباد تک تیری ستائش کریں گے۔

ان اشارات میں جس شخصیت کی طرف نشاندہی ہوتی ہے وہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ جہاں تک صداقت کا تعلق ہے تو یہ الفاظ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بچپن میں ہی مل چکے تھے ظاہر ہے جو صادق و امین ہوگا وہ شرارت کا دشمن بھی ہوگا۔

دوسری بات خاص طور پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر دلالت کرتی ہے۔ کیونکہ آپؐ کے جسم اطہر سے ہر وقت خوشبو نکلتی رہتی تھی۔ جس گلی اور کوچے سے گزر جاتے تھے۔ وہاں کی فضا معطر ہو جاتی تھی۔

تیسرے اشارے میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ان دو ازدواج کا پتہ چلتا ہے جن کا تعلق شاہی خاندان سے تھا یعنی ام المؤمنین حضرت جویریہؓ اور ام المؤمنین حضرت صفیہؓ۔

چوتھا اشارہ ان فتوحات کی طرف ہے جو حضورؐ کے خلفاء اور آپ کے ماننے والوں نے صرف ایک صدی کے اندر حاصل کیں اور دنیائے قدیم کی سیادت اور سرداری حاصل کی۔

پانچواں اشارہ تو اتنا واضح ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپؐ کی امت حشر تک رہے گی اور آپ کی ستائش کرتی

رہے گی۔ اللہ رب العزت اہل ایمان کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝

یعنی بے شک اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود بھیجتے ہیں۔ اے ایمان والو تم بھی خوب درود و سلام بھیجا کرو۔

کتاب زبور میں ہی حضرت داؤد علیہ السلام کی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سلسلے میں ایک اور پیشین گوئی بھی ملتی ہے جو بالکل واضح ہے۔

> مبارک ہیں وہ لوگ جو تیرے گھر میں بستے ہیں۔ وہ سدا تیری تسبیح کرتے ہیں۔ مبارک ہیں وہ لوگ جن کی عزت و قوت تیری وجہ سے ہے۔ تیرے گھر کی راہیں ان کے قلوب میں ہیں وہ بکہ کی وادی میں گذرتے ہیں۔ اس میں ایک کنواں بناتے ہیں۔

(کتاب زبور باب ۸۴)

اس پیش گوئی میں بکہ اور کنواں دو ایسے واضح الفاظ ہیں جن کی وجہ سے زیر غور شخصیت سوائے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔ بکہ بکہ مکہ ہی کا نام ہے۔ گھر سے مراد خانہ کعبہ ہے۔ اس میں ایک کنواں ہے جس کا نام چاہ زمزم کے نام سے مشہور ہے۔ خانہ خدا کی راہیں یعنی خانہ کعبہ سے محبت و عقیدت عالم اسلام کے مسلمانوں کے اذہان و قلوب میں موجزن ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کی سطوت و جلالت کا یہ حال تھا کہ سرکش سے سرکش مخلوق بھی آپ کے اشارہ پر ناچتی تھی۔ آپ کی بادشاہت و حکمرانی صرف عالم انسانیت پر ہی نہ تھی بلکہ حیوانات، جنات، ہواؤں اور پانیوں پر بھی تھی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام اپنے والد حضرت داؤد علیہ السلام کی وفات کے بعد تخت سلطنت پر بیٹھے۔ بیت المقدس کی تعمیر بھی آپ نے کروائی۔ آپ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد کی جو پیشین گوئی فرمائی وہ صحیفہ غزل الغزلات کے باب پنجم آیت ۱۰ میں نبی کریم کے اسم مبارک مع حلیہ کے یوں ہے اصل عبارت عبرانی بخط عربی یہ ہے۔

دودی صح وادہ م دغول مربابا عدوش کشریاتِ قصوثا رتلیتلم شحوروت کفوریلیط عَناد
کیونیم ط مل انیعتی ما لم بحا لاب طبو تیئوث علی صیلیث لحابا وکعر رغیث ھیوسمہ معلّو
مرتاحیم ط سفتونا وشوشیم بطلفوث مودعو بیوط مَادا وُ اکلیلی ذھاب مملابیم بتو سلیسث ط
مغیاوعشتِ شین ط مُعَلِفَت سپریم ط شرقاو عمودی شیسن مَیادیم علی ادنی نارم طمیھو کلیاتو
طیاجود کارادیم خلو محمد یم ط زہ دودہ رعی مایتوث یردشلایم ط

یعنی۔ میرا دوست ! نورانی گندم گوں، ہزاروں میں سردار، اس کا سر چمکدار، اس کی زلفیں ! مثل کوے کی کالی

اس کی آنکھیں ایسی ! جیسے پانی کے کنڈ پر کبوتر۔ دودھ میں دھلی ہوئیں۔ نگینے کی مانند جالنے میں جڑی ہوئیں۔
اس کے رخسار ایسے ! جیسے خس کی ٹٹی پر بیل اور لوح پر رگڑی ہوئی خوشبو۔
اس کے ہونٹ ! پھولوں کی پنکھڑیاں جن سے خوشبو مترشح ہے۔
اس کے ہاتھ ! سونے سے ڈھلے ہوئے اور جواہر سے جڑے ہوئے۔
اس کا شکم !
جیسے ہاتھی دانت کی تختی
جواہر سے لپٹی ہوئی۔
اس کی پنڈلیاں !
جیسے سنگ مرمر کے ستون سونے کی بیٹھکی پر جڑے ہوئے۔
اس کا چہرہ مانند آفتاب !
جوانی مانند صنوبر !
اس کا گلا نہایت شیریں !
اور وہ بالکل محمدیم ہے
یہ ہے میرا دوست اور میرا محبوب
اے یروشلم کی بیٹیو !

اس الہامی کلام میں بھی بین السطور صرف ایک شخصیت ہے اور وہ ہیں سرورِ کشورِ رسالت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ کیونکہ اس میں بعض الفاظ صراحت کے ساتھ آپؐ ہی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

آپؐ کی شخصیت بڑی بھرپور اور جاذب نظر تھی۔ روئے اقدس چودھویں کے چاند کی طرح منور اور تاباں تھا، پستہ قد سے ذرا دراز تھے۔ بال کسی قدر گھنگریالے۔ سر کے بالوں میں اگر اتفاقاً مانگ نکل آتی تو مانگ نکال لیتے۔ بال سیاہ چمکدار، پیشانی کشادہ تھی ابرو خم دار، باریک اور گنجان تھے۔ آنکھوں کی پتلیاں سیاہ تھیں، رخسار مبارک ہموار اور ابھرے ہوئے تھے۔ دہن مبارک اعتدال کے ساتھ فراخ تھا۔ دندان مبارک باریک اور چمکدار تھے۔ گردن انتہائی خوبصورت، سینہ ہموار، فراخ اور چوڑا، کلائیاں دراز، ہتھیلیاں فراخ، ہاتھ پاؤں کی انگلیاں مناسبت کے ساتھ لمبی تھیں۔ غرضیکہ

مُنَزَّہٌ عَنْ شَرِیْکٍ فِیْ مَحَاسِنِہٖ فَجَوْہَرُ الْحُسْنِ فِیْہِ غَیْرُ مُنْقَسِمٖ

حضرت سلیمان علیہ السلام نے نبی اکرم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد کی پیشین گوئی ان الفاظ میں بھی فرمائی۔

"اثر سلطنة ظهرة واسمه احمد" یعنی مہر نبوت ان کی پشت پر ہوگی اور ان کا نام احمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ہوگا۔ (توریت یسعیاہ باب ۴۲ عربی ترجمہ مطبوعہ ۱۸۱۱ء دکتاب سیرت الرسول از سید محمد رضوان اللہ دانتظام اللہ)

آل اسرائیل میں حضرت یحییٰ علیہ السلام ایک جلیل القدر پیغمبر گذرے ہیں انہیں بپتسمہ دینے والے یوحنا کے نام سے بھی موسوم کیا گیا (انجیل یوحنا باب اکی ۱۹ تا ۲۵) سطور کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ عہدنامہ جدید کے دور میں یہودی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مانند پیشین گوئی کی تکمیل کے منتظر تھے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہودیوں کا مسیحا ہونے کا دعویٰ کیا تو یہود نے ایلیا (حضرت الیاسؑ) سے متعلق استفسار کرنا شروع کیا کیونکہ ان کے پاس موجود ایک اور پیشین گوئی کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آمد سے قبل ایلیا (الیاس) کو اپنی دوسری زندگی میں آنا تھا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جواب میں کہا۔

ایلیا البتہ آئے گا اور سب کچھ بحال کرے گا۔ لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ ایلیا تو آچکا ہے اور انہوں نے اسے پہچانا نہیں۔

(انجیل متی باب ۱۷ آیت ۱۱ تا ۱۳)

یہود نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جواب سنا تو سمجھ گئے کہ انہوں نے یوحنا بپتسمہ دینے والے کی بابت کہا تھا۔

انجیل یوحنا (باب ۱ آیت ۲۱) کے مطابق جب یہودیوں نے یروشلم سے کاہن اور لاوی، حضرت یحییٰؑ کے پاس بھیجے۔ یہ پوچھنے کو کہ وہ کون ہیں؟ تو انہوں نے نہ تو کوئی اقرار کیا اور نہ ہی انکار۔ بلکہ یہ کہا۔ میں مسیح نہیں ہوں۔ پھر انہوں نے پوچھا؟ پھر تو کون ہے؟ کیا تو الیاس ہے؟ جواب دیا میں نہیں ہوں۔ کیا تو وہ پیغمبر ہے؟ انہوں نے جواب دیا نہیں۔

سوال کرنے والے یہودیوں نے کہا اگر تو نہ مسیح ہے۔ نہ ایلیا ہے اور نہ ہی وہ نبی تو پھر بپتسمہ کیوں دیتا ہے۔

(انجیل یوحنا باب ۱ آیت ۲۵)

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہودی جو چودہ سو سال سے تین شخصیتوں کا انتظار کر رہے تھے۔ ان کے نام یہ ہیں، عیسیٰ علیہ السلام، الیاس علیہ السلام اور دو پیغمبر حضرت عیسیٰؑ اور حضرت الیاس علیہ السلام تو آچکے تھے۔ مگر جس پیغمبر کو بعد میں آنا تھا وہ ابھی تشریف نہیں لائے تھے حضرت یحییٰؑ نے اپنے تئیں ان تینوں میں سے کوئی ایک ہونے سے انکار کیا مگر انجیل کے بیان کے مطابق حضرت عیسیٰؑ نے ان کی بعثت کو حضرت الیاس علیہ السلام کی آمد کا مصداق ٹھہرایا ہے۔ اس لئے اوّل الذکر دو بزرگ یعنی حضرت الیاسؑ اور حضرت عیسیٰ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے قبل ظاہر ہو چکے تھے۔

یہاں وہ نبی سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مانند ایک نبی کے ہیں۔ اور ہم یہ ثابت کر چکے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مانند سوائے ہادیٔ اعظم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اور کوئی شخصیت ہے ہی نہیں۔

لفظ وہ نبی، پیغمبر اعظم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ خاص ہے کیونکہ بعض سابقہ کتب آسمانی میں بھی مذکور ہے اور آج مسلمان بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے "آنحضرت" کا لفظ استعمال کرتے ہیں جبکہ اہل یورپ "دی پرافٹ" کہتے ہیں۔ تینوں الفاظ کے ایک ہی معنی ہیں۔ چنانچہ تیسری حقیقت منتظرہ جس کو "وہ نبی" سے تعبیر کیا ہے۔ ذات محمدیؐ کے سوا اور کوئی

ذات نہ تھی۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام نے "بروت بار بیت عیناہ" میں ایک بڑے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے نبی کریم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ظہور کی نوید سناتے ہوئے کہا۔

"تمہارے درمیان ایک شخص کھڑا ہے۔ جسے تم نہیں جانتے۔ یعنی میرے بعد آنے والا، میں جس کی جوتیوں کا تسمہ کھولنے کے لائق نہیں۔"

(انجیل یوحنا باب ۱ آیت ۲۷)

یہ پیشین گوئی بہت ہی واضح ہے۔ حضرت یحییٰ ؑ کے عہد میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ظہور ہو چکا تھا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام آل اسرائیل میں نبوت کی آخری کڑی تھے۔ ان کے بعد صرف اور صرف حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ظہور ہوا۔ "میں جس کی جوتیوں کا تسمہ کھولنے کے لائق نہیں" کا مطلب ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آسمانِ نبوت کے سورج، ہادیان مذاہب کے سرتاج اور رہنمایان دین کے رہبر اعظم ہیں۔ آپ پر باب نبوت تمام ہوا۔ آپ کی شریعت تاحشر قائم و دائم رہے گی۔ آپ نوعِ انسانی کے لئے رحمت عام بنا کر بھیجے گئے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام آل اسرائیل کے سلسلہ نبوت کی آخری کڑی ہیں۔ ان کا شمار تاریخی دور میں ہوتا ہے ان کے بارے میں تاریخی طور پر بہت سی باتیں ہم تک صحت کے ساتھ پہنچیں اگرچہ اس دوران میں ان کی کتاب (انجیل مقدس) میں بھی بہت سی تحریف ہوئی اور یہ آج اپنی حقیقی صورت میں موجود نہیں۔ محققین یورپ بھی آج اس کو تسلیم کرتے ہیں۔ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد ابتدائی تین صدیوں میں تقریباً اڑھائی سو انجیلیں پائی جاتی تھیں ۳۲۵ء میں نیسیا کی کونسل نے ان سب انجیلوں کو جمع کیا اور صرف چار کو منتخب کر کے باقی کو متروک کر دیا۔ یہ انتخاب کسی تاریخی علمی بنیاد پر نہیں کیا گیا بلکہ ایک طرح کی فال نکالی گئی اور اس کو الہامی اشارہ تسلیم کر لیا گیا۔ آج جو انجیلیں دستیاب ہیں ان میں انجیل یوحنا، انجیل متی، انجیل مرقس اور انجیل لوقا عیسائیوں کے نزدیک محترم ہیں۔ ان اناجیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بہت سی ایسی پیشین گوئیاں ملتی ہیں جن سے واضح طور پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد کی نوید ملتی ہے انجیل یوحنا میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد کی پیشین گوئی یوں ملتی ہے۔

"لیکن جب فارقلیط آئے گا جسے میں تمہارے پاس بھیجوں گا، وہ خدا سے آئے گا۔ وہ سچائی کی روح ہوگا۔ جو خدا کی طرف سے آئے گا وہ میری گواہی دے گا۔

(یوحنا باب ۱۵ آیت ۲۶)

اس پیشین گوئی میں دو الفاظ میں حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ پہلا لفظ "فارقلیط" عبرانی زبان میں جس کے معنی حمد کیا گیا ہے۔ احمد، محمدؐ، تسلی دینے والا اور وکیل کے ہیں۔ دوسرا لفظ سچائی کی روح جو آپ کے صادق اور امین ہونے کی طرف دلالت کرتا ہے۔ ان الفاظ کی موجودگی میں کوئی دوسری شخصیت سامنے آ ہی نہیں سکتی۔

ایک دوسری جگہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیشین گوئی یوں ہے۔

میں خدا سے درخواست کروں گا اور وہ تمہیں اور کوئی تسلی دینے والا (فارقلیط) دے گا جو ہمیشہ تمہارے

ساتھ رہے گا۔

(انجیل یوحنا باب ۱۴۔ آیت ۱۶)

اس پیشین گوئی میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں واضح اشارہ کیا گیا ہے۔ کیونکہ آپ کے بعد نہ کوئی شریعت آئی اور نہ کوئی نبی مبعوث ہوا۔ اور "جو ہمیشہ تمہارے ساتھ رہے گا" سے مراد بھی دراصل یہ ہے کہ آپ کی شریعت، آپ کا قانون اور آپ کی نبوت باقی رہے گی۔ خود اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں واضح طور پر اعلان کر دیا۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ط

(سورۃ احزاب آیت ۴۰)

یعنی محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تمہارے مردوں میں کسی کے باپ نہیں۔ ہاں اللہ کے رسول اور سب نبیوں میں پچھلے ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ آپ پر باب نبوت بند ہو گیا اور آپ کی شریعت تا قیامت جاری و ساری رہے گی۔

حضرت عیسیٰ ؑ کی ایک اور پیشین گوئی اسی قسم کے الفاظ پر مشتمل ملتی ہے۔

"لیکن وہ تسلی دینے والا (فارقلیط) وکیل اور مقدس روح جسے میرے نام پر خدا بھیجے گا وہ سب کچھ تمہیں پڑھائے گا اور ان تمام باتوں کی یاد دلائے گا جو میں نے کہی ہیں۔"

(انجیل یوحنا باب ۱۴ آیت ۲۶)

اس پیشین گوئی میں دیگر باتوں کے علاوہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفت "مصدق" کی جانب اشارہ ہے۔ کیونکہ آپ نے دیگر انبیاء کے ساتھ ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کی بھی تصدیق فرمائی۔ انجیل یوحنا میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ایک اور پیشین گوئی یوں ہے۔

میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لئے فائدہ مند ہے۔ کیونکہ اگر میں نہ جاؤں گا تو وہ مددگار تمہارے پاس نہ آئے گا لیکن اگر میں جاؤں گا تو اسے تمہارے پاس بھیج دوں گا۔

(یوحنا باب ۱۶ آیت ۷)

مزید ارشاد ہوا

"بعد اس کے میں تم سے بہت کلام نہ کروں گا۔ اس لئے کہ اس جہاں کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اسکی کوئی چیز نہیں۔"

(یوحنا باب ۱۵ آیت ۳۰)

وہ تمہیں سچائی کی راہ دکھائے گا۔ وہ جو کچھ خدا سے سنے گا صرف وہی کہے گا۔ تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا۔ خدا کی تمجید کریگا اور اس کا جلال ظاہر کرے گا۔

(یوحنا باب ۱۶ آیت ۱۳)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی یہ سب پیشین گوئیاں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر حرف بحرف صادق آتی ہیں۔ جس صراحت اور اہتمام کے ساتھ حضرت عیسیٰؑ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد کی خوشخبری دی وہ کسی اور سے منقول نہیں۔ انجیل متی کے باب ششم

آیت ۱۰ کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے حواریوں کو یہ دعا سکھائی اور انہیں ہدایت کی کہ اسی طور دعا مانگتے رہنا۔
"اے خدا! وہ حکومت آ سے اور تیری حکومت کی عملداری اس زمین پر قائم ہو جیسی کہ آسمانوں میں ہے۔"

متی کی انجیل باب ۱۰ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے حواریوں کو یہودیوں کے شہروں میں تبلیغ کرنے کے لئے بھیجا تو انہیں ایک نصیحت یہ بھی کی تھی کہ تم جہاں سے بھی گزرو۔ راہ میں یہ اعلان کرتے جانا کہ خدا کی حکومت نزدیک آرہی ہے۔ متی میں یوں مرقوم ہے۔

اور اس نے اپنے بارہ حواریوں کو اکٹھا کر کے انہیں یہ طاقت بخشی کہ انہیں تمام شیطانی روحوں پر پورا پورا اختیار ہو اور وہ بیماریوں کا علاج کر سکیں پھر انہیں خدائی حکومت کا وعظ کرنے کے لئے اور بیماروں کو شفایاب کرنے کے لئے باہر بھیج دیا گیا۔"

(انجیل متی باب ۹ آیت ۱ تا ۲)

انجیل متی کے اگلے باب میں ہے۔
"ملک میں بیماروں کو صحت و تندرستی عطا کرو اور انہیں بتاؤ کہ خدا کی حکومت ہمارے نزدیک آپہنچی ہے اور جو تمہاری نصیحت پر عمل نہ کریں تو انہیں بتاؤ کہ اللہ کی حکمرانی نزدیک آ گئی ہے۔"

(انجیل متی باب ۱۰ آیت : ۹)

انجیل کے ان مندرجات سے واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی یہ خوشخبری کسی آئندہ زمانے کے لئے تھی جس کا تعلق حضرت عیسیٰ علیہ السلام یا اور کسی ذات سے جو کبھی اس وقت موجود بھی نہ تھا اگر ہوتا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر کو اپنے حواریوں کو یہ دعا سکھانے کی کیا ضرورت تھی۔
کہ اے خدایا! وہ حکومت آ ئے یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری شہر شہر، لوگوں کو یہ بتاتے پھریں۔ کہ اللہ کی بادشاہی نزدیک آرہی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے بعد بھی اگر ان کے حواری یہ دعا مانگتے ہیں تو اس سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا عہد نبوت نہیں بلکہ ان کے بعد کسی عظیم شخصیت کی آمد کی نشاندہی ہو رہی ہے اور وہ شخصیت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ اور کوئی نہ تھی۔ اناجیل میں حضرت عیسیٰ کی پیشین گوئیوں کی تصدیق قرآن کریم سے بھی ہوتی ہے۔ قرآن پاک کے مطابق جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس بات کی تصدیق کی کہ میرا وجود تورات کی باتوں کی تصدیق کرتا ہے وہاں یہ بشارت بھی سنائی

وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ (سورۃ الصف، آیت ۶)
اور ایک رسول کی خوشخبری سنانے والا ہوں جو میرے بعد آئے گا۔ اور اس کا نام احمد ہوگا۔
اب آیئے انجیل برنا باس کی طرف جو اگرچہ اہل نصاریٰ کے ہاں زیادہ معتبر کتاب نہیں لیکن اگر تمام اناجیل کا مطالعہ

کیا جائے تو بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ "برناباس" جس کا اصل نام "یوسف" تھا حضرت عیسٰی ؑ کے بارہ حواریوں میں سے سب سے زیادہ معتبر تھا حضرت عیسٰی علیہ السلام کے اٹھا لیے جانے کے بعد اناجیل سینکڑوں کی تعداد میں لکھی گئیں۔ کئی اناجیل ایسی تھیں جن میں آپ کو اللہ یا ابن اللہ (معاذ اللہ) کہا گیا۔ جبکہ کچھ ایسی بھی تھیں جن میں اس نظریئے کی سختی سے تردید کی گئی اور ان میں حضرت عیسٰی علیہ السلام کو خدا کے جہاں کا نبی بنایا گیا "انجیل برناباس" کا شمار بھی انہی کتابوں میں ہوتا ہے۔ تاریخی نظر میں اسی کو تمام انجیلوں کا اصل اور مرجع قرار دیا جاتا ہے۔ عیسائی "انجیل برناباس" کے قائل اس لئے نہیں ہیں کہ اس کے مندرجات سے عیسائیت کے عقیدۂ تثلیث پر ضرب کاری پڑتی ہے۔

برناباس نے اپنی کتاب میں ہادی اعظم حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے متعلق حضرت عیسٰی علیہ السلام کی جو بھی پیشن گوئیاں لکھی ہیں۔ ان میں سے چند درج ذیل ہیں۔

"وہ نشانیاں جو خدا میرے ہاتھ پر ظاہر کرتا ہے، ظاہر کرتی ہیں کہ میں اللہ کے ارادے سے کلام کرتا ہوں اور میں اپنے کو اس نبی جیسا نہیں سمجھتا۔ جس کے بارے میں تم کہتے ہو۔ اس لئے کہ میں تو اس کا بھی اہل نہیں، کہ رسول اللہ کے جوتوں کے تسمے کھولوں جسے تم "مسیا" کہتے ہو اور مجھ سے پہلے پیدا ہوا ہے اور میرے بعد کلام حق لیکر آئے گا اور اس کے دین کی انتہا نہ ہو گی۔

(انجیل برناباس باب ۴۴، آیت: ۵ - ۱۱)

ڈاکٹر سعادت بک جنہوں نے برناباس کی انجیل کا ترجمہ عربی زبان میں کیا۔ وہ انجیل برناباس کے دیباچہ میں لکھتے ہیں "برناباس نے محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کا ذکر کئی فصلوں میں صراحت کے ساتھ کیا ہے اور انہیں رسول اللہ بتایا ہے اور ذکر کیا ہے کہ جب آدمؑ جنت سے نکالے گئے تو جنت کے دروازے پر یہ سطریں نورانی حروف میں لکھی ہوئی دیکھیں۔ لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔

حضرت عیسٰی علیہ السلام سے سوال کیا گیا کہ وہ مسیح کس نام سے پکارا جائے گا اور اس کی آمد کی کیا نشانیاں ظاہر ہوں گی۔ تو حضرت عیسٰی علیہ السلام نے جواب دیا۔

اس مسیح کا نام قابل تعریف ہے کیونکہ خدا نے جب اس کی روح پیدا کی تھی اس وقت اس کا یہ نام خود رکھا تھا۔ اور وہاں اسے ایک ملکوتی شان میں رکھا گیا تھا۔ خدا نے کہا اے محمد! انتظار کر کیونکہ تیری ہی خاطر میں جنت، دنیا اور بہت سی مخلوق پیدا کروں گا اور اس کو تحفہ کے طور پر تجھے دوں گا۔ یہاں تک کہ جو تیری تبریک کریگا۔ اسے برکت دی جائے گی سو اس کا نام محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) ہے۔ (انجیل برناباس باب: ۹۷)

"میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ ہر نبی جب آیا ہے۔ خدا کی رحمت کا نشان صرف ایک قوم کے لئے لایا اور اسی لئے ان کا کلام نہ پھیلا سوائے ان لوگوں تک کے۔ جن کی طرف وہ بھیجے گئے تھے۔ پر خدا کا رسول جب وہ آئے گا، تو خدا اسے گویا اپنے ہاتھ سے مہر نبوت عطا کرے گا۔ کہ وہ دنیا کی ان تمام قوموں کے لیے جو

اس کا دین قبول کریں گے، نجات اور رحمت لائے گا۔ وہ بے دینوں پر طاقت کے ساتھ آئے گا، اور بت پرستی مٹا دے گا۔ یہاں تک کہ وہ شیطان کو مبہوت کر دے گا۔ کیونکہ خدا نے ابراہام سے یہی وعدہ کیا تھا کہ دیکھ، تیری نسل میں، میں زمین کے تمام قبیلوں کو برکت دوں گا۔ اور جس طرح اے ابراہام! تو نے بت پاش پاش کئے اسی طرح تیری نسل کرے گی!!!!!

(انجیل برناباس اردو ترجمہ آسی ضیائی صفحہ: ۷۹)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ان کے ایک حواری اندریاس نے سوال کیا کہ آپ جس نبیؐ کے آنے کی نوید سنا رہے ہیں، ہمیں ان کی کوئی نشانی بتائیں تاکہ ہم اسے جان لیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جواب میں فرمایا۔

"وہ تمہارے وقت میں نہ آئے گا۔ بلکہ تمہارے چند سال بعد آئے گا۔ جب انجیل کالعدم کر دی جائے گی۔ یہاں تک کہ بمشکل تیس ایمان دار رہ جائیں گے۔ اس وقت خدا دنیا پر رحم فرمائے گا۔ سو وہ اپنا رسول بھیجے گا۔ جس کے سر پر ایک سفید بادل چھایا رہے گا۔ جس سے وہ خدا کا برگزیدہ جان لیا جائے گا۔ اور خدا اسی کے ذریعے دنیا پر ظاہر ہو گا وہ بے دینوں پر بڑی طاقت کے ساتھ آئے گا۔ اور زمین پر بت پرستی نیست کر دے گا۔ اور اس سے مجھے مسرت ہے۔ کیونکہ اسی کے ذریعے ہمارے خدا کی معرفت اور تمجید ہو گی اور میرا سچا ہونا معلوم ہو گا۔

انجیل برناباس اردو ترجمہ آسی ضیائی صفحہ (۱۱۲-۱۱۳)

ان اقتباسات کے بعد نہ کسی بحث کی ضرورت رہتی ہے اور نہ ہی کسی دلیل کی کیونکہ آفتاب آمد دلیلِ آفتاب
تورات اور اناجیل کی پیشین گوئیوں کی مزید تصدیق اس بات سے بھی ہوتی ہے، کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت مبارکہ کے زمانے میں یہود و نصاریٰ دونوں عناصر عرب میں موجود تھے اور وہ ایک ایسے نبی آخر الزمان کی آمد کے منتظر تھے جو آلِ اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کو راستہ دکھلائے۔ یہ عقیدہ یہود مدینہ کا بھی تھا اور انہی سے مدینہ منورہ کے قبائل اوس و خزرج نے سن کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دست اقدس پر بیعت کر کے اسلام میں سبقت کی۔ یہی عقیدہ عرب کے نصاریٰ کا تھا۔ وہ بھی منتظر ہی رہے۔ اور غالباً آج تک منتظر ہیں۔ لیکن انہی کے کلام سے اہل مدینہ اور دیگر بادیہ نشین عرب نے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسلام کی طرف پہل کی اور رسولِ منتظر کی امت میں داخل ہو گئے۔ کہ

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اسلامی تاریخ نگاری میں زہری کا حصہ*

عبدالعزیز دوری : مترجم : ظفرالاسلام

اسلام میں تاریخ نگاری کی ابتدا دو مرکزوں سے ہوئی۔ پہلا مرکز مدینہ تھا جو بنیادی طور پر اسلامی فکر کا ترجمان اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و اسلام کی ابتدائی تاریخ کے ساتھ مخصوص تھا۔ دوسرا مرکز عراق (البصرہ و کوفہ) تھا جو قبائلی زندگی اور تاریخی مطالعہ کے مختلف پہلوؤں سے متعلق تھا۔ اسلامی تاریخ نگاری کی نشو و نما پہلے مرحلہ میں اجتماعی کوششوں کی مرہونِ منت تھی۔ انفرادی کوششیں ان میں سے کسی نہ کسی مرکز سے منسلک تھیں۔ اور اس کو ترقی دینے میں ممد و معاون ثابت ہوئیں۔

مدینہ کے اہلِ علم حضرات نے سب سے پہلے احادیث نبوی کو اپنے مطالعہ و تحقیق کا موضوع بنایا جو بعد میں سیرت نبوی[1] اور امت کے حالات و معاملات میں دلچسپی کا باعث بنے۔ اس طریقہ سے اسلامی تاریخ نگاری ابان بن عثمان رض کے دور سے جو علم حدیث و فقہ میں دستگاہ رکھنے کے علاوہ مغازی میں بھی دلچسپی رکھتے تھے[1] ارتقا کر کے عروہ بن زبیر کے یہاں ایک فن کی شکل میں نمایاں نظر آتی ہے۔ ایک محدث و فقیہ کی حیثیت سے مشہور ہونے کے علاوہ عروہ بن زبیر مغازی ادب اور تاریخ نگاری کے مدنی اسکول کے بانی کی حیثیت سے بھی جانے جاتے ہیں۔ ان کی بیان کردہ روایات سے سیرت نبوی اور اسلام کی ابتدائی تاریخ میں اُن کی خاص دلچسپی ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن مدنی اسکول کی بنیادوں کو استوار کرنے اور تاریخی مطالعہ کو وسعت و ترقی دینے کا امتیاز زہری کو حاصل ہے۔ مزید برآں زہری کی تالیفات سے اس امر کو سمجھنے میں بخوبی مدد ملتی ہے کہ مغازی ادب کی اصلیت مشہور و معروف قصوں میں ہے۔ جیسا کہ بعض مورخین کا خیال[2] ہے، یا اس کی بنیاد دیں محدثین اور ان کے متبعین کی تالیفات سے فراہم ہوئی ہیں۔

زہری کی تاریخ وفات ۱۷ رمضان ۱۲۴ھ (۷۴۲ء) ہے۔ سوانح نگار اور مورخین عام طور سے اس پر متفق ہیں[3]۔ لیکن ان کی تاریخ پیدائش سے متعلق مختلف روایتیں ملتی ہیں جو درحقیقت وفات کے وقت ان کی عمر کی بابت مختلف اقوال - ۵۰، ۵۱، ۵۶، ۵۸ سال[4] پر مبنی ہیں۔ زبیر بن بکار[5] اور واقدی کی ایک روایت کے مطابق[6] انھوں نے ۷۳ سال کی عمر میں وفات پائی تھی۔ اس لحاظ سے ان کا سن پیدائش ۵۱-۵۲ھ (۶۷۱-۶۷۲ء) قرار پاتا ہے[7]۔

زہری کے اساتذہ میں اس دور کے جلیل القدر محدثین شامل تھے۔ لیکن زہری کے نزدیک روایت کے اعتبار سے

---

* مطبوعہ "بلیٹن آف دی اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز" یونیورسٹی آف لندن، جلد ۲۹ - جزو اول، ص ۱-۱۲

ان میں سب سے زیادہ مقبول اور علم و فضل کے لحاظ سے نہایت معزز سعید بن مسیبؒ، ابان بن عثمانؓ، عبداللہ بن عتبہ[۹] اور عروہ بن زبیر ہیں۔ زہری ان چاروں محدثین کو "علم کا سمندر"[۱۰] تصور کرتے ہیں جن کے فیض سے ان کی علمی جبلت و استعداد کو چار چاند لگ گئے[۱۱]۔

زہری اپنی قوتِ حافظہ کے لیے بھی بہت مشہور ہیں۔ علمی میدان میں اس کی اہمیت و افادیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ زہری کے بارے میں یہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ یادداشت کو تقویت دینے کے لیے شہد کا استعمال کرتے تھے[۱۲]۔ اس سے اہم بات یہ کہ وہ تختیوں اور کاغذ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں پر احادیث اور اُن کی تشریحات لکھنے میں خاص دلچسپی رکھتے تھے۔ اس سے انہیں اپنے علمی سرمایہ کے تحفظ میں مدد ملتی تھی۔ ان کی بابت یہ عام طور پر مشہور ہے کہ وہ جو کچھ سنتے تھے قلمبند کر لیا کرتے تھے[۱۳] اور احادیث نبویؐ و آثار صحابہؓ کو نوٹ کرنے میں خصوصی توجہ سے کام لیتے تھے[۱۴]۔ زہری اپنے تحریری کارناموں کی وجہ سے اپنے دور کے سب سے ممتاز اہل علم میں شمار ہوتے تھے۔

مغازی کے بیان میں زہری کے سب سے اوّل اور اہم ماخذ عروہ بن زبیر ہیں۔ وہ تحصیلِ علم کی خاطر کافی عرصہ تک اُن کی خدمت میں مقیم رہے۔ وہ انھیں علم کے "بحر زخار" سے تعبیر کرتے تھے[۱۵]۔ ابن خلکان کی رائے میں عروہ بن زبیر مغازی کے سب سے پہلے مصنف ہیں[۱۶]۔ حاجی خلیفہ نے بھی اسی خیال کی تائید کی ہے[۱۷]۔ سخاوی نے اس پہلو پر خاص زور دیا ہے کہ زہری نے عروہ کی سند سے مغازی کی روایات کو ذکر کیا[۱۸]۔ اس طرح مختلف ذرائع سے یہ ثبوت بہم پہنچتا ہے کہ مغازی کے باب میں زہری نے عروہ کی روایات پر کافی اعتماد کیا ہے۔ عروہ کی بیان کردہ روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ غزوں کے طرز پر ہیں۔ اور جزئی واقعات پر مشتمل ہیں[۱۹]۔ تاریخ نگاری کا کوئی متعین خاکہ ان میں نہیں ملتا۔ لیکن زہری نے عروہ کے علاوہ سعید بن مسیب[۲۰]، عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ[۲۱] اور بہت سے دوسرے راویوں کی سند سے مغازی کے واقعات کو بیان کیا ہے[۲۲]۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زہری نے مدینہ میں رہ کر احادیث نبویؐ اور اقوال صحابہؓ کی چھان بین کی۔ اس اہم کام میں ان کی سماجی حیثیت، اچھے حافظہ اور تحریری یادداشت سے کافی مدد ملی۔ انھوں نے اپنی تحقیق و تفتیش کا دائرہ صرف اہلِ علم تک محدود نہیں رکھا۔ بلکہ ہر اس شخص سے رجوع کرنے کی کوشش کی جو احادیث و روایات کی بابت تھوڑی بہت بھی معلومات رکھتا تھا اور قابلِ اعتماد تھا۔ وہ مجلسوں میں شریک ہوتے اور لوگوں کے گھر جا کر انفرادی طور پر ان سے رابطہ قائم کرتے۔ عورت و مرد، بچے و بوڑھے سب سے معلومات فراہم کرتے[۲۳]۔ زہری کی یہ روایتیں زیادہ تر مغازی سے متعلق ہیں۔

پیشِ نظر مقالہ کا مقصد محدث و فقیہ کی حیثیت سے زہری کے فضل و کمال پر روشنی ڈالنا نہیں بلکہ ایک سیرت نگار یا مؤرخ کی حیثیت سے ان کی خدمات کا جائزہ لینا ہے[۲۴]۔ حدیث و فقہ کے میدان میں ان کی عظمت و فضیلت کا اندازہ کرنے کے لیے یہ ذکر کافی ہے کہ وہ مدینہ کے معروف و مشہور محدثین و فقہا کی روایات کے امین تصور کیے جاتے تھے[۲۵]۔

زہری کی معرکۃ الآرا تالیف سیرت نبویؐ کے جملہ ادوار (ماقبل اسلام و مابعد اسلام) کی عکاسی ہے (بعثت سے قبل،

آپ کی زندگی میں جو اہم واقعات رونما ہوئے اُن کے ذکر کے علاوہ یہ کتاب مکّی و مدنی زندگی کے مختلف پہلوؤں بالخصوص آپ کے پیغمبرانہ مشن اور فوجی کارناموں پر روشنی ڈالتی ہے۔ سخاوی کے خیال میں حجاج بن ابی معنی نے مغازی کی روایات میں زہری کو ماخذ کی حیثیت سے استعمال کیا ہے[۲۶]۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ زہری نے مغازی پر مشتمل کوئی کتاب تصنیف کی ہوگی۔ حاجی خلیفہ نے اس نوعیت کی ایک کتاب زہری سے منسوب کی ہے[۲۷]۔ زہری بار بار "سیرۃ" کا لفظ استعمال کرتے ہیں[۲۸] گرچہ ان کی کوئی کتاب اس نام سے معروف نہیں ہے۔

زہری کی مکمل کتاب دستیاب نہیں۔ صرف اس کے متفرق اجزاء واقدی، طبری اور بلاذری کی تالیفات میں ملتے ہیں۔ ان اجزاء کو ترتیب دے کر تاریخی واقعات کا ایک مربوط مجموعہ تیار کیا جا سکتا ہے۔ مختصراً اس کا ایک خاکہ ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

۱۔ زمانہ ماقبل اسلام :

(ا)۔ اس دن (جمعہ) کا ذکر جس میں حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش ہوئی، جنت میں دخول اور اس سے اخراج ہوا[۲۹]۔

(ب) حضرت نوح علیہ السلام کا بیان، اُن کی اولاد اور نسل کا کرۂ ارض پر منتشر ہونا اور اُن کے مابین زمین کی تقسیم[۳۰]۔

(ج) عرب (اولاد اسمٰعیل) کی قدیم تاریخ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالنے کے واقعات سے شروع ہو کر عام الفیل تک پہنچتی ہے اور عہد ہجرت پر اختتام پذیر ہوتی ہے[۳۱]۔

(د) حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جانب سے اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی کا عہد اور اس کی عدم تکمیل کے لیے شیطان کی ناکام کوشش[۳۲]۔

تاریخی واقعات کے یہ اجزاء گزشتہ انبیاء کی زندگی کے مطالعہ میں زہری کی دلچسپی کو ظاہر کرتے ہیں قطعی طور سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ بیانات مغازی کا حصہ تھے یا کسی اور باب کا۔ البتہ پہلی صورت قرین قیاس نہیں معلوم ہوتی۔ سخاوی کی روایت کے مطابق[۳۳] یونس بن فرید (وفات ۱۵۶ھ/ ۷۷۵ء) نے بھی نبوت سے پہلے کے ان واقعات کو قلمبند کیا ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مشاہدہ میں آئے تھے۔ مثلاً حرب فجار، تعمیر کعبہ اور حلف الفضول۔

(ر) زہری نبی موعود کے ظہور کے کچھ آثار کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ مثلاً اس کی بابت ایک فرشتہ کا کسری کو انتباہ[۳۴]۔ دورِ جہالت کے خاتمہ سے متعلق ایک کاہن کی پیشین گوئی اور ایک معجزانی علامت کا ظاہر ہونا جس کی نشاندہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے منسوب کی جاتی ہے[۳۵]۔

(س) اس کے علاوہ تجارت کے لیے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی جانب سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمات حاصل کرنے اور ان کے رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے کا بیان اور آپ کی عمر مبارک کا ذکر ملتا ہے[۳۶]۔

۲۔ عہد رسالت[م] : مکّی دور :

(الف) نزولِ وحی کی ابتدا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی گھبراہٹ و پریشان حالی اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی تسلی و دلجوئی۔

اس حقیقت کا انکشاف کہ محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے پہل کیسے ادراک کیا کہ انھیں پیغمبرانہ مشن کے لیے منتخب کیا گیا ہے[۳۷]۔ قرآن کریم کی پہلی و آخری آیت کا ذکر[۳۸]۔ سلسلہ وحی کے انقطاع کے دوران پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی پریشانی[۳۹]، اور قبولیتِ اسلام میں اوّلیت کا شرف حاصل کرنے والوں (حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا و حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ) کا بیان[۴۰]۔

(ب) رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اور تبلیغی جدوجہد، قریش کا ردِّ عمل[۴۱]۔ قریش کے علاوہ، دوسرے قبائل بالخصوص کندہ اور بنی عامر میں آپؐ کی دعوتی سرگرمیوں کا ذکر[۴۲]۔

(ج) **ہجرت حبشہ**: نجاشی بادشاہ کے دربار میں مسلمانوں کا استقبال، نجاشی بادشاہ کے دربار میں ایک قریشی وفد کی آمد، مسلمانوں کو وہاں سے نکالنے اور اُن کے حوالہ کرنے کی ناکام کوشش، مسلمانوں کے تحفظ کے لیے نجاشی بادشاہ کی یقین دہانی اور اس سے متعلق دوسری تفصیلات[۴۳]۔

(د) قریش کی جانب سے بنو ہاشم اور بنو عبد المطلب کا مقاطعہ[۴۴]۔ آپ کے عم محترم ابوطالب کی وفات اور کلمہ شہادت پڑھنے سے ان کی محرومی[۴۵]۔ شب اسراء و واقعہ معراج کا بیان[۴۶]۔

(س) بیعت عقبہ اور اس کے خاص خاص نکات، مدینہ میں دعوتِ اسلام کی ابتدا[۴۷]۔

مدنی دور:

(الف) **سفرِ ہجرت**: سراقہ بن جعشم کا آپؐ کے تعاقب میں نکلنا اور مشکلات سے دوچار ہونا[۴۸]۔ مدینہ منورہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد اور اس کا پس منظر، مسجد نبا کی تعمیر[۴۹]، مہاجرین پر نئے ماحول کے طبعی اثرات اور ابتلاء بخار[۵۰]۔

(ب) **سریہ بجار عبداللہ بن جحش**: شرکاء سریہ کی تعداد اور ان کا تعارف[۵۱]۔ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کے بغیر) قریشی کارواں پر حملہ اور آپؐ کی جانب سے اظہار ناپسندیدگی[۵۲]۔

(ت) محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت توحید و رسالت[۵] اور یہودیوں کا ردِّ عمل[۵۳]۔ مسلمانوں کے ساتھ ان کا برتاؤ، عبداللہ بن ابی کا معاندانہ رویہ[۵۴]، تحویل قبلہ[۵۵]۔

(ث) **غزوہ بدر**[۵۶]: کاروان قریش کی بابت عاتکہ بنت عبد المطلب کا خواب[۵۷]۔ قریش کی اعانت کے لیے ایاس بن رحضہ کی دس اونٹوں کی پیشکش اور ضرورت کے وقت مزید کی یقین دہانی، فوج کے نظم و ضبط سے متعلق ایک قریشی نوجوان عمیر بن وہب کی رپورٹ اور قریش کو واپسی کا مشورہ، عتبہ بن ربیعہ کا اس مشورے سے اتفاق، ابوجہل کا اس کی قبولیت سے انکار، جنگ کی ابتداء اور دونوں فوجوں کی مڈبھیڑ، مسلمانوں کو دیکھتے ہی ابوجہل کی زبان پر بددعا کا جاری ہونا، کفار مکہ کی فوج پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک نظر، مسلمانوں کی فتح و کامرانی اور دشمنوں کی پسپائی کے لیے خدائے تعالیٰ کے حضور آپ کی التجا[۵۸]، تمام مسلمانوں میں سب سے پہلے جام شہادت نوش کرنے والے اور ہر قبیلہ میں شہادت میں اوّلیت حاصل کرنے والے کا ذکر[۵۹]۔ جنگ کے خاتمہ پر رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے میدان جنگ

کا معائنہ، تبدیلیوں کی حاضری اور اُن کے ساتھ مثالی حسن سلوک کا بیان۔[۶۰]

(ح) غزوہ سویق: اس کی تاریخ اور متعلقہ تفصیلات۔[۶۱]

(د) مسلمانوں اور یہودیوں کے مابین تعلقات کی خرابی، باہمی منازعت کی ابتدا، اوس کے ہاتھوں کعب بن اشرف کا قتل[۶۲] نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خوش کرنے کے لیے اوس خزرج کی مسابقانہ کوشش، خزرج کا دوسرے یہودی سردار ابن ابی الحقیق کو قتل کرنا[۶۳] یہودیوں کی جانب سے خطرات اور اُن سے مصالحتی معاہدہ۔[۶۴]

(ذ) غزوہ بنی قینقاع: ایک آیت کے منشا کو اُن کے خلاف اقدام کے لیے ارشادِ ربانی تصور کرنا، اس قبیلہ کے لوگوں کے ساتھ مسلمانوں کے برتاؤ کا مفصل بیان۔[۶۵]

(ر) غزوہ قرقرۃ الکدر کا ذکر جو ہجرت کے بائیس مہینہ بعد واقع ہوا۔[۶۶] اور ہجرت کے دو برس و دو مہینہ بعد بحران میں بنوسالم کے خلاف معرکہ کا پیش آنا۔[۶۷]

(ز) غزوہ اُحد[۶۸]: مدینہ کے اندر رہ کر یا اس سے باہر جاکر قریش سے مقابلہ کے لیے مسلمانوں کا باہمی مشورہ[۶۹] عبداللہ بن ابی بن سلول کی رائے کا ذکر[۷۰] جنگ کے خاتمہ پر مسلمانوں کا ایک دوسرے سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خیریت معلوم کرنا[۷۱]۔ مشہور قریشی ابی بن خلف کا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو (نعوذ باللہ) قتل کرنے کی کوشش اور خود اس کا خاتمہ[۷۲]۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت اور متعلقہ واقعات کا بیان[۷۳]۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی میدانِ جنگ پر ایک نظر اور اپنے تاثرات کا اظہار۔[۷۴]

(س) مدینہ سے بنونضیر کا اخراج: پس منظر، تاریخ وحالات اخراج، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ مالِ غنیمت کی تقسیم۔[۷۵]

(ش) غزوہ خندق[۷۶]: اعداء اسلام کی مختلف جماعتوں کا اتحاد اور مسلمانوں کے لیے کٹھن صورتِ حال، بعض محاصرہ کرنے والوں سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو، دشمنوں سے مصالحت کرنے کے لیے انصار کی مخالفت۔ بعض قریش کی جانب سے خندق پار کرکے جنگ کرنے کی کوشش اور پسپائی[۷۷]، مسلمانوں کے خلاف بنو قریظہ کی سازش اور بدعہدی، قریش و یہودیوں میں پھوٹ ڈالنے کی کامیاب کوشش، سخت آندھی و طوفان اور محاصرہ کا خاتمہ۔[۷۸]

(ص) غزوہ خندق کے فوراً بعد بنو قریظہ کے خلاف اقدام[۷۹] اور ان کے ساتھ سخت برتاؤ[۸۰]، دیگر تفصیلات۔[۸۱]

(ض) بنو لحیان کے خلاف ایک مہم کی روانگی اور بعد کی تفصیلات کا ذکر۔[۸۲]

(ط) واقعہ افک کی تفصیلات۔[۸۳]

(ظ) سریہ زید بن حارث رضی اللہ عنہ کا ذکر جو امر قرافہ سے مقابلہ کے لیے بھیجی گئی۔[۸۴]

(ع) صلح حدیبیہ: اس کی غرض وغایت، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدینہ سے روانہ ہونے والے مسلمانوں اور قربانی کے لیے ساتھ جانے والے اونٹوں کی تعداد[۸۵]۔ راہ سفر کے انتخاب کے لیے نبی کریم

صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت۔ حدیبیہ میں مسلمانوں کا قیام، قریش مکہ سے صلح کا معاہدہ کرنے کے لیے آپ کی خواہش اور پیش رفت۔ قریش کا ردِ عمل اور ان کا برتاؤ۔ بنو خزاعہ اور مسلمانوں کے مابین دوستانہ تعلقات، قریش کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ارادوں کی اطلاع[۸۶]۔ تفتیش حالات اور پیغام رسانی کے لیے قریش کے متعدد سفراء کی آمد اور قریش کے سامنے صورتِ حال کی وضاحت، قریش کے نمائندوں سے بات چیت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حکمت عملی، صلح کے لیے نیک ارادوں کا اظہار اور معاہدہ کا مشورہ۔ قریش کی جانب سے بات چیت کے لیے سہیل بن عمرو کی آمد۔ معاہدہ کے بعض الفاظ سے متعلق اختلافی بحث، معاہدہ کا طے شدہ متن اور گواہوں کے نام۔ معاہدہ کی بعض شرطوں پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اظہار ناپسندیدگی۔ حدیبیہ میں قربانی انجام دینے پر صحابہ کا پس و پیش صلح حدیبیہ اور اس کے نتائج کی اہمیت پر زہری کے تاثرات[۸۷]۔

(ع) **فتح خیبر**: فتح کا پس منظر اور اس کی تاریخ، یہودیوں سے صلح کا معاہدہ، اس کے نکات پر عمل آوری اور کچھ قانونی باریکیاں، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ و حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خیالات[۸۸]۔ فتح خیبر کے دوران پیش آنے والے واقعات[۸۹]۔ فدک کے معاملات کا تصفیہ[۹۰]، بعض چھوٹے چھوٹے معرکوں کا بیان[۹۱]۔

(ف) **فتح مکّہ**: حلیف اور مخبر کی حیثیت سے بنو خزاعہ کی خدمات کا ذکر[۹۲]۔ صلح حدیبیہ کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بنو خزاعہ سے باقاعدہ معاہدہ، بنو بکر اور قریش کا بنو خزاعہ پر حملہ اور فتح مکّہ کے لیے مہم کا آغاز[۹۳]۔ مسلمانوں کو اس سے باز رکھنے کے لیے ابوسفیان کی ناکام سفارت، اس مہم کو سرانجام دینے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تیاریاں[۹۴]۔ آپؐ کی جانب سے مدینہ میں ایک قائم مقام کا تعین اور آپ کی قیادت میں مہم کی روانگی، روانگی کی تاریخ اور اس کے شرکاء کی تعداد[۹۵]۔ خانہ کعبہ کو بتوں سے پاک کرنے اور دوسرے اہم فیصلوں کا اعلان۔ فتح کے بعد مکہ میں آپؐ کے قیام کی مدت کا ذکر[۹۶]۔

(ق) **فتح مکّہ کے بعد کے غزوات**: غزوہ ہوازن (یا غزوہ حنین) تعداد کی کثرت اور مسلمانوں کی خوش گمانی، کفارِ مکہ کے ایک مقدس درخت (ذات انواط) سے متعلق ایک دلچسپ واقعہ کا ظہور[۹۷]۔ ابتداءً مسلمانوں کی شکست کے آثار، انصار سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اپیل اور ان کا حوصلہ مندانہ جواب، جنگ فیصلہ کن مرحلہ میں، اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعائیں۔ فتح و کامرانی کا حصول[۹۸] اور مالِ غنیمت کی تقسیم[۹۹]۔ غزوہ تبوک[۱۰۰] اور اس کی تفصیلات[۱۰۱] ایلہ، اذرح، اذرعات[۱۰۲]۔ تبالہ اور جرش کے باشندوں پر جزیہ کا نفاذ[۱۰۳]۔ دومۃ الجندل کا معرکہ اور وہاں کے لوگوں سے جزیہ کی تحصیل[۱۰۴]۔

(ک) غیر مسلم سربراہانِ مملکت کے نام خطوط اور وفود کی آمد و رفت، کندہ کے وفد کی آمد[۱۰۵]۔ بادشاہ ہرقل کے پاس دحیہ کلبی کے بدست ارسال مکتوب، زہری اس ضمن میں ہرقل کے ایک خواب اور اسلام کی جانب اس کے پوشیدہ رجحان کا ذکر کرتے ہیں، اور بطور ثبوت ایک پادری کے بیان کا حوالہ دیتے ہیں[۱۰۶]۔

کسریٰ بادشاہ کے نام رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا خط اور اس کو پھاڑنے کا واقعہ،[۱۰۷] آپؐ پر اس کا ردِ عمل، یمن کے گورنر کو کسریٰ کا حکم کہ وہ محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اقدام کرے اور ان سے مطالبہ کرے کہ یا تو وہ توبہ کرلیں ورنہ اپنی جان کی قیمت ادا کرنے کے لیے تیار ہو جائیں، باذان کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے خط و کتابت، کسریٰ کے خاتمے سے متعلق آپؐ کی پیشین گوئی پر یقین، باذان کا دیگر اہلِ فارس کے ساتھ اسلام قبول کرنا۔[۱۰۸]

(ل) نجران کے قبیلۂ بنی حارث میں خالد بن ولید کا دعوتی مشن، بنو حارث کا مشرف بہ اسلام ہونا۔[۱۰۹] بنو تمیم کا صدقہ کی ادائیگی سے انکار اور ان کے خلاف اقدام، مدینہ میں وفدِ بنی تمیم کی آمد اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بات چیت[۱۱۰]

(م) رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی زندگی سے متعلق تفصیلات،[۱۱۱] ازواجِ مطہرات کا ذکر، پیغمبر کے بعض ناموں کی توضیح و تشریح۔[۱۱۲]

(ن) حجۃ الوداع اور اس سے متعلق تفصیلات،[۱۱۳] رومیوں کے خلاف حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کی قیادت میں ایک مہم کی تیاری۔[۱۱۴]

(و) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری علالت، وفات کی قربت کا احساس اور ایک خطبہ میں اس کی جانب اشارہ، حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کی مہم کو جلد روانہ کرنے کی ہدایت، خلافت کے مسئلہ پر بات کرنے کے لیے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونے کا مشورہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اس پر عمل کرنے سے انکار، اس ضمن کی دوسری تفصیلات۔[۱۱۵] مسجد نبویؐ میں آخری بار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مسلمانوں سے ملاقات اور نماز کی امامت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سپرد کرنا۔[۱۱۶] رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری کلمات اور آپؐ کا وصال، تاریخ وصال اور عمرِ مبارک کا ذکر،[۱۱۷] آپؐ کی تجہیز و تکفین کا مفصل بیان۔[۱۱۸]

مذکورہ بالا مضامین و واقعات کی اس بالترتیب تشکیل سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سب سے پہلے زہری نے سیرت کا ایک متعین خاکہ فراہم کیا اور اس کے مختلف پہلوؤں کو اس انداز میں نمایاں کیا کہ بعد کے سیرت نگار اس کو وسعت دینے کے علاوہ اس پر کچھ اضافہ نہ کر سکے۔ مغازی یا سیرت پر زہری کی بحث کا آغاز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے ان اہم واقعات سے ہوتا ہے جو دورِ نبوت سے پہلے رونما ہوئے۔ زہری آپؐ کے شجرہ نسب سے متعلق بھی معلومات فراہم کرتے ہیں۔[۱۱۹] آثارِ نبوت پر روشنی ڈالنے کے بعد نزولِ وحی کا ذکر کرتے ہیں۔ پھر مکی و مدنی دونوں ادوار میں آپؐ کے نبویؐ کارناموں کا مفصل بیان پیش کرتے ہیں۔ ہجرت کی تفصیلات، مدینہ کے مخصوص حالات، رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتی سرگرمیاں، سفراء و وفود کی آمد و رفت، آپؐ کی آخری علالت اور وفات زہری کے بیان کے خاص و اہم موضوعات ہیں۔

زہری کے بیان کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں واقعات کی ترتیب زمانی کی رعایت کی گئی ہے، وہ سیرت نبویؐ کے اہم واقعات، مثلاً ہجرت مدینہ، بدر، احد، خندق اور قرقرۃ الکدر کی جنگیں، بنو سالم، بنو قینقاع اور بنو نضیر کے خلاف معرکے، فتح خیبر، فتح مکہ، وفود کنندہ کی آمد اور آپؐ کے وصال کو خاص طور سے ان کے وقوع کی تاریخ کے ساتھ ذکر کرتے ہیں۔[۱۲۰] واقعات کی

تاریخ کے تعیّن میں زہری کی دلچسپی سے فنِ سیرت نگاری کو ایک نیا اور اہم رُخ ملا۔

زہری کا اندازِ بیان بنیادی طور پر محدثانہ ہے[121]۔ ان کی علمی سرگرمیوں اور تصنیفی و تالیفی کارناموں کا خاص مُدعا علمِ حدیث کو فروغ دینا تھا۔ تاریخی روایات پر مشتمل حدیثیں محض اُن کا ایک حصّہ ہیں۔ تحصیلِ علم اُن کے خیال میں ایک اہم سماجی و مذہبی ضرورت کی تکمیل کا نام ہے۔ ایک تعبدی عمل کی حیثیت سے بھی اس کا مقام کچھ کم نہیں ہے[122]۔ علم شرافت اور سماج میں اعلیٰ مرتبہ کے حصول کا ایک ذریعہ بھی ہے[123]۔

زہری کا طریقۂ تحقیق و تفتیش اسناد یا سلسلۂ روایت پر مبنی ہے۔ روایت کی چھان بین میں ان کا نظریہ ایک محدّث سے ملتا جلتا ہے۔ بعض اوقات ایک تابعی ہی کی روایت پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ ان کی بیان کردہ حدیثوں میں تاریخی واقعات کی کثرت پائی جاتی ہے۔ زہری کا خاص کارنامہ یہ ہے کہ اُنھوں نے اجتماعی روایت کے طریقہ کو ایجاد کر کے علمِ حدیث میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ اس نئے طریقہ کے تحت زہری متعدد احادیث کو ایک مربوط روایت میں مجتمع کر دیتے ہیں اور اس طرح ترتیب زمانی کی رعایت کے ساتھ تاریخی روایات کو بیان کر کے فنِ تاریخ نگاری کو ترقی و وسعت دیتے ہیں[124]۔ زہری اپنی روایات میں متعلقہ آیات قرآنی کا بھی بار بار حوالہ دیتے ہیں[125]۔ درحقیقت واقدی کی زہری سے بیان کردہ روایات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کے مطالعہ نے جس میں متعدد مقامات پر مدینہ کے مسلمانوں کے حالات زیرِ بحث آئے ہیں۔ تاریخی مطالعہ اور علمی تحقیق کے لیے ایک اہم داعیہ فراہم کیا[126]۔

زہری کے بیان میں خاص کر جنگی مہمات کی تفصیل کے موقعہ پر ما فوق البشری اور انسانی دونوں کرداروں کی کارفرمائی نظر آتی ہے[127]۔ ان کے نزدیک واقعات کے ظہور اور نتائج کے رونما ہونے کا واحد مؤثر سبب تقدیر کے مطابق ان کا پہلے سے طے ہونا نہیں ہے۔ زہری نے صلح حدیبیہ کا اس طور سے جائزہ لیا ہے کہ یہ ایک ایسا اقدام تھا جو ابتداء میں مسلمانوں کے جوش و خروش کا مستحق نہ بن سکا[128]۔ لیکن یہ ایک عظیم الشان کامیابی (فتح مکّہ) کا پیش خیمہ ثابت ہُوا۔

زہری کی احادیث بالعموم آسان پیرایہ اور مختصر انداز میں حقائق کے بیان پر مشتمل ہیں[129]۔ زہری نے عام طور پر واقعات کو فاخرانہ انداز میں بیان کرنے سے گریز کیا ہے۔ گرچہ ان کے یہاں بھی کہیں کہیں اس کی جھلک ملتی ہے۔ ان کے علاوہ دوسروں کے یہاں اس کی مثالیں بکثرت موجود ہیں[130]۔ زہری کا تاریخی مواد مجموعی طور پر احادیث سے اخذ کردہ ہے۔ معروف و مشہور قصّے ان کی رائے میں محض تفریح طبع کے آسان ذرائع ہیں[131]۔

زہری کے تاریخی مواد میں کچھ دوسرے عناصر کی آمیزش بھی نظر آتی ہے۔ یہ بعض تبدیلیوں کی نشاندہی کرتے ہیں مثلاً بعض مقامات پر مروجہ روائتوں اور قصّوں کے اثرات دکھائی دیتے ہیں، خصوصاً رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے سفیر سے ہرقل کے ناروا برتاؤ[132]، کسریٰ کی پیشگی آگاہی[133]، کسریٰ کی حکومت کے خاتمہ کے سلسلہ میں ایک کاہن کا اپنے رفیق کو انتباہ[134] اور ہجرتِ مدینہ کے وقت سراقہ کی جانب سے آپؐ کے تعاقب[135] جیسے واقعات کے ضمن میں۔ زہری گزشتہ پیغمبروں اور اہلِ کتاب کے مفاد میں بھی دلچسپی رکھتے ہیں[136]۔ اور اُن کے اس بیان میں بائبل کی روائتوں کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ اس نوعیت کے واقعات میں زہری کے واحد ماخذ کعب احبار ہیں[137]۔

زہری کے یہاں شعر و شاعری کی لطافت بھی ملتی ہے[138]۔ درحقیقت اس عہد کے تہذیب و تمدن میں شاعری کو جو مقبولیت حاصل تھی اس کی وجہ سے اسے نظر انداز کرنا مشکل تھا۔ شعر و شاعری میں زہری کی دلچسپی[139] اور اس میدان میں ان کے علم کی گہرائی عام طور سے مشہور و معروف ہے[140]۔ اشعار کے حوالے زیادہ تر مغازی کے بیان میں ملتے ہیں۔ لیکن ان میں دورِ جاہلی کی مخصوص شاعری "ایام" کا عکس نظر نہیں آتا۔

زہری کا تاریخی مطالعہ مغازی تک محدود نہیں ہے بلکہ انساب کی تفصیل اور اسلام کے ابتدائی حالات ان کی تاریخی روایات کے اہم اجزا ہیں۔ زہری کو علم الانساب میں مہارت حاصل تھی[141]۔ ان کے بارے میں یہ روایت مشہور ہے، کہ جب خالد القسری نے ان سے عرب کا نسب لکھنے کو کہا اور انھوں نے شمالی عرب کے قبیلہ مضر سے اس کی ابتداء کی۔ لیکن اس قدر تفصیل سے اُسے تحریر کرنا شروع کیا کہ یہ بھی مکمل نہ ہو سکا[142]۔ مصعب زبیری نے اپنی کتاب "نسب قریش" میں زہری کو ماخذ کی حیثیت سے استعمال کیا ہے[143]۔ اور اس سے قرہ بن عبدالرحمٰن کے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ زہری نے اپنے لوگوں (قریش) کے نسب پر ایک کتاب تالیف کی تھی[144]۔

زہری نے خلافتِ راشدہ سے بھی بحث کی ہے۔ زہری نے اس عہد کے ان تمام واقعات کو بیان کیا ہے جو امت کی تعمیر و ترقی اور سنت کی آبیاری میں کافی اہمیت کے حامل تھے۔ انھوں نے آپ کی وفات کے بعد مسئلہ خلافت کے رونما ہونے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے انتخاب کا تفصیل سے جائزہ لیا[145]۔ خلیفہ اول کے افتتاحی خطبہ کے ذکر کے بعد ایک خلیفہ کی حیثیت سے ان کے مثالی کردار کو نمایاں کیا ہے[146]۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے انتخاب کے ضمن حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نقطہ نظر، ان کی جانب سے بیعت میں تاخیر اور فدک کی جائیداد پر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا دعویٰ استحقاق بھی زیر بحث آیا ہے[147]۔ خلیفۂ ثانی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں دیوان (سپاہیوں کے اندراج اور ان کے وظائف کی تعیین و تقسیم کا دفتر) کی تشکیل[148]۔ اور شوریٰ کی کارکردگی پر روشنی ڈالی گئی ہے[149]۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی عمر اور ان کے بعض خطبات کا بھی ذکر آیا ہے[150]۔ زہری کے یہاں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت پر نہایت مفصل بیان ملتا ہے۔ سب سے پہلے قرآن کی ترتیب مذکور ہے[151]۔ اس کے بعد پُرفتن حالات کی عکاسی ہے۔ ان کا بیان اس حیثیت سے کافی اہمیت رکھتا ہے کہ یہ اہل مدینہ کے نقطہ نظر کی وضاحت کرتا ہے۔ زہری کی رائے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنے دورِ خلافت کے چھ سال تک کافی مقبول رہے۔ اس کے بعد شکایتوں کی ابتدا ہوتی ہے جس میں بتدریج اضافہ ہوتا رہا[152]۔ زہری نے ان شکایتوں[153] اور ان کے ازالہ کے لیے خلیفہ کی کوششوں کا مفصل بیان پیش کیا ہے[154]۔ مروان کے بیجا اثر و رسوخ[155]، اہل مدینہ میں افتراق و انتشار کا ظہور[156]، شورش و ہنگامے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت[157]۔ مدینہ کی اہم شخصیات پر اس کا ردِ عمل اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے انتخاب کے واقعات بالترتیب بیان ہوئے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور سے متعلق جو امور خصوصیت سے مذکور ہیں، وہ ہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے انتخاب پر حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ و حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے تاثرات، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ان لوگوں کی گفتگو، بصرہ کے لیے تینوں کی روانگی، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ان کی بات چیت، جنگ جمل کا وقوع[158]، حضرت علی رضی اللہ عنہ و حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا اختلاف، جنگ صفین اور فیصلہ تحکیم، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی فتح مصر[159]، اہل کوفہ سے حضرت

حسن رضی اللہ عنہ کے تعلقات، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے اُن کی بات چیت اور ان کے حق میں خلافت سے دستبرداری۔[۱۶۱]

زہری نے دورِ بنو اُمیّہ سے متعلق باقاعدہ کوئی تاریخی مطالعہ پیش نہیں کیا ہے۔ تاہم یہ مروی ہے کہ اموی خلیفہ ولید اوّل نے زہری سے خلفاء بنی اُمیّہ کے دورِ حکومت کو انفرادی طور پر درج کرنے کی خواہش ظاہر کی[۱۶۲] اور زہری نے ہر ایک کا عہدِ خلافت تاریخ کے تعین کے ساتھ قلمبند کر کے اس کی تکمیل کی[۱۶۳]۔ زہری کے مختصر بیان کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ مشہور مؤرخ طبری ولید اوّل کی خلافت کی مدت پر بحث کرتے ہوئے زہری کا حوالہ دیتے ہیں۔[۱۶۴]

اسلامی تاریخ کے مختلف ادوار (عہدِ نبویؐ، خلافتِ راشدہ اور مختصراً خلافتِ بنو اُمیّہ) سے متعلق زہری کے مطالعے سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ حدودِ اسلامیہ کی توسیع اور مفتوح علاقوں کے نئے حالات و تجربات نے تاریخ نگاری کے ارتقا کے لیے زمین ہموار کی۔ اصولِ اجماع کی نشو و نما، سیاسی اختلافات اور فرقہ بندی، شورش و ہنگامے کے نتیجے میں رونما ہونے والے واقعات سے متعلق مختلف رائیں، خلیفہ کے تعین کے لیے انتخاب کے اصول کا اختیار کرنا، نظم و نسق کے شعبہ جات خصوصاً شعبہ محاصل و دیوان کی ترتیب و تشکیل[۱۶۵]۔ وہ اہم مسائل ہیں جن پر زہری نے وضاحت سے روشنی ڈالی ہے۔

زہری کا اندازِ بیان سیدھا سادہ ہے۔ اُن کے بیان میں امّت مجموعی طور پر صحیح راہ پر گامزن نظر آتی ہے۔ ان کی بیان کردہ روایات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ امّت کی قیادت کے لیے رسولِ خداؐ نے کسی کو نامزد نہیں کیا، اس سے آپ کی جانب سے اصولِ انتخاب کی پسندیدگی اور موروثی جانشینی کی مخالفت کا پتہ چلتا ہے اور آپ کے وصال کے بعد اسی اصول کے تحت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خلیفہ مقرر کیے گئے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جو ابتداءً کچھ متامل تھے۔ بعد میں بطیبِ خاطر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ زہری کے خیال میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ اچھے اور کامیاب ترین خلیفہ کے اعلیٰ نمونہ تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دورِ حیات کا فتنہ میں مبتلا ہونا اور تفرق و انتشار کا شکار ہونا زہری کی رائے میں یقیناً "ایک تشویشناک معاملہ اور پیچیدہ مسئلہ تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف جذبات کا برانگیختہ ہونا ان کے بعض انتظامی اقدامات کی وجہ سے تھا۔ بہر حال زہری کے بیان میں اس پُرفتن دور کی تصویر اتنی تاریک نظر نہیں آتی جتنی دوسروں کے یہاں دکھائی دیتی ہے۔ ان کی رائے کے مطابق اہلِ مدینہ فتنوں کے دوران واضح طور پر دو کیمپ میں منقسم تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ شروع میں ایک صلاح کار کا کردار ادا کرتے ہیں، لیکن بعد میں وہ بالکل کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔ تاہم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت سے انھیں سخت صدمہ پہنچتا ہے۔ اس کے بعد زہری حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اختلاف کا ذکر کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ و زبیر رضی اللہ عنہ کے مابین جو اختلاف تھا اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ حق بجانب تھے اور ان کے مخالفین کا عمل محلِ نظر تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ و حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی منازعت میں بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اقدامات کی تائید کی گئی ہے۔ زہری کے نزدیک حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی تیزی و ہوشیاری قابلِ تعریف تھی۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں خلافت سے دستبردار ہونے کے واقعہ سے زہری یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے اقدامات کو قانوناً صحیح تسلیم کر لیا گیا تھا۔ زہری کے خیالات اس امر کی نشان دہی کرتے ہیں کہ وہ کسی سیاسی جماعت

سے متاثر نہیں تھے۔ وہ اپنے مشاہدات کی روشنی میں ایک غیر جانبدارانہ بیان پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس امر کی مزید وضاحت کے لیے یہاں زہری و بنو اُمیہ کے تعلقات پر مختصراً روشنی ڈالنا ضروری معلوم ہوتا ہے[۱۶۶]۔

یعقوبی کے بیان کے مطابق عبدالملک نے ابن زبیر سے اختلاف کے وقت اہلِ شام کو حج کے لئے جانے سے روکنے کی خاطر زہری کے حوالہ سے ایک حدیث روایت کی تھی جس سے حج کے لیے یروشلم جانے اور مسجد اقصیٰ کی زیارت کرنے کا جواز ثابت ہوتا تھا[۱۶۷]۔ اوّل تو یہ حدیث مشکوک ہے دوسرے زہری اس وقت کم سن اور بالکل غیر معروف تھے۔ زہری نے یقیناً دمشق کا سفر کیا تھا لیکن عبدالملک سے اُن کی ملاقات اتفاقیہ تھی۔ خلیفہ پہلے سے ان کے واقف نہیں تھے، اس ملاقات کے بعد وہ ان کی علمیت و ذہانت سے متاثر ہوئے۔ خلیفہ نے خوش ہو کر ان کے ذمہ جو کچھ قرض تھا اس کی ادائیگی کا انتظام کرایا اور تحف و تحائف سے نوازا۔ مزید برآں انھیں علمی کاموں میں مصروف رہنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ زہری مدینہ واپس آکر علمی مشاغل میں لگ گئے[۱۶۸]۔ اس روایت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ زہری اس وقت ایک نوجوان عالم تھے اور اگر خلیفہ وہاں ان کی موجودگی کو اہم تصور کرتے تو خانہ جنگی کے دوران انھیں مدینہ واپس اور خاموشی کے ساتھ علمی کام کرنے کا مشورہ نہ دیتے۔ اس کے علاوہ ایک دوسری روایت سے یہ پتا چلتا ہے کہ ابن زبیر و عبدالملک کی باہمی جنگ کے دوران زہری عبدالملک کے اقدام سے متفق نہ تھے[۱۶۹]۔ اس لیے عبدالملک سے زہری کے اچھے تعلقات اور اموی دربار میں اُن کی مقبولیت قرین قیاس نہیں معلوم ہوتی۔ اس صورتِ حال میں زہری کا یہ بیان زیادہ قابلِ قبول ہے کہ وہ ابن الاشعث کے دور (۸۰ھ) میں دمشق آئے[۱۷۰]۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ ابن زبیر کی وفات اس سے تقریباً سات آٹھ سال پہلے ہی ہو گئی تھی۔

اس امکان سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ علمی مصروفیات کی وجہ سے زہری ایک طویل عرصہ تک مدینہ میں مقیم رہے اور اس دوران اموی دربار میں ان کی موجودگی اتفاقیہ تھی: مدینہ سے وہ ادرح منتقل ہوئے جو حجاز کی سرحد پر فلسطین کے شمال میں واقع ہے، وہاں سے اُنھوں نے ایک عالم کی حیثیت سے حجاز و دمشق کا سفر کیا[۱۷۱]۔ عمر بن عبدالعزیز اُن کی بہت عزت کرتے تھے[۱۷۲]۔ عین ممکن ہے یزید ثانی اور ہشام کے دورِ خلافت میں اُنھوں نے دمشق میں سکونت اختیار کی ہو۔ یزید ثانی نے انھیں عہدۂ قضا سے سرفراز کیا۔ خلیفہ ہشام سے بھی اُن کے تعلقات اچھے تھے۔ خلیفہ نے اُنھیں اپنے لڑکے کا اتالیق مقرر کیا۔ اس سے اموی خلفاء کے یہاں اسلامی روایات کے پروان چڑھنے کا بھی پتا چلتا ہے کہ ہشام نے انھیں اپنے لڑکے کے لیے حدیثیں نقل کرنے کی بھی ہدایت کی[۱۷۳]۔ اور بعد میں ان کی مجلسوں کے لیے دو کاتب مقرر کیے جو اُن کے درس میں شریک ہوتے اور ان کی بیان کردہ روایات کو قلمبند کرتے[۱۷۴]۔

بنو اُمیہ کے آثارِ قدیمہ میں زہری کی علمی یادگاروں کا بیشتر حصہ انھیں مجلسوں کے خطبات پر مشتمل ہے۔ خلیفہ ہشام سے زہری کی ایک اختلافی بحث سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مکمل طور پر اموی خلفاء کے زیرِ اثر نہ تھے۔ ایک روایت کے مطابق ہشام نے زہری سے ایک آیت کے مفہوم کے بارے میں دریافت کیا۔ زہری نے جواب دیا کہ اس کا اطلاق عبداللہ بن ابی پر ہوتا ہے۔ ہشام کے خیال میں اس سے حضرت علی رضی اللہ عنہ مقصود تھے۔ جب زہری نے اپنی رائے پر اصرار کیا تو ہشام نے اُنھیں جھوٹا قرار دیا۔ زہری نے اس کی تردید کی اور یہ خیال ظاہر کیا کہ خدا کی قسم اگر آسمان سے یہ آواز سنائی دے کہ خدا نے جھوٹ بولنے کی اجازت دی ہے تو بھی میں جھوٹ نہیں بولوں گا[۱۷۵]۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ زہری کس پایہ کے عالم تھے۔

زہری کی علمی و تاریخی خدمات اسلام کے ابتدائی دَور پر مفصل بحث اور بیان کردہ روایات سے نتائج اخذ کرنے تک محدود نہیں بلکہ ان کا اصل کارنامہ اپنی روایات اور علمی تحقیقات کو ضبطِ تحریر میں لانا ہے۔ ان کے شب و روز کتابوں کے ارد گرد رہتے تھے[175] وہ کتابیں آج بھی اموی آثارِ قدیمہ کی زینت بنی ہوئی ہیں۔ جنھیں زہری نے ہشام کی ہدایت پر تصنیف کیا تھا[176]۔ زہری کی جانب منسوب کردہ یہ بیان کہ "ہم حدیثیں لکھنا ناپسند کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اربابِ اقتدار کی جانب سے ہم اس کے لیے مجبور کیے گئے۔ اس کے بعد ہم نے یہ پسند نہ کیا کہ دوسروں کو اس سے منع کیا جائے[178]۔ متاخرین رواۃ کی صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہے درحقیقت طالب علمی ہی کے زمانہ سے زہری نے احادیث اور ان کی تشریحات کو نوٹ کرنا شروع کر دیا تھا[179]۔ اس روایت سے بھی زہری کے تالیفی و تصنیفی کارناموں کا ثبوت ملتا ہے کہ لیث سمرقندی نے جب یہ توقع ظاہر کی کہ زہری کی کتابوں سے عام لوگوں کو استفادہ کا موقعہ ملے گا اور یہ کہ وہ اپنے علمی کارناموں کو تحریری شکل میں محفوظ کر کے اپنے آپ کو دوسرے کام کے لیے فارغ کریں گے تو زہری نے اس کے جواب میں یہ عرض کیا کہ اُنھوں نے جس انداز سے علم کی اشاعت کی ہے اور دوسروں کے لیے قابلِ استفادہ بنایا ہے۔ اس کی نظیر ملنی مشکل ہے[180]۔ زہری تصنیفی کارناموں کو اس قدر اہمیت دیتے تھے کہ کسی صاحبِ علم و فن کی کتاب کو پڑھنا یا اس سے براہِ راست فیض حاصل کرنا یکساں تصوّر کرتے تھے[181]۔ عبد اللہ بن عمر کی روایت کے مطابق زہری کسی کو اپنی کتاب دیتے وقت اس کے مضامین کو بغیر کسی مزید استفسار کے نقل کرنے یا روایت کرنے کی اجازت دیتے تھے[182]۔ مالک بن انس نے زہری کی علمی خدمات کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے۔ زہری پہلے شخص ہیں جنھوں نے علم کو تحریر کا جامہ پہنایا[183]۔ ان تحریروں نے دوسروں کے لیے اشاعت علم کی راہیں ہموار کیں۔

مختصر یہ کہ مذکورہ بالا تفصیلات سے یہ حقیقت آشکارا ہوتی ہے کہ زہری نے سیرت نگاری کے لیے ایک متعین خاکہ اور مضبوط ڈھانچہ فراہم کیا۔ اپنے تصنیفی کارناموں کی وساطت سے مدنی روایات کو مقبول بنانے اور انھیں محفوظ کرنے کی اہم خدمات انجام دیں۔ اگر عروہ کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے تاریخ نگاری کی داغ بیل ڈالی تو تاریخ نگاری کے مدنی اسکول کے قیام کا سہرا زہری کے سر ہے۔ دراصل زہری کی روایات اور سنجیدہ تخلیقات سے فن مغازی کی بنیادیں استوار ہوئیں اور نہ کہ وہب بن منبہ جیسے قصہ گو کے ذریعہ ان کے تلامذہ میں موسیٰ بن عقبہ اور ابن اسحاق نے خاص طور سے ان کے علمی کارناموں کو ترقی و وسعت دی۔ گرچہ ابن اسحاق کی کتابوں میں معروف و مشہور روایات اور بائبل کے قصّوں کا کافی مواد موجود ہے۔ لیکن ان کی تخلیقات کو مرکزی خیال بہرحال زہری ہی نے فراہم کیا تھا۔

زہری نے خود اس نکتہ کی وضاحت کی ہے کہ اُمّت کی روز افزوں ترقیات اور نت نئے تجربات فن تاریخ نگاری کے نشوونما کے لیے اہم محرک ثابت ہوئے۔ تاریخ نگاری کے ارتقاء میں زہری کی گراں قدر خدمت یہ ہے کہ اُنھوں نے عروہ کی ابتدائی کوشش کو آگے بڑھایا۔ تاریخ نگاری میں ان کی دلچسپی نے تاریخی مطالعہ کے لیے راہیں ہموار کیں اور تاریخی روایات کے تحفّظ کا سامان فراہم کیا۔

تعلیقات و حواشی

۱؎ مغازی عام طور پر "مہم" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ گرچہ لغوی طور پر یہ صحیح ہے لیکن تاریخی نقطۂ نظر سے اس وقت اس کا مفہوم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نبوی کارنامہ تھا۔

۲؎ دیکھئے انسائیکلو پیڈیا آف اسلام (مضمون "سیرۃ")

۳؎ بخاری، تاریخ، جلد اوّل حصہ اوّل صـ۲۲۱، ابن قتیبہ، معارف، ۲۳۹، یافعی، مرآۃ، حصہ اوّل، ۲۶۰، ابن جوزی، صفوۃ الصفوہ، دوم، ۷۹، فیشر، ذہبی، زیڈ، ڈی، ایم، جی، جلد ۴۴، ۱۸۹۰ء، ۴۳۵۔ ذہبی (تراجم، ۷۳) اور ابن کثیر (جلد ۹، ۳۴۳) دونوں ۱۲۴ھ کو صحیح قرار دیتے ہیں۔ گرچہ ۱۲۳ھ اور ۱۲۵ھ کا بھی امکانی حیثیت سے ذکر کرتے ہیں، دیکھئے اغانی، جلد ۶، ۱۰۶؛

۴؎ ذہبی، ۷۳ (واقدی ان کا سن پیدائش ۵۸ھ قرار دیتے ہیں) ابن جوزی، دوم، ۷۹، ابن کثیر، ۳۴۴؛

۵؎ ابن کثیر، جلد ۹، ۳۴۲۔

۶؎ فیشر، ذہبی، زیڈ، ڈی، ایم، جی ۱۸۹۰ء، ۴۳۵؛

۷؎ زہری کئی سال تک سعید بن مسیب کی خدمت میں رہے، ذہبی، ۶۷

۸؎ بخاری، محولہ بالا، ۴۵۱۔

۹؎ اغانی، جلد ۸، ۹۲-۹۳؛

۱۰؎ ایضاً، ۹۲، ابن حجر، تہذیب، جلد ۷، ۶۵

۱۱؎ ذہبی، ۶۹۔ نیز دیکھئے ابن قتیبہ، ۲۶۰، بخاری، ۲۲۱، ابن جوزی، دوم، ۷۷-۷۸

۱۲؎ سمعانی، انساب، ۲۸۱، ذہبی، ۶۸، ابن حجر، جلد ۷، ۶۸

۱۳؎ ذہبی، ۶۷

۱۴؎ ابن حجر، جلد ۷، ۶۸، ابن کثیر، جلد ۹، ۳۴۴، نیز دیکھئے ابن جوزی، دوم، ۷۸،

۱۵؎ بخاری، جلد ۴، ۳۲، ابونعیم، جلد ۳، ۳۶۰، ابن حجر، جلد ۷، ۶۵

۱۶؎ ابن خلکان، اوّل، ۵۸۶

۱۷؎ حاجی خلیفہ، دوم، ۱۷۴۷

۱۸؎ سخاوی، اعلان، ۴۸

۱۹؎ عروہ کی روایتیں خاص طور سے نزول وحی، ہجرت، غزوہ بدر، غزوہ بنی قینقاع، صلح حدیبیہ، فتح مکّہ اور پیغمبر کی زندگی کے کچھ ذاتی حالات سے متعلق ہیں۔

۲۰ھ واقدی (مخطوطہ، مطبوعہ بتصحیح جانسن) ۱۵۱، ۲۱۹، ۲۲۱، ۲۳۹، ۵۶۲، ۸۲۸، ۸۶۹، ۱۰۲۵، بلاذری، انساب، جلد ۵، ۲۵ - ۲۶، ۶۷، ۹۷

۲۱ھ واقدی، ۳۸۳، ۵۱۹، ۶۵۷، ۸۱۶، طبری، اوّل ۱۸۳۴۔

۲۲ھ ابن کعب بن مالک (واقدی، ۱۶۲، ۳۰۸، ابن سیدالناس، اوّل، ۲۳۱)، انس بن مالک (طبری، اوّل، ۱۸۲۸)، محمد بن جبیر بن مطعم (واقدی، ۲۸۱، ابن سیدالناس، اوّل، ۳۰) ابن عباس (طبری، اوّل، ۱۵۶۹، ابن سیدالناس، دوم، ۱۴۵) عبداللہ بن عمرو بن العاص (ابن ہشام، ۲۱۲) ابن سلمہ بن عبدالرحمٰن بن عوف (طبری، اوّل، ۱۰۱۹، واقدی، ۴۵، ابن سیدالناس، اوّل، ۱۴۲)، مالک بن اوس بن الحدثان (واقدی، ۲۴۹، ۳۶۳)

۲۳ھ دیکھیے ذہبی، ۶۹

۲۴ھ دیکھیے ہورونس (سیرت کے اوّلین ماخذ اور اُن کے مصنفین، اسلامک کلچر (حیدرآباد) جلد دوم ۱۹۲۸ء، ۳۲،

۲۵ھ بخاری، ۲۲۱، ابن جوزی، دوم، ۷۷-۷۸، ذہبی، ۶۸-۷۲، یافعی، ۲۶۱، ابن کثیر جلد ۹، ۳۴۲

۲۶ھ سخاوی، اعلان، ۸۸ (انگریزی ترجمہ، روزنیتھال، (ہسٹری آف مسلم ہسٹوریوگرافی، ۳۲۳)

۲۷ھ حاجی خلیفہ، دوم، ۱۷۲۷

۲۸ھ اغانی، جلد ۱۹، ۵۹

۲۹ھ طبری، اوّل، ۱۱۲،

۳۰ھ ایضاً، ۳۰۰ - ۳۰۱

۳۱ھ ایضاً، ۱۲۵۳

۳۲ھ ایضاً، ۲۹۳

۳۳ھ سخاوی، اعلان، ۸۸

۳۴ھ طبری، اوّل، ۱۰۱۴

۳۵ھ ایضاً ۱۱۴۵

۳۶ھ ابن سیدالناس، اوّل، ۴۷، ۵۰، طبری، اوّل، ۱۱۴۵،

۳۷ھ طبری، اوّل، ۱۱۵۶، ابن سیدالناس، اوّل، ۸۴ - ۸۵

۳۸ھ الندیم، فہرست، ۲۵، ابن سیدالناس، اوّل، ۸۵

۳۹ھ طبری، اوّل، ۱۱۵۵، ابن سیدالناس، اوّل، ۸۵

۴۰ھ طبری، اوّل، ۱۱۶۷، ابن سیدالناس، اوّل، ۹۲

۴۱ھ ابن حجر، ۲۰۳، نیز دیکھیے ابن سیدالناس، اوّل، ۱۱۱ - ۱۱۲

۴۲؎ ابن حجر، ۲۸۲-۲۸۳، طبری، اوّل، ۱۲۰۵-۱۲۰۶، ۱۲۱۳

۴۳؎ ابن حجر، ۲۱۷-۲۲۲، ۲۲۳-

۴۴؎ ابن سیدالناس، اوّل، ۱۲۱-۱۲۷

۴۵؎ ایضاً، ۱۳۱-۱۳۲-

۴۶؎ ایضاً، ۱۴۲، ۱۴۵، ۱۴۸

۴۷؎ طبری، اوّل، ۱۲۱۳، ابن سیدالناس، اوّل، ۱۵۷-۱۵۸

۴۸؎ ابن حجر، ۲۳۱-۲۳۲

۴۹؎ طبری، اوّل، ۲۵۰، ۲۵۶، ابن سیدالناس، اوّل، ۱۸۵-۱۸۶

۵۰؎ ابن حجر، ۴۱۷

۵۱؎ طبری، اوّل، ۱۲۷۳

۵۲؎ واقدی (القاہرہ ایڈیشن)، ۱۰، ابن سیدالناس، اوّل، ۲۳۹

۵۳؎ ابن حجر، ۳۹۳-۳۹۴

۵۴؎ ایضاً، ۵۹۱

۵۵؎ ابن سیدالناس، اوّل، ۲۳۱-۲۳۶

۵۶؎ طبری، اوّل، ۱۲۹۱

۵۷؎ ایضاً، ۱۲۹۲

۵۸؎ واقدی، ۴۳، ۴۵-۴۶، ایضاً (مخطوطہ) ۵۲-۵۳، ۵۶-۵۷، ۱۳۱، طبری، اوّل، ۱۳۲۲-۱۳۲۳

۵۹؎ واقدی، ۶۲، ۸۲، ایضاً (مخطوطہ)، ۱۰۱

۶۰؎ واقدی، ۸۹، ۱۱۱، ایضاً، مخطوطہ، ۱۰۷-۱۰۸

۶۱؎ واقدی، ۱۴۲ اور مخطوطہ، ۱۵۹-۱۶۰

۶۲؎ واقدی، ۱۴۴-۱۴۵ اور مخطوطہ، ۱۶۲

۶۳؎ طبری، اوّل، ۱۳۷۸-۱۳۷۹

۶۴؎ واقدی، ۱۵۱

۶۵؎ ایضاً، ۱۳۴-۱۴۱ اور مخطوطہ، ۱۵۶-۱۵۸، طبری، اوّل، ۱۳۶۰

۶۶؎ واقدی، ۱۴۳ اور مخطوطہ، ۱۲۴

۶۷؎ واقدی، ۱۵۹

۶۸ ایضاً (مخطوطہ) ۱۸۵، طبری، اوّل، ۱۳۸۴، ابن سیدالناس، دوم، ۲۰

۶۹ واقدی، ۱۶۴-۱۶۸ اور مخطوطہ، ۱۸۵-۱۸۶

۷۰ ابن حجر، ۵۹۱

۷۱ واقدی، ۱۸۴-۱۸۵ اور مخطوطہ، ۲۰۸، طبری، اوّل، ۱۴۰۶

۷۲ واقدی، ۱۸۵-۱۸۶ اور مخطوطہ، ۲۱۹، طبری، اوّل، ۱۴۰۶، ۱۴۰۷

۷۳ واقدی، ۲۱۲

۷۴ ابن حجر، ۵۸۶، واقدی، ۲۳۹، ابن سیدالناس، دوم، ۲۱

۷۵ طبری، اوّل، ۱۴۵۱، بلاذری، فتوح، ۱۸، ۲۰، ۲۱، ابن سیدالناس، دوم، ۴۸، ۵۰، ۵۱، واقدی (مخطوطہ)، ۱۵۸، ۳۳۱-۳۳۲

۷۶ طبری، اوّل، ۱۴۶۴، واقدی، (مخطوطہ)، ۳۸۷، ابن سیدالناس، ۵۵

۷۷ طبری، اوّل، ۱۴۷۳، واقدی (مخطوطہ) ۴۲۱-۴۲۲

۷۸ واقدی (مخطوطہ) ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۶

۷۹ طبری، اوّل، ۱۴۸۵، ابن سیدالناس، دوم، ۶۸

۸۰ بلاذری، فتوح، ۲۸۳

۸۱ ابن سیدالناس، دوم، ۴، ۱۷

۸۲ واقدی (مخطوطہ) ۴۸۰-۴۸۱

۸۳ طبری، اوّل، ۱۵۱۷، ابن سیدالناس، دوم، ۳۸۷

۸۴ واقدی، ۵۰۸، دیکھیے ابن سیدالناس، دوم ۱۰۵-۱۰۶

۸۵ طبری، اوّل، ۱۵۲۹، ابن سیدالناس، دوم، ۱۱۳

۸۶ طبری، اوّل، ۱۵۳۱، ۱۵۳۷، ابن سیدالناس، دوم، ۱۱۵، واقدی (مخطوطہ)

۸۷ طبری، اوّل، ۱۵۴۹-۱۵۵۰، ابن حجر، ۷۳۶-۷۴۰، ابن سید الناس، دوم، ۱۱۵-۱۱۹، ۱۲۱-۱۲۲، واقدی (مخطوطہ) ۵۱۹، ۵۲۹-۵۳۰، ۵۶۵-۵۷۰، ۵۷۲-۵۷۳

۸۸ ابن حجر، ۷۷۹، واقدی (مخطوطہ) ۶۳۴، ۶۵۷، بلاذری، فتوح، ۲۷، ابن سیدالناس، ۱۳۶-۱۳۷

۸۹ھ طبری، اوّل، ۱۵۷۵

۹۰ھ بلاذری، فتوح، ۵۹

۹۱ھ غزوۃ الغضبیہ المعروف ایضاً بعمرۃ القضیہ (واقدی، مخطوطہ، ۷۶۰)، معرکہ ابی العوجاء السلمی۔ یہ دونوں جنگیں ۷ھ میں واقع ہوئیں، اس کے علاوہ ذات الاطلاح پر حملہ ۸ھ میں پیش آیا۔ ابن سید الناس، دوم، ۱۲۰

۹۲ھ ابن حجر، ۷۴۷-۷۴۹

۹۳ھ طبری، اوّل، ۱۶۲۰، ابن سید الناس، دوم، ۱۲۰

۹۴ھ واقدی (مخطوطہ) ۷۳۱

۹۵ھ طبری، اوّل، ۱۶۲۸، ابن حجر، ۸۱۰، واقدی (مخطوطہ، ۸۱۴) فتح کی تاریخ بھی ذکر کرتے ہیں۔

۹۶ھ طبری، اوّل، ۱۵۶۵-۱۵۶۶، واقدی (مخطوطہ) ۷۶۶، ۷۹۵

۹۷ھ ابن حجر، ۸۴۴، واقدی (مخطوطہ)، ۸۱۸، ۸۱۹، ابن سید الناس دوم، ۱۹۱-۱۹۲

۹۸ھ طبری، اوّل، ۱۶۶۱-۱۶۶۲، واقدی (مخطوطہ) ۸۲۶، ۸۲۷-۸۲۸-۸۲۹

۹۹ھ واقدی (مخطوطہ) ۸۶۹ - ۸۷۰

۱۰۰ھ طبری، اوّل، ۱۶۹۴

۱۰۱ھ ابن حجر، ۷۹۸، ابن سید الناس، دوم، ۲۱۸

۱۰۲ھ بلاذری، فتوح، ۶۸

۱۰۳ھ ایضاً، ۵۹

۱۰۴ھ ایضاً، ۶۳

۱۰۵ھ طبری، اوّل، ۱۷۳۹

۱۰۶ھ ایضاً، ۱۵۶۵ - ۱۵۶۶

۱۰۷ھ ایضاً، ۱۵۷۲

۱۰۸ھ ابن حجر (القاہرہ ایڈیشن) اوّل، ۷۹

۱۰۹ھ ابن سید الناس، دوم، ۲۴۴ - ۲۴۵

۱۱۰ھ واقدی (مخطوطہ)، ۸۹۶ - ۹۰۳

۱۱۱ھ طبری، اوّل، ۱۷۷۶

۱۱۲ھ ایضاً، ۱۷۸۸۔ نیز دیکھیے ابن سید الناس، اوّل، ۳۰

۱۱۳ھ واقدی (مخطوطہ) ۱۰۰۱ - ۱۰۰۵

۱۱۴ه واقدی ، ۱۰۲۵

۱۱۵ه طبری ، اوّل ، ۱۸۰۹ ، ۱۸۱۰ ، ابن سیدالناس ، دوم ، ۳۳۶ - ۳۳۷

۱۱۶ه طبری ، اوّل ، ۱۸۱۳ ، ابن حجر ، ۱۰۱۰

۱۱۷ه طبری ، اوّل ، ۱۸۱۴ ، ۱۸۳۴ - ۱۸۳۵

۱۱۸ه ایضاً ، ۱۸۳۱

۱۱۹ه دیکھئے طبری ، اوّل ، ۱۱۶ اور نیز ملاحظہ کیجئے اسی مضمون کا ص۵۳

۱۲۰ه دیکھئے اسی مضمون کا ص۴۹

۱۲۱ه ابن کثیر ، جلد ۹ ، ۳۴۳ ، ۳۴۴ ، فیشر ، ذہبی ، محولہ بالا ، ۴۳۱

۱۲۲ه ذہبی ، ۲ ، ۷۲ ، بقول زہری "حفظ دامان سُنّت کے اتباع میں ہے" ذہبی ، ۸۷ ، نیز دیکھئے ابن حجر ، اوّل ، ۷۹

۱۲۳ه بخاری ، جلد ۴ ، ۳۲

۱۲۴ه دیکھئے طبری ، اوّل ، ۱۵۱۷ ، ابن سیدالناس ، دوم ، ۹۶

۱۲۵ه دیکھئے واقدی (مخطوطہ) ۵۶۲ - ۵۷۰ ، ۱۵۶ - ۱۵۷ ، ابن سیدالناس ، دوم ، ۹۶ ، ۱۲۱

۱۲۶ه واقدی (مخطوطہ) ۵۶۲ - ۵۷۰ ، ابن سیدالناس ، اوّل ، ۲۳۲

۱۲۷ه ملاحظہ کیجئے طبری ، اوّل ، ۱۴۷۳ ، واقدی ، (مخطوطہ) ۴۲۱ - ۴۲۲

۱۲۸ه طبری ، اوّل ، ۱۴۹۵

۱۲۹ه ذات الرقاع سے متعلق تفصیل کے لیے دیکھئے ابن حجر ، ۸۹۴

۱۳۰ه طبری ، اوّل ، ۱۱۵۴ ، ۱۳۶۰ ، ۱۴۸۵

۱۳۱ه ذہبی ، ۴ ، ۷۲ ، ابن کثیر ، جلد ۹ ، ۳۴۳

۱۳۲ه طبری ، اوّل ، ۱۵۶۵ - ۱۵۶۶

۱۳۳ه ایضاً ، ۱۰۱۴

۱۳۴ه ایضاً ، ۱۱۴۵

۱۳۵ه ابن حجر ، ۳۳۱ - ۳۳۲

۱۳۶ه ابن جوزی ، دوم ، ۷۸ ، ابن کثیر ، جلد ۹ ، ۳۴۲ ، حلیہ ، جلد ۳ ، ۳۶۲

۱۳۷ه ملاحظہ کیجئے طبری ، اوّل ، ۱۱۲ ، ۲۰۰ - ۲۰۱ ، ۲۹۳ ، بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ واقعات مغازی کے ضمن میں شامل نہیں تھے۔

۱۳۸ه واقدی ، ۹۴ ، ایضاً ، (مخطوطہ) ۵۶۹ - ۵۷۰ ، طبری ، اوّل ، ۱۶۵۲ - ۱۶۵۳

۱۳۹ؔ ذہبی ، ۲ ، ۷ ، ابن کثیر، ۳۴۳

۱۴۰ؔ دیکھیے اغانی ، جلد ۴ ، ۴۹

۱۴۱ؔ ابن جوزی ، دوم ، ۷۸ ، فلیشر، ذہبی محولہ بالا ، ۴۳۴ ، حلیہ، جلد ۳ ، ۳۶۱ ، نیز دیکھیے ابن حجر، ۱ ، ۸

۱۴۲ؔ اغانی ، جلد ۱۹ ، ۵۹

۱۴۳ؔ نسب قریش ، ۴

۱۴۴ؔ ذہبی ، ۶۸

۱۴۵ؔ طبری ، اوّل ، ۱۸۲۰ ، ۱۸۳۴ - ۱۸۳۴ ، ابن حجر، ۶۸۳ - ۶۸۶ ، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد شدید رنج و غم کے اظہار کے لیے دیکھیے طبری، اوّل ، ۱۸۱۶ - ۱۸۱۷

۱۴۶ؔ طبری ، اوّل ۲۱۴۲ - ۲۱۴۳ ، ۱۸۲۸ - ۱۸۲۹

۱۴۷ؔ طبری ، اوّل ، ۱۸۲۵ - ۱۸۲۷ - نیز حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات کے لیے دیکھیے طبری ، اوّل ، ۲۱۲۸

۱۴۸ؔ بلاذری ، فتوح ، ۴۵۰ ، ۴۵۵

۱۴۹ؔ بلاذری، انساب، جلد ۵ ، ۲۱

۱۵۰ؔ طبری، اوّل ، ۲۷۳۱ ، ۲۷۵۷ - ۲۷۵۸ ، ۲۷۹۸

۱۵۱ؔ فہرست ، ۲۴

۱۵۲ؔ بلاذری ، فتوح ، ۴۶۲ ، انساب، جلد ، ۵ ، ۲۵

۱۵۳ؔ بلاذری ، انساب ، جلد ۵ ، ۲۶ - ۲۷ ، ۳۸ - ۳۹ ، ۸۸ - ۸۹

۱۵۴ؔ ایضاً ، ۲۶ ، ۶۷ ، ۸۹

۱۵۵ؔ ایضاً ، ۶۲ ، ۶۷ - ۶۹

۱۵۶ؔ ایضاً ، ۲۶ ، ۸۸ - ۹۰

۱۵۷ؔ ایضاً ، ۶۲ ، ۶۷ - ۷۰ ، ۸۵ ، ۹۱ ، ۹۷ ، طبری ، اوّل ، ۲۸۷۱ نیز دیکھیے ایضاً ، ۳۰۵ - ۳۱۲

۱۵۸ؔ بلاذری ، انساب ، جلد ۵ ، ۶۹ - ۷۱ ، ۹۱ - ۹۲

۱۵۹ؔ طبری ، اوّل ، ۳۰۶۹ ، ۳۱۰۲ - ۳۱۰۳ ، ۳۱۸۵ - ۳۱۸۷

۱۶۰ؔ ایضاً ، اوّل ، ۳۲۳۱ - ۳۲۴۲ - ۳۳۴۱ - ۳۳۴۳ ، ۳۳۹۰ - ۳۳۹۲

۱۶۱ؔ ایضاً ، دوم ، ۱ ، ۵ - ۷

۱۶۲ؔ ایضاً ، ۱۴۹

۱۶۳ؔ ایضاً ، ۴۲۸

۱۶۴ؔ الیضاً، ۱۲۶۹

۱۶۵ؔ دیکھئے بلاذری، فتوح، ۱۹۰-۲۰، ۵۹، ۶۸، ۸۰، ۳۸۴

۱۶۶ؔ دیکھئے ذہبی، ۷۲

۱۶۷ؔ یعقوبی، تاریخ، دوم، ۳۱۱

۱۶۸ؔ ابن کثیر، جلد ۹، ۳۴۰-۳۴۱، ذہبی، ۷۰، ابن قتیبہ، معارف، ۲۳۹، ابن کثیر نے اس پر اتنا اضافہ کیا ہے کہ ان کی درخواست پر خلیفہ نے ان کے لیے وظیفہ منظور کیا، دیکھئے ابن سعد، جلد ۷، ۱۵۷، ابن قتیبہ، ۲۲۸

۱۶۹ؔ بلاذری، ۱۶۳

۱۷۰ؔ بخاری، تاریخ، ۹۳

۱۷۱ؔ ذہبی، ۷۰، ابن کثیر، جلد ۹، ۳۴۱-۳۴۲، ابن جوزی، دوم، ۷۹

۱۷۲ؔ ابن جوزی، دوم، ۷۸، نیز ملاحظہ کیجئے ابن عبدالحکم، ۱۰۴

۱۷۳ؔ ذہبی، ۷۰-۷۱، ابن کثیر، جلد ۹، ۳۴۲

۱۷۴ؔ حلیہ، سوم، ۳۶۱

۱۷۵ؔ ذہبی، ۷۲

۱۷۶ؔ یافعی، اوّل، ۲۶۱، ابن قتیبہ، معارف، ۲۶۰-۲۶۱

۱۷۷ؔ ذہبی، ۷۲، ابن کثیر، جلد ۹، ۳۴۴، حلیہ، جلد ۳، ۳۶۱، ۳۶۳

۱۷۸ؔ ذہبی، ۶۹، ابن کثیر، جلد ۹، ۳۴۱، حلیہ، جلد ۳، ۳۶۳

۱۷۹ؔ دیکھئے اسی مضمون کا ۱۶۱ؔ

۱۸۰ؔ ذہبی، ۷۲-۷۳

۱۸۱ؔ ابن کثیر، جلد ۹، ۳۴۴

۱۸۲ؔ ذہبی، ۶۹-۷۰

۱۸۳ؔ ابن جوزی، دوم، ۷۸

ابو الحسن علی بن حسین بن علی المسعودی

فاروق خورشید ٭ ترجمہ : جناب اسد اللہ

مسعودی بغداد کے رہنے والے تھے۔ اسلامی تہذیب اور ثقافت کے تمام مراکز کی سیاحت کی۔ پوری زندگی سیر و سیاحت میں گزار کر آخر کار مصر پہنچے اور ۳۴۶ھ/۹۵۷ء میں فسطاط میں انتقال فرمایا۔ ان کا پورا نام ابو الحسن علی بن حسین مسعودی ہے۔ انہوں نے اپنی سیاحت کے دوران صرف عوام اور زمین و آسمان کے مظاہر کا مشاہدہ ہی نہیں کیا بلکہ علم بھی حاصل کیا خصوصاً تاریخ میں کمال حاصل کیا اور جس قدر تاریخی کتب تک رسائی ہوئی سب کو چھان مارا۔ اسی سیر و سیاحت، مطالعہ اور قدیم کتب کی ورق گردانی نے ان کی کتاب "مروج الذہب و معادن الجوہر" کو نہ صرف اسلامی مؤرخین بلکہ عربی انشر دپولوجی و فلکلوری کے ماہرین کی تحقیق اور بحث و تمحیص کا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مرکز و محور بنا دیا ہے۔

مسعودی نے بغداد میں پرورش پائی۔ پھر انہوں نے ایران، برصغیر پاک و ہند، سری لنکا، مڈغاسکر، آذربائیجان، جرجان، شام اور ان ایشیائی علاقوں کی سیر و سیاحت کی جنہیں عرب سیاح ماوراء النہر کے علاقے کہتے ہیں اور سب سے آخر میں وہ مصر میں قیام پذیر ہو گئے۔ جرجی زیدان اپنی کتاب "تاریخ اللغۃ العربیہ" (حصہ دوم) صہ۳۱۲ پر لکھتے ہیں کہ "مسعودی سمندر کے راستے سری لنکا سے چین گئے۔ انہوں نے مڈغاسکر تک بحر ہند میں سفر کیا اور پھر عمان واپس آ گئے۔ ۳۱۴ھ میں انہوں نے ایک اور سفر کیا اور اس سفر میں پہلے تو یہ آذربائیجان، جرجان اور ان کے ارد گرد کے علاقوں میں گھومتے رہے اور پھر شام اور فلسطین کی سیاحت کی۔ ۳۲۰ھ میں انطاکیہ آئے اور دمشق سمیت متعدد شامی علاقوں کو گھوم پھر کر دیکھا۔ پھرتے پھراتے آخر کار مصر پہنچے اور ۳۴۵ھ میں فسطاط کو اپنا مسکن بنا لیا اور اس سے اگلے سال وہیں انتقال فرمایا۔"

کتاب دیکھنے سے ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ مسعودی صرف سیاح ہی نہ تھے جو کائنات کی اشیا کو ظاہری طور پر دیکھتے ہوئے اور ہر ایک چیز پر ایک اچٹتی ہوئی طائرانہ نگاہ ڈالتے ہوئے نئے نئے علاقے دیکھنے کے شوق میں آگے بڑھتے چلے گئے ہوں بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان واقعات کو پڑھتے ہوئے ہم ان تمام اشیا اور مناظر کو جو مسعودی نے دیکھے تھے، محسوس و مرئی طور پر دیکھ رہے ہیں اور ہر ایک چیز مجسم شکل میں گویا اب ہمارے سامنے ہے۔ نیز اس کے ساتھ ساتھ ہمیں ان کے ثقافت کے ذوق اور اس سے دلچسپی کا بھی علم ہوتا ہے۔ ابن الندیم "الفہرست" صہ۲۱۹ پر لکھتے ہیں، "مسعودی اہلِ مغرب ہی سے تھے۔ ابو الحسن علی بن حسین علی المسعودی کے نام سے معروف و مشہور ہیں، حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی اولاد میں سے تھے۔ بادشاہوں کے حالات اور تاریخ کے موضوع پر کئی ایک کتابوں کے مؤلف ہیں جن میں سے درج ذیل کتب قابلِ ذکر ہیں:

۱۔ "مروج الذہب و معادن الجوہر فی تحف الاشراف والملوک" (۲) "ذخائر العلوم و ما کان فی سالف الدہور" (۳) الاستذکار لما فی سالف الاعمار" (۴) کتاب التاریخ فی الاخبار الامم من العرب والعجم" (۵) "کتاب الرسائل"۔

ابن شاکر کتبی نے اپنی کتاب "فوات الوفیات" حصہ دوم صہ۷ پر شیخ شمس الدینؒ سے نقل کرتے ہوئے لکھا ہے: "مسعودی اہلِ بغداد میں شمار ہوتے ہیں۔ کچھ عرصہ مصر میں رہے۔ بہت بڑے مؤرخ تھے۔ نہایت عجیب و غریب اور نادر واقعات لکھنے میں ممتاز ہیں، ۳۴۶ھ

یں انتقال فرمایا"۔ اس کے بعد ابن شاکر نے اپنے علم کی حد تک مسعودی کی کتابوں کے نام لکھے ہیں۔ جرجی زیدان مسعودی کی سیاحت پر تبصرہ کرتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں: "مسعودی نے اپنے سفروں کے دوران مختلف علوم حاصل کرنے، ہر چیز کی حقیقت کا کھوج لگانے اور مختلف موضوعات کے متعلق جو مواد بھی حاصل ہو سکا اسے قلم بند کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ انہوں نے بے شمار ایسے تاریخی اور جغرافیائی حقائق لکھے جو ان سے پہلے کسی نے نہیں لکھے تھے۔ انہوں نے متعدد موضوعات پر نہایت اہم اور مفید کتابیں لکھیں جن میں سے تاریخی کتب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ان محققین کی آراء سے معلوم ہوتا ہے کہ مسعودی، ہماری توجہ اپنی ذات اور اپنی زندگی کے واقعات و سوانح کی طرف مبذول نہیں کرتے بلکہ وہ ہماری توجہ ان دو عظیم شاہکاروں کی طرف مبذول کرتے ہیں، جو ہم تک پہنچ چکے ہیں اور جنہیں مسعودی نے نہایت محنت، جانفشانی اور عرق ریزی سے تیار کیا ہے۔ ان میں سے ایک شاہکار "مروج الذہب" ہے جو علامہ محمد محی الدین عبدالحمید کی تعلیق و ترتیب اور نظر ثانی کے ساتھ قاہرہ سے چھپ چکی ہے۔ اس کا فرانسیسی ترجمہ مشہور فرانسیسی مستشرق باربیر دی مینار (BARBIER DE-MEYNARD) کے قلم سے ۱۸۷۲ء میں نو جلدوں میں پیرس سے شائع ہو چکا ہے۔ سپرنگر نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا جس کی پہلی جلد ۱۸۴۱ء میں لندن سے شائع ہوئی۔ جرجی زیدان اس کتاب کے متعلق لکھتے ہیں کہ اپنی شہرت کی وجہ سے یہ کتاب محتاج تعارف نہیں۔ ایک سے زائد بار دو حصوں میں شائع ہوتی رہی ہے۔ پہلے حصے میں تخلیق کائنات اور مختصر طور پر انبیاء کے واقعات کے بعد بڑے بڑے سمندروں، برّاعظموں اور عجائب و نوادر کا بیان ہے۔ اس میں قدیم اقوام، ایرانیوں، سریانیوں، یونانیوں، رومیوں، انگریزوں، قدیم عربوں کی تاریخ، مذاہب، عادات اور رسوم و رواج کے علاوہ مختلف علاقوں اور ادوار میں رائج مہینوں اور برسوں کے نام اور عجیب و غریب عمارات اور بڑے بڑے محلات اور قلعوں کا تذکرہ بھی شامل ہے۔ آخر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت تک کی اسلامی تاریخ ہے۔ دوسرے حصے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت سے لے کر عباسی خلیفہ مطیع اللہ کے زمانے تک کی اسلامی تاریخ کا بیان ہے۔

عرب و عجم کے تمام اہل علم کے نزدیک یہ نہ صرف عربی اسلامی تاریخ بلکہ قدیم تہذیبوں اور ثقافتوں کی تاریخ کا ایک بہت بڑا اور اہم ماخذ ہے۔ اس کے متعلق ڈاکٹر سیدہ اسماعیل کاشف اپنی کتاب "مصادر التاریخ الاسلامی" صفحہ ۲۶ پر لکھتی ہیں کہ: "یہ تاریخ و جغرافیہ کے موضوع پر نہایت بیش قیمت اور قابل قدر کتاب ہے۔ اس میں مؤلف نے صرف ان موضوعات کا تذکرہ ہی نہیں کیا جو عام طور پر دوسرے اسلامی مؤرخین ذکر کرتے ہیں، بلکہ اس میں ہندوؤں، ایرانیوں، رومیوں اور یہودیوں کی تاریخوں کے علاوہ نہایت عجیب و غریب امور اور نادر واقعات بھی مذکور ہیں، اور اسی شاہکار کی بدولت مسعودی کو عربوں کا ہیروڈوٹس کہا جاتا ہے۔

اس کتاب میں جا بجا بکثرت عجیب و غریب واقعات اور قصے کہانیاں مذکور ہیں، جو دیگر مضامین کے ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ مسعودی کو قصص و حکایات اور نادر واقعات سے بہت زیادہ دلچسپی تھی۔ یہ حکایات و واقعات کچھ تو انہوں نے دوسری کتابوں سے اخذ کیے اور کچھ اپنی سیر و سیاحت اور متعدد سفروں کے دوران تجربہ و مشاہدہ اور دیگر ذرائع سے جمع کیے۔

مسعودی کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا مقصد صرف تاریخ جغرافیہ اور قصص و حکایات قلمبند کرنا ہی نہ تھا بلکہ انہوں نے ان کے علاوہ — بے شمار ایسے امور بھی اپنی تصنیفات میں جمع کر دیے جن کے ہم تک کچھ اجزاء یا نام ہی پہنچ سکے ہیں۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ تالیف و تصنیف کے سلسلے میں مسعودی کا میدان کس قدر وسیع و عریض اور ان کے عزائم کس قدر بلند تھے۔ ابن شاکر نے

"فوات الوفیات" میں ان دو کتابوں کے علاوہ مسعودی کی درج ذیل کتابوں کا ذکر بھی کیا ہے۔

(۱) ذخائر العلوم و ما کان فی سالف الدھور"۔ (۲) "الرسائل والاستذکار بما فی سالف الاعصار"۔ (۳) التاریخ فی اخبار الامم من العرب والعجم"۔ (۴) خزائن الملوک وسر العالمین"۔ ۵" المقالات فی اصول الدیانات" (۶) "اخبار الزمان فی ابادۃ الحدثان" (۷) "البیان فی اسماء الائمہ"۔ (۸) "الخوارج"۔

بروکلمان نے دی خویہ کے لکھے ہوئے "التنبیہ والاشراف" کے مقدمہ سے نقل کرتے ہوئے مسعودی کی ایک اور کتاب کا تذکرہ بھی کیا ہے، یہ ایک رسالہ ہے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے اثبات توحید کے بارے میں یہ رسالہ طہران سے شائع ہو چکا ہے مسعودی کا ایک رسالہ "احوال الامام" کے متعلق بھی ہے جو نجف آباد کی لائبریری میں ہے۔ اسی طرح بروکلمان نے مسعودی کی دو اور کتابوں کا ذکر کیا ہے جن کے نام (۱) "القضایا والتجاریب" اور (۲) "مظاہر الاخبار وطرائف الآثار" ہیں۔ استاد محمد محی الدین عبد الحمید، جنہوں نے ۱۹۳۸ء میں "مروج الذہب" شائع کی، مسعودی کی سترہ کتابوں کا ذکر کرتے ہیں، جن کا ذکر خود مسعودی نے کیا ہے جن میں سے کچھ کا تذکرہ بروکلمان نے بھی کیا ہے اور کچھ کتابیں مفقود ہیں اور ان کا علم صرف مسعودی کے اپنے بیان ہی سے ہوتا ہے۔ محمد محی الدین لکھتے ہیں کہ مسعودی حسب عادت تقریباً مروج الذہب کے ہر مضمون کے آخر میں "اخبار الزمان" اور "الکتاب الاوسط" کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مسعودی "مروج الذہب" میں اپنی سابقہ تصنیفات و تالیفات کی طرف بکثرت اشارے کرتے جاتے ہیں اور اس سے ان کا مقصد:

۱۔ یا تو یہ ہوتا ہے کہ اس موضوع کے متعلق جو شخص مکمل معلومات حاصل کرنا چاہے وہ مذکورہ کتاب میں دیکھ لے۔ مثلاً "مروج الذہب" حصہ اول صہ ۳۷۵ پر لکھتے ہیں: "ہر ایک کو اپنے وطن سے محبت ہوتی ہے۔ یہ ایک طویل بحث ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں اور اسے ہم نہایت تفصیل سے اپنی دو کتابوں "سر الحیاۃ" اور "طب النفوس" میں ذکر کر چکے ہیں"۔

۲۔ یا یہ ہوتا ہے کہ زیر نظر موضوع تفصیل چاہتا ہے لیکن وہ یہاں اختصار سے کام لینا چاہتے ہیں۔ اس لیے وہ اپنی کسی سابقہ تصنیف کا حوالہ دے دیتے ہیں، جہاں یہ موضوع مفصل و مدلل طور پر مذکور ہوتا ہے۔ اگر قاری چاہے تو وہاں دیکھ سکتا ہے۔ مثلاً "مروج الذہب" حصہ اول صہ ۱۲ پر لکھتے ہیں کہ "تخلیق کائنات کی ابتداء اور اس کے حدوث کے بارے میں جو کچھ ہم نے یہاں لکھا ہے وہ شریعت کے مطابق اور سلف سے منقول ہے۔ ہم یہاں اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتے کہ کون اس کے حدوث کا قائل ہے اور کون اس کے قدیم ہونے اور فریقین کے دلائل کیا ہیں؟ کیونکہ یہ بحث ہم سابقہ تصنیفات و تالیفات میں کر چکے ہیں"

۳۔ اور یا یہ بتانا مقصود ہوتا ہے کہ: یہ بات نہیں کہ اس موضوع کے بارے میں ان کی معلومات کم ہیں بلکہ یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں اور وہ اختصار سے کام لینا چاہتے ہیں کیونکہ وہ یہ موضوع دوسری جگہ تفصیل سے لکھ چکے ہیں۔ مثلاً "مروج الذہب" حصہ دوم صہ ۸۲ پر خیافہ کے متعلق لکھتے ہیں:

"ہم اپنی مشہور و معروف کتاب "الرؤس السبعۃ لسیاسۃ العالم و اسرارہ" میں خیافہ کے متعلق تفصیلی بحث اور مختلف لوگوں کے مذاہب کا ذکر کر چکے ہیں"۔

نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ان میں سے بیشتر تالیفات ضائع ہو چکی ہیں اور اُن کے ضائع ہونے سے اتنا علمی نقصان ہو چکا ہے جس کی تلافی مسعودی کے اشارات یا محض کسی کتاب کا نام لکھ دینے سے ہرگز نہیں ہو سکتی۔ تاہم ان اشارات سے ان موضوعات اور کتب کی اہمیت اور افادیت ضرور ظاہر ہوتی ہے۔ کواکب و نجوم کے بارے میں کتابیں لکھنے والوں میں مسعودی کا شمار صفِ اوّل میں ہوتا ہے اس موضوع پر انہوں نے "الزلفہ" نامی کتاب لکھی جس کی طرف وہ "مروج الذہب" جلد اوّل ص۱۲ پر اشارہ کرتے ہیں، اسی طرح وہ سیاست کے موضوع پر لکھنے والے صفِ اوّل کے لوگوں میں سے ہیں اور اس موضوع پر انہوں نے "الرءوس السبعة ..." نامی کتاب لکھی جس کی طرف انہوں نے "مروج الذہب جلد دوم ص۱۲۱ پر اشارہ کیا ہے۔

"مروج الذہب" کے مطالعے کے دوران ہمارے ذہن میں یہ امر ضرور رہنا چاہیے کہ متعدد علوم اور کئی انواع پر مشتمل یہ کتاب یونہی وجود میں نہیں آئی بلکہ اس کی تصنیف و تالیف میں مؤلف نے اپنی پوری محنت صرف کی ہے۔ محمد محی الدین اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں: اس کتاب میں مؤلف نے گذشتہ اہلِ علم کے علوم و معارف اور مفید و اہم مسائل و کلیات کو یکجا کر دیا ہے، لیکن اس کے باوجود اس قدر طویل بحثوں اور غیر ضروری تفصیلات سے احتراز کیا تاکہ قاری پر گراں نہ گزرے، اس سلسلے میں مؤلف نے ہر موضوع اور ہر مسئلہ کے بارے میں یہ طریقہ اختیار کیا کہ ہر ہار میں سے نفیس ترین موتی، ہر سمندر میں سے سب سے عمدہ قطرہ ہر باغ میں سے سب سے خوشبودار، تر و تازہ اور خوبصورت پھول لے لیا ہے۔ اکثر مسائل پر بحث کرتے ہوئے مؤلف نے مختلف علماء کے مسالک اور ان کے اقوال نقل کیے ہیں بعض مسائل کے بارے میں دلائل بھی دیئے ہیں۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ یہ کتاب مسعودی کے تمام علوم و معارف کا نچوڑ اور ان کی تمام سابقہ تالیفات و تصنیفات میں دو اہم ترین تصنیفات کا اختصار ہے۔

بروکلمان نے لکھا ہے کہ پہلی کتاب یعنی "اخبار الزمان" کی تالیف مسعودی نے ۳۳۲ھ میں شروع کی جبکہ مسعودی کا اپنا بیان یہ ہے کہ انہوں نے "مروج الذہب" کی تالیف کا آغاز امیر المومنین متقی للہ کے دورِ خلافت یعنی ۳۳۲ھ میں کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بروکلمان کی رائے غلط ہے، کیونکہ "مروج الذہب" جلد اوّل ص۲ پر مسعودی نے وضاحت کی ہے کہ ۳۳۲ سے پہلے اخبار الزمان مکمل ہو چکی تھی۔ اسی سال مسعودی نے مروج الذہب" کی تالیف شروع کی۔

"مروج الذہب" میں جہاں مسعودی نے اپنے سفر، اپنی تالیفات اور دیگر مؤرخین کی ان کتابوں کا تذکرہ کیا ہے جو انہوں نے پڑھیں، وہاں انہوں نے مذکورہ بالا دو کتابوں کے علاوہ اس کتاب کے دیگر ماخذ و مصادر بھی لکھے ہیں۔

مسعودی کے مختلف سفر معلومات کے اکتساب کا نہایت اہم اور حقیقی ذریعہ تھے۔ ان سفروں کے ذریعے انہوں نے بہت سی اشیاء کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور بہت سے کوائف و حالات اپنے کانوں سے سُنے۔ وہ لکھتے ہیں: "اس کتاب میں جہاں کہیں کوئی سقم، غلطی یا تقصیر نظر آئے اس کے لیے ہم قارئین کرام سے معذرت خواہ ہیں کیونکہ ہمیں سیر و سیاحت اور سفر کے دوران بہت سی دقتیں اٹھانا پڑیں۔ ہم نے بڑے بڑے بری اور بحری سفر کیے تاکہ دُنیا کے مختلف خطوں اور وہاں کے رہنے والوں کے حالات بچشم خود دیکھ سکیں، دورانِ سفر پیش آنے والی تکلیفوں اور مصائب کی بنا پر انسانی ذہن کی پریشانی اور اس کا تفکرات میں مبتلا ہوتا ایک فطری امر ہے جس کی وجہ سے تصنیف و تالیف کے کام میں

غلطیاں سرزد ہو سکتی ہیں۔
وہ کسی محقق سائنسدان کی طرح تجربہ و مشاہدہ کے بعد نئے نئے انکشافات وایجادات لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ مثلاً "مروج الذہب" جلد اوّل صفحہ ۲۴۲ پر مصری کتبوں کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "مَیں نے ان کتبوں والے آدمی سے ملاقات کی۔ یہ شخص باب الاخشید (محمد بن طغج) میں مقیم تھا۔ یہ ۳۳۰ھ کی بات ہے۔ مَیں نے اس آدمی سے اُن کے شہر اور ملک سے بہت سے حالات اور وہاں کی وہ اشیاء دریافت کیں جو مَیں معلوم کرنا چاہتا تھا۔ میرا دستور یہی رہا ہے کہ مَیں جن علاقوں تک خود نہ جا سکا وہاں کے حالات ان کے علاقوں کے ملنے والے باشندوں سے دریافت کرتا رہا۔ اس آدمی نے مجھے بتایا کہ ان کے ملک میں کس کس نوع کے معدنی نمک اور پھٹکری وغیرہ پائے جاتے ہیں؟ وہاں سے کیا کیا اشیاء برآمد ہوتی ہیں؟ کون کون سے کھاری پانی کے چشمے ہیں اسی طرح مختلف ذائقے کے کون کون سے پانیوں کے چشمے ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔

مسعودی نے یہاں اپنے حصولِ علم کا ذریعہ ایک ایسے شخص کو بنایا جس نے ایک چیز صرف سُن رکھی ہے، دیکھی نہیں اور وہ اپنے سفر کے دوران اکثر ایسا کرتے رہے اور بعض اشیاء کی تحقیق و تفتیش میں اُن کا طریقہ کار یہی رہا ہے۔ عام معلومات ایک الگ چیز ہیں اور ان معلومات کے متعلق ان کے اصلی ماخذ سے تحقیق و جستجو اور تفتیش ایک الگ چیز ہے جو بلا تفتیش سُنی سنائی باتوں کے نقل کر لینے سے کہیں زیادہ اقرب الی الصواب ہوتی ہے۔ بسا اوقات مسعودی اپنے سے پہلے مؤرخین اور جغرافیہ دانوں کی لکھی ہُوئی باتوں کو مشاہدہ اور معائنہ کی کسوٹی پر پرکھ کر ان کی غلطیاں واضح کر دیتے ہیں اور کئی ایک پہلے سے معروف و معلوم اشیاء کو خلافِ واقعہ اور خلافِ حقیقت ہونے کی بناء پر ترک کر دیتے ہیں۔ ان کی کتاب میں آپ کو ایسی مثالیں بکثرت ملیں گی۔ مثلاً ج ۱ ص ۱۰۳ پر خلیج قسطنطنیہ کا حال بیان کرتے ہُوئے اپنے سے پہلے مؤلفین پر تنقید کرتے ہیں: "متقدمین و متاخرین میں سے دنیا کے بڑے بڑے سمندروں کے حالات بیان کرنے والے مؤلفین کی اکثر کتب میری نظر سے گزری ہیں۔ ان حضرات نے اپنی کتابوں میں لکھا ہے کہ نیطش سے شروع ہونے والی خلیج قسطنطنیہ بحر خزر سے متصل ہے۔ مجھے معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ کیوں کر ممکن ہے اور انہوں نے یہ بات کہاں سے نقل کی ہے بمحض ظن وتخمین سے ایسا لکھ دیا ہے یا استدلال اور استنباط کی بناء پر یہ نتیجہ نکالا ہے۔ مَیں نے اسکون یعنی ساحل جرجان سے اس میں سفر شروع کیا اور طبرستان کے علاقہ تک سفر کرتا رہا۔ اس سفر کے دوران بحری علاقے کے جتنے واقف لوگ مجھے ملے، خواہ وہ علماء تھے یا ملاح، سب سے میں نے بحر خزر اور خلیج قسطنطنیہ کے متعلق دریافت کیا۔ سب نے یہی بتایا کہ اس کا راستہ بحر خزر ہی سے گزرتا ہے، جہاں سے روسی جہاز اس میں داخل ہوتے ہیں۔ یا آذربائیجان۔ الباب، الابواب، دیلم اور جیل کے علاقوں کے لوگ آتے ہیں اسی طرح جرجان طوسان کے لوگوں کا بھی یہی راستہ ہے، کیونکہ انہیں کبھی کسی ایسے دشمن سے سابقہ نہیں پڑا جو ان پر حملہ آور ہوتا۔ نہ ماضی قریب میں نہ ماضی بعید میں اور جو کچھ ہم نے لکھا ہے اس سے مذکورہ بالا تمام علاقوں کے لوگ آگاہ ہیں اور یہ بات ان میں مشہور و معروف ہے۔
جلد اوّل صفحہ ۱۰۸ پر جاحظ پر تنقید کرتے ہُوئے لکھتے ہیں کہ: "دریائے مہران جو علاقہ سندھ کا ایک دریا ہے۔ اس کے متعلق عمرو بن بحر جاحظ کا خیال ہے کہ یہ دریا دریائے نیل سے نکلتا ہے کیونکہ اس میں گرمچھ اور گھڑیال پائے جاتے ہیں۔۔۔۔ معلوم نہیں انہوں نے یہ گرمچھ والی دلیل کہاں سے نقل کی ہے۔ یہ بات جاحظ نے اپنی کتاب "الامصار" میں لکھی ہے جو نہایت غلط کتاب ہے۔ کیونکہ اس کے مؤلف نے نہ تو بحری سفر کیے اور نہ یہ سمندروں، بری راستوں اور مختلف علاقوں سے واقف تھا۔ وراقین کی کتابوں سے ایک حاطب لیل کی طرح جو ملا نقل کرتا چلا گیا۔ اسے تو یہ علم بھی نہیں تھا کہ مہران علاقہ سندھ کا ایک دریا ہے جو قنوج و کشمیر وغیرہ کے بالائی علاقوں سے آتا ہے اور جب علاقہ مولتان میں

پہنچتا ہے تو وہاں سے اس کا نام دریائے مہران (دریائے سندھ) ہے۔

"مروج الذہب" جلد دوم ص ۱۴۸ پر لکھتے ہیں: "اصطخر فارس کے قریب ایرانیوں کا ایک آتش کدہ ہے۔ یہ آتش کدہ ہمائی بنت بہمن بن اسفندیار نے بنوایا تھا، لیکن پھر تباہ و برباد ہو گیا۔ آج کل کے ہمارے زمانے کے لوگ اسے سلیمان علیہ السلام کی مسجد خیال کرتے ہیں اور یہ اسی نام سے مشہور و معروف ہے۔ میں خود وہاں گیا تھا۔ یہ اصطخر سے ایک فرسخ کے فاصلے پر واقع ہے۔"

اس کے بعد مسعودی اس عمارت کے حالات اور اس میں موجود مورتیوں کا ذکر کرتے ہیں پھر اس کے قرب جوار میں رہنے والے اپنے معاصرین کے بیان کردہ قصص و حکایات لکھتے ہیں: "اس عمارت میں کچھ انسانوں کے مجسمے اور مورتیاں بنا کر رکھی ہوئی ہیں، جن کے متعلق یہاں کے قرب جوار کے لوگوں کا خیال ہے کہ یہ انبیائے کرام کے مجسمے اور مورتیاں ہیں۔ یہ عمارت پہاڑ کے دامن میں ہے۔ اس کے اندر ہر وقت ہوا بڑی تیزی سے چلتی رہتی ہے (یہ ہوا کا چلنا تو دراصل عمارت کی خاص ساخت کی بنا پر ہے لیکن) یہاں کے لوگوں کا خیال ہے کہ سلیمان بن داؤد علیہما السلام نے ہوا کو یہاں محبوس کر دیا تھا۔ سلیمان علیہ السلام کا دستور تھا کہ وہ دوپہر کا کھانا تو شام کے شہر بعلبک میں اور رات کا کھانا یہاں تناول فرماتے تھے۔"

باوجودیکہ مسعودی نے عمارت کا تو چشم دید حال ہی لکھا ہے لیکن اس کے متعلق مشہور حکایات انہوں نے عقل و درایت کے معیار پر جانچے بغیر ہی نقل کر لی ہیں اور انہیں نقد و نظر کی بھٹی میں ڈال کر کھرا کھوٹا الگ نہیں کیا۔ "وہاں کے لوگوں کا خیال ہے کہ ....." لکھ کر اس کے بعد جو کچھ سُنا من و عن لکھ دیا ہے۔

جو کچھ انہوں نے دیکھا اس کے ذریعے انہوں نے عربی میں بہت سا علمی، تاریخی و جغرافیائی مواد جمع کر دیا، لیکن جو کچھ انہوں نے سُنا وہ زیادہ تر وہی ہے جو دوسرے علمائے مؤرخین نے لکھا ہے۔ جو کچھ وہ سُنتے ہیں کبھی تو وہ کسی معاشی حقیقت کا اظہار و بیان ہوتا ہے۔ بلاشک و شبہ یہ تو بہت بڑا علمی اضافہ ہوتا ہے لیکن مختلف قدیم قبائل کے موروثی سُنے سُنائے قصے کہانیاں اور افسانے ہوتے ہیں جن میں طرح طرح کے خرافات اور بے سروپا باتیں بھی شامل ہوتی ہیں۔ "مروج الذہب" جلد اوّل ص ۲۹۱ پر اس کے دو نمونے ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں، مصر میں لیلۃ الغطاس کے متعلق لکھتے ہیں کہ: "میں خود ۳۳۰ھ کی اس رات کو مصر میں موجود تھا۔ اخشید محمد بن طغج کا دور تھا جو اس وقت دریائے نیل میں ایک جزیرہ میں واقع اپنے محل مختارہ میں تھا۔ دریائے نیل اس محل کا چکر لگا کر گزرتا ہے۔ اس رات اخشید محمد بن طغج کے حکم سے اس جزیرہ اور فسطاط شہر کے اطراف و جوانب ایک ہزار مشعلیں روشن کر کے چراغاں کیا گیا۔ لوگوں نے اپنی مرضی سے اس کے علاوہ بھی بے شمار مشعلیں جلا رکھی تھیں اور دُور دُور تک سارا علاقہ بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ اس رات دریائے نیل کے کنارے مصری مسلمان اور عیسائی جمع تھے۔ کچھ تو دریائے نیل میں تیرنے والے بجروں اور کشتیوں میں تھے، کچھ کناروں پر تھے اور کچھ کناروں پر واقع عمارات کی چھتوں پر تھے۔ سب کے سب نگے زرق برق اور خوبصورت لباس پہنے لہو و لعب، کھیل تماشے اور کھانے پینے میں مشغول تھے۔ بہت سے لوگ گانے بجانے میں بھی مشغول تھے۔ یہ رات مصر کی خوبصورت ترین رات ہوتی ہے اور لوگ اس میں جی بھر کے خوشیاں مناتے ہیں۔ لوگ تمام رات عیش و نشاط میں جاگتے ہوئے گزار دیتے ہیں۔ اس رات کوئی شخص اپنے گھر کا دروازہ بند نہیں کرتا۔ اکثر لوگ اس رات دریائے نیل میں نہاتے ہیں جس کے متعلق ان کا خیال ہے کہ انسان بیماریوں سے محفوظ رہتا ہے اور اگر بیمار ہو تو صحت یاب ہو جاتا ہے۔"

مسعودی کا یہ بیان ہی اب وہ واحد نادر ذریعہ ہے جس سے ہمیں اس میلے کا پتہ چلتا ہے جس کا انعقاد اب مصر میں ختم ہو چکا ہے

اسی طرح مسعودی نے اپنے زمانے میں مصر میں جو جو اہم واقعات یا مواقع و محلات دیکھے سپردِ قلم کر دیے۔ چند سطور کے بعد مسعودی نے اہلِ مصر سے سُنی سنائی ہوئی ایک اور بات لکھی کہ: ”دریائے نیل کا اُتار چڑھاؤ معلوم کرنے کے لیے جو پیمانے بنے ہوئے ہیں۔ ان کے متعلق مَیں نے وہاں کے باخبر لوگوں سے سُنا کہ ان میں سے ایک پیمانہ تو مصر کے قدیم دار السلطنت منیف میں یُوسف علیہ السّلام نے اس وقت بنوایا جب اہرام تعمیر کرائے تاکہ دریائے نیل کا اُتار چڑھاؤ معلوم ہوتا رہے۔ اس وقت شہر فسطاط کی ابھی بنیاد ہی نہیں پڑی تھی۔ بوڑھی ملکہ دلوکہ نے ایک اور پیمانہ اسی مقصد کے لیے مصر کے بالائی علاقہ صعید میں بلادِ اخمیم میں بنوایا تھا:“ بظاہر اس عبارت سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یوسف علیہ السلام کا بانیٔ اہرام ہونا ایک حقیقی اور واقعی امر ہے جو کسی نقد و نظر کا محتاج نہیں۔ اسی طرح مسعودی دلوکہ نامی ملکہ فرعونیہ کا تذکرہ بھی بغیر کسی تنقید کے کرتے ہوئے آگے نکل جاتے ہیں۔ معلوم نہیں انہوں نے ملکہ دلوکہ کا نام کہاں سے لیا ہے؟ لیکن فراعنۂ مصر کے تذکرہ میں اس کا ذکر وہ بار بار بڑی کثرت سے کرتے ہیں۔ وہ ان معلومات کو من و عن تسلیم کرتے ہیں اور اُن پر کسی قسم کی تنقید کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ اُن کے نزدیک اس سلسلے میں یہی امر کافی ہے کہ یہ معلومات اسی علاقہ کے ایسے لوگوں سے حاصل ہوئی ہیں جو بزعمِ خویش صاحبِ علم ہیں۔ اس طرح مسعودی کی کتاب میں بہت سی حکایات قصے کہانیاں، قدیم، قبائلی رسوم و عادات ایسی شامل ہوگئی ہیں جن پر کسی محقق نے کوئی تحقیق نہیں کی اور نہ ہی کسی عالم نے ان میں سے صحیح و غیر صحیح کو چھانٹ کر الگ کیا ہے۔

”مروج الذہب“ جلد اول ص۲۱۱ پر لکھتے ہیں کہ: ”مَیں نے علاقہ صعید اور دیگر علاقوں کے مصری قبطی علماء سے لفظ فرعون کی تحقیق کی تو ان میں سے کسی نے مجھے اس کا کوئی جواب نہ دیا اور نہ ہی یہ لفظ مجھے ان کے ہاں رائج زبان میں ملا۔ حقیقتِ حال تو خدا تعالیٰ ہی جانتا ہے لیکن ممکن ہے کہ یہ لفظ قدیم زمانہ کے مصری بادشاہوں کا لقب رہا ہو اور اب وہ زبان بھی تبدیل ہو چکی ہو اور یہ لفظ متروک ہو چکا ہو، جیسے پہلوی یعنی قدیم فارسی۔ فارسی جدید میں، یونانی زبان لاطینی میں اور حمیری اور دیگر مختلف اور متعدد زبانیں تبدیل ہو گئی ہیں“ یہاں مسعودی نے اپنے غور و فکر سے دو نتائج بالکل صحیح اخذ کیے ہیں۔ ایک یہ کہ فرعون، قدیم مصری بادشاہوں کا لقب تھا اور دوسرے یہ کہ فرعونی زبان تبدیل ہو گئی ہے اور ان کے ہمعصر قبطی اب وہ زبان نہیں بولتے۔

اسلامی مؤرخین کے بارے میں جن میں مسعودی بھی شامل ہیں۔ ابنِ خلدون کا درج ذیل قول مسعودی پر بھی صادق آتا ہے۔ ابنِ خلدون اپنی مشہور تاریخ ”کتاب العبر و دیوان المبتدأ والخبر فی ایام العرب“ جلد اول ص۳ پر لکھتے ہیں:

”بڑے بڑے مسلمان مؤرخین نے اسلامی تاریخ لکھی ہے اور تاریخ کے موضوع پر دفتر کے دفتر سیاہ کر دیے ہیں اور اس مضمون کی کتب کے انبار لگا دیے ہیں۔ ان کے بعد کچھ ایسے ناقلین پیدا ہوئے جنہوں نے حق کے ساتھ باطل کو بھی ملا دیا اور حق و باطل درست و نادرست میں امتیاز کیے بغیر جو کچھ لکھ سکے لکھتے چلے گئے۔ اس طرح تاریخی کتب میں بہت سی توہمات پر مبنی کہانیاں اور قصے شامل ہو گئے۔ کوئی واقعہ لکھتے وقت یا کوئی داستان بیان کرتے وقت انہوں نے اس کے اسباب و علل پر عقل و فکر سے کبھی غور نہ کیا اور نہ ہی صحیح واقعات کو افسانوں اور قصے کہانیوں میں سے چھانٹ کر الگ کرنے کی کوشش کی۔ اس طرح تحقیق و تنقیح والا کام آج تک تشنۂ تکمیل ہے اور تاریخی واقعات میں اغلاط اور اوہام کی بھرمار ہے اور عموماً بعد کے مؤرخین بھی لکیر کے فقیر بنے جو کچھ کسی کتاب میں لکھا دیکھتے ہیں بے دریغ و بلا تامل نقل کرتے چلے جاتے ہیں۔ کورانہ تقلید کا ارتکاب جہالت کی حد تک پہنچا ہوا ہے۔ یہ صرف تاریخ کے معاملہ میں ہی نہیں دیگر علمی فنون میں بھی یہی روش ہے۔ حق و باطل اور صحیح و غلط میں امتیاز کرنے کی

تکلیف بہت کم لوگ گوارا کرتے ہیں اور جو کچھ دیکھتے ہیں نقل کرتے چلے جا رہے ہیں۔ ضرورت ہے کہ بصیرت اور عقل و درایت سے کام لے کر ہی قلم اٹھایا جائے۔ تاکہ علوم و فنون کدورتوں اور اغلاط سے پاک ہو کر نکھر جائیں اور آئندہ نسلوں تک صحیح علمی حقائق پہنچیں۔"

ہم مسعودی کی کتاب کو ابنِ خلدون کے قائم کردہ اس سخت معیار پر جانچ بھی نہیں سکتے۔ کیونکہ یہ کتاب صرف تاریخ کی کتاب نہیں یہ تو ایک وسیع شاہکار ہے جس میں تاریخی واقعات کے علاوہ بہت سے مشاہدات اور مؤلف کی اپنی آرا بھی شامل ہیں۔ قدیم قبائل کے رسوم و رواج اور ان کے مذہبی عقائد بھی درج ہیں۔ اگر مسعودی اپنی ہر دیکھی سنی چیز نہ لکھتے تو ہم اس دور کے بہت سے مذہبی عقائد اور سیاسی، اجتماعی اور معاشی امور کے علم سے محروم رہتے۔

اگرچہ ابنِ خلدون، مسعودی پر اس لحاظ سے گرفت کرتے ہیں کہ مسعودی ہر سنی سنائی چیز اور کسی اور ذریعے سے ان تک پہنچنے والا ہر قصہ اور ہر حکایت بغیر کسی تحقیق و تنقید اور بحث و تمحیص کے لکھ دیتے ہیں، لیکن اس کے باوجود ابنِ خلدون نے خود ہی مسعودی کی طرف سے معذرت پیش کی ہے یا کم از کم یہ کوشش ضرور کی ہے کہ وہ دوسروں کی نظروں میں مسعودی کا ایک خاص مقام پیدا کریں۔ لکھتے ہیں: "جیسا کہ محققین و ناقدین کے درمیان مشہور و معروف ہے۔ مسعودی اور واقدی کی کتابوں میں بہت سے امور محلِ نظر ہیں۔ ضروری نہیں کہ ان کی کتابوں میں لکھی ہوئی ہر بات معتبر اور قابلِ قبول ہو لیکن اس کے باوجود تمام علماء نے انہیں معتبر مورخ قرار دیا ہے اور ان کی روایات و اخبار کو اہم سمجھا جاتا ہے۔ ہر ناقد و بصیر اپنی عقل و بصیرت سے کام لے کر خود دیکھ سکتا ہے کہ کونسی روایت معتبر اور قابلِ قبول ہے اور کونسی غیر صحیح اور غلط ہے۔ ہر دور اور ہر علاقے کے کچھ طبعی حالات ہوتے ہیں جن پر وہاں کے حالات اور کوائف کا دارومدار ہوتا ہے۔ ہر علاقے کے متعلق روایات کو اس علاقے کے لحاظ سے جانچا جائے گا۔ (مثلاً اگر کوئی کہے کہ میں نے قطبِ شمالی یا قطبِ جنوبی کے اردگرد رہنے والے لوگوں کو دیکھا ہے۔ اُن کا لباس صرف ایک لنگوٹی ہوتا ہے۔ یا یہ کہے کہ خطِ استوا کے قریب رہنے والے لوگ سال کے اکثر حصوں میں پوستین اور بھاری اُونی لباس پہنتے ہیں تو یہ دونوں یقیناً غلط ہیں، خواہ کہنے والا کتنا ہی معتبر کیوں نہ ہو) پھر اسلامی مؤرخین کی کتابیں عام طور پر ظہورِ اسلام ہی سے شروع ہوتی ہیں اور ان میں صدرِ اسلام کی دو بڑی حکومتوں (بنو امیہ و بنو عباس) کے احوال ہوتے ہیں۔ البتہ مسعودی اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے والے کچھ مؤرخین ایسے بھی ہیں جنہوں نے اسلام سے پہلے کی بہت سی قوموں کے احوال بھی لکھتے ہیں۔

دراصل مسعودی پر ابنِ خلدون کی تنقید کا ہدف وہ قصص و حکایات ہیں جو انہوں نے اپنے سے پہلے مؤرخین و مؤلفین کی کتابوں سے نقل کی ہیں اور وہ تاریخی روایات جو انہوں نے دوسری کتبِ تاریخ سے لیے ہیں۔ علامہ محمد محی الدین "مروج الذہب" کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ: مسعودی نے جو علوم و معارف اور تاریخی واقعات اس کتاب میں لکھے ہیں۔ ان کے دو بڑے ماخذ ہیں جن میں سے ایک ماخذ سابقہ علماء و مؤلفین کی تالیفات و تصنیفات ہیں جن میں سے اکثر کی طرف مسعودی نے "مروج الذہب" کے آغاز میں اشارہ کیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مسعودی نے اپنے سے پہلے کے تمام معتبر مؤرخین کی تالیفات سے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ انہیں اپنی تالیفات و تصنیفات کا ماخذ بنایا ہے۔ وہ ان سب کا تذکرہ "مروج الذہب" کے آغاز میں بھی کرتے ہیں اور دیگر متعدد کتب میں مختلف مقامات پر بھی کرتے ہیں۔ "مروج الذہب" جلد اول صہ۹ پر لکھتے ہیں: "بہت سے پہلے لوگوں نے بھی تاریخ کے موضوع پر کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے تو بالکل صحیح صحیح واقعات لکھے ہیں اور بعض سے غلطیاں بھی صادر ہوئی ہیں، لیکن ہر ایک نے اپنی پوری کوشش صرف کر کے اپنی قابلیت کے جوہر

دکھائے ہیں، مثلاً وہب بن منبہ والی مخنف لوط یحییٰ عامری محمد بن اسحٰق واقدی۔ ابن الکلبی۔ ابوعبیدہ محمد بن مثنیٰ ....." اس طرح مسعودی بہت سے راویوں اور مورخین کا تذکرہ کرتے کرتے اپنے "ہمعصر مورخین تک پہنچتے ہیں۔ اپنے معاصرین میں سے وہ " مروج الذہب" جلد ا صـ ۲ پر سنان بن ثابت بن قرہ جرجانی پر یوں تنقید کرتے ہیں: " میں نے سنان بن ثابت بن قرہ جرجانی کو دیکھا ہے۔ انہوں نے ایک ایسا کام کیا جو ان کے فن سے غیر متعلق تھا اور اپنا راستہ چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کر لیا۔ انہوں نے ایک مؤلف کے نام مکتوب کے طور پر ایک کتاب تالیف کی۔ اس کی تمہید میں انہوں نے اخلاق نفس اور نفس کی مختلف اقسام ناطقہ غضبیہ شہوانیہ وغیرہ کے بارے میں کچھ جامع کلمات لکھنے کے بعد کچھ سیاست کے موضوع پر لکھا۔ یہ موضوع انہوں نے افلاطون سے لیا۔ افلاطون نے اس سلسلے میں دس مقالات لکھے ہیں جن میں سیاست، بادشاہوں اور وزراء کے فرائض وغیرہ امور کا تذکرہ ہے۔ اس کے بعد سنان بن ثابت نے بزعم خویش کچھ صحیح واقعات لکھے ہیں، حالانکہ وہ ان کے چشم دید واقعات نہیں تھے اور پھر اسے مستنصر باللہ کے حالات سے جا ملایا ہے اور لکھا ہے کہ وہ مستنصر باللہ کی صحبت میں کچھ عرصہ رہ چکے ہیں۔ پھر مستنصر باللہ کی طرف ایک تالیف کو منسوب کیا ہے۔ یہ فعل سابقہ مؤرخین و مؤلفین کی روش کے سراسر خلاف ہے۔ اگر مان بھی لیا جائے کہ جو کچھ انہوں نے لکھا ہے بالکل صحیح ہے اور اس میں انہوں نے کوئی غلط بات نہیں لکھی، پھر بھی اس میں یہ عیب ضرور ہے کہ انہوں نے ایک ایسا کام کیا جو ان کے فن سے متعلق تھا اور وہ اپنا راستہ چھوڑ کر دوسرے راستے پر چل نکلے۔" اپنی کتاب کے آغاز میں مسعودی اس طرح بہت سے سابقہ مورخین پر تنقید و تبصرہ کرتے ہیں، مثلاً طبری کے متعلق لکھا ہے: " ابوجعفر بن محمد بن جریر طبری کی تاریخ اس موضوع پر بے نظیر اور لاثانی کتاب ہے۔ کوئی دوسری تاریخی کتاب اس جیسی نہیں۔ اس میں مختلف النوع تاریخی واقعات اور متعدد علوم و فنون کے متعلق علمی حقائق ذکر کئے گئے ہیں۔ یہ کتاب انتہائی مفید کتاب ہے اور آخر کیوں نہ ہو؟ اس کتاب کا مؤلف اپنے دور کا سب سے بڑا فقیہ، یگانۂ زمانہ اور نادرۂ روزگار تھا۔ اس کے زمانے کے تمام فقیہ اس کا لوہا مانتے تھے اور تمام محدث اور آثار و سنن کے ماہرین اس کے علوم کے سامنے سر تسلیم خم کرتے تھے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مختلف مقاصد کے پیش نظر مسعودی ہر اس کتاب کی طرف راجع ہوتے ہیں جو انہیں ملے۔ کبھی کسی واقعہ کے نقل کرنے کے لیے وہ اکثر و بیشتر ایسا کرتے رہتے ہیں۔

جب کوئی مختلف فیہ امر پیش آ جائے تو مسعودی ایک سے زیادہ ماخذ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات کے بارے میں جلد دوم صـ ۲۰۱ پر لکھتے ہیں کہ: " مذکورہ بالا قول محمد بن اسحٰق کا ہے۔ واقدی اس امر میں تو ابن اسحٰق سے متفق ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان نو غزوات میں شرکت کی ہے۔ لیکن اس پر یہ اضافہ کرتے ہیں کہ حضورؐ نے وادی القریٰ والے غزوات میں بھی شرکت فرمائی ہے..." دونوں کے اقوال پر تبصرہ کرتے ہوئے آخر کار مسعودی لکھتے ہیں کہ: " واقدی کے قول کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گیارہ غزوات میں شرکت فرمائی ہے اور ابن اسحٰق کے قول کے مطابق حضورؐ نو غزوات میں شریک ہوئے ہیں۔ لہٰذا آپؐ کے نو غزوات میں شریک ہونے پر دونوں مؤرخین متفق ہیں۔"

جہاں تک کسی حیوان یا مکان، عمارت، علاقہ وغیرہ کے متعلق کچھ لکھنے کا سوال ہے تو اس سلسلے میں مسعودی صرف دوسری کتابوں سے نقل کر کے کچھ لکھ دینے پر اکتفا نہیں کرتے کیونکہ یہ حسی اور موجود اشیاء ہیں اور اس سلسلے میں مشاہدہ اور اپنے معاصرین میں سے ان لوگوں سے استفادہ ممکن ہوتا ہے جنہوں نے وہ حیوان یا مکان دیکھا ہو۔ جاحظ نے کرکدن (گرگدن یا گینڈا) کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس پر مسعودی نے بڑی سخت تنقید کی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مسعودی کسی حیوان یا مکان کے متعلق کچھ لکھتے وقت لکیر کے فقیر نہیں ہوتے۔ جلد اول صـ ۱۴۶ پر لکھتے

ہیں: "عمرو بن بحر الجاحظ کا خیال ہے کہ کرگدن اپنی ماں کے پیٹ میں سات سال تک رہتا ہے۔ وہ اپنا سر باہر نکال کر چرتا ہے اور پھر دوبارہ سر ماں کے پیٹ میں داخل کر لیتا ہے۔ یہ بات جاحظ نے اپنی "الحیوان" نامی کتاب میں ایک اعجوبے کے طور پر لکھی ہے۔ میں نے جاحظ کی یہ بات جسے بھی بتائی اس نے اس پر سخت حیرت و استعجاب کا اظہار کیا۔ میں نے اس کے متعلق سیراف، عمان اور ہندوستان کے تاجروں اور سیاحوں وغیرہ سے دریافت کیا تو سب نے یہی بتایا کہ یہ گائے بھینسوں کی طرح بچے جنتا اور انہیں دودھ پلاتا ہے اور اس کی مدتِ حمل بھی گائے بھینس کی مدتِ حمل کے لگ بھگ ہوتی ہے، مجھے آج تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ حکایت جاحظ نے کہاں سے لی ہے۔ کسی کتاب سے نقل کی ہے یا کسی آدمی نے اسے بتائی ہے ...؟"

مسعودی نے اسلامی مؤرخین اور عربی کتب کے علاوہ دوسرے مؤرخین اور غیر عربی اجنبی کتب سے بھی استفادہ کیا ہے۔ اگرچہ غیر مؤرخین، مؤلفین یا کتب سے استفادہ کے متعلق انہوں نے خود کوئی وضاحت نہیں کی، لیکن کتاب میں ایسے اشارات ضرور ملتے ہیں جن سے ظاہر ہے کہ نہ صرف غیر عربی کتب سے استفادہ کیا بلکہ اکثر و بیشتر اس زبان کی اصلی کتب سے استفادہ کیا جس زبان میں وہ لکھی گئی تھیں۔ مثلاً جغرافیہ کے موضوع پر کچھ لکھتے وقت وہ عموماً بطلیموس کی کتاب جغرافیہ سے استفادہ کرتے ہیں۔ صد۱۰۲ پر لکھتے ہیں:-

"بطلیموس نے اپنی کتاب جغرافیہ میں زمین، بڑے بڑے شہروں، پہاڑوں، سمندروں، جزیروں، دریاؤں اور چشموں وغیرہ کے احوال و کوائف لکھے ہیں۔" معلوم ہوتا ہے کہ مسعودی نے یہ کتاب اور اس میں موجود نقشے خود دیکھے تھے۔ لکھتے ہیں: "کتاب جغرافیہ میں یہ سمندر مختلف رنگوں اور شکلوں میں دکھائے گئے ہیں، کوئی سبز نیلگوں، کوئی شالوری، کوئی مصرانی اور کوئی مثلث شکل کے ہیں۔" یہ کتاب انہوں نے اسی زبان میں لکھی دیکھی جس میں مؤلف نے لکھی تھی۔ لکھتے ہیں کہ "لیکن اس کتاب میں ان دریاؤں، پہاڑوں، شہروں وغیرہ کے نام لکھے ہوئے ہیں جس کا سمجھنا دشوار ہے۔" اگرچہ مسعودی نے خود اس کی وضاحت نہیں کی کہ وہ یونانی زبان جانتے تھے۔ لیکن ان کی مذکورہ بالا عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ وہ یونانی زبان سے آگاہ تھے۔ اس لیے جب وہ یونانی کتب سے استفادہ کرتے تو تراجم سے نہیں بلکہ عموماً یونانی میں لکھی ہوئی اصل کتابوں سے استفادہ کرتے تھے۔

افلاک و نجوم کے موضوع پر وہ علمِ نجوم کی عربی کتب کی طرف رجوع کرنے کے ساتھ ساتھ اس موضوع کی یونانی کتب بھی دیکھتے۔ جلد اوّل صد۲۰ پر اس فن کی کتاب الزیج کا تذکرہ کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ کتاب المجسطی کے مؤلف بطلیموس نے لکھا ہے کہ پہاڑوں اور سمندروں سمیت زمین کی گولائی (محیط) چوبیس ہزار میل ہے۔" جلد اوّل صد۳۳۳ پر حیوانات کے موضوع پر لکھتے ہوئے صاحب المنطق کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ زرافہ کے متعلق بہت سے عجیب و غریب واقعات اور کوائف ہیں۔ یہ بات صاحب المنطق نے اپنی "الکتاب الکبیر" میں لکھی ہے۔ جس میں انہوں نے زرافہ اور دیگر حیوانات کے اعضاء کے فوائد لکھے ہیں کہ وہ اپنے کن کن اعضاء سے کیا کیا کام لیتے ہیں۔

ہوا اور مٹی وغیرہ کے طبائع و خواص کے سلسلے میں مسعودی کا ماخذ بھی اس فن کے ائمہ ہیں۔ جلد اوّل صد۱۵۹ پر لکھتے ہیں کہ جالینوس کا کہنا ہے کہ ہوا میں نشوونما اور سکون دونوں خواص پائے جاتے ہیں۔" بلیغاس" سے منقول ہے کہ جب یہ دو عناصر یعنی مٹی اور پانی میں خلق (از سرِ نو وجود میں آنا) اور مسکن (جگہ گھیرنا) کی خصوصیات پائی جاتی ہیں تو لازمی امر ہے کہ دوسرے دو عناصر بھی ہوا اور آگ میں بھی یہ دونوں خاصیتیں یقیناً پائی جاتی ہیں۔" اور جلد دوم صد۱۳۰ پر مختلف خطوں کی آب و ہوا کے انسانی مزاج و طبائع پر اثرات کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "حکیم بقراط کا کہنا ہے کہ جنوبی علاقوں میں ایک علاقہ ایسا ہے جہاں بارش بہت زیادہ ہوتی ہے، وہاں سبزہ بکثرت

پیدا ہوتا ہے اور گھنے جنگلات پائے جاتے ہیں۔"

تاریخ عالم قدیم کے بارے میں جلد دوم صفحہ ۱۶ پر ایک مقالہ ہے جس میں مختلف اقوام کے اقوال ہیں۔ کچھ اقوال قدیم عجیب غریب اور افسانوی رنگ کے ہیں اور کچھ صحیح اور عقل کے مطابق ہیں۔ انہوں نے اپنے زمانے میں سب سے پہلے قدیم اقوام کی مذہبی کہانیوں اور عجیب غریب واقعات سے پردہ اٹھایا۔ انہوں نے ہندوستان سے لے کر ایشیا کے انتہائی شمالی علاقوں روس تک، مغرب میں سوڈان، یونان سے ایران تک۔ نیز مصر کی قدیم اقوام مجوسیوں، صائبین۔ جزیرۃ العرب۔ غرضیکہ دنیا کی ان تمام اقوام کی تاریخ لکھی جن کا کسی طور پر وجود ملتا ہے۔ اس میں قدیم تاریخ بھی شامل ہے اور اسلام کے بعد محمد بن طغج اخشید تک کے دور کی جو ان کی کتاب کا زمانہ مابعد ہے، تاریخ بھی شامل ہے۔

علامہ احمد امین اپنی کتاب "فجر الاسلام" کے صفحہ ۱۶۶ پر مسعودی کی کتاب "مروج الذہب" کی اہمیت و افادیت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں، "اس نے تاریخ نویسی میں قدیم محدثین اور مؤرخین کی روش کو چھوڑ کر ایک نئی روش اختیار کی اور اس میں کلام نہیں کہ اس کے مصر میں رہنے اور وہاں اس کی کتب کی اشاعت سے ثقافتِ تاریخ پر گہرا اثر پڑا۔"

ڈاکٹر سیدہ اسماعیل کاشف اپنی کتاب "مصادر التاریخ الاسلامی" کے صفحہ ۳۵ پر مسعودی کے طرزِ تالیف کے بارے میں لکھتی ہیں انہوں نے تاریخ نویسی میں ایک نئی روش اپنائی۔ وہ مختلف واقعات سنین کے تحت ترتیب وار نہیں لکھتے کہ پہلے مثلاً ۳ ھ کے بعد ہم لکھیں، پھر ۴ ھ کے پھر ۵ ھ کے ... بلکہ موضوعات کے لحاظ سے ان کے مختلف عنوان قائم کرتے ہیں اور ہر قوم، ہر بادشاہ یعنی شاہی خاندان کے حالات ان عنوانوں کے تحت درج کرتے ہیں۔ دیگر کئی ایک مؤرخین خصوصاً ابنِ خلدون نے بھی ان کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے یہی روش اختیار کی ہے۔" اس طرزِ تالیف کا فائدہ یہ ہوا کہ ہر قوم کی تاریخ کے ساتھ ساتھ اس قوم کی ثقافت، تہذیب و تمدن، طرزِ معاشرت۔ علوم، مذاہب عقائد وغیرہ امور بھی ان کے سامنے آگئے اور اس طرح کسی قوم کی تاریخ، اس کی طرزِ معاشرت تہذیب و تمدن، ثقافت رسوم و رواج اور مذہبی عقائد وغیرہ امور کی تاریخ کا جزو لاینفک بن گئی۔

مسعودی اسی کتاب میں اپنی طرزِ تالیف کی وضاحت کرتے ہوئے جلد اول صفحہ ۳ پر لکھتے ہیں: تاریخ، دنیا کے حالات، زمانے کے واقعات انبیائے کرام اور بادشاہوں کے حالات، مختلف اقوام اور ان علاقوں کے حالات جہاں وہ قومیں آباد تھیں ایسے ہی متعدد امور پر مشتمل میرا یہ کتاب لکھنے کا باعث، علمائے کرام کے طریق کار کے اتباع و پیروی کی محبت اور حکماء کے احکام کی تعمیل ہے تاکہ آئندہ نسلوں تک دنیا کے اچھے اچھے حالات و واقعات اور علوم و معارف پہنچ سکیں اور وہ ان سے مستفید ہو کر اس سے پہلے بھی ان فنون پر متعدد کتابیں لکھی گئیں۔ اس سلسلے میں بعض مؤلفین نے قابلِ قدر کام کیا اور بعض کی کوششیں ادھوری رہ گئیں۔ بعض نے مفصل اور ضخیم کتابیں لکھیں اور بعض نے اختصار سے کام لیا۔ نیز ہم نے محسوس کیا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نئے واقعات و حوادث ظہور پذیر ہو رہے ہیں جن کا قلمبند ہونا ضروری ہے۔ اس فن میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض اوقات بڑے بڑے اہم واقعات بھی بڑے بڑے فاضل مؤلفین کے علم میں نہیں آتے اور قلمبند ہونے سے رہ جاتے ہیں۔ ان مختلف وجوہ کے سلسلے میں ضروری سمجھا کہ ایک کتاب لکھوں۔ رہی یہ بات کہ میری یا دیگر مؤلفین کی سعی و کوشش کہاں تک کامیاب ہے۔ تو اس سلسلے میں کہنا پڑے گا کہ ہر ایک کو اس کی محنت و کوشش کے مطابق ہی صلہ ملے گا۔ نیز ہر دور اور ہر علاقے کے کچھ عجیب و غریب مسائل و حالات ہوتے ہیں جن کا علم اس دور اور اس علاقے کے لوگوں کو ہی ہو سکتا ہے۔ نیز جو شخص گھر کے کونے میں بیٹھا رہے اور جو کچھ وہاں میسر ہو اسی پر قانع رہے تو وہ کبھی بھی اس شخص کا ہم پلہ نہیں ہو سکتا جو دور دراز کے سفر کرے اور طرح طرح کی مشقتیں برداشت کر کے مختلف و متعدد دشوار گزار مقامات سے علوم و

معارف کے قیمتی جواہر اکٹھے کرے۔

مسعودی نے کتاب لکھتے وقت جن اشیاء اور علوم و معارف کو اس میں درج کرنے کا ارادہ کیا تھا اس میں وہ کامیاب ہوئے۔ انہوں نے صرف حوادث ہی قلمبند نہیں کیے بلکہ حوادث کے ساتھ ساتھ تہذیب و تمدن کی تاریخ بھی لکھی۔ انہوں نے عقائد کے متعلق زیادہ بحث و تمحیص اور فلسفی موشگافیوں سے اجتناب کیا ہے اور اگر کہیں ناچار ان امُور کا ذکر آ گیا ہے تو یا تو نہایت اختصار سے ذکر کیا ہے یا کسی دوسری کتاب کے حوالے و اشارے پر اکتفا کیا ہے جس میں انہوں نے یہ موضوع پہلے مفصل بیان کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں وہ خود جلد سوم ص۴۲۳ پر لکھتے ہیں کہ "اگر ہمارا ارادہ اس کتاب کی ضخامت کو ایک خاص حد تک رکھنے اور اختصار سے کام لینے کا نہ ہوتا تو ہم مختلف اقوام کے مختلف مذاہب اور فلسفوں پر تفصیل سے کلام کرتے اور اس سلسلے میں وہ تمام اقوال و آراء اور دلائل سامنے لاتے جو ہم سے پہلے لوگوں نے پیش کیے یا ہمارے معاصرین پیش کر رہے ہیں۔

جلد دوم ص۱۵۲ پر لکھتے ہیں کہ "بہت سے ایسے لوگوں نے جو اقوام قدیمہ (ارم و عاد) کے حالات سے آگاہ ہیں، لکھا ہے کہ یہ قصے کہانیاں اور حکایات خود ساختہ اور موضوع ہیں، مَن گھڑت خرافات ہیں۔ درباری مقربین اور قصہ گوؤں نے بادشاہوں کو بہلانے کے لیے وضع کیے تھے۔ پھر اس زمانے کے لوگوں میں مشہور اور زبان زدِ عام ہو گئے۔ ہم تک یہ قصص و حکایات ہندی، فارسی اور رُومی کتب کے تراجم سے پہنچی ہیں اور ان کی وجہ تالیف یہی ہے جو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ مثلاً کتاب "افسان" اور اس کی "افسانیہ" نامی فارسی تعبیر۔ اہل عرب میں یہ کتاب "الف لیلہ و لیلہ" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ دراصل ایک بادشاہ، اس کے وزیر اور وزیر کی بیٹی کی داستان ہے جو شیوازاد اور اسازاد نے نقل کی ہے یا جیسے "وزرہ و شماس" نامی کتاب جس میں ہندوستان کے بادشاہوں اور وزراء کے قصے ہیں اور کتاب سندباد اور اسی قسم کی دیگر متعدد کتب ہیں"

مسعودی خود "مروج الذہب" کے باب جوامع اغراض میں لکھتے ہیں کہ یہ کتاب "اخبار الزمان و اخبار الملوک" "الاوسط" نامی دو کتابوں کا نچوڑ ہے۔ "اخبار الزمان و اخبار الملوک میں زمین۔ دنیا کے بڑے بڑے برِ اعظم، سمندر، کواکب و افلاک ان امُور سے متعلق فلاسفہ کے اقوال مختلف ادوار کے دنیا کے بڑے بڑے بادشاہوں کے حالات۔ فراعنۂ مصر، ایران کے اکاسرہ قوم عاد، یونانی، رومی، ان بادشاہوں کا طرزِ حکومت، مختلف ادوار کے فلاسفہ کی آراء، انبیاء و رُسلؑ کے حالات اور ۳۳۲ھ تک کی تاریخ وغیرہ مضامین شامل ہیں۔ "الاوسط" میں ... تخلیقِ کائنات سے لے کر مؤلف کے زمانے تک کی تاریخ ہے۔" مروج الذہب، جلد اوّل ص۲ پر اس کتاب کی طرزِ تالیف کے متعلق مذکور ہے کہ مذکورہ بالا دو کتابوں میں درج مفصل مضامین کو مختصر الفاظ میں قارئین کے سامنے پیش کرنے کے لیے اور جو مضامین ان کتابوں میں نہیں آئے اور دیگر متعدد موضوعات قلمبند کرنے کے لیے یہ کتاب لکھی گئی ہے۔

مسعودی کا دوسرا بڑا شاہکار "التنبیہ والاشراف" ہے جو اگرچہ "مروج الذہب" جتنا مقبول و مشہور تو نہیں، تاہم نہایت گراں بہا قابلِ قدر ہے۔ جرجی زیدان اس کتاب کے متعلق لکھتے ہیں کہ "اس میں افلاک، ہیئت، نجوم، النجوم کی تاثیر، عناصر، ترکیب عناصر، زمانے کے مختلف ادوار، سال کے تمام موسم، مختلف ہوائیں۔ ہواؤں کے رُخ، زمین، زمین کی مختلف شکلیں، زمین کا رقبہ، مختلف برِ اعظموں میں زمین کی تقسیم، ہر علاقے کے لوگوں پر وہاں کی آب و ہوا کا اثر، ہفت اقلیم اور ان کی حدود، عرض بلد اور طول بلد، بڑے بڑے دریا اور ان کی گزرگاہیں، سات قدیم اقوام، ان کی زبانیں اور مسکن۔ ایران کے شاہی خاندانوں کا ترتیب وار تذکرہ۔ رُومیؔ اور ان کی تاریخ، تمام اقوامِ عالم کی تاریخ اور انبیاء کرام کا تذکرہ۔ سفینۂ قمریہ و شمسیہ کا بیان۔ سیرت النبیؐ، ظہور اسلام اور ۳۴۵ھ تک اسلامی خلفاء کی سیرت اور ان کے اعمال مناقب وغیرہ امُور کا تذکرہ

ہے۔ ان امُور کے علاوہ اس میں متعدد ایسے امُور بھی ہیں جو دوسری تاریخی کتابوں میں نہیں ملتے۔ یہ کتاب ۱۸۹۴ء میں لیڈن سے پانچ سو صفحات میں شائع ہو چکی ہے۔

اگرچہ دونوں کے درمیان بہت بڑی حد تک مطابقت تو نہیں تاہم "مروج الذہب" کے موضوعات اور جرجی زیدان کے پیش کردہ موضوعات کے درمیان ایک حد تک مشابہت ضرور پائی جاتی ہے بلکہ یوں کہنا زیادہ بہتر ہے کہ دوسری کتاب کی نسبت پہلی کتاب کی ترتیب اور کسی حد تک دوسری کتاب کی ترتیب اور جرجی زیدان کی تحریروں کی ترتیب ایک دوسرے کے زیادہ مشابہ ہے۔ اگرچہ مسعودی کی دوسری کتاب یعنی "التنبیہ والاشراف" میں فلسفیانہ انداز" مروج الذہب" کی نسبت زیادہ نمایاں ہے۔ ڈاکٹر سیدہ اسماعیل کاشف لکھتی ہیں کہ:

"مسعودی نے مروج الذہب" کے علاوہ ایک اور کتاب بھی تالیف کی ہے جس کا نام "التنبیہ والاشراف" ہے۔ اس میں انھوں نے فلسفۂ تاریخ اور فلسفۂ کائنات کے متعلق اپنا نقطۂ نظر واضح کیا ہے۔ نیز حیوانات، نباتات اور معدنیات کے تدریجی ارتقا اور آپس میں تعلق کے متعلق قدیم فلاسفہ کی آرا بھی سامنے لائے ہیں۔ ان امُور کے علاوہ تاریخ قدیم، اسلامی تاریخ اور جغرافیہ کے متعلق بہت کچھ لکھتے ہوئے مختلف شہروں اور علاقوں کا تذکرہ کیا ہے۔

کارل بروکلمان اپنی کتاب "تاریخ الادب العربی" حصہ سوم ص ۵۹ پر لکھتے ہیں کہ: "التنبیہ والاشراف" مسعودی کی تصنیف میں سے آخری کتاب ہے۔ گویا یہ ان کی پوری زندگی کی علمی و ادبی کوشش و کاوش کا خلاصہ اور نچوڑ ہے۔ یہ کتاب انھوں نے ۳۴۵ھ مطابق ۹۵۶ء میں تصنیف کی۔ بروکلمان لیڈن سے شائع ہونے والے ایک نشریہ میں لکھتے ہیں کہ عبداللہ اسماعیل صادی نے یہ کتاب ۱۳۵۷ھ/۱۹۳۸ء میں مصر سے شائع کی۔ کارودی نے اس کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا جو ۱۸۹۷ء میں پیرس سے شائع ہوا۔ بروکلمان کی اس رائے سے کہ یہ کتاب مسعودی کی پوری زندگی کی علمی و ادبی کوشش و کاوش کا خلاصہ و نچوڑ ہے۔ اس حقیقت کا انکشاف ہوا ہے کہ اس کتاب اور "مروج الذہب" کے درمیان اس قدر تشابہ کیوں پایا جاتا ہے؟

مسعودی کی عمدہ، جلیل القدر اور عظیم المنفعت کتاب کا تبصرہ ان کے اپنے الفاظ پر ختم ہونا ہی زیادہ موزوں و مناسب ہے۔ جلد اوّل ص ۹ پر اس کی وجہ تسمیہ کے متعلق لکھتے ہیں کہ: "چونکہ یہ کتاب ان موضوعات پر ہماری سابقہ تالیفات و تصنیفات کا اختصار اور خلاصہ ہے اور بذاتِ خود اس کے مضامین نہایت نفیس، عمدہ اور از حد مفید ہیں، اس لیے میں نے اس کا نام "مروج الذہب و معادن الجوہر" تجویز کیا ہے۔ یہ کتاب بادشاہوں اور حکما و اہلِ علم کے لیے ایک بیش قیمت تحفہ ہے اور ہر کہ و مہ کو اس کتاب کے مذکور علوم و معارف کی ضرورت ہے۔ لوگ بڑے شوق سے اس کا مطالعہ کریں گے۔ یہ ایسے موضوعات پر مشتمل ہے جن کی ہر ایک کو ضرورت ہوتی ہے اور ان علوم سے لاعلمی اس کے لیے باعثِ نقصان ہے۔ ہم نے تمام علوم و معارف اور تاریخی واقعات میں تفصیلاً یا اجمالاً یا اشارۃً بیان کر دیے ہیں۔"

سیرت کی چھیالیس[46] مطبوعہ اور قلمی کتابیں

تحریر: مسعد سویلم الشامان، ترجمہ: مولانا اجمل اصلاحی

یہ مقالہ جس کا ترجمہ قارئین نقوش کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ استاذ مسعد سویلم الشامان کے قلم سے ہے جو ریاض یونیورسٹی کے کلیۃ الآداب میں استاذ ہیں۔ اور انقرہ یونیورسٹی ترکی سے "سیرت نبوی ترکی لٹریچر میں" کے موضوع پہ ڈاکٹریٹ کی تیاری کر رہے ہیں۔ یہ مقالہ ریاض کے موقر سہ ماہی مجلہ "عالم الکتب" (جلد سوم، شمارہ سوم ص ۴۴۰ - ۳۵۳) میں شائع ہوا ہے۔

فاضل مقالہ نگار نے اس مضمون میں سیرت نبوی کی ۴۶ کتابوں کا تذکرہ کیا ہے۔ ان کتابوں کے ترجمہ یا مخطوطات کے سلسلہ میں بعض غلط فہمیوں کو دور کیا ہے۔ اب تک کی معلومات پر اضافہ کیا ہے۔ نئے مخطوطات کا انکشاف کیا ہے۔ اور اس باب میں بروکلمان، فواد سزگین اور رمضان ششن کے قابل قدر کاموں پر اضافہ کیا ہے۔ موصوف کا سب سے اہم کارنامہ سیرت ابن ہشام کے ترکی ترجمہ کا انکشاف ہے۔ جس زمانہ میں میں ابن ہشام پر مضمون لکھ رہا تھا[1]۔ اس کے ترجموں کی تلاش تھی۔ ترکی ترجمہ کا ذکر کسی کتاب میں نہ ملا۔ خود مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ اس کا ذکر ترکی ماخذ میں بھی نہیں ہے۔ یہ ترجمہ دسویں صدی ہجری کا ہے۔ اور خوش قسمتی سے اس کا آٹوگراف جامعہ استنبول کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ مقالہ نگار کی تجسس کا ایک جز اس ترجمہ کی تحقیق بھی ہے۔

مضمون کے ترجمہ میں بعض مقامات پر معمولی اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ اس لئے "ترجمہ" کے ساتھ "تلخیص" کا بھی اضافہ کر دیا ہے — مترجم

میری پی ایچ ڈی کے مقالہ کا عنوان ہے "سیرت نبوی ترکی لٹریچر میں" اس مقالہ کی تمہید میں عربی ادب میں اس موضوع پر تحقیقات کا مختصر جائزہ لینا ضروری تھا۔ اس سلسلہ میں مطالعہ کے دوران کتب سیرت کے بارے میں ماخذ بعض غلطیاں نظر آئیں۔ اسی طرح بعض نئے مخطوطات کا سراغ لگا۔ جن کا تذکرہ قدیم ماخذ میں موجود نہیں ہے۔ اور بعض کا تو کہیں ذکر مذکور نہیں ملتا۔ مناسب معلوم ہوا کہ یہ معلومات سیرت کے طلبہ کی خدمت میں پیش کر دی جائیں۔

۱۔ کتاب المغازی مولفہ واقدی متوفی ۲۰۷ھ یا ۲۰۹ھ:

---

[1] نقوش رسول نمبر جلد اول ص ۴۸۸

ڈاکٹر فواد سزکین نے لکھا ہے کہ اس کتاب کا ایک فارسی ترجمہ جس کا مترجم نامعلوم ہے۔ خزانہ حاجی محمود (سلیمانیہ) میں نمبر ۴۷۶۴ کے تحت محفوظ ہے۔ نیز مغازی واقدی کا ایک ترکی ترجمہ استنبول میں ۱۲۶۱ھ میں شائع ہوا[۱]۔

یہ غلطی ڈاکٹر صاحب موصوف کے ذہن میں معلومات کی کثرت اور ہجوم کی وجہ سے واقع ہو گئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مغازی واقدی کا ترجمہ ترکی زبان میں ہوا ہی نہیں۔ مذکورہ بالا کتاب ترکی زبان میں ہے، نہ کہ فارسی میں۔ پھر یہ کتاب مغازی کے بجائے واقدی کی جانب منسوب فتوح الشام کا ترجمہ ہے اور مترجم ہیں محمد بن یوسف بن مصطفیٰ اجکس زادہ متوفی ۱۱۶۰ھ[۲]

ڈاکٹر صاحب نے جو یہ لکھا ہے کہ ترکی ترجمہ استنبول میں ۱۲۶۱ھ میں شائع ہوا تھا تو یہ تاریخ دراصل طباعت کی نہیں بلکہ کتاب مذکور کی کتابت کی ہے۔ جیسا کہ عبارت ذیل سے واضح ہے۔

"واقع الفراغ من تحریر کتاب الواقدی فی وقت الضحیٰ فی یوم الاربعاء من شہر ربیع الاول فی سنۃ احدی وستین بعد المائتین والالف من الهجرة النبویة" (وکذا)

مغازی واقدی کے فارسی ترجمہ کا ذکر اسٹوری نے اپنی کتاب میں کیا ہے[۳]؛ ڈاکٹر سزکین نے جہاں واقدی کی فتوح الشام کا ذکر کیا ہے۔ وہاں اس کے درج ذیل ترکی ترجمے ذکر سے رہ گئے ہیں۔

۱۔ سابق الذکر ترجمہ جسے مترجم نے ۱۱۰۷ھ یا ۱۰۹۸ھ میں مکمل کیا۔ اس کے متعدد نسخے بایزید العامۃ نمبر ۲۲۶، علی امیری نمبر ۴۲۵، حاجی محمود نمبر ۴۶۶۴/۱، طوبقبوسرائے نمبر ۱۲۴۷، قونغشلر نمبر ۸۹۱ وغیرہ میں پائے جاتے ہیں۔

۲۔ فتوح الشام کا ایک ترجمہ مصطفیٰ بن یوسف بن عمر الارضرومی المعروف بالضریر (وفات بعد ۷۹۶ھ) کے قلم سے ہے مترجم نے یہ ترجمہ اس وقت کے امیر حلب جلبان GULPAN کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ ترکی زبان کی تاریخ کے پہلو سے اس ترجمہ کی بڑی اہمیت ہے[۴]۔ اس ترجمہ کے متعدد مخطوطات فاتح (نمبر ۴۲۸۶) علی امیری (نمبر ۴۳۴) ایا صوفیا (نمبر ۳۲۲۷) طوبقبوسرای (نمبر ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳) وغیرہ میں موجود ہیں۔

۳۔ فتوح الشام کا ایک ترجمہ محمد بن اُجا نے کیا ہے۔ یہ ترجمہ منظوم ہے۔ مترجم الملک الاشرف قایتبای کے یہاں (۸۷۳ھ تا ۹۰۲ھ) قاضی لشکر کے عہدہ پر فائز تھے۔ اسی طرح وہ اوزون حسن کے یہاں (۸۵۸ تا ۸۸۲ھ) سفیر کی حیثیت سے بھی کام کیا تھا عربی زبان میں ایک کتاب "سفارت نامہ" کے نام سے لکھی تھی۔ مذکورہ ترجمہ کی جلد اول کتب خانہ صالحہ خاتون میں نمبر ۱۵۷، اور جلد دوم طوبقبوسرائے قونغشلر میں نمبر ۸۸۲ کے تحت محفوظ ہے[۵]۔

۴۔ فتوح الشام کا چوتھا ترجمہ صادق بن صالح المؤید العظم متوفی ۱۳۲۸ھ[۶] نے کیا۔ یہ ترجمہ استنبول میں ۱۳۰۲ھ، ۱۳۰۳ھ میں شائع ہو چکا ہے۔

۵۔ ایک اور ترجمہ بھی ملتا ہے۔ جس کے مترجم کا نام محمد آفندی الفقیہ الحنفی ہے۔ ترجمہ کی تکمیل ماہ رجب ۷۸۶ھ میں ہوئی۔ اس ترجمہ اور مترجم کے بارے میں ہمارے پاس اس سے زیادہ معلومات نہیں ہیں۔ اس کا مخطوطہ دار الکتب المصریہ میں عمومی نمبر ۱۷۹۷۱ (۲۸۴ تاریخ ترکی) کے تحت محفوظ ہے[۷]۔

۲ - سیرت ابن ہشام کا ترکی ترجمہ

عربی یا ترکی مآخذ میں سیرت ابن ہشام کے کسی ترکی ترجمہ کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ سیرت ابن ہشام کے واحد ترکی ترجمہ کا پورا متن مجھے دستیاب ہو گیا ہے۔ اس ترجمہ کا ذکر کسی نے نہیں کیا۔ اور مترجم کے بارے میں بھی عربی اور ترکی مآخذ میں اس سے زیادہ معلومات نہیں ملتیں جو خود مترجم نے کتاب کے مقدمہ میں اپنے بارے میں لکھی ہیں۔ اس ترجمہ کی تحقیق میری ڈاکٹریٹ کے مقالہ کا دوسرا حصہ ہے۔ میں نے ترجمہ کا مقابلہ عربی متن سے کیا ہے اور مترجم نے جہاں حذف و اختصار سے کام لیا ہے۔ اس کی جانب بھی اشارہ کیا ہے۔ اس طرح ترکی نثر کے ارتقاء میں اس ترجمہ کی بھی اہمیت واضح کی ہے۔ مذکورہ ترجمہ کا واحد مخطوطہ مترجم کے قلم سے استنبول یونیورسٹی کے کتب خانہ میں (ترکی نمبر ۲۴۱۴) محفوظ ہے۔ مترجم ایوب بن خلیل آیدینی ہیں جنہوں نے یہ ترجمہ سلطان مراد سوم (۹۸۲ھ تا ۱۰۰۳ھ) کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ یہ ترجمہ ۱۱ ربیع الاول ۹۸۶ھ کو مکمل ہوا۔

(۳) **مختصر سیرۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم** - مولفہ ابو الحسین احمد بن فارس بن زکریا قزوینی متوفی ۳۹۵ھ[۲۲]

یہ کتاب جیسا کہ معلوم ہے۔ ایک بار ۱۳۰۱ھ میں الجزائر میں چھپی پھر ۱۳۱۱ھ میں بمبئی میں شائع ہوئی۔ ایک بار اور[۲۳] "اوجز السیر لخیر البشر" کے نام سے چھپی۔ اس کا ایک مخطوطہ انقرہ کے کتب خانہ لغت و تاریخ و جغرافیہ - قسم اسمٰعیل صائب میں (ادا، نمبر ۴۰۰۰/۲) میں موجود ہے۔ یہ نسخہ ایک مجموعہ میں شامل ہے مجموعہ کے ورق ۸۴ ب پر درج ذیل عبارت ہے:-

"کتاب فیہ مختصر سیرۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، جمع الامام ابی الحسین احمد بن فارس بن زکریا۔ رحمہ اللہ - روایۃ ابی الحسین علی بن القاسم المقری عنہ روایۃ ابی داؤد سلیمان بن ابراہیم و ابی محمد عبداللہ بن محمد النیلی و کلاھما عنہ روایۃ ابی القاسم اسمٰعیل بن محمد بن الفضل الاصبہانی (ملاحظہ ہو کحالہ ۲: ۲۹۳) عنہما روایۃ ابی الحسین احمد بن حمزہ بن علی الموازینی اجازۃ عنہ روایۃ جہتہ بنت ہبۃ اللہ بن علی بن حیدرۃ السلمی عنہ سماع عنہا الصاحب محمد بن احمد بن عبدالرحیم بن علی الشیبانی نفعنا اللہ بہ و لسائر کتبہ آمین"

ورق ۱۰۱ الف پر یہ کتاب ختم ہو جاتی ہے۔ اس مجموعہ پر بعض اور تحریریں بھی ہیں۔ جن کا تعلق ۷۷۵ھ سے ہے۔

بروکلمان نے اس رسالہ کے جن نسخوں کا ذکر کیا ہے۔ ان پر درج ذیل نسخوں کا اضافہ کیا جاتا ہے۔

۱۔ نسخہ علی امیری: عربی نمبر ۲۴۴۵ (اوراق ۱ - ۵)

۲۔ نسخہ ولی الدین نمبر ۲۱۸۰ (اوراق ۱۱۴ - الف - ۱۱۷ ب) اس نسخہ کی ابتداء یوں ہوتی ہے "اب تم: اخبرنا الشیخ الملہام العلامتہ۔ مفتی الشام حجۃ الحفاظ ۔۔ تقی الدین ابو عمرو عثمان بن عبدالرحمن بن عثمان بن نصر النصری النصری ارزدی المشہور با بن الصلاح ۔۔۔"

۳۔ نسخہ الفاتح نمبر: ۵۳۰۰/۷ (اوراق ۱۴۷ الف - ۱۵۰ الف)

۴۔ نسخہ حاجی محمود نمبر ۴۴۳۰ (۸ اوراق)

اس مختصر کتاب کی دو شرحیں ہیں۔

۱. فرائد الدرر و فوائد الفکر مولفہ ابن بادیس القسطینی متوفی ۸۰۷ھ۔

اس شرح کا ایک نسخہ الازہر، رواق المغاربہ (نمبر ۱۰۱۴) میں موجود ہے۔

۲۔ دوسری شرح ہے "مستعذب الاخبار باطیب الاخبار" مولفہ ابو مدین فاسی متوفی ۱۱۸۱ھ

اس کا ایک نسخہ دار الکتب المصریہ (نمبر ۷۰۸۲) میں محفوظ ہے۔

۴ ۔ رسالۃ المتعبدین فی سیرۃ سید المرسلین ۔ مولفہ عمر بن محمد بن خضر اردبیلی متوفی ۵۷۰ھ

اس کتاب کا ایک مخطوطہ ولی الدین میں نمبر ۷۰۶ کے تحت محفوظ ہے۔ اوراق کی تعداد ۱۹۰ ہے اور ہر صفحہ میں ۲۲ سطریں ہیں۔ کتاب کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

"اخبرنا الشیخ الاجل السید العالم العامل . . . ابی محمد بن طاہر بن سعید الصوفی رحمۃ اللہ علیہ وھو یسمع قال ۔ حدثنا ابوبکر محمد بن عبد اللہ بن احمد بن حبیب البغدادی قال : حدثنا . . ."

ق ۱۹۰ ب پر کتاب کا خاتمہ درج ذیل عبارت پر ہوتا ہے۔

"ثم ولی من ابنہ ولی عہدہ الراشد باللہ وھو ابو جعفر المنصور بن المسترشد باللہ وابویع لہ فی یوم الاثنین سابع وعشرین من ذی القعدۃ سنۃ ثلاثین وخمسمأۃ وبقی الی ان تستل بظاہر اصفہان فی شہر رمضان سنۃ اثنتین وثلاثین وخمسمأۃ ۔ قد تمت رسالۃ (رسیلۃ) المتعبدین فی سیرۃ حضرت (؟) سید المرسلین والحمد للہ علی توفیقہ الاتمام والصلوٰۃ والسلام علی محمد خیر الانام وعلی الہ واصحابہ العظام الکرام"

اس کتاب کا ایک اور نسخہ بھی ہے۔ جس کا ذکر فہرس المخطوطات العربیۃ المصورۃ میں کیا گیا ہے۔[۱]

۵ ۔ سیرۃ النبی ۔ مولفہ ابو السعادات سعد اللہ بن الحسین بن ابی تمام التکریتی۔

مصنف چھٹی صدی کے بزرگ ہیں۔ بروکلمان نے اس نسخہ کا ذکر جو مکتبہ بایزید (نمبر ۵۲۰۰) میں محفوظ ہے۔ رائٹر کے حوالے سے کیا ہے۔ "یہ کتاب ۲۳۱ ورق میں ہے۔ ہر صفحہ میں ۱۷ سطریں ہیں اور پوری کتاب خط نسخ میں لکھی گئی ہے۔ شروع میں نقص ہے۔ ورق ۱/ب پر یہ عبارت ہے۔

". . . . وما احتلم وانزل علیہ الکتاب المنیر المحکم ھدایۃ . . ."

پہلا ورق کرم خوردہ ہے۔ دوسرے ورق /ب پر پہلا باب "اثبات قاعدۃ النبوات" کے عنوان سے ہے۔ خاتمہ ۲۲۱/الف پر درج ذیل عبارت پر ہوتا ہے۔

"قرأ جمیع ھذا الکتاب الشیخ الامام شہاب الدین ابو الفتوح یحیی بن سعد اللہ بن الحسین بن ابی تمام علی مصنفہ والدہ الشیخ الامام ابی السعادات بن الحسین التکریتی حماہ اللہ فقد رھا نمعہ الشیوخ الصالحون القاضی ابو غالب نصر بن علی بن محمد بن ابی تمام وسعید بن فضل اللہ بن نعمان وحمزہ

بن بریک البنا وولداہ ابو بکر و عمر و الحسین بن عنبر بن سنکرویت فی المدرسۃ المعروفۃ بسینی (؟) الی تمام فی ذی الحجۃ سنۃ ثمان وستین وخمسمأۃ"۔

اسی صفحہ پر خاتمہ سے پہلے کتاب کی تکمیل کی تاریخ درج ہے یعنی نصف صفر ۵۰۳ھ

۶۔ کتاب اللوامع المنیرۃ فی جوامع السیرۃ۔ مولفہ عمر بن عیسیٰ بن درباس الہمدانی المازانی متوفی ۶۰۲ھ

بروکلمان کے مطابق اس کتاب کا ایک نسخہ الجزائر میں (نمبر ۱۶۵۹) موجود ہے[۱۲]۔ کتاب کا ایک اور نسخہ بورضا اوغلو جامع میں نمبر ۲۷۵۹ کے تحت محفوظ ہے۔ اس نسخہ کا سن تحریر ۶۸۲ھ ہے۔ اوراق کی تعداد ۸۲، اور ہر صفحہ میں ۲۱ سطر ہے۔ کاتب کا نام محمد بن محمد ہے۔

۷۔ کتاب نخبۃ المیرۃ فی اختصار السیرۃ۔ مولفہ تاج الدین ابو نصر (ایک نسخہ میں ابو محمد ہے) عبدالوہاب بن حسن بن الفرات متوفی بعد ۶۸۳ھ

مولف کے بارے میں مزید معلومات نہ مل سکیں۔ لیکن بظاہر مؤلف کا تعلق اسی خاندان ابن الفرات سے ہے۔ جس میں متعدد مورخین پیدا ہوئے[۱۳]۔

اس کتاب کا ایک نسخہ فیض اللہ آفندی میں (نمبر ۱۵۴۷) اور دوسرا ینی جامع میں (نمبر ۸۹۷) محفوظ ہے۔ نسخہ فیض اللہ افندی ۱۸۱ اوراق میں ہے۔ یہ نسخہ یا تو مؤلف کا آٹوگراف ہے یا مولف کے زمانہ میں لکھا گیا ہے۔ اس لئے کہ یہ مولف کو پڑھ کر سنایا گیا ہے۔ اس کا خط جلی نسخ ہے۔ پہلا ورق جس پر قراءات و سماعات اور دوسری اہم تحریریں تھیں پوری طرح محفوظ نہ رہ سکا مثلاً ورق ۱/ الف پر ایک عبارت حسب ذیل ہے۔

"فرغنہ قراءۃ علی مؤلفہ الفقیر الی اللہ محمد عبدالحمید بالاسکندریۃ حرمہا اللہ فی سنۃ ثلاث وثمانین وستمأۃ"۔ یہی تحریر کتاب کے آخر میں ورق ۱۸۱/ب پر مکرر درج ہے۔

ورق اول کی ایک اور اہم عبارت یہ ہے۔

"ملکہ محمد المظفری وھو نجا المؤلف وھذا اصلہ"۔

تیسری عبارت:

"ملکہ احمد بن ابراھیم بن رضی الدین (رالله) الکتانی العسقلانی الحنبلی"

سماعت کی ایک تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف کتاب مصر میں فقیہ اور تاجر تھے۔ قدیم ترین سماعت کا تعلق ۶۷۸ھ سے ہے۔

کتاب کا آغاز ورق ۱/ب درج ذیل عبارت سے ہوتا ہے۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم عونک اللھم"

یقول اصغر عبید اللہ وافقرھم الیہ عبدالوھاب بن حسن بن الفرات بعد حمد اللہ رب العالمین۔۔

ھذا مجموع اختصرت فیہ سیرۃ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم: اقتصرت فیہ علی ذکر الکائنات وما اتفق وقوعہ من الغزوات وما روی عنہ فیہا من المعجزات ...."

خاتمہ ورق ۱۸۱/ب پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مرثیہ میں حضرت حسان بن ثابت کے درج ذیل اشعار پر ہوتا ہے۔

"ولیس ھوای نازعا عن ثنائہ ۔۔۔ لعلی بہ فی جنۃ الخلد اخلد

مع المصطفی ارجو بذاک جوارہ ۔۔۔ وفی نیل ذاک الیوم اسعی واجہد

تم اختصار السیرۃ الفاضلۃ الزکیۃ الطاھرۃ النبویۃ"

بنی جامع کا نسخہ اس نسخہ سے مختلف نہیں ہے۔ البتہ اس کا خط اس سے بہتر ہے۔ تجلید بھی عمدہ ہے۔ البتہ کتاب کا نام نسخہ کے کسی حصہ میں نہ مل سکا۔ یہ نسخہ ۱۹۲ اوراق میں ہے۔ ہر صفحہ میں ۱۹ سطریں ہیں۔ خط نسخ مشکول میں لکھا گیا ہے۔

خاتمہ کی عبارت درج ذیل ہے۔

"... فرغ منہ نسخاً اشد عبید اللہ احتیاج ... محمد بن ابی بکر بن یحیی بن احمد بن شریف بن ھلال بن داذن الحمیدی ... ووافق الفراغ من نسخہ نہار السبت المبارک سنۃ خمس وستین وست بحماۃ ... (وسماہ) للاثیرۃ النبویۃ ... برسم خزانۃ المجلس العالی السامی الناصری محمد الکاتب جملۃ اللہ تعالی بالعلم ...."

۸ - الرسالۃ الکاملیۃ فی السیرۃ النبویۃ - مولفہ علاء الدین علی بن ابی الحزم القرشی المعروف بابن النفیس متوفی ۶۸۷ھ

اس کتاب کا ایک نسخہ انقرہ کے مکتبہ کلیۃ اللغۃ والتاریخ والجغرافیا۔ قسم اسمعیل صائب اول نمبر ۲۰۵۲ میں محفوظ ہے۔ اوراق کی تعداد ۷ ہے۔ خط نسخ میں ہے۔ سن کتابت تقریباً دسویں صدی ہجری ہے۔[۱۴]

۹ - السیرۃ النبویۃ[۱۵] - مولفہ ابو الحسن احمد بن عبداللہ البکری البصری الواعظ متوفی بعد ۶۹۴ھ[۱۶]

یہ کتاب بعض اور ناموں سے بھی معروف ہے۔ مثلاً الانوار ومفتاح السرور والافکار فی مولد النبی المختار[۱۷] بروکلمان نے کتاب مذکور کے مصنف کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے۔ اس کے سوا اب تک کوئی مفصل بحث اس سلسلہ میں نہیں کی گئی ہے۔

یہ مصنف دروغ گوئی اور وضع میں مشہور ہے۔ اس کے معاصر علماء نے اس پر تنقید کی ہے۔ وہ ایسی باتیں لکھتا ہے جن سے عوام کو دلچسپی ہو۔ اور ان کے جذبات کو اپیل کرے۔ امام محمد بن احمد الذہبی (متوفی ۷۴۸ھ) نے میزان الاعتدال میں لکھا ہے جیسا کہ ابن حجر عسقلانی (متوفی ۸۵۲ھ) نے لسان المیزان میں نقل کیا ہے[۱۸]:

"احمد بن عبداللہ بن محمد ابو الحسن البکری، جھوٹا، دجال، بے بنیاد واقعات کو گھڑنے والا، بے حد جاہل اور بے شرم ایک حرف کی بھی سند نہیں بیان کی۔ کتب فروشوں کے بازار میں اس کی کتابوں میں کتاب ضیاء الانوار اور ..... ملتی ہیں۔ اس کی مشہور کتاب "الذروۃ فی السیرۃ النبویۃ" ہے۔ اس کتاب میں کسی غزوہ کا ذکر بھی اس کی اصل شکل میں نہیں کیا ہے۔ بلکہ جو کچھ بھی ذکر کرتا ہے یا تو یکسر باطل ہے یا اس میں اضافہ کر دیا ہے۔

احمد بن علی قلقشندی (متوفی ۸۲۱ھ) نے صبح الاعشیٰ[۱۹] میں ایک باب کا عنوان رکھا ہے "من کان فرداً فی زمانہ

بحیثیت بےنصیب سید المثل فی امثالہ" یعنی جو لوگ اپنے زمانہ میں ایسے یکتا ہوئے کہ اپنے ہمسروں میں ضرب المثل ہیں۔ اس باب میں لکھا ہے۔

"... سیبویہ نحو میں، اور ابوالحسن البکری جھوٹ میں ..."

سیوطی (متوفی ۹۱۱ھ) کی الحاوی فی الفتاوی میں لکھا ہے[21]۔

سوال :۔ بکری کی کتاب سیرت کیا کل صحیح ہے یا بیشتر صحیح ہے، اور کیا اس کا پڑھنا جائز ہے؟

جواب :۔ اس کتاب کا بیشتر حصہ جھوٹ اور باطل ہے۔ اور اس کا پڑھنا جائز نہیں۔

اس طرح کا فتویٰ ابن حجر ہیثمی نے بھی دیا۔ ابراہیم بن محمد بن سبط العجمی (متوفی ۸۴۱ھ) نے بھی "نورالنبراس علی سیرۃ ابن سید الناس" (ورق ۲/الف نسخہ شہید علی پاشا نمبر ۱۹۶۳) میں بکری کی مذکورہ کتاب کے پڑھنے سے منع کیا ہے۔ بروکلمان نے اس کتاب کے متعدد نسخوں کا ذکر کیا ہے۔ رمضان ششن نے دو نسخوں کا ذکر کیا ہے جو ایا صوفیہ (نمبر ۳۲۲۸، ۳۲۴۹) میں محفوظ ہیں[22]۔ موخر الذکر نسخہ مصر کے امرائے مابیک میں کسی کے لئے لکھا گیا تھا۔ اس کتاب میں کوئی ترتیب نہیں ہے۔ تقدیم و تاخیر اور غلط ملط کثرت سے ہے۔ دیہاتی الفاظ بھی بہت ہیں۔ مصر میں رائج مجالس میلاد سے بہت کچھ ملتی جلتی ہے۔ کتاب کے فقرے عام طور پر "ایہا السادۃ الحاضرین" "ایہا الاخوان" جیسے الفاظ سے شروع ہوتے ہیں۔

صرف مولد سے متعلق کتاب کے حصہ کا ایک نسخہ لالہ لی (نمبر ۲۰۴۲) میں محفوظ ہے۔ اس کتاب کے بارے میں اتنی تفصیل ہم نے اس لئے بیان کی ہے کہ سیرت نبوی کے موضوع پر یہ پہلی کتاب ہے جس کا ترجمہ ترکی زبان میں ہوا۔ بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ سیرت کی یہ پہلی کتاب ہے جو ترکوں تک پہنچی۔ مترجم مصطفیٰ بن یوسف بن عمر ارضرومی ہیں جو "ضریر" کے نام سے مشہور ہیں۔ اور جن کا ذکر فتوح الشام کے ترجموں کے تذکرہ میں گذر چکا ہے۔ یہ ترجمہ مصر میں ۷۹۰ھ میں مکمل ہوا۔ تقریب یہ ہوئی کہ مملوک سلطان ظاہر سیف الدین برقوق (۷۸۴ھ — ۸۰۱ھ) نے مترجم کو ترکی زبان میں سیرت کے موضوع پر کسی کتاب کے ترجمہ کا حکم دیا۔ موصوف شیخ اکمل الدین بابرتی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مشورہ چاہا۔ شیخ نے مشورہ دیا کہ سیرت ابن ہشام کے بجائے ابوالحسن بکری کی سیرت کا ترجمہ کیا جائے۔ اس لئے کہ سیرت ابن ہشام عوام کیلئے مشکل ہے۔ اور سیرت بکری ان کے لئے زیادہ دلچسپ ہے۔

یہ ترجمہ بلاد اناضول میں اور ممالیک مصر کے یہاں خوب رائج ہوا۔ اور ایک زمانہ تک اس کا اثر قائم رہا۔ ترکی زبان میں مولد معراج اور معجزات پر جتنی نظمیں لکھی گئیں۔ سب کی بنیاد اسی ترجمہ پر ہے۔ ضریر نے جب اس کتاب کا ترجمہ کیا تھا تو اس میں سیرت ابن ہشام کے بعض حصے بھی شامل کر دیئے تھے۔ بہر حال اس کتاب کے بارے میں علمائے اتراک کی معلومات اب تک غلط در غلط چلی آ رہی ہیں۔

۱۰ مختصر السیرۃ النبویۃ۔ مولفہ احمد بن عبداللہ بن محمد محب الدین طبری متوفی ۶۹۴ھ[23]

اس کتاب کا ایک مخطوطہ جامع استنبول (عربی نمبر ۱۰۸۹) میں ۲۷ اوراق میں محفوظ ہے۔

۱۱ الذروۃ العلیا فی سیرۃ المصطفیٰ۔ مولفہ ظہیر الدین علی بن محمد کازرونی متوفی ۶۹۷ھ[24]

یہ کتاب اگرچہ ضائع ہو گئی۔ لیکن اس کا فارسی ترجمہ جو بہاؤالدین کازرونی نے ۷۰۰ھ میں کیا تھا۔ ہم تک پہنچا ہے۔ اس کے نسخے قونیہ کے میوزیم (نمبر ۱۱۶۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸) [25] اور لالہ اسمٰعیل (نمبر ۳۳۰) میں محفوظ ہیں۔

۱۲۔ **کتاب الشجرۃ فی ذکر نسب (فی سیرۃ) النبی صلی اللہ علیہ وسلم و اصحابہ العشرۃ رضی اللہ عنہم**۔ مولفہ عزالدین عبدالعزیز بن احمد بن سعید الدمیری الدیرینی متوفی ۶۹۷ھ

اس کتاب کا ایک مخطوطہ ایاصوفیا (نمبر ۴۲۴۸/۲) میں محفوظ ہے۔ اوراق ۳۵/الف تا ۴۶/الف سطریں ۱۵، خط نسخ یہ سیرت منظوم ہے۔ کتاب کی ابتداء ورق ۳۵/ب پر اس طرح ہوتی ہے۔

الحمد للہ المنیر الہادی — الملک الحق البدیع البادی
الاول القدیم ذوالسناء — الآخر الموصوف بالبقاء

خاتمہ کے اشعار ورق ۴۶/الف پر حسب ذیل ہیں

سمیتہا فی نظمہا بالشجرۃ — فی سیرۃ النبی ثم العشرۃ
فی عام خمس قبلہا سبعونا — من بعد ستمائۃ سنینا
ناظمہا ابن احمد المعتذر — عبد العزیز سائل مفتقر
الی کریم مجزل العطایا — یغفر الذنوب والخطایا
ویرتجی منہ تمام الفضل — والفوز والامان یوم الفصل

آخری ورق کے حاشیہ پر یہ تحریر ہے۔

"بلغ مقابلۃ وتصحیحا بقدر الوسع فی المدینۃ المشرفۃ علی مشرفہا من الصلوات افضلہا ..... من تاریخ سنۃ احدی (غالباً "وخمسین" چھوٹ گیا ہے) وثمانمائۃ ..... المجزت ..... علی ید ... ابراہیم بن جلال الدین احمد الخجندی المعتنی المدنی ... سنۃ ۸۵۱" (کاتب مذکور کے بارے میں ملاحظہ ہو کحالہ ۱/۹۱)

ورق ۴۸/ب اور ۴۹/الف پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا شجرہ نسب ہے۔ اس مجموعہ میں اسی مصنف کی دوسری منظوم کتاب "کتاب الوسائل الالہیۃ والرسائل المحمدیۃ" بھی ہے۔ یہ کتاب مجموعہ کے شروع میں ورق ۱/ب تا ۳۴/الف ہے۔

کتاب الشجرۃ کے بعض دوسرے مخطوطات طوبقپوسرای: احمد الثالث نمبر ۲۸۰۱، ۷۵۰ھ کے لگ بھگ کا لکھا ہوا) حاجی محمود نمبر ۴۳۰۲/۲ اور دار الکتب المصریہ ۲۱۱۶ ب میں محفوظ ہیں۔

۱۳۔ **مختصر سیرۃ ابن ہشام**۔ مولفہ احمد بن ابراہیم بن عبدالرحمن واسطی متوفی ۷۱۱ھ [26]

اس کتاب کا ایک مخطوطہ انقرہ میں انجمن تاریخ ترکی کے کتب خانہ (نمبر ۶۸) میں محفوظ ہے۔ اس مخطوطہ پر رطوبت کا اثر ہے اور کچھ کرم خوردہ بھی ہے۔ ۲۱۶ اوراق میں ہے۔ ۲۵ سطریں ہیں مخطوطہ کی کتابت دمشق میں شب جمعہ ۱۷ جمادی الاول ۷۲۰ھ کو مکمل ہوئی۔ اس نسخہ پر مقابلہ اور سماعت کی بعض اہم تحریریں ہیں۔

۱۴۔ الموردُ العذب الہنی فی شرح السیرہ للحافظ عبدالغنی ۔ مولفہ عبدالکریم بن عبدالنور بن منیر حلبی متوفی ۷۳۵ھ[۲۸]
اس کتاب کا ایک حصہ ایا صوفیا (نمبر ۳۳۴۸/۳) میں محفوظ ہے۔ اوراق ۶۴ ب تا ۷۳ ب۔ اس حصہ کی ابتدا یوں ہوتی ہے
"روی ابن ماجہ عن محمد بن اسمعیل البختری عن زید بن ھارون ..."
اس کتاب کا ایک اور نسخہ طوبقپو سرای؛ ؟ خزانہ سی (نمبر ۱۱۵۴) میں محفوظ ہے۔

۱۵۔ الجوہر الثمین من نخب سیر الامین ۔ مولفہ شہاب الدین احمد بن بیبک الحسنی متوفی ۷۵۳ھ
مولف امرائے دیار مصریہ میں سے ہے۔ کتاب کا ایک مخطوطہ فاتح (نمبر ۴۳۱۳) میں محفوظ ہے۔ ایک اور مخطوطہ کا ذکر فہرس المخطوطات المصورہ، جزء ثانی، قسم اول صفحہ ۱۱۲ میں نمبر ۴۳۱۵ کے تحت کیا گیا ہے۔

۱۶۔ المنتقیٰ فی مولد المصطفیٰ ۔ مولفہ سعدالدین محمد بن مسعود گازرونی متوفی ۷۵۸ھ
مصنف نے یہ کتاب عربی میں لکھی تھی۔ فارسی میں اس کا ترجمہ ان کے فرزند عفیف الدین گازرونی (متوفی تقریباً ۷۶۰ھ) نے کیا۔ پھر اسی فارسی ترجمہ سے دو بار ترکی میں ترجمہ ہوا۔ حاجی خلیفہ نے اس کے برعکس یہ لکھا ہے کہ اصل کتاب فارسی میں ہے۔ اور فارسی سے اس کا ترجمہ عربی میں ہوا جو صحیح نہیں ہے[۲۹]۔ بروکلمان اور شپش کے ذکر کردہ نسخوں کے علاوہ اس کتاب کا ایک نسخہ یا صوفیا (نمبر ۳۲۵۱) میں محفوظ ہے جو ۱۸۵ اوراق میں ہے۔

۱۷۔ مختصر سیرۃ النبی / یا المختصر الصغیر فی سیرۃ البشیر النذیر ۔ مولفہ ابو عمر عزالدین عبدالعزیز بن محمد بن ابراہیم بن جماعہ کنانی متوفی ۷۶۷ھ[۳۰]

اس کتاب کا ایک مخطوطہ مکتبہ بایزید (نمبر ۵۲۹۵) میں ۲۹ اوراق میں موجود ہے۔ ایک اور نسخہ بھی اسی مکتبہ (نمبر ۵۲۹۶) میں محفوظ ہے۔ ورق ۱/الف پر کتاب اور اس کے مصنف کا نام اس طرح لکھا ہے۔

"المختصر الکبیر من سیرۃ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تالیف الشیخ الامام ... ابی محمد عزالدین عبدالعزیز بن الشیخ بدرالدین بن محمد بن ابراھیم بن سعد اللہ بن جماعۃ الکنانی الشافعی رحمہ اللہ تعالیٰ"

ورق ۱/ب پر مصنف نے لکھا ہے کہ اس کتاب میں صحیح احادیث اور مغازی کے سلسلہ میں، میں نے حافظ .. شرف الدین ابو محمد عبدالمؤمن دمیاطی پر اعتماد کیا ہے اور اختلافی مسائل میں انہیں کی رائے ذکر کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ اس لئے کہ اس موضوع سے ان کو خاص اعتناء اور طویل ممارست تھی۔

یہ نسخہ ۴۴ اوراق میں ہے۔ ہر ورق میں ۱۹ سطریں ہیں۔ کتاب کا خاتمہ ورق ۴۴/ب پر اس طرح ہے۔

"تم المختصر الکبیر ... فی السابع والعشرین من شہر رجب ... سنۃ عشر وثمانمائۃ برسم مولانا الامام .. محمد بن ابی بکر الخیاط"

اسی ورق پر مزید لکھا ہے۔

"الحمد للہ سمع علی بعض ھذا المختصر کاتبہ الشیخ الامام . . . امین الدین ابو عبد اللہ محمد بن ابراھیم بن عبد الرحمن بن الشماع الدمشقی نفع اللہ بہ و صح ذلک یوم الخمیس سادس عشر شعبان سام سبعۃ و ثلاثین . . وقد ناولتہ جمیع ھذا المختصر واذنت لہ فی روایۃ واجزت لہ روایۃ مایجوز لی و عنی روایۃ بشرطہ وکتب عبد العزیز بن محمد بن ابراھیم بن سعد اللہ بن جماعۃ۔

اس کتاب کے بعض اور نسخے طوبقپوسرای میں؛ بغداد کوشکی نمبر ۲۶۰ اور احمد الثالث نمبر ۲۷۹۶ میں محفوظ ہیں۔
یہاں خاص طور پر جس غلطی پر متنبہ کرنا مقصود ہے۔ وہ یہ کہ کبھی کبھی مذکورہ مختصر اور کتاب "نور الروض" کو جو مؤلف مختصر کے پوتے محمد بن ابوبکر بن عبد العزیز بن محمد بن ابراہیم بن سعد اللہ بن جماعۃ الکنانی متوفی ۸۱۹ھ کی تصنیف ہے باہم گڈمڈ کر دیتے ہیں[۳۱]
بروکلمان نے "نور الروض" کو ایک جگہ ابو عمر عز الدین عبد العزیز بن محمد بن جماعۃ متوفی ۷۶۷ھ کی جانب اور دوسری جگہ بدر الدین علی بن محمد بن برہان الدین بن سعد اللہ بن جماعۃ الکنانی متوفی ۷۳۲ھ کی جانب منسوب کیا ہے جو غلط ہے[۳۲]
اسی طرح ڈاکٹر سزگین نے "نور الروض" کو سیرت ابن ہشام کی تلخیص بتایا ہے۔ جبکہ وہ سہیلی متوفی ۵۸۱ھ کی الروض الانف کا اختصار ہے[۳۳]

"نور الروض" کے مخطوطات کے لئے ملاحظہ ہو: فہرس المخطوطات المصورۃ۔ الجزء الثانی۔ القسم الثالث۔ ص ۲۲۸
موخر الذکر مصنف کی ایک کتاب شرح سیرۃ ابن سید الناس بھی ہے۔

۱۸ ۔ **الفصول فی اختصار سیرۃ الرسول** ۔ مولفہ ابو الفداء اسمٰعیل بن عمر بن کثیر متوفی ۷۷۴ھ[۳۵]

یہاں ہم اس کتاب کے ایک مخطوطہ کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جو جامعہ استنبول کے کتب خانہ میں عربی نمبر ۳۰۷۹ محفوظ ہے۔ یہ نسخہ ۷۷ اوراق پر ہے۔ اس کی ابتداء ورق ۱/ب پر "ذکر مولد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" سے ہوتی ہے۔ خاتمہ ورق ۷۷/ب پر درج ذیل عبارت پر ہوتا ہے۔

"فھزموھم وقتلوا مسیلمۃ وعشرۃ آلاف رجل من اصحابہ وغنم المسلمون اموالھم ورجع من بقی الی الاسلام"[۳۶]

۱۹ ۔ **منحۃ اللبیب فی سیرۃ الحبیب** ۔ مولفہ شمس الدین محمد بن احمد بن محمد بن احمد باعونی متوفی ۸۷۰ھ[۳۷]

اس کتاب کا ایک مخطوطہ کلیۃ اللغۃ والتاریخ والجغرافیا کے کتب خانہ قسم اسمٰعیل صائب (اول نمبر ۴۸۴۴) میں ۳۹ اوراق میں محفوظ ہے۔

بروکلمان نے لکھا ہے کہ اس منظوم کتاب میں مغلطائی کی سیرت "الاشارۃ الی سیرۃ المصطفیٰ" کو نظم کیا گیا ہے۔ لیکن خود شاعر ورق ۲/الف پر کہتا ہے۔

نقلت فیھا من کتاب السیرۃ لمغلطائی لمعاً یسیرہ
وربما من غیرھا نقلت ما رأیتہ مما ارادہ العلما

ان اشعار سے واضح ہے کہ شاعر نے اگر ایک طرف مغلطائی کی سیرت سے کچھ معلومات لی ہیں تو دوسری کتابوں

کو بھی سامنے رکھا ہے اور ان سے استفادہ کیا ہے)

۲۰ ۔ المقتفی من سیرۃ المصطفیٰ :۔ مولفہ بدرالدین بن الحسن بن عمر بن حبیب حلبی متوفی ۷۷۹ھ[۲۸]
اس کتاب کا ایک نسخہ ایا صوفیا (نمبر ۳۳۸۸) اور دارالکتب المصریہ (نمبر ۲۰۹) میں محفوظ ہے۔ ایا صوفیا کا نسخہ ۹۴ اوراق میں ہے۔ ہر ورق میں ۱۲ سطریں ہیں۔

۲۱ فتح القریب فی سیرۃ الحبیب[۱] ۔ مولفہ فتح الدین محمد بن ابراہیم بن محمد الشہید النابلسی متوفی ۷۹۳ھ[۲۹]
اس کتاب کا ایک ناقص نسخہ زمینی الکتاب (نمبر ۶۸۲) میں محفوظ ہے۔ ابتدا ورق ۱/ب پر درج ذیل شعروں سے ہوتی ہے

نحمد اللہ الذی بحمدہ ۔ أنعمنا المستزید من عندہ

فکل حمد یستحق حمدا ۔ لا یبلغ الحامد فیہ حدا

خاتمہ ورق ۲۱۷/الف پر اس شعر پر ہوتا ہے۔

أو خرج بن العاص بعد اشہر ۔ من احد الی النجاشی داسیر

مذکورہ ورق کے حاشیہ پر سماعت کی درج ذیل تحریر ہے۔

"بلغ السماع فی السادس علی مولفہ فتح اللہ فی مدتنہ عمراً۔"

یہ نسخہ خط نسخ مشکول میں ۲۱۷ اوراق میں ہے۔ ہر ورق میں ۱۷ سطریں ہیں۔

اس کتاب کی ایک شرح بھی پائی جاتی ہے ۔ جو غالباً شہاب الدین احمد بن محمد بن عماد بن احمد بن حجی متوفی ۸۱۶ھ نے لکھی ہے۔ اور جس کی جانب آربری نے سیرت کی منظوم کتابوں پر اپنے مقالہ میں اشارہ کیا ہے[۳۰] اس شرح کا پہلا حصہ ۱۶۷ اوراق میں شہید علی پاشا (نمبر ۱۸۹۳) میں محفوظ ہے۔ مصنف پہلے شعر درج کرتا ہے۔ پھر اس کی شرح کرتا ہے۔ یہ حصہ ورق ۱۶۷/الف پر عبارت ذیل پر ختم ہوتا ہے۔

"ولا تمکنہ ان یکذب علیہ کذبۃ تخالف ما اشتہر من حمدھم السابق مدحہم ایاہ وسنذکر من ھذا فی فصول من الکتاب ما یقر بہ عیون المومنین وللہ الحمد والمنہ"

یہ نسخہ خط نسخ جلی غیر منقوط میں ہے بعض اوراق کے حاشیہ میں تعلیقات بھی ہیں۔ مثلاً ورق ۱۶۷/ب پر ہے۔

"طالعتہ ونسختہ داعیا لمؤلفہ ومالکہ، کتب علی بن الصیرفی الشافعی"

ورق ۱/الف پر ملکیت کی بھی ایک تحریر ہے جس کا تعلق ۹۹۰ھ سے ہے (مذکورہ بالا عبارت میں جن علی بن الصیرفی کا ذکر ہے۔ کیا وہ علی بن الصیرفی الشافعی متوفی ۸۴۴ھ ہیں؟ دیکھئے کحالہ ۷ : ۱۴۷)

۲۲ ۔ الدرر السنیہ فی السیرۃ الزکیہ ۔ مولفہ زین الدین عبدالرحیم بن الحسین بن عبدالرحمٰن عراقی متوفی ۸۰۶ھ[۳۱]

---

[۱] ۔ صحیح نام الفتح القریب ہے۔ اس کتاب کے بارے میں ملاحظہ ہو۔ ہمارا مضمون ابن ہشام۔ نقوش ۱/ ۴۸۷ (مترجم)

یہ منظوم سیرت "الفیۃ العراقی فی السیرۃ" کے نام سے بھی مشہور ہے۔ اس کے مخطوطات درج ذیل کتب خانوں میں موجود ہیں۔

شہید علی باشا نمبر ۲۷۵۰، رشید افندی نمبر ۱۰۰۱، حاجی محمود نمبر ۴۳۰۸، رئیس الکتاب نمبر ۱۱۴، حسن حسنی باشا نمبر ۲/۲۳، دکزلی نمبر ۲۲۰، چورلولو علی باشا نمبر ۲/۳۴۳، جامعہ استنبول عربی نمبر ۳۱۱۰، ۳۱۱۷، ۷۸۶۔

۲۳۔ شرح نظم السیرۃ النبویۃ/ یا شرح الدرر فی ہجرۃ سید البشر/ یا الدرۃ السنویۃ فی الہجرۃ النبویۃ ـ مولفہ شہاب الدین احمد بن عماد الدین اقفہسی متوفی ۸۰۸ھ [۴۲]

یہ کتاب نظم میں ہے۔ پھر مصنف ہی نے خود اس کی شرح لکھی ہے۔ اس کتاب کا ایک نسخہ شرح کے ساتھ قرۃ چلبی زادہ میں ہے۔ اصل کا نمبر ۲۴۴/۳ اوراق از صفحہ ۵۲ تا صفحہ ۵۸۔ شرح کا نمبر ۲۴۴/۴ ہے اوراق از صفحہ ۶۰ تا صفحہ ۱۲۷۔ یہ نسخہ ۸۵۹ھ کا لکھا ہوا ہے۔ کتاب مذکور کا ایک اور نسخہ جامعہ استنبول کے کتب خانہ میں ۴۰ اوراق میں نمبر ۳۱۱۲ کے تحت محفوظ ہے۔

۲۴۔ المنظومۃ الحلبیۃ فی السیرۃ ـ مولفہ ابوالولید محمد بن محمد بن محمود بن الشحنۃ زین الدین حلبی متوفی ۸۱۵ھ [۴۳]

اس کتاب کا ایک مخطوطہ شہید علی باشا (نمبر ۲۷۱۲/۸) میں محفوظ ہے۔ اوراق از ۲۲۲ تا ۲۴۳۔ خط نسخ ہے۔ ہر صفحہ میں ۱۹ سطریں ہیں۔

۲۵۔ نور النبراس علی سیرۃ ابن سید الناس ـ مولفہ برہان الدین ابراہیم بن محمد بن خلیل حلبی سبط ابن العجمی متوفی ۸۴۱ھ [۴۴]

اس کتاب کے نسخے درج ذیل کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔

۱۔ جار اللہ افندی نمبر ۱۶۳۶، اوراق: ۲۷۱۔ صرف جلد اول ہے۔

۲۔ مصلی مدرستہ سی نمبر ۲۰۲۰/۱

۳۔ راغب باشا نمبر ۱۰۵۵، اوراق: ۲۶۶ سطریں: ۳۵ ـ ۸۲۸ھ میں حلب میں لکھا گیا۔

۴۔ فیض اللہ افندی، نمبر ۱۵۵۰۔

۲۶۔ جوامع الاخبار النبویہ ولوامع الانوار المصطفویہ ـ مولفہ محمد بن ابراہیم الحجی متوفی تقریباً ۸۴۲ھ

اس کتاب کا ایک نسخہ ایا صوفیا (نمبر ۹۴۱) میں ۲۵۹ اوراق میں محفوظ ہے۔ سطریں: ۱۳ رسم الخط: نسخ مشکول۔

یہ کتاب معروف معنوں میں سیرت کی کتاب نہیں ہے۔ بلکہ جیسا کہ مصنف کتاب نے لکھا ہے صحیحین اور سنن ترمذی کی حدیثوں کا انتخاب ہے[1]۔ مصنف کے بارے میں معلومات حاصل نہ ہو سکیں۔ یہاں مصنف کے شیوخ کا نام درج کیا جاتا ہے۔ جن کا ذکر دیباچہ کتاب کے آخر میں کیا ہے۔ صحیح بخاری کی سماعت مولف نے شیخ جمال الدین ابو سلیمان داؤد بن العطار دمشقی سے کی اور صحیح

---

[1] اس کتاب کا ذکر کتب سیرت کے ضمن میں بے محل ہے۔ جیسا کہ خود فاضل مقالہ نگار نے لکھا ہے۔ یہ کتاب منتخب احادیث کا مجموعہ ہے۔ (مترجم)

مسلم و سنن ترمذی کی اجازت شیخ شمس الدین ابو عبداللہ محمد بن ابراہیم خزرجی دمشقی بیانی صوفی سے حاصل کی۔

کتاب کا آغاز ورق ۱/ب پر اس طرح ہوتا ہے۔

"الحمد للہ المنفرد بانشاء ظواہر الشریعۃ وحقائقہا ۔ ۔ ۔ فیقول الفقیہ الی اللہ المنجی محمد بن ابراہیم الکیجی ۔ ۔ ۔ انی لما طالعت الکتب المتعددۃ المصطفویۃ من درر الاحادیث النبویۃ باسانید ھذا الصحیحۃ المرویۃ ووقفت علی مناہج اسرارھا السنیۃ وتاملت رموز کنوز اشاراتہا الجلیتہ وسمعت کتاب البخاری ومسلم والترمذی من الشیوخ الثقات والمحدثین الرواۃ باسنادی المذکور فی آخر الدیباجتہ، نظری جمع احادیث من ھولاء الثلاثۃ المذکورۃ"

ورق ۲/الف پر کتاب کے ابواب کے بارے میں مصنف نے لکھا ہے

"وافتتحت بالواب النیۃ والایمان والاعتصام بالکتاب والسنۃ والعلم ونضیلۃ وعقبتہا باربعۃ کتب علی نہج الکتب الفقہیۃ: الاول فی العبادات والثانی فی المعاملات والثالث فی المناکحات والرابع فی الجراحات والغزوات ۔ واختتمت بنعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم ومناقب الصحابۃ رضوان اللہ علیہم اجمعین ۔ ۔ ۔ ۔"

کتاب کا خاتمہ ورق ۲۵۹/ب پر عبارت ذیل پر ہوتا ہے۔

"خدمہ اضعف خلق اللہ ۔ ۔ ۔ احمد بن حاجی سالک القومی عفا اللہ عنہما فی سنۃ ثلاث واربعین وثمانماۃ للہجرۃ النبویۃ ۔ ۔ ۔ ببینۃ الاسلام القومن حرسہا اللہ ببقاء والیہا"

کتاب کے بین السطور اس کا فارسی ترجمہ بھی لکھا ہوا ہے۔

۲۰ ۔ الاخبار المرویہ فی سیرۃ خیر البریۃ ۔ مصنف نامعلوم ۔

اس کتاب کا ایک خوبصورت طلائی نسخہ محمود پاشا (سلیمانیہ) میں نمبر ۶۹ کے تحت محفوظ ہے۔ ورق ۱/الف پر لکھا ہے۔

"الاخبار المرویۃ فی سیرۃ خیر البریۃ برسم الخزانۃ الشریفۃ السلکیۃ الظاھریۃ خلد اللہ ملک مالکہا ونصرہ"

کتاب کی ابتداء ورق ۱/ب پر عبارت ذیل سے ہوتی ہے۔

"بسم اللہ الرحمن الرحیم وبہ ثقتی

الحمد للہ الذی خلق کل شیئ وقدرہ وعلم مورد کل مخلوق ومصدرہ، واثبت فی ام الکتاب ما عادہ وسطرہ"

ورق ۳/ب پر لکھا ہے کہ مؤلف نے یہ کتاب سلطان ظاہر ابو سعید جقمق کے لئے تصنیف کی ہے۔ سلطان مذکورہ کی حکومت ۸۴۲ھ تا ۸۵۷ھ تھی۔

کتاب کا خاتمہ ورق ۷۵ ر الف پر عبارت ذیل پر ہوتا ہے۔

"... توضع التراب علی رؤوسهم ومضی دلم یبرده - انتهی ما اوردناه من سیرة النبی صلی الله علیه وسلم تمت السیرة النبویه ... وحسبنا الله ونعم الوکیل"

کتاب خط نسخ میں ہے۔ ہر صفحہ پر ۱۷ سطریں ہیں۔ مصنف نے ابن اسحٰق، ابن ہشام، ابن سید الناس کی کتب سیرت، ابن سعد کی طبقات اور قطب الدین عبدالکریم الحلبی متوفی ۷۳۵ھ کی کتاب "المورد العذب الهنی" سے استفادہ کیا ہے۔

اس کتاب کا ایک اور نسخہ طوپقپوسرای کے میوزیم میں نمبر ۱۵۰۲ کے تحت محفوظ ہے جو ابتداء میں مقدم الذکر نسخہ سے مختلف ہے۔

(دیکھیے فہرس مخطوطات طوپقپوسرای المخطوطات العربیة ۲ : ۴۲۸)

۲۸۔ طیب الانفاس بمختصر سیرة ابن سید الناس ۔ مولفہ محمد بن عبداللطیف بن احمد اقصری محلی متوفی ۸۷۲ھ[۴۵]

اس کتاب کا واحد نسخہ کتب خانہ ولی الدین (نمبر ۸۸۹) میں محفوظ ہے۔ اوراق ۷۲، سطریں ۱۷، میرے سامنے جو مآخذ ہیں۔ ان میں کتاب مذکور کے کسی اور نسخہ کا سراغ نہیں ملا۔

کتاب کی ابتداء ورق ۱ر ب پر عبارت ذیل سے ہوتی ہے۔

"الحمد لله الذی نور قلوبنا بنور السنة النبویة و محا عنا ظلمة الجهل لضیاء الشریعة المحمدیة وجعل اعیننا بالایمان قریرة ..."

ورق ۲ر الف پر کتاب کے نہج کے بارے میں لکھا ہے۔

"... فانتقطت منه (یعنی من سیرة ابن سید الناس) فی هذا المختصر ما التذ به الخاطر ...... محذوف الاسانید طلبا للاختصار وعدولا عن المیل من الاکثار، معولا علی سند مولف اصله، معتمدا علی حفظه و نقله، وما ذکرته فیه من غیره جار برکته و خیره فقد عزوته لقائله و نبهت علی ناقله، وسمیته طیب الانفاس بمختصر سیرة ابن سید الناس"

کتاب کا خاتمہ ورق ۷۲ر ب پر عبارت ذیل پر ہوتا ہے۔

"تم بحمد الله وعونه هذا المنتقط المختصر فی سیرة سید البشر صلی الله علیه وسلم ما بزغت الشمس و انل القمر۔ وکان الفراغ من جمعه ورقمه فی لیلة تسفر عن صبیحة رابع عشر من شوال المبارک من سنة (اس جگہ جو لفظ لکھا ہے وہ پڑھا نہ جا سکا) علی ید مجمعه و رقمه اقل عبید ربه و احوجهم ... محمد عبداللطیف المحلی الحنفی عاملہ الله بلطفه الحنفی۔

الحمد لله: فتوبل و عورض مع ... فی بعض مواضع مما وافق نسخة الاصل الذی هذا فراغه ..." خاتمہ کے بعد بعض اور تعلیقات بھی ہیں۔ مگر جلد بندی میں یہ ضائع ہو گئیں۔ اس لئے پڑھی نہیں جا سکیں۔

۲۹۔ مختصر سیرة الرسول وثلاثة من الخلفاء الراشدین ۔ مولفہ برہان الدین ابراہیم بن عمر بن حسن الرباط بقاعی

متوفی ۸۸۵ھ

اس کتاب کا ایک نسخہ ۱۱۵۹ھ کا لکھا ہوا ریس الکتاب میں نمبر ۴۰۰ کے تحت محفوظ ہے۔ اوراق ۱۹۸، سطریں : ۱۷۔

۳۰ ۔ بہجۃ المحافل و بغیۃ الاماثل فی تلخیص السیر والمعجزات والشمائلؐ ۔ مولفہ ابو زکریا عماد الدین یحییٰ بن ابو بکر عامری تہامی متوفی ۸۹۳ھ

کتاب مذکور کا ایک نسخہ انقرہ کے کلیۃ اللغۃ والتاریخ والجغرافیا ۔ اسمٰعیل صائب : ثانی رمنبر ۸۰ ۳۷) میں محفوظ ہے ۔ یہ نسخہ ۳۳۱ اوراق میں ہے اور ۹۶۳ھ کا لکھا ہوا ہے۔

۳۱ ۔ غایۃ السؤل فی سیرۃ الرسول ۔ مولفہ عبدالباسط بن خلیل بن شاہین الملاطی بن الوزیر متوفی ۹۲۰ھ

اس کتاب کا ایک نفیس طلائی نسخہ جامعہ استنبول (عربی نمبر ۲۸۸۰) میں ۱۶ اوراق میں محفوظ ہے۔ بعض اور نسخے طوبقپوسرائی کے میوزیم میں احمد ثالث نمبر ۲۸۰۳ /۱، ۵۲۷ /۱ میں اور ایا صوفیا (۲/۲۶۴) میں (شمائل ترمذی کے ساتھ) موجود ہیں۔

۳۲ ۔ الالمام بالروض وسیرۃ ابن ہشام الملقب بجلاء الافکار بسیرۃ المختار ۔ مولفہ ابو الفتح محمد بن ابراہیم بن محمد بن مقبل الحلبی المقدسی متوفی ۹۲۷ھ

ڈاکٹر فواد سزگین نے فہرس المخطوطات المصورہ کے حوالہ سے صرف پہلی جلد کا ذکر کیا ہے۔ جو مکتبہ خالدیہ قدس رمنبر سیرہ ۳) میں محفوظ ہے اور بخط مصنف ہے۔ کتاب کی دوسری اور تیسری جلدیں بھی بخط مصنف جامعہ استنبول کے کتب خانہ میں محفوظ ہیں۔

جلد دوم ۔ کتب خانہ جامعہ استنبول عربی نمبر ۵۹۵ ۔ اوراق : ۲۳۵ ۔ سطریں : ۱۹، رسم الخط : نسخ ۔ ورق ۱/ب پر کتاب کے ماخذ لکھے ہیں ۔ ورق ۲/الف پر کتاب کا نام ہے اور درج ذیل تحریر ۔

.. نظر فیہ واغتنا لمؤلفہ بالرحمۃ ولمالکہ بالبقاء وعمرہ رقا احمد بن احمد بن سلودین ابراہیم المقری الشافعی فی رجب الفرد سنۃ ۹۳۱ھ

اس جلد کی ابتدا ورق ۲/ب پر اس طرح ہوتی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم	ھو المستعان وعلیہ التکلان
لا الٰہ الا اللہ عدۃ للغایہ	محمد رسول اللہ امانا من شقایہ
نبینا محمد خیر الانام المصطفٰے	وشیخنا احمد تاج الکرام ابو الوفا

ابتداء فرض الصلاۃ : قال ابن اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ وحدثنی صالح بن کیسان عن عروۃ بن الزبیر . . .“

خاتمہ ورق ۲۲۵ /الف پر عبارت ذیل پر ہوتا ہے۔

”تم الجزء الثانی من کتاب جلاء الافکار لسیرۃ المختار . . . . فی یوم الثلاثاء ثالث عشر ذی الحجۃ لحر

سنہ ۔ اس کتاب کا ایک محققانہ ایڈیشن قطر کے مدیر امور دینیہ ابراہیم عبداللہ انصاری نے شائع کیا ہے (مترجم)

سنۃ ثلاثین وتسعمأۃ من الھجرۃ الشریفۃ ... علی ید مؤلفہا وکاتب ذکرہ افقر عباد اللہ ..... ابی الفتح محمد بن ابراھیم بن محمد بن مقبل البابیبی مولداً والمقدسی منشأ الشافعی مذھباً ... بدمشق المحروسۃ ..."

صفحہ کے گوشہ میں لکھا ہے۔

"انما ذکرہ ، ھذا الجزء المبارک مطالعۃ فی اوائل رجب الفرد سنۃ ۹۷۸ھ امین عبد الباسط نعلموی (ان کے بارے میں دیکھئے کحالہ ۵ : ۷۹)

جلد سوم : جامعہ استنبول عربی نمبر ۶۵۷ - اوراق : ۲۵۵ - رسم الخط : نسخ۔

یہ جلد ہجرت کے بیان سے شروع ہوتی ہے۔ خاتمہ ۲۵۵ رب پر عبارت ذیل پر ہوتا ہے۔

"تم الجزء الثالث ... فی یوم السبت ثالث شہر ربیع الاول سنۃ ثلاث وثلاثین وتسعمأۃ من الھجرۃ النبویۃ ... یتلوہ الجزء الرابع ان شاء اللہ تعالی لغزوۃ بنی سلیم بالکدر والحمد للہ علی التمام"

اسی صفحہ کے حاشیہ پر لکھا ہے۔

"توفی اللہ مؤلف ھذا الکتاب رحمہ اللہ تعالی ... فی اول رجب سنۃ سبع وثلاثین وتسعمأۃ بعد موت والدتی ... الشیخۃ آسیۃ حماۃ المؤلف بیومین . ولم یعمل ھذا الکتاب (یعنی جزء رابع) وکانت بدرت منہ الاشارۃ لکاتب ھذا الحروف بانہ لا یتم ھذا الکتاب الا ..." (بقیہ عبارت مٹ گئی ہے)

یہ نوٹ عبدالباسط علموی متوفی ۹۸۱ھ کا ہے (کحالہ ۵ : ۶۹ - ۷۰) اس نوٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ عبدالباسط علموی کی والدہ محمد بن ابراہیم بن مقبل بلبیسی کی ساس تھیں۔

۲۳ - الفتوحات السبحانیہ فی شرح نظم الدرر السنیہ للعراقی[1] - مولفہ عبدالرؤف مناوی متوفی ۱۰۳۱ھ [۷۹]

اس کتاب کا ایک مخطوطہ انقرہ کے مکتبہ عامہ میں (نمبر ۱۵۱۵/۱) ایک مجموعہ میں محفوظ ہے۔ اوراق ۱رب تا ۱۱۲رب۔ تاریخ کتابت ۲۲۹ھ ہے۔ اس مجموعہ میں محمد بن احمد الشربینی الخطیب الشافعی متوفی ۹۷۷ھ کی تفسیر کا ایک جزء بھی ہے۔ ایک اور مخطوطہ اسی مکتبہ میں نمبر ۱۲۵۸ کے تحت محفوظ ہے۔ کتاب کے دوسرے مخطوطات کلیۃ اللغۃ والتاریخ والجغرافیا "انقرہ" مخطوط اوراق (نمبر ۲۸۰۷) عاطف افندی (نمبر ۲۷۹) ایا صوفیا (نمبر ۳۲۷۲) اور طوبقپو سرائی کے میوزیم - مدینہ (نمبر ۲۴۴) میں محفوظ ہیں۔

۲۴ - خلاصۃ الاخبار فی احوال النبی المختار - مولفہ عزیز محمود الاسکداری المعروف بہدائی متوفی ۱۰۳۸ھ [۸۰]

مصنف نے یہ کتاب ۹۷۸ھ میں مکمل کی۔ ابواب کتاب کے لئے ملاحظہ ہو۔ کشف الظنون ۱ : ۷۱۷ - بروکلمان کے ذکر

---

[1] - یہ شرح چھپ چکی ہے (مترجم)

کردہ نسخوں کے علاوہ کتاب کے مزید نسخے درج ذیل کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں۔

دوکو ملوبابا (سلیمانیہ) نمبر ۵۲۳، حاجی محمود نمبر ۴۴۰۳، حاجی بشیر آغا نمبر ۲۸/۴۶۲، ابراہیم افندی نمبر ۷/۸۷۷، لالا اسمٰعیل نمبر ۲/۶۸۸، ۲/۶۹۳، لالہ لی نمبر ۲۰۲۴، ۱/۳۶۶۹، شہید علی پاشا نمبر ۸/۱۳۵۹، فاتح نمبر ۴۲۴۳، ینی جامع نمبر ۲/۲۳۸، ۶۲۲، اسعد افندی نمبر ۲۵۸۶، ۸/۲۷۸۹، ۴/۱۶۵۴، ۳/۱۶۵۴ وغیرہ۔

۳۵۔ السیرۃ الحلبیۃ: انسان العیون فی سیرۃ الامین المامون۔ مؤلفہ ابوالفرج علی بن ابراہیم بن احمد بن علی بن عمر بن نورالدین حلبی، متوفی ۱۰۴۴ھ[51]

بروکلمان نے لکھا ہے کہ اس کتاب کا ترکی ترجمہ بولاق میں ۱۲۵۱ھ میں چھپا۔ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے نئے ایڈیشن میں J. W. FUK نے بھی بروکلمان کے اتباع میں یہی بات دہرائی ہے جو کہ بے بنیاد ہے[52]۔ اس کتاب کا کوئی ترجمہ ترکی زبان میں نہیں ملتا۔ اور نہ بولاق میں ۱۲۵۱ھ میں سیرت کے موضوع پر ترکی میں کوئی کتاب شائع ہوئی!!

واقعہ یہ ہے کہ ایک اور کتاب ترکوں میں "سیرت حلبیہ" یا "سیر حلبی" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ کتاب ترکی زبان میں عربی سے ترجمہ ہوئی۔ کتاب کے مصنف ابراہیم بن مصطفیٰ بن ابراہیم حلبی مداری متوفی ۱۱۹۰ھ آستانہ میں وزیر راغب پاشا (متوفی ۱۱۷۶ھ) کے استاذ تھے[53] حلبی نے سیرت پر نظم السیرۃ کے نام سے ۶۳ اشعار پر مشتمل ایک قصیدہ نظم کیا تھا۔ پھر خود ہی اس قصیدہ کی مفصل شرح لکھی۔ اس نظم اور اس کی شرح کے مخطوطات کبھی تو علیحدہ علیحدہ ملتے ہیں اور کبھی نظم و شرح یکجا ملتے ہیں۔

اس سیرت کے اہم مخطوطات درج ذیل ہیں۔

۱۔ مخطوطہ کتب خانہ کلیۃ اللغۃ والتاریخ والجغرافیا۔ مظفر اوزناق۔ ثانی نمبر ۴۴۷۔

اس مخطوطہ میں شرح بھی ہے۔ یہ مخطوطہ ۸۰ اوراق میں ہے۔ اور مؤلف کی زندگی میں لکھا گیا ہے۔ کاتب کا نام عبدالرحمٰن لومی ہے۔ مخطوطہ کا خاتمہ اس عبارت پر ہوتا ہے۔ جس سے کتابت کی تاریخ معلوم ہوتی ہے۔

"ختمنا تحریرہ فی وقت الضحوۃ الکبری یوم الثلاثاء السابع عشر من شعبان المعظم سنۃ تسع وسبعین ومائۃ والف من کانون الثانی"

۲۔ مخطوطہ مہری شاہ سلطان نمبر ۳۱۲

۳۔ مخطوطہ اسعد افندی رقم ۱/۲۲۴۷۔ کاتب: سلیمان بن خلیل۔ یہ نسخہ بھی حیات مولف میں ۱۱۷۱ھ میں لکھا گیا ہے۔

۴۔ مخطوطہ لالا اسمٰعیل نمبر ۳۴۹۔ یہ نسخہ بھی حیات مولف میں ۱۱۷۷ھ میں لکھا گیا ہے۔

مندرجہ بالا نسخوں کے علاوہ ذیل کے کتب خانوں میں اس کتاب کے نسخے ملتے ہیں۔ لالالی نمبر ۲۰۷۴، ولی الدین نمبر ۸۷۵، جامعہ استنبول عربی نمبر ۱۵۸۰، نمبر ۸۹۸ راغب پاشا نمبر ۱۰۲۶ اکیرسون (سلیمانیہ) نمبر ۱/۵۲، دارالکتب المصریہ نمبر ۴۹۶۹، ۲۲۲۴۲ ب

موخرالذکر نسخہ کو بروکلمان نے پرٹش کی فہرست پر اعتماد کر کے ابراہیم حلبی متوفی ۹۵۶ھ کی جانب منسوب کیا ہے جو غلط ہے[54]۔

احمد عاصم عینتابی متوفی ۱۲۳۵ھ نے جو مترجم عاصم کے نام سے مشہور ہیں۔ اس کتاب کا ترجمہ ترکی زبان میں کیا اور اسے سلطان سلیم سوم (۱۲۰۳-۱۲۲۲/۱۲۲۲ھ) کی خدمت میں پیش کیا۔ یہ ترکی ترجمہ بولاق میں ۱۲۴۸ھ میں شائع ہوا۔ ترجمہ کے متعدد مخطوطات کتب خانوں میں ملتے ہیں[۵۶]

۳۶ ۔ الدرۃ المنیفۃ فی السیرۃ النبویۃ الشریفۃ ۔

کیا یہ وہی کتاب ہے جو علی بن عبدالواحد بن محمد بن عبداللہ انصاری سجلماسی متوفی ۱۰۵۷ھ کی جانب منسوب ہے[۵۷] ۔ لالہ لی (نمبر ۲۰۲۵) میں ۷۶ اوراق (سطریں: ۱۹ ، خط: نسخ) میں ایک مخطوطہ ہے جو دارالکتب المصریہ کے نسخہ سے مختلف ہے۔ لالہ لی کا نسخہ ورق ۱/ب پر اس شعر سے شروع ہوتا ہے۔

قد قال ذا لحمد الا دلاھر　　المرتجی عفو الاله القاھر

ھذا وقد اردت یا نجل الکرام　　یا احمد ابن الوزیر ذی احترام

ورق ۲/الف پر ہے ۔

ارسمہا بالدرۃ المنیفہ　　فی السیرۃ السنیۃ الشریفہ

ورق ۷۶/ب پر درج ذیل شعر پر کتاب ختم ہو جاتی ہے ۔

والختم بالحمد بما یرضاہ　　من قول لا الہ الا اللہ

تدتمت القصیدۃ المسماۃ بالدرۃ المنیفۃ فی السیرۃ السنیۃ الشریفۃ ۔

۷۶/ب پر بعض اشعار ایسے ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف کا نام احمد بن الوزیر ہے، اور یہ نظم ۱۰۸۵ھ میں مکمل ہوئی ہے[۵۸]!

من نظم عبدہ الضعیف الراجی　　من العذاب ان یکون ناجی

فی سنۃ بعد ثمانین والف　　لسلہ سجانہ الجمع بالف

بنی من ابوہ ھو الذ قد ضرب　　بسیفہ الکفار حتی قد خضب

بساحل البحر المحیط سبسلا　　والقلب بالثقۃ باللہ سلا

ورق ۷۶/الف پر یہ شعر ہے ۔

واحفظ الوزیر ذا السلطانا　　محمد الغازی دمصطفانا

کیا اس شعر میں سلطان محمد رابع کی جانب اشارہ ہے۔ جس کی حکومت ۱۸ رجب ۱۰۵۸ھ سے ۲ محرم ۱۰۹۹ھ تک تھی ۔

---

[۵۸] فاضل مضمون نگار نے بعد میں جو اشعار دیئے ہیں۔ ان میں کسی شعر سے واضح نہیں ہوتا کہ مؤلف کا نام احمد بن الوزیر ہے۔ اس سے قبل ورق ۱/ب کے جو دو شعر نقل کئے ہیں ان سے صاف ظاہر ہے کہ مؤلف نے احمد بن الوزیر کو مخاطب کیا ہے ۔ (مترجم)

٢٧ ۔ **السیرۃ النبویۃ** ۔ مولفہ محمد بن سلطام بن رستم بن قنبر الحیسی الخوشابی الواتی متوفی ٩٦٠ھ

اس کتاب کا ایک نسخہ دار الکتب المصریہ میں (نمبر ٢١٢٨ ب) محفوظ ہے ۔ لیکن مصنف کے آثار میں اس کا ذکر نہیں ملا ۔ (دیکھئے کحالہ ٩ : ١٠٢ ، فہرس دار الکتب المصریہ ۔ فواد سید ۔ القسم الاول ، قاہرہ ١٩٦١ ، ص ٢٧٢)

٢٨ ۔ **مختصر السیرۃ الحلبیۃ** ۔ مولفہ احمد بن محمد بن عبد الغنی البنا دمیاطی متوفی ١١١٧ھ

١ ۔ اس کتاب کا ایک نسخہ جامعہ استنبول کے کتب خانہ (عربی نمبر ٢٣٦٩) میں محفوظ ہے ۔ اوراق : ٢٣٣ ، رسم الخط : نسخ ۔ نسخہ کی ابتداء ورق ١/ب پر عبارت ذیل سے ہوتی ہے ۔

" الحمد للہ رب العالمین حمدا یوافی نعمہ ویکافی مزیدہ ... الحمد یا ربنا کما ینبغی لجلال وجہک وعظیم شانک ... "

خاتمہ ورق ٢٣٣ / الف پر اس عبارت پر ہوتا ہے ۔

" وکان الفراغ من رقم ہذہ النسخۃ ... بعد عصر الاربعاء ... خلت من شہر صفر ... سنۃ الف ومائتین وثمان وستین من الہجرۃ النبویۃ ... علی ید منصور بن سلمان الشافعی النقشبندی ... امام مسجد الولی ... سیدی ابی العباس احمد العتریس ... "

٢ ۔ ایک اور نسخہ جامعہ استنبول (عربی نمبر ٢٠٠٨) میں ہے لیکن کتاب کے صرف دوسرے حصہ پر مشتمل ہے اور غزوہ حمراء الاسد سے شروع ہوتا ہے ۔ یہ نسخہ ٢٦٤ ورق میں ہے ۔

ورق ٢٦٤ / الف پر تاریخ کتابت کی عبارت ذیل پر ختم ہوتا ہے ۔

" ووافق الفراغ من کتابۃ ہذہ النسخۃ فی غایۃ جماد اول من سنۃ ١١٥٣ علی ید الفقیر احمد بن فتوح الدمیاطی غفر اللہ لہ ... "

٣ ۔ تیسرا نسخہ ١١٢٨ھ کا لکھا ہوا ، ٣٦٣ اوراق میں رئیس الکتاب (نمبر ٧٠٥) میں محفوظ ہے ۔ ورق ٣٦٢ / ب پر مصنف کے نسخہ سے مقابلہ کی تصریح اور کاتب کا نام عبارت ذیل سے ظاہر ہے ۔

" بلغ مقابلۃ وتصحیحا ، قوبلت علی نسخۃ مؤلفہ عبدہ محمد بن مصطفی بن محمد بن محی الدین الطرابلسی الحنفی المشتہر بابن المقابلۃ جی ۔ "

٤ ۔ ایک نسخہ دار الکتب المصریہ (نمبر ٣٠٨) میں ہے ۔ اور ١١٧٩ھ کا لکھا ہوا ہے ۔ دار الکتب کی فہرست میں لکھا ہے کہ مصنف نامعلوم ہے ۔

٥ ۔ ایک پانچویں نسخہ کا ذکر بروکلمان نے کیا ہے کہ ٹیونس میں ہے ۔

٢٩ ۔ **اتحاف البریۃ بمنتقی السیرۃ الحلبیۃ** ۔ مولفہ تاج الدین موفق نابلسی شافعی ، متوفی بعد ١١٥٥ھ

اس کتاب کا ایک مخطوطہ ، ٣١٧ اوراق میں جامعہ استنبول میں (نمبر ٢٩٢١) محفوظ ہے ۔ بغدادی نے یہی نسخہ دیکھا تھا ۔ چنانچہ

اپنی کتاب ایضاح المکنون ۱: ۹۰ میں اسے درج کیا۔ ورق ۱/الف پر عبداللہ شبراوی شافعی متوفی ۱۱۷۱ھ کے قلم سے کتاب کی تقریظ ہے۔ کتاب کی ابتداء ورق ۱/ب پر اس عبارت سے ہوتی ہے۔

"حمداً لمن رفع لبيه طه عليه السلام اعسر الدين ووضع جيوشه وسرايا فوق اعضاء السنين وجعل غزواته نصر المؤمنين"

خاتمہ ورق ۲۱۷/الف پر عبارت ذیل پر ہوتا ہے۔

"ووافق الفراغ من تبييضته صبيحة يوم الثلاثاء رابع عشر من شعبان سنة ۱۱۵۵ھ على يد مختصره السيد تاج موفق غفر له"

معلوم ہوا کہ یہ نسخہ بخط مصنف ہے اور ۱۱۵۵ھ میں مکمل ہوا ہے۔ رسم الخط نسخ ہے اور ہر صفحہ میں ۲۰ سطریں ہیں۔

الاخبار المرضیۃ فی سیرۃ خیر البریۃ۔ مولفہ احمد بن احمد حاتمی فیومی۔

اس کتاب کا ایک مخطوطہ بخط مولف ۱۱۹۱ھ کا لکھا ہوا ۱۲۱ اوراق میں جامعہ استنبول کے کتب خانہ رقم ۲۴۱۳ ۲۴ میں محفوظ ہے۔ اسی کتب خانہ میں ایک اور نسخہ بھی ہے رقم ۲۵۹۲ جو ۱۲۷۲ھ کا لکھا ہوا ہے۔ اور ۲۲۴ اوراق میں ہے۔ ملاحظہ ہو بیشش، نوادر المخطوطات ۲: ۲۰۰۔ بغدادی، ایضاح المکنون ۱: ۳۵۔

۴۱۔ اسعاف الراغبین فی سیرۃ المصطفیٰ و فضائل اہل بیت الطاہرین۔ مولفہ ابو الوفاء محمد بن علی الصبان متوفی ۱۲۰۶ھ

بروکلمان کے ذکر کردہ نسخوں کے علاوہ اس کتاب کے دو نسخے جامعہ استنبول کے کتب خانہ میں موجود ہیں۔ ایک کا نمبر ۸۰۹ ہے اور تاریخ کتابت ۱۲۳۱ھ ہے۔ دوسرے کا نمبر ۲۰۰۸ اور تاریخ ۱۲۸۶ھ ہے۔

۴۲ التحفۃ الظریفۃ فی بیان السیرۃ الشریفۃ۔ مولفہ علاء الدین ابو الحسن علی بن السیفی؟؟

اصل کتاب فارسی میں ہے۔ یہ اس کا عربی ترجمہ ہے۔ اس کا مخطوطہ سلیمانیہ افغانی رقم ۲/۷۰ میں ہے۔ ورق ۲۶/الف پر کتاب اور مولف کا نام اس طرح لکھا ہے۔

"هذا كتاب التحفة الظريفة في بيان السيرة الشريفة للعلامة علاء الدين ابو الحسن على بن الموسوم السيفي نفعنا الله بعلومه آمين"

کتاب کی ابتداء ورق ۲۶/ب پر عبارت ذیل سے ہوتی ہے۔

"قال الفقير الى الله تعالى علاء الدين مفيد الطالبين ابو الحسن على بن الجناب الموسوم السيفي مبدسان الفارسي دام الله النفع بفوائده . . . . وبعد فهذه نبذة يسيرة سميتها التحفة الظريفة في بيان السيرة الشريفة"

خاتمہ ورق ۳۲/ب پر اس عبارت پر ہوتا ہے۔

"تم الکتاب بحمد اللہ وعونہ علی ید العبد الفقیر ... عبد الباری نصر العشمادی المالکی یوم الثلاثاء فی ۷ جمادی الاول ... من شہور سنۃ ۱۳۲۹ھ الف وماتین تسعۃ وعشرین عربیۃ۔"

۴۳ ۔ **کشف الحجاب فی سیرۃ النبی المجتبیٰ والاصحاب** ۔ مولفہ احمد بن سلیمان بن عثمان، خالدی، نقشبندی، ارادی، متوفی تقریباً ۱۲۷۰ھ

مولف کی تصنیفات میں اس کتاب کا ذکر نہیں ملتا۔ اس کا مخطوطہ جامعہ استنبول کے کتب خانہ (عربی نمبر ۲۴۴۹) میں موجود ہے۔ اوراق ۳۱۹، سطریں: ۲۵، رسم الخط نسخ۔ کتاب کی ابتداء ورق ۱/ب پر عبارت ذیل سے ہوتی ہے۔

"الحمد للہ رفیع الدرجات المنفرد فی الذات والافعال والصفات .... وبعد فیقول .... احمد بن سلیمان بن عثمان الخالدی النقشبندی ..... قد سألنی بعض الاخوان ... ان اجمع کتابا مختصرا فی سیرۃ المصطفیٰ واصحابہ الکرام .... فتوقفت عن ذلک .. ثم خطری خاطری الی ان استخیر بذلک الواحد المالک فاستخرت اللہ تعالیٰ فحصل الاذن فبادرت لما طلب ..... وجمعتہ من السیر والشفا والمواھب والتفسیر ومن غیرھا من الکتب والتفاسیر خصوصا النخب الفاخر وکتاب البخاری الماھر۔ وسمیتہ کشف الحجاب فی سیرۃ النبی المجتبیٰ والاصحاب ....."

خاتمہ کی عبارت ورق ۳۱۹/الف پر حسب ذیل ہے۔

"..... الحمد للہ رب العالمین وکان الفراغ من تسویدھا لیلۃ الاحد سابع رجب المبارک سنۃ الف ومأتان (کذا) واحدی وسبعین من ھجرۃ المصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم علی ید کاتبھا الفقیر .... محمد بن الشیخ مراد السطار خطیب حضرۃ (مسجد) حضرۃ سیدی خالد بن الولید رضی اللہ عنہ ..... ۱۷ رجب ۱۲۷۱ھ"

۴۴ ۔ **تحفۃ العالم فی اخبار سید ولد آدم** ۔ مولفہ عبد القادر بن مصطفیٰ بن سعید اللہ البیرقی الحنفی (؟؟)

اس کتاب کی صرف دوسری جلد انقرہ کے کتبہ عامہ (نمبر ۱۰۰۸) میں محفوظ ہے۔ یہ جلد ہجرت کے بیان سے شروع ہوتی ہے اور "سریۃ ابی قتادہ الانصاری" کے ذکر پر ختم ہو جاتی ہے۔ اس جلد کی ابتداء ورق ۱/ب پر عبارت ذیل سے ہوتی ہے۔

"الجزء الثانی من کتاب تحفۃ العالم فی اخبار سید ولد آدم

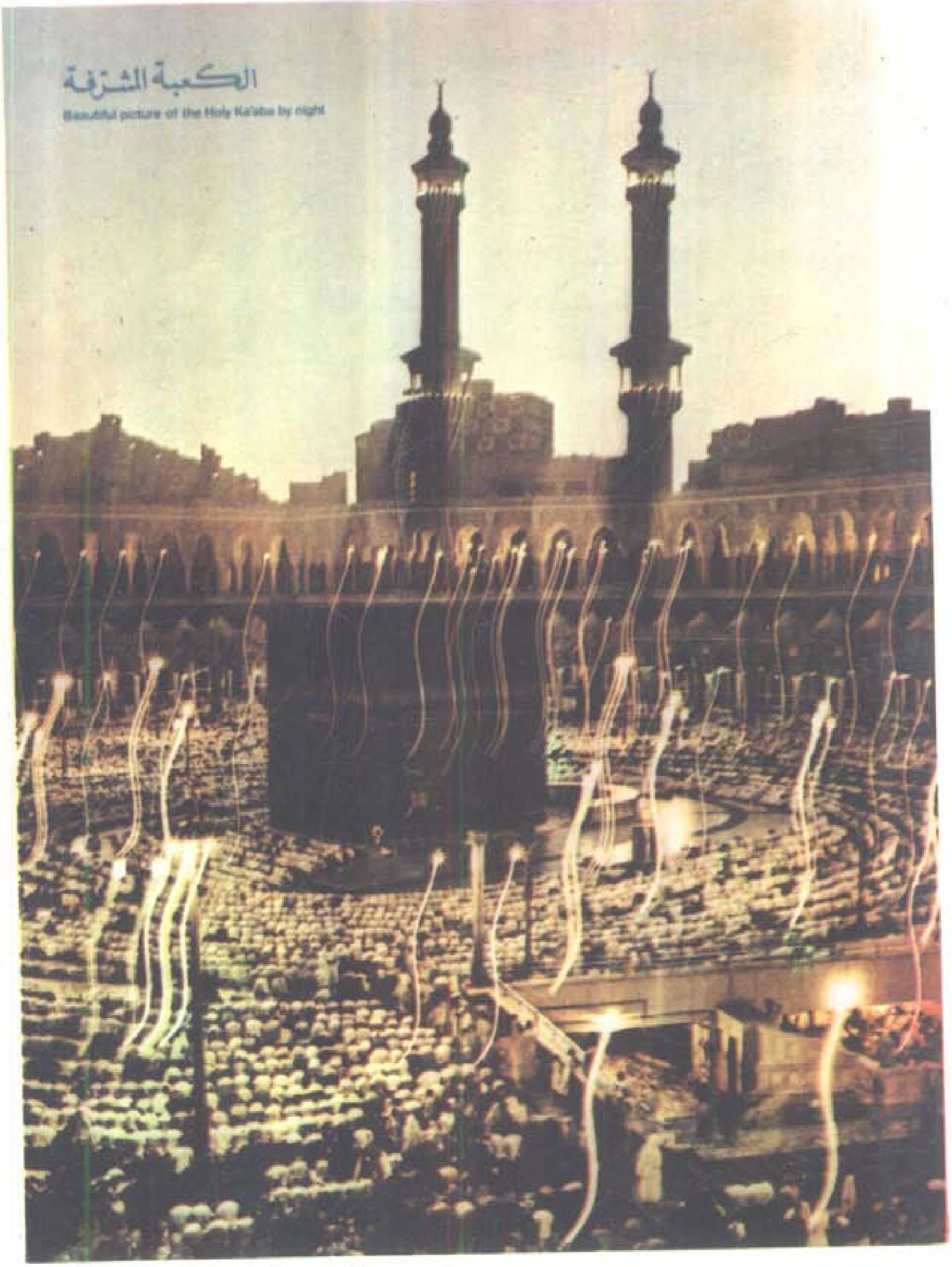
باب فی ذکر الھجرۃ النبویۃ الی المدینۃ المنورۃ وفیہ فصول

فصل ذکر خروجہ صلی اللہ علیہ وسلم من مکہ ووصول الی المدینۃ المنورہ وما اتفق لہ بینھما"

خاتمہ کی عبارت ورق ۲۸۶/ب پر حسب ذیل ہے۔

"فذکروا ذلک لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال: ان الارض تقبل من ھو شر من صاحبکم ولکن اللہ اراد ان یعظکم فی حرمۃ ما بینکم بما اراکم منہ فاتقوا اللہ واحذروا عقابہ

تم الجزء الثانی ویلیہ الجزء الثالث: اولہ فتح مکۃ المشرفۃ"



خانہ کعبہ کا ایک منظر

یہ نسخہ خط رقعہ میں ۳۸۶ اوراق میں ہے۔ کاٹ چھانٹ بہت ہے۔ بظاہر یہ مسودہ ہے۔ اور اس کا تعلق چودھویں صدی ہجری سے ہے۔

۴۵ ۔ سیرت پر ایک منظوم کتاب ؟

سلیمانیہ (یازمہ باغشلر، نمبر ۳۱۴/۴) میں ایک مخطوطہ ہے جو خط نسخ میں ہے۔ اور ۷۰ اشعار پر مشتمل ہے۔ ہر صفحہ پر ۱۴ سطریں ہیں ابتدا ورق ۱۸/ب پر درج ذیل اشعار سے ہوتی ہے۔

الحمد للہ القدیم الباری ثم صلاتہ علی المختار

وبعد ھاک سیرۃ الرسول منظومۃ موجزۃ الفصول

خاتمہ کے اشعار ورق ۲۱/ب پر یہ ہیں۔

وتمت الارجوزۃ السنیہ فی ذکر حال اشرف البریہ

صلی علیہ اللہ ربی و علی اصحابہ وآلہ ومن تلا

۴۶ ۔ سیرت پر ایک کتاب ؟

سلیمانیہ (انطالیا : تکہ لی اوغلو نمبر ۴۵۸) میں سیرت پر ایک کتاب ۱۲ اوراق میں ہے۔ مگر اس کے نام اور مولف کا پتہ نہیں چلتا۔ آخر میں ناقص ہے۔ ہر صفحہ میں ۱۹ سطریں ہیں۔ رسم الخط تعلیق ہے۔ عام نسخ ہے۔ رطوبت اور کرم خوردگی کے اثرات بھی ہیں۔ ابتداء ورق ۱/ب پر اس عبارت سے ہوتی ہے۔

الحمد للہ الذی انشأ العالم من العدم، ونورہ بنور قدرتہ من الظلم، وصور النفوس تصویرا وجعلہ لبشیرا ونذیرا...

اما بعد فانی اردت ان اذکر اصل النبی صلی اللہ علیہ وسلم اولاً وثانیا وکیفیۃ مولدہ وبعثہ وظہورہ وشوکتہ و بعض معجزاتہ مقدماً ومؤخراً ومعراجہ علی الروایۃ المتفق علیہا ...۔"

ورق ۱۲/ب پر خاتمہ اس عبارت پر ہوتا ہے جو ناقص ہے۔

"نتکلم الی بلا لفظ ولا حرف ولا صوت تسعین الف کلمۃ ثلاثین الفا من الحقیقۃ فلما وصلت الیہ ..."

حواشی اور حوالہ جات

۱ ۔ فواد سزکین، تاریخ التراث العربی ۱ : ۴۷۲، الہیئۃ المصریۃ العامۃ للکتاب ۱۹۷۷ء

۲ Turkce Tarih—Cografya Yazmalari Katalogu, 300—301 Isntanbul, 1944.

۳ Storey: Persian literature 1, 174. London, 1939.

۴ - Turkce Tarih—Cografya Yazmalari, 305—306, Darir: by Fahir 17.

۵ - Karatay: Topkapi Sarayi Muzesi Kutup. Turkce Yazmalar Katalogu 1, 164—165.

۶ - کحالہ: معجم المؤلفین ۴ : ۳۱۶

۷ - فہرست الکتب الترکیۃ الموجودۃ فی الکتبخانۃ الخدیویۃ - جامع اعلیٰ حلمی داغستانی مصر ۱۳۰۷ ص ۱۹۱

۸ - اس سے قبل رسالہ "عالم الکتب" کے شمارہ ۳ جلد دوم صفحہ ۴۴۳ ۴ نمبر ، میں "ترکی لٹریچر میں سیرت نبوی کے موضوع پر" اپنے مقالہ میں میں نے لکھا تھا کہ ضریر ارضرومی نے سیرت ابن ہشام کو سامنے رکھ کر سیرت نبوی کا ترجمہ ترکی میں کیا تھا۔ لیکن اب واضح ہو گیا ہے کہ یہ قطعاً غلط ہے۔

۹ - کحالہ: معجم المؤلفین ۲ : ۴۰ - ۴۱، بروکلمان ۱ : ۱۳۰، ذیل ۱ : ۱۹۸

۱۰ - فہرس المخطوطات المصورۃ ۔ الجزء الثانی ۔ القسم الرابع صفحہ ۱۷۴ ۔ نیز دیکھیے معجم المؤلفین ۷ : ۳۰۹

۱۱ - بروکلمان ۱ : ۱۵۶

۱۲ - بروکلمان ذیل ۱ : ۵۶۲ نیز دیکھیے السخاوی : التوبیخ لمن ذم التاریخ، علم التاریخ عند المسلمین ص ۵۳۰، بغداد ۱۹۶۳ء

۱۳ - معجم المؤلفین ۵ : ۱۱۰، ۵ : ۲۱۲، ۱۰ : ۱۵۹

۱۴ - بروکلمان ۱ : ۳۴۹، ذیل ۱ : ۹۰۰ بروکلمان نے لکھا ہے کہ کتاب کے دو نسخے قاہرہ اور عاشر افندی میں محفوظ ہیں۔

۱۵ - یہ کتاب مصر میں متوسط سائز کے تقریباً ۶۰ صفحات میں چھپی تھی۔ (مترجم)

۱۶ - بروکلمان ذیل ۱ : ۶۱۶

۱۷ - کشف الظنون ۱ : ۱۹۵، بروکلمان ذیل ۱ : ۶۱۶

۱۸ - ذہبی : میزان الاعتدال فی نقد الرجال ۱ : ۵۲ قاہرہ ۱۳۲۵ھ

۱۹ - عسقلانی : لسان المیزان ۱ : ۲۰۲ - حیدرآباد ۱۳۲۹ھ

۲۰ - قلقشندی : صبح الاعشیٰ ۱ : ۴۵۳ - ۴۵۴، قاہرہ ۱۳۳۹ھ

۲۱ - سیوطی : الحاوی فی الفتاوی ۱ : ۳۶۹، قاہرہ ۱۳۵۲ھ

۲۲ - رمضان ششن : نوادر المخطوطات العربیۃ فی ترکیا ۱ : ۲۲۸ نیز دیکھیے روزنتھال : علم التاریخ عند المسلمین، ترجمہ صالح احمد العلی بغداد ۱۹۶۳ء ص ۲۶۴ نیز Catalogue of the Arabic Mss. in the collection of the Royal Asiatic Society of Bengal 1, pp. 137. Calcutta 1939.

۲۳ - کحالہ: معجم المؤلفین ۱ : ۲۹۸ - ۲۹۹، رمضان ششن ۲ : ۳۷۵

۲۴ - معجم المؤلفین ۷ : ۲۳۶، مختصر التاریخ للکازرونی (تحقیق مصطفیٰ جواد) بغداد ۱۹۷۰ء ص ۱۸ ، ۱۷

۲۵ - 24 Mevlana Muzesi Yazmalari Katalogue, 1, 106, 123.

۲۶ - معجم المؤلفین ۵ : ۱۴۲، بروکلمان ۱ : ۸۱۱

۲۷ . فؤاد سزکین: تاریخ التراث عربی ۱ : ۴۷۹

۲۸ - معجم المؤلفین ۵ : ۳۱۸، رمضان ششن : نوادر المخطوطات ۲ : ۳۲۱

۲۹ - بروکلمان ۲ : ۱۹۵، ذیل ۲ : ۲۶۲، رمضان ششن : نوادر المخطوطات ۲ : ۳۲۷ کشف الظنون ۲ : ۱۸۵۱
عالم الکتب جلد دوم شمارہ ۳ صفحہ ۳۴۴

۳۰ - معجم المؤلفین ۵ : ۲۵۷، بروکلمان ۲ : ۲۷، ذیل ۲ : ۷۸، رمضان ششن ۱ : ۵۲

۳۱ - معجم المؤلفین ۹ : ۱۱۱ کشف الظنون ۱ : ۹۱۷، ۲ : ۱۹۸۲، بروکلمان ۲ : ۹۴ ذیل ۲ : ۱۱۱ - ۱۱۲

۳۲ - بروکلمان ذیل ۲ : ۸۰ - ۸۱ معجم المؤلفین ۸ : ۲۰۱ - ۲۰۲

۳۳ - فؤاد سزکین : تاریخ التراث ۱ : ۴۷۹

۳۴ - فہرس المخطوطات المصورۃ، الجزء الثانی - القسم الرابع ص ۲۵۰

۳۵ - معجم المؤلفین ۲ : ۲۸۳ — ۲۸۴ رمضان ششن ۱ : ۱۶۳

۳۶ - یہ کتاب سب سے پہلے ۱۳۵۷ھ میں قاہرہ میں شائع ہوئی۔ پھر اس کا تحقیقی ایڈیشن ڈاکٹر محمد العید الخطراوی اور محی الدین مستو کی تحقیق سے دار القلم دمشق سے ۱۳۹۹ - ۱۴۰۰ھ میں شائع ہوا۔ ان دونوں ایڈیشنوں کی بنیاد مکتبہ عارف حکمت مدینہ منورہ کے نسخہ پر تھی جو ۱۱۰۱ھ کا لکھا ہوا تھا۔ بعد میں سلیمانیہ میں دو نسخے ملے۔ جنہیں حاصل کر کے محققین نے تیسرا ایڈیشن تیار کیا جو حال میں شائع ہوا ہے۔ یہاں فاضل مقالہ نگار نے اس کتاب کے ایک چوتھے نسخہ کا پتہ دیا ہے جس کا علم محققین کو نہیں ہو سکا (مترجم)

۳۷ - بروکلمان ذیل ۲ : ۷۴، فہرس دار الکتب المصریۃ، الجزء الثامن الملحق الثانی قاہرہ ص ۱۹۴۲ و ۲۵۶

۳۸ - بروکلمان ۲ : ۲۷، ذیل ۲ : ۳۵، رمضان ششن ۱ : ۳۵۱، ۳۵۲

۳۹ - معجم المؤلفین ۸ : ۲۱۸ - ۲۱۹، رمضان ششن ۲ : ۲۸ فہرس الظاہریۃ التاریخ وملحقاتہ - یوسف العش ص ۲۰

۴۰ - Arberry, A. S. : The Sira in verse : Arabic and Islamic studies in honour of H. A. R. Leiden 1965

۴۱ - معجم المؤلفین ۵ : ۲۰۴

۴۲ - معجم المؤلفین ۲ : ۲۶، بروکلمان ذیل ۲ : ۱۱۱ کشف الظنون ۱ : ۲۰۷

۴۳ - بروکلمان ۲ : ۱۴۲، ذیل ۲ : ۱۷۶ - ۱۷۷، رمضان ششن ۱ : ۱۱۹

۴۴ - بروکلمان ذیل ۲ : ۷۷

۴۵ - معجم المؤلفین ۱۰: ۱۹۲

۴۶ - بروکلمان ۲: ۱۴۲ - ۱۴۳ - لکھا ہے کہ برلین میں اس کتاب کا ایک نسخہ محفوظ ہے۔ نیز دیکھیے فہرس المخطوطات المصورۃ، الجزء الثانی، القسم الثانی ص: ۱۴۳

۴۷ - معجم المؤلفین ۵: ۶۸ - ۶۹ رمضان ششن ۲: ۱۹۰ - ۱۹۱

۴۸ - معجم المؤلفین ۸: ۲۱۸ فؤاد سزگین: تاریخ التراث العربی ۱: ۸۷۴، فہرس المخطوطات المصورۃ، الجزء الثانی القسم الثانی ص ۳۰۔

۴۹ - معجم المؤلفین ۵: ۲۲۰

۵۰ - معجم المؤلفین ۱۲: ۱۸۹ - ۱۹۴، بروکلمان ذیل ۲: ۶۶۱

۵۱ - بروکلمان: ذیل ۲: ۴۱۸

۵۲ - Hababi, EI², EI², III, 90 Leiden 1971.

۵۳ - معجم المؤلفین ۱: ۱۱۲ - ۱۱۳

۵۴ - بروکلمان ۳: ۱۳۰۴ - ۶۴۳ و ۱۱ ۸ S اسی طرح فلیپ حتی اور دوسرے محققین۔ Descriptive Catalogue of the Garrett collection. Princeton univ. Press 1938. pp. 216, No. 652.

۵۵ - بغدادی: ہدیۃ العارفین ۱: ۱۸۴، ایضاح المکنون ۱: ۱۷۶ نیز دیکھیے ناشر کا حاشیہ۔

۵۶ - عالم الکتب، جلد دوم، شمارہ ۳ ص ۴۴۵

۵۷ - معجم المؤلفین ۷: ۱۴۲، فہرس دار الکتب، فؤاد سید، القسم الاول، قاہرہ ۱۹۶۱ء ص ۲۱۲، فہرس الظاہریۃ۔ التاریخ یوسف العش ص ۲۷

۵۸ - معجم المؤلفین ۲: ۱۷، بروکلمان ذیل ۲: ۴۱۸

۵۹ - بروکلمان ۲: ۲۸۸، ذیل ۲: ۳۹۹، فہرس الظاہریۃ۔ التاریخ۔ العش ص ۲۴ - ۲۵

۶۰ - معجم المؤلفین ۱: ۲۲۶ - ۲۲۷

سیرت اور مطالعۂ سیرت

مولانا ابوالکلام آزاد

رشتۂ درگردنم افگندہ دوست　　　می بُرد ہر جا کہ خاطر خواہِ اوست

حافظ ابنِ کثیر

حافظ ابنِ کثیر[1] نے اپنی تاریخ کبیر "البدایۃ والنھایۃ" میں شیخ عماد الدین واسطی کی نسبت لکھا ہے کہ ابتدا میں ان کا مسلک دوسرا تھا، لیکن پھر دوسرا ہی رنگ چڑھ گیا۔ اس تبدیلی کا باعث صرف امام ابنِ تیمیہ کی ایک صحبت ہُوئی۔ ان کی نشو و نما فقہا و متکلمین کی جماعت میں ہوئی تھی۔ اس لیے جدل و خلاف اور کلام و رلبے کا اثر غالب تھا۔ مصر سے بغداد گئے تو وہاں خیالات میں توسیع ہوئی اور اپنی حالت کا محاسبہ کیا، تو یقین و طمانیت سے قلب کو خالی پایا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ فقہا و متکلمین کے طریق سے دل برداشتہ ہوگئے اور تصوّف کی طرف توجہ ہُوئی، لیکن عامۂ متصوفین کی صحبتوں کا جو رنگ ڈھنگ نظر آیا، اس سے طبیعت اور زیادہ مکدر ہوگئی۔ بالآخر دمشق آئے اور امام ابنِ تیمیہ کی صحبت میں داخل ہُوئے۔

امام ابنِ تیمیہ کی ایک صحبت درس

وہ خود بیان کرتے ہیں کہ جب پہلی مرتبہ ان کی صحبتِ درس میں حاضر ہُوا، تو عجیب اتفاق ہے کہ علم کلام ہی کی نسبت صحبت تھی۔ امام موصوف فرما رہے تھے: "دنیا میں متکلمین و فلاسفہ سے بڑھ کر مضطرب و محروم اور اطمینانِ قلب و سرورِ روح کی لذّت سے یک قلم ناآشنا اور کوئی گروہ نہیں۔" پھر مشاہیرِ فلاسفۂ قدما و اربابِ مقالات کے چند اقوال سنائے جن میں انہوں نے خود اپنے وجود پر مجہولیت و نامرادی اور بدحالی و بے بصیرتی کی شہادت دی ہے، اسی سلسلے میں امام رازی کے اشعار پڑھے کہ اُن کی مدت العمر کی کاوش و تعمّق اور طلب و جستجو کا ماحصل یہ تھا:

لعمری لقد طفت المعاهد کلها　　　وسیرت طرفی بین تلک المعالم

فلم ار الا واضعاً کف حائر　　　علی ذقن، او قارعاً سن نادم[2]

اور کہا کہ بعضوں نے اپنی مدت العمر کے قیل و قال اور کیف و لماذا کا حاصل یہ بتلایا ہے:

نهایة ارباب العقول عقال　　　واکثر سعی العالمین ضلال

ولم نستفد من بحثنا طول عمرنا　　　سوی ان جمعنا فیه قیل وقالوا[3]

فلاسفہ و متکلمین کی محرومی

آخر میں ایک ایسے قاطع اور رادع طریق سے جو سارے شکوں کو مٹا دینے والا اور ساری بے چینیوں سے نجات دلانے والا تھا، ثابت کیا کہ جن لوگوں نے اپنی محرومی و مجہولیت اور کوری و مجہولیت پر خود

---

[1] صاحبِ تفسیر کبیر۔ [2] یہ اشعار شہرستانی نے اپنی تصنیف نہایۃ الاقدام فی علم الکلام میں نقل کیے ہیں؛ شاید انہی کے ہوں، لیکن یہی اشعار ابن باجہ معروف بابن الصائغ الاندلسی سے بھی منسوب ہیں۔ [3] یہ اشعار امام فخر الدین　　کے ہیں۔

یہ کچھ شہادتیں دی ہیں، بھلا ان کی پیروی سے کب بابِ معرفت تک رسائی ہو سکتی ہے؟ قلت وما احسن قول الشاعر العارف:

آں لعلِ گراں بہا ز کان دگرست — واں دُرِّ یگانہ ز نشانِ دگرست
اندیشۂ ایں و آں خیالِ من و تست — افسانۂ عشق را بیانِ دگرست

پس حقیقت وہی ہے جس کو وحی الٰہی اور حاملینِ منصبِ نبوت علی الخصوص آخرہم واعظمہم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے اصحاب و اتباع نے دُنیا کے آگے پیش کیا اور شک و ظن کی ظلمت و محجوبیت کی جگہ علومِ سماویہ و نبویہ کی یقینیات و براہین کا دروازہ نوعِ انسانی پر کھول دیا اور جس کے علم و عمل کا نمونہ سلف صالح و اوائلِ امتِ مرحومہ من السابقون الاولون من المھاجرین والانصار والذین اتبعوھم باحسان[1] من ورثۃ الانبیاء و خلفاء الرسل و ائمۃ الھدیٰ، رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ[2] نے اخلاف و آخرِ امت کو ہمیشہ کے لیے دکھلا دیا: اُولٰئِکَ عَلٰی ھُدًی مِّن رَّبِّھِم وَاُولٰئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ[3] شیخ موصوف کہتے ہیں کہ اس ایک ہی صحبت میں سارے پردے شکوک و اضطراب کے اُٹھ گئے، اور میرے دل نے حلاوتِ ایقان و طمانیت کی لذت پائی۔ میرا دل بے اختیار پکار اُٹھا کہ جس نورِ حقیقت کی جستجو میں سرگرداں و حیراں ہوں، اس کی شعاعیں امام ابن تیمیہ کے ناصیۂ امامت پر چمک رہی ہیں۔

ایک نصیحت جب وہ میرے حالات سے مطلع ہوئے، تو وصیت کی کہ ساری چیزیں چھوڑ کر صرف سیرتِ نبویہ کے مطالعے اور تدبر و تفکر کو اپنے اوپر لازم ٹھہرا لو، یقین اور ایمان کی تمام بیماریوں کے لیے یہی ایک نسخہ کافی ہے، چنانچہ میں نے اس وصیت کو حرزِ جان بنا لیا، اور جو کچھ پایا، اسی کے وسیلے سے پایا اور ہلاکتِ دنیا و آخرت سے نہیں بچا مگر اسی کے طفیل۔

شیخ موصوف نے صرف سیرتِ طیبہ کے مطالعے پر ہی اکتفا نہیں کیا، بلکہ کمالِ شغف و ربطِ قلب سے اس باب میں بعض مفید تالیفات بھی کیں۔ ازاں جملہ "سیرتِ ابنِ اسحاق" کا خلاصہ ہے، جس کی حافظ ذہبی نے بہت تعریف کی ہے، اور لکھا ہے کہ گو ماخذ اس کا تہذیب ابنِ ہشام ہے، لیکن حسنِ تبویب و اضافۂ فوائد کے لحاظ سے مستحق ترجیح ہے۔ —

(۲)

امام موصوف کا مرتبہ تجدید و مقام فاتحیت شیخ عماد الدین واسطیؒ نے امام موصوف کی جس صحبت کا ذکر کیا ہے، تو یہ مبحث منجملہ ان اہم ترین مباحثِ شریعت اور دقیق ترین مقاماتِ معارفِ کتاب و سُنت کے ہے، جن کی کشف و تحقیق اور بحث و تنقیب امام ابن تیمیہ کے مخصوص معارف میں سے ہے۔ بلکہ اُن کے منصبِ تجدید و امامت فی الدین کا اصلی جوہر اور اُن کے تمام علوم و مقالات کا روح الروح اور صفوۃ المقال یہی مقام ہے۔ حقیقت اگرچہ سلف کے یہاں حالاً و عملاً بہ حد کمال موجود تھی لیکن قولاً و علماً اس کو منتہا درجۂ بحث و تحقیق و وضوح تک پہنچا دینا اور بطریقِ جوامع و کلیات و قواعد و مقالید اس کا اثبات کرنا اور اس درجہ منقح و صاف کر دینا کہ لو کشف الغطاء ما ازددت یقینا[4] کا جملہ اس پر صادق آئے، تو یہ فضلِ مخصوص صرف امام موصوف اور ان کے اصحاب و تلامذہ ہی کے حصہ میں آیا۔ اسی لیے امام ذہبی نے کہا: "ولقد نصر السنۃ المحضۃ والطریقۃ السلفیۃ واحتج لھا ببراھین ومقدمات وامور لم یسبق الیھا واطلق عبارات احجم عنھا الاولون والاخرون" اور اسی لیے

[1] و [2] سورہ توبہ، آیت نمبر ۱۰۰ [3] سورہ بقرہ، آیت نمبر ۵ [4] حضرت علی رضؓ سے منسوب ایک قول۔

ان کا مرتبۂ تجدید اور خاتمیت تمام مجددین وخاتمینِ اعصار اواخر میں سب سے بالاتر وارفع واقع ہوا، کیونکہ اکثر مجددینِ امت کی تجدید دعوت متعلق اعمال و فروع کے ہے لیکن امام موصوف کی تجدید براہِ راست علوم وعقائد واصول و اساسات شریعت سے متعلق ہوئی۔ پس جو نسبت اصل اور فرع میں ہے، وہی نسبت ان کے مرتبۂ تجدید اور دیگر مجددین امت کے مراتب میں سمجھنی چاہیے، اور پھر بسبب اکتساب فیضان نسبت جامعیت محمدیؐ علم وعمل کی اور تمام شاخوں اور راہوں کا بھی اُن کے مقام دعوت وتجدید نے احاطہ کیا، اور اس طرح "آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری" کا معاملہ بھی واقع ہوا، ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ[1] اور اسی لیے گو ان کا ظہور دورِ متاخرین میں ہوا، لیکن بلحاظ مرتبہ ومعنویت کے داخل صفوفِ اوائل واسلافِ امت ومصداقِ صحیح وَآخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ[2] اور پھر اسی لیے سلسلۂ اصلاح وتجدید امت میں ان کی دعوت خلف کے لیے واسطۃ العقد کا برزخ واقع ہوئی، جو خلف کو سلف سے جوڑتی اور اواخر پر اوائل کے فیضان وبرکات کا دروازہ کھولتی ہے اور یہی بات ہے کہ عہد آخر کے تمام معاملات وکاروبارِ تجدید و دعوت کی خاتمیت وقطبیت انہی کے سپرد ہوئی۔ وما احسن ما قال الشیخ عبدالمدین بن علاءالدین المغیثی فی رثائہ، رحمۃ اللہ علیہما:

فلئن تاخر فی القرون لثامن
فلقد تقدم فی العلوم امام

موجودہ دور کا فتنۂ عقائد اور اس کا علاج

بہرحال اصحابِ تاویل ورائے اور متکلمین واتباعِ فلاسفہ کی بے حاصلی ونامرادی اور سلفِ امت واصحابِ تفویض کے مذہبِ حق وطریقِ حکمت اور عقلیاتِ صادقہ و فاضلہ کے اثبات ونصرت میں امام ابن تیمیہ کے مباحث ومقالات اور براہین وقواطع کا عالم دوسرا ہے اور افسوس امت کی محرومی ودماندگی پر کہ صدیوں سے یہ خزائنِ معارف وکنوزِ حقائق موجود ہیں، مگر کوئی ان کا شناسا وعارف پیدا نہ ہوا، بلکہ ہمیشہ غفلت وجہل اور تعصب وجمود کی تاریکیوں میں مدفون ومجہول رکھا گیا۔ وھذہ لیست اول غادرۃ کسرت فی الاسلام، وکم نوبۃ قد رموا الحق والعلم من قوس واحدۃ! علی الخصوص آج کل مسلمانوں میں جس فتنۂ عقائد نے سر اُٹھایا ہے اور بحکم بَلْ قَالُوْا مِثْلَ مَا قَالَ الْاَوَّلُوْنَ[3] وہ تمام فتنے اکٹھے ہو کر پلٹ آئے ہیں جو عقائدِ اسلامیہ کے مختلف دوروں میں فرداً فرداً ظاہر ہوئے تھے۔ اس کے لحاظ سے تو آج معارفِ ابن تیمیہ سے بڑھ کر اور کوئی چیز مطلوب ومقصودِ وقت نہیں۔ البتہ ضرورت بہت کچھ اضافۂ مطالب وتفصیلِ اجمال وتوضیحِ اشارات وضبط وتالیفِ اشتات وانتشار کی ہے۔

شیخ واسطی نے امام موصوف کے جو اشارات متکلمین وارباب تاویل کے باب میں نقل کیے ہیں، ان کو زیادہ تفصیل کے ساتھ انہوں نے اپنے مشہور مقالہ "عقیدۃ الحمویہ" میں لکھا ہے، یہ وہی تحریر ہے، جس کی بنا پر سب سے پہلے امام موصوف کے خلاف علمائے سوء نے فتنہ اٹھایا اور ربیع الاول ۶۹۸ھ میں مبتلائے محن وآلام ہوئے۔ یہ رسالہ مصر میں دو بار چھپ چکا ہے، علامہ سفارینی[4] نے کہ گیارھویں صدی[5] کے کبار اصحابِ اثر واعاظم حماتِ طریقِ سلف میں سے ہیں، ایک ضخیم مجلد میں اس کی شرح بھی لکھی ہے، اور ان طالبانِ حق وجویانِ حقیقت کے لیے جن کے امراضِ قلب

---

[1] سورہ جمعہ، آیت نمبر ۴ [2] ایضاً آیت نمبر ۳ [3] سورہ مومنون، آیت نمبر ۸۱ [4] محمد ابن احمد السفارینی (۱۱۱۴ھ تا ۱۱۸۸ھ) اصول وادب و حدیث کے عالم [5] بارھویں صدی ہجری کہنا چاہیے۔

واعتقادا کو علامہ نسفی و تفتازانی و دوانی (رحمہم اللہ) کے شفاخانوں نے اور زیادہ مزمن و شدید کر کے چھوڑ دیا ہو، اکسیرِ اعظم و تریاقِ مجرب و شفاء لما فی الصدور کا حکم رکھتی ہے۔ فِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ الْأَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْأَعْيُنُ [۱]

سرِ خدا کہ عارف و زاہد کسے نہ گفت
در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید؟ [۲]

(۳)

حیاتِ طیبۂ نبوت، علم و بصیرت کا اصلی سرچشمہ

بہر حال اس واقعے میں قابلِ غور دہ عشق و شغف ہے، جو امام موصوف کو خصوصیت کے ساتھ سیرتِ نبویہ سے تھا۔ ایک سرسری نظر رکھنے والا تو اس واقعے کو معمولی سی بات سمجھ کر سرمانہ آگے بڑھ جائے گا۔ لیکن صاحبِ نظر و بصیرت اسی ایک بات سے امام موصوف کے تمام علوم و اعمال کا محور و مرکز معلوم کر لے سکتا ہے۔

انہوں نے ایک ایسے صاحبِ علم مگر مریضِ شک و اضطراب کو جو مدعیانِ علم و حکمت کی دانش فروشیوں کے ہاتھوں اپنا یقین و اطمینان ضائع کر چکا تھا، یہ وصیت کی کہ ساری چیزیں چھوڑ کر صرف حیاتِ طیبۂ نبوت کے مطالعہ و تفکر میں لگ جاؤ اور گویا اس طرح بتلا دیا کہ علم و بصیرت کا اصلی سرچشمہ صرف حیاتِ نبوت اور منہاجِ مقامِ رسالت ہے، جس کو قرآنِ حکیم نے "الحکمت" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا [۳]۔ کیونکہ دنیا میں "حکمتِ صادقہ" کا اس "حکمت" سے الگ کوئی وجود ہی نہیں، "حکمت" یا تو خود منہاجِ سنتِ نبوت ہے، یا علم و عمل کی ہر وہ بات جو اس سے ماخوذ اور صرف اسی پر مبنی ہو۔ یہی "خیرِ کثیر" مبدء جمیع خیرات و برکاتِ ارض و نوع ہے اور صرف اسی نسخۂ شفا سے دل اور روح کی ساری بیماریاں دور ہو سکتی ہیں، خواہ شکوک و ارتیاب کی بیماری ہو، خواہ اوہام و انکار کی، خواہ ادعائے ادریت کا ہیجان ہو، خواہ حیرانی و سرگردانی لا ادریت کا خمار:

زہر مرض کہ بنالد کسے، شراب دہید [۴]

کوئی بیماری ہو، دوا صرف ایک ہی ہے:

یکے دواست بدار الشفائے میکدہ ہا!

باقی یا تو اسمائے مختلف ہیں اور مسمّٰی وہی ایک ہے۔ مثلاً "سنت و سیرت" کی جگہ "قرآن و کتاب" کا لفظ بول دیا جائے کہ نام دو ہو گئے، مگر حکایت شہد و عسل سے زیادہ نہیں۔ یعنی بات وہی ایک رہی۔ دلالت و تسمیہ میں تعدد ہوا، مدلول و مسمّٰی میں نہیں:

عباراتنا شتی وحسنک واحد! [۵]

آثار و سیرتِ صحابہ

یا پھر اُسی نسخے کے اجزاء و توابع جیسے آثار و سیرتِ صحابہ و سلفِ امت [۶] اور معارف و بصائر ماخوذہ دکتبۂ کتاب و سنت کہ گو اشکال و اسماء میں تفرقہ و امتیاز ہوا، مگر بحکم علیکم بسنتی وسنۃ الخلفا

۱۔ سورہ زخرف، آیت نمبر ۔ ۲۔ حافظ شیرازی کا شعر ہے۔ پہلا مصرع اس طرح ہے: سرِ خدا کہ عارف سالک بکس نگفت ۳۔ سورہ البقرہ آیت نمبر ۲۶۹۔ ۴۔ یہ اور اس کے بعد والا مصرع یحییٰ کاشی کے ایک ہی شعر کے دو مصرع ہیں، یہ اس کا دوسرا مصرع ہے، پہلے مصرع کا پہلا جملہ "یکے دواست" کے بجائے "دوا یکیست ہے"۔ ۵۔ کسی نامعلوم شاعر کا مشہور شعر۔ دوسرا مصرع یہ ہے: وکل الی ذاک الجمال یشیر

الراشدین[1] اور وَآخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِهِمْ[2] اور فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ[3] الخ اور ما انا علیه واصحابی[4] معناً و حکماً، جزء و کل، اصل و فرع، مصدر و مشتق، یا شمس و کواکب کا سارا معاملہ واقع ہوا ہے۔ روشنی صرف ایک ہی ہے اور ایک ہی کی ہے، اگرچہ چاند سے بھی مل جائے اور چمکیلے ستاروں سے بھی۔

بحر یست متحد کہ بہ اشکال مختلف

باران و قطرہ و صدف و گوہر آمدہ

مشتق چونیک درنگری عین مصدر است

یکیں در صفات ظاہر خود مضمر آمدہ

ویقرب من هذا ما قیل بالعربیة۔

وما البحر الا الموج لاشیٔ غیره

وان فرقته کثرة المتعدد

اور اگر یہ دونوں صورتیں بھی نہیں، تو پھر جو کچھ ہے، نہ تو علم ہے اور نہ شفا، بلکہ خود جہل ہے اور مرض! اگرچہ افسوس کہ اس دنیا میں زیادہ حصہ انہی مریضوں کا بستا ہے۔ جنہوں نے ہمیشہ طلب مرض کو طلب شفا سمجھا ہے، اور سم قاتل سے اُمید حیات رکھی ہے! اور پھر یاد رہے کہ یہی معنی ہیں سلف کے اس قول کے کہ علم نہیں ہے مگر وہ جس میں حدثنا اور اخبرنا ہو۔ اس کے سوا جو کچھ ہے وساوس و ضلالت سے زیادہ نہیں۔ کما قال الشافعی رضی اللّٰه عنه۔

کل العلوم سوی القرآن مشغلة — الا الحدیث والا الفقه فی الدین

العلم ما کان فیه قول حدثنا — وما سوی ذاک وسواس الشیاطین

جوامع الکلم نبویہ

اور یہی معنی ہیں اس قول نبوی صلعم کے کہ علم صرف تین ہیں، ماسوا ان کے جو کچھ ہے فضل ہے، آیت محکمہ، سنت قائمہ، فریضہ عادلہ[5] اور یہ منجملہ جوامع الکلم نبویہ کے ہے کہ اس دنیا میں علم کی حقیقت اور اس کے حدود، مقاصد و مراتب و انواع کی نسبت جو کچھ بھی کہا جا سکتا ہے، وہ سب کچھ ان تین لفظوں میں جمع کر دیا گیا اور تبلا دیا گیا۔ ولکن ما یعقلها الا العالمون[6] وقدس اللّٰه روح القائل وهو حجة الاسلام ابن قیم اذ یقول فی النونیة الکبری[7]

العلم قال اللّٰه قال رسوله — قال الصحابة هم اولوا العرفان

ما العلم نصبک للخلاف سفاهة — بین الرسول وبین رأی فلان

کلا ولا عزل النصوص وانها — لیست تفید حقائق الایمان

---

[1] ایک حدیث کے الفاظ ہیں۔ یہ حدیث ابُو داؤد، ابن ماجہ، الدارمی وغیرہ نے روایت کی ہے [2] سورہ جمعہ آیت نمبر ۳ [3] سورہ نساء، آیت نمبر ۶۹ [4] ایک حدیث کا ٹکڑا جو بخاری، نسائی وغیرہ میں روایت کی گئی ہے [5] ایک حدیث نبوی کے مضمون کی طرف اشارہ ہے جو ابُو داؤد اور ابن ماجہ نے روایت کی ہے۔ [6] سورہ عنکبوت، آیت نمبر ۴۳ [7] حافظ ابن قیم کے ایک طویل قصیدے بہ عنوان "الکافیة الشافیه فی انتصار الفرقة الناجیه" کے چند شعر پُورے قصیدے میں ۵۸۲۸ شعر ہیں۔

اذلا تفید کم یقیناً لا، ولا — علماً، فقد عزلت عن الایقان
والعلم عندکم ینال بغیرھا — بزبالۃ الافکار والاذھان
سمیتموہ قواطعا عقلیۃ — لنفی الظواھر حاملات معان
کلا، ولا احصاء آراء الرجال — وضبطھا بالحصر والحسبان
کلا ولا التاویل والتبدیل — والتحریف للوحیین بالبھتان
کلا ولا الاشکال والتشکیک — والوقف الذی مافیہ من عرفان
ھذی علومکم التی من اجلھا — عادیتمونا یا اولی العرفان

وقال الشیخ الاکبر من جملۃ ابیات افتتح بھا الباب الثامن وثلاث مائۃ من الفتوحات:

کل علم یشھد الشرع لہ — فھو علم نبہ فلتعتصم
فاذا خالفہ العقل فقل — طورک الزم مالکم فیہ قدم

عدمِ یقین وبصیرت اور عوارضِ قلب و روح

اور سبب اس کا ظاہر ہے۔ قلب و روح کی جتنی بیماریاں بھی ہیں، اصل مبدا ان کا دو قسموں سے باہر نہیں۔ ایک قسم مرض کا نام الحاد و انکار ہے۔ دوسری کا توہم و سوفسطائیت۔ باقی تمام بیماریاں اسی کے اتباع و عوارض و فروع ہیں اور دونوں قسموں میں ظہورِ مرض کے علائم و آثار و عواقب مشترک ہیں یعنی دونوں کا نتیجہ شک و جہل و اضطراب اور فطرت کی طمانیت اور سرور و راحتِ قلبی کا ازالہ یعنی باصطلاح قرآن حکیم "نفس مطمئنہ" کا فقدان۔ پس مرض بلحاظِ علت و ظہور ہر حال میں صرف یہی ہوا کہ شک و ظلمت، اور اس عالم میں وحی الٰہی اور حکمتِ نبوت اور ان سے ماخوذ و مکتسب کے علاوہ جو کچھ ہے "یقین" "برہان" "بصیرت" اور "فرقان" نہیں ہے، شک و ظن ہے، عدم علم و بصیرت ہے، یا تخمین و رائے اور تلعب و تخرص بالریب ہے۔ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ [1] اور بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ يَّلْعَبُوْنَ [2] اور وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ثَانِيَ عِطْفِهٖ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ [3] اور هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا [4] اور اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ كَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ؟ (محمد[5]) اور وَمَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا (النجم[6]) اور قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ (آخر یوسف[7]) اور بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ (یونس[8]) مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ

---

[1] سورہ جاثیہ، آیت نمبر ۲۴ [2] سورہ دخان، آیت نمبر ۹ [3] سورہ حج، آیت نمبر ۸، ۹ [4] سورہ انعام، آیت نمبر ۱۴۸ [5] سورہ محمد، آیت نمبر ۱۴ [6] سورہ نجم، آیت نمبر ۲۸
[7] سورہ یوسف آیت نمبر ۱۰۸ [8] سورہ یونس، آیت نمبر ۳۹

مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (یوسف[1]) وغیر ذالک من الآیات والقواطع۔ اور اسی لیے دعوت خاتم الادیان ومکمل الشرائع کی نسبت اکثر خطبات نبویہ میں یہ اعلانِ عام پاتے ہو کہ اس کا ظہور کرۂ ارضی کے کمالِ جہل و فقدانِ علم کے وقتوں میں ہوا یعنی اس لیے ہوا تاکہ علم و نور سے دنیا کو بھرپور کر دے اور علم و نور نہیں ہے مگر یقین و زوالِ شک و ریب۔ علی الخصوص اولین خطبۂ جمعہ بالمدینہ میں فرمایا: ارسلہ بالھدیٰ والنور والموعظۃ علی فترۃ من الرسل، وقلۃ من العلم وضلالۃ من الناس الخ۔ اخرجہ الحاکم علی شرط الصحیحین والطبری فی تاریخہ[2]۔ پس ظاہر ہے کہ جن نام نہاد علوم کا ماحصل خود ظلمتِ ظن و شک اور کوری و ہم و رائے سے زیادہ نہیں، وہ مریضانِ یقین و اعتقاد کے لیے کیونکر نسخۂ شفا ہو سکتے ہیں؟ اور جو خود سرگشتۂ راہ اور واماندۂ کار ہے۔ وہ دوسرے گم کردہ راہوں کی کیا رہنمائی کر سکتا ہے۔؟

جوہر طینتِ آدم زخمیرِ دگر ست
تو توقع زگلِ کوزہ گراں می داری[3]

بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْهَا بَلْ هُمْ مِّنْهَا عَمُوْنَ (نمل[4]) مرض کا ازالہ دوا سے ہو سکتا ہے، نہ کہ خود تولیدِ مرض سے اگر دنیا کا اصل مرض "یقین" اور "بصیرت" سے محرومی ہے اور شک و گمان کی ہلاکت، تو اس کا علاج وہ کیوں کر کر سکتے ہیں، جن کا خود اعلان یہ ہے کہ ہمارا منتہائے فکر و ادراک اس سے زیادہ نہیں کہ "لا ادری ولا اعلم" ہم نہیں جانتے اور نہیں کہہ سکتے کہ کیا ہے اور کس لیے ہے! یعنی بحکم وَشَهِدُوْا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ[5] وہ خود اپنے منتہائے معرفت کو جہل سے زیادہ نہیں بتلاتے: اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ[6]۔

معلومم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد[7]

دارالشفائے وحی و حکمتِ نبوت

اس کا علاج اور نسخۂ شِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ[8] تو صرف اُسی اعلم الخلائق و اعرف العباد کے دارالشفائے وحی میں مل سکتا ہے، جو شک کی جگہ یقین کا، ظلمت کی جگہ نور کا، عدمِ علم کی جگہ علم البصیرت کا، ظن و قیاس و گمان کی جگہ بینہ و حجت کا، برہان و فرقان کا اور تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ[9] اور عروۃ الوثقیٰ کا۔ غرض کہ "لا ادری" اور "لا اعلم" کی جگہ "اِنِّیْٓ اَعْلَمُ" اور "اِنِّیْ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ[10]" اور "اِنِّیْٓ اَشْهَدُ" بلکہ "رأیت و سمعت" کا دعویٰ اور اعلان کر رہا ہو اور تمام نوعِ بشر کو یہ کہہ کر بلا رہا ہو: هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ[11]!

---

[1] سورہ یوسف، آیت نمبر ۴۰
[2] تاریخ طبری (تاریخ الرسل والملوک) ۲: ۲۵۵، ۱
[3] حافظ شیرازی کا شعر، بعض نسخوں میں جوہر کی جگہ گوہر کے اختلاف کے ساتھ صحیح شعر اس طرح ہے:

جوہرِ جامِ جم از کانِ جہانے دگر ست — تو تمنا زگلِ کوزہ گراں می داری

[4] سورہ نمل، آیت نمبر ۶۶ [5] سورہ انعام، آیت نمبر: ۱۳۰ [6] سورہ جاثیہ، آیت نمبر ۳۲ [7] عمر خیام کی ایک رباعی کا مصرع، رباعی یہ ہے۔

ہر چند دلم زعشق محروم نشد — کم ماند زاسرار کہ معلوم نشد
واکنوں کہ بچشمِ عقل دری نگرم — معلومم شد کہ ہیچ معلوم نشد

[8] سورہ یونس، آیت نمبر ۵۷ [9] سورہ نحل، آیت نمبر ۸۹ [10] سورہ انعام، آیت نمبر ۵۷ [11] سورہ یوسف، آیت نمبر ۱۰۸

اور تمام منکرین و جاحدین سے بار بار مطالبہ کرتا ہو: هَلْ عِنْدَكُمْ مِنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا[1]؟ یعنی یہ علم و یقین اور خروج من ظلمات الجہل الی نور المعرفۃ والحقیقۃ کی راہ ہے، جس پر میں تم کو دعوت دے رہا ہوں۔ پھر تمہارے پاس بھی کوئی "یقین" اور "علم و بصیرت" ہے، جس کو دنیا کے آگے پیش کر سکتے ہو؟ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْأَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ[2]؟ اور قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ[3] ایک کہتا ہے "میرے پاس شک ہے" اگر تم میری طرف آؤ، تو تم کو شک سے معمور کر دوں گا۔ دوسرا کہتا ہے کہ میرے پاس جو کچھ ہے بجز یقین اور برہان کے اور کچھ نہیں۔ لَا يَأْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ (حم سجدہ[4]) اور بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ (عنکبوت[5]) میں بصیرت ہوں۔ دعوت علم ہوں۔ پیام حجت و برہان ہوں حقیقت جو ایک سے زیادہ نہیں ہو سکتی، اس کی ایک ہی راہ ہوں۔ اقوام الطرق، اوضح السبل، صراط السوی: وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ[6] پھر بتلاؤ، دنیا کو، جو طمانیت و قرار قلب کی بھوکی پیاسی اور شک و اضطراب نفس کے زخموں سے جاں بلب ہے، کس کا ساتھ دینا چاہیے؟ اس کا جو خود شک و ریب کی تاریکیوں میں ٹھوکریں کھا رہا ہے، ایک تاریکی سے نکلنے کے لیے دوسری تاریکی میں ڈوبتا ہے، اور تاریکیوں کا یہ حال ہے کہ خود اپنا ہاتھ بھی سجھائی نہیں دیتا۔ ایک گتھی سلجھانا چاہتا ہے تو دس نئے الجھاؤ رشتۂ ادراک میں پڑ جاتے ہیں۔ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰىهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ اِذَاۤ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ؟ (نور[7]) اور جس کی ان ساری کوششوں اور طلب و جستجو کا جو حقیقت تک پہنچنے اور عقدۂ ہستی کو حل کرنے کے لیے کرتا ہے، یہ حال ہے کہ ہر نیا مرحلہ ایک نئی گمرہی کا پیام اور ہر منزل ایک نئے بُعد و گم گشتگی کی مایوسی ہوتی ہے۔ جس نظریے پر رُکتا اور جس تھیوری کو فاتح کار سمجھ کر دوڑتا ہے۔ جب اس تک پہنچتا ہے، تو یقین کی جگہ وہ خود ایک نئے شک کی دعوت نکلتی ہے، اور جواب کی جگہ وہ خود ایک نیا سوال ہوتی ہے، اور اس طرح اس کی ساری امیدیں اور ساری خوشیاں اس پیاسے کی امید سے زیادہ نہیں ثابت ہوتیں جو ریگستان افریقہ کو دجلہ و فرات سمجھ کر بے تحاشا دوڑ رہا ہو: كَسَرَابٍۢ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً حَتّٰۤى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْئًا (نور[8]) پس کیا کھوئے ہوؤں کو طلب دلیل و ہدایت میں اپنے ہی جیسے کھوئے ہوؤں کا دامن پکڑنا چاہیے؟ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ (حج[9]) اور لَبِئْسَ الْمَوْلٰى وَلَبِئْسَ الْعَشِيْرُ (حج[10])! یا پھر اس کا ساتھ دینا اور بلا چون و چرا سمع و اطاعت کا سر جھکا دینا چاہیے۔ جس کی ساری پکار اور سارے پیاموں کی بنیاد ہی یہ ہے کہ میں ظلمت نہیں، بلکہ سرتاسر نور ہوں۔ میں تاریکی میں ادھر اُدھر بھٹکنے والا قدم اور خود اپنے ہاتھ کو بھی نہ دیکھ سکنے والی آنکھ نہیں ہوں، بلکہ معرفت و شہادت کا اُجالا ہوں، نورانیت میں بے خوف لغزش و بے خطرۂ گم رہی، دوڑنے والا قدم ہوں اور دوپہر کی چمکیلی روشنی میں ایک ایک ذرہ تک کو دیکھ لینے اور پا لینے والی بینائی ہوں۔ السمحۃ الحنیفیۃ والحجۃ البیضاء۔ لیلہا کنہارہا

---

[1] سورہ انعام آیت نمبر ۱۴۸ [2] سورہ رعد، آیت نمبر ۱۶ [3] سورہ زمر، آیت نمبر ۹ [4] سورہ حم سجدہ، آیت نمبر ۴۲ [5] سورہ عنکبوت آیت نمبر ۴۹ [6] سورہ انعام آیت نمبر ۱۵۳ [7] سورہ نور، آیت نمبر ۴۰ [8] سورہ نور آیت نمبر ۳۹ [9] سورہ حج آیت نمبر ۷۳ [10] سورہ حج آیت نمبر ۱۳

یہاں ظُلُمَاتٌ بعضها فَوْقَ بَعْضٍ کا معاملہ نہیں ہے، بلکہ یمین و یسار، بالا و پست، اور مِنْ بَیْنَ یَدَیْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ بجز نور اور نُورٌ عَلٰی نُورٍ[1] کے اور کچھ نہیں ہے۔ وکان من دعائہ صلعم باللیل، اللّٰھُمّ اجعل فی قلبی نورا وفی لسانی نورا، وجعل فی بصری نوراً وفی سمعی نوراً، واجعل من خلفی نوراً، ومن امامی نوراً۔ وجعل لی من فوقی نوراً، ومن تحتی نوراً، اللّٰھُمّ اعطنی نوراً (مسلم[2]) نہ میری حقیقت بین آنکھ کے لیے زیغ ہے، نہ منزل شناس قدم کے لیے ٹھوکر: مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی لَقَدْ رَاٰی مِنْ آیَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰی[3] اور حدیث انس کہ "والذی نفسی بیدہ، لقد عرضت علی الجنة والنار آنفاً فی عرض ھذا الحائط وانا اصلی (بخاری[4]) اور حدیث اسماء بنت ابی بکر، در خطبۂ صلوٰۃ کسوف کہ ما من شئی لم أرہ الا وقد رأیتہ فی مقامی ھذا حتی الجنة والنار، واوحی الیّ انکم یفتنون فی القبور" الخ (رواہ البخاری[5]) اور ابیت عند ربی یطعمنی ویسقینی (رواہ الائمہ[6]) اور ان سب سے بھی بڑھ کر یہ کہ اتانی ربی فی احسن صورة (وفی روایة اتانی اللیلة ربی) فقال فیم یختصم الملاء الاعلی فقلت لا ادری فوضع کفہ بین کتفی حتی وجدت برد انامله بین ثدیی فتجلی لی کل شیء اخرجه جماعة منهم احمد و ترمذی[7] و صححہ۔ بلکہ جس حقیقت ہزار حجاب کا ایک سچا یا کم از کم سچائی سے قریب تصور بھی تم سے بن نہ آیا، میں نہ صرف اس کا سراغ ہی رکھتا ہوں بلکہ وہ تو میری دیکھی بھالی اور میرے سامنے کی مشہود و منظور ہے۔ حتی وجدت بردانامله بین ثدیی! اس کی انگلیوں سے چھونے کی ٹھنڈک اپنے سینے پر محسوس کر رہا ہوں۔ اس کے بعد اور کیا باقی رہ گیا؟ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی، فَكَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی۔[8]

جمالک فی عینی وحبک فی قلبی
وَذکرک فی فمی، فاین تغیب[9]؟

حقائق و معارف کتاب و سنت

تم نے اپنی درماندگیوں سے عاجز آ کر اس کا نام ہی ما فوق ادراک اور غیب رکھ دیا ہے حالانکہ یہاں تو اس کی مشہودیت کا یہ حال ہے کہ اس کا ذکر ہی "شہادت" کے لفظ سے کیا جاتا ہے جس کے معنی حضور و رویت کے ہیں: شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ (عمران[10]) تم اس کی طلب و جستجو کو گمان و خیال اور قیاس و ظن سے تعبیر کرتے ہو کہ اس سے آگے تمہارا قدم نہیں بڑھتا۔ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا[11] حالانکہ یہاں ظن و گمان کا کیا ذکر، ظن کو تو یہاں زندگی (ہدایت) کے دائرے ہی سے خارج اور موت (کفر) کا ہمنشین سمجھا جاتا ہے۔ یہاں تو اس کی نسبت جو کچھ کہا اور سمجھا جاتا ہے۔ اس کا نام ہی "ایمان" اور "ایقان" ہے یعنی عدم شک اور یقین صرف و بحت: یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِیْنَ وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَا جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ وَنَطْمَعُ اَنْ یُّدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِیْنَ (مائدہ[12]) اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّیْلِ سَاجِدًا وَّقَآئِمًا یَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ

---

[1] سورہ نور، آیت نمبر ۳۵ [2] صحیح مسلم میں مروی ایک دعائے نبویؐ۔ کتاب صلوٰۃ المسافرین میں بہت جگہ آئی ہے۔ [3] سورہ نجم، آیت نمبر ۱۷، ۱۸، [4] بخاری کے علاوہ مسلم، نسائی وغیرہ میں بھی یہ حدیث روایت کی گئی ہے [5] یہ حدیث بھی بخاری کے علاوہ مسلم، نسائی، ابن ماجہ وغیرہ میں روایت کی گئی ہے [6] بخاری، مسلم، ترمذی وغیرہ کے مختلف ابواب میں یہ حدیث بیان ہوئی ہے [7] مسند حنبل، سنن ترمذی، ابوداؤد وغیرہ میں یہ حدیث کچھ الفاظ کے اختلاف کے ساتھ

(باقی اگلے صفحے پر)

وَيَرْجُوا رَحْمَةَ رَبِّهِ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُوا الْأَلْبَابِ (زمر[1]) غرض کہ جس کا حال یہ ہو کہ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ[2] ان کا سانہ ہو کہ يُجَادِلُونَ فِي آيَاتِ اللَّهِ بِغَيْرِ سُلْطَانٍ[3] (مومن) اور بِغَيْرِ عِلْمٍ وَلَا هُدًى وَلَا كِتَابٍ مُنِيرٍ (حج[4]) تو کیا صرف وہی اکیلا نہیں ہے جس کی راہ دُنیا کے لیے امن و سلامتی کی راہ ہے اور جس کے ساتھیوں کے لیے نہ تو کبھی شک کی بے چینی ہے اور نہ جہل و ظلمت کا ہراس: لَا يَمَسُّنَا فِيهَا نَصَبٌ وَلَا يَمَسُّنَا فِيهَا لُغُوبٌ[5] أَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ آنَاءَ اللَّيْلِ سَاجِدًا وَقَائِمًا کے بعد فرمایا: هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ؟ تو اس سے معلوم ہُوا کہ معرفت و ایمانِ باری اور عِبَادَة وَتَبَتُّلٌ إِلَى اللهِ کی بنیاد علم اور دانستن ہے، کیونکہ اس سے بڑھ کر جاننا اور پہچاننا کیا ہوگا کہ جب ساری خلقت رات کے بسترِ عافیت پر سو رہی ہو، تو ایک عارفِ حق کو کسی جانے پہچانے ہُوئے کا عشق بسترِ راحت سے اُٹھاتا اور اپنے سامنے جھکاتا ہے! وہ اُس کی نظرِ رحمت کے لیے روتا ہے۔ اُس کی ہیبت و جبروت سے کانپتا اور تھراتا ہے۔ اس کے بخشش کے بڑھے اور کھلے ہُوئے ہاتھوں (بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوطَتَانِ) کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ کر بے اختیار طلب و سوال کا ہاتھ بڑھاتا اور بیقراریوں کی آوازوں میں پکارتا اور مانگتا ہے۔ اسی لیے دوسری جگہ فرمایا: إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ[6] کہ خوفِ الٰہی معرفتِ صفات کے بعد ہو سکتا ہے اور معرفت علم ہے، پس جو صاحبانِ علم ہیں، وہی اس سے ڈریں گے۔ غرض کہ قرآنِ حکیم کے نزدیک عبادت، علم و تعقل و ادراک ہے اور عصیان و غفلت جہل و سفاہت و کوری اور یہ موقع مزید تشریح کا نہیں (مولانا آزاد) یہی معنی ہیں ان آیاتِ کریمہ کے کہ أَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَأَحْيَيْنَاهُ وَجَعَلْنَا لَهُ نُورًا يَمْشِي بِهِ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَثَلُهُ فِي الظُّلُمَاتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِنْهَا ؟ (انعام[7]) اور أَفَمَنْ يَمْشِي مُكِبًّا عَلَىٰ وَجْهِهِ أَهْدَىٰ أَمَّنْ يَمْشِي سَوِيًّا عَلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ؟ (ملک[8]) اور أَفَمَنْ شَرَحَ اللَّهُ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ فَهُوَ عَلَىٰ نُورٍ مِنْ رَبِّهِ فَوَيْلٌ لِلْقَاسِيَةِ قُلُوبُهُمْ مِنْ ذِكْرِ اللَّهِ (زمر[9]) وَغَيْرِ ذٰلِكَ مِنَ الْآيَاتِ فِي هٰذَا الْبَابِ اور فی الحقیقت یہی وہ نُورِ حقیقت اور مشکوٰۃِ معرفت ہے، جس کو ایک عجیب و غریب اور جامع و مانع تمثیل مرکب میں واضح فرمایا کہ: مَثَلُ نُورِهِ كَمِشْكَاةٍ فِيهَا مِصْبَاحٌ الْمِصْبَاحُ فِي زُجَاجَةٍ الزُّجَاجَةُ كَأَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُوقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُبَارَكَةٍ زَيْتُونَةٍ لَا شَرْقِيَّةٍ وَلَا غَرْبِيَّةٍ يَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ نُورٌ عَلَىٰ نُورٍ يَهْدِي

---

[1] سورہ زمر، آیت نمبر ۹ [2] سورہ نجم، آیت نمبر ۳، ۴ [3] سورہ مومن، آیت نمبر ۳۵ [4] سورہ حج آیت نمبر ۸ [5] سورہ فاطر، آیت نمبر ۳۵ [6] سورہ [7] انعام، آیت نمبر ۱۲۲ [8] سورہ ملک، آیت نمبر ۲۲ [9] سورہ زمر، آیت نمبر ۲۲

روایت کی گئی ہے۔ [8] سورہ نجم، آیت نمبر ۹، [9] منصور حلاج کا شعر ہے۔ دیوان میں اس طرح ہے۔

مثالک فی عینی و ذکرک فی فمی

وحبک فی قلبی فاین تغیب ؟

[10] سورہ آلِ عمران، آیت نمبر ۱۸ [11] سورہ ص، آیت نمبر ۲ [12] سورہ مائدہ، آیت نمبر ۸۳، ۸۴

اللہُ لِنُورِہٖ مَنْ یَّشَآءُ وَیَضْرِبُ اللہُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ وَاللہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ (نور) اور یہ مقام منجملہ رُوح الروح معارف کتاب و سنت وحقیقۃ الحقائق قرآن و شریعت کے ہے جس کی طرف بہت کم توجہ کی گئی ہے۔ مگر اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ...... ارباب ذوق وصلاح کے لیے ایک اشارہ حقیقت کافی ہے۔ وَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِھِمْ مَّرَضٌ[2] تو ان کے لیے حقائق و معارف کے قناطیر مقنطرہ بھی بیکار ہیں وہ تو ہمیشہ یہی کہیں گے: مَاذَآ اَرَادَ اللہُ بِھٰذَا مَثَلًا[3] وما احسن واصدق ما قال العرفی الشیرازی۔

ہزار معجزہ بنمود عشق و عقل جہول
ہنوز راست اندیشہ ہائے خویشتن ست

(۴)

نسخۂ شفائے شک و ریب

غرض کہ امام ابن تیمیہ نے ایک ایسی حقیقت جو طبیعت کو جو ارباب ظن و رائے کی صحبتوں سے وادیٔ شک و اضطراب میں حیران و سرگرداں ہو گئی تھی' ان ساری باتوں میں سے ایک بات بھی نہیں کہی جو اور لوگ کہہ سکتے تھے، بلکہ صرف یہ وصیت کی کہ سیرت طیبۂ نبویہ کا مطالعہ کرو' یہی نسخۂ شفا شک و ریب کے سارے دکھوں کا ایک ہی علاج ہے' اور پھر قولاً بھی اپنی تمام مصنفات میں اسی چیز کو بنیاد و منبع ہر گونہ علم و ایقان بتلاتے ہیں' تو یہ بات بھی منجملہ انہی خصائص مقام وراثت نبوت کے ہے۔

حلیم بادواء النفوس یسوسها
بحکمته فعل الطبیب المجرب[1]

اور حقیقت یہ ہے کہ نہ صرف اُس عہد میں بلکہ جب تک دنیا باقی ہے' صاحب قرآن کی سیرت و حیات مقدس کے مطالعہ سے بڑھ کر نوع انسانی کے تمام امراض قلوب و علل ارواح کا اور کوئی علاج نہیں' اسلام کا دائمی معجزہ اور ہمیشگی کی حجۃ اللہ البالغہ قرآن کے بعد اگر کوئی چیز ہے' تو وہ صاحب قرآن کی سیرت ہے اور دراصل قرآن اور حیات نبوت معناً ایک ہی ہیں' قرآن متن ہے اور سیرت اس کی شرح۔ قرآن علم ہے اور سیرت اس کا عمل' قرآن صفحات و قراطیس ما بین الدفتین اور فِیْ صُدُوْرِ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ[2] میں ہے' اور یہ ایک مجسم و متمثل قرآن تھا، جو یثرب کی سرزمین پر چلتا پھرتا نظر آتا تھا۔ کما قالت الصدیقۃ رضی اللہ تعالیٰ عنها: وکان خلقه القرآن[3]

ما دو جانے آمدہ در یک بدن
من کیم؟ لیلیٰ، و لیلیٰ کیست؟ من[4]

---

[1] امام احمد بن حنبل کی مدح میں شیخ نجم الدین اسحاق بن ابی بکر المقری کے قصیدے کا شعر [2] سورہ عنکبوت' آیت نمبر ۴۹ [3] صحیح مسلم کی مشہور حدیث
[4] مولانا روم کا شعر ہے' مثنوی میں اس طرح ہے۔ من کیم؟ لیلی کیست؟ من   ما یکے روحیم اندر دو بدن

سیرت انبیاء۔ دلیل و برہان حق

انبیائے کرام کی زندگی سے بڑھ کر "یقین" اور "ایمان" کی پکار اور کیا ہو سکتی ہے؟ محال قطعی ہے کہ ایک صاحب استعداد سیرت نبویہ کا کوئی چھوٹا سے چھوٹا ٹکڑا بھی پیش نظر رکھتا ہو اور پھر شک و اضطراب نفس کا افسون ہلاکت اس پر کارگر ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے جابجا انبیائے کرام علیہم السلام کی نفس زندگی و وجود کو بطور ایک حجت و برہان کے پیش کیا ہے، نہ کہ محض بطور قصص و اظہار علم ماسبق و انبار با لغیب کے جیسا کہ عموماً سمجھا گیا ہے۔

قرآن حکیم کا کھلا کھلا دعویٰ یہ ہے کہ ہر نبی کی زندگی جس طرح شروع ہوئی اور جس طرح ختم ہوئی اور جو کچھ اس پر گزرا اور قولاً و فعلاً جو کچھ اس سے تعلق رکھتا ہے، ان میں سے ہر بات بجائے خود ایک دلیل اور برہان حق ہے۔ اس سے بڑھ کر اس حقیقت کے اثبات کے لیے اور کوئی دلیل یقینی و قطعی نہیں ہو سکتی کہ خدا ہے اور ساری اچھی اور حسین صفتوں سے متصف ہے اور اس نے جس طرح عالم ہستی اور مافیہا کو بنایا، اسی طرح اس کے لیے قوانین و نوامیس عمل و نتائج بھی بنائے اور وہ ہر حال میں اٹل ہیں۔ دنیا میں انسان زیادہ سے زیادہ اور قطعی سے قطعی یقین جن چیزوں پر رکھتا ہے اور جن وسائل سے ان کے یقینی ہونے کو مانتا ہے، قرآن کی یہ دلیل ان سب سے زیادہ قطعی اور سب سے زیادہ روشن و محکم ہے، اور اگر یقین کے لیے یہ دلیل کافی نہیں، تو پھر اس دنیا میں یقین کا وجود ہی نہیں حتیٰ کہ دوپہر کے وقت چمکتے ہوئے سورج کا بھی نہیں، اور جسم کے ایک ایک مسام سے چھوتی اور لگ کر چلنے والی ہوا کا بھی نہیں، اگر تم کہتے ہو کہ دنیا میں صرف انہیں باتوں کو ماننا چاہیے جو "یقینی" ہوں اور "ثابت" "شدہ" یعنی تم اعتقاد کے لیے صرف "امکان" کو کافی نہیں سمجھتے، اثبات کے طلب گار ہو تو جب بھی دنیا میں الکلم الطیب اور العمل الصالح سے بڑھ کر اور کون سی ثابت و واقع حقیقت ہو سکتی ہے؟ خود تمہارا وجود اور اثبات "انا" بھی اس سے زیادہ ثابت و مشہود نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے جابجا دعوت الی الوحی کو "قول الثابت" اور "دین القیم" اور "الواقع" اور "الثابت"[1] وغیرہا سے تعبیر کیا ہے گو لوگ دوسری طرف چلے گئے۔ بہرحال حضرت نوح کا وجود بجائے خود ایک دلیل و اثبات ہے، حضرت ابراہیم اپنی ذات کے اندر خود ایک حجت قائمہ اور آیت کاملہ ہیں، حضرت موسیٰ کی پوری زندگی صرف اس ایک لفظ میں بتلا دی جا سکتی ہے: برہان محکم و دلیل ثابت اور اسی طرح تمام انبیاء و مرسلین اور بوجہ ان کی تبعیت و معیت کے تمام نفوس صادقہ بشر من الصدیقین والشہداء والصالحین علیہم الصلوٰۃ والسلام کی زندگیاں اور زندگی کے تمام وقائع و اعمال بجائے خود ایک مستقل دلیل و برہان حق ہیں اور اسی طرح ہر نبی کا تنہا وجود سینکڑوں دلیلوں اور ہزاروں شہادتوں کا مجموعہ ہے۔ اسی لیے قرآن حکیم ان کا استشہاداً و استدلالاً ذکر کرتا اور ان کو "آیت" اور "بینہ" سے تعبیر کرتا اور اسی طرح گویا ہر ایک تذکرہ و حکایت حیات نبوت وما جاء بالحق میں دنیا کے سامنے صدہا دلیلیں اور روشنیاں چمکا دیتا ہے۔

وقائع و اعمال حیات نبوت۔ حجۃ اللہ البالغہ

علی الخصوص یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے جابجا حضرت ختم المرسلین و صاحب اسوۂ حسنہ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کو بطور ایک مستقل دلیل و شاہد ثابت کے پیش کیا ہے اور نہایت کثرت کے ساتھ ان کی سیرت و سوانح اور وقائع و ایام پر مختلف پیرایوں اور مختلف لواحق اور روابط کے ساتھ بار بار توجہ دلائی ہے اور بسا مقامات میں ایسا بھی ہے کہ:

[1] یہ الفاظ جن سے یہاں دعوت الٰہی والی الوحی کا استشہاد کیا گیا ہے، سورۃ ابراہیم، یوسف، روم اور ذاریات میں آئے ہیں۔

گفتہ آید در حدیث دیگراں[۱]

کا معاملہ ایک کیفیتِ خاص اور لذتِ اشارات ارباب راز و نیاز کے ساتھ اصحابِ نظر و ذوق کے لیے قرۃ عیون اور سرورِ انفس و قلوب کا حکم رکھتا ہے۔ حتیٰ کہ بعض عرفا و اصحابِ اشارات نے کہا۔ بائے بسم اللہ سے سین، والناس تک جو کچھ ہے، اگو حکایت موسیٰ کلیم کی ہو اور یوسف صدیق کی (صلوٰۃ اللہ علیہما) لیکن ان سب سے مقصود ایک ہی ہے، اور گو نام دوسروں کے ہوں مگر روئے سخن اسی طرف ہے:

چشم سوئے فلک و روئے سخن سوئے تو بود[۲]

اور اردو میں کسی نے خوب کہا ہے:

نام اُن کا آسماں ٹھہرا لیا تحریر میں[۳]

الکنایۃ ابلغ والذ من التصریح:

خوشتر دل کش ست قصۂ خوبان روزگار
تو یوسفی و قصۂ تو احسن القصص[۴]

اور اگر اس بات کو بابِ اشارات سے باہر بھی دیکھا جائے، جب بھی اس کی صداقت میں کلام نہیں جب تمام انبیائے کرام علیہم السلام کا وجود اصلاً ایک ہی اصل حقیقت پر مبنی اور اپنے مقاصد و اعمال و وقائع میں جزءً و کلاً ایک ہی سلسلۂ بعثت کی مختلف کڑیاں اور ہم رنگ و ہم معنی اشکال و صور ہیں، اور اسی لیے باہم دگر یک قلم اشباہ و نظائر کا حکم رکھتے ہیں، بحدے کہ بوجہ کمال اشتراکِ صورت و معنی اگر ایک کڑی شادی جائے تو دوسری ٹھیک ٹھیک اس کی جگہ جڑ جائے۔

منتہائے مرتبہ سیادت

اور معلوم ہے کہ اس سلسلہ کی آخری کڑی یعنی وجودِ مقدس حضرتِ خاتم الادیان و مکمل الشرائع و متمم النعم ساری پچھلی کڑیوں کا جامع اور اسی لیے بحکم انا سید ولد آدم[۵] اور لو کان موسیٰ حیاً ما وسعہ الا اتباعی اور نصوص قرآنی کہ کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ[۶] اور اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ[۷] الخ اور فَکَیْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ کُلِّ اُمَّۃٍ بِشَہِیْدٍ وَّجِئْنَا بِکَ عَلٰی ھٰٓؤُلَآءِ شَہِیْدًا[۸] منتہائے مرتبہ سیادت و قیادت عالم و مرکزیت رسل و شرائع و افضلیت کلی نوع سے فائز و ممتاز ہے۔

---

[۱] مثنوی مولانا روم کا شعر ہے پہلا مصرع یہ ہے: خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں۔

[۲] مرزا غالب کا شعر، جس کا مصرع اول یہ ہے: روش کہ بجر گردش بخشم نگہ بر رُئے تو بود

[۳] نواب رامپور یوسف علی خاں ناظم کے ایک شعر کا مصرع ثانی، مصرع اولیٰ یہ ہے

اب لکھیں گے شکوہ بیدادِ ہم دل کھول کر

[۴] مولانا جامی کا شعر ہے جس کا مصرع اولیٰ اس طرح ہے

بس دلکش است قصۂ خوباں وزان میاں

[۵] سنن ابی داؤد، مسند احمد حنبل کی ایک روایت [۶] سورہ آل عمران آیت نمبر ۱۱۰ [۷] سورہ مائدہ آیت نمبر ۳ [۸] سورہ نسا آیت نمبر ۴۱ (باقی اگلے صفحہ پر)

بطرازِ زندگی قامتِ موزوں نازم
یک قبا نیست کہ شائستہ اندام تو نیست[1]

جامعیت کبریٰ

تو لامحالہ باب فضائل و مقامات اور قصص و حکایاتِ مناقب و برکات میں جو کچھ قرآن حکیم نے بیان کیا ہے، یا جو کچھ صدق لسان و تحقیق بیان کے ساتھ اس بارے میں کہا جائے گا۔ وہ گو بلا واسطہ دوسروں کی حکایت ہو، مگر بالواسطہ متعلق اسی وجودِ اجمع و اکمل سے ہوگی، اور جب کبھی خاص اس وجودِ جامعیت کی نسبت کچھ کہا جائے گا، تو گو اس میں دوسروں کا ذکر لفظاً نہ آئے، لیکن حال یہ ہوگا کہ گویا تمام انبیاء و مرسلین بلکہ نوعِ انسانی کے تمام افرادِ فضیلت اور جماعتِ مَنْ اَنْعَمَ اللہُ علیہم[2] کے تمام اشخاصِ مراتب و کمال میں سے ایک ایک فرد کا ذکر کر دیا گیا، اور وہ سب کچھ آگیا اور سمیٹ لیا، جو ان کے بارے میں کہا جا سکتا تھا۔ جب باغ و چمن کا نام لیا، تو گو تم نے نہ پھولوں کا نام لیا ہو، نہ ان کی رنگت و بو کا، نہ نہروں کا ذکر کیا ہو، نہ ان کی نضارت و سیرابی کا، لیکن خود بخود اُن سب کا ذکر آگیا اور اس ایک نام کے ساتھ وہ سارے نام لے لیے گئے، اور جب تم نے کہا تختۂ گل، ہوائے عطر بیز، نظارۂ انہار و اشجار، بنفشہ و سنبل و یاسمن، تو اب تم باغ و چمن کا نام لو یا نہ لو، مگر اس کا نام تو تم نے ان ناموں میں سے ہر نام کے ساتھ لے ہی لیا،

---

[1] ان آیاتِ کریمہ سے فضیلت و سیادتِ حضرت ختم المرسلین کا یُوں اثبات ہُوا کہ اُمّتِ مسلمہ کو ساری اُمّتوں سے بہتر فرمایا اور شریعتِ محمدی کو تکمیلِ ادیان اور اتمامِ نعمت قرار دیا اور ظاہر ہے کہ مطیع کی افضلیت مستلزمِ افضلیتِ مطاع اور نعمت کا تمام نعمِ سابقہ سے اعلیٰ و اتم ہونا حاملِ مبلغ نعمت کے اعلیٰ و افضل ہونے پر دال ہے۔ اگر آخری شریعت تمام پچھلی شریعتوں کی جامع اور اس لیے ان سب سے افضل ہے۔ اگر آخری امت ساری پچھلی اُمّتوں کے برکات و نعم سے مالا مال اور اس لیے اُن سب سے اشمل و اصلح ہے، اور اگر اسی طرح شریعتِ آخری کے ظہور و زمان و مکان و قوام و اعمال کی ساری باتیں پچھلی امتوں کی ان ساری باتوں پر فوقیت و فضیلت رکھتی ہیں، تو یہ بغیر اس کے ممکن نہیں کہ اُمّتِ آخری کا رسول و مقوم بھی سارے پچھلے رسولوں کے مراتب و مقامات کا جامع اور اس لیے اُن سب سے افضل و مافوق، اور "آنچہ خوباں ہمہ دارند، تو تنہا داری" کا مصداق ہو۔ کتاب و سُنّت کی نصوص و تصریحات اس بارے میں بیشمار ہیں: تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ کی تفسیر میں اس مطلب کو کمال شرح و بسط اور شاید ایک طرزِ تازہ و استدلال جدید کے ساتھ لکھا جاتا ہے، اور حقیقت جامعیتِ رسالتِ محمدی، و جامعیت شریعتِ اسلامیہ و جامعیتِ اُمّتِ مسلمہ اور جامعیت جمیع ما یتعلق بہا پر ایک خاص اسلوب نظر سے بحث کی گئی ہے باقی رہا لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ تو وہ معاملہ دوسرا ہے۔ تفریق بین الرسل کو مسئلہ تفضیل سے کوئی تعلق نہیں، اسی طرح لا تفضلونی علی یونس بن متی و غیر ذالک تو اس نہی کا مورد و محل بھی دوسرا ہے اور منہی عنہ معاملہ تفضیل میں وہ تکلم ہے جو منجر بہ تفریق بین الرسل ہو، جس نے تمام امم سابقہ کو گمراہ کیا، نہ کہ نفسِ تفضیل، کیونکہ انا سید ولد آدم ولا فخر اور آدم وما دونہ تحت لوائی کے بعد اور کیا باقی رہ گیا؟ اور پھر قطع نظر قرآن حکیم کے، خود نصوصِ سنت اس بارے میں بیشمار و معلوم

[1] نظیری کا شعر ہے لیکن مطبوعہ کلیات نظیری میں بطرازِ زندگی کی جگہ "بیرازِ زندگی" لفظ ہے۔

[2] سورہ نساء کی آیت نمبر ۶۹ کی طرف اشارہ ہے۔

اور گو بظاہر ذکر بنفشہ وسنبل اور اشجار و انہار کا تھا مگر فی الحقیقت ذکر ان سب کا نہیں بلکہ صرف ایک ہی حقیقتِ جامعہ کا تھا یعنی باغ وچمن کا۔ مولانا[1] کے اشارات اس مقام کی نسبت از بس لطیف و پُر ذوق واقع ہوئے ہیں۔ ازاں جملہ کیا خوب فرمایا:

نامِ احمد نام جملہ انبیاست
چونکہ صد آمد نود ہم پیش ماست

جب "سو" کہہ دیا، تو اب ایک سے ننانوے تک جو کچھ ہے سب آگیا، اور جب کہا ایک دو۔ دس۔ پچاس، تو فی الحقیقت ذکر "سو" ہی کا ہُوا۔ قرآن حکیم میں یا احکام ہیں، یا مواعظ و حِکَم ہیں، یا شرحِ قوانینِ ہدایت وضلالت، اور یا پھر قصص الاوّلین، تو معلوم ہے کہ اگر احکام ہیں تو اُسی شریعت کے جس کا حامل سیدالمرسلین ہے۔ مواعظ و حکم ہیں، تو وہی ہیں جن کی عملی تصویر و اسوۂ کاملہ وجودِ سیدالمرسلین ہے۔ قصص ہیں تو انہی فضائل و مراتب کے جو سب کے سب مرتبۂ جامعیتِ محمدی میں بوجہ اتم و اکمل جمع ہوگئے۔ پس اگر حضرات صوفیائے کرام نے تمام قرآن کو اسی ایک حسنِ اکمل و جمالِ بے ہمتا کی حکایتِ شمائل و شرحِ سراپا کہا، تو قطع نظر فسحتِ میدانِ اشارات کے، ویسے بھی یہ کیوں موجبِ قدح و شک ہو؟ حق یہ ہے کہ "قرآن اور" صاحبِ سُنّت" کی باہمی یگانگت و اتحاد کے باب میں جو کچھ بھی اور جس قدر بھی کہا جائے۔ اس سے بہت کم ہے جس قدر کہنا چاہیے: ولله درما قال:

ماشئت قل فیہ، فانت مصدق
فالحب یقضی والمحاسن تشھد

بلکہ اس مقام پر حق تو وہ ہے جو شیخ ابن الفارض نے کہا۔ طاب اللہ مضجعہ

وعلی تفنن واصفیہ بوصفہ — یفنی الزمان وفیک مالم یوصف

وَقَالَ الصاً رحمۃ اللہ:

ارٰی کل مدح فی النبی مقصرا — وان بالغ المثنی علیہ واکثرا
اذا اللہ اثنی بالذی ھو اھلہ — علیہ فما مقدار مایمدح الوریٰ

خصائصِ قرآن کا ایک عظیم الشان پہلو

اور اگر خاص طور پر اس معاملہ کو دیکھا جائے، تو فی الحقیقت یہ چیز بھی منجملہ خصائصِ قرآن وصاحبِ قرآن کے ہے۔ آج تمام ادیانِ حاضرۂ عالم میں کوئی دین بھی ایسا نہیں جس کی کتابِ الٰہی اور صاحب و حاملِ کتاب کے باہمی علاقۂ وحدت کا یہ حال ہو اور دونوں میں سے ہر وجود ایک دوسرے سے اس طرح پیوستہ و ملحق اور باہم دگر شاہد و مشہود کا تعلق رکھتا ہو کہ کتاب، حاملِ کتاب کی صداقت پر دلیل و شاہد ہو اور حاملِ کتاب اصل کتاب کی صداقت پر:

ایں دو شمع اند کہ از یک دگر افروختہ اند[2]

---

[1] "مولانا" کے لفظ سے اشارہ مولانا روم کی طرف ہے۔ آگے اُن کا ایک شعر بھی مثنوی کے دفترِ اوّل سے آیا ہے

[2] عرفی کا مصرع۔ مکمل شعر اس طرح ہے:
از ازل حسن و محبت بہم اندوختہ اند
در چراغِ اند کہ از یک دگر افروختہ اند

حتیٰ کہ اگر تاریخ شریعت کے تمام وسائل معدوم ہو جائیں اور روایت و حکایت کے تمام صحائف سے قطع نظر کر لیا جائے جب بھی صاحب شریعت کے وجود و سیرت کی تاریخی حقیقت اسی طرح روشن و تبن باقی رہے جس طرح تاریخ و روایت کے دفاتر میں ہے اور اگر دنیا چاہے، تو اس کی پوری سوانح عمری اور تاریخ حیات صرف ایک کتاب اللہ کی لوح محفوظ اور کتاب قیم ہی سے بلا ایک نقطہ کی فروگذاشت کے مرتب کرلے!

(۵)

قرآن حکیم اور سیرت طیبہ

لوگوں نے حیات و سیرت طیبہ ختم المرسلین صلعم، پر اس حیثیت سے بہت کم نظر ڈالی ہے کہ اگر روایات و دفاتر تاریخی سے قطع نظر کر لیا جائے اور صرف قرآن حکیم ہی کو سامنے رکھا جائے تو آپ کی سیرت و حیات پر کیسی روشنی پڑتی ہے! اور جس طرح قرآن اپنی کسی بات میں اپنے غیر کا محتاج نہیں؟ اسی طرح اپنے حامل و مبلّغ کے وجود و حیات کے بیان میں بھی خارج کا محتاج ہے یا نہیں! اصحاب سیر و محدثین کرام نے فضائل و مدائح منصوصۂ قرآنیہ کے تو باب باندھے ہیں، مثلاً قاضی عیاض نے "شفا" کے متعدد ابواب میں قرآن حکیم کی آیات متعلق فضائل و مدائح جمع کی ہیں، لیکن، جہاں تک مجھے معلوم ہے آج تک کبھی اس کی کوشش نہیں کی گئی کہ صرف قرآن حکیم میں دائرہ استناد و اخذ محدود رکھ کر ایک کتاب سیرت میں مرتب کی جائے۔ جس زمانہ میں مولانا شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ سے سیرت نبویہ کے بارے میں تذکرے رہتے تھے، تو ایک مرتبہ مجھے اس کا خیال ہوا تھا۔ میں نے کہا آپ سیرت، میں ایک خاص باب یا سیرت کا ایک خاص حصہ اس عنوان سے قرار دیجیے: "قرآن اور سیرت محمدیہ" اور اس میں صرف آیات قرآنیہ کو بہ ربط و ترتیب جمع کر کے دکھلائیے کہ خود قرآن سے کہاں تک آپ کی شخصیت اور آپ کے وقائع و ایام معلوم ہو سکتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے، ان کی طبیعت میں ایک خاص بات یہ بھی کہ کوئی معاملہ ہو وہ اس کی ابتدا ہمیشہ شک اور تردد سے کیا کرتے تھے اور جب تک یقین کے لیے مجبور نہ ہو جائیں یقین نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے اس خیال پر بہت ہی پسندیدگی ظاہر کی مگر وہی اپنی عادت کے مطابق اظہار شک و ناامیدی کہ آتنا مواد صرف قرآن سے کہاں نکل سکتا ہے کہ سیرت کا ایک باب مرتب ہو سکے! لیکن جب میں نے بہت اصرار کیا، تو کہا اچھا اگر یہ ٹکڑا مرتب کر دو، تو سیرت کے ساتھ شامل کر دیا جائے۔ آخری یکجائی دہلی میں ہوئی تھی، اُس وقت انہوں نے کہا: اب مجھ کو بھی خیال ہوتا جاتا ہے کہ یہ ممکن ہے اور بہت ہی اہم چیز ہوگی۔ چنانچہ دہلی سے آکر میں نے کچھ وقت اس میں صرف کیا اور ایک مستقل سیرت نبویہ مجرد قرآن حکیم سے ماخوذ و مستنبط شروع کر دی۔ جوں جوں قدم آگے بڑھتا گیا۔ نئے نئے دروازے کھلتے گئے، اور امید و توقع سے کہیں زیادہ کامیابی ہوئی۔ گو یہ حقیقت پہلے سے پیش نظر تھی، حتیٰ کہ اس بارے میں بڑا ذخیرہ آیات کا ذہن پر مستحضر تھا، لیکن یہ بات تو کبھی وہم و گمان میں بھی نہیں گزری تھی کہ جس کتاب کو بظاہر جا بجا ذکر احکام و مسائل و قصص گذشتگان سے مملو پاتے ہیں، اس میں اس قدر وافر ذخیرہ خاص شخص رسالت کے حالات و وقائع کا بھی موجود ہوگا۔ کتاب کے مرتب ہو جانے کے بعد جو دیکھا، تو ایک عجیب عالم نظر آیا۔ حیات و سیرت کا کوئی ضروری ٹکڑا ایسا نہیں ہے، جس کے لیے قرآن میں ایک سے زیادہ آیات نہ ہوں۔

قرآن حکیم اور حالات و خصائص صحابہ کرام

اور پھر نہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی سیرت بلکہ صحابۂ کرام کے حالات و خصائص کا بھی کافی ذخیرہ موجود ملا۔ صحابہ کی جماعت درگاہ

تزکیہ و تعلیم نبوت سے نکل ہوئی مومنون الاوّلون کی اولین جماعت تھی وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ [1]
اس لیے اُن کے سوانح و ایّام بھی سیرتِ نبویہ ہی کے مختلف اجزا ہیں بلکہ ہدایتِ قرآنی و حکمتِ نبویؐ کے عملی و مجسّم ثمرات ہونے کے لحاظ سے دلائل و آیاتِ نبوت کے حکم میں داخل۔ پس یقیناً آپ کی سیرت مکمل نہ ہوتی۔ اگر اُن کے حالات بھی قرآن میں پُوری شرح و تفصیل سے نہ ملتے

قرآنی سیرتِ نبویؐ

اس ٹکڑے کو دیکھ کر مجھ کو آخری مرتبہ یقین اس بارے میں حاصل ہو گیا کہ اگر دنیا سے تاریخِ اسلام کی ساری کتابیں معدوم ہو جائیں اور دُنیا نے جو کچھ چھٹی صدی عیسوی کے ایک ظہورِ دعوت کی نسبت سُنا ہے وہ سب کچھ بھلا دے اور صرف قرآن ہی دُنیا میں باقی رہے، جب بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیتِ مقدسہ اور آپ کی سیرت و حیات کے براہین و شواہد مِٹ نہیں سکتے۔ صرف ایک قرآن ہی اس کے لیے بس کرتا ہے کہ وہ ہمیشہ دنیا کو بتلا دے کہ اس کا لانے والا کون تھا؟ کیسے زمانے میں آیا؟ کس ملک میں پیدا ہُوا؟ اس کے خویش و بیگانہ کیسے تھے؟ قوم و مرز و بوم کا کیا حال تھا؟ اس نے کیسی زندگی بسر کی؟ اس نے دُنیا کے ساتھ کیا کیا اور دنیا نے اس کے ساتھ کیا کیا؟ اس کی باہر کی زندگی کیسی تھی اور گھر کی معاشرت کا کیا حال تھا۔ اس کے دن کیسے بسر ہوتے تھے اور راتیں کن کاموں میں کٹتی تھیں؟ اس نے کتنی عمر پائی؟ کون کون سے اہم واقعات و حوادث پیش آئے؟ پھر جب دنیا سے جانے کا وقت آیا، تو دنیا اور دنیا والوں کو کس حال میں چھوڑ گیا؟ اس نے جب دنیا پر پہلی نظر ڈالی تھی، تو دنیا کا کیا حال تھا؟ اور جب دا پسیں نظرِ وداع ڈالی تو وہ کہاں سے کہاں تک پہنچ چکی تھی؟ غرض کہ ایک وجود و مقاصدِ وجود اور اعلامِ صداقت و عظمت کے لیے اس کے وقائع وما یتعلق بہما و ما یناسب ذلک میں سے جن جن باتوں کی ضرورت ہو سکتی ہے، وہ سب کچھ صرف قرآن ہی کی زبانی دنیا معلوم کر سکتی ہے اور اس بارے میں بھی قرآن اپنے سے باہر کا ابداً محتاج نہیں۔ اور پھر یہ سب کچھ از قبیل اشارات و رموزات نہیں ہے جیسا کہ ارباب نکات و دقائق کا طریق استنباط ہے بلکہ صاف صاف اور کھلا کھلا بیان جو فقہا کے طریق استنباط اشارۃ النّص سے کہیں زیادہ واضح و ظاہر ہے۔ اور اگر رموز و اشارات و تلمیحات کا طریق اختیار کیا جائے تو پھر خاص خاص آیتوں کو چھانٹنے کی کیا ضرورت؟ پورے قرآن میں بجز اس ایک ذکر کے اور کوئی ذکر ہی نہیں ہے!

وکل الی ذاک الجمال یشیر [2]!

اگر غور کیا جائے تو فی الحقیقت یہ معاملہ بھی منجملہ مہمات خصائص و اعجاز قرآن کے ہے۔ کسی پیغام کی صداقت جانچی نہیں جا سکتی، جب تک پیغام لانے والے کی صداقت و امانت نہ جانچی جا سکے اور وہ ممکن نہیں، جب تک اُس کی پُوری زندگی اور زندگی کے وقائع و اعمال دنیا کے سامنے نہ ہوں۔ پس اس اعتبار سے آج تمام عالم میں اگر کوئی صحیفۂ آسمانی ایسا ہے جو اپنے لانے والے کی زندگی کے وقائع و سوانح ہر زمانے اور ہر عہد میں خود اپنی زبانی سنا دے سکتا ہے تو وہ بحکم هَٰذَا كِتَابُنَا يَنطِقُ عَلَيْكُم بِالْحَقِّ [3] بجز قرآنِ حکیم و محفوظ کے اور کوئی نہیں، اس کے علاوہ جس قدر کتب سماویہ رفتہ اعتقادنا او فی زعمہم، موجود ہیں وہ یا تو اپنی صداقت کی اور ساری باتوں کی طرح اس بارے میں بھی بالکل خاموش و منظلم ہیں، حتیٰ کہ اپنے لانے والوں کے وجود کے اثبات سے بھی عاجز، اور اگر اس کی شخصیت کا ذکر کرتی بھی ہیں تو ایسے مجہول و سراپا شکوک و ارتیاب

---

[1] سورہ آل عمران، آیت نمبر ۱۶۴ نیز سورہ جمعہ آیت نمبر ۲ میں یہ مضمون آیا ہے

[2] شاعر کے نام کا پتا نہیں چل سکا۔ مصرع اولیٰ یہ ہے: عباراتنا شتیٰ وحسنک واحد [3] سورہ جاثیہ آیت نمبر ۲۹

شکل میں جس سے اثبات کی جگہ اور زیادہ سلب و نفی کا یقین پیدا ہو جاتا ہے اور پھر جب اس لحاظ سے دیکھا جائے کہ آج دنیا میں شہرت و تواتر، نقل و حفظ و روایت، اور توارثِ اسناد و قرأت، و تعامل کروڑ ہا نفوسِ عالم نسلاً بعد نسلٍ و حیناً بعد حین، و تلاوتِ اوقاتِ خمسہ لیل و نہار و فضلاً عن غیر تلاوت و تدبرہ فی کلِ حین و آن کے اعتبار سے صرف یہی ایک کتاب قطعی و یقینی اور محفوظ و غیر مبدل ہے۔ بحیث لا یاتیہ الباطل من بَیْنِ یَدَیْہِ وَلَا مِنْ خَلْفِہٖ[1] و اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ[2] و بَلْ ھُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِیْدٌ فِیْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ[3] و فِیْ صُدُوْرِ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ[4] و غیر ذالک من قواطع الحفظ والصیانۃ، اور اسی لیے علی وجہ الارض اسم و علم الکتاب " کا مستحق اور کوئی نہیں، تو پھر ظاہر ہے کہ جس وجود و شخصیت اور اس کی حیات و سیرت کا اثبات و اعلام اس کتاب کے اندر ہو گا اس کے وجود و سیرت سے بڑھ کر سمار دنیا کے نیچے اور کون سی انسانی ہستی قیامت تک کے لئے اثبت و اقوم ہو سکتی ہے ؟ اور دنیا اپنی ہدایت کے لیے اگر کسی انسان کے آگے جھک سکتی ہے، تو اس انسانیتِ کبریٰ و عبدیتِ اعلیٰ و بشریتِ واحدہ کے سوا اور کون انسان ہے، جس پر آنکھوں سے دیکھنے والوں کی طرح ہمیشہ یقین کیا جا سکتا ہے ؟ اور جس پر ایمان لانے کے لیے پچھلی امتیں اور نسلیں بھی پہلوں کی طرح قطعی و یقینی روشنی رکھتی ہیں ؟ اور پھر جس وجود کی سیرت و حیات قیامت تک کے لیے اس طرح محفوظ و ثبت کر دی گئی ہو، علاوہ اُن نقوشِ غیر فانی کے جو صفحۂ عالم پر ثبت ہیں، اور جس کی زندگی کے وقائع طیبہ کو اس طرح سورج کی دائمی روشنی اور ستاروں کی یکساں سیر و حرکت کے دامن سے باندھ دیا ہو کیوں اس خاکدانِ جسم و زمان میں اس کی موت و حیات یکساں ہو؟ اور کیوں آپ کی دائمی حیات و قیام کے عقیدہ سے انسان کے تاریک دلوں کو انکار اور غافل روحوں کو گریز ہو ؟

دائرہ حقیقت محمدیہ

فی الحقیقت یہی معنی ہیں دیگر صدہا معانی و حقائق ثابتہ کے ساتھ اس رفعِ ذکر کے کہ وَرَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ[6] اور یہی وہ مقام ہے کہ جب اصحابِ کشف و مشاہدات کے سامنے کھلا تو انہوں نے "حقیقتِ محمدیہ" کے احاطۂ حیات اور عدمِ زوال و بقار و استمرار کو تمام انبیائے کرام کے حقائق تعینات سے مافوق، اور بوجہ دائرۃ الدوائر اور مرکزِ ادوارِ تعینات مابعد اور نقطۃ الحیات فی الاصل والحقیقت ہونے کے تمام انوارِ تعینات و وجود کو اس کی نورانیت کے سامنے بے فروغ و ماند پایا اور اسی لیے شیخِ اکبر نے اس کو تعینِ اول اور موردِ صحیح اصطلاح "عقلِ اول" کا قرار دیا اور پھر انسانِ کامل " اور " روحِ اعظم " اور " نفسِ واحدہ " اور " قلم الاعلیٰ " اور " نور الانوار " اور " نفس الکائنہ " سے بھی اس کو تعبیر کیا گیا کہ بلحاظِ بقاء ذکر و دوامِ فیضان و حیات وہی ایک الانسان الکامل روح الاعظم اور النفس الواحدہ والکائنہ ہے اور حیاتِ معنویہ مستمرۂ نوع وارض کی مرکزیت صرف اُسی کو پہنچتی ہے اور اسی لیے قرآن حکیم نے صرف اسی وجود کو " العبد " سے تعبیر کیا کہ ساری عبودیتیں آنی و وقتی ہیں، مگر صرف یہی وہ عبودیتِ کاملہ و واحدہ ہے جو ہمیشہ عباد و معبود میں واسطۂ ہدایت اور ہمیشہ عبد کو معبود سے واصل کر دینے کے لیے حی و قائم ہے قال العارف البوصیری

منزہ عن شریکٍ فی محاسنہ ۔۔۔ فجوھر الحسن فیہ غیر منقسم

---

[1] سورہ حم سجدہ، آیت نمبر ۴۲ [2] سورہ حجر، آیت نمبر ۹ [3] سورہ بروج، آیت نمبر ۲۱، ۲۲ [4] سورہ عنکبوت، آیت نمبر ۴۹

[6] سورہ الانشراح، آیت نمبر ۴۔

اور چونکہ نوعِ انسانی کی سعادت و تنویر کا مرکز و مبدء وجود انبیائے کرام ہے اور حقیقتِ محمدیہ بحکم وَجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا[1] ان سب سے مافوق اور شمس و کواکب اور صباح و مصباح کے معاملہ کا حکم رکھتی ہے، اس لیے حیاتِ قائمہ و دائمہ کا نور الانوار اور مصباح المصابیح صرف وہی دائرہ ٹھہرا، اور اسی لیے شیخ اکبر و جیلی نے اس کو "حقیقت الاسمائیہ" اور "لوحِ محفوظ" سے بھی تعبیر کیا۔ سبحان اللہ! یہ آخری تمثیل و تعبیر کس درجہ ترجمانِ حقیقت وادفق بالشرع والعقل ہے! دنیا میں جس قدر بھی ہدایت و تعلیم کی لوحیں تھیں، سب کے لیے تغیر و تبدل ہوا حتیٰ کہ آج کوئی بھی محفوظ نہیں، لیکن اللہ اکبر مقامِ محمدی کی محفوظیت و مصئونیت کہ اس کی سیرتِ طیبہ اور حیاتِ حیہ و قائمہ کی لوحِ محفوظ کا ایک نقطہ بھی محو نہ ہو سکا، اور قرآن محفوظ وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ فِىْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ[2] اور فِىْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ[3] میں اس کا ایک ایک حرف، ایک ایک نقطہ اسی طرح نقش و ثبت ہے اور ہمیشہ رہے گا، جس طرح قلمِ ازل نے اوّلِ صبحِ تعین کی کرنوں سے لکھ دیا تھا۔ پس قرآن کے بعد اگر کوئی اور ہستی "لوحِ محفوظ" ہو سکتی ہے، تو وہ صرف وہی روحِ اعظم و خالد ہے جس کے ذکر کو خود قرآن نے اپنی آغوشِ حفظ و صیانت میں ہمیشہ کے لیے لے لیا ہے۔ حضرت سید العارفین شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسی مقام کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اگرچہ بعض کم فہموں نے اس کی ضمیرِ متکلم کو نہ سمجھا اور ایک دوسری ہی وادی میں لے گئے، اور یہ آفت عام و دائم ہے:

افلت شموس الاولین، وشمسنا
ابدًا علی افق البقا لا تغرب!

حضرت والد[4] مرحوم نے اس ملفوظِ مبارک پر ایک دوسرا پیش مصرع لگا کر مطلب واضح کر دیا ہے۔ یہ ان کے طول طویل قصیدۂ بائیہ میں سے ہے:

شمس تقادم قبل آدم طلعها
ابدًا علی افق البقا لا تغرب[5]

اور یہ جو بعض اکابرِ نقشبندیہ علی الخصوص حضرت مجدد سرہندی رحمۃ اللہ علیہم نے اپنے علومِ کشفیہ میں ظاہر کیا کہ دائرہ حقیقتِ محمدیہ سیرِ قدمی کی آخری حد ہے، اس کے بعد صرف سیرِ نظری کی گنجائش ہے۔ وَهُوَ مِنْ خَصَائِصِهٖ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ اور نیز تمام اصحابِ احوال و کشوف بھی اس پر متفق ہوئے، تو حقیقت اس کی بھی یہی ہے کہ چونکہ حقیقتِ محمدیہ روح و حیات کا آخری نقطہ اور سرچشمہ قرار پائی، تو لاجرم سیر و اقدام کی آخری منزل بھی وہی ٹھہری۔ اس کے بعد جو کچھ ہے، مافوق اور وراء الوراء سے تعینات ہے۔ اس لیے نہ سیر کی وہاں گنجائش، نہ قافلۂ طلب اور محملِ شوق کا وہاں گزر، بلکہ طائرِ فکر و مرغِ خیال بھی اس کی فضائے لاتعین میں درماندہ و پر و بال سوختہ:

اے بروں از وہم و قال و قیلِ من
خاک بر فرقِ من و تمثیلِ من![6]

والکلام فی هذا یطول وله موضع غیر هذا الموضع الذی نحن فیه۔ اور یہ جملہ معترضہ

---

[1] سورہ طور، آیت نمبر ۲، ۳، [2] سورہ عنکبوت، آیت نمبر ۴۹ [3] والد سے مراد مصنف (مولانا آزاد) کے والد مولوی خیرالدین ہیں، [4] یہ شعر مولوی خیرالدین کا ہے، [5] مولانا روم کا شعر ہے۔

بھی جو بمد فصل زخلل ربطِ مطالب پہنچ گیا، تو اس لیے کہ مذکور کی جاذبیت و محبوبیت سے ذکر و ذاکر کی بیخودی و محویت ناگزیر ہے، اور اشارات کا طول و قصر مشارٌ الیہ کے جذب و کشش پر موقوف۔ پھر جس مذکور و مقصود کا یہ حال ہو کہ بقولِ صاحبؒ "فتوحات مکیہ"

یا من ھو للقلوب مقناطیس

اور اس دنیا میں ذکر صرف اُسی کا ذکر اور بات صرف اُسی کی بات ہو۔ اس کے سوا جو کچھ ہو، یا اسی کی طرف مصروف و محمول ہو اور یہ نہ ہو تو پھر بیخودی و بےحاصلی، اتلاف صرف و ضیاعِ ہمت۔

اوقات ہماں بود کہ با یار بسر رفت ؂ باقی ہمہ بے حاصلی و بے خردی بود

تو یوں کر ممکن ہے کہ عنانِ قلم از دست رفتہ نہ ہو، اور سر رشتۂ فکر و شغل دامنِ صبر و شکیب کی طرح ہاتھ سے چھوٹ نہ جائے۔

ویلہ وکونے فی ذکرہ تستعریر ؂ لھا بین جلدی والعظام دبیب

ذکر سیرتِ نبویہ ماخوذ و مستنبط از قرآن کی نسبت تھا۔ سو الحمد للہ وہ امید و گمان سے بھی وہ چند اوسع و اکمل مرتب ہو گئی۔ وہ اُیت فیہ مالا عین رأت وما لا اذن سمعت انسانوں کی ترتیب دی ہوئی ساری سیرتیں اور تاریخیں ایک طرف اور خود لسانِ الٰہی کا ایک کلمۂ منظوم و محفوظ ایک طرف۔ تعجب ہے کہ اصحابِ سیر نے باوجود کمالِ سعی و نظر اور مشغولیت بجمع طرق و ترتیبات سیرت اس طرف کیوں توجہ کی؟ جب تک یہ چیز مُرتب نہیں ہوئی تھی، خود اپنا حال بھی دوسرا تھا۔ اور اب جو دیکھا تو کارخانہ ہی دوسرا نظر آیا۔

تمام بود بہ یک حرفِ گرم و ناخوش
حکایتے کہ بہ ناتمام می گفتند[1]

معہذا

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایاں
بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہمچناں باقی[2]

---

[1] عرفی کا شعر ہے۔ پہلے مصرع میں گرم کی جگہ ختم ہے۔ [2] سعدی کا شعر ہے۔ کلیات میں پہلا مصرع اس طرح ہے
نہ حسنت آخرے دارد، نہ سعدی را سخن پایاں۔

مدینۃ الرسول، بزبان محمد رسول اللہ

محمد مسعود عبدہٗ   ترجمہ : مسعود مشہدی

قوسین میں تعارف کے تمام الفاظ کتب احادیث سے منتخب کر کے براہِ راست آپ کی طرف منتقل کئے جا رہے ہیں جس طرح ربّ السمٰوات والارض کی الوہیت اول و آخر ہے۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت تا قیامت زمان و مکان کی تمام حدود سے بالا زندہ و تابندہ ہے۔ وقت کو صدیوں کے نام سے پکارا جائے یا سالوں اور مہینوں کے نام سے۔ بحوالۂ رسالت اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دہن مبارک سے جس لفظ یا جملے کو زندگی نصیب ہوئی۔ وہ تا قیامت زندہ ہے۔ گویا ہے۔ توانا ہے۔ زمین و آسمان کی وسعتیں اُس کی محافظ ہیں۔ بسیط فضاؤں میں آوازوں کو محفوظ کرنے والی لہریں انہی مقدس آوازوں کی امین ہیں۔ افضل البشر علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ہر خطاب براہِ راست ہر دور، ہر مقام اور ہر نسل کے انسان کے ضمیر سے ہے۔ روح سے ہے! یہ دوسری بات ہے کہ جن کے ضمیر دنیا کی خواہشوں کے طلسمی سمندر میں غرق ہو چکے ہیں، یا جن کی روحیں بدن کی آسائشوں اور لذتوں میں مقفل ہو چکی ہیں۔ وہ نہ انہیں سن سکتے ہیں۔ نہ ہی ان کی حلاوتوں، برکتوں اور سکون بخش اثرات سے بہرہ ور ہو سکتے ہیں۔

ارشادات "میرے جسد میں استعمال ہونے والی خاک کو اسی شہر نور (مدینۃ) کی خاک کا وہ حصہ ہونے کا شرف حاصل ہے جہاں میری آخری آرام گاہ ہے" علیہ التحیۃ والسلام

یہ میرے اللہ کی سچائی کا ثبوت ہے۔ "منها خلقناكم وفيها نعيدكم" ہم نے تمہیں (مٹی) سے پیدا کیا ہے اور اسی میں تمہیں لوٹا دیں گے! یہ بھی اللہ تعالےٰ کا اصول غیر متبدل ہے کہ جب کسی کو اس کی مقررہ سرزمین پیدائش میں مقام مدفن پہ لے جانا ہو، تو اس کے لئے ایسے اسباب مہیا کر دیتے ہیں کہ وہ انجانے طور پر وہیں منتقل ہو جاتا ہے۔ اللہ جل شانہٗ کا یہ ضابطہ اس بات کا گواہ ہے کہ میرے لباس بشریت کو میری آرام گاہ کی خاک سے ہی مزین کیا گیا اور مکہ سے ہجرت کے بعد اسی شہر کو میرا دار الھجرت ہے قرار پایا۔ "میرے دار الہجرت، میرے حرم، میرے شہر، جس کے لئے میں نے دعا مانگی: اے اللہ مدینہ (منورہ) کی محبت کو ہمارے لئے فزوں تر فرما مکہ شریف کی محبت سے بھی زیادہ۔" مدینہ منورہ کو میری اس دعا کی برکتوں کا بھی فیض حاصل ہو۔

اَللّٰهُمَّ اِنَّ ابراهيم نبيك وخليلك دعاك لاهل مكة "اے اللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تیرے نبی اور تیرے مخلص ترین دوست تھے۔ انہوں نے شہر مکہ کے لئے تم سے دعا فرمائی اور آپ نے قبول کی۔ انا نبيك ورسولك وعبدك ادعوك لاهل مدينة۔ یا اللہ میں تیرا نبی، تیرا رسول، تیرا بندہ اہل مدینہ کے لئے دعا گو ہوں۔

اَللّٰھُمَّ بَارِکْ لَھُم۔ اے اللہ ان کی زندگی کو اپنے بے پایاں انعامات و برکات سے نواز۔ فِیْ مُدِّھِمْ ان کے ناپ تول کے پیمانے مُد میں (لغات میں اسی لفظ کا ایک اور مفہوم بھی ہے جس کا مقصد ہے) ان کی زندگی کے مقررہ ایام میں وَصَاعِھِمْ اور ان کے ناپ تول کے پیمانے صاع (اس کے دوسرے معنی ہیں کوششوں کا مقصد) میں برکت عطا فرما۔ وَقَلِیْلِھِمْ وَکَثِیْرِھِمْ اور ان کے تھوڑے یا زیادہ اعمال کو خیر سے بھرپور فرمائے۔ آمین ثم آمین۔ میری اس دعا کی مقبولیت کا شرف اس شہر کو حاصل ہے۔ میں نے اپنے اللہ سے دعا کی "ضعفی مَا بورکت لاھل مکہ" اور جتنی برکتوں سے تو نے اہل مکہ کو نوازا۔ اپنی نوازشیں اہل مکہ سے زیادہ اہل مدینہ پر نازل فرما۔ میں نے اللہ سے دعا مانگی "اَللّٰھُمَّ ارزقنا من ثمرات الارض اے اللہ میرے حرم کی سرزمین پر رہنے والوں کو زمین کے ثمرات سے فیضیاب فرما۔ میں نے اپنے دارِ قرار کے لئے اور یہاں کے رہنے والوں کے لئے دعا کی۔ اللّٰھم اجعل لنا بھا قرارًا و رزقًا حسنًا اللہ ہمیں یہاں سکون دل کے ساتھ قرار عطا فرما۔ اور اس سے اعمال حسنہ کا رزق عطا فرما۔ اور دل کے کانوں سے سنو۔ اِنّ اللّٰہ جعل المدینۃ مھاجری و بھا مضجعی و منھا مبعثی اس سے بڑھ کر زمین کے کسی حصہ کو اور کیا خوش نصیبی اور عظمت نصیب ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالے نے مدینہ منورہ کو میرا ہجرت کا گھر بنایا۔ اور اسی میں میرا آخری مقام استراحت ہے۔ اور اسی شہر کو یوم حشر میرے قیام کے لئے منتخب فرمایا۔ فحق علی امتی حفظ جیرانی ما اجتنبوا الکبائر فمن حفظ فیھم حرمتی کنت لہٗ شفیعًا یوم القیامۃ لہٰذا میری امت کو میرے پڑوسی ہونے کا حق ادا کرنا چاہئے۔ اور یہ بھی ضروری ہے کہ کبیرہ گناہوں سے اجتناب کریں۔ اور جو شخص بھی اس احترام کا پاس اپنا شعار بنائے گا۔ قیامت کے دن اس کی شفاعت کا میں ضامن ہوں۔

یہی شہر مدینہ جو مجھ سے پہلے یثرب کہلاتا تھا یعنی اذیتوں کا مقام۔ جہاں وبائیں عام تھیں۔ جہاں لوگوں کے ذہنی اور قلبی اوہام کی بیماریوں کا یہ عالم تھا کہ ثنیۃ الوداع کے قریب آکر اس سے آگے بڑھنے سے پہلے اگر کوئی شخص گدھوں کی طرح تین بار ڈھیکوں ڈھیکوں آواز بلند نہیں چلاتا تھا تو وہ اپنے آپ کو ان بیماریوں سے محفوظ نہیں سمجھتا تھا۔ جہاں احترام آدمیت کے مفہوم سے بھی لوگ ناواقف تھے۔ جہاں سود خور یہودیوں کے ہاتھوں میں نادار لوگوں کی جانیں تھیں جہاں ظلم و استبداد کے شکنجے میں نیم جان انسانی لاشیں تڑپتی تھیں۔ میری دعا نے انہیں ان سب سے نجات دلا دی۔ یاد رکھو میرے حرم کی سرزمین انبیاؑ کی سرزمین ہے۔ اور اب اگر میرے امتی کی زبان سے بھول کر بھی اس سرزمین کا نام یثرب نکل جائے تو اسے چاہئیے کہ دس بار مدینہ منورہ کہے۔ بلکہ تین بار استغفراللہ کہے۔ وَمن سمی المدینۃ یثرب فلیستغفراللہ ھی طابہ اور یقین کرو کہ مدینہ منورہ مقام راحت و مسرت ہے۔ اور یہ بھی یاد رکھو، اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو وہیں مدفون فرماتے ہیں جو جگہ اسے زیادہ پیاری ہو، اور مجھے مدینہ منورہ کی زمین سے بے پناہ محبت ہے۔ اور اس محبت کو میں نے اپنے اللہ سے مانگ کر لیا ہے۔ تمہارے ایمان کی کسوٹی اسی محبت کو قرار دیا جاتا ہے۔ تم میں سے جو بھی صاحب ایمان ہو گا۔ وہ مدینہ منورہ کی طرف یوں دوڑ کر آئے گا جس طرح سانپ اپنے بل میں دوڑ کر داخل ہوتا ہے مجھے اس سرزمین سے اتنی محبت ہے کہ میں نے اسی میں زندگی بھر بسیرا کرنا اور اسی میں اپنی آرام گاہ کا انتخاب کرنا سب سے زیادہ عزیز جانا۔ اور یاد رکھو، جو بھی میرے اس شہر ایمان میں ٹھہرنے کے ایام میں موسم یا حالات کی سختیوں کو برداشت کرتے ہوئے صبر کرے گا۔ میں قیامت کے دن اس کی شفاعت کا وعدہ کرتا ہوں۔

یاد رکھو۔ ان اللہ قد نجاھذہ الجزیرۃ من الشرک" اللہ تعالیٰ نے اس جزیرہ کو شرک سے پاک فرما دیا۔ اور اس میں بھی کوئی شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ " ان المدینۃ تنفی خبث الرجال" مدینہ منورہ کا قیام انسان کی اندرونی خباثتوں (INTERNAL EVILS) اور بیرونی بُرے ماحول کی اثر پذیری سے اس طرح صاف کر دیتا ہے۔ جیسے لوہار کی دہکتی ہوئی بھٹی لوہے کو زنگ اور کھوٹ سے صاف کر دیتی ہے "المدینۃ کالکیر تنفی خبثھا و تنصع طیبھا" نہ صرف بدخوئی اور بدکرداری سے انسان کی اندرونی شخصیت کو سنوارتا ہے۔ بلکہ اچھے اعمال کی خوبصورتی کا جمال بھی بخشتا ہے۔

خبردار مَن اراد اھل ھذہ البلدۃ بسوءٍ (یعنی مدینہ منورہ) اذابہ اللہ تعالیٰ کما یذوب الملح فی الماء۔ جو بھی اہل مدینہ سے بدسلوکی کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اسے یوں ملیامیٹ کر دیں گے جس طرح پانی نمک کو تحلیل کر دیتا ہے۔ اور سن لیجیے۔ اللّٰھم من ظلم اھل المدینۃ و اخافھم فاخفہٗ وعلیہ لعنۃ اللہ والملائکۃ والناس اجمعین ہ لا یقبل منہ صرف و عدل" اے اللہ جو شخص بھی اہل مدینہ پر ظلم کرے یا ان کو دہشت زدہ کرے تو آپ اس کو خوف زدہ فرما دینا۔ اور لعنت ہو اس پر اللہ کی اس کے فرشتوں کی اور تمام انسانوں کی۔ اور میرے اللہ اس کے نوافل و صدقات اور عبادات (صرف) اور اچھائیاں سب باطل قرار دے دینا۔

ضمانت تحفظ "علی انقاب المدینۃ ملائکۃ یحرسونھا لا یدخلھا الطاعون ولا الدجال" فرشتے مدینہ منورہ کے پہاڑوں میں واقع خصوصی راستوں پر متعین پاسبانی کر رہے ہیں۔ تاکہ طاعون اور دجال کی مدافعت کر سکیں۔ یا یوں کہیئے کہ "لیس من بلد الا سیطؤھا الدجال الا مکہ والمدینۃ" شہروں میں سے دجال کی پیش رفت صرف دو شہروں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی بیرونی حدود تک رہے گی۔

یوم نجات "یا اھل المدینہ اذکروا یوم الخلاص" اہل مدینہ اس یوم نجات کی تفصیل سن لو۔ اس دن دجال تو مدینہ منورہ کی مخصوص حد کے باہر ہوگا لیکن مدینہ منورہ حد حرم تک تین بار تھرتھرائے گا۔ اس کیفیت سے متاثر ہو کر منافق، مشرک، فاسق و فاجر اور بدطینت لوگ مدینہ منورہ سے نکل کر دجال کے پاس پہنچ جائیں گے۔ اس طرح مدینہ منورہ کی حدود حرم کو تمام گمراہ لوگوں سے پاک صرف نیک، متقی، مومن اور مومنات کا بسیرا ہونا نصیب ہوگا۔ بس یہی دن یوم نجات (یوم خلاص) ہوگا۔

اس تعارف کی روشنی میں ابوالیمن ابن عساکر، عقیل حنبلی، علامہ نووی اور بہت سے دوسرے علمائے متقدمین المحقق ابن عابدین لکھتے ہیں۔ والحق ان مواضع الانبیاء دارواحھم اشرف من کل ما سواھا من الارض والسماء" سچ بات تو یہی ہے کہ آسمانوں کا وہ حصہ جہاں انبیاء کرام کی روحوں کا بسیرا ہے۔ اور زمینوں میں جہاں انبیاء کرام کے اجسام استراحت فرما ہیں۔ وہی آسمان اور زمین میں دوسرے مقامات کے مقابلہ میں قابل تکریم ہیں۔ لیکن مدینہ منورہ کو بطور خاص عبادات کی فضیلت بھی حاصل ہے یہاں ہر روز ہر لمحہ امت مسلمہ کے درود و سلام کے ہدیے، افواج در افواج کی طرح بارگاہ نبوی میں پیش ہوتے ہیں۔ یہاں ہر پل اور ہر گھڑی رحمت کے فرشتوں کی آمد و رفت کا سلسلہ غیر منقطع رہتا ہے۔ یہ وہ مقام فضیلت ہے جس کی گلیوں میں اب بھی ایسی خوشبو کے جھونکے پھرتے ہیں۔ جو اپنی کیفیت انگیزی میں بالکل منفرد ہے۔ اور یاد رکھیئے۔ حرم نبوی وہ مقام ادب ہے جسے ارض اللہ کہا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں "الم تکن ارض اللہ واسعۃ فتھاجروا فیھا" طاغوتی طاقتوں کو

اپنے اعمال و ایمان کے درمیان دیواروں کا بہانہ بنانے والو۔ کیا اللہ کی زمین اتنی وسیع نہ تھی کہ تم اس کی طرف ہجرت کر جاتے! جس طرح ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحابہ اکرام کے ساتھ مکہ سے اس لئے ہجرت کی کہ عبادات الٰہیہ میں قریشی مخالفت حائل تھی۔ لہٰذا۔ ہمارے نبیؐ نے ___ عملی طور پر تمہاری راہ نمائی کرتے ہوئے تمہیں بتا دیا کہ ایسے حالات میں تمہیں اپنے سیم و جان کی حفاظت کے لئے نہیں بلکہ اتباع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (جو آئین الٰہیہ کے ترجمان ہیں) کو مفقود نہ کر۔ کسی ایسی جگہ چلے جاؤ۔ جہاں تم اپنے اعمال حسنہ کے حسن کو اتنا دوبالا کر سکو کہ لوگ خود بخود اس سے متاثر ہو کر اپنی زندگی کے صحیح مقصد کی طرف مائل ہو جائیں ہمارے رسولؐ کا یہ شہر۔ اللہ کی وہ زمین ہے جو مثالی ہے۔ اس کا دوسرا نام اسی لئے :۔

۳۔ **دارالھجرت** :۔ رکھا گیا۔ تاکہ اس کا نام سنتے ہی، اس کی یاد آتے ہی، تم جہاں کہیں بھی ہو، اس طریق نجات کو اختیار کر سکو۔

۴۔ **اکالۃ البلدان** :۔ اس شہر کا نام بھی تمہارے علم میں ہونا چاہیئے۔ اس شہر کو اللہ تعالےٰ نے دنیا کے تمام شہروں کے مقابلہ میں جلال و جمال کے اعتبار سے ممیز او ربلند فرمایا ہے۔ اسی طرح تمام بستیاں۔ اس بستی کے مقابلہ میں پست کر دی گئیں۔

۵۔ **اکالۃ القری** :۔ حدیث نبوی میں ہے" امرت بقریۃ تاکل القری" ہم نے اس قریہ کو حکم دیا کہ وہ اپنے محاسن کے اعتبار سے دوسری بستیوں پر غالب آ جائے۔

۶۔ **الایمان** : اللہ تعالےٰ نے انصار کے اعمال حسنہ کی تائید میں فرمایا" وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ اور وہ لوگ، انصار کی ان خصوصیات کو ایمان پر دائمی علامت قرار دیتے ہوئے مدینہ منورہ کو اس نام سے نوازا گیا۔

۷۔۸۔ **البارۃ والبرۃ** ۔ یہ شہر نیکیوں اور بھلائیوں کا وہ مرکز ہے جس سے نیکیوں اور اعمال حسنہ کی نورانی شعاعیں ابھریں اور پھر تمام دنیا کے اندھیرے دلوں کو منور کر گئیں۔

۹۔۱۰۔ **البحرۃ اور البحیرۃ** ۔ یوں سمجھئے کہ مدینہ منورہ ایک گہری جھیل ہے جس سے حسن اعمال کے لطیف بخارات آسمان کی بلندیوں کی طرف اڑتے اور پھر بادلوں کی صورت میں تمام روئے زمین پر اپنی برکات برسا رہے ہیں!

۱۱۔ **البلاط** ۔ یہ وہ شہر رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے جس کی ہر راہ جس کا ہر فرش، مرمریں فرش کی طرح ہموار ہے۔ جس پر چلنے والے کو ٹھوکر کھانے کا مطلق امکان نہیں۔

۱۲۔ **البلد** ۔ اللہ تعالےٰ اسی شہر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں فرماتے ہیں" لَا اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ" ہم اس شہر کی قسم کھاتے ہیں۔ عربی لغت میں" بلد" بستیوں کی صدر بستی کو کہا جاتا ہے۔

۱۳۔ **بیت الرسول** اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں" کَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ" (سورۂ انفال آیت نمبر ۵) مفسرین اس آیہ کریمہ میں بیت سے مراد ___ مدینہ منورہ ہی لیتے ہیں کیونکہ اسی میں

آپ ہجرت کے بعد ہمیشہ مکین رہے۔

۱۴-۱۵ - تندد اور تندر - یہ دونوں نام بھی وفاء الوفاء (سمہودی) میں مذکور ہیں۔ بجلی کی کڑک کی طرح کفر کو مرعوب کرنے والا شہر۔

۱۶ الجابرۃ - حدیث نبوی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "للمدینۃ عشرۃ اسماء" سمیت بہ لانھا تجبر الکسیر، وتغنی الفقیر وتجبر علی الاذعان لمطالتہ برکاتھا، وشہود ایاتھا وجبرت البلاد علی الاسلام۔

مدینہ منورہ کے دس ناموں میں سے ایک نام یہ بھی ہے اور اس کے نام کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہ برائیوں کی نیت سے جبر کرنے والوں کی طاقت کو ریزہ ریزہ کر دیتا ہے اور محتاجوں کو غنی بنا دیتا ہے اور شعور انسانی کو برکات الٰہیہ کے انہام اور آیات الٰہیہ کے مشاہدہ کی استعداد عطا کرتا ہے اور دوسرے شہروں کو اخلاقی طور پر اسلام کے اصولوں کو تسلیم کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

۱۷ - جزیرۃ العرب - اس نام سے یہ شہر اس وقت منسوب ہوا جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے ساتھ مدینہ منورہ سے نکلے تو پلٹ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ان اللہ برأ ھذہ الجزیرۃ من الشرک" اللہ تعالیٰ نے اس جزیرہ کو شرک سے مبرا فرما دیا۔

۱۸ - الجنۃ الحصینۃ - غزوہ احد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "انا فی جنۃ الحصینۃ" میں مضبوط بازوؤں کی حفاظت میں ہوں۔

۱۹ - الحبیبۃ - گویا یہ شہر مدینہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حبیب کی حیثیت رکھتا ہے۔

۲۰ - الحرم - حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ہے "انھا حرم امن" یہ شہر حرم امن ہے۔

۲۱ - حرم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم - اس نام سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پکارتے ہوئے فرمایا: (ومن اخاف اھل حرمی اخافہ اللہ) جس نے میرے اہل حرم کو ڈرایا، اللہ تعالیٰ اسے خوف زدہ کریں۔

۲۲ - حسنہ - مدینہ منورہ حسنات (نیکیوں کا منبع ہے) کا گھر ہے۔

۲۳ - الخیرۃ - انوار میں اتنا درخشاں کہ دیکھنے والے کی آنکھیں چندھیا جائیں۔

۲۴ - الخیرۃ - بھلائیوں میں یہ شہر مکہ معظمہ سے بڑھ کر ہے" حدیث المدینۃ خیر من المکۃ۔

۲۵ - دار الابرار - نیک لوگوں کا گھر

۲۶ - دار الاخیار - بھلائیاں بانٹنے والوں کا گھر

۲۷ - دار الانصار - بھلائیوں کی امداد کرنے والوں کا گھر

۲۸ - دار الایمان - ایمان ویقین سے آباد گھر

۲۹ - دار السنہ - وہ گھر جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال حسنہ کی یادوں کا خزانہ ہے۔

۳۰ ۔ دارالسلامہ ۔ وہ گھر جس میں سلامتی ہی سلامتی ہے ۔

۳ ۔ ذات الحجر ۔ محفوظ چار دیواری والا شہر جہاں نیکیوں کو پناہ ملتی ہے ۔

۳۴ ۔ الطابہ } قلبی مسرتیں بخشنے والا گناہوں کی بدبو سے پاک وصاف ،

۳۵ ۔ الطیبہ } اخلاق حسنہ سے معطر شہر

۳۶ ۔ ذات الحوار ۔ رگوں میں اعمال حسنہ کے لئے لہو گرم رکھنے والا شہر

۳۸ ۔ ذات النخل ۔ سرسبز و شاداب درختوں کا شہر

۳۹ ۔ السلفۃ ۔ فتح و کامرانی کا مرکز شہر

۴۰ ۔ سیّدۃ البلدان ۔ شہروں کا سردار شہر

۴۱ ۔ الشافیہ ۔ انسان کو روحانی اور جسمانی بیماریوں سے شفا بخشنے والا شہر ۔ حدیث نبوی "الترابھا شفاء من کل داء" اس کی مٹی شفا بخش ہے ۔

۴۲ طیاب ۔ مستطیل قطعہ زمین ۔

۴۳ العاصمہ ۔ قدیم امن بخش مقام جہاں موسیٰ علیہ السلام اور داؤد علیہ السلام کے لشکر مقیم ہوئے اور حضور اکرم نے فرمایا ۔ "لا یدخلھا الدجال و لا طاعون" اس شہر میں دجال اور طاعون کا گزر نہیں ہو سکے گا ۔

۴۴ ۔ العذراء ۔ قدیم ظالم و جابر لوگوں کے غلبوں کو کالعدم قرار دے کر امن و سلامتی کا آزاد شہر ۔

۴۵ ۔ العراء ۔ بغیر کوہان کے اونٹنی کی طرح خوشنما

۴۶ ۔ الغراء ۔ گھوڑے کی پیشانی پہ سفیدی، ہر چیز کا ابتدائی اور معظم حصہ، صبح کی وہ روشنی جو سورج کے آغاز سفر پہ نظر آتی ہے بسفید اور وجیہہ چہرہ کے انسانوں کی بستی ۔

۴۷ ۔ العروض ۔ مدینہ منورہ کو عروض کا نام اس لئے دیا گیا ہے کہ نجد کی تمام بستیاں خط مستقیم کی طرح طول میں اور مدینہ منورہ ان کے کنارہ پہ واقع ہے ۔

۴۸ الغالبۃ ۔ وہ بستی جو اپنے محاسن کے ساتھ دنیا کی تمام بستیوں پر فوقیت یا غلبہ پائے ہوئے ہے ۔

۴۹ ۔ الفاضحہ ۔ خالص اوصاف انسانیت بخشنے والی جس میں کسی قسم کی کھوٹ نہ رہ جائے ۔ شہر مدینہ

۵۰ ۔ الفاصمہ ۔ بدارادہ لوگوں کی کمر توڑ دینے والا شہر

۵۱ ۔ قبۃ الاسلام ۔ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے "المدینۃ قبۃ الاسلام"

۵۲ ۔ قریۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم } اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بستی ۔

۵۳ قلب الایمان ۔ مدینہ منورہ ایمان کا دل ہے ۔

۵۴ ۔ المومنة ۔ حدیث نبویؐ ہے" والذی نفسی بیدہ ان تربتھا المومنة" جس اللہ کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ مجھے اُس کی قسم مدینہ منورہ کی مٹی بھی صاحب ایمان ہے۔

۵۵ ۔ المبارکہ ۔ ان تمام برکات سے لبریز شہر جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بارگاہ معطی ومغنی سے مانگی تھیں۔

۵۶ ۔ مبوالحلال والحرام ۔ حلال روزی کس طرح کمائی جاتی ہے۔ حرام سے کس طرح بچا جاتا ہے اور پھر ان اصولوں کو کس طرح معاشرہ میں مستحکم کیا جاتا ہے۔ اس کی عملی مثالوں سے بھرپور شہر۔

۵۷ سبین الحرام والحلال ۔ حلال کسے کہا جاتا ہے۔ حرام کا مفہوم کیا ہے۔ اس کی وضاحتوں کا مثالی شہر۔

۵۸ ۔ المحببه ۔ اسلام کے قدیم زمانے میں اس شہر کو ان ناموں سے بھی پکارا جاتا تھا۔ گویا یہ شہر محبتوں کا شہر ہے۔ جہاں

۵۹ ۔ المجسبه ۔ اللہ کی محبت ہے، اس کے رسولؐ کی محبت ہے۔ اچھے اعمال کی محبت ہے۔ انسانوں کے آپسی رشتوں کی

۶۰ ۔ المحبوبه ۔ محبت ہے۔ یہاں کی فضاؤں میں محبت ہی محبت ہے۔

۶۱ ۔ المحبورة ۔ اس شہر اور حدود حرم کی زمین سے اگنے والے ثمرات اور نعمتیں دنیا کے تمام ارضی ثمرات سے افضل ہیں۔

۶۲ ۔ الحرمة، ۶۳ ۔ المحفوظة، ۶۴ ۔ المحفوفة :۔ یہ قابل احترام ہے۔ یہ شہر مامون فساد ہے۔ یہ شہر محفوظ بلیات ہے

۶۵ ۔ المختارة :۔ اس شہر کو مختار و آزاد احساس عمل کا خمیر حاصل ہے۔

۶۶ ۔ مدخل الصدق :۔ اس شہر میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سچے اصولوں اور سچائی کے اجالوں کی مانگ بھرتے ہوئے قدم بڑھائے۔

۶۷ ۔ المرحومة، ۶۸ ۔ المرزوقه، ۶۹ ۔ المسکینة، ۷۰ ۔ المسلمه، ۷۱ ۔ مضجع الرسول صلی اللہ علیہ وسلم، ۷۲ ۔ المطیبه، ۷۳ ۔ المقدسه، ۷۴ ۔ المقر، ۷۵ ۔ المکنان، ۷۶ ۔ الموفیه

۷۷ ۔ الناجیه، ۷۸ ۔ نبلاء، ۷۹ ۔ الغر، ۸۰ ۔ الهذراء ۔ ان اسماء کی وجہ تسمیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کے سانسوں سے بے شمار پھولوں کی پھلواریوں کی وہ لازوال خوشبو ہے۔ جو اس وقت سے آج تک زمین و آسمان کی وسیع تر وسعتوں مشرق مغرب، شمال وجنوب کی آخری حدوں تک سمونے کے باوجود، اور صدیوں کا لمبا سفر طے کرنے کے بعد بھی اتنی ہی تر و تازہ اور شگفتہ تر ہے۔ جیسے توحید و رسالت کی پھلواری میں ابھی ابھی یہ پھول کھلا ہو۔ ہاں تنگ نظر، چھوٹی انا، تکبر، رنگ، نسل، زبان اور علاقائی تعصب کے مریض قدیم وجدید کے فریب میں مبتلا دل اس وقت بھی اس خوشبو کے مسرت افزا اثرات سے محروم تھے اور آج بھی ہیں۔

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک ۔ دلیل کم نظری قصۂ جدید و قدیم

(اقبال مرحوم)

حدودِ حرم مدینہ "ان ابراھیم حرم مکه ودعالھا ودعا لاھلھا وانی حرمت المدینة کما حرم ابراھیم علیه السلام مکه" ابراہیم علیہ السلام نے مکہ مکرمہ کی حدود کو حرم قرار دیا۔ اس کے لئے دعا کی یا اُن کے رہنے والوں کے لیئے دعا کی" میں بھی مدینہ منورہ کے مخصوص علاقہ (سنت ابراہیم علیہ السلام)

کو حرم قرار دیتا ہوں۔ اور میرے حرم کی حدود "انی احرم ما بین لابتیھا" "میں آبتین" پہاڑوں کے درمیان کی زمین کو حرم قرار دیتا ہوں" ان حدود میں شکار نہ کیا جائے اور سرسبز درختوں کو توڑا نہ جائے۔ لیکن جانوروں کے لئے' اونٹ، بکریوں اور بھیڑوں کے لئے انہیں توڑ کر دینا جائز ہے۔

لابتین سے مراد شرقی اور غربی علاقہ میں واقع پہاڑ ہیں۔ علاوہ ازیں حمٰی (چراگاہیں) جو مدینہ منورہ سے دس میل دور پر واقع ہیں۔ اس کے درمیان کے باغات اور جنگلات کو حرم قرار دیا گیا تھا۔ گو آج نہ وہ چراگاہ ہے' نہ ہی باغات لیکن وہ پہاڑ اب بھی موجود ہیں۔ اور ان کی بستیاں انہیں حدود میں ہیں۔ حدود حرم میں ایک دوسرے سے جھگڑنا' اسلحہ لے کر چلنا' گالی دینا سب حرام ہے۔ ظاہری صورتوں کے بدلنے سے حقیقت نہیں بدل جاتی ہے یہ حکم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم "حکم" ہے اور وہ ہمیشہ جاری و ساری رہے گا۔

غبار مدینہ

اور یاد رکھو" غبار المدینۃ شفاء من الجذام" مدینہ منورہ کی غبار میں کوڑھ کے لئے شفا ہے۔ ایک بار حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بنو حارث کے قبیلہ سے گزرے تو ان میں ایک شخص تپ محرقہ میں مبتلا تھا۔ انہوں نے عرض کیا۔ اصابتنا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ھذہ الحمّٰی' عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے علاقہ میں اس بخار کا چلن ہو گیا ہے۔ فرمایا مقام صُعیب تم سے کتنی دور ہے۔

عرض کیا۔۔۔ ہم سمجھے نہیں۔ آپ نے فرمایا۔ وہاں کی مٹی لو' اور تم میں سے کوئی ایک اُسے پانی میں گھول لے اور پھر یہ پڑھتے ہوئے بسم اللہ تراب ارضنا' بریق بعضنا شفاء لمریضنا باذن ربنا" اُس کے جسم پر مل دے۔ چنانچہ حکم کی تعمیل ہوئی اور مریض کو اللہ تعالےٰ نے شفا عطا فرما دی!

اس کے بعد مدتوں تک یہی عمل اصحاب سلف میں رہا۔ اور سب کے سب شفا پاتے رہے۔ اسی طرح برص کی بیماری اور دوسری جلدی بیماریوں کے لئے اس مٹی کو تریاق پایا گیا۔ اور آج بھی وہ گڑھا جہاں سے لوگ مٹی لیا کرتے تھے۔ اس کے آثار موجود ہیں۔

اسی طرح جب کسی کو گہرا زخم آ جاتا تو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تشریف لاتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم مٹی اس پر لگاتے اور فرماتے "تراب ارضنا شفاء لقرحنا باذن ربنا" ہماری زمین کی مٹی کو اللہ تعالےٰ نے ہمارے زخموں کے لئے شفا بخش مرہم بنایا ہے"

مدینہ منورہ کی عجوہ کھجور

اسی طرح کھجوروں میں سے عجوہ کھجور (جو ایسی کھجور کا پھل ہیں۔ جنہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے باغ میں اپنے مبارک ہاتھ سے بویا تھا۔ اس کھجور کے سات دانے سات دن کھانے والے پہ اگر آسیب ہو تو وہ دور ہو جاتا ہے اور آئندہ کبھی وہ ان اثرات سے متاثر نہیں ہوتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ان فی عجوۃ العالیۃ شفاء" او انھا تریاق اول البکرہ" عجوہ کھجوروں میں اللہ تعالےٰ نے شفا رکھی ہے۔ وہ سحر اور زہر دونوں کے لئے تریاق ہے۔ ... فرمایا الکماۃ من المن وماؤھا شفاء للعین والعجوۃ من الجنۃ" کھمبی (ایک

چھتری نما برسات کے دنوں میں پیدا ہوتا ہے۔ اس کا پانی آنکھوں کے لئے شفائے کامل ہے اور عجوہ جنت کے پھلوں میں سے ایک پھل ہے۔ اسی قبیل کا ایک درخت بیتل کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا پھل اور اس کا رس، اس کا دھواں بھی صحت بخش تیر کب ہے۔ اسی طرح مدینہ منورہ کے تمام درختوں کا پھل (موسمی پھل) بے گنت امراض کے لئے شفا ہے۔ جنہیں وہاں کے مقامی لوگوں نے استعمال کیا اور تجربوں کی روشنی میں اس کی تصدیق پائی اور پھر انہوں نے اسے آنے والی نسلوں کو ان کے فوائد سے آگاہ کیا۔

مدینہ منورہ کی فضیلت کی وجوہات اصحابہ کرامؓ اور تابعینؒ نے اس طرح بیان فرمائی ہیں۔

۱ ۔ یہ وہ بستی ہے جس میں مکمل شفا اور رحمت سراپا صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت فرمائی۔ اور اس کی زمین کے ذروں کو شہداء کے اجسام مقدسہ کو محفوظ کرنے کا شرف حاصل ہے۔

۲ ۔ مدینہ منورہ وہ شہر ہے جس نے اقصائے عالم بہ تلوار سے نہیں، بلکہ قرآن حکیم کے احکامات پر عمل کرنے کے بعد اپنے اخلاق اور تعلیم کے ذریعے فتح کیا۔

۳ ۔ اللہ تعالیٰ کے مقرب فرشتوں اور ان فرشتوں کی صبح و مسا گزرگاہ جنہوں نے مجاہدین اسلام کی نصرت کی۔

۴ ۔ قیامت کے دن سب انسانوں سے زیادہ اعلیٰ صفات و کردار کے لوگ اسی مرکز دین قیم سے قیام کریں گے۔

۵ ۔ اسی زمین کے حصہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے ہاتھوں سے تعمیر کردہ دو مسجدوں کا شرف حاصل ہے۔ مسجد قبا اور مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اس سرزمین کی مٹی کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ یہ مومنہ اور مسلمہ ہے۔

مسجد نبوی میں عبادت کا ثواب

فرمایا۔ من صلّی فی مسجدی ھٰذا اربعین صلاۃ کتب لہ براءۃ من النار۔ جس شخص نے میری مسجد میں چالیس نمازیں ادا کیں۔ اسے جہنم کی آگ سے نجات مل گئی۔

اور جس شخص نے رمضان شریف کے روزے رکھے تو اسے ایک ہزار روزوں کا ثواب اسی طرح ایک نماز جمعہ کا ایک ہزار جمعہ کا ثواب!

غرض یہ کہ جتنے بھی اعمال صالحہ انسان سے ہوسکتے ہیں۔ مدینہ منورہ میں اسے اتنا ہی زیادہ ثواب ملے گا جس کا ذکر کیا گیا ہے۔

جو شخص مدینہ منورہ میں وفات پائے گا۔ میری شفاعت اس کے لئے مقدر ہوگی!

جو شخص قبر شریف کے پاس اور ستون المخلق کے پاس، منبر کے قریب، جنت البقیع، مسجد فتح میں ظہر کی نماز کے بعد چار دن ——— دعا کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اسے قبول فرمائیں گے۔

مسجد قبا میں جو شخص دو رکعت نماز نفل ادا کریگا۔ وہ عمرہ کے ثواب کا مستحق قرار دیا جائے گا۔

فرمایا۔ ما بینی و منبری روضۃ من ریاض الجنۃ و منبری علیٰ حوضی۔ میرے مقام استراحت اور منبر کے درمیان جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے اور میرا منبر میرے اس حوض پر واقع ہے۔ جو مومنین کے لئے مخصوص ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنی امت کے افراد کو اسی حوض سے پانی پلائیں گے۔ لہٰذا اس مقام پر زیادہ سے زیادہ نوافل، تلاوت قرآن حکیم اور صلوٰۃ وسلام جتنا بھی زیادہ سے زیادہ ہوسکے پڑھنا چاہیئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جو بھی میری مسجد میں داخل ہو، اسے چاہیئے کہ حسنات آخرہ اور حسنات دنیا کا مقصود اپنے

دل میں اسی طرح کہے جس طرح اصحابہ کرام رضی اللہ تعالےٰ عنہم نے کیا۔ ورنہ دنیا ہی کے مقصود سے اسے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اسے چاہیئے کہ وہ اعمال حسنہ کی مانگ کرے اسے چاہیئے کہ وہ اپنے گناہوں سے استغفار کرے۔

آداب مسجد نبوی

اور مسجد میں داخل ہوتے ہوئے دعا پڑھے بِسْمِ اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ اَللّٰهُمَّ افْتَحْ لِيْ اَبْوَابَ رَحْمَتِكَ وَمَغْفِرَتِكَ ۔ اللہ تعالےٰ کے نام اس پر توکل کرتے ہوئے نبی صلی اللہ تعالےٰ علیہ وآلہ وسلم پر درود پڑھتے ہوئے (مسجد میں داخل ہوتا ہوں) اے اللہ میرے لئے اپنی رحمت کے دروازے کھول دے! آمین ثم آمین (مسجد نبوی کے باب الرحمۃ یا باب جبریل سے داخل ہوں (مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم) کے الباب کا نام ہے۔ تدفین شریفین کی طرف باب جبریل ہے اور دوسری مقابل سمت پہلا باب، باب الرحمہ کہلاتا ہے۔ سر جھکا ہوا، دل میں اپنے گناہوں کی ندامت موجزن ہو اور آنکھیں بار بار آنسوؤں سے وضو کر رہی ہوں۔ آواز بلند نہ ہونے پائے۔ شور۔ یا اونچی آواز آج بھی اللہ تعالےٰ کو ناپسند ہے۔ مکہ مکرمہ کے مقامات دعا میں تم پاگلوں کی طرح رو سکتے ہو۔ چلا سکتے ہو۔ جو چاہے کہہ سکتے ہو جس طرح چاہے اپنی التجائیں پیش کر سکتے ہو۔ لیکن بارگاہ نبوی میں بڑے صبر ضبط، ادب، دبی سی آواز ضروری ہے۔ ورنہ۔ اگر آواز اونچی ہوگئی تو یاد رکھو تمام نیکیاں ضائع ہو جائیں گی۔ اب سب سے پہلے روضۃ الجنۃ میں دو رکعت نماز تحیۃ المسجد) پڑھیئے۔ یہی سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ جذبات کو قابو میں رکھو اور بارگاہ نبوی میں دو رکعت نماز پڑھنے کے بعد اور روؤ اور التجا کرو۔ معافی مانگو اور اب اٹھو اور مواجہہ شریف کی طرف دست بستہ، بارگاہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں سلام و درود عرض کرو۔ بھرائی ہوئی آواز ہو۔ دھڑکتا دل ہو۔ اور جو دل میں آئے کہو۔ لیکن حد شریعت اور ادب کا پاس رکھ کر۔ اب بائیں طرف رفیق غار، ہمسفر ہجرت اور عزیز ترین معاون نبوت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی خدمت میں سلام عرض کرو۔ ان کی خدمات، ان کے احسانات کا اعتراف کرو۔ اس کے بعد عمر فاروق رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی خدمت میں سلام عرض کرو۔ ان کی خدمات ان کے اسلام کے استحکام اور فتوحات کے علاوہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمات اور ان کی اتباع میں اپنی جرأت کو استعمال کرنے پر ان کو خراج تحسین پیش کرو۔ یہاں کھڑے یہ خیال رہے کہ یہ وہ مقام ہے۔ جہاں صدیوں سے ہر لمحہ، ہر پل، ہر ساعت، دنیا کے کونے کونے سے نہ جانے کتنے متقی، مومن، مومنات، صالح، اولیا، اصفیاء، علما۔ اور نہ جانے کتنے نفوس مقدسہ کے درود و سلام اور اعمال کو پیش کرنے کا سلسلہ جاری ہے اور تاقیامت جاری رہے گا۔

مدینہ منورہ کی خاک پاک کا ہر ذرہ قابل صد احترام ہے۔ یہاں کے محلے، گلیاں، فضائیں، ہوائیں آج بھی اپنے سینوں میں اصحابہ کرام، اہل بیت، شہدا، غازی، مجاہد، متقی، صالح، اصحاب سلف کے ایمان افروز سانسوں کی خوشبو سمیٹے ہوئے ہیں۔ مدینہ منورہ اس ذات والی صفات کا مقام آرام گاہ ہے جس کا نام محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ نسل آدم کی پیشانی پہ عزت و تکریم کا درخشندہ اعزاز اولاد آدم کے ناموں میں سب سے ممیز، سب سے مکرم سب سے معزز سب سے پہلا اور سب سے آخری وہ نام جسے اللہ کے بعد تمام اعلیٰ اعزاز حاصل ہیں۔ وہ نام جس کی نسبت سے اولاد آدم کی تمام معصیت، نافرمانیوں، گناہوں اور بداعمالیوں پہ جلال الٰہی کی نگاہ عفو درگزر میں بدل جاتی ہے۔ وہ اسم عظیم جو ایسے علم کا مظہر ہے جو انسان کی گمراہ عقل کو زندگی اور موت کی "حقیقت" کا آئینہ دکھا کر اسے فراق و وصال کے سفر کے اصل مقصد کی خبر دیتا ہے۔ اپنے زور بیان کے شور سے نہیں بلکہ اپنے عمل "اسوۂ حسنہ"

کی نرم اور محبت بھری آواز میں کہتا ہے۔ رنگ و بو کے دھوکوں میں مبتلا، آوارہ وادیوں کے اندھیروں میں بھٹکنے والے انسان۔ تو وارث نہیں تو حرف غلط نہیں۔ تیرا مالک بلا شرکت غیرے بڑا عظیم ہے۔ وہ تیرا خالق ہے۔ وہ تیرا رازق ہے۔ جہالت نے تمہیں رسواکن زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے۔ انہیں توڑ پھینک۔ تو نے اپنے مالک سے تعلق توڑ کر احسان فراموشی اور عہد شکنی کے ذلیل کن طوق اپنے گلے میں ڈال رکھے ہیں۔ انہیں اتار پھینک! تیرا لباس عزت ہے، شرف ہے، تکریم ہے۔ اپنی عزت کا احساس کر۔ کائنات کی ہر چیز تیرے مالک نے تیری خادم بنائی ہے۔ یہ چاند، ستارے، زمین میں مدفون خزانے، فضاؤں میں برقی قوتیں، ثوابت و سیارے سب تیرے خادم۔ تو اشرف المخلوقات۔

لیکن اس شرف کے بقا۔ اور ارتقا کا انحصار صرف اور صرف اس نام کے مالک علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اطاعت میں مضمر ہے۔ آسمانی مخلوق اور ارضی مخلوق میں سب سے زیادہ تعریف کیا یہ نام محمد صلی اللہ علیہ وسلم اُس روحانی اور مادی ارتقا کی ضامن حکمت کی لازوال علامت ہے۔ جو انسان کو اپنی عزتِ نفس، اعراف نفس سے شرفیاب کرتی ہے جو دوسروں کی عزت اور احترام کی صفت سے موصوف کرتی ہے۔ اگر کوئی مادی یا جسمانی طاقت کے احساس برتری کے طاعون میں مبتلا ہے تو اسے آدمیت کی نعمت سے نوازتی ہے۔ اگر کوئی احساس کمتری کے اعصاب شکن عوارض میں مبتلا ہے تو اسے توانائی اور تندرستی عطا کرتی ہے۔

یہ نام وہ عظیم نام ہے۔ علیہ التحیۃ والسلام جس کے اعمال اور ارشادات عالیہ صفحہ ہستی پہ اخلاق حسنہ کے وہ بقعۂ نور شہر ہیں جن کی روشنی جس انسان کے دل میں اتر جائے۔ وہ انسانی شرف کے اوج کو پہنچا جس قوم کی عقول نے اس سے رہنمائی حاصل کی وہ عزت و وقار کی نعمتوں کو پا گیا۔ زمین کے جس خطے نے اس کی روشنی کو قبول کر لیا۔ وہاں رحمت و برکت کے باغ لہلہانے لگے۔ امن، سکون، محبت و شفقت، اخلاص، مساوات اور باہمی ہمدردی کے پھول کھلنے لگے۔ لیکن . . . . روشنی میں لپٹے ہوئے اندھیرے اتنے ہو گئے ہیں کہ ان کو چیر کر گزرنے والی بصیرت محبت اور خلوص کی متقاضی ہے۔

مدینہ منورہ ـــ سلام صد سلام اس کے ذروں پر۔ اس کے مکینوں پر۔ اس کے چرند و پرند پر حجار و شجر پر سلام ـــ انسانیت کے محسن عظیم۔ رحمتِ دو عالم پر بے حد درود و سلام ـــ بظاہر مدینہ منورہ میں کافی تبدیلیاں ہو گئی ہیں۔ لیکن صورتوں کے بدلنے سے حقائق کبھی نہیں بدلتے۔ انسان کی عقل اپنی دریافتوں میں تغیر و تبدل پا سکتی ہے۔ لیکن اللہ کی عظمتوں، اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمتوں اور برکتوں میں کبھی نہ ہی کمی ہو سکتی ہے اور نہ ہی زوال آ سکتا ہے۔

ـــہ نوعِ انساں را بشیر و ہم نذیر ترجمہ :۔ وہ نوعِ انسان کو بشارتیں بخشنے والا اور وہی "فراق و وصال" کے سفر کے خطروں سے ڈرانے والا۔

ہم سپاہی، ہم سپہ گر، ہم امیر	وہی خود اعمال حسنہ کا سپاہی، سپہ سالار اور خود ہی "اعمال حسنہ" کے سپاہیوں کا امیر
مدعائے علم الاسما ستے	علم الاسمائے اصل مدعا بھی ذات اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام ہے
سرِ سبحان الذی اسرا ستے	اور سبحان الذی اسریٰ بعبدہٖ، یعنی معراج کے اسرار و معارف کا دانا بھی ہے۔

زندگی بخشد ز اعجاز عمل	اپنے "عظیم الشان" اعمال سے زندگی کو حسن بخشنے والا بھی وہی ہے علیہ الصلوٰۃ والسلام
می کند تجدید انداز عمل	عمل کے خوبصورت انداز کا بھی وہی موجد ہے علیہ الصلوٰۃ والسلام
جلوہ ہا خیزد ز نقش پائے او	اس کے ہر نقش پا سے مسرت افزا جلوؤں کے شہر آباد ہوتے ہیں۔
صد کلیم آوارۂ سینائے او	اس کی وادی سینا میں آپ کو ایک نہیں بے گنت کلیم پھرتے ہوئے نظر آئیں گے۔
چوں عناں گیرد بدست آں شہسوار	جب وہ شہسوار وقت کی لگام اپنے ہاتھوں میں لیتا ہے۔
تیز تر گردد سمند روزگار	تو زمانے کے گھوڑے کی رفتار تیز سے تیز تر ہو جاتی ہے۔
ذات او توجیہ ذات عالم است	اس کی ذات مقدس اس عالم کے وجود کا سبب ہے۔
از جلال او نجات عالم است (اقبالؒ)	اس عالم کی نجات اسی کے جلال کی مرہون منت ہے۔

مدینۃ النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اوّلین اسلامی مملکت

حکیم محمد یحییٰ خان شفا

ہجرت کے نویں اور نبوت (علیٰ صاحبہا الف الف تحیۃ) کے بائیسویں برس تک مدینہ منوّرہ کی نوخیز اسلامی مملکت اپنی کم عمری اور بظاہر انتہائی بے سروسامانی کے باوصف بہت حد تک مضبوط و مستحکم ہو چکی تھی۔

خداوند کی سچی آسمانی بادشاہت:

کرۂ ارض کے اس سنگلاخ اور غیر ذی زرع خطّہ میں خداوند خدا (ملك الحیّ القیّوم) کی سچی آسمانی بادشاہت ایک دہائے (DECADE) سے بھی کم مدّت میں اپنی جڑیں پختگی سے جما چکی تھی اور اللہ تعالیٰ کی وسیع اور بے پایاں رحمت اور اس کے بے حساب فضل و احسان کی بدولت شرک و بُت پرستی، کفر و سرکشی اور طغیان و عصیان کے اس ناسازگار ماحول میں توحید الوہیت اور وحدتِ ربّانی کا سدا بہار پودا روز افزوں توانائیوں کے ساتھ بڑھتا، پھیلتا اور پھولتا چلا جا رہا تھا۔

اسلام کا شجرۂ طیّبہ:

یہ گلشن اسلام کی مؤید من اللہ اور اولوالعزم باغبان (صلی اللہ علیہ وسلم) کی محنت اور حُسن تدبیر کا خوشگوار نتیجہ تھا کہ عرب کی شور زمین میں بھی امن و طمانیت کا یہ روح افروز و دل نواز سنبل نہ صرف اُگ آیا بلکہ دیکھتے ہی دیکھتے پھلنے پھولنے بھی لگا۔ اور یہ دراصل اللہ خالق الارض والسمٰوٰت کی قدرت کاملہ و حکمتِ بالغہ کا اعجاز تھا کہ اس دھرتی کی بے پناہ شوریت، اس کے اکثر باسیوں کی روایتی سنگدلی اور اہل جحود و جمود کی شوریدہ سری ہی اس شجرۂ طیّبہ کے حق میں نشوونما دینے والی کھاد (FERTILISER) بن گئی۔ چنانچہ امن و سلامتی کا یہ نوخیز مگر ہونہار پودا تھوڑے ہی دنوں کے اندر لہلہانے اور دل و نظر کی تقویت کا سامان فراہم کرنے لگا۔

وُہ شمع کیا بجھے جسے روشن خدا کرے:

چند سال کی مختصر سی مدّت میں اس ننھے سے پودے پر کفر و طغیان اور ظلم و عدوان کی تیغ بے اندازہ آندھیوں کی بے پناہ یورش رہی۔ عداوت و عناد کی بے رحمانہ یلغار نے اس کے تنِ نازک پر طرح طرح کے ستم توڑے۔ اس کی جان ناتواں مخالفتوں کی برق بے اماں کی زد میں رہی لیکن اس پودے کی شان ہی کچھ اور تھی اصلها ثابت وفرعها فی السمآء کائنات فطرت کے سینے میں اس کی جڑیں پیوست ہو چکی تھیں اور اس کی شاخوں کو آسمانی فضاؤں سے بھی آگے تک پھیلنا مقدر تھا۔ طوفانی آندھیاں اور جانسوز بجلیاں اُس کا

بھلا کیا بگاڑ سکتی تھیں۔ دشمنوں کی سب تدبیریں اُلٹی ہوتی چلی گئیں اور حریفوں کی خطرناک سازشیں اس رحمانی پودے کا بال بیکا نہ کر سکیں۔ کفار و مشرکین اور یہود و نصاریٰ نے شجرِ اسلام بیخ و بُن سے اُکھاڑ نے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ ان کی کوششیں واقعی بڑی جان لیوا تھیں، وکان مکرھم لتزول منہ الجبال لیکن پروردگار اسے مخالفوں کے ہر وار سے بچاتا اور آئندہ کی ہر یلغار سے کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہونے کے لیے نِت نئی توانائیاں ودیعت فرماتا رہا۔

چنانچہ حیرت انگیز سرعت کے ساتھ نہالِ اسلام سرسبز و شاداب ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ بہت جلد ایک تناور اور سایہ دار درخت کی شکل اختیار کر گیا جس کی ٹہنیوں پر ہر دو ایمان و آگہی علم و حکمت، دین و دانش، خیر و برکت، اخلاص و ایثار، اور زہد و تقویٰ کی تازہ تازہ کونپلیں پھوٹتی تھیں اور امن و آسودگی، اخوت و محبت، صلح و مروّت، انسان دوستی اور نسلِ آدمؑ کی خیر خواہی کے غنچے چٹختے اور رحمت للعالمینی کے پھول کھلتے تھے۔ ان رحمۃ اللّٰہ قریب من المحسنین۔

اے مسلماں آنے والے دَور کی تصویر دیکھ:

گلبن اسلام کے یہ نکہت خیز اور مشام افروز پھول آنے والے عہد کی بہار سامانیوں کے نقیب تھے اور اس شجرۂ طیبہ کے رس بھرے اور جاں پرور پھلوں سے عالمِ اسلام بلکہ کائناتِ انسانیت کو مستقبل کی پائیدار نعمتوں اور لازوال خوشیوں کی نوید ملتی تھی۔ مصائب و نوائب اور حوادث و آفات سے اس کو تحفظ دینے اور اپنا خون دے کر اس کی آبیاری کرنے والوں کو ان کا مہربان خدا ان مع العسر یسرًا کا مژدہ سناتا ہے اور ان کا شفیق و رحیم رہنما (صلی اللہ علیہ وسلم) کامیابی اور فلاح کی خوشخبری دیتا تھا۔ محاذِ جنگ میں خندقیں کھودتے اور فاقہ مستی میں پیٹ پر پتھر باندھتے ہوئے انتہائی صبر آزما صورتِ حالات میں بھی مستقبل قریب میں قیصر و کسریٰ کی سلطنتوں کا وارث اور ان کے خزانوں پر قابض ہونے کی پیش گوئی اہلِ ایمان کے ذوقِ مجاہدہ اور جوشِ عمل کے لیے مہمیز کا کام دیتی تھی۔

ایمانی فراست اور قلبی بصیرت سے بہرہ مند خوش نصیب لوگ جوق در جوق شجرِ اسلام کی گھنی چھاؤں تلے اکٹھے ہو رہے تھے۔ البتہ آدمؑ کے غلاف میں آدمؑ کے خلاف فکرِ آخرت سے بے پروا، جہالت و ضلالت کی حمیّت میں اندھے اور نسلی غرور و تفاخر کے مدھ ماتے انسان، اب بھی اپنے خبط میں مبتلا فضل و رحمت کردگار کے اس عظیم و پُربہار درخت کو جڑوں سے اُکھاڑ دینے کی شیطانی تدبیروں اور طاغوتی اسکیموں کے جال بُننے میں مصروف تھے۔ یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰہِ بِاَفْوَاھِھِمْ وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْکٰفِرُوْنَ۔

مدینہ منوّرہ کی اس اسلامی حکومت نے بڑے ہی ناسا عد حالات اور پُرفتن ماحول میں جنم لیا تھا۔ مکّے سے ہجرت کر کے مدینہ چلے آنے کے باوجود دشمنوں نے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم اور ان کے سچے پیروکاروں کو ایک لمحہ کے لیے بھی چین سے نہیں بیٹھنے دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح جوئی، امن پسندی اور عافیت کوشی کی کتنی ہی کوششیں کیں۔ قریش کا جذبۂ عناد کسی طرح کم ہونے کا نام نہ لیتا تھا۔ اللہ کے پاک رسُولؐ (فداہ امی وابی) نے ان کے شر و فساد کا سدِّباب کرنے کی غرض سے مدینہ منورہ پہنچنے کے فوراً ہی بعد اس کے متحارب گروہوں اور یہود بے بہبود اور اہلِ حق کی مختصر سی جمیعت کو ایک مدبرانہ اور امن پسندانہ معاہدہ کا پابند کر دیا تھا اور

تاریخ عالم میں آپؐ کا یہ معاہدہ جو بجا طور پر میثاق مدینہ کے تاریخی نام سے معروف ہے۔ امن و اعتدال، صلح پسندی اور خیر سگالی کی وہ اوّلین دستاویز ہے جس کی مثال اس سے پہلے کے ادوار میں نہیں ملتی۔ آپؐ کے سیاسی تدبر اور سلامت روی کا یہی شاہکار اپنے ثمرات و نتائج کے اعتبار سے مدینہ میں پہلی اسلامی حکومت کے قیام و تاسیس کا موجب بنا اور یہودیوں اور ان کے گٹھ بندھے مشرک ساتھیوں کی عہد شکنی اور خلاف ورزی کے باوصف یہی معاہدہ مملکت اسلامی کی توسیع و استحکام کی خشتِ اوّل ثابت ہوا۔

اِسلامی حکومت کے شورہ پشت مخالفین:

حالات اس درجہ پُر آشوب تھے کہ اپنے پرائے سب اس نوزائیدہ اسلامی مملکت کو صفحۂ ہستی سے مٹانے پر تُلے ہوئے تھے پرائے تو ظاہر ہے روزِ اوّل ہی سے اس کی جان کے دشمن تھے، بظاہر اپنے بننے اور حلیف کہلانے والے بھی بداندیشی اور فتنہ گری میں پرائوں سے کم نہیں تھے۔ چنانچہ ان سب نے اپنے جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ نبی رحمت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تمام تر صلح جوئی رائیگاں چلی گئی۔ بدبختوں نے سازش، غداری، فریب اور منافقانہ جعلسازی سے امن و سلامتی کے سارے منصوبوں پر پانی پھیر دیا۔ ظلم و ستم اور فساد انگیزی وہ کون سا حربہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ اور امن پسند بندوں کی اس مختصر سی جمعیت کو پراگندہ کرنے کے لیے آزمایا نہ گیا ہو۔

ہر روز نیا ظلم نئی طرزِ ستم ہے!

کھلی جنگوں اور سفاکانہ یلغاروں کا حال تو سب پر روشن ہے۔ شب خون مارنے اور چھاپے ڈال کر بے سروسامان انسانوں کا بچا کھچا مال و متاع لوٹ لینے اور مویشی تک ہانک لے جانے پر ہی بس نہیں کرتے تھے۔ بلکہ ظلم و عداوت کے یہ پتلے نہتے آدمیوں کو مار ڈالنے اور بعض حالتوں میں یرغمال بنا لینے سے بھی نہیں ہچکچاتے تھے۔

اس کے ساتھ ہی ان کینہ توزوں نے ایک نئی طرز ستم اور بھی ایجاد کر لی تھی۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تو تھے ہی رحمتِ مجسم، آدمؑ کے بگڑے ہوئے بیٹوں کی اصلاح و فلاح کی خاطر آپؐ کا شفقت بھرا دل ہر وقت بے تاب و بیقرار رہتا تھا، اور وہ بڑی دردمندی اور دلسوزی کے ساتھ انھیں نارِ جہنم سے بچانے اور اسلام کی آغوشِ رحمت میں لانے کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ ان سنگدل لوگوں نے (حضور صلی اللہ علیہ وسلم) کی اس دُکھتی رگ کو تاڑ لیا اور آپؐ کی اس طبعی دردمندی اور تبلیغِ اسلام اور عمومِ دعوت کے لیے حرص و والہیت کو بھانپ کر ناجائز فائدہ اُٹھانے لگے اور تحریک و دعوت اور تبلیغ و ارشاد کی توسیع کے نام پر حضرت محمدؐ رحمۃ للعالمین کو ایک بار نہیں بار بار دھوکہ دیا۔

وقوعہ بئرِ معونہ۔ عامر بن طفیل کی سازش:

اس سلسلہ میں ایک واقعہ بئر معونہ کا ہے۔ ہجرت کے چوتھے سال کی بات ہے۔ صفر کے مہینے میں بنو کلاب کا ایک سردار ابو براء

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے درخواست کی کہ میری قوم میں تبلیغ اسلام کے لیے مبلغین کی ضرورت ہے۔ وہ لوگ تحریک سے متاثر ہیں اور اب انھیں تلقین و ارشاد کے لیے اچھے کارکن مل جائیں تو یقیناً وہ سارے قبائل اور ان کے حلیف حلقہ بگوش اسلام ہو جائیں گے۔ آپؐ نے اس کی باتیں سنیں تو فرمایا: مبلغین بھجوانے میں تو کوئی عذر نہیں لیکن تمھارے پڑوس والے عامر بن طفیل رئیس نجد کی طرف سے اندیشہ ہے۔ ایسا نہ ہو وہ کوئی شرارت کرے۔

نبیِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دُور اندیشی:

اور حضورؐ کا یہ خدشہ بے جا بھی نہیں تھا۔ آنے والے دنوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس فکر مندی کو صحیح ثابت کیا۔ لیکن ہونے والی بات ہو کر رہتی ہے۔ احتیاط اور فکر مندی کے اظہار کے باوجود حضور کریم علیہ الصلاۃ والتسلیم نے توسیع دعوت کی غرض سے ابو براء کی باتوں پر یقین کر لیا اور اصحاب صفہؓ میں سے ستر منتخب اور پاک باطن انصاری قاریوں کی ایک جماعت اس کے ساتھ کر دی۔ اس لیے اس کو سریۂ قراءؓ کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

> "قصہ یہ تھا کہ عامر بن طفیل، جو اپنے علاقے کا طالع آزما رئیس اور نیزہ و طرار سردار تھا، حضورؐ علیہ الصلاۃ والسلام کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا، اور کہنے لگا کہ میں اور میری پوری قوم اپنے حلیف قبائل سمیت آپؐ کے ساتھ ہو جائے گی بشرطیکہ آپؐ میرے ساتھ یہ معاہدہ کر لیں کہ بادیہ کے مالک آپؐ ہوں اور شہر میری عملداری میں رہیں۔ نیز اپنے بعد آپؐ مجھے اپنا جانشین نامزد کر لیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی یہ مشروط پیشکش ٹھکرا دی تھی اور وہ ناراض ہو کر چلا گیا تھا۔ لیکن اس نے جاتے ہوئے دھمکی دی تھی کہ میں قبائل غطفان کو لے کر آپؐ کے خلاف لشکر کشی کروں گا۔"
>
> آنحضرتؐ نے عامر کے اس چیلنج پر اپنے اس خدشہ کا اظہار فرمایا تھا۔ تاہم جب اس نے اطمینان دلایا کہ "میں اس کی ضمانت دیتا ہوں" تو آپؐ نے اپنے جان نثار صحابہؓ کی منتخب جمعیت کو تبلیغی مہم پر روانہ فرما دیا۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ ابو براء اور عامر میں ملی بھگت تھی یا وہ اپنی سادگی میں اس کا آلہ کار بن گیا تھا۔ بہرحال ولنبلونکم بشیء من الخوف والجوع ونقص من الاموال والانفس والثمرات کے سلسلۂ ابتلاء میں سے یہ بھی ایک آزمائش تھی، جسے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن کی آمادگی کے ساتھ انگیز کیا گیا۔"

فزت برب الکعبہ!

سرفروشانِ اسلام کا یہ مقدس قافلہ ابو براء اور اس کے ساتھیوں سمیت بئر معونہ کے مقام پر پہنچ کر رک گیا۔ مسلمانوں نے دیکھا کہ کچھ فاصلے پر اسلام دشمنوں کی ایک بھاری جمعیت ان کی راہ روکے کھڑی ہے اور ان کے تیور بتا رہے ہیں کہ وہ استقبال کے لیے

نہیں آئے بلکہ ان کے ارادے فاسد ہیں۔ اس قافلہ میں حضرت انس رضؓ کے ماموں اور جناب اُم سلیم رضؓ کے بھائی حضرت حرام بن ملحان بھی تھے۔ وہ دو آدمیوں کو ساتھ لے کر آگے بڑھے اور اپنے ساتھیوں کو یہ ہدایت دے کر ایک جگہ ٹھہرا دیا کہ میں اُن سے بات چیت کے لیے اُن کے پاس جاتا ہوں۔ تم یہیں سے دیکھتے رہو اگر انھوں نے مجھے مار ڈالا تو تم واپس جا کر اپنے ساتھیوں سے جا ملنا۔ ایک اور روایت سے مستفاد ہوتا ہے کہ ابو براء اور اس کے ساتھیوں نے انھیں خط دے کر بھیجا تھا ــــ خیر حضرت حرام رضؓ کافروں کے پاس پہنچے اور آواز بلند سے کہا "تم مجھے امن دیتے ہو کہ میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت تم تک پہنچا دوں"، انھوں نے اثبات میں جواب دیا، تو آپ رضؓ نے تقریر شروع کی۔

اسی اثناء میں دشمنوں کے اشارہ پر ایک شخص نے پیچھے سے آ کر نیزہ مارا اور انھیں شہید کر دیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ حضرت حرام رضؓ نے اپنا خون اپنے ہاتھوں میں لے کر چہرے پر مل لیا اور نعرہ لگایا اللہ اکبر! فزت برب الکعبہ۔ اللہ بہت بڑا ہے۔ رب کعبہ کی قسم میں کامیاب و کامران ہو گیا"۔ یہ عامر بن طفیل کی شرارت تھی۔ اس نے اپنے جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے کے لیے ان اطراف کے دوسرے قبائل رُعل، ذکوان اور عصیۃ وغیرہ کے جنگ آزماؤں کو اپنے ساتھ لے کر مٹھی بھر مسلمانوں کی مختصر سی جماعت کو گھیرے میں لے لیا۔ اللہ کے ان بندوں نے جی توڑ کر مقابلہ کیا اور کفار کے گھیرے کو توڑنے کے لیے سر توڑ کوششیں کیں۔ لیکن اس انبوہِ کثیر کے سامنے گنے چنے اور نہتے افراد کی بھلا کیا پیش جاتی۔ تھوڑی ہی دیر میں سب جامِ شہادت پی کر سرخرو ہو گئے۔

کہتے ہیں صرف ایک صحابی عمرو بن امیۃ الضمری بچ گئے تھے۔ لیکن انھیں بھی عامر نے پہلے سر کے بال کاٹ کر غلام بنا لیا لیکن پھر یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ "میری ماں نے ایک غلام آزاد کرنے کی منت مان رکھی تھی۔ اس لیے اسے چھوڑ دیتا ہوں"۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس المناک واقعہ کی اطلاع ملی تو آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ میرا بدترین خدشہ صحیح نکلا، آپؐ بہت غمگین ہوئے اور مہینہ بھر تک نمازِ فجر میں دُعائے قنوت پڑھتے رہے اور ظالموں کے ظلم کو انہی کے حق میں اُلٹ دینے کی دُعائیں کرتے رہے۔

عامر بن طفیل کچھ ہی عرصے بعد طاعون کے عذاب میں مبتلا ہو کر گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھے بیٹھے مر گیا۔

سریۂ رجیع:

اسی طرح عضل اور قارہ دو قبیلوں کا ایک وفد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں پہنچا اور اپنے قبیلوں کو نو مسلم ظاہر کر کے چند صحابہ کو اسلامی احکام کی تبلیغ اور دینی شعائر کی تلقین کرنے کی غرض سے مہیا فرمانے کی خواہش ظاہر کی۔ آپؐ نے عاصم بن ثابت الانصاری کی سرکردگی میں دس صحابہ کی ایک جمعیت ان کے ہمراہ بھجوا دی۔ ایک روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ یہ جمعیت سریہ کے طور پر کفار و مشرکین کی سرگرمیوں کا اندازہ اور بحدِ امکان ان کا قلع قمع کرنے کے لیے بھیجی گئی تھی۔ لیکن اللہ کے سپاہی خواہ تبلیغی مشن پر بھی جائیں، طاغوتی سازشوں کا تار و پود بکھیرنا ان کے فرائض میں شامل ہوتا ہے اس لیے ان

کے فرائض میں شامل ہوتا ہے ۔ اس لیے ان دونوں روایتوں میں تعارض کا کوئی پہلو نہیں ہے ۔ بہر کیف یہ لوگ مدینہ سے چل کر عسفان کے مقام پر پہنچے اور وہاں سے بڑھ کر رجیع کے کنوئیں تک آگئے ۔

یہ جگہ مکہ اور عسفان کے مابین واقعہ ہے ۔ یہاں پہنچ کر انھوں نے سیٹیاں بجا بجا کر اردگرد کی گھاٹیوں میں چھپے ہوئے اپنے حلیفوں کو اکٹھا کرنا شروع کیا ۔ یہ تقریباً دو سو بنو لحیان کے تیرانداز تھے جو مسلمانوں کی گھات میں بیٹھے تھے ۔ عاصم نے جب ان کی غداری اور سازش کا یہ عالم دیکھا تو وہ اپنے ساتھیوں سمیت پھرتی سے ایک قریبی ٹیلے پر چڑھ گئے ۔

تیراندازوں نے کہا آپ لوگ خواہ مخواہ بدک گئے ۔ بدگمانی نہ کیجئے نیچے اتر آیئے ۔ ہم آپ کو امان دیتے ہیں " عاصم رضی اللہ عنہ بولے ۔ میں کافروں کی امان میں نہیں آتا ۔ ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کے حضور میں دعا کی :

الٰہی ! اپنے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ہمارے حال کی خبر پہنچا دے ۔ پھر یہ مٹھی بھر جماعت اپنے سردار سمیت پوری بے جگری سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئی ۔ صرف دو صحابی خبیب الانصاری اور زید بن دثنہ رضی اللہ عنہما کافروں کی باتوں میں آ کر ٹیلے سے نیچے اتر آئے تھے ۔ لیکن ان سازشی غداروں نے اپنے وعدوں کا پاس نہیں کیا ۔ ان دونوں کی مشکیں کس کر انھیں قیدی بنا لیا اور مکے لے جا کر فروخت کر آئے ۔

حضرت زیدؓ کی شہادت :

حضرت زیدؓ بن دثنہ کو صفوان بن اُمیہ نے خرید لیا تھا وہ انھیں اپنے باپ اُمیہ بن خلف کے بدلے میں قتل کرنا چاہتا تھا ۔ جو غزوۂ بدر میں واصل جہنم ہوا تھا ۔ ڈھائی تین مہینے بعد جب حرمت والے مہینے گزر چکے تو یہ لوگ زیدؓ کو قتل کرنے کے لیے مقتل میں لائے اور ان سے پوچھا کہ آیا تم یہ نہیں چاہتے کہ اس وقت تمھاری جگہ محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو تختۂ دار پر لٹکایا جائے ۔ زیدؓ نے تڑپ کر جواب دیا ۔ نہیں ! خدا کی قسم ہرگز نہیں ۔ میں اپنی جان دینا تو گوارا کر سکتا ہوں ۔ لیکن آپؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پائے مبارک میں ایک کانٹا بھی چبھ جانا برداشت نہیں کر سکتا ۔ اس پر ابو سفیان نے بلیسا خنہ کہا میں نے کبھی کسی شخص سے کسی کو اتنی محبت و شیفتگی کا برتاؤ کرتے نہیں دیکھا جتنا محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ان کے صحابہؓ کرتے ہیں ۔ آخر نسطاس نے حضرت زیدؓ بن دثنہ کو تلوار کے ایک زبردست وار سے شہید کر دیا ۔

حضرت خبیبؓ کا واقعۂ شہادت :

جنگ بدر میں حارث بن عامر حضرت خبیب بن عدی (جو یثرب کے قبیلہ اوس کے انصاری تھے) کے ہاتھ سے ہلاک ہوا تھا ۔ اس لیے انھیں حارث کے ماں جائے بھائی اور اس کے بیٹوں کے حلیف حجیر تمیمی نے حارث کے انتقام میں قتل کرنے لیے خرید لیا تھا ۔ اور اب وہ بھی حرمت والے مہینوں کے گزر جانے کا انتظار کر رہے تھے ۔ اس دوران میں حجیر کی ایک کنیز ماویہ حضرت خبیبؓ کی دیکھ بھال کرتی تھی ۔ اس کا بیان ہے کہ خبیبؓ جب رات کو تہجد میں قرآن حکیم کی تلاوت کرتے تھے تو قبیلہ

کی عورتیں کلام الٰہی سن سن کر زار و قطار روتی تھیں۔

حارث کی بیٹی روایت کرتی ہے کہ خبیبؓ سے بہتر قیدی میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ میں نے ان کے ہاتھ میں انگور کا عمدہ اور تر و تازہ خوشہ دیکھا جسے وہ مزے لے لے کر کھا رہے تھے۔ حالانکہ وہ زنجیروں میں پابند تھے۔ اور مکہ میں ان دنوں کوئی پھل نہیں آ رہا تھا۔ خدا کی قسم وہ جنّت ہی کا پھل تھا۔ جو اللہ نے خبیبؓ کو عطا کیا تھا۔

انہی دنوں حضرت خبیبؓ نے زیر ناف بالوں کو صاف کرنے کے لیے ایک اُسترہ طلب کیا تھا جو اُنھیں دے دیا گیا۔ حارث کی بیٹی کہتی ہے میں نے دیکھا کہ اُسترا خبیبؓ کے ہاتھ میں ہے اور میرا ننھا بچہ خبیبؓ کی گود میں بیٹھا ہے۔ اس خوف سے میری چیخ نکل گئی کہ قیدی خود تو موت کے منہ میں ہے ایسے میں اگر وہ میرے ننھے کو قتل کر ڈالے تو اُسے کون روک سکتا ہے۔ یہ چیخ کی آواز سن کر خبیبؓ نے میری طرف دیکھا اور ہنس کر بولے تم کیوں ڈر گئی ہو، میں اس بچے کو ذبح نہیں کروں گا۔ کسی بے گناہ کی جان لینا ہمارا شیوہ نہیں ہے۔

جب حضرت خبیبؓ کو قتل کرنے کا انتظام کیا جا رہا تھا تو آپؓ نے دو رکعت نماز ادا کرنے کی تحیۃ کے طور پر مہلت چاہی۔ آپؓ نے نماز ختم کی اور بروایت بخاری یہ شعر ارتجالاً ارشاد فرمائے: ؎

وَلَسْتُ اُبَالِیْ حِیْنَ اُقْتَلُ مُسْلِمًا   عَلٰی اَیِّ شِقٍّ کَانَ لِلّٰہِ مَصْرَعِیْ

وَذٰلِکَ فِیْ ذَاتِ الْاِلٰہِ وَاِنْ یَّشَاْ   یُبَارِکْ عَلٰی اَوْصَالِ شِلْوٍ مُمَزَّعٖ

(جس صورت میں کہ اسلام پر مارا جا رہا ہوں مجھے اس بات کی قطعاً پروا نہیں کہ میں کس پہلو پر گرتا ہوں۔ چونکہ یہ مصیبت اللہ کی راہ میں آئی ہے اور وہ چاہے تو میرے اعضا کے کٹے ہوئے ایک ایک بند میں برکت عطا فرما دے۔)

اس کے بعد آپؓ نے کہا اگر تم یہ خیال نہ کرتے کہ اُس نے موت سے ڈر کر لمبی نماز شروع کر دی تو میں ابھی اپنے خالق و معبود کو اور بھی یاد کرتا۔ پھر فرمایا اے اللہ ان کو گن لے اور ایک ایک کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے۔

حضرت عروہ بن زبیر فرماتے تھے کہ کفار نے خبیبؓ سے بھی وہی بات کہی جو زیدؓ بن دثنہ سے کہی تھی۔ یعنی کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ تمھاری جگہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو موت کے گھاٹ اُتارا جاتا۔ تو آپؓ نے بھی وہی جواب دیا: "خدا کی قسم! میں اپنی جان کے بدلے میں یہ بھی گوارا نہیں کر سکتا کہ میرے محبوب و مطاع (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاؤں میں ایک کانٹا تک چبھ جائے۔"

اب ابو سروعہ عقبہ بن حارث نے آگے بڑھ کر حضرت خبیبؓ پر نیزے کا وار کیا پھر سب کے سب اپنے حربے، نیزے اور تلواریں لے کر آپؓ پر ٹوٹ پڑے اور آپؓ کو شہید کر دیا۔ رضی اللہ عنہ وارضاہ ؎

بنا کردند خوش رسمے بخون و خاک غلطیدن   خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

حضرت خبیبؓ کی نذرِ عبودیت بارگاہِ خداوندی میں مقبول ہوئی اور ان کے آخری دو گانہ کو ہدیۂ جاں سپاری کے طور پر نبی اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پسندیدہ قرار فرمایا:

بھڑوں کا کارنامہ :

ادھر خداوندِ عالم نے حضرت عاصم رضؓ کی دُعا قبول فرمائی اور ان کے ابتلاء کی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچائی ادھر حضرت عاصم رضؓ کی نعش مبارک کو کفار کی چیرہ دستیوں سے بچانے کا ایک انوکھا انتظام فرما دیا۔ دشمنوں کو وہم تھا کہ اس طلایہ گرد اسلامی دستہ کے امام و سردار عاصم رضؓ بن ثابت شہید نہیں ہوئے۔ اس لیے انھوں نے چند سپاہی اس غرض سے بھیجے کہ وہ ان کا سر کاٹ لائیں۔ ایک روایت میں یوں بھی آیا ہے کہ ہذیل کے کچھ لوگ آپ کا سر لینے آئے تھے تاکہ اسے سلافہ بنت سعد کے ہاتھ فروخت کر دیں، کیونکہ غزوۂ احد میں سلافہ کا بیٹا عاصم رضؓ کے ہاتھ سے مارا گیا تھا اور اس نے منت مانی ہوئی تھی کہ عاصم کا سر میرے ہاتھ لگ جائے تو میں اس کی کھوپڑی میں شراب بھر کر پیوں گی۔ غرض یہ لوگ جب اس ارادہ سے رجیع پہنچے تو مرتی سے بھڑوں کی ایک کثیر تعداد چھتوں کے چھتے بن کر حضرت عاصم رضؓ کی لاش پر چھا گئی اور یوں وہ اپنے مذموم ارادے کی تکمیل میں ناکام رہے۔ انھوں نے سوچا چلو کچھ دیر بعد بھڑیں ہٹ جائیں گی ہم عاصم کا سر کاٹ لیں گے۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد اتنے زور کا سیلاب آیا کہ عاصم رضؓ اور ان کے ساتھیوں کی تمام لاشیں بہہ کر ان کی دسترس سے دُور نکل گئیں۔ وما ذالک علی اللہ بعزیز۔

المختصر خود نبی پاک (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان گرامی کو چشم زخم پہنچانے کی پے درپے تدبیریں کی گئیں۔ آپؐ پر سوتے میں تلوار تانی گئی۔ رُعبِ نبوت تھا کہ وار کرنے کا حوصلہ نہ پڑا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام یک لخت بیدار ہو گئے، نگاہِ نیم باز سے دیکھا تو جان کا دشمن کانپ اُٹھا۔ تلوار ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر گئی، بدن پر لرزہ طاری ہو گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسکرا کر تلوار ہاتھ میں لے لی اور پوچھا "بتا اب تجھے میرے ہاتھ سے کون بچائے گا۔ گھگیا کر بولا! حضورؐ آپ ہی رحم فرمائیں اور میری جان بخشی کر دیں۔

——— آپؐ پر چٹانیں لڑھکانے اور کچل دینے کی سازش کی گئی۔ اگر اشارۂ خداوندی سے لمحہ بھر پہلے آپؐ اُٹھ نہ گئے تو دشمن کا وار بہت کارگر تھا۔

——— آپ پر جادو کیا گیا۔

——— یہودیہ نے زہریلا گوشت کھلا کر آپؐ کو ہلاک کرنے کی کوشش کی۔

غرضیکہ عناد و عداوت میں اندھے لوگوں نے کسی نوع کے ظلم و ستم سے دریغ نہیں کیا اور مسلمانوں اور ان کے آقا و مولا (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ختم کرنے کے لیے طرح طرح کے جتن کیے۔ لیکن وہ جو کسی نے کہا ہے۔ ع۔ دشمن چہ کند چو مہرباں باشد دوست۔ مشیتِ الٰہی کے آگے کسی کی پیش نہیں گئی۔ ؎

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن

پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے سچے پیروکاروں (رضوان اللہ علیہم اجمعین) نے ہر ابتلا کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔

اور صبر و ضبط اور سکون و ثبات کا دامن کسی موقع پر بھی ہاتھ سے جانے نہ دیا ۔ وُہ فرمانِ الٰہی ؟
یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ۔
کے تقاضے پورے کرنا جانتے تھے اور خود بھی صبر کرتے اور دوسروں کو بھی صبر کرنے کی تلقین کرتے تھے ۔ اور اللہ اور رسولؐ سے باہم مل کر نظم و ضبط قائم رکھتے تھے ۔ پھر اُنھیں اپنے خالق و مالک کی یکتا اور بے ہمتا ذات پر پورا ایمان اور مکمل اعتماد تھا اور وہ اسی کی نصرت و امداد پر ہمیشہ آس لگائے رہتے تھے ۔ ہر طرح کے نامساعد احوال و ظروف میں بھی اُنھیں آخر کار دینِ حق کی کامیابی اور اسلام کے غلبہ کا یقین تھا ۔ وہ اللہ سے ڈرتے تھے اور ما سوا اس کے انھیں اور کوئی خوف نہ تھا ۔
چنانچہ ان کے مالک و مولا ، خالق یکتا اور قادر توانا نے اپنے فضل و رحم سے اُنھیں ہر ابتلاء میں سرخرو کیا اور ہر مُصیبت سے نجات بخشی ۔
اللہ نے ان کو پہلے ہی بتا دیا تھا :- ولتسمعنّ من الذین اوتوا الکتٰب من قبلکم ومن الذین اشرکوا اذًی کثیرا ۔ کہ اہلِ کتاب اور مشرکین دونوں کی طرف سے تمھاری دل آزاری ہوگی ۔ وان تصبروا وتتقوا فان ذالک من عزم الامور ۔ بڑی اولوالعزمی اس میں ہے کہ صبر اور تقویٰ کی راہ اختیار کرو ۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا عزم جزم :

پھر یہ سیّد الاوّلین والآخرین حضرت خاتم النبیین (علیہ الصلوٰۃ والسلام) الیٰ یوم الدین کی بےمثال عزیمت اور عدیم النظیر تدبر کا حسن کمال ہے کہ اپنوں بیگانوں سب کے وار سہتے ہوئے کچھ ایسے جوابی اقدامات فرمائے ہیں کہ اپنا نقصان کم سے کم ہو ۔ اور بے رحم دشمن کے چھکے بھی چھوٹ جائیں ۔
اس حکمت عملی کا نتیجہ حسب دلخواہ نکلا کہ رفتہ رفتہ مخالفین کے حوصلے پست ہوتے چلے گئے ۔ یہودیوں کی سازشیں نہ یہ کہ ناکام ہوتی چلی گئیں بلکہ بعض اوقات ساری تدبیریں اُلٹی ہوتی چلی گئیں اور اُنھیں لینے کے دینے پڑ گئے ۔ دشمنوں کی جمعیت بکھرتی چلی گئی ۔ یکے بعد دیگرے اور پے در پے ناکامیوں سے اُن کے حوصلے پست ہوئے ۔ ولولے دم توڑ گئے اور ہمتیں شکست ہوگئیں ۔

یہ نبوغ نبوت کی بُرہان ہے :

نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ہر ایسے موقعہ پر کمال فراست اور خدا داد بصیرت سے کام لیا اور صورتِ حالات کا رُخ انتہائی تدبر اور دانشمندی کے ساتھ اپنے حق میں پلٹ دیا ۔ مخالف طاقتوں کی سرکوبی کے بروقت اِقدامات کیئے اور ان کے بکھرے ہوئے شیرازہ کو پھر سے مجتمع ہونے کی مہلت نہیں دی بلکہ اپنے حسن عمل سے اِن کی ہر ناکامی کو دوامی بنا دیا ۔
یہ اسی عزم و تدبر کی خوشگوار پیش رفت تھی کہ مدینہ منورہ کی بے ساز و برگ اسلامی حکومت دن بدن استحکام و استقلال کے

مرحلے طے کرتی بڑھتی اور پھیلتی چلی گئی۔یہاں تک کہ اندرونی و بیرونی ہر طرح کے دشمنوں کی معاندانہ سازشوں کے رغم الف ۹ھ ہجری علی صاحبہا السلام تک گردشِ لیل و نہار کے ساتھ اس مقام پر پہنچ گئی کہ اب نہ تو مشرکین عرب کی مشترکہ طاقت اس کو چیلنج کرنے کا حوصلہ رکھتی تھی اور نہ ہی یہود بے بہبود کی ریشہ دوانیاں اس کے پائے ثبات کو متزلزل کرنے میں کامیاب ہو سکتی تھیں۔

منافقین کی دسیسہ کاریاں

لیکن وہ جو کسی نے کہا ہے ؎

نیش عقرب نہ از پئے کین است
مقتضائے طبیعتش این است

کچھ بدطینت افراد قسام ازل سے ایسی کج نہاد طبیعت لیکر آتے ہیں جو بچھو کی طرح انھیں ڈنک مارنے پر ہمیشہ اکساتی رہتی ہے۔خواہ اس نیش زنی کا اثر ہو یا نہ ہو انھیں تو اپنی طبیعت کا تقاضا پورا کرنا ہوتا ہے۔

ابو عامر نامی ایک شخص ایسے ہی بد نہادوں میں سے تھا۔یہ مدینے کے مشہور قبیلے اوس سے تعلق رکھتا تھا اور عیسائیت اختیار کرکے اپنی پارسائی کی بنا پر راہب کہلاتا تھا اور اسلام اور مسلمانوں کا بدترین دشمن تھا۔مہاجرین کے مدینہ منورہ آنے اور انصار کے ساتھ مواخات قائم ہونے کے وقت ہی سے یہ جلا بھنا ہوا تھا اور ہر وقت اسلام اور مسلمانوں کو زک پہنچانے کی کاوشوں میں مصروف رہتا تھا۔اسلام دشمنی کے ہی باعث ابو عامر فاسق کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔یہ کینہ پرور اور عداوت کیش انسان، ابو سفیان سے ساز باز رکھتا تھا۔جنگِ اُحد کے موقع پر اس نے قریشی سرداروں کو یقین دلایا تھا کہ میں انصار کو بہکا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امداد و اعانت سے باز رکھوں گا۔مزید براں اس نے میدانِ اُحد میں گڑھے کھدوائے تاکہ مسلمان مجاہدین ان میں گر پڑیں اور اسلامی فوج کو نقصان پہنچے۔ادھر ابو سفیان بھی اس پر خاصہ تکیہ کیے بیٹھا تھا، لیکن جب اُحد میں بھی کفار و مشرکین کو منہ کی کھانی پڑی تو ابو عامر بھی دل مسوس کے رہ گیا۔تاہم اپنی بدفطرتی اور اسلام دشمنی سے پھر بھی باز نہ آیا اور بدستور اپنی کارستانیوں میں مصروف رہا۔جنگِ احزاب میں بھی اس نے اسلام اور مسلمانوں کی تباہی و بربادی کے لیے بڑی بڑی اُمیدیں باندھ رکھی تھیں، لیکن اب کے بھی پھر اس کا منہ کالا ہوا۔ہوازن بھاگ نکلے تو یہ بھی اپنی سالہا سال کی پیہم تگ و دو بے سود نکلتے دیکھ کر مایوس و دل برداشتہ ہو کر شام چلا گیا۔

ابو عامر کی ایک نئی فتنہ انگیزی

کم و بیش پانچ سال بعد ابو عامر فاسق کی باسی کڑھی میں پھر اُبال آیا۔اس نے شام سے مدینہ کے منافقین کو ایک جُدا گانہ مسجد تعمیر کرنے کا ایک منصوبہ بھیجا جس میں سادہ لوح مسلمانوں کو عبادت کے نام سے اکٹھا کر کے اسلام اور اہلِ ایمان کے خلاف استعمال کرنے کی سازشیں کی جائیں۔ساتھ ہی یہ بھی کہلا بھیجا کہ تم یہ کام کر دو اور میں قیصر روم کے پاس جا کر اس کی افواج قاہرہ کو مدینے کی

کمزور و ناتواں حکومت پر چڑھا لاتا ہوں اندر سے تم اسے کھوکھلا کر دو اور باہر سے میں اسے صفحۂ ہستی سے کھرچ کر مٹا دینے کا بندوبست کرتا ہوں۔

منافقین نے مسجد قبا کے قریب ہی ایک نام نہاد مسجد تیار کر لی اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں جا کر عرض کی کہ ہمارے محلوں میں رہنے والے بوڑھے اور دیگر وراشخاص کو مسجد نبویؐ میں ہر وقت پہنچنے میں بہت دقت تھی، اس لیے ہم نے اسی علاقے میں ایک مسجد تعمیر کی ہے۔ ازراہِ تلطف آپ تشریف لے چلیں اور ایک وقت کی نماز بنفسِ نفیس پڑھا کر اس کا افتتاح کر دیں۔

حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) ان دنوں غزوۂ تبوک کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ اس لیے فرمایا کہ ابھی تو فرصت نہیں البتہ تبوک سے واپسی پر دیکھا جائے گا اور یوں ان کی سازش پروان چڑھتے چڑھتے رہ گئی۔

غزوۂ تبوک۔ جیش العسرہ

تبوک مدینہ منورہ سے کم و بیش ڈیڑھ سو میل دُور دمشق کی راہ میں ایک سرحدی اور عسکری اہمیت کا مقام ہے۔ اگرچہ اس مقام پر متوقع جنگ نہیں ہوئی بلکہ شام کی عرب ریاستوں اور ان کے اتحادی ہرقل کے لشکر مسلمانوں کی آمد کی خبر پا کر فرو ہو گیا رہ ہو گئے تھے اور اس طرح اس مقام تک حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی آمد سفر ہی کے درجے تک رہی، لیکن خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر بڑی بڑی خونریز جنگوں کے مقابلے میں اس معرکہ آرائی سے اسلام اور مسلمانوں کو بہت سے اہم اور دیرپا فائدے حاصل ہوئے تھے اس لیے اپنی اہمیت اور ثمرات کے اعتبار سے یہ لشکر کشی غزوہ سے بھی کم نہیں اور پھر اس غزوہ کے اہتمام و انصرام میں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے جاں نثار اور سراپا ایثار فدائیوں نے جس جوش اور جذبے سے کام لیا ہے اس کے مدِنظر اُسے دوسرے کئی معرکوں پر برتری حاصل ہے۔

مزید براں تبوک کی یہ مہم حضور سرورِ عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بے مثال قائدانہ صلاحیتوں، حربی و انشوری اور اولوالعزمی کا بے مثال اور عظیم الشان مظاہرہ بھی ہے۔ اس لیے اسے آنے والی دنیا کے ماہرینِ حرب و ضرب کے سامنے جنگی حکمتِ عملی کی ایک نادر اور عدیم النظیر مثال کی حیثیت سے پورے فخر و وقار کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے۔

حق یہ ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی موجودہ حیرت انگیز ترقیوں اور خصوصیت کے ساتھ اسلحہ اور آلاتِ جنگ میں تہلکہ خیز پیش رفت کے باوجود کہ ENERGY کی تقریباً ہر ایک شکل کو مخالف طاقتوں کی بیخ کنی کے لیے جنگی تکنیک کا اہم جزو بنا لیا گیا ہے۔ تبوک کی اس سادہ و پرکار تدبیرِ حرب WAR STRATEGY کا آج بھی کوئی جواب نہیں۔ جس میں خون کا ایک قطرہ بھی نہیں بہایا گیا اور مخالف جنگ آزماؤں کی تمام تر حربی تدبیروں کو یکسر اُلٹ کر رکھ دیا گیا۔

عرب رؤسا جو فتح مکہ کے بعد قریش اور ان کے حلیف قبائل اور ان کے سازشی اتحادی (ALIES) یہودیوں وغیرہ سے مایوس ہو کر اب دنیا کی سب سے بڑی سلطنت سے (جو اس وقت کی معلوم دنیا کے نصف حصے پر حکمران تھی اور جس نے ابھی

حال ہی میں ایران ایسی متمدن اور شہزور بلکہ قہرمانی سلطنت کو عبرتناک شکست دے کر چار دانگ عالم میں اپنی دھاک بٹھا دی تھی) آس لگائے بیٹھے تھے۔ اپنی اپنی افواج کے ساتھ ہرقل کی بے پناہ اور بے شمار فوج میں شامل ہو کر مدینہ کی نئی اور نوعمر حکومت کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے کے لیے نکل کھڑے ہوئے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اولوالعزمانہ اقدام کا اس درجہ دہشت خیز، حوصلہ شکن اور روح فرسا اثر ہوا جو دورِ حاضر کے خوفناک ترین ایٹمی آلات، ہائیڈروجن بم اور دور مار میزائلوں سے بھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ آجکل کی لیزر (LASER) شعاعیں بھی نبیٔ امی صلی اللہ علیہ وسلم کے بغیر جنگ کے سامنے پانی بھرتی نظر آتی ہیں اور دیکھنے والی آنکھیں یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاتی ہیں کہ وہ کونسی بے نام شعاعیں تھیں، جو تیس ہزار قدسیوں اور ان کے سالارِ اعظم کی خشمگیں نگاہوں سے نکلیں اور چشم زدن میں کم و بیش دو لاکھ جنگجوؤں کی ذہنی کایا کو پلٹ گئیں۔ ان کی ایسی BRAIN WASHING ہوئی کہ سارا دم خم کافور ہو گیا۔ ابھی کچھ دن پہلے مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے ناپید کر دینے کے منصوبے بنانے والے ایسے دبکے کہ پھر سر نہ اٹھا سکے اور مدنی آقا کے غلام ان کی سرحدوں پر مہینوں ھل من مبارز کی دستک دیتے پھرے۔

جنگی امور کے ماہرین حیران ہیں

جدید دنیا کے لال بجھکڑ اس صورتِ احوال پر تعجب کرتے ہیں کہ اس وقت کی عظیم ترین سلطنت اپنی کارآزمودہ اور کشورکشا فوجی قوت اور خود عرب کے جنگجو اور خونخوار قبائل لخم، جذام عاملہ اور غسان کی معاونت کے باوجود چند ہزار بے سروسامان مسلمانوں کے مقابلے میں کیوں پسپا ہو گئی۔ ان کے بعض دانشوروں نے بڑی چھان بین کے بعد یہ نکتہ اٹھایا ہے کہ نبیٔ عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی طوفانی یلغار اور بے جگری کا مظاہرہ کر کے اپنے حریفوں کو نفسیاتی طور پر مبہوت کر ڈالا تھا اور وہ میدانِ جنگ سے واپس لوٹ گئے تھے۔ کوئی کہتا ہے کہ موسمی حالات اور ملک کے اندرونی معاملات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے رومی فوجوں نے مسلمانوں سے جنگ آزمائی کو آئندہ کسی مناسب موقع تک ملتوی کر دیا تھا۔

بہرحال کسی کی عقلِ خام کار و کج اندیش کو یہ نہیں سوجھتا کہ دینِ فطرت کے داعیٔ اعظم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو باریٔ فطرت جل شانہٗ کی تائید و نصرت حاصل تھی۔ یہ خالقِ انفس و آفاق ہی کی مشیت تھی کہ جس نے نبیٔ امی صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنی عظیم قوتِ نفسی سے مالا مال کر دیا تھا جس نے اس دور کی انتہائی متمدن اور متمول سلطنتِ روما کو نفسیاتی شکست وریخت سے دوچار کر دیا اور پھر حالات کی عدم مناسبت کی بھی ایک ہی کہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس عالم میں اس لشکرکشی کا اہتمام کیا ہے۔ اس پر نظر ڈالیئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ناسازگاری احوال کسے کہتے ہیں۔

اہلِ کتاب کی فوجی تیاریاں

نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں ایک شامی قافلہ نے یہ خبر پہنچائی تھی کہ قیصرِ روم کی افواج جن میں عرب کی عیسائی

ریاستوں کے حکمران اور ان کے قبائل بھی شامل ہیں مدینۃ منورہ پر حملہ کرنے والی ہیں۔ آپؐ کو معلوم تھا کہ قیصر اور اس کے حلیف سال سوا سال پہلے کی شکست کا بدلہ لینے کے لیے یقیناً بے تاب ہیں اس لیے آپؐ پہلے ہی سے اس نوع کی کسی کارروائی کے متوقع تھے۔ گزشتہ سال موتہ کے مقام پر مسلمانوں کی ایک مختصر سی فوج سے جس کی نفری تین ہزار سے زیادہ نہ تھی، شام کے ایک عرب عیسائی سردار شرحبیل بن عمرو غسانی اور قیصر کی مشترکہ افواج نے بڑے زور و شور سے جنگ کی تھی اور اگرچہ اس میں بعض بڑے نامی گرامی مسلمان سالار مثلاً حضرت زید بن حارثہ (حضور علیہ السلام کے محبوب عزیز) جعفر طیار ذوالجناحین (حضرت علیؓ کے برادر اکبر) اور عبداللہ بن رواحہ (مداح پیغمبر صحابی) بے جگری سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے اور مسلمانوں کو خاصا نقصان پہنچا۔ تاہم آخر الامر حضرت خالد بن ولید (سیف اللہ) کی جرأت و بسالت اور حربی مہارت کے نتیجے میں ڈیڑھ دن کی شدید جنگ کے بعد اپنے سے تین چار گنا زیادہ تعداد اور تقریباً دس گنا بڑھ کر مسلح دشمن کو ہزیمت اور فرار پر مجبور کر دیا تھا اور مخالفین اسی دن سے مسلمانوں سے انتقام لینے کی تیاری کر رہے تھے۔

جیش عسرت کا اہتمام

حضور علیہ الصلوٰۃ والتسلیمات کو دشمن کے عزائم اور اس کی تیاریوں کا پتہ چلا تو آپؐ نے اپنی خداداد بصیرت و فراست سے صورتِ حالات پر نظر ڈالی شام کے عرب عیسائیوں کے خون آشام عزائم، رُوما کی عظیم سلطنت کی ناقابلِ تسخیر عسکری قوت، دو بہت بڑے عفریت تھے جو مسلمانوں کو ہڑپ کر جانے کے لیے اپنے خوفناک جبڑے کھولے بڑھے چلے آ رہے تھے جزیرۃ العرب کی اسلام دشمن طاقتوں کفار و مشرکین، یہود اور نصاریٰ کے بچے کھچے گروہ بھی اپنی سی سازشوں میں مصروف تھے۔ ابو عامر راہب بھی اسی مشن میں لگا ہوا تھا۔ الغرض حالات بڑے دگرگوں تھے لیکن نبوت کی نگاہِ ژرف بین نے عناد و شداد کی گھٹا ٹوپ تاریکیوں کے پیچھے سے اسلام و ایمان کا نورانی چاند طلوع ہوتا دیکھ لیا۔

آپؐ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فیصلہ کیا کہ یہ کفر و شرک کی آخری حرکت مذبوحی ہے۔ اب ہمارے لیے بیٹھ کر ان کی راہ دیکھنے کا وقت نہیں ہے بلکہ ملک و ملت کے ان دشمنوں کی سرکوبی کا ہنگام ہے۔ چنانچہ آپؐ نے سرحد پار سے آنے والے عفریتوں کا سر توڑنے کی غرض سے عام لام بندی کا اعلان فرمایا۔

شدید گرمیوں کے دن تھے۔ ملک میں قحط کی سی کیفیت تھی۔ مدینے میں میوے پکنے کا موسم تھا۔ لوگ درختوں تلے بیٹھ کر میوے کھانے کے خیال میں تھے۔ ایسے میں اتنے دُور دراز ملک کی آخری سرحد پر دُنیا کی عظیم ترین سلطنت سے ٹکر لینے کے لیے جانا کوئی بچوں کا کھیل نہیں تھا۔ اُدھر منافق لوگوں میں طرح طرح سے بددلی اور سراسیمگی پھیلانے میں لگے تھے۔ کُھلے عام لا تنفروا فی الحر (اس سخت آگ میں بھرتی نہ ہو) کہتے پھرتے تھے۔

الغرض بڑے سخت اور ناسازگار حالات میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے عزم مصمم کر لیا کہ بے سروسامانی کے باوجود جس حد تک ضروری ہو ممکنہ تیاری کر کے شمالی سرحد کی طرف یلغار کی جائے اور دشمنوں کو سرزمین عرب پر قدم رکھنے کی مہلت نہ دی جائے بلکہ اُن کے

حرکت میں آنے سے پہلے ہی تبوک پہنچ کر روم و شام کی دہلیز پر پاؤں جما لیے جائیں۔

یہ فیصلہ کوئی معمولی فیصلہ نہیں تھا اور اسی طرح یہ فیصلہ کرنے والا کوئی عام انسان نہیں تھا۔ بلکہ یہ فیصلہ ایک پیغمبر کا فیصلہ تھا اور پیغمبر بھی کوئی عام پیغمبر نہیں تھا۔ ساری کائنات انسانی کا گلِ سرسبد اور سب سے زیادہ اولوالعزم الشان تھا۔ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ واہل طاعتہٖ اجمعین)

بے شک آپؐ کو اس امر کا یقین تھا کہ وہ وعدۂ الٰہی سنلقی فی قلوب الذین کفروا الرعب کے مطابق دنیا کی اس عظیم سلطنت کو اپنے سارے جاہ و جلال اور تزک و احتشام کے باوصف اسلامی مجاہدوں سے پنجہ آزمائی کا اول تو کوئی حوصلہ ہی نہیں پڑے گا اور اگر اسے اپنی بے پناہ طاقت اور قوت کا گھمنڈ اور تعداد و استعداد کا غرور میدانِ جنگ میں لے ہی آیا تو اللہ تعالیٰ کی نصرت اور اس کے غیر مرئی ملکوتی عساکر کی مدد سے اس کا کاسۂ سر پاش پاش کر دیا جائے گا۔

ایک عظیم الشان مہم

لیکن حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو یہ بھی معلوم تھا کہ یہ جنگ حق و باطل کی آخری اور فیصلہ کن جنگ کا حکم رکھتی ہے۔ مقابل کی طاقت، جو جدید ترین اسلحہ جنگ اور کثیر التعداد (MANPOWER) سے مالا مال ہے اور اس کے مقابلے میں عساکرِ اسلام تقریباً نہتے ہیں اور اتنے دُور دراز کے سفر پر جانے کے لیے ان کے پاس سواری اور باربرداری کا بھی کوئی بندوبست نہیں ہے، سُننے میں آیا ہے کہ دشمن نے سال بھر کا راشن بھی جمع کر لیا ہے اور یہاں پینے کو پانی تک میسّر نہیں لوگ اونٹ ذبح کر کے ان کی آنتوں کا پانی پیتے ہیں۔ الغرض نہایت دقت و عُسرت کا عالم ہے۔

تاہم اللہ کے دین کی نصرت و حمایت کے لیے ہر کڑی آزمائش جھیلنے کے لیے مسلمان پوری طرح تیار رہتے۔ منافقین کی ریشہ دوانیوں کے باوجود ایسے لوگ بھی تھے جو سامان سفر اور سواری وغیرہ نہ ہونے کے باعث جیش تبوک میں شامل ہونے کے قابل نہ تھے۔ لیکن ان کے شوقِ جہاد کا یہ عالم تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت عالی میں سواری کی طلب میں حاضر ہوئے اور جب آپؐ نے بھی معذوری ظاہر کی تو وہ اپنی بے بسی اور معذوری پر روتے ہوئے واپس گئے۔ کما قال اللہ تعالیٰ!

اذا ما اتوک لتحملهم قلت لا اجد ما احملکم علیه، تولوا و اعینهم تفیض من الدمع حزنا ان لا یجدوا ما ینفقون ؕ

چہ خوش بود کہ بر آید بہ یک کرشمہ دو کار:

نبی امی علیہ الصلوٰۃ والتسلیمات نے اپنی عام روش کے برخلاف تبوک کی طرف پیش قدمی اور سرحد روم و شام پر لشکر کشی کے منصوبے کو پوشیدہ نہیں رکھا بلکہ کھلے عام بھرتی اور بلند آہنگ تیاری کے علاوہ جزیرۃ العرب کے طول و عرض میں پھیلے دور و دست قبائل تک بھی اپنے نمائندے روانہ فرمائے جو ان کو اس جیش عسرۃ میں شمول کی دعوت دیتے اور سواری کے جانور

بھی فراہم کرتے اور ان سب سے لشکر کی تیاری کے لیے مالی امداد بھی طلب کرتے تھے۔

اور یہ بھی حضورؐ کی غیر معمولی حربی صلاحیتوں کا ایک پہلو تھا کہ وہ ایک پنتھ دو کاج کے مصداق جیش عسرت کے اہتمام کے ساتھ ساتھ ملک بھر میں اپنی عظیم الشان تیاری اور قیصرِ روم سے ٹکر لینے کی جی داری کا رُعب انگیز ولولہ پھیلا کر اندرون ملک بسنے والے مخالفین میں خوف و دہشت کی فضا قائم کرنا چاہتے تھے۔

چنانچہ اس کا نتیجہ حسب دلخواہ نکلا۔ سواری کے جانور میدان جنگ کے سورما اور سامانِ حرب وغیرہ کی فراہمی کے علاوہ نہ صرف چھپے ڈھکے شورہ پشتوں پر اسلامیوں کی اولوالعزمی کا رُعب طاری ہوا، بلکہ ان کے توسط سے سرحد پار کے دشمنوں تک بھی خوف و دہشت کی لہر پہنچ گئی۔ جتنی دیر میں مسلمانوں کی دلیرانہ پیشقدمی اور فیصلہ کن جنگ کی تیاری کی خبریں رُوم و شام تک پہنچیں اتنی ہی دیر میں ضروری کیل کانٹے سے لیس ہو کر اسلامی افواج اپنے عظیم و جلیل سالارِ اعظم کی کمان میں مارچ کرتی ہوئی دشمن کے سر پر جا پہنچیں۔

پس معرکہ یہیں پر سَر ہو گیا۔ دشمن مسلمانوں کی ہمہ گیر تیاری کی خبریں سُن سُن کر پریشان تھا کہ اُسے عساکرِ اسلام کی پیشقدمی کی اطلاع ملی۔ وہ ابھی اسی گھبراہٹ میں تھا کہ پتہ چلا مسلمان سرحد پر پہنچ بھی گئے ہیں۔ رُومیوں اور شامیوں دونوں پر سکتہ طاری ہو گیا۔ اعصاب جواب دے گئے اور دماغ مختل ہو گیا۔

مجاہدینِ اسلام کی دلیرانہ پیشقدمی:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معرکۂ تبوک میں حصّہ لینے کے لیے تیس ہزار مجاہدوں کی فوج ظفر موج اپنے ساتھ لے گئے تھے۔

اور یہ عظیم الشان جیش، وہ بڑے سے بڑا جیش تھا جو حضور علیہ السلام اپنی ساری عمر میں کبھی تیار کر سکے۔ لُطف یہ کہ دنیا کی تقدیر پلٹ دینے والا یہ جیش حد درجہ بے سرو سامان تھا۔ سب کے پاس ہتھیار تک نہیں تھے۔ اوسطاً اٹھارہ بیس آدمیوں کے لیے صرف ایک اُونٹ مہیا ہو سکا۔ اسی پہ سامان لادیں اور اسی پہ باری باری سوار ہوں۔ مزہ یہ کہ زادِ راہ راستے ہی میں ٹھُرک گیا اور درختوں کے پتّوں سے پیٹ بھرے گئے۔ نبوت کی برکات اور اعجازی کمالات ہی تھے کہ یہ لشکر بخیر و سلامت سلطنتِ رُوما کی دہلیز پر جا پہنچا۔ اب کہنے کو دو لاکھ سے زیادہ تعداد میں دشمن سامنے موجود تھا۔ لیکن ہازم الجیوش اور مصرّف القلوب خدا کی قدرت کا کرشمہ دیکھیے کہ رُومی و شامی سب کے سب پسپا ہو کر اِدھر اُدھر بکھر گئے۔ بخاری کی روایت ہے حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ نصرت بالرّعب میسرۃ شھر (مجھے اس بات سے مدد دی گئی ہے کہ ایک مہینہ کی مسافت سے دشمن پر میرا رُعب پڑتا ہے۔ لقد صدق الصادق المصدوق۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مجاہدین سمیت بروایتے کم و بیش دو ماہ تک اس علاقے میں اپنے کوکبۂ جلال کے ساتھ قیام پذیر رہے۔ لیکن کسی کو سر اُٹھانے کی جرأت نہیں ہوئی۔ پورے علاقے کو گویا سانپ سُونگھ گیا۔ مجاہدینِ اسلام کے اس دلیرانہ اقدام سے سب کے چھکے چھوٹ گئے۔ اِرد گرد کی ریاستوں کے حکمران حالات کی رفتار کو دیکھ کر نبیٔ عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی

سیادت و قیادت کو تسلیم کرنے پر از خود آمادہ ہو گئے۔

نتائج و ثمرات

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے قیام تبوک کے دوران دو باتوں کا خصوصیت سے اذعان حاصل کیا۔ ایک یہ کہ اس مہم جویانہ پیشقدمی سے چند در چند فوائد مرتب ہوئے یعنی صرف یہی نہیں کہ سرحدوں سے پرے بسنے والوں ہی پر اس یلغار نے خاطر خواہ اثرات ڈالے ہیں اور ان کی منتقمانہ سازش ناکام ہوگئی ہے بلکہ اندرون سرحد قبائل بھی دہشت زدہ ہو گئے اور اب یہ آئندہ کے لیے سازشی عناصر کے آلہ کار بننے اور امن و عافیت کو خطرے میں ڈالنے پر تیار نہیں ہوں گے۔

ایک اور فائدہ یہ تھا کہ اردگرد کے رئیس اور سردار ہَوا کا رُخ پہچان گئے اور ان میں سے اکثر وفود کی شکل میں خدمت نبوی میں حاضر ہو کر اظہار اطاعت و مصالحت کرنے لگے۔

تبوک کے قریب المقصر اور اس کے اردگرد کے ماحول کے علاقوں میں کئی عیسائی قبائل بستے تھے۔ اسلامی مجاہدوں نے حریف کے سکوت و جمود کے باعث حرب و ضرب کی سرگرمیوں سے نجات پاکر تبلیغی اور تحریکی مشاغل اپنا لیے۔ کچھ قبائل اسلام لے آئے، کچھ اپنے عقیدے پر قائم رہے لیکن انھوں نے اطاعت قبول کر کے جزیہ دینا منظور کر لیا۔ بعض سرداروں نے مدینہ کی اسلامی مملکت کے ساتھ معاہدے کر لیے۔ ایلہ کا فرمانروا یوحنا حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور جزیہ دینا قبول کر کے صلح کا معاہدہ کیا اس نے حضور علیہ السلام کی خدمت میں ایک سپید خچر ہدیۃً پیش کیا تو آپؐ نے اس کے جواب میں ایک عمدہ چادر اُسے تحفہ میں دی۔

جربا، اذرح اور ادرح کے عیسائی قبائل نے بھی جزیہ ادا کرنے کا اقرار کر کے صلح کر لی۔ کچھ دنوں بعد حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت خالدؓ بن ولید کی کمان میں چار سو سواروں کا ایک دستہ دومۃ الجندل کے عیسائی حکمران اکیدر کی طرف بھیجا وہ شکار کھیل رہا تھا کہ حضرت خالدؓ سیف اللہ نے اُسے گرفتار کر لیا اور لا کر حضورؐ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ اس نے معاہدہ صلح کر لیا اور کچھ عرصہ بعد حلقہ بگوش اسلام ہو گیا۔

عام الوفود

مشرکین کا وہ گروہ جو ابھی تک اسلام اور مسلمانوں سے برسرِ پرخاش تھا اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دعوت کو حق ماننے سے انکاری تھا، اس خیال میں تھا کہ مکّہ کی فتح کے باوجود اسلام کے نام لیوا عنقریب تباہ و برباد ہو جائیں گے اور ان کا بھی حشر وہی ہوگا جو ان سے پہلے حاکم یمن ابرہہ کا ہو چکا ہے۔ اسی طرح مدینہ کا مشہور منافق ابی بن سلول، جیش عسرت کی ترتیب و روانگی کے وقت سے یہ وسوسہ پھیلا رہا تھا کہ اب خدا نخواستہ محمدؐ اور ان کے ساتھیوں کو رُومی افواج نہس نہس کر کے رکھ دیں گی، ہرقل، نبیِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو گرفتار کر کے تلوار کے گھاٹ اُتار دے گا۔ لیکن غزوۂ تبوک کے بعد ان سب کے ارمانوں

پر اوس پڑ گئی۔ اب حق نے اپنا آپ سب سے منوا لیا تھا۔ الحق یعلو ولا یعلیٰ علیہ۔ یظھرہ اللہ علی الدین کلہ۔
یوں تو فتح مکہ سے فوراً بعد ہی وفود کی آمد جاری شروع ہوگئی تھی اور خود نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تبلیغی اور دعوتی سرگرمیاں تیز سے تیز تر کر دی تھیں اور عرب اور بیرون عرب کے ملوک و سلاطین، اکابر و عمائدین وقت کے نام قبولِ اسلام کے دعوت ناموں اور مراسلات کا سلسلہ جاری تھا۔ ان سب کے نتیجے میں مختلف مقامات سے وفود حاضر ہونے لگے تھے۔ لیکن تبوک کی مہم کی عظیم الشان کامیابی نے باقیماندہ مذبذب اور متردد ذہنوں کو بھی صاف کر دیا اور اب تو اندرون و بیرون ملک سے اظہار اطاعت و خیر سگالی کے لیے مصالحت کوش وفودوں کا تانتا بندھ گیا۔ چنانچہ اس سال کا نام ہی مورخین اور سیرت نگاروں نے عام الوفود رکھ دیا۔

تاریخ عالم میں بےمثال سیاسی فتح

نبی امی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تاریخی پیشقدمی دُنیا بھر کے جنگی کارناموں میں سب سے جُداگانہ اور یکتا حیثیت کی حامل ہے۔ تاریخ عالم اس نوعیت کا کوئی دوسرا واقعہ پیش کرنے سے قاصر ہے۔ جس میں خُون بہائے بغیر اس درجہ عظیم انقلابی نتائج حاصل ہوئے ہوں۔ تبوک کی لشکر کشی اسلامی تاریخ کا ایک درخشاں واقعہ تو ہے ہی۔ ساری دنیا کی حربی تاریخ میں اس کو واحد مثال قرار دیا جاتا ہے کہ خون کا ایک قطرہ بھی نہ بہے اور داخلی و خارجی ہر طرح کے دشمنوں پر پوری فتح بھی حاصل ہو جائے۔ گویا ہینگ لگے نہ پھٹکڑی رنگ چوکھا آئے اور حقیقت یہ ہے کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا تنہا ایک یہی کارنامہ پوری انسانی کائنات پر آپؐ کی برتری ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ واقعیت بھی آشکارا ہے کہ آپؐ خدا تعالیٰ کے فرستادہ تھے اور آپؐ کو اپنے تمام اقدامات میں رب کائنات کی ہدایت و معیت حاصل تھی۔ اگر خداوند تعالیٰ کی نصرت و حمایت آپؐ کے شاملِ حال نہ ہوتی تو قیصر روم اور اس کے حلیفوں کی متفقہ طاقت آپؐ کے بے سروسامان ساتھیوں کے مقابلہ میں یوں دُم دبا کر نہ بھاگتی، بلکہ اپنے مرکز سے سینکڑوں میل دُور آتے ہوئے ان قلیل البضاعۃ اور فاقہ زدہ عربوں کو اس بُری طرح رگیدتی کہ ان کے لیے نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن کی سی صورتِ احوال پیدا ہو جاتی۔

یہ اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل تھا کہ اس نے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بہترین جنگی فراست، اعلیٰ ترین سیاسی تدبر اور بلند پایہ اخلاقی قوت عطا کی تھی۔ انہی خوبیوں سے کام لے کر آپؐ نے چند سال کے مختصر سے عرصے میں ایسا عظیم انقلاب برپا کر دکھایا جس نے نہ صرف جزیرۃ العرب کی کایا پلٹ دی بلکہ تمام کرۂ ارض کو آئندہ ہزاروں سال تک کے لیے متاثر کر دیا۔

تبوک پر دلیرانہ یلغار کسی طالع آزما کا جسورانہ اقدام نہیں تھا بلکہ خالق خلق و امر کے ہدایت یافتہ مامور صلی اللہ علیہ وسلم کے فریضۂ رسالت و منصب امامت کا ایک تقاضہ تھا جسے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور خلق اللہ کی بہبود و فلاح کے لیے پورا کرنا ناگزیر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا انجام دنیا کے ہر شخص کی توقع اور اندازہ کے برخلاف لیکن دین کے ہر پیروکار کی اُمید و آرزو کے مطابق ہوا۔

- ——— جزیرۃ العرب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سازشوں اور فتنوں سے محفوظ ہوگیا۔
- ——— عجمی دنیا کو اس پر حملہ آور ہونے کا حوصلہ نہ رہا۔
- ——— مدینۂ آئندہ کے لیے مذہبی اور عالمی قوت کا مرکز قرار پایا۔
- ——— نوخیز اسلامی حکومت بیش از پیش مضبوط و مستحکم ہوگئی

اور

- ——— اسلام ایک ناقابلِ تسخیر قوت کی حیثیت سے ابھرا اور رزم عالم میں بقائے دوام کی خلعت سے سرفراز ہوگیا۔

اور یہ سب کچھ حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی حکمتِ عملی اور خداداد دانشمندی کا ادنیٰ کرشمہ تھا۔

سیاسی اور عمرانی تاریخ اور فلسفۂ تمدّن کے بالغ نظر مبصرین اپنے چند در چند تعصبات اور جنبہ داریوں کے باوجود اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں اور یہ صداقت تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ آدم سے لے کر تا ایں دم نسلِ انسانی کا کوئی لیڈر ایسا نہیں ہے جس نے اپنے مشن یا مقصد کی تکمیل کے لیے اس درجہ تحمل، بردباری، رحم و مروت اور نرمی و رواداری سے کام لیا ہو جس کا مظاہرہ حضور رحمۃ للعالمینؐ نے فرمایا ہے۔ دنیا کے جابر اور مستبد حکمرانوں کی بات تو چھوڑ دیئے، مذہبی اور اخلاقی مصلحین نے بھی حالات کی سنگینی کے خلاف اتنی رحمدلی سے کبھی کام نہیں لیا۔ اور نہ کسی ایسی شفقت کو جائز سمجھا ہے جو ان کی ذات اور خصوصیت سے ان کی سرگرمیوں کو زک پہنچانے والے دشمنوں پر تغلب حاصل کرنے کے بعد عفو و رحم کی متقاضی ہو۔ لیکن حضورؐ (فداہ امی و ابی) ایک شفیق و مخلص داعی تھے۔ ان کے سارے اقدامات آیہ مبارکہ ھو الذی ارسل رسولہٗ بالھدی و دین الحق لیظھرہٗ علی الدین کلہٖ کی تفسیر تھے۔ آپ علیہ السلام اپنی شخصیت گرامی کے دوسرے تمام پہلوؤں کی جامعیت کے باوجود بنیادی طور پر مبلغ اور مشنری تھے۔ آپؐ کی جنگ فتح مکہ ہو یا غزوۂ تبوک اور آپؐ کی صلح معاہدۂ صلح حدیبیہ ہو یا میثاق مدینہ سب کچھ دین حنیف، اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے منصوبوں کا ایک حصہ تھا۔

نبیٔ رحمت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی عظیم الشان اخلاقی قوت

حضور رحمۃ للعالمین علیہ الصلوٰۃ والسلام الی یوم الدین نے انتہائی نامساعد حالات میں اپنے مقدّس مشن کا آغاز کیا تھا۔ اپنی دعوت کے روز اوّل ہی سے آپؐ کو بیحد زہرہ گداز اور صبر آزما صعوبتوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ لیکن کائنات انسانی کے اس سب سے بڑے مصلح نے کسی مادی ساز و سامان کی بجائے صرف اپنی برتر اخلاقی قوت سے ہر مصیبت کو انگیز کیا۔ دشمنوں کے تمام تر جور و جفا کے جواب میں آپؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ عفو و رحمت اور صلح و مروّت سے کام لیا۔ آپؐ کی یہ شان رحمۃ للعالمینی خلقی، خلقی بلکہ فطری تھی وما ارسلنٰک الا رحمۃ للعالمین کے طغرائے امتیاز سے مفتخر فرمانے والے پروردگار نے شمائل نبوی میں عفو و تصفح اور رحمت و رافت کے اوصاف بیش از بیش ودیعت فرمائے تھے۔ اور یہ اوصاف و خصائل آپؐ کی پوری مشنری زندگی اور ساری دعوتی سرگرمیوں میں آپؐ کے زندہ و تابندہ کردار کا نمایاں جوہر تھے۔

آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام صبر و استقامت کے ساتھ انتہائی اکھڑ اور جفا پیشہ مخالفین کی بے دردانہ ستم آفرینیوں کا مقابلہ کرتے ہوئے بےمثال عزم و حوصلہ سے اپنے مشن کی پیش رفت میں برابر کوشاں رہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہم آپ وہ کوئی بھی ان جاں گداز اور روح فرسا مظالم و مصائب کا صحیح صحیح اندازہ نہیں لگا سکتے جو اللہ کے اس برگزیدہ بندے، نوعِ بشر کے سردار اولادِ آدمؑ کے لیے مایۂ افتخار سید الاولین والآخرین (صلی اللہ علیہ وسلم) کو نسلِ انسانی کی خیر اندیشی و خیر خواہی کے "مقدس جرم" کی بناء پر جھیلنے پڑے۔

تاہم آپؐ کی فطری رحمت اور ایک سچے داعی کی بے لوث محبت ان تمام شدائد و مکارہ کی چوطرفہ یورش پر غالب آئی آپؐ اپنی حیرت انگیز اخلاقی برتری اور خداداد تدبر و حکمت کے ساتھ قدم بہ قدم بڑھتے اور اپنے پست فطرت اور کینہ توز مخالفین کو مبہوت و درماندہ چھوڑتے آگے ہی آگے چلتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ مکّہ سے ہجرت کرکے مدینہ تشریف لے گئے۔ وطن، اپنے اجداد کا پُر وقار مسکن اور اپنے روحانی اور نسبی باپ، امام الناس ابراہیم خلیل اللہ علی نبینا و علیہ السلام کا مامن چھوڑ دیا، کیونکہ آپؐ کی شانِ "رحمۃ للعالمین" کو، حرم محترم بھی اپنی تمام تر عظمتوں اور عقیدتوں کے باوجود خونِ مسلماں بہانے پر آمادہ نہ کر سکا تھا۔ چنانچہ آپؐ اپنے "گنتی" کے ساتھیوں کو لے کر نکل گئے۔ پردیس کی صعوبتیں اور غیر یقینی حالات کی گردشیں کتنی ہی حوصلہ شکن کیوں نہ ہوں پیغمبر امن و سلامتی کے نزدیک خونریزی و جنگ آزمائی کے مقابلے میں ہیچ تھیں۔

رحمت للعالمین کی امن پسندی

نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کم و بیش پانچ سو مسلمانوں کی نفری کے ساتھ مدینہ منورہ پہنچے تھے۔ مکہ سے بہت کم لوگ آپؐ کے شریکِ سفر ہو سکے تھے۔ کچھ لوگ پہلے ہی مدینہ میں تھے۔ کچھ مکہ اور کچھ حبشہ سے نکل کر مدینہ منورہ میں اکٹھے ہوئے۔ ہجرت کے تقریباً سال بھر بعد جب مدینہ منورہ کے مسلمانوں کی مردم شماری کرائی گئی تو کل سات سو مرد گنے گئے۔ عورتیں اور بچے ملا لیجیے تو دو ہزار سے زائد نہیں بنتے تھے گویا، یوں سمجھ لیجیے کہ ۲ھ ہجری میں پوری دنیا میں مسلمانوں کی کل تعداد دو ہزار تھی۔ جنھیں آپ سفاک اور خونخوار دشمنوں سے بچائے ہوئے تھے۔ اور یہی وہ افرادی قوت تھی جسے نہ صرف آئندہ کی عالمی اسلامی حکومت کی بنیاد رکھنی تھی، بلکہ اسے شرِ اعدا سے بچا کر پروان بھی چڑھانا تھا۔

نبیٔ رحمت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہمیشہ قتل و خونریزی اور جبر و تشدد سے پرہیز کیا ہے۔ آپؐ کی تمام تر حکمتِ عملی ایک اسی نقطہ پر مرکوز رہتی تھی، کہ راہِ حق میں، طاغوتی طاقتوں سے، جان کی بازی بھی لگانی پڑے تو ایسی تدبیر کی جائے کہ اپنا بھی کم سے کم نقصان ہو اور دشمنوں کی جانیں بھی زیادہ سے زیادہ بچ جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ نبیُ الملحمہ کہلانے والی اس نادرۂ روزگار شخصیت نے کم و بیش تیئیس برس تک دشمنوں، سازشیوں اور منافقوں کی بے رحمانہ جنگ آرائیوں کے باوجود اس تمام عرصے میں اپنی رحمۃ للعالمینی کا عدیم النظیر اور عظیم الشان کرشمہ دکھایا کہ سارے ہنگاموں میں نو سو سے کچھ اوپر مخالفین مارے گئے اور چار سو کے لگ بھگ اپنے فدائی کام آئے اور خوب یاد رکھیے کہ یہ کسی ایک معرکۂ جدال و قتال کے اعداد و شمار نہیں ہیں بلکہ پورے پچاس معرکہ ہائے خون و کشت کا مجموعی جانی

نقصان (TOTAL DEATH R...) ہے۔ ان پچاس معرکوں میں سے صرف سترہ مواقع ایسے تھے جن میں آنحضورؐ خود بھی شامل تھے اور انھیں "غزوات" کہا جاتا ہے۔ باقی کے تینتیس ہنگامے "سرایا" کہلاتے ہیں کہ ان میں صحابہ کرام ہی کے مختلف دستے وقتاً فوقتاً اطراف واکناف کی قبائلی سرگرمیوں کی ٹوہ لگانے یا ان کے فتنہ و فساد کو فرو کرنے کے لیے بھیجے گئے ہیں۔ پھر اگر علاوہ بریں دیگر دستوں کو بھی شامل کر لیا جائے تو ان پچاس معرکوں میں ۹۰ کے قریب مزید فوجی کارروائیوں کا بھی اضافہ کرنا پڑے گا۔ اس صورت میں کم و بیش ڈیڑھ سو جنگی یلغاروں میں زیادہ سے زیادہ چودہ سو انسانی جانوں کا نقصان یعنی فی جنگ صرف نو آدمیوں کا کام آنا دنیا کی تاریخ حرب و ضرب میں کہیں اور بھی ہے؟ کیا یہ تجزیہ ان لوگوں کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی نہیں جو علمی تحقیق و تجزیہ کے بلند بانگ دعووں کے باوجود یہودی اور عیسائی مستشرقین (ORIENTALISTS) کے متعصبانہ اور پر عناد کذب و افترا کا شکار ہوتے ہیں اور حقیقت و واقعیت کا منہ چڑاتے ہوئے امن و سلامتی کے دینِ "اسلام" کو بزور شمشیر پھیلایا ہوا دین کہتے ہیں۔

ہیروشیما اور ناگاساکی میں اپنی جنگی مردانگی کے مظاہرے کرنے والی مہذب، ترقی یافتہ اور برتر مانی ہوئی قوموں کے مؤرخین و محققین کیا اس حقیقت سے چشم پوشی کر سکتے ہیں؟ کہ ایک ایک دو دو دن کی معمولی جنگوں بلکہ ایک دو گھنٹہ کی بمباری میں ہزاروں انسانوں کو بے تکلف موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے اور اسے روشنی اور انسانیت کے یہ علمبردار سند جواز عطا کرنے میں قطعاً تامل نہیں کرتے، کم و بیش ربع صدی کے طویل حربی وقائع میں ہزار ڈیڑھ ہزار جانوں کا ضیاع آخر انھیں کیوں کھلتا ہے۔؟

اور پھر جس صورت میں کہ اس جہاد فی سبیل اللہ کے نتیجے میں نو دس لاکھ مربع میل کے وسیع و عریض ملک میں آئندہ ہمیشہ کے لیے امن و امان اور سکون و راحت کی وہ فضا قائم ہو جاتی جس کی پیشگوئی مخبر صادق (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کچھ ان الفاظ میں فرمائی کہ وقت آئے گا کہ "صنعا سے حضرموت تک ایک تن تنہا عورت ہاتھوں میں سونا اچھالتی چلی جائے گی اور اسے روکنے ٹوکنے کی جرأت کسی کو نہ ہو گی"۔

اور فی الواقعہ ایسا ہی ہوا۔ چند سال بعد ہی دنیا نے اس پیشگوئی کو عملاً متشکل ہوتے دیکھ لیا کہ بے رحم لٹیروں اور قطاع الطریق رہزنوں کے اس دیس میں ؎

رہا ڈر نہ بیڑے کو موج بلا کا　　　ادھر سے ادھر پھر گیا رخ ہوا کا

وما ارید الا الاصلاح ما استطعت

داعی اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام فطرتاً صلح پسند اور امن دوست تھے۔ جنگ و جدال اور حرب و قتال سے آپؐ کو طبعاً نفرت تھی۔ آپؐ اس وقت تک آمادۂ قتال نہیں ہوتے تھے جب تک حریف پہل نہیں کر لیتا تھا۔ آپؐ کی سلامت روی اور مصالحت کوشی کا یہ عالم تھا کہ آپؐ نے رسل و رسائل اور مراسلت و مواصلات کی چند در چند دقتوں کے باوجود سو کے لگ بھگ سیاسی مشن ملک کے اطراف و اکناف میں بھجوائے۔ پانچ سو سے زیادہ تبلیغی اور دعوتی خطوط اندرون ملک اور بیرون عرب ملحقہ حکومتوں اور ان کے سربراہوں کے نام ارسال فرمائے۔ جن میں سے چار سو کے قریب مکاتیب نبویؐ کے مضامین و متون اور ان کے مکتوب الیہم کے نام پتے معلوم ہو چکے ہیں۔ حضورؐ

علیہ الصلوٰۃ والسلام نے سیاسی سفیروں اور خیر سگالی کے وفود کے ذریعے جزیرۃ العرب کے اکثر قبائل کے سرداروں اور چھوٹی بڑی ریاستوں کے شیوخ اور اُمراء کو صلح و امن کا پیغام دیا اور ان کے مقابل میں اپنی عسکری برتری اور حربی مہارت میں تفوق کے باوجود جنگ آزمائی کے بجائے تالیف قلب اور صلح پسندی کے ذریعے اُنھیں اپنا حلیف بنالیا۔ تاریخ و وقائع کے صفحات اس حقیقت کو آشکارا کر رہے ہیں کہ کم و بیش تین سو قبائل ذکر اور سربرآوردہ شیوخ اور رؤسائے عرب نے آپؐ سے امن و سلامتی کی بیعت کی، اور قریب قریب تیس معاہدات صلح طے پائے۔ یہ ساری تفصیلات ظاہر کرتی ہیں کہ نبیؐ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوت کی تبلیغ اور مشن کی تکمیل کے لیے حرب و ضرب اور جبر و اکراہ کے ہتھیاروں سے کبھی اور کسی ایک موقع پر بھی کام نہیں لیا بلکہ ہمیشہ اپنے مخاطبین کے دلوں کے دروازوں پر ہی دستک دی ہے اور ان کے ذہن و ضمیر کو انسانی فلاح و صلاح کے پیغام سے روشن کرنا پسند فرمایا ہے۔

اس رحمت و رافت صلح و مصالحت کے مقابلے میں اگر حریفوں نے عناد و سرکشی کے مظاہرے کیے ہیں تو بھی حضورؐ نے عفو و تصفح ہی کا وطیرہ اپنایا ہے۔ ہاں اگر دشمنوں کا بغض و عناد حد برداشت سے بھی آگے بڑھ گیا ہے اور ان کی فتنہ انگیزیاں امن و انسانیت کے لیے مہلک بننے لگی ہیں تو آپؐ نے مجبوراً دفاعی اقدامات کیے ہیں اور ان میں بھی کوشش یہی رہی ہے کہ دونوں طرف سے جانی نقصان کم سے کم ہو اور فتنہ و فساد کی آگ کو زیادہ بھڑکنے اور پھیلنے سے جلد از جلد روک دیا جائے۔

یہی وجہ ہے کہ عرب کے جنگ بازوں کی قدیم روایات کے برخلاف کہ نائرہ حرب مہینوں بلکہ سالوں تک شعلہ افروز رہتی تھی، آپؐ کے غزوات کے چند دنوں بلکہ بسا اوقات چند گھنٹوں سے زیادہ کے وقفے تک طول نہیں کھینچتے تھے۔

محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی انسان دوستی

یہ بھی اس عظیم الشان شخصیت کے معلمانہ اخلاق اور مصالحانہ کردار کا ایک اور پہلو ہے جو اس داعیٔ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصلاحی اور تعمیری اقدامات میں آپؐ کی انسان دوستی کو اُجاگر کرتا ہے۔ فرشتوں کے بقول من یفسد فیہا و یسفک الدماء کے مسالوں اور قتل و غارت گری کے خونی عناصر سے بنی ہوئی مخلوق کی سفاکی اور فساد انگیزی کو بھی حضورؐ نے اپنی بے مثال رحمدلی اور اصلاح پسندی سے کم سے کم تر کر دینے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

پوری دنیا کی جنگی تاریخ کو کھنگال جائیے کہیں بھی حضور رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم الی یوم الدین کے مغازی کی مثال نہیں ملے گی۔ حرب و ضرب اور قتال و مقاتلہ میں پورے جوش و جذبہ سے حصہ بھی لیا جائے اور کم سے کم جانی نقصان کے عوض زیادہ سے زیادہ مفاد انگیز کیا جائے۔ جیسا کہ ہم اوپر واضح کر چکے ہیں کہ صرف دو ہزار کی نفری پر مشتمل مدینہ منورہ کی اسلامی حکومت ۸ھ میں طاغوتی نظام ہائے حیات کے مقابلہ میں اسلام کا پرچم بلند کرتی ہے۔ اس کے پیش نظر اعلائے کلمۃ الحق ہے اور وہ ایک اسی نصب العین لیظہرہ علی الدین کلہ۔ کی تکمیل چاہتی ہے اپنے تعمیری اصلاحی، اخلاقی اور روحانی پروگرام بااحترام آدمیت اور فلاح انسانیت کے زریں اصولوں کے تحت عمل پیرا ہو جاتی ہے۔ اسے عرب کے کینہ توز جنگ آزما سکھ چین کا سانس نہیں لینے دیتے۔ انھیں یہ تک گوارا نہیں ہے کہ وہ امن و عافیت کے ایک گوشے میں بیٹھ کر اپنے اصلاحی مشن کی تکمیل کا فلاحی اور رفاہی کام کرتے رہیں کیونکہ وہ مدینہ کے

یہودیوں کو اکساتے ہیں اور کبھی اطراف و جوانب کے بُت پرست قبائل کو بھڑکاتے ہیں اور موقع ملتا ہے تو خود اپنے دستے بھیج کر مسلمانوں کو جانی مالی نقصان پہنچانے میں دریغ نہیں کرتے۔ مخالفت و عناد کی یہ لَے یہاں تک بڑھتی ہے کہ مدینہ منورہ میں حضور علیہ السلام کے پیغام کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کے لیے پورے جوش و غضب سے چڑھ دوڑتے ہیں۔

گو ہمیشہ چاند پر تھوکا انھیں کے منہ پر آتا ہے اور ان کی ہر تدبیر اُلٹی پڑتی ہے۔ اور ان کا غیظ و غضب خود انھیں کے لیے وبالِ جان بنتا ہے۔ قل موتوا بغیظکم۔ لیکن ہر دفعہ وہ پہلے سے زیادہ بھنا کر مسلمانوں کی مختصر سی جماعت کو زک پہنچانے کی نئی ترکیب DEVICE ایجاد کرتے ہیں۔ تاہم پھر ایک تازہ رسوائی ان کا مقدر بن جاتی ہے۔ لیکن اس پر بھی وہ باز نہیں آتے۔

باطل کی نگونساری

اور حق و باطل کی یہ آویزش ہمیشہ سے یونہی چلی آئی ہے۔ ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

بل نقذف بالحق علی الباطل فیدمغہ فاذا ھو زاھق۔ باطل جب حق سے ٹکراتا ہے تو ہمیشہ منہ کی کھاتا ہے۔ اس کے بیسیوں اوچھے واروں کے جواب میں حق کی ایک ہی ضرب کاری اس کے سر کے ٹکڑے اڑا دیتی ہے اور اس کا بھیجہ پاش پاش ہو جاتا ہے۔ حق کے مقابلے میں باطل کتنی ہی اکڑفوں دکھائے ٹھہر نہیں سکتا۔ جآء الحق وزھق الباطل، ان الباطل کان زھوقا۔

حضرت نبی امی فداہ ابی و امی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو خالق کون و مکاں کی تائید و حمایت حاصل تھی۔ دشمن نے شیطانی ہتھکنڈوں اور طاغوتی روباہ بازیوں کے تمام حربے آزما لیے لیکن حضور نبی کریم اور ان کے جاں نثار و فدا کار ساتھیوں کی روز افزوں بڑھتی ہوئی قوت کے سیل بے پناہ کے سامنے بند باندھنے کی ان کی کوئی سی کوشش کامیاب نہیں ہوئی اور گنتی کے چند سال بھی گذرنے نہ پائے تھے کہ مدینہ منورہ کی مرکزی اسلامی حکومت کے سامنے جزیرۃ العرب کی مستبد، خود سر اور مطلق العنان حکومتیں اور ریاستیں گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو گئیں۔

ابلق ایام پر سرور انام علیہ الصلوٰۃ والسلام کا کنٹرول

اس تمام صورتِ حالات کا غیر جانبدارانہ اور منصفانہ تجزیہ کرنے پر اپنے تو خیر اپنے ہیں، غیر بھی اس اعتراف حقیقت پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ اس درجہ مختصر بلکہ ناقابلِ ذکر افرادی قوت، استعدادی زبوں حالی اور ماحول کی عدم مساعدت کے باوصف ایک دہائی (DECADE) سے بھی کم مدت میں اتنی انقلاب آفریں کامیابیاں حاصل کر لینا اور کسریٰ کے فاتح اور عرب و شام کے نصاریٰ کے پشتیبان قیصر شہنشاہ روم کو اس کے اہالی موالی سمیت وادی خمول میں دھکیل دینا اور وہ بھی ایک بے سرو سامان امی لقب اور

بادیہ نشین عرب کے ہاتھوں بظاہر سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کارکنان قضا و قدر محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے اشارۂ چشم و ابرو پر کام کر رہے تھے۔ اشہب دوراں کی باگ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں تھی کہ جس رُخ چاہتے تھے اُسے موڑ دیتے تھے اور یہ باور کرنا ہی پڑتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت کی عالمی سیاست کا پورا پورا شعور رکھتے تھے۔ اس عہد کے طبعی اور تاریخی تقاضوں پر آپ کو پوری گرفت حاصل تھی اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام عہد شناس ہی نہیں عہد ساز بھی تھے۔ یہاں تک کہ صورتِ حالات کو اپنی حسب منشا ڈھال لینے کی غیر معمولی مگر خداداد صلاحیتوں کے مالک تھے۔ اللّٰھم صل وسلم علیہ۔

جنّت البقیع

سیّد مسعود مشہدی

"مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے جنوب کی طرف جاتی ہوئی سڑک پر چند قدم چلنے کے بعد تقریباً
نو فٹ اُونچی دیوار کا احاطہ نظر آئے گا۔ جس کی لمبائی ۱۵۰ میٹر اور چوڑائی ۱۰۰ میٹر ہے۔ اس کے بڑے
دروازے کی پیشانی پر ایک پتھر پہ کندہ نظر آئے گا۔ " ھٰذا البقیع شریف "

زمین کا وہ حصہ جو مختلف جڑ دار درختوں کا مرکز ہو عربی لُغت میں اس کو بقیع کہتے ہیں۔ اس صفت کی بنا پر اس حصّہ کو بقیع کہا جاتا تھا۔ اس کے بعد اس زمین کو جنت البقیع اور بقیع شریف کا اعزاز ملا۔ اس بقیع شریف یا جنت البقیع کے اس پار ایسے مقدس اجسام کو مقام آرام ملا جن میں سے اکثر ایسے بھی ہیں جنھیں اللہ کے بعد بزرگ و برتر معلمِ الٰہی اور معلمِ دینِ قیّم، شافعِ محشر، رحمتِ دوعالم محمد و احمد صلی اللہ علیہ وسلم سے قریبی رشتے کی عظمت حاصل ہے۔

لختِ جگر، آنکھوں کی ٹھنڈک، مادرِ مشفق، برادرزادے، نواسوں کے نواسے، بھائی، دوست، جاں نثار، معیارِ وفا، معیارِ صداقت، معیارِ شرافت، غرض رشتوں کے تعلق کے علاوہ اعلیٰ وارفع بہترین سے بہترین اعمال سے مزین ہستیوں کے مقدس اجسام کی امین۔ بہت تھوڑی سی زمین ـــ مگر اپنی عظمت کے اعتبار سے سارے آفاق پہ حاوی ہے!

ہزار ہا صحابہ کرام وصحابیات کی آرامگاہ جنت البقیع۔ بقیع شریف!

الفاظ میں اتنی ندرت کہاں کہ ان کی عظمتوں اور برکتوں کا احاطہ کر سکیں۔ مگر اس نامکمل سے تعارف کے بعد تھوڑا سا تفکر۔

ان میں سے ہر ایک کو جھوٹ سے نفرت تھی۔

ہر ایک کو سچائی اپنی جان سے پیاری تھی۔

ہر ایک کو اللہ اور اس کے رسولِ برحق صلی اللہ علیہ وسلم سے والہانہ محبت تھی۔

ہر ایک کو موت کے بعد کی زندگی کا یقین تھا۔

ہر ایک کو وحدہٗ لاشریک کے مختارِ مطلق ہونے کا یقین تھا۔

ہر ایک صرف انہیں عادتوں کو مقصدِ حیات سمجھتا تھا جس کا درس انھیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال و اقوال سے ملتا تھا۔ اخوت، مساوات، قناعت، صبر، شجاعت، عدالت، عفت، حکمت، علم، عمل اور یقین کا وہی معیار ان کی زندگی تھی جس پر اللہ جل شانہٗ اور ان کے منتخب خاندانِ اوّل و آخر انسانیت کی رُوح، انسانیت کی معراج، انسانیت کا معلم تربیت کنندہ، موت کے بعد کی زندگی کے شاہد ـــ اللہ کے تمام نظام قیام و تدبیر کے عینی گواہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر تصدیق ہوتی۔

اس لیے ضروری ہے

قدم اس دروازہ کے اندر رکھنے سے پہلے ہم ندامت اور اپنی کم علمی اور کمزور ترین یقین اور اعتراف کے ندامت بھرے آنسوؤں سے اپنی نیت کو سچا بنالیں۔ اپنے جسم ـــ اور نگاہ کو پاک کرلیں۔ ہوسکتا ہے۔ دل کی نگاہوں کو وہ روشنی مل جائے جو ان نورتوں کو چھونے کے بعد ہمیں ان اعمال کی شرافت نصیب ہو جائے جو قیامت کے دن شفیع محشر صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوبِ نظر ہوں ـ!

اب آیئے اندر چلیں

اسی انداز سے جس انداز سے رسولِ اکرم صلی اللہ تعالٰے علیہ وسلم شعبان کی پندرھویں شب تشریف لایا کرتے تھے۔ ابوہریرہ رضی اللہ تعالٰی عنہ نے اسے یوں بیان کیا ہے :

ان رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم خرج الی المقبرۃ ۔ فقال : السّلام علیکم دار قوم مومنین ۔

"جب حضور اکرم صلی اللہ تعالٰے جنت البقیع میں داخل ہوتے تو فرماتے : السلام علیکم" مومن قوم کی بستی اور مومنوں پہ اللہ کی سلامتی ہو ـ!

" وانا ان شاء اللّٰہ بکم لاحقون "۔ اور ہم اللہ نے چاہا تو تم سے ملاقات کرنے ہی والے ہیں "

انتم سلفنا ونحن بالاثر یغفر اللّٰہ لنا ولکم ورحم اللّٰہ المتقدمین منکم والمتاخرین اللّٰھم لا تحرمنا اجرھم ولا تفتنا بعدھم واغفر لنا ولھم اللّٰھم اغفر لاھل بقیع غرقد ۔

لہٰذا آپ بھی سب سے پہلے انھیں کلمات "سلام" سے آغاز کیجیے۔

اور اب نگاہ اور قدم کا رُخ دائیں جانب کیجیے۔ جہاں اس زمین کے حصّہ کو سب سے پہلے جس جسم اطہر کو سپرد خاک کیا گیا۔ ان کا نام تھا۔

(۱) عثمان بن مظعون " اس وقت محمد بن علی بن الحنفیہ کا گھر یہاں ہوتا تھا۔ اُس کے قریب " اس کے بعد

(۲) ابراھیم ابن رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ ابن زبالہ قدامہ بن موسیٰ کے حوالے سے روایت کرتے ہیں۔

" فلما توفی ابنہ ابراھیم " قالوا یا رسول اللّٰہ۔ این نحفر لہ "۔

اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لختِ جگر ابراہیم علیہ السلام وفات پاتے تو پوچھا گیا۔ ان کو کہاں دفن کیا جائے؟ تو آنحضرت صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم نے فرمایا :

قال عند فرطنا عثمان بن مظعون "عثمان بن مظعون کے پہلو میں "

(۳) رقیہ بنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم۔

ابن عباس رضی اللہ تعالٰی عنہ فرماتے ہیں : فلما ماتت رقیہ بنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم وقال الحقی بسلفنا عثمان بن مظعون رض۔

"جب آپؐ کی بیٹی رقیہ وفات پاگئیں توان کے بارے میں بھی فرمایا۔ اسے عثمان بن مظعون کے پاس ہی دفن کردو۔"

۴۔ قبر فاطمہ بنت اسد رضی اللہ تعالیٰ عنہا
ام علی ابن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ
ابن شیبۃ نے جابر بن عبد اللہ سے روایت کیا ہے۔

بینا نحن جلوس مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا اتاہ آت ۔ فقال :۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان ام علی وجعفر وعقیل قد ماتت !

ہم حضور اکرم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے ساتھ مجلس میں موجود تھے ۔جب ایک شخص نے آکر خبر دی۔ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی رضی اللہ عنہٗ جعفرؓ، عقیلؓ کی والدہ کا انتقال ہو گیا ہے۔

فقال : تو رسولِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : قوموا الی امی - میری والدہ کے احترام میں اُٹھ جاؤ۔

فقمنا : ہم سب اُٹھ گئے ۔اس کے بعد ہم سب دار وفات پہ پہنچے ۔آپؐ نے اپنی قمیص پھاڑ کر اُسی کا ایک ٹکڑا دیتے ہوئے فرمایا "غسل کے بعد ۔اُن کے کفن میں رکھ دیا جائے ۔"

اس کے بعد جب جنازہ چلا تو آپؐ نے اسے دوبار کندھا دیا۔ پھر دوبار دائیں طرف اور پھر دو بار بائیں طرف کندھا دیا۔

اس کے بعد قبر کھودی گئی تو اللہ کا نام لے کر خود داخل ہوئے ، قبر میں لیٹے ۔اور پھر باہر آ گئے ۔اس کے بعد ام علی ابن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کو لحد میں لٹایا گیا تو قبر کے سرہانے کھڑے ہو کر فرمایا : "بہترین ماں اور بہترین مرتبہ !تم پر خدا کی رحمتیں ہوں !"

صحابہ کرام نے جب حیرت سے قمیص پھاڑ کر کفن میں رکھنے اور خود قبر میں اُترنے اور لیٹنے کی حکمت کے بارے میں دریافت کیا۔ تو فرمایا "قمیص کا ٹکڑا اس لیے کہ انھیں جہنم کی آگ سے بچاتے اور قبر میں لیٹنے کا مقصد یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ اس قبر کو وُسعت دے دیں۔"

۵۔ عبد الرحمٰن بن عوفؓ
۶۔ سعد بن ابی وقاصؓ
۷۔ عبد اللہ بن مسعودؓ
۸۔ خنیس بن حذافہؓ
۹۔ سعد بن زرارہؓ

اس کے علاوہ یہاں ہزاروں صحابہ کرام خوابیدہ ہیں جن میں سے ہر ایک نے اپنے اعمال و اقوال اور ایمان و ایثار کی قابلِ حیرت تاریخیں چھوڑی ہیں۔

۱۰۔ نافع مولیٰ عبد اللہ بن عمرؓ
۱۱۔ مالک بن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ
۱۲۔ ابی سفیان بن الحارثؓ
۱۳۔ عقیل بن ابی طالبؓ
۱۴۔ عبد اللہ بن جعفر ذی الجناحین

ازواج مطہرات رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم :

۱۵۔ اُمّ حبیبہؓ

۱۶ ۔ اُم سلمہ رضؓ ۔ ۱۷ ۔ عائشۃ الصدیقہ رضؓ

۱۸ ۔ ام المومنین حفصہ رضؓ ۔ ۱۹ ۔ ام المومنین سودہ رضؓ

۲۰ ۔ زینب بنت جحش رضؓ ۔ ۲۱ ۔ زینب بنت خزیمہ (ام المساکین)

۲۲ ۔ جویریہ رضؓ ۔ ۲۳ ۔ ام المومنین صفیہ رضؓ اور

۲۴ ۔ اُمّ المومنین میمونہ رضؓ ۔

ماسوا اُم المومنین خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جو کہ "مشہد جنّت المعلیٰ" میں مدفون ہیں ۔

بنات رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم

۲۵ ۔ سیّدہ اُمّ کلثوم علیہا السّلام

کہئے :

السلام علیکن یا بنات رسول اللہ (صلّی اللہ علیہ وسلّم)

السلام علیکن یا بنات نبی اللہ ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ۔

۲۶ ۔ خلیفۃ المومنین عثمان بن عفان رضی اللہ تعالےٰ عنہ

کہئے :

السلام علیک یا ثالث الخلفاء الراشدین عثمان بن عفان ذا النورین ۔

السلام علیک یا مجہز جیش العسرۃ بالنفذ والعین ، جامع القرآن بین الدفتین

جزاک اللہ عن امۃ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ۔

اللّٰھم ارض عنہ وارفع درجتہ واکرم مقامہ واجزل ثوابہ ۔ امین ۔

اہل بیت

۲۷ ۔ عباس عم رسول صلی اللہ علیہ وسلّم

۲۸ ۔ سیدہ فاطمۃ الزھرا سیدہ نساء العالمین ، ام سیدی شباب اھل الجنۃ فی الجنۃ ۔

۲۹ ۔ علی بن حسین زین العابدین علیہ السلام ۔ ۳۰ ۔ حسن بن علی علیہ السلام ۔

۳۱ ۔ محمد باقر ۔ ۳۲ ۔ جعفر صادق

کہئے ،

السلام علیکم یا اھل بیت النبوۃ ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ۔

اس کے بعد آپ کا خلوص اور محبت جس طرح بھی ہدیۂ عقیدت پیش کر سکے۔!

وفاء الوفاء کے مؤلف سمہودی نے حسین علیہ السلام کے سر کے بارہ میں محمد بن سعید کے حوالے سے لکھا ہے۔
یزید بن معاویہ نے عامل مدینہ سعید بن العاص کو سر مبارک بھیجا۔ اور اس نے کفنا کر جنت البقیع میں ان کی والدہ سیدہ کے احاطہ میں دفن کیا۔" (واللہ اعلم بالصواب)

۳۳ ۔ صفیہ بنت عبدالمطلب ـــ عمۃ رسول صلی اللہ علیہ وسلم۔

۳۴ ۔ اسمٰعیل بن جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ ۳۵ ۔ مالک بن سنان رضی اللہ تعالیٰ عنہ

اور بحوالہ ذخائر مدینہ منورہ، تنقیب وجمع محمد سعید دفتر دار، مطبوعہ منشورات مطبعۃ الانصاف، بیروت۔

شہداء الحرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔

مشہد عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف سے آتے ہوئے دائیں طرف ایک احاطہ سا راقم نے بھی دیکھا ہے۔ یہاں شہداء الحرۃ ـــ مدفون ہیں۔
لیکن ان کے اسماء کی تفصیل کوشش کے باوجود نہیں ملی۔

یہاں پڑھیے:

السلام علیکم یا شہداء الحرہ، السلام علیکم بما صبرتم فنعم عقبی الدار یغفر اللہ لنا ولکم۔ آمین ثم آمین۔

اب یہاں سے روانہ ہونے سے پہلے بقیع شریف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہِ اقدس میں کن عظمتوں کی حامل ہے وہ بھی سن لیجیے!

اُمّ قیس بنت محصن کہتی ہیں۔
غرقد البقیع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا نام لے کر پکارا۔ میں نے کہا لبیک یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔
آپ نے فرمایا:
"قیامت کے دن ان مقابر میں سے ستر ہزار نفوس اس طرح اٹھیں گے کہ ان کے چہرے سورج اور چاند (بدر) سے زیادہ روشن ہوں گے"

ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"قیامت کے دن زمین سے سب سے پہلے اُٹھنے والوں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم، پھر ابوبکرؓ، پھر عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، پھر جنت البقیع میں مدفون اور پھر مکہ کے لوگ اٹھیں گے۔"
آپ نے فرمایا۔
مرقد البقیع اور مقبرہ عسقلان دونوں آسمان والوں کے لیے اس طرح نور افشاں ہیں جس طرح دنیا والوں کے لیے سورج اور چاند!
ان ارشادات سے بقیع شریف۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نظروں میں کتنا محبوب اور عظیم ہے۔ آپ خود اندازہ لگالیجیے۔

جنات بارگاہِ نبویؐ میں

محمد مسعود عبدہ

صاحب ہدی العالمین رحمۃ للعالمین علیہ التحیۃ والسلام کی بارگاہِ ہدایت سے نہ صرف انسان نے شرف ہدایت پایا۔ بلکہ "جنات" نے بھی آپ کی بارگاہ رسالت کی صداقت پہ سرِ تسلیم خم کیا۔

قرآن مجید میں سورۃ جن میں دجنات کی آمد قرآن حکیم کی سماعت اور تصدیق رسالت و ہدایت کا ان الفاظ میں ذکر فرمایا ہے۔

"قُلْ اُوْحِیَ اِلَیَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا ۝

کہہ دیجئے مجھے بذریعہ وحی اطلاع دی گئی۔ جنات کی ایک جماعت نے قرآن مجید سنا اور" اس کی معجز بیانی اور مضامین" کے اثرات پر تعجب کا اظہار کیا۔

یَّهْدِیْٓ اِلَی الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ

جو راہِ راست سمجھاتا ہے۔ اور ہم نے اُس کی ہدایات کو تسلیم کرلیا (ایمان لے آئے)

وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا ۝

اب ہم اپنے وحدہٗ لاشریک رب کا کسی کو بھی حصہ دار نہیں مانیں گے۔

وَاَنَّهُ تَعٰلٰی جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَّلَا وَلَدًا ۝

بے شک ہمارا رب بڑی شان والا ہے۔ نہ اُس کی بیوی ہے' نہ اس کی اولاد۔

وَاَنَّهُ كَانَ يَقُوْلُ سَفِيْهُنَا عَلَى اللّٰهِ شَطَطًا ۝

یقیناً ہم میں سے بے وقوفوں نے اللہ تعالٰے سے جھوٹی باتیں وابستہ کر رکھی ہیں۔

وَاَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ تَقُوْلَ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ۝ وَاَنَّهُ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا ۝

اور ہم تو یہی سمجھتے رہے کہ انسانوں اور جنوں میں سے کسی کی مجال ہی نہیں کہ وہ اللہ کے بارے میں جھوٹے الزام تراشتے۔۔

انسانوں میں سے کچھ انسانوں نے جنوں سے پناہ مانگی جس کے سبب جنات میں جذبہ سرکشی اور بڑھ گیا۔

وَاَنَّهُمْ ظَنُّوْا كَمَا ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ اَحَدًا ۝

اور بلاشبہ (تمہاری طرح انسانوں نے بھی گمان کرلیا کہ اب اللہ کسی "ہادی" کو نہیں بھیجے گا۔"

وَاَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيْدًا وَّشُهُبًا ۝ ہم نے آسمان کو چھو کر دیکھا تو اسے

سخت پہرے اور خطرناک شعلوں میں بھرا پایا

وَاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا ۝ اور ہم اس سے پہلے آسمان میں جگہ جگہ باتیں سننے کے لئے بیٹھ جایا کرتے تھے لیکن اب جو کان لگائے تو ایک شعلہ اپنی تاک میں پایا۔

وَاَنَّا لَا نَدْرِيْٓ اَشَرٌّ اُرِيْدَ بِمَنْ فِي الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا ۝ اور ہم نہیں جانتے کہ زمین والوں سے کسی بُرے ارادہ کا فیصلہ کیا گیا ہے یا ان کا رب ان سے کسی بھلائی کا ارادہ کر چکا ہے۔

وَّاَنَّا مِنَّا الصّٰلِحُوْنَ وَمِنَّا دُوْنَ ذٰلِكَ كُنَّا طَرَآئِقَ قِدَدًا ۝ اور بلا شبہ ہم میں بعض نکوکار ہیں اور بعض اس کے سوا بھی۔ ہم مختلف فریق ہیں۔

وَّاَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ نُّعْجِزَ اللّٰهَ فِي الْاَرْضِ وَلَنْ نُّعْجِزَهٗ هَرَبًا ۝ وَّاَنَّا لَمَّا سَمِعْنَا الْهُدٰٓى اٰمَنَّا بِهٖ ؕ فَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِرَبِّهٖ فَلَا يَخَافُ بَخْسًا وَّلَا رَهَقًا ۝ وَّاَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ وَمِنَّا الْقٰسِطُوْنَ ؕ فَمَنْ اَسْلَمَ فَاُولٰٓئِكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا ۝

اور ہمیں یقین ہو گیا کہ ہم اللہ تعالیٰ کو زمین میں عاجز نہیں کر سکیں گے ۔ اور نہ ہم بھاگ کر اسے مات دے سکتے ہیں ۔ ہم تو ہدایت سنتے ہی مسلمان ہو گئے ! اور ہم سے بعض بے انصاف بھی ہیں ۔ طے شدہ بات ہے جو مسلمان ہو گئے ۔ انہوں نے صحیح راستہ کا انتخاب کیا۔

وَاَمَّا الْقٰسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا ۝ اور ظالم جہنم کا ایندھن بن گئے ۔

وَّاَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا عَلَى الطَّرِيْقَةِ لَاَسْقَيْنٰهُمْ مَّآءً غَدَقًا ۝ اور اے نبی یہ بھی کہہ دو اگر لوگ راہ راست پر قائم رہتے تو ہم ان کو پانی بھر کر پلاتے ۔

جنات کا قرآن مجید سننا' اس کی اثر انگیزی اور مطالب ہدایات بحوالۂ توحید کو دل سے تسلیم کرنے کے بعد اپنے باقی جنات کو جا کر ان کا اظہار توحید اقرار توحید اور پھر اس کی تبلیغ کے بارہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو علم نہیں تھا وہ یہ تھی (بحوالہ ابن کثیر) ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں ۔ جب شیاطین جو اس سے پہلے آسمان کے ان حصوں میں جا کر بیٹھ سکتے تھے ۔ مگر کچھ دنوں سے ان مقامات پر پہنچتے ہی ان کو آگ کے شعلوں نے طمانچے مارنا شروع کر دیئے ۔ جو ان کے لئے بڑی حیران کن بات تھی ۔ آسمان پر رونما ہونے والے اس بالکل نئے حادثہ کے بارے میں سب جن پریشان ہو گئے ۔ آپس میں مشورہ ہونے لگا ۔ دانشوروں کی جماعت اکٹھی ہوئی ۔ بحث مباحثے کے بعد جنات نے اپنے سب سے بزرگ اور بڑے جن (شیطان) ابلیس کے سامنے مسئلہ پیش کیا ۔ اس نے کہا

سلے :- چودہ سو سال پہلے کسی کا آسمان کی بلندیوں میں جا کر بیٹھنا ناقابل یقین تھا ۔ اس وقت کے دانشوروں نے اسے باطل ٹھہرایا ۔ لیکن آج کے زمانہ میں جب روس اور امریکہ کے خلا باز خلاؤں میں چہل قدمی کی خبر دیتے ہیں تو دانشور اسے تسلیم کر لیتے ہیں ۔ کرنا بھی چاہیئے ۔ لہذا اللہ کے فرمان سچے تھے ۔ سچے ہیں ۔

میرے خیال میں روئے زمین پر کوئی غیر معمولی انقلاب انگیز شخصیت پیدا ہوئی ہے۔ جاؤ دنیا کے کونے کونے میں پھیل کر پتہ لگاؤ۔ سمجھ میں نہ آئے تو۔ ہر خطہ کی مٹھی بھر مٹی اپنے ساتھ لے آؤ۔

چنانچہ یہی ہوا۔ شیطانوں و جنات کی ٹولیاں دنیا کے مختلف حصوں میں پھیلیں اور حسب حکم مٹی لے آئیں۔ بزرگ شیطان نے مختلف علاقوں سے لائی ہوئی مٹی کو سونگھنا شروع کیا۔ لیکن مکہ معظمہ۔ اور مدینہ منورہ کی مٹی سونگھتے ہی اس کے چہرہ کی رنگت بدل گئی۔ آنکھوں میں غم کی اندھیری رات چھاگئی۔ انتہائی دل شکستہ آواز میں۔ اعلان کیا۔ یہ انقلاب انگیز شخصیت۔ مکہ معظمہ کی سرزمین میں پیدا ہوئی ہے۔ سب کے سب چونکے۔ اور اپنی دشمن اس شخصیت کی طرف اس لئے بڑھے کہ وہ اسے جانیں۔ اسے سمجھیں۔ اور پھر اگر ان کے بزرگ ابلیس کے خلاف' یا نسل آدم کی بھلائی میں اس شخصیت کا عمل کوشاں ہو۔ تو ہم اس کی پرزور مخالفت کریں۔ اسے پھلنے پھولنے سے پہلے مسل دیں (نعوذ باللہ)

چنانچہ اس مقصد کے لئے جنات کی ایک جماعت اس وقت مکہ معظمہ میں پہنچی۔ جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بازار عکاظ کی طرف جاتے ہوئے مقام نخلہ میں اپنے اصحاب کے ساتھ صبح کی نماز پڑھ رہے تھے۔ جنات کی اس جماعت نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان اقدس سے آواز رحمت و برکت سے قرآن حکیم کی آیات "نورٌ علی نور" سنیں تو۔ سب کے سب حیرت میں ڈوبے' شانِ رسالت کے سامنے دم بخود۔ بغیر آداب سلام کہے اپنی جماعت۔ جنات میں لوٹے۔ اور انہیں خبر دی! ہمارے بھائیو! ۔ ہم نے اس بے مثال شخصیت انقلاب آفریں کی زبان سے ایسی عجیب وغریب کلام نبی (قرآن مجید) اس نے ہم پر بڑی اہم حقیقت کا انکشاف کیا۔ ہمارے ضمیر تو اسی وقت اُس کی صداقت کو مان گئے۔ اور اب ہم اعلان کرتے ہیں کہ نبی آخر الزمان ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم سچے' قرآن سچا آج سے ہم اللہ وحدہٗ لاشریک کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔ نہ اس کی کوئی اولاد ہے۔ نہ ہی اس کو کسی نے پیدا کیا ہے۔

یہ تھی جنات کی سب سے پہلی دانشوروں کی جماعت' جن کی عقل نے صداقت رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلیم کیا۔ اور زبان سے بے باک اعلان کیا جس سے جنات کی دنیا میں بھی تہلکہ مچ گیا۔ تعلیم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مبلغ جنوں میں بھی پیدا ہوگئے! ابلیس تلملایا۔ غصہ میں تھرتھرایا۔ ان کو ڈرایا دھمکایا۔ مگر سب بے سود! سچائی سب سے بڑی طاقت ہے۔ اور جب یہ کسی کے دل میں "ایمان" کے ساتھ جاگزیں ہو جائے تو پھر۔ ناقابلِ تسخیر قوت بن جاتی ہے۔

ابلیس نے اپنے ہم عقیدہ جنات کو یہ کام سونپا۔ کہ تم احکامات الٰہیہ کو مسخ۔ اور اُس میں ایسی تبدیلیاں کر دو کہ حقیقت! خرافات میں ڈوب جائے۔ غرض ادھر ابلیس کی کارروائیاں تیز تر ہوگئیں۔ ادھر۔ ایمان لانے والے جنات کا عمل دوسرے جنات کو متاثر کرنے لگا۔ بارگاہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں گروہ در گروہ جنات تعلیم کے لئے حاضر ہونے لگے۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے لئے الگ اور مخصوص مقامات پر درس فرماتے! عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اصحابہ کرام سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ آج کی رات تم میں سے جو کوئی چاہے "جنات" کو تعلیم دینے کے سلسلہ میں میرے ساتھ چلے! سب کے سب خاموش رہے۔ لیکن میں نے ۔ اظہارِ معیت کیا

۔ ۔۔ مٹی سونگھنا اور علاقہ کا تعین۔ اس وقت تو یہ بھی عجیب بات ہوگی۔ لیکن آج تو مٹی اور دھاتوں کا تجزیہ اور اس کی روشنی میں مٹی کے مقام کی خصوصیات کا تعین ۔ عام بات ہے۔

چنانچہ اس رات شفیع المذنبین ہدی للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم جب پہاڑی کے ایک بلند حصہ پر پہنچے تو مجھے اپنے قدم مبارک سے ایک گول دائرہ کھینچ کر حکم فرمایا کہ تم یہیں اس حدود میں بیٹھے کر دیکھتے رہو۔ میں بیٹھ گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بلند جگہ پر کھڑے ہو کر قرآن پاک کی تلاوت شروع کی تو دیکھتے ہی دیکھتے مختلف سمت سے غول در غول جماعتیں انتہائی ادب کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں چاروں طرف سے آئیں اور بیٹھ گئیں۔ میں تو قرآن حکیم (اور پھر تلاوت کرنے والے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم) کی حلاوتوں میں کھو گیا۔ اثرات نے دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیا۔ لیکن جیسے ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک خاموش ہوئی تو میں نے دیکھا۔ بادل کے چھٹتے ہوئے ٹکڑوں کی طرح جنات گروہ در گروہ مختلف سمت بکھر گئے۔ اب صبح ہو چکی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے دریافت فرمایا۔ تم نے کیا دیکھا —؟

میں نے عرض کیا۔ میں نے دیکھا۔ سیاہ رنگ، بھیانک چہرے اور سفید لباس میں ملبوس مخلوق۔

آپ نے فرمایا۔ ہاں۔ یہ مختلف قبیلوں اور مقامات سے آئے تھے۔ انہوں نے مجھ سے انسانوں کے ساتھ مساجد میں نماز پڑھنے کی درخواست کی لیکن میں نے انہیں منع کر دیا۔ اتفاقاً نماز پڑھ لیں تو جائز ہے لیکن مستقل اختلاط یعنی گھل مل جانے سے منع کر دیا۔ اسی طرح ایک بار حضرت عکرمہ رضی اللہ تعالے عنہ کو بارگاہ نبوی میں جنات کے مجمع کو دیکھنے کا موقع نصیب ہوا تو وہ کہتے ہیں۔

مجھے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک گول دائرہ کی حدود میں بیٹھنے کا حکم فرمایا۔ اور خود۔ ایک اونچے مقام پر کھڑے ہو کر قرآن حکیم کے اوامر و نواہی پر مبنی آیات تلاوت فرمانا شروع کیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک جم غفیر نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو چاروں طرف سے ایسے گھیرا۔ جیسے چاند بادلوں میں گھر جائے۔ مجمع کا شور میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ لیکن اس مہیب صورت مخلوق میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو غائب دیکھ کر میں گھبرا گیا۔ لیکن میں نے دیکھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو چھڑی سے بیٹھنے کا حکم دے رہے ہیں۔ یہ سلسلہ چلتا رہا۔ اختتام پر جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ جنات چلے گئے تو میں نے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ تو آپ نے فرمایا۔ ان لوگوں میں ایک قتل کا واقعہ ہو گیا تھا۔ دونوں فریق اپنے اپنے دلائل پیش کر رہے تھے۔ میں نے اُن کا فیصلہ کر دیا۔

ابوہریرہ رضی اللہ تعالے عنہ اپنے حوالے سے ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جنات نے مجھ سے توشہ مانگا تو میں نے ان کو اللہ تعالے کے نام پر مذبوح جانوروں کی ہڈیاں اور گھوڑوں کی لید تجویز کی ہے۔ اور انہیں بتایا کہ ان ہڈیوں کو ان کے ہاتھ میں لیتے ہی اللہ تعالے ویسا ہی گوشت پوست دے دیں گے۔ جیسا کہ پہلے تھا۔ اسی طرح گھوڑوں کی لید ان کی غذا کی صورت میں بالکل وہی وجود اختیار کرے گی۔ جو گھوڑوں کے معدوں میں جانے سے پہلے تھا۔ (یعنی دانے یا غذا کی دوسری اصلی صورت) اس لئے آج سے ہم تمام امت مسلمہ کے لئے ہڈیوں اور گوبر سے نجاست صاف کرنا ممنوع قرار دیتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی روشنی میں یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ انسانوں کی طرح ان میں بھی کمزور اور طاقتور ہیں۔ قتل اور جھگڑے بھی ہوتے ہیں۔ ان میں بھی صالح اور متقی اور نیک جن موجود ہیں۔ ان میں بھی شر پسند، ایذا پسند اور فساد پسند جن موجود ہیں

ان میں بھی ایک گروہ شرک میں مبتلا ہے اور ایک گروہ انبیاء اور آسمانی کتابوں کے احکام کی اتباع کرتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان جلیل کی روشنی میں یہ بات واضح ہے کہ۔ انسانوں کی طرح "جن" بھی عبادات کے مکلف قرار دیئے گئے ہیں۔

ارشاد ربانی ہے۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ ۝ ہم نے انسانوں اور جنوں کا مقصودِ حیات اللہ جل شانہٗ کی "عبادت" (فرماں برداری) قرار دیا ہے۔

ایک اور جگہ "سورۃ احقاف چھبیسواں پارہ" قرآن حکیم میں اللہ تعالٰے فرماتے ہیں

"وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۝" اور ہم نے جنات کی ایک جماعت کی توجہ تمہاری طرف مبذول کی۔ انہوں نے قرآن حکیم سنا۔

فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا۔ اور جب وہ حاضر ہوئے تو دوران سماعت انہوں نے ایک دوسرے کو مؤدب خاموشی کا حکم دیا۔ فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ۝ اور جب تلاوت اختتام کو پہنچی تو یہ جماعت اپنے دوسرے افراد کی طرف لوٹی۔ اور انہیں بھی ان احکامات سے آگاہ کیا۔

قَالُوْا يٰقَوْمَنَآ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ

اے ہماری قوم ہم نے وہ کتاب سنی جو موسیٰ علیہ السلام کے بعد نازل ہوئی اور وہ اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے سچائی وَاِلٰى طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ راہ راست کی رہنمائی کرتی ہے

يٰقَوْمَنَآ اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ وَاٰمِنُوْا بِهٖ ۔ اے ہماری قوم والو، اللہ کی طرف بلانے والے (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دعوت قبول کر لو۔ اور اس پر یقینِ محکم (ایمان) لے آؤ!

يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ اس کے نتیجہ میں تمہارے تمام سابقہ گناہوں کو بخش دیا جائے گا۔ اور دردناک عذاب سے بچا لیا جائے گا۔

وَمَنْ لَّا يُجِبْ دَاعِيَ اللّٰهِ فَلَيْسَ بِمُعْجِزٍ فِى الْاَرْضِ وَلَيْسَ لَهٗ مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءُ

اور اگر تم لوگوں نے اللہ تعالٰے کے سچے داعی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بات نہ مانی تو پھر یقین کر لو۔ تمہارا روئے زمین میں کسی حصہ میں بھاگ جانا تمہیں نجات نہیں دے سکے گا۔ اسے اگر مدد مل سکتی ہے تو صرف بارگاہ الٰہی سے۔ اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ اور یہ بھی یقین کر لو۔ ایسی کوشش کرنے والا کھلی گمراہی کے اندھیروں میں بھٹکنے کے سوا کچھ نہیں۔

ارشادات ربانی کے ان ارشادات سے "جنات" کے اعمال ذہن۔ اور پھر ان میں پھیلی ہوئی گمراہی کا ہر پہلو کھلی کتاب کی طرح سامنے آجاتا ہے۔ اور پھر ایمان لانے والے جنات کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور توحید کی تصدیق کے ساتھ ان کی تعلیمات کی تبلیغ کا عمل کن عقائد پر مبنی ہے وہ بھی عیاں ہے

قرآن مجید میں اس کے بعد کفار جنوں کا ردعمل کیا ہوا۔ اس کا ذکر تو نہیں لیکن احکامات الٰہیہ کے پیغام کو جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کفار کے سامنے لب کشا ہوئے تو کس طرح کا ردعمل ہوا۔ تاریخ کی سیر کی کتابوں میں ان کی وضاحت موجود ہے۔ ظاہر ہے۔ جنات میں بھی کفار جنوں کا وہی ردعمل ہوگا۔

ابن عباس رضی اللہ تعالٰے عنہما فرماتے ہیں کہ کفار جنات آیات الٰہیہ کو سنتے تو اس میں اپنی طرف سے عبارات کو بڑھا کر اس

کے مفہوم کو خلط ملط کرتے۔ تاکہ حقیقت خرافات میں کھو جائے! اس سے پتہ چلتا ہے کہ شیطان (ابلیس) نے جو سب سے پہلا حربہ استعمال کرنے کے لئے جن جنات کو استعمال کیا وہ اس کا دانشور پڑھا لکھا گروہ تھا۔

اللہ تعالےٰ نے اس کا فوری انسداد فرما دیا۔ اور انہیں آیات الٰہیہ کی سماعت سے محروم کر دیا گیا۔ ابن جریر میں مرقوم ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نصیبین کے رہنے والے سات جنوں کو جنات کی مختلف بستیوں کی طرف تبلیغ دین کے لئے بھیجا ان کی تعداد نو، اور اس کے علاوہ ہزاروں کی تعداد میں بھی یہ سلسلہ مرقوم ہے۔

قرآن مجید کے ارشادات کی روشنی میں تھوڑی سی اور وضاحت!۔

(۱) وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا وَلَوْ شَاۗءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ○

اور اسی طرح ہم نے شیطان سیرت انسانوں اور جنوں کو ہر پیغمبر کا دشمن بنا دیا تھا۔ اور دھوکہ دینے کے لئے ایک دوسرے کے دل میں ایسے خیالات میں مدد کرتے جو مخالف میں کارگر ہوں اور ایک دوسرے کے قول کو غرور بخش انداز میں سراہتے) اگر اللہ تعالےٰ چاہتے تو ایسا نہ ہوتا لہٰذا تم ان کی افترا پردازیوں کو چھوڑ دیجئے!

سورہ انعام آیت ۱۱۲

اس آیہ کریمہ میں شیطان کے تابع جن انبیاء سے دشمنی کا طریقہ کار انداز کا اختیار کرتے اور اس دشمنی میں انسانوں کے دانشور طبقہ کو کس طرح استعمال کرتے۔ اس کی نشان دہی واضح ہے۔

دوسری آیات سورہ انعام آیت ۱۲۸

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ"

اور جس دن وہ سب (جن و انس) کو جمع کرے گا اور پھر فرمائے گا۔ اے گروہ جنات تم نے انسانوں سے بہت فائدے حاصل کئے۔

وَقَالَ اَوْلِيٰۗؤُهُمْ مِّنَ الْاِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَّبَلَغْنَآ اَجَلَنَا الَّذِيْٓ اَجَّلْتَ لَنَا

اور جو انسانوں میں سے ان کے دوست ہوں گے وہ بھی اقرار کریں گے" ہاں پروردگار ہم ایک دوسرے سے فائدہ حاصل کرتے رہے۔ اور آخر کار ہم وقت کو پہنچ گئے جو تو نے ہمارے لئے مقرر کیا تھا۔

قَالَ النَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا مَا شَاۗءَ اللّٰهُ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ○

حکم الٰہی ہوگا۔ اب تمہارا ٹھکانا دوزخ ہے۔ ہمیشہ اس میں جلتے رہو گے۔ مگر اللہ تعالےٰ جو چاہیں۔ تمہارا رب بڑا صاحب حکمت اور علم والا ہے۔

جنوں کی پیدائش

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ○ وَالْجَاۗنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ ○

ہم نے انسان کو کھنکھناتے ہوئے سڑے ہوئے گارے سے پیدا کیا۔ اور جنوں کو اس سے بھی پہلے بے دھوئیں کی

آگ سے پیدا کیا۔ سورۃ الحجر۔ آیت نمبر ۲۶ ۔ اور ۲۷ ۔

جن اور انسان کی تخلیق میں بنیادی فرق کی وضاحت کر دی گئی۔

ایک اور آیۂ کریمہ سورہ نمل آیت ۳۹ ۔ قَالَ عِفْرِيتٌ مِّنَ الْجِنِّ أَنَا آتِيكَ بِهِ قَبْلَ أَن تَقُومَ مِن مَّقَامِكَ وَإِنِّي عَلَيْهِ لَقَوِيٌّ أَمِينٌ

سلیمان علیہ السلام۔ کو ایک قوی ہیکل جن نے کہا۔ اس سے قبل کہ آپ اپنی جائے نشست سے اٹھیں میں اسے آپ کے پاس حاضر کر سکتا ہوں مجھے اس پر قدرت بھی حاصل ہے۔ اور میں قابل اعتماد بھی ہوں۔

اس آیۂ کریمہ میں اس بات کی تصدیق ہے کہ جنّ اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت سلیمان علیہ السلام کے مطیع تھے۔ ایک اور بات جو اس ضمن میں خیال رکھنا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ جنّ۔ انسان پر غالب ہیں، یا انسان کو ان پر قدرت حاصل ہے۔ انسان اشرف و اکرم ہے یا جن۔ اس کی وضاحت آدم علیہ السلام کے یوم آفرنیش کے اس واقعہ سے آئینہ کی طرح صاف ہے۔ جب فرشتوں اور جنوں کے بزرگ ابلیس کو آدم علیہ السلام کے حضور سجدہ کرنے کا حکم دیا اور پھر فرمایا " إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ "

اے آدم ہم نے تمہیں انتہائی بہترین پیدائش سے نوازا ہے۔ ثابت ہوا جن انسان پر کسی قسم کا جبر نہیں کر سکتے۔ انسان کو اپنے تابع بنانے کی قدرت نہیں رکھتے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ اگر کوئی انسان ان سے دوستی کرنا چاہے، یا انہیں اپنی قوت ارادی سے اپنا مطیع بنانا چاہے تو ایسا ممکن ہو سکتا ہے۔ اور ایسا ہوا ہے۔

یہ بالکل ایسا ہی ہے۔ جیسے کسی ماہر نفسیات کے زیر علاج مریض جب تک معالج سے تعاون نہ کرے۔ کسی ہپناٹسٹ کا مفعول اس سے اثر پذیر کا خواہش مند نہ ہو تو اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ چنانچہ قبل اسلام نہ صرف عرب بلکہ دنیا کے اور بہت سے ممالک میں جنات اور انسانوں کے باہمی رابطے کے واقعات ملتے ہیں۔ اور آج بھی۔ ایسی مثالیں ملتی ہیں۔ جن کا ذکر ہم آگے کریں گے!

پہلے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جنات کے بارے میں اپنے مشاہدہ کا تاثر پڑھ لیجئے۔ (بحوالہ ترمذی شریف)

ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اصحابۂ اکرام کے سامنے سورۂ رحمٰن تلاوت فرمائی۔ اور اصحابۂ اکرامؓ سے فرمایا۔ کیا بات ہے۔ تم لوگ خاموش ہی رہے۔ تم سے جن بہت اچھا جواب دینے والے ثابت ہوئے۔ جب بھی میری زبان سے فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ٥ سنتے تو جواب میں بے ساختہ کہتے۔

وَلَا بِشَيْءٍ مِّنْ آلَائِكَ أَوْ نِعْمِكَ رَبَّنَا نُكَذِّبُ فَلَكَ الْحَمْدُ

یہ استدلال جنات کا مومن ہونا۔ بارگاہ نبوی میں حاضری اور تعلیم حاصل کرنے کے بعد ان کے اپنے دینی ذہن اور فکر کی ترجمانی کرتا ہے۔

جنات جب اللہ کی وحدانیت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق سے پہلے کی شریعتوں کو تسلیم کرنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کا ثبوت اس عام تاثر کو غلط ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ جن سبھی کے سبھی "شیطان" کے تابع یا مکمل شر و فساد ہی نہیں۔

ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب السیرۃ میں جنات کے بارہ میں کچھ تفصیلی حوالے دیئے ہیں۔ ورنہ اکثر سیرۃ کی کتابیں خاموش

ـــکے موضوع کو صرف قبل اسلام عرب شعراء اور قبائل کے جنات سے گہرے باطلوں عقیدوں کے بارے میں تذکرہ ضرور کیا ہے شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی چوتھی جلد میں "ظہور اسلام کے وقت عرب کی مذہبی و اخلاقی حالت" کے عنوان وادہ باب میں جن شیاطین اور بھوت پلید کے حوالے سے جو کچھ لکھا ہے اس کا اختصار یہ ہے۔

جن، شیاطین، بھوت پلید کو اشغال اور اشکال کے لحاظ سے تو مختلف سمجھتے تھے لیکن ان کے اعتقاد کے مطابق یہ ایک ہی خاندان تھا۔ اسی طرح ان کے بسیروں کے حوالے سے جو جنگلوں میں رہتے ہیں۔ ان کا نام غول تھا۔ ان کے خیال کے مطابق ان کا کام مسافروں کو ڈرانا اور دھوکہ دیتا ہوتا تھا۔ ان میں مونث اور مذکر دونوں ہوتے تھے۔

وَغولاً قَفرَةٌ ذَكَرٌ و اُنثىٰ كَانَ عَلَيهِمَا قِطَعَ البِجَادُ

اور بیابان کے دو غول مرد اور عورت بھی گویا ان دونوں پر کمبل کے دو ٹکڑے پڑے ہیں۔

اَذَلَّ وَسُعْلَاةٌ وغولُ لِقَفرَةٍ اذا الليل وارى الجِنَّ فيه اَرَنَّتْ"

میں بیابان میں چلتا ہوں اور چڑیل (مونث) غول (مرد جن) جب رات پردہ پوش ہوتی تھی تو بھوت اس میں آوازیں دیتے تھے۔ پھر یہ جن صحرانشین بدوؤں کی صحبتوں میں شریک ہوتے جاڑوں میں جب بدو آگ جلاتے تو یہ آگ تاپتے۔ مگر کھانے میں شریک ہونے سے انکار کرتے ہوئے کہتے ہم آدمیوں کی غذا نہیں کھاتے۔

اَتَوا نَارِيَ فَقُلتُ مَنُونَ اَنتُم؛ فَقَالُوا الجِنّ قُلتُ عِمُوا ظَلَامَا

وہ لوگ رات کو میرے پاس آئے۔ میں نے کہا تم کون ہو؟ انہوں نے کہا ہم جن ہیں۔ میں نے کہا اس تاریکی میں خوش رہو یہ اکثر بچوں اور جوانوں کو اٹھا کر لے جاتے۔ عمرو بن عدی لخمی جو عرب کا بادشاہ تھا۔ اس کو بھی اٹھا کر لے گئے۔ لیکن کئی برسوں کے بعد جذیمہ ابرش کو لا کر دے گئے۔

اسی طرح علامہ جاحظ نے اپنی تصنیف "کتاب الحیوان" میں تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔ ابوالبلاد طہوی ایک شاعر نے لکھا ہے کہ میں غول بیابانی سے ملا۔ جو رات کے اندھیروں میں چلتے ہیں۔

چنانچہ اس وقت کے کاہن جو پیشین گوئیاں کرتے تھے ان کی زبان انتہائی بلیغ اور مسجع ہوتی تھی۔ وہ آسمانی خبریں بھی بتاتے تھے۔ اُن کا یہی دعویٰ ہوتا تھا کہ ان کا دوست ایک جن ہے۔ جو انہیں القا کرتا ہے۔ وہ اپنی صورت اور لباس ایسا اختیار کرتے تھے کہ لوگ ان کو دیکھتے ہی پہچان لیتے تھے۔ ایک دن حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس سے ایک آدمی گزرا۔ آپ نے قیافہ سے اسے پہچان لیا۔ اس کو بلا کر پوچھا۔ تیرے جن نے سب سے زیادہ کون سی عجیب بات کہی؟ تو اس نے بوکھلا کر کہا۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الْجِنِّ وَاِبلَاسِهَا وَيَاسِهَا مِنْ بَعدِ اِنكَاسِهَا وَلُحُوقِهَا بِالقِلَاصِ وَاَحْلَاسِهَا" کیا تم جنوں کی سراسیمگی، ان کی ناامیدی ان کے کاروبار کی ابتری نہیں دیکھتے؟ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔ یہ ٹھیک کہتا ہے یہ حقیقت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کا شیطان کو سب سے زیادہ غم ہوا۔ کیونکہ یہی ذات رحمت و شفقت ہے۔ صلی اللہ علیہ وسلم یہی ذات رؤف الرحیم ہے۔ ——— یہی وہ ذات عفو و درگزر

یہی وہ غم خوار انسانیت ہے۔ یہی وہ محسن انسانیت ہے۔ یہی وہ محسن کائنات ہے جس سے زیادہ نسل آدم کا کوئی ہمدرد نہیں، غمخوار نہیں، محبت کرنے والا شفقت کرنے والا نہیں۔ یہی وہ ذات افضل البشر علیہ التحیۃ والسلام ہے جو۔ غم آدمیت، احترام آدمیت میں بار بار اشک بار ہوئی۔ اتنی فکر مند ہوئی کہ اللہ تعالیٰ کو اسے بار بار، کہنا پڑا۔ تم ان کے غم میں اتنے کیوں تڑپتے ہو! ——— یہ ہماری بھی تو مخلوق ہے۔ لیکن معراج کی بلندیاں میں تو وہاں بھی۔ اپنے ساتھ عباد الصالحین نہیں بھولے۔ شیطان جو آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد کا پہلے ہی دن سے دشمن ہوا۔ اور پھر کھل کر دشمنی کا اعلان کیا۔ اسے اس سے بڑھ کر اور کیا غم ہو سکتا تھا کہ رحمت للعالمین علیہ السلام آگئے۔ شفیع المذنبین، سید المرسلین علیہ الصلوٰۃ والسلام جلوہ افروز ہوئے۔ اور ان زندگی بخش جلووں نے شیطان اور اس کے مطیع جنوں میں اپنی ہلاکت اور موت اپنے ارادوں میں شکست اور اپنی چالوں میں ناکامیاں نظر آنے لگیں اس کی نسل میں سے بہت سے اس کے فریب سے نکل کر ایمان لانے آئے۔ اس طرح انسانوں کو گمراہ کرنے کا کاروبار سرد پڑ گیا

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔ ایک روز میں زمانۂ جاہلیت میں بتوں کے پاس سویا ہوا تھا کہ میں نے خواب میں دیکھا۔ ایک آدمی نے گائے کا بچھڑا ذبح کیا۔ اس کے بعد ایک شخص اس کے پاس آکر زور زور سے چلایا۔

یاجلیح امر نجیح رجل فصیح یقول لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰہ "اے جلیح امر نجیح ایک فصیح شخص لاالٰہ الا اللہ کہتا ہے" چنانچہ اس کے چند ہی دنوں بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ کی بعثت ہوئی۔

کاہنوں کے علاوہ عرب شعراء کی نسبت بھی لوگوں کا یہی خیال تھا۔ بلکہ ہر شاعر خود کہتا تھا کہ میرا دوست ایک جن ہے اعشیٰ جو عرب کا مشہور شاعر تھا۔ اس کے شیطان کا نام مسحل تھا۔ اعشیٰ خود کہتا ہے۔

دعوت خلیلی مسحلاً ودعواله　　　جھنام سید عی للھجین المذمم

ترجمہ:۔ میں نے اپنے دوست مسحل کو پکارا۔ اور انہوں نے اس کے لئے جہنام کو پکارا۔ (حریفوں نے) اور یہ کمینہ (جہنام) بد اطوار کے لئے بلایا جاتا ہے۔ ابوالنجم کہتا ہے

انی وکل شاعر من البشر　　　شیطانه انثی و شیطانی ذکر

ہر شاعر کا شیطان تو مونث ہے۔ مگر میرا شیطان تو مذکر ہے۔

یہ تو عرب شعراء کی زبانی اپنے جن کی دوستی کا حال آپ نے پڑھا۔ اب۔ ایک ابتدائی ایام میں مشہور کاہن اور بعد میں مسلمان ہونے والے سواد بن قارب کی اپنی زبانی ایک ایسے جن کی تفصیل سنیئے جو مبلغ اسلام تھا۔ جسے ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی "تفسیر ابن کثیر" میں سورۂ احقاف کی تفسیر میں مرقوم کیا ہے۔ اور ہمارا ماخذ ابن دیدار کی صُوَرٌ مِنْ حیاۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم مطبوعہ دار المعارف القاہرہ ہے۔

"حافظ ابو یعلیٰ الموصلی محمد بن کعب القرظی سے روایت کرتے ہیں۔

ایک دن ہم حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مجلس میں بیٹھے تھے۔ ایک شخص گذرا تو میں نے کہا، یا امیر المومنین اس راہ گیر کو [illegible] جانتے۔ انہوں نے فرمایا۔ کون ہے [illegible] ہم نے کہا یہ سواد بن قارب [illegible]

قبل از اسلام یہ وہی شخص ہے۔ جس کا مطیع ایک جن تھا۔ جو اسے غیب کی خبریں بتانے میں مدد دیتا تھا۔ عمر فاروق رضی اللہ تعالے عنہ نے کسی آدمی کو اس کے تعاقب میں بھیج کر اسے بلایا اور دریافت کیا۔ کیا تمہیں سواد بن قارب ہو۔ اس نے جواب دیا۔ ہاں۔ میں ہی سواد بن قارب کاہن تھا۔ مگر اب میں مسلمان ہو چکا ہوں۔ بحمد اللہ! عمر فاروق نے فرمایا۔ سبحان اللہ۔ میں تم سے زمانہ کہانت کی باقی آپ بیتی نہیں پوچھوں گا۔ مگر اتنا بتا دو کہ تمہارے دوست جن نے تمہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کیا بتایا تھا۔ سواد نے کہا۔ تو سنیئے امیر المومنین رضی اللہ تعالے عنہ!

ایک رات میں نیم خوابی کی حالت میں تھا کہ میرے مطیع جن نے میرے پاؤں جھنجھوڑے اور کہا۔

قم یا سواد بن قارب و اسمع مقالتی۔ اٹھو سواد بن قارب اور میری بات سنو! اور اگر تم عقل مند ہو تو عقل سے کام لو۔

واعقل ان کنت تعقل۔ ۔۔۔۔ انہ قد بعث رسول من لوی بن غالب، یدعوالی اللہ والی عبادتہ، ثم انشاء یقول :۔ بلاشبہ لوی بن غالب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہو چکی ہے۔ وہ اللہ کی طرف بلاتے ہیں۔ اور اللہ کی عبادت کی دعوت دیتے ہیں اور پھر۔ انتہائی کیفیت میں جھوم کر یہ شعر پڑھنے لگا۔

عَجِبْتُ للجن وتطلابھا ۔۔۔ وَشدّ العیس بأقتابھا

میں جنوں کے دور دراز سفر کے لئے بوریا بستر باندھنے پہ تعجب کر رہا ہوں۔

تھوی الی مکۃ تبغی الھدیٰ ۔۔۔ ما صادق الجن ککذابھا

اگر تم ہدایت کے طلبگار ہو تو مکہ مکرمہ کی طرف جلدی چلو اور یاد رکھو سچا جن جھوٹے جن کی طرح ناقابل اعتماد نہیں ہوتا

فارحل الی الصفوۃ من ھاشم ۔۔۔ لَیْسَ قدامھا کاذنابھا

جا جلدی جا اور ایک بار بنو ہاشم کے اس جمیل چہرہ کو ایک نظر دیکھ تو سہی۔ دنیا جہاں تم نے پہلے کبھی نہ دیکھا ہوگا

میں نے اسے کہا۔ دعنی انام۔ چل بھاگ سونے دے! لیکن دوسری رات کو پھر اس نے میرے پاؤں جھنجھوڑے۔ پھر وہی الفاظ دہراتے ہوئے وجدانی کیفیت میں شعر کہنے لگا۔

وارحل الی الصفوۃ من ھاشم ۔۔۔ بین روابیھا واحجارھا

بنو ہاشم کے عظیم صفت، اللہ کے منتخب صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے اپنا دل منور کرے۔

تیسری رات بھی اس نے یہی عمل کیا۔ اور تینوں بار اس نے یہ بات ضرور کہی۔

عجبت الجنّ وتحسّاسھا ۔۔۔ وشدھا العیس باحلاسھا

مجھے اپنی جن برادری کی (مکہ مکرمہ) کو جلد سے جلد روانگی پہ تعجب ہے۔ ہر ایک اپنے اونٹوں کے پلان اور کجاوے کسے ہوئے تیار ہے اور تو اگر عقل مند ہے ہدایت کا طالب ہے تو اٹھ جلد کر۔

جلدی سے بنو ہاشم کے نور نظر کی خدمت میں حاضر ہو۔ اس کے انوار و برکات سے اپنے دل، اپنی آنکھوں کو منور کرے۔

اس کے بعد میرا دل بھی بے چین ہوا۔ میں نے تیز تر سواری کا اہتمام کیا اور پھر رات دن ریگستانی طوفان اور پتھریلی چٹانوں کو چیرتا ہوا مکہ معظمہ پہنچا تو ہادی الزماں علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنے اصحاب کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ میں با ادب ان کے قریب گیا۔ اور عرض کی۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں اپنی معروضات پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت مرحمت فرمائی تو میں نے دھڑکتے دل اور نمناک آنکھوں سے عرض کیا۔

آتانی نجیی بعد ھدءٍ ورقدۃٍ　　　ولم اکُ فیما قد تلوت بکاذب
ثلاث لیالٍ قولہ کُلّ لیلۃ　　　اتاک رسول من لوی بن غالب
فشمرت ذیلی الازار وسّطت　　　بی الذعلبُ الوجنا غُبرالسباسب
فاشھد ان اللہ لا رب غیرُہ　　　وانک مامون علی کل غائب
فمرنا بما یاتیک یا خیر مرسل　　　وان کان فیما جاء شیب الذوائب
وکن لی شفیعاً یوم لا ذو قرابۃ　　　بمغن فتیلاً عن سواد بن قارب

ترجمہ:۔ میرا جن میرے پاس انتہائی سچی خبرلے کر تین رات تک مسلسل آتا رہا اور ہر بار ہر رات وہ یہی کہتا رہا۔ لوی بن غالب" خاندان شرفا" کے صدر نشین خاندان کے ہاں اللہ کا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مبعوث ہو چکا ہے۔ آخر کار اس کی سچائی نے میرے ضمیر کو جگا یا۔ میں نے بھی سفر کی تیاری کی۔ جلد سے جلد سفر طے کرنے کی خواہش میں تیز اور بہت تیز راہوں کو لپیٹتا ہوا حاضر خدمت ہوا ہوں۔!

اب میں اس سچائی کا اقرار اور اعلان کرتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی رب نہیں معبود نہیں۔ اور آپ اللہ تعالیٰ کے امانت دار (امین) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں) اور آپ سے اُس دن شفاعت کا طالب ہوں جب عزیز و اقارب، احباب و آشنا سب میں سے کسی کی کچھ نہیں چلے گی۔ اس دن اپنی شفاعت سے نوازیئے گا۔ اے بہترین اخلاق سے سنورے ہوئے بزرگوں اور نیک طینت خاندان کے چشم و چراغ، اے تمام رسولوں سے افضل رسول صلی اللہ علیہ وسلم۔ آپ کی بارگاہ میں وعدہ کرتا ہوں جو حکم آسمانی (الٰہی) آپ مجھ تک پہنچائیں گے۔ وہ کتنا ہی مشکل اور طبیعت کے خلاف کیوں نہ ہو۔ اسے ٹالا نہیں جائے گا۔ لیکن اس گناہ گار کی ایک التجا قبول فرما لیجئے۔ یوم جزا سواد بن قارب کا آپ کے سوا کوئی آسرا نہیں ہوگا۔ اس یوم جزا و سزا کے مشکل ترین دن میری سفارش ضرور فرمایئے گا۔

یہ سن کر رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم مسکرائے اور پھر فرمایا۔ آج سے خیر و بھلائی ایمان کا نور تمہارا مقدر ہو گیا سواد بن قارب!

بس، امیر المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہ، ان سعادت مند گھڑیوں میں جو ایمان کی دولت سے جھولی بھری تو اب تک اس کو سنبھالے پھرتا ہوں!

عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا اللہ تمہیں مبارک کریں یہ سعادت اور اسے اپنے اعمال کے قلعہ میں محفوظ رکھنے کی توفیق عطا فرما دے۔ آمین ثم آمین۔

سواد بن قارب کو ابدی سعادتوں سے مالا مال کرنے کا سبب ایک جن بنا۔ جن کے اشعار اُس کی کیفیات کے بدرجۂ اتم ترجمان ہیں۔

جن کا خاندان چونکہ اس سربراہ یا بزرگ سے تعلق رکھتا ہے۔ جو بارگاہ الٰہی سے مردود ہونے کی بدبختی کا مالک بنا، اپنی تخلیق کے غرور نے اس کی عقل کو ایک لمحہ کے لئے مختل کر دیا۔ اور پھر آدم کی اولاد سے اس کی دشمنی کا آغاز ہوتا ہُوا۔

تکبر عزازیل را خوار کرد — بزندان لعنت گرفتار کرد

اس دشمنی کے آغاز کا ذکر قرآن حکیم میں کئی جگہ ارشاد فرمایا۔ لیکن ہر جگہ مفہوم ایک ہی ہے " اَبٰی وَاسْتَکْبَرَ" سجدہ سے انکار کیا۔ اور تکبر کا اظہار کیا۔ اس تکبر اور انکار پر اللہ جل شانہٗ کا جلال حق بجانب ہے۔ ابلیس۔ اللہ جل شانہٗ کی زبان مبارک سے آدم کی عظمت کے دلائل فرشتوں سے بیان کرتے ہوئے سن چکا تھا۔

اِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً ... تا آخر

جب تمہارے رب نے فرشتوں کے سامنے اپنی زمین کی خلافت سونپی جانے والی شخصیت کا اظہار فرمایا۔ تو اس کی تخلیق میں متضاد جبلتوں، غصہ، حمیت، شجاعت، جبن، حرص، ایثار، نفرت، محبت علیٰ ہذا القیاس۔ اسی طرح آگ، پانی، مٹی، ہوا عناصر کا مجموعہ دیکھ کر انہوں نے اپنی رائے میں خرابی کے امکانات کی توقع ظاہر کی جس کے جواب باصفائی میں رب جلیل نے علم الاسماء کی برتری حاصل کردہ "آدم" کی عظمت کا فرشتوں کو معترف کروالیا۔ ان دلائل کے بعد ۔ جب اللہ تعالےٰ نے "آدم" کے سامنے سجدہ تعظیم بجالانے کا حکم صادر فرمایا تو فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ "سب نے سجدہ کیا۔ لیکن ابلیس (عزازیل) نے حکم عدولی کی۔ تکبر آمیز وجوہات بیان کیں۔ از خود عقل کی گمراہی کے ہاتھوں طوق لعنت گلے میں ڈال لیا۔

حسد نے جلتی پر تیل چھڑکنے کا کام کیا۔ قیامت تک کی زندگی اس چیلنج کے ساتھ اللہ سے مانگی کہ میں آدم کی وجہ سے ہی ذلیل ہوا ہوں۔ اس سے اس کی اولاد سے اس کے ذہنی اور فکری اغوا سے انتقام لوں گا۔ مجھے زندگی دے تو دیکھنا کہ میں ان کے شعور اور عقل کو ایسا ورغلاؤں گا کہ یہ تیرے ہی خلاف برسرپیکار رہیں گے۔ احکم الحاکمین ملیک و مقتدر فعال لما یرید ذی العرش المجید نے ناراضی کے باوجود اپنا اصول عطا نہیں توڑا۔ جو اس نے مانگا اسے دیا۔ اور ساتھ ہی فرمایا۔ وفا و عہد کے پکے میرے بندے تیری گرفت میں نہیں آئیں گے۔

شیطان کی عقل نے جس منطق کا سہارا لیا۔ وہ تھی۔ اَنَا خَیْرٌ مِّنْہُ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَہٗ مِنْ طِیْنٍ" میں اس سے تخلیق میں اس لئے بہتر ہوں کہ تو نے مجھے آگ سے اور اسے (آدم) مٹی سے پیدا کیا ہے۔

گویا شیطان کی عقل مٹی کی ظاہر صورت کے چکر میں پھنس کر چکرا گئی۔ اس کی نگاہ بصیرت یہ نہ دیکھ سکی۔ اس مٹی میں ملبوس نور ہدایت بھی ہے۔ منبع علم و حکمت بھی ہے۔ تمام کائنات کی شرافت و تکریم بھی ہے۔ ثوابت و سیار کو مسخر کرنے کی قوت بھی ہے۔

(میرے یقین کے مطابق چاند اور ستاروں کی تسخیر اُسی دن ہو گئی تھی۔ حبیب افضل البشر نے فرمایا "میرے مہربان چچا۔ اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی پہ چاند اور بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پہ سورج بھی رکھ دیں تو بھی میں اپنے موقف یعنی نیابت الٰہیہ سے بال برابر بھی نہیں

ہٹ سکتا) اُس کی بصیرت یہ نہ دیکھ سکی۔ اس مٹی میں ملبوس صاحب معراج بھی ہے۔ صاحبِ قاب قوسین بھی ہے، سورج اور چاند کی طنابوں کو گرفت میں لینے والی قوت بھی، صبر واستقلال، عفو و درگزر، رحمت و شفقت کا جمال بھی ہے۔ عدل، شجاعت، تہور، تدبر تمدن و تہذیب کا نکھار و جلال بھی ہے۔

عقل پر شیطان کا ہی تصرف ہے جو انسان نے ہمیشہ ان تمام حقیقتوں کے وجود سے انکار کر دیا جو اسے نظر نہیں آتیں، یا اس کے دائرہ احساس سے باہر ہیں سے

خوگر پیکر محسوس تھی انساں کی نظر ماننا کوئی ان دیکھے خدا کو کیونکر

جب آسمانوں پر حیات کے گھات لگا کر بیٹھنے کا انکشاف فرمایا تو اس گروہ کی عقل ہنسی۔ مگر آج اسی عقل کے چیلوں نے خلابازوں کو خلا میں چہل قدمی کرتے ہوئے دیکھا تو۔ مان لیا۔ یہ ممکن ہے۔

آج مدار میں چھوڑے گئے مصنوعی سیاروں سے نظر میں نہ آنے والا تعلق حقیقت مان لیا گیا۔ اسی طرح قدیم زمانے کے ایک گروہ نے وحی اور جنوں کے وجود سے انکار کر دیا اور آج بھی اپنی عقل کی ہمہ دانی کے زعم میں اسے مفروضہ جات کہا جاتا ہے۔ ہمارا موضوع جنات کے وجود یا عدم وجود پر بحث نہیں بلکہ اپنے اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی صداقت جسے ہماری عقل، ادراک، عرفان اور علم نے اللہ کی استعانت اور تعلیم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے نور ہدایت کے تعاون سے تسلیم کیا ہے۔ اس کا اظہار ہے۔

اس نظر نہ آنے والے دشمن کے طریقہ واردات کی نشاندہی کرتا ہے جس کی خبر اللہ تعالیٰ نے ہمیں ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے اس آیت میں ان الفاظ میں دی ہے۔

"یُوَسْوِسُ فِی صُدُوْرِ النَّاسِ مِنَ الْجِنَّۃِ وَالنَّاسِ" شیطان اور اس کے دوست یا تصرف میں آنے والے انسان" تمہارے سینوں (یعنی دل میں) وساوس (شبہ، تشکیک، خوف) ڈالتے ہیں۔

عربی میں وسوس کے معنی (بحوالہ منجد) وسوسہ ڈالنا۔ عقل کی خرابی سے بے تکی باتیں کرنا۔ آہستہ بولنا۔ وسوس بہ کلام کا مخلوط ہونا۔ دل میں آنے والی برائی یا بے نفع بات ان معانی کے مفہوم کے بعد اب بحوالہ لغات القرآن الوسوس، اس کا مصدر وسوسہ بھی ہے رباعی مجرد کے ابواب میں سے ہے۔ معنی ہیں کسی بُری چیز کا دل میں ڈالنا۔ عقل کا اغوا کر لینا۔ کتے اور شکاری کی مدھم سی آواز، ہوا جھونکے سے درختوں میں پیدا ہونے والی ہلکی سی آواز سرسراہٹ' اسے اغوائے قلبی بھی کہا جا سکتا ہے

منجد۔ کا مصنف عیسائی ہے۔ لہٰذا اس کی نظر میں انسان کی کل کائنات عقل ہے۔ اس لئے اس نے اغوائے عقل یا گمراہی عقل کا عمل جو نظر نہ آئے یہ کیا ہے لیکن' لغات القرآن" دین کے معلم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق انسان کی اصلی کائنات صرف دل ہے۔ فرمایا۔ انسان کے پہلو میں گوشت کا لوتھڑا (دل) اگر درست ہے۔ تو انسان کی ساری کائنات فکری اور عملی درست ہے۔ اگر یہ بگڑ جائے تو پورا جسم بگڑ گیا پورا نظام بگڑ گیا۔

مقصود و غرض یہ ہے کہ شیطان کا طریقہ واردات نگاہوں سے پوشیدہ ہے۔ اس لئے اس کے عمل کے تاثرات کی نشاندہی کے ساتھ معالج حقیقی مزکی نفس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ یہ غصہ میں شامل ہو جاتا ہے۔ جب دل میں غصہ سر اٹھائے تو کھڑے ہو تو بیٹھ

جاؤ۔ بیٹھے ہو تو اٹھ جاؤ۔ اور ساتھ ہی پڑھو لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم' اسی طرح اس کے عمل کی مثال PSYCHO VIBRATIONS کے عمل سے دی جا سکتی ہے " HYPNOTIST کے عمل HYPNOTISM سے دی جا سکتی ہے۔ لہذا خیالات میں حبیب بھی اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی مخالفت رینگنے لگے تو سمجھ لو۔ اس میں جنات کے اس گروہ کا ہاتھ ہے جو شیطان کے پیروکار ہیں۔ غالب نے ایک شعر میں کہا ہے آتے ہیں غیب سے مضامیں خیال میں۔ یہ غیب سے آنے والے مضامین اگر اپنے سفر میں شیطان کے ہاتھوں اغوا ہو جائیں تو ان سے ایسی تحریر یا ایسے شعر فصاحت و بلاغت میں انتہائی اعلیٰ محاسن کلام میں سب سے اچھے بن کر شاعر اور مصنف کے خیال میں سموتے ہیں کہ انہیں سننے والا اور پڑھنے والا سر دھن کر رہ جاتا ہے۔ جنسی تلذذ جمالیاتی۔ تلذذ۔ میں ایسے رس گھول دیتا ہے کہ ؎

جی چاہتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن　　بیٹھے رہیں تصور جاناں کئے ہوئے

اور پھر وہ حقیقت زندگی اور فرائض زندگی سے گریز کر کے کہتا ہے۔

اک معمہ ہے نہ سمجھنے کا نہ سمجھانے کا　　زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

جن اچھے ہیں یا بدکردار۔ انسان سے نہ ہی وہ افضل ہیں اور نہ ہی وہ انسان پر جبراً تصرف کر سکتے ہیں۔ ان کا تصرف جاہل اور بے شعور افراد پر زیادہ ہوتا ہے۔

جس طرح انسان کی عقل نے اسرار کائنات کی دریافت میں انسان کو سمجھنے میں ارتقا پایا ہے اور انسان کے ہر کام کا طریقہ کار بدل گیا ہے۔ اسی طرح شیطان اور اس کے پیروکار نے بھی اپنے طریقہ واردات میں نکھار پیدا کر لیا ہے۔
اس کا سب سے بڑا اور اہم مرکز نسل انسانی کے وہ گروہ ہیں جن کا لوگوں کے اذہان بنانے میں مضبوط ہاتھ ہوتا ہے۔
اگر ہمارے ذہن تعلیم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے بنیادی خمیر حاصل نہ کریں تو انہیں اغوا کرنا شیطان کے لئے بہت آسان کام ہے۔
عقل کی اہمیت تدبر اور تفکر کی دعوت، شعور کے استعمال پر تکرار زور قرآن مجید میں موجود ہے۔ "افلا یعقلون" افلا تبصرون افلا یشعرون" لیکن ان اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی نعمتوں کے استعمال میں اس نور کی ضرورت ضرور ہے جو دربار نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور اسوۂ حسنہ میں ہی دستیاب ہو سکتی ہے۔ سید جن و بشر کے فرمودات سے ہی میسر ہو سکتی ہے۔

رحمت للعالمینؐ کی قائم کردہ چراگاہیں

ابن حکیم غلام مصطفےٰ

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح اپنے ارشاداتِ عالیہ اور اعمال قدسیہ کے باہمی اتحاد اور تطابق کے معیار میں ماضی حال اور مستقبل کے تمام مصلحین کے مقابلہ میں بے داغ، بے مثل اور اعلیٰ ہیں جس طرح آپؐ کی تعلیم، امن وسلامتی، رحمت وبرکت اخوت ومساوات اور باہمی احترام کی مسرت انگیز بہاروں کی شگفتگی اپنے دامن میں سمیٹے اپنی تحریر وتقریر فصاحت وبلاغت، افادیت اور جامعیت میں سب سے ممیز ہے۔ جس طرح آپؐ کے اعمال حسنہ کا پرتو انسانی برادری کو رنگ ونسل، زبان، طبقات اور علاقہ جات کی عصبیت وخصومت کی مہلک بیماریوں سے نجات دلانے میں تریاقِ منفرد ہے جس طرح آپ کی نگاہِ ادب آموز دانش وبینش روح وبدن کو باہمی اتحاد ورفاقت سے مہذبانہ زندگی کی خوش انجام منزلوں پہ گامزن کرنے کا بے مثال اثر رکھتی ہے انسانی برادری کے تاقیامت زندگی کے تمام انفرادی اور اجتماعی مسائل کو اپنے پہلو میں سمیٹے آپؐ کی قانون سازمقننہ، حکمت وفراست، علم ودانش اپنی ابدی توانائی اور بلندی میں ایسی لازوال ودرخشاں کہ اس کے سامنے تمام شہر دانشوراں کی حکمت فراست، علم ودانش بیمار اور لاغر ہے اسی طرح آپؐ کی منتخب زبان عربی بھی اپنی لغوی، معنوی، صوری، صوتی وسعتوں میں ایسی بے پایاں کہ دنیا کے تمام اہل لسانیات ورطۂ حیرت میں گم ہیں اسی لئے یہ زبانوں کی شہ نشین زبان، "اُمّ اللسان" کے اعزاز سے ملقب ہوئی۔ اظہارِ حقیقت کو کوئی لاکھ اندھی عقیدت کہے لیکن حق گو زبان ہر لمحہ ہر دور میں اپنا عمل جاری رکھے ہوئے ہے اور تاقیامت جاری رکھے گی ان شاء اللہ

دیکھئے ایک اعراب یا حرف کے اسقاط، ادغام، تشدید سے آواز کے ساتھ معنوی تبدیلی کی ایک معمولی مثال اَلحُمّیٰ[1] اَلحَمِيُّ[2]۔ اَلحَمِيُّ[3]۔ اَلحِمَاءُ[4]۔ اَلحَمَاءُ[5]۔ حِمیٰ[6]۔ حَمِیٌّ[7] (۱) بخار (۲) وہ شخص جو کسی کا ظلم برداشت نہ کرے (۳) میرا گوشت (۴) چراگاہ (۵) بچائی ہوئی چیز (۶) پانی میں ملا ہوا کیچڑ (۷) حمایت حاصل کرنے والا

پیش نظر لسانیات کا تقابل نہیں۔ مقصود اس لفظ کی معنویت عرض کرنا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعین فرمائی اس سے قبل تو الحِمیٰ کے معنی ہر وہ سبزہ زار جو چراگاہ ہو سے مراد تھی لیکن شرعًا یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے مخصوص معنویت دے کر امتِ مسلمہ کو اس کارِ خیر کی رغبت دلائی۔ اس کی ح مکسور ہے۔ صوتی لحاظ سے یوں ہوگا۔ الحِما "حِمیان" اس کی جمع ہوگی۔

اس کے ساتھ ہی اس کی ملکیت اور مقصد کا تعین ان الفاظ میں فرمایا

حسن بن جثامہ فرماتے ہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ لاحِمیٰ اِلا لله۔ چراگاہوں کا۔ اللہ کے سوا کوئی مالک نہیں)

قال الشافعیؒ ۔ قولہ صلی اللہ علیہ وسلم " لاحمی الا للہ ورسولہ " چراگاہ پر اللہ تعالےٰ اور اس کے رسولؐ کے سوا کسی کا حق نہیں

مشہور چراگاہیں (حِمیان) حمی ضریہ ، حمی الربذہ (نجد میں) اور بقول معجم حمی فید ، حمی ذی الشری حمی النقیع

حمی النقیع نقیع اس جگہ کو کہا جاتا ہے کہ جہاں پانی کی بہتات ہو، چنانچہ یہ نام اسی مناسبت کی وجہ سے ہے ۔ مدینہ منورہ سے تقریباً بیس فرسخ پر یہ جگہ واقع ہے ۔ وادی عقیق کے درمیان ، جس کے چاروں طرف پہاڑ ہیں ۔ اور درمیان میں یہ زرخیز ہموار زمین ہے ۔

حضور اکرم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے سب سے پہلے جس چراگاہ کو قدامت کا شرف وفضل بخشا ، وہ یہی چراگاہ نقیع ہے آپؐ نے فرمایا " احماہ لخیل المسلمین ورکابھم " یہ چراگاہیں گھوڑوں اور ان کے سواروں کے لئے مخصوص ہیں ۔

اس کی جغرافیائی حدود کا تعین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح فرمایا ۔ ایک دن صبح کی نماز کے بعد ایک انتہائی بلند آواز شخص کو بلایا گیا ۔ وہ شخص کھجور کے تنے کی بلندی پر پہنچا ، اور اپنی آواز کی انتہا تک آواز دی ۔ یہ آواز جن حدود تک سنائی دی ۔ ان حدود کو اس چراگاہ کی چاردیواری قرار دیا گیا ۔

اس میں سبزیاں ، پھول اور جنگلی قسم کے درخت بوئے گئے ۔ جن میں ، گل لالہ (شقراو) بیری (سدر) سیال ، ایک کانٹے دار سفید دراز قد درخت ، غرف (اس کے پتوں سے چمڑا رنگا جاتا ہے) سلم ، کیکر ، کھجوریں ، جو ، گیہوں غرض اس کے مختلف حصوں میں درخت اور سبزیاں لگائی گئیں ۔ اور پھر یہ خطہ اس قدر پھلا پھولا کہ اگر اس میں گھوڑ سوار داخل ہو جائے تو نظر نہیں آتا تھا ۔

حمی الربذہ ربذہ چراگاہ کے بارہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ چراگاہ اونٹوں کے لئے صدقہ ہے ۔ حمی النبی صلی اللہ علیہ وسلم الربذۃ لابل صدقۃ " محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چراگاہ ربذہ اونٹوں کے لئے صدقہ ہے " مزاوح المزنی کہتے ہیں ۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار نقیع تشریف لائے اور فرمایا نعم مرتع الافراس یحمٰی لھن ویجاھد بھن فی سبیل اللہ " چراگاہ نقیع گھوڑوں کے لئے بہترین چراگاہ ہے ۔ انہیں یہاں خوب چراؤ ۔ اور اللہ کی راہ میں ان پر سوار ہو کر جہاد کرو ۔

چراگاہ کے وسط میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دو رکعت نماز ادا فرمائی جہاں اس کے بعد مسجد تعمیر کی گئی ۔ دوسری روایات صحیحہ میں اس کی تصدیق ملتی ہے کہ آپ جب بھی اپنے لئے نئی جگہ خریدیں تو اس کے حقوق ملکیت کے بعد سب سے پہلا کام اس پر مصلیٰ بچھا کر دو رکعت نماز پڑھیں : تاکہ اللہ تعالےٰ اس زمین کو آپ کے لئے باعث برکت بنا دے ۔

چراگاہوں کا انتظام ابن سیقم فرماتے ہیں ۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مزارع کو بلوایا اور اس کو چراگاہ کی دیکھ بھال اور دوسرے امور سونپنے کی خواہش ظاہر کی تو اس نے عرض کیا " میں تنہا ہوں ۔ میری اولاد سب لڑکیاں ہیں ۔ لڑکا کوئی نہیں " آپؐ نے فرمایا ۔ " اللہ تعالےٰ تم کو بیٹا عطا فرمائیں گے " چنانچہ یہی ہوا کہ اللہ نے اسے بیٹے عطا کئے اور پھر

وہ نسل در نسل اس ذمہ داری کو نبھاتا رہا۔ اس ذمہ داری کے عوض اسے اس چراگاہ سے اگنے والی ہر چیز سے اپنے اور اپنی اولاد کی کفالت کے لئے استفادہ کرنے کا پورا پورا حق تھا۔

چراگاہوں کے بارے میں حکم اگر کوئی شخص کسی چراگاہ کو ذاتی منفعت کے لئے قائم کرتا ہے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے منع فرمایا۔ لیس لاحد ان یحمی للمسلمین غیر ما حمی صلی اللہ علیہ وسلم "کسی مسلمان کو اگر وہ کسی چراگاہ کو قائم کرتا ہے تو اسے صرف انہی اصولوں پر قائم کرنا ہوگا۔ جس کی عملی مثال حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش فرمائی۔"

چراگاہ ابوبکر رضی اللہ تعالٰی عنہ ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالٰی عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد اس چراگاہ کی انہیں اصولوں کے ساتھ نگہداشت فرمائی۔ بلکہ مزید اضافہ فرمایا۔

چراگاہ عمر رضی اللہ تعالٰی عنہ اسی طرح عمر فاروق رضی اللہ تعالٰی عنہ نے بھی سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جاری رکھتے ہوئے اس میں اضافہ فرمایا۔ اس کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ تعالٰی عنہ نے بھی ایسا ہی کیا۔ لیکن حضرت علی کرم اللہ وجہہ دارالخلافہ بدلنے کے سبب ذاتی نگہداشت تو نہ کر سکے لیکن ان کی نگہداشت کا حکم جاری رہا۔

چراگاہ اشرف نبی آکل المرار کی منازل میں چراگاہ "الشرف، ربذہ، اور حمی الابین" کے نام سے چراگاہیں تاریخوں میں مذکور ہیں۔ یہ مقام سریہ کے درمیان حد فاصل سمجھی جاتی ہے۔

چراگاہ ربذہ مدینہ منورہ سے پیدل تین دن کی مسافت پر ایک مقام محید کے نام سے مشہور ہے۔ چراگاہ ربذہ کا اصل مقام یہی جگہ بتائی جاتی ہے۔ اس جگہ پر ایک مسجد اور کنواں ابی ذر غفاری رضی اللہ تعالٰی عنہ کے نام سے منسوب ہے۔

چراگاہ ضریہ مکہ مکرمہ سے پیدل گیارہ دن کی مسافت کے بعد بصرہ جاتے ہوئے ایک مقام ضریہ کہلاتا ہے۔ حلوان بن عمران بن الحاف بن قضاعہ کی والدہ کا نام "ضریہ بنت نزار" تھا۔ لہٰذا یہ چراگاہ انہی کے نام سے منسوب ہوئی۔

چراگاہ فید ارض بنی سعد کوفے جاتے ہوئے راستے میں جبل احمر سے گیارہ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔

چراگاہ رخیمہ اور دوسری چراگاہیں یہیں پر چراگاہ رخیمہ، افعی، وراتہ، غیر، جثجاثہ، الضباب واقع ہیں اور منی کے قریب جبل قارم کے دامن میں قادمہ ہے۔ یہ ہیں وہ چند نام جو ہمیں سمہودی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب وفا الوفا میں حوالہ جات کے ساتھ ملے۔ لیکن اس موضوع کی وضاحت اور عمل کی قومی افادیت کی تفصیل بہت طویل ہے۔ اس ضمن میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ چراگاہوں کی زمین حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی سے جبراً حاصل نہیں کی۔ نہ ہی ان میں سے کسی کا عطیہ ہے۔ بلکہ یہ وہ تمام مقامات ہیں۔ جن کی افادیت سے مسلمان بحیثیت مجموعی انفرادی

اور معاشی فائدہ اٹھا سکتے اور جن کی بنیاد رحمت للعالمین نے رکھی۔ جو کسی کی ملکیت ہی نہیں تھے۔

اب ان چراگاہوں کے بارے میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ غذائی اجناس سے تعلق رکھنے والی اجناس گندم، جو اور دالیں وغیرہ ہوتی تھیں۔ پھلوں میں کیلے، کھجوریں جو کئی اقسام کی ہیں اپنی غذائیت کے اعتبار سے غیر معمولی اوصاف رکھتی ہیں اور جو اس وقت کی مرغوب غذا تھی۔ جانوروں کے لئے ببول، بیریاں اور دوسرے درختوں کا حصہ مخصوص کیا جاتا۔ جڑی بوٹیوں میں سنا مکی، بلسان اور بہت سی مفید ترسبزیاں۔ صنعت میں کام آنے والے چمڑے کو جن کے پتوں سے رنگ دیا جاتا تھا، یہ سب ان چراگاہوں میں موجود تھے۔ اور ان چراگاہوں میں پیدا ہوتے والی غذائیں، پھل پھول، چارہ اور دوسرے اقسام سب کے سب ان لوگوں میں تقسیم ہوتے جنہیں استفادہ کرنے کا حق ہوتا، جو نادار اور کمزور لوگ ہوتے۔ اس عظیم اقتصادی اور معاشی کار خیر کو نہ معلوم وقت کے کس موڑ اور کس ہاتھ نے بند کر دیا۔ لیکن حیرت ہے سیرت نگاروں اور مورخین نے اس اہم موضوع کو کیوں تفصیل سے آنے والی امت مسلمہ تک نہیں پہنچایا۔ غور فرمایئے "الحمٰی للہ و رسولہ" چراگاہوں کے مالک صرف اللہ تعالےٰ اور اس کے رسول ہیں۔ جب بھی حمٰی کے بارے میں کچھ فرمایا تو اس میں اپنے ذاتی اسماء مبارک میں سے کسی نام مبارک کو استعمال نہیں فرمایا۔ ہر جگہ یہی فرمایا کہ اللہ اور اس کا رسولؐ ان کے مالک ہیں۔ گویا رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مالکانہ حیثیت ثانی نائب کی جگہ ہے۔ ورنہ اصل مالک اللہ ہے اور کئی جگہ فرمایا "ان چراگاہوں سے فائدہ اٹھانے کا حق صرف مسلمانوں کو ہے۔ جس کا کوئی معاوضہ نہیں لیا جاتا تھا۔" جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرما کر کہ ایک پودا لگانا بھی صدقہ ہے۔ کنواں کھودنا بھی صدقہ ہے۔ سرائے تعمیر کرنا بھی صدقہ ہے۔ اسی طرح چراگاہوں کو ان مقاصد نبویہؐ کی روشنی میں اگر آج قائم کیا جائے تو یہ عمل ہمارے نادار لوگوں کے لئے کتنا مفید ثابت ہو سکتا ہے اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اجر اللہ کا ثواب اس پہ مضاف ہوگا۔

عظیم یادیں (جنھیں حضورؐ سے نسبت ہے)

ترجمہ : مسعود مشہدی

۱۔ ذلکو فی مدینۃ المصطفیٰ من + ذکریات تفیض بالاحسان

شہرِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم میں بہت سی یادگاریں ہیں، ممکن ہے اللہ کا احسان تمھیں اُن سے فیض یاب کر دے

۲۔ رُبَّ حَرفٍ اغناک عن صفحات + رُبَّ رمزکفاک عن تبیان

اکثر ایک لفظ تمھیں کئی صفحات کی عبارت سے بے نیاز کر سکتا ہے اور یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک ہلکا سا اشارہ طویل تر بیان پر غالب آ جاتا ہے۔ (دار اُمّ مریم آمنہ)

مقاماتِ سجود (نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم) "مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے قرب وجوار میں کون کونسے مقامات کو آپؐ کی صلوٰۃ وسجود کا شرف نصیب ہوا۔ ان سب کی تفصیلی نشان دہی

ان صحابہ کبارؓ (ابو ہریرہ، جابر بن عبداللہ، زبیر بن العوام، ابن ابی فروۃ، ابن شہاب براء بن عازب، ابی زبالہ، علی کرم اللہ وجہہ عثمان ذوالنورینؓ، ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین) نے فرمائی۔ اور شیخان، ابو داؤد، ترمذی اور نسائی نے اپنے اوراق پر انھیں محفوظ کیا۔

نور الدین علی بن احمد السمہودی نے اپنی تالیف وفاء الوفاء باخبار دار المصطفیٰ میں مستقل باب کی شکل دی۔ عبد القدوس انصاری نے اپنی کتاب "آثار مدینہ منورہ" میں ذکر کیا محمد بن عبد المحسن الخیال ناصح المستعجلۃ مدینہ منورہ نے اپنے کتابچہ:

"التعریف بما انست الهجرۃ من معالم دار الهجرۃ" میں ان یادگاروں کو ضبط تحریر کیا۔

انہی کے علم کی روشنی میں آئیے۔ ہم بھی اپنے شوقِ جلوہ کا سفر وہیں سے شروع کریں۔ جس زمین کو سب سے پہلے قدمین شریفین چومنے اور شرف النساگی کی پیشانی نے رَبُّ العِزّت کی بارگاہ میں سجود کرنے کا شرف بخشا۔

——— مدینہ منورہ کا عزبی جنوب باغات میں گھرا ہوا مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے تین میل دور آباد ی قباء۔

اسم بامسمّٰی عالیہ!

یہیں بنی عمرو بن عوف کے معزز خاندان کا چشم وچراغ، کلثوم بن الهدم رضی اللہ تعالیٰ عنہ، کا گھر دارالهجرت کا استقبالیہ مقام بنا جس کے حصے میں سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی میزبانی آئی۔ جس کی زمین کے ایک چوکور حصے کو تا قیامت عزّت و تکریم نصیب ہوئی جس کے تقدس کے تحفظ کی خاطر خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مبارک ہاتھوں سے اس کی بنیادوں کے پتھر رکھے۔ صحابہ کبارؓ اور انصار نے جس

کو تعمیر کے ہر پتھر پر اپنے ایمان اور تقوے کے لافانی نقوش چھوڑے جس کی عظمت کی سند رب ذوالاکرام نے خود اپنے کلام معجز بیان میں ثبت فرمائی :

لمسجد اسس علی التقوی من اول یوم احق ان تقوم فیہ "

جہاں کے رہنے والوں کے لیے نبیٔ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کے بادل برسے جن کی پاکیزہ مزاجی کی مدح سرائی ہوئی۔

فیہ رجال یحبون ان یتطھروا۔

یہ سب کچھ — اس وفا کا صلہ جو مہاجرین نے اللہ کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم سے روا رکھی اور اس مقام کا نام مسجد قبا — قرار پایا۔

یہ وہ مسجد ہے جس کے بارے میں ابن عمر فرماتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر ہفتہ کبھی اونٹنی پر سوار اور کبھی پیدل۔ تشریف لے جاتے اور وہاں دو رکعت نماز پڑھتے۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :۔ جو شخص اس مسجد میں دو رکعت نماز ادا کرے گا اُسے ایک "عمرہ" کا ثواب ملے گا۔

یہ تمام برکتیں اور عظمتیں زمین کے اس حصّے کو صرف اس لیے نصیب ہوئیں کہ یہاں سرور انبیاءؐ نے — آرام فرمایا۔ نمازیں پڑھیں، رکوع و سجود کیے۔

مسجد قبا کے باب اول کے سامنے قریب ہی ایک اور یادگار "بئر اریس" بھی ہے۔

گو آج وہ حصہ مٹی سے پاٹ دیا گیا ہے۔ لیکن نگاہِ محبّت آج بھی وقت کے اندھیروں کو چیرتی، مٹّی کے سینے کو پھاڑتی ہوئی چشمۂ ازرق سے جاری ہونے والے ۱۲ میٹر گہرے کنوئیں کے پانی کو اپنی مشتاق جلوہ بے چینی سے سامانِ تسکین دیتی ہے۔

ع دیکھ لیتے ہیں تجھے دیکھنے والے یوں بھی — ذوقِ جلوہ کہیں پابند نظر ہوتا ہے۔

اس سے آپؐ نے غسل فرمایا، وضو کیا، اور مسجد قبا کی تعمیر میں استعمال ہونے والی مٹی کا خمیر گوندھا۔ عظیم سے عظیم تر نسبت اور عظیم یادگار "بئر اریس"

۲۔ خیمہ گاہ عوالی گاؤں کے مشرقی محلہ میں واقع اس جگہ بنی نضیر کے سات رات محاصرہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے رکوع و سجود فرمائے۔ اس جگہ کو بھی تاریخی عظمت نصیب ہوئی اور آج یہ جگہ مسجد الفضیخ یا مسجد شمس کے نام سے پکاری جاتی ہے۔ روایات کے مطابق حرمت شراب کا حکم اس مسجد یا اسی جگہ کے قیام کے وقت نازل ہوا۔

۳۔ بڑھیا کا گھر قریب ہی کے محلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بنی نضیر کی ایک بڑھیا نے اپنے گھر (جو خضری تبدیل ہو سے تھی) نماز ادا کرنے کی درخواست کی — آپؐ نے وہاں بھی نماز پڑھی۔ بعد میں یہی گھر مسجد میں تبدیل ہوا، اور آج وہ مسجد بنی قریظہ کے نام سے مرجع زائرین ہے۔

۴۔ طویل سجدہ، اس وقت کے مشہور باغ "البحیری" میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک طویل سجدہ فرمایا،

اس جگہ بھی مسجد تعمیر ہوئی۔ اور اسی سجدہ کی نسبت سے اس کا نام مسجد سجدہ رکھا گیا۔

۵۔ بطن الوادی یا وادی ذی صُلب یہ وہ جگہ ہے جہاں بنی سالم کے قبیلہ کا قیام تھا۔ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قباء سے مدینہ منورہ میں داخل ہونے کے لیے تشریف لا رہے تھے، تو جمعہ کی نماز کا وقت ہو گیا۔ مہاجرین اور انصار کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز جمعہ ادا فرمائی اور خطبہ دیا۔ اس جگہ کو اس نسبت سے محصور کر کے مسجد تعمیر کی گئی اور اس کا نام ہے "مسجد جمعہ"۔

۶۔ عتبان بن مالک کا ویران قلعہ مسجد جمعہ کے قریب انصاری عتبان بن مالک نے اپنے ویرانے کو قدوم میمنت لزوم سے مشرف فرما کر دو رکعت نماز کی درخواست کی۔ آپ نے شرف قبولیت بخشا۔

۷۔ مشربۂ اُمّ ابراھیمؑ موضع عوالی میں واقع باغات اور درختوں میں گھرا ہوا مشربہ (پانی پینے کا مقام) جہاں سے اُمّ ابراہیم علیہ السلام نے پانی پیا۔

بعض روایات میں آیا ہے ام ابراہیم علیہ السلام ماریہ قبطیہ نے چند دن یہاں قیام فرمایا اور یہیں ابن رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت ہوئی۔

"عن یحییٰ بن ثابت ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم" صلی فی مشربہ اُمّ ابراھیم"۔

ترجمہ: حضرت یحییٰ بن ثابت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے مشربہ ام ابراہیم پر نماز ادا فرمائی۔ یحییٰ بن ثابت کے حوالہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشربہ اُمّ ابراہیمؑ میں نماز ادا کی۔

۸۔ مسجد بنی ظفر باب بقیع سے پندرہ سکینڈ کے راستہ پر مغرب کی طرف محلۂ دائم میں یہ سجدہ گاہ رسالت مآب ۳ میٹر، سیٹی میٹر لمبی اور اتنی ہی چوڑی ہے۔ جہاں ایک پتھر پہ آپ تشریف فرما ہوئے۔ آپ کے ساتھ چند صحابہ کرام بھی تھے۔ آپ نے ان میں سے کسی ایک کو قرآن پاک کی تلاوت کے لیے فرمایا۔ آپ سنتے رہے۔ اور جب اس آیت کو سماعت فرمایا:

"فکیف اذا جئنا من کل امۃ بشھید وجئنا بک علیٰ ھٰؤلاء شھیدا"۔

تو آپ اشتار وئے کہ ریش مبارک تر ہو گئی۔ اس وقت جو صحابہ کرامؓ تھے، اُن کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔

عبداللہ بن مسعودؓ، معاذ بن جبلؓ، حضرت انسؓ"

۹۔ مسجد الاجابہ بقیع کے شمال کی طرف شاہراہ کے بائیں جانب بنی معاویہ کے ٹوٹے پھوٹے آثارات میں تقریباً ۲۵ گز فاصلہ طے کرنے کے بعد اُس مسجد کے آثار ملتے ہیں۔ عامر بن سعد کے والد حضور اکرم صلی اللہ

علیہ وسلم نے ایک دن محلہ عالیہ سے واپسی میں یہاں نماز پڑھی اور نماز کے بعد بہت ہی طویل دعا فرمائی، ابی عنسان، محمد بن طلحہ رح وسعد بن ابی وقاص آپ کے ساتھ تھے۔ یہ طویل دعا تین حاجتوں پر مشتمل تھی۔

۱۔ اے اللہ میری اُمت کو غرقابی کی موت سے بچانا!

دعا قبول ہوئی!

۲۔ اے اللہ میری اُمت کو قحط اور باد صرصر کی ہلاکت سے محفوظ رکھنا۔!

دعا قبول ہوئی!

۳۔ اے اللہ میری اُمت کو باہمی خوف سے بچانا۔

اسی نسبت سے اس مسجد کا نام مسجد اجابہ ہے۔

۱۰۔ مسجد احزاب، مسجد اعلیٰ اور مسجد فتح وادی بطحان میں واقع یہ مسجد ان تینوں ناموں سے پکاری جاتی ہے۔ جبل سلع مدینہ منورہ کے نواحی علاقہ وادی مذکور میں بہت دور تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کی چوٹی پر یہ مسجد ۸ میٹر لمبی اور ۳ میٹر چوڑی پتھروں سے تعمیر شدہ، اپنے دامن میں ان اہم لمحات کو لیے ہوئے ہے جن میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعائیں۔ اضطراب اور سکون کی مقدس آوازیں شامل رہی ہیں۔

جنگِ احزاب زوروں پر تھی۔ چراغ مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کو بجھانے کے لیے تمام الوہی قوتوں نے ہلّہ بول دیا تھا۔ بھوکے پیاسے خندق کھودنے کے بعد مہینوں سے مجاہدینِ اسلام کا محاصرہ جاری تھا، ــــ حلقہ بگوشانِ اسلام کے صبر و استقلال اور جرأتِ ایمان پر شبہ تو نہ تھا، اور اس رات رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم مسجد سلع میں تشریف لائے اور صلواۃ خوف کے بعد یہ دعا مانگی۔

اللّٰھم لک الحمد ھدیتنی من الضلالۃ۔ اے اللہ! تمام تعریفوں کا صرف تُو مستحق ہے۔ تُو نے مجھے زندگی کے تمام اندھیروں میں روشنی بخشی۔ :

فلا مکرم لمن اھنت	:	جسے تو ذلیل کر دے اُسے کوئی عزت و تکریم نہیں دے سکتا۔
ولا مھین لمن اکرمت	:	اسے کوئی ذلیل نہیں کر سکتا جسے تو عزت و تکریم سے نواز دے۔
ولا مذل لمن اعززت	:	اور جسے تو غالب فرما دے اُسے کوئی ذلیل نہیں کر سکتا۔!
ولا ناصر لمن خذلت	:	اس کا کوئی مددگار نہیں ہو سکتا جسے تو رسوا کر دے۔
ولا خاذل لمن نصرت	:	اور تیری نصرت سے جو بھی نوازا گیا۔ اُسے کوئی رسوا نہیں کر سکتا۔
ولا معطی لما منعت	:	جسے تو نادار کر دے اُسے کوئی کچھ دے نہیں سکتا۔
ولا مانع لما اعطیت	:	اور جسے تو ہمہ دار بنا دے اُسے کوئی نادار بنا نہیں سکتا۔
ولا رازق لمن حرمت	:	اُسے کوئی آب و دانہ نہیں دے سکتا جسے تو محروم قرار دے۔
ولا حارم لمن رزقت	:	اُسے کوئی محروم نہیں کر سکتا جسے تو اپنی عطا سے نواز دے۔

ولا رافع لمن خفضت :	اُسے کوئی اٹھا نہیں سکتا جسے تو گرا دے۔
ولا خافض لمن رفعت :	اور اسے کوئی گرا نہیں سکتا جسے تو سربلند فرما دے۔
ولا خارق لمن سترت :	اس کا بھرم کوئی توڑ نہیں سکتا، جس کا بھرم تو رکھ لے۔
ولا ساتر لمن خرقت :	جس کا بھرم تو توڑ دے اُسے کوئی سنبھالا نہیں دے سکتا۔
ولا مقرب لما باعدت :	جسے تو دور کر دے اُسے کوئی قریب پھٹکنے نہیں دے سکتا۔
ولا مباعد لما قربت :	اور جسے تو اپنی قربت سے نواز دے اُسے کوئی دُور نہیں کر سکتا۔!

یہ دُعا اتنی بار آنحضرت ؐ نے دُہرائی کہ صحابہؓ کبار آپ ؐ کے انتظار میں پریشان ہو گئے اور حذیفہ رضؓ تلاش میں تشریف لائے تو دیکھا، دینِ قیم کے قائد خلافتِ الٰہیہ کے مبلغ و مؤسس محمد صلی اللہ علیہ وسلم دونوں ہاتھ اُٹھائے بھرائی ہوئی آواز میں بارگاہِ الٰہی میں دُعا فرما رہے ہیں۔

یاصریخ المکروبین ویا مجیب المضطرین ویا کاشف همی غمی وکربی تدنو حالی و حال اصحابی۔

اے بے قراروں کی فریاد سننے والے، اے تڑپتے دلوں کی فریاد قبول کرنے والے، اے میرے دُکھ، میرے غم اور میرے درد و کرب کو دُور فرمانے والے تو میری حالت، میرے صحابیوں کا حال دیکھ رہا ہے۔

اپنے محبوب کی زبان سے یہ فریاد سنتے ہی ربّ ذوالرحمة کی رحمت جوش میں آئی اور فوراً جبرئیل امین کو بھیجا ——— جبرئیل امین نے کہا:

ان اللہ سمع دعوتک وکفاک هول عدوک۔

اللہ نے آپ ؐ کی دُعا سنی اور قبول فرمالی۔ اور آپ ؐ کے دشمنوں سے خود نپٹنے کا فیصلہ صادر فرما دیا۔

یہ خوشخبری سنتے ہی آپ ؐ نے چشم مبارک سے آنسو پونچھے ——— چہرۂ مبارک پہ مسکراہٹ نمودار ہوئی، سجدہ شکر ادا فرمایا۔ اور صحابہ کرام کو مژدہ فتح سنایا۔

اور پھر دوسرے ہی لمحے ایک قیامت خیز آندھی نے دشمنانِ دینِ قیم کے خیمے اکھاڑ کر پھینکنے شروع کر دیئے۔ سب پر بدحواسی چھا گئی، قہرِ الٰہی نے ان کی ہمتوں کو اپنے جلال سے روند ڈالا ——— اور سرورِ دوعالم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو فتح و کامرانی نصیب ہوئی۔

چنانچہ مسجد فتح میں آج بھی جو شخص اپنی پریشانیوں اور درد و کرب کو دُور کرنے کے لئے دُعا مانگتا ہے وہ قبول ہوتی ہے۔

صحابہ کرام ایسے مواقع پر مندرجہ ذیل دُعا پڑھا کرتے۔

اللّٰهم یاصریخ المستصرخین والمکروبین	اے اللہ، بے چین دُکھیوں کی فریاد سننے والے مدد کو
ویا غیاث المستغیثین، ویا مفرج کرب	پکارنے والوں کی مدد فرمانے والے، درد و کرب سے نجات
المکروبین ویا مجیب دعوة المضطرین	دینے والے بے قراروں کی دُعا قبول فرمانے والے درود و سلام
صل علی سیدنا محمّد وآله واصحابه وسلّم	ہو محمد ؐ پر ان کی اولاد اور صحابہ کرام پر، میرا غم دُور فرما،

وَ اکشف عنی کربی، وغمی، وھمی وحزنی کما کشفت عن حبیبک ورسولک صلی اللہ علیہ وسلم کربہ وحزنہ وغمہ وھمہ فی ھذا المقام وانا اتشفع الیک بہ صلی اللہ علیہ وسلم فی ذالک یا حنان یا منان یا ذالجود والاحسان۔

میرا درد و کرب، میری ذہنی اذیت، میرے جسمانی دُکھ، میرے فکری درد کو دُور فرما۔ ! جس طرح تُو نے اپنے حبیب اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے درد و کرب، ذہنی کوفت، دل کے غم اور جسمانی اذیت کو اسی مقام پر دور فرمایا۔ میں اُنہی کی شفاعت کے حوالے سے اپنے غم اور دُکھ کی فریاد کرتا ہوں۔ بےحد احسان کرنے والے اے بےحد مہربانیاں فرمانے والے، اے بے حد احسانات اور سخاوت سے نوازنے والے۔

اس مسجد فتح کے دامن میں اور بھی مسجدیں ہیں۔ مسجد سلمان فارسی، مسجد امیر المومنین علی ابن ابی طالب ! ایک اور مسجد بھی تھی، لیکن اب اس کے آثار باقی نہیں رہے۔

ان مساجد کا درمیانی فاصلہ ستّرہ ہاتھ کے قریب ہے۔

۱۱۔ بنی حرام الکبیر: اسی جبل سلع کے دامن میں ایک چھوٹی سی مسجد واقع ہے جو بنی حرام الکبیر انصار کے ایک قبیلہ کے نام سے منسوب ہے۔ مدینہ منوّرہ سے جاتے ہوئے دائیں جانب اور جبل سلع کی طرف آتے ہوئے بائیں جانب یہ مسجد واقع ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب بھی قبیلہ مذکورسے ملنے تشریف لاتے، تو اسی مسجد میں نماز پڑھتے۔

۱۲۔ کھف بنی حرام مسجد بنی حرام الکبیر کی طرف جاتے ہوئے سامنے میں ایک غار پڑتا ہے۔ اس غار کا نام "کہف بنی حرام" ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کے ساتھ قریب سے بہتے ہوئے چشمہ میں وضو فرمایا۔ اور تمام صحابہ کرام کے ساتھ اس غار میں داخل ہوئے۔ تمام رات یہاں عبادت میں گذاری اور صبح کے اُجالے میں باہر تشریف لائے۔

۱۳۔ مسجد قبلتین جبل سلع کے سامنے ایک وسیع میدان سے گزر کر قبیلہ بنی حرام کا ایک گاؤں ہے جہاں حضور اکرم کی ایک خوش نصیب عورت (ام بشر من بنی سلمہ)

بنی سلمہ کے قبیلہ میں سے اُم بشر نے دوپہر کے کھانے کی دعوت کی۔ ظہر کا وقت ہوا تو آپ نے مسجد میں ظہر کی نماز پڑھی۔ اس کی پہلی دو رکعات بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے پڑھی ہی تھیں کہ تبدیلیٔ قبلہ کا حکم "فلنولینک قبلۃ ترضاھا" نازل ہوا۔ تو آپ نے باقی دو رکعات کعبہ کی طرف منہ کر کے ادا فرمائیں۔ اسی لئے اس مسجد کا نام مسجد قبلتین ہے۔

۱۴۔ مسجد سقیا مدینہ منورہ کے مغربی نواح میں واقع ایک کنواں ہے، جو "بئر سقیا" کے نام سے مشہور ہے۔ باب عنبریہ کے قریب آج کل وہاں قبۃ الرؤس کے نام سے مشہور منزل ہے۔

امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں۔

ہم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چل رہے تھے۔ جب ہم اس کنوئیں (سقیا) کے قریب پہنچے تو آپ کے ساتھ ہم نے بھی

اس کنوئیں کے پانی سے وضو کیا اور نماز ادا کی۔ نماز کے بعد آپؐ نے دعا فرمائی۔

اللّٰھم ان ابراھیم کان عبدک خلیلک ودعاک لاھل مکۃ بالبرکۃ۔

اے اللہ ابراہیم علیہ السلام تیرا بندہ تھا، تیرا مخلص بندہ تھا۔ اس نے تیری بارگاہ میں اہلِ مکہ (مکرمہ) کے لیے خیر و برکت کی دُعا کی۔

وانا عبدک ورسولک ادعوک لاھل مدینۃ ان تبارک لھم فی مدھم وصاعھم۔

اور میں تیرا بندہ ہوں، تیرا رسولؐ ہوں۔ تجھ سے اہلِ مدینہ کے لیے دُعا کرتا ہوں۔" اے اللہ اہلِ مدینہ" کے صاع میں اور مد میں اسی طرح برکت عطا فرما۔

مثل ما بارکت لاھل مکۃ مع البرکۃ برکتین۔

جس طرح آپؐ نے اہلِ مکہ کو دوہری برکتوں سے نوازا۔ آمین!

۱۵۔ ثنیۃ الوداع کے قریب وداعی گھاٹیوں میں سے ایک کی چوٹی پر ایک چھوٹی سی ایک مسجد ہے۔ اس کا نام ہے، "مسجد ذباب" اس چھوٹے سے پہاڑ کا نام بھی "ذباب" ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقامات سجود میں سے ایک مقام یہ بھی ہے۔

۱۶۔ مسجد البقیع جبل احد میں دائیں طرف گھاٹی کی جانب جائیں تو وہاں ایک گول سا گڑھا ہے۔ وہاں یہ چھوٹی سی مسجد تھی۔ اب اس کی دیواریں گر چکی ہیں لیکن مقام و مرتبہ کی عظمت میں کوئی فرق نہیں آیا۔

یاایھا الذین اٰمنوا اذا قیل لکم تفسحوا فی المجالس۔

اس آیہ کریمہ کا نزول اسی مسجد میں ہوا تھا۔

۱۷۔ رکن جبل العینین غزوۂ اُحد میں جس پہاڑی پہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چند تیر اندازوں کو تاحکم ثانی کھڑا رہنے کا حکم دیا تھا، اسی پہاڑی پر یہ مسجد تھی۔ یہ پہاڑی جبل عینین الشرقی شعب الحرا، کا ایک حصہ ہے۔ موضع قنطرۃ کے آخری سرے پہ یہ مقام ہے جہاں غزوۂ احد میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کے ساتھ نماز ظہر ادا فرمائی۔

۱۸۔ مصرع حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ یا مسجد العسکر! جبلِ احد کا یہ حصہ اُس المیہ کی یادگار ہے جہاں سیّد الشہداء حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے جسم اطہر کے ساتھ وحشیانہ سلوک کو دیکھ کر چشم رسولِ اکرمؐ نمناک ہوئی اور آپؐ نے وہاں نماز ادا فرمائی۔ اس مقام کا نام مسجد عسکر کے نام سے موسوم ہوا۔ اس کے آثار بھی آج کل مفقود ہیں۔

۱۹ مسجد ابی ذر غفاری رض: اگر آپ بقیع کے بازار سے جبل احد کی طرف چلیں تو چند قدموں کے فاصلہ پر بحیرہ کے نام سے مشہور مقام آئے گا۔ یہیں ایک چھوٹی سی مسجد ملے گی، جو ابی ذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نام سے مشہور ہے۔

اس مسجد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا طویل سجدہ فرمایا کہ صحابہ کرام کو ——— ان پر بے جان ہونے کا گمان ہوا۔

دریافت کرنے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

میرا یہ طویل سجدہ "سجدۂ شکر" تھا۔ میرے اللہ نے مجھ پر مہربان فرماتے ہوئے مجھے خوشخبری دی۔

"من صلی علیک منهم صلاة كتب له عشر حسنات"

(اے ہمارے محبوب) جو بھی تمہاری اُمت میں سے ایک بار تم پر درود پڑھے گا، ہم اسے (۱۰) دس نیکیوں کا ثواب انعام میں دیں گے۔

۲۰۔ مسجد ابی بن کعب، بنی جدیلہ البقیع: جنت البقیع میں مدفن عقیل رض اور امہات المومنین کے مغرب کی طرف ایک چھوٹی سی مسجد ——— جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز ادا فرمائی۔

۲۱۔ مسجد مصلی یا مسجد غمامہ: عید الفطر اور عید الاضحیٰ کی نمازیں اسی مسجد میں پڑھی جاتی رہیں۔ یہ کھلی جگہ تھی جہاں بعد میں مسجد تعمیر ہوئی۔

۲۲ مسجد ابی بن کعب: بنی جدیلہ کے بئر شامی کے قریب جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازیں پڑھیں لیکن آج اس کے آثار نہیں ہیں۔

اسی طرح ——— مسجد الخربیہ (۲۳)، مسجد جہینہ (۲۴)، مسجد بنی غفار (۲۵)، مسجد بنی ذریق (۲۶)۔

حُدُودِ مَدِینَہ مَنَوَّرَہ

مسجد ابی بن کعب: اس محلِ وقوع کا جغرافیائی نقشہ تو نہیں ملتا ہے۔ لیکن شامی سمت مدینہ منورہ کے باہر ہی بئر حا کے قریب بنی نجار کے بنی جدیلہ قبیلہ کے حوالے سے یہ مقام "مسجد ابی بن کعب بنی جدیلہ" کے نام سے مشہور ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں نماز پڑھی۔

مسجد بنی حرام: جبل بنی عبید (جس سے چشمہ کا اجراء حضرت معاویہ رض کا مرہون منت ہے) کے قریب وادی بطحان

ہیں مساجد الفتح کی غربی سمت عرجون ابن طالب سے ملی ہوئی مسجد بنی حرام ہے۔ ابن زبالہ جابر بن عبداللہ رضؓ کے حوالے سے کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مسجد میں نماز ادا فرمائی۔

مسجد الخربہ: ابن جابر بن عبداللہ بن ابی قتادہ نے اپنے بزرگوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ شافع محشر صلی اللہ علیہ وسلم سلافہ ام البراء بن معرور کے ساتھ اس مسجد میں اکثر نماز ادا فرماتے تھے۔ جس کا نام ہے۔ مسجد الخربہ وبر القرصہ "

مسجد جہینیہ: جبل سلع کے درمیان موجودہ مقام عزبی حسن صاحب مدینہ جہینیہ کی شاہراہ پر رونق کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مبارک ہاتھوں سے یہاں کے لوگوں کے لیے مسجد کی چار دیواری اور محراب کی نشان دہی فرمائی۔

مسجد بنی غفار: یہ مسجد بنی غفار کے خیموں کے قریب جہاں آل ابی رُہم کلثوم بن الحصین کے لوگوں کا ٹھکانا تھا واقع ہے اور یہاں بھی آپؐ نے نماز ادا فرمائی ہے۔

مسجد بنی زریق: ثنیۃ الوداع سے تقریباً ایک میل دور یہ مسجد واقع ہے جہاں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو فرمایا، لیکن اس میں نماز کی ادائیگی کے بارے میں تصدیق نہیں ہوئی۔

مسجد بنی ساعدہ: مدینہ منورہ کے مشرقی بازار بئر بضاعہ کے پاس سہل بن سعد کا گھر تھا۔ ایک بار وہ بیمار ہوئے تو عیادت کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کے ساتھ تشریف لے گئے۔ آپؐ نے سہل رضؓ سے پانی مانگا، انھوں نے پیش کیا۔ یوم ثقیفہ کے دن اصحابؓ یہیں جمع ہوتے تھے۔ اس مسجد میں آپؐ نے نماز پڑھی۔

مسجد بنی خدارہ: شام کی طرف سے آتے ہوئے ثنیۃ الوداع سوق مدینہ کے آخری سرے پہ واقع بنی خدارہ کی بستی میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز ادا فرمائی۔

مسجد بنی راتج: بنی عبدالاشہل کی بستی کے مشرق کی طرف بئر ابی الہیثم بن التیہان کے احاطہ میں سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ وضو کیا۔ بلال رضی اللہ عنہ نے اذان دی اور نماز ادا کی گئی۔

مسجد واقم: محلہ واقم بنی ظفر کے مکانات سے پہلے بنی عبدالاشہل کے مکانات کی حدود میں جمعہ کی نماز صحابہ کرام کے ساتھ ادا فرمائی۔

مسجد القرصہ: یحییٰ بن قتادہ اپنے اسلاف کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب بنی انصار کے محلوں کی گشت فرماتے ہوئے یہاں تشریف لاتے تو بئر علی رضؓ کے قریب اسی مسجد میں نماز ادا فرماتے تھے۔

مسجد حارثہ: بنی حارثہ کی بستی میں واقع اسی مسجد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز ادا فرمائی اور شہید خیبر

عبداللہ بن سہل کے بھائی عبدالرحمٰن بن سہیل کے حق میں دُعا فرمائی ۔

مسجد شیخین یا مسجد البدائع: وادی قناۃ کی طرف جاتے ہوئے مقام شیخین کے قریب واقع اس مسجد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ احد میں شامل ہونے سے پہلے جمعۃ المبارک کی نماز ادا فرمائی۔ پھر عصر، عشاء اور صبح کی نماز کے بعد چاشت کی نماز ادا فرمائی۔ اس کے بعد احد کی طرف روانہ ہوئے۔ شیخین مدینہ منورہ اور جبل احد کے درمیان ایک گاؤں کا نام ہے ۔

مسجد بنی دینار: وادی بطحان کے مغربی کنارے "مغسلہ" کے نام سے موسوم موضع جہاں کسی زمانہ میں کھجوروں کے گھنے باغ ہوتے تھے ۔ وہاں زیادہ تر لوگ غسل کیا کرتے تھے ۔ آج وہاں ایک پتھر پہ یہ عبارت کندہ ہے۔ مسجد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس پتھر کے آس پاس ہی مسجد کے آثار بھی موجود ہیں ۔

مسجد بنی عدی اور مسجد دار النابغہ: ابن جوزی بتصدیق لکھتے ہیں کہ یہ وہ مقام ہے جہاں مدفن جناب "عبداللہ بن عبدالمطلب" والد گرامی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے ۔ جہاں دو مسجدیں ہیں۔ ایک مسجد بنی عدی ۔ جو بنی عدی کے مکانات میں اور مسجد نابغہ ـــــ موجود ہے ۔ ابن شیبہ یحیٰی بن عمارۃ المازنی سے راوی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد بنی عدی میں غسل فرمایا اور مسجد نابغہ میں نماز ادا فرمائی ۔

مسجد بنی مازن: ابن زبالہ یعقوب بن محمد کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد بنی مازن میں النجار کی مسجد کے خطوط کی نشاندہی اپنے ہاتھوں سے فرمائی اور ابراہیم ابن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضعہ (دودھ پلانے والی) اُمّ بردہؓ کے گھر نماز ادا فرمائی ۔

مسجد بنی عمرو: مسجد بنی عمرو بن مبذول بن مالک بن النجار بقیع زبیر کے پاس یہ مسجد مذکورہ خاندان کی نسبت سے مشہور ہوئی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں نماز ادا فرمائی ۔

مسجد بقیع الزبیر: بقیع زبیر کے پاس اس مسجد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عیدالاضحیٰ کی نماز ادا فرمائی، جو بنی زریق سے مشرق کی طرف واقع ہے ۔

مسجد صدقہ الزبیر: مشربہ "اُمّ ابراہیم علیہ السلام" سے مغرب کی طرف واقعہ حاقر اور اعوان کے قریب "زبریۃ" کے نام سے مشہور مقام وہ ہے جو بنو محرم کی زمینوں سے ملحق ہے ۔ اس کے ایک حصّہ کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ کر دیا تو زبیر بن العوام نے بھی آپ کی اتباع کی۔

زبیر بن العوام سے ایک عرب بنی اُمیّہ بن زید زمین کے ایک حصّہ پر اپنی ملکیت کا دعویٰ رکھتا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وہیں فیصلہ فرمایا۔ اسی جگہ پر یہ مسجد موجود ہے ۔

مسجد بنی خذرہ: ابن زبالہ ہشام بن عروہ کی روایت کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت الحیہ کے سامنے مسجد بنی خذرہ میں نماز ادا فرمائی ۔

اس گھر کو "بیت الحیہ" یعنی اژدہے کا گھر اس لیے کہتے ہیں کہ صحیح مسلم میں روایت ہے کہ ایک دن ابی سائب ابی سعید الخدری رضی کے گھر میں داخل ہوئے تو وہ نماز پڑھ رہے تھے میں انتظار میں خاموش بیٹھا تھا کہ اچانک مجھے مکان کے ایک کونہ سے کسی چیز کے رینگنے کی آواز آئی میں نے ادھر دیکھا تو وہ ایک بہت بڑا اژدہا تھا۔ میں نے اُسے مارنا چاہا مگر ابی سعید الخدری رضی نے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا میں خاموش بیٹھا رہا۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد اُنھوں نے کہا، اس کمرہ میں جن رہتا ہے جو دین کی تعلیم حاصل کرتا ہے۔ یہ وہی تھا۔ تب سے یہ گھر "بیت الحیۃ" یعنی "اژدہے کا گھر" سے موسوم ہو گیا۔

مسجد بنی حارث و مسجد السنح: ہشام بن عروہ فرماتے ہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جشم، زید بن حارث بن خزرج اور حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زوجہ بنت خارجہ کی بستیوں میں نماز ادا فرمائی۔ جو وادی بطحان کے مشرق میں تھیں۔ مسجد بنی حارث کے قریب ہی مسجد سُنح بھی موجود ہے۔

مسجد بنی الحبلی: قبا اور بنی حارث کے محلہ کے درمیان یہ مسجد واقع ہے جس میں ہشام بن عروہ کے حوالے سے ادائے صلوٰۃ کا تذکرہ موجود ہے۔

مسجد بنی بیاضہ: یہ مسجد کھنڈروں کے درمیان واقع ہے۔ عبدالرحمٰن بن کعب رضی بن مالک فرماتے ہیں۔ "ہمارا ایک وفد تبلیغ کے سلسلہ میں نکلا تو یہاں سے اذان کی آواز سنائی دی۔ ربیعہ بن عثمان رض فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں نماز پڑھی۔ معلوم ہوا یہ قبیلہ بیاضہ کا گاؤں ہے۔

مسجد بنی خطمہ: مسلم بن عبید اللہ خطمی فرماتے ہیں کہ عقبہ کے ایک شہید کی قبر بر ابن معرور کی قبر کے قریب ایک بڑھیا کے گھر کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ادائے صلوٰۃ کا شرف بخشا۔ اس کے بعد یہاں مسجد تعمیر ہوئی۔

عبداللہ بن حارث رض فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بئر الخطمہ سے وضو فرمایا اور خوش نصیب بڑھیا کے گھر کو ابدی عزت بخشی۔

مسجد بنی اُمیہ الدوسی: سعید بن عمران فرماتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے موضع کبا، نہیک بن ابی نہیک کے علاقہ کے قریب بنی اُمیہ کی بستی میں نماز ادا فرمائی۔ یہ مسجد شمس سے مشرق کی طرف واقع ہے۔

مسجد بنی واقف: عوالی کے قریب کے گاؤں میں اوس قبیلہ کے تین حضرات میں سے ایک ہلال بن اُمیہ واقفی کی توبہ اللہ تعالیٰ نے قبول فرمانے کی بشارت دی تھی جو غزوہ تبوک میں تساہل کی بناء پر شریک نہیں ہوئے تھے۔ مسجد فضیخ کے قریب ایک بار گذرتے ہوئے سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز ادا فرمائی۔

مسجد بنی انیف: وادی قبا کے گردونواح میں ہی بئر غذق کے قریب صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے ساتھ آپ نے نماز ادا فرمائی۔

مسجد دار سعد ابن خیثمہ: مسجد قبا کی تعمیر سے پہلے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں استراحت فرمائی اور پھر نمازیں ادا فرمائیں۔ کلثوم بن الہدم رضی اللہ تعالیٰ عنہ' کا گھر اسی کے قریب ہی ہے۔ یہ گھر سعد بن خیثمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ' کا گھر تھا۔ جہاں مہاجرین کی مقتدر و مکرم ہستیاں ہجرت کے بعد قیام پذیر ہوئیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ، زوجہ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ' امہات المومنین حضرت سودہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور عائشہ الصدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے علاوہ ان کی والدہ ام رمان رضؓ، ہمشیرہ اسمائؓ، مہاجرین میں سے سب سے پہلا ——— عبداللہ بن زبیرؓ تھے۔

مسجد النور: ابونعیم انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ' کے حوالے سے روایت کرتے ہیں کہ ایک رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ' اور حضرت ابی بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اتنی دیر تک باہمی گفتگو کرتے رہے کہ رات کا تیسرا پہر گذر گیا۔ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ گہری اندھیری رات میں چلے کہ اچانک حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عصائے مبارک سے شعاعیں پھوٹیں جن کے اُجالے میں ہم لوگ محلہ نور تک پہنچے اور وہاں جس جگہ نماز پڑھی گئی وہ مسجد نور کے نام سے مشہور ہوئی۔

مسجد عتبان بن مالک: وادی عدوۃ کے مشرق میں ایک قلعہ کا کھنڈر ہے جہاں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز ادا فرمائی۔

مسجد منارتین: وادی زبیقتین سے وادی عقیق کی طرف جاتے ہوئے بائیں طرف جبل احمر آتا ہے۔ اس کی چوٹی پر واقع یہ مسجد جس کے آثار آج بھی موجود ہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں بھی نماز پڑھی۔

مسجد فیفاء الخبار: یہ ایک موضع ہے جو پتھریلی زمین پر واقع ہے لیکن اس کے ارد گرد صدقہ کے اُونٹ چرایا کرتے تھے، واقعہ عرنین میں پیش آیا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں نماز ادا فرمائی۔

مسجد بین الجتیائہ و بئر شدّاد: حلیفہ اور رشر بد پہاڑوں کے درمیان عباد بن حمزہ بن عبداللہ بن زبیرؓ کی وقف کردہ زمین پر یہ مسجد واقع ہے جس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز ادا فرمائی۔

مسجد التوبہ: یہ مسجد جحجبا بنو عمرو بن عوف عوسی کی منازل بیر ہجیم کے کنارے قبا کے مغربی نواح کے کھیتوں میں ہے۔ افلح بن سعد فرماتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اصحابہ کرام کے ساتھ یہاں نماز ادا کی۔

انبیاء کرام اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی اختیار کردہ راہیں اور قرب و جوار کی مساجد!

مَدِینَہ مُنَوَّرَہ ——— تا مَکَّہ مُعَظَّمَہ

سابقہ انبیاء علیہم السلام بھی انہی راہوں سے گزرے تھے: دورِ حاضر میں مسجد غزالہ سے مقام خیف اور صفراء کی طرف مڑنے کے بجائے لمبی اور پرمشقت گھاٹیوں سے گزر کر جحفہ سے جا ملتے ہیں مگر قدیم راہ مسجد غزالہ کے دائیں جانب سے جحفہ کے نچلے حصہ کو طے کرتے ہوئے مقام قدید پر پھر جحفہ کے بالائی حصہ سے جا ملتی تھی اور یہی وہ تاریخی

راہ ہے جس کے سینے پہ مختلف فاصلوں پہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی یادوں کے مینار نظر آج بھی آپ کے دل کی آنکھوں کو ضیا بار نظر آئیں گے۔

ان راہوں کی نشاندہی کتب احادیث، بخاری، مسلم اور دوسری کتب میں مندرج صحابہ کبارؓ، ابوہریرہؓ، انس بن مالکؓ، ابن عمرؓ کے حوالے سے مستند ہے۔

مسجد شجرہ ذی الحلیفہ: یہ مسجد ذی الحلیفہ، ذوالحلیفہ، المیقات المدنی اور بئر علیؓ کے ناموں سے معروف ہے۔ یہاں ایک ببول کا درخت اب بھی موجود ہے۔ ذی الحلیفۃ کے اسی مقام پر خاتم الانبیاءؐ نے نزول فرمایا۔ اس درخت کی مناسبت سے مسجد شجرہ اور مقام کی مناسبت سے ذی الحلیفہ کہاجاتا ہے یہی مقام مدینہ منورہ سے عمرہ یا حج کی نیت سے آنے والوں کے لیے وہ حد ہے۔ جہاں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے احرام باندھا۔ دو رکعت نماز کے بعد لبیک اللّٰھم لبیک (حاضر ہوں میرے اللہ میں حاضر ہوں) کی صدا بلند فرمائی۔ ابوہریرہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ فرماتے ہیں۔ سید انس رجان صلی اللہ علیہ وسلم نے درمیانی ستون کو سامنے رکھتے ہوئے نماز ادا فرمائی۔ انس بن مالک فرماتے ہیں کہ ہم نے پیشوائے اعظم ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ظہر کی چار رکعت مدینہ منورہ (مسجد نبویؐ) میں ادا کیں اور عصر کی دو رکعت ذی الحلیفہ (مسجد شجرہ) میں ادا کیں۔ حجاج کرام کو احرام باندھنے کے لیے حدود مسجد کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ اکثر حجاج حدود سے مغرب کی طرف تجاوز کرکے غلطی کرتے ہیں جو نہیں ہونی چاہیئے یہ مسجد کافی بڑی ہے کسی زمانہ میں اس کے شمال غربی رکن پہ مینار ہوتے تھے۔ جو اب منہدم ہو چکے ہیں۔ ہاں غربی رکن کا مینار اب بھی سلامت ہے، محراب اور مسجد کی حدود دالواب بلفصلہ وہی ہیں جو زمانہ قدیم سے تھے ــــ بئر علیؓ یہیں پہ ہے۔

مسجد اخربذ الحلیفہ: مسجد شجرہ سے بہت زیادہ دُور تو نہیں، لیکن یہ ذوالحلیفہ کی آخری حد چھوٹی سی مسجد ہے۔ جہاں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے نماز ادا فرمائی۔

مسجد المُعرَّس: یہ مسجد وادی شقیر کے مشرق کی طرف وادی بطحا کے درمیان واقع ہے۔ نافع بن عبداللہ فرماتے ہیں۔ عمرہ، حج یا غزوات سے واپسی پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اکثر رات کے وقت یہاں آرام فرماتے اور صبح مدینہ منورہ کی طرف قصد فرماتے۔ عربی زبان میں عرس کے معنی شب کو آرام فرمانے کے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں آرام فرمانے کی نسبت سے اس مسجد کا نام ہی المُعرَّس مشہور ہو گیا۔

مسجد شرفُ الروحاء: مکہ کرمہ کی طرف جاتے ہوئے دائیں طرف چٹانوں کا طویل سلسلہ طے کرنے کے بعد قبلہ رُخ بائیں سمت پہ ایک وسیع میدان جس کا نام سیالہ ہے اس سے ملحق سیالہ قبیلہ کا قدیم قبرستان ہے جو قبورِ شہداء کے نام سے مشہور ہے۔ اُن کی روایات کے مطابق وہاں کے سرداروں کے ہاتھوں قتل ہونے والوں کا مشہد ہے۔ یہاں ایک مسجد المشرف کے نام سے واقع ہے۔ مسجد مشرف اس نسبت سے اس کا نام رکھا گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سجود نے اسے شرف بخشا ــــ اس مسجد سے گیارہ میل کے فاصلہ پر قبلہ رُو وادی الروحا ہے جو آج کل وادی بنی سالم کے نام سے مشہور ہے۔ سیالہ سے ایک آدھ میل چلنے کے بعد بائیں طرف ایک گھاٹی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے پہاڑ کے دامن میں ایک ٹوٹی

ہوئی مسجد کے آثار نظر آئیں گے — یہاں بھی حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز ادا فرمائی۔ یہ مقام "عرق الظبیۃ" کے نام سے مشہور ہے۔ اسی مقام پر آپ نے غزوۂ بدر کے بارہ میں غزوہ کی عسکری تنظیم وتربیت کا مشورہ صحابہ کرام سے فرمایا۔ اس کے بعد صرف دو میل کے فاصلہ پر مسجد الروحا واقع ہے۔ یہاں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح کی نماز ادا فرمائی۔ "عرق الظبیۃ" (یعنی ظلبیہ کا دشوار گذار پہاڑ) کی طرف جاتے ہوئے تھوڑی ہی دور پر ایک پہاڑ ہے جس کا نام ہے "ورقان" — عمرو بن عوف المزنی فرماتے ہیں "میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوہ الوا میں شامل تھا۔ جب ہم لوگ ظبیہ کی دشوار گزار گھاٹی میں پہنچے تو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے پہاڑ کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے فرمایا — اس پہاڑ کا نام "ورقان" ہے یہ جنت کے پہاڑوں میں سے ایک ہے۔ اور فرمایا اے اللہ اس بستی کے رہنے والوں کو ہم کو برکتوں سے نواز — اور پھر وضاحت فرماتے ہوئے آپ نے ارشاد فرمایا۔ یہ ہمیشہ خوشگوار ہواؤں سے بھرپور وہ وادی روحا ہے، جہاں سے ستر انبیاء کرام گذرے۔ موسیٰ بن عمران سے روایت ہے کہ ستر ہزار انبیاء نے اس جبل ورقان کو شرف بخشا۔ عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کی ناقہ عمرہ اور حج کی غرض سے اسی مقام سے گزری۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وادی روحا کی مسجد میں نماز ادا فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا۔ "مجھ سے پہلے یہاں ستر ہزار نبیوں نے نماز ادا فرمائی ہے۔"

مسجد المنصرف: الغزالہ: ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ وادی روحا سے گزرنے کے بعد ایک مقام پر راستہ گول دُرہ کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ منصرف کی پہاڑیوں سے ذرا ہٹ کر مکہ مکرمہ کی طرف جاتے ہوئے یہ مسجد تھی لیکن اب صرف اس کے دروازوں کی پتھریلی دہلیزیں اور عمارت کے آثار موجود ہیں۔ عبد اللہ بن عمر رض فرماتے ہیں جب ہم صحابہ کرام رض کے ساتھ یہاں پہنچے تو ایک صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔ یہ وہ درخت ہے جہاں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نزول فرمایا۔ اور وضو فرماتے ہوئے درختوں کی جڑوں میں پانی دیا۔ ہم نے بھی سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اپناتے ہوئے ایسا ہی کیا۔ جب مسجد المنصرف المعروف مسجد غزالہ پر پہنچیں تو یہاں سے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اختیار کردہ راستے کو بائیں گے۔ قبلہ رخ بائیں طرف وہ قدیم راستہ ہے، جہاں سے آپ نے سقیا اور پھر ہرشی گھاٹیوں کی طرف رُخ فرمایا۔ آپ نے فرمایا: یہی وہ راستہ ہے جسے مجھ سے پہلے عمرہ یا حج کے لیے آنے والے انبیاء کرام نے اختیار کیا۔ اس راستہ کو چھوڑ کر حجاج کرام آج کل وادی روحا کے کنارے صفرآ سے مڑتے ہوئے بدر کی راہ اختیار کر کے نکل جاتے ہیں۔ اس راستے میں بھی کئی مساجد ہیں جن کا ذکر آگے آئیگا۔

مسجد الرویثہ: جبل الحمراء کے عقب میں دہنی جانب مشرق میں جبل الحسنا ہے۔ اس بستی میں حوض اور چھوٹے چھوٹے کنوئیں بہت ہیں۔ اس بستی کا نام رویثہ ہے جس کی پیشانی پر یہ مسجد تھی۔ آج اس کے صرف آثار باقی ہیں یہاں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشانی اقدس بارگاہِ الٰہی میں سجدہ ریز ہوئی۔

مسجد ثنیۃ الرکوبہ: عرج کے پہاڑوں کی طرف رُخ کرتے ہوئے ثنیۃ العابر نظر آتی ہے جو اصل میں عرج کی پشت پر واقع ہیں۔ اس سے تین میل کی دوری پر "ثنیۃ الرکوبہ" (یعنی رکوبہ کی پہاڑی) ہے۔ اسی جگہ یہ مسجد واقع ہے۔

مسجد الاثایہ : عرج کی چوٹی سے گیارہ میل پہلے مقام جُحفہ کے راستے میں اثایہ نام کے گاؤں میں یہ مسجد ہے۔ اس کے آس پاس کنوئیں اور پیلو کے بہت سے درخت ہیں۔ یہ حجاز کی آخری حد ہے۔

مسجد العرج : عرج پہاڑ پر واقع اس مسجد میں بعض روایات کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قیلولہ فرمایا لیکن معدقہ روایات کے مطابق اس کی سند مشکوک ہے۔ ہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں نماز ضرور ادا فرمائی۔

مسجد المنبجس : عرج سے تین میل مشرق کی طرف مسجد الرسول صلی اللہ علیہ وسلم جہاں سے ہجرت کے دوران عبداللہ بن اریقط لے کر گزرے اور دوپہر کی شدید گرمی میں وادیٔ مُنبجس میں چشمۂ مُنبجس کے کنارے آپ نے یہاں ظہر کی نماز ادا فرمائی۔

مسجد لحی جمل : عرج سے گیارہ میل کے فاصلہ پر بئر ذات المطلب ہے جس کا پانی گندا ہے اور سُقیا یہاں سے چھ میل پر واقع ہے۔ ایک موضع "لحی جمل" کے نام سے مشہور ہے۔ مختصر یہ کہ یہ مسجد جہاں رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے رکوع و سجود فرمائے۔ سُقیا اور تاحد سے پہلے ہے۔

مسجد السُقیاء : چشمہ "تعذبہ" کے قریب پہاڑ پر واقع یہ مقام جو سقیا کے نام سے معروف ہے سجدہ گاہ شاہ اُمم صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ اس کے اردگرد کے کھیتوں کو بہت سے سیراب کرنے والے چشمے بھی ہیں۔

مسجد مدلجۃ تعھن : صخر بن مالک بن ریاس اپنے آباؤ اجداد کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ مقام مدلجہ تعہن میں آپ نے نماز ادا فرمائی۔ اور مسجد کی بنیاد رکھی۔

مسجد الرمادۃ : سقیا کے بعد مکہ مکرمہ کی جانب بارہ میل کے فاصلہ پر چشمہ قشیری ہے۔ جس کا منبع جبل المشرف اور قدس کے نام سے مشہور ہے۔ اور وادیٔ الراء سے ملحق ہے۔ مسجد الرمادۃ اسی جگہ واقع ہے۔

مسجد الابواء : مقام جُحفہ اور الابواء کے درمیان تیرہ میل کا فاصلہ ہے۔ اور یہ مسجد اس کے بیچ میں واقع ہے۔ یہ علاقہ بھی کافی سرسبز و شاداب ہے۔

مسجد البیضۃ : الابواء سے پانچ میل پر واقع یہ مسجد الرسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

مسجد عقبۃ ھرشی : مذکورہ مسجد سے آگے آٹھ میل کے فاصلہ پر عقبۃ ہرشی آتا ہے جسے کترا کر نکلنے والے راستہ پر واقع مقام "سرحات" پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نزول فرمایا اور نماز ادا فرمائی۔

مسجد الجحفۃ : مقام جُحفہ پر دو مساجد ہیں۔ ایک تو جُحفہ اور ندید کے درمیان ہے۔ اس کا نام مسجد ائمہ ہے اور دوسری مسجد الرسول صلی اللہ علیہ وسلم جُحفہ کی داخلی حدود پر واقع ہے۔

مسجد غدیر خم : مقام جُحفہ سے تین میل دور راستے کے بائیں طرف چشمہ کے کنارے مسجد الرسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ غدیر خم مسجد اور

چشمے کے درمیان کی جگہ کا نام ہے۔ مسند احمد میں براء بن عازبؓ سے روایت ہے کہ ہم اُس وقت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ جب آپؐ غدیر خم میں تشریف فرما ہوئے۔ ایک درخت کے نیچے اذان دی گئی۔ ہم نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے درخت کے نیچے ہر طرف جھاڑو دی اور ظہر کی نماز ادا کی۔

اس کے بعد رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بلند کیا اور فرمایا۔ اے اللہ جس کا میں مولیٰ اس کا علیؓ بھی مولا۔ اے اللہ اُسے آپ بھی دوست رکھنا جس نے علی رضی اللہ تعالےٰ عنہٗ کو دوست رکھا اور اس سے تیری دشمنی بھی، جس نے علی رضی اللہ تعالےٰ عنہٗ سے دشمنی رکھی۔ اس کے ساتھ ہی سب سے پہلے حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ اُٹھے اور کہا۔ مبارک ہو اے ابن ابی طالبؓ ہر مومن اور مومنہ کی آقائی کا اعزاز مبارک ہو۔ زید بن ارقم نے بھی اس واقعہ کو انہی الفاظ میں ادا کیا ہے۔

مسجد طرف قدید: مقام قدید سے تین میل پہلے اُمِ معبد خزاعیہ کا خیمہ واقع ہے۔ یہیں مسجد الرسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں اس خیمہ کے قریب سرِراہ ایک گاؤں موسوم بہ موضع "مناۃ الطاغیہ" تھا۔ قدید کے قریب ہی اُونچی جگہ پر پتھر اور مٹی سے بنی ہوئی مسجد نظر آتی ہے۔

مسجد عند حرۃ خلیص: مذکورہ مسجد سے دائیں طرف جاتے ہوئے راستے پر قدید سے چشمہ ابن بزیع اور حرۃ خلیص میں تقریباً تین میل کا فاصلہ ہے۔ اس جگہ سیاہ گھاٹی دوسرے راستوں سے الگ ہو جاتی ہے۔ اس مقام پر مسجد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

مسجد خلیص: یہاں سے تھوڑی ہی دُور سرسبز و شاداب حصہ میں چشمہ عزیزہ کے کنارے بھی مسجد الرسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

مسجد بطن مر الظہران: سفر ادات کی وادیوں سے اُتر کر آگے بڑھیں تو مقام بطن مر الظہران آتا ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے عمر بن عبد اللہ کے حوالے سے یہاں کی مسجد کا ذکر کیا ہے۔ لیکن تلاش کے باوجود اس کے آثار مفقود ہیں۔

مسجد سرف: یہ وہی موضع ہے جہاں اُمّ المومنین میمونہ رضؓ نے وفات پائی اور یہیں مدفون ہوئیں۔ یہاں مسجد الرسولؐ موجود ہے۔

مسجد تنعیم: قبر میمونہؓ سے تین میل آگے موضع شجرہ میں واقع مسجد الرسولؐ اہلِ مکہ کا مقام میقات ہے۔ تنعیم میں دو مسجدیں ہیں۔ اُن میں مسجد عائشہ الصدیقہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا اور مسجد تنعیم کا تعین کرنے میں اکثر لوگ غلطی کر جاتے ہیں۔ جہاں ہریڑ کا درخت تھا جواب نہیں ہے۔ بعض روایات کی روشنی میں اہلِ مکہ جسے مسجد الہلیلجہ کہتے ہیں۔ اسے مسجد علیؓ بھی کہتے ہیں اور اس مسجد میں ایک سنگِ بنیاد کندہ عبارت بھی اس کی موید ہے۔ مسجد کے قریب ایک کنواں بھی موجود ہے۔

مسجد عمرات الرسول: ابن عمرؓ و عباسؓ فرماتے ہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے چار بار عمرہ ادا فرمایا: عمرۃ الحدیبیہ

عمرۃ القضاء، عمرۃ التنعیم اور عمرۃ الجعرانہ" تین کے بارہ میں تو سند ہے۔ لیکن تنعیم کے بارہ میں معتدنہ روایات نہیں ملتیں۔

مسجد ذی طویٰ: وادی ذی طویٰ مکہ مکرمہ میں دو گھاٹیوں کے درمیان مشہور ہے۔

موجودہ مجوزہ راہوں پہ مساجد

دبۃ المستعجلہ: یہ ایک موضع کا نام ہے جہاں چاروں طرف ریت ہی ریت ہے۔ محمد بن فضالہ فرماتے ہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مضیق (دشوار گذار راستے سے) گزر کر دَبۃِ دَبۃ المستعجلہ میں تشریف فرما ہوئے اور بئر (کنواں) الشعبیۃ الصابۃ سے (جو دبہ کے نچلے حصہ میں واقع ہے) پانی نوش فرمایا۔

شعب سبیر: مستعجلہ اور صفراء کے درمیان اس کا محلِ وقوع ہے۔ ابن اسحاق فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مقام بدر سے روانہ ہو کر مضیق الصفراء سے نکلے اور مضیق اور نازیہ کے درمیان مقام سبیر پہ دو رکعت نفل ادا فرمائے۔

متعدد مساجد: مسجد بزات اجدال، مسجد بالجیزتین، مسجد یذخوان و موضع مذب ذفران المقبل۔ ابن فضالہ فرماتے ہیں۔ بذات اجدال میں نماز ادا فرمائی۔ اسی طرح مذکورہ مساجد میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز ادا فرمائی۔

مسجد الصفراء: طلحہ بن ابی حدیر رضؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد صفراء میں نماز ادا فرمائی۔

مسجد ثنیۃ المبرک: عیسٰی ابن معن رضؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ثنیۃ المبرک کی مسجد میں نماز ادا فرمائی۔

مسجد بدر: میدانِ بدر میں وہ مقام جہاں غزوۂ بدر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خیمہ نصب تھا۔ یہ مسجد وہیں واقع ہے۔

مسجد العشیرہ: بطن ینبع مشہور مقام ہے۔ علی ابن ابی طالبؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں بھی نماز ادا کی۔

مساجد الفرع: مقام فُرع میں تین مساجد واقع ہیں، اور مستند روایات سے ان تینوں مساجد میں سرور انبیا علیہ التحیۃ والسلام نے نمازیں پڑھی ہیں۔

(۱) مسجد الاعلیٰ ——— فرع سے اکسہ میں بڑی مسجد ——— جہاں آپؐ نے خواب استراحت فرمایا، صبح کی نماز ادا

چاشت کی نماز کے بعد آپ اکمہ کے نچلے علاقہ کی طرف چلے اور (۲) پھر مسجد قرع کو برکتوں سے نوازا (۳) تیسری مسجد میں بھی رکوع و سجود فرمایا۔

مسجد الفیقہ: یہ مسجد کہف اعشار میں واقع ہے۔ غزوہ بنی مصطلق کے بعد آپ نے یہیں نماز پڑھی۔

مسجد مقمل: ہیثم المزنی اپنے اجداد سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بطحا نقیع میں ہمارے مقام مقمل کو اپنی برکات سے نوازا جہاں آج یہ مسجد موجود ہے۔

مسجد العصر: ابن اسحاق فرماتے ہیں (مدینہ منورہ کی منازل میں واقع یہ مسجد وہ ہے) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خیبر کی طرف سفر فرماتے ہوئے عصر کے وقت یہاں سے گزرے۔ نماز ادا کی اور اسی جگہ یہ آج مسجد ہے۔

مسجد الصہباء: سوید بن النعمان رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ فرماتے ہیں۔ خیبر کی طرف جاتے ہوئے جب آپ مقام صہباء پہ پہنچے تو یہاں نماز ادا کی اور طویل دُعا فرمائی، پھر طعام تناول فرمایا، اور ہم نے شرف شرکت طعام حاصل کیا۔

خیبر کے قریب مساجد: خیبر میں داخل ہونے سے پہلے ایک مقام پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھوں سے پتھروں کو ترتیب دے کر مسجد بنائی اور نماز ادا فرمائی۔ اس مسجد کو "مسجد المنزلہ" کے نام سے پکارتے ہیں۔ یہاں آپ نے رات کے وقت آرام بھی فرمایا۔ پھر آگے تشریف لے گئے اور موضع صخرا کو اپنی برکتوں سے نوازا — اور ایک مقام کو اشارہ سے مسجد کی نشاندہی سے نوازا — جہاں آج بھی مسجد موجود ہے۔

مسجد الشق اور نطاط: قبیلہ اشجع نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خیبر کے مواضع کی نشاندہی کی اور اہل شق" اور "اہل نطاط" میں پہنچے تو یہاں نماز پڑھی، جہاں بعد میں مسجد تعمیر ہوئی۔

مسجد شمران: خیبر کے پہاڑ کی چوٹی جسے شمران کے نام سے پکارا جاتا ہے اُس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز ادا فرمائی۔ جہاں آج مسجد ہے۔

مساجد تبوک: مدینہ منورہ سے تبوک تک کے راستے میں بیس مساجد ہیں جن میں سے ہر ایک کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رکوع و سجود کا شرف حاصل ہے۔

(۱) مسجد توبہ (۲) مدان کی گھاٹیوں پہ واقع مسجد (۳) بذات الزراب (۴) مقام اخضر (۵) مقام خطمی (۶) حبالی (۷) مبرآء۔ (۸) شق تارہ (۹) ذی الحلیفہ (۱۰) ذی الخلیفہ (۱۱) شرشق (۱۲) صدر غازی (۱۳) حجر (۱۴) معبد قرح (۱۵) وادی القرای (۱۶) قریہ بنی عذرہ (۱۷) رقعہ (۱۸) ذی المردہ (۱۹) نیفاء الفحلتین (۲۰) ذی خشب۔

مسجد کدید: یہ مسجد مقام کدید سے ایک میل پر کھیتوں میں واقع ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک درخت کے نیچے نماز ادا فرمائی تھی اسی جگہ یہ مسجد تعمیر کی گئی ہے۔

مسجد شجرۃ با لحدیبیہ: ابن شہاب کہتے ہیں بلدح کے قریب یہ ایک غیر معروف گاؤں سے حدہ کی طرف جاتے ہوئے

شمس کے نام سے ایک کنواں ہے۔ اس کے قریب کے موضع کا نام حدیبیہ ہے جس میں ایک درخت کے نیچے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز ادا فرمائی۔ اس لیے یہ مسجد دونوں ناموں سے پہچانی جاتی ہے۔

مسجد ذات عرق: مذکورہ مسجد سے ۲½ میل کے فاصلہ پہ یہ مقام ذات عرق کے نام سے مشہور ہے۔ عراق اور نجد سے آنے والوں کا مقام میقات بھی ہے۔

مسجد الجعرانہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں احرام باندھا اور دو رکعت نماز پڑھی۔ آج بھی اسی جگہ یہ مسجد موجود ہے۔

مسجد لیۃ: مسجد لیہ وادی لیہ اور وادی طائف کے درمیان واقع ہے۔ جنگ حنین کے بعد رسولِ اکرم نخل یمانیہ طائف کی طرف چلے پھر ملیح اور بحرۃ الرغاء سے ہوتے ہوئے مقام لیہ پہ پہنچے، وہاں قیام فرمایا اور رکوع و سجود سے جس مقام کو نوازا یہ مسجد اُسی جگہ پہ واقع ہے۔

مسجد الطائف: ابن اسحاق فرماتے ہیں، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر اختیار فرمایا تو پہلے مقام فیقہ پھر نخب سے ہوتے ہوئے سدرہ (جو صادرہ کے نام سے مشہور ہے) اور پھر طائف تشریف لائے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لشکر کے ساتھ جس جگہ محاصرہ کا پڑاؤ ڈالا تھا وہاں امہات المومنین میں سے اُمّ سلمہؓ بھی تھیں، الگ دو خیمے قبہ نما نصب فرمائے۔ یہاں بیس راتوں تک محاصرہ رہا۔ جب قبیلہ ثقیف مسلمان ہو گیا تو اُنھوں نے اس جگہ مسجد تعمیر کی، جو آج بھی موجود ہے۔

شہدائے کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم

(جنھوں نے حضورؐ کے پیغام پر لبیک کہا)

سیّد مسعود مشہدی

ہجرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے مکہ مکرمہ میں جس ہستی نے اپنی رُوح کی زبان سے تصدیقِ رسالتؐ کر کے مرتبۂ شہادت میں سرِ فہرست نام پانے کا شرف حاصل کیا۔ وہ تھیں عزیب الوطن یمنی شوہر یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بیوی، سالقہ ابو حذیفہ مخزومی کی کنیز حضرت عمار رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قابلِ فخر ماں۔ جن کی مسکینی کی دہلیز پر شاہی وقار سر بخم۔ جن کی غریبی پہ ثروت ہفت اقلیم نچھاور، جس کی کمزوری کو جرأت و ہمت کی عظمتیں سلام کریں۔ جس کے صبر و استقلال کو دعا ہیں چومیں۔ وفا تے عہد کی تاریخی علامت ایمان اور اسلام کی ناقابلِ تسخیر شخصیت! اُس کا نام تھا ــــ سمیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا۔

اے روائت پردۂ ناموس ما ـــ تابِ تو سرمایۂ ناموسِ ما
طینتِ پاک تو مارا رحمت است ـــ قوّتِ دین واساسِ ملت است
اے امینِ نعمتِ آئینِ حق، ـــ در نفس ہائے تو سوزِ دینِ حق

تلواروں کی دھاروں، نیزوں بھالوں کی انیوں اور دہکتے ہوئے انگاروں پہ تصدیقِ صداقت رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُس کا معمولِ زندگی تھا۔ جھنجلا کر ایک کافر سفاک ہاتھ نے اس کی کوکھ میں برچھی گھونپ دی۔ جہالت کا باپ یہ سمجھا کہ صدائے حق ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی۔ لیکن تاریخ گواہ ہے۔ اُس کی مقدس روح کی زبان سے نکلنے والے الفاظ لا اِلٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" (حق معبودیت اور حکومت صرف اللہ کو ہے۔ اور محمدؐ اللہ کے (سچے) رسول ہیں") اپنے دامن میں غیر فانی زندگی سموئے ہوئے اس شان کے ساتھ فضاؤں میں تحلیل ہوئے کہ آج تک ہر لحظہ، ہر آن، ہر سو، ہر سمت یہی آواز گونج رہی ہے:
لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)"

اس آواز کو خاموش کرنے کی مذموم و ناکام کوشش کا بدنما داغ جس کے ماتھے کو نصیب ہوا جس کے مقدر میں بدبختی سرِ فہرست لکھی گئی ـــ وہ تھا ابوجہل۔!

اس کے بعد ان کے شوہر یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی اس اندازِ شہادت کو سینے سے لگایا ـــ کفار مکہ نے انھیں بہت مارا، بہت ستایا۔ مٹی کا جسم ان کا ساتھ چھوڑ گیا۔ مگر وہ عہد و پیماں جو اُنھوں نے اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تھا۔ وہ اُنھوں نے نہ توڑا، اور نہ ہی کوئی ظالم و جابر اُسے توڑ سکا۔ ہاں پھر وہی صدائے حق فضاؤں میں گونجی میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ ایک ہے اور اس کے رسول برحق ہیں صلی اللہ علیہ وسلم! سلام اُن کے ناقابلِ شکست ایمان کو صد سلام۔

سیرۃ النبیؐ میں سیّد سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے "اصابہ فی احوال الصحابہ ذکر حارثؓ بن ابی ہالہ کے حوالے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ربیب حضرت حارث بن ابی ہالہ کا نام سب سے پہلے شہید سے منسوب کیا ہے۔ لیکن دوسری سیرت کی کتابوں میں اس کی تصدیق نہیں مل سکی" پھر بھی اس حوالے سے جو کچھ آپ نے لکھا ہے۔ لفظ بلفظ پیش خدمت ہے۔

جب آپؐ نے حرم کعبہ میں جاکر توحید کا اعلان کیا۔ کفار کے نزدیک یہ حرم پاک کی سب سے بڑی توہین تھی۔ اس لیے دفعۃً ایک ہنگامہ سا برپا ہو گیا۔ اس لیے ہر طرف سے لوگ آپؐ پر ٹوٹ پڑے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ربیب حارثؓ بن ابی ہالہ گھر میں تھے۔ ان کو خبر ہوئی دوڑتے ہوئے آئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بچانا چاہا۔ لیکن ہر طرف سے ان پر تلواریں پڑیں اور وہ شہید ہو گئے۔ اسلام کی راہ میں یہ پہلا خون تھا جس سے زمین رنگین ہوئی (سیرۃ النبی صفحہ ۱۴۳ مطبوعہ دارالمصنفین اعظم گڑھ) کئی برس فتح مکہ سے پہلے ایک بار پھر حق کی صدائے بازگشت! خبیبؓ بن عدی اور زید بن دثنہ کو مقام رجیع پر قوم عضل اور قارہ نے گرفتار کر کے قریش مکہ کے ہاتھوں فروخت کر دیا۔ اور ان کے بقیہ ساتھی صحابہ کرام کو مکاری سے بلا کر شہید کر دیا۔ اس کے بعد حضرت خبیبؓ کو حارث کے بیٹوں نے اور حضرت زیدؓ کو صفوان بن اُمیہ نے خرید لیا۔ بہت دن بھوکے پیاسے تڑپا کر انتقام کی آگ بجھانے کی کوشش کرتے رہے۔ لیکن آخر میں حد حرم کی شمالی جانب مقام تنعیم پر سولی نصب کی۔ مکہ کے تمام مشرکین کے بچوں، جوانوں، بوڑھوں اور عورتوں کو جمع کیا۔ اس طرح سرِعام عبرتناک سزا دینے کا مقصد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کے حامی و ناصر مسلمانوں کی حوصلہ شکنی تھا۔ عہد شکنی پر اکسانے کی دہشت انگیز دھمکی تھی۔ موت سے پہلے حضرت خبیبؓ نے اپنے فی البدیہہ اشعار میں ان کے مذموم ارادوں کی وضاحت اس طرح کی۔ جسے اس وقت اس مجمع میں موجود ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے نوٹ کیا۔

۱۔ لقد جمع الاحزاب حولی والبوا   قبائلهم واستجمعوا كل مجمع

میرے مقتل کے ارد گرد مکہ کے تمام گروہ بلائے گئے ہیں۔ اور لوگوں کا ایک ہجوم میرے چاروں طرف ہے۔

۲۔ وقد جمعوا ابناءهم ونساءهم   وقربتُ من جزع طويل ممنع

اس جم غفیر میں ان کے بچے اور عورتیں بھی ہیں۔ اور مجھے مشکیں باندھے "ایک مضبوط لکڑی (صلیب) کے قریب لے آئے ہیں۔

۳۔ وقد خيروا فى الكفر والموت دونه   وقد حملت عيناى من غير مجزع

(مجھ سے کہا جا رہا ہے) اگر زندگی اور اس کی بھلائیاں چاہتے ہو تو کافر ہو جاؤ۔ ورنہ موت تمہارے لیے یقینی ہے (میرا جواب ہے) بلاشبہ میری آنکھوں میں آنسو فطری امر ہے۔ لیکن میرا ایمان غیر متزلزل ہے۔

۴۔ انلست بمبدٍ للعدوّ تخشعًا   ولا جزعًا الى الله مرجع

میری غیرت ایمانی اسلام دشمنوں سے کبھی عجز و انکساری نہیں کرے گی۔ نہ چلائے گی۔ کیونکہ میں سمجھتا ہوں میری موت میرے اللہ کی طرف سفر کا دوسرا نام ہے۔

۵۔ ومالى حذ الموت انى لميت   ولكن حذارى حجم نارًا ملفيع

اور سُن لو میں موت سے زیادہ موت کے بعد خون چوسنے والی آگ سے ڈرتا ہوں (جو بحالت کفر مرنے کی سزا ہے)

۶ - فو الله ما ارجو اذا مت مسلما ۔ الی ای جنب کان فی الله مصرع

میں اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں میں مسلمان ہوں (مسلمان مر رہا ہوں) اس کے بعد مجھے پروا نہیں میں کس پہلو گرتا ہوں۔

حضرت خبیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے یہ اشعار ان کے ما فی الضمیر ہی کی نہیں، بلکہ ان تمام صحابہ کرام کے ایمان، وفا، ایثار کے ترجمان ہیں جن کو سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم سے فیضانِ تربیت نصیب ہوا۔ اطمینانِ قلب کا عالم دیکھئے۔ دو رکعت نماز پڑھی، اور دعا مانگی۔ اللھم بلغنا رسالۃ رسولک ۔ اے اللہ! ہم تیرے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کو اپنے ایثار و عمل سے ہمیں سب تک پہنچا "گواہ رہنا ۔ اور انھوں نے جو سلوک کیا۔ اس کی اطلاع ان تک پہنچانا تیرا کام ہے۔ "بلغه ما یصنع بنا"۔

ایک اور معیارِ وفا

کفار حضرت زیدؓ کو بھی اسی جگہ تنعیم میں لائے۔ پھر وہی لوگوں کا ہجوم، ان میں ابوسفیان بھی تھا۔ جب صفوان نے اپنے غلام نسطاس کو سب کے سامنے گردن مارنے کا حکم دیا تو ابوسفیان نے غلام کو روکا۔ خود آگے بڑھا۔ اور حضرت زیدؓ سے مخاطب ہو کر کہا:۔

آج تمھاری جگہ اگر (نعوذ باللہ) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کیا جاتا تو تمھیں خوشی نہ ہوتی۔ زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: ابوسفیان — تو نعوذ باللہ ان کی جان کی بات کرتا ہے۔ مجھے تو یہ بھی گوارا نہیں کہ میری جان کے بدلے ان کے پاؤں مبارک کو کسی کانٹے کا منہ بھی چھو جائے۔

نسطاس بوکھلا گیا ۔ اور کہا ۔ گردن اڑا دو۔ گردن کٹی اربعہ عناصر کا مجسمہ ٹوٹا، لیکن پرواز کرتی ہوئی روح سے کفر کی دنیا میں زلزلہ خیز صدا بلند ہوئی:۔

"لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ" (صلی اللہ علیہ وسلم)

سراسیمہ کفر

۶ ہجری قریش نے حدیبیہ کے مقام پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جو معاہدہ کیا تھا اس کی ایک دفعہ یہ بھی کہ دس سال تک جنگ نہیں ہوگی۔ اس اثنا میں جو قبائل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب ملنا چاہیں وہ ادھر مل جائیں اور جو قریش سے ملنا چاہیں وہ ادھر مل جائیں۔ اس معاہدہ کو ابھی دو سال بھی نہیں گذرے تھے کہ قریش نے قبیلہ بنو بکر کو افراد اور اسلحہ کی امداد دے کر بنو خزاعہ پر صرف اس لیے حملہ کرا دیا کہ ان میں سے کچھ لوگ مسلمان ہو گئے تھے اور بنو خزاعہ کی ہمدردیاں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہونے کی اطلاع انھیں مل چکی تھی۔

بنو بکر نے بنو خزاعہ کو بڑی بے دردی سے بچوں، بوڑھوں اور عورتوں سمیت قتل کیا۔ کچھ لوگ نے جان بچانے کے لیے

بھاگ کر "حرم بیت اللہ شریف" میں پناہ لی لیکن انھیں یہاں بھی رحم کی بھیک مانگنے کے باوجود قتل کر دیا گیا۔ عمرو بن سالم خزاعی اور چند دوسرے افراد نے جن کی تعداد ۴۰ کے لگ بھگ بتائی جاتی ہے۔ بارگاہِ رسالتؐ میں پناہ لی اور تمام واقعات بیان کئے۔ ان اشعار میں سے ایک مصرع اس بات کا مؤید ہے کہ چند خزاعی اسلام لا چکے تھے۔ " فقتلونا رکعًا وسجدًا " "ظالموں نے ہمیں ایسی حالت میں قتل کیا۔ جب کہ ہم میں سے لوگ رکوع و سجود میں تھے۔

اقبالؒ مرحوم نے دورِ حاضر میں شیطان کی مسلمانوں کی بے داری کے حوالے سے جس پریشانی کے سبب کی نشاندہی کی ہے اس سے اُس وقت کے کفر کی سراسیمگی سے کتنی مماثلت ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:۔

"عصر حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف — ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب — بادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں

فتح مکہ کے دن: حُبیشؓ بن اشعر بن منقذ اور دوسرے صحابی کرز بن جابر بن حسیل فہری قرشی نے شہادت پائی۔

میدانِ بدر: شہداء کے حضور نذرانہ سلام پیش کرنے سے پہلے شاہد، شہادت، شہید ——— کے حقیقی مفہوم کا تعین!

عربی زبان میں شاہد ——— گواہ

شہادت۔ گواہی۔

شہود اور شہادت کے معنی اُس کے حضور موجود رہنا، سامنے ہونا کے ہیں۔ جو مشاہدہ کے ساتھ ہو۔ خواہ مشاہدہ بصر کے ساتھ ہو یا عقل و فہم کے ساتھ ہو۔

اور کبھی صرف حضور کو بھی کہتے ہیں۔ جیسے عالم الغیب والشھادۃ (روانائے غیب و ظہور ہے)

شہود کا استعمال حضور مجرد کے ساتھ اَولیٰ ہے اور شہادت کا اس حضور سے مراد ہے جو مشاہدہ کے ساتھ ہو۔

نیز ——— شہادۃ وہ بیان ہے جو اس علم کی بناء پر سرزد ہو جو مشاہدہ بصیرت یا مشاہدہ بصر کے ذریعہ حاصل ہوا ہو۔

(بحوالہ لغات القرآن جلد سوم صفحہ ۲۹۵، مصنف مولانا محمد عبدالرشید نعمانی، مولانا سید عبدالدائم الجلالی، مطبوعہ دینی کتب خانہ اُردو بازار۔ لاہور)

بحوالہ "المنجد" صفحہ ۵۴۵۔ مطبوعہ دارالاشاعت کراچی۔

شَھِدَ (س) شھودًا + المجلس مجلس میں حاضر ہونا۔

شَھِدَ شئیً۔ کسی شے کا معائنہ کرنا۔

شاھد گواہی دینا ج۔ شھود و شُھَّد

شھد (س) وشھَدَ (ک) مشاھدۃٌ۔

عند الحاکم بفلانٍ او علیٰ فلان او علیٰ فلان ۔ گواہی دینا ۔

اَلشَّھِیْدُ والشَّھِیْدُ ۔ حاضر گواہی ہیں امین ، جس کے علم سے کوئی چیز پوشیدہ نہ ہوتی ۔ عربی کی لغات کے حوالے سرف اس لیے پیش کیے ہیں تاکہ شہید یا شہادت پانے والے کی نیت اور مقصد کا واضح تعین کیا جا سکے ۔

چنانچہ وہ تمام شہداء جنھوں نے غزوات میں شہادت کی سعادت حاصل کی ۔ انھوں نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اللہ جل شانہٗ کے پیش کئے ہوئے عقیدۂ توحید یعنی ایک اللہ کے مقتدر اعلیٰ وحدہٗ لاشریک یعنی صفت یا عمل میں یکتا و تنہا محسوس کیا اور وہ نظامِ حیات جو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیا ، اس کی خیر و برکت ، اس کی زندگی کے ہر شعبہ میں سنوارنے کی اہلیت کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ۔

تو اس یقین اور عینی مشاہدوں کے ساتھ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کی شہادت کو زبانی ہی نہیں کہا ۔ اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ) بلکہ اپنی جان قربان کر کے اس گواہی کا معیار بھی پیش کیا ۔

یہ شہادت گہہِ اُلفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

اب آیئے مدینہ منورہ سے اسّی میل دور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کے شہداء کی بستی ۔ میدانِ بدر ۔

بیضوی شکل کا میدانِ بدر جس کے چاروں طرف پہاڑیاں ہیں ۔ تقریباً ۴½ میل یا پانچ میل کا یہ میدان اور یہ مسجد عریش (جہاں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا سائبان تھا) جہاں آپ ؐ اپنے رب ذوالجلال والاکرام کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہو کر رات بھر فتح و نصرت کی التجا کرتے ہوئے کہتے ۔۔۔ یا حی ۔ یا قیوم ۔ اے بلا واسطہ غیرے زندہ رہنے والے ،

اے بلا شرکت غیرے قائم و دوائم ۔

تیری توحید اور میری رسالت کے سچے اور پکے گواہ تھوڑے ہیں ، بہت تھوڑے ۔ حق و باطل کی اس جنگ میں انھیں کچھ ہو گیا تو پھر تیری وحدانیت اور ربانیت کو قیامت تک کوئی تسلیم نہیں کرے گا ۔

اور وہ سامنے احاطہ سا بنا ہوا ہے ۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں ان چودہ صحابہ کرام کے جسم اطہر آرام فرما ہیں جنھوں نے زبانی نہیں بلکہ اپنی جان کی قربانی دے کر اللہ کی وحدانیت اور رسول اللہؐ کی رسالت کی گواہی دی ۔ اور بدر کے میدان میں اُترنے سے پہلے سعد بن معاذ کے اس دعوے کی سچائی پر اپنے مقدس خون سے مہر ثبت کی ۔

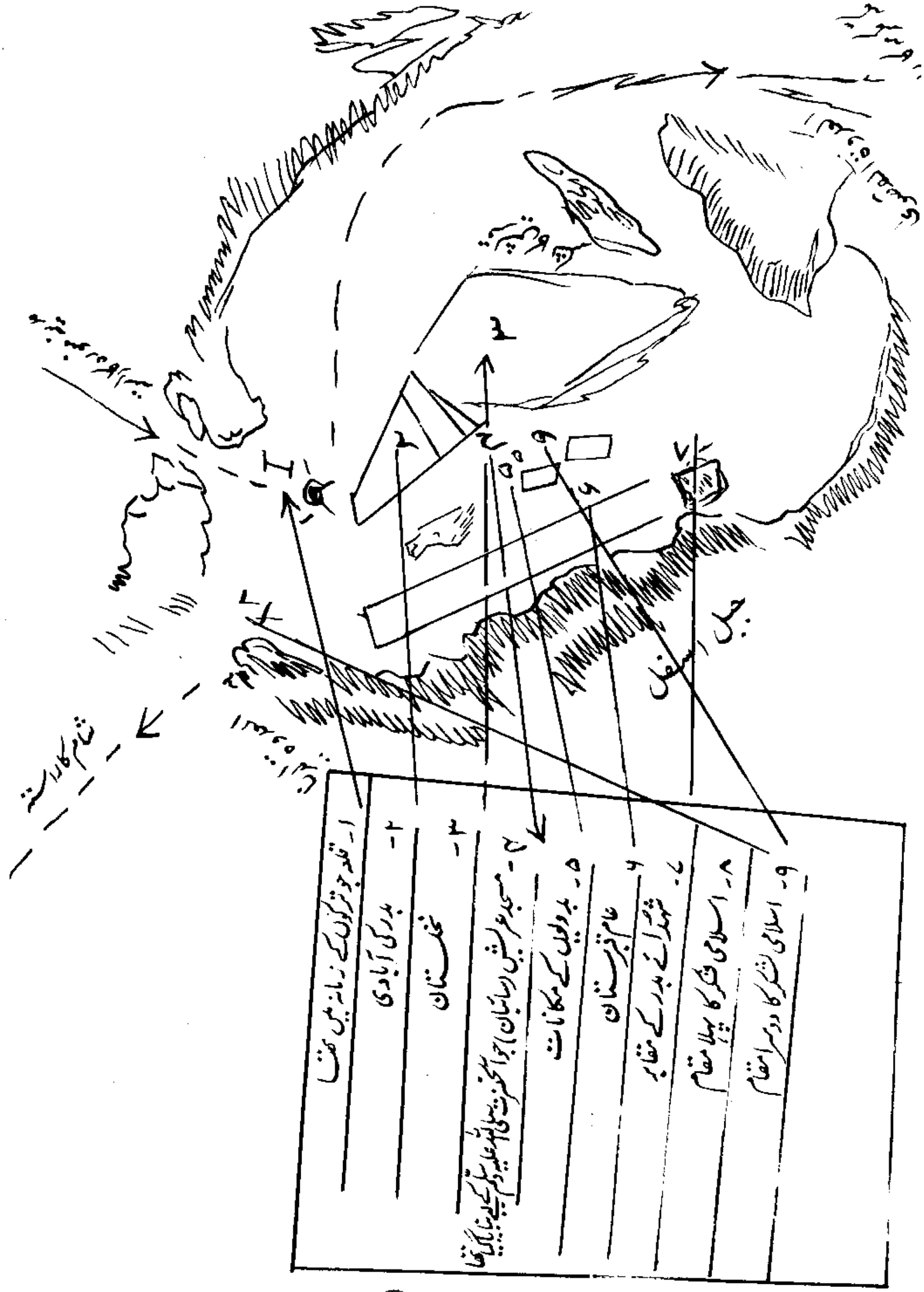
سعد بن معاذ نے مدینہ منورہ میں فرمایا ۔ یا رسول اللہؐ آپؐ ہم سے خطاب فرما رہے ہیں ۔

ہم آپؐ پر ایمان لا چکے ہیں ۔

ہم نے آپؐ کی تصدیق اور گواہی دی ۔

آپؐ جو تعلیم لائے ہیں وہ سچی ہے ۔

ہم آپؐ کی اطاعت اور فرمانبرداری کے اس دعوے کے ثبوت ہیں ۔


جبل اسفل
شام کا راستہ
۱۔ قلعہ جو ترکوں کے زمانہ میں تھا
۲۔ بدر کی آبادی
۳۔ نخلستان
۴۔ مسجد عریش (سائبان) جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے عریش بنایا گیا تھا
۵۔ بدر والوں کے مکانات
۶۔ عام قبرستان
۷۔ شہدائے بدر کے مقابر
۸۔ اسلامی لشکر کا پہلا مقام
۹۔ اسلامی لشکر کا دوسرا مقام

میدانِ جنگ میں اپنی جانیں نثار کریں گے۔

اور ہوا بھی یہی ——— اپنے اس دعوے کی تصدیق ان صحابہ کرامؓ نے اس انداز اور شان کے ساتھ کی اور توحید و رسالت کی گواہی۔

(اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ)

(ہم گواہی دیتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ۔ وہ وحدہٗ لاشریک ہے اور ہم گواہی دیتے ہیں محمدؐ اس کے عبد اور رسولؐ ہیں) کو ایسا دوام بخشا کہ ان کے مقدس خون کے ہر قطرہ سے نکلنے والی شعاع سے ہی اس گواہی کے الفاظ مشرق و مغرب، شمال و جنوب کی فضاؤں میں ایسے مدغم ہو گئے کہ آج تک خشکی و تری، بلندی و پستی، زمین و آسمان کے خلاء میں ہر لمحہ، ہر ساعت، ہر سُو وہی صدا آرہی ہے اور تا قیامت آتی رہے گی۔

اشهد ان لآ اله الا الله واشهد ان محمدًا عبدهٗ ورسولهٗ

ہم گواہی دیتے ہیں کہ اس وحدہٗ لاشریک اللہ کے سوا کوئی اللہ نہیں اور محمدؐ اس کے عبد اور رسولؐ ہیں۔

ان کے اسمائے گرامی رضی اللہ تعالیٰ عنہم و رضوا عنہ۔

۱۔ مہجع بن صالح :

عک قوم کے تھے۔ عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ نے انھیں اپنی غلامی سے آزاد کیا تھا۔

اس گواہی کے سب سے پہلے ناطق۔ (شہید)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں سیّد الشہداء کے خطاب سے نوازا۔

۲۔ عبیدہ بن حارث بن مطلب بن عبد مناف بن قصی رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ :

سب سے پہلے اسلامی سریہ کے سردار

قرشی المطلبی ابو الحارث یا ابو المعاویہ کنیت تھی۔

۶۳ سال کی عمر میں رتبہ شہادت پایا۔

۳۔ عمیر بن ابی وقاصؓ۔ مالک ابن اہیب بن عبد مناف :

سب سے کم سن شاہد ——— ۱۶ سال کی عمر، سعد بن وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کے چھوٹے بھائی۔

رحمتِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں واپس جانے کا حکم دیا تو رو پڑے۔ شوق نے شرفِ قبولیت بخشا ——— اور ابدی مسکراہٹوں سے بھرپور زندگی میں منتقل ہو گئے۔

۴۔ عاقل بن بکیر بن عبد یالیل :

شہدائے رجیع خالدؓ کے بھائی تھے۔

۵۔ عمیر بن عبد عمیر بن نضلہ :

ذو الشمالین لقب تھا۔

۶ - عوف یا عوذ بن عفراء :

انصاری تھے۔

۷ - معوذ بن عفراء :

عوف بن عفراء کے بھائی تھے۔

۸ - حارث یا حارثہ بن سراقہ رضؓ

ان کی والدہ انس بن مالک رضؓ کی پھوپھی تھیں۔

۹ - یزید بن حارث بن قیس بن مالک :

انصاری تھے۔

۱۰ - رافع بن معلیٰ بن لوذان :

انصاری تھے۔

۱۱ - عمیر بن حمام بن جموح بن زید :

میدانِ جنگ میں ان کا رجز تھا۔

رکضا الی اللہ بغیر زاد — الا التقی وعمل المعاد

والصبر فی اللہ علی العباد — وکل زاد عرضۃ النفاد

غیر التقی والبر والرشاد

۱۲ - عمار بن زیاد رضؓ :

انصاری الاشہلی۔

۱۳ - سعد بن خیثمہ الانصاری الدوسی :

ان کے والد خیثمہ غزوۂ اُحد میں شہید ہوئے۔

گویا صحابی ابن صحابی اور شہید ابن شہید کی دوہری سعادت کے مالک۔

۱۴ - مُبشر بن عبد المنذر بن زبیر بن زید :

انصاری الدوسی۔

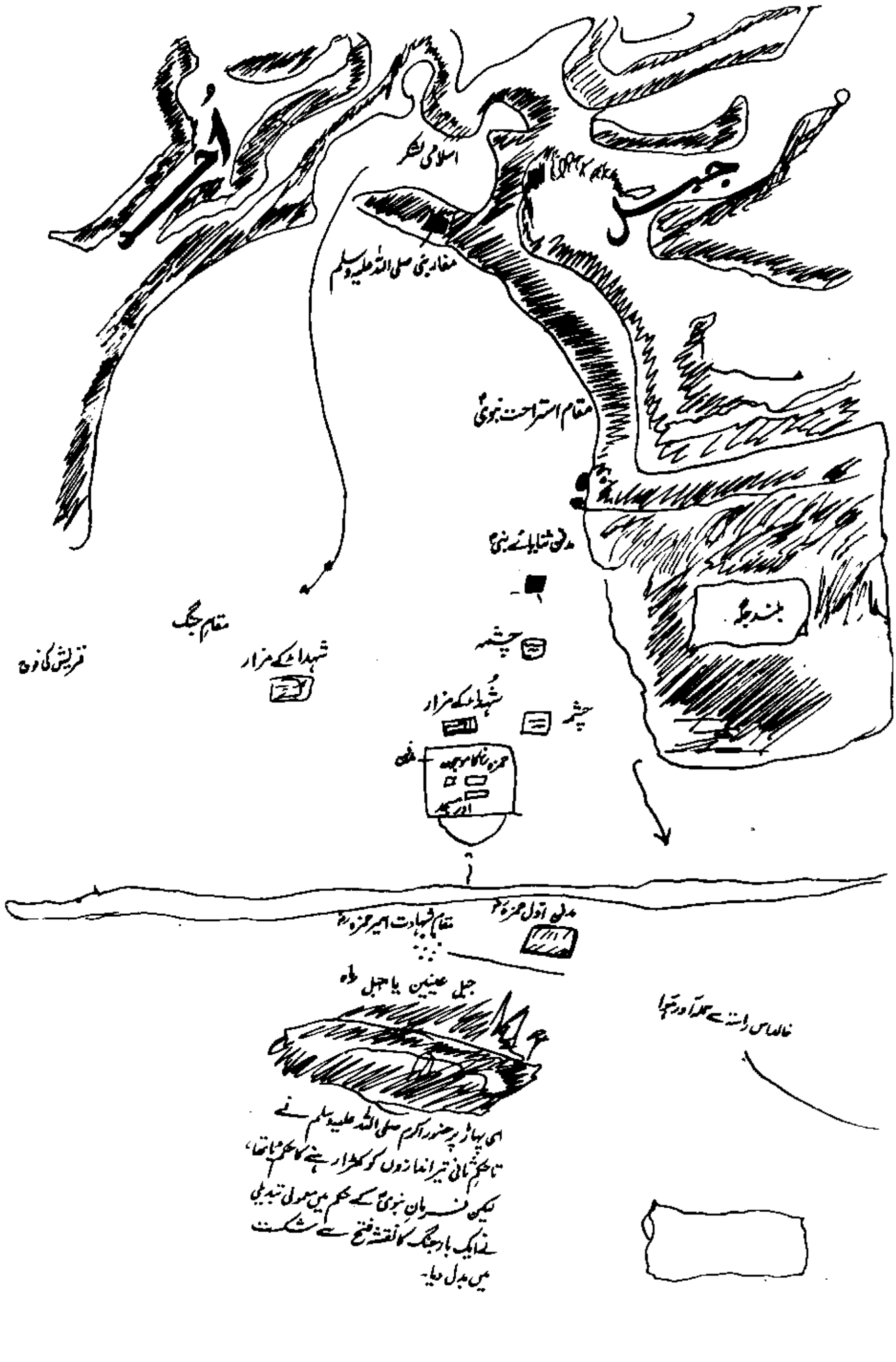
معیار شہادت، معیار وفا و صداقت — خلافتِ الٰہیہ کے ان معماروں سے کوئی سیکھے۔

سلام ان پر — ان کی مقدس ارواح پر

اور اے میدانِ بدر تیرے ذروں پر — تیری ان فضاؤں پر جن میں آج صدائے اللہ اکبر — گونج رہی ہے۔ اور ہبل، لات اور عزیٰ کی لاشیں تڑپ رہی ہیں۔ ان مقدس ذروں کو چومتے۔ ؎ شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن — نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی،

—

(۲) جبل اُحد کا دامن ۷۰ گواہوں کی بستی



جبل احد کا تعارف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی

(۱) اُحد جبل احبنا و نحبہ۔ اُحد پہاڑ کو ہم سے اور ہمیں اس سے محبت ہے۔

(۲) اِنّ اُحداً علی باب من الابواب الجنۃ۔ اُحد پہاڑ جنّت کے دروازوں میں سے ایک دروازے پہ واقع ہے۔

(۳) فاذا جئتموہ فکلوہ ولوکان عضاھہ۔ اور تم جب بھی یہاں آؤ، اس پہ اُگی ہوئی کوئی بھی سبزی، جڑی بوٹی، چاہے وہ سُوکھی جھاڑی کیوں نہ ہو۔ ضرور کھاؤ۔

مدینہ منورہ سے تین میل دُور یہ پہاڑ :

مشاہدہ میں آیا ہے کہ دن کے مختلف اوقات میں اس کی رنگوں میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ کبھی نیلگوں، کبھی عنابی اور کبھی گہری سُرخی مائل کبھی سرمئی کبھی کالا۔

شاید سب کبھی اُسے یاد آتا ہوگا کہ میرے ہی دامن میں رحمتِ دوعالم کے دندانِ مبارک شہید ہوئے اور لب مبارک پہ گہرا زخم آیا۔ خود کی دو کڑیاں رخسار مبارک میں گھس گئیں۔

پھر بھی رحمت و شفقت کے مصدر و منبع محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہی فرماتے رہے۔

اے اللہ میری قوم کو راہِ ہدایت دکھا دے۔ یہ نہیں جانتے کہ کیا کر رہے ہیں۔ انھیں معاف فرما دے "

تو میں سب کچھ دیکھتا رہا۔ خاموش ——— بے جان ——— حکمِ خداوندی سے بستہ و جامد۔

اور پھر جب ابوعامر فاسق کے کھودے ہوئے گڑھے میں شاہِ ارض و سما صلی اللہ علیہ وسلم گرے تو مجھے اتنا غصہ آیا، کہ میرا چہرہ لال ہو گیا۔

آج بھی اس لمحہ کے یاد آتے ہی میرا جسم انگارے کی طرح لال ہو جاتا ہے۔

وہ تو اچھا ہوا۔

رحمتِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے میری کوکھ کے ایک حصہ میں اپنے سر مبارک کو ٹکا کر مجھے تسلی دی۔

اور میں ضبط کر گیا۔

اور پھر میرے بلند و بالا سینے کے ایک کونہ (غار) میں استراحت فرما کر تا قیامت مجھے جو عزّت بخشی۔ وہ لمحہ یاد آتے ہی مجھ پہ خوشی لبریز کر لیتی ہے۔ اُس وقت مجھے جو بھی دیکھتا ہے ——— میری مسکراہٹیں اُسے بہت بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ اور پھر ——— ان تیر اندازوں کی بھول سے اللہ کی وحدانیت اور رسول اللہ کی صداقت کی گواہیاں دینے والوں پر ——— جہالت اور شرک کے ماروں نے کس انداز کا ہلّہ بولا ——— الامان الحفیظ۔

ان لمحوں میں ——— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ——— شیرِ خدا امیر حمزہؓ پہ حبشی کے بزدلانہ حملے ——— ہندہ کے کلیجہ چبانے کو

پھر جسم اطہر کے ساتھ وحشیانہ سلوک کو دیکھ کر مجھ پر جو بیتی ———

بس میں دم بخود رہ گیا۔ جب میں سیاہ اور خوفناک لگتا ہوں تو اصل میں میری یادوں میں وہی لمحات زندہ ہو جاتے ہیں، اور اس المیہ کو دیکھ کر، ضبط و صبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دیکھ کر مجھے نعمت صبر ملی اور میں ایک جامد و ساکت پتھر۔ خاموش رہا۔

اُف، ایسا المیہ کہ تاحیاتِ اقدس ——جب بھی وحشی کو دیکھتے تو صرف اتنا فرماتے۔

"میرے سامنے مت آیا کرو" کبھی نہیں فرمایا "مجھے تم پر غصہ آتا ہے" فرماتے ——"مجھے اپنے پیارے چچا یاد آجاتے ہیں۔"

والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید المرسلین رحمت للعٰلمین۔

"اور پھر میرے لئے سب سے بڑی حوصلہ افزا ——اُن مومنوں کی شہادتیں ہیں جن کے مقدس لہو کو میں نے اپنے ذروں میں آج تک سمویا ہے، میں ان کی عظمتوں کی یادگار رہوں ——

میں ان کی شہادت کے بے مثال اندازوں کی تاریخ ہوں۔

مجھے آج بھی یاد ہے۔ اسلامی لشکر میں خالد کے حملہ سے افراتفری مچ گئی تھی۔ ہبل وعزیٰ، لات ومنات کے پجاری، ایک بار پھر منظم ہو کر ایک اللہ، ایک رسولؐ، ایک کعبہ ——ایک دستورِ حیات کی صداقت کے گواہوں پر ٹوٹ پڑے، تو ذرِ مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کے اردگرد صرف سات جان نثار ڈھال بن گئے۔

ایک ایک نے بڑی جرأت سے ڈٹ کر شہادت دی۔ اشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ واشھد ان محمداً عبدہٗ ورسولہٗ

ان میں سے ایک نے تو آپؐ کے قدمین شریفین میں شہادت پائی اور اس طرح اس شہادت کا شاہد خود اپنے نبی کو بنایا۔

اُمّ عمارہؓ ——حبیب بن زید بن عاصم جنھوں نے مسیلمہ کذّاب کو کیفرِ کردار تک پہنچایا ——اس عظیم بیٹے کی ماں، ملتِ اسلامیہ کی عظیم ماں ——اُمّ عمارہؓ —— حفاظت کے لیے چٹان بن گئیں۔ عمرو بن قمیئہ نے بہت ضربیں لگائیں۔ کندھے پر شدید زخم آئے لیکن جرأت ایمان میں جنبش نہ آئی۔

اور ابو دجانہؓ کی شہادت تو میں بھول نہیں سکتا۔ تیر پہ تیر کھا رہا تھا، جسم چھلنی ہو گیا۔ لیکن صداقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق سے منہ نہیں پھیرا۔

سعد بن وقاص کو رحمتِ دو عالم تیر دیتے جاتے اور فرماتے۔ میرے ماں باپ تم پر قربان تیر چلاتے جاؤ۔

اور طلحہؓ نے کس شان سے ابن قمیئہ کے وار کو جو اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہ کیا تھا، اپنے ننگے ہاتھوں پر جھیل کر کمال کر دیا۔ ان کا ہاتھ کٹ گیا، پھر بھی کہا۔ جسم کا ایک ایک حصّہ کٹ جائے تب بھی زبان وعمل سے صداقتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اعلان ہم نہیں چھوڑ سکتے۔

میرے دامن میں آج وہ ستّر دینِ قیّم کے موحد شہید آرام فرما ہیں۔

۱۔ حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ ہاشمی :

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا سید الشہداء ۔

۲۔ عبداللہ بن جحش الاسدی رضی اللہ عنہ القرشی :

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پھپھیرے بھائی ۔

۳۔ مصعب بن عمیر بن ہاشم بن عبدمناف :

بدر اور اُحد میں علم نبوی انہی کے ہاتھوں میں رہا۔ اُن کی شہادت کے بعد علی شیرِ خدا رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں میں آیا آپ قاری بھی تھے۔

۴۔ شماس بن عثمان بن شرید :

دو ہجرتیں کیں، بدر میں بھی شامل غزوہ تھے ۔

۵۔ انس بن نضر رضی اللہ عنہ

انس بن مالک کے چچا۔ وہ شہید جن کے بارے میں قرآن حکیم کی آیت نازل ہوئی ۔

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۔

۶۔ انیس بن قتادہ رضی اللہ عنہ بن ربیعہ

۷۔ ابو ہبیرہ رضی اللہ عنہ بن حارث بن علقمہ بخاری

۸۔ اوس رضی اللہ عنہ بن ارقم بن زید بن قیس خزرجی

۹۔ ایاس رضی اللہ عنہ بن اوس بن عتیک

۱۰۔ اوس بن ثابت رضی اللہ عنہ مزنی

۱۱۔ رفاعہ بن وقش رضی اللہ عنہ

۱۲۔ ثابت بن وقش رضی اللہ عنہ

۱۳۔ عمرو بن ثابت رضی اللہ عنہ بن وقش

۱۴۔ سلمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ بن وقش

۱۵۔ ثابت بن عمرو رضی اللہ عنہ بن زید عدی

۱۶۔ ثابت بن جراح رضی اللہ عنہ

۱۷۔ ثعلبہ بن سعد رضی اللہ عنہ

۱۸۔ ثقیب بن فروہ رضی اللہ عنہ بن بدنی عدی۔ انساب انصار کے بڑے عالم تھے ۔

۱۹۔ حارث بن اوس رضی اللہ عنہ

۲۰۔ عمرو بن معاذ اشہلی

۲۱۔ حارث بن انس رضی اللہ عنہ

۲۲۔ حارث بن عبداللہ

۲۳۔ حارث بن ثابت رضی اللہ عنہ

۲۴۔ حارثہ بن عمرو رضی اللہ عنہ

۲۵۔ حبیب بن زید رضی اللہ عنہ

۲۶۔ حنظلہ بن ابی عامر

۲۷۔ خارجہ بن زید رضی اللہ عنہ

۲۸۔ سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ

۲۹۔ حباب رضی اللہ عنہ بن قیظی

۳۰۔ صیفی بن قیظی

۳۱۔ خنیثر بن حارث بن مالک اوسی ـــ مدینہ منورہ میں سب سے پہلے مبلغ اسلام ـــ ان کے ساتھ ابو زرارہ بھی تھے ۔

۳۲۔ ذکوان بن عبدقیس بن خلدہ زرقی ـــــــ بیعت عقبہ میں شامل تھے ۔

۳۳ - رافع بن مالک بن عجلان زرقی خزرجی ——— بیعت عقبہ میں شامل تھے۔

۳۴ - رافع مولیٰ غزیہ بن عمرو ——— "

۳۵ - رفاعہ بن عمرو بن زید خزرجی ——— "

۳۶ - سعد یا سعید بن سوید بن قیس بن ابجر ——— غزوۂ بدر میں بھی شامل تھے۔ خدری ہیں

۳۷ - سہل بن عدی بن زید بن عامر اشہلی ——— "

۳۸ - سہل بن قیس بن ابی کعب بن قیس ——— بدری اسلمی

۳۹ - سُبیع بن حاطب بن قیس بن ہُبَیشہ ——— اوسی خاندان سے ہیں

۴۰ - سُوَیبق بن حاطب بن حارث بن حاطب ——— خزرج کے حلیف

۴۱ - صخرہ بن عمرو (لشر)

۴۲ - عبداللہ بن جبیر بن نعمان ——— ساعدی قبیلہ سے ہیں

۴۳ - عبداللہ بن عمرو بن وہب بن ثعلبہ ——— بدری تھے۔

۴۴ - عبداللہ مخذر بن زیاد بلوی ——— بدری ہیں۔

۴۵ - عبادہ بن خشخاش بن عمرو بن زمرہ

۴۶ - لغمان بن عبد عمرو بن مسعود ——— بدری ہیں،

۴۷ - عامر بن اُمیہ بن زید بن خشخاش نجّاری

۴۸ - عبید (عتیک) بن تیہان بن مالک

۴۹ - لیبار

۵۰ - عبید بن معلّٰی بن نودان بن حارثہ

۵۱ - عباس بن عبادہ خزرجی

۵۲ - عامر بن مخلد بن حارث نجّاری

۵۳ - عمرو بن عیاض

۵۴ - عمرو بن مطروف یا مطرف بن علقمہ بن عمرو بن ثقف

۵۵ - عتبہ بن ربیع بن رافع

۵۶ - عیاد بن سہل بن مخرمہ

۵۷ - عبداللہ بن عمرو بن حرام اسہلی

۵۸ - عمرو بن جموع بن زید بن حرام ——— سید الانصار تھے پاؤں میں لنگ تھا۔ فرمایا یوں ہی لنگڑا تا ہوا جنت میں جا پہنچوں گا۔

۵۹ - خلاد بن عمرو بن جموع

۶۰ - الوایمن

۶۱ - عمارہ بن زیاد ——— ان کے جسم پر چودہ زخم تھے، جب ان کی روح نے پرواز کی تو ان کے رخسار حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں پر تھے۔

۶۲ - عمرو بن معاذ بن النعمان
۶۳ - حسیل بن جابر
۶۴ - یمان ابو حذیفہ
۶۵ - یزید بن حاطب بن امیہ
۶۶ - ابو حبہ بن عمرو بن ثابت اخو سعد بن خیثمہ !
۶۷ - عبداللہ بن مسلمہ
۶۸ - وکیبان مولی بنی نجار
۶۹ - مجذر بن زیاد
۷۰ - مالک بن غنیلہ

ان سب پر سلام عقیدت اور وعدہ کیجئے۔ ہم بھی اسی نظام حیات اور وحدت و رسالت کے مصدق و مؤید رہیں گے۔

تھوڑی دیر سید الشہداءؓ کے سر قد پر رکئے۔ یہاں اکثر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آتے اور دعا فرماتے اور قریب کی مسجد میں نماز ادا کرتے۔

نقشہ میں نشان زدہ مقامات پر ایک نظر ڈالئے اور چلتے چلتے جبل اُحد کے بارے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چند ارشادات بھی ملاحظہ کیجئے۔

عمرو بن عوف حدیث بیان کرتے ہیں :
جنّت کے پہاڑوں میں سے چار پہاڑ ہیں۔

(۱) جبل اُحد (۲) جبل طور (۳) جبل لبنان

(۴) جبل ورقان ـــ ورقان سے مراد جبل ابی قبیس، جبل نور حرا، اور جبل ثور۔ بعض نے جبل کعبہ بھی لکھا ہے۔ جس کے پتھر تعمیر بیت اللہ شریف میں استعمال ہوئے ـــ

اس پہاڑ میں نمو پانے والی کوئی جڑی بوٹی کھا نا نہ بھولئے گا۔ اور اب چلئے ـــ شہداء کی تیسری بستی کی طرف۔

اس مقام شہادت کو تاریخ نے اپنے اوراق کی پیشانی پر غزوۂ خندق اور غزوۂ احزاب کے عنوان سے موسوم کیا ہے۔ اس کا محلِ وقوع مدینہ منورہ کے باب برابیخ سے صرف بیس منٹ کے فاصلہ پر جبل سلع کے دامن سے لے کر مقام شیخین تک محیط ہے جہاں خود متعلم مدبر الامور احکم الحاکمین کے محبوبؐ، دین قیّم کے معلّمؐ نے اپنے تین ہزار صحابہ کرام کے ساتھ بھوک، پیاس اور بے حد محنت شاقہ جھیلنے کے بعد دفاعی خندق کھودی۔

خندق کے اس طرف عیسائیوں، یہودیوں اور اپنی اپنی مرضی کے مطابق خود ساختہ معبودوں کی پرستش کرنے والوں، اللہ کے منکروں، فرشتوں اور پیغمبروں کی تعلیم کو بے وقوف لوگوں کے وہم کی میراث کہنے والوں نے قریش کی قیادت میں تیس ہزار افراد پر مشتمل جنگی پڑاؤ ڈال دیا ـــ ان میں سے ہر فرد فنون حرب کا ماہر اور اس وقت دستیاب ہونے والے آلات حرب سے لیس تھا۔ کبھی ایک نہ ہونے والے یہ گروہ (احزاب) صرف اس لیے ایک ہوئے تھے کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کے آنکھوں دیکھے گواہوں کو اپنے سخت سے سخت محاصرہ سے مرعوب کر کے ان کے حوصلے توڑ دیں اور پھر نورِ مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی سیلابی یلغار میں ہمیشہ کے لیے دفن کر دیں۔

تقریباً دو ہفتے، اس طرف مرعوب کن تلواروں، نیزوں اور بھالوں کی نمائش تھی۔

اور اس طرف ناقابلِ تسخیر صبر و استقلال کا مظاہرہ۔

اُس طرف شرابی دھاڑیں تھیں۔ اِس طرف زبانوں پر حمد ذوالجلال اور مدحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

اُس طرف — ان کے دلوں میں قتل و غارت گری کی وحشت رقصاں تھی۔

اِس طرف — احترام آدمیت سے نگاہیں درخشاں تھیں۔

اُس طرف دھمکیاں تھیں۔

اِس طرف — اپنے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے کئے ہوئے عہد و پیماں پر دل و جاں سے نقوش وفا ثبت کرنے کے ناقابلِ تسخیر ارادے!

اُس طرف فضاؤں میں — لات و ہبل کے نعرے تھے۔

اِس طرف اللہ اکبر کی صدا تھی —

اُس طرف سے تیروں، پتھروں اور بھالوں کی بارش ہو رہی تھی۔

اِس طرف — ہر ایک جذبۂ شوقِ شہادت میں سرشار نغمہ سرا تھا۔

نحن الذی بایعوا محمّد　　علی الجھاد ما بقینا ابدا

ہم وہ ہیں جنھوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سروری کو تسلیم کر لیا ہے۔ ہم نے ان کی نصرت کے لیے جہاد کرنے کے لیے اپنی تمام زندگی وقف کر دی ہے۔

اللھم لولا انت ما اھتدینا　　ولا تصدقنا ولا صلینا

اے اللہ اگر تو نے ہمیں ہدایت سے نہ نوازا ہوتا تو ہم کبھی ہدایت نہ پا سکتے تھے اور نہ ہی خیرات کر سکتے اور روزے رکھتے۔!

فَاَنْزِلَنْ سَکِیْنَۃً عَلَیْنَا　　وثبت الاقدام ان لاقینا

سکون اور صبر ہم پہ نازل فرما　－　اور دشمنوں کے مقابلے میں ہمیں ثابت قدمی عطا فرما

ان الاعداء قد بغوا علینا　　اذا ارادوا فتنۃ ابینا

دشمن ہم پر بلا وجہ حملہ آور ہوتے ہیں　－　ان فتنہ گروں کے خلاف ہماری بغاوت ہے

آخر کفار نے تیروں، نیزوں اور پتھروں کی بارش شروع کر دی، خندق پھلانگ کر حملہ آور ہوئے۔ حیدر کرار علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھوں کفار کی قوت کا غرور ایک ہی ہلہ میں زمیں دوز ہو گیا۔

اور فضا میں صدائے اللہ اکبر گونجی — اس غزوہ میں چھ شہدائے کرام نے اپنی جان عزیز قربان کرتے ہوئے اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کے نعرے فضاؤں کے سینے میں ضم کر دیئے۔

(۱) انس بن اوس بن عتیک بن عمرو — انصاری تھے، غزوۂ احد میں شرکت کا اعزاز بھی حاصل تھا۔

(۲) ثعلبہ بن عنمہ بن عدی ——— غزوۂ احد کے غازی ۔ انصاری تھے۔

(۳) کعب بن زید بن قیس بن مالک ——— بیرِ معونہ کے ستر اصحابؓ میں سے بچ نکلنے والے بدر کے غازی انصاری تھے۔

(۴) اسعد بن معاذ بن نعمان ——— تیران کی کلائی پہ لگا۔ ایک ماہ تک زیرِ علاج رہے۔ دو مرتبہ شافع محشر صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مرہم پٹی کی مگر اللہ تعالےٰ نے انھیں اس زخم کے سبب شہادت نصیب فرمائی اور حضورؐ نے فرمایا: "اھتزلہ عرش الرحمٰن"۔
(ان کی شہادت پر عرشِ الٰہی جھوم اٹھا۔)

(۵) عبداللہ بن سہیل بن زید ——— انصاری تھے۔

(۶) طفیل بن مالک بن نعمان ——— انصاری تھے۔

اب کے خدائے ذو الجلال کو کفر کی بربریت پر غصہ آیا۔ خوفناک آندھی نے ان کے حوصلے پست کر دیئے اور پھر قریش کے جوش اور قوت کا مدفن ——— یہی خندق ہمیشہ کے لیے مقدر ہو گئی۔

جس پر ارشادِ نبویؐ نے مہرِ تصدیق ثبت فرمادی۔ "نغزوھم ولا یغزوننا" آج کے بعد ہم قریش پر دھاوا بولیں گے اور وہ کبھی ہم پر حملہ نہیں کر سکیں گے۔

مدینہ منورہ سے تین میل دُور عریض کے مقام پر واقع نخلستان پہ ابوسفیان نے دھاوا بولا۔ بوکھلاہٹ میں دو افراد کو شہید کر دیا۔

ان میں ایک کا نام ——— سعد بن عمرو الانصاری

۲ ——— ان کے دوسرے ساتھی کا نام نہیں ملتا۔

ماراَ ستین یہ شہید ——— یوم رجیع کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ عضل و قارہ کے سات آدمی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا۔ ہمارے ساتھ چند ایسے آدمی بھیجئے جو دین اسلام کی خوبیاں ہمیں سمجھا سکیں قرآن کے احکامات سمجھا سکیں۔ آپ نے ان کی بات پہ یقین کر کے عاصم بن ثابتؓ کو جماعت کا امیر بنا کر بعض روایات میں دس بعض میں چھ اور بعض میں آٹھ صحابہ کرامؓ کو ان کے ساتھ روانہ کیا۔ چشمۂ رجیع پہ پہنچتے ہی ——— جو عسفان اور مکہ کے درمیان ہے بنو لحیان کے (جن کے ساتھ مل کر یہ سازش کی گئی تھی) آدمیوں نے انھیں گھیرے میں لے لیا، چار تو وہیں شہید ہو گئے مگر تین کو مکار گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ عبداللہ بن طارقؓ نے مرّالظہران کے مقام پر اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش میں شہادت پائی۔ لیکن خبیب رضی اللہ تعالےٰ عنہٗ اور زید رضی اللہ تعالےٰ عنہٗ کو ساتھ لے جانے میں کامیاب ہو گئے۔ شہداء کے اسمائے گرامی:

(۱) عاصمؓ بن ثابت بن ابی الاقلح ۔ (۲) مرثدؓ بن ابی مرید الغنوی (۳) خالدؓ بن بکیر اللیثی (۴) خبیبؓ بن عدی ۔ (۵) زید بن الدثنہ (۶) معتبؓ بن عبید (۷) عبداللہ بن طارق (۸) زیدؓ بن مزین انصاری بیاضی!

واقعہ کی پوری نوعیت سے ثابت ہوتا ہے کہ دشمنانِ دین جب اپنی کوششوں میں ناکام ہوتے ہیں تو پھر اس طرح مارِآستین

بن کر بھی ڈستے ہیں۔

ایک اور دام تزویر رجیع کے واقعہ کے چند دنوں بعد ہی ابو براء عامر بن مالک کلابی نے بالکل اسی طرح کی سازش سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تبلیغ اسلام کے سلسلہ میں اپنے ساتھ صحابہ کرام کو بھیجنے کی درخواست منظور کروالی۔ آپؐ نے منذرؓ بن عمرو انصاری جو عمر فاروق کے خسر اور عاصمؓ بن عمرؓ کے نانا تھے) کی امارت میں ۷۰ صحابہ کرام کو روانہ کیا۔ ان میں سے چند کے اسمائے گرامی یہ ہیں:۔

(۱) منذر بن عمرو بن خنیس انصاری (۲) حکم بن کیسان۔ ہشام مخزومی کے غلام تھے۔ نخلہ میں اسیر ہو کر مشرف بہ اسلام ہوئے۔ دوسرے لفظوں میں آزاد ہوئے (۳) حرام بن ملحان (۴) سلیم بن ملحان (حرام بن ملحان کے برادر شفیق) (۵) حارث بن صمہ انصاری (۶) ثابت بن خالد بخاری (۷) عامر بن فہیرہ (ہمرکاب ہجرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم) (۸) عروہ بن اسماء بن صلت (۹) عائذ بن ماعص بن قیس (۱۰) معاذ بن ماعص بن قیس (۱۱) مسعود بن قیس (۱۲) سفیان بن ثابت انصاری (۱۳) مالک بن ثابت (۱۴) سفیان بن حاطب (۱۵) سہیل بن عامر (۱۶) سعد بن عمرو (۱۷) طفیل بن سعد (۱۸) سہیل بن عمر ثقفی (۱۹) قطبہ بن عبد عمرو بن مسعود (۲۰) منذر بن محمد بن عقبہ (۲۱) نافع بن بدیل بن ورقہ (۲۲) انس بن معاویہ (۲۳) اُبی بن ثابت بن منذر (۲۴) ابی بن معاذ بن انس (۲۵) ابی بن معاذ کے بڑے بھائی (۲۶) مسعود بن خلدہ بن عامر بن زریق۔ اس کے علاوہ باقی شہدائے کرام کے نام بتصدیق نہیں ملتے۔ جب یہ تمام بزرگ ہستیاں بئر معونہ پہ پہنچیں (جو بنی عامر اور بنی سلیم کے علاقہ کے درمیان واقع ہے) تو بنو عامر کے رئیس عامر بن طفیل نے بنو سلیم کے قبیلے عصیہ، رعل اور ذکوان کے آدمیوں کے ساتھ مل کر ان نہتے صحابہ کرام کو شہید کر دیا۔ کعب بن زید جن کو یہ لوگ مردہ سمجھ کر چھوڑ گئے تھے، بچ گئے اور منذرؓ بن محمد کے ساتھ امیہ بن عمرو ضمری جو اس وقت اُونٹ چرانے نکل گئے تھے۔ لیکن مقام مقتل پہ پہنچے تو منذر بن عمرو کو بھی شہید کر دیا گیا۔ لیکن عمرو بن اُمیہ انصاری کو عامر نے یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ میری ماں نے قبیلہ مضر میں سے کسی ایک کو چھوڑنے کی منت مان رکھی ہے۔ جاؤ تم کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔

بقیہ کے نام تاریخ کے اوراق پہ نہیں تو نہ سہی لیکن اللہ کی کتاب میں ان کا نام بھی موجود ہے۔ اور وہ خود بھی زندۂ جاوید ہیں ——— اللہ تعالیٰ ان سب سے راضی اور یہ سب اپنے اللہ سے راضی ——— بدبخت تو وہ لوگ تھے جو اسلام دشمنی میں انسانیت کا دامن بھی اپنے ہاتھ سے چھوڑ بیٹھے اور آخر کار انھیں اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی رسوائی کے سوا کچھ نہ ملا۔

شہید مریسیع ہشام بن لیثی ——— (مریسیع ایک چشمہ کا نام ہے۔ جو مدینہ منورہ سے سو میل جنوب مغرب میں ساحل کی طرف واقع ہے۔

شہدائے بنو قریظہ

(۱) خلاد بن سوید

(۲) سنان بن محصن

غزوۂ غابہ کے شہید ایک چراگاہ جو مدینہ منورہ سے بارہ میل کے فاصلہ پہ ہے۔

(۱) زربن ابوذرؓ (۲) محرز بن نضلہ (۳) وقاص بن محرز۔

ذی القصّہ مدینہ منورہ سے چوبیس میل دُور نجد میں بنو ثعلبہ کا ایک موضع ذی القصّہ کے نام سے مشہور تھا۔
(۱) سلکان بن سلامت (۲) حارث بن اوس (۳ اور ۴) قبیلہ مزنیہ کے دو افراد (۵) بنو غطفان ـ کا ایک فرد۔

سریہ وادی القریٰ مدینہ منورہ سے ۱۲۵ میل شمال کی طرف فدک اور رنبائے کے درمیان ایک وادی!
(۱) ورد بن مرداس۔

عرنیین (۱) یسار نوبی۔
مدینہ منورہ سے چھ میل دُور، قباء سے آگے ایک چراگاہ۔

خیبر یہودیوں کا ایک قلعہ جو مدینہ منورہ سے سو میل دُور شمال میں واقع ہے۔ اس فتح کے بعد اسلام کی ملکی اور سیاسی حالت کا نیا دور شروع ہوتا ہے۔ اس لیے کہ عرب میں یہودی قوت کا یہ سب سے بڑا مرکز تھا۔ جب بنو نضیر کے لوگ خیبر میں آکر آباد ہوئے تو انھوں نے تمام عرب کو اسلام کی مخالفت پہ اسی طرح آمادہ کر لیا جس طرح آج فلسطین میں یہودیوں نے عیسائیوں اور دوسرے مشرکوں کو اسلام دشمنی میں اپنے ساتھ ملا لیا ہے۔ اس قلعہ کی فتح و نصرت کا سہرا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے سر ہے۔

(۱) اوس بن حبیب ــــــــــ انصاری

(۲) اوس بن فاتک ــــــــــ انصاری

(۳) اوس بن عائذ ــــــــــ (۴) اسلم ــــــــــ خیبر کے کسی یہودی کے غلام، میدانِ خیبر میں ہی اسلام لائے اور اُسی روز شہید ہو گئے۔ (۵) ثابت بن واثلہ ــــــــــ (۶) حارث بن حاطب ــــــــــ انصاری حدیبیہ، اُحد اور خندق کے غازی (۷) رفاعہ بن سرو ــــــــــ بنو اسد سے ہیں (۸) ربیعہ بن اکثم بن سنجرہ ــــــــــ (اسدی مہاجر) ابو یزید کنیت۔ بدر، اُحد، اور خندق کے غازی (۹) سلیم بن ثابت بن وقش بن زغبہ ــــــــــ اُحد، خندق اور حدیبیہ کے غازی (۱۰) عامر بن اکوع ــــــــــ مشہور پہلوان صحابی سلمی بن عمرو کے چچا (۱۱) عبداللہ بن ابو اُمیہ بن وہب (۱۲) عبداللہ بن حبیب بن اُہیب ــــــــــ (اسعدی الحبشی) (۱۳) عدی بن مرہ سراقہ بن حباب (بلوی) (۱۴) عروہ بن مرہ بن سراقہ انصاری (۱۵) عمارہ بن عقبہ ــــــــــ (بنو عصار کے فرد) (۱۶) ابو سفیان بن حارث (۱۷) عمیر بن ثابت (انصاری، اوسی، بدر، اُحد، خندق اور حدیبیہ کے غازی) (۱۸) مسعود بن سعد بن عامر انصاری (۱۹) محمود بن مسلمہ (۲۰) زنیف بن وائلہ (۲۱) نیف بن حبیب۔

سریہ حزبہ مرداس بن نہیک بن مرداس ــــ
بنو فزارہ میں سے تھے

ابن ابی العرجاء (۱) حرم بن ابی العرجاء

شہیدا طلح (۱) کعب بن عمیر ــــ (غفاری انصاری صحابہ کبار میں سے تھے۔ باقی آٹھ شہیدوں کے اسماء کتب سیرۃ سے نہیں ملے)

شُہدائے موتہ

موتہ شام میں ایک مقام کا نام ہے۔ جو بلقاء سے آگے آتا ہے۔ عرب کی مشرقی تلوار یں یہیں بنتی تھیں۔ اس مہم کا آغاز حارث بن عمیر کی شہادت کے قصاص کی بنا ء پر ہوا۔ قیصر روم کے تحت بلقاء کے رئیس شرجیل بن عمرو نے سفارتی آداب کے خلاف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام بردار اور صحابی حارث بن عمیر رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا تھا۔ گو یہ مہم قصاص کی غرض سے تھی لیکن چونکہ تمام مہمات کا اصل مقصد تبلیغ اسلام تھا اس لیے ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہوا: "پہلے ان کو دعوتِ اسلام دی جائے۔ اگر وہ اسلام قبول کر لیں تو جنگ کی ضرورت نہیں۔" ثنیۃ الوداع تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انہیں الوداع کہنے تشریف لائے۔

(۱) زید بن حارثہ بن شرحبیل الکلبی :- باپ کی طرف سے ان کا سلسلۂ نسب قضاعہ اور والدہ کی طرف سے سعدی بنت ثعلبہ تک جا ملتا ہے۔ ان کو ان کی والدہ سے راہزنوں نے چھین کر بیچ دیا۔ بازارِ عکاظ میں حکیم بن حزام نے اپنی پھوپھی خدیجۃ الکبریٰ کے لیے خرید لیا۔ ام المومنین نے ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہبہ کر دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کمال شفقت سے پرورش کیا۔ ان کے والد اور چچا ان کو لینے آئے، تو انھوں نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر جانا پسند نہ کیا۔ بدر میں حاضر ہوئے۔ سات سرایا میں امیرِ لشکر بنا کر بھیجے گئے۔ امام زہری کی روایت کے مطابق سب سے پہلے یہی اسلام لائے۔ مسلمانوں میں صرف انہی کا نام قرآنِ پاک میں آیا ہے۔ انعام یافتۂ خدا اور انعام یافتۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ ان کے فرزند اسامہ تھے جو اُم ایمن کے بطن سے تھے۔ وہ حبِّ رسول اللہ کے لقب سے ملقب تھے۔ حضرت زیدؓ کو مواخات میں حضرت حمزہؓ کا بھائی بنایا گیا تھا اور مقدمہ حضانت دخترِ حمزہ میں ان کو انت اخونا مولانا کا خطاب ملا۔ الاستیعاب میں ہے کہ ایک بار انھوں نے مکہ سے طائف تک ایک خچر کرایہ پر لیا۔ خچر والا راہزن تھا۔ وہ ایک ویران جنگل میں لے گیا۔ جہاں لاشیں ہی لاشیں تھیں۔ اس نے آپؓ کو قتل کرنا چاہا۔ آپؓ نے کہا کہ مجھے دو رکعت نماز پڑھ لینے دو۔ اس نے کہا کہ یہ لاشیں بھی سب کی سب نمازہی پڑھنے والوں کی ہیں۔ آپؓ نے نماز کے بعد یا ارحم الراحمین تین بار کہا تو جبرئیل علیہ السلام نے ڈاکو کو قتل کر دیا۔

(۲) جعفر طیار بن ابی طالب بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ :- یہ وہی ہیں جو دربارِ حبشہ میں مسلمانوں کے امیر بن کر گئے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عم زاد ہیں۔ غزوہ موتہ میں حضرت زیدؓ کے بعد آپؓ ہی امیرِ لشکر منتخب ہوئے۔

(۳) عبداللہ بن رواحہ بن ثعلبۃ الخزرجی : یہ از دو از دہ نقبائے محمدیؐ - بیعت عقبہ اور غزوات بدر، احد، خندق حدیبیہ و عمرۃ القضا میں شامل تھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص شعراء میں سے تھے۔ بیحد ریاضت کش تھے۔ ابوالدرداء سے روایت ہے کہ ہم لوگ بیحد گرم دن میں سفر کر رہے تھے۔ سخت گرمی کا

عالم تھا۔ اس روز تمام لشکر میں صرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عبداللہ بن رواحہ روزہ سے تھے۔

جنگ موتہ کے لیے جب لشکر روانہ ہونے لگا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو خیر و برکت کی دعا دی تو انھوں نے فی البدیہہ یہ شعر پڑھے۔

اُسکنني اَسَالُ الرَّحمٰنَ مغفرۃ ۔ وضربۃً ذاتَ فَزغٍ تقذف الزبدا

ترجمہ:۔ میری تو بارگاہِ رحمٰن سے درخواست ہے کہ وہ میری مغفرت کریں اور میرے سر پر ایسی چوٹ لگے جو کھوپڑی توڑ ڈالے۔

وطعنۃ بیدی حران مجھزۃ ۔ بحربۃ تنفذ الاحشاء والکبدٌ

نیزہ اور تلوار میرے دل و جگر کو چھید ڈالیں۔

حتی یقولوا اذا مرّ واعلیٰ جَدَثِي ۔ یا اَرْشَدَ اللہ من غازٍ وقد رشدا

اور میری لاش دیکھ کر لوگ کہیں صد آفریں غازی بڑی شان سے لڑا اور شہادت پائی آپ کی دعا قبول ہوئی اور جب حضرت زید رضہ اور جعفر طیار رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعد ان کو کمان ملی، تو اسی شان سے جان عزیز قربان کر دی۔

(۴) جعفر بن ابی صعصعہ المازنی الانصاری (۵) ابو کلاب بن ابو صعصعہ (۶) سراقہ بن عمرو بن عطیہ (۷) عباد بن قیس بن عبسہ (۸) وہب بن سعد بن ابی سرح القرشی (۹) مسعود بن سوید بن حارثہ (۱۰) مسعود بن الاسود بن حارثہ (۱۱) عبادہ بن قیس بن زید بن اُمیہ الانصاری (۱۲) سوید بن عمرو (۱۳) ہویجہ بن بجیر بن عامر الضبتی!

شہدائے حنین حنین، مکّہ اور طائف کے درمیان ایک وادی کا نام ہے۔ اس مقام کو اوطاس بھی کہتے ہیں یہاں ثقیف اور ہوازن دو قبیلوں اور مکّہ کے منافقین کی اجتماعی کوشش تھی۔ چنانچہ اس جنگ میں ایک بار تو مجاہدین میں بھگدڑ مچ گئی لیکن آخر کار فتح حق کو نصیب ہوئی۔

(۱) ایمن بن عبد حبشی (۲) حویرث بن عبداللہ بن علف (۳) مرہ بن سراقہ (۴) سراقہ بن حباب (۵) سراقہ بن حارث عدی (۶) یزید بن زمعہ بن اسود بن مطلب۔

اسی جنگ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاعی ہمشیرہ شیما بھی اسیر ہو کر آئیں۔ آپ نے انھیں عزت و احترام سے ان کی خواہش کے مطابق وطن واپس بھیج دیا۔

شہدائے طائف جنگ حنین میں شکست کھانے کے بعد اسلام دشمن فوج طائف میں پناہ گزین ہو گئی اور جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اس مقام کو طائف اس لیے کہتے ہیں کہ اس کے ارد گرد شہر پناہ کے طور پر چار دیواری تھی۔ یہ وہی مقام ہے جہاں آپ کو پتھر مار کر سر تا پا لہولہان کر دیا گیا تھا۔ (۱) حارث بن سہل بن ابو صعصعہ (۲) حباب بن جبیر،

(۳) عرفطہ بن حباب (۴) صبیح بن عبداللہ بن حارث (۵) رقیم بن ثابت (۶) ثابت بن جذیع (۷) سعید بن سعید بن عاص بن امیہ (۸) عبداللہ بن الرامیہ (۹) عبداللہ بن حارث بن عبدالمطلب (۱۰) سائب بن حارث بن قیس بن عدی (۱۱) عبداللہ بن عامر (۱۲) عبداللہ بن قوال بن قیس بن وقش (۱۳) منذر بن عبداللہ بن قوال۔

اسلام کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا جب اس جنگ میں قلعہ شکن آلات دبابہ اور منجنیق استعمال کئے گئے۔ دبابہ پر اہل قلعہ نے لوہے کی گرم سلاخیں برسائیں اور اس شدت سے تیر باری کی کہ مجاہدین کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ مذکورہ شہداء کے علاوہ بہت سے زخمی ہوئے۔

بیس دن کے بعد محاصرہ اُٹھا لیا گیا، اور روانہ ہوتے ہوئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دُعا دی۔

اللھم اھد ثقیفاً وائت بھم ـــ اے اللہ ثقیف کو ہدایت سے نواز اور انھیں میرے پاس آنے کی توفیق عطا فرما۔

(۱) ان کے علاوہ محلہ قینقاع میں ایک مسلمان عورت سے یہودیوں کی شرمناک شرارت پہ احتجاج کرنے والا عزت مند مسلمان بھی شہید ہوا۔ جس کا نام تاریخ اور کتب سیرۃ میں نہیں ملتا۔

(۲) مخیریق ــ ایک یہودی عالم جو غزوہ احد میں شریک ہوا۔ شہادت پائی اور شہادت گاہ میں آنے سے پہلے اپنی تمام جائیداد سرکار دو عالمؐ کے نام وقف کر آیا۔

(۳) بشیر بن براء بن معرور ـــ دھوکے سے زہر آلود کھانا کھلانے سے موت واقع ہوئی۔

(۴) طفیل بن النعمان بن خنسہ!

(۵) مسعود بن خلدہ (۶) عبداللہ بن سعید بن العاص (۷) مسعود بن الاسود بن حارثہ (۸) ہبار بن سفیان بن اسد!

گویا تمام غزوات اور سریوں کے علاوہ کسی دوسری نوعیت میں کل شہید ہونے والوں کی تعداد ۲۵۹ کے لگ بھگ ہے اور اس کے مقابلہ میں اسلام دشمنوں کی اموات ۷۵۹ کے لگ بھگ ہیں۔

ان اعداد کا بنظرِ غائر جائزہ لیجئے اور غور فرمائیے۔ آخر وہ کون سی قوت تھی، وہ کون سی خواہش تھی، وہ کون سی تمنا تھی جس نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حلقۂ بگوش صحابہ کی شہادتوں کو تمام دنیا کی اُمتِ مسلمہ کی تعمیر کا موسس بنایا ـــ تو سُنیے ـــ انھیں کی زبانی سُنیے:

اللھم انہ لاخیر الا اٰخرہ + فبارک فی الانصار والمھاجرہ

اللہ کی تمام برکتیں اور بھلائیاں تو آخرت کی زندگی میں ہیں۔ اللہ انصار اور مہاجر کے اعمال کو اپنی برکتوں سے نواز دے۔

اعنی الرسول فان اللہ فضلہ ـــ علی البریہ بالتقوی و بالجود

ہم نے اپنے اللہ کے فضل کی اعانت کی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اعانت کی جو سراپا نیکی، تقویٰ اور سخاوت ہیں۔

مستعصمین بحبل غیر منجذم　　　مستحکم من حبال الله ممدود

ہم نے اللہ کی اٹوٹ رسّی کو تھاما ہے　　　اللہ کی رسّی جو ہمیشہ قائم و دائم اور مضبوط تر ہے

نورا اضاء علی البریة کلها　　　من یهد للنور المبارک یهتد

نیکیوں نے اسی لیے اُس ہستی صلی اللہ علیہ وسلم، بدامان اُس کی مبارک ہدایت جسے نصیب ہوئی وہ ہم ہیں۔

یارب فاجمعنا معا و نبینا　　　فی جنة تثنی عیون الحسد

اے رب ہیں قیامت کے دن دشمنوں کی نظر سے بچا کر اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مددگاروں میں شامل فرمانا۔ آمین!

یا لله ما حملت انثی ولا وضعت　　　مثل النبی رسول الرحمة الهاد

اے اللہ رسول رحمتؐ جیسا راہنما۔ بہترین ہادی آج تک نہ کسی ماں نے جنا اور نہ ہی متحمل ہوئی۔

دعاه الٰه الحق ذوالعرش دعوة　　　الی جنة یرضی بها وسرور

ہر شہید کو عرش مجید کے سچے مالک اللہ نے پکارا، اور وہ ہنستا مسکراتا چلا۔ یہاں تک کہ جنّت میں داخل ہوگیا۔

کفرتم بالقرآن وقد اتیتم　　　بتصدیق الذی قال النذیر

اے دشمنانِ اسلام تم ہی اور ہم ہیں حدِ فاصل یہ ہے کہ تم نے قرآن کے احکامات ماننے سے انکار کیا اور ہم نے نذیر و بشیر صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فرمایا ــــ اس کی اپنے خون سے وضو کر کے تصدیق کی۔

شهدت باذن الله ان محمدا　　　رسول الذی فوق السموات من عل

"ہم نے اللہ کے حکم سے گواہی دی۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آسمانوں اور زمینوں کے مالک اللہ کے سچے رسولؐ ہیں"

نصر الاله للنبی و دینه　　　واکرمنا باسم معنے ماله مثل

ہم تو گھٹیا تھے لیکن اللہ تعالیٰ (اور) اس کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے دین کی حمایت کر کے ہمیں بے مثال تکریم ملی۔

کنا ملوک الناس قبل محمد　　　فلما اتی الاسلام کان لنا الفضل

ہم تو لوگوں کے غلام تھے۔ سرورِ دوعالم کی غلامی کا شرف ملا ہم مسلمان ہوئے تو تمام عزتیں ہمارا نصب العین بن گئیں۔

الله اکرمنا بنصر نبیه　　　وبنا اقام دعائم الاسلام

اللہ تعالیٰ کے کرم سے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت سے ہم نے اسلام کے ستون قائم کیے!

یتلو علینا النور فیها محکما　　　قسما لعمرک لیس کالاقسام

وہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو ہمیں ایسا نور بخشتا ہے جس میں زندگی کی کامرانیاں کس طرح حاصل کی جاتی ہیں اس کے واضح اور محکم احکام موجود ہیں اور تمھاری عمر کی قسم وہ بے مثال ہیں۔

وبنا اعز نبیه وکتابه　　　واعزنا بالضرب والاقدام

ہم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کی کتاب اور عزت کو جہاد اور مسلسل پیش قدمی کا ہدیہ پیش کیا ہے۔

ان اشعار سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام مجاہدوں کو نہ دنیا کے وقار، نہ دنیا کے مال، نہ دنیا کی آسائشوں سے دلچسپی تھی بلکہ انھیں یقین تھا کہ موت کے بعد کی زندگی ہے۔ اللہ تعالیٰ محاسب ہیں۔ وہ ہر لمحہ ہر جگہ دیکھتے ہیں۔ وہ ہر بات سنتے ہیں۔ کاش ہم اپنے ان محسنوں کی جنھوں نے اپنے خون سے وضو کرکے ہمیں مسلمان اور مومن ہونے کے انداز سکھائے؛ پیروی کرتے اپنی آخرت سنوار سکیں۔ حکیم الامت علامہ اقبال مرحوم کی ایک دردبھری آواز بھی سن لیجئے:

اہلِ حق را رمزِ توحید از بر است ۔۔۔ در آتی الرّحمٰن عبداً مضمر است
دیں ازو حکمت ازو آئیں ازو ۔۔۔ زور ازو قوت ازو تمکیں ازو
تو ہمی دانی کہ آئینِ تو چیست؟ ۔۔۔ زیرِ گردوں سرِّ تمکینِ تو چیست؟
آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم ۔۔۔ حکمت او لایزال است و قدیم
نسخۂ اسرارِ تکوینِ حیات ۔۔۔ بے ثبات از قوتش گیرد ثبات
حرف او را ریب نے تبدیل نے ۔۔۔ آیہ اش شرمندۂ تاویل نے
نوعِ انساں را پیامِ آخریں ۔۔۔ حامل او رحمۃٌ للعالمین

تا شعارِ مصطفیٰؐ از دست رفت
قوم را رمزِ بقا از دست رفت

اسلام کا نظامِ اقتصاد

محمد ایوب قادری

اسلام دینِ فطرت ہے [illegible] انسانیت کی فلاح و بہبود اس کا مقصد ہے اسلام کے اقتصادی نظام میں زراعت، تجارت اور صنعت و حرفت کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان شعبوں کے بارے میں واضح لائحہ عمل ملتا ہے تاکہ کسی پر ظلم اور زیادتی نہ ہو اور معاشرہ آزادی سے پھل پھول سکے اسلام نے آجر اور اجیر اور سرمایہ دار اور مزدور کے مسائل سے اعتنا کیا ہے اور ایسے واضح اصول متعین کئے ہیں کہ جن پر عمل کرنے سے مفاسد کا سدباب ہو جاتا ہے۔ یہاں ہم نے زراعت، تجارت صنعت اور اجرت کے تحت اسلام کے اقتصادی نظام کا مختصر طور سے جائزہ لیا ہے۔

زراعت

اگر ہم اسلام سے قبل عرب کی زراعت پر نظر ڈالیں تو ہمیں خاص خاص مقامات کا جائزہ لینا ہو گا۔ اول طائف کو لیجئے کہ وہاں بنو عامر زمینوں کے مالک تھے اور بنو ثقیف غریب تھے۔ بنو ثقیف نے بنو عامر سے معاہدہ کیا کہ ہم پیداوار کا کچھ حصہ دیں گے ہمیں زمین برائے کاشت دی جائے اس طرح بنو ثقیف نے بنو عامر کی زمینوں پر کاشت کی آہستہ آہستہ بنو ثقیف کی حالت اچھی ہو گئی اور خود بنی عامر اپنی سستی کاہلی اور عیاشی کی وجہ سے کمزور ہو گئے بنو ثقیف نے بنو عامر کو شکست دی اور خود صاحبِ اقتدار ہو گئے یہ زراعت کے برکات تھے۔

مکہ ایک وادی غیر ذی زرع ہے۔ یہاں زراعت کے امکانات نہیں اور یہاں تجارت ہوتی تھی۔

مدینہ کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ خاص طور پر کسانوں کا شہر تھا۔ یہاں کے لوگ زراعت پیشہ اور اچھے کاشتکار تھے۔ زراعت کی باریکیوں سے واقف تھے مدینہ کے قرب و جوار میں نخلستان تھے۔ جو اور گیہوں کی کاشت ہوتی تھی۔ بہت سے کھیت اور باغات تھے جہاں کھجور، انجیر، انگور اور شفتالو وغیرہ پیدا ہوتے تھے۔

مدینہ میں لگان ادا کرنے کا طریقہ

عام طور سے اس وقت لگان ادا کرنے کے چار طریقے رائج تھے۔

۱۔ کاشتکار جو زمین کاشت کے لئے زمیندار سے لیتا اس کے عوض زمیندار کی کسی قدر خاص زمین پر محنت

کرکے اس میں کاشت کرتا اور یہ کاشت بطور لگان ہوتی۔

۲۔ کبھی خشکی کا حصہ کاشت کار کو ملنا اس طرح لگان کی ادائیگی سمجھ لی جاتی۔

۳۔ کبھی پیداوار کا ایک حصہ زمیندار لے لیتا مثلاً تہائی چوتھائی وغیرہ۔

۴۔ کبھی کاشت کار لگان میں پیداوار کا کچھ حصہ ادا کرتا اور کبھی زمین کے معاوضہ میں دوسری پیداوار کھجور وغیرہ دیتا خاص بات یہ ہے کہ زر، سونا یا چاندی لگان کی شکل میں دینے کا رواج تھا۔

عہد اسلام میں زراعت

اسلام کے نظام معیشت میں زراعت کی قدر وقیمت تجارت سے کم نہیں ہے قرآن میں متعدد مقامات پر زراعت کی فضیلت اور اس کی اہمیت کا سراغ ملتا ہے۔

ایک جگہ ارشاد ہے۔

وھوالذی انشاء جنت معروشات والنخل والزرع مختلفًا اکلہ والزیتون والرمان متشابھا وغیر متشابہ کلوا من ثمرہ اذا اثمر	وہ خدا ہی تو ہے جس نے باغات لگائے جن میں ٹٹیوں پر چڑھائے ہوئے بھی ہیں اور بن ٹٹیوں پر چڑھائے ہوئے بھی ہیں۔ کھجور کے درخت اور کھیتی اگائی جن کے مزے مختلف ہیں۔ نیز زیتون اور انار کے درخت اگائے بعض تو مزے اور شکل میں یکساں ہوتے ہیں اور غیر یکساں بھی اور جب پھل پک جائیں تو انہیں کھاؤ

——— سورہ انعام آیت ۱۴۱

دوسری جگہ ارشاد فرمایا

فلینظر الانسان الی طعامہ انا صببنا الماء صبًا ثم شققنا الارض شقا فانبتنا فیھا حبًا وعنبا وقضبا وزیتونا ونخلا وحدائق غلبا وفاکھۃ وابًا متاعا لکم ولانعامکم	انسان کو چاہیئے ذرا اپنے کھانے پر بھی نظر ڈالے ہم نے زور و شور سے پانی برسایا اور زمین کو پھاڑ ڈالا پھر زمین سے انگور، کھجور، زیتون، ترکاری اور اناج اگائے اور گھنے باغات اگائے اور میوے اور چارہ بھی جو تمہارے اور تمہارے جانوروں کے کھانے کیلئے ہے۔

——— (القرآن)

کہیں ارشاد خداوندی ہے۔

ءانتم تزرعونہ ام نحن الزارعون ٥ لو نشاء لجعلناہ حطاما فظلتم تفکھون انا لمغرمون بل نحن محرومون ٥ ۵۶/۶۷	بتاؤ تم جو کھیتی کرتے ہو اس کو تم پیدا وار بناتے ہو یا ہم بناتے ہیں اگر ہم چاہیں تو اس کو چورا چورا کر دیں اور تم باتیں بناتے رہ جاؤ کہ بلا شبہ ہم پر تاوان ڈالا گیا بلکہ ہم تو محروم رہ گئے

——— (القرآن)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زراعت کے متعلق گرانقدر ارشاد فرمائے ہیں۔

ارشاد نبوی ہے۔

"تم اپنی روزی زمین کی پوشیدگیوں میں تلاش کرو۔"

امام سرخسی اس کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ زمین کی پوشیدگیوں میں روزی تلاش کرنے سے مراد زراعت ہے۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب کوئی مسلمان درخت لگاتا ہے یا کوئی زراعت کرتا ہے پھر کوئی پرندہ یا آدمی یا جانور اس میں سے کھالیتا ہے تو یہ اس شخص کے لئے صدقہ ہے۔ (بخاری)

علامہ عینی اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں کہ چونکہ زراعت کا فائدہ ہر مومن و کافر بلکہ ہر جاندار کو پہنچتا ہے اس لئے اس پر اجر ملنے کے واسطے کسی ارادہ کو دخل نہیں اور زراعت میں سے جاندار کھالیں تو زراعت کرنے والے کو اس کا اجر ضرور پہنچے گا۔

امام سرخسی نے یہ تحقیق کی ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مقام "جرف" میں زراعت فرمائی ہے۔ بعض صحابہ کرام جیسے حضرت عمرو بن العاص وغیرہ کاشت کرتے تھے چنانچہ مؤرخین نے بیان کیا ہے کہ عمرو بن العاص نے طائف سے تین میل دور ایک قریہ میں انگور کی بیلیں چڑھائی تھیں اور ہر بیل کے انگور ایک درہم میں فروخت ہوتے تھے۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی فرماتے ہیں۔

"جو ملک قابل کاشت زمین رکھتا ہو اور اس کے باشندے زراعت سے غفلت یا بے پروائی برتیں تو اس ملک کی تباہی میں کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ عیش پرستانہ سامان صنعت کے مقابلہ میں، ملک کی اصلی ترقی زراعت سے وابستہ ہے اس لئے کہ تجارت اور صنعت ان سب کا دار و مدار خام پیداوار پر ہے اگر ملک کی زمین قابل کاشت ہے اور پھر کاشت نہیں کی جاتی تو وہ ملک نہ صرف یہ کہ تجارتی اور صنعتی میدان میں پیچھے ہوگا بلکہ اپنی ضروری گذر بسر کے لئے بھی دوسرے ملک کا دست نگر ہوگا۔ (حجۃ اللہ البالغہ)

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

بخاری کی ایک روایت ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جس گھر میں آلات زراعت داخل ہوں گے۔ اس گھر پر ذلت و خواری مسلط ہوگی" اس حدیث کے ظاہری مفہوم اور سابقہ بیانات میں بظاہر سخت اختلاف ہے، اس اختلاف کو دور کرنے کے لئے شاہ ولی اللہ دہلوی نے فرمایا کہ عام حکم نہیں ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ جہاد کو ترک کرکے کاشت کاری پر قناعت نہ کی جائے۔ خدا بزدل اور حریص کو جنم دیتا ہے اور جس قوم میں بزدلی اور حرص کی خصلتیں پیدا ہوگئی ہوں اس کے لئے ذلت و خواری لازمی ہے۔ ابن قیم لکھتے ہیں کہ اس

حدیث کا مقصد اسلام کے معاشی نظام کو بیان کرنا نہیں ہے ۔ بلکہ یہ ایک پیشین گوئی ہے ۔ آنے والے حالات کے متعلق کہ جب مسلمان اپنی تمام تر توتیں صرف زراعت کی طرف منعطف کر دیں گے تو ان کا کمزور ترین دشمن بھی ان پر جری ہو جائیگا۔

لگان اور مالگزاری

زراعت دو طرح عالم وجود میں آتی ہے ایک یہ کہ کوئی شخص زمین کو خود کاشت کرے ۔ دوسری صورت میں کبھی صاحب زمین حکومت ہوتی ہے اور کبھی کوئی فرد خاص ۔ ایک صورت یہ بھی کہ زمین کی ملکیت افراد ملک ہی کے ہاتھوں میں رہے اور حکومت نے اس پر کوئی محصول مقرر کر دیا ہو ۔ یعنی حکومت یا فرد اگر کسی کو ایک مقررہ شرح پر کاشت کیلئے زمین دے تو اس کو لگان کہا جاتا ہے ۔ اور اگر زمین پر سالانہ محصول لگایا جائے تو اس کو مالگزاری کہتے ہیں ۔ چونکہ قرآن کریم کی آیات مطلق ہیں اور ان میں مالگزاری کی شرح کا تعین نہ تھا اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شارع ہونے کی حیثیت سے لگان کی شرح معین فرما دی جیسا کہ بہت سی حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے ۔ اس اصول پر آپ کے عاملین عرب کے مختلف حصوں کے باشندوں سے لگان وصول کرتے تھے ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف والیوں کے نام تقرری کے جو فرمان صادر فرمائے ان میں بھی لگان کا تذکرہ ہوتا تھا ۔ اس طرح مختلف قبیلوں کے سردار جب اسلام لے آتے تو آپ انہیں بھی لگان سے متعلق مختلف احکام بھیجتے ۔ حضرت عمر فاروق رضؓ نے مفاد عامہ کی خاطر صحابہؓ کے مشورہ سے عراق، شام اور مصر کے بڑے بڑے زرخیز قطعات اراضی کو تقسیم نہیں کیا اور تمام مسلمانوں کی ملکیت قرار دیا ۔ اس کی پیمائش کرائی اور سیرابی کے اعتبار سے لگان مقرر فرمایا ۔ حضرت عمرؓ کے بعد دوسرے خلفاءؓ نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا غرض بندوبست اراضی کے جامع اور مفصل طریقے رائج کئے اور اس بات کا پورا پورا خیال رکھا گیا کہ کاشت کاروں پر زیادہ بار نہ پڑے ۔

لگان بصورتِ زر

لگان کے سلسلہ میں یہ بات ضروری ہے کہ نہ تو کاشت کار کا نقصان ہو اور نہ زمین کے مالک کا اس لئے مناسب طریقہ یہ ہے کہ لگان کا تعین زر کی شکل میں کیا جائے خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کو نصف پیداوار پر دیا تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ اور بعد کے زمانہ میں بھی لوگ پیداوار کے کچھ حصہ پر زمینوں کو کرایہ پر دیتے تھے لیکن بخاری شریف کی ایک حدیث سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منشا کا پتہ چلتا ہے کہ آپ خود اس طرح پیداوار کی شکل میں لگان وصول کرنے کے طریقہ کو برقرار رکھنا نہیں چاہتے تھے ۔ بلکہ زر کی شکل میں لگان لینے کا طریقہ رائج کرنا چاہتے تھے ۔ چنانچہ رافع بن خدیج بیان کرتے ہیں کہ مجھ سے میرے چچا نے بیان کیا کہ لوگ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کھیت کی چوتھائی پیداوار یا کسی ایسی چیز کے بدلہ میں جس کو زمین کا مالک مستثنیٰ کر لیتا تھا ۔ زمین کو کرایہ پر دے دیا کرتے تھے ۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اس چیز سے منع فرما دیا ۔ میں نے رافع سے کہا کہ دینار اور درہم کے

عوض کرایہ پر دینا کیسا ہے انہوں نے کہا دینار اور درہم کے بدلہ کچھ حرج نہیں۔

کاشتکار کی حیثیت

زراعت کرنے والوں میں زمیندار اور کاشت کار دو گروہ پائے جاتے ہیں۔ زمیندار آقا اور مالک کی حیثیت رکھتا ہے اور کاشتکار کی ایک طرح سے غلام کی۔ کاشت کار کے ساتھ جو ناانصافیاں ہو رہی ہیں وہ ظاہر ہیں۔ اسلام ان امتیازوں کو ایک دم ختم کرتا ہے اس کی نظر میں زمیندار اور کاشت کار دونوں برابر کے معاملہ دار ہیں۔ ایک صاحب زمین اور متاجر ہے دوم اشتراک عمل یا اجیر نہ کہ غلام کیونکہ اگر ایک طرف دولت (زمین) ہے تو دوسری جانب بھی دولت (بیج، آلات زراعت اور محنت) ہے۔ پھر کیا وجہ کہ ایک آقا اور دوسرا غلام ٹھہرے۔

ایک مثال سے اندازہ لگایئے کہ ایک غیر مسلم (ذمی) نے حضرت عمرؓ سے یہ شکایت کی کہ جب اسلامی فوج میرے گاؤں سے گزر رہی تھی تو اس نے میری کھیتی کو روند ڈالا۔ حضرت عمرؓ نے یہ سن کر بیت المال سے دس ہزار درہم بطور تاوان کر دیئے۔ مزارعت میں کاشت کار اور زمین دار کا تعلق مضاربت کے تحت آتا ہے اس طرح یہ چیز باہمی اشتراک ہے نہ کہ آقائی و غلامی

عشری و خراجی زمین

اگر زمین افراد ملک کی ذاتی مملوکہ ہے تو حکومت اجتماعی حق "سالانہ محصول" لیتی ہے تو اس صورت میں وہ زمین عشری ہوگی یا خراجی۔ اور اگر زمین عشری ہے تو ہر پیداوار پر عشر لیا جائے گا جو سال میں دو تین مرتبہ تک ہو سکتا ہے اور اگر خراجی ہے تو سال میں صرف ایک مرتبہ مالگزاری لی جائے گی خواہ پیداوار سال میں دو مرتبہ ہو یا تین مرتبہ یا اس سے زیادہ اگر خراجی زمین مسلمان خریدے تو اس زمین پر خراج ہی قائم رہے گا وہ عشری نہیں بن سکتی اور اگر ذمی کسی مسلمان کی زمین خریدے گا تو خراجی ہو جائے گی۔ اس لیے کہ غیر مسلم (ذمی) پر عشر واجب نہیں ہے اور اگر زمین کی مالک حکومت یا فرد خاص ہے اور اجارہ پر کاشت کرائی جاتی ہے تو لگان سال میں ایک دفعہ لیا جائے گا اور اگر بٹائی پر ہے تو پیداوار کے ساتھ مربوط ہے اور اسے مزارعت کہتے ہیں اور باغ کی پیداوار کو مساقاۃ کہتے ہیں۔

زمین کے اقسام

اسلامی حکومت کے زیر اثر آنے والی زمینوں کی چار بڑی قسمیں ہیں۔ زراعت کے سلسلہ میں ان کی تشریح ضروری ہے۔

۱۔ وہ زمین جس کے مالک اسلام قبول کر لیں۔

۲۔ وہ زمین جس کے مالک اپنے مذہب پر قائم رہیں مگر معاہدہ کے ذریعے اپنے آپ کو کسی اسلامی حکومت کی

فرمانبرداری میں دے دیں۔

۳۔ وہ زمین جس کے مالک بزور شمشیر مغلوب ہوں۔

۴۔ وہ زمین جو کسی خاص شخص کی ملکیت نہ ہو۔

پہلی قسم کی زمین کے بارے میں حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفاء کا طرز عمل یہ رہا کہ وہ زمینیں بدستور اس کے سابق مالکوں کی ملکیت، تصور کی گئیں اور اس کے لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک قانونی انداز میں یہ ارشاد فرمایا۔

"کہ جب کوئی قوم اسلام لائی تو اس نے اپنی جانوں کو اور اپنے اموال کو اپنے لئے محفوظ کرلیا۔"

(ابوداؤد، کتاب الخراج، ابو یوسف)

ایک دوسرے موقع پر حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اس سے بھی زیادہ جامع الفاظ میں پایا جاتا ہے اور وہ یہ کہ۔

"جو شخص کسی شے کا مالک ہوتے ہوئے اسلام قبول کرتا ہے تو وہ شے اس کی ملکیت ہے۔"

(کتاب الاموال قاسم ابن ابی عبید)

اس کی تشریح امام ابو یوسف نے کتاب الخراج میں یہ کی ہے کہ جو لوگ اسلام قبول کرلیں۔ ان کا خون حرام ہے۔ قبول اسلام کے وقت جن اموال کے وہ مالک ہوں۔ وہ ان ہی کی ملکیت رہیں گے۔ اسی طرح ان کی زمینیں بھی ان کی ملکیت رہیں گی اور وہ زمین عشری زمین قرار پائے گی۔ اس کی نظیر مدینہ ہے۔ جس کے باشندوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر اسلام قبول کیا اور وہ اپنی زمینوں کے مالک رہے اور ان پر عشر لگا دیا گیا۔ ایسا ہی معاملہ طائف اور بحرین کے لوگوں سے بھی کیا گیا۔ اسی طرح اہل مدر میں سے جن جن لوگوں نے اسلام قبول کیا وہ اپنے پانی اور زمین کے مالک تسلیم کئے گئے۔ ان کی زمین عشری زمین ہے اور وہ اس سے بیدخل نہیں کئے جا سکتے اور انہیں اس پر بیع اور وراثت کے جملہ حقوق حاصل ہیں بالکل اسی طرح آئندہ بھی جس علاقے کے باشندے اسلام قبول کرلیں وہ اپنی املاک کے مالک رہیں گے۔

قاسم ابن ابی عبید اس کی شرح میں فرماتے ہیں کہ جس علاقہ کے باشندے اسلام لے آئے وہ اپنی زمینوں کے مالک قرار پائے، جیسے مدینہ، طائف، یمن، بحرین اور مکہ اگرچہ بزور شمشیر فتح ہوئے لیکن رسول اللہ نے ان کے باشندوں پر احسان کیا اور ان کی جانیں بخشیں۔

ابن قیم "زاد المعاد" میں لکھتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ تھا کہ جو شخص اسلام لانے کے وقت جس چیز پر قابض ہے وہ اس کے قبضہ میں رہنے دی گئی یہ نہیں دیکھا گیا کہ اسلام لانے سے پہلے وہ چیز کس ذریعہ سے اس کے قبضہ میں آئی تھی بلکہ وہ اس کے ہاتھ میں اسی طرح سے رہنے دی گئی جس طرح وہ پہلے سے چلی آرہی تھی۔ ہاں اگر

کسی دوسرے حقدار نے اپنے حق کا دعویٰ کیا تو اس کے متعلق عدالتی کارروائی کی گئی خلاصہ یہ کہ عہد نبوی اور عہد خلافت میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ اسلام لانے والے قبائل یا افراد کی ملکیت کو ان سے چھین لیا گیا ہو یا بید خل کیا گیا ہو۔ دوسری قسم کی زمینوں کے متعلق معاہدہ کی پابندی اسلام کا دستور العمل رہا۔ قرآن پاک نے سورۂ مائدہ میں سب سے پہلی آیت میں یہ فرمایا کہ۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَوْفُوا بِالْعُقُودِ ۚ ۵/۱ — "اے ایمان والو! اپنے تمام معاہدوں کو پورا کرو"

اسی سورت میں آگے چل کر یہ بتایا گیا کہ

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا ۚ اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۖ ۵/۸ — "کسی قسم کا کینہ تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم ان کے ساتھ انصاف نہ کرو، انصاف کرنا ہی پرہیزگاری کے قریب ہے۔"

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسئلہ معیشت کے متعلق فرمایا۔

مجھے قوی امید ہے کہ تم قوموں سے جنگ آزمائی میں غالب آ جاؤ گے اور وہ مغلوب ہو کر تمہارے سامنے آئیں گی اور مال کی پیشکش کے ذریعے وہ اپنی جانوں اور بیٹوں کی حفاظت کریں گی اور تم ان سے صلح بھی کر لو گے اور اگر تم ان سے صلح کر تو شرائط کی پوری پوری پابندی کرنا اور قرار داد سے زیادہ ان سے ہرگز نہ لینا، اس لئے کہ یہ کسی طرح جائز نہیں ہے "(ابوداؤد)"

دوسری جگہ آپ نے فرمایا کہ

جس شخص نے کسی معاہد کے ساتھ ظلم کیا یا اس کے حق میں کوئی کمی کی یا اس کو اسکی طاقت سے زیادہ ذمہ دار بنا دیا یا اس سے کوئی چیز بھی اس کی بغیر رضامندی کے لی تو قیامت کے دن اس کی جانب سے میں مدعی بن کر کھڑا ہوں گا۔

(ابوداؤد، ابن ماجہ)

امام ابو یوسف اس حدیث کے تحت کتاب الخراج میں لکھتے ہیں اور وہ قانونی دفعہ ہے کہ

غیر مسلموں میں سے جس قوم کے ساتھ اس بات پر صلح ہو جائے کہ وہ حکومت کے وفادار رہیں گے اور مقررہ خرچ ادا کرتے رہیں گے تو وہ اہل ذمہ ہیں ان کی اراضی وہ اراضی خراج " ہیں۔ ان سے بھی وہی کچھ لیا جائیگا جس پر ان سے صلح ہوئی ہے اور ان کے ساتھ عہد پورا کیا جائے اور اس پر کسی طرح کا اضافہ نہ کیا جائے ورنہ یہ ظلم ہوگا اور ان کو حکومت کے خلاف عدالت میں چارہ جوئی

کا پورا پورا موقع حاصل ہوگا،،

تیسری قسم کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے طرزعمل سے جو نتیجہ اخذ ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ایسی زمینوں کا فیصلہ حکومت کی رائے پر موقوف ہے۔ بعض مفتوحہ علاقوں کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شرکائے جنگ میں تقسیم کردیا تھا اور بعض مفتوحہ علاقوں کو آپ نے احسان کرکے ان کے سابق مالکوں کے ہاتھوں میں چھوڑدیا جن کی مثالیں بہ ترتیب خیبر اور طائف ہیں حضرت عمرؓ نے فتح عراق کے بعد عراق کی زمین سرکاری ملکیت قرار دے دی۔ غرض کہ ان نظائر سے فقہاء نے مذکورہ بالا نتیجہ اخذ کیا۔ یعنی ایسی زمینوں کا فیصلہ حکومت اسلامیہ کی صوابدید پر موقوف ہے۔ قرآن پاک نے سورہ انفال میں سب سے پہلی آیت میں اس حقیقت کو واضح کیا جس کا ترجمہ یہ ہے کہ:

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ؕ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ۚ ۸/۱

آپ سے لوگ انفال "مال غنیمت کے بارے میں پوچھتے ہیں آپ کہہ دیجئے کہ انفال اللہ اور اس کے رسول کے لئے ہے۔"

اس آیت کا صاف منشا یہ ہے کہ انفال درحقیقت حکومت کی ملک ہے اور حکومت ہی اس میں تصرف کا اختیار رکھتی ہے۔

چوتھی قسم کی زمینیں تمام فقہا کے نزدیک قومی ملکیت ہیں اور اس میں آبادکاری کے اصول پر عمل درآمد کیا جائیگا چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے کسی بنجر زمین کو آباد کیا ہو وہ اس کی ہے اور اس کی نسل کے لئے ہے۔ امام ابوحنیفہ نے آبادکاری کے قبضہ کو صحیح قانونی قضیہ قرار دینے کے لئے حکومت کی اجازت کی شرط رکھی، اور امام شافعی نے اس شرط کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی بلکہ وہ اس شرط کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دیئے ہوئے حق میں مداخلت تصور کرتے ہیں۔

اسلام نے زراعت کی ترقی کے لئے حسب ذیل تدابیر اختیار کی ہیں۔

۱۔ مالگزاری یا لگان کا کم سے کم ہونا۔
۲۔ کاشت کرنے والے کے لئے مخصوص حقوق و رعایات۔
۳۔ غیر مزروعہ زمین کو مزروعہ بنانا
۴۔ آبپاشی کے وسائل کو سہل اور وسیع بنانا۔

لگان اور مالگزاری کا کم سے کم ہونا

زراعت کی سہولتوں میں کا فرد مسلمان برابر ہیں۔ لگان میں تخفیف اور سہولت کا اسلام میں خاص لحاظ رکھا گیا ہے حضرت عمرؓ کے عہد میں خاص طور سے زرعی سہولت اور لگان میں تخفیف کے واقعات ملتے ہیں۔ ایک دفعہ

حضرت حذیفہ کو دجلہ اور حضرت عثمان بن حنیف کو فرات کے علاقہ میں بھیجا تاکہ وہ خراج وصول کریں۔ خراج کی معقول رقم آئی تو شکوک کی نگاہ سے دیکھا گیا اور تخفیف و سہولت کی تاکید فرمائی اور لگان میں تخفیف کے مسئلہ کو پیش نظر رکھنے کی تنبیہ ہوئی۔ جب عراق کا خراج وصول ہو کر آیا تو حضرت عمرؓ کوفہ یا بصرہ کے دس دس آدمیوں کا وفد بلا کر قسم لیتے کہ آیا یہ خراج برضا و رغبت وصول ہوا ہے۔ یا نہیں۔ کسی پر زیادتی تو نہیں ہوئی ہے خواہ وہ مسلم ہو یا ذمی۔

حضرت عمرؓ نے عثمان بن حنیف سے عراق کی پیائش کرائی تو جنگل اور نہروں وغیرہ کو چھوڑ کر کل رقبہ زمین کروڑ ساٹھ لاکھ جریب ہوا اور حضرت عمرؓ نے مندرجہ ذیل شرح لگان مقرر فرمایا۔

گندم	فی جریب	ڈھائی بیگہ خام	۸ ر سالانہ
جو	"	"	۴ ر "
گنا	"	"	۸ عہ "
روئی	"	"	۴ عہ "
انگور	"	"	۸ عا "
کھجور	"	"	۸ عگ "
تمام ترکاریاں	"	"	۱۲ ر "

مصر کی زمین اچھی اور پیداوار معقول تھی۔ لیکن ہر سال نیل کی طغیانی کی وجہ سے پیمائش کرنے کے بعد تخمینہ لگا کر لگان وصول کیا جاتا تھا اور حضرت عمرؓ کو پھر بھی اطمینان نہ ہوتا تو قسم لیتے کہ آیا لگان کی وصولیابی میں کاشتکاروں پر زیادتی تو نہیں ہوئی ہے حضرت عمرؓ نے فراعنۂ مصر کے لگان کی وصولیابی کے طریقوں میں ترمیم کر کے انکو آسان بنا دیا۔

۱۔ نقد اور پیداوار دونوں صورتوں میں وصول کیا جائے۔

۲۔ اوسط اور جمع بندی کے طریقہ کو رائج کر کے لگان کی تشخیص میں زمین کی حیثیت اور پیداوار کی نوعیت کو اہمیت دی گئی۔

۳۔ حسب موقع، رعایا کو جب سہولت ہو ادا کرے۔

۴۔ لگان کے علاوہ جملہ قسم کی وصولیابی بند کر دی جائے۔

یہ حکومت کا معاملہ رہا۔ اگر زمین دار اور کاشت کار کے درمیان مزارعت کا معاملہ ہو تو زمیندار کو کوئی ترجیحی حیثیت حاصل نہیں ہے بلکہ کاشت کار کو حاصل ہے۔

خصوصی حقوق و مراعات

اسلام سے قبل عرب سے متصل دو بڑی حکومتیں تھیں یعنی ایران اور روم، ان کے دور میں کاشت کار غلام محض تھا

اس کو کوئی رعایت حاصل نہ تھی وہ قریب قریب محروم المعیشت تھا۔ اسلام نے ان مفاسد کو روکا۔

۱۔ یہ حکومتیں لگان وصول کرنے میں کاشت کاروں پر وحشیانہ مظالم کرتی تھیں اور آخر میں زمیندار بھی ظلم کرتے تھے۔ اسلام نے اس کا انسداد کیا اور وصولیابی میں پوری سہولت بہم پہنچائی اور خلاف ورزی کرنے والوں کو وعیدیں سنائیں۔ اس کے باوجود اس قسم کا اگر کوئی واقعہ ہوا تو معزولی عمل میں آئی اور عمال کو صاف وصریح حکم دیا گیا کہ اگر اہل خراج وقت پر خراج ادا نہ کریں تو اس وقت تک مہلت دو۔ جبکہ ان کو سہولت ہو جائے۔ ایک مرتبہ شام کے ملک سے حضرت عمرؓ آرہے تھے۔ راستہ میں تیز دھوپ میں کچھ لوگ کھڑے دیکھے معلوم ہوا کہ ان کو جزیہ ادا نہ کرنے پر سزا دی جارہی ہے اور جب آپ کو یہ معلوم ہوا کہ یہ ادا کرنے سے مجبور ہیں تو آپ نے عامل سے سخت باز پرس کی اسی طرح والیٔ شام نے جب دیر کی تو حضرت عمرؓ نے جواب طلب کیا اس نے کہا میں آپ کے حکم کے مطابق اس وقت تک ٹھہرا رہتا ہوں۔ جب تک ان کے پاس (رقم) فراہم نہ ہو جائے اس لئے دیر ہوئی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ میں تجھ کو کبھی معزول نہ کروں گا۔

۲۔ بعض قدیم اور جدید حکومتوں میں لگان کے علاوہ "رواج و رسوم" کے مطابق کچھ رقم وصول کی جاتی تھی۔ (جس کا آج بھی رواج ہے) بعض جگہ تحصیلدار جب اپنے ماتحت کو بھیجتے ہیں تو اس کی تنخواہ لگان کے علاوہ ، کاشت کاروں سے وصول کی جاتی ہے۔ اسلام میں صاف صاف ہدایات ہیں کہ کاشت کاروں سے لگان کے سوا اور کچھ وصول کرنا صریح ظلم ہے۔

۳۔ بعض حکومتیں زمینداروں سے اور زمیندار کاشت کاروں وغیرہ سے بیگار لیتے تھے اور وہ غریب ان کی خدمت کرتے تھے۔ اسلام نے ان چیزوں کی سخت مذمت کی ہے۔ فقہا لکھتے ہیں کہ مزارعت میں مستاجر و اجیر کے درمیان کاشت کاری ومحنت کا معاملہ ہے اس کے سوا کوئی اور بیگار نہ لی جائے اور اس کو ظلم قرار دیا ہے حدیث نبوی میں اس کی صریح مخالفت ہے۔ ابن حجر عسقلانی اور علامہ عینی نے بیگار کے مسئلہ پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے اس کو ظلم قرار دیا ہے۔

۴۔ ایران اور روم کی حکومتوں میں یہ طریقہ رائج تھا کہ تہوار، غمی، شادی، اور مکان وغیرہ بننے کے موقع پر کاشت کاروں سے بھینٹ لی جاتی تھی آج بھی بعض جگہ زمینداروں کے یہاں اس کا رواج ہے اسلام نے اس جبر و ظلم کا انسداد کیا وہ کہتا ہے کہ یہ اضافہ (بھینٹ) کس لئے جبکہ زمین میں اضافہ نہیں کیا جا سکتا بلکہ اسلام نے اس کو ربٰو اور سود قرار دیا ہے۔

۵۔ اسلام سے قبل یہ طریقہ رائج تھا کہ زمین کو لگان پر دینے سے پہلے کاشت کار سے ایسا معاملہ کرتے تھے۔ کہ جس سے زمین کی حیثیت مستقل طور سے بڑھ جائے اور جو کام یا ذمہ داری اپنے اوپر عائد ہے وہ بھی کاشت کار پر ڈال دی جائے۔ اس کو بھی اسلام نے پسند نہیں کیا۔ فقہ اسلامی میں اس کی تفصیل موجود ہے۔

۶۔ اگر کبھی کسی ارضی وسماوی آفت کی بنا پر پیداوار ٹھیک نہیں ہوتی ہے تو لگان کی وصولیابی کے لئے زمین اور آلات وغیرہ نیلام ہوتے ہیں۔ اسلام اس نیلام کی اجازت نہیں دیتا اس کے ہاں کاشت کاری وغیرہ کے آلات نیلام نہیں ہوتے وہ مہلت دیتا ہے۔

۷۔ زمیندار سرکاری زمین پر جو اچھی ہو کم ٹیکس دیکر چراگاہ بناتے۔ جس سے غریب کاشت کار کو دقتیں ہوتی تھیں اسلام نے اس ظالمانہ طریقہ کو روکا۔ اس نے حکومت کو صرف یہ حق دیا ہے کہ صدقات وجہاد کے مویشیوں کیلئے چراگاہ محدود کرے۔

۸۔ زمیندار خودرو گھاس، تالاب کے پانی اور خشک لکڑی پر خود قابض رہتے تھے۔ کسی دوسرے کا ان چیزوں پر کوئی حق تسلیم نہیں کرتے تھے۔ اسلام نے ان چیزوں پر سب کا حق تسلیم کیا ہے۔

بعض بنیادی اصول

۱۔ اگر کوئی زمین پانی میں غرق ہو جائے یا خشک سالی سے قابل زراعت نہ رہے یا کسی آفت سے کھیتی تباہ ہو جائے تو اس سال کا خراج (مالگزاری) معاف ہے۔ اگر کچھ نقصان پہنچتا ہے تو بقدر نقصان معاف ہوگی اور خلیفہ کل خراج بھی معاف کر سکتا ہے۔

۲۔ اگر کاشت کار نے حکومت یا زمیندار سے زمین مزارعت پر لی ہے تو بھی یہی صورت ہوگی۔

۳۔ اگر زمین کو نقد لگان (کراء الارض) پر لیا ہے تو بھی یہی صورت ہے بعض ائمہ وفقہاء نے اس سے اختلاف بھی کیا ہے۔

۴۔ اگر کاشت کار زمین کا خود مالک نہیں ہے اور درمیان میں زمیندار ہے۔ تو مالگزاری زمیندار کے ذمہ ہے نہ کہ کاشت کار کے ذمہ۔

۵۔ اگر زمین سرکاری ہے اور کاشت کار مقررہ لگان (کراء الارض) ادا کر رہا ہے تو اس کو بیدخل نہیں کیا جائیگا اور یہ اس کا ذریعہ معاش ہے، جس سے اس کو محروم نہیں کیا جائے گا۔

بنجر زمین کو مزروعہ بنانا

زراعت کو ترقی دینے کے لئے سب سے اہم چیز بنجر زمینوں کو قابل کاشت بنانا ہے۔ ریتلے، سخت اور چٹیل میدان کو قابل زراعت بنا کر خام پیداوار سے ملک کی معاشیات کو ترقی دی جا سکتی ہے اور بنجر زمینوں کو مزروعہ بنایا جائے اس کے دو طریقے ہیں۔

اول یہ کہ خلیفہ افراد ملک کو ترغیب دے اور اعلان کرے کہ جو بنجر زمینوں کو قابل کاشت بنائے گا وہ اس کی ملک

ہے۔ اسے عربی میں اقطاع اور اردو میں جاگیر کہتے ہیں۔ اس اعلان سے مسلمان اور ذمی دونوں فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ بعض صورتوں میں خلیفہ ایک یا دو سال کا لگان بھی معاف کر سکتا ہے۔ لیکن اس کے لیے تین شرطیں ہیں۔

۱۔ وہ زمین فنائے شہر میں شامل نہ ہو یعنی عام ضروریات کے کام میں نہ آتی ہو۔

۲۔ اگر کسی نے تین سال تک بنجر زمین پڑی رہنے دی ہے تو وہ کسی دوسرے کو الاٹ کر دی جائے گی چنانچہ اس قسم کی جاگیر کا حصہ حضرت عمرؓ نے واپس لے لیا جو بلال بن حارث کو ملی تھی۔

۳۔ وہ زمین، کنواں، باؤلی، تالاب اور چشمہ کی حریم یعنی ملحقہ زمین نہ ہو جو پانچ سو مربع گز تک ہو سکتی ہے۔

بنجر زمین کو آباد اور کارآمد بنانے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ حکومت اپنی نگرانی میں کاشت کرائے اور اس کی وہ ملکیت ہو۔ ایسی زمینوں کے متعلق احکام یہ ہیں کہ ذمی کے پاس ایسی زمین ہو تو خراج لیا جائے گا اور اگر مسلم کے قبضہ میں ہو تو امام ابویوسف اور دوسرے ائمہ کے نزدیک اگر وہ زمین عشری زمینوں سے ملحق ہو تو عشر لیا جائے گا اور خراجی زمینوں سے ملحق ہو تو خراج لیا جائے گا۔

وسائل آبپاشی کی بہم رسانی اور سہولت

زراعت کی ترقی اور وسعت کے لیے چوتھا ذریعہ آبپاشی ہے۔ جسے سہل الحصول اور وسیع بنانا ہے اس لیے کہ زرعی ترقی میں نہروں اور آبپاشی کے کنوؤں کو بہت دخل ہے اور اسلام نے اس کی اہمیت تسلیم کی ہے اور اس کے لیے چند اصول مقرر کیے ہیں۔

۱۔ تالاب، نہر، کنوئیں اور چشمے اگر شخصی ملکیت میں ہیں تو ان چیزوں میں تمام پبلک کا یکساں حق انتفاع ہے اور وہ کسی حال میں شخصی ملکیت نہیں بن سکتے۔

۲۔ اگر پانی شخصی ملکیت میں ہو اس وقت بھی عام حالات میں پینے اور استعمال کرنے کے لیے دوسروں کو اس سے یکساں فائدہ اٹھانے کا حق ہے کیونکہ پانی اپنے مقام میں کسی کی شخصی ملکیت نہیں اور نہ اس حالت میں اس کی خرید و فروخت جائز ہے۔ لیکن پینے اور نہانے کی ضرورتوں کے علاوہ آبپاشی کے لیے مالک کی اجازت ضروری ہے۔ اس کو اخلاقی طور سے اجازت دینی چاہیے۔ اگر خود اس کا نقصان ہو تو وہ روک بھی سکتی ہے۔

۳۔ آبپاشی کے لیے کثرت سے نہریں کھدوائی جائیں اور اس کا تمام خرچ بیت المال پر لازم ہے اور اگر بیت المال میں گنجائش نہیں ہے تو اہل دول پر زور دیا جائے۔

۴۔ اگر چھوٹی چھوٹی نہریں۔ عام مصالح آبپاشی اور بہم رسانی آب کے لیے نہ بنائی جائیں۔ بلکہ اہل محلہ، اہل قصبہ، اور اہل شہر اپنی ذاتی ضروریات کے لیے بنانا چاہیں تو اگر اس میں مصالح عامہ کو نقصان نہ پہنچتا ہو تو خلیفہ ایسی مخصوص

نہروں کی اجازت دے سکتا ہے۔ البتہ اس کے اخراجات حکومت پر نہیں ہوں گے۔

۵۔ آبپاشی کی نہریں اور کنوئیں مصالح عامہ اور معاشی وسائل کی ترقی کے لئے ہیں نہ کہ حکومت کی آمدنی کیلئے اس لئے حکومت کو محصول آبپاشی نہ لینا چاہیئے یا صرف اس قدر لیا جائے جس قدر ان نہروں اور کنوؤں کی بقاء کے لئے ضروری ہے انتظامات کا مکمل بار بیت المال پر ڈالا جائے۔

بہرحال ان اصولوں کے پیش نظر خلافت فاروقی میں اس محکمہ پر خاص طور سے توجہ دی گئی۔ نہریں جاری کی گئیں۔ بند باندھے گئے۔ تالاب بنائے گئے۔ کنوئیں کھو دے گئے۔ چھوٹی نہریں نکالی گئیں اور اس طرح زراعت کی ترقی کو وسعت دی گئی اس سلسلہ میں بصرہ کی نہر موسیٰ دجلہ سے کاٹ کر نکالی گئی کوفہ کے علاقہ کی نہر سعد اور مصر کی نہر امیر المؤمنین مشہور نہریں ہیں اور دور فاروقی کے بعد نہر اساورہ، نہر عمرو اور نہر حرب وغیرہ کے نام بھی اکثر تاریخی کتابوں میں ملتے ہیں۔

تجارت

وسائل معیشت میں زراعت کے بعد دوسرا درجہ تجارت کا ہے جو اقتصادی نظام کا جزو اعظم ہے۔ اسلئے اسلام میں اس کی خاص طور سے ترغیب دی گئی ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے۔

فاذا قضیت الصلوۃ فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل اللہ ۵ (سورہ جمعہ)	جب نماز پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل (رزق) تلاش کرو۔
لا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل الا ان تکون تجارۃ عن تراض منکم (النساء)	اپنے مال کو آپس میں باطل کی راہ سے نہ کھاؤ تجارت کی راہ سے نفع حاصل کرو۔
یاایھا الذین امنوا انفقوا من طیبات ما کسبتم ۵	اے ایمان والو! تم خرچ کرو۔ ان پاک چیزوں میں سے جو تم نے کمائی ہیں۔

حتیٰ کہ حج کے موقعہ پر بھی تجارت کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔

لیس علیکم جناح ان تبتغوا فضلا من ربکم ۵	حج کے دنوں میں اپنے رب کے فضل حاصل کرنے میں کچھ حرج نہیں۔

اگر ہم تجارت کے متعلق احادیث نبوی پر نظر ڈالیں تو ایک بڑا ذخیرہ ملتا ہے۔ فقہائے کرام نے خاص طور سے "باب التجارت" قائم کر کے اس بارے میں احکام کی وضاحت کی ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ "سچے اور امانت دار تاجروں کا حشر نبیوں، صدیقوں اور شہداء کے ساتھ ہوگا۔ ایک اور حدیث میں کپڑے کی تجارت کی ترغیب دیتے ہوئے

اس کا نفسیاتی پہلو بھی بیان کر دیا ہے۔ کپڑے کی تجارت کرو کیونکہ کپڑے کا تاجر چاہتا ہے کہ لوگ خوش حال اور فارغ البال رہیں۔"

خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تجارت فرمائی۔ حضرت خدیجہؓ کا مال تجارت لیکر گئے۔ فروخت کیا، جس میں کافی نفع ہوا۔ اسی طرح حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کپڑے کی تجارت کی بلکہ خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے بعد بھی جب صدیق اکبرؓ کپڑے کی گٹھڑی لیکر چلے تو حضرت فاروق اعظمؓ نے منع فرمایا اور پھر بیت المال سے وظیفہ مقرر ہوا۔ اسی طرح دوسرے خلفائے عظام اور صحابہ کرام نے تجارت کو اپنا ذریعہ معاش قرار دیا ہے۔

قبل از اسلام

عرب میں اسلام سے قبل تجارت کی کیا حالت تھی اس سلسلہ میں طائف اور مکہ وغیرہ کے حالات پیش نظر رکھنا ضروری ہیں۔ طائف کی وادی زرخیز تھی تجارت میں گندم، منقیٰ اور لکڑیاں نمایاں تھیں۔ یہاں کے لوگ عراق اور ایران سے تجارت کرتے تھے۔ طائف میں سود کا بھی رواج تھا۔ سرمایہ دار اور غریب طبقہ کی کشمکش بھی شروع ہوگئی تھی مکہ میں ہاشم پہلے شخص ہیں۔ جنہوں نے قریش کے لئے جاڑے اور گرمی کے موسموں کے دو سفر مقرر کئے اور ان سفروں کا ذکر قرآن کی سورہ ایلاف میں موجود ہے غرض قریش تاجر قوم تھی یہی وجہ ہے کہ جب مکہ کے مہاجرین مدینہ پہنچے تو انہوں نے سب سے پہلے یہ پوچھا کہ بازار کہاں ہے نہ صرف مرد بلکہ عورتیں بھی کاروبار کرتی تھیں۔ ابوجہل کی ماں عطر کا کام کرتی تھی۔ حضرت خدیجہؓ کا تجارت کا کاروبار مشہور ہے۔ یہاں کے لوگ بڑے بڑے کارواں لیکر جاتے تھے ہاشم نے تجارتی معاہدے کئے پھر ان کے بھائیوں نے تجدید کی۔ مختلف قبائل سے مفاہمت کی کہ قریش کے تجارتی قافلے امن سے گزریں اور یہ قافلے ان قبیلوں کے لئے ضروری سامان بہم پہنچاتے تھے۔ اسی طرح قریشی تاجروں کو دو فائدے تھے۔ مدینہ میں بھی تجارت ہوتی تھی۔ یہاں کی تجارت میں یہودیوں کا زیادہ ہاتھ تھا بلکہ تجارت کے اعتبار سے حجاز میں یہودیوں کا ایک خاص مقام تھا۔

بعد از اسلام

اسلام نے دنیا میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ اس نے فاسد اصول تجارت کو چھوڑ کر تجارت کے وہ اصول و طریق اختیار کئے جو انسانی معاشرہ کے لئے مفید اور نافع ہوں ان اصولوں کو اپنا کر مسلمانوں نے تجارت کو بڑی ترقی دی۔ ان کی اقتصادی حالت درست ہوئی اور فارغ البالی نصیب ہوئی۔ تجارت سے نہ صرف دنیوی فائدہ ہوا بلکہ تبلیغ اسلام کا کام بھی باحسن وجوہ پورا ہوا اس کا ثبوت چین، سماترا، جاوا، بورنیو، لنکا اور جنوبی ہندوستان میں مسلمانوں کا وجود ہے کہ تاجروں کے ذریعے سے ان علاقوں میں اسلام پہنچا اور پھیلا۔ تجارت فلاح و فارغ البالی کی ضامن ہے۔

اسلام نے تجارت کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اس کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔

(۱) صحیح اصولی تجارت (۲) فاسد اصولی تجارت۔ اسلام صحیح اصولی تجارت کا حامی ہے جو انسانیت اور معاشرہ کے لیے فلاح و بہبود کا ذریعہ ہیں۔ فاسد اصول تجارت کی اسلام نہ صرف مخالفت کرتا ہے بلکہ ان کو بیخ و بن سے مٹا دینا چاہتا ہے۔ کیونکہ وہ معاشرہ میں غیر متوازی حقوق قائم کر کے معاشرہ کی جڑیں کھوکھلی کرتا ہے۔

بُنیادی اصُول

۱۔ چونکہ تجارت کا انحصار باہمی تعاون پر ہے۔ لہٰذا دونوں معاملہ داروں میں تعاون ہو اور ایک کو دوسرے کے نفع و نقصان کا خیال ہو اور گناہ و ظلم کا شائبہ نہ ہو۔

۲۔ طرفین سے پوری رضامندی ہو۔ اضطراری کیفیت کا اعتبار نہیں۔

۳۔ اہل معاملہ، معاملہ داری کی پوری پوری اہلیت رکھتے ہوں۔ عاقل، بالغ اور آزاد ہوں، بچہ، مجنون اور مجبور نہ ہوں۔

۴۔ معاملہ میں کسی قسم کے دھوکے، فریب، خیانت، ضرر، نقصان اور معصیت کا دخل نہ ہو۔

اسلام ان اصولوں کے ساتھ، تجارت کی اجازت دیتا ہے اور فاسد اصول تجارت کی اس کے یہاں کوئی گنجائش نہیں۔

فاسد اصُول

۱۔ مال کی زیادتی اور حصول کا ایسا معاملہ جس میں باہمی تعاون قطعاً مفقود ہو ایک کا نقصان اور دوسرے کا نفع ہو مثلاً جوا، لاٹری، اور سٹہ کے تمام اقسام ممنوع ہیں۔

۲۔ مالی نمو اور حصول نفع کا وہ معاملہ جس میں باہمی رضامندی پوری پوری اور حقیقی نہ ہو مثلاً سود یا اجیر کی زیادہ محنت کی اجرت مجبوری سے کم دینا۔

۳۔ ایسا کاروبار جو اسلام کی نگاہ میں معصیت ہو۔ مثلاً شراب، مردار اصنام اور خنزیر وغیرہ کی بیع و شریٰ اور ان اشیاء کی خرید و فروخت جو نجس و ناپاک ہوں۔

۴۔ ایسے معاملات جن سے جانبین سے معاملہ ہونے کے باوجود جھگڑے کا اندیشہ ہو مثلاً قیمت وغیرہ میں ابہام یا مال کا بغیر دیکھے لے لینا وغیرہ

۵۔ ایسا معاملہ جس میں دھوکہ بازی ہو درست چیز کا ذکر کر کے ناقص مال دیدینا یا کسی جگہ قحط پڑا ہو اور باہر سے مال آئے تو شہر کے باہر ہی مال کو کم قیمت پر خرید لینا۔

غرض اس قسم کے فاسد اصول اسلام کی نگاہ میں قابل قبول نہیں جن سے سماج اور معاشرہ میں اصلاح کی بجائے خرابی پیدا ہوتی ہے۔ اسلام ایک ایسے معاشرہ کا حامی ہے۔ جہاں مواسات، مساوات، ہمدردی اور باہمی اخوت و محبت ہو نہ کہ جاگیردار اور سرمایہ دار کا گروہ ایک طرف ہو اور دوسری طرف مفلس و قلاش گروہ ہو اور معاشرہ میں جھگڑے اور فساد پیدا ہوں۔

اسلام تجارت کے سلسلہ میں دو چیزوں کا خاص طور سے مخالف ہے۔

۱۔ اکتناز، دولت کے عظیم الشان ذخیرے افراد کے پاس ہوں۔ اسی لئے اسلام نے خیرات، زکوٰۃ اور صدقات کا سلسلہ مقرر کیا ہے۔

۲۔ احتکار، غلہ وغیرہ جمع کر لینا۔ احتکار کی دوسری قسم سٹہ بازی ہے۔ اس میں جوئے وغیرہ کی شکلیں آجاتی ہیں آج احتکار و اکتناز سے تجارت ملوث ہے اور دنیا ایک کرب عظیم میں مبتلا ہے زمانہ سابق میں اس کی مختلف صورتیں تھیں۔ احتکار کی سب سے ملعون قسم سودی لین دین ہے اسلام میں ربوٰ کا مفہوم بہ معنی سود سے وسیع ہے۔ اسلام نے ان سب کی جڑ کاٹ دی ہے آج کل ربوٰ اور سود میں تجارتی طور سے کوئی فرق نہیں ہے۔ بنک، منڈیاں، غرض سود کی لعنت ہر جگہ موجود ہے اور انسانی معاشرہ تمام برائیوں اور خرابیوں کا سرچشمہ بن گیا ہے اسلام باہمی امداد کا منکر نہیں ہے۔ اسلام میں اس کی پوری پوری گنجائش ہے کہ باہمی اصول پر اجتماعی کمپنیاں بنا کر تجارت کی جائے مگر اس میں سود کا ذکر تک نہ ہو۔

تجارت کے تین طریقے ہیں۔

۱۔ انفرادی۔
۲۔ اجتماعی۔
۳۔ مضاربت۔

پہلی صورت یہ ہے کہ انسان خود سرمایہ لگائے اور خود ہی محنت کرے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ چند اشخاص مل کر سرمایہ اور محنت کو استعمال میں لا کر تجارت کریں۔

تیسری صورت مضاربت کی ہے کہ ایک شخص روپیہ لگائے اور دوسرا شخص محنت کرے اور نفع جس نسبت سے طے ہو جائے وہ تقسیم کر لیا جائے۔ مشترکہ تجارت چار طریقوں سے ہو سکتی ہے اس کو اسلام نے چار مختلف ناموں سے واضح کیا ہے اور چاروں اپنی نوعیت کے اعتبار سے جداگانہ ہیں (۱) شرکت المفاوضہ (۲) شرکت العنان (۳) شرکت الوجوہ (۴) شرکت الصنائع۔

(۱) شرکت المفاوضہ

مفاوضہ کے معنی ہیں ایک دوسرے کو سونپ دینا اس میں ہر حصہ دار اپنا سرمایہ ایک دوسرے کو سونپ دیتا

ہے۔ اس میں کل شرکا رمساوی روپیہ یا زر لگا کر شریک ہوتے ہیں اور صرف زر میں شرکت ہو سکتی ہے سامان میں نہیں شرکت المفاوضہ کے لئے صرف دو شرطیں ہیں پہلی شرط اس معاہدہ کو متعین کرتی ہے۔ شرکا میں سے ہر ایک لفظ مفاوضہ یا اس کے ہم معنی، لفظ ضرور استعمال کرے۔ جس کا ہماری زبان میں یوں ترجمہ کیا جائے گا کہ فلاں اور فلاں کے درمیان مساوی شرکت کا معاہدہ ہے۔

دوسری شرط مساوات سے پیدا ہوتی ہے لہٰذا یہ ضروری رکھا گیا ہے کہ اس شرکت کے تمام شرکار کی حیثیت مساوی ہو جس کی تفصیل یہ ہے کہ دونوں کا سرمایہ، دونوں کے اختیارات اور دونوں کے تصرف کی صورتیں بالکل مساوی ہوں لہٰذا یہ معاہدہ ایک بالغ اور بچہ کے درمیان، ایک آزاد اور غلام کے درمیان نہیں ہو سکتا (بچہ کی طرف سے اس کا ولی معاہدہ کر سکتا ہے)، اگر سرمایہ کم و زیادہ ہو گا تو وہ شرکت تو ہو گی مگر شرکت المفاوضہ نہیں ہو گی۔

وکالت وکفالت

اختیارات اور ذمہ داریاں

وکالت کے معنی ہیں اختیارات ذمہ داری اور جوابدہی کو دوسرے کے سپرد کر دینا، کفالت کے معنی ہیں ایک شخص کی ذمہ داری کو برقرار رکھتے ہوئے اپنی ذمہ داری کو بھی شریک کر دینا (اصلی معنی ہیں جوڑنا اور قوت پہنچانا)
اس معاہدہ کی رو سے ہر شریک اپنے ساتھی کا وکیل ہوتا ہے۔ اس لئے ہر ایک شریک دوسرے کی جانب سے مال فروخت کرنے، خریدنے، قرض دینے اور امانت رکھوانے کا مستحق ہے اور حق رکھتا ہے اس طرح ہر شریک اپنے ساتھی کا کفیل بھی ہوتا ہے یعنی ہر وہ معاملہ جو ایک شریک کرتا ہے ذمہ داری اس کے ساتھی پر بھی آتی ہے۔

(۲) شرکت العنان

اس شرکت میں جتنے شرکار شریک ہوتے ہیں وہ سب سرمایہ یا سامان سے شریک ہوتے ہیں۔ لیکن سرمایہ کا مساوی ہونا یا نفع، اختیارات اور تصرف کا مساوی ہونا اس شرکت میں ضروری نہیں ہے۔

شرائط

شرکت العنان کی پہلی شرط ایک منفی (انکاری) شرط ہے جس کے بارے میں یہ خیال ہے کہ اگر یہ شرط ذکر نہیں کی جاتی ہے تو خود اس معاہدہ کی نوعیت متعین نہیں ہو سکتی کیونکہ شرکت العنان کے معنی ہیں وہ شرکت جس میں سرمایہ،

نفع اور اختیارات وغیرہ برابر نہ ہوں

۱۔ اس شرکت میں شرکار کے سرمایہ کا مساوی ہونا ضروری نہیں۔

۲۔ جس طرح اس میں سرمایہ کی برابری غیر ضروری ہے۔ اسی طرح نفع کی برابری بھی غیر ضروری ہے بلکہ اس شرکت میں یہ بات بالکل جائز ہے کہ تھوڑے سرمایہ والا شریک زیادہ سرمائے والے شریک کے مقابلہ میں زیادہ نفع کا مستحق ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تھوڑا سرمایہ لگا کر شریک ہونیوالا کاروباری تجربہ کے اعتبار سے زیادہ سرمایہ والے شریک کے مقابلہ میں زیادہ نفع کا مستحق ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تھوڑا سا سرمایہ لگا کر شریک ہونے والا کاروباری تجربہ کے اعتبار سے زیادہ سرمایہ والے شریک کے مقابلہ میں ممتاز ہو اور نفع کا حاصل ہونا اس کی تجربہ کارانہ تدبیروں کا نتیجہ ہو۔

۳۔ چونکہ شرکت العنان میں مساوات کی شرط نہیں ہے اس لئے یہ معاہدہ بالغ اور بچوں کے درمیان یا آزاد اور غلام کے درمیان ہو سکتا ہے بشرطیکہ غلام کو اس کا آقا اجازت دیدے۔

ذمہ داریاں اور اختیارات

اس معاہدہ میں ہر شریک، دوسرے کا صرف وکیل ہوتا ہے کفیل نہیں بنتا، ہر ایک شریک مالِ شرکت کو بیچنے اور خریدنے کا حق رکھتا ہے لیکن کسی شریک کو مالِ شرکت میں قرض دینے کا حق نہیں ہے اور اگر کسی شریک نے دوسرے شرکار کی اجازت کے بغیر کوئی قرض لیا ہے تو اس کی ذمہ داری صرف اس شخص پر ہوتی ہے۔ دوسرے شرکار پر نہیں ہوتی ہے۔

(۳) شرکت الوجوہ

وہ شرکت ہے جس میں شرکار میں سے کسی کا بھی زر نہ ہو بلکہ سب کی محنت ہو اور اس شرکت میں باہمی اعتماد پر کام کیا جاتا ہے گویا چند اشخاص کا محض اپنی ساکھ کی بنا پر بغیر کسی سرمائے کے تجارتی کاروبار میں شریک ہو جانا ہے۔ شرکت الوجوہ کے صحیح ہونے کی شرط یہ ہے کہ ہر شریک نفع نقصان میں برابر کا حصہ دار ہو۔ اس کی مختلف صورتیں ہیں۔

(۴) شرکت الصنائع

اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ چند کاریگر عمل پیدائش کو انجام دیں۔ شرکت الصنائع کے بارے میں امام شافعیؒ کا اختلاف ہے وہ اس کو درست نہیں سمجھتے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ حصول منفعت کے لئے سرمایہ کا ہونا ضروری ہے صرف محنت بدوں سرمایہ پیدائش کا ذریعہ نہیں بن سکتی لیکن ان کے علاوہ دوسرے ائمہ نے اس کو جائز تصور کیا ہے امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک تو اس میں اتنی وسعت ہے کہ دو مختلف پیشے یا ہنر والے جیسے درزی اور رنگریز چاہیں تو

مل کر شرکت کا معاملہ کر سکتے ہیں یعنی جسے جو کام آتا ہے وہ انجام دے گا اور کمپنی کو جو نفع ہو گا وہ تقسیم کر لیا جائیگا۔

ان ائمہ کی پہلی اور بنیادی دلیل یہ ہے کہ عہد نبوی میں عبد اللہ ابن مسعود اور سعد، اس قسم کی شرکت کا معاہدہ کر چکے ہیں۔ (غزوہ بدر کے موقع پر ہتھیار بنانے کی صنعت میں شرکت کی تھی) اور حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر کوئی اعتراض نہیں فرمایا۔ لہذا اس کا جائز ہونا منشائے نبوی کے مطابق ہے۔ دوسری دلیل یہ ہے۔ کہ محنت بھی ایک نوع کا سرمایہ ہے امام سرخسی نے "المبسوط" میں محنت کو سرمایہ اور راس المال قرار دیا ہے "راس مالهما صنعتهما" کے الفاظ سے یہ بات واضح ہوتی ہے۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ شرکت الصنائع میں شرکت الوجوہ کی طرح نفع اور نقصان میں برابری ضروری نہیں بلکہ کاریگر اپنی محنت اور کاریگری کی حیثیت کے اعتبار سے باہم جس معاہدہ پر رضامند ہو جائیں وہ قابلِ قبول ہو گا۔

امام مالکؒ اور ان کے شاگردوں نے "المدونۃ الکبریٰ" نامی کتاب میں اس شرکت کی اور بہت سی قسمیں ذکر کی ہیں مثلاً طبی شرکت کہ چند معالج مل کر ایک ہسپتال قائم کریں، تعلیمی شرکت، کہ چند اساتذہ ملکر ایک تعلیمی ادارہ قائم کریں، زرعی شرکت (مشترکہ کاشت) المدونۃ الکبریٰ میں ان تمام صورتوں کو جائز قرار دیا گیا ہے۔

شرکت کی بحث ختم کرتے ہوئے امام سرخسی کی نقل کردہ ایک شرط کا ذکر کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے وہ فرماتے ہیں کہ شرکت کے معاہدہ کی تکمیل کے لئے چاہے وہ کسی قسم کی شرکت ہو۔ دستاویز لکھی جانی ضروری ہے۔ کیونکہ یہ معاہدہ ایک مقررہ میعاد کے لئے ہوا کرتا ہے۔ قرآن میں اشارہ ہے۔

یا یها الذین امنوا اذا تداینتم بدین الی اجل مسمی فاکتبوه	اے ایمان والو! جب تم ایک مقررہ مدت تک کسی دین کا لین دین کرو تو اسے لکھ لو۔

(سورہ بقرہ رکوع ۳۹)

امام سرخسی اس آیت کے پیش نظر کہتے ہیں کہ شرکت کا معاہدہ بھی چونکہ ایک مدت تک کے لئے ہے اسلئے اس کا لکھ لینا ضروری ہے۔ اس گفتگو کے بعد انہوں نے معاہدہ کے فارم کا ایک نمونہ بھی پیش کیا ہے۔ جس میں امور ذیل کی صراحت ضروری سمجھی ہے۔

۱۔ تاریخ معاہدہ

۲۔ شرکاء کا نام

۳۔ مدت معاہدہ

۴۔ سرمایہ کی تعداد

(شرکت الصنائع یا شرکت الوجوہ میں شئے کی وضاحت کرنا)

اور اس بات کی صراحت کے بعد کہ یہ سرمایہ شرکاء کے قبضہ میں فلاں مدت تک موجود ہے۔

مضاربت یا قراض

مضاربت اس کو کہتے ہیں کہ ایک شخص روپیہ لگائے اور دوسرا شخص محنت کرے اور نفع جس نسبت سے طے ہو جائے وہ تقسیم کر لیا جائے۔ اسے شرکت مضاربت یا قراض اس لئے کہتے ہیں کہ قراض کے معنی ہیں سفر کرنا اور چونکہ ایک شخص یعنی رب المال صرف روپیہ لگا کر سب ذمہ داریوں سے بری ہو جاتا ہے اور دوسرا شخص پوری محنت کرتا ہے یا قراض کے معنی ہیں قرضہ دینے کے، چونکہ یہ ایک قسم کا احسان ہوتا ہے جو ایک شخص پر دوسرا شخص کرتا ہے۔ ایک شخص دوسرے کو اپنا روپیہ دیتا ہے تاکہ وہ اس کو اپنی تجارت میں لگائے اس لیے اس کو قراض بھی کہتے ہیں۔

مضاربت پر بحث کرنے کے لئے درج ذیل چار چیزیں زیر غور ہیں۔

۱۔ سرمایہ۔

۲۔ سرمایہ دار۔

۳۔ محنت۔

۴۔ نفع۔

۱۔ سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ مضاربت صرف زر ہی میں ہو سکتی ہے۔ سامان میں نہیں اور اس پر کل فقہاء متفق ہیں سوائے قاضی ابن ابی لیلیٰ کے، ان کا کہنا ہے کہ مضاربت سامان میں بھی ہو سکتی ہے جبکہ قیمت خرید مقرر کردے لیکن چونکہ سامان کی صورت میں رب المال اور مضروب کے درمیان اختلاف ہو سکتا ہے اس لئے تمام فقہا اس سے اختلاف کرتے ہیں۔

۲۔ رب المال، تمام سرمایہ مضروب کو اس طرح سپرد کر دے کہ اس کا کوئی قبضہ اس پر نہ ہو یہاں تک کہ وہ اس امر کا بھی مجاز نہ ہو کہ بغیر مضروب کی خواہش کے اس کو کسی معاملہ میں مشورہ دے۔ البتہ اگر مضروب کسی مشورہ کا خواہش مند ہے تو وہ اسے مشورہ دے سکتا ہے۔

۳۔ عامل یا مضروب کے لئے سب سے ضروری اور پہلی چیز یہ ہے کہ وہ ان تمام شرائط کی پوری طرح پابندی کرے کہ جو رب المال اور اس کے درمیان طے پائی ہیں اور یہاں تک کہ اگر اس شرط میں کسی خاص مقام پر اور کسی خاص شے کی تجارت کرنے کا ذکر ہے تو مضروب کو چاہیئے کہ ان شرائط کے مطابق عمل کرے۔

۴۔ حصول نفع کی بھی تمام شرطیں اس طرح پر طے ہوں کہ کل حاصل شدہ نفع کا اس قدر فیصد رب المال کا اور اس قدر فیصد مضروب کا ہے۔ سہام یعنی مقدار کی شکل درست نہیں مثلاً یہ کہ رب المال پانچ سو روپیہ نفع لے اور باقی مضروب لے یا مضروب کے پانچ سو روپے اور باقی رب المال کے بلکہ شرح فیصد مقرر ہو۔ جس کی صورت میں

ر. المال اور مضروب کے درمیان نفع تقسیم ہوا کرے۔

وضاحت

اگر مضروب بسلسلہ تجارت سفر کرتا ہے تو سفر کے اخراجات راس المال میں شمار کئے جائیں گے نہ کہ نفع میں اور نفع وہ خالص آمدنی ہے جیسا کہ نفع کی نوعیت اور لغوی معنی سے ظاہر ہے گویا نفع وہ خالص آمدنی ہوگی جس میں کسی قسم کی کوئی دوسری چیز شامل نہ ہو سوائے اس روپیہ کے کہ جو اخراجات کے بعد بطور اضافہ حاصل ہوا ہے۔

مضاربت کا طریقہ عرب میں اسلام سے پہلے رائج تھا اور خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت سے قبل عادل کی حیثیت سے یہ معاملہ کیا ہے اسلام چونکہ ہر مفید معاملہ کو جائز شکل میں باقی رکھنے کا حامی ہے۔ اس لیے نبوت کے بعد بھی صحابہ کرام مضاربت کرتے رہے اور حضورؐ نے بجائے منع فرمانے کے اس کی ہمت افزائی فرمائی۔

صنعت

وسائل معیشت کے شعبوں میں زراعت اور تجارت کے بعد صنعت و حرفت کا درجہ ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ تمدن و معاشرت اور ملک کی ترقی میں صنعت و حرفت کا بڑا دخل ہے اور اس سے بہت سے برکات وابستہ ہیں۔ دراصل یہ بھی تجارت ہی کا ایک حصہ ہے ہر صنعت و حرفت اور تجارت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

خام پیداوار کی صورت و شکل اور ترکیب بدل دینے سے اس کی افادیت میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ جو صنعتیں صرف انسانی ہاتھوں سے تیار ہوتی ہیں انہیں دست کاریوں سے موسوم کیا جاتا ہے جو کل پرزوں اور مشینوں سے تیار ہوتی ہیں ان کو صنعتوں سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اسلام سے قبل عرب کی صنعتی حالت

طائف : یہاں کے لوگ صنعت و حرفت میں مشغول رہتے تھے۔ طائف کی خاص صنعت چرم سازی تھی۔ وہاں دباغت کے کارخانے اس قدر زیادہ تھے کہ طائف بلدۃ الدباغ کے نام سے مشہور ہوا۔ طائف میں لوہار بھی تھے جو لوہے کی دست کاری میں ماہر تھے۔ طائف میں دیگر صناعوں کے علاوہ طبیب بھی تھے۔

مکہ : ایک وادی غیر ذی زرع تھی۔ وہاں خام پیداوار نہ ہونے کی وجہ سے کوئی خاص صنعت نہ تھی۔ چمڑے کی صنعت صرف اونٹ کی کھالوں کی وجہ سے تھی۔

مدینہ : مدینہ میں پارچہ بانی، تلوار سازی، اور لکڑی کے سامان کی صنعتیں چھوٹے پیمانہ پر جاری تھیں سہل بن سعد کہتے ہیں کہ ایک مدنی عورت ایک حاشیہ دار چادر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لیکر آئی اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ ! یہ چادر میں نے اپنے ہاتھ سے بنی ہے۔ مدینہ کے بعض یہودی اچھے صناع تھے اور ان کے کارخانے تھے چنانچہ انصار مدینہ نے یہودیوں سے کپڑا بننا، رنگ سازی، تلواریں، زرہیں۔ کاشت کاری کے آلات اور دیگر آلات بنانے سیکھے۔

صنعت اور قرآن کریم

صنعت کے سلسلہ میں قرآن کریم میں واضح اشارات ملتے ہیں۔ جہاز سازی اور کشتیوں کی صنعت کے متعلق حضرت نوح علیہ السلام کا واقعہ موجود ہے۔ دھاتوں کی صنعت کے بارے میں کئی واقعے قرآن کریم میں ملتے ہیں حضرت داؤد علیہ السلام زرہ بنانے تھے اسی طرح قرآن کریم میں ظروف سازی کی صنعت کا اشارہ بھی ملتا ہے۔ ذوالقرنین کے قصے میں لوہے کی چادروں اور پگھلے ہوئے تانبے کا پتہ چلتا ہے۔ غرض قرآن کریم میں صنعت کے متعلق اشارات موجود ہیں اور اس کی اہمیت، ضرورت اور انسانی معاشرہ میں اس کے فوائد کو مانا جاتا ہے۔ فرعون کے قصہ میں مینارہ کی تعمیر کا تذکرہ اور عیسیٰ علیہ السلام کے ذکر میں ان کے بچپن میں مٹی کے کھلونے بنانے کا ذکر ہے اسی طرح زیور سازی اور پارچہ بافی کا ذکر ملتا ہے۔

صنعت اور احادیث

اسلام نے صنعت و حرفت کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کی ہے اور اس کو انسانی فلاح و بہبود کا ذریعہ ٹھہرایا ہے خالدؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ انسان کے لئے کسب معاش کا کونسا ذریعہ بہتر ہے تو فرمایا دست کاری (ابن ماجہ)

حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ داؤد علیہ السلام زرہ بناتے تھے اور حضرت ادریس علیہ السلام درزی کا پیشہ کرتے تھے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بکریاں چرانے کا پیشہ کرتے تھے۔ (فتح الباری)

متعدد حدیثیں ملتی ہیں جن میں صنعت و حرفت اور دست کاری کی ترغیب دی گئی ہے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ میں ہاتھ سے کام کرنے کا مذکور ہے مختلف انبیائے کرام کے حالات میں مذکور ہے کہ وہ کوئی نہ کوئی پیشہ یا صنعت و حرفت سے وابستہ تھے۔

عمل صحابہ کرامؓ

صحابہ کرام نے بھی انسانی معاشرہ کی ترقی و بقاء کے لئے خود محنت کی اور صنعت و دست کاری کو اپنایا اسماء الرجال

کی کتابوں میں ان صنعتوں کی صراحت ہے۔

حضرت امام ابو حنیفہ کپڑے کا کاروبار کرتے تھے بڑے بڑے علماء و فقہا کا تعلق دست کاری اور صنعت سے رہا ہے۔ دراصل اسلام نے تقویٰ کو معیار فضیلت قرار دیا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے۔

ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم (سورہ حجرات) اللہ کے نزدیک سب سے شریف وہی ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔

مسلمانوں کا مختلف صنعتوں سے اعتنا

مسلمانوں نے صنعت کے بارے میں بڑی ترقی کی اور انہوں نے ہر مفید صنعت کو شروع ہی سے اپنایا۔ عہد نبوی میں جنگوں میں رومی دماموں کا استعمال کیا گیا اور مسلمانوں نے منجنیق کی صنعت کو سیکھا اور اس کا استعمال کیا اس طرح مسجد میں منبر کی ابتدا بھی ملک شام کی یادگار ہے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی نے "اسلامی معاشیات" میں اس واقعہ کو بڑا زور دے کر لکھا ہے اور اس بات کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ عربوں کی کمانوں سے ایرانی کمانیں مضبوط ہوتی تھیں۔ مسلمانوں نے ایرانی طرز کی کمانوں کا استعمال کیا اور بنایا اور حضرت سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہد میں پون چکیوں کا استعمال ہوا۔ غرض مسلمانوں نے صنعتی ترقی میں شروع ہی سے دلچسپی لی۔

دست کاروں اور مزدوروں کے چند بنیادی مسائل

آج کل تمام دنیا میں سرمایہ داروں اور مزدوروں اور دست کاروں کے درمیان کش مکش ہو رہی ہے اور بعض انسانیت سوز تحریکیں پرورش پا رہی ہیں۔ دراصل بڑے بڑے ملوں اور کارخانوں میں جو بہترین صناع اور دست کار ہیں جن کو مزدوروں کے نام سے پکارا جاتا ہے وہ دنیا کے محسن ہیں۔ اسلام نے مزدور اور کارخانہ دار کے مسائل کو باحسن وجوہ حل کیا ہے۔

ہم نے "اجرت" کے عنوان کے تحت بخاری شریف کی ایک حدیث کے تحت اس موضوع پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

صنعت کی ترقی کے لئے سہولتیں بہم پہنچانا

تجارت اور صنعت و حرفت کی ترقی و کامیابی کے لئے موجودہ زمانے میں دو چیزیں بہت اہم ہیں۔

۱۔ شرح مبادلہ

۲۔ محصول درآمد

اسلام کے آغاز میں پہلی چیز کا سوال ہی نہ تھا اس لئے کہ سونے اور چاندی کی غیر مسکوک ڈلیاں کام میں آتی تھیں۔

البتہ درآمد برآمد کے محاصل کا مسئلہ ضرور پیش آیا آج کل کی قومی اور ملکی حکومتیں اپنے ملک کی صنعت و حرفت کا تحفظ اور ترقی اس طرح کرتی ہیں کہ غیر ملکی چیزوں پر بھاری بھاری محصول اور ڈیوٹیاں لگا دیتی ہیں اور اس طرح ملکی چیزوں اور صنعتوں کی حفاظت کرتی ہیں اسلام چونکہ ایک عالمگیر مذہب ہے لہٰذا وہ اس اصول کا قائل نہیں کہ ایک ملک فائدہ اٹھائے اور دوسرا تباہ ہو جائے اور دنیا میں فساد پھیلے اس معاملہ میں وہ بڑی رواداری دکھاتا ہے۔ اس کا اصول ہے کہ مخلوق خدا کا ایک کنبہ ہے اور سب کو فائدہ پہنچنا چاہیئے کسی پر کوئی ظلم نہ ہو۔

خلافت فاروقی میں یہ سوال اٹھا کہ خلافت اسلامیہ میں غیر مذہب والوں سے کوئی محصول نہیں لیا جاتا ہے مگر مسلمانوں سے دوسری حکومتیں محصول لیتی ہیں حضرت سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ۱/۱۰ حصہ مقرر کیا جو عشر کہلاتا ہے اور جو ہر شخص سے لیا جائیگا اور سال میں صرف ایک مرتبہ لیا جائے گا اگرچہ دوسری حکومتیں ہر مرتبہ محصول لیتی تھیں اس طرح اسلام نے صنعت و حرفت کی ترقی کے سامان بہم پہنچائے

ملیں اور کارخانے

جب صنعت و حرفت انسانی ہاتھوں سے نکل کر مشینوں اور ملوں کے قبضے میں چلی جاتی ہے تو سرمایہ دار اور مزدور دو طبقے سامنے آجاتے ہیں اور دونوں میں جھگڑا پیدا ہو جاتا ہے کیونکہ توازن و اعتدال باقی نہیں رہتا اسلام چونکہ دین فطرت ہے اور اس کا ایک عالمگیر نظام ہے لہٰذا اس کے یہاں سرمایہ داری اور محنت میں ایک معتدل توازن ہے اسلام ان تمام مفاسد کو بیخ و بن سے مٹانے کا داعی ہے جو صنعت کاروں اور دست کاروں کے حقوق کو پامال کرتے ہیں یا جن سے افراط و تفریط عدم اعتماد و عدم تعاون پیدا ہوتا ہے اور وہ ان اصولوں کو پیش کرتا ہے جس سے صنعت و حرفت کو ترقی ہو۔ اس سلسلہ میں اس نے عادلانہ اصول متعین کئے ہیں اور واضح کیا ہے کہ مزدور کو اس کی محنت کا پورا معاوضہ دیا جائے اس کا احترام کیا جائے حسب ضرورت حکومت اس کے حقوق کا تحفظ کرے اس کو آسانیاں بہم پہنچانے کا انتظام کرے تاکہ صنعت و حرفت ترقی کر سکے اور معاشرہ کو استحکام نصیب ہو۔

اُجرت

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل دنیا میں جہالت کی تاریکی چھائی ہوئی تھی انسانی زندگی کا ہر شعبہ زنگ آلود تھا ہر طرف لوٹ کھسوٹ، ظلم و جور اور رہزنی و قزاقی کا دور دورہ تھا مذہبی مقتدی ارباب من دون اللہ بنے بیٹھے تھے اور عوام الناس کو محض غلام سمجھتے تھے۔ غریبوں کا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ مزدوروں اور اجیروں کی مٹی پلید تھی ان سے سخت سے سخت محنت لی جاتی تھی اور کم سے کم اجرت دی جاتی تھی غلاموں کی حالت تو جانوروں سے بھی بدتر تھی بعض اوقات مزدوروں کی

جان محض ایک رسی کے نقصان پر لے لی جاتی تھی مگر جب آفتاب اسلام طلوع ہوا تو کفر و ضلالت کی تاریکی ختم ہو گئی غریبوں کو زندگی کے حقوق ملے۔ غلاموں کی حالت سنبھلی اور اجیر و مزدور کو چین ملا۔

مزدوروں کی زبُوں حالی

آج بیسویں صدی کی مہذب دنیا میں مزدور پیشہ طبقہ چنداں وقعت کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا ہے۔ جسمانی محنت کرنے والوں دست کاروں اور مزدوروں کی کوئی حیثیت اور وقعت نہیں۔ لوگوں کے دل و دماغ میں اب تک تعصب کا غبار چھایا ہوا ہے کہ جسمانی محنت حقیر ہے اور جسمانی محنت کرنے والا کسی عزت کا مستحق نہیں ہے۔ سرمایہ دارا ور جاگیر دار طبقوں میں توان کی پہلے ہی سے کوئی قدر نہیں تھی اسلام دین فطرت اور ایک مکمل نظام حیات کا مالک ہے اس میں اس قسم کے طبقاتی تعصبات کی کوئی گنجائش نہیں اسلام نے تمام مصنوعی اور طبقاتی امتیازات ختم کر کے اخوت و مساوات کی تعلیم دی ہے اور عملی طور سے مزدور کے وقار کو بلند کیا اور محنت کو باعزت ٹھہرایا ہے۔

قریش کا مسئلہ آجر و مزدور

زمانہ جاہلیت میں مکہ میں آجر و مزدور کا باہمی تعلق نہایت خراب تھا اور آجر کو مزدور پہ پوری طرح حکمرانی کے حقوق حاصل تھے یہاں تک کہ اگر کوئی آجر کسی مزدور کو جان سے مار ڈالتا تھا تو اس کی کوئی شنوائی نہ ہوتی تھی۔

محنت اور قرآن

محنت کے باب میں قرآن حکیم نے ہمارے سامنے تین پیغمبروں کی زندگی بطور نمونہ پیش کی ہے اوّل حضرت یوسف علیہ السلام دوم حضرت موسیٰ علیہ السلام سوم حضرت داؤد علیہ السلام۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ اس وقت زیر بحث آتا ہے جب وہ جیل سے رہا ہو کر عزیز مصر کے پاس پہنچتے ہیں اور جب بحث آتی ہے کہ ان کو کونسا عہدہ عطا کیا جائے تو وہ فرماتے ہیں کہ مجھے محکمہ مالیات پہ مقرر کیا جائے کیونکہ میں بہت علم رکھنے والا اور حفاظت کرنے والا ہوں اور عزیز مصر نے بھی کہا تھا کہ "آپ امین ہیں" اس وجہ سے بھی آپ کو اس عہدہ پہ مقرر کرنا چاہتا ہوں

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اس وقت ارشاد ہوتا ہے جب وہ مصر چھوڑ کر مدائن کی جانب روانہ ہوتے ہیں۔ یہاں ان کی ملاقات حضرت شعیب علیہ السلام سے ہوتی ہے اور وہ فرماتے ہیں کہ میں تمہارے ساتھ اپنی ایک لڑکی کی شادی کروں گا بشرطیکہ تم اس کا مہر اس طرح ادا کرو کہ میری بکریاں آٹھ سال تک چراؤ اور اگر دس سال تک چراؤ تو یہ تمہاری مہربانی ہوگی۔ اس موقع پہ حضرت شعیب علیہ السلام کی صاحبزادی فرماتی ہیں کہ اے باپ! کہ آپ جن

شخص کو محنت کے لئے رکھتے ہیں اس میں سب سے بہتر وہ ہے جو قوی اور ایماندار ہو۔ چونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کام جسمانی مشقت کا تھا اس لئے قوی ہونے کی شرط ضروری سمجھی گئی ویسے امین ہونے کی شرط خاص ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس پر رضامند ہو گئے اور ان کی شادی حضرت شعیب علیہ السلام کی صاحبزادی سے ہو گئی اس باب میں کوئی تشریح نہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کتنے سال بکریاں چرائیں لیکن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دس سال بکریاں چرائی ہوں گی کیونکہ ایک پیغمبر اور بالخصوص حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہی توقع تھی۔

اسلام نے صنعت و حرفت کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کی ہے اور اسے انسانی معاشرہ کی فلاح و بہبود کا ذریعہ ٹھہرایا ہے مقدام رضؓ کہتے ہیں کہ حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنے ہاتھ کی کمائی سے بہتر کوئی کھانا نہیں ہے اور حضرت داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ کی کمائی کھاتے تھے مشہور ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام زرہ بنایا کرتے تھے گویا حدادی کے کام سے ان کا تعلق تھا۔

اجیر اور آجر کی خصوصیات

اجیر کے بارے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسے امین ہونا چاہیئے دوسرے اس میں اس کام کی جو اس کے سپرد کیا جائے۔ پوری صلاحیت ہونی چاہیئے آپ نے فرمایا کہ وہ روزی جو امانت اور ذمہ داری سے حاصل ہوتی ہے حلال و طیب ہے جو شخص مزدور رکھے اس کے لئے دو شرائط ہیں اول یہ کہ اجیر کی اجرت اس کے کام اور محنت کے لحاظ سے مقرر کرے اور کام کی اہمیت کے لحاظ سے اس کی واجبی اجرت ادا کرے اور دوسری چیز یہ ہے کہ اجیر کی اجرت اسی وقت دیدے کہ اس کا پسینہ خشک نہ ہونے پائے اور اگر فوراً نہ دے سکے تو یہ دو باتیں ضروری ہیں۔

۱۔ اجیر کو خندہ پیشانی سے رخصت کرے اور کوئی بات ایسی پیش نہ آنے دے۔ جس سے اجیر کو کسی قسم کی تکلیف یا رنج پہنچے۔

۲۔ مستاجر اپنی صوابدید کے مطابق رقم بعد میں ادا کرتا ہے تو اسے چاہیئے کہ وہ کچھ رقم اضافہ کر دے تاکہ اجیر خوش ہو جائے۔

نبی کریمؐ کا اسوۂ حسنہ

خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ میں تجارت کے علاوہ "عمل بالید" کا سراغ ملتا ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بکریاں چرائیں اور اس کا ذکر فخریہ فرمایا۔ آپ نے اجرت پر بھی کام کیا غرض کہ حضورؐ نے "کسب" کی حوصلہ افزائی فرمائی ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ خندق کے موقع پر خندق کھودنے میں شرکت فرمائی۔ ایک دفعہ ایک سفر میں

صحابہ کرامؓ نے کھانے کی تیاری میں مختلف کام اپنے ذمہ لے لیے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے لکڑیوں کی فراہمی کی ذمہ داری لے لی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنا کام اکثر خود کرتے تھے۔ جھاڑو خود دے لیتے تھے۔ کپڑوں میں پیوند لگا لیتے تھے۔ جوتیاں درست فرما لیتے تھے۔ غرض کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کی روشنی میں محنت کی عظمت مسلمہ ہے۔

عمل صحابہ کرامؓ

صحابہ کرامؓ نے بھی انسانی معاشرہ کی ترقی و بقا کے لیے خود محنت کی۔ خلیفہ اوّل سیدنا صدیقؓ کپڑا فروخت کرتے تھے بلکہ آپ نے خلافت کی ذمہ داریوں کے سنبھالنے کے بعد بھی یہ کام جاری رکھنا چاہا۔ اس طرح آپ ایک بوڑھی عورت کے گھر جا کر اس کی بکریوں کا دودھ دوہا کرتے تھے اور خلیفہ ہونے کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ خلیفہ دوم سیدنا فاروق اعظمؓ کے حالات میں بکریاں چرانے اور اینٹیں تھاپنے کا بھی ذکر ملتا ہے۔ خلیفہ سوم سیدنا عثمان غنیؓ تو ایک ممتاز تاجر تھے اسی طرح خلیفہ چہارم سیدنا علیؓ نے چند کھجوروں کے عوض ایک یہودی کے کھیت میں پانی دیا تھا دوسرے صحابہ بھی کسب معاش کے کسی نہ کسی طریقے پر کاربند تھے۔ مہاجرین کا عام مشغلہ تجارت اور انصار کا زراعت تھا غرض صحابہ کرام جو براہ راست صحبت نبوی کے فیض یافتہ تھے، محنت مزدوری کو عیب نہیں سمجھتے تھے اور کسب حلال کو فرض جانتے تھے ان ہی کی صحبت سے مشرف ہونے والے تابعین تھے جنہوں نے اپنی بسر اوقات کے لیے اکثر چھوٹی موٹی تجارت یا حرفت کے پیشہ پر قناعت کی۔ اسلام کی اسی تعلیم کا اثر تھا کہ مدتوں بعد بھی اکابر اسلام اپنی مشقت سے روزی کمانے کو ضروری جانتے تھے اور سوسائٹی پر بار بننا پسند نہیں کرتے تھے۔

عظمت مزدور

اُجرت کے متعلق سب سے اہم اور بنیادی مسئلہ محنت کی عزت اور مزدوروں کا وقار ہے دنیا میں ہمیشہ مزدوروں کا طبقہ معاشرہ میں ایک پسماندہ طبقہ شمار کیا گیا ہے۔ انبیائے کرام خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعات اور صحابہ کرام کا ذکر کیا جا چکا ہے کہ ان حضرات نے ہاتھ سے کام کیا ہے اور اجرت پر بھی کام کیا ہے۔ اسلام میں مزدور کے مقام کو متعین کرنے کے لیے یہی کافی ہے یہ تو اسلامی تعلیم کا اخلاقی پہلو تھا۔ قانونی حیثیت سے اسلام نے آجر اور اجیر کے ہر مصنوعی امتیاز کو اٹھا دیا ہے اور آجر و اجیر کو معاشرے میں پورا مساوی درجہ دیا ہے۔ یہاں یہ بات کہنی بے موقع نہ ہوگی کہ ذات پات اور اونچ۔ نیچ کے امتیاز کو ختم کر دینے سے آجر و اجیر کے خود ساختہ امتیازات خود بخود ختم ہو جاتے ہیں۔ آخر میں مزدور کے وقار کے لیے اس بات کا اعادہ بھی ضروری ہے کہ اپنے ہاتھ سے مزدوری (کسب کرنے والا) اسلام میں عزت کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔

مسئلہ اُجرت کی اہمیت

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اجیر کی اجرت کو اتنا اہم قرار دیا ہے کہ جس کے بغیر قوم فارغ البالی کی زندگی بسر نہیں کر سکتی۔ کارخانۂ ہستی کو اسلام مضبوط و منظم کرنا چاہتا ہے مزدور اس کے لئے ایک اہم ترین عامل ہے اور اس کے عمل کا محور اس کی اجرت ہے۔ قرآن کریم نے سورۂ مائدہ کے شروع میں ہر اس معاملہ کو پورا کرنے کی تائید فرمائی ہے جو ایک انسان قانون توڑے بغیر کر سکتا ہے سورۂ مائدہ کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ط   اے ایمان والو۔ پورے کرو قرار۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ایک انصاری حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضورؐ نے ان کا ایک پیالہ نیلام کر کے ان کو دو درہم دلوائے۔ ایک درہم سے کلہاڑی خریدی گئی۔ حضورؐ نے اپنے دست مبارک سے کلہاڑی میں دستہ ڈالا اور ان سے فرمایا کہ لکڑی کاٹو اور بیچو۔ انہوں نے ایسا ہی کیا اور ان کو مرفہ الحالی نصیب ہوئی اس حدیث سے مزدوری اور محنت کی عظمت کا حال ظاہر ہے۔

تعینِ اُجرت

آج کل دنیا میں سرمایہ دار اور مزدور کے درمیان کشمکش اور رسہ کشی جاری ہے اور بعض خطرناک تحریکیں اس کشمکش کے نتیجہ میں پرورش پا رہی ہیں سرمایہ دار، مزدوروں کو نوکر رکھ کر ان کی اجتماعی محنت سے نفع حاصل کرتا ہے۔ اور ان کو چند ٹکے دے دیتا ہے اسلام نے تعین اجرت کیلئے واضح ہدایات فرمائی ہیں۔ جن سے بعض مفاسد کا کلی انسداد ہو جاتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے۔

"وہ مزدور تمہارے بھائی ہیں۔ ان کو خدا نے تمہارے ماتحت کیا ہے۔ پس جس کے ماتحت خدا نے اس کے بھائی کو کیا ہو۔ اس پر ضروری ہے کہ جو خود کھائے وہی اس کو بھی کھلائے، جو خود پہنے وہ اس کو بھی پہنائے اور جو کام اس کی طاقت سے باہر ہو اس کو اسکی تکلیف نہ دے اور اگر کسی دشوار کام کی تکلیف دے تو اس کی مدد کرے۔

اس حدیث سے حسب ذیل امور بآسانی مستنبط ہوتے ہیں۔

۱۔ آجر، اجیروں کو اپنا بھائی سمجھے۔ دونوں کے تعلق کی نوعیت دو بھائیوں کی سی ہو۔

۲۔ کم از کم کھانے اور پہننے کی حد تک دونوں کی سطح برابر ہو۔

۳۔ وقت اور کام دونوں کے اعتبار سے مزدور پہ اتنا بوجھ نہ ڈالا جائے کہ جو اس کو جھکا دے۔

۳۔ اگر کوئی ایسا کام آجائے کہ جس کی انجام دہی میں دشواری ہو تو آجر کا فرض ہے کہ اس کی مدد کرے۔

اس سلسلہ میں اوقات کار کی تحدید بھی بیان کر دینی مناسب ہو گی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عام قانون یہ ارشاد فرمایا کہ کام کی مقدار اور کام کا وقت اتنا ہونا چاہیئے جس پر دوام ہو سکے نیز معقول اجرت کے لئے اسلام نے مزدوروں کو پوری آزادی دی ہے اور وہ ایک شہر میں مزدوروں کی کثرت اور کام کی قلت کی صورت میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو سکتا ہے یہ بات بیان کرنی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ جب کفار مکہ نے مسلمان مزدوروں کے ساتھ بالخصوص زیادتیاں شروع کر دیں تو قرآن نے ہجرت کی ترغیب و تبلیغ ان الفاظ میں دی۔

وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرَاغَمًا كَثِيْرًا وَّ سَعَةً ؕ

"جو شخص خدا کی راہ میں ہجرت کرتا ہے وہ زمین میں اپنے لئے فارغ البالی اور کشادگی پاتا ہے۔"

اسی لئے اسلام میں پیشہ کی آزادی ہے کہ ہر شخص جو چاہے پیشہ اختیار کرے۔ مزدوروں کی فارغ البالی کیلئے اسلام کے معاشی نظام میں ہر غریب کو کافی روزی بہم پہنچانے کی ذمہ داری حکومت کے ذمہ ڈالی گئی ہے۔ زکوٰۃ فے، اموال صدقات، وعشر وغیرہ کا بڑا مصرف عام باشندوں کی معاشی کفالت ہے

چند ضروری واضح ہدایات

اسلام ایک عالمگیر نظام حیات ہے لہٰذا وہ دنیا کی فلاح وبہبود اور انسانیت کی بقا اور تحفظ کے اصول پیش کرتا ہے اس کی نظر میں محنت معاشی نظام کا ایک اہم ترین جزو ہے، وہ سرمایہ دار اور مزدور کے لئے اعتدال، باہمی تعلقات اور اشتراک کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ اسلام ان چیزوں کو بیخ و بن سے مٹانے کا داعی ہے۔ جو مزدوروں کے حقوق کو پامال کرتی ہیں یا جن سے افراط و تفریط، عدم تعاون اور عدم اتحاد ظاہر ہوتا ہے چنانچہ وہ محنت کے ایسے اصول پیش کرتا ہے جن سے عادلانہ اور صالح نظام معاشرت کے قیام میں مدد ملے اس سلسلہ میں خاص خاص باتیں درج ذیل ہیں

۱۔ اُجرت کم نہ دی جائے کیونکہ مزدور بے چارہ، غریب، بیکس اور فاقہ زدہ ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ لبا اوقات کم اُجرت پر راضی ہو جاتا ہے۔

۲۔ کم سے کم اُجرت دے کر زیادہ سے زیادہ محنت لینے کو اسلام اس کو ظلم قرار دیتا ہے۔

۳۔ مزدوروں کی اُجرت مقرر کر دی جائے۔ ایسا نہ ہو کہ کام کرنے کے بعد انہیں کم اجرت دی جائے۔ اسلام اس کو ناپسند کرتا ہے۔

۴۔ مزدوروں کی اجرت کے ادا کرنے میں حیلہ وحجت نہ کی جائے۔ اسلام کی نظر میں یہ بات ناپسندیدہ ہے۔

۵۔ مزدوروں کا حق تلف کر کے اور مزدور پر خراب کام کرنے کا الزام لگا کر جرمانہ کے نام سے مزدوری واپس نہ لی جائے اسلام نے اس کو بھی افراط و تفریط سے تعبیر کر کے اس کا انسداد کیا ہے۔

۶۔ مزدور اور نوکر کے ساتھ چشم پوشی کا برتاؤ کرنا چاہیئے ایک شخص حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اس نے دریافت کیا کہ میں اس نوکر کو کتنی دفعہ معاف کیا کروں، راوی کا بیان ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے اس پر اس نے پھر وہی سوال دہرایا۔ تب ارشاد ہوا۔ روزانہ ستر مرتبہ معاف کیا کرو (ابوداؤد ترمذی)
اس سے فقہائے اسلام نے استنباط کیا ہے کہ اگر مقررہ مدت کی تنخواہ پر ملازم سے بلا مقصد نقصان ہو جائے تو تاوان نہ لیا جائے۔

شرکت منافع

اسلام نے مزدور کی اجرت کا تحفظ کرتے ہوئے اس بات کو پسند کیا ہے کہ مزدور کو اس کے کام کی منفعت میں شریک کیا جائے مسند احمد میں یہ روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عاملوں کو ان کے عمل سے حصہ دو، تمہارا یہ عمل اللہ کے لئے ہوگا، جس میں تمہیں کبھی گھاٹا نہ ہوگا۔
حدیث کی کتابوں میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ روایت مذکور ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تمہارا خادم کھانا تیار کر کے لائے تو اس کو اپنے ساتھ کھانے پر بٹھاؤ اور اگر یہ نہ کر سکو تو کم سے کم چند لقمے اس کے لئے دیدو کہ اس نے کھانا پکانے میں گرمی، دھواں اور دوسری مشقتیں برداشت کی ہیں اس کو اپنی مشقت کا پورا پھل ملنا چاہیئے تاکہ وہ یہ نہ سمجھے کہ میں اپنی محنت سے مستفید نہیں ہوں اور محنت کا پورا ثمر آقا کو پہنچ رہا ہے۔

حکومت کی نگرانی

جس طرح حکومت کو آجروں اور اجیروں کے جھگڑوں کو ختم کرنے کے لئے مداخلت کا حق حاصل ہے۔
اسی طرح حکومت کو ان کے کام پر نگرانی رکھنے کا پورا حق حاصل ہے۔ ابومسعود انصاری کا بیان ہے کہ ایک دن میں اپنے غلام کو مار رہا تھا۔ پیچھے سے آواز آئی ابومسعود! ابومسعود! یہ معلوم کر کہ تجھ کو اپنے زیر دست پر جتنی قدرت حاصل ہے خدا کو نہ بھولو۔ ایسا نہ ہو کہ قیامت کے دن تیرا یہ کوڑا غلام کے ہاتھ میں ہو میں نے عرض کیا کہ میں نے یہ غلام خدا کی راہ میں آزاد کیا۔ یہ سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تو ایسا نہ کرتا تو دوزخ کی آگ تجھے جھلس ڈالتی۔
خلیفہ دوم حضرت سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اکثر مدینہ کے باہر تشریف لیجاتے اور اگر کسی شخص کو اس طرح کام کرتے دیکھتے کہ جو اس کی برداشت سے باہر ہو تو اس کے آجر کو اس کی طاقت کے مطابق کام لینے پر مجبور کرتے حضرت فاروق اعظم نے اپنے دور خلافت میں محتسب مقرر کئے اور ان کو یہ حکم دیا گیا کہ کسی مزدور پر

زیادتی نہ ہو اور اگر ہو تو اس کے آجروں سے باز پرس کی جائے اور آجروں کو یہ حکم دیا جائے کہ اجیروں کی برداشت سے زیادہ ان سے کام نہ لیا جائے اس طرح اگر کوئی شخص اپنے جانوروں کو پوری خوراک نہ دے یا طاقت سے زیادہ کام لے تو اس سے مواخذہ کیا جائے۔ حتیٰ کہ ملاحوں کی کشتیوں میں اتنا بوجھ لادنے کی ہرگز اجازت نہ دی جائے کہ جس سے غرق ہونے کا خطرہ ہو۔ حکومت کو چاہیئے کہ مزدوروں کی محنت کا بھی پورا خیال رکھے۔ ایک بار آپ کو یہ اطلاع ملی کہ ایک کارخانہ دار بیمار مزدوروں کی عیادت کو نہیں جاتا۔ آپ نے محتسب کو ہدایت کی کہ کارخانہ دار سے باز پرس کی جائے اور اس کو ایک طبیب مقرر کرنے کی فہمائش کی جائے اور اگر اس کی آمدنی طبیب کا بوجھ نہ اٹھا سکے تو بیت المال کی طرف سے فوراً طبیب مقرر کر دیا جائے۔

اس سلسلہ میں حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی بڑا خیال تھا۔ مزدوروں کی ایک جماعت تھی آپؐ نے مزدوروں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر تم روزانہ غسل نہیں کر سکتے تو کم از کم ہفتہ میں جمعہ کا غسل ضرور کیا کرو ایک زمانہ تک یہ غسل فرض کی حیثیت سے کیا جاتا تھا لیکن بعد کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس غسل کا سبب بیان فرماتے ہوئے اس کو مسنون قرار دیا۔

ان تصریحات کے بعد اسلام اپنے اقتصادی نظام میں مزدوروں اور پیشہ وروں کو راس المال کے ساتھ زیادتی اور تعدی کرنے سے روکتا ہے اور نہیں چاہتا کہ ایک طرف سے افراط اور دوسری طرف سے تفریط ہو۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بہترین کمائی مزدور کی کمائی ہے۔ بشرطیکہ وہ کام والے کا کام خیر خواہی اور بھلائی کے ساتھ انجام دے۔

شعب ابی طالب

ڈاکٹر نثار احمد

شعب ابی طالب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے دیگر اہلِ خاندان کا تین سال تک محصور رہنا سیرتِ نبوی کا ایک اہم اور غور طلب واقعہ ہے۔ اس کی اہمیت تو اس لیے واضح ہے کہ کُفارِ قریش اور مخالفینِ اسلام نے تحریکِ اسلامی کو دبانے، مٹانے اور ختم کرنے کے لیے جو حربے استعمال کیے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے ساتھیوں کو انتہائی سخت اذیتیں پہنچانے کی جو صورتیں اختیار کیں ان میں سے ایک صورت یہ واقعہ بھی ہے۔ جس زمانے میں یہ واقعہ پیش آیا آپؐ کو نبوّت ملے چھ سال گزر چکے تھے لیکن اس سارے عرصے میں انتہائی ناروا سلوک کے باوجود قریش نے آنحضرتؐ کے خلاف کبھی اس سے زیادہ سخت اقدام نہیں کیا تھا۔ بلاشبہ مصائب و آلام کا دور ماقبل بھی قریش کی ظالمانہ تاریخ کا ایک حصّہ ہے۔ جس میں ترغیب و ترہیب کا ہر انداز ملتا ہے۔ لیکن ایک حلف نامے کے ذریعے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خاندانِ بنو ہاشم کا معاشی، معاشرتی مقاطعہ کرنا سخت الم انگیز اور کافرانہ سیاست کی انتہائی شاطرانہ چال تھی جس کے نتائج ان کی توقع کے مطابق تو نہ نکلے لیکن بہرحال اس کے ذریعے مسلسل تین سال تک داعئ اسلام صلعم اور بنو ہاشم کو مبتلائے عذاب رکھا گیا۔

اور یہ واقعہ غور طلب اس لیے ہے کہ اگرچہ اس کا ذکر کم و بیش ہر قدیم و جدید سیرت نگار نے کیا ہے لیکن جس انداز سے کیا ہے اور جو تفصیلات فراہم کی ہیں ان سے بدیہی طور پر یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ جب قریش نے بنو ہاشم کا مقاطعہ کرایا تو اس کے بعد تین سال تک بنو ہاشم کو ناخواستہ محصوری اور نظر بندی کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کے بیانات سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ بنو ہاشم کی رہائش الگ کسی مقام پر تھی اور محصوری کا واقعہ دوسرے مقام شعبِ ابی طالب میں پیش آیا۔ جس کی صورت یہ ہوئی کہ بنو ہاشم اس اعلانِ مقاطعہ کے بعد مکّہ سے نکلے اور سامانِ خور و نوش باندھ کر وہاں جا بیٹھے اور اپنے آپ پر باہر نکلنے کے سارے دروازے بند کر لیے۔ پھر جب تین سال بعد وہ معاہدہ ختم ہوا تب یہ لوگ وہاں سے نکل کر دوبارہ اپنی رہائش گاہوں میں منتقل ہوئے حالانکہ کسی سیرت نگار نے یہ تصریح نہیں کی کہ بنو ہاشم کی رہائش کس جگہ تھی، اور شعبِ ابی طالب کہاں اور ان کی اصل رہائش گاہ سے کتنے فاصلے پر واقع تھا۔

یہ صورتِ حال اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ مندرجہ ذیل مسائل پر غور کیا جائے:

۱۔ شعبِ ابی طالب میں محصوری کیوں ہوئی۔ بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں مقاطعہ کیوں کیا گیا؟

۲۔ مقاطعہ صرف بنو ہاشم کا کیوں کیا گیا؟

۳۔ شعبِ ابی طالب کیا ہے اور کہاں واقع ہے؟

۴۔ مقاطعہ کی نوعیت کیا تھی؟

۵۔ مقاطعہ کیسے ختم ہوا؟

ہم اسی ترتیب سے ان مسائل کا جائزہ لیں گے۔

جہاں تک مقاطعہ کا تعلق ہے، اس میں کوئی ابہام یا پیچیدگی نہیں پائی جاتی۔ سیرت کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ کفارِ قریش کی چھ سال سے زائد کی معاندانہ کوششیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کے پائے ثبات میں برائے نام بھی اضمحلال پیدا نہ کرسکی تھیں۔ دھمکی اور لالچ کا ہر وار ہدف سے دور اور سختی و نرمی کا ہر حربہ کند ہو چکا تھا۔ بلکہ تماشہ یہ تھا کہ تحریک کو دبانے کی ہر کوشش الٹا اس کے فروغ کا باعث بن جاتی تھی۔ یہاں تک کہ دعوتِ حق سے مکہ کے دشت و جبل گونج اٹھے اور حبشہ کے سرکار و دربار تک اعلانِ حق پہنچ گیا۔ پھر حضرت ابوبکرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت حمزہؓ اور بالآخر حضرت عمرؓ جیسے بااثر افراد مشرف بہ اسلام ہو گئے تھے۔ یہ سب حالات مشرکین و کفار کو برافروختہ کرنے کے لیے کافی تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابوطالب صاحبِ ایمان نہ ہونے کے باوجود داعیٔ اسلام کی پشت پناہی کر رہے تھے۔ اور ان کی موجودگی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ہاتھ ڈالنا یقیناً ایک مشکل امر تھا۔

غرض ان اسباب نے اہلِ قریش کو مقاطعہ کا سخت قدم اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ جس سے ان کا اصل مقصد یہ تھا کہ انتہائی سختیوں سے گھبرا کر یا تو خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعوت سے دستبردار ہو جائیں گے یا بصورتِ دیگر (مومن و کافر) اہلِ خاندان ان مصائب و آلام کو برداشت کرنے کے مقابلے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش کے حوالے کرنے میں زیادہ عافیت محسوس کریں گے۔

چنانچہ قریش کے اس مقصد کی توضیح اس معاہدہ[1] میں موجود ہے جس کے ذریعہ انہوں نے بنوہاشم کو یہ سزا دی تھی اور خاص طور پر یہ بات کہ یہ معاہدہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک کہ (یسلموا الیھم النبی صلی اللہ علیہ وسلم) یعنی بنوہاشم، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کے لیے قریش کے حوالے نہ کر دیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ :-

ا۔ قریش نے یہ مقاطعہ صرف تین سال کے لیے نہیں کیا تھا بلکہ غیر معینہ مدت کے لیے اور اس وقت تک کے لیے تھا جب تک کہ بنوہاشم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش کے حوالے نہ کر دیں۔ یہ محض ایک اتفاق ہے کہ خدا کی کرشمہ سازی سے دیمک اس معاہدے کو چاٹ گئی یا کچھ لوگوں نے جرأت و بہادری سے کام لے کر اس ظالمانہ معاہدہ کو ختم کرانے کی سنجیدہ کوشش کی تھی۔ ورنہ ایک غیر معینہ مدت تک مقاطعہ کا نتیجہ کچھ بھی نکل سکتا تھا۔ ممکن تھا کہ بنوہاشم حضورؐ کو دشمنوں کے حوالے کر دیتے۔ ممکن تھا کہ سارے بنوہاشم جوشِ حمیّت میں مسلمان ہو جاتے اور یہ بھی ممکن تھا کہ خود قریش اس معاہدہ پر زیادہ دیر تک متحد و متفق نہ رہ سکتے۔ بہرحال یہ بات طے ہے کہ مذکورہ بائیکاٹ غیر معینہ مدت کے لیے تھا۔

ب۔ قریش کا اصل مقصد یہ تھا کہ بنوہاشم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پشت پناہی سے دستبردار ہو کر آپؐ کو ان کے حوالے کر دیں تاکہ وہ آپؐ کے خلاف من مانی کارروائی کر سکیں۔

—— (۲) ——

اس مرحلے پر یہ سوچنا چاہیے کہ قریش نے ترکِ موالات کا معاملہ صرف بنوہاشم کے ساتھ ہی کیوں مخصوص رکھا۔ دوسرے اہلِ ایمان

---

[1] معاہدہ کے الفاظ میں اہلِ سیر اور مؤرخین نے اختلاف کیا ہے، مگر مضمون و معنی کے اعتبار سے کاملاً اتفاق پایا جاتا ہے۔

جن کا تعلق عرب کے مختلف قبائل سے تھا اس سے مستثنیٰ اور کسی قسم کی پابندی سے آزاد کیوں تھے ؟ دوسرے الفاظ میں مقاطعہ کے دائرے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ساتھ دوسرے تمام مسلمانوں کو شامل کیوں نہ کیا گیا۔ ہمارے خیال میں اس کی مندرجہ ذیل وجوہ ہیں :—

ا ۔ نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم خاندانِ بنو ہاشم سے تعلق رکھتے تھے۔ قریش کی دشمنی کا ہدف اصل میں آپ ہی کی ذات تھی۔ پھر وہ خاندان بھی ان کی نگاہ میں مبغوض بن گیا جس سے آپ کا تعلق تھا۔ یہ ایک عام قاعدہ ہے کہ اگر کسی کے نزدیک کوئی شخصیت محبوب ہو تو اس سے متعلقہ دوسری اشیاء بھی محبوب و محترم ہو جاتی ہیں۔ اور اس کے برعکس اگر نفرت ہو تو پھر اس سے تعلق رکھنے والی ہر چیز ناپسندیدہ اور مکروہ قرار پاتی ہے۔

ب ۔ آنحضرتؐ کے بعد دوسرے درجے میں دشمنی ابوطالب سے تھی، جو اپنے بھتیجے کی (ان کے خیال میں) حمایت بے جا کر رہے تھے۔ اور جنہوں نے حضور صلعم کی حمایت کو "ہاشمی وقار" کا مترادف قرار دے کر بجز ابولہب کے تمام مومن و کافر بنو ہاشم کو اپنا ہمنوا بنا لیا تھا۔

ج ۔ حضورؐ کو کفارِ قریش کے حوالے کر دینے کی ذمہ داری قبائلی دستور کے مطابق بنو ہاشم کی تھی جس سے حضور کے چچا اور بنو ہاشم کے سردار ابوطالب نے صاف صاف انکار کر دیا تھا۔

اور یہاں تک جواب دے دیا تھا کہ :—

ونسلمه حتی نصرع حوله ✱ ونذهل عن ابنائنا والحلائل

ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اس وقت دشمنوں کے حوالے کریں گے جب ان کے گرد لڑ کر مر جائیں اور ہم اپنے بیٹوں اور بیویوں سے بھلا دیے جائیں۔

اس بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم تو ان کے براہِ راست مجرم تھے ہی، بنو ہاشم اور ابوطالب بھی بالواسطہ طور پر مجرم بن گئے۔ اس لیے قریش چاہتے تھے کہ حضور صلعم کی "حمایت بے جا" کا مزہ ان سب کو چکھانا چاہیے۔

د ۔ چونکہ اہلِ ایمان کا تعلق عرب کے مختلف شعوب و قبائل سے تھا اس لیے اگر قریش تمام مسلمانوں کا بیک وقت مقاطعہ کر دیتے تو کس کس سے جنگ مول لیتے اور پھر کون کون ان کا شریکِ معاہدہ ہوتا۔ آخر عصبیت جاہلیت کا معاملہ تھا۔ اس بنا پر مقاطعہ کو انہوں نے صرف بنو ہاشم تک محدود رکھا۔

ہ ۔ اس مقاطعہ کے ذریعے وہ عام مسلمانوں کو بنو ہاشم (در اصل نبی صلی اللہ علیہ وسلم) سے کاٹ کر الگ کرنا چاہتے تھے۔ تاکہ دوسرے مسلمان اور آپؐ ممکن حد تک ایک دوسرے سے غیر متعلق رہیں، آزادانہ میل جول نہ رکھ سکیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ قریش کے خلاف متحدہ محاذ نہ بنا سکیں۔ اس میں ایک فائدہ ان کے لحاظ سے یہ بھی تھا کہ سب پر الگ الگ سختیاں کرنے میں آسانی ہو گی اور اس طرح اجتماعی مظلومیت میں جو ڈھارس بندھ جاتی ہے وہ بھی باقی نہ رہے گی۔

و ۔ قریش یہ گمان رکھتے تھے کہ اگر بنو ہاشم کے بارے میں مقاطعہ کا تجربہ کامیاب ہو گیا تو پھر دستِ تظلم رفتہ رفتہ دوسرے قبائل کے مسلمانوں تک دراز کر دیا جائے گا۔ گویا یہ پہلا تجربہ تھا جسے اگلے ظالمانہ تجربات کی بنیاد بنایا جا سکتا تھا۔ بہرحال ان اسباب و مصالح کے پیشِ نظر قریش

نے بنو ہاشم پر اس مقاطعہ کو نافذ کر دیا جو اتفاقاً محض تین سال تک جاری رہ سکا۔

——— (۳) ———

اب آگے بڑھنے سے پہلے ایک لمحہ ٹھہر کر شعبِ ابی طالب پر نظر ڈال لیجئے۔ شعب ابی طالب دراصل مکہ معظمہ کے محلّے کا نام تھا جس میں بنو ہاشم رہا کرتے تھے اور وہ ان کا موروثی تھا۔ شعب عربی زبان میں درہ یا گھاٹی کو کہتے ہیں۔ چونکہ یہ محلّہ کوہ ابوقبیس کی گھاٹیوں میں سے ایک گھاٹی میں واقع تھا اور ابو طالب بنو ہاشم کے سردار تھے۔ اس لیے اسے شعب ابی طالب کہا جاتا ہے۔ یہاں یہ وضاحت بے جا نہ ہوگی کہ شاید شعب کے لفظ سے لوگوں کو بالعموم یہ مغالطہ ہوا ہے کہ یہ اصل رہائش گاہ سے دُور کوئی پہاڑی درہ ہوگا جہاں جاکر بنو ہاشم محصور و نظر بند ہو گئے، حالانکہ مکہ کے طبعی حالات جاننے والا ہر شخص اس حقیقت کا علم رکھتا ہے کہ مکہ بجائے خود ایک وادی ہے اور پورا شہر چاروں طرف سے پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے۔ مکہ کا بیشتر علاقہ پہاڑی ہے[1] اور میدانی حصہ بہت کم پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کچھ علاقا کچھ مجبوراً مکّہ کی آبادی جن محلوں میں بٹی ہوئی تھی اس میں سے بیشتر پہاڑی دروں اور گھاٹیوں ہی میں واقع تھے۔ اس لیے تاریخ میں شعب ابی طالب کے علاوہ دوسرے بیسیوں شعب کے نام پائے جاتے ہیں۔ مثلاً شعب آلِ الاخنس یا شعب الخوارج، شعب المطلب، شعب ابی زیاد، شعب ابن ابی ربیع، شعب آل عمرو، شعب بنی کنانہ، شعب بنی عبداللہ، شعب بنی اسد، شعب بنی عامر، شعب الخضارمہ، شعب الخوز، شعب الفقارت، شعب ابی دب وغیرہ[2]

علاوہ ازیں تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مکّہ کی آبادی ابتداً حرم کعبہ سے دُور ہی بسائی گئی تھی اور لوگ حرم سے متصل مکان یا عمارت بنانے سے (تقدس اور خوف کی بنا پر) گریز کرتے تھے۔ البتہ قصی بن کلاب کے زمانے (تقریباً ۴۴۰ء) سے قریب مکانات و عمارات بنانے کا رواج ہوا۔ ان ہی وجوہ سے مکّہ کی پرانی آبادی حرم سے خاصے فاصلوں تک ممتد ہے[3] اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ زیرِ بحث مقام شعبِ ابی طالب بھی مضافاتِ مکّہ میں یا حرم سے دُور واقع تھا۔ اس کے برعکس صحیح صورت یہ ہے کہ جبل ابو قبیس کے دامن میں (ایک کنارے پر) شعبِ ابی طالب ایک ایسے مقام کا نام تھا جو مولدِ رسولؐ کی نسبت بیت اللہ سے زیادہ قریب اور شمال مشرق کی سمت حد سے حد ایک فرلانگ کی مسافت پر واقع تھا جس کی تصدیق آج کل کے آثار اور مقامی روایات سے بآسانی کی جاسکتی ہے۔[4]

شعب ابی طالب کی یہ جائے وقوع اور کعبۃ اللہ سے قربت اس لیے بھی قابلِ فہم ہے کہ خانۂ کعبہ سے متعلق سقایہ کی ایک اہم خدمت بنو ہاشم کے سپرد تھی اور اس کی بجا آوری میں ان کا حرم سے قریب سکونت رکھنا ہی زیادہ باعثِ سہولت ہو سکتا تھا۔

یہاں یہ بتا دینا بھی بے محل نہ ہوگا کہ مذکورہ مقاطعہ اور شعب ابی طالب میں ان کی روایتی محصوری سے یہ بہرحال لازم نہیں آتا کہ نبی

۱؎ توسیعِ حرم کے سلسلے میں آج کل یہاں سے پہاڑوں کو صاف کر دیا گیا ہے۔

۲؎ شفاء الغرام باخبار البلد الحرام۔ الفاسی۔

۳؎ تاریخ مکّہ ازرقی

۴؎ سفرنامہ ارض القرآن۔ مرتبہ محمد عاصم ص ۱۴۷

صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے اہلِ خاندان کو اس مدت میں لازمی طور پر حرمِ مکّہ سے دُور تصور کیا جائے اور ان کے مخالفین و معاندین کی مستقل رہائش حرم میں یا اس سے متصل فرض کرلی جائے۔ مسلمانوں کی طرح دشمنانِ اسلام کا تعلق بھی مختلف شعوب و قبائل سے تھا اور یہ شعوب و قبائل متفرق مقامات پر سکونت پذیر تھے۔

اندازہ یہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں جو علاقہ شعب ابی طالب کہلاتا تھا اسے ایک ایسا بڑا محلہ کہا جا سکتا ہے جس میں مجموعی طور پر شعب مولد، شعب علی اور شعب عبدالمطلب سب شامل تھے۔ اور اگر شعبِ ابی طالب کو ایک وسیع دائرہ مانا جائے تو شعب مولد، شعب علی وغیرہ سب مقامات آگے پیچھے اسی میں نظر آئیں گے۔

ــــــــ (۴) ــــــــ

بہر حال شعب ابی طالب کی جائے وقوع کا تعین بڑی حد تک مقاطعہ کی اس نوعیت کو واضح کر دیتا ہے کہ یہ مقاطعہ محض معاشی اور معاشرتی بائیکاٹ تھا۔ اور ہمارے اس موقف کی تائید اس ظالمانہ معاہدہ کے مضمون سے بھی ہوتی ہے جس کے تحت یہ مقاطعہ نافذ کیا گیا تھا۔ معاہدہ میں بنو ہاشم پر جو پابندیاں عائد کی گئی تھیں ان میں جزوی فرق اور مضمون کی کمی بیشی مورخین کے یہاں البتہ پائی جاتی ہے۔ مثلاً ابن ہشام نے شادی بیاہ، خرید و فروخت کی پابندی کا ذکر کیا ہے۔ ابن سید الناس، صاحب عیون الاثر کے بیان کے مطابق مقاطعہ میں شادی بیاہ، خرید و فروخت کے علاوہ قریش نے یہ بھی طے کیا کہ ان کی طرف سے کبھی صلح کو قبول نہ کیا جائے گا۔ اور نہ کسی قسم کی نرمی اور مہربانی کا سلوک بنو ہاشم سے روا رکھا جائے گا۔ علامہ برہان الدین الحلبی نے اپنی سیرۃ میں لکھا ہے کہ یہ بھی طے کیا کہ بنو ہاشم کو بازاروں میں آنے سے روکا جائے گا اور تاریخ زمبی میں یہ اضافہ بھی ہے کہ بنو ہاشم کو قریش اپنے محلوں میں نہ بٹھائیں گے۔ یہ ہے قرار دادِ قریش کا خلاصہ۔ اس کو دیکھ لیجئے۔ روایات میں کہیں یہ ذکر نہیں ہوا کہ قریش نے بنو ہاشم کو مکّہ سے نکل جانے اور رہائش گاہوں سے بے دخل ہو جانے کو کہا ہو۔ کسی مؤرخ نے یہ بھی نہیں لکھا کہ بنو ہاشم کو درہ میں نظر بند یا محصور کرنے کی بابت طے کیا تھا۔ ظاہر ہے اس قسم کی کوئی چیز نہیں طے کی گئی کیونکہ

(ا) قید و نظر بندی اور وہ بھی پورے خاندان کی، عرب میں قطعاً ایک غیر معروف چیز تھی اور اس کی کوئی مثال پہلے موجود نہیں تھی۔

(ب) مذکورۃ الصدر پابندیوں نے معاشی اور معاشرتی دونوں اعتبار سے بنو ہاشم کو بے دست و پا، سب سے الگ اور مجبور کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے معاہدہ میں محصوری یا نظر بندی کی کوئی قرار داد نہیں رکھی اور یہ بالکل سیدھی سی بات ہے کہ اگر واقعی نظر بندی اور محصوری ہی مقصود تھی جیسا کہ ہمارے اکثر مورخین بیان کرتے ہیں تو معاہدہ میں اتنا ہی ذکر کافی تھا "بنو ہاشم کو فلاں جگہ محصور کیا جاتا ہے"۔ آخر دوسری پابندیوں کو لگانے میں کیا تُک تھی؟ اگر ایک شخص محصور و نظر بند ہو گا تو آپ سے آپ شادی، بیاہ، خرید و فروخت، صلح و جنگ اور ملنے جلنے یا بازاروں میں حاضر ہونے کے راستے مسدود اور ہر قسم کے تعلقات دوسروں سے منقطع ہو جائیں گے۔

(ج) قریش کو اپنی مذہبی سیادت کے باوجود (جس میں بنو ہاشم بھی برابر کے شریک تھے) کوئی ایسی قوتِ قاہرہ حاصل نہ تھی اور نہ مکّہ میں کوئی ایسی مرکزی قوت پائی جاتی تھی جو بنو ہاشم یا کسی بھی خاندان کو من حیث المجموع اپنی موروثی جگہ سے بے دخل کر سکے، اس لیے قریشِ مکّہ کی طرف سے بنو ہاشم کو جلا وطن کرنے، مکّہ سے باہر نکالنے یا شعب میں محصور و نظر بند کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور شعبِ ابی طالب کی جائے وقوع کے تعین کے بعد تو یہ امر بالکل ظنی اور قیاسی بن جاتا ہے۔ اب اس کا ایک دوسرا پہلو اور دیکھ لیجئے۔ وہ یہ کہ قریش نے تو بنو ہاشم

کو شعب ابی طالب میں محصور نہ کیا اور نظر بند ہو جانے پر مجبور کیا، لیکن بنو ہاشم نے ڈر کر مکّہ کی سکونت خود ترک کر دی اور مع خاندان شعب میں جا کر محصور ہو گئے۔ اس توجیہہ کو بعض مورخین اور سیرۃ نگاروں نے اختیار کیا ہے۔ چنانچہ بیان کیا ہے کہ اطلاقِ مقاطعہ کے بعد ابو طالب نے اپنے خاندان والوں کو جمع کیا اور ان کو ساتھ لے کر شعب میں چلے گئے۔ یہ شکل بھی متعدد وجوہ سے سخت محلِ نظر ہے :-

(۱) اس معاہدہ کو جن حالات میں نافذ کیا گیا تھا وہ اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھیوں کے علاوہ ابو طالب بھی عزم و حوصلہ اور صبر و استقلال کا مظاہرہ کر رہے تھے اور آپؐ کے دشمنوں سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گفتگو کرتے تھے۔ چنانچہ مذکورہ مقاطعہ کے بعد انہوں نے ان صاف لفظوں میں قریش کا چیلنج قبول کیا تھا کہ "ہاں ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اس وقت تمہارے حوالے کر دیں گے جب ہم سب کٹ کر مر جائیں گے۔" کیا یہ الفاظ اس کی بے خوفی، جرأت و ہمت پر دلالت نہیں کرتے ؟ یوں بھی ایک بُزدل، ڈرپوک اور کم ہمت آدمی جانتے بوجھتے تمام قریش کی مخالفت مول نہیں لے سکتا تھا۔ ابو طالب اپنے خاندان کے خلاف دوسرے خاندانوں کے مخالفانہ اتحاد سے ذرا نہ گھبرائے اور اپنے بھتیجے کی خاطر پوری پامردی سے آفات و مصائب کے مقابلے میں سینہ سپر ہو گئے۔ ایسے نڈر، بے باک آدمی اور صاحبِ حمیت و غیرت سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ معاً ڈر کر اپنے مکانوں کو خیر باد کہہ کر مکّے سے نکل جائے گا یا اپنے آپ کو ڈر کر از خود محصور کرے گا۔ علاوہ ازیں اپنے جس بھتیجے کی حمایت و حفاظت علی الاعلان کرتا رہا ہے اب شدائد کا سامنا ہوتے ہی پست ہمتی کا شکار ہو جائے گا اور اپنے بھتیجے سمیت دشمنوں کی نظروں سے دُور چلا جائے گا۔ کیا یہ باتیں قرینِ قیاس ہیں ؟

(۲) ابو طالب کے علاوہ دوسرے اہلِ خاندان اور داعی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سب ہی مقاطعہ کا شکار رہے تھے۔ اب ذرا اس پہلو پر غور کیجئے۔ کیا ایک برحق نبی اور پیغمبرِ آخر الزماں ہوتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ابتلاء اور آزمائش سے بچ کر شعب میں محصور ہو جانے کو گوارا کر سکتے تھے۔ حالانکہ گزشتہ چھ سال سے آپؐ برابر آزمائش کی بھٹی میں تپائے جا رہے تھے ؟ لیکن ان تمام صعوبتوں اور مخالفتوں کے علی الرغم آپؐ نے کسی قسم کی عافیت تلاش کرنے کی بجائے اپنے چچا ابو طالب کی حمایت کی بھی پروا نہیں کی تھی۔ ایسے صاحبِ عزیمت نبی سے یہ توقع ہرگز نہیں کی جا سکتی کہ اپنے آپ کو "قتل" سے بچانے کے لیے شہر سے دُور ایک گھاٹی میں جا کر محصور ہو جائیں گے۔

اور ایک انتہائی اہم پہلو یہ غور طلب ہے کہ اگر بالفرض ہم ان تمام حضرات کو شعب میں محصور مان بھی لیں تو ایک اور پیچیدگی یہ پیدا ہو جاتی ہے کہ کیا اس دور ان کارِ نبوت موقوف رہا ؟ ایک ایسے دُور دراز مقام پر جہاں باہر نکلنے کا کوئی موقع نہ ہو اور جہاں اپنے خاندان والوں کے سوا (جن کو وہ کئی بار دعوتِ اسلام دے چکے تھے) کوئی اور آبادی نہ تھی، آپؐ دعوت و تبلیغ کا فریضہ کیونکر ادا کر سکتے تھے ؟ حالانکہ امرِ واقعہ یہ ہے کہ اس پورے عرصے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم مسلسل دعوت و تبلیغ میں منہمک رہے۔ ادھر وحی کا نزول بھی ہوتا رہا۔ چنانچہ ابن ہشام کے بیان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ متعدد آیات کا نزول اسی عرصہ میں ہوا۔ مثلاً ابو لہب، اس کی بیوی، امیہ بن خلف بن وہب، عاص بن وائل، ابو جہل، اخنس بن شریق ثقفی، ولید بن مغیرہ، ابی بن خلف، نضر بن الحارث وغیرہ کفار و مشرکین کے کردار پر بطورِ خاص روشنی ڈالنے والی آیات جو سورۃ لہب، ہمزہ، مریم، کافرون، فرقان، انبیاء وغیرہ آئی ہیں، اسی دور کی ہیں۔ مزید برآں آپؐ مختلف قبائل میں دعوت و تبلیغ کے لیے تشریف لے جاتے تھے اور خصوصاً دورانِ حج آپؐ اس فریضہ کو بڑے پیمانے پر انجام فرمایا کرتے تھے۔ حج کا موقع اس لحاظ سے بھی بہت اہم تھا کہ خاندان بنو ہاشم کے افراد اسی موسم میں جو کچھ خرید و فروخت اور معاملت کر لیتے تھے، کر لیتے تھے ورنہ پھر دوسرے ایام ان کو باہر کے

تاجر وخریدار آسانی سے نہیں مل سکتے تھے۔

ان حقائق کی روشنی میں ہم بڑے اطمینان سے یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ شعب ابی طالب میں حضورؐ اور دیگر خاندانِ بنو ہاشم کی محصوری و نظر بندی کا واقعہ محض ظنی اور قیاسی ہے۔ اصل نوعیت یہ ہے کہ یہ معاشی اور معاشرتی اعتبار سے ایک خاندانی مقاطعہ تھا، اس سے زیادہ نہیں۔ صورت اس مقاطعہ کی رو سے نہ تو محصوری لازم آتی ہے نہ نظر بندی اور نہ یہ بات کہ محصورین شعب سے باہر نہیں نکل سکتے تھے جیسا کہ مورخین کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ وہ تمام پابندیاں جن کا ذکر ہم اصحاب سیر کے واسطے سے کر چکے ہیں، عملاً دو قسم کے تعلق کا انقطاع ثابت کرتی ہیں۔ ان میں سے ایک معاشرتی ہے جس میں شادی بیاہ، صلح، نرمی و مہربانی اور مجلس میں آنے جانے کی پابندیاں شامل ہیں۔ اور دوسرا معاشی ہے جس کے ضمن میں خرید و فروخت اور بازاروں کی آنے جانے کی ممانعت اور روک ٹوک آجاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں قسم کی پابندیاں اور معاشی و معاشرتی ترک تعلق بنو ہاشم کی سماجی و معاشی زندگی کو مفلوج کرنے کے لیے کافی تھا۔ ان میں سے بھی اوّل الذکر معاشرتی مقاطعہ کسی نہ کسی صورت میں قابلِ برداشت ہو سکتا تھا لیکن معاشی بائیکاٹ کی شکل میں زندگی گزارنا ناممکن سا تھا۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مکہ کی آبادی تجارت پیشہ تھی اور اس کی ضروریاتِ زندگی کی تکمیل لین دین اور تجارت ہی سے ممکن تھی۔ اس ذریعہ پر بھی پابندی لگ جانا سخت اذیت ناک تھا کیونکہ اس کا تعلق براہِ راست زندگی کے قیام و بقا سے ہے۔ اس لیے یہ پابندی بنو ہاشم پر انتہائی گراں گزری اور انہوں نے مجبور ہو کر درخت کے پتے حتیٰ کہ چمڑہ تک بھگو کر اور بھون کر کھایا۔ شدید بھوک کی بنا پر ہی بچے بلک بلک کر روتے تھے۔ اس پورے عرصے میں صرف دو ذریعے ایسے رہ گئے تھے جن سے کچھ عرصے کے لیے کام چل جاتا تھا۔ ایک تو موسم حج اور دوسرے پوشیدہ طور پر جو تھوڑا بہت سامان بعض لوگ پہنچا دیا کرتے تھے۔ کفارِ قریش اس بات پر کڑی نظر رکھتے تھے کہ شریکِ معاہدہ قبائل کا کوئی فرد معاہدہ کی خلاف ورزی نہ کرنے پائے اور سچی بات تو یہ ہے کہ معاہدہ سے زیادہ انہیں اس بات کا خیال تھا کہ جو تکلیف اور جس حد تک وہ خاندانِ بنو ہاشم کو مع رسول اللہؐ کے پہنچانا چاہتے تھے اس میں کسی قسم کی کمی نہ ہونے پائے بلکہ اضافہ ہی ہوتا رہے، اس لیے ان کے نزدیک اصل مسئلہ یہ نہیں تھا کہ معاہدہ کی خلاف ورزی ہو رہی ہے یا نہیں اصل مسئلہ یہ تھا کہ حضورؐ اور آپؐ کے متعلقین کو کسی طرف سے کوئی سہولت یا امداد تو نہیں مل رہی ہے جو اس کی تاب مقاومت کو دراز کر دے۔ چنانچہ اس ضمن میں بعض بڑے دلچسپ واقعات بھی ملتے ہیں، مثلاً ایک مرتبہ حکیم بن حزام اپنی پھوپھی حضرت خدیجہؓ (جن کا مکان حرم سے انتہائی قریب واقع تھا) کے پاس اونٹ پر غلہ لادے جا رہے تھے۔ ابو جہل نے روکا۔ اتنے میں ابو البختری وہاں آیا اور اس نے ابو جہل سے پوچھا کیا بات ہے۔ ابو البختری نے کہا اس کی پھوپھی کے گیہوں اس کے پاس رکھے تھے، اس نے اپنے گیہوں منگائے ہیں۔ یہ لیے جاتا تیرا کیا حرج ہے اس کو جانے دے ابو جہل نے انکار کیا۔ یہاں تک کہ ابو البختری اور ابو جہل میں سخت کلامی کے بعد زد و کوب کی نوبت پہنچی۔ ابو البختری نے ابو جہل کے اونٹ (جس پر وہ سوار تھا) کی گردن پکڑ کر مروڑ ڈالی اور ایسا جھٹکا دیا کہ اونٹ بیٹھ جائے۔ پھر ابو جہل کی گدی پکڑ کر کھینچ لیا اور اس کے سر پر ایسی ضرب لگائی جس سے اس کا سر پھٹ گیا۔ پھر اس کو اپنے پیروں اور لاتوں سے خوب روندا اور حمزہ بن عبد المطلب پاس کھڑے ہوئے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر ابو جہل اور بھی اندوہناک ہوا۔ یہ واقعہ مندرجہ ذیل حقائق سے پردہ اٹھا دیتا ہے۔

۱۔ خاندانِ بنو ہاشم کے افراد پر قریش کی طرف سے سخت کڑی نگرانی کی جاتی تھی۔

۲۔ کچھ ایسے لوگ موجود تھے جن کے دلوں میں ہمدردی، انسانیت اور جذبہ موجود تھا اور جو حق کے لیے عملی اقدام کر سکتے تھے۔

۳۔ ان پابندیوں کو مکّہ کے تمام شہری پسندیدہ نظر سے نہ دیکھتے تھے۔
۴۔ شعب مکّہ سے باہر مقام نہ تھا۔ حضرت حمزہؓ کے پاس کھڑے ہونے کا کیا مطلب تھا؟

——— (۵) ———

اب ہم آخری مسئلہ کو لیں گے یعنی یہ کہ مقاطعہ کیسے ختم ہوا۔؟ اس سلسلے میں عموماً دو صورتیں بتائی جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ قدرتِ خداوندی سے اس تحریری معاہدہ کو دیمک چاٹ گئی۔ اور دوسری یہ کہ مکّہ کے چند بہادر اور غیرت مند افراد کی کوششوں سے یہ عہد نامہ چاک ہو کر ختم ہوا۔

عہد نامہ کو دیمک کا چاٹ لینا قدرتِ خداوندی کی دلیل اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا کھلا ثبوت ہے۔ ابنِ ہشام نے لکھا ہے کہ اس کی اطلاع جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوطالب کو دی تو وہ قریش کے پاس آئے اور کہا: "اے گروہ قریش میرے بھتیجے نے ایسا ایسا کہا ہے[1]۔ پس تم اپنے عہد نامہ کو دیکھو۔ اگر واقعی اس کی یہی صورت ہو تو لازم ہے کہ تم اپنے ظلم و ستم سے جو ہم پر تم نے کر رکھا ہے باز آجاؤ۔ اور اگر بھتیجے کا کہا غلط ہوا تو مَیں اپنے بھتیجے کو تمہارے حوالے کر دوں گا" قریش اس بات پر راضی ہو گئے۔ جا کر دیکھا تو ویسا ہی پایا جیسا کہ حضورؐ نے مطلع کیا تھا۔ اس طرح یہ عہد نامہ ختم ہو گیا۔

اب دوسری روایت کو دیکھیے۔ قریش جو مظالم خاندانِ بنو ہاشم پر ڈھا رہے تھے ان کو دیکھ کر خود قریش میں سے بعض لوگوں کے دل بالآخر پسیج گئے۔ ان سے بنو ہاشم کی تکلیف نہ دیکھی گئی اور انہوں نے اس ظلم کے خلاف آواز بلند کرنا اپنے ضمیر کا تقاضا سمجھا۔ چنانچہ ابوالبختری ابوجہل کے پاس پہنچا اور اس سے یہ مقاطعہ ختم کرنے کا مطالبہ کیا۔ جن لوگوں نے اس ظلم و تشدّد کے خلاف آواز بلند کی اور سراپا احتجاج بن گئے، وہ مندرجہ ذیل پانچ آدمی تھے:

۱ ——— ہشام بن عمرو (بنو عامر سے)
۲ ——— زہیر بن ابی امیہ (بنو مخزوم سے)
۳ ——— مطعم بن عدی (بنو نوفل سے)
۴ ——— ابوالبختری
اور ۵ ——— زمعہ بن الاسود } (بنو اسد سے)

ہشام کا باپ عمرو اور نضر بن ہشام دونوں ایک ماں سے تھے۔ اس سبب سے اس کو بنی ہاشم سے محبت تھی اور اپنی قوم میں بڑی عزّت و وقعت رکھتا تھا۔ یہ بعد میں مسلمان ہو گیا تھا۔ حضرت حسان بن ثابتؓ نے اس کی مدح بھی لکھی۔ مقاطعہ مذکورہ کے دوران اس نے یہ وطیرہ بنا لیا تھا کہ رات کے وقت اونٹ پر گیہوں بار کر کے بنی ہاشم کو پہنچا دیتا تھا اور بنی ہاشم اونٹ پر سے گیہوں اُتار کر اونٹ واپس کر دیتے تھے۔ یہ پھر لا کر پہنچا دیتا تھا۔ زہیر ابنِ امیہ کی ماں عاتکہ بنت عبد المطلب تھی اور ابوطالب اس کے ماموں تھے۔ یہ بھی بعد کو اسلام لے آیا تھا۔

مطعم بن عدی مکّہ کا مشہور و معزز آدمی تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب طائف سے واپس ہوئے ہیں تو اسی مطعم نے آپؐ کو اپنی پناہ میں لیا تھا۔ وہ کافر ہی مرا۔ اس کی موت پر حضرت حسان بن ثابتؓ نے مقاطعہ کو ختم کرانے میں اس کی کوشش اور دوسری خوبیوں پر ایک مرثیہ میں بہت تعریف کی ہے۔ چند اشعار قابل ذکر ہیں:

ولو ان مجداً اخلد الدھر واحداً … من الناس ابقی مجدہ الدھر مطعما

---

[1] یعنی یہ کہ صحیفہ کو کیڑوں نے کھا لیا ہے اور صرف جہاں خدا کا نام ہے چھوڑ دیا ہے۔ بحوالہ اصح السیر از عبد الرؤف دانا پوری (ادارہ)

فما تطلع الشمس المنيرة فوقهم على مثله منهم اعز واكرما
اباء اذا يأبى واكرم شيمة وانوم عن جار اذا الليل اظلما [1]

(اگر کسی شخص کو مجد کی بدولت ہمیشہ کی زندگی ملنا ممکن ہوتی تو مطعم کے ساتھ ایسا ہی ہوتا۔ سورج جب ان لوگوں پر طلوع ہوتا ہے تو مطعم سے بڑھ کر معزز و مکرم شخص نہیں دیکھتا۔ وہ خوددار و با اخلاق ہے اور رات کی تاریکی میں اس کی طرف سے مامون ہوتے ہیں)

ابوالبختری اور زمعہ بھی معاشرہ کے معزز افراد اور بنو اسد کے رؤسا میں سے تھے۔ اس بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ ان پانچوں اشخاص میں سے کس نے پہل کی اور نقض صحیفہ کے لیے دوسروں کو آمادہ کیا۔ بعض کہتے ہیں زہیر پہلا آدمی تھا جس نے آواز بلند کی، لیکن زیادہ تر اصحاب اولیت ہشام بن عمرو کو دیتے ہیں۔ چنانچہ ابن ہشام، ابن سیدالناس اور صاحب الدرر نے یہی لکھا ہے۔ ابن ہشام لکھتا ہے کہ پہلے ہشام زہیر کے پاس گیا اور اس سے کہا "اے زہیر! کیا تو اس بات سے خوش ہے کہ تو ہر قسم کے کھانے کھائے، کپڑے پہنے اور شادی بیاہ کرے، لیکن تیرے ماموں یعنی بنی مطلب کسی چیز کی نہ تو خرید و فروخت کر سکیں اور نہ شادی بیاہ"! اصل الفاظ یہ ہیں "یازهیر اقدرضيت ان تاكل الطعام و تلبس الثياب و تنكح النساء واخوالك حيث قد علمت لا يباعون ويتباع منهم ولا ينكحون اليهم"۔

غرض باری باری دوسرے لوگ بھی اس مہم کے لیے تیار ہو گئے۔ اور اس طرح ان پانچوں آدمیوں نے نقض صحیفہ کے لیے جدوجہد کی۔ ممکن ہے بنو ہاشم کی محبت نے ہشام کو اس کارِ خیر کے لیے آمادہ کیا ہو۔ اسی طرح زہیر کو خونی رشتے نے آواز اٹھانے پر مجبور کیا ہو۔ باقی دوسرے لوگ ممکن ہے اس نقطۂ نظر سے شریکِ کار ہو گئے ہوں کہ قریش کو بنو ہاشم کے خلاف متحد ہو کر تجارتی اجارہ داری حاصل ہو گئی تھی۔ اور یوں بعض خاندان مسلسل اپنی پوزیشن کو مستحکم کر رہے تھے جب کہ یہ افراد اپنے خاندانوں کو نظر انداز کیے جانے کا احساس رکھتے ہوں گے، ورنہ کم از کم مظلوم سے ہمدردی اور احساسِ قومیت تو ان میں ضرور موجود تھی جس کی وجہ سے انہوں نے مقاطعہ سے براءت ظاہر کی۔

بہرحال پانچوں اشخاص مل کر دوسرے دن حرم میں گئے اور اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ چنانچہ زہیر نے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا۔ "اے اہل مکہ! یہ کیا انصاف ہے کہ ہم آرام سے بسر کریں اور بنو ہاشم کو آب و دانہ نصیب نہ ہو؟ خدا کی قسم! جب تک یہ ظالمانہ معاہدہ چاک نہ کر دیا جائے گا میں باز نہ آؤں گا۔" ابوجہل قریب سے بولا "اس معاہدہ کو ہرگز کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا!" زمعہ نے کہا تو جھوٹ کہتا ہے۔ جب یہ لکھا گیا تھا اس وقت بھی ہم راضی نہ تھے۔ غرض مطعم نے ہاتھ بڑھا کر دستاویز چاک کر دی۔

مختصر یہ کہ ان دونوں اسباب میں سے کسی ایک یا دونوں اسباب یعنی قدرتِ خداوندی سے اور چند جیالے بہادروں کی ہمدردانہ سعی کی بدولت اس معاہدۂ نامرضیہ کا خاتمہ ہو گیا اور یوں آپؐ اور بنو ہاشم پر سے معاشرتی و معاشی ساری پابندیاں تارِ عنکبوت کی طرح منقطع ہو گئیں۔ اس طرح ایک مرتبہ پھر بنو ہاشم مکہ کی مذہبی و سماجی زندگی میں تازہ خون بن کر دوڑنے لگے۔ تحریکِ اسلامی کو دبانے اور مٹانے کی یہ گہری سازش ناکام ہو گئی اور جن مقاصد کی خاطر قریش نے یہ مقاطعہ کیا تھا پورے نہ ہو سکے۔ خصوصاً ان کا یہ اندازہ قطعاً غلط ثابت ہوا کہ شدائد سے گھبرا کر بنو ہاشم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کے لیے پیش کر دیں گے۔ غرض ساری کافرانہ سیاست اپنے تمام کروفر کے ساتھ بابِ شکست میں داخل ہوئی۔

خدا نے سچ کہا ہے۔ ومكروا ومكر الله والله خير الماكرين۔

[1] دیوان حسان بن ثابت

تقابلِ تقویمین

حکیم محمد یحییٰ خاں شفا

شمس و قمر کی تخلیق میں، خالق ارض و سماوات (جلت عظمتہٗ) نے عالم خلق و امر کے بعض مخصوص و متعین مقاصد کی تکمیل کا اہتمام فرمایا ہے اور اپنی حکمت بالغہ سے دونوں کے دوائر عمل و اثر کو جداگانہ اور امتیازی حیثیت بخشی ہے۔ شمسی نظام (SOLAR SYSTEM) اپنی کہکشاں، اس کے کواکب و نجوم وغیرہ سمیت اپنے مفوضہ مقاصد کی تحصیل کے لیے حیرت انگیز نظم و ترتیب کے ساتھ متحرک ہے۔ اسی طرح قمری نظام (LUNAR SYSTEM) بھی اپنے فریضہ کی ادائی میں باقاعدگی اور تنظیم سے مصروف عمل ہے اور یوں خالق کائنات کے یہ دونوں کارندے خلق و امر کے سلسلے میں اپنی اپنی ذمہ داریاں حسن اسلوب سے انجام دیتے چلے آتے ہیں۔ یہ سنۃ اللہ ہے۔ جو ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گی۔ اس میں تغیر و تبدل کا امکان نہیں ہے اور اگر اس میں تحول و تقلب واقع ہو جائے۔ تو پوری کائنات کا نظم درہم برہم ہو سکتا ہے۔

البتہ شمسی اور قمری نظاموں کے عمل و اثر سے کرۂ ارض اور اس کے مشمولات جس تحول و تغیر سے دوچار ہوتے رہتے ہیں۔ وہ حیات و کائنات کی باہمی تطبیق و توافق کا فطری عمل ہے۔ جس کے ذریعہ باریٔ فطرت (عز اسمہٗ) کی مشیئت ظہور پذیر ہوتی ہے۔ اور کون و فساد کی یہ دنیا اپنا طبیعی سفر جاری رکھتی ہے۔

سورج اور چاند اس نظام کے محور ہیں اور اللہ تعالیٰ کی تکوینی حکمت میں اپنا اپنا کردار (ROLE) کسی ادنیٰ لغزش کے بغیر ادا کرتے چلے جاتے ہیں۔ قرآن مجید کی سورہ یونس کی پانچویں آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :-

هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَاءً وَالْقَمَرَ نُوراً وقدره منازل لتعلموا عدد السنين والحساب ؏	وہی ذات ہے جس نے سورج کو ضیا اور چاند کو نور بنایا ہے اور پھر اُسے منزلوں میں بانٹ دیا تاکہ تم ماہ و سال کی گنتی اور حساب جان لو۔

اس ارشاد صداقت بنیاد سے واضح ہوتا ہے۔ کہ یہ کائنات اور اس کے دور دور تک بکھرے ہوئے بے حد و حساب مظاہر و عوالم اپنے آپ کچھ یونہی پیدا نہیں ہو گئے اور ان کا وجود و شہود کسی اتفاق یا مصادفہ کا کرشمہ نہیں ہے۔ بلکہ ان کے پیچھے اللہ تعالیٰ کی مشیئت (GOD'S WILL) اس کی خاص تخلیقی حکمت اور تکوینی مقصدیت کارفرما ہے جو بے مثال تدبیر و تدبر اور ناقابل انکار نظم و انضباط سے انھیں وجود و حیات کی منزلیں طے کرا رہی ہے۔ ارشاد ہوا ملاحظہ ہو اسی آیت کا اگلا ٹکڑا :-

ما خلق الله ذلك الا بالحق ج يفصل	اللہ تعالیٰ نے ان کی تخلیق تدبیر و حکمت کے ساتھ کی

الآیات لقوم یعلمون ٥ — ہے وہ اپنی نشانیاں جاننے سمجھنے والوں پر کھول دیتا ہے۔

یہی نہیں کہ اجرامِ سماوی اور ان کے مظاہر و توابع نیز ان کے مضمرات و ممکنات اللہ تعالیٰ کی ارادی تخلیق ہیں۔ بلکہ ان میں اصل کی ذات کے وجوب پر کھلی کھلی نشانیاں بھی موجود ہیں ؎

وفی کل شیئ لہ آیۃ — تدل علیٰ انہ واحد

برگ درختانِ سبز در نظر ہوشیار — ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

فلکیات اور ہیئت (ASTROLOGY) کے علم و فن کی اساس یہی آیت ہے۔ اس کے چند کلمات میں شمسی و قمری نظام مواقیت کی صورت اور غایت بلکہ فلسفیانہ اصطلاح میں ان کی پوری علل اربعہ بیان کر دی گئی ہیں اور یہی آیت آگے چل کر اسلامی علماء و حکماء (MUSLIM SCHOLERS) کے لیے علم النجوم، علم الہیئت، علم الافلاک اور ان کے متعلقہ علوم و فنون کو مدون کرنے اور فروغ دینے ـ مزید براں عظیم الشان رصدگاہیں، یادگار تاریخی زیجیں اور حیرت افروز اصطرلابیں اور ہیچ قسم بیسیوں چیزیں ایجاد و تعمیر کرنے کی محرک ثابت ہوئی۔

اسی سلسلۂ بیان میں اگلی آیت میں ایک اور آفاقی نکتے کی وضاحت فرمائی گئی ہے :

ان فی اختلاف الیل والنہار وما خلق اللہ فی السمٰوات والارض لآیات لقوم یتقون ٥

البتہ رات اور دن کے اختلاف، ایک دوسرے کے پیچھے آنے میں اور آسمانوں زمینوں میں جو کچھ اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا ہے اس میں، خدا سے ڈرنے اور برائیوں سے بچنے والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔

سورج اور چاند کے طلوع و غروب، ان کی منازل سفر، ان کی رفتار و کردار اور ان کے تدرج و تحول سے رات اور دن کے پیدا ہونے، پھر زمین و آسمان کی وسعتوں اور پہنائیوں میں اللہ تعالیٰ کی گوناگوں تخلیقات سے نہ صرف یہ کہ کرۂ ارض پر انسانوں کے ماہ و سال کا حساب اور ما مضیٰ و ما بقیٰ کا اندازہ لگتا ہے۔ بلکہ اس میں متقی اور پاکباز لوگوں کے لیے بولتی ہوئی واضح دلیلیں ہیں۔

سورج کو ضیاء اور چاند کو نور قرار دینے میں کردگارِ عالم و عالمیان کی تکوینی قدرت و حکمت پر مفسرین کرام اور فلاسفۂ اسلام نے بہت کچھ لکھا ہے۔ لیکن وہ ہمارے موضوع گفتگو سے خارج ہے۔ اس لئے ان نکات کی دلچسپی اور عرفان آموزی کے باوصف فی الوقت ہم ان سے صرف نظر کرتے ہیں۔ البتہ چاند کی مقررہ منازل اور نظام مواقیت سے تعلق رکھنے والے دوسرے اہم امور پر روشنی ڈالنا ضروری ہے کہ ان کا ہمارے موضوع کے ساتھ گہرا رابطہ ہے۔

سورۂ برأت کی چھتیسویں آیت :

ان عدۃ الشھور عند اللہ اثنا عشر شھراً فی کتاب اللہ یوم خلق السمٰوٰت والارض منھا اربعۃ حرم، ذلک الدین

مہینوں کی گنتی اللہ کے ہاں بارہ ہے جو اس نے لکھ رکھی ہے اسی دن سے جب کہ زمین اور آسمان پیدا کئے گئے تھے ان میں چار حرمت والے ہیں اور یہی سیدھا

القیم فلا تظلموا فیھن انفسکم ۵ وقاتلوا المشرکین کافۃ کما یقاتلونکم کافۃ ط واعلموا ان اللہ مع المتقین ۵

دین ہے پس ان میں اپنی جانوں پر ظلم نہ کرو۔ اور مشرکین سے ہر حال میں لڑو جیسا کہ وہ تم سے ہر حال میں لڑتے ہیں اور یہ جان لو کہ اللہ تعالیٰ تقوٰی شعاروں کا ساتھی ہے۔

سے مستفاد ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابتدائے آفرینش ہی سے سال کے بارہ مہینے مقرر فرما دیے تھے۔ تحویل آفتاب اور منازل قمر اور سیاروں کی گردش سے زمین و آسمان کی تخلیق کے روز اول ہی سے (جیسا کہ مذکورۂ فوق دونوں آیتوں سے متبادر ہے) تغیر و تحول کا ایک متعین نہج قائم ہوا۔ اس سے واضح طور پر سورج کے ایک دورانیہ میں چاند کے غرہ اور سلخ تک کی بارہ منزلیں وجود میں آئیں آفتاب کا تحول عام طور پر محسوس نہیں کیا جا سکتا۔ جبکہ ماہتاب کی سیر (چال) سریع اور واضح طور پر محسوس کی جا سکتی ہے۔ اسی بنا پر منازل کا تقرر و تعین بھی اسی کے ساتھ مقدر کیا گیا۔ سورج کی تحویل سے شہر کی تحقیق ہوتی ہے۔ جبکہ چاند کی مسافت سے شہر نمودار ہوتا ہے۔ غرہ کی ساعت سے ہلال مترقی ہو کر چودہ دن رات میں بدر کامل یا ماہِ تمام بنتا ہے اور پھر اگلے چودہ رات دن میں متنزل ہوتے ہوتے اٹھائیسویں شب کو منسلخ ہو جاتا ہے۔ اور یوں اس کی ایک منزل شہر بن جاتی ہے جس کا مفہوم ظہور قمر ہے جس طرح سورج کے طلوع و غروب سے دن تشکیل پاتا ہے اسی طرح چاند کے ظہور و غیوب سے مہینہ وجود میں آتا ہے یہ صورتِ احوال آغاز عالم سے یونہی چلی آتی ہے اور اقوام عالم کو انبیاء و رسل اور ان کے الہامی صحف کے توسط سے اسی کی تعلیم دی گئی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ دنیا بھر کی مختلف قوموں میں سال کے بارہ مہینے اور مہینے کے چار ہفتے عموماً پائے جاتے ہیں مہینے کا چار ہفتوں پر مشتمل ہونا اس امر کا واضح قرینہ ہے کہ بدو دہر ہی سے اعداد سن، شمار ماہ و سال کی اساس قمری مواقیت پر استوار کی گئی ہے قرآن پاک بھی اس نکتہ پر واضح رہنمائی پیش کرتا ہے:

ویسئلونک عن الاھلۃ قل ھی مواقیت للناس والحج ۵

آپ سے چاند کے ظہور و غیوب کی بابت پوچھتے ہیں! فرما دیجئے کہ یہ لوگوں کے واسطے نظام اوقات اور تقویم ہے حج کے لیے بھی۔

مفسرین کا بیان ہے کہ حضرت معاذ بن جبل انصاری رضی اللہ عنہ نے ایک روز نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا۔ یا نبی اللہ یہ جو چاند پہلی تاریخ کو ایک دھاگے جتنا ہوتا ہے اور بڑھتے بڑھتے چودھویں شب تک کمال کو پہنچ جاتا ہے۔ پھر گھٹنے لگتا اور اگلے چودہ دنوں میں گھٹتے گھٹتے پھر دھاگے جیسا ہو کر غائب ہو جاتا ہے۔ آخر اس میں کیا حکمت ہے؟ اس پر یہ آیت اتری اور آپ نے ارشاد فرمایا۔ ھی مواقیت للناس والحج، کہ یہ چاند کا بڑھنا گھٹنا لوگوں کے لئے فطری تقویم کا حکم رکھتا ہے۔ اس سے وہ ساری دنیا میں اپنے اوقات کا نظام مرتب کر سکتے ہیں۔ تاریخوں اور دنوں کا حساب لگا سکتے اور سب سے اہم معاشی، معاشرتی اور اجتماعی تقریب حج میں شمولیت و شرکت کا بندوبست کر سکتے ہیں۔

اس آیت مبارکہ سے بھی قمری نظام مواقیت کی فطری نوعیت کا پتہ چلتا ہے۔ منازل قمر کے صعود و ہبوط سے جہاں ارضی ماحول

اور اس کی کیفیات پر اثر پڑتا ہے۔ وہاں سماوی تحولات اور اجرام فلکی کے سیر و سفر سے بھی انسانی جسد و روح اور ان کے داعیات متاثر و منفعل ہوتے ہیں اس لئے منازل قمر سے آگاہی کے ساتھ ساتھ فلکیات کے مفتشین نے ان کی رفتار و کردار کے مؤثرات کو بھی منضبط کرنے کی کوششیں کی ہیں چنانچہ بارہ مہینوں کی مناسبت سے بروج دوازدہ کی تعیین کی گئی اور فضائے آسمانی میں اجرام کے اجتماع و قیام کا جائزہ لے کر ان کی ہیئت وغیرہ کی مشابہت کی بنا پر انھیں تعارفی نام دیے ہیں۔ مثلاً :-

۱- حمل	۴- سرطان	۷- میزان	۱۰- جدی
۲- ثور	۵- اسد	۸- عقرب	۱۱- دلو
۳- جوزا	۶- سنبلہ	۹- قوس	۱۲- حوت

مختلف قوموں اور زبانوں میں ان بروج اور ان کے توابع وغیرہ کے لیے الگ الگ نام ہیں اور بعض حالتوں میں وجوہ تسمیہ بھی مختلف ہیں۔ تاہم تعداد ہر جگہ بارہ ہی ہے۔

بروج دوازدہ گانہ کے تذکرہ کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ہم معروف تقویموں کے بارہ مہینوں کی ایک جدول پیش کر دیں غالباً یہ وضاحت چنداں ضروری نہیں ہے کہ قمری تقویم کے علاوہ شمسی تقویم، بلکہ مخلوط شمسی قمری تقویم میں بھی مہینوں کا شمار بارہ ہی ہے:

جدول شہور سنین شمسی، قمری متداولہ

شمارہ	بروج	قمری ہجری	شمسی میلادی	شمسی قمری ایرانی	شمسی قمری قبطی ورومی	شمسی ہندی بکرمی
۱	جدی	محرم الحرام	جنوری	دے	کانون الثانی	ماگھ
۲	دلو	صفر المظفر	فروری	بہمن	شباط	پھاگن
۳	حوت	ربیع الاول	مارچ	اسفندار	آذار	چیت
۴	حمل	ربیع الثانی	اپریل	فروردین	نیسان	بیساکھ
۵	ثور	جمادالاولیٰ	مئی	اردی بہشت	مایس - آیار	جیٹھ
۶	جوزا	جمادالاخریٰ	جون	خرداد	حزیران	اساڑھ
۷	سرطان	رجب المرجب	جولائی	تیر	تموز	ساون
۸	اسد	شعبان المعظم	اگست	مرداد	آب - مہرجان	کوار - اسوج
۹	سنبلہ	رمضان المبارک	ستمبر	شہریور	ایلول	کارتک
۱۰	میزان	شوال المکرم	اکتوبر	مہر	تشرین اوّل	اگھن
۱۱	عقرب	ذی قعدہ	نومبر	آبان	تشرین ثانی	پوس
۱۲	قوس	ذوالحجۃ	دسمبر	آذر	کانون اول	پوس

عرب جاہلیتہ میں بھی قدیم الایام سے یہی قمری سنین اور شہور مروج تھے۔ عربی مہینوں کی وجوہ تسمیہ بعض اعتبارات سے بڑی معنی خیز اور دلچسپ ہیں لیکن یہاں ان کی تفصیل تطویل لاطائل کے حکم میں آتی ہے۔

نبینا محمدؐ سید الاولین والآخرین کی بعثت سے کم و بیش تین سو تین سو سال پہلے تک مہینوں کی وہی ترتیب قائم رہی جو شروع سے چلی آرہی تھی اور آج بھی برقرار ہے۔ لیکن اس زمانہ میں عرب جاہلیتہ نے اپنے بعض دوسرے قبیح و شنیع افعال و اطوار میں ایک اور خرابی کا اضافہ کیا۔ قرآن نے اسے زیادۃٌ فی الکفر کے عنوان سے بیان کیا ہے۔ اور فرمایا :-

انما النسئ زیادۃٌ فی الکفر یضل به الذین کفروا یحلونه عاماً ویحرمونه عاماً، لیواطئوا عدۃ ما حرم اللہ، فیحلوا ما حرم اللہ، زین لهم سوٓء اعمالهم، واللہ لا یھدی القوم الکافرین ○

مہینوں کا اپنی جگہ سے آگے پیچھے کرنا، کفر کے زمانے کی بڑھائی ہوئی بات ہے، جس سے کافر گمراہ ہوتے ہیں۔ ایک برس اس مہینہ کو حلال کر لیتے ہیں اور اگلے برس اسی مہینہ کو حرام قرار دیتے ہیں۔ تاکہ اللہ کی طرف سے ادب والے مہینوں کی گنتی پوری کر لیں۔ پس اللہ کے حرام کئے ہوئے کو حلال کر لیتے ہیں۔ اچھے کر دیے گئے ان کے برے کرتوت اور اللہ تعالیٰ کافروں کو ہدایت کی راہ نہیں دکھاتا۔

عرب میں قدیم انبیاء کی تعلیم کے مطابق بارہ مہینوں میں سے چار مہینوں کو حرمت و ادب والے مہینے قرار دیا جاتا تھا لیکن اپنی خود سری اور انانیت کے باعث اشھر حرم کے ادب و احترام کو تسلیم کرنے کے باوجود، حسبِ ضرورت خود ہی ان مہینوں کو آگے پیچھے سرکا کر اپنی من مانیوں کا جواز پیدا کر لیتے تھے۔ لوٹ مار کا شوق چرایا۔ تو بھلے سے کوئی بھی ماہ حرام ہو، اسے پرے کر دیا اور یہ کہتے ہوئے کہ محرم نہیں صفر کا مہینہ ہے قتل و غارتگری کے لئے نکل کھڑے ہوتے۔ تغیر فصول اور ایسی ہی موقت ضرورتوں کی بنا پر، مہینوں کے اپنے مقام سے ہٹا دینے کا یہ خود پسندانہ مشغلہ عام ہونے لگا۔ تو انہوں نے اس میں ایک نام نہاد ضبط پیدا کر لیا۔ شروع میں تو نسئی شہور کا یہ فعل شنیع، بقول مشہور اسی عمرو بن لحی الخزاعی نے رواج دیا تھا۔ جس نے بیت اللہ کے مقدس احاطے میں لکڑی اور پتھر کے بتوں کی نجاست لا کے ڈالی تھی۔ یہ شخص فطرتاً بدعت پسند اور متجدد تھا۔ جب نسئی و تبدل کا یہ سلسلہ عام ہو گیا۔ تو بنو مالک بن کنانہ میں سے ایک شخص قلمس نے پہلی مرتبہ ایک عوامی میلے میں باقاعدہ اعلان کر کے مہینے کی تقدیم و تاخیر کا عمل کیا۔ اس نے اس اعلانِ نسئی کو ثقافتی اور فنی روپ رنگ دے کر عوام میں سنسنی پیدا کی اس کے بعد اس کا بیٹا عباد اسی طریق پر ہر سال اعلانِ نسئی کرتا رہا عباد کے بعد اس کا بیٹا قلع اور قلع کے بعد اس کا جانشین امیہ پھر امیہ کے بعد اس کا فرزند عوف اور اس کے بعد عوف کا بیٹا ابو ثمامہ جنادہ یہ رسم انجام دیتا۔ بنو کنانہ نے اس جدت کو باضابطہ ایک ادارہ (INSTITUTION) بنا لیا اور یہ تمام نامبردہ حضرات اس ادارہ کے بانی و سرپرست، کی حیثیت سے قلمس اول کے جانشین بن کر قلامسہ کے لقب سے ملقب ہوتے چلے آتے تھے۔

ان لوگوں نے اسے وجہ افتخار بنا لیا تھا اور موقع بے موقع کبر و تعلی کرتے رہتے تھے۔ ان کے ایک شاعر عمیر بن قیس نے قبیلہ معد پر

اپنے احسانات جتاتے ہوئے چند اشعار کہے تھے (بقول بعض یہ اشعار کمیت کے ہیں) جن میں اُس نے کہا:

"ہم شریف لوگ ہیں۔ ہمارے آباؤ اجداد کریم تھے اور ہم نے انتقام لئے بغیر کسی کو نہیں چھوڑا۔ ہم نے ہمیشہ حریفوں کے منہ میں لگام دی ہے۔ ہم وہی تو ہیں۔ جو بنو معد کے لئے حلال مہینوں کو حرام اور حرام مہینوں کو حلال کر دیا کرتے تھے۔"

ایک اور شاعر نے کہا۔ ہمیں میں وہ شخص ہے۔ جو مہینوں کو مؤخر کر دیتا ہے۔ لوگ اس کے جھنڈے تلے چلتے ہیں اور وہ جب چاہتا ہے مہینوں کو حلال یا حرام کر دیتا ہے۔" ایک مصرعہ ہے! ومنا ناسئ الشہر قلمس یعنی مہینوں کو مؤخر کرنے والا قلمس ہم میں سے تھا۔

ابن اسحٰق مغازی میں ابو ثمامہ جنادہ بن عوف الکنانی، یعنی آخری قلمس کے بارہ میں تصریح کرتے ہیں کہ وہ جمرۃ العقبہ کے قریب ٹیلے پر کھڑا ہو جاتا۔ لوگ اس کے اردگرد اکٹھے ہو جاتے اور وہ بآواز بلند کہتا۔

"خدایا مجھے نہ تو عیب لگایا جا سکتا ہے۔ نہ گناہ کا الزام، جن امور کا تو نے فیصلہ کر دیا ہے انھیں کوئی رد نہیں کر سکتا تمہارے خداؤں نے محرم کو تمہارے لیے حلال کر دیا ہے۔ تم بھی اسے حلال سمجھو۔"

ابن مردویہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے اس کی توثیق کی ہے۔ کلبی کی روایت میں قلمس اول کا نام نعیم بن ثعلبہ بیان کیا گیا ہے۔

نسئی کے بھی مختلف اور متعدد طریقے اختیار کئے گئے تھے۔ کبھی محرم کو صفر سے اور صفر کو محرم سے بدل دیتے تھے۔ یوں ایک ہی مہینے کو ہٹا دینے سے کام بن جاتا تھا۔ اور کبھی دو صفر اور دو محرم اکٹھے کر لیتے تھے۔ حج کے موسم میں شمسی سال پورا کرنے کے لئے بعض اوقات دو ذوالحجہ قرار دے دیتے تھے اور کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ تقدیم و تاخیر کے عمل سے سال کے پورے بارہ مہینے اپنی جگہ سے کھسک جاتے تھے۔ ذیل میں مہینوں کی تقدیم و تاخیر کا جدول پیش کیا جاتا ہے۔ نسئی مشہور کا جدول ملاحظہ ہو:

ذوالحجہ	محرم	صفر	ربیع ۱	ربیع ۲	جمادی ۱	جمادی ۲	رجب	شعبان	رمضان	شوال	ذی قعدہ	ذی الحجہ
محرم	صفر	ربیع ۱	ربیع ۲	جمادی ۱	جمادی ۲	رجب	شعبان	رمضان	شوال	ذی قعدہ	ذی الحجہ	محرم
صفر	ربیع ۱	ربیع ۲	جمادی ۱	جمادی ۲	رجب	شعبان	رمضان	شوال	ذی قعدہ	ذی الحجہ	محرم	صفر
ربیع ۱	ربیع ۲	جمادی ۱	جمادی ۲	رجب	شعبان	رمضان	شوال	ذی قعدہ	ذی الحجہ	محرم	صفر	ربیع ۱
ربیع ۲	جمادی ۱	جمادی ۲	رجب	شعبان	رمضان	شوال	ذی قعدہ	ذی الحجہ	محرم	صفر	ربیع ۱	ربیع ۲
جمادی ۱	جمادی ۲	رجب	شعبان	رمضان	شوال	ذی قعدہ	ذی الحجہ	محرم	صفر	ربیع ۱	ربیع ۲	جمادی ۱
جمادی ۲	رجب	شعبان	رمضان	شوال	ذی قعدہ	ذی الحجہ	محرم	صفر	ربیع ۱	ربیع ۲	جمادی ۱	جمادی ۲
رجب	شعبان	رمضان	شوال	ذی قعدہ	ذی الحجہ	محرم	صفر	ربیع ۱	ربیع ۲	جمادی ۱	جمادی ۲	رجب
شعبان	رمضان	شوال	ذی قعدہ	ذی الحجہ	محرم	صفر	ربیع ۱	ربیع ۲	جمادی ۱	جمادی ۲	رجب	شعبان
رمضان	شوال	ذی قعدہ	ذی الحجہ	محرم	صفر	ربیع ۱	ربیع ۲	جمادی ۱	جمادی ۲	رجب	شعبان	رمضان
شوال	ذی قعدہ	ذی الحجہ	محرم	صفر	ربیع ۱	ربیع ۲	جمادی ۱	جمادی ۲	رجب	شعبان	رمضان	شوال
ذی قعدہ	ذی الحجہ	محرم	صفر	ربیع ۱	ربیع ۲	جمادی ۱	جمادی ۲	رجب	شعبان	رمضان	شوال	ذی قعدہ
ذی الحجہ	محرم	صفر	ربیع ۱	ربیع ۲	جمادی ۱	جمادی ۲	رجب	شعبان	رمضان	شوال	ذی قعدہ	ذی الحجہ

نسیٔ کا یہ کھیل محدود، ذاتی اغراض اور قبائلی حمیتِ جاہلیہ کے تقاضے پورے کرنے کے لئے تین صدیوں سے زیادہ عرصے تک جاری رہا۔ لیکن آخر کار حجۃ الوداع (اسے حجۃ الاسلام اور حجۃ الکمال بھی کہتے ہیں) کے یادگار تاریخی موقعے پر یہ مذموم اور خود ساختہ رسم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دی گئی۔ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے اس موقع پر قرآن حکیم کی متعلقہ آیات کی تلاوت کے بعد ارشاد فرمایا تھا:۔

وان الزمان قد استدار کھیئتہ یوم — البتہ زمانہ گھوم پھر کر اسی دن کی شکل میں پھر آگیا ہے

خلق اللہ السماوات والارض۔ — جبکہ اللہ تعالیٰ نے آسمان اور زمین پیدا فرمائے تھے۔

اس نبوی ارشاد کی توضیح و تشریح میں علما محققین نے بڑی بصیرت افروز باتیں لکھی ہیں مگر بالعموم اس کو نسئی اور تحول و تغیر شہور تک ہی محدود سمجھا گیا ہے۔ حالانکہ ادنیٰ سے غور و تامل پر یہ حقیقت واضح ہو سکتی ہے کہ مہینوں کی تقدیم و تاخیر کی مذمت و ممانعت میں تو آیۂ قرآنی بالکل جامع اور حاوی تھی یہ فرمانِ واجب الاذعان اپنی معنویت اور اہمیت کے اعتبار سے نسبتاً زیادہ توجہ کا خواستگار ہے۔ اس کے جامع کلمات کا در و بست اس امر کا مقتضی ہے کہ اسے آیۂ عدۃ الشھور ۹ : ۳۶ کی طرح، اس ازلی صداقت کا آئینہ دار سمجھا جائے کہ اس کا عطف تخلیق کائنات کے اولیں دن سے ہے۔ ان دونوں میں یوم خلق اللہ السماوٰت والارض کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اس بنا پر یہ نکتہ واضح ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا مفہوم نسئی شہور کی غلط کاری تک ہی محدود نہیں بلکہ اس سے آگے بڑھ کر یہ فرمان نبوی زمانے کی ہیئت اور اس کے دوران کے اشارہ سے نظام مواقیت (اور تقویمی امور کی طرف خصوصی توجہ دلاتا ہے)

اس انداز سے اگر ہم حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد پر غور کریں۔ تو ظاہر ہو گا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کو قمری تقویم کی فطری نوعیت اور طبیعی خصوصیت اپنانے کی تلقین فرما رہے ہیں۔ میرا خیال ہے۔ کہ اسلامی سن کی تعیین اور ہجری سال کی تقویم اختیار کرنے کا موجب و محرک بھی رسول اللہؐ کا یہی فرمان حقیقت بنیان تھا۔ ورنہ اس وقت ارد گرد کے ممالک اور خصوصیت سے قیصر و کسریٰ کی ترقی یافتہ انتظامی روایات سے متاثر ہو کر شمسی قمری تقویم کو اپنا لینا بہت ممکن تھا۔ لیکن حضرت علی حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم ایسے جلیل القدر صحابہ کبار اور ان کے رفقاء کار ان الزمان قد استدار کھیئتہ یوم خلق اللہ السمٰوات والارض کی ایمائیت سے بخوبی آشنا تھے۔ اس لیے انہوں نے اپنے اور ہمارے سب کے آقا و مولا سید ولد آدم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق قمری تقویم پر ہی سنہ ہجری کو استوار کیا۔ فجزاھم اللہ عنا وعن سائر الامۃ۔ امین۔

قمری تقویم کی فطری حیثیت کے باعث جیسا کہ ہم اوپر عرض کر چکے ہیں۔ اس کا رواج آغاز عالم ہی سے ہو گیا تھا۔ اور دنیا کی مختلف قوموں نے پہلے پہل اسی حساب مہ و سال کو اپنایا تھا۔ بعد کے ادوار میں مختلف النوع محرکات کے زیر اثر دوسرے تقویمی حسابات کا رواج بھی شروع ہو گیا اور کئی قوموں اور ملکوں میں اپنے اپنے تعصبات و رجحانات کے مطابق اشخاص اور واقعات کی نسبت سے سالوں کا شمار ہونے لگا۔ اکثر نے اپنے دنیوی مصالح اور موسمی کیفیات کے پیش نظر شمسی تقویم کو، یا شمسی قمری مخلوط تقویم کو اپنا لیا۔ لیکن قمری نظام مواقیت پھر بھی کرۂ ارض کے متعدد خطوں میں مروج رہا۔

چاند کی رفتار اور دوران سیر زمین سے قربت اور فاصلہ کی بنا پر اس کا چکر کبھی ۳۰ دن میں پورا ہوتا ہے اور کبھی ۲۹ دن میں اسی وجہ سے قمری مہینے بھی کبھی تیس دن کے ہوتے ہیں اور کبھی ۲۹ دن کے۔ علمائے ہیئت کے مطابق زمین کے گرد چاند کے

پورے بارہ چکروں کی مجموعی مدت ۴۸، ۳۵۴ دن قرار پاتی ہے جبکہ شمسی سال کے دوران میں ۴۸، ۳۶۵ دن آتے ہیں۔ حسابدانوں نے ان کسور کو جمع کر کے ان دونوں تقویموں میں کبیسہ "لونداپا" LEA P کا قاعدہ وضع کیا جس سے قمری بارہ ماہ میں تیرھویں مہینہ کا اضافہ اور شمسی سال کے مہینہ فروری میں ہر چار سال بعد ایک دن کی ایزادی کر لی جاتی ہے۔

چاند کو زمین کے گرد ½ ۲۹ دن میں اپنا چکر پورا کر لینا چاہیے لیکن خود زمین کی حرکت کی بنا پر یہ چکر ½ ۲۹ دن میں ختم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح سورج کی حرکت محوری کی بنا پر اس کا سال بھی ½ ۳۶۵ دنوں میں پورا ہو جاتا ہے۔ اس طرح جو تفاوت رونما ہوتا ہے۔ اس کو دور کرنے کی غرض سے کبیسہ کے قاعدہ پر عمل پیرا ہونے کے علاوہ اور کئی طریقے بھی استعمال کئے جاتے۔ تاہم ان کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔

ہیئت والوں نے قمری سالوں کو صغیر اور کبیرہ دو قسم کے ادوار میں تقسیم کر رکھا ہے۔ تیس قمری سالوں کا ایک دورۂ صغیرہ محسوب ہوتا ہے۔ اور سات ادوار صغیرہ یعنی ۲۱۰ قمری سال مل کر ایک دورۂ کبیرہ کو تشکیل دیتے ہیں۔

دورۂ صغیرہ کے دنوں کی مجموعی تعداد ۱۰۶۳۱ ہوتی ہے یعنی ۱۹ سال ۳۵۴ دن کے اور گیارہ سال ۳۵۵ دن کے شمار ہوتے ہیں۔ اسی طرح دورۂ کبیرہ ۷۴۴۱۷ دنوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ ادوار صغیرہ کی جدول ملاحظہ ہو۔

دورۂ صغیرہ	سنین قمری	تعداد ایام
۱	۳۰	۱۰۶۳۱
۲	۶۰	۲۱۲۶۲
۳	۹۰	۳۱۸۹۳
۴	۱۲۰	۴۲۵۲۴
۵	۱۵۰	۵۳۱۵۵
۶	۱۸۰	۶۳۷۸۶
۷	۲۱۰	۷۴۴۱۷

دورۂ کبیرہ کے حساب سے قمری ہجری تقویم کا ساتواں دور جاری ہے۔ چھٹے دور کے بعد ابھی ۱۴۱ برس گزرے ہیں اور اسے مکمل ہونے کے لیے مزید ۶۹ سال باقی ہیں اور ایک تخمینے کے مطابق آج تک ہجری قمری تقویم کے ۵۰۲۱۴۲ ، ایام گزرے ہیں ہر دور صغیر کے مکمل ہونے کے بعد آنے والا دورۂ صغیرہ اپنے سے پہلے دور سے ترتیبی مماثلت رکھتا ہے یعنی جس طرح پچھلے دورۂ صغیرہ میں قمری مہینے ۳۰-۳۰ یا ۲۹-۲۹ دن کے آئے تھے اسی ترتیب سے تیس برس بعد اتنے ہی دنوں کے آئیں گے دورۂ کبیرہ اپنے مسبوق دورہ کبیرہ سے برسوں اور مہینوں کی مطابقت رکھتا ہے۔ یعنی مہینوں کے غرے اور سالوں کے آغاز کے دن بالکل یکساں ہوتے ہیں۔ محققین نے ہجری سنین اور شہور کے ایام غرہ دریافت کرنے کے لئے بڑی محنت اور وقت نظر سے مختلف

طریقے وضع کئے ہیں۔ جن میں سے چند ایک یہاں بیان کر دیے جائیں تو فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

غرہ سال قمری کا ایک ضابطہ یہ ہے کہ مطلوبہ سن ہجری کو آٹھ پر تقسیم کریں اور حاصل قسمت کو ان حروف ثمانیہ سے منطبق کریں۔ وہ حروف یہ ہیں ب و د ا ھ ج ز د۔ یہ حروف اصل میں قمری مہینوں کی رموز ہیں۔ حاصل قسمت جس حرف پر منطبق ہوگا وہی حرف رمز غرہ ماہ کی نشان دہی کرے گا۔

مندرجہ ذیل جدول میں عربی مہینوں اور ان کے ایام کی تعداد تقویمی رموز کے ساتھ مرتب کر دی گئی ہے۔

محرم	صفر	ربیع الاول	ربیع الثانی	جمادی الاول	جمادی الثانیہ
ز	ب	ج	ہ	و	ا
۳۰	۵۹	۸۹	۱۱۸	۱۴۸	۱۷۷
رجب	شعبان	رمضان	شوال	ذوالقعدہ	ذوالحجۃ
ب	د	ہ	ز	ا	ج
۲۰۷	۲۳۶	۲۶۶	۲۹۵	۳۲۵	۳۵۴

کبیسہ (لوند) کے سال کے غرے معلوم کرنے ہوں۔ تو ان کا حساب یوں کرتے ہیں۔ کہ مندرجہ ذیل شعر کے حروف معجمہ کے محاذی سنین کے ذوالحجہ میں اضافہ کر کے اسے تیس دن کا قرار دے لیتے ہیں ؎

کف الخلیل کفه ودیانه
عن کل خل حبه فصانه

اس شعر کے حروف مہملہ کے محاذی آنے والا مہینہ ۲۹ دن کا ہوگا اور حروف معجمہ کے مقابل والا ۳۰ دن کا شمار ہوگا۔
ایک اور طریقہ رؤیت ہلال پر مبنی وضع کیا گیا ہے۔

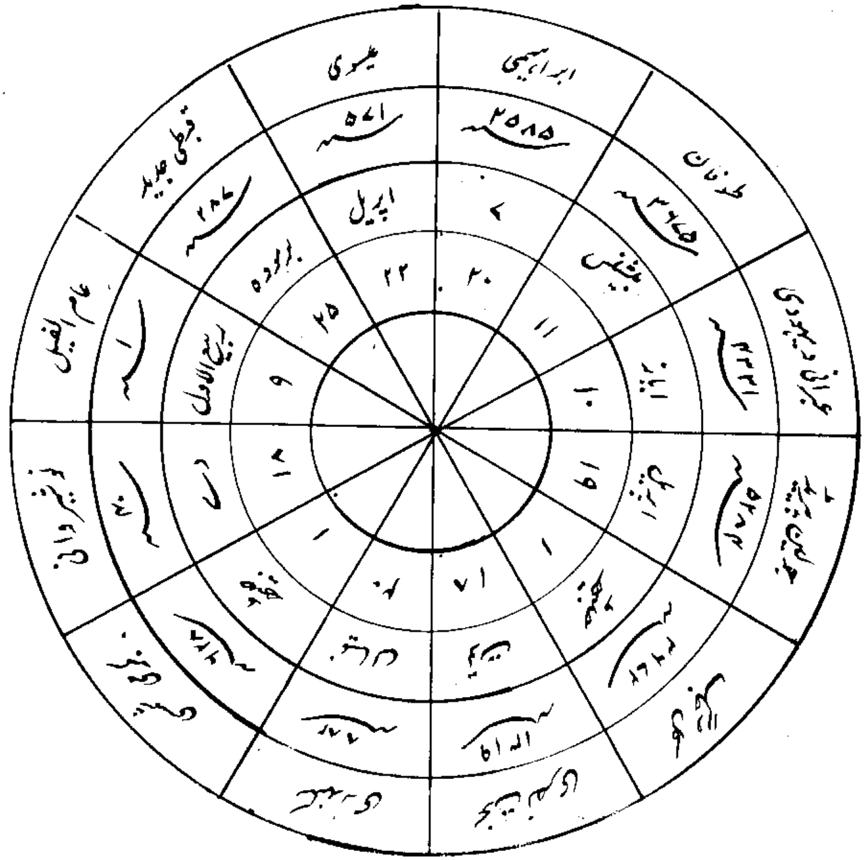
یکشنبہ	دوشنبہ	سہ شنبہ	چہارشنبہ	پنجشنبہ	جمعہ / آدینہ	شنبہ
ا	ب	ج	د	ہ	و	ز

اشعار

ا دج وز اگر بینی ہلال — سی دیک ایام داں لے نیک فال
ب وده چو آید خوب رو — ماه راسی روزه بشمر نیک خو
لیک گر در روز واو آمد عیاں — بست ونہ ایام در آں ماه داں

اوائل السنین والشہور یعنی قمری سالوں اور مہینوں کے عزہ معلوم کرنے کا ایک طریقہ امام جلال الدین السیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب الدائرۃ العظیمہ میں بیان کیا ہے۔ لیکن وہ زیادہ طویل اور مبسوط ہے۔ یہاں اس کے بیان کی گنجائش نہیں ہے۔

مسلم ہیئت دانوں نے ہجری قمری تقویم کی رو سے حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے ایام کا حساب بھی مرتب کیا ہے۔ اس کی رو سے آپ علیہ السلام اس دنیا میں ۲۲۳۳۰ دن اور چھ گھنٹے قیام فرما رہے ہیں۔ ان میں سے رسالت و نبوت کی تبلیغ کے ایام ۸۱۵۶ شمار کئے گئے ہیں۔ یہاں ہم سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کے سال مہینے اور دن کی تطبیقات کا عالمی تقویمی نقشہ پیش کرتے ہیں۔



مسلمان علمائے ہیئت و نجوم نے عہدِ نبوی کے اہم اسلامی وقائع و ایام کی معروف و مروج تقویموں سے تطبیق دے کر ہجری قمری تاریخوں کے جدول بھی مرتب کئے ہیں۔ جو تبرک کا ہی نہیں بلکہ تاریخی تحقیق اور یادداشت کے لیے بھی یہاں درج کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ تقویم ہجری اور سیرت نبوی صلی اللہ علی

صاحبہا وسلم کے سکالروں کیلئے بڑے کام کی چیز ہیں۔

ایام و وقائع	یوم	سنہ قمری اسلامی: تاریخ	ماہ	سنہ ولادت	سنہ نبوت	سنہ ہجرۃ	سنہ عیسوی شمسی: تاریخ	ماہ	سال	سنہ قمری عیسوی
ولادت باسعادت	یکشنبہ / دوشنبہ	یکم / ۹	محرم / ربیع الاول	۱ / ۱			۲ / ۱۵	فروری / اپریل	۵۷۱ / 〃	۵۸۸ / 〃
بعثت	دوشنبہ	۹	ربیع الاول	۴۱	۱		۹ / ۱۲	۲	۶۱۰	۶۲۸
فرضیت نماز فجر و عصر	〃	〃	〃	〃	〃		〃	〃	〃	〃
آغاز نزول قرآن	شب جمعہ	۱۷	رمضان	〃	〃		۱۴ / ۱۷	۸	〃	〃
ہجرت حبشہ			رجب	۴۵	۵			۴	۶۱۴	۶۳۲
شعب ابیطالب میں محصوری	سہ شنبہ	۱	محرم	۴۷	۷		۳۰ / ۳	۹ / ۱۰	۶۱۵	۶۳۴
سفر طائف			جمادی الاخریٰ	۵۰	۱۰			۲	۶۱۹	۶۳۷
معراج ـ فرضیت پنجگانہ	دوشنبہ	۲۷ویں شب	رجب	〃	〃		۱۹ / ۲۰ شب	۳	〃	〃
ابتدائے ایمان اہل مدینہ			ذی الحجہ	〃	〃			۷	〃	〃
بیعت عقبہ اولیٰ			〃	۵۲	۱۲			۷	۶۲۱	۶۳۹
بیعت عقبہ ثانیہ			〃	۵۳ / ۵۴	۱۳ / ۱۴			۶	۶۲۴	۶۴۰
ہجرت داخلہ ثور	شب جمعہ	۲۷	صفر	〃	〃	۱	۱۰ / ۱۳ شب	۹	۶۲۲	۶۴۱
داخلہ قبا	دوشنبہ	۸	ربیع الاول	〃	〃	۱	۲۰ / ۲۳	〃	〃	〃
داخلہ مدینہ منورہ	جمعہ / دوشنبہ	۱۲-۱۲۲	〃			۱	۲۴ / ۲۷/۷/۴	〃	[illegible]	〃
بنیاد مسجد نبوی	دوشنبہ	۲۲	〃	〃	〃	۱	〃	〃	〃	〃
اضافہ نماز ظہر، عصر و عشاء			ربیع الثانی	〃	〃	۱		۱۰	〃	〃
تحویل قبلہ	شنبہ	۱۵	شعبان	۵۵	۱۵	۲	۱۱ / ۱۴	۱۰	۶۲۴	۶۴۴
اول صوم رمضان	یکشنبہ	۱	رمضان	〃	〃	〃	۲۶ / ۲۹	۲	〃	〃
فرضیت زکوٰۃ				〃	〃	〃			〃	〃
فرضیت جہاد				〃	〃	〃			〃	〃
جنگ بدر	سہ شنبہ	۱۷	رمضان	〃	〃	〃	۱۳ / ۱۶	۳	〃	〃
تحریم خمر				۵۶	۱۶	۳			۶۲۵	۶۴۳
حکم حجاب النساء	جمعہ	۱	ذی قعدہ	۵۷	۱۷	۴	۴ / ۷	۴	۶۲۶	۶۴۴
تبلیغ بہ سلاطین	چہارشنبہ	۱	محرم	۶۰	۲۰	۷	۱۱ / ۱۴	۵	۶۲۸	۶۴۷
فتح مکہ	پنجشنبہ	۲۰	رمضان	۶۱	۲۱	۸	〃	۱	۶۳۰	۶۴۸
فرضیت حج				۶۲	۲۲	۹			۶۳۱	۶۴۹
اولین حج باامامت صدیق رض	دوشنبہ / سہ شنبہ	۹	ذوالحجہ	۶۳	۲۳	۹	۱۸ / ۲۱	۳	〃	〃
حجۃ الوداع	جمعہ	〃	〃	۶۳	۲۳	۱۰	۱۶ / ۹	〃	۶۳۲	۶۵۰
آغاز مرض	دوشنبہ	۲۹	صفر	۶۴	〃	۱۱	۲۵ / ۲۸	۵	۶۳۲	۶۵۱
وفات الم آیات	چاشت دوشنبہ	۱۳	ربیع الاول	〃	〃	〃	۵ / ۱۱	۶	〃	〃
تدفین جسد اطہر	شب چہارشنبہ	۱۴	〃	〃	〃	〃	۳ / ۱۲	〃	〃	〃

ہجری تقویم کے مروج ہونے کے کم و بیش ہزار سال بعد ۹۹۰ھ المطابق ۱۵۸۲ء میں جولین پیریڈ کا سال آغاز ہے حالانکہ اسے بہت قدیم زمانے سے شمار کرتے ہیں، لیکن اپنی وضعی کیفیت میں وہ سنہ ہجری سے بہت بعد کا ہے۔

علاوہ ازیں عبرانی ۔ رومی ۔ سکندری، بکرمی، قبطی اور نوشیروانی و بخت نصری سالوں کا حساب بھی چلتا رہا ہے لیکن یہ سب دوسری تقویموں پر عمل پیرا رہے ہیں اور قمری تقویم کی سی فطری نہج پر ان کی پیش رفت نہیں ہو سکی۔

شمسی عیسوی جدید تقویم بھی دائرۃ المعارف برطانیہ (ENCYCLOPEDIA BRITANNICA) کی تصریحات کے مطابق سنہ قمری ہجری کے بعد کی پیداوار ہے۔ جولین پیریڈ کے بارہ میں تو ہم اوپر واضح کر ہی چکے ہیں عبرانی سال کی تشکیل جدید بھی بعد کے دور میں ہوئی ہے۔ اسی طرح یورپی ہیئت دانوں نے کل جگ کی موجودہ تقویم کو بھی چوتھی صدی عیسوی سے زیادہ پرانا تسلیم نہیں کیا ہے۔ سنہ سکندری اگرچہ ہجری سال سے ۹۳۲ برس قدیم ہے۔ لیکن ان دنوں یہ قمری تقویم کے مطابق تھا۔ اب اسے شمسی مہینوں کے حساب سے ترتیب دیا گیا ہے۔ یہی حال سمت بروشٹہ اور بکرمی کا بھی ہے اور تو اور سنہ عیسوی تک بھی ۱۱۶۵ھ تک قمری تقویم اپنائے رہا۔ کلاسیکل ڈکشنری (CLASSICAL DICTIONARY) کے مطابق ۱۴ ذی قعدہ ۱۱۶۵ھ پنجشنبہ کے دن سے جدید شمسی حساب سے ۱۷۵۲ء کا ۱۴ ستمبر سے آغاز کیا گیا۔

اسلامی تقویم کا مدار علیہ قمری نظام المواقیت ہے۔ باوجودیکہ قمری سال کو شمسی سال کے برابر کرنے کے لئے ہر بارہ ماہ میں گیارہ دن سے کچھ زیادہ دن بڑھانے کی ضرورت ہے۔ لیکن غیر فطری انداز سے اس غرض کو پورا کرنے کی خاطر لوند۔ لیپ یا کبیسہ کا سہارا نہیں لیا گیا۔ مساوات اسلامی معاشرے کی اساسی اقدار میں سے ہے۔ اور اسلام نے ہر حالت میں تمام انسانوں کی برابری اور ان کے مختلف طبقات میں خوشگواری کی کیفیت استوار کرنے کی تلقین کی ہے اسلامی مہینوں کا ادلتے بدلتے موسموں میں آنا اور فصول کے تحول (ROTATE) کرنے سے مساوات کی عالمی فضا جنم لیتی ہے۔ شمسی حساب میں یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ مثلاً رمضان کو کسی شمسی مہینہ کے ساتھ مطابق کر دیا جائے۔ تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہمیشہ ہمیش کے لیے نصف کرہ زمین کے مسلمان گرمی اور باقی نصف کرہ کے سردی میں روزے رکھیں۔ اسی پر باقی کے احکام و فرائض کی ادائی کا قیاس کیا جا سکتا ہے۔ البتہ قمری حساب میں بے اعتدالی نہیں ہے تحویل ROTATION کے باعث زمین کے ہر خطہ کے مسلمان تغیر فصول کے ساتھ ساتھ برابر برابر کی کیفیات و حالات میں فرائض و مناسک ادا کر سکتے ہیں۔

شمسی تقویم اختیار کر کے قدیم عیسوی سال کو بھی یک گونہ غیر طبیعی نہج پر ڈال دیا گیا ہے۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ پرانا رومی کیلنڈر جسے آگسٹس نے ترمیم کیا اور پھر جولین نے ترمیم مزید کے بعد اسے جولین پیریڈ بنا دیا نت نئی ترمیموں اور بار بار کے حذف و اضافہ کا موضوع قرار پا گیا۔ ۱۵۸۲ء میں پاپائے گریگوری XIII نے اس میں ترمیمیں کر کے اسے موجودہ GREGORIAN CALENDAR کی شکل دی۔

جولین کے کم و بیش چھ سو سال بعد ایک عیسائی راہب ڈینس ایگزگاس نے بے محابا جوش عقیدت کے تحت اسے ایک غلط حساب کتاب کی بنا پر حضرت مسیح علیہ السلام سے منسوب کر دیا گرنہ اس سنہ کا عیسیٰ علی نبینا وعلیہ السلام سے دور کا تعلق

بھی نہیں ہے۔ امریکن پبلیز انسائیکلوپیڈیا میں اس پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے

شمسی تقویم سال کو فصول و مواسم سے ہم آہنگ رکھنے کے لئے بار بار ترمیموں کا ہدف بنایا جاتا ہے۔ تاریخ واضح کرتی ہے کہ پہلی ترمیم ۳۰۰ء میں ہوئی پھر ۱۷۹۹ء میں بہت سی ترمیمیں کی گئیں اور پھر نہ جانے کتنی ترمیمیں کی گئیں پاپائے گریگوری کی ترمیم تو معلوم ہے کہ ۱۵۸۲ء میں ہوئی تھی۔

بہر حال ایسا لگتا ہے کہ فطری نہج سے ہٹ جانے کی پاداش میں اس تقویم کو بار بار حذف و اضافہ کا شکار بنایا پڑا کبھی آٹھ دن کم کئے گئے۔ کبھی دس اور کبھی بیس دن اسی طرح خلا پُر کرنے کے لیے سال کو کبھی چودہ مہینوں تک پھیلا دیا گیا اور کبھی ساڑھے دس مہینوں ہی میں برابر کر لیا گیا۔

تقویم میلادی شمسی کو ان خرابیوں اور بے ضابطگیوں کے اثر سے بچانے کے لئے متعدد کوششیں عمل میں لائی گئیں۔ اس سلسلہ میں تقویم میلادی شمسی کو تقویم ہجری قمری سے منطبق کرنے کے لیے بھی ہاتھ پاؤں مارے گئے نقطۂ اعتدال ربیعی VERNAL EQUINOX کے بعد واقع ہونے والے پہلے بدر کامل کو عید الفصح (EASTER) کا دن مقرر کر کے پاپائے گریگوری نے میلادی سال کو ہجری تقویم کے قریب تر لانے کا اقدام کیا اور اب یہ کیلنڈر NEW STYLE کے نام سے مروج ہے۔

شمسی اور قمری تقویموں میں مطابقت پیدا کرنے کی کوششیں صدیوں سے جاری ہیں۔ اس غرض سے کئی طرح کی تقابلی جدولیں مرتب کی گئی ہیں۔ اسلامی حکمائے بھی اس طرف خاصی توجہ دی ہے۔ تیسری صدی ہجری کا معروف ہئیت دان الیعقوبی ان کا پیشرو تھا۔ اس کے بعد البیرونی۔ خیام اور مسعودی نے اس خصوص میں قابلِ توجہ کوششیں کی ہیں۔

پندرھویں صدی عیسوی میلادی کے بعد یورپی ASTROLOGERS نے تقابلی جدولوں کی تیاری میں بہت زیادہ دلچسپی لی ہے۔ موجودہ دور میں جرمنی کے سکالر WUSTENFLED کی تقابلی جدول بین الاقوامی شہرت کی حامل ہے۔ اس کا ترجمہ دنیا کی مختلف زبانوں میں شائع ہو چکا ہے۔ اس کی اساس پر ماہرینِ ہیئت نے کئی اہم گوشوں پر تحقیقی مقالے بھی لکھے ہیں نے بعض اضافات کے ساتھ اس جدول کو ۱۹۲۶ء میں LEIPZIG سے شائع کیا تھا۔

جس کا ترجمہ ابوالنصر محمد خالدی ایم اے عثمانیہ کے قلم سے انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی نے ۱۹۳۹ء میں تقویم ہجری و عیسوی کے نام سے شائع کیا تھا[1]

انگریزی میں MUSLIM AND CHRISTIAN CALENDARS کے نام سے G.S.P. FREEMAN GREMILLE نے آکسفورڈ یونیورسٹی پریس سے اپنی جدول شائع کرائی تھی۔ اس کا عربی ترجمہ "التقویمان الہجری والمیلادی" کے نام سے الدکتور حسام محی الدین الآلوسی نے ۱۹۷۰ء میں شائع کیا ہے۔ جو اس وقت میرے سامنے ہے۔ اس میں اپنے بعض مآخذوں پر معلومات افزا نقد کیا گیا ہے۔ ایک کتاب "جدول مقارنہ التواریخ الہجریہ والمیلادیہ" جو SIR WOLOSELY HAIG کی تالیف ہے اور جسے عبدالعزیز المراغی نے عربی میں منتقل کیا تھا۔ اس کے بارے میں لکھتے ہیں کثیرۃ الاغلاط معلومات غیر وافیہ۔ لایحتوی علیٰ جداول تعیین الایام وغیرہ وغیرہ

---

[1] انجمن ترقی اردو پاکستان (کراچی) نے اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۵۲ء میں شائع کیا۔ (ادارہ)

اس کتاب میں مؤلف نے خاصی کاوش سے آٹھ طول طویل جدولیں قمری اور شمسی تقویموں کی مدد سے اور ہجری و میلادی سالوں کے ایام میں تطبیق دے کر مرتب کی ہیں۔

مہینوں کی مطابقت سے بارہ برجوں کے نام ہیں۔ اسی طرح ہفتہ کے سات دنوں کی مناسبت سے سات ستارے مقرر کئے گئے ہیں گویا ہر دن کا ایک الگ ستارہ ہے۔ چنانچہ ہر دن کے نیچے اس کا ستارہ درج کیا جاتا ہے:۔

۱۔ شنبہ	۲۔ یکشنبہ	۳۔ دوشنبہ	۴۔ سہ شنبہ	۵۔ چہارشنبہ
زحل	شمس	قمر	مریخ	عطارد

۶۔ پنجشنبہ	۷۔ جمعہ
مشتری	زہرہ

پھر چونکہ دن رات کو آٹھ پہر میں منقسم کیا گیا ہے۔ اس لئے ایک دن کے طلوع آفتاب سے لے کر دوسرے دن کے طلوع آفتاب تک روز و شب کو چوبیس ساعتوں میں تقسیم کیا گیا ہے:۔ ذیل میں شب و روز کی مقررہ ساعتوں کی جدول ملاحظہ ہو:

	پہلا پہر			دوسرا پہر			تیسرا پہر			چوتھا پہر		
ساعت ←	۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰	۱۱	۱۲
شب شنبہ	مریخ	شمس	زہرہ	عطارد	قمر	زحل	مشتری	مریخ	شمس	زہرہ	عطارد	قمر
روز شنبہ	زحل	مشتری	مریخ	شمس	زہر	عطارد	قمر	زحل	مشتری	مریخ	شمس	زہرہ
شب یکشنبہ	عطارد	قمر	زحل	مشتری	مریخ	شمس	زہرہ	عطارد	قمر	زحل	مشتری	مریخ
روز یکشنبہ	شمس	زہرہ	عطارد	قمر	زحل	مشتری	مریخ	شمس	زہرہ	عطارد	قمر	زحل
شب دوشنبہ	مشتری	مریخ	شمس	زہرہ	عطارد	قمر	زحل	مشتری	مریخ	شمس	زہرہ	عطارد
روز دوشنبہ	قمر	زحل	مشتری	مریخ	شمس	زہرہ	عطارد	قمر	زحل	مشتری	مریخ	شمس
شب سہ شنبہ	زہرہ	عطارد	قمر	زحل	مشتری	مریخ	شمس	زہرہ	عطارد	قمر	زحل	مشتری
روز سہ شنبہ	مریخ	شمس	زہرہ	عطارد	قمر	زحل	مشتری	مریخ	شمس	زہرہ	عطارد	قمر
شب چہار شنبہ	زحل	مشتری	مریخ	شمس	زہرہ	عطارد	قمر	زحل	مشتری	مریخ	شمس	زہرہ
روز چہار شنبہ	عطارد	قمر	زحل	مشتری	مریخ	شمس	زہرہ	عطارد	قمر	زحل	مشتری	مریخ
شب پنج شنبہ	شمس	زہرہ	عطارد	قمر	زحل	مشتری	مریخ	شمس	زہرہ	عطارد	قمر	زحل
روز پنج شنبہ	مشتری	مریخ	شمس	زہرہ	عطارد	قمر	زحل	مشتری	مریخ	شمس	زہرہ	عطارد
شب جمعہ	قمر	زحل	مشتری	مریخ	شمس	زہرہ	عطارد	قمر	زحل	مشتری	مریخ	شمس
روز جمعہ	زہرہ	عطارد	قمر	زحل	مشتری	مریخ	شمس	زہرہ	عطارد	قمر	زحل	مشتری

مسلمان منجمین نے غرہ ماہ مبارک کے حساب سے **لیلۃ القدر** دریافت کرنے کا ایک فارمولا مرتب کیا ہے۔ بعض مجربین کا بیان ہے کہ یہ اکثر حالتوں میں درست ثابت ہوا ہے واللہ اعلم بالصواب وعلمہ اتم واحکم۔ بہر کیف وہ فارمولا یہ ہے۔

غرہ ماہ رمضان المبارک اگر یکشنبہ کو پڑے تو شب قدر انتیسویں کو آئے گی۔
" " " دوشنبہ " " " اکیسویں " " " ۔
" " " سہ شنبہ " " " ستائیسویں " " " ۔
" " " چہار شنبہ " " " انیسویں " " " ۔
" " " پنجشنبہ " " " پچیسویں " " " ۔
" " " جمعہ " " " سترھویں " " " ۔
" " " شنبہ " " " تیئیسویں " " " ۔

ایک شاعر نے بارہ برجوں کے نام ذیل کے قطعے میں یکجا منظوم کر دیے ہیں :-

برجہا دیدم کہ از مشرق برآوردند سر — جملہ در تسبیح و در تہلیل حیٔ لایموت
چوں حمل چوں ثور و چوں جوزا و سرطان و اسد — سنبلہ میزان و عقرب قوس و جدی دلو حوت

جدول ماہانہ طلوع و غروب ماہتاب

تاریخ	طلوع	غروب	تاریخ	طلوع	غروب
۱	ظہور قمر	۳۰ / ۷ شام	۱۵	۱۵ / ۶ تقریباً	تمام شب تقریباً
۲	"	۲۰ / ۸ شب	۱۶	۷ "	طلوع فجر
۳	"	۳۰ / ۹ "	۱۷	۸ "	"
۴	۶ بجے شام	۰۰ / ۱۰ "	۱۸	۹ "	"
۵	" تقریباً	۰۰ / ۱۱ "	۱۹	۱۰ "	"
۶	" "	۰۰ / ۱۲ "	۲۰	۱۱ "	"
۷	" "	۰۰ / ۱ "	۲۱	۱۲ "	"
۸	" "	۰۰ / ۲ "	۲۲	۱ "	"
۹	" "	۰۰ / ۳ "	۲۳	۲ "	"
۱۰	" "	۱۰ / ۴ "	۲۴	۳ "	"
۱۱	" "	۴۵ / ۴ "	۲۵	۴ "	"
۱۲	۱۵ / ۶	۳۵ " ۵ "	۲۶	۵ "	"
۱۳	" "	۰۰ / ۶	۲۷	۶ "	"
۱۴	" "	تمام شب تقریباً	۲۸	غیوب	غیوب

۵۷۱ء کی شمسی کیلنڈر

تاریخ	جنوری	فروری	مارچ	اپریل	مئی	جون	جولائی	اگست	ستمبر	اکتوبر	نومبر	دسمبر
۱	سہ شنبہ	جمعہ	جمعہ	دو شنبہ	چہار شنبہ	شنبہ	دو شنبہ	پنجشنبہ	یکشنبہ	سہ شنبہ	جمعہ	یکشنبہ
۲	چہار شنبہ	سہ شنبہ	شنبہ	سہ شنبہ	پنج شنبہ	یکشنبہ	سہ شنبہ	جمعہ	دو شنبہ	چہار شنبہ	شنبہ	دو شنبہ
۳	پنجشنبہ	یکشنبہ	دو شنبہ	پنجشنبہ	شنبہ	سہ شنبہ	پنجشنبہ	یکشنبہ	چہار شنبہ	جمعہ	دو شنبہ	چہار شنبہ
۴	شنبہ	سہ شنبہ	سہ شنبہ	جمعہ	یکشنبہ	چہار شنبہ	جمعہ	دو شنبہ	پنجشنبہ	شنبہ	سہ شنبہ	پنجشنبہ
۵	یک شنبہ	چہار شنبہ	چہار شنبہ	شنبہ	دو شنبہ	پنجشنبہ	شنبہ	سہ شنبہ	جمعہ	یکشنبہ	چہار شنبہ	جمعہ
۶	دو شنبہ	پنجشنبہ	پنجشنبہ	یکشنبہ	سہ شنبہ	جمعہ	یکشنبہ	چہار شنبہ	شنبہ	دو شنبہ	پنجشنبہ	شنبہ
۷	سہ شنبہ	جمعہ	شنبہ	سہ شنبہ	پنجشنبہ	یکشنبہ	سہ شنبہ	جمعہ	دو شنبہ	چہار شنبہ	شنبہ	دو شنبہ
۸	پنجشنبہ	یکشنبہ	یکشنبہ	چہار شنبہ	جمعہ	دو شنبہ	چہار شنبہ	شنبہ	سہ شنبہ	پنجشنبہ	یکشنبہ	سہ شنبہ
۹	جمعہ	دو شنبہ	دو شنبہ	پنج شنبہ	شنبہ	سہ شنبہ	پنجشنبہ	یکشنبہ	چہار شنبہ	جمعہ	دو شنبہ	چہار شنبہ
۱۰	شنبہ	سہ شنبہ	سہ شنبہ	جمعہ	یکشنبہ	چہار شنبہ	جمعہ	دو شنبہ	پنجشنبہ	شنبہ	سہ شنبہ	پنجشنبہ
۱۱	یکشنبہ	چہار شنبہ	پنجشنبہ	یکشنبہ	سہ شنبہ	جمعہ	یکشنبہ	چہار شنبہ	شنبہ	دو شنبہ	پنجشنبہ	شنبہ
۱۲	سہ شنبہ	جمعہ	جمعہ	دو شنبہ	چہار شنبہ	شنبہ	دو شنبہ	پنجشنبہ	یکشنبہ	سہ شنبہ	جمعہ	یکشنبہ
۱۳	چہار شنبہ	شنبہ	شنبہ	سہ شنبہ	پنج شنبہ	یکشنبہ	سہ شنبہ	جمعہ	دو شنبہ	چہار شنبہ	شنبہ	دو شنبہ
۱۴	پنجشنبہ	یکشنبہ	یکشنبہ	چہار شنبہ	جمعہ	دو شنبہ	چہار شنبہ	شنبہ	سہ شنبہ	پنجشنبہ	یکشنبہ	سہ شنبہ
۱۵	جمعہ	دو شنبہ	سہ شنبہ	جمعہ	یکشنبہ	چہار شنبہ	جمعہ	دو شنبہ	پنجشنبہ	شنبہ	سہ شنبہ	پنجشنبہ
۱۶	یکشنبہ	چہار شنبہ	چہار شنبہ	شنبہ	دو شنبہ	پنجشنبہ	شنبہ	سہ شنبہ	جمعہ	یکشنبہ	چہار شنبہ	جمعہ
۱۷	دو شنبہ	پنجشنبہ	پنجشنبہ	یکشنبہ	سہ شنبہ	جمعہ	یکشنبہ	چہار شنبہ	شنبہ	دو شنبہ	پنجشنبہ	شنبہ
۱۸	سہ شنبہ	جمعہ	جمعہ	دو شنبہ	چہار شنبہ	شنبہ	دو شنبہ	پنجشنبہ	یکشنبہ	سہ شنبہ	جمعہ	یکشنبہ
۱۹	چہار شنبہ	شنبہ	یکشنبہ	چہار شنبہ	جمعہ	دو شنبہ	چہار شنبہ	شنبہ	سہ شنبہ	پنجشنبہ	یکشنبہ	سہ شنبہ
۲۰	جمعہ	دو شنبہ	دو شنبہ	پنجشنبہ	شنبہ	سہ شنبہ	پنجشنبہ	یکشنبہ	چہار شنبہ	جمعہ	دو شنبہ	چہار شنبہ
۲۱	شنبہ	سہ شنبہ	سہ شنبہ	جمعہ	یکشنبہ	چہار شنبہ	جمعہ	دو شنبہ	پنجشنبہ	شنبہ	سہ شنبہ	پنجشنبہ
۲۲	یکشنبہ	چہار شنبہ	چہار شنبہ	شنبہ	دو شنبہ	پنجشنبہ	شنبہ	سہ شنبہ	جمعہ	یکشنبہ	چہار شنبہ	جمعہ
۲۳	دو شنبہ	پنجشنبہ	جمعہ	دو شنبہ	چہار شنبہ	شنبہ	دو شنبہ	پنجشنبہ	یکشنبہ	سہ شنبہ	جمعہ	یکشنبہ
۲۴	چہار شنبہ	شنبہ	شنبہ	سہ شنبہ	پنجشنبہ	یکشنبہ	سہ شنبہ	جمعہ	دو شنبہ	چہار شنبہ	شنبہ	دو شنبہ
۲۵	پنجشنبہ	یکشنبہ	یکشنبہ	چہار شنبہ	جمعہ	دو شنبہ	چہار شنبہ	شنبہ	سہ شنبہ	پنجشنبہ	یکشنبہ	سہ شنبہ
۲۶	جمعہ	دو شنبہ	دو شنبہ	پنجشنبہ	شنبہ	سہ شنبہ	پنجشنبہ	یکشنبہ	چہار شنبہ	جمعہ	دو شنبہ	چہار شنبہ
۲۷	شنبہ	سہ شنبہ	چہار شنبہ	شنبہ	دو شنبہ	پنجشنبہ	شنبہ	سہ شنبہ	جمعہ	یکشنبہ	چہار شنبہ	جمعہ
۲۸	دو شنبہ	پنجشنبہ	پنجشنبہ	یکشنبہ	سہ شنبہ	جمعہ	یکشنبہ	چہار شنبہ	شنبہ	دو شنبہ	پنجشنبہ	شنبہ

BIBLIOGRAPHY

کتابیات

القرآن الحکیم	تنزیل من رب العالمین
تفسیر انوار التنزیل	ابن کثیر حافظ عماد الدین الدمشقی
الجامع الصحیح	لمحمد بن اسماعیل البخاری
سیرۃ ابن ہشام کتاب المغازی	لابن ہشام
کتاب المغازی	لابن اسحٰق
منطقۃ البروج	لمحمد بن علی القدوسی
الدائرۃ العظیمہ	لجلال الدین السیوطی
تقویم ہجری وعیسوی	ابو النصر محمد خالدی ایم اے عثمانیہ
التقویمان الہجری والمیلادی	الدکتور حسام محی الدین الآلوسی
تقویم تاریخی	عبدالقدوس الہاشمی

ENCYCLOPEDIA BRITANICA.

AMERICAN PEOPLE' ENCYCLOPEDIA

زبدۃ المقادیر	لابی اسمٰعیل یوسف حسین الخانپوری

اسرار النجوم

جمہرۃ الخطب اور

بہت سی قدیم تقویمیں اور کتب فلکیات۔

معجزانہ قوّتِ انقلاب کا داعی

خلیق دہلوی

آج سے ہزاروں برس پہلے کی ایک جگ بیتی داستان ہے کہ دنیا استبداد و استعباد کے عذاب الیم میں گرفتار تھی وحشت، وجہالت کا دور دورہ تھا، اور قوت وبہیمیت کا سکہ رائج، عدالت مجروح تھی اور انسانیت زخمی، غلامی کی زنجیروں نے اس کا بند بند جکڑ رکھا تھا۔

فرمانروایانِ ملک، امرائے شہر، روسائے قبائل، اپنے اپنے حلقہ میں، اپنی اپنی استبدادی وسعت فرمانروائی میں ارباباً من دون اللہ بنے بیٹھے تھے، اور ان کے مستعبد ہاتھوں میں ان کے اطاعت گزار، اور بیرو بالکل معدوم الارادۃ، اور مفقود الحس آلاتِ عمل تھے، طاعت نابردتھی، اور ایمان وضمیر کا فقدانِ کلی، ان کی زندگی کا موضوع واحد اپنی متکبرانہ خوش خیالوں کی تعمیل اور اپنی قدرت جابرہ کی تکمیل تھا، ہوس تھی تو ہوائے نفس واتباع مرضیات کی صداقتوں کی حقیقت، اور امور د واقعات کی صداقت کا فیصلہ سلاطین و امراء کے چشم و ابرو کا اک اشارہ یا ملوک و رؤساء کے کام و دہن کی ایک جنبش تھی، !

مسیح سے ۱۸۰۰ برس پہلے ذات شاہی ہر تقدیس سے متصف اور ہر احترام فوق العادت سے متدس ہر نقص وعیب سے مبرا تھی، کیونکہ وہ خدا تھی، خدا کا سایہ تھی، یا کم از کم اس کا ہیولا، رتبہ انسانیت سے ایک بالاتر شئے سمجھا جاتا تھا۔

فراعنہ مصر دیوتا تھے، جب ہی تو مصر کے اک فرعون نے مسیح علیہ السلام سے ۱۸۰۰ برس پہلے اپنے درباریوں سے کہا تھا۔ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى، موسیٰ کا خدا کون ہے ؟ تمہارا بڑا خدا تو میں ہوں، کلدانیوں کے ملک میں نمرود بابل کی پرستش کے لئے اس کے اسٹیچو بنتے تھے، ہندوستان کے راجہ دیوتاؤں کے اوتار بن کر زمین پر اترتے تھے، روما کا پوپ، خدا کے مقدس فرزند کا جانشین تھا جس کا در آستانہ قدس سجدہ گاہ ملوک وسلاطین تھا؛

روم کے قیصر اور فارس کے کسریٰ گو دیوتا نہ تھے۔ مگر فطرۃ البشریہ سے منزہ اور مرتبہ انسانیہ سے بلند تر ہستی ضرور خیال کئے جاتے تھے، جن کے سامنے بیٹھنا ممنوع تھا، جن کے روبرو ابتدائے کلام اور سبقتِ سخن گناہ اور نام لینا سوء ادبی میں شامل تھا، جن کی شان میں ادنیٰ سا اعتراض موجبِ قتل تھا، !

دنیا اسی تعبد وغلامی اور ذلت وتحقیر میں مبتلا تھی کہ سواحل بحرِ احمر کی ریگستانی سرزمین پر اک عربی عدالت کا، اک عربی بادشاہ ہدایت کا ظہور ہوا، جس نے اپنی منفردانہ قوتِ روحانی سے جس نے اپنی معجزانہ زور وتوانائی سے قیصر وکسریٰ کے تختِ استبداد و استعباد الٹ دیئے، جس کے اعلائے کلمۃ الحق سے بابائے رومۃ الکبریٰ کے دیوانِ قدس کی بنیادیں ہل گئیں ؛

حقارت و غلامی کی زنجیریں اس کی تیغ غیر آہنی کی ادنیٰ ادنیٰ ضرب سے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر پڑیں، نیاز عبدیت استقلال ذات، قدر حریت، شرف انسانیت، احترام نفس، مساوات، اور ابطال شاہنشی کی روشنی دنیائے قدیم کے قلب سے نکل کر ربع عالم میں پھیل گئی۔ شاہان دنیا مرتبۂ قدوسیت و معصومیت سے گر کر عام سطح انسانی پر آ گئے۔ اور عام انسان سطحِ غلامی و حیوانیت سے بلند ہو کر مصر و بابل کے دیوتاؤں اور روم و ایران کے قیصر و کسریٰ کے پہلو بہ پہلو کھڑے ہو گئے۔

یہ معجزانہ قوت انقلاب جس نے حالتوں میں تغیر پیدا کر دیا کیا تھی؟ یہ جمال روحانی سے بھری جھلک کیا تھی، جس سے دنیا میں روشنی ہی روشنی پھیل گئی؟ یہ باعظمت و ہیبت آواز کیا تھی جو بوقبیس کی چوٹیوں سے بلند ہو کر گنبد عالم کے گوشے گوشے میں پہنچ گئی؟ یہ تکمیل استبداد نہ تھا، یہ کوئی قوت جبر نہ تھی، بلکہ قرین فراست ایک بات تھی، جو دل میں اتر گئی؟ اور یہ وہ سادہ دعوت تھی جو سب کے لئے قابل قبول تھی، کہ

یاھل الکتٰب تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا وبینکم الا نعبد الا اللہ ولا نشرک بہ شیئاً ولا یتخذ بعضنا بعضاً ارباباً من دون اللہ (قرآن مجید)

وہ آؤ ایک بات جو اصولاً و عقلاً ہم میں، تم میں متفق علیہ ہے، اسکو عملاً بھی تسلیم کر لیں، یعنی خدا کی پرستش کے سوا کسی کو نہ پوجیں نہ اس کی خدائی میں کسی کو شریک ٹھہرائیں اور نہ ہم خدا کے سوا ایک دوسرے کو اپنا خدا اور آقا بنائیں۔

کفر کی یورش تھی، اور توحید نرغہ میں تھی، عصمت مایوس تھی، اور دنیا، اور دنیا کی خوشی، دنیا کی حقیقت مرجھا گئی تھی، جمال صداقت پژمردہ ہو گیا تھا، اس کا روئے ہدایت زخمی ہو گیا تھا، وہ پیمان روحی، مواثیق قلب، جو اولاد آدم نے برگزیدہ ہادیوں اور مقدس رسولوں سے ان کے پاک پیغاموں کو سن کر باندھے تھے، جو سعادت کے رشتے ضمیر و ایقان کے تاروں سے کبھی نہ ٹوٹنے کے لئے، کبھی نہ توڑنے کے قابل باندھے تھے، ٹوٹ گئے تھے، خدا کی رحمت و رافت زمین کے بسنے والوں سے روٹھ گئی تھی، اس کا جمال ازلی و ابدی جس سے بارہا پردے اٹھا دیئے گئے تھے، پھر محجوب ہو گیا تھا پھر مستور ہو گیا تھا۔ اس میں اور اس کے بندوں میں کوئی رشتہ باقی نہ رہا تھا، کوئی ربط نہ رہا تھا ....

ہاں کوئی نہ تھا جو اس کو ڈھونڈے، کوئی قدم نہ تھا جو اس کی سمت مضطربانہ بڑھے، کوئی آنکھ نہ تھی جو اس کے محض اس کے لئے اشکبار ہو، کوئی دل نہ تھا جو اس کے لئے بیقرار، کوئی روح نہ تھی جو اس کو پیار کرے، اس کی دنیا اس سے بے خبر تھی، دنیا، دنیا والے کو بھول گئی تھی، اس کے بندے اس سے غافل تھے، انسانی ضمیر مر چکا تھا، فطرت کا حسن حقیقی عصیان عالم کی تاریکی میں چھپ گیا تھا، تمرد و سرکشی کے سیلاب بہہ رہے تھے۔ جو خشک و تری میں امنڈ آئے تھے اور جن کے اندر خدا کے رسولوں کی بنائی ہوئی عمارتیں بہہ رہی تھیں۔

جب کہ یہ حالت تھی تو دنیا بگڑ کر پھر سنوری، انسانیت مر کر پھر زندہ ہوئی۔ خدا نے پھر چہرے کو بے حجاب کر دیا خدا پھر دنیا میں آیا، ہاں وہی جو شام کے مرغزاروں اور یروشلم کے ہیکل کے ستونوں سے روٹھ گیا تھا۔ اب پھر آیا، تاکہ دشت حجاز کے ریگستانوں کو پیار کرے، اور اپنے راز و نیاز محبت کے لئے، اپنی عشوہ نواز محبت کے لئے ایک نئی قوم کو چن لے

دنیا کن سے بعد کے اضطراب تجسس کو، اپنے پہلے ہیجان سعی کو جو پہلا ورثہ تھا اور جسے کام میں لاتی رہی ہے پھر کام میں لائی؛ صدیوں سے جس کو بھلا چکی تھی پھر اس کی تلاش پر اتر آئی۔

تلاش کے لیے ایک ہی چیز ہے، دنیا نے جس کی ہمیشہ تلاش کی ایک ہی چیز تھی،

اب سے ہزاروں برس پہلے اسی زمین پر خدا کے جس مخلص بندہ نے درد و اضطراب کے لہجہ میں رَبِّ اِنِّیْ دَعَوْتُ قَوْمِیْ لَیْلاً وَّنَهَارًا کہا تھا وہ وہی کامیاب تلاش تھی۔ جس نے غافلوں کی شکایت کی، خود پا گیا تھا، دوسروں کو سمجھا، سمجھا جب تھکا تو جو شکایت کی وہ تلاش کا پتہ تھی۔ کالڈیا کے بت خانے میں اصنام پرستوں کے مسترمیں جس برگزیدہ نوجوان نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض مقدس ادا کیا، اور چھری ہاتھ میں لے کر محبت الٰہی کی سرشاری میں اپنے فرزند کو زمین پر دے مارا ایک ذات کے حصول کے لیے علائق سے قطع تعلق تلاش تھی، تلاش کے مقصود پر قربانی تھی۔

تخت گاہ فراعنہ کے ایک قید خانے میں کنعان کے قیدی نے جس شے کا وعظ کہا تھا۔ وہ وہی چیز تھی، جس کا وہ سراغ دے رہا تھا۔

وہ بقعۂ مبارک کا مقدس چرواہا جو کوہ سینا کے کنارے اِنِّیْ اَنَا اللّٰہُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ کی ندا سے مخاطب ہوا وہ تلاش کا نمایاں وجود تھا، جبکہ ایک ظالم و جابر حکومت کی غلامی سے نجات دلانے کے لیے اس یکہ و تنہا نے فرمانروائے عہد کے سامنے بے خوف کہا کہ رَبِّیْ اَعْلَمُ بِمَنْ جَآءَ بِالْهُدٰى تو وہ بھی اسی صداقت آمیز تلاش کا اعلان حقیقت تھا؛

ناصرہ کا وہ اسرائیلی نوجوان جو پچھلی بشارتوں کے مطابق آیا تھا تاکہ عہد اسرائیلی کے خاتمے اور دور اسماعیلی کے آغاز کا اعلان کرے۔ اس نے بھی اسی تلاش کی محویت کا اظہار کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی حیات ہدایت و سعادت کی تاریخ یکسر تلاش و جستجو میں ہے، اس نے اپنے ہر دور میں جو پایا تھا کھو دیا ہے، پھر ہر دور میں جو کھو یا تھا پا لیا ہے۔ وہ جب کبھی گری ہے تو اسی کو کھو کر، اور پھر جب کبھی اٹھی تو اسی کو پا کر، اس کے ہادیوں نے جب کبھی اس کو جگایا ہے تو اسی کے لیے جگایا، اور جب کبھی ہاتھ پکڑا تو اسی کی تلاش میں نکلنے کے لیے اس نے جب مضطرب ہو کر پکارا، اس نے جب بے چین ہو کر یاد کیا، اثر ہوا، اور خبر لی گئی ہے۔ لیکن یہ انقلاب عظیم ہیئت انسانیہ میں جب کبھی ہوا، جس نے یکسر دنیا کو بدل ڈالا کس چیز کا نتیجہ تھا؟ یقیناً وہ ایک صدائے الٰہی کا دلولہ شنید تھا، ایک جمال پاک کا شوق نظارہ تھا، کچھ شک نہیں کہ وہ جمال ربانی کی اک بے نقاب تجسس تجلی تھی، مگر اس جلوہ ریزی کا آفتاب کن کی پیشانیوں پر چمکا؟ کن کے خانہ دل اس سے روشن ہوئے؟ وہ وہی تھے جو ذوق طلب رکھتے تھے۔ جو مذاق درد رکھتے تھے اصلاح عالم کی یہ آخری کوشش و تلاش مقبول ہوئی، محبت کے راز و نیاز نے ایک جماعت کو چن لیا۔

اس لیے عشق کو ضرورت ہے اک دل کی کہ وہ جمال و تاثرات کا مسکن بنے، اور عشق حقیقت کی وہ مقدس آگ جس کے لیے نوحؑ نے لکڑیاں چنیں، جس کو ابراہیمؑ نے اپنی قربانی سے بھڑکایا۔ جس کی چنگاریاں وادی ایمن میں چمکیں، جس کے شعلہ خرد افروز پر خون مسیح معصوم نے تیل چھڑکا اور اب بو قبیس کے غاروں میں سِرَاجًا مُّنِيرًا بن کر بھڑکے۔

ہاں وہ خدا جو قید مکان و زمان سے آزاد و منزہ ہے، جب دنیا میں آیا ہے، جب دنیا میں آتا ہے، تو اپنے رہنے کے لیے اپنے بسنے کیلئے اک گھر چاہتا ہے؛ زمین کی پرشان و شوکت آبادیاں، پہاڑوں کی سربلند چوٹیاں، سمندروں کی فراخ موجیں، صحراؤں کے وسیع و پرفضا میدان، یہ سب اس کے لئے بیکار ہیں۔ شہنشاہوں کے تخت ہیبت و جلال، اور لعل و جواہر سے لبریز خزانے، بڑے بڑے گنبدوں اور ستونوں کے عظیم الہیئتہ ایوان و محل، اس کا گھر نہیں بن سکتے تم اس کے لئے ایک مختصر سا گھر بنالو جو اس کے جمال قدس کا نشیمن اور اس کے حسن ازلی کا کاشانہ بن سکے

تم جو اس کی جستجو میں نکلنا چاہتے ہو، پہلے اپنی جستجو میں نکل کھڑے ہو، تم کہ اس کے نہ ملنے کی شکایت کرتے ہو، پہلے اپنی گم گشتگی پر ماتم کرو، اس کے حریم محبت کا دروازہ ہمیشہ سے ہمیشہ کے لئے کھلا ہوا ہے۔ اس کے کاشانہ وصل کے باب محبت نواز پر کوئی پاسبان نہیں، وہ تو ہر لحظہ وہر آن اپنے متلاشیوں کا منتظر ہے، خرابی ساری اس کی ہے محرومی ساری یہ ہے کہ ہمارے پاس کوئی مکان نہیں جو اس کے قدوم محبت کا مسکن بن سکے؛

اس کے بسنے کے لئے چاندی اور سونے کی محل سرائے اور کوئی زریں کوشک درکار نہیں صندل و آبنوس کے تخت مطلوب نہیں، جس میں لعل و الماس جڑے ہوں۔ وہ تو ان معموم دلوں کا طالب ہے جن میں اس کے درد و محبت کے زخموں سے خون کے قطرے ٹپک رہے ہوں، اس کو تو فقیروں اور خاک نشینوں کے وہ جسم چاہئیں۔ جن کے پہلو میں ٹوٹے پھوٹے دل ہوں، جن میں جلے ہوئے جگر ہوں؛ جن کی آنکھیں خونبار ہوں؛ یہی ٹوٹے پھوٹے کھنڈر چاہئیں جو اس کے لئے محل بن سکتے ہیں؛ یہی اجڑی ہوئی ویران بستیاں ہوں جو اس کو اپنے میں بسا سکیں؛

وہ کہ آبادی کی رونق، فضا کے روپ صحراؤں کی شگفتگی، اور پہاڑوں کی دلفریبی اور ملکوت السموات کی بوقلمونی کی طرف متوجہ نہ ہوا۔ اور دلوں کی شکستہ حالی میں آسودہ ہو گیا؛ کیسی آسانی سے مل سکتا ہے؛

کیا تھا عرب کی ساری آبادی میں ایسے دل پیدا ہو گئے تھے جن میں اس نے اپنا گھر بنالیا اور ان میں ایک تلاشِ مجسم؛ اک فروغ انسانیہ کبریٰ؛ اک مجسمۂ نعمت عظمیٰ کا ظہور ہوا صلی اللہ علیہ وسلم

تلاش روحانیت کی یہ آخری تکمیل تھی؛ جس سے اصلاح عالم کا نظام حیات سعادت بالکل مکمل ہو گیا اور حقیقت آگہی کے لئے صاف صاف کہدیا گیا۔ اب جلب منفعت کی شکل اسی میں ہے کہ سود اعمال کی تلاش کی جائے اور وہ اس طرح ممکن ہے۔ اب سے جو انسان احکام اسلامی کی جگہ کسی دوسری تعلیم کو تلاش کریگا تو یقین کرو کہ اس کی تلاش کبھی کامیاب نہ ہوگی اور اس کے تمام کاموں کا انجام نامرادی ہی ہوگا۔

ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ وھو فی الاخرۃ من الخسرین ہ

اب ہم اس انقلاب روحانی پر ارتقائی حیثیت سے اک نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کے اندر تبدیلی پیدا کرنا کچھ آسان نہیں؛ تم کسی مکان کی ایک دیوار بناتے ہو یا گھر کے اندر کوئی تبدیلی کرنا چاہتے ہو، تو اس کے لئے کیا کیا سامان کرنے پڑتے ہیں۔ پھر وہ لوگ جو سطح ارضی کے بڑے بڑے رقبوں اور انسانوں کی عظیم الشان آبادیوں کو نہیں ان کے اعمال و

معتقدات کو بدلنا چاہتے ہیں، سوچنا چاہیئے کہ ان کے مقصد کس درجہ مشکل اور عظیم ہیں:

دنیا میں مادی انقلابات، سلطنتوں کے تغیرات، اور خونریز جنگوں کے ظہور ہوتے ہیں لیکن اک نظر خاص ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ہر چھوٹا سا انقلاب بھی کیا کچھ قدر وقیمت رکھتا ہے۔

مدتیں فکر و تدابیر میں صرف ہو جاتی ہیں، معمور خزانے خالی کر دیئے جاتے ہیں۔ کروڑوں روپے قرض لئے جاتے ہیں، پھر کہ فوجوں کے سیلاب طوفان میں آتے ہیں، قیمتی سے قیمتی آلات و اسلحہ کروڑوں کی تعداد میں تقسیم کئے جاتے ہیں۔ لاانتہا انسانوں کی قربانیاں خونیں میدانوں میں تڑپتی ہیں، خون کی ندیاں بہتی ہیں۔ عورتیں بیوہ، بچے یتیم۔ والدین زندہ درگور ہو رہتے ہیں، یہ اور کیا سب کچھ ہو کر جب کہیں ایک مختصر سا ملکی انقلاب حد تکمیل کو پہنچتا ہے، پھر وہ بھی یقینی نہیں۔ بلکہ ہزار ہا کوششیں رائیگاں اور صدیوں کی امیدیں پامال ہو جاتی ہیں؛ جب دنیا کے ان مادی انقلابات کی یہ صورت ہے جو انسانوں کی حکومت و سیاست اور انسانی نسلوں کی آبادیوں کو، متغیر کرنا مقصود کہتے ہیں تو ذرا سوچو جو زمین کی سطح اور انسانی جسموں کو نہیں بلکہ روحوں اور دلوں کی اقلیموں کی کایا پلٹ چاہتے ہیں اور کروڑوں انسانوں کے اعمال و خصائل کے اندر تبدیلی کے جویاں ہوتے ہیں۔ ان کا مقصد وحید، ان ایسے انقلابات کے لئے کیا محض انسانی قوت تدبیر، محض اخلاقی کوشش، صرف مذہب کے چند رسمی اصول پکار دینا ہی کافی ہو سکتا ہے۔

تم اک مرتبہ خود اپنے نفس کو ذرا آزماؤ جس پر تمہارے ارادے پوری قوت رکھتے ہیں کیا گوارا ہے کہ ایک چھوٹی سے چھوٹی تبدیلی بھی اپنے نفس و اعمال کے خلاف اپنے اندر پیدا کر۔ پھر جب کہ تم اک نفس کی تبدیلی یا اس میں کسی نوع کا بھی فرق کرنا جو خود تمہارے اختیار میں ہے۔ اس پر قادر نہیں، تو ان کروڑوں دلوں کو کیونکر بدل دو گے جن پر تمہاری طرح نہیں بلکہ صدیوں سے پرورش یافتہ، محکم اعتقادات و اعمال کی حکومت قاہرہ اور توہم کا تسلط جابرہ قائم ہے؟

اصل یہ ہے کہ انسان جسموں کو پارہ پارہ کر سکتا ہے۔ مگر دلوں پر ذرہ برابر بھی قدرت نہیں رکھتا۔ زمین کی جغرافیائی شکل تبدیل کر دینا آسان ہے۔ مگر قلب و روح کے کسی ایک گوشے میں بھی تغیر ممکن نہیں؛ میں تعلیم دے سکتا ہوں؛ میں ہدایت و تلقین کر سکتا ہوں مگر نہ تو کامیابی کی امید میرے پاس ہے اور نہ فتح مندی پر میرا قبضہ۔ یہ صرف اسی قدیر و حکیم کے دست قدرت میں ہے۔ جو مقلب القلوب، اور مسبب الاسباب ہے، ہاں یہ صرف اسی کا کام تھا۔ کہ ایک یتیم و معصوم، ایک سادہ و امّی، ایک امّی و محض عربی نژاد کو صدیوں کے جہل و سرکشی، طغیان و تمرد پر فتحمندی عطا فرمائی؛ اور سرگشتہ معصیان عالم کو راہ ہدایت دکھائی؛ کیا یہ لوالعجبی نہیں کہ اس قدر سادے بشر کے نام لیواؤں کی تعداد آج دنیا کی آبادی کا پانچواں حصہ ہے؟ اللھم زد فزد،

اللّٰھم صلی علی محمد و بارک وسلم

وما ارسلنٰک الا رحمۃ للعالمین

چیف جسٹس شیخ آفتاب حسین

یہ مہینہ محسن انسانیت کی ولادت کا مہینہ ہے۔ یہ جلسے اور جلوس اس مبارک موقع پر ایک خاص مقصد کے لئے منعقد کئے جاتے ہیں۔ اس مقصد کو پاکستان میں اسلامی نظام کی ترویج کی ایک کڑی کی حیثیت سے دیکھتا ہوں۔

اسلامی نظام کے دو پہلو ہیں جن میں سے کسی ایک کو بھی نظر انداز کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی کسی ایک پہلو کی اہمیت کو کم کیا جا سکتا ہے۔ دونوں ہی پہلوؤں کا اجتماعیت سے واسطہ ہے۔ ان دونوں پہلوؤں میں ایک ملتِ اسلامیہ کے ہر ہر فرد کی اصلاح ہے کہ وہ ہر لحاظ سے ایک صادق الایمان ہی نہیں بلکہ صادق العقل اور صادق العمل مسلمان ہو جائے۔ جس ملت کے افراد میں یہ صفت پیدا ہو جائے وہ ملت اسلامیہ کی ہر ہر صفت سے بہرہ ور ہو جاتی ہے۔ دوسرے پہلو کا تعلق قوانین ملکی سے ہے کہ ایک ایسی سوسائٹی میں جس میں اسلامی معاشرہ کی تدوین اصلاح اعضائے ملت کی بنا پر ہو چکی ہو۔ اس میں ایسے قوانین رائج کئے جائیں جو اس معاشرہ کو راہ راست پر رکھنے میں ممد و معاون ہوں۔ حدود و تعزیرات اس لئے ہوں کہ ایک نیک معاشرے میں اگر کسی شخص سے وہ جرائم سرزد ہوں جس سے معاشرے میں خرابی کا امکان ہو تو وہ کیفر کردار کو پہنچ جائے تاکہ اچھے لوگ اطمینان کا سانس لیں اور کمزور طبیعت لوگوں کو جن کا اشتعال و ترغیب کی زد میں ہو جانے کا امکان ہو عبرت حاصل ہو۔ اس طرح سوسائٹی میں اعتدال اور توازن پیدا ہو جاتا ہے اس کے لئے کسی طویل تقریر یا تبصرے کی ضرورت نہیں ہے آنحضرتؐ کا اسوہ اس کی بہترین مثال ہے آنحضرتؐ کا مشن اگر ایک طرف تبلیغ اسلام تھا تو دوسری طرف ایک ایسی ملت کی تخلیق اور اس کا فروغ تھا جس کا ہر فرد یا کم از کم افراد کی اکثریت نیک اور پاک و صاف زندگی بسر کر سکتی ہو ظاہر ہے جو شخص کسی ملت یا قوم یا گروہ کی اصلاح کرنا چاہتا ہو تو اس کو اس گروہ ملت یا قوم کے سامنے اپنے آپ کو نیکی کے نمونہ کی حیثیت سے پیش کرنا چاہئیے چنانچہ آنحضرتؐ کی زندگی ہر نقص سے پاک و صاف تھی جس کے نمونہ اور اسوۂ پر دوسرے عمل کر سکیں۔ اقراء کی وحی آنے سے قبل حضور اکرم نے اگرچہ یہ بات محسوس نہ ہونے دی کہ آپ دنیا کی اصلاح کے لئے نبی مبعوث ہوئے ہیں لیکن پھر بھی چالیس سالہ زندگی میں نہ صرف یہ کہ آپ نے بتوں کی پرستش کبھی نہ کی بلکہ ہمیشہ جاہلانہ لہو و لعب اور ہر قسم کی برائی سے علیحدگی اختیار کی خود کو قوم کے سامنے بحیثیت صادق و امین پیش کیا کہ آپ کا بڑے سے بڑا دشمن بھی آپ پر جھوٹ بولنے کا الزام نہیں لگا سکتا تھا۔ حضرت خدیجہ کی طرف سے تجارت پر مامور ہوئے تو تجارت میں دیانت و امانت کا سکہ بٹھا دیا۔ آنحضرتؐ کی اس زمانہ کے ماحول میں ان منفرد خوبیوں نے ہی حضرت خدیجۃ الکبریٰ کو نکاح کا پیغام دینے پر مجبور کیا۔ انہی خصائص کا یہ نتیجہ تھا کہ اولاً جو لوگ آپ پر ایمان لائے وہ آپ کے دوست اور عزیز تھے۔ یعنی حضرت خدیجہ آپ کی زوجہ محترمہ حضرت علی آپ کے چچا زاد حضرت ابوبکر آپ کے رفیق جان نثار واقعہ معراج کی تصدیق حضرت ابوبکر نے محض اپنی صفت ایمانی کی وجہ سے نہیں کی کیونکہ اس قسم کی تصدیق تو ہر مسلمان کا فرض تھا جو قرآن پر ایمان رکھتا ہو بلکہ اس کا بھی خاص محرک ان کا آپ کے اکمل البشر ہونے کا علم تھا۔ اسی تصدیق نے ان کو صدیق اکبر بنا دیا اس پر مستزاد یہ کہ قرآن کریم نے آپ کی ان خوبیوں اور خصائص کی گواہی دے کر ان کی تاریخی اہمیت کو دائم

قائم بنا دیا۔ چنانچہ کفار کو بار ہا جتایا گیا ہے کہ کیا تم ہمیشہ سے نبی سے واقف نہیں ہو۔ کیا تمہارا یہ علم ایمان لانے کے لئے کافی نہیں ہے چنانچہ ارشاد ہے۔ فقد لبثت فیکم عمراً من قبلہ افلا تعقلون (۱۶:۱۰) کیونکہ اس سے پہلے میں تم میں کافی عمر رہ چکا ہوں کیا پھر تم نہیں سوچتے) اور وہ واقعہ تو بہت ہی مشہور ہے کہ جب آنحضرتؐ نے کفار مکہ سے دریافت کیا کہ اگر میں تم سے کہوں کہ پہاڑ کے اس جانب دشمنوں کا ایک لشکر تم پر حملہ کرنے کے لئے تیار ہے تو کیا تم میری بات کا اعتبار کر دگے اور جواب میں کفار نے کہا۔ کیوں نہیں کیونکہ ہم نے تم کو ہمیشہ صادق پایا۔

بعثت کے بعد کے واقعات خصوصاً وہ واقعات جو مکی دور سے متعلق ہیں اس بات کے شاہد ہیں کہ نبوت نے پیروانِ محمدؐ میں وہ تاثیر پیدا کی کہ ہر شخص نہ صرف شرک سے محترز ہوا بلکہ دیانت سخاوت عالی ہمتی صدق و صفا غرضیکہ ہر اچھائی کا مرقع بن گیا۔

مدینہ منورہ میں قیام حکومت کے بعد بھی باوجود غزوات اور انتظامی مسائل میں انہماک کے رسول کا یہ مشن تابع فرمانِ الٰہی جاری رہا۔ کیونکہ مسلمان کی تعریف قرآن حکیم میں ان الفاظ میں کی گئی ہے۔ تأمرون بالمعروف وتنھون عن المنکر (تم لوگوں کو) اچھائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے منع کرتے ہو)

رسول اللہ کی زندگی کے ان واقعات سے یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں کہ نظام اسلام کے اجراء یا اس کے احیاء کے لئے معاشرے کو مکمل طور پر پاک صاف کرنا بے حد ضروری ہے خصوصیت کے ساتھ جبکہ کلام پاک کا مذکورہ حکم بھی موجود ہو۔ قوانین کا اجراء قرآن کریم کے ذریعہ بعثتِ رسالت سے کافی عرصے کے بعد عمل میں آیا ماسوا حکم زکوٰۃ کے۔ اس سلسلہ میں یہ توضیح ضروری ہے کہ زکوٰۃ کا حکم اس کلیہ سے اس وجہ سے مستثنیٰ ہے کہ مال کا جمع کرنا ہر ایسی سوسائٹی کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ جس کا مقصد غریب لوگوں کی بھلائی ہو۔ بالخصوص ان غرباء کی جو قبول اسلام کی وجہ سے اور کفار کے رحم و کرم پر ہونے کے سبب اپنی روزی سے بھی محروم ہو چکے ہوں یا ایسے غلاموں کو خرید کر کے آزاد کرنے کے لئے جو ایمان لانے کے جرم کی وجہ سے مشرکین کے تختہ مشق بنے ہوں اور جن پر ظلم کر کے اور جن کو اذیتیں دے کر مشرکین اپنی اسلام دشمنی کے پیدا کردہ تجرو انا کی تسکین کا سامان کرتے ہوں۔ اس لئے اکثر غلاموں کو خرید کر ان کو آزادی دینا ضروری ہوا لیکن یہ بات قابلِ غور ہے کہ ابتدائی سوسائٹی میں زکوٰۃ یا صدقہ کی کوئی شرعی حد مقرر نہ کی گئی جس کی ضرورت اس وقت محسوس ہوئی کہ جب ملتِ اسلامیہ ایسی نہج پر پہنچ چکی تھی کہ یہ بات غیر ضروری ہو گئی کہ کوئی شخص اپنا سارا مال و متاع یا اس کا بیشتر حصہ ملت کی بقاء کی خاطر متاع جنگ کے حصول کے لئے پیش کرنا ضروری سمجھے۔

جہاں تک حدود و تعزیر کا تعلق ہے اس کی ضرورت کسی حکومت کی تنظیم کے وقت سے ہی محسوس ہونا چاہیئے بلکہ حکومت کی تنظیم کا انحصار ہی عام طور پر جبریہ قوانین کے نفاذ اور سزا پر ہوتا ہے لیکن ملت اسلامیہ کا معاملہ دوسری ملتوں سے اس لئے مختلف تھا کہ یہاں تبلیغ اور ترغیب کو زبردستی اور جبر پر فوقیت ہے چونکہ جبر مجبور کو باغی بنا سکتا ہے لیکن ترغیب سے اصلاح کا عمل تقویت ایمان کا باعث ہوتا ہے اور اثر میں دیرپا ہوتا ہے۔ سوسائٹی کے پاکباز ہونے کے بعد حدود اور تعزیر کی ضرورت بعد میں اس لئے محسوس کی گئی کہ اس معاشرہ میں بھی اگر کوئی شخص شیطان کے بہکانے سے کسی جرم کا مرتکب ہو تو اس کو ایسی سزا دی جائے کہ اچھے لوگ اچھائی

کی صفت پر نازاں و فرحاں ہوں اور جو لوگ کمزور ایمان ہوں ان کو تنبیہ اور عبرت ہو۔

اگر غور کیا جائے تو یہ بات بالکل واضح ہو جائے گی کہ قوانین حدود و تعزیر کا حصہ ملت اسلامیہ کو معتدل اور متوازن رکھنے میں بہت کم ہے۔ مسلمان معاشرہ کو اسلامی صفات سے بہرہ ور کرنے کا سہرا زیادہ تر ترغیب اور تبلیغ کے سر ہے لیکن یہ بات فراموش نہیں ہونی چاہیئے کہ کوئی تبلیغ اس وقت تک موثر نہیں ہو سکتی جب تک مبلغ کی گفتار اور عمل میں یکسانیت نہ ہو۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ اسلام کی ترویج باعمل مسلمانوں کے عمل کو دیکھ کر ہوئی اس سے یہ نتیجہ بھی لازماً اخذ کرنا پڑتا ہے جو یقیناً صحیح ہے کہ جب سے مسلمانوں کا انفرادی اور اجتماعی کردار اسلامی اصولوں کے برعکس ہو گیا۔ ترویج مذہب میں لاینحل مشکلات پیدا ہو گئیں۔ دوسری قومیں اسلام کو مسلمانوں کے اعمال سے بھی جانچتی ہیں۔ اگر مسلمان کا عمل "برعکس نہند نام زنگی کافور" کے مصداق ہو تو کیا اس سے کوئی غیر مسلم متاثر ہو سکتا ہے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر عمل اسلام میں ہر دور کے لئے فرض کیا گیا۔ اس پر عمل جہاں ہر مسلمان کا انفرادی فریضہ ہے وہ ایک اسلامی مملکت میں مملکت کا اجتماعی فریضہ بھی ہے لیکن ادائیگی فرض کے طریق کار میں بہت بین فرق موجود ہے۔ انفرادی حیثیت سے یہ فرض صرف تبلیغ اور ترغیب کے ذریعے ادا کیا جا سکتا ہے کیونکہ کسی فرد کو جبر کرنے کے لئے قانون کو ہاتھ میں لینے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ تبلیغ کے ذریعہ رغبت دلانے والوں کو یہ نفسیاتی پہلو نظر انداز نہ کرنا چاہیئے کہ جو بات بلا طعن و طنز نجبت و رافت سے سمجھائی جائے انسانی طبیعت اس کو جلد قبول کرتی ہے لیکن سختی ہی نہیں بلکہ طعن و تشنیع کی ملاوٹ بھی سامع میں تبلیغ کے خلاف ضد کا مادہ پیدا کرتی ہے جو تبلیغ کی نفی کے لئے کافی ہے اسی لئے مبلغ کے لئے شیریں دہنی ایک لازمی صفت ہے اس کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ دوسروں کے طنز و مزاح کو ٹھنڈے دل سے برداشت کر سکے۔ ارشاد ہے "ولو کنت فظا غلیظ القلب لانفضوا من حولك (اگر آپ تند خو اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ آپ کے پاس سے منتشر ہو جاتے۔"

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے حصول کے لئے جبر صرف حکومت وقت ہی کے لئے ممکن ہے ورنہ قوم میں فتنہ پیدا ہونے کا اندیشہ ہے جبر کا احسن طریقہ جرمیہ اور عقود و حدود و تعزیرات کی تنفیذ ہے جس کی بنیاد عدل و احسان ہو لیکن معاشرہ کی اصلاح محض قوانین کے نفاذ سے ممکن نہیں اس سلسلہ میں ترغیب اور تبلیغ کا ایک جامع منصوبہ ضروری ہے

یہ صحیح ہے کہ حضورؐ نے پہلے اصلاح معاشرہ کی طرف توجہ دی لیکن یہ سیاق و سباق ہر مرتبہ اسلامی نظام کے اجراء میں قائم نہیں رکھا جا سکتا بالخصوص مسلمانوں کی اپنی مملکت میں اس لئے اصلاح معاشرہ کو ملت اسلامیہ بن جانے کے بعد نہ تنفیذ حدود و تعزیر پر مقدم کیا جا سکتا ہے اور نہ موخر۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اصلاحِ معاشرہ اور تنفیذ حدود و تعزیر پر ایک ساتھ عمل کیا جائے۔

ان اصولوں کی روشنی میں پاکستان میں اجرائے نظام شرعی کا جائزہ لینا ضروری ہے پاکستانی معاشرے کی اصلاح کی اشد ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اکثر و بیشتر پاکستانی مسلمان اپنے اخلاقی زوال اور اپنے درمیان غیر اسلامی اقدار کے

فروغ کا خود ذمہ دار ہے لیکن اس میں کچھ حصہ انگریز کے نافذ کردہ قانون کا بھی ہے۔ مثال کے طور پر انگریزی قانون میں دو بالغ مرد اور عورت میں زناکاری جرم نہیں اس وجہ سے اگر اس گناہ کو مسلمانوں میں فروغ حاصل ہوا ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں اور حقائق اس بات کے شاہد ہیں کہ فروری ۱۹۷۹ء میں جبکہ یہ گناہ جرم قرار دیا گیا۔ اس کے مرتکبین کی تعداد بہت کافی تھی۔ اسی طرح رشوت کا جرم منافع خوری، ذخیرہ اندوزی سمگلنگ جنگ عظیم دوئم کی پیداوار ہے۔ مسلمانوں میں یہ سب جرائم نیز غنڈہ گردی، قتل و غارت، بے جا طریقوں سے دولت کے حصول اور کسب حلال سے بے نیازی جس میں دھوکہ دہی اور کم تولنا بھی شامل ہے اس حد تک بڑھ چکے ہیں کہ دیکھ کر انسان ششدر رہ جاتا ہے کہ پاکستانی معاشرے میں سے ان برائیوں کا سدباب کس طرح ہو۔

سب سے قابلِ افسوس بات اس ضمن میں یہ ہے کہ عوام نے بڑے کام کو بُرا سمجھنا بھی ترک کر دیا ہے۔ اعمالِ حکام کی نکتہ چینی کے سلسلہ میں ایک مقولہ ہے کہ "افضل الجہاد ان تنظر منکراً منکراً" (افضل جہاد کسی بری چیز کو برا جاننا ہے) لیکن کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس مقولہ کی عمومیت کو کس طرح قطع کیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی معاشرے کی بنیادی اچھائی اس بات پر ہی منحصر ہوتی ہے کہ کم از کم اس میں اچھے لوگ برائی کو برائی سمجھیں اور اس سے نفرت کریں اور اپنے کردار سے برائی کرنے والے پر اس برائی کی خرابی کو واضح کرتے ہیں لیکن پاکستان میں معاشرے کی خرابی کا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ اگر کسی شخص کی عزت کی جاتی ہے تو اس کی ثروت کی وجہ سے بغیر اس بات پر غور کئے ہوئے کہ یہ ثروت کن کن جرائم کی مرہونِ منت ہے یہی وجہ ہے کہ اگر رشوت لینے والا اپنی کسبِ حرام کو چھپانے کی کوشش کرتا تھا تو اب وہ کسبِ حرام کو طرح طرح سے اچھالتا ہے بلکہ جو لوگ کسبِ حلال کی وجہ سے کم مایہ ہوتے ہیں ان کو کبھی کبھی تحقیر یا کم از کم رحم کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

یہ بات نہیں کہ کاسبین حرام اپنے اعمال کی برائی سے واقف نہ ہوں وہ اپنی برائی سے ضرور واقف ہوتے ہیں اس لئے وہ حرام کے روپے کو تھوڑی سی خیرات کر کے یا مدرسوں، مسجدوں، خانقاہوں میں چندہ دے کر یا مانگنے والوں کو اچھی رقم دے کر اپنے پیسے کو پاک کرنا چاہتے ہیں۔ ان لوگوں میں ایسے صاحبان کی تعداد بھی کافی ملے گی جو ایک طرف تو فرائض کی ادائیگی میں بہت آگے آگے ہوتے ہیں اور دوسری طرف کسبِ حلال سے مستقل منہ موڑے رکھتے ہیں ان کی مثال اس بدو کی سی ہے جو مسجد میں نماز پڑھ کر باہر نکلا ہو تو اس نے راہگیر کو پیچھے سے گولی مار کر اس کا مال لوٹ لیا۔ جب استفسار کیا گیا کہ نمازی ہونے کے باوجود اس نے یہ حرکت کیوں کی تو اس نے کہا نماز کی ادائیگی تو میرا فرض تھا اور قزاقی میرا پیشہ ہے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ ایسے صاحبان حساب کتاب کا معاملہ اللہ بزرگ و برتر پر چھوڑنے کی بجائے اپنے آپ ہی کر لیتے ہیں اور بزعم خود اپنی نیکیوں کو ستر سے ضرب دے کر بدیوں کی تعداد کم کر کے اپنے متعلق جنت کا مستحق ہونے کا فیصلہ صادر کرتے رہتے ہیں۔ یہ مذہب اسلام کو بدنام کرنے کے مترادف نہیں ہے تو کیا ہے۔

قیام پاکستان کے بعد سے ہی نظام اسلام کے اجرا کا مطالبہ بہت اہمیت اختیار کر گیا اور باوجود اس کے کہ موجودہ حکومت نے اس سلسلے میں قابلِ قدر اور سریع اقدامات کئے ہیں لیکن مطالبے کی روز افزونی سے یہ احساس ہوتا ہے کہ مطالبہ کرنے والے صرف حکومت کو ہی اس نظام کے اجرا کا ذمہ دار خیال کرتے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ حکومت یا تو قوانین جاری کر سکتی ہے جو کافی تعداد میں اب تک جاری کر بھی دیئے گئے ہیں اور یا مبلغین کی ہمت بڑھا سکتی ہے کہ وہ آسانی کے ساتھ تبلیغ کر سکیں۔ چنانچہ اس سلسلے

میں بھی اس حکومت کا کردار نمایاں ہے کہ اس نے علماء دین اور مذہبی مدرسوں سے فارغ شدہ فاضلین کو نمایاں عزت کا مقام اہل ملک کی تاریخ میں پہلی مرتبہ عنایت فرمایا۔ جیسا کہ بیان ہو چکا ہے کہ ترویج نظام اسلامی کے لئے زیادہ اہم کام تبلیغ و ترغیب کا ہے۔ تاکہ معاشرے کی اصلاح ہو، لوگ اچھائی کو اچھائی اور برائی کو برائی سمجھیں۔ اچھائی سے محبت کریں اور برائی سے نفرت کریں۔ اچھائی کے قریب ہوں۔ اور برائی سے بعید۔ مذہب کا یہ تخیل کہ رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی۔ ان کے دلوں سے بالکل محو ہو جائے۔ ان کو پتہ چلے کہ نماز اسی وقت اللہ کی بارگاہ میں قابل قبول ہے جب وہ فحشا اور منکر سے نماز پڑھنے والے کو روکے۔ جیسا کہ ارشاد ہے ان الصلوٰۃ تنھیٰ عن الفحشآء والمنکر (بے شک نماز فحش اور بُرے کاموں سے روکتی ہے) ان کو اکل حلال کی اہمیت کا اور اکل حرام کی لعنت کا علم اور احساس ہو۔ ان کو معلوم ہو کہ مال حرام میں سے صدقہ یا خیرات سے انسان کو فائدہ نہیں ہو سکتا نہ کوئی پیر یا بزرگ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسے مال کے چڑھاوے سے متاثر ہو کر ان کی شفاعت کر سکتے ہیں۔ اسلام نام ہے دنیا میں تقویٰ کی زندگی بسر کرنے کا اور اسی زندگی کا حاصل جنت الفردوس ہے۔

مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مساجد سے تبلیغ کرنے وقت عوام میں پیدا شدہ ان خرابیوں کا خیال نہیں کیا جاتا۔ اگر ایسا ہوتا تو ہر مسجد سے خطبہ میں ان خیالات کی تردید کی جاتی جو معاشرے کے غلط کار افراد نے بزعم خود اپنا لئے ہیں۔

اصلاحِ معاشرہ کام ہے ان صاحبوں کا جو لوگوں میں سے با اثر ہیں۔ اس لئے یہ کام زیادہ احسن طریقہ سے علماء کرام اور مشائخ عظام اور دیگر مسلمانوں کے رہنما ہی انجام دے سکتے ہیں۔ لیکن اس کے لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ خود اپنے آپ کو ایک مثالی مسلمان بنا کر پیش کریں۔ اگر ان کو کوئی چندہ یا تحفہ پیش کیا جائے تو وہ اس بات پر قادر ہوں کہ حرام پیسے سے خریدا ہوا مال اور کسب حرام کا پیسہ دینے والے کے منہ پر مار دیں۔ صرف اسی صورت میں وہ کسبِ حلال کی وقعت لوگوں کی نظر میں بڑھا سکتے ہیں۔

نظام اسلام کا قیام حکومت و عمال حکومت کے علاوہ ہر فرد کی ذمہ داری ہے۔ جب تک اس ذمہ داری کا احساس نہ کیا جائے اس منزل تک رسائی مشکل ہے۔ یہ ایک محنت طلب کام ہے۔ خدارا ہر شخص اس میں حصہ لے کر اپنا فرض ادا کرے۔

واللہ اعلم بالصواب

مساوات کا علمبردار

مولانا علم الدین سالک

تہذیب جدید کی بدولت جو نئے الفاظ ہم تک پہنچے ہیں۔ ان میں حریت، مساوات اور اخوت اپنے اندر خاص جذب اور کشش رکھتے ہیں، غلام آباد ہند کا ہر فرد ان الفاظ کو بار بار دہراتا ہے اور انہیں اپنا وظیفہ حیات تصور کرتا ہے مگر غور سے دیکھا جائے تو یہی الفاظ ابھی تک شرمندہ معنی نہیں ہوئے۔ یورپ کے "عشرت کدے" اور امریکہ کی مقدس سرزمین" بھی ان الفاظ کی حقیقی تفسیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔

مساوات آج دنیا کی سیاسی اور اقتصادی کش مکش کا ایک اہم مسئلہ ہے جس نے بڑے بڑے مفکر اور سیاسی رہنماؤں کی توجہ اپنی طرف مبذول کر رکھی ہے اور حق یہ ہے کہ دنیا کی تمام مصیبتوں اور انسانیت کے تمام دکھوں کا حل اسی ایک لفظ میں مضمر ہے، مگر اس کے باوجود لوگ مساوات سے کوسوں دور بھاگ رہے ہیں، گو سیاسی پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر تہذیب جدید کے علم بردار بنی نوع انسان کے خیر خواہ اور امن و امان کے پرستار ببانگ دہل اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ ہماری ملک گیری کی غرض و غائت دنیا اور اہل دنیا کو دکھوں سے نجات دلانا ہے۔ کالے گورے کی تمیز مٹانا اور تمام انسانوں کو مساوی حقوق دلانا ہے۔ اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ یہ بلند بانگ دعاوی کہاں تک اپنے اندر سچائی رکھتے ہیں اور ان کے پرستار کہاں تک اپنے عزائم اور مقاصد میں کامیاب ہوئے ہیں اور کیا ان کے ہاتھوں دنیا کے اندر مساوات پھیل سکتی ہے یا نہیں۔ میرا دعویٰ یہ ہے کہ وہ اس میں ناکام ہیں اور ناکام رہیں گے۔ البتہ اگر دنیا میں سچی اور حقیقی مساوات کہیں ہے اور وہ ہمیں عملی زندگی میں مدد دے سکتی ہے تو وہ اسلام اور داعی اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعلیمات میں ہے اور اس کی پیروی سے دنیا نجات حاصل کر سکتی ہے۔

ہم اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر بحث کر کے اپنے دعوے کے جواز میں ثبوت پیش کریں گے۔

۱:۔ مذہبی نقطہ نظر

دنیا کے قدیم مذاہب میں جو اس وقت ہمارے سامنے ہیں۔ ہندویت اور عیسائیت خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ہندوؤں میں مساوات سرے ہی سے مفقود ہے۔ ذاتوں اور ورنوں کی تقسیم دائمی غلامی کا پیش خیمہ اور انسانیت کے لئے ظلم اکبر ہے کیونکہ اس تقسیم کی وجہ سے برہمن کا درجہ اتنا بلند اور ارفع ہے کہ شودر اور اچھوت کی چیخ و پکار بھی اس کے کانوں تک نہیں پہنچ سکی۔ برہمن شکم مادر سے پوتر پیدا ہوتا ہے وہ گناہوں سے منزہ اور آلائشوں سے پاک سمجھا جاتا ہے

ے یہ مضمون ۱۳۵۵ھ میں چھپا تھا

کوئی عدالت اس کے خلاف مقدمہ قائم نہیں کر سکتی اور نہ ہی اس کے بیان پر شک و شبہ کی گنجائش ہو سکتی ہے اگر اس سے کسی انسان کا قتل بھی سرزد ہو جائے تو ہندو قانون کے مطابق اسے بڑی سے بڑی سزا بھی دی جا سکتی ہے کہ اسے شہر بدر کر دیا جائے اور اس کی املاک اور جائیداد کی قیمت اسے دیدی جائے۔ شودر یا اچھوت شروع سے باقی تین ورنوں کے مظالم کا تختہ مشق بنے ہوئے ہیں ان کو تعلیم سے روکا جاتا ہے۔ مندروں کے دروازے ان پر بند ہیں انسانیت کے ابتدائی حقوق سے وہ محروم ہیں۔ ان کا سایہ اونچی ذات کے آدمیوں کو ناپاک کر سکتا ہے۔ ان کے کنوئیں علیحدہ ہوتے ہیں ان کی بستیاں الگ تھلگ بنائی جاتی ہیں اور اگر وہ بدقسمتی سے کسی اونچی ذات کی جگہ پر بیٹھ جائیں تو ان کے چوتڑوں کو گرم لوہے سے داغ دیا جاتا ہے۔ ہندوستان کی تاریخ اس قسم کے خون چکاں واقعات سے لبریز ہے اور اچھوتوں کی مظلوم خاموشی اب اچھوت ادھار کی صورت میں سیاسی اغراض کے لئے رنگ لا رہی ہے۔

عیسائیت جس کا ماخذ انجیل مقدس ہے خود مساوات کے حاصل کرنے میں ناکام رہی ہے۔ بائیبل میں تو یہ پایا جاتا ہے کہ اپنے پڑوسیوں سے اپنے جیسا سلوک کرو مگر آج ہر عیسائی اس تعلیم کے خلاف عمل کر رہا ہے۔ عیسائیت کی تاریخ جنگ و جدل کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔ ایک مدت تک عیسائیوں کے مختلف فرقے مذہب کا نام لے لے کر ایک دوسرے کا گلہ کاٹتے رہے۔ قرون وسطیٰ کی مذہبی عدالتوں نے مذہب کے نام پر ہزارہا انسانوں کا خون بہایا۔ پروٹسٹنٹ فرقہ نے ایک مدت تک رومن کیتھلکوں کو ظلم و تشدد سے دبائے رکھا اور جب ان کی چیخ و پکار سے یورپ کی تمام فضا گونج اٹھی تو انہیں کچھ تھوڑے بہت سیاسی حقوق دے کر خاموش کر دیا گیا مگر ان کی عبادات اور دیگر مذہبی رسوم کی ادائیگی پر پابندیاں عائد کر دیں۔ اسی طرح صلیبی جنگوں میں ہم کو امتیاز رنگ و بو کی داستانیں بکثرت ملتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ عیسائی دنیا ہر طرح ناکام ہے۔

۲۔ تمدنی پہلو

تمدن عالم پر بھی سرسری نظر ڈالیئے، آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اسلام کے سوا دنیا کا کوئی تمدن مساوات کا حامی نہیں ہے۔

دنیا کا قدیم ترین تمدن اہل مصر کا ہے مگر اس میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ بنی اسرائیل کے مظلوم فراعنہ مصر کے محلات کی تعمیر کے لئے ہزاروں من پتھر اپنی پیٹھوں پر لاد لاد کر لاتے تھے۔ انہیں جانوروں کی طرح چھکڑوں میں جوتا جاتا تھا، امراء کی تفریح کی گاڑیوں کو وہ میلوں تک کھینچتے تھے اور جب وہ تھک کا چکنا چور ہو جاتے تھے تو وہ کوڑوں سے ان کی پیٹھ کو لہولہان کر دی جاتی تھی۔ بیگمات مصر کی پالکیوں کو کندھوں پر اٹھائے اٹھائے پھرنا ان کے سروں پر چھتریاں تانے دم بخود تصویر مظلومی بنے سایہ کی طرح ساتھ ساتھ جانا ان کی سواریوں کے ہمراہ میلوں تک دوڑتے پھرنا اور آخر بدحواس ہو کر گر پڑنا۔ چیتھڑوں سے پیوند کیے ہوئے تہہ بند پھٹے پرانے لباس، غربت اور افلاس زدہ چہرے انہیں مصریوں

سے صاف ممیز کر دیا کرتے تھے۔

اسی طرح سرزمین یونان میں ایتھنز والوں کو تمام دنیا پر ترجیح دی جاتی ہے مگر افلاطون کا فلسفہ اور ارسطو کی نکتہ آرائیاں اس امتیاز کو مٹانے سے یکسر قاصر ہیں بلکہ انہوں نے خود اس بات کا اعلان کیا کہ اہل ایتھنز تمام دنیا پر فوقیت رکھتے ہیں وہ سب کو غلام بنا سکتے ہیں مگر انہیں کوئی غلام نہیں بنا سکتا۔

اسی طرح اہل روما کی عدم مساوات نے موجودہ قومیت اور نسلی امتیاز کی بنیاد رکھی۔ نیشنلزم کا موجودہ تخیل بھی ان کی تہذیب کا اثر ہے۔

یورپ کا جدید تمدن بھی بظاہر نہایت دلفریب اور دلکش معلوم ہوتا ہے سائنس اور فلسفہ کی ترقی سے دنیا نے یہ یقین کر لیا تھا کہ اب انسانیت کے مجروح قلوب کا مداوا ہو جائے گا اور وہ دل جو مدت کے ظلم و ستم سے پاش پاش ہو چکے تھے۔ ان کے اندمال کا وقت آ گیا ہے مگر نقاب اٹھنے پر معلوم ہوا کہ دنیا ایک عظیم الشان دھوکہ میں مبتلا تھی جسے وہ مساوات کی نیلم پری سمجھ رہی تھی وہ استبدادیت کا دیو تھا اور بنی نوع انسان کے جذبہ ہمدردی کی تہہ میں طمع زر، جنگ و جدل شخصی خودغرضی مطلب پرستی اور مطلب براری استعمار پسندی اور تفریق رنگ و بو، سپید رنگ کا تفوق اور اس قسم کے دیگر خوفناک خیالات مضمر تھے۔ دنیا نے ایک بار پھر دیکھ لیا کہ بین الاقوامی قوانین کے شاندار اصول انسانی ہمدردی کیلئے لمبے چوڑے دعوے اور اس بات کا اعلان کہ تہذیب جدید کا اصول اساسی بنی نوع انسان کی خدمت اور مساوات ہے۔ ہماری پریشانیوں کو خوفناک صورت میں بڑھا رہا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے سچ کہا تھا۔

ہے وہی سازِ کہن یورپ کا جمہوری نظام
کہ نہیں جس میں نوا غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

کیا یہ حقیقت نہیں کہ کینیڈا، نیوفاؤنڈ لینڈ، تسمانیا اور دیگر سپید انسانوں کی بستیوں نے اپنے دروازے ایشیا پر بند کر دیئے ہیں اور کسی غیر یورپی انسان کو وہاں رائے دینے کا حق حاصل نہیں۔

کیا یہ درست نہیں کہ امریکہ میں کالے اور گوروں کے گرجے الگ الگ ہوتے ہیں؟

کیا یہ سچ نہیں کہ کالا کسی گورے کا امام نہیں ہو سکتا!

کیا امریکہ نے ہندوئے احمر کو مٹانے میں ایڑی سے چوٹی تک کا زور نہیں لگایا؟

کیا اہل فرانس نے اپنی بستیاں بسانے کے لئے ہمدردی کے بہانے خوفناک بیماریوں کے جراثیم سے آلودہ کمبل وہاں کے باشندوں میں تقسیم نہیں کئے!

کیا اہل ہسپانیہ نے میکسیکو والوں پر انسانیت سوز مظالم نہیں توڑے؟

کیا اہلِ بلیجیم نے ربڑ کی تجارت کے سلسلہ میں اہل کانگو پر خوفناک ستم نہیں ڈھائے ؟
کیا یورپ کی مختلف قوموں نے افریقہ کے غریب باشندوں کو بھیڑوں اور بکریوں کی طرح جہازوں میں لاد لاد کر مختلف ممالک میں فروخت نہیں کیا !
اور کیا جنگ عظیم کے بعد ایک بہت بڑی جمہوری سلطنت کے ایک وزیر نے تقریر کرتے ہوئے یہ نہیں کہا کہ امریکہ اور یورپ کی گوری نسلوں کو خدا نے اس واسطے پیدا کیا ہے کہ وہ سیاہ فام قوموں اور کالی نسلوں پر حکومت کریں اور انہیں محکوم بنائیں۔
یہ وہ حقائق ہیں جن پر انسانیت ہمیشہ خون کے آنسو بہائے گی اور مساوات ماتم کرے گی۔ ان واقعات کی موجودگی میں کون کہہ سکتا ہے کہ یورپ اور امریکہ کی تہذیب مساوات کی علم بردار ہے اور اس سے انسانی دکھوں کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔
آیئے اس تصویر کو اسلام کے آئینہ میں دیکھیے اسلام، اخوت اور مساوات کے ذریعے انسانوں کی عالمگیر برادری قائم کرتا ہے وہ نسلی امتیاز مٹا کر کالے اور گورے حبشی و رومی، یورپی اور غیر یورپی کو ایک سٹیج پر کھڑا کرتا ہے اور زندۂ جاوید حافظ کے قول کے بموجب کہ :-

محو بہ محمل شاہی کہ در ولایت عشق — گدا بہ تخت نشاند و بادشاہ گیرند

اسلام کے آتے ہی نسلی تفاخر، قومی تکبر اور نسبی وجاہت کی کایا پلٹ گئی تمام عرب ایک ہی رنگ میں رنگے گئے اور وہ اسلام کا رنگ تھا جس نے انہیں ملکی بندھنوں اور جغرافیائی حدود سے آزاد کر کے ایک عالمگیر برادری کا رکن بنا دیا اب صہیب رومیؓ، بلال حبشیؓ، سلمان فارسی اور ابن عباس میں کوئی فرق نہ تھا

حسن ز بصرہ ، بلال از حبش، صہیب از روم
ز خاک مکہ ابوجہل ایں چہ بوالعجبی است

اسلام عمل کا مذہب ہے اس کی تعلیم عمل پر مبنی ہے جب ہادیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام انسانوں کو مساوات کا درس دیا تو قریش نسبی تفاخر میں اس قدر ڈوبے ہوئے تھے کہ اپنے سوا تمام انسانوں کو ہیچ سمجھتے تھے ان کی نظروں میں خدا کی بادشاہت فقط ان ہی کے لئے تھی وہ اپنے آبائی مذہب پر فخر کرتے اور اپنی نسلی نجابت پر اتراتے، تھے یہاں تک کہ جنگ بدر میں مدینہ منورہ کے دو مسلمان ان کے مقابلے میں نکلے تو انہوں نے پکار کر کہا کہ "اے محمدؐ! قریش کی تلوار غیر قریشی کی گردن پر نہیں چل سکتی۔ تو ہمارے مقابلہ میں مدینہ کے آدمی بھیج کر ہماری تلواروں کی توہین و تذلیل کر رہا ہے" مگر ہادی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام باتوں کا قلع قمع کیا اور بتایا کہ اے قریش اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لو کہ تمہارا باپ ایک ہی ہے کسی عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں اگر فضیلت ہے تو حسن عمل اور اتقا کی وجہ سے، اس حقیقت سے آگاہ ہو جاؤ۔ یہی سچی حقیقت ہے اس سے سرتابی نہیں ہو سکتی یہ میرا فرض تھا میں نے،

اسے پورا کر دیا۔"

پھر فرمایا :۔

لَیْسَ لِاَحَدٍ عَلٰی اَحَدٍ فَضْلٌ اِلَّا بِدِیْنٍ وَ تَقْوٰی

یعنی کسی کو ایک دوسرے پر کوئی فضیلت نہیں سوائے پاکیزہ خصلت کے ۔

ان ارشادات کا اثر یہ ہوا کہ جب بلال حبشی رضی اللہ عنہ نے شادی کی خواہش ظاہر کی تو اہل قریش کی گردنیں ان کے سامنے جھک گئیں سب یہ آرزو کرنے لگے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی انگلی ان کی طرف اٹھے اور وہ یہ سعادت حاصل کریں ۔ یہاں تک کہ جب آپ کا انتقال ہوا تو فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ آہ :

اُٹھ گیا آج زمانہ سے ہمارا آقا   اٹھ گیا آج نقیب حشم پیغمبر

رسول امی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات کا ماخذ قرآن حکیم ہے اس میں بھی خداوند تعالیٰ فرماتا ہے کہ :

یٰاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّ اُنْثٰی وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ

"اے انسانو یہ ایک مانی ہوئی حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا تمہارے مختلف خاندان اور قبیلے اس واسطے قائم کئے کہ خاندانوں اور قبیلوں کا امتیاز باہمی جان پہچان کا سبب بن جائے ۔"

خداوند تعالیٰ کا یہ حکم نسلی اور جغرافیائی امتیازات کے لئے موت کا پیغام ثابت ہوا۔ آناً فاناً یہ سب جھگڑے مٹ گئے اور ایک ایسی عالمگیر برادری قائم ہو گئی جس کا اصل اصول مساوات تھا اور جس کی تاسیس مواخات، محبت، عفو اور کرم پر تھی اس برادری کا طغرائے امتیاز یہ تھا کہ سب ایک دوسرے کو عزت کی نظر سے دیکھتے تھے ۔ یہ وہ برادری تھی جس میں انصار نے اپنی جائیدادیں مہاجرین کے ساتھ نصف نصف بانٹیں ! در جس میں ایک سیاہ فام حبشی اپنے تقویٰ کی وجہ سے ایک قریشی شہزادہ سے زیادہ معزز ہو گیا۔ اس مساوات نے ایسا ماحول پیدا کر دیا کہ آقا اور غلام قانون کی نظر میں یکساں ہو گئے اور دوسری اقوام کے خلاف ادنے ادنے غلام اس عالمگیر برادری کی امامت اور بادشاہت کے درجے تک پہنچ گئے یہ مساوات کوئی شاعرانہ تخیل یا ناقابل عمل اصول نہ تھا اسلام اور پرستاران اسلام نے اسے جس رنگ میں پیش کیا اس کی مثال تاریخ عالم میں نہیں مل سکتی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر جو خطبہ ارشاد فرمایا اس میں نہایت پر جوش الفاظ میں اس کا اعادہ کیا اور کہا کہ ۔

"اے حاضرین میں تمہیں اسلامی وحدت کا سبق یاد دلاتا ہوں یاد رکھو کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور اخوت خدا کی ودیعت ہے پس کسی بھائی کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ کسی دوسرے بھائی کی مرضی کے خلاف اس کا مال حاصل کرے ۔ ہاں اگر وہ اپنی خوشی سے بخشدے تو اور بات ہے ۔ اے حاضرین اسلام میں سب آدمی برابر ہیں نہ عربی کو عجمی پر فضیلت ہے نہ عجمی کو عربی پر سب میں پایۂ امتیاز صرف پارسائی ہے اور خدا کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ بزرگ وہی ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے ۔ آج میں

نسل رنگ اور قوم کے بتوں کو پاؤں تلے روندتا ہوں اور تمام انسانوں کو عالمگیر اخوت اور مساوات کے رشتہ میں جکڑ دیتا ہوں کیونکہ تمام انسان آدمؑ کی اولاد ہیں اور آدمؑ مٹی سے پیدا ہوا تھا۔

مساوات کا اس سے شاندار نقشہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ کیا کوئی مذہبی کتاب ایسے شاندار الفاظ مساوات کے متعلق پیش کر سکتی ہے؟ کیا کوئی سیاسی مفکر مساوات کے متعلق اتنے مؤثر جذبات، دنیا کے سامنے رکھ سکتا ہے؟ کیا کوئی ریفارمر مساوات کا اتنا عمدہ درس دے سکتا ہے؟ ہرگز نہیں صدیاں گذر گئیں، زمانہ کے اوراق پلٹ گئے تاریخ کے دور گذر گئے مگر مکہ کے ایک امی نبیؐ دنیا کے سب سے بڑے ریفارمر اور تاریخ عالم کے پہلے اور آخری تاریخی پیغمبرؐ کے الفاظ حروف زریں کی طرح انسانیت کے اوراق اور تاریخ کے صفحات پر آج تک جگمگا رہے ہیں اور ان کی چمک دمک سے تہذیب و تمدن کلچر اور معاشرت کی آنکھیں خیرہ ہو رہی ہیں

ہادی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آزاد اور غلام کے امتیاز کو حرف غلط کی طرح مٹا دیا یہ وہ بندھنیں تھیں جو منو اور ارسطو کے انسانی دماغوں کی کاوشوں کا نتیجہ تھیں جن کے توڑنے میں گوتم بدھ اور جین مت، کاپالی مہا بیر ناکام رہ چکا تھا جن کی گرفت روز بروز مضبوط اور استوار ہو رہی تھی اور جنہیں بڑے بڑے فلاسفر اور روشن دماغ مفکر جائز اور مباح قرار دے رہے تھے۔ پرانا عہد نامہ اس کی تائید کرتا ہے۔ انجیل اس کے متعلق خاموش ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ سعادت بھی نبی آخر الزمانؐ کے لئے محفوظ رکھی تھی کہ وہ شودر، اچھوت اور غلاموں کا اد ہار کریں اور ان کو ایک عالمگیر برادری کا فرد بنا کر انسانیت کے ماتھے سے یہ کلنک کا ٹیکہ مٹائیں۔ تاریخ کہتی ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حین حیات میں ۵۰ ہزار غلاموں کو آزادی نصیب ہوئی اور وہ اسلام کی برادری کے اہم ترین رکن بن گئے۔

بلال حبشیؓ کے نام سے کون واقف نہیں، اسلام کا یہ معزز فرزند اسلام قبول کرنے سے پہلے غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ سلمان فارسی بھی اس مصیبت میں گرفتار تھے۔ زید بھی اسی جام کی تلخیوں کا مزہ چکھ رہے تھے ہادی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لبوں کی ایک ہلکی سی جنبش نے انہیں غلامی کی آہنی زنجیروں سے رہا کر دیا۔ حجۃ الوداع کے موقعہ پر رسول کریمؐ نے اس کی پر زور مذمت کی اور فرمایا کہ:

"اے مسلمانو! تمہارے غلام تمہارے بھائی ہیں۔ ان سے اتنا ہی کام لو جتنا آسانی سے وہ کر سکیں ان کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرو جیسا کہ تم اپنے دوستوں اور عزیزوں سے روا رکھتے ہو جو اپنے لئے ناپسند کرتے ہو وہ ان کے لئے بھی ناپسند کرو، جو خود کھاؤ وہ ان کو بھی کھلاؤ، جو خود پہنو وہی انہیں بھی پہناؤ"

کیا کوئی مذہب کوئی تہذیب اور کوئی مفکر غلاموں کے متعلق اس قسم کے خیالات ظاہر کر سکتا ہے یورپ آج اس بات پر اتراتا ہے کہ اس نے غلامی کا سدباب کیا، اس کی روک تھام کے لئے قانون وضع کئے مگر جو امتیازی سلوک وہ ایک دوسرے کے ساتھ روا رکھتا ہے۔ وہ صاف صاف بتاتا ہے کہ اس آزادی کا دوسرا نام غلامی ہے اور وہ قدیم زمانہ کی غلامی سے بھی بدتر ہے پہلے صرف جسم غلام ہوتے تھے۔ اب روح اور دماغ کو غلام بنایا جاتا ہے۔ اس کا

چارہ اور علاج محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آغوش میں ہے آپ کو غلاموں کا اتنا خیال تھا کہ جب آپ نے آخری ہچکیاں لیں تو فرمایا کہ :

اپنی لونڈیوں اور غلاموں کے بارے میں خدا سے ڈرو۔"

ایک مرتبہ حضرت ابوذرؓ نے اپنے ایک عجمی غلام کو برا بھلا کہا وہ فریاد لیکر بارگاہ نبویؐ میں حاضر ہوا۔ آپ حضرت ابوذرؓ پر سخت ناراض ہوئے اور فرمایا کہ :۔

یہ غلام تمہارے بھائی ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ اللہ نے تم کو ان پر ایک گونہ فضیلت دی ہے یاد رکھو جو غلام تمہاری مرضی کے مطابق نہ ہو اسے فروخت کر دو اور خدا کی مخلوق کو عذاب اور تکلیف نہ دو۔"

ایک بار آپ نے دیکھا کہ ایک شخص اپنے غلام کو پیٹ رہا ہے آپ نے فرمایا کہ "خدا تم سے زیادہ قدرت والا ہے" اس شخص نے آپ کی آواز پہچان کر غلام کو آزاد کر دیا۔ آپ نے پھر فرمایا کہ " اگر تم ایسا نہ کرتے تو آتش جہنم تمہیں بھسم کر ڈالتی۔"

ان مثالوں کے ہوتے ہوئے بھی مغرب کے گندہ ذہن پادری گرجا کے منبروں پر کھڑے ہو ہو کر یہ کہتے ہیں کہ اسلام غلامی کی تعلیم دیتا ہے۔ اگر اس کا نام غلامی ہے تو یہ مغرب کی آزادی سے ہزار درجہ اچھی ہے۔

خدا گواہ است کہ گر جرم ہمیں عشق است — گناہ گبر و مسلمان بجرم ما بخشند

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مظلوم اور بے زبان عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق دلائے اور حجۃ الوداع کے موقعہ پر فرمایا کہ :۔

اے مردو! عورتوں کے معاملہ میں خدا سے ڈرو، جس طرح تمہارے حقوق ان پر ہیں اسی طرح ان کے حقوق تم پر ہیں ان کو حقیر اور ذلیل نہ سمجھو، وہ خدا کی طرف سے تمہارے پاس امانت ہیں ان کی عزت کرو۔

یہ ہے اسلامی مساوات کی تعلیم جو دنیا کے سب سے بڑے، سب سے کامیاب اور سب سے اولوالعزم پیغمبر کی معرفت ہم تک پہنچی اور یہ فقط تعلیم ہی تعلیم نہیں بلکہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس پر عمل کیا اور دنیا کو بتایا کہ عمل بہترین معلم ہے۔

ایک مرتبہ ایک صحابی نے اپنا لڑکا رسول خدا کی خدمت میں بھیجنا چاہا لڑکے نے پاس ادب سے دریافت کیا کہ وہ حضورؐ کو کس لقب سے مخاطب کرے۔ صحابی نے جواب دیا۔ جان پدر! بارگاہ نبوت میں کسی شاہانہ لقب کی ضرورت نہیں، تم محمدؐ کہہ کر پکار لینا۔

اللہ اکبر! کیا شان مساوات ہے۔ یورپ بایں ہمہ ادعائے مساوات آج یہ کہتا ہوا سنائی دیتا ہے: کہ ایک شریف مرد اپنے خادم کی نگاہ میں شریف نہیں ہوتا" یہ کیوں؟ اس لئے کہ یورپ کی مساوات ریاکارانہ ڈپلومیسی ہے، جس میں خلوص کلیتاً مفقود ہے۔ مگر تاریخی اوراق پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ عرب کا امی نبیؐ اپنے نزدیک ترین خدام کی

نگاہوں میں بھی اتنا ہی معزز رہتا جتنا کہ غیر ان کا احترام کرتے تھے کیونکہ وہ اخوت اور مساوات کا درس دینے سے پہلے خود اس پر عمل کرتا تھا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے کسی بات پر حضرت بلال ؓ اور سلمان فارسی کو ڈانٹا۔ حضور ؐ نے فرمایا کہ: تم نے ان لوگوں کو آزردہ کیا۔" یہ سن کر حضرت ابوبکر صدیق ؓ واپس آئے اور ان سے معافی مانگی۔

قبیلہ بنی مخزوم کی ایک عورت چوری کے الزام میں گرفتار ہوئی اسامہ بن زید لوگوں کی طرف سے تشفیع بنکر بارگاہِ اقدس میں آئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اسامہ ؓ سے بہت محبت تھی آپ نے فرمایا کہ اے اسامہ، کیا تم حدود خداوندی میں تجاوز کی سفارش کرتے ہو؟ پھر آپ نے لوگوں کو جمع کیا اور فرمایا کہ تم سے پہلی امتیں اس واسطے تباہ ہوئیں کہ جب کوئی معزز آدمی جرم کرتا تو چشم پوشی کرتے اور جب کسی معمولی آدمی سے جرم سرزد ہوتا تو سزا دیتے خدا کی قسم اگر محمد ؐ کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو اس کے بھی ہاتھ کاٹ دیئے جاتے۔

تہذیب جدید کے علم بردار آئیں اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس اسوۂ حسنہ کے ساتھ یورپ کی چکا چوند کر دینے والی تہذیب کے اس مقولہ کا توازن کریں کہ بادشاہ قانون سے مستثنیٰ ہوتا ہے۔ دنیا کی کوئی عدالت اس کے خلاف مقدمہ قائم نہیں کر سکتی اور نہ ہی اس سے گناہ سرزد ہوتا ہے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ سفر میں کھانا تیار نہ تھا، تمام صحابہ نے مل کر کھانا پکانے کا انتظام کیا۔ سب نے ایک ایک کام اپنے ذمہ لیا۔ حضور علیہ السلام نے جنگل سے لکڑیاں لانے کے لئے اپنے آپ کو پیش کیا۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ کام ہم خود ہی کر لیں گے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ سچ ہے مگر میں یہ پسند نہیں کرتا کہ تم میں سے اپنے آپ کو ممتاز کروں۔ خدا اس بندہ کو پسند نہیں کرتا جو اپنے ہمراہیوں سے ممتاز بنتا ہے۔

جب حضرت عباس ؓ جنگ بدر میں گرفتار ہو کر آئے تو لوگوں نے دوسرے قیدیوں کے ساتھ ان کے ہاتھ پاؤں جکڑ کر باندھ دیئے، جس کی وجہ سے وہ بہت بے چین ہوئے۔ ان کے کراہنے کی آواز آپ کے کانوں میں آرہی تھی لیکن آپ اس خیال سے ان کے ہاتھ پاؤں نہیں کھولتے تھے کہ لوگ کہیں گے کہ اپنے عزیزوں کے ساتھ رعایت کرتے ہیں مگر ان کی تکلیف کی وجہ سے آپ کو رات بھر نیند نہ آئی۔ صحابہ کرام آپ کی کروٹیں بدلنے کا سبب سمجھ گئے اور ان کی گرہیں ڈھیلی کرنے کے لئے اٹھے۔ مگر آپ نے فرمایا کہ یا تو سب کی گرہیں ڈھیلی کر دو یا سب کو ویسے ہی رہنے دو۔

ایک حبشی مسجد میں جھاڑو دیا کرتا تھا وہ فوت ہو گیا۔ اس کے انتقال کی خبر آپ کو نہ ملی۔ آپ نے اس کا سبب پوچھا تو بتایا گیا کہ وہ اس قابل نہ تھا کہ آپ کو اس کے مرنے کی اطلاع دی جاتی۔ آپ یہ سن کر بہت رنجیدہ ہوئے اور اس کی قبر پر جا کر نماز جنازہ ادا کی۔

ایک دفعہ ایک شخص آپ سے ملنے کے لئے آیا لیکن نبوت کا رعب اس درجہ طاری ہوا کہ وہ کانپنے لگا آپ نے اسے تسلی دی اور فرمایا کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں میں بھی تمہاری طرح انسان ہوں ایک قریشی عورت کا لڑکا ہوں

جو سوکھا گوشت لگا کر کھائی تھی۔

مسجد نبوی کی تعمیر کے وقت جب صحابہ کرام اینٹیں اٹھا اٹھا کر لاتے تھے اور مسجد کی تعمیر میں بڑے ذوق و شوق سے حصہ لے رہے تھے تو حضرت اقدسؐ خود بھی ان میں شریک تھے آپ اینٹیں اٹھا اٹھا کر لاتے تھے اور نہایت پرجوش الفاظ میں انہیں یہ خوشخبری سناتے تھے کہ وہ شخص خوش نصیب ہے جو مسجد تعمیر کراتا ہے اور اٹھتے بیٹھتے قرآن مجید پڑھتا ہے۔ صحابہ کرام نے عرض کیا کہ حضورؐ ہم خدمت کے لیے حاضر ہیں آپ کیوں تکلیف فرماتے ہیں آپ نے مسکراتے ہوئے فرمایا کہ یہ نہیں ہو سکتا کہ تم سب کام کرو اور میں خاموش بیٹھا رہوں مجھے بھی اس کام میں حصہ لینے دو۔

جنگ احزاب کا ذکر ہے کہ کفار عرب ۲۴ ہزار کی عظیم الشان فوج لیکر نہتے مسلمانوں کو مٹانے کیلئے مدینہ پر چڑھ آئے۔ مدینہ کی حفاظت کے لیے اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ شہر کے گرداگرد خندق کھود دی جائے تمام صحابہ نے اس میں حصہ لیا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام تین دن کے فاقہ کے باوجود خندق کھودنے میں دوسرے مسلمانوں کے ساتھ شریک تھے۔ صحابہ کرام بار بار عرض کرتے تھے کہ حضورؐ تکلیف نہ فرمائیں مگر اس کام میں آپ اسی انہماک سے مشغول رہے مٹی کھودی جا رہی تھی رجز پڑھتے جاتے تھے۔ حضورؐ بھی مٹی ٹوکریوں میں بھر بھر کر اٹھاتے تھے اور دوسروں کے ساتھ رجز خوانی کرتے تھے۔

کیا مساوات کی ایسی شاندار مثال انسانیت کی تاریخ میں مل سکتی ہے اور کیا یہ وہ مساوات نہیں جس پر عمل کرنے سے انسانی دکھوں کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ دنیا کا اضطراب مٹ سکتا ہے اور سارا جہان امن سکھ اور طمانیت قلب حاصل کر سکتا ہے۔

جنگ احزاب ہی کا واقعہ ہے کہ صحابہ کرام نے کام کو جلدی ختم کرنے کے لئے فیصلہ کیا کہ قبیلہ قبیلہ کے لوگ اکٹھے مل کر کام کریں۔ تمام صحابی ٹولیوں میں تقسیم ہو گئے۔ سلمان فارسیؓ اکیلے رہ گئے، وہ بے حد مغموم ہوئے ہادی اکرمؐ نے انہیں دیکھا ان کے پاس تشریف لائے، تاسف کا سبب پوچھا اور جب اصل حقیقت سے واقف ہوئے تو اپنی باہیں ان کی گردن میں ڈال دیں اور فرمایا کہ "تم غمگین کیوں ہوتے ہو میں بھی تمہارا بھائی ہوں آؤ ہم تم اکٹھے ملکر کام کریں"۔

اللہ اکبر! مساوات کا کتنا روح افزا منظر ہے کیا پژمردہ قلوب میں روح حیات دوڑانے کے لیے یہی ایک واقعہ کافی نہیں؟

آخری ایام میں جب آپ نے رومیوں کی روک تھام کے لیے فوج روانہ کرنے کا ارادہ کیا تو اس کی سپہ سالاری حضرت اسامہ بن زیدؓ کے سپرد کی، حضرت اسامہؓ آپ کے غلام زیدؓ کے صاحبزادے تھے، اس وقت سینکڑوں قریشی اور ہاشمی مدینہ منورہ میں موجود تھے۔ آپ ان میں سے کسی کو منتخب فرما سکتے تھے۔ مگر مساوات کی عملی تعلیم دینے اور نسبی فخر مٹانے کے لیے آپؐ نے حضرت اسامہؓ کو نامزد فرمایا جس نے یہ ثابت کر دیا کہ آپ درحقیقت پیغمبر مساوات ہیں اور اس دنیا میں رنگ و نسل کے بت توڑنے آئے تھے آپ کی اس عملی تعلیم کا اثر یہ ہوا کہ ہر مسلمان اس رنگ میں رنگا گیا اور آج ہم بلا خوف تردید

یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ مساوات کے متعلق جتنی شاندار روایات اسلام پیش کرتا ہے۔ دنیا کی تمام قومیں مل کر بھی پیش نہیں کر سکتیں۔ ساڑھے تیرہ سو برس سے اب تک حج کے موقعہ پر اس کا نظارہ دنیا کو محوِ تحیر کر رہا ہے۔ دنیا کے ہر خطہ کے مسلمان، ہر آب و ہوا کے بسنے والے مختلف بولیاں بولنے والے، کالے گورے خوبصورت و بدصورت، غرضیکہ ہر طرح کے انسان مکہ مکرمہ کی مقدس سرزمین میں جمع ہوتے ہیں اور ایک لباس پہنے ایک اثر میں ڈوبے اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ کے نعرے لگاتے حرم کے گرد طواف کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کی ایک ایک حرکت مساوات کی زندہ تصویر اور ان کی ایک ایک جنبش خدائے قہار کی عبودیت کا جذبہ لئے ہوئے ہوتی ہے۔ وہ شمع حرم کے گرد پروانہ وار گھومتے ہیں ان کا جوش اور دلولہ دیکھنے والوں کے دلوں پر ایک خاص اثر کرتا ہے اور سخت سے سخت مخالف اسلام کو بھی اسلام کی مساوات کا قائل کر دیتا ہے۔

نماز جو مومن کی معراج ہے، مساوات کی بہترین مثال ہے، دن میں پانچ مرتبہ اللہ کے بندے دوش بدوش کھڑے ہو کر مساوات کا عملی ثبوت دیتے ہیں وہ نظارہ کتنا شاندار اور حیرت افزا ہوتا ہے۔ جب ایک غریب مزدور جس کا جسم گرد و غبار سے اٹا ہوا جس کا لباس میلا کچیلا اور پھٹا ہوا اور جس کی ظاہری شکل و صورت مسکنت و افلاس کی منہ بولتی تصویر ہوتی ہے۔ ایک کروڑ پتی نازک مزاج کے ساتھ کندھا جوڑ کر کھڑا ہوتا ہے اور دنیا کو بتاتا ہے کہ ؎

بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے (اقبال)

اسلامی مساوات کا یہ ایک اجمالی سا خاکہ ہے جو تعصبوں سے بلبلاتی دنیا کے لئے اکسیر اعظم کا حکم رکھتا ہے دنیا کے سیاسی مفکر لاکھ ہاتھ پاؤں ماریں بڑے بڑے روشن دماغ کتنا ہی سر ٹپکیں اور دنیا کو دکھوں سے نجات دلانے کے لیے لاکھ جتن کریں مگر جب تک وہ اسلام کی آغوش میں آ کر صحیح مساوات کا جذبہ اپنے اندر پیدا کر کے شاطرانہ عیاریوں کو ترک نہ کریں گے۔ اس وقت تک اپنے مقاصد میں کامیاب نہ ہوں گے اور انسانیت اسی طرح مبتلائے آلام رہے گی۔ علامہ اقبال نے سچ کہا ہے ؎

جو تو سمجھے تو آزادی ہے پوشیدہ محبت میں
غلامی ہے اسیرِ امتیازِ ما و تو رہنا

مقامِ رسولؐ

ڈاکٹر محمد ذکی

دنیا میں آج تک کسی بھی انسان کی سیرت پر اتنا تحقیقی کام نہیں ہوا ہے۔ جتنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر ہو چکا ہے۔ آپ کے سیرت نگاروں میں آپؐ پر ایمان لانے والے جاں نثار، عقیدت مند بھی شامل ہیں اور آپؐ کی رسالت کے منکر، سخت نکتہ چین اور انتہائی دشمن بھی اور ان میں سے ہر ایک اپنے مخصوص نقطۂ نظر سے آپؐ کی سیرت کے کسی نہ کسی پہلو کو اجاگر کرنے میں دوسرے سے بازی لے جانا چاہتا ہے۔ یہ گہرا لگاؤ اور عام دلچسپی صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ذات سے مخصوص ہے ورنہ تو آپؐ سے پہلے بھی ایسی بہت سی شخصیات گزر چکی ہیں۔ جنہوں نے بڑے بڑے شاندار کارنامے انجام دیئے ہیں اور انسانی قلوب پر بڑے گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ ان میں سے کسی بھی رہنما کی زندگی کے مختلف گوشوں پر اتنی بحث نہیں کی گئی جتنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلہ میں کی گئی ہے۔

اس کی بہت سی وجوہ ہو سکتی ہیں۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ ان ہستیوں کے صحیح اور تفصیلی حالات معلوم نہیں اور جتنا کچھ بھی معلوم اور مشہور ہے اس میں بھی غیر مستند روایات اتنی زیادہ ہیں کہ ان کی شخصیات کے صحیح خدوخال مستور ہو کر رہ گئے ہیں۔ اب ظاہر ہے ظن وتخمین اور فرضی داستانوں کی بنیاد پر ان کی سیرت کی تشکیل ہو سکتی ہے نہ وسیع پیمانہ پر تحقیقی کام ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر بائبل ہی کو لے لیجیئے جو اس نوع کی قدیم ترین دستاویز سمجھی جاتی ہے۔ اس میں انسانِ اول (حضرت آدمؑ) سے لے کر حضرت عیسیٰؑ تک مختصر انسانی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ بنی اسرائیل کے تفصیلی حالات اور ان کے رہنماؤں کے سوانحی خاکے ہیں۔ چودھویں، پندرہویں صدی عیسوی تک عام اہل کتاب (یہودی پرانے عہد نامہ کو اور عیسائی نئے اور پرانے عہد نامہ کو یعنی بائبل کو ایک الہامی اور مستند کتاب مانتے رہے لیکن دورِ جدید میں جب یورپ میں علمی سرگرمیوں کا آغاز ہوا اور اہل علم کا تنقیدی شعور بیدار ہوا تو انہوں نے بائبل کا بھی تحقیقی مطالعہ کیا لیکن ان کے انکشافات نے یورپ کے مذہبی حلقوں میں ایک طوفان برپا کر دیا۔ کیوں کہ یہ سارے محققین اس نتیجہ پر پہنچے کہ بائبل الہامی کتاب نہیں ہے، اس کے مصنفین انسان ہی تھے لیکن ان سب کے نہ تو نام معلوم ہیں نہ اس کے مختلف صحائف کا زمانۂ تصنیف متعین کیا جا سکتا ہے۔ اس کا متن جو قدیم عبرانی زبان میں تھا اور تحریری شکل میں ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتا رہا۔ لیکن نقل و روایت میں صحت کا التزام نہیں ہوا۔ مختلف مراحل پر مختلف وجوہ کی بنا پر راویوں اور کاتبوں نے تغیر وتبدل بھی کیا اور لفظی اور معنوی تحریف بھی کی ہے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ قدیم عبرانی نسخے اب ناپید ہیں۔ زیادہ سے زیادہ پرانا عبرانی نسخہ جو دستیاب ہو سکا ہے وہ نویں، دسویں صدی عیسوی کا ہے، یعنی ظہورِ اسلام کے بھی

کئی سو سال بعد کا۔ اس کے بیشتر نسخے یونانی تراجم کی شکل میں ملتے ہیں لیکن ان کے بارے میں بھی مغربی محققین کی رائے یہ ہے کہ ترجمے لاپروائی کے ساتھ ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ اس میں اختلافات، متضاد بیانات اور خرافات بھی ہیں اس لئے اس میں جو کچھ بھی کہا گیا ہے اسے بہت احتیاط کے ساتھ قبول کرنا چاہیے[1]۔

آج بھی مغربی دانشوروں کا یہی مسلک ہے البتہ وہ یہودی اور عیسائی جو تنقیدی مطالعہ کو جرم سمجھتے ہیں اور علمی تحقیقات میں کوئی دل چسپی نہیں رکھتے اب بھی بائبل کو الہامی اور غلطیوں سے پاک کتاب سمجھتے ہیں۔ اسی پر ان کتابوں کو بھی قیاس کر لیجیے جن میں مختلف قوموں کے رہنماؤں کی داستانیں بیان کی گئی ہیں۔ ان کے بارے میں عوام کا عقیدہ خواہ کچھ بھی ہو علمی حلقوں میں سب ہی تسلیم کرتے ہیں کہ ان میں حقائق کم اور اساطیر زیادہ ہیں اور ان میں سے بیشتر کتابوں کے مصنفوں کے نام معلوم ہیں نہ زمانہ تصنیف۔ پھر ان کتابوں کی بنیاد پر بھلا ماضی کی مشہور اور تاریخ ساز ہستیوں کے بارے میں علمی اور تحقیقی نقطۂ نظر سے کیا کام ہو سکتا ہے۔

لیکن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ اوّل تو آپؐ کا ظہور ہی تاریخ کی پوری روشنی میں ہوا ہے۔ دوسرے آپؐ کی سیرت کے لئے جتنے مستند مآخذ ممکن ہیں وہ سب موجود ہیں۔

سب سے زیادہ قابل اعتبار اور مستند ذریعۂ معلومات جو کسی شخصیت کے سمجھنے اور اس کے کارناموں کا جائزہ لینے کے لئے ضروری سمجھا جاتا ہے وہ خود اس کا کلام یا تصنیف ہے کیونکہ انسان کا اپنا کلام نہ صرف یہ کہ اس کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے بلکہ اس کے پورے ماحول کی بھی عکاسی کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کسی ممتاز شخصیت کی خود نوشت سوانح حیات (AUTO - BIOGRAPHY) دستیاب ہو جاتی ہے تو اسے بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ورنہ اس کے اقوال اور متفرق بیانات کی تلاش کی جاتی ہے اور پھر ان کی روشنی میں اس کی سیرت مرتب کی جاتی ہے۔

دوسرے درجہ پر معاصرین کی شہادتوں اور بیانات کی طرف رجوع کیا جاتا ہے اگر کسی معروف شخصیت کے بارے میں کسی ہم عصر نے کچھ لکھا ہے یا اس کے ہم عصروں کی شہادتیں مل جاتی ہیں تو ان کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ ان لوگوں کی تحریروں اور بیانات کے مقابلہ میں جو کچھ زمانہ کے بعد قلمبند ہوئے ہیں۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے لئے اوّلین ماخذ قرآن حکیم ہے۔ اس کے بارے میں اہل اسلام کا عقیدہ تو یہ ہے کہ یہ اللہ رب العالمین کا کلام ہے جو اس نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا ہے اس

---

[1] یہ رائے ان تمام مغربی محققین کی ہے جنہوں نے بائیبل کا تنقیدی مطالعہ کیا ہے۔ مثال کے لئے ملاحظہ ہو۔

1- THE STORY OF BIBLE, LIBRARY EDIION, VOL.1, PP.7-14-

2-THE INTERNATIONAL CRITCAL COMMENTORY ED BY I SKINNEV

لئے اس میں حقیقت ہی حقیقت ہے ۔ اس کے سوا کچھ اور نہیں۔ اس میں ماضی کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ حق ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے معاصرین اور عہد کے بارے میں جو تفصیلات بیان کی گئی ہیں وہ سب ہر قسم کے شک و شبہ سے بالا تر ہیں۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے لیے اولین ماخذ قرآن حکیم ہے۔ اس کے بارے میں اہل اسلام کا عقیدہ تو یہ ہے کہ یہ اللہ رب العالمین کا کلام ہے جو اس نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا ہے اس لئے اس میں حقیقت ہی حقیقت ہے، اس کے سوا کچھ اور نہیں۔ اس میں ماضی کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ حق ہے، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے معاصرین اور عہد کے بارے میں جو تفصیلات بیان کی گئی ہیں وہ سب ہر قسم کے شک و شبہ سے بالا تر ہیں۔

البتہ غیر مسلموں کا نظریہ ذرا مختلف ہے۔ ان کے نزدیک قرآن خدا کا کلام نہیں ہے بلکہ خود حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف ہے (یعنی آپؐ کا کلام دوسرے لوگوں نے سن کر لکھا ہے کیونکہ آپؐ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے) اس اعتبار سے اس کا حکم وہی ہے جو ایک خود نوشت سوانح عمری کا ہوتا ہے۔ اس کی بہت سی باتیں بالکل صحیح اور یقیناً قابل تسلیم ہیں لیکن دیگر باتیں، بالخصوص رسالت سے متعلق، ناقابل تسلیم ہیں۔

اس بنیادی اختلاف سے قطع نظر مسلمانوں اور غیر مسلموں، سب کا اس پر اتفاق ہے کہ موجودہ قرآن حرف بحرف وہی ہے جو آج سے تقریباً چودہ سو سال پہلے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ادا ہوا تھا اور اس پوری مدت میں اس کے اندر ایک لفظ کی بھی کمی بیشی نہیں ہوئی ہے[1]۔ اس لیے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے لئے قرآن نہایت مستند ذریعۂ معلومات ہے۔ اس کے مضامین اور بیان کردہ بعض واقعات کو اگرچہ غیر مسلم مفکرین تسلیم نہیں کرتے لیکن یہ سب ہی مانتے ہیں کہ قرآن تحریف سے بالاتر کتاب ہے جبکہ ماضی کے دوسرے رہ نماؤں کے اپنے بیانات صحت کے ساتھ نقل ہو کر ہم تک نہیں پہنچے ہیں۔

دوسرا اہم ماخذ احادیث کا مجموعہ ہے۔ اس میں بالاتفاق حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا کلام ہے۔ یعنی آپؐ کے خطبات، قرآنی آیات کی تشریحات، نصیحتیں، آپؐ سے کئے گئے سوالات کے جوابات، حالات پر تبصرے، آپؐ کے اخلاق و عادات، آپؐ کا طرز زندگی، شب و روز کے مشاغل، لوگوں کے بارے میں آپؐ کی آرائیں، آپؐ کے معاصرین کے تبصرے اور آپؐ کے بارے میں ان کے تاثرات، سب ہی شامل ہیں۔

ان تفصیلات کے نقل کرنے والے آپؐ کے اصحاب ہیں جو آپؐ کی صحبت سے فیض یاب تھے اور جن کے بارے میں عام رائے یہی ہے کہ انہوں نے اپنی دانست میں ہر بات نہایت سچائی اور ایمانداری کے ساتھ نقل کی ہے۔ اس میں مبالغہ

---

[1] مثال کے لئے دیکھئے، ولیم میور، سیرت رسولؐ، مقدمہ صـ ۲۶، رچرڈ بیل (RICHARD BELL) مقدمہ قرآن، صـ ۴۴

ہے نہ غلط بیانی۔ اس لئے جو کچھ صحابہؓ نے نقل کیا ہے اس پر اعتبار نہ کرنے کی کوئی معقول وجہ موجود نہیں۔

پھر ان اصحاب سے اس جماعت نے یہ تفصیلات سن کر نقل کی ہیں۔ جو تابعین کے نام سے مشہور ہیں۔ اور یہ لوگ صحابہؓ کے تربیت یافتہ اور ایمان داری، حافظہ کی پختگی اور تقویٰ میں مشہور تھے۔ اسی طرح دوسری نسل جو ان کے بعد آئی تبع تابعین سے فیض یافتہ اور نیکی و ایمانداری میں مشہور تھے۔ روایت کا یہی سلسلہ جاری رہا۔ یہاں تک کہ ائمہ حدیث نے اس علمی سرمایہ کو قلمبند کر دیا اور پھر سب طرف شائع ہو گیا۔

اس مجموعہ کی چند قابلِ ذکر خصوصیات حسبِ ذیل ہیں۔

۱۔ اس میں جہاں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا کلام ہے وہاں معاصرین کے بیانات بھی ہیں۔ انہوں نے بچشم خود جو کچھ دیکھا، سُنا اور محسوس کیا ہے وہ بھی نقل ہو گیا ہے علمی اور تاریخی اعتبار سے معاصرین کی یہ شہادتیں بہت اہمیت رکھتی ہیں، بالخصوص جبکہ دوسری اہم شخصیات کے معاصرین کے بیانات سرے سے ملتے ہی نہیں اور اگر کچھ نقل بھی ہوا ہے تو صحت کے ساتھ نہیں۔

۲۔ ان معاصرین کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہے۔ ان میں ہر قسم کے لوگ شامل ہیں۔ عرب بھی اور عجمی بھی، امیر بھی، غریب بھی، عام افراد بھی اور قبائل و اقوام کے سردار بھی۔ وہ لوگ بھی جن کے سامنے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ہوئی تھی اور وفات بھی ہوئی۔ وہ بھی جو بچپن کے ساتھی تھے، وہ بھی جنہوں نے آپ کا عہد شباب دیکھا تھا۔ آپ کے قریبی عزیز، دوست، احباب، پڑوسی اور ہم وطن، تجارت و کاروبار میں شریک رہنے والے وہ بھی جنہوں نے دور سے دیکھا تھا، وہ بھی جنہوں نے قریب سے مشاہدہ کیا تھا۔ ایسے بھی جو لمحہ دو لمحہ آپؐ کے ساتھ رہے اور وہ بھی جو مدتوں آپؐ کے ساتھ رہے، آپؐ سے محبت کرنے والے۔ آپؐ کے اشارے پر گردن اتروا دینے کے لئے تیار رہنے والے بھی تھے اور وہ بھی جو کبھی شدید مخالف اور کٹر دشمن رہے تھے۔ اور ان میں آپؐ کی نجی زندگی کو نہایت قریب سے دیکھنے والی جماعت بھی ہے۔ یعنی ازواج مطہرات۔

۳۔ یہ تمام صحابہ اور صحابیات آپ کی زندگی کے مختلف گوشوں اور پہلوؤں کے بارے میں ساری تفصیلات محفوظ کر کے نہایت اہتمام اور احتیاط کے ساتھ نقل کرتے ہیں۔ سب عینی شاہد ہیں۔ گھر سے باہر آپؐ کا کوئی لمحہ (بالخصوص اعلان رسالت کے بعد) ایسا نہیں گزرا جب کہ کوئی نہ کوئی صحابی آپؐ کے ساتھ نہ ہو۔ اسی طرح آپؐ کا گھر کے اندر بھی کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرتا تھا جبکہ ازواج مطہرات میں سے کوئی یا قریبی عزیز آپؐ کے مشاغل کو دلچسپی سے نہ دیکھ رہا ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کے گرد مختلف فاصلوں پر اور مختلف زاویوں سے بے شمار کیمرے نصب تھے جو آپؐ کی ہر نقل و حرکت کو محفوظ کرتے چلے جا رہے تھے اور ایسے آلات لگے ہوتے تھے جو آپؐ کے ہر ہر لفظ کو ریکارڈ کر رہے تھے، اس میں نہ دن کی قید تھی، نہ رات، نہ گھر کی نہ باہر کی۔

اب آپ ساری دنیا کی تاریخ پڑھ جایئے ایک ایک ورق چھان لیجئے اور دیکھئے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی ہستی ایسی نظر آتی ہے۔ جس کی زندگی کے تمام شعبوں کے ساتھ یہ اہتمام ہوا ہو؟ ناممکن، ناممکن۔

اگر مشینوں کے ذریعے تصاویر اور آواز ریکارڈ کرنے اور پھر ان کو منتقل کرنے کے عمل میں کبھی کبھی نقص اور خامی کا امکان ہے تو اگر یہی کام انسانوں کے ذریعہ ہو تو کچھ نہ کچھ کمی رہ جانے کا قوی احتمال ہے اور یہی ہوا بھی ہے۔ تمام احادیث پر نظر ڈالنے سے ہر شخص اسی نتیجہ پر پہنچنے پر مجبور ہے کہ اس میں نہایت مستند، مضبوط، شک و شبہ سے بالاتر احادیث بھی ہیں، کچھ کمزور، کم تر درجہ کی احادیث بھی ہیں اور موضوع بھی۔ اصلی بھی ہیں اور نقلی بھی۔ لیکن اصل کی طرف رجوع کر کے جعلی اور نقلی الگ کی جاسکتی ہیں اور کر بھی دی گئی ہیں اور آئندہ اس عمل پہ پابندی بھی نہیں ہے۔

اس کے باوجود ایک بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے۔ وہ یہ کہ نقل و روایت کے جو بہتر سے بہتر طریقے اس آسمان کے نیچے ممکن تھے وہ سب ہی استعمال کر لئے گئے ہیں اور ان سے بہتر ممکن بھی نہیں[1]

احادیث کے بعد سیرت اور تاریخ کی کتابوں کا نمبر آتا ہے۔ اسناد کا اہتمام گو یہاں بھی ہے۔ لیکن اتنی شدت اور احتیاط کے ساتھ نہیں۔ اس لئے صحت کے اعتبار سے ان کا وہ درجہ نہیں جو کتب حدیث کا ہے۔ پھر بھی دنیا کی دوسری سیرت و تاریخی کتب سے کسی طرح کم بھی نہیں۔

بہر حال ان مآخذ نے اتنا علمی سرمایہ مہیا کر دیا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں کہ جس کے بارے میں معلومات نہ ہوں۔ اب ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ مختلف پہلوؤں کو سامنے رکھ کر آپؐ کی شخصیت کو سمجھنے اور آپؐ کا مقام متعین کرنے میں مدد ملتی، لیکن ہوا یہ کہ کوئی بھی شناور اس بحر کی تہ کو نہ پاسکا جس کے ہاتھ جو موتی بھی آگیا اسی کو اپنی کاوش کا ثمرہ سمجھ لیا۔ آپؐ کی سیرت کا ہر پہلو اپنی تاب ناکی کے ساتھ اُبھر آیا کہ جس کی نظر ایک پہلو پر پڑ گئی اسی پر ساری توجہ مرکوز ہو گئی۔ دوسرے تمام پہلوؤں پر نظر نہ جا سکی اور کوئی بھی تمام پہلوؤں کا احاطہ نہ کر سکا کسی نے بحیثیت رسول آپؐ کی سیرت پر نظر ڈالی تو تحقیقات کا دریا بہاتا چلا گیا لیکن بحیثیت رسول آپؐ کا کیا مقام ہے اس کا کوئی ادراک نہ کر سکا۔ آپؐ نے ایک بگڑے ہوئے معاشرہ کی اصلاح فرمائی، یہ دیکھ کر کسی نے آپؐ کو ایک مصلح کی حیثیت سے پیش کیا لیکن اصلاحات کے دائرہ کی وسعت اور قلیل مدت میں حیرت انگیز کامیابی پر نظر پڑی تو اس کے سوا کچھ نہ کہہ سکا کہ آپ جیسا کوئی مصلح نہیں گزرا۔ کسی نے آپؐ کے لائے ہوئے دین کو ایک انقلاب سے تعبیر کرتے ہوئے آپؐ کو انقلابی رہنما سمجھ لیا لیکن یہ انقلاب بھی بے مثل تھا۔ کسی نے آپؐ کو ایک عظیم رہنما کہا تو کسی نے محسن انسانیت، رحمت للعلمین، کسی نے بہترین نمونۂ حیات کہہ کر خراج عقیدت پیش کیا۔ کسی نے آپؐ کی سیاست، عدالت، غربا پروری، امانت اور دیانت کو موضوع بنایا کسی نے معاشرت اور ازدواجی زندگی کو اجاگر کیا۔ اس طرح ہر ہر پہلو پر مستقل کتابیں لکھ ڈالیں لیکن سفر ختم کرنے کے بعد بھی معلوم ہوا کہ تحقیق کی راہیں

---

[1] موضوع ذرا پیچیدہ اور وضاحت طلب ہے لیکن اس علم کے ماہرین تفصیلات کو ذہن میں پھیلالیں تو اسی نتیجہ پر پہنچیں گے۔ یہاں اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں۔

ئے ابواب کھلی ہیں۔ نہ تو کسی ایک پہلو پر کام مکمل ہو سکا۔ نہ سارے پہلوؤں کا احاطہ ہو سکا۔ کوششیں جاری ہیں، ہر لمحہ نئے انداز سے آپؐ کی سیرت پر تحقیق ہو رہی ہے۔ نئے نئے گوشے ابھر رہے ہیں اور ہر میدان میں آپ کی امتیازی شان نمایاں ہوتی چلی جا رہی ہے۔

آپ تاریخ عالم کی منتخب ہستیوں کے کارناموں کو سامنے رکھ لیجیے۔ پھر اسی شعبہ میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کارناموں پر ایک نظر ڈالیے، آپ اس کے سوا کچھ اور نہیں کہہ سکیں گے کہ کسی بھی جہت سے کائنات میں آپؐ کا ثانی نہیں ہے! کوئی گل ہے تو آپؐ یقیناً لاجواب چمن ہیں۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

یہ بات ہم بلاشبہ عقیدت کی بنا پر کہہ رہے ہیں۔ اس کے اظہار میں ہمیں قطعاً تردد نہیں اور اسے اپنی خوش نصیبی ہی سمجھتے ہیں کہ آپؐ کی ذات سے عقیدت کی نعمت سے نوازے گئے۔ لیکن یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے کہ حقیقت بھی یہی ہے یعنی آپؐ کا ثانی نہیں ہے (انسانوں میں اور پوری کائنات میں) خالق کائنات کا بہترین اور حسین ترین کوئی شاہکار ہے تو وہ آپؐ ہی کی ذات ہے۔ اب ملاحظہ فرمایئے اس حقیقت کی کچھ جھلکیاں ———

جب بھی دنیا میں خرابی پھیلی ہے، جب بھی انسانی معاشرہ میں فساد رونما ہوا ہے تو کچھ نہ کچھ لوگ اصلاح کے لئے کھڑے ہوئے ہیں اور کبھی کبھی اپنی کوششوں میں کامیاب بھی ہو گئے ہیں۔ ان تمام اصلاحی کوششوں کی چند مشترک خصوصیات یہ رہی ہیں۔

۱۔ اصلاحات کا دائرہ ہمیشہ زندگی کے چند مخصوص شعبوں تک محدود رہا ہے۔ مثلاً اگر کسی نے مذہبی شعبہ میں اصلاح کی کوشش کی تو سیاسی اور معاشی نظام سے تعرض نہیں کیا، کسی نے معاشی نظام کی خرابیاں دور کرنی چاہیں تو مذہب و اخلاق کو نظر انداز کر دیا، تو کسی نے سارے مسائل کا حل سیاسی نظام کی اصلاح میں منحصر سمجھ لیا۔ اس کا نتیجہ ہمیشہ یہی نکلا ہے کہ اول تو کسی بھی شعبہ میں اصلاح نہیں ہو سکی اور اگر وقتی طور پر کچھ خرابیاں دور ہو بھی گئیں تو پہلے سے زیادہ شدت کے ساتھ دوسرے شعبوں میں خرابیاں پھیل گئیں اور جزوی اصلاحات کا ایک نہ ختم ہونے والا چکر شروع ہو گیا۔

۲۔ جتنے بھی مشہور مصلحین گزرے ہیں۔ ان کی نظریں ہمیشہ ایک مخصوص طبقہ یا زیادہ سے زیادہ اپنی قوم پر مرکوز رہی ہیں۔ اس لئے ان کے کارنامے وقتی رہے ہیں اور ان کے اثرات بہت محدود۔

اس کے برخلاف حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی کے صرف ایک نہیں بلکہ تمام شعبوں میں اصلاح فرمائی ہے۔ اس کوشش میں نہ صرف یہ کہ آپ قلیل مدت میں کامیاب بھی ہو گئے بلکہ ہزاروں مصلحین کی ایک جماعت تیار فرما دی۔

دوسری اہم خصوصیت یہ رہی ہے کہ ابتدا ہی سے آپؐ نے تمام انسانوں کو خطاب فرمایا اور قومی نہیں انسانی معاشرہ کی اصلاح کو اپنا نصب العین بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ آپؐ کے کارنامہ نے نوع انسانی کو متاثر کیا ہے نہ کہ کسی طبقہ یا ملک کو۔

یہی اصلاحی کوشش جب ذرا وسیع پیمانہ پر زیادہ شدت سے کی جاتی ہے تو اسے انقلاب سے تعبیر کر دیا جاتا ہے اسلام کو بھی ایک انقلاب سے تعبیر کیا گیا ہے۔ آیئے دیکھیں آپؐ نے اسلام کے ذریعہ کس نوع کا انقلاب برپا کیا۔

انقلاب کے معنی ہیں مروجہ نظام میں اہم اور بنیادی تبدیلی۔ یہ تبدیلی خواہ سیاسی نظام میں ہو یا معاشی یا معاشرتی نظام میں، جب رونما ہوتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پرانا نظام یکسر ختم ہوگیا۔ ایک دور کا خاتمہ ہوگیا اور ایک نئے دور کا آغاز ہوگیا۔ یہ عمل بہ تدریج پُرامن طریقہ سے نہیں بلکہ یک لخت، اچانک شدت کے ساتھ اور طاقت کے بل پر ہوتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں طاقت، حکومت اور معاشی وسائل انقلابیوں کے ہاتھوں میں پہنچ جاتے ہیں۔ اس طرح قدیم نظام الٹ دیا جاتا ہے۔ اور اس کی جگہ ایک دوسرا ہی نظام قائم کر دیا جاتا ہے۔

بادی النظر میں یہ بنیادی تبدیلی اچانک (بہت قلیل مدت میں) ہوتی ہے لیکن واقعتاً ایسا نہیں ہوتا۔ اصل انقلاب کے رونما ہونے سے بہت پہلے سے اس کے لئے زمین ہموار ہوتی ہے۔ ہوتا یوں ہے کہ مدتوں تک مروجہ نظام کی خرابیاں علانیہ بیان کی جاتی ہیں۔ تحریر و تقریر کے ذریعہ لوگوں کو یقین دلایا جاتا ہے کہ موجودہ نظام فرسودہ ہوچکا۔ اپنی افادیت کھوچکا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس نظام کو ہٹا کر اس سے بہتر نظام قائم کیا جائے۔ اس تبدیلی کے لئے مدتوں تک لوگوں کے ذہنوں کو تیار کیا جاتا ہے پھر جب ایک خاص طبقہ اس تبدیلی کا خیر مقدم کرنے کے لئے تیار ہوجاتا ہے تو پھر باقاعدہ کوششیں شروع ہوتی ہیں۔ انقلابیوں کی سرگرمیوں میں شدت آجاتی ہے۔ تشدد کا سہارا لیا جاتا ہے مروجہ نظام پر ضربیں لگائی جاتی ہیں۔ ادھر وہ بوسیدہ ہوتا ہے اور ادھر انقلابی آخری چوٹ لگا دیتے ہیں۔ بس یہی آخری کامیاب وار انقلاب کے نام سے موسوم ہوجاتا ہے۔

انقلاب کے لئے بنیادی شرط یہی ہے کہ اس سے پہلے مروجہ نظام کے خلاف عوام یا معاشرہ کے ایک طبقہ میں بےچینی پیدا ہوچکی ہو اور وہ اس کو الٹنے کے لئے تیار ہوجائیں۔ ورنہ انقلاب رونما ہی نہیں ہوسکتا۔ اس کو منظم طریقہ سے اشتراکیوں نے یوں پیش کیا ہے کہ ہمیشہ سے معاشرہ میں طبقاتی کشمکش برپا رہی ہے۔ طاقت ور طبقہ معاشی وسائل پر قابض رہا، اور کمزور طبقہ کو دباتا رہا۔ ان دونوں کے درمیان کشمکش شدت اختیار کرتی رہی اور بالآخر کمزور طبقہ منظم ہوا اور اس نے وسائل پر قابض طبقہ کو اکھاڑ پھینکا اور خود وسائل پر قابض ہوگیا۔ پھر اس کا ایک حریف طبقہ ابھرا اور از سر نو کشمکش شروع ہوگئی۔ جاگیرداروں کے خلاف کسان اٹھے۔ سرمایہ داروں کے خلاف مزدور، دنیا میں ہمیشہ اور ہر انقلاب کے پس پردہ یہی طبقاتی کشمکش رہی ہے۔ جس کا ایک کامیاب مظاہرہ روس کے ۱۹۱۷ء کے انقلاب میں ہوا ہے، اس کے علاوہ سیاسی حقوق کے لئے کامیاب جدوجہد، غیر ملکیوں کو نکالنے اور نوآبادیات کے خلاف جو تحریکیں کامیاب ہوئی ہیں انہیں بھی انقلاب سے موسوم کیا گیا ہے۔ مثلاً

برطانیہ کا شاندار انقلاب، فرانس کا اٹھارویں صدی کا انقلاب، پھر اس کو اور وسعت دے کر صنعتی اور ثقافتی تبدیلیوں کو بھی انقلاب کی تعریف میں شامل کر لیا گیا۔

مختصر یہ کہ تبدیلی کی کوشش خواہ کسی بھی شعبہ میں ہوئی ہو اگر کامیاب ہوگئی اور اس کے اثرات بہت گہرے ہوتے ہیں تو اسے انقلاب کے نام سے موسوم کر دیا گیا ہے۔

جہاں تک اسلام کا تعلق ہے تو اس اعتبار سے یقیناً یہ ایک انقلاب تھا جس نے جاہلیت کے نظام کو الٹ کر اس کی جگہ اسلامی نظام قائم کر دیا اور نہ صرف عربوں بلکہ ان تمام لوگوں کی زندگی میں اہم اور بنیادی تبدیلی کر دی جنھوں نے اس کا خیر مقدم کیا۔ لیکن اس کے علاوہ دوسری تمام خصوصیات کے اعتبار سے یہ دنیا کے تمام انقلابوں سے بالکل مختلف تھا۔

پہلی بات تو یہ کہ انقلاب کے لئے ضروری ہے کہ مروجہ نظام کے خلاف ایک عام بے چینی پائی جاتی ہو۔ تاریخ شاہد ہے کہ پوری سرزمین عرب میں مروجہ نظام حیات جسے جاہلیت سے تعبیر کیا جاتا ہے کے خلاف کہیں بے چینی نہیں تھی بلکہ ہر فرد اس سے نہ صرف یہ کہ مطمئن تھا اس کے تحفظ کے لئے جان کی بازی لگا دینے کے لئے تیار تھا۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب صدائے انقلاب بلند کی ہے اس سے ایک لمحہ پہلے بھی کسی نے اپنی تقریر یا تحریر سے اس انقلاب کے لئے زمین ہموار نہیں کی تھی۔ جبکہ دوسرے تمام انقلابات سے مدتوں پہلے ذہنوں کو تیار کیا گیا ہے۔

اتنا ہی نہیں انقلاب کے اعلان میں آپ کا ایک بھی ہمنوا اور ہمخیال موجود نہیں تھا۔ کسی بھی انسان کے ذہن میں آنے والے انقلاب کا ہلکا سا بھی تصور نہیں تھا۔[لہ] یہ انسانی تاریخ میں واحد انقلاب ہے جس کی ابتدا صرف ایک شخص نے کی اور اس کو بلندیوں تک پہنچا دیا۔ ورنہ دنیا میں جتنے انقلاب برپا ہوئے ہیں ان کے پیچھے انقلابیوں اور ان کے حامیوں کی منظم جماعت پہلے سے موجود رہی ہے۔

دوسری اہم خصوصیت یہ تھی کہ یہ کسی طبقاتی کشمکش کا نتیجہ نہیں تھا۔ مکہ یا پوری دنیائے عرب میں کہیں بھی زمین داروں (جاگیرداروں) اور کسانوں یا سرمایہ داروں اور مزدوروں کے درمیان کشمکش نہیں تھی۔ دو منظم طبقے اقتدار کے لیے برسرِ پیکار نہیں تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسانوں یا مزدوروں کو جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے خلاف نہ بھڑکایا نہ اس قسم کی کوئی تحریک چلائی۔ انقلاب کے منشور (لا الٰہ الا اللّٰہ) میں کہیں اس کی طرف اشارہ تک نہیں تھا۔ آپؐ کی دعوت پر امیر بھی آئے اور غریب بھی، مخالفت کی تو دونوں نے۔ اس سے اشتراکی نظریہ کی جڑ ہی کٹ جاتی ہے۔ جس کی رو سے ہر انقلاب کی تہ میں طبقاتی کشمکش کارفرما ہوتی ہے۔

تیسری خصوصیت یہ تھی کہ اسلامی انقلاب کا رُخ زندگی کے کسی ایک شعبہ کی طرف نہیں تھا۔ یعنی یہ محض مذہبی، سیاسی، معاشی یا معاشرتی انقلاب نہیں تھا بلکہ انسان کی پوری زندگی اور زندگی کے ہر شعبہ میں بنیادی تبدیلی لانے کا اعلان تھا اور اس نے کیا بھی یہی جبکہ دنیا کے تمام انقلابات جزوی تھے یعنی انہوں نے صرف ایک ہی شعبہ میں تبدیلی کی یا توسیع کی

لہ گنتی کے چند لوگ، آپ کی بعثت کے وقت ضرور ایسے تھے جو بُت پرستی سے بیزار تھے، انہیں حنیف کہا جاتا ہے اوّل تو ان کا اختلاف ایک ذاتی اور نظریاتی تھا۔ دوسرے انہوں نے بُت پرستی کے خلاف کوئی تحریک نہیں چلائی۔ تیسرے یہ کہ اُن کے سامنے بت پرستی کے مقابلہ پر کوئی دوسرا مذہب واضح طور پر نہیں تھا۔ جسے وہ نعم البدل کے طور پر قبول یا پیش کرتے، نیز اگر عربوں یا دوسرے ممالک میں کہیں بھی مروجہ نظام کے خلاف بے چینی پائی جاتی تو لوگ اسلام کی اس شدت سے مخالفت نہ کرتے اور اپنے روائتی نظام کے تحفظ کی خاطر جان و مال کی بازی نہ لگاتے۔

نظام بدل دیا یا معاشی، مذہبی یا ثقافتی، دنیا کی تاریخ میں کسی ایسے انقلاب کی نشاندہی نہیں کی جا سکتی جو زندگی کے تمام شعبوں میں تبدیلی لانے کے لئے کیا گیا ہو۔

اس انقلاب کی چوتھی خصوصیت یہ تھی کہ برسر اقتدار طبقہ کو حکومت سے محروم کرنے کی کوشش کی گئی نہ معاشی وسائل پر قبضہ کرنے کو نصب العین بنایا گیا، جیسے کہ دوسرے انقلابات (انقلاب فرانس اور انقلاب روس) میں ہوا اسلام کا انقلاب نہ کسی مخصوص طبقہ کے حقوق کے لئے تھا نہ کسی خاص طبقہ کی مخالفت میں تھا اس لئے جب لوگوں نے لبیک کہا تو ہر طبقے کے لوگ اس میں شامل نظر آنے لگے۔ وہی لوگ جاہلیت کے نظام سے وابستہ تھے اب اسلام کے علمبردار بن گئے۔ حضرت حمزہؓ، عمر فاروقؓ، عمرو بن العاصؓ، اور خالد ابن ولیدؓ جیسے نہ جانے کتنے باصلاحیت افراد اسلام سے وابستہ ہو کر اور زیادہ چمک اٹھے۔ اس کے برخلاف جب دوسرے انقلابات آئے ہیں تو مخالفین کا صفایا کر دیا گیا ہے۔ نہ ان کی اصلاح کی کوشش کی گئی نہ انہیں معاف ہی کیا گیا (جیسا کہ فرانس اور روس میں ہوا)

ایک اور اہم خصوصیت اسلامی انقلاب کی یہ تھی کہ اس سے وابستہ افراد کی پہلے تربیت کی گئی۔ مکہ اور مدینہ کے ماحول میں ہر طرح کے حالات اور آزمائشوں سے گزارا گیا اور جب وہ خالص سونے کی طرح نکھر گئے تب انہیں اقتدار سونپا گیا، چنانچہ جب یہ تربیت یافتہ جماعت (صحابہ) انقلاب اسلام کی علمبردار بن کر اٹھی تو پھر دنیا کی دولت، ہیرے اور جواہرات کے ڈھیر انہیں نصب العین سے نہ ہٹا سکے اور نہ ایران و روم کے سورما، فوجوں کے سیلاب، پہاڑ، دریا اور سمندر ان کی پیش قدمی کو روک سکے اور یہ بہت ہی قلیل مدت کے اندر اس وقت کی مہذب دنیا کے حکمران بن گئے۔ محکوم اقوام نے ان کا خیر مقدم کیا اور اپنے ہم قوم فرماں رواؤں پر ترجیح دی۔ ان کا دور حکومت ان کے لئے نعمت ثابت ہوا، لیکن جب دوسرے لوگوں نے سیاسی اور معاشی انقلاب برپا کیا تو ابتداء ہی سے اپنا مقصد یہ بنا لیا کہ کسی نہ کسی طرح اقتدار اور معاشی وسائل پر قبضہ کر لیں۔ چنانچہ آن کی آن میں انقلابیوں نے حکومت پر قبضہ تو کر لیا لیکن انقلاب کے بعد اقتدار جن لوگوں کو سونپا گیا ان کی پہلے سے تربیت نہیں کی گئی تھی۔ انہیں صرف اقتدار کی ہوس تھی وہ پوری ہو گئی اور پھر دنیا نے دیکھ لیا کہ ظالموں کا ایک طبقہ جو صاحب اقتدار تھا، ہٹ گیا لیکن اس کی جگہ ظالموں کا دوسرا طبقہ برسر اقتدار آ گیا۔ پہلے اگر جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے نام سے ظلم ہو رہا تھا تو اب "کسانوں اور مزدوروں" کی طرف سے ظلم کی چکی چلنے لگی۔

چھٹی خصوصیت، انسانی تاریخ میں، اسلام سے پہلے کوئی انقلاب ایسا رونما نہیں ہوا۔ جسے انسانی اور عالمگیری انقلاب کہا جا سکے۔ دنیا میں جتنے انقلابات برپا ہوئے ہیں وہ زیادہ سے زیادہ قومی انقلاب تھے۔ وہ انگلینڈ و امریکہ کا انقلاب ہو یا فرانس، اٹلی یا روس کا، سب کا مقصد زیادہ سے زیادہ اپنے ملک میں تبدیلی لانا تھا۔ انقلابیوں کے سامنے ایک مخصوص طبقہ یا اپنی ہی قوم کا مفاد تھا۔ اس سے باہر نہ ان کی نظریں اٹھیں نہ دوسرے اس میں شریک ہوئے مثلاً فرانس میں انقلاب برپا ہوا تو ہندوستان کا اس سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا۔ فرانس کے لوگ صرف فرانس ہی کے نظام میں تبدیلی کے لئے جدوجہد کر رہے تھے، ان کا مقصد کبھی یہ نہیں رہا کہ ایسی ہی تبدیلی ساری دنیا میں ہو، اور ساری

دنیا کے مروجہ نظام الٹ کر ایسا ہی نظام قائم ہوجائے جیسا کہ وہ فرانس میں لانا چاہتے تھے۔ یہی بات دوسرے انقلابات کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔

ساتویں اور نہایت اہم خصوصیت:۔ دنیا میں جتنے بھی انقلاب آئے ہیں ان سب کا منبع و مخرج اسی دنیا کا ماحول تھا۔ مفکرین نے مروجہ نظام میں خرابیاں محسوس کیں، ان کا علانیہ اظہار کیا۔ غور و فکر کے بعد ایک دوسرے نظام کا خاکہ بنایا، اس کے لئے ذہنوں کو تیار کیا اور پھر انقلابیوں نے لائحہ عمل بنایا اور اس کو عملی شکل دی، مختصر یہ کہ ابتدا سے لے کر انتہا تک انسانی فکر و عمل کی کارفرمائی رہی ہے اور ہر انقلاب کے بانی اور رہنما اپنے ہی ذہن سے فیصلے کرتے رہے ہیں۔ ان سے کوئی (کامیاب) انقلاب ماورائی طاقت کے نام سے نہیں ہوا، وہ چاہے روس کا انقلاب ہو یا فرانس کا۔[1]

اس کے برعکس اسلام کا انقلاب کسی انسانی ذہن کی بنا پر رونما نہیں ہوا۔ اس کا لائحہ عمل ایک یا بہت سے انسانوں نے تیار نہیں کیا۔ اس کے لئے ہدایات کسی بھی انسان کی طرف سے نہیں دی جا رہی تھیں۔ یہ انقلاب اللہ کی طرف سے اور اسی کے نام سے رونما ہوا ہے۔ یہ بات ابتدا ہی سے واضح کر دی گئی تھی کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنی طرف سے کچھ نہیں فرما رہے تھے، آپ فیصلے کر رہے تھے نہ ہدایات دے رہے تھے بلکہ آپ کی طرف جو کچھ وحی کیا جا رہا تھا اسی کا اعلان فرما رہے تھے۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝ (النجم، ۵۳ / ۳-۴)

وہ اپنی خواہش نفس سے نہیں بولتا، یہ تو ایک وحی ہے جو اس پر نازل کی جاتی ہے۔

مروجہ (جاہلیت کے) نظام کو الٹنے اور اس کی جگہ دوسرا نظام قائم کرنے کا فیصلہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم یا کسی دوسرے انسان کی طرف سے نہیں ہوا تھا۔ اس کا فیصلہ اللہ رب العالمین کی طرف سے ہوا، اُسی کی طرف سے لمحہ بہ لمحہ ہدایات آتی رہیں اور اسی کے حکم کے مطابق یہ انقلاب شروع ہوا اور مختلف مراحل سے گزر کر پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ اس کا مکمل منشور (قرآن حکیم) اسی کی طرف سے نازل ہوا۔ یہ ایک الٰہی انقلاب تھا جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ رونما ہوا۔ یہ اپنی نوعیت کا واحد کامیاب اور عالمگیر انقلاب تھا۔ اس سے پہلے تاریخ میں کوئی انقلاب اس طرح نہ برپا ہوا اور نہ اس طرح پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

بلاشبہ اللہ کے دوسرے بہت سے انبیاء بھی اسلامی انقلاب کے نقیب تھے لیکن بہت کم اپنے مشن میں کامیاب ہوئے اور جو ہوئے بھی تو ان کے انقلاب کا دائرہ صرف ان ہی کی قوم تک محدود رہا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کوئی نبی یا رسول پوری نوع انسانی کی طرف نہیں بھیجا گیا۔ یہ صرف آپؐ ہی کی خصوصیت ہے کہ آپ پوری نوع انسانی کی اصلاح اور ہدایت کے لئے کھڑے کئے گئے ہیں۔ ارشاد ہے:

---

[1] عام طور پر ان ہی دو انقلابات کے زیادہ چرچے ہیں۔

قُلْ يَآ يُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا (الاعراف ۷ / ۱۵۸)

(اے پیغمبر! تم لوگوں سے) کہو "اے افرادِ نسلِ انسانی میں تم سب کی طرف خدا کا بھیجا ہوا آیا ہوں ...

اس مختصر سے جائزہ سے یہ بات تو واضح ہو ہی جاتی ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا انقلاب دنیا کے تمام انقلابات سے بالکل مختلف اور بے مثل انقلاب تھا۔ اسی طرح بحیثیت رہ نما بھی آپ کی امتیازی شان نمایاں ہے۔

دنیا کی تاریخ رہ نماؤں سے بھری پڑی ہے لیکن سب کے بارے میں مندرجہ ذیل خصوصیات بالکل واضح ہیں۔

۱۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جتنے عظیم رہ نما گزرے ہیں ان کی تعلیمات اور ان کے حالاتِ زندگی چونکہ محفوظ نہیں رہ سکے اس لئے یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ اُن کے پیروؤں نے اُن کی تقلید کی، اُن کے بتائے ہوئے راستے پر چل رہے ہیں یا حالات کی مناسبت اور وقت کے تقاضوں کے مدنظر خود ہی راہیں تلاش کیں اور اصول بنالئے اور پھر ان سب باتوں کو ان رہ نماؤں کی طرف منسوب کر دیا۔

۲۔ یہ بات بھی واضح ہے کہ دنیا میں جتنے رہ نما بھی گزرے ہیں وہ کسی گروہ یا قوم کی ہدایت کے مدعی تھے انہوں نے کبھی ساری دنیا کے انسانوں کی رہ نمائی کا دعویٰ نہیں کیا۔

۳۔ ان میں سے کسی بھی رہ نما کے بارے میں دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ کسی ایک ہی قوم کی زندگی کے تمام شعبوں میں اس کی پیروی کی جا سکتی ہے۔

۴۔ ان میں سے بیشتر نے صرف اصول بیان کئے ہیں، اپنی تعلیمات کا عملی نمونہ پیش نہیں کیا ہے۔ مثلاً اخلاق کے اعلیٰ اصول تو وضع کر دیئے، ان پر عمل کر کے نہیں دکھایا۔ ایک مثالی معاشرہ کے خد و خال تو بیان کر دیئے، مگر ایسا معاشرہ قائم کر کے نہیں دکھایا۔ حکومت چلانے کے اصول تو بتا دیئے، مگر حکومت چلا کر نہیں دکھائی، ایک متوازن معاشی نظام کی تعریف میں صفحات کے صفحات تو لکھ ڈالے لیکن ایسا نظام قائم کر کے نہیں دکھایا۔

۵۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اصول جب عملی کسوٹی پر پرکھے گئے تو ناقابلِ عمل ثابت ہوئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے پیروؤں نے ان کے بیان کردہ اصولوں میں ترمیم و تنسیخ کی اور ان کے مجوزہ نظام کو بدلتے بدلتے کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔

۶۔ جب یہ رہ نما ایک ہی قوم کی ہر قسم کے بدلتے ہوئے حالات میں رہ نمائی نہیں کر سکتے تو پھر نوعِ انسانی کی ہمیشہ رہ نمائی کرنے کا ان کے بارے تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ اتنی عظیم الشان ذمہ داری سے عہدہ برا ہونے کے لئے انتہائی غیر معمولی صلاحیتوں اور خوبیوں کی ضرورت ہے۔ مثلاً

کسی بھی قافلہ کی رہ بری کرنے کا حق اسی شخص کو حاصل ہے جو منزل سے باخبر ہو۔ محض ظن و تخمین کی بنیاد پر ایک خیالی منزل کی طرف نہ لے جائے۔ منزل اس کی نظر میں ہو، اس کا یقینی علم ہو، راستہ کا پورا علم رکھتا ہو، اس کے نشیب و فراز، خطرات اور سہولتوں سے واقف ہو، سفر کے لئے زادِ راہ اور جملہ ساز و سامان کے بارے میں مکمل ہدایات دے سکتا ہو۔ مسافروں کی ضروریات، ان کی صلاحیتوں اُن کے جذبات اور اُمنگوں کو جانتا ہو

دور سے بیٹھ کر "وعظ و نصیحت، لیکچر و تقریر" ہی سے رہ نمائی نہ کرے بلکہ عملاً رہ نمائی کرے" تاکہ لوگ اس کے پیچھے پیچھے چل سکیں۔

اسی طرح ساری دنیا کے انسانوں کی رہ نمائی کا حق اسی کو حاصل ہو سکتا ہے جو نوعِ انسانی کی منزل سے باخبر ہو۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی اسی آیت کی رو سے (جو ابھی آپ کے ملاحظہ سے گزری ہے) ساری دنیا کے انسانوں کی رہنمائی کرنے کا اعلان فرمایا اور نوعِ انسانی کی منزل کی بھی نشاندہی فرما دی۔ یعنی یہ کہ سارے انسان مرنے کے بعد ایک مقررہ وقت پر زندہ ہوں گے، فرماں روائے کائنات کی عدالت قائم ہوگی، ہر انسان کو اپنے اعمال کا حساب دینا ہوگا، جنہوں نے خالقِ کائنات کے احکام کے مطابق زندگی گزاری ہوگی وہ جنت کی نعمتوں اور اللہ رب العالمین کی رضا سے نوازے جائیں گے، البتہ جنہوں نے اللہ کی نافرمانی میں زندگی گزاری ہوگی عذابِ الٰہی میں مبتلا ہوں گے اور مالکِ کائنات کا ان پر غضب ہوگا۔

ان باتوں کا علم آپ کو کس طرح ہوا۔ خود آپ کے بیان کے مطابق یہ باتیں آپ کو غور و فکر کے بعد لوگوں کی صحبت میں یا کسی اور ذریعہ سے نہیں معلوم ہوئیں بلکہ جس کی عدالت میں سب کو حاضر ہونا ہے اسی نے وحی کے ذریعہ بتائی ہیں[1]۔ اس منزل کے بارے میں آپ کو یقینی علم بھی تھا اور اس کے بعض گوشوں کا آپؐ نے بچشمِ خود مشاہدہ بھی کیا تھا۔ پس آپ جس منزل کی نشاندہی فرما رہے تھے اس کے عینی شاہد بھی تھے[2]۔ آپؐ کے سوا کسی اور انسان کے بارے میں انسانی تاریخ نہیں بتاتی کہ اس نے ماورائی منزل کا مشاہدہ کر کے اس کی تفصیلات بیان کی ہوں۔

اس منزل تک پہنچنے کے لئے انسان کو کیا کرنا ہے، خطرات سے بچ کر کس طرح سفر کرنا ہے، کس طرح زندگی گزارنی ہے، اس کی مکمل تفصیلات قرآن اور حدیث میں موجود ہیں۔ اس معاملہ میں نہ ابہام ہے۔ نہ ضروری معلومات کی کمی۔

اس میں شک نہیں کہ رہ نمائی کے لئے راستہ کے بارے میں تفصیلی علم کا ہونا ضروری ہے لیکن سفر کا تجربہ رکھنا اس سے کہیں زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ کیونکہ اگر کوئی رہ نما اس راستہ پر خود سفر کر چکا ہے جس کی طرف وہ دوسروں کو دعوت دے رہا ہے تو لوگ زیادہ اعتماد کے ساتھ اس کی پیروی کر سکیں گے اور یہ عذر پیش نہیں کر سکیں

---

[1] بہت سی باتوں کے سلسلہ میں دلیل اور ثبوت کی ضرورت محسوس ہو رہی ہوگی، بعض کے بارے میں شکوک و شبہات بھی پیدا ہو رہے ہوں گے، ان پر بحث کرنے سے موضوع کا تسلسل ٹوٹ جائے گا۔ اس کا کچھ ذکر آخر میں ثبوتِ رسالت کے ضمن میں مل جائے گا، ان شاء اللہ۔

[2] معراج کے سلسلہ میں سورہ نجم میں اس کا ذکر ہے، نیز بہت سی احادیث میں اس مشاہدہ کی تفصیلات ہیں۔ جگہ کی کمی کے سبب یہاں اس سے زیادہ تفصیل ممکن نہیں۔

گئے ہر اس راستہ پر سفر نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ اس کے تقاضے پورے نہیں ہو سکتے۔ لیکن تاریخ میں کوئی انسان ایسا گزرا ہے جو ساری دنیا کے انسانوں کے لئے نمونہ حیات بن سکے۔؟

دنیا میں سینکڑوں قومیں آباد ہیں، سب کے جغرافیائی حالات مختلف ہیں کوئی لامحدود وسائل کی مالک ہے تو کوئی ان سب سے محروم، سب کا رہن سہن الگ، تہذیب و تمدن جدا۔ مسائل مختلف مزاج جدا گانہ۔ اب ظاہر ہے سب کا انداز سفر اور طرز زندگی مختلف ہوگا۔ بھلا وہ کونسا انسان ہے جو ان تمام حالات سے گزرا ہو جن سے اقوام عالم گذر چکی ہیں یا آئندہ دو چار ہو سکتی ہیں۔ کیا کسی ایسے رہ نما کی نشاندہی کی جا سکتی ہے جس کے سامنے وہ تمام مسائل آچکے ہوں جن کا اقوام عالم نے سامنا کیا ہے اور کر سکتی ہیں۔

ایسے رہنما گزرے ہیں جنہوں نے امن و سلامتی کا پیغام دیا، پُرسکون زندگی گزاری اور اپنی قوم کو بھی اسی طرح زندگی بسر کرنے کی دعوت دی۔ اس میں شک نہیں پرسکون حالات میں ایسے رہنماؤں کی پیروی کی جا سکتی ہے لیکن دنیا میں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جو فساد برپا کرتے ہیں، لوگوں کو چین سے نہیں رہنے دیتے، ان کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرتے ہیں۔ انہیں آزادی کے حق سے محروم کر دینا اپنا حق سمجھتے ہیں۔ کبھی کبھی ایسے لوگوں یا قوموں سے تصادم ناگزیر ہو جاتا ہے اور جنگ کی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے۔ ان حالات میں کسی رہنما کی زندگی کس طرح نمونہ بن سکتی ہے۔ جس کا جنگ سے کبھی سابقہ ہی نہیں پڑا ؟

اس کے برعکس بعض رہ نماؤں نے صرف فرماں روائی کی ہے کبھی محکوم بن کر نہیں رہے۔ لہٰذا ایک حکمران قوم کو ایسے رہ نما سے ہدایت مل سکتی ہے لیکن اگر وہی قوم محکوم و مظلوم بن جائے تو کس طرح زندگی گزارے، اس صورت میں اس رہ نما کی زندگی نمونہ نہیں بن سکے گی۔

وہ رہنما جس نے تجرد کی زندگی گزاری ہو، ازدواجی زندگی کے لئے نمونہ نہیں بن سکتا، جس نے ترک دنیا کی تعلیم دی ہو۔ جنگلوں اور غاروں میں زندگی بسر کی ہو اس کو وہ لوگ کس طرح نمونہ بنا سکتے ہیں جو انسانوں میں رہتے ہیں۔ اور ان گنت معاشرتی مسائل سے دوچار ہوتے رہتے ہیں۔ جن رہنماؤں نے فلسفہ کی بلند عمارتیں تعمیر کیں، مثالی معاشرہ کے خواب دیکھے اور دکھائے، اخلاقی اصولوں کے انبار لگا دیئے، ان کی زندگی سے ایک سپہ سالار، ایک تاجر ایک فاتح، یا فرمانروا کیا سبق حاصل کر سکتا ہے۔

بے شمار قومی اور اجتماعی مسائل کے علاوہ ہزاروں انفرادی مسائل بھی زندگی میں پیش آتے رہتے ہیں، تنگی عسرت اور فاقہ، فراخی اور فراوانی، غم اور خوشی، اہل و عیال اور ان سے وابستہ مسائل، خواہشات و جذبات اور ہر لمحہ بدلتے ہوئے حالات ——— ان بدلتے ہوئے مختلف النوع حالات میں کیا ایک ہی انسان کی زندگی اس کے لئے نمونہ بن سکتی ہے ؟

پوری عقیدت اور احترام کے جذبات کے ساتھ، بلاخوف تردید، ہم کہہ سکتے ہیں کہ آج تک جتنے

بھی رہ نما گزرے ہیں وہ زندگی کے مختلف شعبوں اور مختلف حالات میں بلا شبہ نمونہ بن سکتے ہیں۔ لیکن اگر آپ تاریخ عالم کے سارے صفحات الٹ ڈالیں، تمام دنیا کی کتابیں چھان ماریں تو کسی ایک فرد کی نشاندہی نہیں کر سکتے جو ایک ہی انسان کی ساری زندگی کے لیے نمونۂ عمل بن سکے یا ایک ایسا فرد جو ان تمام حالات سے گذر چکا ہو جن سے ساری دنیا کے رہ نما گزرے ہیں۔

بہ حیثیت رہ نما یہ مقام صرف حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو حاصل ہے۔ یہ بلا شبہ اظہار عقیدت بھی ہے اور اعتراف حقیقت بھی۔ اس اجمال کی شرح بھی ملاحظہ فرمایئے۔

اس کائنات اور نوع انسانی کے خالق کا، جس کی نظر میں ہر انسان اور اس کی تمام صلاحیتیں ہیں، ارشاد ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ۝ (الاحزاب، ۳۳/۲۱)

درحقیقت تم لوگوں کے لیے اللہ کے رسولؐ میں ایک بہترین نمونہ تھا، ہر اس شخص کے لیے جو اللہ اور یوم آخر کا امیدوار ہو اور کثرت سے اللہ کو یاد کرے۔

یہاں ہم مولانا بدر عالم مرحوم کا حقیقت سے لبریز ایک اقتباس نقل کرتے ہیں جس سے موضوع زیر بحث کے گوشے اچھی طرح واضح ہو جاتے ہیں۔

"یہ امر بھی ملحوظ رہنا چاہیئے کہ کتاب اللہ صرف ایک علمی کتاب نہیں جس کا مقصد صرف علمی طور پر حل کر لینا ہو اور بس بلکہ یہ افراد و اقوام کا وہ دستور العمل بھی ہے جسے زندگی کے ایک ایک شعبہ میں نافذ کرنا ہے۔ اس لیے رسول کی تعلیم کے بعد بھی ایک اہم ضرورت اور باقی رہتی ہے اور وہ اس کا نقشۂ عمل ہے۔ دنیوی علوم میں بھی بہت سے علم ایسے ہیں جو عملی مشاقی کے بغیر اولاً تو سمجھ ہی میں نہیں آتے اور اگر سمجھ میں بھی آجائیں تو اس وقت تک صحیح طور پر کئے نہیں جا سکتے۔ جب تک کہ اس کا نقشہ آنکھوں کے سامنے نہ ہو، جیسے ڈاکٹری کا علم یا سائنس کے دوسرے تجربات کہ ان کا علمی طور پر سمجھنا بھی پہلے ان کے عمل کو دیکھنے پھر خود عملی طور پر ان کو کر لینے پر موقوف ہے صرف ان کا پڑھ لینا ان کی پوری حقیقت سمجھنے کے لئے قطعاً ناکافی ہے۔ جب ان معمولی علوم کا حال یہ ہے تو پھر ربانی علوم کی دقتیں اور معاملات اور عبادات کی نزاکتیں اپنے انواع و اقسام کے اختلاف کے ساتھ کسی ربانی معلم کی تعلیم اور اس کے صحیح نقشے کے دیکھے ہوئے بغیر کیسے سمجھی جا سکتی ہیں۔ اس لئے ضروری ہوا کہ کتاب اللہ کے ساتھ ساتھ اس کا صحیح صحیح نقشہ عمل بھی بھیجا جاتے تاکہ تعلیم رسول کے بعد جو اس میں عملی الجھنیں باقی رہ جائیں وہ اس مکمل نقشہ کو دیکھ دیکھ کر حل کر لی جائیں۔ مشیت ایزدی نے یہاں معلم کتاب کے ساتھ اس کا نقشہ عمل علیحدہ نہیں بھیجا بلکہ جو معلم تھا خود اسی کو مجسم نقشۂ عمل بنا دیا تھا۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ہر قوم کیلئے اپنے پیشوا نمونہ ہوتے ہیں تمہارے لئے بہتر

نمونہ خدا کا یہ رسول ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ رسول صرف تبلیغ وحی کے لیے نہیں آتے بلکہ عملی طور پر کتاب اللہ کا نمونہ بھی ہوتے ہیں اس لیے ہر عمل میں ان کی اطاعت لازم ہوتی ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ قرآن کریم تمام کتب سماویہ میں سب سے زیادہ جامع کتاب ہے اس لیے اس کا نقشۂ عمل بھی تمام نقشوں میں جامع تر ہونا چاہیے۔ یعنی اگر کتاب اللہ میں روزہ، نماز، حج، زکوٰۃ کے احکام مذکور ہیں تو اس کی زندگی میں بھی ان عبادات کا مکمل نقشہ ملنا چاہیے اور اگر اس میں امارت و امامت، غزوات و جہاد، نظم و نسق اور فصل خصومات کے ہدایات بھی موجود ہیں تو ان کا نقشہ بھی اس کی زندگی میں نظر آنا چاہیے۔ اگر اس کی حیات میں قرآن کا ایک ہی پہلو ہو۔ فصل خصومات اور دیگر انتظامی امور کا نمونہ نہ ہو تو اس مؤکو مکمل نمونہ اور اس نقشہ کو قرآن کریم کا مکمل نقشہ نہیں کہا جا سکتا۔ اس نمونہ کو جامع اسی وقت کہا جا سکتا ہے۔ جب کہ قرآن کے ہر چھوٹے بڑے عمل کی تصویر اس کی ساعات زندگی میں نظر آجائے صرف عبادات و معاملات کی نہیں بلکہ اُن فطری حالات کی بھی جہاں شریعت سے کچھ نہ کچھ دخل دیا ہے۔ یعنی بول و براز، طعام و شراب، رفتار و گفتار، خندہ و گریہ، نوم و بیداری، حتیٰ کہ انسانی زندگی کے نازک سے نازک حالات کی بھی۔ اگر قرآن کی جامعیت کے لیے ان معمولی گوشوں پر بھی علمی حیثیت سے روشنی ڈالنا ضروری تھا تو اس کے نقشۂ عمل کی تکمیل کے لیے ان کی عملی نزاکتوں کا ظاہر کرنا بھی ناگزیر تھا۔ پس اگر قرآن نے ازدواجی زندگی کی تشریحات کرنا انسانیت کی تکمیل کے لیے ضروری سمجھا ہے تو ان نزاکتوں کی باریکیاں بھی اس نقشہ میں صفائی سے نظر آنی چاہئیں چہ جائیکہ باہمی معاملات کے فیصلے اُمت کے مہمات اور جنگ و صلح کی تدابیر جیسے مسائل .....

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو صرف کسی خاص شعبۂ زندگی کا نمونہ نہیں بنایا تھا۔ بلکہ جو کچھ قرآن میں کہا گیا تھا وہ سب یہاں دکھلا دیا گیا تھا۔ ایک شخص نے حضرت عائشہ رضؓ سے پوچھا آپ کے اخلاق کیا تھے۔ فرمایا کہ یہ قرآن ہی آپ کا خلق تھا۔ خلق میں اقوال و افعال سب داخل ہیں۔ مطلب یہ تھا کہ آپ کا کوئی قول کوئی فعل ایسا نہ تھا جو قرآن سے باہر ہو۔ گویا اسوۂ رسول کی جامعیت بھی کتاب اللہ کی ہم رنگ تھی۔ اسی لیے آپ کی ذات کو بلا کسی تفصیل کے تمام عالم کے لیے اسوہ بنا دیا گیا تھا، ایک طرف خدا کی یہ جامع کتاب موجود تھی۔ دوسری طرف یہ جامع اسوہ موجود تھا۔ خلاصہ یہ کہ ایک قرآن بشکل مصحف تھا اور دوسرا بشکل اسوۂ رسول، فرق یہ تھا کہ وہ خاموش تھا یہ ناطق، یہاں تیسری چیز احادیث رسول تھیں۔ یہ بھی قرآن ہی کی ایک شکل تھی مگر وہ مجمل تھا۔ یہ مفصل۔ یہ تینوں قرآن گو بلحاظ اجمال و تفصیل جدا جدا تھے۔ مگر بلحاظ اصل حقیقت یہ ایک ہی قرآن تھا۔[1]

اجتماعی امور کے سلسلہ میں اتنی بات سمجھ لینا کافی ہے کہ قرآن حکیم نے کائنات کی ابتدا، تدریجی ارتقاء اور تکمیلی

---

[1] مولانا بدر عالم مرحوم، ترجمان السنۃ، ج ۱، مقدمہ، صفحہ ۱۰۵ - ۱۰۷

مراحل کا جہاں ذکر کیا ہے وہاں انسان کی تخلیق سے لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تک انسانی تاریخ کا مختصر حال بھی بیان کر دیا ہے۔ بظاہر اس میں چند انبیاء علیہم السلام اور ان کی اقوام کا مختصر بیان ہے لیکن اگر تاریخ عالم کے پس منظر میں اس مختصر تاریخ انبیاء کو سامنے رکھا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ یوں تو دنیا میں ہزاروں اقوام ابھریں۔ ترقی و تنزلی کے مراحل سے گزریں، بہت سی فنا ہو گئیں اور ان کے آثار بھی باقی نہیں رہے، کچھ کی نسلیں بچ گئیں۔ دنیا میں پھیلیں اور تہذیب و تمدن کے مختلف مدارج طے کرتی رہیں لیکن اگر ان کے مشترک مزاج اور خصوصیات کو سامنے رکھا جائے اور اس اعتبار سے ان کی گروہ بندی کی جائے تو ہزاروں کی تعداد گھٹ کر بہت کم ہو جائے گی مثلاً دنیا کی بہت سی اقوام کی مشترک خصوصیت یہ رہی ہے کہ انہوں نے آخرت کی زندگی کا انکار کیا اور اسی دنیا کی زندگی کو آخری زندگی سمجھا اور دنیا کے وسائل سے فائدہ اٹھانے اور ان سے جی بھر کر لطف اندوز ہونے کو اپنا مقصد بنایا اور زندگی کو بے لگام چھوڑ دیا۔ اب دنیا کے مختلف خطوں میں جتنی اقوام بھی اس مزاج کی گزری ہیں ان میں سے ایک کا انتخاب کر کے اس کی سرگزشت بیان کر دینے سے زندگی کا ایک نمونہ سامنے آجائے گا، اس ایک قوم کی تاریخ اسی نوعیت کی تمام اقوام کی ترجمانی کے لیے کافی سمجھی جائے گی۔

کچھ قومیں ایسی ملیں گی جنہوں نے تمام اخلاقی حدود کو توڑ کر ہر قسم کی بے اعتدالی کو اپنا شعار بنا لیا، تو بعض نے دوسری اقوام کو غلام بنا لیا، ایسی قومیں بھی گزری ہیں۔ جنہوں نے اونچ نیچ کے تصور کی بنیاد پر معاشرہ کی تشکیل کی۔ اسی طرح آپ چاہیں تو معاشرتی نظام کے نمونوں کا انتخاب کر سکتے ہیں، عقاید کی بنا پر، معاشرتی نظام اور سیاسی تنظیم کے مشترک اصولوں کو لے کر اقوام عالم کی گروہ بندی کر سکتے ہیں۔

اس معاملہ میں قرآن کا انداز یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان ہی مشترک خصوصیات کی بنیاد پر اقوام عالم کی گروہ بندی کر کے بطور نمونہ ایک ایک قوم کی جامع خصوصیات اور مختصر تاریخ بیان کر دی ہے اور اسی قبیل کی دوسری تمام اقوام کا ذکر نہیں کیا ہے۔ کیونکہ اسی پر دوسری اقوام کو قیاس کر لینا چاہیے کہ اس مزاج اور ایسے نظام کی اقوام کی زندگی کس نوعیت کی تھی، وہ کن مراحل سے گزریں اور ان کا کیا انجام ہوا۔

بالفاظ دیگر قرآن میں جو چند اقوام کی مختصر تاریخ بیان کی گئی ہے وہ دراصل نوع انسانی کی مختصر لیکن نہایت جامع تاریخ ہے۔

اس کا اندازہ آپ اس طرح بھی لگا سکتے ہیں کہ ساری دنیا کی جتنی اقوام کی تاریخ معلوم ہے ان پر ایک نظر ڈالیے اور ان کے مشترک انداز زندگی، طرز سفر کے اعتبار سے ان کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر لیجیے۔ اس کے بعد حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت عیسیٰؑ تک جن اقوام کا ذکر قرآن میں ہے ان کو سامنے رکھیے۔ آپ دیکھیں گے کہ اقوام عالم کے جتنے نمونوں کا آپ نے انتخاب کیا ہے وہ سب کے سب آپ کو قرآن کی بیان کردہ تاریخ میں مل جائیں گے[1]

---

[1] اس موضوع کو راقم نے اپنی تالیف "مغربی تہذیب، آغاز و انجام" میں زیادہ شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ملاحظہ فرما لیا جائے۔

یہ بھی کتنی عجیب بات ہے کہ حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت عیسٰیؑ تک جو اہم واقعات انسانی تاریخ میں رونما ہوئے ہیں وہ سب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ترییسٹھ سالہ زندگی میں دہرا دیئے گئے ہیں۔

اس کو یوں سمجھ لیجیے کہ قرآن عزیز نے انسانی تاریخ کے مختلف ادوار کو مخصوص انبیاء کی بعثت کے تحت بیان کرتے ہوئے تمام مفید اور قابل ذکر گوشوں کو سمیٹ لیا ہے۔ اب آپ قرآن کی بیان کردہ "تاریخ انبیا" کو سامنے رکھیے اور ان تمام واقعات کو بھی شامل کر لیجیے جو کسی تفسیر قرآن میں بیان ہو گئے ہیں اور پھر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر نظر ڈالیے آپ بہ آسانی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ان تمام واقعات کی نشاندہی کرتے چلے جائیں گے جو انسان کی طویل "تاریخ" کے ضمن میں قرآن میں مذکور ہیں۔

زیادہ معروف اور واضح الفاظ میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت تمام انبیائے کرامؑ کی سیرتوں کی جامع ہے۔ جو دعوت ساری دنیا کے انبیاء اور رسولوں نے دی وہی آپ نے دی۔ مختلف ادوار میں، مختلف ملکوں کی اقوام نے جو جوابات اپنے اپنے نبیوں اور رسولوں کو دیئے ہیں، وہی سب کے سب آپ کو دیئے گئے ہیں، جو سلوک دنیا کی اقوام نے اپنے اپنے رسولوں کے ساتھ کیا۔ وہی آپ کے ساتھ ہوا، جن مسائل کا سامنا سارے رسولوں نے کیا وہی آپ کے سامنے بھی آئے، اللہ کا پیغام بندوں تک پہنچانے میں جو جو طریق کار آپ سے پہلے رسولوں کا رہا ہے وہی آپ کا بھی تھا، جن مشکلات کا سامنا آپ سے پہلے انبیاء نے کیا ہے ان ہی سے آپ بھی دوچار ہوتے ہیں۔ صبر آزما لمحات میں، جنگ وصلح کی صورت میں، فرماں رواؤں، سرداروں اور عوام کے سامنے تبلیغ دین کا فریضہ ادا کرنے میں، عبادات، معاملات اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں جو کچھ آپؐ سے پہلے کے رسول نے کیا ہے وہی آپؐ نے بھی کیا۔[1]

آنچہ ہمہ خوباں دارند تو تنہا داری

یہ بات بھی کم حیرت انگیز نہیں کہ وہ تمام اقوام جن کا ذکر قرآن میں ہے۔ مختلف علاقوں کی رہنے والی تھیں ان کے حالات اور نظام ایک دوسرے سے مختلف تھے لیکن سرزمین عرب کے علاقہ میں وہی ماحول پیدا ہو گیا جو مصر، شام و فلسطین، عراق و یمن جیسے سرسبز و شاداب علاقوں میں تھا اور وہی حالات رونما ہو گئے جو صدیوں پہلے ان علاقوں میں ہوتے تھے (جیب اللہ کے رسولوں نے انہیں توحید و آخرت کی دعوت دی تھی)۔

بہرحال اتنا تو واضح ہو ہی جاتا ہے کہ تیئس ۲۳ سالہ دور نبوت میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اقوام عالم

لہ یہ موضوع سے متعلق صرف اشارے ہیں۔ خاکسار نے اپنی تالیف "اعجاز سیرت" میں اسی موضوع کو لیا ہے، جو اگرچہ ابھی غیر مطبوعہ ہے لیکن اس کے کچھ اجزاء بعض جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔

کی رہ نمائی کی تربیت مکمل طور پر دے دی گئی تھی۔ آپ کو وہ تمام تجربات ہو چکے تھے جو انبیائے سابقین کو ہوئے تھے [۱] جس طرح سارے رسولوں نے مختلف اقوام عالم کی رہ نمائی کی تھی۔ آپ نے بھی ان طبقات کی رہ نمائی کر کے دکھادی جو ٹھیک ٹھیک، سابقہ اقوام کی پیروی کر رہے تھے۔

اب آپ کی سمجھ میں یہ بات آگئی ہوگی کہ اقوام عالم کی رہ نمائی صرف حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کیوں کر سکتے ہیں، کوئی دوسرا نہیں کر سکتا، کیونکہ تنہا آپ ہی کی ذات ہے جس میں سارے انبیاء (رہ نماؤں) کی صفات وخوبیاں جمع ہوگئی ہیں۔ اور اجتماعی یا انفرادی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کا عملی نمونہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں نہ مل جاتے۔

ایک فرماں روا کس طرح حکومت کرے، آپ کی زندگی سے سیکھ سکتا ہے کیونکہ آپ نے بھی فرماں روائی کر کے دکھائی ہے، ایک معمولی چرواہا کس طرح زندگی گزارے، آپ سے سیکھ سکتا ہے کیونکہ آپ نے بھی بکریاں چرائی ہیں، تجارت کس طرح کرے، آپ کی سیرت میں اس کا نمونہ بھی ہے، بھوک اور فاقہ کی حالت میں کیا کرے، یہ بھی آپ کی سیرت میں مل جائے گا کہ آپ کے پیٹ سے بھی (بھوک کی شدت کے سبب) پتھر بندھے تھے۔ دوست احباب سے تعلقات کی نوعیت، عزیزوں، غریبوں، محتاجوں اور غلاموں سے کس طرح سلوک کیا جائے، ازدواجی زندگی کس طرح گزاری جائے، اولاد کی پرورش، ولادت وموت، غم وخوشی، نفع ونقصان، فتح وشکست کے مواقع پر کیا کیا جائے۔ سب کی مثالیں آپ کی سیرت میں مل جائیں گی۔ ظاہر ہے اس کی مکمل فہرست بنا کر پیش کرنا ناممکن ہے البتہ اتنا کہا جا سکتا ہے کہ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں جو جو واقعات رونما ہوتے ہیں اور ہو سکتے ہیں ان سب کا بہترین عملی نمونہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں مل جائے گا آپ کے علاوہ کسی دوسرے انسان کی سیرت میں نہیں مل سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی ذات سے گہرا لگاؤ اور عام دل چسپی سب سے زیادہ ہے کیونکہ قدم قدم پر آپ کا اسوۂ حسنہ رہ نمائی کے لئے موجود ہے اور زندگی کے ہر شعبہ پر آپ کے قائم کردہ نقوش سب سے زیادہ گہرے ہیں

ایک رہ نمائی ہی کیا آپ کی سیرت کا ہر پہلو یہی شان لئے ہوئے ہے۔ بحیثیت مصلح، عہد آفریں، انقلاب لانے والے، انسانی آزادی کا صور پھونکنے والے، کسی بھی حیثیت سے آپ کا ذکر کیا جائے۔ آپ کی امتیازی شان

---

[۱] یہاں یہ بات نوٹ کر لیجیے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد گمراہی کی کوئی نئی شکل ظاہر ہوئی ہے نہ ہدایت کا کوئی نیا راستہ دکھایا گیا ہے۔ نیک لوگ اسی راستہ پر چل رہے ہیں جس پر پہلے نیک لوگ چل چکے ہیں، اسی طرح گمراہ لوگ ان لوگوں کی پیروی کر رہے ہیں جو گمراہ تھے۔ اب قیامت تک یہی صورت حال رہے گی، جس کی طرف سورۂ الفاتحہ میں اشارہ ہے "خدایا ہم پر (فلاح وسعادت کی) سیدھی راہ کھول دے! وہ راہ جو ان لوگوں کی راہ ہے جن پر تیرا انعام ہوا، ان کی نہیں جو تیرے حضور مغضوب ہوئے اور نہ ان کی راہ جو راہ سے بھٹک گئے اور منزل کا سراغ ان پر گم ہو گیا۔" (ترجمان القرآن)

اور انفرادی حیثیت نمایاں ہی رہے گی ۔

البتہ ایک بات ذہن میں رہنی چاہیئے وہ یہ کہ جب ہم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا تعارف کسی خاص صفت کے اعتبار سے کراتے ہیں ۔ مثلاً مصلح ، انقلاب لانے والے ، غریبوں کے ہمدرد ، بے کسوں کے مونس ، سب سے زیادہ کامیاب فرماں روا ، بہترین جنرل ، ازدواجی زندگی کے لئے نمونہ ، عظیم رہنما وغیرہ تو اول تو اسی خاص شعبہ میں آپ کی سیرت کی بلندی اور مقام تک رسائی نہیں ہوتی ، دوسرے اس سے آپ کی شخصیت کا پورا تعارف بھی نہیں ہوتا ۔ بس زیادہ سے زیادہ آپ کی جامع الصفات سیرت کا ایک ہی پہلو ابھر کر سامنے آجاتا ہے اور جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کسی بھی انسان یا جماعت کے لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ سیرت کے تمام پہلوؤں کو بیک وقت واضح کر دے ۔ اسی لئے آپ کے مقام کا ادراک بھی ممکن نہیں ، کیونکہ جب آپ کی مکمل شخصیت ہی سامنے نہیں آپاتی تو مقام کا تعین کس طرح ہو ؟

اب آخر میں ملاحظہ فرمایئے :۔ قرآن نے آپ کا تعارف کس انداز سے کرایا ہے ۔ ارشاد ہے ۔

قل سبحان ربی ھل کنت الا بشرا رسولا ٥ (بنی اسرائیل ، ۱۷/۹۳)

(اے پیغمبرؐ!) ان لوگوں سے کہہ دے " سبحان اللہ ! (میں نے کچھ خدائی کا دعویٰ تو کیا نہیں) میں اس کے سوا کیا ہوں کہ ایک آدمی ہوں پیغام حق پہنچانے والا "

دو لفظوں میں دو حیثیتیں نمایاں کر دی گئیں ، "بشر" اور "رسول" بہ حیثیت بشر آپ کی عظمت سے کسی کو پہلے انکار تھا نہ آج ۔ انتہائی مخالفت اور عداوت کے باوجود قریش مکہ آپ کی امانت ، دیانت ، شرافت ، حق گوئی سخاوت ، حسن سلوک ، حسن صورت ، حسن سیرت ، کردار کی پختگی اور ان تمام خوبیوں کے معترف تھے جو بحیثیت انسان کسی میں ہو سکتی ہیں ۔ آج بھی تمام دنیا کے دانشور آپ کو ایک عظیم انسان ، بہترین رہنما ، منصف حکمران ، اعلیٰ خوبیوں اور بلند حوصلہ میں ممتاز اور رحم انکم دنیا کی عظیم ترین ہستیوں میں شمار کرتے ہیں ۔

اسی طرح آپ کی رسالت بھی اتنی واضح اور روشن ہے کہ اس کا بھی انکار ناممکن ہے ۔ جو لوگ آپ کو بحیثیت رسول تسلیم نہیں کرتے وہ دراصل اللہ ہی کے قائل نہیں ۔ اب ظاہر ہے جو شخص اللہ کے موجود ہونے ہی کو تسلیم نہیں کرتا وہ اس کے رسول کا کس طرح قائل ہو جائے گا ۔ البتہ جو شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہے اس کے لئے آپ کی رسالت کا انکار ناممکن ہے ، پھر اس کے لئے مزید کسی دلیل کی ضرورت نہیں رہتی ۔ اس مضمون کو قرآن نے نہایت واضح الفاظ میں بیان کر دیا ہے ۔ ملاحظہ فرمایئے :۔

تنزیلاً ممّن خلق الارض والسّمٰوٰت العلیٰ ٥ الرحمٰن علی العرش استویٰ ٥
لہٗ ما فی السمٰوٰت وما فی الارض وما بینھما وما تحت الثریٰ ٥ وان تجھر بالقول
فانہ یعلم السرّ واخفیٰ ٥ اللہ لآ الٰہ الا ھو لہ الاسمآء الحسنیٰ (طٰہٰ ۲۰/۴)

یہ اس ہستی کا اتارا ہوا ہے۔ جس نے زمین پیدا کی اور بلندی سے آسمان۔ الرحمٰن کہ جہانداری کے تخت پر متمکن ہے، جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے، جو کچھ مٹی کے نیچے ہے (یعنی زمین کے نیچے ہے) سب اسی کا ہے اور اسی کے لئے ہے۔

اور اگر تم پکار کے بات کہو (تو اس کی سماعت اس کی محتاج نہیں) کیونکہ وہ بھیدوں کا جاننے والا ہے زیادہ سے زیادہ چھپے بھیدوں کو بھی! وہی اللہ ہے۔ کوئی معبود نہیں ہے مگر صرف وہی۔ اس کے لئے حسن و خوبی کے نام ہیں! (ترجمان القرآن)

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کو جس ہستی کا رسول بتایا ہے اس کی شان تو یہ ہے:-

تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرَا ۝ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا ۝ (الفرقان ۲۵/۱-۲)

نہایت متبرک ہے وہ جس نے یہ فرقان (یعنی قرآن) اپنے بندے پر نازل کیا تاکہ سارے جہان والوں کے لئے نذیر ہو وہ جو زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے، جس نے کسی کو بیٹا نہیں بنایا ہے، جس کی بادشاہی میں کوئی شریک نہیں ہے، جس نے ہر چیز کو پیدا کیا پھر اس کی ایک تقدیر مقرر کی (تفہیم القرآن)

اس حقیقت کو ذہن میں رکھیے اس کے بعد اس پر غور فرمائیے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کے اندر علانیہ اپنی رسالت کا دعویٰ کیا، مکہ، بلکہ سارے عرب اور اس کے گردو پیش کے ممالک تک اس بات سے اچھی طرح واقف ہو گئے کہ آپ نے رسالت کا اعلان کیا ہے تو بتائیے کیا اس ہستی کو اس کا علم نہیں ہوا جو کائنات کے ذرہ ذرہ سے آگاہ ہے جو علانیہ بات ہی نہیں مخفی ترین بات کو بھی خود سنتا ہے؟ کیا اس نے نہیں سنا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم خود کو اس ہستی کے رسول کی حیثیت سے پیش کر رہے ہیں اور اس کے نام سے ہزاروں فرامین لوگوں کو سنا رہے ہیں؟

ظاہر ہے دنیا کا کوئی انسان بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلان رسالت کا اللہ کو علم نہیں ہوا۔ جب یہ امر طے شدہ اور اظہر من الشمس ہے کہ اللہ کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلان رسالت کا علم تھا تو دیکھنا یہ ہے کہ اس نے کیا کیا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوے کی تردید کی یا آپ کی تائید و نصرت فرمائی۔ اس کے لئے کسی دلیل و استدلال کی ضرورت نہیں۔ اعلانِ رسالت کے بعد کی زندگی دنیا کے سامنے روشن ہے، اس کو سامنے رکھ کر دنیا کا ہر انسان فیصلہ کر سکتا ہے کہ اللہ نے آپ کو غلط مدعی قرار دیا یا سچا رسول۔ اس کا اندازہ صرف ایک ہی چیز سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔

ہجرت کے وقت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صرف ایک جاں نثار حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے۔

جنگِ بدر میں آپ کی حمایت کرنے والے تقریباً تین سو تیرہ، اُحد کے موقع پر، سات سو، حدیبیہ میں چودہ سو

فتح مکہ کے دن دس ہزار، جنگ حنین میں بارہ ہزار، تبوک کے موقع پر تیس ہزار اور حج الوداع کے دن تقریباً ایک لاکھ جان نثار آپ کے ارد گرد تھے[1] اور آج تک یہ تعداد کتنی ہو چکی ہے — شمار سے باہر

دس سال کے اندر یہ عروج، کامیابی کی انتہائی بلندی، دنیا کے گوشہ گوشہ میں آپ کی تعریفیں، آپ پر درود و سلام کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ، آپ کی اطاعت اور نام پر مرمٹنے والوں کی شمار میں آنے والی تعداد، مخالفین کی نظروں میں آپ کا احترام، ماننے والوں کے گل ہائے عقیدت، انسانوں کے قلوب پر آپؐ کے نقوش، تاریخ عالم پر آپ کے اثرات، یہ سب کیا اس بات کا بین ثبوت نہیں کہ اللہ نے آپ کو یہ کامیابی اور عظمت عطا کی۔ اگر آپ اللہ کے رسول نہیں تو کیا اللہ آپ کو اس بلندی تک پہنچنے دیتا؟[2]

ایک انسان اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا ہے کہ بحیثیت بشر آپ احمدؐ اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں۔ یعنی آپ وہ ہیں جس نے پروردگار عالم کی (اس کائنات میں) سب سے زیادہ تعریف کی ہے اور اس کائنات میں (اللہ کے بعد) سب سے بہتر اور سب سے زیادہ تعریف آپ کی کی گئی ہے اور کی جاتی رہے گی۔

آج تک انسانوں نے جن الفاظ میں اور جس طرح آپؐ کی تعریف کی ہے اس سے ہمارے کان کم از کم آشنا تو ہیں۔ اس کا بہت قلیل ہی سہی کچھ تو اندازہ ہم کر سکتے ہیں، لیکن ذرا غور تو فرمائیے۔ خود اللہ تعالیٰ فرماتا ہے،

ان اللّٰہ وملٰٓئکتہٗ یصلّون علی النّبیّ ط یٰایھا الذین اٰمنوا صلّوا علیہ وسلموا تسلیماً ○ (الاحزاب، ۳۳/۵۶)

اللہ اور اس کے ملائکہ نبیؐ پر درود بھیجتے ہیں، اے لوگو جو ایمان لائے ہو، تم بھی ان پر درود و سلام بھیجو

آپ پر ایمان لانے والوں نے آپ پر کس طرح درود بھیجا ہے اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ چودہ سو سال سے آج تک، اس آسمان کے نیچے کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرا ہے جب کہ سیکڑوں، ہزاروں اور لاکھوں اہل ایمان آپ پر (نمازوں اور اس کے علاوہ بھی) مسلسل درود نہ بھیج رہے ہوں اور سلام! آج بھی آپ کے دربار میں حاضر ہو کر آپؐ کی خدمت میں سلام عرض کرنا ایک عظیم نعمت ہے۔ شاہان عرب ہوں، یا سلاطین عجم، آپؐ کے حضور، مودب، سلام عرض کرنا اپنی خوش قسمتی سمجھتے رہے ہیں۔ آج بھی سلام کا ایک سیلاب رواں ہے جہاں آوازیں بلند نہیں ہوتیں مگر

---

[1] ملاحظہ ہو طبری؛ مولانا شبلی، سیرت النبیؐ

[2] دراصل جو لوگ آپ کی رسالت کے منکر ہیں وہ اللہ کو نہیں مانتے بلکہ ایک ایسے معبود کے قائل ہیں جس کے بٹیا ہے یا اس کے بہت سے شریک ہیں۔ اسی کی اوپر کی آیات میں تردید کی گئی ہے۔ قرآن یا آپؐ نے کبھی دعویٰ نہیں کیا کہ آپ کو اس خدا نے رسول بنایا ہے جس کے بٹیا یا شریک ہیں۔ جو آپ کی رسالت کے منکر ہیں۔ ان کے کہنے کا منشاء یہ ہے کہ ان کے خدا نے رسول نہیں بنایا اور یہ صحیح ہے۔ وہ اللہ کے قائل ہیں نہ اس کے رسول کے منکر

[3] (اگلے صفحہ پر)

اور اللہ تعالیٰ کس طرح درود بھیجتا ہے، اس کے کتنے فرشتے ہیں جو درود بھیجتے رہتے ہیں، اس کا کوئی اندازہ کر سکتا ہے؟

رہا آپ کا مقام بہ حیثیت رسول، تو اس کا ادراک ہو تو کس طرح جب کہ آپ کا مقام سدرۃ المنتہیٰ سے بھی ماوراء ہے [2]

---

[1] متعلق صفحہ گذشتہ اسمائے گرامی کی شرح کرتے ہوئے مولانا بدر عالم تحریر فرماتے ہیں احمد: یہ اسم تفضیل کا صیغہ ہے۔ اسم فاعل اور اسم مفعول دونوں معنی میں مستعمل ہو سکتا ہے۔ پہلی صورت میں اس کے معنی ہیں "احمد الحامدین لربہ" یعنی تمام تعریف کرنے والوں میں اپنے پروردگار کی سب سے زیادہ تعریف کرنے والا۔ دوسری صورت میں اس کے معنی ہیں "احق الناس واولاہم بان یحمد" تمام لوگوں میں سب سے زیادہ تعریف کے قابل اور ثناء کا مستحق۔ حافظ ابن قیم اسم "محمد" کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ محمد وہ ہے جس میں بکثرت تعریف کے اوصاف پائے جائیں، جس کی اتنی تعریف کی جائے جتنی کسی اور بشر کی نہ کی جاتے ....

حافظ سہیلی" لکھتے ہیں "محمد" کے وزن میں ہمیشہ تکرار کے معنی ملحوظ رہتے ہیں۔ اس لئے محمد اس کو کہا جائے گا جس کی بار بار تعریف کی جائے۔ (ترجمان السنہ، ج ۱، حواشی صفحہ ۴۵۲، ۴۵۳)

[2] سورہ النجم میں جہاں معراج کا ذکر ہے وہاں سدرۃ المنتہیٰ کا بھی بیان ہے اس کے بارے میں اکابر محققین کی تحقیق یہ ہے کہ یہ انسانی فہم و ادراک کی آخری سرحد پر ایک درخت ہے۔ اس پر ہر عالم کا علم ختم ہو جاتا ہے آگے جو کچھ ہے اسے اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا (تفہیم القرآن! سیرت النبیؐ ج ۳، ۳۲۹) اس مقام سے آگے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ نہ جبرئیل علیہ السلام اور دوسرے ملائکۃ اللہ کا گذر ہوا اور نہ کسی نبی مرسل کا (قصص القرآن ج ۴ حاشیہ ص ۲۶۱، مولانا حفظ الرحمٰن)

مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں: لیکن حضور صلعم چونکہ سردار انبیاء اور سید اولاد آدم تھے، اس لئے اس حظیرہ قدس اور بارگاہِ لامکان میں آپ کو وہاں تک رسائی حاصل ہوئی جہاں تک کسی فرزند آدم کا قدم اس سے پہلے نہیں پہنچا تھا اور وہ کچھ مشاہدہ کیا جو اب تک دوسرے مقربان بارگاہ کی حد نظر سے باہر رہا تھا (سیرت النبیؐ، ج ۳، ۲۷۲)

محمد رسول اللہ کی فتح

سید قطب شہید

زمین کے گوشہ گوشہ میں روز و شب **لَآ اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ** کی کروڑوں آوازیں گونجتی ہیں۔ یہ آوازیں چودہ صدیوں سے نہ خاموش ہوئی ہیں اور نہ کم، سلطنتیں بدل گئیں، حالات متغیر ہو گئے، لیکن زمانہ کے دل میں پیوست یہ ابدی گونج متغیر نہیں ہوئی۔

فتح کی جیتی جاگتی دلیل :

یہ آوازیں **محمد بن عبداللہ** کی فتح کی جیتی جاگتی دلیل ہیں۔ آپ کی یہ فتح کسی غزوہ یا معرکہ کی فوجی کامیابی نہیں، مکہ کی فتح نہیں، جزیرہ عرب کو مغلوب کر لینے کی تاریخی حقیقت بھی نہیں، قیصر و کسریٰ کو سرنگوں کر لینے کا مہتم بالشان واقعہ بھی نہیں بلکہ یہ وہ فتح ہے جس نے زندگی کی سرشت میں اپنا مقام پیدا کر لیا، جو تاریخ کا دھارا موڑنے والی ہے، دنیا کی قسمت پر متصرف ہے اور زمانہ کے قلب میں متمکن ہے۔

یہ فتح :

یہ وہ فتح ہے جو اُمت مسلمہ کو پہنچ جانے والے کسی ضعف سے ختم نہیں ہوئی، نئے نئے مذاہب اور فلسفے اس کی قدر و قیمت کم نہیں کر سکتے۔ زمین کے کسی گوشہ میں ایک فریق کا دوسرے فریق پر غلبہ اس کا نور بجھا نہیں سکتا۔ اس لئے کہ اس کے بیج کائنات کی گہرائیوں میں دفن ہیں اور انسانوں کے ضمیر اس پر گواہ ہیں۔ یہ فتح آپ اپنی دلیل ہے۔ اس کے لئے کسی دلیل یا برہان کی ضرورت نہیں

آیئے ہم اس کے اسباب اور وسائل کا پتہ لگانے کی کوشش کریں تاکہ آج ہم وہی ذرائع و وسائل اختیار کر سکیں اور انہیں اسباب کے مطابق کام کر سکیں۔

قربانیوں کا منطقی نتیجہ :

اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی یہ تھی کہ محمد بن عبداللہ کامیاب و کامران ہوں اور دین مستقیم کو غلبہ نصیب ہو، لیکن اللہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کامیابی کو آسان اور سہل بنا دے، اور نہ یہ چاہتا تھا کہ اسے معجزہ بنا دے کہ کوئی انسانی کوشش اور ذریعہ اسے حاصل نہ کر سکے۔ اس لئے اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جدوجہد کا شیریں پھل، اور آپؐ اور آپ کے اصحاب کی قربانیوں کا منطقی نتیجہ بنایا۔

چنانچہ جو شخص معلوم کرنا چاہتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کامیابی کیسے حاصل کی اور اسلام کو فتح کیسے حاصل ہوئی، اُسے آپؐ کی

شخصیت، سلوک، سیرت اور جدوجہد کے مطالعہ سے معلوم کرنا چاہیئے۔ اسے معلوم ہو جائے گا کہ کامرانی کا طریقہ مقرر ہے، اس کے وسائل موجود ہیں، اسباب حاضر ہیں اور کوئی بھی شخص کسی بھی زمانہ میں، کسی بھی جگہ اگر کامران ہونا چاہے تو اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے لئے نمونہ بنانا چاہیئے

تین بنیادی مراحل:

محمد بن عبداللہ کی کامیابی کے تین بنیادی مراحل ہیں۔ اسی میں سارے دیگر مراحل پوشیدہ ہیں۔

۱۔ محمد بن عبداللہ نے کامیابی کا پہلا مرحلہ اس دن طے کیا جس دن قریش کے سردار ابوطالب سے یہ مطالبہ کرنے آئے کہ اپنے اس بھتیجے کو روکے جس نے ان کے دین ان کے رسومات اور ان کے اعتقادات میں مداخلت کر کے ان کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ اسے ان کے معبودوں کے بارے میں بولنے سے روک دے اور اس کے بدلہ میں اگر وہ چاہے تو وہ اسے مالا مال کر دیں، اگر سردار بننا چاہے تو سرداری عطا کر دیں۔ اور اس کے بعد اسے ان پر پورا اختیار ہوگا

محمد بن عبداللہ کامران رہے جب آپؐ نے ان لوگوں کے اور زمانہ کے کانوں میں ایمان کے منبع سے پھوٹنے والی ابدی بات کہی "خدا کی قسم، چچا جان! اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند رکھ دیں تاکہ میں یہ چھوڑ دوں، تو میں یہ ہرگز ہرگز نہیں چھوڑوں گا، یہاں تک کہ مجھے موت آجائے"۔ خدا کی قسم کیا ہی زلزلہ خیز شان و شکوہ ہے اکتنی پرشکوہ تصویر ہے۔

'لو وضعوا الشمس فی یمینی والقمر فی یساری'

اسی دن محمد عبداللہ نے کامیابی حاصل کر لی اور قریش کے اجتماعی ضمیر کو اس طرح ڈگمگا دیا کہ پھر وہ کبھی قرار نہ پکڑ سکا۔ یہ ایمان تھا، یہی وہ قوت ہے کہ جب انسان کے شعور میں جاگزیں ہو جائے تو پھر اسے کوئی چیز مغلوب نہیں کر سکتی۔

۲۔ اور محمد بن عبداللہ کی کامیابی کا دوسرا مرحلہ جب طے ہو گیا تو آپؐ نے اپنے اصحاب کو ایمان کی زندہ چلتی پھرتی تصویریں بنا دیا ——— ان میں سے ہر ایک کو زمین پر چلنے پھرنے والا زندہ قرآن اور مجسم اسلام بنا دیا۔

خالی نصوص کچھ نہیں کر سکتے۔ صرف مصحف سے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اگر ان پر عمل کرنے والا انسان نہ ہو۔ نظریات زندہ نہیں رہ سکتے۔ اگر عملاً نہ اپنائے جائیں۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد یہ تھا کہ انسان، تیار کریں، صرف وعظ و نصیحت نہ کریں۔ دلوں اور ضمیروں کو ڈھالیں، صرف تقاریر نہ کریں، ایک اُمت کی تعمیر کریں صرف فلسفہ پیش نہ کریں ——— نظریہ تو قرآن نے پیش کر دیا تھا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا مشن یہ تھا کہ اس مجرد فکر کو انسانوں کے قالب میں ڈھال دیں اور ایسی زندہ حقیقت بنا دیں جنہیں ہاتھ چھو سکیں اور آنکھیں دیکھ سکیں۔

جب یہ لوگ زمین کے مشرق و مغرب میں گئے تو لوگوں نے دیکھا کہ یہ تو بالکل نئی مخلوق ہے۔ انسانیت اس سے پہلے ایسی مخلوق سے ناآشنا تھی۔ اس لئے کہ وہ نظریہ کے زندہ نمونے تھے جو اس وقت کی انسانیت کے لئے اجنبی ہو کر رہ گیا تھا۔ اس وقت لوگ اس نظریہ پر ایمان لے آئے۔ اس لئے کہ وہ ان لوگوں پر ایمان لے آئے تھے جن میں یہ نظریہ جلوہ گر تھا

یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی کامیابی تھی کہ آپؐ نے اسلامی فکر کو انسانی شکل میں ڈھال دیا۔ مصحف کے سینکڑوں اور ہزاروں نسخے لکھے لیکن یہ روشنائی کے ذریعے کاغذ کے صفحات پر نہیں لکھے گئے تھے، بلکہ نور کے ذریعے دلوں پر لکھے گئے تھے۔ لوگوں کے حال کی صورت میں لکھے گئے تھے۔

لوگوں کا عمل یہ ظاہر کر رہا تھا کہ وہ اسلام کیا ہے جو اللہ کی طرف سے محمد بن عبداللہ لے کر آئے ہیں۔ اس محمد بن عبداللہ کی آخری کامیابی یہ تھی کہ شریعت اسلامیہ کو زندگی پر حکمرانی کرنے والا ضابطہ، معاشرہ کی تبدیلیوں کا بنیادی مرکز، اور لوگوں کے معاملات کا حقیقی منتظم بنا دیا۔

اسلام ایک عقیدہ ہے جس کے بیج سے شریعت کی کونپل پھوٹتی ہے۔ اس شریعت پر ایک نظام قائم ہوتا ہے۔ اگر ہم اسلام کو ایک درخت سے تشبیہ دیں تو عقیدہ اس کا بیج، شریعت اس کا تنا اور نظامِ شرعی اس کا پھل ہے۔

تنا بیج کے بغیر جڑ نہیں پکڑ سکتا، اور اس بیج کی کوئی قدر و قیمت نہیں جس سے تنا نہ نکلے۔ اس تنے کا کوئی فائدہ نہیں جو پھل نہ دے۔ اس لئے اسلام نے یہ ضروری قرار دیا ہے کہ اس کی شریعت ہی زندگی کی حاکم ہو۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ [1]

"جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں"۔

دین اور حکومت کی علیحدگی اسلام میں نہیں ہے۔ کوئی حکومت دین کے بغیر نہیں اور کوئی دین شریعت اور نظام کے بغیر نہیں۔

اسلامی حکومت کے قیام کے اوّل روز ہی سے شریعت اسلامیہ اس حکومت کا دستور العمل تھی اور صاحبِ شریعت اس کے والی تھے۔ اس حکومت نے مسلمانوں کو یہ موقع بہم پہنچایا کہ وہ ظلم کے مقابلہ میں اپنا دفاع کر سکیں اور فتنہ سے اپنے آپ کو بچا سکیں اور زمین کے ایک ایک گوشہ میں اسلام کے پرچم تلے محفوظ رہ سکیں۔

اس وقت سے اسلام ایک اجتماعی نظام ہو گیا۔ یہ مسلمانوں کے تعلقات کا مرکزی سر رشتہ تھا۔ وہ ان کے لئے ایک ایسا نظامِ حکومت بن گیا، جس کی بنیاد پر وہ غیروں سے معاملات کرتے تھے۔ پھر اسلام زمین کے دوسرے گوشوں میں پھیلنے لگا۔ جہاں بھی اس کا عقیدہ پہنچا اس کی شریعت اور اس کا نظام بھی پہنچا۔ جس نے چاہا اس میں داخل ہو گیا اور جس نے نہ چاہا تو "دین میں اکراہ نہیں ہے"۔ لیکن اسلامی شریعت اور اسلامی نظام ہر اس سرزمین پر حکمرانی کرنے لگا۔ جہاں اسلام داخل ہوا لوگ اس سے وہ انصاف اور خیر پانے لگے جس کا مزہ انہوں نے پہلے کبھی نہیں پایا تھا اور اس وقت لوگ اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہونے لگے اور اس وقت اللہ نے اپنے رسولؐ سے کیا ہوا وعدہ پورا کر دیا۔

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ، وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا، فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ، اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا

جب اللہ کی مدد آجائے اور فتح نصیب ہو جائے اور (اے نبی) تم دیکھ لو کہ لوگ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں تو اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو، اور اس سے مغفرت کی دعا مانگو، بے شک وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے۔

اسلام اس لئے فاتح ہوا کہ اس کے عقیدہ نے شریعت کا قالب اختیار کیا اور اس شریعت نے ایک ایسا نظام بپا کیا جس کی طرف لوگوں کے دل کھنچنے لگے اور لوگوں نے اسی میں اپنے دلوں کے لئے راحت اور سکون محسوس کیا۔

---

[1] المائدہ آیت ۴۴

اس وقت محمدؐ بن عبداللہ کامیاب ہو گئے اس لئے کہ آپؐ نے اللہ کی شریعت نافذ کر دی جس طرح اللہ کی منشا تھی۔

یہ اس لازوال فتح کے مراحل تھے جس پر تاریخ انسانی کا ایک ایک باب گواہ ہے۔ اور آج کروڑوں آوازیں مشرق و مغرب میں اس کے نغمے گاتی ہیں۔ اور یہ مراحل طبعی اور حقیقی ہیں۔ ایسے مراحل جن پر ہم مسلمان ہر دور میں قدرت رکھتے ہیں۔ یہ وہ مراحل ہیں جو ہمارے سامنے ہیں کہ ہم کوشش کریں انکو آزمائیں اور ان کے ذریعے وہ کامیابی حاصل کریں جو اللہ نے ان بندوں کے لئے مقرر کر دی ہے جو اللہ کی مدد کرتے ہیں۔

وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ۔ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۔ اَلَّذِيْنَ اِنْ
مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا
بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ، وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ۔

اللہ ضرور اُن لوگوں کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کریں گے۔ اللہ بڑا طاقتور اور زبردست ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے منع کریں گے اور تمام معاملات کا انجام کار اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

صَدَقَ اللّٰهُ الْعَظِيْمُ

دُنیا کا آخری پیغمبرؐ

مولانا قاری خلیل احمد

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

آج سے تیرہ سو برس پہلے دنیا کی حالت بہت خراب تھی۔ مذہب سے کوئی تعلق باقی نہ رہا تھا۔ خدا کو لوگ بھول چکے تھے عرب کی حالت خاص طور پر بری تھی۔ مذہب کا تو ذکر کیا عام اخلاقی حالت بھی ایسی بدتر تھی کہ انسانیت کو اس سے شرم آتی تھی۔

خدا نے اس خراب حالت کو دور کرنے کے لئے اپنا ایک نیک بندہ دنیا میں بھیجا جس کا نام محمدؐ ہے آنحضرتؐ عرب کے اس خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو سارے عرب میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ آنحضرتؐ نے دنیا کو وہ تعلیم دی جو اس خوبی سے نہ پہلے کبھی نہیں دی گئی نہ آپ کے بعد اور اب جو بھلائی دنیا میں نظر آتی ہے وہ آپ ہی کی تعلیم کا اثر ہے اس تعلیم سے دنیا کو کیا فائدہ پہنچا اس کا بیان آگے آتا ہے لیکن اس سے پہلے آپ کی شخصیت کو واضح کر دینا ضروری ہے تاکہ آپ کی تعلیم کی عظمت کا صحیح طور پر اندازہ ہو سکے۔

محمدؐ قرآن میں

خدا کی طرف سے آنحضرتؐ کو ایک کتاب دی گئی تھی جسکا نام قرآن ہے۔ آنحضرتؐ نے اسی کتاب کے ذریعہ تمام دنیا کو تعلیم دی۔ تعلیم محمدیؐ کی خوبی کے مطالعہ کرنے والے کو سب سے پہلے قرآن ہی میں تلاش کرنا چاہیئے کہ خدا نے اپنی کتاب میں آنحضرتؐ کا ذکر کن کن اوصاف کے ساتھ کیا ہے تاکہ آپ کی تعلیم کو آپ کے عمل کے مقابلہ میں رکھ کر جانچنے کے لئے اندرونی شہادت کے ساتھ ساتھ ہم کو یہ اندازہ کرنے میں آسانی ہو کہ آپ کی تعلیم کس حد تک صحیح ہے۔ خدا نے قرآن میں مختلف مقامات پر آپ کا ذکر کیا ہے اور ہر جگہ آپ کی ایک نہ ایک نمایاں خصوصیت کو بیان کیا ہے قرآنی توصیف کو ہم اپنے لفظوں میں اس طرح پیش کر سکتے ہیں۔ اے محمدؐ بیشک تم رسولوں میں ہو تم صرف ایک رسول ہو تم حق کو لیکر آئے ہو تم رسولوں کی تصدیق کرتے ہو۔ اے محمدؐ تم اللہ کے رسولؐ اور آخری نبی ہو۔ اے محمدؐ تم سے وہی بات کہی جاتی ہے جو تم سے پہلے رسولوں سے کہی گئی۔ یعنی تمہاری اور ان کی تعلیم مقصد کے لحاظ سے ایک ہے محمدؐ تم گمراہی وضلالت سے پاک ہو۔ کیونکہ یہ چیز انبیا کی شان کے خلاف ہو۔ مسلمانوں کے لئے تم رحمت ہو۔ اے محمدؐ تم کو سارے عالم کیلئے بشارت

دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا گیا ہے اور اے محمدؐ تم سچائی اور حق پر ہو۔

اب ہمیں دیکھنا چاہیے کہ محمدؐ کس طرح عالم کے لئے رحمت اور بشارت دینے والے تھے اور بحیثیت ایک انسان کے آپ نے انسانیت کی کیا خدمت کی۔

خدمت

رسول کی زندگی کا ایک بہت بڑا مقصد مخلوق خدا کی خدمت تھی۔ رسولؐ نے فرمایا ''قوم کا خادم ہی قوم کا سردار ہوتا ہے'' آپ نے اپنے اس قول کو پورا کر دکھایا اور اپنی تمام عمر مخلوق کی خدمت میں صرف کر دی اور اسی کے ساتھ مخلوق کو سیدھا راستہ بھی دکھایا۔ ہم رسول کی زندگی کے تمام واقعات میں سے کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہیں دکھا سکتے جو آپ کے قول کے خلاف ہو۔ آپ گھر کے اندر اپنی بیویوں کے ساتھ خود بھی کام کرتے تھے گھر کے باہر پڑوسیوں اور بیواؤں کی خدمت کرتے تھے۔ سفر میں اپنے ساتھیوں کی خدمت کرتے تھے۔ آپ نے زندگی کے آخری سانس تک معذور و مجبور بوڑھے بچے اور عورتوں کا خیال رکھا۔

دشمنوں کی نظر میں

آنحضرتؐ کی صداقت کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ دشمنوں نے بھی آپ کی سچائی کا اقرار کیا۔ آپ نے سب سے پہلی مرتبہ ایک پہاڑ پر چڑھ کر اپنی قوم کو خدائے واحد کی تعلیم کے لئے جمع کیا آپ نے لوگوں سے کہا کہ جو کچھ میں تم سے کہہ رہا ہوں کیا تم اس پر یقین کرتے ہو۔ سب نے متفق ہو کر کہا نَعَمْ مَا جَرَّبْنَا عَلَيْكَ اِلَّا صِدْقًا'' ہاں ہمیں اب تک بار بار کے تجربہ سے یہی ثابت ہوا کہ تم سچے ہو۔

ابوجہل۔ اُمیہ بن خلف، نضر بن حارث، عتبہ بن ربیعہ اور ولید بن مغیرہ یہ لوگ آپ کے بہت بڑے مخالف تھے۔ لیکن آپ کی صداقت اور امانت کا اقرار سب نے کیا ہے اور ابوسفیان نے تو ہرقل شاہ روم کے بھرے دربار میں آپ کی صداقت و دیانت کا بحیثیت دشمن سردار کے اقرار کیا۔ یہ تمام باتیں اسلامی تاریخ میں اب بھی موجود ہیں جنہیں ہر شخص دیکھ سکتا ہے۔

زندگی کا مقصد

آنحضرت دنیا میں کس لئے تشریف لائے تھے۔ صرف اس ایک بات کے سمجھ لینے سے مذہب اسلام کے متعلق آسانی سے رائے قائم کی جا سکتی ہے۔ آنحضرت کی زندگی کا مقصد ہم اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھنا چاہتے بلکہ ایک غیر مسلم اہل قلم کا مختصر سا مضمون پیش کئے دیتے ہیں وہ لکھتا ہے۔

"پیغمبر اسلام کی زندگی کا مقصد دنیا کی اصلاح کرنا تھا اور اس میں ان کو پوری پوری کامیابی ہوئی۔ دنیا ان کے احسانات سے دبی ہوئی ہے ان سے پہلے بھی بہت سے لیڈر اور ریفارمر اور نبی آئے اور اسی مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اپنی زندگیاں صرف کر دیں۔ مگر رسول عربی کا طرز عمل کچھ ایسا مخلصانہ اور سادہ تھا کہ دوست و دشمن سب ان سے یکساں متاثر ہوئے اور فائدہ اٹھایا۔ آپ نے دنیا کی فلاح و بہبود کے لئے ایک ایسے تمدن کی بنیاد ڈالی جو شخصیت پرستی سے مبرا ہے جس میں امتیاز رنگ و نسل کوئی چیز نہیں جس کے نزدیک انسانی بزرگی کا معیار پرہیزگاری اور خدا پرستی کی پیدا کی ہوئی عظمت و فضیلت جس نے خدا اور اس کی مخلوق کے رشتہ کو مضبوط کر دیا جس کی بنیاد عدل و انصاف و صدق اخوت باہمی، ہمدردی، مساوات پسندی و رواداری پر قائم ہے اگر آج دنیا اسی طریقہ پر عمل پیرا ہو تو بہت سے دقت طلب مسائل کا حل آسانی سے ہو جائے اور خدا کی مخلوق پر امن زندگی بسر کرے۔"

یہ عبارت کسی مسلمان کے قلم سے نہیں بلکہ ایک غیر مسلم کے قلم سے نکلی ہے میں اسی بیان کی روشنی میں آپ کے سامنے ان تمام چیزوں کو پیش کرتا ہوں جن کی طرف اس غیر مسلم نے اشارہ کیا ہے آزادی پست اور کم درجہ انسانوں اور قوموں کے ساتھ اسلام کا سلوک لوگوں میں جذبہ انسانیت و شرافت پیدا کرنا۔ تہذیب و تمدن کی ترقی عورت کا مرتبہ کیا ہونا چاہیئے۔ بچوں کے ساتھ برتاؤ اور ہمسایہ قوموں کے ساتھ اسلام کس قسم کے برتاؤ کا حکم دیتا ہے۔

آزادی

ملک عرب بلکہ ساری دنیا میں برائیاں پھیل گئی تھیں۔ دماغوں میں ہر وقت ذلیل اور پست خیالات چکر لگاتے رہتے تھے۔ غریبوں کا کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ مالدار اپنی دولت اور عزت کے گھمنڈ میں کسی کی پروا نہ کرتے تھے۔ ہر شخص دوسروں کی بربادی کی فکر میں لگا رہتا تھا جن لوگوں کو غلام بنا لیا جاتا تھا ان کے ساتھ اتنا برا سلوک کیا جاتا تھا کہ اس کے خیال سے اس وقت بھی ظلم کرنے والوں سے نفرت پیدا ہوتی ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر برسوں لڑائیاں ہوتی تھیں سیکڑوں جانیں ایک چھوٹی سی بات پر خاک و خون میں لتھڑی ہوئی نظر آتی تھیں۔ اخلاقی حالت کا تقریباً وہی عالم تھا جو آج یورپ کا ہے یا ان ملکوں کا جہاں یورپ کے اثرات پہنچ چکے ہیں۔ ہندوستان میں بھی جہاں ہم بستے ہیں۔ برہمن اور شودر میں وہی فرق تھا جو آج موجود ہے۔ جیسا کہ ملک عرب میں آقا اور غلام کے درمیان امتیاز تھا چھوٹی اور نیچ ذات قوم کے کسی فرد کی یہ مجال نہ تھی (نہ ہے) کہ وہ کسی برہمن یا اونچی ذات والے کے پاس سے یا اس کی کسی چیز کو چھوتا ہوا گذر جائے۔ غرضیکہ جب دنیا کا یہ حال تھا تو خدا نے اپنی رحمت سے دنیا کی اصلاح کے لئے آنحضرتؐ کو بھیجا۔ آپ نے آقا اور غلام کے فرق کو مٹایا جو جہالت تمام دنیا میں پھیلی ہوئی تھی اسے دور کیا تاکہ تمام آدمی یکساں طور پر امن و سکون کی زندگی بسر کریں۔ آپ اپنی تعلیم میں کامیاب ہوئے اور تھوڑے ہی دنوں کے بعد دنیا نے دیکھ لیا، کہ مسلمانوں میں نہ کوئی آقا ہے نہ کوئی غلام سب آپس میں بھائی بھائی ہیں اور صرف خدا کے بندے اور غلام ہیں۔ اگر کوئی

مالدار ہے تو اپنے لیے کوئی بڑی ذات کا ہے تو اپنے لیے۔ کسی غریب کے مقابلہ میں اسے اپنے آپ کو بڑا سمجھنے کا کوئی حق نہیں۔ کیونکہ خدا کے نزدیک یہ تمام چیزیں قابلِ اعتبار نہیں۔ اس کے نزدیک تو وہی شخص عزت والا ہے جو اس کی عبادت کرے اور اس سے ڈرتا رہے۔

پست اور کم درجہ انسانوں اور قوموں کیساتھ اسلام کا سلوک

اچھوت اسلام سے پہلے

یہ عجیب بات ہے کہ آج انسانوں کے جس حصہ کو مہذب دنیا (یورپ امریکہ) میں حد سے زیادہ آزادی حاصل ہے اور جس کی بے انتہا آزادی نے مہذب دنیا کے چھوٹوں اور بڑوں سب ہی کو غیر مہذب بنا دیا اسلام سے پہلے یہاں اس انسانی گروہ جس کو صنف نازک سے تعبیر کیا جاتا ہے، یعنی عورت کی حالت بہت خراب تھی روم و ایران کی مہذب حکومتیں جاپان، چین اور ہندوستان جیسے بڑے بڑے ملک اس انسانی گروہ کی کوئی قدر نہ کرتے تھے اور نہ اس صنف کو کوئی شرافت حاصل تھی حالانکہ عورت اس وقت بھی دنیاوی زندگی کے لیے اتنی ہی ضروری چیز تھی جتنی کہ آج ہے اسی طرح غلاموں اور نیچ اور پست قوموں کی حالت تھی اس گروہ کی خراب و خستہ حالت کا نقشہ ہم کسی قدر زمیندار اور کسان کی زندگی میں دیکھ سکتے ہیں۔ بیچارہ کسان باوجود اپنا خون و پسینہ ایک کرنے کے بعد چند دانے جمع کرتا ہے۔ سال بھر تک محنت و مشقت برداشت کرنے کے بعد بھی زمیندار، سرمایہ دار کے سود سے نجات نہیں پاتا اپنی بے انتہا مشقت سے پیدا کیا ہوا ایک ایک دانہ سرمایہ دار کے قرض میں ادا کرنے کے بعد بھی سکون اور چین نہیں پاتا۔ پست قومیں ساری عمر خدمت میں صرف کر دینے کے باوجود اپنے مالکوں کے دل میں کوئی عزت نہیں حاصل کرتیں۔ یہی حالت زمانۂ اسلام سے پہلے غلاموں اور کم درجہ رکھنے والے انسانوں اور قوموں کی تھی اسلام نے اس تفریق کو مٹایا۔ غلاموں، عورتوں اور کم درجہ قوموں کی بحیثیت انسان کے مساوی حیثیت تسلیم کی اور بتایا کہ اللہ کے نزدیک سب برابر ہیں۔

آنحضرتؐ اور پسماندہ قومیں

اسلام نہ تو سرمایہ داری کا حامی ہے اور نہ نیشنلزم کا وہ دنیا میں صحیح اور واقعی جمہوریت کا طرفدار ہے جس کا نمونہ ہمارے سامنے خلفاء راشدین اور ان کا زمانہ خلافت ہے جمہوریت ہی وہ چیز ہے جو بڑے اور چھوٹے کے امتیاز کو مٹاتی ہے اور خالص اور سچی مساوات پیدا کرتی ہے۔ قرآن کے صفحات اور آنحضرتؐ کی خدمتیں ہمیں اسی چیز کی تعلیم دیتی ہیں۔

یہ ہی چیز تھی جس نے بلال حبشیؓ کی خاندانی پستی کا خیال تک مسلمانوں کے دلوں میں نہ آنے دیا۔ بڑے بڑے

صحابہؓ کرام بیساختہ پکارا ٹھتے تھے کہ بلال ہمارے ... ہیں۔ یہ اسلامی تعلیم ہی کا ... تھا کہ عرب جو اپنے نسب و خاندان کی شرافت کو سب سے بڑی فضیلت سمجھتے تھے اور زمانہ جاہلیت کے بچے بچے کو اپنا شجرہ نسب ازبر تھا یا ورد زبان تھا۔ لیکن جب بلال حبشی کو اپنے نکاح کی فکر ہوتی ہے تو عرب کے بڑے بڑے معزز خاندان بلالؓ کو اپنی لڑکیاں دینے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔

جس وقت تک دنیا آباد ہے اسلام کی تاریخ سے یہ بات کبھی مٹائی نہیں جا سکتی کہ مسلمانوں نے کم درجہ لوگوں کو وہ حیثیت دیدی تھی کہ آگے چل کر انہوں نے تخت حکومت پر بیٹھ کر حکمرانی کی اور ہندوستان میں سب سے پہلا حکمران خاندان غلاموں کا خاندان تھا۔

غریبوں کا ہمدرد محمدؐ

ہر زمانہ میں ہر بڑے آدمی نے خواہ وہ بادشاہ ہو یا وزیر۔ حاکم ہو یا لیڈر ہر ایک نے غریبوں کی ہمدردی کا اظہار اپنی زبان قلم سے کیا ہے اور یہ اس لئے کیا کہ دنیا کے کاروبار۔ دنیا کا سارا نظام زندگی ان غریبوں کی امداد و اعانت پر موقوف ہے اس لئے ہر وہ شخص جو جسموں یا روحوں پر حکومت کرنا چاہتا ہے اپنی ضرورت کی آسانی کیلئے غریبوں کے ساتھ اظہار ہمدردی ضروری سمجھتا ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ عمل کے ساتھ اس کا قول کس حد تک مطابق ہے۔

تاریخ عالم پر نظر ڈالئے تو اس قسم کے بہت کم لوگ ملیں گے جن کے قول و عمل یکساں ہوں مگر آنحضرتؐ ان سب سے الگ بالکل نرالی شان کے مالک تھے۔ آپ نے اپنے قول کو کبھی اپنے عمل کے مخالف نہیں ہونے دیا۔ کتنا عبرتناک واقعہ ہے کہ آنحضرتؐ جیسا عظیم الشان ہادی جس کی پیدائش نے قیصر و کسریٰ کے فلک بوس محلوں میں زلزلہ ڈال دیا تھا جب وہ دنیا میں آتا ہے تو باپ کا سایہ سر سے اٹھ جاتا ہے اور اس کی پرورش چچا کے سپرد ہوتی ہے جو خود بھی کوئی صاحب ثروت نہ تھے بلکہ غربت کی زندگی بسر کرتے تھے جس دایہ کو آنحضرتؐ کی دودھ پلائی ہونے کا شرف حاصل ہوا وہ بھی ایک مفلس گھر کی فرد تھی بعد میں گو آپ کا نکاح ملکہ عرب حضرت خدیجہؓ سے ہو گیا لیکن آپ نے کبھی اپنے اخراجات کا بوجھ خدیجہؓ پر نہ ڈالا بلکہ باپ کے ترکہ سے جو معمولی سا حصہ ملا تھا اس پر بسر اوقات کرتے تھے۔ غرضیکہ ساری عمر آپ نے غریبی میں گذاری اور قدرت کے باوجود کبھی امیرانہ زندگی کو پسند نہ کیا اس لئے کہ آپ کو معلوم تھا کہ ہر زمانہ میں امیر اور مالدار گنے چنے ہوتے ہیں ساری دنیا غریبوں سے ہوتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ آپ غریبوں میں اکثر جا کر بیٹھتے تھے اور انکی صحبت کو پسند کرتے تھے اس چیز کا اثر تھا کہ امیروں اور مالداروں کی بے انتہا مخالفت کے باوجود غریبوں نے ہر موقع پر آپ کا ساتھ دیا۔ ابتدائے اسلام میں آنحضرتؐ نے انہی غریبوں کی امداد سے کامیابی حاصل کی۔ آج بھی اسلام کی وہی تعلیم موجود ہے اور وہی اللہ و رسول کا فرمان مسلمانوں کے لئے مستقل ہدایت ہے جو آنحضرتؐ کے زمانہ میں تھی۔ البتہ خود مسلمان بدل گئے ہیں۔

انسانیت

آنحضرتؐ نے انسان کو انسان بنایا

آنحضرتؐ کو جن حالات میں نبوت میں عطا کی گئی وہ تاریخ کے اوراق میں ابتک موجود ہے جن کی تصدیق اب بھی نہ صرف مسلمان بلکہ غیر مسلم علماء بھی کرتے ہیں جہالت و گمراہی کا زمانہ تھا نہ صرف عرب بلکہ ساری دنیا میں بت پرستی کے سوا کوئی چیز نظر نہ آتی تھی اس کا اثر تھا کہ سارا عالم ظلم و فساد فسق و فجور میں مبتلا ہو گیا تھا۔ قرآن نے بھی اس حالت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ آنحضرتؐ نے چند ہی دن میں ان کی اس حالت کو ایسا پلٹ دیا کہ گویا عالم ہی بدل گیا جو گردنیں غیر اللہ کے سامنے جھکتی تھیں۔ اب صرف خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں جھک رہی تھیں۔ فارس آگ کے بڑے بڑے ڈھیروں کو اپنا معبود سمجھتا تھا روم اور ساری دنیائے نصرانیت عیسیٰ مسیح کی قربانی کو اپنی ساری نافرمانیوں اور بدعملیوں کا کفارہ سمجھتی تھی ہندوستان اپنی غیر معمولی وسعت کے باوجود محدود اور گنے چنے معبودوں پر کیسے اکتفا کر سکتا تھا۔ یہاں پینتیس کروڑ دیوتاؤں کا راج تھا جن کے سامنے ہندوستان کے بسنے والوں کی پیشانیاں جھکی تھیں عرب جو روم و فارس کا ہمسایہ ہونے کی وجہ سے وہاں کی گمراہیوں سے اچھی طرح متاثر تھا۔ وہ اپنی عبادت و پرستش کی ایک نرالی شان رکھتا تھا۔ اس اندھیری دنیا میں آنحضرتؐ توحید کی مشعل لیکر نکلے اور گمراہوں کو دکھلا دیا کہ توحید ہی وہ چیز ہے جس کی وجہ سے انسان میں انسانیت و شرافت پیدا ہوتی ہے۔

دوسری چیز اخوت و مساوات تھی جو آنحضرتؐ نے دنیا کے سامنے پیش کی۔ شرافت و عظمت کا معیار اعمال کو قرار دیا۔ قومیت۔ نسل اور رنگ و روپ کی تفریق کو مٹایا۔ یہاں تک کہ اس کا خیال ہی لوگوں کے دلوں سے دور کر دیا۔ آپ کے نزدیک مالدار کبھی اس لئے قابل عزت نہیں قرار پایا کہ وہ مال و دولت کا مالک ہے۔ آپ نے ہمیشہ امیروں اور غریبوں کو ایک نظر سے دیکھا بلکہ کسی حد تک غریبوں پر آپ کی نظر عنایت زیادہ رہی۔

ہم دیکھتے ہیں کہ آج دنیا پھر اسی قومیت اور رنگ و روپ کی تفریق کے درپے ہے کہیں کالے اور گورے کا فرق ہے کہیں اونچ اور نیچ ذات کا امتیاز ہے اس وقت بھی یہ امتیاز و تفریق نہ صرف یہ کہ باہمی معاشرت ہی میں تھی بلکہ عبادت گاہوں تک اس کا اثر پہنچ گیا تھا جس طرح کہ آج بھی ہندوستان میں ہم دیکھ رہے ہیں ہر ذات کے الگ الگ گرجے اور مندر ہیں جن میں صرف اسی ذات کے لوگ جاتے ہیں۔ دوسری ذات والا نہیں جا سکتا اگرچہ اب اس حالت میں بعض مفاد سیاسی کی غرض سے تبدیلی ہو رہی ہے۔ ہندوستان میں نیچ ذات والوں کے لئے اونچ ذات والوں کے مندر کھلوائے جا رہے ہیں یا کھلوانے کی کوشش کی جا رہی ہے یہ چیز اگرچہ اچھی ہے لیکن ایسا کرنے والے اپنے اعتقاد کی روشنی میں نہیں بلکہ اپنے مفاد کے پیش نظر عقل کی رہنمائی سے کر رہے ہیں لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان

کی عقل کی رسائی اس فائدہ کی طرف کیسے ہوئی تو ہم بلاخوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی تعلیم کے سرسری مطالعہ نے یا اس گئی گزری حالت میں بھی مسلمانوں کو باہمی معاشرت اور اونچ نیچ کی تفریق نہ کرنے نے ان لوگوں کو اس اصلاحی و سیاسی تدبیر پر مجبور کیا۔

شرافت و انسانیت کے پیدا کرنے کے لئے جو سب سے اہم پیغام آنحضرتؐ نے ہم کو دیا وہ جسم و ضمیر کی آزادی ہے اس لئے کہ آزادی ہی وہ چیز ہے جو انسان میں شرافت کے جوہر پیدا کرتی ہے۔ کلیسا کی تاریخ ہمارے سامنے ہے۔ پوپ اور پادری ایک عیسائی کے جسم و روح پر کس طرح حکومت کرتا تھا اسے عیسائیت نے ابھی فراموش نہ کیا ہوگا۔ اسی طرح ہندوستان میں پنڈتوں اور برہمنوں کے ہاتھ میں ہندوستان کی قسمت کا الٹ پھیر تھا۔ کوئی ہندوستانی بغیر ان کے حکم کے نقل و حرکت نہیں کر سکتا تھا لیکن آنحضرتؐ نے ان غلط اختیارات کا خاتمہ کر دیا۔ ان ناجائز حقوق کو باطل قرار دیا۔

آنحضرتؐ نے انسان کو بلند مرتبے پر پہنچایا

ان حالات کو دیکھ کر مجبوراً تسلیم کرنا پڑے گا کہ آنحضرتؐ نے انسان کو پستی و ذلت سے نکالکر بہت بلند درجہ پر پہنچا دیا انسانوں پر آپ کا یہ بہت بڑا احسان ہے۔ آنحضرتؐ کی تعلیم نے یہ ہی نہیں کہ عرب کے جاہل باشندوں میں تبدیلی پیدا کر دی اور آپ کی تعلیم عرب کے حدود میں بند ہو کر رہ گئی ہو بلکہ آپ کا پیغام ساری دنیا کیلئے تھا اور بلا امتیاز رنگ و نسل ساری دنیا نے آپ کے پیغامات سے فائدہ اٹھایا اور آپ نے اپنی تعلیم کے سلسلہ میں جان و مال غرضیکہ کسی چیز کے صرف کرنے میں تامل نہیں کیا۔ آپ کی انہی انتھک کوششوں کا نتیجہ تھا کہ تعلیمات اسلامی ملک عرب سے نکل کر اپنے گرد و پیش کے ملکوں اور پھر سارے عالم میں پھیل گئیں۔ قرآن نے اسی لئے آپ کو رحمۃ للعالمین کے خطاب سے نوازا۔

شرافت اور عہدوں کی پابندی

انسانی شرافت کا اظہار عہدوں کی پابندی سے بھی ہوتا ہے۔ عہد صرف اس چیز کا نام نہیں ہے کہ جو کچھ ہم دوسروں سے بطور وعدہ کے کہتے ہیں بلکہ ہر وہ چیز عہد ہے جو انسان سے عمل کی شکل لئے ہوئے صادر ہوتی ہے گو اس کا تعلق دوسروں سے نہ ہو لیکن خود اس شخص کے جسم و دل کے درمیان اس کا یہ عمل ایک عہد کی حیثیت رکھتا ہے۔ پھر ایک مصلح کیلئے تو بہت ہی ضروری ہے کہ ہر عمل جو اس سے صادر ہو یا قول جو اس کی زبان سے نکلے پورا کر کے دکھائے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آنحضرتؐ اپنے اس وصف میں بھی تمام دنیا کے ریفارمر اور اصلاح کرنے والوں سے ممتاز تھے۔ مثال کے طور پر اس یہودی کا واقعہ پیش کیا جا سکتا ہے جو ایک مرتبہ آپ کو راستہ میں ملا اور کہا کہ مجھے آپ سے کچھ کام ہے۔ آنحضرتؐ نے جواب دیا کہ میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ تم تھوڑی دیر یہیں ٹھہرو۔ میں ابھی واپس آتا ہوں۔ یہودی وہیں ٹھہر کر

آپ کی واپسی کا انتظار کرنے لگا کچھ دیر کے بعد اسے خیال ہوا کہ شاید محمدؐ کو واپسی میں دیر ہوگی اس لئے یہودی اپنے گھر چلا گیا۔ آپ کام سے فارغ ہو کر اسی جگہ پہ واپس آئے دیکھا کہ یہودی موجود نہیں ہے۔ لیکن آپ صبح تک وہیں اس کے انتظار میں رہے۔ دوسرے دن یہودی کا گذر اسی طرف سے ہوا دیکھتا کیا ہے کہ آنحضرتؐ اس کے انتظار میں اب تک موجود ہیں عہد کی اس پابندی کو دیکھ کر وہ فوراً ایمان لے آیا۔ آپ کا یہی دستور ہر معاملہ میں تھا کوئی شخص یہ ثابت نہیں کر سکتا کہ آپ نے کسی موقع پر بھی شرافت و انسانیت کو چھوڑا ہو۔

آنحضرتؐ بحیثیت انسان کے

آنحضرت کو بحیثیت انسان کے ہم دنیا کا بہترین انسان پاتے ہیں گھر میں اور باہر دوستوں اور عزیزوں کے ساتھ غیروں اور غریبوں کے ساتھ اولاد اور بچوں کے معاملہ میں ہر جگہ آپ انسانیت و شرافت کا ایک اعلیٰ نمونہ ہیں اور جو چیز آپ نے دنیا کے سامنے پیش کی اس پر خود بھی عمل کیا اور اپنے ماننے والوں سے بھی اس پر عمل کرنے کی توقع کی۔

آپ کے صاحبزادے حضرت ابراہیمؑ کا جب انتقال ہوتا ہے تو آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ ایک صحابیؓ نے دریافت کیا یا رسول اللہ یہ کیا بات ہے۔ آپ نے فرمایا رحمت و شفقت کی وجہ سے میرا یہ حال ہے۔ ان صحابیؓ نے دوبارہ یہی سوال کیا تو آپؐ نے فرمایا" آنکھیں نم ہیں دل غمگین ہے مگر ہم وہی کہیں گے جو ہمارے رب کی مرضی ہے۔ اے ابراہیم ہم تمہاری جدائی سے بیشک غمگین ہیں۔"

یہ انسانی رحمت و شفقت کا کس قدر کھلا ہوا ثبوت ہے۔ ایک مرتبہ ایک شخص ملنے کے لئے آیا نبوت کے رعب و دبدبہ سے کانپنے لگا۔ آپ نے فرمایا" ڈرو نہیں میں فرشتہ نہیں ہوں ایک قریشی عورت کا بیٹا ہوں جو خشک گوشت پکایا کرتی تھی۔"

شجاعت و بہادری کے میدان میں بھی آپ سے انسانی مردانگی کا جوہر یعنی دلیری و جوانمردی کا اظہار ہوتا رہا ہے دوسرے مذہب کے پیشواؤں کی تاریخ میں ہم اس چیز کو نہیں پاتے ہمیں معلوم ہے کہ جب کبھی دنیائے عیسائیت میں جنگ کے شعلے بلند ہوئے تو پادریوں نے گرجا کی محفوظ چار دیواری میں اپنے آپ کو بند رکھا اور کلیسا کے معتقدین اپنی جانوں پر میدان جنگ میں کھیلتے رہے۔ ہندوؤں کے متعلق بھی واقف کاروں سے معلوم ہوا ہے کہ برہمن اور مندر کے پجاری ایسے وقت میں بتوں کے سامنے پیشانی رگڑتے رہے اور بھارت ماتا کو بچانے کے لئے عام ہندو سپوتوں نے اپنی جانیں قربان کیں لیکن آنحضرتؐ کی زندگی اس سے بالکل الگ ہے۔ عبادت کے موقع پر یقیناً آپ کی پیشانی مسجد کی محرابوں میں رکھی ہوئی نظر آتی تھی مگر جب اسلام کی حفاظت کا سوال پیدا ہوتا تھا تو دوسرے مسلمانوں کی طرح آنحضرتؐ کو ہم میدان کارزار میں مصروف جنگ پاتے ہیں۔

آپ کو اپنے چچا ابوطالب سے بہت محبت تھی ایک مرتبہ ابوطالب بیمار ہوئے۔ آنحضرت عیادت کے لئے

تشریف لائے تو چچا نے کہا میری صحت کے لئے دعا کرو آپ نے دعا کی۔ ابوطالب اچھے ہو گئے اس پر ابوطالب نے کہا "خدا تمہاری بات مانتا ہے"۔ آپ نے فرمایا "اے چچا آپ بھی خدا کا کہنا ماننے لگیں تو وہ بھی اسی طرح آپ کا کہا مانے"

ایک مرتبہ آپ ایک قبیلہ کے مکانوں کے پاس سے گذر رہے تھے کہ ایک مکان کو دیکھ کر فرمایا اس مکان میں میری والدہ ٹھہری تھیں یہی وہ تالاب ہے جہاں میں تیرا کرتا تھا۔

ایک مرتبہ صحابہ کے ساتھ جنگل میں تشریف لے گئے۔ صحابہ جنگلی بیر توڑ توڑ کر کھانے لگے آپ نے فرمایا جو خوب سیاہ ہوتے ہیں وہ بہت لذیذ ہوتے ہیں میرا اس وقت کا تجربہ ہے جب میں بچپن میں یہاں بکریاں چرایا کرتا تھا اپنے خالق و مربی کا خیال و خوف بھی انسانیت کا ایک فرض ہے۔ آنحضرتؐ کو جتنا خدا کا خوف رہا ہے اس کی مثال دنیا میں ملنا مشکل ہے حدیثوں میں وارد ہے کہ جب کبھی آندھی آتی تو آپ سہم جاتے۔ ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ نے دریافت کیا کہ آندھی سے آپ اسقدر پریشان کیوں ہو جاتے ہیں۔ فرمایا عائشہ تمہیں کیا معلوم۔ کہیں قوم ہود کا حادثہ پھر پیش نہ آجائے۔ اس قوم نے بادلوں کو دیکھ کر کہا تھا کہ یہ ہمارے کھیتوں کو سیراب کرنے کے لئے آئے ہیں حالانکہ وہ عذاب الٰہی تھے ایک مرتبہ آپ جنازہ میں تشریف لے گئے قبر کھودی جا رہی تھی۔ آپ قبر کے کنارے بیٹھ گئے اور اس وقت کا منظر دیکھ کر آپ پر رقت طاری ہو گئی اسقدر روئے کہ زمین تر ہو گئی اس کے بعد فرمایا "بھائیو۔ اس دن کے لئے سامان کر رکھو"

جنگ بدر میں جو قیدی مسلمانوں کے ہاتھ آئے تھے ان میں سہیل بن عمرو بھی تھا جو فصیح و بلیغ تھا اپنی خوش بیانی سے لوگوں کو آنحضرتؐ کے خلاف بہکایا کرتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے رائے دی کہ اس قیدی کے نیچے کے دانت اکھڑوا دیئے جائیں تاکہ پھر نفیس گفتگو نہ کر سکے۔ آپ نے فرمایا اگر میں اس کے ساتھ ایسا کروں گا تو گو نبی ہوں لیکن خدا اس کی جزا میں میرے اعضا بھی بگاڑ دے گا آنحضرتؐ کا حج وداع ایک تاریخی حج ہے کیونکہ یہ آپ کا آخری حج تھا۔ اس کے بعد آپ دنیا سے تشریف لے گئے اس حج میں کثرت سے لوگ شریک ہوئے تھے۔ لاکھوں کا مجمع تھا۔ نماز کے بعد آنحضرتؐ نے اسامہ بن زید کو اونٹ پر بٹھا لیا اور خود اونٹ کی نکیل پکڑ کر کھینچتے ہوئے لے چلے چونکہ مجمع بہت تھا اس لئے بڑی کشمکش پیدا ہو گئی تھی۔ آنحضرتؐ داہنے ہاتھ سے لوگوں کو اشارہ کرتے جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے۔ لوگو سکون و اطمینان کے ساتھ۔

آنحضرتؐ جب کبھی مجلس میں تشریف رکھتے تو آپ کے زانو دوسرے لوگوں کے بالکل برابر ہوتے۔ آگے نکالکر نہیں بیٹھتے تاکہ کوئی امتیاز پیدا نہ ہو جب کسی کے یہاں تشریف لیجاتے تو ممتاز جگہ پر بیٹھنے سے پرہیز فرماتے۔

آپ کی شرافت کے واقعات کو کہاں تک بیان کیا جائے۔ دوستوں کے ساتھ آپ کا سلوک آپ کی نرم دلی اور آپ کی خوش طبعی، غرضیکہ آپ کی ہر چیز ایسی تھی جس سے آپ کی انتہائی شرافت کا اظہار ہوتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ مخالف بھی آپ کی شخصیت کو ماننے لگے تھے۔

اسلامی تمدن

تہذیب و تمدن ہی وہ چیز ہے جو کسی قوم کے کیرکٹر اور اس کے مذہب کی اچھائی اور برائی کو ظاہر کرتی ہے۔ غالباً

اسی بنا پر مذہب نے اپنی بنیاد دو چیزوں پر رکھی ہے۔

انسانوں کا تعلق اپنے پیدا کرنے والے کے ساتھ اور انسانوں کا باہمی ارتباط۔ اس کو ہم اجتماعی اور مدنی زندگی کہتے ہیں۔ تمام مذاہب کے لوگ مقدس اور بزرگ انہیں لوگوں کو سمجھتے ہیں جو اجتماعی زندگی سے الگ ہو کر پہاڑوں اور جنگلوں میں جا کر تنہائی کی زندگی بسر کرنے لگیں یا مندروں اور گرجاؤں کے گوشوں میں تارک الدنیا ہو کر بیٹھ رہیں۔ اس صورتحال نے قوم میں کس قدر خرابیاں پیدا کیں۔ چرچ کی مخالفت اور آزاد پارٹیوں کے قیام سے اس کا کسی قدر اندازہ ہوتا ہے جن لوگوں کے دلوں میں مقدس بننے کی خواہش پیدا ہوئی۔ بر ہمچریہ اور مذہبی عبادت گاہوں کی خدمت کا اعلان کر دیا حالانکہ ان کے دل خوف و مشیت الٰہی سے بالکل بے بہرہ تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تقدس کے پردہ میں شرمناک اعمال کا ظہور ہونے لگا۔ یہ خیالات میرے نہیں ہیں بلکہ ایک پادری کے ہیں جو آج بھی مسیح اور مسیح کی تعلیم کا دلدادہ ہے۔ لیکن وہ اس صورت حال سے پریشان خاطر نظر آتا ہے۔

اب اسلامی تعلیم کو دیکھئے وہ اگر ایک طرف خدا کے ساتھ مضبوط تعلق پیدا کرنے کا حکم دیتی ہے تو دوسری طرف دنیا والوں سے بھی رشتہ تعلق کو سلسلہ مراسم کے باقی رکھنے کا اور بڑھانے کا سبق دیتی ہے وہ دنیا اور دنیا کی خواہشوں اور لذتوں کو چھوڑنے سے منع کرتی ہے۔

بہرحال اسلام جس قدر خدا اور بندے کے تعلقات پر زور دیتا ہے اسی قدر بندوں کے آپس کے تعلقات پر بھی یہی چیز اسلامی تمدن کی بنیاد ہے۔ ایسی بنیادی چیز کا اثر تھا کہ غلام و آقا کی مساویانہ حیثیت تسلیم کی گئی اسی تمدن کا اثر تھا۔ کہ عورت کی وہ ذلیل حیثیت باقی نہیں رہی جو زمانہ جاہلیت کا طرۂ امتیاز تھا اور جس سے دنیائے انسانیت کو شرم آتی تھی عورت کا مرتبہ اس قدر بلند کیا گیا کہ خود آنحضرتؐ نے فرمایا کہ جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے۔ دوسری جگہ فرمایا ہے کہ مجھے تین چیزیں پسند ہیں۔ خوشبو، نماز اور عورت۔

ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ جس قدر اسلامی تمدن کو کامیابی نصیب ہوئی وہ کسی اور تمدن کو نہیں۔ دنیا کی بڑی بڑی غیر مسلم قوموں نے اسلامی تمدن کو یا اس کے بعض حصوں کو تسلیم کیا ہے اس لئے اسلامی تمدن کو ایک کامیاب تمدن کہنا بالکل درست اور صحیح ہے۔

آنحضرت کی تعلیم اور تمدن

آنحضرت نے مسلمانوں کو نماز پنجگانہ کی تعلیم دی، عیدین و حج کے اجتماع کا حکم دیا۔ زکوٰۃ کا حکم دیا ان تعلیمات کا مقصد قوم میں اجتماعی زندگی کا پیدا کرنا تھا اور جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ آپ نے مساوات انسانی کا جذبہ خاص طور پر لوگوں کے دلوں میں پیدا کیا۔ اس لئے عربوں کے ساتھ ساتھ جن عجمیوں نے اسلام کو قبول کیا۔ ان کو عرب کے بڑے بڑے معزز خاندانوں نے اس طرح اپنے اندر ملا لیا کہ ان کو اپنے غیر ہونے کا احساس تک نہ رہا اس مساوات اور اجتماعی

زندگی کا اثر یہ ہوا کہ تہذیب اور تمدن کے منازل بہت جلد مسلمانوں نے طے کر لئے۔

سیاسیات و اخلاقیات، حکمیات و فنون لطیفہ، نظام عسکری، قانون، فن تعمیر غرضیکہ تہذیب کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جسے مسلمانوں نے ہاتھ نہ لگایا ہو اور اسی باعث ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں نے اس زمانہ کے لحاظ سے ہر فن میں یگانۂ روزگار اور یادگار زمانہ افراد تاریخ کے صفحات پر چھوڑے ہیں یہ دوسری بات ہے کہ اس وقت عملی طور پر خود مسلمان ہر چیز میں پیچھے نظر آرہے ہیں جس کی وجہ اپنی تعلیمات سے بے اعتنائی اور بے پروائی ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ مسلمانوں کی بے عملی اسلامی تعلیمات پر وجہ اعتراض نہیں بن سکتی اس لئے ان اوراق کے پڑھنے والوں سے میری یہ درخواست بیجا نہ ہوگی کہ وہ مطالعہ کے وقت مسلمانوں کی بجائے اسلامی تعلیم کو پیش نظر رکھیں۔

آنحضرتؐ کی بعثت اور مدنیت

آنحضرتؐ ایک جاہل اور اکھڑ قوم میں پیدا ہوئے تھے اور ایسے زمانہ میں آپ کو نبوت دی گئی جبکہ ساری دنیا پر جہالت کی تاریکی چھائی ہوئی تھی لیکن چند دنوں کے بعد اس قوم کی بالکل ہی کایا پلٹ ہو گئی ہر شخص جس نے آپ کی تعلیمات کو قبول کیا وہ صحیح معنی میں ایک تہذیب یافتہ اور سچا انسان بن گیا۔ آپ نے ہر مسلمان کو بہترین اخلاق سے مزین کر دیا اسی لئے چند ہی دن میں مسلمان تہذیب و تمدن، جاہ و ثروت اور سلطنت و حکومت غرضیکہ ہر چیز کے مالک بن گئے۔

عورت

اسلام سے پہلے

آنحضرتؐ کی بعثت سے پہلے عورت کی حالت بہت ہی بری ہو چکی تھی۔ روم کی تہذیب یافتہ سلطنت میں یہ دستور تھا کہ عورتیں مردوں کے مخصوص مکانات میں داخل نہیں ہو سکتی تھیں اس کی گواہی قابل قبول نہ تھی کسی قسم کا معاہدہ یا اقرار کرنے کا حق حاصل نہ تھا۔ صنف نازک کی شان امتیازی ذیل کے اوصاف تھے۔

"بدکرداری، بغض و حسد، حرص و طمع، بدزبانی اور آوارہ مزاجی فرانس کا ایک روشن دماغ شاعر تعجب سے کہتا ہے کہ قدرت نے آخر کیوں اس قسم کے ناپاک اور بدذات جانور (عورت) کو پیدا کیا۔ جس نے دنیا کی زیبائش و آرائش کا ستیاناس کر دیا۔"

چین میں اس کے ساتھ یہ سلوک کیا گیا کہ مذہبی دنیا نے اسے نکال باہر کر دیا۔ مندروں میں اس کے ناپاک قدم نہیں جا سکتے تھے۔

یونان میں عورت کو برائیوں اور گناہوں کا خزانہ سمجھا جاتا تھا۔

- روس کے باشندوں کا یہ خیال تھا کہ اس فرقہ کے دس افراد میں مشکل سے ایک روح ہوتی ہے۔
- اٹلی میں ذرا ذرا سی بات پر جوتے اور لات سے عورت کی خبر لی جاتی تھی۔
- آج کا مہذب جاپان بھی اس فرقہ کو مندروں میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔
- ہندوستان میں بھی اس فرقہ کی حالت بہت ابتر تھی دنیا میں خطرناک سے خطرناک چیز عورت سے کم مضرت رساں سمجھی جاتی تھی۔
- مہاتما بدھ کے معتقد اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنا بھی پسند نہ کرتے تھے۔ عورت کے ساتھ زندگی بسر کرنے سے بہتر یہ سمجھتے تھے کہ جلاد کے خنجر تلے جان جانِ آفریں کو سونپ دی جائے۔
- یہودی ہر روز عبادت سے فارغ ہو کر اس بات کا شکریہ ادا کرتے تھے کہ خدا نے انہیں اس فرقہ میں نہیں پیدا کیا۔ عیسائی مذہب کے لوگ اس فرقہ کو کتاب مقدس کے چھونے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔
- اطاعت و تابع داری اس کا کام تھا پڑھنے لکھنے سے اسے کوئی واسطہ نہیں ہوتا تھا۔ شیطانی حرکات کا سرچشمہ سمجھی جاتی تھی ظلم و سیہ کاری کا سبب اس کو قرار دیتے تھے غرضیکہ دنیا کی ہر برائی کا سبب عورت کو قرار دیا جاتا تھا اور اس کے ساتھ اچھوتوں جیسا برتاؤ کیا جاتا تھا۔

اچھوت پن کی یہ بھی ایک شاخ ہے جو اس قدر ہولناک صورت میں دنیا کے اندر موجود تھی انسانیت کے سب سے بڑے محسن آنحضرتؐ نے اچھوت پن کی لعنت کو دنیا سے دور کرنے کے سلسلہ میں عورت کو بھی ان مصائب سے نجات دلائی۔ عورتوں کو آنحضرتؐ کے ان احسانات کو کبھی فراموش نہ کرنا چاہیئے۔

عورتوں پر احسانات

یہ تو تمہیں معلوم ہو چکا ہے کہ اسلام سے پہلے عورت کی حالت کس قدر خراب تھی یہ اسلام ہی کا صدقہ ہے کہ عورت نے اس مصیبت سے نجات پائی اب ذرا اسی قدر تفصیل کے ساتھ معلوم کرو کہ درحقیقت عورت پر کیا کیا احسانات آنحضرت نے کئے۔

اسلام میں عورت کا مرتبہ

اسلام میں عورت کا مرتبہ کیا ہے۔ اس کے معلوم کرنے کیلئے صرف دو آیتوں کا ترجمہ پیش کردینا کافی ہے۔

۱:۔ لوگو! اپنے پالنے والے سے ڈرو۔ جس نے ہم کو ایک ہی اصل سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا (عورت) اور ان دونوں سے بہت مرد اور عورتیں پیدا کیں۔

۲:۔ اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے تمہاری ہی جنس میں سے تمہارے واسطے بیویاں بنادیں

تاکہ تم ان سے تسکین پاؤ اور اسی سے تم میں الفت اور محبت پیدا کی۔

ان دونوں آیتوں نے عورت و مرد کا باہم مساوی ہونا اور آپس میں ایک دوسرے سے محبت کے ضروری ہونے کو ثابت کیا ہے۔

اب ایک حدیث بھی ملاحظہ ہو۔

ایک عورت جو نماز روزے کی پابند ہو۔ پاکدامن ہو۔ شوہر کو خوش رکھتی ہو۔ وہ جنت میں جس دروازے سے چاہے داخل ہو سکتی ہے۔

عورت کے لئے تحصیل علم

جس طرح مرد کے لئے علم کا حاصل کرنا ضروری ہے اسی طرح عورت کے لئے علم کا حاصل کرنا ضروری قرار دیا گیا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا۔

ہر مسلمان (یعنی مرد اور عورت) پر علم کا حاصل کرنا ضروری ہے۔

اسی جذبہ کا اثر تھا کہ عورتوں نے آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر استدعا کی کہ ہمارے لیے تحصیل علم کیلئے بھی ایک خاص وقت مقرر کیجئے مردوں کی آپ کے پاس اس قدر کثرت رہتی ہے کہ ہم لوگوں کو حصول فیض کا موقع بہت کم ملتا ہے۔

آپ نے ان کی خواہش کو پورا کیا ان کے لئے ایک خاص دن مقرر کیا جس میں ان کو تعلیم دیتے تھے اور آپ کی یہ تعلیم صرف بڑے گھرانوں کی عورتوں تک محدود نہ تھی اور نہ ہو سکتی تھی کیونکہ آپ ہی کا یہ ارشاد ہے کہ جس شخص کے پاس لونڈی ہو اور وہ اس کو تعلیم دے اور اچھی تعلیم دے ادب سکھائے اور اچھے آداب سکھائے۔ پھر اسے آزاد کر دے اور اس سے نکاح کر لے تو اس کے لئے دوگنا اجر ہے۔

عورت کا حق وراثت میں

دنیا کے بہت سے ایسے مذاہب نکلیں گے جو عورت کو وراثت کے حق سے محروم کرتے ہیں لیکن آنحضرتؐ نے عورت کے حق وراثت کو تسلیم کیا۔ قرآن کی اس آیت کو پڑھ کر پرانے دستور و رواج کا خاتمہ کر دیا۔

قرآن:" ماں باپ اور دوسرے رشتہ دار جو مال و اسباب چھوڑ کر مر جائیں اس میں مردوں کے لئے حصہ ہے۔ اسی طرح عورتوں کے لئے بھی اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ دار چھوڑ کر مر جائیں۔ مال تھوڑا ہو یا زیادہ"

نکاح میں عورت کا اختیار

نسل کو باقی رکھنے اور زندگی کو خوشگوار بنانے کے لئے عورت اس قدر ضروری چیز ہے کہ اس کے بغیر نسل کا

بقاء اور زندگی کا خوشگوار ہونا ناممکن ہے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ عورت اور مرد میں ایک پائیدار اور مستحکم رشتہ قائم ہو جائے اس کو ہم عقد اور نکاح سے تعبیر کرتے ہیں یہ عجیب بات ہے کہ ساری دنیا نے نکاح کے معاملہ میں بھی عورت کے ساتھ وہی سلوک کیا جو اور تمام معاملات میں ہوتا رہا ہے لیکن اسلام نے جس طرح مردوں کو نکاح کے معاملہ میں آزادی عطا کی ہے۔ اسی طرح عورتوں کو بھی۔ اس لئے اسلام میں نکاح کے لئے عورت کی اجازت کا حاصل ہونا بھی ضروری ہے۔ اس آزادی کا کتنا خوشگوار اثر تہذیب و تمدن پر پڑا۔ یہ غور کرنے پر خود واضح ہو جاتا ہے۔

بیوہ کا نکاح

ہر زمانہ میں مردوں کو نکاح کے معاملہ میں آزادی حاصل رہی وہ ایک سے زائد بیویاں رکھ سکتے تھے لیکن بیوہ کے لئے بیچارگی اور تنہائی کی زندگی ہی ضروری سمجھی جاتی تھی کسی قوم نے بیوہ کے عقد کو جائز تو قرار دیا تھا۔ مگر اس کیلئے ایسی شرطیں کر رکھیں جن کا بآسانی پورا کرنا ہر بیوہ کے لئے ناممکن تھا۔ آنحضرتؐ نے عورت کی اس مشکل کو بھی دور کر دیا فرمایا۔ "تین باتوں میں ہرگز دیر نہ کرو۔ جب نماز کا وقت آجائے جب جنازہ آجائے اور جب بیوہ کا کفو (جوڑ) مل جائے (یعنی فوراً بیاہ کر دو)"

اور آپ نے اکثر بیواؤں سے شادی کر کے اس پر عمل کر کے بھی بتا دیا۔

ماں، بیوی اور بیٹی غرضیکہ عورت کے جو جو رشتے نکل سکتے ہیں ان سب کے حقوق کے متعلق قول و عمل سے تصریح و تشریح فرما دی اس موقع پر ایک غیر متعصب اور صاحب علم پارسی کے مضمون سے دو جملے نقل کر کے اس عنوان کو ختم کرتا ہوں وہ لکھتے ہیں۔

"اسلام نے چودہ سو سال سے انہیں (عورتوں کو) وہ حقوق اور رعائتیں دی تھیں جو یورپ کی مجالس آئین ساز نے گذشتہ صدی کے آخر میں یورپ کی عورتوں کو دیں یا اب دی جا رہی ہیں"۔ اسی مضمون کے دوسرے مقام پر لکھتے ہیں۔

"رسول کریم کی زندگی اور آپ کا پیغام عورتوں کے لئے آنیوالے زمانہ میں ایک مستقل شاہراہ اور ابدی (دائمی) شمع ہدایت ہے۔"

بچوں کے ساتھ محمدؐ کا برتاؤ

دنیا میں ایسی قومیں بھی گذری ہیں جو اپنے ہاتھوں سے اپنی اولاد کو فنا کر دیتی تھیں اور ان کے دلوں میں پدری اور مادری محبت کے جذبات ایک لمحہ کے لئے بھی حرکت میں نہیں آتے تھے۔ عرب نے اپنے زمانۂ جاہلیت میں خدا جانے کتنے معصوم اور بے زبان بچوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا (اسی طرح ایسے لوگوں سے بھی دنیا خالی نہ تھی جو اپنے بچوں کے ساتھ نرمی و برتاؤ کرنا کیا معنی وہ اس احساس سے ہی خالی تھے کہ بچے محبت کرنے کی چیز ہیں وہ ایسے مہکتے ہوئے پھول

ہیں جن کو عمر بھر سونگھا جائے لیکن ان کی خوشبو سے سیرابی ناممکن ہے)

ایک طرف دنیا کا یہ حال تھا دوسری طرف آنحضرت جو گندگیوں اور بد اعتقادیوں ہی کو دور کرنے کیلئے تشریف لائے تھے معصوموں کی اس حالت سے بہت متاثر ہوئے اور اپنی تعلیم سے اس بری رسم کو نیست و نابود کر دیا۔ لڑکیوں کی پرورش کو بہت ضروری اور اہم قرار دیا۔ بچوں سے اس طرح محبت کی کہ جوانوں کو رشک ہوا کہ کاش ہم بھی بچے ہوتے اور آنحضرتؐ کی گود میں کھیلنے کا شرف حاصل کرتے۔ آپ صرف اپنی ہی اولاد سے محبت نہیں کرتے تھے بلکہ دوسروں کی اولاد سے بھی ایسا پیار فرماتے تھے کہ اگر راستہ میں گذر ہوتا تو بچے آپ کے گرد جمع ہو جاتے اور آپ ان سے باتیں کرتے۔

حسنؓ اور حسینؓ کو بارہا اپنی پیٹھ پر سواری دی اور جب کسی نے پوچھا کہ یا رسول اللہ یہ کیا تو فرمایا "رحمدلی" آپ کے صاحبزادے ابراہیم کا انتقال ہوتا ہے تو بے ساختہ آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ آپ کی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ جب کبھی آپ کے پاس تشریف لاتی تھیں تو آپ کھڑے ہو جاتے اور بہت پیار و محبت کے ساتھ اپنی جگہ پر بٹھلاتے تھے۔

لیکن اسی کے ساتھ مناسب طریقہ سے آپ بچوں کی تربیت بھی کرتے تھے تاکہ جوان ہو کر وہ بھی انسانی اخلاق کا نمونہ بنیں اور یہ ہی والدین کا فرض ہے جسے آج کل کے مسلمانوں نے بھلا دیا ہے اسی وجہ سے دیکھا جاتا ہے کہ مسلمان اپنی اولاد کی شکایتیں کرتے رہتے ہیں اگر غور سے دیکھا جائے تو قصور خود ماں باپ کا ہے۔ کہ کیوں انہوں نے آنحضرتؐ کی تعلیم پر عمل نہیں کیا۔

غلامی

بحیثیت انسان کے سب برابر ہیں

اسلام کو بدنام کرنے والوں نے ہمیشہ یہ پروپیگنڈہ کیا اور اب بھی کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے تلوار کے زور سے ملکوں کو فتح کیا اور مفتوح قوموں کو غلامی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا یہ ایک بالکل نئی بحث ہے۔ جس کے لئے بیان کی گنجائش نہیں کہ مسلمانوں نے از خود ملکوں کو فتح کیا یا ان کو مجبور کیا گیا کہ وہ بھی اپنی حفاظت کے لئے تلوار کا جواب تلوار سے دیں۔ لیکن اس چیز کو کبھی نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ مسلمانوں نے اسلام کی صحیح تعلیمات پر قائم رہتے ہوئے کبھی اور کسی وقت از خود دوسری قوموں پر حملہ نہیں کیا۔ بلکہ جب دوسروں نے مسلمانوں کو فنا کرنے کی کوشش یا سازش کی تو مسلمانوں نے مدافعانہ تدابیر اختیار کیں اور اپنے بچاؤ میں تلوار کو بھی آلہ کار بنایا جب صورتحال یہ تھی تو مسلمانوں پر یہ الزام کیسے لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے غلامی کی رسم کو جاری کیا یا دوسروں کو غلام بنانے میں انہیں کوئی مسرت ہوتی تھی۔ نہیں ہرگز نہیں بلکہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا کہ اسلام اور صرف اسلام ہی ایسا مذہب ہے جس نے چھوٹے اور بڑوں کے امتیاز کو مٹایا۔ آقا اور غلام کے

جابرانہ تعلقات کو عملی صورت سے ختم کر دیا۔ اس موقع پر ہندوستان کے مشہور قومی لیڈر گاندھی جی کے مضمون کے بعض اقتباسات پیش نظر ہیں جو بہت موزوں اور مناسب ہوں گے گاندھی جی لکھتے ہیں "اس نبوت کے زمانہ میں اسلام تلوار کے زور سے نہیں پھیلا، بلکہ اس کی مقبولیت کا باعث آنحضرت کی انتہائی سادگی بے نفسی۔ ایفاء وعدہ، بے خوف ہونا، مقلدین اور اپنے دشمنوں سے محبت اور خدا پر پورا اعتماد تھا۔ تلوار کا زور نہیں۔"

اسلامی مساوات کی تعریف کرتے ہوئے دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

"لیکن اسلام قبول کرتے ہی وہ اس پیالہ میں پانی پی سکتا ہے۔ اس طشتری میں کھانا کھا سکتا ہے جس میں کوئی اور جسم کا مسلمان کھاتا ہے۔"

حضرت نے غلامی کو رد کیا ہے۔

جس عرب کے ریگستان میں آنحضرت کو نبی بنا کر بھیجا گیا تھا۔ وہاں سیکڑوں برائیوں کے ساتھ ساتھ غلامی کی لعنت بھی موجود تھی آنحضرت کو انتہائی حیرت ہوئی کہ ایک ہی قسم کے ہاتھ پیر رکھنے والے دو شخصوں میں سے ایک اپنا مقصد حیات ذلت و خواری برداشت کرنا سمجھتا ہے اور دوسرا اس پر ہر قسم کی حکومت کا استحقاق رکھتا ہے۔ آنحضرت نے اپنی تعلیم کے ذریعہ غلامی سے کہیں زیادہ کم تر چیز امیر و غریب کے امتیاز ہی کو ختم کر دیا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ عثمان غنیؓ جیسا رئیس اعظم اور ابوہریرہؓ جیسے فاقہ کش اور غریب جنہیں کئی کئی وقت کھانے کو نہیں ملتا تھا بعض وقت صرف کھجور کی گٹھلیاں چوس چوس کر زندگی بسر کرتے تھے مگر آنحضرت کی مجلس میں دونوں سے ایک قسم کا سلوک ہوتا تھا۔ آنحضرت نے آقا اور غلام کے فرق کو مٹانے کے لیے ہر ممکن صورت اختیار کی اور اپنی اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے تدریجی قدم اٹھایا آپ نے فرمایا یہ (غلام) تمہارے بھائی ہیں جو خود کھاتے ہو۔ ان کو کھلاؤ۔ جو پہنتے ہو ان کو پہناؤ "ایک مرتبہ ایک صحابیؓ اپنے ایک غلام کو مار رہے تھے۔ پیچھے سے آواز آئی۔

"اس غلام پر تم کو جس قدر اختیار ہے اس سے زیادہ خدا کو تم پر اختیار حاصل ہے۔"

صحابیؓ نے مڑ کر دیکھا تو آنحضرتؐ تھے عرض کیا یا رسول اللہ میں نے اس غلام کو لوجہ اللہ آزاد کیا۔ فرمایا۔

"اگر تم ایسا نہ کرتے تو دوزخ کی آگ تم کو چھو لیتی۔"

ایک شخص نے آنحضرتؐ سے دریافت کیا کہ غلاموں کا قصور کتنی دفعہ معاف کروں آپ خاموش رہے دوبارہ دریافت کیا پھر بھی خاموش رہے، تیسری بار دریافت کیا تو آپ نے فرمایا۔ "دن میں ستر بار" ایک نکتہ یہاں پر اور یاد رکھنے کے قابل ہے وہ یہ کہ اسلام جسمانی اور روحانی غلامی کو ختم کرنے کے لیے آیا تھا جیسا کہ تعلیمات اسلامی سے اپنی جگہ پر ثابت ہے کہ اسلام نے کسی وقت بھی غلامی کو جائز نہیں رکھا اس لیے اس نے ان طریقوں کو اختیار کرنے کا حکم دیا جو آہستہ آہستہ غلامی کا خاتمہ کر دینے والے تھے۔ چونکہ اس وقت کی دنیا غلامی کو ایک جائز شے تصور کرتی تھی اور دوسروں کو غلام بنانا۔

ان کی طبیعت کا ایک دل خوش کرنے والا مشغلہ تھا اسی لیے ایک دم سے ایسی چیز سے روکنا جس کا انسان عادی ہو چکا ہو۔ نفسانی اصول کے خلاف تھا۔ لہذا اسلام نے جس طرح اور خرابیوں کو مثلاً شراب و جوا، لڑکیوں کا زندہ دفن کر دینا ان سب کو آہستہ آہستہ دور کر دیا۔ اس معاملہ میں بھی اس طریقہ کو اختیار کیا۔ ظاہر ہے کہ ایک شخص جس کو کل تک پاس بیٹھنے کی بھی اجازت نہ تھی اس کے متعلق یہ حکم دیا جائے کہ وہ تمہارا بھائی ہے اور تم اس کے ساتھ وہی معاملہ کرو جو تم اپنے ساتھ کرتے ہو۔ تو سوچیے کہ آقا کے ذہن میں یہ بات کس طرح رہ سکتی ہے کہ میں آقا ہوں اور یہ میرا غلام ہے اور ایسی صورت میں کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ اسلام کے سچے پرستار ایک زمانہ کے بعد غلامی کے مفہوم ہی سے ناآشنا ہو جائیں گے۔

جسمانی غلامی سے بڑھ کر روحانی غلام ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ فاتح قوم محکوم کی آزادی کو چھین کر اس کی شرافت اور احساس خودداری کا بھی خاتمہ کر دیتی ہے وہ یہی چیز ہے جو سرمایہ دار کے دل میں غریب و مفلس انسانوں کی روحوں کو غلام بنانے کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ آج نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کے اور بہت سے ممالک بھی "غلامی" کے اس مفہوم سے اچھی طرح واقف ہیں لیکن قربان جائیے آنحضرتؐ اور آپ کی تعلیم کے۔ کہ نہ صرف جسمانی غلامی کو بلکہ روحانی غلامی کو بھی دنیا سے مٹا دیا۔

سلمان فارسیؓ اور بلال حبشیؓ کا شمار۔ ان صحابہ میں تھا۔ جو بہت غریب اور مفلس تھے۔ ابوبکرؓ صدیق نے ان کو کسی بات پر ڈانٹا۔ آنحضرتؐ نے ابوبکرؓ سے کہا "تم نے ان کو رنجیدہ تو نہیں کیا۔ آنحضرتؐ کا یہ ارشاد سن کر ابوبکرؓ ان دونوں صحابیوں کے پاس واپس آئے اور معافی مانگی۔

یہاں یہ بات خاص طور پر یاد رکھنی چاہیے کہ صحابہ کرام رسول اکرم کے تربیت یافتہ تھے ظاہر ہے کہ بلا وجہ وہ کسی غریب کو کیوں ڈانٹتے۔ بلا سبب کسی غلام کو کیوں سزا دیتے۔ اس کے باوجود آنحضرتؐ کا ان کو متنبہ کرنا اور ان کا معافی مانگنا۔ غلام کو لوجہ اللہ آزاد کرنا آج دنیا کے لیے درس عبرت ہے۔ کیا اسلامی تعلیم کے سوا کوئی اور تعلیم سطح ہستی پر موجود ہے جو اپنے ماننے والوں کو ایسی پاکیزہ تعلیم دیتی ہو۔

آنحضرتؐ اپنے غلاموں اور خادموں کے ساتھ

یہاں پر ہم صرف چند واقعات کا ذکر کیے دیتے ہیں جن کے پڑھ لینے کے بعد آسانی کے ساتھ معلوم ہو جائیگا کہ آنحضرتؐ کا برتاؤ اپنے غلاموں اور خادموں کے ساتھ کیا تھا۔

(۱) آپ کے وہ غلام ہیں کہ آپ نے آزاد کر دیا تھا اور انہیں اختیار دید یا تھا کہ وہ چاہیں جا سکتے ہیں اس لیے کہ وہ اب آزاد ہیں۔ لیکن ان غلاموں نے آزادی پر آپ کی غلامی میں رہنے کو ترجیح دی اور باوجود آزاد ہونے کے وہ آپ کے دروازے کو چھوڑ کر کہیں نہیں گئے۔ صحیح احادیث اور کتب تاریخ میں تفصیل کے ساتھ ان واقعات کا تذکرہ آتا ہے۔ سوچنا چاہیے کہ آخر وہ کون سی کشش تھی جس نے ان کو آنحضرتؐ کی خدمت میں رہنے پر مجبور کیا۔

(۲) غزوۂ خندق (وہ لڑائی جس میں مسلمانوں نے اپنی حفاظت کے لئے خندق کھودی تھی) میں آنحضرتؐ نے کھودنے کے لیے زمین کی تقسیم کر دی تھی۔ کہ اتنا حصہ فلاں کھودے اور اتنا فلاں۔ ان سب کے ساتھ آنحضرتؐ نے بھی کدال لیکر خندق کھودی۔

(۳) مقام قبا کے رہنے والوں میں ایک مرتبہ جھگڑا ہو گیا جس نے نازک صورت اختیار کر لی۔ آنحضرتؐ کو خبر ہوئی تو آپ صحابہ کرام کی ایک جماعت کے ساتھ صلح کرانے کے لئے قبا جا پہنچے۔ حالانکہ قبا کے رہنے والوں کو آپ اپنی خدمت میں بلوا سکتے تھے۔

(۴) جنگ خندق میں سعدؓ تیر سے سخت زخمی ہو گئے۔ آنحضرتؐ ان کو اپنے پاس لے آئے اور خود انکی تیمارداری کی۔ اپنے ہاتھ سے سعدؓ کے زخموں کو کئی مرتبہ داغا تاکہ خون کا بہنا بند ہو جائے۔

(۵) ایک دفعہ ایک شخص آپ کے یہاں آکر مہمان ہوا۔ رات کے کھانے کے لئے صرف بکری کا دودھ تھا جسے آنحضرتؐ نے مہمان کو پلا دیا اور خود مع اہل و عیال کے فاقہ سے گذار دی۔ حالانکہ اس سے پہلی رات میں بھی سب کا فاقہ ہی تھا۔

(۶) جنگ بدر میں سواریاں کم تھیں۔ اس لئے آنحضرتؐ نے تین تین آدمیوں پر ایک ایک اونٹ تقسیم کر دیا تھا اور آپ نے بھی دو آدمیوں کی شرکت میں ایک اونٹ لیا اور جس طرح دوسرے لوگ باری باری سے اونٹ پر سواری سے رہے تھے۔ ویسا ہی آنحضرت بھی کرتے تھے۔ صحابہ کرام جوش محبت سے اپنی اپنی باری پیش کرتے تھے اور آپکی خدمت میں عرض کرتے کہ یا رسول اللہ آپ سوار رہیں۔ ہم پیدل چلیں گے آپ بڑی شفقت سے جواب دیتے کہ "تم لوگ مجھ سے زیادہ نہیں چل سکتے"

آپ نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا کہ عقیدت مند خادموں کیساتھ بھی کام میں شریک رہنا چاہیئے اور وقار کا سوال اس وقت بالکل نہ پیدا ہونا چاہیئے۔ جبکہ کوئی قوم جنگ کی مصیبت میں گرفتار ہو اور اپنے بڑوں کی امداد کی محتاج ہو۔ آپ نے بتادیا کہ خادم بھی انسان ہے جسم و جان رکھتا ہے۔ وہ اگر بیماری و مصیبت میں مبتلا ہے تو تم آقا اور پیشوا ہونے کے باوجود اس کی خدمت کرو۔ آپ نے مسلمان کے لئے یہ سنت قائم کر دی کہ خود بھوکا رہنا بہتر ہے۔ مگر مہمان خواہ کتنی ہی کم حیثیت کا ہو۔ اس کی مہمانی جس طرح بھی ممکن ہو کرو اور آپ نے صرف قول سے نہیں بلکہ عمل کر کے بتادیا کہ جسم و روح رکھنے والے خادم کو اسی طرح تکان اور تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ جس طرح آقا اور مالک کو اس لئے آقا کو اپنی آقائیت کے گھمنڈ میں یہ ہرگز زیبا نہیں ہے کہ وہ اپنے خادم کی تکلیف کو بھول جائے۔

آنحضرت کا سلوک ہمسایہ قوموں سے۔

ساری دنیا نے مسلمانوں پر یہ اعتراض کیا ہے کہ مسلمان جن ملکوں میں فاتحانہ شان سے پہنچے۔ وہاں کے لوگوں

کی جان و مال اور مذہب ہمیشہ خطرہ میں رہا اور انہوں نے اپنی حکومت میں غیر مسلموں کو عہدے نہیں دیئے. لباس سلام و دعا اور رہنے سہنے میں مسلم و غیر مسلم کا امتیاز رکھا یہ اور اسی قسم کے بہت سے اعتراض مسلمانوں پر کئے جاتے ہیں۔ اس چیز کا پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے کہ مسلمانوں نے خود کبھی کسی ملک پر حملہ نہیں کیا۔ کبھی کسی دوسری قوم سے اپنی طرف سے لڑائی نہیں چھیڑی لیکن جب دوسروں نے ان کی تباہی و بربادی کی فکر کی تو انہوں نے اپنے بچاؤ کیلئے جنگ کی اور اس طرح سے جن جن ملکوں پر مسلمانوں کا قبضہ ہوا۔ وہاں کے لوگوں کے ساتھ انہوں نے وہی برتاؤ کیا۔ جس کا حکم اسلام نے ان کو دیا تھا۔ آنحضرت نے مختلف قوموں سے معاہدے کئے ہیں. آپ کے الفاظ بجنسہٖ اب تک تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہیں ہم آپ کا ایک عہد نامہ یہاں نقل کرتے ہیں. جس سے معلوم ہو جائے گا کہ آپ نے فاتح اور غالب ہونے کے باوجود کس قدر شریفانہ عہد نامہ ان قوموں کو لکھوا کر دیا جو اسلام کی امان اور حفاظت میں داخل ہو رہی تھیں۔ تقریباً اسی قسم کا معاہدہ ایک قوم سے نہیں بلکہ متعدد قوموں سے آپ نے کیا ہے۔

عہد نامہ کے الفاظ حسب ذیل ہیں۔

۱:- دشمن سے مخالفت کی جائے گی۔

۲:- حفاظت کا ٹیکس ادا کرنے کے لئے خود ان کو ٹیکس وصول کرنیوالے کے پاس جانا پڑے گا۔

۳:- مذہب سے ان کو برگشتہ نہیں کیا جائے گا۔

۴:- ان کی جان محفوظ رہے گی۔

۵:- مال محفوظ رہے گا۔

۶:- قافلہ اور تجارت محفوظ رہے گی۔

۷:- اراضی (زمین) محفوظ رہے گی۔

۸:- پادری اور گرجوں کے مجاور وغیرہ اپنے عہدے سے برطرف نہیں کئے جائیں گے۔

۹:- ان کے قبضہ میں جو چیزیں ہیں وہ انہیں کے قبضہ میں رہیں گی۔

۱۰:- صلیبوں اور مورتیوں کو نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔

۱۱:- عشر، یہ ایک خاص ٹیکس ہے جو مسلمانوں کو دینا پڑتا ہے. نہیں لیا جائے گا۔

۱۲:- ان کے ملک میں فوج نہیں بھیجی جائے گی۔

۱۳:- عقیدے اور مذہب کو تبدیل نہیں کرایا جائے گا۔

۱۴:- وہ حقوق جو پہلے سے چلے آرہے بحال رہیں گے۔

۱۵:- جو لوگ اس وقت غیر موجود ہیں ان کے لئے بھی یہی شرائط ہیں۔

یہ وہ عہد نامہ ہے جو آنحضرت نے مختلف وقتوں میں عیسائی قوموں کو لکھوا کر دیا۔ جس وقت پہلی مرتبہ مسلمانوں

کا داخلہ ہندوستان میں ہوا ہے تو ہندوستان کا وہ حصہ جو سندھ کے نام سے مشہور ہے مسلمانوں کا ہیڈکوارٹر تھا محمد بن قاسم وہ پہلا شخص ہے جس نے حکومت اسلامی کا پھریرا ہندوستان کی سرزمین پر لہرایا۔ یہ اپنی حکومت کی طرف سے سندھ کا گورنر تھا اور فوج کا سپہ سالار بھی۔ سندھ کو فتح کر لینے کے بعد وہاں کے برہمنوں کو ان کی عبادت گاہوں کے متعلق اختیارات کو ایک معاہدہ کی شکل میں لکھ کر برہمنوں کے حوالہ کر دیا تھا۔ وہ اختیارات یہ ہیں۔ جس طرح پہلے عبادت کرتے تھے ویسے ہی کرو اپنے قدیم مراسم کو پہلے کی طرح بجا لاؤ برہمنوں کو جو صدقات پہلے دیئے جاتے تھے اسی طرح دیئے جائیں غرضیکہ ہر قوم اور مذہب کے ساتھ مسلمانوں کا مصالحانہ اور روادارانہ برتاؤ رہا ہے باوجودیکہ حکومت اسلام کی تھی لیکن دوسرے کہنے کو مسلمانوں کے محکوم تھے۔ اسلامی رواداری کا اس سے بڑھ کر ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ فقہا اسلام نے کسی عیسائی کے گرجا بنانے کی وصیت کو جائز تسلیم کر لیا ہے۔ لیکن اگر مسجد بنانے کی وصیت کرے تو تسلیم نہیں کی جائے گی۔ یعنی وصیت کے بعد اس کا مال گرجا بنانے پر تو خرچ کیا جا سکتا ہے لیکن مسجد بنانے پر نہیں گو اس نے پہلے ہی روپیہ سے مسجد بنانے کی وصیت کی ہو۔

ایک اور واقعہ مسلمانوں کی رواداری کا سنیئے۔ ابوبکر صدیقؓ کی خلافت کے زمانہ میں اسلامی حکومت کے ایک افسر نے ایک عورت کے ہاتھ اس لئے کٹوا دیئے تھے کہ وہ مسلمانوں کی ہجو کیا کرتی تھی۔ مسلمانوں کے متعلق حقارت آمیز کلمات استعمال کیا کرتی تھی۔ ابوبکر صدیق کو اس واقعہ کی خبر ہوئی۔ تو آپ نے اس افسر کو لکھا کہ "جب ہم ان کے (کافروں کے) شرک و کفر سے درگذر کرتے ہیں۔ تو ان کی ہجو تو کفر سے بہت کم ہے۔"

غرضیکہ مسلمانوں نے فاتح ہونے کے باوجود مفتوح قوموں کے ساتھ دوستانہ برتاؤ کیا۔ کبھی فاتح و مفتوح کا فرق نہیں پیدا ہونے دیا۔ حکومت کی طرف سے قانون جس طرح ایک غیر مسلم پر جاری ہوتا تھا۔ بلکہ اسی طرح ایک مسلمان پر۔ جو ٹیکس مسلمانوں پر تھے تقریباً وہی غیر مسلم پر بھی۔

مسلمانوں نے کبھی غیر مسلموں سے کوئی ایسا ٹیکس وصول نہیں کیا۔ جو ناجائز کہا جا سکتا ہو۔ یہ آنحضرتؐ کی تعلیم کا اثر تھا

خاتمہ

بڑے افسوس کی بات ہے کہ آج مسلمان اسلام کی تعلیم سے بہت دور جا پڑے ہیں ان میں بڑے چھوٹے کا امتیاز پیدا ہو گیا ہے۔ اور اونچ نیچ کی تفریق پیدا ہو گئی ہے۔ ایک فرم کا مالک اپنے ملازموں سے وہ سلوک کرتا ہے۔ جس سے انسانیت شرماتی ہے۔ ایک کارخانہ دار اپنے مزدوروں کو حقیر و ذلیل سمجھ کر کام لیتا ہے۔ حتیٰ کہ مسلمان لیڈر اور علماء بھی جن کی عزت و حرمت قوم کی عنایت کردہ ہوتی ہے وہ بھی اس قوم کے ساتھ اس قسم کا برتاؤ کرتے ہیں کہ جس سے یہ معلوم ہو کہ وہ مخدوم ہے اور قوم اس کی خادم، مذہبی جماعتوں اور اداروں کا بھی یہی حال ہے۔

مدرسہ کا مہتمم ناظم یا رکن اور ٹرسٹی مدرسہ کے استادوں اور ملازموں کو یہ سمجھتا ہے کہ یہ سب مجھ سے کم درجہ کے انسان ہیں۔ غرضیکہ مسلمانوں کا نظم زندگی ہر شعبہ میں بد سے بدتر نظر آئے گا۔ لیکن حق کے متلاشی کو ان چیزوں سے بددل ہونا چاہیئے کیونکہ کسی مذہب کے اچھے یا برے ہونے کا دارو مدار اس کی تعلیمات پر ہے۔

آج اس گئی گذری حالت میں بھی دو ایک باتیں محمدی تعلیم کی مسلمانوں میں باقی نظر آتی ہیں اور ہماری پست حالت کو دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ اتفاقی طور پر وہ باتیں ہم میں باقی رہ گئی ہیں وہ یہ ہیں۔ "ہر انسان خواہ وہ کسی معزز قوم کا فرد ہو یا پنچ قوم کا اسلام میں آنے کے بعد ہر مسجد میں مسلمانوں کے بڑے سے بڑے آدمی کے برابر کاندھے سے کاندھا ملا کر نماز ادا کرنے کے لئے کھڑا ہو سکتا ہے۔ کسی کو یہ کہنے کی مجال نہیں کہ تم ایک بڑے آدمی کے برابر کیوں کھڑے ہو گئے حالانکہ تم چھوٹے ہو۔" اسی طرح ایک مسلمان کسی بڑی سے بڑی قوم کی لڑکی سے اپنے نکاح کا پیغام دے سکتا ہے اور اگر جانبین کی رضامندی کا اظہار ہو جائے تو وہ بلا تکلف نکاح کر سکتا ہے۔

غرضیکہ آج کے مسلمانوں کو ان کی مذہبی تعلیم کی اچھائی یا برائی کا معیار قرار نہ دینا چاہیئے اس لئے کہ اس دور کا مسلمان اپنی مذہبی تعلیم سے بہت دور جا پڑا۔

سرورِ کائناتؐ کی پیش گوئیاں

محمد نیاز عبد اللہ

خندق میں سلطنتوں کی کنجیاں عطا ہوئیں

یہ تو سبھی کو معلوم ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ملک شام۔ ملک فارس اور ملک یمن کی کنجیاں عطا فرمائی گئی تھیں اور ہر ملک کے محل اور دروازے دکھائے گئے تھے۔ گویا حضورؐ نے اپنے اور اسلام کے جان نثاروں سے ان مملکتوں کی تسخیر کا وعدہ فرمایا تھا اور ایسے حالات میں کہ مدینۂ منورہ پر کفار حملہ آور ہو رہے تھے اور ان کے سیلاب کو روکنے کے لئے خندق تیار کرائی جا رہی تھی۔

جنگ خندق میں تائیدِ ایزدی نے آندھی کی شکل اختیار کر لی تھی اور نادیدہ لشکر بھی آسمان سے اترا۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے:۔

"اذ جاءتکم جنودٌ فارسلنا علیھم ریحًا وجنودًا لم تروھا"	جب تم پر کافروں کا لشکر (امنڈ کے) آپڑا تو ہم نے (تمہاری مدد کو) ان پر آندھی بھیجی اور ایک ایسا لشکر جس کو تم نے نہ دیکھا

خندق کی لڑائی جاڑے کے دنوں میں ہوئی تھی۔ بلا کی سردی تھی۔ ہاتھ پاؤں ٹھٹھرے جا رہے تھے۔ جس آندھی کا آیت مندرجہ بالا میں ذکر ہے وہ اس زور سے چلی کہ خیموں کی طنابیں اکھڑ گئیں۔ چولھے ٹھنڈے ہو گئے۔ پہلے ہی سردی کیا کم تھی پھر آندھی کی ہلاکت آفرینی! کفار ایسے گھبرائے کہ اپنے اپنے قبیلہ کے لوگوں کو سمیٹا اور بھاگ کھڑے ہوئے۔

جب خندق کھودی جا رہی تھی تو ظاہر ہے کہ مسلمانوں کو اپنے بچاؤ کی پڑی تھی۔ کتاب "رحمۃٌ للعالمین" کے مصنف بجا لکھتے ہیں:۔

"ایسے ضعف کی حالت میں اتنے ممالک کی فتوحات کی اطلاع دینا اللہ کے نبیؐ ہی کا کام ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حرف بحرف پورا فرمایا۔"

پورے ہوئے گئے تھے جو وعدے حضورؐ نے

اقبالؔ جنگ یرموک کا ایک واقعہ پیش کرتا ہے۔

صف بستہ تھے عرب کے جوانانِ تیغ بند　　تھی منتظر حنا کی عروسِ زمینِ شام
اک نوجوان صورتِ سیماب مضطرب　　آکر ہوا امیرِ عساکر سے ہمکلام

اے بوعبیدہؓ رخصت پیکار دے مجھے
لبریز ہو گیا مرے صبر و سکوں کا جام
بے تاب ہو رہا ہوں فراقِ رسولؐ میں
اک دم کی زندگی بھی محبت میں ہے حرام
جاتا ہوں میں حضورِ رسالت پناہؐ میں
لے جاؤں گا خوشی سے اگر ہو کوئی پیام
یہ ذوق و شوق دیکھ کے پُرنم ہوئی وہ آنکھ
جس کی نگاہ تھی صفتِ تیغِ بے نیام
بولا امیرِ فوج کہ وہ نوجواں ہے تو
پیروں پہ تیرے عشق کا واجب ہے احترام
پوری کرے خدائے محمدؐ تری مراد
کتنا بلند تیری محبت کا ہے مقام
پہنچے جو بارگاہِ رسولِ امینؐ میں تو
کرنا یہ عرض میری طرف سے پس از سلام
ہم پر کرم کیا ہے خدائے غیور نے
پورے ہوئے کئے تھے جو وعدے حضورؐ نے

"میں نے اُس کی سلطنت کو پارہ پارہ کر دیا"

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سنہ ۶ ہجری میں دیگر ملوک و سلاطین کے علاوہ شہنشاہ ایران کے نام دعوتِ اسلام کا خط بھیجا۔ ان تبلیغی خطوط میں عرب کے طرزِ تحریر کے مطابق (آج ساری دنیا کا طرزِ تحریر یہی ہے) فرستندہ کا نام مکتوب الیہ کے نام سے پہلے تھا۔ خسرو پرویز تخت پر برہم ہوا اور یہ کہہ کر کہ میرا غلام مجھے اس طرح لکھتا ہے۔ نامۂ اقدس کو چاک کر ڈالا اور امیر باذان والیِ یمن کے نام حکم صادر کر دیا کہ میرے اس حکم کے ملتے ہی حجاز کے اس مدعیِ نبوت کو گرفتار کر کے میرے دربار میں حاضر کرو۔ امیر مذکور نے دو آدمی مدینہ بھیجے۔ انہوں نے عرض کی کہ آپ کو مدائن طلب کیا گیا ہے۔ شہنشاہِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب دیا:

"جاکر اس سے کہہ دو کہ اسلام کی حکومت کسریٰ کے پایۂ تخت تک پہنچے گی۔"

ابھی یہ دونوں سفیر واپس بھی نہ ہوئے تھے کہ خسرو پرویز کے لڑکے نے باپ کا کام تمام کر دیا۔

جب قاصدِ نبویؐ حضرت عبداللہ نے واپس آکر خبر سنائی کہ کسریٰ نے آپؐ کا نامۂ اقدس دیکھتے ہی پھاڑ ڈالا تو ارشاد ہوا۔ "میں نے اس کی سلطنت کو پارہ پارہ کر دیا۔"

عبرت

پیغمبرِ جلیل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان سے نکلی ہوئی بات کس طرح خالی جاتی۔ خسرو پرویز کے بیٹے شیرویہ نے پہلے باپ کو قید کیا۔ اپنے سترہ بھائیوں کو اس کے سامنے قتل کیا۔ پھر اس کی آنکھیں نکلوائیں۔ وہ تیرہ دن تک ایک تیرہ و تاریک زنداں میں بھوکا پیاسا پڑا رہا۔ آخر میں اس وقت جب یمنی عامل مدینہ پہنچے اس کو قتل کر دیا!

عبرت پر عبرت!

بادشاہِ ایران نے جس ذاتِ اقدسؐ کی گرفتاری کے احکام صادر کئے تھے اور جس کو وہ اپنا غلام سمجھتا تھا اسی کے غلاموں نے اس کے خاندان۔ اس کے تخت و تاج اور اس کے ملک کے پرزے اڑا کر رکھ دیے!

امیر باذان مسلمان ہو گیا

امیر باذان والیِ یمن کے دونوں آدمیوں کو حضورؐ نے خبر دے دی تھی کہ پرویز کے بیٹے نے پرویز کو مار ڈالا ہے۔ چند روز بعد باذان کے نام شیرویہ کا خط پہنچا کہ پرویز ظالم تھا میں نے اس کو ہلاک کر دیا۔ باذان

دو بیٹوں کے ساتھ مسلمان ہو گیا۔

"فاتح ایران" کی بیماری اور حضورؐ کا ارشاد

سیرۃ النبیؐ میں مولانا شبلی لکھتے ہیں :-

"حضرت سعد بن وقاص حجۃ الوداع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمرکابی میں مکہ معظمہ گئے تھے اور وہاں وہ اس قدر سخت بیمار پڑے کہ اُن کو اپنی زندگی کی امید نہ رہی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کی عیادت کو تشریف لے گئے تو ان کا اضطراب دیکھ کر ان کو تسلی دی اور اُن کے حق میں دعا فرمائی اور فرمایا کہ اگر خدا نے چاہا تو ابھی نہیں مرو گے۔ تم کو، اگر خلوص سے کام کرو گے تو درجۂ عظیم ملے گا۔ بہتیرے لوگوں کو تم سے فائدہ اور بہتوں کو تم سے نقصان پہنچے گا۔"

حضرت سعد نے سپہ سالارِ اسلام بن کر بڑا درجہ پایا اور چند سال میں کسریٰ کا تاج و تخت چھین لیا۔ مسلمانوں کو ان سے فائدہ اور مجوس کو نقصانِ عظیم پہنچا۔"

کسریٰ ہلاک ہو گیا۔ اسکے بعد کسریٰ نہ ہو گا اور قیصر بھی ہلاک ہو جائے گا اسکے بعد قیصر نہ ہو گا

کتبِ احادیث میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد درج ہے۔ اس پیش گوئی کے متعلق ایک شخص لکھتا ہے :-

"کسریٰ کے متعلق یہ پیش گوئی حرف بحرف پوری ہوئی۔ حضورؐ کی رحلت سے صرف دس برس بعد ۶۴۲ء میں جنگِ نہاوند نے ساسانی خاندان کو ہمیشہ کے لئے مٹا دیا۔ کچھ عرصہ بعد آخری کسریٰ یزدگرد قتل ہو گیا اور اس کے بعد آج تک پھر کوئی کسریٰ پیدا نہ ہوا۔

قیصر ہرقل ۶۴۱ء میں مرا۔ اس کے بعد یہ سلسلہ ۱۴۵۳ء تک جاری رہا یہاں تک کہ سلطان محمد ثانی (۱۴۵۱ء سے ۱۴۸۱ء) فاتح قسطنطنیہ نے اس سلسلہ کو ۱۴۵۳ء میں ختم کیا۔ حضورؐ نے یہ پیش گوئی ۶۳۰ء میں کی۔ یہ خاندان ۸۲۳ برس بعد بھی زندہ رہا۔"

معترض کو (جو مسلمان ہے) اس بنا پر کہ قیصر کا خاندان ۸۲۳ برس بعد بھی زندہ رہا ارشادِ اقدس کی صداقت میں شبہ ہے یا اس سے انکار ہے لیکن "الہلال" مصر کا عیسائی مدیر لکھتا ہے :-

"سب سے زیادہ تعجب خیز یہ امر ہے کہ اہلِ عرب نے صرف چودہ پندرہ برس کی قلیل مدت میں ان دونو (سلطنت ہائے روم و فارس) کا چراغ گل کر دیا اور انھیں فتح کر لیا۔"

تاریخ شہادت دیتی ہے کہ صحابہؓ کے ہاتھوں نہ صرف کسریٰ کا خاتمہ ہوا بلکہ مؤرخ گبن کے الفاظ میں خالدؓ نے :

"شام و دمشق فتح کر کے شاہ روم کا تخت ہلا دیا۔"

کسریٰ کی تباہی کے ساتھ ساتھ قیصر کی خانہ بربادی بھی ہوئی۔ مسلمانوں نے سلطنتِ روم کے مقبوضات بھی انھیں ایام میں اس سے چھین لیے۔ اگر قیصر کا خاندان ۸۲۳ برس بعد بھی اپنے ایشیائی و افریقی ممالک کا ماتم کرنے کے لیے یورپ میں زندہ رہا اور اس مدت کے بعد اُس کا دم نکلا تو اس سے کیا فرق پیدا ہو گیا؟ حضورؐ کی پیش گوئیاں تو ان واقعات کے متعلق بھی ہیں جو قیامت تک ظہور میں آتے رہیں گے۔ قیصر کے متعلق حضورؐ کے ارشاد کی تصدیق اس واقعہ سے ہو جاتی ہے کہ آٹھ سو سال بعد ہی سہی خاندانِ قیاصرہ کا

خاتمہ ایک مسلمان (سلطان محمد ترک) نے کیا اور ہلاک ہونے والے قیصر کے بعد دوسرا قیصر نہ ہُوا بلکہ اس کے تخت و تاج کا وارث جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک پیرو ہُوا۔ حضورؐ کے ارشاد کا ایک حصّہ یہ بھی ہے۔

"کسریٰ و قیصر کے خزانے خدا کی راہ میں تقسیم کئے جائیں گے۔"

یہ کوئی لازمی بات نہ تھی کہ قسطنطنیہ کا آخری قیصر کسی مسلمان کے ہاتھ سے ہلاک ہوتا۔ یہ امر بھی ممکن تھا کہ وہ کسی غیر مسلم سے لڑ کر ہلاک ہو جاتا لیکن تاریخ گواہ ہے کہ حضورؐ کی پیش گوئی ہی اس خاندان کے نیست و نابود ہو جانے اور مسلمانوں کے قسطنطنیہ پر قابض ہونے کا باعث بنی۔

تم قسطنطنیہ کو ضرور فتح کرو گے

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا کہ مسلمان قسطنطنیہ کو ضرور فتح کریں گے۔ اسی ارشاد کی بنا پر معاویہؓ کے عہد میں تسخیرِ قسطنطنیہ پر ایک لشکر مامور ہُوا۔ بڑے بڑے صحابہؓ مثلاً حضرت ابوایوب انصاری۔ عبداللہ بن عمرؓ۔ عبداللہ بن عباس وغیرہ اس فوج میں شامل تھے۔ حضرت ابوایوب انصاریؓ شہید ہوئے۔

سلطان محمد ثانی کی فتح سے پیشتر متعدد مرتبہ مسلمانوں نے قسطنطنیہ کو فتح کرنے کی کوششیں کی تھیں اور ان تمام کوششوں کی بنیاد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مذکورۂ بالا پیش گوئی تھی اور سلطان کی فتح کی بنیاد بھی اسی پیش گوئی نے رکھی تھی۔

کسریٰ کے خزانے جو خدا کی راہ میں تقسیم ہوئے

وہ لوگ جو تاریخِ اسلام اور فتوحاتِ اسلام سے بے خبر ہیں دیکھیں کہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لُطف و کرم نے شہنشاہوں کے خزانے مجاہدینِ عرب کو بخش دیئے تھے۔ "الفاروق" میں لکھا ہے:

"جب حضرت سعد جنگِ قادسیہ میں مظفر و منصور ہو کر مدائن میں داخل ہوئے تو ہر طرف سناٹا تھا۔ نہایت عبرت ہوئی اور بے اختیار یہ آیتیں زبان سے نکلیں۔

"کم ترکوا من جنٰت وعیون وزروع ومقام کریم ونعمۃ کانوا فیھا فاکھین کذالک واورثناھا قوما اٰخرین۔"

ایوانِ کسریٰ میں تختِ شاہی کے بجائے منبر نصب ہُوا۔ چنانچہ جمعہ کی نماز اسی میں ادا کی گئی اور یہ پہلا جمعہ تھا جو عراق میں ادا کیا گیا۔ دو تین دن ٹھہر کر سعد نے حکم دیا کہ ایوانات شاہی کا خزانہ اور نادرات لا کر ایک جا جمع کئے جائیں۔ کیانی سلسلے سے لے کر نوشیرواں کے عہد تک کی ہزاروں یادگار چیزیں تھیں۔ خاقانِ چین۔ راجہ داہر۔ قیصرِ روم۔ نعمان بن منذر۔ بہرام چوبین کی زرہیں اور تلواریں تھیں۔ کسریٰ۔ ہرمز اور قباد کے خنجر تھے۔ نوشیرواں کا تاج زرنگار اور ملبوس شاہی تھا۔ سونے کا ایک گھوڑا تھا جس پر چاندی کا زین کسا ہُوا تھا اور سینے پر یاقوت جڑے ہوئے تھے۔ چاندی کی ایک اونٹنی تھی جس پر سونے کی پالان تھی اور مہار میں بیش قیمت موتی پروئے ہوئے تھے۔ ناقہ سوار سر سے پاؤں تک جواہرات سے مرصع تھا۔ سب سے عجیب و غریب ایک فرش تھا جس کو ایرانی بہار کے نام سے پکارتے تھے۔ یہ فرش اس غرض سے تیار کیا گیا تھا کہ جب بہار کا موسم نکل جاتا تھا تو اس پر بیٹھ کر شراب پیتے تھے۔ اس رعایت سے اس میں

بہار کے تمام سامان مہیا کیئے تھے اور بیچ میں سبزے کا چمن تھا۔ چاروں طرف جدولیں تھیں۔ ہر قسم کے درخت اور درختوں میں شگوفے اور پھول اور پھل تھے۔ طرہ یہ کہ جو کچھ تھا زر و جواہرات کا تھا۔ سونے کی زمین۔ زمرد کا سبزہ۔ پکھراج کی جدولیں۔ سونے چاندی کے درخت۔ حریر کے پتے۔ جواہرات کے پھل تھے۔

یہ تمام سامان فوج کی عام غارتگری میں ہاتھ آیا تھا۔ لیکن اہلِ فوج ایسے راست باز اور دیانت دار تھے کہ جس نے جو چیز پائی تھی بجنسہٖ افسر کے پاس لاکر حاضر کردی تھی۔ چنانچہ جب سب سامان لاکر سجایا گیا اور دور دور تک میدان جگمگا اٹھا تو خود سعد کو حیرت ہوئی۔ بار بار تعجب کرتے تھے اور کہتے تھے کہ جن لوگوں نے ان نادرات کو ہاتھ نہیں لگایا بےشبہ انتہا درجے کے دیانت دار ہیں۔ مالِ غنیمت حسبِ قاعدہ تقسیم ہوکر پانچواں حصہ دربارِ خلافت کو بھیجا گیا فرش اور قدیم یادگاریں بجنسہٖ بھیجی گئیں تاکہ اہلِ عرب ایرانیوں کے جاہ و جلال اور اسلام کے فتح و اقبال کا تماشا دیکھیں۔ حضرت عمر کے سامنے جب یہ سامان چُنے گئے تو ان کو بھی فوج کی دیانت اور استغنا پر حیرت ہوئی۔

محلّم نام مدینہ میں ایک شخص تھا جو نہایت موزوں قامت و خوب صورت تھا۔ حضرت عمر نے حکم دیا کہ نوشیروان کے ملبوسات اس کو لاکر پہنائے جائیں۔ یہ ملبوسات مختلف حالتوں کے تھے۔ سواری کا جدا۔ دربار کا جدا۔ جشن کا جدا۔ تہنیت کا جدا۔ چنانچہ باری باری تمام ملبوسات محلّم کو پہنائے گئے۔ جب ملبوسِ خاص اور تاجِ زرنگار پہنا تو تماشائیوں کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں اور دیر تک لوگ حیرت سے تکتے رہے۔

فرش کی نسبت لوگوں کی رائے تھی کہ تقسیم نہ کیا جائے۔ خود حضرت عمرؓ کا بھی یہی منشا تھا لیکن حضرت علیؓ کے اصرار سے اس بہار پر بھی خزاں آئی اور دولتِ نوشیروانی کے مرقع کے پرزے اڑ گئے۔"

ایک اور کتاب میں کسریٰ کے خزانے کا حال اس طرح درج ہے:-

> "رستم جس قدر زر و جواہر خیمہ و خرگاہ اور نقد و جنس ہمراہ لایا تھا سب کا سب قادسیہ کے میدان میں پڑا تھا۔ اہلِ عرب نے ان کو اتنا بھی نہ سنبھلنے دیا کہ وہ کوئی چیز اُٹھا سکتے۔ سعد اور تمام لشکرِ اسلام نے نمازِ شکر ادا کی اور کیمپ کے گرد پہرہ لگا کر نماز پڑھنے لگے۔

دوسرے دن مالِ غنیمت جمع کیا گیا۔ مالِ غنیمت کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ اہلِ عرب نے اس قدر نقد و جنس اور سامان اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ تمام نقدی جو ایرانی پہلوانوں کو انعام دینے کے لیے لائی گئی تھی اسلامی لشکر کے حصے میں آئی۔ اہلِ عرب مالا مال ہوگئے اور اس نعمت پر بار بار اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے تھے۔ ہلال بن علقمہ کو رستم کا کل سامان ملا۔ رستم کا تاج تو ندی میں بہ گیا تھا مگر اس کے کمر بند اور اسلحہ بڑے قیمتی تھے کیونکہ ان میں جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ صرف ایک کمر بند کی قیمت ستر ہزار اشرفی تھی۔ جس شخص نے دُرفشِ کاویانی یعنی ایران کا قومی علم جان پر کھیل کر حاصل کیا تھا اس کو اس کے صلے میں تیس ہزار اشرفیاں دی گئیں کیونکہ علم مدینہ بھیجا تھا اور اس کے جواہرات کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ جب اس علم کے جواہرات اتار کر فروخت کیے گئے

تو ایک لاکھ اشرفیاں وصول ہوئیں جو بیت المال میں داخل کی گئیں۔ جن بہادروں نے میدانِ جنگ میں حیرت ناک کام کئے تھے ان کو علاوہ حصہ کے ان کے کاموں کی شان کے لائق انعام دلائے گئے اور ہر ایک سپاہی کو معمولی حصہ چھ ہزار اشرفیاں ملا۔

اس طرح کسریٰ کے خزانے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کو نصیب ہونے شروع ہوئے اور آپؐ کی پیش گوئی کے پورا ہونے کا آغاز ہُوا۔

"تو دیکھے گا کہ ایک شخص زکوٰۃ کا سونا اور چاندی لئے ہوئے پھرے گا اور اُسے کوئی نہ ملے گا جو زکوٰۃ کا پیسہ لینے والا ہو۔"

"کتاب" رحمۃ للعالمین" سے ایک پیش گوئی نقل کی جاتی ہے:-

"صحیح بخاری میں عدیؓ بن حاتم طائی کی روایت ہے کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں بیٹھا تھا کہ ایک شخص آیا اور اس نے فاقہ کی شکایت کی۔ دوسرا آیا اس نے ڈکیتیوں کی شکایت کی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے عدی! اگر تمہاری عمر لمبی ہوئی تو تم دیکھ لوگے کہ ایک بڑھیا حیرہ سے اکیلی چلے گی اور خانۂ کعبہ کا طواف کرے گی۔ وہ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی سے نہ ڈرتی ہوگی۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ طےّ کے ڈکیت کدھر چلے جائیں گے جنہوں نے تمام بستیوں کو اجاڑ رکھا ہے۔ پھر فرمایا اگر تمہاری عمر لمبی ہوئی تو تم کسریٰ کے خزانوں کو جاکر کھولوگے۔ میں نے پوچھا کیا کسریٰ بن ہرمز؟ فرمایا ہاں کسریٰ بن ہرمز۔

پھر فرمایا اگر تیری عمر لمبی ہوئی تو تُو دیکھے گا کہ ایک زکوٰۃ کا دینے والا سونا اور چاندی لئے ہوئے پھرے گا اور اُسے کوئی نہ ملے گا جو زکوٰۃ کا پیسہ لینے والا ہو۔

عدیؓ کہتے ہیں میں نے ایسی بڑھیا کو بھی حج کرتے دیکھ لیا جو کوفہ سے اکیلی چلی اور اللہ کے سوا اسے کسی اور کا خوف نہ تھا اور خزائنِ کسریٰ کی فتح میں تو میں شامل تھا۔ تیسری بات بھی اے لوگو! تم دیکھ لوگے۔

امام بیہقی کہتے ہیں کہ عمرؒ ابن عبدالعزیز کی سلطنت میں تیسری بات بھی پوری ہوگئی کہ زکوٰۃ دینے والے کو تلاش سے بھی کوئی فقیر نہ ملتا اور وہ اپنا مال گھر واپس لے جایا کرتا تھا۔"

ابوہریرہ پانچ لاکھ درہم لے کر مدینہ میں آتے ہیں

ابتدائے اسلام میں حضرت ابوہریرہؓ کے افلاس کا یہ حال تھا کہ مسلسل فاقہ کی وجہ سے غش کھا کھا کر گر پڑتے تھے۔ یہ حالت بار بار رونما ہوئی۔ یہی ابوہریرہؓ بحرین کے حاکم مقرر ہوئے تو پانچ لاکھ درہم لے کر مدینہ منورہ میں آئے۔ حضرت عمرؓ کو اطلاع کی گئی۔ پانچ لاکھ کی رقم اتنی عجیب چیز تھی کہ حضرت عمرؓ نے کہا خیر ہے کہتے کیا ہو۔ انہوں نے پھر پانچ لاکھ کہا۔

حضرت عمرؓ نے کہا: "تم کو گنتی بھی آتی ہے"۔ ——— کہا "ہاں ۔ یہ کہہ کر پانچ دفعہ لاکھ لاکھ کہا۔"

الطاف مسلسل

حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ایک مرتبہ نہیں بلکہ کئی مرتبہ غلبۂ اسلام کی خبر دی اور فرمایا:
"میں سو رہا تھا۔ میرے پاس تمام دنیا کے خزانوں کی کنجیاں لائی گئیں اور میرے ہاتھ میں رکھ دی گئیں"

اُمت پر الطاف مسلسل کی بارش کا تماشا دیکھئے:۔

۱۔ حضورؐ نے عرب کو فتح کیا اور ملکِ شام۔ ملک یمن اور ملک فارس کی فتوحات کی خبریں دیں اور وہ پوری ہوئیں ۔

۲۔ قسطنطنیہ کی فتح کی خبر دی اور وہ پوری ہوئی ۔

۳۔ ہندوستان کی فتح کی خبر دی اور وہ پوری ہوئی ۔ اقبال کہتا ہے:

میرِ عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

۴۔ سپین پر حملہ کرنے کا حکم طارق کو دیا۔ اس کا حال بھی سن لیجئے جو ہم نے اپنی ایک اور کتاب میں لکھا ہے:۔

"طارق نے اللہ کا نام لے کر سپین پر حملہ کر دیا۔ اس کے ساتھ بارہ ہزار تین سو سپاہی تھے۔ سپین کے بادشاہ راڈرک کے پاس ایک لاکھ فوج تھی۔ لیکن طارق فتح یاب ہوا۔ اس نے اپنی تمام کشتیاں جلا دی تھیں کہ لشکر کے دل میں واپسی کا خیال بھی نہ آئے۔ لوگوں نے کہا یہ کیا نادانی ہے۔ جنگ کے دو رُخ ہوتے ہیں۔ ہم غریب الوطن ہیں۔ اگر ہم کو پسپا ہونا پڑا تو کدھر جائیں گے؟

طارق کے خواب کو اقبالؔ نے اپنے ایک نہایت دل آویز قطعہ میں لقائے دوام کا لباس پہنایا ہے:

طارق چو بر کنارۂ اندلس سفینہ سوخت
گفتند کارِ تو بنگاہِ خرد خطاست
دُوریم از سوادِ وطن باز چوں رسیم
ترکِ سبب ز روئے شریعت کجا رواست
خندید و دستِ خویش بہ شمشیر برد و گفت
ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست

طارق عرب تھا۔ اس کی رگوں میں خون نہیں دوڑتا تھا بجلیاں لہراتی تھیں۔ مسلمان تھا اس کے دل میں خوف و ہراس کے لیے جگہ نہ تھی۔ لیکن کشتیاں جلا دینے کا سبب کچھ اور تھا۔ حملہ سے پہلے اس نے آں حضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو خواب میں دیکھا حضورؐ کے پاس تمام صحابہؓ تلواریں سونتے کھڑے ہیں اور آپؐ فرما رہے ہیں:۔

"طارق! اپنے کام کی طرف بڑھ"

اس خواب نے اس کا حوصلہ بڑھا دیا۔ اس کو اپنی فتح کا یقین بلکہ عین الیقین تھا۔ جانتا تھا کہ سپین سے واپس نہ جانا پڑے گا۔ (خدا کا آخری پیغام) "

(۵) خلافتِ عباسیہ کے قیام کی بنیاد یہ تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے چچا حضرت عباسؓ سے فرمایا تھا کہ خلافت آخر تمہاری اولاد کو ملے گی۔ بنو عباس اس وقت سے خلافت کے اُمیدوار چلے آتے تھے۔

(۶) بابر کی سلطنت حضورؐ کا عطیہ تھی۔ ہندوستان میں خاندانِ مغلیہ کی سلطنتِ عظیم کی بنیاد شہنشاہ بابر نے رکھی تھی۔ تاریخ دان جانتے ہیں کہ اس بادشاہ کو بارہ برس کی عمر میں آوارۂ دشتِ غربت ہونا پڑا اور مسلسل گیارہ برس اس طرح گزرے کہ خانماں برباد ہو کر شب روز صحراؤں، دریاؤں اور پہاڑوں کے دامن میں پناہ لیتا پھرتا تھا اور اعدائے جان اس کا تعاقب کرتے رہتے۔ بابر خود اپنی تزک میں لکھتا ہے کہ ایک مقام پر وہ تھکا ماندہ پڑا سوتا تھا اور دشمن بالکل قریب پہنچ چکے تھے۔ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو خواب سے بیدار کیا اور خطرے سے آگاہ فرمایا۔ گویا وہ سلطنت جو بابر نے اولاد کے لئے پشتوں تک قائم کی حضورِ شہنشاہِ کونینؐ ہی کا عطیہ تھی۔

(۷) وہ تمام ممالک جن کی تسخیر میں صحابۂ کرام کا ہاتھ تھا آج تک مسلمانوں کے قبضہ میں ہیں۔ یہ ممالک آغوشِ اسلام میں آنے کے بعد ایک دن کے لیے بھی آستانِ کفر پہ سرنگوں نہیں ہوئے۔ مثلاً عرب۔ عراق۔ شام۔ مصر۔ ایران۔ قسطنطنیہ۔ شمالی افریقہ وغیرہ۔ ہم نے اس سلسلہ میں قسطنطنیہ کو بھی شامل کیا ہے۔ اس کو سلطان محمد ثانی نے ۱۴۵۳ء میں فتح کیا تھا لیکن سب سے پہلے جہاد میں حضرت ابو ایوب انصاری شامل ہو کر شہید ہوئے تھے۔ قسطنطنیہ میں جامع ایوبؓ کی قدر و منزلت رہتی دُنیا تک رہے گی۔ شمالی افریقہ کو ایک صحابی عقبہ بن نافع نے فتح کیا تھا۔ کابل۔ غزنی وغیرہ پر اسلام کا جھنڈا حضرت عثمانؓ کے عہد میں لہرانے لگا تھا۔ اگر بغداد، مصر اور شمالی افریقہ پر فرنگی چند روز غالب رہے تو اس عرصہ میں بھی فرمانروا مسلمان ہی رہے۔

برعکس اس کے اندلس۔ صقلیہ اور دہلی کی اسلامی حکومتوں کا حشر ہم دیکھ چکے ہیں۔ اندلس اور صقلیہ کی اسلامی سلطنتیں صدیوں بصد جاہ و جلال قائم رہیں۔ ان دونوں ممالک نے دنیا کو تہذیب و تمدن اور علوم و فنون کی دولت سے مالا مال کیا لیکن آخر پیوندِ خاک ہو گئیں اور آج وہاں مسلمان نہیں رہا۔ دہلی کی اسلامی حکومت کا خاتمہ بھی نہایت رنجدہ حالات میں ہوا۔ اسی لئے اقبال کو کہنا پڑا تھا۔

ہزار مرتبہ کابل نکوتر از دلی است
کہ ایں عجوز عروسِ ہزار داماد است

اگر ان تینوں ممالک کو فتح کرنے میں صحابہ کا دخل ہوتا تو کیا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آج بھی یہاں اسلامی حکومتیں نظر آتیں؟

(۸) سرزمین حبش کو اسلام سے نہایت زبردست تعلق رہا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقدس جھنڈا آج تک حبشہ کے عیسائی بادشاہ کے پاس بطور تبرک موجود ہے اور اسی جھنڈے کی برکت سے آج بھی اس کی آزادی برقرار ہے۔ اطالیہ ملک پر قابض ہوا لیکن سڑکیں بنا کر اور جدید ساز و سامان مہیا کر کے ملک کو چھوڑ گیا۔

(۹) افغانستان کے سابق بادشاہ امان اللہ خاں مرحوم کا ذکر یہاں کرنا پڑتا ہے۔ غریب انتہائی نیک نیتی کے باوجود تہذیب فرنگ

سے نہ بچ سکا تھا اور نتیجہ یہ ہُوا کہ روما میں رہ کر غریب الوطنی کے دن پورے کئے اور غربت ہی میں جان دی۔ اس کا ایک خواب قابلِ ذکر ہے کہ عبرت انگیز اور سبق آموز ہے۔

امان اللہ خاں ابھی افغانستان کا فرمانروا تھا کہ اس نے یورپ کا سفر اختیار کیا۔ ارضِ فرنگ کی طرف جاتے ہوئے اس نے خود ہندوستان میں اپنے اِس خواب کا ذکر مجمعِ عام میں کیا تھا۔ اس نے خواب میں دیکھا تھا کہ ایک بھاری صندوق میں حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جُبّہ اقدس رکھا تھا۔ امیر اس صندوق کو اٹھا کر تھوڑی دور لے گیا مگر فوراً رکھ دیا کہ اس کی برداشت دشوار ثابت ہوئی۔ غور اور عبرت کا مقام ہے کہ اس کا اپنا بیان کیا ہُوا خواب چند ہی روز میں صحیح ثابت ہُوا۔ کاش وہ فتنۂ تفریج سے بچ جاتا اور اس کا تخت و تاج قائم رہتا! دنیا جانتی ہے کہ اصلاحات کے شوق کی گرمی نے نہایت عجلت کے ساتھ اس کے جاہ و اقبال کو ٹھنڈا کر دیا اور اس کو جان بچا کر ملک سے رخصت ہونا پڑا۔

تعجب ہے کہ یہ خواب ہمارے ملک کے تمام اخباروں میں شائع ہوا تھا لیکن امیر کا انجام دیکھ لینے کے بعد بھی کسی کا ذہن اس خواب کی طرف منتقل نہ ہُوا۔ ظاہر ہے کہ جُبّۂ اقدس سے مراد شعائرِ اسلام ہی تھے۔

(۱۰) قیامِ پاکستان کے متعلق کیا ہم کو کچھ کہنے کی ضرورت ہے؟ اگر یہ مملکت عالم وجود میں آئی تو فقط اس لیے کہ قائدِ اعظم کے الفاظ ہیں "THE MUSLIMS ARE A NATION" (مسلمان ایک "قوم" ہیں "فرقہ" نہیں ہیں)۔ کون نہیں جانتا پاکستانی مسلمانوں کی قومیت اور پاکستان کا قیام جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عطیہ ہیں۔

آج بھی مسلمان دُنیا میں ہر اعتبار سے سربلند ہے

ایک امریکی ریڈن کر اس ۱۹۳۹ء میں رسالہ کرنٹ ہسٹری (THE CURRENT HISTORY.) میں "دنیائے اسلام کی بیداری" کے عنوان سے لکھتا ہے:-

"ہر جمعہ کے روز نیو یارک کے پچیس ہزار مسلمان رو بہ قبلہ ہو کر نماز باجماعت ادا کرتے ہیں اور یہ صرف نیو یارک میں نہیں ہوتا بلکہ دنیا بھر کے مسلمان جو مراکو سے لے کر جزیرہ سنڈا تک اور مڈغاسکر سے لے کر منگولیا تک پھیلے ہوئے ہیں ہر جمعہ کے دن اکٹھے ہو کر ایک خدا کے سامنے سربسجود ہوتے ہیں۔ جزائر فلپائن میں۔ مصر کی یونیورسٹیوں میں۔ مشرقی ایوان ہائے حکومت اور تاتاری خانہ بدوشوں کے خیمہ میں۔ یوگوسلاویہ پارلیمنٹ کے بنچوں پر۔ افریقہ کی گولڈ کوسٹ کی نو آبادی میں۔ حبشیوں کی جھونپڑیوں میں۔ غرض ہر جگہ اور ہر وقت یہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ اسلام اور اس کے پیرو از سرِ نو جدید زندگی اور طاقت حاصل کر رہے ہیں۔"

"اسلام کی طاقت کا پہلا سنگِ بنیاد تو اس کی مذہبی یگانگت و قوت ہے لیکن دوسرا اہم ترین ذریعہ اس کی بے مثال قوتِ تولید میں مضمر ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایشیائی بیشتر اقوام کی شرحِ پیدائش کافی ہے۔ لیکن مسلمان تو خرگوش کی طرح اس سرعت سے بڑھ رہے ہیں کہ اس کا اندازہ کرنا محال ہو رہا ہے۔ بطورِ مثال کے مصر کو دیکھئے اس کی آبادی اس تیزی سے بڑھ رہی ہے کہ صرف ایک صدی میں وہ چار گنا ہو جائے گا اور اگر ترقی کی یہی رفتار جاری رہی تو ماہرینِ حساب کا بیان ہے کہ چار سو پچیس برس کے عرصہ میں مصر کی آبادی اتنی بڑھ جائے گی جتنی اِس وقت دنیا بھر کی ہے۔ فلسطین میں جہاں یہودی بکثرت آباد ہیں وہاں عربوں اور یہودیوں کی شرح

پیدائش کا اندازہ کرتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ عربوں کی شرحِ پیدائش یہودیوں سے اڑھائی گنا زیادہ ہے۔ الجیریا میں مسلمانوں کی شرحِ پیدائش یورپینوں کے مقابلہ میں چار گنا زیادہ ہے۔ مصر۔ ترکی اور ایران میں عام یورپین ممالک کے مقابلہ میں سہ گنا زیادہ شرحِ پیدائش ہے۔

اسلام کی قوت کا تیسرا اسباب اسلامی ممالک کی خام پیداوار کی کثرت و قیمت ہے۔ روئی اور مٹی کا تیل انھیں امریکہ کا مدِمقابل بنا دیتا ہے۔ ایران۔ عراق۔ ترکی اور افغانستان میں تیل کے اتنے چشمے ہیں جتنے دنیا بھر میں ہوں گے۔ روئی کی پیداوار میں مصر کا درجہ اتنا بلند ہے کہ اس کی روئی کے لیے دنیا بھر کی منڈیاں کھلی رہتی ہیں۔ سوڈان۔ عراق اور اناطولیہ کی روئی بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔"

مضمون نگار آگے چل کر لکھتا ہے :۔

"پان اسلامزم ایک خواب نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ لکھ پتی مسلمان تاجر جو کلکتہ کے شاندار ایوان ہائے تجارت میں بیٹھا نظر آتا ہے۔ بورینو اور سماٹرا کے مزدور۔ تبت اور منگولیا کی سول وار کے مارشل۔ سائبیریا کے انقلاب پسند نوجوان۔ کابل۔ طہران اور مکہ کے بادشاہ۔ ترکی کے انجینئر ماہرینِ حرب اور افسر۔ شام کے طلبہ۔ عرب کے مذہبی دیوانے۔ مصر کے نوجوان۔ صحرا کے خانہ بدوش بحر اطلانتک کے کناروں پر رہنے والے عرب۔ افریقہ کی جھونپڑیوں کے نیم وحشی۔ یہ سب سینکڑوں قسم کی مختلف زبانیں بولتے ہیں۔ لیکن سب تہذیب و تمدن کے دروازے پر کھڑے ہیں۔

ان کے رنگ سفید سے لے کر آبنوس کی طرح سیاہ ہیں۔ لیکن جب جمعہ کے دن وہ نماز کی اذان سنتے ہیں تو سب کے سب خدائے واحد کی پرستش کے لیے مکہ کی طرف منہ کرکے سربسجود ہو جاتے ہیں۔

جو لوگ پان اسلامزم کو ایک کہانی سمجھتے ہیں وہ اس حقیقت سے کیسے آنکھیں بند کر سکتے ہیں"

اسلام کی نمایاں باتیں

ربن کر اس کے مضمون میں اسلام کی حسبِ ذیل باتیں نمایاں طور پر ظاہر ہیں :۔

۱۔ مسلمان دنیا کے ہر حصہ میں موجود ہیں اور ان میں یگانگت و قوت ہے۔

۲۔ مسلمانوں کی آبادی دنیا کے ہر حصہ میں نہایت تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ غیر مسلم ممالک کی آبادی کے مقابلہ میں شرحِ پیدائش سہ چند بلکہ چہار چند ہے اور بے مثال ہے۔

۳۔ تمام اسلامی ممالک میں خام پیداوار کی کثرت ہے۔ مصر۔ سوڈان۔ عراق۔ اناطولیہ کی روئی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

۴۔ تیل کے چشمے اتنے ہیں جتنے دنیا بھر میں ہوں گے۔

کیا ان چاروں باتوں سے یہ امر ظاہر نہیں ہوتا کہ مسلمان آج بھی ہر اعتبار سے دنیا میں سربلند ہے۔ جہاں تک قدرت کے الطاف و کرم کا تعلق ہے مشرق و مغرب کی کوئی دوسری قوم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ خدا نے اس کو سب کچھ دے رکھا ہے اور دوسروں سے زیادہ! کاش اس کو اپنے تفوق کا احساس ہو!

(۲)

چند معجزات

ستونِ حنانہ کھجور کا ایک تنہ جس کو ستونِ حنانہ کہا جاتا ہے رونے لگ گیا تھا۔ یہ تنہ مسجد نبویؐ میں تھا۔ جب

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خطبہ ارشاد فرماتے تھے تو ذرا ٹیک لگا لیتے تھے۔ ایک بڑھئی نے منبر تیار کرکے پیش کیا کہ حضورؐ کو کھڑے رہنے کی تکلیف نہ ہو۔ جب حضورؐ منبر پر بیٹھے تو ستون چیخ اٹھا اور بچوں کی طرح رونے لگا۔ اس گریہ وزاری کا اثر نہ صرف حاضرین پر ہوا بلکہ خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی متاثر ہوئے۔ مولوی اشرف علی صاحب تھانوی نے اس واقعہ کا ذکر اپنی کتاب میں کرتے ہوئے زبانِ عربی کے یہ دو اشعار بھی نقل کئے ہیں :-

وحن له الجذع القديم تحزنا فان فراق الحب ادهى المصائب

(چیخنے لگا حضورؐ کے لیے بوسیدہ کھجور کا تنہ غم فراق کی وجہ سے کیونکہ محبوب کی جدائی سب سے بڑی مصیبت ہے)

رأيتم جذعا حنت وانت درت الحاضرون لها دنيا

(دیکھا تم نے ایک کھجور کے تنہ کو چیخنے لگا اور زاری کرنے لگا حتیٰ کہ حاضرینِ مجلس بھی اس کے ساتھ چیخنے لگے)

ان باتوں کو نہ ماننے والے کم از کم یہ نہیں کہہ سکتے کہ درخت جذبات سے آزاد ہوتے ہیں اور ان کا چیخنا اور رونا قوانینِ فطرت کے خلاف ہے۔

ابوجہل کی مٹھی میں کنکریاں

مولانا رومؒ نے اس معجزہ کا ذکر کیا ہے ؎

معجزہ جُست از نبیؐ بوجہل سگ
دید و نفزودش ازاں الا کہ شک

ابوجہل نے حضورؐ سے کہا تھا کہ بتائیے میری مٹھی میں کیا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا میں بتاؤں یا یہ کنکریاں خود بتائیں۔ کہا کنکریاں بتائیں فوراً کنکریاں تسبیح میں مصروف ہوگئیں۔ ابوجہل نے کہا یہ جادو ہے۔

جن لوگوں کو حضرت سید احمد بریلوی کی طرح شبِ قدر کا ذاتی تجربہ ہوا ہوگا کیا ان کو کنکریوں کے بول اٹھنے پر تعجب ہوسکتا ہے؟ لیلۃ القدر ایک سالانہ عید ہے اور دیکھنے والے اس مقدس رات کی تجلیاں ہمیشہ دیکھتے رہتے ہیں۔

شق القمر

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اعجاز سے چاند کے دو ٹکڑے ہوگئے تھے اور نہ صرف حاضرین نے اس امر کو دیکھا تھا بلکہ ان لوگوں نے بھی دیکھا تھا جو کہیں دور سے آرہے تھے۔ یہ لوگ میدانوں میں سفر کر رہے تھے۔ قرآن مجید میں اس معجزہ کا ذکر ہے۔ بعض مسلمان حضرات نے جو نام نہاد قوانینِ فطرت سے مرعوب ہیں اور ضرورت سے زیادہ مرعوب ہیں اس کو آثارِ قیامت میں شامل کیا ہے کیونکہ آیت کے الفاظ ہیں :

"اقتربت الساعة وانشق القمر" قریب آگئی ساعت اور پھٹ گیا چاند

لیکن معلوم ہوتا ہے ان حضرات نے اس بات کی طرف توجہ نہیں کی کہ کفار نے اس کو جادو سمجھا اور آیت میں الفاظ مندرجہ کے بعد ہی اس چیز کا ذکر بھی فرمایا گیا ہے :- "وان يروا اية يعرضوا ويقولوا سحر مستمر" (اگر یہ کفار کوئی معجزہ دیکھتے ہیں تو منہ پھیر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تو سحر مستمر ہے)

یہی جملہ واضح کر دیتا ہے کہ چاند کے دو ٹکڑے حقیقت میں ہوئے ورنہ وہ اور کون سی چیز تھی جس کو منکرینِ اسلام نے جادو

خیال کیا۔ "سحر" "مستمر" کے معنی ہیں "وہ جادو جو دائم ہو"۔ کفار حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تمام معجزات کو جادو سمجھتے تھے۔ جب انہوں نے معجزہ شق القمر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تو کہا کہ یہ بھی وہی جادو ہے جو ہمیشہ کیا جاتا ہے۔

اگر یہ فقط قیامت کا ذکر ہوتا تو کفار کے لیے "سحر" اور "سحر مستمر" کے ذکر کا کیا موقع تھا۔ قرآن مجید میں قیامت اور اس کی ہول آفرینیوں کا ذکر جا بجا آیا ہے اور سینکڑوں بار آیا ہے لیکن کسی مقام پر یہ نہیں فرمایا گیا ہے کہ کفار قیامت کے ذکر کو بھی جادو سمجھتے ہیں۔ جس چیز کو انہوں نے دیکھا ہی نہ تھا اس کے متعلق وہ کیونکر کہہ سکتے تھے کہ "یہ جادو ہے اور وہی پرانا جادو"۔ ہاں جب اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ چاند پھٹ گیا تو حسب عادت اور از راہِ ضلالت اس کو جادو خیال کر لیا۔

پھر ایک اور نکتہ قابلِ غور ہے۔ جن آیات میں قیامت کا ذکر فرمایا گیا ہے اُن میں تنہا ایک چیز مثلاً شق القمر کا بیان نہیں ہے۔ بلکہ زمین۔ آسمان۔ پہاڑ۔ دریا۔ سورج۔ چاند۔ ستارے وغیرہ بیسیوں چیزیں مذکور ہیں۔ اگر آیت زیر بحث بھی ان آیات میں سے ہے تو فقط چاند کے پھٹ جانے کا ذکر کیوں ہے۔ قیامت کے متعلق قرآن مجید کی دوسری تمام آیات دیکھ لیجیے یہ اختصار کہیں نہ ملے گا۔

کیا یہ نظر بندی تھی؟

اوپر کی چند سطور قطعی طور پر واضح کر دیتی ہیں کہ کفار نے چاند کے دو ٹکڑے دیکھے۔ اگر انہوں نے اس کو "نظر بندی" سمجھا تو ہماری رائے میں یہ چیز قابلِ توجہ نہیں ہے۔ بہر حال کسی نے وہ بات کر دکھائی جو کوئی اور شخص نہیں کر سکتا تھا۔ کرسکتا ہے حسین آفندی اس سلسلہ میں لکھتے ہیں :۔

"فرض کریں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے حاضرین کی نظر بندی کر دی، یہاں تک کہ انہوں نے اس امر کا مشاہدہ کر لیا کہ چاند شق ہو گیا تو کیا آپؐ کی قدرت میں یہ بات بھی ہو سکتی ہے کہ آپ ان مسافروں کی بھی نظر بندی کر دیتے جن میں سے ہر فریق میدانوں میں جدا جدا مقام پر تھا۔"

ایک تازہ نظیر

مولانا عبد الماجد دریابادی نے جون ۱۹۵۲ء میں "ایک تازہ نظیر" کے عنوان سے حسب ذیل الفاظ لکھے تھے۔

"ڈار لنگٹن۔ وسکونسن (امریکہ) ۲/جون ۱۹۵۲ء۔

کل متعدد شخصوں نے یہاں کہا کہ انہوں نے اتوار کو صبح تڑکے آسمان پر ایک دوسرے چاند کا مشاہدہ کیا۔ لیکن ہوائی فوج والوں کی رپورٹ ہے کہ ہوا باز جو اس تحقیق کے لیے اوپر گئے انھیں کچھ معلوم نہ ہوا۔ زمین سے مشاہدہ کرنے والوں کا جن میں ایک رئیس بلدیہ ہیں۔ کئی پولیس والے ہیں اور محکمہ دفاع ہوائی کے ایک فضا کا پاسبان ہیں بیان ہے کہ ہم نے ایک عظیم الشان نیلی سفید روشنی دوسرے چاند کی طرح مشاہدہ کی۔ کرنل شوب افسر دفاعِ ہوائی نے کہا کہ یہ شے جو مشاہدہ میں آئی، ممکن ہے فضائی کیفیات کا عکس ہو اور ابر کی یا سورج کی یا چاند کی کرشمہ سازی ہو۔"

(یو۔ پی۔ اے)

اصل واقعہ جو کچھ بھی ہو بہر حال اتنا تو ظاہر ہی ہے کہ اس بیسویں صدی کے وسط میں معتبر ثقہ گواہوں کی ایک جماعت نے اپنے نزدیک آسمان پر ایک قمرِ ثانی کا مشاہدہ کیا اور اس شہادت کے بعد ناممکن نہ رہا کہ ساتویں صدی عیسوی کے شروع میں بھی، مکہ کی سرزمین

ہیں ایک پوری جماعت نے فضا میں ایک قمر ثانی کا مشاہدہ کیا ہو۔

اجرامِ فلکی کی ہیئت اور نوعیت بجائے خود کیا ہے اس سے اسلام اور شریعتِ اسلامی کو مطلق بحث نہیں۔ ان کو تو صرف اس سے بحث ہے کہ یہ چاند اور سورج اور ستارے عام انسانوں کو کیسے نظر آتے ہیں اور ان کے حواس اور عقل اور جذبات پر اثر کیا کیا ڈالتے ہیں۔"

ہم کو مولانا دریا بادی کے آخری جملوں سے اتفاق نہیں۔ لیکن ہم یہاں ایک غیر ضروری بحث میں نہیں الجھنا چاہتے۔ اوپر جو کچھ لکھا گیا اس سے ظاہر ہے کہ قرآن مجید میں شق القمر کے ذکر کو قربِ قیامت کے آثار میں داخل کر دینا اور اس بات سے انکار کرنا کہ چاند کے دو ٹکڑے ہوئے عقلِ سلیم سے فراغت حاصل کرنا ہے۔

کفار نے آخر مکہ میں کچھ نہ کچھ دیکھا تھا کہ ان کو خود قریش کے پرانے حربے سے کام لینا پڑا اور کہنا پڑا کہ "یہ تو وہی جادو ہے!"

ہم کو معلوم ہے کہ قرآن اجرامِ فلکی اور تمام کائنات کی حقیقت پر روشنی ڈالتا ہے اور یہی وہ بات ہے جس میں ہم کو مولانا عبدالماجد صاحب سے اتفاق نہیں ہے۔

اسمِ اقدس آسمان پر

ہم نے روزنامہ "زمیندار" لاہور اور دیگر اسلامی اخباروں میں پڑھا تھا کہ ۵ شعبان ۱۳۴۵ھ مطابق ۸ فروری ۱۹۲۷ء کو مغرب کے بعد آسمان پر ستارے اس طرح اکٹھے ہو گئے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مبارک نام لکھا ہوا نظر آیا۔ سینکڑوں آدمیوں نے مختلف مقامات پر الہ آباد، جہلم، پوہ، سکھر وغیرہ میں یہ نظارہ آدھ گھنٹے تک دیکھا اور نامہ نگاروں کی تحریریں نہایت آب و تاب کے ساتھ اسلامی اخباروں میں شائع ہوئیں۔

اسمِ اقدس کے اس اعجاز کا چرچا مدت تک ہمارے ملک میں رہا۔ مولانا ظفر علی خان مرحوم نے ایک نظم میں مندرجہ ذیل شعر بھی کہا تھا۔ ؎

ستارہ کو وہ تلم مستعار دیتے ہیں

مولوی اشرف علی صاحب تھانوی کی کتاب "اسلام اور عقلیات" میں یہ الفاظ درج ہیں :-

"راقم نے بعض مقامات سے اس کی تصدیق کرائی۔ ۴۶ اشخاص کے نام۔ ولدیت۔ سکونت۔ دستخط و نشان انگوٹھا راقم کے پاس موجود ہیں جن میں بہت سے ہندو بھی ہیں۔"

فتنۂ تاتار اور اہلِ فرنگ کے موجودہ تفوق کی خبر

فتنۂ تاتار

صحیح بخاری و صحیح مسلم میں ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

(ترجمہ) قیامت قائم نہ ہوگی (کئی باتوں کے بعد فرمایا) جب تک تم ان ترکوں سے جنگ نہ کر لو گے جو چھوٹی آنکھوں والے، سرخ چہرے والے، پست ناک والے ہوں گے ان کے چہرے ڈھال جیسے چوڑے ہوں گے۔

یہ فتنہ تتر کی خبر ہے۔ ہلاکو خاں کے لشکروں نے خراسان و عراق کو تباہ کیا۔ بغداد کو لوٹا تھا اور بالآخر ان کو بھی ایشیائے کوچک میں شکست عظیم ہوئی تھی۔

یہ واقعہ ۶۵۶ھ کا ہے اور صحیحین میں پانچ صدی پیشتر سے درج چلا آتا تھا۔"

("رحمۃ للعالمین")

اہلِ فرنگ کا موجودہ تفوق

"مستورہ قرشی نے عمرو بن العاص المتوفی ۴۳ھ کے روبرو کہا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ فرماتے تھے قیامت اس وقت قائم ہوگی جب یورپین لوگ سب سے زیادہ ہوں گے۔

عمرو نے کہا دیکھ! تو کیا کہتا ہے؟

مستورہ نے کہا" میں تو وہی کہتا ہوں جو رسول اللہ صلعم سے سنا ہے (عمرو نے کہا تب تو ٹھیک ہے)

بے شک ان میں چار خصلتیں ہیں:

۱۔ وہ مصیبت کے وقت نہایت بردبار ہیں۔

۲۔ مصیبت کے بعد بہت جلد ہوشیار ہو جاتے ہیں

۳۔ بھاگنے کے بعد سب سے پہلے پھر حملہ کرتے ہیں۔

۴۔ مسکین و یتیم و ضعیف کیلئے سب لوگوں سے بہتر ہیں۔

اور ایک پانچویں صفت اور ہے جو نہایت عمدہ ہے۔ وہ بادشاہوں کے ظلم کو سب لوگوں سے بڑھ کر روکتے ہیں۔

واضح ہو کہ یہ حدیث صحیح مسلم کی ہے۔

امام مسلم کا رجب ۲۶۱ھ میں انتقال ہوا اس لیے ہر ایک مخالف کو اس قدر تو ضرور تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ پیش گوئی مسلمانوں میں تیسری صدی کے اندر پھیل چکی تھی یہ وہ زمانہ تھا جبکہ کل دنیا پر اسلامی پرچم لہرا رہا تھا۔ علم و حکمت۔ زور و طاقت تمدن و سیاست میں سب سے فائق تر تھے۔ اس وقت یہ کہنا کہ یہ تمام بزرگی و برتری خاک میں مل جائے گی اور دنیا میں یورپین عیسائی قوموں کی حکومت ہو جائے گی بالکل عقل و فکر سے باہر تھا اور مسلمانوں کے لئے فالِ بد بھی تھا۔ مگر امام مسلم نے اسے اپنی کتاب میں درج کر دیا کیونکہ ان کو صحیح طور پر معلوم ہو گیا کہ ضرور یہ ارشاد نبیؐ پاک کا ہے۔ بالآخر اب صدیوں کے بعد اس کا ظہور ہو رہا ہے۔ آج کوئی بتلائے کہ کون سا ملک ہے جو عیسائی سلطنتوں کی حکومت یا اثر یا ڈپلومیسی سے باہر ہے۔ اس لیے پیش گوئی کے صحیح ہونے میں کلام نہیں۔" (رحمۃ للعالمین)

مدینہ منورہ کے متعلق

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سینکڑوں آنے والے واقعات کی خبر دی اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ حضور کی پیش گوئیاں پوری ہو رہی ہیں۔ ایک خبر مدینہ منورہ کے متعلق بھی ہے جس کو لکھتے ہوئے قلم کانپتا ہے۔

حضورؐ کا ارشاد ہے کہ "ظہورِ دجال کے وقت بیت المقدس آباد ہوگا اور مدینہ تباہ۔"

نفی معجزہ بھی اسلام کا معجزہ ہے

کفار معجزے طلب کیا کرتے تھے | ہم نے اپنی ایک کتاب میں جس کا نام "خدا کا آخری پیغام ہے"۔ لکھا ہے:۔
"منکرین اسلام حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے معجزے طلب کرتے تھے۔ وہ خرقِ عادت کو لازمۂ نبوت سمجھتے تھے آج بھی کفار نہیں مسلمان اور جہلا نہیں پڑے تعلیم یافتہ لوگ باخدا حضرات سے اسی چیز کی توقع رکھتے ہیں۔ گویا نبوت یا ولایت کا یہ معیار بہت کم بدلا ہے یہ لوگ اس معیار کو صحیح نہیں سمجھتے وہ زیادہ تر ایسے اشخاص ہیں جو اپنے اپنے زمانہ میں حکیم سمجھے گئے یا سمجھے جاتے ہیں۔ مثلاً بوعلی سینا جس نے تمام خرق عادات کے طبعی اسباب تلاش کیے۔ امام رازی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ پیغمبر کے لیے معجزہ شرط نہیں ہے۔ امام غزالی بھی اسی قسم کی باتیں لکھ گئے ہیں۔

آج مغربی تعلیم نے بھی معجزات کی اہمیت ختم کر دی ہے۔ جو لوگ خدا اور انبیاء کے قائل نہیں ان کو معجزات و خوارق سے کیا سروکار ہو سکتا ہے۔ لہٰذا وہ تمام مسلمان بھی جو تعلیم یافتہ سمجھے جاتے ہیں (کم از کم راقم کی نظر میں یہ لوگ نیم مغربی ملا ہیں) اور مغربی "روشن خیالی" سے متاثر ہو چکے ہیں وہ معجزہ کا لفظ نہیں سن سکتے البتہ امتحان کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں لوگوں کی ذہنیت بہت مختلف تھی۔ اسلام نے بے شبہ ہر مومن کو حکیم بنا دیا لیکن اسلام سے پہلے وہ حکیمانہ و فتر آرائیوں کی صلاحیت سے محروم تھے۔ ان کے دماغ پر کسی تعلیم، فلسفہ یا سائنس کا سایہ نہ پڑا تھا۔ وہ معجزات ہی طلب کرتے تھے۔ اس مطالبہ کا ذکر قرآن مجید میں کئی مرتبہ فرمایا گیا ہے۔

وقالوا لن نؤمن لک حتٰی	اور وہ تم سے کہتے ہیں کہ ہم تو اس وقت تک تم پر ایمان
تفجر لنا من الارض ینبوعاً	نہیں لائیں گے کہ یا تو ہمارے لیے زمین سے کوئی چشمہ بہا
او تکون لک جنۃ من نخیل	نکالو یا کھجوروں اور انگوروں کا تمہارا کوئی باغ ہو
وعنب فتفجر الانہار خللھا	اور اس کے بیچ میں تم بہت سی نہریں جاری کر دکھاؤ
تفجیرا او تسقط السماء کما	یا جیسا کہ تمہارا خیال ہے آسمان کے ٹکڑے ہم پر لا کر گراؤ
زعمت علینا کسفاً او تاتی باللہ	یا خدا اور فرشتوں کو ہمارے سامنے لا کھڑا کرو یا
والملئکۃ قبیلا او یکون لک	رہنے کے لیے تمہارا کوئی طلائی گھر ہو یا آسمان پر چڑھ
بیت من زخرف او ترقٰی	جاؤ اور جب تک تم وہاں سے ایک کتاب اتار کر نہ لاؤ
فی السماء ولن نؤمن لرقیک حتٰی	کہ ہم آپ اس کو پڑھ بھی لیں ہم تمہارے چڑھنے کو بھی باور
تنزل علینا کتاباً نقرءہ قل سبحان	کرنے والے نہیں کہ دیجئے (اے محمد صلعم) کہ میں رسول
ربی ھل کنت الا بشرا رسولا۔	تو ہوں مگر بشر رسول ہوں۔

اس مطالبہ کا جواب | ایک جواب تو آیت مندرجہ کے اختتام پر موجود ہے۔

"قل سبحان ربی ھل کنت الا بشرا رسولا" (کہہ دو کہ سبحان اللہ میں تو صرف آدمی ہوں اور پیغمبر ہوں)

ایک اور جواب یہ ہے:

"ویقول الذین کفروا لولا انزل علیہ آیۃ من ربہ انما انت منذر و لکل قوم ھاد۔" کفار کہتے ہیں ان پر کوئی نشانی (معجزہ) خدا کے ہاں سے کیوں نہیں اتری۔ اے محمدؐ! تو صرف ڈرانے والا ہے اور ہر قوم کے لئے ایک ڈرانے والا ہوتا ہے۔

"وقالوا لولا انزل علیہ آیات من ربہ قل انما الایات عند اللہ وانما انا نذیر مبین۔" کافر کہتے ہیں کہ ان پر خدا کے ہاں سے معجزے کیوں نہیں آئے۔ کہہ دو کہ معجزے تو خدا کے پاس ہوتے ہیں اور میں تو صرف ڈرانے والا ہوں۔

آیات مندرجہ کی ہم مضمون آیات اور بھی ہیں۔ خداوند تعالٰے نے بار بار اپنے محبوب رسولؐ کو حکم دیا کہ آپ اپنی بشریت کا واضح اعلان کریں اور معجزات طلب کرنے والوں کو صاف کہدیں کہ آپ کسی معجزہ پر قادر نہیں ہیں۔ معجزے تو خدا کے پاس ہوتے ہیں اور آپ فقط ڈرانے والے ہیں۔

اللہ تعالٰے کی بے نیازی اللہ تعالیٰ کی بے نیازی ذیل کی آیات میں اور بھی نمایاں ہو جاتی ہے۔

"قل لا اقول لکم عندی خزآئن اللہ ولا اعلم الغیب ولا اقول لکم انی ملک ان اتبع الا ما یوحیٰ الیّ۔" ان لوگوں سے کہہ دو کہ میں یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس خدا کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب جانتا ہوں اور نہ میں یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔ میں تو اس حکم پر چلتا ہوں جو میری طرف وحی کیا جاتا ہے۔

"قل لا املک لنفسی نفعاً و لا ضراً الا ما شآء اللہ ولو کنت اعلم الغیب لاستکثرت من الخیر و ما مسنی السوء ان انا الا نذیر و بشیر لقوم یؤمنون ٥" (۷ : ۱۸۸) ان لوگوں سے کہہ دو کہ میرا ذاتی نفع و نقصان بھی میرے اختیار میں نہیں ہاں جو کچھ خدا چاہتا ہے وہ ہوتا ہے اور اگر میں غیب کی بات جانتا تو اپنا بہت سا فائدہ کر لیتا اور مجھ کو کوئی تکلیف نہ پہنچتا۔ میں تو خوش خبری دینے والا اور خوف دلانے والا ہوں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں۔

یہ باتیں رسول جلیلؐ اللہ تعالٰے کے حکم کے ماتحت کہہ رہا ہے! وہ رسول جو لولاک کا خلعت پوش ہے۔ انبیا کا سرتاج ہے اور انجمنِ کائنات کا صدر۔ کونین کا شہنشاہ ہے۔

کس زمانہ میں کہہ رہا ہے؟ آج سے چودہ سو برس پہلے!

کہاں کہہ رہا ہے؟ اور کن لوگوں کے سامنے کہہ رہا ہے؟ ریگزارِ عرب میں اُمیّوں کے سامنے! بدویوں کے مجمع میں جو بجز معجزات و خوارق کے اور کسی چیز سے مرعوب و متاثر نہ ہو سکتے تھے جن کو فلسفہ یا حکمت سے کوئی تعلق نہ تھا۔ لیکن ان متواتر اعلانات

کے باوجود کہ میرے پاس خدا کے خزانے نہیں ہیں۔ میں غیب نہیں جانتا۔ میرا ذاتی نفع و نقصان بھی میرے اختیار میں نہیں ہے۔ میں گزند سے اپنے آپ کو نہیں بچا سکتا۔ میں بشر ہوں فرشتہ نہیں ہوں۔ سارا عرب اس کے قدموں پہ گر جاتا ہے اور ایک ہی صدی کے اندر اندر مشرق و مغرب کی بلندیاں اس کے ذکر کو سجدہ کرتی ہیں۔

"ورفعنا لک ذکرک" ہم نے تیرے ذکر کو بلند کر دیا

کیا یہی ایک بات سینکڑوں معجزوں سے زیادہ نہ تھی!

دورِ جدید کا رنگ

قرآن مجید کی ان آیات میں اور اُن کے علاوہ تمام دیگر آیات میں یہ بات بھی کچھ کم حیرت انگیز نہیں کہ زمانۂ حال کا رنگ جھلک رہا ہے اور یہ قطعاً معلوم نہیں ہوتا کہ یہ باتیں آج سے قریباً ڈیڑھ ہزار برس پہلے ان لوگوں سے کہی گئی تھیں جن کی طبائع ان کو قبول کرنے سے قاصر تھیں۔ دورِ قدیم میں تو لوگوں کی ذہنیت یہ تھی کہ شجر و حجر بلکہ نہایت ادنیٰ اور حقیر جانور بھی ان کی نظر میں "خدا" تھے۔ چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے راجے خدا تھے۔ ہندوستان میں کرشن، رام چندر وغیرہ آج تک کروڑوں شخصوں کی نگاہ میں خدا ہیں۔ پیشوایانِ مذہب کو کمتر رتبہ کس طرح دیا جا سکتا تھا وہ بھی خدا تھے اور آج تک ہیں۔ گوتم بدھ اور حضرت عیسیٰ کی مثالیں دیکھ لیجئے۔ ہم نے ایک مغربی پادری سے جو ریل گاڑی میں ہمارا ہم سفر تھا پوچھا کہ تم حضرت عیسےٰ کو خدا سمجھتے ہو۔ جواب دیا کہ ہاں عیسےٰ خدا ہے (گفتگو انگریزی میں تھی)

ہم نے دورِ حاضر کے جس رنگ کا ذکر کیا ہے اس سے ذہنیت کا فقط وہ انقلاب مقصود ہے جو خود اسلام نے پیدا کیا۔

آیاتِ مندرجہ بالا کو نفیِ معجزہ کا ثبوت سمجھا گیا

اسلام نے تمام اوہام باطلہ اور وساوس کا خاتمہ کر دیا۔ اس نے اس بات کا بھی خاتمہ کر دیا کہ کوئی نبی معجزہ پر یا علم غیب پہ قادر ہو سکتا ہے۔ قرآن میں واضح طور پر فرمایا گیا ہے:

"وما کان لرسولٍ ان یاتی بآیۃ الّا باذن اللّٰہ" (کسی پیغمبر کی یہ مجال نہ تھی کہ کوئی معجزہ خدا کے اذن کے بغیر لا دکھائے)

آیات مندرجۂ بالا سے نفیِ معجزہ فقط اس حد تک ثابت ہے کہ نبی خدا کی اجازت کے بغیر معجزہ نہیں دکھا سکتا۔ یہ چیز فقط قدرت کے ہاتھ ہے۔ بعض مسلمان بہت دُور چلے گئے۔ انہوں نے فریبِ تجدد کے دام میں آ کر سمجھ لیا کہ قرآن سے خوارق کا وجود ثابت نہیں ہوتا۔ لیکن اگر نفیِ معجزہ سے مراد یہ ہے کہ معجزات کا اختیار رسولوں کو نہیں دیا گیا کہ جب چاہیں دکھا دیں تو ہم اس نفیِ معجزہ کو بھی معجزہ سمجھتے ہیں کہ روشن خیالی کی یہ بنیاد اُس زمانہ میں رکھی گئی جب تمام دنیا میں معجزہ پرستی کا اندھیرا تھا۔

"جاہل سے جاہل اقوام میں مسلمانوں کا خالص توحید کی رُوح پھونک دینا نہایت حیرت انگیز ہے" (لیکی)

رُوم میں مسیحیت کے عروج و اشاعت کا سبب وہ اہلِ روما کی معجزہ پرستی قرار دیتا ہے اور آخر میں کہتا ہے:-

"یہ چیز مطلق حیرت انگیز نہیں۔ یہ تو تمام تر حالاتِ معاصرانہ و اسبابِ طبعی کا صریحی نتیجہ تھا۔"

لیکن لیکی دو اور فقط دو باتوں پر حیران ہوتا ہے۔ اس کے اپنے الفاظ ملاحظہ ہوں :-

"ہمیں اس سے انکار نہیں کہ واقعاتِ تاریخی کی سطح تمام تر ہموار نہیں۔ بعض واقعات بے شبہ تاریخ کی رفتارِ طبعی کے بظاہر مخالف معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن یہ قطعی ہے کہ رومی حکومت کا اصطباغ ان مستثنیات میں نہیں۔ یہ تو ایک سیدھا سادہ طبعی اور معمولی واقعہ ہے جس کی توجیہہ و تشریح علت و معلول کے عام سلسلہ میں بخوبی ہو جاتی ہے۔

یونان کی محدود و قلیل آبادی میں اکثر ایسے لوگ ایک دو کی تعداد میں نہیں بلکہ کثرت سے پیدا ہو گئے جن کی نظیر فلسفہ۔ شاعری۔ ڈراما۔ خطابت۔ نقاشی۔ مصوری۔ سیاست۔ موسیقی وغیرہ میں آج تک نہ پیدا ہو سکی یا مثلاً جاہل سے جاہل اقوام میں جن کے پست دماغوں کے لیے شرک و بت پرستی کا تخیل ناگزیر تھا، مسلمانوں کا خالص توحید کی روح پھونک دینا بے شبہ نہایت حیرت انگیز عجیب واقعات ہوئے ہیں اور گو ان میں سے پہلے واقعہ کی توجیہہ آب و ہوا۔ جغرافی۔ سیاسی۔ معاشرتی و ذہنی خصوصیات کی بنا پر کی جاتی ہے اور دوسرے کی اس بنا پر کی جاتی ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے تصویر کشی اور دیگر فنونِ لطیفہ کو کس قدر دبایا تاہم ہمیں اعتراف کرنا چاہیے کہ پھر بھی ان واقعات کی ندرت و بوالعجبی باقی رہتی ہے۔ لیکن میں مکرر کہتا ہوں کہ روم میں مسیحیت کا عروج و شیوع مطلق حیرت انگیز نہیں۔"

مسیحیت اور تائیدِ ربانی

سلسلۂ مذکور میں لیکی کی مندرجۂ ذیل سطور بھی پڑھنے کے لائق ہیں :-

"جن مصنفوں کا خیال اس کے برعکس ہے وہ یہ کہتے ہیں کہ روم میں مسیحیوں پر مظالم کیسے روا رکھے گئے۔ مسیحیت کو کس طرح حکومت نے کچلنا چاہا اور تعذیب و عقوبت کی کوئی شکل باقی نہیں رہی جس کا استعمال مسیحیت قبول کرنے والوں پر نہ کیا جاتا ہو۔ ایسی حالت میں اور ان عظیم الشان موانع کے باوجود بھی اگر مسیحیت نے قبولیت حاصل کی تو اسے سوا تائیدِ ربانی کے اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

میں اس رائے کی غلطی آئندہ صفحات میں دکھاتا ہوں اور یہ بتاتا ہوں کہ مسیحیوں پر جو کچھ بھی مظالم ہوئے وہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے اس طرح کے نہ تھے کہ مسیحیت کی رفتارِ ترقی کو روک دیتے۔"

اس کے بعد لیکی دو فصلوں میں قریباً ساٹھ صفحات لکھ کر اس غلطی کو کامیابی سے دکھاتا ہے۔

جو شخص روم میں مسیحیت کی ترقی و اشاعت کو تاریخ کی رفتارِ طبعی کا نتیجہ قرار دیتا ہے اور اس لئے اس کو تائیدِ ربانی نہیں سمجھتا وہ اسلام کے عقیدۂ توحید کی اشاعت کو حیرت انگیز اور عجیب و نادر تسلیم کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جاہل اقوام کے پست دماغوں کے لئے شرک و بت پرستی کا تخیل ناگزیر تھا۔ بالفاظِ دیگر وہ تسلیم کرتا ہے کہ جس نے ان اقوام میں خالص توحید کی روح پھونک دی اس کو تائیدِ ربانی حاصل تھی۔

مسیحیت اور اسلام کے حالات کا مقابلہ

یہاں ہم بطورِ اعادہ ان حالات کا مقابلہ کرتے ہیں جن کے ماتحت روم میں مسیحیت کی اشاعت ہوئی اور دنیا میں اسلام پھیلا تھا :

مسیحیت	اسلام
۱- اہلِ روما کے دماغ پر وہم پرستی اور ضعیف الاعتقادی مسلط تھی۔ ان کی معجزہ پرستی کی استعداد نے قبولِ مسیحیت کی راہ کشادہ کی۔	۱- اسلام کے دشمن معجزات دیکھتے تھے لیکن مانتے نہ تھے بلکہ ان کو جادو سمجھ کر منہ پھیر لیتے تھے۔
۲- معجزاتِ مسیح کے قصے صدی دو صدی کے بعد بغیر تفتیش کے قبول کر لیے گئے۔	۲- سوال پیدا نہیں ہوتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود اہلِ عرب کے درمیان موجود تھے۔
۳- لیکی کہتا ہے کہ مسیحیوں نے سینکڑوں ہزاروں جعلی پیش گوئیوں کا بہت سارا لٹریچر وضع کر لیا۔	۳- یہ سوال بھی پیدا نہیں ہوتا۔
۴- تمام مسیحی خرقِ عادت اور علمِ غیب کے مدعی تھے۔	۴- کفار کے مطالبہ کا جواب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے یہ دیا جاتا تھا کہ میں غیب کا علم نہیں رکھتا معجزوں پر قادر نہیں ہوں۔ فقط بشر ہوں اور رسول ہوں۔
۵- بت پرستوں کے نظریات اور معتقدات مسیحیت نے قبول کر لئے کہانت کی واقعیت تسلیم کی گئی۔ دیوتاؤں کو مانا گیا جیسا کہ لیکی نے لکھا ہے۔	۵- اسلام نے کفر و شرک کی ہر شکل سے مکمل بیزاری اور علیحدگی اختیار کی۔
۶- ترقی کے میدان میں معجزات نے قدم قدم پر مسیحیت کا ساتھ دیا۔ اہلِ روم نے اپنی معجزہ پرستی کی وجہ سے اس کو قبول کیا پیروانِ مسیح نے معجزاتِ مسیح کی داستانیں پھیلائیں پیش گوئیوں کے جعلی دفتر تیار کئے۔ پیغمبر کو خدا بنا دیا اور خود صاحبِ کرامات بن گئے۔ بت پرستوں کے عقائد بھی قبول کر لئے کیونکہ کاہنوں کے بعض اقوال مسیحیت کو تقویت دیتے تھے۔	۶- اسلام نے معجزات و کرامات کا عصا نہ ٹیکا وہ جس کے ادنےٰ غلام بھی صاحبِ کرامات ہیں بار بار اعلان کرتا ہے کہ معجزات خدا کے پاس ہیں میرے پاس نہیں ہیں میں اپنے نفع و نقصان پر بھی قادر نہیں ہوں۔ میرے پاس غیب کا علم نہیں ہے۔ عالم الغیب فقط خدا ہے۔ میں بشر ہوں اور خدا کا پیغام پہنچا دیتا ہوں۔
لیکن	**اس لیے**
ارضِ فرنگ ہی کا نقاد کہتا ہے کہ مسیحیت کا عروج روم یعنی یورپ میں کوئی معجزہ نہ تھا یا غیر معمولی بات نہ تھی۔	ارضِ فرنگ کا وہی نقاد کہتا ہے کہ جاہل سے جاہل اقوام میں مسلمانوں کا خالص توحید کی روح پھونک دینا نہایت حیرت انگیز اور عجیب بات ہے یعنی معجزہ۔

اب آپ ہی بتائیے کیا نفی معجزہ بھی اسلام کا معجزہ ہے ؟ کیا یہ عجیب بات ہے کہ اس قسم کی باتیں آج بیسویں صدی عیسوی میں نہیں بلکہ ساتویں صدی کی ابتدا میں کہی گئی تھیں۔

اسلام کا سب سے بڑا معجزہ قرآن ہے

معجزہ کا فائدہ یہی ہو سکتا ہے کہ شکوک مٹ جائیں۔ خداوند تعالیٰ نے قرآن ہی میں فرمادیا ہے "اِنْ کُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَۃٍ مِّنْ مِّثْلِہٖ"

ترجمہ : (جو کچھ ہم نے اپنے عبد پر نازل کیا ہے اگر اس میں تم کو شک ہے تو ایک ایسی سورت تم بھی لاکر پیش کردو)

اس سے ظاہر ہے کہ قرآن ہی وہ معجزہ ہے جو شک و ارتیاب کا خاتمہ کر دیتا ہے۔

ما بداں منزلِ عالی نتوانیم رسید
ہاں مگر لطفِ خدا پیش نہد گامے چند!

رسولِ اکرمؐ کا انتباہ

مولانا ڈاکٹر عبدالحی

کچھ عرصہ سے میری طبیعت ناساز چل رہی ہے ضعف بھی زیادہ ہے مگر آپ لوگ زحمت اُٹھا کر دُور دُور سے آتے ہیں، عذر کرتے ہوئے بھی شرم معلوم ہوتی ہے۔

آج آپ لوگوں سے ایک بہت ضروری بات کہنی ہے جو بلاتکلف اور بلاخوف تردید عرض کرتا ہوں۔

دیکھئے! اس وقت زندگی کے کسی شعبہ پر بھی نظر ڈالئے ہر فرد پر کچھ ایسی بے حسی طاری ہے کہ کسی کو اپنے مآل کار کا ہوش نہیں، ہر شخص کے ذمہ اپنے اپنے مشاغل ہیں وہ دیندار ہوں یا دنیا دار۔ مگر سب کے ساتھ ایک بے حسی کا عالم ہے۔ میں سب کو تو نہیں کہتا مگر اکثر و بیشتر کی یہی حالت ہے۔ تجارت گاہوں میں، دفاتر میں، مختلف اداروں میں لوگ اپنی اپنی دُھن میں سرگرداں ہی رہتے ہیں قربِ قیامت کی علامات میں یہ بھی ہے کہ ایسا وقت آئے گا کہ لوگ اپنی زندگی کے انداز میں ایسے مدہوش ہو جائیں گے کہ ان کو یہ ہوش ہی نہ ہوگا کہ صبح کب ہوئی اور شام کب ہوئی اور کس طرح ہوئی جائز طریقہ سے ہوئی کہ ناجائز طریقہ سے۔ حلال کی کمائی ہوئی کہ حرام کی ہوئی۔ انسانوں کی طرح سے ہوئی کہ حیوانوں کی طرح ہوئی یہ احساس ہی مٹ جائے گا اس وقت اب ایسے ہی آثار دیکھ رہا ہوں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جتنی علاماتِ قیامت احادیث میں ارشاد فرمائی ہیں وہ کچھ تو برملا اب پائی جا رہی ہیں اور جن کا ابھی وقت نہیں آیا وہ بھی آئندہ ظاہر ہوتی رہیں گی۔

قربان جایئے اُس نبی برحق علیہ الصلوٰۃ والسلام پر سے کہ جس نے دین کی یا دنیا کی کوئی بھی بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی ضرورت اور بات ایسی باقی نہیں چھوڑی جس کے متعلق صاف اور کھلے الفاظ میں احکام نہ بیان فرما دیئے ہوں اور اُن کے منافع اور نقصان نہ بتا دیئے ہوں اگر مسلمان نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سچا رسول سمجھتے ہیں تو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہئیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس قسم کے اعمال پر جس قسم کے عذاب اور پریشانیوں کا مرتب ہونا ارشاد فرمایا ہے وہ تو یقیناً ہو کر رہیں گے مگر ہم کو اپنی مدہوشی کی وجہ سے ان ارشاداتِ نبویہ کی طرف دھیان دینے کی فرصت اور ہوش کہاں؟

علاماتِ قیامت کے سلسلہ میں ایک حدیث میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اس اُمت میں ایک جماعت رات کو کھانے پینے اور لہو ولعب میں مشغول ہوگی اور صبح کو بندر اور سُور کی صورتوں میں تبدیل ہو جائے گی اور بعض لوگوں کو زمین میں دھنس جانے کا عذاب ہوگا لوگ کہیں گے کہ آج رات فلاں خاندان دھنس گیا اور فلاں گھر دھنس گیا اور بعض لوگوں پر آسمان سے پتھر برسائے جائیں گے جیسے کہ قوم لوط پر برسائے گئے تھے اور بعض لوگ آندھی سے تباہ ہوں گے۔ اور یہ سب کیوں ہوگا ان حرکتوں کی وجہ سے، شراب پینے کی وجہ سے۔ ریشمی لباس پہننے کی وجہ سے گانے والیاں رکھنے کی وجہ سے، سود کھانے کی وجہ سے، اور قطع رحمی کی وجہ سے۔ (مشکوٰۃ)

علاماتِ قیامت میں یہ بھی وارد ہوا ہے کہ عام کساد بازاری ہوگی، زنا کی کثرت ہوگی، غیبت پھیل جائے گی، مالداروں کی عظمت کی جائے گی، منکرات کرنے والوں کا غلبہ ہوگا اور تعمیرات کی کثرت ہوگی نیز فحش گوئی، بدخلقی، پڑوسیوں کے ساتھ بُرا برتاؤ۔ نیز یہ بھی علاماتِ قیامت میں ہے کہ مرگ ناگہانی کثرت سے ہونے لگے گی جو آج کل عام طور سے ہونے لگی جس کو دل کی حرکت بند ہوجانا (HEART FAILURE) کہتے ہیں۔

ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ نیک اعمال میں جلدی کرو، مبادا ایسے فتنے واقع ہوں جو اندھیری رات کی طرح ہوں کہ حق ناحق کا پہچاننا مشکل ہو جائے ان میں آدمی صبح کو مسلمان ہوگا شام کو کافر۔ شام کو مسلمان ہوگا تو صبح کو کافر ہوگا معمولی سے دنیوی نفع کے عوض دین کو فروخت کرے گا (مشکوٰۃ)

ایک حدیث میں ارشاد ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اس اُمّت کے زمانہ میں خسف ہوگا یعنی آدمیوں اور مکانوں کا زمین میں دھنس جانا اور مسخ ہوگا کہ آدمی کتے اور بندر وغیرہ کی صورتوں میں ہو جائیں گے اور قذف ہوگا کہ آسمان سے پتھر برسنے لگیں گے کسی نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! ہم اس حالت میں بھی ہلاک ہوسکتے ہیں کہ ہم میں صلحاء موجود ہوں؟ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ہاں جب خباثت کی کثرت ہو جائے۔

اور یہ ارشاد تو متعدد احادیث میں مختلف عنوانات سے وارد ہوا ہے کہ نیک کاموں کا آپس میں ایک دوسرے کو حکم کرتے رہو اور بُری باتوں سے روکتے رہو ورنہ حق تعالیٰ شانہ تم پر اپنا عذاب مسلط کر دیں گے پھر تم اس سے دعائیں کرو گے تو تمہاری دعائیں بھی قبول نہ ہوں گی۔ (مشکوٰۃ)

ایک حدیث میں ارشاد ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ اسلام میں فوجیں کی فوجیں داخل ہو رہی ہیں لیکن ایک زمانہ ایسا آنے والا ہے کہ اسی طرح فوجیں کی فوجیں اسلام سے خارج ہونے لگیں گی۔

ایک حدیث میں ارشاد ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو قوم بدعہدی کرتی ہے اس میں آپس میں خونریزی ہوتی ہے اور جس قوم میں فحش کی کثرت ہوتی ہے اس میں اموات کی کثرت ہوتی ہے اور جو جماعت زکوٰۃ کو روک لیتی ہے اس سے بارش رک جاتی ہے

ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ جن لوگوں میں رشوت کی کثرت ہوتی ہے ان کے دلوں پر رُعب کا غلبہ ہوتا ہے اور وہ ہر شخص سے مرعوب رہتے ہیں۔ (مشکوٰۃ)

ایک حدیث میں ہے کہ حق تعالیٰ شانہ، چند آدمیوں کے کسی ناجائز کام کے کرنے سے عام عذاب نازل نہیں فرماتے جب تک کہ ان لوگوں کے سامنے وہ کام کیا جائے اور وہ اس کے روکنے پر قادر ہوں اور نہ روکیں، اور جب یہ نوبت آجائے تو پھر عام و خاص سب ہی کو عذاب ہوتا ہے۔ (مشکوٰۃ)

اور یہی اسباب ہیں جن کی وجہ سے آج کل نئی نئی آفات اور حوادث روزمرہ کے واقعات ہیں نئے نئے امراض، نئے نئے مصائب ایسے روز افزوں ہیں جو پہلے کبھی برسوں میں بھی سننے میں نہ آتے تھے۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ جب میری اُمّت اپنے علماء سے بُغض رکھنے لگے اور بازاروں کی تعمیر کو نمایاں کرنے لگے اور دراہم (روپیہ) جمع کرنے پر نکاح کرنے لگے (یعنی نکاح کرنے کے لئے بجائے دیانت، تقویٰ، دینداری کے مالدار ہونے کی رعایت ملحوظ ہو) تو حق تعالیٰ شانہ ان پر چار چیزیں مسلط فرما دیں گے۔

۱۔ زمانہ قحط۔

۲۔ اور بادشاہ کا ظلم۔
۳۔ اور حکام کی خیانت۔
۴۔ اور دشمنوں کا حملہ۔ (مشکوٰۃ)

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علامات قیامت میں یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ ہر ذی رائے اپنی رائے کو سب سے اچھا سمجھے گا جس کا آج کل ظہور پوری طرح ہو رہا ہے۔ ہر شخص یہی سمجھتا ہے بزعم خود "ہمچو من دیگرے نیست" کہ جو میری سمجھ میں آیا ہے وہی درست اور ٹھیک ہے چاہے کوئی بڑا کچھ کہے یا چھوٹا۔

الغرض سیکڑوں روایات ہیں جن میں صاف طور سے نیک اعمال پر دارین کی فلاح اور بدعلی پہ دارین کے نقصان تفصیل سے بتا دیئے گئے ہیں ———

مقصود ان چند احادیث کے ذکر کرنے سے یہی ہے کہ اگر ہمارے نزدیک حضور مخبر صادق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات سچے ہیں تو پھر ہم لوگوں کا اپنے اوپر کتنا صریح ظلم ہے کہ دیدہ دانستہ ہم خود اپنے افعال سے ہلاکت میں پڑتے ہیں۔ نقصان اور خسارہ والے... امور اختیار کرتے ہیں اور کام کے انجام پر نظر نہیں کرتے۔

الغرض میں یہ کہہ رہا تھا کہ ہم پر غفلت کی مدہوشی طاری ہے اس کا تدارک کیا جائے اس کے لئے اپنے بزرگوں سے سنی ہوئی باتیں آپ کی ہدایت کے لئے عرض کر رہا ہوں۔ اس کے بعد واللہ اعلم یہ باتیں سننے میں بھی آئیں یا نہ آئیں۔

سب سے پہلے آپ اسی بات پر توجہ کر لیں کہ اس وقت دنیا جن آلام وآزار میں مبتلا ہے اور جس کا ہم کو کسی نہ کسی درجہ میں علم ہوتا رہتا ہے اس کے متعلق ہمارے کیا تاثرات ہیں!

دیکھئے! ہم میں سے اکثر و بیشتر روزانہ اخبار پڑھتے ہیں پہلے صفحہ سے لے کر آخری صفحہ تک کیا ہوتا ہے! فلسطین میں یہ قتل عام ہو رہا ہے! عراق اور ایران میں کیسی خونریزیاں ہو رہی ہیں! افغانستان میں مسلمانوں کی کیسی تباہی و بربادی جان و مال کی ہو رہی ہے ہندوستان میں کیسے مسلم کش فسادات ہو رہے ہیں جہاں بغیر کسی داد فریاد کے مسلمانوں کا خون بہایا جا رہا ہے۔ روزمرہ یہ خبریں اخباروں میں آپ پڑھتے ہیں یا نہیں ———

اس کے علاوہ اور سانحات و حادثات کی خبریں برابر شائع ہوتی رہتی ہیں آج یہاں بس گر گئی۔ اتنے افراد ہلاک ہو گئے فلاں جگہ ریل کا حادثہ ہو گیا اتنے آدمی مر گئے۔ کہیں ہوائی جہاز گر گیا یا جہاز کا اغوا ہو گیا۔ آج فلاں جگہ آگ لگ گئی اتنا نقصان ہو گیا۔ آج فلاں جگہ زلزلہ آ گیا اتنے آدمی مر گئے آج فلاں محلہ میں قتل ہو گیا کل فلاں جگہ دوہرا قتل ہو گیا فلاں جگہ آج ڈاکہ پڑ گیا فلاں گھر لوٹ لیا گیا۔ فلاں بنک لوٹ لیا گیا۔ یہ خبریں بلاناغہ روز اخباروں میں آپ پڑھتے ہیں یا نہیں؟

قتل، غارت گری، چوری، ڈاکہ، لوٹ مار، اغوا، کراچی میں، پاکستان میں اور بیرونی مقامات میں فلسطین و لبنان تک پہنچ جایئے۔ یہ سب ہو رہا ہے یا نہیں؟

بس آپ نے اخبار پڑھا اور ڈال دیا آپ سچ سچ اپنے تاثرات بتایئے کہ کسی کے دل میں ایک لمحہ کے لئے جنبش پیدا ہوئی

دن دہاڑے لوٹ مار، غارت گری، تباہ کاری، جانی اور مالی حادثات اور نقصانات کے واقعات وحالات پڑھے اور اخبار رکھ دیا کسی نے کوئی تاثر لیا؟

میں کہتا ہوں کہ کسی نے کوئی تاثر نہیں لیا تو یہ کتنی بڑی بے حسی ہے گویا یہ واقعات صرف اخبار میں پڑھ لینے کے لئے ہیں یا سُن لینے کے لئے ہیں آپ سے اور آپ کے امور زندگی سے ان کا کوئی واسطہ نہیں، آپ کی جان و مال کو گویا کوئی خدشہ نہیں یہ کس قدر بے حسی ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی پکارنے والا پکار اٹھے ؎

؎ اے موج حوادث ان کو بھی دو چار تھپیڑے ہلکے سے — کچھ لوگ ابھی تک ساحل پر طوفاں کا نظارہ کرتے ہیں

پھر انسانی ہمدردی کا بھی کوئی تقاضا ہونا چاہیئے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔

بھائی اخبار پڑھنے کے بعد کم از کم دو کلمہ تو کہہ دیتے کہ یا اللہ اپنا رحم فرمایئے آپ کی مخلوق تباہ ہو رہی ہے ہم بھی محفوظ و مامون نہیں، یا اللہ ہماری اور ہمارے اہل وعیال کی حفاظت فرمایئے۔ کیا اخبار پڑھنے کے بعد یہ دو کلمے بھی آپ کی زبان سے نکلتے ہیں! یہ بے حسی ہے یا نہیں؟ یہ آپ نے اخباروں میں کس کا ذکر پڑھا۔ یہ سب اپنے مسلمان بھائیوں ہی کا ذکر تو تھا۔ کیا دین اور انسانیت کا تقاضا یہی ہے کہ اتنی دلسوزی اور ہمدردی بھی نہ ہو ایمان واسلام تو ہمیں انسانیت کی تعلیم دیتا ہے، جذبات انسانیت کو بیدار کرنے کے لئے آیا ہے اشرف المخلوقات بنانے کے لئے آیا ہے مگر ہم نے ساری انسانیت اور ساری اسلامیت بے حسی کی نذر کردی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون کبھی غور بھی کیا کہ یہ نتیجہ کس بات کا ہے؟

اس کا سبب یہی ہے کہ عام طور پر مسلمان فی زمانہ غیر اسلامی تعلیم و تہذیب اور معاشرہ کے ماحول میں اسلامی شعائر و شعور سے بیگانہ ہوتے چلے جارہے ہیں۔ اور جو عبرت ناک حالات ابھی مذکور ہوئے ہیں وہ سب ہماری شامت اعمال اور بے محابا گناہوں کا خمیازہ ہیں، کاش ہم اس کا احساس کریں۔

اب دوسری بے حسی سنیئے جو اس سے بھی زیادہ سنگین ہے۔

میں ہمہ گیر بات نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ اکثر و بیشتر کا حال ہے کہ کسی شعبے میں بھی تا یئے کہ شرافت دیانت اور امانت کا کام ہو رہا ہے؟ دفاتر میں جایئے، تجارت گاہوں میں جایئے، تعلیم گاہوں میں جایئے انجمنوں میں جایئے بازاروں میں جایئے کہاں خدا کا قانون نہیں توڑا جارہا کھلے بندوں جوا کھیلا جارہا ہے شرابیں پی جارہی ہیں، بدکاریاں ہو رہی ہیں بے شرمی اور بے غیرتی کے اڈے قائم ہیں سینما جاری ہیں ٹیلی ویژن چل رہے ہیں، عورتوں کے ناچ رنگ ہو رہے ہیں۔ ریڈیو چل رہا ہے۔ فلمی گانے بجانے ہو رہے ہیں۔ اب ایک اور نامراد چیز چل رہی ہے جس کا نام وی سی آر کہا جاتا ہے جس کی وجہ سے دنیا اور آخرت دونوں جہنم بن رہی ہیں بڑے ذوق شوق سے دیکھا جاتا ہے جو لوگ اسے ذوق شوق سے دیکھ رہے ہیں ان کو احساس تک نہیں کہ یہ باتیں سب ایمان واسلام کے خلاف ہیں اور کبیرہ گناہ ہیں۔ یہ بے حسی نہیں تو اور کیا ہے؟ کتنی حیا سوز کتنی مخرب اخلاق اور کتنی برباد کرنے والے حرکات سینما اور ٹیلی ویژن پر ہو رہی ہیں کہ الامان الحفیظ۔

ہم لوگ انہیں دیکھتے ہیں اور سنتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ اگر خدا کا قہر نازل ہو جائے تو پھر کیا ہوگا؟ یہ سب کبیرہ گناہوں میں شامل ہیں کہ نہیں ہیں؟ اللہ اور اللہ کے رسُول نے انہیں کبائر میں شمار کیا ہے کہ نہیں؟ ان کا خمیازہ اور وبال دنیا اور آخرت میں تبلایا ہے کہ نہیں

ہماری اور آپ کی دوسری بے حسی یہ ہے کہ ہم چاروں طرف کھلم کھلا علانیہ طور پر کبیرہ گناہوں کا ارتکاب ہوتے دیکھ رہے ہیں نہ اپنے لئے حفاظت کی دعا مانگتے ہیں اور نہ اُن کے لئے ہدایت کی دعا مانگتے ہیں۔ بھائی آخر کب تک بے حس رہو گے؛ ذرا اپنے اسلام اور ایمان کی خبر لو۔

میں پھر عرض کروں گا کہ اس وقت میرے مخاطب وہی لوگ ہیں جن کے دلوں میں ایمان و اسلام کی قدر نہیں ہے صرف اسلام کے نام سے موسوم ہیں تو کیا نام رکھ لینے سے، صورت شکل بنا لینے سے، مردم شماری میں مسلمان لکھے جاتے سے آپ صحیح معنیٰ میں مسلمان ہو گئے؟ کس نے آپ سے ایسا کہہ دیا شیطان نے آپ کو دھوکہ دیا ہے۔ یاد رکھئے! جب تک اللہ تعالیٰ کے تمام اوامر و نواہی پر نظر نہ جائے گی اور اُس کے احکام کی عظمت دل میں نہ ہوگی؛ اور اُس کے مطابق عمل نہ ہوگا ہرگز آپ کا ایمان کامل نہیں۔ اب یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے کہ جس کو چاہیں بخش دیں۔ وہ اپنے نبی الرحمتہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اُمت کو بغیر حساب کتاب کے جنت میں داخل کر دیں تو کوئی کہنے والا نہیں۔ اُن کی قدرت اور اُن کی رحمت ایسی ہی ہے لیکن یہ بتاؤ کہ تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض معروض کرنے کی کیا صورت ہے؟

غرضیکہ بے حسی کا یہ عالم ہے کہ دن رات کے سانحات سے نہ عبرت لیتے ہو۔ اور نہ رائج الوقت کبیرہ گناہوں کو دیکھ کر اپنے لئے اللہ سے پناہ مانگتے ہو۔ نہ اُن کے لئے اللہ تعالیٰ سے ہدایت کے لئے دُعائیں مانگتے ہو؛ حالانکہ نبی الرحمتہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسی بہت سی دعائیں ہم کو تعلیم فرمائی ہیں جن میں تمام مسلمانوں کے لئے مغفرت اور عذاب الٰہی سے نجات مضمر ہے استغفر اللہ ولا حول ولا قوۃ الا باللہ۔

ذرا غور تو کرو؛ کہ اس زمانہ میں کون سے وہ گناہ ہیں اور کون سے وہ کبائر ہیں جن میں قوم کی اکثریت مبتلا نہیں ہے ذرا کلام الٰہی کو پڑھو اور تاریخ کو دیکھو؛ گزشتہ زمانوں میں کتنی قومیں تباہ و برباد ہوئی ہیں اُنہی حرکتوں اور بدعملیوں سے جو آج کل رائج الوقت ہیں؛ ایک ایک حرکت اور کارنامہ اپنی قوم کا دیکھ لو کہ علانیہ کتنے گناہ کبیرہ کا رواج ہو رہا ہے؛ بازاروں میں، دفتروں میں، تجارت گاہوں میں، تعلیم گاہوں میں، تفریح گاہوں میں، حتیٰ کہ گھر گھر میں لغویات رائج ہو گئی ہیں جن کا نتیجہ یہ ہے کہ خاندانوں میں بدمزگی، آپس میں نااتفاقی، زن و شوہر میں نہیں بنتی؛ نہ ماں باپ کا احترام، نہ بڑوں کا ادب۔ معلوم ہوتا ہے کہ چین و سکون سلب ہو گیا ہے؛ بڑے عبرت کا مقام ہے بڑے مطمئن ہیں کہ ہم سفید پوش ہیں؛ دفاتر میں ہمارا یہ منصب اور رتبہ ہے تجارت گاہوں میں ہمارا اتنا سرمایہ ہے۔ بینک بیلنس بھرپور ہے کوٹھیاں ہیں، بنگلے ہیں، کاریں ہیں یہ ہے؛ وہ ہے۔ یہ سب کچھ سہی پر یہ بتاؤ کہ تم انسان بھی ہو کہ نہیں؛ تمہارے اندر انسانیت کے جوہر بھی ہیں کہ نہیں؛ خاک بھی نہیں۔ بڑے افسوس کی بات ہے انسانوں کی سی بس صورت ہے لیکن اعمال حیوانوں سے بدتر ہیں۔ بھائی معاف کرنا میرا لہجہ تلخ ہو گیا مگر غور کرو اور اپنے گریبان میں سر ڈال کر دیکھو کہ اللہ تعالیٰ کے کھلے ہوئے احکامات کی کس بے باکی اور جرأت سے نافرمانی ہو رہی ہے اور معاشرہ میں کیسے اشد گناہ کبیرہ ہو رہے ہیں نہ عورتوں میں شرم و حیا ہے نہ مردوں میں غیرت۔ عورتیں برہنہ سر عریاں لباس پہنے بازاروں میں گھوم رہی ہیں؛ نوجوان لڑکیاں آزاد۔ نوجوان لڑکے آزاد۔ کیا یہ سب علامات قیامت نہیں ہیں؟ اور کیا ان پر قہر خداوندی اور عذاب الٰہی کو دعوت دینا احادیث میں اللہ کے سچے رسول نے نہیں بتلایا ہے؟ عبرت حاصل کرو اور توبہ و استغفار کرو۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت طلب کرو۔

ابتدا میں جو چند احادیث علامات قیامت کے سلسلہ میں بیان کی گئی ہیں ان پر ایک بار پھر نظر ڈالیے اور ان پر جو قہر خداوندی اور عذاب الٰہی ہونا ارشاد فرمایا گیا ہے اُن کو سوچیے کہ جن معاصی اور گناہوں میں ہم ہر وقت مبتلا رہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی جتنی کھلی ہوئی نافرمانیاں ہوتے دیکھتے ہیں اور اُن سے مانوس ہوئے جاتے ہیں اور جس شامت اعمال میں مبتلا ہو رہے ہیں اس کا بھی احساس نہیں ہے۔

ایسی حالت میں کیا تو ہماری دعائیں قبول ہوں اور کیا ہماری پریشانیاں دور ہوں یہ تو اللہ کی رحمت خاصہ اور نبی الرحمۃ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی طرف نسبت اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی دعاؤں کی برکت ہے کہ پھر بھی ہم سب محفوظ اور مامون ہیں۔

غور کیجئے کہ میری باتوں میں کچھ حقیقت ہے یا محض باتیں ہی باتیں ہیں؟ اب میں ایک اعلان کرتا ہوں جس کو عبرت اور غور و خوض کے ساتھ سنیئے اور وہی اس وقت کی تقریر سے میرا مقصود ہے خدا کرے کہ آپ لوگوں کے قلب میں کچھ جنبش ہو۔ کچھ خلش اور فکر پیدا ہو۔ پہلے آپ اپنے ذہن میں اُن باتوں کا استحضار کر لیجئے جو میں نے موجودہ معاشرہ کی بے حسّی کے متعلق کہی ہیں کہ کس درجہ ہم نافرمانیوں اور گناہوں سے مانوس ہو گئے ہیں اور شب و روز کے حادثات و سانحات سے کیسے بے حس اور بے فکر ہو گئے ہیں۔

آج چوتھا روز ہے منگل کا قصّہ ہے کہ شام کو پانچ بجے مجھ سے کہا گیا کہ کچھ لوگ مجھ سے ملنے آئے ہیں میں باہر آکر اُن میں بیٹھ گیا۔ وہ اجنبی لوگ تھے۔ معلوم یہ ہوا کہ پشاور کی طرف کے ہیں۔ اور اس وقت لانڈھی سے آئے ہیں ایک صاحب جو مجھ سے بات کر رہے تھے وہ بھی شاید صوبہ سرحد ہی کے تھے مگر وہ اُردو جانتے تھے اور باقی لوگ پشتو جانتے تھے کچھ اُردو بھی سمجھ لیتے تھے۔ میں نے اُس وقت اُن سے اس نیت سے باتیں نہیں سُنیں کہ ان کو بعینہٖ یاد رکھوں گا۔ وقت کم تھا مغرب قریب تھی۔ میں نے دریافت کیا کہ کیسے تشریف لائے؟ تو متکلم نے اشارہ کر کے کہا کہ یہ جو بڑے میاں بیٹھے ہیں اُنہوں نے کچھ خواب دیکھے ہیں اُن کی تعبیر لینے آئے ہیں۔

کہنے لگے کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں کہیں جا رہا ہوں کسی بزرگ کے پاس تفسیر پڑھنے کے لئے تو میں نے ان بزرگ سے کہا کہ مجھے تفسیر پڑھا دیجئے اُنہوں نے کہا کہ بھائی ہم پشتو میں تو پڑھائیں گے نہیں تفسیر پڑھاویں گے اور تمہاری سمجھ میں آجائے گی اتنے میں پیچھے سے ایک آواز آئی کہ۔

دیکھو! مسلمانوں سے کہہ دو کہ بیدار ہو جاؤ۔ خدا کا قہر نازل ہونے والا ہے اور اس سے کوئی نہیں بچے گا خدا کا قہر نازل ہونے والا ہے۔ مسلمانوں سے کہہ دو سنبھل جائیں۔ کہہ دو مسلمانوں سے۔ اعلان کر دو کہ گناہوں کو ترک کریں اور توبہ و استغفار کریں۔ جنہوں نے یہ خواب دیکھا وہ سیدھے سادے آدمی تھے دو ایک لوگوں سے اس خواب کا ذکر کر دیا۔ دوسری رات حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی خواب میں زیارت ہوئی اور آپ نے فرمایا۔

تم نے ہمارا اعلان کیوں نہیں لوگوں سے کہا؟

حضور اقدس رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے لہجہ بدل کر فرمایا۔ تم نے ہمارا پیغام کیوں نہیں لوگوں تک پہنچایا کہ لوگوں میں طغیان بڑھ گیا ہے خدا کا قہر متوجہ ہونے والا ہے بیدار ہو جاؤ جلد توبہ کرو، استغفار کرو۔ گناہوں کو ترک کریں۔

اب یہ بیدار ہوئے اور کچھ لوگوں سے ذکر کیا اپنے اس خواب کا۔ ظہر کی نماز جب مسجد میں پڑھنے گئے اور جماعت کھڑی ہونے لگی تو زلزلہ آیا۔ اور اتنے زور کا زلزلہ آیا کہ لوگ لڑکھڑا گئے اور گر گئے اس کے بعد متعدد جھٹکے آتے رہے یہ ابھی حال ہی کا واقعہ ہے اور اخبار میں لانڈھی میں زلزلہ محسوس ہونے کی خبر بھی شائع ہوئی ہے۔

اس کے بعد تیسری رات میں پھر حضور سرور کائنات رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی پھر زیارت ہوئی۔ آپ رحمۃ للعالمین ہمیشہ تھے اور ہمیشہ رہیں گے۔ آپ کی اُمت چاہے جو کچھ ہو جائے لیکن آپؐ کو اپنی اُمت کے ساتھ بڑی محبت اور تعلق ہے۔ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم) تو جن صاحب کو پھر خواب میں زیارت ہوئی اُنہوں نے بتایا کہ۔

مجھ سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

تم نے لوگوں سے کیوں نہیں کہا؟ لوگوں سے علی الاعلان کہو کہ خدا کا قہر متوجہ ہونے والا ہے' (اور فرمایا کہ) لوگ تائب ہو جائیں' اپنے اپنے گناہوں کو چھوڑ دیں توبہ واستغفار کریں ورنہ خدا کا قہر متوجہ ہو جائے گا۔

صاحب خواب نے تین دن مسلسل یہ خواب دیکھے تھے اُنہوں نے مجھ سے کہا کہ اس کی تعبیر بتائیے۔ میں نے اُن سے کہا کہ میں کیا تعبیر بتاؤں تعبیر تو صاف ظاہر ہی ہے۔

یہ اللہ تعالےٰ کا رحم اور شانِ کرم ہے کہ اپنے بنی الرحمۃ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ سے یہ اعلان کروا دیا اسی طرح کے خواب اور چند حضرات نے بھی دیکھے جن سے ان کے خواب کی تائید ہوتی ہے میں سوچتا رہا کہ یہ خواب کسی بزرگ سے کہوں' کس سے مشورہ کروں' کیا کرنا چاہیئے کس طرح اعلان عام کرنا چاہیئے تاکہ مسلمانوں کو اطلاع عام ہو جائے

اللہ تعالےٰ کا شکر ہے کہ ہر زمانہ میں' ہر ملک اور ہر جگہ اللہ تعالےٰ کے نیک مقبول بندے' گو تعداد میں کم سہی' موجود ہوتے ہیں جو تبلیغ دین اور اشاعتِ اسلام اور مسلمانوں کی مغفرت اور فلاحِ دارین کے لئے دعائیں کرتے رہتے ہیں

میں نے اپنے بزرگانِ دین سے یہی سنا ہے کہ ایسے حوادثات کے وقت مساجد کے امام ہر پنجگانہ نماز کے بعد مسنونہ دعائیں استعاذہ کی پڑھیں اور مقتدی آمین کہیں' اس کے علاوہ ہر شخص نماز کے بعد چند دعائیں پڑھا کرے' عورتیں بھی پڑھیں تو انشاء اللہ تعالےٰ بہت کچھ رحمت الٰہی کو متوجہ کرنے کی صورت ہو جائے گی اور ہم پر اللہ تعالےٰ کا فضل وکرم ہو گا۔ میں نے اُسی دن سے ارادہ کیا کہ تمام مساجد کے ائمہ' جن سے میری ملاقات ہوتی ہے' اُن سے کہتا ہوں کہ آپ اپنی اپنی مساجد میں ایسی اجتماعی دعا بعد نماز جاری کر دیجئے۔

آج مجھے آپ لوگوں سے بھی یہی کہنا تھا کہ ہوشیاری کے ساتھ سُن لیجئے۔ مرد بھی اور عورتیں بھی' اپنے مصائب اور پریشانیوں کا اندازہ کرو' اور عبرت حاصل کرو۔ للہ معاصی اور گناہوں کو چھوڑ دو۔ ٹیلی ویژن' ریڈیو' سینما کی لغویات اور فضولیات اور فسق وفجور کی باتیں جو رائج الوقت ہو رہی ہیں ان سے بچو۔ اخباروں میں حادثات وسانحات کی خبریں پڑھو تو بارگاہِ الٰہی میں رقت کے ساتھ فریاد کرو کہ یا اللہ! یا ارحم الراحمین!! اُمت مسلمہ پر رحم فرمایئے یہ آپ کے بنی الرحمۃ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اُمتی ہیں' حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صدقہ میں ہم سب پر رحم فرمایئے جہاں لوگوں کو طرح طرح کی پریشانیوں میں بیماریوں میں گرفتار دیکھو تو اللہ تعالےٰ سے اپنے لئے پناہ چاہو اور بیماروں کی شفا کے لئے دعا کرو' لوگوں کو اللہ کی نافرمانی کرتے ہوئے دیکھو تو اللہ تعالےٰ سے ان کی ہدایت کے لئے دعا کرو اور اپنے لئے ہر گناہ سے بچنے کی توفیق کی دعا کرو اور توبہ استغفار کو اپنا شعار بنا لو۔

یہ اعلان معمولی بات نہیں ہے بڑا ضروری اور اہم اعلان ہے صرف خواب ہی کی اہمیت نہیں ہے بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیداری کی مستند احادیث میں صاف صاف اعلان کیا گیا ہے کہ گناہوں کی کثرت پر قہر خداوندی متوجہ ہوتا ہے اس سے پناہ مانگو۔

میں نے آپ سب لوگوں کے کان میں ڈال دیا ہے۔ اپنی اپنی مسجدوں میں' اپنے اپنے گھروں میں اور اپنے اہل وعیال ومتعلقین سے کہو کہ ہر نماز کے بعد خدا کے قہر سے پناہ مانگیں اور خوب گڑگڑا کر اللہ تعالےٰ کی بارگاہ میں اپنے گناہوں کی مغفرت طلب کریں' اور گناہوں کو بالکل ترک کر دیں۔

خدانخواستہ اگر ایسی ہی بے حسی، غفلت اور مدہوشی چھائی رہی اور علانیہ طور پر یونہی اللہ جل شانہ کی نافرمانیاں ہوتی رہیں تو اندیشہ ہے کہ خدا کا قہر متوجہ نہ ہو جائے تو قبل اس کے کہ خدانخواستہ ایسا وقت آجائے توبہ و استغفار کر لو۔ اپنے لئے بھی کرو، اور تمام مسلمانوں کے لئے کرو اور ایسی چند جامع دعائیں کتاب "معمولات یومیہ" میں شائع ہو چکی ہیں ان کو اپنا ورد بنائیے۔

قرآن کریم کی یہ دعائیں بھی اپنی نمازوں کے بعد اور ویسے بھی مطلب و معنی سمجھ کر مانگا کرو۔

۱۔ رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا وَإِنْ لَمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝

ترجمہ:۔ اے ہمارے رب ہم نے اپنی جان پر ظلم کیا، اور اگر تو ہم کو نہ بخشے اور ہم پر رحم نہ کرے تو ہم ضرور تباہ ہو جائیں گے۔

۲ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَسِيْنَا أَوْ أَخْطَأْنَا۔ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا، رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ، وَاعْفُ عَنَّا، وَاغْفِرْ لَنَا، وَارْحَمْنَا أَنْتَ مَوْلٰنَا، فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۔

ترجمہ:۔ اے ہمارے رب! نہ پکڑ ہم کو اگر ہم بھولیں یا چوکیں۔ اے ہمارے رب! ہم پر ایسا بھاری بوجھ نہ رکھ جیسا رکھا تھا ہم سے اگلوں پر۔ اے ہمارے رب! اور نہ اٹھوا ہم سے وہ بوجھ کہ جس کی ہم کو طاقت نہیں اور درگذر ہم سے۔ اور بخش ہم کو اور رحم کر ہم پر۔ تو ہی ہمارا رب ہے، مدد کر ہماری کافروں پر۔

۳۔ رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَأَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ ۝

ترجمہ:۔ اے میرے رب! بخش (مجھ کو) اور رحم کر، اور تو ہی سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔

۴۔ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَأَصْلِحْهُمْ وَأَصْلِحْ ذَاتَ بَيْنِهِمْ وَاجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْإِيْمَانَ وَالْحِكْمَةَ وَثَبِّتْهُمْ عَلٰى مِلَّةِ رَسُوْلِكَ وَأَوْزِعْهُمْ أَنْ يَّشْكُرُوْا نِعْمَتَكَ الَّتِيْ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ وَأَنْ يُّوْفُوْا بِعَهْدِكَ الَّذِيْ عَاهَدْتَّهُمْ عَلَيْهِ

یا اللہ بخشش فرما دیجئے تمام مومن مردوں اور عورتوں کی۔ اور ان کی بہتری فرما دیجئے اور اُن کے آپس میں محبت و اخوت پیدا فرما دیجئے۔ اور ان کے دلوں میں ایمان و حکمت ڈال دیجئے اور ان کو اپنے رسُول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دین پر ثابت قدم رکھ اور ان کو اس کی توفیق عطا فرما کہ وہ تیری عنایت کی ہوئی نعمتوں کا شکر بجالائیں اور اس کی بھی کہ وہ اس عہد کو نبھا سکیں جو آپ نے ان سے ازل میں لیا تھا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک صحابی نے عرض کیا تھا یا رسُول اللہ! آپ ہم کو ایک ایسی دعا بتلا دیجئے کہ جس میں تمام خیر اور سب دعائیں آجائیں آپؐ نے فرمایا کہ دیکھو! میں تم کو ایک ایسی ہی جامع دعا بتاتا ہوں تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی امت کو یہ دعا تعلیم فرمائی، اور کمال شفقت سے اپنا اسم گرامی ہر جزو کے ساتھ شامل فرما دیا تاکہ مقبولیت یقینی ہو جائے۔

اَللّٰهُمَّ إِنَّا نَسْأَلُكَ مِنْ خَيْرِ مَا سَأَلَكَ مِنْهُ نَبِيُّكَ مُحَمَّدٌ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

یا اللہ! ہم آپ سے وہ سب بھلائیاں اور خیر مانگتے ہیں جو آپ کے محبوب نبی الرحمۃ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپ سے مانگی ہیں یہ تو بڑی قوی اور جامع دعا ہے وہ کون سی خیر اور بھلائی ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالےٰ سے نہیں طلب فرمائی۔

پھر دنیا میں خیر کے ساتھ شر کا بھی سلسلہ چل رہا ہے۔ تو جہاں اللہ تعالےٰ سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم کردہ دعا کے ذریعہ خیر طلب کی جائے وہیں شر سے اللہ تعالےٰ کی پناہ مانگنے کی بھی ضرورت ہے اور اس کے لئے بھی حضور صلی اللہ علیہ

وسلّم نے یہ جامع دعا تعلیم فرمائی کہ اس طرح اللہ تعالیٰ سے تمام شرور سے پناہ مانگا کرو۔
اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَعُوْذُ بِکَ مِنْ شَرِّ مَا اسْتَعَاذَ مِنْہُ نَبِیُّکَ مُحَمَّدٌ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ۔

یا اللہ! ہم آپ سے پناہ مانگتے ہیں ان تمام برائیوں اور شرور سے جن سے آپ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپ سے پناہ مانگی ہے

بس اب وقت بھی تھوڑا ہے مگر دعا سے پہلے میں ایک بات اور یہ کہنا چاہتا ہوں کہ معاشرہ کے حالات کیسے ہی ابتر ہوں اور ہم کیسے ہی شامتِ اعمال میں مبتلا ہوں مگر مایوسی اور نا امیدی کسی حال میں مسلمان کا شیوہ نہیں۔ ایمان اور اسلام اللہ تعالیٰ کی ایسی عظیم نعمت ہے کہ مسلمان کے لئے ہمیشہ توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور حق تعالیٰ کا وعدہ ہے اور کیسے پیار اور شفقت کے الفاظ میں خطاب فرمایا گیا ہے۔

یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَۃِ اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا اِنَّہٗ ھُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ۔

اے، میرے وہ بندو، جنہوں نے اپنی جانوں پہ زیادتیاں کی ہیں تم اللہ تعالیٰ کی رحمت سے نا امید مت ہو، بالیقین اللہ تعالیٰ تمام گناہوں کو معاف فرما دے گا واقعی وہ بڑا بخشنے والا بڑی رحمت کرنے والا ہے

ایک حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مجھے ساری دنیا اور اس کی ہر چیز کے ملنے سے اتنی خوشی نہ ہوئی جتنی اس آیت کے نازل ہونے سے ہوئی ہے۔

تو یہ آیت ارحم الراحمین کی رحمت بے پایاں اور عفو و درگزر کی شان عظیم کا اعلان کرتی ہے اور سخت سے سخت گناہ گار اور مایوس العلاج مریض کے حق میں اکسیر شفا کا حکم رکھتی ہے تو اس آیت میں تمام نافرمانوں کو گو وہ مشرک اور کافر بھی ہوں توبہ کی دعوت دی گئی ہے کہ اگر کوئی گذشتہ غلطیوں پر نادم ہو کر اور اللہ تعالیٰ کے بے پایاں جود و کرم سے شرما کر عصیان و نافرمانی کی راہ چھوڑ دے اور عجز و اخلاص کے ساتھ رب کریم کے احکام کے سامنے گردن ڈال دے تو ایسی سچی توبہ سے گزشتہ سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں اس لئے کسی کو اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا چاہیے اور پھر اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ کے لئے یہ بھی اعلان فرما دیا ہے کہ جب تک بندے توبہ و استغفار کرتے رہیں گے ہم ان پر عذاب نازل نہیں فرمائیں گے مگر توبہ کی شرط ترک گناہ ہے۔

اور پھر یہی نہیں کہ سچی توبہ سے گزشتہ سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں بلکہ اللہ توبہ کرنے والوں سے محبت کرتے ہیں اور ان کے ساتھ رحمت کا معاملہ فرماتے ہیں۔ ایک حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس نے گناہ کے بعد توبہ کر لی وہ گویا بے گناہ ہو گیا۔ یعنی گناہ کے وبال سے بچ گیا۔

تو بھائی اللہ کی کریمی و رحیمی کا دریا بھی ابھی بہہ رہا ہے، لگاؤ اس میں غوطہ اور پاک صاف ہو جاؤ اور اگر کوئی اپنی بدنصیبی سے اس کے لئے تیار نہیں ہے تو پھر اللہ کے عذاب کی گرداب میں پڑ کر تباہ ہونے اور خسر الدنیا والاخرہ کا مصداق ہونے کے لئے تیار رہے، کیونکہ عصیان و نافرمانی کا نتیجہ ہمیشہ ہلاکت ہی کی صورت میں نکلتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی سنت بدلا نہیں کرتی۔ عمل اور ردِّ عمل قانونِ فطرت ہے۔

بس اب دعا کر لو:۔

یا اللہ! ہمارے قلوب میں بیداری پیدا فرما دیجئے ہماری غفلتوں کو اور شامت اعمال کو دور فرما دیجئے۔

یا اللہ! ہم پر جو بے حسی طاری ہے اُسے دُور فرما دیجئے۔

یا اللہ! تمام عالم امکان میں جہاں جہاں مسلمانوں پر تباہیاں اور بربادیاں آرہی ہیں ان پر رحم فرمائیے۔ یہ سب ہمارے شامتِ اعمال کی صورتیں ہیں ان کو اپنی رحمت سے بدل دیجئے۔

یا اللہ! ہماری توبہ اور استغفار کو قبول فرمائیے اور اپنے قہر کو ہم سے دُور کر دیجئے اور ہم کو اپنے آغوشِ رحمت میں لے لیجئے۔

یا اللہ! ہر طرح کے مصائب و آلام سے۔ ہر طرح کے حادثات و سانحات سے ہر طرح کے شر و فساد سے ہر طرح کے آلام و آزار سے ہماری ہمارے اعزہ و اقارب کی اور تمام مسلمانوں کی حفاظت فرمائیے۔

یا اللہ! ہمارے وجود کو دنیا و آخرت کے دردناک عذاب سے بچائیے اور عبرت ناک آزمائشوں سے بچائیے۔

یا اللہ! ہم ضعیف الایمان ہیں کسی آزمائش کی سہار نہیں رکھتے ہیں ہمارے ساتھ اپنی مغفرت و رحمت کا معاملہ فرمائیے۔

یا اللہ! آپ خالق خیر و شر ہیں۔ ہم تمام شرور اور فتن سے آپ کی پناہ چاہتے ہیں اور ہر طرح کی دین و دنیا کی خیر آپ سے طلب کرتے ہیں

یا اللہ! ہمارے ایمانی تقاضے بیدار فرما دیجئے ہمارے ایمان کو قوی فرما دیجئے۔ ہم کو سچا مومن و مسلمان بنا دیجئے۔

یا اللہ! ہم کو، ہمارے اہل و عیال کو، ہمارے دوست احباب کو ہمارے عزیز و اقربا، کو سب کو عافیتِ دارین نصیب فرمائیے۔

یا اللہ! جو حاضر ہیں ان کے حق میں بھی، اور جو حاضر نہیں اُن کے حق میں بھی ہماری دعائیں قبول فرمائیے۔

یا اللہ! لبنان، فلسطین، ہندوستان اور افغانستان کے مسلمانوں کی امداد و نصرت فرمائیے۔

وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ نَصِيْرًا وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا وَكَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيْرًا۔

اور جہاں جہاں مغلوب ہیں دشمنانِ اسلام پر اُنہیں غلبہ عطا فرمائیے۔

یا اللہ! پاکستان کو فواحشات و منکرات سے پاک و صاف فرما دیجئے۔ ایمانی اور اسلامی شعور بیدار فرما دیجئے۔

یا اللہ! رشد و ہدایت کے دروازے ہمارے لئے کھول دیجئے۔

یا اللہ! ہمارے جو صاحب اقتدار ہیں ان کے قلوب کو قوی فرما دیجئے۔ اسلام اور ایمان کی سچی محبت سے ان کے دلوں کو بھر دیجئے اور اشاعتِ دین و حفاظتِ دین کی ان کو توفیق عطا فرمائیے اور ان کی نصرت فرمائیے۔

یا اللہ! رشد و ہدایت کا فیصلہ اس قوم اور ملک کے حق میں صادر فرما دیجئے اور اس کے ذرائع و وسائل پیدا فرما دیجئے۔

یا اللہ! جو آپ کی نافرمانیوں اور گناہوں میں ملوث ہیں ان کے قلوب کو بدل دیجئے۔ ان کو ہدایت نصیب فرمائیے ان کو سچی توبہ کی توفیق عطا فرمائیے۔ ان کو اپنا فرمانبردار بندہ بنا لیجئے۔

یا اللہ! اس ملک میں دین اور قرآن و سنت کی ہوائیں چلا دے اور فسق و فجور کے طوفان ٹھنڈے فرما دے اور دنیا میں سربلند فرما دیجئے۔

یا اللہ! ہم کو اپنی اور اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سچی محبت عطا فرما دے۔ اسلام اور ایمان کی عظمت ہمارے دلوں میں بٹھا دے اور اُن کا حق ادا کرنے کی صلاحیت پیدا فرما دیجئے۔

یا اللہ! ہم میں جو صاحب اقتدار ہیں اور جو مصلح بہی خواہانِ قوم و ملت ہیں جو واعظین اور مبلغین ہیں اُن کے مساعی میں اور اُن کے ذرائع و وسائل میں اعانت و نصرت فرمائیے اور کامرانی عطا فرمائیے۔

(آمین رب العالمین، آمین ثم آمین!)

موجودہ مشکلات اور سیرتِ رسولؐ

سیّد حامد علی

آج ساری دنیا پریشان ہے، انسانی مسائل میں گتھیوں پر گتھیاں پڑتی جارہی ہیں جو طریقے بناؤ اور سُدھار کے لئے اختیار کئے جاتے ہیں، وہ اُلٹا بگاڑ کا باعث ہوتے ہیں، کسی کو چین اور سکون حاصل نہیں، ایک دائمی بے اطمینانی ہے جو سب پر مسلط ہے۔ ایک جنگ ختم ہونے نہیں پاتی کہ دوسری جنگ کا ہوّا سامنے آکھڑا ہوتا ہے۔ جھگڑوں، خونریزیوں، فسادات، انقلابات اور باہمی کشمکشوں نے دنیا کا سکون بالکل غارت کردیا ہے۔ قومیں، قوموں سے، فرقے فرقوں سے، طبقے طبقوں سے، پارٹیاں پارٹیوں سے اور افراد افراد سے دست و گریبان ہیں اور یہ کشمکش ختم ہوتی نظر نہیں آتی، ہر شخص خود غرضی میں مبتلا ہے کسی کو کسی پر اعتماد حاصل نہیں، نیکی، شرافت اور اخلاق کوئی چیز نہیں۔ انسان کا علم بہت بڑھ چکا ہے۔ وہ بڑے بڑے خوشنما فلسفے گھڑتا ہے بڑی دلفریب اسکیمیں بناتا ہے۔ امن وانسانیت، آزادی وفلاحِ عالم پر بڑی جادو بیانی کے ساتھ لیکچروں پر لیکچر دیتا ہے لیکن ان سب کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ دنیا کو دھوکہ دے اور لوگوں کی آنکھوں میں خاک جھونک کر اپنا اُلّو سیدھا کرے۔ انسان کو مادی وسائل پر بے پناہ قدرت حاصل ہوگئی ہے یہ انسانیت کی بہترین تعمیر کا ذریعہ بن سکتی تھی۔ لیکن انسان کے بگڑ جانے کی وجہ سے بدترین تخریب کا باعث بن گئی ہے۔ آج انسان کی عقل جواب دے چکی ہے اس کی تمام تدبیریں فیل ہوچکی ہیں۔ خدا کی ہدایت اور اس کے رسولوں کی رہنمائی کی ضرورت اگر کبھی انسان کو ہوتی تھی تو آج بہ ضرورت سب سے زیادہ ہے

انسان کا سب سے بڑی مشکل کسی متفقہ اقتدار کا نہ ہونا ہے، کوئی ایسا اقتدار نہیں جسے سب مل کر تسلیم کرسکیں جس کی سب اطاعت کرسکیں اور جو انسانیت کے شیرازے کو مجتمع رکھنے کا باعث ہو۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں تصادم اور کشمکش کا ایک طوفان برپا ہے اور کوئی روکنے والا نہیں، نہ کوئی کسی کی سنتا ہے۔ یہ سب سے بڑی گتھی ہے جس کے حل ہونے پر دوسری گتھیوں کے سلجھنے کا دارومدار ہے۔

اللہ کے رسولؐ نے اس گتھی کو انتہائی خوش اسلوبی سے حل کیا ہے۔ آپؐ نے دنیا کے انسانوں کے سامنے یہ حقیقت دلائل کی روشنی میں رکھی کہ دنیا کے انسان جو کبھی پیدا ہوئے تھے جو آج موجود ہیں اور جو آئندہ رہتی دنیا تک پیدا ہوں گے، ان کا پیدا کرنے والا، پالنے والا، ان کی زندگی و موت کا مالک، ان کے لئے زندگی کا تمام سامان بہم پہنچانے والا، انہیں جسمانی، ذہنی، روحانی ہر قسم کے قویٰ بخشنے والا صرف اللہ ہے اسی نے اس ساری کائنات کو پیدا کیا ہے اور وہی اس نظامِ عالم کا نگران اور مدبّر و منتظم ہے۔ وہی تمام انسانوں کا مالک اور آقا ہے اور وہی ان کا حقیقی فرمانروا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم خدا کی جو کتاب انسانوں کی ہدایت کے لئے لائے اس کی ابتداء اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ؁ شکر و ستائش اللہ کے لئے ہے جو ساری کائنات کا مالک

اور پروردگار ہے) سے ہوتی ہے اور قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ مَلِكِ النَّاسِ إِلَٰهِ النَّاسِ .... دکھ دیجئے میں پناہ چاہتا ہوں تمام انسانوں کے پروردگار کی تمام انسانوں کے بادشاہ کی اور تمام انسانوں کے معبود کی) پر اس کی انتہا ہوتی ہے۔ اور اس کا پورا زور اسی بنیادی تعلیم پر ہے کہ تمام انسان اللہ کو اپنا مالک و آقا مانیں اور اُسی کو مقتدر اعلیٰ تسلیم کریں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ساری زندگی اسی بات کے منوانے میں صرف کر دی اور اپنے پیچھے ایک بہت بڑی جماعت چھوڑی جو اس بنیاد پر متفق ہو چکی تھی۔

آپ غور کریں تو انسانوں کی اس گتھی کو سلجھانے کا یہی فطری اور حقیقی حل ہے اور اس کے سوا اس کا اور کوئی حل ہے نہیں۔ کسی ایک انسان کی حاکیت سے ایک قوم کے افراد بھی مطمئن و راضی نہیں ہوتے تو تمام انسان اور سب قومیں کس طرح راضی ہوں گی۔ اس دور میں جب کہ ہر قوم دوسری قوم سے انتہائی بدظن ہے اور ان میں اتحاد کی کوئی بنیاد نہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ کسی ایک انسان کو جو بہر حال کسی خاص قوم سے متعلق ہوگا، سب اپنا فرمانروا منتخب کر لیں اور اگر ایسا ہو بھی جائے اور اس شخص کو قوت و اقتدار کے سارے ذرائع و وسائل سونپ دیئے جائیں تو اس کے سوا کیا نتیجہ نکل سکتا ہے کہ وہ دنیا کا سب سے بڑا فرعون بن جائے اور اپنی طاقت کے نشے میں تمام انسانوں کو مصائب و آلام میں مبتلا کر دے۔ معمولی اقتدار پانے پر بھی انسان نے ہمیشہ یہی کیا ہے، تو اتنے بڑے اقتدار کے مل جانے کے بعد وہ کیوں ظلم کی راہ اختیار نہ کرے گا؟ انسان اغراض اور خواہشات سے پاک نہیں ہو سکتا اس لئے وہ اپنے لئے، اپنے خاندان کے لئے، اپنے فرقے اور اپنی قوم کے لئے سارے فائدے سمیٹ لے گا اور باقی انسانوں کو اُن سے محروم کر دے گا۔ وہ بہر حال اپنے عزیزوں سے زیادہ محبت رکھتا ہوگا، وہ اپنے خاندان کو زیادہ چاہتا ہوگا اور اپنی قوم کو زیادہ پسند کرتا ہوگا اس لئے وہ سب کے ساتھ یکساں انصاف نہ کر سکے گا، اس کے احکام میں عدل اور مساوات کی بجائے ظلم اور نامساوات ہوگی۔ اس کا علم کسی طرح اتنا وسیع نہیں ہو سکتا کہ وہ سب انسانوں کی ضروریات سے واقف ہو، سب کی فلاح و بہبود کے طریقوں سے باخبر ہو اور سب کی فطری صلاحیتوں کے ارتقاء کی راہیں جانتا ہو، وہ جہالت کی وجہ سے قدم قدم پر ٹھوکریں کھائے گا اور اس طرح انسانیت کو تباہ کر کے رکھ دے گا۔ رہی یہ بات کہ کوئی ادارہ تمام انسانوں کا حاکم بن جائے تو یہ اور بھی ناممکن ہے۔ ایسے ادارے جو مختلف اغراض و مقاصد رکھنے والی قوموں کے اشتراک سے وجود میں آئے کبھی ایسی طاقت ہاتھ نہیں آسکتی کہ وہ سب قوموں اور سب انسانوں کو ایک مرکز پر جمع کر سکے اور انہیں اپنی اطاعت کے لئے مجبور کر سکے، اس ادارے کے پاس متصادم اغراض کے سوا کوئی ایسا بنیادی قانون بھی نہ ہوگا جس کو سب دل و جان سے مانتے ہوں اور جس کے مطابق انسانیت کے اختلافات طے ہو سکتے ہوں۔ یہ ادارہ لازمی طور پر قوت و اکثریت رکھنے والی قوموں کے ہاتھ میں ایک کھلونا بن جائے گا اور ان کی ناجائز اغراض پورا کرنے کے سوا کسی بھی گتھی کو سلجھا نہ سکے گا۔ یہی حال لیگ آف نیشنز کا ہوا اور یہی یو این او کا ہو رہا ہے اور یہی حشر ہر اس ادارے کا ہوگا جس کی بنیاد کسی متفقہ مقصد و مفاد پر نہ ہو اور جس کی زمام کسی ایک مقتدر اعلیٰ کے ہاتھ میں نہ ہو۔

اللہ سب کا پیدا کرنے والا اور پالنے والا ہے۔ اس لئے اس کی حاکیت پر سب انسان اکٹھے ہو سکتے ہیں۔ وہ ساری کائنات کا حاکم و فرمانروا ہے، اس لئے اگر انسان اُسے حاکم مان لے گا تو اس کے اقتدار میں کوئی اضافہ نہ ہوگا کہ نشۂ اقتدار کا خطرہ ہو۔ اس کی حکومت کسی کے قائم کرنے اور تسلیم کرنے کی محتاج نہیں کہ اس کی وجہ سے وہ لوگوں کی ناروا رعایت کرے، اس کی حکومت آپ سے آپ قائم ہے، وہ ظلم سے پاک ہے۔ عدل و انصاف کا سرچشمہ اور اس کا خالق ہے۔ اس لئے اس سے تمام انسانوں کو یکساں طور پر عدل و انصاف مل سکتا ہے۔ سب انسان اس کے بندے ہیں۔ اس کا تعلق سب سے یکساں ہے، اس کی مہربانیاں سب کے لئے عام ہیں، اس لئے اس کی حکومت میں کسی کی حق تلفی نہیں ہو سکتی اور نہ اس سے کسی کو

جانب داری کا ڈر ہو سکتا ہے، پھر وہ تمام انسانوں کی تمام ضروریات سے اچھی طرح واقف ہے اور ان کی تمام فطری صلاحیتوں اور ان کے ارتقاء کی ایک ایک راہ سے خوب باخبر ہے اس لئے اس سے بہتر اور اس کے سوا انسانوں کے لئے مقتدر اعلیٰ اور واحد مقتدر اعلیٰ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

انسانیت کی دوسری بڑی مشکل کسی مشترک رشتے کا نہ ہونا ہے۔ یہ بات اس وقت تو کسی حد تک قابلِ برداشت تھی جب دنیا کی قومیں ایک دوسرے سے الگ تھلگ پڑی تھیں اور ایک دوسرے سے غیر متعلق تھیں لیکن آج جب کہ پوری دنیا ایک شہر اور تمام قومیں ایک خاندان میں تبدیل ہو گئی ہیں اُن میں کسی رشتے کا نہ ہونا کتنی بڑی مصیبت ہے! اسی کا نتیجہ ہے کہ سفید فام سیاہ فام کے دشمن ہیں، ایشیا اور یورپ میں برتری اور کمتری کی مستقل نسبت قائم ہے اور آرین نسل کے لوگ سامی نسل والوں سے بیَر رکھتے ہیں۔ مختصر یہ کہ ہر قوم دوسری قوم کی بدخواہ ہے اور ہر ملک دوسرے ملک کا مخالف، یہ دوسری بڑی غلطی ہے جس نے انسانوں کو جنگل کے وحشی درندوں کے مقام سے بھی گرا دیا ہے اور پوری دنیا دوما کے اکھاڑوں کی شکل میں تبدیل ہو کر رہ گئی ہے۔

وحدت انسانیت کے اس سب سے بڑے علمبردار (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس گتھی کو سلجھانے کے لئے سب سے پہلے یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرنے کی کوشش کی کہ سب انسان ایک خالق کی مخلوق، ایک مالک کے بندے اور ایک حاکم کی رعیت ہیں اور انہیں صاف صاف الفاظ میں بتا دیا کہ ان کا مالک اپنی رعیت کو متحد و متفق دیکھنا پسند کرتا ہے اور وہ جھگڑے فساد اور دشمنی و بدخواہی کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔ آپؐ نے دوسری بات یہ بتائی کہ زمین کو جن جغرافیائی سیاسی اور معاشی حدود میں بانٹ دیا گیا اور جن کی وجہ سے انسانیت قومیتوں کی ناقابلِ شکست قسموں اور تفریقوں میں تقسیم ہو گئی۔ ان کی کوئی اصل نہیں ہے۔ پوری زمین اللہ کی ہے اور اس پر پائے جانے والے سارے ذرائع و وسائل اللہ کے پیدا کئے ہوئے ہیں اور سب انسانوں کے لئے ہیں، پوری زمین انسان کا وطن ہے اور خاک و وطن کے تمام تعصبات نہ صرف یہ کہ بے اصل ہیں بلکہ انتہائی غلط اور مالک ارض و سما کی ناخوشی کا باعث ہیں۔

اس کے بعد آپؐ نے یہ بات دلوں میں پیوست کی کہ تمام انسان ایک ہی ماں باپ (آدم و حوّا) کی اولاد ہیں اس لئے اُن میں خون کا اشتراک ہے اور وہ بھائی بھائی ہیں، رنگ و نسل کی ساری تفریقیں غلط اور بے بنیاد ہیں، کسی کو کسی پر رنگ و نسل کی بنیاد پر کوئی برتری اور بڑائی نہیں، تقسیم ایک ہی صحیح ہے اور وہ ہے اچھوں اور بُروں کی تقسیم، خدا کو مقتدر اعلیٰ ماننے والوں اور نہ ماننے والوں کی تقسیم۔

جس سوسائٹی اور جس قوم کو آپؐ نے سب سے پہلے یہ تعلیم دی وہ اس لحاظ سے بہت گئی گزری تھی، چھوٹی سی قوم ہونے کے باوجود اس میں سینکڑوں قبیلے تھے۔ پھر ہر قبیلے کے مختلف ٹکڑے تھے اور ہر ٹکڑے میں مختلف خاندان اور کنبے تھے اور ان میں سے ہر ایک اس نسلی غرور کا بُری طرح مارا ہوا تھا، اسی بنا پر وہ آپس میں دست و گریباں رہتے تھے اور کسی طرح بھی ان کو متحد نہ کیا جا سکتا تھا لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کا اثر یہ ہوا کہ چند سال کے اندر وہ بھائی بھائی بن گئے اور جہاں جہاں یہ پیغام گیا اور اسے دل و جان سے تسلیم کیا گیا وہاں تمام تفریقیں ختم ہو گئیں اور ایک عالمگیر برادری اور ہمہ گیر اخوت وجود میں آگئی جس کا ہر فرد دوسرے فرد سے اسی طرح وابستہ و متعلق تھا جس طرح ایک جسم کے اعضا ایک دوسرے سے ——— آج بھی اس تعلیم کو عام کرنے سے یہ نتائج برآمد ہو سکتے ہیں اور انسانیت کا انتشار اور تصادم یقینی طور پر ختم ہو سکتا ہے۔

انسانیت کی تیسری پریشانی کسی متفقہ نصب العین کا نہ ہونا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ مختلف قوموں کے نصب العین مختلف ہیں ہر فرقے اور ہر طبقے کا نصب العین جدا ہے۔ ہر خاندان اور ہر فرد کا مقصدِ زندگی علیحدہ ہے جن کے حاصل کرنے کے لئے یہ سب اپنی سی پوری کوشش کرتے ہیں۔

اس طرح یہ نصب العین ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں اور دنیا کے امن وامان کے لئے خطرے کا باعث ہوتے ہیں۔ پھر یہ نصب العین عموماً غلط ہوتے ہیں اور ان کے غلط ہونے کی وجہ سے نوعِ انسانی کی بہترین صلاحیتیں اور زمین کے کثیر مادی وسائل نہ صرف رائیگاں جاتے ہیں بلکہ وہ انسانیت کی تخریب میں صرف ہوتے ہیں۔ پھر یہ نصب العین آئے دن بدلتے رہتے ہیں اور اس طرح انسانوں کو مسلسل ذہنی، عملی اور سیاسی و معاشی پریشانی میں مبتلا رہنا پڑتا ہے۔ یہ ہے تیسری پریشانی جسے دور کئے بغیر انسانیت کی گاڑی چند قدم بھی خطرے کے بغیر نہیں چل سکتی۔

اس مشکل کو بھی دنیا کے سب سے بڑے رہنما نے بڑی عمدگی سے حل کیا۔ آپ نے بتایا کہ انسان کی زندگی کا مقصد اور پوری انسانیت کا نصب العین مقرر کرنا اصل میں خالق و مالک کا کام ہے۔ وہی بتا سکتا ہے کہ اس نے سب انسانوں کو کس مقصد کے لئے پیدا کیا ہے اور وہی بتا سکتا ہے کہ کون سا نصب العین صحیح ہے، انسانیت کے لئے مفید ہے اور نوعِ انسانی کے اتحاد و اتفاق کا باعث ہے۔ آپ نے بتایا کہ یہ پوری کائنات اللہ کی تابع فرمان ہے اور اس کی ہر ہر شے کی زندگی اللہ کی اطاعت و فرمانبرداری میں بسر ہو رہی ہے، انسان بھی اسی کائنات کا ایک جزو ہے اسے بھی خدا نے پیدا کیا ہے، وہ خدا ہی کی دی ہوئی نعمتوں سے فائدہ اٹھا رہا ہے اور خدا ہی اس کا مالک و آقا ہے اس لئے انسان کی زندگی کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے مالک و آقا اور خالق و پروردگار کی اطاعت و بندگی اختیار کرے اور اپنی ساری کوششیں خدائے پاک کو خوش کرنے میں صرف کرے۔ یہی ہر انسان کا مقصد ہے، ہر خاندان اور ہر گروہ کا مقصد ہے اور ہر قوم اور پوری نوعِ انسانی کا مقصد ہے۔ اسی لئے مقاصد کے اختلاف سے جو کشمکش آئے دن برپا رہتی ہے وہ اسے اختیار کر لینے کے بعد آپ سے آپ ختم ہو جاتی ہے۔ پھر یہ ایک ایسا مقصد ہے جو صحیح اور مفید ہے جو سب انسانوں کی فطرت کو اپیل کر سکتا ہے اور جس پر تمام دنیا کے انسان اکٹھے ہو سکتے ہیں۔

چوتھی مشکل یہ ہے کہ انسانوں کے درمیان کوئی ایسا مشترک اور منصفانہ مفاد موجود نہیں جو ان سب کو یکجا رکھے اور ایک مقصد میں لگائے رکھے ایک فرد سے لیکر ایک قوم تک سب کے مفاد جدا ہیں، ہر شخص خود غرضی میں مبتلا ہے، ہر قوم مفاد پرستی کا شکار ہے ہر طبقے اور ہر انسان پر اپنے مادی مفاد کا بھوت سوار ہے، ہر ایک اپنے جائز و ناجائز حقوق ہر طرح منوانے پر مُصر ہے اور دوسروں کے حقوق دینے کے لئے کسی طرح تیار نہیں، ہر ایک دنیا کے تمام مادی وسائل پر قابض ہونا چاہتا ہے اور دوسروں کو کچھ دینا نہیں چاہتا۔ یہ کشمکش ہر دم جاری ہے اور برابر تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی ہے۔ دنیا کے محدود وسائل اس کشمکش کو سہار نہیں سکتے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جنگوں پر جنگیں جاری ہیں، دنیا ایک سخت قسم کے معاشی بحران میں مبتلا ہے، ہر طرف بے اطمینانی، بے چینی، بھوک، خوف و ہراس کا دور دورہ ہے۔ روز بروز حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں اور اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا مکمل تباہی و بربادی کے قعرِ عمیق میں گرا ہی چاہتی ہے۔ بڑے بڑے امید افزا اور خوش آئند پروگرام پیش ہوتے ہیں مگر مفادات کی کشمکش کی وجہ سے سب کے سب خاک میں مل جاتے ہیں۔ انسانوں کی خود غرضیاں ہر بنتے ہوئے کام کو بگاڑ دیتی ہیں اور اس طرح کوئی الجھن دور نہیں ہوتی بلکہ کئی الجھنوں کا اضافہ ہو جاتا ہے۔

انسانیت کے اس سب سے بڑے محسن نے اس عقدۂ لاینحل کا جو حل پیش کیا ہے اس سے بہتر کسی حل کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس نے آثارِ کائنات اور قوانینِ فطرت کی روشنی میں دنیا کو اس حقیقت سے روشناس کرایا کہ زندگی یہی زندگی نہیں ہے، مرنے کے بعد ایک دوسری زندگی انسان کو ملے گی یہ زندگی دائمی و ابدی ہوگی، جس عالم میں یہ زندگی بسر کرنا ہوگی اس کے ذرائع و وسائل غیر محدود اور اس کی نعمتیں اور تکلیفیں بے پایاں و غیر فانی ہوں گی۔ اس عالم کی دوامی اور لامحدود نعمتوں کے مقابلے میں اس دنیا کی چند روزہ اور محدود فائدوں کی وہی حیثیت ہے جو سمندر کے

مقابلے میں ایک حقیر لونڈی کی۔ دنیا کی یہ حقیر نعمتیں پوری جدوجہد اور دوڑ دھوپ کے باوجود اکثر انسانوں کو حاصل نہیں ہو پاتیں اور وہ اس کی تمنا کرتے کرتے ہی دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں لیکن اس عالم کی لازوال اور عظیم نعمتیں ہر اُس انسان کو جو اُن کے لئے مناسب کوشش کرے یقیناً ملیں گی، خواہش اور تمنا کے مطابق ملیں گی بلکہ انسان کی تمنا سے کہیں زیادہ ملیں گی اور اتنی اور ایسی ملیں گی کہ انسان کا تصور کسی طرح وہاں تک پہنچ ہی نہیں سکتا لیکن یہ سب کچھ صرف اُن لوگوں کو ملے گا جو دنیا کے بھوکے ہونے کے بجائے آخرت کی کامیابی کے دلدادہ ہوں جو مادہ پرست ہونے کے بجائے خدا پرستی کے پیکر ہوں جو ہوس کے بندے ہونے کے بجائے خدا کے بندے اور اس کے تابع فرمان ہوں، جو خدا کی تھوڑی سی خوشنودی کے مقابلے میں دنیا کی بڑی سے بڑی نعمت کو ہیچ سمجھتے ہوں، جو حق پرستی اور انصاف کے لئے اپنے بڑے سے بڑے فائدے کو قربان کرنے کے لئے آمادہ ہوں جو اپنے ناجائز مفادات کو پورا کرنے کے چکر میں پھنسے رہنے کے بجائے دوسروں کے حقوق ادا کرنے اور انسانیت کی خدمت کرنے کے لئے غلطاں و پیچاں رہتے ہوں، جو خود تکلیفیں اٹھا اٹھا کر دوسروں کو آرام پہنچانے کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہوں۔ ایسے ہی لوگ آخرت میں کامیاب ہوں گے اور دائمی وابدی نعمتوں کے مالک، لیکن جو لوگ ایسے نہ ہوں جو اپنے مادی فائدوں کی خاطر خدا کی خوشنودی، آخرت کی کامیابی، انسانیت، امن و انصاف سب کو قربان کر سکتے ہوں اور کر دیتے ہوں اُن کے لئے اس عالم میں دردناک سزائیں ہوں گی، ہولناک تکلیفیں ہوں گی، مصائب و شدائد کا ہجوم ہوگا۔ ایسے ایسے دکھ ہوں گے جن کو انسان کسی طرح برداشت نہ کر سکے گا، وہ چاہے گا کہ اسے موت آجائے، لیکن موت بھی اس کی دستگیری نہ کرے گی، یہ سزائیں دائمی اور غیر فانی ہوں گی۔ اس عذاب کے مقابلے میں دنیا کے سارے عذاب ہیچ ہوں گے۔ انسان کے پاس اس عالم میں کچھ بھی نہ ہوگا، کوئی اس کا امداد کرنے والا نہ ہوگا۔ کسی کی سفارش وہاں کام نہ آئے گی۔ انسان نہ اُس عذاب سے نکل کر بھاگ سکے گا اور نہ دنیا بھر کی ساری دولتیں اور نعمتیں دے کر اس عالم کے معمولی عذاب سے نجات پا سکے گا ـــ اس عقیدے کو آپ نے زندگی بھر مختلف انداز سے ذہنوں میں اُتارا اور اپنا ماننے والوں کے رگ و پے میں پیوست کر دیا، نتیجہ کیا ہوا، تاریخ سے معلوم کیجئے، مسلمانوں کے بجائے غیر مسلموں سے دریافت کیجئے، سب جانتے اور سب مانتے ہیں کہ جن لوگوں کے ذہن میں یہ عقیدہ اچھی طرح بیٹھ گیا تھا۔ ان کے ہاتھوں ایک ایسا زریں دور وجود میں آیا جس سے زیادہ پُرسکون اور انصاف پرور دور دنیا نے کبھی نہ دیکھا یہ لوگ قعرِ مذلت سے اٹھ کر تختِ حکومت پر جا بیٹھے لیکن نشۂ اقتدار سے بدمست نہ ہوئے۔ یہ کروڑوں اور اربوں انسانوں کی جان و مال کے مالک بنے لیکن ہمیشہ اپنے آپ کو ان کا خادم سمجھتے رہے، یہ زمانے کرتے کرتے قیصر و کسریٰ کی حکومتوں کے وارث ہو گئے مگر دولت پرستی اور ہوسِ اقتدار کا شکار نہ ہوئے۔ ان کے ہاتھ میں بے شمار دولت آئی اور رعیت کو ملتی بھی مگر انہوں نے سادہ زندگی گزاری اور وہ قوتِ لایموت سے زیادہ لینے کے خواہشمند نہ ہوئے۔ وہ مظلومیت کی زندگی گزارتے گزارتے اٹھے اور بے پناہ اقتدار کے مالک ہوئے لیکن اس کے باوجود ظالم وجابر نہ ہوئے۔ ان کے بدترین دشمنوں نے گواہیاں دیں کہ وہ دشمن و دوست سب کے ساتھ یکساں انصاف کرتے ہیں، سب کے حقوق کا برابر خیال رکھتے ہیں اور ہر انسان کے جان و مال کو اپنے جان و مال کی طرح عزیز و قیمتی سمجھتے ہیں ـــ آج بھی اگر اس دور کو واپس لانا ہے تو آخرت کے عقیدے ہی کو ذہن میں اتارنا ہوگا اور دنیا کے مفادات کے بجائے آخرت کی کامیابی کو اپنا مقصود بنانا ہوگا۔

دنیا کی پانچویں گتھی کسی ایسے کامل اور متوازن نظامِ زندگی کا نہ ہونا ہے جو خیر و صلاح کا سرچشمہ ہو، فلاح و بہبود کا ضامن ہو جس میں انسانی زندگی کے تمام شعبوں کے لئے متوازن اصول ہوں جس میں تمام انسانی قوتوں اور صلاحیتوں کے ارتقاء اور ہم آہنگی کا سامان ہو جس میں ہر ہر فرد، ہر ہر صنف، ہر ہر اور پوری نوعِ انسانی کے تمام مسائل کا صحیح اور عادلانہ حل ہو جس میں پوری زندگی اور ہر ایک کی پوری رہنمائی کا مکمل انتظام ہو، جو نہ صرف آج کار آمد

اور صحیح ہو بلکہ کل حالات کے بدل جانے اور مادی حیثیت سے انسان کے ارتقاء کر جانے کے بعد بھی بدستور موزوں اور صحیح ہو ——— ایسا نظام زندگی انسان آج تک وضع نہیں کر سکا اور نہ اپنے محدود علم، ناقص عقل، مستقبل کے حالات سے اپنی بے خبری، خواہشات و اغراض اور جذبات کی بندگی کرتے ہوئے وہ ایسا نظام کبھی وضع کر سکتا ہے۔ کچھ ناقص، غیر متوازن، غیر صالح اور قومی و طبقاتی نظام ہیں جو دنیا کو تباہ و برباد کر رہے ہیں۔ جن سے نہ کسی کو امن و سکون میسر ہے نہ انسان کی ساری صلاحیتوں کا ارتقاء ہوتا ہے۔ نہ تمام شعبے ہم آہنگی اور توازن کے ساتھ ترقی کر پاتے ہیں اور نہ تمام قوموں اور طبقوں کے لئے ان میں سیاسی معاشی اور معاشرتی حقوق کا تحفظ ہے۔ کسی میں اگر انسان کی انفرادی آزادی محفوظ ہے تو اس کی معاشی خطرے کی نذر ہو چکی ہے اور معاش کے ساتھ ساتھ اخلاق و شرافت بھی کسی دوسرے نظام میں اگر معاش کا مسئلہ حل کیا گیا ہے تو انسان کی آزادی ختم کر کے رکھ دی گئی ہے اور اخلاق اور انسانیت سے اُسے محروم کر دیا گیا ہے۔

کسی دوسرے نظام میں اخلاق و روحانیت کا انتظام ہے مگر اس کے پاس سیاسی و معاشی مسائل کا کوئی حل نہیں ——— یہ ہے بلا استثناء تمام موجودہ نظام ہائے حیات کا حال۔

اگر آپ اس مسئلے پر پوری سنجیدگی سے غور کریں تو اسی نتیجے پر پہنچیں گے کہ ایسا نظام صرف اُسی خدا کی طرف سے مل سکتا ہے جس نے ہم سب کو اور ہماری صلاحیتوں اور قوتوں کو پیدا کیا ہے، جس نے انسانی ضرورتیں پیدا کی ہیں اور ان کے پورا کرنے کا انتظام کیا ہے۔ جو سب پر مہربان ہے اور جو سب کی ضروریات سے اچھی طرح واقف ہے، جس کا علم ہر شے کو محیط ہے جس کی نظر ماضی و حال اور مستقبل سب پر یکساں حاوی ہے اور جو ظلم و جور سے اور خواہشات و جذبات کی بندگی سے پاک ہے کیا جس خدا نے انسان کی معمولی معمولی ضرورتوں کے لئے پورا کرنے کے لئے وسیع انتظامات کئے ہیں کیا اُس نے اس سب سے بڑی ضرورت کے پورا کرنے کا انتظام نہ کیا ہو گا، جس کا بندوبست کرنے سے انسان بطور خود عاجز ہے؟ آپ کی عقل کہے گی کہ ضرور کیا ہو گا اور مذاہب عالم اور انسانی تاریخ گواہی دیتے ہیں کہ اس نے ایسا بندوبست کیا ہے۔

انسانیت کے اس سب سے بڑے رہنماؐ نے ہمیں بتایا کہ خدا ہی انسان کی اس ضرورت کو پورا کر سکتا ہے اور اسی نے اس ضرورت کو پورا بھی کیا ہے اس نے ہر مخلوق کی رہنمائی فرمائی ہے اور اس کو مختلف انداز سے یہ بتا دیا ہے کہ وہ اپنی زندگی کس نہج پر گزارے۔ اس طرح اس نے پہلے انسان کو زمین پر بھیجتے ہی یہ واضح کر دیا تھا کہ انسان دنیا میں اپنی زندگی کیسے گزارے۔ پھر جب انسان اس حقیقت کو بھول گیا اور گمراہی اور ناکامی کا شکار ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے یاددہانی کے لئے اپنے نبی و رسول بھیجے اور کتابیں نازل کیں تاکہ لوگوں کو ہر وہ طریقہ معلوم ہو جس پر چل کر وہ اپنی زندگی کو کامیاب بنا سکتے ہیں۔ اللہ کے یہ بندے ہر ملک و قوم آئے۔ مختلف زمانوں میں آئے اور لوگوں نے جب اللہ کی بھیجی ہوئی ہدایت کو بھلا دیا یا اُس میں گڑبڑ کر دی تو اُس کو از سر نو پیش کرنے یا اس کو ٹھیک کرنے آئے۔ یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہا اور اللہ کی طرف سے ہدایت اسی طرح آتی رہی یہ ہدایت اپنے اساسات، اپنے اصول اور اپنے بنیادی احکام کے لحاظ سے ہمیشہ ایک ہی رہی۔ البتہ حالات کے اختلاف اور مختلف ضروریات و مزاج و اطوار کے مطابق اس نظام زندگی کی تفصیلات میں تھوڑا بہت فرق رہا جو مختلف قوموں کو دیا جاتا رہا۔ قوموں نے جب کبھی اس نظام زندگی کو اپنایا وہ کامیاب و کامران رہیں اور ترقی و عروج کی منزلیں طے کرتی چلی گئیں اور جب انہوں نے اس سے انحراف کیا تو سارے مادی شان و شکوہ کے باوجود آخر کار وہ ناکام و ذلیل ہوئیں اور دنیا سے ان کا وجود مٹا دیا گیا یا باعزت و ذی اقتدار قوم کی حیثیت سے باقی نہ رہیں۔

انسانیت کے اس عظیم رہنماؐ نے بتایا کہ وہ کوئی نیا مشن لے کر نہیں آئے ہیں اور نہ اُن کے پاس کوئی نیا پیغام ہے۔ وہ انبیاء علیہم السلام کے زریں

سلسلے کی جو ابتدائے آفرینش سے چل رہا تھا، آخری کڑی ہیں، وہ اسی حیات بخش پیام کو پھر لوگوں تک پہنچانے آئے ہیں جسے اُن سے پہلے بے شمار انبیاء کرام علیہم السلام لوگوں کے پاس لاتے رہے ہیں اور جسے انسان نے اپنی بدبختی سے بار بار بھلادیا ہے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ خدا کے بھیجے ہوئے نظام زندگی میں لوگوں نے جو تحریفات کر دی ہیں میں اس نظام کو ان تحریفات سے پاک کر کے تمہارے سامنے رکھ رہا ہوں تاکہ تم پورے اطمینان کے ساتھ خدا کی بندگی کر سکو اور اپنی زندگی سنوار سکو۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ اب تک جو نظام ہائے زندگی خدا کی طرف سے آئے تھے وہ وقتی اور قومی تھے۔ دائمی اور عالمگیر نہ تھے اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ایک ہی قوم کو مخاطب کیا اور کچھ عرصے کے بعد اُن نظاموں میں مختلف اسباب کے ماتحت کچھ تحریفات ہوتی رہیں اور اللہ تعالیٰ ان کی اصلاح فرماتا رہا یا کچھ دوسرے بہتر قوانین بھیجتا رہا، لیکن اب جو نظام زندگی میں خدا کی طرف سے لایا ہوں یہ دنیا کے تمام انسانوں کے لیے قیامت تک کے لیے ہے اور اس سے ہمیشہ ہمیشہ انسانوں کو صحیح رہنمائی مل سکے گی۔ اس طرح یہ نظام زندگی عالمگیر و بین الاقوامی ہونے کے ساتھ ساتھ مکمل بھی ہے اور چونکہ قیامت تک اس سے راہنمائی حاصل کی جانی ہے اس لئے یہ قیامت تک محفوظ رہے گا اور اس میں کسی طرح تحریف نہ ہو سکے گی، کسی انسان کی دیانت و صداقت کو معلوم کرنے کے لیے جن سخت سے سخت شرائط سے کسی کی سیرت کو پرکھا جا سکتا ہے ان سے اگر آپ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو جانچیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس شخص نے اپنی پوری زندگی میں کبھی جھوٹ نہیں بولا، نہ مزاح میں نہ دشوار سے دشوار تر حالات میں، اس شخص کی زندگی سرتاپا صداقت تھی پھر اپنے دعوے کو ثابت کرنے کے لیے انہوں نے جو دلائل دیئے۔ اگر آپ ان پر غور فرمائیں تو آپ کا دل اندر سے خود گواہی دے گا کہ واقعی آپ اللہ کے رسول ہیں۔ پچھلے صحیفوں کی پیش گوئیاں اگر آپ اٹھا کر دیکھیں گے تو وہ آپ پر ٹھیک ٹھیک اُتریں گے۔ مذاہب کی جو تاریخ آپ نے بیان کی ہے، خود مذہبی کتابیں اس کی گواہی دیتی ہیں اور اس سے بہتر مذاہب کی کوئی توجیہ نہیں ہو سکتی۔ قرآن کے محفوظ رہنے کے متعلق جو پیش گوئی کی تھی وہ بالکل صحیح ثابت ہوئی اور عربوں کے کم تعلیم یافتہ اور دائی ہونے کے باوجود قرآن من وعن ویسا ہی موجود ہے جیسا کہ دور رسالت میں تھا اور اس کے شواہد اتنے محکم ہیں کہ خود غیر مسلموں کو اس کا اعتراف ہے اس کے برعکس تعلیم یافتہ اور مہذب قوموں نے اپنی کتابوں کو ضائع و محرف کر دیا اور آج قرآن ہی وہ واحد خدا کی کتاب ہے جو مستند ہے اور ہر طرح کی تحریفات سے محفوظ ——— جو نظام زندگی آپ نے پیش فرمایا عقلِ انسانی اس سے بہتر، اس سے جامع اور اس سے مکمل نظام نہ سوچ سکی۔ اس نظام کی تفصیلات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سب انسانوں کے لئے مفید اور موزوں ہے اور اس میں تمام انسانوں کی زندگی کے تمام شعبوں کا صحیح اور کامل ارتقاء ہے۔ پھر یہ نظام وقتی بھی نہیں ہے۔ اگرچہ یہ آج سے چودہ سو سال پہلے پیش کیا گیا تھا اور آج کے بہت سے مسائل اس وقت تک نہ پیدا ہوئے تھے اور نہ کسی کے ذہن میں ان کا خیال و گمان تک تھا مگر ہم دیکھتے ہیں کہ موجودہ دور کے وہ تمام مسائل جنہیں سلجھانے سے انسانی عقول عاجز ہیں اس تعلیم میں اُن کا بہترین حل موجود ہے اور ہم پورے عقلی اطمینان کے ساتھ اپنے آپ کو اس یقین پر مجبور پاتے ہیں کہ اگر آج اسے پورے کا پورا اختیار کر لیا جاتے تو وہ ان مسائل کا بہترین حل ہے پھر ایسا بھی نہیں کہ یہ نظام کوئی فلسفیانہ اور غیر عملی نظام ہو، یہ خود اسی رہنمائے انسانیت کے ہاتھوں عملاً قائم ہو چکا ہے اور اُس کے بعد اس کے جانشینوں نے اُسے چلا کر اس کے ہر ہر پہلو کو بالکل اُجاگر کر دیا ہے۔ تاریخ میں اس دور کی مکمل تاریخ اور معاصرین کے تاثرات کا ریکارڈ موجود ہے جسے دیکھ کر ہر دوست و دشمن اُسے انسانیت کا بہترین دور کہنے پر مجبور ہے ——— ظاہر ہے کہ اس سے بہتر اس گتھی کا کوئی حل نہیں ہو سکتا۔ خدائی نظام ہمارے پاس محفوظ، مستند اور یقینی شکل میں موجود ہے جو عملی بھی ہے اور تجربہ شدہ بھی اور انسانیت کے سارے مسائل کا حل بھی۔

دنیائے انسانیت کو غلط نظاموں سے جو نقصانات پہنچتے ہیں ان کی طرف اوپر اشارہ ہو چکا ہے اور درحقیقت یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس سے آج کا کوئی انسان بے خبر ہو ہم سب ہی ان تلخ نتائج سے دوچار ہیں جو ان نظاموں کے پیدا کردہ ہیں۔ انقلاب، انقلاب کی ہمہ گیر آوازیں انہیں تلخیوں کی بازگشت ہیں لیکن سچ پوچھئے تو ان پریشانیوں اور مصیبتوں کے پیدا کرنے میں جہاں ان نظام ہائے حیات کو دخل ہے۔ وہاں ان افراد کا بھی ہاتھ ہے جو ان نظاموں کو بددیانتی اور بے ایمانی کے ساتھ چلاتے ہیں۔ ہر غلط نظام برائیوں کے ساتھ کچھ اچھائیاں ضرور رکھتا ہے اور اس کے قائم ہونے پر برائیوں کے غلبے کے ساتھ ساتھ کچھ اچھائیوں کا پرورش پانا بھی ضرور ہے مگر ہوتا یہ ہے کہ جن ہاتھوں میں زمام کار ہوتی ہے وہ بددیانت اور خود غرض ہوتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان ان چند خوبیوں سے بھی بہرہ یاب نہیں ہو پاتے جو ان نظاموں میں پائی جاتی ہیں۔ سارے اچھے اور مفید نتائج برسر اقتدار طبقے کے حصے میں آتے ہیں اور عوام کی قسمت میں صرف تلخیاں اور پریشانیاں رہ جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ مختلف نظام ہائے حیات سے جو توقعات لگائے ہوتے ہیں۔ وہ ان کے قائم ہونے کے بعد پوری نہیں ہوتیں اور انقلاب در انقلاب کا ایک لامتناہی سلسلہ چلتا رہتا ہے۔

یہ بڑی اندوہناک صورت حال ہے لیکن کوئی اتفاقی بات نہیں۔ اس کا اصل سبب یہ ہے کہ دنیا کے تمام انسانی نظام انقلاب برپا کرنے اور اقتدار پر قبضہ کرنے کی فکر میں تو رہتے ہیں لیکن اس بات کی فکر بالکل نہیں کرتے کہ اپنے علمبرداروں کو دیانت دار اور مخلص بنائیں وہ اس بگڑی ہوئی دنیا کی اصلاح کے لئے اس دنیا کے ان بگڑے ہوئے انسانوں کو اپنے ساتھ لیتے ہیں جو کسی نہ کسی طرح سیاسی اقتدار حاصل کرنے کا ذریعہ بن سکتے ہوں۔ اور چونکہ یہ جمہوری انقلابات کا زمانہ ہے اس لئے زیادہ سے زیادہ بھیڑ اکٹھی کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس جدوجہد میں کامیاب ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ انسان اخلاق و دیانت کی بات نہ کرے کیونکہ لوگ اس "وعظ" کو سن کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ اس "اخلاق باختہ" بھیڑ کو مادی مفادات کا لالچ دے دیکر خود غرض، لالچی اور ضمیر فروش بنایا جاتا ہے اور پھر انقلاب برپا کرنے کے لیے اُسے تمام جائز و ناجائز طریقوں کا عادی بنایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب ایسے لوگوں کے ہاتھ میں زمام کار آئے گی تو وہ خود غرض اور لالچی کیوں نہ ثابت ہوں گے اور مقصد براری کے لئے ناجائز ذرائع استعمال کرنے میں کیوں دریغ کریں گے جبکہ انہیں خدا کے آگے جواب دہی کا کوئی خوف نہیں ہوتا اور آخرت کی کامیابی ان کے سامنے نہیں ہوتی۔ اس طرح یہ لوگ پہلے ہی سے کافی بگڑے ہوئے ہیں اور اقتدار و دولت کا نشہ انہیں اور بھی بگاڑ کر رکھ دیتا ہے۔

یہ انسانیت کی چھٹی بڑی گتھی ہے اور افسوس یہ ہے کہ اس کے حل کی طرف کسی کی توجہ نہیں۔ اس گتھی کا صرف ایک ہی حل ہے اور وہ یہ ہے کہ لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار کی کنجی دینے سے پہلے انہیں اتنا بااخلاق بنا دیا جائے کہ وہ اس سے غلط فائدہ اٹھانے کی خواہش نہ کر سکیں۔ نیز ماحول ایسا بنا دیا جائے کہ اس میں اخلاق و دیانت داری ہی کا چلن ہو تاکہ بددیانت اور بداخلاق لوگ برسر اقتدار نہ آنے پائیں اور برسر اقتدار لوگ بددیانت ہو کر اقتدار کی کرسی پر قابض نہ رہنے پائیں۔

انسانیت کے اس سب سے بڑے رہنما نے جہاں انسانیت کو ایک ایسا نظام دیا جو سراسر خیر و برکت کا سرچشمہ ہے وہاں اس نے اس نظام کو قائم کرنے اور چلانے والے افراد کی تعمیر سیرت کا بہترین انتظام کیا۔ آیئے اس تربیتی پروگرام پر بھی ایک نظر ڈالتے چلیں۔

آپ نے سب سے پہلے لوگوں میں اللہ پر ایمان و یقین پیدا کرنے کی کوشش کی اور انہیں لوگوں کو اپنے ساتھ لیا جو اللہ کے وجود اور اس کی صفات پر پورا یقین رکھتے تھے اور اللہ کی مکمل بندگی کو اپنا مقصود اور اس کی رضا کو اپنی زندگی کا حاصل یقین کرتے تھے۔ اللہ کی بندگی اور اس کی رضا کو مقصود بنانے کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ نظام اسلامی کے بہترین مخلص اور بے مثال پیرو بن جاتے تھے اور کسی قیمت پر اس سے خیانت کرنے پر آمادہ نہ ہوتے تھے۔ اللہ کے وجود

اور اس کی صفات پر ایمان رکھنے کا اثر زندگی پر یہ پڑا کہ وہ ہر وقت اپنے آپ کو ایک ایسے مقتدر اعلیٰ کے سامنے جواب دہ محسوس کرنے تھے جو ہر دم ان کی نگرانی کر رہا ہے، جو ہر جگہ حاضر و ناظر ہے جس سے وہ اپنا کوئی فعل نہیں چھپا سکتے، جو دل کے ارادوں اور نیتوں تک سے بخوبی واقف ہے، جس کے قبضۂ قدرت سے نکل کر وہ کہیں نہیں جا سکتے، جس کی پولیس ہر جگہ انسان کو گھیرے ہوئے ہے اور جس کی سی آئی ڈی ہر وقت انسان کا ریکارڈ مرتب کرنے میں مشغول ہے جس کی رحمتیں بے پایاں ہیں اور انہی پر انسان کی زندگی اور اس کے تمام معاملات کا انحصار ہے۔ اس کا عذاب بے پناہ ہے اور وہ کسی وقت بھی نافرمان اور ظالم بندوں پر آسکتا ہے اور انہیں تباہ و برباد کر سکتا ہے ———— اس یقین کا جو کچھ اثر انسانی زندگی پر پڑے گا اس کا اندازہ بآسانی کیا جا سکتا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ آپؐ نے آخرت کے یقین کو پیدا کرنے اور اس دنیا کی کامیابی کو مقصود بنانے کی کوشش کی۔ اس غرض کے لئے آپؐ نے وہ دلائل و براہین پیش کئے جو انسان کے دل میں آخرت کا یقین پیدا کر سکیں، پھر آپؐ نے دنیا اور آخرت کی نعمتوں کا مقابلہ کر کے بار بار اس حقیقت کو اچھی طرح واضح کیا کہ دنیا کی نعمتیں چند روزہ ہیں، معمولی ہیں، ناپائیدار ہیں، اور پھر بھی بہت کم انسانوں کو ملتی ہیں، اس کے مقابلے میں آپؐ نے بتایا کہ آخرت کی نعمتیں دائمی ہیں، پائیدار ہیں، عظیم الشان ہیں اور یہ ہر اس انسان کو ملیں گی جو اُن کے لئے ایمانداری و اخلاق کی راہ اختیار کرے اور اسی طرح آپؐ نے دونوں دنیاؤں کے تکالیف و مصائب کا موازنہ کیا، پھر آپؐ نے ہر ہر قدم پر اپنے ساتھیوں کی تربیت کی کہ وہ ہر کام صرف خدا کی رضا اور آخرت کی کامیابی کے لئے کریں اور دنیوی مفادات کو مقصود نہ بنائیں۔ اس کے لئے آپؐ نے دنیا کی طرف سے بے رغبتی پیدا کی، خدا کی راہ میں دولت خرچ کرنے، ضرورت پڑنے پر عیش و آرام کو تج دینے، گھر بار کو چھوڑ دینے، اپنے معاشی ذرائع و وسائل کو تباہ کر لینے اور بالآخر جان تک دے دینے کا حکم دیا اور اس کی عملی تربیت کرائی۔ پھر ان سب قربانیوں کے سلسلے میں دنیا کے دوسرے نظاموں کے برخلاف قدم قدم پر یہ حقیقت واضح کی کہ اگر تم یہ سب کچھ دنیوی فوائد یا اقتدار کے حصول کے لئے کرو گے تو یہ سب رائیگاں جائے گا اور اس کے لئے خدا کے یہاں جواب دہ ہو گے۔ نہیں یہ سب کام صرف خدا کو خوش کرنے کے لئے اور آخرت کو کامیاب بنانے کے لئے کرنا چاہیئے۔

آپؐ نے اس کے ساتھ یہ بھی واضح کیا کہ اللہ کی صرف قانونی بندگی سے کام نہ چلے گا، اللہ کا تقرب ان لوگوں کو حاصل ہوتا ہے۔ جو اس سے محبت کرتے ہیں اور اس کی محبت کے مقابلے میں دنیا کی ہر ایک محبت کو قربان کر دیتے ہیں جو صرف وہی اعمال بجا نہیں لاتے جن کا خدا نے حکم دیا ہے بلکہ بہت سے وہ کام بھی کرتے ہیں جنہیں خدا نے قانوناً ضروری تو نہیں ٹھہرایا ہے لیکن جن سے وہ خوش ہوتا ہے۔ جو ہر کام پورے جذبۂ خلوص و اطاعت کے ساتھ کرتے ہیں اور اچھے سے اچھے طریقے پر کرتے ہیں۔ آپ نے ساتھ ہی اللہ کی ان صفات رحم و کرم کو بھی واضح فرمایا جن کو جاننے سے انسان کے دل میں اللہ کی محبت پیدا ہوتی ہے پھر آپ نے یہ بھی بتایا کہ جو خدا سے محبت کرتے ہیں، خدا ان سے محبت کرتا ہے۔ اس طرح آپؐ نے لوگوں میں خدا کی گہری محبت اور اس کی مخلص فرمانبرداری پیدا کی ——— موجودہ نظام اپنی پابندی قانون کے زور سے کرانا چاہتے ہیں جس کا دائرہ بہت محدود ہوتا ہے اور جس کو توڑنے کے لئے انسان سو بہانے کرتا رہتا ہے، برسر اقتدار طبقے کے لئے یہ روک بھی نہیں ہوتی اس لئے وہ خوب کھل کھیلتا ہے۔ اسلامی نظام کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ انسانوں کے دلوں میں اپنے مقتدر اعلیٰ کے خوف کے ساتھ ساتھ اس کی گہری اور والہانہ محبت پیدا کرتا ہے اور ان سے رضاکارانہ اور وفادارانہ اپنی اطاعت کراتا ہے اور اس محبت و وفاداری کے جذبے سے وہ لوگ بھی خالی نہیں ہوتے جن کے ہاتھ میں زمام کار ہوتی ہے۔

آپؐ نے اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کیا کہ انسان یقین رکھنے اور یہ فیصلہ کرنے کے باوجود جو غلطیاں کرتا ہے اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ دنیا کے دوسرے علائق اس پر چھا جاتے ہیں اور وہ تھوڑی دیر کے لیے ان حقائق کو بھول جاتا ہے جو اُس کے دل میں گھر کئے ہوئے تھے۔ یہ کیفیت ہر انسان پر طاری ہو سکتی ہے اور ہوتی ہے اور اگر اس کیفیت کو دور نہ کیا جائے تو بالآخر انسان اپنا سرمایہ ایمان و یقین کھو بیٹھتا ہے۔ آپؐ نے انسان کی اس کمزوری کو دور کرنے کے لیے اور اس کو اللہ کی عظمت یاد دلانے، اس کی بندگی پر اکسانے اور اس کی محبت و وفاداری کے بڑھانے کے لئے ذکرِ الٰہی کو مسلمان کی زندگی میں اس طرح سمو دیا کہ وہ خدا کو کسی طرح بھول نہ سکے۔ اُسے قرآن کی تلاوت کا حکم دیا جو ہدایت کا سرچشمہ ہونے کے علاوہ خدا کو یاد دلانے اور اس کی محبت پیدا کرنے اور آخرت کی کامیابی کی خوشخبری سنانے اور خدا کے عذاب سے ڈرانے کا بہترین ذریعہ ہے۔ آپؐ نے دن رات میں ہر چند گھنٹے کے بعد نمازیں ادا کرنا دین کی بنیاد اور مومن کی سب سے پہلی اور اہم نشانی قرار دیا۔ یہ نماز کیا ہے، اللہ کی یاد، مسلسل یاد، اس کی بندگی کا عہد، اس کے سامنے انتہائی عاجزی و عبودیت کا اظہار اس کی صفات کا ورد، اس سے قریبی تعلق پیدا کرنے کا بہترین طریقہ، نماز کے علاوہ آپؐ نے مومن کی یہ صفت بتائی کہ وہ ہر وقت خدا کو یاد رکھتا اور یاد کرتا ہے، اس غرض کے لئے آپ نے ہر کام کے کرنے سے پہلے اور کرنے کے بعد کچھ دعائیں مانگنے اور کچھ اذکار کے ورد میں رکھنے کی تلقین فرمائی جن میں سے ہر ایک غفلت کو دور کرنے، انسان کو اس کی حیثیت سے باخبر رکھنے اور خدا کی محبت و عظمت پیدا کرنے کے لئے اکسیر ہے، نماز کے علاوہ آپ نے مسلسل ایک ماہ کے روزے رکھنے کا حکم فرمایا، یہ روزے ایک طرف اخلاقی انضباط پیدا کرنے کے بے مثل نسخہ ہیں، دوسری طرف ہمہ وقتی ذکر کا بہترین پروگرام ہیں، مزید برآں استطاعت رکھنے والوں پر حج بیت اللہ فرض قرار پایا جو محبت الٰہی میں انسان کو سرشار کر دینے اور دین خداوندی کا والہ و شیفتہ بنا دینے والی عبادت ہے۔

آپؐ نے اخلاقیات کی بہترین تعلیم علمی اور عملی حیثیت سے لوگوں کے سامنے پیش کی۔ لوگوں کے حقوق کی ادائیگی اور انصاف اور حُسنِ سلوک کو دین میں بنیادی اہمیت دی اور اربابِ اقتدار کی ذمہ داریوں کو خصوصیت سے بہت واضح الفاظ میں بیان فرمایا آپ نے کھلے الفاظ میں بتا دیا کہ اسلام میں قیادت، مخلوق کی خدمت اور شبانہ روز محنت و تندہی کا نام ہے عیش و آرام اور نفع اندوزی کا نام نہیں۔ آپؐ نے طرح طرح سے عوام و خواص میں یہ ذہنیت پیدا کرنے کی کوشش کی کہ وہ دولت و اقتدار کو بڑائی کا ہم معنی قرار نہ دیں اس کے برخلاف حضورؐ نے وضاحت سے فرمایا کہ بڑائی اللہ کی بندگی اور اس کے قانون کی پیروی میں ہے اور جو اس لحاظ سے بڑا ہے وہی قیادت و سرداری کا مستحق ہے۔ آپؐ نے بتایا کہ مومن کی رائے بھی خدا کی امانت ہے اور اس کا مستحق وہی شخص ہے جو خدا ترس ہو اور واقعتاً اس منصب کا اہل ہو جس کے لئے رائے دی جا رہی ہے، آپ نے اس شخص کو منتخب کرنے سے بالکل روک دیا جو خود کسی عہدے کا طالب ہو اور اپنے آپ کو امیدوار کی حیثیت سے پیش کر رہا ہو۔

اس کے علاوہ آپؐ نے اپنے ماننے والوں پر ایمان و عمل کے بعد سب سے بڑا یہ فرض عائد کیا کہ وہ نیکی کا حکم دینے، برائی سے روکنے اور حق کی طرف دعوت دینے کو اپنی زندگی کا مشن بنائیں اور جب تک دنیا میں کہیں بھی کوئی برائی موجود ہو وہ اپنے اس کام میں پورے انہماک کے ساتھ مشغول رہیں اس فریضے کو بجا لانے میں انہیں نہ تو سستی کرنا چاہیئے، نہ محبت و قرابت کا کوئی لحاظ کرنا چاہیئے، نہ کسی بڑے سے بڑے لالچ یا بڑے سے بڑے خوف کی بنا پر اسے ترک کرنا چاہیئے، سوسائٹی میں جہاں کہیں برائی سر نکالے ہر مومن کا فرض ہے کہ اُسے بڑھ کر وہیں دبا دے۔ اسلامی نظام حکومت کا مقصدِ وجود یہی ہے کہ وہ اس فریضے کو ادا کرے اور دنیا میں نیکی، انسانیت، حق پرستی اور خدا کی بندگی غالب و عام کر دے لیکن اگر اربابِ اقتدار اس مقصد کو پورا نہ کریں اور خلافِ اسلام مقاصد میں منہمک ہو جائیں تو ہر مومن کا حق ہے کہ ان پر تنقید کرے اور اس کا فرض ہے کہ اس کو اس غلط روش

سے روکے اور راہِ راست پر لائے اور ان کے ناجائز احکام کی تو ہرگز اطاعت نہ کرے، لیکن اگر وہ اپنی غلطیوں سے باز نہ آئیں اور کھلم کھلا خلافِ اسلام روش اختیار کریں تو اہلِ ایمان کا فرض ہے کہ وہ انہیں اقتدار کی گدی سے اتار پھینکیں اور صالح قیادت کو برسرِ کار لائیں —— ان احکام کی پابندی اور اس ماحول کی موجودگی میں اربابِ اقتدار کی بددیانتی کا خطرہ پیدا نہیں ہو سکتا اور اگر کسی خامی یا غلطی کی بنا پر پیدا ہو جائے تو اس قدر شدت اختیار نہیں کر سکتا جتنا اس دور میں ہے پھر اس کا تدارک آسانی کے ساتھ ہو سکتا ہے۔

اس دور کی ایک بہت بڑی مصیبت یہ ہے کہ نیکی داخلاق اور انسانیت و فلاحِ عالم کے دعوے کرنے والے، ان موضوعات پر تحقیقی مقالے لکھنے والے، دنیا کو اس کا درس دینے والے، ان چیزوں کو بنیاد بنا کر تنظیمیں کرنے والے تو کم نہیں ہیں، مگر ان لوگوں کی کمی نہیں، قحط ہے جو ان نیکی داخلاق کا نمونہ اور انسانیت و خیر خواہی کا پیکر ہوں۔ اس کے برخلاف ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے اور وہ پوری دنیا میں حشرات الارض کی طرح بکثرت موجود ہیں جن کی زندگی سراسر بدی سے معمور ہے جو بدی کے پرجوش داعی و مبلغ ہیں اور جو بدی کو دنیا میں پھیلانے کے لئے ہر قسم کی تدبیریں اور کوششیں کر رہے ہیں حکومتیں اور برسرِ اقتدار طبقے اس "مقدس مہم" میں آگے آگے ہیں اور عوام ان کے پیچھے بدی کے اس عالمگیر سیلاب میں کوئی نیکی کیسے اختیار کرے اور کون سا نمونہ سامنے رکھے۔ یہی وجہ ہے کہ بدی کی راہ اختیار کرنا عام شیوہ ہو چکا ہے اور نیکی کی راہ سنسان پڑی ہے۔

پھر مشکل صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ نیکی کا کوئی نمونہ سامنے نہیں ہے بلکہ جو اسکیم بھی سامنے آتی ہے اس کا سب سے زیادہ ناقص پہلو یہی ہوتا ہے کہ وہ محض دماغی اسکیم ہوتی ہے جو ایک شخص یا چند اشخاص مرتب کرتے ہیں، ان کے سامنے اس اسکیم کے تمام روشن و تاریک پہلو نہیں ہوتے اور چند روشن پہلوؤں کو سامنے رکھ کر یہ فیصلہ کر لیتے ہیں کہ یہ اسکیم لوگوں کے لئے مفید ہوگی اور انہیں پہلوؤں کا وہ لوگوں میں پروپیگنڈا کرتے ہیں لیکن جب لوگ اس اسکیم کو اپناتے ہیں تو اچانک اس کے تاریک پہلو سامنے آتے ہیں اور جن پہلوؤں کو روشن خیال کیا گیا تھا۔ بسا اوقات وہ بھی اپنے پیچھے تلخ نتائج رکھتے ہوتے ہیں۔ وہ لوگ یہ حالت دیکھ کر گھبرا اُٹھتے ہیں اور پھر یا تو ترمیموں کے ذریعے کچھ دنوں اس اسکیم کو اور گھسیٹ کر لے چلتے ہیں یا اس کے خلاف انقلابی جدوجہد شروع کر دیتے ہیں، یہ صورتِ حال ہر اسکیم اور ہر تحریک کے سلسلے میں پیش آتی ہے۔

انسانیت کے اس سب سے بڑے رہبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کا بہت بڑا احسان یہ ہے کہ انہوں نے جہاں ایک ایسا نظام دنیا کو دیا جس کی بنیاد نیکی و خدا ترسی پر تھی اور جو سراپا خیر و برکت کا سرچشمہ تھا۔ وہاں انہوں نے اس کے ایک ایک جزو پر سب سے پہلے خود عمل کیا اور اس طرح عمل کا جذبہ رکھنے والوں کے سامنے اس کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کر دیا اور ان پر واضح کر دیا کہ اس نظام کو انفرادی طور پر اختیار کرنے سے انسان دنیا کیلئے کس قدر خیر و برکت کا باعث اور فلاح و بہبود کا ذریعہ بنتا ہے۔ اجتماعی اثرات واضح کرنے کے لئے آپ نے اُن گذشتہ قوموں کے حالات کا حوالہ دیا جن کی تاریخ لوگوں کے سامنے تھی اور جو اس نظام کو اختیار کرنے سے ترقی و کامرانی کی منزل تک پہنچے تھے اور جو اس سے انحراف کرنے کے باعث تباہی و بربادی کا شکار ہو گئے تھے کیونکہ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا۔ اسلامی نظام ہی ایک ایسا نظام ہے جو تفصیلات کے تھوڑے سے بہت اختلاف کے ساتھ ابتدائے آفرینش ہی سے دنیا میں موجود رہا ہے اور قوموں نے اس سے فوائد و برکات حاصل کئے ہیں۔ پھر آپ نے یہ بتایا کہ یہ اس خدا کا بھیجا ہوا نظامِ زندگی ہے جو علیم و خبیر ہے اور جس نے اپنے علم و آگہی کی بنا پر یہ نظام تمہارے لئے بھیجا ہے اس لئے نہ تو یہ غیر عملی ہو سکتا ہے کہ اس کے روشن پہلو تاریک ثابت ہوں، یا کچھ تاریک پہلو سامنے آجائیں جو اس کے روشن پہلوؤں کو تاریک کر کے رکھ دیں جن لوگوں نے اس اعتماد پر اس نظام کو قبول کیا اور اپنی زندگی کو اس کا عملی نمونہ بنایا۔ آپؐ نے انہیں منظم کیا اور اس جماعت کا مقصد ہی یہ قرار دیا کہ وہ

اپنی زندگی اقامتِ دین، امر بالمعروف نہی عن المنکر اور دعوت الی الحق میں لگا دیں چنانچہ آپؐ کی زندگی ہی میں اس جماعت کی اجتماعی جدوجہد کے نتیجے کے طور پر وہ نظامِ حق عملاً قائم ہو گیا جو آپ لے کر آئے تھے اور آپؐ کے بعد آپؐ کے خلفاء نے اس کو عمدگی کے ساتھ چلا کر اور دنیا پر اُسے غالب و بالا اقتدار کر کے دکھا دیا کہ اس سے جو توقعات لگائی گئی تھیں۔ نہ صرف یہ کہ وہ پوری ہو گئیں بلکہ بہت سے ایسے روشن پہلو سامنے آ گئے جن کا لوگ تصور تک نہ کر سکتے تھے۔

آج یہ ساری تفصیلات ہمارے سامنے موجود ہیں جنہیں دیکھ لینے کے بعد کسی شخص کو دوسرے نظاموں کی طرح اس نظام کے بارے میں یہ بدگمانی نہیں ہو سکتی کہ یہ غیر عملی ہے یا مہلک و مضر ہے۔ پھر ان تفصیلات میں ہمارے لئے کام کی راہیں بھی آسان کر دی ہیں، ان سے ہم جان گئے ہیں کہ اس نظام پر کس طرح عمل کریں اور کن کن مراحل میں کون کونسی راہ اختیار کریں ---- یہ کہ ایسی نعمت ہے جو صرف سیرت رسولؐ اور سیرت صحابہؓ ہی سے مل سکتی ہے لیکن ان سب آسانیوں کے باوجود یہ ایک واقعہ ہے کہ یہ ایک عملی نمونہ اب کتابی نمونہ بن چکا ہے اور مخالفین اور بدگمان لوگوں کے لئے یہ کہنے کی بڑی گنجائش پیدا ہو گئی ہے کہ یہ تو پچھلے زمانے کی باتیں اور کتابوں کی روایات ہیں۔ اس لئے اس دور میں سیرت رسولؐ کا سب سے بڑا تقاضا یہ ہے کہ اسکو اپنا رہنما بانے والے اپنی پوری زندگی کو اس نمونے کے مطابق ڈھالیں، اسی طرح پھر شہادت حق اور اقامت دین کے لئے اٹھ کھڑے ہوں اور اس کے لئے انفرادی اور اجتماعی جدوجہد شروع کر دیں یہاں تک کہ نظامِ حق کو سیاسی طور پر دنیا میں قائم و غالب کر کے چھوڑیں۔ اُسی وقت دنیا کو یقین ہو گا کہ سیرت رسولؐ دنیا کے لئے خیر و برکت کا سرچشمہ ہے اور اس کا عملی نمونہ بھی ان کے سامنے آ جائے گا اور درحقیقت عام انسان اسی وقت آپکی سیرت سے فائدہ اٹھا سکیں گے ورنہ مشکلات کا واحد حل کتابوں کی زینت بن کر رہ جائے گا اور دنیا اسی طرح ہلاکت و بربادی کی طرف بڑھتی رہے گی جس طرح بڑھ رہی ہے۔

رسولِ اکرمؐ اور تعمیرِ انسانیت

غلام احمد حریری

شرفِ انسانیت

کائنات گوناگوں موجودات کا مرقع ہے۔ فلاسفہ نے اشیاء کائنات کو تین قسموں میں منقسم کیا ہے۔ جمادات، نباتات اور حیوانات۔ پہلی دو قسمیں ہمارے موضوع سے خارج ہیں تیسری قسم یعنی حیوانات میں نشوو ارتقاء کے ساتھ حرکت و ارادہ بھی پایا جاتا ہے اسی قسم میں مخلوق کی وہ نوع بھی شامل ہے جس میں تمام حیوانی اوصاف کے ساتھ عقل و شعور اور قوتِ ناطقہ کا جوہر بھی موجود ہے کائنات کی یہی انوکھی مخلوق ہے جو علم الاجتماع میں خصوصی موضوع کی حیثیت رکھتی ہے اور یہ حضرت انسان ہے، جو شاہکار فطرت ہے۔

موجودات عالم میں انسان کو کیا مرتبہ و مقام حاصل ہے؟ اس کا جواب دو طرز پر دیا گیا ہے جو لوگ مذہب کو کسی فکر و فلسفہ کی اساس قرار نہیں دیتے ان کا کہنا ہے کہ انسانی حرکات و سکنات میں چونکہ حیوانیت کا پہلو نمایاں ہے اس لیے حیوانیت کی ارتقائی صورت کا نام ہی انسانیت ہے۔ بالفاظ دیگر انسان ایک سُلجھے ہوئے حیوان سے زائد اور کچھ بھی نہیں، اس نظریہ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ انسان واقعی شاہکار فطرت ہے۔

بخلاف ازیں اہلِ مذہب نے اس بات کو ایک بنیادی اصول کی حیثیت سے تسلیم کیا ہے کہ انسان عام حالت میں ایک ادنیٰ مخلوق ہے اسے بلند مرتبہ حاصل کرنے کے لیے بڑی محنت و کاوش کی ضرورت ہے مسیحیت نے انسان کو پیدائشی گناہگار قرار دیا۔ بدھ مت نے دنیوی زندگی کو آلائش کا نام دیا مہاتما بدھ کے نزدیک دنیا سے کنارہ کشی اور بے رغبتی ہی عین انسانیت ہے۔ انسان اپنے گناہوں اور آلائشوں سے اسی صورت میں نجات حاصل کر سکتا ہے جب کہ وہ اپنے آپ کو سخت تکلیفوں میں مبتلا کرے۔ غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ مذہبی نقطۂ نظر سے بھی انسان کا مرتبہ و مقام متعین نہیں ہو سکا۔ اگر ایک طرف روحانی پیشوا کی پُرشکوہ شخصیت کو دیکھ کر عظمت انسان کا احساس ہوتا ہے تو دوسری طرف جھکتے ہوئے انسانوں کی ذلت آشکار ہوتی ہے۔ جس طرح ایک طرف بادشاہ اور صاحبِ اقتدار انسان ہیں، تو دوسری طرف بھیڑ بکریوں کی بکنے والے غلام اور باندیاں تذلیل کا سامان فراہم کرتے ہیں۔

اسلام اور انسان

اس غیر فطری طرز فکر کو اسلام نے مٹایا اس نے انسانی عظمت کا نعرہ اس وقت لگایا جب اس بات کو سوچنے کا شعور بھی مفقود تھا۔ یہ شرف صرف اسلام کو حاصل ہے کہ اس نے انسانی عظمت کا نظریہ پیدا کیا اور عقلی و منطقی دلائل سے اس کو ثابت کیا۔

قرآن کریم میں فرمایا۔

"وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰي كَثِيْرٍ مِّمَّنْ

اور ہم نے اولاد آدم کو عزت دی اور ہم نے ان کو خشکی اور دریا میں سوار کیا۔ اور پاکیزہ چیزیں ان کو عطا کیں اور ہم نے

خَلَقْنَا تَفْضِيلًا" (بنی اسرائیل - ۷۰) ان کو اپنی بہت سی مخلوقات پر فوقیت دی۔

"لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ" (التین ۴) ہم نے انسان کو بہترین سانچے میں ڈھالا ہے۔

انسانی عظمت کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ وہ اس کائنات میں خلیفۃ اللہ یعنی اللہ تعالیٰ کا نائب ہے اللہ تعالیٰ نے انسان کی اس حیثیت کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا تھا۔ جب فرشتوں نے اس پر اعتراض کیا تو فرمایا: "اِنِّیْ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ" (جو کچھ میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے) کائنات کی کوئی اور مخلوق اس فضیلت میں انسان کی شریک نہیں۔ قرآن کریم نے اسے امانت قرار دیا ہے اور انسان کو اس کا امین۔ ساری مخلوق نے اس بار امانت کو اٹھانے سے انکار کر دیا تھا۔

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید
قرعۂ فال بنامِ من دیوانہ زدند!

قرآن کریم میں فرمایا۔

"اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَۃَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا" (الاحزاب ۷۲)

ہم نے یہ امانت آسمان زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی تھی مگر انہوں نے اس کی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس کو اٹھالیا بے شک وہ بڑا ظالم اور جاہل ہے۔

اکثر مفسرین نے اس آیۂ کریمہ میں امانت سے نیابت خداوندی اور خلافت الٰہی مراد لی ہے کیونکہ اس سے انسانی عظمت کا اثبات ہوتا ہے گویا انسانی عظمت کا راز اس امر میں مضمر ہے کہ انسان ایک اجتماعی نظام تشکیل دے جس میں احکام خداوندی کو نافذ کیا جائے اس کا صحیح مقام یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا بندہ بن کر رہے اور لوگوں کو خدا کی بندگی کی طرف دعوت دے اسے یہ حق حاصل نہیں کہ وہ خود خدا بن بیٹھے اور خلق خدا کو اپنا محکوم بنائے۔

اسلام انسانی شرف کے لحاظ سے سب کو مساوی قرار دیتا ہے۔ کسی شخص کو اظہار فضیلت کا ایسا کوئی حق نہیں، جس سے فساد بپا ہو اور جو باطل امتیازات پر مبنی ہو۔ اسلام نے فخر و مباہات اور عصبیت جاہلیہ کو ملعون قرار دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حاکم و محکوم آقا و غلام اور اشرف و ادنیٰ کا امتیاز جاتا رہا۔ مصنوعی حد بندیاں ٹوٹ گئیں اور انسان ایک مرتبہ پھر انسانی شرافت اور عظمت آدمیت کا حامل بن گیا۔

نبوت کا کارنامہ

انسانی عظمت و شرف کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے رسل و انبیاء کو انسانوں کی اصلاح و تکمیل کا فریضہ تفویض کیا اور ان حضرات نے انسان کو اپنی دعوت و ارشاد کا موضوع بنایا۔ انبیاء علیہم السلام کی بصیرت پر اللہ تعالیٰ نے یہ نکتہ فاش کیا کہ اس دنیا کی قسمت اور اساس کی آبادی و ویرانی کا فیصلہ انسان پر موقوف ہے اگر حقیقی انسان موجود ہے تو یہ دنیا اپنی سب ویرانیوں اور بے سرو سامانیوں کے ساتھ آباد و معمور ہے اور اگر حقیقی انسان موجود نہیں تو یہ اپنی ساری رونقوں اور اپنے ساز و سامان کے ساتھ ایک ویرانے سے بہتر نہیں اس دنیا کی بدقسمتی و وسائل کی کمی اور فقدان سے نہیں بلکہ اچھے انسانوں کے نہ ہونے سے ہے۔ پھر انسان اپنی عظمت، اپنی وسعت اور اپنی مرکزیت کے اعتبار سے کہیں زیادہ اس کا مستحق ہے کہ اس کو سعی و محنت اور توجہ کا موضوع

بنایا جائے۔ یہ کائنات بڑی پُر اسرار، بڑی پر از عجائبات، بڑی حسین و جمیل اور بڑی طویل و عریض ہے۔ لیکن انسان کی فطرت کے اسرار و عجائبات اس کے تخیل کی بلند پروازیوں، اس کی روح بے تابیوں اور گرم جوشیوں اور اس کی غیر محدود صلاحیتوں کے سامنے اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ اس کے عزم و ارادہ کے آگے ہر طاقت سرنگوں ہے۔ اس کی حسن سیرت کے سامنے دنیا کا ہر حسن ماند ہے۔

اسی بنا پر ہر نبوت نے اپنے دور میں ایسے افراد تیار کیے جنہوں نے اس دنیا کو نئی زندگی بخشی۔ نبوت کے ان کارناموں میں جو زندگی کی پیشانی پر درخشاں و تاباں ہیں سب سے روشن کارنامہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا کارنامہ ہے۔ مردم سازی اور آدم گری کے اس کام میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو کامیابی عطا فرمائی وہ آج تک کسی انسان کو حاصل نہیں ہوئی۔ آپ نے جس سطح سے تعمیر انسانیت کا کام شروع کیا اس سطح سے کسی پیغمبر اور کسی مصلح اور کسی مربی کو شروع کرنے کی ضرورت کبھی پیش نہیں آئی تھی۔ یہ وہ سطح تھی جہاں حیوانیت کی سرحد ختم ہوتی تھی اور انسانیت کی سرحد شروع ہوتی تھی اور جس سطح پر آپ نے اس کام کو پہنچایا اس سطح تک کبھی تعمیر انسانیت کا کام نہیں پہنچا تھا جس طرح آپ نے انسانیت کی انتہائی پستی سے کام شروع کیا اسی طرح انسانیت کی آخری بلندی تک اس کو پہنچایا۔ آپ کے تیار کیے ہوئے افراد میں سے ایک ایک نبوت کا شاہکار ہے اور نوع انسانی کے شرف و افتخار کا باعث، انسانیت کے مرقع میں بلکہ اس پوری کائنات میں پیغمبروں کو چھوڑ کر اس سے زیادہ حسین و جمیل، اس سے زیادہ دلکش و دل آویز تصویر نہیں ملتی جو ان کی زندگی میں نظر آتی ہے۔ دل کا پختہ یقین، ان کا گہرا علم، ان کا سچا دل، ان کی بے تکلف زندگی، ان کی بے نفسی و خدا ترسی، ان کی پاکبازی، ان کی شفقت و رافت اور ان کی شجاعت و جلادت، ان کا ذوق عبادت اور ان کا شوق شہادت، ان کی شہسواری اور ان کی شب زندہ داری، ان کی سیم و زر سے بے پروائی اور اُن کی دنیا سے بے رغبتی، ان کا عدل اور ان کا حسن انتظام دنیا کی تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ حضور کا کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے انسانی افراد تیار کیے۔ ان میں ایک ایک فرد ایسا تھا جو اگر تاریخ شہادت پیش نہ کرتی اور دنیا اس کی تصدیق نہ کرتی تو ایک شاعرانہ تخیل اور ایک فرضی افسانہ معلوم ہوتا لیکن وہ تاریخ کی ایک حقیقت ہے۔ وہ ایک ایسا انسانی وجود تھا جس میں نبوت کے اعجاز نے متضاد اوصاف و کمالات پیدا کر دیئے تھے۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں۔

خاکی و نوری نہاد بندۂ مولیٰ صفات ! ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل اس کی ادا دلفریب اس کی نگہ دل نواز !
نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو ! رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل و پاک باز !
اُس کے زمانے عجیب، اُس کے فسانے غریب عہد کہن کو دیا اُس نے پیام رحیل
ساقی ارباب ذوق، فارس میدان شوق بادہ ہے اس کا رحیق، تیغ ہے اس کی اصیل

سیرت سازی کے درخشاں نمونے

دنیا میں بے شمار اصلاحی اور انقلابی تحریکیں اُٹھیں، مگر اُن میں سے ہر ایک نے انسان کو جُوں کا توں رکھ کر خارجی نظام کو بدلنے کی تدبیریں کی ہیں لیکن ہر وہ تبدیلی حقیقی مسائل حیات کو حل کرنے کے لحاظ سے بالکل رائیگاں رہی جو انسان کو اندر سے نہیں بدل سکی۔ حضور کی زندگی کا یہ پہلو بڑا ہی اہم ہے کہ انسان کا باطن یکسر بدل گیا انسانی روپ میں جو خواہش پرست حیوان پایا جاتا تھا حضور کی سیرت سازی کی تاثیر سے وہ بالکل مٹ گیا اور اس کی راکھ سے ایک نیا انسان

اُبھر آیا۔ اس نئے انسان کے کردار کی درخشانی دیکھئے تو آنکھوں میں چکا چوند آ جاتی ہے۔ حضرت عمرؓ جیسا مکہ کا ایک لاابالی نوجوان بدلا تو کہاں پہنچا۔ حضرت ابوذر غفاریؓ کو دیکھئے کہ انقلابی جذبہ سے سرشار ہو کر جاہلیت کو چیلنج کیا اور خوب مار کھائی۔ کعب بن مالک کا کردار دیکھئے، "لبینہ" اور سُمیہؓ جیسی کنیزوں کی انقلابی شجاعت و عزیمت پر نگاہ ڈالئے۔ نجاشی کے دربار میں حضرت جعفر طیارؓ کی جرأت سے سبق لیجئے ایرانی سپہ سالار کے دربار میں ربعی بن عامرؓ کی شانِ استغناء ملاحظہ فرمائیے۔ تاروں کے اس جھرمٹ میں سے کون ہے جس کا ایمان لمعۂ آتش نہیں ہے۔

ان ہستیوں سے وہ معاشرہ بنا اور ایسے قائدین اور اراکین کے ہاتھوں وہ نظام چلا جس نے اگر بندش شراب کی منادی کی تو ہونٹوں سے لگے پیالے فوراً الگ ہو گئے اور بہترین شراب کے مٹکے مدینہ کی گلیوں میں لنڈھا دیئے گئے جس نے اگر عورتوں کو سر و سینہ ڈھانپنے کا حکم دیا تو حکم ملتے ہی کسی تاخیر کے بغیر اس کی تعمیل ہو گئی جس نے اگر جہاد کے لئے پکارا تو نو عمر لڑکے تک ایڑیوں پر کھڑے ہو کر یہ کوشش کرتے دکھائی دیئے کہ ان کو واپس نہ کیا جائے جس نے اگر چندہ طلب کیا تو حضرت عثمانؓ جیسے دولت مند تاجروں نے سامان سے لدے اونٹوں کی قطاریں لا لا کر کھڑی کر دیں۔ اور حضرت ابوبکرؓ جیسے فدائیوں نے گھر کی ساری متاع حضورؐ کے قدموں میں ڈال دی۔

وہاں ایسے مزدور بھی تو تھے جنہوں نے دن بھر کی مزدوری سے حاصل شدہ کھجوریں جنگی فنڈ میں دے کر دامن جھاڑ دیا جس نے اگر مہاجرین کی بحالی کے لئے انصار کو پکارا تو اُنہوں نے اپنے مکان اور کھیت اور باغ آدھوں آدھ بانٹ دیئے اور اخوت کا ایک بے مثل سماں پیدا کر دیا جس نے اگر مال غنیمت کو سپہ سالار کے پاس جمع کرانے کا حکم دیا تو اس شان سے تعمیل کی گئی کہ فوج ایک ایک سوئی اپنے افسر کو پیش کر دیتی تھی۔ یہ واقعہ ہمیشہ تاریخ میں درخشاں رہے گا کہ مدائن کے اموال کا ایک قیمتی حصہ عام نامی سپاہی کے ہاتھ آتا ہے اور بغیر اس کے کہ کسی کو بھی اس خزانہ زر و جواہر کا علم ہو وہ رات کی تاریکی میں چپکے سے اپنے سردار تک پہنچا دیتا ہے۔ یہ ہستیاں تھیں جنہوں نے نیکی کا ایسا ماحول تیار کیا کہ جس میں شاذ و نادر ہی جرائم ہوتے تھے حضورؐ کے پورے دس سالہ دور میں گنتی کے چند مقدمات عدالت میں آئے یہ نیکی کا ایسا ماحول تھا جس میں کوئی سی آئی ڈی نہ تھی بلکہ لوگوں کے ضمیر ہی ان کے پاسبان اور نگران بن گئے۔

یہ تھا وہ انقلاب جس نے باہر کے نظام کے ساتھ ساتھ اندر سے انسانی قلب و ذہن کو بدلا اور نیا کردار پیدا کر دیا۔ اس لئے وہ حقیقی اور بنیادی مسائل حیات کو حل کرنے میں کامیاب ہوا۔ انہی اینٹوں سے اسلامی معاشرہ کی عمارت استوار ہوئی ان افراد ہی کی طرح ان سے بنا ہوا معاشرہ بھی صالح، امانت دار، دنیا پر آخرت کو ترجیح دینے والا تھا۔ اس معاشرے کے اثر و نفوذ اور اس حکومت کے اقتدار کے تحت عوامی زندگی میں ہر طرف ایمان و عمل صالح، صدق و اخلاص، جہاد و اجتہاد، لین دین میں نظر آنے لگا آپ کے تیار کردہ افراد آزمائش کی ان بھٹیوں سے کھرے اور خالص سونے کی طرح نکلے۔ جس میں کوئی کھوٹ اور ملاوٹ نہ تھی۔ اُنہوں نے ہر نازک موقع پر قوت ایمانی قوت ارادی، پاکبازی، احساس ذمہ داری اور امانت و دیانت کے وہ بلند نمونے پیش کئے، جس کی مؤرخین و ماہرین نفسیات توقع بھی نہیں کر سکتے۔

خلفائے راشدین کا زہد اور ان کی سادگی

اس کی بہترین مثال یہ ہے کہ خلیفۃ المسلمین حضرت ابوبکر صدیقؓ کی زوجہ محترمہ کو ایک دفعہ میٹھی چیز کھانے کی خواہش ہوئی اور اس کے لئے اُنہوں نے روزانہ کے خرچ سے کچھ پس انداز کر لیا جب حضرت صدیق اکبرؓ کو اس کا علم ہوا تو اُنہوں نے وہ رقم بیت المال کو واپس کر دی اور اپنے روزانہ کے وظیفہ سے بقدر اس رقم کے کم کرا دیا۔ اُنہوں نے کہا کہ تجربہ سے یہ ثابت ہو گیا کہ اتنی رقم زائد تھی۔ اور اس سے کم میں ابوبکر کے گھرانے کا گذارہ ہو سکتا ہے مسلمانوں

کا بیت المال اس لئے نہیں کہ اس سے حاکم کا خاندان عیش کی زندگی بسر کرے اور کھانے پینے میں توسّع سے کام لے۔

آپ نے بہت سے بادشاہوں اور بہت سی جمہوریتوں کے سربراہوں کے سرکاری دوروں کی روداد سنی ہوگی اور ان کے شاہانہ تزک و احتشام اور کر و فر کا تماشا دیکھا ہوگا ساتویں فصل مسیحی کے سب سے بڑے طاقتور فرماں روا کے ایک سرکاری دورے کی تفصیل ابن کثیر کی زبانی سنئے۔ یہ ایسے حاکم کا دور تھا جس کا نام سن کر لوگوں کے دل لرز جاتے تھے اور وہ تھرا اُٹھتے تھے۔ میری مُراد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے ہے۔

ابن کثیر رقمطراز ہیں۔

"حضرت عمر بن الخطاب بیت المقدس جاتے ہوئے ایک خاکستری رنگ کی اونٹنی پر سوار تھے۔ دھوپ میں آپ کے سر پر کوئی ٹوپی اور عمامہ نہ تھا۔ کجاوہ کے دونوں طرف آپ پاؤں لٹکائے ہوئے تھے اس میں رکاب بھی نہ تھی۔ اونٹ پر موٹا اونی کپڑا تھا جسے آپ اتر کر بچھاتے تھے۔ آپ کی گٹھڑی جو چمڑے یا اون کی تھی، جس میں پتے بھرے ہوئے تھے۔ سواری کی حالت میں اسی پہ ٹیک لگاتے اور اترنے کے بعد اس کا تکیہ بناتے تھے۔ آپ کی قمیص ایک پُرانے موٹے کپڑے کی تھی جو بغل کے نیچے سے پھٹی ہوئی تھی۔

آپ نے وہاں کے سردار کو بلایا۔ چنانچہ لوگ جلومس کو بلانے گئے۔ اس کے بعد حضرت عمر نے فرمایا کہ میرا کرتہ دھو دو اور اس کے پھٹے ہوئے حصّے میں پیوند لگا دو۔ اور میرے لئے عاریتاً کوئی کپڑا فراہم کر دو۔ چنانچہ ایک ریشمی کرتہ حاضر کیا گیا۔ آپ نے اسے دیکھ کر حیرت سے پوچھا یہ کیا ہے۔ لوگوں نے عرض کیا 'ریشم ہے' فرمایا ریشم کیا ہوتا ہے لوگوں کے بتانے پر آپ نے کرتہ اتار کر غسل فرمایا۔ آپ کا پیوند لگا کرتہ حاضر کیا گیا تو آپ نے اُن کا ریشمی کرتہ اتار کر اپنا وہی کرتہ پہن لیا۔

سردار نے اُن سے کہا کہ آپ شاہ عرب ہیں اور یہاں کے لوگوں میں اونٹ کی کوئی اہمیت نہیں۔ اس لئے آپ اگر کوئی اچھا کپڑا پہن لیں اور گھوڑے پر سوار ہوں تو اہل روم اس سے متاثر ہوں گے آپ نے فرمایا ہم وہ قوم ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے اسلام کے ذریعے عزت دی تو اب اللہ کے بدلے ہم کسی چیز کو نہیں اپنائیں گے۔ ایک گھوڑا لایا گیا جس پر آپ نے اپنی چادر ڈال دی اس پر نہ لگام استعمال کی اور نہ رکاب باندھی بلکہ یونہی سوار ہو گئے لیکن تھوڑی دیر بعد فرمایا۔ روکو، روکو۔ میں نے اس سے پہلے لوگوں کو شیطان پر سوار ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ چنانچہ آپ کا اونٹ لایا گیا اور آپ اس پر سوار ہوئے۔ (البدایہ والنہایہ ج ۷، ص ۵۹)

اسی طرح مؤرخ طبری نے آپ کے ایک سفر کا حال لکھا ہے۔

"ایک بار حضرت عمر حضرت علیؓ کو مدینہ میں اپنا جانشین بنا کر سفر پر نکلے۔ آپ کے ساتھ کچھ صحابہ بھی تھے آپ بحر احمر کے ساحل کے ساتھ ساتھ جا رہے تھے اسی اثنا میں آپ اپنے غلام کی سواری پر سوار ہو گئے اور اپنی سواری غلام کو دے دی۔ جب لوگوں کا پہلا گروہ آپ سے ملا تو دریافت کیا کہ امیر المومنین کہاں ہیں۔ آپ نے فرمایا تمہارے سامنے ہیں۔ چنانچہ وہ آپ کو چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔ جب ایلہ کے مقام پر پہنچے تو لوگوں نے آپ کو پہچانا۔ (طبری ج ۴، ص ۲۰۳) خلفائے راشدین اور صحابہ کرام کی سیرت کے مختلف پہلو اور اُن کے محاسن اخلاق کتابوں میں متفرق و منتشر موجود ہیں ان سب کو جمع کر کے آپ اپنے ذہن میں ایک فرد کی مکمل زندگی اور پوری تصویر تیار کر سکتے ہیں۔ خوش قسمتی سے سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا پورا اخلاقی سراپا ہمارے لٹریچر میں موجود ہے۔ اس کو پڑھیے اور دیکھیے کہ نبوت نے اپنی تعلیم و تربیت اور اپنی مردم سازی اور کیمیا گری کے کیسے یادگار نمونے چھوڑے ہیں۔ حضرت علی کی خدمت میں شب و روز رہنے والے ایک رفیق ضرار بن ضمرہ اس طرح ان کی تصویر کھینچتے ہیں۔

"بڑے بلند نظر بڑے عالی ہمت بچی تلی گفتگو فرماتے۔ زبان و دہن سے علم کا سرچشمہ ابلتا۔ دنیا اور اس کی بہاروں سے وحشت تھی، رات کی تاریکی میں خوش رہتے آنکھیں پر آب۔ ہر وقت فکر و غم میں ڈوبے ہوئے۔ کپڑا وہ مرغوب جو موٹا جھوٹا ہو۔ غذا وہ مرغوب جو غریبانہ اور سادہ ہو۔ کوئی امتیازی نشان پسند نہیں کرتے تھے۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے ایک شب ان کو ایسی حالت میں دیکھا کہ رات نے اپنی ظلمت کے پردے ڈال دیئے تھے اور تارے ڈھل چکے تھے۔ آپ اپنی مسجد کی محراب میں کھڑے تھے۔ داڑھی مٹھی میں تھی اس طرح تڑپ رہے تھے جیسے سانپ نے ڈس لیا ہو روتے جاتے تھے اور کہتے تھے۔

"اے دنیا کیا تو میرا امتحان لینے چلی ہے؟ مجھے بہکانے لگی ہے؟ مایوس ہو جا کسی اور کو فریب دے۔ میں نے تو تجھے ایسی تین طلاقیں دی ہیں جن کے بعد رجوع کا کوئی سوال نہیں، تیری عمر کوتاہ، تیرا عشق بے حقیقت، ہائے زادِ راہ کس قدر کم ہے سفر کتنا طویل اور راستہ کتنا وحشت ناک ہے (صفۃ الصفوۃ ابن الجوزی ج ۱)

پہلا اسلامی معاشرہ

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کے نتیجے میں قائم ہونے والا یہ معاشرہ جسے آپ کی تربیت نے کندن بنا دیا تھا۔ انسانیت کی پوری تاریخ میں بہترین انسانی معاشرہ ثابت ہوا جو تمام انسانی محاسن کا جامع تھا۔ اس معاشرے کا تعارف اس کے ایک فرد حضرت عبداللہ بن مسعود نے بڑے بلیغ ہمہ گیر اور معنی خیز الفاظ میں اس طرح کرایا ہے۔ وہ لوگ تمام لوگوں میں پاکیزہ ترین دل، عمیق ترین علم اور کم سے کم تکلف والے تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی صحبت بابرکت اور دین کی سربلندی و نصرت کے لئے منتخب فرمایا تھا۔ (مسند دارمی)

حضورؐ کی سیرت سازی کا اثر بعد کی نسلوں پر

نبوت کا یہ کارنامہ زمانہ بعثت اور پہلی صدی ہجری کے ساتھ مخصوص نہیں۔ آپ کی تعلیمات نے اور آپ کے صحابہ کرام نے زندگی کے جو نمونے چھوڑے تھے۔ وہ مسلمانوں کی بعد کی نسلوں اور وسیع عالم اسلام کے مختلف گوشوں میں ہر شعبہ زندگی اور صنف کمال میں عظیم انسان پیدا کرتے رہے۔ اس لازوال مدرسہ نبوت کے فضلاء اور تربیت یافتہ اپنے اپنے زمانہ کی زیب و زینت اور انسانیت کے شرف و عزت کا باعث ہیں۔ کسی بڑے سے بڑے مصنف اور مؤرخ کی طاقت نہیں کہ ان لاکھوں اہل یقین اور اہل معرفت کے ناموں کی فہرست ہی پیش کر سکے جو اس تعلیم کے اثر سے مختلف زمانوں اور مختلف مقامات پر پیدا ہوتے رہے یہ اُن کے مکارم اخلاق۔ ان کی بلند انسانیت۔ ان کے روحانی کمالات کا احاطہ تو کسی طرح ممکن نہیں۔

ان کے یقین نے لاکھوں انسانوں کے دلوں کو یقین سے بھر دیا۔ ان کے عشق نے لاکھوں انسانوں کے سینوں کو عشق کی حرارت اور سوز سے منور کر دیا ان کے فیض صحبت نے لاکھوں حیوان صفت انسانوں کو حقیقی انسان بنا دیا۔ بادشاہوں کی صف میں بھی جو کشورستانی اور ملک گیری کے سوا کچھ نہیں جانتے تھے۔ آپ کی تعلیم نے ایسے درویش صفت اور زاہد سیرت بادشاہ پیدا کئے۔ جنہوں نے زہد و ایثار کا ایسا نمونہ پیش کیا جس کی نظیر تارک الدنیا درویشوں اور گوشہ نشین فقیروں کے یہاں بھی مشکل سے ملتی ہے۔ بقول اقبال۔

جن کی حکومت سے ہے فاش یہ رمز غریب
سلطنت اہل دین فقر ہے شاہی نہیں

مدرسہ نبوت کے ان فیض یافتہ سلاطین میں آپ صرف سلطان صلاح الدین ایوبی کا حال پڑھیں۔ نسل و نسب کے اعتبار سے جس کی رگیں عربی خون سے خالی تھیں۔ اور جو چھٹی صدی ہجری میں ہوئے ہیں۔ سلطان کے بارے میں ان کا معتمد خاص ابن شداد شہادت دیتا ہے

زکوٰۃ فرض ہونے کی ساری عمر نہیں آئی۔ اس لئے کہ اُنہوں نے کبھی اتنا پس انداز ہی نہیں کیا جس پر زکوٰۃ فرض ہو اُن کی ساری دولت صدقات وخیرات میں خرچ ہوئی۔ وفات کے وقت صرف ۴۷ درہم اور ایک سونے کا سکہ چھوڑا۔ باقی کوئی جائیداد و ملکیت۔ کوئی مکان زمین اور باغ نہیں چھوڑا۔ اُن کی تجہیز وتکفین میں ایک پیسہ بھی اُن کی میراث سے صرف نہیں ہوا۔ سارا سامان قرض لیا گیا۔ یہاں تک کہ قبر کے لئے گھاس کے پولے بھی قرض لئے گئے۔ کفن کا انتظام ان کے وزیر قاضی فاضل نے کسی حلال ذریعہ سے کیا۔ (النوادر السلطانیہ ص ۱۳)

انسانی بلندی شرافت نفس اور عالی حوصلگی کے اعتبار سے بھی سلطان تاریخ کے عظیم ترین انسانوں میں شمار ہونے کے قابل ہے بیت المقدس کی فتح کے موقع پر عیسائی فاتحین کے برخلاف سلطان نے جس شفقت ورحمت کا مظاہرہ کیا اس کا ذکر کرتے ہوئے اُن کا مغربی سوانح نگار اسٹینلی لین پول لکھتا ہے۔

اگر دنیا کو صلاح الدین کی شرافت وعالی حوصلگی کے اس معاملہ کے سوا اور کچھ نہ معلوم ہو جو اُس نے بیت المقدس کی فتح اور اسلام کے لئے اس کی بازیابی کے وقت اپنے مسیحی دشمنوں کے ساتھ کیا تھا تب بھی یہ بات ثابت کرنے کے لئے بہت کافی ہے کہ اس کے زمانے میں عالی ہمتی عظمت وشجاعت اور مردانگی وبسالت میں کوئی آدمی اس سے بڑھا ہوا نہیں تھا۔ بلکہ اس معاملہ میں وہ ہر زمانے کے لوگوں میں عظیم تر تھا۔

(سلطان صلاح الدین ص ۲۰۵)

یہ ٹھیک ہے کہ سارے سلاطین وفرمانروا جو اسلامی عہد میں گذرے وہ نورالدین۔ صلاح الدین۔ ناصر الدین محمود۔ اور اورنگ زیب۔ عالمگیر جیسے نہ تھے لیکن آپ کو جن سلاطین میں بلند اخلاقی۔ خدا ترسی، فقر وزہد۔ ایثار وقربانی اور شفقت ورحمت کی یہ شان نظر آتی ہے وہ صرف نبوت کے فیض اور دینی جذبہ کا نتیجہ ہیں۔ آپ اگر اُن کی زندگی اور سیر وسوانح کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو سراغ لگانے میں وقت نہ ہوگی کہ ان سب کا تعلق اسی ایک سرچشمہ ہدایت سے تھا جس نے ہر دور میں عظیم انسان پیدا کئے خواہ ان کا زمانہ کتنا ہی دُور رہو دراصل یہ سب اُسی درس گاہ نبوت کے فیض یافتہ ہیں جس نے تعمیر انسانیت کا کام سب سے وسیع پیمانے پر اور سب سے اعلیٰ سطح پر انجام دیا۔ اور جس کا فیض اب بھی انسانیت کے چراغ کو روشن کئے ہوئے ہے۔ اور جہاں کہیں روشنی ہے اسی ایک چراغ کا پرتو ہے۔

یک چراغیست دریں خانہ کہ از پرتو آں   هر کجا می نگرم انجمنے ساختہ اند

اس مدرسہ کی تربیت کی تاثیر اور اس کے بانی کا فیض کبھی طارق کی شجاعت، محمد بن قاسم کی بسالت اور موسیٰ بن نصیر کی ہمت کے پردے میں چمکا۔ کبھی امام ابو حنیفہ اور امام شافعی کی ذکاوت کی شکل میں ظاہر ہوا۔ کبھی امام مالک واحمد بن حنبل کی صلابت واستقامت کے پیکر میں آشکارا ہوا، کبھی نورالدین زنگی کے لطف وکرم میں جلوہ گر ہوا۔ کبھی صلاح الدین کے عزم محکم اور سعی پیہم سے ہویدا ہوا۔ کبھی امام غزالی کا جوہر کمال بن کر سامنے آیا اور کبھی شیخ عبدالقادر جیلانی کا تقدس وروحانیت بن کر دلوں کا مداوا بنا۔ کبھی ابن جوزی کی تاثیر بنا۔ اور کبھی اورنگ زیب عالمگیر کے آہنی عزم کی ہیئت میں نمایاں ہوا۔ کبھی مجدد الف ثانی کے آثار قلم میں۔ کبھی شیخ محمد بن عبدالوہاب کی دعوت بن کر اُبھرا اور کبھی شاہ ولی اللہ کی حکمت بن کر اور کبھی ان کے بعد آنے والے داعی ومصلحین کی خدمات بن کر نمایاں ہوا۔

ان تمام عبقریتوں اور اُن کی عملی وعلمی خدمات کا سلسلہ نسب اس مدرسہ اور اس کی تربیت اور اس خوش آئند عہد پر منتہی ہوتا ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے شروع ہوا۔ جس میں انسانیت کے افضل ترین امکانات کو اُبھرنے اور سرگرم ہونے کا موقع ملا اور جس میں ان صلاحیتوں

سے فائدہ اُٹھانے اور کام لینے والے افراد ملنے لگے۔ یہ مدرسہ زمانے کی چیرہ دستی اور لوگوں کی ناآشنائی کے باوجود تاریخ میں بے مثال افراد پیدا کرتا رہا۔ اور اپنے مفید اثرات و ثمرات سے انسانیت کی جھولی بھرتا رہا ہے۔

اس بات پر جس قدر افسوس کا اظہار کیا جائے کم ہے کہ ہماری جدید تہذیب اور موجودہ فکری قیادت معاشرہ انسانی کی ذمہ داریاں سنبھالنے والے افراد تیار کرنے اور انسان کی سیرت سازی میں بُری طرح ناکام رہی ہے۔ وہ سورج کی شعاعوں کو گرفتار کر سکتی ہے۔ وہ انسان کو چاند اور ستاروں پر پہنچا سکتی ہے۔ وہ ذراتی طاقت سے بڑے بڑے کام لے سکتی ہے۔ وہ علم و ہنر کو آخری نقطۂ عروج پر پہنچا سکتی ہے۔ اس کی ان کامیابیوں اور کامرانیوں سے کسی انکار کی گنجائش نہیں۔ لیکن وہ صالح اور صاحب یقین افراد پیدا کرنے سے بالکل عاجز ہے اور یہی اُس کی سب سے بڑی ناکامی اور بدنصیبی ہے۔ اور اسی وجہ سے صدیوں کی محنتیں ضائع و برباد ہو رہی ہیں اور ساری دنیا مایوسی اور انتشار کا شکار ہے۔

نئی فکری قیادت نے جو افراد دنیا کو عطا کئے ہیں وہ ایمان و یقین سے خالی۔ ضمیر انسانی سے محروم۔ اخلاقِ عالیہ سے تہی دامن۔ انسانیت کے شرف و احترام سے غافل ہیں وہ یا تو لذت و عزت کے فلسفہ سے واقف ہیں یا صرف قوم پرستی اور وطن دوستی کے مفہوم سے آشنا ہیں اس نوعیت و صلاحیت کے افراد خواہ جمہوری نظام کے سربراہ ہوں یا اشتراکی نظام کے ذمہ دار کبھی کوئی صالح معاشرہ۔ پُرامن ماحول اور خداترس و پاکباز سوسائٹی قائم نہیں کر سکتے۔ اور اُن پر خدا کی مخلوق اور انسانی کنبہ کی قسمت کے بارے میں کبھی اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

اس دنیا میں صالح ترین افراد اور صالح ترین معاشرہ صرف نبوت نے تیار کیا ہے۔ اور اسی کے پاس دل کو بدلنے اور گرمانے، نفس کو جھکانے اور رجھانے، نیکی و پاکبازی کی محبت اور گناہ و بدی سے نفرت پیدا کرنے، مال و زر، ملک و سلطنت، عز و جاہ اور سیادت و قیادت کی سحر انگیز ترغیبات کا مقابلہ کرنے کی طاقت پیدا کرنے کی صلاحیت ہے وہی افراد ان صلاحیتوں کے مالک ہوں دنیا کو ہلاکت سے اور تہذیب جدیدہ کو تباہی سے بچا سکتے ہیں نبوت نے دنیا کو سائنس نہیں دی، ایجادیں نہیں عطا کیں۔ اس کو نہ اس کا دعویٰ ہے نہ ایسا نہ کرنے پر شرمندگی اور معذرت۔ اس کا کارنامہ یہ ہے کہ اُس نے دنیا کو افراد عطا کئے جو خود صحیح راستے پر چل سکتے ہیں اور دنیا کو چلا سکتے ہیں جو اپنی زندگی کے مقصد سے واقف اور اپنے پیدا کرنے والے سے آشنا ہیں۔ نبوت نے دنیا کو ایجادوں کے عوض ابوبکرؓ اور عمرؓ دیئے ہیں، عثمانؓ و علیؓ دیئے ہیں۔ طارق و خالد اور محمد بن قاسم امام بخاری و مسلم رازی و غزالی اور ابن تیمیہ عطا کئے ہیں۔ انہیں کا وجود انسانیت کا اصل سرمایہ اور انہی کی تربیت نبوت کا اصل کارنامہ ہے۔ اس لئے دنیا و آخرت کی فلاح و بہبود کے لئے اس سرچشمہ فیض کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

ہمارے نبیؐ کی قوّتِ عمل

مولانا نیاز فتحپوری

اگر تمدنِ موجودہ کی محیر العقول نیرنگیاں، نظامِ کائنات کا یہ حیرت زا مستقر، مادی نشوو ارتقار کی ایسی محسوس بوالعجبیاں استقرار کے ایسے مسکت اور مبہوت کر دینے والے نتائج، یعنی اگر سائنس و فلسفہ کی حکومت تامہ کا یہ احاطۂ عظیم لا کھول میل کی بات ایک ستون لاسلکی کے ذریعہ سے آن واحد میں سن سکتا ہے ایک دوربین کے ذریعہ سے وہ کرۂ قمر کے ان خشک شدہ بحور اور شقاق جبل کو دیکھ سکتا ہے جن کو ہماری عریاں آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں۔ اگر وہ اپنے نظریات مسلمہ کے ذریعہ سے مغرب میں بیٹھ کر حالاتِ عالم کا مطالعہ کر کے واقعاتِ آئندہ پر حکم لگا سکتا ہے تو ہمیں ایسے محسوساتِ بصری، ایسے معلومات، سماعی اور اس نوع کے اخبار کے یقین کر لینے میں ذرا تامل نہیں لیکن اگر نظامِ برق ہم کو ہماری سماعت حقیقی سے محروم کر دینے والا ہے، اگر آلاتِ نجوم میں ہماری اصلی بینائی ہم سے چھین لینے کو آمادہ ہیں، اگر ایسے مسلماتِ قیاس ہمارے دماغ کے نقوشِ فطرت اور ہمارے دلوں کے ضرباتِ جبلی مٹا دینے والے ہیں تو ہم کو قبل اس کے کہ ایسی کورانہ بصارت، اس طرح کی کر سماعت اور اس نوع کے غیر وجدانی تیقنات پر ایمان لائیں۔ اپنے زوالِ سامعہ، اپنی تقصیرِ باصرہ اور اپنے فقدانِ روح پر ایک وسیع ماتم کرنا چاہیئے کہ کانوں نے سننا چھوڑ دیا، اور آنکھوں نے دیکھنا، دماغ نے سوچنا ترک کر دیا اور دل نے دھڑکنا مشرق جس نے مغرب پر رشک کیا، یعنی وہ فطری سادگی جو آج غیر فطری صناعت کو دیکھ دیکھ کر اس میں جذب ہو جانا چاہتی ہے، وہ روحانی سکون جو آج مادی شور و غل پر اپنے تئیں قربان کر دینا چاہتا ہے، آج ان نفوسِ قدسیہ پر ناز کرنے کے لئے زندہ نہیں، جن کی اشراقیت اس کے ہر ہر ذرہ کے لئے مایۂ حیات تھی، بلکہ وہ ان تزئینات و تعیشات پر فخر کر رہا ہے جن کو اس نے اپنی اخلاقی رفعت اپنی روحانی عظمت اور اپنی انسانی خصوصیات ہاتھ سے دے کر حاصل کیا ہے لیکن اس کی آنکھیں نہیں ورنہ وہ دیکھتا کہ آج اخلاق کیسا سوگوار ہے۔ اس کے کان نہیں ورنہ وہ سنتا کہ آج روح کیسا شدید ماتم کر رہی ہے۔

لیکن دنیا حیرت سے سنے گی کہ وہ شخص جو صرف اس شوق سے نابینا بنا کہ دوسرے کے سہارے سے چلے آج وہ اس سہارے کو بھی چھوڑ بیٹھا، وہ شخص جس نے اپنے کانوں میں روئی ٹھونس لی صرف اس امید پر کہ وہ اشارات سے اخذِ مفہوم کر لیگا، آج ان اشارات سے بھی عملاً متنفر ہے۔ پھر اگر ہم مذہب سے صرف اس لئے بیزار ہو گئے تھے، کہ مذہب وحشت و بہیمیت ہے، مذہب جہل و درندگی ہے، تو کہاں ہیں وہ مقتدایانِ مغرب اور کہاں ہیں ان کی تلقیناتِ قدسیہ جنہوں نے ہمارے اندر یہ انجذاب گدایانہ پیدا کیا! لیکن مذہب ہمارے ہاتھ سے گیا کیونکہ ہم اس سے بیزار تھے اور مغربی

عروج نے ہمیں منہ نہ لگایا کہ ہم اس کے اہل نہ تھے، اور ہمیشہ یہی حال ہوتا ہے اس قوم کا جو قومیت کے مفہوم سے بیگانہ ہوتی ہے اور قومی خودداری کو ہاتھ سے کھو بیٹھتی ہے، ہم مناظر دولت کو دیکھ کر مست و سرشار ہو سکتے ہیں، ہم مادی ترقیات کی کرشمہ زائیوں سے مبہوت و متحیر ہو سکتے ہیں، ہم زرکار ملبوسات اور ایک پرتعیش زندگی کی جلوہ طرازیوں پر حسد کر سکتے ہیں لیکن ہم کو نہیں معلوم کہ دولت کیونکر حاصل ہوتی ہے۔ ہمیں خبر نہیں کہ مادی ترقی کا راز کیا ہے ہم بالکل بیگانہ ہیں کہ ایسی پرلطف زندگی حاصل کرنے کے کیا ذرائع ہیں۔ پھر اگر صرف خواہشات قلبی و داعیات تمنا سے کوئی کامیابی حاصل ہو سکتی ہے، تو بیشک خوش نصیب ہے وہ دل جو دولت کو دیکھ کر تڑپ جاتا ہے اور قابل تہنیت و تبریک ہے وہ آرزو جو ایک آسودہ اور فارغ البال حیات انسانی سے متاثر ہو کر ہماری روح کو مالوف و مشغول کر سکتی ہے لیکن نہیں تجربہ ایک ایسی واقعیت حقہ اپنے اندر پنہاں رکھتا ہے جس سے انکار محال ہے، اور ہماری حالت اک ایسی تادیب میں ہے۔ جس کو زمانہ جھٹلانے کے لئے تیار نہیں، ہم نے وضع بدل کر دیکھ لیا، ہم نے اپنی صورتیں بدل کے تجربہ کر لیا، لیکن ترقی کا راز آج تک نہیں معلوم ہوا۔ ہم راستہ سے ہٹ گئے ہم نے ایک غلط راہ اختیار کی، جن کو ہم نے اپنے پندار میں رہبر و ہادی سمجھا تھا۔ ان کی گردنے بھی ہماری پرستش نہ کی اور اب ہم سراسیمہ و پریشان کھڑے ہیں کہ کیا کریں مگر نہیں۔ ادھر آؤ مذہب تم کو اب بھی بتانے کے لئے تیار ہے کہ حقیقی ترقی کیا ہے اور اس کے حاصل کرنے کا کیا طریقہ ہے۔

ترقیاں دو قسم کی ہیں ایک ترقی تو بالکل اضطراری ہے۔ جس میں مخلوقات عالم کو کوئی اختیار نہیں ہے، مثلاً تکوین عالم کہ پہلے ذرات سدیمیہ (ETHOR) کا فضائے عالم میں منتشر ہونا، پھر ان میں باہم انفصال اور پھر اس شدت انفعال سے جمادات کا ظہور میں آنا، جمادات سے نباتات کا پیدا ہونا اور پھر نباتات کا روح حیوانی کو قبول کرنا، روح حیوانی کا مختلف انواع میں تبدیل ہو جانا، ان انواع میں مختلف اجناس کا پیدا ہونا، اور پھر ہر جنس کے ہر فرد کا اک تدریجی انداز سے آگے بڑھنا وغیرہ وغیرہ لیکن اک ترقی اختیاری ہے جو نیچر نے بالکل ہمارے اوپر چھوڑ دی ہے، اور ہمارے اوپر کیا چھوڑ دی ہے یوں کہنا چاہیئے کہ اس نے تمام اسباب مہیا کر دیئے ہیں، صرف ہم کو ان سے کام لینے کے لئے چھوڑ دیا ہے کہ ترتیب قضایا تو ہو چکی ہے۔ صرف نتائج پیدا کرنا باقی رہ گیا ہے۔ جس کی نسبت ہم کہتے ہیں کہ ہم کو اختیار کلی دے دیا گیا ہے۔ یہ امر ظاہر ہے کہ جس وقت وہ اضطراری ترقی عالم نوع انسان کی حد تک پہنچی۔ اس میں پھر مدارج پیدا ہوئے یہاں تک کہ بڑھتے بڑھتے انسان موجودہ شکل و صورت، وضع، تمدن اور انداز معاشرت تک پہنچا، اس لئے یقینی نہیں کہا جا سکتا کہ دنیا میں سب سے پہلا انسان جو پیدا ہوا وہ کیسا تھا، اس کی یہی شکل و صورت تھی یا اس سے کچھ مختلف، تاریخ جہاں تک ہم کو اس بحث میں مدد دے سکتی ہے وہ ہرچند نہایت ناقابل اطمینان اور قلیل ہے، تاہم انسان کا زمانہ حجری یا اس سے کچھ قبل کا زمانہ جس کے کچھ حالات اس وقت ہمیں معلوم ہو سکتے ہیں، اک بین ثبوت اس امر کا ہے کہ موجودہ حالت ارتقا خدا معلوم نیچر کی کتنی صدیوں کی محنت کا نتیجہ ہے۔ یعنی وہ زمانہ کہ جس وقت انسان نے اضطراری ترقی سے نکل کے اختیاری ترقی میں قدم رکھا، کس کو خبر ہے کہ کس انداز سے رفتہ رفتہ بڑھ کر اس حد تک پہنچا، ہرچند وہ لمحہ جب ایک انسان کے وجود سے

تمام دیگر مخلوقات کو اس کا مطیع و منقاد ہونا ثابت کر دیا گیا، ہماری اختیاری ترقی کا لمحۂ اولین تھا، لیکن اس ترقی کی کُنہ دریافت کر لینے کے لیئے جس کو ہم تدبیر عالم کہتے ہیں، ضرورت تھی کہ نیچر ہماری اور مدد کرتا، اور اس نے کی، یہاں تک کہ انسان اس سطحِ فائقہ پر آ گیا جس کو دیکھ کر نیچر نے اک سکون حاصل کیا، اور ایک حقیقی اختیاری جد و جہد کا وسیع میدان ہمارے پیش نظر ہو گیا؛ ذرا میں اس کو اور صاف الفاظ میں بیان کروں گا:۔

وہ زمانہ اپنے پیش نظر رکھیے جب انسان کی آرزوئیں اور تمنائیں صرف اس حد تک محدود تھیں کہ وہ اپنی گرسنگی کو دور کر سکے، پیاس کو بجھا سکے، اور موسمی اثرات کے خلاف اپنے جسم کی حفاظت کرنے کے قابل ہو جائے۔ صحرا اس کا گھر تھا، اور ویرانہ اس کا نشیمن، وہ اس زمانہ کے درندوں میں صرف اک ذی شعور درندہ تھا، جو پتھروں کو گھس گھسا کے شکار کرنے کے کام میں لاتا تھا اور جن جانوروں کا وہ شکار کرتا تھا۔ انہیں کی کھال وہ اپنے جسم سے لپیٹ لیتا تھا، ہم کو خبر نہیں کہ وہ اپنی ان ضروریات سے زیادہ اور کوئی جذبات بھی اپنے اندر رکھتا تھا یا نہیں، اور اگر رکھتا تھا تو وہ جذبات متعدی بھی تھے یا نہیں یعنی وہ ان کو دوسروں تک منتقل کر بھی سکتا تھا یا نہیں، اس کے بعد وہ زمانہ آیا، جب اس کو اپنی انہیں مختصر و محدود ضروریات کے متعلق کچھ اور سلیقہ پیدا ہوا، اور اس میں اس نے ایک حد تک ترقی کی؛ بہرحال یہ تھی ہماری ابتدائی ہستی، اور یہ تھی بنیاد اس عقل کی جس نے آج عالم میں ایک قیامت برپا کر رکھی ہے اس کے بعد رفتہ رفتہ ایک زمانہ وہ آیا جب انسان نے اس بات کو سمجھنا شروع کیا کہ اس کا دل اور بھی بہت سی باتوں کو چاہتا ہے اور وہ ان کے حاصل کرنے کی تدابیر میں مصروف ہوا۔ یہاں تک کہ اللہ نے اس طور سے اس کی عقل کو پختہ کر دیا اور وہ ساعت آ گئی جب دنیا میں احتساب کی بنیاد پڑی اور ہمارے لیئے ہماری جنس سے زیادہ زیرک و صاحب فراست ہستیاں نمودار کی گئیں۔ ہم نے ان کو اپنا مقتدا سمجھا یا نہ سمجھا یہ بات دوسری ہے لیکن اس میں کلام نہیں کہ ہم اس قدر ضرور محسوس کرتے تھے کہ وہ ہم سے برتر و اعلیٰ تھیں اور انکی عقل ہماری عقلوں سے زیادہ پختہ و مستحکم۔ مگر نیچر ابھی پورے طور سے فارغ نہیں ہوا تھا اس کو ابھی اور کام کرنا تھا اس نے آدم پیدا کیا۔ شیث، نوح وغیرہ پیدا کیئے۔ یہاں تک کہ نیچر کی طمانیت کا زمانہ قریب آتا گیا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نگاہ حقیقت شناس سورج، چاند اور ستاروں کی کنہ کو صرف ایک شب و روز کے عروج و زوال میں پوری طرح سمجھ گئی اب وہ زمانہ قریب آتا جاتا تھا جس کی تخلیق عالم منتظر تھی، انسانی ہستیاں اب بہت بلند ہو گئی تھیں، ان کی آرزوئیں بہت وسیع ہو چلی تھیں اور ان کے حوصلے بہت بلند نظر آتے تھے۔ ان میں وہ مادہ پیدا ہو گیا تھا۔ جس سے کام لینے کے بعد دنیا میں حقیقی امن و سکون پھیل سکتا تھا، حضرت موسیٰ تشریف لائے اور ایک منادی کی حیثیت سے اپنی خدمت انجام دے کر چلے گئے، حضرت عیسیٰ مبعوث ہوئے اور اس انسان کے دیکھنے کی تمنا اپنے دل میں لیے ہوئے گزر گئے جو تکمیل منشائے خداوندی کے لیئے ایک دفعہ اور ہمیشہ کے لیئے آنے والا تھا،

ابتدائے عالم سے ساری کائنات ترقی کرتی چلی آ رہی تھی، خدا معلوم کتنے دریا صحرا ہو گئے اور کس قدر صحرا جبال، معلوم نہیں کتنے پہاڑ نباتات میں تبدیل ہو گئے، اور کس قدر نباتات حیوانیت میں، حیوان کو انسان ہوئے زمانہ ہو گیا۔

یہاں تک کہ انسانیت اللہ کی زمین پر پھیلی، اور اس کی آرزوؤں، اس کی تمناؤں نے کیسے کیسے تنوعات پیدا کر کے دکھا دیئے۔ بیداری نے سارے عالم پر قبضہ کر لیا تھا، لیکن فطرت حقیقی ابھی سو رہی تھی۔ انسانی بستیاں آباد تھیں، لیکن اللہ کا گھر ویرانہ تھا یعنی انسان، انسان تھا، لیکن خلیفۃ اللہ نہ تھا۔ زمانہ کی لاتعداد گردشوں کے بعد، آسمانوں کے بیشمار چکروں کے بعد آخر کار وہ ساعت آئی۔ جب خداوند جل وعلا نے براہ راست اپنا ہاتھ تمدن عالم کی طرف بڑھایا اور وہ تنہا عظیم ترین ہستی، وہ خلاصہ موجودات، وہ تکوین عالم کا انتہائی نقطہ تگ و دو، جو اساس مدنیت و تہذیب، یعنی وہ آسمانی صداقت جس کی جگہ اس وقت تک دنیا میں کسی نے پر نہیں کی تھی، وہ خداوندی حقیقت جو اس وقت تک عالم میں بے نقاب نہیں کی گئی تھی، یعنی وہ تمنائے خلیل اللہ جس نے کتنے آزر خانے اپنے انہماک جستجو میں برباد کر دیئے، وہ جلوۂ منور جو ارنی گوئے کوہ طور کے لئے بھی عریاں نہیں کیا گیا۔ وہ فارقلیط موعود جس کا غلغلہ صدیوں قبل رہبانیت مسیح میں بلند ہو چکا تھا، منودار ہوا۔ پردے اٹھا دیئے گئے ساری دنیا اچھل پڑی، ذرے جگمگا اٹھے، ظلمت کی جگہ نور نے عدوان و بغاوت کی جگہ امن و صلاحیت نے لے لی اور بالآخر کار وہ آخری حقیقت کاملہ ظاہر کر دی گئی، جس کے لئے انسانیت اس دنیا میں مضطرب تھی، اور وہ حسن حقیقی پیش نظر ہو گیا جس کے لئے عالم تڑپ رہا تھا۔

وہ ہم جیسا سریع الاظفار، مستقیم القامتہ، متحرک بالارادہ حیوان ناطق تھا لیکن پھر بھی سارے انسانوں سے جدا، وہ اور تمام انبیاء و رسل کی طرح مدعی اصلاح و مبلغ احکام خداوندی تھا۔ لیکن ان سب سے ارفع و اعلیٰ، اس نے ہم کو وہ باتیں بتائیں۔ جو اس وقت تک کسی نے نہ بتائی تھیں، اس نے ہم کو ان رموز سے آشنا کیا جو اس وقت تک کسی نے ظاہر نہ کیے تھے، یعنی اس نے ہمارے سامنے ایک ایسی عملی زندگی کا نمونہ پیش کیا جو اس وقت تک ہمارے خیال میں نہ تھا، اور اس نے ہم کو ایسا درس دیا جو اس سے قبل کسی نے نہ دیا تھا۔ اس نے اتنا زبان سے نہیں کہا جتنا خود کر کے دکھایا، اور اس نے کبھی کوئی بات ایسی نہیں کی۔ جس کو کہتے ہوئے وہ شرماتا۔

گروہ صوفیہ جانتا ہے کہ وجود محض سے مراد ذات باری ہے اور وہ اسی ذات کا مظہر تھا۔ یعنی اس تنہا خصوصیت باری کا پرتو حقیقی تھا، جو سوائے ذات باری کے کچھ نہیں۔ اس نے ہم کو بتایا کہ زندگی کیا ہے، جینا عبارت کس چیز سے ہے۔ اس نے ہمیں وجود کا مفہوم بتایا اور اس خصوصیت حیات سے آگاہ کیا۔ جس سے اس وقت تک ہم غافل تھے

جس وقت وہ مبعوث ہوا، نہ صرف اس حصۂ زمین کی جو اس کا مسقط الراس تھا۔ بلکہ سارے عالم کی کیا حالت تھی؟ ہم اس کے متعلق کوئی بحث نہیں کرنا چاہتے، کیونکہ بارہا اس پر روشنی ڈالی جا چکی ہے اور دنیا کا ہر شخص اس سے آگاہ ہے، لیکن ہم اس وقت صرف اس راز سے بحث کرنا چاہتے ہیں۔ جس نے اس کے مشن کو کامیاب کیا وہ باوصف اس کے کہ اُمی غریب تھا، وہ باوصف اس کے کہ کوئی اس کا سردھرا اور تربیت کرنے والا نہ تھا، وہ باوصف اس کے کہ کوئی اس کا ہمنوا و ہم زبان نہ تھا، کوئی حامی مددگار نہ تھا، وہ باایں ہمہ نقائص ظاہری آخر تھا کیا؟ جس کی اُمیت نے فراستوں کو دنگ، جس کی غربت نے دولت و امارت کو سرنگوں، جس کی بے کسی نے قوموں کو آمادہ حمایت، اور

جس کی لاچارگی نے اک دنیا کو اس کا طرف دار بنا دیا۔ فلسفہ مبہوت ہے، علم سراسیمہ ہے اور دانش متحیر۔ لیکن ہم بتانا چاہتے ہیں کہ وہ نہ کوئی سحر تھا اور نہ کوئی افسوں، نہ کوئی طلسم تھا اور نہ کوئی نظر بندی بلکہ وہ صرف اس کی قوت عمل تھی اور اس کے ارادہ کا استحکام، لیکن ہاں اس میں کلام نہیں کہ اس کی قوت عمل اک ایسی زبردست قوت تھی۔ اس کے ارادہ کا استحکام اک ایسا استحکام تھا جو تخلیق کی عالم ابتدا سے لیکر اس وقت تک زمانہ پیش نہ کر سکا۔ اور اس کی کھلی ہوئی وجہ ہے کہ وہ جملہ صفات باریہ کا مکمل ترین مظہر خصوصی تھا اور وجود مطلق جو اضطراب عمل کا سرچشمہ حقیقی ہے اس کے اندر کام کر رہا تھا۔ کوئی انسانی قوت، کوئی تزکیہ نفس، کوئی استقامت فکر، کوئی استقلال رائے اور کوئی اصابت ذہن وعقل، اپنی انتہائی مدارتقا میں بھی اس قوت عمل کا درک صحیح نہیں کر سکتی۔ کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کا مبدا رفیضان خداوندی تھا، ہم نے جو کچھ سمجھا، یا ہم جو کچھ حکم لگا سکتے ہیں وہ اس کے مجرا کو دیکھ کر۔

جس وقت اس مقدس ہستی نے فرائض تبلیغ ادا کرنے کی ابتدا کی ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ اس کام کے لئے وہ کیسا پرآشوب زمانہ تھا۔ بہیمیت پورے طور سے انسانی نسلوں میں نفوذ کر چکی تھی اور زمانہ سے جہات تہذیب یکسر محو ہو چکے تھے۔ لوگ گناہ کرتے تھے۔ لیکن اک عشر لمحہ کے لئے بھی وہ غور نہ کر سکتے تھے کہ یہ گناہ ہے، وہ بتوں کی پرستش کرتے تھے اور اس کو اک صداقت تسلیم کرتے تھے وہ وحوش و بہائم کی طرح معاشرت مدنیت کو پامال کر رہے تھے اور انہیں ذرا احساس نہ تھا کہ یہ اک ناشائستہ فعل ہے۔ غرضیکہ عصیان وضلالت کی حکومت تھی اور انسانیت زمین کے اوپر بار ہو گئی تھی۔ کسے خیال ہو سکتا تھا کہ ایسے زمانہ میں اور علی الخصوص ایسی سرزمین سے جو مرکز حیوانیت تھا اللہ اک ایسی ہستی ظاہر کرے گا۔ جو چند سال کے قلیل عرصہ میں نہ صرف اس قطعہ زمین بلکہ سارے عالم میں اک انقلاب عظیم پیدا کرا دے گی۔ مگر نہیں۔ فطرت غافل نہ تھی، وہ خاموش تھی، لیکن سوتی نہ تھی۔ ظلمت شدید کا انتظار تھا کہ نور کی درخشانی زیادہ نمایاں ہو، سخت تاریکی کی ضرورت تھی کہ بجلی کوندتے ہی سب کی آنکھیں اسی طرف متوجہ ہو جائیں جب یہ سب کچھ ہو گیا، تو وہ بھی ہو گیا جس کے لئے یہ سب کچھ ہوا تھا۔ پھر اس سرشار محبت کا حال کسے نہیں معلوم۔ اک شیفتگی تھی جو کسی دماغ میں پیدا نہیں ہوئی اک والہانہ جسارت تھی جو کسی قلب سے ظاہر نہیں ہوئی۔ وہ نوحؑ نہ تھا کہ اپنی قوم سے تکلیف پاکر "رب لا تذر علی الارض من الکفرین دیاراً" پکار اٹھتا، وہ موسیٰ نہ تھا کہ فراعنہ عرب کی غرقابی اس کی انتہائے سعی تبلیغ ہوتی، وہ عیسیٰؑ نہ تھا کہ حواریین سے تنگ آکر دین و دنیا کے جھگڑوں سے پناہ مانگتا۔ وہ سقراط نہ تھا کہ قوم کے ہاتھوں سے پریشان ہو کر چیخ اٹھتا کہ "تم نہیں مانتے تو نہ مانو۔ لاؤ مجھے زہر کا پیالہ دو کہ پی لوں اور پھر تمہیں نہ دیکھ سکوں" وہ تو محمدؐ تھا، وہ مصیبتیں برداشت کرنے اور راحتیں پہنچانے وہ گالیاں سننے اور دعائیں دینے کو آیا تھا۔ وہ تو خاتم النبیینؐ تھا کہ اللہ کو اس کے بعد پھر اس دنیا میں کوئی رسول بھیجنا مقصود نہ تھا، وہ تکمیل دین اور اتمام نعمت کے لئے آیا تھا، وہ سمجھتا تھا کہ امانت الٰہی کا حامل ہونا آسان نہیں، دوست دشمن ہو جائیں گے اور عزیز بیگانے، اپنے چھٹ جائیں گے۔ وطن عالم غربت ہو جائے گا۔ لیکن باوصف اس

آگاہی وعلم کے اس نے غارِ حراء سے نکل کر جو پہلا وعظ دیا، کیا کوئی شخص بتا سکتا ہے کہ تادم واپسیں اس سے اس نے انحراف کیا ہو۔ راہ میں کانٹے اس کے بچھائے گئے، گالیاں اسے دی گئیں۔ قاتلانہ حملے اس پر ہوئے، تنہا بے یار و مددگار وہ چھوڑ دیا گیا۔ غرضیکہ دنیا اس پر بالکل تنگ کر دی گئی لیکن آج ہم غیروں کی تاریخیں تلاش کرتے ہیں اور پھر بھی ہم کو کوئی مثال ایسی نظر نہیں آتی کہ اس کی استقامت قدسیہ اور اس کے انہماک مقدسہ نے اپنے جادۂ اولین سے ایک انچ قدم ادھر ادھر ہٹایا ہو، پھر یہی نہیں کہ اس نے اسی ایک ابتلا کو ایسے پرشوکت تحمل و سکون سے برداشت کیا ہو۔ نہیں بلکہ اس سے زیادہ سخت آزمائشوں سے وہ دوچار ہوا یعنی لالچ اسے دیئے گئے، دولت اس کے سامنے پیش کی گئی سلطنت و حکومت اس کے قدموں پر ڈال دی گئی، مگر دنیا کے اس فاقہ کرنے والے اور ٹاٹ کا ملبوس استعمال کرنے والے سب سے بڑے انسان نے دولت سے منہ پھیر لیا، سلطنت کو ٹھکرا دیا، اور کہہ دیا کہ "محمدؐ نہ دولت جمع کرنے آیا ہے اور نہ سلطنت حاصل کرنے، وہ تو دنیا میں حقیقی سکون پھیلانے آیا ہے۔ جس کے لئے دنیا مضطرب تھی، وہ تو عالم میں ایک سچے امن کا بیج بونے آیا ہے۔ جس کا عالم منتظر تھا، پس اگر تم اس سکون پھیلانے میں کچھ اس کی مدد کر سکتے ہو، اس امن کے قائم کرنے میں اس کا ہاتھ بٹا سکتے ہو، تو آؤ، ورنہ اس کو اسی کے حال پر چھوڑ دو"، آہ، خلق و رافت کی ایسی پاکیزہ مثالیں محبت و شفقت کے ایسے دلگداز واقعے، دیانت و حصانت کے ایسے عظیم الشان کارنامے، امانت و استقامت کی ایسی عجیب و غریب نظیریں، جیسی اسوۂ محمدیؐ نے پیش کیں، ممکن نہیں کہ کوئی انسانی نظام عصبی پیش کر سکے، مذہب عیسوی نے حالانکہ وہ دنیا میں صرف درسِ رہبانیت دینے آیا تھا، دشمن سے عوض لینا مکروہ قرار دیا ہے۔ لیکن محمدؐ نے دشمنوں کے ساتھ بھی لطف و رفق کا درس دیا، اور اس درس کی عظمت کتنی بڑھ جاتی ہے، جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ تو ہم سے دنیا بھی ترک نہیں کراتا ایک تارک دنیا بادیہ نشین، ایک مجرد صحرا نورد جس میں قدرتاً جذباتِ عجز و انکسار کا پیدا ہونا لازمی ہے حضرت عیسٰیؑ کی اس تعلیم کو "دشمنوں کو بھی معاف کر دو" جس آسانی کے ساتھ قبول کر سکتا ہے ظاہر ہے۔ لیکن اللہ اللہ شائستگی کے اس اوج، تہذیب کے اس عروج، انسانیت کی اس ترقی اور روحانیت کی اس ارتقاء کو دیکھئے کہ باوصف متاہل ہونے کے، باوصف جملہ مصالح دنیاوی کے پیش نظر ہونے کے، باوصف اس کے کہ تعلقات معیشت و معاشرت۔ ہم میں تمام وہ حسیات پیدا کر دینے والے ہیں جو اک حیاتِ انسانی کے لئے اس عالم میں ناگزیر ہیں، ہم کو یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ دشمن کے ساتھ بھی مہربانی کرو! اور پھر یہی نہیں کہ صرف زبانی تعلیم دی جاتی ہو بلکہ اس کا نمونہ بھی پیش کیا جاتا ہے، اور نہ صرف نمونہ ہی پیش کیا جاتا ہے۔ بلکہ اس کے اثرات بھی دکھا دیئے جاتے ہیں۔ اس کی کامیابیاں بھی صفحاتِ تاریخ پر ثبت کر دی جاتی ہیں اور دور و نزدیک ہر متنفس سے یہ بات منوالی جاتی ہے کہ کونین میں حصول اقتدار، دین و دنیا میں کسبِ مدارج کا اگر کوئی صحیح و جامع ذریعہ ہے تو وہ صرف وہی تعلیم مقدسہ ہے جو مذہب اسلام دیتا ہے۔ آج کل لفظ قومیت جیسا کثیر الاستعمال لفظ ہے اور کوئی نہیں، اور اس میں شک نہیں کہ یہی اصل اصول ہے لیکن عہد رسولؐ و صحابہ اطہار میں اس کا استعمال زبان پر اس قدر زیادہ نہ تھا جتنا درد اس کا دل میں تھا۔ پھر دیکھو کہ وہی

قومیت جس کا بکھرا ہوا شیرازہ آج ہم سے جمع نہیں ہو سکتا، اس کی حسِ صحیح پیدا کرنے والا کون تھا، کیا ہم نہیں تھے نہ جن کی مغرور گردن، باوصف اس کے کہ حلق "قومیت قومیت" چیختے مجروح ہو گیا ہے ایک غریب فرد قوم کا سلام قبول کرنے کے لیے بھی نہیں جھکتی، یا وہ تھے جو اپنے پسے اور پکے دشمنوں اور ایذا پہنچانے والوں کی نجاست کو خود اپنے ہاتھ سے دھوتے تھے اور اس کے حق میں دعا کرتے جاتے تھے۔ پھر جو آج ہم قومی ترقی کے لیے مٹے جا رہے ہیں۔ دوسروں کے عروج کو دیکھ دیکھ کر کڑھ رہے ہیں تو کیا ایک لمحہ کے لیے ہم اس بات پر غور نہیں کر سکتے کہ وہ کیا اصول تھے جن سے ہم نے کسی زمانہ میں ترقی کی تھی، اور وہ ترقی کیا تھی۔ جس نے مادیات و روحانیات دونوں کو ہمارا محکوم بنا دیا تھا یہ یاد رکھو کہ مسلمان اگر کبھی ترقی کر سکتا ہے اور اگر اس کی ترقی وقیع ہو سکتی ہے تو وہ صرف مسلمان ہی بننے سے ہو سکتی ہے۔ مشرق و مغرب جمع ہو سکتے ہیں۔ شمال جنوب سے مل سکتا ہے۔ لیکن ترقی اور اسلام سے انحراف قیامت تک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے، یہ ممکن ہے کہ ایک شخص تارکِ اسلام ہو اور زر و جواہر کا انبار اس کے گھر میں ہو، لیکن یاد رکھو کہ رشک کرنے کی چیز یہ نہیں ہے بلکہ ہمیں رشک اس شخص کی زندگی پر کرنا چاہیئے۔ جو حقیقتاً بڑا آدمی ہے، پھر بڑا آدمی ایک دولتمند نہیں کہ اس کی دولت اور خاک کا ڈھیر برابر ہے، بڑا آدمی ایک بادشاہ نہیں کہ عزت اس کی ذات کی نہیں بلکہ تاج کی ہے بلکہ بڑا آدمی وہ ہے جو اپنے بعد ابنائے جنس میں اور دنیا میں ایک ایسی مستقل یادگار چھوڑ جائے۔ جس سے ہمیشہ استفادہ ہو سکے۔ بڑا آدمی وہ تھا جس نے اول اول یہ معلوم کیا کہ ایک اونس پانی کا بخار ایک پونڈ وزن کو ایک بالشت اٹھا سکتا ہے، جس پر علم جر ثقیل (MECHANICS) کی بنیاد رکھی گئی۔ لیکن آج اسے کوئی نہیں جانتا اور نہ اس کی زندگی پر کوئی رشک کرتا ہے، بڑا آدمی وہ تھا، جس نے مقناطیس کی یہ خصوصیت دریافت کی کہ زلزلہ کے وقت اس کی قوت کہربائی سلب ہو جاتی ہے۔ بڑا آدمی وہ تھا جس نے پہیہ کی مدوّر مقنطوری پر غور کیا، لیکن ہم میں سے کوئی ان جیسا بننا پسند نہیں کرتا اور نہ حامیان قومیت یہ حس قوم میں پیدا کرتے ہیں مگر اسوۂ رسولؐ کا مطالعہ کرو، کہ سب سے پہلے اس نے جس چیز کی ہمیں تعلیم دی وہ قوت عمل تھی اور ارادہ کا استحکام جس کے احاطہ سے دین و دنیا کی کوئی ترقی باہر نہیں۔ رات دن میں پانچ وقت نماز فرض سمجھ کر پڑھنا، زکوٰۃ کا پابندی کے ساتھ ادا کرنا، بشرط استطاعت حج کرنا یہ اور تمام دیگر شعائر اسلام سے منجملہ اور اغراض کے ایک غرض یہ بھی تھی کہ قوت عمل ہم سے مفقود نہ ہو جائے اور ہم اس نکتہ سے غافل نہ ہو جائیں کہ کام کو اس کے وقت پر کرنا، اور کسی مدعا کے حصول کے لیے برابر جد و جہد کرتے جانا۔ یہی ہے مقصود حیات اور یہی ہے اک تنہا ذریعہ فلاح، پھر جبکہ ہم شعائرِ اسلام سے یکسر بیگانہ ہیں اور ان کی وقعت دل سے مٹا بیٹھے ہیں، تو کیوں ان کی برکات حاصل کرنے کے آرزومند ہیں۔

ایک معترض یہ کہہ سکتا ہے کہ موجودہ ترقی یافتہ اقوام میں سے کوئی مذہب اسلام کی پابند نہیں۔ لیکن یہ اعتراض اٹھ جاتا ہے جب ہم ذرا جستجو کرتے ہیں اور انجیر میں اس ترقی کا سبب بھی اسی قوت عمل کو پاتے ہیں جو ہمارے ہاں

اصل اصول حیات ہے اور اس اعتراض کی وقعت تو اور بھی نہیں رہتی جب ہمارے معیار سے ان کی ترقی حقیقی ترقی میں شمار ہونے کے قابل نہیں، اس میں شک نہیں کہ انہوں نے مادی ترقی کی جو ہمارے مقاصد زندگی سے باہر نہیں لیکن یہ ترقی انسانیت کی ترقی نہیں ہے، بلکہ ذکاوت، و ذہانت کی ترقی ہے جو لبغیر شمول روحانیت، حقیقتاً ایک جسد بے روح ہے اور دنیا کے لیے ہلاکت و بربادی، موجودہ زمانہ جنگ میں غالباً اس امر کے ثبوت کے لئے بہت سے دلائل مل سکیں گے، اور اس لیے ہمیں اس سے زیادہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں، رہا یہ امر کہ روحانیت کیا چیز ہے، اور اس کی ترقی، مادیات کی ترقی پر کس طرح مشتمل ہے، یہ ایک جدا بحث ہے جس پر کبھی آئندہ لکھا جائے گا۔ فی الحال ہمیں اسوۂ محمدی کی اس خصوصیت کا ذکر کرنا تھا جو ہماری رائے میں اصل راز اشاعت اسلام، استحکام قومیت، اور ثروت وجاہ کا تھا، غالباً اس سے انکار کسی کو نہ ہوگا۔ لیکن رہا یہ امر کہ اس قدر وقت خراب کرنے کے بعد بھی کچھ بھی کو اس سے فائدہ ہوا ہو، تو وہ معلوم ہے۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ صرف زبانی وعظ و تلقین کی ضرورت نہیں، ضرورت ہے ایسے نفوس کی جن کا حال ہی ہمارے لیے مثال ہو، مگر ایسے نفوس کہاں، عہد رسالت گزر گیا، زمانہ صحابہ ختم ہو گیا اب کہ اس دور صالح کا ذکر بھی اپنی محافل میں نہیں۔ کیونکر امید کی جا سکتی ہے کہ ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق کبھی ہو سکے گی۔ رہا بلا اسباب و علل کے انقلاب عظیم، سو ہمارے اعتقاد میں اللہ کر سکتا ہے اور اب جزئیات کے لیے اگر کوئی سہارا ہے تو صرف یہی اعتقادی تسلی، ورنہ آرزوؤں کی اس فراوانی نے ہمیں کب کا مایوس کر کے خودکشی پر آمادہ کر دیا ہوتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور شعر

عبد الوہاب خان عاصم

فاطرِ فطرت نے نفسِ انسانی کی اصلاح اور ارتقاء کے لیے بمقتضائے وقت و مقام جو رہنما بھیجے ان کو ایک نصاب عمل دیا اور اس کی تعمیل کے ذرائع بھی دیئے تاکہ اس سے مخالف قوتوں کو دبا سکیں، مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں جادوگروں کا زور تھا، جو رسّی اور لکڑی کے ٹکڑوں کو سانپ کرکے دکھا سکتے تھے، ان کے مقابلہ میں حضرت موسیٰ ؑ کو یہ معجزہ دیا گیا کہ وہ اپنے عصا کو اژدہا بنادیں اور جادوگروں کا زور توڑ دیں۔ حضرت عیسےٰ علیہ السلام کے زمانہ میں جالینوس کے اصولِ طب پر بڑا ناز کیا جاتا تھا جس سے خدا فراموشی اور مادہ پرستی عام ہوگئی تھی اس لیے حضرت عیسیٰ ؑ کو ایسا روحانی معجزہ ملا کہ وہ بیماروں کو صرف چھو کر اور مُردوں کو محض اپنے اعجازِ نفس سے زندہ کرسکتے تھے۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں عرب میں کہانت اور شاعری کا بڑا زور تھا، خاص کر شعرائے عرب کو اپنی طلاقت پر ایسا غرور تھا کہ وہ اپنے مقابلہ میں دیگر ممالک کو عجم (گونگا) کہتے تھے۔ بعض کو تو یہاں تک زعم تھا کہ ان سے بہتر شعر کہنا ناممکن ہے۔ چنانچہ سات قصیدے کعبہ کے دروازہ پر اسی دعوے سے لٹکائے گئے تھے۔ ایسے زمانہ میں جب رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن پاک کی آیتیں سنانی شروع کیں تو فصحائے عرب اس کی فصاحت اور بلاغت اور جامعیت کو دیکھ کر مبہوت ہوگئے۔ ان کی مشکل یہ تھی کہ وہ نہ اس کو شعر کہہ سکتے تھے، اس لیے کہ قرآن کا اندازِ بیان ان کے اصولِ موضوعہ کے مطابق نہ تھا۔ نہ یہ ممکن تھا کہ وہ اس کو شعر نہ کہیں، اس لیے کہ سوا ایک مفروضہ وزن کے حسنِ کلام کے وہ تمام اصول جو ان کے مسلّمات کے مطابق کسی کلام کو شعر بنا سکتے ہیں، اس میں پائے جاتے تھے۔ پھر ہر بات تاثیر میں ڈوبی ہوئی تھی اور ساتھ ہی جو پیش گوئیاں کی جاتی تھیں، وہ بھی صحیح ثابت ہوتی تھیں، اس لیے سب نے آپ ؐ کا اعجازِ کلام تسلیم کرلیا اور وہ آپ ؐ کو کاہن اور شاعر کہنے پر مجبور ہوگئے۔

کاہن اور شاعر

کہانت اور شاعری ان میں معیوب نہ تھی بلکہ موجبِ فخر سمجھی جاتی تھی۔ لیکن کیونکہ وہ اعجازِ نبوت کو تسلیم نہ کرتے ہوئے آپ ؐ کو (نعوذ باللہ) کاہن اور شاعر کہتے تھے، اس لیے اس فریب کو بھی قرآن نے توڑ دیا اور کہانت تو کہا آپ ؐ کی ذات سے شعر کی بھی نفی کردی اور کاہنوں اور شاعروں کی اس طرح مفصل تنقید فرمادی کہ (۱) یہ کاہن تو باتیں اُڑا لیتے ہیں (اِدھر اُدھر کی باتیں سُن کر) یا اپنی معلومات پر قیاس کرکے پیشین گوئی کرتے ہیں اور غیب دانی کا دعویٰ کرتے ہیں) (۲) ناقابلِ اعتبار اور بدکار ہوتے ہیں (۳) اور اکثر ان میں سے جھوٹے ہوتے ہیں اور شاعروں کو گمراہوں کا پیشوا کہہ کر فرمایا کہ (۱) یہ ہر میدان میں بھٹکتے پھرتے ہیں (ہر قسم کی اچھی بُری بات کے پیچھے لگے رہتے ہیں اور بیشتر جھوٹ اور مبالغے سے کام لیتے ہیں۔ (۲) جو کہتے ہیں کرتے نہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی واضح کردیا کہ ہر شاعر اس حکم میں داخل نہیں، جو صاحبِ ایمان اور نیکوکار ہیں وہ اس سے مُستثنیٰ ہیں۔ سُورۃ شعراء آخری رکوع) مختصر یہ کہ نہ کاہنوں کی قیاس آرائی کو احکامِ نبوت سے کوئی نسبت ہے نہ شاعرانہ موہومات اور واہی تباہی باتیں حقائق اور مکارمِ اخلاق کا مقابلہ کرسکتی ہیں لیکن

مخالفین یہی سمجھتے تھے کہ ایسی حیرت انگیز باتیں کرنے والا یا تو کاہن ہو سکتا ہے، یا شاعر، یا جادوگر، یا دیوانہ۔ بہرحال وہ آپؐ کی نبوت کا اعتراف نہ کرتے تھے۔ اس لیے اتمام حجت کے لیے اُن سے کہا گیا کہ اگر تم کو شبہ ہے اور تم قرآن کو اللہ کا کلام نہیں سمجھتے، تو ایسی کوئی سُورت یا اس جیسی کوئی عبارت تم بھی بنا لاؤ اور ساتھ ہی یہ چیلنج بھی دے دیا گیا کہ تم سب مل کر بھی اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکو گے چنانچہ سب مدعیانِ فصاحت اپنی کوششوں میں ناکام ہو کر رہ گئے اور جب ان چند کلمات میں اعجاز فصاحت و بلاغت کا مشاہدہ کیا۔

اِنَّآ اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَرْ اِنَّ شَانِئَکَ هُوَ الْاَبْتَرُ

تو ماننا پڑا مَا هٰذَا قَوْلُ الْبَشَرِ

(یہ آدمی کا کلام نہیں ہے)

نتیجہ یہ ہُوا کہ سبعہ معلقات جو معجزاتِ فصاحت سمجھے جاتے تھے کعبے کے دروازے سے اُتار لیے گئے اور شعرائے عرب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔

سیرتِ نبویؐ کا یہ وہ پہلو ہے جس سے کہانت کا اس طرح ابطال ہو گیا جس طرح اعجازِ موسوی سے جادو کا اور شعر کی اصلاح کی بنیاد ایسی پڑی جیسی تن بیمار کی اعجازِ مسیحائی سے۔ کہانت کا دار و مدار چونکہ قرائن و قیاس پر تھا جو اکثر غلط ہو جاتے تھے اور چونکہ اس قسم کی اوہام پرستی کا قوت عمل پر سخت مہلک اثر پڑتا تھا، اس لیے اس کا تو تختہ ہی اُلٹ دیا گیا اور کاہنوں کو بلا استثنا ناقابلِ اعتبار اور اُن میں سے اکثر کو جھوٹا کہا گیا لیکن کیونکہ شاعری بیکار چیز نہ تھی بلکہ اس فن کا استعمال غلط کیا جاتا تھا، شعرائے جاہلیت ایک دوسرے کو آپس میں بھڑکانے اور لڑانے کے لیے اپنا سارا زور کلام صرف کرتے رہتے تھے اور خود کسی مسلک کے پابند نہ ہوتے تھے۔ اس لیے اُن کی اس قسم کی لاابالی اور بے عملی زندگی کے مقابلہ میں ایک راہِ عمل بتا کر سمجھا دیا گیا کہ جو اس راہ پر چلیں گے اچھے شاعر سمجھے جائیں گے۔

ایک شبہ سیرت رسولؐ اللہ کا شعر سے یہ علاقہ قرآن کریم اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہے لیکن بعض قرینے ایسے بھی ہیں، جن سے شعر کی نسبت مخالف اور موافق دونوں پہلو نکلتے ہیں، مثلاً قرآن کریم کا ارشاد کہ: وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا یَنْۢبَغِیْ لَهٗ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِکْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِیْنٌ ۝ لِیُنْذِرَ مَنْ کَانَ حَیًّا وَّیَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ ۝

(سورۃ یٰسین) واضح کرتا ہے کہ (۱) آپؐ کو شعر کا علم نہیں دیا گیا (۲) نہ یہ علم آپ کے لائق تھا (۳) بلکہ آپؐ کا منصب تو تعلیم قرآن اور تبلیغ احکام دین تھا تاکہ ہر ایسے شخص کو جو زندہ ہو یعنی جس میں ہدایت پانے کی صلاحیت ہو، پاداشِ عمل سے ڈرائیں اور اگر کوئی آپؐ کی بات نہ بھی مانے، تو کم سے کم اس پر حجت پوری ہو جائے تاکہ وہ یہ نہ سمجھنے پائے کہ مجھ سے تو کسی نے حق بات کہی ہی نہ تھی۔ اس قرینے سے شعر کا منافی منصب نبوت اور خلاف منشائے ہدایت ہونا پایا جاتا ہے۔ (۴) اس کے علاوہ شاعروں کو گمراہوں کا پیشوا کہنا (وَالشُّعَرَاءُ یَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ) اور آپ کا ایسے لوگوں کا رہنما ہونا جن میں ہدایت پانے کی صلاحیت ہو (لِیُنْذِرَ مَنْ کَانَ حَیًّا) ایسا قرینہ ہے جس سے مذکورہ بالا نظریہ کی تائید ہوتی ہے اور ظاہر ہوتا ہے کہ شعر اور نبوت میں وہی تقابل

ہے جو ضلالت اور ہدایت میں ہے!

اسی ذیل میں یہ احادیث ہیں۔

(۱) لِاَنْ یَّمْتَلِئَ جَوْفُ رَجُلٍ قَیْحًا یَّرِیْہِ خَیْرٌ مِّنْ اَنْ یَّمْتَلِئَ شِعْرًا (صحیح بخاری)

البتہ پُر ہونا مرد کے پیٹ کا کیڑوں سے بہتر ہے اس سے کہ پُر ہو شعر سے۔

(۲) اَلشِّعْرُ مِنْ مَزَامِیْرِ اِبْلِیْسَ (صحاح)

شعر شیطانی باجوں میں سے ایک ہے۔ اسی قسم کا ایک قول ہے: اَلشِّعْرُ سِحْرٌ مِّنَ الزِّنَا۔ یعنی شعر محرک زنا ہے (یہ حدیث نہیں ہے)

(۳) اَلشُّعَرَاءُ کَذَّابُوْنَ (صحاح) شاعر بہت جھوٹے ہوتے ہیں

(۴) ھَلَکَ الْمُتَنَطِّعُوْنَ (مسلم) ہلاک ہوئے وہ لوگ جو بناوٹ سے باتیں کرتے ہیں، یعنی جو لوگ شعر و سخن میں تصنع اور مبالغہ کرتے ہیں۔

دوسرا نظریہ یہ ہے کہ قرآن کریم میں نفس شعر کی مذمت نہیں ہے بلکہ ان شعراء کی مذمت ہے جو شعر کا غلط استعمال کرتے ہوں چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ وَالشُّعَرَاءُ یَتَّبِعُھُمُ الْغَاوٗنَ ۝ اَلَمْ تَرَ اَنَّھُمْ فِیْ کُلِّ وَادٍ یَّھِیْمُوْنَ ۝ وَاَنَّھُمْ یَقُوْلُوْنَ مَالَا یَفْعَلُوْنَ ۝ لا اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَذَکَرُوا اللّٰہَ کَثِیْرًا وَّانْتَصَرُوْا مِنْ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا ط وَسَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ

(سورہ شعراء) یعنی۔

۱۔ شاعروں کی پیروی وہ کرتے ہیں، جو بے راہ ہوتے ہیں۔

۲۔ شاعر ہر میدان میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔

۳۔ شاعروں کے قول و فعل میں مطابقت نہیں ہوتی۔

۴۔ البتہ ان شاعروں میں سے وہ مستثنیٰ ہیں، جو ایمان اور حسن عمل سے متصف ہیں اور بیشتر یاد الٰہی میں مصروف رہتے ہیں، اور اگر ان پر ظلم ہوتا ہے، تو اس کی مدافعت کرتے ہیں (خود ظلم نہیں کرتے یعنی اگر کوئی شعر کے ذریعہ سے ان کی مخالفت ہجو وغیرہ سے کرتا ہے، تو وہ بھی اس کا جواب شعر میں دیتے ہیں۔ الخ

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شعر کا عیب و صواب شاعر کی طرف منسوب ہوتا ہے نہ کہ نفس شعر کی طرف۔ چنانچہ امراء القیس کو جو دور جاہلیت کا جلیل القدر شاعر تھا، حضورؐ نے اَشْعَرُ الشُّعَرَاءِ وَقَائِدُھُمْ اِلَی النَّارِ۔ یعنی سب سے بڑا شاعر اور شاعروں کا جہنمی لیڈر فرمایا اور حسان بن ثابتؓ کی نسبت جو عہد رسالت کے شاعر تھے، ارشاد ہوا۔ اِنَّ اللّٰہَ یُؤَیِّدُ حَسَّانَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ (اللہ روح القدس کے ذریعہ سے حسّان کی مدد کرتا ہے)

اس قسم کی احادیث جن سے شعراء کی موافقت ہوتی ہے اور بھی ہیں مثلاً:

۱- اِنَّ مِنَ الشِّعْرِ لَحِکْمَۃً (بخاری)
واقعی بعض شعر سراسر حکمت ہوتے ہیں۔

۲- الشُّعَرَاءُ تَلَامِیْذُ الرَّحْمٰن (شاعر رحمن کے شاگرد ہوتے ہیں یعنی شاعروں کو سرچشمۂ رحمت سے الہام ہوتا ہے۔)

۳- اِنَّ لِلّٰہِ تعالیٰ کَنْزًا تَحْتَ الْعَرْشِ مَفَاتِیْحُہٗ اَلْسِنَۃُ الشُّعَرَاءِ (عرش معلّٰی کے نیچے اللہ کے خزانے ہیں جن کی کنجیاں شاعروں کی زبانیں ہیں۔

۴- عَلِّمُوْا صِبْیَانَکُمُ الشِّعْرَ فَاِنَّہٗ یُوْرِثُ الشَّجَاعَۃَ - (اپنے بچوں کو شعر سکھاؤ اس سے شجاعت پیدا ہوتی ہے۔

۵- صحابہؓ نے حضورؐ سے پوچھا، شعر کہنا اچھا ہے، یا بُرا۔ فرمایا:
ھُوَ کَلَامٌ فَحَسَنُہٗ حَسَنٌ وَ قَبِیْحُہٗ قَبِیْحٌ۔ یعنی شعر بھی عام کلام کی طرح دو قسم کے ہوتے ہیں، اچھی قسم کے شعر اچھے ہوتے ہیں، بُری قسم کے بُرے۔

۶- کعبؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اللہ نے شعر کی مذمت کی ہے، آپ مجھے کیا فرماتے ہیں، فرمایا:
اِنَّ الْمُؤْمِنَ یُجَاھِدُ بِسَیْفِہٖ وَلِسَانِہٖ۔ یعنی جو شعرا تائید اسلام اور ہجو کفار میں شعر کہتے ہیں وہ گویا تلوار سے جہاد کرنے والے مومن کی طرح زبان سے جہاد کرتے ہیں۔

۷- اسی قسم کے شعرا کی نسبت بسلسلۂ حدیث سابقہ آپؐ نے فرمایا: وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَکَاَنَّمَا تَرْمُوْنَھُمْ نَضْحُ النَّبْلِ - (قسم اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، البتہ تم کافروں کو اس طرح تیروں سے مارتے ہو، جس طرح جہاد میں تیر چلاتے ہو) یعنی تمہارے شعر کفار پر تیروں کی طرح کارگر ہوتے ہیں۔

ان احادیث اور اسی قسم کی دوسری حدیثوں سے ثابت ہوتا ہے کہ از رُوئے قرآن و حدیث شعر میں فی نفسہٖ کوئی عیب نہیں بلکہ جیسا شاعر ہوتا ہے ویسا ہی شعر کہتا ہے۔

لیکن شُبہ یہ ہوتا ہے کہ جب شعر میں فی نفسہٖ کوئی قباحت نہ تھی جس کی وجہ سے اہل ایمان کے لیے روا رکھا گیا، تو پھر کیا وجہ تھی کہ اس فن کو شائستۂ نبوت نہ سمجھا گیا، اور اگر یہ فن محل قباحت ہونے کی وجہ سے یعنی اس وجہ سے آپؐ کے لائق نہ تھا کہ عموماً شعر میں جھوٹی اور بے سرو پا باتیں کہی جاتی ہیں اور شاعر اکثر بے عمل ہوتے ہیں، تو جب ان عیوب کے نہ ہونے پر اہل ایمان عام شعراء سے مُستثنیٰ کر دیے گئے، تو آپؐ تو بہ سبب سرچشمۂ ایمان و ہدایت ہونے کے بدرجۂ اولیٰ مستثنیٰ ہو سکتے تھے۔ لیکن ایسا نہ ہُوا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شعر میں شعراء کے مذکورہ عیوب کے علاوہ فی نفسہٖ کوئی نہ کوئی بات ایسی اور بھی ہے جو منافی منصب نبوت اور خلاف منشائے رب ہو۔ پھر سیرت نبویؐ سے شعر کی اصلاح اور ترقی کیا معنی؟

شعر کی حقیقت: اس شبہ کو رفع کرنے کی غرض سے اوّل ہم کو شعر کی حقیقت پر ایک تفصیلی نظر ڈالنی چاہیئے۔

شعر کلام کی اس مخصوص ترتیب کا نام ہے، جس کے لفظوں میں اصول موسیقی کی تصویر اور معنوں میں جذبات انسانی کی تاثیر پائی جائے۔ شعر کے اجزائے ترکیبی چار ہیں۔ لفظ، معنی، وزن، قافیہ۔ اور غالباً ہمیشہ ہر جگہ انہیں اربعہ عناصر پر شعر کی بنیاد رہی ہے آج کل جو شعر کی نئی نئی تعریفیں سننے میں آتی ہیں، وہ انہیں اجزا میں سے کسی نہ کسی کی تفصیل یا تحلیل ہوتی ہے، مثلاً کہا جاتا ہے۔

(۱) دلکش الفاظ کا مجموعہ شعر ہے۔

(۲) حسنِ معانی کا اثر شعر ہے۔

(۳) کلمات کی متناسب الحرکات ترتیب شعر ہے۔

(۴) مشترکہ جز و کلمات کی منفصل تکرار شعر ہے۔

(۵) کبھی ان تمام تعریفوں کو جمع کر کے کہا جاتا ہے کہ شعر ایسے بامعنی الفاظ کا مجموعہ ہوتا ہے جس میں وزن اور قافیہ پایا جائے۔

(۶) کبھی اس پر یہ اضافہ اور کیا جاتا ہے کہ ایسا کلام ارادے سے کہا گیا ہو تو شعر ہے ورنہ نہیں کبھی بطریق تفریق اس میں سے بعض اجزا کی نفی کی جاتی ہے، مثلاً

(۱) شعر کے لیے ارادہ ضروری نہیں۔

(۲) شعر کے لیے نہ ارادہ ضروری ہے نہ قافیہ۔

(۳) شعر وزن کا محتاج نہیں ہے۔

(۴) شعر کسی مفہوم یا معنیٰ میں مقید نہیں ہو سکتا۔

(۵) شعر کے لیے لفظ کی قید بھی نہیں ہے۔ (محسوسات بھی شعر ہو سکتی ہیں)

(۶) ان آزادیوں کے دیکھتے ہوئے اب صرف یہ کہنا باقی رہ گیا ہے کہ شعر کو شعر نہیں کہا جا سکتا!

شعر کی تعریف

جو لوگ شعر کو لفظ، معنی، وزن اور قافیہ کی قید سے آزاد رکھنا چاہتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ شعر چونکہ شعور سے مشتق ہے، اس لیے ہر وہ چیز جو کسی قسم کا معین یا غیر معین شعور پیدا کرے شعر ہو گی، مثلاً مرئیات، مشمومات، مسموعات، مذوقات، ملموسات، متخیلات، متوہمات، متمیزات وغیرہ سب شعر ہیں۔ پانی کی صفائی ہو یا کیچڑ کا گدلاپن، گلاب کی خوشبو ہو یا شراب کا تعفن، بلبل کا ترانہ ہو یا کوے کی کائیں کائیں، آم کی شیرینی ہو یا اندراین کی تلخی، پھول کی نرمی ہو یا کانٹے کی خلش سب شعر ہیں جن سے کوئی خوشی یا رنج یا رحم یا غصہ یا ہمت یا ڈر یا اور کسی قسم کا تاثر پیدا ہو۔ اس نظریہ کی رو سے شعر صرف احساس کا نام ہے، اظہار اس میں شامل نہیں، لیکن چونکہ یہ ممکن ہے کہ ایک چیز سے ایک طبیعت متاثر ہو، دوسری نہ ہو یعنی وہ چیز کسی کے لیے شعر ہو کسی کیلئے نہ ہو اور ہو سکتا ہے کہ ایک چیز سے ایک ہی طبیعت کسی وقت متاثر ہو کسی وقت نہ ہو۔ یعنی وہی چیز کبھی شعر ہو کبھی نہ ہو اس لیے اس تعریف سے شعر متعارف نہ ہو گا اور ضرورت ہو گی کہ اس میں احساس کے ساتھ اظہار بھی شامل ہو، لیکن چونکہ احساسات کی طرح اظہار کے ذریعے بھی متعدد ہیں اور ہر ذریعۂ اظہار کو شعر کہنے میں وہی دشواری ہے جو ہر احساس کو شعر کہنے میں تھی، اس لیے شعر کے تعین کی غرض سے کوئی ایسا ذریعۂ اظہار تسلیم کرنا پڑے گا، جو شعور سے ناشی ہو اور دوسروں میں شعور پیدا کرے اور ظاہر ہے کہ یہ ذریعہ

الفاظ و معانی یعنی کلام ہی کا ہے، پھر چونکہ جنس کلام کا اطلاق اس کی ہر نوع پر ہوتا ہے، یعنی جس نوع کو شعر فرض کیا جائے وہ بھی اور جس نوع کو شعر فرض نہ کیا جائے وہ بھی دونوں برابر کلام ہیں، اس لیے یہ تعریف بھی کہ شعر ایسا کلام ہے جس سے اظہارِ احساس ہو، کافی نہ ہوگی بلکہ اس کے ساتھ کسی ایسی قید کی اور ضرورت ہوگی جس سے شعر اور غیر شعر کا امتیاز پیدا ہو اور وہ وزن ہی ہے یعنی وزن ہی کلام کا وہ جزو ہے جس سے شعر کی صورت نوعیہ متعین ہوتی ہے۔ قافیہ بھی اس کی کمی پوری نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ قافیہ شعر کا زیور تو ضرور ہے، لیکن نفس شعر میں داخل نہیں ہے اور یہ مسلم ہے کہ نہ قافیہ کے اضافے سے نثر پر شعر کا اطلاق ہو سکتا ہے نہ قافیہ کی کمی سے شعر میں فرق آتا ہے۔ لہٰذا جب تک کلام میں وزن تسلیم نہ کیا جائے گا شعر کا مصداق سمجھ میں نہ آئے گا اور شعر کی سب سے زیادہ محکم اور جامع و مانع تعریف یہی ہوگی کہ کلام موزوں کو شعر کہا جائے۔

وزن شعر کا جزو لاینفک ہے

کسی قوم کی شاعری وزن کی قید سے خالی نہیں پائی جاتی۔ یہ اور بات ہے کہ زمین کے فاصلے، زبانوں کے اختلاف اور زمانہ کے انقلاب سے شعر کی صورت مختلف نظر آئے اور ایک ملک کا شعر دوسرے ملک میں ناموزوں سمجھا جائے، مثلاً قدیم ہند کے علوم و فنون خاص کر مذہبی کتابوں کا وہ ذخیرہ جو نظم میں ہے اور جس کی سب سے بڑی اور پہلی کتاب وید ہے۔ اس کو پڑھ کر یا سُن کر ایران و عرب میں کوئی موزوں نہیں کہہ سکتا بلکہ خود ہندوستان کی موجودہ شاعری کے اصول اب اس سے مختلف ہو چکے ہیں۔ قدیم ایرانی شاعری کا وہ دفتر جو گاتھا، اوستا اور ژند کے اوراق میں دستیاب ہوا ہے وہ موجودہ فارسی شاعری کے لحاظ سے بالکل ناموزوں نظر آتا ہے، حالانکہ ان کتابوں کا نظم ہونا مسلم ہے۔ اسی طرح عبرانی شاعری کے وہ نمونے جو اناشید و مزامیر داؤد کی صورت میں موجود ہیں اُن کے نظم ہونے کا دعویٰ اُن کے نام، اُن کی ترتیب کلام اور تاریخی شہادت سے ثابت ہے، لیکن ان کو نہ موجودہ عروضِ عرب کی رُو سے شعر کہہ سکتے ہیں، نہ مشرق و مغرب کے کسی اور اصول شعر کے لحاظ سے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے باوجودیکہ ہر ملک میں تناسب اعضا ہی کا نام حُسن ہے لیکن معیارِ تناسب میں ملک تو ملک ایک جگہ کے دو آدمیوں کا مکمل اتفاق نہیں ہوتا، چین میں جس ناک نقشے کو حُسن کہا جاتا ہے، ہندوستان میں اس کو بدصورتی سے تعبیر کرتے ہیں، یہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ ایک شخص جس صورت کا دیوانہ ہے، دوسرے کو اس میں کوئی خاص بات نظر نہیں آتی، وہ یہی کہتا ہے۔

سودا جو ترا حال ہے ایسا تو نہیں وہ
کیا جانیے تو نے اسے کس حال میں دیکھا۔

اسی طرح شعر جو تناسب کلام کا نتیجہ ہے، اگر اس کا موجودہ معیارِ تناسب گذشتہ سے اور ہندوستان کا انگلستان سے مختلف پایا جائے، تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ زمانۂ قدیم میں شعر نہ تھا اور اگر تھا، تو اس میں وزن نہ تھا، یا انگریزی شاعری جو ہمارے اصول سے مختلف ہے ناموزوں ہے۔

شعر کا ماخذ نغمہ ہے

اس کے علاوہ یہ امر مُسلّم ہے کہ شعر کی فطرت میں نغمہ مضمر ہے اور چونکہ نغمہ کا دار و مدار صرف آواز کے توازن پر ہوتا ہے، اس لیے شعر اس توازن سے خالی نہیں ہو سکتا بلکہ شعر کا وجود اصول نغمہ پر اس طرح مبنی ہوتا ہے، جس طرح لفظوں کا وجود آواز پر۔ انہیں اوزان غنائی کے مطابق شعر کے اوزان بنتے اور بدلتے رہتے ہیں، اور انہیں اوزان کے

اختلاف کی وجہ سے کبھی کلام موزوں، ناموزوں اور ناموزوں موزوں نظر آتا ہے۔ مثلاً موجودہ اُردو شاعری کا یہ اصول ہے کہ شعر کے دونوں مصرعے برابر ہوں، لیکن انگریزی میں کبھی دو مصرعے برابر ہوتے ہیں، کبھی ایک مصرعہ ایک انچ کا، دوسرا سات انچ کا۔ اس کی مثال عربی شاعری میں بھی پائی جاتی ہے۔ جہاں یک رُکنی دو رکنی شعر بھی ہیں اور رکنی کی رکن کا ایک مصرعہ بھی۔ اس کو اُردو کی شاعرانہ طبیعت موزوں نہیں سمجھتی، لیکن بہ حیثیت فن اس کی موزونیت کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

رفع اشتباہ

ان امور سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں (۱) اول یہ کہ جن اجزا سے شعر مرکب ہوتا ہے ان میں سے الفاظ کا وزن ہی ایسا جزء ہے جس سے کلام میں شعر اور غیر شعر کا امتیاز پیدا ہوتا ہے، یہ شعر کا بیرونی پہلو ہے (۲) دوسرے ہر حال اور خیال جس سے جذبات انسانی کی تحریک ہو شعر ہے۔ یہ شعر کا اندرونی پہلو ہے جس کو عموماً شعریت سے تعبیر کیا جاتا ہے اور ضمناً یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ شعر کے اجزائے ترکیبی جواب ہیں، وہی رسول اللہؐ کے زمانہ میں تھے بلکہ کم و بیش انہیں پر ہمیشہ شعر کا انحصار رہا ہے' ان میں سے نفس شعر کا تعلق فطرت سے ہے اور اس کی صورت کا صنعت سے۔ فطرت کا کون سا راز ہو گا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر منکشف نہ ہُوا ہو۔ لیکن صنعتیں بے شمار ہیں جن سے آپؐ کو سروکار نہ تھا۔ منجملہ اُن کے ایک صنعت شعری بھی ہے، جس کا آپ کو علم نہ تھا یعنی آپ کی طبیعت میں شعریت موجود تھی، لیکن آپؐ شاعر نہ تھے نہ فن شعر آپؐ کے لائق تھا، اس لیے کہ اوّل تو الفاظ کی موزونیت ہو یا تخیل کی پرداز، فن شعر ہر حالت میں انسان کی کوشش اور صناعت سے متعلق ہے اور نبوّت انسان کی کوشش سے بالاتر ایک مرتبہ ہے جس کی اصل فطرتِ حق ہے۔ ایسی صورت میں اگر آپؐ شاعر ہوتے اور دین فطرت صنعت کا لباس پہن لیتا' تو دنیا کی نظر میں وہ بھی مصنوعی ہو کر رہ جاتا۔ دوسرے شعر کا مقصد تحریک جذبات ہے اور نبوّت کا منشاء تہذیب جذبات۔ اگر آپؐ کا دستور العمل موعظت اور حکمت کے بجائے شعر و شاعری ہوتا یعنی آپؐ کا پیغام صرف مُحرّک جذبات ہوتا' مفید تعقل نہ ہوتا، تو اصلاح نفس اور احقاق حق کا نتیجہ برآمد نہ ہوتا جس کی صراحت قرآن کریم میں آپ کی ذات سے شعر کی نفی فرما کر' ان لفظوں میں کی گئی ہے کہ (آپؐ جو کچھ فرماتے ہیں) وہ تو ذکر حق اور قرآن یعنی نصاب دین ہے تاکہ ہر ایسے شخص کو ڈرائیں' جو زندہ دل ہو اور جو منکر ہوں اُن پر حق ثابت ہو جائے تیسرے آپؐ کا منصب صرف یہ تھا کہ جو احکام آپؐ پر نازل ہوں وہ بجنسہٖ لوگوں کو پہنچا دیں۔ اپنی طرف سے کچھ نہ کہیں جیسا کہ شاعروں کا طریقہ ہوتا ہے۔ اگر آپؐ شاعر ہوتے' تو قرآن کو بھی انسانی خیالات اور حسن تفکر کا نتیجہ سمجھ لیا جاتا جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا تھا۔ اور اگر ایسا نہ بھی سمجھا جاتا، تو بھی آپؐ کا شاعر ہونا کس کام آتا جبکہ قرآن کے علاوہ بھی احکامِ دین میں آپؐ کے تخیّل یا تفکر اور جذبات کا بالکل دخل نہ تھا بلکہ آپؐ صرف وہی بات فرماتے تھے جو بذریعۂ وحی آپؐ کو معلوم ہوتی تھی جس کی وضاحت قرآن میں اس طرح فرمائی گئی ہے۔ وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ (سورہ نجم) آپؐ اپنی خواہشاتِ نفس سے کچھ نہیں فرماتے بلکہ وہی فرماتے ہیں' جو بذریعۂ وحی آپؐ کو معلوم ہوتا ہے)، اس لیے فن شعر کسی طرح آپؐ کے لائق نہ تھا۔

لیکن اس کا نتیجہ یہ نہیں ہو سکتا کہ آپؐ کے لائق نہ ہونے کی وجہ سے فنّ شعر سرے سے معیوب ہو جائے اور کسی کو بھی شعر کہنا جائز نہ ہو، اس لیے کہ اوّل تو یہ ضروری نہیں کہ جو امر آپؐ کے لیے مناسب نہ ہو' وہ کسی کے لیے بھی مناسب نہ ہو یا جو بات آپؐ کو روا ہو' وہ سب کے لیے روا بھی جائے۔ مثلاً آپؐ کسی کے شاگرد نہ تھے۔ نہ کسی کی شاگردی آپؐ کو زیبا تھی' تو اس کا نتیجہ یہ نہیں ہو

سکتا کہ کسی کا شاگرد ہونا کسی کو بھی زیبا نہ ہو اس لیے کہ آپؐ تو براہِ راست سرچشمۂ علم سے فیضیاب ہوتے تھے۔ اس لیے آپؐ کو کسی کی شاگردی نہ ضروری تھی نہ مناسب، لیکن جو لوگ اس مرتبہ پر فائز نہیں ہوتے، ان کو اکتساب علم کے لیے کوئی نہ کوئی ذریعہ اختیار کرنا ضروری ہے، کیونکہ اکتسابِ علم کی ہدایت قرآن و حدیث میں موجود ہے۔ اسی طرح اگر حاملِ وحی ہونے کی وجہ سے آپؐ کے لیے شاعری مناسب نہ تھی تو جن پر وحی نہ آتی ہو اُن کے لیے یہ فن نازیبا یا بیکار نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ قرآن کریم میں اس کی اجازت موجود ہے۔ پھر شعر کو فی نفسہٖ معیوب، موجبِ غوایت یا منافی ہدایت کس طرح کہا جا سکتا ہے، بلکہ اس جہت سے تو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے شعر کو ایسا نوازا کہ قرآن کریم میں شعر کی ذاتی صلاحیت کی بنا پر اس فن کا اچھا یا بُرا استعمال کرنے والوں کی جو اصولی تقسیم کی گئی تھی، اس کی وضاحت اس طرح فرمائی کہ: اِنَّ مِنَ الشِّعْرِ لَحِکْمَۃً۔ یعنی ہر شعر موجبِ غوایت نہیں بعض شعر سراسر حکمت ہوتا ہے تاکہ شعر کے فی نفسہٖ معیوب ہونے کا شبہ ہی نہ رہے۔

شعر اور حکمت

حکمت دراصل قول و فعل کی راستی کو کہتے ہیں اور اصطلاحاً نفسِ انسانی کا علم و عمل میں امکانی کمال حاصل کرنا یعنی حقائقِ موجودات کا جیسی کہ وہ ہیں حتی الوسع علم حاصل کرنا اور جو مختلف قوتیں فطرت نے اس کو دی ہیں، ان کو اعتدال کے ساتھ عمل میں لانا حکمت ہے، لیکن کیونکہ صحیح اعتدال مزاج کا ہر شخص کو علم نہیں ہو سکتا بلکہ یہ وہ مرتبہ کمال ہے جس پر انبیأ علیہم السلام تائیدِ الٰہی سے فائز ہوتے ہیں، اس لیے حکیم کامل دراصل نبی ہوتا ہے، جس کا منصب یہ ہوتا ہے کہ جو ہر نفس کی ایسی حفاظت کرے جس سے اس کی جملہ قوتوں میں خواہ وہ نظری ہوں یا عملی افراط و تفریط سے خلل واقع نہ ہو بلکہ ہر قوت دوسری قوت کی اس طرح مدد کرتی رہے کہ اُن کے باہمی امتزاج سے نفس میں وہ کیفیت متوسط پیدا ہو جائے جس کو عدالت کہتے ہیں اور جس پر نفس کی صحت کا دارومدار ہے، اور اگر صحتِ نفس میں فرق آئے، تو وہ اس کو بحال کرنے کی تدبیر کر سکے اور اس طرح اس جوہرِ شریف کو شریف سے شریف تر بنا کر خلافتِ الٰہی اور حیاتِ ابدی کا مستحق بنا دے۔

اس مقصد یعنی صحیح اعتدال مزاج کے قائم رکھنے یا حاصل کرنے کے لیے حکیم کامل جو اصُول تجویز کرتا ہے، اُن کا ضمنی نتیجہ کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ نفس کے بعض خاصّوں یا اُن کے عواطف میں جن کو جذبات اور وارداتِ قلب سے تعبیر کیا جاتا ہے، ایک قسم کی غیر معتدل حرکت یا سکون پیدا ہو جائے جو دراصل شاعر کا نصب العین ہوتا ہے، یعنی جس طرح حکمت کا اصل منشا تہذیب قوائے انسانی ہے اور اس کے احکام سے ضمناً بعض جذبات کا برانگیختہ ہونا اور بعض کا افسردہ ہونا ممکن ہے، اسی طرح اگرچہ شعر کا مطمع نظر جذباتِ انسانی کو مشتعل یا مضمحل کرنا ہوتا ہے، لیکن ضمناً اس سے اصلاحِ نفس کا نتیجہ بھی برآمد ہوتا رہتا ہے۔ شعر کا یہی پہلو ہے جس کو دربارِ رسالت سے شریکِ حکمت ہونے کی سند ملی ہے اور شعر کی یہی فطری صلاحیت ہے جو شاعر کو اَلشُّعَرَاءُ تَلَامِیْذُ الرَّحْمٰنِ کا مصداق بنا دیتی ہے۔

پردۂ رازیکہ سخن پروری است
سایۂ از پردۂ پیغمبری است

قرآن اور شعریت

قطع نظر ان مباحث کے علم بیان کے وہ اسالیب جو شعر شاعری کی جان ہیں، قرآن کریم میں کثرت سے پائے جاتے ہیں، مثلاً الفاظ و معانی کا حُسن، ترتیب کلمات کی متانت، طرزِ بیان کی جدت، ہم قافیہ

جملوں کا تواتر، تشبیہ، استعارہ، کنایہ، تمثیل وغیرہ کی دل کشی، حقائق اور جذبات کا اہتمام غرض ایک عروضی وزن کے سوا وہ سب باتیں جو کلام میں شعریت پیدا کرتی ہیں، قرآن کریم میں بدرجہ اتم موجود ہیں، بلکہ کہیں کہیں موزوں جملے بھی پائے جاتے ہیں، مثلاً:

۱-	بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ	مفعولن مفعولن فاعلات
	قرآن کی پہلی آیت	بحرِ سریع مقطوع مطوی موقوف
۲-	ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ	فاعلاتن فاعلاتن فاعلات
	سورہ بقرع ۱۰ آیت ۸۴	بحرِ رمل مسدس مقصور
۳-	ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ	فاعلاتن فاعلاتن فاعلات
	سورہ بقرع ۱۰ آیت ۸۵	بحرِ رمل مسدس مقصور
۴-	لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا	فاعلاتن فاعلاتن فاعلن
	سورۂ آلِ عمران ع ۱۰ آیت ۹۱	بحر رمل مسدس محذوف
۵-	اِنَّا اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ	فعلن فعلن فعلن فعلن
	سورۂ کوثر ع ۱ آیت ۱	بحرِ متقارب مثمن اثلم

بسم اللہ، ایکہ منکر شعری بگو جواب
موزوں چراست آنکہ بقرآں مقدم است

علیٰ ہذا القیاس لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ کا وزن ہے، مفعول مفاعیل مفاعیلن فاع دبحر ہزج مثمن اخرب مکفوف اخرم اہتم، جو رباعی کا وزن ہے۔

ان شواہد سے ظاہر ہے کہ محض شعر کہنا یا سننا سنانا کسی طرح محلِ اعتراض نہیں بلکہ فنِ شعر کا غلط استعمال باعثِ غوایت اور صحیح استعمال موجبِ ہدایت اور قابلِ تحسین و ستائش ہے۔ یہی وجہ تھی کہ دربارِ رسالت سے ایسے شعرا کی وقتاً فوقتاً حوصلہ افزائی فرمائی جاتی تھی۔

آپؐ کا ذوقِ سخن

جس طرح یہ مسلم ہے کہ آپؐ نے کبھی شعر نہیں کہا نہ شعر کہنا آپ کو زیبا تھا، اسی طرح یہ بھی ثابت ہے کہ آپ کو شاعرانہ کلام سے دلچسپی تھی، شعر سنتے تھے۔ شعر پر تنقید فرماتے تھے، شعراء کی حوصلہ افزائی کے لیے مناسب داد اور انعام دیتے تھے، آپ کی خدمت میں جمع ہو کر شعرا مشاعرے کرتے تھے اور کبھی کبھی زبان مبارک سے ایسے کلمات ادا ہوتے تھے جو شعر سے مشابہ ہوتے تھے۔ کبھی کبھی کسی شاعر کا کلام بھی آپؐ کی زبان پر آجاتا تھا، چنانچہ شمائل ترمذی میں صفتِ کلام رسول اللہ فِی الشِّعْرِ کے عنوان سے ایک باب اسی قسم کی احادیث کا ہے، مثلاً:

۱- حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مثال دینے کے لیے ابن رواحہ کے شعر پڑھتے تھے۔

۲- ایک مرتبہ آپؐ نے فرمایا شعرائے عرب میں لبید نے کیا ہی بہتر شعر (اشعر کلمہ) کہا ہے، اَلَا کُلُّ شَیْءٍ مَا خَلَا اللّٰہَ بَاطِلٌ (سب چیزیں اللہ کے سوا فنا ہونے والی ہیں)

۳۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حسان بن ثابت کے لیے مسجد میں منبر بچھواتے جس پر حضرت حسان کھڑے ہوکر رسول اللہ پر فخر کرتے اور جو آپ پر اعتراض ہوتے ان کا جواب دیتے اور آپ فرماتے: اِنَّ اللّٰهَ يُؤَيِّدُ حَسَّانَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ مَا نَافَحَ اَوْ فَاخَرَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم، یعنی اللہ تعالیٰ جبرئیل کے ذریعہ سے حسان کی مدد کرتا ہے جب تک وہ رسول اللہ کی طرف سے موافقت کرتے ہیں یا مفاخرت کرتے ہیں۔

۴۔ اسی ذیل میں یہ حدیث ہے۔ اَجِبْ عَنِّیْ اَللّٰهُمَّ اَيِّدْهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ یعنی جواب دے میری طرف سے (اے حسان) یا اللہ مدد کر حسان کی جبرئیل کے ذریعہ سے۔

۵۔ ایک مرتبہ پتھر کی چوٹ سے حضرتؐ کی ایک انگلی زخمی ہوگئی اور خون بہہ نکلا۔ آپؐ نے فرمایا:

هَلْ اَنْتِ اِلَّا اِصْبَعٌ دَمِيْتِ
وَفِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَا لَقِيْتِ

تُو تو انگلی ہے خون میں بھری ہوئی اور جو تُو نے دیکھا راہِ خدا میں دیکھا ہے۔

۶۔ فتح مکہ کے بعد ۸ھ ہجری میں بنی ہوازن، بنی ثقیف وغیرہ آس پاس کے چند قبائل جمع ہوکر چاہتے تھے کہ مسلمانوں پر اُن کی بے خبری کی حالت میں حملہ کر دیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوگئی۔ آپ ایک بڑی جماعت مسلمانوں کی لے کر ان کے مقابلہ کے لیے بڑھے۔ فریقین کے دلوں میں یہ حالت تھی کہ ایک طرف مسلمانوں کو اگرچہ اپنی جمعیت پر ناز تھا، لیکن یہ بھی مانے ہوئے تھے کہ اہلِ ہوازن کے تیر خطا نہیں کرتے۔ دوسری طرف اہلِ ہوازن کو اپنی قدر اندازی کا غرور تھا، لیکن یہ بھی اندیشہ تھا کہ عبدالمطلب کا وہ خواب اسی وقت صحیح نہ ہو جائے کہ رسُول اللہ آخر کار ہم پر غالب آجائیں گے۔ بہرحال دونوں طرف سے امید و بیم کے ان جذبات کے ساتھ مقابلہ ہُوا۔ بنی ہوازن نے اس زور کا حملہ کیا کہ مسلمانوں کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ صورتِ حال کا اندازہ لگا کر حضورؐ آگے بڑھتے جاتے تھے اور فرماتے تھے۔

اَنَا النَّبِیُّ لَا كَذِبْ
اَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبْ

مَیں نبی ہُوں اس میں جھوٹ نہیں ہے، مَیں فرزندِ عبدالمطلب ہُوں، یہ سن کر ایک طرف تو مسلمانوں کو جوش آیا کہ جب نبی برحق ہمارے ساتھ ہیں، پھر ہم کو کیا خطرہ ہے، دوسری طرف کفار کا دل دہل گیا کہ عبدالمطلب کے خواب کے صحیح ہونے کا وقت آگیا اور ابنِ عبدالمطلب ہمارے سر پر آپہنچا۔ غرض زبانِ مبارک سے جو کلمات ادا ہُوئے کام کر گئے اور لڑائی کا نقشہ فوراً بدل گیا۔

(یہ روایت بخاری شریف میں بھی ہے)

۷۔ عمرۃ القضا کے سال آپؐ مکہ تشریف لائے۔ جس وقت حرم میں داخل ہوئے تو آگے آگے ابنِ رواحہؓ چلتے تھے اور شعر پڑھتے جاتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے کہا ابنِ رواحہؓ تم حرم شریف میں شعر پڑھتے ہو اور وہ بھی رسول اللہ کے سامنے۔ آپؐ نے فرمایا: عمرؓ اسے چھوڑ دو واقعی ان لوگوں میں شعر کہنا تیر برسانے سے زیادہ کارگر ہوتا ہے۔

۸ - آپؐ کے سامنے صحابہؓ شعر پڑھتے (مشاعرے کرتے) اور جاہلیت کی بعض باتوں کا ذکر کرتے، تو آپؐ کبھی چپ رہتے اور کبھی مسکراتے۔ حضرت جابرؓ بن سمرہ نے ایسے سو سے زیادہ مشاعرے سُنے تھے۔

۹ - عمرو بن شرید کہتے ہیں میں نے اپنے والد سے سُنا وہ کہتے تھے ایک مرتبہ میں رسول اللہ کے ساتھ سواری پر پیچھے بیٹھ کر کہیں گیا اور امیہ بن ابی صلت کے سو شعر آپؐ کو سنائے۔ جب کوئی شعر پڑھتا، آپؐ فرماتے "ہاں اور سناؤ" یہاں تک کہ میں نے سو شعر پڑھے۔ آپؐ نے فرمایا قریب تھا کہ امیہ مسلمان ہو جاتا۔

(امیہ بن ابی صلت وہ شخص ہے جو حضورؐ کی ہجو کیا کرتا تھا اور لوگوں کو جمع کر کے سنایا کرتا تھا)

ان احادیث کے علاوہ شعر شاعری کی نسبت اور احادیث بھی ہیں۔ مثلاً:

۱۰ - ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں سب سے پہلا کام جو حضورؐ نے کیا وہ مسجد کی تعمیر تھی۔ مزدوروں کے ساتھ آپؐ خود بھی کام کرتے تھے۔ عبداللہ بن رواحہؓ جو شاعر تھے وہ بھی مزدوروں کے ساتھ شریک تھے اور جس طرح مزدور کام کرنے کے وقت تھکن مٹانے کو گاتے جاتے ہیں، وہ یہ اشعار پڑھتے جاتے تھے۔

افلح من یعالج المساجدا

ویقرء القرآن قائما و قاعدا

ولا یبیت اللیل عنه راقدا

(وہ کامیاب ہے جو مسجد تعمیر کرتا ہے اور اٹھتے بیٹھتے قرآن پڑھتا اور رات کو جاگتا رہتا ہے)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہر قافیہ کے ساتھ آواز ملاتے جاتے تھے۔ منقول از سیرت النبیؐ جلد اوّل از علامہ شبلیؒ بروایت وفاء الوفا بحوالہ ابن ابی شیبہ۔

۱۱ - مسجد نبوی کی تعمیر جاری ہے۔ حضورؐ (فداہ روحی) مزدوروں کے ساتھ شریک مشقت ہیں۔ صحابہؓ پتھر اٹھا اٹھا کر لاتے ہیں اور یہ رجز پڑھتے جاتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اُن کے ساتھ آواز ملاتے ہیں اور فرماتے ہیں۔

اللھم لا خیر الا خیر الآخرہ

فاغفر الانصار والمھاجرہ

(اے خدا کامیابی صرف آخرت کی کامیابی ہے، اے خدا مہاجرین اور انصار کو بخش دے) ماخوذ از سیرت النبی جلد اوّل مصنفہ علامہ شبلیؒ بحوالہ صحیح بخاری باب المساجد وغیرہ۔

یہ وہ اسباب تھے جن سے شاعری کا نیا دور شروع ہوا اور جن کی وجہ سے اب تک دنیائے ادب میں اسلامی شاعری کا ڈنکا بج رہا ہے۔ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت حسانؓ بن ثابت، حضرت کعبؓ بن زہیر، ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ اور بہت سے صحابہؓ کرام اور صحابیات رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور اکابر امت نے شعر کہے جن میں سے دواوین میں حضرت علیؓ کا دیوان، حضرت حسانؓ کے بہت سے اشعار، حضرت کعبؓ بن زہیر کا قصیدہ بانت سعاد جس پر حضورؐ نے

اپنی چادر (بردہ) انعام میں مرحمت فرمائی تھی (بخاری و مسلم)، اور جس کی وجہ سے یہ قصیدہ، قصیدہ بُردہ[1] کہلانے لگا کافی مشہور ہیں اور حضرت امام زین العابدین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا وہ قصیدہ تو زبان زد خاص و عام ہے جس کا مطلع ہے:

اِنْ نِلْتِ یَا رِیْحَ الصَّبَا یَوْمًا اِلیٰ اَرْضِ الْحَرَمْ

بَلِّغْ سَلَامِیْ رَوْضَۃً فِیْھَا النَّبِیُّ الْمُحْتَرَمْ

اے باد صبا اگر کسی دن حرم کی طرف تیرا گزر ہو جائے، تو روضۂ مبارک تک میرا سلام پہنچا دینا۔ جہاں نبیٔ محترم علیہ الصلوٰۃ والسلام آرام فرماتے ہیں۔

---

[1] امام شرف الدین محمد بوصیریؒ (متوفی ۶۹۶ھ) کا قصیدہ بھی اسی نام سے مشہور ہے۔ انھیں بھی حضورؐ کی بارگاہ سے قصیدہ کے صلہ میں بحالت خواب چادر مبارک عطا ہوئی تھی لیکن کعب کا قصیدہ بانت سعاد کے نام سے ہی مقبول ہوا۔ (ادارہ)

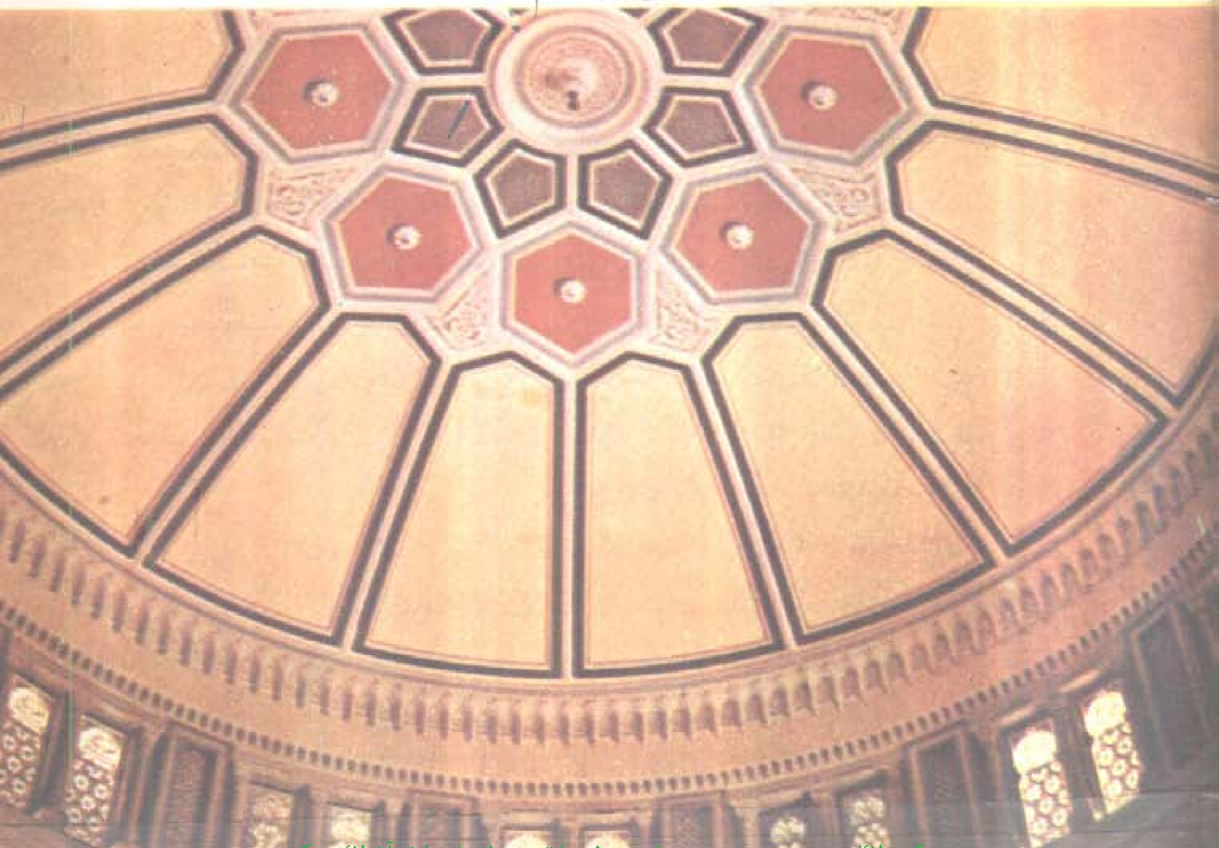
لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ایک عمدہ نمونہ موجود ہے تمہارے لیے۔

(الاحزاب: ۲۱)

معمولاتِ رسول

صلی اللہ علیہ وسلم



معمولاتِ رسولؐ

ترجمہ: سیّد خورشید احمد گیلانی

رسولِ اکرمؐ کا اپنے اصحاب سے مشورہ کرنا

(عبداللہ) ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں بدر کے دن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے قیدیوں کا مسئلہ آیا تو آپ نے ابوبکرؓ، عمرؓ اور علیؓ سے مشورہ کیا اور فرمایا تمہاری اس بارے میں کیا رائے ہے؟

حضرت ابوبکرؓ نے کہا وہ اپنے ہی خاندانوں کے لوگ ہیں میں سمجھتا ہوں کہ انہیں فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے. یہ بات ہمارے لئے کفار کے معاملہ میں تقویت کا باعث بنے گی اور ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اسلام کی راہ سجھادے.

آپ نے حضرت عمرؓ سے پوچھا تمہارا کیا خیال ہے؟ وہ بولے قسم بخدا میری وہ رائے ہرگز نہیں جو ابوبکرؓ کی ہے بلکہ میں تو کہوں گا کہ ہم اپنے ہی ہاتھوں سے ان کی گردنیں اڑا دیں، البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کی رائے سے اتفاق فرمایا اور پھر وہ کچھ نازل ہوا جو نازل ہوا.

ابن غنمؓ کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکرؓ اور عمرؓ سے فرمایا اگر تم ایک بات پر متفق ہو جاتے تو میں تمہاری متفقہ رائے سے کبھی خلاف نہ جاتا.

ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی جنگ میں شریک تھے، آپ کے ہمراہیوں کو بھوک لگی اور کھانے پینے کا سامان ختم ہو چکا تھا وہ آپ کے پاس آئے اور اپنی مشکل پیش کی، انہوں نے بعض سواری کے جانور ذبح کرنے کی اجازت چاہی آپ نے دے دی، وہ لوگ حضرت عمرؓ کے قریب سے گذرے انہوں نے پوچھا تم لوگ کہاں سے آرہے ہو؟ انہوں نے بتایا ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ سواری کے جانور ذبح کرنے کی اجازت دیدی ہے، حضرت عمرؓ بولے میں جا کر پوچھتا ہوں اور تم میرے ساتھ چلو آپ نے جا کر کہا اے اللہ کے رسول کیا واقعی آپ نے بعض سواری کے جانور ذبح کر دینے کو کہا ہے تو پھر وہ کس پر سوار ہوں گے؟ آپ نے فرمایا بتاؤ میں ان کے لئے کیا کرتا. میرے پاس تو دینے کو کچھ نہیں، حضرت عمرؓ بولے ہاں یا رسول اللہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ آپ انہیں حکم دیں کہ جو زائد از ضرورت چیز کسی کے پاس ہے وہ سب لے آئیں اور پھر آپ اسے لوگوں میں تقسیم فرما دیں چنانچہ ایسا کیا گیا، کچھ لوگ زیادہ لائے اور کچھ کم آپ نے برکت کی دعا فرمائی اور اس کی تقسیم شروع کی، چنانچہ پورے لشکر میں سے کسی کا برتن خالی نہ رہا اور کچھ بچ بھی رہا. پھر فرمایا.

اشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريك له واشهد ان محمدا عبده ورسوله

بعد ازاں فرمایا، جو شخص اللہ اور رسول کو خوش کر کے قیامت کے دن آئے گا اللہ اسے جنت میں داخل فرمائے گا.

حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ احد کے موقع پر صحابہ سے مشورہ کیا تھا کہ وہ باہر نکل کر جنگ کریں تو انہوں نے مدینہ میں رہ کر مقابلہ کرنے کا مشورہ دیا تھا آپ نے فرمایا یہ امر نبی کی شان کے زیب نہیں کہ وہ ہتھیار بند ہو کر پھر ہتھیار کھول دے،

لہ "کتاب الوسیلہ" سے (مطبع دائرۃ المعارف عثمانیہ)

تا آنکہ اللہ تعالیٰ اُس کے اور اس کے دشمنوں کے درمیان فیصلہ نہ فرما دے۔

جب واقعہ افک (تہمت) پیش آیا تو آپ نے صحابہ سے سیدہ عائشہؓ کے متعلق رائے لی تھی ان میں حضرت علیؓ اور حضرت اُسامہؓ شامل ہیں اُسامہؓ نے کہا تھا، بس خیر کے علاوہ کچھ گمان نہیں کرنا البتہ حضرت علیؓ نے کہا تھا آپ کے لیے عورتوں کی کمی نہیں تاہم آپ اپنی خادمہ سے ساری صورتحال معلوم کر لیجیے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے دن پہلے پہل وہاں قیام فرمایا جہاں پانی جمع تھا حباب بن مُنذر بن جموحؓ نے آپ سے کہا اے اللہ کے رسول آپ کا یہ پڑاؤ حکم خداوندی کے مطابق ہے کہ ہم آگے پیچھے نہیں ہو سکتے یا آپ کی رائے اور جنگ کی حکمت عملی کا حصہ ہے؟ آپ نے فرمایا نہیں۔ یہ جنگی حکمت عملی کا ایک حصہ ہے تو وہ بولے یہ مقام ہمارے قیام کے لئے مناسب نہیں۔ ہمیں وہاں قیام کرنا چاہیے جہاں قریش کا پانی ہمیں قریب ہو تاکہ ہم ایک گڑھا کھود لیں اور اُس پر حوض بنا کر پانی اس میں جمع کر لیں پھر جنگ کریں کہ خود تو پانی پی سکیں لیکن دشمن کو نہ مل سکے آپ نے اس سے فرمایا تمہاری رائے صحیح ہے چنانچہ آپ نے وہاں قیام فرمایا جس کا مشورہ دیا گیا تھا۔

آپؐ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ سے اکثر و بیشتر مشورہ کرنے کے عادی تھے اور جب کبھی اہم کام پڑ جاتا یا جنگ کا امکان ہوتا تو آپ مدینہ کے اہل الرائے اور مہاجرین کو جمع فرماتے۔ اُن سے مشورہ لیتے اور جس طرح اللہ کا حکم ہوتا آپ اس پر عمل فرماتے۔

ابوسعید خدریؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ہر نبی کے آسمان اور زمین میں دو دو وزیر ہوتے ہیں۔ میرے آسمانوں میں وزیر جبریلؑ اور میکائیلؑ ہیں اور زمین میں ابوبکرؓ اور عمرؓ۔

حذیفہؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرا ارادہ ہے کہ میں لوگوں کے لیے کچھ معلم بھیجوں، جو لوگوں کو فرائض اور سُنن کی تعلیم دے سکیں جیسا کہ عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے حواری بھیجے تھے، کہتے ہیں کہ لوگوں نے کہا کہ ابوبکرؓ اور عمرؓ کو لوگوں کی طرف سے بھیج دیا جائے آپ نے فرمایا میں اُن کے مشوروں سے بے نیاز نہیں رہ سکتا، کیونکہ ان کی حیثیت دین کے لیے اس طرح ہے جس طرح جسم میں سر کی حیثیت ہے اور آپ بالعموم ان سے مشورہ کیا کرتے تھے۔

رسولِ اکرمؐ کی مجلس اور اس کے آداب اور متعلقات کا ذکر

بیان کیا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب صحابہ کے پاس تشریف لے جاتے تو سب سے آخر میں جہاں جگہ ملتی بیٹھ جاتے۔

ابوہریرہؓ اور ابوذرؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان تشریف فرما ہوتے اور اجنبی آپ کو نہ پہچان پاتے کہ آپ سے گفتگو کریں چنانچہ ہم نے کہا اے اللہ کے رسول! کیا یہ مناسب نہیں کہ ہم آپ کے لیے مٹی کا چبوترہ تیار کریں جس پر آپ بیٹھیں تاکہ ناواقف لوگ بھی آپ کو پہچان سکیں چنانچہ ایسا کیا گیا آپ اس پر بیٹھتے اور ہم آپ کے سامنے ہوتے۔

حسن بن علیؓ روایت کرتے ہیں میں نے اپنے والد سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نشست و برخاست کے متعلق پوچھا، تو انہوںؓ نے کہا آپ کی مجلس کا آغاز اور اختتام ذکر الٰہی پر ہوتا تھا، جب جگہ پُر ہو جاتی تو آخر میں بیٹھ جاتے، ہر ایک کو اس کا حصہ دیتے ہر شخص یہی سمجھتا کہ آپ سب سے زیادہ مجھ پر مہربان ہیں اور اس کی ضرورت پوری کرنے میں سرگرم! آپ کی مجلس حیا، تواضع، راستی اور امانت

کی مجلس، ہوتی تھی۔ کسی کی آواز بلند نہ ہوتی، بڑوں کی عزت کی جاتی اور چھوٹوں پر شفقت کی جاتی۔

بیٹھنے کا مقام :-

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا تو مسجد میں بیٹھتے یا بازار میں مسجد کے دروازے پر تشریف فرما ہوتے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ صحابہ میں سے ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا آپ اس وقت مسجد میں تشریف فرما تھے اور اکیلے تھے جب وہ شخص بیٹھنے لگا تو آپ ذرا پیچھے کو ہٹ گئے۔ وہ بولا آپ کے پاس کوئی دوسرا شخص تو موجود نہیں تو آپ کس لیے اپنی جگہ سے ہٹے (یعنی جگہ بہت کھلی تھی) آپ نے فرمایا ایک مسلمان کا دوسرے پر یہ حق بنتا ہے کہ جب وہ بیٹھنے لگے تو اس کے لئے مجلس میں جگہ پیدا کی جائے۔

بنی سلیط کے ایک شخص سے مروی ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب سے گزرا اور آپ مسجد کے دروازے پر تشریف فرما تھے۔ آپ نے سوتی کا کپڑا اوڑھ رکھا تھا اور آپ فرما رہے تھے۔

مسلمان مسلمان کا بھائی ہے نہ وہ ظلم کرتا ہے اور نہ رسوا! پھر اپنے ہاتھ کا اشارہ سینے کی طرف کیا اور فرمایا تقویٰ یہاں ہے تقویٰ کا مقام یہ ہے۔

ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دن کے کسی حصے میں باہر تشریف لائے نہ آپ نے مجھ سے کلام کیا اور نہ میں نے کچھ کہا حتیٰ کہ آپ بنی قینقاع کے بازار میں پہنچے اور سیدنا فاطمہؓ کے گھر کے صحن میں تشریف فرما ہوئے اور فرمایا، بزدل گنہگار ہے۔ بزدل گنہگار۔

آپ کبھی زمین پر بیٹھ جاتے۔ کبھی مخملیں چادر پر۔ کبھی گاؤ تکیہ رکھتے اور کبھی تخت۔ چٹائی اور کرسی پر تشریف فرما ہوتے۔

ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زمین پر بیٹھتے اور وہیں کھانا تناول فرماتے۔

عبداللہ بن بسرؓ روایت کرتے ہیں مجھے میرے والد نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا کہ انہیں بلا لائے کیونکہ آپ کیلئے کھانا تیار کرایا تھا چنانچہ آپ میرے ساتھ آئے۔ آپ کے لئے مخملیں چادر بچھائی گئی اور آپ اس پر بیٹھے۔

عمر بن خطابؓ روایت کرتے ہیں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ کھجور کی چٹائی پر سو رہے تھے اور اس کے نشانات آپ کے جسم پر تھے جب مجھے دیکھا تو اٹھ بیٹھے۔

سیدہ عائشہؓ روایت کرتی ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک چٹائی تھی جس پر آپ دن کو بیٹھتے اور رات کو اس پر سوتے اور نماز پڑھتے تھے۔

آپ کبھی بیٹھ اور ٹانگوں پر کپڑا لپیٹ کر بیٹھتے۔ کبھی گھٹنوں کے بل اور کبھی چوکڑی مار کر تشریف فرما ہوتے۔ کعبے کی طرف منہ کر کے بیٹھتے یا اس کی طرف پیٹھ کر کے!

سلیم بن جابر ہجیمیؓ روایت کرتے ہیں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا آپ چادر کی لپیٹ لیکر بیٹھے تھے اور اس کا پلو آپ کے پاؤں پر پڑا تھا۔

ابوسعید خدریؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب بیٹھتے تو چادر اپنے ارد گرد لپیٹ لیتے۔

ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کعبہ کے صحن میں بیٹھے دیکھا کہ ہاتھوں کا حلقہ باندھ کر بیٹھے ہیں۔

آپ گھٹنوں کے بل بیٹھتے اور گھٹنوں کے بل بیٹھ کر کھانا تناول فرماتے تھے۔

سیدہ عائشہؓ روایت کرتی ہیں میں نے کہا اے اللہ کے رسول! آپ ٹیک لگا کر کھانا کھایا کیجئے کیونکہ آپ کے لیے یہ زیادہ سہولت کا باعث ہے آپ نے فرمایا میں بندہ ہوں میری نشست بندوں جیسی ہے اور کھانا بھی بندوں کی طرح ہوں۔

حنظلہ بن حذیمؓ روایت کرتے ہیں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آپ کو چوکڑی مار کر بیٹھے ہوئے دیکھا۔

آپ اکثر کعبے کی طرف منہ کر بیٹھتے اور فرماتے اچھی مجلس وہ ہے جس کا رخ کعبے کی طرف ہو۔

جابر بن سمرہؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز صبح پڑھ لیتے تو وہیں سورج طلوع ہونے تک بیٹھے رہتے۔

ابو درداؓ روایت کرتے ہیں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھتے تو ہم آپ کے اردگرد بیٹھتے تھے۔

اہل مجلس کا خیال رکھنا:

ابو مالک الاشجعیؓ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں ہم رسول اللہؐ کے پاس بیٹھتے آپ زیادہ تر خاموش رہتے اور آپؐ کے چہرے پر اکثر مسکراہٹ کھیلتی رہتی۔

حضرت حسنؓ کہتے ہیں میں نے اپنے والد سے پوچھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ہم نشینوں کے درمیان کیسے ہوتے تھے؟ انہوں نے فرمایا آپ ہمیشہ شگفتہ رہتے، اچھا برتاؤ کرتے، نرم طبیعت تھے، کبھی نہ جھڑکتے نہ سختی برتتے، آپ نے تین چیزیں یکسر چھوڑ رکھی تھیں "تکبر، لبسیارگوئی اور بے مقصد" آپ کبھی کسی کی برائی بیان نہ کرتے کسی کو شرمندہ نہ کرتے اور نہ کسی کی عیب جوئی کرتے اچھی بات کے علاوہ کچھ منہ سے نہ نکالتے، جب آپ گفتگو کر رہے ہوتے تو مکمل خاموشی طاری رہتی جیسے سروں پر پرندے بیٹھے ہوں، جب آپ بولتے تو لوگ خاموش رہتے اور جب آپ خاموش ہوتے تو لوگ گفتگو کرتے، آپ کی محفل میں تو تکار نہ ہوتی، جو بھی بولتا باقی لوگ خاموشی سے سنتے حتیٰ کہ وہ اپنی بات مکمل کر لیتا، جب لوگ ہنستے آپ بھی ہنستے جب لوگ کسی بات پر اظہار تعجب کرتے تو آپ بھی ایسا کرتے، کوئی اجنبی کسی بات یا مسئلے میں اکھڑپن کا مظاہرہ کرتا تو آپ اسے برداشت کرتے، آپ کسی کی قطع کلامی نہ فرماتے، ہاں اگر کوئی بات خلاف واقعہ ہوتی تو آپ اسے روک دیتے یا اٹھ کھڑے ہوتے۔

سماک بن حرب روایت کرتے ہیں میں نے جابر بن سمرہؓ سے کہا کیا آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مجلس نشیں رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کئی بار! آپ بہت زیادہ خاموش رہتے۔ آپ کی مجلس میں کوئی دورِ جاہلیت کا واقعہ بیان کیا جاتا، لوگ ہنستے آپ بھی اس میں شامل ہو جاتے۔

ایک اور روایت کے مطابق آپ کی مجلس میں شعر پڑھے جاتے، کھانے پینے کا ذکر ہوتا، مختلف چیزوں کے بارے میں باتیں ہوتیں، لوگ ہنستے تو آپ بھی مسکرا دیتے۔

سلیمان بن خارجہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں اہل عراق کا ایک وفد زید بن ثابت کے پاس آیا اور کہا ہم جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہوتے تو ہم دنیا کی باتیں کرتے تو آپ بھی دنیوی گفتگو کرتے اور جب ہم آخرت کی باتیں کرتے تو آپ اخروی باتیں کرتے، جب ہم کھانے پینے کی باتیں کرتے تو آپ بھی کھانے پینے کی بات کرتے۔

صحابہؓ کی مجلس میں تربیت:

اسامہ بن شریکؓ روایت کرتے ہیں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ کے پاس صحابہ بھی بیٹھے تھے (اور اس طرح سنجیدگی اور خاموشی تھی) گویا ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہیں میں نے جا کر سلام کہا اور بیٹھ گیا، کچھ دیہاتی آئے اور انہوں نے مسائل دریافت کئے۔

ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیٹھا تھا ایک شخص آیا اور دوسرا شخص اپنی جگہ سے اٹھا کہ وہاں جاکر بیٹھے آپ نے اُسے اس کی جگہ پر بیٹھنے سے منع فرمایا۔

عمرو بن یحییٰ المازنیؒ اپنے والد اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہیں تشریف فرما تھے ایک شخص اٹھا اور دوسرا اس کی جگہ پر بیٹھ گیا پھر وہی شخص واپس آگیا آپ نے دوسرے سے فرمایا تم اس کی جگہ خالی کردو کیونکہ ہر شخص اپنی جگہ کا زیادہ حقدار ہے۔

سیدہ عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ لوگ ایک شخص کی ہوا خارج ہونے پر ہنس پڑے آپ نے انہیں ملامت کی اور فرمایا کیا تم اس پر ہنستے ہو جو تم میں سے ہر ایک کرتا ہے؟

معاویہ کے غلام قاسم روایت کرتے ہیں ایک اعرابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے کے لیے اپنی سرکش اونٹنی پر سوار ہو کر آیا اور آکر سلام کیا، جو شخص بھی آپ کے پاس آتا تو وہ اس سے اونٹنی کے متعلق پوچھتا اور اصحاب رسول یہ دیکھ دیکھ کر ہنستے ایسا کئی مرتبہ ہوا، بعد ازاں اس اونٹنی نے اعرابی کو نیچے گرادیا اور اس نے اسے ذبح کر ڈالا، آپ کو بتایا گیا کہ اونٹنی نے اعرابی کو پچھاڑ ڈالا اور اس نے اُسے ہلاک کر دیا، آپ نے فرمایا ہاں تمہارے منہ اُس کے خون سے بھرے ہوئے ہیں (یعنی تمہارے ہنسی مذاق کا یہ نتیجہ نکلا ہے)

مجاہد روایت کرتے ہیں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس موجود تھا آپ صحابہ میں تشریف فرما تھے جب آپ نے محسوس کیا کہ کسی کی ہوا خارج ہوئی ہے تو آپ نے فرمایا وہ صاحب اٹھ کر وضو کرلیں، وہ شخص شرمایا۔ آپ نے پھر فرمایا کہ وہ اٹھ کر وضو کرلیں، لیکن کوئی بھی نہ اُٹھا آپ نے تیسری بار فرمایا اور کہا اللہ تعالیٰ حق سے نہیں شرماتا عباسؓ بولے کیا ہم سب اُٹھ کر وضو نہ کرلیں؟ آپ نے فرمایا ہاں اٹھو اور سب وضو کرلو۔

زید بن اسلمؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں کہا گیا کہ میں فلاں کے بارے میں نہیں جانتا، آپ نے فرمایا کس چیز کے متعلق؟ انہوں نے کہا اس کے عربی نسب اور آباؤ اجداد کے بارے میں؟ آپ نے فرمایا اس سے کیا فرق پڑتا ہے، جان لیا تو کوئی فائدہ نہیں نہیں معلوم تو کونسا نقصان واقع ہو گیا؟

سیدہ عائشہ روایت کرتی ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں نسب کے باعث کسی کی عزت میں کمی یا بیشی نہیں دیکھی ہاں اہل تقویٰ کا احترام ہوتا تھا۔

حسنؓ روایت کرتے ہیں عہد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں کسی نے کسی کو اس کی ماں کا طعنہ دیا آپ نے اس سے فرمایا تم اسے اس کی ماں کے بارے میں مطعون کر رہے ہو بلا شبہ تم میں ابھی جاہلیت کا اثر موجود ہے فرمایا تم سر اوپر اٹھا کر اپنے ارد گرد دیکھو، قسم بخدا جو کچھ تم نے دیکھا اس میں تمہیں کالے اور گورے ہونے کی وجہ سے فضیلت حاصل نہیں بلکہ تقویٰ ہی مدار فضیلت ہے۔

ابو درداءؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب بیٹھتے تو ہم بھی ارد گرد بیٹھ جاتے۔ جب آپ مجلس سے اُٹھنا چاہتے تو اِدھر اُدھر سے کپڑے سمیٹتے اور پھر اُٹھ کر کھڑے ہوتے صحابہ اس سے پہچان جاتے کہ آپ اٹھنا چاہتے ہیں، چنانچہ وہ بھی اٹھ کھڑے ہوتے۔

یوسف بن عبداللہ بن سلام اپنے والد سے روایت کرتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب بیٹھتے اور باتیں کرتے تو نگاہ زیادہ تر آسمان کی طرف اٹھی رہتی۔

جابر بن سمرہؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لائے اور صحابہ نے سر منڈوا رکھے تھے آپ نے،

فرمایا میں نہیں یہ کیا حماقت دیکھ رہا ہوں؟

ابوسعید خدری روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بہترین مجلس وہ ہے جس میں وسعت ہو۔ آپ کو جب زیادہ دیر بیٹھنا ناگوار گزرتا تو اٹھ کھڑے ہوتے۔

انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب زینب بنت جحش سے نکاح کیا اور ولیمہ کا اہتمام فرمایا تو لوگوں کو بلایا، کچھ لوگ تو کھانا کھا کر چلے گئے اور کچھ لوگ آپ کے پاس بیٹھے رہے اور خاصی دیر بیٹھے رہے۔ آپ اٹھے اور باہر چل آئے میں بھی آپ کے ساتھ ہو لیا تاکہ وہ لوگ چلے جائیں، آپ چلے اور میں بھی آپ کے ساتھ چل دیا۔ حتیٰ کہ آپ حجرۂ عائشہ کی سیڑھی کے زینے تک پہنچ گئے، آپ نے سوچا کہ وہ لوگ چلے ہوں گے آپ واپس پلٹے میں بھی پلٹ آیا۔ جب سیدہ زینبؓ کے گھر پہنچے تو وہ لوگ ابھی تک بیٹھے ہوئے تھے آپ پھر پلٹ آئے اور حجرۂ عائشہؓ کی سیڑھی تک آئے آپ پھر ہوئے اور میں بھی ساتھ لوٹا دیکھا تو وہ لوگ جا چکے تھے آپ اندر چلے گئے اور میرے اور آپ کے درمیان پردہ حائل ہو گیا۔

چھینک مارنے والے کو جواب دینا اور چھینکنے والا کیا کہے :

انسؓ روایت کرتے ہیں دو آدمیوں نے رسول اللہؐ کی موجودگی میں چھینک ماری۔ ان میں سے ایک کو تو آپؐ نے جواب دیا اور دوسرے کو نہیں آپ سے کہا گیا اے اللہ کے رسولؐ آپ کے ہاں دو آدمیوں نے چھینک ماری آپ نے ایک کو جواب دیا لیکن دوسرے کو نہیں آپ نے فرمایا ایک نے تو الحمد للہ کہا لیکن دوسرے نے نہیں کہا۔

ایاس بن سلمہ بن الاکوعؓ روایت کرتے ہیں مجھے میرے والد نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص نے چھینک ماری آپ نے فرمایا یرحمک اللہ، پھر دوسری چھینک ماری تو آپ نے فرمایا یہ زکام میں مبتلا ہے۔

سالم بن عبیدؓ روایت کرتے ہیں ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چھینک ماری اور کہا السلام علیکم آپ نے فرمایا السلام علیك وعلی أمك (تم پر اور تمہاری ماں پر سلامتی ہو)

بعد ازاں آپ نے فرمایا جب تم میں سے کسی کو چھینک آئے تو اسے کہنا چاہیے۔ الحمد للہ رب العالمین الحمد للہ علی کل حال تو اس کے جواب میں کہا جائے "یرحمکم اللہ" پھر یہ بھی کہنا چاہیے۔

یغفر اللہ لی ولکم (اللہ تمہیں اور مجھے بخشے)

ابی موسیٰؓ روایت کرتے ہیں یہودی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چھینکتے تو وہ توقع کرتے کہ انہیں جواب میں یرحمکم اللہ کہا جائے لیکن آپ فرماتے یھدیکم اللہ ویصلح بالکم (اللہ تمہیں ہدایت بخشے اور تمہارے معاملات سنوارے)

یحییٰ بن ابی کثیر روایت کرتے ہیں ایک شخص کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چھینک آئی اور اس نے کہا اللہ اکبر آپ نے فرمایا اللہ اکبر، دوسرے کو چھینک آئی وہ بولا الحمد للہ علی کل حال آپ نے فرمایا "یرحمک اللہ"

عبدالرحمٰن بن ذوبیبؓ کہتے ہیں مجھے ایک شخص نے بتایا کہ کسی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چھینک آئی آپ نے اس کا جواب دیا، پھر آئی تو جواب دیا، پھر چھینکا تو آپ نے جواب دیا، جب چوتھی بار آئی تو آپ نے فرمایا تمہیں زکام کی شکایت ہے اٹھ کر

تاکہ معاف کر لو۔

ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم میں سے کسی کو چھینک آئے تو کہے "الحمد للہ علی کل حال" (ہر حال میں اللہ کا شکر ہے) اس کا بھائی اور دوست جواب میں کہے "یرحمک اللہ" (اللہ تم پر رحم کرے) اور پھر وہ جواب میں کہے "یھدیکم اللہ و یصلح بالکم"

ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھینک آتی تو آپ اپنی آواز پست کرتے اور منہ چھپا لیتے۔

ایک اور روایت کے مطابق جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھینک آتی تو اپنا چہرہ ہاتھ یا کپڑے سے ڈھانپ لیتے اور اپنا ہاتھ منہ پر رکھ دیتے اور اپنی آواز دباتے۔

ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ چھینک کو پسند کرتا اور اُباسی کو ناپسند کرتا ہے، پس جسے اُباسی آنے لگے تو وہ مقدور بھر اُسے روکے اور خاہ خاہ کی آواز منہ سے نکالے کہ اس سے شیطان ہنستا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی مجلس میں شگفتہ رہتے آپ کے چہرے پر کبھی خشونت نہیں دیکھی گئی۔ آپ دوستوں کے ساتھ بشاشت اور خندہ روئی سے پیش آتے تھے۔

جریرؓ روایت کرتے ہیں کہ جب سے میں اسلام لایا ہوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے کبھی پوشیدہ نہیں ہوئے اور میں نے ہمیشہ آپ کو مسکراتا ہوا پایا۔

جابر بن سمرہؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صبح کی نماز کے بعد جائے نماز سے نہ اُٹھتے۔ تاآنکہ سورج طلوع ہو جاتا جب سورج نکلتا تو آپ اٹھ کھڑے ہوتے لوگ دورِ جاہلیت کی باتیں کرتے اور ہنستے اور آپ بھی مسکراتے رہتے۔

عبداللہ بن حارثؓ روایت کرتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کسی کو زیادہ متبسم نہیں دیکھا۔

رسول اللہ کا بازار آنا جانا اور معاملہ فرمانا

بکیر بن عبداللہ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بازار میں داخل ہوئے اور فرمایا ہم اس بازار میں اللہ سے خیر مانگتے ہیں، اور میں نقصان رساں تجارت، بڑی یا برکت ختم کرنے والی قسم سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں پھر فرمایا، اے بازار والو زیادہ قسمیں کھانے سے گریز کرو کیونکہ زیادہ قسمیں کھانے سے تجارت تو بڑھتی ہے لیکن برکت گھٹ جاتی ہے۔

ایک اور روایت کے مطابق جب آپ بازار میں داخل ہوتے تو اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے پھر فرماتے میں اس بازار کے لیے اللہ سے خیر چاہتا ہوں اور اے اللہ میں اس کی نحوست اور گناہ سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔

اے اللہ میں نقصان دینے والے کاروبار اور بے برکت سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔

قیس بن ابی غرزہ روایت کرتے ہیں عہد رسالت مآب میں ہمیں سماسرہ (دلال) کہا جاتا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہم پر گزر ہوا تو آپ نے ہمارے لیے ایک اچھا نام تجویز کیا پھر فرمایا اے تاجروں کا گروہ! یہ تجارت ہے جس میں اکثر و بیشتر قسمیں کھائی اور توڑی جاتی ہیں۔

سونم صدقہ کر کے کفارہ ادا کیا کرو۔

آپؐ کا معاملہ کرنا :

آپ معاملات میں نرم اور جنگ میں بہت بہادر تھے۔ آپ اچھے طریقے سے ادائیگی اور تقاضا کرتے تھے سوید بن قیس روایت کرتے ہیں میں اور مخرمہ عبدی ھجر (جگہ کا نام) سے کپڑا بیچنے کو آئے۔ ہمارے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور ہم سے شلوار کا کپڑا لیا میرے پاس اجرت پر ایک تولنے والا تھا آپ نے اس سے فرمایا تولو اور جھکتی ڈنڈی سے تولو!

ابو رافعؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جوان اونٹ کچھ مدت تک قرض پر لیا جب صدقے کے اونٹ آئے تو آپ نے مجھے فرمایا کہ میں اسے اونٹ واپس کروں، میں نے عرض کیا وہاں تو چار دانتوں والا اونٹ ہے آپ نے فرمایا وہی دے دو بہر فرمایا اچھے لوگ وہی ہیں جو اچھے طریقے سے ادائیگی قرض کرتے ہیں۔

طارقؓ روایت کرتے ہیں ہم لوگ مدینہ منورہ کے قریب اونٹ بیچنے کی غرض سے لے کر آئے ہمارے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے ہم آپ کو نہیں پہچانتے تھے آپ نے فرمایا تم کون لوگ ہو؟ ہم نے کہا ہمارا تعلق بنی محارب سے ہے، فرمایا کہاں سے آئے ہو؟ ہم بولے ربذہ سے، آپ نے فرمایا تمہارے پاس فروخت کرنے کو کیا ہے؟ ہم نے کہا ہاں یہ اونٹ ہیں، آپ نے پوچھا یہ کتنے کا ہے؟ ہم نے اس کی قیمت بتائی کہ اتنے وسق کھجور۔ آپ نے اس کی مہار پکڑ لی اور مدینہ منورہ چل دیئے، ہم نے کہا یہ کیا ہوا ہم نے یہ سودا کیسے کر دیا جب کہ ہم انہیں جانتے بھی نہیں ہمارے ساتھ ایک عورت تھی جو دیوار کی طرف بیٹھی تھی کہا میں نے اس شخص کو دیکھا ہے اس کا چہرہ چاند جیسا تھا میں اونٹ کی قیمت کی ضامن بنتی ہوں، جب صبح ہوئی تو وہی شخص آیا اور کہا میں اللہ کا رسول ہوں میں تمہیں یہ کھجور کھانے کا کہتا ہوں حتیٰ کہ سیر ہو جاؤ اور پھر تول کر اپنا حساب پورا کر لو اور جو کچھ کھاؤ گے یہ ہدیہ ہوگا اس کا کہ میں نے کھجور بھیجنے میں تاخیر کی!

حضرت حمزہؓ کی زوجہ خولہؓ روایت کرتی ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کسی کا دو وسق کھجور قرض تھا اس کا تعلق بنی ساعدہ سے تھا۔ وہ آیا اور قرضہ طلب کیا آپ نے بلالؓ کو فرمایا اس کا قرض چکا دو۔ انہوں نے ان کھجوروں کے بجائے دوسری قسم کے کھجور دیئے اس نے نہ لیئے۔ بلالؓ بولے کیا تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چیز مسترد کرتے ہو؟ آپ نے فرمایا ہاں ٹھیک ہے مجھ سے بڑھ کر عدل کی پاسداری کرنیوالا کون ہے؟ پھر آپ کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور فرمایا اللہ اس امت کو پاک نہ بنائے جو قوی سے ضعیف کا حق نہ لے سکے، پھر فرمایا اے خولہؓ اس کا قرضہ اتار دو، کیونکہ جو قرضہ دار اپنے قرض خواہ کو خوش کرتا ہے تو اس کے لئے خشکی اور تری کے جانور دعائے رحمت کرتے ہیں۔

سیدہ عائشہؓ روایت کرتی ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی اعرابی سے ایک اونٹنی عجوہ کھجوروں کے بدلے خریدی۔ آپ گھر آئے کھجور تلاش کئے مگر وہ نہ ملے آپ واپس آئے اور فرمایا ہم نے تم سے اونٹ لیا تھا مگر کھجور میسر نہ آئے لہٰذا تم اپنا اونٹ واپس لے لو اعرابی چیخ اٹھا ہائے مجھ سے دھوکہ ہو گیا لوگ اس کی طرف گئے اور کہا خدا تجھے غارت کرے کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تم سے دھوکہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا اسے معاف کرو حقدار کو سب کچھ کہنے کا حق ہے آپ نے تین بار اس سے معذرت کی لیکن اس نے قبول نہ کی جب آپ نے دیکھا کہ وہ بات سمجھ نہیں رہا آپ نے صحابہ میں سے کسی سے کہا کہ تم خولہ بنت حکیم بن امیہ کے پاس جاؤ اور اس سے کہو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کہتے ہیں اگر تمہارے پاس زخرہ کے کھجور ایک وسق کے برابر ہوں تو ہمیں ادھار دے، دو ہم جلدی واپس کر دیں گے، وہ شخص ان کے پاس گیا اور واپس آکر کہا وہ کہتی ہیں کہ ہاں میرے پاس موجود ہیں آپ اسے بھیج دیجئے تاکہ میں اسے دے دوں۔ آپ نے اس اعرابی سے فرمایا جاؤ وہ تمہیں اس کی قیمت ادا کر دیں گی چنانچہ وہ گیا اور اسے ادا کر دیا گیا۔ وہ کہتی ہیں کہ وہ اعرابی آپ کے پاس سے گزرا۔ آپ صحابہ کے درمیان تشریف فرما تھے بولا اللہ آپ کو جزائے خیر دے آپ نے پوری اور اچھی قیمت ادا کی آپ نے فرمایا قیامت کے روز اللہ کے بہترین بندے وہ ہوں گے جو پورا اور اچھے طریقے سے ادا کرنے والے ہوں،

عبدالرحمٰن بن عثمان روایت کرتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عید کے دن بازار میں کھڑے ہوتے دیکھا اور لوگ گزر رہے تھے ۔

عبداللہ بن جعفر بن ابوطالب روایت کرتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت چاہی کہ میں اپنے بھائی کے پاس بکری کا سودا کر دوں آپ نے فرمایا اے اللہ اس کے سودے میں برکت ڈال، عبداللہ کہتے ہیں اس کے بعد میں نے کوئی چیز لی یا دی تو اس میں بہت برکت ہوئی ۔

جابر بن عبداللہ روایت کرتے ہیں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھا آپ نے فرمایا تم اپنا اونٹ میرے ہاتھ فروخت کر دو۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ وہ آپ ہی کا ہے آپ نے فرمایا نہیں، بیچ دو میں نے کہا بیچ دیا آپ نے بلال سے فرمایا اس کی قیمت ادا کر دو اور کچھ اوپر بھی دیدو جب مجھے قیمت ادا کی جانے لگی تو میں نے عرض کیا یا رسول اللہ داس سے تو بہتر ہے کہ، مجھے میرا اونٹ واپس کر دیا جائے آپ نے فرمایا جاؤ اور اونٹ اور قیمت دونوں لے جاؤ اور میرے لئے دعا بھی فرمائی ۔

ایک اور روایت کے مطابق بلال نے فرمایا جابر کو تول دو اور ذرا ڈنڈی جھکا کر!

ابن عمر روایت کرتے ہیں میں ایک سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھا اور میں حضرت عمر کے اونٹ پر سوار تھا آپ نے فرمایا یہ اونٹ مجھے بیچ دو میں نے بیچ دیا آپ نے فرمایا اے عبداللہ یہ اونٹ تمہارا ہے جو چاہو اس سے کام لو۔

سیدہ عائشہ روایت کرتی ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے گھر میں بے وقت تشریف لائے حضرت ابوبکر آپ کے پاس گئے آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے ہجرت کا حکم دیا ہے وہ بولے یا رسول اللہ میرے پاس دو اونٹنیاں ہیں میں انہیں سفر کے لئے تیار کرتا ہوں ان میں سے ایک آپ لے لیں۔ آپ نے فرمایا میں قیمت دے کر لوں گا ۔

سیدہ عائشہ روایت کرتی ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک یہودی سے کھانا لیا اور اپنی زرہ اسکے پاس گروی رکھ دی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوا تو ایک یہودی کے پاس تیس صاع جَو کے عوض آپ کی زرہ گروی رکھی ہوئی تھی۔

رسول اللہ ؐ کے کہیں جانے اور واپس آنے کے معمولات

حسن رضی اللہ عنہ اپنے والد علی کرم اللہ وجہہ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے ان سے رسول اللہ ؐ کے کہیں جانے کے متعلق

دریافت کیا تو جواب دیا کہ آپ اجازت لینے کے بعد کسی کے گھر داخل ہوتے تھے۔

ایک اور روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی کے گھر تشریف لے جاتے تو کہتے۔

اللہ کا نام لیکر ہم داخل ہوتے ہیں اور اللہ کا نام لے کر نکلتے ہیں، اے اللہ میں داخل ہونے اور نکلنے کے شر سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔

سیدہ عائشہؓ سے دریافت کیا گیا کہ آپ گھر میں داخل ہوتے سب سے پہلے کیا کرتے اور آخر میں کیا؟ تو فرمایا آپ گھر میں داخل ہوتے ہی مسواک کرتے اور بعد ازاں دو رکعت نماز فجر ادا فرماتے (یعنی رات بھر کا آخری معمول صبح کی نماز ہوتی)،

سیدہ عائشہؓ فرماتی ہیں آپ جب صبح کی نماز پڑھتے تو گھر تشریف لاتے اور مسواک کرتے،

سیدہ ام سلمہؓ روایت کرتی ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز مغرب سے فارغ ہو کر گھر آتے اور آکر دو رکعت نماز ادا کرتے پھر یہ پڑھتے "اے دل کو پھیرنے والے ہمارے دلوں کو اپنے دین پر قائم فرما"

یہ بھی آپؐ کا معمول تھا کہ جب گھر میں داخل ہوتے تو جو بھی گھر میں ہوتا اُسے سلام کرتے :

مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں اور میرے دو ساتھی رسول اللہؐ کے مہمان تھے۔ آپ ہمارے پاس تشریف لاتے اور ہمیں سلام کیا اور اس انداز سے کہ سویا ہوا جاگ نہ پڑے اور جاگتا ہوا سن لے۔

اور انہی سے روایت ہے کہ آپ جب گھر میں آتے تو سلام کہتا اور جاتے تو سلام کہتے۔

سیدہ عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب گھر میں داخل ہوتے تو فرماتے

اگر ابن آدم کے پاس سونے کی دو وادیاں ہوں تو اس کی خواہش تیسری وادی کی ہوگی اور واقعہ یہ ہے کہ ابن آدم کا پیٹ تو (قبر کی) مٹی ہی بھر سکتی ہے حالانکہ مال تو نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کے لئے ہے اور اللہ تعالیٰ اُس کی طرف متوجہ ہوتا ہے جو اس کی طرف متوجہ ہو۔

سیدہ عائشہؓ سے پوچھا گیا کہ آپ گھر میں آکر کیا کیا کرتے تھے؟ فرمایا کپڑوں کو پیوند لگاتے، اپنا جوتا گانٹھتے اور وہ سب کچھ کرتے تھے جو لوگ اپنے گھروں میں کرتے ہیں۔

ایک اور روایت کے مطابق جب آپ گھر میں ہوتے تو گھر والوں کا ہاتھ بٹاتے اور گوشت کاٹتے بناتے تھے۔

عمرو بن العاصؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب دن کے وقت گھر پلٹتے تو فرماتے۔

لائق حمد ہے وہ ذات جس نے میری سرپرستی فرمائی، مجھے پناہ بخشی اور لائق حمد ہے وہ خدا جس نے مجھے کھلایا اور پلایا اور لائق حمد ہے وہ خدا جس نے مجھ پر احسان کیا اور میں اے اللہ تجھ سے دوزخ سے بچنے کا سوال کرتا ہوں۔

گھر سے نکلتے وقت تیاری کا معمول :

بیان کیا جاتا ہے کہ جب آپ گھر سے نکلتے تھے تو اپنے بال درست کرتے، جسم سنوارتے اور آئینہ دیکھتے تھے اور کہتے تھے اللہ تعالیٰ اُس

بندے سے خوش ہوتا ہے جب وہ اپنے بھائیوں سے ملنے کے لئے نکلتا ہے کہ وہ اسے دیکھ کر خوش ہوں۔

سیدہ عائشہؓ روایت کرتی ہیں ایک دن آپ میرے گھر سے نکلنے لگے تو آپ کی نظر چھاگل پر پڑی جس میں پانی بھرا تھا آپ نے اس میں نگاہ ڈالی اور اپنے بال سنوارے، اور فرمایا اللہ تعالیٰ اس بندے کو پسند کرتا ہے جو اپنے بھائیوں کی طرف نکلے کہ وہ اسے دیکھ کر خوش ہوں،

انسؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی مجلس سے اٹھنے کا ارادہ فرماتے تو اٹھتے وقت کہتے اے اللہ تیرے حکم سے ہی میں اٹھ رہا ہوں اور تیری ہی طرف متوجہ ہوں اور تیرے ساتھ ہی وابستہ ہوں، تو ہی میرا سہارا میری امید ہے مجھے سخت کاموں میں اپنی سرپرستی سے نواز کہ جو میری ہمت سے زیادہ ہیں۔ اے اللہ میرا تقویٰ بڑھا، میرے گناہ بخش اور ہر اس طرف بھلائی ہو جس طرف میں متوجہ ہوں،

انسؓ ہی سے روایت ہے کہ آپ جب کسی گھر سے جانے کا ارادہ فرماتے تو ڈیوڑھی پر کھڑے ہو کر فرماتے۔

"اللہ کے نام سے، اللہ ہی پر اعتماد ہے، نہیں ہے کوئی قوت بجز و بزرگ و بالا اللہ کے، اے اللہ میرے لئے فضل و رحمت کے دروازے کھول دے"۔

ام سلمہؓ روایت کرتی ہیں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھر سے نکلتے تو کہتے تھے" اللہ کے نام سے اور اللہ پر ہی توکل ہے ہم تجھ سے ... اور نکلتے وقت پناہ مانگتے ہیں"۔

ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنے مکان سے برآمد ہوتے تو فرماتے'

"اللہ کے نام کے ساتھ، اللہ کی ذات پر توکل، اور اللہ کے علاوہ کوئی طاقت نہیں"۔

ایک اور روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنے گھر سے نکلتے تو فرماتے۔

"اللہ کے نام کے ساتھ اور اللہ کے ساتھ میں اپنا رخ اللہ کی جانب کرتا ہوں، اور اپنی کمر اللہ کے آگے جھکاتا ہوں، اللہ کی توفیق کے علاوہ کچھ بھی نہیں، سارا فضل و کمال اللہ کے ہاتھ میں ہے، اصل ہدایت اللہ کی رہنمائی ہے اور بہترین صاحب قدرت اللہ ہے، بہترین آقا اللہ بہترین مددگار اللہ ہے، ہمارا پلٹنا اللہ کی طرف ہے۔ اللہ کی نعمت کے علاوہ کوئی نعمت نہیں، اللہ کے علاوہ کوئی گناہ بخشنے والا نہیں، اللہ کے علاوہ کسی کی حکومت نہیں، تمام امور اللہ کے ہاتھ میں ہیں، اللہ کے فیصلے سے اس کے رحم کے علاوہ کوئی بچانے والا نہیں"۔ میں اللہ سے ہدایت چاہتا ہوں، میں اللہ کی سرپرستی چاہتا ہوں، میں اللہ کی مدد چاہتا ہوں اور میں اللہ کے فرشتوں، نبیوں، رسولوں اور اللہ کے نیک بندوں پر درود پڑھتا ہوں۔

اجازت لینے اور سلام اور مصافحہ کا ذکر:

آپؐ کا یہ معمول تھا کہ آپ جب کسی کے ہاں تشریف لے جاتے تو دروازے پر کھڑے ہو کر اجازت چاہتے اگر اجازت ملتی تو اندر تشریف لے جاتے۔

قیس بن سعدؓ روایت کرتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے ملنے کے لئے تشریف لائے اور السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہا سعد نے آہستہ جواب دیا، قیس بولے، کیا تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اندر آنے کی اجازت نہیں دیتے ؟ کہا رہنے دو تاکہ آپ بار بار

سلام ورحمۃ کہیں، آپ نے پھر السلام علیکم کہا سعد نے پھر آہستہ سے جواب دیا، آپ نے پھر السلام علیکم کہا۔ سعدؓ نے پھر آہستہ آواز میں سلام کا جواب دیا، حضورؐ پلٹ آئے اور فرمایا تین بار سلام کرنے کے بعد پلٹ جانا چاہیئے، سعد پیچھے دوڑے اور کہا اے اللہ کے رسول میں نے آپ کا سلام سنا تھا اور جواب بھی دیا تھا لیکن بہت آہستہ، تاکہ آپ بار بار السلام علیکم کہتے رہیں۔

عبداللہ بن بسرؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی کے دروازے پر جاتے اور اجازت چاہتے تو دروازے کے عین سامنے کھڑے نہیں ہوتے تھے بلکہ دیوار کے ساتھ ٹہلتے رہتے تاآنکہ اجازت ملتی یا واپس پلٹ آتے، اور یہ بھی آپ کا معمول تھا کہ جب کسی کے ہاں جانے اور آپ کے ہمراہ کوئی ہوتا تو دروازے پر کھڑے ہو کر اجازت طلب فرماتے اگر اجازت مل جاتی تو فرماتے میں اور میرا ساتھی بھی! (یعنی ہم دونوں اندر آ سکتے ہیں)

عمران بن حصینؓ روایت کرتے ہیں مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے عمران ہمارے نزدیک تمہاری بڑی عزت ہے کیا تم فاطمہؓ کی عیادت کو نہیں چلو گے؟ میں نے کہا حاضر ہوں ابھی چلتا ہوں، چنانچہ آپ اُٹھے اور میں بھی ساتھ ہو لیا حتیٰ کہ ہم سیدہ فاطمہؓ کے دروازے پر پہنچے، آپ دروازے پر ٹھہر گئے اور فرمایا السلام علیکم میری بیٹی! کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟ بولیں، ہاں آجایئے، آپ نے فرمایا میں اور میرا ساتھی بھی؟ انہوں نے پوچھا ہمراہ کون ہے؟ آپ نے فرمایا عمران بن حصین

سہل بن سعدؓ روایت کرتے ہیں ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کی درز سے جھانک رہا تھا۔ آپ کے پاس پُشت خار تھا جس سے آپ سر کھجا رہے تھے آپ نے فرمایا اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تو جھانک رہا ہے تو میں تیری آنکھ پھوڑ دیتا کیوں کہ ہمارے ہاں اجازت آنکھ ہی کی تو ہے (یعنی جب جھانک لیا تو پھر اجازت کاہے کی؟)

انسؓ روایت کرتے ہیں، ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر جھانک رہا تھا آپ اس کی طرف تیر کا گانسا لے کر اُٹھے اور گویا کہ میں ابھی دیکھ رہا ہوں کہ آپ اُس کی آنکھ پھوڑنے کے لئے بڑھ رہے ہیں،

انسؓ روایت کرتے ہیں ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر جھانک رہا تھا آپ نے تیر اٹھا کر اس کا منہ پھیر دیا۔

ابوموسیٰؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میں سے ہر ایک تین بار اجازت چاہے اگر اجازت مل جائے تو بہتر ورنہ پلٹ آئے۔

جابرؓ روایت کرتے ہیں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنے والد پر قرض کے سلسلے میں حاضر ہوا۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا، آپ نے فرمایا کون؟ میں نے عرض کیا میں ہوں، آپ نے فرمایا۔ یہ کیا میں ہوں، گویا آپ نے اسے ناپسند فرمایا (یعنی نام بتانا چاہیے تھا)

ربعی بن حراشؓ بنو عامر کے حوالے سے روایت کرتے ہیں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گیا اور کہا کیا میں اندر آسکتا ہوں؟ آپ نے اپنی خادمہ سے فرمایا تم اس کے پاس جاؤ اور کہو یہ کوئی اجازت کا اچھا طریقہ نہیں؟ تم اس سے کہو کہ وہ یوں کہے۔ السلام علیکم کیا اندر آسکتا ہوں؟ اس شخص نے سن لیا اور کہا السلام علیکم کیا میں اندر آسکتا ہوں؟ آپ نے اسے اجازت دے دی۔

دربان بٹھانے اور اس کا کسی کو روکنے کا ذکر :

رسول اللہؐ کا معمول تھا کہ جب کوئی آپؐ سے آنے کی اجازت چاہتا اور آپؐ مصروف ہوتے تو اجازت نہ دیتے۔

عمر بن خطابؓ روایت کرتے ہیں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا........ دروازے پر ایک حبشی غلام تھا، میں نے اس سے کہا کہ میرے لئے آپ سے اجازت مانگو۔ وہ گیا اور پھر آیا اور کہا اجازت نہیں مل رہی، پھر میں نے کہا واپس جاؤ اور میرے لئے اجازت چاہو اس نے پھر کہا اجازت نہیں ہے پھر بالآخر تیسری یا چوتھی بار اجازت ملی۔

ایک اور روایت کے مطابق عمرؓ دروازے پر کھڑے ہو گئے اور کہا السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، کیا عمرؓ داخل ہو سکتا ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت نہ دی، پھر پلٹ آئے اور پھر گئے، پھر اجازت مانگی لیکن پھر بھی اجازت نہ ملی۔

سلام اور مصافحہ :

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب سلام کرتے تھے تو تین بار کرتے تھے، انسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب سلام کرتے تو تین بار کرتے اور جب بات کرتے تو تین بار دہراتے،

ایک اور روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب لوگوں کے پاس جاتے یا ان کے پاس سے گزرتے تو ان پر سلام کرتے اگر جواب ملتا تو بہتر ورنہ تین بار السلام علیکم کہتے

بیان کیا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب لوگوں کے پاس جاتے تو انہیں سلام کرتے اور تشریف فرما ہوتے جب اٹھتے تو سلام کرتے اور پلٹ آتے اور فرماتے پہلا سلام دوسرے سے کوئی زیادہ افضل نہیں یعنی ہر بار سلام کا مستقل درجہ ثواب ہے۔ آپ کا یہ بھی معمول تھا کہ جو بھی آپ کو ملتا آپ اسے سلام کرتے۔ اگر کوئی آپ کا ہاتھ تھام لیتا تو آپ اسوقت تک اپنا ہاتھ نہ چھڑاتے تاوقتیکہ وہ خود نہ چھوڑ دیتا۔ اور آپ کسی سے ملتے وقت سلام کرنے میں پہل فرماتے اور لوگوں کو بھی اس کا حکم دیتے۔

بچوں اور عورتوں کو سلام کرنا :

جریرؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہؐ عورتوں پر سے گزرے تو انھیں سلام کیا، اسماء بنت یزیدؓ روایت کرتی ہیں رسول اللہؐ عورتوں پر سے گزرے وہ بیٹھی تھیں، آپؐ نے ہاتھ کے اشارے سے سلام کیا اور فرمایا تم بطور خاص اپنے محسنوں کی ناشکری سے پرہیز کرو، وہ بولیں ہم اللہ کی پناہ مانگتی ہیں کہ اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کریں، آپ نے فرمایا ہاں تم میں ہر ایک طویل کنوارپن یا بیوگی کے بعد شوہر والی بنتی ہو، اس سے اولاد ہوتی ہے۔ اور آنکھوں کو ٹھنڈک ملتی ہے پھر کسی بات پر رنجش ہو جاتی ہے تو تم اللہ کی قسم کھا کر کہتی ہو کہ میں نے تو اس سے کبھی کوئی خوشی دیکھی ہی نہیں۔

ثابت البنانی اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ انسؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بیان کیا۔ انصار کی شادی سے واپس آنے والی عورتوں، بچوں اور خادموں نے آپ کا استقبال کیا تو آپ نے انہیں سلام کیا اور فرمایا قسم بخدا میں تمہیں دوست رکھتا ہوں۔

یزید کی بیٹی کہتی ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم پر گزرے اور ہم عورتیں مسجد میں تھیں تو آپ نے ہمیں سلام کیا۔

انسؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بچوں کے پاس سے گزرے تو انہیں سلام کیا۔

انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم بچوں کے پاس سے گزرے تو ہمیں سلام کیا اور فرمایا اے بچو! السلام علیکم

ثابت البنانی روایت کرتے ہیں کہ انس بن مالکؓ بچوں پر سے گزرے تو انہیں سلام کیا اور کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسا ہی کرتے تھے۔

انسؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم پر سے گزرے اور ہم بچے کھیل رہے تھے آپ نے ہمیں سلام کیا، آپ نے مجھے کسی کام پر بھیج دیا، اور آپ راستے میں بیٹھ کر میرا انتظار کرنے لگے حتیٰ کہ میں واپس آگیا، تاہم میں ام سلیم کے پاس ذرا دیر سے پہنچا۔ انہوں نے کہا تاخیر کیوں ہوئی؟ میں نے کہا حضور نے مجھے کسی کام کے لئے بھیج دیا تھا بولیں کیا؟ میں نے کہا وہ آپ کا راز ہے تو بولیں اچھا آپ کے راز کی حفاظت کرو۔

مشرکوں اور اہلِ کتاب کا سلام کرنا :

اسامہ بن زیدؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہ ایک ایسی مجلس سے گزرے جس میں مسلمان مشرک بتوں کے پجاری اور یہودی ملے جلے تھے تو آپ نے انھیں سلام کیا۔

انہی سے روایت ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گدھے پر سوار تھا اور اس پر پالان کسا ہوا تھا۔ آپ سعدؓ کی بیمار پرسی کے لیے تشریف لے جا رہے تھے آپ کا گزر ایسی مجلس سے ہوا جس میں عبداللہ بن ابی بھی موجود تھا آپ نے انہیں سلام کیا۔

سیدہ عائشہؓ روایت کرتی ہیں یہود کے کچھ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور ملنے کی اجازت چاہی آپ نے اجازت دے دی، جب وہ اندر آئے تو کہا السام علیک یا محمد (یعنی آپ پر بیماری ہو) آپ نے فرمایا وعلیکم۔ سیدہ عائشہؓ کہتی ہیں میں نے کہا وعلیکم السام واللعنۃ، آپ نے فرمایا عائشہ اللہ تعالیٰ رفیق ہے اور وہ نرمی کو پسند کرتا ہے۔ میں نے عرض کیا آپ نے کچھ نہیں سنا؟ فرمایا کیا تم نے وہ نہیں سنا جو میں نے کہا؟ میں نے کہا وعلیکم (یعنی تم پر بھی)

کسی کا سلام رد کر دینا :

ابی تمیمہؓ روایت کرتے ہیں ایک شخص رسول اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا علیک السلام یا رسول اللہ آپ نے فرمایا علیک السلام مت کہا کرو کیونکہ یہ مردوں کا سلام ہے۔ تم سلام علیکم کہا کرو۔ کلدہ بن حنبلؓ کہتے ہیں کہ صفوان بن امیہ نے اسے رسول اللہؐ کی خدمت میں دودھ یا چھوٹے ہرن کا گوشت اکھیس اور چھوٹی ککڑی دے کر بھیجا آپ اس وقت مکہ کی بلندی پر تھے، میں گیا لیکن میں نے سلام نہ کیا آپ نے فرمایا لوٹ جاؤ اور پھر آکر السلام علیکم کہو، کہتے ہیں کہ میں گیا اور پھر آیا اور السلام علیکم کہا اور آپ نے فرمایا وعلیکم السلام۔

عمران بن حصینؓ روایت کرتے ہیں، ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے، ایک شخص آیا اور اس نے آکر سلام کیا، آپ نے اس کا جواب دیا اور فرمایا بیس (نیکیاں)، پھر ایک اور شخص آیا اور سلام کیا اور کہا السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، آپ نے فرمایا وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، اور کہا تیس (نیکیاں)

انسؓ کی روایت کے مطابق ایک اور شخص آیا اور کہا السلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہ ومغفرتہ آپ نے اس کا جواب دیا اور فرمایا چالیس پھر فرمایا یہ فضائل (اور نیکیاں) ہیں

غالب بن خطاف کہتے ہیں ہم حسن بصریؒ کے دروازے پر بیٹھے تھے ایک شخص آیا اور کہا مجھ سے میرے والد اور انہوں نے اپنے والد سے بیان کیا کہ مجھے میرے باپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا اور مجھے کہا آپ تک میرا سلام بھی پہنچا دینا کہتے ہیں کہ میں آپ کے پاس گیا اور کہا کہ میرے والد آپ کو سلام کہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا تم پر اور تمہارے والد پر سلام!

بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت علیؓ مسجد میں داخل ہوئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کی جماعت میں تشریف فرما تھے انہوں نے آکر کہا السلام علیکم آپ نے فرمایا وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ دس (نیکیاں) میرے لیے اور دس تمہارے لیے، پھر حضرت علیؓ چلے گئے اور واپس آئے اور کہا السلام علیکم ورحمۃ اللہ آپ نے فرمایا وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ بیس (نیکیاں) میرے لئے اور بیس تمہارے لئے، پھر پلٹ کر آئے اور کہا السلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہ، آپ نے فرمایا وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ تیس (نیکیاں) میرے لیے اور تیس تمہارے لیے ہیں اور تم اے علی سلام میں برابر ہیں۔

بیان کیا جاتا ہے کہ ایک بچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا میری امی آپ کو سلام کہتی ہے۔ آپ نے فرمایا تم پر اور تمہاری امی پر سلام

انسؓ روایت کرتے ہیں ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے گزرا جو صحابہ کے مویشی چرایا کرتا تھا اور کہا السلام علیک یا نبی اللہ (یا کہا) یا رسول اللہ، آپ نے فرمایا وعلیک السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، ومغفرتہ ورضوانہ، آپ سے کہا گیا اے اللہ کے رسول آپ نے اس کا جواب اس طرح دیا کہ کبھی صحابہ کو ایسا جواب نہیں دیا، آپ نے فرمایا کون مجھے اس سے روک سکتا ہے اور وہ شخص دس آدمیوں کے برابر ثواب لے کر چلا گیا۔

آپ کا یہ کہنا کہ تم کیسے ہو؟ کیسے صبح کی؟ اور کچھ ایسی ہی باتیں:

عبداللہ بن ابی طلحہؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی اپنے صحابی کو دیکھتے تو فرماتے تم کیسے ہو؟ کیسے صبح کی؟ وہ کہتا، خیریت ہے اللہ کی تعریف کرتا ہوں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُسے فرماتے اللہ تجھے خیریت سے رکھے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عباس بن عبدالمطلبؓ سے فرمایا تم اور تمہارے بیٹے صبح اپنے گھر سے نہ نکلیں تا آنکہ میں وہاں آؤں۔ مجھے تم سے کوئی کام ہے، جب صبح ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے پاس آئے اور فرمایا السلام علیکم تمہاری صبح کیسے ہوئی؟ بولے خیریت سے اور ساری تعریفیں اللہ کے لئے ہیں۔

جابرؓ روایت کرتے ہیں عقیلؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ نے فرمایا خوش آمدید ابو یزید کس طرح صبح ہوئی؟ فرمایا خیریت سے اور خدا کرے کہ آپ کی صبح بخیر ہو۔

عباسؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے اور فرمایا السلام علیکم صبح کیسے ہوئی؟ ہم بولے آپ پر ہمارے ماں باپ قربان، آپ کی صبح کیسی ہوئی؟ فرمایا صبح بخیر میں اللہ کی حمد و ثنا کرتا ہوں۔

عبداللہ بن عمروؓ روایت کرتے ہیں ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عبداللہ بن عمرو کی والدہ کے پاس تشریف لائے اور فرمایا:

اے ام عبداللہ کیسی ہو؟ بولی خیر سے ہوں، آپ پر میرے ماں باپ قربان! اور آپ کیسے ہیں؟ فرمایا خیریت سے ہوں اور ہاں تمہارے عبداللہ کا کیا حال ہے؟ بولیں خیریت سے ہے یا رسول اللہ کے رسول!

عصام بن بشیر روایت کرتے ہیں کہ میرے والد نے بیان کیا بنی الحارث بن کعب نے مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور سلام عرض کیا آپ نے فرمایا خوش آمدید وعلیکم السلام، کہاں سے آئے ہو؟ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ پر میرے ماں باپ قربان میں بنی الحارث سے ہوں، انہوں نے مجھے اسلام کی غرض سے آپ کے پاس بھیجا ہے، آپ نے فرمایا بہت خوب تمہارا نام کیا ہے؟ میں نے کہا میرا نام اکبر ہے۔ آپ نے فرمایا تمہارا نام بشیر ہے، اور آپ نے میرا نام بشیر رکھا۔

سیدہ عائشہؓ روایت کرتی ہیں حضرت فاطمہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں آپ نے جب انہیں دیکھا تو فرمایا خوش آمدید میری بیٹی! پھر انہیں آپ نے اپنے داہنی جانب بٹھایا

ام ہانی بنت ابی طالبؓ روایت کرتی ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس فتح مکہ کے سال گئی۔ آپ ہاتھ منہ دھو رہے تھے میں نے سلام کیا آپ نے فرمایا خوش آمدید ام ہانی!

محمود بن لبید روایت کرتے ہیں غزوہ خندق کے دن سعدؓ کو زخم پہنچا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ان کے پاس سے گزرتے تو فرماتے صبح کیسے ہوئی؟ آپ جب صبح کو گزرتے تو فرماتے صبح کیسے ہوئی؟ اور شام کو گزرتے تو فرماتے شام کیسے ہوئی؟ اور وہ آپ کو بتاتے۔

رسول اللہ ؐ جس شخص کو سلام کا جواب نہ دیتے اور جسے اشارے سے جواب دیتے:

عمار بن یاسرؓ روایت کرتے ہیں میں رات کو سفر سے اپنے گھر واپس آیا میرے ہاتھ پھٹ گئے تھے، میں نے ان پر زعفران مل لیا۔ پھر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اور آپ نے نہ تو جواب دیا اور نہ خوش آمدید کیا، بلکہ فرمایا تم جاؤ اور یہ ہاتھوں سے صاف کر دو، چنانچہ میں گیا اور اُسے دھو ڈالا پھر واپس آیا اور ابھی زعفران کا اثر باقی تھا میں نے سلام کیا آپ نے جواب نہ دیا اور مرحبا بھی نہ کہا پھر فرمایا جاؤ اسے دھو ڈالو، میں گیا اور جا کر اُسے دھو ڈالا اور واپس آکر سلام کیا آپ نے جواب دیا اور مجھے خوش آمدید بھی کہا اور فرمایا بلاشبہ خدا کے فرشتے اور کافر، زعفران ملنے والے اور جنبی کے جنازے میں شریک نہیں ہوتے۔

بیان کیا جاتا ہے ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کیا اور آپ ابھی پیشاب کر کے فارغ ہوئے تھے۔ آپ نے جواب نہ دیا آپ نے اپنا ہاتھ دیوار پر مارا۔ ایک اور روایت کے مطابق وضو کیا اور پھر اسے سلام کا جواب دیا اور فرمایا مجھے یہ اچھا نہ لگا کہ میں بغیر پاکیزگی حاصل کئے اللہ کا نام لوں

رسول اکرم ؐ کا حالتِ نماز میں سلام کا جواب دینا اور نمازی کو سلام کہنا:

صہیبؓ روایت کرتے ہیں میں رسول اللہ ؐ کے پاس سے گزرا آپ ؐ نماز پڑھ رہے تھے۔ میں نے سلام کیا اور آپ نے انگلی کے اشارے سے سلام کا جواب دیا۔

ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کی غرض سے مسجد کی طرف تشریف لائے۔ انصار آپ کے پاس سلام کرنے کی غرض سے آئے اور آپ نماز میں تھے۔ ابن عمرؓ کہتے ہیں میں نے بلال سے کہا۔ آپ نے کس طرح ان کے سلام کا جواب دیا؟ انہوں نے بتایا آپ نے ہاتھ کھولا اور ہتھیلی کی پشت اوپر اور پیٹ نیچے کیا۔

ابن عمرؓ ہی سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابی بن کعبؓ کے پاس سے گزرے جب وہ نماز پڑھ رہے تھے آپ نے سلام کیا لیکن انہوں نے جواب نہ دیا، انہوں نے نماز مختصر کی اور آپ کے پیچھے پہنچ گئے اور کہا یا رسول اللہ آپ نے سلام کیا جبکہ میں نماز پڑھ رہا تھا، آپ نے فرمایا تمہیں سلام کا جواب دینے میں کونسی چیز مانع تھی؟ بولے میں نماز پڑھ رہا تھا، آپ نے فرمایا کیا تم نے اللہ تعالیٰ کا ارشاد نہیں سنا۔ "اے ایمان والو تم اللہ اور رسول کی پکار کا جواب دو جب وہ تمہیں بلائیں" وہ بولے اے اللہ کے رسول اب آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔

مصافحہ کرنا :

ایوب بن بشیر بن کعب العدوی رضی اللہ عنہ عنزہ کے ایک شخص سے روایت کرتے ہیں، میں نے ابوذر رضی اللہ عنہ سے ان کے شام جانے وقت دریافت کیا۔ میں آپ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث کے متعلق پوچھنا چاہتا ہوں، وہ بولے میں تمہیں جب بتاؤں گا اگر وہ کوئی راز نہ ہوا تو؟ میں نے کہا کوئی راز کی بات نہیں کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مصافحہ کرتے تھے جب آپ لوگ انہیں ملا کرتے تھے، فرمایا آپ مجھے کبھی بھی نہیں ملے جبکہ آپ نے مصافحہ نہ کیا ہو۔ ایک مرتبہ آپ نے مجھے بلا بھیجا میں گھر پر نہ تھا جب مجھے پتہ چلا تو میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ تخت پر تشریف رکھتے تھے، آپ نے مجھے لپٹا لیا اور یہ اس سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔

رسول اللہؐ فرمایا کرتے پورا اسلام تو ہاتھ ملانا ہی ہے :

براء بن عازبؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہؐ نے فرمایا جب دو مسلمان آپس میں ملتے اور مصافحہ کرتے ہیں تو انکے جدا ہونے سے پہلے ان کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ ایک اور روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ جب دو مسلمان ملتے ہیں اور مصافحہ کرتے اللہ کی حمد کرتے اور گناہوں کی مغفرت چاہتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کے گناہ معاف فرما دیتا ہے۔

انسؓ روایت کرتے ہیں ایک شخص نے کہا اے اللہ کے رسول! اگر کوئی شخص اپنے بھائی یا دوست سے ملے تو اس کے لئے جھکے؟ فرمایا نہیں، وہ بولا کیا اُسے لپٹائے اور بوسہ دے؟ فرمایا نہیں۔ اس نے کہا کیا اس کا ہاتھ پکڑے اور مصافحہ کرے؟ فرمایا ہاں!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں آتا ہے کہ جب آپ کسی سے ملتے تو اسے سلام کہتے اس کا ہاتھ پکڑتے اور اپنی انگلیاں اس کی انگلیوں میں پیوست کر دیتے اور آپ اس وقت تک اپنا ہاتھ نہ چھڑاتے جب تک کہ وہ آپ کا ہاتھ نہ چھوڑ دیتا۔

انسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی کا ہاتھ پکڑ کر اس وقت تک نہیں چھوڑتے تھے جب تک کہ یہ نہ کہتے

اللھم آتنا فی الدنیا حسنۃً وفی الآخرۃ حسنۃً وقنا عذاب النار،

حذیفہؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے ملے اور فرمایا ہاتھ ملاؤ، لیکن میں نے نہ ملایا۔ آپ نے دو تین بار یہی فرمایا میں نے عرض کیا یا رسول اللہ میں حالت جنابت میں تھا اور مجھے اچھا نہ لگا کہ آپ کے ہاتھ چھوؤں، آپ نے فرمایا حذیفہ کوئی مسلمان

جب اپنے دوست سے ملتا ہے اور اس کا ہاتھ تھامتا ہے تو ان دونوں کے گناہ یوں جھڑ جاتے ہیں جس طرح درخت سے پتے جھڑتے ہیں

اُٹھ کر استقبال اور معانقہ کرنا:

سیدہ عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ میں نے کسی کو شکل و شباہت، سیرت، عادات اور گفتگو میں حضرت فاطمہؓ سے بڑھ کر رسول اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مشابہ نہیں دیکھا جب وہ آپ کے پاس آتیں تو آپ اٹھ کھڑے ہوتے، ان کا ہاتھ تھام لیتے، بوسہ دیتے اور اپنی جگہ پر بٹھاتے تھے اور جب آپ اُن کے ہاں تشریف لے جاتے تو وہ کھڑی ہو جاتیں، آپ کا ہاتھ پکڑتیں اور چومتیں اور اپنی جگہ پر بٹھاتیں۔

شعبیؒ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جعفر بن ابی طالبؓ سے ملے، انہیں گلے لگایا اور پیشانی پر بوسہ دیا۔

سیدہؓ عائشہ روایت کرتی ہیں زید بن حارثہؓ مدینہ منورہ میں آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے گھر میں تشریف فرما تھے۔ انہوں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے لیے اٹھے۔ آپ نے اس وقت کپڑے اتار رکھے تھے، اپنے کپڑے کھینچتے ہوئے اُن کی طرف بڑھے، قسم بخدا میں نے انہیں اس سے پہلے اور اس کے بعد آپ کو کبھی برہنہ نہیں دیکھا آپ نے ان سے معانقہ کیا اور انہیں بوسہ دیا۔

ابوامامہ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے اور آپ نے عصا سے ٹیک لگا رکھی تھی ہم آپ کیلئے اُٹھے آپ نے فرمایا تم عجمیوں کی طرح نہ اٹھا کرو جس طرح وہ ایک دوسرے کی تعظیم کرتے ہیں۔

انسؓ روایت کرتے ہیں کہ کوئی شخص صحابہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر محبوب نہ تھا لیکن جب وہ آپ کو دیکھتے تھے تو کھڑے نہیں ہوتے تھے کیوں کہ انہیں معلوم تھا کہ آپ کو یہ ناپسند ہے

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص یہ پسند کرے کہ لوگ اسی کے لئے کھڑے ہوں تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں سمجھے۔

ابوسعید خدری روایت کرتے ہیں جب بنو قریظہ سعد بن معاذ کے فیصلے پر (قلعہ سے) نیچے اتر آئے۔ سعد آپ کے پاس گدھے پر سوار ہو کر آئے جب وہ مسجد کے قریب پہنچے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار سے فرمایا اپنے سردار کے لئے اُٹھو۔

رسول اللہؐ کے ہاتھ پاؤں اور چہرہ چومنا:

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے جنگ سے فرار ہونے والوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے ہم نے آپ کے ہاتھ پر بوسہ دیا اور روئے اور کہا کہ ہم جنگ سے فرار ہونے والے ہیں، آپ نے فرمایا تم تو پلٹ کر حملہ کرنے والے ہو۔

اُسید بن حضیرؓ روایت کرتے ہیں کہ انصار کے ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک پہلو پر بوسہ دیا۔

صفوان بن عسال المرادیؓ روایت کرتے ہیں کہ اہل کتاب میں سے دو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کچھ باتیں دریافت کیں آپ نے ان کا تشفی بخش جواب دیا تو انہوں نے آپ کے ہاتھ پاؤں چومے اور کہا ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔

ام ابان بنت وازع اپنے دادا زارع بن عامر سے روایت کرتی ہیں ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے اور ہمیں بتایا گیا یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں ہم نے آپ کا ہاتھ پکڑا اور آپ کے پاؤں چومے۔

انہی کی بیان کردہ روایت ہے کہ جب جعفر بن ابوطالب حبشہ سے واپس آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انکے ہاتھ کا بوسہ لیا۔

رسول اکرمؐ کے کھانے کی خصوصیت

- اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے ٹیک لگا کر کھانا ناجائز قرار دیا ہے۔

سیدہ عائشہ روایت کرتی ہیں کہ میں نے کہا اے اللہ کے رسولؐ، آپ کھانا ٹیک لگا کر کھایا کیجئے!

آپ نے فرمایا میں ایک بندہ ہوں اس طرح بیٹھتا ہوں جس طرح بندے کو بیٹھنا چاہیئے اور ویسے کھاتا ہوں جس طرح بندہ کھاتا ہے،

ابن عمروؓ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی ٹیک لگا کر کھانا کھاتے نہیں دیکھا۔

ابی جحیفہؓ کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ واضح رہے میں ٹیک لگا کر کھانا نہیں کھایا کرتا۔

- یہ بھی آپ کی خصوصیت تھی کہ آپ کے لئے پیاز اور لہسن کھانا جائز نہ تھا،

ابوایوب انصاری روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک پیالہ پیش کیا گیا جس میں پیاز تھا آپ نے فرمایا تم کھاؤ کہ میں تمہاری مانند نہیں ہوں۔

ابوایوبؓ روایت کرتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کھانا بھجوایا آپ نے اسے واپس لوٹا دیا اور کچھ بھی نہ کھایا میں نے عرض کیا کیا وجہ تھی اے اللہ کے رسولؐ آپ نے کھانا واپس کر دیا؟ فرمایا میں نے اس میں لہسن دیکھا تھا۔

- آپؐ گندنا اور بدبودار سبزیاں نہیں کھایا کرتے تھے

اُم ایوبؓ روایت کرتی ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کھانا بھیجا اور بعض کچھ ایسی ہی سبزیاں تھیں، آپؐ نے انہیں پسند نہ فرمایا اور صحابہ سے فرمایا تم کھاؤ میں نہیں کھاتا اور میں تمہاری طرح بھی نہیں مجھے اندیشہ ہے کہ اس سے میرے دوست (فرشتے) کو ایذا پہنچے گی۔

- آپ کو یہ بھی خصوصیت حاصل ہے کہ اگر آپ کو کسی کھانے، پینے اور پہننے کی کسی چیز کی ضرورت ہو اور وہ چیز کسی ایسے شخص کے پاس ہو جو خود حالتِ اضطرار میں ہو تب بھی اس پر لازم ہے کہ وہ اپنی چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے کر دے خواہ وہ خود بھوک پیاس سے مر جائے لیکن اپنی ذات پر آپ کی ذات کو ترجیح دے۔

اسی طرح آپ پر عقیقہ اور قربانی بھی واجب تھی۔

بیان کیا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھ پر تین ایسی چیزیں واجب ہیں جو تم پر نہیں، قربانی، نماز چاشت اور وتر،

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہر سال قربانی کیا کرتے تھے اور دو چتکبرے رنگ کے مینڈھے ذبح فرماتے تھے ایک اپنی اور اہل و عیال کی

طرف سے اور دوسرا اپنی اُمت کی طرف سے،

بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت علیؓ نے دو مینڈھے قربان کئے ایک اُن میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اُن کے لئے تھا، آپ سے پوچھا گیا تو فرمایا مجھے آپ نے ایسا کرنے کو کہا تھا،

آپؐ کی یہ خصوصیت کہ آپؐ کیلئے دنیوی زندگی کی چمک دمک کی طرف توجہ کرنا ممنوع تھا:

بیان کیا جاتا ہے کہ رسول اللہؐ سرخ اونٹنیوں اور فربہ اونٹوں کے پاس سے گزرے اور موٹاپے کی وجہ سے اُن کا پیشاب اُن کی رانوں سے لتھڑا ہوا تھا۔ آپؐ نے آنکھیں نیچی کر لیں، آپ سے کہا گیا آپ نے آنکھیں جھکا لیں جبکہ یہ تو ہمارے بہترین مال مویشی ہیں؟ فرمایا اللہ تعالیٰ نے مجھے منع فرمایا ہے کہ میں دنیوی زندگی کی چمک دمک کی طرف نظر اٹھا کر دیکھوں، ارشاد خداوندی ہے۔ "اور اپنی نگاہیں اس کے پیچھے لمبی نہ کرو جو ہم نے ان میں سے قسم قسم کے لوگوں کو سامان دیا ہے"۔ (طٰہٰ: ۱۳۱)

ام سلمہؓ روایت کرتی ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس تشریف لائے میں نے گلے میں ہار ڈال رکھا تھا جس میں کچھ سونے کی آمیزش تھی جب آپ نے اسے دیکھا تو میری طرف سے منہ پھیر لیا میں بولی یا رسول اللہ آپ نے منہ کیوں پھیر لیا؟ فرمایا اللہ تعالیٰ نے مجھے دنیوی زندگی کی آرائش پر نظر ڈالنے سے منع فرمایا ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں آتا ہے کہ آپ نے ایک دن نماز پڑھی آپ نے منقش جبہ پہن رکھا تھا۔ آپ نے جب اس کی طرف دیکھا اور نماز سے فارغ ہوئے تو اسے اتار دیا اور فرمایا اس کے نقش و نگار نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا تم اسے ابوجہم کے پاس لے جاؤ اور مجھے ابوجہم کا انبجانیہ یعنی سادہ دھاری دار کرتا لا دو،

علی بن ابی طالبؓ روایت کرتے ہیں، میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! اگر آپ کہیں تو ہم گدھے کا گھوڑے سے ملاپ کرا دیں تاکہ جلبی خچر جیسا خچر بن جائے تو آپ نے فرمایا یہ مشغلے "مترف" (سرمایہ دار) لوگوں کے ہوتے ہیں۔

آپ کی یہ بھی خصوصیت تھی کہ آپ پر توکل کرنا واجب اور ذخیرہ کرنا ناجائز تھا۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "تم اللہ پر توکل کرو بے شک تم واضح حق پر ہو" (النمل: ۷۹)

ام سلمہؓ روایت کرتی ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک رات روتے رہے میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول آپ رات بھر روتے رہے فرمایا میں کچھ دینار بستر کے ایک کونے میں بھول گیا تھا اور وہ کوئی سات یا نو دینار تھے۔

سیدہ عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مرض الموت میں مجھے فرمایا اے عائشہؓ کتنے دینار ہیں؟ میں نے عرض کیا کس لئے؟ فرمایا میرے پاس لے آؤ کہتی ہیں کہ میں لے گئی، پھر فرمایا انہیں نکال دو بعد ازاں آپ ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جب اپنے رب سے ملے گا تو کیا گمان کرے گا کہ اس کے پاس یہ کچھ ہے"۔

انسؓ بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بھی کل کے لئے کوئی چیز نہیں رکھ چھوڑی تھی!

ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے مجھے دنیا جوڑنے کے لئے پیدا نہیں کیا جو شخص دنیا جوڑتا ہے تو زندگی کے باقی رہنے کا یقین رکھتا ہے جبکہ زندگی اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، میں نہ دینار بٹورتا ہوں اور نہ درہم اور نہ ہی کل کے لئے کچھ بچا کر رکھتا ہوں۔

انسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دستر خوان پر تشریف لائے جہاں پرندہ بھی تھا۔ آپ نے اپنی خادمہ سے پوچھا یہ کیا ہے؟ بتلایا گیا یہ پرندہ ان دو میں سے ایک ہے جو شام کو آپ کی نذر کیا گیا تھا فرمایا، اچھا تم نے اسے کل کے لئے بچا رکھا تھا جب ہر دن کا رزق روز ہی اُترتا ہے۔

سیدہ عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس حالت میں رحلت پذیر ہوئے کہ آپ نے نہ کوئی دینار چھوڑا نہ درہم اور نہ کوئی غلام چھوڑا نہ لونڈی اور نہ کوئی بکری اور نہ کوئی اونٹ چھوڑا۔

یہ بھی آپ کی خصوصیت تھی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ پر کچھ بچا کر رکھنا ممنوع قرار دے دیا تھا جو کچھ آپ نے چھوڑا وہ صدقہ ہے کیوں کہ جب آپ پر زمین کے خزانے پیش کئے گئے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو انتخاب کا حق دیا کہ بادشاہ نبی بننا پسند کریں گے یا بندہ نبی! تو آپ نے فرمایا میں مسکین اور بندہ نبی رہنا پسند کرتا ہوں کہ ایک دن بھوکا رہوں اور ایک دن سیر، جب پیٹ بھرے تو تیری تعریف کروں اور جب بھوک لگے تو تجھ سے التجا کروں۔

جب آپ نے خود ہی امیری پر فقیری اور خوشحالی پر تنگی کو ترجیح دی تو اللہ تعالیٰ نے آپ پر اسے لازم کر دیا۔

سیدہ عائشہ روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم متواتر دو دن کبھی بھی شکم سیر نہ رہے تا آنکہ اللہ تعالیٰ سے جا ملے۔

جب اللہ تعالیٰ نے آپ پر دنیا میں سے کم سے کم قناعت کو واجب کر دیا اور آپ بھی اس پر راضی ہو گئے تو جو اس سے زائد تھا وہ اللہ کے لئے تھا آپ اسے وہیں پر خرچ کرتے جہاں اللہ کا حکم ہوتا جب آپ کی زندگی تمام ہوئی تو جو کچھ آپ کے پاس تھا وہ اللہ کا تھا اس لئے وہ اپنے آپ اللہ کے ضرورت مند بندوں کی طرف منتقل ہو گیا۔

ارشاد نبوی ہے۔

میری وراثت میں دینار اور درہم تقسیم نہ کر دکہ جو کچھ اہل و عیال کے نفقہ سے بچے وہ صدقہ ہے۔

مالک بن اوسؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے عمر بن خطابؓ کو عثمان بن عفانؓ، عبدالرحمٰن بن عوفؓ سعد بن ابی وقاصؓ، طلحہؓ اور زبیرؓ سے یہ کہتے ہوئے سُنا کہ تمہیں وہ اللہ بیان کی توفیق دے۔ جس کی قدرت سے زمین و آسمان قائم ہیں کیا تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے سنا ہے کہ

"ہمارا کوئی وارث نہیں ہوتا ہم جو کچھ چھوڑ جاتے ہیں وہ صدقہ ہے۔"

ایک اور روایت کے مطابق "ہم انبیاء کا گروہ وارث نہیں بنایا جاتا جو کچھ ہم چھوڑیں وہ صدقہ ہے" بعض علماء کا یہ بھی کہنا ہے کہ انبیاء کے مال کی وراثت اس لئے بھی نہیں ہوتی کہ وہ زندہ ہوتے ہیں۔ بنا دریں میراث تقسیم نہیں ہوتی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہم انبیاء کے گروہ کا گوشت زمین نہیں کھاتی اور نہ ہی ہمارا خون پیتی ہے، ہم اپنی قبروں میں زندہ

ہوتے ہیں اور قیامت تک نماز پڑھتے رہتے ہیں ۔

آپؐ کی یہ خصوصیت کہ آپ اُمت کی ان تمام ذمہ داریوں ازقسم قرض، خون اور کفارہ کے ضامن ہیں جن کی ادائیگی سے وہ قاصر ہو ،

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے ۔

"نبی، مومنوں کی جان سے بھی زیادہ ان کے قریب (خیر خواہ) ہے"۔ (الاحزاب : ۶)

بنا بریں یہ آپ کی خصوصیت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ پر لازم کر دیا کہ اُن تنگدست اُمتیوں کا قرض اتاریں جو مقروض ہو کر مریں، بیان کیا جاتا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو آپ نے مہاجرین اور انصار میں مواخات قائم فرمائی اور ایک جماعت ایسی بھی تھی جن کی بعد از وفات میراث بھی مشترکہ قرار پاتی تھی اور وہ بطور خاص مہاجرین میں تقسیم کی جاتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی مہاجر کی میراث اس کے ورثاء یا قرابت داروں میں تقسیم نہیں کی تا آنکہ کہ فتح ہوا اور سلسلہ ہجرت منقطع ہو گیا، تب اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نازل ہوا ۔

"اللہ کی کتاب میں اُن کے ذوی الارحام اُن سے زیادہ قریب ہیں" (الانفال : ۵۷)

اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو مال چھوڑ جائے وہ اس کے ورثاء کا ہے اور جو قرض اور یتیم چھوڑ جائے۔ اس کی ذمہ داری مجھ پر ہے"۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر اس شخص کا قرض ادا کرتے تھے جو مقروض ہو کر مرے اور اس کے اہل و عیال کی کفالت کرتے تھے جو تنگ دست ہو کر مرے۔

اسی طرح آپ اس شخص کا تاوان ادا کرتے تھے جو ادا نہ کر سکتا ہو اور ایسے کفاروں کی کیفیت تھی، اور ہر وہ حقوق جو کسی مسلمان پر عائد ہوتے اور وہ ان کی ادائیگی سے عاجز ہوتا تو آپ از رہ شفقت ادا فرماتے، البتہ آپ اگر کسی میت کا قرضہ ادا کرنے کے قابل ہوتے تو آپ اس پر نماز نہیں پڑھتے تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے یہ خاص کر دیا ہے کہ مقروض ہو کر مرنے والے پر نماز نہ پڑھیں تا آنکہ اس کے مال سے قرضہ ادا کیا جائے یا آپ اپنی طرف سے ادا کریں ۔

بیان کیا جاتا ہے کہ جب آپ کے پاس کوئی جنازہ لایا جاتا تاکہ اس پر نماز پڑھیں تو آپ فرماتے تھے کیا اس پر کوئی قرض ہے ؟ کہا جاتا کہ ہاں تو فرماتے کیا کچھ چھوڑا بھی ہے جس سے قرض ادا ہو سکے لوگ کہتے کہ ہاں تو آپ آگے بڑھ کر نماز پڑھتے اور اگر آپ پوچھتے کہ اس پر قرض ہے ؟ اور لوگ کہتے کہ ہاں، پھر آپ فرماتے کیا ادائیگی کے لیے کچھ چھوڑا گیا ہے اور لوگ کہتے کہ نہیں! تو فرماتے تم اس کی نماز جنازہ پڑھو۔ اور آپ نہ پڑھتے ۔

آپ ہی کے متعلق آتا ہے کہ ایک دن آپ کے پاس جنازہ لایا گیا تاکہ آپ اس پر نماز پڑھیں، آپ نے فرمایا اس پر کوئی قرض ہے ؟ کہا گیا ہاں! دو دینار ہیں فرمایا ادائیگی کے لیے کچھ چھوڑ گیا ہے ؟ بتایا گیا نہیں، فرمایا تم اس پر نماز پڑھو اور آپ پیچھے ہٹ گئے۔ حضرت علیؓ بولے یا رسول اللہ یہ میرے ذمے رہا آپ نے فرمایا ہاں اب اس کی گرہ کھلی ہے ایک اور روایت کے مطابق اب اس کی جلد ٹھنڈی ہوئی ہے ،

اے علی! اور پھر آپ آگے بڑھے اور نماز ادا کی۔ ایک اور روایت میں ہے کہ اس کی روح ہمیشہ قرض کے عوض گروی رہتی، ہاں اب گرہ کھلی ہے۔

آپؐ کی یہ خصوصیت کہ آپ کے لیے کن انکھیوں سے دیکھنا اور اشارہ کرنا ممنوع تھا :

مصعب بن سعدؓ اپنے والد سعدؓ سے روایت کرتے ہیں کہ فتح مکہ کے دن عبداللہ بن ابی سرح حضرت عثمانؓ کے پاس آیا اور یہ شخص تھا جسکے متعلق ہر حال میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قتل کا حکم دے رکھا تھا کیونکہ وہ مسلمان ہوا تھا اور کاتب وحی مقرر ہوا لیکن مکہ لوٹ کر پھر مرتد ہو گیا جب فتح (مکہ) کا دن آیا تو اس نے حضرت عثمانؓ کے ہاں پناہ لے لی۔ اور لوگوں نے اُسے چھوڑ دیا پھر اُسے حضرت عثمانؓ ساتھ لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بولے اے اللہ کے رسول! یہ عبداللہ بن ابی سرح ہے بیعت کے لئے حاضر ہے آپ نے سر اٹھا کر دیکھا لیکن کوئی جواب نہ دیا تین بار آپ نے اسی طرح کیا اور اس کے بعد اُسے بیعت کیا، پھر آپ صحابہ کی طرف متوجہ ہوئے کہا کہ تم میں کوئی بھی رجل رشید نہ تھا جب اس نے مجھے دیکھا تو وہ بیعت سے ہاتھ روک دیتا اور اُسے قتل کر دیتا، صحابہ بولے اے اللہ کے رسول ہمیں کیا معلوم کہ آپکے دل میں کیا تھا، آپ ہمیں آنکھ سے اشارہ کر دیتے آپ نے فرمایا کہ یہ نبی کے شایان شان نہیں ہوتا کہ آنکھ سے اشارہ کرے،

بعض وہ باتیں جو اُمت کے بعض افراد کے لیے مخصوص ہیں :

ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں ایک شخص رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا :

"اے اللہ کے رسولؐ! میں ہلاک ہو گیا، میں ہلاک کر دیا گیا"۔ آپ نے فرمایا، کیا ہوا؟ بولا "میں رمضان کے دن میں اپنی عورت کے پاس چلا گیا" آپ نے فرمایا "غلام آزاد کرو" کہا "میرا تو کوئی غلام نہیں" فرمایا "لگاتار دو ماہ کے روزے رکھو" کہا "اس کی بھی طاقت نہیں"، آپؐ نے فرمایا "ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ" وہ بولا "اس کی بھی سکت نہیں" آپؐ نے فرمایا "بیٹھ جاؤ"۔ وہ بیٹھ گیا، آپ کے پاس کھجوروں کا ایک ٹوکرا لایا گیا۔ آپ نے فرمایا جاؤ اور انہیں صدقہ کر دو۔ اس نے عرض کیا "حضور! مجھ سے بڑھ کر کون مسکین ہے" آپ ہنس پڑے، حتیٰ کہ آپ کے دانت ظاہر ہو گئے اور فرمایا "جاؤ اپنے بال بچوں کو کھلاؤ"، ایک اور روایت کے مطابق آپ نے اس سے فرمایا یہ لے جاؤ اور صدقہ کر دو اس نے کہا مجھ سے بڑھ کر کون غریب ہو گا؟ تو آپ نے فرمایا سب کا سب لے جاؤ اور اہل و عیال کو کھلاؤ اور تمہارے علاوہ کسی کے لئے جائز نہیں۔

ایسی ہی ایک خصوصیت کا ذکر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن گھر سے نکلے اور آپ کے ہاتھ میں ریشم اور سونا تھا۔ آپ نے فرمایا یہ دونوں چیزیں میری اُمت کے مردوں پر حرام ہیں اور عورتوں پر حلال! عبدالرحمٰن بن عوفؓ بولے یا رسول اللہ، مجھے خارش ہے میں ریشم کے علاوہ کوئی کپڑا نہیں پہن سکتا، میرے لئے آپ کا کیا حکم ہے؟ آپ نے انہیں اجازت دے دی اور یہ اُن کے لئے مخصوص تھی!

وائل بن حجرؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک عورت نماز کی غرض سے باہر نکلی (بعض روایات میں

نماز صبح کا ذکر ہے! کہتے ہیں ایک شخص اس سے ملا اور اس سے اپنی جنسی خواہش پوری کی اور چلا گیا بعد ازاں ایک اور شخص آیا تو اس عورت نے اس سے کہا کہ وہ آدمی جو ابھی یہاں سے گیا ہے اُس نے میرے ساتھ یہ یہ کیا، وہ شخص اس کی تلاش میں نکل پڑا۔ اتنے میں انصار کے کچھ لوگ وہاں آئے اور اُس عورت نے انہیں بھی بتایا کہ فلاں نے میرے ساتھ یہ یہ کیا، انصاری لوگ اس کی تلاش میں اسی جانب چل پڑے اور اس کو پکڑ لائے جو خود دوسرے کو تلاش کرنے گیا تھا، وہ بولا میں وہ نہیں ہوں۔ بہر کیف لوگ اُسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور عورت بھی آگئی لوگوں نے کہا یہی وہ شخص ہے؟ بولی ہاں، آپ نے حد جاری کرنے کا حکم دیدیا۔ اتنے میں وہ اصل شخص اٹھا اور کہا اللہ کی قسم وہ میں ہوں (یعنی جس نے زنا کا ارتکاب کیا ہے)، آپ نے اس عورت سے کہا تم جاؤ اللہ تعالیٰ نے تمہیں معاف کر دیا ہے اور آپ نے اس مرد سے نصیحت آمیز کلمات ارشاد فرمائے۔ آپ سے کہا گیا کیا آپ اسے سنگسار نہیں کریں گے؟ فرمایا اس نے بڑی اچھی توبہ کی ہے اگر اہل مدینہ ایسی توبہ کریں تو قبول کی جائے گی۔

اسی طرح کی ایک اور خصوصیت کا ذکر ہے کہ ایک بدوی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا اے محمد! آپ مجھے اپنی دعوت کے بارے میں بتایئے؟ آپ نے فرمایا اللہ کے ایک ہونے کی شہادت اور میں اللہ کا رسول ہوں اور یہ پانچ نمازیں جو رات دن میں فرض ہیں وہ شخص بولا اے محمد! کیا آپ اس پر رضامند ہیں کہ میں آپ پر ایمان لاؤں لیکن نماز نہ پڑھوں؟ فرمایا ہاں تم مجھ پر ایمان لاؤ اور نماز نہ پڑھو چنانچہ وہ شخص ایمان لے آیا اور کوئی چالیس دن گزرے ہوں گے کہ وہ دوبارہ آپ کے پاس آیا اور کہا اے اللہ کے رسول! میں نماز پڑھنے کا ارادہ کر رہا ہوں آپ نے فرمایا نماز پڑھا کرو اور قضا نمازیں ادا کرلو۔

ایک اور واقعہ ہے، عمارہ بن خزیمہ اپنے چچا سے روایت کرتے ہیں جو اصحاب رسول میں سے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اعرابی سے گھوڑا خریدا۔ اعرابی آپ کے پیچھے چلا تاکہ قیمت ادا کی جاسکے، آپ آگے نکل گئے اور اعرابی پیچھے رہ گیا۔ کچھ لوگ آئے تاکہ اعرابی سے اس گھوڑے کا سودا طے کریں اور انہیں معلوم نہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسے پہلے ہی خرید چکے ہیں۔ اعرابی بولا یا رسول اللہ! اگر آپ گھوڑا خریدیں تو بہتر ورنہ میں اُسے فروخت کرتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کیا تم اسے فروخت نہیں کر چکے؟ وہ بولا نہیں آپ نے فرمایا ہاں ہاں تم اسے فروخت کر چکے ہو، اعرابی نے کہا کون گواہ ہے؟ آپ نے فرمایا کون گواہی دیتا ہے؟ خزیمہؓ بولے میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ نے اس سے خریدا ہے، آپ خزیمہؓ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا تم کیسے گواہی دے رہے ہو تم تو اس وقت موجود ہی نہ تھے؟ انہوں نے کہا یا رسول اللہ! جب ہم نے آپ کی آخرت کے معاملات میں تصدیق کی ہے تو دنیوی امور میں کیوں نہ کریں گے؟ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خزیمہ کی گواہی کو دو مردوں کی گواہی کے برابر قرار دے دیا اور وہ اس دن سے لوگوں میں "ذو شہادتین" مشہور ہو گئے۔

ام سلمہؓ کہتی ہیں میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول میں ایسی عورت ہوں جس کے بال بہت پیچیدہ ہیں۔ کیا غسل جنابت کے وقت انہیں ضرور کھولا کروں؟ آپ نے فرمایا نہیں تمہارے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ تم سر پر تین بار پانی بہا دیا کرو اور تم پاک ہو جایا کرو گی،

اُم فضل بنت عباسؓ روایت کرتی ہیں میں نے خواب میں دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم کا ایک ٹکڑا میرے گھر میں ہے اس

سے مجھے شدید اذیت ہوئی پھر میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور واقعہ بیان کیا۔ آپ نے فرمایا یہ اچھا خواب ہے، فاطمہ (الزہراء) بیٹا جنے گی اور تم ہی اسے دودھ پلاؤ گی، چنانچہ جب سیدہ فاطمہؓ نے حضرت حسینؓ کو جنم دیا تو میں نے انہیں دودھ پلایا جب دودھ چھڑایا تو انہیں حضور کے پاس لے آئی۔ آپ نے انہیں اپنی گود یا ران پر بٹھایا تو انہوں پیشاب کر دیا میں نے دونوں کندھوں کے درمیان انہیں ذرا ٹھوکا دیا تو آپ نے فرمایا میرے بیٹے سے نرمی برتو خدا تم پر رحم کرے خدا تمہارے کام سنوارے، پھر میں بولی ذرا کپڑے اتار دیجئے تاکہ دھو دوں۔ آپ نے فرمایا لونڈی کے پیشاب سے کپڑا دھویا جاتا ہے دودھ پیتے بچے کے پیشاب کے لئے صرف پانی چھڑک دینا ہی کافی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پانچ جانوروں کا قتل حرم اور اس سے باہر ہر حال میں جائز ہے۔ بچھو، کوا، چوہا اور کاٹنے والا کتا۔ ایک اور روایت کے مطابق چیل۔

رسولِ اکرمؐ کے لیے کچھ اوقات کی خصوصیت :

یہ اوقات پانچ نمازوں کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان اوقات کو نماز کے لئے مخصوص فرمایا ہے دن کو ۲ نمازوں ظہر اور عصر کے لئے مخصوص فرمایا اور رات کو عشاء اور روتر کے لئے اور دو نمازیں رات اور دن دونوں کے لیے ہیں صبح اور مغرب۔

جہاں تک ظہر کا تعلق ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس وقت کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا اس وقت سورج شیطان کے دو سینگوں کے درمیان ہوتا ہے، جب سورج ڈھلتا ہے تو آسمان کے تمام دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور ہر چیز اللہ کی تسبیح کرتی ہے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ مجھے یہ پسند ہے کہ اس وقت میرے عمل اوپر لے جائے جائیں۔
ایک اور روایت کے مطابق آپ نے فرمایا:-

جب سورج ڈھلتا ہے تو جہنم بھڑکائی جاتی ہے پس جو شخص اس وقت نماز پڑھے گا یعنی ظہر تو اللہ تعالیٰ اس پر عذابِ جہنم حرام فرما دے گا۔

نماز عصر کا وقت وہ ہوتا ہے جب دن کی چوتھائی باقی رہ جائے نماز عصر کے وقت کے متعلق آپ سے پوچھا گیا آپؐ نے فرمایا اس ساعت میں آدم علیہ السلام نے وہ درخت کھایا تھا پس جو مسلمان اس وقت نماز ادا کرے گا وہ گناہوں سے یوں پاک ہو جائے گا جس طرح ابھی ماں کے پیٹ سے نکلا ہو۔

نماز مغرب کا وقت سورج کا ڈوب جانا ہے اور رات کا برآمد ہونا، اس وقت کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا اس ساعت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کی توبہ قبول کی تھی پس جو مسلمان اس وقت میں ذمہ داری کیساتھ نماز ادا کرے گا اور پھر وہ اللہ تعالیٰ سے کچھ مانگے گا تو اللہ تعالیٰ اُسے ضرور دے گا۔

نماز عشاء کا وقت شفق کا ڈوب جانا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس وقت کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ

نے فرمایا قبر اندھیری ہے، اور قیامت اندھیری ہے۔ پس جو مسلمان اس کے لیے چل کر نماز ادا کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو آگ کی ظلمت سے بچائے گا اور اُسے وہ نور عطا فرمائے گا جو پل صراط پر چلتے میں اسے کام دے گا، اور اللہ تعالیٰ اُسے قبر حشر اور جہنم کی ظلمت سے محفوظ فرمائے گا۔

نماز صبح کا وقت وہ ہے جب فجر طلوع ہو اور مشرق کے کناروں پر پھیل جائے، آپ سے اس وقت کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ صبح کے وقت ہر رات آسمان دنیا پر نزول اجلال فرماتا ہے اور کہتا ہے کوئی توبہ کرنے والا کہ اس کی توبہ قبول کروں؟ ہے کوئی بخشش کا طالب کہ اُسے بخش دوں؟ ایک اور روایت میں ہے کہ صبح کے وقت عرش حرکت کرتا ہے۔

صدقات میں خصوصیت

عبداللہ بن حارث بن نوفل اور عبدالمطلب بن ربیعہ بن ابن الحارث بن عبدالمطلب کہتے ہیں کہ اُن کے باپ ربیعہ بن حارث اور عباس بن عبدالمطلب دونوں نے اپنے بیٹوں فضل بن عباسؓ اور عبدالمطلب بن ربیعہ سے کہا کہ وہ دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جائیں اور ان سے گزارش کریں کہ اے اللہ کے رسول کہ ہم جس عمر کو پہنچ گئے ہیں وہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ ہماری خواہش ہے کہ ہم شادی کریں، اور آپ اے اللہ کے رسول لوگوں میں سب سے زیادہ نیکی کرنے والے اور انہیں جوڑنے والے ہیں، ہمارے والدین کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں جسے وہ خرچ کر سکیں، لہذا ہمیں صدقات اکٹھے کرنے پر مامور فرما دیں جو کچھ دوسرے اہلکار آپ کو دیتے ہیں اتنا کچھ ہم دیں گے، اور آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ آپ نے مجھے اور فضل کو شرف ملاقات بخشا تو پھر ہم نے آپ سے گفتگو کی، فضل نے بھی کچھ کہا، جو کچھ ہمیں والدین نے کہا تھا، آپ ایک لمحہ خاموش ہوئے اور پھر اپنی آنکھیں گھر کی چھت کی طرف اٹھائیں، اور زیادہ دیر تک ایسے کئے رکھا ہم نے کہا کہ شاید اب آپ ہماری طرف متوجہ نہ ہوں گے، حتیٰ کہ ہم نے سیدہ زینب کو دیکھا کہ وہ پردے کے پیچھے سے اشارہ کر رہی تھیں اور مطلب یہ تھا کہ تم جلدی جانے کی فکر نہ کرو آپ ضرور تمہیں کچھ کہیں گے، پھر آپ نے سر نیچے کیا اور ہمیں فرمایا یہ صدقہ لوگوں کی میل ہوتی ہے اور یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور آل محمد کے لئے قطعاً جائز نہیں پھر فرمایا نوفل بن الحارث کو میرے پاس بلاؤ، اُسے بلایا گیا آپ نے فرمایا اے نوفل تم عبدالمطلب کا نکاح کر دو، پس نوفل نے میرا نکاح کر دیا، پھر آپ نے فرمایا محمیہ بن جزء کو میرے پاس بلاؤ وہ بنی زبید کے آدمی تھے، آپ نے اسے خمس وصول کرنے پر مامور فرمایا۔ پس آپ نے محمیہ سے فرمایا تم فضل کا نکاح کر دو، انہوں نے نکاح کر دیا اور اُس کو آپ نے فرمایا اٹھو اور اس طرح نکاح کے اخراجات خمس سے پورے کرو۔

بیان کیا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک راستے سے گزر رہے تھے آپ کو ایک کھجور پڑی ہوئی ملی۔ آپ نے اُسے اٹھایا اور ساتھ والے آدمی کو دے دی، اور فرمایا اسے کھالو، وہ بولا اے اللہ کے رسول میں کیسے کھاؤں؟ جبکہ آپ نے نہیں کھائی۔ آپ نے فرمایا اگر مجھے یہ خدشہ نہ ہوتا کہ یہ صدقہ کی ہے تو ضرور کھالیتا۔

ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ حسن بن علی کرم اللہ وجہہ نے صدقے کی ایک کھجور اٹھا کر منہ میں ڈال لی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے

انہیں فرمایا کخ کخ، تاکہ وہ منہ سے نکل پڑے پھر فرمایا کیا تمہیں یہ علم نہیں کہ ہم صدقہ کی چیز نہیں کھاتے اور فرمایا یہ صدقہ ہے لوگوں کی میل ہے اور یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) وآلِ محمد کے لیے جائز نہیں۔

ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ جب کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کھانا لاتا تو آپ اس سے دریافت فرماتے یہ ہدیہ ہے یا صدقہ اگر وہ کہتا کہ صدقہ ہے تو آپ صحابہ سے کھانے کو کہتے اگر کہا جاتا کہ ہدیہ ہے تو آپ مل کر کھاتے،

- صدقہ کی کوئی چیز کھانا جب وہ اپنے مصرف میں پہنچ چکی ہو۔

سیدہ عائشہؓ روایت کرتی ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے اور اس وقت ہانڈی میں گوشت پک رہا تھا، جو صدقہ میں بریرہ کو ملا تھا، آپ نے دوپہر کا کھانا طلب فرمایا۔ ہم نے روٹی اور جو کچھ گھر میں میسر تھا آپ کی خدمت میں پیش کر دیا، آپ نے فرمایا کیا میں اُبلتی ہوئی ہانڈی نہیں دیکھ رہا تھا؟ ہم بولے ہاں یارسول اللہ لیکن وہ تو بریرہ کے لیے صدقہ تھا اور آپ صدقہ نہیں کھایا کرتے۔ آپ نے فرمایا اس کے لئے صدقہ ہے اور ہمارے لئے ہدیہ، ایک اور روایت میں ہے کہ صدقہ اپنے مقام پر پہنچ گیا اب یہ اُس کے لئے صدقہ ہے اور ہمارے لئے ہدیہ بعد ازاں آپ نے اُسے لے لیا اور تناول فرمایا۔

- آپ کی یہ خصوصیت کہ آپ پر اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے ہدیہ کو حرام قرار دیا ہے۔

عیاض بن حمار المجاشعی بیان کرتے ہیں کہ میرے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان اسلام سے پہلے بھی شناسائی تھی۔ عیاض نے آپ کو کچھ ہدیہ بھیجا اور کہا گیا یہ اونٹ ہے آپ نے اُسے لوٹا دیا اور فرمایا ہم مشرکین کے "زبد" کو قبول نہیں کرتے، پوچھا گیا کہ "زبد المشرکین" کیا ہے؟ فرمایا اُن کے عطیے اور ہدیے!

بیان کیا جاتا ہے کہ ابو براء نے اپنے بیٹے کے ہاتھ کوئی ہدیہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا اور وہ ایک گھوڑا تھا۔ آپ نے اسے لوٹا دیا اور فرمایا میں کسی مشرک کا ہدیہ قبول نہیں کرتا (اور فرمایا کرتے تھے) اگر میں کسی مشرک کا ہدیہ قبول کرتا تو ابو براء کا ہدیہ قبول کرتا،

- "آپ کی اس خصوصیت کا ذکر کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے لازم قرار دیا ہے کہ آپ کسی ہدیہ کا مناسب معاوضہ عطا کیا کریں کہ ہدیہ دینے والا خوش ہو جائے"۔

بیان کیا جاتا ہے کہ کسی اعرابی نے آپ کو ایک اونٹ بطور ہدیہ بھیجا آپ نے اس کے بدلے میں دس اونٹ بھیجے۔ پھر آپ نے اس سے فرمایا اے فلاں کے باپ تم خوش ہو نا؟ وہ بولا نہیں، آپ پر یہ بات گراں گزری پھر فرمایا میں نے یہ ارادہ کیا ہے کہ میں بجز قریش اور دوس کے کسی کا ہدیہ قبول نہ کروں اور (آپ نے کچھ لوگوں کا ذکر فرمایا)۔

آپ کی یہ بھی ایک خصوصیت ہے کہ آپ کے لئے یہ امر جائز نہیں کہ آپ کسی کو ہدیہ اس لئے دیں کہ وہ آپ کو اس سے زیادہ لوٹائے ارشادِ خداوندی ہے کہ "اس لئے احسان نہ کرو کہ اس سے زیادہ کی طلب کرو" (المدثر: ۶) اس کا مطلب یہی ہے کہ آپ کسی کو اس نیت سے کچھ نہ دیں کہ اس سے زیادہ مل جائے، بلکہ آپ ہدیہ کے جواب میں کچھ زیادہ عطا فرماتے تھے، اور یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ نے اس لئے کیا کہ آپ احسانات سے بچے رہیں۔ آپ کو اللہ نے جو جملہ مخلوق میں سب سے زیادہ عزت اور بے نیازی عطا کی ہے۔ یہ اس کا بھی تقاضا ہے۔

جہاد اور مال غنیمت میں آپؐ کی فضیلت

جہاد کے ضمن میں یہ آپ کی خصوصیت ہے کہ آپ جب امت کے لیے (جہاد کا) لباس پہن لیں تو پھر اس کا اتارنا جائز نہیں جب تک دشمن سے مڈ بھیڑ نہ ہو جائے۔

سیدہ عائشہ روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب غزوۂ خندق سے واپس تشریف لائے تو آپ نے ہتھیار اتارے اور غسل فرمایا اتنے میں حضرت جبریلؑ آگئے اور انہوں نے کہا۔ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ نے ہتھیار کھول ڈالے؟ فرمایا ہاں، انہوں نے کہا لیکن قسم بخدا ہم تو اب تک اسی طرح ہتھیار بند ہیں،

ایک اور روایت کے الفاظ کے مطابق، لیکن ہم فرشتوں کے گروہ نے تو ہتھیار نہیں کھولے!

ایک اور روایت میں ہے کہ (جبریلؑ نے) کہا، اے اللہ کے رسول! آپ نے ہتھیار کھول ڈالے؟

فرمایا ہاں، وہ بولے، یہ تو نبی کے شایان شان نہیں کہ وہ امت کے لیے ہتھیار بند ہو اور پھر ہتھیار کھول دے تا آنکہ اللہ تعالیٰ اُن کے اور دشمنوں کے درمیان فیصلہ نہ فرما دے۔

آپ پر جہاد کے ضمن میں یہ بھی واجب ہے کہ آپ قتال پر مومنین کو ابھارتے رہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

"اے نبی اہل ایمان کو قتال کے لیے تیار کیجئے" (الانفال: ۶۵)

آپ پر کفار سے قتال اور جہاد میں اُن پر شدت کرنا واجب ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

"اے نبی کفار اور منافقین سے جہاد کرو اور اُن سے سختی برتو" (التوبہ: ۷۳)

سعد بن عیاض الثمالیؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہت کم گفتگو فرمانے والے تھے لیکن جب آپ کو حکم جہاد ملا، تو آپ سخت اور تیز ہو گئے اور سب سے زیادہ بے خوف تھے،

علی بن ابی طالبؓ روایت کرتے ہیں کہ جب خوف وہراس عروج پر ہوتا اور قوم قوم سے بھڑ جاتی تو ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں خوف لاحق ہوتا لیکن آپ سب سے بڑھ کر دشمن کی صفوں کے قریب ہوتے۔

علی بن ابی طالبؓ سے روایت ہے کہ میں نے غزوہ بدر کے دن دیکھا ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پناہ لے رہے تھے۔ اور آپ دشمن سے سب سے زیادہ قریب تھے، اور آپ لوگوں میں سب سے زیادہ نڈر تھے۔

عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ میں غزوہ حنین کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھا، لوگ اِدھر اُدھر بکھر گئے اور آپ نے انہیں باآواز بلند پکارا، کہاں ہو اے لوگو! لیکن کوئی بھی نہ آیا، ایک اور روایت کے مطابق آپ نے بلند آواز سے پکارا! اے لوگو!

میں اللہ کا رسول اور تمہارا نگران ہوں تم میرے ارد گرد اکٹھے ہو جاؤ، آگاہ رہو کہ میں باعافیت ہوں، ایک اور روایت میں ہے کہ مسلمان جب ہزیمت سے دو چار ہونے کے بعد آپ کی خدمت میں پہنچے تو روتے تھے اور کہتے تھے اے اللہ کے رسول ہمارے لئے مغفرت کی دعا کیجئے ہم بھاگ جانے والے تھے، آپ نے فرمایا تم حملہ کرنے والے ہو اور میں دیکھ بھال کرنیوالا ہوں۔

مالِ غنیمت میں آپ کی خصوصیت کا ذکر۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے لئے مال غنیمت حلال کر دیا گیا ہے اور مجھ سے پہلے کسی کے لئے حلال نہ تھا۔

یہ بھی آپ کی خصوصیت تھی کہ آپ کا مالِ غنیمت میں پانچواں حصہ ہے، اور آپ کے لئے خُمس مقرر کیا گیا۔ باقی چار حصے بھی آپ جہاں چاہیں اللہ کے حکم سے خرچ فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، تمہیں معلوم ہو کہ جو کچھ مال غنیمت ہے اسمیں اللہ کے لئے پانچواں حصہ اور اس کے رسول کے لئے پانچواں حصہ ہے، اور اہلِ قرابت یتامیٰ اور مسکینوں کا ہے (الانفال: ۴۱)

آپ کے لئے یہ اختیار تھا کہ وہ خُمس مالِ غنیمت میں سے جو چاہیں لے لیں، غلام، لونڈیاں اور گھوڑے وغیرہ اور باقی کو تقسیم فرما دیں اور جو خُمس آپ کے لئے مقرر تھا اس میں سے آپ اپنے اہل و عیال کا سال بھر کا خرچ نکال لیتے اور ہر ایک اہلیہ کے پاس سو یا اسی وسق کھجور اور بیس وسق جَو بھجوا دیتے۔

یہ بھی آپ کی خصوصیت تھی کہ اللہ تعالیٰ نے مالِ غنیمت آپ کے حوالے فرما دیا کہ وہ جس طرح چاہیں کریں اور جسے چاہیں عطا فرمائیں۔

ابن ہشام بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے دن مالِ غنیمت عطا فرمایا اور جس وقت اہل بدر کو فتح نصیب ہوئی اور لوگوں کو حکم دیا گیا کہ لشکر میں سے مالِ غنیمت اکٹھا کر لیں، اور وہ (ایک جگہ) جمع کیا گیا تو لوگوں میں اختلاف پیدا ہو گیا وہ لوگ جنہوں نے یہ مال اٹھایا کہنے لگے ہمارے لئے کیا ہے؟ اور جنہوں نے دشمن سے جنگ کی وہ بولے ہمارے لئے کتنا ہے؟ اور جنہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دشمن کی یلغار سے حفاظت کی تھی وہ کہنے لگے ہمارے لئے کیا ہے؟ تب اللہ تعالیٰ نے آپ کو مالِ غنیمت لینے کو کہا اور یہ آیت اس موقع پر اتری۔

"آپ سے مالِ غنیمت کے متعلق دریافت کرتے ہیں آپ کہیے یہ سب کچھ تو اللہ اور اس کے رسول کا ہے"۔

عُبادہ بن صامتؓ روایت کرتے ہیں مجھ سے اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے متعلق پوچھا گیا "ویسئلونک عن الانفال" میں نے بتایا کہ یہ ہم اہل بدر کے بارے میں ارشاد ہوا کہ جب ہم مالِ غنیمت کے مسئلہ پر اختلاف پیدا ہو گیا تھا اور بہت ہی زیادہ اختلاف! تو اللہ تعالیٰ نے مالِ غنیمت ہم سے لے کر اپنے رسول کے حوالے کر دیا آپ نے اُسے مسلمانوں میں برابر برابر تقسیم فرما دیا۔

ایک اور روایت کے مطابق آپ نے اُسے مسلمانوں میں فضیلت اور نیکی کے اعتبار سے تقسیم فرمایا، یہ بھی آپ کو حق حاصل تھا کہ آپ مالِ غنیمت کی تقسیم کے بعد بھی جسے چاہیں کچھ عطا فرمائیں۔

ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم میں مال غنیمت تقسیم فرمایا اور پھر خُمس میں سے بھی مجھے ایک بوڑھی اونٹنی ملی۔

ابن عمرؓ ہی سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کبھی بعض سریہ میں جانیوالوں کو عام لشکریوں سے زیادہ مال عطا فرماتے۔

آپ کی یہ بھی خصوصیت تھی کہ آپ مالِ غنیمت میں سے انتخاب فرمائیں آپ کے لئے مالِ غنیمت میں سے انتخاب کر لینا درست ہے آپ چاہیں تو لونڈی لیں یا غلام اور گھوڑا وغیرہ لیکن جہاں تک "فی" (بغیر لڑائی کے حاصل ہونیوالا مال) کا تعلق ہے وہ تو ہے ہی اللہ کے رسول کا! اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

"اور جو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو ان لوگوں سے دلوایا ہے اس میں تمہارا کوئی حق نہیں، کیونکہ اس کے لئے نہ تم نے گھوڑے دوڑائے اور نہ اونٹ" (الحشر:۶)

مالک بن اوسؓ روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مالِ فَے میں یہ خصوصیت رکھی ہے کہ وہ اس میں کسی کو کچھ نہ دیں پھر پڑھا "وما افاء اللہ علیٰ رسولہ منہم — قدیر (الحشر: ۶)

اور یہ امر صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مخصوص ہے کہ وہ اس میں سے اپنے اہل وعیال کے لئے سال بھر کا خرچ نکالیں اور جو باقی بچ رہے وہ اللہ کا مال ہے۔

عمرؓ روایت کرتے ہیں بنی نضیر (قبیلہ) کا مال اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دے دیا جس کے لئے مسلمانوں کو نہ گھوڑے دوڑانے پڑے اور نہ اونٹ، یہ مال آپ کے لئے مخصوص تھا کہ وہ اس سے اپنے اہل وعیال کے لئے سال بھر کا خرچ نکالیں، اور جو بچ رہے اُسے جہاد فی سبیل اللہ کی تیاری کے لئے جانوروں اور اسلحے کے حصول میں خرچ کریں۔

عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بنو نضیر، خیبر اور فدک کا مال ملا۔ بنو نضیر کا مال آپ نے اپنے نائبین کے لئے مخصوص فرمایا، فدک کو مسافروں کے لئے مختص کیا۔ خیبر کے مال کے تین حصے فرمائے دو حصے مسلمانوں کے لئے اور ایک اپنے اور اپنے اہل وعیال کے لئے اور جو اہل وعیال سے بچ رہا اُسے غریب مسلمانوں میں بانٹ دیا۔

عوف بن مالکؓ روایت کرتے ہیں جب مالِ فَے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تو آپ نے اُسے ایک ہی دن میں تقسیم فرما دیا۔ اہل وعیال والوں کو دو حصے اور (غیر متاہل) کو ایک حصہ ملا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز، شرائط نماز

آپ کے لئے یہ جائز ہے کہ آپ حالتِ جنابت میں مسجد کے اندر رہ سکتے ہیں اور یہ بھی جائز ہے کہ آپ باوضو سو جائیں اور اُٹھ کر بغیر وضو کئے نماز ادا فرمائیں۔

(عبد اللہ) ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ میں اپنی خالہ ام المومنین سیدہ میمونہ کے ہاں ایک رات ٹھہرا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم سو گئے، جب رات ایک تہائی گزر گئی۔ آپ اُٹھے اور قریب ہی لٹکی ہوئی پانی کی مشک کا تسمہ کھولا پھر وضو فرمایا اور نماز پڑھی بعد ازاں آپ لیٹ گئے، حتیٰ کہ خراٹے لینے کی آواز آئی اور ویسے بھی جب آپ سوتے تھے تو خراٹے لیتے تھے، اس اثناء میں بلالؓ آئے اور انہوں نے نماز کے لئے اذان دی، آپ اُٹھے اور نماز پڑھی لیکن وضو نہیں فرمایا۔

آپ کی بیٹھ کر ادا کی جانیوالی نماز کھڑے ہو کر پڑھی گئی نماز کی مانند ہے۔

آپ کو یہ بھی خصوصیت عطا کی گئی ہے کہ جب آپ کسی کو نماز کی حالت میں بھی سلام کریں تو اُسے آپ کے سلام کا جواب دینا لازمی ہے اور اس سے اس کی نماز میں کوئی خلل واقع نہیں ہوگا۔

ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابی بن کعب کے قریب گزرے اور وہ نماز پڑھ رہے تھے آپ نے انہیں سلام کیا لیکن انہوں نے جواب نہ دیا، بعدازاں وہ نماز جلد ختم کر کے آپ کی خدمت میں پہنچے۔ آپ نے فرمایا تم نے میرے سلام کا جواب کیوں نہیں دیا؟ عرض کیا میں نماز پڑھ رہا تھا۔ آپ نے فرمایا کیا تم نے اللہ تعالیٰ کا ارشاد نہیں سنا "اے ایمان والو جب تمہیں اللہ اور رسول بلائیں تو انہیں جواب دو" (الآیہ)

اُبیؓ بولے اب آپ جب بھی مجھے بلائیں تو میں ضرور جواب دوں گا'

آپ کے لئے یہ بھی جائز ہے کہ آپ نماز عصر کے بعد دو رکعت پڑھ سکتے ہیں۔

سیدہ عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز عصر کے بعد کوئی نماز پڑھنے سے روکتے تھے لیکن خود پڑھتے تھے اور صوم وصال (لگاتار روزے) سے منع فرماتے تھے لیکن خود ایسا کرتے تھے۔

آپ پر ہر نماز کے ساتھ مسواک کرنا لازم تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے تم پر تین باتوں کی وجہ سے فضیلت حاصل ہے، مجھ پر مسواک کرنا، چاشت کی نماز پڑھنا اور قربانی کرنا لازم ہے۔

اور یہ بھی آپ کے لئے ضروری ہے کہ آپ اگر کسی کو نماز کے وقت سویا ہوا دیکھیں تو اسے جگا دیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "لوگوں کو اپنے رب کے راستے کی طرف بلایئے"

مسلم بن ابی بکرہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں، میں صبح کی نماز کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلا۔ آپ اس اثناء میں جس بھی سوئے ہوئے شخص کے پاس سے گزرتے تو یا تو اسے نماز کے لئے کہتے یا اپنے پاؤں سے ہلاتے،

- آپ پر رات کا قیام واجب تھا،

نصف رات یا تہائی یا اس سے کم اور یا اس سے زیادہ،

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے "اے کمبل پوش! رات کو قیام کیا کرو مگر تھوڑا، آدھی رات یا اس سے بھی کم یا اس سے زیادہ اور قرآن کو خوب خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھیں (المزمل: ۱۔۴)

مزید ارشاد ہوتا ہے" اور رات کو تہجد آپ کے لئے ایک اضافی ذمہ داری ہے قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ "مقام محمود" سے سرفراز فرمائے (الکہف: ۷۹)

یعنک ربک مقاما محمودا" کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید میں "عسیٰ" اور "لعل" کا لفظ وجوب کیلئے ہے، اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد "نافلۃ لک" کا مطلب یہ ہے کہ یہ خاص آپ کے لئے ہے یعنی اس کا قیام آپ کے لئے واجب ہے۔

مغیرہ بن شعبہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قیام فرماتے تھے حتیٰ کہ آپ کے پاؤں سوج جاتے تھے، آپ سے کہا گیا کہ اے اللہ کے رسول کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کی اگلی اور پچھلی لغزشیں، معاف نہیں فرمادیں؟ آپ نے فرمایا کیا میں شکرگزار بندہ نہ بنوں؟

اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے آپ پر قیام لیل کا وجوب ثابت ہوتا ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کیا میں شکر گزار بندہ نہ بنوں ؟" شکر چونکہ واجب ہے اور آپ کا قیام لیل ہی شکر ہے۔

دراصل قیام لیل اوّل اوّل آپ پر اور امت پر فرض تھا، اللہ تعالیٰ کے اس قول کے مطابق "یا یھا المزمل قم الیل" پس کچھ رات کا قیام تو باقی رہ گیا اور وہ آپ اور آپ کی امت پر فرض تھا لیکن جب نماز پنجگانہ فرض ہوئی تو اُمت پر سے یہ فرض ساقط ہو گیا کیوں کہ ان کے لیے یہ مشقت کا باعث تھا، اللہ تعالیٰ کے اس قول کے بموجب وہ فرض ساقط ہوا۔

"اس نے معلوم کیا کہ تم اس کو نبھا نہ سکو گے تو اس نے تم پر مہربانی کی پس جتنا آسانی سے ہو سکے اتنا قرآن پڑھ لیا کرو اس نے جانا تم میں سے بعض بیمار ہوتے ہیں اور بعض تلاشِ معاش میں زمین پر سفر کرتے ہیں اور بعض خدا کی راہ میں لڑتے ہیں تو جتنا آسانی سے ہو سکے اتنا پڑھ لیا کرو اور نماز پڑھتے رہو" (المزمل : ۲۰)

البتہ یہ فریضہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر باقی رہا اس فرمانِ خداوندی کے مطابق "اور رات کی تہجد آپ کے لئے اضافی فریضہ ہے"۔

اور اسی طرح آپؐ چاشت کی نماز اور وتر بھی واجب تھے،

بیان کیا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، مجھ پر تین چیزیں فرض ہیں لیکن تم پر نہیں۔ نماز چاشت، قربانی اور نماز وتر۔

سیدہ عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب بھی جمعہ کے دن نماز عصر کے بعد میرے ہاں تشریف لاتے تھے تو دو رکعت نماز پڑھتے اور جب تک آپ کو اللہ تعالیٰ نے بلا نہیں لیا۔ آپ برابر ایسا کرتے رہے اور وفات سے پہلے آپ کے لئے نماز پڑھنا دشوار ہو گیا تھا اور آپ اکثر و بیشتر نماز بیٹھ کر ادا فرماتے، تاہم آپ انہیں مسجد میں ادا نہ فرماتے کہ شاید اُمت پر بوجھ بن جائے اور جو چیز اُن سے معاف کر دی گئی ہے وہ دوبارہ واجب ہو جائے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ پر تمام نمازیں فرائض اور نوافل وغیرہ فرض قرار دے دی تھیں۔ اور دن رات میں ان کی تعداد کوئی ڈیڑھ سو رکعت بنتی ہے، جیسا کہ انس بن مالکؓ نے بھی اسے روایت کیا ہے، صعصعہ کے حوالے سے حدیث معراج کے ضمن میں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر روز پچاس نمازیں فرض کی گئی تھیں، میں واپس آیا اور موسیٰ علیہ السلام سے ملا۔ انہوں نے پوچھا آپ کو کس بات کا حکم ملا؟ میں نے کہا ہر روز پچاس نمازیں ادا کرنے کا!

انہوں نے کہا یہ آپ کی اُمت کے بس میں نہیں کہ وہ ہر روز پچاس نمازیں ادا کر سکے،

اور قسم بخدا میں نے اس سے پہلے لوگوں کو بہت آزمایا اور بنی اسرائیل کا بڑی تندہی سے (روحانی) علاج کیا، اس لئے آپ واپس جائیے اور اللہ تعالیٰ سے مزید تخفیف کرائیے۔ آپ نے فرمایا میں واپس گیا، اور دس نمازیں کم کر دی گئیں پھر موسیٰ علیہ السلام کی طرف آیا۔ انہوں نے پھر وہی کہا اور پھر دس نمازیں کم کر دی گئیں، پھر موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا پھر دس نمازیں کم کر دی گئیں۔ پھر موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا اور انہوں نے وہی کہا جو پہلے کہا تھا پھر میں پلٹا اور دس نمازیں ادا کرنے کا حکم دیا گیا میں بعد ازاں موسیٰ علیہ السلام کے پاس واپس آیا اور انہوں نے وہی پہلے کی طرح کہا میں واپس گیا اور پھر مجھے پانچ نمازوں کا حکم دیا گیا پھر موسیٰ علیہ السلام سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے پوچھا اب کیا حکم ملا؟ میں نے کہا پانچ نمازوں کا، انہوں نے کہا یہ بھی آپ کی اُمت کے لئے بہت مشکل ہے کہ ہر روز پانچ نمازیں پڑھے۔ میں اس سے پہلے

بنی اسرائیل کا تجربہ کر چکا ہوں، آپ واپس اپنے رب کے پاس جا کر تخفیف اور رعایت کی درخواست کیجئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں میں نے کہا اب مجھے مزید سوال کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ آپ سے موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ آپ پر اور آپ کی اُمت پر کیا فرض کیا گیا؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے مجھ پر اور میری اُمت پر پچاس نمازیں دن اور رات میں فرض قرار دی ہیں۔ انہوں نے کہا آپ اللہ تعالیٰ کے پاس واپس جائیے کیونکہ آپ کی اُمت کمزور ہے اور وہ اس کی طاقت نہیں رکھتی، اور میں بار بار اللہ تعالیٰ کی طرف واپس جاتا رہا تا آنکہ ۵ نمازیں باقی رہ گئیں۔ پہلے آپ پر ستر اور آپ کی اُمت پر پچاس نمازیں فرض تھیں اور آپ کا اللہ تعالیٰ کی طرف واپس جانا اُمت کی کمزوری کے باعث تھا۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس کمزوری کے پیش نظر باقی نمازیں ساقط فرما دیں اور بقایا نمازیں آپ پر ویسی کی ویسی فرض رہیں کیونکہ آپ ظاہری اور باطنی اعتبار سے لوگوں میں زیادہ طاقت رکھنے والے تھے اور آپ جو بھی نمازیں ادا فرماتے تھے وہ سب آپ پر لازم ہوتی تھیں کیوں کہ نوافل فرائض میں کمی بیشی رہ جانے کی غرض سے پڑھی جاتی ہیں اور آپ اس سے پاک اور محفوظ ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دن اور رات میں نمازوں کا ذکر،

سیدہ عائشہؓ فرماتی ہیں (اصولی طور پر) دو دو رکعتیں ہی فرض کی گئی ہیں البتہ گھر پر ڈ زائد کر دی گئیں اور سفر میں وہی برقرار رہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم پانچ نمازیں ادا فرماتے تھے اور اُن کی تعداد سترہ رکعات ہے۔

آپ ان کے ساتھ ہر روز اضافی بیس رکعتیں پڑھتے تھے، دو رکعت نماز فجر، چار نماز ظہر سے پہلے اور چار بعد میں اور چار نماز عصر سے پہلے۔ دو مغرب اور چار عشاء کی نماز کے بعد ادا فرماتے تھے، اور بعض کے مطابق چھ رکعت ادا فرماتے تھے۔

سیدہ عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب بھی عشاء کی نماز پڑھی اور میرے ہاں تشریف لائے تو آپ نے مزید چار یا چھ رکعتیں پڑھیں۔

اور آپ ہی سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز عصر سے پہلے چار رکعت ادا فرماتے تھے اور سورج طلوع ہونے کے بعد جب وہ نیزے کے برابر بلند ہو جاتا تھا تو دو رکعت نماز ادا فرماتے تھے۔

جابر بن سمرہؓ روایت کرتے ہیں کہ اُن سے پوچھا گیا کہ آپ کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مجلس رہی ہے؟ میں نے کہا بہت زیادہ، کہ آپ اس وقت تک نماز کی جگہ نہیں چھوڑتے تھے حتیٰ کہ سورج طلوع ہو جاتا۔ دوسری روایت میں ہے کہ جب سورج طلوع ہو چکتا اور بلند ہو جاتا تب آپ دو رکعت نماز ادا کرتے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز چاشت کی آٹھ رکعتیں ادا فرماتے تھے۔

سیدہ ام ہانیؓ فرماتی ہیں فتح مکّہ کے دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم میرے ہاں تشریف لائے اور میرے گھر پر آٹھ رکعت نماز پڑھی میں نہیں جانتی کہ آپ کا قیام طویل تھا یا رکوع یا سجدہ اور یہ نماز چاشت تھی۔

آپ زوالِ آفتاب کے بعد ایک سلام کے ساتھ چار رکعت پڑھا کرتے تھے، آپ سے کہا گیا اے اللہ کے رسول آپ زوالِ آفتاب کے بعد کی چار رکعت نماز کبھی نہیں چھوڑتے۔ آپ نے فرمایا۔ یہ وہ گھڑی ہے جس میں آسمان کے دروازے کھلتے ہیں اور میں پسند کرتا

ہوں کہ اس میں میرے اچھے اعمال اوپر جائیں۔

آپ رات میں بارہ رکعتیں ادا فرماتے اور ایک وتر اور اس طرح تیرہ رکعتیں بن جاتیں۔

بیان کیا جاتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب کبھی کسی مجبوری یا بیماری کے باعث رات کی نماز کے لئے نہ اُٹھتے تو دن میں بارہ رکعتیں ادا فرما لیتے۔

سیدہ عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اُن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وتر پڑھنے کے متعلق دریافت کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ آپ سات، نو اور گیارہ رکعت وتر پڑھتے تھے اور آپ نے کبھی تیرہ رکعت سے زیادہ نہیں پڑھے۔

آپ مغرب اور عشاء کے درمیان بھی بیس رکعت نماز پڑھا کرتے تھے اور لوگوں کو یہ پڑھنے کی تلقین فرمایا کرتے تھے۔

سیدہ عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص مغرب کے بعد بیس رکعت پڑھے اللہ تعالیٰ اُس کے لئے جنت میں گھر بنا دیتا ہے،

کبھی کبھار آپ دیگر اہم مشاغل کے باعث (نافلہ) نمازیں چھوڑ بھی دیتے تھے کیونکہ وہ مشاغل عذر میں شامل ہیں جس طرح اُمت کے لیے بعض نمازیں عذر کے باعث ساقط ہو جاتی ہیں مثلاً سفر کا عذر یا نفسے مشقت کے عذر کے باعث!

خاص مقامات کی خصوصیت اور فضیلت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ زمین پر سب سے اچھا اور اللہ کا پسندیدہ شہر مکہ ہے۔ آپ نے فرمایا جو بھی نبی اپنی قوم سے نکلے تو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف نکلے اور مکے میں آباد ہوئے وہاں اللہ کی عبادت کی اور وہیں انتقال کیا،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص مکہ میں مرا گویا وہ آسمان دنیا میں مرا اور جو شخص حرمین شریفین میں کہیں بھی فوت ہوا حج یا عمرہ کے دوران تو اُسے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس طرح اُٹھائے گا کہ اس پر کوئی حساب و کتاب اور عذاب نہ ہو گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے رمضان کا مہینہ مکہ میں گزارا، پورے روزے رکھے، راتوں کو قیام کیا جتنا کچھ ممکن ہو سکا اللہ تعالیٰ اُس کے لیے دیگر جگہوں پر گزارے ہوئے رمضان سے سو گنا زیادہ اجر عطا فرمائے گا اس کے لئے ہر دن مغفرت اور شفاعت کا ہو گا ہر دن اور رات اُسے اللہ کی راہ میں بار بردار گھوڑوں کے وقف کرنے کا ثواب عطا فرمائے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے مکہ کی گرمی پر دن کی ایک ساعت بھی صبر سے کام لیا تو اللہ تعالیٰ اس سے سو سال کے فاصلے کے بقدر جہنم کو دُور کر دے گا اور اتنا ہی جنت کو قریب کر دے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص مکہ میں ایک دن بھی بیمار ہوا۔ اللہ تعالیٰ اُس کے لئے ساٹھ سال کی عبادت کے برابر نیک عمل لکھ دے گا، اور یہ بھی روایت ہے کہ مکہ میں گناہ بھی دگنا ہوتا ہے جس طرح نیکی دگنی ہوتی ہے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ کوئی ایسا شہر نہیں بجز مکہ کے کہ جس میں تخریب کاری کا ارادہ کیا جائے اور اللہ تعالیٰ فوراً گرفت کرتا ہے ارشاد خداوندی کے مطابق "اور جو اس میں کسی تخریب کا ناروا ارادہ کرے ہم اسے دردناک عذاب چکھائیں گے" (الحج ۲۲)

انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ نے پہاڑ (طور) پر تجلی نازل فرمائی تو وہ پاش پاش ہوگیا اور اس کے چھ حصے بن گئے تین حصے مدینہ منورہ اور تین حصے مکہ مکرمہ میں نصب ہو گئے مدینہ کے تین پہاڑ احد، ورقان اور رضوی ہیں اور مکہ کے ثور، ثبیر اور حراء ہیں۔

انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بہترین مقام مکہ ہے، بہترین مہینہ رمضان ہے، بہترین دن جمعہ ہے اور بہترین انسان وہ ہے جو خود علم سیکھے اور سکھائے۔

حرم کے مخصوص فضائل کا بیان :

(عبداللہ) بن مسعودؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک پہاڑی قبر پر کھڑے ہوئے (اور آج یہاں وہ قبر نہیں) اور فرمایا اللہ تعالیٰ اس جگہ اور حرم سے ستر ہزار آدمی ایسے اٹھائے گا جنہیں بغیر پوچھ گچھ کے جنت میں داخل کیا جائے گا اور ان میں ہر ایک دوسروں کی سفارش کریگا ان کے چہرے چودھویں کے چاند کی طرح ہوں گے۔ حضرت ابوبکر الصدیقؓ نے پوچھا اے اللہ کے رسولؐ! وہ لوگ کون ہوں گے؟ فرمایا مسکین لوگ۔

ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ایک آیت) تلاوت کی "بیشک یہ قرآن کافی ہے عبادت (گزار) لوں کے لئے" (انبیاء: ۱۰۶) پھر فرمایا یہ مسجد حرام میں باجماعت پڑھی جانیوالی نمازیں ہیں۔

انہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص نے دو رکعت نماز مسجد حرام میں پڑھی گویا اس نے میری مسجد میں ایک ہزار رکعت ادا کیں اور جس نے میری مسجد میں ایک رکعت پڑھی وہ دوسرے شہروں میں پڑھی جانے والی ایک ہزار نماز کے برابر ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لوگوں میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ اہلِ حرم کو دیکھتا ہے پس جو شخص اُسے طواف کرتے ہوئے دیکھے وہ بخش دیا جائے گا جو سجدے کی حالت میں دیکھے بخش دیا جائے گا اور جو بیٹھے ہوئے دیکھے وہ بخش دیا جائے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر حج کرنے والے کو ایک قدم اٹھانے پر حرم کی سات سو نیکیاں ملتی ہیں پوچھا گیا اے اللہ کے رسول حرم کی نیکیوں سے کیا مراد ہے؟ فرمایا ایک نیکی سو ہزار نیکیوں کے برابر ہوتی ہے۔

کعبہ کا فضل و شرف :

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کعبہ ستر ہزار فرشتوں سے ڈھنپا ہوا ہے وہ اسکے طواف کرنیوالے اور اس میں نماز پڑھنے والے لوگوں کے لیے دعائے مغفرت کرتے رہتے ہیں رسول اللہؐ نے فرمایا بہترین اور اللہ تعالیٰ کے قریب ترین جگہ دو ارکان (رکن اسود و رکن یمانی) کے درمیان کی جگہ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس گھر کے لئے روزانہ ایک سو بیس رحمتیں ہیں ساٹھ طواف کرنیوالوں، چالیس نمازیوں اور بیس محض ذاکروں کے لئے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کعبہ کے ارد گرد تین سو انبیاء کی قبریں ہیں رکن یمانی اور رکن اسود کے درمیان ستر انبیاء کی

قبریں ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا رکن یمانی اور رکن اسود کے درمیان جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص ایمان ویقین کی نظر سے بیت اللہ کو دیکھے اس کے اگلے پچھلے گناہ بخش دیئے جاتے ہیں اور وہ قیامت کے دن امن پانے والوں میں اٹھایا جائے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا رکن یمانی جنت کا ایک دروازہ ہے اور رکن اسود بھی جنت کا ایک دروازہ ہے جو شخص اللہ تعالیٰ کو رکن اسود کے قریب بلاتا ہے یا رکن یمانی کے پاس اور یا میزاب (رحمت) کے قریب تو اللہ تعالیٰ اس کی دعا کو ضرور قبول فرماتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بیت اللہ کا طواف سراسر اللہ کی رحمت ہے اور اللہ تعالیٰ فرشتوں کے درمیان طواف کرنے والوں پر اظہار فخر فرماتا ہے،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص بیت اللہ کا سات مرتبہ سخت گرمی میں طواف کرے اور حجر اسود کو چومے اور اس دوران کسی کو تکلیف نہ دے، اللہ کے ذکر کے علاوہ زیادہ باتیں نہ کرے تو اللہ تعالیٰ اُسے ہر قدم اُٹھانے اور رکھنے پر ستر ہزار نیکیاں عطا فرمائے گا اس کی ستر ہزار برائیاں معاف کرتا اور ستر ہزار درجے بڑھاتا ہے چل کر طواف کرنے والی کی نفضیلت سوار ہو کر طواف کرنیوالے پر اس طرح ہے جیسے چودھویں کے چاند کی باقی تاروں پر ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ رکن زمین میں اللہ کا دایاں ہاتھ ہے بندے اس سے یوں ہاتھ ملاتے ہیں جس طرح ایک دوسرے سے لوگ ملتے ہیں۔

جابر بن عبداللہ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص سات بار بیت اللہ کا طواف کرے، نماز باجماعت ادا کرے اور آبِ زمزم پیئے اللہ تعالیٰ اس کے تمام گناہ معاف فرما دے گا۔

مقام عرفات کی فضیلت :

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی جاتی ہے کہ آپ نے فرمایا جو شخص عرفات میں کھڑا ہوا اور دل میں گمان کیا اللہ تعالیٰ اُسے نہیں بخشے گا تو یقیناً اللہ تعالیٰ اُسے کبھی بھی نہیں بخشے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب عرفہ کا دن ہوتا ہے اور لوگ مقام عرفات پر موجود ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ آسمان کے دروازے کھول دیتا ہے اور فرشتوں سے اظہار فخر کرتا ہے، اور کہتا ہے

"دیکھو میرے بندے گرد و غبار میں اٹے ہوئے ہر طرف سے میرے پاس آرہے ہیں میری مغفرت کی اُمید رکھتے ہیں میں نے ان سب کو بخش دیا! اے میرے بندو چلو! تم سب بخشے گئے ہو اور تمہاری شفاعت قبول کی گئی ہے۔ خواہ تمہارے گناہ دنیا کے دنوں کے برابر ہی کیوں نہ ہوں، خواہ وہ ریت کے ذرّوں اور پانی کے قطروں کے برابر ہی کیوں نہ ہوں میں نے سب گناہ بخش دیئے۔

جابر بن عبداللہؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، پہلی حرکت کے ساتھ ہی اہلِ عرفات پر اللہ کی رحمت نازل ہو جاتی ہے، جب آخری مرحلہ طے ہو جاتا ہے تو شیطان (اللہ اس کے سر پر لعنت بھیجے) واویلا اور فریاد کرتا ہے۔ اس کے معاونین

شیاطین اکٹھے ہو جاتے ہیں اور پوچھتے ہیں نہیں کیا ہوا؟ وہ کہتا ہے تم نے جو ستر سال، ساٹھ سال محنت کی وہ رائیگاں گئی ان کے تمام گناہ پل جھپکنے میں معاف کر دیئے گئے ہیں۔

منیٰ اور مسجد خیف کے فضائل:

ابوہریرہؓ کہا کرتے تھے کہ میں اگر اہل مکہ میں سے ہوتا تو ہر ہفتے مسجد منیٰ میں آتا، مجاہد کا کہنا ہے حج بیت اللہ کے موقع پر چھہتر انبیاء نے بیت اللہ کا طواف کیا اور مسجد منیٰ میں نماز پڑھی۔

مدینہ منورہ کے فضائل:

ابوہریرہؓ اور سعد بن ابی وقاصؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مدینہ فرشتوں کی حفاظت میں ہے اس میں نہ طاعون داخل ہوگا اور نہ دجال، جو اس کے باشندوں کو تکلیف پہنچانا چاہے گا تو اللہ تعالیٰ اُسے گھلا کر رکھ دے گا جس طرح پانی میں نمک گھل جاتا ہے۔

ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں جس کے لئے ممکن ہو وہ مدینہ میں مرے۔ میں یہاں مرنے والوں کی شفاعت کروں گا۔

ابوبکر الصدیقؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے گھر اور میرے منبر کے درمیان جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے۔

بیان کیا جاتا ہے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے نکلے تو حزورہ (مکہ کا ایک بازار) پر ٹھہرے اور کہا" اے اللہ میں اپنی محبوب جگہ سے نکلا ہوں تو مجھے اپنے محبوب شہر تک پہنچا"۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص ظہر کے لئے نکلا اور میری مسجد میں آیا یہ مدینہ کی مسجد ا اور اس میں دو رکعت نماز پڑھی وہ ایک غلام آزاد کرنے کے برابر ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص اہلِ مدینہ کو خوفزدہ کرے گا اللہ تعالیٰ اُسے خوفزدہ کرے گا، اس پر قیامت تک اللہ کی لعنت اور ناراضگی ہوگی اللہ تعالیٰ اُس سے کوئی معاوضہ اور فدیہ قبول نہ فرمائے گا۔

ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے میری قبر کی زیارت کی اس کے لئے میری شفاعت واجب ہوگئی۔

بیان کیا جاتا ہے کہ نفخۂ اُولیٰ کے بعد کعبہ اللہ تعالیٰ سے قبر رسول کی زیارت کی اجازت چاہے گا۔ اور اسے اجازت مل جائے گی جب وہ روضۂ رسول کی طرف آئیگا تو کہے گا اے اللہ کے رسول! میں تین آدمیوں کی شفاعت کروں گا آپ مجھے متہم نہ کیجئے گا پہلا وہ جس نے میرا طواف کیا دوسرا جو اپنے گھر سے نکلا مگر (کسی وجہ سے) مجھ تک پہنچ نہ سکا تیسرا وہ جس کا مجھ تک آنے کا مصمم ارادہ تھا مگر اُسے وسائل مہیا نہ ہو سکے

مسجد قبا کی خصوصیت کا ذکر:

علی بن ابی طالبؓ روایت کرتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس مسجد کی بنیاد ہی تقویٰ پر رکھی گئی ہے وہ مسجد قبا ہے۔

ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد قبا میں پیدل یا سوار ہو کر آتے تھے اور ہر ہفتے کو تشریف لاتے تھے۔

سہل بن حنیفؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص وضو کر کے مسجد قباء میں آئے اور دو رکعت نماز ادا کرے اُسے ایک عمرے کا ثواب ملے گا۔

سیدہ عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ اُن کے والد کہتے تھے خدا کی قسم میرے نزدیک مسجد قباء میں دو رکعت نماز ادا کرنا بیت المقدس کی طرف دو مرتبہ جانے سے زیادہ محبوب عمل ہے۔

(کوہ) احد کی فضیلت کا ذکر :

انسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "احد پہاڑ ہم سے محبت کرتا ہے اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں"

یمن کی برکت کی خصوصیت کا ذکر :

ابوذرؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب فتنوں کا ظہور ہو تو تم یمن چلے جانا کہ وہ مبارک مقام ہے۔

ابو سعید خدریؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم یمن چلے جانا جب فتنوں کا ظہور ہو، وہاں کے باشندے رحمدل، زمین برکت والی اور وہاں عبادت کرنے کا اجر بہت زیادہ ہے۔

جابر بن عبداللہ الانصاریؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دنیا کی تہائی برکت یمن میں ہے، جو فتنوں کے باعث نکلے، اسے چاہئے وہ یمن کی طرف آئے کیونکہ یمن میں عبادت اللہ کی بہت بڑی خوشنودی کا باعث ہے۔

شام کی فضیلت اور برکت کا ذکر اور بیت المقدس :

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے" پاک ہے وہ ذات جس نے رات کے ایک حصے میں اپنے بندے کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک کی سیر کرائی جس کے ارد گرد ہم نے برکتیں رکھی ہیں۔ (بنی اسرائیل: ۱)

بیان کیا جاتا ہے کہ برکت کے اس حصے ہیں اور ان میں سے نو شام میں ہیں۔

قتادہؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے شام، یمن اور عراق کا لشکر ہے کسی نے کہا اے اللہ کے رسول کون سا لشکر حق پر ہے؟ فرمایا حق شام کے ساتھ ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے شام کی ضمانت دی ہے اور اس کے باشندوں کی بھی!

ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، عنقریب حضر موت یا حضر موت کے سمندر سے آگ بھڑکے گی قیامت سے پہلے پہلے اور لوگ پھیل جائیں گے۔ لوگوں نے کہا

یا رسول اللہ ہمارے لئے کیا حکم ہے؟ فرمایا شام چلے جانا

زید بن ثابتؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مبارک ہو شام کے لئے ہم نے کہا اے اللہ کے رسول! وہ کس لئے؟ فرمایا اللہ کے فرشتے اس پر اپنے پر پھیلائے ہوئے ہیں۔

ابو امامہؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (آیت) تلاوت فرمائی "ہم نے انہیں ایک بلند زمین جو رہنے کا مقام ہے میں ٹھکانہ بخشا اور آنکھوں کے سامنے بہتا ہوا پانی ہے" (المومنون: ۵۰) پھر فرمایا تم جانتے ہو یہ کیا ہے؟ کہا گیا اللہ اور رسول بہتر جانتے ہیں، فرمایا ارض شام! جسے غوطہ کہا جاتا ہے اور مدینہ میں دمشق! یہ شام کے بہترین شہروں میں سے ہے،

بیت المقدس اور دیگر شہروں کی فضیلت :

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے کو رات کے ایک حصے میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک کی سیر کرائی جس کے ارد گرد ہم نے برکتیں رکھی ہیں (بنی اسرائیل : ۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ تین مقامات کے علاوہ کسی کے لئے رخت سفر نہ باندھا جائے۔ بیت الحرام، مسجد اقصیٰ اور میری یہ مسجد۔

ابو زیاد غسانی اور ابو امیہ شعبانی رضی کہتے ہیں کہ ہم مکہ میں تھے ایک شخص کعبہ کے سائے میں تھا اور وہ سفیان ثوریؒ تھے کسی نے ان سے پوچھا اے ابو عبداللہ آپ اس شہر میں نماز کے متعلق کیا فرماتے ہیں؟ فرمایا ایک لاکھ نماز کا ثواب، وہ بولا اور مسجد نبوی کے متعلق؟ فرمایا پچاس ہزار نمازوں کا ثواب، پھر بولا اور بیت المقدس میں؟ فرمایا چالیس ہزار نمازیں، اس نے کہا مسجد دمشق؟ فرمایا تیس ہزار نمازوں کے برابر ثواب ہے۔

انس بن مالک رضی روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص جنت کی دیوار دیکھنا چاہے وہ بیت المقدس کی دیوار دیکھے ہر وہ شخص جو بیت المقدس کی دیوار پر اللہ کی کبریائی کا اعلان کرے تو فرشتے اُسے آسمان کے کناروں سے جواب دیتے ہیں۔

مساجد کے مجموعی فضائل :

ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں کسی نے رسول اللہ ؐ سے دریافت کیا، بدترین جگہ کونسی ہے؟ فرمایا میں نہیں جانتا جب تک جبرلؑ سے نہ پوچھ لوں، پس جبرلؑ سے پوچھا انہوں نے کہا جب تک میں اللہ تعالیٰ سے نہ پوچھ لوں آپ کو جواب نہیں دے سکوں گا، بہرکیف وہ آئے اور کہا بہترین جگہ مسجد اور بدترین جگہ بازار ہے

ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے محبوب ترین شہر اس کی مسجدیں ہیں اور بدترین مقامات بازار ہیں آپ نے فرمایا اگر آسمان سے اللہ کا عذاب نازل ہو تو صرف اہل مساجد ہی اس سے محفوظ رہیں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم جنت کے باغوں سے گزرو تو پھل کھایا کرو۔ لوگوں نے کہا اے اللہ کے رسول! اللہ کے باغات کون سے ہیں؟ فرمایا مساجد، پھر کہا گیا اور پھل؟ فرمایا یہ کلمات، سبحان اللہ، الحمد للہ اور لا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھ پر اپنی امت کے اعمال پیش کئے جاتے ہیں میں اچھے اعمال بھی دیکھتا ہوں جس طرح راستے سے کانٹا وغیرہ ہٹانا اور بُرے اعمال بھی جیسے مسجد میں تھوکنا اور اسے مٹی سے ڈھانپ نہ دینا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مسجد ہر نیک آدمی کا گھر ہے۔

آپ نے فرمایا اندھیرے میں مسجد کی طرف جانے والوں کے لئے قیامت میں بھرپور روشنی کی خوشخبری ہے۔

عبید اللہ بن جعفرؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو مسجد کو اچھی طرح آباد رکھتا ہے اس کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جنت کا تحفہ ہے، پوچھا گیا مسجد کی بہترین آبادی کیا ہے؟ فرمایا تم اس میں بلند آواز سے اور جھگڑے کی باتیں نہ کرو۔

عقبہ بن عامرؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص اپنے گھر سے مسجد کی طرف گیا۔ اللہ تعالیٰ اس کے ایک ایک قدم پر دس نیکیاں لکھے گا اور مسجد میں بیٹھ کر دوسری نماز کا انتظار کرنے والا گویا اللہ کے لیے یکسو ہے اور وہ نماز ہی میں سمجھا جائے گا تا آنکہ وہ اپنے گھر لوٹ آئے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ دنیا والوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے جب وہ لوگوں کو گناہ کرتے دیکھتا ہے تو اس کا غضب بھڑک اٹھتا ہے اور جب مسجد والوں کی طرف دیکھتا ہے اور قل ھو اللہ احد کی تلاوت کرنے والوں پر نظر ڈالتا ہے تو اس کا غضب ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔

حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے وصایا

حضرت ابو سعید خدریؓ روایت کرتے ہیں ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگا اے اللہ کے رسول مجھے وصیت کیجئے! فرمایا تقویٰ اختیار کرو، کیونکہ یہ تمام بھلائیوں کا سرچشمہ ہے،

تم جہاد کو اپنے اوپر لازم کر لو، اہل اسلام کے لئے یہی ترکِ دنیا ہے۔ تم ذکر الٰہی اور تلاوتِ قرآن حکیم کیا کرو، کیونکہ یہ تمہارے لئے زمین میں روشنی اور آسمان میں تمہارے تذکرہ کا موجب ہے اپنی زبان سے بجز اچھی بات کے کچھ نہ بولو، اس سے شیطان غلبہ پالیتا ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اے میرے بیٹے، موت کو اکثر یاد رکھا کرو، کیونکہ جب تم اسے یاد رکھتے ہو تو تم میں دنیا سے بے نیازی اور آخرت میں رغبت پیدا ہو جاتی ہے، بلاشبہ آخرت دائمی گھر ہے، اور دنیا دھوکے کی ٹٹی، اپنے اوپر دعا لازم کر لو تم نہیں جانتے کہ کب قبول ہو جائے۔ تم پر شکرِ خداوندی لازم ہے شکر نعمتوں کے اضافے کا باعث بنتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا، کسی چیز کو برا نہ کہو، معمولی نیکی بھی ہاتھ سے نہ جانے دو خواہ مسلمان بھائی سے مسکرا کر بات کرنا ہی کیوں نہ ہو، اور اپنے ڈول سے کسی پیاسے کے برتن میں ایک گھونٹ پانی ڈالنا ہی کیوں نہ ہو۔ اپنا ازار نصف پنڈلی تک رکھو ہاں اگر اپنے گھر میں ہو تو ٹخنوں تک! اور ازار لٹکانے سے احتراز کرو، یہ تکبر کی علامت ہے اور اللہ تعالیٰ کو تکبر سخت ناپسند ہے۔

عمر بن خطابؓ روایت کرتے ہیں، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا آپ اسامہ بن زیدؓ کی طرف متوجہ تھے فرمایا اے اسامہ جنت کا راستہ اختیار کرو اور دوسرے راستوں سے کنارہ کش ہو جاؤ، اسامہؓ نے عرض کیا، یہ راستہ کس طرح جلد طے ہو سکتا ہے؟ فرمایا سخت دنوں کے روزوں، میں پیاس اور نفس کی لذت گریزی سے، اے اسامہ! تم پر روزہ لازم ہے، یہ اللہ تعالیٰ کا قرب عطا کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کے نزدیک روزہ دار کے منہ کی بُو اور اس کے لیے کھانا پینا ترک کرنے سے بہتر اور کوئی چیز نہیں، اگر تم سے ہو سکے تو ایسا ضرور کرو کہ جب موت آئے تو تمہارا پیٹ خالی اور سینہ پیاسا ہو، اس سے تم آخرت میں بلند مرتبہ، انبیاء کی رفاقت، روح کے لیے فرشتوں کا استقبال اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے تحسین حاصل کر سکو گے اور ہاں اے اسامہ خالی سینہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے تمہارے حق میں جھگڑے گا، اور اے اسامہ، تم ایسے بندوں کی دعا سے بچو جنہوں نے اپنا گوشت گھلایا،

جھڑا، تند اور زہریلی ہواؤں میں جلایا، اور رسینہ پیاسا، حتیٰ کہ ان کی آنکھیں مُند گئیں۔ بے شک اللہ تعالیٰ جب ان بندوں کو دیکھتا ہے تو خوش ہوتا ہے اور فرشتوں کے سامنے فخر و مباہات کرتا ہے اور اُن سے فتنوں اور زلزلوں کو ہٹا لیتا ہے، پھر آپ اس قدر روئے کہ صحابہ خوفزدہ ہو گئے کہیں آسمان سے کوئی مصیبت تو نہیں ٹوٹ پڑی پھر گویا ہوئے اور فرمایا افسوس ہے اس قوم پر، انہیں کیا ملا؟ کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرے اور وہ اس لئے ماریں اور جھٹلائیں کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتا ہے، عمر بن خطابؓ بولے اے اللہ کے رسول! کیا اس دن وہ لوگ اسلام پر ہوں گے، فرمایا ہاں، بولے وہ آخر کس لئے اس کے قتل کا ارتکاب کریں گے کہ وہ خود اللہ کی اطاعت کرتا ہوگا اور انہیں اس کی تلقین کرتا ہوگا؟

فرمایا اے عمر، لوگ صحیح راستہ چھوڑ دیں گے اچھی سواریاں رکھیں گے، نرم لباس پہنیں گے، عجمی غلام ان کے خادم ہوں گے مرد اس طرح بنیں سنوریں گے جیسے عورت اپنے خاوند کے لئے بناؤ سنگھار کرتی ہے، اُن کی عادات ظالم بادشاہوں کسریٰ اور ہرمزان جیسی ہوں گی، جب کوئی اللہ کا بندہ اللہ کی بُرائی بیان کرے گا تو یہ اس کی پیٹھ داغیں گے، اسے پیاسا ہلاک کریں گے، جب کوئی انہیں سمجھانے کی کوشش کریں گے تو وہ اسے جھٹلائیں گے اور اس سے کہا جائے گا تم شیطان کے ساتھی ہو اور گمراہی کا سرچشمہ، تم اللہ کی زینتوں اور حلال رزق کو حرام قرار دیتے ہو؟ وہ اللہ کی کتاب کی غلط تاویلیں کریں گے اور اولیاء اللہ کو غلط راستوں پر چلانے کی کوشش کریں گے، اور اے اُسامہ! قیامت میں اللہ کے نزدیک وہ شخص ہوگا جو دنیا میں غمزدہ، بھوکا اور پیاسا رہا ہوگا، اللہ کے وہ بندے ایسے گمنام مگر صالح ہوں گے کہ کہیں موجود ہوں تو پہچانے نہیں جائیں گے اور گم ہو جائیں گے تو انہیں ڈھونڈا نہیں جائے گا، ہاں البتہ انہیں زمین کے خطے جانتے ہوں گے وہ آسمانوں میں خوب متعارف ہوں گے مگر اہل دنیا سے پوشیدہ ہوں گے فرشتے انہیں اپنے پیروں میں ڈھانپے رہتے ہیں، لوگوں کو دنیوی نعمتیں دی جائیں گی اور انہیں بھوک پیاس سے نوازا جائے گا۔ لوگ نرم کپڑے زیب تن کریں گے اور وہ موٹے جھوٹے پر گزارہ کریں گے، لوگ فرش فروش پر آرام کریں گے اور ان کی پیشانیاں، اور گھٹنے زمین پر ہوں گے، لوگ ہنسیں گے اور وہ محو گریہ ہوں گے، اے اُسامہ اللہ تعالیٰ کبھی بھی دنیا اور آخرت کی تنگی کو اکٹھا نہیں کرتا، کاش تم انہیں دیکھتے کہ زمین ان پر فراخ ہوگی اور اللہ تعالیٰ اُن پر راضی! عام لوگ رسولوں کے اعمال اور اخلاق کو بھولے ہوئے ہوں گے اور وہ ان پر کاربند! وہ انسان رحمت کا مستحق ہوگا جو ان کی طرح اللہ کی طرف راغب ہو، وہ نقصان اُٹھائے گا جو ان کی مخالفت کرے گا زمین ان کے گم ہونے پر روئے گی وہ شہر خدا کے غضب کا مستحق ہے جہاں ایسے لوگ نہ ہوں۔ اے اُسامہ! جب تم انہیں کسی بستی میں دیکھو تو یقین جانو کہ وہ بستی کے باشندوں کی ضمانت ہیں اللہ تعالیٰ اُن کے طفیل بستی والوں پر عذاب نہیں کرتا، تم اپنے لئے ان کی رفاقت لازم کر لو ہو سکتا ہے تم نجات پا جاؤ اور اس سے بچتے رہو کہ تم وہ چیزیں چھوڑ دو جنہیں یہ اختیار کرتے ہیں کہیں تمہارے قدم جہنم کی جانب نہ پھسل جائیں، یہ لوگ بعض جائز چیزوں کو بھی چھوڑ دیتے ہیں جو ان کے لئے حلال کر دی گئی ہیں یہ آخرت کی طلب زیادہ کرتے ہیں یہ لوگ اپنی مرضی سے کھانا پینا ترک کر دیتے ہیں، یہ دنیا پر یوں نہیں ٹوٹ پڑتے جس طرح کتے مردار پر ٹوٹتے ہیں، لوگ دنیا میں منہمک رہتے ہیں اور یہ خود کو اطاعتِ الٰہی میں مصروف رکھتے ہیں، تم انہیں خراب حال دیکھو گے، لوگ انہیں بیمار سمجھتے ہیں حالانکہ وہ بیمار نہیں ہوتے، لوگوں کو اُن کے مخبوط الحواس ہونے کا گمان گزرتا ہے جبکہ وہ ہوتے نہیں دراصل خوف (آخرت) نے انہیں ایسا بنا دیا ہوتا

ہے، لوگ کہتے ہیں کہ ان کی عقل ٹھکانے نہیں جبکہ واقعہ میں یوں نہیں ہوتا، حقیقت میں ان کے دل کسی اور طرف لگے ہوتے ہیں جس سے ان کے ذہن دنیا سے کٹ جاتے ہیں، اور لوگ انہیں مجنوں سمجھ بیٹھتے ہیں، اے اُسامہ اُن کے لیے آخرت کی عزت ہے وہ اس وقت ہوش میں ہوں گے جب لوگ حواس باختہ ہوں گے۔

ثوبانؓ روایت کرتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عبداللہ بن عباسؓ سے یہ فرماتے سُنا، اے عبداللہ، اے رسول کے چچا کے بیٹے، بیشک میں تمہیں عطیہ دوں، میں تمہیں آگاہ کروں اور نہیں بہتر ین تحفہ دوں! پھر آپ کچھ دیر خاموش رہے پھر گویا ہوتے اے رسول کے چچازاد بھائی ضبطِ نفس اس عہدے سے کہیں بہتر ہے جو تالوبیں نہ ہو۔ اے ابن عباس جس نے تھوڑا کہا اور اس پہ اکتفا کیا اس سے کہیں اچھا ہے جس نے زیادہ کیا اور ٹھکا۔

ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حزم واحتیاط سے رہو۔ لوگوں میں سب سے بڑے عابد بن جاؤ گے قناعت اختیار کرلو شاکر بندے بن جاؤ گے، لوگوں کے لئے وہی پسند کرو جو اپنے لئے کرتے ہو مومن بن جاؤ گے، بہترین ہمسایگی کا مظاہرہ کرو مسلمان بن جاؤ گے، ہنسا کم کرو کیوں کہ زیادہ ہنسنا دل مردہ کردیتا ہے، اور فرمایا میں تمہیں پانچ چیزیں سکھاتا ہوں تم ان پر عمل کرو اور انہیں بھی تعلیم دو جو ان پر عمل کرنا چاہیں، فرمایا محرّمات سے بچو سب سے بڑے عبادت گزار بن جاؤ گے۔ اپنے مقدر پر راضی رہو غنی انسان بن جاؤ گے اپنے ہمسائے سے اچھا سلوک کرو مومن قرار پاؤ گے، لوگوں کے لئے وہی چاہو جو اپنے لئے چاہتے ہو مسلمان ہو جاؤ گے اور زیادہ نہ ہنسا کرو کیونکہ زیادہ ہنسنا دل کی موت ہے۔

عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا کندھا پکڑ کر فرمایا تم دنیا میں یوں رہو جیسے اجنبی یا راہ چلتا مسافر ہو، اور خود کو مُردوں میں شمار کرو، جب تم شام کرو تو صبح کی آرزو نہ کرو اور جب صبح کرو تو شام کی فکر نہ کرو، صحت کو بیماری زندگی کو موت اور دنیا کو قیامت سے پہلے غنیمت جانو پس تم اے عبداللہ کیا جانو! کہ کل تمہارا نام کیا ہو؟

عمران بن حصینؓ کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیچھے سے میرا عمامہ پکڑ کر فرمایا۔

اے عمران! بلاشبہ اللہ تعالیٰ خرچ کرنے کو پسند اور بخل کو ناپسند کرتا ہے، پس تم کھاؤ اور کھلاؤ اور ذخیرہ نہ کرو کہ تمہارے لئے ملنا مشکل ہو جائے یاد رکھو اللہ تعالیٰ مشکوک چیزوں کے بارے میں کڑی نگاہ اور کھلے ذہن رکھنے والے کو پسند کرتا ہے، اور لذائذ و مرغوبات میں ہوشمندی اختیار کرنے والے کو محبوب رکھتا ہے، وہ فیاضی کو پسند کرتا ہے خواہ کھجور ہی دی جائے، وہ بہادری پسند کرتا ہے گو سانپ مارنا ہی ہو، اور جان لو جو اللہ کا ہو کر

رہ جائے۔ اللہ تعالیٰ اس کی ہر مشکل کو آسان بنا دیتا اور بے سان وگمان رزق عطا فرماتا ہے جو دنیا میں لگ جائے۔ اللہ تعالیٰ اُسے دنیا ہی کا بنا کر رکھ دیتا ہے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک شخص کو نصیحت فرما رہے تھے کہ ہر نماز یوں پڑھو کہ آخری نماز ہے، ایسی بات مت کہو جس پر بعد میں معذرت کرنی پڑے، تم خود کو لوگوں کے مال سے ناامید کر لو، اور آپ نے فرمایا تم خواہ کسی چیز کو محبوب بناؤ وہ تم سے جدا ہونے والی ہے اور جیو جیسے چاہو مگر بالآخر مرنے والے ہو، اور جو چاہو کرو بہرحال خدا سے ملنے والے ہو، آپ نے ایک شخص کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا دنیا میں کٹ کر رہو کہ لوگ تم سے پیار کریں اور اس میں زیادہ رغبت پیدا کرو جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہیں چاہے گا اور فرمایا۔

جو اپنی زبان قابو میں رکھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے عیب ڈھانپ لیتا ہے جو اپنا غصہ پی جاتا ہے اللہ اس سے اپنا غضب ہٹا لیتا ہے جو لوگوں کے عذر قبول کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی معذرت قبول کر لیتا ہے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ کو یمن کے لئے روانہ فرمایا تو اُن سے کہا، اے معاذ! جب تم وہاں پہنچو تو انہیں کتاب الٰہی کی تعلیم دو، انہیں اچھے اخلاق سکھاؤ، حفظ مراتب کا خیال رکھو، حدود الٰہی اور بیت المال میں مروت نہ کرو کیونکہ وہ مال نہ تمہارا ہے اور نہ تمہارے باپ کا ہے، تم اپنے اہلکاروں کی معذرت قبول کرو کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تمہارے لئے اپنے دلوں میں تنگی محسوس کریں اور تمہیں معذور جانیں...... نماز کا بطور خاص اہتمام کرو کیونکہ وہ ایمان کے بعد اسلام کی جڑ ہے، بار بار نصیحت کرو۔ یہ ان کے لئے اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ اعمال کرنے پر زیادہ مفید ہے اور لوگوں پر معلم مقرر کرو، اور اللہ سے ڈرتے رہو جس کے پاس پلٹ کر جانا ہے۔

پھر فرمایا اے معاذ مومن کو قرآن نے کئی ایک مرغوبات سے روک رکھا ہے اور اُن سے کہ جن میں پڑ کر ہلاکت کا خطرہ ہے، مومن کبھی مطمئن اور بے خوف نہیں رہتا تاآنکہ وہ پل صراط سے گزر جائے پس قرآن اس کے لئے رہنما، خوف دلیل، شوق سواری، نماز پناہ گاہ، روزہ ڈھال، صدقہ ادائیگی، راستبازی امیر، حیا وزیر اور اس کا رب اس کا نگران ہے، اے معاذ! مومن قیامت کے دن اپنی ہر کوشش کا بدلہ چاہے گا حتیٰ کہ آنکھ میں سُرمہ لگانے کا بھی! پھر فرمایا، اے معاذ دین میں مخلصانہ رویہ اختیار کرو۔ اللہ تعالیٰ تمہارے تھوڑے عمل کو بھی تمہارے لئے کافی بنا دے گا،

ابوالدسواد روایت کرتے ہیں۔ ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے نو باتوں کی وصیت فرمائی اور کہا اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ خواہ تمہیں کاٹ ڈالا جائے اور جلا دیا جائے، کسی صورت میں فرض نماز نہ چھوڑو۔ جو اسے ترک کر دیتا ہے۔ اس کا [illegible] ہیں ذمہ دار نہیں، شراب سے بچو کہ ہر بُرائی کی کنجی ہے، اپنے والدین کی فرمانبرداری کرو، اگر تمہارے حاکم تمہیں دنیا ہی سے چلتا کر دیں

تو چلے جاؤ اور اپنے حکام سے مت اُلجھو خواہ تم حق پر ہی ہو، تم میدانِ جنگ سے نہ بھاگو۔ اپنے اہل وعیال پر کھلے دل سے خرچ کرو۔ البتہ اُن سے ڈنڈا الگ نہ کرو (یعنی بے ادب نہ ہونے دو) اور انہیں خدا سے ڈراتے رہو۔

ابو ذرؓ روایت کرتے ہیں مجھے میرے دوست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سات باتوں کی وصیت فرمائی ہے، مسکینوں سے محبت صلہ رحمی، خواہ وہ تم سے منہ موڑلیں، حق بات کہو چاہے کس قدر تلخ ہو، کسی سے سوال نہ کرنا، اپنے سے نیچے والوں کو دیکھو اور اوپر والوں کو نہیں، اللہ کی راہ میں کسی ملامت گر کی پروا نہ کی جائے اور اکثر زبان پر یہ کلمہ جاری رہے۔

لاحول ولاقوۃ الا باللہ ، کیونکہ یہ جنت کے خزانوں میں سے ہے اور فرمایا:

اے ابو ذرؓ! قبروں کی ہمسائیگی اختیار کرو تمہیں آخرت کا عذاب یاد دلاتی رہیں گی، مُردے نہلایا کرو نصیحت ملتی ہے، جنازوں کیساتھ جایا کرو دل رقیق ہوتا ہے، جان لو اللہ کی راہ میں غم کھانے والے اللہ کے ہاں مسرور ہوں گے، تم اپنے اوپر دُکھیوں اور ناداروں کی صحبت لازم کرلو، اُن کے ساتھ اور اپنے نوکروں کے ساتھ مل کر کھانا کھایا کرو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن عزت بخشے گا، موٹے اور کھردرے کپڑے پہنا کرو، محض اللہ کے سامنے انکسار اور عاجزی کی غرض سے، امید ہے تمہارے دل میں فخر اور غرور پیدا نہیں ہو سکے گا، اور اللہ تعالیٰ عطا کرے تو جائز حد تک زینت اختیار کرو تاکہ تمہارے اندر شکر کے جذبات پیدا ہوں۔

ابوہریرہؓ کہتے ہیں مجھے میرے دوست (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تین باتوں کی وصیت فرمائی اور تین باتوں سے روکا، سونے سے پہلے وتر پڑھنے، ہر ماہ میں تین روزے رکھنے اور صبح کی دو رکعتوں (یعنی مسنون) کی وصیت فرمائی اور تین باتوں سے روکا، بندر کی طرح بیٹھنا، لومڑی کی طرح جھانکنا اور کوے کی طرح (نماز میں) ٹھونگیں مارنا اور فرمایا جو ایسا کرے اس کی نماز نہیں ہوگی۔

عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور کہا اے اللہ کے رسول، بلاشبہ آپ کے وجود مسعود سے اللہ تعالیٰ نے تمام مسلمانوں کو برکت عطا فرمائی پھر کہا اللہ کا شکر ہے میں پسند کرتا ہوں کہ مجھے بھی کوئی بھلائی پہنچے۔ آپ نے فرمایا کیا کوئی وصیت چاہتے ہو؟ عرض کیا ہاں، آپ نے فرمایا بیٹھو اور سنو، جب تم کوئی کام کرنے کا ارادہ کرو تو اس کے نتیجے پر غور کرو اگر تو بہتر ہے تو کر گزرو اگر اس میں ضلالت ہے تو اسے چھوڑ دو۔

حضرت علی ابن ابی طالبؓ کے لیے:

حضرت حسنؓ کے مطابق حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت فرمائی اے علیؓ میں تمہیں وصیت کرتا ہوں اسے یاد رکھو، ہمیشہ بھلائی ہی ملے گی اگر اسے یاد کر لو تو! اے علیؓ، مومن کی تین نشانیاں ہیں۔ نماز، روزہ اور زکوٰۃ،

خود غرض کی تین نشانیاں ہیں، سامنے خوشامد کرے گا، پیٹھ پیچھے غیبت کرے گا، اور مشکل وقت میں بُرا چاہے گا۔ ظالم کی تین نشانیاں ہیں، اکمزوروں پر ظلم کرے گا، طاقتوروں کی (گناہوں میں بھی) اطاعت کرے گا اور ظلم کو عام کرے گا، ریاکار کی تین نشانیاں ہیں، لوگوں میں چست ہوگا، تنہائی میں سست ہوگا، اور ہر کام میں خود ستائی اور خود روئی پسند کرے گا، منافق کی تین علامتیں ہیں

جب بات کرتا ہے جھوٹ بولتا ہے، امانت میں خیانت کرتا ہے اور جب وعدہ کرتا ہے خلاف ورزی کرتا ہے۔

عقلمند انسان کو چاہیئے کہ تین باتوں کا دھیان رکھے، طلب معاش، آخرت کی تیاری اور حلال چیزوں سے استفادہ، اے علیؓ یہ یقین ہی کا ایک حصہ ہے کہ تم اللہ کو ناراض کر کے کسی کی خوشنودی نہ چاہو، اللہ کی دین پر کسی دوسرے کی ستائش نہ کرو اور اگر اللہ نہ دینا چاہے تو کسی کی برائی نہ کرو، کیونکہ رزق کسی حریص کے حرص کے باعث بڑھتا نہیں اور کسی منکر کے انکار سے گھٹتا نہیں، بے شک اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت اور فضل سے خوشی اور مسرت کو یقین اور اپنی خوشنودی میں پوشیدہ رکھا ہے اور پریشانی اور غم تشکیک اور اس کی ناراضگی میں ہے۔

اے علی! جہالت سے بڑھ کر افلاس، عقل سے بڑھ کر دولت، اکبر سے بڑھ کر تنہائی، مشورہ سے بڑھ کر قوت، تدبیر سے بڑھ کر عقل ضبط نفس سے بڑھ کر تقویٰ، حسن خلق سے بڑھ کر نسب اور غور و فکر سے بڑھ کر کوئی عبادت نہیں۔

اے علی! گفتگو کے لئے جھوٹ، علم کے لئے نسیان، عبادت کے لئے عدم استقلال، ظرف (قلب) کے لئے غلو (یعنی تکبر) شجاعت کے لئے سرکشی، فیاضی کے لئے منت جتانا، حسن کے لئے شیخی، نسب کے لئے فخر مہلک ہے۔

اے علی! جب تم آئینہ دیکھو تو تین بار اللہ اکبر کہو اور پھر پڑھو اللھم انی اسئلک بحق محمد و آل محمد

اے علی! جب تم اپنے گھر میں سانپ دیکھو تو اسے نکل جانے دو، تین بار ایسا کرو اگر چوتھی بار نظر آئے تو مار ڈالو کیونکہ وہ کافر ہے، اے علیؓ جب تم سانپ کو راستے میں دیکھو تو اسے مار ڈالو کیونکہ جنوں کو اس کا پابند کر دیا گیا ہے کہ وہ سانپ کا روپ نہ بنائیں پس اگر وہ اس روپ میں ظاہر ہوں تو مار ڈالو۔

اے علیؓ تین عادات بدبختی کی علامت ہیں، دل کی سختی دنیا کی محبت اور آرزو کا پھیلاؤ۔

اے علیؓ میں تمہیں چار بری باتوں سے روکتا ہوں حسد، حرص، تکبر اور غصہ سے بچو،

اے علیؓ اگر کوئی شخص تمہارے منہ پر تمہاری تعریف کرے تو تم کہو اللھم اجعلنی خیرا مما یظنون واغفرلی مالا یعلمون ولا تواخذنی بما یقولون وتسلم مما تالوا (اے اللہ مجھے ان کی گمان سے زیادہ اچھا بنا دے اور جو یہ نہیں جانتے وہ معاف فرما دے اور جو یہ کہتے ہیں اس کا مجھ سے مواخذہ نہ فرما اور مجھے اس سے بچا جو یہ کہتے ہیں) جب تم اپنی بیوی کے پاس جاؤ، تو کہو "مجھے شیطان سے دور فرما اور جو مجھے بخشا ہے اس سے شیطان کو دور کر دے اور مجھ سے شیطان کو دور فرما دے"۔ اگر اس دوران کوئی اولاد جنم لے گی تو اسے شیطان تکلیف نہ پہنچا سکے گا،

اے علیؓ (کھانا) نمک سے شروع کرو اور نمک پر ختم کرو کیونکہ اس میں شفا ہے، ستر بیماریوں کے لئے اور ان میں معمولی سے معمولی بیماری جذام، پھلبہری، حلقوم کا داڑھ اور پیٹ کا درد ہے۔

اے علی! زیتون کا تیل استعمال کیا کرو، زیتون کھایا کرو، کیوں کہ جو زیتون کا تیل استعمال کرے چالیس راتوں تک شیطان اس کے

قریب نہیں پھٹکتا۔

اے علی! اپنی بیوی سے آدھی رات اور چاند کی رات کو جماع نہ کرو، میں نے پوچھا کیوں؟

فرمایا کیونکہ جنات چاند کی رات اور آدھی رات کو عورت کو زیادہ تر اپنی لپیٹ میں رکھتے ہیں،

اے علی! جب تمہارے ہاں بچہ یا بچی پیدا ہو تو اس کے داہنے کان میں اذان اور بائیں میں اقامت کہو، اس سے وہ شیطان کی شرارتوں سے محفوظ رہیں گے۔

اے علی! تم اکیلے سفر نہ کرو کیونکہ شیطان اکیلے کے ساتھ اور دو سے دور رہتا ہے،

اے علی! جب انسان اکیلا سفر کرتا ہے تو بھٹک جاتا ہے ۲ ہوں تو بھی بھٹک سکتے ہیں۔ لیکن تین ہوں تو جماعت بن جاتی ہے۔

اے علی! سفر کے دوران وادیوں میں مت پڑاؤ ڈالو اس لئے کہ وادیاں سانپوں اور درندوں کا گھر ہوتی ہیں۔

اے علی! جب روزے کے دوران شام ہو اور روزہ افطار کرو تو پڑھو "اللھم لک صمت و بک آمنت و علیک توکلت و بو جہتک وجہت و علی رزقک افطرت" تمہارے لئے ساری دنیا کے روزہ داروں کے برابر ثواب لکھا جائے گا لیکن اُن کے ثواب میں بھی کوئی کمی واقع نہ ہوگی،

اے علی! سورج کی طرف منہ کر کے نہ بیٹھو بلکہ پیٹھ پھیر کر بیٹھو کیوں کہ اس کی طرف منہ کر کے بیٹھنا سراسر بیماری اور پیٹھ پھیر کر بیٹھنا شفا ہے۔

اے علی! جب تم شیر کو دیکھو تو تین بار اللہ اکبر کہو، اور پڑھو "اللہ اکبر من کل شئی واعز من کل شئی اللھم انی اعوذ بک من شر کل ما اخاف واحذر" تو انشاء اللہ تم اس کے ضرر سے محفوظ رہو گے، اور جب تم کُتے کو دیکھو تو پڑھو "یامعشر الجن والانس ان استطعتم ان تنفذوا من اقطار السموات والارض فانفذوا لاتنفذون الا بسلطان"

اے علی! رات کو ضرور قیام کرو خواہ بکری دوہنے کے وقت جتنا ہی ہو، صبح کے وقت نماز پڑھو اور دعا مانگو رد نہیں جائے گی کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے" اور صبح کے وقت بخشش طلب کرنے والے"

حضرت علیؓ کہتے ہیں میں نے کہا اے اللہ کے رسول! کیا پڑھا جائے جب میت کو نہلایا جائے فرمایا اللھم عفوک عفوک جب تک کہ فارغ نہ ہوا جائے۔

اے علی! کیا تمہیں بدترین انسان کے بارے میں نہ بتاؤں؟ عرض کیا ہاں! فرمایا جو لوگوں کو بُرا سمجھے اور لوگ اُسے بُرا سمجھیں۔

اے علی! تمہیں بُرا انسان بتاؤں؟ جو اکیلے سفر کرے، سخاوت نہ کرے اور اپنے غلام کو کوڑے مارے۔

فرمایا تمہیں ان سب سے زیادہ بُرے کے بارے میں خبر دوں جسے اللہ تعالیٰ قطعاً نہیں بخشے گا اور اس کی معذرت قبول نہیں فرمائے گا، پھر فرمایا اس سے بھی زیادہ بُرے انسان کی نشان دہی کردوں؟ فرمایا وہ شخص جس کے شر سے تو ڈرا جائے لیکن اس سے کسی خیر کی توقع نہ ہو،

اے علی! اگر یہ باتیں مان لو تو ہمیشہ بھلائی میں رہو گے۔

(فرمایا) میری وصیت ہے کہ تم حق کے ساتھ ہو گے اور حق تمہارے ساتھ ہوگا، اے علی جب تم کسی مرد یا عورت کا جنازہ پڑھو تو کہو" اللھم ہذا عبدک فلان بن فلان ماض فیہ حکمک خلقتہ، ولم یلد شیئاً مذکوراً زارک وانت خیر مزور، اللھم لقنہ حجتہ. والحقہ بنبیہ ونورلہ قبرہ ووسع علیہ مدخلہ وثبتہ بالقول الثابت فانہ افتقر الیک واستغنیت عنہ کان یشھدان لاالہ الا انت فاغفرلہ ولاتحرمنا اجرہ، ولاتفتنا بعدہ، اللھم ان کان زاکیاً فزکہ وان کان خاطئاً فاغفرلہ"

اور جب تم کسی عورت کی نماز جنازہ پڑھو تو کہو" اللھم انت خلقتھا وانت احییتھا وانت امتھا تعلم سرھا وعلانیتھا جئنا شفعاً فاغفرلھا وارحمھا وتحرمنا اجرھا ولا تفتنا بعدھا

اور جب تم کسی بچے کی نماز جنازہ پڑھو تو کہو" اللھم اجعلہ لابویہ سلفاً واجعلہ لھما فرطا واجعلہ لھما نوراً وزخراً" واجعلہ لھما رشدا واعقب لہ لابد الجنۃ ولاتحرمنا اجرہ، ولاتفتنا بعدہ"

اور جب تم وضو کر و تو پڑھو" بسم اللہ اللھم انی اسلک تمام الوضوء وتمام الصلوۃ وتمام رضوانک وتمام مغفرتک"

حذیفہؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، تم (عام رسم کے) پیرو کار نہ بنو، کہ اگر لوگ تم سے حسن سلوک کریں تو تم بھی حسن سلوک سے پیش آؤ، اگر بُرا کریں تو تم بھی بُرا کرو، اگر وہ ظلم کریں تو ادھر سے بھی زیادتی ہو بلکہ تم اپنے مزاج کو اس پر تیار کرو کہ اگر لوگ اچھائی سے پیش آئیں تو تم بھی اچھائی کا مظاہرہ کرو اور اگر وہ بُرائی کریں تو تم ان پر زیادتی نہ کرو،

ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب (الیسا دور آئے کہ) مالِ غنیمت کو اپنا مال، امانت کو مال غنیمت اور زکوٰۃ کو جرمانہ سمجھ لیا جائے، دین کے علاوہ مضامین کی تعلیم عام ہو جائے، رشوت کھانا معمول بن جائے، مرد اپنی عورت کی اطاعت میں لگ جائے (بیٹا) اپنے باپ سے دور اور دوستوں کے قریب ہو جائے، مسجدوں میں چیخ و پکار ہونے لگے، قبیلے کی سربراہی اُن کے فاسق کے پاس ہو، قوم کا بڑا سب سے بُرا شخص ہو، کسی کی عزت محض اس کے شر سے بچنے کے لئے کی جائے رقص و سرود کا بازار گرم ہو جائے، شراب عام پی جائے۔ پچھلے لوگ اپنے اگلوں پر لعنت بھیجیں، تو ایسے وقت میں سُرخ ہواؤں زلزلوں، دھنسنے، چہروں کے مسخ ہونے اور آندھیوں کا انتظار کرو اور دہولناک، نشانیاں یکے بعد دیگرے یوں ظاہر ہوں گی جیسے ہار کے ٹوٹنے سے منکے اوپر تلے گرتے ہیں،

فرمایا، عنقریب قیامت سے پہلے دن حضرموت سے ایک آگ بھڑکے گی، پوچھا گیا اے اللہ کے رسول! تو پھر ہم کیا کریں؟ فرمایا شام چلے جانا،

حارثہ بن وہبؓ کہتے ہیں، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا، کہ صدقہ کیا کرو، ہو سکتا ہے کہ ایک شخص (اپنا مال) صدقہ لے کر چلے اور مستحق کہے کہ اگر آپ کل شام کو دیتے تو میں لے لیتا لیکن اب آپ آئے ہیں اور مجھے اس کی ضرورت نہیں، اور بالآخر اُسے کوئی لینے والا نہ ملے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منعم حقیقی کا شکر ادا کرنے کی وصیت فرما رہے تھے اور آپ نے ایک واقعہ بیان

فرمایا، گنجے، اندھے اور کوڑھی کا،

بنی اسرائیل میں تین آدمیوں کو اللہ تعالیٰ نے آزمانا چاہا، ان میں ایک گنجا تھا، ایک اندھا اور ایک کوڑھ کا مریض تھا، اللہ تعالیٰ نے فرشتے کو کوڑھی کے پاس بھیجا، اور آکر پوچھا تمہیں کونسی چیز محبوب ہے؟ بولا میرے رنگ اور جلد کا حسن لوٹ آئے، لوگ مجھ سے نفرت کرتے ہیں، فرشتے نے اپنا ہاتھ اس کے جسم پر پھیرا جس سے اس کا رنگ اور چمڑا خوبصورت بن گیا، پھر پوچھا تمہیں کونسا مال پسند ہے؟ بولا اونٹ! بس اُسے دس اونٹنیاں دے دی گئیں، پھر اُسے کہا اللہ تعالیٰ تمہارے مال میں برکت ڈالے، پھر وہ فرشتہ گنجے کے پاس آیا، اور کہا تمہیں کونسی چیز پسند ہے؟ بولا خوبصورت بال، جب سے میرے بال جھڑے ہیں لوگ نفرت کرنے لگے ہیں، آپ نے فرمایا کہ اُس فرشتے نے اپنا ہاتھ اس کے سر پر پھیرا تو خوبصورت بال اُگ آئے، پھر پوچھا کس قسم کے مال کی خواہش ہے؟ کہا گائے تو اسے حاملہ گائے دیدی گئی اور اس میں برکت کی دعا کی گئی، پھر وہ اندھے کے پاس آیا، اور پوچھا تمہاری کیا خواہش ہے؟ بولا، اللہ تعالیٰ میری بینائی لوٹا دے تاکہ میں لوگوں کو دیکھ سکوں، فرمایا کہ اُس فرشتے نے اُس کی آنکھوں پر ہاتھ پھیرا اور اللہ تعالیٰ نے اس کی بینائی بحال کر دی، پھر پوچھا تمہیں کونسا مال اچھا لگتا ہے؟ بولا بکریاں، تو اللہ تعالیٰ نے اُسے زیادہ بچے دینے والی بکریاں عطا فرما دیں۔

بالآخر یہ سب پھلے پھولے ایک کے لئے اونٹوں کی وادی بھر گئی، دوسرے کے لئے گایوں کی اور تیسرے کا بکریوں کا ریوڑ بن گیا، پھر وہی فرشتہ کوڑھی کے پاس اسی شکل و صورت میں آیا اور کہا میں ایک مسکین آدمی ہوں میرا سفر کا سامان جاتا رہا ہے۔ اب منزل مقصود تک پہنچایا تو خدا کی مہربانی سے ممکن ہے یا آپ کی مدد سے، میں آپ سے اس خدا کا واسطہ دے کر جس نے تمہیں اچھا رنگ اور اچھی جلد اور مال عطا فرمایا ہے ایک اونٹ کا سوال کرتا ہوں تاکہ اپنی منزل تک پہنچ جاؤں، (سائل) کوڑھی بولا مجھ پر بہت ذمہ داریاں ہیں، اس لئے تم اس کے مستحق نہیں ہو سکتے؟ فرشتہ بولا، شاید میں آپ کو پہچانتا ہوں آپ وہی نہیں جسے کوڑھ کی بیماری تھی، اور لوگ نفرت کرتے تھے؟ آپ کو تنگدستی لاحق تھی اللہ تعالیٰ نے آپ کو مال دیا، کوڑھی بولا یہ مال تو مجھے وراثت میں ملا ہے، فرشتے نے کہا اچھا اگر تم جھوٹے ہو تو تمہیں خدا ویسے کر دے جیسے تھے، بعد ازاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہی فرشتہ اسی صورت میں گنجے کے پاس گیا اور اس سے وہی کہا جو کوڑھی سے کہا تھا اور اس نے بھی وہی جواب دیا جو کوڑھی نے دیا تھا، چنانچہ فرشتے نے کہا خدا تعالیٰ تمہیں ویسا بنا دے جیسے تھے اگر تم جھوٹے ہو؟ پھر حضور فرماتے ہیں وہی فرشتہ اندھے کے پاس گیا اور کہا میں ایک مسکین آدمی ہوں اور مسافر بھی! میرا سامان سفر جاتا رہا۔ اب منزل تک پہنچایا تو اللہ تعالیٰ کی عنایت سے ممکن ہے یا پھر آپ کی اعانت ہے! میں تم سے اس ذات کے طفیل ایک بکری مانگتا ہوں جس نے تمہیں دوبارہ بینائی عطا فرمائی تاکہ میں اپنا سفر پورا کر سکوں، اندھے نے یہ سن کر کہا واقعی میں نابینا تھا اللہ تعالیٰ نے مجھے بینائی بخشی، پس جس قدر تمہارا دل چاہے لے جاؤ اور جتنا جی چاہے چھوڑ جاؤ، اور میں تم سے دی ہوئی چیز واپس لے کر تمہیں اذیت نہیں دوں گا۔ فرشتے نے یہ سن کر کہا تم اپنا مال اپنے پاس رکھو تم لوگوں کا دراصل امتحان لیا گیا تھا اللہ تعالیٰ تم سے راضی رہا اور دوسروں سے ناخوش ہوا۔

صخر بن قعقاع کہتے ہیں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرفات اور مزدلفہ کے درمیان ملا اور آپ کی اونٹنی کی مہار پکڑ کر کہا

وہ کیا چیز ہے جو مجھے جنت کے قریب اور جہنم سے دُور کرے، فرمایا تمہارا سوال بظاہر مختصر مگر بہت عظیم اور اہم ہے، نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو، حج بیت اللہ کرو اور جو تم اپنے لیے لوگوں کا رویہ پسند کرتے ہو اُن کے ساتھ وہی رویہ اختیار کرو اور جو اپنے لیے ناپسند کرتے ہو تو تم ایسا کرنے سے باز رہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہانی (بن یزید) سے فرمایا تم پر اچھی بات اور کھانا کھلانا لازم ہے۔

علقمہ بن حارثؓ روایت کرتے ہیں، میں سات آدمیوں کا ایک وفد لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، جب ہم آپ کے پاس گئے، اور آپ سے گفتگو کی، آپ ہماری عادات اور شکل وصورت دیکھ کر متعجب ہوئے پس فرمایا تم کون ہو؟ ہم بولے مسلمان ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسکرائے اور فرمایا ہر چیز کی حقیقت ہوتی ہے تمہارے اس دعوے اور ایمان کی کیا حقیقت ہے؟ میں بولا پندرہ چیزیں ہیں، ان میں سے پانچ وہ ہیں جن کے بارے میں آپ کے سفیروں نے کہا کہ ان پر ایمان لایا جائے اور پانچ پر عمل کیا جائے اور پانچ ایسی ہیں جو دورِ جاہلیت میں بھی ہم میں تھیں اور اب تک ہیں الا یہ کہ اُن میں سے کسی چیز کو آپ ناپسند فرمائیں۔

آپ نے فرمایا وہ پانچ باتیں کونسی ہیں جن پر میرے قاصدوں نے ایمان لانے کو کہا ہم بولے آپ کے پیامبروں نے کہا کہ ہم لوگ اللہ اس کے فرشتوں، کتابوں، رسولوں اور مرکر جی اُٹھنے پر ایمان لائیں، پھر آپ نے فرمایا وہ کونسی پانچ باتیں ہیں جن پر میرے نمائندوں نے عمل کرنے کو کہا، ہم نے عرض کیا، آپ کے سفیروں نے ہمیں بتایا کہ ہم سب لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھیں، نماز قائم کریں، زکوٰۃ دیں اور جسے طاقت ہو وہ بیت اللہ کا حج کرے اور روزہ رکھیں، اور ہم ایسا کر رہے ہیں، پھر فرمایا وہ کونسی پانچ باتیں ہیں جو تمہارے اخلاق کا حصہ ہیں، ہم نے کہا خوشحالی میں شکر، بدحالی میں صبر، ہر حال میں سچ بولنا، قدرت کے فیصلوں پر رضامندی اور دشمن کو تکلیف میں دیکھ کر خوش نہ ہونا، پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسکرائے اور فرمایا یہ لوگ ادیب، عالم اور دانا ہیں اور ہوسکتا تھا کہ اپنی حکمت و دانائی کے باعث نبی بنتے کیونکہ ان کی یہ عادات بزرگانہ، شریفانہ اور بہت بڑے اجر کی موجب ہیں، پھر فرمایا میں تمہیں پانچ اور باتوں کی وصیت کرتا ہوں تاکہ بیس مکمل ہوجائیں۔ ہم نے کہا فرمایئے اے اللہ کے رسول! پس فرمایا اگر تم ویسے ہی ہو جیسا کہ کہتے ہیں تو وہ چیز جمع نہ کرو جو کھا نہ سکو اور وہ نہ بناؤ جس میں رہ نہ سکو اور اس میں جی نہ لگاؤ جو کل کو ختم ہونے والی ہے اور اسے چاہو جو پیش آنے والی ہے اور اس پر جزا ملنے والی ہے اور اس خدا سے ڈرو جس کی طرف پلٹ کر جانا ہے اور جس کے حضور پیش ہونا ہے۔

ابوذرؓ (غفاری) روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے وصیت فرمائی، کہ میں اپنے سے نیچے والوں کو دیکھوں اُوپر والوں کو نہیں، مجھے مسکینوں سے محبت کرنے کی وصیت فرمائی، اور اُن سے قریب ہونے کو کہا، اور مجھے سچ کہنے کی وصیت کی خواہ کتنا ہی تلخ کیوں نہ ہو؟ اور مجھے صلہ رحمی کی تلقین فرمائی خواہ دوسرے منہ کیوں نہ پھیریں، اور مجھے لوگوں سے سوال نہ کرنے کی وصیت فرمائی، اور اللہ کی راہ میں کسی ملامت گر کی ملامت کرنے کی پروا نہ کرنے کی وصیت فرمائی اور مجھے بکثرت لا حول ولا قوۃ الا باللہ پڑھنے کی وصیت فرمائی کیوں کہ یہ جنت کے خزانوں میں سے ہے، انصار کا ایک نوجوان کھڑا ہوا اور کہا اے اللہ کے رسول! مجھے بھی کچھ وصیت فرمایئے۔

آپ نے فرمایا میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، خواہ تمہیں کاٹ ڈالا جائے پیٹا جائے اور سخت اذیت پہنچائی جائے۔ وہ بولا کچھ اور فرمایئے، فرمایا اپنے والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو اگر وہ تمہیں کہیں کہ اپنے سارے مال سے دستبردار ہو جاؤ تو چھوڑ دو، پھر عرض کیا مزید فرمایئے! آپ نے اُس سے فرمایا تم میدانِ جنگ میں پیٹھ نہ دکھاؤ، کیونکہ میدانِ جنگ سے فرار اللہ کے غضب کو دعوت دینا ہے، پھر بولا کچھ اور! اے اللہ کے رسول! آپ نے فرمایا اپنے اہل وعیال کو خدا سے ڈراؤ، اور اُن پر سے ڈنڈا مت ہٹاؤ (یعنی ادب سکھاتے رہو)

ابی تمیمہؓ اپنی قوم کے ایک شخص کے متعلق بتاتے ہیں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا آپ اللہ کے رسول ہیں؟ فرمایا ہاں، بولا آپ کس بات کی دعوت دیتے ہیں؟ آپ نے فرمایا ایک خدا کی طرف بلاتا ہوں، اور حدیث بیان کی اور کہا اس شخص نے سلام کیا اور کہا اے اللہ کے رسول مجھے کوئی وصیت فرمایئے آپ نے فرمایا کسی چیز کو بُرا بھلا نہ کہو، اور نیکی کسی حال میں ترک نہ کرو خواہ اپنے بھائی سے ہنس کر بات کرنا ہی کیوں نہ ہو؟ کسی پیاسے کے برتن میں اپنے ڈول سے پانی ہی کیوں نہ ڈالنا ہو، اپنا ازار نصف پنڈلی تک رکھو اور اگر تم اپنے گھر میں ہو تو ٹخنوں تک ٹھیک ہے اور تہمد نیچے لٹکانے سے بچو کیوں کہ یہ تکبر کی علامت ہے اور اللہ تعالیٰ تکبر کو پسند نہیں کرتا۔

عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں ہیں وہ اصحابِ رسول میں سے دسواں صحابی تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مسجد میں موجود تھے جب انصار کا ایک نوجوان آیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کرکے بیٹھ گیا، پھر کہا اے اللہ کے رسول، بہترین مسلمان کون ہے؟ آپ نے فرمایا جس کے اخلاق اچھے ہوں، پھر پوچھا کونسا مسلمان دانا ہے؟ فرمایا جو موت کو ہمیشہ یاد رکھتا ہو اور اس کے آنے سے پہلے ٹھیک ٹھاک تیاری کرتا ہو۔ یہی وہ لوگ ہیں جو دانا ہیں، پھر وہ نوجوان خاموش ہوگیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا اے جماعتِ مہاجرین! پانچ باتیں ایسی ہیں جب وہ تم میں پیدا ہوں گی تو میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں کہ تم انہیں پاؤ، جب کسی قوم میں فحاشی عام ہو جاتی ہے تو اس میں طاعون اور مختلف قسم کی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں جو تم سے اگلوں میں کبھی ظاہر نہیں ہوئیں اور جب ناپ تول میں کمی کا رجحان بن جاتا ہے تو قحط، مشقت اور حکمرانوں کے مظالم عام ہو جاتے ہیں، جب زکوٰۃ نہ دی جائے تو آسمان سے بارش بند ہو جاتی ہے، ہاں اگر جانور نہ ہوں تو بارش بالکل نہ اترے، اور جب اللہ اور رسول کے احکام توڑے جانے لگیں تو اللہ تعالیٰ اس قوم پر دشمن کو مسلط کر دیتا ہے، پس جو کچھ ہوتا ہے وہ چھین لیتا ہے اور جس قوم کے حکمران اللہ تعالیٰ کی کتاب کے مطابق فیصلے نہیں کرتے اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا اس کے سامنے اکڑتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان میں خوف وہراس پیدا کر دیتا ہے۔

سائب العبسی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے کہتے ہیں کہ آپ نے فرمایا تین باتیں ایسی ہیں۔ قیامت کے دن جو یہ لے کر نہیں آئے گا۔ اس کے لئے کچھ بھی نہ ہوگا، ایسا تقویٰ جو اسے اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیزوں سے روکے، ایسا خلق جس سے انسانوں کی مدارات ہو اور ایسا حلم جس سے بیوقوفوں کی جہالت برداشت کی جائے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم اپنے والدین سے نیکی کرو، تمہاری اولاد تمہارے ساتھ نیکی کرے گی، تم عورتوں سے درگزر کرو، تمہاری عورتیں تم سے ایسا کریں گی، جو کسی نادم گنہگار کی معذرت قبول نہیں کرتا خواہ وہ سچا ہو یا جھوٹا، وہ میرے حوض پر نہیں آسکے گا۔

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری وصیت)

علی بن ابی طالبؓ روایت کرتے ہیں جب آیت "اذا جآء نصراللہ و الفتح" نازل ہوئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس قدر عمر گذار لی پھر آپ کو بیماری نے آلیا جس میں آپ کی وفات ہوئی، آپ اسی بیماری کے دوران ایک دن ہمارے پاس تشریف لائے، آپ نے سر پر پٹی باندھ رکھی تھی آپ منبر کی آخری سیڑھی پر تشریف لے گئے آپ کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ آپ کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے پھر آپ نے بلالؓ کو بلا کر فرمایا کہ سب چھوٹوں بڑوں کو یہاں اکٹھا کرو اور انہیں فرمایا کہ مدینہ میں اعلان کر دو کہ سب لوگ رسول کی وصیت سننے کے لئے جمع ہو جائیں۔ پس سب لوگ جمع ہو گئے اور پوری مسجد لوگوں سے کھچا کھچ بھر گئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اپنے بعد آنیوالوں کے لئے جگہ چھوڑ دو، بعد ازاں آپ نے اللہ کی حمد و ثنا بیان کی، انبیاء سابقین کا ذکر خیر کیا پھر اپنے آپ پر دُرود پڑھا اور فرمایا میں محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم العربی ہوں جس کے بعد کوئی نبی نہیں۔

اے لوگو! تحقیق میرے نفس نے مجھے موت کی خبر کر دی ہے اور آج تم سے بچھڑنے کا لمحہ ہے، اور میرے رب نے مجھے مبتلائے مرض کیا ہائے افسوس ہے امت سے بچھڑنے پر، جب وہ میرے بعد تنہا رہ جائے گی اے اللہ سلامتی نازل فرما سلامتی نازل فرما،

اے لوگو! بیشک اللہ تعالیٰ نے اپنی محکم کتاب میں حلال و حرام کو تمہارے لئے واضح فرما دیا ہے، اور جسے لو اور جس سے بچو، پس تم حلال کو حلال اور حرام کو حرام جانو، متشابہات پر ایمان لاؤ اور محکمات پر عمل کرو، امثال سے عبرت پکڑو، پھر آپ نے اپنی نظر آسمان کی طرف اٹھائی، اور کہا اے اللہ! کیا میں نے پہنچا دیا؟ پھر فرمایا، اے لوگو! بچو، ان گمراہ کن خواہشات سے جو اللہ سے اور جنت سے دُور کرنے والی ہے،

عرباض بن ساریہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے ساتھ نماز فجر ادا فرمائی پھر ہماری طرف متوجہ ہو کر ایک بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا جس سے آنکھوں سے آنسو نکل پڑے اور ہمارے دل ہل گئے، حاضرین میں سے کسی نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! لگتا ہے کہ یہ آپ کا آخری خطاب ہے آپ ہمیں کوئی وصیت فرمائیے، آپ نے فرمایا میں تمہیں خدا سے ڈرنے کی وصیت کرتا ہوں، اور تمہیں اپنی بات سننے اور اس کی اطاعت کرنے کی وصیت کرتا ہوں اور اس کی بھی جو تم پر حاکم بنا کر بھیجوں خواہ وہ حبشی غلام ہی ہو، پس تحقیق جو شخص تم میں سے زندہ رہا وہ امت میں بہت زیادہ اختلاف دیکھے گا بس تم پر میری سُنت اور میرے بعد ہدایت یافتہ خلفاء کا طریقہ اختیار کرنا لازم ہے تم اسے اپنے دانتوں سے پکڑ لو اور ہاں بدعات سے بچ کر رہنا کیوں کہ ہر بدعت سراسر ضلالت ہے۔

ام سلمہؓ کی روایت کے مطابق کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنی مرض الموت میں لوگوں کے درمیان تشریف لائے اور منبر پر تشریف فرما ہوئے اور لوگ ارد گرد بیٹھ گئے تو آپ نے فرمایا مجھے قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، میں حوض کوثر پر تمہاری شفاعت کے لئے کھڑا ہوں گا، پھر آپ نے کلمۂ شہادت پڑھا اور اس کے بعد سب سے پہلے شہدائے احد

کے حق میں دعائے مغفرت کی اور فرمایا بیشک اللہ کے بندوں میں سے ایک بندے کو دنیا اور جو کچھ اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ ان میں سے کسی ایک کو حاصل کرنے کا اختیار دیا گیا تو بندے نے اسے پسند کیا جو اللہ کے پاس ہے، پھر فرمایا مسجد کی تمام کھڑکیاں چن دو مگر ابوبکرؓ والی کھڑکی رہنے دو، پس تحقیق لوگوں میں سے مجھ پر سب سے زیادہ رفاقت اور مالی تعاون کے اعتبار سے احسانات ابوبکرؓ کے ہیں، اگر میں کسی کو اپنا خلیل بناتا تو وہ ابوبکرؓ ہوتے لیکن اُن کے ساتھ اسلامی اخوت اور دوستی ہے۔

ایک اور روایت میں ہے ہاں البتہ اس کے ساتھ بھائی چارہ اور رفاقت ہے، پھر فرمایا

اے لوگو! لشکر اُسامہ کو فوراً روانہ کرو، یہ بات آپ نے تین مرتبہ کہی،

ایک اور روایت کے مطابق ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کلمہ شہادت کے بعد یہ ارشاد فرمایا، اے جماعتِ مہاجرین! تم روز بروز ترقی کر رہے ہو اور انصار اپنی پہلی حالت پر ہیں، یہ لوگ میری پناہ گاہ بنے ہیں، یہی میرا جوتا ہیں جن سے چلتا ہوں، یہی میرا برتن ہیں جس میں میں کھاتا ہوں، پس ان کے معاملے میں میرا لحاظ کرو، ان کے معززین کی عزت کرو، اُن کے اچھے کاموں کو سراہو اور اُن کی لغزشوں سے درگزر کرو۔

اور فرمایا، بادشاہ اللہ کا سایہ ہوتا ہے زمین میں! اس کی طرف مظلوم لوگ رجوع کرتے ہیں پس اگر اس نے عدل و احسان کیا تو اس کے لئے اجر و ثواب ہے، اور تم پر اظہار تشکر، اگر وہ ظلم اور زیادتی کرتا ہے تو اس پر بوجھ ہے اور رعایا کیلئے صبر و ضبط! جان لو کہ جب وہ رعایا کے ساتھ حسن سلوک کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ انہیں اجر عطا فرماتا ہے اور اگر وہ غلطیاں کریں تو اللہ تعالیٰ بخشش فرماتا ہے، پھر آپ نے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان پڑھا۔

"اس طرح ہم ظالموں کو ایک دوسرے کا ساتھی بنائیں گے اس کے باعث کہ جو کچھ وہ کرتے تھے"۔

اور جب حکمران ظلم کرنے لگتے ہیں تو قحط پڑتا ہے، اور جب حقوق پامال کئے جاتے ہیں تو مال مویشی برباد ہو جاتے ہیں، جب سود عام ہو جائے تو فقر و مسکنت کا دور دورہ ہوتا ہے اور جب عہد شکنی کی جائے گی تو کفار غلبہ حاصل کریں گے۔

وفات کے وقت وصیت:

عبداللہ بن مسعودؓ روایت کرتے ہیں ہمارے نبیؐ اور ہمارے محبوبؐ نے ایک ماہ قبل ہمیں اپنی موت کا اشارہ دے دیا تھا، پس جب جدائی کی گھڑی قریب آتی نظر آئی اور تکلیف بڑھ گئی تو ہمیں اُم المومنین عائشہؓ کے گھر اکٹھا کیا گیا پھر آپ نے کلمۂ شہادت پڑھا اور فرمایا اللہ تعالیٰ تم پر سلامتی نازل فرمائے اللہ تمہیں حفظ و امان میں رکھے، تمہارا بھلا کرے۔ تمہیں رزق عطا فرمائے۔ تمہیں بلند مرتبہ عطا فرمائے، تمہیں اپنی پناہ میں رکھے، تمہیں (مصائب و آلام سے) بچائے، میں تمہیں خدا سے ڈرنے کی وصیت کرتا ہوں، میں تمہیں اللہ کے لئے وصیت کرتا ہوں اور وہ جو تمہارے بعد آئیں اور میں تمہیں اللہ سے ڈراتا ہوں کیوں کہ میں تمہارے لئے کھلا ڈرانے والا بن کر آیا ہوں کہ تم اللہ کے مقابلہ میں اس کے بندوں اور شہروں میں تکبر نہ کرنا، کیوں کہ اس نے مجھے اور تمہیں حکم دیا ہے کہ "یہ آخرت کا گھر اُن لوگوں کے لئے ہے جو زمین میں تکبر اور فساد برپا نہیں کرنے اور انجام کار خدا ترس لوگوں کیلئے ہے" (الآیۃ) پھر ارشاد ہوتا ہے۔

"کیا جہنم متکبرین کا ٹھکانہ نہیں" (آلایہ)

عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں ہم نے آپ سے پوچھا آپ کا وقت اجل کیا ہے؟ فرمایا بس جدائی قریب ہے۔ اللہ اور جنت کی طرف جانے ہی والا ہوں، کہتے ہیں کہ لوگ رونے لگ گئے، اور آپ بھی روئے پھر فرمایا۔ اللہ تعالیٰ تم پر اپنا رحم فرمائے اور تمہارے نبی کی طرف سے تمہیں جزائے خیر عطا فرمائے پھر آپ نے اپنے غسل، تکفین اور نماز جنازہ کا ذکر کیا۔ بعد ازاں فرمایا تم پر میرا اسلام ہو، اور تم میرا اسلام اُن دوستوں تک پہنچا دینا جو یہاں موجود نہیں اور تم اس بات کے گواہ رہو کہ میں نے ہر اس شخص پر جو میری پیروی اور دین کی پیروی کرتا رہا قیامت تک سلام بھیجا ہے۔

مواعظ اور وصایا

عبداللہ بن مسعودؓ اور ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وعظ و نصیحت کچھ دن چھوڑ کر فرمایا کرتے تھے آپ ایسا ازراہِ شفقت کیا کرتے تھے۔ دوسری روایت میں ہے کہ ہمارے اکتا جانے کے اندیشے کے پیش نظر ایسا کیا کرتے تھے۔ اہل بدر میں سے ایک شخص روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ ایسی مجلس میں بیٹھنا چار غلاموں کے آزاد کرنے سے زیادہ محبوب ہے۔ شعبہؒ کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا کونسی مجلس؟ کہا جہاں قصص بیان ہو رہے ہوں۔

انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اے لوگو! اللہ سے ڈرو جیسا کہ اُس سے ڈرنے کا حق ہے اور اس کی رضا طلبی میں کوشاں رہو اور دنیا کے فنا ہونے اور آخرت کے باقی رہنے پر یقین پیدا کرو اور مرنے کے بعد کے لئے عمل کرو۔ تم دنیا میں یوں رہو کہ گویا نہیں ہو اور آخرت میں رہنے کو دائمی سمجھو۔

اے لوگو! جو بھی دنیا میں ہے مہمان ہے اور جو کچھ اُس کے ہاتھ میں ہے عارضی ہے اور بلاشبہ مہمان جانے ہی والا ہوتا ہے اور مانگی ہوئی چیز واپس ہی کرنی ہوتی ہے۔ آگاہ رہو! تحقیق دنیا نقد جنس ہے۔ اُسے نیک اور بد کھاتے ہیں اور آخرت ایک سچا وعدہ ہے جس میں تمام قدرتوں کا مالک فیصلہ کرے گا۔ پس اللہ اُس شخص پر رحم کرے گا جو اپنے نفس پر نگاہ رکھتا ہے اور قبر کے لئے تیاری کرتا ہے۔ تم ہمیشہ اس کی منتظر رہتی ہے اور اس کی رسی گردن پر پڑنے ہی والی ہے۔ قبل اس کے کہ اُس کی میعاد ختم ہو اور اعمال کا سلسلہ منقطع ہو جائے۔

آپؐ نے فرمایا۔ اے لوگو! بلاشبہ یہ گھر چھوڑ جانے کے لئے ہے۔ یہ رہنے کے لئے نہیں اور دکھ کا مقام ہے سکھ کا نہیں۔ جو اس کی حقیقت جان لیتا ہے۔ وہ اس کی آسانی پر خوش نہیں ہوتا اور تنگی پر رنجیدہ۔ آگاہ رہو! اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو دارالامتحان بنایا ہے اور آخرت کو دارالجزا۔ پس اس دنیا کی تکلیف کو آخرت کے اجر کا سبب بنایا اور آخرت کا ثواب دنیا کی تکلیف کا معاوضہ ہے۔ پس وہ سلب کرتا ہے تاکہ عطا کیا جائے اور آزماتا ہے تاکہ جزا دیا جائے۔ پس یہ دنیا جلد جانے والی اور بہت جلد بدل لینے والی ہے۔ تم دودھ پینے کی لذت کے مقابلے میں دودھ چھوڑنے کی تلخی سے ڈرو۔ عارضی لذت کو دائمی تکلیف کے لئے چھوڑ دو اور اُس گھر کو آباد کرنے کی کوشش نہ کرو جس کو برباد کرنے کا اللہ نے فیصلہ کر رکھا ہے اور تم اس کو اپنانے کی کوشش نہ کرو جس کو تم سے الگ کرنے کا اللہ نے ارادہ کر لیا ہے ورنہ

تمہیں اللہ کی ناراضگی کا سامنا کرنا پڑے گا اور اُس کے عذاب کے مستحق بنو گے ۔

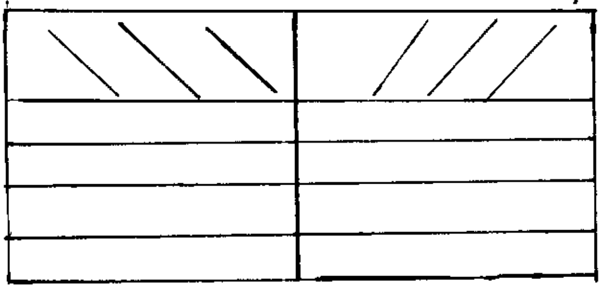
ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں وعظ فرمانے کے لئے کھڑے ہوئے۔ پس فرمایا اے لوگو! تم اللہ کی طرف ننگے پاؤں، ننگے بدن اور غیر مختون حالت میں اکٹھے کئے جاؤ گے۔

پھر فرمایا

"جس طرح ہم نے تمہیں پہلی دفعہ پیدا کیا اُسی طرح لوٹائیں گے۔ یہ ہمارا پکا وعدہ ہے کہ ایسا کر کے رہیں گے۔" آگاہ رہو! کہ قیامت کے دن سب سے پہلے حضرت ابراہیمؑ کو لباس پہنایا جائے گا اور اُس دن میری اُمت کے کچھ لوگوں کے بائیں ہاتھ میں نامۂ اعمال دیا جائے گا۔ میں کہوں گا یا رب! یہ تو میرے اصحاب ہیں پس مجھے کہا جائے گا۔ آپؐ نہیں جانتے انہوں نے آپؐ کے بعد کیا کیا۔ تب میں وہی کہوں گا جو اللہ کے نیک بندے حضرت عیسیٰ نے کہا "جب تک میں ان میں رہا میں اُس کا گواہ ہوں"۔ پھر کہا جائے گا کہ آپؐ کے جدا ہوتے ہی اپنی ایڑیوں کے بل لوٹ گئے تھے۔ پس میں کہوں گا۔ افسوس ہے! افسوس ہے!

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے۔ دانا وہ ہے جو اپنے نفس کی نگرانی کرے اور آخرت کے لئے عمل کرے اور احمق وہ ہے جو پیروی تو کرے اپنے خواہشات نفس کی اور امید باندھے اللہ پر، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ دو نعمتیں ایسی ہیں جو لوگوں کو بہت مرغوب ہیں صحت اور فراغت اور مومن تین باتوں میں کوشاں رہتا ہے آخرت کی تیاری، معاش کا حصول اور جائز چیزوں سے لذت اندوزی، ایک عاقل کے لئے چار گھڑیاں ہونی چاہیئں۔ ایک ساعت وہ جب وہ اپنے رب کو پکارے۔ دوسری میں اپنے نفس کا محاسبہ کرے تیسری کائنات خداوندی میں غور وفکر کے لئے ہو، اور چوتھی کھانے پینے کے لئے ہو، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا موت کو اکثر یاد رکھا کرو کیونکہ وہ گناہوں کو مٹاتی ہے اور دنیا سے بے رغبتی پیدا کرتی ہے۔ آپؐ کچھ لوگوں کے پاس سے گزرے جو کسی کی قبر کھود رہے تھے۔ آپ وہیں ٹھہرے اور رونے لگے حتیٰ کہ آپؐ کی ٹھوڑی تر ہو گئی اور فرمایا اے میرے بھائیو! ہر ایک کیلئے یہی جگہ ہے پس تیار رہو اور آپؐ نے ایک دن اپنے دوستوں سے فرمایا۔ اللہ سے حیا کرو جیسے اُس سے حیا کرنے کا حق ہے بولے، وہ کیسے؟ اے اللہ کے رسولؐ! فرمایا وہ کچھ جمع کرتے ہو جو نہیں کھانے اور اُس کی آرزو کرتے ہو جو نہیں پاؤ گے اور وہ بناتے ہو جس میں رہ نہیں سکو گے ۔

عبداللہ (ابن مسعودؓ) روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مربع خط بنایا اور ایک لکیر درمیان میں کھینچی اور درمیانی لکیر کے پاس کئی لکیریں کھینچیں۔ اور چاروں طرف پھر ایک اور لکیر کھینچی اور اس کی شکل یہ بن گئی ۔



پھر فرمایا جانتے ہو کیا ہے؟ عرض کیا گیا اللہ اور رسول بہتر جانتے ہیں۔ فرمایا یہ جو درمیانی لکیر ہے انسان ہے اور اردگرد موت احاطہ کیے ہوئے ہے اور ادھر اُدھر کی لکیریں اس کی ضروریات ہیں جو اُسے جکڑے ہوئے ہیں۔ اگر وہ انہیں پورا نہ کرے تو اُسے ڈستی ہیں اور باہر کی لکیر اُس کی اُمید ہے اور پھر فرمایا۔ ابن آدم جوں جوں بوڑھا ہوتا جاتا ہے ہوس زور اُمید توں توں بڑھتی جاتی ہے پھر فرمایا لے لوگو! زنا نہ کرو تمہاری عورتوں سے زنا کیا جائے گا کیونکہ جو لوگ زنا کرتے ہیں ان کی عورتوں سے زنا کیا جاتا ہے۔ بعد ازاں فرمایا جو عدل کرتا ہے اس سے عدل کیا جاتا ہے جو جس باٹ سے تولتا ہے اسی باٹ سے تولا جاتا ہے۔ جو بغاوت کی تلوار کھینچتا ہے اُسی سے مارا جاتا ہے۔

قیس بن عاصم المنقریؓ روایت کرتے ہیں، مَیں بنی تمیم کے ایک وفد میں شامل ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپؐ نے مجھے فرمایا کہ پانی اور بیری کے پتوں سے غسل کرو۔ میں نے ایسا کیا اور پھر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا اے اللہ کے رسولؐ! ہمیں ایسی نصیحت فرمایئے جس سے ہم نفع اٹھائیں۔ آپؐ نے فرمایا اے قیس! بے شک عزت کے ساتھ ذلت، زندگی کے ساتھ موت اور دنیا کے ساتھ آخرت ہے۔ بلاشبہ ہر ایک چیز کیلئے محاسب اور ہر ایک چیز پر نگران مقرر ہے۔ ہر نیکی کے لیے ثواب اور ہر برائی کے لئے عذاب اور ہر چیز کا وقت مقرر ہے اور اے قیس! یہ لازمی ہے کہ تیرا دوست (نامۂ اعمال) تیرے ساتھ دفن ہو اور وہ زندہ ہو اور تم اس کیساتھ دفن ہو اور تم مردہ ہو۔ بہرحال اس کا حشر تمہارے ساتھ ہوگا اور تم اس کے ساتھ اُٹھو گے اور تم سے اسی کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔ تم اُسے زیادہ سے زیادہ اچھا بنانے کی کوشش کرو۔ اگر وہ اچھا ہوا تو تمہیں اُسی سے اُنس ہوگا اور اگر وہ بُرا ہوا تو تمہیں اُسی سے وحشت ہوگی کیونکہ وہ تمہارا ہی فعل ہے۔

ابن عباسؓ روایت بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص خود کو دنیا کے لیے وقف کر دیتا ہے اللہ تعالیٰ اُسے دنیا کے سپرد کر دیتا ہے جو شخص کوئی چیز اللہ کی نافرمانی کر کے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اُسے بہت دور کر دیتا ہے جس کی وہ آرزو کرتا ہے، اور اُسے قریب کر دیتا ہے جس سے وہ بچنا چاہتا ہے، جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کر کے لوگوں کی تعریف چاہتا ہے۔ تو اللہ اُن میں اس کے مذمت کرنے والے پیدا کر دیتا ہے، جو اللہ کو ناراض کر کے لوگوں کو راضی کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے ان لوگوں کے سپرد کر دیتا ہے جو لوگوں کو ناراض کر کے اللہ تعالیٰ کو خوش کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اُسے اُن لوگوں کے شر سے محفوظ فرما لیتا ہے، جو اپنے اور خدا کے درمیان معاملات کو درست رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے اور دوسرے لوگوں کے درمیان معاملات کو ٹھیک کر دیتا ہے، جو اپنا باطن اچھا بناتا ہے خدا تعالیٰ اس کا ظاہر اچھا بنا دیتا ہے اور جو شخص آخرت کے کام کرتا ہے اللہ تعالیٰ اُس کے دنیوی کام آسان فرما دیتا ہے۔

اے لوگو! تمہارے لئے کچھ علامات ہیں۔

مومن کو دو خوف ہوتے ہیں، ایک یہ کہ جو وقت گزرا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے متعلق کیا کرتا ہے اور دوسرے جو وقت باقی رہ گیا ہے۔ اس کے بارہ میں کیا فیصلہ دیتا ہے، پس بندے کو چاہیئے کہ اپنی ذات کے لئے ہر سانس سے فائدہ اٹھائے آخرت سے پہلے دنیا، بڑھاپے سے

پہلے جوانی اور موت سے پہلے زندگی سے فائدہ اٹھائے۔

قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے، کہ موت کے بعد کوئی مشکل امر نہیں اور اس دنیا کے بعد جنت اور جہنم کے علاوہ کوئی گھر نہیں، اور فرمایا کیا تمہیں سب سے زیادہ بُرے آدمی کے بارہ میں نہ بتاؤں؟ عرض کیا گیا اگر آپ چاہیں تو؟ اے اللہ کے رسول، فرمایا بُرا انسان وہ ہے جو اکیلا سفر کرے، اپنے غلام کو کوڑے مارے اور بخشش کو روک رکھے، پھر فرمایا اس سے بھی زیادہ بُرے انسان سے تمہیں آگاہ نہ کروں؟ عرض کیا گیا اگر آپ چاہیں تو اے اللہ کے رسول! فرمایا جو کسی کی لغزش سے درگزر نہیں کرتے کسی کی معذرت قبول نہیں کرتے اور کسی کا جُرم معاف نہیں کرتے، پھر فرمایا کیا اس سے بھی زیادہ بُرے انسان کی نشاندہی نہ کروں؟ عرض کیا گیا اگر آپ چاہیں تو؟ فرمایا تم میں سب سے زیادہ بُرا انسان ہے وہ ہے کہ جس سے کسی خیر کی توقع نہ ہو اور اس کے شر سے امان نہ ہو۔

ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم کرے، جب وہ گفتگو کرتا ہے تو مفید ہوتی ہے یا خاموش رہتا ہے تو آسودہ رہتا ہے، بلاشبہ زبان سب سے زیادہ انسان کے قابو میں ہے، آگاہ رہو بندے کی گفتگو زیادہ تر اس کے لئے نقصان دہ ہوتی ہے نفع بخش نہیں الّا یہ کہ ذکرِ الٰہی ہو، اچھی بات کا حکم ہو، بُری بات سے روکنا اور مسلمانوں کے درمیان اصلاح کی بات ہو، معاذ بن جبلؓ نے کہا اے اللہ کے رسولؐ! کیا گفتگو پر بھی ہمارا مواخذہ ہوگا فرمایا، جہنم میں لوگ اپنی زبان کی بے اعتدالی کے باعث اوندھے منہ لٹکائے جائیں گے پس جو شخص امن چاہتا ہے وہ اپنی زبان قابو میں رکھے اور دل سے اٹھنے والے خیالات کی نگرانی کرے، اچھے عمل کرے اور آرزوئیں کم کر دے۔

ابی موسیٰؓ کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم دنیا کو بُرا نہ کہو کہ وہ مومن کی بہترین سواری ہے وہ اسی سے بھلائی تک پہنچتا ہے اور بُرائی سے بچتا ہے، جب کوئی شخص کہتا ہے اللہ تعالیٰ دنیا پر لعنت بھیجے تو دنیا کہتی ہے اللہ تعالیٰ اپنے نافرمانوں پر لعنت بھیجے۔

ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لذتوں کو مکدّر کرنے والی چیز کا اکثر ذکر کیا کرو،

ہر انسان دو دنوں کے درمیان ہے ایک وہ دن جو گزر گیا اس کے عمل اس میں شمار کیے گئے اور وہ ختم ہو گیا اور ایک دن وہ جو ابھی آئے گا جس کے متعلق وہ نہیں جانتا کہ وہ اسے دیکھنا بھی نصیب ہوگا، ہر انسان موت اور قبر میں داخل ہوتے وقت اپنے گزشتہ اعمال کی جزا اور پیچھے چھوڑ جانے والے مال کو دیکھتا ہے اور اسے گمان گزرتا ہے کہ شاید اس نے یہ مال غلط طریقے سے جمع کیا اور حقداروں سے روکے رکھا۔

ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا رزق لکھ دیا گیا ہے اور جو کچھ طے ہو گیا ہے۔ اس میں سے کم نہیں کیا جائے گا لہٰذا اس کی خواہش میں کمی کرو اور عمر بھی مقرر کر دی گئی ہے اور جتنا کچھ مقرر ہوئی ہے اس میں اضافہ نہیں ہوگا۔ پس مدت مقررہ ختم ہونے سے پہلے اس سے فائدہ اٹھالو، اعمال گنے جا چکے ہیں اب ان میں سے کوئی بڑا یا چھوٹا چھوٹنے نہ پائے گا، پس زیادہ سے زیادہ اچھے عمل کرو۔ اے لوگو! قناعت میں کشادگی اور میانہ روی میں کامیابی ہے، اور بیشک زہد میں مسرت ہے۔ ہر عمل کی جزا اور آنے والی چیز قریب ہے۔

اے لوگو! تیاری کر لو کہ اگلا مرحلہ سخت ہے، جلدی کرو کہ کوچ کا وقت آپہنچا ہے زادِ راہ بنا لو کہ دور کا سفر ہے، اپنے بوجھ ہلکے کر لو کہ تمہارے پیچھے ہولناک وادیاں ہیں۔ انہیں ہلکے پھلکے لوگ ہی طے کریں گے،

اے لوگو! قیامت سے پہلے بہت سنگین واقعات، زبردست حادثات اور مشکل حالات ہوں گے: تاریکی چھا جائے گی، فسق و فجور کا دور دورہ ہوگا، بھلائی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے والوں کو اذیتیں دی جائیں گی لہٰذا تم ایمان کو بچائے رکھو اور اسے دانتوں کیساتھ مضبوطی سے پکڑے رکھو، اچھے اعمال کی طرف لپکو اور اپنے نفس کو اس پر مجبور کرو، تکلیفوں پر صبر کرو تو دائمی مسرتوں کو حاصل کر لو گے۔

اے لوگو! طمع تنگدستی ہے، اور بے نیازی دولت، قناعت میں مسرت ہے، گوشہ نشینی عبادت ہے، عمل خزانہ ہے، دنیا کان ہے، اللہ کی قسم ہے یہ ساری دنیا جتنا کچھ گذر گئی ہے چادر کے پلو کے برابر ہے اور جتنا کچھ باقی ہے وہ بالکل اتنی ہی ہے جیسے پانی پانی سے مشابہ ہوتا ہے، پس ہر ایک خاتمے کی طرف بڑھ رہا ہے اور اس کا زوال قریب ہے، تم سانسوں کی مہلت میں جی رہے ہو، جلدی کرو قبل اس کے کہ تمہارا سخت ناراضگی کے ساتھ محاسبہ ہو اور تمہیں ندامت بھی کوئی فائدہ نہ دے سکے۔

ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا! اے لوگو! تم حکمت کو نا اہل لوگوں کے سپرد نہ کرو ورنہ تم ظلم کے مرتکب ہو گے اور نہ اُسے اس کے اہل سے روکے رکھو کہ اس طرح بھی تم ظلم کا ارتکاب کرو گے، ظالم کی پیروی نہ کرو تمہارا انعام گر جائے گا، دکھاوا مت کرو تمہارے اعمال ضبط ہو جائیں گے جو کچھ موجود ہے اُسے روکے نہ رکھو ورنہ تمہیں عطا کرنے میں کمی واقع ہوگی۔

اے لوگو! تین چیزیں ہیں ایک یہ کہ اس کی ہدایت واضح ہے۔ پس اس کی پیروی کرو، ایک یہ کہ اسکی گمراہی ظاہر ہے۔ اس سے بچو اور ایک جس میں اختلاف ہے اسے اللہ کی طرف لوٹا دو۔

اے لوگو! کیا تمہیں ایسی دو چیزوں سے آگاہ نہ کروں جن پر محنت کم آتی ہے اور اجر زیادہ، اور اللہ تعالیٰ کے ہاں ان سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں وہ ہے خاموشی اور اچھے اخلاق،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ قیامت کے دن تین طرح کے لوگ آئیں گے یا تو وہ دین میں مشکوک چیزوں کے مرتکب ہوئے ہوں گے، یا شہوات میں پڑ گئے ہوں گے یا غصے میں کچھ کر گزرے ہوں گے، پس اگر تم کوئی مشکوک چیز پاؤ تو اسے یقین کیساتھ چھوڑ دو، اگر کوئی شہوت انگیز چیز کا سامنا ہو تو اسے زہد کے ساتھ ذبح کر دو اور اگر غصہ آ جائے تو اسے عفو و درگزر سے ٹال دو، کیونکہ قیامت کے دن منادی ندا دے گا کہ جس کا اجر اللہ کے ذمے ہو وہ کھڑا ہو جائے پس لوگوں کو معاف کرنے والے کھڑے ہوں گے، پھر فرمایا: جو معاف کرے اور بھلائی کرے اسکا اجر جو اللہ کے ذمے ہے، پھر آپ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اے ابن آدم! تجھے ہر روز کا رزق مل جاتا ہے اور تو غمزدہ رہتا ہے اور تیری عمر میں ہر روز کمی واقع ہوتی ہے اور تو خوش ہوتا ہے، یہ تیرے لئے کافی ہے لیکن تو وہ طلب کرتا ہے جو تجھے سرکش بنا دے، تھوڑے پر تو قناعت نہیں کرتا اور زیادہ سے سیر نہیں ہوتا، اے لوگو! تم اگلوں کے جانشین اور آنے والوں کے لئے بقیہ ہو، تم سے پہلے کئی لوگ زیادہ خوشحال اور طاقتور تھے مگر باایں ہمہ اُن سے وہ مکانات خالی کرائے گئے جہاں وہ رہتے تھے اور انہیں اس چیز نے دھوکہ دیا جس پر انہیں بہت بھروسا تھا، سو نہ انہیں جتھے کی قوت نے فائدہ پہنچایا اور نہ اُن سے کوئی معاوضہ قبول کیا گیا، پس تم

منزل پر پہنچنے کے لئے زادِ راہ تیار کر لو کہیں ایسا نہ ہو کہ اچانک پکڑ لیے جاؤ اور تمہیں تیاری کا موقعہ بھی نہ مل سکے۔

ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بیشک دنیا چل پڑی ہے جانے کیلئے اور آخرت چل پڑی ہے آنے کیلئے، خبردار، تم جو آج کا وقت ملا ہے یہ عمل کیلئے ہے یہاں حساب نہیں اور کل تمہارا حساب ہوگا لیکن عمل کا موقع نہ ملے گا، اللہ تعالیٰ ہر ایک کو دنیا عطا فرماتا ہے خواہ وہ اُسے پسند کرے یا نہ ! لیکن آخرت صرف اُسے ملتی ہے جو اُسے محبوب ہو، بہر کیف کچھ دنیا کے بیٹے ہیں اور کچھ آخرت کے، پس تم لوگ آخرت کے بیٹے بنو دنیا کے نہیں، مجھے سب سے زیادہ تمہارے متعلق جس چیز کا خوف ہے وہ ہوا و ہوس کی پیروی اور امیدوں کے دراز ہونے کا خوف ہے۔

اے لوگو! زیادہ کھانے سے پرہیز کرو، کیونکہ زیادہ کھانا دل کو قساوت سے زہریلا کر دیتا ہے، اعضاء کو اطاعت کیلئے سُست بنا دیتا ہے۔ ارادوں کو نصیحت سُننے سے بہرہ بنا دیتا ہے اور بُری نظر سے بچو، کیونکہ وہ خواہشوں کو ابھارتی اور غفلت کو پیدا کرتی ہے طمع سے بچو، کہ وہ دل کو حرص سے بھر دیتا ہے، دلوں پر مہر لگا دیتا ہے حب دنیا کو اُبھارتا ہے، وہ ہر بُرائی کی کنجی ہے اور ہر نیکی کے ضائع ہونے کا سبب ہے۔

آپ نے فرمایا وہ بھلائی نہی ہے جس کی آرزو کی جائے اور بُرائی ہے جس سے بچا جائے۔ باطل کھلا ہے اس سے بچو، حق مضبوط ہے اسے طلب کرو، آخرت سعادت مندی کا سایہ ہے اس کے لئے کوشش کرو، اور دنیا ختم ہونے کے قریب ہے اس سے منہ پھیر لو، پس کیسے آخرت کا عمل ہو سکے گا اگر دنیا سے رغبت ختم نہ کی جائے اور اس کی لذتوں سے منہ نہ موڑا جائے۔ سب سے بڑھ کر تعجب خیز بات یہ ہے کہ ایک شخص آخرت کے باقی ہونے کا یقین رکھتا ہے اور کوشش فانی گھر کی کرتا ہے اور جانتا ہے کہ اللہ کی رضا اس کی اطاعت میں ہے لیکن اس کی نافرمانی میں کوشاں رہتا ہے، سب سے بُرا انسان وہ ہے جو اترائے، اور تجاوز کرے اور اپنے رب کو بھول جائے، بُرا انسان ہے وہ جو بھٹک گیا، غافل ہوا اور قبر اور آزمائش کو بھول گیا، بُرا ہے وہ انسان جو باغی ہوا، سرکش ہوا اور اپنے آغاز و انجام کو بھول گیا، بُرا ہے وہ انسان جس کا پیشوا طمع ہے، بُرا ہے وہ انسان جسے خواہشات نے بھٹکا دیا۔

اے ابنِ آدم! تجھے وہ کچھ میسر ہے جو تیرے لئے ضروری ہے اور تو اسے چاہتا ہے جو تجھے سرکش بنا دے، تو تھوڑے پر قناعت نہیں کرتا اور زیادہ سے سیر نہیں ہوتا، جبکہ تو صحت مند ہے، اپنے گھر میں آسودہ ہے، ہر روز کا کھانا میسر ہے گویا دنیا اپنے تمام ساز و سامان کے ساتھ تمہیں مہیا ہے، پھر فرمایا! دنیا کو دنیا والوں کے لئے چھوڑ دو آپ نے تین مرتبہ فرمایا جو شخص دنیا میں سے اپنی ضرورت سے زیادہ طلب کرتا ہے اُسے ہلاکت آلیتی ہے اور اُسے اس کا شعور نہیں ہوتا۔

قیامت کے دن کوئی شخص اپنے پاؤں کی جگہ نہ چھوڑنے پائے گا جب تک کہ اللہ تعالیٰ اُس سے یہ نہیں پوچھ لے گا کہ تم نے مال کہاں سے جوڑا اور کہاں پر خرچ کیا، اپنی عمر کن کاموں میں کھپائی، جوانی کیسے گزاری، امانتیں کیسے ادا کیں، پھر فرمایا قسم اسی ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے اللہ تعالیٰ کے سامنے بندہ کا قیام اور اس کی شرمندگی اس قدر شدید ہوگی کہ وہ آرزو کرے گا کہ کاش جہنم ہی میں ڈال دیا جائے۔ بعد ازاں فرمایا جس قدر ممکن ہو دنیا کے دھندوں سے فارغ ہونے کی کوشش کرو جو دنیا ہی کی فکر

میں رہتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو ضائع کرنے کا ارادہ کر لیتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے اسے محتاج بنا دیتا ہے، جو بندہ اپنا دل اللہ کی جانب مائل کر دیتا ہے اللہ تعالیٰ اہل ایمان کے دل اس کی طرف پھیر دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کے لیے بھلائی میں بہت جلدی کرتا ہے پھر فرمایا کسی انسان کی حماقت یہی کافی ہے کہ اس کی لذت بڑھ جائے، عمل اور خدا خوفی کم ہو جائے۔ رات کو بے سدھ سویا رہے اور دن کو لغویات بکتا رہے، کاہل، بے صبرا، حریص اور کھلنڈرا۔

ابن حبیبؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی نصیحت کرنیوالا ہو، اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک محافظ بھی ہوتا ہے، جو اپنے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان معاملات درست کر لیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے اور دوسروں کے درمیان معاملات ٹھیک کر دیتا ہے، جو شخص اپنی ذات کے لیے لوگوں سے انصاف کرتا ہے۔ اللہ اُسے زیادتیوں سے محفوظ رکھتا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا چار چیزیں دل میں فساد پیدا کرنیوالی ہیں، کسی پاگل کو اس کی حرکت پر سزا دینا، گناہوں کی کثرت، عورتوں کے ساتھ اختلاط، اُن سے ناجائز تعلقات اور اُن کے مشوروں پر عمل کرنا، اور مردوں کے ساتھ نشست برخاست!

پوچھا گیا اے اللہ کے رسول! یہ مُردے کون ہیں؟ فرمایا، وہ مالدار جسے دولت مغرور بنا دے اور ظالم حکمران،

فرمایا اے لوگو! کیا تم میں ایسے لوگ ہیں جو چاہتے ہوں کہ انہیں بغیر تعلیم کے علم حاصل ہو جائے اور بغیر طلب ہدایت کے راہ راست پر چل نکلیں؟ کیا تم میں ایسے ہیں جو چاہتے ہوں کہ ان سے اندھا پن ختم ہو جائے اور وہ دانا بینا ہو جائیں؟

آگاہ رہو، جو شخص دنیا میں غیر معمولی دلچسپی لیتا اور آرزوؤں کو طول دیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کا دل اندھا کر دیتا ہے، جو دنیا سے الگ تھلگ رہتا اور اپنی اُمید کم کرتا ہے اللہ تعالیٰ اُسے بغیر تحصیل علم کے علم اور طلب ہدایت کے ہدایت عطا فرما دیتا ہے،

خبردار! تمہارے بعد کچھ لوگ ایسے آئیں گے جو ظلم اور جبر سے حکومت حاصل کریں گے۔ وہ دولت کے باعث فخر و غرور میں مبتلا ہوں گے اور انہیں دنیوی مسرتوں اور خواہشات کی پیروی سے محبت ہو گی، لہٰذا تم میں سے جو لوگ اس وقت موجود ہوں انہیں چاہیئے کہ وہ فقر پر اکتفا کریں خواہ انہیں دولت حاصل کرنے پر قدرت بھی ہو، وہ عاجزی ہی کو اپنائیں گو کہ انہیں عظمت حاصل ہو، اگر ایسا وہ اللہ کی خوشنودی کے لیے کریں تو اللہ تعالیٰ انہیں پچاس صدیقوں کا ثواب عطا فرمائے گا۔

آپ سے ایک شخص نے کہا اے اللہ کے رسول، دنیا میں سب سے بڑا زاہد کون ہے؟ فرمایا جو قبر کو نہ بھولے، دنیا کی غیر ضروری زینت کو چھوڑ دے، باقی کو فانی پر ترجیح دے، آنے والے وقت کا انتظار نہ کرے اور خود کو مُردوں میں شمار کرے، پھر فرمایا اے لوگو! قریب ہے کہ تم لوگ اہل جنت کو اہل نار میں سے پہچان لو! کسی نے عرض کیا وہ کیسے؟ اے اللہ کے رسول فرمایا بُری شہرت یا اچھی شہرت کے ذریعے

ابو ایوبؓ انصاری روایت کرتے ہیں، میں نے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے، اپنے نفسوں کو اطاعت سے آراستہ کرو اور انہیں خشیت (الہٰی) کے اسلحہ سے مسلح کرو، اپنے لیے آخرت کو اختیار کرو اور تمہاری کوشش اپنے مستقل ٹھکانے

کیلئے، ہوتی چاہیئے، تم کو معلوم ہونا چاہیئے کہ تم بہت تھوڑے اثاثے کو چھوڑ کر جانے والے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں پہنچنے والے ہو، تمہیں کوئی فانی چیز نہیں بچا سکے گی اِلاّ یہ کہ وہ اچھا عمل جو تم نے اپنے آگے بھیج رکھا ہے، تمہیں اپنے تمام اعمال کی جزا دی جائے گی. تمہیں دنیا کے ٹھیکرے جنت کے اعلیٰ مدارج کے مقابلے میں دھوکے میں نہ ڈال دیں، پس اس وقت تمام شکوک وشبہات زائل ہو جائیں گے ہر شخص اپنے ٹھکانے پر جا پہنچے گا، ہر ایک اپنے ٹھکانے کو پہچان لے گا

آپ نے فرمایا کہ یہ یقین میں ضعف کی علامت ہے کہ تم اللہ کی ناراضگی کے مقابلہ میں لوگوں کو راضی کرو اور اللہ کے عطا کردہ رزق پر لوگوں کی تعریف کرو اور اگر اللہ نہ دے تو لوگوں کو بُرا بھلا کہو، کیونکہ خدا کا رزق کسی حریص کے حرص کی وجہ سے بڑھتا نہیں اور کسی نہ پسند کرنے والے کی وجہ سے گھٹتا نہیں، بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے خوشی اور مسرت کو تسلیم ورضا اور یقین میں پوشیدہ رکھا ہے دُکھ اور غم کو شک اور ناراضگی میں رکھا ہے، پس تم اللہ کی رضا کے لئے کوئی بھی چیز مت ہاتھ سے جانے دو، یقیناً اس کا عظیم اجر تمہیں دیا جائے گا، لہٰذا تم اپنی تمام کوششیں آخرت کے لئے وقف کرو،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کوئی ایسی بات جو تمہیں دوزخ سے دُور اور جنت سے قریب کرنیوالی ہو بیان کرنے سے نہیں رہی جو تم پر واضح نہ کر دی ہو، جبریل نے یہ بات میرے دل پر اتاری ہے کہ کوئی بندہ اس وقت تک موت سے ہمکنار نہیں ہوتا جب تک کہ اس کا رزق پورا نہیں ہو جاتا، پس تم رزق تلاش کرنے میں حسن کارانہ انداز اپناؤ، نیز رزق ملنے میں تاخیر واقع ہونے پر تم خدا کی نافرمانی کر کے ذرائع اختیار نہ کرو، کیونکہ جو کچھ اس کے ہاں ہیں وہ اس کی اطاعت ہی سے ملتا ہے.

آگاہ رہو کہ ہر شخص کا رزق اُسے مل کر رہتا ہے جو اس پر مطمئن ہو تو اللہ تعالیٰ اس میں برکت ڈالتا ہے اور وسعت دیتا ہے، اور جو اس پر راضی نہیں ہوتا تو اللہ اُسے برکت اور وسعت سے محروم کر دیتا ہے، رزق بندے کو موت کی طرح ڈھونڈتا ہے

(عبداللہ) ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا، جس دل میں دنیا کی محبت گھر کرتی ہے تو اس کے نتیجے میں تین باتیں پیدا ہوتی ہیں، اس قدر مصروفیات کہ ختم نہیں ہوتیں، ایسی محتاجی کہ کبھی دل نہیں بھرتا اور کبھی نہ پوری ہونے والی آرزو! بے شک دنیا اور آخرت طالب بھی ہیں اور مطلوب بھی! پس جو شخص آخرت کا طالب ہے، اسے دنیا ڈھونڈتی ہے حتیٰ کہ اس کی روزی پوری ہو جاتی ہے، اور جو دنیا کا طالب ہو اس کی تلاش میں آخرت رہتی ہے تاآنکہ موت اُسے گردن سے آپکڑتی ہے.

انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر روز ملک الموت ہر انسان کے دروازے پر پانچ مرتبہ جاتا ہے وہ جب کسی کو دیکھتا ہے کہ اس کا رزق ختم ہو گیا اور مہلت کی مدت گزر گئی تو اس پر موت وارد کر دیتا ہے جس سے اس شخص کو دکھ اور غم چھا جاتے ہیں، اس کے پسماندگان اپنے بال نوچتے، منہ پیٹتے اور زار وقطار روتے ہیں، ملک الموت انہیں کہتا ہے، افسوس ہے تم پر یہ جزع فزع کیا معنی؟ میں کسی کا رزق نہیں چھینتا، کسی کی موت قریب نہیں کرتا، میں بغیر حکم الٰہی کسی کے پاس نہیں آتا، میں اللہ کی منشا کے بغیر کسی کی روح قبض نہیں کرتا، میں پھر آؤں گا، بار بار آؤں گا حتیٰ کہ تم میں سے کوئی بھی یہاں زندہ نہ رہے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے اگر لوگ اس کا ٹھکانہ دیکھ لیں اور اس کی بات سنیں تو اس پر گریہ کرنے کے بجائے اپنے آپ پر روئیں، جب کسی میت کو چارپائی پر رکھ کر اٹھایا جاتا ہے تو وہ پکارتی ہے "اے میرے گھر والو! اے میرے بیٹو! تم دنیا میں یوں مشغول نہ ہونا جس طرح میں رہا، میں نے حلال و حرام سے مال جمع کیا پھر اُسے دوسروں کے لیے چھوڑ گیا، اس سے نفع انہوں نے اٹھایا اور ذمہ داری مجھ پر آپڑی تم اس سے بچو جو مجھے پیش آیا...

(عبداللہ) ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں میری اُمت میں تین طرح کے لوگ ہیں، ایک طبقہ وہ ہے جو نہ مال جمع کرنے میں دلچسپی رکھتا ہے اور نہ ہی ذخیرہ اندوزی کرتا ہے، بس انہیں دنیا سے اتنا کچھ مطلوب ہے کہ بھوک مٹ جائے اور لباس مل جائے، اُن کیلئے وہی کافی ہے جو آخرت میں انہیں ملے گا، پس یہی وہ لوگ ہیں جن پر کوئی خوف اور حُزن نہیں،

دوسرا گروہ وہ ہے جو مال جوڑتا ہے لیکن جائز ذرائع سے، اُسے اچھی جگہ خرچ کرتے ہیں، صلہ رحمی کرتے ہیں۔ اپنے بھائیوں کے ساتھ نیک سلوک کرتے ہیں، نعرا سے ہمدردی برتتے ہیں، اُن کے لیے منہ میں انگارہ لے لینا اس سے کہیں زیادہ آسان ہے کہ حرام ذریعے سے مال کمائیں، اسے غلط مصارف میں کھپائیں حقداروں سے روک رکھیں اور اُسے موت تک ذخیرہ بنائے رکھیں۔ یہ وہ لوگ ہیں اگر ان سے پوچھ گچھ ہوگئی تو پکڑے جانے کا امکان ہے اگر ان سے صرف نظر کرلی جائے تو محفوظ رہیں گے۔

تیسرا طبقہ ان لوگوں کا ہے جو حلال و حرام ذرائع سے مال کماتا ہے۔ فرائض اور واجبات کو نظر انداز کرتا ہے خرچ کرنے تو ہمیشہ فضول جگہوں پر خرچ کرتا ہے، اگر خرچ نہ کرے تو بخل پر اُتر آتا ہے، یہ وہ لوگ ہیں جن کے دل دنیا کے غلام بن چکے ہیں حتیٰ کہ اُن کے گناہ انہیں دوزخ میں اتار دیں گے۔

ابو سعید خدریؓ روایت کرتے ہیں، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا جب آپ اُحد سے واپس تشریف لا رہے تھے لوگ آپ کے ارد گرد تھے اور آپ ایک درخت کے نیچے تشریف فرما تھے، آپ نے فرمایا،

اے لوگو! اصلاحِ آخرت کے لیے جو کام تمہیں سونپے گئے ہیں وہ کرو اور اُس سے بے نیاز ہو جاؤ جس کی دنیا میں تمہیں ضمانت دے دی گئی ہے، اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں سے پلے ہوئے اعضاء و جوارح کو اس کی نافرمانی میں مت استعمال کرو خود کو طلبِ مغفرت میں مصروف رکھو، اپنی تمام کوششیں اطاعت کے ذریعے اس کا قرب حاصل کرنے کے لئے وقف کر دو۔

پس جو شخص دنیا کا ارادہ کرتا ہے اُسے دنیا مل جاتی ہے اور آخرت میں اُسے کچھ نہیں ملے گا اور جو شخص آخرت کے نصیب کی فکر کرتا ہے اسے دنیا بھی ملے گی اور آخرت میں جو ارادہ کرے گا وہ کچھ بھی ملے گا۔

انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ وہ اولیاء اللہ کون ہیں جنہیں نہ کوئی خوف لاحق ہے اور نہ کوئی غم، آپ نے فرمایا یہ وہ لوگ ہیں جو دنیا کا باطن دیکھتے ہیں جبکہ لوگ ان کے ظاہر پر خوش ہو رہے ہوتے ہیں، یہ دنیا کے انجام کی سوچ رہے ہوتے ہیں جبکہ لوگ دنیا کے مفاد عاجلہ کے حصول میں لگے ہوتے ہیں، وہ اُسے خود ہی ختم کر دیتے ہیں، جن کے بارے میں انہیں اندیشہ ہوتا ہے کہ وہ ختم کر دی جائے گی، وہ اُسے چھوڑ دیتے ہیں جس کے متعلق انہیں علم ہوتا ہے کہ وہ چھوڑنا پڑے گا۔

ابوسعید خدری روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا، آپ کسی کو نصیحت فرما رہے تھے تم اس میں دلچسپی بڑھاؤ جو اللہ کے ہاں ہے تو اللہ تعالیٰ تمہیں محبوب بنائے گا۔

کچھ گروہ قیامت کے دن ایسے آئیں گے جن کی نیکیاں پہاڑوں کی مانند ہوں گی لیکن انہیں دوزخ میں جانے کا حکم دیا جائے گا وہ بولا اے اللہ کے نبی! کیا وہ نمازی ہوں گے؟ فرمایا ہاں نماز پڑھتے ہوں گے روزے رکھتے ہوں گے، راتوں کو قیام کرتے ہوں گے لیکن جب اُن کے لیے دنیا کی کوئی چیز ظاہر ہوتی تھی تو وہ اس پر ٹوٹ پڑتے تھے۔

ایک اور وعظ جس میں دجال کا ذکر ہے:

نواس بن سمعان کلابی روایت کرتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دجال کا نہایت حقارت کے ساتھ ذکر کیا اور (اس کے خوارق کی) ساتھ ساتھ بڑائی بیان کی حتیٰ کہ ہمیں گمان گزرا کہ وہ یہاں کھجوروں کی اوٹ میں موجود ہے، ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے رخصت ہو کر آ گئے، پھر ہم آپ کے پاس گئے، ہم نے وہاں دجال کا خوف اور اثر محسوس کیا، آپ نے فرمایا تمہارا کیا حال ہے؟ ہم بولے آپ نے کل دجال کا ذکر بڑی اہانت اور اس کے فتنوں کی شدت کے ساتھ کیا اور ہمیں تو گمان گزرا کہ وہ کھجوروں کی اوٹ میں ہے آپ نے فرمایا مجھے تمہارے لئے دجال کے بارہ میں زیادہ ڈر ہے، اگر وہ ظاہر ہوا اور میں بھی موجود ہوا تو میں حجّت بن کر اس کے سامنے پیش ہوں گا اور اگر اس کے ظہور کے وقت میں موجود نہ ہوا تو ہر شخص اپنی ذات کا ذمہ وار ہے، اور میری طرف سے اللہ تعالیٰ ہی ہر مسلمان کا نگہبان ہے، تحقیق دجال نوجوان ہوگا، گھونگھریالے بالوں والا، اس کی ایک آنکھ سلامت ہوگی اس کا لشکر شام اور عراق کے درمیان سے برآمد ہوگا پھر وہ دائیں بائیں سب کچھ تباہ کر دے گا۔

اے اللہ کے بندو! ثابت قدم رہنا! پس ہم نے عرض کیا اے اللہ کے رسول وہ کتنی مدت زمین پر قیام کرے گا؟ فرمایا چالیس دن لیکن اس کا ایک دن ایک سال کے برابر ہوگا، اور ایک دن ایک ماہ اور ایک دن ایک ہفتہ کے برابر ہوگا اور باقی دن تمہارے دنوں کی طرح ہوں گے، ہم نے پوچھا اگر وہ دن ایک سال کے برابر ہوگا تو ہمارے لئے ایک دن اور رات کی نماز کافی ہوگی، فرمایا نہیں، بلکہ اوقات نماز کا اندازہ کر لینا، ہم نے عرض کیا کہ زمین میں اس کے چلنے کی کیا کیفیت ہوگی؟

فرمایا تیز بارش کی طرح کہ ہوا اس کے پیچھے رہ جاتی ہے پھر وہ ایک قوم کے پاس جائے گا اور انہیں اپنی طرف بلائے گا اور وہ لبیک کہے گی، پھر وہ آسمان کو حکم دے گا کہ وہ برسے اور زمین کو کہے گا کہ وہ اگائے، پھر اُن پر اُن کے جانور پھریں لمبی کوہان والے تھنے پھلائے ہوئے اور دودھ بھرے تھن والے، پھر اس کا گزر ایک اور قوم پر ہوگا وہ اسے دعوت دے گا لیکن وہ اس کی دعوت کو مسترد کر دے گی وہ پلٹ جائے گا اور اس کے تمام مال اموال اس کے ساتھ ہو لیں گے اور صبح کو اُن کے پاس کچھ بھی نہ ہوگا، پھر وہ ایک ویرانے پر سے گزرے گا، اور اسے کہے گا اپنا خزانہ نکال باہر کر، جب وہ پلٹے گا تو تمام خزانہ شہد کی مکھیوں کے بادشاہ کی طرح اس کے ساتھ ہوگا، وہ ایک آدمی کو قتل کر دے گا، اور اپنی تلوار سے اس کے دو ٹکڑے کر دے گا، پھر اسے بلائے گا تو وہ زندہ ہو کر اس کے سامنے آ جائے گا اس کا چہرہ دمک رہا ہوگا، فرمایا اس حال میں عیسیٰ بن مریمؑ مشرقی دمشق کے سفید مینار سے دو زرد کپڑوں میں ملبوس فرشتوں کے بازوؤں پر ہاتھ رکھے ہوئے نازل ہوں گے، پھر آپ اسے تلاش کر کے لُدّ شرقی کے دروازے پر قتل کر دیں گے، اسی اثناء

میں اللہ تعالیٰ عیسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل فرمائے گا، کہ میرے کچھ بندے ایسے ہیں جن میں اس کے ساتھ مقابلہ کی تاب نہیں آپ انہیں (کوہ) طور کی طرف لے جائیں، بعد ازاں اللہ تعالیٰ یاجوج ماجوج نکالے گا، جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے" کہ وہ ہر بلندی سے امڈ پڑیں گے"۔

تب عیسیٰ علیہ السلام اور آپ کے اصحاب اللہ کی طرف متوجہ ہوں گے، پھر اُن کی گردنوں میں ایک کیڑا نمودار ہوگا اور وہ صبح کو مرے ہوئے ملیں گے جیسے کہ ایک آدمی تھا اور مر گیا، پس عیسیٰ علیہ السلام اور اُن کے ساتھی نیچے اُتریں گے، اور انہیں زمین میں ایک بالشت بھر جگہ نہ ملے گی کہ جہاں اُن کی چربی، بدبو اور خون نہ ہوگا، عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوں گے تب اللہ تعالیٰ اونٹوں جیسی گردن والے پرندے بھیجے گا وہ انہیں اٹھا کر پھینک دیں گے بعد ازاں اللہ تعالیٰ بارش برسائے گا کہ جسے اون کے خیمے اور مٹی کے گھر روک نہ سکیں گے چالیس دن لگاتار بارش رہے گی جس سے زمین دُھل جائے گی اور آئینے کی طرح صاف ہو جائے گی، پھر زمین کو حکم دیا جائیگا کہ وہ اپنے پھل نکالے اور برکتیں لائے، آپ نے فرمایا ایک دن میں ایک پوری جماعت ایک انار کھائے گی اور اس کے چھلکوں کا سایہ کریں گے، اُن کے دودھ میں برکت دی جائے گی حتیٰ کہ ایک اونٹنی ایک پوری جماعت کے لئے کافی ہوگی اور ایک قبیلے کے لئے ایک گائے اور ایک خاندان کے لئے ایک بکری کافی رہے گی، لوگ اس حال میں ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ ایک خوشبو دار ہوا اُن کی بغلوں کے نیچے بھیجے گا، جس سے ہر مسلمان کی روح قبض ہو جائے گی یا فرمایا ہر مومن کی! بُرے لوگ البتہ بچ رہیں گے جو سرِ عام گدھوں کی طرح زنا کریں گے اور انہی پر قیامت قائم ہوگی۔

عورتوں کے لئے ایک وعظ اور اُن سے صدقات کی وصولی:

اسماء بنت یزیدؓ روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہؐ مسجد کے ایک کونے میں تشریف لائے جہاں اور دیگر عورتیں موجود تھیں آپ نے اُن کا شور سنا پھر فرمایا اے عورتو! تم میں سے اکثر جہنم کا ایندھن بنیں گی میں نے جواب دیا، اور میں ذرا اس معاملہ میں بیباک ہوں اور پوچھا یا رسول اللہ ایسا کیوں ہوگا؟ فرمایا جب نہیں ملتا ہے تو شکر نہیں کرتیں اور جب نہیں ملتا تو صبر نہیں کرتیں۔ اگر تم سے کوئی چیز روک لی جائے تو تم شکوہ کرتی ہو اور اگر دیدی جائے تو ناشکری کرتی ہو، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ محسنوں کی ناشکری کا کیا مطلب؟ آپ نے فرمایا ایک عورت کسی مرد کے پاس ہوتی ہے، دو تین بچے پیدا ہوتے ہیں لیکن پھر بھی کہتی ہے کہ مجھے تمہاری طرف سے کوئی آرام نہیں پہنچا۔

ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ میں عید کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھا آپؐ نے نماز پڑھی، خطبہ ارشاد فرمایا بعد ازاں آپ عورتوں کے پاس گئے انہیں وعظ و نصیحت فرمائی اور انہیں صدقہ دینے کو کہا۔

ایک اور روایت میں ہے کہ آپ نے اُن سے فرمایا تم صدقہ دیا کرو کیونکہ تم میں سے اکثر دوزخی ہیں، عورتوں نے آپ سے کہا وہ کس لئے؟ فرمایا کیونکہ تم ناشکری کرتی ہو۔ عورتیں بولیں کیا ہم اللہ کی ناشکری کرتی ہیں فرمایا نہیں بلکہ اپنے خاوند کی! اگر تمہارے ساتھ زمانے بھر کی بھی نیکی کی جائے تو تم کہو گی میں نے تم سے کبھی سکھ نہیں پایا۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ میں نے انہیں دیکھا کہ وہ کانوں اور گلے کی طرف ہاتھ بڑھاتیں اور بالیاں کڑے اتار کر بلالؓ کے کپڑے میں ڈال دیتیں۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص کبریٰ

عباس بن عبدالمطلبؓ روایت کرتے ہیں میں نے کہا اے اللہ کے رسولؐ! قریش ایک جگہ پر اپنے حسب و نسب کا ذکر کر رہے تھے اور آپ کے متعلق انہوں نے کہا کہ گویا گھوڑے پر کھجور کا درخت ہے، آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کیا اور مجھے بہترین گروہ میں شامل فرمایا پھر بہترین قبیلے سے انتخاب فرمایا پھر بہترین گھر کا فرد بنایا، لہذا میری ذات بہتر اور میرا گھر بہتر ہے۔

انسؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے دن اٹھائے جانے والے لوگوں میں سے میں سب سے پہلے اٹھوں گا اور پیش کیے جانیوالے انسانوں کا خطیب ہوں گا، میں اس وقت خوشخبری سنانے والا ہوں گا جب لوگوں پر مایوسی طاری ہو گی، اس دن "لواء الحمد" میرے ہاتھ میں ہوگا، میں اللہ کے ہاں بنی آدم میں سب سے زیادہ مکرم ہوں مگر اس پر فخر نہیں کرتا، میں ہی وہ پہلا شخص ہوں گا جس کی قبر شق ہو گی، مجھے قیامت کے دن جنت کا لباس پہنایا جائے گا، پھر میں عرش کے دائیں طرف کھڑا ہوں گا اس جگہ پر میرے علاوہ کوئی بھی کھڑا نہیں ہوگا۔

مہر نبوت اور آپ پر بادلوں کے سایہ کرنے کا ذکر:

علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ اُن کے والد (ابوطالب) نے بتایا کہ ہم شام گئے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قریش کے چند بوڑھے بھی ہمراہ تھے، جب وہ راستے میں ایک راہب کے پاس سے گزرے تو وہیں اتر پڑے اور اپنے کجاووں سے سامان اتار لیا، راہب ان کے پاس آیا، اس سے پہلے جب کبھی وہ ادھر سے گذرتے تو راہب کبھی ملنے نہیں آتا تھا، راہب اُن کے درمیان آیا اور آکر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا یہ سید العالمین ہیں۔ یہ رسول رب العالمین ہیں اللہ تعالیٰ نے انہیں رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا ہے، قریش کے بڑے بوڑھوں نے پوچھا تمہیں اس کا کیسے علم ہوا؟ بولا جب تم یہاں پہنچے تو درخت اور پتھر سجدے میں جھک گئے اور یہ بغیر کسی رسول کے کسی کو سجدہ نہیں کرتے اور میں انہیں مُہر نبوت سے پہچانتا ہوں جو کندھوں کے درمیان سیب کی طرح ایک غدہ ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم اونٹ چرانے چلے گئے۔ راہب نے کہا انہیں کسی کو بھیج کر بلا لو، جب آپ آئے تو بادل نے آپ پر سایہ کر رکھا تھا، جب آپ لوگوں کے پاس پہنچے تو لوگ درخت کے سائے میں بیٹھے تھے جب آپ بیٹھے تو سایہ آپ کی طرف جھک آیا،

سائب بن یزید کہتے ہیں مجھے میری خالہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے گئیں اور بولیں اے اللہ کے رسول! یہ میری بہن کا بچہ ہے اور یہ بیمار ہے آپ نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور برکت کی دعا کی، آپ نے وضو فرمایا میں نے وضو کا غسالہ پیا اور آپ کی پُشت کے پیچھے آ گیا مجھے آپ کے کندھوں کے درمیان مُہر نظر پڑی جس طرح چھپر کھٹ کا گھنڈ ہوتا ہے۔

جابر بن سمرہؓ روایت کرتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں کندھوں کے درمیان سُرخ رنگ کا کبوتر کے انڈے کی طرح ایک غدہ دیکھا،

بادل کے سایہ کرنے کا ذکر:

بیان کیا جاتا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا کے اُونٹ

لے کر شام کے سفر پر نکلے تو انہوں نے اپنا غلام میسرہ آپ کے ساتھ کر دیا، آپ ایک درخت کے نیچے بحیرا نامی راہب کے حجرے کے پاس ٹھہرے بحیرا نے آپ کو دیکھا کہ آپ چلتے ہیں اور بادل سایہ کرتے ہیں، جس طرف آپ جاتے ہیں بادل بھی اس طرف جاتا ہے جب بحیرا نے یہ دیکھا تو زور سے پکار کر پوچھا تم کون ہو؟ میسرہ بولا میں خدیجہ کا غلام ہوں اور میرے ہمراہ محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب ہیں، ہم شام تجارت کی غرض سے جا رہے ہیں، جب راہب نے یہ سنا اور آپ کو دیکھا تو آپ کا سر چوما اور میسرہ سے نظر بچا کر آپ کے پاؤں چومے اور کہا اے محمد! ذرا اپنے کندھے کھولئے، آپ نے کندھے کھولے تو آپ کے کندھوں کے درمیان مہر نبوت چمک رہی تھی، اس نے بوسہ دیا اور کہا میں آپ پر ایمان لایا میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور آپ اللہ کے رسول ہیں۔ وہ نبی امی جس کی بشارت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام نے دی اور انہوں نے فرمایا تھا کہ اس درخت کے نیچے میرے بعد سوائے نبیٔ ہاشمی عربی کے اور کوئی نہیں اترے گا۔

ایک اور روایت میں ہے کہ خدیجہ بنت خویلد نے واپسی پر اپنے غلام میسرہ سے شام کا حال دریافت کیا تو اس نے آپ کی سیرت سے انہیں آگاہ کیا اور کہا کہ آپ کے سر پر ہمیشہ بادلوں نے سایہ کئے رکھا۔

آپؐ کے چہرۂ اقدس کی نورانیت کا ذکر:

ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر حسین نہیں دیکھا یوں لگتا تھا کہ چہرے پر سورج کھیل رہا ہے۔

حسن بن علیؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے ہند بن ابی ہالہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات پوچھیں تو بولے کہ آپ عظیم المرتبت تھے، آپ کے چہرے پر نور چمکتا تھا۔

ابن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ ایک تاریک رات میں جا رہا تھا آپ نے سینے پر سے اپنی چادر ہٹائی۔ آپ کے سینے سے چمک پیدا ہوئی اور اسی کی روشنی میں ہم نے راستہ طے کیا۔

اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جب آپ دھوپ میں باہر نکلتے تھے تو جسم اطہر کے منور ہونے کے باعث آپ کا سایہ زمین پر نہیں پڑتا تھا۔

اور یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک رات حضرت عائشہؓ کے پاس تشریف لائے اور ان کی سوئی گم ہو گئی تھی۔ انہوں نے اس کا آپ سے ذکر کیا، آپ ہنس دیئے جس سے پورا گھر آپ کے دانتوں کے نور سے روشن ہو گیا اور انہوں نے اپنی سوئی ڈھونڈ لی۔

اللہ تعالیٰ کے ہاں آپؐ کی عزت اور کتاب اللہ میں آپکی قدر و منزلت کی خصوصیت کا بیان:

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ہر نبی کو اس کے نام سے ”یا“ کی ندا کے ساتھ پکارا لیکن آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح خطاب نہیں فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو خطاب کیا۔

یاآدم انبئھم باسمآئھم (البقرہ ۳۳) یاآدم اسکن انت وزوجک الجنۃ (البقرہ: ۳۵)

حضرت نوحؑ کے لئے ارشاد ہے یانوح اھبط بسلام منا برکت علیک وعلیٰ امم ممن معک (ہود: ۴۸) یانوح انہ لیس من اھلک (ہود: ۴۶)

حضرت ابراہیمؑ کو مخاطب فرمایا یاابراھیم اعرض عن ھذا (ہود: ۷۶)

حضرت لوطؑ کے بارہ میں فرمایا یالوط انا رسل ربک (ہود: ۸۱)

حضرت شعیبؑ کے متعلق آتا ہے یاشعیب مانفقہ کثیرا مما تقول (ہود: ۹۱)

حضرت ہودؑ کو مخاطب کیا گیا یاہود ماجئتنا ببینۃ (ہود: ۵۳)

حضرت صالحؑ کو پکارا گیا یاصلح قدکنت فینا مرجوا قبل ھذا (ہود: ۶۲)

حضرت داؤدؑ سے خطاب فرمایا گیا یاداؤد انا جعلنٰک خلیفۃ فی الارض (ص: ۲۶)

حضرت موسیٰؑ کو اس طرح مخاطب کیا گیا یاموسیٰ انی اصطفیتک علی الناس برسالتی وبکلامی (الاعراف: ۱۴۴)

حضرت یوسفؑ کے متعلق خطاب اس طرح ہے یوسف ایھا الصدیق (یوسف ۴۶)

یوسف اعرض عن ھذا (یوسف: ۲۹)

حضرت عیسیٰؑ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا گیا یاعیسیٰ انی متوفیک ورافعک الی (آل عمران: ۵۵

اس کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس انداز سے مخاطب فرمایا۔

یاایھا النبی انا ارسلنٰک شاھدا ومبشرا ونذیرا (الاحزاب : ۴۵)

ارشاد خداوندی ہے، یاایھا النبی حسبک اللہ ومن اتبعک المؤمنین (الانفال: ۶۴)

یاایھا النبی جاھد الکفار والمنافقین (التحریم: ۹) یاایھا النبی قل لازواجک (الاحزاب: ۲۸)

یاایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک (المائدہ: ۶۷)

اور یہ بھی آپ کی خصوصیت ہے کہ انبیاء کرام کے ذکر میں آپ کا نام مقدم رکھا گیا جب انبیاء کرام سے میثاق لیا گیا" اور جب ہم نے انبیاء سے اور آپ سے میثاق لیا، نوحؑ سے، ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ ابن مریم (علیہم السلام) سے میثاق لیا" (الاحزاب: ۷)

ابوہریرہ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، میں پیدائش کے اعتبار سے تمام انبیاء سے پہلے اور بعثت میں سب کے بعد ہوں اور اس طرح ارشاد خداوندی ہے۔

"جب ہم نے انبیاء اور آپ سے میثاق لیا اور نوح اور ابراہیم علیہما السلام) سے" (الآیہ)

یہ بھی آپ کی خصوصیت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب بھی قرآن مجید میں آپ کا ذکر کیا تو نبوت اور رسالت کی صفات کے ساتھ ذکر کیا۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔

"محمد اللہ کے رسول ہیں اور ان کے رفقاء کافروں پر سخت اور اپنوں کے لئے نرم دل ہیں" (الفتح: ۲۹)

ارشاد ہوا "محمد اللہ کے رسول ہیں اور آپ سے پہلے بھی کئی رسول ہو گزرے ہیں" (آل عمران: ۱۴۴)

ارشاد خداوندی ہے "محمد تم میں سے کسی کے باپ نہیں لیکن وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبین ہیں" (الاحزاب: ۴۰)

ارشاد باری تعالیٰ ہے "اور وہ بشارت دینے والا ہے ایک رسول کہ میرے بعد احمد نام کے رسول آئیں گے (الصف: ۶)

یہ بھی آپ کی تعظیم و تکریم کا ایک پہلو ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں آپ کے تمام اعضاء کا ذکر فرمایا ہے۔

ارشاد ہوا، "تم اُن کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھو" (الحج: ۸۲)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا آپ بار بار نگاہ اٹھا کر دیکھئے (کارخانہ قدرت میں) کہیں بھی جھول نظر نہیں آئے گی (الملک: ۱۰)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا، "اور ہم دیکھ رہے تھے آپ کا آسمان کی طرف بار بار چہرہ اٹھانا" (البقرہ: ۱۴۴)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا آپ اپنی زبان کو حرکت نہ دیجئے (القیامہ: ۱۶) اللہ تعالیٰ نے فرمایا "کہتے ہیں کہ یہ تو نرا کان ہے آپ کہیئے کہ یہ کان بھی تمہارے بھلے میں ہے" (التوبہ: ۶۱) اللہ تعالیٰ نے فرمایا "آپ اپنے ہاتھوں کو گردن سے نہ باندھ لیں" (بنی اسرائیل: ۲۹) اللہ تعالیٰ نے فرمایا "کیا ہم نے آپ کا سینہ نہیں کھول دیا" (الم نشرح: ۱) آگے چل کر فرمایا "(وہ بوجھ کہ، جس سے آپ کی کمر دہری ہو رہی تھی" (الم نشرح: ۳) اللہ تعالیٰ نے فرمایا "روح الامین نے اسے آپ کے دل پر اتارا" (الشعراء: ۱۹۳، ۱۹۴) اللہ تعالیٰ نے فرمایا "ان کے دل نے اُسے جھوٹ نہ جانا جو کچھ کہ دیکھا" (النجم: ۱۱) اللہ تعالیٰ نے فرمایا "طٰہٰ، ہم نے آپ پر قرآن مجید اس لئے نازل نہیں کیا کہ آپ مشقت میں پڑ جائیں" (طٰہٰ: ۱-۲)

پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کے وجود مسعود کا ذکر فرمایا "آپ تو اپنا جسم گھلا دیں گے کہ یہ ایمان کیوں نہیں لاتے" (الشعراء: ۳)

اللہ تعالیٰ کی جانب سے آپ کی یہ تعظیم و تکریم بھی ہوئی کہ زلفوں کی سیاہی اور رنگ کی سفیدی کی قسم کھائی گئی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "قسم ہے دوپہر کی اور رات کی جب چھا جاتی ہے" (الضحیٰ: ۱)

آپ کے قدموں کی جگہ کی قسم کھائی گئی ہے، ارشاد باری ہے "قسم ہے اس شہر کی کہ اس شہر میں آپ رہتے ہیں (البلد: ۱، ۲)

اس کا مطلب آپ کے شہر کی قسم ہے، آپ کی انسانیت کی قسم کھائی گئی،

ارشاد ہوا "اے سردار، قرآن حکیم کی قسم" (یٰسین: ۱، ۲) آپ کی زندگی کی قسم کھائی گئی "قسم ہے آپ کی زندگی کی یہ گمراہی میں بھٹک رہے ہیں" (الحجر: ۷۲)

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے جہاں کہیں بھی آپ کو ٹوکنا چاہا تو اس سے پہلے لطف آمیز الفاظ استعمال فرماتے فرمایا گیا "اللہ آپ سے درگزر کرے آپ نے انہیں کیوں اجازت دی" (التوبہ: ۴۳)

کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں صریح انداز اور اشاروں کنایوں میں کوئی چار ہزار مقامات پر آپ کی عظمت اور فضیلت بیان فرمائی ہے۔

- آپ کی اس خصوصیت کا ذکر کہ اللہ تعالیٰ نے اُمت کو آپ کی تعظیم اور آپ سے محبت کرنے کا مکلف ٹھہرایا ہے،

اللہ تعالیٰ نے فرمایا "تم اس کی مدد کرو، اس کی عزت بجالاؤ اور صبح و شام حمد و تسبیح کیا کرو" (الفتح: ۹)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا، اے ایمان والو، تم اپنی آوازوں کو رسول کی آواز سے بلند نہ کرو اور نہ اُن کے ساتھ اس طرح زور سے بات کرو جیسے ایک دوسرے سے کرتے ہو ورنہ تمہارے اعمال اکارت ہو جائیں گے اور تمہیں اس کا شعور بھی نہ ہوگا (الحجرات: ۲)

بتایا جاتا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کہا اے اللہ کے رسول اب میں ہمیشہ آپ سے آہستہ بات کیا کروں گا، اس آیت کے نزول کے بعد اگر کوئی آپ کو زور سے پکارتا تو آپ بھی زور سے اُسے جواب دیتے تاکہ امت اس آیت کی مصداق نہ بنے اور اس کے اعمال اس کی بے خبری ہی میں ضبط کر لئے جائیں۔

یہ بھی آپ کی خصوصیت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی محبت امت پر واجب کر دی اور آنحضورؐ نے بھی فرمایا ہے "تم میں کوئی بھی مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک مجھے اپنے اہل و عیال، مال، جان اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ رکھے"۔

بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک دن کہا اے اللہ کے رسول، قسم بخدا آپ مجھے اپنے اہل و عیال، مال اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب ہیں، آپ نے اُن سے فرمایا نہیں بلکہ اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھ پھر فرمایا تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ مجھے اپنے اہل و عیال، مال، جان اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ جانے، عمرؓ بولے ہاں یا رسول اللہ اب جان سے بھی زیادہ عزیز ہیں۔

- آپ کی اس خصوصیت کا ذکر کہ اللہ تعالیٰ نے امت پر ہر فرض اور سنت نماز میں آپ پر درود پڑھنا لازم قرار دیدیا ہے، ارشادِ خداوندی ہے "بلاشبہ اللہ اس کے فرشتے اپنے نبی پر درود بھیجتے ہیں سو اے اہل ایمان تم بھی درود و سلام بھیجو۔

ام الحسن اپنے والد سے روایت کرتی ہیں کہ انہوں نے کہا اے اللہ کے رسولؐ آپ نے اللہ تعالیٰ کا فرمان دیکھا ہے؟ یایھا الذین آمنو صلوا علیہ وسلموا تسلیما"، آپ نے فرمایا یہ پوشیدہ علم ہے اگر تم پوچھنا چاہو تو میں تمہیں آگاہ کر سکتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے دو فرشتے مقرر کر رکھے ہیں کہ جب کہیں میرا ذکر ہوتا ہے اور مجھ پر جو شخص درود پڑھتا ہے تو وہ دونوں فرشتے کہتے ہیں "اللہ تعالیٰ تمہاری مغفرت فرمائے" اللہ تعالیٰ اور تمام فرشتے اس پر "آمین" کہتے ہیں، اور جب کہیں میرا ذکر ہوا اور مجھ پر درود نہ پڑھا جائے تو وہی دونوں فرشتے کہتے ہیں "خدا تمہیں نہ بخشے" اللہ تعالیٰ اور تمام فرشتے اس پر "آمین" کہتے ہیں۔

ابو حمید ساعدیؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ آپ پر درود کس طرح پڑھا جائے آپ نے فرمایا یوں پڑھا جاتے "اللھم صلی علیٰ محمد وعلیٰ ازواجہ وذریتہ کما صلیت علیٰ ابراھیم وبارک علیٰ محمد کما بارکت علیٰ آلِ ابراھیم"

ایک اور روایت میں ہے آپ نے فرمایا یوں پڑھا کرو "اللھم صلّ علیٰ محمد وعلیٰ اھل بیتہ وازواجہ وذریتہ کما صلیت علیٰ ابراھیم انک حمید مجید وبارک علیٰ محمد وعلیٰ اھل بیتہ وازواجہ وذریتہ کما بارکت علیٰ آلِ ابراھیم انک حمید مجید"

- آپ کی یہ خصوصیت تھی کہ آپ دور اور نزدیک سے برابر سن لیتے تھے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جبریل کی آواز سن لیتے تھے جب وہ سدرۃ المنتہیٰ سے روانہ ہوتے اور آپ وہ خوشبو سونگھ لیتے جب جبریل وحی لے کر آپ کی طرف آنا چاہتے تھے، آپ پیچھے سے بھی اسی طرح دیکھ لیتے تھے جس طرح سامنے سے اور دائیں اور بائیں سے، اور آپ وہ کچھ دیکھ لیتے تھے جو تم نہیں دیکھ سکتے اور وہ سن لیتے تھے جو تم نہیں سن سکتے۔

انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کی طرف متوجہ ہوئے جب نماز کے لئے اقامت کہی جا چکی تھی آپ نے فرمایا اپنی صفیں درست کر لو اور قریب قریب ہو کر کھڑے ہوا کرو، کیونکہ میں تمہیں پیٹھ پیچھے بھی دیکھتا ہوں ایک اور روایت میں ہے میں پیٹھ پیچھے ویسے دیکھتا ہوں جیسا کہ سامنے سے دیکھتا ہوں،

انہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں وہ کچھ دیکھتا ہوں جو تم نہیں دیکھتے اور وہ کچھ سنتا ہوں جو تم نہیں سنتے آسمان چرچراتا ہے اور اُسے چرچرانا چاہیئے کہ اس میں ایک بالشت جگہ بھی ایسی نہیں کہ جہاں فرشتہ تسبیح میں مشغول نہ ہو ایک اور روایت میں ہے کہ فرشتے نے اپنی پیشانی نہ جھکا رکھی ہو،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرشتوں کو دیکھتے تھے اُن کی باتیں سنتے تھے لیکن دوسرے لوگ نہیں دیکھ پاتے تھے۔

- اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس خصوصیت سے نوازا کہ آپ کی اطاعت امت پر ہر حال میں فرض ہے۔ ظاہری اور باطنی دونوں اعتبار سے اور آپ کا ہر حکم ماننا خواہ لوگ اُسے مفید سمجھیں یا مضر، یہاں تک کہ آپ کی اطاعت اس درجہ لوگوں کے لئے لازم ہے کہ اگر آپ ان سے کہیں "اپنی جانوں کو قتل کر دو، اپنی اولاد کو آگ میں جلا ڈالو اور انہیں مار ڈالو" تو اس کی اطاعت واجب ہے۔

اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا ارشاد ہے۔

"اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو" (آل عمران: ۱۳۲) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ "تم اُن کی اطاعت کرو راہ یاب ہو جاؤ گے"۔ (النور: ۵۴) اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

"جو کچھ رسول تمہیں دے وہ لے لو اور جس سے روکے اس سے رک جاؤ (الحشر: ۷)

اللہ تعالیٰ نے آپ کے احکام کی خلاف ورزی پر سخت تنبیہ اور وعید فرمائی ہے، ارشاد باری ہے۔

"جو لوگ آپ کی مخالفت کرتے ہیں انہیں ڈرنا چاہیئے کہ کہیں وہ فتنے میں مبتلا نہ ہو جائیں اور ان پر عذاب نہ نازل ہو جائے"۔ (النور: ۶۳)

ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا گیا، آپ اپنے بعد کسی کو مقرر فرما جائیں جو ہمیں امر و نہی کی تعلیم دے، ہمیں نہیں معلوم کہ آپ کے بعد کون ہوگا؟

آپ نے فرمایا اگر میں کسی کو مقرر کر جاؤں اور وہ تمہیں اللہ کی اطاعت کا حکم دے اور تم اس کی بات نہ مانو، تو اس کی نافرمانی میری نافرمانی شمار ہوگی اور نافرمانی اللہ کی نافرمانی بن جائے گی اور اگر وہ تمہیں اللہ کی نافرمانی کرنے کو کہے اور تم ایسا کرو تو یہ بات قیامت کے دن تمہارے لئے ایک حجت بن جائے گی لہٰذا میں تمہیں اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کے حکم کی تعمیل امت پر ہر حال میں واجب قرار دے دی ہے، خواہ وہ انہیں پسند ہو یا ناگوار گزرے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ زبیر بن عوامؓ اور ایک انصاری کے درمیان حرہ کے ندی کے متعلق جھگڑا پیدا ہوگیا وہ دونوں اس سے زمین سیراب کرتے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زبیر سے فرمایا تم اپنی زمین سینچ لیا کرو اور پھر اپنے ہمسائے کے لئے اُسے چھوڑ دو، انصاری بولا اے اللہ کے رسول آپ یہ فیصلہ اس لئے کر رہے ہیں کہ وہ آپ کی پھوپھی کے بیٹے ہیں، آپ اس پر ناراض ہوئے حتیٰ کہ آپ کا چہرہ سُرخ ہوگیا پھر فرمایا اے زبیر، تم پانی پلاؤ، پھر اُسے روک لیا کرو تا آنکہ پانی کھیت کی دیوار تک پہنچ جائے اور پھر اپنے ہمسائے کے لئے چھوڑ دیا کرو۔

پہلے فیصلے میں آپ نے حق کو ملحوظ رکھتے ہوئے زبیرؓ کے حق میں فیصلہ فرمایا اور اس میں انصاری کی دلجوئی کو ملحوظ رکھا، لیکن اس پر انصاری خوش نہ ہوا تو آپ نے کھرا اور بے لاگ فیصلہ فرمایا، جب اس پر انصاری نے دل میں تنگی محسوس کی تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

"قسم ہے تیرے ربّ کی یہ ہرگز مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ یہ آپ کے فیصلوں کو دل میں تنگی محسوس کئے بغیر تسلیم نہ کریں اور جیسا کہ تسلیم کرنا چاہیے (النساء ۶۵)

اطاعت کے اس وجوب اور احکام کو بخوشی قبول کرنے کو ہر حال میں لازم قرار دے دیا گیا جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے "کسی مومن اور مومنہ کے لئے اختیار باقی نہیں رہتا کہ جس معاملے میں اللہ اور اس کے رسول فیصلہ فرمادیں" (الاحزاب ۳۶)

آپ کی یہ خصوصیت کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو خوشی اور غصے دونوں حالتوں میں خطاء سے محفوظ فرمایا ہے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کیا ہم مسرت اور غم دونوں حالتوں میں آپ کی باتیں لکھ لیا کریں، آپ نے فرمایا ہاں جو میں کہوں وہ لکھ لیا کرو میں خوشی اور غم میں بھی حق بات ہی کہتا ہوں۔

ایک روایت میں ہے کہ جب تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث بیان کرو تو یقین جانو کہ آپ بالکل صاف ستھری اور صحیح بات کہنے والے ہیں اگر کوئی یہ گمان کرے کہ آپ خوشی اور غصے کی حالت میں ہٹ جانے تھے تو وہ کفر کا مرتکب ہوگا۔

حتیٰ کہ آپ خوش طبعی بھی فرماتے تو اس میں بھی حق کو ملحوظ رکھتے تھے، کیونکہ یہ آپ کی خصوصیت ہے کہ آپ نہ تو خواہشات کی پیروی کرنے والے ہیں اور نہ ہی آپ اپنی خواہش سے کلام کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ آپ کے اقوال بجائے خود حجت اور آپ کے اعمال لائقِ حجت ہیں، ارشاد خداوندی ہے "یہ اپنی خواہش سے نہیں بولتے بلکہ جو کچھ ہوتا ہے وحی ہے" (النجم: ۳-۴)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "تم اُن کی پیروی کرو ہدایت پاؤ گے" (النور: ۵۴) مزید ارشاد ہوا "تم اس کی پیروی کرو امید ہے کہ راہ یاب ہو جاؤ گے" (الاعراف: ۱۵۸)

آپ کے کلام کا حکم اللہ کے کلام جیسا ہے۔

آپ کا کلام اللہ تعالیٰ کے کلام کی عمومیت کی تخصیص کرتا ہے، کلام الٰہی کے اجمال کی تفصیل بیان کرتا ہے اور اس کے مشکل مضامین کی تشریح کرتا ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا "تم عورتوں کو گھروں میں بند کر دو حتیٰ کہ انہیں موت آجائے یا اللہ تعالیٰ اُن کے لئے کوئی راستہ نکال دے" (النساء: ۱۵)

آپ نے فرمایا مجھ سے سمجھو، مجھ سے حاصل کرو اللہ تعالیٰ نے ان کیلئے راستہ نکال دیا کہ اگر غیر شادی شدہ عورت و مرد زنا کریں تو

سو کوڑے ہیں اور ایک سال کی جلاوطنی اور شادی شدہ جوڑا اس فعل کا ارتکاب کرنے تو سنگساری کی سزا ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو"۔

آپ نے اپنے قول اور فعل سے اس کی تفصیل بیان فرمائی اس طرح زکوٰۃ، حج وغیرہ ۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس خصوصیت سے نوازا کہ آپ اپنی امت پر رحم و لطف فرمائیں، ان کے حق میں دعا کریں اور اُن سے مشورے طلب فرمائیں ۔ ارشاد ہوا "آپ ان سے درگزر فرمایئے ان کے لیے بخشش کی دعا کیجیے، اور انہیں اپنے مشوروں میں شامل فرمایئے" (آل عمران : ۱۵۹) اور یہ بھی کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ پر لازم فرمایا ہے کہ آپؐ برائی کے مقابلہ میں حسن کارانہ انداز اختیار فرمائیں، ارشاد خداوندی ہے "آپؐ اس کی برائی کو اچھے طریقے سے ٹال دیں" (المومنون: ۹۶)

آپؐ کے مختلف اعضاء شریفہ کی خصوصیت :

بیان کیا جاتا ہے آپؐ کے بال مبارک آگ میں ڈالے جائیں تو وہ نہیں جلتے ۔

بیان کیا جاتا ہے کہ خیبر کی جنگ کے موقعہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو بلوایا اور اس وقت حضرت علی کو آشوب چشم کی تکلیف تھی، آپ نے اپنا لعاب دہن آنکھوں پر ملا اور وہ اسی وقت ٹھیک ہو گئیں

آپ کے لعاب دہن کی یہ بھی خصوصیت تھی کہ آپ اگر اُسے کھاری پانی میں ڈالتے تو وہ فوراً میٹھا ہو جاتا ۔ آپؐ کی انگلیوں کی یہ خصوصیت تھی کہ آپ نے مشک میں اپنا ہاتھ ڈالا تو انگلیوں سے پانی کے فوارے ابل پڑے حتیٰ کہ چودہ سو افراد نے پانی پیا جانوروں نے بھی پانی پیا اور جو بچ رہا اُسے پورے لشکر میں تقسیم کر دیا گیا، آپ کی ہتھیلی کی یہ خصوصیت تھی کہ آپ اُسے کسی مریض پر پھیرتے تو فی الفور شفایاب ہو جاتا، ایک گنجے بچے کے سر پر ہاتھ پھیرا تو فوراً بال اُگ آئے اسی طرح ٹنڈ منڈ درختوں پر ہاتھ پھیرا تو انہیں پھل لگ گئے،

آپ کی شہادت کی انگلی دوسری انگلیوں سے نسبتاً بڑی تھی آپ اُس سے جس طرف اشارہ فرماتے وہ چیز آپ کی اطاعت کرتی، آپ نے چاند کی طرف اشارہ کیا وہ پھٹ پڑا، درخت کی طرف اشارہ کیا وہ چلا آیا اور بتوں کی طرف اشارہ کیا تو وہ گر پڑے ۔

آپ کے پاؤں کی یہ خصوصیت تھی کہ آپ پتھر پر رکھتے تو وہاں نشان پڑ جاتا، کسی گھر میں قدم رنجہ فرماتے تو برکتوں کا نزول ہوتا اور وہاں کے لوگ ہلاکت سے بچ جاتے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

"اللہ انہیں ہرگز عذاب میں مبتلا نہ کرے گا جب تک کہ آپ ان میں تشریف فرما ہیں" (الانفال : ۳۳)

آپ کا پسینہ اچھی سے اچھی خوشبو سے زیادہ خوشبودار تھا ،

انسؓ کہتے ہیں جب میں ایک اندھیری رات میں آپ سے ملا تو آپ کے چلے جانے کے بعد اس راستے میں آپ کی خوشبو سے آپ کا پتہ چلا ،

آپ کے جسم اقدس کی خصوصیت ہے کہ جس مسلمان سے آپ کا جسم اطہر لگ جائے تو اسے دوزخ کی آگ کبھی نہیں چھوئے گی ۔ اور یہ بھی آپ کے جسم اطہر کی خصوصیت ہے کہ آپ کے جسم پر کبھی مکھی نہیں بیٹھی اور نہ ہی آپ کا سایہ کبھی زمین پر پڑا ۔

آپ کی ذات اقدس کی خصوصیات میں سے یہ بھی ہے کہ آپ کو چالیس انبیاء کے برابر قوت حاصل تھی اور ہر نبی کو چالیس اولیاء کے برابر

قوت حاصل ہوتی ہے اور ہر ولی کی قوت چالیس مسلمانوں کے برابر ہوتی ہے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ آپ کے ہاتھ میں ایک رومال تھا، آپ نے اس سے اپنے ہاتھ اور چہرہ پونچھا اور پھر اُسے آگ میں ڈال دیا گیا تو وہ نہیں جلا، پھر اُسے آپ نے ابوہریرہؓ کو عطا فرما دیا جب وہ میلا جاتا تو ابوہریرہؓ اُسے آگ میں ڈال دیتے، وہ صاف ہو جاتا اور میل کچیل نکل جاتی۔

یہ بھی آپ کی خصوصیت تھی کہ آپ کسی بھی سواری پر تشریف فرما ہوتے خواہ وہ کتنی ہی سُست کیوں نہ ہوتی تیز دوڑنے لگتی۔

بیان کیا جاتا ہے کہ آپ ابوطلحہ کے گھوڑے پر سوار ہوئے اور وہ بہت سُست رَو تھا، آپ سے کہا گیا کہ یہ بہت سُست رفتار ہے۔ آپ نے اسے ایڑ لگا کر دوڑایا اور وہ دوڑا۔ جب آپ واپس آئے تو فرمایا ہم نے تم سے بہت تیز رفتار پایا۔

اور یہ بھی آپ کی خصوصیت تھی کہ جب آپ کسی سواری پر سوار ہوتے اور وادی کا سفر درپیش ہوتا تو سواری کے اگلے پاؤں بڑے ہو جاتے اور پچھلے چھوٹے ہو جاتے اور جب پہاڑ نظر آتا تو اس کے اگلے پاؤں چھوٹے ہو جاتے اور پچھلے پاؤں بڑے ہو جاتے۔

آپ کی نیند کی خصوصیت کا ذکر:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھیں سوتی تھیں مگر دل جاگتا رہتا تھا۔ آپ کا ارشاد ہے۔ میری آنکھیں سوتی اور دل جاگتا ہے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ دو فرشتے آپ کے پاس آئے اور آپ اس وقت آرام فرما تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا کیا آپ سو رہے ہیں یا جاگ رہے ہیں، تو دوسرے نے کہا آپ کی آنکھ سو رہی ہے مگر دل جاگ رہا ہے۔

آپ کی نیند کی ایک خصوصیت یہ بھی کہ آپ کو اس دوران کبھی احتلام نہیں ہوا، آپ نے ارشاد فرمایا ہے کہ نبی کو کبھی احتلام نہیں ہوتا، مطلب یہ ہے کہ نبی پر احتلام سے کبھی حالتِ جنب طاری نہیں ہوتی۔

آپ کا ارشاد ہے جس نے مجھے خواب میں دیکھا اُس نے صحیح دیکھا ہے کیونکہ شیطان کبھی میری شکل اختیار نہیں کر سکتا۔

رسول اللہؐ کی تمام انبیاء پر فضیلت

ابوسعید خدریؓ روایت کرتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں قیامت کے دن بنی آدم کا سردار ہوں گا لیکن اس پر فخر نہیں کرتا میرے ہاتھ میں "لواء الحمد" ہو گا۔ بایں ہمہ مجھے فخر نہیں، تمام انبیاء قیامت کے دن میرے جھنڈے کے نیچے ہوں گے اور میری ہی قبر سب سے پہلے کھلے گی مگر فخر نہیں کرتا،

ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کچھ اصحابِ رسول بیٹھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتظار کر رہے تھے، پس آپ تشریف لائے جب آپ اُن کے نزدیک پہنچے تو وہ بحث کر رہے تھے آپ نے اُن کی بات سنی کچھ کہہ رہے تھے، کیا کہنے حضرت ابراہیمؑ کے کہ انہیں مخلوق میں سے خلیل بنایا گیا۔ دوسرا بولا اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ موسیٰ علیہ السلام کو خصوصی کلام سے نوازا گیا، ایک اور بولا حضرت عیسٰی اللہ کا کلمہ اور اس کی روح ہیں، آپ اُن کے پاس آئے اور فرمایا میں نے تمہاری باتیں بھی سنیں اور تمہارا اظہارِ تعجب بھی دیکھا، بلاشبہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ ہیں اور واقع میں ایسے ہیں، حضرت موسیٰ نجی اللہ ہیں اور یقیناً ایسے ہیں، آگاہ ہو کہ میں "حبیب اللہ" ہوں تاہم کسی فخر میں مبتلا نہیں ہوں

قیامت کے دن میں لواء الحمد اٹھانے والا ہوں گا لیکن کسی فخر کی ضرورت نہیں میں قیامت کے دن سب سے پہلا شفاعت کرنیوالا اور شفاعت قبول کیا جانیوالا ہوں مگر اظہار فخر نہیں کرتا، میں اولین و آخرین میں سب سے زیادہ عزت والا ہوں۔ البتہ فخر نہیں کرتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے اولاد ابراہیم سے حضرت اسماعیل کو اور اولاد اسماعیل سے بنو کنانہ کو منتخب کیا، فرمایا قیامت کے دن سب سے زیادہ میرے پیروکار ہوں گے، میں ہی سب سے پہلے جنت کا دروازہ کھٹکھٹاؤں گا، فرمایا میں قیامت کے دن جنت کے دروازے پر آؤں گا اور دروازہ کھولوں گا۔ دربان پوچھے گا تم کون ہو؟ میں کہوں گا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) وہ کہے گا مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں آپ سے پہلے کسی کے لیے دروازہ نہ کھولوں، آپ نے فرمایا میری اور دوسرے انبیاء کی مثال اس طرح ہے جیسے کسی نے اچھا محل بنایا ہو، اور اس میں ایک اینٹ کی جگہ خالی رکھ دی ہو، دیکھنے والے محل کی عمارت سے تو متاثر ہوتے تھے لیکن ایک اینٹ کی خالی جگہ پر متعجب! پس میں ہی وہ اینٹ ہوں اور میں خاتم الانبیاء ہوں اور فرمایا پانچ چیزیں مجھے ایسی عطا کی گئیں جو مجھ سے پہلے کسی کو نہیں ملیں، ایک ماہ کے فاصلے تک مجھے رعب سے مدد دی گئی، میرے لئے پوری زمین کو مسجد اور پاک بنا دیا گیا ہے، میرے لئے مال غنیمت کو حلال قرار دیا گیا، اور مجھ سے پہلے کسی کے لئے جائز نہیں تھا، مجھے شفاعت کی خصوصیت بخشی گئی اور ہر نبی اپنی قوم کے لئے بطور خاص مبعوث ہوا اور مجھے تمام انسانوں کے لئے مبعوث کیا گیا۔

ابی بن کعبؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب قیامت کا دن ہوگا تو میں انبیاء کا امام اور اُن کا خطیب ہوں گا۔ شفاعت کا حامل بھی ہوں گا لیکن فخر نہیں کرتا۔

ابن مسعودؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر نبی کا انبیاء میں سے ایک دوست ہوگا میرے دوست میرے والد (حضرت ابراہیم علیہ السلام) ہیں اور میرا خلیل میرا رب ہے، پھر آپ نے پڑھا "لوگوں میں سے حضرت ابراہیمؑ کے نزدیک تر وہ ہیں جو اُن کی پیروی کرتے ہیں اور اس رسول کی" (آل عمران: ۶۸)

جابر بن عبداللہؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے مجھے بہترین اخلاق اور اچھے کردار کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے۔

امتہ محمدیہ کی تمام امتوں پر فضیلت

ابن عمر روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہاری اور یہود و نصاریٰ کی مثال اس شخص کی سی ہے جسے ایک قیراط معاوضے پر آدھے دن تک مزدوری پر لگایا گیا تو یہود نے کام کیا، پھر فرمایا ایک اور شخص کو ایک قیراط پر عصر تک کام پر لگایا گیا تو نصرانیوں نے کام کیا، پھر فرمایا کسی کو رات تک دو قیراط پر کام دیا گیا سو تم نے وہ کام کیا اور تمہیں دوہرا معاوضہ ملا، یہود بولے یہ کیا کہ ہم کام زیادہ کریں اور اُجرت تھوڑی پائیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کیا معاوضہ کی ادائیگی میں تم سے کوئی زیادتی ہوئی، وہ کہیں گے نہیں تو فرمایا یہ تو میرا فضل ہے جسے چاہوں عطا کردوں۔

سہل بن سعدؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری امت میں سے ستر ہزار افراد بغیر حساب و کتاب کے

جنت میں جائیں گے، یا فرمایا سات سو ہزار افراد،

بیان کیا جاتا ہے کہ عمر بن خطابؓ کا کسی یہود پر قرض تھا آپ اس سے ملے اور فرمایا مجھے قسم ہے اس ذات کی جس نے ابوالقاسم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام انسانوں پر فضیلت بخشی، آج میں تمہیں ہرگز نہیں چھوڑوں گا اور مطلوبہ چیز لے کر رہوں گا۔ یہودی بولا اللہ تعالیٰ نے ابوالقاسم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بنی نوع انسان پر فوقیت نہیں دی۔ حضرت عمرؓ نے ہاتھ اٹھا کر یہودی کے منہ پر تھپڑ دے مارا۔ یہودی نے کہا اب میرا اور تمہارا فیصلہ ابوالقاسم (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی کریں گے، یہودی نے کہا اے ابوالقاسم عمرؓ کا یہ خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تمام انسانوں پر فضیلت بخشی ہے اور میں کہتا ہوں کہ آپ کو تمام انسانوں پر فضیلت نہیں دی گئی تو انہوں نے مجھے طمانچہ رسید کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عمرؓ کیا واقعی ایسا ہے؟ تم اسے اپنے تھپٹر مارنے کے متعلق راضی کر دو، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اے یہودی آدم صفی اللہ ہیں، ابراہیم خلیل اللہ ہیں، موسیٰ کلیم اللہ ہیں۔ عیسیٰ روح اللہ ہیں، اور میں حبیب اللہ ہوں، پھر فرمایا اللہ تعالیٰ کے دو نام ہیں جن سے میری امت کو نوازا گیا،

اللہ تعالیٰ کا اپنا نام "سلام" ہے اور میری اُمت کو "مسلمین" سے موسوم فرمایا اس کا نام "مومن" ہے اور میری اُمت کا نام "مومنین" ہے اور ہاں اے یہودی! تم نے ایک دن مانگا اور ہمیں "جمعہ" کا دن دیا گیا پس آج کا دن ہمارا کل کا تمہارا اور اس سے بعد کا نصرانیوں کا ہے۔ (اسی طرح) تم قیامت کے دن پیچھے اور ہم پہلے ہوں گے۔

اور ہاں اے یہودی! بلاشبہ جنت تمام پر حرام ہوگی جب تک کہ میں اس میں داخل نہیں ہوں گا۔ اسی طرح تمام اُمتوں پر جنت حرام ہوگی، جب تک کہ میری امت اس میں داخل نہ ہوگی۔

بیان کیا جاتا ہے کہ آدم علیہ السلام نے کہا۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے امتہ محمدیہ (علیہ الثنا والتحیہ) کو چار خوبیاں عطا کی ہیں جو مجھے نہیں ملیں، پہلی یہ کہ میری توبہ مکہ میں جا کر قبول ہوئی اور اُمت محمدیہ کسی بھی جگہ توبہ کرے تو قبول کر لی جاتی ہے، دوسری یہ کہ میں لباس میں تھا جب مجھ سے لغزش ہوئی اور شجر ممنوعہ کھا بیٹھا تو مجھے لباس سے محروم کر دیا گیا اور اُمت محمدیہ گناہ بھی کرے گی لیکن اسے لباس بھی میسر رہے گا (تیسری یہ کہ) مجھ سے لغزش ہوئی تو مجھ سے میری عورت حوا الگ کر دی گئی۔

امت محمدیہ گناہ کرے گی لیکن اُن کی عورتیں ان سے جدا نہیں کی جائیں گی (چوتھی یہ کہ) مجھ سے جنت میں لغزش ہوئی اور مجھے جنت سے نکال دیا گیا اور اُمت محمدیہ جنت سے باہر غلطیاں کرے گی لیکن اسے پھر بھی جنت میں داخل کیا جائے گا۔

ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے دن سب سے پہلے نوح علیہ السلام اور اُن کی اُمت کو بلایا جائے گا پھر اُن سے کہا جائے گا کہ آپ نے وہ کچھ پہنچا دیا جو آپ کو دیا گیا تھا؟ وہ کہیں گے ہاں! پھر اُمت سے کہا جائیگا کیا نوحؑ نے حق تبلیغ ادا کیا، وہ کہیں گے نہیں، ہمارے پاس کوئی ڈرانے والا نہ آیا اور نہ ہی آپ کا پیغام ہم تک پہنچایا گیا۔ اللہ تعالیٰ حضرت نوحؑ سے فرمائے گا، یہ لوگ کہتے ہیں کہ تم نے ان تک میرا پیغام نہیں پہنچایا۔ کیا تمہارے پاس کوئی گواہ ہے؟ نوحؑ کہیں گے ہاں! اللہ تعالیٰ فرمائے گا کون؟

نوح علیہ السلام کہیں گے اُمت محمدیہ (علیہ الثنا والتحیہ) پھر اُس سے پوچھا جائے گا۔ اُمت محمدیہ کہے گی کہ ہاں نوح علیہ

السلام اپنی قوم کے پاس آئے، قوم نوح کہے گی تم ہم پر کیسے گواہ بن سکتے ہو جبکہ ہم پہلے تھے اور تم بعد میں آئے؟ اُمت محمدیہ کہے گی اللہ تعالیٰ نے ہماری طرف اپنا رسول بھیجا اور ہم پر کتاب نازل کی اور اس میں تمہارے واقعات بھی تھے، اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد بھی ہے "اور ہم نے تمہیں درمیانی امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ بنو" (البقرہ ۱۴۳)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری امت "اُمۃ مرحومہ" ہے اس پر قیامت کے دن عذاب نہ ہوگا۔ ان پر دنیا میں عذاب از قسم قتل وغیرہ ہی کافی ہے۔

———

حضورؐ کی حاضر جوابی

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جب آیت اِنَّکُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ حَصَبُ جَھَنَّمَ اَنْتُمْ لَھَا وَارِدُوْنَ ہ (تم بھی اور اللہ کے سوا تم جن کی عبادت کرتے رہے ہو جہنم کا ایندھن بننے والے ہو۔ تم سب اس میں جانے والے ہو۔ سورۃ الانبیاء ۹۸) نازل ہوئی تو عبداللہ[1] ابن الزبعری قریش کے پاس آیا اور ان سے کہا:

"اے قریش! آج میں محمد سے بحث کروں گا کہ اس کے رب کی طرف سے اس پر یہ کیوں نازل ہوا ہے؟"

یہ کہہ کر وہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس گیا اور کہا:

"اے محمدؐ! کیا تمہیں یہ یقین نہیں ہے کہ تم پر اللہ نے یہ آیت نازل کی ہے اِنَّکُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ حَصَبُ جَھَنَّمَ اَنْتُمْ لَھَا وَارِدُوْنَ؟"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "بلا شک مجھ پر نازل ہوئی ہے"۔

زبعری نے کہا "مشرکین نے فرشتوں کی عبادت کی۔ نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی عبادت کی اور یہود نے حضرت عزیر (علیہ السلام) کی عبادت کی۔ تمہارے خیال کے مطابق یہ دونوں تمہاری طرح نبی ہیں۔ یہ دونوں بھی ہمارے معبودوں کے ساتھ دوزخ میں جائیں گے؟"

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً جواب دیا "ارے! کیا تمہیں معلوم نہیں کہ "ما" غیر ذی عقل اشیاء کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اور "من" ذی عقل کے لئے۔ اللہ تعالیٰ تو کہہ رہا ہے "اِنَّکُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ" یعنی تم اور اللہ کے سوا جن چیزوں کی تم عبادت کرتے ہو) اگر الفاظ "اِنَّکُمْ وَمَنْ" ہوتے تو پھر وہ صورت ہوتی جو تم سمجھ رہے ہو"۔ یہ سن کر وہ خاموش اور لاجواب ہو گیا۔

ایک مرتبہ اُبی ابن خلف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ اس کے پاس دو ہڈیاں تھیں جو بوسیدہ ہو کر بھر بھری ہو چکی تھیں۔ اس نے انھیں مروڑ کر راکھ بنا دیا اور ہوا میں پھینک دیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مخاطب ہو کر کہا: "اے محمدؐ! تمہارا یہ خیال ہے کہ ہم اور ہمارے آباؤ اجداد گل سڑ کر راکھ ہو جانے کے بعد دوبارہ زندہ ہو جائیں گے۔ تم تو وہ بات کہہ رہے ہو جو آج تک کسی نے نہیں کہی۔ تم نے بہت عجیب بات کہہ دی ہے۔ آخر اس ہڈی کو کون زندہ کرے گا جبکہ یہ بوسیدہ ہو چکی ہے"۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے زبانِ وحی سے فوراً جواب دیا:

---

[1] قریش کے انتہائی زیرک لوگوں میں سے تھے اور اسلام اور مسلمانوں کے سخت ترین دشمن تھے۔ فتح مکہ کے موقعہ پر اسلام لے آئے (مترجم)

"یُحْیِیْهَا الَّذِیْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِیْمٌ (اُسے وہ زندہ کرے گا جس نے اُسے پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا۔ اور وہ ہر چیز کی پیدائش سے اچھی طرح باخبر ہے)"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور تعبیر خواب :

حضرت سمرۃ بن جندب روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز فجر ادا فرما لیتے تو اپنے اصحاب سے فرماتے:۔ "تم میں سے جس نے کوئی خواب دیکھا ہو وہ بیان کرے"۔ لوگ ماشاء اللہ بیان کرتے اور رسول اللہؐ فرماتے:" نبوت میں سے اب صرف مبشرات ہی باقی رہ گئی ہیں"۔ لوگوں نے عرض کیا۔"یا رسول اللہؐ! یہ مبشرات کیا ہیں ؟"
آپ نے فرمایا۔" نیک خواب جو مومن دیکھتا ہے یا اُسے دکھایا جاتا ہے"۔
یہی واقعہ حضرت انسؓ بن مالک نے یوں روایت فرمایا ہے:
"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔" اب رسالت اور نبوت کا سلسلہ منقطع ہو گیا ہے۔ میرے بعد اب نہ کوئی رسول آئے گا اور نہ کوئی نبی"۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ یہ بات لوگوں پر کچھ شاق گذری۔ اس پر آں حضورؐ نے فرمایا۔" لیکن مبشرات ہوں گے"۔ لوگوں نے عرض کیا۔" اے اللہ کے رسولؐ! یہ مبشرات کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا" مسلمان کا خواب اور یہ نبوت کے اجزا میں سے ہی ایک جزو ہے"۔

خواب کی تعبیر

حضرت انسؓ ابن مالک روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا!" خواب میں کنیتیں بھی ہوتی ہیں اور نام بھی۔ سو تم کنیتوں سے اشارے سمجھ لو اور ناموں سے تعبیر لے لو"۔ جو شخص آپ کے سامنے کوئی خواب بیان کرتا آپؐ اسے کہتے" جو کچھ تم نے دیکھا ہے خیر ہے۔ تجھے خیر ہی دکھایا گیا ہے اور جو ہوگا۔ وہ خیر ہی ہو گا۔

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ بیان کرتے ہیں!" میں نے خواب میں دیکھا کہ میں ایک درخت کے نیچے سایے میں بیٹھا ہوں میرے پاس کاغذ اور دوات ہے اور میں سورت کے آغاز سے لکھ رہا ہوں جب میں آیت السجدہ پر پہنچا تو کاغذ دوات اور درخت نے سجدہ کیا۔ میں نے انھیں سجدہ میں یہ کہتے سنا۔ اَللّٰهُمَّ احْطُطْ بِهَا وِزْرًا وَاحْرُزْ بِهَا شُكْرًا وَاَعْظِمْ بِهَا اَجْرًا۔ اے اللہ تو اس کے ذریعے بوجھ اُتار دے شکر ادا کرنے کے لیے محفوظ رکھ اور اس کی وجہ سے بہت بڑا اجر عطا فرما۔ ابوموسیٰ کہتے ہیں میں بھی انہی کی طرح سجدہ میں گر گیا۔ جب میں جاگا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور سارا ماجرا آپ کو سنایا۔ آپ نے فرمایا!" تم نے بھلائی دیکھی۔ بھلائی ہی ہوگی۔ تم سو گئے اور تمہاری آنکھ بھی نہیں کی نیند سو گئی"۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا!" خواب دراصل دل کی بات ہے۔ یا شیطان کا ڈراوا یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے بشارت۔ لہٰذا جو شخص ایسی چیز دیکھے جو اُسے ناپسند ہو تو اُسے دوسروں سے اس کا ذکر نہیں

کرنا چاہیے ۔ بلکہ اٹھ کر نوافل پڑھنے چاہئیں"؟

و ——— حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا " میں نے خواب میں دیکھا کہ میرا سر کاٹ دیا گیا ہے " اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہنس پڑے اور فرمایا کہ "جب خواب میں شیطان تم میں سے کسی کے ساتھ تلعب کرے تو اُسے لوگوں کے پاس اس کا ذکر نہیں کرنا چاہیے "

و ——— حضرت ابن زمل جہنیؓ سے روایت ہے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب صبح کی نماز سے فارغ ہوئے تو لوگوں کی طرف رُخ کر کے فرمایا " تم میں سے کسی نے کوئی خواب دیکھا ہے"؟ میں نے عرض کیا " ہاں ! یا رسول اللہ ! میں نے دیکھا ہے" فرمایا "خدا کرے تم اچھی بات دیکھو اور بُری سے بچو ۔ بھلائی ہمارے لیے ہو اور بُرائی ہمارے دشمنوں کے لئے ۔ سب تعریفیں اللہ رب العالمین کے لئے ہیں ۔ کہو ! بیان کرو"

و ——— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا " جس نے مجھے خواب میں دیکھا اُس نے حقیقتاً مجھے دیکھا ۔ کیونکہ شیطان کے لئے میری شکل اختیار کرنا ممکن نہیں ہے "

و ——— حضرت انسؓ ابن مالک سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا " ایک رات میں نے خواب میں دیکھا کہ ہم عقبہؓ بن رافع کے گھر میں ہیں ہمارے پاس ابن طاب کی تازہ کھجوریں لائی گئی ہیں ۔ میں نے اس کی یہ تاویل کی کہ دنیا میں ہمارے لئے رفعت و بلندی ہے اور آخرت میں ہمارے لئے عافیت ہے اور یہ کہ ہمارا دین پاک ہے ۔

و ——— حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں دیکھا کہ مدینہ میں بکھرے ہوئے بالوں والی ایک عورت سوداً مدینہ سے نکل کر مہیعہ مقام میں چلی گئی ہے ۔ (مہیعہ کو جحفہ بھی کہتے ہیں یہ مقام شام والوں کے لیے میقات احرام ہے) آنحضورؐ نے اس کی تاویل یہ کی کہ وبا مدینہ سے نکل کر مہیعہ مقام میں چلی جائے گی ۔

و ——— حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا " میں نے خواب میں دیکھا کہ میں نے تلوار کو گھمایا اُس نے آپ کے سینہ مبارک کو زخمی کر دیا ۔ نتیجتہً مسلمانوں کو غزوہ احد میں ہزیمت اُٹھانا پڑی ۔ آنحضورؐ نے تلوار کو دوبارہ گھمایا اور مسلمانوں کو وہ صورت حال پیش آئی جس میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح نصیب کی اور مسلمان دوبارہ متحد ہو کر ایک مٹھی بن گئے ۔

و ——— حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا " خواب میں میرے پاس روئے زمین کے خزانے لائے گئے ۔ میری دونوں ہتھیلیوں میں سونے کے دو زیور رکھے گئے ۔ میرے لیے یہ دونوں گراں ہو گئے ۔ پس اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ ہدایت کی کہ میں ان میں پھونک ماروں ۔ جب میں نے ان میں پھونک ماری تو وہ دونوں چلے گئے ۔ میں نے ان دونوں کی تاویل یہ کی کہ یہ دونوں وہ جھوٹے مدعیانِ نبوت ہیں جو میرے ارد گرد ہیں یعنی صنعاً اور یمامہ کے مدعیان نبوت "

و ——— حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا " میں نے خواب میں دیکھا کہ میرے پاس دودھ کا

ایک پیالہ لایا گیا۔ میں نے اس سے خوب سیر ہو کر دودھ پیا یہاں تک کہ دودھ میرے ناخنوں سے پھوٹ پڑا پھر میں نے زائد دودھ عمر کو دے دیا۔" لوگوں نے عرض کیا:" آپ نے اس کی کیا تاویل فرمائی؟ فرمایا:" یہ علم تھا۔"

و ــــ حضرت ابوسعید الخدری رض روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے: میں سو رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ لوگ میرے سامنے پیش کئے گئے ہیں۔ سب قمیص پہنے ہوئے ہیں البتہ کسی کا قمیص سینے تک ہے اور کسی کا اس سے نیچے تک پھر میرے سامنے عمر ابن الخطاب رض کو پیش کیا گیا، ان کے قمیص کا دامن سب سے زیادہ لمبا ہے۔ وہ اسے گھسیٹے لیے چلے جا رہے ہیں۔" لوگوں نے عرض کیا:" اے اللہ کے رسول! آپ نے اس کی کیا تاویل کی ہے؟ آپ نے فرمایا:" یہ دین ہے۔"

ایک دوسری روایت میں ہے کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ" مجھے کچھ قمیص دیئے گئے ہیں۔ جنہیں میں نے اپنے اصحاب میں تقسیم کر دیا۔"

و ــــ حضرت ابوہریرۃ رض سے روایت ہے۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:" میں سو رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ میں پرانے کوئیں پر بیٹھا ہوں۔ کوئیں پر ڈول رکھا ہے۔ پھر میں نے اس میں سے جتنا اللہ نے چاہا پانی نکالا۔ پھر ابن ابی قحافہ رض نے ڈول پکڑ لیا۔ اور ایک یا دو ڈول پانی نکالا۔ اس کے ڈول نکالنے میں زور شور نہیں تھا اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت کرے! پھر یہ ڈول عمر بن الخطاب رض نے لے لیا اس کے ہاتھ میں ڈول چرسے کی شکل اختیار کر گیا۔ میں نے کسی بہادر کو عمر بن الخطاب کی طرح پانی نکالتے نہیں دیکھا۔ یہاں تک کہ لوگوں نے اپنے اونٹوں کو پانی پلا کر پانی کے گرد بٹھا دیا۔" (یعنی میرے بعد نظام حکومت حضرت ابوبکر صدیق رض کے ہاتھ میں ہوگا ان کی حکومت سال دو سال ہوگی پھر یہ حضرت عمر بن الخطاب رض کو منتقل ہو جائیگی اور وہ خوب حکومت کریں گے یہاں تک کہ لوگ مال و دولت سے خوب بہرہ مند ہوں گے اور آرام سے زندگی گذاریں گے)

و ــــ حضرت عائشہ رض روایت کرتی ہیں:" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ورقہ بن نوفل کے بارے میں دریافت کیا تو حضرت خدیجہ رض نے فرمایا:" یا رسول اللہ! انہوں نے آپ کی تصدیق کی تھی اور آپ کے غلبہ سے پہلے وہ انتقال کر گئے۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا!" میں نے اسے خواب میں دیکھا سفید براق لباس زیب تن کئے ہوئے تھا۔ یہ لباس اہل جنت کا لباس ہے۔ اگر وہ دوزخیوں میں سے ہوتا تو اس کا لباس کوئی دوسرا ہوتا۔"

و ــــ حضرت ام العلاء انصاریہ رض فرماتی ہیں کہ" جب حضرت عثمان رض بن مظعون فوت ہو گئے تو میں نے انہیں خواب میں دیکھا ان کے پاس پانی کا ایک چشمہ جاری تھا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس کا ذکر کیا۔ آپ نے فرمایا۔ " یہ ان کا عمل ہے جو جاری ہے۔"

و ــــ حضرت خزیمہ رض بن ثابت راوی ہیں وہ کہتے ہیں۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ انور پر سجدہ کر رہا ہوں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا۔ آنحضور ص لیٹ گئے اور انہیں فرمایا کہ اپنی خواب سچی کر لو۔ اس پر حضرت خزیمہ رض نے آپ کی پیشانی پر سجدہ کیا (یعنی انہوں نے جھک کر آپ کی پیشانی کو بوسہ دے لیا۔)

و ــــ حضرت عبداللہ رض بن عمر رض سے مروی ہے وہ کہتے ہیں:" میں غیر شادی شدہ نوجوان تھا۔ مسجد ہی میں رہا کرتا تھا۔ میں دیکھتا کہ

لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اپنی خوابیں بیان کرتے اور آپ اُن کی تعبیر بیان کرتے۔ میں نے دعا کی: اے اللہ! اگر تیرے حضور میں میرے مقدر میں کوئی بھلائی لکھی ہے تو مجھے خواب دکھا دے تاکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اُس کی تعبیر دریافت کروں۔" راوی کہتے ہیں کہ "میں سو گیا میں نے دیکھا کہ دو فرشتے میرے پاس آئے اور مجھے لے کر چل دیئے راستہ میں ایک اور فرشتہ ملا۔ اُس نے مجھ سے کہا: "تم کیوں ڈرتے ہو۔ تم ایک نیک آدمی ہو۔" وہ دونوں فرشتے مجھے دوزخ کی طرف لے گئے۔ پس کنوئیں کی طرح یہ چاروں طرف سے بند کی ہوئی تھی۔ میں نے اس میں اپنی جان پہچان کے بعض لوگوں کو دیکھا۔ وہ دونوں مجھے دائیں طرف لے گئے۔ جب صبح ہوئی تو میں نے سارا ماجرا حضرت حفصہ رضؓ سے بیان کیا۔ انہوں نے سارا قصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گوش گزار کر دیا۔ آنحضورؐ نے سارا قصہ سن کر فرمایا: "عبداللہ مرد نیک ہے کاش کہ رات کو کثرت سے نوافل پڑھا کرے۔" حضرت عبداللہ کہتے ہیں کہ اس کے بعد میں نے ہمیشہ رات کو نفل نماز پڑھنے کا التزام کیا۔

و ——— حضرت عبداللہؓ بن سلام فرماتے ہیں: "میں نے خواب میں ایک سرسبز و شاداب باغ دیکھا جس کے وسط میں ایک ستون تھا۔ ستون کے اوپر ایک کھونٹا لگا ہوا تھا۔ مجھے اس کھونٹے پر چڑھنے کے لیے کہا گیا۔ میں نے کہا: "میں نہیں چڑھ سکتا۔" پھر میرے پاس ایک غلام آیا اور اُس نے کپڑوں سے پکڑ کر مجھے اُوپر اٹھایا ———

اس طرح میں اوپر چڑھا اور میں نے اُس کھونٹے کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اسی حال میں کہ میں نے اُسے پکڑ رکھا تھا میں بیدار ہوگیا۔ اور سارا قصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیان کیا۔ آپؐ نے فرمایا: وہ باغ اسلام ہے۔ اور وہ ستون دراصل اسلام کا ستون ہے یعنی اسلام کی بلندی ہے اور وہ کھونٹا دین اسلام کا مرکز ہے۔ اے عبداللہ! تم موت کی آمد تک اسلام ہی کی مضبوط رسی کو پکڑے رکھو گے۔

و ——— حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ فرماتے ہیں: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص حاضر ہوا اور عرض کی: میں نے رات کو خواب میں دیکھا کہ ایک سائبان ہے جس سے گھی اور شہد کے قطرے ٹپک رہے ہیں اور لوگ اُنھیں ہاتھوں میں لے رہے ہیں۔ کسی کے پاس زیادہ ہے اور کسی کے پاس کم۔ اچانک میں دیکھتا ہوں کہ ایک رسی آسمان سے زمین تک لٹک رہی ہے۔ پھر میں دیکھتا ہوں کہ آپ، اے اللہ کے رسولؐ، اُسے پکڑ کر اُوپر چڑھتے ہیں۔ پھر ایک اور شخص اُسے پکڑ کر اُوپر چڑھتا ہے۔ پھر ایک اور (تیسرا) شخص اس کے ذریعے اُوپر چڑھتا ہے۔ پھر ایک اور شخص اُسے پکڑ لیتا ہے۔ رسی ٹوٹ جاتی ہے وہ اُسے جوڑ دیتا ہے۔" حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا "یا رسول اللہؐ! آپ پر میرے ماں باپ فدا ہوں۔ بخدا آپ مجھے اس کی تعبیر بیان کرنے دیں۔" آنحضور علیہ السلام نے فرمایا "ضرور تعبیر بیان کرو۔"

حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا "یہ سائبان تو اسلام ہے۔ اور جو شہد اور گھی اُس میں سے قطرہ قطرہ ٹپک رہا ہے یہ قرآن اور اس کی حلاوت ہے اور جو کچھ لوگ ہتھیلیوں میں لے رہے ہیں۔ یہ قرآن مجید ہے خواہ تھوڑا ہو یا زیادہ اور آسمان سے زمین تک پہنچنے والی رسی وہ حق ہے جس پر آپ قائم ہیں، آپ اُسے پکڑے ہوئے ہیں اللہ تعالیٰ آپ کو اس کے ذریعہ بلند مرتبہ کر رہا ہے۔ پھر آپ کے بعد ایک شخص اُسے پکڑتا ہے اور اس کے ذریعے بلندی پر پہنچ جاتا ہے۔

پھر ایک دوسرا آدمی اُسے پکڑ کر مقامِ بلند پر پہنچتا ہے۔ پھر ایک اور شخص اُسے پکڑتا ہے وہ رسّی ٹوٹ جاتی ہے وہ اُسے پیوند لگا کر اُس کے ذریعہ اوپر چڑھتا ہے۔ اے اللہ کے رسولؐ! (آپ پر میرے ماں باپ قربان ہوں) آپ مجھے بتائیں مَیں نے درست تعبیر کی ہے یا غلط؟ آنحضور علیہ السلام نے فرمایا "تمہاری بعض باتیں درست ہیں اور بعض غلط"۔ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا "یا رسول اللہؐ بخدا آپ ہی فرمائیں مَیں نے کیا غلطی کی؟" آنحضورؐ نے فرمایا: "تم قسم مت کھاؤ۔"

و حضرت ابن زملؓ سے روایت ہے "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب صبح کی نماز سے فارغ ہو جاتے تو اپنا رُخ لوگوں کی طرف کر لیتے اور پوچھتے "کیا تم میں سے کسی نے کچھ دیکھا ہے؟ (یعنی خواب میں)" ابن زمل کہتے ہیں۔ میں نے عرض کیا: "یا رسول اللہ! میں نے دیکھا ہے"۔ آنحضور علیہ السلام نے فرمایا "خدا کرے تم نے بھلائی دیکھی ہو اور برائی سے بچے ہو۔ بھلا ہمارا ہو اور بُرا ہمارے دشمنوں کا۔ سب تعریفیں اللہ رب العالمین کے لیے ہیں۔ ہاں بھئی کہو کیا دیکھا؟" ابن زملؓ کہتے ہیں مَیں نے عرض کیا! مَیں نے خواب میں دیکھا کہ سب لوگ ایک نہایت کھلے کشادہ صاف راستے پر چلے جا رہے ہیں۔ یہ راستہ لیے لیے سب کو ایک نہایت شاداب سبزہ زار کے کنارے لے گیا۔ میری آنکھوں نے ایسا پُررونق سبزہ زار کبھی نہیں دیکھا ہر طرف سبزہ لہلہا رہا ہے اور شبنم کے قطرے طرح طرح کے سبزے پر پڑے ہوئے ہیں۔ مَیں کیا دیکھتا ہوں کہ لوگوں کا پہلا گروہ جب اس سبزہ زار کے کنارے پہنچا تو انہوں نے اللہ اکبر کہہ کر اپنی سواریوں کو راستہ پر ڈال لیا کسی نے سواری کو چرنے دیا اور کسی نے مٹھی بھر سبزہ لے لیا یہ لوگ راستہ سے دائیں بائیں ہٹے بغیر آگے چل دیے۔ پھر اُن کے بعد ایک دوسرا گروہ آ پہنچا۔ یہ پہلے گروہ سے تعداد میں کئی گنا زیادہ تھا۔ یہ لوگ بھی جب اس سبزہ زار کے کنارے پہنچے تو اُنہوں نے بھی اللہ اکبر کہا اور سواریوں کو راستے پر ڈال دیا۔ کچھ لوگوں نے جانوروں کو گھاس کو منہ مارنے کا موقع دیا اور کچھ نے مٹھی بھر سبزہ لیا اور سب آگے بڑھ گئے پھر ان کے بعد ایک تیسرا گروہ آیا اور یہ لوگ تعداد میں ان سے بھی کئی گنا زیادہ تھے یہ جب اُس سبزہ زار کے کنارے پہنچے تو انہوں نے بھی اللہ اکبر کہا اور سواریوں کو راستہ پر ڈال دیا۔ لیکن خوب صورت سبزہ کو دیکھ کر کہنے لگے "یہ تو ایک اچھی جگہ ہے"۔ وہ اس سبزہ زار پر پھیل گئے اور دائیں بائیں کو مُڑ گئے۔ جب مَیں نے یہ صورت حال دیکھی تو مَیں نے اپنی راہ لی یہاں تک کہ میں سبزہ زار کے آخری سرے پر پہنچا۔ اچانک میں آپ کے پاس تھا اور اے اللہ کے رسول! آپ ایک منبر پر تشریف فرما تھے جس کی سات سیڑھیاں تھیں۔ آپ اُس کی سب سے اوپر کی سیڑھی پر تشریف فرما تھے۔ ناگاہ میں نے دیکھا کہ آپ کے دائیں طرف اونچی ناک لمبے قد اور گندمی رنگ کا ایک آدمی بیٹھا ہے۔ جب وہ بات کرتا ہے تو ایسا لگتا ہے کہ وہ سب لوگوں سے اونچے قد کا ہے۔ پھر اچانک میں نے دیکھا کہ آپ کے بائیں طرف ایک میانہ قد کا آدمی بیٹھا ہے جس کے سرخ دمکتے چہرے پر بہت سے تِل ہیں جب اُس نے بات کی تو آپ سب احتراماً اُس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ پھر اچانک میں نے دیکھا کہ آپ سب کے آگے ایک بوڑھا آدمی بیٹھا ہے اور آپ سب اُس کی اقتداء کر رہے ہیں۔ اور معاً میں نے دیکھا کہ اس سارے منظر کے آگے ایک دبلی پتلی ادھیڑ عمر کی اونٹنی ہے۔ مجھے یوں لگا جیسے اُسے یا رسول اللہؐ! آپؐ نے اُٹھایا ہے۔ ابن زملؓ کہتے ہیں کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ انور کا رنگ پل بھر کے لیے متغیر ہو گیا۔ پھر بڑی فراخدلی کے ساتھ آپ نے ارشاد فرمایا۔ "جو تم نے کشادہ کھلا اور صاف راستہ دیکھا وہ راہ ہدایت ہے جس پر میں تم کو لے جا رہا ہوں۔ وہ خوشنما سبزہ زار جو تم نے دیکھا وہ دنیا اور اُس کی پُرعیش زندگی ہے۔ میں اور میرے اصحاب ہم اُس سے آگے بڑھ گئے۔ ہم نے دنیا سے کوئی تعلق نہیں رکھا نہ دنیا ہی کو ہم سے کوئی سروکار رہا۔ نہ اُس نے ہماری خواہش کی اور نہ ہم نے اُسے چاہا۔ البتہ دوسرا اور تیسرا گروہ جو آیا ــ (یہاں آنحضورؐ نے بات مختصر کر دی) ــ تو بس انا للہ وانا الیہ راجعون البتہ تم نیک راستے پر چل رہے ہو تم اسی راستے پر چلتے رہو گے یہاں تک کہ (قیامت کے روز) تم مجھ سے ملاقات کرو۔ البتہ وہ منبر یہ دنیا کے سات ہزار سال ہیں میں آخری ہزاروں میں ہوں۔ ہاں! لمبے قد اور گندمی رنگ کے صاحب حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں ہم ان کا اس لئے احترام کرتے ہیں کہ انھیں کلیم اللہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ دوسرے سرخ دمکتے چہرے والے حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں ہم ان کا احترام اس لئے کرتے ہیں کہ انھیں اللہ تعالیٰ کے ہاں بلند مقام حاصل ہے۔ تیسرے بوڑھے شیخ جن کی اقتدا کرتے تم نے ہمیں دیکھا ہے وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ اور وہ بوڑھی دبلی پتلی اونٹنی جو تم نے دیکھی کہ گویا میں نے اُٹھائی ہے وہ قیامت کی گھڑی ہے جو ہم پر آنے والی ہے۔ پس نہ میرے بعد کوئی اور نبی آنے والا ہے اور نہ میری امت کے بعد کوئی اور اُمت آنے والی ہے"۔

و ــــ روایت ہے کہ ابو عمرو نخعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں نخع کے ایک وفد کے ساتھ حاضر ہوئے اور عرض کیا "یا رسول اللہؐ! میں نے راستے میں ایک خواب دیکھا ہے۔ وہ یہ ہے "میں جو گدھی اپنے قبیلے میں چھوڑ کر آیا ہوں اُس نے بکری کا ایک بچہ جنا ہے جو سرخی مائل سیاہ بھورے رنگ کا ہے"۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کیا تمہاری کوئی لونڈی ہے جسے تم اس خوشی کے ساتھ چھوڑ کر آئے ہو کہ یہ حاملہ ہے"؟ میں نے کہا "ہاں! میں ایک لونڈی چھوڑ کر آیا ہوں میرا خیال ہے کہ وہ حاملہ ہے"۔

آنحضورؐ نے فرمایا۔ "اس کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا ہے جو تمہارا بیٹا ہے"۔ عرض کیا "سرخی مائل سیاہ بھورے رنگ کا کیا مطلب ہے"؟ آپ نے مجھے نزدیک ہونے کا حکم دیا اور میں آپ کے نزدیک ہوا۔ آپ نے فرمایا "کیا تجھے برص کی بیماری ہے جو تم نے چھپا رکھی ہے"؟ میں نے عرض کیا "ہاں! اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا کسی مخلوق نے میرے برص کے نشان کو نہیں دیکھا نہ مجھے کسی ایسے آدمی کا علم ہی ہے"۔ آنحضورؐ نے فرمایا "بس یہ ایسے ہی ہے"۔ راوی کہتے ہیں کہ میں نے نعمان بن المنذر کو دیکھا اس نے دو بالیاں اور بازو بند پہن رکھے تھے جن میں دو موتی جڑے ہوئے تھے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا "وہ عربوں کا بادشاہ ہے وہ اعلیٰ ترین لباس پہن کر اپنی شان و شوکت کو لوٹے گا"۔

راوی کہتا ہے "میں نے زمین میں سے نکلتی ہوئی ایک ادھیڑ عمر کی بڑھیا دیکھی ہے"۔

آنحضورؐ نے فرمایا "یہ دنیا کی باقی زندگی ہے"۔

و ــــ حضرت سمرہ بن جندبؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میں نے ایک خواب میں دیکھا کہ دو آدمی آئے اور مجھے ہاتھ سے پکڑ کر باہر پاک زمین میں لے گئے۔ وہاں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک شخص بیٹھا ہے اور دوسرا ہاتھ میں لوہے کی ٹیڑھے سرے والی سلاخیں لئے اُس کے سر پر کھڑا ہے۔ وہ ایک سلاخ اس کی ایک باچھ میں ٹھونستا ہے جو اُس کے

جبڑے کو پھاڑ کر اس کی گُدّی تک چلی جاتی ہے۔ پھر وہ اسے نکال کر دوسری باچھ میں ٹھونس دیتا ہے جو اُس کے دوسرے جبڑے کو پھاڑ دیتی ہے۔ چنانچہ وہ اسی طرح کرتا چلا جاتا ہے۔

میں نے اُن سے کہا۔ "یہ کیا ہے؟"

ان دونوں نے جواب دیا۔ "آگے چلو!"

چنانچہ میں ان کے ساتھ ہو لیا اچانک میں نے دیکھا کہ ایک آدمی چت لیٹا ہُوا ہے اور ایک دوسرا آدمی ہاتھ میں پتھر لئے کھڑا ہے اور اُس کے سر پر چوٹ مارتا ہے جب پتھر لڑھک جاتا ہے وہ اُسے پکڑنے کے لئے آگے بڑھتا ہے۔ جب وہ واپس آتا ہے تو اُس کا سر پہلی حالت میں آجاتا ہے۔ وہ بار بار اسی طرح کرتا ہے۔ میں نے پوچھا "یہ کیا ہے؟"

ان دونوں نے کہا۔ "تم چلو!"

میں ان دونوں کے ساتھ وہاں سے چل دیا۔ پھر میں نے اچانک ایک ایسا مکان دیکھا جس کی بنیاد تنور پر رکھی گئی تھی۔ اُس کا اوپر کا حصہ تنگ اور نچلا حصہ بہت وسیع تھا۔ اس کے نیچے آگ جلائی جا رہی تھی اور کچھ مرد اور عورتیں اس میں ننگے پڑے ہوئے تھے۔ جب آگ بھڑکتی وہ اُوپر کو اُٹھتے اور یوں لگتا جیسے وہ باہر نکل جائیں گے۔ جب وہ بجھ جاتی وہ پھر لوٹ کر اُسی میں آجاتے۔ میں نے پھر پوچھا۔ "یہ کیا ہے؟"

ان دونوں نے مجھے کہا کہ میں آگے چلوں۔ چنانچہ میں ان دونوں کے ساتھ آگے بڑھا تو دیکھا کہ خون کی ایک نہر بہہ رہی ہے۔ اس میں ایک آدمی کھڑا ہے۔ نہر کے کنارے پر بھی ایک آدمی کھڑا ہے جس کے ہاتھ میں پتھر ہے، جو آدمی نہر میں ہے جب وہ باہر نکلنے کے لئے آگے بڑھتا ہے تو باہر والا آدمی اُس کے مُنہ پر پتھر مارتا ہے اور وہ پھر اپنی جگہ پر چلا جاتا ہے پس جونہی وہ باہر نکلنے کی کوشش کرتا ہے باہر والا اُس کے مُنہ پر پتھر مارتا ہے اور وہ پھر اپنی جگہ پر واپس لوٹ جاتا ہے۔ میں نے پھر پوچھا "یہ کیا ہے؟"

انہوں نے پھر آگے چلنے کے لئے کہا اور ہم آگے بڑھے یہاں تک کہ ہم ایک سرسبز باغ میں پہنچ گئے۔ اس میں ایک بہت بڑا درخت تھا جس کے نیچے ایک بوڑھا آدمی بیٹھا تھا اور اُس کے اردگرد چھوٹے چھوٹے بچے بیٹھے تھے۔ پھر میں اچانک دیکھتا ہوں کہ اس درخت کے نزدیک ہی ایک شخص کھڑا ہے۔ اور اپنے سامنے آگ جلا رہا ہے۔ میرے دونو ساتھی مجھے درخت کے اُوپر لے گئے۔ اس درخت کے عین وسط میں مجھے ایک گھر میں لے گئے۔ اس سے بڑھ کر خوب صورت گھر میں نے کوئی نہیں دیکھا۔ اس میں مرد بوڑھے جوان عورتیں اور بچے سب موجود تھے۔ پھر انہوں نے مجھے اس درخت سے نکال کر ایک اور گھر میں داخل کیا یہ گھر بھی بڑا خوب صورت اور شاندار تھا۔ اس میں بوڑھے اور جوان تھے۔ بعد ازاں میں نے اپنے دونوں ساتھیوں سے کہا۔ "تم نے آج رات مجھے سیر کرائی۔ اس اثنا میں جو کچھ میں نے دیکھا ذرا اس کے بارے میں بھی کچھ بتاؤ۔"

انہوں نے کہا۔ "اچھا تو سنو! وہ آدمی جس کو تم نے دیکھا ہے کہ اس کے جبڑے پھاڑے جا رہے ہیں وہ ایک جھوٹا آدمی ہے۔ وہ جھوٹ گھڑتا ہے وہ اس جھوٹ کو لے کر روئے زمین پر پہنچا دیتا ہے۔ اب اس کے ساتھ وہ سلوک تا قیامت ہوتا رہے گا جو

تم نے یہاں دیکھا۔ (یعنی سلاخوں سے اس کے جبڑے چیر ڈالے جائیں گے) وہ شخص جس کے سر میں پتھر مارا جا رہا تھا وہ شخص ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن سکھایا اس نے رات اس سے بے اعتنائی میں گزاری اور دن میں اس پر کوئی عمل نہ کیا۔ قیامت کے دن تک اس کے ساتھ یہی معاملہ ہوتا رہے گا۔ اور وہ لوگ جنھیں تم نے آگ کے الاؤ میں دیکھا ہے وہ زانی مرد اور عورتیں ہیں۔ جس شخص کو تم نے نہر میں کھڑے دیکھا ہے وہ سود خور ہے۔ اور جس بزرگ کو تم نے درخت کے نیچے بیٹھے دیکھا ہے وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ ان کے چاروں طرف بیٹھنے والے لوگ ان کی اولاد ہے۔ وہ شخص جو آگ جلا رہا ہے وہ آگ کے خزانے کا ذمہ دار ہے۔ پہلا گھر جس میں تم داخل ہوئے وہ عام اہل ایمان کا گھر ہے اور دوسرا گھر شہداء کا گھر ہے۔ میں جبرائیل ہوں اور یہ میرے ساتھی میکائیل ہیں۔ اب تم اپنا سر اٹھاؤ۔ میں نے سر اٹھایا تو میرے اوپر بادل سا تھا۔ دونوں نے کہا" وہ تمہارا گھر ہے۔" میں نے ان سے کہا" تو پھر مجھے اپنے گھر میں داخل ہونے دو۔" انہوں نے جواب دیا" تمہاری عمر ابھی باقی ہے جو ابھی تم نے پوری نہیں کی۔ جب تم اپنی عمر پوری کر لو گے تو اپنے گھر میں آجاؤ گے۔"

و ـــــ حضرت امّ الفضلؓ بنت الحارث نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی چچی (حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب کی زوجہ اور حضرت خدیجہؓ کے بعد دوسری ایمان لانے والی سعادت مند بی بی) روایت کرتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا۔ "یا رسول اللہؐ! میں نے ایک ناپسندیدہ خواب دیکھا ہے۔" آنحضورؐ نے فرمایا:" اللہ آپ کا بھلا کرے! آپ نے کیا دیکھا؟" ہاں نے کہا:" میں نے آپ کے جسم اطہر کے بعض حصے اپنے گھر میں دیکھے ہیں۔"

آپ نے فرمایا:" ہاں! آپ نے کیا دیکھا! فاطمہ کے ہاں ایک لڑکا ہوگا اور تم اُسے اپنے بیٹے قُثَم کے ساتھ دودھ پلاؤ گی۔

و ـــــ حضرت عمروؓ بن العاص فرماتے ہیں:" میں نے خواب میں دیکھا کہ میری ایک انگلی میں گھی ہے اور دوسری میں شہد، اور گویا میں اپنی دونوں انگلیاں چاٹ رہا ہوں۔" میں نے اس کا ذکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا۔ آپ نے فرمایا:" تم دو کتابیں۔ تورات اور انجیل پڑھو گے۔"

و ـــــ حضرت ابورزینؓ عقیلی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" مومن کا خواب نبوت کے چھیالیس اجزاء میں سے ایک جز ہے اور یہ آدمی کے اوپر محو پرواز رہتا ہے جب تک کہ وہ اُسے کسی سے بیان نہ کرے۔ جب وہ کسی سے بیان کر دیتا ہے تو وہ وقوع پذیر ہو جاتا ہے اور میرا خیال ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ" تم اُسے صرف کسی دوست یا صاحب دانش آدمی سے ذکر کرو۔" اور ایک دوسری روایت میں یوں ہے:" تم صرف کسی دوست یا صاحب رائے آدمی سے ذکر کرو۔"

و ـــــ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:" نبوت (کی خصوصیات) میں سے

صرف نیک خواب باقی رہ جائے گا۔ جب قیامت کا وقت قریب ہو گا تو مسلمان کا خواب جھوٹا نہیں ہو گا۔ جتنا سچا کسی کا خواب ہو گا اتنی ہی سچی اس کی بات ہو گی۔"

و ــــ حضرت قتادہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے: "اچھا خواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے۔ جب کوئی شخص ایسا خواب دیکھے جو اُسے پسند ہو تو اُسے اپنے کسی دوست کے سوا کسی سے بیان نہیں کرنا چاہیئے اور اگر کوئی ناپسندیدہ بات دیکھے تو شیطان کے شر سے اللہ کی پناہ مانگنی چاہیے اور تین بار اپنی بائیں طرف تھوک دینا چاہیے۔ اور کسی سے اس کا ذکر نہ کرے۔ یوں اُسے اس کا کوئی نقصان نہ ہو گا۔"

و ــــ ابن ہشام کہتے ہیں کہ ان کے پاس کسی اہلِ علم نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خواب دیکھا۔ آنحضورؐ نے فرمایا: "میں نے دیکھا کہ گویا میں نے حَیس (گھی، کھجور اور پنیر کا حلوہ) کا ایک لقمہ منہ میں ڈالا ہے۔ وہ مجھے بہت لذیذ لگا۔ لیکن جب اُسے نگلنے لگا تو اُس کا کچھ حصہ میرے حلق میں اٹک گیا۔ اور حضرت علیؓ نے اپنے ہاتھ سے اُسے نکالا۔" حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا: "یا رسول اللہ! آپ کے بھیجے ہوئے سریوں میں سے یہ ایک سریہ ہے۔ اس کے بارے میں کچھ خبر آپ کو ایسی ملے گی جو آپ کو پسند آئے گی اور کچھ اُس میں اُلجھن سی ہو گی آپ حضرت علیؓ کو بھیجیں گے اور ان کی کوشش سے معاملہ درست ہو جائے گا۔" یہ اسی طرح واقعہ پیش آیا جس طرح حضرت ابوبکرؓ نے توجیہ کی تھی۔

و ــــ امام بخاریؒ امام مسلمؒ اور امام مالکؒ نے بیان کیا ہے کہ کسی خوفناک خواب سے تعوذ کے لیے یہ الفاظ ہیں:

اَعُوْذُ بِرَبِّ مُوسٰی وعیسٰی و ابراھیم الّذی وفّٰی و محمد المصطفٰی مِنْ شَرِّ مَا رَأَیْتُ فِیْ رُؤْیَایَ اَنْ تَضُرَّنِیْ فِیْ دِیْنِیْ وَ دُنْیَایَ، عزّ جارُ اللہِ وجلّ ثناءُ اللہِ وتقدّست اسماءُ اللہِ۔

(میں موسیٰؑ، عیسیٰؑ اور ابراہیمؑ (جس نے اپنا خواب پورا کر دیا) علیہم السلام اور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے رب کی پناہ مانگتا ہوں اس خواب کے شر سے جو میں نے دیکھا ہے۔ یعنی یہ کہ اس سے مجھے میرے دین اور میری دنیا میں کوئی تکلیف پہنچے۔ اللہ کا پڑوسی غالب ہے اللہ کی ثنا بہت بلند ہے اور اس کے اسماء بڑے پاک و مقدس ہیں)

و ــــ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جس نے کوئی جھوٹا خواب بیان کیا حالانکہ اُس نے فی الواقع وہ دیکھا نہیں اُسے قیامت کے روز دو بالوں میں گانٹھ دینے پر مجبور کیا جائے گا اور وہ ہرگز گانٹھ نہ دے سکے گا۔ یعنی ایک ناقابل عمل کام پر مجبور کیا جائے گا اور وہ ہرگز ایسا نہیں کر سکے گا۔ جس پر اُسے عذاب دیا جائے گا۔ اگرچہ بیداری میں بھی جھوٹ بولنا سخت گناہ ہے لیکن اگر کوئی خواب میں بھی جھوٹ گھڑے تو یہ اور بھی بڑا گناہ ہے جس کی اُسے سزا ملے گی۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

حضورؐ کی دعائیں

سلیس سلطانہ

اـ دعا اور اس کے آداب[1]

عربی زبان میں دعا کا لفظ ندا اور پکار کے معنی میں آتا ہے۔ دعا یدعوا کا مصدر ہے۔ یوں تو دعا اور ندا ہم معنی ہیں۔ مگر ندا کبھی بغیر نام لئے بھی یا اور ایا کے ساتھ ہوتی ہے اور دعا میں نام لیا جاتا ہے۔ جیسے فلاں اور کبھی دعا کا استعمال ندا کی جگہ اور ندا کا استعمال دعا کی جگہ بھی ہوتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

کمثل الذی ینعق بما لا یسمع الا دعآء وندآء (سورۃ بقرۃ آیت ۱۵) جیسے مثال ایک شخص کی کہ چلّاتا ہے ایک چیز کو جو نہیں سنتی ہے مگر پکارنا اور چلّانا۔

اور کبھی دعا کا استعمال تسمیہ یعنی نام رکھنے اور نام لینے کے معنی میں بھی ہوتا ہے۔ جیسے ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہے: لا تجعلوا دعآء الرسول (نور ۶۳) اگر دعا یا اس کے مشتقات کے بعد "الیٰ" استعمال ہو تو اس صورت میں اس کے معنی ابھارنے اور کسی چیز پر آمادہ کرنے کے آتے ہیں۔ جیسا کہ فرمایا۔

رب السجن احب الیّ مما یدعوننی الیہ (سورۃ یوسف۔۲۳)

قرآن مجید میں متعدد مقامات پر دعا کا لفظ عبادت کے معنی میں مستعمل ہوا ہے۔ حافظ ابن القیمؒ لکھتے ہیں کہ وہ تمام آیات جن میں مشرکین کی زبان سے اصنام و معبودانِ باطل کے لئے دعا کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اس عبادت کا مفہوم مراد ہے جو ضمنی طور پر سوال اور فریاد کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

انسان دنیاوی خوش حالی اور مادی ترقی کی بنا پر خواہ اپنے رب سے کتنا ہی دور ہو جائے اور غفلت و نسیان کے کتنے ہی دبیز پردے اس پر پڑ جائیں مگر مصائب کے ہجوم میں بے ساختہ فریاد اور دعا کے لئے اس کے ہاتھ اللہ تعالیٰ کے سامنے اٹھتے ہیں۔

کسی نے خوب کہا ہے کہ انسان کے سامنے اپنی ضرورت کے لئے ہاتھ نہ پھیلاؤ۔ اس سے مانگو جس کے فضل و کرم کے دروازے ہر وقت کھلے رہتے ہیں۔ اگر بندہ اپنے رب سے مانگنا چھوڑ دے تو وہ ناراض ہو جاتا ہے لیکن انسان کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ جب کوئی اس سے مانگتا ہے تو وہ غضبناک ہو جاتا ہے۔

---

[1] اس حصہ کی ترتیب میں مولانا عبدالغفار حسن کے ایک مضمون سے مدد لی گئی ہے جو ماہنامہ میثاق لاہور میں دو اقساط میں شائع ہوا تھا۔ (مرتب)

انسان کو جس چیز کی ضرورت ہو خواہ وہ دنیا کا کام ہو یا دین کا اور خواہ اس میں اپنی کوشش کرنا پڑے یا کوشش اور قابو سے باہر ہو۔ سب خدا تعالیٰ سے مانگنا چاہیئے۔ لیکن اتنا ضرور خیال رہے کہ وہ گناہ کی بات نہ ہو۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں ہر شخص کو اپنے ربّ سے حاجتیں مانگنا چاہئیں اور حضرت ثابتؓ کی روایت میں یہاں تک ہے کہ اس سے نمک بھی مانگے اور جوتی کا تسمہ ٹوٹ جائے وہ بھی اس سے مانگے۔ (ترمذی) تدبیر و دعا کا ساتھ ساتھ ہونا ضروری ہے۔ اس طرح ہر کام اور ہر مصیبت میں اسی طرح جو اپنے کرنے کی تدبیر ہے وہ بھی کرے اور سب تدبیروں کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے عاجزی اور توجہ کے ساتھ ساتھ عرض بھی کرتا رہے۔

دعا فقط اس کا نام نہیں کہ دو چار باتیں یاد کرلیں اور نمازوں کے بعد اس کو صرف زبان سے آموختہ کی طرح پڑھ دیا یہ دعا نہیں ہے محض دعا کی نقل ہے۔ دعا کی حقیقت اللہ تعالیٰ کے دربار میں درخواست پیش کرنا ہے۔ جس طرح حاکم کے یہاں درخواست دیتے ہیں کم سے کم دعا اس طرح تو کرنا چاہیئے کہ درخواست دینے کے وقت آنکھیں بھی اسی طرف لگی ہوتی ہیں۔ دل بھی ہمہ تن ادھر ہی ہوتا ہے۔ صورت بھی عاجزوں کی سی بناتے ہیں اگر زبانی کچھ عرض کرنا ہوتا ہے تو کیسے ادب سے گفتگو کرتے ہیں اور اپنی عرض کے منظور ہونے کے لئے پورا زور لگاتے ہیں اور اس کا یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہم کو آپ سے پوری امید ہے کہ ہماری درخواست پر پوری توجہ فرمائی جائے گی۔

دعا مانگنے کیلئے آداب و شرائطِ دعا کا خیال رکھنا چاہیئے۔ اس کی مثال ظاہری جسمانی علاج کی طرح ہے۔ بیمار، دوا کے ذریعہ شفایاب اسی وقت ہوسکتا ہے۔ جب کہ ان شرائط و ہدایات کو ملحوظ رکھے جو معالج نے بتائی ہیں اور ان چیزوں سے پرہیز کرے جن سے بچنے کا اس نے حکم دیا ہے محض دوا کا استعمال ہی کافی نہیں یہی حال اس روحانی علاج کا ہے قرآن و حدیث کی دعائیں باطن اور ظاہری امراض کے لئے اس وقت مفید ہوں گی جب کہ ان کے اثر کو قبول کرنے کی صلاحیت، واستعداد بھی مریض میں موجود ہو اور پرہیز و احتیاط کے ان تمام تقاضوں کو بھی پورا کرے۔ جو اس راہ میں ناگزیر ہیں

قبولیت دعا کے شرائط

(۱) اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات پر ایمان کامل

(۲) داعی کا دل اخلاص، انابت، حضور قلب اور سوز یقین سے معمور ہو۔ (مستدرک حاکم)

(۳) کبائر سے پرہیز کرے مثلاً مکر و فریب، غیبت، چغلی، حسد، تکبّر وغیرہ [1]

دعا کے باطنی اور ظاہری آداب

تضرع، خشوع، خضوع عاجزی وانکساری ہر ہر حرکت سے نمایاں ہو، دل اپنے رب کی عظمت و جلال سے بھرا ہو (صحاح ستہ مستدرک حاکم، نسائی)

(۲) اللہ کے فضل و کرم کی توقع اور عذاب کے اندیشہ سے ملے جلے جذبات (بیم و رجا) موجود ہوں۔ قرآن میں مومنین صالحین کی صفات میں خوف اور امید دونوں کا ساتھ ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ ان دونوں کی یکجائی سے انسان میں توازن اور اعتدال پیدا ہو سکتا ہے۔ ابن قیم نے اس حقیقت کو ایک لطیف مثال کے ذریعہ واضح کیا ہے یوں سمجھنا چاہیئے کہ اس دنیا کے سفر میں خوف بمنزلہ کوڑے اور تازیانے کے ہے اور امید حدی خوانی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس سے سفر کی مشقتیں بآسانی برداشت

---

[1] روایت مسلم والترمذی عن ابی ہریرہؓ

ہوسکتی ہیں۔ محبت سواری کی تکمیل ہے اگر سوار کے پاس سواری کو قابو میں رکھنے کے لئے کوڑا نہ ہو تو سیدھی راہ سے ہٹنے کا اندیشہ قوی ہے۔ اس کے خوف کے تازیانے کے بغیر حدود الٰہیہ کی حفاظت ناممکن اور گمراہی یقینی ہے۔ خوف رجا اور محبت سے جو دل بھی خالی ہوگا۔ اس کی اصلاح کی توقع ناممکن ہے اور جس قدر یہ صفات کمزور ہوں گی اسی قدر ایمان کمزور ہوگا۔

(۳) دعا میں جہاں تک ہوسکے اخفا سے کام لیا جائے۔[۱] حسن بصریؒ کہتے ہیں کہ سرّی اور جہری دعا کے درمیان ستر گنا فرق ہے اس لئے کہ سرّی دعا ایمان و یقین کو پختہ کرتی ہے۔ ادب و تعظیم اور خشوع و خضوع کے لئے بھی یہ طریقہ زیادہ موزوں ہے اس کے علاوہ اس شکل میں ریاکاری اور نمائش پسندی کے بجائے اخلاص کا پہلو زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ نیز پست آواز کی شکل میں شیطانی وساوس و موانع اور رکاوٹوں سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ خدا کی سب سے بڑی نعمت یہ ہے کہ بندہ اپنے ربّ کی طرف کامل یکسوئی اور پوری توجہ کے مواقع حاصل کرسکے۔ یہ بھی واضح رہے کہ کوئی نعمت خواہ چھوٹی ہو یا بڑی حاسدوں کی نگاہ سے نہیں بچ سکتی۔ پھر اس اعلیٰ نعمت پر حاسدین کا پیدا ہو جانا بعید از قیاس نہیں۔ ایسی صورت میں حاسد کی شرر بار نگاہوں سے بچنے کی شکل یہی ہوسکتی ہے کہ اس نعمت کو پوشیدہ رکھا جائے اور اس کا چرچا نہ کیا جائے۔

(۴) دعا مانگنے میں حد سے تجاوز نہ کیا جائے۔ یہ ادب قرآن کے ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے۔ انہ لا یحب المعتدین (البقرہ ۱۹۰) اس اعتدا کی کئی صورتیں ہوسکتی ہیں۔

ا۔ دعا میں ایسی چیزیں طلب کرنا جن کا داعی اہل نہیں ہے مثلاً انبیاء کرام کے درجات و مراتب مانگنا۔

ب۔ حرام کاموں پر نصرت طلب کرنا۔

ج۔ اللہ تعالیٰ سے ایسی آرزو کرنا جو پوری نہیں ہوسکتی۔ مثلاً قیامت تک کی زندگی، یا بشری ضرورت سے بے نیازی حاصل کرنا۔

د۔ ابن جریحؒ کا قول ہے کہ چلاّ چلاّ کر دعا مانگنا بھی اعتداء میں شامل ہے۔

ھ۔ سب سے بڑا اور خطرناک اعتداء یہ ہے کہ بندہ دعا و عبادت میں غیر خدا کو بھی شریک کرے اور ان سے اسی طرح مدد طلب کرے جس طرح خدا سے ہوتی ہے۔

و۔ دعا میں تضرع دعا جزی کے بجائے بے پروائی یا تغافل کا اظہار کیا جائے۔

۵۔ ان احوال و اوقات میں دعا مانگنے کا خاص طور پر اہتمام کیا جائے۔ جن میں دعا کے مقبول ہونے کی تصریح احادیث میں مذکور ہے۔

۶۔ فراخی ہو یا تنگ دستی ہر حال میں اپنے رب سے دعا طلب ہو۔ یہ انتہائی خودغرضی ہے کہ مصیبت اور پریشانی میں تو خدا کو پکارا جائے لیکن جب راحت و آرام ہو تو بھول جائے۔

---

[۱] تفسیر ابن کثیر

۷۔ دعا کے وقت اپنی حاجت اور ضرورت اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کرنے سے پہلے حمد و ثناء اور رسول اللہؐ پر درود بھیجنا ضروری ہے۔ دعا سے قبل دو رکعت کی ادائیگی بھی مسنون ہے۔

۸۔ خدا کی رحمت و نعمت خاص اپنے ہی لئے نہ کی جائے۔ اگر کوئی شخص امام ہے اور وہ دعا کرتے وقت مقتدیوں کو نظر انداز کر کے محض اپنا ہی خیال رکھتا ہے تو یہ طرزِ عمل خیانت کے ہم معنی ہے۔

۹۔ دعا میں اپنی ضرورت پیش کرنے سے پہلے اپنے گناہوں کا اعتراف ضروری ہے۔

۱۰۔ دعا کرتے وقت ہاتھ اٹھانا بھی مسنون ہے اور دعا کے بعد دونوں ہاتھوں کو چہرہ پر پھیر لینا بھی مسنون ہے

۱۱۔ دعا کے وقت آسمان کی طرف نگاہ اٹھانے سے منع کیا ہے۔

۱۲۔ دعائیہ کلمات کو بار بار دہرانا چاہیئے۔

۱۳۔ دعا کے خاتمہ پر آمین کہنا بھی مسنون ہے۔

اوقاتِ دعا

یوں تو اللہ تعالیٰ ہر وقت ہر آن اپنے بندوں کی فریاد سنتا ہے اور ان کی دعا قبول کرتا ہے لیکن کچھ خاص اوقات ایسے ہیں جن میں دعائیں بہت جلد مقبول ہوتی ہیں اور اپنا اثر دکھاتی ہیں۔

۱۔ سب سے زیادہ اعلیٰ اور مقبول ترین وقت رات کا پچھلا حصہ ہے۔ (مسند احمد)

۲۔ جمعہ کے دن میں ایک ساعت (ابوداؤد۔ نسائی۔ ابن ماجہ)

۳۔ شب قدر[1] ۴۔ اذان[2] ۵۔ اقامت کے وقت، ۶۔ اذان و اقامت کے درمیان[3]

۷۔ جہاد کی صف بندی کے وقت (طبرانی، ابن حبان، موطا)

۸۔ فرض نمازوں کے بعد (ترمذی، نسائی)

۹۔ سجدے کی حالت میں[4] ۱۰۔ تلاوتِ قرآن یا ختم قرآن مجید کے موقع پر[5]

۱۱۔ عرفہ کے دن[6] ۱۲۔ ماہ رمضان میں خصوصاً افطار کے وقت

۱۳۔ بارش کے وقت بارش میں کھڑے ہو کر۔

۱۴۔ ذکر الٰہی کے لئے مسلمان جمع ہوں تو یہ وقت قبولیت کے لئے ساز گار ہے۔

دعا کے مقامات

(۱) بیت اللہ شریف (۲) مسجد نبوی (۳) بیت المقدس (۴) رکن اور مقام ابراہیم کے درمیان ملتزم پہ (۵) صفا، مروہ پر (۶) مقام سعی (۷) میدان عرفات (۸) مزدلفہ (۹) تینوں جمرات کے پاس (۱۰) منیٰ (۱۱) میزاب کے نیچے (۱۲) مقام ابراہیم کے پیچھے۔

(۱) مظلوم و مضطر[1] (۲) باپ کی دعا بیٹے کے بارے میں (۳) مسافر[2] (۴) نیک اولاد کی

---

[1] ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، مستدرک [2] ابوداؤد۔ مستدرک [3] ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ [4] مسلم ابوداؤد، نسائی [5] ترمذی، طبرانی [6] ترمذی

مستجاب الدعوات دعا ماں باپ کے حق میں[۵]، روزہ دار[۶]، انصاف پسند حاکم کی دعا[۷]، مسلمان کی دعا اپنے غیر حاضر مسلمان کے لئے[۸]، گناہ سے توبہ کرنے والے کی دعا[۹]، آیت کریمہ پڑھنے کے بعد کی دعا[۱۰]، حاجی جب تک سفر میں ہوتا ہے[۱۱]، رات کو جاگنے والا اگر لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریک لہ، لہ الملک ولہ الحمد وھو علیٰ کل شئ قدیر پڑھ کر دعا کرے تو اس کی دعا قبول ہوتی ہے۔ (ترمذی - بخاری)

۲

فلسفۂ دعا[ؒ] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی میں جو کمالات جمع تھے ان کو دو شعبوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے (۱) عبدیت کاملہ اور (۲) نبوت جامعہ۔

عبدیت کا ظہور اور نتیجہ دعا ہے اور نبوت کا مظہر دعوت ہے۔ دعا کے لئے اس ہستی کے یقین کی ضرورت ہے۔ جس سے دعا کی جائے۔ پھر اس یقین کی کہ اس کو ہر طرح کی قدرت ہے اور دینے کے لئے اس کے پاس سب کچھ ہے۔ پھر اس یقین کی کہ اس کے سوا کوئی اور در نہیں۔ پھر اس یقین کی کہ وہ خود بھی دینا چاہتا ہے اور کوئی لے کر اتنا خوش نہیں ہوتا۔ جتنا وہ دے کر خوش ہوتا ہے۔ پھر اس یقین کی کہ مخلوق محتاج محض اور سرتا پا کشکول گدائی ہے۔ پھر اس یقین کی کہ وہ معبود اپنی ہر مخلوق سے دنیا کی ہر چیز سے یہاں تک کہ اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ وہ ہر ایک کی سنتا ہے اور ہر ایک کی ہر حال میں مدد کر سکتا ہے۔

جاہلیت کی تاریخ میں ہر یقین نایاب اور مضمحل ہو چکا تھا۔ یونانی فلسفہ کو "واجب الوجود" یا "مبداءِ اوّل" کی صفات سے جتنا گریز و انکار اور صفات کی نفی اور مجرد و بلا صفت ذات کے اثبات پر جتنا اصرار تھا۔ اس کے بعد اس کے حلقۂ اثر میں دعا و التجا کا کیا امکان باقی رہ جاتا تھا۔ اس کے مقابلہ میں مشرکانہ جاہلیت نے صفات الٰہیہ میں سے تقریباً ہر صفت کو کسی نہ کسی مخلوق کی طرف منسوب کر رکھا تھا۔ کوئی اختیار پر قادر تھا۔ کسی کے ہاتھ میں رزق تھا۔ کسی کا علم محیط و ہمہ گیر تھا اور "ہر غیب" اس کے لئے شہود تھا۔ ایسی حالت میں "الٰہ واحد" کی طرف رجوع کرنے اور اس کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے کا کوئی امکان نہیں۔

بہر حال یونانی فلسفہ نے (اس مسلک کی بنا پر جو اس نے صفات کے بارے میں اختیار کیا تھا) دعا و التجا کا دروازہ ہی بند کر دیا تھا۔ اور مشرکانہ جاہلیت نے (صفاتِ الٰہیہ کو مخلوقات کی طرف منسوب کر کے) دعا و التجا کا رُخ خدا سے موڑ کر بندوں کی طرف تبدیل کر دیا تھا۔ دونوں کا مجموعی نتیجہ یہ تھا کہ براہ راست خدا سے طلب و سوال اور دعا و التجا کا رواج تقریباً ختم ہو چکا تھا زمانۂ بعثت میں پورے پورے ملک اور وسیع علاقوں میں ایسے چند آدمی بھی ملنے مشکل تھے جن کو خدا سے دعا کرنے کی عادت اور اس کا سلیقہ ہو اور جو اس سے تسکین حاصل کرتے ہوں اور اسی کی دعوت دیتے ہوں۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محروم و محجوب انسانیت کو دوبارہ دعا کی دولت عطا فرمائی اور بندوں کو خدا سے

---

[۱] بخاری، مسلم، ابوداؤد، مسند احمد [۲] ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ [۳] ابوداؤد، ابن ماجہ [۴] مسلم [۵] ترمذی ابن ماجہ [۶] ایضاً [۷] ابوداؤد ابن ماجہ [ؒ] یہ حصہ مولانا ابوالحسن علی ندوی کے ایک مضمون کی تلخیص ہے جو ماہنامہ فاران کے سیرت نمبر طبع دوم جنوری ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا تھا۔

ہم کلام کردیا۔ دعا سے محرومی کا ایک بڑا سبب جاہلیت کا یہ غلط تصور تھا کہ خدا ہم سے بہت دور ہے۔ ہماری آواز وہاں کہاں پہنچ سکتی ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے یہ اعلان فرمایا اور یہ مژدہ سنایا کہ

واذا سالک عبادی عنی فانی قریب اجیب دعوۃ الداع اذا دعان (البقرہ ۱۸۶)

(اور جب آپؐ سے میرے متعلق سوال کریں تو میں نزدیک ہوں دعا کرنے والوں کی دعا سنتا ہوں)

آپؐ نے صرف اسی کو واضح نہیں کیا کہ بندہ اپنے مالک سے دعا کر سکتا ہے اور وہ اس کی مدد کر سکتا ہے۔ بلکہ آپؐ نے ثابت کیا کہ خدا کو دعا مطلوب ہے اور وہ اس سے خوش اور راضی ہوتا ہے بلکہ دعا نہ کرنے سے ناراض ہوتا ہے۔ دعا بندگی سے گریز اور استکبار و سرکشی کی علامت ہے آپؐ کے اس اعلان نے دعا کا پایہ کہیں سے کہیں پہنچا دیا اور اس کو بندگی کے فعل اضطراری کے درجہ سے اعلیٰ عبادت اور قرب کے مقام تک پہنچا دیا۔

وقال ربکم ادعونی استجب لکم ان الذین یستکبرون عن عبادتی سیدخلون جھنم داخرین (المومنون ۶۰)

(اور تمہارے رب نے فرمایا ہے کہ مجھے پکارو میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔ بیشک جو لوگ میری عبادت سے سرکشی کرتے ہیں۔ عنقریب ہی وہ ذلیل ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے)

پھر آپؐ نے اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ دعا کو مغفرت قرار دیا۔ دعا کو رحمت و برکت کے دروازے کی کلید قرار دیا۔ اس طرح دعا کا شعبہ جس کی زندگی میں کوئی جگہ نہیں رہی تھی۔ عبادات اور معابد بھی اس کے نور سے خالی ہو چکے تھے۔ دوبارہ تازہ ہوئے۔ نبوتِ محمدیؐ کی تجدید اور اس کا عملِ تکمیل اسی پر ختم نہیں ہوتا۔ آپؐ نے ہمیں دعا کرنا بھی سکھایا۔ آپؐ نے انسانیت کے خزانے کو اور دنیا کے ادب کو دعاؤں کے جواہرات سے مالا مال کر دیا۔ آپؐ نے اپنے مالک سے ان الفاظ میں دعا مانگی جن سے زیادہ موثر اور بلیغ الفاظ انسان لا ہی نہیں سکتا۔ یہ دعائیں مستقل معجزات اور دلائل نبوت ہیں۔ ان کے الفاظ شہادت دیتے ہیں کہ یہ ایک پیغمبر کی زبان سے نکلے ہیں۔ ان میں نبوت کا نور ہے، پیغمبر کا یقین اور عبد کامل کا نیاز ہے حدیث و سیرت کے دفتر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جو دعائیں منقول ہیں ان پر نظر ڈالیے کیا کوئی بڑے سے بڑا ادیب اپنی بے بسی اور کمزوری کا نقشہ کھینچنے کے لئے اور دریائے رحمت کو جوش میں لانے کے لئے اس سے زیادہ جامع الفاظ لا سکتا ہے۔

میدانِ عرفات میں ایک لاکھ چوبیس ہزار کفن بردوش انسانوں کا مجمع ہے۔ لبیک کی دعاؤں اور صداؤں سے فضا گونج رہی ہے۔ خدا کی شان بے نیازی اور عظمت و جبروت کا نقشہ سامنے ہے، انسانوں کے اس جنگل میں ایک برہنہ سر احرام پوش ایسا بھی ہے جس کے کاندھوں پر ساری انسانیت کا بار ہے۔ جو ہر دیکھنے والے سے زیادہ خدا کی عظمت و جلال کا مشاہدہ کر رہا ہے اور ہر جاننے والے سے زیادہ انسان کی درماندگی بے وقعتی اور بے بسی سے واقف ہے۔ اس پُر تاثیر اور پُر ہیبت فضا میں اس کی آواز بلند ہوتی اور سننے والے سنتے ہیں۔

اللھم انك تسمع کلامی وتری مکانی وتعلم سری وعلانیتی لا یخفی علیك شئ من امری وانا البائس الفقیر المستغیث المستجیر الوجل المشفق المقر المعترف بذنبہ اسألك مسئلة المسکین وابتھال المذنب الذلیل وادعوك دعاء الخائف الضریر دعاء من خضعت لك رقبتہ وفاضت عبرتہ وذل لك جسمہ ورغم لك انفہ اللھم لا تجعلنی بدعائك شقیا وکن بی رؤفا رحیما یا خیر المسئولین ویا خیر المعطین (کنز العمال عن ابن عباس)

اے اللہ تو میری بات کو سنتا ہے اور میری جگہ کو دیکھتا ہے اور میرے پوشیدہ اور ظاہر کو جانتا ہے۔ تجھ سے میری کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی۔ میں مصیبت زدہ ہوں محتاج ہوں، فریادی ہوں، پناہ جو ہوں، پریشان ہوں، ترساں ہوں اپنے گناہوں کا اقرار کرنے والا ہوں۔ اعتراف کرنے والا ہوں۔ تیرے آگے سوال کرتا ہوں۔ جیسے بیکس سوال کرتے ہیں۔ تیرے آگے گڑگڑاتا ہوں۔ جیسے گناہ گار ذلیل وخوار گڑگڑاتا ہے۔ اور تجھ سے طلب کرتا ہوں، جیسے خوف زدہ آفت رسیدہ طلب کرتا ہے اور جیسے وہ شخص طلب کرتا ہے۔ جس کی گردن تیرے سامنے جھکی ہو اور اس کے آنسو بہہ رہے ہوں اور تن بدن سے وہ تیرے آگے فروتنی کئے ہوئے ہو اور اپنی ناک تیرے سامنے رگڑ رہا ہو۔ اے اللہ تو مجھے اپنے سے دعا مانگنے میں ناکام نہ رکھ اور میرے حق میں بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہو جا۔ اے سب مانگے جانے والوں سے بہتر۔ اے سب دینے والوں سے اچھے)

سب جانتے ہیں کہ ایک قوی اور غنی ذات، قادر مطلق، سلطانِ برحق، مالک الملک کو اپنی طرف متوجہ کرنے اور اس کی رحمت کو اپنی طرف کھینچنے کے لئے اپنی عجز و درماندگی اور اپنی بندگی و بیچارگی کے زیادہ سے زیادہ اور موثر سے موثر طریقے کی ضرورت ہوتی ہے اور اس اعتراف کی کہ ہم خاندانی و نسلی غلام، مملوک ابن مملوک اور اس درِ دولت اور آستانہ شاہی کے قدیمی نمک خوار و پروردہ نعمت ہیں۔ جان و مال ہر چیز کے آپ مالک ہیں۔ کوئی چیز آپ کے قبضہ قدرت سے باہر نہیں۔ ایسی حالت میں آپ ہی رحم نہ فرمائیں گے اور آپ ہی خبر نہ لیں گے تو کون لے گا۔ دیکھیے کسی دعا کے لئے اس سے بہتر تمہید اور مقصد کی کشائش کے لئے اس سے بہتر کلید کیا ہو سکتی ہے؟

اللھم انی عبدك وابن امتك ناصیتی بیدك ماض فی حکمك عدل فی قضاءك اسألك بکل اسم ھو لك سمیت بہ نفسك او انزلتہ فی کتابك او علمتہ احداً من خلقك او استأثرت بہ فی علم الغیب عندك ان تجعل القرآن العظیم ربیع قلبی ونور بصری وجلاء حزنی وذھاب ھمی۔ (طبری عن ابن مسعودؓ)

اے اللہ میں بندہ ہوں تیرا اور بیٹا ہوں تیرے بندے کا اور بیٹا ہوں تیری بندی کا ہمہ تن تیرے قبضہ میں ہوں نافذ ہے میرے بارے میں تیرا حکم اور عین عادل ہے میرے باب میں تیرا فیصلہ میں تجھے ہر اسم کے واسطے سے جس سے تو نے اپنی ذات کو موصوف کیا ہے اس کو اپنی کتاب میں اتارا ہے یا اسے اپنی مخلوق میں سے کسی کو بتایا ہے یا اپنے پاس اسے غیب ہی میں رہنے دیا ہے۔ درخواست کرتا ہوں کہ قرآن عظیم کو میرے دل کی بہار بنا دے اور میری آنکھ کا نور اور غم کی کشائش اور میری تشویش کا دفعیہ)

۳

دعائیں

(۱) اللھم ما اصبح لی من نعمة او باحد من خلقك فمنك وحدك لاشریك لك فلك الحمد ولك الشکر (ابوداؤد عن عبداللہ بن غنامؓ)

(اے اللہ جو چیز مجھ کو صبح کے وقت حاصل ہوئی ہے تیری نعمتوں میں سے یا کسی (دوسرے) کو تیری مخلوقات میں سے پس وہ صرف تیری طرف سے ہے تو ایک ہے کوئی تیرا شریک نہیں۔ ہر قسم کی تعریف تیرے ہی لئے ہے اور تیرے ہی لئے شکر ہے۔)

(۲) لا الٰہ الا اللہ العظیم الحکیم لا الٰہ الا اللہ رب العرش العظیم لا الٰہ الا اللہ رب السمٰوٰت ورب الارض ورب العرش الکریم۔ (البخاری ومسلم عن ابن عباسؓ)

(کوئی معبود نہیں مگر اللہ جو بزرگ اور بردبار ہے کوئی معبود اس کے سوا نہیں پروردگار ہے۔ عرش عظیم کا کوئی معبود اس کے سوا نہیں پروردگار ہے آسمانوں کا اور پروردگار ہے زمین کا اور پروردگار ہے عرش کریم کا)

(۳) اللھم انی اعوذبك من الھم والحزن واعوذبك من العجز والکسل واعوذبك من البخل والجبن واعوذبك من غلبة الدین وقھر الرجال۔

(ابوداؤد عن ابو سعید خدریؓ)

(اے اللہ میں تیرے ذریعہ پناہ مانگتا ہوں فکر اور غم سے اور پناہ مانگتا ہوں۔ عاجزی اور سستی سے اور پناہ مانگتا ہوں۔ بخل اور نامرادی سے اور پناہ مانگتا ہوں قرض کے غلبہ سے اور آدمیوں کے غلبہ سے)

(۴) اللھم انی اعوذبك من الاربع من علم لا ینفع ومن قلب لا یخشع ومن نفس لا تشبع ومن دعاء لا یسمع۔ (ابوداؤد، احمد، ابن ماجہ، ترمذی عن ابو ہریرہؓ)

(اے اللہ میں تیرے ذریعہ پناہ مانگتا ہوں، چار چیزوں سے اس علم سے جو نفع نہ دے اس دل سے جو عاجزی نہ کرے اس نفس سے جو سیر نہ ہو اس دعا سے جو سُنی نہ جائے۔)

(۵) اللھم انی اعوذبک من الفقر والقلة واعوذبک من ان اظلم او اظلم

(ابوداؤد۔ نسائی عن ابو ہریرہؓ)

(اے اللہ میں تیرے ذریعہ پناہ مانگتا ہوں۔ افلاس سے، نیکیوں کی کمی سے یا مال کی کمی سے اور ذلت سے پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ میں کسی پر ظلم کروں یا کوئی مجھ پر ظلم کرے)

۶۔ اللھم اصلح لی دینی الذی ھو عصمة امری واصلح لی دنیای التی فیھا معاشی واصلح آخرتی التی فیھا معادی واجعل الحیاة زیادة لی فی کل خیر واجعل الموت راحة لی من کل شر (مسلم عن ابو ھریرہؓ)

(اے اللہ درست کر دے میرا دین وہ دین جو میرے کاموں کا محافظ ہے اور درست کر دے میری دُنیا وہ دنیا جس میں میری زندگانی ہے اور درست کر دے میری آخرت جس کی طرف مجھے جانا ہے اور میری زندگی کو زیادہ

کردے جو سبب ہے نیکی کا اور بنا میرے لئے موت کو ہر برائی سے راحت و آرام کا سبب)

۷۔ اللھم اتنا فی الدنیا حسنة وفی الاخرة حسنة وقنا عذاب النار (بخاری مسلم عن انس)

(اے اللہ عطا فرما ہم کو دنیا میں نیکی اور آخرۃ میں نیکی اور بچا ہم کو دوزخ کے عذاب سے)

۸۔ اللھم اجعلنی اعظم شکرک واکثر ذکرک واتبع نصحک واحفظ وصیتک

(ترمذی عن ابوہریرہؓ)

(اے اللہ مجھ کو ایسا بنا دے کہ میں کروں بڑا شکر تیرا اور بہت کروں ذکر تیرا اور پیروی کروں تیری نصیحت کی اور یاد رکھوں میں وصیت تیری)

۹۔ اللھم طھر قلبی من النفاق وعملی من ریاء ولسانی من الکذب وعینی من الخیانة فانك تعلم خائنة الاعین وما تخفی الصدور (بیہقی عن ام معبدؓ)

(اے اللہ پاک کر میرے دل کو نفاق سے اور میرے عمل کو ریا سے اور میری زبان کو جھوٹ سے میری آنکھوں کو خیانت سے بے شک تو آنکھوں کی خیانت کو جانتا ہے اور اس چیز کو بھی جس کو چھپاتے ہیں دل)

۱۰۔ اللھم انی اعوذبك من الجوع فانه بئس الضجیع واعوذبك من الخیانة فانھا بئست البطانة (ابوداؤد، نسائی۔ ابن ماجہ عن ابوہریرہؓ)

(اے اللہ میں تیرے ذریعہ پناہ مانگتا ہوں بھوک اور فاقہ سے کہ وہ بدترین خواب ہے اور پناہ مانگتا ہوں خیانت سے کہ وہ بدترین اندرونی عادت ہے)

۱۱۔ اللھم انی اعوذبك من زوال نعمتك وتحول عافیتك وفجاءة نقمتك وجمیع سخطك

(مسلم عن عبد اللہ بن عمر)

(اے اللہ میں تیرے ذریعہ پناہ مانگتا ہوں تیری نعمت کے زوال سے تیری عافیت کی تبدیلی سے اور تیرے ناگہانی عذاب سے اور تیرے تمام غضب سے)

۱۲۔ اللھم لك اسلمت وبك آمنت وعلیك توكلت والیك انبت وبك خاصمت اللھم انی اعوذ بعزتك لا الٰہ الا انت ان تضلنی انت الحی الذی لا یموت والجن والانس یموتون (بخاری مسلم عن ابن عباسؓ)

اے اللہ تیری اطاعت کی میں نے تجھ پر ایمان لایا میں۔ تجھ پر بھروسہ کیا میں نے اور تیری طرف رجوع کیا میں نے اور تیری مدد سے لڑتا ہوں میں۔ اے اللہ تیری عزت کے ذریعہ پناہ چاہتا ہوں (نہیں ہے کوئی معبود مگر تو) اس سے کہ گمراہ کرے تو مجھ کو تو زندہ ہے۔ ایسا زندہ کہ نہ مرے گا اور جن و انسان مریں گے۔

۱۳۔ اللھم اھدنی لاحسن الاعمال واحسن الاخلاق لا یھدی لاحسنھا الا انت وقنی سئی الاعمال وقنی الاخلاق لا یقی سیئھا الا انت (نسائی عن جابرؓ)

اے اللہ مجھے بہترین اعمال اور بہترین اخلاق کی توفیق و رہنمائی فرما بہترین اعمال و اخلاق کی توفیق و رہنمائی فرما سکتا ہے

اور مجھے بُرے اعمال و اخلاق سے بچا۔ بُرے اعمال و اخلاق سے تو ہی بچا سکتا ہے)

۱۴۔ اللھم انی اسئالک نعیما لا ینفد و قرۃ عین لا تنقطع و اسئلک الرضاء بالقضاء و برد العیش بعد الموت و لذۃ النظر فی وجھک والشوق الی لقائک (مستدرک عن عامر بن یاسر)

اے اللہ تجھ سے ایسی نعمت مانگتا ہوں جو ختم نہ ہو اور ایسی آنکھوں کی ٹھنڈک جو جاتی نہ رہے اور میں تجھ سے مانگتا ہوں تیرے حکم (تکوینی) پر رضامند رہنا اور موت کے بعد خوش عیشی اور تیرے دیدار کی لذت اور تیری دید کا شوق)

۱۵۔ اللھم انی اسئالک فعل الخیرات و ترک المنکرات وحب المساکین (مستدرک حاکم عن ثوبان)

(اے اللہ میں تجھ سے توفیق چاہتا ہوں نیکیوں کے کرنے کی اور برائیوں کے چھوڑنے کی اور غریبوں کے ساتھ محبت کی)

۱۶۔ اللھم اجعلنی صبورا واجعلنی شکورا واجعلنی فی عینی صغیرا و فی اعین الناس کبیرا

(اے اللہ مجھے بڑا صبر کرنے والا بنا دے اور مجھے میری نظر میں چھوٹا بنا دے اور دوسروں کی نظر میں بڑا بنا دے) (کنز العمال عن بریدہؓ)

۱۷۔ اللھم اجعل اوسع رزقک علی عند کبر سنی و انقطاع عمری۔ (مستدرک عن عائشہؓ)

(اے اللہ میری سب زیادہ کشادہ روزی میرے بڑھاپے اور میرے خاتمہ کے وقت کر)

۱۸۔ اللھم اغفرلی ذنبی و وسع فی داری و بارک لی فی رزقی (النسائی عن ابوموسیٰ اشعریؓ)

اے اللہ میرے گناہ بخش دے اور میرے گھر میں وسعت دے اور میرے رزق میں برکت دے)

۱۹۔ اللھم فاطر السموات والارض عالم الغیب والشھادۃ انت رب کل شیئ والملائکۃ یشھدون انک لا الہ الا انت فانا نعوذ بک من شر انفسنا و من شر الشیطان الرجیم و شرکہ و ان تعترف سوء او نجرہ الی مسلم (جمع الفوائد عن ابی مالکؓ)

(اے اللہ آسمانوں اور زمینوں کے خالق غیب و شہود کے جاننے والے تو ہر چیز کا مالک ہے اور فرشتے بھی گواہی دیتے ہیں کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں ہم تجھ سے اپنے نفس کی بُرائی سے اور شیطان کی برائی سے اور شیطان رجیم کے شر اور شرکت سے پناہ چاہتے ہیں اور اس سے کہ ہم اپنے حق میں کسی شرک کا ارتکاب کریں یا کسی مسلمان تک پہنچائیں)

۲۰۔ اللھم قنی شر نفسی واعظم لی علی رشد امری (ابو داؤد عن ابن عمر)

(اے اللہ مجھے میرے نفس کی برائی سے محفوظ رکھ اور مجھے میرے امور کی اصلاح کی ہمت دے)

۲۱۔ اللھم اقسم لنا من خشیتک ما تحول بہ بیننا و بین معاصیک و من طاعتک ما تبلغنا بہ جنتک و من الیقین ما تھون بہ علینا مصائب الدنیا (ترمذی عن ابن عمرؓ)

(اے اللہ ہمیں اپنی خشیت سے اتنا حصہ دے کہ ہمارے اور گناہوں کے درمیان حائل ہو جائے اور اپنی اطاعت سے اتنا حصہ کہ تو ہمیں اس کے ذریعہ سے جنت میں پہنچا دے اور یقین سے اتنا حصہ کہ اس سے تو ہم پر دنیا کی مصیبتیں آسان کر دے)

۲۲ - لا تجعل الدنیا اکبر ھمنا ولا مبلغ علمنا و لا غایۃ رغبتنا ولا تسلط علینا من لا یرحمنا

(ترمذی ونسائی عن ابن عمرؓ)

دنیا کو ہمارا مقصود اعظم نہ بنا اور نہ ہمارے معلومات کی انتہا اور نہ ہماری رغبت کی منزل مقصود اور ہم پر اس کو حاکم نہ کر جو ہم پر نامہربان ہو۔

۲۳ - اللھم اجعل حبک احب الاشیاء الی و اجعل خشیتک اخوف الاشیاء عندی واقطع عنی حاجات الدنیا بالشوق الی لقاءک واذا اقررت اھل الدنیا من دنیاھم فاقرر عینی من عبادتک (کنز العمال عن ابی بن مالکؓ)

(اے اللہ اپنی محبت کو میرے لئے تمام چیزوں سے محبوب تر اور اپنے ڈر کو میرے لئے تمام چیزوں سے خوفناک تر بنا دے اور مجھے اپنی ملاقات کا شوق دے کر دنیا کی حاجتیں مجھ سے قطع کر دے اور جہاں تو نے دنیا والوں کی آنکھیں ان کی دنیا سے ٹھنڈی کر رکھی ہیں۔ میری آنکھ اپنی عبادت سے ٹھنڈی رکھ۔

۲۴ - اللھم ارزقنی حبک وحب من ینفعنی حبہ عندک اللھم ارزقتنی فیما احب فاجعلہ قوۃ لی فیما تحب اللھم وما زویت عنی مما احب فاجعلہ فراغاً لی فیما تحب۔ (ترمذی عن عبد اللہ بن زیدؓ)

اے اللہ مجھے اپنی محبت نصیب کر اور اس شخص کی بھی محبت جس کی محبت تیرے نزدیک میرے حق میں نافع ہو یا اللہ جس طرح تو نے مجھے وہ دیا جو مجھے پسند ہے۔ اسے میرا معین بھی اس کام میں بنا دے جو مجھے پسند ہے۔ اے اللہ تو نے جو دور رکھا ہے مجھ سے جو مجھ کو پسند ہیں تو اسے میرے حق میں ان چیزوں کے لئے موجب فراغ بنا دے جو تجھے پسند ہیں۔

۲۵ - اللھم انی اسالک صحۃ فی ایمانٍ وّ ایماناً فی حسنِ خُلقٍ و نجاحاً تُتْبِعُہٗ فلاحاً وّ رحمۃ منک وعافیۃً ومغفرۃ منک ورضوانا۔ (نسائی وحاکم عن انس)

(اے اللہ میں مانگتا ہوں تجھ سے تندرستی ایمان کے ساتھ اور ایمان حسن خلق کے ساتھ اور کامیابی جس کے پیچھے فلاح بھی دے تو مجھے اور رحمت تیری طرف سے اور امن اور بخشش تیری طرف سے اور خوشنودی)

۲۶ - اللھم اجعل خیر عمری آخرہ وخیر عملی خواتیمہ وخیر ایامی یوم القاک فیہ (طبرانی عن انس)

اے اللہ میری عمر کا بہترین اس کا آخری حصہ کرنا اور میرا بہترین عمل میرا آخر ترین عمل کرنا اور میرا بہترین دن وہ کرنا جس میں تجھ سے ملوں)

۲۷ - اللھم اغفرلی خطیئتی وجھلی واسرافی فی امری وما انت اعلم بہ منی اللھم اغفرلی جدی و ھزلی وخطائی وعمدی وکل ذالک عندی اللھم اغفرلی ما قدمت وما اخرت وما اسررت وما اعلنت وما انت اعلم بہ منی انت المقدم وانت المؤخر وانت علی کل شیءٍ قدیر (بخاری ومسلم عن ابو موسٰی اشعریؓ)

(اے اللہ بخش دے میری خطا کو، میری نادانی کو، کاموں میں میری زیادتی کو اور اس گناہ کو جس کا علم مجھ سے زیادہ تجھ کو ہے یا اللہ بخش دے میری اس بات کو جس کو میں نے ارادہ اور سنجیدگی کے ساتھ کیا ہو اور اس بات کو جو ہنسی دل لگی میں کی ہو اور ان باتوں کو جو دانستہ یا نادانستہ کی ہوں اور یہ تمام باتیں مجھ سے ہیں۔ اے اللہ تو بخش دے میرے پہلے گناہ کو پچھلے گناہوں کو مخفی گناہوں کو، ظاہر گناہوں کو ان گناہوں کو جن کا علم مجھ سے زیادہ تجھ کو ہے۔ تو ہی آگے بڑھانے والا ہے اور تو ہی پیچھے ہٹانے والا ہے اور تو ہی ہر چیز پر قادر ہے)

۲۸۔ اللھم زدنا ولا تنقصنا وکرمنا ولا تھنا واعطنا ولا تحرمنا واثرنا ولا تؤثر علینا وارضنا وارض عنا

(احمد، ترمذی عن عمر بن خطابؓ)

اے اللہ زیادہ کر (دنیا اور آخرت کی نعمتیں) اور (ان میں) کمی نہ کر اور عزت سے رکھ ہم کو (دنیا و آخرت میں) اور ذلیل کر ہم کو اور عطا کر ہم کو (دنیا اور آخرت کی بھلائی) اور نہ محروم رکھ (اس سے) اور مخصوص کر ہم کو (اپنی رحمت و عنایت کے ساتھ) اور نہ مخصوص کر ہمارے مقابلہ میں غیر کو اور راضی کر ہم کو اور راضی ہو ہم سے)

۲۹۔ اللھم لعلمک والغیب وقدرتک علی الخلق احینی ما علمت الحیوۃ خیراً لی وتوفنی اذا علمت الوفاۃ خیرا لی اللھم واسئلک فی الغیب والشھادۃ واسئلک کلمۃ الحق فی الرضی والغضب واسئلک القصد فی الفقر والغنی واسئلک نعیما لا ینفد واسئلک قرۃ عین لا ینقطع واسئلک الرضا بعد القضا واسئلک برد العیش بعد الموت واسئلک لذۃ النظر الی وجھک والشوق الی لقائک فی غیر ضرا مضرۃ ولا فتنۃ مضلۃ اللھم زینا بزینۃ الایمان

(نسائی عن عطاء بن سائبؓ)

(اے اللہ بحق اپنے علم غیب کے اور بحق اپنی قدرت کے مخلوق پر مجھ کو زندہ رکھ اس وقت تک جب تک کہ میری زندگی میرے لئے بہتر ہو اور موت دے تو مجھ کو اس وقت جب کہ تو میرے لئے موت کو بہتر جانتا ہو اے اللہ اور مانگتا ہوں میں تجھ سے تیرا خوف ظاہر و باطن میں اور مانگتا ہوں میں تجھ سے کہنا کلمہ حق کا خوشی اور ناراضگی میں اور مانگتا ہوں تجھ سے میانہ روی افلاس اور خوشحالی کی حالت میں اور مانگتا ہوں تجھ سے ایسی نعمت جو کبھی ختم نہ ہو اور مانگتا ہوں تجھ سے ٹھنڈک آنکھ کی جو کبھی ختم نہ ہو اور مانگتا ہوں تجھ سے شوق تیری ملاقات کا ایسا شوق کہ حرز نہ بن جائے اور نہ گمراہی کے فتنہ میں ڈالے اے اللہ ہم کو ایمان کی زینت کے ساتھ زینت دے۔

۳۰۔ اللھم اغفرلی وارحمنی واھدنی وعافنی وارزقنی (مسلم عن ابو مالک اشجعیؓ)

(اے اللہ مجھ کو بخش دے۔ مجھ پر رحم فرما۔ مجھ کو ہدایت دے مجھ کو عافیت سے رکھ اور مجھ کو رزق عطا فرما۔

۳۱۔ اللھم قنی عذابک یوم تجمع عبادک او تبعث عبادک (ترمذی۔ احمد عن حذیفہؓ)

(اے اللہ بچا تو مجھ کو عذاب سے اس روز جب کہ تو اپنے بندوں کو جمع کرے۔ یعنی قیامت کے دن یا اس دن کہ تو بندوں کو قبر سے اٹھا لے)

۴۲ - سبحان اللّٰہ وبحمدہٖ لا قوۃ الا باللّٰہ ما شاء اللّٰہ کان وما لم یشأ لم یکن اعلم ان اللّٰہ علی کل شیئٍ قدیر وان اللّٰہ قد احاط بکل شیئٍ علماً (ابوداؤد)

پاک ہے خدا سے لئے اور ہر قسم کی تعریف اسی کو زیبا ہے اور حمد و تسبیح کی قوت نہیں ہے۔ (ہم میں) مگر اللّٰہ کی مدد سے جو کچھ اللّٰہ نے چاہا ہوا اور جو نہ چاہا نہ ہوا اور اللّٰہ ہر چیز پر قادر ہے اور اللّٰہ کا علم ہر چیز کو محیط ہے۔

(مسلم عن عبداللّٰہ بن مسعودؓ)

۴۳ - اللّٰھم انی اسئالک الھدی والتقی والعفاف والغنیٰ

(اے اللّٰہ میں طلب کرتا ہوں تجھ سے ہدایت پرہیزگاری، پاک دامنی اور بے پرواہیؓ)

۴۴ - اللّٰھم اٰت نفسی تقوٰھا وزکّھا وانت خیر من زکّٰھا انت ولیھا و مولاھا۔

(بخاری ومسلم، ترمذی و نسائی و ابن ابی شیبہ عن زید بن ارقمؓ)

یا اللّٰہ میرے نفس کو پرہیزگاری عطا فرما اور اسے تو پاک کر دے۔ تو ہی سب سے بہتر اس کو پاک کرنے والا ہے تو ہی اس کا مالک اور اس کا آقا ہے)

۴۵ - اسألک علماً نافعاً (ابن حبان عن جابرؓ)

(میں تجھ سے ایسا علم مانگتا ہوں جو کارآمد ہو۔)

۴۶ - اللّٰھم اغفرلی ذنوبی وخطئی وعمدی (طبرانی عن ابن عباسؓ)

اے اللّٰہ بخش دے میرے گناہ نادانستہ یا دانستہ

۴۷ - اللّٰھم مصرف القلوب صرف قلوبنا علیٰ طاعتک (مسلم ونسائی عن عبداللّٰہ بن عمروؓ)

(اے اللّٰہ پھیرنے والے دلوں کے پھیر دے ہمارے دل اپنی اطاعت کی طرف۔

۴۸ - اللّٰھم انی اسالک رزقاً طیباً وعلماً نافعاً وعملاً متقبلاً (طبرانی وابن السنی عن ام سلمہؓ)

(اے اللّٰہ میں مانگتا ہوں تجھ سے پاکیزہ رزق کارآمد علم اور عمل مقبول)

۴۹ - اللّٰھم اجعل فی قلبی نوراً وفی بصری نوراً وفی سمعی نوراً وعن یمینی نوراً وعن شمالی نوراً وخلفی نوراً ومن امامی نوراً واجعل لی نوراً وفی عصبی نوراً وفی لحمی نوراً وفی دمی نوراً وفی شعری نوراً وفی بشری نوراً وفی لسانی نوراً واجعل فی نفسی نوراً واعظم لی نوراً واجعلنی نوراً واجعل من فوقی نوراً ومن تحتی نوراً اللّٰھم اعطنی نوراً

(بخاری ومسلم والبوداؤد ونسائی و ابن ماجہ وحاکم عن ابن عباسؓ)

(یا اللّٰہ کر دے میرے دل میں نور اور میری بینائی میں نور اور میری شنوائی میں نور اور میرے داہنی طرف نور اور بائیں طرف نور اور میرے پیچھے نور اور میرے سامنے نور اور کر دے میرے لئے خاص نور اور میرے پٹھوں میں نور اور میرے گوشت میں نور اور میرے خون میں نور اور میرے بالوں میں نور اور میرے پوست میں نور اور میری زبان میں نور اور کر دے میری جان میں نور اور دے مجھے نور عظیم اور کر دے مجھے سراپا نور اور کر دے میرے اوپر نور اور میرے نیچے نور، یا اللّٰہ دے مجھے نور۔

رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ

اللہ اُن سے خوش رہا اور وہ اللہ سے خوش رہے ، یہی بڑی کامیابی ہے ۔

(المائدۃ : ۱۱۹)



جانِ نثارانِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم

خلفاء رضی اللہ عنہم

مواخاتِ صحابہؓ

ڈاکٹر نثار احمد

مواخاۃ کے لغوی معنی ہیں آپس میں بھائی چارہ کرنا۔ لیکن ہم یہاں جس "مواخاۃ" کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں اس سے مراد وہ "مواخاۃ" ہے جس کا انعقاد مہاجرین و انصار (رضی اللہ عنہم) کے درمیان بر بنائے حق، مواساۃ اور توارث[1] اس وقت ہوا جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ سے ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لائے۔

مدینہ طیبہ میں تشریف آوری کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جن گوناگوں مسائل کا سامنا کرنا پڑا، اور جن مشکلات پر قابو پانے کے لئے آپ نے فوری تدابیر اختیار فرمائیں ان میں مندرجہ ذیل خاص ہیں۔

(۱) مہاجرین مکہ کی معاشی آسودگی اور آبادکاری کا انتظام۔

(۲) مدینہ میں بسنے والے مختلف عناصر سے تعلقات۔

(۳) اسلام کی اشاعت و تبلیغ کا اہتمام اور۔

(۴) اسلامی جماعت کی سالمیت اور اتحاد کو برقرار رکھنے کا مسئلہ۔

ان کو حل کرنے کے لئے آپ نے جو ابتدائی اقدامات فرمائے ان میں سے ایک مسجد نبوی کی تعمیر، دوسرے مواخاۃ کا قیام، اور تیسرے میثاق مدینہ، انتہائی اہم ہیں۔ ان تینوں اقدامات میں کوئی زمانی ترتیب حتمی طور پر قائم کرنا اگرچہ مشکل ہے لیکن یہ بات طے ہے کہ یہ اقدامات سلہ میں ہی کیے گئے۔ البتہ اصحاب سیر نے جس انداز سے ان کا ذکر کیا ہے اس میں اختلافات پائے جاتے ہیں مثلاً متقدمین میں سے ابن ہشام[2] نے پہلے مسجد نبوی کی تعمیر پھر میثاق مدینہ، اور پھر مواخاۃ سے بحث کی ہے متاخرین میں سے ابن خلدون[3] نے ٹھیک اسی ترتیب کا اتباع کیا ہے جبکہ بعض مورخین ایسے ہیں جنہوں نے پہلے مسجد نبوی، پھر مواخاۃ، اور اس کے بعد میثاق مدینہ کو رکھا ہے۔ مثلاً ہمارے ہاں علامہ شبلی نے یہی ترتیب برقرار رکھی ہے[4] جبکہ ابن سعد نے نئی ترتیب یہ قائم کی ہے کہ پہلے مواخاۃ پھر بناء مسجد سے بحث

۱۔ کتاب المحبر صفحہ ۱، از علامہ محمد بن حبیب بغدادی م ۲۴۵ھ مطبعۃ دائرۃ المعارف دکن ۱۹۴۲ء

۲۔ دیکھئے ابن ہشام صفحہ ۴۹۸ تا صفحہ ۵۰۳ ج ۱۔ مطبوعہ مطبع محمد علی صبیح۔ ازھر (مصر)

۳۔ دیکھئے ابن خلدون صفحہ ۱۶، ۱۷، ج ۲ تاریخ۔ طبع مصر۔ بتصحیح نصر ابوالوفا الہورینی۔ ذی الحجہ ۱۳۸۴ھ (بولاق)

۴۔ دیکھئے سیرۃ النبی حصہ اول۔ مطبع معارف اعظم گڑھ، طبع ششم صفحہ ۲۷۶ تا صفحہ ۲۹۴

کی ہے ہمیں مدینہ کی مخصوص صورت حال اور مسائل کی نوعیت کے اعتبار سے دوسری ترتیب ہی زیادہ صحیح اور مرجح معلوم ہوتی ہے۔ یعنی پہلے مسجد نبوی کی تعمیر اور اس کے بعد مواخاۃ مدینہ۔ لیکن یہاں یہ تصریح غیر مناسب نہ ہو گی کہ اگرچہ مسجد کی تعمیر پہلا قدم ہے تاہم تعمیر کا کام کئی ماہ کی مدت پر پھیلا ہوا ہے۔ چنانچہ ابن ہشامؒ نے لکھا ہے کہ حضرت ابوایوب انصاری کے مکانؓ میں ٹھہرنے کے فوراً بعد آپ نے مسجد بنانے کا منصوبہ بنایا اور پھر زمین خرید کر تعمیر کا آغاز بھی کر دیا۔ پھر ابن اسحاق کے حوالے سے وہ آگے لکھتا ہے کہ "ماہ ربیع الاوّل میں حضورؐ مدینہ کے اندر رونق افروز ہوئے اور اس کے نویں مہینے صفر میں آپ کی مسجد اور مکان بن کر تیار ہوا۔[۳]" اور ظاہر ہے کہ ان تعمیرات کے مکمل ہونے کے بعد آپ دار ایوب سے مسجد (نبوی) میں منتقل ہوئے۔ ابن ہشام نے تعمیر کے سلسلہ میں نو ماہ کی جس مدت کا ذکر کیا ہے بعض متاخرینؒ نے اس سے اختلاف کرتے ہوئے یہ مدت سات ماہ بھی لکھی ہے۔ بہرحال مسجد نبوی اور حجرات کی تعمیر میں اتنا عرصہ لگنا بالکل قرین قیاس ہے۔ کیونکہ مسجد نبوی اپنی انتہائی سادہ شکل اور غیر مزین ہونے کے باوجود تقریباً ڈھائی ہزار مربع گز پر محیط تھی۔

اب جہاں تک مواخاۃ کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں بعض مورخین نے یہ تصریح کی ہے کہ مواخاۃ کا واقعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ تشریف لانے کے پانچویں مہینے یعنی رجب سلہ میں پیش آیا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ مسجد نبوی کی تعمیر مکمل ہونے سے پہلے مواخاۃ کا انعقاد ہو۔ اس اعتبار سے ابن سعد کی ترتیب صحیح ہو جاتی ہے اور اس کا ایک قرینہ یہ بھی موجود ہے کہ یہ مواخاۃ حضرت ابوطلحہ انصاریؓ یعنی حضرت انس بن مالکؓ کے گھر پر کرائی گئی جس کی وجہ غالباً ایک تو حضورؐ کی قیام گاہ سے قربت ہو سکتی ہے اور دوسری یہ کہ اس وقت تک مسجد نبوی کی تکمیل نہ ہوئی تھی۔ ورنہ یہ مواخاۃ بھی یقیناً مسجد نبوی میں کرائی جاتی۔ اس اعتبار سے ہم مسجد نبوی کی تعمیر اور مواخاۃ دونوں کو ایک ہی زمانے میں پاتے ہیں اور اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ یہ دونوں واقعات آمد مدینہ کے فوراً بعد ہوئے اور میثاق مدینہ سے یقیناً تقدم زمانی رکھتے ہیں۔

تعین زمانی کے بعد مواخاۃ کے سلسلے میں دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ متذکرہ بالا عقد مواخاۃ "کن مصالح کے پیش نظر قرار پایا اور کون کون سے فائدے اس سے حاصل ہوتے۔ علامہ محمد ابن حبیب نے اپنی کتاب المحبر[۵] میں لکھا ہے کہ: آخی بین المهاجرين والانصار على الحق والمواساة وان يتوارثوا بعد الممات صاحب روض الانف امام سہیلی م ۵۸۱ھ لکھتے ہیں: ليذهب عنهم وحشة الغربة ويؤنسهم من مفارقة الاهل والعشيرة ويشد ازر بعضهم ببعض[۶] اور علامہ ابن کثیر، م ۷۷۴ھ نے لکھا ہے: لاجل ارتفاق بعضهم من بعض وليتالف قلوب بعضهم

۱۔ الطبقات الکبریٰ۔ ج ا صفحہ ۲۲۸، ۲۲۹ دار بیروت للطباعة والنشر بیروت ۱۹۶۰ء

۲۔ ابن ہشام صفحہ ۲۹۸ ۳۔ ایضاً صفحہ ۳۰۰

۴۔ مثلاً ابن قیم دیکھیے زاد المعاد ج ا صفحہ ۲۵ الطبعة الثانیہ ۱۹۵۰ء مصطفیٰ البابی، مصر

۵۔ صفحہ ۱۷

۶۔ الروض الانف د شرح السیرۃ النبویة لابن ہشام ج ۲ ازابی القاسم عبدالرحمٰن بن عبداللہ السہیلی۔ الجزء الثانی صفحہ ۱۸ مطبع جمالیہ، مصر ۱۹۱۴ء

علی بعض لہ

مطلب واضح ہے۔ چونکہ مہاجرین اپنا گھر بار، عزیز و اقارب، اموال و اولاد اور مولد و وطن سب کچھ چھوڑ کر اور راہِ حق میں لٹا کر مدینہ پہنچے تھے اس لئے ضرورت اس بات کی تھی کہ ان کی دلدہی کی جائے، ان کی تالیفِ قلب کی جائے۔ ان کی غریب الوطنی اور غریب الدیاری کے فطری احساس کو دور کیا جائے[1] اسی لئے ان کا انصار سے رشتۂ اخوت استوار کیا گیا۔ اس میں یہ مصلحت بھی تھی کہ اس طرح ایک دوسرے کا بھائی بن جانے سے فریقین کو ایک دوسرے سے تقویت اور امداد بہم پہنچے گی۔

اگرچہ بادی النظر میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ مہاجرین و انصار کے درمیان مواخاۃ کا یہ عمل ایک عارضی اور وقتی عمل تھا جو مہاجرین کو مدینہ کے ماحول سے مانوس کرنے اور ان کی دلدہی و پاسِ خاطر کے تحت کیا گیا تھا۔ لیکن بنظرِ غائر دیکھا جائے تو حقیقت صرف اتنی ہی نہیں ہے بلکہ مواخاۃ کا یہ عمل اپنے دامن میں چند مستقل اور پائیدار فوائد و مصالح رکھتا ہے۔ مزید برآں اس "مواخاۃ" سے محض مہاجرین کو ہی فائدے نہیں پہنچے، انصار بھی اس سے مساوی طور پر متمتع ہوئے۔ بلکہ خود "مواخاۃ" کا لفظ باب مفاعلہ سے ہے جس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں عمل یکطرفہ نہیں بلکہ دوطرفہ ہوتا ہے۔ اس سے یہ امر بھی بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ مواخاۃ قائم کر کے صرف مہاجرین کو ہی فائدہ پہنچانا مقصود نہ تھا اور نہ یہ محض ان ہی کی خواہش کے پیشِ نظر کیا گیا تھا بلکہ یہ معاملہ دوطرفہ حیثیت رکھتا ہے۔ اب فوائد و مصالح کا مطالعہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

۱۔ اس واقعہ سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ مہاجرین و انصار کے درمیان مواخاۃ کی وجہ سے ایک طرف تو بے سر و سامان، غریب الدیار، مہاجرین مکہ کی آباد کاری کا مسئلہ حل ہو گیا۔ اور دوسری طرف ان کی معاشی کفالت کی ایک سبیل پیدا ہو گئی۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ مہاجرین نے ضرورت سے زیادہ کوئی عطیہ قبول نہ کیا اور اپنے انصاری بھائی پر بار بننے کے بجائے اپنی قوت بازو سے معاش کا بندوبست کیا۔ چنانچہ حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ کا یہ مشہور واقعہ ہے کہ جب ان کے انصاری بھائی حضرت سعد بن ربیعؓ نے یہ پیش کش کی کہ "میں اپنا نصف مال و منال نہیں بانٹ دیتا ہوں اور میری دو بیویاں ہیں ان کو دیکھ لو جو پسند آئے اس کا نام بتاؤ میں طلاق دے دوں گا عدت گزرنے کے بعد تم نکاح کر لینا"..... لیکن حضرت عبدالرحمان بن عوف کی غیرت نے گوارا نہ کیا اور جواب دیا، 'خدا تمہارے مال و منال اور اہل و عیال میں برکت دے مجھے صرف بازار دکھا دو'[3]

اسی طرح جب مہاجرین کو زمینیں مل گئیں یا مکانات بن گئے تو وہ انصار پر مزید بوجھ بننے کے بجائے وہاں منتقل ہو گئے۔ مہاجرین

۱۔ السیرۃ النبویۃ۔ للامام ابی الفداء اسماعیل بن کثیر۔ الجزء الثانی صفحہ ۳۲۶ مطبعہ مصطفی البابی الحلبی قاہرہ ۱۹۲۴ء

۲۔ مدینہ پہنچ کر اکثر صحابہ بیمار ہو گئے تھے اور مکہ کی آب و ہوا کو یاد کیا کرتے تھے۔

۳۔ حضرت عبدالرحمان بن عوف نے کاروبار شروع کیا اور اس میں اللہ نے اتنی برکت دی کہ مٹی سے سونا پیدا کرنے لگے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے مال کا آٹھواں حصہ چار بیویوں پر تقسیم کیا گیا تو ہر ایک کو اسی (۸۰) اسی (۸۰) ہزار درہم ملے۔ (مہاجرین حصہ اول صفحہ ۱۲۷ از حاجی معین الدین ندوی۔ مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۹۲۸ء)

کی آبادکاری کا یہ مسئلہ جو فی الحقیقت ایک پریشان کن مسئلہ تھا وہ اتنی آسانی سے حل ہو گیا کہ جس پر شاید ان لوگوں کو حیرت ہو جو قوموں کی تعمیر و تشکیل کے مطالعہ سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ بستی اجاڑنے یا اجڑنے میں دیر نہیں لگتی البتہ بستی بسانا ایک مشکل کام ہے مگر یہ مشکل کام اور پیچیدہ مسئلہ بھی حضورؐ نے اپنے ناخن تدبیر سے چشم زدن میں حل کر دیا۔

۲۔ مہاجرین کو یہ فائدہ بھی پہنچا کہ ان کا احساس غربت دور ہو گیا۔ وطن کی یاد، گھر بار، عزیز و اقارب سے چھٹنے کا فطری احساس و ملال اور مدینہ کی اجنبیت وغیرہ کا جو کچھ تھوڑا بہت خیال ہو سکتا تھا اپنائیت میں تبدیل ہو گیا۔ انصار نے عقبہ کی بیعت اور عہد کے مطابق صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی ہاتھوں ہاتھ نہیں لیا بلکہ آپ کے تمام جانثاروں کی خیرخواہی اور دلدہی بھی انتہائی ہمدردی، فراخدلانہ محبت، خلوص، ایثار اور جذبۂ رفاقت سے کی اور اپنے پرائے کی تمیز کا شائبہ بھی پیدا نہ ہونے دیا اور اس کی انتہا یہ ہے کہ مہاجرین کو اس طرح وصیت اور وراثت تک میں شامل کر لیا جس طرح ذوی الارحام حق دار ہوتے ہیں اور یہ صورت حال اس وقت تک جاری رہی جب تک کہ غزوہ بدر کے بعد ۲ھ میں سورۂ انفال کی یہ آخری آیت نازل نہ ہو گئی کہ:

واولوا الارحام بعضھم اولیٰ ببعض فی کتاب اللہ ان اللہ بکل شئی علیم (آیت ۷۵)

(یعنی اور رشتہ دار خدا کے حکم کی رو سے ایک دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز سے واقف ہے۔

۳۔ مواخاۃ کے ذریعہ ایک مناسب ٹھکانہ میسر آجائے بنیادی مادی ضروریات کی تکمیل اور ایک گونہ معاشی آسودگی حاصل ہو جانے کے بعد مہاجرین نے مدینہ کی معاشی و تجارتی زندگی میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ جیسا کہ معلوم ہے، مدینہ میں معاشی طور پر تفوق اور برتری یہود کو حاصل تھی۔ یہودی مدینہ کی زراعت، تجارت اور صنعت پر چھائے ہوئے تھے[۱] خوشحال اور فارغ البال تھے۔ زرخیز زمینیں گھنے نخلستان اور باغات ان کے قبضہ میں تھے، ان کی آبادی بہت قدیم تھی اور اس وقت مدینہ کی کل آبادی[۲] کا تقریباً نصف حصہ[۳] بھی لوگ تھے۔ ان کے مختلف قبائل اور بطون کی تعداد اویوں تو دس تھی مگر ان میں سے تین قبیلے بڑے اہم اور مضبوط تھے۔ یعنی بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ، جو مدینہ کے جنوب مشرق میں آباد تھے اور تجارت پر تو ان کی اجارہ داری قائم اور مارکیٹ پر ان کا قبضہ و تسلط تھا۔ جس کی وجہ سے وہ سرمایہ دار و ساہوکار بن گئے تھے اور اپنی اس پوزیشن سے فائدہ اٹھاتے ہوئے معاشی استحصال کے ذریعہ انہوں نے انصار کو اپنا دست نگر بنا لیا تھا۔ انصار کا حال یہ تھا کہ ان کی آبادی اوس و خزرج کے متعدد قبائل میں بٹی ہوئی تھی[۴] اوس و خزرج

۱۔ رسول اکرم کی سیاسی زندگی صفحہ ۲۲۲ از ڈاکٹر حمید اللہ۔ بحوالہ صحیح بخاری۔ ۲۔ تقریباً پانچ تا دس ہزار نفوس

۳۔ The first written constitution of the world. By Dr. Mohd Hamidullah. Sh. Mohd Ashraf Lahore. 1968 p. 13.

نیز دیکھئے: عہد نبوی میں نظام حکمرانی۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ ج ۱ صفحہ ۷۶ تا ۱۱۲ مکتبہ ابراہیمیہ دکن، بار دوم

۴۔ ان کے قبائل کی تفصیل اور نسب کے لئے ملاحظہ ہو: جمہرۃ انساب العرب۔ لابی محمد علی بن احمد بن سعید ابن حزم الاندلسی، م ۴۵۶ھ مع تحقیق و تعلیق عبدالسلام محمد ہارون، دارالمعارف، قاہرہ مصر ۱۹۶۲ء صفحہ ۳۳۲ تا ۳۴۷

اپنی باہمی لڑائیوں[1] میں نہ صرف اپنی قوتیں ضائع کر چکے تھے بلکہ معاشی اعتبار سے اتنے کمزور ہو گئے تھے کہ وہ یہودیوں کے مقروض[2] سود در سود کے چکروں میں گرفتار، نیز معاشی دباؤ کی وجہ سے بڑی حد تک اُن کے زیر اثر اور مطیع و فرمانبردار بھی تھے۔ دوسری طرف انصار تھوڑا بہت تجارت کا شغل بھی رکھتے تھے۔ ان کے بازار اور مراکز خرید و فروخت بھی تھے[3] مگر فن تجارت سے فی الواقع وہ بالکل نابلد تھے اور کم از کم یہ بات طے ہے کہ مدینہ کی تجارت پر ان کا کوئی کنٹرول نہ تھا۔ اگرچہ زراعت ان کا آبائی پیشہ اور اصل فن تھا مگر مالی اعتبار سے کمزور ہونے اور زرخیز زمینوں کی قلت کے سبب، اس میں بھی وہ خاطر خواہ ترقی نہ کر سکتے تھے اور یہودیوں کو خراج تک ادا کیا کرتے تھے[4]۔ بحیثیت مجموعی سیاسی اعتبار سے اس وقت مدینہ میں نراجی کیفیت طاری تھی۔ کوئی منظم حکومت، باقاعدہ حکمران یا سیاسی قانون و ضابطہ نہ تھا۔ وہی قبائلی نظام جو عرب کی خصوصیت تھی وہاں بھی قائم تھا اور ہر قبیلہ پوری طرح انتظام خود اختیاری کا مالک اور اپنے داخلی معاملات میں آزاد تھا۔

اب جہاں تک مہاجرین کا تعلق ہے تو یہ بات مسلمات میں سے ہے کہ وہ سینکڑوں برس سے فن تجارت میں مشغول، اس کی نزاکتوں سے واقف، اور اس پیشہ کے امام تھے۔ انہوں نے مدینہ آنے کے فوراً بعد ہی بازاروں کا رخ کیا اور کچھ ہی عرصہ میں تجارت و کاروبار پر اس حد تک چھا گئے کہ مارکیٹ سے یہودیوں کی اجارہ داری ختم ہوئی اور ان کا سارا زور ٹوٹ گیا۔ یہودیوں کی معاشی طور پر یہ شکست اور مہاجرین کی فتح اس وقت اور بھی قابلِ لحاظ اور قابلِ ستائش بن جاتی ہے جبکہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مدینہ میں اس وقت حالات کتنے سخت تھے۔ مہاجرین کو معاشی میدان میں کتنی سخت مسابقت درپیش تھی اور یہ سب کچھ اس انداز سے کیا گیا کہ نہ توان کے پاس سرمایہ تھا اور نہ اپنے گھر بار کی آسائشیں۔ یہ مزید دلالت ہے اس بات کی کہ وہ فنِ تجارت میں کس حد تک درک بلکہ مہارت تامہ رکھتے تھے۔

معاشی طور پر یہود کو جو ضرب کاری لگی تھی، اس نے ان کی حیثیت کو بُری طرح متاثر کیا اور اس کی رہی سہی کسر اس طرح پوری ہو گئی کہ مواخاۃ کے چند ماہ بعد ۱ھ میں ہی میثاق مدینہ میں انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا حکمران، اور آخری عدالت مرافعہ تسلیم کر لیا۔ اگلے سال ۲ھ میں ان کے قبیلہ بنو قینقاع کا ۴ھ میں بنو نضیر کا اخراج اور ۵ھ میں ان کے قبیلہ بنو قریظہ کا استیصال ہوا اور اس طرح

۱۔ آخری جنگ "جنگ بعاث" تھی۔

۲۔ چنانچہ بنو نضیر نے جلا وطنی کے حکم پر توجہ دلائی کہ ان کے قرضے مقامی باشندوں سے وصول طلب ہیں۔ آنحضرت نے فرمایا کہ صنعوا و تعجلوا (رقم گھٹا کر میعاد سے قبل حساب بے باک کر لو (رسول اکرم کی سیاسی زندگی از حمید اللہ۔ بحوالہ سرخسی)

۳۔ انصار نے اپنے لئے (یہودیوں کے بازاروں سے الگ) چند بازار قائم کئے تھے چنانچہ مدینہ کا سب سے بڑا بازار وہ تھا جو مہروز میں لگتا تھا اور جس کے قریب بنو ساعدہ کی آبادی تھی۔ ایک بازار قبا میں، ایک بازار ام العیال نامی ایک چشمہ کے کنارہ، اور ایک بازار مسجد الرایہ کے قریب تھا۔ ایک بازار مزاحم تھا اور یہ اوائل اسلام تک لگتا تھا (سیر انصار، اوّل صفحہ ۶۶ از مولوی سعید احمد انصاری، مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۳۴۳ھ)

۴۔ سیر انصار حصہ اوّل صفحہ ۶۵ (بحوالہ معجم البلدان از یاقوت الحموی)

پانچ سال سے بھی کم مدت میں مدینہ کی بستی یہودیوں کے وجود نامسعود سے پاک اور مدینہ کے کوچہ و بازار ان کے معاشی تسلط سے کلیتاً آزاد ہو گئے۔

اس کا نتیجہ یہ بھی نکلا کہ انصار کا معاشی اور معاشرتی دونوں اعتبار سے مرتبہ بلند ہو گیا۔ یہودیوں کے دائرہ اثر سے نجات ملی اور اب اپنی تمام تر توجہ انہوں نے تجارت (جسے وہ گویا مجبوراً یا تکلفاً کرتے تھے) کے بجائے زراعت پر مرکوز کر دی۔ نیز یہودیوں کے اخراج مدینہ کے بعد وہ نہ صرف ان کے پنجۂ تظلم سے آزاد ہوئے بلکہ زراعت کے میدان میں آگے بڑھنے لگے اور اس طرح مواخاۃ کے نتیجہ میں مہاجرین و انصار کے مبارک اتحاد نے کچھ ہی عرصہ میں مدینہ کی چھوٹی سی بستی میں خوشحالی اور فارغ البالی کا دور دورہ کر دیا۔

مواخاۃ کے ان نتائج و اثرات کو آپ ممکن ہے بڑی حد تک وقتی اور عارضی قرار دیں۔ اس کی ایک دلیل تو شاید یہ دی جائے کہ غزوہ بدر کے بعد وراثت کو مواخاۃ کے بجائے ذوی الارحام کی طرف منتقل کر دیا گیا۔ اسی طرح جن دوسرے نتائج کا اوپر ذکر آیا ہے وہ بھی چند سالوں کے اندر تکمیل پذیر ہو گئے اس لحاظ سے بھی اس کی افادیت عارضی معلوم ہوتی ہے لیکن یہ سب محض احتمالات ہیں۔ کیونکہ بغور مطالعہ سے یہ واضح ہو گا کہ واقعات کو تو ضرور وقتی کہا جا سکتا ہے لیکن نتائج وقتی اور عارضی نہیں بلکہ دور رس ہیں، مستقل ہیں کیونکہ اس سے جو معاشرتی بنیادیں استوار ہوئیں جو تحریک پیدا ہوئی اور جو اجتماعی فضا طاری ہوئی اس نے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کی تشکیل، عام برادرانہ تعلقات کے قیام اور اسلامی تہذیب کی آبیاری میں انتہائی مؤثر حصہ لیا اور اگر تھوڑی دیر کے لیے یہ مان لیا جائے کہ یہ سارے نتائج واقعات کی طرح عارضی اور وقتی تھے، تب بھی یہ بات کیا کم ہے کہ وقتی طور پر پیدا ہونے والے مسائل کو وقتی طور پر حل بھی کر دیا گیا۔

۴۔ واقعہ یہ ہے کہ عقد مواخاۃ کے ذریعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسا عظیم الشان کارنامہ انجام دیا جس کے تین پہلو ہیں۔

(۱) ایک تو یہ کہ مواخاۃ کے ذریعے ایک ایسی بنیاد اور اعلیٰ قدر سے دنیا کو پہلی بار متعارف کرایا جس سے وہ پہلے واقف نہ تھی۔ اب سے پہلے تک نظری اور عملی دونوں اعتبار سے ایک انسان اور دوسرے انسان سے تعلق، وابستگی اور اتحاد کی حقیقی بنیادیں متعین طور پر وطن، رنگ، نسل، زبان، قومیت، محدود و ناقص مذہبی تصور اور دوسری عصبیتیں سمجھی جاتی تھیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام بنیادوں کو مسترد فرما کر انسانوں کے باہمی تعلق و ہم آہنگی، وابستگی اور اتحاد کی حقیقی بنیاد صرف ایک قرار دی یعنی دین اور حق۔ اسی بنیاد کی طرف توحید کی پہلی تعلیم آغاز دعوت میں ہی دے دی گئی تھی اور یہ محض فلسفیانہ پیش کش یا محض نظریہ نہ تھا بلکہ اس کا عملی مظاہرہ اس طرح کیا کہ دین و ایمان کی اس بنیاد پر لوگوں کو جوڑتے چلے گئے اور جو لوگ یوں ایک دوسرے سے وابستہ ہوئے تو ان کے رشتہ محکم کو نہ قبیلہ اور معاشرہ کی روایات توڑ سکیں اور نہ ظلم و تعدی، جور و جفا کی کوئی شکل اس کو منقطع کر سکی۔ بلکہ معاملہ بالکل برعکس ہوا یعنی اس رشتہ محکم نے جاہلی معاشرہ کو، اس کی معاشرتی روایات کو، قریش مکہ بلکہ پورے عرب کی مسلمہ روایات کو توڑ دیا اور ان کے پورے معاشرتی نظم کو منتشر اور ان کے سارے تار و پود کو بکھیر کر رکھ دیا۔ اگر ان اسباب کا جائزہ لیا جائے جن کی بنیاد پر قریش مکہ خصوصاً اور اہل عرب عموماً نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی دعوت حق کے خلاف صف آرا ہوئے اور مخالفت کی انتہائی حد تک جا پہنچے تو ان میں دوسرے اسباب کے علاوہ ایک سبب یہ بھی نظر آئے گا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت و تحریک نے دراصل جاہلیت کے پورے معاشرتی نظم کو درہم برہم کر دیا تھا۔ اس وقت تک حال یہ تھا کہ ان کی اصل معاشرتی تنظیم قبائلی تھی۔ معاشرہ میں کوئی آدمی کسی نہ کسی قبیلہ سے کوئی نہ کوئی نوع کا تعلق پیدا کیے

بغیر زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ اُس کے لئے ضروری تھا کہ کسی نہ کسی قبیلہ سے باقاعدہ وابستگی پیدا کرے اور ہر شخص کے لئے یہ بھی لازمی تھا کہ قبیلہ کے نظم کی سختی سے پابندی کرے، بڑوں کا کہنا مانے، شیخ قبیلہ کی اطاعت اور قبیلہ کی روایات کا احترام کرے۔ بصورت دیگر وہ معتوب، مستحق عذاب اور طرد کے قابل تھا۔ ادھر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوت کا آغاز کیا تو اس کا جواب دینے، اُسے قبول کرنے اور لبیک کہنے والے پاک نفس، پاک وطن، قدسیوں نے اپنے سارے جاہلی مراسم اور معاشرتی آداب کو بالائے طاق رکھ دیا۔ اور شیخ قبیلہ، اعزہ و اقارب، بزرگ و احباب سب کی نصیحتوں اور مرضی و خوشنودی کے علی الرغم، اور نتائج و عواقب کی پروا کئے بغیر آپس میں جڑنا اور شمع رسالت کے گرد جمع ہونا شروع کر دیا اور اس اولو العزمی اور ثابت قدمی کے ساتھ کہ پھر اس رشتہ کو کوئی چیز منقطع نہ کر سکی العروۃ الوثقیٰ لا انفصام لہا۔ اب باپ بیٹے کے لئے غیر اور بیٹا باپ کے لئے اجنبی بن گیا۔ حسب و نسب کے تمام بت سجدہ ریز ہو گئے، امتیاز و افتخار کے جھوٹے معیار باطل قرار پائے۔ اب نہ شیخ قبیلہ کی دھمکیاں، اور عذابات اسے جنون حق سے باز رکھ سکے اور نہ خاندان اور قبیلے والوں کی ترغیب و ترہیب کی کوئی انتہائی شکل ان کے جذبہ ایمان کی حرارت کو چھین سکی۔ گویا اجتماعیت کی ایک نئی بنیاد اور اتحاد و تعلق کی نئی اساس پر جو گروہ بن رہا تھا وہ اہل عرب کے لئے کھلا چیلنج بھی تھا اور اس نے ان کے صدیوں کے معاشرتی نظم کو بھی الٹ پلٹ کر دیا تھا یہی وہ سبب ہے جس کی بنا پر اہل قریش، اہل عرب سب آپؐ کے خون کے پیاسے اور تحریک اسلامی کے دشمن بن گئے۔

دعوت کے اس مکی دور میں متذکرہ بالا اساسی قدر کو مزید موکد اور واضح کرنے کے لئے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان حضرات صحابہ کے درمیان ایک "عقد مواخاۃ" باندھا جنہوں نے بالکل ابتدائی زمانہ میں اسلام قبول کیا تھا۔ ممکن ہے بعض لوگوں کے لئے یہ امر باعث حیرت ہو کہ مکہ میں بھی کوئی مواخاۃ ہوئی ہے۔ لیکن تاریخ کی شہادت اس پر ثبت ہے کہ اس پہلی "مواخاۃ" کا انعقاد مکہ میں ہی ہوا تھا اور جن لوگوں کے درمیان ہوا تھا۔ ان میں سے چند کے نام محمد ابن حبیب صاحب کتاب المحبر کے حوالے[1] سے درج ذیل ہیں:

۱۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علیؓ کے درمیان
۲۔ حضرت حمزہؓ 〃 〃 زید بن حارثہ مولیٰ رسول اللہ 〃 〃
۳۔ 〃 ابو بکرؓ 〃 〃 عمرؓ بن الخطاب 〃 〃
۴۔ 〃 عثمان ابن عفانؓ 〃 〃 عبدالرحمٰن بن عوفؓ 〃 〃
۵۔ 〃 زبیر بن العوامؓ 〃 〃 عبداللہ بن مسعودؓ 〃 〃
۶۔ 〃 عبیدہ بن الحارثؓ 〃 〃 بلالؓ مولیٰ ابی بکر 〃 〃
۷۔ 〃 مصعب بن عمیرؓ 〃 〃 سعدؓ بن ابی وقاص 〃 〃
۸۔ 〃 ابو عبیدہ بنؓ الجراح 〃 〃 سالمؓ مولیٰ ابی حذیفہ 〃 〃
۹۔ 〃 سعیدؓ بن زید بن عمرو 〃 〃 طلحہؓ بن عبید اللہ 〃 〃

۱۔ کتاب المحبر صفحہ ۷۰، ۷۱

ٹھیک یہی فہرست ابن سید الناس م ۷۳۴ھ نے اپنی کتاب عیون الاثر فی فنون المغازی والشمائل والسیر[1] میں بھی نقل کی ہے البتہ زرقانی نے شرح مواہب[2] میں ابن عبدالبر کے حوالے سے یہ کہا ہے کہ حضرت زبیرؓ بن العوام کی مواخاۃ حضرت طلحہؓ سے کرائی گئی تھی۔

بہرحال یہ تو چند نام تھے ورنہ بقول زرقانی مواخاۃ ان کے علاوہ اور دوسرے صحابہ کے درمیان بھی ہوئی تھی[3]۔ مکہ کی یہ مواخاۃ کہاں ہوئی تھی اس کا ذکر مورخین نے تو نہیں کیا ہے لیکن یہ بالکل واضح ہے کہ اس کا انعقاد یقیناً دارارقم میں ہوا ہوگا۔ اس لئے کہ مذکورہ صحابہؓ میں سے حضرت عمرؓ، حضرت حمزہؓ اور حضرت مصعب بن عمیرؓ کے بارے میں مشہور اور صحیح بات ہے کہ یہ حضرات اس وقت ایمان لائے جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دارارقم میں مقیم تھے۔

اس مواخاۃ مکہ کے بعد مدینہ میں مواخاۃ صحابہ کا رجب سنہ ۱ھ میں، دوسرا واقعہ، گویا ایک اعادہ، صورت حال کے تقاضوں کی تکمیل، اور اسی حقیقت متذکرہ بالا کو مزید موکد و مؤثر کرنے کا انتظام تھا۔

بہرکیف مدعا یہ ہے کہ مواخاۃ تو محض ایک علامت ہے جس کے ذریعے آپ نے بنیادی طور پر ایک شخص کو محض ایک کلمہ توحید پر، صرف اللہ کی خاطر، اور کلیتاً حق کے لئے، دوسرے شخص کا بھائی بنا دیا۔ اور یہ بنیاد ایسی ہے جو صرف عرب کے لئے ہی نہیں بلکہ پوری انسانیت کے لئے، ایک عالمگیر، ہمہ گیر، آفاقی اور زمان و مکان کی تمام قیود سے بالاتر تمام انسانوں کے لئے نقطہ اتصال اور مرکز اتحاد بن سکتی ہے۔

(ب) اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس مواخاۃ کے ذریعہ تمام امتیازات کو محو کر دیا گیا۔ ہمہ اقسام کے فرق اور اختلافات کو نظر انداز کرتے ہوئے ان اکرمکم عنداللہ اتقکم کی بنیاد پر تمام لوگوں کو احترام و مساوات انسانی کا بے نظیر درس دیا گیا کہ ایک آدمی اپنے قبائلی حسب و نسب اور معاشرتی رتبہ کے اعتبار سے اور جاہلی عز و افتخار کے لحاظ سے خواہ کتنا ہی بلند مقام کیوں نہ رکھتا ہو مگر جب رشتہ اخوت میں پرو دیا گیا تو پھر نظارہ یہ ہے کہ حضرت حمزہؓ کا بھائی ایک آزاد کردہ غلام زیدؓ بن حارثہ کو بنایا جاتا ہے حضرت عبیدہؓ بن حارث کو بلال حبشیؓ مولی ابوبکر سے وابستہ کیا جاتا ہے اور حضرت ابوعبیدہ بن الجراح کو سالم مولی ابو حذیفہ سے منسلک کیا جاتا ہے۔ مدینہ کی مواخاۃ صحابہ میں بھی یہ درس، یہ حسین منظر صاف اور واضح ہے بلکہ زیادہ بڑے پیمانے پر ہے۔ اس لئے کہ مکہ میں تو معاملہ صرف مہاجرین کا، ایک ہی جگہ ایک ہی ماحول میں بسنے والوں کا تھا، فرق صرف معاشرتی پیمانوں کا تھا۔ جب کہ مدینہ میں معاشرتی فرق مراتب کے ساتھ ساتھ ماحول بھی اجنبی ہے، لوگ بھی بالکل اجنبی ہیں، جگہ بھی دوسری ہے اور لوگوں کے مزاج و طبائع میں بھی اختلافات ہیں۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود عقد مواخاۃ ان سب کو ہم رتبہ و ہم مرتبہ بنا کر ایک ہی سلک مروارید میں، ایک ہی نظم میں پرو دیتا ہے۔

(ج) اس کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ اس کے ذریعہ جاہلی نظم معاشرت کو اکھاڑ کر ایک نئی معاشرتی تنظیم، ایک امت مسلمہ، اور ایک اسلامی معاشرہ کی داغ بیل ڈالی گئی جس کی حقیقی بنیاد اخوت، بھائی چارہ اور برادرانہ تعلق پر استوار کی گئی۔ حضورؐ کا یہ ارشاد کہ المسلم اخو المسلم اور

۱۔ الجزء الاوّل صفحہ ۱۹۹ مکتبہ القدس قاہرہ ۱۳۵۶ھ

۲۔ الجزء الاوّل صفحہ ۳۰۳، طبع اوّل مطبعہ ازہریہ مصر ۱۳۲۵ھ

۳۔ ایضاً

اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان کہ انما المومنون اخوۃ (حجرات) اسی حقیقت واضح کی تصدیق کرتے ہیں بلکہ سورۂ حجرات کا مقام جہاں یہ آیت (انما المومنون اخوۃ) آتی ہے اس سے متصل جو ہدایات ہیں۔ ان میں ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کے استہزاء، تمسخر برے نام رکھنے، القاب و آداب بگاڑنے، سوءِ ظن، غیبت، عیب جوئی اور تجسس سے روکا گیا ہے اور اسے فسق و فجور کا کام بتایا گیا ہے۔ اس کی جوہری حقیقت یہی ہے کہ دراصل یہ سب باتیں ایک مسلمان اور دوسرے مسلمان کے رشتہ اخوت کو کمزور کرنے، مسلمان معاشرے میں فتنوں کا دروازہ کھولنے، اور قلب مومن کے شیشہ صفا پر بال ڈالنے والی ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اگر ایک مسلمان اپنے دوسرے مسلمان بھائی کو ان حرکات کا مرتکب پائے گا تو اس کے لئے مودت و محبت کے جذبات کے بجائے بغض و عداوت کے داعیات پیدا ہوں گے اور یہی وہ پہلا دریچہ ہے جو تمام معاشرتی پیچیدگیوں اور آپس کی نااتفاقیوں کا فتح باب کرتا ہے۔

۵۔ اس مواخاۃ نے مہاجرین و انصار دونوں کو باہمی تربیت، تعلیم دین و دنیا اور اخلاق فاضلہ کے اظہار کا بہترین موقع عطا فرمایا۔ مہاجرین چونکہ سبقت ایمانی رکھتے اور علم و اکتساب کی جملہ صلاحیتیں بہم پہنچا چکے تھے اس لیے ان کو انصار کا بھائی بنایا گیا تاکہ ہر گھر میں ایک تربیت یافتہ، فاضل و متقی، دینی معلم موجود ہو اور وہ معلم اس گھر میں رہتے ہوئے تعلیم و اصلاح کے فرائض بھی انجام دے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مہاجرین و انصار دونوں نے مل کر اپنی باہمی کوششوں اور تائید الٰہی سے کچھ ہی عرصہ میں تعلیمات اسلامی کو گھر اور بازار، مدرسہ اور مسجد، منبر اور دفتر، جلوت اور خلوت، غرض ہر جگہ اور ہر وقت پہنچاتے رہے، یہاں تک کہ ہر سمت سے صدائے حق آنے لگی۔ گویا اشاعت اسلام انتہائی آسان اور مؤثر طریقے اور سرعت رفتار سے ہونے لگی اور تعلیمات اسلامی کے زندہ نسخے اسلامی معاشرے میں ہر طرف چلتے پھرتے نظر آنے لگے۔

۶۔ مواخاۃ سے ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ مہاجرین و انصار "بنیان مرصوص" (ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار) بن گئے اور ایک محسوس قوت بن کر ہر خطرہ کے آگے سینہ سپر ہو گئے اور جس کا ادنیٰ سا مظاہرہ کچھ ہی ماہ بعد جنگ بدر میں نظر آتا ہے۔ اسلامی جماعت میں اتحاد، تعاون و ہم آہنگی کی فضا اور مرکزیت پیدا ہو گئی اور دونوں ایک دوسرے کے اس طرح غمخوار بن گئے کہ اگر ایک کو کسی قسم کی تکلیف پہنچتی تھی تو دوسرا بے چین ہو جاتا تھا۔

بہرحال اس گفتگو سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ عقد مواخاۃ کوئی وقتی عمل اور ایک عارضی واقعہ نہیں ہے بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ مہتم بالشان کارنامہ ہے جس سے آپ نے گوناگوں فوائد حاصل کئے اور مہاجرین و انصار دونوں میں بیک وقت، اتحاد فکر و عمل اس طرح پیدا کر دیا کہ جذبہ ایثار و قربانی کی تابناک مثالیں قائم کر کے کچھ ہی عرصہ میں محیر العقول کارنامے انجام دیئے گئے۔

اب جہاں تک ان مہاجر و انصار صحابہ کی تعداد کا تعلق ہے جن کے درمیان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عقد مواخاۃ قائم فرمایا تھا تو اصحاب تاریخ و سیر عموماً کل تعداد نوے (۹۰) بتاتے ہیں۔ یعنی پینتالیس مہاجرین اور پینتالیس انصار۔ ابن سعد نے اس تعداد کو بتا کر یہ بھی کہہ دیا ہے کہ "یقال: کانوا مائۃ، خمسون من المهاجرين وخمسون من الانصار"[1] (یعنی کہا جاتا ہے کہ ان کی تعداد سو ہے پچاس مہاجرین اور

۱۔ الطبقات الکبریٰ ج ۱ صفحہ ۲۳۸

پچاس انصار میں سے) لیکن مقام افسوس یہ ہے کہ بالعموم تعداد ظاہر کر دینے پر ہی اکتفا کیا گیا ہے۔ اور ان کے مکمل اسماء نقل کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ اس لئے سیرت نبوی کے تمام قدیم و جدید ماخذوں میں بمشکل سترہ یا اٹھارہ نام ملتے ہیں۔ بلکہ بعض مؤرخین کے یہاں تو یہ نام بھی نہیں ملتے۔ البتہ صرف دو مؤرخین کو استثنا حاصل ہے ایک تو ابن سعد کو جنہوں نے ذکر مواخاۃ میں تو نہیں البتہ تراجم رجال کے ضمن میں ان کی مواخاۃ کی تصریح بھی کر دی ہے اور یوں ایک اچھی خاصی تعداد میں نام وہاں مل جاتے ہیں۔ دوسرے محمد ابن حبیب صاحب کتاب المحبر ہیں جنہوں نے سب سے زیادہ تعداد لکھی ہے۔ یعنی نہ صرف پینتالیس بلکہ دس زائد یعنی پچپن آدمیوں کے نام بڑی وضاحت سے لکھے ہیں [۱]

آگے بڑھنے سے پہلے چند وضاحتیں کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ایک وضاحت تو یہ ضروری ہے کہ اگرچہ مکہ سے ہجرت کر کے آنے والے صحابہ (مہاجرین) کی کل تعداد تقریباً ڈیڑھ سو ہے [۲]۔ لیکن مواخاۃ کے سلسلے میں نام صرف ۴۵ یا ۵۰ وغیرہ کے ملتے ہیں۔ اس سے تین باتیں سمجھ میں آتی ہیں یعنی :

(ا) مواخاۃ اُن تمام لوگوں کی کرائی گئی جو مکہ سے ہجرت کر کے آئے تھے۔ سوء اتفاق کہ ان کے نام وغیرہ کو مؤرخین نے نقل و محفوظ نہ کیا۔

(ب) مواخاۃ صرف اُن ہی مہاجرین و انصار کے درمیان ہوئی جو حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے گھر میں موجود تھے جو وہاں موجود نہیں تھے۔ ان کی مواخاۃ نہیں کرائی گئی۔

(ج) یہ مواخاۃ کا پہلا مرحلہ تھا۔ ممکن ہے بعد میں باقی بچے کھچے مہاجرین و انصار کے درمیان بھی مواخاۃ کرا دی جاتی۔ مگر شاید پھر مسجد نبویؐ کی تکمیل اور میثاق مدینہ کی تسوید کے بعد ضرورت نہ سمجھی گئی ہو۔ اس لئے کہ مسجد نبویؐ نے اسلامی جماعت کی سالمیت و اتحاد اور ان میں مرکزیت پیدا کرنے کے سلسلے میں انتہائی اہم اور مؤثر کردار ادا کیا۔ اسی طرح میثاق مدینہ کے بعد مدینہ میں رہنے والے تمام عناصر کے درمیان حقوق و فرائض کا تعین بھی ہو گیا اور مسلمانوں کی ممتاز حیثیت بھی واضح ہو گئی یا پھر یہ وجہ ہو سکتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کی غزوات و سرایا میں مصروفیات نے اس کا موقع نہ دیا ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ انما المومنون اخوۃ، (قرآن) اور المسلم اخو المسلم (حدیث) کی اصولی ہدایات دے دینے کے بعد نام بنام رشتۂ اخوت استوار کرنے کی حاجت باقی نہ رہ گئی ہو۔

دوسری وضاحت یہ کرنا ہے کہ حضورؐ کے ہاتھوں رشتۂ اخوت میں منسلک ہونے والے مہاجرین و انصار کے ناموں میں اختلافات اور رشتوں میں فرق بھی پایا جاتا ہے مگر تاریخ اسلامی کے بیشتر ماخذوں کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم نہ صرف یہ کہ بعض ناموں کا اضافہ کر سکتے ہیں بلکہ مہاجرین و انصار کی فہرست کو دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں یعنی :

۱- دیکھئے المحبر صفحہ ۷۱ تا ۷۵

۲- مہاجرین کی اس تعداد کا تعین اور فہرست اسماء راقم الحروف نے ابن ہشام، ابن سعد ابن قیم اور دوسرے مؤرخین کے بیانات کی مدد سے مرتب کرنے کی کوشش کی تو کم از کم ۱۰۲ نام مل گئے جو تعداد باقی رہ جاتی ہے اس کے پیش نظر یہ اندازہ ہے کہ کل تعداد اندازاً (۱۵۰) ڈیڑھ سو ہو گی۔ اس مقدار کو ہمارے یہاں بعض مصنفین نے لکھا ہے مگر بغیر حوالے کے۔ مثلاً دیکھئے غلام سرور کی انگریزی کتاب صفحہ ۱۵۲ Muhammad - the Holy Prophet شائع کردہ شیخ اشرف لاہور ۱۹۶۴ء

(ا) پہلے حصہ میں ان صحابہ کے نام آتے ہیں جن کی مواخاۃ کے بارے میں مؤرخین کا اتفاق کامل ہے۔ اس فہرست میں انچاس مہاجرین اور انچاس انصار کے نام ہیں۔

(ب) دوسرے حصہ میں ایسے صحابہ شامل ہیں جن کے بارے میں اختلافات پائے جاتے ہیں یہ کل چودہ صحابہ ہیں۔

اب سب سے پہلے ہمیں پہلے حصہ کو دیکھنا چاہیئے۔ اس حصہ میں انچاس مہاجرین اور انچاس انصار شامل ہیں اور ان کے مکمل اسماء[1] درج ذیل ہیں۔

نمبر شمار	مہاجرین	مواخاۃ ہمراہ	انصار
۱	حضرت ابو سلمہ بن عبد الاسد رضؓ (سب سے پہلے مہاجر)	"	حضرت سعد بن خیثمہ رضؓ
۲	" عامر بن ربیعہ رضؓ	"	" یزید بن المنذر بن سرح رضؓ
۳	" عبداللہ بن جحش الاسدی رضؓ	"	" عاصم بن ثابت بن ابی الافلح رضؓ
۴	" محرز بن نضلہ رضؓ	"	" عمارہ بن حزم رضؓ
۵	" زید بن خطاب رضؓ	"	" معن بن عدی رضؓ
۶	" خنیس بن حذافہ رضؓ	"	" ابو عبس بن جبیر رضؓ
۷	" واقد بن عبداللہ التمیمی رضؓ	"	" بشر بن براء بن معرور رضؓ
۸	" ایاس بن ابی البکیر رضؓ	"	" حارث بن خزیمہ رضؓ
۹	" عاقل بن ابی البکیر رضؓ	"	" مجذر بن زیاد رضؓ
۱۰	" خالد بن ابی البکیر رضؓ	"	" یزید بن دثنہ رضؓ
۱۱	" عامر بن ابی البکیر رضؓ	"	" ثابت بن قیس بن شماس رضؓ
۱۲	" ابو مرثد الغنوی رضؓ	"	" عبادہ بن صامت رضؓ
۱۳	" مرثد بن ابی مرثد الغنوی رضؓ	"	" اوس بن الصامت رضؓ
۱۴	" عبیدہ بن حارث رضؓ	"	" عمیر بن الحمام السلمی رضؓ

۱۔ یہ فہرست ابن ہشام، ابن سعد، محمد ابن حبیب، ابن عبد البر (الدرر فی اختصار، المغازی والسیر قاہرہ ۱۳۸۶ھ)، سہیلی، ابن سید الناس، ابن کثیر (السیرۃ النبویہ۔ الجزء الثانی مطبعۃ عیسیٰ البابی الحلبی وشرکاء، مصر ۱۹۶۴ء) الذہبی (سیر الاعلام والنبلاء۔ الجزء الاول۔ دار المعارف۔ مصر) وغیرہ کے تقابلی مطالعہ کی مدد سے مرتب کی گئی ہے۔

نمبر شمار	مہاجرین	مواخاۃ ہمراہ	انصار
۱۵	حضرت حصین بن حارث بن المطلب رض	//	حضرت رافع بن عنجدہ رض
۱۶	// طلیب بن عمیر بن وہب رض	//	// منذر بن عمرو خزرجی رض
۱۷	// ابو سبرۃ بن ابی رہم رض	//	// سلمہ بن سلامہ بن وقش رض
۱۸	// مصعب بن عمیر رض	//	// ابوایوب انصاری
۱۹	// ابوحذیفہ بن عتبہ رض	//	// عباد بن بشر رض
۲۰	// سالم مولی ابی حذیفہ رض	//	// معاذ بن ماعص انصاری رض
۲۱	// عتبہ بن غزوان بن جابر رض	//	// ابودجانہ سماک بن خرشہ رض
۲۲	// عثمان بن عفان رض	//	// اوس بن ثابت رض
۲۳	// حضرت ابوبکر صدیق رض	//	// خارجہ بن زید بن ابی زہیر رض
۲۴	// زید بن حارثہ رض	//	// اسید بن حضیر رض
۲۵	// عبدالرحمان بن عوف رض	//	// سعد بن ربیع رض
۲۶	// عمار بن یاسر رض	//	// حذیفۃ بن الیمان رض
۲۷	// بلال حبشی مکی	//	// ابورویحہ عبداللہ بن عبدالرحمان خثعمی رض
۲۸	// شجاع بن وہب اسدی رض	//	// اوس بن خولی رض
۲۹	// سعد مولی عتبہ رض	//	// تمیم مولی خراش رض
۳۰	// عبداللہ بن مسعود رض	//	// معاذ بن جبل رض
۳۱	// عمیر ابن عمرو بن نضلہ رض	//	// یزید بن حارث رض
۳۲	// مقداد بن عمرو کندی رض	//	// جبیر بن عتیک رض
۳۳	// عمیر بن ابی وقاص رض	//	// عمرو بن معاذ رض
۳۴	// مسعود بن ربیع القاری رض	//	// عبید بن التیہان رض
۳۵	// عامر بن فہیرہ رض	//	// حارث بن اوس بن معاذ رض
۳۶	// شماس بن عثمان رض	//	// حنظلۃ بن ابی عامر رض
۳۷	// ارقم بن ابی الارقم مخزومی رض	//	// ابوطلحہ زید بن سہل انصاری رض
۳۸	// معتب بن حمراء الخزاعی رض	//	// ثعلبہ بن حاطب رض

نمبر شمار	مہاجرین	مواخاۃ ہمراہ	انصار
۳۹۔	حضرت عبداللہ بن مظعونؓ	//	حضرت سہل بن عبیدؓ بن المعلی
۴۰۔	// سائب بن عثمان جمحیؓ	//	// حارثہ بن سراقہؓ
۴۱۔	// معمر بن الحارثؓ	//	// معاذ بن عفراءؓ
۴۲۔	// عبداللہ بن مخرمہ بن عبدالعزیؓ	//	// فروۃ بن عمرو بیاضیؓ
۴۳۔	// وہب بن سعد بن ابی سرحؓ	//	// سوید بن عمروؓ
۴۴۔	// صفوان بن بیضاءؓ	//	// رافع بن المعلیؓ
۴۵۔	// حذیفہؓ	//	// ابو سعید خدریؓ
۴۶۔	// مقداد بن اسود کندیؓ	//	// عبداللہ بن رواحہؓ
۴۷۔	// مسطح بن اثاثہؓ	//	// زید بن المزینؓ
۴۸۔	// مہجع مولیٰ عمرؓ	//	// سراقہ بن عمرو بن عطیہؓ
۴۹۔	// صہیب بن سنان رومیؓ	//	// حارث بن القمہؓ

اس فہرست میں ایک نام شامل نہ ہونے سے آپ کو بڑی تشویش ہوگی جسے عام طور پر شامل کیا جاتا ہے یعنی خود رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک کہ جن کا عقد مواخاۃ مشہور روایت کے مطابق آپؐ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے قائم فرمایا تھا۔ ابن ہشام نے یہی لکھا ہے[1] لیکن ابن سعد اور دوسرے مورخین اس رشتہ کو تسلیم نہیں کرتے اور وہ حضرت علیؓ کی مواخاۃ بجائے حضورؐ کے حضرت سہل بن حنیفؓ سے قرار دیتے ہیں[2]۔ علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ :

اما مواخاۃ النبی وعلی فان من العلماء من ینکر ذلک ویمنع صحتہ ومستندہ فی ذلک ان ہذا المواخاۃ انما شرعت لاجل ارتفاق بعضہم من بعض ویتالف قلوب بعضہم علی بعض فلا معنی لمواخاۃ النبی لاحد منہم ولا مہاجری لمہاجری[3]۔ اور بقول امام زرقانی، علامہ ابن تیمیہ نے بھی اس مواخاۃ کا انکار کیا ہے اور یہاں تک دعویٰ کر دیا ہے کہ :

ان ذلک من الاکاذیب وانہ لم یواخ بین مہاجری ومہاجری[4]۔ اسی طرح سے بعض دوسروں نے مواخاۃ کی اغراض و مقاصد، مصلحتوں اور خواص کے پیش نظر اسے رد کر دیا ہے[5] اور علامہ ابن قیم نے بطرز مناظرہ یہ بحث اصولی طور پر کی ہے کہ اول تو ایک مہاجر سے دوسرے

۱۔ ابن ہشام صفحہ ۳۰۴ ج ۱

۲۔ ابن عبدالبر (الدرر) صفحہ ۹۰

۳۔ السیرۃ النبویہ۔ ابن کثیر ج ۲ صفحہ ۳۲۶

۴۔ شرح زرقانی علی المواہب صفحہ ۳۷۳ ج ۱ مطبعہ ازہریہ، مصریہ ۱۳۲۵ھ ۵۔ ایضاً

مہاجر کی مواخاۃ ہی ناقابلِ قبول ہے اور دوسرے یہ کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم مہاجرین میں سے ہی کسی کو اپنا بھائی بناتے تو تمام لوگوں سے زیادہ تو اس کے مستحق حضرت ابوبکرؓ تھے۔ جو حضورؐ کے محبوب ترین ساتھی اور رفیق ہجرت، انیس غار دیگر تمام صحابہ سے افضل واکرم ہیں اور جن کے بارے میں آپؐ یہ فرما چکے تھے کہ "دنیا والوں میں سے اگر میں کسی کو اپنا دوست بناتا تو ابوبکر کو بناتا مگر یہ کہ اسلامی اخوت سب سے بہتر ہے"۔ ان کے اصل الفاظ یہ ہیں:

وقد قیل انہ آخی بین المہاجرین بعضہم مع بعض مواخاۃ ثانیۃ واتخذ فیہا علیا اخا لنفسہ والانصار والمہاجرون کانوا مستغنین باخوۃ الاسلام داخوۃ الدار وقرابۃ البیت عن عقد مواخاۃ بخلاف المہاجرین مع الانصار ولو آخی بین المہاجرین کان احق الناس باخوۃ احب الخلق الیہ و رفیقہ فی الہجرۃ وانیسہ فی الغار وافضل الصحابۃ واکرمہم علیہ ابوبکر الصدیق وقد قال لوکنت متخذاً من اہل الارض خلیلاً لاتخذت ابابکر خلیلاً ولکن اخوۃ الاسلام افضل"[1]

غرض ان دلائل کے پیش نظر جو خاصے وزنی اور وقیع ہیں۔ مدینہ میں حضورؐ اور حضرت علیؓ کی مواخاۃ ہمیں بھی ناقابلِ فہم معلوم ہوتی ہے۔ ہمارے نزدیک مورخین کو اس رشتہ مواخاۃ میں التباس ہو گیا ہے۔ اس کی اصل حقیقت یہ ہے کہ حضورؐ اور حضرت علیؓ کے درمیان مواخاۃ یقیناً ہوئی ہے مگر مکہ میں۔ مدینہ میں نہیں۔ صحیح قرین قیاس اور مناسب حال بات یہی ہے کہ حضرت علیؓ کی مواخاۃ حضورؐ سے نہیں بلکہ حضرت سہل بن حنیف سے قائم کی گئی تھی اور حضرت علیؓ کی یہ مواخاۃ اس امر کو مستلزم نہیں ہے کہ اب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی رشتہ مواخاۃ متعین طور پر کسی نہ کسی انصاری سے ضرور جوڑا جائے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ دوسرے بہت سے مہاجرین کی طرح اگر مواخاۃ میں شرکاء کی تعداد اور کیفیت روایتی طور پر ۴۵ یا ۵۰ تسلیم کر لی جائے، حضورؐ کی بھی کسی سے مواخاۃ نہیں ہوئی۔ دوسرے یہ کہ حضورؐ چونکہ تمام انصار سے بحیثیت مجموعی بیعت عقبۂ کبیرہ میں یہ کہہ چکے تھے کہ تمہارا خون میرا خون، تمہاری جان میری جان ہے تم اطمینان رکھو جس سے تم لڑو گے اس سے میں لڑوں گا اور جس سے تم صلح کرو گے اس سے میں بھی صلح کروں گا۔ تمہارا ذمہ میرا ذمہ ہے اور تمہاری حرمت میری حرمت، میرا جینا اور مرنا تمہارے ساتھ ہو گا[2] تو پھر ظاہر ہے کہ دوبارہ انفرادی طور پر کسی انصاری سے رشتۂ اخوت استوار کرنا محض ایک تکلف اور غیر ضروری امر ہوتا۔ نیز اگر حضورؐ کسی ایک انصاری سے بھی مواخاۃ کر لیتے تو شاید یہ عقد دوسرے انصار کی دل شکنی کا باعث بنتا۔ علاوہ ازیں آپ کی نبوت کی انفرادیت کا تقاضہ یہی تھا کہ آپ کسی ایک سے وابستہ ہونے کے بجائے سب سے وابستہ رہیں۔

اسی طرح حضرت حمزہؓ اور حضرت زید بن حارثہؓ کی مواخاۃ کا معاملہ ہے۔ ابن ہشام اور اس کے اتباع میں بعض دوسروں نے بھی اسے مواخاۃ مدینہ سے منسوب کیا ہے حالانکہ ایک طرف تو یہ بات ہے کہ ایک مہاجر کا دوسرے مہاجر سے رشتہ ہی مواخاۃ کی مجموعی اسکیم سے مطابقت نہیں رکھتا اور دوسری طرف یہ کہ یہاں بھی التباس نظر آتا ہے واقعہ یہ ہے کہ حضرت حمزہ اور حضرت زید کی یہ

۱۔ زاد المعاد فی ھدی خیر العباد۔ ابن قیم جوزی۔ طبع ثانی ۱۹۵۰ء مصطفیٰ البابی الحلبی مصر صفحہ ۵۶ ج ۲

۲۔ یہ عبارت کا مفہوم ہے۔ دیکھیے ابن ہشام صفحہ ۲۶۶، ۲۶۷ ج ۱

مواخاۃ مکہ میں ہوئی تھی۔ مدینہ میں حضرت حمزہؓ کی کوئی مواخاۃ نہیں جبکہ حضرت زید کو حضرت اسید بن حضیرؓ کا بھائی بنایا گیا اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے

اب ہم فہرست مواخاۃ کے دوسرے حصہ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اس میں کل چودہ مہاجرین صحابہ شامل ہیں اسکے بھی دو حصے کئے جا سکتے ہیں۔ ایک حصہ میں نو ان صحابہ کو شمار کیا جا سکتا ہے جن کے رشتہ مواخاۃ کے بارے میں کچھ نہ کچھ اختلافات پائے جاتے ہیں اور دوسرے حصہ میں ان صحابہ کو رکھا جا سکتا ہے جن کی مواخاۃ ہمارے نزدیک ناقابل فہم ہے۔ یہ دونوں فہرستیں درج ذیل ہیں۔

فہرست دوم ، حصہ اوّل

نمبر شمار	مہاجرین	مواخاۃ ہمراہ	انصار
۱ .	حضرت عمر بن خطابؓ	〃	حضرت معاذ بن عفراءؓ یا عویم بن ساعدہؓ یا عتبان بن مالکؓ
۲ .	〃 سعید بن زید بن عمروؓ	〃	〃 ابی ابن کعبؓ یا رافع بن مالکؓ بن عجلان
۳ .	〃 طلحہ بن عبید اللہؓ	〃	〃 ابی بن کعبؓ یا کعب ابن مالکؓ
۴ .	〃 خباب بن الارت تمیمیؓ	〃	〃 جبار بن صخرؓ یا خراش بن صمہؓ یا مقداد اسود کندیؓ
۵ .	〃 زبیر بن العوامؓ	〃	〃 سلمہ بن سلامہؓ بن وقش یا کعب بن مالکؓ
۶ .	〃 ابو عبیدہؓ بن الجراح	〃	〃 محمد بن مسلمہؓ یا سعد بن معاذؓ یا ابو طلحہ انصاریؓ
۷ .	〃 حاطب بن ابی بلتعہؓ	〃	〃 عویم بن ساعدہؓ یا رخیلہؓ بن یخلد یا خالدؓ بن رخیلہ
۸ .	〃 طفیلؓ بن حارث بن المطلب	〃	〃 منذر بن محمدؓ یا سفیان بن نسرؓ
۹ .	〃 سعدؓ بن ابی وقاص	〃	〃 سعد بن معاذؓ
۱۰ .	〃 عامر بن ابی البکرؓ	〃	〃 زید بن دثنہؓ یا ثابت بن قیسؓ
۱۱ .	〃 عثمان بن مظعونؓ	〃	〃 ابی الہیثم بن التیہان یا عباس بن نضلہ خزرجی

فہرست دوم ، حصہ دوم :

نمبر شمار	مہاجرین	مواخاۃ ہمراہ	انصار
۱ .	حضرت ابوذرؓ غفاری	〃	〃 حضرت منذر بن عمروؓ یا طلیب بن عمروؓ
۲ .	〃 سلمان فارسیؓ	〃	〃 ابو درداءؓ
۳ .	〃 جعفر طیارؓ	〃	〃 معاذ بن جبلؓ

اب ہم اسی ترتیب سے مختصراً اپنے معروضات پیش کرنا چاہتے ہیں۔

۱ . جہاں تک حضرت عمرؓ کا تعلق ہے تو آپ کی مواخاۃ حضرت عتبانؓ بن مالک انصاری سے کرائی گئی۔ حضرت عتبانؓ نے ہجرت سے

قبل ہی اسلام قبول کر لیا تھا۔ اور خصوصیت یہ ہے کہ خود عہد رسالت میں مسجد بنی سالم کے امام تھے اور اس منصب پر اخیر عمر تک رہے۔ غزوہ بدر میں شریک تھے۔ بعد میں نابینا ہو جانے کی وجہ سے دوسرے غزوات میں شرکت سے معذور رہے۔ آپؓ[1] ذی حدیث بھی ہیں۔ تقدس، حب رسولؐ، حسن خلق کے اوصاف سے متصف تھے۔ انہوں نے ۵۲ھ میں وفات پائی۔ حضرت عمرؓ سے مواخاۃ کے ضمن میں اگرچہ دو قول اور بھی ملتے ہیں یعنی ایک حضرت معاذ بن عفراء انصاری اور دوسرے حضرت عویمؓ بن ساعدہ انصاری کا لیکن صحیح بات یہی ہے کہ حضرت عمرؓ کی مواخاۃ حضرت عتبانؓ سے ہوئی تھی اور مؤرخین کا زیادہ رجحان اسی قول کی طرف ہے۔ ظاہر ہے ایک صحابی کی مواخاۃ بیک وقت بہت سے صحابہ سے نہیں بلکہ کسی ایک ہی صحابی سے ہو سکتی ہے۔ چنانچہ حضرت معاذ بن عفراءؓ کی حضرت معمر بن الحارثؓ سے اور حضرت عویم بن ساعدہؓ کی حضرت حاطبؓ بن ابی بلتعہ سے ہوئی تھی۔

۲۔ حضرت سعیدؓ بن زیدؓ بن عمرو بن نفیل زمرہ سابقین الاولین اور عشرہ مبشرہ میں سے تھے۔ حضرت عمرؓ کے حقیقی بہنوئی تھے۔ مہاجرین مدینہ کی اولین جماعت میں شامل تھے۔ آپ کی مواخاۃ حضرت رافع بن مالکؓ بن عجلان سے کرائی گئی۔ انصار کے ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے سب سے پہلے حضورؐ کے دست حق پرست پر بیعت فرمائی تھی۔ تمام بیعت ہائے عقبہ میں حاضر تھے اور آخری بیعت میں بنو زریق[2] کے نقیب بنائے گئے تھے۔ ابن ہشام اور ابن عبدالبر نے بتایا ہے کہ حضرت سعیدؓ کی مواخاۃ حضرت ابیؓ ابن کعب انصاری سے ہوئی اور ہمارے یہاں علامہ شبلی نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے لیکن بقول علامہ محمد ابن حبیب کے صحیح یہی ہے کہ حضرت سعید کی مواخاۃ حضرت رافع بن مالک سے ہوئی تھی جبکہ حضرت ابیؓ ابن کعب کی مواخاۃ حضرت طلحہ سے ہوئی تھی۔

۳۔ حضرت طلحہ بن عبیداللہ کا شمار بروایت اسد الغابہ ان آٹھ آدمیوں میں تھا جو ابتداً حلقہ بگوش اسلام ہوئے اور اسلام کی خاطر نشانہ ظلم و ستم بنتے رہے۔ مکہ میں ان کی مواخاۃ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زبیرؓ بن العوام سے کرائی تھی۔ حضرت طلحہؓ حضرت ابوبکرؓ کے داماد تھے اور اس رشتہ سے حضورؐ اور حضرت زبیرؓ دونوں کے ہم زلف بھی تھے۔ خشیت الٰہی، حب رسول، جوش، جذبہ فداکاری اور مہمان نوازی آپ کی نمایاں خصوصیات تھیں۔ اقلیم سخاوت کے بادشاہ تھے کہ دربار رسالت سے "فیاض" کا خطاب ملا تھا۔ تجارت و زراعت دونوں کا مشغلہ رکھتے تھے۔ غیر معمولی دولت و ثروت کا عالم یہ تھا کہ روزانہ آمدنی کا اوسط ایک ہزار دینار کیا گیا ہے۔ ہجرت مدینہ کے بعد بقول ابن سعد و علامہ محمد ابن حبیب بغدادی ان کی مواخاۃ حضرت ابیؓ ابن کعبؓ سے ہوئی۔ حضرت ابیؓ عقبہ ثانیہ میں موجود تھے۔ مرتبہ کا عالم یہ تھا کہ حضرت عمرؓ ان کو سید المسلمین کہتے تھے۔ بارگاہ نبوت میں سب سے پہلے منصب انشاء پر سرفراز ہوئے۔ فن قرأت کے امام، حافظ قرآن تھے۔ مزاج میں خود داری، غیرت اور تکلف نمایاں تھا۔ حُبّ رسولؐ اور مہمان نوازی میں مشہور تھے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ حضرت طلحہؓ کی مواخاۃ حضرت کعبؓ ابن مالک سے ہوئی لیکن جیسا کہ آگے تفصیل آتی ہے۔ حضرت کعبؓ حضرت زبیرؓ بن العوام کے انصاری بھائی تھے۔

۱۔ مدینہ میں مسجد بنی زریق وہ پہلی مسجد ہے جہاں قرآن سب سے پہلے پڑھا گیا (زاد المعاد۔ الجزء الاول صفحہ ۲۵)

۲۔ سیر انصار ج دوم صفحہ ۴۶

۴۔ حضرت خبابؓ دورِ جاہلیت میں غلام تھے۔ دارارقم میں قیام سے پہلے حضورؐ کے ہاتھ پر بیعت اطاعت کی۔ اسلام لانے والوں میں چھٹا نمبر تھا اس لئے سادس اسلام بھی کہلاتے ہیں۔[۱] ہجرت کے بعد بقول ابن حبیب، حضرت جابرؓ بن صخر سے مواخاۃ ہوئی۔ حضرت جابرؓ بیعت عقبۂ ثانیہ میں حاضر اور تمام غزوات میں شریک تھے۔ جب رسول ان کی نمایاں خصوصیت تھی۔ بعض مصنفین[۲] نے حضرت خبابؓ کی مواخاۃ حضرت مقداد اسود کندی اور خراش بن صمہ غلام تمیم سے تسلیم کی ہے مگر ہمارے نزدیک پہلا قول ہی راجح ہے۔

۵۔ حضرت زبیر بن العوام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پھوپھی زاد بھائی اور ہم زلف، حضرت خدیجہ کے حقیقی بھتیجے اور حضرت ابوبکر کے داماد تھے۔ ان کا لقب حواریٔ رسول تھا۔ تحریک اسلامی کے بالکل ابتدائی دور میں اسلام لائے۔ ایک روایت کے مطابق اس وقت تک صرف پانچ یا چھ اشخاص نے اسلام قبول کیا تھا۔ پہلی ہجرت حبشہ میں شامل تھے۔ پھر کچھ دنوں بعد واپس مکّہ آگئے تھے۔ ذریعہ معاش تجارت تھا جس میں کبھی نقصان نہیں ہوا۔ متمول ترین اشخاص میں سے تھے۔ مکہ میں ان کی مواخاۃ حضرت طلحہ سے ہوئی تھی۔ ہجرت مدینہ کے بعد مواخاۃ حضرت کعب بن مالکؓ سے ہوئی نہ کہ سلمہ بن سلامہ بن وقش[۳] سے جو حضرت ابوسبرۃ بن ابی رہم کے دینی بھائی تھے۔[۴] اور حضرت عبداللہ بن مسعود سے[۵] تو ان کی مواخاۃ کا سوال اصولی طور پر ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۶۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دارارقم میں مقیم ہونے سے پہلے ایک اور ایمان لانے والے امین الامۃ حضرت ابوعبیدہؓ بن الجراح ہیں اگرچہ ابن ہشام اور ابن حجر نے ان کی مواخاۃ حضرت سعد بن معاذؓ سے قرار دی ہے لیکن ابن حبیب بغدادی کا یہ قول ہی صحیح رہا ہے کہ ان کی مواخاۃ حضرت محمد بن مسلمہؓ سے ہوئی تھی، جنہوں نے حضرت سعد بن معاذؓ سے قبل ہی حضرت مصعب بن عمیرؓ کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا تھا جبکہ حضرت سعد بن معاذ کے مہاجر بھائی اکثر مؤرخین (مثلاً محمد ابن حبیب اور ابن عبدالبر صاحب الدرر وغیرہ) کے بقول حضرت سعدؓ بن ابی وقاص ہیں۔

ہمارے خیال میں اب یہ مختصر سے اشارات بھی خاصے طویل ہو گئے ہیں اور اس بات کا اندیشہ ہو رہا ہے کہ اس فہرست کا حصہ دوم بالکل ہی نہ چھوٹ جائے اس لئے یہاں بربنائے ترجیح اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ حضرت حاطب بن ابی بلتعہؓ کی مواخاۃ حضرت عویم بن ساعدہؓ سے، حضرت طفیل بن حارثؓ کی حضرت منذر بن عمروؓ سے، حضرت عامر بن ابی البکیر کی حضرت زید بن دثنہ سے اور حضرت عثمان کی حضرت ابی الہیثم بن تیہان سے ہوئی تھی۔

اب جہاں تک فہرست کے آخری حصہ کا تعلق ہے جس میں تین مہاجر صحابہ (حضرت جعفرؓ، حضرت سلمانؓ اور حضرت ابوذرؓ) شامل

۱۔ مہاجرین حصہ دوم صفحہ ۲۰۸

۲۔ 〃 〃 صفحہ ۲۱۰

۳۔ ابن ہشام صفحہ ۳۰۴ ج ۱

۴۔ کتاب المحبر صفحہ ۷۲

۵۔ ابن ہشام صفحہ ۳۰۴ ج ۱

ہیں اور جس کا ذکر نہ صرف ابن ہشام بلکہ دوسرے مؤرخین نے بھی کیا ہے تو اس سلسلے میں ہمیں اتنا عرض کرنا ہے کہ ان حضرات کی مواخاۃ بعض وجوہ کی بنا پر ہمارے لئے سخت ناقابل فہم بن گئی ہے اور اس اجمال کی تفصیل یہ ہے۔

ل۔ پہلے حضرت جعفرؓ طیار کی مواخاۃ پر غور کیجئے۔ ابن ہشام کی روایت، جس کا تتبع دوسروں نے بھی کیا ہے۔ یہ ہے کہ ان کی مواخاۃ حضرت معاذ ابن جبلؓ سے ہوئی پھر آگے یہ بھی صاف صاف لکھ دیا ہے کہ : وکان جعفر بن ابی طالب یومئذ غائبا بارض الحبشۃ[1] اور یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ حضرت جعفر ۷ھ تک حبشہ میں مقیم رہے اور پھر اسی سن میں ایک جماعت مہاجرین کے ساتھ مدینہ اس وقت تشریف لائے جبکہ مسلمان فتح خیبر کی خوشیاں منا رہے تھے۔ حضرت جعفرؓ کہیں اور رکنے کے بجائے سیدھے خیبر پہنچے اور حضورؐ سے ملاقات کی۔ ظاہر ہے کہ نہ تو غائبانہ طور پر مواخاۃ کرانے کا کوئی مفہوم ہو سکتا ہے اور نہ یہ ممکن ہے کہ حضرت معاذؓ بن جبل کی مواخاۃ کو حضرت جعفرؓ طیار کی تشریف آوری تک ملتوی رکھا گیا ہو اور پھر جب وہ آگئے تو رشتۂ اخوت استوار کر دیا گیا۔ اسے علامہ ابن کثیر نے بھی اپنی کتاب السیرۃ النبویہ میں محل نظر قرار دیا ہے[2]

ب۔ اس کے بعد حضرت سلمانؓ فارسی کے معاملہ کو لیجئے۔ اول تو یہی مسئلہ مختلف فیہ ہے کہ حضرت سلمان نے اسلام کب قبول فرمایا؟ پھر دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ آپ حلقۂ غلامی سے آزاد ہو کر مسلمانوں کے ساتھ آزادانہ رہنے کے قابل یا جماعت صحابہ کے دوش بدوش سرگرم عمل کب سے رہے ہیں؟ بہرحال اگر یہ مان لیا جائے کہ انہوں نے حضورؐ کی آمد مدینہ کے فوراً بعد اسلام قبول کر لیا تھا تو دوسرا مسئلہ ان کے انصاری بھائی حضرت ابوالدرداء کا ہے جن کے بارے میں یہ بات معلوم ہے کہ انہوں نے ۲ھ میں اسلام قبول کیا تھا جبکہ مواخاۃ کا انعقاد ہجرت مدینہ کے پانچویں مہینے ۱ھ میں ہوا[3] غرض واقعات کی یہ تقدیم و تاخیر معاملہ کو ناقابلِ فہم بنا دیتی ہے۔ مزید برآں ایک قابلِ غور پہلو یہ بھی ہے کہ ان کو کس زمرہ میں شمار کیا جائے گا۔ مہاجرین کے یا انصار کے۔ اب ظاہر ہے کہ مہاجرین میں تو شمار ممکن ہی نہیں کہ نہ ہجرت سے قبل اسلام قبول کیا نہ یہ کہ قبول اسلام کے بعد ہجرت فرما کر مدینہ آئے ہوں۔ اگر انصار میں شمار کریں گے تو ایک مسئلہ اور اُٹھ کھڑا ہو گا یعنی یہ کہ اگر ہم بالفرض حضرت ابوالدرداءؓ کی سبقت اسلامی بھی قبول کر لیں تو سوال یہ ہے کہ ایک انصاری کی مواخاۃ دوسرے انصاری سے کیسے ممکن ہے جبکہ نہ اس کی کوئی مثال ہے اور نہ مواخاۃ کے اغراض و مقاصد اور مصالح کے اعتبار سے یہ مناسب ٹھہر سکتی ہے اور پھر یہ کہ جس طرح ایک مہاجر اور دوسرے مہاجر کی مواخاۃ ناقابلِ قبول ٹھہرتی ہے تو اسی قاعدہ کی رو سے ایک انصاری اور دوسرے انصاری کے درمیان مواخاۃ بھی عندالناس ناقابل قبول ہو گی۔

ج۔ آخیر میں اسی قسم کا نمونہ حضرت ابوذر غفاریؓ اور حضرت منذرؓ بن عمرو یا طلیب بن عمیرؓ کی مواخاۃ میں نظر آتا ہے حالانکہ واقعہ یہ

۱۔ ابن ہشام ج ا صفحہ ۳۰۴

۲۔ ج ۲ صفحہ ۳۲۶

۳۔ دیکھئے: المعارف: ابن قتیبہ صفحہ ۱۵۲ دار الکتب مصر ۱۹۶۰ء ابن عبدالبر، الدرر صفحہ ۹۶ حاشیہ، نیز زرقانی ج ا صفحہ ۲۷۲

ہے کہ حضرت طلیب تو خود مہاجر ہیں اور ان کی مواخاۃ دراصل حضرت منذر بن عمرو سے ہوئی تھی۔ اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ حضرت ابوذر غفاریؓ کی مواخاۃ ان حضرات میں سے کسی ایک سے یا دونوں سے ہوئی تھی تو دوسرا مسئلہ خود حضرت ابوذر غفاریؓ کا سامنے آجاتا ہے اور وہ یہ کہ اسلام لانے والوں میں تقریباً پانچویں نمبر پہ ہونے کے باوجود بنی غفار کے ساتھ ہی مقیم رہے اور ہجرت کر کے مدینہ غزوہ خندق ۵ھ کے بعد تشریف لائے۔ اگر واقدی کا یہ قول تسلیم کر لیا جائے کہ حضرت ابوذرؓ آیت میراث کے بعد مدینہ تشریف لائے تھے تو ظاہر ہے کہ اس آیت کے بعد عقد مواخاۃ کا واقعہ پیش ہی نہیں آیا۔ اس طرح وہی غائبانہ مواخاۃ کی شکل یہاں بھی بن جاتی ہے جو محال ہے۔

بہر صورت یہ ہے مواخاۃ اور اس کے چند پہلوؤں کا ایک مختصر سا جائزہ جو آپ کے سامنے پیش کیا گیا۔ کاش کہ وقت اور فرصت بہم مل جاتے تو ہم مباحث کا قدرے تفصیلی مطالعہ کر سکتے تھے اور پھر یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ جن حضرات صحابہؓ کے درمیان عقد مواخاۃ قائم کیا گیا تھا۔ ان میں کیا کیا باہمی مناسبتیں موجود تھیں بلکہ سیرت رسول اور اسوہ صحابہ کے بارے میں بہت سے ایسے نکات بھی سامنے آجاتے جو عموماً دوران مطالعہ نظروں سے اوجھل رہ جاتے ہیں مثلاً دیکھئے حضرت ارقم بن ابی الارقم مخزومی کی مواخاۃ حضرت ابوطلحہ زید بن سہل انصاریؓ یعنی حضرت انس بن مالک کے سوتیلے باپ سے کرائی گئی۔

ذرا دیکھئے اور غور کیجئے کہ یہ کیسا حسین اتحاد اور دلآویز امتزاج و اتفاق ہے کہ ایک طرف تو حضرت ارقم ہیں جو مکہ میں گیارہ یا بارہ اصحاب کے بعد ایمان لائے، انہی کا گھر فرودگاہ نبوی بنا، دار ارقم میں ہی وحی و نبوت کے چشمے سے تشنگان حق سیراب ہوئے اور ان ہی کے مکان میں "پہلا عقد مواخاۃ" بھی قائم ہوا۔ دوسری طرف حضرت ابوطلحہ ہیں جو بیس سال کی عمر میں بیعت عقبۂ ثانیہ میں ایمان لائے انہی کو حضورؐ نے انصار کا نقیب بھی تجویز فرمایا تھا غزوہ احد میں یہی آنحضرتؐ کے آگے سپر بن گئے تھے۔ آپ ہی نے خیبر میں گدھے کے گوشت کے بارے میں منادی کی تھی، آپ ہی نے حضورؐ کی لحد مبارک تیار کی تھی۔ آپ ہی کا گھوڑا (مندوب) حضورؐ نے مستعار لیا تھا اور اس پر سوار ہو کر دشمن کی خبر لینے گئے تھے اور پھر سب سے اہم بات یہ ہے کہ آپ ہی کے گھر میں دوسری مرتبہ "عقد مواخاۃ" کا انعقاد ہوا۔ گویا مہاجر کا گھر بھی "مواخاۃ" کا مرکز اور اس کے انصاری بھائی کا دولت کدہ بھی "مواخاۃ" کا مرکز۔

اسی طرح سے حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ اور حضرت معاذ بن جبلؓ کی مواخاۃ کا معاملہ ہے۔ دونوں پر عنایات نبوی خاص ہیں اور دونوں فقہی ذہن و بصیرت کے مالک ہیں اور دونوں امارات و قضا کے مناصب پر فائز ہوئے اور ہجرت مدینہ کے بعد دونوں ایک ہی گھر میں رہے کیونکہ ہجرت کے بعد حضرت ابن مسعودؓ ان ہی کے مہمان ہوئے اور اُن ہی کے یہاں قیام رہا اور ان ہی سے مواخاۃ کا رشتہ قائم ہوا۔

حضرت وہب بن سعدؓ بن ابی سرح اور ان کے انصاری بھائی حضرت سوید بن عمروؓ کو دیکھئے کہ دونوں نے زندگی میں تو دامن رفاقت پکڑا ہی تھا جنگ موتہ کے موقع پر آغوش شہادت میں بھی دونوں ساتھ گئے یا پھر اس طرح حضرت زید بن خطابؓ اور ان کے انصاری بھائی حضرت معنؓ بن عدی ہیں۔ ان دونوں نے بھی جنگ یمامہ میں جام شہادت ایک ساتھ نوش کیا اور حضرت عمیرؓ بن ابی وقاص اور حضرت عمرو بن معاذؓ کی مواخاۃ کو دیکھئے کہ دونوں نوجوان، دونوں ہم عمر ہیں۔

آخر میں مواخاۃ کا یہ انداز بھی دیکھتے چلئے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مواخاۃ کے سلسلہ میں انصار کو بھائی بناتے وقت اس کی بھی رعایت رکھی کہ جو مہاجر ہجرت کے بعد جس انصاری کے یہاں آکر فروکش ہوا، اس کا رشتہ اخوت اُسی انصاری سے باندھ دیا گیا۔ مثلاً حضرت ابو بکرؓ حضرت عثمان بن عفانؓ حضرت عبداللہ بن جحشؓ حضرت محرز بن نضلہؓ، حضرت ابو حذیفہؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ وغیرہ بالترتیب حضرت خارجہؓ بن زید بن ابی زہیرؓ، حضرت عمارہؓ بن حزم، حضرت عبادہؓ بن بشر بن وقش اور حضرت معاذؓ ابن جبل کے مہمان بنے اور رشتہ اخوت بھی ان حضرات سے ہی استوار کر دیا گیا۔

بہرحال یہ تو چند مثالیں تھیں ورنہ سلسلہ گفتگو اور دراز ہو سکتا ہے جس کا اب نہ وقت ہے نہ موقع اور نہ آپ میں مزید سماعت کا حوصلہ۔ اس لئے اس باب کو اسی حد پر تمام کرتے ہیں۔ البتہ یہ عرض کرنے کی اجازت چاہتے ہیں کہ مواخاۃ کا یہ عظیم الشان واقعہ صرف اس لئے نہیں ہے کہ ہم اس کا مطالعہ کرنے کے بعد اس کی تاریخی حقیقت کا اعتراف کر کے رہ جائیں یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کارنامہ پر خراجِ عقیدت پیش کر دیں بلکہ اس لئے ہے کہ ہم اس واقعہ کو اپنے عمل کی بنیاد بنائیں اور انفرادی و اجتماعی زندگی میں اس سے وہی تعمیری مقاصد حاصل کریں جن کو دورِ رسالت میں حاصل کیا گیا اور اپنے معاشرہ کی تشکیل اس طرح کریں کہ جس میں رنگ، نسل، وطن، زبان، قوم، ملک اور دوسری تمام عصبیتوں کو کلیتاً نظر انداز کر کے محض حق و مواسات کی خاطر تمام کلمہ گو ایک ہی رشتہ اخوت و مودت میں منسلک ہو جائیں اور پوری فضا "انما المومنون اخوۃ" کی عطر بیز ہواؤں سے مہک اٹھے۔

شانِ حضرت سیدنا صدیقِ اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت حسّان رضی اللہ عنہ کی نظر میں

ماخوذ از شرح دیوان حضرت حسان بن ثابت الانصاری رضی اللہ عنہ از عبد الرحمٰن البرقوقی مطبوعہ مصر ۱۹۲۹ء صفحہ ۲۹۹

إِذَا تَذَكَّرْتَ شَجْوًا مِنْ أَخِي ثِقَةٍ — فَاذْكُرْ أَخَاكَ أَبَا بَكْرٍ بِمَا فَعَلَا
اَلتَّالِي الثَّانِيَ الْمَحْمُودَ شِيمَتُهُ — وَأَوَّلَ النَّاسِ طُرًّا صَدَّقَ الرُّسُلَا
وَالثَّانِيَ اثْنَيْنِ فِي الْغَارِ الْمُنِيفِ وَقَدْ — طَافَ الْعَدُوُّ بِهِ إِذْ صَعَّدَ الْجَبَلَا
وَكَانَ حِبَّ رَسُولِ اللهِ قَدْ عَلِمُوا — مِنَ الْبَرِيَّةِ لَمْ يَعْدِلْ بِهِ رَجُلَا
خَيْرُ الْبَرِيَّةِ أَتْقَاهَا وَأَرْأَفُهَا — بَعْدَ النَّبِيِّ وَأَوْفَاهَا بِمَا حَمَلَا

ترجمہ: "اگر تو اپنے معتمد بھائی کا غم یاد کرے، تو اپنے بھائی ابوبکر (رضی اللہ عنہ) کے کارنامے یاد کر۔ ترتیب درجات میں آپ دُوسرے ہیں۔ آپ کی خصلت ستودہ اور قابلِ ستائش ہے۔ آپ رسولوں کی تصدیق کرنے والوں میں تمام انسانوں پر شرفِ سبقت رکھتے ہیں۔ اس عظیم بلند غار میں جب ثانی اثنین تشریف فرما تھے اور دشمن پہاڑ پر غار کے اردگرد سرگرداں تھے آپ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب ہیں اور سب جانتے ہیں کہ پوری مخلوق میں محبوبیت کے اس درجے پر کوئی شخص فائز نہیں ہوا۔ جو نبی (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کے بعد مخلوق میں سب سے بہتر سب سے زیادہ متقی ہیں اور سب سے زیادہ رافت کے پیکر ہیں اور سب سے بڑھ کر اپنے فرائض کو انجام دینے والے ہیں۔"

حضرت حسان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ تعریف محض شاعرانہ نہ تھی، حقیقت پر مبنی تھی۔ واقعی پوری نوعِ انسانی میں عشقِ رسول اور تصدیقِ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم میں سیدنا صدیقِ اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہم پایہ کوئی نہیں۔ چنانچہ حدیث شریف میں اس امر کی صراحت موجود ہے کہ جب رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے حضرت حسان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے یہ اشعار سماعت فرمائے تو فرطِ محبت سے خندہ فرمایا اور ارشاد مبارک ہوا:

"صَدَقْتَ يَا حَسَّانُ! هُوَ كَمَا قُلْتَ"

(اے حسان! تُو نے سچ کہا، صدیق واقعی ویسا ہی ہے جیسا تم نے کہا)

آپ کے اس فرمان نے سیدنا صدیقِ اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عدیم النظیر جذبۂ عشقِ رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر مُہرِ توثیق ثبت کر دی ہے تاکہ قیامت تک آنے والی نسلِ انسانی سوزِ صدیق رضی اللہ عنہ سے اپنے قلب و روح کو گرماتی رہے۔

سیرۃ الصدّیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ

محمد حبیب الرحمٰن خاں شروانی

باب اوّل

نام، نسب، لقب، والدین ایامِ جاہلیت میں عبدالکعبہ نام تھا بعد اسلام حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ تجویز فرمایا۔ صدّیق و عتیق دو نوں لقب ہیں، ابوبکر کنیت، سب سے زیادہ شہرت کنیت نے حاصل کی۔ نسباً قریشی تیمی ہیں۔ سلسلۂ نسب یہ ہے:

عبداللہ بن ابی قحافہ عثمان بن عامر بن عمرو بن کعب بن سعد بن تیم بن مُرہ بن کعب بن لُوئی بن غالب۔

چھٹی پشت میں مرہ بن کعب پر پہنچ کر اُن کا نسب حضرت سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے نسب سے مل جاتا ہے۔ حضرت ابوبکر کے والد کا نام عثمان، کنیت ابوقحافہ تھی۔ سنہ ۸ھ میں فتح مکّہ کے وقت نوّے برس کی عمر میں اسلام لائے۔ سنہ ۱۴ھ میں بعہدِ خلافتِ فاروقی وفات پائی۔ والدہ کا نام سلمیٰ، کنیت ام الخیر تھی، قریشی تیمی ہیں، اسلام سے مشرف ہوئیں۔

ولادت حضرت ابوبکرؓ عام فیل[2] کے ڈھائی برس بعد پیدا ہوئے یعنی آغاز سنہ ہجری سے پچاس برس چھ مہینے پہلے۔

ایامِ جاہلیت ایامِ[3] جاہلیت میں بھی قریش کے رؤسا میں سے تھے۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ صحابہ کرامؓ[4] میں دس آدمی ایسے تھے جو ایامِ جاہلیت اور عہدِ اسلام دونوں میں رئیس و سربرآوردہ مانے گئے۔ منجملہ ان کے ایک حضرت صدّیق بھی ہیں۔ قیام مکّہ میں رہتا تھا۔ تجارت ذریعۂ معاش و دولتمندی تھی۔ سلسلۂ تجارت میں شام اور یمن کے متعدد سفر کیے تھے۔ پہلا سفر اٹھارہ برس کی عمر میں کیا۔ حسنِ اخلاق، ہمدردی، وسعتِ معلومات، دانشمندی اور معاملہ فہمی وہ اوصاف ہیں جن میں حضرتِ صدّیق قبل اسلام بھی ممتاز تھے۔ انہی صفات کی وجہ سے لوگ ان کے گرویدہ تھے۔ اہم معاملات میں مشورہ

۱؎ بکر آپ کی اولاد میں کسی کا نام نہ تھا۔

۲؎ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت سے چالیس برس پہلے حبش کے بادشاہ نے مکّہ پر حملہ کیا تھا۔ چونکہ ہاتھی اُس کے ساتھ تھے اس لیے اس سال کا نام عام فیل اور حملہ کرنے والوں کا نام اصحابِ فیل مشہور ہوا۔

۳؎ ایامِ جاہلیت عرب کا وہ زمانہ جو ظہورِ اسلام کے قبل تھا۔

۴؎ جو مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے جمالِ مبارک کی زیارت سے مشرف ہوئے وہ صحابی کہلاتے ہیں۔ صحابہ جمع کا صیغہ ہے۔

لیتے اور ان کی رائے پر اعتماد کرتے۔ قبیلہ قریش کی تاریخ اُس کی مختلف شاخوں اور خاندانوں کی قرابت و نسب کا جاننے والا اُن کے عہد میں اُن سے زیادہ کوئی نہ تھا۔ قبائل عرب صدیوں سے آزاد تھے اور ان پر کوئی بادشاہ حکمران نہ تھا۔ قبیلوں کے سردار ہی معاملات کو طے کرتے تھے اور حکومت کے فرائض اور مختلف خدمتیں مختلف سرداروں کے سپرد ہوتی تھیں۔ قبیلۂ قریش کی خدمتِ اشناق[ا] حضرت صدیق اکبرؓ کے متعلق تھی۔ جب کسی قبیلہ میں کوئی خون ہو جاتا تو اگر صدیق اکبرؓ خونبہا کی ضمانت کر دیتے تو مقبول ہوتی دوسرے کی ضمانت قبول نہ کی جاتی۔ شعر کہنے پر پُوری قدرت حاصل تھی۔ اسلام لائے تو شعر کہنا چھوڑ دیا۔ اور پھر کبھی نہیں کہا۔ شراب زمانۂ جاہلیت میں بھی نہیں پی۔

اسلام نزولِ وحی سے ایک سال پہلے سے حضرت ابوبکر صدیقؓ حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آتے جاتے تھے۔ آغازِ وحی کے زمانہ میں بسلسلہ تجارت یمن گئے ہوئے تھے جب واپس آئے تو قریش کے سردار ابوجہل، عتبہ، شیبہ وغیرہ ملنے گئے۔ اثناءِ گفتگو میں حضرت ابوبکر نے تازہ خبر دریافت کی تو کہا سب سے بڑی خبر اور بڑی بات یہ ہے کہ ابوطالب کا یتیم بچہ مدعیٔ نبوت بنا ہے۔ اس کے انسداد کے متعلق ہم تمہارے آنے کے منتظر تھے۔ یہ سُن کر حضرت صدیق کے دل میں اشتیاق پیدا ہوا اور اعیانِ قریش کو خوش اسلوبی کے ساتھ رخصت کر کے خدمتِ مبارک میں حاضر ہوئے۔ بعثت کے متعلق سوال کیا اور اُسی جلسہ میں قبولِ اسلام سے مشرف ہوئے۔ حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میں نے جس شخص کے سامنے اسلام پیش کیا اُس میں ایک قسم کی جھجک اور تردّد و فکر ضرور پائی۔ مگر ابوبکر کہ جس وقت میں نے ان کے سامنے اسلام پیش کیا انھوں نے بے جھجک قبول کر لیا۔ اس میں اختلاف ہے کہ اوّل اسلام کون لایا۔ بعض نے کہا ہے کہ حضرت علی المرتضیٰؓ۔ بعض کا قول ہے حضرت ابوبکرؓ۔ قولِ فیصل یہ ہے کہ بالغ مردوں میں حضرت ابوبکرؓ، لڑکوں میں حضرت علیؓ، بیبیوں میں حضرت خدیجہؓ اور غلاموں میں حضرت زید بن حارثہ سب سے اوّل اسلام لائے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص وحی نازل ہونے کے ساتویں روز دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ اُن سے پہلے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ دولتِ ایمان سے مالا مال ہو چکے تھے۔ ایمان لانے کے بعد صدیقِ اکبرؓ نے اپنی تمام قوت و قابلیت سارا اثر کل مال و متاع، جان اور اولاد غرض جو کچھ ان کے پاس تھا وہ سب اللہ اور اس کے رسولؐ کی رضاجوئی و اطاعت میں وقف کر دیا اور قبولِ اسلام کے بعد ان کی تمام زندگی اطاعت و استقامت کی داستان ہے۔ قریش میں اُن کا جو اثر تھا اس کو تم سُن چکے ہو۔ اُس اثر کا جلوہ تھا کہ گروہِ سابقون اوّلون[۲] کے ممتاز فرد مثلاً حضرت عثمانؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف، حضرت سعدؓ بن ابی وقاص اُن کے ذریعہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام سے فیضیاب ہوئے۔ مال اُن غریبوں کی مدد میں صرف کیا جو اسلام لا کر سنگدل

[ا] اس خدمت کا تعلق دیت اور خونبہا سے تھا۔ جب کوئی کسی کو قتل کر دیتا تھا تو قاتل سے جو مالی بدلا لیا جاتا تھا اس کو دیت کہتے تھے، اُس بدامنی و خونریزی کے زمانے میں ظاہر ہے کہ یہ صیغہ کس قدر اہم اور ذمہ داری کا تھا۔

[۲] سابقون اوّلون وہ صحابۂ کرام جو واقعۂ بدر ۲ھ تک ایمان لائے۔

آقاؤں کی سختی کا نشانہ بن رہے تھے۔ ان میں بہت سوں کو حضرت ابوبکرؓ نے خرید خرید کر آزاد کر دیا۔ منجملہ ان کے حضرت بلالؓ بھی تھے۔ اُن کی داستان کیسی دردانگیز ہے۔ حضرت بلالؓ کا آقا اُن کے مسلمان ہو جانے کی وجہ سے بہت ناراض تھا۔ جوشِ غضب میں وُہ عین دوپہر کے وقت تپتی ہوئی ریت پر لٹاتا، سینے پر بھاری سا پتھر رکھ دیتا اور کہتا: جب تک لات اور عُزّیٰ[1] پہ ایمان نہیں لائے گا اسی عذاب میں مبتلا رکھوں گا۔ مگر پتھر کے نیچے سے آواز آتی:

"اَحَدٌ اَحَدٌ" (میرا معبود وحدہٗ لاشریک ہے، وحدہٗ لاشریک۔)

ایک روز حضرت ابوبکرؓ نے یہ حالت دیکھی تو رحم آیا اور خرید کر آزاد کر دیا۔

ابتدائے اسلام میں تین برس تک حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلیغ اسلام خفیہ فرمائی تھی اُس زمانہ میں حضرت ابوبکرؓ بھی پوشیدہ خدمتِ اسلام کرتے تھے، جب رسالت کے چوتھے سال یہ آیت نازل ہوئی:

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ۔ تم کو جو حکم دیا جاتا ہے اس کو علانیہ بیان کرو اور مشرکوں کی طرف سے منہ پھیر لو۔

تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کلمۂ حق کا اعلان شروع کیا اور شرک و جہل کی مذمت علانیہ فرمانے لگے۔ اس سے مشرکینِ عرب بھڑکے، اُن کی بھڑک وحشی اور جنگجو عربوں کی بھڑک تھی کیا کچھ نہ کر گزرے۔ کوئی ایذا اور کوئی تکلیف نہ تھی جو خدا کے حبیب (صلی اللہ علیہ وسلم) کو نہ پہنچائی گئی۔ ان مصیبتوں میں صدیقِ اکبرؓ کا بھی حصہ تھا۔ ایک روز حرمِ کعبہ میں مشرکوں کا مجمع ہے اور یہ تذکرہ کر رہے ہیں کہ ہمارے معبودوں کی مذمت نئے نبی نے کیسی کی ہے۔ ناگاہ حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم طوافِ کعبہ کے واسطے داخلِ حرم ہوئے آپ کو دیکھ کر مشرکوں کی آتشِ غضب بھڑکی اور ایک شخص نے بڑھ کر کہا:

"اے شخص! تُو ہی ہمارے معبودوں کی توہین کرتا ہے۔"

ارشاد فرمایا: "بیشک!"

یہ سن کر تمام مجمع آپ سے لپٹ گیا۔ نا ہنجار مارتے تھے اور کہتے تھے:

اَتَجْعَلُ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا۔ کیا تُو سب خداؤں کو ایک خدا کر دے گا!

آخر آپ بیہوش ہو کر گر گئے۔ کسی نے حضرت ابوبکرؓ سے جا کر کہا:

"اَدْرِكْ صَاحِبَكَ" (اپنے رفیق کی خبر لو)

دوڑتے ہوئے آئے اور مجمع کفار میں گھس گئے۔ کسی کو مارتے، کسی کو ہٹاتے اور کہتے جاتے:

وَيْلَكُمْ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ وَقَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ تم پر افسوس ہے کیا تم ایک شخص کو اس کہنے پر مارے ڈالتے ہو کہ میرا رب اللہ ہے اور حال یہ ہے کہ وُہ خدا

---

[1] لات اور عزّیٰ عرب کے دو مشہور بُت تھے۔

مِنۡ رَّبِّكُمۡ۔ کی جانب سے روشن دلیلیں تمہارے پاس لایا ہے۔

یہ مداخلت مشرکوں کو سخت ناگوار ہوئی اور سب کے سب اُن پر جھپٹ پڑے۔ اتنا مارا کہ سر پھٹ گیا اور خون بہنے لگا عزیزوں نے آکر بچایا۔ یہ سُن لو کہ حضرت صدیقؓ پٹتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے:

تَبَارَكْتَ يَا ذَا الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ۔ اے عزّت وجلال والے! تیری ذات بہت بابرکت ہے۔

حضرت عائشہؓ کا قول ہے کہ اس واردات کے بعد جب حضرت ابوبکرؓ گھر پہنچے ہیں تو یہ حال تھا کہ سر پر جس جگہ ہاتھ لگتا وہیں سے بال الگ ہو جاتے۔ واقعہ ہذا کے ساتھ ایک اور واقعہ سنو جس سے عزمِ رسالت کی شان کا اندازہ کر سکو اور عیاں ہو جائے کہ عین تلاطمِ شدائد کے وقت حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خاطرِ مبارک کس قدر مطمئن تھی اور آپ کو اپنے رب کے فضل پر کس قدر بھروسہ تھا۔

صحیح بخاری میں حضرت خبّاب سے روایت ہے کہ میں ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا آپ، اُس وقت کعبہ کے سائے میں ردائے مبارک سر کے نیچے رکھے لیٹے ہوئے تھے میں نے عرض کی "یا رسول اللہ! آپ ہماری مدد کے واسطے اللہ سے دعا نہیں کرتے۔" یہ سُن کر آپ اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ چہرۂ مبارک غصّے سے سُرخ ہو گیا۔ فرمایا: "اگلے لوگوں کا گوشت لوہے کے کنگھوں سے نوچ نوچ کر ہڈیوں سے الگ کیا گیا۔ اس پر بھی وہ دین سے نہیں ہٹے۔ اُن کے سر پر آرے چلائے گئے۔ چیر کر بیچ میں سے دُو کر دئیے گئے۔ تاہم دین پر قایم رہے[1]۔ اللہ اس دین کو ضرور کامیاب فرمائے گا اور نوبت یہ پہنچے گی کہ ایک سوار صنعاء[2] سے حضرموت تک جائے گا اور سوائے اللہ کے کسی سے نہیں ڈرے گا۔"

جب کفّار کی سختیوں کا تحمل مسلمانوں سے نہ ہو سکا تو آپ نے فرمایا کہ حبشہ کو ہجرت کر جاؤ وہاں کا عیسائی بادشاہ عادل و رحم دل ہے۔ اُس کے زیرِ سایہ آدمیوں کو امن و آسائش کی نعمت حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ دو مرتبہ مسلمان ہجرت کر کے ملکِ حبش کو گئے۔ ایک دفعہ گیارہ مرد اور چار بیبیاں، دوبارہ اسّی سے زیادہ مرد اور بیبیاں۔ خود سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں قیام فرما رہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے عرصۂ دراز تک سختیوں کی برداشت کی اور دامنِ حضوریؐ نہ چھوڑا۔ مگر آخر وہ بھی مجبور ہو گئے اور گھر بار کو چھوڑ کر براہِ یمن ملکِ حبش کی راہ لی۔ پانچ منزلیں طے کر کے برک الغماد نامی مقام پر[3] پہنچے تھے کہ قبیلۂ قارہ[4] کے رئیس ابن الدغنہ سے ملاقات ہوئی۔ اس نے دیکھ کر حیرت سے پوچھا کہ کہاں جاتے ہو؟ صدیقِ اکبرؓ نے جواب دیا کہ مجھ کو میری قوم نے نکال دیا۔ اب پردیس میں پھر کر اپنے رب کی عبادت کروں گا۔

---

[1] مدعا یہ ہے کہ تم اتنی ہی تکلیفوں سے گھبرائے جاتے ہو۔

[2] صنعاء و حضرموت یمن میں واقع ہیں اُن کے درمیان فاصلہ ۲۱۶ میل ہے۔

[3] یہ مقام یمن کی طرف مکّہ سے پانچ منزل ہے۔ [4] قبیلۂ قارہ قریش کے قبیلہ بنی زہرہ کا حلیف تھا اس کی تیراندازی ضرب المثل تھی۔

ابن الدغنہ! تم سا آدمی جو بیکسوں کا مددگار، مصیبت زدوں کا ہمدرد، مہمان نواز، راہ حق کی مصیبتوں میں غمخوار ہو وہ نہ اپنے گھر سے نکل سکتا ہے اور نہ نکالا جا سکتا ہے۔ میں تم کو پناہ دُوں گا، مکہ کو لُوٹ چلو اور وطن میں اپنے رب کی عبادت کرو۔

چنانچہ حضرت ابوبکرؓ ابن الدغنہ کے ساتھ واپس آ گئے۔ شام کو ابن الدغنہ نے اشرافِ قریش کے مجمع میں جا کر کہا کہ تم ایسے شخص کو یہاں سے نکالتے ہو جو محتاجوں کا حامی، مصیبت زدوں کا غمخوار اور راہِ حق کی مصیبتوں میں ہمدرد ہے۔ ابوبکر سے شخص کو نہ نکلنا چاہیے اور نہ نکالنا۔ قریش نے ابن الدغنہ کی امان کو تسلیم کیا اور کہا کہ ابوبکر سے کہہ دو کہ اپنے رب کی عبادت گھر کے اندر کریں۔ گھر میں بیٹھ کر جو چاہیں پڑھیں علانیہ عبادت کریں نہ تلاوت۔ ورنہ ہم کو خوف ہے کہ ہماری مستورات اور ہمارے نوجوان مبتلائے فساد ہو جائیں گے۔

عرصہ تک حضرت ابوبکرؓ نے اس کی پابندی کی آخر کار شوقِ دل نے مجبور کیا اور گھر کے باہر میدان میں ایک مسجد[1] بنا کر نماز و تلاوت میں مصروف رہنے لگے۔ حضرت ابوبکرؓ بے حد رقیق القلب تھے۔ تلاوتِ کلامِ مجید کے وقت زار زار روتے۔ یہ عالم دیکھ کر قریش کی عورتوں اور نوجوانوں کا ہجوم ہو جاتا اور محویت ہو کر پروانہ وار ایک دُوسرے پر گرتے۔ اشرافِ قریش یہ حالت دیکھ کر گھبرا اُٹھے اور ابن الدغنہ کو بلا کر کہا کہ ابوبکر شرائطِ امن پر قائم نہیں رہے۔ باہر مسجد میں بالاعلان نماز و قرآن پڑھتے ہیں۔ ہم کو اپنی عورتوں اور نوجوانوں کے گمراہ ہو جانے کا سخت اندیشہ ہے۔ ان کو روکو ورنہ اپنی پناہ واپس لو۔ ہم تم سے بدعہدی نہیں کرنی چاہتے۔ اسی کے ساتھ ابوبکر کو علانیہ نماز و قرآن پڑھنے کی اجازت بھی نہیں دے سکتے۔ ابن الدغنہ نے آ کر حضرت ابوبکرؓ سے یہ ماجرا کہا تو انہوں نے جواب دیا:

اَرُدُّ اِلَیْکَ جِوَارَکَ وَ اَرْضٰی بِجِوَارِ اللّٰہِ۔	تمہاری پناہ تم کو مبارک میں اپنے اللہ کی پناہ سے خوش ہوں۔

یہ واقعہ تیرھویں سال نبوت کا ہے۔

ہجرت نزولِ وحی کے بعد تیرہ برس تک حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں قیام فرمایا۔ صبر و تحمل اور عزم و استقلال کی جو شان ان تیرہ برس میں ذاتِ اقدس سے عیاں ہوئی وہ قیامت تک نوعِ انسانی کے واسطے شمعِ ہدایت کا کام دے گی۔ خیال کرو ایک ذات ظاہری اسبابِ حفاظت و مدافعت قطعاً معدوم۔ خالق کا پیامِ مخلوق کو پہنچانے کی گرانبار ذمہ داری دوشِ مبارک پر، عرب سی سرکش، جنگجو اور کینہ پرور قوم سے شرک و بت پرستی پُشتوں کے اخلاقی جرائم اور بدکاریاں (جن کا سرچشمہ جہالت سفاکی و خودسری تھی) چھڑانے اور تصفیہ و تزکیہ کے بعد اُن کے دلوں کو نورِ عرفان اور پاکیزگیِ اخلاق سے معمور کر دینے کی خدمت سپرد۔ اُس پر کفارِ عرب کی اُن اذیتوں اور تکلیفوں کا تحمل جن کا ایک شمہ اوپر بیان ہُوا۔ پھر خدارا انصاف کرو کہ کیا یہ سب کچھ بدون صداقت اور حق کی قوت کے ہوا؟ اگر ہُوا تو پھر دنیا میں حق یا صداقت کوئی قوت نہیں۔ جھوٹ اور

---

[1] یہ اسلام میں پہلی مسجد تھی۔

دعا سے بھی سب کچھ ہوسکتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ مبعوث ہونے کے بعد تین برس تک آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلیغِ رسالت خفیہ فرمائی۔ اسی زمانہ میں اکابر صحابہ مثلاً حضرت ابوبکرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ ایمان لائے۔ اس کے بعد اعلان تبلیغ کا حکم ہُوا تو آپ نے اعلانِ حق اس قوت و عزیمت کے ساتھ فرمایا کہ عرب کی پہاڑیاں اُس کی صدا سے گونج اُٹھیں۔ اور آج تیرہ سو[1] برس گزر جانے پر بھی باوجود ہزاروں انقلابوں کے دنیا کے تمام برّاعظموں میں وہ صدا گونج رہی ہے اور کروڑوں نفوسِ انسانی کے دل اس کی طرف کھنچے ہوئے ہیں۔ جب اہلِ مکہ کی طرف سے حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم مایوس ہوگئے تو آپ نے یہ طریقہ اختیار فرمایا کہ جو میلے نواحِ مکہ میں ہوتے ان میں تشریف لے جا کر احکامِ الٰہی سُناتے۔ مدت تک یہ مجمعے بھی فیضیاب نہ ہوئے۔ آخر ایک مرتبہ آپ مدینہ والوں کی جماعت میں تشریف لے گئے۔ اس گروہ نے پہلی ہی مرتبہ کلامِ الٰہی شوق اور توجہ سے سنا۔ دو تین سال کے عرصہ میں اہلِ مدینہ کے دل پُوری طرح مسخّر ہوگئے اور وہ بقعۂ پاک اسلام کا دارالامن بن گیا۔ ہجرت سے چار مہینے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کو عام اجازت فرمائی کہ مدینہ کو ہجرت کر جائیں۔ چنانچہ جوق جوق صحابی دار الہجرة کو جانے لگے۔ حضرت عمرؓ نے بھی اسی زمانہ میں ہجرت[2] کی صدیقِ اکبرؓ نے چند مرتبہ قصد کیا۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر مرتبہ یہ کہہ کر منع فرمایا کہ خود مجھ کو حکمِ ہجرت کا انتظار ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے فراستِ ایمانی سے اپنی رفاقت کا احساس کرکے اہتمام کے ساتھ دو طاقتور اونٹوں کی پرورش شروع کردی۔ حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ صبح و شام حضرت ابوبکرؓ کے مکان پر تشریف لے جاتے۔ ایک روز خلافِ عادت دوپہر کے وقت دُھوپ کی تیزی میں تشریف لے گئے۔ سر پر چادر لپٹی ہوئی تھی۔ اس وقت حضرت ابوبکرؓ اپنے بال بچوں میں بیٹھے ہُوئے تھے۔ کسی نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آ رہے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے سُن کر کہا، میرے ماں اور باپ اُن پر قربان، یہ ناوقت کا آنا بے وجہ نہیں ہوسکتا۔ اسی عرصہ میں آپؐ دروازہ پر پہنچ گئے۔ اوّل اجازت طلب فرمائی، بعد اجازت اندر تشریف لے گئے اور تخلیہ کی فرمائش کی۔ حضرت صدیقؓ نے کہا کہ کوئی غیر نہیں صرف میری ہی دونوں لڑکیاں ہیں۔ یہ سُن کر آپؐ نے فرمایا کہ،

ابوبکر کی ہجرت کی اجازت آگئی۔

اُنھوں نے بے ساختہ کہا:

والصحابة یا رسول اللہ۔ اور میری رفاقت یا رسول اللہ؟

ارشاد فرمایا،

رفاقت کی بھی اجازت ہے۔

---

[1] اب چودہ سو برس

[2] ہجرت، رضائے الٰہی کے واسطے ترکِ وطن۔ اُس زمانہ میں ہجرت فرض تھی۔

یہ سُن کر حضرت ابوبکرؓ فرطِ مسرت سے رونے لگے۔ حضرت عائشہؓ کا قول ہے کہ اس روز میں نے جانا کہ آدمی جوشِ خوشی میں بھی روتا ہے۔

اُسی وقت حضرت ابوبکر نے دونوں اونٹ پیش کر کے عرض کی کہ یہ اونٹ آج ہی کے واسطے تیار کیے ہیں۔ ایک سواری خاصہ کے واسطے پسند فرمالیجئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اونٹ قیمتاً لے لیا۔ باقی جملہ انتظام بھی اُسی وقت کیے گئے اور شب کا وقت روانگی کے واسطے مقرر ہُوا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ تمام جلیل القدر اصحاب ہجرت کر کے مدینے چلے گئے تھے، صرف حضرت علی مرتضیٰؓ اور حضرت ابوبکرؓ باقی تھے۔ حضرت علیؓ کو آپؐ نے اس غرض سے مکہ میں چھوڑا کہ جو امانتیں حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھیں وہ واپس دے کر مدینے چلے آئیں۔ یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ باوجود تمام خصومت اور عداوت کے کفارِ مکہ اپنی عزیز اور قیمتی چیزیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے پاس اماناتاً رکھتے تھے اور اس کا باعث وہ اطمینان تھا جو آپ کی صداقت و امانت پر تھا۔ الغرض وقتِ معین پر حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت فرمائی۔ حضرت ابوبکرؓ ہمراہ تھے۔ مکہ سے روانہ ہو کر تین دن تک غارِ ثور میں قیام رہا جو مکہ کے نواح میں ہے۔ اُسی رفاقت کا ذکر اس آیتِ پاک میں ہے؛

ثَانِیَ اثْنَیْنِ اِذْ ھُمَا فِی الْغَارِ۔ دو میں کا دوسرا جبکہ وہ دونوں غار میں تھے۔

اور اسی غار میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کی تسلی کے واسطے وہ کلام ارشاد فرمایا تھا جس کی عظمت و شان کے سامنے آج تک شدید سے شدید دشمن کا بھی سرخم ہے۔ یعنی؛

لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا۔ غمگین نہ ہو، یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

یہ وہ موقع ہے کہ صرف آپ اور آپ کے رفیقِ غار کے اندر ہیں کفارِ مکہ حالتِ غیظ و غضب میں سرگرمِ تلاش ہیں۔ تلاش کرتے کرتے دفعتاً غار کے منہ پر آکھڑے ہوتے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے جو ان کے قدم اپنے سر کے اوپر دیکھے تو گھبرا گئے اور کہا:

اُدْرِکْنَا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ۔ اے اللہ کے رسولؐ! کافروں نے ہم کو آ لیا۔

آپؐ نے غایت اطمینان کے ساتھ فرمایا:

لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا۔ غمگین نہ ہو، یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

رُوحی فداک یا رسول اللہ! تین دن کے بعد اونٹوں پر سوار ہو کر سمندر کی قریب کی راہ سے مدینہ کو روانہ ہوئے۔ ایک اونٹ پر حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ تھے، دوسرے پر عبداللہ بن ارقط راہبر اور حضرت ابوبکرؓ کے غلام آزاد حضرت عامرؓ بن فہیرہ۔ حضرت ابوبکرؓ کا سن اُس وقت انچاس برس چھ مہینے کا تھا۔ ڈاڑھی اور سر کے بال بالکل سپید تھے۔ حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا سن مبارک ترپن برس کا تھا مگر بال بالکل سیاہ تھے۔ قبولِ اسلام کے زمانہ میں جو چالیس ہزار کا سرمایہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس تھا وہ خدمتِ اسلام میں صرف ہوتے ہوتے اب صرف پانچ ہزار رہ گیا تھا۔ ہجرت کے وقت وہ سب روپیہ انھوں نے ساتھ لے لیا۔ اہل و عیال کفار کے نرغے اور خدائے ذوالجلال کی پناہ پر چھوڑ دیے۔ ابو قحافہ نے جب اپنے بیٹے کی ہجرت کا حال سُنا تو گھبرائے ہوئے آئے اور اپنی پوتی حضرت اسماءؓ سے پوچھا کہ تیرا باپ ہجرت کر گیا اور سنا ہے

روپیہ بھی ساتھ لے گیا۔ اُنھوں نے یہ خیال کر کے کہ بوڑھے دادا کو زیادہ صدمہ نہ ہو۔ کہا: ابّا! یہ بات نہیں ہے، وہ بہت کچھ چھوڑ گئے ہیں۔ ابوقحافہ کا سن اُس وقت نواسی برس کا تھا۔ بینائی سے معذور تھے۔ حضرت اسمأ نے اُس الماری میں جس میں روپیہ رہتا تھا پتھر بھر کر کپڑا ڈال دیا اور دادا کا ہاتھ پکڑ کر کہا: اس الماری میں دیکھو۔ انھوں نے ہاتھ سے کپڑا ٹٹولا اور کہا خیر اتنا چھوڑ گیا ہے تو مضائقہ نہیں۔ صدیق اکبرؓ نے اپنے اہل و عیال کو کس بیکسی اور خطرہ کی حالت میں چھوڑا تھا اس کا اندازہ ذیل کے واقعہ سے ہو سکتا ہے: ہجرت کے بعد جب کفار اپنی ناکامی پر برافروختہ ہوئے تو ابوجہل مع چند آدمیوں کے اُن کے گھر آیا اور حضرت اسمأ سے پوچھا: تیرا باپ کہاں ہے؟ اُنھوں نے کہا مجھکو معلوم نہیں۔ اس پر طیش میں آکر اُس شقی نے ایک تھپڑ اُن کے منہ پر اس زور سے مارا کہ کان سے آویزہ نکل کر دُور جا پڑا۔

۱۲ ربیع الاوّل کو حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم مع اپنے رفیق کے مدینہ پہنچے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ اہلِ مدینہ نے چونکہ تمام طور پر جمالِ مبارک نہیں دیکھا تھا اس لیے امتیاز نہ کر سکے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کون سے ہیں۔ ادب مانع سوال تھا۔ جب چہرۂ اقدس پر دُھوپ آئی اور حضرت ابوبکرؓ نے اُٹھ کر چادر کا سایہ کیا اس وقت پہچانا۔

مہاجرین کا گروہ مدینہ طیبہ میں محض بے خانماں تھا ٹھہرنے کا ٹھکانہ تو کسی کا بھی نہ تھا۔ بہت سے بے سروسامان بھی تھے جن کے پاس سرمایہ تھا وہ بھی دم لینے اور جائے قیام کے محتاج تھے۔ اہلِ مدینہ نے جس حوصلہ اور محبت کے ساتھ اپنے مہمانوں کا خیر مقدم کیا وہ تاریخ کا مشہور واقعہ ہے۔ انھی خدمات کے صلے میں انصار کا برگزیدہ لقب پایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ پہنچنے کے بعد اپنے اصحاب میں مواخات کا سلسلہ قائم کیا۔ یعنی ایک کو دُوسرے کا بھائی بنایا۔ یہ بھائی حقیقی بھائیوں سے بھی بڑھ کر ایک دوسرے کے ہمدرد اور رفیق بن گئے۔ ایک انصاری[۱] جب اپنے بھائی مہاجر کو عقدِ مواخاۃ کے بعد گھر لے گئے تو اُن کو اپنے تمام مال و جائداد کا جائزہ دیا اور کہا اس میں سے نصف تمہارا ہے۔ میری دو بیبیاں ہیں ایک کو طلاق دیتا ہوں بعد عدت تم اُس سے نکاح کر لینا۔ اُن کے بھائی مہاجر نے کہا کہ تمہارا مال و جائداد اور بیبیاں تم کو مبارک مجھ کو ضرورت نہیں۔ حضرت ابوبکرؓ کی مؤاخات حضرت خارجہ بن زید انصاری سے قایم فرمائی گئی تھی۔ اس لیے حضرت ابوبکرؓ نے سُنخ[۲] میں قیام کیا۔

ہجرت سے وفات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک

مدینہ پہنچ کر سات مہینے تک آنحضرتؐ نے حضرت ابوایوب انصاری کے مکان پر قیام فرمایا۔ پھر ایک موقع دس اشرفیوں سے خرید کر مسجد نبویؐ تعمیر کرائی۔ یہ اشرفیاں حضرت ابوبکرؓ کے مال سے دی گئیں۔ جو صحابہ کرامؓ مکہ سے ہجرت کر کے آئے تھے اُن کے واسطے مسجد کے گرد مکانات تجویز کیے گئے۔ اسی سلسلہ میں حضرت ابوبکرؓ کا مکان مسجد کے متصل بنا جس کی ایک کھڑکی احاطۂ مسجد کے اندر تھی۔ بنا مسجد نبوی کے زمانہ میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ آدمی بھیج کر اہل و عیال کو طلب فرمایا۔ اسی قافلہ

---

[۱] انصار، مدینہ کے باشندے۔ مہاجر، جو مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تھے۔

[۲] سُنخ، مدینہ کا ایک محلہ تھا۔

میں حضرت ابوبکرؓ کے اہل و عیال بھی مدینہ پہنچے۔ حضرت صدیقؓ کے بال بچے چندے بمقام سُنح رہے۔ جب مسجد کے پاس مکان تیار ہو گیا تو اس میں آ گئے۔ یہ مکانات کچی اینٹوں کے تھے۔ اینٹوں کو مٹی سے لھیس کر علیحدہ علیحدہ حجرے بنا دیے جاتے تھے۔ چھت کھجور کی لکڑی اور پتّوں سے پاٹی جاتی تھی۔ اس قدر بلند ہوتی تھی کہ آدمی ہاتھ اٹھاتا تو چھت سے جا لگتا۔

ہجرت سے آغازِ خلافتِ صدیقی تک دس برس کا زمانہ سیرتِ نبوی کا زمانہ ہے۔ اگر اس عہد کے کل واقعات متصل لکھے جائیں تو ایک جزوِ اعظم سیرۃِ رسالت کا بیان کرنا ہوگا جو اس رسالے کا موضوع نہیں۔ اگر بالکل چھوڑ دیے جائیں تو سیرتِ صدیقی کا ایک عظیم الشان حصہ ترک ہوتا ہے اس لیے میں بھی وہی مسلک اختیار کرتا ہوں جو علامہ شبلی نے الفاروق میں اختیار کیا ہے یعنی واقعات کا مجمل بیان اور اُن کے ضمن میں حالاتِ صدیقی کا خصوصیت سے اظہار۔

غزوۂ بدر اوپر کے بیانات سے فی الجملہ اندازہ ان مصائب اور تکالیف کا ہوتا ہے جو حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو مشرکینِ مکّہ کے ہاتھ سے پہنچی تھیں۔ نیز اُس شانِ رضا و تسلیم کا جو ذاتِ اقدس اور مسلمانوں کی جانب سے عیاں ہوئی۔ اُس زمانے میں کفار نے اپنی تمام کوشش اذیت اور تکلیف پہنچانے میں صرف کی تھی۔ مدینہ پہنچنے کے بعد اُنہوں نے نورِ اسلام کو آبِ شمشیر سے بجھانا چاہا، اس لیے حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے قوّتِ ایمان و اسلام کا اظہار فرمایا اور قیامِ مدینہ میں غزوات کا ایک سلسلہ جاری رہا۔ تمام غزوؤں میں بدر کا غزوہ افضل و اشرف ہے اور جو حضرات اس غزوہ میں شریک تھے وہ تمام مسلمانوں سے درجہ میں بڑھ کر ہیں۔ بدر ساحلِ سمندر کی جانب مدینہ سے سات منزل دور ایک کنواں تھا، ہر سال تین دن وہاں میلہ لگتا تھا۔ یہ غزوہ چونکہ اس موقعے پر ہوا لہٰذا بدر کے نام سے مشہور ہے۔ ۲ھ میں مشرکینِ مکّہ نے ایک بڑی جمعیت فراہم کی جس میں قریش کے تمام سردار اور چیدہ آدمی شریک تھے اور حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ کرنے کے واسطے مدینہ کا قصد کیا۔ آپ کو جب کفار کے ارادہ کا حال معلوم ہوا تو آپ بھی مسلمانوں کی فوج لے کر روانہ ہوئے اور بدر پہنچ کر مقام فرمایا۔ مسلمانوں کے لشکر کی تعداد تین سو تیرہ تھی۔ ان میں ستتّر مہاجرین تھے اور دو سو چھتیس انصار۔ تمام لشکر میں صرف ستّر اونٹ اور تین گھوڑے تھے، جن پر باری باری سے مجاہدین سوار ہوتے۔ حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی مرتضیٰ اور حضرت مرثد غنوی کی سواری میں ایک اونٹ تھا۔

کفار کی جمعیت ایک ہزار تھی جن میں سَو سوار تھے۔ میدانِ بدر میں جب آپ نے لشکرِ اسلام کی صفیں ترتیب دیں اور مسلمانوں کی قلت و بے سرو سامانی اور کفار کی کثرت و شوکت دیکھی تو بارگاہِ الٰہی میں سربسجود ہوئے اور غایت خضوع و خشوع سے دُعا فرمائی:

اَللّٰهُمَّ اَنْجِزْلِيْ مَا وَعَدْتَنِيْ اَللّٰهُمَّ اَنْ	اے اللہ! تیرا جو وعدہ مجھ سے تھا وہ پورا فرما دے
تُهْلِكَ هٰذِهِ الْعِصَابَةَ مِنْ اَهْلِ	اے اللہ! اگر تو اس گروہِ اسلام کو ہلاک کر دے گا
الْاِسْلَامِ لَا تُعْبَدُ فِي الْاَرْضِ۔	تو پھر سطحِ زمین پر تیری عبادت نہ ہوگی۔

عالم یہ تھا کہ آپ دعا میں مصروف تھے اور صدیقِ اکبرؓ ردائے مبارک کو آپ کے شانوں پر اٹھائے ہوئے تھے۔ آخر دعا

درجۂ اجابت کو پہنچی اور حضرت ابوبکرؓ نے عرض کی:

كَفَاكَ يَا نَبِيَّ اللهِ بِأَبِي أَنْتَ وَأُمِّي فَاشْدَتْكَ وَرَبُّكَ فَإِنَّهُ سَيُنْجِزُ لَكَ وَعْدَكَ

اے اللہ کے نبی! تم پر میرے باپ اور ماں فدا ہوں بارگاہِ الٰہی میں آپ کی مناجات کامیاب ہوئی جو آپ سے وعدہ تھا وہ عنقریب پورا فرمائے گا

اس پر حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دُعا ختم فرما دی اور یہ کہتے ہوئے میدان میں تشریف لائے:

سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ۔

جماعتِ کفار کو عنقریب شکست دی جائے گی اور وہ پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے۔

اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے آیۂ پاک میں:

إِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ أَنِّي مُمِدُّكُمْ بِأَلْفٍ مِنَ الْمَلَائِكَةِ مُرْدِفِينَ۔

یاد کرو اُس دن کو جبکہ تم فریاد کرنے لگے تھے اپنے رب سے بس اس نے قبول فرمائی تمہاری دعا کہ میں تم کو مدد دوں گا ہزار فرشتوں سے جو لگاتار آنے والے ہوں گے۔

صحابہ کرام نے ایک چھوٹا سا سائبان حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی نشست کے واسطے میدانِ جنگ کے کنارے پر بنا دیا تھا اُس میں آپ تشریف فرما تھے اور حضرت ابوبکر شمشیر برہنہ لیے حفاظت پر کمربستہ۔ جب معرکۂ کارزار گرم ہوا اور آپ نے بذاتِ خاص کفار پر حملہ فرمایا تو سردار میمنہ حضرت ابوبکرؓ تھے اور سردار میسرہ حضرت علی مرتضیٰ۔ صدیقِ اکبرؓ کے بیٹے عبدالرحمٰن اس وقت تک کافر تھے اور لشکرِ مشرکین میں شامل۔ حضرت صدیقؓ نے اُن کو دیکھا تو طیش میں آکر للکارا اور کہا:

أَيْنَ مَالِي يَا خَبِيثُ۔

او پلید! میرے حقوق کیا ہوئے۔

انہوں نے جواب دیا:

لَمْ يَبْقَ غَيْرُ شِكَّةٍ وَيَعْبُوبٍ وَصَارِمٍ يَقْتُلُ ضُلَّالَ الشَّيْبِ۔

صرف دستہ دتیر و سمند تیز گام باقی ہے اور گمراہی پیری کی قاتل تلوار۔

اسلام لانے کے بعد ایک بار حضرت عبدالرحمٰن نے اپنے والد سے کہا کہ غزوۂ بدر میں ایک موقع پر آپ میری زد پر آ گئے تھے لیکن میں نے بچا دیا۔ یہ سُن کر کہا کہ تُو میری زد پر آجاتا تو میں کبھی نہ چھوڑتا۔ آخر کار مسلمانوں کو فتح اور مشرکوں کو شکست نصیب ہوئی۔ صنادید کفار اس معرکہ میں قتل ہوئے۔ مثلاً ابوجہل، عتبہ، شیبہ۔

غزوۂ اُحد بماہِ رمضان ۳ھ بروز شنبہ

غزوۂ بدر کے ایک سال بعد مشرکینِ مکہ ابوسفیان کے پاس جمع ہو کر گئے اور اپنے مقتول اعزہ کے انتقام میں مدد چاہی۔ ابوسفیان نے مقتولینِ بدر کے انتقام کا اہتمام کیا مالی مدد دی، قبائل میں نقیب بھیجے کر جوش دلا کر

حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے پر آمادہ کریں۔ الغرض تین ہزار پُرجوش مشرکوں کا لشکر لے کر ابوسفیان روانہ ہوا۔ عورتیں بھی ساتھ تھیں تاکہ مردوں کو غیرت دلا کر بھاگنے سے روکے رہیں۔ مدینہ کے قریب اُحد نامی ایک پہاڑ ہے۔ یہ غزوہ اس پہاڑ پر ہوا تھا۔ اس لیے غزوۂ اُحد کے نام سے مشہور ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حملۂ کفار کی خبر سُن کر مع ایک ہزار مسلمانوں کے مدینہ سے روانہ ہوئے۔ راستہ میں عبداللہ بن اُبیؔ سرگروہِ منافقین کی دراندازی سے لشکرِ اسلام میں تفرقہ پڑ گیا۔ ایک ثلث آدمی منافق مذکور کے ساتھ واپس چلے گئے اور مسلمانوں کی جمعیت کم ہو کر سات سو رہ گئی۔ میدانِ اُحد میں دونوں لشکروں کا مقابلہ ہُوا۔ مسلمانوں کی پشت پر جو راستہ تھا اُس پر حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے تیر اندازوں کا ایک دستہ متعین فرما کر ہدایت کی کہ بدون حکم اپنی جگہ سے کسی حالت میں جنبش نہ کریں۔ مقابلہ شروع ہُوا۔ مشرکین کی عورتیں صفوں کی پشت پر ڈھول بجا بجا کر جوش انگیز اشعار گاتی جاتی تھیں۔ بڑے زور کا رَن پڑا۔ مسلمانوں کے حملہائے مردانہ نے لشکرِ کفار کی صفیں اُلٹ دیں اور جمعیتِ کفر میں تفرقہ ڈال دیا۔ تیر اندازوں کے دستے نے دشمنوں کی ہزیمت دیکھی تو اپنی جگہ چھوڑ کر مشرکوں کے خیمے لوٹنے لگے اِس سے مسلمانوں کی فوج کا پیچھا کُھل گیا۔ اسی عرصہ میں کسی نے مشہور کر دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مقتول ہو گئے۔ کفار نے اِس موقع کو غنیمت خیال کر کے اپنی جمعیت پھر قائم کی اور دوبارہ بڑے زور کا حملہ کر کے مسلمانوں کے لشکر کے اندر گھس آئے۔ لشکرِ اسلام میں تفرقہ شدید پڑ گیا۔ کافروں کی ایک جماعت خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جا پہنچی۔ ایک نے لبِ مبارک پر پتھر مارا جس کے صدمے سے ہونٹ شق ہو کر ایک دانت شہید ہو گیا۔ دوسرے نے پیشانی اقدس پر۔ تیسرے نے چہرۂ منور پر۔ اِن متواتر زخموں کی وجہ سے چہرۂ مبارک پر خون بکثرت بہنے لگا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خون پونچھتے اور فرماتے :

كيف يفلح قوم خضبوا وجه نبيهم وهو يدعوهم الى ربهم۔	وہ قوم کس طرح فلاح پائے گی جس نے اپنے نبی کا چہرہ خون سے رنگین کر دیا حالانکہ وُہ ان کو اُن کے رب کی طرف بلاتا ہے۔

اسی حالت میں کفار نے ریلا دیا اور آپ زخموں کے صدمے سے بیہوش ہو کر ایک غار میں گر گئے جس میں مسلمان شہدا کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ جب جمالِ مبارک نگاہ سے دُور ہو گیا تو مسلمانوں کی پریشانی و آشفتگی کی انتہا نہ رہی اور فرطِ اضطراب میں ہر طرف پھرنے لگے۔ بالآخر سنبھلے اور اس مقام پر آئے جہاں آپؐ تھے۔ محدّث مشہور حاکم کا قول ہے کہ سب سے اول اس موقع پر پہنچ کر حضرت ابوبکرؓ نے حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچانا۔ حضرت علیؓ نے دستِ مبارک پکڑا، اور حضرت طلحہؓ نے سہارا دیا اور آپؐ اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ خُود کی کڑیاں پتھروں کے صدمے سے چہرۂ اقدس میں گھس گئی تھیں ان کو حضرت ابو عبیدہؓ نے دانتوں سے پکڑ پکڑ کر نکالا جس کے صدمے سے خود اُن کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ مالکؓ بن سنان نے چہرۂ مبارک سے خون صاف کیا۔ اُس وقت صحابہ کرامؓ نے بے تاب ہو کر عرض کی کہ :

یا رسول اللہ! کفار کے حق میں بددُعا کیجئے۔

فرمایا کہ:

میں بددعا کے واسطے نہیں بھیجا گیا۔

اور دعا فرمائی:

"اے اللہ! میری قوم کو ہدایت دے، وہ سمجھتے نہیں۔"

اسی عرصے میں کفار کی ایک جماعت پھر آپؐ کی طرف بڑھی۔ حضرت زیادؓ نے پانچ انصار کو ساتھ لے کر جوانمردی سے روکا اور مع رفقاء اُسی موقع پر شہید ہو گئے۔ جب زیادؓ زخموں سے چُور ہو کر گرے تو حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ان کو اُٹھا کر میرے پاس لاؤ۔ آئے تو پائے مبارک پر اُن کا سر رکھ لیا اور اس جاں نثار نے اس حالت میں جان دی کہ رخسارہ قدم مبارک پر رکھا ہوا تھا۔ رضی اللہ عنہ۔ حضرت ابُو دجانہؓ سپر بن کر حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر جھک گئے تھے اور حضرت سعد ابن ابی وقاص آپ کے پاس کھڑے ہوئے کفار پر تیر برسا رہے تھے۔ خلاصہ یہ کہ اس کوشش اور جانفشانی سے کفار کو مسلمانوں نے ذاتِ گرامی کے حملوں سے روکا۔ اسی وقفہ میں باقی مسلمانوں نے سنبھل کر جمعیت پھر قائم کی اور کفار پر حملہ آور ہوئے۔ حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم درۂ کوہ کے اوپر تشریف لائے۔ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت طلحہؓ و حضرت زبیرؓ ہمراہ تھے۔ یہاں خالد بن ولید نے اپنے سواروں کی جمعیت سے آپؐ پر حملہ کرنا چاہا۔ آپؐ نے حضرت عمرؓ کو حکم دیا اور انھوں نے کفار کو مار ہٹایا۔ جب مشرکین نے دیکھا کہ آپؐ حیات ہیں اور مسلمان خدمت میں کمربستہ و مستعد، تو ان کے حوصلے پست ہو گئے اور میدان چھوڑ کر بھاگے۔ حضرت حمزہؓ عمِ رسولؐ اسی غزوہ میں شہید ہوئے۔ آغاز معرکے میں حضرت ابوبکرؓ کے بیٹے حضرت عبدالرحمٰن نے میدان میں آکر اپنے مقابلے کے واسطے حریف طلب کیا۔ یہ دیکھ کر حضرت ابوبکرؓ خود ان کے مقابلے پر آمادہ ہوئے۔ تلوار میان سے نکالی اور آپؐ سے میدان میں جانے کی اجازت طلب کی۔ آپؐ نے فرمایا:

شم سيفك و امتعنابك۔ — تلوار میان میں کر دو اور ہم کو اپنی ذات سے متمتع ہونے دو۔

بعد ہزیمت کفار ستر سپاہی لشکرِ اسلام کے اُن کے تعاقب میں مامور ہوئے۔ منجملہ ان کے حضرت ابوبکرؓ بھی تھے۔

غزوۂ خندق۔ شوال ۵ھ بدر اور اُحد کی ناکامی و ہزیمت کے بعد کفارِ مکہ میں تو حملہ آوری کی ہمت نہ رہی تھی مگر اسی زمانہ میں ایک اور دشمنِ اسلام پیدا ہو گیا تھا۔ یعنی یہود۔ مدینہ اور نواحِ مدینہ میں یہودی کثرت سے آباد اور آسُودہ تھے۔ حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلّم اور دینِ اسلام کو انھوں نے اپنا بیخ کن خیال کر کے مخالفت پر کمربستہ ہو گئے۔ یہ لوگ خود تو مردِ میدان نہ تھے لیکن سازش و فساد کا پورا ملکہ رکھتے تھے۔ اہلِ مکہ کے پاس وفد بھیج کر پھر مخالفت پر آمادہ کیا، اہلِ مکہ سے مطمئن ہونے کے بعد وفد نے قبائل میں دورہ کر کے ہر جگہ جوشِ جنگ تازہ کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دس ہزار نبرد آزما دشمنانِ اسلام پھر آمادہ ہو گئے۔ حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس مہم کی اطلاع ملی تو آپ نے حفاظت کے لیے مدینہ کے گرد خندق کھودنے کا اہتمام فرمایا۔ خود بہ نفسِ نفیس خندق کھودنے میں شرکت فرماتے تھے۔

مسلمانوں نے اِس محنت وجانفشانی سے کام کیا کہ لشکرِ کفار کے مدینہ پہنچنے سے پہلے پہلے خندق کُھد کر تیار ہوگئی۔ مشرکین کی فوج دس ہزار تھی، مسلمانوں کی تین ہزار۔ موسم نہایت سرد تھا۔ سامانِ رسد قلیل باوجود ان تمام مشکلات کے اہلِ ایمان نے مردانہ وار مقابلہ کیا اور برابر ثابت قدم رہے۔ دشمنوں نے ایک مہینے تک محاصرہ رکھا اور متواتر حملے کیے۔ لیکن ہر مرتبہ زک اٹھائی۔ لشکرِ اسلام کا ایک دستہ حضرت صدیقؓ کے ماتحت خندق کے ایک حصہ کی حفاظت پر مامور تھا۔ اُس موقع پر بعد کو مسجد بنا دی گئی جو مسجدِ صدیق کے نام سے مشہور اور شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے زمانہ تک موجود تھی۔

حدیبیہؔ ذیقعدہ ۶ھ

ذیقعدہ ۶ھ میں حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم ادائے عمرہ کے واسطے مکہ کو روانہ ہوئے اِحرام باندھے ہوئے تھے۔ قربانی کے جانور ہمراہ تھے۔ آپ نے اِس امر کا اعلان اچھی طرح فرما دیا تھا کہ مقصود صرف زیارتِ بیت اللہ ہے نہ مخالفت یا مخاصمت۔ مہاجرین انصار اور قبائل کے چودہ سو آدمی ہمرکاب تھے اثنائے سفر میں یہ اطلاع ملی کہ قریش راستہ روکے ہوئے ہیں اور باہم یہ عہد کر چکے ہیں کہ آپ کو مکہ میں نہ داخل ہونے دیں گے۔ آپ نے یہ حال سُن کر وہ راستہ چھوڑ دیا اور دوسرے راستہ سے ایک منزل طے فرما کر بمقام حدیبیہ قیام فرمایا۔ بعد قیام حسبِ عادت آپ نے صحابہ سے مشورہ فرمایا، بعد مشورت حضرت ابوبکرؓ کی رائے پسند فرمائی گئی۔ اُس مقام پر قریشیوں کے متعدد ایلچی حاضر ہوئے اور آپ نے سب کو اطمینان دلایا کہ محض زیارتِ کعبہ کا ارادہ ہے۔ کوئی نزاع یا مخالفت پیشِ نظر نہیں۔ ایلچی اہلِ مکہ کو آپ کی جانب سے مطمئن کرتے تھے مگر قریشیوں کا شک کسی طرح رفع نہ ہُوا۔ آخر عروہ بن مسعود قریش کی طرف سے ایلچی ہوکر آیا، اور اُس نے اہلِ مکہ کا عزم و اہتمامِ جنگ نہایت شدّومد کے ساتھ بیان کیا۔ حضرت ابوبکرؓ اُس وقت حاضر تھے عروہ کی لن ترانی سُن کر ضبط نہ کرسکے اور کہا لات و عزّیٰ کے پُوجنے والے مشرکوں کا یہ اہتمام ہے تو کیا ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد سے مُنہ موڑ لیں گے۔ عروہ نے پُوچھا:

یہ کون ہے؟

آپ نے فرمایا:

ابنِ ابی قحافہ۔

عروہ نے کہا:

اگر ابوبکر کے احسان مجھ پر نہ ہوتے تو میں اس کا جواب دیتا۔ لیکن میں اُن کے احسانوں کا خیال کر کے درگزر کرتا ہوں۔

جب اُدھر کے ایلچیوں کو کامیابی نہ ہُوئی تو آپ نے خود اپنا ایلچی خاص سواری کے اُونٹ پر بھیجا۔ اُس کے ساتھ یہ سلوک ہوا کہ اُس کے پاؤں قلم کر دیے گئے۔ آپ نے اس کے بعد حضرت عثمانؓ کو بھیجا۔ جب اُنھوں نے پیامِ رسالت ابوسفیان وغیرہ اعیانِ قریش سے بیان کیا تو جواب دیا کہ تم کو طوافِ بیت اللہ کی اجازت ہے۔ حضرت عثمانؓ نے کہا کہ جب تک

ؔ حدیبیہ، مکہ سے ایک منزل فاصلہ پر چھوٹا سا گاؤں تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طواف نہ فرمائیں میں طواف نہیں کرسکتا۔ طیش میں آکر قریش نے ان کو نظر بند کر دیا۔ لشکرِ اسلام میں خبر پہنچی کہ عثمان قتل کر دیے گئے۔ یہ سُن کر حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اب جب تک عثمان کے خون کا بدلہ نہ لے لیا جائے۔ معاودت ممکن نہیں۔ چنانچہ تمام مسلمانوں کو جمع فرمایا اور اُن سے مقابلۂ دشمن کی بیعت لی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک درخت کے زیرِ سایہ کھڑے تھے۔ ایک ایک مسلمان آتا تھا اور دستِ مبارک پکڑ کر اقرار کرتا تھا کہ جب تک تن میں جان ہے دشمن کے مقابلہ سے منہ نہ موڑوں گا۔ یہ بیعت تاریخ اسلام میں بیعت الرضوان کے نام سے مشہور ہے۔ اور اسی کی نسبت کلامِ مجید میں ارشاد ہے:

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ۔

یہ بات تحقیق ہے کہ اللہ مومنوں سے خوش ہوا جس وقت کہ تجھ سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے۔

چونکہ حضرت عثمان غیر حاضر تھے اس لیے آپ نے اپنا ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ میں لے کر اُن کی جانب سے بیعت کی۔ بعد بیعت معلوم ہوا کہ حضرت عثمان کے قتل کی خبر غلط تھی۔ اُدھر مسلمانوں کے یہ عزم دیکھ کر قریشیوں کے حوصلے پست ہو گئے۔ اور سُہیل نامی قاصد کی زبانی یہ پیام بھیجا کہ اس سال مسلمان واپس جائیں آئندہ سال داخلۂ مکہ اور زیارتِ بیت اللہ کی اجازت دی جائے گی۔ اب اگر مسلمان داخلِ مکہ ہوئے تو ہم کو اندیشہ ہے کہ عرب خیال کریں گے کہ قریش مسلمانوں سے دب گئے۔ طویل مباحثے کے بعد شرائطِ صلح طے ہوئیں اور معاہدہ قلم بند ہونے لگا۔ شرائطِ صلح سے بظاہر کفار کی کامیابی ثابت ہوتی تھی۔ حضرت عمرؓ کو اس سے اضطراب ہوا اور وہ جھپٹ کر حضرت ابوبکرؓ کے پاس گئے اور فاروقی لہجے میں اپنا خیال ظاہر کیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے سُن کر جواب دیا:

اَلْزِمْ غَرْزَهٗ۔ آپ کی رکاب تھامے رہو۔

اس سے بھی اطمینان نہ ہُوا تو فاروقِ اعظمؓ نے اپنا خیال خود حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے ظاہر کیا۔ آپ نے فرمایا کہ میں وحیِ ربانی کے مطابق عمل کر رہا ہُوں۔ یہ سن کر عمرؓ خاموش ہو گئے۔ الغرض حضرت علیؓ نے معاہدہ تحریر فرمایا۔ بعد تکمیل مسلمانوں کی جانب سے حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف اور سعدؓ بن ابی وقاص وغیرہ صحابۂ کرام کے دستخط ہُوئے۔ بعد معاہدہ آپ نے اسی مقام پر ارکانِ عمرہ ادا فرما کر مدینہ کو مراجعت کی۔ راستہ میں سورۃ الفتح نازل ہوئی، جس میں صلح حدیبیہ کو فتح مبین سے تعبیر فرمایا ہے۔

امام زہری کا قول ہے کہ اسلام میں اس سے پہلے کوئی فتح واقع حدیبیہ سے بڑھ کر نہیں ہوئی تھی۔ اب تک مسلمان اور کافر جہاں ملتے تھے لڑنے کے واسطے، اب صلح کی وجہ سے آشتی کے ساتھ ملنے لگے۔ اور کافروں کو احکامِ اسلام

لہ الفاظِ بیعت میں اختلافِ روایت ہے۔ بعض نے موت لکھا ہے، بعض نے عدمِ فرار۔

اطمینان سننے کا موقع ملا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جو ذرا بھی دانشمند تھے مسلمان ہوگئے۔ اور صلح حدیبیہ کے بعد دو سال کے عرصہ میں اس قدر مسلمان ہوئے جس قدر اس سے پہلے ۱۹ برس کے زمانے میں ہوئے تھے، بلکہ اُس سے بھی زیادہ۔ ابن ہشام کا مقولہ ہے کہ امام زہری کے قول کی دلیل یہ ہے کہ حدیبیہ میں چودہ سو آدمی حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ اس کے دو سال کے بعد فتح مکہ کے موقع پر دس ہزار تھے۔

خیبر[1] - محرم ۷ھ حدیبیہ سے مراجعت فرمانے کے بعد حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مہینے سے زائد مدینہ میں قیام فرمایا اور آخر محرم میں یہودیوں کا فتنہ فرو کرنے کے ارادہ سے خیبر کو تشریف لے گئے۔ خیبر بہت سے قلعوں کا مجموعہ اور یہودیوں کا ملجا و ماویٰ تھا۔ یہودی قلعہ بند ہو کر لڑے اور مختلف قلعوں پر معرکے رہے۔ لشکر اسلام کا بڑا سفید نشان حضرت شیرِ خدا کے سپرد تھا۔ ایک قلعہ پر حضرت ابو بکرؓ امیرِ لشکر مقرر ہو کر گئے، مگر فتح نہ ہوا۔ دوسرے روز حضرت عمرؓ نے حملہ کیا وہ بھی کامیاب نہ ہوئے۔ تیسرے روز حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"آج میں ایسے شخص کو امیرِ لشکر بنا کر نشان دوں گا جو خدا اور اس کے رسولؐ کو بہت دوست رکھتا ہے اور جو بھاگنے والا نہیں، اس کے ہاتھ سے قلعہ فتح ہوگا۔"

چنانچہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو نشان ملا اور حملۂ حیدری سے قلعہ سر ہو گیا۔ خیبر صفر ۷ھ میں فتح ہوا۔

فتح مکہ - رمضان ۸ھ جو معاہدہ صُلح حدیبیہ میں ہُوا تھا کفارِ قریش نے جلد توڑ ڈالا۔ قبیلہ خزاعہ پر (جو مسلمانوں کا حلیف (ہم پیمان) تھا) قبیلہ بنو بکر نے حملہ کیا۔ یہ قبیلہ قریش کا حلیف تھا۔ خلاف شرائط معاہدہ قریش نے اپنے میل والوں کو مدد دی، انتہا یہ کہ قبیلہ خزاعہ کو جوارِ کعبہ میں بھی پناہ نہ ملی اور حرم کے اندر قتل کیے گئے۔ آخر انھوں نے اپنا قاصد فریاد لے کر بارگاہِ رسالت میں بھیجا۔ جس وقت ابنِ سالم ان کا ایلچی حاضرِ خدمت ہوا۔ حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم مع صحابہ کرام مسجد نبویؐ میں رونق افروز تھے۔ ابن سالم نے ایک دردناک نظم پڑھی جس میں مدد کی التجا تھی اور قبیلہ خزاعہ کی مصیبت کی تشریح۔ آپ نے سن کر فرمایا کہ تم کو مدد ملے گی۔ اسی عرصہ میں دوسرا وفد طلبِ مدد کے واسطے حاضر ہوا۔ دسویں رمضان المبارک کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مع دس ہزار لشکر کے مکہ کی طرف کوچ فرمایا۔ آپؐ کے عم بزرگوار حضرت عباسؓ نے اس کا اندازہ کر لیا تھا کہ اگر کفار نے لشکرِ اسلام کا مقابلہ کیا تو کیا مصیبت نازل ہوگی۔ اس لیے آگے بڑھ کر قریش کی اطاعت کا پیام آپ کی خدمت میں پیش کیا جو منظور ہوا، اور سب کی جاں بخشی کا اعلان فرما دیا گیا۔ چند مشرک جو اسلام کے شدید دشمن تھے امان سے محروم رہے۔ ان کا نام لے کر فرما دیا گیا کہ اگر کعبہ کے پردوں میں بھی لپٹے ہوئے ملیں تو قتل کر دیے جائیں۔ اس موقعہ پر یہ خیال کرنا چاہیے کہ یہ وہ اہلِ مکہ تھے جنھوں نے تیرہ برس تک انتہائی سفاکی اور ظلم کے ساتھ آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو اذیتیں پہنچائی تھیں۔ وطن سے بے وطن کیا۔ مدینہ میں

---

[1] خیبر، مدینہ سے آٹھ منزل شام کی جانب ہے۔

بھی برسوں چین سے نہیں بیٹھنے دیا۔ آج جب دس ہزار جاں نثار ہمرکاب ہیں۔ مکہ کے فتح ہونے اور کفار کو سزائے کردار ملنے کا وقت آتا ہے تو رحمت کا ظہور ہوتا ہے اور بے دریغ دولتِ امن و امان لٹائی جاتی ہے۔ حکم ہوتا ہے کہ جو اپنے دروازے بند کر کے گھروں میں بیٹھ جائیں محفوظ۔ جو ابوسفیان کے گھر میں پناہ لیں ان کا خون معاف۔ ذرا سوچو ابوسفیان کس کا نام تھا۔ جن لوگوں کی نسبت یہ عتاب تھا کہ خانہ کعبہ کے پردے بھی اُن کو امان و پناہ نہ دیں اُن کی بھی سفارشیں ہوتی ہیں اور خطا معاف ہو جاتی ہے۔

اس واقعۂ عظیم کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھو کہ یورپ کے منصف مزاج مصنف نبی کریم (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی تصویر ایک ایسے خونخوار شخص کی شکل میں پیش کرتے ہیں جو جوشِ انتقام میں بیخود ہو۔ فتح مکہ کے بعد حضرت ابوبکرؓ اپنے والد ابو قحافہ کو حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے تاکہ ان کو تلقینِ اسلام فرمائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھ کر فرمایا کہ:

"ابوبکرؓ تم نے شیخ (بڑے میاں) کو مکان پر رہنے دیا ہوتا، مَیں خود ان کے پاس چلتا۔"

عرض کی:

"یارسول اللہ! انہی کو آپ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہیے تھا۔"

آپ نے ابو قحافہ کو سامنے بٹھایا اور سینہ پر دستِ مبارک پھیر کر فرمایا:

اَسْلِمْ۔ (اسلام لے آؤ)

ابو قحافہ نے کلمہ پڑھا اور مسلمان ہو گئے۔

حُنین[1] فتح مکہ نے قریش کی مخالفت کا تو خاتمہ کر دیا اور وہ ہمیشہ کے واسطے اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے۔ لیکن نواحِ مکہ میں ہنوز جوشِ مخاصمت برپا تھا۔ قبیلۂ ہوازن کے سردار مالک بن عوف نے اپنے قبیلہ کو جمع کیا۔ ہوازن کے حلیف ثقیف وغیرہ قبائل بھی فراہم ہوئے اور سب نے مل کر حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ کا عہد کیا۔ دُرید نے (جو ایک اہل الرائے سن رسیدہ شخص تھا) مالک کو بہت سمجھایا کہ مسلمانوں کا مقابلہ نہیں کرنا چاہیے مگر مطلق اثر نہ ہوا۔ جب آپ کو ان قبائل کے ارادہ کی خبر ہوئی تو آپ نے حضرت عبداللہ اسلمی کو دریافت حال کے واسطے بھیجا۔ انھوں نے واپس آ کر بیان کیا کہ قبائل ہوازن وغیرہ پوری طرح آمادۂ پیکار ہیں۔ یہ سُن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے کوچ کا حکم دیا۔ علاوہ اُن دس ہزار آدمیوں کے جو مدینہ سے آئے تھے دو ہزار اہلِ مکہ بھی ساتھ ہوئے۔ اِس طرح بارہ ہزار آدمیوں کی جمعیت رکابِ سعادت میں تھی۔ وادی حنین میں مقابلہ ہوا۔ قبائل کے لشکرِ مخالف کے عزم و ثبات کا یہ عالم تھا کہ ایک دیوار آہنی معلوم ہوتا تھا۔ معرکۂ کارزار گرم ہوا، مسلمانوں کے قدم اوّل ہی حملہ میں اکھڑ گئے۔ حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ اسلام کی جمعیت قائم کرنے کی کوشش فرمائی، لیکن تفرقہ نہ مٹ سکا۔ اُس وقت آپ کی خدمت میں صرف چند مہاجرین و انصار حاضر تھے۔

---

[1] حنین، ایک وادی مکہ سے تین میل ہے۔

باقی تمام لشکر متفرق ہوگیا تھا۔ منجملہ حاضرین حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ تھے۔ اہلبیت میں سے حضرت علیؓ، حضرت عباسؓ، حضرت فضل بن عباسؓ، حضرت اُسامہ بن زیدؓ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کھلائی اُم ایمن کے بیٹے حضرت ایمنؓ (جو اسی روز شہید ہُوئے) حاضر تھے۔ حضرت عباسؓ آپ کے سفید خچر کی باگ تھامے ہُوئے تھے، وُہ نہایت جسیم اور بلند آواز تھے۔ حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو حکم دیا کہ باواز بلند پکارو :

"یا معشر الانصار یا معشر اصحاب سمرہ۔"

اس ندا کے سامنے سارے تفرقہ اور ابتری نے سپر ڈال دی۔ اُدھر عم رسولؐ نے باوازِ بلند پکارا :

"یا معشر الانصار یا معشر اصحاب سمرہ۔"

اُدھر "لبیک لبیک" کی صدا سے جنگل گونج اُٹھا۔ گلہ نے اپنے راعی کی آواز پہچان لی۔ اب بیتابی کا یہ عالم ہے کہ اونٹ قابو میں نہ آتے تو سب نے آہنی زرہیں اُتار اُتار کر اُن کی گردنوں میں ڈال دیں۔ ہلکے ہو ہو کر کُودنے اور شمشیر بکف پروانہ وار شمع رسالت (روحی فداہ) کے گرد جمع ہوگئے۔ جس وقت سو آدمی فراہم ہوگئے ہلہ کا حکم دیا گیا۔ اُن کی جانبازی دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسرور ہوئے اور فرمایا کہ اب معرکۂ کارزار میں گرمی آئی۔ حضرت شیرِ خدا اور ایک انصاری نے مل کر دشمن کے نشان بردار پر حملہ کیا۔ حضرت علیؓ نے اونٹ کے پاؤں کاٹ دیے، وہ گرا تو انصاری نے ایک ہاتھ میں سوار کا کام تمام کر دیا۔ اسی عرصہ میں مسلمانوں کی جمعیت زیادہ ہوگئی اور میدان اعدا سے جیت لیا۔ جب لشکر کا آخری حصّہ لوٹ کر میدان میں آیا تو اُس نے دیکھا کہ قیدی مشکیں کسے میدان میں پڑے تھے۔

تبوک[1] ۔ رجب ۹ ھ اسلام کی آب و تاب اب دُور دُور تک نگاہوں کو خیرہ کرنے لگی اور کفر کے حلقوں میں تہلکہ بڑھتا گیا۔ پرخاش اور مخالفت کا دائرہ عرب اور یہود سے گزر کر روم تک جا پہنچا۔ اسی سلسلہ میں فتح مکہ سے پہلے حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مہم رومیوں کے مقابلہ پر روانہ فرمائی جو سیرت میں غزوہ مُوتہ کے نام سے مشہور ہے۔ اِسی معرکہ میں حضرت جعفر طیار اور حضرت زید بن حارثہ شہید ہوئے۔ (رضی اللہ عنہما)

اب مدینہ خبر پہنچی کہ خود ہرقل روم باتفاق نصارائے عرب حملہ پر آمادہ ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شر کے دفع کرنے کی تیاریاں شروع فرمائیں۔ یہ مہم ایک بڑی سلطنت کے مقابلے پر تھی اور منزل دُور دراز عرب میں قحط پڑا ہوا تھا۔ اسی مناسبت سے اس غزوہ کا نام جیش العسرۃ (مصیبت کا لشکر) ہے سب پر طرہ یہ کہ موسم کھجوروں کے پختہ ہونے کا تھا۔ اِس موسم میں اہلِ مدینہ باہر نہیں جاتے تھے۔ باغوں میں درختوں کے نیچے کھجوریں جمع کرتے۔ احباب کے ساتھ مل کر کھاتے کھلاتے۔ ان اسباب سے منافقین نے خوب نفع اٹھایا، اور دل کھول کر مسلمانوں میں تفرقہ اور مہم میں خلل ڈالا۔ حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمان دولتمندوں کو تیاریِ لشکر میں مدد دینے کی ترغیب فرمائی۔

---

[1] تبوک: شام کا سرحدی شہر، مدینہ سے تقریباً ڈیڑھ سو میل ہے۔

حضرت عمرؓ نے خود بیان کیا ہے کہ جس وقت لشکرِ تبوک کے انفاق (چندہ) کا ارشاد ہوا اس وقت میں خوب مالدار تھا۔ میں نے دل میں کہا کہ اگر ابوبکر سے آگے بڑھ سکتا ہوں تو وہ یہی موقع ہے۔ گھر گیا اور بہت سا مال لاکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا۔ فرمایا:

عمر! بال بچوں کے لیے کیا چھوڑا؟

جواب دیا: اسی قدر۔

اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے اپنا انفاق (چندہ) پیش کیا۔ استفسار ہوا:

ابوبکر! بچوں کے لیے کیا رکھا؟

عرض کیا:

اَبْقَیْتُ لَهُمَ اللهَ وَرَسُوْلَهٗ۔ اُن کے واسطے اللہ اور اس کا رسول رکھ لیا ہے۔

(یعنی مال ظاہری کچھ نہیں چھوڑا)

یہ سن کر حضرت عمرؓ نے کہا کہ:

میں ابوبکرؓ سے کبھی بازی نہیں لے جا سکتا۔

لشکرِ تبوک کے جائزہ اور امامت کا منصب اور بڑا نشان حضرت ابوبکرؓ کے سپرد تھا۔ فوج کی تعداد تیس ہزار تھی۔ تبوک پہنچ کر معلوم ہوا کہ دشمن نے اپنے مقام سے جنبش نہیں کی۔ یوحنا حاکمِ ایلیا[1] نے حاضر ہو کر صلح کی درخواست کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمانِ صلح عطا فرمایا اور مع الخیر مدینہ کو معاودت فرمائی۔

حج ۹ھ ذی حجہ ۹ھ میں حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے قافلہ حج مکہ کو روانہ فرمایا۔ حضرت ابوبکرؓ امیرِ حج مقرر ہوئے۔ اسلام میں یہ پہلے امیرِ حج ہیں۔ بیس جانور قربانی کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے اور پانچ خود ان کے ہمراہ تھے۔ تین سو آدمیوں کا قافلہ تھا۔ اس سال مومن و مشرک دونوں نے حج ادا کیا۔ اس کے بعد مشرکوں کے واسطے داخلۂ حرم ممنوع ہو گیا۔ اسی حج کے زمانہ میں سورۃ برأت کی تبلیغ حضرت علی مرتضٰیؓ نے بآوازِ بلند متواتر منجانب حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرمائی۔

وفاتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۱۲ ربیع الاوّل ۱۱ھ ۱۰ھ میں حضرت سرورِ عالم نے حج ادا فرمایا۔ چونکہ یہ حج آپ کا آخر حج تھا اور خطبے میں آپ نے اس کا اعلان فرما دیا تھا۔ اس لیے اس کا لقب حجۃ الوداع ہے۔ معاودت فرمانے کے بعد مزاجِ اقدس ناساز ہوا۔ آخر صفر یا شروع ربیع الاول میں علالتِ وفات کی ابتدا ہوئی۔ ایک روز نصف شب کے وقت آپ گورستانِ بقیع

---

[1] ایلیا شہر بیت المقدس

کو (جہاں آپ کے رفقاء دفن ہیں) تشریف لے گئے۔ ابو مُوَیہبہ آپ کے غلام سے روایت ہے کہ اُس شب کو مجھ کو یاد فرماکر ارشاد کیا کہ اہلِ بقیع کے واسطے دعائے مغفرت کرنے کا حکم مجھ کو ہوا ہے تم ہمراہ چلو۔ میں ساتھ گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبور کے وسط میں قیام فرماکر کہا:

اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ یَا اَھْلَ الْمَقَابِرِ لِیَھْنِیْ لَکُمْ مَا اَصْبَحْتُمْ فِیْہِ مِمَّا اَصْبَحَ النَّاسُ فِیْہِ اَقْبَلَتِ الْفِتَنُ کَقِطَعِ اللَّیْلِ الْمُظْلِمِ تَتْبَعُ اٰخِرُھَا اَوَّلَھَا الْاٰخِرَۃُ شَرٌّ مِّنَ الْاُوْلٰی۔

اے بقیع کی قبروں میں سونے والو! تم جس حال میں ہو وہ بہت اچھا ہے اُس حال سے جس میں زندہ انسان ہیں، تاریک رات کے حصّوں کی طرح فتنے چلے آرہے ہیں پچھلا فتنہ اگلے کو نگل لیتا ہے اور اگلے سے پچھلا بدتر ہے۔

اس کے بعد میری طرف مخاطب ہوکر فرمایا:

اے ابو مویہبہ! میرے سامنے دنیا کا ابدی قیام، اس کے خزانوں کی کنجیاں اور جنت پیش کی گئی۔ میں نے اپنے رب کے دیدار اور جنت کو انتخاب کر لیا۔

میں نے کہا: میرے ماں باپ آپ پر قربان، دنیا کے خزانوں کی کنجیاں اور یہاں کا ابدی قیام پسند فرمالیجئے۔

آپ نے فرمایا: نہیں، میں لقاءِ ربّانی اور جنت پسند کر چکا۔

یہ فرماکر اہلِ بقیع کی مغفرت کی دُعا کی اور دولت خانہ کو واپس تشریف لے آئے، حُجرے میں پہنچے تو حضرت عائشہؓ کے سر میں درد تھا۔ آپ نے فرمایا:

میرے سر میں بھی درد ہے۔

یہ ہی آغازِ مرض تھا جو رفتہ رفتہ بڑھتا گیا۔ دورانِ مرض میں بھی حسبِ معمول آپ باری باری سے ازواجِ مطہرات کے یہاں قیام فرماتے رہے۔ جب مرض کی زیادہ شدّت ہُوئی تو سب بیبیوں کو جمع فرماکر ایامِ مرض میں حضرت عائشہؓ کے یہاں قیام کی اجازت حاصل کی۔ بعد اجازت حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ کے شانوں پر دستِ مبارک رکھ کر حضرت عائشہؓ کے حجرے میں تشریف لے آئے۔ سر بندھا ہوا تھا اور پاؤں فرطِ ضعف سے زمین پر کھینچتے جاتے تھے۔ زمانۂ علالت میں ایک روز مسجد میں تشریف لائے۔ منبر پر بیٹھ کر اوّل شہدائے اُحد کے واسطے دعائے مغفرت کی۔ اُس کے بعد فرمایا:

اِنَّ عَبْدًا مِّنْ عِبَادِ اللّٰہِ خَیَّرَہُ اللّٰہُ بَیْنَ الدُّنْیَا وَبَیْنَ مَا عِنْدَہٗ فَاخْتَارَ مَا عِنْدَ اللّٰہِ۔

یعنی اللہ نے اپنے بندوں میں سے ایک بندے کو اختیار دیا کہ وہ دنیا اور قربِ الٰہی میں سے جسے چاہے پسند کرلے۔ اُس نے اللہ کے قرب کو پسند کرلیا۔

حضرت ابوبکرؓ فراستِ ایمانی سے اِس قول کی تہہ کو پہنچ گئے، رونے لگے اور کہا:

بَلْ نَفْدِيْكَ بِاَنْفُسِنَا وَاٰبَائِنَا۔ — نہیں بلکہ ہم اپنی جانیں اور اپنے باپ آپ پر سے قربان کر دیں گے۔

آپ نے سن کر ارشاد فرمایا:

عَلٰی رِسْلِكَ يَا اَبَا بَكْرٍ۔ — ابوبکر! سنبھلو۔

پھر ارشاد فرمایا کہ:

جس قدر مکانوں کے دروازے صحنِ مسجد میں ہیں وہ سب بند کر دیے جائیں مگر ابوبکرؓ کے گھر کا دروازہ بدستور رہے۔

یہ کہہ کر فرمایا:

فَاِنِّیْ لَا اَعْلَمُ اَحَدًا كَانَ اَفْضَلَ فِی الصُّحْبَةِ عِنْدِیْ يَدًا اِمِنْهُ فَاِنِّیْ لَوْ كُنْتُ مُتَّخِذًا خَلِيْلًا لَاتَّخَذْتُ اَبَا بَكْرٍ خَلِيْلًا وَّلٰكِنْ صُحْبَةٌ وَّاِخَاءُ اِيْمَانٍ حَتّٰی يَجْمَعَ اللّٰهُ بَيْنَنَا عِنْدَهٗ۔ — میں کسی کو نہیں جانتا جو میرے نزدیک رفاقت میں باعتبار احسانات کے ابوبکرؓ سے افضل ہو۔ پس اگر میں کسی کو قلبی دوست بنانے والا ہوتا تو ابوبکر کو بناتا، مگر یہ صرف رفاقت اور اخوتِ ایمانی ہے یہاں تک کہ خدا تعالیٰ ہم کو اپنے پاس جمع کر لے۔

اس کے بعد مہاجرین کو تاکید فرمائی کہ انصار کے حقوق کا لحاظ رکھیں۔ جب مرض کو اور زیادہ شدت ہوئی تو آپؐ نے فرمایا:

ابوبکرؓ سے کہو کہ نماز کی امامت کریں۔

یہ سن کر حضرت عائشہؓ نے کہا کہ:

رَجُلٌ رَقِيْقٌ ضَعِيْفُ الصَّوْتِ كَثِيْرُ الْبُكَاءِ اِذَا قَرَاَ الْقُرْاٰنَ۔ — وہ ایک نرم دل، کمزور آواز کے آدمی ہیں۔ جب قرآن پڑھتے ہیں تو بہت روتے ہیں۔

مطلب یہ تھا کہ امامت کا بار نہ اٹھا سکیں گے۔ حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جھڑک کر دوبارہ حکم فرمایا۔ چنانچہ پنجشنبہ کی عشا کے وقت سے حضرت صدیقؓ نے امامت شروع کی اور اس طرح سترہ نمازیں حیاتِ مبارکہ میں پڑھائیں۔ دوشنبہ کو نمازِ صبح کے وقت حضرت سرورِ عالمؐ پردہ اٹھا کر باہر تشریف لائے۔ دردِ سر کی شدت کی وجہ سے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ حضرت ابوبکرؓ نماز پڑھا رہے تھے۔ صحابۂ کرامؓ کی جماعت اور نماز دیکھ کر چہرۂ مبارک فرطِ مسرت سے دمکنے لگا۔ آپؐ آگے بڑھے تو لوگوں نے راستہ دے دیا۔ حضرت ابوبکرؓ سمجھ گئے کہ آنحضرتؐ تشریف لاتے ہیں پیچھے ہٹنے لگے، آپؐ نے پیٹھ پر ہاتھ مار کر کہا:

صَلِّ بِالنَّاسِ (نماز پڑھاؤ)

خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کی دائیں جانب بیٹھ گئے اور نماز پڑھنے لگے۔ بعد نماز بآوازِ بلند (جو مسجد کے باہر تک جاتی تھی) وعظ ارشاد فرمایا۔ اس میں یہ جملے بھی تھے:

اَيُّهَا النَّاسُ سُعِّرَتِ النَّارُ وَاَقْبَلَتِ الْفِتَنُ — اے لوگو! آگ روشن کی گئی اور فتنے اندھیری رات کے

كَقِطَعِ اللَّيْلِ الْمُظْلِمِ وَ اِنِّيْ وَ اللّٰهِ مَا تُمْسِكُوْنَ عَلَيَّ بِشَيْءٍ لَمْ اُحِلَّ اِلَّا مَا اَحَلَّ الْقُرْاٰنُ وَ لَمْ اُحَرِّمْ اِلَّا مَا حَرَّمَ الْقُرْاٰنُ۔

ٹکڑوں کی طرح چلے آتے ہیں۔ اور قسم ہے رب کی میرے ذمہ تمہارا کچھ مطالبہ نہیں ہے۔ میں نے وہی حلال بتایا جس کو قرآن نے حلال کیا اور وہی حرام بتایا جس کو قرآن نے حرام کیا۔

جب کلام مبارک ختم ہو لیا تو حضرت ابو بکرؓ نے عرض کی،

اے اللہ کے نبی! آج تو خدا کے فضل و کرم سے آپ ایسے اچھے ہیں جیسا ہم سب کا دل چاہتا تھا۔ آج بنت خارجہ[1] کی یہاں جانے کی باری ہے اجازت ہو تو وہاں جاؤں۔ آپ نے اجازت مرحمت فرمائی۔ پھر دولت خانہ میں تشریف لے آئے۔ صدیق اکبر سُنح کو چلے گئے اُس کے بعد بھی کچھ عرصہ تک مزاج درست رہا۔ چنانچہ جب حضرت علی مرتضیٰ آپ کے پاس سے باہر آئے اور لوگوں نے خیریت دریافت کی تو جواب دیا:

اَصْبَحَ بِحَمْدِ اللّٰهِ بَارِئًا۔ — آج صبح سے خدا کا شکر ہے صحت ہے۔

مسجد سے واپس تشریف لانے پر حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہؓ کی آغوش میں تکیہ لگا کر بیٹھ گئے تھے۔ اسی اثنا میں آپ نے حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر کے ہاتھ میں مسواک دیکھی اور اس کو بہ نظر رغبت ملاحظہ فرمایا۔ حضرت عائشہؓ نے منشاء مبارک سمجھ کر مسواک ہاتھ سے لے لی، پہلے خود چبا کر نرم کی پھر حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس کو پیش کیا۔ آپ نے مسواک لے کر پوری قوت کے ساتھ دندانِ مبارک پر پھیری اور پھیرنے کے بعد رکھ دی۔ بعد مسواک جب آپ کے بدن کا بوجھ زیادہ محسوس ہونے لگا تو حضرت عائشہؓ نے چہرۂ اقدس کی طرف دیکھا، پتلیاں چڑھ گئی تھیں اور زبان مبارک پر یہ الفاظ تھے:

اَللّٰهُمَّ فِي الرَّفِيْقِ الْاَعْلٰى۔ — اے اللہ! مقام رفیق اعلیٰ میں پہنچا۔

تین بار یہ کلمات ادا فرما کر بتاریخ ۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ روز دوشنبہ وقتِ چاشت رحلت فرمائی اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔ وصلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ اجمعین۔

صدیق اکبرؓ نے اس سانحۂ ہوش ربا کی خبر سُنی تو فوراً گھوڑے پر سوار ہو کر آئے اور مسجد کے دروازے پر پہنچ کر گھوڑے سے اُترے۔ حضرت عمر مسجد میں مجمع کے سامنے گفتگو کر رہے تھے۔ حضرت ابو بکر نے کسی جانب التفات نہیں کیا اور سیدھے حجرہ مبارک میں پہنچے۔ چہرۂ انور سے بُردِ یمانی ہٹا کر پیشانی پر بوسہ دیا اور رو کر کہا،

بِاَبِيْ اَنْتَ وَ اُمِّيْ طِبْتَ حَيًّا وَّ مَيِّتًا اَمَّا الْمَوْتَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ عَلَيْكَ فَقَدْ ذُقْتَهَا ثُمَّ لَنْ تُصِيْبَكَ بَعْدَهَا

آپ پر میرے ماں باپ قربان ہوں۔ آپ کی حیات اور وفات دونوں پاک ہیں۔ جو موت آپ کے حق میں اللہ نے لکھ دی تھی اس کا ذائقہ

---

[1] حضرت ابو بکرؓ کی بی بی تھیں جو سُنح میں رہتی تھیں۔

مَوْتَتَہٗ اَبَدًا۔ — آپ نے چکھ لیا۔ اب اس کے بعد آپ کبھی وفات نہ پائیں گے۔

یہ کہہ کر چادر اطہر ڈھک دی اور باہر آئے، اس وقت حضرت فاروق مجمع سے مخاطب ہو کر کہہ رہے تھے :

" منافق کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی، واللہ وفات نہیں پائی ہے بلکہ اپنے رب کے پاس موسیٰؑ کی طرح گئے ہیں۔ جو چالیس روز غائب ہو کر واپس آ گئے تھے، حالانکہ ان کی نسبت بھی کہا جاتا تھا کہ وفات پا گئے۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مراجعت کریں گے اور اُن لوگوں کے ہاتھ پاؤں کاٹیں گے جو کہتے ہیں کہ آپ نے رحلت فرمائی۔"

حضرت ابوبکرؓ نے یہ کلام سُنا تو کہا :

" اے عمرؓ ! سنبھلو اور خاموش ہو جاؤ۔"

وُہ چُپ نہ ہوئے تو حضرت صدیق اکبرؓ نے خود سلسلۂ گفتگو شروع کر دیا۔ حاضرین حضرت عمرؓ کو چھوڑ کر اُدھر متوجہ ہو گئے۔ صدیق اکبرؓ نے پہلے حمد و ثنا بیان کی۔ اس کے بعد کہا :

اَیُّھَا النَّاسُ اِنَّہٗ مَنْ کَانَ یَعْبُدُ مُحَمَّدًا فَاِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ مَاتَ وَمَنْ کَانَ یَعْبُدُ اللّٰہَ فَاِنَّ اللّٰہَ حَیٌّ لَا یَمُوْتُ۔ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِہِ الرُّسُلُ اَفَاِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓی اَعْقَابِکُمْ وَمَنْ یَّنْقَلِبْ عَلٰی عَقِبَیْہِ فَلَنْ یَّضُرَّ اللّٰہَ شَیْئًا وَسَیَجْزِی اللّٰہُ الشّٰکِرِیْنَ۔

اے لوگو ! جو شخص محمدؐ کو پُوجتا تھا (وہ سمجھ لے کہ) محمدؐ نے وفات پائی اور جو کوئی اللہ کو معبود مانتا تھا (وہ جان لے کہ) اللہ زندہ ہے کبھی نہیں مرے گا (خدا کا ارشاد ہے) اور نہیں ہیں محمدؐ مگر ایک رسول ان سے پہلے رسول گزر چکے ہیں تو کیا وہ اگر مر جائیں گے یا قتل کر دیے جائیں گے تو تم برگشتہ ہو جاؤ گے، اور جو شخص برگشتہ ہو جائے گا وہ خدا کو کچھ نقصان نہیں پہنچائے گا۔ اور اللہ شکرگزاروں کو عنقریب جزا دے گا۔

اس آیت پاک کو سن کر لوگ چونک پڑے اور گویا اُن کو یاد آ گیا کہ یہ آیت بھی نازل ہوئی ہے بہ روایت حضرت ابو ہریرہؓ حضرت عمرؓ کا بیان ہے کہ اس آیت کو سُن کر میرے پاؤں ٹوٹ گئے، کھڑے رہنے کی قوت نہ رہی، زمین پر گر گیا اور مجھ کو یقین ہو گیا کہ بیشک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رحلت فرمائی۔

ل ایام خلافت میں ایک مرتبہ فاروق اعظمؓ نے حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ سے فرمایا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے دن جو میرا کلام تھا اس کا منشا یہ آیت تھی : وَکَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّۃً وَّسَطًا لِّتَکُوْنُوْا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ وَیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْکُمْ شَھِیْدًا۔ میں اس کا مطلب یہ سمجھا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُمت میں آخر وقت تک قیام فرما کر اس کے اعمال کی شہادت ادا فرمائیں گے۔

باب دوم

خلافت

سقیفۂ بنی ساعدہ اسی حالت میں کہ مہاجرین مسجدِ نبویؐ میں جمع تھے ایک شخص نے آکر کہا کہ انصار سقیفۂ بنی ساعدہ میں فراہم ہو کر خلافت کے بارہ میں مشورہ کر رہے ہیں، اگر تم کو اُمت کے بچانے کی ضرورت ہے تو بچا لو۔ قبل اس کے کہ کام ہاتھ سے نکل جائے۔ یہ سنتے ہی حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا کہ ہم کو اپنے بھائیوں انصار کے پاس چلنا چاہیے۔ چنانچہ دونوں صاحب روانہ ہُوئے۔ راستہ میں حضرت ابوعبیدہ بھی شامل ہو گئے۔ آگے بڑھے تو دو انصاری ملے اور پوچھا کہاں جاتے ہو؟

فاروقِ اعظمؓ نے جواب دیا: انصار کے جلسہ میں۔

انصاریوں نے کہا:

وہاں نہ جائیے، مہاجرین کو اپنا معاملہ خود طے کر لینا چاہیے۔

حضرت عمرؓ نے قسم کھا کر کہا کہ ہم ضرور جائیں گے۔ اس موقع پر یہ بیان کر دینا مناسب ہے کہ سقیفۂ بنی ساعدہ میں کیا ہو رہا تھا۔ جب انصار سقیفے میں جمع ہو لئے تو سب سے اوّل حضرت سعد بن عبادہ نے خطبہ دیا۔ پہلے حمد و ثنا الٰہی بیان کی، پھر کہا:

يَا مَعْشَرَ الْاَنْصَارِ لَكُمْ سَابِقَةٌ فِي الدِّيْنِ وَ فَضِيْلَةٌ فِي الْاِسْلَامِ لَيْسَتْ بِقَبِيْلَةٍ مِّنَ الْعَرَبِ اَنَّ مُحَمَّدًا عَلَيْهِ السَّلَامُ لَبِثَ بِضْعَ عَشْرَةَ سَنَةٍ فِيْ قَوْمِهٖ يَدْعُوْهُمْ اِلٰى عِبَادَةِ الرَّحْمٰنِ وَخَلْعِ الْاَنْدَادِ وَالْاَوْثَانِ فَمَا اٰمَنَ بِهٖ مِنْ قَوْمِهٖ اِلَّا رِجَالٌ قَلِيْلٌ وَكَانَ مَا كَانُوْا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى اَنْ يَّمْنَعُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَ لَا اَنْ يُّعِزُّوْا دِيْنَهٗ وَلَا اَنْ يَّدْفَعُوْا عَنْ اَنْفُسِهِمْ ضَيْمًا عَمُّوْا بِهٖ، حَتّٰى اِذَا اَرَادَ بِكُمُ الْفَضِيْلَةَ سَاقَ اِلَيْكُمُ الْكَرَامَةَ وَخَصَّكُمْ بِالنِّعْمَةِ فَرَزَقَكُمُ اللّٰهُ الْاِيْمَانَ بِهٖ وَبِرَسُوْلِهٖ وَ الْمَنْعَ لَهٗ وَلِاَصْحَابِهٖ وَالْاِعْزَازَ لَهٗ	اے گروہِ انصار! تم کو دین میں وہ سبقت اور اسلام میں وہ فضیلت حاصل ہے جو عرب کے کسی قبیلہ کو حاصل نہیں ہے۔ اور وُہ یہ ہے کہ محمد علیہ السلام اپنی قوم میں کچھ اوپر دس برس رہ کر اُس کو خدا کی عبادت کرنے اور بت پرستی کے ترک کی جانب بلاتے رہے مگر باستثنار قلیل اُن کی قوم میں سے کوئی ایمان نہ لایا۔ جو ایمان لائے انھیں اتنی قوت نہ تھی کہ رسول اللہؐ کی حفاظت کرتے، دین کا اعزاز بڑھاتے اور اپنے آپ سے ظلم اعدا کو دفع کرتے جس میں سب مبتلا تھے۔ یہاں تک کہ جب اللہ کو منظور ہوا کہ تم کو عزت دے تو اس نے تم کو شرف بخشا، فضیلت کے ساتھ مخصوص فرمایا اور اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لانے کی توفیق عطا فرمائی۔ نیز اس امر کی کہ تم رسول اللہؐ اور ان کے

وَلِدِيْنِهٖ وَالْجِهَادَ لِاَعْدَائِهٖ وَكُنْتُمْ اَشَدَّ النَّاسِ عَلٰى عَدُوِّهٖ مِنْكُمْ وَاَثْقَلَهٗ عَلٰى عَدُوِّهٖ مِنْ غَيْرِكُمْ حَتّٰى اِسْتَقَامَتِ الْعَرَبُ لِاَمْرِ اللّٰهِ طَوْعًا وَكَرْهًا وَاَعْطَى الْبَعِيْدُ الْمَقَادَةَ صَاغِرًا دَاخِرًا حَتّٰى اَثْخَنَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ لِرَسُوْلِهٖ بِكُمُ الْاَرْضَ وَدَانَتْ بِاَسْيَافِكُمْ لَهُ الْعَرَبُ وَتَوَفَّاهُ اللّٰهُ وَهُوَ عَنْكُمْ رَاضٍ وَبِكُمْ قَرِيْرُ عَيْنٍ اِسْتَبِدُّوْا بِهٰذَا الْاَمْرِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَاِنَّهٗ لَكُمْ دُوْنَ النَّاسِ۔

اصحاب کی حفاظت کرو۔ اُن کا اور اُن کے دین کا اعزاز بڑھاؤ اور ان کے دشمنوں سے جہاد کرو۔ اس کے بعد تم اُن کے دشمنوں پر (خواہ وہ تم میں سے تھے یا تمہارے غیر) سب سے زیادہ سخت اور بھاری ہو گئے۔ یہاں تک کہ تمام عرب کے سر حکمِ الٰہی کے سامنے طوعاً و کرہاً جھک گئے اور تمہاری تلواروں نے عرب کو فرمانبردار بنا دیا اور تمہارے ذریعے سے خدا تعالیٰ نے سرزمینِ عرب کو مطیع۔ خدا تعالیٰ نے ان کو (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو) وفات دی اور وہ تم سے راضی و خوش تھے (خلافت کی نسبت) پورا اصرار کرو وہ تمہارا حق ہے نہ کہ اوروں کا۔

اس خطبے کے ختم ہونے پر تمام مجمع نے تحسین و آفرین کی اور کہا ہم تمہاری رائے پر عمل کریں گے۔ تم ہم میں سے سربرآوردہ ہو۔ اور صلحائے مومنین کے محبوب۔ اس کے بعد باہم بحث و گفتگو ہوتی رہی، دورانِ بحث میں کسی نے کہا کہ اگر مہاجرین نے اپنا یہ دعویٰ پیش کیا کہ ہم مہاجرین اور اوّلین صحابہ ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عزیز و رفیق، پھر تم کس طرح ہمارے مقابلہ پر دعوےٰ کرتے ہو تو ہمارا جواب کیا ہوگا؟ اس پر کسی نے کہا کہ ہم یہ جواب دیں گے:

اِذًا مِنَّا اَمِيْرٌ وَمِنْكُمْ اَمِيْرٌ۔ — اس صورت میں ایک امیر ہم میں سے ہو ایک تم میں سے۔

اس کے بغیر ہم کبھی راضی نہ ہوں گے۔

یہ سن کر حضرت سعد نے کہا کہ یہ پہلی کمزوری ہے۔

یہ مکالمہ ہو رہا تھا کہ حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور ابوعبیدہ وہاں پہنچے، دیکھا کہ ایک آدمی چادر اوڑھے لیٹا ہے۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا:

یہ کون ہے؟

کسی نے کہا:

سعد بن عبادہ۔

اس طرح کیوں لیٹے ہیں؟

بیمار ہیں۔

اس سوال و جواب کے بعد تینوں صاحب بیٹھ گئے۔ اُن کے بیٹھ جانے پر انصار کا ایک خطیب کھڑا ہوا، اور اس نے انصار کے حقوق و فضائل پوری تفصیل کے ساتھ بیان کیے۔ اسی طرح متعدد انصاریوں نے خطبے دیے۔ جب ان کے سب خطیب سلسلۂ کلام ختم کر چکے

تو حضرت عمرؓ نے خطبہ دینا چاہا (جس کو پہلے سے سوچ چکے تھے)۔

حضرت ابوبکرؓ نے کہا: ٹھہرو!

وہ رک گئے۔ صدیقِ اکبرؓ نے کھڑے ہو کر خطبہ دیا، اوّل حمد و ثنائے الٰہی بیان کی، پھر کہا:

اِنَّ اللّٰہَ بَعَثَ مُحَمَّدًا رَّسُوْلًا اِلٰی خَلْقِہٖ شَہِیْدًا عَلٰی اُمَّتِہٖ لِیَعْبُدُوا اللّٰہَ وَیُوَحِّدُوْہُ وَھُمْ یَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِہٖ اٰلِھَۃً شَتّٰی وَیَزْعُمُوْنَ اَنَّھُمْ شَافِعَۃٌ وَّلَھُمْ نَافِعَۃٌ اِنَّمَا ھِیَ مِنْ حَجَرٍ مَنْحُوْتٍ وَخَشَبٍ مَنْجُوْرٍ۔

واقعہ یہ ہے کہ اللہ نے محمدؐ کو اپنی مخلوق کے پاس رسول اور ان کی امت کے واسطے رہنما بنا کر بھیجا، اس غرض سے کہ بندے اللہ کی عبادت اور اس کی توحید کا اقرار کریں، حالت یہ تھی کہ لوگ متفرق معبودوں کو اس خیالِ خام سے پوجتے تھے کہ وہ اللہ کے سامنے اُن کے شفیع بن کر نفع پہنچائیں گے۔ ان معبودوں کی حقیقت یہ تھی کہ چوب و سنگ سے تراش لیے گئے تھے۔

ثم قرأ "وَیَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ مَا لَا یَضُرُّھُمْ وَلَا یَنْفَعُھُمْ وَیَقُوْلُوْنَ ھٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰہِ وَقَالُوْا مَا نَعْبُدُھُمْ اِلَّا لِیُقَرِّبُوْنَآ اِلَی اللّٰہِ زُلْفٰی" فعظم علی العرب ان یترکوا دین اٰباءھم فخص اللہ المھاجرین الاولین من قومہ بتصدیقہ والایمان بہٖ والمواسات لہٗ والصبر معہ علٰی شدۃ اذی قومھم لھم و تکذیبھم ایاھم وکل الناس لھم مخالف زار علیھم فلو یستوحشوا القلۃ عددھم و شنف الناس لھم واجماع قومھم علیھم فھم اوّل من عبد اللہ فی الارض و اٰمن باللہ وبالرسول وھم اولیائہ و عشیرتہ واحق الناس ھذا الامر من بعدہ و لا ینازعھم فی ذٰلک الا ظالم وانتم یا معشر الانصار من لا ینکر فضلھم فی

پھر یہ آیت پڑھی (جس کا ترجمہ یہ ہے) اور وہ لوگ اللہ کے سوا ایسے معبود پُوجتے ہیں جو نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں اور نہ نفع، اور کہتے ہیں کہ ہم ان کی پرستش صرف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ ہمارا قرب بارگاہِ الٰہی میں بڑھائیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عربوں کو اپنے دین آبائی کا چھوڑنا گراں گزرا، اس وقت اللہ نے رسول کی قوم میں سے مہاجرین اوّلین کو یہ خصوصیت بخشی کہ انہوں نے آپ کی تصدیق کی اور ایمان لائے، خدمت کے لیے کمربستہ ہوئے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ سخت مصیبتیں جھیلیں اس حالت میں کہ تمام آدمی اُن کو جھٹلاتے تھے اور دشمن جانی ہو رہے تھے۔ وہ اس سے باوجود اپنی قلت اور دشمنوں کی سختی کے گھبرائے نہیں۔ لہٰذا یہ لوگ وہ ہیں جنہوں نے سب سے اوّل روئے زمین پر اللہ کی عبادت کی اور رسول پر ایمان لائے، اسی کے ساتھ یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رفقا اور کنبے والے ہیں اور خلافت کے سب سے زیادہ حقدار۔

الدین ولا سابقتھم العظیمة فی الاسلام۔ رضیکم اللہ انصارا لدینه و رسوله و جعل الیکم ھجرة و فیکم جلة ازواجه واصحابه فلیس بعد المھاجرین الاولین عندنا بمنزلتکم فنحن الامراء وانتم الوزراء لا تفتاتون بمشورة ولا نقضی دونکم الامور۔

سوائے ظالم کے اِس معاملہ میں اُن سے کوئی شخص نزاع نہیں کر سکتا۔ اور اے معشر انصار تمہاری دینی فضیلت اور اسلامی شرف سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا تم کو اللہ نے اپنے دین اور رسول کی مدد کے واسطے انتخاب کیا۔ اپنے رسول کو تمہاری پناہ میں ہجرت کے بعد بھیجا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اکثر ازواج و اصحاب تم میں سے ہیں۔ لہٰذا مہاجرین اولین کے بعد تمہارا مرتبہ سب سے زیادہ ہے۔ پس ہم امرا ہوں تم وزرا۔ تم اپنے مشورہ پر ہٹ مت کرنا۔ ہم بغیر تمہارے مشورہ کے معاملات طے نہیں کریں گے۔

ایک روایت کے بموجب آخر میں یہ کہا:

وَقَدْ رَضِیْتُ لَکُمْ اَحَدَ هٰذَیْنِ الرَّجُلَیْنِ اَیُّهُمَا شِئْتُمْ۔

میں ان دونوں میں سے جس ایک کو تم چاہو انتخاب کرتا ہوں۔

یہ کہہ کر حضرت ابوعبیدہؓ اور حضرت عمرؓ کی طرف اشارہ کیا اور دونوں کے مختصر فضائل بیان کیے، انصار اس کے بعد بھی جوش کے ساتھ اپنے حقوق بیان کرتے رہے۔ آخر کار حضرت ابوعبیدہؓ نے کہا:

یا معشر الانصار انکم اوّل من نصر و آزر فلا تکونوا اوّل من بدّل و تغیّر۔

اے گروہِ انصار! تم نے مدد اور قوت پہنچانے میں سبقت کی تھی لہٰذا تغیر و تبدل کرنے میں سبقت نہیں کرنی چاہیے۔

یہ سن کر دو جلیل القدر انصاری یعنی حضرت زیدؓ بن ثابت اور حضرت بشیرؓ بن سعد نے اپنے فریق کو سمجھایا۔ حضرت زید بن ثابت نے کہا:

ان رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم کان من المھاجرین فان الامام یکون من المھاجرین و نحن انصاره کما کنّا انصار رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم۔

یہ واقعہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زمرۂ مہاجرین میں تھے۔ پس ضرور ہے کہ امام بھی مہاجرین میں سے ہو، اور ہم اُس کے اسی طرح مددگار ہوں جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تھے۔

حضرت بشیر بن سعد نے کہا:

یا معشر الانصار انا واللہ لئن کنا اولی

اے گروہِ انصار! اگر ہم نے مشرکوں کے جہاد میں

فضیلۃ فی جہاد المشرکین وسابقۃ فی هذا الدین ما اردنا بہ الا رضاء ربنا وطاعۃ نبیّنا ولکدح لانفسنا فیما ینبغی لنا ان نستطیل علی الناس بذالك ولا ینبغی بہ من الدنیا عرضاً فان الله ولیّ المنّۃ علینا بذلك الا ان محمداً صلی الله علیہ وسلم من قریش وقومہ احق بہ و اولیٰ وایم الله لا یرانی الله انازعہم هذا الامر ابداً فاتقوا الله ولا تنازعوہم۔

سب سے زیادہ فضیلت حاصل کی اور دین میں عزت تو اُس سے مقصود صرف اللہ کی رضا اور اپنے نبی کی اطاعت اور خود اپنے لیے کسب عمل تھا۔ ہم کو روا نہیں کہ ہم اس کو دوسرے آدمیوں کے حقوق میں دست اندازی کا ذریعہ بنا دیں نہ اُس کے عوض ہم کو جاہ دنیا طلب کرنا چاہیے۔ خدا ہم کو اس کی جزا دے گا خوب سمجھ لو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم قریشی تھے، ان کی قوم ان کی جانشینی کی سب سے زیادہ مستحق و اہل ہے میں بالقسم کہتا ہوں کہ خدا مجھ کو کبھی نہ دیکھے گا کہ میں اُن سے اس بارہ میں نزاع کروں۔ پس تم خدا سے ڈرو اور ان سے جھگڑا نہ کرو۔

حضرت بشیر کی گفتگو ختم ہونے پر حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ عمرؓ اور ابوعبیدہؓ موجود ہیں۔ ان میں سے جس سے چاہو بیعت کر لو۔ دونوں نے کہا:

لا والله بنتولّٰی هذا الامر علیك فانك افضل المهاجرین وثانی اثنین اذهما فی الغار وخلیفۃ رسول الله علی الصلوٰۃ والصّلوٰۃ افضل دین المسلمین فمن ذا ینبغی لہ ان یتقدمك او یتولّٰی هذا الامر علیك ابسط یدك نبایعك۔

نہیں، قسم رب کی اس معاملہ میں ہم تم پر سبقت نہیں کر سکتے، تم افضل مہاجرین ہو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رفیق غار اور خلیفۂ نماز ہو۔ اور نماز مسلمانوں کے دین میں سب سے بڑھ کر ہے پس یہ کس کو زیبا ہے کہ وہ تم پر مقدم ہو، یا تمہارے ہوتے ہوئے خلافت کا متولی بنے۔ ہاتھ بڑھاؤ۔ ہم تم سے بیعت کرتے ہیں۔

جس وقت ان دونوں صاحبوں نے حضرت ابوبکر کی بیعت کا ارادہ کیا حضرت بشیر بن سعد انصاری نے سبقت کر کے سب سے اول بیعت کی۔ ان کے بعد حضرت عمر اور حضرت ابوعبیدہ نے۔ پھر تو یہ عالم ہوا کہ تمام مجمع بیعت پر ٹوٹ پڑا اور خوف ہوا کہ حضرت سعد بن عبادہ (جو بوجہ مرض مجمع کے اندر لیٹے ہوئے تھے) کچل نہ جائیں۔ جب بیعت کی خبر جلسہ کے باہر پہنچی تو ہر طرف سے آدمی جوق در جوق آنے لگے۔ یہاں تک کہ گلیاں ان کے ہجوم سے بھر گئیں۔ یہ بیعتِ خاصّہ تھی۔

بیعتِ عامّہ اگلے روز سہ شنبہ کو بیعتِ عامّہ ہوئی۔ مسجد نبویؐ میں مسلمان جمع ہوئے۔ اول حضرت عمر نے منبر پر کھڑے ہو کر کہا:

كنت ارجو ان يعيش رسول الله صلى الله
عليه وسلم حتى يدبرنا فان يك محمداً
صلى الله عليه وسلم قد مات فان الله
قد جعل بين اظهركم نوراً تهتدون
به هدى الله محمداً صلى الله عليه
وسلم وان ابا بكر صاحب رسول الله صلى
الله عليه وسلم وثاني اثنين وانه اولى
المسلمين بامورکم فقوموا وبايعوه۔

میری یہ توقع تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم سب کے
بعد تک زندہ رہیں گے۔ لیکن اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے
وفات پائی تو تمہارے پاس وہ نور موجود ہے (قرآن)
جو تم کو راستہ دکھائے گا جس پر اللہ نے اپنے رسول
صلی اللہ علیہ وسلم کو چلایا تھا اور ابوبکر رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کے صحابی رفیقِ غار ہیں اور وہ سب مسلمانوں
سے زیادہ تمہارے معاملات کے انصرام کے اہل ہیں
اب بڑھو اور ان سے بیعت کرو۔

حضرت عمر نے کلامِ بالا ختم کر کے حضرت ابوبکر سے اصرار کیا کہ منبر پر بیٹھئے، مگر وہ انکار کرتے رہے۔ آخر حضرت فاروق کا اصرار غالب آیا اور حضرت ابوبکر منبر پر بیٹھے۔ لیکن اس مقام سے ایک درجہ نیچے جہاں حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم قیام فرماتے تھے، جلوسِ منبر کے بعد عام طور پر مسلمانوں نے بیعت کی (فبایعہ الناس عامہ) بعد بیعت حضرت ابوبکر نے کھڑے ہو کر خطبۂ خلافت دیا۔ اول حمد و ثنائے الٰہی بیان کی، پھر کہا:

اما بعد ايها الناس فوالله ما كنت حريصاً
على الامارة يوماً ولا ليلة قط ولا كنت
راغبا فيها ولا سالتها الله عز وجل في
سر وعلانية ولكني اشفقت من الفتنة
ومالي في الامارة من راحة ولكن كلفت
اجراً عظيماً مالي به طاقة ولا
يدان الا بتقوية الله عز وجل ولوددت
ان اقوى الناس عليها مكاني اليوم
اني قد وليت عليكم ولست بخيركم
فان احسنت فاعينوني وان اساءت
فقوموني الصدق امانة والكذب خيانة
والضعيف فيكم قوي عندي حتى
ازيح عليه حقه ان شاء الله و
القوي منكم ضعيف حتى اخذ الحق

بعد حمدِ الٰہی اے آدمیو! واللہ مجھے ہرگز امیر بننے
کی حرص نہ کبھی دن میں تھی نہ رات میں اور نہ میرا
میلان اس کی جانب تھا اور نہ میں نے اللہ سے ظاہر
یا پوشیدہ اس کے لیے دعا کی البتہ مجھ کو یہ خوف ہوا
کہ کوئی فتنہ نہ اُٹھ کھڑا ہو۔ مجھ کو حکومت میں کچھ راحت
نہیں ہے بلکہ مجھ کو ایک ایسے امرِ عظیم کی تکلیف دی گئی ہے
جس کی برداشت کی مجھ میں طاقت نہیں اور نہ وہ بدون
اللہ عزوجل کی مدد کے قابو میں آسکتا ہے۔ میری ضرور
یہ آرزو تھی کہ آج میری جگہ سب سے زیادہ قوی آدمی
ہوتا یہ تحقیق ہے کہ میں تمہارا امیر بنایا گیا اور میں تم سے
بہتر نہیں ہوں۔ اگر میں راہِ راست پر چلوں تو مجھ کو
مدد دو، اگر بے راہ چلوں تو مجھ کو سیدھا کر دو۔ صدق
امانت ہے اور کذب خیانت۔ جو تم میں کمزور ہے وہ
میرے لیے قوی ہے ان شاء اللہ اُس کا حق دلوادوں گا۔

منه إن شاء الله لا يدع قوم الجهاد في سبيل الله الا ضربهم الله بالذل و لا يشيع الفاحشة في قوم قط الا عمهم الله بالبلاء اطيعوني ما اطعت الله و رسوله فلا طاعت لي عليكم قوموا الى صلوتكم يرحمكم الله تعالى۔

اور تم میں جو قوی ہے وہ میری نظر میں کمزور ہے، اُس سے اِن شاء اللہ حق لے کر چھوڑوں گا۔ جو قوم راہِ حق میں جہاد چھوڑ دیتی ہے وہ ذلیل کر دی جاتی ہے اور جس قوم میں بے حیائی کا رواج ہو جاتا ہے اس پر عام طور پر عذابِ الٰہی نازل ہوتا ہے۔ جب تک میں اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کروں تم میری اطاعت کرو اور جب میں خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی کروں تم کو میری اطاعت نہیں کرنی چاہیے اب نماز کے واسطے کھڑے ہو جاؤ خدا تم پر رحم کرے۔

بعد بعیت خلیفۂ رسول اللہ لقب ہوا۔ ایک موقع پر کسی نے خلیفۃ اللہ کہہ کر مخاطب کیا تو کہا میں رسول اللہ کا خلیفہ ہوں اور اسی سے میں خوش ہوں۔

شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے ازالۃ الخفاء میں معنیٔ خلافت پر ایک لطیف بحث لکھی ہے اگرچہ اُس کی اصلی شان تو خود شاہ صاحبؒ کے الفاظ میں ہے۔ مگر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کا خلاصہ عام فہم پیرایہ میں یہاں بھی لکھ دیا جائے۔

یہ امر قطعی طور پر ثابت ہے کہ حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت عام تھی اور آپ تمام بنی نوع انسان کی ہدایت کے واسطے مبعوث ہوئے تھے، بعد بعثت آپ نے جن امور کا اہتمام کوشش بلیغ کے ساتھ فرمایا اگر ان سب کا استقراء کر کے جزئیات سے کلیات بنائیں اور کلیات سے کلی واحد جو جنسِ اعلیٰ ہو تو ثابت ہو گا کہ تمام کوششوں کا مرجع اقامتِ دین تھی۔ یہ جنس اعلیٰ ہے اس کے تحت میں حسبِ ذیل کلیات آتی ہیں:

۱۔ علومِ دین کا احیاء (قایم رکھنا اور رائج رکھنا)۔ علومِ دین سے مراد ہے قرآن و سنّت کی تعلیم اور وعظ و نصیحت۔

۲۔ ارکانِ اسلام نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج وغیرہ کا قیام و استحکام۔

۳۔ لشکرِ اسلام کی آراستگی و درستی، امراءِ لشکر کا تقرر، غزوات کا اہتمام۔

۴۔ مقدمات کا انفصال، قاضیوں کا تقرر۔

۵۔ امر بالمعروف (عمدہ افعال و اوصاف کا حکم دینا اور اُن کو رائج کرنا) و نہی عن المنکر (بُری باتوں کو رد کنا اور ان کا انسداد کرنا)

۶۔ جو حکام نائب مقرر ہوں اُن کی نگرانی کہ پابندِ حکم رہیں اور خلاف ورزی احکام نہ کریں۔

ان جملہ امور کا اہتمام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفسِ نفیس فرمایا اور ان کے انصرام کے واسطے نائب بھی مقرر کیے، وعظ و نصیحت فرمائی۔ صحابہ کو ممالک میں وعظ و نصیحت کے واسطے بھیجا۔ جمعہ و عیدین و پنجوقتہ نماز کی امامت خود فرمائی۔ دوسرے

مقامات کے واسطے امام مقرر کیے۔ وصولِ زکوٰۃ کے واسطے عامل مامور کیے۔ وصول شدہ اموال کو مصارف مقررہ میں صرف کیا۔ رؤیت ہلال کی شہادت آپ کے حضور میں پیش ہوتی اور بعد ثبوت روزہ رکھنے یا عید کرنے کا حکم صادر ہوتا۔ حج کا اہتمام بعض اوقات خود فرمایا۔ بعض اوقات نائب مقرر کیے۔ جس طرح ۹ھ میں حضرت ابوبکر کو امیر حج مقرر کر کے بھیجا۔ غزوات کی سپہ سالاری خود کی، نیز امرا نائب سے یہ کام لیا گیا۔ مقدمات و معاملات فیصل کیے۔ قاضیوں کا تقرر عمل میں آیا۔ علیٰ ہٰذا القیاس باقی امور۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد دین کے قیام و حفاظت کے واسطے ضروری تھا، نائب مطلق یا خلیفہ کا تقرر تاکہ وہ اقامتِ دین کی مذکورۂ بالا خدمات کو انجام دے۔

جیشِ اسامہؓ مرضِ وفات میں حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لشکر کی روانگی کا حکم دیا تھا جس کے سردار اسامہؓ بن زید مقرر فرمائے گئے تھے۔ مدینہ اور نواحِ مدینہ کے سات سو جوان اس مہم کے لیے نامزد ہوئے تھے۔ یہ مہم رومیوں کے مقابلہ پر اس لشکر اسلام کے انتقام لینے کے واسطے مامور ہوئی تھی جس کو رومیوں نے ۸ھ میں بمقام موتہ تباہ کیا تھا، مگر آپ کی علالت کی شدت اور وفات کے سبب روانگی نہ ہو سکی۔ حضرت ابوبکرؓ نے بیعت کے دوسرے روز حکم دیا کہ جیش اُسامہ تیار ہو کر روانہ ہو۔ منادی نے ندا دی:

لیتم بعث اسامة الا لا یبقین بالمدینة احد الاخرج الی عسکرہ بالجرف۔	اسامہ کے لشکر کو تیار ہو جانا چاہیے۔ تاکید کی جاتی ہے کہ جو لوگ اس مہم میں نامزد ہیں ان میں سے ایک آدمی بھی مدینہ میں نہ رہے اور سب کے سب بمقام جُرفؔ[1] جمع ہو جائیں۔

یہ پہلا حکم تھا جو حضرت ابوبکرؓ نے بحیثیت خلافت جاری کیا۔ اسی عرصہ میں کہ لشکر چھاؤنی میں جمع ہو اور اُس کی روانگی عمل میں آئے عرب کے ارتداد اور یہود و نصاریٰ کی سرکشی کی خبریں متواتر مدینہ آنے لگیں۔ ان خبروں سے مسلمانوں کا تردّد بڑھا۔ مورخین کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ وقت مسلمانوں کے لیے نہایت سخت تھا۔ مصیبتِ عظمیٰ حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے سایہ کا سر دں سے اُٹھ جانا تھا۔ اسی کے ساتھ عرب میں ارتداد پھیل رہا تھا۔ یہود و نصاریٰ نے ان حالات کو دیکھ کر سرکشی شروع کر دی تھی اس پر طرہ مسلمانوں کی قلت، دشمنوں کی کثرت۔ صحابی جلیل القدر حضرت عبداللہ بن مسعود کا قول ہے کہ اس وقت مسلمان بکریوں کے اس گلہ سے مشابہ تھے جو جاڑوں کی سردرات میں بحالتِ بارش میدان میں بے گلہ بان کے رہ جائے۔ ان حالات پر نظر کر کے صحابہ کرام نے امیر المومنین سے کہا کہ جو آدمی لشکر اُسامہ میں جا رہے ہیں وہ مسلمانوں کے چیدہ و منتخب افراد ہیں۔ عرب کی حالت آپ کی نگاہ کے سامنے ہے۔ اس صورت میں مسلمانوں کی جمعیت کو متفرق کرنا مناسب نہیں۔

حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا:

---

[1] جُرف مدینہ کے باہر ایک میدان تھا۔

والذی نفسی بیدہ لو ظننت السباع تخطفنی لانفذت جیش اسامة کما امر بہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولو لم یبق فی القری غیری لا نفذتہ۔	قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر مجھ کو یہ بھی گمان ہوتا کہ درندے مجھ کو اٹھالے جائیں گے تو بھی بہ تعمیل حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسامہ کا لشکر ضرور بھیجتا۔ اگر بستیوں میں سوائے میرے ایک متنفس بھی باقی نہ رہتا تو بھی روانگی کا حکم یقیناً دیتا۔

اس کے بعد بہ خیال مزید اہتمام مسلمانوں کے سامنے مجمع عام میں خطبہ دیا اور تیاری لشکر کی تاکید کی جب تمام لشکر جُرف کے پڑاؤ پر جمع ہوگیا تو حضرت اسامہؓ امیر عسکر نے حضرت عمرؓ کی زبانی حضرت ابوبکر سے کہلا بھیجا کہ مجھ کو اندیشہ ہے کہ میری روانگی کے بعد کفار خلیفۂ رسولؐ اللہ، حرم نبویؐ اور باقی مسلمانوں پر دوڑ پڑیں گے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں مع لشکر مدینہ چلا آؤں۔ اسی کے ساتھ انصار نے پیغام بھیجا کہ آپ لشکر روانہ ہی کریں تو بجائے اسامہؓ کے کسی سن رسیدہ آدمی کو سردار مقرر کیجئے۔ پہلا پیغام سن کر حضرت ابوبکرؓ نے تقریباً وہی جواب دیا جو اُوپر مذکور ہوا۔ جب حضرت عمرؓ نے انصار کا پیغام سنایا تو حضرت صدیقؓ غصے سے بیتاب ہو کر کھڑے ہوگئے اور کہا:

تم کو موت ہو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسامہ کو امیر لشکر بنایا تم مجھ کو ہدایت کرتے ہو کہ میں اس کو معزول کردوں۔

اس جواب کے بعد جُرف کے پڑاؤ پر خود گئے اور رخصت کر کے لشکر کو کوچ کا حکم دیا۔ جب کوچ ہوا تو حضرت اُسامہؓ گھوڑے پر سوار تھے۔ حضرت ابوبکرؓ پیادہ پا ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ خلیفہ کا کوتل گھوڑا حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کے ہاتھ میں تھا حضرت اسامہؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا:

یا آپ سوار ہولیں یا مجھ کو پیادہ چلنے کی اجازت دیں۔

جواب دیا کہ نہ میں سوار ہوں گا نہ تم کو پیادہ چلنے کی اجازت ملے گی۔ اگر میں ایک ساعت راہِ خدا میں اپنے قدم خاک آلود کروں تو میری کیا شان جاتی ہے۔ غازی راہِ خدا میں قدم رکھتا ہے اُس کے بدلے میں سات سو درجے بلند کیے جاتے ہیں۔ سات سو گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔ سات سو نیکیاں نامۂ اعمال میں لکھی جاتی ہیں۔

اس کے بعد لشکر کو مخاطب کر کے فرمایا:

یا ایھا الناس قفوا اوصیکم بعشر فاحفظوھا عنی، لا تخونوا ولا تغلوا ولا تغدروا ولا تمثلوا ولا تقتلوا طفلا ولا شیخا ولا کبیرا ولا امرأة	اے آدمیو! کھڑے ہو جاؤ میں تم کو دس حکم دیتا ہوں اُن کو میری جانب سے اچھی طرح یاد رکھنا: خیانت نہ کرنا، دھوکا نہ دینا، سردار کی نافرمانی مت کرنا، کسی شخص کے اعضا مت کاٹنا، کسی بچے، بوڑھے

۱؎ حضرت اسامہؓ کا سن اس وقت انیس برس کا تھا۔

ولا تعقروا نخلا و لا تحرقوه ولا تقطعوا الشجرة الثمرة و لا تذبحوا شاة و لا بقرة ولا بعيرا الا لما كلة و سوف تمرون باقوام قد فرغوا انفسهم بالصوامع فدعوهم وما فرغوا انفسهم و سوف تقدمون علی قوم یاتوکم بانیة فیها الوان الطعام فاذا اکلتم منها شیئا بعد شیء فاذکروا اسم اللہ علیها و تلقون اقواما قد فحصوا و ساط رؤسهم و ترکوا حولها مثل العصائب فاخفقوهم بالسیف خفقا اندفعوا باسم اللہ اکناکم اللہ الطعن و الطاعون۔

یا عورت کو قتل مت کیجیو۔ کھجور یا اور کسی میوہ دار درخت کو مت کاٹیو، نہ جلائیو۔ بکری، گائے یا اونٹ کو سوائے غذا کی ضرورت کے نہ مارنا۔ تم کو ایسے لوگ ملیں گے جو عبادت گاہوں میں گوشہ گیر ہوکر بیٹھے ہوں گے۔ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دینا۔ اور تم کو ایسے آدمی ملیں گے جو تمہارے پاس قسم قسم کے کھانے برتنوں میں رکھ کر لائیں گے۔ جب تم ان کھانوں کو یکے بعد دیگرے کھاؤ تو خدا کا نام لیتے جانا (یعنی نعمتیں پاکر خدا کو بھول نہ جانا) اور تم کو ایک ایسی قوم ملے گی جن کے سر کے بال بیچ میں منڈے ہوں گے اور پٹے چھوٹے ہوں گے۔ اُن کو تازیانہ کی سزا دی جائے، خدا کا نام لے کر روانہ ہو۔ خدا تم کو (دشمن کے) حربہ اور طاعون کے حملے سے محفوظ رکھے۔

یہ لشکر غرّہ ربیع الآخر کو (یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے ٹھیک انیس روز بعد) مدینہ سے روانہ ہوا منزلِ مقصود پر پہنچا اور باختلافِ روایت چالیس دن یا اس سے کسی قدر زائد عرصہ میں ارشادِ نبویؐ کی تعمیل کر کے مع الخیر واپس آگیا۔

مورخین کا قول ہے کہ اس لشکر کی روانگی سے قبائل میں دھاک بندھ گئی اور انھوں نے خیال کیا کہ اگر مسلمانوں میں قوت نہ ہوتی تو اس لشکر کو مدینہ سے باہر نہ بھیج دیتے۔

ارتداد فتح مکہ[1] کے بعد کثرت سے قبائل عرب نے اپنے وفد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجے اور اسلام سے مشرف ہوئے۔ چنانچہ سیرت میں ۹ھ کا نام "سنۃ الوفود" ہے۔ اسی سلسلہ میں یمن کے زبردست قبیلے بنو حنیفہ کا وفد بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوا۔ وفد مذکور میں مسیلمہ بھی تھا۔ اس میں اختلاف ہے کہ مسیلمہ جمالِ نبویؐ کے دیدار سے مشرف ہوا یا کہ نہیں۔ بہر حال یہ وفد مسلمان ہوکر یمن واپس گیا اور اس کی واپسی پر قبیلہ بنو حنیفہ اسلام لے آیا۔ ۱۰ھ کے آخر میں حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے علی مرتضیٰؓ کو اہلِ یمن کی ہدایت کے واسطے بھیجا۔ اس سے قبل چھ مہینے تک حضرت خالد بن ولید نے تبلیغِ اسلام کی مگر کچھ اثر نہ ہوا۔ حضرت شیرِ خدا کی آمد کی خبر سن کر کثرت سے یمنی سرحد پر

---

[1] مکہ ۸ھ کے آخری حصہ میں فتح ہوا۔

استقبال کو آئے۔ صبح کی نماز حضرت علی نے با جماعت ادا فرمائی۔ بعد نماز سب اہلِ یمن صف بستہ سامنے کھڑے ہو گئے۔ حضرت علی مرتضیٰ نے اُن کو مخاطب کر کے اوّل حمد و ثناء الٰہی بیان فرمائی اس کے بعد فرمانِ رسالت سُنایا اور تلقینِ اسلام کی۔ اس تلقین کا یہ اثر ہوا کہ اُسی روز تمام قبیلۂ ہمدان مسلمان ہوگیا۔ بعد کامیابی حضرت علیؓ نے مراجعت فرمائی اور حجۃ الوداع کے موقع پر بمقام عرفات آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ بغرض ۹ھ اور ۱۰ھ میں ملک یمن محض تبلیغ کے اثر سے دائرۂ اسلام میں داخل ہوا۔ ۹ھ میں زکوٰۃ فرض ہوئی اور آپ نے اس کے وصول کے واسطے عمال مختلف اطراف میں مقرر فرمائے۔ یمن میں باذان کو بدستور سابق تمام یمن کا عامل رکھا۔ حجۃ الوداع میں باذان[1] کی وفات کی خبر پہنچی اور آپ نے اسی موقع پر جدید انتظام فرمایا۔ ملکِ یمن مختلف حصوں میں تقسیم کیا گیا اور ہر حصہ پر جداگانہ عامل کا تقرر ہوا۔ حضرت معاذ بن جبل اس خدمت پر مامور ہوئے کہ تمام ملکِ یمن میں دورہ کر کے احکامِ اسلام کا اجرا کرتے رہیں۔ اسی عرصہ میں پہلا کاذب مدعی نبوت یمن میں بمقام صنعا پیدا ہوا جس کا نام اسود عنسی تھا اُس کو بجد فوری کامیابی ہوئی اور چند ہی دن میں اس نے ہر طرف آتش فساد مشتعل کر دی۔ قبیلہ بنی اسد میں طلیحہ نے دعویٰ نبوت کیا۔ تیسرا مدعی نبوت مُسیلمہ کذاب تھا۔ اسود عنسی کی کامیابی دیکھ کر اس کو بھی جرأت ہُوئی اور دعوٰی نبوت کا منصوبہ قائم کر کے اُس نے اعلان کیا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو شریکِ رسالت کر لیا ہے۔ انتہائے خیرہ سری یہ تھی کہ ۱۰ھ کے آخر میں اس نے ذیل کا خط آپ کی خدمت میں بھیجا:

من مسیلمة رسول الله الیٰ محمد رسول الله فانی قد اشترکت معك فی الامر و ان لنا نصف الارض ولقریش نصفها و لکن قریشاً قومٌ یعتدون۔	مسیلمہ رسول اللہ کی طرف سے محمدؐ رسول اللہ کے نام کہ میں رسالت میں تمہارا شریک کیا گیا ہوں آدھی زمین ہماری ہے اور آدھی قریش کی مگر قریشی ایسی قوم ہے جو ظلم کرتی ہے۔

اِس کے جواب میں یہ فرمانِ رسالت مدینہ سے جاری ہوا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم	شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان بخشنے والا ہے۔
من محمد رسول الله الیٰ مسیلمة الکذاب امّا بعد فالسّلام علیٰ من اتبع الھدیٰ فان الارض للہ یورثھا من یّشآء من عبادہٖ و العاقبة للمتقین۔	محمد رسول اللہ کی جانب سے مسیلمہ کذاب کے نام بعد حمد، پس سلام ہو اُن پر جو راہِ راست کے پیرو ہیں پھر یہ تحقیق ہے کہ ساری زمین اللہ کی ہے اپنے بندوں میں سے وہ جس کو چاہتا ہے بخش دیتا ہے اور عاقبت پرہیزگاروں کے حصہ میں ہے۔

حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حسبِ عادت شریف اوّل ان مدعیانِ نبوت کو بذریعہ پند و نصیحت سمجھایا۔ متعدد مراسلات

---

[1] باذان پہلے کسریٰ کی طرف سے عاملِ یمن تھے۔

بھیجے۔ لیکن کچھ اثر نہ ہوا۔ مرتدوں نے مسلمانوں پر دست درازی و تعدّی شروع کی اور جمعیت فراہم کر کے مقابلہ و مقاتلہ کا سلسلہ جاری کر دیا۔ جب نوبت اس حد تک پہنچی تو آپ نے ان کے دفعیہ کے واسطے عمال کے نام احکام جاری فرمائے اور یہ اہتمام مرضِ وفات کی شدّت میں بھی برابر جاری رہا۔

اسود عنسی کا خاتمہ آپ کی حیاتِ مبارک میں ہو گیا اور آپ نے یہ خبر مسلمانوں کو سُنا دی۔ اس بیان سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت جھوٹے مدعیانِ نبوت اور اُن کے پیرؤوں کی کیا کیفیت تھی جس وقت آپ کی رحلت کی خبر شائع ہوئی ان قبائل میں اور ان کے اثر سے دوسرے جدید الاسلام قبیلوں میں اضطرابِ عظیم پیدا ہوا۔ اور تمام ملک یمن میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ مسلمان عامل ہٹا دئے گئے اور مرتدین نے دخل کر لیا۔ اسود عنسی اگرچہ مر چکا تھا لیکن اس کی فوج مختلف حصہ ہائے ملک میں منتشر تھی اب وہ پھر جمع ہو کر ایک لشکرِ عظیم بن گئی۔ اسی کے ساتھ ساتھ نواحِ مدینہ میں ارتداد و سرکشی پیدا ہوئی۔ خلاصہ یہ ہے کہ مدینے کے باہر صرف دو قبیلے ایسے تھے جو تمام و کمال اسلام پر قائم رہے یعنی قریش و ثقیف۔ باقی تمام قبائل میں کم و بیش ارتداد کا فساد پھیلا۔ بعضے کُل کے کل مُرتد ہو گئے۔ بعض میں کچھ مسلمان رہے کچھ مرتد ہو گئے۔ ارتداد کا زور زیادہ تر دو طرف تھا، ایک یمن میں، دوسرے نواحِ مدینہ کے قبائل میں۔ اور یہ سب کے سب جدید الاسلام تھے۔ معرکہ طلب طبائع نے اپنے عروج و سرداری کا حیلہ دعوٰی نبوت و ارتداد قرار دے لیا تھا۔ واقعاتِ ذیل سے اِس بیان کی صحت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

قبیلۂ بنی عامر میں سردار عامر بن الطفیل تھا وہ علانیہ کہتا تھا کہ میں تمام عرب کی امارت کا متمنی ہوں ایک قریشی کا اتباع کس طرح کر سکتا ہوں۔ قبیلۂ غطفان قبیلۂ بنی اسد کا حلیف تھا۔ غطفانی کہتے تھے کہ ہم اپنے حلیف اسدیوں کے نبی (طلیحہ) کو چھوڑ کر رسول قریشی کی پیروی کیوں کریں، قریش کے نبی نے وفات پائی۔ اسد کا نبی زندہ ہے۔ قبیلہ عبدالقیس میں مرتدوں کا نشان بردار غرور نعمان بن منذر کا پوتا تھا۔ یہ نعمان بن منذر اُس خاندان حِمیَر کی اخیر یادگار تھا، جس نے صدیوں تک یمن میں حکومت کی تھی۔ دعوائے نبوت کی انتہائی اُرزانی یہ تھی کہ سجاح نامی ایک عورت بھی مدعیِ نبوت بن بیٹھی۔ اس نے یمن میں نبی ہونے کا اعلان کیا۔ قبیلۂ بنی تغلب (جو نصرانی تھا) اپنا مذہب چھوڑ کر اُس کی اُمت میں شامل ہوا۔ مدعیانِ نبوت کے احکام بھی عجیب تھے۔ طلیحہ کی نکتہ سنجی ملاحظہ ہو۔ نماز کے ارکان میں سے سجدہ موقوف کر دیا۔ مسیلمہ کے حکم سے شراب اور زنا مباح و حلال قرار پایا۔ جب اس نے سجاح مدعیہ نبوت سے نکاح کیا تو اس کے مہر میں دو وقت کی نماز معاف کر دی۔ ایک صبح کی، دوسری عشا کی۔ وجہ یہ ظاہر کی کہ ان سے لوگوں کو تکلیف ہوتی ہے۔

فتنۂ ارتداد کے سلسلہ میں یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ باوجود اس قدر فتنہ و فساد اور ہنگامے کے ایک شخص بھی ایسا مرتد نہیں ہوا جو قدیم الاسلام اور مذہب میں راسخ ہو چکا تھا عموماً جدید الاسلام قبیلے مرتد ہوئے۔ ان میں بھی اکثر عوام فتنہ جُو تھے۔ چنانچہ طلیحہ کے نشان کے نیچے زیادہ تر قبیلہ طے اور اسد کے عوام الناس کا ہجوم تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے فراستِ ایمانی سے آغاز ہی میں اس ہنگامے کی قوت کا پورا اندازہ فرما لیا تھا۔ چنانچہ یمن سے جب ابتداءً قاصد آئے تو خط دیکھ کر اُن سے فرمایا:

ابھی صبر کرو اس کے بعد جو خط آئیں گے ان میں اس سے بھی زیادہ سخت خبریں ہوں گی۔ اور ہُوا بھی یہی۔ اس کے بعد ہی ہر طرف سے امرائے مسلمین کے مراسلے آنے لگے جن میں قبائل کے ارتداد اور اُن مظالم کی اطلاع درج تھی جو مرتدوں کے ہاتھ سے مسلمانوں پر ہوتے تھے۔ نواحِ مدینہ کے قبائل نے مرتد ہو کر بالاتفاق مدینہ کا رُخ کیا۔ بنی اسد سمیرا[1] میں۔ فزارہ اور غطفان کا ایک حصہ جنوب مدینہ میں ثعلبہ و مرہ و عبس کا ایک حصہ، ابرق[2] میں دوسرا ذوالقصہ[3] میں خیمہ زن ہوا۔ اُسی زمانہ میں حضرت عمرو بن العاص اس راستہ سے مدینہ پہنچے اور بیان کیا کہ دبّا[4] سے لے کر مدینہ تک برابر مرتد فوجیں پڑی ہوئی ہیں۔ ان قبائل نے اس طرح مدینہ کو گھیر کر اپنے قاصد حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں بھیجے۔ یہ آگ کس طرح جلد بھڑکی تھی، اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ بیعتِ خلافت کے دسویں روز ایلچی مدینہ پہنچ گئے تھے۔ مدینہ پہنچ کر قاصد مختلف عمائد کے یہاں مقیم ہُوئے۔ عمِ رسول حضرت عباسؓ کی یہ خصوصیت تھی کہ انھوں نے کسی قاصد کو اپنے مکان پر نہیں ٹھہرنے دیا۔ ایلچیوں نے اول ان مسلمانوں سے گفتگو کی جن کے یہاں ٹھہرے تھے۔ اس کے بعد متفق ہو کر حضرت ابوبکرؓ کے پاس گئے اور بالاتفاق یہ پیام پہنچایا کہ ہم سے نماز پڑھوا لو مگر زکوٰۃ معاف کر دو۔ اُن کا پیام سُن کر حضرت صدیق اکبرؓ نے صحابہ کرام سے مشورہ کیا۔ سب نے یہ صلاح دی کہ نرمی مناسب وقت ہے۔ حضرت عمرؓ بھی اس رائے میں شریک تھے۔ اُن کے یہ الفاظ ہیں:

یا خلیفۃ رسول اللہ تالف الناس و ارفق بھم۔	اے خلیفۂ رسول اللہ! ان لوگوں کے ساتھ تالیفِ قلوب اور نرمی کا برتاؤ کیجئے۔

حضرت ابوبکرؓ نے یہ مشورہ سُن کر حضرت عمرؓ کو مخاطب کر کے فرمایا:

اجبار فی الجاھلیۃ و خوار فی الاسلام انہ قد انقطع الوحی و تم الدین اینقص و انا حیٌّ۔ واللہ لاجاھدھم ولو منعونی عقالا۔	یہ کیا کہ تم جاہلیت میں تو بڑے سرکش تھے۔ مسلمان ہو کر ذلیل و خوار بن گئے۔ وحی کا سلسلہ قطع ہو گیا۔ دین کمال کو پہنچ چکا۔ کیا میری زندگی میں اُس کی قطع و برید کی جائے گی۔ واللہ اگر (فرض زکوٰۃ میں سے) ایک رسی کا ٹکڑا دینے سے بھی لوگ انکار کریں گے تو میں جہاد کا حکم دوں گا۔

فاروقِ اعظمؓ کا مقولہ ہے کہ اس کلام کو سُن کر مجھ پر منکشف ہو گیا کہ اللہ نے ابوبکرؓ کا سینہ جہاد کے واسطے کھول دیا۔

صحابہ کرامؓ کے مشورہ کے بعد حضرت صدیقؓ نے جواب مذکور الصدر سُنا کر ایلچیوں کو ناکام واپس کر دیا۔ اسی عرصہ میں جیشِ اُسامہؓ مدینہ سے روانہ ہو چکا تھا۔ قاصد واپس گئے تو انھوں نے مسلمانوں کی بے سر و سامانی اور قلت بیان کی۔ ادھر قاصدوں کو

---

[1] سمیرا مکّہ کے راستہ میں ایک منزل

[2] ابرق بنی ذبیان کا وطن

[3] ذوالقصہ مدینہ سے ایک منزل بجانب نجد

[4] دبّا، ایک قدیم مشہور شہر یمن کے قریب۔

رخصت کر کے حضرت ابوبکرؓ نے مدینہ کی حفاظت کا اہتمام کیا۔ شہر کے ناکوں پر حضرت علیؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت عبداللہ بن مسعود کو مقرر کیا۔ عام اہلِ مدینہ کو جمع کر کے حکم سنایا کہ عرب میں ارتداد پھیلا ہوا ہے۔ قاصد تمہاری حالت اپنی آنکھوں سے دیکھ گئے ہیں دشمن کے بعض حصے تم سے صرف ایک منزل کے فاصلے پر ہیں۔ معلوم نہیں تم پر کس وقت حملہ کر دیں اُن کو امید تھی کہ ہم اُن کی درخواست منظور کریں گے مگر وہ رد کر دی گئی لہٰذا تم کو ہر وقت مسلح مسجد نبویؐ میں حاضر رہنا چاہیے۔ اس حکم کے مطابق تمام اہلِ مدینہ مستعد رہتے تھے۔ قاصدوں کی واپسی کے تیسرے دن دشمنوں نے مدینہ پر حملہ کیا۔ ایک حصہ فوج ان کی مدد کے واسطے ذی حسی[1] میں تیار تھا۔ جب دشمن کی جمعیت ناکوں پر پہنچی تو محافظ ہوشیار تھے۔ انہوں نے حملہ روک کر امیرالمومنین کے پاس اطلاع بھیجی۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہلا بھیجا کہ تم اپنی اپنی جگہ پر قائم رہو، میں فوراً موقع پر آتا ہوں۔ چنانچہ اہلِ مدینہ کی جمعیت لے کر موقع پر پہنچے اور دشمنوں پر حملہ کیا۔ مسلمانوں کے حملہ سے کفار کے قدم اکھڑ گئے اور بھاگنا شروع کیا۔ مسلمانوں نے ذی حسی تک تعاقب کیا۔ وہاں کی فوج نے پہلے سے بہت سی مشکوں میں ہوا بھر رکھی تھی۔ جیسے ہی مسلمان شتر سوار پہنچے وہ مشکیں سامنے لڑھکا دیں۔ اونٹ قدرتاً اس سے بہت ڈرتا ہے۔ مسلمانوں کے اونٹ ڈر کر پیچھے کو بھاگے اور مدینہ پہنچ کر دم لیا۔ مرتدوں نے خیال کیا کہ مسلمان بھاگ گئے۔ اس سے ان کی جرأت بڑھی۔ ذی حسی کی پشت پر جو فوج بمقام ذوالقصہ تھی اس کو بھی آگے بلا لیا اور دشمن کی کُل جمعیت ذی حسی میں مدینہ کے قریب جمع ہو گئی۔ حضرت ابوبکرؓ نے اُسی روز دوسرے حملے کا انتظام کیا اور شبا شب کوچ کر کے صبح ہوتے ہوتے مرتدوں کے لشکر پر چھاپہ جا مارا۔ طلوعِ آفتاب کے وقت دشمن کو ہزیمت ہوئی۔ سردار لشکر حبال (جو طلیحہ مدعیِ نبوت کا قوت بازو تھا) مارا گیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے ذوالقصہ تک تعاقب کیا وہاں حضرت نعمان بن مقرن کو مع ایک حصہ فوج کے متعین کیا اور خود مدینہ کو واپس چلے آئے۔

اِس شکست سے کفار کا جوش زیادہ بڑھا اور تمام قبائل نے اپنے اپنے یہاں کے مسلمانوں کو طرح طرح کی اذیتیں دے کر قتل کرنا شروع کیا۔ اعضا کاٹتے تھے، آگ میں زندہ جلاتے تھے۔ اوّل قبیلہ ذبیان وعبس نے یہ سفاکی شروع کی پھر اُن کے قرب وجوار کے تمام قبیلوں میں پھیل گئی۔ جب ان مظالم کی اطلاع حضرت ابوبکرؓ کو ہوئی تو انہوں نے قسم کھا کر فرمایا کہ مسلمانوں کے مصائب کا بدلہ لیا جائے گا۔ ذوالقصہ کی فتح کا مسلمانوں پر یہ اثر ہوا کہ تمام قبائل میں جس قدر مسلمان تھے وہ اسلام پر زیادہ شدت سے قائم ہو گئے اور اُن میں تازہ جوش وعزم پیدا ہوا۔ بعض قبائل نے زکوٰۃ کا روپیہ بھیج دیا۔ غرض مختلف تدابیر سے حضرت صدیق اکبرؓ مدینہ کی حفاظت فرماتے رہے یہاں تک کہ حضرت اُسامہؓ کا لشکر مدینہ واپس آ گیا۔ اُن کو حفاظتِ مدینہ پر مامور کر کے حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ اب تم آرام لو ہم دشمن کے مقابلہ پر جاتے ہیں۔ بقیہ فوج فراہم ہوئی اور اس کے امیر خود خلیفۂ رسول اللہ بنے۔ مسلمانوں نے یہ دیکھ کر کہا کہ آپ خود مہم پر نہ جائیں اگر آپ کو صدمہ پہنچ گیا تو اسلام کا سارا انتظام درہم برہم ہو جائے گا۔ اور کسی کو سردار مقرر کر کے بھیجئے وہ کام آئے تو دوسرا مقرر ہو۔ مگر یہ صلاح پذیرانہ ہوئی۔ اور حضرت ابوبکرؓ لشکر کو ہمراہ لے کر ذوالقصہ ہوتے ہوئے پرگنہ ربذہ[2] کے ابرق نامی مقام

---

[1] ذی حسی ایک مقام ہے۔

[2] ربذہ ایک گاؤں مدینہ سے ۳ میل۔

پہ پہنچے، وہاں دشمن سے مقابلہ ہُوا۔ اہلِ ایمان فتحیاب ہُوئے۔ فرمانِ خلافت کے مطابق ابرق مجاہدین کے گھوڑوں کی چراگاہ بنا دیا گیا۔ لشکرِ اُسامہؓ آرام لے چکا تھا۔ زکوٰۃ کا روپیہ زیادہ مقدار میں وصول ہونے لگا تھا۔ اس لیے حضرت ابوبکرؓ نے تہیہ فرمایا کہ مرتدوں کا استیصال پوری طرح کر دیا جائے۔ بعد فتح نواح ابرق میں قیام کر کے تمام مرتد قبائل کے مقابلہ کا انتظام فرمایا ۔ گیارہ فوجیں مامور کی گئیں کہ مختلف حصصِ ملک میں جا کر دشمنانِ اسلام کا مقابلہ کریں۔ اُس زمانہ میں ملازمت کا سلسلہ نہ تھا۔ مسلمانوں کے تمام کام محض رضائے الٰہی کے واسطے ہوتے تھے۔ فوج کا انتظام بھی رضاکارانہ تھا۔ اجتماع لشکر کا طریقہ یہ تھا کہ ایک شخص امیرِ لشکر مقرر ہو کر مہم پر مامور ہوتا تھا اور اُس کی ہمراہی کے واسطے قبائل نامزد ہو کر احکام جاری کیے جاتے تھے۔ زمانۂ رسالت میں آپ اپنے دستِ مبارک سے اور دورِ خلافت میں خلفاءؓ اپنے ہاتھ سے نشان بنا کر سردار کو دیتے۔ اُس نشان کو لے کر امیر پڑاؤ پر خیمہ زن ہوتا اور میعادِ معیّن کے اندر سپاہ نشان کے نیچے آ کر فراہم ہو جاتی۔ یا یہ ہوتا کہ امیر نشان لے کر نامزد شدہ قبائل کے قریب سے روانہ ہوتا اور ہر قبیلہ کے فوجی جوان اُس کے ساتھ ہوتے جاتے۔ ہتھیار، سواری وغیرہ کی مدد خزانہ سے کی جاتی۔ نیز سپاہی اپنے ہتھیار خود ہمراہ لاتے۔ اُس زمانہ میں عرب کا بچہ بچہ ہتھیار سے آراستہ تھا۔ اسی طرح بمقام ذوالقصہ حضرت ابوبکرؓ نے گیارہ نشان تیار کر کے امراءِ لشکر کو دئے۔ اور ان کی مدد کے واسطے قبائل مقرر فرمائے۔ ہر سردار کو اس کی مہم اور طرزِ عمل کی بابت پوری ہدایتیں دی گئی تھیں، یعنی وہ کس دشمن کا مقابلہ کرے، اُس سے فارغ ہو کر کس طرف بڑھے، کون سا لشکر کس کی مدد کرے۔ علیٰ ہٰذا القیاس حضرت خالد طلیحہ کے مقابلہ پر مامور ہُوئے۔ حضرت عکرمہ مسیلمہ کے مقابل، اسود عنسی کی مہم پر مہاجرین آلِ زبیر وغیرہ وغیرہ۔ خاص ہدایات کے علاوہ بعض عام احکام تھے جو کل امراء کے واسطے دستورالعمل تھے۔ ہر فوج کے ساتھ ایک فرمانِ خلافت تھا جس میں مخالفین سے خطاب کیا گیا تھا اور ان کو مخالفت سے باز آنے اور مسائلِ اسلام کی جانب رجوع کرنے کی ہدایت و ترغیب تھی۔ اُس میں یہ بھی درج تھا کہ فلاں سردار مہاجرین و انصار و تابعین کا لشکر لے کر تمہارے مقابلہ پر آتا ہے اُس کو یہ حکم ہے کہ اوّل کسی سے وہ قتال و جنگ نہ کرے بلکہ دعوتِ اسلام دے جو قبول کرے اُس کو امن بخشی جائے جو عناد پر قایم رہیں ان سے لڑے، اور پوری شدّت کے ساتھ لڑے۔ اس فرمان کی بابت حکم تھا کہ لشکر کے آگے آگے قاصد لے کر جائیں اور لشکر پہنچنے سے پہلے مجمع عام میں پڑھ کر سنائیں۔ ذریعۂ اجتماع اذان ہو۔ جو لوگ اذان سُن کر فراہم ہو جائیں ان کو احکامِ خلافت سنائے جائیں۔ جو جمع نہ ہوں ان سے مقابلہ کیا جائے۔ علاوہ فرمانِ بالا کے ایک اور مراسلہ ہر لشکر کے ساتھ تھا جس میں سردارِ لشکر کے واسطے احکام تھے۔ تمام مہمات کا بیان باعثِ طول ہوگا۔ اس لیے صرف دو مہموں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ ایک میں نمونہ آشتی ہے، دوسرے میں نمونۂ رزم۔

مہم قبیلۂ طےؔ[1] (نمونہ آشتی) حضرت خالد بن ولید کا تقرر طلیحہ مدّعی نبوّت کے مقابلہ پر ہوا تھا۔ مدعی مذکور کے ساتھ عوام قبیلہ طے کا بڑا مجمع تھا۔ اس لیے حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عدی

---

[1] مشہور حاتم طائی کا قبیلہ

بن حاتم کو اوّل روانہ کیا کہ اپنے قبیلہ کو فہمائش کر کے تباہی سے بچائیں۔ آگے آگے حضرت عدی اور ان کے پیچھے لشکرِ اسلام روانہ ہوا حضرت عدی نے منزلِ مقصود پر پہنچ کر اپنے قبیلہ کو جمع کیا اور فہمائش کی۔ لیکن بے سُود۔ دوبارہ پھر سمجھایا۔ اس مرتبہ نصیحت کارگر ہوئی۔ وعدۂ اطاعت کے ساتھ انھوں نے یہ درخواست کی کہ ہم کو اتنی مہلت دی جائے کہ اپنے اہل و عیال کو طلیحہ کے لشکر سے نکال لائیں ورنہ ہماری اطاعت کی اُن پر مصیبت پڑے گی۔ ہماری واپسی تک خالد کا لشکر روک دیا جائے۔ حضرت عدی نے یہ پیام حضرت، خالد کو پہنچایا۔ تین روز کی مہلت منظور ہوئی۔ اس عرصہ میں قبیلۂ طے کے آدمی اپنے اہل و عیال کو لشکر طلیحہ سے ترکیب کے ساتھ لے آئے اور تجدیدِ اسلام کے بعد حضرت خالد کے پاس حاضر ہو گئے۔ اسی طرح یہ مہم حُسن و خوبی کے ساتھ بغیر خُونریزی کے طے ہو گئی۔ مہم طے کے ختم ہونے کے بعد حضرت خالد نے قبیلہ جدیلہ کی طرف رُخ کیا۔ حضرت عدی نے کہا کہ قبیلہ طے مثل ایک، پرندہ کے ہے جس کا ایک بازو جدیلہ ہے۔ مجھ کو اجازت دو کہ اُن کو جا کر فہمائش کروں۔ اجازت ملی اور حضرت عدی نے کوششِ بلیغ کے ساتھ سمجھایا۔ نتیجہ حسبِ مراد نکلا۔ جب حضرت خالد اس مہم سے فارغ ہو کر آگے بڑھے تو قبیلۂ طے کے ایک ہزار سواران کے، ہم رکاب نصرتِ اسلام کے لیے کمربستہ تھے۔

مورخین نے عدی کی مساعی کی تحسین ان الفاظ میں کی ہے :

وکان خیر مولود ولد فی ارض طے و اعظم برکۃ علیہم۔	وہ قبیلہ طے کے بہترین فرزند تھے جن کی وجہ سے برکت عظیم نازل ہوئی۔

طُلَیحہ نے حضرت خالد کے مقابلہ پر شکست کھائی اور شام کو بھاگ گیا۔ وہاں پہنچ کر دوبارہ اسلام لایا۔ ایک مرتبہ خلافتِ صدیقی کے زمانہ میں طلیحہ ادائے عمرہ کو مکہ جاتا تھا۔ جب مدینہ کے کنارے پر پہنچا تو کسی نے جھپٹ کر حضرت ابوبکرؓ کو اطلاع کی، طلیحہ جا رہا ہے۔ سُن کر فرمایا اب وہ داخلِ اسلام ہو چکا۔ اُس سے کچھ تعرض نہیں کیا جا سکتا۔ جانے دو۔ خلافت فاروقی میں، طلیحہ نے مدینہ آکر بیعت کی۔

مُسَیلمہ کذّاب (معرکۂ رزم) اگرچہ مرتدین کے تمام معرکے نہایت سخت اور حوصلہ فرسا تھے مگر مسیلمہ کذاب کا معرکہ شدت و قوت میں سب سے بڑھ کر تھا۔ مسیلمہ کا قبیلہ بنو حنیفہ تھا اور وطن یمامہ، واقع ملکِ نجد اُس کا یہ دعویٰ تھا کہ مجھ کو رسول اللہ نے شریکِ رسالت کر لیا ہے۔ اس دعوے کی تائید کے لیے نہار نامی ایک شخص اُس کے ہاتھ آ گیا۔ نہار نے مدینہ میں شرفِ حضوری سے مشرف ہو کر قرآن و مسائلِ دین کی تعلیم حاصل کی تھی۔ جب مسائل ضروری حاصل کر چکا تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مامور فرمایا کہ یمن جا کر تائیدِ اسلام اور مُسیلمہ کی تردید کی خدمت انجام دے۔ بدبخت یمن پہنچ کر مسیلمہ سے مل گیا اور بالاعلان شہادت دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے خود سنا ہے کہ مُسیلمہ شریکِ نبوت ہے۔ اس سے ہزاروں آدمی گمراہ ہو گئے۔ اذان میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اعلان، کیا جاتا تھا۔ جب مسیلمہ تکبیر کے وقت شریکِ نماز ہوتا تو مؤذن سے کہتا: "اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ خوب زور سے کہو۔" مسجع مہمل عبارتیں لوگوں کو سناتا اور کہتا: یہ وحی ہے۔ شراب و زنا کی حلّت کا اعلان کر دیا تھا۔ ایسے اسباب سے مُسیلمہ کا

زور روز بروز ترقی کرتا رہا۔ جب مدعیہ نبوت سجاح سے مسیلمہ نے نکاح کر لیا تو اس کے لشکر سے مسیلمہ کو مزید شوکت حاصل ہوئی۔ بارگاہِ خلافت سے دو لشکر مسیلمہ کے مقابلہ پر نامزد ہوئے تھے، ایک حضرت عکرمہ کی زیر امارت، دُوسرا حضرت شرحبیل بن حسنہ کی ماتحتی میں۔ ان دونوں لشکروں نے یکے بعد دیگرے شکستیں کھائیں۔ جب حضرت ابوبکرؓ کو ان ہزیمتوں کی اطلاع پہنچی تو دونوں شکست خوردہ امیروں کو دوسری مہموں پر مقرر کیا اور مسیلمہ کے مقابلہ کا حضرت خالدؓ کو (جو مہم طلیحہ سے کامیابی کے ساتھ فارغ ہو چکے تھے) حکم دیا۔ اُن کی کمک کے واسطے تازہ دم جمعیت روانہ کی۔ اس جمعیت میں انصار کے سردار حضرت ثابت بن قیس اور مہاجرین کے امیر حضرت زید بن خطاب (فاروق اعظمؓ کے بھائی) بھی تھے۔ جب حضرت خالد یمامہ پہنچے ہیں تو مسیلمہ کے لشکر کی تعداد چالیس ہزار تک ترقی کر چکی تھی۔ مسیلمہ نے حضرت خالد کی آمد کی خبر سنی تو آگے بڑھ کر عقرباء نامی مقام پر پڑاؤ کیا۔ اسی میدان میں حق و باطل کا مقابلہ ہوا۔ جب دونوں جانب صفوفِ جنگ آراستہ ہو لیں تو سب سے اوّل نہار میدان میں آ کر مبارز طلب ہوا۔ حضرت زید بن خطاب اس کے مقابلہ پر گئے۔ بعد مقابلہ نہار مارا گیا۔ اس کے بعد عام لڑائی شروع ہوئی۔ رن اس زور کا پڑا کہ مسلمانوں کے قدم اُکھڑ گئے اور جمعیت پریشان ہو گئی۔ مسیلمہ کے لشکر نے تعاقب کیا اور دباتا ہوا خود حضرت خالد کے خیمہ تک پہنچ گیا۔ حضرت خالد کو بھی پیچھے ہٹنا پڑا۔ اُمِ تمیم حضرت خالد کی بی بی خیمہ کے اندر تھیں کفار نے ان کو قتل کرنا چاہا۔ مجاعہؓ نے روکا اور کہا:

نعمة الحرة ھٰذہ۔ یہ بہت اچھی آزاد بی بی ہیں۔

عورتوں کو کیا مارتے ہو مردوں کا مقابلہ کرو۔ یہ سُن کر مسیلمہ کے سپاہی خیمہ کی طنابیں کاٹ کر ہٹ گئے۔ اس نازک اور حوصلہ فرسا موقع پر مسلمان امرائِ لشکر نے اپنی شکست خوردہ فوج کی جمعیت قائم کرنے کی کوشش جس قوتِ ایمانی کے ساتھ کی وہ قیامت تک صفحاتِ تاریخ پر یادگار رہے گی۔ انہوں نے یکے بعد دیگرے جانیں مردانہ وار اسلام پر قربان کر کے فوج کو غیرت دلائی اور آخر کار کامیاب ہوئے۔ حضرت قیس بن ثابت نے مفرورین کو مخاطب کر کے کہا:

بئسما عودتم انفسکم یا معشر المسلمین	اے گروہ اہلِ اسلام! تم نے اپنے نفوس کو بُری عادت
اللّٰھم انی ابراالیك مما یعبد ھٰؤ لاءِ	سکھائی۔ اے اللہ! میں تیرے سامنے اُن کے (یعنی
(یعنی اھل الیمامہ) وابراء الیك مما	اہلِ یمامہ کے) معبود سے اور اُن کی (یعنی مسلمانوں
یصنع ھٰؤلآء (یعنی المسلمین) ھٰکذا	کی) اُس حرکت سے جو اس وقت کر رہے ہیں اظہارِ
عنی حتّٰی اریکم الجلاء۔	نفرت کرتا ہوں۔ مسلمانو! دیکھو حملہ یُوں کیا کرتے ہیں۔

لہ مورخ طبری نے اس لڑائی کی بابت لکھا ہے:

لم یلق المسلمون حرباً مثلھا قط۔ مسلمانوں کو اس سے زیادہ سخت معرکہ کبھی پیش نہیں آیا۔

سے مجاعہ کفار کا سردار حضرت خالد کی قید میں تھا اس کی آسائش کی نگرانی ام تمیم کے سپرد تھی۔ حُسنِ سلوک کا اثر تھا جو مجاعہ نے کہا۔

یہ کہہ کر حملہ کیا۔ ایک دشمن کی ضرب سے ان کا پاؤں کٹ گیا۔ وہی کٹا ہوا پاؤں لے کر اس زور سے مارا کہ اپنے حریف کا کام تمام کر دیا اور خود بھی شہید ہو گئے۔ مسلمان ہٹتے ہٹتے جب اپنے خیموں سے بھی پیچھے ہٹ گئے تو حضرت زید بن خطاب نے یہ کہہ کر ان کو روکا:

لا تحوز بعد الرحال و اللہ لا انکلم الیوم حتی انھزمھم او القی اللہ فاکلمہ الحجتی عضوا ابصارکم و عضوا علی اضراسکم واضربوا فی عدوکم وامضوا قدماً۔ یامعشر المسلمین انتم حزب اللہ وھم احزب الشیطان والعزۃ للہ ولرسولہ ولاحزابہ۔ اروئی کما اریکم فاصنعوا کما اصنع۔	خیموں سے ہٹ کر کہاں جاؤ گے واللہ آج میں اس وقت تک کلام نہیں کروں گا یا دشمن کو شکست دوں یا خدا کے سامنے پہنچ کر اپنی معذرت پیش کروں اے لوگو! مصائب برداشت کرو، ڈھالیں تھام لو اور دشمن پر جا پڑو اور قدم بڑھاؤ۔ اور اے گروہِ اہل اسلام! تم خدا کی جمعیت ہو۔ تمہارے دشمن شیطانی لشکر، غلبہ خدا، اس کے رسول اور اس کے انصار کے واسطے ہے۔ میری مثال کی پیروی کرو جو میں کرتا ہوں وہی تم بھی کرو۔

یہ کہہ کر شمشیر بکف کفار پر حملہ کیا اور شہادت سے سُرخرو ہوئے۔ حضرت ابُو حذیفہ نے للکار کر کہا:

یا اھل القرآن زینوا القرآن با لفعال۔	اے قرآن والو! قرآن کی زینت عمل سے بڑھاؤ۔

یہ کہہ کر دشمن پر ہلّہ کیا اور شہید ہوئے۔ حضرت زید بن خطاب کے بعد حضرت براؑ بن مالک (حضرت انسؓ خادم رسولؐ اللہ کے بھائی) آگے بڑھے اُن کی عادت عجیب تھی۔ جب میدان جنگ کا عزم کرتے بدن پر لرزہ طاری ہوتا۔ آدمی اُن کو دبا لیتے۔ جب یہ حالت گزر لیتی تو میدانِ جنگ میں آکر شیر کی طرح بپھرتے۔ اُس روز بھی یہی ہُوا، مسلمانوں کی شکست دیکھ کر اُن کو جوش آیا اور لرزہ سے فارغ ہو کر میدان میں پہنچ کر للکارے:

این یا معشر المسلمین البراء بن مالک ھلمّ الیّ۔	اے گروہِ مسلمین! کدھر کا ارادہ کیا، میں براءؓ بن مالک ہوں میری طرف آؤ۔

ان ترغیبوں اور شہادتوں کا یہ اثر ہُوا کہ مسلمانوں کے ایک گروہ نے میدان کی طرف پلٹ کر تازہ جوش کے ساتھ پھر حملہ کیا۔ اس حملہ سے دشمن کے قدم ڈگمگا گئے۔ اور اُس مقام تک ہٹ گیا جہاں مسیلمہ کا مشہور سردار محکم بن الطفیل اپنی قوم کو لیے کھڑا تھا۔ اس نے للکار کر اپنے لشکر کو غیرت دلائی اور مسلمانوں پر حملہ کیا عین اسی حالت میں حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر کی شست سے تیرِ قضا چھوٹا جس نے محکم کی گردن میں لگ کر کام تمام کر دیا۔ اس سے مسلمانوں کی ہمّت اور زیادہ بڑھی اور زور سے ہلّہ کیا اور اعدا کو حدیقہ تک ہٹا لے گئے۔ یہ مقام چار دیواری سے محصور تھا اور اس کے وسط میں مسیلمہ قلبِ لشکر میں قدم جمائے کھڑا تھا دشمنوں نے حدیقہ میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔ حضرت براءؓ بن مالک نے کہا کہ مجھ کو اٹھا کر اندر پھینک دو۔ مگر کسی نے اس کی جرأت نہ کی۔ آخر انہوں نے قسم دلائی۔ مجبور ہو کر لوگوں نے اُن کو اٹھا کر دیوار پر پہنچا دیا۔ وہ نیچے کود پڑے اور جانبازی کر کے دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھل جانے پر مسلمانوں نے ان پر حملہ کیا مگر مسیلمہ نے جگہ سے جنبش نہیں کی۔ یہ دیکھ کر حضرت خالد نے اپنے لشکر کو

دوسری ترتیب سے قایم کیا اور حکم دیا کہ ہر قبیلہ الگ الگ ہو کر اپنے اپنے نشان کے نیچے لڑے تاکہ ہم دیکھیں کہ ہماری کمزوری کس گروہ کی وجہ سے ہے۔ اِس حکم پر ہر قبیلہ سمٹ کر اپنے نشان کے نیچے آگیا اور نہایت بے جگری کے ساتھ دوبارہ حملے شروع ہوئے۔ اب لڑائی اس قدر شدید ہوئی کہ پہلے معرکے گرد ہو گئے۔ سب سے زیادہ نقصان گروہِ مہاجرین و انصار کو پہنچا۔ ان حملوں پر بھی مسیلمہ ثابت قدم رہا۔ وہ وسطِ لشکر میں مرکزِ کارزار بنا ہوا تھا۔ حضرت خالد نے اس حالت کو جانچا اور فیصلہ کیا کہ جب تک مسیلمہ کا خاتمہ نہ ہوگا لڑائی ختم نہ ہوگی۔ یہ خیال کر کے خود صف سے نکلے اور حریف مقابل طلب کیا۔ اُس شمشیر برہنہ کے سامنے جو آیا اُڑ گیا۔ آخر صفوں کو چیرتے اور مقابلہ کرنے والوں کو کاٹتے ہوئے مسیلمہ تک جا پہنچے اور اس سے گفتگو کر کے حملہ کیا۔ حضرت خالد کے حملہ سے مسیلمہ کے قدم ڈگمگاتے اور اس کے لشکر میں فی الجملہ تزلزل پیدا ہوا۔ یہ دیکھ کر سپاہ اسلام نے للکار کر کہا: مسلمانو! ثابت قدم رہو، ایک مردانہ حملہ اور دشمن کو مار لیا۔ اس للکار پر جو حملہ حق پرستوں نے کیا وہ اتنا زبردست تھا کہ مسیلمہ کا لشکر تاب نہ لا سکا، قدم اُکھڑ گئے اور میدان سے بھاگنے لگا۔

جب اہلِ ارتداد کو ہزیمت ہوئی تو لوگوں نے مسیلمہ سے کہا کہ آخر آسمانی مدد کے وعدوں کا کیا حشر ہوا۔ اس نے جواب دیا کہ اپنا ننگ و ناموس بچانا ہے تو بچا لو۔[1] اسی حالت میں وحشی قاتلِ حضرت حمزہؓ نے اپنا حربہ پھینک کر مسیلمہ کے مارا جس کے صدمہ سے وہ گرا۔ گرا تو ایک انصاری نوجوان نے سر کاٹ لیا۔ دشمن کی فوج میں ایک شور پڑ گیا کہ مسیلمہ کو ایک حبشی[2] نے مار ڈالا۔ یہ سُن کر اہلِ باطل کے رہے سہے حواس بھی جاتے رہے اور بے تحاشا بھاگے۔ لشکرِ اسلام مظفر و منصور رہا۔ مورخ طبری نے لکھا ہے کہ حدیقہ کے قرب وجوار میں دس ہزار مرتد مارے گئے۔ اس لیے اس کا نام "حدیقۃ الموت" مشہور ہے۔ مسیلمہ کے قتل کی خبر سن کر حضرت خالد اس مقام پر آئے جہاں وہ مارا گیا تھا اور لاش تلاش کی۔ مجاعہ پابجولاں ساتھ تھا اس نے پہچان کر بتائی۔ کوتہ قد، زرد رُو، لانبی ناک کا آدمی تھا۔ اِس معرکہ میں مدینہ کے مہاجرین و انصار تین سو اور بیرونِ مدینہ کے تین سو شہید ہوئے، باقی مسلمان ان کے علاوہ۔ بعد فتح حضرت خالد نے مدینہ کو مژدۂ فتح بھیجا۔ قاصد کے ساتھ بنی حنیفہ کا وفد بھی تھا۔ جب یہ وفد مدینہ پہنچا تو حضرت ابوبکرؓ نے ان سے کہا:

افسوس! تمہارے حال پر، تم کس وبال میں مبتلا ہو گئے۔

شرمندگی سے جواب دیا:

آپ نے جو کچھ سنا سب سچ ہے۔

پوچھا:

آخر اس کی تعلیم کیا تھی؟

---

[1] مسیلمہ کے باطل پرست ہونے کی یہ بیّن دلیل ہے کہ وہ ہمیشہ ننگ و ناموس کی غیرت دلا کر فوج کو لڑاتا تھا اگر حق پرست ہوتا تو حق کا واسطہ دیتا۔

[2] وحشی کا وطن حبش تھا۔

کہا : اس کی وحی کا نمونہ یہ ہے :

یا ضفدع نقی نقی لا الشارب تمنعین و لا الماءُ تکدرین۔ لنا نصف الارض و لقریش نصفٌ۔ ولکن قریشاً قوم یعتدون۔	اے مینڈک ! تو پاک ہے نہ پانی پینے والوں کو روکتا ہے نہ پانی کو گدلا کرتا ہے، آدھا ملک ہمارا اور آدھا قریش کا، لیکن قریش تو ظالم قوم ہے۔

حضرت ابوبکرؓ نے یہ کلام بلاغت نظام سن کر کہا :

سبحان اللّٰہ و یحکم أھٰذا الکلام ماخرج من اِلٍ و لا برٍ فاین یذھب بکم	سبحان اللہ ! تمہارے حال پر افسوس، یہ بھی کلام الٰہی ہے یہ کلام تو شانِ ربانی نہیں رکھتا، تم کو کہاں کھینچ لےگیا۔

خلاصہ یہ کہ مسلمانوں نے اسی طرح ہر موقع پر جاں بازی کے جوہر دکھائے۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ باستثناءِ بعض خفیف مہموں کے اہلِ ردّہ کے تمام معرکے ۱۱ھ میں ختم ہو گئے اور ۹ مہینہ کے قلیل عرصہ میں وہ سیلاب فرو ہو گیا جو نواح مدینہ سے لے کر بحرین و عمان تک پھیلا ہوا تھا۔ فجزی اللّٰہ ابابکر و جنودہ عن المسلمین خیر الجزاء۔

مہمِ عراق طوفانِ ارتداد کے فرو ہو جانے کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے فوراً اپنی توجہ ان دو زبردست دشمنوں کی جانب مائل کی جو مسلمانوں کو گھیرے ہوئے اسلام کی تباہی کی فکر میں تھے۔ یعنی روم و فارس۔ خلیفۂ رسولؐ اللہ کو کس قدر اہتمام ان مہموں کا تھا۔ واقعۂ ذیل سے معلوم ہوتا ہے۔ اس زمانہ میں جبکہ حضرت صدیقؓ مذکورۂ بالا مہموں کے انتظام میں مصروف تھے۔ ایک صحابی نے اپنے قبیلہ کا کوئی معاملہ پیش کرنا چاہا۔ غصہ ہو کر جواب دیا کہ میں تو ان دو شیروں کے زیر کرنے کی فکر میں ہوں جو مسلمانوں کی تاک میں ہیں اور تم میری توجہ معمولی کاموں کی جانب مائل کرتے ہو۔ ۶ھ کے آغاز میں حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلّم نے دعوتِ اسلام کے مراسلے سلاطینِ عالم کے نام جاری فرمائے تو ایک مراسلہ خسرو پرویز پادشاہِ ایران کے پاس بھی روانہ فرمایا۔ قاصد حضرت عبداللہ بن حذافہ تھے۔ نامہ شریف حسب ذیل تھا :

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم	شروع خدا کے نام سے جو بڑا مہربان بخشنے والا ہے۔
من محمد رسول اللّٰہ الٰی کسریٰ عظیم فارس سلامٌ علیٰ من اتبع الھدٰی و اٰمن باللّٰہ و رسولہ واشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہٗ لا شریک لہ وان محمداً عبدہٗ ورسولہ وادعوک بدعاءِ اللّٰہ فانی رسول اللّٰہ الی الناس کافۃ لانذر من کان حیًّا و یحق القول علی الکافرین فاسلم تسلم	محمد رسول اللہ کی طرف سے کسریٰ بادشاہ فارس کے نام اس کو سلام جو سیدھی راہ پر چلے اور خدا اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور میں اس امر کی گواہی دیتا ہوں کہ کوئی معبود سوا خدا کے نہیں ہے، وہ یگانہ ہے، کوئی اس کا شریک نہیں اور محمد اس کا عبد و رسول ہے اور میں تجھ کو خدا کا فرمان پہنچاتا ہوں اس لیے کہ میں تمام انسانوں کے پاس اُس کا ایلچی ہو کر آیا ہوں، میری رسالت کا مقصود یہ ہے کہ جن کے دل زندہ ہیں اُن کو

فان ابیت فان اثم المجوس علیک۔	خدا سے ڈراؤں اور جو انکار پر قائم رہیں اُن پر حُجّتِ الٰہی تمام ہو تو اسلام لے آ، سلامت رہے گا۔ اگر انکار کرے گا مجوس کا گناہ تیری گردن پر رہے گا۔

خسرو نے فرمانِ مبارک پڑھ کر پارہ پارہ کر دیا اور باذان صوبہ دار یمن کو لکھا کہ دو تیز رو آدمی بھیجو تاکہ حجاز میں جو شخص ہے اس کو پکڑ کر یہاں لے آئیں۔ باذان نے اپنے قہرمان بابویہ کو (جو اُس کا منشی اور فارسی خط کتابت میں ماہر تھا) اور خرخرہ نامی ایرانی کو مدینہ بھیجا اور ایک تحریر آپ کے نام اس مضمون کی بھیجی کہ ان دو آدمیوں کے ساتھ خسرو کے پاس چلے آؤ۔ قاصد براہ طائف مدینہ پہنچے۔ عرب میں اس سفارت کی بڑی شہرت ہوئی۔ اور قریش اس خیال سے بہت خوش ہوئے کہ اب شہنشاہِ ایران کی بدولت مسلمانوں کو مصیبت سے نجات مل جائے گی۔ خدمت مبارک میں حاضر ہو کر بابویہ نے سلسلۂ کلام یوں شروع کیا۔

شاہنشاہ ملک الملوک کسریٰ کا شاہِ یمن کو یہ حکم ہے کہ تم کو اس کے پاس بھیج دے۔ میں بادشاہِ یمن کا فرستادہ ہوں۔ اگر تم میرے ساتھ چلو گے تو شاہِ یمن تمہاری سفارش شاہنشاہ کے دربار میں کرے گا، جس سے تم کو نفع پہنچے گا۔ اگر چلنے سے انکار کرو گے تو تم شاہِ یمن کو جانتے ہو وہ تم کو اور تمہارے ملک کو برباد کر دے گا۔

اِن قاصدوں کی داڑھی مُنڈی ہوئی تھی، مُونچھیں بڑی بڑی تھیں، حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے چہرے کی طرف بہ نگاہِ نفرت دیکھا اور فرمایا:

افسوس تم پر، تم نے یہ صورت کس کے حکم سے بنائی ہے؟

جواب دیا کہ اپنے پروردگار کسریٰ کے حکم سے۔

آپؐ نے فرمایا: مگر میرے پروردگار کا مجھ کو یہ حکم ہے کہ داڑھی بڑھاؤں اور مونچھیں تراشوں۔ اچھا اب ٹھہرو، کل میرے پاس آنا۔

دوسرے روز طلب کر کے فرمایا:

تمہارے کسریٰ کو اس کے بیٹے شیرویہ نے فلاں شب قتل کر دیا، جاؤ اور اپنے آقا کو خبر دو اور کہہ دو کہ میرا دین اور میری حکومت عنقریب ملک کسریٰ میں پہنچتی ہے اور دنیا کے کناروں پر جا کر ٹھہرے گی۔ یہ بھی کہہ دینا کہ اگر تم اسلام لے آؤ گے تو تمہارا ملک تمہارا تخت چھوڑ دیا جائے گا اور اپنی قوم پر حاکم رہو گے۔

یہ فرما کر خرخرہ کو ایک طلائی پیٹی (جو کسی بادشاہ نے بطور تحفہ آپ کی خدمت میں بھیجی تھی) عطا فرمائی اور رخصت کر دیا۔

باذان نے جب کلامِ مبارک سُنا تو کہا:

خدا کی قسم یہ بادشاہوں کا سا کلام نہیں ہے اس کا قائل نبی معلوم ہوتا ہے۔

چند روز کے بعد خسرو کے قتل اور شیرویہ کی تخت نشینی کی خبر باضابطہ یمن میں آگئی۔ شیرویہ نے یہ بھی لکھا کہ نبی عربی سے کچھ مزاحمت نہ کی جائے۔ آخر عہدِ نبوت میں باذان نے اسلام قبول کر لیا، اور جو ایرانی یمن میں تھے وہ بھی مسلمان ہو گئے۔ خسرو پرویز

کے قتل کے بعد ایران میں خانہ جنگی و بدنظمی کا دَور دَورہ رہا۔ چند ہی سال کے عرصہ میں بارہ تیرہ بادشاہ تخت نشین ہوئے۔ جن میں بعض عورتیں بھی تھیں۔ اس تغیر و تبدّل سے بدامنی و فساد کا دائرہ وسیع ہوگیا تھا۔ خلافتِ صدیقی میں ایران کی طرف سے حاکم عراق ہرمز تھا۔ جس کو عربوں سے سخت عداوت تھی اور ہمیشہ بر سرِ پرخاش رہتا۔ اہلِ عرب بھی اُس سے نفرت کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اس کی سختی اور شرارت ضرب المثل ہوگئی تھی :

اکفر من هرمز و اخبث من هرمز۔

اہلِ ایران کے مظالم سے مسلمانوں کو محفوظ رکھنے کی فکر حضرت ابوبکرؓ کو ابتدا سے تھی لیکن کچھ روز ارتداد کے انسداد کی وجہ سے مہلت نہ ملی۔ اسی عرصہ میں حضرت مثنیٰ عراق سے مدینہ آئے اور حضرت صدیقؓ سے کہا کہ اگر آپ مجھ کو میرے قبیلے کی امارت پر مقرر کردیں تو میں مسلمانوں کو اُن اہلِ ایران کے شر سے محفوظ رکھ سکتا ہُوں جو میری سرحد پر ہیں۔ یہ درخواست منظور ہوئی اور حضرت مثنیٰ نے عراق واپس جاکر ایرانیوں سے آویزش شروع کی۔ اس طرح ایک حد تک اُدھر کی بے اعتدالیوں کا سدِّباب ہوگیا۔ آخر کار اہلِ ارتداد کی طرف سے اطمینان حاصل ہوا۔ یمامہ کی مہم سر ہوئی۔ مسیلمہ کام آیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت خالد کو طلب کرکے دس ہزار فوج کے ساتھ اہلِ فارس کے مقابلہ پر مقرر کیا۔ علاوہ اس لشکر کے آٹھ ہزار سپاہ حضرت مثنیٰ وغیرہ اُن چار سرداروں کے پاس اور تھی جو پہلے سے مامور تھے۔ اس طرح جملہ اٹھارہ ہزار فوج مہم عراق پر متعین ہوئی۔ حضرت خالد کو یہ ہدایت تھی کہ عراق کے نشیبی حصہ سے بڑھ کر اوّل اُبلّہ پر حملہ کریں۔ یہ مقام اس موقع کے متصل تھا جہاں اب بصرہ آباد ہے اُس زمانے میں ہندوستان کا وہی بندر تھا اور اُس کے ذریعہ سے ہرمز سمندر میں ہندوؤں کے ساتھ لڑتا رہتا تھا۔ دُوسرے لشکر کو حکم تھا کہ عراق کے بالائی حصہ سے حملہ آور ہو۔ اور دونوں لشکر فتح کرتے ہوئے حیرہ[1] پر آکر مل جائیں اور شہر مذکور پر متفقہ حملہ کریں۔ جو سردارِ لشکر وہاں اوّل پہنچے وہی تمام فوج کا امیر ہوگا۔ جب حیرہ فتح ہوجائے تو ایک حصۂ لشکر وہاں قیام کرکے عقب کی حفاظت کرے۔ دوسرا حصہ خدا اور مسلمانوں کے دشمن اہلِ فارس کے دارالسلطنت مدائن پر بڑھے۔ حضرت خالد کو یہ بھی ہدایت تھی کہ زراعت پیشہ رعایا کو پریشان نہ ہونے دیں۔ امن کے ساتھ بدستور اراضی پر قابض رکھیں اور کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچائیں مقابلہ صرف ان لوگوں سے کیا جائے جو میدان میں آکر لڑیں۔ اس ہدایت کا تمام مہماتِ عراق میں پورا لحاظ رکھا گیا۔

حضرت خالد کی مہم محرم ۱۲ھ میں روانہ ہوئی۔ حسبِ ہدایت اوّل اُبلّہ کی جانب رُخ کیا۔ یہ بندر ایران کی تمام بندرگاہوں سے زیادہ پُرشوکت اور مستحکم تھا۔ ہرمز سلطنت فارس کے اوّل درجہ کے اُمرا میں تھا۔ جس کی علامت یہ تھی کہ لاکھ روپے کی قیمت کا تاج پہنتا تھا۔ لڑائی سے پہلے حسب ذیل خط ہُرمز کے نام بھیجا گیا۔

اما بعد اسلم تسلم او اعتقد	بعد حمد و ثنا اسلام لے آؤ سلامت رہو، ورنہ اپنی
لنفسك وقومك الذمه واقرر	طرف سے اور اپنی قوم کی طرف سے جزیہ کا اقرار

---

[1] حیرہ کوفے سے تین منزل تھا۔ خورنق عمارت مشہور اسی شہر میں تھی۔

بالجزیة والا فلا تلومنّ الا نفسك فقد جئتك بقوم یحبّون الموت كما تحبّون الحیٰوة۔

کر کے مسلمانوں کی پناہ میں آجاؤ۔ یہ بھی نہیں تو پھر تمہارا ہی قصور ہے۔ میں وہ آدمی لے کر آیا ہوں جن کو موت ایسی پیاری ہے جیسی تم کو زندگی۔

ہُرمز نے یہ خط پڑھ کر کسریٰ اور ولی عہد کو اطلاع کی اور فراہمیِ لشکر کا اہتمام شروع کیا چند ہی روز میں نہایت سُرعت کے ساتھ "اڑان کھٹو" (سرعان اصحابہ) لے کر حضرت خالد کے مقابلہ پر روانہ ہوا۔ اوّل کو آظم پہنچا، معلوم ہوا کہ مسلمان حفیر میں ہیں۔ وہاں پہنچا تو سپہ سالارِ اسلام نے لشکر کاظمہ میں لاڈالا۔ ہرمز کو کاظمہ آنا پڑا۔ اس تگ و دو میں ایرانی لشکر خوب خستہ ہوگیا۔ کاظمہ کے پڑاؤ پر آتش پرست فوج پانی کے کنارے مقیم ہُوئی۔ مجوسیوں نے بھاگنے کے خوف سے اپنے آپ کو زنجیروں سے جکڑ لیا تھا۔ حضرت خالد ہرمز کی آمد کی خبر سُن کر مقابلہ پر آئے۔ لشکرِ اسلام کے اُترنے کے واسطے وُہ جگہ باقی تھی جہاں پانی نہ تھا۔ مسلمانوں کو تامل ہُوا تو حضرت خالد نے منادی کرا دی کہ یہیں اُترو اور لڑ کر پانی پر قبضہ کر لو۔

فلعمری لیصیرن الماء لا صبر الفریقین و اکرم الجلدین۔

میری جان کی قسم پانی اس کا ہے جو دونوں حریفوں میں زیادہ ثابت قدم اور جوان مرد ثابت ہو۔

یہ سُن کر مسلمانوں نے وہیں پر سامان اتار دیا۔ اُدھر سامان اتارا تھا کہ ادھر حضرت خالد نے ہلّہ کا حکم دیا۔ میدانِ کارزار گرم ہونے پر ہرمز نے دھوکے سے چند آدمی کمیں گاہ میں چھپا کر حضرت خالد کو اپنے مقابلہ پر طلب کیا۔ یہ جیسے پہنچے ویسے ہی آدمیوں نے نکل کر وار کیا۔ حضرت خالد نے ان کا وار خالی جانے دیا اور دلیرانہ ہرمز پر حملہ کر کے کام تمام کر دیا۔ ہرمز کے قتل کے بعد معرکۂ جنگ میں اور زیادہ شدّت ہوئی۔ بہت سے کُشت و خون کے بعد ایران کے لشکر نے ہزیمت پائی، مسلمان مظفر و منصور ہوئے۔ رات تک مفرورین کا تعاقب ہوتا رہا۔ زنجیریں میدان میں سے فراہم کی گئیں تو ایک شتر بار (تخمیناً ۱/۲ من) نکلیں۔ اسی وجہ سے اس معرکہ کا نام "ذات السلاسل" ہے۔ مدینہ مژدۂ فتح پہنچا تو حضرت ابوبکرؓ نے ہرمز کا تاج حضرت خالد کو عطا فرما دیا۔ اسلام کا مسئلہ ہے کہ خاص خاص معرکہائے جنگ میں جو مسلمان اپنے حریف کو قتل کرے اُس کے بدن کا سامان وہی لے لے۔ مالِ غنیمت کے ساتھ ایک ہاتھی بھی مدینہ آیا اور خلیفہ کے حکم سے شہر میں پھرایا گیا۔ بڑھیاں دیکھتیں اور حیرت سے کہتیں:

امن خلق اللّٰہ ما نریٰ۔

کیا جو ہمارے آنکھوں کے سامنے ہے خدا کی مخلوق ہے۔

گشت کے بعد عراق کو واپس بھیج دیا گیا۔ حفیر کی جنگ کے بعد مذار کا معرکہ پیش آیا۔ یہ واقعہ پہلے سے زیادہ شدید تھا۔ کسریٰ کے حکم سے تازہ دم فوجیں مدائن سے آکر اس مہم میں شریک ہوئی تھیں فتح مسلمانوں کو حاصل ہوئی۔ اسی لڑائی میں خواجہ حسن بصری کے والد حبیب گرفتار ہوئے تھے۔

خلاصہ یہ کہ یکے بعد دیگرے ولجہ، الیس، یوم المقر، حیرہ، عین التمر، دومۃ الجندل، انبار، حصید، مضیع۔

ثنی[۱۲]، زمیل[۱۳]، فراض[۱۴] کے معرکے پیش رو سے زیادہ سخت تھے۔ عراق چونکہ سلطنت فارس کا مستقر تھا اور مدائن دارالسلطنت اسی صوبہ میں (قریب بغداد) واقع۔ اس لیے اہلِ فارس نے نہایت جاں بازی و دلیری سے مقابلے کیے۔ لیکن حضرت خالد سیف اللہ کی شمشیرِ بُرّاں کے سامنے ہر جگہ سر جھکانا پڑا۔ سپاہِ اسلام نے اس سرعت و جلادت سے حملے کیے کہ دشمن کو دم لینے کی مُہلت نہ ملی اور چند ہی روز میں میدان صاف ہو گیا۔

مورخ طبری نے حضرت خالد کی نسبت لکھا ہے :

وکان قلیل الصبر اذا رآہ او سمع به۔ — یعنی جب وہ موقع جنگ دیکھتے یا لڑائی کی خبر سُنتے تو پھر صبر نہ ہوتا۔

حیرت یہ ہے کہ باوجود اس قدر مہمات سر کرنے کے اسی قلیل زمانے میں انہوں نے ملکی انتظامات بھی کیے۔ عمّال مقرر کیے۔ وصولِ خراج کا بندوبست کیا۔ کاشت کاروں اور زمینداروں کو امن دے کر لگان کے معاہدے کیے۔ ایرانیوں نے شروع میں ان فتوحات کو عرب کی معمولی لُوٹ مار خیال کیا تھا۔ لیکن جب مسلمانوں کا عزم اور انصاف اور برتاؤ کی خُوبی دیکھی تو اپنے اپنے گھروں میں باطمینان واپس آ گئے۔ ہر پرگنہ اور علاقہ کے باشندوں نے اپنے اپنے قایم مقام بھیج کر جزیئے کے معاہدے کیے اور معاہدے کے بعد پُورے اطمینان کے ساتھ کاروبار میں مصروف ہو گئے۔

حضرت خالد کے دو فرمان یہاں نقل کیے جاتے ہیں جن سے اُس منصفانہ طرزِ عمل کا پتا لگتا ہے جو مسلمانوں نے عراق میں اختیار کیا تھا۔ نقل فرمان بنام صلو بالسوادی :

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم	بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
من خالد بن الولید لابن صلوا بالسوادی و منزلہ بشاطی الفرات۔ انك آمنٌ بامان اللہ علیٰ حقن دمك باعطاء الجزیۃ و قد اعطیت عن نفسك و عن اهل خرجك و عن جزیرتك و من كان فی قریتك بانقیا و بار و سماء الف درهم فقبلتها منك و رضی من معی من المسلمین بها منك و لك ذمۃ اللہ و ذمۃ محمد صلی اللہ علیه وسلم و ذمۃ المسلمین علیٰ ذالك۔ و شهد هشام بن الولید۔	خالد بن ولید کی جانب سے بنام صلو بالسوادی ساکن کنارۂ فرات۔ تو اللہ کی پناہ میں ہے۔ قبول جزیئے کے بعد تیری جان بخشی گئی۔ تو نے اپنی ذات، اپنی رعایا، اپنے جزیرے اور بانقیا اور بار و سماء کی جانب سے ایک ہزار درہم جزیہ دیا، میں نے اُس کو قبول کیا اور جو مسلمان میرے ساتھ ہیں۔ انہوں نے اتفاق کیا۔ اس کے عوض میں تو اللہ کی، محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کی پناہ میں آ گیا۔ ہشام بن ولید گواہ ہوا۔

اہلِ حیرہ کے نام معاہدہ ربیع الاوّل ۱۲ھ میں لکھا گیا :

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

هذا ما عاهد عليه خالد بن الوليد عديا وعمروا ابنى عدى وعمرو بن عبد المسيح و اياس بن قبيصه وحيرى بن اكال وهم نقباء اهل الحيره ورضى بذلك اهل الحيره وامرهم به عاهدهم على تسعين ومائة الف درهم تقبل فى كل سنة جزاءً عن ايديهم فى الدنيا رهبانهم وقسيسهم الا من كان منهم على غير ذى يد حبيسا عن الدنيا تاركا لها وعلى المنعة فان لم يمنعهم فلا شئ عليهم حتى يمنعهم وان غدروا بفعل او بقول فالذمة منهم بريئة۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ وہ معاہدہ ہے جو خالد بن ولید نے عدی اور عمرو پسران عدی اور عمرو بن عبد المسیح اور ایاس بن قبیصہ کے ساتھ کیا۔ یہ لوگ اہلِ حیرہ کے مقبولہ و معتبر کردہ قائم مقام ہیں۔ یہ قرار داد ہے کہ ہر سال ایک لاکھ نوے ہزار درہم بطور جزیہ وہ لوگ ادا کریں گے جو دنیاوی مقدرت رکھتے ہوں اور رہبان اور قسیس مگر وہ لوگ مستثنیٰ ہیں جو دنیا سے بالکل بے تعلق ہوں۔ بنیادِ معاہدہ حفاظت ہے اگر میں خالد بن الولید ان کی حفاظت نہ کروں جزیہ کا کوئی جز واجب نہ ہوگا اور وہ (اہلِ حیرہ) قولاً یا فعلاً بدعہدی کریں تو ہماری پناہ سے نکل جائیں گے۔

حضرت خالد نے فوجی اور ملکی انتظام کو ایک دوسرے سے علٰحدہ رکھا تھا۔ فوجی افسر جُدا تھے اور ملکی جُدا۔ چنانچہ اول ہی لڑائی کے بعد جس میں ہُرمز کام آیا فوج کا سردار حضرت سعید بن نعمان اور ملکی حاکم سوید بن مقرن مقرر کیے گئے۔ سوید کو ہدایت کی گئی کہ اپنے ماتحت عمّال وصول خراج کے واسطے مفصّلات میں متعین کریں۔ جن پرگنوں کے باشندے مقابلہ پر نہیں آئے اُن سے کچھ مزاحمت نہیں کی گئی اور آشتی کے ساتھ لگان کا بندوبست کرلیا گیا۔ بانقیا، باروسما وغیرہ اسی سلسلے میں تھے۔ حیرہ اور اُبلہ خراج کے صدر مقام تھے۔ جو اس وقت کی اصطلاح میں سواد کہلاتے تھے۔ سوادِ حیرہ کے ماتحت حسبِ ذیل پرگنے اور عاملِ خراج تھے :

نام پرگنہ	نام عامل	نام پرگنہ	نام عامل
فلالیج (بلندی عراق) نہرین	عبداللہ ابن رشیمہ بشیر بن خصاصہ	بانقیا و باروسما روذستان	جریر بن عبداللہ اُط بن ابی اُط
سوادِ اُبلہ کے حاکمِ مال سوید بن مقرن کے نائب حسبِ ذیل عُمّال تھے :			
حکہ حبطی	حصین بن ابی الخیر	ربیعہ بن غسل	؟

خوبیِ انتظام کی شہادت اِس سے بڑھ کر اور کیا ہوسکتی ہے کہ پچاس دن کے اندر حصۂ مقبوضہ کا مقررہ خراج وصول ہو کر

داخلِ خزانہ ہوگیا۔ اس روپیہ سے مسلمانوں کو آیندہ مہمات میں بہت مدد ملی۔ حضرت خالد کا اصولِ عمل یہ تھا کہ جہاں پہنچتے تھے اوّل تبلیغِ اسلام کرتے تھے۔ بصورتِ عدم قبول جزیہ طلب کرتے تھے۔ اس سے بھی انکار ہوتا تو اعلانِ جنگ کیا جاتا۔ چنانچہ حیرہ کے معرکے سے پہلے جب اشرافِ اہلِ فارس بہ سرگروہی قبیصہ بن ایاس نائبِ کسریٰ حضرت خالد کے پاس آئے تو انہوں نے کہا:

ادعوکم الی الاسلام فان اجبتم فانتم من المسلمین لکم مالهم وعلیکم ما علیهم فان ابیتم فالجزیة فان ابیتم فقد اتیتکم باقوام هم احرص علی الموت منکم علی الحیٰوة۔	یعنی میں تم کو اسلام کی جانب بلاتا ہُوں اگر تم قبول اسلام کروگے تو تم مسلمانوں کا جزو ہو جاؤ گے تمہارے وہی حقوق ہوں گے جو ہمارے ہیں اور وہی ذمہ داریاں ہوں گی جو ہم پر ہیں اس سے انکار ہے تو جزیہ دو۔ یہ بھی منظور نہیں تو سمجھ لو کہ تمہارے مقابلہ کے واسطے وہ فوجیں لے کر آیا ہُوں جو موت پر ایسی ہی جان دیتی ہیں جیسے تم زندگی پر، بلکہ زیادہ۔

جزیہ کی مقدار معاہدہ حیرہ میں فی کس چار درہم تھی (یعنی ایک روپیہ) راہب تارک الدنیا اور مفلس مستثنیٰ تھے۔ جزیہ کے عوض میں مسلمانوں کی جانب سے حفاظت کا عہد ہوتا تھا ہر معاہدۂ جزیہ میں یہ تصریح ہوتی تھی کہ اگر ہم تمہاری حفاظت نہ کرسکیں گے تو جزیہ بھی نہ لیں گے۔ ان معرکوں میں کس قدر احتیاط کی جاتی تھی اور حضرت ابوبکرؓ چھوٹے چھوٹے واقعات سے بھی کس درجہ خبردار رہتے تھے۔ حسبِ ذیل واقعہ سے واضح ہوتا ہے۔ مضیح کی لڑائی میں جب مسلمانوں نے شبخون مارا تو دو مسلمان بھی جو دشمنوں میں رہتے تھے کام آئے، ایک عبدالعزیٰ جن کا اسلامی نام عبداللہ تھا، دوسرے لبید۔ شبخون کے وقت جو اشعار عبداللہؓ کی زبان پر تھے ان میں یہ مصرع بھی تھا: ؎

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ رَبَّ مُحَمَّد

حضرت ابوبکرؓ نے یہ ماجرا سُنا تو دونوں کا خوں بہا ورثا کو ادا کیا اور حکم دیا کہ ان کے پس ماندوں کے ساتھ حسنِ سلوک اختیار کیا جائے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی کہا:

امّا ان ذٰلك لیس علیّ اذ نازلا اهل الحرب۔	اس کی ذمہ داری میرے سر نہیں ہے جبکہ وہ دارالحرب میں قیام پذیر تھے۔

فتح حیرہ کے بعد حضرت خالد نے حیرہ کو اپنا صدر مقام مقرر کیا۔ وہیں سے ہر طرف انتظام کے واسطے آتے جاتے تھے۔ السّیب سرحدی مقام تھا۔ سرحد کی حفاظت پر کار آزمودہ جو انمرد مامور تھے۔ مثلاً:

حضرت ضرار بن ازور، حضرت ضرار بن الخطاب، مثنیٰ بن حارثہ۔

خلافت کے احکام فتح عراق کی بابت یہ تھے کہ جب حیرہ پر نشیبی و بالائی دونوں لشکرِ اسلام جمع ہوجائیں تو ایک امیرِ عسکر حیرہ میں قیام کرے، دوسرا مدائن دارالسلطنت پر بڑھے۔ حضرت خالد اپنے مفوضہ مہمات طے کرکے حیرہ پہنچ گئے۔

لیکن حضرت عیاض اس سرعت سے ختم نہ کرسکے، اور حسبِ ارشاد خلافت حضرت خالد کو اُن کی مدد کے واسطے بمقام دُومۃ الجندل جانا پڑا۔ اسی سلسلے میں حضرت خالد کربلا کی چھاؤنی تک گئے۔ اُس وقت مسلمانوں کی آویزش کا سلسلہ کنارۂ دجلہ تک پہنچ چکا تھا۔ مثنّیٰ بن حارثہ خود مدائن کے بعض مورچوں پر سرگرم قتال تھے۔ حضرت خالد نے چند روز کربلا میں قیام کیا، وہاں اُس زمانے میں مکھیوں کی بہت کثرت تھی۔ عبداللہ بن وثیمہ نے شکایت کی تو حضرت خالد نے جواب دیا: صبر کرو۔ میں چاہتا ہُوں کہ جن چھاؤنیوں کا خالی کرنا عیاض کے سپرد تھا اُن کو فتح کرکے عربوں کو قابض کر دُوں تاکہ مسلمانوں کا عقب محفوظ ہو جائے اور آمد و رفت کا سلسلہ بے خدشہ جاری رہے۔ یہی حکم خلیفہ کا ہے اور خلیفہ کی رائے ایک جماعت کی رائے کے برابر قوی ہے۔

وسرایه یعدل بحده الامّة۔

رمضان المبارک میں دُومۃ الجندل وغیرہ کے معرکے سر کرکے حضرت خالد فراض جا پہنچے۔ جہاں فارس، شام اور جزیرہ کی سرحدیں ملتی ہیں۔ اسی موقع پر عید کی نماز ادا کی۔ مسلمانوں کا اجتماع فراض پر دیکھ کر رومیوں کو جوش اور غصہ آیا اور انہوں نے فارس کی چھاؤنیوں، کفارِ عرب کے قبائل تغلب آباد، نمر سے مدد لے کر مسلمانوں کے مقابلے کا تہیہ کیا۔ تغلب وغیرہ سرحدِ روم پر آباد تھے اور اُن میں مسلمانوں کے خلاف جوش موج زن تھا۔ اس طرح رومی، اہلِ فارس اور عرب متفق ہوکر مسلمانوں پہ بڑھے۔ فرات کے کناروں پر دونوں فوجیں جمع ہوئیں۔ رومیوں نے حضرت خالد سے دریافت کیا کہ تم اِدھر آؤ گے یا ہم اُدھر آئیں۔ اُنھوں نے جواب دے دیا کہ تم آؤ۔ رومیوں نے کہا: بہتر۔ لیکن جس موقع پر تم ہو وہاں سے ہٹ جاؤ تاکہ ہم دریا کو عبور کرسکیں۔ حضرت خالد نے اس سے انکار کیا۔ انکار سُن کر رومیوں نے اور ایرانیوں نے مشورہ کیا کہ خالد اپنی بات سے ہٹنے والا نہیں۔ خود ہم کو دُوسرے گھاٹ سے عبور کرکے مقابلہ کرنا چاہیے۔ چنانچہ مخالف لشکر نے دریا اتر کر نہایت جواں مردی و عزم کے ساتھ حملہ کیا، مگر میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہا۔ بعد فتح لشکرِ اسلام نے تعاقب کیا اور کثرت سے دشمن کام آئے۔ کامیابی کے بعد حضرت خالد دس روز فراض میں مقیم رہے اور ضروری انتظام کرکے پانچویں ذیقعدہ کو حیرہ کی واپسی کا حکم دیا۔ عاصم کو ہدایت کی کہ لشکر لے کر چلیں۔ شجرہ بن الاعز ساقہ پر تھے خود حضرت خالد نے اپنا قیام ساقہ میں رکھا۔ جب لشکر آگے بڑھا تو حضرت خالد چند آدمیوں کو لے کر علیحدہ ہو گئے اور غیر معروف راستہ سے مکہ پہنچ کر حج کیا۔ یہ سفر اس تیزی سے طے کیا کہ لشکر کے اخیر حصہ کے ساتھ حیرہ میں داخل ہو گئے۔ واپس آئے تو فرمانِ خلافت ملا، جس میں اس جسارت پر کہ لشکر سے علیحدہ ہو کر حج ادا کیا تنبیہ تھی اور آئندہ احتیاط کی ہدایت۔ اس طرح حضرت خالد نے ۱۲ھ کے اختتام سے پہلے تجویز شدہ مہم عراق کی تکمیل کر دی۔

حج ذی حجہ ۱۲ھ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حج کیا۔ اُن کی غیبت کے زمانے میں حضرت عثمانؓ بن عفّان مدینہ میں نائب رہے۔

شام ۱۳ھ ملکِ شام اُس عہد میں سلطنت روم میں شامل تھا۔ عراق کی طرح سلطنت روم کی عربی سرحد پر بھی قبائلِ عرب آباد تھے جو اہلِ حجاز کے ساتھ گوناگوں تعلقات رکھتے تھے۔ ہجرت کے بعد جب

نواحِ مدینہ کے یہود وعرب مسلمانوں کی مخالفت پر کمربستہ ہوکر اُٹھے اور دائرہ خصومت وسیع ہوا تو اُس کا اثر سرحدِ روم تک پہنچا اور اس طرف سے بھی کاوش و آویزش شروع ہوئی۔ ۸ھ کے وسط میں حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مہم رومیوں کے مقابلہ پر روانہ فرمائی جو سیرت میں غزوۂ موتہ کے نام سے مشہور رہے۔ اُس مہم کا جس فوجِ گراں سے مقابلہ ہوگیا اُس میں خود ہرقل روم عربوں کی ایک جماعت کثیر کے ساتھ موجود تھا۔ اسی غزوہ میں حضرت جعفر طیار اور زید بن حارثہ شہید ہوئے۔ رضی اللہ عنہما۔

رجب ۹ھ میں خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم تیس ہزار لشکر کے ساتھ تبوک تشریف لے گئے۔ اِس مہم کا مقصود بھی ہرقل کے حملہ کا روکنا تھا۔ جیشِ اُسامہ کی روانگی بھی رومیوں کے مقابلہ پر ہوئی تھی۔ ابھی ابھی سُن چکے ہو کہ مہم عراق کے دوران میں کس طرح رومی از خود میدان میں دَر آئے۔ ان ہی وجوہ سے آغازِ خلافت سے حضرت صدیق اکبرؓ کی نگاہ جن دَو شیروں سے لڑ رہی تھی اُن میں ایک ہرقلِ روم بھی تھا۔ مہم عراق کی کامیابی کے بعد سفرِ حج سے واپس آکر حضرت ابوبکرؓ نے مہم شام کا اہتمام کیا۔ سب سے اوّل حضرت خالد بن سعید کو ایک حصہ فوج کے ساتھ بھیجا اور اُن کو حکم دیا کہ بمقام تیما پہنچ کر قیام کریں اور تا حکم ثانی آگے نہ بڑھیں۔ خود حملہ نہ کریں، اُدھر سے حملہ ہو تو دفع کریں۔ جو مسلمان قبائل تیما کے نواح میں ہوں اُن کو شرکت کی ترغیب دیں۔ لیکن یہ شرط تھی کہ جو لوگ ارتداد کا داغ کھا چکے ہوں وہ شامل نہ کیے جائیں۔ حضرت خالد بن سعید نے بموجب حکم تیما پہنچ کر پڑاؤ کیا۔ قبائل کا لشکرِ عظیم اُن کے نشان کے نیچے جمع ہوگیا۔ ہرقل کو جب اس فوجِ گراں کی خبر پہنچی تو اس نے بھی تیاریاں شروع کیں اور عرب کے مقابلہ کے لیے عرب انتخاب کیے۔ قبائل لخم، غسان، جذام وغیرہ جو شام کی سرحد پر آباد تھے حضرت خالد بن سعید کے مقابلہ کے واسطے تیما سے تین منزل کے فاصلے پر فراہم ہوئے۔ حضرت ابوبکرؓ کو اطلاع کی گئی۔ حکم آیا:

اقدم ولا تحجم واستنصر اللّٰہ۔ آگے بڑھو، رو گومت، خدا سے مدد مانگو۔

اس ہدایت کے مطابق مسلمانوں نے حملہ کیا اور مخالفین کی جمعیت پریشان ہوگئی۔ شامیوں کی چھاؤنی پر حجازی لشکر کا قبضہ ہوگیا۔ اِس کش مکش کا ایک مبارک نتیجہ یہ ہوا کہ جو قبائل مقابلہ پر بڑھے تھے وہ دائرۂ اسلام میں داخل ہوگئے۔ اِس کی اطلاع بھی مدینہ گئی۔ حکم ہُوا: اور آگے بڑھو، لیکن اس احتیاط سے کہ عقب محفوظ رہے۔

حضرت خالد بن سعید نے قدم آگے بڑھایا اور زیراء و آبل کے درمیان منزل کی یہاں باہان نامی ایک بطریق نے مقابلہ کر کے شکست کھائی۔ اس اطلاع کے ساتھ حضرت خالد بن سعید نے مزید مدد کی درخواست بھیجی اور اب حضرت صدیق نے پُورے اہتمام کے ساتھ مہم کا انصرام فرمایا۔ اسی عرصہ میں وہ لشکر جو یمن، عمان، بحرین، تہامہ وغیرہ مقامات میں اہلِ ارتداد سے لڑ رہے تھے کامیابی کے ساتھ مدینہ واپس آگئے۔ حضرت عکرمہ ذو الکلاع حمیری (یمن کے شاہی خاندانِ حمیری کی یادگار) اسی جمعیت میں تھے۔ چار جدید فوجیں شام کو روانہ کی گئیں۔ ایک کے امیر حضرت ابوعبیدہ تھے، دُوسرے کے حضرت شرحبیل بن حسنہ، تیسری کے حضرت یزید بن ابوسفیان، چوتھی کے حضرت عمرو بن العاص۔ یہ افواج مختلف حصص شام پر مامور ہوئیں۔ حضرت عمرو بن العاص کو براہ معرفہ فلسطین پر بڑھنے کا حکم ملا۔ بقیہ تینوں لشکر مختلف سمتوں سے بلقاء (بلندی شام) کی جانب بڑھے۔ ہر امیر کے متعلق مختلف شہروں کی تسخیر تھی۔ مجموعی اصول یہ تھا کہ:

اعرف ان الروم ستشغلهم فاحب ان یصعد المصوب و یصوب المصعد لئلا یتوکلوا۔	میں جانتا ہوں کہ عنقریب رومی پوری قوت سے مسلمانوں کے مقابل ہوں گے۔ لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ بلندی والے نشیب کی جانب اور نشیب والے بلندی کی طرف آجا سکیں اور ایک دوسرے کے محتاج نہ رہیں۔

مورخ طبری لکھتے ہیں:

فکان کما ظن۔	وہی ہوا جو حضرت ابوبکر کا خیال تھا۔

مسلمانوں کی ان چاروں فوجوں کی تعداد ستائیس ہزار تھی۔ حضرت خالد بن سعید کی جمعیت اس کے علاوہ ہرقل کو جب ان واقعات کا علم ہوا تو اس نے بڑے زور شور سے تیاریاں کیں۔ خود شام پہنچ کر حمص[1] میں قیام کیا۔ یہ تجویز کی کہ مسلمانوں کے ہر لشکر کا جدا جدا مقابلہ کیا جائے تاکہ ان کو اجتماع کا موقع نہ ملے۔ تذارق ہرقل کا حقیقی بھائی نوّے ہزار فوج کے ساتھ عمرو بن العاص کے، جرجہ بن توذرا قریباً اسی قدر جمعیت کے ساتھ یزید بن ابی سفیان کے، ذراقص حضرت شرجیل بن حسنہ کے اور فیقار بن نسطوس ساٹھ ہزار لشکر کے ساتھ حضرت ابوعبیدہ بن الجراح کے مقابلہ پر مامور ہوا۔ تذارق کا مقدمۃ الجیش آگے بڑھ کر ثنیہ نامی مقام پر (جو فلسطین کا بلند حصّہ تھا) خیمہ زن ہوا۔ مسلمانوں نے جب رومیوں کا ٹڈی دَل دیکھا تو گھبرائے اور حضرت عمرو بن العاص سے مشورہ طلب کیا۔ فوج کی زیادہ جمعیت انہی کے پاس تھی جواب دیا:

الرای الاجتماع و ذلك ان مثلنا اذا اجتمع لم یغلب من قلۃٍ و اذا نحن تفرقنا لم یبق الرجل منّا فی عددٍ یقرن فیه لاحد ممن استقبلنا واعدلنا لکل طائفۃٍ منّا فاتعدوا الیرموك۔	رائے یہ ہے کہ سب مجتمع ہو جاؤ۔ وجہ یہ ہے کہ ہم سے آدمی جب جمع ہو جائیں تو محض قلت کی وجہ سے مغلوب نہیں ہو سکتے۔ اور اگر ہم متفرق ہو گئے تو پھر ہم میں سے کسی کے پاس اس قدر جمعیت نہیں رہے گی کہ اپنے مقابل حریف کا مقابلہ کر سکے ہمارے لشکر کے مقابلہ کے واسطے الگ الگ فوج بھیجی گئی ہے۔ یرموک پر جمع ہو جاؤ۔

حضرت ابوبکرؓ کو ان واقعات کی خبر ہوئی تو انھوں نے بھی مذکورۂ بالا رائے پسند کی اور لکھا:

اجتمعوا فتکونوا عسکراً واحداً والقوا زحوف المشرکین بزحف المسلمین فانکم	سب جمع ہو کر ایک لشکر بن جاؤ اور مشرکوں کی صفیں مسلمانوں کی فوج سے اُلٹ دو۔ اس کا یقین رکھو کہ

---

[1] شام کا وہ صوبہ جس کا صدر بیت المقدس تھا۔

اعوان اللّٰہ واللّٰہ ناصر من نصرہ وخاذل من کفرہ ولن یوتیٰ مثلکم من قلّۃٍ و انّما یوتی العشرۃ الآف والزیادۃ علی العشرۃ الآف اذا اتوا من تلقاء الذنوب فاحترسوا من الذنوب واجتمعوا بالیرموک متساندین ولیصل کل رجل باصحابہ۔

تم اللہ کے مددگار ہو اور اللہ اپنے مددگار کو فتح دیتا ہے اور جو اس کا منکر ہو اس کو رسوا کرتا ہے۔ تم سا گروہ قلت کی وجہ سے مغلوب نہیں ہو سکتا حقیقتِ حال یہ ہے کہ ہزاروں کی جمعیت اگر راہِ معصیت اختیار کرے تو بے دست و پا ہو جاتی ہے۔ لہٰذا واجب ہے کہ گناہوں سے خبردار رہو۔ مقامِ یرموک میں اپنے اپنے نشان کے نیچے جمع ہو ہر امیرِ عسکر اپنے آدمیوں کے ساتھ نماز ادا کرے۔

ہرقل کو جب یہ حال معلوم ہوا تو اس نے بھی نقشۂ مہم بدل دیا کہ تمام لشکر ایک جگہ جمع ہو کر مسلمانوں کا مقابلہ کرے۔ پڑاؤ ایسے موقع پر کیا جاوے جس کا سامنا کشادہ ہو اور عقب تنگ۔ تذارق امیر الامرا ہو۔ مقدمہ پر جرجہ اور دائیں بائیں بازو پر ذراقص و باہان۔ اس کے ساتھ یہ خوشخبری بھی تھی کہ باہان عنقریب اور تازہ دم فوج لے کر تمہارے پاس پہنچتا ہے۔ فرمانِ شاہی کے مطابق رومیوں کا لشکر واقوصہ نامی مقام پر اُترا۔ یہ مقام دریائے یرموک کے کنارے پر تھا۔ سامنے دریائے یرموک تھا۔ پشت پر ایک سیدھا اونچا پہاڑ۔ یہ محفوظ جگہ اس لیے انتخاب کی گئی کہ رومیوں کے ہوش بجا ہوں مسلمانوں کا جو خوف طاری تھا وہ رفع ہو اور دل ٹھہریں۔ مسلمانوں نے اس موقع کا اندازہ کیا اور اپنا پڑاؤ چھوڑ کر رومیوں کے سامنے مورچہ جمایا۔ اس طرح رومی پُشت اور پیش دونوں جانب سے محصور ہو گئے۔

حضرت عمرو بن العاص نے یہ کیفیت دیکھ کر مسلمانوں سے کہا:

ایھا الناس ابشروا احصرت واللّٰہ الروم وقل ماجاء محصورٌ بخیرٍ۔

مژدہ ہو اے لوگو! قسم رب کی رومی محصور ہو گئے اور محصور فوج بہت کم فلاح پاتی ہے۔

مسلمان تین مہینے تک محاصرہ کیے رہے۔ سامنے دریا حائل تھا، پُشت پر پہاڑ۔ اس لیے مسلمان خود حملے سے مجبور تھے۔ رومی حملے سے دل چراتے تھے۔ معمولی ہلّے کرتے تھے جو پسپا کر دئے جاتے۔ صفر کے مہینے میں اس اجتماع اور معرکہ کی کیفیت مدینہ پہنچی۔ حضرت خالد کے نام مراسلہ جاری ہوا کہ عراق کے معاملات مثنیٰ کے سپرد کر کے اپنے لشکر کے ساتھ یلغار کر کے شام پہنچو۔ حضرت خالد نے پُوری تعمیل کی اور اس سُرعت سے یرموک پہنچے کہ اُن کے گھوڑے کے پاؤں بیکار ہو گئے ربیع الآخر کے آخر میں یہ لشکر یرموک پہنچا۔ اُسی روز باہان رومیوں کی کمک لے کر پہنچا تھا۔ اس لشکر کے آگے آگے پادریوں کے مختلف طبقے شمامسہ، راہب، قسیس وغیرہ تھے اور مسلمانوں کے مقابلہ کی ترغیب دیتے جاتے تھے۔ مورخین نے رومیوں کی مجموعی فوج کی تعداد دو لاکھ لکھی ہے۔ حضرت خالد کی نو ہزار سپاہ اور بعض اور کمکوں کے شامل ہو جانے سے مسلمانوں کی جمعیت چھیالیس ہزار ہو گئی تھی۔ رومی باوجود اپنی کثرت اور حریف کی قلت کے حضرت خالد کے پہنچنے کے بعد بھی ایک مہینے تک خندق

میں چھپے رہے۔ مذہبی پیشوا ان کو اُبھارتے تھے نصرانیت کی تباہی کا ماتم کرتے تھے لیکن کچھ اثر نہ ہوتا تھا۔ آخر کار بہت سی کوششوں کے بعد آمادۂ پیکار ہوئے۔ یہ واقعہ جمادی الآخر کا ہے۔ اس طرح پانچ مہینے کے محاصرے کے بعد میدان میں نکلے۔ مسلمانوں کی مختلف فوجیں اپنے اپنے امیر کے زیرِ حکم تھیں۔ کل فوج پر کوئی سردار نہ تھا۔ جب رومیوں کے حملے کی اطلاع ہوئی تو اس طرف سے ارادہ ہوا کہ ہر حصّہ لشکر اپنے اپنے سردار کی ماتحتی میں مقابلہ کرے۔ اس طرزِ جنگ کو عرب کی اصطلاح میں تساند کہتے تھے۔ حضرت خالد نے یہ حالت دیکھی تو تمام فوج کے سامنے ایک خطبہ دیا اس میں بیان کیا کہ آج کا دن ایک عظیم الشان دن ہے جو تاریخ میں یادگار رہے گا۔ اپنے ذاتی شرف اور فخر کو علٰحدہ رکھ کر صرف مرضیِ الٰہی کے واسطے کام کرنا چاہیے اور وہ طرز اختیار کرنا چاہیے جس سے دشمن لفع نہ اٹھائے۔ متفرق امرا کی ماتحتی میں لڑنا قوت کو منتشر کرنا ہے۔ وہ رائے قرار دو جو مناسبِ موقع ہو۔ سب نے کہا تم اپنی رائے ظاہر کرو۔ انہوں نے کہا کہ خلیفہ کا اندازہ تھا کہ معرکے آسان ہوں گے۔ جو واقعات یہاں پیش ہیں اگر ان کی خبر ہوتی تو ضرور وہ تمام لشکر کو ایک امیر کے ماتحت کر دیتے۔ اب یہ ہونا چاہیے کہ کل لشکر ایک سپہ سالار کے حکم سے لڑے، جو باری باری سے مقرر ہو۔ ایک دن ایک امیر ہو، دُوسرے روز دُوسرا۔ اگر پسند ہو آج کی امارت میرے سپرد کر دو۔ سارے امرا نے اس رائے کو تسلیم کیا' اور اس روز کی سپہ سالاری حضرت خالد کو تفویض کی گئی۔ رومیوں نے اپنی فوج نئی ترتیب سے قایم کی تھی، امیرِ اسلام نے بھی معمولی ترتیب چھوڑ کر جدید طرز اختیار کی۔ جو عرب نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی تمام سپاہ کو چالیس دستوں پر تقسیم کر کے ہر دستے پر ایک کارآزمودہ سردار مقرر کیا اور فوج والوں سے کہا کہ دشمن کی کثرت ہو تو اس سے بہتر ترتیب نہیں ہو سکتی۔ اس سے لشکر کی تعداد دو نی معلوم ہوتی ہے۔ قلب پر حضرت ابوعبیدہ، میمنہ پر حضرت شرحبیل بن حسنہ اور عمرو بن العاص' اور میسرہ پر حضرت یزید بن ابی سفیان مقرر کیے گئے۔ ایک دستہ حضرت خالد کے بیٹے عبدالرحمٰن کے سپرد تھا' جن کی عمر اس وقت اٹھارہ برس کی تھی۔ قاضیِ عسکر حضرت ابودرداؓ تھے۔ قاص حضرت ابوسفیان' اور قاری حضرت مقداد۔ غزوۂ بدر کے بعد حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلّم نے یہ سنّت مقرر فرما دی تھی کہ آغاز غزوہ سے پیشتر سپاہِ اسلام کے سامنے سورۂ انفال پڑھی جائے۔ یہ خدمت قاری کے سپرد تھی۔ قاص کی یہ خدمت تھی کہ سپاہیوں کے سامنے کھڑے ہو کر جوشِ جنگ تازہ کرتے۔ چنانچہ حضرت ابوسفیان ہر دستے کے سامنے جاتے اور کہتے:

انتم ذادة العرب و انصار الاسلام	تم جوان مردانِ عرب ہو، اور اسلام کے انصار،
وهم ذادة الروم و انصار الشرك ۔	وہ جواں مردانِ روم ہیں اور شرک کے مددگار۔
اللّٰھم ھذا یوم من ایامك ، اللّٰھمّ	اے اللہ! آج کا دن معرکہ کا دن ہے۔ اے
انزل نصرك علیٰ عبادك ۔	اللہ! اپنی مدد اپنے بندوں پر نازل فرما۔

لشکرِ اسلام میں ایک ہزار صحابی شریک تھے جن میں سے سو بزرگ بدری تھے۔ جب حضرت خالد لشکر کی صفیں قایم کر رہے تھے ایک شخص نے کہا کہ رومیوں کی فوج کس قدر زیادہ ہے اور ہماری کتنی کم۔ حضرت خالد نے کہا کہ نہیں ہماری فوج بہت ہی زیادہ ہے اور رومیوں کی بہت ہی کم۔ سپاہ کی قلّت یا کثرت تعداد پر موقوف نہیں۔ نتیجۂ جنگ فتح د

شکست سے اس کا اندازہ ہوتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ ترتیبِ صفوف کے بعد حضرت خالد نے حکم دیا کہ حضرت عکرمہ و حضرت قعقاع قلب کے دونوں بازوؤں سے نکل کر حملہ آور ہوں۔ معرکہ کارزار گرم ہوا۔ عین معرکہ میں مدینہ سے قاصد پہنچا۔ لوگوں نے حال دریافت کیا تو اس نے آمدِ مدد کی خوشخبری سُنائی۔ حضرت خالد کے پاس پہنچا تو آہستہ سے کچھ کہا اور مراسلہ دیا۔ اُنھوں نے مراسلہ کو بجنسہٖ ترکش میں رکھ لیا اور مصروفِ جنگ ہوگئے۔ ہنگامۂ دار و گیر میں جذبِ حق کا کرشمہ دیکھو دورانِ کارزار میں رومیوں کا سردار جرجہ بن توذرا میدان میں آیا اور للکار کر کہا:

خالد میرے سامنے آئیں۔

حضرت خالد نے حضرت ابوعبیدہ کو اپنا نائب مقرر کیا اور خود آگے بڑھ کر دونوں لشکروں کے درمیان جرجہ سے ملے اوّل دونوں نے ایک دوسرے کو پناہ دی۔ بعدازاں اس قدر مل کر کھڑے ہوئے کہ گھوڑوں کی کنوتیاں مل گئیں۔

جرجہ: "سچ کہنا، جھوٹ مت بولنا، آزاد مرد جھوٹ نہیں بولتے۔ دھوکا نہ دینا، فریب شرفا کا شیوہ نہیں۔ میں یہ پوچھتا ہوں کہ خدا نے تمہارے نبی کے پاس آسمان سے تلوار بھیجی تھی وہ تم کو عطا ہوئی اور اس کا اثر ہے کہ تم ہر جگہ فتح یاب ہوتے ہو"

حضرت خالد: "نہیں!

جرجہ: "پھر تمہارا لقب سیف اللہ کیوں ہے؟"

حضرت خالد: "اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمارے پاس بھیجا، انہوں نے اسلام ہمارے سامنے پیش کیا، اوّل ہم سب کے سب بھاگ کر کنارہ کش ہوگئے، پھر بعض نے تصدیق کر کے پیروی اختیار کی، بعض دُور دُور رہ کر جھٹلاتے رہے، مَیں اُن میں تھا جو تکذیب پر قایم تھے۔ اس کے بعد اللہ نے ہمارے قلب پھیر دیئے، گردنیں جھکا دیں اور ہدایت بخشی۔ میں نے بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت قبول کی، اُس وقت ارشاد ہوا:

انت سیفٌ من سیوف اللہ علی المشرکین۔ اے خالد! تو خدا کی تلواروں میں سے ایک تلوار ہے جو مشرکین کے مقابلے کے لیے نیام سے نکلی ہے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ اب میں سب مسلمانوں سے زیادہ مشرکوں کا دشمن ہوں"۔

جرجہ: "تم نے سچ کہا، اب یہ بتاؤ کہ دعوتِ اسلام کیا ہے؟"

حضرت خالد: "اس امر کا اقرار کہ سوائے اللہ کے کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اُس کے بندے اور رسول ہیں۔ اور اس پیام کی تصدیق جو وہ خدا کی طرف سے لاتے"۔

جرجہ: "اگر اس کو کوئی نہ مانے؟"

حضرت خالد: "جزیہ دے"۔

جرجہ: "یہ بھی قبول نہ کرے؟"

حضرت خالد : "ہم اوّل اعلانِ جنگ کریں گے پھر لڑیں گے۔"
جرجہ : "جو تم میں شامل ہو اس کا مرتبہ ؟"
حضرت خالد : "اللہ کا فرمان ہے کہ سب مسلمان درجہ میں برابر ہیں، اعلیٰ ہوں یا ادنیٰ، اوّل ہوں یا آخر۔"
جرجہ : "جو آج ایمان لائے وُہ بھی رتبہ میں مساوی ہوگا ؟"
حضرت خالد : "برابر ہوگا بلکہ افضل۔"
جرجہ : "یہ کس طرح ؟"
حضرت خالد : "ہم نے جب اسلام قبول کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حیات تھے۔ نزولِ وحی کا سلسلہ جاری تھا۔ آپ احکامِ آسمانی کی خبر دیتے تھے ہم معجزات وتصرفات کا مشاہدہ کرتے تھے اِس صورت میں ہمارا مسلمان ہونا لازم تھا۔ آج تم اِن باتوں کو نہیں دیکھتے پھر بھی ایمان لاتے ہو تو تم ہم سے افضل ہو۔"
جرجہ : "تم قسم سے کہتے ہو کہ تم نے مجھ سے پورا سچ کہا، دھوکا نہیں دیا، تالیفِ قلب نہیں کی ؟"
حضرت خالد : "واللہ نہ میں نے جھوٹ کہا نہ مجھ کو تم سے یا کسی سے نفرت ہے۔ جو تم نے پُوچھا اُس کا سچّا جواب مَیں نے دے دیا۔ اللہ میرا مددگار ہے۔"
جرجہ : "بے شک تم نے سچ کہا۔"
یہ کہہ کر اپنی ڈھال پسِ پشت ڈال دی اور کہا :
"مجھ کو اسلام کی تلقین کرو۔"

حضرت خالد اُس کو اپنے خیمے میں لے گئے، اوّل غسل دیا پھر تلقینِ اسلام کے بعد جرجہ کو مقتدی بنا کر دو رکعت نماز ادا کی۔ جرجہ کی یہ حالت دیکھ کر رومیوں نے عام ہلّہ کر دیا۔ پہلے حملہ میں مسلمانوں کے قدم ڈگمگا گئے۔ حضرت عکرمہ اور حضرت حارث بن ہشام ثابت قدم رہے۔ جس وقت حضرت خالد جرجہ کو لے کر خیمے سے نکلے تو رومی مسلمانوں کی صفوں میں گھسے ہوئے تھے۔ حضرت خالد نے للکارا تو مسلمانوں نے دلیری سے حملہ کر کے دشمن کو پیچھے ہٹا دیا۔ اب سیف اللہ نے ہلّہ کیا اور شمشیر آزمائی شروع ہوئی۔ چاشت سے دن ڈھلنے تک میدانِ جنگ یکساں گرم رہا۔ انتہا یہ کہ عصر کی نماز اشارہ سے ادا کی گئی۔ یہ عالم قابلِ دید تھا کہ وہ جرجہ جو صبح کو مسلمانوں کے دشمن تھے اب حضرتِ خالد کے پہلو بہ پہلو نشّہ ایمان میں سرشار رومیوں پر وار کر رہے تھے اور یہ قسمت کہ عین معرکہ میں سعادتِ شہادت سے کامیاب ہُوئے اور صرف وہ نماز ادا کر کے جو آغازِ اسلام کا نیاز تھی سُرخرو اپنے رب کے حضور میں پہنچے۔ رضی اللہ عنہ۔

شام کے قریب رومیوں کو لغزش ہوئی۔ یہ دیکھ کر حضرت خالد نے قلب کے دستے لے کر خود حملہ کیا اور پہلے ہلّہ میں دشمن کے پیادوں اور رسالوں کے درمیان گھس کر حدِ فاصل بن گئے۔ اوّل رسالوں کو شکست ہُوئی اور میدان چھوڑ کر بھاگے۔ مسلمان اِس شکست سے خوش ہوئے لیکن اپنی جگہ پر قایم رہے۔ تعاقب نہیں کیا۔ سواروں کے بعد حضرت خالد نے پیدلوں پر دھاوا کیا۔ اُن کی جمعیت بھی متفرق ہُوئی اور خندق میں جا گھسی۔ مسلمان متعاقب پہنچے۔ پشت پر پہاڑ تھا۔ اس لیے رُومی گھِر گئے۔

اور ہزاروں تلوار کے گھاٹ اُتر گئے۔ حضرت خالد نے بڑھ کر روم کے سپہ سالار تذارق کے خیمے پر قبضہ کر لیا۔ نمازِ مغرب بعد فتح تنگ وقت پر ادا کی گئی۔ رومی شکست پا چکے تاہم متفرق لڑائی کا سلسلہ صبح تک جاری رہا۔ حضرت خالد کے گرد مسلمانوں کے رسالے تھے اور تذارق کے خیمہ گاہ سے وہ تمام شب فوج کو لڑاتے رہے شب کے وقت حضرت عکرمہ نے کہا کہ :

میں بہت سے معرکوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقابلہ کرتا رہا آج کیا میں رومیوں سے بھاگ جاؤں گا؟ کون ہے جو مجھ سے موت پر بیعت کرے۔

یہ سُن کر حضرت ضرار بن ازور نے مع چار سو مسلمانوں کے ان کے ہاتھ پر موت کی بیعت کی اور حضرت خالد کے خیمے کے سامنے جم کر لڑنا شروع کیا یہاں تک کہ باستثنا معدودے چند سب کے سب شہید ہو گئے۔ صبح کو لوگ بحالت نزع حضرت عکرمہ اور ان کے بیٹے عمرو بن عکرمہ کو اٹھا کر حضرت خالد کے پاس لائے۔ انہوں نے حضرت عکرمہ کا سر اپنی ساق اور عمرو بن عکرمہ کا سر اپنی ران پر رکھا۔ چہرہ سے خاک صاف کرتے منہ میں پانی ٹپکاتے اور کہتے جاتے اس پر بھی ابن خثیمہ کا خیال ہے کہ ہم کو شہادت کی تمنا نہیں۔ اسی حالت میں خدا کے دونوں برگزیدہ راہگرائے عالمِ بالا ہوئے۔ رضی اللہ عنہما

یہ واقعہ سننے کے قابل ہے کہ اس لڑائی میں مسلمان بیبیاں بھی شریک تھیں اور اپنے دستے جُداگانہ قائم کر کے سرگرم قتال ہوئیں۔ جویریہ بنت ابی سفیان کے دستے نے سب سے زیادہ کارِ نمایاں کیا۔ تین ہزار مسلمان شہید ہوئے۔ صبح ہوتے ہوتے میدان رومیوں سے صاف ہو گیا۔ آفتاب طلوع ہُوا تو اُس نے اسلامی پرچم دریائے یرموک پر لہراتا دیکھا۔ یہ فتح بہت مہتم بالشان تھی اس کی وجہ سے مسلمانوں کا سکہ رومیوں کے دل پر بیٹھ گیا اور فتوحات کا دروازہ کُھل گیا۔ اِس معرکے کا یہ واقعہ یاد رکھنے کے لائق ہے کہ رومیوں نے آغاز کار میں ایک عرب جاسوس مسلمانوں کے لشکر میں بھیجا۔ ایک دن ایک رات وہ حالت جانچتا رہا۔ واپس گیا تو کہا :

باللیل رھبانٌ و بالیوم فرسانٌ لو سرق ابن ملکھم قطعوا یدہ ولو زنی رجم لاقامۃ الحق فیھم۔	وُہ لوگ رات میں درویش ہیں۔ دن میں شہسوار حق پرستی کا یہ عالم ہے کہ اگر ان کے بادشاہ کا بیٹا چوری کرے تو اس کا ہاتھ کاٹا جائے۔ زنا کرے تو سنگسار کر دیا جائے۔

اب ہم کو یہ بتا دینا چاہیے کہ جو قاصد اثنائے جنگ میں مدینہ سے آیا تھا وہ حضرت ابوبکر کی رحلت کی خبر لے کر پہنچا تھا۔ جو مراسلہ اُس نے دیا تھا وہ حضرت عمرؓ خلیفہ ثانی کا تھا۔ اُس میں حضرت خالد کی معزولی اور حضرت ابوعبیدہ بن الجراح کی سپہ سالاری کا حکم درج تھا۔

مرض الموت ۔ وفات

ساتویں جمادی الآخر ۱۳ھ کو ہوا سرد تھی۔ حضرت ابوبکرؓ نے غسل کیا۔ سردی کے اثر سے بخار ہو گیا۔ یہی بخار انجام کار مرضِ وفات ثابت ہُوا پندرہ روز علیل رہے۔ علالت روز بروز بڑھتی گئی۔ جب مسجد تک آنے کی قوت نہ رہی تو حضرت عمرؓ کو امامت پر مقرر کیا۔ شدتِ مرض کی حالت میں بعض آدمیوں

نے کہا کہ طبیب طلب کر لیا جائے۔ جواب دیا کہ طبیب دیکھ چکا۔ پوچھا: کیا کہا؟
فرمایا: اس کا قول ہے:

اِنِّیْ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ۔ — میں جو ارادہ کر لیتا ہوں کر ڈالتا ہوں۔

مدعا سمجھ کر لوگ چپ ہو رہے۔ ایام علالت اُس گھر میں بسر کیے جو مسجد نبویؐ کے قریب حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا عطا کردہ تھا حضرت عثمانؓ پڑوس میں تھے اس لیے اکثر حاضر باش رہے۔ سختی مرض زیادہ بڑھی تو حضرت ابوبکرؓ کو اپنے جانشین کی فکر ہوئی۔ اور چاہا کہ مسلمانوں کو اختلاف سے بچانے کے لیے اپنا جانشین نامزد کر دیں، اوّل خود سوچا پھر اکابر صحابہ سے مشورہ کیا۔ اور بعد مشورت حضرت عمرؓ کی نسبت رائے قایم کی۔ بعض صحابہ نے جن کو حضرت عمرؓ کی سختی کا اندیشہ تھا اپنا یہ خیال مشورہ کے وقت ظاہر کیا تو جواب دیا کہ عمر کی سختی اس وجہ سے تھی کہ وہ میری نرمی سے واقف تھے۔ میرا تجربہ ہے کہ جب میں غصہ میں ہوتا تو وہ غصہ فرو کرنے کی کوشش کرتے۔ نرمی دیکھتے تو سختی کا مشورہ دیتے۔ بعد مشورہ جب رائے پختہ ہوگئی تو ایک روز حضرت ابوبکرؓ بالاخانے پر تشریف لے گئے۔ شدتِ ضعف کی وجہ سے کھڑے ہونے کی طاقت نہ تھی۔ اُن کی بی بی حضرت اسماؓ بنت عمیس دونوں ہاتھوں سے سنبھالے ہوئے تھیں نیچے آدمی جمع تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے ان کو مخاطب کر کے کہا:

اترضون ممن استخلف علیکم فانی واللہ ما آلوت من جھد الرائ ولا ولیت ذاقرابۃ وانی قد استخلفت عمر بن الخطاب فاسمعوا واطیعوا۔	آیا تم اُس شخص کو پسند کرو گے جس کو میں ولی عہد مقرر کروں اس کو خوب سمجھ لو اور میں بالقسم کہتا ہوں کہ میں نے غور اور فکر کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اور میں نے اپنے کسی قرابت دار کو تجویز نہیں کیا۔ میں عمر بن الخطاب کو اپنا جانشین مقرر کرتا ہوں۔ تم میرا کہنا سُنو اور مانو۔

سب نے کہا:

سمعنا واطعنا۔ — ہم نے سنا اور مانا۔

اس کے بعد نیچے اُتر آئے اور حضرت عثمانؓ کو طلب کر کے کہا: عہد نامہ لکھو۔ چنانچہ حسب ذیل عہد نامہ لکھا گیا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم	بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
ھذا ما عھد ابابکر بن ابی قحافۃ فی آخر عھدہ بالدنیا خارجا منھا وعند اول عھدہ بالاخرۃ داخلا فیھا حیث یومن الکافر ویوقن الفاجر ویصدق الکاذب انی استخلفت علیکم بعدی عمر بن الخطاب	یہ عہد نامہ ابوبکر بن ابی قحافہ کی آخر زندگی کا ہے جبکہ وہ دنیا سے سفر کر رہا ہے اور عالم آخرت کے داخلہ کی پہلی ساعت ہے جہاں کافر مومن بدعقیدہ، عقیدت مند اور جھوٹا صداقت شعار ہو جاتا ہے۔ میں نے عمر ابن الخطاب کو اپنا ولیعہد کیا لہٰذا ان کا حکم سُنو اور مانو

فاسمعوا له واطیعوا وانی لم ال اللہ ورسوله ودینه ونفسی وایاکم الاخیرا فان عدل فذالك ظنی به وعلمی فیه وان بدل فلکل امرما اکتسب والخیرارددت ولا اعلم الغیب وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون والسلامُ علیکم و رحمة اللہ و برکاتهٗ۔

خوب سمجھ لو کہ اس بارہ میں خدا، اس کے رسول، اس کے دین کی خود اپنی اور تمہاری خیرخواہی کا حق ادا کرنے کی میں نے پوری کوشش کی ہے۔ اگر وہ عدل کریں گے تو ان کی نسبت میرا یہی خیال اور علم ہے۔ اگر وہ بدل گئے تو ہر شخص اپنے عمل کا پھل پائے گا۔ نیت میری بخیر ہے غیب کا علم نہیں جو لوگ ظلم کریں گے وہ جلد دیکھ لیں گے کہ وہ کس پہلو پر پلٹا کھائیں گے اور تم پر سلام اور اللہ کی رحمت اور برکتیں۔

اِس عہد نامہ کی تحریر و تشہیر کے بعد ایک شخص نے آکر حضرت ابوبکرؓ سے کہا کہ تم نے عمرؓ کو ولیعہد مقرر کیا ہے حالانکہ تم دیکھتے ہو کہ وہ لوگوں سے تمہارے سامنے کیسا برتاؤ کرتے تھے۔ اُس وقت کیا ہوگا جب وُہ تنہا رہ جائیں گے۔ تم اپنے رب کے پاس جا رہے ہو۔ تم سے رعیت کی بابت سوال کرے گا۔ حضرت صدیق رضؓ اس وقت لیٹے ہوئے تھے۔ یہ کلام سُن کر کہا: مجھ کو بٹھا دو۔ بیٹھ گئے تو کہا:

اما اللہ تخوفنی اذا لقیت قلت استخلفت علیٰ اهلك خیرا هلك۔

کیا مجھ کو خدا سے ڈراتے ہو۔ میں جس وقت اللہ کے سامنے جاؤں گا تو کہوں گا کہ میں تیری اُمت سے بہتر بندہ کو اپنا جانشین مقرر کر آیا ہوں۔

اِس کے بعد حضرت عمرؓ کو تخلیہ میں طلب کیا اور جو سمجھانا تھا وہ سمجھایا۔ پھر ہاتھ اٹھا کر دُعا کی:

اللھم انی لم ارد بذالك الا اصلاحھم وخفت علیھم الفتنة فعملت فیھم بما انت اعلم به واجتھدت لھم رأیا ولیت علیھم خیرھم واقویھم واحرصھم علیٰ ما ارشدھم وقدحضرنی من امرك ما حضرفاخلفنی فیھم فھم عبادك ونواصیھم بیدك اصلح الیھم ولا تھم واجعله من خلفاءك الراشدین واصلح له رعیتهٗ۔

اے اللہ! میں نے یہ انتخاب صرف مسلمانوں کی بہتری کے ارادے سے کیا ہے اور اس اندیشہ سے کہ ان میں فساد نہ ہو۔ میں نے وُہ عمل کیا ہے جس کو تو بہتر جانتا ہے۔ میں نے خوب غور و فکر کے بعد رائے قایم کی ہے بہترین اور قوی ترین شخص کو اپنا ولی عہد کیا ہے جو سب سے زیادہ مسلمانوں کی راست روی کا خواہشمند ہے۔ میرے لیے تو کُوچ کا حکم آچکا۔ اب میں ان کو تیرے سپرد کرتا ہُوں وہ تیرے بندے ہیں اور ان کی باگ تیرے ہاتھ میں ہے اے اللہ ان کے حاکموں کو صلاحیت دے اور ولی عہد کو خلفائے راشدین کے زمرے کر اور اس کی رعیت کو صلاحیت بخش۔

یہ اوپر بیان ہو چکا کہ روانگیِ شام کے وقت حضرت خالد عراق کی امارت مثنیٰ بن حارثہ کے سپرد کر گئے تھے۔ اُن کی روانگی کے بعد اُدھر کسریٰ نے تازہ دم فوجیں بھیجیں اِدھر حضرت ابوبکرؓ کی علالت کے سبب مدینہ سے مراسلت کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ حضرت مثنیٰ نے متردد ہو کر بشیر کو اپنا نائب کیا اور خود مدینہ آ پہنچے۔ جس دن وہ پہنچے حضرت ابوبکرؓ کی حیات کا آخری دن تھا تاہم حالات مفصل سنے اور خطرہ کا اندازہ کر کے حضرت عمرؓ کو بلا بالا اور کہا کہ جو میں کہتا ہوں اسے سنو اور اس پر عمل کرو، مجھ کو توقع ہے کہ آج میری زندگی ختم ہو جائے گی۔ دن میں میرا دم نکلے تو شام سے پہلے اور رات میں نکلے تو صبح ہوتے ہوتے مسلمانوں کو ترغیب دے کر مثنیٰ کی مدد پر آمادہ کرنا۔ کسی مصیبت کی وجہ سے تم کو دین کی خدمت اور حکمِ ربانی کی تعمیل سے نہ رکنا چاہیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت سے بڑھ کر کون سی مصیبت ہو سکتی ہے۔ تم نے دیکھا ہے کہ اس روز میں نے کیا کیا تھا۔ قسم ہے رب کی اگر میں اُس روز حکمِ الٰہی کی بجا آوری میں کوتاہی کرتا تو اللہ ہم کو تباہ کر کے سزا دیتا اور مدینہ میں آگ بھڑک اُٹھتی۔ اگر خدا تعالیٰ شام میں مسلمانوں کو فتح دے تو خالد کے لشکر کو عراق بھیج دینا اس لیے کہ وہ کار آزمودہ اور وہاں کے حالات سے واقف ہے۔ ایک روز دورانِ مرض میں دریافت کیا کہ مجھ کو بیت المال سے کُل وظیفہ اب تک کس قدر ملا ہے۔ حساب کیا گیا تو چھ ہزار درہم ہوئے (پندرہ سو روپیہ تخمیناً) ہدایت کی کہ میری فلاں زمین فروخت کر کے بیت المال کا روپیہ واپس دے دیا جائے۔ چنانچہ وہ زمین بیچ کر روپیہ واپس دے دیا گیا۔ یہ بھی تحقیقات کی کہ بیعت کے بعد میرے مال میں کیا اضافہ ہوا۔ معلوم ہوا کہ ایک حبشی غلام ہے جو بچوں کو کھلاتا ہے اور اسی کے ساتھ مسلمانوں کی تلواروں پر صیقل کرتا ہے۔ ایک اونٹنی ہے جس پر پانی آتا ہے اور ایک سوا روپیہ کی چادر۔ وصیت کی کہ وفات کے بعد یہ سب چیزیں خلیفۂ وقت کے پاس پہنچا دی جائیں۔ رحلت کے بعد جب یہ چیزیں حضرت فاروقؓ کے سامنے آئیں تو روئے اور کہا:

اے ابوبکرؓ! تم اپنے جانشینوں کے واسطے کام بہت دشوار کر گئے۔

قریبِ وفات حضرت عائشہؓ سے پُوچھا:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کتنے پارچہ کا کفن دیا گیا تھا؟

کہا: تین پارچہ کا۔

وصیت کی کہ میرے کفن میں بھی تین کپڑے ہوں، دو یہ چادریں جو میرے بدن پر ہیں دھو لی جائیں، ایک کپڑا نیا لے لیا جائے۔

اُمّ المومنینؓ نے کہا کہ ابا جان! ہم تنگدست نہیں کہ نیا کپڑا نہ خرید سکیں۔

جواب میں فرمایا کہ جانِ پدر! نئے کپڑے بمقابلہ مُردوں کے زندوں کے لیے زیادہ موزوں ہیں۔ کفن تو پیپ لہو کے واسطے ہے۔

انتقال کے روز دریافت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس روز رحلت کی تھی؟

لوگوں نے کہا: دوشنبہ کو۔

سُن کر کہا مجھ کو اُمید ہے میری موت بھی آج ہی ہو۔
وصیت کی کہ میری قبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کے پاس بنائی جائے۔ عین سکرات کے وقت جبکہ دم سینہ میں تھا حضرت عائشہؓ نے حسرت سے یہ شعر پڑھا:

وابیض تستسقی الغمام بوجہہ
ربیع الیتامٰی عصمۃ للارامل

(وہ نورانی صورت جس کے چہرہ کی تازگی سے بادل سیراب ہو، یتیموں پر شفیق، بیواؤں کی پناہ ہے)

آنکھیں کھول دیں اور کہا:

یہ شان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی۔

آخر کلام یہ تھا:

رب توفنی مسلما والحقنی بالصالحین۔ اے رب! تُو مجھ کو مسلمان اُٹھا اور صالحوں سے ملا۔

۲۲۔ جمادی الآخر ۱۳ھ دوشنبہ کا دن گزرنے پر عشاء و مغرب کے درمیان وفات پائی۔ نمازِ جنازہ کی امامت حضرت عمرؓ نے کی اور اسی شب کو حضرت عائشہؓ کے حجرہ میں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کے قریب اس طرح دفن کئے گئے کہ ان کا سر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شانہ کے برابر رہا۔ رضی اللہ عنہ۔ عمر ۶۳ سال کی تھی۔ ایامِ خلافت دو برس تین مہینے گیارہ دن۔

ذاتی حالات قبولِ اسلام کے وقت مالی سرمایہ چالیس ہزار درہم تھا۔ تجارت ذریعۂ معاش تھی۔ اس سرمایہ کو خدمتِ اسلام میں صرف کرتے رہے۔ جب ہجرت کر کے مدینہ کو چلے تو پانچ ہزار درہم باقی تھے، سب ساتھ لے آئے اور مدینہ میں تجارت اور مالی خدمتِ اسلام کا شغل جاری رہا۔ وفات کے وقت نقد ایک حبّہ نہ تھا۔ خلافت کے بعد بھی شغلِ تجارت قائم رہا۔ روزانہ چادریں اپنے کندھے پر لاد کر بازار کو لے جاتے اور خرید و فروخت کرتے۔ چھ مہینے تک یہی عمل رہا۔ جب مشاغلِ خلافت بڑھے اور فرصت مفقود ہوئی تو صحابہ کو جمع کیا اور کہا کہ خلافت کے کاروبار اب تجارت کی مہلت نہیں دیتے اور میں اہل و عیال کی پرورش کا سامان مہیّا نہیں کر سکتا۔ یہ سُن کر صحابہ کرامؓ نے ان کے مصارف خزانہ سے مقرر کر دئے۔ بعد غور معیارِ مصارف مدینہ کے ایک مہاجر کا خرچ رکھا گیا۔ اس میں اختلاف ہے کہ مقدار وظیفہ کی کیا تھی۔ بعض نے کہا ہے کہ آدھی بکری کا گوشت روزانہ، معمولی لباس۔ شرط یہ تھی کہ پرانا لباس بیت المال میں داخل کر دیا جائے۔ بعض نے نقد وظیفہ کا تقرر لکھا ہے۔ نقدی کی مقدار باختلافِ روایت ڈھائی ہزار درہم سالانہ سے چھ ہزار درہم تک بتائی گئی ہے۔ میں کم و بیش ڈھائی ہزار کو ترجیح دیتا ہوں۔ وجہ یہ کہ وفات کے وقت جو حساب وظیفہ کا کیا گیا اُس کے بموجب کچھ اُوپر سوا دو سال کا وظیفہ چھ ہزار درہم ہوا۔

خلافت سے پہلے سُنح میں رہتے تھے۔ وہیں اُن کی بی بی حضرت حبیبہ خارجہ انصاریہ کی سکونت تھی۔ ایک کمل کا حجرہ

(چھوٹا تیمیہ یا راوٹی) مکان کی بساط صرف اسی قدر تھی۔ چھ مہینے تک زمانۂ خلافت میں بھی اُسی میں قیام رہا۔ جس روز وہاں جانے کی باری ہوتی جاتے۔ اکثر پیدل کبھی اپنے ذاتی گھوڑے پر، عشا کے بعد جاتے صبح کو واپس آ جاتے۔ خلافت سے پہلے محلہ کی لڑکیاں اُن کے پاس بکریاں لاتیں اور وہ دُودھ دوہ دیتے۔ جب خلیفہ ہو کر محلے میں گئے تو لڑکیوں نے دیکھ کر کہا اب یہ دُودھ نہیں دوہیں گے۔ سُن کر کہا: ضرور دوہوں گا۔ مجھ کو خدا کی ذات سے اُمید ہے کہ اس منصب سے میری کسی عادت میں فرق نہیں آئے گا۔ چنانچہ جب محلہ میں آتے تو دریافت کرتے: دُودھ دوہ دُوں یا بکریاں چرا لاؤں۔ جیسا لڑکیاں کہہ دیتیں اس کے مطابق تعمیل کرتے۔ خود اُن کی بکریاں بھی تھیں۔ کبھی کبھی اُن کو بھی لیجا کر چَرا تے۔ شفقت کا یہ عالم تھا کہ جب محلے میں نکلتے تو بچے بابا بابا کہہ کر دوڑتے اور آ کر لپٹ جاتے۔ جُمعہ کے دن صبح کو سُنح میں ٹھہر کر سر اور داڑھی میں سُرخ خضاب لگاتے، غسل کرتے، کپڑے بدل کر مدینہ آتے اور نمازِ جمعہ پڑھاتے۔ چھ مہینے کے بعد سُنح کی سکونت ترک کر کے مدینہ کے مکان میں متصل مسجدِ نبوی سکونت اختیار کی۔ اُن بزرگوں کی روزانہ زندگی کا اندازہ اس حدیث سے ہوتا ہے:

ایک روز حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو مخاطب کر کے دریافت فرمایا:

"آج تم میں سے روزہ کس نے رکھا؟"

حضرت ابوبکرؓ: "میں نے۔"

"جنازہ کے ساتھ کون گیا؟"

حضرت ابوبکرؓ: "میں۔"

"محتاج کو کھانا کس نے کھلایا؟"

حضرت ابوبکرؓ: "میں نے۔"

"بیمار کی عیادت کس نے کی؟"

حضرت ابوبکرؓ: "میں نے۔"

سُن کر ارشاد فرمایا: "یہ اوصاف جس میں جمع ہوں گے وہ جنتی ہے۔"

مدینہ کے کنارہ پر ایک بُڑھیا اندھی محتاج رہتی تھی۔ حضرت عمرؓ ہمیشہ اُس کے یہاں اس ارادہ سے جاتے کہ کچھ خدمت کریں۔ مگر جب پہنچتے تو معلوم ہوتا کہ کوئی آدمی اُن سے پہلے آ کر خدمت کر گیا۔ ایک روز دروازے میں چھپ کر کھڑے ہو گئے۔ وقتِ مقررہ پر وہ شخص آیا۔ دیکھا تو حضرت ابوبکرؓ تھے۔ یہ خلافت کا زمانہ تھا۔ مقررہ وظیفہ کے خرچ میں کس قدر احتیاط تھی اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیجئے:

ایک روز ان کی بی بی نے شیرینی کی فرمائش کی۔ جواب دیا: میرے پاس کچھ نہیں۔ انہوں نے کہا کہ اجازت ہو تو میں خرچ روزمرہ میں سے کچھ دام بچا کر جمع کر لوں۔ فرمایا: جمع کر لو۔ کچھ روز میں چند پیسے جمع ہو گئے تو حضرت ابوبکرؓ کو دیئے کہ شیرینی لا دو۔ پیسے لے کر کہا: معلوم ہوا کہ یہ خرچ ضروری سے زیادہ ہیں، لہٰذا بیت المال کا حق ہیں۔ چنانچہ وہ پیسے خزانہ میں

جمع کرا دیے اور اُسی قدر اپنا وظیفہ کم کر دیا۔ مُنہ پر کوئی تعریف کرتا تو کہتے :

اے اللہ ! تو میرا حال مجھ سے بہتر جانتا ہے۔ اور تعریف کرنے والوں سے مَیں اپنا حال بہتر جانتا ہوں۔ جو ان کا گمان میری نسبت ہے اس سے اچھا مجھ کو کر دے اور میرے وہ گناہ بخش دے جن کو یہ نہیں جانتے۔ اور جو یہ کہتے ہیں اس کا مواخذہ مجھ سے مت کیجیو۔

اپنا سب کام خود اپنے ہاتھ سے کرتے تھے۔ دُوسروں سے کام لینے سے سخت احتراز تھا۔ انتہا یہ کہ اُونٹ کی نکیل ہاتھ سے گر پڑتی تو خود اُتر کر نکیل اٹھاتے۔ ایک بار لوگوں نے کہا کہ آپ ہم سے کیوں نہیں کہتے ؟ جواب دیا کہ :

ان حبیبی صلی اللہ علیہ وسلم امرنی ان لا اسئل الناس شیئاً۔	میرے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کا مجھ کو حکم ہے کہ انسان سے میں کچھ نہ مانگوں۔

حلیہ شریف

رجل ابیض نحیف خفیف احنی لا یستمسك ازارہ یسترخی عن حقوتیہ معروق الوجہ غائر العینین ناتی الجبھۃ عاری الاشاجع حسن القامۃ۔	گورے چٹے دُبلے پتلے آدمی تھے، کمر جھکی ہوئی تھی، تہمد کمر پر نہیں رک سکتا تھا نیچے کو کھسک جاتا تھا، چہرہ سُتا ہوا، آنکھیں بیٹھی ہوئیں، پیشانی بلند، انگلیوں کے جوڑ گوشت سے خالی، قد موزوں۔

امام زہری کا قول ہے کہ بال گھونگر والے تھے، آواز دردناک تھی۔ بات بہت کم کرتے تھے۔ جو کہتے سنجیدہ کہتے۔ اندازِ کلام ذوق و محویت کی شان لیے ہوئے تھا۔ قلب نہایت رقیق و نرم تھا۔ اسی لیے اوّاہ لقب تھا۔ سخی، باوقار، حلیم و شجاع تھے۔ رائے نہایت سدید و صائب تھی۔ اس کا جوہر وہ نورِ ایمانی تھا جس کا نام اصطلاحِ شرع میں فراستِ مومن ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحب ازالۃ الخفاء میں لکھتے ہیں :

(خلاصۃً) حضرت ابوبکرؓ علمِ کتاب و سنّت میں مثل دیگر علمائے صحابہؓ تھے۔ جس صفت میں سب سے ممتاز تھے وُہ یہ تھی کہ جب کوئی مشکل مسئلہ یا مشورہ پیش آتا وُہ اپنی فراست کو اس پر غور کرنے میں صرف کرتے۔ خداوند تعالیٰ غیب سے ایک شعاع اُن کے دل پر ڈالتا جس سے حقیقتِ حال روشن ہو جاتی۔ اِس شعاع کا ظہور لطیفۂ قلبیہ سے ہوتا۔ لہٰذا حقیقتِ حال بصورتِ عزیمت ظاہر ہوتی، نہ برنگِ تخیل۔"

اصولِ حکومت بنیادِ حکومت قرآن و حدیث تھی۔ جب کوئی معاملہ پیش آتا اوّل قرآن کی طرف رجوع کرتے۔ اگر کلامِ مجید میں نہ ملتا حدیث کی طرف توجہ کرتے۔ اگر خود حدیث نہ معلوم ہوتی مجمع میں آکر دریافت کرتے

کہ فلاں معاملہ میں کسی کو حدیث یاد ہے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ بہت سے آدمیوں کو حدیث معلوم ہوتی اس پر شکر کرتے کہ میری مدد کے واسطے اس قدر سنتِ رسولؐ کے جاننے والے موجود ہیں۔ جب حدیث بھی نہ ملتی تو صحابہؓ میں جو اہل الرائے اور منتخب بزرگ تھے اُن کو جمع کر کے مشورہ کرتے جس رائے پر اجماع ہو جاتا اُسی پر کاربند ہوتے۔ اسلام نے جو مساوات کی رُوح پھونکی تھی اُس کو آخر عہد تک نہایت اہتمام سے قایم رکھنے کی کوشش کی۔ بیت المال کی آمدنی مساوی طور پر تقسیم کی جاتی تھی، اُس میں جوان، بُوڑھے، مرد یا عورت کا کچھ امتیاز نہ تھا۔ اُن کا قول تھا:

لا یحقرن احد کو احداً من المسلمین	تم میں سے کوئی شخص کسی مسلمان کو حقیر نہ سمجھے اس لیے
فان صغیر المسلمین عند اللہ اکبر۔	کہ چھوٹا سا مسلمان (بھی) اللہ کے نزدیک بڑا ہے۔

ایک مرتبہ مجمع میں بیٹھے تھے ایک شخص نے آکر کہا:

"السلام علیکم یا خلیفۃ رسول اللہ!"

سُن کر کہا:

"تمام مجمع میں خصوصیت کے ساتھ مجھ کو سلام کیوں کیا؟"

خلافت کے بعد جب اوّل مرتبہ ادائے عمرہ کے واسطے مکہ گئے تو لوگ ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگے سب کو علٰحدہ کر دیا اور کہا اپنی اپنی راہ چلو۔ شانِ تکبر سے ہمیشہ احتراز رکھا۔

ایک مرتبہ ایک فاتح امیر نے نامۂ فتح کے ساتھ دشمن کا سر بھیجا تو بہت ناخوش ہُوئے۔ لانے والے نے عذر کیا کہ ہمارے دشمنوں کا یہی طرزِ عمل ہے۔

فرمایا کہ ہم روم و فارس کے مقلد نہیں۔

اس کے بعد عام ہدایت کی کہ آیندہ صرف فتح کی خبر بھیجی جائے دشمن کا سر نہ بھیجا جائے۔ عُمّال کی بابت یہ اصول تھا کہ جو عامل حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر کردہ تھے وہ بدستور قایم و برقرار رہے۔ سادگی اسلام کو ہمیشہ اپنا شعار رکھا۔ اُس سادگی و وقار پر ہزار تکلف اور شان و شوکت نثار تھے۔ اہلِ ارتداد کے مقابلے سے جب اسلام کے لشکر لوٹے تو اُن کے ہمراہ ذوالکلاع حمیری بھی یمن سے آئے یہ اس شاہی خاندانِ حمیر کی یادگار تھے جو مدتوں یمن پر جاہ و جلال کے ساتھ فرمانروا رہ چکا تھا۔ شاہی خاندان کے دورِ آخر کے تکلفات و ناز و نعمت کا پُورا جلوہ ذوالکلاع میں نظر آتا تھا۔ سر پر جواہر نگار تاج تھا بدن میں زرّیں پوشاک، طلائی پٹی کمر میں، ہمراہی بھی زرق برق لباس میں تھے۔ مدینہ آکر خلیفہ کو دیکھا تو گیروا چادریں ایک باندھے ایک اوڑھے، اسلامی وقار و تمکین کا رفتہ رفتہ یہ اثر ہُوا کہ ذوالکلاع نے لباسِ شاہی چھوڑ کر دلق درویشی اختیار کر لی۔

ایک روز مدینہ کے بازار میں نکلے تو کمر سے چمڑے کی معمولی پٹی بندھی تھی، ایک ہمراہی نے دیکھ کر حسرت سے کہا کہ یہ کیا شکل بنا لی؟ جواب دیا کہ اسلامی اثر سے لایعنی تکلفات بے لطف ہو گئے۔

عُمّال و کاتب حضرت ابو عبیدہؓ بن الجراح خزانہ کے مہتمم تھے اور جزیہ کی آمدنی کا حساب اُن کے سپرد تھا۔ بیعت کے بعد اُنہوں نے کہا کہ مال کا کام خلیفہ کی طرف سے میں انجام دُوں گا۔ خزانہ جب تک حضرت ابو بکرؓ سُنح میں رہے وہاں رہا، قفل پڑا رہتا تھا، پہرہ نہ تھا، لوگوں نے کہا کہ پہرہ رکھئے۔ تو جواب دیا: قفل کافی ہے۔ جب مدینہ کی سکونت اختیار کی تو خزانہ مدینہ چلا آیا۔

قاضی حضرت عمرؓ تھے۔ اُس عہد کی صفائی معاملات کا یہ عالم تھا کہ ایک سال تک ایک مدعی بھی حضرت عمرؓ کے سامنے نہ آیا۔ کاتب حضرت زیدؓ بن ثابت، حضرت علی مرتضیٰؓ، حضرت عثمانؓ تھے۔ معمولی خط و کتابت کا کام جو حاضر ہوتا اُس سے لے لیا جاتا۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اُس زمانے میں اِن خدمات کا معاوضہ لینا سخت بُرا سمجھا جاتا تھا۔ جو کام کرتے محض حسبۃً للہ۔

عُمّال

مقامِ حکومت	نام عامل	مقامِ حکومت	نام عامل
مکّہ (حجاز)	عتاب بن اُسید	طائف (حجاز)	عثمان بن ابی العاص
صنعاء (یمن)	مہاجر	حضرموت (یمن)	زیاد بن لبید انصاری
خولان 〃	یعلیٰ بن منبہ	زبید و زمع 〃	حضرت ابو موسیٰ اشعری
جند 〃	حضرت معاذ بن جبل	بحرین 〃	علاؑ حضرمی
نجران 〃	جریر بن عبداللہ	دومۃ الجندل (عراق)	عیاض بن الغنم
عراق	مثنیٰ بن حارثہ	ثور (بلاد مزینہ)	جرش

علمی کمالات و علمی خدمات **قرآن**: قرآن شریف بطور وحی تئیس برس تک تھوڑا تھوڑا حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتا رہا۔ بہت سے صحابہ کرامؓ ایسے تھے جن کو کلام مجید پُورا حفظ تھا۔ نہایت کثرت سے ایسے جن کو مختلف حصّے یاد تھے جب وحی نازل ہوتی تھی تو حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کاتبانِ وحی میں سے کسی کو طلب فرماتے اور لکھوا دیتے۔ حضرت زید بن ثابت کو یہ سعادت اکثر حاصل ہوتی۔ کاغذ نایاب تھا اس لیے علاوہ کاغذ کے وحی چمڑے کے ٹکڑوں، کھجور کی چھال، بکری کے شانہ کی ہڈی، سپید پتھر کے ٹکڑوں پر بھی لکھی جاتی اور یہ لکھے ہوئے اجزا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس محفوظ رہتے۔ ع

عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد

یمامہ کے پُرشر معرکہ سے یہ نتیجہ خیز نکلا کہ کلامِ مجید ایک جگہ تحریر ہو کر بشکل کتاب محفوظ ہوگیا۔ اُوپر سُن چکے ہو کہ معرکہ مذکور

میں کس کثرت سے مہاجرین و انصار شہید ہوئے ان میں کثرت سے ایسے تھے جو کُل یا جُز قرآن کے حافظ (قرا) تھے۔ حضرت عمرؓ نے اس واقعہ سے متاثر ہو کر حضرت ابوبکرؓ سے کہا کہ مسلمانوں کو ابھی بہت سے معرکے سر کرنے ہیں۔ اگر ہر معرکے میں اسی کثرت سے حافظ شہید ہُوئے تو قرآن کا خدا حافظ ہے۔ آپ حکم دیجئے کہ کلام مجید ایک جگہ ضبط تحریر میں آجاوے۔ اوّل حضرت صدیقؓ نے اس بنیاد پہ تامّل کیا کہ جو فعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا کس طرح کریں۔ مگر بحث کے بعد حضرت ابوبکرؓ پر منکشف ہو گیا کہ حضرت عمرؓ کی رائے صحیح ہے۔ حضرت زید بن ثابت کو طلب کر کے اوّل اپنی اور حضرت عمرؓ کی گفتگو کا اعادہ کیا۔ پھر کہا تم جوان ذی ہوش ہو کوئی الزام تم پر نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں وحی لکھا بھی کرتے تھے۔ لہٰذا تم کلام مجید لکھ کر ایک جگہ جمع کر دو۔ اوّل حضرت زید بن ثابت کو بھی وہی تامّل ہُوا جو حضرت صدیقؓ کو ہوا تھا۔ لیکن مباحثہ کے بعد اطمینان ہو گیا اور انہوں نے خدمت قبول کی۔ حضرت زیدؓ کا مقولہ ہے کہ:

اگر پہاڑ کو اٹھا کر ایک جگہ سے دُوسری جگہ رکھ دینا میرے سپرد کیا جاتا تو وہ آسان ہوتا بمقابلہ اس کے جمع قرآن کا بوجھ میرے سر پر رکھا گیا۔

اِس سے اُس احساس کا اندازہ ہو سکتا ہے جو حضرت زید بن ثابت کو خدمتِ مفوضہ کی ذمہ داری کا تھا۔ کاشانۂ نبوت سے تحریر شدہ اجزا برآمد کیے گئے۔ مزید احتیاط و غایت اہتمام صحت کے لحاظ سے حضرت زید بن ثابت اُن اجزا کا مقابلہ بار بار اُن صحابہ سے کرتے جن کو کل یا جُز کلام مجید یاد تھا۔ اور جب کوشش کا کوئی دقیقہ باقی نہ رہتا تب کاغذ پر نقل کرتے۔ غرض اسی جانفشانی و تحقیق کے ساتھ حضرت زید بن ثابت نے تمام کلام مجید کاغذ پر لکھ کر ایک جگہ جمع کر دیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس کا نام "مصحف" رکھا۔ یہ نسخہ خاص حضرت ابوبکرؓ کی تحویل میں رہا۔ حضرت ابوبکرؓ خود بھی حافظ قرآن تھے اور حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں کاتبانِ وحی کے زُمرہ میں شامل۔ لکھنا اُس زمانہ میں اِس قدر کم یاب تھا کہ قریش کے اتنے بڑے قبیلے میں بقول علامہ بلاذری آغازِ اسلام میں صرف ستّرہ آدمیوں کو لکھنا آتا تھا۔ زمانۂ خلافت میں جو اشکال معانی کلام مجید کے متعلق پیش آیا اُس کو حل کیا۔

حدیث: متعدد احادیث ایسی ہیں جو حضرت ابوبکرؓ کے سوال کے جواب میں ارشاد ہوئیں۔ اس طرح وہ ان کے عالمِ وجود میں آنے کے باعث ہُوئے۔ ایک سو بیالیس حدیثیں بہ روایت حضرت صدیقؓ مروی ہیں۔ ان کو امام سیوطیؒ نے تاریخ الخلفا میں ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔ قلتِ روایت کے اسباب شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے یہ لکھے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بہت کم زندہ رہے، وہ تھوڑا زمانہ بھی اور قسم کی مہمات کے طے کرنے میں گزر گیا۔ اُن کے معاصر قریباً سب صحابہؓ تھے۔ جو خود عالمِ حدیث و روایتِ حدیث سے مستغنی تھے۔ تابعین بہت ہی کم تھے۔ واقعات بھی زیادہ پیش نہیں آئے۔ باوجود قلت روایت کے اُمّہاتِ مسائل میں حضرت ابوبکرؓ کی روایتیں سند ہیں۔ مثلاً طریقۂ نماز حضرت ابوبکر سے ابنِ زبیر نے حاصل کیا اُن سے امام عطا نے، ان سے ابن الجریج نے۔ ابن الجریج کی نسبت یہ قول ہے کہ اُن کے زمانہ میں ان سے بہتر نماز کا ادا کرنے والا نہ تھا۔ اہلِ مکہ ادائے نماز میں طریقہ صدیقیہ کے پابند تھے۔ زکوٰۃ کی مقادیر کی بابت سب سے زیادہ مستند

روایت حضرت صدیقؓ کی ہے۔

فقہ : فقہ کے متعلق اجتہاد کا قاعدہ مقرر کیا جو سارے مجتہدوں کا دستور العمل بن گیا۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے لکھا ہے کہ:

"وے رضی اللہ عنہ، شیخ و استاد جمیع مجتہدین شد بوضع ایں قاعدہ"

فقہ کے جو مشکل مسائل پیش آئے ان کو حل کیا۔ مثلاً میراث جدّہ، میراث جد، تفسیر کلالہ، حدِ شرب خمر۔ مہم شام کی روانگی کے وقت جو احکام اُمرائے لشکر کو دیے وہ صدیوں تک اُمرائے اسلام کا دستور العمل رہے۔

تعبیرِ رؤیا : یہ بھی ایک علمِ الٰہی ہے جس کا ادراک جدید روشنی میں مشکل ہے۔ وجہ یہ کہ جو لوگ نہیں سمجھتے یا نہیں سمجھا سکتے وہ نور و صفائی باطن سے محروم ہیں جس کی ضرورت اِس فن کے لیے ہے بہرحال فنِ تعبیر کے امام ابن سیرین کا قول ہے:

کان ابوبکر اعبر ھذہ الامۃ بعد النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔	آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس امت میں ابوبکر فنِ تعبیر میں سب سے زیادہ ماہر تھے۔

تصوّف : سب سے اوّل تصفیہ و تزکیۂ باطن کے واسطے کلمہ طیّبہ کا طریقہ ذکر حضرت ابوبکرؓ نے تلقین کیا۔ حضرت جنیدؒ کا قول ہے کہ توحید میں بزرگ تر کلام حضرت ابوبکر صدیقؓ کا یہ مقولہ ہے:

سبحان من لم یجعل لخلقہ سبیلا الا بالعجز۔	پاک ہے وہ ذات جس نے اپنی مخلوق کے لیے سوائے عجز کے کوئی رستہ نہیں بنایا۔

کشف المحجوب میں ہے طریقۂ تصوف کے امام ابوبکرؓ ہیں انقطاع عن الاغیار جو جانِ تصوف ہے اُن کے اس خطبے سے عیاں ہے:

اِلاَّ مَنْ كَانَ يَعْبُدُ مُحَمَّدًا الخ

محبتِ دنیا سے پاک و صاف ہونے کا شاہد غزوۂ تبوک کا وہ واقعہ ہے:

ما خلفت لعیالك، قال اللہ ورسولهٗ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: اہل و عیال کے لیے کیا چھوڑ آئے؟ کہا: اللہ اور اس کا رسول۔

شاہ ولی اللہؒ نے تصوّفِ صدّیقی کے ذیل میں حضرت صدّیق اکبرؓ کے اُن تمام اوصاف کی تفصیل کی ہے جو اساسِ تصوّف ہیں۔ مثلاً:

توکّل، احتیاط، تواضع، خدا کی مخلوق پر شفقت، رضا، خوفِ الٰہی۔

جو صاحب شایقِ تفصیل ہوں ازالۃ الخفاء دیکھیں۔ ہم مضمون کے عام فہم نہ ہونے کے سبب زیادہ تفصیل سے نہیں لکھتے۔ صرف خوفِ الٰہی کی ایک مثال پر اکتفا کرتے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے ایک روز درخت پر ایک چڑیا دیکھی تو حسرت سے کہا:

طوبٰی لك یا طیر تاکل من شجرۃ و تستظل من شجرۃ و تصیر الی غیر	اے پرندے! خوشحال ہے تُو پھل کھاتا ہے۔ درخت کے سایہ میں بسر کرتا ہے۔ حساب کتاب کا کچھ کھٹکا

حساب یالیت ابا بکر مثلك۔	نہیں۔ کاش، ابوبکرؓ تجھ سا ہوتا۔

نماز میں خشیتِ الٰہی کا یہ عالم ہوتا کہ ایک چوبِ خشک کی طرح کھڑے ہوتے۔ طریقۂ نقشبندیہ جو آج تک عالم میں فیض رساں ہے، اُس کا سلسلہ بواسطۂ حضرت امام جعفر صادق حضرت ابوبکر صدیقؓ تک پہنچتا ہے۔

عقائد: عقائد کے متعلق حضرت ابوبکرؓ نے سب سے اوّل توحید رسالت کا امتیاز علی الاعلان اُس وقت ظاہر کیا جب کہ خود صحابۂ کرامؓ متحیر تھے۔ یعنی بعد وفات حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم اس موقع کا خطبہ قیامت تک یادگار رہے گا۔ بعد بعیت رسالت و خلافت کے حدود و صاف صاف علٰحدہ قایم کر دیے۔ خلیفہ ہونے کے بعد ایک خطبہ خاص اس مبحث کے متعلق دیا۔ اُس میں بوضاحت بیان کیا کہ دو باتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص تھیں وہ مجھ سے طلب نہ کرنا۔ ایک وحی دُوسری عصمت۔ اس کو اس کثرت کے ساتھ خطبوں میں ظاہر کیا کہ سامعین کے ذہن میں راسخ ہوگیا۔ علاوہ خطبوں کے اور مواقع پر بھی اُس کا لحاظ اہتمام کے ساتھ رکھا۔ کسی نے ان سے کہا "خلیفۃ اللہ" تو کہا:

اناخلیفه رسول الله وانا به راض۔	میں رسول اللہؐ کا خلیفہ ہوں اور اسی سے خوش ہوں۔

ایک بار کسی پر غصّے ہو رہے تھے ایک شخص نے کہا حکم ہو تو اُس کی گردن اڑا دوں۔ فوراً کہا کہ یہ رتبہ خدا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا تھا۔ واقعاتِ وفات میں پڑھ چکے ہو کہ شدّتِ سکرات میں جب ایک مدحیہ شعر اُن کی شان میں پڑھا گیا تو آنکھیں کھول کر کہہ دیا کہ یہ شان رسول اللہؐ کی تھی۔ زکوٰۃ اور نماز میں جو تفریق قایم کرنے کی کوشش کی گئی اُس کو آغازِ خلافت میں کس شدّت سے روکا۔

علمِ انساب شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے لکھا ہے کہ آج انسابِ قریش کے متعلق جس قدر علم ہے وُہ بروایت زبیر بن بکار محفوظ ہے۔ انھوں نے مصعب زبیری سے حاصل کیا مصعب نے بہ یک واسطہ مطعم بن جبیر سے مطعم نے حضرت ابوبکر سے۔

بلاغتِ خطب مورخین کا قول ہے کہ صحابۂ کرام میں فصاحت خطبہ میں دو صحابی سب سے ممتاز تھے، ایک حضرت ابوبکرؓ، دُوسرے حضرت علی مرتضٰی۔

بعض مقولے:

لا یحقرن احد کم احداً من المسلمین فان	تم میں سے کوئی شخص کسی مسلمان کو حقیر خیال نہ کرے
صغیرالمسلمین عند الله اکبر وجدنا	اس لیے کہ چھوٹا سا مسلمان بھی خدا کے نزدیک بڑا ہے
الکرم فی التقوٰی و الغناء فی الیقین و	ہم نے بزرگی تقوٰی میں اور بے نیازی یقین میں اور
الشرف فی التواضع۔	عزّت تواضع میں دیکھی۔

ایک خطبے میں حدیث کے یہ الفاظ بیان کیے تھے جو آجکل ہر مسلمان کا دستور العمل بننے چاہئیں۔

ولا تقاطعوا ولا تباغضوا ولا تحاسدوا	باہم قطع تعلق مت کرو، بغض نہ رکھو، حسد مت کرو

وکونوا عباد اللہ اخوانا کما امرکم۔ | اور اے اللہ کے بندو! بھائی بھائی ہو جاؤ جیسا کہ تم کو حکم ہے۔

حضرت خالد بن ولید کو ایک موقع پر نصیحت کی:

فرمن الشرف یتبعك الشرف واحرص علی الموت توھب لك الحیوٰۃ۔ | جاہ و عزت سے بھاگو عزت تمہارے پیچھے پھرے گی موت پر دلیر رہو تم کو زندگی بخشی جائے گی۔

محبتِ رسولؐ حضرت صدیق اکبر محبتِ رسولؐ میں غرق تھے۔ حضرت عروہ نے روایت کی ہے کہ حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے دوسرے سال حضرت ابوبکرؓ نے ایک روز خطبہ دیا اُس میں یہ الفاظ زبان سے نکلے:

انی سمعت نبیکم صلی اللہ علیہ وسلم عام الاوّل۔ | یعنی میں نے تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پارسال سنا ہے۔

پارسال کے لفظ سے حادثۂ وفات یاد آ گیا، بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور بیتاب ہو گئے۔ سنبھل کر پھر خطبہ کا سلسلہ درست کیا۔ پھر ان الفاظ سے دل پر چوٹ لگی اور مضطرب ہو گئے۔ تیسری دفعہ ضبط کی کوشش کی اور خطبہ ختم کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی انّا حضرت اُمّ ایمن کے پاس تشریف لیجایا کرتے تھے۔ بعد خلافت حضرت ابوبکرؓ نے ایک روز حضرت عمرؓ سے کہا:

انطلق بنا الی ام ایمن نزورھا کما کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یزورھا۔ | چلو سنّتِ نبویؐ کی پیروی کریں اور ام ایمن سے چل کر مل لیں۔

وہاں پہنچے تو وہ رونے لگیں۔ دونوں نے کہا:

روتی کیوں ہو! اللہ کا تقرب اُس کے رسول کے واسطے بہتر ہے۔

کہا: یہ میں بھی جانتی ہوں، صدمہ اس کا ہے کہ وحی آسمانی کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

یہ سُن کر دونوں صاحب رونے لگے۔

امام سیوطیؒ نے لکھا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کا اصلی سببِ وفات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت تھی۔ اس صدمے سے گھلتے رہے یہاں تک کہ انتقال ہو گیا۔

ازواج و اولاد حضرت ابوبکرؓ نے چار شادیاں کیں، دو زمانۂ جاہلیت میں دو بعد از اسلام۔ ایامِ جاہلیت کی بیبیاں قتیلہ اور ام رومان تھیں۔ قتیلہ قبیلۂ بنی عامر سے تھیں۔ اسلام سے مشرف نہیں ہوئیں۔ ام رومان مالک بن کنانہ کی اولاد سے تھیں، اسلام لائیں۔ ہجرت کے وقت حضرت ابوبکرؓ ان کو مکہ میں چھوڑ گئے تھے۔ چند روز کے بعد مدینہ بلا لیا۔ ذی الحجہ ۶ھ میں بمقام مدینہ رحلت کی۔ حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دستِ مبارک سے دفن کیا۔ زمانۂ اسلام

ہیں، ایک شادی اُمّ رومان کی وفات کے بعد اسماء بنت عمیس سے ۸ھ میں کی۔ دُوسری شادی حبیبہ بنت خارجہ انصاریہ سے۔ حضرت ابوبکرؓ کی وفات کے وقت یہ دونوں بیبیاں زندہ تھیں۔ اولاد تین لڑکے اور تین لڑکیاں۔ اولاد میں سب سے بڑے حضرت عبدالرحمٰن اُمّ رومان کے بطن سے ۵۳ھ میں وفات پائی۔ دُوسرے لڑکے عبداللہ قتیلہ کے بطن سے۔ غزوہ طائف میں حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب شریک تھے۔ تیر کا زخم پاؤں میں لگا۔ اُس کے صدمہ سے شوال ۱۱ھ میں انتقال ہوا۔ تیسرے لڑکے محمد ہیں۔ یہ مدینہ میں پیدا ہوئے۔ اُن کی والدہ اسمأ بنت عمیس تھیں۔ قاسم ان کے صاحبزادے تھے جو فقہائے سبعہ میں ہیں۔ لڑکیوں میں سب سے بڑی حضرت اسماء تھیں۔ اُن کی والدہ قتیلہ۔ حضرت زبیر کے ساتھ شادی ہُوئی۔ سترہ آدمیوں کے بعد دائرۂ اسلام میں شامل ہوئیں۔ دوسری لڑکی ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا تھیں، حضرت عبدالرحمٰن کی حقیقی بہن، تمام ازواجِ مطہرات میں حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو زیادہ محبوب تھیں، اُن کا علم و فضل مسلّم ہے۔ حافظ ابنِ حجر نے اصابہ میں لکھا ہے کہ جو آٹھ بزرگ صحابۂ کرام میں اجتہاد و فقہ میں ممتاز تھے اُن میں حضرت عائشہؓ بھی تھیں۔ تیسری لڑکی ام کلثوم ہیں، ان کی والدہ بنت خارجہ اپنے والد کی وفات کے بعد پیدا ہوئیں۔ لڑکوں میں سلسلۂ نسل حضرت عبدالرحمٰن اور محمد سے چلا۔ حضرت عبداللہ کا سلسلہ ختم ہوگیا۔

باب[1] سوم

فضائل

اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ اس تیرہ سو برس کے عرصے میں کتنی کروڑ مرتبہ خطیبوں نے برسرِ منبر حضرت ابوبکرؓ کے افضل البشر بعد الانبیاء بالتحقیق ہونے کا اعلان کیا ہے اور اس طرح اُن کی فضیلت کی سچی شہادت علیٰ رؤس الاشہاد ادا کی ہے آج بھی چار دانگِ عالم میں جہاں جہاں اہلِ حق ہیں یہ پُرعظمت صدا ہر جمعہ کو لاکھوں منبروں پر بلند ہوتی ہے۔

فضائلِ صدیقی کی بنیاد تین شہادتوں پر ہے:

۱۔ آیاتِ کلامِ مجید

۲۔ احادیثِ نبویؐ اور

۳۔ اقوالِ صحابہ کرام و اہلبیت اطہار و سلف صالحین رضی اللہ عنہم اجمعین۔

---

[1] اس باب کا ماخذ کتبِ ذیل ہیں:

(۱) تاریخ الخلفاء امام جلال الدین سیوطیؒ (۲) ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ دہلوی (۳) الصلوٰۃ الہامیہ سید مصطفیٰ بن کمال الدین خلوتیؒ (۴) الاصابہ امام ابن حجر عسقلانیؒ (۵) الاستیعاب حافظ ابن عبدالبر (۶) الریاض النضرۃ محب الدین طبریؒ۔

اسی ترتیب سے ہم فضائل بیان کرتے ہیں،

آیاتِ کلام مجید (۱) والیل اذا یغشٰی ○ والنہار اذا تجلّٰی ○ وما خلق الذکر والانثٰی ○ ان سعیکم لشتّٰی ○ فاما من اعطٰی واتقٰی ○ وصدق بالحسنی فسنیسرہ للیسرٰی ○

قسم رات کی جب ڈھانک لے اور دن کی جب روشن ہو۔ نر اور مادہ پیدا کرنے کی ضرور تمہاری کوشش قسم قسم کی ہے۔ جس نے دیا اور پرہیزگار رہا اور سچ مانا اچھی بات کو تو ہم اس کو آہستہ آہستہ آسانی میں پہنچائیں گے۔

وسیجنبہا الاتقی ○ الذی یؤتی مالہ یتزکّٰی ○ وما لاحد عندہ من نعمۃ تجزٰی ○ الا ابتغاء وجہ ربہ الاعلٰی ○ ولسوف یرضٰی ○

اور سب سے زیادہ پرہیزگار جہنم کی آگ سے بچایا جائے گا جو دیتا ہے اپنا مال تزکیۂ باطن کے لیے۔ اور نہیں اس پر کسی کا احسان جس کا بدلہ دیا جائے۔ مگر اپنے رب اعلیٰ کی خوشنودی کے واسطے دیتا ہے اور وہ ضرور آیندہ خوش ہوگا۔

مفسرین نے بالاتفاق لکھا ہے کہ جب حضرت ابوبکرؓ نے راہِ خدا میں حضرت بلال وغیرہ کو (جو اسلام لانے کی وجہ سے اپنے کافر آقاؤں کے پنجۂ عذاب میں گرفتار تھے) خرید خرید کر آزاد کیا تو ایک روز ان کے والد ابو قحافہ نے کہا کہ "جانِ پدر! میں دیکھتا ہوں کہ تم کمزور اور حقیر غلاموں کو مول لے کر آزاد کرتے ہو۔ کاش! تم قوی اور کام کے آدمیوں کو آزاد کرتے تو وہ تمہارے کام آتے اور پشت و پناہ بنتے۔"

حضرت ابوبکرؓ نے یہ سُن کر جواب دیا کہ "ابّا جان! میں صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا طالب ہوں۔"

اِس پر آیاتِ بالا نازل ہُوئیں۔

امام ابنِ جوزی نے لکھا ہے کہ:

"اجماعِ اُمت اس پر ہے کہ آیہ وسیجنّبہا الاتقی حضرت ابوبکرؓ کی شان میں نازل ہُوئی ہے۔"

اس موقع پر ایک نکتہ سُن لینا چاہیے۔ آیہ بالا میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکرؓ کو "اتقٰی" (سب سے زیادہ پرہیزگار) فرمایا ہے۔ ایک دوسری آیت ہے:

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ۔ — اللہ کے نزدیک بالتحقیق تم میں وہ سب سے زیادہ بزرگ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار رہے۔

ان دونوں آیتوں کے مفہوم سے منطق کی شکل اوّل بنی اَبُوْ بَکْرٍ اَتْقٰکُمْ وَکُلُّ اَتْقٰکُمْ اَکْرَمَکُمْ فَاَبُوْ بَکْرٍ اَکْرَمَکُمْ۔ (ابوبکرؓ سب سے زیادہ پرہیزگار رہیں، سب سے زیادہ پرہیزگار سب سے زیادہ بزرگ ہے، لہٰذا ابوبکرؓ سب سے زیادہ بزرگ ہیں)

شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے لکھا ہے کہ :

" احادیث سے حضرت ابوبکرؓ کی افضلیت کی چار وجہیں معلوم ہوتی ہیں ؛

اوّل اُمت میں مرتبۂ عُلیا پانا ۔ صدیقیت اسی سے مراد ہے ۔

دوم ابتدائے اسلام میں حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اعانت ۔

سوم نبوت کے کاموں کو اتمام تک پہنچانا ۔

چہارم آخرت میں علوِ مرتبہ "

یہ بھی لکھا ہے کہ ؛

"حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی عملی قوت اور عقلی قوت حضرات انبیاء علیہم السّلام کی عملی و عقلی قوت سے مشابہ تھی "

جس مال کو راہِ خدا میں صرف کر کے حضرت ابوبکرؓ لطفِ خداوندی سے ممتاز ہوئے اس کی شان دیکھو ۔ حدیث میں آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکرؓ کے مال کو مثل اپنے مال کے بے تکلف خرچ فرماتے تھے ۔ ارشادِ نبویؐ ہے کہ " ہم پر جس کا احسان تھا اُس کا بدلہ ہم نے دے دیا ، صرف ابوبکرؓ کا احسان باقی ہے اُس کا بدلہ قیامت کے دن خداوند تعالیٰ بخشے گا " اس حدیث کے ساتھ ایک اور حدیث ملاؤ :

یا ابا بکر عطاك الله الرضوان الاکبر قال وما رضوانه الاکبر قال ان الله یتجلی للخلق عامة و یتجلی لك خاصة ۔	اے ابوبکر ! اللہ تعالیٰ نے تم کو سب سے بڑی خوشنودی سے سربلند فرمایا ۔ عرض کیا : یا رسول اللہ ! سب سے بڑی خوشنودی اللہ کی کیا ہے ۔ فرمایا : اللہ تعالیٰ مخلوق کے واسطے تجلّی عام فرمائے گا اور تمہارے واسطے تجلی خاص ۔

اب تمہارے ذہن میں عطائے ربّانی کا مفہوم آ سکے گا ۔ ایک اور امر غور طلب ہے ۔ آیاتِ بالا میں حضرت ابوبکرؓ کے خوش ہو جانے کا وعدہ ہے ۔ سورہ والضحٰی میں حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو خوش فرما دینے کا وعدہ ہے ۔ اس سے بھی حضرت ابوبکرؓ کے علوِ مرتبہ کا پتا چلتا ہے ۔

(۲) الا تنصروہ فقد نصرہ الله اذ اخرجه الذین کفروا ثانی اثنین اذ هما فی الغار اذ یقول لصاحبه لا تحزن ان الله معنا ۚ	اگر تم رسول کی مدد نہیں کرتے ہو تو (کچھ پروا نہیں) اللہ نے ان کی مدد اُس وقت کی جب کافروں نے ان کو نکال دیا اور وہ دو میں کے ایک تھے جب دونوں غار میں تھے جس وقت وہ اپنے دوست سے کہتے تھے ملول نہ ہو خدا ہمارے ساتھ ہے ۔

اِس آیت میں اُس موقع کا ذکر ہے جب ہجرت کے وقت حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت میں حضرت ابوبکرؓ غارِ حرا میں تھے ۔ اُس وقت کا ارشاد " اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا " اُس قوتِ ایمانی کا جلوہ دکھلاتا ہے جس کے سامنے مخالفین نے بھی

سرِ تسلیم و ادب خم کر دیا ہے۔ ایسے موقع پر صدیق اکبرؓ کی محبت اُن کے علوِ مرتبہ کی اعلیٰ شہادت ہے رضی اللہ عنہ۔
علوِ مرتبہ کا پایہ بلند تر ہو جاتا ہے بلکہ اس درجہ پر پہنچ جاتا ہے جس کے آگے صرف رسالت اور نبوت کا رُتبہ ہے جب اس ارشادِ نبویؐ پر غور کیا جائے :

ماظنك باثنين الله ثالثهما۔ (اے ابوبکر) تمہاراان دو کی نسبت کیا گمان ہے جن کا تیسرا اللہ ہے۔

جب کفار سرگرمِ تلاش غارِ حرا کے مُنہ پر آ کھڑے ہوتے ہیں اور یارِ غار کو ان کے پاؤں نظر آتے ہیں تو اُن کی زبان سے بے اختیار نکلتا ہے :

"اے اللہ کے رسولؐ! ہم تو اب پا لئے گئے"۔

اُس وقت ارشاد بالا صادر ہوتا ہے۔ غور کیجئے قُربِ الٰہی کا یہ وہ مقام ہے جہاں صرف اللہ، رسول اور صدیق ہیں ۔ اللہ اکبر۔ ثانی اثنین میں دُوسری شان ہے۔ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس آیت میں دُو میں کا ایک فرمایا ہے ۔ اس طرح صدیق اکبر آپ کے دُوسرے ہوتے ہیں۔ یہ تقرب نبوی کا جلوہ ہے۔ یہ رفاقت اور اثنینیت محض اتفاقی نہ تھی۔ نتیجہ تھی اس فدائیت اور سرگرمی خدمت کا جس کی سعادت روزِ ازل سے حضرت صدیق کے مقدر میں تھی۔ یارِ غار نے یہ معیت جان، مال، اہل، عیال، ریاست و آسایش، غرض جو کچھ ان کی بساط میں تھا سب کچھ آپؐ پر سے قربان کر کے حاصل کی تھی ۔

ان اللہ اشتری من المومنین انفسھم بان لھم الجنۃ۔ اللہ تعالیٰ نے مومنین سے جنت دے کر جانیں خرید لی ہیں اہلِ تقرب کی جنت رضائے دوست ہے ۔

۵

بمزد یادِ خود باغ بہشتم وعدہ فرمودی
مگر باغ بہشتی بہتر از یادِ تو می باشد

تم حالاتِ صدیقِ اکبرؓ میں پڑھ چکے ہو کہ وہ بعثت سے ایک سال پہلے سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے ۔
مردوں میں سب سے پہلے ایمان لائے اور دوسرے ہوئے ۔ ارشاد ہے : (ابتدائے اسلام میں)
"میں نے کہا کہ میں سارے انسانوں کی جانب خدا کا رسول ہُوں، تم نے کہا جھُوٹ ہے ابوبکر نے کہا سچ ہے"۔
آنحضرت آغازِ اسلام میں حرمِ محترم میں خانہ کعبہ کے قریب مشغولِ عبادت ہیں۔ کفار حملہ آور ہوتے ہیں اور گلوئے مبارک میں چادر ڈال کر گھونٹتے ہیں۔ کسی نے صدیقِ اکبرؓ سے جا کر کہا :

أَدْرِكْ صَاحِبَكَ ۔ اپنے دوست کی خبر لو۔

یہ سُن کر بے تابانہ آئے اور کفار کے نرغے میں گھُس گئے اور یہ کہہ کر حملہ کیا :

ویلکم اتقتلون رجلا ان یقول ربی اللہ تم پر افسوس ہے کیا تم ایک شخص کو اس کہنے پر قتل کرتے ہو

وقد جاءکم بالبینات من ربکم ۔ کہ میرا رب اللہ ہے ۔ اور حال یہ ہے کہ وہ تمہارے پاس خدا کی جانب سے روشن دلیلیں لے کر آیا ہے ۔

کافروں نے جو سلوک ان کے ساتھ کیا وہ تم پڑھ چکے ہو ۔

جب ہجرت کا حکم آیا اور مدینہ کا ستارا چمکا یارِ غار سب کو چھوڑ کر ہمرکاب تھے ۔ غرض وہ کون سا معرکہ اور موقع تھا جہاں صدیقِ اکبرؓ پروانہ وار شمعِ رسالت پر (بابی وامی) نثار نہ تھے ۔ اس جاں نثاری و جاں بازی نے قلبِ اقدس میں وہ جگہ پائی تھی کہ ہر موقع پر ارشاد ہوتا تھا :

انا و ابو بکر و عمر ۔ میں اور ابو بکر اور عمر ۔

ایک موقع پر جب نطقِ حیواں کا ایک واقعہ آپ نے بیان فرمایا تو سامعین نے تعجب کیا ۔ ارشاد ہُوا :

" میرا اور ابو بکر و عمر کا اس پر ایمان ہے ۔"

حالانکہ یہ دونوں جلیل القدر صحابی اُس وقت حاضر نہ تھے ۔ غزوۂ بدر میں نشستگاہِ نبویؐ کی پاسبانی حضرت صدیقؓ کے سپرد ہُوئی یہ ایسا معرکہ خیز وقت تھا کہ اس کے لحاظ سے حضرت شیرِ خدا نے حضرت ابو بکرؓ کو " اشجع الناس " (سب آدمیوں سے زیادہ بہادر) فرمایا ہے ۔ حیاتِ نبویؐ میں احکامِ دین بتانے میں ثانی ہوئے ۔ حدیث شریف میں ہے کہ حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارک کے زمانہ میں سوائے صدیقِ اکبر کے کسی نے فتویٰ نہیں دیا ۔ ناسازیِ مزاج مبارک میں امامتِ نماز میں ثانی ہوئے ۔ حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد خلیفۂ رسول اللہ کی حیثیت سے ترقیِ دین کی خدمت ان کے سپرد ہوئی ۔ اس وقت جس عزم اور قوتِ ایمانی کا ظہور ہوا وہ صدیقِ اکبر کا حصہ تھا ۔ اُس کا حال حالات و واقعات آپ کو سنا چکے ۔ مفارقتِ محبوب کا صدمہ جان لے کر گیا ۔

امام سیوطیؒ کا قول تم نے پڑھا کہ " اُن کا اصل مرض آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مفارقت تھی "۔ جب تک زندہ رہے اس صدمے سے گھُلتے رہے ۔ حیاتِ ظاہری ختم ہوئی تو پہلوئے مبارک میں جگہ ملی اور دوسرے ہوئے ۔

ارشادِ نبویؐ ہے کہ قیامت کے روز سب سے اوّل میری قبر کشادہ ہوگی پھر ابو بکر کی پھر عمر کی ۔ میری امت میں سب سے اوّل ابو بکر داخلِ جنت ہوں گے ۔

دعا فرمائی کہ الٰہی ! ابو بکر کو جنت میں میرے درجہ میں جگہ دینا ۔

اللہ اور اس کے رسولؐ بہتر جانتے ہیں کہ سلوکِ رفاقت کن مقاماتِ عالیہ تک پہنچا ہے ۔ صوفیائے کرام نے فرمایا ہے کہ حضرت صدّیق کو ضمنیتِ کبریٰ کا مرتبہ حاصل تھا اور اُن کی نسبت ابراہیمی تھی ۔ کلامِ مجید میں حضرت ابراہیم کا لقب اوّاہ (دردمند) ہے ۔ صحابہ کرامؓ حضرت صدّیق کو اسی لقب سے یاد کرتے تھے ۔

(۳) ھو الذی یصلی علیکم وملٰئکتہ — وہی ہے جو رحمت بھیجتا ہے تم پر اور اس کے فرشتے

لیخرجکم من الظلمات الی النور ط — تاکہ نکالے تم کو تاریکیوں سے روشنی میں ،

وکان بالمومنین رحیماً[1] — اور ہے ایمان والوں پر مہربان۔

جب یہ آیت انّ اللہ و ملٰئکتہ یصلّون علی النبی نازل ہوئی تو حضرت ابوبکرؓ نے عرض کی کہ یا رسولؐ اللہ! اللہ تعالیٰ جو فضل وکرم آپ پر فرماتا ہے اُس میں ہم نیازمندوں کو بھی شریک فرماتا ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

(۴) ووصّینا الانسان بوالدیہ احساناً ط[2] — اور ہم نے انسان کو ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنے کا حکم دیا ہے۔

(۵) وَشاوِرْھم فی الامر ج[3] — اور ان سے مشورہ لو ہر کام میں۔

حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "میرے دو وزیر اہلِ آسمان میں سے ہیں: جبرئیل اور میکائیل۔ اور دو اہلِ زمین میں سے ہیں: ابوبکر اور عمر"

ایک اور حدیث میں ارشاد ہے:

"ابوبکر اور عمر میرے سمع وبصر ہیں"

(۶) وان تظٰھرا علیہ فان اللہ مولٰہ و جبریل وصالح المؤمنین والملٰئکتہ بعد ذٰلک ظھیراً۔[4] — اگر تم دونوں چڑھائی کرو ان پر (رسول پر) تو اللہ ان کا کارساز ہے اور جبریل اور صالح اہلِ ایمان اور اس کے بعد فرشتے مددگار ہیں۔

شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے لکھا ہے کہ مفسرین کے سوادِ اعظم کا قول ہے کہ یہ آیت حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی شان میں نازل ہوئی۔ صالح مومنین سے وہی مراد ہیں۔

(۷) ولمن خاف مقام ربہ جنتان۔ — اور جو شخص خدا تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرے اس کے لیے دو جنتیں ہیں۔

آیاتِ بالا کے سوا جس قدر آیتوں میں صحابہ کرام، سابقون اوّلون، مہاجرین، مجاہدین اور مومنین وغیرہ کے اوصاف و فضائل ہیں اُن میں حضرت ابوبکرؓ بطریق اولیٰ شریک ہیں۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ بکثرت آیات قرآنی سے فضائل صدیقی ثابت ہیں۔

احادیثِ نبویؐ خاص حضرت ابوبکر کے فضائل میں ایک سو اکیاسی (۱۸۱) حدیثیں مروی ہیں۔ اٹھاسی (۸۸) حدیثیں ایسی ہیں جن میں حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کی فضیلت کا بیان ہے۔ سترہ (۱۷) حدیثیں ایسی ہیں جن میں مجموعی طور پر خلفائے ثلاثہ کے فضائل ہیں۔ چودہ (۱۴) حدیثوں میں خلفائے اربعہ کے ساتھ اور صحابہ کرام

---

[1] سورۂ احزاب۔ رکوع ۵
[2] سورۃ الاحقاف۔ رکوع ۲
[3] سورہ آل عمران۔ رکوع ۱۷
[4] التحریم۔ رکوع ۱۱

بھی شریکِ فضائل ہیں، رضی اللہ عنہم اجمعین۔ اس طرح (۱۸۱ + ۸۸ + ۱۷ + ۱۴ + ۱۶ = ۳۱۶) تین سو سولہ حدیثیں حضرت ابوبکرؓ کے فضائل میں روایت کی گئی ہیں۔ یہ تعداد تو اُن حدیثوں کی ہیں جو مخصوص نام کے ساتھ ہیں۔ جن ہزاروں حدیثوں میں مہاجرین، مومنین وغیرہ اہلِ ایمان وصلاح کے فضائل مذکور ہیں وُہ بھی حضرت صدیق اکبرؓ کی شان میں صادق آتی ہیں۔ چند حدیثیں بطور نمونہ اور تبرک کے یہاں نقل کی جاتی ہیں:

(۱) ما دعوت احداً الی الاسلام الا کانت له عنه کبوة وتردد ونظر الا ابابکر ما عتم عنه حین ذکرته وما تردد فیه۔ (ابن اسحٰق)	میں نے کسی کو اسلام کی دعوت نہیں دی۔ مگر اُس میں اُس کی طرف سے ایک گونہ کراہت، تردّد اور فکر پائی۔ لیکن ابوبکر سے جب میں نے اسلام کا ذکر کیا تو انھوں نے بلا توقف و تردد اس کو قبول کر لیا۔
(۲) هل انتم تارکون لی صاحبی انی قلت ایها الناس انی رسول الله الیکم جمیعاً فقلتم کذبت وقال ابوبکر صدقت۔ (بخاری)	کیا تم میرے دوست کا ستانا میری خاطر سے چھوڑ دو گے۔ میں نے کہا کہ اے لوگو! میں تم سب کے پاس اللہ کی طرف سے رسول ہو کر آیا ہوں۔ تم نے کہا جھوٹ۔ ابوبکر نے کہا سچ ہے۔

ایک مرتبہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر میں کچھ جھگڑا ہو گیا تھا۔ حضرت ابوبکر فوراً نادم ہوئے اور معافی چاہی فاروق اعظم نے معاف کرنے سے انکار کیا۔ حضرت ابوبکر نے بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو کر یہ ماجرا عرض کیا۔ آپؐ نے فرمایا:

یا ابابکر! یغفر الله لك، یا ابابکر یغفر الله لك۔	اے ابوبکر! تمہاری خطا اللہ بخشے، اے ابوبکر! تمہاری خطا اللہ بخشے۔

اِس عرصے میں حضرت عمر کو اپنے فعل پر ندامت ہوئی اور حضرت ابوبکر کے مکان پر پہنچے۔ وہاں نہ ملے تو کاشانۂ نبوت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے ان کو دیکھا تو چہرۂ مبارک غصّے سے متغیّر ہو گیا۔ حضرت ابوبکر یہ کیفیت دیکھ کر ڈر گئے اور گھٹنوں کے بل گر کر دوبارہ عرض کی:

انا کنت اظلم منه۔	زیادتی میری جانب سے ہوئی۔

اُس وقت حدیثِ بالا ارشاد فرمائی گئی۔ راوی کا بیان ہے کہ اس کے بعد پھر کسی نے حضرت ابوبکرؓ کو کبھی ایذا نہیں پہنچائی۔

(۳) ما طلعت الشمس ولا غربت علیٰ احد افضل من ابی بکر الا ان یکون نبی۔ (ابونعیم، عبدالرحمٰن بن حمید وغیرہما)	سوائے نبی کے آفتاب کسی ایسے شخص پر طلوع یا غروب نہیں ہوا جو ابوبکر سے زیادہ بزرگ ہو۔
(۴) ابوبکر خیر الناس الا ان یکون نبی۔ (طبرانی)	سوائے نبیوں کے ابوبکرؓ سب آدمیوں سے بہتر ہیں۔

(۵) ان اللہ یکرہ فوق السماء ان یخطاء ابوبکر۔
(طبرانی، ابونعیم وغیرہما)

اللہ تعالیٰ آسمان پر اس بات کو ناپسند فرماتا ہے کہ ابوبکر خطا کریں۔

(۶) عن عمرو بن العاص قال قلت یا رسول اللہ من احب الناس الیک، قال عائشۃ۔ قلت من الرجال، قال ابوھا قلت ثم من قال عمر بن الخطاب۔
(بخاری، مسلم)

عمرو بن العاصؓ نے کہا ہے کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ آپ کے نزدیک سب آدمیوں میں کون زیادہ محبوب ہے۔ فرمایا: عائشہؓ میں نے کہا: مردوں میں؟ فرمایا: ابوبکرؓ۔ پھر عرض کی: اُن کے بعد؟ فرمایا: عمرؓ بن الخطاب۔

اِس حدیث کو حضرت انسؓ، حضرت ابن عمرؓ اور حضرت ابن عباسؓ نے بھی روایت کیا ہے۔

(۷) عن علی بن ابی طالب کنت مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذ طلع ابوبکر و عمر فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا بی بکر و عمر ھذان سیدا ھؤلاء اھل الجنۃ من الاولین والآخرین الا النبیین والمرسلین۔ لا تخبرھما۔ (ترمذی وغیرہ)

حضرت علیؓ ابن ابی طالب سے روایت ہے کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھا کہ حضرت ابوبکر اور عمر نمایاں ہوئے۔ آپ نے ان کی نسبت فرمایا کہ یہ دونوں انبیاء اور مرسلین کے سوا سارے اگلے پچھلے ادھیڑ عمر والے جنتیوں کے سردار ہیں ان کو خبر نہ کرنا۔

حضرت شیرِ خداؓ سے اس حدیث کے راوی حضرت امام زین العابدین ہیں۔ رضی اللہ عنہ۔ یہ حدیث حضرات ابن عباسؓ، ابن عمرؓ، ابوسعید خدریؓ اور جابر بن عبداللہؓ نے بھی روایت کی ہے۔

(۸) ارحم امتی بامتی ابوبکر۔
(ترمذی امام احمد)

میری اُمت میں میری امت پر سب سے زیادہ مہربان ابوبکرؓ ہیں۔

(۹) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما من نبی الا ولہ وزیران من اھل السماء و وزیران من اھل الارض۔ فاما وزیرای من اھل السماء فجبریل و میکائیل واما وزیرای من اھل الارض فابوبکر و عمر۔ (ترمذی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کوئی نبی ایسا نہیں ہے جس کے دو وزیر اہلِ آسمان میں سے اور دو وزیر زمین والوں میں سے نہ ہوں۔ میرے دو وزیر آسمان والوں میں سے جبریلؑ اور میکائیلؑ ہیں اور اہلِ زمین سے ابوبکرؓ اور عمرؓ۔

(۱۰) ابوبکر فی الجنّۃ۔ (اصحاب سنن وغیرہ)

ابوبکر جنتی ہیں۔

(۱۱) ان اھل الدرجات العلیٰ لیراھم من

بلند مرتبہ (جنتیوں) کو نیچے درجے والے اس طرح

تحتھم کما ترون النجم الطالع فی افق السماء وان ابا بکر وعمر منھم۔ (ترمذی۔ طبرانی)

دیکھیں گے جس طرح تم کنارۂ آسمان پر روشن ستارے کو دیکھتے ہو ابوبکرؓ اور عمرؓ ان ہی میں ہیں۔

(۱۲) ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یخرج علیٰ اصحابہ من المھاجرین والانصار وھم جلوس فیھم ابوبکر وعمر فلا یرفع الیہ احد منھم بصرہ الا ابوبکر وعمر فانھما کان ینظر ان الیہ وینظر الیھما ویتبسمان الیہ ویتبسم الیھما۔ (ترمذی)

حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام مہاجرین اور انصار کے مجمع میں تشریف لاتے تھے جن میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ بھی ہوتے تھے۔ اہلِ جلسہ میں سے کوئی صاحب آپ کی جانب نگاہ نہیں اٹھاتے تھے سوائے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے۔ یہ دونوں صاحب آپؐ کی جانب دیکھتے تھے آپؐ ان کی طرف۔ اور یہ دونوں صاحب آپ کی جانب دیکھ کر مسکراتے تھے اور آپؐ ان کی طرف دیکھ کر تبسم فرماتے تھے۔

(۱۳) ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خرج ذات یوم فدخل المسجد وابوبکر وعمر احدھما عن یمینہ والاٰخر عن شمالہ وھو اٰخذ بایدیھما وقال ھٰکذا نبعث یوم القیامۃ۔ (ترمذی، حاکم، طبرانی)

ایک روز حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم دولت خانہ سے مسجد میں اس شان سے تشریف لائے کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ آپؐ کے دائیں بائیں تھے اور آپ ان کے ہاتھ پکڑے ہوئے تھے اور فرمایا ہم اسی طرح قیامت کے دن اُٹھیں گے (دیکھو اسی کا انتظام کہ دونوں صحابی روضۂ اقدس میں پہلوئے مبارک میں دفن ہیں)

(۱۴) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انا اوّل تنشق الارض عنہ ثم ابوبکر ثم عمر۔

حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ (قیامت کے دن) سب سے اوّل میرے اوپر سے زمین کشادہ ہوگی، پھر ابوبکرؓ کے پھر عمرؓ کے۔

(۱۵) ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم رای ابابکر وعمر فقال ھذان السمع والبصر۔ (ترمذی، حاکم، طبرانی)

حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو دیکھ کر فرمایا کہ یہ دونوں سمع وبصر ہیں۔

(۱۶) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انت صاحبی علی الحوض وانت صاحبی فی الغار۔ (ترمذی)

حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے (حضرت ابوبکرؓ سے) فرمایا کہ تم میرے رفیق حوض (کوثر) پر ہو اور میرے رفیق غار میں۔

(۱۷) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ان من امن الناس علیّ فی صحبتہ ومالہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جن شخصوں کا میرے اوپر صحبت اور مال میں سب سے زیادہ احسان ہے

ابابکر ولوکنت متخذ اخلیلا لا تخذت ابابکر خلیلا ولکن اخوۃ الاسلام ۔ (بخاری ومسلم)

اُن میں ابوبکرؓ ہیں اور اگر میں کسی کو اپنا خلیل (دلی دوست) بناتا تو ابوبکرؓ کو بناتا ۔ لیکن اخوۃ اسلام ہے ۔

یہ حدیث تیرہ صحابیوں نے روایت کی ہے اور امام سیوطی نے اس کو متواتر حدیثوں میں داخل کیا ہے ۔

(۱۸) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مالاحد عندنا یدًا الاوقد کافاناہ الا ابابکر فان لہ عندنا یداً یکافیہ اللہ بہا یوم القیامۃ وما نفعنی مال احد قد ما نفعنی مال ابی بکر۔ (ترمذی)

حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہم پر کسی کا احسان نہیں جس کا بدلہ ہم نے نہ دیا ہو۔ مگر ابوبکرؓ کہ اُن کا جو احسان ہمارے ذمہ ہے اُس کا بدلہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن دے گا۔ اور کبھی کسی کے مال نے وہ نفع مجھ کو نہیں دیا جو ابوبکرؓ کے مال نے دیا۔

حضرت ابوبکرؓ اس ارشادِ مبارک کو سُن کر رو دئے اور کہا یا رسولؐ اللہ! کیا میرا مال آپ کا مال نہیں ہے ۔

(۱۹) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لحسان بن ثابت ھل قلت فی ابوبکر شیئا قال نعم فقال قل وانا اسمع فقال:

حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے (ایک روز) حضرت حسانؓ بن ثابت سے فرمایا کہ تم نے ابوبکرؓ کی شان میں کچھ کہا ہے ۔ جواب دیا کہا ہے فرمایا مجکو پڑھ کر سناؤ۔ انہوں نے یہ شعر پڑھے:

اشعار

(۱) وثانی اثنین فی الغار المنیف وقد
طاف العدو بہ اذ صعد الجبلا

اور بلند غار میں وہ دو میں کے ایک تھے ۔ جب دشمن پہاڑ پر چڑھ کر گرد گھوم رہے تھے ۔

(۲) وکان حب رسول اللہ قد علموا من
البریۃ لم یعدل بہ احدا

وہ رسولؐ اللہ کے محبوب ہیں اور لوگوں کو تحقیق کے ساتھ اس کا علم ہے کہ ساری مخلوق میں آپ کے نزدیک ان کے برابر کوئی نہیں ہے ۔

فضحک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حتی بدت نواجذہ ثم قال صدقت یا حسان ھو کما قلت ۔ (ابوسعید، حاکم)

یہ سن کر حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر ہنسے کہ دندان مبارک نمایاں ہوگئے اور فرمایا: اے حسان! تم نے سچ کہا وُہ ایسے ہی ہیں جیسا کہ تم نے کہا ۔

(۲۰) عن ابی الاروی الدوسی کنت عند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاقبل ابوبکر وعمر فقال الحمد

حضرت ابی اروی سے روایت ہے کہ میں حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھا کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ آئے ۔ ان کو دیکھ کر آپ نے فرمایا: اُس

لله الذی ایدنی بکما۔ (بزاز، حاکم)

خدا کا شکر ہے جس نے تم دونوں کے ذریعہ سے میری تائید کی۔

(۲۱) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابوبکر صاحبی فی الغار ومونسی فی الغار سدوا کل خوخة فی المسجد غیر خوخة ابی بکر۔ (عبداللہ ابن احمد)

حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ابوبکرؓ غار میں میرے رفیق تھے اور غار میں میرے مونس تھے۔ مسجد میں جس قدر کھڑکیاں ہیں سب بند کر دو مگر ابوبکرؓ کی کھڑکی۔

جب مسجد نبویؐ تعمیر ہوئی تھی تو اس کے گرد مکانات تعمیر ہوئے تھے۔ صحابۂ کرام کے مکانوں کی کھڑکیاں مسجد کی جانب تھیں۔ رحلت کے قریب ارشاد ہوا کہ سب کھڑکیاں بند کر دی جائیں، ابوبکرؓ کی کھڑکی مستثنیٰ رہے۔ (جزو ثانی اس حدیث کا مسلم و ترمذی نے بھی روایت کیا ہے)

(۲۲) اللّٰھم اجعل ابا بکر فی درجتی فی الجنة یوم القیامة۔ (حاکم)

(ارشاد مبارک ہے) الٰہی! ابوبکر کو قیامت کے دن جنت میں میرے ہی درجہ میں جگہ دینا۔

(۲۳) یا ابا بکر انت عتیق اللہ من النار۔ (حاکم۔ ابن عساکر)

(ارشاد مبارک ہے) اے ابوبکر! تم کو اللہ تعالیٰ نے دوزخ سے آزاد کر دیا ہے۔

(۲۴) یا ابا بکر اعطاك اللہ الرضوان الاکبر قال وما رضوانه الاکبر قال ان اللہ یتجلّٰی للخلق عامة ویتجلی لك خاصة۔ (حاکم)

(ارشاد مبارک ہے) اے ابوبکر! بارگاہِ الٰہی سے تم کو سب سے بڑی خوشنودی عطا ہوئی۔ دریافت کیا سب سے بڑی خوشنودی کیا ہے؟ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمام مخلوق کے لیے تجلی عام فرمائے گا اور تمہارے لیے تجلی خاص۔

(۲۵) ابی اللہ والمؤمنون ان یختلف علیك یا ابا بکر۔ (امام احمد۔ ابونعیم)

اے ابوبکر! اللہ تعالیٰ اور مومنین کو اس سے سخت انکار ہے کہ تمہارے متعلق اختلاف ہو۔

(۲۶) ان لم تجدینی فاتی ابا بکر۔ (تاریخ بخاری)

اگر تو مجھ کو نہ پاوے تو ابوبکرؓ کے پاس آنا۔

ایک صحابی بی بی نے مدینہ میں آکر مسئلہ دریافت کیا۔ جب رخصت ہونے لگیں تو عرض کی کہ یا رسول اللہؐ! اگر آئندہ میں آؤں اور آپ نہ ملیں تو مسئلہ کس سے دریافت کروں؟ ان کے جواب میں آپؐ نے ارشاد بالا صادر فرمایا۔

(۲۷) مروا ابا بکر فلیصل بالناس۔ (بخاری، مسلم، ترمذی، ابن ماجہ)

ابوبکرؓ کو حکم دو کہ نماز پڑھائیں۔

جب مرضِ وفات میں آپ مسجد میں تشریف لیجا کر امامت نہ فرما سکے تو ارشاد بالا صادر ہوا۔

(۲۸) نعم وارجوان تکون منھم۔ (امام احمد۔ بخاری۔ مسلم)

ہاں اور میں امید کرتا ہوں کہ تم ان میں سے ہو گے۔

ایک بار حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم جنت کے دروازوں اور ان میں ہوکر داخل ہونے والوں کا ذکر فرمارہے تھے۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے پوچھا کہ یارسول اللہ! کوئی ایسا بھی ہوگا جو سب دروازوں سے داخل ہو۔ اس کے جواب میں حدیث مذکورہ بالا ارشاد ہوئی۔

(۲۹) ما اوحی الی شئ الا صببتہ فی صدر ابی بکر۔ (ریاض)

جو وحی مجھ پر نازل فرمائی گئی میں نے اُس کو ابوبکرؓ کے سینہ میں نچوڑ دیا۔

صوفیائے کرام نے اس حدیث کو بہ کثرت روایت فرمایا ہے۔

(۳۰) ما فضلکم ابوبکر بفضل صوم ولا صلوٰۃ ولکن بشئ وقر بصدرہ۔ (ریاض)

ابوبکر کو تم پر نماز روزے کی وجہ سے فضیلت حاصل نہیں ہے بلکہ ایک باوقار چیز کی وجہ سے ہے جو اُن کے سینہ میں ہے۔

اقوالِ صحابہ کرام و اہلِ بیت اطہار رضی اللہ عنہم اجمعین

(۱) قال عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ لابی بکر یا خیر الناس بعد رسول اللہ۔ (ترمذی)

حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکر سے کہا اے سب آدمیوں سے بہتر رسول اللہ کے بعد۔

(۲) قال عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ ابوبکر سیدنا۔ (بخاری)

فاروق اعظمؓ کا یہ بھی قول ہے کہ ابوبکر ہمارے سردار ہیں۔

(۳) قال عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ لو وزن ایمان ابی بکر بایمان اھل الارض لرجح بھم۔ (بیہقی)

حضرت عمر کا یہ بھی قول ہے کہ اگر ابوبکر کا ایمان سارے زمین کے اہل ایمان سے تولا جائے تو اس کا پلّہ بھاری رہے گا۔

(۱) قال علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ خیر ھٰذہ الامۃ بعد نبیھا ابوبکر و عمر۔ (امام احمد وغیرہ)

حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ اس اُمت میں اُس نبی کے بعد ابوبکر اور عمر سب سے بہتر ہیں۔

امام سیوطی کا قول ہے کہ امام ذہبی نے اس حدیث کو متواتر لکھا ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا قول ہے کہ اسّی[۸۰] بزرگوں نے اس حدیث کو حضرت شیرِ خداؓ سے روایت کیا ہے۔

(۲) قال علی رضی اللہ عنہ والذی نفسی بیدہ ما استبقنا الی خیر قط الا سبقنا ابوبکر۔ (طبرانی اوسط)

حضرت علیؓ نے فرمایا ہے کہ اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ ہم کسی نیکی کی طرف نہیں جھپٹے مگر یہ کہ ابوبکر اُس میں ہم سے سبقت لے گئے۔

حضرت عمرؓ سے بھی یہی مروی ہے۔

(۳) قال علی رضی اللہ عنہ خیر الناس بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم ابوبکر و عمر لا یجتمع حبی و بغض ابی بکر و عمر فی قلب مومن۔ (طبرانی)

حضرت شیر خدا کا قول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ابوبکر اور عمر سب آدمیوں سے بہتر ہیں۔ میری محبت اور ابوبکر اور عمر کا بغض کسی مومن کے دل میں جمع نہیں ہو سکتا۔

(۴) قال علی رضی اللہ عنہ فھو اشجع الناس۔ (البزاز)

لہٰذا وہ سب سے زیادہ شجاع ہیں۔

پوری حدیث کا ترجمہ یہ ہے: ایک بار حضرت علیؓ نے اپنے ہمنشینوں سے دریافت کیا کہ:

"بتاؤ سب میں زیادہ کون بہادر ہے؟"

سب نے کہا: "آپ۔"

فرمایا: "میں تو جس سے لڑا میں نے اس سے حق کا بدلہ لے لیا۔ سب سے زیادہ شجاع آدمی کا نام لو۔"

عرض کی: "ہم کو نہیں معلوم۔"

فرمایا: "ابوبکر۔ غزوہ بدر کے معرکے میں ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے ایک سایہ دار نشستگاہ بنادی تھی اس کے بعد پوچھا گیا کہ کون شخص یہاں پاسبانی پر رہے گا جو کفار کو آپ کے پاس نہ آنے دے۔ یہ سن کر واللہ کوئی شخص آپ کے قریب نہ آیا، مگر ابوبکر۔ وہ تلوار کھینچ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب کھڑے ہو گئے۔ جب کوئی مشرک آپ کے قریب آتا تو وہ شمشیر بکف اُس پر حملہ کرتے۔ لہٰذا وہ سب سے زیادہ شجاع ہیں۔"

(۵) عن ابی یحیٰی قال لا احصی کم سمعت علیا یقول علی المنبر ان اللہ عزوجل سمّٰی ابابکر علیٰ لسان نبیہ صلی اللہ علیہ وسلم صدیقا۔ (دارقطنی فی الافراد (اصابہ))

ابویحیٰی سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ میں شمار نہیں کر سکتا کہ میں نے کتنی مرتبہ حضرت علیؓ کو منبر پر کہتے ہوئے سُنا کہ "اللہ عزوجل نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی ابوبکر کا نام صدیق رکھا ہے۔"

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے جب حضرت ابوبکرؓ کی وفات کی خبر سنی تو اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن پڑھ کر ان کے مکان پر یہ فرماتے ہوئے تشریف لائے:

(۶) الیوم انقطعت خلافۃ النبوۃ۔

آج خلافت نبوت کا خاتمہ ہو گیا۔

جس مکان میں حضرت ابوبکرؓ کی لاش تھی اُس کے دروازہ پر کھڑے ہو کر ذیل کا بلیغ خطبہ دیا جو فی الحقیقت صدیق اکبرؓ کے اوصاف باطنی اور ظاہری اور اُن کے مراتب و فضائل کا پُورا تبصرہ ہے۔ اِس خطبہ سے اندازہ ہوگا کہ حضرت شیرِ خداؓ کے دل میں حضرت ابوبکرؓ کی عظمت اور محبت کس قدر تھی۔

خُطبہ

يرحمك الله يا ابا بكر، كنت الف رسول الله صلى الله عليه وسلم و انسه و مستراحه وثقته و موضع سره و مشاورته كنت اول القوم اسلامًا و اخلصهم ايمانا و اشدهم يقينا و اخوفهم لله و اعظمهم عناءً في دين الله و احوطهم على رسول الله صلى الله عليه وسلم و احدبهم على الاسلام ايمنهم على اصحابه و احسنهم صحبة و اكثرهم مناقب وافضلهم سوابق و ارفعهم درجة و اقربهم وسيلة و اشبههم برسول الله صلى الله عليه وسلم هديا وسمتا ورافة وفضلا و اشرفهم منزلة و اكرمهم عليه واوثقهم عنده فجزاك الله عن الاسلام وعن رسوله خيرا كنت عنده بمنزلة السمع والبصر صدقت رسول الله صلى الله عليه وسلم حين كذبه الناس فسماك الله عز و جل في تنزيله صديقا فقال والذي جاء بالصدق وصدق به الذي جاء بالصدق محمد و صدق به ابوبكر واسيته حين بخلوا و قمت به عند المكاره حين عنه قعدوا و اصحبته

اے ابوبکر! تم پر خدا کی رحمت، تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب، مونس، سرور، معتمد، رازدار اور مشیر تھے تم مسلمانوں میں سب سے پہلے ایمان لائے۔ تمہارا ایمان سب سے زیادہ خالص اور تمہارا یقین سب سے استوار تھا۔ تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والے اور سب سے بڑھ کر دین کو نفع رساں تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں سب سے زیادہ حاضر باش، اسلام پر سب سے زیادہ شفیق، اصحابِ رسول اللہ کے لیے سب سے زیادہ بابرکت، رفاقت میں سب سے بہتر، سب سے زیادہ صاحبِ مناقب، فضائل کی دوڑ میں سب سے آگے، درجہ میں سب سے بلند، سب سے قریب وسیلہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سب سے زیادہ مشابہ سیرت میں ہیئت میں مہربانی اور فضل میں قدر و منزلت میں سب سے بلند اور آپ کے نزدیک سب سے بڑھ کر معتمد اللہ تعالیٰ تم کو اسلام کی جانب سے جزائے خیر دے اور اپنے رسول کی جانب سے۔ تم آپ کے نزدیک بمنزلہ سمع و بصر تھے۔ تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وقت سچا جانا جب سب نے آپ کو جھوٹا کہا۔ اسی لیے اللہ عز و جل نے اپنی وحی میں تمہارا نام صدیق رکھا۔ چنانچہ فرمایا اور وہ جو سچ کو لایا اور جس نے اس کی تصدیق کی، لانے والے محمد اور تصدیق کرنیوالے ابوبکر، تم نے آپ کے ساتھ اس وقت غمخواری کی جب اوروں نے تنگ دلی کی۔ جب لوگ مصائب کے وقت مدد سے بیٹھ رہے تھے تم آپ کی مدد پر قائم رہے

فی الشدۃ اکرم الصحبۃ ثانی اثنین و صاحبہ فی الغار والمنزل علیہ السکینۃ و رفیقہ فی الھجرۃ وخلیفتہ فی دین اللہ و امتہ احسن الخلافۃ حین ارتد الناس وقمت بالامر ما لم یقم بہ خلیفۃ نبی فنھضت حین وھن اصحابک و برزت حین استکانوا وقویت حین ضعفوا لزمت منھاج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذھوا کنت خلیفۃً حقا لم تنازع ولم تصدع برغم المنافقین وکبت الکافرین وکرہ الحاسدین وغیظ الباغین وقمت بالامر حین فشلوا وثبت اذ تنعنعوا ومضیت بنور اللہ اذ وقفوا فاتبعوک فھدوا وکنت احفضھم صوتاً واعلاھم فوقا و امثلھم کلاماً واصوبھم منطقا واطولھم صمتاً وابلغھم قولاً واشجعھم نفساً و اعرفھم بالامور واشرفھم عملاً کنت واللہ للدین یعسوبا اولاً حین نفس علیہ الناس واخرا حین اقبلوا کنت للمؤمنین ابًا رحیماً حتی صاروا علیک عیالاً

سختی میں تم نے آپ کی بہترین رفاقت کی تم دو میں کے ایک تھے اور غار میں رفیق اور وہ شخص جس پر اللہ تعالیٰ نے سکینہ (تسکین قلب) نازل فرمائی اور آپ کے ساتھی ہجرت میں تھے اور آپ کے خلیفہ دین الٰہی میں اور اُمت میں۔ جب لوگ مرتد ہوئے تو تم نے بہترین خلافت کی اور امر الٰہی کی تم نے وہ حفاظت کی جو کسی نبی کے خلیفہ نے نہیں کی تھی۔ جب تمہارے ساتھی سُستی کرنے لگے تو تم اُٹھ کھڑے ہوئے اور جب وہ دب گئے تو تم دلیر ہو گئے۔ اور جب وہ کمزور ہو گئے تو تم قوی رہے، تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے سے اس وقت چپٹے رہے جب لوگ مضطرب ہو گئے۔ اگرچہ اس سے منافقین کو غصہ کفار کو رنج حاسدوں کو کراہت اور باغیوں کو غیظ و غضب تھا، تاہم تم بلا نزاع و تفرقہ خلیفہ برحق تھے۔ تم دینِ الٰہی پر قایم رہے اور جب وہ رک گئے تو تم نورِ الٰہی کی روشنی میں رواں رہے پھر انہوں نے (بھی) تمہاری پیروی کی اور منزل پر پہنچ گئے تمہاری آواز سب سے پست تمہارا تفوق سب سے اعلیٰ تمہارا کلام سب سے زیادہ باوقار تمہاری گفتگو سب سے زیادہ باصواب تمہاری خاموشی سب سے زیادہ طویل تمہارا قول سب سے زیادہ بلیغ تھا تمہاری ذات سب سے زیادہ شجاع اور معاملات سے زیادہ واقف اور عمل میں سب سے زیادہ بزرگ تھی واللہ تم اہلِ دین کے سردار تھے۔ جب لوگ دین سے ہٹے تو تم آگے بڑھے اور جب وہ دین پر جُھکے تو تم ان کے پیچھے پیچھے تھے۔ تم اہلِ ایماں کے مہرباں باپ تھے اس مہر پدری سے وہ تمہاری اولاد بن گئے، جن

تحملت اثقال ما ضعفوا و رغبت ما اهملوا
و حفظت ما اضاعوا و علمت ما جهلوا
و شمرت اذ خضعوا و صبرت اذ جزعوا
فادركت اوتار ما طلبوا و راجعوا
برشدهم برايك فظفروا و نالوا
بك ما لم يحتسبوا كنت على الكافرين
عذاباً صباً و لهباً و للمؤمنين
رحمة و انساً وحصناً فطرت
و الله بغضائها وفزت بحبائها و
ذهبت بفضائلها وادركت سوابقها
لم تفلل حجتك و لم تضعف بصيرتك
ولم تجبن نفسك ولم يزغ قلبك و لم
يحسر كنت كالجبل الذى لا تحركه
القواصف و لا تزيله العواصف
وكنت كما قال رسول الله صلى
الله عليه وسلم امن الناس
علينا فى صحبتك و ذات يدك
وكنت كما قال ضعيفاً فى بدنك
قوياً فى امر الله متواضعاً فى نفسك
عظيماً عند الله جليلاً فى اعين الناس
كبيراً فى انفسهم لم يكن لاحد فيك مغتر
ولا لقائل فيك مهمز ولا لاحد فيك
مطمع ولا لمخلوق عندك هوادة
الضعيف الذل عندك قوى عزيز حتى
تاخذ بحقه والقوى عندك ضعيف
ذليل حتى تاخذ منه الحق

بھاری بوجھوں کو وہ نہ اٹھا سکے اُن کو تم نے اٹھایا جو
اُن سے فروگزاشت ہوئی اس کی تم نے نگہداشت کی
جو چیز اُنھوں نے کھو دی اُس کی تم نے حفاظت کی۔
جو انہوں نے نہ جانا وہ تم نے سکھایا۔ تم نے جانبازی کی
جب وہ عاجز ہو گئے تم ثابت قدم رہے۔ جب وہ
گھبرا گئے تو تم نے داد خواہوں کی داد رسی کی۔ وُہ اپنی
راہنمائی کے لیے تمہاری رائے کی جانب رجوع ہوئے۔
اور کامیاب ہوئے۔ تمہارے ذریعہ سے ان کو وہ
ملا جس کا ان کو گمان نہ تھا۔ تم کافروں کے لیے بارشِ
عذاب اور آتشِ سوزاں تھے اور مومنوں کے لیے اُنس
رحمت و پناہ، تم نے اوصاف کی فضا میں پرواز کی، اُن کا
خلعت پا لیا اُن کے محاسن لے لیے اور فضائل کی بازی
جیت لی۔ تمہاری دلیل کو شکست نہیں ہوئی تمہاری بصیرت
کمزور نہیں ہوئی اور تم نے بزدلی نہیں کی، تمہارا دل
نہ کج ہوا اور نہ پھرا۔ تم اُس پہاڑ کی مثل تھے جس کو نہ
شدائد ہلا سکتے ہیں اور نہ ہوا کے طوفان ہٹا سکتے ہیں۔
تم بقول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رفاقت اور مال میں
زیادہ منت افزا تھے اور بقول آپ کے بدن کے ضعیف تھے
حکمِ الٰہی میں قوی، خود اپنے ذہن میں ناچیز اللہ تعالیٰ کے
نزدیک گرامی قدر، انسانوں کی نگاہوں میں با اجلال اور
دلوں میں با وقعت تھے۔ تمہاری نسبت کسی کو آنکھ مارنے
کی مجال نہ تھی اور نہ کوئی طعن کا موقع پا سکتا تھا۔ کسی
کے لیے تم محلِ طمع نہ تھے اور نہ مخلوق میں کسی کی رعایت بیجا
کر سکتے تھے عاجز اور ذلیل تمہارے نزدیک قوی اور
معزز تھا کہ تم اس کا حق لے کر مانتے تھے اور زبردست
تمہارے سامنے کمزور اور ناچیز تھا کہ تم اس سے حق

القریب والبعید عندك فی ذالك سواءٌ اقرب الناس الیك اطوعهم لله واتقاهم له شانك الحق والصدق والرفق قولك حكم حتم وامرك حلم حزم و رایك علم و عزم فاقلعت وقد نهج السبیل وسهل العسیر و اطفیت النیران واعتدل بك الدین وقوی بك الایمان و ثبت الاسلام والمسلمون وظهر امر الله ولو كره الكافرون فسبقت والله سبقاً بعیداً و تعبت من بعدك اتعاباً شدیداً وفزت للخیر فوزاً مبیناً فجللت عن البكاء وعظمت رزیتك فی السماء و هدت مصیبتك فی الانام فَاِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیۡهِ رٰجِعُوۡنَ و رضینا عن الله قضاءهٗ و سلمنا له وامره فو الله لن یصاب المسلمون بعد رسول الله صلی الله علیه وسلم بمثلك ابداً كنت للدین عزا وحرزا وكهفا وللمؤمنین فئة وحصناً وغیثاً وعلی المنافقین غلظة وغیظا فالحقك الله نبیك صلی الله علیه وسلم و لا حرمنا اجرك ولا اضلنا بعدك فَاِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیۡهِ رٰجِعُوۡنَ۔

لے کر رہتے تھے اس معاملہ میں قریب و بعید سب تمہاری نظر میں برابر تھے۔ تمہارا سب سے زیادہ مقرب وہ تھا جو خدا کا سب سے زیادہ فرمانبردار اور سب سے زیادہ پرہیزگار تھا تمہاری شان حق راستی اور نرمی تھی تمہارا قول حکم اور امر قطعی تھا۔ تمہارے حکم میں حلم تھا اور حزم۔ رائے میں دانائی تھی اور عزم تھا۔ ان اوصاف اور فضائل کی قوت سے تم نے باطل کو اکھیڑ کر پھینک دیا اس کے بعد راستہ صاف تھا، مشکل آسان تھی اور (فتنہ وفساد کی) آگ سرد۔ دین تمہاری مدد سے اعتدال پر آگیا۔ ایمان تمہاری وجہ سے قوی ہوگیا اور اسلام اور مسلمان مضبوط ہو گئے اور فرمان الٰہی غالب آگیا۔ اگرچہ کفار کو یہ سخت ناگوار تھا۔ اس حسنِ خدمت میں واللہ تم بہت آگے نکل گئے اور اپنے جانشین کو سخت دشواری میں ڈال دیا اور علانیہ خیر کے مراتب پالئے تمہاری شان آہ و بکا سے ارفع ہے اور تمہارا ماتم آسمان پر عظیم ہے اور تمہاری مصیبت نے لوگوں کی کمر توڑ دی تمہاری مصیبت پر ہم انا للہ وانا الیہ راجعون کہتے ہیں قضائے الٰہی پر رضا مند ہیں اور اس کے حکم کو تسلیم کرتے ہیں واللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد تمہاری وفات سے بڑھ کر مسلمانوں پر کبھی کوئی مصیبت نہیں پڑے گی۔ تم دین کی عزت حفاظت اور پناہ تھے۔ مسلمانوں کی جمعیت، قلعہ اور جائے پناہ اور منافقین کے حق میں سختی اور غصہ۔ اس کی جزا میں اللہ تعالیٰ تم کو تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاوے اور ہم کو تمہارے اجر سے محروم اور تمہارے بعد گمراہ نہ فرمائے۔ ہم پھر انا للہ وانا الیہ راجعون کہتے ہیں۔

راوی کا بیان ہے کہ جب تک حضرت علیؓ خطبہ دیتے رہے سب آدمی خاموش رہے۔ جب خطبہ ختم ہوا تو اس قدر رونے کی آواز بلند ہوگئی اور بالاتفاق کہا کہ اے رسول اللہ کے خویش! آپ نے سچ فرمایا۔ (الریاض النضرہ)

قال عبد اللہ بن جعفر رضی اللہ عنہما ولینا ابوبکر فکان خیر خلیفۃ اللہ وارحمہ وارضاہ علینا۔

(الحاکم)

حضرت عبد اللہ ابن جعفر طیار نے فرمایا ہے کہ ابوبکر ہم پر والی ہوئے تو اس شان سے کہ مخلوقِ الٰہی میں سب سے بہتر تھے اور ہم پر سب سے زیادہ مہربان اور سب سے زیادہ ہم سے خوش۔

قال ابو مریم کنت بالکوفۃ فقام الحسن بن علی خطیبا فقال یایھا الناس رایۃ البارحۃ فی منامی عجبا رایت الرب تعالیٰ فوق عرشہ فجاء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حتی قام عند قائمۃ من قوائم العرش فجاء ابوبکر فوضع یدہٗ علی منکب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثم جاء عمر فوضع یدہٗ علی منکب ابوبکر ثم جاء عثمان فکان بیدہ راسہ فقال رب سل عبادك فیم قتلونی فانبعث من السماء میزابان من دم فی الارض قال فقیل لعلی الا تری مایحدث بہ الحسن قال یحدث بمارای۔

(ابو العلی)

ابو مریم کا بیان ہے کہ میں کوفہ میں تھا۔ امام حسن بن علی نے کھڑے ہو کر خطبہ دیا کہ اے لوگو! رات میں نے ایک عجیب خواب دیکھا، میں نے رب کریم کو عرش پر دیکھا اسی عرصہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور عرش کے ایک پایہ کے پاس قیام فرمایا۔ پھر ابوبکر آئے اور دوش مبارک پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہوگئے۔ پھر عمر آئے اور ابوبکر کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہوگئے۔ پھر عثمان آئے۔ اُن کے ہاتھ میں اُن کا سر تھا عرض کی: الٰہی! اپنے بندوں سے پوچھ کہ انہوں نے مجھ کو کس قصور میں قتل کیا۔ اس کہنے پر آسمان سے دو خون کے پرنالے زمین میں بہنے لگے۔ یہ خطبہ سُن کر لوگوں نے حضرت علی سے کہا کہ "آپ دیکھتے ہیں حسن کیا کہتے ہیں"۔ فرمایا: "جو دیکھا وہ کہتے ہیں"۔

قال ابو جعفر ما رأیت احداً من اھل بیتی الا وھو یتولّٰی بھما۔

(امام محمد)

حضرت امام باقر کا قول ہے کہ میں نے کسی کو اپنے اہلِ بیت میں سے نہیں دیکھا جو اُن دونوں (حضرت ابوبکر اور حضرت عمر) سے محبت نہیں رکھتا تھا۔

عن ابی حفصہ قال سالت محمد بن علی وجعفر بن محمد عن ابی بکر و عمر فقال اما ما عدل نتولھما و نتبرء من عدوھما ثم

ابی حفصہ سے روایت ہے کہ میں نے محمد بن حنفیہ اور امام جعفر صادق سے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کی نسبت رائے طلب کی۔ دونوں نے کہا کہ وہ دونوں امام عادل تھے ہم ان کو دوست رکھتے ہیں اور ان کے

التفت ابی جعفر بن محمد فقال یا سالم یسب الرجل جده ابوبکر الصدیق جدی لا تنال بشفاعة جدی محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان لم اکن اتولهما واتبرء من عدوهما۔

(امام محمد)

دشمن سے بیزار ہیں۔ پھر امام جعفر صادق نے میری طرف مخاطب ہو کر فرمایا: اے سالم! کیا کوئی انسان اپنے جد کو گالی دے سکتا ہے۔ ابوبکر صدیق میرے جد ہیں مجھ کو میرے جد حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت نصیب نہ ہو۔ اگر میں اُن دونوں سے محبت نہ رکھتا ہوں اور اُن کے دشمنوں سے بیزار نہ ہوں۔

وعن ابی جعفر من جهل فضل ابی بکر وعمر جهل السنة۔ (امام محمد)

حضرت امام باقر سے روایت ہے کہ جو شخص حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی فضیلت کو نہیں جانتا وہ سنّت کو نہیں جانتا۔

وعنه قال بغض ابی بکر وعمر نفاق و بغض الانصار نفاق انه کان بین بنی هاشم و بین بنی عدی وبنی تیم شحناء فی الجاهلیة فلما اسلموا انزع اللہ ما فی قلوبهم حتی ان ابا بکر اشتکی خاصرته فکان علی یسخن یده بالنار ویکمد بها خاصرة ابی بکر و نزلت فیهم و نزعنا ما فی صدورهم من غل اخوانا علی سرر متقابلین۔ (امام محمد)

حضرت امام باقر سے روایت ہے کہ ابوبکر اور عمر سے بغض نفاق ہے اور انصار سے بغض نفاق ہے۔ بنی ہاشم، بنی عدی (قبیلۂ حضرت عمر) اور بنی تیم (قبیلہ حضرت ابوبکر) میں زمانۂ جاہلیت میں عداوت تھی۔ جب یہ قبیلے مسلمان ہو گئے تو ان کے دل میں جو کچھ (عداوت) تھی۔ اللہ تعالیٰ نے نکال لی۔ اب نوبت یہ پہنچی کہ ایک مرتبہ حضرت ابوبکر کے پہلو میں درد ہوا تو حضرت علی اپنا ہاتھ آگ سے گرم کر کے حضرت ابوبکر کا پہلو سینکتے تھے۔ اُنھیں بزرگوں کے حق میں یہ آیت نازل ہوئی (ترجمہ) اُن کے دلوں میں جو کچھ عداوت تھی ہم نے کھینچ لی بھائی بن کر آمنے سامنے تختوں پر بیٹھے ہوئے۔

جاء رجل الی علی بن الحسین فقال ما کان منزلة ابی بکر وعمر من رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم قال کمنزلتهما منه الساعة۔ (امام احمد)

ایک شخص نے حضرت امام زین العابدین کی خدمت میں حاضر ہو کر استفسار کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جناب میں حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کا کیا مرتبہ تھا۔ فرمایا: وہی مرتبہ تھا جو اس وقت بھی ہے (یعنی روضۂ اقدس میں سب سے قرب حاصل ہے)

قال الزبیر بن العوام انا نری ابابکر احق الناس بہا بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہ لصاحب الغار وثانی اثنین وانا لنعلم شرفہ وکبرہ ولقد امرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالصلوٰۃ بالناس وھو حیؐ۔ (الحاکم)

حضرت زبیر کا قول ہے کہ ہم سب سے زیادہ خلافت کا مستحق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکر کو جانتے ہیں وہ بالتحقیق رفیقِ غار تھے اور دو میں کے ایک تھے اور ہم کو ان کا شرف اور ان کی بزرگی خوب اچھی طرح معلوم ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حیاتِ مبارک میں اُن کو امامت کا حکم فرمایا تھا۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی ایک یہ بھی فضیلتِ خاص ہے کہ اُن کی چار نسلیں صحابی تھیں وہ خود اُن کے والد حضرت ابو قحافہ، ان کے بیٹے حضرت عبدالرحمٰن اور حضرت عبدالرحمٰن کے بیٹے حضرت ابو عتیق محمد رضی اللہ عنہم اجمعین (الاستیعاب، بر سند امام بخاری ذکر محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی بکر ابن ابی قحافہ رضی اللہ عنہم اجمعین)

بابؐ چہارم

اولیاتِ صدیقی

۱۔ مردوں میں سب سے اوّل اسلام قبول کیا۔

۲۔ سب سے اوّل قرآن شریف کا نام مصحف رکھا۔

۳۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے پہلے قرآن شریف کو جمع کیا۔

حضرت شیرِ خدا کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ ابوبکر پر رحم فرمائے وہ سب سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے کتاب اللہ کو ترتیب مخصوص کے ساتھ جمع کیا جو تمام اُمت کے نزدیک مقبول ہے اور جس پر ساری اُمت کا اتفاق ہے۔

۴۔ سب سے پہلے وہ شخص ہیں جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے کفّار سے لڑے، اس لیے وہ دینِ الٰہی اور دعوتِ نبوّت کے سب سے پہلے مجاہد ہیں۔

۵۔ سب سے پہلے خلیفۂ راشد ہیں۔

۶۔ سب سے پہلے وہ خلیفہ ہیں جن کو باپ کی حیات میں خلافت ملی۔

لہ اس باب کا ماخذ (باستثناء نمبر ۴ اور ۱۶ کے) کتاب محاضرۃ الاوائل مولفہ شیخ علاء الدین سکندری ہے جو امام سیوطی کی کتاب محاضرۃ الاوائل سے ماخوذ ہے۔ نمبر ۴ کا ماخذ صحیح بخاری مطبوعہ مطبع احمدی ۱۲۶۲ھ کا صفحہ ۵۳ ہے۔ نمبر ۱۶ کا ماخذ رسالہ مناقب الخلفاء مولفہ سید نور الحسن خاں مرحوم بھوپالی ہے جو تاریخ الخلفاء سیوطی کا خلاصہ ہے۔

۷۔ سب سے پہلے انہوں نے خلافت کے لیے ولیعہد مقرر کیا۔
۸۔ سب سے پہلے بیت المال قائم کیا۔
۹۔ سب سے پہلے صدر اسلام میں اجتہاد کیا۔
۱۰۔ صحابۂ کرام میں سب سے اول اجتہاد کیا۔
۱۱۔ سب سے پہلے ان کا لقب خلیفہ ہوا۔
۱۲۔ اسلام میں سب سے پہلے ان کا لقب عتیق ہوا۔
۱۳۔ اُمتِ محمدیہ میں سب سے پہلے داخل جنت ہوں گے۔
۱۴۔ سب سے پہلے اسلام میں مسجد انہوں نے بنائی۔
۱۵۔ سب سے پہلے یہ مقولہ انھوں نے فرمایا:
"البلاء موکل بالمنطق"۔
۱۶۔ اسلام میں سب سے اول لقب ان کو ملا۔ یعنی عتیق۔

خاتمہ

حضرت ابوبکرؓ کی زندگی کے معتبر اور مستند حالات و واقعات آپ نے پڑھے۔ اُن کی زندگی کے دو حصے ہیں، ایک قبل اسلام، دوسرا بعد اسلام۔

مسلمان ہونے سے پہلے بھی وہ رئیس قریش تھے اور دولتمند تاجر، ریاست اور دولت کے ساتھ ساتھ حسنِ اخلاق، ہمدردی، وسعتِ معلومات، دانشمندی اور معاملہ فہمی میں صاحبِ امتیاز تھے۔ ان ہی صفات کے اثر سے قوم میں محبوب اور معتمد تھے۔ گزشتہ واقعات سے واقف تھے۔ حال کے حالات کا سفر اور تجارت کے ذریعہ سے تجربہ حاصل تھا۔ اُن کی صفات کی شہرت نواح مکہ تک محدود نہ تھی بلکہ ابن الدغنہ کا قول ثابت کرتا ہے کہ ان کی اخلاقی خوبیاں دُور دُور تک مسلّم تھیں۔ شراب کبھی نہیں پی۔ شعر پر پُوری قدرت تھی۔ یہ اوصاف اور حالات بتاتے ہیں کہ حضرت ابوبکر زمانۂ جاہلیت میں بھی ایک سلیم الطبع، غمخوار، دانشمند اور زندہ دل انسان تھے۔ جس انسان میں یہ صفات ہوں وہ بہترین ہمدم و رفیق ہو سکتا ہے۔

آفتابِ رسالت کے طلوع ہونے سے ایک سال پہلے سے حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اُن کی آمد و رفت تھی۔ جس طرح طلوعِ آفتاب سے قبل نور کا ظہور ہو جاتا ہے اسی طرح قربِ وحی کے زمانہ میں انوارِ رسالت کا ظہور شروع ہو گیا تھا۔ خلوت گزینی و عبادت مزاجِ اقدس کو بہت زیادہ مرغوب ہو گئی تھی۔ رؤیا صادقہ (سچے خواب) نظر آتے تھے۔ غرض بیداری و خواب دونوں حالتوں میں ظہورِ نور تھا۔ ظاہر ہے کہ اس زمانہ کی صحبت بھی بے اثر نہ رہ سکی تھی۔ اس طرح حضرت صدیق اکبرؓ نزولِ وحی سے پہلے قبولِ اسلام اور رفاقت و خلافت کی قابلیت و استعداد سے مشرف ہو چکے تھے۔

اسی کا اثر تھا کہ جب اسلام کی صدا کان میں آئی مانوس محسوس ہوئی۔ اِدھر حضرت صادق الامین صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے تبلیغ اسلام ہوئی۔ اُدھر بے تامل حضرت صدیقِ اکبرؓ نے آمنّا کہا اور تصدیق کی اُس قوت کے ساتھ کہا جو صدیقیت کے خلعت سے مشرف ہوئی۔

شرفِ اسلام کے بعد حضرت ابوبکرؓ کی زندگی اطاعت و استقامت کا مرقع ہے اور ارشادِ ربانی:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِى السِّلْمِ كَآفَّةً۔ — اے ایمان والو! اسلام میں پُوری طرح داخل ہو جاؤ۔

کی تابحدِّ بشر تعمیل، جسم جان شان عقل و فراست اولاد مال جائداد، آرام و آسائش غرض جو کچھ اُن کی بساط میں تھا اللہ اور اس کے رسولؐ کے حکم پر قربان تھا۔ اسی لیے فاروقِ اعظم اور حضرت شیرِ خدا کی شہادت ہے:

"ما استبقنا الی خیر قط الا سبقنا ابوبکر۔" — ہم جس نیکی کی طرف جھپٹے اس میں ابوبکر ہم سے سبقت لے گئے۔

اپنی وجاہت کے اثر سے سابقین اوّلین کے اعلیٰ افراد کو خدمتِ مبارک میں قبولِ اسلام کے واسطے لاکر پیش کیا۔ مال خدمتِ اسلام کے لیے وقف تھا۔ مالی سرمایہ آخر عمر تک تجارت کے ذریعہ سے بڑھایا اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی راہ میں صرف کیا۔ کمزور مسلمانوں کو خرید کر ظالم آقاؤں کے پنجے سے چھڑایا۔ مجاہدین کی خدمت میں بے دریغ روپیہ خرچ کیا۔ غزوہ تبوک کے موقع پر جو کچھ تھا سب لاکر حاضر کر دیا۔ حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اس کو دیکھ کر فرماتے ہیں:

اے ابوبکر! بال بچوں کے لیے کیا چھوڑا؟

جواب میں عرض کرتے ہیں:

اللہ اور اس کے رسول کو رکھ چھوڑا ہے۔

اللہ اکبر! کیسا پاکیزہ سرمایہ رکھا۔ صدیقِ اکبر کی اُن دس اشرفیوں کی قیمت کا کون اندازہ کر سکتا ہے جو مسجد نبویؐ کی زمین کا زرِ ثمن تھیں۔ اس پاک سرزمین کا ایک ٹکڑا روضۂ جنّت ہے۔ یہ منبر شریف اور قبرِ مبارک کے درمیان میں ہے۔ دوسرا عرش سے بھی افضل ہے جو جسمِ اطہر کو مس کر رہا ہے۔ جان و مال کی اصل طہارت یہ تھی کہ حضرت ابوبکر اپنے مال اور اپنے نفس کو اپنی ملکیت نہیں جانتے تھے بلکہ دونوں کو حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ملکیت جانتے اور مانتے تھے۔ جب ارشادِ مبارک ہوا:

مانفعني مال احد قط مانفعني مال ابي بكر۔ — کسی کے مال نے مجھ کو وہ نفع نہیں دیا جو ابوبکر کے مال نے دیا۔

تو یارِ غار نے رو کر عرض کی:

یا رسولؐ اللہ! کیا میں اور میرا مال آپ کے نہیں ہیں؟

اسی تسلیم و رضا کا اثر تھا کہ حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم ان کا مال مثل اپنے مال کے بے تکلف صرف فرماتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ جب تک زندہ رہے خدمتِ دین کے واسطے کماتے رہے۔ جب زندگی کے ساتھ خدمت کا سلسلہ قطع ہوا تو

مال بھی ختم ہوا۔ وفات کے بعد نقد ایک حبّہ پاس نہ تھا اور کفن کے لیے کوڑی نہیں چھوڑی۔

اولاد بھی اللہ اور اس کے رسولؐ کی مرضی پر قربان تھی۔ جب حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی وفات سے خاطرِ اقدس ملول تھی تو اپنی بیٹی حضرت عائشہ صدّیقہ رضی اللہ عنہا کو آپ کے عقد میں دے دیا۔ حضرت عبدالرحمٰن جب تک کافر رہے اُن کو دشمنِ جانی کی طرح دیکھا۔ تعلق کیا۔ بدر میں جب ان کو لشکرِ کفّار میں دیکھا تو نہایت خشمگیں ہو کر کہا:

این مالی یا خبیث ؟ اے پلید! میرے حقوق کیا ہوئے؟

دیکھو حقوق یہی تھے کہ لشکرِ اسلام کی صف میں لڑیں اور اسلام پر قربان ہوں۔ غزوۂ اُحد میں تلوار میان سے لے کر اُن کے مقابلے کے لیے تیار ہو گئے تھے مگر دربارِ رسالت سے میدان میں جانے کی اجازت نہیں ملی۔ جب انہوں نے مسلمان ہو کر ایک مرتبہ کہا کہ ابّا جان! ایک موقع پر غزوۂ بدر میں آپ میری زد پر آگئے تھے مگر میں نے بچا دیا۔ سُن کر فرمایا کہ بیٹا! اگر تم میری زد پر آجاتے تو میں ہرگز نہ چھوڑتا۔

ایک دُوسرے صاحبزادے حضرت عبداللہ غزوۂ طائف میں کام آئے اور خلعتِ شہادت سے سُرخرو ہوئے رضی اللہ عنہ۔ دُو صاحبزادیوں نے باپ سے حدیث روایت کی۔ یعنی حضرت عائشہ اور حضرت اسماء رضی اللہ عنہما۔

فتحِ مکّہ کے وقت اپنے نوّے سالہ بوڑھے اور نابینا باپ کو خدمت میں لاکر حاضر کیا کہ شرفِ اسلام سے مشرف ہوں۔ آپ نے دیکھ کر فرمایا کہ ابوبکر بڑے میاں کو کیوں تکلیف دی میں خود اُن کے پاس چلتا۔ عرض کی کہ انہی کو حاضرِ خدمت ہونا چاہیے تھا۔

ہجرت کے واقعات پر غور کرو۔ خونخوار دشمنوں کا زرغہ ہے۔ بارہ منزل دُور مدینہ طیبہ ہے۔ مکّۂ مکرمہ میں اہل و عیال اور مال و جائداد کا کوئی ظاہری محافظ نہیں۔ گھر میں بال بچّوں کے حلقے میں بیٹھے ہیں کہ اسی اثناء میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاکر ارشاد فرماتے ہیں:

"ابوبکر! ہجرت کا حکم آگیا۔"

بے اختیار مُنہ سے نکلتا ہے:

"اور میری رفاقت کا؟"

ارشاد ہوتا ہے:

"اس کی بھی اجازت ہے۔"

یہ مژدۂ جانفزا سُن کر جوشِ مسرت سے بیتاب ہو جاتے ہیں اور نہایت شوق سے سامانِ سفر کا اہتمام کرتے ہیں۔ بی بی، بچّے، مال اور مکان سب آنکھوں کے سامنے ہیں۔ اُن کی مصیبت اور تباہی بھی شاید ذہن میں آئی ہو گی۔ لیکن ہمدمی حبیب (روحی فداہ) کے ذوق کے مقابلہ میں کسی کی پروا نہیں۔ کوئی سیرت یا تاریخ اِس کا پتا ہی نہیں دیتی کہ مژدۂ ہجرت اور ہجرت کے درمیان جو وقت ملا اُس میں اُنھوں نے اپنی اولاد یا جائیداد کی آسائش و حفاظت کا کچھ بھی بندوبست کیا ہو۔

انتہا یہ کہ باپ کو بھی خبر نہ کی۔ جو سرمایہ نقد تھا وہ خدمت کے لیے ساتھ لے لیا اور خونخوار کفار کے نرغے میں سب کچھ چھوڑ کر رکاب سعادت میں باطمینانِ قلب روانہ ہو گئے۔ اُن کی تسلیم و رضا کا پرتو اُن کے گھر والوں پر بھی اس قدر تھا کہ بجائے پریشان ہونے کے دوسروں کی پریشانی رفع کرتے تھے۔ جب بوڑھے دادا مضطرب ہو کر آئے تو پوتی نے تدبیر سے اُن کی تسکین کر دی حالانکہ اسی پوتی کو بیکسی میں ابوجہل کی شقاوت کا صدمہ پہنچا تھا۔ شرفِ اسلام کے بعد سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت تک پروانہ وار شمعِ رسالت (بابی و امی) پر قربان و نثار تھے۔ تمام جانفروشی کے موقعوں پر یعنی غزوات میں شمشیر بکف ہمرکاب رہے بدر میں جوشانِ شجاعت دکھائی اس نے حضرت شیرِ خدا کی زبانِ مبارک سے "اشجع الناس" کا خطاب دلوایا۔ اُحد کے حوصلہ فرسا ہنگامے میں سب سے اول حضرت سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو بحالتِ مجروحی شہدا کی لاشوں میں دیکھ کر شناخت کیا، جب ان کے بیٹے عبدالرحمٰن نے کفار کی طرف سے میدان میں آکر حریف طلب کیا تو تلوار میان سے نکال کر مقابلے کے لیے تیار ہو گئے اور اجازت طلب کی۔

فرمانِ رسالت ہوا "شم سیفک و امتعنا بک" (تلوار میان میں کر لو اور ہم کو اپنی ذات سے متمتع ہونے دو)۔ یہ فرمان سنا تو قصد ملتوی کر دیا۔ لڑائی اور صلح سب میں آپ ہی کی خوشنودی مطلوب تھی۔

غزوۂ خندق میں ایک دستہ حضرت صدیقؓ کے ماتحت تھا، دیکھو صداقت کی برکت، جس موقع پر یہ دستہ متعین تھا وہاں ایک مسجد بنی جو صدیوں تک قایم رہی۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے لکھا ہے کہ اُن کے زمانہ تک موجود تھی یعنی بارھویں صدی ہجری میں حدیبیہ کے معرکے میں جو وقت معرکہ کا تھا اُس میں حضرت فاروقِ اعظم تک بیتاب تھے مگر حضرت صدیق اکبر کی تسلیم و رضا کا یہ جلوہ تھا کہ اضطراب کیا۔ جب حضرت فاروق اعظم نے جا کر ماجرا بیان کیا تو صرف اس قدر کہا کہ رکابِ سعادت تھامے رہو۔ تبوک میں جائزۂ فوج امامت اور بڑا نشان یہ سب خدمات حضرت صدیقِ اکبرؓ کے سپرد تھیں۔ اندازہ کر سکتے ہو کہ حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کا وقت کیسا ہوش ربا وقت تھا۔ دُنیا میں ایسے اشخاص کی وفات سے جو سرگروہ اور کارفرما ہوتے ہیں ایک تلاطم برپا ہو جاتا ہے چہ جائیکہ اس ذاتِ پاک کی رحلت جو دونوں عالم کی مرکز تھی، جس پر صحابہ کرام جان سے قربان تھے اور جس کے وجود باجود کی برکت سے وحی کا سلسلہ قائم تھا۔ انوارِ قدس کی بارش اس عالم خاکدان پر ہو رہی تھی اور اس فیض و برکت کو اُس قدسی گروہ کا ہر فرد محسوس کرتا تھا۔ چنانچہ اپنی خلافت کے دور میں جب حضرت صدیقِ اکبر فاروقِ اعظم کو ساتھ لے کر حضرت ام ایمن کے پاس باتباعِ سنتِ نبویؐ گئے تو وہ روئیں اور رونے کی وجہ یہ بتائی کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے سلسلۂ وحی منقطع ہو گیا۔ اس حادثہ کا یہ اثر تھا کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین وقفِ حیرت تھے مسجد میں صحابہ کرام کا مجمع تھا اور حضرت عمرؓ اس مجمع میں یہ تقریر فرما رہے تھے کہ منافق کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی۔ واللہ وفات نہیں پائی ہے بلکہ وہ اپنے رب کے پاس موسیٰؑ کی طرح گئے ہیں جو چالیس روز غائب رہ کر واپس آگئے تھے حالانکہ اُن کی نسبت بھی کہا جاتا تھا کہ وفات پا گئے۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مراجعت فرمائیں گے اور ان لوگوں کے ہاتھ پاؤں کاٹیں گے جو کہتے ہیں کہ آپؐ نے وفات پائی۔ اب حضرت ابوبکرؓ کی حالت پر نظر ڈالیے جب اُن کو

اس سانحۂ ہوش ربا کی خبر پہنچی تو گھوڑے پر سوار ہو کر آئے اور سیدھے حجرۂ مبارک پر پہنچے، چہرۂ اقدس سے چادر اٹھائی۔ پیشانی کو بوسہ دیا اور رو کر کہا:

"آپؐ پر میرے ماں باپ قربان ہوں، آپ کی حیات اور وفات دونوں پاک ہیں جو موت خدا تعالیٰ نے آپ کے لیے مقدر فرمائی تھی اس کا ذائقہ آپ نے چکھ لیا۔ اب اس کے بعد آپ کبھی وفات نہ پائیں گے۔"

اس کے بعد مسجد نبویؐ میں آئے تو حضرت عمرؓ کو کلام بالا کہتے سنا۔ اُن سے کہا سنبھلو اور خاموش ہو جاؤ۔ وہ خاموش نہ ہوئے تو خود سلسلۂ کلام شروع کر کے حاضرین کو اپنی طرف مخاطب فرمایا اور کہا:

"اے لوگو! جو شخص محمدؐ کو پوجتا تھا تو (وہ سمجھ لے کہ) محمدؐ نے وفات پائی اور جو کوئی اللہ کو پوجتا تھا تو (وہ جان لے کہ) اللہ زندہ ہے کبھی نہیں مرے گا (اللہ تعالیٰ کا ارشاد) اور نہیں محمدؐ مگر ایک رسول ان سے پہلے رسول گزر چکے ہیں۔ تو کیا وہ اگر مر جائیں یا قتل کر دیے جائیں تو تم برگشتہ ہو جاؤ گے اور جو شخص برگشتہ ہو جائے گا تو وہ خدا کو کچھ نقصان نہیں پہنچائے گا اور اللہ شکر گزاروں کو عنقریب جزا دے گا۔"

اس کلام کو سن کر آنکھوں کے سامنے سے حیرت کا پردہ اُٹھ گیا اور حقیقتِ واقعہ منکشف ہو گئی۔ حضرت عمرؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا انکشاف ہوا تو فرطِ غم سے بیٹھ گئے۔ اہلِ معرفت نے اس خطبہ کو توحید کا اعلیٰ مظہر مانا ہے۔ غور کرو اگر حضرت ابو بکرؓ کی قوتِ ایمانی اس وقت اِس حیرت کو رفع نہ کر دیتی تو مثل اور انبیاءؑ کے آپ کی رحلت کا واقعہ چیستان بن کر رہ جاتا۔ دین و ملت کا سارا شیرازہ درہم برہم ہو جاتا۔ بنی ساعدہ کے سقیفہ کا حال تم پڑھ چکے ہو۔ وہ چند گھنٹے ایسے خطرناک اور قیمتی تھے کہ اُن کے فیصلے نے اُمت کو تباہی سے بچا لیا۔ خود حضرت عمرؓ کا قول ہے کہ واقعہ سقیفہ دفعتہً ہوا مگر اُس نے مسلمانوں کو تباہی سے بچا لیا۔ یہ بھی دیکھو کہ اُس جد و جہد سے صدیقِ اکبرؓ کا مقصد ذاتی رفعت نہ تھی بلکہ محض اُمت کی خدمت کی۔ جب انتخاب اور بیعت کا وقت آیا تو حضرت عمرؓ اور حضرت ابو عبیدہؓ کو پیش فرما دیا کہ ان میں سے جس سے چاہو بیعت کر لو۔ دونوں خلافت کے اہل ہیں۔ خلیفہ ہونے کے بعد صاف کہہ دیا کہ نہ خلافت کی مجھ کو کبھی تمنا تھی نہ میں نے پوشیدہ اس کے لیے دعا کی۔

خلافت کا زمانہ قوتِ ایمانی کے اعلیٰ ظہور کا زمانہ ہے۔ اُس عہد کے واقعات بلند آہنگی سے یہ شہادت دے رہے ہیں کہ شانِ صدیقیت اور ایمانی قوت میں وہ مبارک ذات ممتاز تھی۔ واقعاتِ خلافت کہہ رہے ہیں کہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا یہ قول بالکل صحیح تھا کہ حضرت صدیقؓ اور حضرت فاروقؓ کی قوتِ عالمہ و عاملہ انبیاءؑ و رسل کے مشابہ تھی۔ خلافتِ صدیقی کا زمانہ قوتِ عمل کا زمانہ تھا۔ ابتدائی خطبہ دیکھو، اُس میں یہ الفاظ ہیں:

"جو تم میں کمزور ہے وہ میرے نزدیک قوی ہے۔ اِن شاء اللہ اُس کا حق دلواؤں گا اور تم میں جو قوی ہے وہ میری نظر میں کمزور ہے اُس سے اِن شاء اللہ حق لے کر چھوڑوں گا۔"

اس کے ساتھ وہ فقرہ ملائیے جو ہنگامہ ردّت کے وقت فرمایا تھا:

انه قد انقطع الوحی وتمّ الدین اینقص   ظاہر ہے کہ وحی کا سلسلہ قطع ہو گیا۔ دین کمال کو پہنچ گیا

وانا حیّ۔	کیا یہ ممکن ہے کہ میری زندگی میں اُس کی قطع و برید کی جائے۔

ان دونوں مقولوں سے واضح ہے کہ خلافت سے حضرت ابوبکرؓ کا مقصود حفاظتِ دین اور خدمتِ خلق تھی۔ عملاً یہ ثبوت ہے کہ ان دو خدمتوں کے سوا کوئی تیسرا کام اُنھوں نے خلافت میں نہیں کیا۔

آغازِ خلافت میں جھُوٹے مدعیانِ نبوت کی وجہ سے عرب میں ارتداد خانہ جنگی و بغاوت کا طوفان ہر طرف بپا تھا مورخ ابنِ اثیر کا قول ہے کہ چوبیس قبیلے مرتد ہو کر میدانِ جنگ میں سرگرمِ کارزار تھے۔ سرحد کی دو جانب قیصر و کسریٰ مسلمانوں کی تاک میں تھے۔ اس حالت کا نقشہ عبداللہ بن مسعود نے ان الفاظ میں کھینچا ہے:

"اُس وقت مسلمان بکریوں کے اُس گلّے سے مشابہ تھے جو جاڑوں کی سرد رات میں بحالتِ بارش میدان میں بے گلّہ بان کے رہ جائے۔"

حضرت ابوبکرؓ نے غایت تدبّر سے ان تمام مشکلات کا صحیح اندازہ فرمایا اور اس کی کامل تدبیر فرمائی اور یہی ایک بڑا کمال ہے۔ دیکھو خلافت کے دسویں دن جو قاصد ارتداد کی خبریں لے کر مدینہ طیبہ میں آئے اُن سے حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ:

"صبر کرو، اس کے بعد جو خط آئیں گے اُن میں اس سے زیادہ سخت خبریں ہوں گی۔"

مسلمانوں کو قیصر و کسریٰ کے شر سے محفوظ رکھنے کا یہ اہتمام تھا کہ فتنۂ ارتداد سے فارغ ہوتے ہی ان کی جانب ہمہ تن متوجہ ہو گئے اس زمانہ میں ایک صحابی نے اپنے قبیلے کے ایک معاملے کی جانب توجہ دلائی تو غصہ ہو کر فرمایا کہ میں تو ان دو شیروں کے زیر کرنے کی فکر میں ہوں جو مسلمانوں کی تاک میں ہیں اور تم میری توجہ معمولی کاموں کی طرف مائل کرتے ہو۔ خلافتِ صدیقی کا زمانہ صرف سوا دو سال ہے۔ اسی قلیل عرصہ میں ارتداد کا وہ فتنہ فرو کیا جاتا ہے جس کی آگ یمن سے لے کر نواحِ مدینہ طیبہ تک مشتعل تھی۔ اس حالت پر غور کرو کہ یمن سے لے کر مدینہ طیبہ تک مرتدوں کے لشکر پڑے ہوئے ہیں۔ خود مدینہ طیبہ مرتدوں کے نرغے میں ہے۔ اِس ہنگامۂ قوت کے ساتھ مرتد خلیفۂ رسول اللہ کو پیام دیتے ہیں کہ ہم سے نماز پڑھوا لو مگر زکوٰۃ معاف کر دو۔ گویا بنیادِ اسلام کا ایک پایہ ڈھا دینا چاہتے ہیں۔ اس طرف یہ حالت ہے کہ مسلمانوں کا چیدہ لشکر حضرت اسامہؓ کی سرداری میں رومیوں کے مقابلہ میں روانہ ہو جاتا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ صحابہ کرامؓ سے مشورہ کرتے ہیں جن میں فاروقِ اعظمؓ بھی شریک ہیں۔ سب کی رائے ہوتی ہے کہ نرمی مناسب وقت ہے۔ حضرت عمرؓ کے یہ الفاظ تھے:

یا خلیفۃ رسول اللہ تألف الناس و ارفق بھم۔	یعنی اے خلیفۂ رسول اللہ! ان لوگوں کے ساتھ تالیفِ قلوب اور نرمی کا برتاؤ کیجئے۔

اس مشورے کو سُن کر حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں:

اجبارٌ فی الجاھلیۃ و خوّار فی الاسلام انہ قد انقطع الوحی و تمّ الدین اینقص وانا حیٌّ واللہ لاُجاھدھم	یہ کیا کہ تم جاہلیت میں تو بڑے سرکش تھے۔ مسلمان ہو کر ذلیل و خوار ہو گئے۔ وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور دین کمال کو پہنچ گیا کیا میری حیات میں اس کی قطع و برید

ولو منعونی عقالا۔ کی جائے گی۔ واللہ اگر لوگ ایک رسی کا ٹکڑا بھی (فرض زکوٰۃ میں سے) دینے سے انکار کریں گے تو میں ان پر جہاد کروں گا۔

یہ فرما کر مرتدوں کے ایلچی اسی جواب کے ساتھ واپس کر دئے جاتے ہیں۔ اُن کے جانے کے بعد باوجود ظاہری بے سروسامانی کے مدینہ منورہ کی حفاظت فرمائی جاتی ہے اور حملہ آوروں کے حملے نہ صرف روکے جاتے ہیں بلکہ اُن پر حملہ کرکے شکست دی جاتی ہے اور سیلابِ ارتداد کے فرو کرنے کی قوت کے ساتھ تدبیر کی جاتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ ۱۱ھ کے ختم تک یعنی صرف نو ماہ میں یہ ہنگامہ فرو ہوگیا اور اس قوت کے ساتھ کہ پھر آج تک نہیں برپا ہوا۔ ۱۲ھ میں کسریٰ کی قوت کا کسر و انکسار شروع ہوا اور اختتام سنہ مذکور سے قبل مجوزہ مہم عراق ختم ہوگئی اس کے ختم ہوتے ہی قیصر کی نوبت آئی۔ اسلام کے لشکر شام پر بڑھے اور معرکۂ یرموک کے سر ہونے سے رومیوں کو قوتِ اسلام کا اندازہ ہوگیا۔ اسی واسطے خطبۂ وفات میں حضرت شیرِ خداؓ نے فرمایا تھا:

"اِن اوصاف و فضائل کی قوت سے تم نے باطل کو اکھیڑ کر پھینک دیا۔ اُس کے بعد راستہ صاف تھا۔ مشکل آسان تھی اور فتنہ و فساد کی آگ سرد۔"

جنگی معرکوں کے ساتھ ملکی انتظام بھی تھے۔ عراق فتح بھی ہوا، اُس میں خراج کا بندوبست بھی ہوا اور خراج وصول ہوکر اسلام کے مقاصد کی تکمیل میں صرف بھی ہونے لگا۔ لشکر کو یہ ہدایتیں تھیں:

"خیانت نہ کرنا۔ دھوکہ نہ دینا۔ سردار کی نافرمانی نہ کرنا۔ کسی شخص کے اعضاء نہ کاٹنا۔ کسی بچے، بُوڑھے یا عورت کو قتل نہ کرنا۔ کھجور اور میوہ دار درخت نہ کاٹنا نہ جلانا۔ اُونٹ، بکری یا گائے کو سوا غذا کی ضرورت کے نہ مارنا۔ عیسائیوں کے گوشہ گیر اہلِ عبادت کو نہ ستانا۔ نعمتیں کھاکر خدا کو نہ بُھول جانا۔"

دیکھو عین معرکۂ کارزار میں دین و اخلاق کا سبق یاد رکھنے کی تاکید ہے۔ ترحم و کرم کا دائرہ انسان، حیوان، نباتات سب کے لیے وسیع ہے۔ مورخ ابن اثیر نے (جن کی وفات ۶۳۰ھ میں ہے) لکھا ہے کہ خلافتِ صدیقی کے احکامِ بالا آج تک مسلمانوں کے لشکر کے دستور العمل ہیں۔ یورپ کی حالیہ جنگِ عظیم کے ہولناک مناظر دیکھ کر قدرتی طور پر یہ تمنا قلبِ سلیم میں پیدا ہوتی ہے کہ کاش تعلیم صدیقی کا فیض مغرور یورپ نے حاصل کرلیا ہوتا تو بنی نوع انسان پر یہ مصیبت نازل نہ ہوتی۔

اِس موقع پر ذرا شانِ صدیقی کا مرقع دل کی نگاہ کے سامنے لے آؤ مُسیلمہ کذاب سے معرکہ ہے۔ روم و ایران کے شیروں سے مقابلہ ہے۔ محلہ کی لڑکیوں کی فرمائش سے بکریاں دوہی جارہی ہیں۔ راستہ میں بچے بابا بابا کہہ کر لپٹ رہے ہیں نواحِ مدینہ میں ایک اپاہج اندھی بُڑھیا کی خدمت اس اہتمام سے ہورہی ہے کہ حضرت عمرؓ بھی سبقت نہیں لیجا سکے۔ کاندھے پر کپڑے کی گٹھڑی ہے اور مدینہ کے بازار میں خرید و فروخت کرکے اہل و عیال کی روزی کا سامان کرتے ہیں۔ مدینہ پر حملہ ہوتا ہے تو لشکر کی کمان بھی کرتے ہیں۔ میدانِ جنگ کا پُورا خاکہ تیار کرکے امیرانِ لشکر کے حوالے فرماتے ہیں۔ عراق کی مہم میں یہ بھی اہتمام ہے کہ ملک کی آبادی میں فرق نہ آئے۔ زراعت و اہلِ زراعت تباہ نہ ہوں۔ بندوبست اراضی کی ہدایتیں جاری ہوتی ہیں۔

کلام مجید اور حدیث کی خدمت ہو رہی ہے۔ فقہ کے اصول مرتب ہوتے ہیں۔ دین کے مشکل مسئلے حل کیے جاتے ہیں۔ ذکر کی تلقین ہوتی ہے۔ غرض ایک ہی وقت میں پادشاہ اور درویش، مفسر، محدث، فقیہ، اولوالعزم اور مسکین، سپہ سالار اور مالیات کے حاکم، تاجر سب کچھ ہیں، اور جب دنیا سے جاتے ہیں تو دنیا سے بالکل پاک صاف، نہ ملک ورثا کے لیے چھوڑتے ہیں۔ نہ روپیہ نہ جائیداد، پرانی چادریں دھوئی جاتی ہیں اور خلیفۂ رسول اللہ اُن میں دفنا دیے جاتے ہیں۔ اور دیکھو یہ سب کچھ محض اللہ اور اس کے رسول کی رضامندی کے لیے ہے۔

علمی خدمات قرآن مجید بہ شکل کتاب ایک جا لکھوا کر محفوظ فرما دیا اور اس کا نام "مصحف" رکھا۔ معانیِ کلام مجید کے متعلق جو مشکلات پیش آئیں اُن کو حل کیا۔ حدیث کی روایت کی۔ زکوٰۃ کی مقادیر کی بابت سب سے زیادہ معتبر روایت حضرت صدیق رضؓ کی ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس دیگر اہمات مسائل میں حضرت ابوبکر رضؓ کی روایتیں سند ہیں۔ فقہ میں قاعدہ اجتہاد مقرر کیا جو سارے مجتہدوں کا دستور العمل بنا۔ مشکل مسائلِ فقہ کو حل کیا۔ تعبیر رؤیا میں ان کی شان جلالت مسلّم ہے۔

تصوف میں ذکر کلمۂ طیبہ کا طریقہ سب سے اوّل تلقین کیا۔ کشف المحجوب میں صدیق اکبر رضؓ کو امام تصوّف لکھا ہے۔ طریقہ نقشبندیہ کا سلسلہ بواسطۂ حضرت امام جعفر صادق حضرت صدیق تک پہنچتا ہے۔ اہلِ معرفت کا قول ہے کہ نسبتِ صدیقی نسبت ابراہیمی تھی۔ اسی لیے غلبۂ توحید علیٰ وجہ الکمال تھا۔ کلامِ مجید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لقب "اَوَّاهٌ مُّنِيبٌ" ہیں۔ یعنی دردمند اور اللہ پاک کی طرف رجوع کرنے والے۔ صحابہ کرام رضؓ میں حضرت ابوبکر رضؓ کا لقب "اوّاہ" (دردمند) تھا۔ یہ بھی نسبتِ ابراہیمیؑ کا اثر تھا۔ حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مرتبۂ ضمنیتِ کبریٰ حاصل تھا لہٰذا کمالاتِ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مظہرِ اَتم حضرت ابوبکر رضؓ تھے۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے لکھا ہے حضرت صدیق رضؓ کے قلب پر شعاعِ غیبی کا ظہور لطیفۂ قلبیہ سے ہوتا تھا۔ لہٰذا حقیقتِ حال بصورتِ عزیمت ظاہر ہوتی نہ بہ رنگِ تخیّل۔ حدیث شریف:

ما صب اللہ فی صدری شیئًا الا صببتہ فی صدر ابوبکر۔ — جو کچھ اللہ نے میرے سینہ میں ڈالا میں نے ابوبکر رضؓ کے سینہ میں ڈال دیا۔

واقعۂ وفات پر غور کیجئے۔ ایک انسان کی اصل حالت کا معیار غالباً اُس زمانہ سے بڑھ کر دُوسرا نہیں ہوسکتا جو موت کے قریب ہوتا ہے۔ حضرت ابوبکر جسمانی حیثیت سے کبھی قوی نہ تھے۔ اس ضعف کے ساتھ تریسٹھ برس کی عمر میں علیل ہوتے ہیں۔ پندرہ روز بخار آتا ہے۔ انتہا یہ کہ مسجد جانے کی قوت نہ رہی حالانکہ گھر کی کھڑکی مسجد میں تھی۔ اس سے تمام جسمانی ضعف کا اندازہ کرسکتے ہو۔ اس شدتِ ضعف و مرض میں عزیمت کا کیا حال ہے۔ بعض ہمدرد طبیب کے بلانے کا مشورہ دیتے ہیں تو فرماتے ہیں: طبیب دیکھ چکا۔ استفسار کرتے ہیں دیکھ کر کیا کہا۔ فرماتے ہیں یہ کہا ہے:

اِنِّیْ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ۔ — میں جو ارادہ کرتا ہُوں کر ڈالتا ہوں۔

دیکھو حضرت صدیق کی نبض کس کے ہاتھ میں تھی۔ یہ تسلیم و رضا کا بہترین سبق ہے۔ ایامِ مرض اس گھر میں بسر کرتے ہیں جو دربارِ نبویؐ سے مرحمت ہوا تھا۔ جب مرض نے زیادہ زور پکڑا تو جانشین کی فکر ہوئی۔ سوچا۔ مشورہ کیا۔ بالآخر حضرت

فاروقِ اعظمؓ کو منتخب فرمایا۔ اس انتخاب پر اُن فیوض و برکات نے آفرین کہی جو عالم پر دورِ فاروقی میں عدلِ فاروقیؓ سے نازل ہوئے۔ ملتِ اسلامیہ نے یہ انتخاب کیا تھا، وہ بھی سُن لو۔ جب ایک شخص نے حضرت عمرؓ کو سخت مزاج خیال کر کے اعتراض کیا تو نہایت جوشِ صداقت کے ساتھ جواب دیا:

اباللّٰہ تخوفنی اذا لقیت اللّٰہ قلت استخلفت علیٰ اهلك خیر اهلك۔

کیا تم مجھ کو خدا سے ڈراتے ہو۔ میں جس وقت اللہ کے روبرو جاؤں گا تو کہوں گا کہ میں تیری مخلوق پر سب سے بہتر آدمی کو جانشین مقرر کر کے آیا ہوں۔

اِس کی تشریح اُس دعا کے الفاظ میں بھی ہے جو حضرت عمرؓ کے حق میں بعد وصیت فرمائی:

اللّٰهم انّی لو ارد بذٰلك الا اصلاحهم وخفت علیهم الفتنة فعملت فیهم بما انت اعلم به واجتهدت لهم رأیا ولیت علیهم خیرهم واقویهم واحرصهم علیٰ ما ارشدهم۔

اے اللہ! میں نے یہ انتخاب مسلمانوں کی بہتری کے ارادے سے کیا ہے اور اس اندیشہ سے کہ اُن میں فساد نہ ہو۔ میں نے وہ عمل کیا جس کو تو بہتر جانتا ہے میں نے خوب غور و فکر کے بعد بہترین اور قوی ترین شخص کو ولی عہد کیا ہے جو سب سے زیادہ مسلمانوں کی راست روی کا خواہشمند ہے۔

عین وفات کے قریب حضرت مثنّیٰؓ عراق سے فوجی کمک حاصل کرنے مدینہ آتے ہیں تو خلیفہ کو بسترِ وفات پر پاتے ہیں۔ اس پر بھی حضرت ابوبکرؓ اُن سے مفصّل حالات سنتے ہیں۔ حضرت عمرؓ کو بلا کر فرماتے ہیں:

"جو میں کہتا ہوں اُس کو سُنو اور عمل کرو۔ مجھ کو توقع ہے کہ آج میری زندگی ختم ہو جائے گی دن میں میرا دم نکلے تو شام سے پہلے اور رات میں نکلے تو صبح ہوتے ہوتے مسلمانوں کو ترغیب دے کر مثنّیٰؓ کی مدد پر آمادہ کرنا۔ کسی مصیبت کی وجہ سے دین کی خدمت اور حکمِ ربانی کی تعمیل سے نہ رُکنا چاہیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت سے بڑھ کر کیا مصیبت ہو سکتی ہے تم نے دیکھا ہے کہ اُس روز میں نے کیا کیا تھا۔ قسم ہے رب کی اگر میں اُس روز حکمِ الٰہی کی بجا آوری میں کوتاہی کرتا تو اللہ ہم کو تباہ کر کے سزا دیتا، اور مدینہ میں آگ بھڑک اُٹھتی۔ اگر خداوند تعالیٰ شام میں مسلمانوں کو فتح دے تو خالد کے لشکر کو عراق بھیج دینا اس لئے کہ وہ کار آزمودہ اور وہاں کے حالات سے واقف ہے۔"

اُسی دورانِ مرض میں یہ محاسبہ ہوتا ہے کہ بیت المال سے وظیفہ کیا ملا۔ ظاہر ہے کہ جو کچھ ملا واجبی ملا۔ حق المحنۃ تھا جو صحابہ کرام کی تجویز سے ملا، تاہم صفائی محاسبہ پیشِ نظر تھی اس لیے اپنی ایک جائداد فروخت کرا کر کل رقم بیت المال کی بیباق کر دی۔ بعد بیعت کے جو اضافہ مال میں ہوا تھا (یعنی ایک حبشی غلام جو بچوں کو کھلاتا تھا اُسی کے ساتھ مسلمانوں کی تلواروں پر صیقل کرتا تھا، ایک چادر سوا روپے کی قیمت کی اور ایک اونٹنی، جس پر پانی آتا تھا) اُس کی نسبت حکم ہُوا کہ بعد وفات سب چیزیں خلیفہ کے پاس پہنچا دی جائیں۔ جب اس حکم کی تعمیل ہوئی تو حضرت عمرؓ بہت روئے اور فرمایا: "اے ابوبکرؓ! تم اپنے

جانشینوں کے لیے کام بہت سخت کر گئے۔"

اتباعِ سنّت دیکھو۔

قریب وفات حضرت عائشہؓ سے پوچھا کہ حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو کتنے پارچہ کا کفن دیا گیا۔"

کہا: "تین پارچہ کا۔"

فرمایا: "میرے کفن میں بھی تین ہی کپڑے ہوں۔ دو یہ چادریں جو میرے بدن پر ہیں دھولی جائیں۔ ایک چادر نئی لی جائے۔"

(مسلمانو! تمہارے خلیفہ کے توشہ خانہ میں صرف دو چادریں تھیں)

ایثار ملاحظہ ہو۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ سُن کر کہا کہ "ہم ایسے تنگدست نہیں کہ نیا کپڑا نہ خرید سکیں۔"

فرمایا: جانِ پدر! نئے کپڑے مُردوں سے زیادہ زندوں کے لیے موزوں ہیں کفن تو پیپ اور لہو کے واسطے ہے۔"

قدرتی اتباعِ سنّت دیکھیے۔

انتقال کے روز فرمایا کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس دن رحلت فرمائی۔"

لوگوں نے کہا: "دوشنبہ کو۔"

فرمایا: "مجھے اُمید ہے کہ میری موت بھی آج ہی ہوگی۔" (یہ دوشنبہ کا دن تھا)

سنو ادبِ محبوب۔

عین سکرات کے وقت جب دم سینہ میں آچکا تھا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حسرت سے یہ شعر پڑھا: ؎

وابیض یستسقی الغمام بوجھہ — یعنی "وہ نورانی صورت جس کی تازگی سے ابر سیراب ہو،

ثمال الیتامیٰ عصمۃٌ للارامل — یتیموں کی پناہ، بیواؤں کی محافظ۔"

سُن کر آنکھیں کھول دیں اور کہا:

"یہ شان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی، ابوبکر اس کا مستحق نہیں۔" رضی اللہ عنہ۔

خدارا اِن واقعات پر غور کرو اور کہو کہ حضرت صدیقؓ کے دل میں سوائے اللہ اور اس کے رسولؐ کے کسی کی بھی محبت تھی! واللہ نہ تھی ہرگز نہ تھی ؎

بہ پردہائے دل وچشم من نہاں حسرت
من وخدائے کہ جُز جلوۂ نگارم نیست

رضی اللہ عنہ

وجزاہ عنا خیرا لجزاء، وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین۔

عمر فاروق رضؓ کے عہد میں نظامِ حکومت

محمد حسین ہیکل

حضرت عمرؓ کا دَور غزوات و فتوحات کا دَور تھا، جس میں فتح و نصرت نے اسلامی پرچموں سے پیمانِ وفا باندھ رکھا تھا۔ ان کی حکومت مشرق میں افغانستان اور چین، شمال میں اناطولیہ اور قزوین، مغرب میں تیونس اور اس سے آگے بڑھ کے شمالی افریقہ اور جنوب میں بلادِ نوبہ سے جا ملی تھی۔

ان فتوحات نے اس زمانے کی دُنیا اور اُن مورخین کو حیرت میں ڈال دیا، جنہوں نے واقعات کی تفصیل بیان کرنے کے بعد اُن کے اسباب کی چھان بین کرنی چاہی (ان فتوحات میں غازیانِ اسلام اور اُن کے ایرانی و رومی دشمنوں کی نفسیات کو تو دخل تھا ہی، لیکن ایک سبب جس نے فتوحات کی وسعت پر غیر معمولی اثر ڈالا، وہ جزیرۃ العرب کا نظامِ حکومت تھا۔ یہ نظام ہجرتِ رسولؐ کے بعد کے بیس سال میں ایک ایسے انقلاب سے گزرا، جس نے عربوں کو یہ قوت بخشی کہ وہ سکون و اطمینان کے ساتھ اُن عظیم الشان تاریخی حوادث کا مقابلہ کرسکیں۔ اس سکون و اطمینان نے ان کے جذبۂ خود داری کو بڑھایا۔ اُن میں اپنی قوت کا شعور بیدار کیا اور ان کے اس یقین میں پختگی پیدا کی کہ جس پیغام کے وہ حامل ہیں، اسے ساری دُنیا تک پہنچانا اُن کا اور اُسے سُننا ساری دنیا کا فرض ہے۔ چنانچہ کوئی طاقت اُن کی راہ کا بھاری پتھر بنی، نہ کوئی قوت انہیں اپنے پیغام کی اشاعت سے روک سکی۔

یہ نظام نہ کسی منطقی فکر آرائی کا نتیجہ تھا نہ فقہا کی قانون سازی کا کارنامہ، جنہوں نے مل بیٹھ کر اور اس کے تمام پہلوؤں پر غور کر کے اسے مرتب کیا ہو اور اُس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا آپ کے خلفا نے اس کو نافذ کردیا ہو! نہیں! ہرگز نہیں! یہ نوزائیدہ سلطنت اپنی طفولیت سے لڑکپن اور لڑکپن سے شباب تک کے ارتقائی مرحلے بڑی تیزی سے طے کررہی تھی۔ اس لیے والیٔ سلطنت کا اوّلین فرض تھا کہ اُن حالات کا لحاظ رکھے، جو ارتقائی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ اس کی سلطنت میں رونما ہو رہے تھے اور سب سے پہلے اُس مرکزی قوت کو منظم کرے، جو اس انقلاب و ترقی کے پس پردہ کام کر رہی تھی اور مملکت کے مختلف حصّوں کو ایک مضبوط لڑی میں پرو کر اُنھیں ناقابلِ شکست بنا دے۔ بلادِ عرب میں اتحاد یا کسی قسم کا باقاعدہ نظمِ حکومت قائم ہونے سے پہلے ہی یہ مرکزی قوت اُبھرنی شروع ہوگئی تھی اور اس سے پہلے کہ عرب کسی نظمِ حکومت سے آشنا ہوں، آس پاس کے ملکوں میں اپنے اپنے مستقل نظام قائم تھے۔ عراق پر ایرانی اور شام پر بیزنطینی نظامِ حکومت مسلط تھا، لیکن مدینہ والوں نے ان دونوں میں سے کسی نظام کا چربہ اتارنے اور ایک مکمل عربی یا اسلامی دستورِ حکومت کو کاغذ پر ثبت کرنے کی کوشش نہ کی، جو مملکت کے نزدیک و دُور میں نافذ کیا جائے۔ اگر کوئی اس قسم کی کوشش کرتا بھی، تو اس کی تحریر اور اصلاح و ترمیم ہی میں کئی سال لگ جاتے جب کہیں مملکت کے مختلف حصّوں کے لیے ایک متحدہ دستور وجود میں آتا، لیکن وسیع و برق رفتار فتوحات کے دَور میں تدوینِ دستور کی گنجائش ہوتی ہے، نہ وہ اسے برداشت کرتا ہے۔ چنانچہ

فتوحات کا دور بالطبع اجتہاد کا دور ہوتا ہے، جس میں ہنگامی حالات اور ان کے مقتضیات کو دیکھ کر ہی کوئی حکم دیا جاتا ہے۔ پھر جب فتوحات کی برق رفتاری کا وہ عالم ہو، جو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں تھا، تو اور بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ دستورِ حکومت منطق اصولوں سے زیادہ والیٔ سلطنت کے بدیہی فیصلوں پر موقوف ہو اور والیٔ سلطنت فتوحات کے ساتھ ساتھ چلتا رہے۔ نہ ایک قدم آگے بڑھے نہ ایک قدم پیچھے رہے۔

اس میں شک نہیں کہ جن بزرگ ہستیوں نے جزیرہ نمائے عرب میں اسلام کی جڑیں مضبوط کیں، وہی اپنی طاقتور شخصیتوں، اپنی تعلیمات اور اپنے کردار کی بنا پر اس وحدت کا محور تھیں۔ نبی عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات والاصفات اور آپ کی رسالت اس وحدت کا سرچشمہ اور اساس تھی، اور خلیفۂ اول نے اُن محرکات و عوامل پر کاری ضرب لگائی جو اس وحدت پر حملہ کر کے اس کا کام تمام کر دینا چاہتے تھے۔ اسی طرح حضرت عمرؓ کو خلافت اس وقت سونپی گئی، جب جزیرہ نمائے عرب کی وحدت پردوں میں سے جھلک رہی تھی اور جب اس کے لیے تکمیل کے بغیر کوئی چارہ نہ رہا تھا کہ مبادا وہ شانے کمزور ہو جائیں جنہیں آئندہ اُس کا بوجھ سہارنا ہے۔

حضرت عمرؓ ضعف کا شکار ہونے والوں میں سے نہ تھے۔ اُن کی شخصیت کی توانائی اور اس کے قوتِ ظہور کی روشن مثالیں تاریخ کے صفحات پر ثبت ہیں اور اس کا جو نمایاں اثر اسلام سے پہلے اور اس کے بعد کی عربی زندگی پر مترتب ہوا تھا، وہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں۔ مدینہ کی ہجرت کے بعد اُن کی یہ خصوصیات اور بھی نکھر گئی تھیں، جہاں حضرت ابوبکرؓ کی طرح وہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشیرِ خاص تھے۔ حضرت عمرؓ بعض معاملات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اختلاف بھی کرتے تھے، جن میں سے اسیرانِ بدر جیسے دو چار مواقع پر قرآن نے ان کی تائید بھی کی اور چونکہ وہ اللہ اور اس کے رسولؐ پر سچا ایمان رکھتے تھے، اس لیے جب وحی ان کی رائے کے خلاف فیصلہ کرتی تھی، تو وہ سب سے پہلے اس کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی پیروی میں بھی انہیں ایک خاص امتیاز حاصل تھا۔ اُن کی رائے کے اختلاف کا یہ سلسلہ عہدِ صدیقی میں بھی جاری رہا۔ جب حضرت ابوبکرؓ اپنی رائے پر اصرار فرماتے، حضرت عمرؓ اسے تسلیم کر لیتے کہ صدیقِ اکبرؓ مسلمانوں کے امیر تھے، لیکن ان کی اطاعت نے ان کی شخصیت کو کبھی محو نہ کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر مکمل ایمان ہونے کے باوجود انہوں نے وقت کی ضرورت اور سنتِ ثابتہ کا فرق کبھی فراموش نہ ہونے دیا بلکہ کبھی کبھی تو وہ سنت پر نظرِ ثانی کو بھی ممکن سمجھتے تھے اور اپنے اس یقین کے تحت کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت موجود ہوتے تو اپنے فیصلے سے رجوع فرما لیتے، اسے سنت سے انکار پر محمول نہ کرتے تھے۔ (حالات کی تبدیلی سے خاص پس منظر میں دیے جانے والے احکامات تبدیل ہو جاتے ہیں)

حضرتِ صدیقؓ کے عہدِ خلافت میں حضرت عمرؓ جن مسائل سے دلچسپی رکھتے تھے، ان میں بلادِ عرب کی سیاسی وحدت بھی شامل تھی۔ لیکن ان کی اس دلچسپی نے انہیں حضرت ابوبکرؓ کی اعانت سے کبھی غافل نہ کیا اور وہ صدیقی سیاست کے نفاذ میں پورے خلوص سے کوشاں رہے۔ اس کے بعد جب وہ خود مسند آرائے خلافت ہوئے، تو سب سے پہلے انہوں نے اپنی توجہ اسی وحدت کے استحکام پر مبذول فرمائی۔ ان کے غور و فکر نے انہیں اس نتیجے پر پہنچایا کہ یہ وحدت اس وقت تک محفوظ و مامون نہیں رہ سکتی جب تک وہ ہر قسم کے شائبے سے بالکل پاک نہ ہو جائے اور اس کی یہی ایک صورت ہے کہ جس طرح عربوں کی زبان ایک ہے،

اسی طرح اُن کا وطن اور اُن کے عقاید بھی مکمل طور پر ایک ہو جائیں، لیکن یہودی اور عیسائی ابھی جزیرۂ عرب میں موجود تھے، تو کیا کتاب اور سنّت سے اختلاف کیے بغیر حضرت عمرؓ انہیں وہاں سے نکال سکتے تھے؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ پہنچتے ہی یہودیوں سے دوستی کا معاہدہ فرمایا، لیکن وہ عہد شکنی کر کے غدّاری پر اتر آئے اور مدینہ سے نکال دیے گئے۔ اس کے بعد بھی انہوں نے اپنی دشمنی کا سلسلہ جاری رکھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں جزیرہ نمائے عرب کی اکثر یہودی بستیوں سے جلاوطن فرما دیا۔ کیا یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ یہودیوں کا اپنی آبادیوں میں رہنا کوئی ایسا حق نہ تھا، جس کا احترام ضروری ہو۔ اُن کے ساتھ دوستی کا معاہدہ صرف ایک سیاسی قدم تھا، جو مدینہ کے ابتدائی دور میں حکومت کی کسی مصلحت کے پیشِ نظر اٹھایا گیا تھا، لیکن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ محسوس فرمایا کہ حکومت کی اعلیٰ مصلحت[1] اسے درست نہیں سمجھتی تو اسے چھوڑ کر دوسرا طریق عمل اختیار کر لیا۔ حضرت عمرؓ کی رائے میں حکومت کی اسی اعلیٰ مصلحت کا تقاضا تھا کہ تمام جزیرہ نمائے عرب میں صرف ایک عقیدہ رہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے عہدِ خلافت کا آغاز ہی اس سے کیا کہ نجران کے عیسائیوں کو جزیرۃ العرب سے نکال دیا۔ یعلیٰ بن اُمیّہ کو ان کا حکم تھا کہ عیسائیوں پر دین کے معاملے میں زبردستی نہ کی جائے، لیکن جو عیسائی اپنے مذہب پر قائم رہے، اُسے نکال دیا جانے اور جیسی اور جتنی زمین اس نے نجران میں چھوڑی ہو، ویسی اور اتنی ہی زمین اُسے عراق میں دے دی جائے اور اس کے ساتھ اچھی طرح پیش آیا جائے۔ یہی کچھ اُن یہودیوں کے ساتھ کیا گیا جو خیبر اور فدک میں باقی رہ گئے تھے۔ انہیں وہاں سے جلاوطن کر کے شام بھیج دیا گیا۔ ان کی زمینوں کی قیمت انہیں دے دی گئی اور ان میں سے کسی کے ساتھ کوئی بدسلوکی نہ کی گئی۔ اس طرح جزیرۃ العرب، اسلام کے سوا ہر عقیدے سے خالی ہو گیا اور اس وحدت کی بنیادیں وہاں استوار ہو گئیں، جو امیر المومنینؓ کا مطمحِ نظر تھی۔

یہ ہے اس سبب کی واضح تصویر جس کی بنا پر حضرت عمرؓ نے یہود و نصاریٰ کو جزیرۃ العرب سے نکالا تھا اور اپنے اس اقدام میں سُنّت سے اختلاف و تجاوز کیا تھا، اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود و نصاریٰ سے جو عہد فرمایا تھا، وُہ کوئی ایسی سنّت نہ تھا، جسے حکم کہا جا سکے بلکہ وُہ ایک سیاست تھی، جو عہدِ رسالتؐ ہی میں بدل گئی تھی، تو پھر بعد کو اس کی تبدیلی میں کیا قباحت تھی۔ بدلتے ہوئے حالات، فتوحات کی وسعت اور جزیرۃ العرب میں وحدتی رشتوں کے استحکام کی شدید خواہش اس کی متقاضی تھی کہ اسے بدلا جائے۔ آخر حضرت عمرؓ اس عہد نامے پر کیوں جمے رہتے، جو اپنی اصل کے اعتبار سے ایک خاص وقت تک کے لیے تھا، جو اپنی مدت ختم ہو جانے کے بعد خود بخود ختم ہو جاتا تھا اور جس کی تجدید اس وقت تک نہ ہو سکتی تھی، جب تک امیر المومنینؓ ہی نہ چاہیں۔

بلادِ عرب میں وحدت کی بنیادیں استوار کرنے کے لیے تنہا یہی کافی نہ تھا کہ وہاں اسلام کے سوا کوئی مذہب نہ رہے، جب تک اس کے باشندوں میں وُہ تمام امتیازات نہ مٹ جاتے، جن کی بنا پر کچھ لوگ اپنے آپ کو عزّت و آزادی کا دوسروں سے

---

[1] اس کا جواز خود یہودیوں نے فراہم کیا تھا۔ اسلامی حکومت کے رویّے کی تبدیلی کا سبب یہودیوں کی عہد شکنی تھی۔ ایک عہد شکن گروہ کے ساتھ معاہدہ باقی ہی کہاں رہتا ہے؟ کوئی بھی معاہدہ یکطرفہ نہیں ہوتا، جب ایک فریق اس کے مطابق ذمہ داری ادا نہ کرے تو دوسرا اس کا طوق کیوں گلے میں ڈالے رہے۔ (ایڈیٹر)

زیادہ مستحق سمجھتے تھے اور جب تک ان میں یہ شعور پیدا نہ ہو جاتا کہ صحیح مساوات ہی ہماری سلامتی کی ضامن ہے۔ اس وقت تک یہ خواب حقیقت نہ بن سکتا تھا۔ ارتداد اور ارتداد سے پیدا ہونے والی لڑائیوں نے عربوں میں بعض امتیازات پیدا کر دیے تھے، لیکن حضرت عمرؓ چونکہ صحیح وحدت کے خواہشمند تھے، اس لیے اُن تمام امتیازات کو جڑ بنیاد سے اکھاڑ پھینکنا اُن پر فرض تھا، چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے مرتدین پر جو پابندی لگائی تھی کہ وہ مسلمانوں کی صف میں شامل ہو کر نہیں لڑ سکتے، حضرت عمرؓ نے اُسے ختم کر دیا۔ اس کے بعد حکم دیا کہ عرب غلاموں کو آزاد کر کے اُن کے رشتہ داروں کے ساتھ بھیج دیا جائے، اس لیے کہ وہ (عربوں میں) غلامی کے رواج کو ناپسند فرماتے تھے۔ اس طرح فاروقِ اعظمؓ نے ایک نئے دَور کا افتتاح کیا اور تمام عربوں کے دل میں عرب کے سب سے ہوشمند انسان کی روح سرایت کر گئی۔ وہ جزیرہ نمائے عرب کے مختلف حصوں سے تعلق رکھنے کے باوجود اپنے آپ کو ایک قوم سمجھنے لگے، جس کا نصب العین مشترک تھا اور اس نصب العین کی طرف انھیں لے جانے والی ایک عمومی سیاست اور ایک اعلیٰ مصلحت تھی، جس کی نگرانی امیر المومنینؓ فرما رہے تھے۔

یہ اعلیٰ مصلحت، جس نے حضرت عمرؓ کو اسلام کے سائے میں قومی وحدت تک پہنچنے کی راہ دکھائی، اسی نے انہیں بتایا کہ وہ تاریخ و سنین کا نقطۂ آغاز رسول اللہؐ کی ہجرت کو قرار دیں۔ اس وقت تک عرب تاریخوں کا حساب کبھی عام الفیل سے لگاتے تھے اور کبھی عرب کی دوسری بڑی بڑی جنگوں سے۔ یہ جنگیں چونکہ سب کی سب جاہلیت سے تعلق رکھتی تھیں اور اسلام آیا ہی تھا جاہلیت کے آثار و رسوم مٹانے، اس لیے حضرت عمرؓ نے عہدِ رسالت کی اسلامی تاریخ کا سب سے بڑا واقعہ اس ہجرت کو قرار دیا، جو نبیِّ عربی علیہ التحیۃ والتسلیم نے مکّہ سے مدینہ کی طرف فرمائی تھی۔ کیونکہ اسی ہجرت کے بعد سے اللہ نے اپنے رسول کو نصرت و کامرانی سے نوازنا شروع کیا تھا اور یہی ہجرت اللہ کے دین کی عزّت و سربلندی کا سبب بنی تھی۔ اس کامیاب انتخاب سے وحدت کو بڑی تقویت پہنچی اور اس کی اہمیت اس لیے اور بڑھ گئی کہ اس کی تکمیل ۱۶ھ میں ہوئی، جب اسلامی فوجیں کسریٰ اور قیصر کے ملکوں میں فاتحانہ پیش قدمی کر رہی تھیں اور مدائن میں گھس کر ایوانِ اعظم کے پرخچے اُڑا رہی تھیں۔ اِدھر بیت المقدس کے دروازے مسلمانوں کے لیے کھل رہے تھے اور وہ کلیسائے قیامت کے پہلو میں مسجدِ اقصیٰ کی بنیاد ڈال رہے تھے۔ حضرت عمرؓ نے جب اس شاندار اسلامی سنِ تقویم کو ایرانی و رومی سنِ تقویم کے سامنے رکھ کر دیکھا، تو یہ ان سے کہیں زیادہ روشن ثابت ہُوا، اس لیے کہ اس سے دُنیا کی تاریخ کا ایک بہت بڑا واقعہ نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔

فطری بات تھی کہ حضرت عمرؓ سیاست کے اصول مرتب کرنے میں اپنی طاقت ور شخصیت اور خداداد بصیرت کا سہارا لیں۔ اس لیے کہ حکومت ابھی نشو و ارتقا کے ابتدائی مراحل میں تھی اور عراق و شام کی لڑائیاں انتہائی احتیاط اور ہوش مندی کی متقاضی تھیں۔ جن حالات سے حضرت عمرؓ کو اس زمانے میں دوچار ہونا پڑا تھا، اگر وہی حالات ہمارے یا کسی اور زمانے میں پیش آجائیں، تو جنگی ضروریات کا تقاضا یہی ہوگا کہ حکومت کی باگ ڈور کسی ایسے ذمہ دار شخص کو سونپ دی جائے، جو تمام تر اختیارات کا مالک ہو تاکہ جنگی کوششوں کی تنظیم اور اس کی دشواریوں کا مقابلہ کرنے میں کسی قسم کی رکاوٹ پیش نہ آئے۔

کیا تیزی سے بدلتے ہوئے ان حالات کی موجودگی میں حضرت عمرؓ کے لیے ممکن تھا کہ وہ آغازِ خلافت ہی میں ایک مفصل نظام مرتب کر کے تمام بلادِ عرب میں نافذ کر دیتے یا عراق میں جو ایرانی نظام رائج اور شام پر جو بیزنطینی نظام مسلط تھا، اس سے جزیرہ نمائے عرب کے لیے کوئی نظام اخذ کر لیتے؟ میں نہیں سمجھتا، ان میں سے ایک بات بھی حضرت عمرؓ کے ذہن میں آئی ہو۔ جزیرۃ العرب اپنے

جغرافیائی محلِ وقوع کے پیشِ نظر عراق وشام سے جوہری اختلاف رکھتا تھا اور عرب جس زندگی سے مانوس تھے وہ ایران و روم کے نظاموں سے میل نہ کھاتی تھی۔ پھر اگر فاروقِ اعظمؓ کی تمام تر توجہ اور کوششیں جنگ پر مرکوز نہ ہوتیں، تو شاید وہ اس مسئلے پر غور فرماتے۔ لیکن عہدِ فاروقیؓ کی ابتدا میں اسلامی لشکر، عراق کے محاذ پر نہایت نازک صورتِ حال سے دوچار تھا اور شام میں اُن کی فوجیں رومی قوتوں سے نبرد آزما تھیں جو سامان و تعداد کے لحاظ سے ان سے دگنی اور چوگنی تھیں۔ ان حالات میں اُن کے لیے بس اتنا ہی کافی تھا کہ وہ جزیرہ نمائے عرب کو ایک آزاد اسلامی عربی وحدت میں ضم کر دیتے، جس سے عوام میں خود اعتمادی پیدا ہوتی اور خود اعتمادی فاتحانہ قوتوں کو مہمیز کرتی اور اس کی تنظیم زمانے کے سپرد فرما دیتے کہ وہ کتاب و سنت کی حدود میں اُسے آہستہ آہستہ پختہ کرتا رہتا۔

اگر حضرت عمرؓ جزیرۃ العرب کے مختلف حصوں میں کوئی ایک نظام نافذ کرنے کی کوشش کرتے، تو اس کے نتائج نہ اُن کے لیے خوشگوار ثابت ہوتے، نہ مسلمانوں کے لیے۔ شہریوں کو بدویانہ نظام خوش نہ آتا اور بدوی شہری نظام قبول نہ کرتے۔ حضرت عمرؓ نے غلاموں کو واپس کرنے اور مرتدین پر سے پابندیاں اٹھانے کا جو حکم دیا تھا، اس سے لوگ بہت خوش تھے۔ فاروق اعظمؓ کا یہ اقدام بالکل صحیح تھا کہ انہیں اسی طرح خوش رہنے دیا جائے تاکہ اُن میں تعاون کا جذبہ پیدا ہو اور وُہ جنگ کی دعوت پر بطیبِ خاطر لبیک کہہ کر اسلامی فوج کا بوجھ ہلکا کریں۔ اس [illegible] اتنا میں کوئی حرج نہیں، اگر جزیرہ نمائے عرب کے مختلف گوشوں مثلاً یمن وغیرہ میں ان کا سابقہ نظام بحال رہے اور حضرت عمرؓ بس یہی کریں کہ ہر ریاست میں اپنا ایک والی بھیج دیں، جو وہاں مدینہ کی حکومت قائم کرکے لوگوں سے صدقات وصول کرے۔ ان میں اللہ کی حدود قایم کرے اور انہیں دین کی تعلیم دے تاکہ وُہ اپنی زندگی کو اس کے احکام کے سانچے میں ڈھال لیں۔ اس کے سوا باقی تمام معاملات میں ہر قوم اور ہر قبیلے کی شخصی آزادی برقرار رکھی جائے، جس کے وہ برسوں سے عادی چلے آرہے ہیں اور اُن ریاستوں کے باہمی روابط کو مملکت کے عمومی مفاد پر اثر انداز نہ ہونے دیا جائے۔ اب کہ بلادِ عرب کا نظام یہ تھا ہمیں حق پہنچتا ہے کہ آج کل کی ایک دستوری اصلاح مستعار لے کر ان روابط کو ایک ایسے وفاق سے موسوم کریں، جو ریاست ہائے متحدہ امریکہ یا سوئٹزرلینڈ کی ریاستوں کے وفاق سے مشابہ تھا۔

مدینہ اس وفاق کا دارالسلطنت تھا۔ اُس کے اس تقدم کی تنہا یہی وجہ نہ تھی کہ اُس نے مرتدین پر فتح پائی تھی۔ اگر ارتداد کا فتنہ سر نہ اُٹھاتا تو بھی فطری طور پر مدینہ ہی اسلام کا سب سے پہلا دارالسلطنت ہوتا اور اسے تمام شہری اور بدوی آبادیوں پر فوقیت دی جاتی، کیونکہ یہی شہر تھا جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پناہ دی تھی۔ آپؐ کی بزرگ داشت اور آپ کی سازداری کی تھی۔ یہیں قرآن کی مکہ سے زیادہ آیتیں نازل ہوئی تھیں اور یہیں وہ مہاجرینؓ و انصارؓ جمع تھے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سُنتے اور آپؐ کی سنت کو جانتے تھے اور جنہوں نے اللہ کے دین کی عزت و نصرت کے لیے اپنی جانیں لڑا دی تھیں۔ چنانچہ مدینہ وحیِ محمدی کا مقامِ نزول، اسلامی قانون سازی کا سرچشمہ اور دین کی طرف سب سے پہلے سبقت کرنے والوں کا مستقر تھا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی کو اپنا دارالحکومت بنایا اور دینِ الٰہی کی دعوت کے لیے یہیں سے ملوک و امراء کے پاس اپنے ایلچی بھیجے تھے۔ جس شہر کی شان یہ ہو، عجب کیا اگر وہ دارالسلطنت بنایا جائے اور حیرت کیوں اگر ہر چہار طرف سے نگاہیں اُس کی طرف اُٹھیں!

عہدِ فاروقیؓ میں مدینہ کا نظامِ حکومت اُسی بنیاد پر قائم تھا جو عہدِ رسالتؐ اور اس کے بعد عہدِ صدیقیؓ میں اُس کے لیے مقرر کی گئی تھی

یہ بنیاد شوریٰ تھی جس میں اللہ کے اس حکم سے استنباط کیا گیا تھا کہ: وَاَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ اور آپس کے مشورے سے کام کرتے ہیں اور اس ارشادِ خداوندی سے جو اپنے نبیؐ سے خطاب فرماتے ہوئے کیا گیا تھا کہ: وَشَاوِرْھُمْ فِی الْاَمْرِ اور معاملات میں ان سے مشورہ لو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہؓ سے مشورہ فرماتے تھے، جن میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ سب سے مقدم تھے۔ آپؐ ان دونوں سے فرمایا کرتے تھے:

"خدا کی قسم! اگر تم دونوں کسی مسئلے پر متفق ہو جاتے ہو، تو میں تمہارے مشورے سے کبھی نہیں ہٹتا!"

حضرت ابو ہریرہؓ کہتے تھے:

"میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کسی کو اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرتے نہیں دیکھا۔"

اس کے بعد جب حضرت ابوبکرؓ نے عنانِ خلافت سنبھالتے ہی حضرت اسامہ بن زیدؓ کو روم کی جنگ کے لیے بھیجا، تو اُن سے اجازت چاہی کہ حضرت عمرؓ کو وہ مدینہ ہی میں رہنے دیں تاکہ حضرت ابوبکرؓ دوسرے رفقا کے ساتھ حضرت عمرؓ کے مشوروں سے بھی مستفید ہو سکیں۔

یہی طریق کار حضرت عمرؓ نے بھی اختیار کیا اور "شوریٰ" کو اپنی حکومت کی بنیاد قرار دیا۔

مہاجرینؓ و انصارؓ صحابہ میں سے ممتاز شخصیتیں اُن کے پاس تھیں۔ جس مسئلے کے متعلق وہ کتاب و سنت میں کوئی حکم نہ پاتے ان حضرات کی رائے کی روشنی میں اس کا حل تلاش کرتے۔ یہ بزرگ شوریٰ کے خصوصی ارکان تھے، جن میں حضرت عباس بن عبد المطلب، حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ، حضرت علیؓ بن ابی طالب، حضرت عثمانؓ بن عفان، حضرت عبد الرحمٰنؓ بن عوف اور اسی مرتبے کے دوسرے صحابہ نمایاں حیثیت رکھتے تھے، لیکن حضرت عمرؓ اکثر و بیشتر عام مجلسِ شوریٰ منعقد کرتے تھے۔ چنانچہ لوگوں کو مسجدِ نبویؐ میں بلاتے یا مدینے سے باہر ہوتے، تو انہیں نماز کے لیے جمع ہونے کا حکم دیتے، اور مشورہ طلب بات ان کے سامنے رکھ دیتے۔ اس مجلس میں ہر شخص کو اپنی اپنی رائے پیش کرنے کا حق ہوتا تھا۔ اس کے بعد بھی اگر مسئلہ حل نہ ہوتا تو نوجوانوں کو بلا کر اُن کی رائے دریافت فرماتے کہ نوجوانی کی عقل تیز ہوتی ہے۔ جب عام مجلس شوریٰ میں اس کا کوئی حل نکل آتا، تو اُسے نافذ فرما دیتے، ورنہ وہ مسئلہ خاص مجلسِ شوریٰ کے سامنے پیش کرتے تا آنکہ بحث و تمحیص کے بعد اُس کے کسی بہتر حل پر مطمئن ہو جاتے۔

عراق میں ابو عبید کی شہادت کے بعد انہوں نے لوگوں سے مشورہ کیا اور پوچھا کہ وہ کیا کریں؟ اُن سب نے کہا:

"آپ ہمیں اپنے ساتھ لے کر خود چلیں!"

لیکن خواص نے یہ رائے دی کہ:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی صحابیؓ کو عراق کا امیرِ لشکر بنا کر بھیج دیجئے اور خود مدینہ میں رہ کر اُن کی مدد کیجئے!"

اس پر فاروقِ اعظمؓ نے ان لوگوں کو دوبارہ جمع کر کے فرمایا:

"مسلمانوں کے لیے یہی بہتر ہے کہ ان کے معاملات مشورے سے طے ہوں۔ میرا بھی وہی خیال تھا، جو تم لوگوں کا ہے، لیکن تمہارے اہل الرائے نے مجھے جانے سے روک دیا ہے اور اب میری بھی یہی رائے ہے کہ میں خود مدینہ میں رہوں اور عراق کسی اور شخص کو بھیج دوں!"

اس کے بعد جب وہ شام روانہ ہوئے اور سپہ سالارانِ عساکرِ اسلام نے اُن سے مل کر یہ کہا کہ شام کی سرزمین فساد زدہ ہو گئی ہے اور وہاں نہایت شدید طاعون پھیلا ہوا ہے، تو انہوں نے لوگوں کو جمع کر کے مشورہ کیا کہ انہیں وبا کے باوجود شام کا سفر جاری رکھنا چاہیئے یا مدینہ واپس ہو جانا چاہیے؟ لوگوں میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ ایک گروہ کی رائے تھی کہ سفر جاری رکھنا چاہیئے اور دوسرا گروہ کہتا تھا کہ واپس ہو جانا چاہیے۔ بالآخر دوسرے گروہ کی رائے سے اتفاق کیا گیا اور حضرت عمرؓ اپنے ساتھیوں سمیت مدینہ واپس ہو گئے۔

اُن کے نزدیک شُوریٰ کی حیثیت ایک بنیادی نظام کی تھی، جس پر مملکت کے تمام گوشوں میں عمل ہونا ضروری تھا۔ وہ اپنے امرائے لشکر اور والیوں کو بھی مشورے کا حکم دیتے تھے۔ ابو عبیدہ کو عراق روانہ کرتے وقت انہوں نے فرمایا تھا:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کی بات سننا اور انہیں اپنے معاملے میں شریک رکھنا۔ فیصلہ کرنے میں عجلت سے کام نہ لینا۔ کیونکہ جنگ میں وہی شخص کامیاب ہوتا ہے جس کے مزاج میں تحمل ہو اور جو موقع سے فائدہ اٹھانا جانتا ہو۔"

وہ اپنے تمام والیوں کو اسی طرح ہدایت کرتے تھے، چاہے انہیں محاذِ جنگ کی نگرانی کے لیے بھیجا جا رہا ہو یا کسی علاقے کے انتظام و انصرام کے لیے۔

حضرت عمرؓ نے بنو ہاشم، کبار صحابہؓ اور رؤسائے قریش کو مدینہ میں اس لیے روکا تھا کہ ان کی غیر معمولی عقل و حکمت اور تجربہ لیاقت سے فائدہ اٹھائیں اور انھیں اپنا مشیر بنائیں۔ اس لیے کہ شوریٰ حکومت کی بنیاد تھی اور چونکہ آخری رائے خلیفہ کی ہوتی تھی، ہر معاملے میں قولِ فیصل اسی کی بات سمجھی جاتی تھی، اس لیے ان اختیارات کے بدلے حکومت کی تمام سیاسی ذمہ داریاں بھی اُسی کو اٹھانی پڑتی تھیں۔ چنانچہ سارا اقتدار خلیفہ ہی کے ہاتھ میں آگیا تھا۔ وہ کتاب و سنّت کی حدود میں رہ کر قانون بناتا اور اسے نافذ کرتا تھا۔ وہی قاضی بھی ہوتا تھا اور وہی کمانڈر انچیف بھی۔ حضرت عمرؓ نے یہ تمام ذمہ داریاں بہ طریقِ احسن اٹھائیں اور تاریخ نے ان کے نام کو بقائے دوام بخش کر اس کے گرد عظمت و جلال کا ایک تابناک ہار بنا دیا۔

یہ دیکھ کر، کہ حضرت عمرؓ نے یہ تمام ذمہ داریاں بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ سنبھالیں، دل حیرت و استعجاب میں ڈوب جاتے ہیں اور اُن میں سے اکثر فاروقِ اعظمؓ کی اس عجیب و غریب مقدرت کا راز تلاش کرنے لگتے ہیں۔ اگر کوئی سچّے دل سے اس راز کو معلوم کرنا چاہے تو کرسکتا ہے کہ یہ راز فاروقِ اعظمؓ کی بے نفسی اور اس خلوص میں مضمر تھا، جو فرض کی اہمیت کا پورا پورا احساس کرتے ہوئے وہ ادائے فرض میں برتتے تھے۔ فرض کا یہ احساس اُن میں اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ تاریخ اپنے کسی دَور میں اس کی مثال پیش نہیں کرسکتی۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس احساس کی تصویر کھینچنے کے لیے حضرت عمرؓ کے اس قول سے بہتر الفاظ ہمیں کہیں مل سکتے ہیں کہ:

"میں رعایا کی دیکھ بھال کیسے کرسکتا ہوں جب تک مجھ پر بھی وہ کچھ نہ بیتے جو اس پر بیتتی ہے۔"

غرور و نمائش سے وہ اتنا ڈرتے تھے کہ بعض روایات اس خوف کو حیرت ناک ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا:

"میں عمرؓ کے ساتھ تھا کہ وہ ایک احاطے میں داخل ہو گئے اور دیوار کے پیچھے سے میں نے انہیں یہ کہتے سنا، خطّاب کا

بیٹا عمرؓ اور امیر المومنینؓ! سبحان اللہ! خدا کی قسم! خطاب کے بچو کرے! خدا سے ڈر، ورنہ وہ تجھے ضرور اس کی سزا دے گا۔ کہتے ہیں کہ ایک دن وُہ اپنی پیٹھ پر پانی کا مشکیزہ لادے جا رہے تھے۔ لوگوں نے اس کا سبب پُوچھا تو فرمایا، میرے نفس نے مجھے مبتلائے غرور کرنا چاہا تھا، میں اسے ذلیل کر رہا ہُوں۔"

عہدِ فاروقیؓ میں مملکت کو جو وسعت ہُوئی، وہ حضرت عمرؓ کو اپنی راہ سے بھٹکا نہ سکی اور انہوں نے انتظامِ حکومت کے لیے مسجدِ نبویؐ کو چھوڑ کر کوئی الگ ایوان نہیں بنایا۔ اس خصوص میں ان کی شان وہی رہی، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کی تھی۔ عہدِ فاروقیؓ کے ابتدائی زمانے میں مسجدِ نبویؐ بالکل ویسی ہی تھی، جیسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بنایا تھا۔ کچّی اینٹوں کی دیواریں اور کھجور کی ٹہنیوں کی چھت۔ فاروقِ اعظمؓ اگر چاہتے تو اُسے ڈھا کر از سرِ نو ایسی شاندار مسجد بنوا سکتے تھے، جیسی ان کے جانشینوں کے عہد میں بنوائی گئیں تا کہ ان کی نشست گاہ اُن کے وقارِ سلطنت کے شایانِ شان ہو جاتی، لیکن حضرت عمرؓ نے اپنی خلافت کے ابتدائی چار سال میں مسجد کو ہاتھ تک نہ لگایا، مگر جب مدینہ کی آبادی بڑھی اور مسجد نمازیوں پر تنگ ہوگئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کو سند بنا کر "ہمیں مسجد کی توسیع کرنی چاہیے" اس کی توسیع کا حکم دیا۔ حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے:

"اگر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے نہ سُنتا کہ ہمیں اپنی مسجد کو وسیع کرنا چاہیے، تو ہرگز اس کی توسیع نہ کراتا۔"

مسجد کی توسیع کا حکم دیتے وقت حضرت عمرؓ نے اُسے نماز اور معاملاتِ حکومت کے لیے مخصوص کرنا چاہا، کیونکہ اہلِ مدینہ نے اسے اپنا دار الندوہ بنا رکھا تھا۔ وہیں بیٹھ کر تجارتی مسائل پر گفتگو کرتے اور اسی کو اپنی افسانہ گوئی اور تفاخر کا میدان بناتے۔ بعض اوقات تو یہاں تک ہوتا کہ امیر المومنینؓ وہاں بیٹھے مہماتِ امور پر غور فرما رہے ہیں اور لوگوں کے شور سے کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی۔ چنانچہ مسجد کی توسیع کے بعد اس کے ایک طرف "بطیحاء" کے نام سے فاروقِ اعظمؓ نے ایک جگہ مخصوص کر دی اور فرمایا:

"جو کوئی شور مچانا یا اونچی آواز سے بات کرنا یا شعر پڑھنا چاہے، وہ اس طرف چلا جائے۔"

مسجد کی عمارت میں حضرت عمرؓ نے جو ترمیم کی، وہ اس سے زیادہ نہ تھی کہ صحن وسیع کرا دیا اور دروازوں کی تعداد بڑھوا دی۔ باقی مسجد اُسی طرح رہی جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے تعمیر فرمایا تھا۔ وہی پتھروں کی بنیادیں اور وہی کچّی اینٹوں کی دیواریں، وہی لکڑی کے ستون اور وہی کھجور کی ٹہنیوں کی چھت اور اسی سادہ وضع کی مسجد سے حضرت عمرؓ اپنے سپہ سالاروں کو احکام صادر فرماتے تھے۔ دیکھیے! یہ کسریٰ کا ایوان اُس کے سر پر گر رہا ہے، یہ قیصر شام سے قسطنطنیہ کی طرف بھاگ رہا ہے اور یہ عظیم اسکندریہ۔ یہ اُس دور کی عالمی تہذیب کا پایۂ تخت اپنی کنجیاں مسلمانوں کے حوالے کر رہا ہے۔

اسی طرح حضرت عمرؓ نے جو سادہ زندگی اختیار کی تھی اور اُن کے ایمان نے دنیا کو اُن کی نگاہوں میں جو بے اصل بنایا تھا، فتوحات کی وسعت نے اس میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی۔ مسلمانوں نے اُن کی خلافت کے آغاز میں حضرت ابوبکرؓ کی طرح بیت المال میں اُن کا اور اُن کے اہل و عیال کا بھی حق مقرر کر دیا تھا، لیکن جس وقت مدینہ میں مالِ غنیمت کے انبار لگے، اس وقت بھی حضرت عمرؓ نے اس میں سے اتنا ہی حصّہ لیا، جتنا ایک عام مسلمان کا ہوتا تھا، کیونکہ خلافت کی بنا پر وُہ اپنا حق دوسروں کے حق سے زیادہ نہ سمجھتے تھے۔ ایک دن اُن سے کسی نے پُوچھا کہ اللہ کے مال میں سے آپ کے لیے کیا جائز ہے؟ حضرت عمرؓ نے جواب دیا، "میں تمہیں بتاتا ہُوں کہ اس میں سے میرے لیے

کیا جائز ہے۔ کپڑوں کے دو جوڑے، ایک جاڑے کا اور دُوسرا گرمی کا، حج اور عمرہ کے لیے ایک احرام اور میرے اور میرے اہل و عیال کے لیے فی کس اتنا کھانا جو قریش کے ایک آدمی کی خوراک ہے، نہ اس سے زیادہ نہ اس سے کم۔ اس کے بعد میں مسلمانوں کا ایک فرد ہوں۔ جو اُن کا حال سو میرا حال۔"

وہ فرمایا کرتے تھے:

"اللہ کا مال میرے لیے ایسا ہے، جیسا کسی یتیم کا مال۔ ضرورت نہیں ہوتی، تو اسے ہاتھ نہیں لگاتا اور حاجت مند ہوتا ہوں، تو بقدرِ احتیاج لے لیتا ہوں۔ بیت المال سے کچھ لینے میں وہ اس قدر احتیاط برتتے تھے کہ بعض اوقات یہ احتیاط تکلیف دہ ہو جاتی تھی ایک دن انھیں کوئی شکایت ہوگئی، جس کے لیے شہد تجویز کیا گیا۔ بیت المال میں شہد کا ایک کپّا تھا۔ منبر پر خطبہ دینے آئے تو کہا:

"اگر تم اجازت دو تو میں بیت المال سے شہد لے لُوں، ورنہ وہ مجھ پر حرام ہے۔"

اور لوگوں نے اجازت دے دی۔ حضرت عمرؓ نے خلافت سے اپنے لیے کچھ نہ چاہا، بلکہ جس طرح وہ مسلمانوں کے اتحاد و آزادی کے امانت دارنگراں تھے، اسی طرح اپنے آپ کو اُن کے مال کا بھی امانت دار نگراں سمجھتے تھے۔ اس چیز نے انہیں سب کا محبوب بنا دیا تھا عوام ان سے یُوں اور بھی محبت کرتے تھے کہ فاروقِ اعظمؓ کے نزدیک خلافت کو پدرانہ حیثیت حاصل تھی، یعنی جس طرح ایک باپ اپنی اولاد کا خیال رکھتا ہے، اسی طرح خلیفۃ المسلمین کو مسلمانوں کا خیال رکھنا چاہیے۔ شفقت و دردمندی کو پدرانہ جذبات میں سب سے مقدس اور سب سے بلند مقام حاصل ہے اور حضرت عمرؓ محتاجوں کے ساتھ سب سے زیادہ شفقت و دردمندی سے پیش آتے تھے۔ اس لئے کہ وہ شفقت و دردمندی کو اقامتِ عدل اور تحفظِ امن کی طرح حکومت کا ایک فرض سمجھتے تھے۔

ہمدردی اور اس مہربانی نے اُن کی حکومت کو لوگوں کے نزدیک محبوب بنا دیا تھا اور وُہ خلیفہ کو ہر کمزور، ہر یتیم اور ہر محروم کا باپ سمجھنے لگے تھے۔ پھر لوگ حضرت عمرؓ کے بھی گرویدہ تھے۔ اس لیے کہ فاروقِ اعظمؓ کو عدل و انصاف سے فطری لگاؤ تھا اور وہ آزادی و مساوات سے بے انتہا محبت کرتے تھے، جس کا آسان سا ثبوت یہ تھا کہ وُہ اپنی ذات کو کمزوروں اور محتاجوں کی سطح پر رکھتے تھے۔ ایک دن مسلمانوں کے سامنے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

"میں نے تم پر عمّال اس لیے مقرر نہیں کیے ہیں کہ وُہ تمہاری کھالیں اُدھیڑیں، تمہیں رُسوا کریں اور تمہارا مال چھینیں، بلکہ انہیں اس لیے عامل بنایا ہے کہ وہ تمہیں کتاب و سنّت کی تعلیم دیں۔ پس اگر کسی پر اس کا عامل ظلم کرے گا اور اس کی شکایت مجھ تک پہنچے گی، تو بدلہ لیے بغیر نہ چھوڑوں گا۔"

اور سپہ سالارانِ افواج کو لکھا:

"مسلمانوں کو نہ مارنا کہ وہ ذلیل ہو جائیں گے۔ انھیں محروم نہ کرنا کہ وہ بے دینی اختیار کر لیں گے، انہیں آپس میں شیر و شکر نہ ہونے دینا کہ وہ راہ سے بھٹک جائیں گے اور انھیں گھنے جنگل میں لے کر نہ اُترنا کہ وُہ ہلاکت میں پڑ جائیں گے۔"

یہ حکم انہوں نے سپہ سالارانِ افواج کو اس لیے دیا کہ براہِ راست اِن معاملات کو اپنے ہاتھ میں نہ لے سکتے تھے ورنہ جو کام وہ خود کر سکتے تھے، ہرگز کسی دُوسرے کے سپرد نہ فرماتے تھے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ انہوں نے اپنی خلافت کے آغاز میں کہا تھا:

"خدا کی قسم! تمہارا جو معاملہ میرے سامنے پیش ہوگا، میں اپنے سوا کسی دُوسرے کے ذمّے نہ کروں گا۔"

اور اپنے اس قول کو انہوں نے سچ ثابت کر دکھایا کیونکہ وہ ہر چھوٹے بڑے معاملے کو خود طے کرتے تھے جس طرح فوجی معاملات کی تنظیم، عمّال کا تقرر، مملکتی سیاست کی تعیین اور لوگوں کے درمیان منصفانہ فیصلوں جیسے اہم کام وہ خود انجام دیتے تھے۔ اس کے علاوہ جہاں تک ممکن ہوتا تھا' چھوٹے چھوٹے کاموں کو بھی نظرانداز نہ کرتے تھے۔ ایک دن حضرت علیؓ ابنِ ابی طالب نے دیکھا کہ وُہ مدینہ کے باہر دوڑتے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔ پُوچھا:

"امیر المومنین کہاں ہیں؟"

فرمایا:

"صدقے کے اونٹوں میں سے ایک اونٹ بھاگ گیا ہے اُسے ڈھونڈنے جا رہا ہوں!"

حضرت علیؓ نے کہا:

"آپ نے اپنے جانشینوں کو تھکا دیا۔"

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ فاروقِ اعظمؓ سے حضرت عبدالرحمٰنؓ نے پُوچھا:

"اس وقت آپ کیسے تشریف لائے؟"

فرمایا:

"ایک قافلہ بازار کے پہلو میں آکر اُترا ہے۔ مجھے ڈر ہے' مدینہ کے چور اسے کوئی نقصان نہ پہنچا دیں، آؤ اس کی حفاظت کریں!"

اپنی خلافت کے آخری دَور میں انہوں نے چاہا کہ لوگوں کے معاملات کا بطورِ خود مطالعہ کریں اور سلطنت کے ہر حصّے میں جاکر دیکھیں کہ وہاں کی عمومی حالت کیا ہے اور عمّال اپنے فرائض کس طرح انجام دے رہے ہیں، اُن سے ایک روایت نقل کی گئی ہے کہ فتح مصر کے بعد انہوں نے فرمایا:

"اگر میں زندہ رہا تو ان شاءاللہ پُوری رعایا کا دَورہ کروں گا۔ مجھے معلوم ہے کہ لوگوں کی بعض ضرورتیں بالا ہی بالا قطع کر دی جاتی ہیں نہ عمّال انہیں میرے سامنے پیش کرتے ہیں نہ حاجت مند مجھ تک پہنچتے ہیں۔ چنانچہ میں شام جاؤں گا اور وہاں دو مہینے ٹھہروں گا پھر جزیرے جاؤں گا اور وہاں دو مہینے ٹھہروں گا۔ پھر مصر جاؤں گا اور وہاں دو مہینے ٹھہروں گا۔ پھر بحرین جاؤں گا اور وہاں دو مہینے ٹھہروں گا پھر کوفہ جاؤں گا اور وہاں دو مہینے ٹھہروں گا۔ پھر بصرہ جاؤں گا اور وہاں دو مہینے ٹھہروں گا۔ بخدا میرا یہ دَورہ بہت مفید و بہتر رہے گا۔"

لیکن موت نے اُن کا یہ ارادہ پُورا نہ ہونے دیا۔

حضرت عمرؓ کا عدل آج تک ضرب المثل ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اللہ کے بندوں میں سب سے زیادہ اللہ اور اس کے حساب سے ڈرنے والے تھے۔ اور لوگوں پر حکومت کرنے میں جس بے لاگ سُوجھ بُوجھ، باریک بینی اور محاسبۂ نفس کی ضرورت ہوتی ہے اسے خُوب جانتے تھے۔ ایک دفعہ دو جھگڑنے والے ان کے پاس آئے، تو فاروقِ اعظمؓ گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے اور فرمایا:

"یا اللہ! ان کے بارے میں مجھے روشنی عطا فرما! ان میں سے ہر ایک میرا دین چاہتا ہے!"

عدل قائم کرنے میں وُہ اپنے عزیزوں کے ساتھ کوئی نرمی نہ برتتے تھے، بلکہ ایک بار جب انہوں نے لوگوں کو کسی بات سے روکنا چاہا تو اپنے اہل وعیال کے پاس گئے اور فرمایا :

" میں کسی ایسے شخص کو نہیں جانتا، جسے میں نے کسی کام سے روکا ہو، اور پھر اس نے وہی کام کیا ہو۔ سوائے اس شخص کے جسے سزا دینے میں مجھ سے کمزوری ظاہر ہوئی، ان کے صاحبزادے عبدالرحمٰن مصر میں تھے۔ ایک دن انہوں نے ابو سروعہ کے ساتھ نبیذ پی اور اُن پر نشہ طاری ہوگیا۔ وہ دونوں حضرت عمروؓ بن عاص کے پاس پہنچے کہ وہ ان پر حد جاری کریں۔ ابنِ عاصؓ کہتے ہیں کہ" میں نے انہیں جھڑک کر نکال دیا۔"

اس پر عبدالرحمٰن بولے :

" اگر آپ نے حد جاری نہ کی، تو جب میں والد کے پاس جاؤں گا یہ بات اُن سے کہوں گا۔"

میں جانتا تھا کہ اگر میں نے ان دونوں پر حد نہ لگائی تو عمرؓ ناراض ہوں گے اور مجھے معزول کر دیں گے، اس لیے میں انھیں گھر کے صحن میں لایا اور ان پر حد لگائی۔ عبدالرحمٰن بن عمرؓ گھر کی کوٹھڑی میں گھس گئے اور اپنا سر مونڈا۔ خدا کی قسم! اس واقعے کے متعلق میں نے عمرؓ کو ایک حرف نہیں لکھا، یہاں تک کہ اُن کا یہ خط مجھے ملا :

" اللہ کے بندے امیرالمومنین عمرؓ کی طرف سے عاصی بن عاصی کے نام۔ ابنِ عاصؓ تمہاری جرأت اور بدعہدی پر مجھے حیرت ہے اور میں تمہیں معزول کرکے چھوڑوں گا۔ تم نے عبدالرحمٰن کو اپنے گھر میں تازیانے لگائے اور وہیں اس کا سر مونڈا، حالانکہ تم جانتے تھے کہ یہ کام میری مرضی کے خلاف کر رہے ہو۔ عبدالرحمٰن تمہاری رعایا کا ایک فرد ہے، تمہیں اس کے ساتھ وہی سلوک کرنا چاہیے تھا جو تم دوسرے مسلمانوں کے ساتھ کرتے ہو، لیکن تم نے کہا وہ امیرالمومنین کا بیٹا ہے، حالانکہ تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ میرے نزدیک کسی شخص سے حق وصول کرنے میں رعایت و نرمی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جس وقت میرا یہ خط تمہارے پاس پہنچے، اُسی وقت اُسے ایک اُونی عبا پہناؤ اور کاٹھی پر بٹھا کر فوراً میرے پاس بھیج دو، تاکہ وہ بدکرداری کی حقیقت سے آگاہ ہو جائے۔"

جیسا کہ ان کے والد نے کہا تھا، میں نے اسی طرح انہیں بھیج دیا اور عمرؓ کو معذرت نامہ لکھا کہ میں نے انہیں اپنے گھر کے صحن میں حد لگائی اور خدا کی قسم! جس سے بڑی کوئی قسم نہیں، میں ہر ذمی اور مسلمان کو اپنے گھر ہی میں حد لگاتا ہوں۔ اور یہ خط عبدالرحمٰن بن عمرؓ کے ہاتھ روانہ کردیا۔ عبدالرحمٰن اپنے والد کے پاس لے جائے گئے۔ جب وہ ان کے سامنے پہنچے تو اُونی عبا ان کے جسم پر تھی اور سواری کی تکلیف سے وہ چل نہ سکتے تھے۔ ان کے والد نے پوچھا :

"عبدالرحمٰنؓ! تم نے یہ حرکت کی ہے ؟"

عبدالرحمٰن بن عوف نے اُن کی سفارش کی اور کہا :

" امیرالمومنین! ان پر حد لگائی جاچکی ہے۔"

لیکن عمرؓ نے اُن کی بات پر دھیان نہ دیا اور عبدالرحمٰن بن عمرؓ چلّانے لگے :

"میں بیمار ہوں، آپ مجھے قتل کر رہے ہیں۔"

روایت میں ہے اس کے باوجود حضرت عمرؓ نے اُن پر دوبارہ حد لگوائی۔

محمد بن عمروؓ بن عاص نے ایک مصری کے تازیانے مارے، وہ مارتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے:

"میں بڑوں کی اولاد ہوں۔"

حضرت عمروؓ بن عاص نے اس مصری کو قید کر دیا کہ مبادا وہ امیر المومنینؓ سے ان کے بیٹے کی شکایت کر دے۔ جب وہ قید سے چھوٹا تو سیدھا مدینہ پہنچا اور حضرت عمرؓ سے شکایت کی۔ حضرت عمرؓ نے اُسے تو اپنے پاس ٹھہرا لیا اور ابن عاصؓ اور ان کے بیٹے کو مصر سے بلا کر مجلس قصاص میں طلب کیا۔ جب دونوں باپ بیٹے مجلسِ قصاص میں پیش ہوتے، تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بلند آواز میں فرمایا:

"مصری کہاں ہے؟ لے یہ دُرہ اور بڑوں کی اولاد کو مار!"

مصری نے محمد کو دُرّے مارنے شروع کیے، یہاں تک کہ وہ بے دَم ہو گئے۔ مصری انہیں مارتا جاتا تھا اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے جاتے تھے:

"بڑوں کی اولاد کو مار!"

جب وہ جی بھر کے اُنھیں مار چکا اور دُرّہ امیر المومنینؓ کو واپس کرنے لگا، تو حضرت عمرؓ نے اس سے فرمایا:

"عمروؓ کی چندیا پہ مار۔ خدا کی قسم! بیٹا تجھے ہرگز نہ مارتا، اگر اسے باپ کے اقتدار کا گھمنڈ نہ ہوتا۔"

ابنِ عاصؓ نے کہا:

"امیر المومنینؓ! آپ بھرپور سزا دے چکے ہیں۔"

اور مصری نے کہا:

"امیر المومنینؓ! جس نے مجھے مارا تھا، میں نے اس سے بدلہ لے لیا۔"

حضرت عمرؓ نے فرمایا:

"قسم ہے خدا کی، اگر تو ابنِ عاصؓ کو مارتا تو ہم اُس وقت تک بیچ میں نہ آتے، جب تک خود ہی اپنا ہاتھ نہ روک لیتا۔"

اور عمرو کی طرف مخاطب ہو کر غضب ناک لہجے میں فرمایا:

"عمرو! تم نے لوگوں کو کب سے غلام بنایا، اُن کی ماؤں نے تو انہیں آزاد جنا تھا۔"

فاروقِ اعظمؓ کا قول ہے کہ "عوام میں اس وقت تک ٹیڑھ پیدا نہیں ہوتی جب تک اُن کے پیشوا اور رہنما ان سے سیدھے رہتے ہیں۔"

ایک اور جگہ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ:

"جب تک راعی اللہ کی راہ میں چلتا رہتا ہے، رعایا اس کے پیچھے پیچھے چلتی ہے، لیکن جہاں اس نے پاؤں پھیلائے رعایا

اس سے پہلے پاؤں پھیلا دیتی ہے۔"

اسی لیے جو حیثیت وہ رعایا کے مقابلے میں عمال کی سمجھتے تھے، وہی حیثیت عمال کے مقابلے میں اپنی سمجھتے تھے، یعنی جس طرح عامل اپنے محکوموں کا ذمہ دار تھا، اسی طرح وہ اپنے عمال کے ذمہ دار تھے۔ پس اگر عمال اپنی رعایا پر ظلم کریں، تو ان سے بھی اسی طرح بدلہ لیا جانا چاہیے جس طرح مدینہ کے ایک آدمی سے، جو کسی پر ظلم کرے، لیا جاتا ہے۔ ذمہ داری کے احساس کو حضرت عمرؓ نے اپنے اس فقرے میں واضح کیا ہے:

" اگر کوئی عامل کسی کو ہدفِ ستم بناتے اور اس کی اطلاع مجھ تک پہنچ جائے لیکن میں اس کے بعد بھی اس عامل کو تبدیل نہ کروں، تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اس شخص پر ظلم میں نے کیا ہے۔"

حضرت عمرؓ زہد و اتقا کے مرتبۂ کمال پر فائز تھے۔ پھر فقیروں اور محتاجوں کے ساتھ بھی انتہائی شفقت و ہمدردی اور انصاف و احسان سے پیش آتے تھے، اس لیے ان کی حکومت عوام کے دلوں میں گھر کر گئی تھی اور اُن کی درشتیٔ مزاج، اُن کے رُعب و جلال کا وہ بار بہت ہلکا پڑ گیا تھا، جس کی وجہ سے لوگ ان کے پاس جاتے ڈرتے تھے۔ اپنی درشتیٔ مزاج کے تحت حضرت عمرؓ دُرّہ لے کر مدینہ کا گشت فرماتے تھے کہ جہاں کوئی جماعت کے مروجہ آداب و اخلاق کی خلاف ورزی کرتا نظر آئے، چھوٹے بڑے کا لحاظ کیے بغیر اُس کی تادیب کریں۔ اس دُرّے نے لوگوں کے دلوں میں اور بھی ان کی ہیبت بٹھا دی تھی اور وہ اُن کے انصاف و احسان اور شفقت و ہمدردی کا یقین رکھتے ہوئے بھی اُن سے کانپتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف اور حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کہیں جمع ہوئے۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ ان سب میں نسبتاً حضرت عمرؓ سے بے تکلف تھے، اس لیے ان حضرات نے اُن سے کہا:

"عبدالرحمٰنؓ! امیرالمومنینؓ سے لوگوں کی سفارش کرو۔ ایک شخص ان کے پاس حاجت لے کر جاتا ہے، لیکن ہیبت اس کی زبان پکڑ لیتی ہے اور وہ بغیر کچھ کہے سُنے واپس آجاتا ہے، اس بیچارے کی حاجت پُوری نہیں ہوتی۔"

حضرت عبدالرحمٰنؓ فاروقِ اعظمؓ کے پاس پہنچے اور کہا:

" امیرالمومنینؓ! لوگوں سے نرمی اختیار فرمائیے۔ آنے والا آپ کے پاس آتا ہے، لیکن آپ کی ہیبت اس کے ہونٹ سی دیتی ہے اور وُہ اپنی حاجت کا اظہار کیے بغیر ناکام واپس ہو جاتا ہے۔"

حضرت عمرؓ نے فرمایا:

" تمھیں خدا کی قسم ہے عبدالرحمٰن! کیا علیؓ، عثمانؓ، طلحہؓ، زبیرؓ اور سعدؓ نے تم سے یہ بات کہلوائی ہے؟"

ابنِ عوفؓ نے کہا:

"بخدا یہی بات ہے!"

حضرت عمرؓ نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے فرمایا:

"میں لوگوں سے نرمی کے ساتھ پیش آیا، یہاں تک کہ اس نرمی نے مجھے خدا سے ڈرا دیا۔ پھر میں نے ان پر سختی کی، یہاں تک کہ اس سختی نے مجھے خدا سے ڈرا دیا۔ اب جائیے تو کہاں جائیے؟"

حضرت عبدالرحمٰنؓ اس جواب پر رو دیے اور یہ کہتے ہوئے وہاں سے اُٹھ آئے :

" افسوس ہے آپ کے بعد اُن کے حال پر ! افسوس ہے آپ کے بعد اُن کے حال پر ! "

آپ نے دیکھ لیا کہ حضرت عمرؓ نے حکومت کی ذمہ داریاں کیسے سنبھالیں؟ اور فاروقِ اعظمؓ کی اُس بے مثال مقدرت کا راز بھی آپ پر منکشف ہو گیا ہو گا، جس کے بل پر حکومت کا غیر معمولی بوجھ انھوں نے اس شان سے اٹھایا کہ دل آج بھی ان کے حضور حیرت احترام کا خراج پیش کرتے ہیں۔ اسی طرح یہ بات بھی آپ نے سمجھ لی ہو گی کہ عہدِ فاروقیؓ کے نظامِ حکومت کے وہ کون سے پہلو تھے جنھوں نے فتوحات کی وسعت کا سامان فراہم کیا اور مسلمانوں کے دل میں کامرانی و سربلندی کا شوق بھڑکایا؟ مسلمان امیر المومنینؓ کو اپنے اور اپنے اہل و عیال کے حقوق کا بہترین ضامن سمجھتے تھے، جنھیں گھروں میں تنہا چھوڑ گئے تھے۔ وہ دیکھتے تھے کہ فاروقِ اعظمؓ صاحبِ حق کا حق ادا کرتے اور اس کی ضرورت کو اپنی اور اپنے اہل و عیال کی ضرورت پر مقدم رکھتے ہیں ان حالات میں ان سب کا اپنے مستقبل اور اپنی اولاد و اقارب کے انجام کی طرف سے مطمئن ہو کر جنگ کے میدانوں میں کود جانا ایک لازمی امر تھا۔ ان میں سے ایک بھی اللہ اور اسلامی سلطنت کی راہ میں قتل ہونے سے نہ گھبراتا تھا، کیونکہ اسے یقین تھا کہ اگر وہ شہید ہو گیا تو اس کی اولاد کو اس سے بہتر معاوضہ ملے گا، جو اس کے زندہ رہ جانے کی صورت میں اسے ملتا اور وہ اس پر ایمان رکھتا تھا کہ جو کوئی اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہوئے جان دے گا، اُس کے لیے جنت کے دروازے کھل جائیں گے۔

مغربی مورخین نے حضرت عمرؓ کی ان صفات کا ذکر کر کے اُن پر تعریف و تحسین کے پھول نچھاور کیے ہیں۔ پھر ان میں سے بعض یہ خیال بھی ظاہر کرتے ہیں کہ اگر ان صفات کے پیشِ نظر کسی نظامِ حکومت کا تصور کیا جائے، تو وہ اس دور کا مشہور عربی نظام ہو گا، جو قبائلی نظام سے مکمل مشابہت رکھتا تھا۔ قبائلی نظام میں حکومت کا تاج اُس شخص کے سر پر رکھا جاتا تھا، جو اپنی قوت سے اپنے قبیلے کے حامیوں کو حفاظت و صیانت کے بازوؤں میں سمیٹ کر یا دُور اندیشی سے اپنے قبیلے کا انتظام چلا کر یا حُسنِ تدبر سے اپنے قبیلے کے تعلقات دوسرے قبائل سے استوار کر کے دُوسروں پر اپنی عظمت و فوقیت ثابت کر دیتا تھا۔ چنانچہ اقتدار کی تمام کنجیاں، حضرت عمرؓ کی طرح، قبیلے کے سردار کے ہاتھ میں ہوتی تھیں۔ یہ سردار رواج سے اپنا قانون بناتا تھا اور اس قانون کی بنیاد پر اپنے قبیلے کے درمیان قصاص یا دیت کا فیصلہ کرتا تھا بلکہ جب کسی دُوسرے قبیلے کا کوئی مظلوم یا اُس کا وارث اس سردار کے پاس دعویٰ لے کر آتا تھا کہ آپ کے قبیلے کے فلاں آدمی نے مجھ پر ظلم کیا ہے، تو اس کے خُوں بہا یا قصاص کا فیصلہ بھی اسی قانون کے تحت کیا جاتا تھا۔

ان مورخین کا خیال ہے کہ قرآن نے اس رواج کی تنظیم و تہذیب تو کی جس سے عرب مانوس تھے، لیکن عربوں کو اس نظام کے دائرے سے باہر نہ نکالا، جس پر وہ پہلے سے عمل پیرا تھے، یعنی حضرت عمرؓ، اور ان سے پہلے حضرت ابو بکرؓ کی حکومت اسی عربی نظام پر قائم تھی اور اس کے اصول و قواعد سے متجاوز نہ ہوئی تھی۔ چنانچہ یہ دونوں حکومتیں ——— حکومتِ صدیقیؓ اور حکومتِ فاروقیؓ ——— اس متمدن نظام کے مقابلے میں، جو اُن دنوں ایران و روم میں رائج تھا، بدوی نظام سے قریب تر تھیں۔

اس میں شک نہیں کہ حضرت ابو بکرؓ کی خالص عربی حکومت تھی؛ جو روم و ایران کے نظاموں سے نہ زیادہ متاثر ہوئی نہ کم، اور اسی لیے وہ اُس بدوی نظام کی طرح سادہ تھی جو اُن دنوں جزیرہ نمائے عرب کے اکثر گوشوں میں رائج تھا، لیکن یہ حکومت اپنی تمام تر سادگی کے باوجود عہدِ رسالت کو عہدِ سلطنت سے ملانے والی ایک مضبوط کڑی اور اس نظام کی فطری پیش رفت تھی، جو عہدِ رسالت

ہی میں اُبھرنا شروع ہوگیا تھا۔ جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں نزولِ اجلال فرمایا ہے، عرب کے دوسرے علاقوں کی طرح وہاں بھی ایسے قبائل آباد تھے جو اپنے اوپر کسی دُوسرے قبیلے کا اقتدار تسلیم نہ کرتے تھے۔ اس لیے کبھی تو اوس و خزرج میں کشت و خون کا بازار گرم ہوجاتا اور کبھی مدینہ کے عربوں اور یہودیوں میں جنگ کے شعلے بھڑکنے لگتے اور جب تک کوئی بیرونی خطرہ ہی انہیں اچانک آکر نہ گھیر لیتا، باہمی اتفاق و اتحاد کی کوئی صورت پیدا نہ ہوتی، لیکن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں قیام فرما کر پہلے مہاجرینؓ و انصارؓ میں مواخاۃ قائم کی اور اس کے بعد یہودیوں کو وہاں سے نکال دیا تو شعوب و قبائل کے تمام تفرقے مٹ گئے اور مدینہ اس یک جہتی کے بعد ایک ایسی مدنی وحدت میں تبدیل ہوگیا، جس کی شریعت قرآن تھا اور جس کے فرمانروا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ نظامِ حکومت کے اس انقلاب سے اہلِ حجاز ناآشنا تھے، لیکن فتح مکّہ کے فوراً بعد وہ مدینہ سے اُمّ القریٰ — مکّہ — میں منتقل ہوگیا اور غزوۂ حنین کے بعد اُس نے طائف کو بھی اپنے سایۂ رحمت میں لے لیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے ایک سال پہلے جب مختلف بستیوں اور قبیلوں کے وفد مدینہ آئے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر اپنے اسلام کا اعلان کیا، تو سرکارِ رسالتؐ نے اپنے چند صحابہؓ کو اُن بستیوں اور قبیلوں میں بھیجا کہ وہ لوگوں کو دین کی تعلیم دیں اور اُن سے صدقات وصول کریں۔ یہ حضرات گویا ہراول تھے اس انقلاب کے، جس کی طرف جزیرۃ العرب آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا۔ اس کے بعد جب ارتداد کی لڑائیاں شروع ہوئیں، تو دُوسرے مسلمانوں کی طرح ان حضرات نے بھی ارتداد کا سر کچلنے کے لیے غیر معمولی شجاعت و سرفروشی کا مظاہرہ کیا اور اس طرح فتح و نصرت کا وہ حق مدینہ کے قدموں میں لا کر ڈال دیا، جس سے کوئی عرب انکار نہ کر سکا۔ ارتداد کی آگ ٹھنڈی پڑ جانے کے بعد اُن عاملوں اور والیوں کے اقتدار میں اضافہ ہوگیا، جنہیں حضرت ابوبکرؓ نے مختلف علاقوں میں مقرر فرمایا تھا۔ اب ان کے اختیارات صرف لوگوں کو دین کی تعلیم دینے اور ان سے صدقات وصول کرنے ہی تک محدود نہ رہے بلکہ اپنی اپنی عملداریوں میں انہیں بھی وہی حاکمانہ حقوق حاصل ہوگئے، جو قبیلے کے سردار یا مدینہ کے امیر کو حاصل تھے، چنانچہ احکام کا نفاذ، قضا اور فوج کے عہدے، یہ سب کچھ اب ان کے ہاتھ میں تھا، لیکن ان تمام اختیارات کے استعمال میں وہ خلیفہ کے سامنے ہر طرح جواب دہ تھے۔

حضرت عمرؓ کے ہاتھ میں زمامِ خلافت اس وقت آئی، جب تمام مرتدین عرب صدقِ دل سے دوبارہ دائرۂ اسلام میں داخل ہوچکے تھے، اس لیے اب اُن سے محتاط رہنے یا ان کی بغاوت سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ خلیفہ کے عمّال آخر ان پر جبر و تشدد کرتے بھی کیسے؟ جب تمام قبیلوں کے سورما جہاد کے میدانوں میں پہنچ گئے تھے اور وہاں اللہ کی راہ میں مر بھی رہے تھے اور مار بھی رہے تھے۔ اس بنا پر حضرت عمرؓ نے محسوس فرمایا کہ ان کی وحدت کو اور مستحکم کر دیا جائے اور اپنے عمّال کو حکم دیا کہ وُہ بھی شیوۂ فاروقیؓ کے اتباع میں انصاف و دُور اندیشی اور لطف و مرحمت سے کام لیں۔

حضرت عمرؓ عمّال کو لوگوں پر اس لیے حاکم بنا کر نہ بھیجتے تھے کہ وہ ان کو ذلّت و حقارت کے گڑھے میں دھکیلیں، بلکہ اس لیے بھیجتے تھے کہ اُن کے درمیان عدل و انصاف کے ساتھ اللہ کی حدود قایم کریں۔ عمّال کو اُن کا حکم تھا کہ "سب کو ایک نظر سے دیکھو! قریب و بعید میں کوئی امتیاز روا نہ رکھو! اگر تم نے رشوت لی، حکومت میں ذاتی غرض شامل کی یا غصّے میں لوگوں کو ستایا تو اس کی سزا تمہیں بھگتنی

پڑے گی۔ حق اگر دن کی روشنی میں قائم کرنا پڑے تو اسے قائم کرو!" وہ مملکت کے ایک ایک گوشے میں عدل قایم کرنا چاہتے تھے اور اس سلسلے میں اپنے آپ کو، اپنے ضمیر کو اللہ کے سامنے جوابدہ سمجھتے تھے، یعنی اگر اُن کے کسی عامل نے کوسوں دُور بھی کسی شخص پر ظلم کیا، تو گویا خود انہوں نے اُس شخص پر ظلم کیا۔ ایک دن حاضرین سے فرمایا:

"کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ اگر میں نے اپنے علم کے مطابق بہترین آدمی کو تم پر عامل مقرر کر کے اُسے عدل کا حکم دے دیا، تو میں اپنے فرض سے عُہدہ برآ ہو گیا؟"

لوگوں نے کہا: "جی ہاں!"

فرمایا: "نہیں! یہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا، جب تک میں یہ نہ دیکھ لُوں کہ جو کچھ میں نے حکم دیا تھا، اُس پر عمل بھی کیا جا رہا ہے یا نہیں!"

اسی لیے وہ ان عمّال کا محاسبہ اتنی شدّت سے کرتے تھے کہ ہمارے لیے حضرت خالدؓ بن ولید کی معزولی اور حضرت عمروؓ بن عاص کے مال کی تقسیم اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ روایات میں حضرت عمرؓ کے اس شدید محاسبے سے متعلق بعض ایسے واقعات ملتے ہیں جن پر یقین کرتے ہُوئے لوگ ہچکچاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت ابو عبیدہؓ نے شام میں اپنے اہل و عیال کے لیے راحت و فراغت کے سامان فراہم کر لیے تھے۔ حضرت عمرؓ کو اس کی اطلاع ملی، تو ان کے مشاہرے میں کمی کر دی۔ یہاں تک کہ امین الامتؓ کی رنگت بگڑ گئی، کپڑوں کی حیثیت بدل گئی اور حالت تباہ ہو گئی۔ حضرت عمرؓ کو جب یہ حال معلوم ہوا تو فرمایا:

"اللہ ابو عبیدہ پر رحم کرے!" انہوں نے بڑے صبر و تقویٰ سے کام لیا اور ان کی تنخواہ بحال کر دی۔ عمّال کے محاسبے میں حضرت عمرؓ کی شدّت کا یہ عالم تھا کہ وہ عامل کو کبھی ایسے شبہے پر معزول کر دیتے تھے، جو دلیل سے ثابت نہ ہوتا تھا بلکہ بعض اوقات تو ایسے گمان پر بھی اس کی معزولی کا حکم دے دیتے تھے، جسے صحیح معنی میں شبہ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے متعلق ایک دفعہ ان سے سوال کیا گیا تو فرمایا:

"اگر قوم کے معمولی سے فائدے کے لیے بھی کسی امیر کو بدلنا پڑے، تو میں اسے بدل دوں گا۔"

کئی بار حضرت عمرؓ نے اپنے عُمّال کو بغیر کسی شبہے کے محض بربنائے مصلحت ہی ان کے عہدوں سے معزول کر دیا۔ جن میں سے ایک حضرت سعدؓ بن ابی وقّاص کا معاملہ ہے جنہیں حضرت عمرؓ نے کُوفہ کی ولایت سے صرف اس لیے ہٹا دیا تھا کہ اس شہر کے چند لوگ حضرت سعدؓ کے خلاف بھڑک اُٹھے تھے اور انہوں نے حضرت عمرؓ سے شکایت کی تھی کہ وہ تقسیم میں مساوات نہیں برتتے۔ رعایا سے انصاف نہیں کرتے اور جنگ میں شریک نہیں ہوتے۔ حضرت عمرؓ نے محمد بن مسلمہؓ کو کُوفہ بھیجا اور باوجودیکہ انہوں نے لوگوں کو حضرت سعدؓ سے خوش پایا لیکن حضرت عمرؓ نے فتنے کے خوف سے حضرت سعدؓ کو معزول کر دیا، کیونکہ ایرانی فوجیں اس وقت حملے کے لیے جمع ہو رہی تھیں۔

حضرت عمرؓ اپنے عمّال کو ہر سال حج کے موقع پر مکہ میں جمع کرتے تھے۔ عمّال سے اُن کے کاموں کے متعلق پُوچھتے اور عوام سے عمّال کا رویہ درست فرماتے تھے۔ اس سے وہ یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ اپنے فرائض کے احساس میں عمّال کتنی احتیاط و ہوش مندی سے کام لیتے ہیں اور ادائے فرض کے وقت اپنے یا اپنے کسی رشتہ دار کے مفاد کا لحاظ تو نہیں رکھتے، اس لیے کہ بے غرضی فاروقِ اعظمؓ کے نزدیک ہر چیز پر مقدم تھی۔ چنانچہ جس وقت عمّال مقرر ہوتے تھے، ان کے مال اسباب کا تفصیلی جائزہ لیا جاتا تھا اور اگر بعد کو اس میں اضافہ ہو جاتا تو ان کی امانت و دیانت مشکوک سمجھی جاتی تھی۔ فاروقِ اعظمؓ ان سے حساب لیتے اور زائد سامان ضبط کر لیتے۔ پھر ان سے فرماتے:

"ہم تمہیں والی بنا کر بھیجتے ہیں، تاجر بنا کر نہیں۔"

والیوں کے اس شدید محاسبے سے یہ غرض نہ تھی کہ ان کی حاکمانہ شان کو نقصان پہنچایا جائے یا ان کا وقار کم کیا جائے، نہیں! وہ اپنے اختیارات میں آزاد تھے۔ ان کے احکام نافذ ہوتے تھے اور جب تک وہ عدل و انصاف کی راہ سے نہ ہٹتے تھے، اُن کا اقتدار حضرت عمرؓ کے اقتدار کے مساوی سمجھا جاتا تھا۔ اس کے باوجود اگر کوئی خیرہ سر اُن کے ساتھ زیادتی یا کوئی دریدہ دہن ان کی بے عزتی کرتا، تو اسے عبرتناک سزا دی جاتی۔ اہلِ عراق نے از راہِ تحقیر اپنے امام پر کنکریاں پھینکیں۔ اس سے پہلے بھی وہ ایک امام کے ساتھ بدتمیزی کر چکے تھے۔ حضرت عمرؓ کو غصہ آگیا اور انھوں نے اہلِ شام سے کہا:

"اہلِ عراق کے خلاف تیاری کرو کہ شیطان نے ان میں انڈے بچے دے دیے ہیں۔"

حضرت عمرؓ اپنے عامل کی دلیل بھی سُنتے تھے اور اگر اس دلیل سے مطمئن ہو جاتے تھے، تو اس کے مُنہ پر اپنے اطمینان کا اظہار کر دیتے اور جب وہ چلا جاتا تو اس کی تعریف فرماتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت عمرؓ گدھے پر سوار شام جا رہے تھے، دیکھا کہ حضرت امیر معاویہؓ بن ابی سفیان ایک شاندار جلوس کے ساتھ چلے آرہے ہیں۔ حضرت معاویہؓ نے گھوڑے سے اُتر کر امیر المومنین کو سلام کیا لیکن فاروق اعظمؓ جواب دیے بغیر آگے بڑھ گئے۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے کہا:

"آپ نے انہیں تکلیف پہنچائی، کم سے کم آپ ان سے بات تو کر لیتے!"

حضرت عمرؓ حضرت معاویہؓ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا:

"یہ شاندار جلوس تمہارا ہے؟"

حضرت معاویہؓ نے جواب دیا:

"جی ہاں!"

فرمایا:

"دوسری طرف تمہارا یہ حال ہے کہ تم ہر وقت گھر میں گھسے بیٹھے رہتے ہو، حالانکہ جانتے ہو، اہلِ حاجات تمہاری ڈیوڑھی پہ کھڑے ہیں؟"

حضرت معاویہؓ نے کہا: "یہ بھی درست ہے۔"

بولے :

"افسوس ہے تم پر، ایسا کیوں ہے ؟"

حضرت معاویہؓ نے جواب دیا :

"ہمارے ملک میں دشمن کے جاسوس بہت ہیں۔ اگر ہم اس شان وشوکت سے نہ رہیں، تو دشمن ہمیں کمزور سمجھ کر ہم پر ٹوٹ پڑے۔ رہی گھر میں گھسے بیٹھے رہنے کی بات، سو ہمیں ڈر ہے کہ ہماری فیاضی رعایا کو جری بنا دے گی اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ میں آپ کا عامل ہوں۔ آپ مجھے گھٹائیں گے، گھٹ جاؤں گا۔ بڑھائیں گے بڑھ جاؤں گا اور روک دیں گے، رُک جاؤں گا۔"

تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد حضرت عمرؓ نے فرمایا :

"میں جب تم سے باز پرس کرتا ہوں، صاف بچ کر نکل جاتے ہو۔ اگر تم سچے ہو تو یہ ایک عقلمند آدمی کی رائے ہے اور جھوٹے ہو تو ایک چالباز کا دھوکا۔ میں نہ تمہیں اس کا حکم دیتا ہوں نہ اس سے روکتا ہوں۔"

حضرت عمرؓ جب یہ دیکھتے تھے کہ اُن کے عُمّال محض رعایا کی بھلائی کے لیے کام کر رہے ہیں تو اُن سے بہت خوش ہوتے تھے اور اُن کی بے انتہا تعریف فرماتے تھے۔ عُمیر بن سعد کو انہوں نے حمص کا والی مقرر کیا اور کچھ عرصے کے بعد انہیں لکھا :

"جتنا خراج تم نے وصول کیا ہے وہ سارے کا سارا لے کر میرے پاس پہنچو !"

جب عُمیر بارگاہِ خلافت میں حاضر ہوئے تو پُوچھا :

"کیا کر آئے ؟"

انہوں نے جواب دیا :

"آپ نے مجھے بھیجا اور میں وہاں پہنچا۔ میں نے قوم کے نیک لوگوں کو جمع کیا اور خراج وصول کرنے کی خدمت اُن کے سپرد کر دی۔ جب انہوں نے خراج جمع کر لیا، تو میں نے اُسے موقع موقع سے خرچ کر دیا، اگر اس میں سے آپ کے لیے کچھ بچتا، تو میں ضرور آپ کی خدمت میں پیش کرتا۔"

حضرت عمرؓ نے فرمایا :

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تم کچھ لے کر نہیں آئے ؟"

اور جب عُمیر نے یقین دلا دیا کہ انہوں نے سارا خراج اہلِ حمص پر خرچ کر دیا ہے، تو کہا :

"عُمیر کو پھر وہیں بھیج دو۔"

یہ وہی عُمیر ہیں جنہوں نے ایک دفعہ حمص کے منبر پر کھڑے ہو کر کہا تھا :

"جب تک اسلام میں حکومت کا زور ہے، وہ ناقابلِ شکست رہے گا لیکن حکومت کے زور کا مطلب تلوار سے قتل کرنا اور تازیانے سے مارنا نہیں بلکہ حق کے ساتھ فیصلہ اور انصاف کے ساتھ مواخذہ کرنا ہے !"

ایسی صورت میں کہ یہ حکیمانہ فقرہ اُن کا مدارِ عمل تھا، کوئی تعجب نہیں اگر حضرت عمرؓ نے اُن کے متعلق یہ فرمایا کہ "کاش،

عُمیر بن سعد جیسا کوئی آدمی میرے پاس ہوتا، جس سے میں مسلمانوں کے کام میں مدد لیتا۔"

یہ عُمّال عہدِ فاروقی رضؓ کے آغاز میں وہ تمام خدمات انجام دیتے تھے، جو مدینہ میں حضرت عمرؓ کے ذمّے تھیں۔ عدالت، صوبے کا انتظام اور فوج کی امارت یہ سب عُہدے اِنھیں عُمّال کے پاس ہوتے تھے۔ لیکن اپنی خلافت کے چند ہی روز بعد حضرت عمرؓ نے محسوس فرمایا کہ حکومت کے وسیع معاملات اور اعلیٰ سیاست نے اُنہیں ان تمام ذمہ داریوں سے غافل کر رکھا ہے جن کے متعلق اپنی بیعت کے دن اُن کا خیال تھا کہ وُہ انہیں خود سنبھالیں گے۔ عراق و شام کے اسلامی لشکروں کی خبریں اُن کی بہت سی توجّہ اور ان کا بہت سا وقت لے لیتی تھیں اور مملکت کے مختلف حصّوں میں عمّال کیا کچھ کر رہے ہیں، اس کے متعلق بھی وہ سوچتے رہتے تھے۔ پھر مدینہ کی آبادی بڑھنے اور وہاں رُپے کی ریل پیل ہونے سے اہلِ مدینہ کے مفادات میں اُلجھنیں اور پیچیدگیاں پیدا ہوتی چلی جا رہی تھیں اور اُدھر فتوحات کی وسعت اور مقبوضہ علاقوں کا نظم و نسق اس امر کا متقاضی تھا کہ حضرت عمرؓ انتظامی معاملات میں اُمرائے لشکر کو مشورے اور ہدایتیں دیتے رہیں۔ ان تمام مصروفیتوں کے پیشِ نظر حضرت عمرؓ معاون رکھنے پر مجبور ہو گئے، جو عوامی مفاد کے لیے اس طرح کام کریں کہ اس سے حکومت کا مفاد متاثر نہ ہو۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے انہوں نے یہ کیا کہ مدینہ کے عدالتی فرائض سے سبکدوش ہو کر یہ خدمت ابوالدرداؓ کے سپرد فرما دی اور انہیں قاضی کے نام سے موسوم کر دیا کہ لوگ اگر اپنے مقدمے لے کر اُن کے پاس آئیں، تو وہ ان کا فیصلہ کریں۔ پھر جب کوفہ اور بصرہ آباد ہو گئے عربوں نے وہاں سکونت اختیار کر لی اور لوگوں میں باہمی تنازعات بڑھے تو کوفہ کا قاضی شریحؒ کو بنایا گیا اور بصرہ کا حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو۔ اس کے بعد مصر فتح ہوا اور وہاں کے مسلمانوں کا قاضی قیسؓ بن ابی العاص سہمی کو مقرر کیا گیا۔ یہ تمام قاضی کتاب و سُنّت کی حدود میں رہتے ہوئے آزادانہ فیصلے کرتے تھے اور ان کا تقرّر اختیارات کی تقسیم و تنظیم کی طرف پہلا قدم تھا۔ لیکن ایک ایسا قدم جو مملکت کے بدلتے ہوئے حالات سے مجبور ہو کر ضرورت کے تحت اٹھایا گیا تھا۔ دنوں یہی صورت رہی اور اس قدم نے ایک ایسے مقررہ اصول کی شکل، جو مملکت کے ہر گوشے میں رائج ہو، عہدِ فاروقیؓ کے برسوں بعد اختیار کی۔

حضرت عمرؓ نے قضاۃ کے انتخاب میں، عُمّال کے انتخاب کی طرح، بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ اپنی وہبی صلاحیتوں کا ثبوت دیا جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ فقہ و شریعت کے عالم تھے اور اس باب میں اُن کی نظر اتنی گہری تھی کہ اور کوئی ان کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ حضرت ابنِ مسعودؓ کا قول ہے:

> "عمرؓ کا علم اگر ایک پلڑے میں رکھ دیا جائے اور عرب کے تمام قبائل کا علم دُوسرے پلڑے میں، تو بھی عمرؓ کے علم کا پلڑا بھاری رہے گا!"

اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے۔ حضرت عمرؓ مسلمان ہونے سے پہلے قریش کے عہدۂ سفارت پر مامور تھے۔ پھر جب انہوں نے اسلام قبول کیا، تو ہر وقت خدمتِ رسالت میں حاضر رہنے لگے۔ اللہ کی طرف سے جو وحی نبی علیہ التحیۃ والتسلیم پر نازل ہوتی اُسے حضورؐ سے سیکھتے اور آپ کی سنّت و قضاء سے واقفیت بہم پہنچاتے۔ اس کے علاوہ اُن میں لوگوں کے جوہر پہچاننے اور ان کے بعض کاموں سے اُن کی خصوصیات معلوم کرنے کا بڑا ملکہ تھا۔ شریحؒ کے قاضیٔ کوفہ بنائے جانے کا واقعہ اس کا بہترین ثبوت ہے۔

حضرت عمرؓ نے ایک شخص سے پسند کی شرط پر گھوڑا خریدا اور امتحاناً اس پر سوار ہوئے۔ گھوڑا چوٹ کھا کر داغی ہوگیا۔ حضرت عمرؓ نے اس کو واپس کرنا چاہا، مالک نے انکار کیا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا :

"کسی کو ثالث بنا لو !"

مالک نے کہا :

"شریحؒ عراقی !"

دونوں شریحؒ کے پاس پہنچے۔ شریحؒ نے فریقین کے دلائل سُن کر کہا :

"امیرالمومنین ! یا گھوڑا خریدیئے یا جیسا تھا ویسا واپس کیجئے !"

حضرت عمرؓ نے فرمایا:

"فیصلہ یہی ہے !"

اور شریحؒ کو کوفہ کا قاضی مقرر کر دیا، جہاں وہ ساٹھ برس تک اس منصب پر فائز رہے۔

حضرت عمرؓ کے مکاتیب و اقوال آج بھی اس امر کی زندہ شہادت ہیں کہ قضا اور اس کے اصول و احکام پر اُن کی نظر کتنی وسیع تھی۔ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کے نام اُن کا ایک خط گویا آدابِ قضا کا ایک غیر فانی ٹکڑا ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں :

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ! اللہ کے بندے امیرالمومنینؓ کی طرف سے عبداللہ بن قیس کو سلام علیک ! اما بعد قضا، ایک اہم فریضہ ہے جسے لوگ ہر زمانے میں انجام دیتے رہے ہیں۔ جب کوئی مقدمہ تمہارے سامنے پیش ہو، اس کے تمام پہلوؤں کو اچھی طرح سمجھو اور جب صحیح نتیجے پر پہنچ جاؤ، تو اسے نافذ کر دو ! کیونکہ زبانی فیصلہ بے سُود ہے، تاوقتیکہ اسے عملاً نافذ نہ کیا جائے۔ مدعی اور مدعا علیہ کے ساتھ ایک سا برتاؤ کرو۔ کسی فریق سے بات کرنے یا عدالت میں بٹھانے یا انصاف کرنے میں کوئی امتیاز نہ برتو، تاکہ زوردار یہ توقع نہ کرے کہ تم اس سے رعایت برتو گے اور کمزور کو یہ اندیشہ نہ ہو کہ تم اس کے ساتھ ناانصافی سے پیش آؤ گے۔ جو شخص دعویٰ کرے اُس سے گواہ مانگے جائیں اور جو دعویٰ نہ مانے اس سے قسم لی جائے۔ مسلمانوں کے درمیان صلح کرانی جائز ہے، بشرطیکہ اس سے حرام، حلال اور حلال، حرام نہ ہو جائے۔ کل اگر تم نے کوئی فیصلہ کیا، آج اس سے بہتر فیصلہ تمہاری عقل نے تمہیں سمجھا دیا تو اپنے پہلے فیصلے کو رد کر سکتے ہو اس لیے کہ حق ازلی ہے۔ اس کی طرف رجوع کرنا غلطی پر اڑے رہنے سے بہتر ہے۔ جس مسئلے میں شبہ ہو اور وہ تمہیں قرآن و حدیث میں نہ ملے تو اس پر غور کرو پھر غور کرو اور اس کے امثال و نظائر کو اچھی طرح ذہن نشین کر کے قیاس و اجتہاد سے کام لو۔ کوئی شخص اگر اپنا دعوت ثابت کرنے کے لیے مہلت مانگے تو اُسے مہلت دو، اور اگر وہ گواہ پیش کر دے، تو اس کا حق دلوا دو۔ ورنہ مقدمہ خارج کر دو۔ اس سے شک مٹے گا اور ظلم و ستم کی سیاہی دُور ہوگی۔

ہر مسلمان ثقہ ہے۔ سوائے ان اشخاص کے جنہیں کسی سنگین جرم میں دُرّے لگائے جا چکے ہوں، یا جنھوں نے جھوٹی گواہی دی ہو، یا ولدو نسب میں مشکوک ہوں۔ تمہاری چھپی ہوئی بداعمالیوں کا معاملہ خدا کے ہاتھ ہے۔ دُنیا میں قانونی سزا سے بچنے کے لیے اُس نے گواہی اور حلف ضروری قرار دیا ہے۔ خبردار! تمہارے دل میں اہلِ مقدمہ سے خفگی، اکتاہٹ یا چڑچڑاپن پیدا نہ ہو، کیونکہ جو شخص حق و انصاف کے موقع پر حق و انصاف قائم کرتا ہے، وہ اللہ کے انعام اور اچھی شہرت کا مستحق ہو جاتا ہے۔ جس کسی نے اپنی نیت درست رکھی، اس کے اور لوگوں کے درمیان اللہ کافی ہے اور جو ان سے بناوٹی اخلاق سے پیش آیا، اس کے لیے اللہ کے رزق و رحمت کی امید نہ رکھو! والسلام!"

دیکھیے آپ نے یہ اصول جو حضرت عمرؓ نے اس خط میں مقرر فرمائے ہیں۔ کیا انہی اصولوں پر آج کل کی اکثر مہذب قوموں کا نظامِ عدالت قائم نہیں ہے بلکہ کیا یہی وہ پائدار اصول نہیں ہیں جو زمانے کے ساتھ نہیں بدلے اور جن کے سلسلے میں فقہ و قانون کی کتابوں کی تعلیقات و شروح ڈسیوں نہیں، سیکڑوں مجلدات میں لکھی گئیں، ان اصولوں کا حضرت عمرؓ کی طرف سے مقرر کیا جانا کوئی حیرت ناک بات نہیں ہے کہ حضرت ابوبکرؓ بعض مقدمات ان کے سپرد فرماتے تھے اور خلافتِ فاروقیؓ کے ابتدائی دور میں بھی قضا کے فرائض وہ خود ہی انجام دیتے تھے۔ پھر تعجب اس لیے بھی نہیں ہونا چاہیے کہ وہ بڑے بالغ النظر فقیہہ تھے اور جو مسئلہ ان کے سامنے پیش ہوتا تھا، اپنی بہترین معلومات سے کام لے کر اس کا فیصلہ کرتے تھے۔ اگر کوئی بات سمجھ میں نہ آتی، تو مشورے کے بعد اجتہاد فرماتے تھے اور ان کا اجتہاد درست ہی نہیں بلکہ حجت ہوتا تھا، جسے بعد کے لوگ یقین و اطمینان کے ساتھ قبول کرتے تھے۔

کیا کسی متقی اور انصاف پسند قاضی کے سوا کوئی وہ بات کہہ سکتا ہے، جو حضرت عمرؓ نے قاضیوں کو ہدایت کرتے ہوئے فرمائی ہے:

"جب مدعی اور مدعا علیہ تمہارے سامنے پیش ہوں، تو اُن سے منصفانہ شہادت طلب کرو، یا واضح قسم کھلواؤ! کمزور سے اتنے قریب ہو کہ اس کا دِل بڑھے اور زبان کھل جائے اور غریب کی دل دہی کرو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا، تو وہ اپنا حق چھوڑ کر چلا جائے گا اور اس کا حق ضائع کرنے والا وہ شخص ہوگا، جس نے اس سے لطف و نرمی نہیں برتی۔"

قضاۃ کا تقرر ایک قدم تھا، جو مملکت کے بدلتے ہوئے حالات میں ضرورت کے تحت اٹھایا گیا تھا۔ کوئی عمومی تنظیم نہ تھی، جس سے فی نفسہٖ کسی اصول کی تطبیق مقصود ہوتی۔ چنانچہ جن والیوں پر کام کا غیر معمولی بوجھ نہ تھا اور جو عدالتی فرائض انجام دے سکتے تھے، فصلِ خصومات کی خدمت اُن سے الگ نہ کی گئی اور حضرت عمرؓ نے اُن کے صوبوں میں قاضی مقرر نہ فرمائے بلکہ تمام اختیارات انہی کے ہاتھ میں رہنے دیے لیکن یہ ابتدائی قدم اُٹھائے ابھی چند ہی برس ہوئے تھے کہ وہ حکومت کے دوسرے نظاموں کی طرح ایک نظام بن گیا۔ چنانچہ عدالت کو انتظامیہ سے الگ کر دیا گیا اور قاضی کی ایک خاص حیثیت ہو گئی جسے ہر قسم کی عزت و احترام کا مستحق سمجھا جاتا تھا۔

حضرت عمرؓ کی توجہ جزیہ و خراج کے اموال نے اپنی طرف جذب کر لی جو اُن کے عمّال بھیجتے تھے اور انہوں نے محسوس فرمایا کہ اُن اموال کی جمع و تقسیم کے لیے ایک نظام کا ہونا ضروری ہے۔ یہ وہ اموال نہ تھے جو زکوٰۃ و صدقات کے سلسلے میں جزیرہ نمائے عرب کے مسلمان ادا کرتے تھے، اس لیے کہ وہ تو ان لوگوں میں تقسیم کر دیے جاتے تھے، جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا تھا:

اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسَاكِيْنِ وَالْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا..... (الخ) صدقات تو صرف فقیروں، مسکینوں اور عمال صدقات کے لیے ہیں۔

ان صدقات کا بیشتر حصہ مدینہ نہیں بھیجا جاتا تھا، بلکہ ان اقوام و قبائل کے مسکینوں اور محتاجوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا، جن سے یہ رقم وصول ہوتی تھی۔ اس میں سے جو کچھ مدینہ پہنچتا تھا اور اس کا بڑا حصہ اونٹوں اور مویشیوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ اور جو کچھ ان اہل حاجات پر تقسیم کر دینے کے بعد بچتا تھا، جن کا ذکر صدقات کی آیت میں کیا گیا ہے، اُن پر ایک خاص نشان لگا کر مدینہ کے قریب ایک جگہ رکھ دیا جاتا تھا، جس کا نام "وحمیٰ" تھا۔ جب مسلمان کسی ملک پر چڑھائی کرتے اور کسی کے پاس سواری کے لیے جانور یا لڑنے کے لیے ہتھیار نہ ہوتے، تو وہ ان اونٹوں اور اس سامان سے مدد لیتا تھا اور اگر اس کے بعد بھی کچھ بچ رہتا تھا، تو وہ غریب و محتاج مسلمانوں پر صرف کر دیا جاتا تھا۔

غزواتِ نبویؐ میں مسلمانوں کو جو مالِ غنیمت ملتا تھا، وہ لڑائی کے بعد ان میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ کچھ نہ بچتا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تقلید فرمائی۔ چنانچہ عراق سے جتنا مالِ غنیمت آیا، اہلِ مدینہ میں تقسیم کر دیا اور کوئی چیز اس میں سے باقی نہ رہنے دی۔ عہدِ فاروقیؓ کے آغاز میں بھی یہی طریقہ رہا۔ لیکن فتوحات کی وسعت نے ایک طرف تو مالِ غنیمت میں بے پناہ اضافہ کر دیا اور دوسری طرف جزیہ و خراج کی بے شمار رقمیں مدینہ پہنچنے لگیں۔ مسلمان عراق و ایران اور شام و مصر کے جس علاقے پر قبضہ کرتے، اُس کے باشندوں سے جزیے کی شرط پر صلح کر لیتے جو بالاوسطاً دو دینار فی کس ہوتا تھا۔ یہ آمدنی اس خراج کے علاوہ تھی، جو زمیندار اپنی زمینوں کے بدلے ادا کرتے تھے۔ خراج کا ایک حصہ ملکی اصلاح و انتظام پر خرچ کیا جاتا تھا۔ اس کے بعد جو رقم بچتی تھی مدینہ بھیج دی جاتی تھی۔ اس سے پہلے ہی کہ ایران کی فتح مکمل اور مصر پر حملے کا آغاز ہو، آمدنی کے اس شعبے میں دولت کی وہ ریل پیل ہوئی کہ امیرالمومنینؓ نوزائیدہ سلطنت کے لیے ایک مالی نظام مرتب کرنے کی تجویزیں سوچنے لگے۔

مورخین نے اس سبب کی توضیح میں بہت سی روایات درج کی ہیں، جس نے حضرت عمرؓ کو اس موضوع پر سوچنے کے لیے مجبور کیا۔ کہتے ہیں کہ حضرت ابوہریرہؓ بحرین سے آئے۔ حضرت عمرؓ نے لوگوں کا حال دریافت کرنے کے بعد ان سے پوچھا:

"کیا لائے ہو؟"

جواب دیا:

"پانچ لاکھ درہم!"

حضرت عمرؓ سمجھے کہ وہ مبالغے سے کام لے رہے ہیں اس لیے پھر وہی سوال کیا۔ اور جب ان سے وہی پہلا جواب سُنا تو فرمایا:

"تمہیں نیند آ رہی ہے اپنے گھر جا کے سو رہو، کل صبح میرے پاس آنا۔"

دوسرے دن جب ابوہریرہؓ پہنچے اور انہیں یقین دلایا کہ وُہ واقعی پانچ لاکھ درہم لائے ہیں، تو حضرت عمرؓ نے لوگوں سے فرمایا:

"یہ ہمارے پاس بڑی دولت لے کر آئے ہیں، اگر تم کہو تو گن کر تم میں تقسیم کی جائے اور کہو تو وزن کر کے۔"

ایک شخص بولا:

"امیرالمومنین! میں نے ان ایرانیوں میں دیوان ——— رجسٹر ——— کا رواج دیکھا ہے، وہ رجسٹروں کے اندراج کے مطابق لوگوں میں رقمیں تقسیم کرتے ہیں۔"

چنانچہ حضرت عمرؓ نے بھی ایسا ہی کیا۔

کہا جاتا ہے دیوان ——— رجسٹر ——— مرتّب کرنے کے سلسلے میں حضرت عمرؓ نے مسلمانوں سے مشورہ کیا۔ حضرت علیؓ بن ابی طالب نے فرمایا:

"جتنا مال آپ کے پاس جمع ہو، سال کے سال تقسیم کر دیا کریں اور کوئی چیز باقی نہ رہنے دیں!"

حضرت عثمانؓ بن عفان نے فرمایا:

"میں دیکھتا ہُوں کہ لوگوں میں بڑی دولت پھیلتی جا رہی ہے۔ اگر اس کا شمار نہ کیا گیا اور آپ کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ ان میں سے کس کس کو ملا ہے اور کس کس کو نہیں، تو سارا نظام اتھل پتھل ہو جائے گا۔"

ولید بن ہشام بن مغیرہ نے عرض کی:

"امیرالمومنینؓ! میں شام گیا تھا، وہاں مَیں نے دیکھا کہ سلاطینِ شام رجسٹروں میں نام درج کرتے ہیں۔ آپ بھی ایسا ہی کیجئے!"

اور حضرت عمرؓ نے اُن کی بات مان لی۔ چنانچہ عقیل بن ابی طالب، مخرمہ بن نوفل اور جُبیر بن مُطعم کو بلایا، جو عرب کے مشہور ماہرین انساب تھے اور ان سے کہا:

"حیثیت اور مرتبے کے مطابق لوگوں کی فہرست تیار کریں۔"

ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے دیوان ——— رجسٹر ——— کی تدوین اور وظیفوں کی تعیین کے متعلق مہاجرینؓ و انصارؓ سے مشورہ کیا اور انہوں نے اُن کے حق میں رائے دی۔ پھر فاتحینِ اسلام سے مشورہ کیا اور انہوں نے بھی اس سے اتفاق کیا، سوائے حکیم بن حزام کے جو مکّہ کے سرداروں اور صائب الرائے لوگوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ انہوں نے کہا:

"امیرالمومنینؓ! قریش اہلِ تجارت ہیں۔ اگر آپ اُن کے وظیفے مقرر کریں گے، تو وہ تجارت چھوڑ بیٹھیں گے۔ پھر آپ کے بعد کوئی ایسا فرمانروا آئے گا، جو ان کے وظیفے بند کر دے گا اور تجارت ان کے ہاتھ سے نکل چکی ہو گی۔"

حکیم کے ان فقروں سے ایسا معلوم ہوتا ہے، گویا غیب کے پردے اُن کی نگاہوں سے ہٹا دیے گئے تھے اور یہ بات اُن کے دل میں القا کی گئی تھی، وظائف نے عربوں کو کاہل بنا دیا اور وہ روزی کے لیے دوڑ دھوپ کرنے سے بے پروا ہو گئے۔ اس کے بعد جب حالات بدلے، فتوحات کا سلسلہ رُکا اور غیر عرب اسلامی حکومت میں شامل ہو گئے۔ اور یہ اس وقت کی بات ہے

جب اسلام کا دار السلطنت مدینہ سے دمشق اور دمشق سے بغداد منتقل ہُوا تو جزیرۃ العرب کے باشندوں کے وظائف بند کر دیے گئے۔ آسائش و بے عملی کی گود میں پرورش پانے والی نسل نہ تجارت کی طرف لوٹ سکی، نہ روزی کے لیے جدوجہد کر سکی، جس کے نتیجے میں حجاز ایسا ویران اور بنجر ہوا کہ آج تک نہیں پنپ سکا۔

یہ نتیجہ حضرت عمرؓ کی نگاہوں سے کیسے اوجھل رہ گیا؟ انھوں نے اس کا اندازہ کیوں نہ کیا اور اس سے بچنے کی تدبیر کیوں نہ سوچی؟ بالخصوص جب انھیں یہ بات جتا دی گئی تھی اور اس کے نتائج اُن کے سامنے پیش کر دیے گئے تھے؟ یہ ہے ایک اعتراض جو جزیرہ نمائے عرب کے مفلس و قلاش ہو جانے کے بعد بظاہر دل میں ابھرتا ہے! معلوم ہوتا ہے حضرت عمرؓ کو اس بات کا اندازہ تھا اور وہ اس کی توقع کرتے تھے۔ چنانچہ ایک طرف تو وہ عوام کو محنت و مشقت کرنے اور زیادہ سے زیادہ روزی کمانے کی تاکید فرماتے رہتے تھے اور دوسری طرف اُن لوگوں کو شدید نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، جو نمائشی زہد و عبادت کے زیرِ اثر دنیا سے بے تعلقی ظاہر کرتے تھے۔ ایک دن اُنھوں نے ایک زاہدِ مُرتاض کو دیکھا، اس کے پاس گئے اور ایک دُرّہ مار کر بولے:

"خدا تجھے موت دے! ہمارے دین کا گلا کیوں گھونٹتا ہے؟"

وہ لوگوں سے کہا کرتے تھے:

"جس کے پاس دولت ہے اسے دولت کو مفید کاموں میں لگانا چاہیے، اور جس کے پاس زمین ہے اُسے زمین کو آباد کرنا چاہیے، کیونکہ عنقریب ایسا شخص آنے والا ہے، جو اسی کو دے گا جسے چاہے گا۔"

ان کا اس پر ایمان تھا کہ انسان اپنی دُنیا کے لیے اس طرح کام کرے گویا وہ ہمیشہ زندہ رہے گا اور اپنی عقبیٰ کے لیے اس طرح کام کرے گویا کل ہی مر جائے گا۔

حضرت عمرؓ نے رجسٹر مرتب کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا اور عقیل بن ابی طالب، مخرمہ بن نوفل اور جُبیر بن مُطعم کو بلا کر کہا:

"حیثیت اور مرتبے کے لحاظ سے لوگوں کی فہرست تیار کرو!"

ان لوگوں نے سب سے پہلے بنو ہاشم کے نام لکھے پھر حضرت ابوبکرؓ کے قبیلے بنو تیم کے اور اس کے بعد حضرت عمرؓ کے قبیلے بنو عدی کے۔ حضرت عمرؓ نے یہ دیکھا تو فرمایا:

"خدا کی قسم! چاہتا تو میں بھی یہی تھا۔ کاش ایسا ہوتا۔ لیکن تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت سے شروع کرو، جو حضورؐ سے قریب تر ہیں۔ سب سے پہلے وہ، پھر وہ جو ان کے بعد ہیں یہاں تک کہ عمرؓ کو وہاں رکھو، جہاں اللہ نے اسے رکھا ہے۔"

روایت ہے کہ بنو عدی کو حضرت عمرؓ کی یہ بات معلوم ہُوئی تو وہ ان کے پاس آئے اور کہا:

"آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ ہیں۔ آپ نے اپنا نام وہیں کیوں نہ رہنے دیا، جہاں اُن لوگوں نے لکھا تھا۔"

حضرت عمرؓ نے غضب ناک نگاہوں سے انہیں دیکھا اور فرمایا:

"واہ اے بنو عدی! چاہتے ہو کہ میری کمائی کھاؤ اور تمہاری وجہ سے میری نیکیاں برباد جائیں۔ نہیں، خدا کی قسم!

تم اسی ترتیب سے آؤ گے، جس ترتیب سے تمہارے پاس دعوت پہنچی تھی، چاہے تمہارے ناموں پر رجسٹر ختم ہی کیوں نہ ہوتا ہو۔"

یہ ایک نیا مسئلہ تھا، جس سے لوگوں کی طبقاتی درجہ بندی مقصود تھی۔ یہ نیا مسئلہ جو حضرت عمرؓ نے پیدا کیا تھا، صرف رجسٹر میں ناموں کی ترتیب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت سے آغاز کرنے ہی تک محدود نہ رہا، بلکہ اس سے گزر کر وظیفوں تک پہنچا جس کے نتیجے میں مستقل گروہ پیدا ہو گئے۔

حضرت عمرؓ نے وظیفوں میں مسلمانوں کو ایک دوسرے پر فضیلت دی اور اس باب میں حضرت ابوبکرؓ کی روش سے ہٹ گئے۔

جتنی بے چینی حضرت عمرؓ کو وظیفے تقسیم کرنے کی تھی، اتنی ہی بے چینی جزیرۃ العرب اور مفتوحہ ممالک کے عربوں کو وظیفہ وصول کرنے کی تھی اور کیوں نہ ہوتی جب حضرت عمرؓ ان کے دلوں میں اس کا شوق بھڑکاتے تھے اور وظیفے کی رقم کو منفعت بخش کاموں میں لگانے کی تاکید کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ وہ فرماتے تھے کہ سوادِ عربوں میں سے جس کسی کو وظیفہ ملے اُسے چاہیے کہ بکریاں خرید کر اپنے سرمائے میں شامل کر لے اور جب دوبارہ وظیفہ ملے، تو مویشی خرید لے۔ کیونکہ مجھے اندیشہ ہے کہ میرے بعد ایسے لوگ تمہارے والی بنیں گے، جو اپنے دور میں وظیفے جاری نہیں کریں گے۔ اگر تم میں سے کوئی اس وقت تک زندہ رہا، تو اس کے پاس اتنی جمع جکڑی ہو گی کہ وہ اس کے سہارے زندگی بسر کر لے۔" اور اکثر لوگ حضرت عمرؓ کی اس نصیحت پر عمل کرتے تھے۔

جن حضرات کو حضرت عمرؓ نے وظائف میں امتیازی حیثیت دی تھی، اُن میں سے کچھ بزرگ اس رقم کو صدقے کے طور پر دے دیا کرتے تھے۔ لیکن بیشتر لوگ وظیفہ لے کر تجارت کرتے تھے۔ اس لیے جو وظیفہ یاب ہزاروں درہم وصول کرتے تھے، اُن کی دولت دُگنی اور چوگنی ہو گئی۔ اس سے طبقاتی امتیازات نے جنم لیا اور اجتماعی نظام پر ان امتیازات کا اتنا واضح اثر پڑا کہ حضرت عمرؓ اپنی پالیسی پر نظرِ ثانی کرنے کے لیے مجبور ہو گئے۔ انتہائی سوچ بچار کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ غنیمت کی تقسیم کے سلسلے میں حضرت صدیقؓ نے مسلمانوں کے درمیان جو مساوات رکھی تھی، وہی بہتر تھی اور وظائف کے معاملے میں انہیں بھی اسی روش پر چلنا چاہیے تھا۔

چنانچہ انہوں نے فرمایا:

"خدا کی قسم! اگر میں آئندہ سال تک زندہ رہا تو آخری آدمی کو پہلے آدمی سے ملا کر ایک وجود بنا دوں گا۔"

اور کہا:

"اگر میں ایک سال زندہ رہ گیا تو سب سے پست آدمی کو سب سے بلند آدمی سے ملا دوں گا۔"

لیکن وہ یہ بھی جانتے تھے کہ مسلمانوں کو ایک سطح پر لانے کے لیے اگر امتیازی وظیفوں میں کمی کی گئی، تو اس سے ایک ایسی ناراضی پھیل جانے کا اندیشہ ہے جس کے نتائج ناخوشگوار ہوں گے۔ چنانچہ ان کی انتہائی کوشش یہ تھی کہ چھوٹے وظیفہ یابوں کے وظیفوں میں اضافہ کر کے انہیں بڑے وظیفہ یابوں کی سطح پر پہنچا دیا جائے۔ اُن کا ارشاد تھا:

"اگر میں دولت کی فراوانی تک زندہ رہا، تو ہر مسلمان کا وظیفہ تین ہزار درہم کر دوں گا۔ ایک ہزار اُس کے جانوروں اور ہتھیاروں کے لیے، ایک ہزار خود اُس کے لیے اور ایک ہزار اس کے اہل و عیال کے لیے۔" لیکن وہ سال بھر زندہ نہ رہے اور آنے والے سال سے پہلے ہی شہید کر دیے گئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ طبقات باقی رہ گئے اور اُن طبقات کا آگے چل کر ملتِ اسلامیہ

کی زندگی پر جو اثر پڑا اس کی تفصیل ہمارے دائرۂ بحث سے خارج ہے۔

حضرت عمرؓ نے صرف وظیفہ خواروں کا رجسٹر نہیں بنایا، بلکہ کہا جاتا ہے اسلام میں سب سے پہلے مراسلت کا رجسٹر وجود میں آیا۔ شام، عراق اور مصر کے جو رجسٹر تھے، وہ علی الترتیب رومی، فارسی اور قبطی زبان میں لکھے جاتے تھے اور اُن کی ترتیب تحریر مسلمانوں کے نہیں۔ ایرانیوں، رومیوں اور قبطیوں کے ہاتھ میں تھی۔ مراسلت کا یہ رجسٹر بھی خراج کے رجسٹر، سکّہ ڈھالنے کیلیے ٹکسال کی تعمیر اور مختلف شہروں میں بیت المال کے قیام کی طرح انہی برق رفتار تبدیلیوں کا مرہون تھا، جو اسلامی فتوحات اور مسلمانوں کے ایرانی و رومی سلطنتوں کے مختلف گوشوں میں پھیل جانے کی وجہ سے ظہور میں آئی تھیں۔ اس سے پہلے اسلامی مملکت میں اس قسم کے رجسٹر کہیں نہ تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خطوط آپؐ کے صحابہؓ لکھتے تھے اور ان خطوط کی نقل اور ان کے جواب کاشانۂ نبوت میں محفوظ رکھے جاتے تھے۔ سرکارِ رسالتؐ نے کوئی بیت المال بھی قائم نہیں فرمایا تھا اس لیے کہ آپؐ غنیمت اور صدقات کی رقم وصول ہوتے ہی مسلمانوں میں تقسیم فرما دیتے تھے۔ حضرت صدیقؓ نے بھی اسی سنّت پر عمل کیا۔ چنانچہ جو خطوط مرتدین اور اُن سے لڑنے والے امرائے لشکر کو لکھے اور عراق و شام کے محاذوں پر جانے کے لیے، جو دعوت نامے فوج اور اس کے سپہ سالاروں کو بھیجے جاتے، وہ حضرت صدیق رضؓ ہی کے مکان میں جمع رہتے تھے۔ امرائے لشکر کا بھی یہی طریقہ تھا، وہ خلیفۃ المسلمینؓ کی خدمت میں جو عرضداشتیں بھیجتے، اپنے لشکر کو جو احکام دیتے، دشمن کو جو خطوط لکھتے اور مفتوحہ علاقوں کے باشندوں سے جو معاہدے کرتے، وہ سب انہی کے پاس محفوظ رہتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ کے پاس غنیمت کا جتنا مال آتا، سب کا سب تقسیم فرما دیتے، اور اس میں سے کوئی چیز باقی نہ رکھتے تھے۔ اس کے بعد جب عہدِ فاروقیؓ میں مملکت کی حدود وسیع ہوئیں اور اس کی وجہ سے حکومت کا کام بڑھا، سرحدی چوکیاں قایم کی گئیں اور جزیہ و خراج وغیرہ کی رقمیں پے در پے مدینہ آنے لگیں، تو اس نئی صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اُن وسائل سے کام لینا ناگزیر ہو گیا، جو ان تمام معاملات کی تنظیم اس طرح کریں کہ سا تھ کے ساتھ مملکت کی اصلاح و فلاح کی راہیں بھی کھلتی جائیں اور لوگوں میں عدل و انصاف بھی قائم ہوتا جائے۔ پھر مفتوحہ علاقوں میں ایک ایسی حکیمانہ سیاست بروئے کار لائی جائے کہ وہاں کے باشندے اس حکومت سے خوش ہو جائیں، جو قیصر و کسریٰ کی حکومتوں کی جگہ قائم ہوئی تھی۔

ایران اور روم کے شہنشاہوں کو یہ زعم تھا کہ اُن کے اقتدار کا سرچشمہ ان کا خداداد حقِ شاہی ہے، لیکن امیر المومنینؓ اپنے اقتدار کو اُن لوگوں کے تعاون کا نتیجہ سمجھتے تھے، جنہوں نے اُن کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ ان دونوں شہنشاہوں کے زور و جبر کی کوئی حد و نہایت نہ تھی اور وہ اپنی رعایا کا خُون چُوسنے، اُس کی آزادی کا ہر طرح گلا گھونٹنے میں بالکل آزاد تھے۔ اس کے برعکس امیر المومنینؓ کتاب و سنّت کے پابند تھے اور اہل الرائے کے مشوروں کو پورا پورا وزن دیتے تھے۔ ان کے یہ مشیر نہایت آزادی و بے باکی کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کرتے تھے، لیکن حد سے آگے قدم نہ بڑھاتے تھے اور یہ حد قایم کرنے والے اللہ اور اُس کے رسولؐ اور اُس رسالت پر اُن کا سچا ایمان تھا، جو اللہ نے دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچانے کے لیے عربوں کے سپرد فرمائی تھی۔

اربابِ شوریٰ اور دوسرے تمام مسلمانوں کی آزادی اس بنیاد پر قائم تھی کہ اللہ اور اس کے اوامر و نواہی کے سامنے سب مسلمان برابر ہیں۔

کوئی امیر کسی عام آدمی پر اور کوئی عرب کسی عجمی پر نیکوکاری و پرہیزگاری کے سوا کوئی فضیلت نہیں رکھتا۔ اس مساوات اور اس آزادی پر ان کا یہ ایمان ہی تھا، جس نے انہیں اخوت کے اس بلند مقام پر پہنچا دیا جہاں ہر مسلمان اپنے بھائی کے لیے بھی وہی کچھ چاہتا تھا، جو وہ اپنے لیے پسند کرتا تھا۔

عہدِ فاروقیؓ میں تمدّنی ترقی

علامہ شبلی نعمانی

حکومت کے نظم و نسق میں جو چیز سب سے مقدم ہے، یہ ہے کہ انتظام کے تمام مختلف صیغے ایک دوسرے سے ممتاز اور الگ الگ ہوں اور یہی ترقیِ تمدن کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ جس طرح تمدن کی ابتدائی حالت میں مکانات کی یہ قطع ہوتی ہے کہ ایک ہی حجرہ تمام ضرورتوں کے لیے کافی ہوتا ہے۔ پھر جس قدر تمدن بڑھتا جاتا ہے کھانے، سونے، ملاقات کرنے، لکھنے پڑھنے اور دیگر ضروریات کے لیے جُدا جُدا کمرے بنتے جاتے ہیں۔ یہی حالت بالکل سلطنت کی ہے۔ ابتدائے تمدن میں انتظام کے تمام صیغے ملے جُلے رہتے ہیں۔ جو شخص صوبہ کا گورنر ہوتا ہے وہی لڑائی کے وقت سپہ سالار بن جاتا ہے۔ مقدمات کے انفصال کے وقت وہی قاضی کا کام دیتا ہے۔ جرائم کی تعزیر میں وہی پولیس کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس قدر تمدّن ترقی کرتا جاتا ہے الگ الگ صیغے قائم ہوتے جاتے ہیں اور ہر صیغے کا الگ افسر ہوتا ہے۔ حضرت عمرؓ کے عجیب و غریب کارناموں میں ایک یہ بھی ہے کہ باوجود اس کے کہ اس وقت عرب کا تمدن نہایت ابتدائی حالت میں تھا اور سلسلۂ حکومت کے آغاز کو صرف چند برس گزرے تھے، تاہم انھوں نے بہت سے شعبے جو مخلوط تھے، الگ کر کے جداگانہ محکمے قائم کیے۔

ملک کی تقسیم، صوبجات اور اضلاع

نظامِ حکومت کا ابتدائی سلسلہ جس پر تمام انتظامات متفرع ہیں، ملک کا مختلف حصّوں میں تقسیم ہونا ہے۔ جن کو صوبہ، ضلع اور پرگنہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اسلام میں حضرت عمرؓ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس کی ابتدا کی اور اُس زمانے کے موافق نہایت موزونی اور تناسب سے اس کی حدود قائم کیں۔ تمام مورخین نے اس کی تصریح کی ہے کہ انہوں نے ممالکِ مقبوضہ کو ۸ صوبوں میں تقسیم کیا۔

حضرت عمرؓ کے مقرر کردہ صُوبے

مکّہ، مدینہ، شام، جزیرہ، بصرہ، کوفہ، مصر، فلسطین۔ مورخ یعقوبی نے آٹھ کے بجائے سات صُوبے لکھے ہیں اور لکھا ہے کہ "یہ انتظام حضرت عمرؓ نے ۲۰ھ میں کیا تھا" مورخین کا یہ بیان اگرچہ درحقیقت صحیح ہے لیکن اس میں ایک اجمال ہے، جس کی تفصیل بتا دینا ضروری ہے۔ فاروقی فتوحات کو جو وسعت حاصل تھی، اس کے لحاظ سے صرف یہ آٹھ صوبے کافی نہیں ہو سکتے تھے فارس، خوزستان، کرمان وغیرہ بھی آخر صوبے ہی کی حیثیت رکھتے تھے۔

اصل یہ ہے کہ جو ممالک فتح ہوئے ان کی جو تقسیم پہلے سے تھی اور جو مقامات صوبے یا ضلعے تھے، اکثر جگہ حضرت عمرؓ نے اُسی طرح رہنے دیے، اس لیے مورّخین نے ان کا نام نہیں لیا۔ البتہ جو صوبے خود حضرت عمرؓ نے قائم کیے، ان کا ذکر ضروری تھا اور وہ یہی آٹھ تھے

لیکن یہ امر بھی بلحاظِ اغلب صحیح ہے ورنہ تاریخی تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے پچھلی تقسیم ملکی میں بھی تصرفات کیے تھے۔ فلسطین پہلے ایک صوبہ شمار کیا جاتا تھا اور اس میں دس ضلعے شامل تھے۔ ۱۵ھ میں جب حضرت عمرؓ نے خود فلسطین جا کر معاہدہ امن لکھا تو اس صوبے کے دو حصّے کر دیے۔ ایک کا صدر مقام ایلیا اور دوسرے کا رملہ قرار دیا اور علقمہ بن حکیم و علقمہ بن مجزز کو الگ الگ دونوں صوبوں میں متعین کیا۔ مصر کی نسبت ہم کو معلوم نہیں کہ فتح سے پہلے اس کی کیا حالت تھی۔ لیکن عمرؓ نے اس کو دو صوبوں میں تقسیم کیا۔ بالائی حصّہ جس کو عربی میں صعید کہتے ہیں اور جس میں ۲۸ ضلعے شامل تھے، ایک الگ صوبہ قرار دے کر عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کو وہاں کا حاکم مقرر کیا اور نشیبی حصّہ جس میں ۱۵ ضلعے شامل تھے، اس پر ایک دوسرا افسر تعینات کیا۔ عمرو بن العاص بطور گورنر جنرل کے تھے۔

نوشیروانی عہد کے صوبے

فارس وغیرہ میں چونکہ حضرت عمرؓ نے تقریباً تمام نوشیروانی انتظامات بحال رہنے دیے تھے۔ اس لیے صرف یہ بتا دینا کافی ہے کہ نوشیرواں کے عہد میں یہ ممالک کتنے حصّوں میں منقسم تھے۔

مورخ یعقوبی نے لکھا ہے کہ نوشیرواں کی سلطنت عراق کے علاوہ تین بڑے بڑے صوبوں میں منقسم تھی:

خراسان: اس میں مفصلۂ ذیل اضلاع شامل تھے:

نیشاپور، ہرات، مرو، مرورود، فاریاب، طالقان، بلخ، بخارا، باذغیس، بادرد، غرشستان، طوس، سرخس، جرجان۔

آذربائیجان: اس میں مفصلۂ ذیل اضلاع شامل تھے:

طبرستان، رے قزوین، زنجان، قم، اصفہان، ہمدان، نہاوند، دینور، حلوان، ماسبذان، مہرجان، قذق، شہرزور، صامغان، آذربیجان۔

فارس: اس میں مفصلۂ ذیل اضلاع شامل تھے:

اصطخر شیراز، نوبندجان، جور، گاذرون، فسا، دارابجرد، اردشیر خرہ، سابور، اہواز، جند یساپور، سوس، نہر تیری، مناذر، تستر، ایذج، رام ہرمز۔

صوبوں کے افسر

صوبوں کے مفصلۂ ذیل بڑے بڑے عہدہ دار رہتے تھے:

والی یعنی حاکمِ صوبہ، کاتب یعنی میر منشی، کاتبِ دیوان یعنی دفتر فوج کا میر منشی، صاحب الخراج یعنی کلکٹر، صاحبِ احداث یعنی افسر پولیس، صاحبِ بیت المال یعنی افسرِ خزانہ، قاضی یعنی صدر الصدور و منصف؛ چنانچہ کوفہ میں عمار بن یاسر والی، عثمان بن حنیف کلکٹر، عبداللہ بن مسعود افسر خزانہ، شریح قاضی، عبداللہ بن خلف الخزاعی کاتبِ دیوان تھے۔

ہر صوبے میں ایک فوجی افسر بھی ہوتا تھا لیکن اکثر حالتوں میں صوبے کا عامل ہی اس خدمت پر بھی مامور ہوتا تھا۔ پولیس کا محکمہ بھی، جہاں تک ہم کو معلوم ہے، ہر جگہ الگ نہ تھا۔ اکثر کلکٹر یا عامل اس خدمت کو بھی انجام دیتا تھا۔ مثلاً عمار بن یاسر جس وقت کوفہ کے حاکم تھے پولیس کا کام بھی انہی کے سپرد تھا بحرین میں قدامہ بن مظعون صاحب الخراج تھے اور پولیس کا کام بھی کرتے تھے۔ والی کا اسٹاف وسیع اور مستقل اسٹاف ہوتا تھا اور اس کے ممبر خود دربارِ خلافت کی طرف سے مامور ہوتے تھے۔ عمار کو جب حضرت عمرؓ نے کوفہ کا حاکم مقرر کر کے بھیجا تو دس معزز آدمی ان کے اسٹاف میں دیے جن میں ایک قرظہ خزرجی بھی تھے۔

میر منشی قابل اور تقریر اور تحریر میں یکتا ہوتا تھا۔ ابو موسیٰ اشعری جو بصرہ کے گورنر تھے، ان کا میر منشی زیاد بن سمیہ تھا، جس کی فصاحت و بلاغت پر خود حضرت عمرؓ حیران رہ گئے تھے اور عمرو بن العاص کہا کرتے تھے کہ اگر یہ نوجوان قریش کی نسل سے ہوتا، تو تمام عرب اس کے عَلَم کے نیچے آجاتا۔

صوبجات اور اضلاع کی تقسیم کے بعد سب سے مقدم جو چیز تھی، ملکی عہدہ داروں کا انتخاب اور ان کی کارروائی کا دستور العمل بنانا تھا، کوئی فرمانروا کتنا ہی بیدار مغز اور کوئی قانون کتنا ہی مکمل ہو، لیکن جب تک حکومت کے اعضاؤ جوارح یعنی عہدہ دارانِ ملکی قابل، لائق، راست باز اور متدین نہ ہوں اور ان سے نہایت بیدار مغزی کے ساتھ کام نہ لیا جائے، ملک کو کبھی ترقی نہیں ہوسکتی۔ حضرت عمرؓ نے اس باب میں جس نکتہ رسی اور تدبیر و سیاست سے کام لیا، انصاف یہ ہے کہ تاریخ عالم کے ہزاروں ورق اُلٹ کر بھی اس کی نظیر نہیں ملتی۔

حضرت عمرؓ کی جوہر شناسی

اس مرحلے میں اس بات سے بڑی مدد ملی کہ ان کی طبیعت شروع سے جوہر شناس واقع ہوئی تھی، یعنی جس شخص میں جس قسم کی قابلیت ہوتی تھی وہ اس کی تہہ کو پہنچ جاتے تھے۔ اس کے ساتھ انہوں نے ملک کے تمام قابل آدمیوں سے واقفیت بہم پہنچائی تھی یہی بات تھی کہ انہوں نے جس شخص کو جو کام دیا اس کے انجام دینے کے لیے اس سے بڑھ کر آدمی نہیں مل سکتا تھا۔ عرب میں چار شخص تھے جن کو دہاۃ العرب کہا جاتا تھا، یعنی جو فنِ سیاست و تدبیر میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے، امیر معاویہ، عمرو بن العاص، مغیرہ بن شعبہ، زیاد بن سمیہ۔ حضرت عمرؓ نے زیاد کے سوا تینوں کو بڑے بڑے ملکی عہدے دیے، اور چونکہ یہ لوگ صاحبِ ادّعا بھی تھے اس لئے اس طرح ان پر قابو رکھا کہ کبھی کسی قسم کی خودسری نہ کرنے پائیں۔ زیاد ان کے زمانے میں شانزدہ سالہ نوجوان تھا اس لیے اس کو کوئی بڑا عہدہ نہیں دیا، لیکن اس کی قابلیت اور استعداد کی بنا پر ابو موسیٰ اشعری کو لکھا کہ کاروبارِ حکومت میں اس کو مشیرِ کار بنائیں۔ فنِ حرب میں عمرو معدی کرب اور طلیحہ بن خالد نہایت ممتاز تھے، لیکن تدبیر و سیاست میں ان کو دخل نہ تھا۔ حضرت عمرؓ نے ان دونوں کو نعمان بن مقرن کی ماتحتی میں عراق کی فتوحات پر مامور کیا، لیکن نعمان کو لکھ بھیجا کہ ان کو کسی صیغے کی افسری نہ دینا، کیونکہ ہر شخص اپنا فن خوب جانتا ہے۔ عبد اللہ بن ارقم ایک معزز صحابی تھے ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کہیں سے ایک جواب طلب تحریر آئی، آپ نے فرمایا، "اس کا جواب کون لکھے گا؟" عبد اللہ بن ارقم نے عرض کی کہ "میں"۔ یہ کہہ کر خود اپنی طبیعت سے جواب لکھ کر لائے۔ آنحضرتؐ

نے سُنا تو نہایت پسند فرمایا۔ حضرت عمرؓ بھی موجود تھے۔ ان کی اس قابلیت پر ان کو خاص خیال ہوا، اور جیسا کہ علامہ ابن الاثیر وغیرہ نے لکھا ہے، یہ اثر ان کے دل میں ہمیشہ قایم رہا۔ یہاں تک کہ جب خلیفہ ہوئے تو ان کو میر منشی مقرر کیا۔

عامل

جس وقت کوئی عامل مقرر ہوتا تھا، اس کے پاس جس قدر مال و اسباب ہوتا تھا، اس کی مفصل فہرست تیار کرا کر محفوظ رکھی جاتی تھی اور اگر عامل کی مالی حالت میں غیر معمولی ترقی ہوتی تھی، تو اس سے مواخذہ کیا جاتا تھا۔

اب ہم عمالانِ فاروقی کی ایک اجمالی فہرست درج کرتے ہیں جس سے اندازہ ہوگا کہ حضرت عمرؓ نے حکومت کی کل میں کس قسم کے پُرزے استعمال کیے تھے:

نام	مقامِ ماموریت	عہدہ	کیفیت
ابو عبیدہؓ	شام	والی	مشہور صحابی اور عشرۂ مبشرہ میں داخل ہیں۔
یزید بن ابی سفیانؓ	〃	〃	تمام بنو امیہ میں ان سے بڑھ کر کوئی شخص لائق نہ تھا۔
امیر معاویہؓ	〃	〃	سیاست و تدبیر میں مشہور ہیں۔
عمرو بن العاصؓ	مصر	〃	مصر انہی نے فتح کیا۔
سعد بن ابی وقاصؓ	کوفہ	〃	آنحضرتؐ کے ماموں تھے۔
عتبہ بن غزوانؓ	بصرہ	〃	مہاجرین میں سے ہیں، بصرہ انہی نے آباد کرایا۔
ابوموسیٰ اشعریؓ	〃	〃	مشہور جلیل القدر صحابی ہیں۔
عتاب بن اسیدؓ	مکۂ معظمہ	〃	آنحضرتؐ نے ان کو مکۂ معظمہ کا عامل مقرر کیا تھا۔
نافع بن عبد الحارثؓ	〃	〃	فضلائے صحابہؓ میں سے ہیں۔
خالد بن العاصؓ	〃	〃	ابوجہل کے بھتیجے اور معزز شخص تھے۔
عثمان بن ابی العاصؓ	طائف	〃	آنحضرتؐ کے بعد جب ارتداد پھیلا تو طائف کے لوگوں کو انہی نے تھاما تھا۔
یعلی بن اُمیہؓ	یمن	〃	صحابہؓ میں سے تھے اور فیاضی میں شہرتِ عام رکھتے تھے۔
علاء بن الحضرمیؓ	〃	〃	بڑے صاحبِ اثر تھے، آنحضرتؐ نے ان کو یمن کا عامل مقرر کیا تھا۔
نعمانؓ	مدائن	صاحب الخراج	
عثمان بن حنیفؓ	اضلاعِ فرات	کمشنر بندوبست	حساب کتاب اور پیمائش کے کام میں نہایت ماہر تھے۔

عیاض بن غنمؓ	جزیرہ	والی	جزیرہ انہی نے فتح کیا تھا۔
عمر بن سعدؓ	حمص	"	حضرت عمرؓ ان کی نہایت عزت کرتے تھے۔
حذیفہ بن الیمانؓ	مدائن	"	مشہور صحابیؓ اور آنحضرتؐ کے رازدار تھے۔
خالد بن حرث دہمانیؓ	اصفہان	افسر خزانہ	
سمرۃ بن جندبؓ	سوق الاہواز	.	اکابر صحابہؓ میں ہیں۔
نعمان بن عدیؓ	میسان	.	صحابہؓ میں سے اوّل انہی کو وراثت کا مال ملا۔
عرفجہ بن ہرثمہؓ	موصل	کمشنر مالگذاری	موصل میں انہی نے فوجی چھاؤنی بنوائی۔

صیغۂ محاصل

خراج کا طریقہ عرب میں حضرت عمرؓ نے ایجاد کیا

خراج کا نظم و نسق عرب کی تاریخ تمدن میں ایک نیا اضافہ تھا۔ اسلام سے پہلے اگرچہ عرب کے مختلف خاندان تاج و تخت کے مالک ہوئے جنہوں نے سلطنت کے تمام کاروبار قایم کر دیے تھے، لیکن محاصل کا باقاعدہ انتظام بالکل موجود نہ تھا۔ اسلام کے آغاز میں اس قدر رہا کہ جب خیبر فتح ہوا تو یہودیوں نے درخواست کی کہ زراعت کا کام ہم اچھا جانتے ہیں۔ اس لیے زمین ہمارے ہی قبضے میں چھوڑ دی جائے۔ جناب رسول اللہؐ نے ان کی درخواست منظور کر لی اور بٹائی پر معاملہ ہو گیا۔ اس کے سوا جن مقامات کے باشندے سب مسلمان ہو گئے تھے ان کی زمین پر عشر مقرر کر دیا، جو ایک قسم کی زکوٰۃ تھی۔ حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں عراق کے کچھ حصے فتح ہوئے، لیکن خراج وغیرہ کا کچھ انتظام نہ ہوا بلکہ سرسری طور پر کچھ رقم مقرر کر دی گئی۔

حضرت عمرؓ کو جب جنگی مہمات کی طرف سے فی الجملہ اطمینان ہوا یعنی ۱۶ھ میں ادھر عراق عرب پر پورا قبضہ ہو گیا اور اُس طرف یرموک کی فتح نے رومیوں کی قوت کا استیصال کر دیا، تو خراج کے نظم و نسق کی طرف توجہ کی۔ اس مرحلے میں پہلی یہ مشکل پیش آئی کہ امرائے فوج نے اصرار کیا کہ تمام مفتوحہ مقامات صلۂ فتح کے طور پر ان کی جاگیر میں عنایت کیے جائیں اور باشندوں کو ان کی غلامی میں دے دیا جائے۔ حضرت عمرؓ نے عراق کی فتح کے ساتھ سعد بن وقاصؓ کو وہاں کی مردم شماری کے لیے حکم دیا تھا۔ سعدؓ نے نہایت جانچ پڑتال کے ساتھ مردم شماری کا کاغذ مرتب کر کے بھیجا۔ کُل باشندوں اور اہل فوج کی تعداد کا موازنہ کیا گیا، تو ایک ایک مسلمان کے حصے میں تین تین آدمی پڑتے تھے۔ اُسی وقت حضرت عمرؓ کی یہ رائے قایم ہو چکی تھی کہ زمین باشندوں کے قبضے میں رہنے دی جائے اور اُن کو ہر طرح پر آزاد چھوڑ دیا جائے۔ لیکن اکابر صحابہؓ میں سے عبدالرحمن بن عوفؓ وغیرہ اہل فوج کے ہم زبان تھے۔ حضرت بلالؓ نے تو اس قدر کد کی کہ حضرت عمرؓ نے دق ہو کر فرمایا: اللّٰھم اکفنی بلالا۔ یعنی "اے خدا! مجھ کو بلال سے نجات دے۔"

حضرت عمرؓ یہ استدلال پیش کرتے تھے کہ اگر ممالکِ مفتوحہ فوج کو تقسیم کر دیے جائیں تو آئندہ افواج کی تیاری، بیرونی حملوں کی حفاظت، ملک کے امن و امان قایم رکھنے کے مصارف کہاں سے آئیں گے؟ عبدالرحمٰن بن عوفؓ کہتے تھے کہ جن کی تلواروں نے ملک کو فتح کیا ہے، انھی کو قبضے کا بھی حق ہے۔ آیندہ نسلیں مفت کیونکر پا سکتی ہیں؛ چونکہ حضرت عمرؓ کی حکومت کا طریقہ جمہوری تھا، یعنی جو فیصلہ ہوتا تھا، کثرتِ رائے پر ہوتا تھا۔ اس لیے عام اجلاس ہوا، جس میں تمام قدمائے مہاجرین اور انصار میں سے پانچ قبیلہ اوس اور پانچ قبیلہ خزرج کے سردار وکیل کے طور پر شریک ہوتے۔ حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ اور طلحہؓ نے حضرت عمرؓ کی رائے سے اتفاق کیا؛ تاہم کوئی فیصلہ نہ ہو سکا، کئی دن تک یہ مرحلہ رہا۔

حضرت عمرؓ کا استدلال

حضرت عمرؓ کو دفعۃً قرآن مجید کی ایک آیت یاد آئی، جو بحث کے لیے نصِ قاطع تھی یعنی لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ الخ اس آیت کے اخیر فقرے وَالَّذِيْنَ جَآءُوْا مِنْۢ بَعْدِهِمْ سے حضرت عمرؓ نے یہ استدلال کیا کہ فتوحات میں آئندہ نسلوں کا بھی حق ہے، لیکن اگر فاتحین کو تقسیم کر دیا جائے، تو آنے والی نسلوں کے لیے کچھ باقی نہیں رہتا۔

حضرت عمرؓ نے کھڑے ہو کر نہایت پُر زور تقریر کی اور اس آیت کو استدلال میں پیش کیا۔ تمام لوگ بول اُٹھے کہ بے شبہ آپ کی رائے بالکل صحیح ہے۔ اس استدلال کی بنا پر یہ اصول قائم ہو گیا کہ جو ممالک فتح کیے جائیں وہ فوج کی ملک نہیں ہیں؛ بلکہ حکومت کی ملک قرار پائیں گے اور پچھلے قابضین کو بے دخل نہیں کیا جائے گا۔ اس اصول کے قرار پانے کے بعد حضرت عمرؓ نے ممالکِ مفتوحہ کے بندوبست پر توجہ کی۔

عراق کا بندوبست

عراق چونکہ عرب سے نہایت قریب اور عربوں کے آباد ہو جانے کی وجہ سے عرب کا ایک صوبہ بن گیا تھا، سب سے پہلے اس سے شروع کیا۔ حضرت عمرؓ کا ایک یہ بھی اصول تھا کہ ہر ملک کے انتظام میں وہاں کے قدیم رسم و رواج سے واقفیت حاصل کرتے تھے اور اکثر حالتوں میں کسی قدر اصلاح کے ساتھ قدیم انتظامات کو بحال رکھتے تھے۔ عراق میں اس وقت مال گزاری کا جو طریقہ جاری تھا، یہ تھا کہ ہر ایک قسم کی مزروعہ زمین پر ایک خاص شرح کے لگان مقرر تھے، جو تین قسطوں میں ادا کیے جاتے۔ یہ طریقہ سب سے پہلے قباد نے قائم کیا تھا اور نوشیرواں نے اس کی تکمیل کی تھی۔ نوشیرواں تک لگان کے تعلق میں یہ اصول ملحوظ رہتا تھا کہ اصل پیداوار کے نصف سے زیادہ نہ ہونے پائے، لیکن خسرو پرویز نے اس پر اضافہ کیا اور یزدگرد کے زمانے میں اور بھی تبدیلیاں ہوئیں۔ حضرت عمرؓ نے مزید تحقیقات کے لحاظ سے پیمائش کا حکم دیا۔ اس کام کے لیے چونکہ دیانت کے ساتھ فنِ مساحت سے واقف ہونا ضروری تھا، اور عرب میں اس قسم کے فنون اُس وقت تک رائج نہ تھے، اس لیے فی الجملہ دقت پیش آئی۔ آخر دو اشخاص انتخاب کیے گئے۔ عثمانؓ بن حنیف اور حذیفہؓ بن الیمان، یہ دونوں بزرگ اکابر صحابہ میں سے تھے اور عراق میں زیادہ تر رہنے سے اس قسم کے کاموں سے واقف ہو گئے تھے۔ خصوصاً عثمانؓ بن حنیف کو

اُس فن میں پُوری مہارت حاصل تھی۔

افسرانِ بندوبست

قاضی ابویُوسف صاحب نے کتاب الخراج میں لکھا ہے کہ انہوں نے اس تحقیق اور صحت کے ساتھ پیائش کی جس طرح قیمتی کپڑا ناپا جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے پیائش کا پیمانہ خود اپنے دستِ مبارک سے تیار کر کے دیا۔ کئی مہینے تک بڑے اہتمام اور جانچ کے ساتھ کام جاری رہا۔

عراق کا کُل رقبہ

کُل رقبہ طول میں ۳۷۵ میل اور عرض میں ۳۲۰ یعنی کل ۳۰۰۰۰ میل مکسّر ٹھہرا اور پہاڑ، صحرا اور نہروں کو چھوڑ کر قابلِ زراعت زمین تین کروڑ ساٹھ لاکھ جریب ٹھہری۔ خاندانِ شاہی کی جاگیر، آتش کدوں کے اوقاف، لاوارثوں، مفروروں اور باغیوں کی جائداد وہ زمینیں جو سڑکوں کی تیاری اور درستی اور ڈاک کے مصارف کے لیے مخصوص تھیں، دریا برآورد جنگل، ان تمام زمینوں کو حضرت عمرؓ نے خالصہ قرار دے کر ان کی آمدنی، جس کی سالانہ تعداد ستر لاکھ درہم (۷۰۰۰۰۰۰) تھی رفاہ عام کے کاموں کے لیے مخصوص کر دی۔ کبھی کبھی کسی شخص کو اسلامی کوششوں کے صلے میں جاگیر عطا کی جاتی تھی۔ تو انہی زمینوں سے کی جاتی تھی۔ لیکن یہ جاگیریں کسی حال میں خراج یا عشر سے مستثنیٰ نہیں ہوتی تھیں۔ باقی تمام زمین قدیم قبضہ داروں کو دے دی گئی۔

عراق کا خراج

اُفتادہ زمین پر بشرطیکہ قابلِ زراعت ہو۔ دو جریب پہ ایک درہم مقرر ہوا، اس طرح کُل عراق کا خراج ۸ کروڑ ۶۰ لاکھ درہم ٹھہرا، چونکہ پیائش کے مہتمم مختلف لیاقت کے تھے، اس لیے تشخیص جمع میں بھی فرق رہا؛ تاہم جہاں جس قدر جمع مقرر کی گئی، اُس سے زیادہ مالکانِ اراضی کے لیے چھوڑ دیا گیا۔ حضرت عمرؓ کو ذاتی رعایا کا اس قدر خیال تھا کہ دونوں افسروں کو بلا کر کہا کہ تم نے تشخیص جمع میں سختی تو نہیں کی؛ حضرت عثمانؓ نے کہا کہ نہیں، بلکہ ابھی اسی قدر اور گنجائش ہے۔

زمیندار اور تعلقہ دار

جو لوگ قدیم سے زمیندار اور تعلقہ دار تھے اور جن کو ایرانی زبان میں مرزبان اور دہقان کہتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے ان کی حالت اسی طرح قایم رہنے دی اور اُن کے جو اختیارات اور حقوق تھے، سب بحال رکھے۔

جس خوبی سے بندوبست کیا گیا تھا، اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ باوجود اس کے کہ لگان کی شرحیں نوشیرواں کی مقرر کردہ شرحوں سے زائد تھیں؛ تاہم نہایت کثرت سے افتادہ زمینیں آباد ہوگئیں اور دفعۃً زراعت کی پیداوار میں ترقی ہوگئی۔

پیداوار اور آمدنی میں ترقی

بندوبست کے دُوسرے ہی سال خراج کی مقدار آٹھ کروڑ بیس ہزار درہم تک پہنچ گئی۔ سالہا سے مابعد میں اور بھی اضافہ ہوتا گیا۔ اس پر بھی حضرت عمرؓ کو یہ احتیاط تھی کہ ہر سال جب عراق کا خراج آتا تھا تو دس ثقہ اور معتمد اشخاص کوفے سے اور اسی قدر بصرہ سے طلب کیے جاتے تھے اور حضرت عمرؓ ان کو چار دفعہ شرعی قسم دلاتے تھے کہ یہ مالگذاری کسی ذمی یا مسلمان پر ظلم کر کے تو نہیں لی گئی ہے۔

ہر سال مالگذاری کی نسبت رعایا کا اظہار لیا جانا

یہ عجیب بات ہے کہ حضرت عمرؓ نے اگرچہ نہایت نرمی سے خراج مقرر کیا تھا، لیکن جس قدر مالگذاری اُن کے عہد میں وصول ہوئی زمانۂ مابعد میں کبھی وصول نہیں ہوئی۔

حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز فرمایا کرتے تھے کہ حجاج پر خدا لعنت کرے، کمبخت کو نہ دین کی لیاقت تھی نہ دُنیا کی۔ عمرؓ بن الخطاب نے عراق کی مالگذاری دس کروڑ ۸۲ لاکھ درہم وصول کی، زیاد نے دس کروڑ ۱۵ لاکھ اور حجاج نے باوجود جبر و ظلم کے صرف ۲ کروڑ ۸ لاکھ وصول کیے۔ مامون الرشید کا زمانہ عدل و انصاف کے لیے مشہور ہے، لیکن اس کے عہد میں بھی عراق کے خراج کی تعداد پانچ کروڑ ۴۸ لاکھ درہم سے کبھی نہیں بڑھی۔

خراج کا دفتر فارسی اور رومی زبان میں تھا

جہاں تک ہم کو معلوم ہے عراق کے سوا حضرت عمرؓ نے اور کسی صوبے کی پیمائش نہیں کرائی بلکہ جہاں جس قسم کا بندوبست تھا اور بندوبست کے جو کاغذات پہلے سے تیار تھے ان کو اسی طرح قائم رکھا۔ یہاں تک کہ دفتر کی زبان تک نہیں بدلی، یعنی جس طرح اسلام سے پہلے عراق و ایران کا دفتر فارسی میں، شام کا رومی میں، مصر کا قبطی میں تھا، حضرت عمرؓ کے عہد میں بھی اسی طرح رہا۔ خراج کے محکمے میں جس طرح قدیم سے پارسی، یونانی اور قبطی ملازم تھے، بدستور بحال رہے؛ تاہم حضرت عمرؓ نے قدیم طریقۂ انتظام میں جہاں کچھ غلطی دیکھی، اس کی اصلاح کر دی۔

مصر میں فرعون کے زمانے کے قواعدِ مالگذاری

مصر میں فرعون کے زمانے میں جو بندوبست ہُوا تھا، پٹالومیز (بطالمہ) نے بھی وہی قائم رکھا اور رومن ایمپائر میں بھی وہی جاری رہا۔ فرعون نے تمام اراضی کی پیمائش کرائی تھی اور تشخیص جمع اور طریقۂ ادا کے مقدم اصول یہ قرار دیے تھے:

۱۔ خراج نقد اور اصل پیداوار دونوں طریقے سے وصول کیا جائے۔

۲- چند سالوں کی پیداوار کا اوسط نکال کر اس کے لحاظ سے جمع تشخیص کی جائے۔
۳- بندوبست چار سالہ ہو۔

رومیوں کا اضافہ

رومیوں نے اپنے عہدِ حکومت میں اور تمام قاعدے بحال رکھے تھے۔ لیکن یہ نیا دستور مقرر کیا کہ ہر سال خراج کے علاوہ مصر سے غلّہ کی ایک مقدار کثیر پائے تخت قسطنطنیہ کو روانہ کی جاتی تھی اور سلطنت کے ہر صوبے میں فوج کی رسد کے لیے یہیں سے غلّہ جاتا تھا، جو خراج میں محسوب نہیں ہوتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے یہ دونوں جابرانہ قاعدے موقوف کر دیے۔

حضرت عمرؓ نے قدیم طریقے کی اصلاح کی

یورپ کے مورخوں نے لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ کے عہد میں بھی یہ رسم جاری رہی؛ چنانچہ قحط کے سال مصر سے مدینہ منورہ کو جو غلّہ بھیجا گیا، اسی اصول کے موافق بھیجا گیا، لیکن یہ ان کی سخت غلطی اور قیاس بازی ہے۔ یہ شبہ عام القحط میں مصر سے غلّہ آیا اور پھر یہ ایک رسم قایم ہو کر مدتوں تک جاری رہی۔ لیکن یہ وہی غلّہ تھا جو خراج سے وصول ہوتا تھا۔ کوئی نیا خراج یا ٹیکس نہ تھا۔ چنانچہ علامہ بلاذری نے فتوح البلدان میں صاف صاف تصریح کر دی ہے۔ اس بات کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ جب خراج میں صرف نقدی کا طریقہ رہ گیا تھا، تو غلّہ خرید کر کے بھیجا جاتا تھا۔ چنانچہ امیر معاویہؓ کے عہدِ حکومت کی نسبت علامہ مقریزی نے صاف اس کی تصریح کی ہے۔ حضرت عمرؓ نے ہر صوبے میں فوج کی رسد کے لیے غلّے کے کھتوں کا بھی انتظام کیا تھا لیکن یہ بھی وہی خراج کا غلّہ تھا۔

مصر میں وصولِ مالگذاری کا طریقہ

حضرت عمرؓ نے مالگذاری کے وصول کا طریقہ بھی نہایت نرم کر دیا اور اس لحاظ سے دونوں ملکوں کے قدیم قاعدوں میں فی الجملہ ترمیم کر دی۔ مصر ایک ایسا ملک ہے جس کی پیداوار کا مدار دریائے نیل کی طغیانی پر ہے اور چونکہ اس کی طغیانی کے مدارج میں نہایت تفاوت ہوتا رہتا ہے، اس لیے پیداوار کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکتا تھا۔ چند سالوں کے اوسط کا حساب اس لیے مفید نہیں کہ جاہل کاشتکار اپنے مصارف کی تقسیم ایسی باقاعدہ نہیں کر سکتے کہ خشک سالی میں اوسط حساب کے لحاظ سے ان کا کام چل سکے۔

بہر حال حضرت عمرؓ کے زمانے میں مالگذاری کے وصول کا یہ طریقہ تھا کہ جب مالگذاری کی قسطیں کھلتی تھیں تو تمام پرگنہ جات سے رئیس اور زمیندار اور عرّاف طلب کیے جاتے تھے اور وہ پیداوار حال کے لحاظ سے کُل ملک کے خراج کا ایک تخمینہ پیش کرتے تھے اس کے بعد اسی طرح ہر ہر ضلع اور ہر ہر پرگنے کا تخمینہ مرتب کیا جاتا تھا، جس میں مقامی زمیندار اور مکھیا شریک ہوتے تھے۔ یہ تخمینی رقم ان لوگوں کے مشورے سے ہر ہر گاؤں میں پھیلا دی جاتی۔ پیداوار جو ہوتی تھی، اس میں سے اوّل گرجاؤں اور حماموں کے مصارف اور مسلمانوں کی مہمانی کا خرچ نکال لیا جاتا تھا۔ باقی جو بچتا تھا، اس میں سے جمع مشخصہ ادا کی جاتی تھی۔ ہر گاؤں پر جمع تشخیص ہوتی تھی، پڑتے

سے ایک حصہ گاؤں کے پیشہ وروں سے بھی وصول کیا جاتا تھا۔

اس طریقے میں اگرچہ بڑی زحمت تھی اور گویا ہر سال نیا بندوبست کرنا پڑتا تھا لیکن مصر کے حالات کے حساب سے عدل اور انصاف کا یہی مقتضیٰ تھا۔ مصر میں یہ طریقہ تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ ایک مدت سے معمول بھی تھا۔

لگان کی شرح فی جریب ایک دینار اور نیم اردب غلہ قرار دی گئی اور یہ معاہدہ لکھ دیا گیا کہ اس مقدار پر کبھی اضافہ نہیں کیا جائے گا۔

مصر کا کل خراج

اس عدل و انصاف کے ساتھ حضرت عمرؓ کے زمانے میں جو خراج وصول ہوتا تھا، اس کی تعداد ایک کروڑ بیس لاکھ دینار تھی، جس کے تقریباً ۵ کروڑ ۶ لاکھ روپے ہوتے ہیں۔ علامہ مقریزی نے لکھا ہے کہ یہ صرف جزیے کی رقم تھی، خراج اس کے علاوہ تھا — ابوحوقل بغدادی نے بھی اپنے جغرافیے میں قاضی ابوحازم کا جو قول نقل کیا ہے وہ اسی کے مطابق ہے لیکن میرے نزدیک دونوں نے غلطی کی ہے۔ خود علامہ مقریزی نے لکھا ہے کہ جب عمرو بن العاص نے پہلے سال ایک کروڑ دینار وصول کیے، تو حضرت عمرؓ نے اس خیال سے کہ مقوقس نے ابھی پچھلے سال بیس کروڑ وصول کیے تھے۔ عمرو بن العاص سے بازپرس کی۔ یہ مسلّم ہے کہ مقوقس کے عہد میں جزیے کا دستور نہ تھا۔ اس لیے عمرو بن العاص کی یہ رقم اگر جزیہ تھی تو مقوقس کی رقم سے اس کا مقابلہ کرنا بالکل بے معنی تھا۔ اس کے علاوہ تمام مورخین نے اور خود مقریزی نے جہاں خراج کی حیثیت سے اسلام کے ماقبل اور مابعد زمانوں کا مقابلہ کیا ہے، اسی تعداد کا نام لیا ہے۔ بہرحال حضرت عمرؓ کے عہد میں خراج کی مقدار جہاں تک پہنچی، زمانۂ مابعد میں کبھی اس حد تک نہیں پہنچی۔

مصر کا خراج بنوامیہ اور عباسیہ کے زمانے میں

بنوامیہ اور العباس کے زمانے میں تیس لاکھ دینار سے زیادہ وصول نہیں ہوا۔ ہشام بن عبدالملک نے جب بڑے اہتمام سے تمام ملک کی اراضیات کی پیمائش کرائی، جو تین کروڑ فدان ٹھہری، تو ۳۰ لاکھ سے ۴۰ لاکھ ہو گئے؛ البتہ حضرت عثمانؓ کے زمانے میں عبداللہ بن سعد گورنرِ مصر نے ایک کروڑ چالیس لاکھ دینار وصول کیے تھے لیکن جب حضرت عثمانؓ نے فخریہ عمرو بن العاص سے کہا کہ اب تو اونٹنی نے زیادہ دودھ دیا تو عمرو بن العاص نے آزادانہ کہا "ہاں! لیکن بچّہ بھوکا رہا۔" امیر معاویہ کا زمانہ ہر قسم کی دنیاوی ترقی میں یادگار ہے۔ ان کے عہد میں مصر کے خراج کی تعداد ۹ لاکھ دینار تھی۔ فاطمیین کے عہد میں خلیفہ المعز الدین اللہ کے گورنر نے باوجودیکہ لگان کی شرح دوگنی کر دی، تاہم ۳۲ لاکھ دینار سے زیادہ وصول نہ ہوئے۔

شام

شام میں اسلام کے عہد تک وہ قانون جاری تھا جو ایک یونانی بادشاہ نے اپنے تمام ممالکِ مقبوضہ میں قائم کیا تھا۔ اس نے پیداوار کے اختلاف کے لحاظ سے زمین کے مختلف مدارج قرار دیے تھے اور ہر قسم کی زمین پر جداگانہ شرح کے لگان مقرر کیے تھے۔

یہ قانون چھٹی صدی عیسوی کے آغاز میں یونانی زبان سے شامی زبان میں ترجمہ کیا گیا، اور اسلام کی فتوحات تک وہی ان تمام ممالک میں جاری تھا۔ قرائن اور قیاسات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے مصر کی طرح یہاں بھی وہی قدیم قانون جاری رہنے دیا۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں شام سے جو خراج وصول ہوتا تھا اُس کی کل رقم ایک کروڑ چالیس لاکھ دینار یعنی ۵ کروڑ ۵۰ لاکھ روپے تھی۔

عراق، مصر اور شام کے سوا اور ممالکِ مفتوحہ یعنی فارس، کرمان، آرمینیہ وغیرہ کے بندوبست اور تشخیص خراج کے حالات ہم بہت کم معلوم کر سکے۔ مورخین ان ملکوں کے حالاتِ فتح میں صرف اس قدر لکھتے ہیں کہ وہاں کے لوگوں پر جزیہ اور زمین پر خراج مقرر کیا گیا۔ کہیں کہیں کسی خاص رقم پر معاہدہ ہوگیا ہے، تو اس کی تعداد لکھ دی ہے، باقی اور قسم کی تفصیل کو ہاتھ نہیں لگایا ہے اور چونکہ اس قسم کی جزئی تفصیلوں سے کچھ بڑے نتائج متعلق نہیں، اس لیے ہم بھی اس کی چنداں پروا نہیں کرتے۔

قانون مالگذاری میں حضرت عمرؓ کی اصلاحات

البتہ ایک محقق کی نگاہ اس بات پر پڑتی ہے کہ اس صیغے میں فتوحاتِ فاروقی کی خاص ایجادات اور اصلاحیں کیا ہیں، اور ہم اسی خاص پہلو پر نگاہ ڈالنا چاہتے ہیں۔ سب سے بڑا انقلاب جو حضرت عمرؓ نے اس صیغے میں کیا اور جس کی وجہ سے رعایا کی بہبودی اور خوشحالی دفعۃً نہایت ترقی کر گئی، یہ تھا کہ زمینداری اور ملکیتِ زمین کا جو قدیم قانون تھا اور بالکل جابرانہ تھا، مٹا دیا گیا۔ رومیوں نے جب شام اور مصر پر قبضہ کیا تو تمام اراضیات اصلی باشندوں سے چھین کر کچھ افسرانِ فوج اور کچھ اراکینِ دربار کو دے دیں۔ کچھ شاہی جاگیریں قرار پائیں، کچھ کلیسا اور چرچ پر وقف کر دی گئیں۔ اصلی باشندوں کے ہاتھ میں ایک چپہ زمین بھی نہیں رہی، وہ صرف کاشتکاری کا حق رکھتے تھے، اور اگر مالکِ زمین ان کی کاشتکاری کی زمین کو کسی کے ہاتھ منتقل کرتا، تو زمین کے ساتھ کاشتکار بھی منتقل ہو جاتے تھے۔ اخیر میں باشندوں کو بھی کچھ ذمہ داریاں ملنے لگیں، لیکن زمینداری کی حفاظت اور اس سے متمتع ہونے کے لئے رومی زمینداروں سے اعانت لینی پڑتی تھی۔ اس بہانے سے زمیندار خود زمین پر متصرف ہو جاتے تھے اور وہ غریب کاشتکار کا کاشتکار رہ جاتا تھا۔ یہ طریقہ کچھ رومی سلطنت کے ساتھ مخصوص نہ تھا، بلکہ جہاں تک ہم کو معلوم ہے، تمام دُنیا میں قریب قریب یہی طریقہ جاری تھا کہ زمین کا بہت بڑا حصہ افسرانِ فوج یا ارکانِ دولت کی جاگیر میں دے دیا جاتا تھا۔

حضرت عمرؓ نے ملک پر قبضہ کرنے کے ساتھ اس ظالمانہ قانون کو مٹا دیا۔ رومی تو اکثر ملک کے مفتوح ہوتے ہی نکل گئے اور جو رہ گئے تھے ان کے قبضے سے بھی زمین نکال لی گئی۔ حضرت عمرؓ نے ان تمام اراضیات کو جو شاہی جاگیر تھیں، یا جن پر رومی افسر قابض تھے، باشندگانِ ملک کے حوالے کر دیا اور بجائے اس کے کہ وہ مسلمان افسروں یا فوجی سرداروں کو عنایت کی جاتیں، قاعدہ بنا دیا کہ مسلمان کسی حالت میں ان زمینوں پر قابض نہیں ہو سکتے، یعنی مالکانِ اراضی کو قیمت دے کر خریدنا چاہیں، تو خرید بھی نہیں سکتے۔ یہ قاعدہ ایک مدت تک جاری رہا؛ چنانچہ لیث بن سعد نے مصر میں کچھ زمین مول لی تھی، تو بڑے بڑے پیشوایانِ مذہب مثلاً امام مالک، نافع بن یزید بن الہیعہ نے ان پر سخت اعتراض کیا۔

حضرت عمرؓ نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اہلِ عرب کو جو ان [illegible] میں پھیل گئے تھے، زراعت کی ممانعت کر دی؛ چنانچہ تمام فوجی

افسروں کے نام احکام بھیج دیے۔ لوگوں کے روزینے مقرر کر دیے گئے ہیں۔ اس لیے کوئی شخص زراعت نہ کرنے پائے۔ یہ حکم اس قدر سختی سے دیا گیا کہ شریک غطفی ایک شخص نے مصر میں زراعت کر لی، تو حضرت عمرؓ نے اس کو بلا کر سخت مواخذہ کیا اور فرمایا کہ تجھ کو ایسی سزا دوں گا کہ اوروں کو عبرت ہو۔

ان قاعدوں سے ایک طرف تو حضرت عمرؓ نے اُس عدل و انصاف کا نمونہ قایم کیا جس کی نظیر دنیا میں کہیں موجود نہ تھی، کیونکہ کسی فاتح قوم نے مفتوحین کے ساتھ کبھی ایسی رعایت نہیں برتی تھی۔ دُوسری طرف زراعت اور آبادی کو اس سے نہایت ترقی ہوئی، اس لیے کہ اصلی باشندے، جو مدت سے ان کاموں میں مہارت رکھتے تھے۔ عرب کے خانہ بدوش بدو ان کی برابری نہیں کر سکتے تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس تدبیر نے فتوحات کی وسعت میں بڑا کام دیا۔ فرانس کے ایک نہایت لائق مصنف نے لکھا ہے "یہ بات مسلم ہے کہ اسلام کی فتوحات میں خراج اور مالگذاری کے معاملے کو بہت دخل ہے۔ رومن سلطنت میں باشندگانِ ملک کو جو سخت خراج ادا کرنا پڑتا تھا، اس نے مسلمانوں کی فتوحات کو نہایت تیزی سے بڑھایا۔ مسلمانوں کے حملوں کا جو مقابلہ کیا گیا، وہ اہلِ ملک کی طرف سے نہ تھا، بلکہ حکومت کی طرف سے تھا۔ مصر میں خود قبطی کاشتکاروں نے یونانیوں کے برخلاف مسلمانوں کو مدد دی۔ دمشق اور حمص میں عیسائی باشندوں نے ہرقل کی فوج کے مقابلے میں شہر پناہ کے دروازے بند کر دیے اور مسلمانوں سے کہہ دیا کہ ہم تمہاری حکومت کو بمقابلہ بے رحم رومیوں کے بہت زیادہ پسند کرتے ہیں۔

بندوبست مالگذاری میں ذمّیوں سے رائے لینا

اس معاملے میں ایک اور نہایت منصفانہ اصول جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے برتا تھا، یہ تھا کہ بندوبست اور اس کے متعلق تمام امور میں ذمّی رعایا سے جو پارسی یا عیسائی تھی ہمیشہ رائے طلب کرتے تھے اور ان کی معروضات پر لحاظ فرماتے تھے۔ عراق کا جب بندوبست کرنا چاہا تو پہلے عمّال کو لکھا کہ عراق کے دو رئیسوں کو ہمارے پاس بھیجو، جن کے ساتھ مترجم بھی ہوں۔ پیمائش کا کام جاری ہو چکا تو پھر دس بڑے بڑے زمیندار عراق سے بلوائے اور ان کے اظہار لیے۔

اسی طرح مصر کے انتظام کے وقت وہاں کے گورنر کو لکھا کہ مقوقس سے (جو پہلے مصر کا حاکم تھا) خراج کے معاملے میں رائے لو۔ اس پر بھی تسلی نہ ہُوئی تو ایک واقف کار قبطی کو مدینے میں طلب کیا اور اس کا اظہار لیا۔ یہ طریقہ جس طرح عدل و انصاف کا نہایت اعلیٰ نمونہ تھا، اسی طرح انتظام کی حیثیت سے بھی مفید تھا۔

ان باتوں کے ساتھ اُن اصلاحات کو بھی شامل کرنا چاہیے جن کا بیان ہم بندوبست کے شروع میں کر آئے ہیں۔

ترقیِ زراعت

بندوبست کے ساتھ حضرت عمرؓ نے زمین کی آبادی اور زراعت کی ترقی کی طرف توجہ کی، عام حکم دے دیا کہ تمام ملک میں جہاں جہاں افتادہ زمینیں ہیں، جو شخص ان کو آباد کرے گا اس کی ملک ہو جائیں گی، لیکن اگر کوئی شخص اس قسم کی زمین کو آباد کرنے کی

غرض سے اپنے قبضے میں لائے اور تین برس کے اندر آباد نہ کرے، تو زمین اس کے قبضے سے نکل جائے گی۔ اس طریقے سے افتادہ زمینیں نہایت جلد آباد ہو گئیں۔ حملے کے وقت جہاں جہاں کی رعایا گھر چھوڑ کر نکل گئی تھی اس کے لیے اشتہار دے دیا کہ واپس آجائے اور اپنی زمینوں پر قابض ہو جائے۔ زراعت کی حفاظت اور ترقی کا حضرت عمرؓ کو جو خیال تھا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ایک دفعہ ایک شخص نے اُن سے آکر شکایت کی کہ شام میں میری کچھ زراعت تھی۔ آپ کی فوج اُدھر سے گزری اور اس کو برباد کر دیا۔ حضرت عمرؓ نے اُسی وقت اس کو دس ہزار درہم معاوضے میں دلوائے۔

محکمۂ آبپاشی

تمام ممالکِ مفتوحہ میں نہریں جاری کیں اور بند باندھنے، تالاب تیار کرانے، پانی کی تقسیم کرنے کے دہانے بنانے، نہروں کے شعبے نکالنے اور اس قسم کے کاموں کا ایک بڑا محکمہ قائم کیا۔ علامہ مقریزی نے لکھا ہے کہ خاص مصر میں ایک لاکھ بیس ہزار مزدور روزانہ سال بھر اس کام میں لگے رہتے تھے اور یہ تمام مصارف بیت المال سے ادا کیے جاتے تھے۔ خوزستان اور اہواز کے اضلاع میں جزر بن معاویہ نے حضرت عمرؓ کی اجازت سے بہت سی نہریں کھدوائیں، جن کی وجہ سے بہت سی افتادہ زمینیں آباد ہو گئیں۔ اسی طرح اور سیکڑوں نہریں تیار ہوئیں جن کا پتا جستہ جستہ تاریخوں میں ملتا ہے۔

خراجی اور عشری

نوعیتِ قبضہ کے لحاظ سے زمین کی ایک اور تقسیم کی یعنی خراجی اور عشری۔ خراجی کا بیان اوپر گزر چکا۔ عشری اس زمین کا نام تھا، جو مسلمانوں کے قبضے میں ہوتی تھی اور جس کے اقسام حسبِ ذیل ہوتے تھے۔

۱۔ عرب کی زمین، جس کے قابضین اوائلِ اسلام میں مسلمان ہو گئے تھے۔ مثلاً مدینۂ منورہ وغیرہ۔

۲۔ جو زمین کسی ذمی کے قبضے سے نکل کر مسلمانوں کے قبضے میں آتی۔ مثلاً لاوارث مر گیا، یا مفرور ہو گیا، یا بغاوت کی، یا استعفاً دے دیا۔

۳۔ جو افتادہ زمین، کسی حیثیت سے کسی کی ملک نہیں ہوتی تھی اور اس کو کوئی مسلمان آباد کر لیتا تھا۔

اِن اقسام کی تمام زمینیں عشری کہلاتی تھیں اور چونکہ مسلمانوں سے جو کچھ لیا جاتا تھا، وہ زکوٰۃ کی مد میں داخل تھا، اس لیے ان زمینوں پر بجائے خراج کے زکوٰۃ مقرر تھی، جس کی مقدار اصل پیداوار کا دسواں حصہ ہوتا تھا۔ یہ شرح خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر فرمائی تھی اور وہی حضرت عمرؓ کے عہد میں بھی قائم رہی۔ حضرت عمرؓ نے اتنا کیا کہ ایران وغیرہ کی جو زمینیں مسلمانوں کے قبضے میں آئیں، اگر وہ ذمیوں کی قدیم نہروں یا کنوؤں سے سیراب ہوتی تھیں تو ان پر خراج مقرر کر دیا؛ چنانچہ اس قسم کی زمینیں عبداللہ بن مسعودؓ و خباب وغیرہ کے قبضے میں تھیں اور ان سے خراج لیا جاتا تھا۔ اگر خود مسلمان نئی نہر یا نیا کنواں کھود کر اس کی آبپاشی کرتے تھے تو اس پر رعایتہً عشر مقرر کیا جاتا تھا۔

اور قسم کی آمدنیاں

خراج و عشر کے سوا آمدنی کی جو اور اقسام تھیں وہ حسبِ ذیل تھیں:

زکوٰۃ، عشور، جزیہ، مالِ غنیمت کا خمس، زکوٰۃ مسلمانوں کے ساتھ مخصوص تھی، اور مسلمانوں کی کسی قسم کی جائداد یا آمدنی اس سے مستثنیٰ نہ تھی، یہاں تک کہ بھیڑ بکری، اونٹ سبھی پر زکوٰۃ کے متعلق تمام احکام خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں مرتب ہو چکے تھے۔

گھوڑوں پر زکوٰۃ

حضرت عمرؓ کے عہد میں جو اضافہ ہوا، یہ تھا کہ تجارت کے گھوڑوں پر زکوٰۃ مقرر ہوئی؛ حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے گھوڑوں کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ فرمایا تھا، لیکن اس سے عیاذاً باللہ یہ نہیں خیال کرنا چاہیے کہ حضرت عمرؓ نے جناب رسول اللہؐ کی مخالفت کی۔ آنحضرتؐ نے جو الفاظ فرمائے تھے، اس سے بظاہر سواری کے گھوڑے مفہوم ہوتے تھے اور حضرت عمرؓ نے اسی مفہوم کو قائم رکھا۔ آنحضرتؐ کے وقت میں تجارت کے گھوڑے وجود نہیں رکھتے تھے۔ اس لیے زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہونے کی کوئی وجہ نہیں تھی، بہرحال زکوٰۃ کی مد میں یہ ایک نئی آمدنی تھی، اور اوّل حضرت عمرؓ ہی کے عہد میں شروع ہوئی۔

عشور

عشور خاص حضرت عمرؓ کی ایجاد ہے۔ اس کی ابتدا یوں ہوئی کہ مسلمان جو غیر ملکوں میں تجارت کے لیے جاتے تھے، ان سے وہاں کے دستور کے موافق مالِ تجارت پر فی صد دس روپیہ ٹیکس لیا جاتا تھا۔ ابو موسیٰ اشعریؓ نے حضرت عمرؓ کو اس واقعہ کی اطلاع دی۔ حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ ان ملکوں کے تاجر جو ہمارے ملک میں آئیں ان سے بھی اسی قدر محصول لیا جائے۔ منبج کے عیسائیوں نے جو اُس وقت تک اسلام کے محکوم نہیں ہوئے تھے، خود حضرت عمرؓ کے پاس تحریری درخواست بھیجی کہ ہم کو عشر ادا کرنے کی شرط پر عرب میں تجارت کرنے کی اجازت دی جائے۔ حضرت عمرؓ نے منظور کر لیا، اور پھر ذمیوں اور مسلمانوں پر بھی یہ قاعدہ جاری کر دیا گیا رفتہ رفتہ حضرت عمرؓ نے تمام ممالکِ مفتوحہ میں یہ قاعدہ جاری کر کے ایک خاص محکمہ قایم کر دیا جس سے بہت بڑی آمدنی ہو گئی۔ یہ محصول خاص تجارت کے مال پر لیا جاتا تھا اور اس کی درآمد برآمد کی میعاد سال بھر تھی یعنی تاجر ایک سال جہاں جہاں چاہے مال لے جائے۔ اس سے دوبارہ محصول نہیں لیا جاتا تھا۔

صیغۂ عدالت

محکمۂ قضا

یہ صیغہ بھی اسلام میں حضرت عمرؓ کی بدولت وجود میں آیا۔ ترقیِ تمدّن کا پہلا دیباچہ یہ ہے کہ صیغۂ عدالت، انتظامی

صیغے سے علٰحدہ قائم کیا جائے۔ دنیا میں جہاں جہاں حکومت وسلطنت کے سلسلے قائم ہوئے، مدتوں کے بعد ان دونوں صیغوں میں تفریق ہوئی، لیکن حضرت عمرؓ نے خلافت کے چند سال بعد اس صیغے کو الگ کر دیا۔ حضرت ابو بکرؓ کے زمانے تک خود خلیفۂ وقت اور افسرانِ ملکی قضا کا بھی کام کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے بھی ابتدا میں یہ رواج قائم رکھا اور ایسا کرنا ضروری تھا۔ حکومت کا نظم ونسق جب تک کامل نہیں ہو لیتا، ہر صیغے کا اجرا رعب وداب کا محتاج رہتا ہے۔ اس لیے فصلِ قضایا کا کام وہ شخص انجام نہیں دے سکتا جس کو فصلِ قضایا کے سوا اور کوئی اختیار نہ ہو۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت عمرؓ نے ابو موسیٰ اشعریؓ کو لکھا کہ جو شخص بااثر اور صاحبِ عظمت نہ ہو، قاضی نہ مقرر کیا جائے، بلکہ اسی بنا پر عبد اللہ بن مسعودؓ کو فصلِ قضایا سے روک دیا۔

لیکن جب انتظام کا سکہ اچھی طرح جم گیا، تو حضرت عمرؓ نے قضا کا صیغہ بالکل الگ کر دیا۔ تمام اضلاع میں عدالتیں قایم کیں، اور قاضی مقرر کیے۔ اس کے ساتھ قضا کے اصول وآئین پر ایک فرمان لکھا جو ابو موسیٰ اشعریؓ گورنرِ کوفہ کے نام تھا اور جس میں صیغۂ عدالت کے تمام اصولی احکام درج تھے، ہم اس کو بعینہٖ اس مقام پر نقل کرتے ہیں[1]۔ رومن امپائر کے دوازدہ گانہ قواعد جو

[1] ۴۵۱ قبل مسیح رومن امپائر نے یونان میں سفرا بھیجے کہ وہاں قانون کی تعلیم حاصل کرکے آئین اور سلطنت کے لیے ایک مستقل قانون بنائیں۔ یہ سفرا یونان گئے اور وہاں سے واپس آکر ایک دستور العمل تیار کیا جس میں بارہ امورِ انتظامی پر بارہ بارہ قاعدے تھے۔ یہ تمام قواعد سیسے کی تختی پر کندہ کیے گئے اور مدت تک رومن امپائر کا وہی قانون رہا، اس میں صیغۂ قضا کے متعلق جو احکام تھے وہ حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ جب تم عدالت میں طلب کیے جاؤ تو فوراً فریقِ مقدمہ کے ساتھ حاضر ہو۔

۲۔ اگر مدعا علیہ انکار کرے تو تم گواہ پیش کرو، تاکہ وہ جبراً حاضر کیا جائے۔

۳۔ مدعا علیہ بھاگنا چاہے، تو تم اس کو پکڑ سکتے ہو۔

۴۔ مدعا علیہ بیمار یا بوڑھا ہو، تو تم اس کو سواری دو، ورنہ اس پر حاضری کے لیے جبر نہیں کیا جا سکتا۔

۵۔ مدعا علیہ ضامن پیش کرے تو تم اس کو چھوڑ دو۔

۶۔ دولت مند کا ضامن، دولت مند ہونا چاہیے۔

۷۔ جج کو فریقین کے اتفاق سے فیصلہ کرنا چاہیے۔

۸۔ جج صبح سے دوپہر تک مقدمہ سنے گا۔

۹۔ فیصلہ دوپہر کے بعد فریقین کی حاضری میں ہوگا۔

۱۰۔ مغرب کے بعد عدالت بند رہے گی۔

۱۱۔ فریقین اگر ثالث پیش کرنا چاہیں تو ان کو ضامن دینا چاہیے۔

۱۲۔ جو شخص گواہ نہیں پیش کر سکتا مدعا علیہ کے دروازے پر دعوے کو پکار کر کہے۔

یہ قواعد ہیں جن کو یاد کرکے یورپ رومن امپائر پر ناز کرتا ہے۔

رومیوں کے بڑے مفاخر خیال کیے جاتے ہیں اور جن کی نسبت سیسرو، روم کا مشہور لکچرار لکھتا ہے کہ یہ قوانین تمام فلاسفروں کی تصنیفات سے بڑھ کر ہیں وہ بھی ہمارے سامنے ہیں۔

ان دونوں کا موازنہ کر کے ہر شخص فیصلہ کر سکتا ہے کہ دونوں میں سے تمدن کے وسیع اصول کا کس میں زیادہ پتا لگتا ہے۔

قواعدِ عدالت کے متعلق حضرت عمرؓ کی تحریر

حضرت عمرؓ کا فرمان بعبارتہا ذیل میں درج ہے :

خدا کی تعریف کے بعد، قضا ایک ضروری فرض ہے۔ لوگوں کو اپنے حضور میں، اپنی مجلس میں اپنے انصاف میں برابر رکھو، تاکہ کمزور انصاف سے مایوس نہ ہو اور زوردار کو تمہاری رُو رعایت کی اُمید نہ پیدا ہو، جو شخص دعویٰ کرے، اُس پر بارِ ثبوت ہے اور جو شخص منکر ہو اُس پر قسم، صلح جائز ہے۔ بشرطیکہ اس سے حرام، حلال اور حلال حرام نہ ہونے پائے۔ کل اگر تم نے کوئی فیصلہ کیا، تو آج غور کے بعد اس سے رجوع کر سکتے ہو۔ جس مسئلے میں شبہ ہو اور قرآن و حدیث میں اس کا ذکر نہ ہو، تو اس پر غور کرو اور پھر غور کرو اور اس کی مثالوں اور نظیروں پر خیال کرو۔ پھر قیاس لگاؤ۔ جو شخص ثبوت پیش کرنا چاہے اس کے لیے ایک میعاد مقرر کرو، اگر وہ ثبوت دے تو اس کا حق دلاؤ ورنہ مقدمہ خارج۔ مسلمان سب ثقہ ہیں۔ باستثنائے ان اشخاص کے جن کو حد کی سزا میں دُرے لگائے گئے یا جنہوں نے جھوٹی گواہی دی ہو یا ولا اور وراثت میں مشکوک ہوں۔

اس فرمان میں قضا کے متعلق جو قانونی احکام مذکور ہیں حسبِ ذیل ہیں :

۱۔ قاضی کو عدالتانہ حیثیت سے تمام لوگوں کے ساتھ یکساں برتاؤ کرنا چاہیے۔

۲۔ بارِ ثبوت عموماً مدعی پر ہے۔

۳۔ مدعا علیہ اگر کسی قسم کا ثبوت یا شہادت نہیں رکھتا تو اس سے قسم لی جائے گی۔

۴۔ فریقین ہر حالت میں صلح کر سکتے ہیں، لیکن جو امر خلافِ قانون ہے اس میں صلح نہیں ہو سکتی ہے۔

۵۔ قاضی خود اپنی مرضی سے مقدمہ کے فیصل کرنے کے بعد اس میں نظرِ ثانی کر سکتا ہے۔

۶۔ مقدمہ کی پیشی کی ایک تاریخ معین ہونی چاہیے۔

۷۔ تاریخِ معینہ پر اگر مدعا علیہ نہ حاضر ہو، تو مقدمہ یک طرفہ فیصل کیا جائے گا۔

۸۔ ہر مسلمان قابل اداتے شہادت ہے، لیکن جو شخص سزا یافتہ ہو یا جس کا جھوٹی گواہی دینا ثابت ہو، وہ قابلِ شہادت نہیں۔

صیغۂ قضا کی عمدگی یعنی فصلِ خصومات میں پورا عدل و انصاف چار باتوں پر موقوف ہے :

۱۔ عمدہ اور مکمل قانون جس کے مطابق فیصلے عمل میں آئیں۔

۲۔ قابل اور متدین حکام کا انتخاب۔

۳۔ وہ اصول اور آئین جن کی وجہ سے حکام رشوت اور دیگر ناجائز وسائل کے سبب سے فصلِ خصومات میں رُو رعایت نہ کرنے پائیں۔

۴۔ آبادی کے لحاظ سے قضاۃ کی تعداد کافی ہونا، تاکہ مقدمات کے انفصال میں ہرج نہ ہونے پائے۔

حضرت عمرؓ نے ان تمام اُمور کا اس خوبی سے انتظام کیا کہ اس سے بڑھ کر نہیں ہو سکتا۔ قانون کے بنانے کی تو کوئی ضرورت نہ تھی۔ اسلام کا اصلی قانون قرآن مجید موجود تھا، البتہ چونکہ اس میں جزئیات کا احاطہ نہیں، اس لیے حدیث و اجماع و قیاس سے مدد لینے کی ضرورت تھی۔ حضرت عمرؓ نے قضاۃ کو خاص طور پر اس کی ہدایت لکھی۔ قاضی شریح کو ایک فرمان میں لکھا کہ مقدمات میں اوّل قرآن مجید کے مطابق فیصلہ کرو، قرآن میں وہ صورت مذکور نہ ہو تو حدیث، اور حدیث نہ ہو تو اجماع (کثرت رائے) کے مطابق اور کہیں پتا نہ لگے، تو خود اجتہاد کرو۔

حضرت عمرؓ نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ ہمیشہ وقتاً فوقتاً حکّامِ عدالت کو مشکل اور مبہم مسائل کے متعلق فتاوے لکھ لکھ کر بھیجتے رہتے تھے آج اگر ان کو ترتیب دیا جائے تو ایک مختصر مجموعۂ قانون بن سکتا ہے۔

قضاۃ کا امتحان کے بعد مقرر ہونا

قاضی، اگرچہ حاکم صوبہ یا حاکم ضلع کا ماتحت ہوتا تھا، اور ان لوگوں کو قضاۃ کے تقرر کا پورا اختیار حاصل تھا، تاہم حضرت عمرؓ زیادہ احتیاط کے لحاظ سے اکثر خود لوگوں کو انتخاب کر کے بھیجتے تھے، انتخاب کے لیے، اگرچہ خود امیدواروں کی شہرت کافی تھی، لیکن حضرت عمرؓ اس پر اکتفا نہیں کرتے تھے، بلکہ اکثر عملی امتحان اور ذاتی تجربے کے بعد لوگوں کو انتخاب کرتے تھے۔

قاضی شریح کی تقرری کا یہ واقعہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک شخص سے پسند کی شرط پر ایک گھوڑا خریدا اور امتحان کے لیے ایک سوار کو دیا۔ گھوڑا سواری پر چوٹ کھا کر داغی ہو گیا۔ حضرت عمرؓ نے اس کو واپس کرنا چاہا۔ گھوڑے کے مالک نے انکار کیا۔ اس پر نزاع ہوئی اور شریح ثالث مقرر کیے گئے۔ انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اگر گھوڑے کے مالک سے اجازت لے کر سواری کی گئی تھی، تو گھوڑا واپس کیا جا سکتا ہے؛ ورنہ نہیں۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ حق یہی ہے۔ اس کے بعد انہیں کوفے کا قاضی مقرر کر دیا۔ کعب بن سور الازدی کے ساتھ بھی اسی قسم کا واقعہ گزرا۔ ناجائز وسائلِ آمدنی کے روکنے کے لیے بہت سی بندشیں کیں۔

رشوت سے محفوظ رکھنے کے وسائل

۱۔ تنخواہیں بیش قرار مقرر کیں کہ بالائی رقم کی ضرورت نہ ہو۔ مثلاً سلمان ربیعہؓ اور قاضی شریح کی تنخواہ پان پان سو درہم ماہوار تھی اور یہ رقم اُس زمانے کے حالات کے لحاظ سے بالکل کافی تھی۔

۲۔ قاعدہ مقرر کیا کہ جو شخص دولت مند اور معزز نہ ہو قاضی مقرر نہ ہونے پائے۔ ابوموسیٰ اشعری گورنر کوفہ کو جو فرمان لکھا اس میں اس قاعدے کی وجہ یہ کہ ”دولت مند رشوت کی طرف راغب نہ ہو گا اور معزز آدمی پر فیصلہ کرنے میں کسی کے رُعب و داب کا اثر نہ ہو گا۔“

ان باتوں کے ساتھ کسی قاضی کو تجارت اور خرید و فروخت کرنے کی اجازت نہ تھی اور یہ وہ اصول ہے جو مدّتوں کے تجربے

کے بعد ترقی یافتہ ممالک میں اختیار کیا گیا ہے۔

انصاف میں مساوات

عدالت و انصاف کا ایک بڑا لازمہ عام مساوات کا لحاظ ہے یعنی دیوان عدالت میں شاہ و گدا، امیر و غریب، شریف و رذیل سب ہم رتبہ سمجھے جائیں۔ حضرت عمرؓ کو اس کا اس قدر اہتمام تھا کہ اس کے تجربے اور امتحان کے لیے متعدد دفعہ خود عدالت میں فریقِ مقدمہ بن کر گئے، ایک دفعہ ان میں اور اُبیؓ بن کعب میں کچھ نزاع تھی۔ ابی نے زید بن ثابت کے ہاں مقدمہ دائر کیا۔ حضرت عمرؓ مدعا علیہ کی حیثیت سے حاضر ہوئے۔ زید نے تعظیم دی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا یہ تمہارا پہلا ظلم ہے۔ یہ کہہ کر ابی کے برابر بیٹھ گئے۔ زید کے پاس کوئی ثبوت نہ تھا اور حضرت عمرؓ کو دعویٰ سے انکار تھا۔ اُبیؓ نے قاعدے کے مطابق حضرت عمرؓ سے قسم لینا چاہی لیکن زید نے ان کے رتبے کا پاس کر کے ابی سے درخواست کی کہ امیر المومنین کو قسم سے معاف رکھو۔ حضرت عمرؓ اس طرفداری پر نہایت رنجیدہ ہوئے۔ زید کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ جب تک تمہارے نزدیک ایک عام آدمی اور عمر دونوں برابر نہ ہوں، تم منصبِ قضا کے قابل نہیں سمجھے جا سکتے۔

قضاۃ اور ان کی کارروائیوں کے متعلق حضرت عمرؓ نے جس قسم کے اصول اختیار کیے، اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ ان کے عہدِ خلافت میں بلکہ بنو امیہ کے دور تک عموماً قضاۃ ظلم و ناانصافی کے الزام سے پاک رہے۔ علامہ ابو بلال عسکری نے کتاب الاوائل میں لکھا ہے کہ اسلام میں سب سے پہلے، جس قاضی نے خلافِ انصاف عمل کیا، وہ بلال بن ابی بردہ تھے (یہ بنو امیہ کے زمانے میں تھے)۔

آبادی کے لحاظ سے قضاۃ کی تعداد کا کافی ہونا

آبادی کے لحاظ سے قضاۃ کی تعداد کافی تھی کیونکہ کوئی ضلع قاضی سے خالی نہ تھا، اور چونکہ غیر مذہب والوں کو اجازت تھی کہ آپس کے مقدمات بطور خود فیصل کر لیا کریں اس لیے اسلامی عدالتوں میں اُن کے مقدمات کم آتے تھے اور اس بنا پر ہر ضلع میں ایک قاضی کا ہونا بہرحال کافی تھا۔

ماہرینِ فن کی شہادت

صیغۂ قضا اور خصوصاً اصولِ شہادت کے متعلق حضرت عمرؓ نے جو نادر باتیں ایجاد کیں، ان میں ایک ماہرینِ فن کی شہادت تھی۔ یعنی جو امر کسی خاص فن سے تعلق رکھتا تھا، اس میں خاص اس فن کے ماہر کا اظہار لیا جاتا تھا، مثلاً حطیہ نے زبرقان بن بدر کی ہجو میں ایک شعر کہا جس سے صاف طور پر ہجو نہیں ظاہر ہوتی تھی۔ زبرقان نے حضرت عمرؓ کے ہاں مقدمہ رجوع کیا، چونکہ یہ شعر و شاعری کا معاملہ تھا اور شاعرانہ اصطلاحیں اور طرزِ ادا عام بول چال سے الگ ہیں، حضرت عمرؓ نے حسّان بن ثابتؓ کو جو بہت بڑے شاعر تھے بلا کر پوچھا اور اُن کی رائے کے مطابق فیصلہ کیا۔ اسی طرح اشتباہ نسب کی صورت میں حلیہ شناسوں کے اظہار لیے۔

فصلِ خصومات کے متعلق اگرچہ حضرت عمرؓ نے بہت سے آئین و اصول مقرر کیے لیکن یہ سب وہیں تک تھا، جہاں تک انصاف کی ارزانی اور آسانی میں کوئی خلل نہیں پڑ سکتا تھا۔ ورنہ سب سے مقدم ان کو جس چیز کا لحاظ تھا' وہ انصاف کا ارزاں اور آسان ہونا تھا۔ آج کل مہذب ملکوں نے انصاف اور دادرسی کو ایسی قیود میں جکڑ دیا ہے کہ دادخواہوں کو دعویٰ سے باز آنا' اس کی بہ نسبت زیادہ آسان ہے لیکن حضرت عمرؓ کے اصول اور آئین اس قدر سہل اور آسان تھے کہ انصاف کے حاصل کرنے میں ذرا بھی دقت نہیں ہوسکتی تھی اور حضرت عمرؓ کو خاص اس بات کا ہمیشہ لحاظ رہتا تھا۔

محکمۂ افتاء

عدالت کے متعلق یہ ایک نہایت ضروری صیغہ ہے جو آغازِ اسلام میں قائم ہوا، اور جس کی مثال اسلام کے سوا اور کہیں پائی نہیں جاتی۔ قانون کے جو مقدم اصول ہیں' ان میں ایک یہ بھی ہے کہ ہر شخص کی نسبت یہ فرض کرنا چاہیے کہ قانون سے واقف ہے یعنی مثلاً اگر کوئی شخص کوئی جرم کرے تو اس کا یہ عذر کام نہیں آسکتا کہ وہ اس فعل کا جرم ہونا نہیں جانتا تھا۔ یہ قاعدہ تمام دنیا میں مسلّم ہے اور حال کے ترقی یافتہ ملکوں نے اس پر زیادہ زور دیا ہے۔ بے تحاشہ قاعدہ صحیح ہے، لیکن تعجب یہ ہے کہ اور قوموں نے اس کے لیے کسی قسم کی تدبیر اختیار نہیں کی۔ یورپ میں تعلیم اس قدر عام ہو چکی ہے لیکن اس درجے کو نہیں پہنچ سکی اور نہ پہنچ سکتی ہے کہ ہر شخص قانون دان بن جائے۔ کوئی جاہل شخص قانون کا کوئی مسئلہ جاننا چاہے تو اس کے لیے کوئی تدبیر نہیں۔ لیکن اسلام میں اس کا ایک خاص محکمہ تھا جس کا نام محکمۂ افتا تھا، اس کا یہ طریقہ تھا کہ نہایت لائق قانون دان یعنی فقہا ہر جگہ موجود رہتے تھے، اور جو شخص کوئی مسئلہ دریافت کرنا چاہتا تھا، اُن سے دریافت کرسکتا تھا اور اس لیے کوئی شخص یہ عذر نہیں کرسکتا تھا کہ وہ قانون کے مسئلے سے ناواقف تھا۔ یہ طریقہ آغازِ اسلام میں خود بخود پیدا ہُوا اور اب تک قایم ہے، لیکن حضرت عمرؓ کے دور میں جس پابندی کے ساتھ اس پر عمل رہا، زمانۂ مابعد بلکہ اُن سے پہلے حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں بھی نہیں رہا۔

تاریخوں میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ جن لوگوں کو فتوے کی اجازت نہ تھی' انہوں نے فتوے دیے، تو حضرت عمرؓ نے ان کو منع کر دیا؛ چنانچہ ایک دفعہ عبداللہ بن مسعود کے ساتھ بھی یہ واقعہ گزرا، بلکہ ان کو یہاں تک احتیاط تھی کہ مقرر شدہ مفتیوں کی بھی جانچ کرتے رہتے تھے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے بارہا پُوچھا کہ تم نے اس مسئلے میں کیا فتویٰ دیا؟ اور جب انھوں نے اپنا جواب بیان کیا تو فرمایا کہ اگر تم اس مسئلے کا اور کچھ جواب دیتے تو آئندہ تم کبھی فتویٰ کے مجاز نہ ہوتے۔

دُوسرا امر جو اس طریقے کے لیے ضروری ہے' یہ ہے کہ مفتیوں کے ناموں کا اعلان کر دیا جائے۔ اس وقت گزٹ اخبار تو نہ تھے لیکن مجالسِ عامہ میں جن سے بڑھ کر اعلانِ عام کا کوئی ذریعہ نہ تھا' حضرت عمرؓ نے بارہا اس کا اعلان کیا۔

فوجداری اور پولیس

جہاں تک ہم تحقیق کرسکے' مقدماتِ فوجداری کے لیے حضرت عمرؓ نے کوئی جدا محکمہ نہیں قایم کیا۔ بعض قسم کے مقدمات مثلاً

زنا اور سرقہ قضاۃ کے ہاں فیصل ہوتے تھے اور ابتدائی قسم کی تمام کارروائیاں پولیس سے متعلق تھیں ۔ پولیس کا صیغہ مستقل طور پر قائم ہو گیا تھا، چنانچہ افسرانِ پولیس کو صاحب الاحداث کہتے تھے ۔ بحرین پر حضرت عمرؓ نے قدامہ بن مظعونؓ اور حضرت ابوہریرہؓ کو مقرر کیا تو قدامہ کو تحصیل مالگزاری کی خدمت دی اور حضرت ابوہریرہؓ کو تصریح کے ساتھ پولیس کے اختیارات دیے ۔ احتساب کے متعلق جو کام ہیں مثلاً دُکاندار ترازو میں دھوکہ نہ دینے پائیں ۔ کوئی شخص سڑک پر مکان نہ بنائے ۔ جانوروں پر زیادہ بوجھ نہ لادا جائے ۔ شراب علانیہ نہ بکنے پائے وغیرہ وغیرہ ۔ ان تمام امور کا کافی انتظام تھا اور اس کے لیے ہر جگہ اہلکار اور افسر مقرر تھے، لیکن یہ پتا نہیں چلتا کہ احتساب کا مستقل صیغہ قایم ہو گیا تھا یا یہ خدمتیں بھی صاحب الاحداث سے متعلق تھیں ۔ کنز العمال میں جہاں ابن سعد کی یہ روایت نقل کی ہے کہ حضرت عمرؓ نے بازار کی نگرانی کے لیے عبداللہ بن عتبہ کو مقرر کیا تھا وہاں لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ کے جیل خانے کی ایجاد کا یہ فعل عہدۂ احتساب کا ماخذ ہے ۔

جیل خانے کی ایجاد

اس صیغے میں حضرت عمرؓ کی ایجاد یہ ہے کہ جیل خانے بنوائے ۔ ورنہ اُن سے پہلے عرب میں جیل خانے کا نام و نشان نہ تھا، اور یہی وجہ تھی کہ سزائیں سخت دی جاتی تھیں ۔ حضرت عمرؓ نے اوّل مکّہ معظمہ میں صفوان بن اُمیّہ کا مکان چار ہزار درہم پر خریدا اور اس کو جیل خانہ بنایا، پھر اور اضلاع میں بھی جیل خانے بنوائے ۔ علّامہ بلاذری کی تصریح سے معلوم ہوتا ہے کوفے کا جیل خانہ نرسل سے بنا تھا، اُس وقت صرف مجرم قید خانے میں رکھے جاتے تھے اور جیل خانے میں بھجوائے جاتے تھے ۔

جیل خانہ تعمیر ہونے کے بعد بعض بعض سزاؤں میں تبدیلی ہوئی ۔ مثلاً ابو محجن ثقفی بار بار شراب پینے کے جُرم میں ماخوذ ہوئے تو اخیر دفعہ حضرت عمرؓ نے ان کو حد کے بجائے قید کی سزا دی ۔

جلاوطنی کی سزا

جلاوطنی کی سزا بھی حضرت عمرؓ کی ایجاد ہے، چنانچہ حضرت ابومحجن کو حضرت عمرؓ نے یہ سزا بھی دی تھی اور ایک جزیرہ میں بھیج دیا تھا ۔

بیت المال (یا) خزانہ

بیت المال پہلے نہ تھا

یہ صیغہ بھی حضرت عمرؓ کی ذات سے وجود میں آیا ۔ آنحضرتؐ کے زمانے میں سب سے اخیر جو رقم وصول ہوئی وہ بحرین کا خراج تھا جس کی تعداد آٹھ لاکھ درہم تھی، لیکن آنحضرتؐ نے یہ کل رقم ایک ہی جلسہ میں تقسیم کر دی ۔ حضرت ابوبکرؓ نے بھی اپنی خلافت

میں کوئی خزانہ نہیں قائم کیا، بلکہ جو کچھ غنیمت کا مال آیا، اُسی وقت لوگوں کو بانٹ دیا، چنانچہ پہلے سال دس دس درہم اور دوسرے سال بیس بیس درہم ایک ایک شخص کے حصے میں آئے۔ یہ کتاب الاوائل اور ابن سعد کی روایت ہے۔ ابن سعد کی ایک دوسری روایت ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے ایک مکان بیت المال کے لیے خاص کر لیا تھا، لیکن وہ ہمیشہ بند پڑا رہتا تھا، کیونکہ جو کچھ آتا اُسی وقت تقسیم کر دیا جاتا تھا اور اس کی نوبت نہیں پہنچتی تھی کہ خزانے میں کچھ داخل کیا جائے۔ وفات کے بعد بیت المال کا جائزہ لیا گیا تو صرف ایک درہم نکلا۔

تقریباً ۱۵ھ میں ابوہریرہؓ کو حضرت عمرؓ نے بحرین کا عامل مقرر کیا۔ وہ سال تمام میں پانچ لاکھ کی رقم اپنے ساتھ لائے۔ حضرت عمرؓ نے مجلس شوریٰ کا اجلاس عام کر کے کہا کہ ایک رقم کثیر بحرین سے آئی ہے آپ لوگوں کی کیا مرضی ہے؟

بیت المال کس سنہ میں قائم ہوا؟

حضرت علیؓ نے رائے دی کہ جو رقم آئے وہ سال کی سال تقسیم کر دی جائے اور خزانے میں جمع نہ رکھی جائے۔ حضرت عثمانؓ نے اس کے خلاف رائے دی ——— ولید بن ہشام نے کہا "میں نے سلاطینِ شام کے ہاں دیکھا ہے کہ خزانہ اور دفتر کا جُدا جُدا محکمہ قائم ہے۔"

آج کل کا زمانہ ہوتا تو غیر مذہب والوں کے نام سے اجتناب کیا جاتا لیکن حضرت عمرؓ نے اس رائے کو پسند کیا اور بیت المال کی بنیاد ڈالی۔ سب سے پہلے دارالخلافہ یعنی مدینہ منورہ میں بہت بڑا خزانہ قائم کیا۔ اس کی نگرانی اور حساب کتاب کے لیے نہایت قابل اور دیانت دار آدمی کی ضرورت تھی۔

بیت المال کے افسر

عبداللہ بن ارقمؓ کو جو نہایت معزز صحابی تھے، اور لکھنے پڑھنے میں کمال رکھتے تھے، خزانہ کا افسر مقرر کیا، اس کے ساتھ اور لائق لوگ اُن کے ماتحت مقرر کیے جن میں سے عبدالرحمٰن بن عبید القاریؓ اور معیقیب بھی تھے۔ معیقیب کو یہ شرف حاصل تھا کہ وہ رسول اللہؐ کے انگشتری بردار تھے اور اس وجہ سے اُن کی دیانت داری اور امانت ہر طرح پر قطعی اور مسلم الثبوت تھی۔

دارالخلافہ کے علاوہ تمام صوبجات اور صدر مقامات میں بیت المال قائم کیے اور اگرچہ وہاں کے اعلیٰ حکام کو ان کے متعلق ہر قسم کے اختیارات حاصل تھے لیکن بیت المال کا محکمہ بالکل الگ ہوتا تھا اور اس کے افسر جداگانہ ہوتے تھے۔ مثلاً اصفہان میں خالد بن حرثؓ اور کوفہ میں عبداللہ بن مسعودؓ خاص خزانے کے افسر تھے۔

بیت المال کی عمارتیں

حضرت عمرؓ اگرچہ تعمیر کے باب میں نہایت کفایت شعاری کرتے تھے لیکن بیت المال کی عمارتیں مستحکم اور شاندار بنوائیں۔

کوفے میں بیت المال کے لیے اول ایک محل تعمیر ہوا جس کو روزبہ ایک مشہور مجوسی معمار نے بنایا تھا اور جس کا مصالحہ خسروانِ فارس کی عمارت سے آیا تھا۔ لیکن جب اس میں نقب کے ذریعے سے چوری ہوئی تو حضرت عمرؓ نے سعد وقاصؓ کو لکھا کہ مسجد کی عمارت بیت المال سے ملا دی جائے، کیونکہ مسجد نمازیوں کی وجہ سے ہمیشہ آباد رہتی ہے اور ہر وقت لوگوں کا مجمع رہے گا، چنانچہ سعد وقاصؓ کے حکم سے روزبہ نے بیت المال کی عمارت کو اس قدر وسیع کیا کہ مسجد سے مل گئی اور اس طرح چوری وغیرہ کی طرف سے اطمینان ہو گیا۔

پبلک ورکس یا نظارتِ نافعہ

یہ صیغہ مستقل حیثیت سے زمانہ حال کی ایجاد ہے اور یہی وجہ ہے عربی زبان میں اس کے لیے کوئی اصطلاحی لفظ نہیں، مصر و شام میں اس کا ترجمہ نظارت نافعہ کیا گیا ہے۔ اس صیغے میں مفصلہ ذیل چیزیں داخل ہیں:

سرکاری عمارات، نہریں، سڑکیں، پل، شفاخانے۔

حضرت عمرؓ کے زمانے میں اس کے لیے کوئی مستقل صیغہ نہیں قایم ہوا تھا۔ لیکن شفاخانوں کے سوا اس صیغے کے متعلق اور جتنی چیزیں ہیں، سب موجود تھیں اور نہایت منظم اور وسیع طور پہ تھیں۔

زراعت کی ترقی کے لیے حضرت عمرؓ نے جس قدر نہریں تیار کرائیں، ان کا مختصر حال ہم صیغۂ محاصل کے بیان میں لکھ آئے ہیں۔ یہاں ان نہروں کا ذکر کرتے ہیں جو زراعت کے صیغے سے مخصوص نہ تھیں۔

حضرت عمرؓ نے جو نہریں تیار کرائیں

نہرِ ابی موسیٰ

یہ نہر ۹ میل لمبی تھی جس کی تیاری کی تاریخ یہ ہے کہ ایک دفعہ بصرہ کے لوگ ڈیپوٹیشن کے طور پر حضرت عمرؓ کے پاس حاضر ہوئے۔ حضرت عمرؓ نے معمول کے موافق ایک ایک سے حالات پوچھے۔ ان میں حنیف بن قیس بھی تھے۔ انہوں نے نہایت پُراثر تقریر میں جو کتابوں میں بالفاظہا منقول ہے، اس بات کی شکایت کی کہ بصرہ بالکل شورستان ہے اور پانی ۶ میل سے لانا پڑتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے اسی وقت ابوموسیٰ اشعریؓ کے نام اس مضمون کا تحریری حکم بھیجا کہ بصرہ کے لوگوں کے لیے نہر کھدوا دی جائے۔ چنانچہ دجلہ سے ۹ میل لمبی نہر کاٹ کر بصرہ میں لائی گئی جس کے ذریعے گھر گھر پانی کی افراط ہو گئی۔

نہرِ معقل

یہ ایک مشہور نہر ہے جس کی نسبت عربی میں یہ مثل مشہور ہے: اِذَا جَآءَ نَهْرُ اللّٰہِ بَطَلَ نَهْرُ مَعْقِلٍ۔ یہ نہر بھی دجلہ سے کاٹ کر لائی گئی تھی اور چونکہ اس کی تیاری کا اہتمام معقل بن یسار کے سپرد کیا گیا تھا جو ایک مقدس صحابی تھے، اس لیے انہی کے نام سے مشہور ہو گئی۔

نہرِ سعد

اس نہر کے لیے انبار والوں نے پہلے شہنشاہِ فارس سے درخواست کی تھی۔ اسلام کا زمانہ آیا تو ان لوگوں نے سعد وقاصؓ (گورنرِ کوفہ) سے خواہش ظاہر کی۔ سعد نے سعد بن عمرو کو مامور کیا۔ انہوں نے بڑے اہتمام سے کام کرایا لیکن کچھ

مُوا تک پہنچ کر ایک پہاڑ بیچ میں آگیا اور وہیں چھوڑ دی گئی، پھر حجاج نے اپنے زمانے میں پہاڑ کاٹ کر بقیہ کام پُورا کیا؛ تاہم نہر سعد ہی کے نام سے مشہور ہوئی۔

نہرِ امیر المومنین سب سے بڑی اور فائدہ رساں نہر جو حضرت عمرؓ کے خاص حکم سے بنی وہ نہر تھی جو امیر المومنین کے نام سے مشہور ہے اور جس کے ذریعے سے دریائے نیل کو بحرِ قلزم سے ملا دیا گیا تھا۔ اس کی مختصر تاریخ یہ ہے کہ ۱۸ھ میں جب تمام عرب میں قحط پڑا تو حضرت عمرؓ نے تمام اضلاع کے حکام کو لکھا کہ ہر جگہ سے کثرت کے ساتھ غلہ اور اناج روانہ کیا جائے، اگرچہ اس حکم کی فوراً تعمیل ہوئی لیکن شام اور مصر سے خشکی کا جو راستہ تھا بہت دور دراز تھا اس لیے غلے کے بھیجنے میں پھر بھی دیر لگی۔ حضرت عمرؓ نے ان دقتوں پر خیال کر کے عمرو بن العاص (گورنرِ مصر) کو لکھا کہ مصر کے باشندوں کی ایک جماعت ساتھ لے کر دار الخلافہ میں حاضر ہوں۔ وُہ آئے، تو فرمایا کہ دریائے نیل کو اگر سمندر سے ملا دیا جائے، تو عرب میں قحط و گرانی کا کبھی اندیشہ نہ ہوگا۔ ورنہ خشکی کی راہ غلے کا آنا دقت سے خالی نہیں۔ عمرو نے واپس جا کر کام شروع کر دیا اور فسطاط سے (جو قاہرہ سے دس بارہ میل ہے) بحرِ قلزم تک نہر تیار کرائی اس ذریعے سے جہاز دریائے نیل سے چل کر قلزم میں آتے تھے اور یہاں سے جدہ پہنچ کر لنگر کرتے تھے جو مدینہ منورہ کی بندرگاہ تھی۔ یہ نہر تقریباً ۶۹ میل لمبی تھی اور تعجب یہ ہے کہ چھ مہینے میں بن کر تیار ہو گئی۔ چنانچہ پہلے ہی سال ۲۰ بڑے بڑے جہاز جن میں ساٹھ ہزار اردب غلہ بھرا ہوا تھا، اس نہر کے ذریعے سے مدینہ منورہ کی بندرگاہ میں آئے۔ یہ نہر مدتوں تک جاری رہی اور اس کے ذریعے سے مصر کی تجارت کو نہایت ترقی ہوئی۔ عمر بن عبدالعزیز کے بعد عمالوں نے بے پروائی کی اور وُہ جا بجا سے اَٹ گئی یہاں تک کہ مقام ذنب التمساح تک آ کر بالکل بند ہو گئی۔ ۱۰۵ھ میں منصور عباسی نے ایک ذاتی مصلحت سے اس کو بند کر دیا لیکن بعد کو پھر جاری ہو گئی اور مدتوں تک جاری رہی۔

ایک عجیب و غریب بات یہ ہے کہ عمرو بن العاص نے بحرِ روم و بحرِ قلزم کو براہِ راست ملا دینے کا ارادہ کیا تھا چنانچہ اس کے لیے موقع اور جگہ کی تجویز بھی کر لی تھی اور چاہا تھا کہ فرما کے پاس سے جہاں سے بحرِ روم و بحرِ قلزم میں صرف ۷۰ میل کا فاصلہ رہ جاتا ہے، نہر نکال کر دونوں دریاؤں کو ملا دیا جائے لیکن جب حضرت عمرؓ کو ان کے ارادے سے اطلاع ہُوئی تو ناراضامندی ظاہر کی اور لکھ بھیجا کہ اگر ایسا ہوا تو یونانی جہازوں میں آ کر حاجیوں کو اڑا لے جائیں گے۔ اگر عمرو بن العاص کو اجازت مل ہوتی تو نہر سویز کی ایجاد کا فخر درحقیقت عرب کے حصے میں آتا۔

جو عمارتیں تیار کرائیں

عمارات جو حضرت عمرؓ نے تعمیر کرائیں تین قسم کی تھیں:

۱۔ مذہبی، جیسے مساجد وغیرہ۔ یہاں اس قدر کہنا کافی ہے کہ بقول روضۃ الاحباب چار ہزار مسجدیں تعمیر ہوئیں۔

۲۔ فوجی، جیسے قلعے، چھاؤنیاں، بارکیں۔

۳۔ ملکی، مثلاً دار الامارۃ وغیرہ اس قسم کی عمارتوں کے تفصیلی حالات معلوم نہیں لیکن ان کی اقسام کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

(۱) دارالامارۃ یعنی صوبجات اور اضلاع کے حکام جہاں قیام رکھتے تھے اور جہاں اُن کا دفتر رہتا تھا، کوفہ و بصرہ کے دارالامارۃ کا حال طبری و بلاذری نے کسی قدر تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔

دفتر

(۲) دیوان یعنی جہاں دفتر کے کاغذات رہتے تھے۔ فوج کا دفتر بھی اسی مکان میں رہتا تھا۔

خزانہ

(۳) بیت المال یعنی خزانے کا مکان۔ یہ عمارت مضبوط اور مستحکم ہوتی تھی۔ کوفے کے بیت المال کا ذکر بیت المال کے حال میں گزر چکا ہے۔

قید خانے

(۴) مدینہ منورہ کے قید خانے کا حال صیغۂ پولیس کے بیان میں گزر چکا۔ بصرہ میں جو قید خانہ تھا، وہ دارالامارۃ کی عمارت میں شامل تھا۔

مہمان خانے

(۵) یہ مکانات اس لیے تعمیر کئے گئے تھے کہ باہر والے جو دو چار روز کے لیے شہر میں آجاتے تھے، وُہ ان مکانات میں ٹھہرائے جاتے تھے، کوفے میں جو مہمان خانہ بنا اس کی نسبت علامہ بلاذری نے لکھا ہے کہ مدینہ منورہ کا مہمان خانہ ۱۷ھ میں تعمیر ہوا، چنانچہ ابن حبان نے کتاب الثقاۃ میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔

اس موقع پر یہ بتا دینا ضروری ہے کہ عمارتوں کی نسبت یہ نہیں خیال کرنا چاہیے کہ بڑی شان و شوکت کی ہوتی تھیں۔ اسلام فضول تکلفات کی اجازت نہیں دیتا۔ زمانۂ مابعد میں جو کچھ ہُوا ہُوا لیکن اس وقت تک اسلام بالکل اپنی سادہ اور اصلی صورت میں تھا، اور حضرت عمرؓ کو نہایت اہتمام تھا کہ یہ سادگی جانے نہ پائے۔ اس کے علاوہ اس وقت تک بیت المال پر حاکم وقت کو آزادانہ اختیارات حاصل نہ تھے۔ بیت المال تمام قوم کا سرمایہ سمجھا جاتا تھا اور لوگ اس کا اصلی مصرف یہ سمجھتے تھے کہ چونا پتھر کے بجائے زیادہ تر آدمیوں کے کام آئے۔ یہ خیال مدتوں تک رہا اور اسی کا اثر تھا کہ جب ولید بن عبدالملک نے دمشق کی جامع مسجد پر ایک رقم کثیر صرف کر دی، تو عام ناراضی پھیل گئی اور لوگوں نے علانیہ کہا کہ بیت المال کے روپے کا یہ مصرف نہیں ہے بہرحال حضرت عمرؓ کے زمانے میں جو عمارتیں بنیں، وہ عموماً اینٹ اور گارے کی تھیں۔ بصرہ کا ایوانِ حکومت بھی اسی حیثیت کا تھا، البتہ فوجی عمارتیں نہایت مضبوط اور مستحکم ہوتی تھیں۔

سڑکوں اور پلوں کا انتظام

سڑکوں اور پلوں کا انتظام اگرچہ نہایت عمدہ تھا لیکن براہِ راست حکومت کے اہتمام میں نہیں تھا۔ مفتوحہ قوموں سے جو معاہدہ ہوتا تھا، اس میں یہ شرط بھی ہوتی تھی کہ وہ سڑک اور پل وغیرہ اپنے اہتمام اور اپنے صرف سے بنوائیں گی۔ حضرت ابو عبیدہؓ نے شام فتح کیا۔ تو شرائط صلح میں یہ امر بھی داخل تھا۔[1]

مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ تک چوکیاں اور سرائیں

مکہ معظمہ اگرچہ مدتوں سے قبلہ گاہ خلائق تھا لیکن اس کے راستے بالکل ویران اور بے آب تھے۔ حضرت عمرؓ ۱۷ھ میں جب مکہ معظمہ گئے تو ان کی اجازت سے مدینہ سے لے کر مکہ تک ہر منزل پر چوکیاں، سرائیں اور چشمے تیار ہوئے۔

شہروں کا آباد کرنا

حضرت عمرؓ کے زمانے میں جو جو شہر آباد ہوئے، وہ جن جن ضرورتوں سے آباد ہوئے اور جو جو خصوصیتیں ان میں پیدا کی گئیں اُن کے لحاظ سے ہر شہر تاریخ اسلام کا ایک صفحہ کہا جا سکتا ہے ان میں سے بصرہ کوفہ ایک مدت تک اسلامی آثار کے منظر رہے، عربی نحو کی بنیاد یہیں پڑی۔ نحو کے اصلی دار العلوم یہی دو شہر تھے۔ حنفی فقہ جو آج تمام دنیا میں پھیلی ہوئی ہے، اُس کا سنگِ بنیاد کوفہ ہی میں رکھا گیا۔

فارس اور ہند کے بحری حملوں سے مطمئن رہنے کے لیے حضرت عمرؓ نے ۱۴ھ میں عتبہ بن غزوان کو متعین کیا کہ بندر گاہ ابلہ کے قریب جہاں بحرِ فارس کی خلیج کے ذریعے سے ہندوستان و فارس کے جہازات لنگر کرتے تھے، ایک شہر بسائیں۔ زمین کا موقع اور منظر خود حضرت عمرؓ نے بتایا تھا۔ عتبہ آٹھ سو آدمیوں کے ساتھ روانہ ہوئے اور خریبہ میں آئے جہاں اب بصرہ آباد ہے۔

بصرہ

یہاں پہلے کف دست میدان پڑا ہوا تھا، چونکہ زمین کنکریلی تھی اور آس پاس پانی اور چارہ کا سامان نہ تھا۔ عرب کے مذاق کے بالکل موافق تھی۔ غرض عتبہ نے بنیاد کی داغ بیل ڈالی اور مختلف قبائل کے لیے الگ الگ احاطے کھینچ کر گھاس اور پھونس کے مختصر مکانات بنوائے۔ عاصم بن دلف کو مقرر کیا کہ جہاں جہاں جس قبیلے کو اتارنا مناسب ہو اتاریں۔ خاص سرکاری عمارتیں جو

---

[1] کتاب الخراج ص ۸۰ میں ہے: وھی ان علیھم ارشاد الضال و بناء القناطر علی الانھار من اموالھم۔ تاریخ طبری ۱۵ھ صفحہ ۲۴۰ میں سڑک اور پل دونوں کا ذکر ہے۔

تعمیر ہوئیں، ان میں سے مسجد جامع اور ایوانِ حکومت جس کے ساتھ دفتر اور قید خانے کی عمارت بھی شامل تھی، زیادہ ممتاز تھا۔ ۱۷ھ میں آگ لگی اور بہت سے مکانات جل گئے۔ سعد بن ابی وقاصؓ نے جو اس وقت کوفے کے گورنر تھے، حضرت عمرؓ کے پاس سفارت بھیجی اور اجازت طلب کی کہ پختہ عمارتیں بنائی جائیں۔ حضرت عمرؓ نے منظور کیا لیکن تاکید کی کہ کوئی شخص ایک مکان میں تین کمروں سے زیادہ نہ بنائے۔ بصرہؔ سے دریائے دجلہ دس میل پر ہے۔ اس لیے حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ دجلہ سے بصرہ تک نہر کاٹ کر لائی جائے۔ بصرہ کی آبادی نہایت جلد ترقی کر گئی، یہاں تک کہ زیاد بن ابی سفیان کے زمانِ حکومت میں صرف ان لوگوں کی تعداد جن کے نام فوجی جسٹر میں درج تھے، ۸۰ ہزار اور ان کی آل اولاد ایک لاکھ بیس ہزار تھی۔

کُوفہ

دُوسرا شہر جو بصرہ سے زیادہ مشہور ہوا کُوفہ تھا۔ مدائن وغیرہ جب فتح ہو چکے تو سعد بن ابی وقاصؓ نے حضرت عمرؓ کو خط لکھا کہ یہاں رہ کر اہلِ عرب کا رنگ و روپ بالکل بدل گیا ہے۔ ایسی جگہ تلاش کرنی چاہیے جو برّی و بحری دونوں حیثیت رکھتی ہو، چنانچہ سلمان و حذیفہؓ نے جو خاص اسی قسم کے کاموں پر مامور تھے، کوفے کی زمین انتخاب کی۔ یہاں کی زمین ریتلی اور کنکریلی تھی اور اسی وجہ سے اس کا نام کُوفہ رکھا گیا۔ اسلام سے پہلے نعمان بن منذر کا خاندان جو عراق عرب کا فرمانروا تھا۔ ان کا پایۂ تخت یہی مقام تھا، اور ان کی مشہور عمارتیں خورنق اور سدیر وغیرہ اس کے آس پاس واقع تھیں۔ منظر نہایت خوشنما اور دریائے فرات سے صرف ڈیڑھ، دو میل کا فاصلہ تھا۔ اہلِ عرب اس مقام کو خدُّ العذرا یعنی عارضِ محبوب کہتے تھے، کیونکہ وہ مختلف عمدہ قسم کے عربی پھولوں مثلاً اقحوان، شقایق، قیصوم، خزامی کا چمن زار تھا۔ غرض ۱۷ھ میں اس کی بنیاد شروع ہوئی اور جیسا کہ حضرت عمرؓ نے تصریح کے ساتھ لکھا تھا۔ ۴۰ ہزار آدمیوں کی آبادی کے قابل مکانات بنائے گئے۔ ہیاج بن مالک کے اہتمام سے عرب کے جُدا جُدا قبیلے جُدا جُدا محلّوں میں آباد ہوئے۔ شہر کی وضع اور ساخت کے متعلق خود حضرت عمرؓ کا تحریری حکم آیا تھا کہ شارع ہائے عام ۴۰۔ ۴۰ ہاتھ اور اس سے گھٹ کر ۳۰۔ ۳۰ ہاتھ اور ۲۰۔ ۲۰ ہاتھ چوڑی رکھی جائیں اور گلیاں ۷۔ ۷ ہاتھ چوڑی ہوں۔ جامع مسجد کی عمارت جو ایک مربع بلند چبوترہ دے کر بنائی گئی تھی، اس قدر وسیع تھی کہ اس میں چالیس ہزار آدمی آسکتے تھے۔ اس کے ہر چہار طرف دُور دُور تک زمین کھلی چھوڑ دی گئی تھی۔ عمارتیں اوّل گھاس پھونس کی بنیں لیکن جب آگ لگنے کا واقعہ پیش آیا، تو حضرت عمرؓ نے اجازت دی اور اینٹ گارے

لہ بصرہ کی وجہ تسمیہ عموماً اہلِ لغت یہ لکھتے ہیں کہ بصرہ عربی میں نرم پتھریلی زمین کو کہتے ہیں، اور یہاں کی زمین اسی قسم کی ہے۔ لیکن معجم البلدان میں ایک مجوسی فاضل کا جو قول نقل کیا ہے وہ زیادہ قرینِ قیاس ہے، اس کے نزدیک اصل میں یہ لفظ "بس راہ" تھا۔ جس کے معنی فارسی میں "بہت سے راستوں" کے ہیں، چونکہ یہاں سے بہت سی راہیں ہر طرف کو تھیں، اس لیے اہلِ عجم اس کو اس نام سے موسوم کرتے تھے۔ اس کی تصدیق زیادہ تر اس سے ہوتی ہے کہ اس پاس شاہانِ عرب نے جو عمارتیں تیار کرائی تھیں اس کے نام بھی دراصل فارسی رکھے تھے۔ مثلاً خورنق جو دراصل خورنگاہ ہے اور سدیر جو دراصل سہ دِر ہے۔

کی عمارتیں تیار ہوئیں۔ جامع مسجد کے آگے ایک وسیع سائبان بنایا گیا، جو دوسو ہاتھ لمبا تھا اور سنگِ رخام کے ستونوں پر قائم کیا گیا تھا۔ یہ نوشیروانی عمارت سے نکال کر لائے گئے تھے۔ اس موقع پر یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ باوجود اس کے کہ دراصل نوشیروانی عمارت کا کوئی وارث نہ تھا اور اصولِ سلطنت کے لحاظ سے اگر کوئی وارث ہو سکتا تھا تو خلیفۂ وقت ہوتا لیکن حضرت عمرؓ کا یہ عدل و انصاف تھا کہ مجوسی رعایا کو ان ستونوں کی قیمت ادا کی گئی، یعنی ان کی تخمینی جو قیمت ٹھہری وُہ ان کے جزیے میں مجرا کی گئی۔ مسجد سے دوسو ہاتھ کے فاصلے پر ایوانِ حکومت تعمیر ہُوا جس میں بیت المال یعنی خزانے کا مکان بھی شامل تھا۔ ایک مہمان خانۂ خاص بھی شامل تھا۔ ایک مہمان خانۂ عام بھی تعمیر کیا گیا۔ اس میں باہر کے آئے ہوئے مسافر قیام کرتے تھے اور اُن کو بیت المال سے کھانا ملتا تھا۔

یہ شہر حضرت عمرؓ ہی کے زمانے میں اس عظمت و شان کو پہنچا کہ حضرت عمرؓ اس کو راس الاسلام فرماتے تھے اور درحقیقت وہ عرب کی طاقت کا اصلی مرکز بن گیا۔ زمانۂ مابعد میں اس کی آبادی برابر ترقی کرتی گئی لیکن یہ خصوصیت قایم رہی کہ آباد ہونے والے عموماً عرب کی نسل سے ہوتے تھے۔ ۱۷۰ھ میں مردم شماری ہُوئی تو ۵۰ ہزار گھر خاص قبیلۂ ربیعہ و مضر کے اور ۲۴ ہزار اور قبائل کے تھے اور اہلِ یمن کے ۶ ہزار گھر اُن کے علاوہ تھے۔

فسطاط

عمرو بن العاص نے جب اسکندریہ فتح کر لیا تو یونانی جو کثرت سے وہاں آباد تھے عموماً شہر چھوڑ کر نکل گئے۔ ان کے مکانات خالی دیکھ کر عمرو بن العاص نے ارادہ کیا کہ اسی کو مستقرِ حکومت بنائیں، چنانچہ دربارِ خلافت سے اجازت طلب کی۔ حضرت عمرؓ دریا کے حائل ہونے سے بہت ڈرتے تھے۔ بصرہ و کوفہ کی آبادی کے وقت بھی افسروں کو لکھا تھا کہ شہر جہاں بسایا جائے وہاں سے مدینہ تک کوئی دریا راہ میں نہ آئے، چونکہ اسکندریہ کی راہ میں دریائے نیل پڑتا تھا، اس لیے اس کو مستقرِ ریاست بنانا حضرت عمرؓ نے ناپسند کیا۔

عمرو بن العاص اسکندریہ سے چل کر قصر الشمع میں آئے، یہاں ان کا وہ خیمہ اب تک اسی حالت سے کھڑا تھا جس کو وہ اسکندریہ کے حملے کے وقت خالی چھوڑ گئے تھے، چنانچہ اسی خیمے میں اُترے اور وہیں نئی آبادی کی بنیاد ڈالی۔ ہر ہر قبیلے کے لیے الگ الگ احاطے کھینچے اور معاویہ بن خدیج، شریک بن سمی، عمرو بن مخزم، حیویل بن ناشرہ کو متعین کیا کہ جہاں مناسب سمجھیں آباد کریں۔ جس قدر محلّے اس وقت تھے، اور جو قبائل ان میں آباد ہُوئے ان کے نام علّامہ مقریزی نے تفصیل سے لکھے ہیں۔ جامع مسجد خاص اہتمام سے بنی۔ عام روایت ہے کہ ۸۰ صحابہؓ نے جمع ہو کر اس کے قبلے کی سمت متعین کی۔ ان صحابہ میں زبیرؓ، مقدادؓ، عبادہؓ، ابو دردأؓ اور بڑے بڑے اکابر صحابہؓ شریک تھے۔ یہ مسجد ۵۰ گز لمبی اور ۳۰ گز چوڑی تھی، تین دروازے تھے جن میں سے ایک دار الحکومت کے مقابل تھا اور عمارتوں میں سات گز کا فاصلہ تھا۔

عمروؓ بن العاص نے ایک مکان خاص حضرت عمرؓ کے لیے تعمیر کرایا تھا لیکن جب حضرت عمرؓ نے لکھ بھیجا یہ میرے کس کام کا ہے، تو وہاں بازار آباد کرایا گیا؛ چونکہ اس شہر کی آبادی خیمہ گاہ سے شروع ہوئی تھی اس لیے اس کا نام فسطاط پڑا جس کے معنی عربی میں خیمے کے ہیں آبادی کا سن ۲۱ ہجری ہے۔

موصل

یہ مقام اسلام سے پہلے بھی موجود تھا لیکن اس وقت اس کی حالت یہ تھی کہ ایک قلعہ اور اس کے پاس عیسائیوں کے چند معبد تھے۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں شہر کی حیثیت سے آباد ہوا۔ ہرثمہ بن عرفجہ نے اس کی بنیاد رکھی اور قبائلِ عرب کے متعدد محلّے آباد کیے۔ ایک خاص مسجد بھی تعمیر کرائی۔ ملکی حیثیت سے یہ شہر ایک خاص حیثیت رکھتا ہے۔ یعنی اس کے ذریعے سے مشرق اور مغرب کا ڈانڈا ملتا ہے۔ اور شاید اسی مناسبت سے اس کا نام موصل رکھا گیا۔

جیزہ

یہ ایک چھوٹا سا شہر ہے جو دریائے نیل کے غربی جانب فسطاط کے مقابل واقع ہے۔ عمرو بن العاص اسکندریہ کی فتح کے بعد جب فسطاط میں آئے تو اس غرض کے لیے کہ رومی دریا کی طرف سے نہ چڑھ آئیں۔ تھوڑی سی فوج اس مقام پر متعین کر دی جس میں حمیر اور ازد و ہمدان کے قبیلے کے لوگ تھے۔ فسطاط کی آبادی کے بعد عمرو بن العاص نے ان لوگوں کو بلا لینا چاہا لیکن ان کو دریا کا منظر ایسا پسند آیا تھا کہ وہ یہاں سے ہٹنا نہیں چاہتے تھے اور حجت یہ پیش کی کہ ہم جہاد کے لیے یہاں آئے تھے اور ایسے عمدہ مقصد کو چھوڑ کر اور کہیں نہیں جا سکتے۔ عمرو بن العاص نے ان حالات کی اطلاع حضرت عمرؓ کو دی۔ وہ اگرچہ دریا کے نام سے گھبراتے تھے لیکن مصلحت دیکھ کر اجازت دی اور ساتھ ہی یہ حکم بھیجا کہ ان کی حفاظت کے لیے ایک قلعہ تعمیر کیا جائے۔ چنانچہ ۲۱ھ میں قلعہ کی بنیاد پڑی اور ۲۲ھ میں بن کر تیار ہوا۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جب قلعہ بننا شروع ہوا تو قبیلۂ ہمدان نے کہا: ہم نامردوں کی طرح قلعہ کی پناہ میں نہیں رہنا چاہتے، ہمارا قلعہ ہماری تلوار ہے۔" چنانچہ اس قبیلے اور اس کے ساتھ بعض اور قبیلوں نے قلعے سے باہر کھلے میدان میں ڈیرے ڈالے اور ہمیشہ وہیں رہے۔ حضرت عمرؓ کی برکت سے یہ چھوٹا سا مقام بھی علمی حیثیت سے خالی نہیں رہا۔ چنانچہ بڑے بڑے محدث یہاں پیدا ہوئے۔

حضرت عمرؓ کے آخری لمحات

مولانا ابوالکلام آزاد

۲۳ھ میں کرمان، سجستان، مکران اور اصفہان کے علاقے فتح ہوئے، گویا سلطنت اسلامی کی حدود مصر سے بلوچستان تک وسیع ہوگئیں۔ اسی سال آپ نے آخری حج فرمایا۔ حج سے واپس تشریف لا رہے تھے، راہ میں ایک مقام پر ٹھہر گئے اور بہت سی کنکریاں جمع کرکے ان پر چادر بچھائی، پھر چت لیٹ کر آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے اور دعا کرنے لگے:

"خداوندا! اب میری عمر زیادہ ہو گئی ہے میرے قویٰ کمزور پڑ گئے ہیں اور میری رعایا ہر جگہ پھیل گئی ہے، اب تو مجھے اس حالت میں اٹھا لے کہ میرے اعمال برباد نہ ہوں اور میری عمر کا پیمانہ اعتدال سے متجاوز نہ ہو۔"

کعب بن احبار نے کہا:

"میں تورات میں یہ دیکھتا ہوں کہ آپ شہید ہوں گے۔"

آپ نے فرمایا:

"یہ کیسے ممکن ہے کہ عرب میں رہتے ہوئے شہید ہو جاؤں!"

پھر دعا فرمائی:

"اے خداوندا! مجھے اپنے راستے میں شہادت عطا کر، اور اپنے محبوب کے مدینہ کی حدود کے اندر پیغام اجل ارزانی فرما۔"

ایک دن خطبۂ جمعہ میں ارشاد فرمایا:

"میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ ایک مرغ آیا ہے اور مجھ پر ٹھونگیں مار رہا ہے۔ اس کی تعبیر یہی ہو سکتی ہے کہ اب میری موت کا زمانہ قریب آگیا۔ میری قوم مطالبہ کر رہی ہے کہ میں اپنا ولی عہد مقرر کروں۔

یاد رکھو کہ میں موت کا مالک ہوں نہ دین اور خلافت کا، اللہ تعالیٰ اپنے دین اور خلافت کا خود محافظ ہے۔ وہ انھیں کبھی ضائع نہ کرے گا۔"

زہری کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حکم دیا کہ کوئی مشرک جو بالغ ہو مدینہ منورہ میں داخل نہیں ہو سکتا۔ اس سلسلہ میں حضرت مغیرہ بن شعبہ گورنر کوفہ نے آپ کو لکھا کہ یہاں کوفہ میں فیروز نامی ایک بہت ہوشیار نوجوان ہے اور وہ نقاشی، نجاری اور آہن گری میں بڑی مہارت رکھتا ہے اگر آپ اسے مدینہ میں داخلے کی اجازت عطا کریں تو وہ مسلمانوں کے بہت کام آئے گا۔ حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ اس کو بھیج دیا جائے۔ فیروز نے مدینہ پہنچ کر شکایت کی "مغیرہ بن شعبہ نے مجھ پر بہت زیادہ ٹیکس لگا رکھا ہے،

آپ کم کرا دیجیے۔"
حضرت عمرؓ: "کتنا ٹیکس ہے؟" فیروز: "دو درہم روزانہ (سات آنے)"۔ حضرت عمرؓ: "تمہارا پیشہ کیا ہے؟" فیروز: "نجاری، نقاشی اور آہن گری۔" حضرت عمرؓ: "ان صنعتوں کے مقابلہ میں یہ رقم کچھ بہت نہیں ہے۔"

فیروز کے لیے یہ جواب ناقابلِ برداشت تھا۔ وہ عناد سے لبریز ہوگیا اور دانت پیستا باہر چلا گیا۔ وُہ کہہ رہا تھا کہ امیر المومنینؓ! میرے سوا ہر ایک کا انصاف کرتے ہیں۔ چند روز کے بعد حضرت موصوفؓ نے اُسے پھر یاد فرمایا اور پُوچھا: "میں نے سُنا ہے کہ تم ایک چکّی تیار کر سکتے ہو، جو ہوا سے چلے؟" فیروز نے ترش روئی سے جواب دیا کہ میں تمہارے لیے ایک ایسی چکّی تیار کروں گا، جسے یہاں کے لوگ کبھی نہیں بُھولیں گے۔

فیروز رخصت ہوگیا تو آپ نے فرمایا: یہ نوجوان مجھے قتل کی دھمکی دے گیا ہے۔

دوسرے روز ایک دو دھارا خنجر جس کا قبضہ وسط میں تھا آستین میں چھپایا اور صبح سویرے مسجد کے گوشے میں آ بیٹھا۔ مسجد میں کچھ لوگ صفیں سیدھی کرنے پر مقرر تھے۔ جب وُہ صفیں سیدھی کر لیتے تھے تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تشریف لاتے اور امامت کرانے تھے۔ اس روز بھی اسی طرح ہُوا۔ جب صفیں سیدھی ہو چکیں تو حضرت عمرؓ امامت کے لیے آگے بڑھے اور جونہی نماز شروع کی، فیروز نے دفعۃً گھات میں سے نکل کر چھ وار کیے جن میں ایک ناف کے نیچے پڑا۔ دُنیا نے اس دردناک ترین حالت میں خدا پرستی کا ایک عجیب نظارہ دیکھا، اِس وقت جب کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے قدموں پر گر رہے تھے، آپ نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کا ہاتھ پکڑ کر اپنی جگہ پر کھڑا کر دیا اور خود وہیں زخموں کے صدمہ سے زمین پر گر پڑے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے اس حالت میں نماز پڑھائی کہ امیر المومنین حضرت فاروقِ اعظمؓ سامنے تڑپ رہے تھے۔ فیروز نے اور لوگوں کو بھی زخمی کیا لیکن آخر وہ پکڑا گیا اور اسی وقت اس نے خودکشی کر لی۔

حضرت فاروقؓ کو اٹھا کر گھر لایا گیا، آپ نے سب سے پہلے یہ دریافت فرمایا کہ میرا قاتل کون تھا؟ لوگوں نے عرض کیا: "فیروز"۔ اس جواب سے چہرۂ انور پر بشاشت ظاہر ہوئی، اور زبانِ مبارک سے فرمایا: "الحمدللہ! میں کسی مسلمان کے ہاتھ سے قتل نہیں ہوا۔"
لوگوں کا خیال تھا کہ زخم چنداں کاری نہیں، اس لیے شفا ہو جائے گی۔ چنانچہ ایک طبیب بلایا گیا اس نے نبیذ اور دودھ پلایا۔ مگر یہ دونوں چیزیں زخم کی راہ سے باہر آگئیں۔ اس سے تمام مسلمانوں پر افسردگی طاری ہوگئی اور وہ سمجھے کہ اب حضرت عمرؓ جانبر نہ ہوسکیں گے۔
حضرت عمرؓ تنہا زخمی نہیں ہُوئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، پُورا مدینہ زخمی ہوگیا ہے، خلافتِ اسلامیہ زخمی ہوگئی ہے۔ اس سے بھی زیادہ یہ کہ خود اسلام پاک زخمی ہوگیا ہے۔ غم میں ڈوبے ہوئے لوگ آپ کی عیادت کے لیے آتے تھے اور بے اختیار آپ کی تعریفیں کرتے تھے۔ حضرت ابنِ عباسؓ آئے اور بے اختیار آپ کے فضائل و اوصاف بیان کرنے لگے۔ ارشاد فرمایا: "اگر آج میرے پاس دنیا بھر کا سونا بھی موجود ہوتا تو میں اسے خوفِ قیامت سے رُستگاری حاصل کرنے کے لیے قربان کر دیتا۔"

جب تک حضرت فاروقِ اعظمؓ مسلمانوں کی آنکھوں کے سامنے تھے، انہیں نئے انتخاب کا تصوّر تک نہیں ہوا۔ وُہ یُوں سمجھتے تھے شاید اسلام کا یہ سب سے بڑا خادم یونہی عرصۂ دراز تک اُمّتِ رسولؐ کی حفاظت کرتا رہے گا۔ جب عمر فاروقؓ ناگہاں

بستر پر گر پڑے تو مسلمانوں کو اب پہلی دفعہ اپنی بے بسی اور اسلام کی تنہائی کا احساس ہوا۔ اب ہر مسلمان کو سب سے پہلا فکر یہی تھا کہ اب حضرت عمرؓ کے بعد اس اُمّت کا محافظ کون ہوگا ؟ جتنے بھی لوگ خبر گیری کے لیے آتے تھے ، یہی عرض کرتے تھے : "امیر المومنین! آپ اپنا جانشین مقرر کرتے جائیے۔" آپ مسلمانوں کا یہ تقاضا سُنتے تھے اور چُپ ہو جاتے تھے۔ آخر ارشاد فرمایا :

"کیا تم یہ چاہتے ہو کہ موت کے بعد بھی یہ بوجھ میرے ہی کندھوں پر رہے ؟ یہ نہیں ہو سکتا ، میری آرزو صرف یہی ہے کہ میں اس مسئلہ سے اِس طرح الگ ہو جاؤں کہ میرے عذاب و ثواب کے دونوں پلڑے برابر رہ جائیں۔"

حضرت عمر فاروقؓ نے انتخابِ خلافت کے مسئلہ پر مدّتوں غور فرمایا تھا اور وُہ اکثر اسی کو سوچا کرتے تھے۔ لوگوں نے متعدد مرتبہ ان کو اس حالت میں دیکھا تھا کہ سب سے الگ متفکر بیٹھے ہوئے ہیں اور کچھ سوچ رہے ہیں۔ دریافت کیا جاتا تو ارشاد فرماتے ، "میں خلافت کے معاملے میں حیران ہُوں ، کچھ نہیں سُوجھتا۔" بار ہا کے غور و فکر کے بعد بھی ان کی نظر کسی ایک شخص پر جمتی نہیں تھی۔ بار ہا ان کے مُنہ سے ایک بے ساختہ آہ نکل جاتی تھی۔ افسوس ، مجھے اس بار کا کوئی اُٹھانے والا نظر نہیں آتا۔

ایک شخص نے کہا ، "آپ عبداللہ بن عمرؓ کو خلیفہ کیوں نہیں مقرر کر دیتے ؟" فرمایا : "اے شخص ! خدا تجھے غارت کرے ، واللہ میں نے کبھی خدا سے یہ استدعا نہیں کی۔ کیا میں ایسے شخص کو خلیفہ بنا دوں ، جس میں اپنی بیوی کو طلاق دینے کی بھی صحیح قابلیت موجود نہیں ہے۔"

اسی سلسلہ میں فرمایا : "میں اپنے ساتھیوں کو خلافت کی حرص میں مبتلا دیکھ رہا ہُوں۔ ہاں ، اگر آج سالم مولیٰ ابو حذیفہ یا ابو عبیدہ بن جراح زندہ ہوتے ، تو میں ان کے متعلق کہہ سکتا تھا۔" اِس ارشادِ مبارک سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو یہ بہت زیادہ پسند تھا کہ انتخابِ خلافت کے مسئلہ کو چُھوئے بغیر اس دُنیا کو عبور کر جائیں۔ لیکن مسلمانوں کا اصرار روز بروز بڑھتا چلا گیا۔ آخر آپ نے فرمایا کہ میرے انتقال کے بعد عثمانؓ ، علیؓ ، طلحہؓ ، زبیرؓ ، عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور سعد بن وقاصؓ ، تین دن کے اندر جس شخص کو منتخب کر لیں۔ اسی کو خلیفہ مقرر کیا جائے۔

آخری گھڑیوں میں اپنے صاحبزادے عبداللہ کو طلب کیا۔ وہ حاضر ہو گئے تو ارشاد فرمایا : "تم ابھی اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کے پاس جاؤ اور ان سے التماس کرو ، عمرؓ چاہتا ہے اسے اپنے دُو رفیقوں کے پاس دفن ہونے کی اجازت دی جائے۔"

عبداللہ بن عمرؓ نے آپ کا یہ پیغام حضرت عائشہ صدیقہؓ کو پہنچایا ، تو وہ بے حد درد مند ہوئیں اور فرمایا : "میں نے یہ جگہ اپنے لیے محفوظ رکھی تھی ، مگر آج میں عمرؓ کو اپنی ذات پر ترجیح دیتی ہوں۔" جب بیٹے نے آپ کو حضرت عائشہؓ کی منظوری کی اطلاع دی ، تو بے حد خوش ہُوئے اور اس آرزو کی قبولیت پر بہ صد خلوص و نیاز شکر ادا کرنے لگے۔

اب کرب و تکلیف کی حالت شروع ہو چکی تھی۔ اِسی حالت میں لوگوں سے مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا : جو شخص خلیفہ منتخب ہو وہ پانچ جماعتوں کے حقوق کا لحاظ رکھے۔ مہاجرین کا ، انصار کا ، اعراب کا ، اُن اہلِ عرب کا جو دُوسرے شہروں میں جا کر آباد ہوئے ہیں اور اہلِ ذِمّہ کا۔ پھر ہر جماعت کے حقوق کی تشریح فرمائی اور اہلِ ذمّہ کے متعلق ارشاد فرمایا : "میں خلیفۂ وقت کو وصیّت کرتا ہُوں کہ وُہ اللہ تعالیٰ اور محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلّم کی ذمّہ داری کا لحاظ رکھے ، اور اہلِ ذمّہ کے تمام معاہدات پورے کیے جائیں۔ ان کے دشمنوں سے لڑا جائے اور انھیں طاقت سے زیادہ تکلیف نہ دی جائے۔"

انتقال سے تھوڑا عرصہ پہلے اپنے بیٹے عبداللہ سے ارشاد فرمایا: "میرے کفن میں بے جا صرف نہ کرنا۔ اگر میں اللہ کے ہاں بہتر ہوں تو مجھے از خود بہتر لباس مل جائے گا، اگر بہتر نہیں ہوں، تو بہتر کفن بے فائدہ ہے۔"

پھر فرمایا: "میرے لیے لمبی چوڑی قبر نہ کھدوائی جائے، اگر میں اللہ تعالیٰ کے ہاں مستحقِ رحمت ہوں تو از خود میری قبر حدِ نگاہ تک وسیع ہو جائے گی، اگر مستحقِ رحمت نہیں ہوں تو قبر کی وسعت میرے عذاب کی تنگی کو دُور نہیں کر سکتی۔"

پھر فرمایا: "میرے جنازہ کے ساتھ کوئی عورت نہ چلے، مجھے مصنوعی صفات سے یاد نہ کیا جائے، جب میرا جنازہ تیار ہو جائے تو مجھے جلد سے جلد قبر میں پہنچا دیا جائے۔ اگر میں مستحقِ رحمت ہوں تو مجھے رحمتِ ایزدی تک پہنچانے میں جلدی کرنی چاہیے، اگر مستحقِ عذاب ہوں تو ایک بُرے آدمی کا بوجھ جس قدر جلد کندھوں سے اُتار پھینکا جائے اُسی قدر بہتر ہوگا۔"

ان دردانگیز وصایا کے تھوڑا ہی عرصہ بعد فرشتۂ اجل سامنے آگیا اور آپ جاں بحق تسلیم ہو گئے۔ یہ ہفتہ کا دن تھا ۲۴ھ۔ اس وقت عمر ۶۳ برس کی تھی۔ حضرت صہیبؓ نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ، حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے قبر میں اتارا اور دنیائے اسلام کے اس درخشندہ ترین آفتاب کو آقائے انسانیت کے پہلو میں ہمیشہ کے لیے سُلا دیا گیا۔ اِنّا للہ و اِنّا الیہ راجعون۔

عثمانؓ امامِ صُوفیہ

حضرت شیخ علی ہجویری ثمّ لاہوریؒ

[حضرت شیخ علی ہجویری ثمّ لاہوری المعروف حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "کشف المحجوب" میں خلفائے اربعہ کا ذکرِ جمیل ائمۂ تصوف کی حیثیت سے کیا ہے۔ آپؒ لکھتے ہیں کہ انبیاءِ کرامؑ کے بعد اہلِ تصوف کے پیش رو اور ان کے پیشوا یہی حضرات گزرے ہیں۔ حضرت موصوف نے حضرت عثمانؓ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ بطور تبرک ذیل میں من وعن درج کیا جاتا ہے]

"حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم میں سے ایک ہیں۔ حیا کا خزانہ، اہلِ صفا میں زیادہ عبادت گزار۔ درگاہ رضائے الٰہی سے تعلق رکھنے والے اور حضرت مصطفیٰ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے طریق سے آراستہ۔

حضرت ابو عمر عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ جن کی فضیلتیں تمام امور میں بالکل آشکارا اور اوصاف ظاہر ہیں۔

حضرت عبداللہ بن رباح و ابو قتادہ رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ "حرب الدّار[1]" کے روز ہم آپ کے پاس تھے، جب فسادی لوگ آپ کے دروازے پر جمع ہوگئے تو آپ کے غلاموں نے ہتھیار اٹھا لیے۔ یہ دیکھ کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "جو شخص (غلام) ہتھیار نہ اٹھائے وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں آزاد ہے۔" اور ہم لوگ خوف کی وجہ سے جب باہر نکلے تو حضرت حسن ابنِ علی رضی اللہ عنہما ہمیں راستہ میں ملے۔ چنانچہ ہم ان کے ساتھ واپس لوٹ کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس آئے تاکہ معلوم کریں کہ حسنؓ بن علی کرم اللہ وجہہٗ آپ کے پاس کس مقصد کے لیے آرہے ہیں۔ جب حضرت حسن رضی اللہ عنہ اندر آئے تو سلام کے بعد پہلے آپ سے اس مصیبت پر افسوس اور ہمدردی کا اظہار کیا اور پھر یہ عرض کیا:

اے امیر المومنین! آپ امام برحق ہیں، آپ کے حکم کے بغیر میں مسلمانوں پر تلوار نہیں اٹھا سکتا، اس لیے آپ مجھے حکم دیجیے تاکہ میں یہ مصیبت آپ پر سے ہٹا دوں۔

تو حضرت عثمانؓ نے ان سے فرمایا:

"یا ابن اخی ارجع واجلس بیتك حتی یاتی اللہ بامرہٖ فلا حاجۃ لنا فی اھراق الدماء۔

(اے میرے برادر زادے! واپس جاکر اپنے گھر بیٹھو، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم بھیج دے، ہمیں خون گرانے کی حاجت نہیں)

---

[1] حضرت عثمانؓ کے مکان کے محاصرہ اور ان کی شہادت کے واقعہ کو "حرب الدار" کہتے ہیں۔

اور یہ بات مقامِ خُلّت[1] میں بلا کے وارد ہونے کے وقت تسلیم و رضا کی علامت ہے، جیسا کہ نمرود علیہ اللعنۃ نے آگ بھڑکائی اور ابراہیم علیہ السلام کو منجنیق کے پلڑے میں رکھا تو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے آکر فرمایا :

"ھَلْ لَکَ مِنْ حَاجَۃٍ۔"

(کیا آپ کو کوئی حاجت ہے؟)

تو آپ نے فرمایا :

"اَمَّا اِلَیْکَ فَلَا۔"

(تیری طرف مجھے کوئی حاجت نہیں)

اس پر حضرتِ جبرائیلؑ نے کہا "پھر خدا تعالیٰ سے مدد طلب کیجیے۔" تو آپ نے فرمایا :

"حَسْبِیْ سُؤَالِیْ عِلْمُہٗ بِحَالِیْ۔"

(اس کا میرے حال کو جاننا میرے سوال کے لیے بس ہے)

یعنی وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ مجھ پر کیا مصیبت آ رہی ہے اور وہ میرے حال کو مجھ سے بہتر جانتا ہے اسے معلوم ہے کہ میری بہتری کس چیز میں ہے!

پس حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اس مقام پر بالکل وہی حیثیت تھی جو حضرت خلیل اللہؑ کی منجنیق میں تھی اور فسادیوں کا اجتماع بعینہٖ آتشِ نمرود اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کے قائم مقام تھے۔ لیکن ان دونوں حالتوں میں فرق یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس بلا میں نجات ملی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اس مصیبت میں ہلاکت (شہادت) اور ظاہر ہے کہ نجات کا تعلق بقا سے ہے اور ہلاکت کا فنا سے[2] اور اس کے متعلق اس سے پیشتر ہم بیان کر چکے۔ پس صوفیہ کی جماعت مال و جان کو راہِ مولا میں خرچ کرنے اور اپنے تمام امور خدا تعالیٰ کے سپرد کرنے اور عبادت میں اخلاص کے اندر آپ ہی کی اقتدا کرتی ہے۔ آپ درحقیقت شریعت و حقیقت میں سب کے امام برحق ہیں اور اس سے آپ کی محبت ظاہر ہے۔" (بتغیر قلیل از بیان المطلوب ترجمہ کشف المحجوب صفحہ ۱۱۱، ۱۱۲)

حضرت شیخ ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں :

---

[1] دوستی آزمانے کا مقام

[2] "جو شخص اپنی جان حضرت باقی سبحانہٗ کے حوالے کر دیتا ہے تو جب اس کا نفس فنا ہو جاتا ہے یعنی اس کا تعلق جسم سے منقطع ہو جاتا ہے تو وہ بقائے دوام سے (بغیر تعلق جسم) باقی رہتا ہے۔ جو فعل حق تعالیٰ کی طرف سے بندہ کو پہنچتا ہے وہ سب کا مل ہوتا ہے۔ پس جب بندہ اپنے متعلقات سے فانی ہو جاتا ہے تو جمال حق تعالیٰ سے باقی رہتا ہے۔ بندگی کا صحیح ہونا فنا و بقا میں مضمر ہے۔" (کشف المحجوب) مسئلہ فنا و بقا کو سمجھنے کے لیے کتب تصوف خصوصاً کشف المحجوب کا مطالعہ ضروری ہے۔

رُوایت کرتے ہیں، امیر المومنین حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ ایک دن خلافت کے زمانہ میں اپنے کھجوروں کے باغ سے آرہے تھے اور ایندھن کا گٹھا سر پر رکھا تھا، حالاں کہ آپ کے چار سو غلام تھے۔ لوگوں نے پوچھا،

"اے امیر المؤمنین! یہ کیا حال ہے؟"

تو آپ نے فرمایا:

"اُرِيْدُ اَنْ اُجَرِّبَ نَفْسِيْ۔"

(میں اپنے نفس کو آزمانا چاہتا ہوں)

یعنی میرے پاس غلام تو ہیں جو یہ کام کر سکتے ہیں۔ لیکن میں اپنے نفس کا تجربہ کرنا چاہتا ہوں کہ خلقت کے نزدیک میرا مرتبہ اس کو کسی کام کے خود کرنے سے روک نہ سکے۔" (صفحہ ۹۸)

مآثر و اوصافِ عثمانؓ

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ

[حضرت شاہ ولی اللہؒ نے اپنی نہایت قابلِ قدر کتاب "ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء" کے مقصد دوم میں حضرت عثمانؓ کے اوصاف و مآثر شرح و بسط سے رقم فرمائے ہیں، اس کی تلخیص ملاحظہ فرمائیے]

"بعض لوگوں نے آپ (حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کے ذوالنورین ہونے کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ آپؓ میں دو سخاوتیں تھیں: ایک اسلام سے قبل، دوسری بعد اسلام۔

آپؓ کی فطرت انبیاء کی فطرت سے بہت مشابہ تھی۔ آپ کا یہ قول 'ریاض' میں مندرج ہے کہ "میں نے جاہلیت و اسلام میں کبھی زنا اور چوری نہیں کی۔"

بخاری میں حضرت عثمانؓ سے ایک طویل روایت ہے، جس کا آخری حصّہ یہ ہے:

"..... خدا کی قسم میں نے کبھی آپؐ کی نافرمانی نہیں کی اور آپؐ سے منافقانہ برتاؤ نہیں کیا، یہاں تک کہ آپؐ کی وفات ہوگئی۔ پھر ابوبکرؓ و عمرؓ کے ساتھ ایسا ہی کیا۔"

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ میں ضعفائے مکہ کو تسکین دینی چاہی تو عثمانؓ کے سوا کسی کو اس کام کا اہل نہ پایا۔ پس عثمانؓ کو اس کام پر مامور کیا۔

عثمانؓ پہلے شخص ہیں جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے حلوا پکایا۔ آپؓ کے پاس اونٹوں پر آٹا اور شہد لد کر آیا۔ آپؓ نے حلوا پکا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے اُمّ سلمہؓ کے مکان پر بھیجا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آئے، اُمّ سلمہؓ نے حلوا آپؐ کے سامنے پیش کیا۔ آپؐ نے اس کو پسند کیا۔ پُوچھا:

"کس نے بھیجا؟"

انہوں نے کہا:

"عثمانؓ نے۔"

فرمایا:

"اے اللہ! عثمانؓ تیری رضا چاہتا ہے تُو اس سے راضی ہو جا!"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اکثر اوقات عثمانؓ کے لیے دُعا کی اور اس بارے میں بہت کوشش کی۔

ابوسعید خُدری کہتے ہیں: "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اوّل شب سے صبح تک عثمانؓ کے لیے دُعا کرتے

دیکھا ہے کہ :

" اے خدا ! میں ان سے راضی ہُوں تو بھی راضی ہوجا ! "

اللہ تعالیٰ نے ذوالنورینؓ کو اعمالِ مقربہ سے پُورا حصّہ عنایت کیا تھا۔ آپؓ نے قرآن کریم رسول اللہؐ کے زمانے میں یاد کرلیا تھا۔ آپ کا حافظہ بہت قوی تھا۔ عثمانؓ تمام رات ایک رکعت میں کھڑے قرآن پڑھا کرتے تھے۔

بے نفسی حضرت عثمانؓ لوگوں کو امیروں ایسا کھانا کھلاتے تھے اور خود سرکہ و روغن زیتون پر گزارا کرتے تھے۔

تواضع حسنؒ راوی ہیں کہ میں نے عثمانؓ کو مسجد میں چادر سر کے نیچے رکھے سوتے دیکھا۔ لوگ آپ کے پاس آ آ کر بیٹھتے جاتے معلوم ہوتا تھا گویا انہی میں سے ایک شخص ہے۔

حضرت عثمانؓ قیلولہ کرکے اُٹھتے اور چٹائی کا نشان آپ کے پہلو میں ہوتا، اور لوگ کہتے: "یہ امیرالمومنین ہیں"

صبر عبدالرحمٰن بن مہدی راوی ہیں کہ عثمانؓ میں دو چیزیں ایسی تھیں جو ابوبکرؓ و عمرؓ میں نہ تھیں: ایک آپ کا صبر، یہاں تک کہ آپ مظلوم شہید ہُوئے۔ دوسرے سب لوگوں کو ایک مصحف پر متفق کر دینا۔

حیاؔ (حیاؔ کی شرح میں شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:)

حیاؔ کے معنی (حدیثِ عثمانؓ میں) یہ ہیں کہ طبیعت و قلب کا نورِ ایمان کے مطیع ہوجانا۔ جب کبھی غضب و خواہش کے جوش کا وقت آیا یا کوئی فتنہ کھڑا ہوا، حضرت عثمانؓ اُس (غضب) کے نافذ کرنے سے باز رہے۔ اور یہ بات جوش و خروش پر نورِ ایمانی کے غالب آنے سے پیدا ہوتی ہے۔

رفیقِ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا:

" عثمانؓ جنت میں میرے رفیق ہوں گے۔"

(شاہ صاحبؒ اس کی شرح میں فرماتے ہیں:) یہاں رفیق سے مراد وہ شخص ہے جو اعمالِ مقرّبہ و اخلاقِ مرضیّہ میں رسولِ خداؐ سے مشابہ ہو۔ حواریّت کا مدار معرکوں میں پُوری مدد کرنے پر ہے اور رفاقت کا مدار اعمال و اخلاق کی موافقت پر ہے۔

مشابہتِ نبی صلّی اللہ علیہ وسلم بنتِ رسولؐ رقیہؓ حضرت عثمانؓ کی اہلیہ سے روایت ہے کہ "میں نے حضورؐ کے بالوں میں کنگھی کی، حضورؐ نے پُوچھا:

" عثمانؓ کا برتاؤ کیسا ہے؟"

مَیں نے کہا: "اچھا ہے۔" حضورؐ نے فرمایا:

" ان کی تکریم کیا کرو، وہ اخلاق میں سب صحابہؓ سے زیادہ مجھ سے مشابہ ہیں "

بنتِ رسولؐ، اُمِّ کلثومؓ اہلیہ عثمانؓ فرماتی ہیں کہ:

" میں نے عرض کیا: "یارسول اللہؐ! میرا شوہر بہتر ہے یا فاطمہؓ کا؟" آپ نے کچھ دیر سکوت کیا۔ اس کے بعد کہا: " تمہارا شوہر ان لوگوں میں سے ہے جو خدا تعالیٰ اور رسول اللہؐ کو دوست رکھتے ہیں اور خدا و رسولؐ ان کو دوست رکھتے ہیں۔" الخ

(شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ:)

رسولِ خدا نے آپؓ کے واسطے ان مقامات کی تصریح اس وجہ سے کی کہ یہ اوصاف آپ کے نفس میں راسخ ہو گئے تھے۔ آپ بالکل ان اوصاف (رفاقت، مشابہت، صبر، حیا وغیرہ) میں سر سے پیر تک ڈوبے ہوئے تھے، جیسا کہ آپ کے روزمرہ کے واقعات اس کی کافی شہادت دے رہے ہیں۔

(شاہ صاحبؒ نے آپؓ کے حکیمانہ اقوال نقل کیے ہیں، ان میں سے بعض دیکھیے:)

۱۔ خدا سے تجارت کرو، نفع پاؤ گے۔

۲۔ احکام وحدود کی محافظت کرنا اور عہدوں کو پورا کرنا اور موجود پر راضی ہونا اور معدوم پر صبر کرنا شانِ عبودیت ہے۔

۳۔ موت سے پہلے جو کچھ نیکی کرنی ہو کرلو۔

۴۔ خبردار! دنیا باطل ہے، لہٰذا تم دنیا اور شیطان کے دھوکے سے بچو۔

۵۔ دنیا کی خواہش تاریکی ہے اور آخرت کی خواہش نور ہے۔

۶۔ عامل سے عزل کے وقت ہدیہ قبول کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ مقرر کرتے وقت۔

۷۔ لوگوں میں سے بہترین وہ ہے جو پرہیز کرے اور کتاب اللہ پر عمل کرے۔

۸۔ عارف کی علامت یہ ہے کہ اس کا دل امید و بیم میں ہو، اور اس کی زبان حمد و ثنا میں مشغول ہو، اور اس کی آنکھیں ...

۹۔ متقی کی علامت یہ ہے کہ لوگوں کو ناجی اور اپنے آپ کو ہلاکت میں جانے۔

۱۰۔ سب سے رائیگاں وہ ہے، جس کو بڑی عمر ملے اور وہ آخرت کا سامان نہ کرے۔

۱۱۔ جس کے واسطے دنیا قید خانہ ہوتی ہے قبر اس کے لیے راحت ہے۔

۱۲۔ اگر تمہارے دل پاک صاف ہوتے تو قرآن سے نہ آسودہ ہوتے۔[1]

(آپ کی قرآنی خدمات کے متعلق شاہ صاحب فرماتے ہیں:)

آپؓ نے اشاعتِ قرآن کے متعلق پانچ باتیں ایسی کیں جو خاص اہمیت کی حامل ہیں:

۱۔ لوگوں نے اپنے اپنے تلفظ اور طبعزاد ترتیبوں سے قرآن اور اس کے اجزا کو لکھ رکھا تھا، آپ نے ان کو منگوا کر مٹا دیا۔ شیخین کا مصحف جس کی فاروقِ اعظمؓ نے سالہا سال تصحیح کی تھی ام المؤمنین حفصہؓ کے پاس سے منگوایا اور اس کی چند نقلیں کرا کر اطرافِ عالم میں بھجوا دیں۔ قریش کے لغت پر لکھنے کی بہت تاکید فرمائی۔ ہر طرف احکام نافذ کر دیے کہ اسی قرآن کے موافق لوگ لکھیں۔ آپ کی اس کوشش سے امت کا تفرقہ اٹھ گیا اور قرآۃ مشہورہ و شاذہ میں امتیاز

---

[1] شاید اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کے وعید و تخویف سے خائف ترساں اور لرزاں رہتے۔

ظاہر ہوگیا اور تمام مسلمان ایک مصحف پر جمع ہو گئے۔ اگر آپ ایسا انتظام نہ کرتے تو کتاب اللہ میں اگلی اُمتوں کا سا جھگڑا پیدا ہو جاتا۔

۲ - آپ نے قراء تابعین کی ایک جماعت کو قرآن سکھایا اور آپ کی قرأت کا سلسلہ اس وقت تک باقی ہے۔

۳ - نماز میں مثل شیخین کے قرأت طویل کرتے تھے تاکہ لوگ آپ سے سُن کر اپنا تلفظ درست کریں۔

۴ - آپ ابتدائے نزولِ قرآن سے اس کو لکھتے تھے۔

۵ - تفسیر قرآن اور اوقات و مواقع نزول میں آپ بہت ماہر تھے۔

حمادؓ بن سلمہ کہتے ہیں کہ عثمانؓ جس دن خلیفہ بنے، اس دن وہ سب سے افضل تھے۔ اور جس دن شہید ہوئے، اس دن وہ خلافت والے دن سے بھی زیادہ اشرف تھے۔ اور مصحف کے بارے میں آپ ویسے ہی سخت تھے جیسے ابوبکرؓ قتال مرتدین میں۔

جابرؓ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک آدمی کا جنازہ آیا، آپؐ نے اس پر نماز نہیں پڑھی۔ لوگوں نے پُوچھا، "یا رسولؐ اللہ! ہم لوگوں نے آپؐ کو اس سے پہلے کسی جنازے کی نماز سے انکار کرتے نہیں دیکھا۔" آپؐ نے فرمایا: "یہ شخص عثمانؓ سے بغض رکھتا تھا، اس واسطے خدا نے اس سے بغض کیا۔ (رواہُ الترمذی)

ابوامامہ بن سہل کہتے ہیں کہ جب عثمانؓ محصور ہوئے تو ہم بھی ان کے ساتھ تھے، آپ اپنی چھت پر چڑھے، جس وقت آپ وہاں سے بات کرتے، جو لوگ مقام بلاط (ایک جگہ مسجد نبویؐ اور بازار کے درمیان) میں ہوتے، آپ کی آواز سُن لیتے۔ آپؐ وہاں جاکر ہمارے پاس واپس آئے اور کہا:

"یہ لوگ مجھے اس وقت قتل کی دھمکی دیتے ہیں۔"

ہم (راوی) نے کہا:

"خدا آپ کو کافی ہے۔"

فرمایا: "مجھے کس وجہ سے قتل کریں گے؟ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے، آپ فرماتے تھے: تین صورتوں کے سوا اور کسی صُورت میں مسلمان کا خُون مباح نہیں ہے:

۱ - اسلام کے بعد کافر ہو جائے۔

۲ - شادی کے بعد زنا کرے۔

۳ - قصاص میں۔

خدا کی قسم، جب سے مجھ (عثمانؓ) کو خدا نے دینِ اسلام کی ہدایت کی ہے میں نے اس (اسلام) کو کسی دین سے بدلنے کی خواہش نہیں کی، اور نہ جاہلیت اور اسلام میں کبھی زنا کیا، اور نہ کسی کو قتل کیا۔ پھر یہ لوگ کس وجہ سے مجھے قتل کریں گے!

آخری نکتہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سی حدیثوں میں صراحۃً وکنایۃً فرمایا ہے کہ "خلافتِ خاصہ عثمانؓ کے بعد منعقد نہ ہوگی"۔ اور یہ معنی متعدد سندوں اور مختلف طریقوں سے پایۂ ثبوت کو پہنچ گئے ہیں، جن میں کسی طرح کا شک و شبہ باقی نہیں رہا اور یہ بات خارج میں بھی ظاہر ہوگئی۔ اس لیے کہ حضرت علیؓ باوجود اوصافِ خلافت خاصہ سے متصف ہونے اور خدمات سابقہ میں راسخ القدم ہونے کے خلافت پر متمکن نہ ہو سکے اور ہر طرف آپ کا حکم نافذ نہ ہوا اور ہر دن خلافت کا دائرہ تنگ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ آخر زمانہ میں صرف کوفہ اور اس کے اردگرد حکومت رہ گئی اور معاویہؓ پر اگرچہ سب لوگ متفق ہوگئے اور لشکرِ اسلام کا تفرقہ اُٹھ گیا۔ لیکن خلافتِ خاصہ کے اوصاف ان میں نہ تھے اور خدمات سابقہ میں تمام انصار و مہاجرین سے کم تھے۔

عثمانؓ پر لکھے گئے مراثی کا ذکر

مرتب و مترجم : غلام قادر نجار

جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کیا گیا تو اس دور کے مختلف عرب شعراء نے آپ کے قتل اور آپ پر ظلم و ستم نیز آپ کے مصائب سے متعلق عینی وغیر عینی واقعات کو اشعار کا جامہ پہنایا ۔ ان میں وہ شعراء بھی ہیں جنہوں نے آپ کو مظلوم اور شہید سمجھ کر آپ کی مدح کی اور آپ کے واقعاتِ قتل کو مراثی کی شکل میں ڈھال دیا ، وہ بھی ہیں جنہوں نے آپ کی ہجو میں اشعار کہہ کر عرب کی بے باکی مگر دریدہ دہنی کا ثبوت دیا ، وہ بھی ہیں جنہوں نے آپ کے بہیمانہ قتل پر گریہ و بکا کے ساتھ اپنے جذبات اور ان دردناک واقعات کو فنی عروج کے ساتھ نظم کیا اور وہ بھی ہیں جو اپنی کمینہ فطرت کی بنا پر آپؓ کے دردناک قتل سے خوش ہوئے اور انہوں نے اپنے سفلی جذبات کو اشعار کے سانچے میں ڈھالا ۔

ہم ذیل میں عرب کے ان مخصوص نامی گرامی شعراء کی ایک مختصر فہرست دے رہے ہیں جنہوں نے عثمان رضی اللہ عنہ کے دردناک قتل پر بڑے پُرسوز انداز میں مراثی کہے اور جو برسوں زبان زد خاص و عام رہے ۔ ان مراثی کے کچھ چیدہ چیدہ اشعار بھی یہاں پیش کیے جا رہے ہیں ۔ ان شعراء میں حسان بن ثابت سرِفہرست ہیں جن کے مراثی کچھ اہلِ دل اور اہلِ حقیقت گریہ و بکا کے ساتھ اظہارِ جذبات کے لیے بار بار اعلانیہ پڑھتے رہے :

۱ ۔ حسان بن ثابت[۱]

۲ ۔ کعب بن مالک انصاری[۲]

۳ ۔ ولید بن عُقبہ

۴ ۔ نظر بن حارث سہمی

۵ ۔ حنظلہ بن ربیع تمیمی[۳]

۶ ۔ خالد بن عقبہ بن ابی معیط (انہوں نے حسان بن ثابت سے اجازت لے کر ان کے اشعار کا اضافہ بھی اپنے کلام میں کیا ۔

---

۱ ملاحظہ ہو دیوان حسان بن ثابت طبع لیدن

۲ ان کے کچھ اشعار دیوان حسان بن ثابت میں بھی چھپ گئے ہیں ۔

۳ ان کے کچھ اشعار حسان بن ثابت نے تظمین بھی کیے ہیں ۔

۷۔ مغیرہ بن اخنس

ان شعرأ کے علاوہ عرب کے ایک غیر معروف شاعر اور کچھ جنوں کو بھی مراثی پڑھتے سُنا گیا۔

مذکورہ بالا شعراء کا نمونۂ کلام یہ ہے۔

حسانؓ بن ثابت کہتے ہیں: (ترجمہ)

کیا تم نے غزوہ درروب اس لیے چھوڑا تھا — کہ قبرِ محمد (صلعم) کے نزدیک لڑائی میں شرکت کی تمنا رکھتے تھے

کیا تم مدینے کے اطراف میں اس لیے آئے تھے — کہ وہاں آکر بدترین فعل کے مرتکب ہو؟

اگر تم غور کرو تو سمجھو گے کہ امیر قوم[1] — کے سلسلے میں جو کچھ تم کر گزرے وُہ نہایت بُرا فعل تھا

وہ بھی اصحابِ نبیؐ تھے جنہیں تم نے — رات کے اندھیرے میں مسجد نبویؐ میں قتل کیا

میں ابا عمر (عثمانؓ) اور ان کے شدید مصائب پر — جنت البقیع میں ٹھہر کر برسوں روتا رہوں گا۔

کعب بن مالک انصاری:

کیا یہ مناسب ہے کہ لوگ میرے رونے اور جس پر میں رو رہا ہوں
اسے بُرا سمجھیں، مجھے تعجب ہے کہ میں صحرا میں (تنہا) رو رہا ہوں!
(اے لوگو!) میں نے ایک امین کے جسم کے ٹکڑے دیکھے!
وہ شخص عثمان تھا جسے کفن میں لے جایا جا رہا تھا!
(سمجھ لو) کہ اللہ نے اس قوم کو قتل کر دیا
جس نے ایک ذکی، فطین اور عمدہ امام کو پُرفتن انداز میں قتل کیا
(سمجھ لو کہ) تم نے اس کے ساتھ جملہ اصحابِ نبیؐ کو قتل کر دیا
جس کے اعمالِ نیک کے پیشِ نظر اللہ بھی اس پر درود و سلام بھیجتا ہے
اس میں خلافت کے ساتھ حلم، تقویٰ اور جملہ نیک اعمال
جمع تھے جن کی مثال ملنا امرِ محال ہے!
یہ وہ شخص تھا جس کی صحبت میں رہ کر میں نے دیکھا
کہ اسے دُنیا کی کسی شے کی تمنا تھی نہ اس کی طرف توجہ۔

ولید بن عُقبہ:

کیا تم انصار کی بدقسمتی نہیں دیکھتے! — ان کے سامنے دن کے وقت وُہ شخص قتل کر دیا گیا

---

[1] دیوان (طبع لیدن) میں 'امیر' کی جگہ 'امام' مرقوم ہے۔

جس کے بعد (رات کو) آسمان پر ! ستارے نہیں چمکیں گے !
اور قریش کو دیکھو کہ انہوں نے عصبیت کی بنا پر اس کا خون دیکھا (جبکہ) وہ اس کے قرابت دار اور اصحاب تھے
عثمانؓ کو ان مشیروں نے قتل کیا جو اس کے عزیز یہ اقارب اب روز عقارب کی طرح ہماری طرف لپک رہے ہیں۔
وہ لائق ملامت ہیں جو عثمانؓ کے عیب بیان کرتے ہیں کیا وہ (گریبان میں منہ ڈال کر) اپنے عیب نہیں دیکھتے ؛
(اور تو اور) یہ دیکھیے کہ کعب، زید بن ثابت، طلحہ و نعمان مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ میں واویلا نہ کروں !

نعمان بن حارث سہمی :

ان کے آبا کی قسم جو کچھ انہوں نے کیا (قیامت تک) اس کی تلافی نہیں ہو سکتی
جب خون بہا چکے تو اب اس پر روتے ہیں کیا اس طرح وہ خون جائز ہو جائے گا
انہوں نے اس کے گھر کو لوٹ کر منہدم کیا جس کی وجہ سے شمس و قمر گہنا گئے۔
انہوں نے ہمیں بھی مشتبہ سمجھ کر ہم پر (ہماری نیکی کے باوجود) فساد کے ساتھ ہم پر حملے کیے گئے۔

خُلید بن زفر سے مروی ہے کہ مغیرہ بن اخنس جب حج سے لوٹے تو آپ (عثمانؓ) کو محاصرے میں دیکھ کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے باغیوں کے ساتھ لڑائی کی اجازت ان الفاظ میں مانگی :

وہ مغیرہ کی ضرب کی تاب نہیں لا سکتے (آپ دیکھ لیں گے) وہ میدان چھوڑ کر بھاگ لیں گے

اور جب دشمنوں کے سامنے گئے تو انہیں للکار کر کہا :

میری طرف سے بنی سعد سے کہہ دو کہ آج ان کا مکر و فریب کام نہیں آئے گا۔
اے میرے بنی عم ! بھاگ جاؤ ! کہ بھاگ جانے ہی میں سلامتی ہے اور یہی بہتر ہے۔

عثمانؓ نے چھت سے اتر کر مغیرہ سے کہا :

"اللہ ان سے بدلہ لے گا ، میں نے انہیں (مرورِ ایام کے ساتھ) عبرت کے لیے چھوڑ دیا ہے

حنظلہ بن ربیع تمیمی :

بنو عمرو بن عوف کا وہ عہد[1] کہاں گیا بنو نجار بھی بدل کر[2] غدار ہو گئے !
ان کے پڑوسی بھی کمینے ہو گئے ، ان سے غداری کر کے اس گھر سے منہ موڑا جو پڑوس میں تھا
آج حفاظت کا خیال بھول کر ایسے بن گئے جیسے[3] وہ تمہارے پسندیدہ نہ ہوں
محمد (صلعم) کی وصیت بھول کر پڑوس کی عزت سے رُوگردانی کی !

---

[1] دیوان (ص ۶۸) میں 'عہد' کی جگہ 'نذر' مرقوم ہے۔ [2] دیوان میں 'تلون' کی جگہ 'تلوث' استعمال ہوا ہے۔
[3] دیوان میں 'تبدلوا' کی جگہ 'تخاذلت' مرقوم ہے۔

تم نے اسے (تنہا) مصیبت[1] (ور حالتِ جنگ میں چھوڑا اور اہل امصار[2] شور مچا رہے تھے !
تم غائبانہ خود کو انصار کہتے ہو ! اے گروہِ انصار ! تم پر خرابی ہو !
تم نے اس سے بدعہدی کی ! صرف اپنے کانوں اور اپنی آنکھوں سے وفا کی !

جب حنظلہ نے سُنا کہ اہلِ شام علیؓ پر عثمانؓ کے قتل کی تہمت لگا رہے ہیں تو اس نے مندرجہ بالا اشعار میں مندرجہ ذیل شعر کا بھی اضافہ کر دیا :

کاش ! میرے بال و پر میں اتنی قوت ہوتی کہ میں تمہیں علیؓ اور عثمانؓ بن عفان کے مراتب کی خبر کر سکتا !

حنظلہ کے یہی اشعار حسان بن ثابت نے مشرح کیے ہیں۔

خالد بن عُقبہ بن ابی مُعیط نے ازہر بن سیحان محاربی کو جو اصحابِ عثمانؓ میں سے تھا اور قتل کے روز غائب ہو گیا تھا یوں مخاطب کیا :

تیری جان کی قسم تُو نے چُپ سادھ لی اور دیکھتا رہا کہ وہ اپنے وسیع گھر میں حالتِ محاصرہ میں ہیں

محاربی نے اس کا یہ جواب دیا :

لوگ کہتے ہیں کہ آپ نے مجھے بُلایا اور میں خاموش رہا وہ دعائے خلیل میرے لیے نہیں تھی
اگر میں ان کی آواز سُن لیتا اور (پھر بھی) میرے ہاتھ (مدد سے) رکتے تو میں انھیں کاٹ ڈالتا۔

مغیرہ بن اخنس :

(تم نے) ان کے ہاتھ کاٹ کر ان کا دروازہ بند کیا (سمجھ لو) اللہ تمہاری حرکات سے غافل نہیں ہے
وہ کہہ رہے تھے "مجھے قتل نہ کرو"، "اللہ قتل کے سوا سب گناہ معاف کر دے گا"
میں نہیں سمجھ سکتا کہ دوستی کے بعد ان پر دشمنی کس طرح غالب آ گئی[3]

کسی گم نام شاعر کے اشعار ہیں :

ہائے عثمانؓ ! جن کے دروازے پر حسرت عجب انداز میں رو رہی ہے !
بخشش رو کر کہہ رہی ہے کہ انہیں پر ظلم کیا جن سے عطیات لیے تھے۔

عثمانؓ کے قتل پر جنات کا نوحہ

محمد بن حسین آجری اپنی کتاب الشریعۃ میں لکھتے ہیں :
جب عثمانؓ قتل کیے گئے تو اکثر اصحاب رسول اللہ صلعم نے گریہ و زاری کی، کچھ لوگ

---

[1] دیوان میں "مجدلاً" کی جگہ "مفرداً" مرقوم ہے۔ یہ مفہوم قوسین ( ) میں بڑھا دیا گیا ہے۔

[2] دیوان میں یہاں "من" کی جگہ "فی" مرقوم ہے۔

[3] مغیرہ کا یہ قول شعر نہیں ہے۔

جو اپنے گھروں میں بیٹھ رہے تھے وہ بعد از قتل باہر نکلے اور جنازے کی نماز میں شرکت کے لیے قبرستان پہنچے۔ اس اثنا میں جنّات تک نوحہ پڑھتے رہے۔

عثمان بن مُرّہ کہتے ہیں کہ ان سے ان کی والدہ نے بیان کیا:

"جب عثمانؓ کو قتل کیا گیا تو میں نے تین جنوں کو مسجدِ نبویؐ میں یہ نوحہ پڑھتے سُنا:

رات کو یہ لوگ مسجد میں — رکوع و سجود میں مصروف تھے
(مگر) صبح ہوتے شہاب کی طرح — (گرم رفتاری سے) ان پر ٹوٹ پڑے
یہ لوگ (کل تک) تیری مجلس — کی زینت بنے ہوئے تھے
اور (ہائے افسوس) آج — اس دوستی کی گردن کاٹ ڈالی

عثمان بن مُرّہ کہتے ہیں کہ دُوسرے لوگوں نے بھی ان کی والدہ کے اس بیان کی قسم کھا کر تصدیق کی۔

آجری کہتے ہیں کہ ان سے ابو داؤد نے بیان کیا، ابو داؤد نے عبداللہ بن سعید سے روایت کی، عبداللہ بن سعید نے ابو نُمیلہ سے سُن کر بیان کیا اور ابو نمیلہ کی روایت یہ ہے:

"مجھ سے محمد بن اسحٰق نے ذکر کیا کہ انہوں نے ایک جن کو یہ نوحہ پڑھتے سنا:

آج آپ پر عورتیں رو رہی ہیں — (اور) عمر بھر روتی رہیں گی!
انہوں نے اپنے چہرے (نوچ کر) — زخمی کر لیے ہیں!
(اور) زیب و زینت کے لباس اتار کر — سیاہ کپڑوں میں ملبوس ہو گئی ہیں

حضرت علیؓ اور رسولِ خدا

- علیؓ دنیا و آخرت میں میرے بھائی ہیں۔
- علیؓ مجھ سے ہیں اور میں علیؓ سے ہوں۔ میری طرف سے ادائے فرائض یا تو میں کر سکتا ہوں یا علیؓ۔
- علیؓ میری اصل ہیں۔
- علیؓ میرے علوم کا ظرف ہے۔
- علیؓ میرے لیے ایسے ہیں جیسے میرا سر میرے بدن کے لیے۔
- علیؓ مجھ سے ہے اور میں علیؓ سے ہوں اور وہ ہر مومن کا ولی ہے۔
- علیؓ میرے کیے ہوئے وعدوں کو پورا کریں گے اور میرے قرضوں کو ادا کریں گے۔
- علیؓ میرے رازوں کے خزینہ دار ہیں۔
- علیؓ مجھ سے ہے اور میں علیؓ سے ہوں اور علیؓ ہر مومن کا دوست اور مددگار ہے۔ (بروایت عمران حصین)
- علیؓ کو مجھ سے وہی منزلت حاصل ہے جو مجھے اپنے پروردگار سے ہے۔
- علیؓ ابن ابی طالب کو مجھ سے ایسا رشتہ ہے جیسے میری روح کو میرے بدن سے۔
- علیؓ باب حطہ جیسے ہیں جو شخص اس میں داخل ہوا وہ مومن، اور جو اس سے باہر نکلا وہ کافر۔
- علیؓ جنت میں یوں درخشاں ہوں گے جیسے ستارۂ صبح دنیا والوں کے لیے۔
- علیؓ مومنین کے سردار ہیں۔
- علیؓ قرآن کے ساتھ ہیں اور قرآن علیؓ کے ساتھ۔ یہ دونوں ہرگز جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ حوضِ کوثر پر پہنچیں۔
- علیؓ تمام انسانوں میں سب سے بہتر ہیں۔ جس نے شک کیا وہ کافر ہوا۔
- علیؓ کی ہڈیوں تک میں ایمان بھرا ہوا ہے۔
- علیؓ بروزِ قیامت میرے حوض کے مالک ہوں گے۔
- علیؓ ہم سب میں بہتر فیصلہ کرنے والے ہیں۔
- علیؓ کی شکایت نہ کرو کہ خدا کی قسم خدا کے بارے میں یا راہِ خدا میں علیؓ بہت سخت ہے۔
- علیؓ کی محبت نفاق سے دوری ہے۔

- علیؓ کی محبت گناہوں کو اس طرح کھا جاتی ہے جس طرح آگ لکڑی کو۔
- علیؓ کی محبت وُہ نیکی ہے کہ اس کے ہوتے کوئی بدی ضرر نہیں پہنچاتی۔
- علیؓ کی دشمنی وُہ بدی ہے جس کے ہوتے کوئی نیکی فائدہ بخش نہیں۔
- علیؓ کی محبت آتشِ جہنّم سے رہائی ہے۔
- علیؓ کا اس اُمّت پر بعینہٖ ایسا ہی حق ہے جس طرح باپ کا حق بیٹے پر۔
- علیؓ سے منافق محبّت نہیں کرتے اور مومن علیؓ سے بُغض و عداوت نہیں رکھتا۔
- علیؓ جنّت کے لوگوں پر اس طرح چمکے گا جس طرح صبح کا ستارہ دنیا کے لوگوں پر چمکتا ہے۔ (بروایت حضرت انسؓ)
- علیؓ سب سے پہلے مجھ پر ایمان لایا ہے اور سب سے پہلے مجھ سے حوض پر قیامت کے روز مصافحہ کرے گا۔
- میں حکمت کا گھر ہُوں اور علیؓ اس کا دروازہ ہیں۔
- جنّت تین شخصوں کی مشتاق ہے، علیؓ اور عمّارؓ اور سلمانؓ۔
- اے خدا! علیؓ کی جو عزّت کرے تُو بھی اُسے عزّت دے۔
- تمہارے ناموں میں سزاوار تر نام ابُو تراب ہے۔
- میں شہرِ علم ہُوں اور علیؓ اس کا دروازہ ہیں۔ جو شخص مدینہ میں آنا چاہے وہ پہلے دروازے پر آئے۔
- اے علیؓ! تم مجھ سے ہو اور میں تم سے ہُوں۔
- خداوندِ عالم ہر روز و شب ملائکہ پر علیؓ کے ذریعہ فخر و مباہات کرتا ہے۔
- میرے بعد تمام اُمّت میں سب سے بڑھ کر عالم علیؓ ابنِ ابی طالب ہیں۔
- تمام صحابہؓ میں بہتر فیصلہ کرنے والے علیؓ ہیں۔
- اے علیؓ! تم میرے داماد ہو اور میرے جگر گوشوں کے باپ ہو اور میں تم سے ہُوں تم مجھ سے ہو۔
- خداوندا! مدد کر اس کی جو علیؓ کی مدد کرے اور ذلیل و خوار کر اسے جو علیؓ کی مدد سے گریز کرے۔
- خداوندا! حق کو اُدھر گردش دے جدھر علیؓ گردش کریں۔
- خداوندِ عالم نے ہر نبی کی ذریّت اس کے صلب میں ودیعت کی ہے اور میری ذریت علیؓ کے صلب میں قرار دی۔
- حق اس کے ساتھ ہے یعنی علیؓ کے ساتھ۔
- مَیں نبیوں کا خاتم اور علیؓ وصیوں کے خاتم ہیں۔
- میں اور علیؓ بندگانِ خدا پر خدا کی حُجّت ہیں۔
- میں اور علیؓ ایک درخت سے ہیں۔
- سب سے پہلے میرے ساتھ علیؓ نے نماز پڑھی۔

- جو شخص علیؓ کو دوست رکھے اس سے کہہ دو کہ جنت میں جانے کے لیے تیار رہے۔
- اگر علیؓ نہ پیدا ہوئے ہوتے تو فاطمہؓ کا کوئی کفو نہ ہوتا۔
- خداوندا! علیؓ کی زبان کو استواری دے اور اس کے دل کی ہدایت فرما۔
- جس نے علیؓ سے حسد کیا اس نے مجھ سے حسد کیا اور جس نے مجھ سے حسد کیا وہ کافر ہوا۔
- اے علیؓ! جنت میں تمہارے لیے ایک خزانہ ہے اور تم اس کے دونوں کنارے لو گے۔
- اے علیؓ! ہم اور تم ایک ساتھ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے جنت میں داخل ہوں گے۔
- اے علیؓ! اگر تم نہ ہوتے تو میرے بعد کے مومنین پہچانے نہ جاتے۔
- جس شخص کا میں دوست ہوں، علیؓ اس کا دوست ہے۔ (بروایت زید بن ارقم)
- جس شخص نے علیؓ کو بُرا کہا مجھ کو بُرا کہا۔ (بروایت اُمّ سلمہ)
- رسول اللہؐ نے (مسجد نبوی کے اندر) تمام لوگوں کے گھروں کے دروازوں کو بند کرا دیا مگر علیؓ کا دروازہ مسجد کی طرف باقی رہا۔
- اے علیؓ! کیا تم اس پر راضی نہیں کہ تمہاری منزل جنت میں میری منزل کے برابر ہو گی۔
- اے علیؓ! تم میرے داماد، میرے فرزندوں کے باپ ہو، میں تم سے ہوں اور تم مجھ سے ہو۔
- جنت چار شخصوں کی مشتاق ہے: علیؓ، سلمانؓ، ابوذرؓ اور مقدادؓ۔
- حوضِ کوثر پر روزِ قیامت پیغمبرؐ کے پاس سب سے پہلے پہنچنے والے حضرت علیؓ ہیں جو پیغمبرؐ پر سب سے پہلے اسلام لائے۔
- تمہارے بارے میں دو شخص ہلاک و برباد ہوں گے، محبت میں حد سے گزر جانے والا، دوسرے جھوٹا اور بہتان باندھنے والا۔
- آنحضرتؐ نے اپنے اصحاب کے درمیان فرمایا: "میرے اصحاب میں سب سے زیادہ جچا تُلا فیصلہ کرنے والے علیؓ بن ابی طالب ہیں۔"
- رسولِ اکرمؐ نے لوگوں سے فرمایا: "تم اگر علیؓ کو امیر و حاکم بناؤ تو انہیں ہدایت یافتہ پاؤ گے۔"
- اے علیؓ! تم پہلے وہ شخص ہو جو جنت کا دروازہ کھٹکھٹاؤ گے اور میرے بعد بغیر حساب کے داخلِ جنت ہو گے۔
- میرا ہاتھ اور علیؓ کا ہاتھ عدل میں برابر ہے۔
- ہر نبی کے لیے ایک وصی اور وارث ہُوا کرتا ہے اور علیؓ میرے وصی اور وارث ہیں۔
- رسولِ مقبولؐ نے فرمایا: "اے علیؓ! تیرے لیے جنت میں وہ چیز ہے کہ اگر تمام روئے زمین کے لوگوں پر تقسیم کی جائے تو بچ رہے۔" (بروایت ابو سعید خُدری)
- قیامت کے دن سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السّلام کو ان کے خلیل ہونے کے باعث لباس پہنایا جائے گا، پھر میری برگزیدگی کی وجہ سے مجھے اور پھر علیؓ کو۔ (بروایت ابنِ عباسؓ)
- حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ مجھ سے رسالتمآبؐ نے فرمایا: اے علیؓ! میں تمہارے لیے بھی وہی پسند کرتا ہوں جو اپنے لیے اور تمہارے لیے بھی وہی باتیں مجھے ناپسند ہیں جنہیں مَیں خود اپنے لیے پسند نہیں کرتا۔

○ حضرت رسالت مآبؐ نے حضرت علیؓ سے کہا: کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ تمہیں مجھ سے وہی منزلت حاصل ہے جو ہارونؑ کو موسٰیؑ سے تھی۔ (بروایت حضرت ابراہیم بن سعد)

○ علیؓ نیکو کاروں کے امام اور بدکاروں کو موت کے گھاٹ اتارنے والے ہیں۔ جس نے علیؓ کی مدد کی وہ کامیاب و فتحیاب ہوا اور جس نے علیؓ کی مدد سے گریز کیا وہ بے یار و مددگار رہا۔

○ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے: اے میرے اصحاب! معراج کی رات مجھے سب گھر دکھائے گئے (جنت میں) کہ میرے گھر سے کس قدر فاصلہ رکھتے ہیں۔ اے علیؓ! تو راضی نہیں ہوتا کہ تیرا گھر میرے گھر کے مقابل ہوگا۔ (طبرانی بروایت عبداللہ بن ابی اوفی)

○ تین باتیں جس کسی میں ہوں گی وہ نہ مجھ سے ہے اور نہ میں اس سے ہوں۔ علیؓ کی دشمنی، اہل بیت کی عداوت اور یہ کہنا کہ ایمان محض زبانی اقرار ہے۔

○ خداوند عالم نے جس مومن کے دل میں بھی علیؓ کی محبت راسخ کر دی ہے وہ بروز قیامت پل صراط پر ثابت قدم ہوگا اس کا قدم کبھی بھی پھسلے گا نہیں۔

○ علیؓ تم میں عیسیٰؑ کا نمونہ ہے کہ یہودیوں نے ان سے عداوت برتی یہاں تک کہ ان کی ماں کو متہم کیا اور نصارٰی نے دوست رکھا تو اس دوستی میں اتنے بڑھ گئے کہ ان کو اس درجہ تک پہنچا دیا جس درجے پر وہ واقعتاً فائز نہ تھے۔

○ حبشی بن جیادہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "علیؓ مجھ سے ہے اور میں علیؓ سے ہوں اور میری جانب سے کوئی عہد نہ کرے اور نہ کوئی معاہدہ کرے مگر میں خود یا میری جانب سے علیؓ۔"

○ رسول اللہؐ نے ایک لشکر کہیں بھیجا جس میں حضرت علیؓ بھی تھے۔ اُم عطیہؓ کا بیان ہے کہ علیؓ کے چلے جانے کے بعد رسول اللہؐ نے ہاتھ اٹھا کر دعا کرتے ہوئے کہا: "اے اللہ! مجھ کو اس وقت تک موت نہ دینا جب تک کہ تو مجھے علیؓ کو نہ دکھا دے۔"

○ آنحضرتؐ نے فرمایا حضرت علیؓ سے، "اے علیؓ! تحقیق خدا تعالیٰ نے تجھے اور تیری اولاد کو اور تیرے اہل کو اور تیرے دوستوں کو بخش دیا ہے۔ پس تو خوش ہو کر تو انزع اور بطین ہے۔" (بروایت حضرت ابوایوب انصاریؓ)

○ جابرؓ بن عبداللہ سے روایت ہے کہ ہم آنحضرتؐ کی خدمت میں بیٹھے اصحاب جنت کا ذکر کر رہے تھے آنحضرتؐ نے فرمایا: "جنت میں سب سے پہلے داخل ہونے والا (آنحضرتؐ کے بعد) علیؓ ابن ابی طالب ہے۔"

○ آنحضرتؐ فرمایا کرتے تھے: علیؓ ابن ابی طالب قیامت کے روز میرے حوض کے صاحب ہوں گے۔ اس پر آسمان کے ستاروں کی تعداد کے موافق پیالے ہوں گے۔ میرے حوض کی وسعت جابیہ سے صنعا تک ہوگی۔ (دیلمی بروایت ابوہریرہؓ)

○ ابوسعید خدری سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ فرماتے تھے: "اے علیؓ! تیرے پاس قیامت کے روز جنت کے عصاؤں میں سے ایک عصا ہوگا تو اس سے منافقوں کو حوض سے ہانکے گا۔"

○ آنحضرتؐ فرماتے تھے: "اے میرے اصحاب! معراج کی رات مجھے سب کے گھر دکھائے گئے (جنت میں) کہ میرے گھر سے کس قدر فاصلہ رکھتے ہیں۔ اے علیؓ! تو راضی نہیں ہوتا کہ تیرا گھر میرے گھر کے مقابل ہوگا؟"

- آنحضرتؐ نے حضرت علیؓ سے فرمایا، "عنقریب تمہارے ایک فرزند پیدا ہوگا، میں اسے اپنا نام اور کنیت دونوں عطا کرتا ہوں، یہ دونوں چیزیں اس کے علاوہ کسی اور کے لیے (بیک وقت) جائز نہیں۔"
- خداوندِ عالم نے مجھے چار شخصوں سے محبت کرنے کا حکم دیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ وہ بھی ان چار شخصوں سے محبت رکھتا ہے ان چاروں میں سے ایک علیؓ ہیں اور باقی ابوذر، مقداد اور سلمان ہیں۔
- اے علیؓ! جس نے مجھ سے جُدائی اختیار کی اس نے خدا سے جُدائی اختیار کی اور جس نے تم سے جدائی اختیار کی اس نے مجھ سے جدائی اختیار کی۔
- حضرت علیؓ کی نسبت فرمایا: "تُو میرے لیے ایسا ہے جیسے موسیٰؑ کے لیے ہارونؑ تھے۔ اتنا فرق ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔" (بروایت سعد بن ابی وقاصؓ)
- اللہ نے مجھے اپنا خلیل بنایا ہے، جیسے ابراہیمؑ کو اپنا خلیل بنایا تھا اور بتحقیق میرا محل جنّت میں حضرت ابراہیمؑ کے محل کے مقابل ہوگا اور علیؓ ابن ابی طالب کا محل میرے محل اور حضرت ابراہیمؑ کے محل کے درمیان میں ہوگا۔ پس مبارک ہے وہ حبیب جو دو خلیلوں کے درمیان ہوگا۔ (بروایتِ حذیفہؓ)
- آنحضرتؐ نے چند صحابہؓ کو کپڑے پہنائے، اس وقت حضرت علیؓ موجود نہ تھے۔ جب وہ آئے ان کے چہرے پر خفگی پائی جاتی تھی۔ پس آنحضرتؐ نے ان سے فرمایا: "اے علیؓ! کیا تم راضی نہیں کہ جب مجھے لباس پہنایا جائے گا تمہیں بھی دیا جائے گا۔" (بروایت ابُوسعید خُدری)
- پیغمبرِ خدا نے اپنے اصحابؓ کے درمیان بھائی چارہ قایم کیا۔ حضرت علیؓ آنکھوں میں آنسو بھرے خدمتِ پیغمبر میں حاضر ہوئے، عرض کی: "یارسولؐ اللہ! آپ نے اصحاب کے درمیان بھائی چارہ قایم کیا، ایک کو دُوسرے کا بھائی بنایا اور میرا کسی کے ساتھ بھائی چارہ نہ کیا۔" رسالتمآبؐ نے فرمایا: "تم میرے بھائی دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی ہو۔"
- نبی کریمؐ نے حضرت فاطمہؓ سے پُوچھا: "اپنے کو کیسا پا رہی ہو؟" انہوں نے کہا: "خدا کی قسم میرا رنج بہت زیادہ، میری فاقہ کشی بہت سخت اور بیماری بہت طویل ہے۔" آنحضرتؐ نے فرمایا: "کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ میں نے تمہارا بیاہ ایسے شخص سے کیا جو میری اُمّت میں سب سے پہلے ایمان لایا، سب سے بڑھ کر عالم اور سب سے بڑھ کر حلم والا ہے۔"
- حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسولؐ اللہ کے پاس ایک بُھنا ہوا پرندہ رکھا تھا کہ آپؐ نے یہ دعا فرمائی: "اے اللہ! تُو میرے پاس اس شخص کو بھیج جو تجھ کو اپنی مخلوقات میں بہت پیارا ہو تاکہ وہ میرے ساتھ اس پرند کو کھائے۔" اس دُعا کے بعد آپؐ کی خدمت میں حضرت علیؓ حاضر ہوئے اور آپ کے ساتھ پرند کا گوشت کھایا۔
- طائف کے دن رسولؐ اللہ نے علیؓ کو بلایا اور ان سے سرگوشی کی۔ جب ان باتوں میں دیر ہوگئی تو لوگوں نے کہا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اپنے چچا کے بیٹے سے دیر تک سرگوشی کی۔ رسولؐ اللہ نے یہ سُن کر فرمایا: "میں نے سرگوشی نہیں کی خدا نے ان سے سرگوشی کی ہے۔" (بروایت حضرت جابرؓ)

- حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ میں رسول اللہ کی خدمت میں بیٹھا ہوا تھا کہ آپؐ پر وحی نازل ہونے لگی۔ جب وحی کا سلسلہ ختم ہوا تو آپؐ نے فرمایا: "اے انس! جانتے ہو جبریل کیا وحی لے کر آئے تھے خداوندِ عالم کے پاس سے؟" میں نے عرض کیا میرے ماں باپ قربان، جبریل کیا وحی لے کر آئے؟ آپؐ نے فرمایا کہ خداوندِ عالم نے مجھے حکم فرمایا ہے کہ میں فاطمہؓ کو علیؓ سے بیاہ دوں۔"
- حضرت علیؓ کو چار خصوصیتیں ایسی حاصل ہیں جو کسی کو نصیب نہیں ہوئیں۔ آپ اہلِ عرب و اہلِ عجم دونوں میں پہلے وہ شخص ہیں جس نے پیغمبر کے ساتھ نماز پڑھی۔ ہر جنگ میں علمِ لشکر آپ کے ہاتھ میں رہا، اور اس موقع پر جبکہ سبھی پیغمبر کو تنہا چھوڑ کر بھاگ گئے تھے بس آپ ہی پیغمبر کے پاس موجود رہے اور آپ نے پیغمبر کو غسل و کفن دیا اور قبر میں اتارا۔
- حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ جناب سرورِ کائناتؐ نے ایک روز مجھ سے فرمایا کہ اے انسؓ! جو شخص سب سے پہلے میرے پاس آئے گا وہ مومنوں کا امیر اور مسلمانوں کا سردار اور وصیوں کا خاتم اور سفید ہاتھ اور منہ والوں کا پیشوا ہوگا۔ اچانک جناب امیر تشریف لائے اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ حضرت نے پوچھا: انسؓ! یہ کون ہے؟ میں نے عرض کیا: علیؓ ہے۔ آپؐ نے فرمایا: دروازہ کھول دے۔ میں نے دروازہ کھول دیا۔ جناب امیر علیہ السلام حضرتؐ کے پاس تشریف لائے۔
- حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: پیغمبرِ خدا ایک روز سیاہ بالوں کی منقش چادر اوڑھے باہر سے تشریف لائے۔ پھر حسنؓ بن علیؓ آئے۔ پیغمبرؐ نے انہیں اپنی چادر میں لے لیا۔ پھر حسینؓ آئے وہ بھی چادر میں داخل ہو گئے۔ پھر فاطمہؓ آئیں پیغمبر اکرمؐ نے انہیں بھی چادر میں لے لیا۔ پھر علیؓ آئے، آپ نے ان کو بھی چادر میں لے لیا اور یہ آیت تلاوت فرمائی: "اے پیغمبر کے اہلِ بیت! خدا تو بس یہی چاہتا ہے کہ تم کو ہر طرح کی برائی سے دور رکھے اور جو پاک و پاکیزہ رکھنے کا حق ہے ویسا ہی پاک و پاکیزہ رکھے۔"
- میں تمہیں بتاؤں کہ تمام لوگوں میں سب سے زیادہ بدبخت شخص کون ہیں؟ ہم نے عرض کیا "ارشاد فرمائیں"۔ آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا "قوم ثمود کا سرخ رنگ کا آدمی جس نے ناقۂ صالحؑ کو قتل کیا۔ دوسرا وہ جو تمہیں تلوار کی ضرب لگائے گا۔" یہ کہہ کر آپؐ نے حضرت علیؓ کے سر کے اگلے حصہ پر ہاتھ رکھا "یہاں تک کہ اس کے خون سے اس ڈاڑھی کو (آپ نے حضرت علیؓ کی داڑھی ہاتھ میں لے کر کہا) تر کرے گا۔"
- اے علیؓ! تمہارے لیے میں نے خداوندِ عالم سے پانچ باتوں کا سوال کیا ایک سوال قبول نہ ہوا باقی چار باتیں خداوندِ عالم نے مجھے عطا فرمائیں، میں نے خدا سے سوال کیا کہ میری اُمت کو میرے بعد تمہارے اوپر متفق و متحد کر دے تو خدا نے یہ سوال قبول نہ کیا اور جو باتیں قبول فرمائیں وہ یہ کہ سب سے پہلے بروزِ قیامت ہم اور تم زمین سے ایک ساتھ برآمد ہوں گے۔ تم لوائے میرے آگے آگے رہو گے اور اولین و آخرین سب سے آگے اور یہ بات مجھے عطا کی کہ تم میرے بعد مومنین کے حاکم و امیر ہو گے۔
- عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے جب میرے والد (حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ) زخمی ہو گئے اور انہوں نے مشورت کے لیے حکم دیا، ام المومنین حضرت حفصہؓ سے کہنے لگے: "مجھ کو تکیہ لگا دو"۔ پھر فرمایا: "رسولِ خدا حضرت علیؓ سے فرماتے تھے، اے علیؓ! اپنا ہاتھ میرے میں دے اور داخل ہو جا قیامت کے دن میرے ساتھ جہاں میں داخل ہوں۔"

○ حج سے فارغ ہو کر واپس ہوتے ہوتے آنحضرتؐ راستہ میں ایک مقام پر ٹھہر گئے اور آپ نے نماز باجماعت کا اعلان فرمایا۔ نماز کے بعد حضرت علیؓ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور لوگوں سے خطاب کر کے کہا کیا میں تمام مومنین کی جانوں پر ان سے زیادہ مالک و متصرف نہیں ہوں؟" لوگوں نے کہا "بے شک۔" پھر آپؐ نے پوچھا "کیا میں ہر مومن کی جان پر اس سے زیادہ حکومت و اختیار نہیں رکھتا؟" لوگوں نے کہا "بے شک آپؐ زیادہ مالک و حاکم ہیں۔" آپؐ نے فرمایا: "جس کا میں مالک و حاکم ہوں علیؓ بھی اس کے حاکم ہیں۔ خداوندا! تو دوست رکھ اُسے، جو علیؓ کو دوست رکھے اور دشمن رکھ اُسے جو علیؓ کو دشمن رکھے۔"

○ ابو بریدہؓ سے روایت ہے کہ رسالتمآبؐ نے ارشاد فرمایا خداوند عالم نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں چار شخصوں کو دوست رکھوں، اور خداوند عالم نے مجھے یہ بھی خبر دی ہے کہ خود وہ ان چاروں کو دوست رکھتا ہے۔ لوگوں نے کہا: یا حضرتؐ! ان چاروں کے نام ہمیں بھی بتائیے۔ آپؐ نے فرمایا: "علیؓ ان میں سے ہیں" یہ جملہ آپؐ نے تین مرتبہ فرمایا" اور ابو ذرؓ ہیں، مقدادؓ ہیں اور سلمانؓ ہیں، خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں ان سے محبت رکھوں اور خداوند عالم نے مجھے اس کی بھی خبر دی ہے کہ وہ ان چاروں کو دوست رکھتا ہے۔"

○ اے علیؓ! خداوند عالم نے مجھے حکم دیا ہے کہ اپنے سے تمہیں قریب کروں اور تمہیں علوم تعلیم کروں تاکہ تم یاد رکھو۔ اور یہ آیت نازل ہوئی: "یاد رکھتے ہیں اسے یاد رکھنے والے کان۔" تو تم ہی میرے علوم کے لیے یاد رکھنے والے کان ہو۔ ارشادِ خداوند عالم کہ "یاد رکھتے ہیں اسے یاد رکھنے والے کان" کے متعلق حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ مجھ سے پیغمبرِ خدا نے ارشاد فرمایا: "میں نے خداوندِ عالم سے سوال کیا کہ اسے تمہارے کان قرار دے۔" چنانچہ پیغمبرؐ ہی کی دعا کا یہ نتیجہ ہے کہ میں نے پیغمبرؐ سے جو کچھ بھی سُنا بھولا نہیں۔

○ آنحضرتؐ جب غدیر خم میں قیام پذیر ہوئے (غدیر خم ایک مقام کا نام ہے جو مکہ اور مدینہ کے درمیان واقع ہے) تو علیؓ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر فرمایا: "کیا تم کو معلوم ہے کہ مومنوں کے نزدیک میں اُن کی جانوں سے زیادہ عزیز اور بہتر ہوں؟" لوگوں نے عرض کیا "ہاں"۔ پھر آپ نے فرمایا: "جس شخص کا میں مولا ہوں علیؓ اس کا مولا ہے۔ اے اللہ! تو اس شخص کو دوست رکھ جو علیؓ کو دوست رکھے اور اس شخص کو اپنا دشمن خیال کر جو علیؓ سے دشمنی رکھے۔" اس واقعہ کے بعد حضرت علیؓ نے حضرت عمرؓ سے ملاقات کی۔ عمرؓ نے ان سے کہا: "ابو طالب کے بیٹے! خوش رہو، تم صبح اور شام ہر وقت ہر مومن مرد اور ہر مومن عورت کے دوست اور محبوب ہو۔" (بروایت براءؓ بن عازب و زید بن ارقم)

○ اے علیؓ! بروز قیامت تم اور تمہاری اولاد موتی و یاقوت کے رنگ برنگے گھوڑوں پر سوار آؤ گے۔ خدا تمہیں جنت میں جانے کو کہے گا اور لوگ دیکھتے رہیں گے۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ میں اور علیؓ رسولِ کریمؐ کے ہمراہ مدینہ کے اندر چلے ہمارا گزر ایک باغ سے ہوا حضرت علیؓ نے کہا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کتنا اچھا باغ ہے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: جنت میں تمہارا باغ اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے۔ یہاں تک کہ ہم لوگ سات باغوں سے گزرے۔ ہر باغ کو دیکھ کر حضرت علیؓ نے کہا: یا رسول اللہ! کیا اچھا باغ ہے اور ہر مرتبہ

پیغمبرؑ نے فرمایا کہ جنت میں تمہارا باغ اس باغ سے کہیں بہتر ہے۔

- حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میرے پاس سیدِ عرب کو بلاؤ۔" مطلب یہ تھا کہ حضرت علیؓ کو بلا دو۔ حضرت عائشہؓ نے کہا: یا رسول اللہؐ کیا آپ خود سیدِ عرب نہیں؟" فرمایا: "میں تو جملہ بنی آدم کا سردار ہوں۔" جب حضرت علیؓ آئے تو آپؐ نے انہیں انصار کو بلانے کے لیے بھیجا۔ جب انصار پہنچے تو آپ نے فرمایا: "اے گروہِ انصار! میں تمہیں ایسے شخص کی نشان دہی نہ کروں جس کا دامن اگر تم مضبوطی سے پکڑو تو کبھی گمراہ نہ ہو؟" لوگوں نے کہا: "ضرور یا رسول اللہؐ!" آپ نے فرمایا: "وہ شخص یہ علیؓ ہے جس طرح مجھے محبوب رکھتے ہو اسی طرح اس علیؓ کو بھی محبوب رکھو اور جیسی میری عزت کرتے ہو اسی طرح علیؓ کی بھی عزت کرو۔ یہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اپنی طرف سے نہیں بلکہ خدا کی طرف سے جبریلؑ یہ سب باتیں کہہ گئے ہیں۔"

- براؓ بن عازب سے روایت ہے حضرت سرورِ کائناتؐ نے دو لشکر روانہ کیے، ایک کا سردار حضرت علیؓ کو مقرر کیا دوسرے کا خالدؓ بن ولید کو۔ اور ارشاد فرمایا کہ جب جنگ چھڑ جائے تو دونوں لشکروں کے سردار علیؓ ہی ہوں گے؛ چنانچہ حضرت علیؓ نے ایک قلعہ فتح کیا اور مالِ غنیمت سے ایک کنیز اپنے لیے لے لی۔ خالدؓ نے حضرت سرورِ کائناتؐ کی خدمت میں میرے ہاتھوں شکایتی خط لکھ بھیجا۔ میں خط لے کر خدمتِ رسالتؐ میں حاضر ہوا۔ آنحضرتؐ نے وہ خط ملاحظہ فرمایا تو آپؐ کے چہرے کا رنگ متغیّر ہو گیا۔ پھر آپؐ نے ارشاد فرمایا: "جس شخص کو خدا اور رسولؐ دوست رکھتے ہوں اور وہ بھی خدا اور اس کے رسولؐ کو دوست رکھتا ہو، اس کے متعلق تم کیسا خیال رکھتے ہو؟" میں نے عرض کی: "میں خدا اور اس کے رسولؐ کے غضب سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔ حضورؐ! میں تو پیامبر ہوں۔" یہ سن کر آپ خاموش ہو گئے۔

- اے علیؓ! میں نے اپنے پروردگار سے تمہارے لیے پانچ باتوں کا سوال کیا اور خداوندِ عالم نے میرے پانچوں سوال پورے کیے۔ پہلا سوال تو یہ کیا، جب زمین فنا ہونے کے بعد دوبارہ قائم ہو اور میں سر سے خاک جھاڑتا برآمد ہوں تو تم میرے ساتھ ساتھ ہو۔ یہ سوال خداوندِ عالم نے پورا کیا۔ دوسرا سوال یہ کیا، خداوندِ عالم مجھے میزان کے پلڑوں کے پاس ٹھہرائے اور تم بھی میرے پاس ہو۔ یہ سوال بھی خدا نے پورا کیا۔ تیسرا سوال یہ کہ تمہیں کو میرے جھنڈے کا اٹھانے والا قرار دے۔ خداوندِ عالم نے یہ درخواست بھی منظور کی۔ چوتھا سوال یہ کیا کہ میری اُمّت کو میرے حوضِ کوثر سے سیراب کرو۔ خدا نے اسے بھی منظور کر لیا۔ پانچواں سوال یہ کہ خداوندِ عالم تمہیں میری اُمّت کو جنّت کی طرف لے جانے والا قرار دے۔ خداوندِ عالم نے یہ سوال بھی قبول کیا۔ پس خداوندِ عالم کا حمد و شکر کہ میری التجائیں منظور فرما کر مجھے ممنونِ کرم فرمایا۔

- اے علیؓ! بروزِ قیامت ہم لوگوں کے سوا کوئی سوار نہ ہوگا بس ہم ہی چار سوار ہوں گے۔ انصار میں سے ایک شخص کھڑا ہو گیا اور اس نے سوال کیا "یا رسول اللہؐ! میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں وہ چار آدمی کون ہیں؟" آپ نے فرمایا کہ میں براق پر سوار ہوں گا اور میرے بھائی صالحؑ پیغمبر اپنے ناقہ پر سوار ہوں گے جسے قتل کیا گیا تھا اور میرے چچا حمزہؓ میرے ناقہ پر سوار ہوں گے اور میرے بھائی علیؓ جنّت کے ناقوں میں سے ایک ناقہ پر سوار ہوں گے اور ان کے ہاتھ میں لواءِ حمد ہوگا اور وہ اعلان کرتے جائیں گے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ علیؓ کو دیکھ کر بنی آدم کہیں گے یہ یقیناً مقرب فرشتہ یا نبی مرسل

یا حاملِ عرش ہے۔ اس پر عرش کے فرشتے کہیں گے: "اے بنی آدم! یہ نہ تو ملکِ مقرب ہے نہ نبیِ مُرسل نہ حاملِ عرش بلکہ یہ علیؓ ابنِ ابی طالب ہیں۔"

- سرورِ کائنات نے ایک لشکر روانہ کیا اور اس کا سردار علیؓ بن ابی طالب کو مقرر کیا۔ آپؓ فوج کے ہمراہ روانہ ہُوئے۔ آپؓ نے ایک کنیز حاصل کی۔ لوگوں نے اس بات کو ناپسند کیا اور چار شخصوں نے آپس میں معاہدہ کیا کہ جب پیغمبرؐ کی خدمت میں حاضر ہوں گے تو علیؓ کی اس حرکت سے انہیں آگاہ کریں گے۔ مسلمانوں کا طریقہ یہ تھا کہ جب سفر سے پلٹتے تو سب سے پہلے پیغمبرؐ کی خدمت میں سلام کے لیے حاضر ہوتے اس کے بعد اپنے اپنے گھروں کو جاتے۔ جب یہ لشکر پلٹ کر آیا تو حسبِ دستور مسلمان لشکری پیغمبرؐ کی خدمت میں سلام کے لیے حاضر ہوئے۔ جن چار شخصوں نے آپس میں علیؓ کی شکایت کرنے کے متعلق معاہدہ کیا تھا، ان میں سے ایک اُٹھ کر کھڑا ہُوا اور عرض کی: "یا رسولؐ اللہ! آپ علیؓ کو نہیں دیکھتے کہ انہوں نے ایسا ایسا کیا۔" آنحضرتؐ نے یہ سُن کر اُس کی طرف سے مُنہ پھیر لیا۔ پھر دُوسرا شخص اُٹھا اُس نے بھی وہی بات دُہرائی اور اس مرتبہ بھی آں حضرتؐ نے منہ پھیر لیا۔ پھر تیسرا اُٹھا اُس نے بھی پہلے دونوں کی طرح شکایت کی۔ اس مرتبہ بھی آں حضرتؐ نے منہ پھیر لیا۔ چوتھا اُٹھا اُس نے بھی وہی شکایت کی۔ اس مرتبہ رسول اللہ مُڑے اور برہمی کے آثار آپؐ کے چہرے سے ہویدا تھے۔ آپؐ نے فرمایا:
"تم لوگ علیؓ کے متعلق کیا چاہتے ہو، علیؓ کے متعلق تمہارا کیا ارادہ ہے، علیؓ کے متعلق تم کیا خیال کرتے ہو؟ یقیناً علیؓ مجھ سے ہیں اور میں علیؓ سے ہُوں، اور وہ میرے بعد ہر مومن کے حاکم ہیں۔"

- علیؓ کے متعلق پانچ خواہشیں میری ایسی پوری ہوئیں جو دنیا و مافیہا سے بڑھ کر مجھے محبوب ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ قیامت میں خداوندِ عالم کے حضور علیؓ میرا سہارا ہوں گے۔ میں ان پر فراغتِ حساب تک تکیہ کیے رہوں گا۔ دُوسری بات یہ کہ عَلَم ان کے ہاتھوں میں ہوگا۔ آدمؑ اور اولادِ آدم سب کے سب اس کے سایہ تلے ہوں گے۔ تیسری بات یہ کہ علیؓ حوضِ کوثر کے بیچوں بیچ ہوں گے اور میری اُمّت میں سے جسے پہچانتے ہوں گے اسے سیراب کریں گے۔ چوتھی بات یہ کہ کفن و دفن میرا علیؓ ہی کریں گے اور حضوریٔ پروردگار کی پہلی منزل تک پہنچائیں گے۔ پانچویں بات یہ کہ علیؓ کے متعلق مجھے یہ قطعی خوف نہیں کہ وُہ عفت کے بعد بدکاری اور ایمان کے بعد کفر کو اختیار کریں گے۔

- نبی کریمؐ نے علیؓ کو کلیجہ سے لگایا، ان کی پیشانی پر بوسہ دیا اور آپ کی آنکھوں سے آنسو رخساروں تک بہہ رہے تھے۔ پھر آپؐ نے علیؓ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور بلند آواز سے فرمایا: اے مسلمانو! یہ مہاجرین و انصار کا رئیس ہے۔ یہ میرا بھائی ہے، میرے چچا کا بیٹا، میرا داماد ہے۔ یہ میرا گوشت ہے، میرا خون ہے، میرا پوست ہے۔ یہ میرے جگر گوشوں حسنؓ و حسینؓ کا باپ ہے۔ یہ مصیبتوں کا مجھ سے دُور کرنے والا ہے۔ یہ خدا کا شیر ہے اور اس کی زمین پر اس کی تلوار ہے دشمنوں کے لیے۔ جو لوگ اسے دشمن رکھیں ان پر خدا کی لعنت اور لعنت کرنے والوں کی لعنت۔ خداوندِ عالم اس کے دشمن سے بیزار اور میں بھی اس سے بری۔ پس اب جو شخص خدا سے اور مجھ سے بری رہنا چاہتا ہو وہ علیؓ سے بیزار رہے۔ میرا یہ پیغام موجود و غیر موجود لوگوں کو پہنچا دیں۔

○ عامر بن سعد کہتے ہیں کہ میرے والد سعد بن ابی وقاص کو حضرت معاویہؓ نے حکم دیا کہ حضرت علیؓ کو بُرا کہیں۔ جب انہوں نے انکار کیا تو حضرت امیر معاویہؓ نے کہا: "کیا چیز تمہیں روک رہی ہے حضرت علیؓ کو بُرا کہنے سے؟" سعدؓ نے جواب دیا: جب تک تین باتیں جو خود رسولؐ اللہ نے حضرت علیؓ کے بارے میں ارشاد فرمائی ہیں مجھے یاد رہیں گی میں ہرگز انہیں بُرا نہیں کہہ سکتا۔ اگر ان تین باتوں سے ایک بات بھی مجھے حاصل ہوتی تو میرے لیے سُرخ اونٹوں سے زیادہ محبوب ہوتی (میں نے خود پیغمبرِ خدا کو حضرت علیؓ سے ارشاد فرماتے سنا جب آپ کسی جنگ (تبوک) میں تشریف لے جا رہے تھے اور حضرت علیؓ کو اپنا قائم مقام چھوڑے جا رہے تھے) اور حضرت علیؓ نے کہا تھا کہ یا رسولؐ اللہ! آپ مجھے عورتوں اور بچوں میں چھوڑے جا رہے ہیں۔ تو پیغمبرِ خدا نے حضرت علیؓ سے فرمایا کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ تمہیں مجھ سے وہ منزلت حاصل ہے جو ہارونؑ کو موسیٰؑ سے تھی سوائے اس کے کہ نبوت کا سلسلہ میرے بعد ختم ہے۔

۲۔ خیبر کے دن سرورِ کائنات، فخرِ موجوداتؐ نے فرمایا: "میں ایسے مرد کو علم دُوں گا جو خدا اور رسولؐ کو دوست رکھتا ہے اور جسے خدا اور رسولؐ دوست رکھتے ہیں۔" اس پر ہم لوگوں نے دراز ہو کر اپنے کو دکھانا شروع کیا مگر پیغمبرؐ نے فرمایا: میرے علیؓ کو بلاؤ۔ علیؓ آئے حالانکہ انہیں آشوبِ چشم کی تکلیف تھی۔ آپ نے اپنا لعابِ دہن ان کی آنکھوں میں لگایا اور انہیں عَلَمِ لشکر مرحمت فرمایا اور خداوندِ عالم نے ان کے ہاتھوں پر فتح عنایت کی۔

علیؓ! تم کو تین باتیں ایسی ملیں کہ کسی کو بھی نہیں ملیں یہاں تک کہ خود مجھے بھی نہیں ملیں: تمہیں میرے جیسا خُسر دیا گیا اور یہ بات مجھے نصیب نہیں ہوئی، مجھے تمہارے ایسا خُسر نہیں ملا۔ تمہیں میری بیٹی ایسی صدیقہ بیوی ملی اور مجھے نہ ملی۔ حسنؓ و حسینؓ تمہارے صلب سے پیدا ہوئے، مجھے ایسے فرزند نصیب نہیں ہوئے لیکن تم سب مجھ سے ہو اور میں تم لوگوں سے۔

علم، باب العلمؓ کے الفاظ میں

۱۔ اَلْعِلْمُ يُنْجِدُ، اَلْحِكْمَةُ تُرْشِدُ۔

علم (عالم کو) بلند کر دیتا ہے اور حکمت (اس کے لیے) باعثِ رُشد و ہدایت ہوتی ہے۔

۲۔ اَلْعِلْمُ بِالْفَهْمِ۔

علم، فہم کے ساتھ ہوتا ہے۔ یعنی علم اس سے حاصل ہوتا ہے کہ صاحبِ علم کسی چیز کو اچھی طرح سمجھ لے اور اس کی تہ تک پہنچ جائے۔

۳۔ اَلْعِلْمُ كَنْزٌ۔

علم ایک خزانہ ہے۔

۴۔ اَلْعِلْمُ عِزٌّ، اَلطَّاعَةُ حِرْزٌ۔

علم غلبہ اور عزت ہے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں دنیا و آخرت کے مہالک و شدائد سے پناہ ملتی ہے۔

۵۔ اَلْعِلْمُ دَلِيلٌ۔

علم رہنما ہے یا حق تعالیٰ تک پہنچانے والا ہے۔

۶۔ اَلْعِلْمُ يُنْجِيكَ، اَلْجَهْلُ يُرْدِيكَ۔

علم تجھے نجات دیتا ہے اور جہالت تجھے تباہ کرتی ہے۔

۷۔ اَلْعِلْمُ جَلَالَةٌ، اَلْجَهَالَةُ ضَلَالَةٌ۔

علم بزرگی ہے اور جہالت گمراہی۔

۸۔ اَلْعِلْمُ حَيَاةٌ، اَلْإِيمَانُ نَجَاةٌ۔

علم زندگی ہے اور ایمان نجات۔

۹۔ اَلْعِلْمُ مَجَلَّةٌ، اَلْجَهْلُ مَضَلَّةٌ۔

علم بزرگی کا محل ہے اور جہالت گمراہی کی جگہ، یا علم بزرگ کرنے والا ہے اور جہالت گمراہ کرنے والی ہے۔

اَلْعِلْمُ بِالْعَمَلِ۔

۱۰۔ علم عمل کے ساتھ ہوتا ہے۔

۱۱۔ اَلْعِلْمُ حِرْزٌ۔

علم پناہ ہے۔ یعنی علم ایک ایسی پناہ ہے جو عالم کو دنیا اور آخرت کی آفات سے پناہ دیتی ہے۔

۱۲۔ اَلْعِلْمُ مُمِیْتُ الْجَھْلَ۔

علم جہالت کو مار دیتا ہے۔ یعنی علم سے جہالت جاتی رہتی ہے۔

۱۳۔ اَلْعِلْمُ زَیْنُ الْحَسَبَ۔

علم حسب کی زینت ہے۔ اور حسب اس امر کو کہتے ہیں جو کسی شخص کے لیے سرمایۂ شرف و افتخار ہوتا ہے۔ اور اس سے مراد یہ ہے کہ علم جس حسب میں ہوگا اس کو زینت دے گا اور دوسرے شرفوں سے اس کو بلند و بالا کر دیتا ہے۔ اور اگر حسب سے مراد کرم ہو جیسا کہ بعض اہلِ لغت نے کہا ہے تو اس سے مراد یہ ہوگی کہ علم جس وقت کرم کے ساتھ جمع ہوگا تو وہ اس کو زینت بخشے گا۔

۱۴۔ اَلْعِلْمُ اَفْضَلُ شَرَفٍ۔

علم سب سے زیادہ فضیلت والا شرف ہے اور کوئی شرف و فضیلت اس کی برابری نہیں کرتی۔

۱۵۔ اَلْعِلْمُ مِصْبَاحُ الْعَقْلِ۔

علم عقل کا چراغ ہے۔ یعنی علم ایسا چراغ ہے کہ عقل نے اس کو روشن کیا ہے اور اس سے جہالت کی تاریکی کو زائل کیا ہے۔

۱۶۔ اَلْعِلْمُ خَیْرُ دَلِیْلٍ۔

علم ایک بہترین رہنما ہے۔ یا مطلب تک بہترین (طور پر) پہنچانے والا ہے۔

۱۷۔ اَلْعِلْمُ اَجَلُّ بِضَاعَۃٍ۔

علم بہترین سرمایہ ہے۔ کیونکہ اُخروی سعادت کا سرمایہ ہے۔

۱۸۔ اَلْعِلْمُ اَعْظَمُ کَنْزٍ۔

علم سب سے بڑا خزانہ ہے۔ اور ایسا خزانہ پایا نہیں جا سکتا۔

۱۹۔ اَلْعِلْمُ حَیَاۃٌ وَ شِفَاءٌ۔

علم زندگی ہے اور شفا ہے۔ یعنی علم حقیقی زندگی ہے اور معنوی امراض کے لیے شفاء۔

۲۰۔ اَلْعِلْمُ حِجَابٌ مِّنَ الْاٰفَاتِ۔

علم آفات کو روکنے والا ہے۔ یعنی آخرت کی آفات اور بہت سی دنیاوی آفات کو۔

۲۱۔ اَلْعِلْمُ اَفْضَلُ قِنْیَۃٍ۔

علم وہ بہترین چیز ہے جو انسان کسب کرتا ہے۔

۲۲۔ اَلْعِلْمُ مَرْکَبُ الْحِلْمِ۔

علم، حلم اور بُردباری کی سواری ہے۔ یعنی جس کے پاس علم ہوگا وہ صاحبِ حلم بھی ہوگا۔

۲۳ - اَلْعِلْمُ اَصْلُ كُلِّ خَيْرٍ

علم ہر نیکی اور خیر کی جڑ ہے اور تمام نیکیاں علم کی شاخیں ہیں۔ کیونکہ علم ہی تمام نیکیوں کا مصدر و ماخذ ہے۔

۲۴ - اَلْعِلْمُ عُنْوَانُ الْعَقْلِ -

علم عقل کی نشانی ہے۔ جس کے پاس علم ہوگا وہ صاحبِ عقل ہوگا اور امور میں اس سے مشورہ کیا جا سکتا ہے۔

۲۵ - اَلْعِلْمُ لِقَاحُ الْمَعْرِفَةِ -

علم سے معرفت حاصل ہوتی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔

۲۶ - اَلْعِلْمُ يُنْجِدُ الْفِكْرَ -

علم فکر کو قوت و جلا بخشتا ہے۔ لہٰذا مشورے میں صاحبِ علم کی رائے کو بے علم کی رائے پر ترجیح دینی چاہیے۔

۲۷ - اَلْعِلْمُ نِعْمَ دَلِيْلٍ -

علم اچھا رہنما ہے۔ یعنی سعادت و نیک بختی تک لے جانے والا ہے۔

۲۸ - اَلْعِلْمُ قَائِدُ الْحِلْمِ -

علم حلم کا قائد ہے۔ یعنی حلم کا باعث بنتا ہے۔

۲۹ - اَلْعِلْمُ اَفْضَلُ هِدَايَةٍ -

علم سب سے اچھا رہنما ہے یا مطلب تک پہنچانے والا ہے۔

۳۰ - اَلْعِلْمُ اَصْلُ الْحِلْمِ والحلم فرعه -

علم حلم کی جڑ ہے اور حلم اس کی شاخ ہے۔

۳۱ - اَلْعِلْمُ اَشْرَفُ هِدَايَةٍ -

علم سب سے برتر ہدایت ہے۔

۳۲ - اَلْعِلْمُ قَاتِلُ الْجَهْلِ -

علم جہالت کو مٹا دیتا ہے۔

۳۳ - اَلْعِلْمُ دَاعِيْ الْفَهْمِ -

علم، فہم کو دعوت دینے والا ہے۔ یعنی عالم ہمیشہ تحصیلِ علم میں لگا رہتا ہے جیسا کہ بعض احادیث میں آتا ہے کہ دو حریص کبھی سیر نہیں ہوتے: ایک دُنیا کا طالب، دُوسرا علم کا طالب۔

۳۴ - اَلْعِلْمُ لَا يَنْتَهِيْ -

علم کی انتہا نہیں۔

۳۵۔ اَلْعِلْمُ کَثِیْرٌ وَالْعَمَلُ قَلِیْلٌ۔

علم کثیر ہے اور عمل قلیل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عمل کے ساتھ علم کم ہے اور وہ علم جو کار آمد ہے عمل کے ساتھ ہوتا ہے اور بغیر عمل علم کسی کام نہیں آتا۔

۳۶۔ اَلْعِلْمُ کَنْزٌ عَظِیْمٌ لَا یَفْنٰی۔

علم ایک ایسا عظیم خزانہ ہے جو خرچ کرنے سے ختم نہیں ہوتا بلکہ زیادہ ہوتا ہے۔

۳۷۔ اَلْعِلْمُ رُشْدٌ لِمَنْ عَمِلَ بِہٖ۔

علم اس کے لیے ایک رُشد ہے جو اس پر عمل کرتا ہے

۳۸۔ اَلْعِلْمُ کُلُّہٗ حُجَّۃٌ اِلَّا مَا عُمِلَ بِہَا۔

علم سب کا سب حجت ہے مگر وہ جس پر عمل کیا جاتا ہے۔

۳۹۔ اَلْعِلْمُ جَمَالٌ لَا یَخْفٰی وَنَسِیْبٌ لَا یَجْفٰی۔

علم ایک ایسا حُسن ہے جو پوشیدہ نہیں رہتا اور ایسا اپنا ہے جو قربت کے تعلق کو قطع نہیں کرتا۔ اس کو "خویش" کہنا برسبیلِ مجاز ہے اور جمال خُلق و خلق کے حُسن کا نام ہے۔

۴۰۔ اَلْعِلْمُ زَیْنُ الْاَغْنِیَآءِ وَغِنَی الْفُقَرَآءِ۔

علم اُمرا کی زینت ہے اور فقرا کے لیے امارت ہے۔

۴۱۔ اَلْعِلْمُ یَھْدِیْ اِلَی الْحَقِّ۔

علم حق کی طرف ہدایت کرتا ہے، یعنی حق تک پہنچاتا ہے یا راہنمائی کرتا ہے۔

۴۲۔ اَلْعِلْمُ مِصْبَاحُ الْعَقْلِ وَیَنْبُوْعُ الْفَضْلِ۔

علم عقل کا چراغ ہے اور مرتبہ کی بلندی کا چشمہ ہے۔

۴۳۔ اَلْعِلْمُ بِلَا عَمَلٍ وَبَالٌ۔

بغیر عمل کے علم وبال ہے۔ اور وبال کا معنی سختی ہے۔ یعنی علم بغیر عمل اس امر کا باعث ہوگا کہ ایسے شخص پر سختی کی جائے اور اس کے گناہ گراں ہو جائیں۔

۴۴۔ اَلْعِلْمُ اَحَدُ الْحَیَاتَیْنِ۔

علم دو زندگیوں میں سے ایک ہے۔ ایک حقیقی زندگی ہوتی ہے اور دوسرے علم بھی زندگی کا درجہ رکھتا ہے اگرچہ عالم کی وفات کے بعد ہو۔

۴۵۔ اَلْعِلْمُ اَفْضَلُ الْاُنِیْسَیْنِ۔

علم ان دو رفیقوں میں سے افضل ہے جن سے انسان محبت کرتا ہے۔ ان میں سے ایک علم ہوتا ہے اور دوسرا ہر رفیق۔

۴۶۔ اَلْعِلْمُ اَفْضَلُ الْجَمَالَیْنِ۔

علم دو جمالوں میں سے افضل ہوتا ہے۔ یعنی دوسری تمام خوبیوں سے یا ہر اس جمال سے جس کے ساتھ اس کا وزن کیا جاتا ہے۔ اور جمال خُلق و خَلق کے حُسن سے عبارت ہوتا ہے۔

۴۷۔ اَلْعِلْمُ بِاللّٰہِ اَفْضَلُ الْعِلْمَیْنِ۔

اللہ کے ساتھ علم دو علموں میں سے افضل ہے۔ دو میں سے ایک اسی معنیٰ میں مستعمل ہے جو پہلے فقروں میں مذکور ہوا ہے۔

۴۸۔ اَلْعِلْمُ وِرَاثَۃٌ کَرِیْمَۃٌ وَنِعْمَۃٌ عَمِیْمَۃٌ۔

علم ایک گرانبہا وراثت ہے کیونکہ جو صاحبِ علم ہوتا ہے، درحقیقت اس نے انبیاؑ، اولیاؒ اور تمام علماؒ سے وراثت پائی ہے۔

۴۹۔ اَلْعِلْمُ یُنْجِیْ من الارتباكِ فِی الْحَیْرَۃِ۔

علم حیرانی میں ڈوب جانے سے نجات دیتا ہے۔

۵۰۔ اَلْعِلْمُ یَدُلُّ عَلَی الْعَقْلِ فَمَنْ عَلِمَ عَقَلَ۔

علم عقل پر دلالت کرتا ہے پس جو کوئی علم رکھتا ہے عقل بھی رکھتا ہے۔

۵۱۔ اَلْعِلْمُ ثَمَرَۃُ الْحِکْمَۃِ وَالصَّوَابُ مِنْ فُرُوْعِھَا۔

علم حکمت کا ثمر ہے اور صواب یعنی راست روی کا ۔ یا راست گوئی اس کی شاخیں ہیں۔

۵۲۔ اَلْعِلْمُ مُحْیِی النَّفْسِ وَمُنِیْرُ الْعَقْلِ وَمُمِیْتُ الْجَھْلِ۔

علم نفس کو زندہ کرنے والا ہے اس اعتبار سے کہ جاہل مُردہ کے حکم میں شمار ہوتا ہے، اور عقل کو روشن کرنے والا ہے، اور جہالت کو ختم کرنے والا ہے۔

۵۳۔ اَلْعِلْمُ اَفْضَلُ شَرَفٍ مَنْ لَا قَدِیْمَ لَہٗ۔

علم اس کے لیے افضل شرف ہے جس کے لیے پہلے سے (کوئی شرف) نہ ہو۔

۵۴۔ اَلْعِلْمُ اَکْثَرُ مِنْ اَنْ یُّحَاطَ بِہٖ فَخُذُوْا مِنْ کُلِّ عِلْمٍ اَحْسَنَہٗ۔

علم اتنا وسیع ہے کہ اس کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا اور نہ تمام علم حاصل کیا جا سکتا ہے۔ پس ہر علم کا بہترین حصّہ لے لو۔ یعنی اتنی مقدار جو نہایت ضروری ہو اور اس کا فائدہ بھی زیادہ ہو۔

۵۵۔ اَلْعِلْمُ حَاکِمٌ وَالْمَالُ مَحْکُوْمٌ عَلَیْہِ۔

علم حاکم ہے اور مال اس کا محکوم ہے۔

۵۶۔ اَلْعِلْمُ یُرْشِدُکَ اِلٰی مَا اَمَرَکَ اللّٰہُ بِہٖ وَالزُّھْدُ یُسَھِّلُ لَکَ الطَّرِیْقَ اِلَیْہِ۔

جس کا اللہ تعالیٰ نے تجھے حکم دیا ہے، علم اس کی جانب تیری رہنمائی کرتا ہے اور زُہد و ترکِ دنیا تیرے لیے اس طرف جانے والے راستے کو آسان اور ہموار کرتا ہے۔

۵۷۔ اَلْعِلْمُ خَیْرٌ مِّنَ الْمَالِ ، اَلْعِلْمُ یَحْرُسُكَ وَ اَنْتَ تَحْرُسُ الْمَالَ ۔

علم مال سے بہتر ہے ، علم تیری حفاظت کرتا ہے ، لیکن مال کی تُو حفاظت کرتا ہے۔

۵۸۔ اَلْعِلْمُ مَقْرُوْنٌ بِالْعَمَلِ فَمَنْ عَلِمَ عَمِلَ ۔

علم ، عمل کے ساتھ ہوتا ہے ، پس جو عالم ہوجاتا ہے وہ عمل بھی کرتا ہے۔

۵۹۔ اَلْعِلْمُ یَهْتِفُ بِالْعَمَلِ فَاِنْ اَجَابَهٗ وَ اِلَّا ارْتَحَلَ ۔

علم عمل کو آواز دیتا ہے ۔ اگر اس نے اس پر کان دھرا اور اس کے پاس چلا گیا تو خوب ، ورنہ علم بھی اس کے پاس سے رخصت ہوجاتا ہے ۔

۶۰۔ اَلْعِلْمُ یُرْشِدُكَ وَ الْعَمَلُ یُبَلِّغُ بِكَ الْغَایَةَ ۔

علم تجھے راہ دکھاتا ہے اور عمل منتہائے مقصود تک پہنچاتا ہے ۔

۶۱۔ اَلْعِلْمُ اَوَّلُ دَلِیْلٍ وَ الْمَعْرِفَةُ اٰخِرُ نِهَایَةٍ ۔

علم پہلا رہنما ہے اور معرفت یعنی خدا شناسی آخری حد ہے ۔

۶۲۔ اَلْعِلْمُ عِلْمَانِ مَطْبُوْعٌ وَ مَسْمُوْعٌ وَلَا یَنْفَعُ الْمَطْبُوْعُ اِذَا لَمْ یَكُ مَسْمُوْعٌ ۔

علم دو ہیں ، مطبوع اور مسموع ۔ مطبوع اس وقت تک فائدہ نہیں دیتا جب تک مسموع نہ ہو ۔ مطبوع سے مراد ایسا علم ہے جو طبیعت اور سلیقہ سے حاصل کیا جاسکتا ہے اور اس کا سراغ لگایا جاسکتا ہے ۔ مثلاً علومِ عربیت ۔ اور مسموع سے مراد یہ ہے کہ اسے پیغمبر یا امام سے بالواسطہ طور پر سُننا چاہیئے ۔ مثلاً علومِ شرعیہ ۔ ظاہر ہے کہ علومِ شرعیہ مطلوب نہ ہوتے تو علومِ مطبوعہ کا کوئی فائدہ نہ ہوتا کیونکہ ان کا فائدہ یہ ہے کہ وہ علومِ مسموعہ (شرعیہ) کے کام آئیں ۔

اقتباسات نہج البلاغہ

سیّد عبداللہ یٰسین حسنی

تعارفِ کتاب حاجی سیّد علی نقی ایرانی اپنی شرح نہج البلاغہ (مطبوعہ تہران ۱۳۶۹ھ) کے جزء پنجم کے دیباچے میں کتاب کی مدح میں لکھتے ہیں؛

عصارہ گفتار پیغمبران و بیان کنندہ اسرار حقائق قرآن کریم و نجات دہندہ گمراہان و گرفتاران است. خونریزی و تبہ کاری ستم گری و دورو ئی خودخواہی بدبختی از جہانیان دور نمی شود ۔ آشتی، آسائش ، دادگری، یگانگی، نیک بختی درجہان پائیدار نمی گردد مگر بہ پیروی گفتار و کردار امیر المومنین (علیہ السلام) کہ نمونہ از آنرا سید شریف (علیہ الرحمۃ) درکتاب مقدس نہج البلاغہ گرد آوردہ وچوں در آں از آنچہ مربوط بزندگی و آسائش بشر است چیزے فروگزار نشدہ ۔ بزرگواری و نیک بختی عمل کنندہ را ضامن است ۔ ایں گفتار استوار روی پایہ ہائے علم و عقل بودہ لاف وگزاف نیست ...... ہرکہ طالب خیر و نیکوئی و آسائش و خوشی است بایستی نہج البلاغہ را سرمشق قرار دہد۔

مفہوم: کلام انبیاءؑ کا نچوڑ ، قرآن کریم کے حقائق و اسرار کو بیان کرنے والی ، گم راہوں اور گرفتاروں کو نجات دینے والی کتاب ہے۔ خوں ریزی، تباہی، ظلم ، منافقت ، خودغرضی اور بدبختی دنیا والوں سے دُور نہیں ہو سکتی۔ دوستی ، آسائش، انصاف، اتفاق اور نیک بختی دنیا میں پائیدار نہیں ہوسکتی ۔ مگر امیر المومنین (علیہ السلام) کی گفتار و کردار کی پیروی سے ۔ جس کا نمونہ سید شریف رضی (علیہ الرحمۃ) نے مقدس کتاب نہج البلاغہ میں فراہم کیا ہے اور چونکہ اس میں انسانی زندگی اور آسائش بشر کے متعلق کوئی بات چھوڑی نہیں گئی ۔ اس لیے وُہ اپنے عامل کی بزرگی اور نیک بختی کی ضامن ہے ——— یہ پختہ کلام علم و عقل کے اعلیٰ مراتب پر فائز ہے ، لغو و بیہودہ نہیں ہے .... جو شخص خیر و نیکی اور آسائش و خوشی کا طالب ہے اُسے چاہیے کہ نہج البلاغہ کو اپنا دستور العمل بنائے۔

حمد و نعت میں شہادت دیتا ہُوں کہ اس کی ذاتِ برتر و اعلیٰ کے سوا اور کوئی خدا نہیں ہے ۔ ہم جب تک زندہ ہیں اسی کی ذات سے متمسک ہیں ۔ ایمان کی تکمیل اس کے بغیر ہو نہیں سکتی ۔ اور میں شہادت دیتا ہُوں کہ محمدؐ خدا کے بندے

اقتباس عربی	نہج البلاغہ عربی مصری مطبعۃ الرحمانیہ
اقتباس اردو	نیرنگِ فصاحت ترجمہ نہج البلاغہ اردو
مترجم	سیّد ذاکر حسین صاحب اثنا عشری مطبوعہ مطبع یوسفی دہلی

اور اُس کے رسول ہیں اور پروردگارِ عالم نے انھیں ایسے دین کے ساتھ بھیجا ہے جو مشہور و معروف ہے انہیں معجزات اور شریعت عطا ہوئے۔ وہ کتابِ مسطور لے کر آئے اور نور بلند اور ضیاءِ درخشندہ۔ وہ اس امر کے ساتھ تشریف لائے جو حق و باطل میں فرق کرنے والا ہے۔

ان کی تشریف آوری کی علّت غائی کیا تھی؛ شبہاتِ باطلہ کا ازالہ کرنا، منکرین کے سامنے بیّن اور واضح دلیلیں پیش کرنا، خداوند عالم کی نشانیوں سے ڈرانا اور آنے والے نتائج و عواقب سے خبردار کرنا۔

زمانۂ بعثت جس وقت آپ مبعوث ہوئے اُس وقت یہ کیفیت تھی کہ انسانی گروہ فتنہ و فساد میں مشغول تھا اور دین و شریعت کی رسّی قطع ہوگئی تھی۔ اصل (دین) میں ہزاروں اختلافات تھے اور احکامِ دین بالکل پراگندہ ہو رہے تھے۔ کفر سے نکلنے کی راہیں سخت و تنگ و سکڑی ہوئی تھیں۔ رہائی کا چشمہ نگاہوں سے غائب تھا اور روشن ضمیر بالکل گمنام (مفقود) تھے۔ اندھاپن اور جہالت اطرافِ عالم میں شائع تھیں۔ خدا کی نافرمانیوں پر عملدرآمد تھا۔ شیطان کی نصرتیں دل و جان سے کی جا رہی تھیں اور ایمان بالکل مخذول تھا چھوڑ دیا گیا تھا، اس کے ستون گر چکے تھے، اس کی روشن اور چمکدار راہیں ہٹ چکی تھیں، شیطان کی اطاعت کا دم بھرا جا رہا تھا، شیطانی راستے اختیار کر لیے گئے تھے اور سب کے سب اسی کی آماجگاہوں میں چلے آ رہے تھے اس شیطانی لشکر کے سبب سے ابلیسی جھنڈے گڑے ہوئے تھے اور اسی خبیث کے پھریرے ہواہیں اُڑ رہے تھے۔ (اُردو صفحہ ۱۰۔ عربی صفحہ ۳۱)

خدارسیدہ ہونے کے کام پروردگار حق سُبحانہٗ کا تقرب ڈھونڈنے والے جس چیز کو اپنے تقرب کا وسیلہ بناتے ہیں۔ ان وسائل میں سے سب سے افضل امور یہ ہیں؛ خدا اور رسولؐ پر ایمان لانا، جہاد فی سبیل اللہ۔ کیونکہ جہاد رکنِ اعلاءِ اسلام اور کلمۂ خلاصی ہے۔ اور ایمان انسان کی فطرت میں داخل کیا گیا ہے۔ نماز کا قایم کرنا، یہ رکنِ اعظم ملت و دین ہے۔ زکوٰۃ کا ادا کرنا، یہ فریضہ واجبہ ہے۔ ماہِ رمضان کے روزے رکھنا۔ یہ عذابِ خداوندی کے لیے سپر ہے۔ خانہ کعبہ کا حج و عمرہ بجا لانا۔ کیونکہ یہ فقر و فاقہ کو دُور کرتے ہیں۔ گناہوں کو محو کر دیتے ہیں۔ صلۂ رحم بجا لانا، کیونکہ اس سے مال زیادہ ہوتا ہے۔ مرگ میں تاخیر ہوتی ہے۔ پوشیدہ صدقہ دینا، یہ گناہوں کو ڈھانک لیتا ہے۔ علانیہ صدقہ دینا، بُری حالت کی موت کو دُور کرتا ہے۔ خلقت کے ساتھ احسان و نیکی کرنا۔ یہ ذلت و خواری میں مبتلا ہونے سے بچاتا ہے۔ (اُردو صفحہ ۱۲۳ ۔ عربی صفحہ ۲۲۳)

ایمان

ایمان اصلی و عارضی ایمان کی دو قسمیں ہیں:
ایک تو وہ جو قلب میں راسخ اور ثابت ہو۔
دُوسرا ایمان وہ ہے جسے ایک وقتِ معلوم تک عاریتاً قلب و سینہ کے درمیان رکھ لیا جائے۔ (اردو صفحہ ۴، ۲۔ عربی صفحہ ۱۷)

ایمان کے تین رکن آپ (علیؑ) سے ایمان کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ معرفتِ قلب، اقرار باللسان اور عمل بالارکان کا نام ہے۔ (اردو صفحہ ۲۰۲، ۴۔ عربی صفحہ ۴/۱۹۴)

اوصافِ ایمان حضرت سے دریافت کیا گیا کہ ایمان کے اوصاف بیان کیجئے۔ فرمایا کہ ایمان چار ستونوں پر قائم ہے ۔ اور چار ستون یہ ہیں ؛

(۱) صبر (۲) یقین (۳) عدل (۴) جہاد

اب صبر کی چار شاخیں ہیں ؛

(۱) شوق (۲) خوف (۳) زُہد و تقویٰ (۴) انتظار

جو شخص جنّت کا مشتاق ہوا اُس نے لذاتِ دنیا کو فراموش کر دیا ۔ جو آتش دوزخ سے ڈرا اس نے محرمات سے دُوری کی ۔ جس نے مالِ دنیا سے پرہیز کیا مصیبتیں اس پر آسان ہوگئیں ۔ اور جس شخص نے موت کا انتظار کیا اس نے کارِ خیر کی بجا آوری میں عجلت کی ۔

یقین کی بھی چار شاخیں ہیں ؛

۱۔ عقل کی بینائی ۲۔ حکمت کی تاویل و تفسیر ۳۔ آزمائش سے نصیحت حاصل کرنا اور ۴۔ طریقۂ اوّلین پر چلنا ۔

جس شخص نے اپنی عقل کو روشن کیا حکمت اس کے واسطے ظاہر ہوگئی ۔ اس کا علم و عمل مکمل ہوگیا ۔

جس شخص کے واسطے حکمت ظاہر ہُوئی اس نے اپنی آزمائش کو پہچان لیا (سمجھ لیا کہ دار الامتحان میں ہو) اور اس سبب سے گویا وہ انبیاءِ اوّلین کے زمرہ میں شامل ہوگیا ۔

عدل کے بھی چار شعبے ہیں ؛

۱۔ عقل میں پیر جانا ۔

۲۔ علم کی تہ کو پہنچ جانا ۔

۳۔ حکم کو روشن کرنا ۔

۴۔ حلم اور بُردباری کو قائم رکھنا ۔

پس جس شخص نے عقل و فہم سے کام لیا اس نے علم کی تہ کو پا لیا ۔ جس نے علم کی تہ کو پا لیا اس نے شریعت کے موافق حکم صادر کر دیا ۔ اور جس نے حلم اختیار کیا وہ اپنے کام میں کوئی تقصیر نہیں کرے گا ، اور لوگوں میں رہ کر اس طرح زندگی بسر کرے گا کہ سبھی اس کے مداح ہوں گے ۔

جہاد کی بھی چار قسمیں ہیں ؛

۱۔ امر بالمعروف

۲۔ نہی عن المنکر

۳۔ مقامِ راستی میں راست گوئی سے کام لینا ۔

۴۔ فاسقوں کو دشمن سمجھنا ۔

جو شخص امر بالمعروف کا حامل ہوا ، اچھی باتوں کا حکم دیا اس نے مسلمانوں کی کمر مضبوط کر دی ۔ جس نے منہیات سے منع کیا اس نے

فاسقین کی ناک زمین پر گھس دی۔ اور جس شخص نے صداقت میں استقامت دکھائی اس نے حکم کو ادا کر دیا جس کا ادا کرنا اس پر واجب تھا۔ جس شخص نے فاسق و فاجر کو دشمن سمجھا اور محض خوشنودیٔ خدا کے لیے ان پر غضب ناک ہُوا تو قیامت کے دن خداوندِ عالم فاسق پر غضب ناک ہوتا ہوا اس شخص پر خوشنودی کی نظر ڈالے گا۔ (اردو صفحہ ۱۴۱ - عربی صفحہ ۱۴۸)

محمد صلعم پروردگارِ عالم نے محمدؐ کو ایک روشن نور، ایک ظاہر بُرہان، ایک واضح دین اور ایک ہدایت کرنے والی کتاب کے ساتھ ظاہر فرمایا۔ خداوندِ عالم نے آپ کو حجتِ کافی، موعظت شافی اور تلافی مافات کرنے والی دعوت کے ساتھ بھیجا۔ آپ کے سبب سے ان راستوں کو ظاہر کر دیا جو نا واقفیت کی حالت میں پڑے ہوئے تھے۔ آپ کے واسطے ان بدعتوں کا قلع قمع کر دیا، جو دینِ الٰہی میں داخل ہو گئی تھیں۔ حق و باطل میں فیصلہ کرنے والے احکامات کو آپ کے سبب آشکارا کر دیا۔ اب جس کسی نے اسلام کے سوا کوئی دوسرا دین طلب کیا اس کی شقاوت ثابت ہو گئی۔ اس کی نجات کے حلقے توڑ دیے گئے۔ اس کی ذلتیں اور خواریاں نہایت عظیم ہو گئیں۔ ایک طویل و دراز ہلاک کرنے والا عذاب اس کا مرجع بن گیا ہے۔ (اردو صفحہ ۱۸۲ - عربی صفحہ ۳۱۵)

دنیا میں ہر طرف فساد برپا تھا اب سُنو! خداوندِ عالم نے محمدؐ کو حق کے ساتھ اس وقت مبعوث فرمایا جب کہ انقطاع (وقتِ موت) دنیا سے قریب ہو گیا تھا اور وہ آخرت (انجام) کی طرف مشرف ہونے کے لیے رُخ کر رہی تھی۔ اس کی زیبائش درخشندگیوں کے بعد تاریک ہو چکی تھیں اور اہلِ دُنیا در و شدت کے پنڈلیوں پر قائم تھے اس کے نرم و نازک فرش درشت اور کُھردرے ہو گئے تھے۔ اس کی مدتوں میں بربادی، اس کی نیستی کی علامتوں کے نزدیک ہونے، اس کی نشانیوں کے مٹ جانے، اس کی بوسیدگی کے اظہار، اس کی درازی کے کوتاہ ہونے کے وقت میں اس کی بندشیں کھلنے ہی کے قریب تھیں۔ پروردگارِ عالم نے آپؐ کو اپنی رسالت پہنچانے والا، آپؐ کی اُمت کے لیے کرامت و رحمت و بہار اور مددگاروں کے لیے باعثِ رفعت و بلندی، آپ کے انصار کے لیے باعثِ شرف قرار دیا۔ (اردو صفحہ ۲۲، عربی صفحہ

قرآن میں پروردگارِ عالم سے ان جماعتوں کی شکایت کرتا ہُوں جو جہالت و نادانی کی زندگی بسر کر کے گمراہی اور ضلالت کی حالت میں مر جاتے ہیں۔ ان لوگوں میں اس سے زیادہ ترکوئی امر نا روا تر نہیں ہے کہ کلام اللہ کی کما حقہٗ تلاوت اور تفسیر کی جائے۔ کسی جنس کی خریداری اس سے بڑھ کر نہیں ہے کہ کلامِ خدا کی تعریف کی جائے۔ کوئی شے اس سے بیش بہا نہیں کہ کلامِ خدا کے مقامات کو تبدیل کر دیا جائے اور کوئی رسم اس سے زیادہ بیش بہا نہیں ہے کہ کلامِ خدا کی اپنی ہوا و ہوس کے مطابق تفسیر کی جائے۔ ان لوگوں کے نزدیک نیکی اور احسان سے زیادہ کوئی امر ناشائستہ نہیں ہے اور نہ قبح و برائی سے زیادہ کوئی امر مستحسن سمجھا جاتا ہے۔ (اردو صفحہ ۲۵ - عربی صفحہ ۶۱)

مجموعۂ عجائب و غرائب کیا ایسا تو نہیں کہ پروردگارِ عالم نے اسلام کو تمام و کمال طریقہ سے نازل کیا۔ مگر رسولؐ خدا اس کی تبلیغ باحسنِ وجوہ کرنے سے قاصر رہے؟ قسم خدا کی پروردگارِ عالم فرماتا ہے بے شک یہ کتاب، کتابِ خدا ہے۔ ظاہر میں نہایت خوب ہے، خوش آیند ہے اور اس کا باطن نہایت عمیق اور گہرا ہے۔ اس کے عجائب و غرائب نہ فنا ہونے والے ہیں نہ ناقص ہیں۔ تاریکیوں کے پردے اسی کتاب کی مدد سے اُٹھ سکتے ہیں۔ (اردو صفحہ ۲۶ عربی صفحہ ۶۲)

افضل ترین حدیث تم قرآن کا علم حاصل کرو کیونکہ افضل ترین حدیث یہی ہے۔ اس میں غور و فکر کرو۔ کیونکہ یہ قرآن پژمردہ قلوب کے لیے بادِ بہاری کا کام دیتا ہے۔ اپنے مرض ظلم و جہل کے لیے اسی قرآن کے نور سے شفا طلب کرو کیونکہ یہ سینوں کو شفا دینے والا ہے۔ اس کی عمدہ طریقوں سے تلاوت کرو۔ اسے سمجھو اور اس سے نصیحتیں سیکھو۔ قرآن سب قصوں سے زیادہ نفع دینے والا ہے۔ (اردو صفحہ ۱۲۳۔ عربی صفحہ ۲۳۲)

بولنے والی کتاب خدا کی کتاب تمہارے درمیان ہے۔ وہ ایسی بولنے والی ہے کہ کبھی اس کی زبان نہیں تھکتی۔ وہ ایسا مکان ہے کہ اس کے ارکان منہدم نہیں ہوتے۔ وہ ایسی غالب ہے کہ اس کے دوست اور مددگار کبھی مغلوب نہیں ہوتے۔ (اردو صفحہ ۱۴۸۔ عربی صفحہ ۲۷۰)

قرآن سراپا حکمت ہے اور اس کی آیتیں ایک دوسرے کی تفسیر و تصدیق ہیں یہ جو کچھ بیان کیا بمنزلہ حکمت ہے اور ایسی حکمت ہے کہ مُردہ قلوب کو جلا دے اور کور آنکھوں کو روشن کر دے۔ یہ حکمت بہرے کانوں کو شنوا کر دیتی ہے اور یہ تشنگانِ علم کو سیراب کرنے والی ہے۔ اس حکمت میں دنیا سے بے نیاز ہو جانے کے جوہر ہیں اور یہی عذابِ آخرت سے سلامتی بخشنے والی ہے۔ وہ حکمت کیا ہے؟ وہ کتاب اللہ ہے جس کے سبب سے امرِ حق پر تمہاری قوتِ ناطقہ رواں ہوتی ہے۔ تم اس کی وجہ سے امرِ حق کو سُنتے ہو اور اس کتاب کے بعض مقام بعض کے مفسر ہیں، ایک دُوسرے کی تصدیق کرنے والے ہیں۔ وہ احکام و معارفِ الٰہی میں مختلف نہیں اور وُہ اپنے پیرو کو خداوندِ عالم سے جُدا نہیں کرتے۔ (اردو صفحہ ۱۴۹۔ عربی صفحہ ۲۷۱)

خدا کی تجلّی قرآن میں دیکھو اس مرسلؐ برحق کو قرآن عطا کیا جس نے اس کے اعجاز ظاہر کئے۔ اس کی حقیقت کو محکم اور استوار کر دیا تاکہ جاہل بندے اپنے پروردگار کو پہچانیں۔ منکرینِ وجودِ باری اور دہریہ اس کے وجود کا اقرار کریں اور اعتقاد رکھنے والوں کے دلوں میں اس کی ہستی کا نقشہ قائم ہو جائے۔ وُہ خدا جو ہر ایک نقص و عیب سے مبرا و منزّہ ہے۔ اپنی کتاب کے ذریعے اپنے بندوں پر ظاہر اور آشکارا ہوا بغیر اس بات کے کہ اس کو ظاہری آنکھوں سے دیکھ سکیں۔ ہاں! اس نے قرآن کے ذریعے سے بھی تجلّی دکھا کر اپنی قدرتیں دکھا دیں۔ (اردو صفحہ ۱۵۹۔ عربی صفحہ ۲۸۴)

راہِ نجات، جنّت کی کُنجی تمہیں لازم ہے کہ کتاب اللہ کو اپنا شعار بناؤ کیونکہ یہ حبل المتین ہے۔ ایک روشن اور ظاہر نمود ہے، نفع پہنچانے والی شفا ہے، پیاس کو بجھانے والی اور سیراب کرنے والی ہے۔ اس سے تمسک کرنے والا لغزشوں اور خطاؤں سے دُور ہے۔ جو اس سے ربط پیدا کرے اس کے لیے نجات ہے۔ اس میں کوئی کجی نہیں جس کو سیدھا کیا جائے۔ اس میں کوئی انحراف نہیں جس سے منہ پھیرا جائے۔ اس کا کثرت سے زبانوں پر جاری اور کانوں میں داخل ہونا (تلاوت و سماعت) اسے کہنہ نہیں کرتا۔ جو اس کا معتقد ہوا۔ وہ صادق ہے۔ جس نے اس پر عمل کیا اس نے جنت کی طرف سبقت کی۔ (اردو صفحہ ۱۶۴۔ عربی صفحہ ۳۰۳)

قرآن میں سب ہے وُہ ایسا نور اپنے ہمراہ لایا جس کے ساتھ اقتدا کی جاتی ہے اور جسے قرآن کہتے ہیں۔ اب تم اس

قرآن سے گویائی طلب کرتے ہو۔ وہ (ہماری طرح) بولنے والا نہیں۔ لیکن میں تمہیں اس کے احکام سے خبردار کرتا ہوں۔ آگاہ رہو، اس میں آیندہ واقعات کا علم ہے۔ گزرے ہوئے لوگوں کے حالات ہیں۔ اس میں تمہارے درد کی دوا۔ تمہارے امور کا انتظام۔ یہ سب باتیں ہیں۔ (اردو صفحہ ۱۷۷۔ عربی صفحہ ۳۰۸)

کتاب ناطق اور شقی ازلی پروردگارِ عالم نے ہدایت کرنے والے رسولؐ کو کتابِ ناطق (قرآن) اور امر قایم (دین) کے ساتھ مبعوث فرمایا۔ اس سے تجاوز کرنے سے کوئی شخص ہلاک نہیں ہوتا۔ مگر وہ شخص جس کی استعداد ہلاکت انتہا درجہ کو پہنچ گئی ہو۔ (اردو ص ۱۹۴۔ عربی صفحہ ۲۳۶)

ناصح صادق، ہادیِ کامل تم سمجھ لو کہ یہ قرآن ایسا ناصح ہے کہ جس میں ذرا بھی خیانت کی بُو نہیں ہے۔ یہ ایسا ہادی ہے کہ ہرگز گمراہ نہیں کرتا۔ یہ ایسا خبر دینے والا ہے کہ کبھی جھُوٹ نہیں بولتا۔ کوئی شخص قرآن کا جلیس نہیں مگر یہ کہ وہ ایسی حالت میں اُٹھے کہ یا تو اس کے کمال میں زیادتی ہو گئی ہو یا نقص آگیا ہو۔ زیادتی تو ہدایت کی وجہ سے ہوتی ہے اور نقص اندھے پن سے۔

ہر درد کی دوا، ہر مرض کی شفا جان لو کہ علم قرآن حاصل کرنے کے بعد پھر انسان کو کسی علم کی احتیاج نہیں اور نہ کوئی شخص علمِ قرآن حاصل کرنے سے قبل تحصیلِ علوم سے مستغنیٰ ہو سکتا ہے۔ تم اپنے دردوں کے لیے اسی سے شفا طلب کرو اور اپنے نادانی آمیز اقوال سے بچنے کے لیے اسی قرآن سے مدد مانگو۔ اس میں بڑے بڑے امراض کی دوا ہے وہ درد کیا ہے؟ وُہ ہے کفر، نفاق، ضلالت اور گمراہی۔ تم اسی قرآن کے خدا سے سوال کرو اور نہایت محبّت کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔ مگر تم اس کے وسیلے سے خلقِ خدا سے سوال نہ کرو۔ کیونکہ یہ قرآن ایسی چیز ہے جس کے علم کے وسیلے سے بندے اپنے خدا کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

شافع برحق خُوب جان لو کہ قرآن ایسا شفاعت کرنے والا ہے جو شفاعت کردہ شدہ ہے وہ کہنے والا ہے کہ اس کے قول کی تصدیق کی جا چکی ہے اور بروزِ قیامت جس شخص کی اس قرآن نے شفاعت کی تو اس کی شفاعت اس کے بارے میں قبول کی جائے گی۔ جس شخص کی نادانیوں اور جہالتوں کو بروزِ قیامت اس نے ظاہر کیا، تو بیشک اس شخص کے ضرر پہنچانے پر اس کی تصدیق کی جائے گی۔ سُن لو! قیامت کے دن ایک منادی یہ ندا کرے گا: آگاہ و خبردار ہو جاؤ کہ ہر ایک زراعت کرنے والا اپنی زراعت کے حساب اور اعمال کے انجام میں گرفتار ہے۔ مگر زراعت قرآن اس سے مستثنیٰ ہے۔ اب تم اس قرآن کے کاشت کار اور اسی کے متابعت کرنے والے بن جاؤ۔ اس سے اپنے پروردگار کے وجود پر دلیلیں قایم کرو۔ اپنے نفسوں کے لیے اس سے نصیحت حاصل کرو۔ اپنی رائے اور اپنے اجتہادات کو اس کے ساتھ قائم کرو۔ اس کے بارے میں اپنی ہوا و ہوس کو بالکل جنس ناقص خیال کرو۔

ایمان، عمل، صبر، زہد بندگانِ خدا! عمل کرو، عمل کرو۔ پھر اپنے انجام کو سوچو، اپنی عاقبت کا خیال کرو۔ راستی طلب کرو۔ ایتہاالناس! صبر، صبر۔ زہد، زہد۔ خوب جان لو تمہارا ایک منتہی ہے۔

تم اس کی طرف منتہی ہو جاؤ۔ بالتحقیق پروردگارِ عالم نے کسی شخص کو اس قرآن کی مانند نصیحت نہیں کی۔ یہ خدا کی حبل المتین ہے۔ یہ نہایت با امن راستہ ہے۔ پژمردہ دلوں کی بہاریں اسی میں ہیں۔ یہ علم و معرفت کا سرچشمہ ہے۔ آئینۂ دل کی جلا اس کے کسی دوسری چیز سے ہو ہی نہیں سکتی ہے۔ (اردو صفحہ ۲۰۱۔ عربی صفحہ ۳۴۴)

کتاب ناطق کی تشریح

قرآن (معروف کا) حکم کرنے والا ہے، منکرات سے منع کرنے والا ہے (بلحاظ زبان) خاموش ہے (برائے بیان حجت الٰہی) ناطق ہے۔ خلق اللہ کے لیے حجت ہے۔ ان سے اس کا اقرار و عہد لیا گیا ہے۔ لوگوں کے نفوس اس کے بدلے گروی رکھے ہوئے ہیں۔ اگر وہ اس عہد پر قائم نہ رہیں گے تو انھیں عذاب نصیب ہوگا۔ اس نے معارفِ قرآنی کو تمام کر دیا۔ اس دین کو جو اس (قرآن) سے منسوب ہے۔ گرامی قدر سمجھا اور ایسی حالت میں پیغمبر کی روح قبض فرمائی جب کہ ہدایتِ قرآنی کے احکام کو خلق اللہ تک پہنچانے سے فارغ ہو چکے تھے۔ اب تم انہیں اوصاف بزرگی کے ساتھ خدا کو جن کے ساتھ خود اس نے اپنے نفس کو یاد کیا ہے۔ خدا کو مانو۔

دین میں راز نہیں اسلام ظاہر ہے

اس نے اپنے دین میں سے کوئی شے پوشیدہ نہیں رکھی۔ نہ کوئی شے ایسی چھوڑی ہے جس سے وہ راضی ہو یا اسے مکروہ سمجھے۔ مگر یہ کہ اس کے واسطے ایک ظاہر نشان مقرر کر دیا ہے اور ایک محکم نشانی مقرر فرما دی ہے۔ جو یا تو مکروہات سے باز رکھتی ہے یا اس کی مرضی کی طرف بندوں کو بلاتی ہے۔ پس اس کی رضا، اس کا غضب ہر زمانہ میں ایک ہی اصول پر رہے گا۔ (اردو صفحہ ۲۱۴۔ عربی صفحہ ۳۶۸)

فضائل و اوصاف بے شمار

پھر آپ پر ایک کتاب نازل کی جو ایک نور ہے۔ جس کے چراغ گل نہیں ہو سکتے۔ وہ ایک چراغ ہے جس کا بھڑکنا موقوف نہیں ہوتا۔ ایک سمندر ہے جس کی تہ نہیں ملتی۔ ایک رستہ ہے جس پر چلنے والا گمراہ نہیں ہوتا۔ ایک شعاع ہے جس کی روشنی تاریک نہیں ہوتی۔ ایک فرقان ہے جس کی دلیلوں کی چنگاریاں بجھا نہیں سکتیں۔ وہ ایک ایسی بنیاد ہے جس کے ارکان منہدم نہیں ہو سکتے۔ ایک شفا ہے جس کو امراض کا خوف نہیں ہوتا۔ وہ ایک ایسا غلبہ ہے جس کے انصار مغلوب نہیں ہوتے۔ وہ ایک ایسا حق ہے جس کے مددگار کبھی معزول نہیں ہو سکتے۔ وہ معدن ایمان اور وسط ایمان ہے۔ اس میں علم کے چشمے ہیں، علم کے دریا ہیں۔ عدل و انصاف کے باغ ہیں۔ حوض ہیں۔ وہ اسلام کی بنیاد ہے۔ اس میں حق کی سیرگاہیں ہیں اور سبزہ زار ہیں۔ ایک ایسا بحر ہے کہ پانی نکالنے والے خالی نہیں کر سکتے۔ ایسے چشمے ہیں کہ کھینچنے والے اس میں سے ایک قطرہ کم نہیں کر سکتے۔ پنگھٹ ہیں کہ وارد ہونے والے جنہیں نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ منزلیں ہیں جن کے رستے مسافروں کو گمراہ نہیں کرتے۔ خداوند عالم نے اسے علماء کے لیے تسلی قلب۔ فقہاء کے واسطے بہار، صلحاء کی خاطر نہایت عمدہ مقصد بنا دیا۔ وہ ایک ایسی دوا ہے جس کے بعد کوئی درد باقی نہیں رہتا۔ ایک ایسا نور ہے جس کے ساتھ ظلمت کا ذرہ بھر ملاپ نہیں ہے۔ پروردگار عالم نے اسے ایک ایسی زنجیر قرار دیا ہے جس کے حلقے نہایت مضبوط ہیں ایک ایسی پناہ گاہ بنایا جس کی چوٹی بلند ہے۔ جو شخص اس کی طرف متوجہ ہو یا جو شخص اس میں داخل ہو، جو اس کی پیروی کرے۔ جو شخص اسے اپنے اوپر لازم کرے۔ جو شخص اس کے ساتھ کلام کرے۔ جو شخص اس کے ساتھ دعویٰ کرے۔ ان سب شخصوں

کے لیے عزت ہے۔ سلامتی دینے والا ہے۔ راہ نما ہے ——— برہان ہے۔ زبردست شاہد ہے۔ جو شخص اسے اٹھائے، اس کا اُٹھانے والا ہے۔ جو شخص اس کی مدد سے مجادلہ جنگ کرے اس کے لیے فتح و فیروزی ہے۔ جو اس پر عمل کرے اس کے واسطے سہارا ہے۔ جو شخص فہم و فراست کے ساتھ نظر رکھے اس کی خاطر ایک نشانی ہے۔ جو پہن لے اس کے لیے ڈھال ہے۔ جو شخص اس کی بات کان میں رکھے اس کے واسطے علم ہے۔ روایت کرنے والے کے لیے حدیث ہے، اور حاکم کے لیے زبردست حکم ہے۔ (اردو صفحہ ۲۲۸ ۔ عربی صفحہ ۴۲۸)

جماعت کی تعریف، تفرقہ کی مذمت اے ایمان والو! تم خدا، رسول اور اولی الامر کی اطاعت کرو، جو تم میں سے ہو۔ اگر کسی حکم میں تم تنازعہ کرو تو خدا اور رسول کی طرف رجوع کرو۔ اب یہ بھی سمجھ لو کہ رسول کی طرف رجوع کرنا یہی ہے کہ اس کی جمع کرنے والی، نہ کہ تفرقہ پیدا کرنے والی سنت کو اختیار کیا جائے۔ (اردو صفحہ ۳۵۱ ۔ عربی صفحہ ۹۶)

قرآن بس ہے پیغمبر برحق نے تمہارے درمیان اس چیز کو چھوڑا جسے انبیاء سلف اپنی اُمتوں میں چھوڑتے چلے آئے ہیں کیونکہ کسی نبی نے اپنی اُمت کو حیران اور واضح و صاف راستہ بتانے والی نشانی کے بغیر نہیں چھوڑا۔ اب تمہارے درمیان جو چیز چھوڑی گئی ہے وہ خدا کی کتاب (قرآن) ہے جو حلال و حرام اور فرائض و فضائل کو بیان کرنے والی ہے اور ناسخ و منسوخ اور وہ احکام جن میں رخصت ہے اور جن میں پابندی ہے اور احکام خاص و عام ماضی کے عبرت انگیز واقعات و ہر قسم کی مثالیں اور وہ کلمات جو مقید ہیں اور جو مقید نہیں ہیں۔ وہ آیات محکمات جن کے معنی میں کسی قسم کا اشتباہ نہیں اور وہ متشابہات جن کے معنی میں شبہ دامن گیر ہوتا ہے۔ ان تمام باتوں کو خدا نے کتاب میں ظاہر کر دیا ہے۔ یہ کتاب اپنے مجمل کی تفسیر کرنے والی ہے۔ عوارض و مشکلات کی مظہر ہے۔ یہ کتاب ان آیات کو لیے ہوئے ہے جن کا جاننا خدا نے بندوں پر واجب کر دیا ہے۔ جن کے بارے میں وہ لاعلمی کا عذر نہیں کر سکتے۔ اس کتاب میں محض ایسی آیات و حروف مقطعات بھی ہیں جن کے نہ جاننے میں خدا نے بندوں کو وسعت دی ہے۔ (اردو صفحہ ۷ ۔ عربی صفحہ ۲۹)

قرآن کو مضبوطی سے پکڑو قرآن کی حبل المتین سے تمسک کر۔ اس سے نصیحت حاصل کر۔ اس کے حلال کو حلال سمجھ اور حرام کو حرام۔ اور جو حق پر گزر گئے ان کی تصدیق کر۔ (اردو صفحہ ۳۷۱ ۔ عربی ۲ صفحہ ۱۳۳)

ایک ایک لفظ سند ہے عہد نامہ جو اہلِ یمن اور بنی ربیعہ کے درمیان حضرت علیؓ نے اپنے ہاتھ سے تحریر فرمایا اور ہشام ابن کلبی کے خط سے نقل کیا گیا۔

یہ وہ عہد نامہ ہے جس پہ اہلِ یمن اور بنی ربیعہ کے حاضرین جو شہر میں موجود ہیں اور غائبین جو صحرا میں مقیم ہیں۔ عہد اس بات پر ہے کہ یہ لوگ کتاب اللہ پر قائم رہیں گے۔ لوگوں کو اس کی طرف بلائیں گے۔ اسی کے ساتھ حکم کریں گے۔ جو شخص اس کی طرف بلائے گا اس کے ساتھ حکم دے گا۔ اس کی آواز کو قبول کریں گے۔ کسی قیمت پر اس کو فروخت نہ کریں گے (مال دنیا کے لالچ میں اس سے تجاوز نہ کریں گے) اس کی تبدیلی پر راضی نہ ہوں گے۔

یہ بھی عہد ہے کہ اس شخص کو دُور کرنے کے لیے جو کتاب اللہ کی مخالفت کرے گا یا اسے ترک کرے گا آپس کی متفقہ قوت سے کام لیں گے وقت پر ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔ ان کی دعوت متحد ہے۔ کسی عتاب کرنے والے کے عتاب اور غضب کرنے والے کے غضب، کسی جماعت کے دُوسری جماعت کے ذلیل کرنے، کسی گروہ کے دوسرے گروہ کو گالی دینے کے سبب اپنے اس عہد کو نہ توڑیں گے۔ ان دونوں گروہوں کے حاضر و غائب، عالم و جاہل اس عہد پر متفق ہو گئے ہیں اور اس عہد کے سبب خدا کا عہد و میثاق بھی ان پر واجب ہو گیا ہے۔ بیشک عہدِ خداوندی کے بارے میں ضرور بازپرس ہو گی۔ اس عہد نامہ کو علی ابن ابی طالب نے تحریر کیا۔ (اردو صفحہ ۲۷۹، عربی ۲ صفحہ ۱۴۰)

حقیقت یہ ہے کہ ہم نے مردوں کو حاکم نہیں کیا بلکہ ہم نے قرآن کو حاکم مقرر کیا۔ اور یہ قرآن میان دفتین[ل] ایک خط نوشتہ شدہ ہے یہ اپنی زبان (گوشت کی زبان) سے گویا نہیں ہوتا، اس لیے ترجمان اور مترجم کا ہونا ضروری ہے۔ اس کی طرف سے مرد ہی بولتے ہیں اور جب قوم نے ہم کو اس کی طرف بلایا کہ قرآن کو ہمارے درمیان قایم کر دے تو ہم وہ گروہ نہیں بنیں گے جو قرآن سے روگردانی کرتا ہو۔ خدا نے فرمایا ہے:

فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ۔ اگر تم کسی شے میں تنازعہ کرو تو اللہ و رسول کی طرف رجوع کرو۔ (اردو صفحہ ۱۴۰۔ عربی صفحہ ۲۵۸)

اسلام

بے شک پروردگارِ عالم نے تمہیں اسلام کے لیے مخصوص کیا ہے اور اسی کے لیے تم سے خلوص کا طالب ہے۔ اسلام سلامتی اور نجات کا نام ہے۔ کرامتوں کا جمع کرنے والا۔ پروردگار نے اس کے طریقہ کو برگزیدہ کیا۔ علم ظاہری و احکام باطنی کے سبب اس کی دلیلوں اور برہانوں کو ظاہر کر دیا۔ اس کے آثار نہایت عمدہ ہیں جو فانی نہ ہوں گے۔ اس کے عجائبات کبھی منقضی نہ ہوں گے۔ اس اسلام پر نعمتوں کی بارش برستی رہی ہے۔ اس میں تاریکیوں کو دُور کرنے والے روشن چراغ ہیں۔ اسلام کی کنجیوں کے بغیر سعادت کا دروازہ و خزانہ کُھل نہیں سکتا اور نہ اس کے چراغوں کے بغیر جہالت کی تاریکیوں کے پردے اُٹھ سکتے ہیں۔ پروردگارِ عالم اسے اس لیے عرصۂ شہود میں لایا ہے کہ منہیات و محارم سے پرہیز کیا جائے اور اس لیے مہیا کیا ہے کہ اس کے محل رعایت کی رعایت مدِنظر رکھی جائے۔ اس میں طالبانِ شفا کے لیے شفا ہے اور خواستگارانِ کفایت کے لیے کفایت ہے۔ (اردو صفحہ ۱۶۷۔ عربی صفحہ ۲۹۵)

اسلام ظاہر ہے

اس نے اپنے دین میں سے کوئی شے تم پر پوشیدہ نہیں رکھی نہ کوئی شے ایسی چھوڑی ہے، جس سے وہ راضی ہو یا اسے مکروہ سمجھے۔ مگر یہ کہ اس کے واسطے ایک ظاہر نشان مقرر کر دیا ہے اور ایک محکم نشانی مقرر کر دی ہے۔ یا تو مکروہات سے باز رکھتی ہے یا اس کی مرضی کی طرف بندوں کو بلاتی ہے۔ پس اس کی رضا اس کی مرضی۔

[ل] دفتی: پٹھا، گتہ، وہ موٹا کاغذ جو کتاب کے دونوں طرف اس کی حفاظت کے لیے لگاتے ہیں۔

ایک اصول اسلام ہر زمانہ میں ایک ہی اصول پر رہے گا۔ یاد رکھو! وہ چیزیں جو تم سے پہلے تھیں اور جنہیں خداوندِ عالم دشمن سمجھتا ہے۔ اگر تم کرو گے تو وہ تم سے کبھی راضی نہ ہوگا اور وہ امور جو تم سے پہلے جنہیں وہ درست رکھتا ہے اگر تم ان پر عمل کروگے تو پھر کبھی غضب ناک نہ ہوگا۔ (اردو صفحہ ۴۱۲ - عربی صفحہ ۳۶۸)

خدا کا دین یہ دین اسلام خدا کا دین ہے۔ اور ایسا دین ہے جسے خدا نے اپنے نفس کے لیے منتخب کر لیا ہے۔ پھر اسلام کو ایسا بنایا کہ جس شخص نے اس سے تمسک کیا اس کے لیے ذلت و خواری نہیں۔ اسلام کیا ہے؟ ایسے ستون میں جن کی جڑوں کو اس خالق اکبر نے طریقۂ حق پر پیوست کر دیا ہے۔ ان کی بنیادیں ان کے واسطے قائم اور ثابت کر دی ہیں۔ ایسا چشمہ ہے جس سے ہزاروں چشمے نکل رہے ہیں۔ ایسا چراغ ہے جس کی لو برافروختہ ہے۔ ایسا منارہ ہے کہ جو اپنے مسافروں کے لیے مقتدا بنا ہوا ہے۔ ایسی نشانیاں ہیں کہ ان کے سبب ان کے وسعتوں کا قصد کیا جاتا ہے۔

ہمہ صفت دین ایسی سیراب گاہ ہے جو تشنہ کاموں کو سیراب کر دیتی ہے۔ پروردگار نے اسلام کو اپنی خوشنودی کا منتہا اپنے ستون کی بلندی اور اپنی اطاعت کا رکن قرار دیا ہے۔ یہ دین اسلام خداوندِ عالم کے نزدیک مضبوط ارکان والا، بلند بنیاد والا، روشن دلیل، آتش شعلہ آور، صاحبِ قہر و غلبہ بادشاہ، بلند نشانی اور گرد و غبار سے پاک ہے۔ تم اس سے مشرف ہو جاؤ، سعادت حاصل کرو، اس کا اتباع کرو، اس کے حقوق کو بجا لاؤ، اور اسے اس کے مقام ہی میں رکھو۔ (اردو صفحہ ۲۲۷ - عربی صفحہ ۴۳۶)

اصحابِ رسولؐ میں نے اصحابِ محمدؐ کو دیکھا ہے۔ تم میں کوئی بھی تو ان کا نظیر نہیں۔ وہ اس حالت میں صبح کرتے تھے اُلجھے ہوئے بال، غبار آلود چہرے۔ ان کی راتیں قیام و سجود میں گزرتی تھیں۔ کبھی ان کی پیشانیاں صرفِ سجود ہوتی تھیں کبھی رخسارے۔ وہ اپنی معاد (آخرت) کے ذکر سے ایسے ہو جاتے تھے جیسے بقیہ تنۂ خرما۔ سجدوں کے طول سے ان کی آنکھوں کے درمیان (پیشانیوں پر) گھٹے پڑ پڑ کے ایسے ہو گئے تھے جیسے بکریوں کے زانو۔ جب خدا کا ذکر ہوتا تو ان کی آنکھیں اشکبار ہوتی ہوئی جیب و دامن تربتر کر دیتی تھیں۔ وہ خوفِ عقوبت اور اجر و ثواب سے ایسے لرزتے تھے جیسے سخت آندھی سے درخت جنبش کیا کرتے ہیں۔ (اردو صفحہ ۱۰۵ - عربی صفحہ ۲۰۶)

یادِ رفتگاں اب تو میری دعا یہ ہے اور میں یہی چاہتا ہوں کہ پروردگارِ عالم میرے اور تمہارے درمیان تفرقہ اندازی کر دے۔ مجھے اُن لوگوں سے ملا دے (یعنی دوسرے عالم میں) جو تم سے زیادہ میرے لیے موافق و مناسب ہیں۔ اور وہ ایسے لوگ تھے قسم خدا کی اُن کی راہیں اور تدبیریں عمدہ و مبارک تھیں۔ وہ دانشمندانہ اور حکیمانہ بُردباری کے مالک تھے۔ وہ راست گفتار تھے۔ وہ بغاوت و جور و ستم کے ترک کرنے والے تھے گزر گئے حالانکہ ان کے پاؤں طریقۂ اسلام پر مستقیم تھے۔ وہ واضح راہ پر چلے اور ہمیشہ رہنے والی سرائے عقبیٰ میں فتح و فیروزی حاصل کی۔ نیک اور لائق کرامتوں سے فیضیاب ہو گئے۔

(اردو صفحہ ۱۲۳ - عربی صفحہ ۲۴۵)

اصحابِ رسولؐ کہاں ہیں وہ گروہ جنہیں اسلام کی طرف بلایا جاتا تھا اور وہ اسے قبول کر لیتے تھے۔ وہ قرآن کو پڑھتے تھے اور اپنے اعتقادات کو اس کے ساتھ مضبوط کرتے تھے۔ جہاد کے لیے برانگیختہ ہوتے تھے۔ ان کی آنکھیں روتے روتے تباہ ہوگئی تھیں۔ ان کے شکم روزہ رکھتے رکھتے لاغر ہوگئے تھے۔ دُعائیں کرتے کرتے ان کے ہونٹ سُوکھ گئے تھے۔ شب بیداریوں سے ان پر زردیاں چھاگئی تھیں۔ سجدوں کا غبار اُن کے چہروں پر موجود رہتا تھا۔ وہ لوگ میرے بھائی تھے جو چلے گئے۔ (اردو صـ۱۳۵ ۔ عربی صـ۲۵۲)

علیؓ اور عثمانؓ آپ (حضرت علیؓ) خلیفہ ثالث (حضرت عثمانؓ) کے پاس گئے اور فرمایا کہ لوگ میرے پیچھے پیچھے آرہے ہیں اور مجھے اپنے اور آپ کے درمیان سفیر بنا کر بھیجا ہے۔ اب مجھے معلوم نہیں کہ آپ سے کیا کہوں۔ میں اس چیز کو نہیں جانتا جسے آپ نہ جانتے ہوں اور نہ کسی ایسی چیز میں راہنمائی کرسکتا ہوں جسے آپ نہ پہچانتے ہوں۔ جو کچھ میں جانتا ہوں وہ آپ بھی جانتے ہیں۔ ہم نے آپ سے کسی چیز پر سبقت نہیں کی جس سے آپ کو مطلع کریں۔ ہم آپ سے کسی امر میں جُدا نہیں جسے آپ تک پہنچائیں۔ بے شک جو ہم نے دیکھا یا سنا ہے وہ آپ نے بھی دیکھا اور سنا ہے۔ جیسا میں نے رسولؐ کی متابعت کی ہے ویسی ہی آپ نے بھی کی ہے۔ ابن خطاب (عمرؓ) ابن ابی قحافہ (ابوبکرؓ) عملِ حق میں آپ سے اولیٰ اور افضل ہیں۔ رسول اللہؐ سے از روئے وصلت و خویشی بہ نسبت ان دونوں کے آپ قریب تر ہیں۔ آپ دامادئ پیغمبرؐ کے اس مرتبہ پر پہنچے ہوئے ہیں جس تک یہ دونوں نہیں پہنچے۔ اب آپ اپنے نفس کے بارے میں ڈریئے اور خوفِ خدا سے کام لیجئے۔ قسم خدا کی آپ ایسے نہیں ہیں کہ اندھے پن سے آپ کو بینا کیا جائے اور جہالت سے آپ کو دانا بنایا جائے۔ آپ امامِ مقتول نہ بنئے۔
(اردو صـ۱۸۷ ۔ عربی صـ۳۲۲)

اگلی امتوں سے عبرت و نصیحت : رازِ عمل وہ عقوبتیں جو بدکرداری اور زشتی اعمال کے باعث تم سے پہلی امتوں پر نازل ہوئی ہیں۔ ان سے ڈرو۔ یاد کرو! خیر و شر میں ان کی کیا حالتیں تھیں؟ تم حذر کرو اس بات سے کہ ان جیسے ہو جاؤ۔ تم اس امر کو اپنی ذات سے لازم کرلو جس کے سبب سے دشمن ان سے دُور ہوگئے۔ عافیت ان کی طرف جاری ہوئی۔ نعمتیں ان کی مطیع و منقاد ہوئیں۔ تفرقہ سے بچئے، باہم الفت و محبت کو لازم کرلینے، اسی الفت کی ترغیب دینے اور اسی کی وصیت کرنے کے سبب سے کرامت اور بزرگی ان کی جماعت کی رسیوں سے پیوست ہوگئی۔

اس کام سے پرہیز کرو جس نے ان کی پشت کے مُہروں کو توڑ ڈالا۔ دلوں میں کینہ رکھنے، سینوں میں دشمنی اٹھائے رہنے، ایک دوسرے سے (پیٹھ) منہ پھرا لینے اور آپس میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرنے کے سبب سے ان کی قوت ضعیف اور سُست ہوگئی۔ (اردو صفحہ ۲۷۸ ۔ عربی صفحہ ۴۱۰)

خوبیاں اب تم دیکھو کہ اشراف و بزرگانِ قوم کیوں کر آپس میں جمع تھے۔ خواہشیں متفق، دل راستی کی طرف مائل، ہاتھ ایک دوسرے کے معاون اور تلواریں ایک دوسرے کی مددگار تھیں۔ نگاہیں انجام کو دیکھ لیتی تھیں نیتیں

واحد تھیں۔ کیا وہ اطرافِ زمین میں پرورش کنندہ نہ تھے؟ اور کیا وہ اہلِ دنیا کی گردنوں پر حاکم و بادشاہ نہ تھے؟

خرابیاں تم ان امور کو دیکھو جو نتیجۃً واقع ہوئے ہیں جب کہ ان میں فرقہ پرستی ہوگئی۔ الفتیں پراگندہ ہوگئیں۔ دل اور زبانیں مختلف ہوگئیں۔ ایک دوسرے کے مخالف ہوکر ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے۔ جنگ کر کے منتشر ہوگئے۔ پروردگارِ عالم نے اپنی کرامت کا لباس ان پر سے اتار لیا۔ اپنی نعمت کی خوشنودی کو ان سے سلب کر لیا۔ اور ان کی خبروں کے قصّے تم لوگوں میں عبرت کے لیے باقی چھوڑ دیئے تاکہ تم میں عبرت حاصل کرنے والے لوگ عبرت حاصل کریں۔ (اردو ص ۲۸۸ ۔ عربی ص ۲۱۴)

اس نیک طریقہ کو نہ توڑ جس پر اس امت کے اگلے لوگوں نے عمل کیا ہے جس کے سبب سے الفت اور محبّت جمع ہوئی اور جس کے سبب رعیّت کی اصلاح ہوئی۔ (اردو ص ۴۹ ۔ عربی ۲ ص ۹۲)

حضرت علیؓ کا خط معاویہؓ کے نام بے شک مجھ سے اس قوم نے بیعت کی ہے جس نے ابوبکرؓ، عمرؓ اور عثمانؓ سے بیعت کی تھی اور اسی امر پہ بیعت کی جس پر ان سے بیعت کی تھی۔ اب کسی شخص حاضر کو حق نہیں ہے کہ وہ رد کر دے اور نہ شخص غائب کو۔ فی الحقیقت شوریٰ مہاجرین اور انصار کا حق ہے۔ پس جس شخص کے حق میں انہوں نے اجتماع کیا اور اس کو نامزد کر دیا۔ تو ان کا یہ اجتماع خوشنودیِ خدا ہے۔ (اردو ص ۲۹۹ عربی ۲ ص ۸)

حضرت عمرؓ کے حق میں دُعائے خیر فلاں شخص کے شہروں کی آبادی خدا کے لیے ہو کہ جس نے ٹیڑھے کو سیدھا کیا اور علّت کا علاج کیا، فتنے کو پیچھے کیا اور سنّت کو قایم کیا، پاک دامن گیا۔ کم عیب نہایت عمدہ دین میں پہنچا۔ شر سے بالا رہا۔ خدا کے احکام کی پیروی کی کما حقہٗ، تقویٰ کیا۔ رحلت کی تو آپ کے بعد لوگ شاخوں میں بٹ گئے۔ نہ بےخبر کو راستہ سوجھتا تھا، نہ باخبر ہی مطمئن تھے۔ (اردو ص ۲۵۶ ۔ عربی ص ۴۸۵)

مشورہ حضرت علیؓ حضرت عمرؓ بوقت جنگِ فارس دین اسلام کا غالب آنا یا مغلوب ہو جانا کچھ سپاہ کی کثرت و قلت پر منحصر نہیں ہے۔ یہ اسلام اسی خدا کا دین ہے۔ جس نے اس کو تمام ادیان و مذاہب پر غالب کیا ہے اور سپاہ اسلام اس خدا کی فوج ہے جس کی اس نے ہر جگہ مدد و اعانت کی ہے اسے ایک بلند مرتبہ پر پہنچا دیا۔ ان کا آفتاب وہاں طالع ہوگیا جہاں اس کا ہونا لازم تھا۔ ہم اس وعدۂ خداوندی پر کامل یقین رکھتے ہیں۔ بے شک وُہ اپنے وعدوں کا وفا کرنے والا ہے اور وُہ اپنی سپاہ کا مددگار ہے۔

مدارِ قوم دینِ اسلام کے امیر کی حیثیت رشتہ مروارید کی سی ہے جو موتیوں کے دانوں کو ایک سلسلہ میں پرو کر باہم پیوست کر دیتا ہے۔ اگر یہ رشتہ ٹوٹ جائے تو تمام دانے بکھر جائیں گے۔ پھر کبھی اجتماعِ کامل نصیب نہ ہوگا۔ آج کے دن عرب قلیل ہیں۔ لیکن اسلام کی شوکت انہیں کثیر ظاہر کر رہی ہے۔ یہ اپنے اجتماع کی وجہ سے یقیناً دشمن پر غالب ہوں گے۔ آج آپ عمرؓ، ان کے قطبِ[1] آسیا (مدار) بن جائیے اور آسیائے جنگ کو گروہِ عرب کے ساتھ گردش دیجئے اور اپنے سوا کسی اور کے ماتحت بنا کر لڑائی کی آنچ سے انہیں گرم کیجئے کیونکہ اگر آپ مدینے سے باہر چلے گئے تو

---

[1] دُھری، لوہے کی وہ کیلی جس پر چکّی چلتی ہے۔

عرب کے قبیلے اطراف واکناف سے ٹوٹ پڑیں گے۔ (اردو صفحہ ۱۵۸۔ عربی صفحہ ۲۸۳)

حضرت عمرؓ کے ساتھ خیر خواہی اور مشورہ بوقت جنگِ روم اگر آپ خود دشمن کی طرف کوچ کریں، اور خدانخواستہ مغلوب ومخذول (شکست خوردہ) ہو جائیں تو یہ سمجھ لیجئے کہ پھر مسلمان کو ان کے اقصائے بلاد تک پناہ نہ ملے گی اور آپ کے بعد کوئی ایسا مرجع نہ ہوگا جس کی طرف وہ رجوع کریں۔ لہٰذا دشمنوں کی طرف اس شخص کو بھیجئے جو آزمودہ کار ہو۔ اور اس کے ماتحت ایسے لوگوں کو روانہ کریں جو جنگ میں سختی کے متحمل ہوں۔ اپنے سردار کی نصیحت قبول کریں۔ اگر خدا نے غلبہ نصیب کیا تب تو وہی چیز ہے جسے آپ پسند فرماتے ہیں اور اس کے خلاف ظہور میں آیا تو اس حالت میں بھی آپ لوگوں کے ملجا اور مسلمانوں کے مرجع ہوں گے۔ (اردو صفحہ ۱۵۰۔ عربی صفحہ ۲۷۲)

امام کی نیت ہر ایک ذلیل میرے نزدیک عزیز ہے یہاں تک کہ میں اس کے غیر سے اس کا حق لے لوں۔ اور ہر ایک قوی میرے نزدیک ضعیف ہے۔ حتیٰ کہ مستحق کا حق اسے دلایا جائے۔ ہم رضائے الٰہی کے پابند ہو کر اس کی قضا پر راضی ہیں اور ہم نے اس کے حکم کو تسلیم کیا ہے۔ اس حکم کو اسی سے مختص سمجھتے ہیں۔ قسم خدا کی میں وہ پہلا شخص ہوں جس نے رسولؐ کی تصدیق کی ہے اور اب میں کیوں کر اس کا اول تکذیب کرنے والا ہو سکتا ہوں۔ جب میں نے اپنے امور پر نظر کی تو ناگاہ میں نے دیکھا کہ میرا خدا کے لیے اطاعت کرنا اپنے لیے بیعت لینے سے مقدم ہے۔ (اردو صفحہ ۴۵۔ عربی صفحہ ۹۴)

تسلیم خلافتِ عثمانؓ جب لوگوں نے عثمانؓ سے بیعت کی اس وقت حضرت نے فرمایا تم خوب جانتے ہو کہ میں اپنے غیر سے زیادہ حکومت وبیعت کے لیے قابل اور مستحق ہوں۔ اور خدا کی قسم میں تسلیم کرتا ہوں جب تک امور مسلمین سلامت رہیں اور اس کے امام خلافت میں کھلم کھلا ظلم وجور نہ ہو۔ گو خاص مجھ پر ظلم وستم ہوتے رہیں[۱] (اردو صفحہ ۹۶۔ عربی صفحہ ۱۳۵)

امام کے دل میں اجماع کا احترام قتلِ عثمانؓ کے بعد لوگوں نے حضرت سے بیعت کا ارادہ کیا۔ اس وقت آپ نے فرمایا: مجھے چھوڑ دو اور میرے غیر سے التماس کرو۔ ہم ایک ایسے امر کی طرف رُخ کر رہے ہیں۔ جس کی مختلف صورتیں ہیں جس کے مختلف رنگ ہیں دل اس کے لیے ابھی قائم نہیں ہوئے۔ اور عقلیں اور رائیں اس پر ثابت وقائم نہیں ہوتیں۔ ابرِ جہالت آفاق پر چھایا ہوا ہے۔ شاہراہیں متروک اور ناپید ہو گئی ہیں اور خوب جان لو کہ اگر میں تمہاری التماس کو قبول کروں اور تم سے بیعت لے لوں تو تمہیں احکامِ خداوندی کا متحمل بناؤں گا نہ لومۃ لائم اور نہ کسی اطاعت کرنے والے کی اطاعت کا مجھے خوف ہوگا اور تم مجھے ترک کر دو گے تو اس وقت میں تمہیں میں سے ایک فرد ہوں۔

---

[۱] اس فقرے سے ظلم وستم کا وقوع ثابت نہیں بلکہ یہ وثوق وتائید ظاہر ہے کہ اگر بالفرض میری ذات کی حق تلفی بھی ہو تو میں خلافتِ عثمانؓ کو اس وجہ سے تسلیم کرتا ہوں کہ اس میں عامۃ المسلمین کی سلامتی اور بھلائی کی توقع ہے۔ چنانچہ اگلی سطور میں ہماری اس تعبیر کی تائید پائی جاتی ہے۔

اور اُمید ہے کہ تم سے زیادہ سننے والا اور مطیع بن جاؤں۔ اس شخص کے لیے جسے تم اپنے امر کا والی قرار دو۔ اور میں تمہارے لیے بحیثیت ایک وزیر کے اس سے بہتر ہوں کہ تمہارا امیر بنوں۔ (اردو ص۹ ۔ عربی ص۱۹۰)

احترامِ کثرتِ رائے مجھے اپنی جان کی قسم اگر اس وقت امامت و خلافت منعقد نہ ہو۔ جب تک عامۃ الناس (تمام لوگ) اس پر حاضر و متفق نہ ہو جائیں۔ تو پھر تحققِ امامت (انتخاب خلیفہ) کی کوئی سبیل ہی نہیں ہو سکتی۔ کسی طرح امامت (خلافت) متحقق (طے) ہو ہی نہیں سکتی۔

لیکن انعقادِ امامت (انتخاب خلیفہ و امیر و امام) کرنے والے اس پر بھی حکم لگا دیتے (فیصلہ کر دیتے) ہیں۔ جو (وقت پر) حاضر نہ ہو۔ اب نہ تو اس شخص کے لیے اپنے قول سے پلٹنے کے لیے موقع ہے جو حاضر تھا اور نہ شخص غائب اپنا مختار ہے۔ جو اپنے لیے دُوسرا راستہ اختیار کرے۔ (اردو ص۱۹۷ ۔ عربی ص۳۴۲)

اختلاف کی جڑ ہماری اس ملاقات کی ابتدا جو اہلِ شام کے ساتھ واقع ہُوئی۔ کیا تھی؟ حالانکہ یہ بات ظاہر ہے کہ ہمارا اور اُن کا خدا ایک، رسولؐ ایک، دعوتِ اسلام ایک۔ ہم خدا پر ایمان لانے، اس کے رسولؐ کی تصدیق کرنے میں کسی فضیلت کے خواہاں نہیں ہیں۔ نہ وُہ ہم پر فضل و زیادتی کے طلبگار ہیں۔ ہماری حالتیں بالکل یکساں ہیں مگر وہ ابتدا اس طرح ہُوئی کہ خونِ عثمانؓ میں اختلاف ہو گیا۔ (اردو ص۳۶۳ ۔ عربی ۲ ص۱۱۹)

قسم خدا کی نہ مجھے خلافت کی رغبت تھی نہ اس ولایت کی لیکن تم لوگوں نے مجھے اس کی طرف دعوت دی اور مجھے اس پر سوار کر دیا۔ (اردو ص۴۳ ۔ عربی ص۴۴۵)

شیرِ خدا کی شان قسم خدا کی اگر تمام عرب بھی مجھ سے لڑنے پر آمادہ ہو جائے تو میں کبھی پشت نہ دکھاؤں گا۔ (اردو ص۳۲۹ ۔ عربی ص۵۰)

آپ کے ساتھی اب میں نے دیکھا اور چاروں طرف نظر کی تو سوائے اہلِ بیت کے کسی کو اپنا معین و مددگار نہ پایا۔ پس میں نے ان کی موت سے بخل کیا اور ان کے قتل ہو جانے پر راضی نہ ہوا۔ (اردو ص۳۲ ۔ عربی ص۲)

نامراد و خود غرض ساتھی اے مردصورتو! احالاں کہ تم میں مرد کوئی نہیں ہے۔ اے خوابہائے اطفال! اے عقولِ زنانِ حجرہ نشیں! تم نے بے سمجھے میری بیعت نہیں کی۔ میرا تمہارا معاملہ واحد نہیں ہے کیونکہ میں تو محض خدا کے لیے تمہاری اعانت کا ارادہ کرتا ہوں اور تم اپنے نفسوں کے منافع کے واسطے میری مدد کا ارادہ کرتے ہو۔ (اردو ص۱۵۰ ۔ عربی ص۲۶۳)

متفرق ساتھی خوب جان لو کہ تم ہجرت کے بعد بیابانِ جہالت کے ساکن ہو گئے اور دوست ہونے کے بعد گروہ گروہ اور فرقہ فرقہ ہو گئے۔ تم فقط اسلام کے نام سے تعلق رکھتے ہو، ایمان سے تمہیں کوئی واسطہ نہیں۔ تم کہتے ہو کہ عار کے مقابلہ میں نار قبول ہے۔ اور بے شک اگر تم غیر اسلام کی طرف پناہ لے جاؤ

اور کفار تم سے جنگ کریں، تو پھر نہ جبرائیل و میکائیل تمہاری مدد کر سکتے ہیں اور نہ مہاجرین و انصار، سوائے اس کے کہ تم اپنی شمشیروں کو فتنہ کر لو، حتیٰ کہ پروردگارِ عالم تمہارے درمیان حکم صادر کرے۔ (اردو صفحہ ۹۵ ۔ عربی صفحہ ۲۱۴)

نافرمان ساتھی اے حاضرین! جن کے بدن ان سے غائب ہیں، جن کی عقلیں مختلف ہیں، جن کی خواہشوں نے ان کے بزرگوں کو فتنہ و فساد میں مبتلا کر دیا ہے۔ تمہارا صاحب، تمہارا امیر اطاعتِ خداوندی کی طرف بلاتا ہے اور تم نافرمانی اور عصیان سے کام لیتے ہو۔ (اردو صفحہ ۱۰۴ ۔ عربی صفحہ ۲۰۵)

ایک اور دس قسم خدا کی میں اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ معاویہ مجھ سے اس طریقے سے تمہارا معاوضہ کرے، کہ دینار کے عوض درہم مجھے میسر ہو اور دس مرد تم میں سے لے لے اور ایک شامی مرد میرے حوالے کر دے۔ (اردو صفحہ ۱۰۱ ۔ عربی صفحہ ۲۰۵)

صُمٌّ بُکمٌ عُمیٌ ساتھی اے اہلِ کوفہ! میں تو تمہاری تین خصلتوں کے سبب سے مصیبت میں مبتلا ہوں۔ تم صاحبِ گوش ہو۔ مگر امرِ حق کے سننے سے تمہارے کان بہرے ہیں۔ سچی بات میں تمہاری زبان گنگ ہے حالانکہ تم زبان رکھتے ہو۔ تم آنکھوں والے ہو مگر اندھے بنے ہو۔ نہ تم دوستوں کی ملاقات کے وقت مردانِ راست گو اور آزاد ہو اور نہ بلاؤں کے وقت موثق اور معتمد بھائی۔ تمہارے ہاتھ خاک آلود ہو جائیں (تم ہمیشہ فقیر رہو) تمہاری مثال ان اونٹوں کی سی ہے جن کے ساربان ان سے غائب اور دور ہوں۔ ایک طرف سے جمع ہوتے ہیں تو دوسری طرف سے متفرق ہو جاتے ہیں۔ خدا کی قسم تمہیں عالمِ خیال میں دیکھ رہا ہوں۔ اگر حرب و ضرب کی سختی ہو اور تلوار کی لڑائی گرم ہو جائے تو مقابلہ سے ہٹ جانے والی عورت کی طرح ابن ابی طالب سے علٰحدہ ہو کر پیٹھ دکھا کر بھاگنے والے ہو جاؤ گے۔ (اردو صفحہ ۱۰۴ ۔ عربی صفحہ ۲۰۵)

مایوسیِ امام افسوس جو کچھ تم نے یاد کیا تھا بالکل بھلا دیا۔ جس سے تم کو ڈرایا گیا تھا تم اسی سے اپنے آپ کو امن میں سمجھنے لگے۔ اب تمہاری تدبیر تم سے سرگرداں ہو گئی اور تمہارے امور منتشر اور پراگندہ ہو گئے۔ اب تو میری دعا ہے اور میں اسی بات کو پسند کرتا ہوں کہ پروردگارِ عالم میرے اور تمہارے درمیان تفرقہ اندازی کر دے۔ (اردو صفحہ ۱۳۳ ۔ عربی صفحہ ۲۴۳)

جہاد سے جان چرانے والے جب حضرت نے لوگوں کو بلا کر جہاد فی سبیل اللہ کی ترغیب دلائی۔ تو لوگ یہ سن کر تھوڑی دیر کے لیے بالکل خاموش ہو گئے۔ اس وقت آپ نے فرمایا کہ "کیا چیز ہے جس نے تمہیں گونگا بنا دیا؟ تمہاری زبانیں لال ہو گئیں" یہ سن کر ایک جماعت نے کہا: "یا امیر المومنین! اگر آپ جہاد کے لیے روانہ ہوں گے تو ہم بھی آپ کے ساتھ ہوں گے۔" حضرت نے فرمایا کہ "کیا ہو گیا تم تو سعادت و رشاد رت کے لیے بالکل سچائی کی حد سے گزر گئے تم تو کسی مقصد میں بھی راہ یافتہ نہیں ہو۔ کیا یہ بات مناسب حال ہے کہ اس سفر میں میں باہر نکلوں، نہیں نہیں اس سفر میں وہ جائے گا جسے میں پسند کروں۔ خدا کی قسم میرے سفر کرنے کی رائے نہایت

بُری ہے۔ میں تم میں سے کسی کو مصاحبت کے لیے طلب نہ کرتا جب تک بھی باد شمال وجنوب کا اختلاف باقی ہے کیونکہ تم لوگ ناحق کرنے والے ہو، عیب لگانے والے ہو، حق سے منہ پھیرنے والے ہو۔ نہایت ہی ڈرپوک اور بزدل ہو۔ (اردو صفحہ ۱۳۴۔ عربی صفحہ ۲۵۱)

لفظ ائمہ ضلالت مجلسِ شوریٰ میں آپ نے فرمایا: "کہیں ایسا نہ ہو کہ آج کے دن تم اس امر خلافت کو ایسی حالت میں دیکھو کہ اس میں تلواریں کھنچ جائیں۔ عہد شکنی ظہور میں آئے۔ حتیٰ کہ تم میں سے بعض لوگ اہل ضلالت و گمراہی کے امام کہلائیں۔ اہلِ جہالت و نادانی کے پیرو ہو جائیں۔ (اردو صفحہ ۱۵۳۔ عربی صفحہ ۲۷۶)

امام کے ساتھیوں کی تصویر اے میرے حکم کی اطاعت نہ کرنے والو! اور میری دعوت کو قبول نہ کرنے والے گروہ! اگر تمہیں محاربۂ دشمن سے مہلت دی جاتی ہے تو تم لہو ولعب، ہوا و ہوس میں مشغول ہو جاتے ہو۔ اور تمہیں ساتھ لے کر دشمن سے جنگ کی جاتی ہے تو مقابلے میں ضعیف اور سست ہو جاتے ہو۔ اگر لوگ اپنے امام کے پاس جمع ہوں تو تم میں تفرقہ پڑ جاتا ہے اگر مشقت ومحنت کی طرف بلانے والی آواز کو قبول کرتے ہو تو پھر بہت ہی جلد رجعتِ قہقری (پھر جانا) کر جاتے ہو (بددعا) تمہارے دشمن کے لیے کوئی تمہارا مربی باقی نہ رہے۔ وُہ جہاد جو تمہارے ذمہ واجب ہے اس میں نصرت حاصل کرنے کے لیے جس چیز کا تم انتظار کر رہے ہو وہ تمہاری موت و ذلت ہو (یعنی تمہاری ان حرکتوں کا انجام موت اور خواری ہے)

فریقین میں تفاوت قسم خدا کی اگر میرا روز موعود (موت) آجائے اور وہ بے شک ضرور آجائے گا۔ تو وہ ایسی حالت میں میرے اور تمہارے درمیان تفرقہ اندازی کرے گا کہ میں تمہاری مصاحبت کے لیے دشمن ہوں گا اور تمہارے سبب سے کسی قسم کی قوت وشوکت مجھے حاصل نہ ہوگی۔

خدا کے بندو! کیا (تمہارے) دین میں اتنی بندش کی قوت نہیں ہے جو تمہیں ایک جگہ جمع کردے۔ کیا تمہیں اپنے امثال واقران کو دیکھ کر بھی حمیت وغیرت نہیں آتی جو تمہیں تیز وطرار کر سکے۔ کیا یہ مقامِ تعجب نہیں کہ معاویہ نہایت سفید ستم گاروں کو بلاتا ہے اور وہ بغیر کسی قسم کے احسان وانعام وبخشش کے اس کی متابعت کرتے ہیں اور تمہیں احسان وانعام کے ٹکڑوں کی طرف بلا رہا ہوں حالانکہ تم اہلِ اسلام کے خلف ہو۔ معقول انسانوں کی اولاد ہو۔ مگر پھر بھی مجھ سے متفرق ہوتے ہو اور برابر مجھ سے اختلاف کیے جاتے ہو۔ میرا کوئی حکم تمہارے لیے ایسا صادر نہیں ہوتا جو موجبِ خوشنودی ہو۔ اور تم اس پر رضامند ہو جاؤ۔ (اردو صفحہ ۲۰۵۔ عربی صفحہ ۳۵۷)

امام کے ساتھیوں کا نقشہ قسم اس خدا کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے وہ قوم تم پر غلبہ حاصل کرے گی۔ اس لحاظ سے نہیں کہ وہ اولیٰ بالحق اور حق دار ہے بلکہ اس سبب سے کہ وہ قوم اپنے امیر کی نہایت سرعت کے ساتھ اطاعت کرتی ہے اور تم میری دعوتِ حق کو بھی آہستگی کے ساتھ قبول کرتے ہو۔

میں نے تم کو جہاد کے لیے کُوچ کرنے کا حکم دیا، تم نے کُوچ نہ کیا۔ میں نے امرِ حق کو تمہارے کانوں تک پہنچایا تم نے سُنی ان سُنی کر دی۔ میں نے تمہیں آشکارا اور پنہاں طریقوں سے بلایا تم نے جواب بھی نہ دیا۔ میں نے تمہیں نصیحتیں کیں، مگر تم نے قبول ہی نہ کیں۔ تم میرے پاس مثل غائب کے حاضر ہو (تمہاری حاضری و غیر حاضری دونوں برابر ہیں)۔ تم مثل آقا کے بندے ہو (ہو تو بندے مگر مزاج آقا جیسا رکھتے ہو۔ مجھ سے بیعت کر رکھی ہے پھر بھی مجھ ہی پر حکومت کرنا چاہتے ہو) میں کلمات اور نصائح کو تم پر تلاوت کرتا ہوں تم اس سے بھاگتے ہو۔ میں تمہیں اہلِ بغاوت و ضلال کے ساتھ جہاد کی ترغیب و تحریص دیتا ہوں۔ مگر ابھی میرا قول تمام نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ میں تمہیں اولادِ سبا (اس کی اولاد وطن فرقوں میں متفرق ہوگئی تھی) کی مانند متفرق و پراگندہ دیکھتا ہوں۔ تم اپنی مجلسوں کی طرف رجوع کرتے اور ایک دُوسرے کو اپنی نصیحت سے فریب دیتے ہو۔ میں تمہیں صبح کے وقت سیدھا کرتا ہوں اور شام کے وقت پھر ٹیڑھی کمان کی پشت کی مانند ہو کر میرے پاس آتے ہو۔ (اردو ص ۱۰۱ ۔ عربی ص ۲۰۵)

حسب ونسب پر فخر بے جا ہے

آگاہ ہو جاؤ! ڈرو! اور اپنے بزرگوں اور بڑوں کی اطاعت و حکم برداری سے ڈرو! جو اپنے حسب پر تکبر کرتے ہیں اور اپنی نسبی فوقیت پر برتری کے خواہاں ہیں، جو اپنے پروردگار کے کام پر قباحت اور زشتی کو ڈال رہے ہیں، اس کے احکام کو رد کرتے ہیں، اس کے احسانات کی ناشکری کرتے ہیں، اس شے کا انکار کر رہے ہیں جو پروردگارِ عالم نے انھیں عطا کی ہے۔ بے شک یہ لوگ تعصب کی بنیادوں کے قاعدے ہیں۔ ارکانِ فتنہ و فساد کے ستون ہیں اور زمانۂ جاہلیت کی طرح باپ اور دادا پر فخر کرنے والی تلواریں ہیں۔ (اردو ص ۲۸۲ ۔ عربی ص ۴۱۰)

حسب ونسب کام نہ آئے گا، عمل کام آئیں گے

اپنے حسبی و نسبی فخر و مباہات کو چھوڑ! اپنے کبر و بزرگی کو الگ الگ ڈال! اپنی قبر کو یاد کر! یہی تیری گزرگاہ ہے۔ اور یاد رکھ جو کچھ بوئے گا وہی کاٹے گا۔ اور آج کے روز جو کچھ تُو نے ذخیرہ آگے روانہ کر دیا بروزِ قیامت اسی پر وارد ہو گا۔ (اردو ص ۱۶۸ ۔ عربی ص ۲۹۲)

فرقہ بندی کی مذمت

مسلمانوں کا خدا ایک، نبی ایک، کتاب ایک۔ کیا خداوند عالم نے انھیں اختلاف کا حکم دیا ہے؟ (اردو ص ۲۵ ۔ عربی ص ۶۲)

محب مفرط، مبغض مفرط

تحقیق میری شان پر نظر کر کے دو گروہ ہلاک ہوں گے:
ایک تو محب مفرط، جس کو بے اندازہ اور بیجا محبت اسے غیرِ حق کی طرف لے جاتی ہے۔

دوم مبغض مفرط، جس کا میرے ساتھ بڑھا ہوا بغض اسے حق پر قائم نہیں رہنے دیتا۔ میرے بارے میں بہترین لوگ وہ ہیں جو درمیانی راستہ اختیار کر رہے ہیں اور تم بھی اپنے لیے اسی طریقہ کو لازم کر لو۔ اور اس جماعت (سوادِ اعظم) کے ساتھ ہو جاؤ کیونکہ اس گروہ پر خدا کا ہاتھ ہے لہٰذا اس جماعت کی مفارقت سے حذر کرو۔ اس گروہ سے الگ ہو جانا

جو شیطان کا غلام بنا دیتا ہے، جیسا کہ بھیڑ بکری گلہ سے جُدا ہو کر بھیڑیے کا شکار ہو جاتی ہے۔

فرقہ پرستی گردن زدنی ہے آگاہ رہو جو شخص لوگوں کو اس (تفریق کی) خصلت کی طرف بلائے اس کو قتل کر ڈالو۔ اگرچہ میرے اس عمامہ کے نیچے ہی کیوں نہ چھپا ہو۔ اور حکم تو اسی لیے مقرر کیے گئے تھے کہ اس شے کو زندہ کریں جسے قرآن نے زندہ کیا ہے۔ اور اسے مار ڈالیں جس کی موت کا حکم قرآن نے دیا ہے۔ زندہ کرنا یہی تھا کہ قرآن پر متفق ہو جانے اس سے علیحدہ ہو جانا اور افتراق کر لینا ہی موت ہے۔ (اردو صفحہ ۱۴۲ ۔ عربی صفحہ ۲۶۱)

اسلام میں فرقہ بندی نہیں خبردار! تم خود کو دین میں فرقہ بندی سے دُور رکھو کیونکہ بر سرِ حق جماعت جسے تم مکروہ سمجھ رہے ہو بہتر ہے باطل فرقہ بندی سے، جسے تم پسند کرتے ہو۔ بے شک پروردگارِ عالم نے اگلوں اور پچھلوں میں سے کسی (فرقہ پرست) کو بہتری نہیں بخشی۔ (اردو صفحہ ۲۰۳ ۔ عربی صفحہ ۳۵۱)

ارشادات وصیت کرتا ہوں کہ کسی شے کو اس پروردگارِ یکتا کا شریک نہ بنانا، محمدؐ کی سنت کو ضائع نہ کرنا۔ ان دونوں عمودوں کو قایم رکھنا، ان دونوں چراغوں کو روشن کیے رہنا۔ مذمت اور عیب سے تم دور رہو گے جب تک ان دونوں چراغوں سے دُور نہ بھاگو۔ (اردو صفحہ ۱۹۱ ۔ عربی صفحہ ۲۸۶)

اگلوں کو گالیاں دینے والے اپنا عیب تو دیکھ اے بندۂ خدا! کسی گناہ کے سبب کسی کی عیب جوئی نہ کر۔ شاید وہ بخش دیا گیا ہو۔ تو اپنے نفس سے صغیرہ (گناہ) پر بھی بے خوف نہ رہ۔ کیا عجب اسی سبب سے عذاب دیا جاوے۔ بہتر یہی ہے کہ تم میں سے جو شخص کسی کے عیب پر مطلع ہو تو اپنے عیبوں پر نظر کر کے اس کی عیب جوئی سے باز رہے۔

لاکھ کی ایک بات خبردار ہو جاکہ حق و باطل کے درمیان چار انگل کا فرق ہے۔ حضرت سے اس کلام کے معنی پُوچھے گئے تو آپ نے اپنی چار انگلیوں کو آنکھوں اور کانوں کے درمیان رکھا اور فرمایا: باطل تو یہ ہے کہ تو کہے کہ میں نے ایسا سُنا، اور حق یہ ہے کہ تیرا قول ہو کہ میں نے یہ امر بچشم خود دیکھا ہے۔ (اردو صفحہ ۱۵۴۔ عربی صفحہ ۱۷۱) "شنیدہ کے بود مانند دیدہ"

توحید و اخلاص اور احترام مسلمان ہر مسلمان کی عزت و حرمت کو تمام احترامات پر فضیلت دی ہے۔ توحید و اخلاص کے ساتھ مسلمانوں کے حقوق کو وابستہ کر دیا ہے۔ اب مسلمان وہ شخص ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان کو اذیت پہنچانے کو جائز نہیں کیا، مگر جسے خدا نے واجب کیا۔ (اردو صفحہ ۱۹۳۔ عربی صفحہ ۳۳۴)

دوسروں کو چھوڑ، پہلے اپنا عیب دیکھ خوشا حال اس شخص کا جسے اپنے عیب دوسرے لوگوں کے عیب کی طرف نظر کرنے سے منع کر دے۔ اور خوشخبری ہے اس شخص کے لیے جو اپنی خطاؤں پر گریاں ہو اور لوگ اس کی ذات سے راحت و آرام میں رہیں۔ (اردو صفحہ ۲۰۲ ۔ عربی صفحہ ۳۵۲)

اسلامی شرافت اور گالیاں؟ ایک گروہ اہلِ شام کو سب و شتم (گالی گلوچ) کرتا تھا۔ آپ نے یہ خبر سنی تو فرمایا: میں تمہارے لیے اس امر کو برا سمجھتا ہوں کہ تم دشنام دینے والے بن جاؤ۔ (اردو صـ ۲۳۳ - عربی صـ ۲۴۶)

ترکِ دنیا کی مذمّت

آپ سے حضرت..... نے اپنے بھائی عاصم کی شکایت کی کہ اس نے دنیا ترک کر کے گوشہ نشینی اختیار کی ہے۔ آپ نے فرمایا: ہمارے پاس لاؤ۔ جب وقت عاصم حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا:

اے اپنی جان کے دشمن! تجھے خبیث شیطان نے حیران کر رکھا ہے، تُو اپنے اہل و عیال و اولاد پر رحم نہیں کرتا۔ کیا تُو دیکھتا ہے کہ خدا نے طیّباتِ دنیا کو حلال کیا ہے؟ اور اس بات کو بھی سمجھتا ہے کہ تُو ان سے کچھ نہ حاصل کرے۔ تو اس ترکِ دنیا کے باعث پروردگار کے پاس نہایت ذلیل ہے۔ (اردو صـ ۲۳۵ - عربی صـ ۲۴۸)

نماز کی کسوٹی اعمال ہیں وقتِ معیّن پر نماز پڑھ اور جلدی سے فارغ ہونے کے لیے وقت سے پہلے نماز نہ پڑھ۔ نہ کسی امرِ غیر میں مشغول ہونے کے سبب سے نماز میں تاخیر کر۔ اور خوب جان لے کہ تیرے اعمال تیری نماز کے تابع ہیں۔ (اردو صـ ۳۱۳ - عربی ۲ صـ ۳۰)

زندگی برائے بندگی اب تم سمجھ لو کہ ہم اور تم دونوں بندے ہیں۔ دونوں اس پروردگار کے غلام ہیں جس کے سوا کوئی پروردگار نہیں ہے۔ (اردو صـ ۲۴۳ - عربی صـ ۲۶۳)

احادیث کی نسبت رائے ایک سائل نے سوال کیا کہ یا حضرت! یہ جھوٹی اور مختلف حدیثیں جو لوگوں میں مشہور ہیں ان کی نسبت کچھ ارشاد فرمائیے۔ فرمایا کہ لوگوں کے ہاتھوں میں حق ہے، باطل ہے، صدق ہے، کذب ہے اور موہوم ہے۔

جھوٹی حدیثیں بالتحقیق جب آپؐ کے زمانے میں بھی آپؐ پر جھوٹ بولا گیا آپؐ نے اسی وقت خطبہ دیا کہ جو شخص جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ بولے گا تو لازماً اپنا ٹھکانہ جہنّم بنائے گا۔

اقسامِ محدثین اب یہ جان لے کہ حدیث کو تجھ تک پہنچانے والے چار قسم کے لوگ ہیں:

اوّل منافق جو ظاہراً ایمان کو ظاہر کرتا ہے بطور نمائش اسلام کے ساتھ آراستہ ہے۔ گناہ سے پرہیز نہیں کرتا نہ گناہ میں کسی قسم کا ہرج دیکھتا ہے۔ دانستہ رسولِ خدا پر جھوٹ بولتا ہے۔ اب اگر لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ منافق ہے کاذب ہے تو اس کی بات کو قبول نہ کریں۔

دوم وہ ہے جس نے رسولؐ سے کسی بات کو سنا مگر اسے اسی طرح یاد نہ رکھا جیسا کہ رسولِ خدا نے فرمایا تھا۔ اب اس نے اس حدیث کے بیان کرنے میں غلطی کی، مگر دانستہ جھوٹ بولا۔ سنانے اور سننے والوں کو غلطی کا علم ہو جائے

تو اُس حدیث کو ترک کر دیں۔

سوم وہ شخص ہے کہ جس نے رسولِ خدا سے کسی حکم کو سنا مگر پھر اس نے ممانعتی حکم نہیں سنا، یا ممانعت سنی مگر اس کا حکم نہ سُن سکا۔ جب اس ناسخ و منسوخ کا علم ہو جائے تو ویسا عمل کریں۔

چہارم وہ شخص ہے جس نے کبھی رسولِ خدا پر جھوٹ نہیں بولا۔ جیسا سُنا تھا ویسا ہی یاد رکھا۔ ہر بات کو اس کے مقام میں رکھا۔ اس کی روایت مانی جائے۔

یہ ہیں وہ وجوہات جن کے سبب لوگ اختلاف میں پڑے ہوئے ہیں۔ اور یہ ہیں ان کی روایتوں کے مختلف ہو جانے کے اسباب۔ (اردو صلا ۲۳ ۔ عربی صد ۴۹ ۲)

وقتی احکام جناب رسولِ خدا کی ایک حدیث ہے کہ:

"بڑھاپے کی علامت (ریش سفید) کو متغیر کر دو۔ (یعنی خضاب لگاؤ) اور یہود کے مشابہ نہ ہو جاؤ۔"

اس حدیث کے معنی جناب امیر علیہ السلام سے دریافت کیے گئے تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ رسولِ خدا نے یہ فرمان اس وقت نافذ فرمایا تھا جب کہ اہلِ اسلام نہایت قلیل تھے اور اب تو اسلام کا کمر بند (پٹکا) وسیع ہے۔ اس نے اپنے سینے کو زمین پر ٹیک دیا ہے۔ بالکل ثابت اور قایم ہے۔ اب ہر شخص کو اختیار ہے اور ہر ایک اپنے ارادے کا مالک ہے۔ (اردو صد ۳۷۹ ۔ عربی ۲ صد ۱۴۶)

صبر کی تلقین، ماتم کی ممانعت جب آپ (علیؓ) رسولِ خدا کو غسل دے کر کفن پہنانے لگے تو فرمایا کہ میرے ماں باپ آپؐ پر فدا ہوں، بے شک آپ کی وفات سے نبوت، وحی، آسمان کی خبریں منقطع ہو گئیں جو آپ کے غیر کے مرنے سے نہ ہوئی تھیں۔ آپ (اپنی رحلت سے) مصیبت پہنچانے کے لیے مخصوص ہوئے حتیٰ کہ اپنے غیر کی مصیبت سے ہمیں مطمئن کر دیا (یعنی آپ کی وفات کی مصیبت کے مقابلہ میں ساری مصیبتیں بالکل ہیچ ہیں) آپ کی مصیبت ایک عام (ہمہ گیر) مصیبت ہے۔ حتیٰ کہ لوگ آپ کی مصیبت سے یکساں دلگیر ہو رہے ہیں۔

اگر آپ صبر کا حکم نہ دیتے، جزع فزع (آہ و بکا، ماتم اور بین) سے منع نہ فرماتے تو ہم اس مصیبت پر آنسوؤں کا دریا بہا دیتے۔ اس مصیبت کا رنج دائمی ہے۔ (اردو صد ۲۶ ۔ عربی صد ۴۹۱)

امام کی آخری وصیت جب ابنِ ملجم نے سرِ مبارک پر ضرب لگائی تو حضرت (علیؓ) نے دونوں صاحبزادوں (حسنؓ و حسینؓ) کو طلب فرما کر یہ وصیت فرمائی: میں تم دونوں کو (خصوصاً) اور تمام بیٹوں اور اہل و عیال اور جس شخص کو بھی یہ نوشتہ ملے اس کو (عموماً) وصیت کرتا ہوں کہ تقویٰ الٰہی اختیار کرو۔ اپنے دین کے کام کا انتظام کرو۔ آپس میں (تمام مسلمین) صلح و آشتی رکھیں کہ رسولِ خدا نے فرمایا ہے کہ باہمی صلح و صفائی، نماز و روزے سے بھی افضل ہے۔ (اردو صد ۳۴۲ ۔ عربی ۲ صد ۷۹)

اس امّت کے اگلے لوگ اس نیک طریقہ کو نہ توڑ جس پر اس اُمّت کے اگلے لوگوں نے عمل کیا ہے جس کے سبب سے الفت اور محبت جمع ہُوئی اور جس کے سبب رعیت کی اصلاح ہوئی ہے۔
(اردو ص۴۹ - عربی ۲ ص۹۲)

کرّار بن آگاہ رہو کہ درخت صحرائی (جسے پانی کم نصیب ہوتا ہے) کی شاخیں سخت ہوتی ہیں اور باغ کے درختوں (جنھیں ہر وقت پانی سے سینچا جاتا ہے) کی جلد نہایت نازک ہوتی ہے۔ بارانی زمین کی نباتات لکتے لکتے نہایت قوی ہوتی ہیں اور بہت دیر میں مرجھاتی ہیں (ایسا ہی انسان کا حال ہے جس کی غذا سادہ ہوگی کم ہوگی وہ جہاد میں نہایت سخت ہوگا اور ناز و نعم کے پلے ہوئے یُوں ہی دہل کر رہ جائیں گے۔ (اردو ص۳۳۹ - عربی ۲ ص۷۵)

شیعہ سُنّی ملاپ اس موقع پر حضورِ اکرمؐ کی وفات کا مختصر حال لکھ دینا مناسب و ضروری معلوم ہوتا ہے جب حجۃ الوداع (آخری حج رسولؐ) کے بعد آپ نے مکّہ سے مہاجرین و انصار کے ساتھ مدینے کی طرف مراجعت فرمائی۔ راہ میں ایک مقام "خم" پڑا جو جُحفہ سے تین میل پر ہے۔ یہاں ایک تالاب ہے، عربی میں تالاب کو "غدیر" کہتے ہیں۔ اس لیے اس مقام کا نام عام روایتوں میں "غدیر خم" آتا ہے۔ آپ نے یہاں تمام صحابہ کو جمع کر کے ایک مختصر سا خطبہ دیا:

امّا بعد الا ایها الناس فانما انا بشر۔ یوشك ان یاتی رسول ربی فاجیب و انا تارك فیكم الثقلین۔ اولهما كتاب الله۔ فیه الهدٰی والنور۔ فخذوا كتاب الله واستمسكوا به و اهل بیتی اذكركم الله فی اهل بیتی (ثلاثہ مرتبہ عادہا)

یعنی حمد و ثنا کے بعد، اے لوگو! میں بھی بشر ہوں۔ ممکن ہے خدا کا فرشتہ جلد آ جائے اور مجھے قبول کرنا پڑے (یعنی موت) میں تمہارے درمیان دو بھاری چیزیں چھوڑتا ہوں،
ایک خدا کی کتاب، جس کے اندر ہدایت اور روشنی ہے۔ خدا کی کتاب کو مضبوط پکڑو۔
اور دُوسری چیز میرے اہلِ بیت ہیں۔ میں اپنے اہلِ بیت کے بارے میں تمہیں خدا کو یاد دلاتا ہوں۔
(آخری جملے کو آپؐ نے تین بار مکرر فرمایا)

یہ ایک حدیث کی کتاب میں (مناقب علیؓ کی) روایت ہے۔ دُوسری حدیثوں کی کتابوں میں کچھ اور فقرے بھی ہیں جن میں حضرت علیؓ کی منقبت ظاہر کی گئی ہے۔ ان روایتوں میں ایک فقرہ اکثر مشترک ہے:
من كنت مولاه فعلی مولاه۔ اللهم وال من والاه وعاد من عاداه۔ (جس کو میں محبوب ہوں علیؓ بھی اس کو محبوب ہونا چاہیے۔ الٰہی! جو علیؓ سے محبت رکھے تو بھی اس سے محبت رکھ اور جو علیؓ سے عداوت رکھے اس سے تو بھی عداوت رکھ)

آخری حج سے واپسی پر کوئی دو ڈھائی مہینے کے بعد ایک دن ماہِ صفر ۱۱ھ میں آدھی رات کو جنت البقیع

(عام مسلمانوں کا قبرستان) میں تشریف لے گئے۔ وہاں سے جب واپس تشریف لائے تو مزاج ناساز ہوا۔ یہ حضرت میمونہؓ کی باری کا دن تھا اور روز چہارشنبہ تھا۔ پانچ دن تک آپؐ اس حالت میں بھی ازراہِ عدل و انصاف و کرم باری باری ایک ایک بیوی کے حجرہ میں تشریف لے جاتے رہے۔ دوشنبہ کے دن مرض میں شدت ہوئی تو ازواج مطہراتؓ سے اجازت لی کہ حضرت عائشہؓ کے گھر قیام فرمائیں۔ سب سے آخری نماز جو آپؐ نے پڑھائی وہ مغرب کی نماز تھی۔ عشاء کی نماز کا وقت آیا تو دریافت فرمایا کہ نماز ہو چکی؟ لوگوں نے عرض کی کہ سب کو حضورؐ کا انتظار ہے۔ لگن میں پانی بھر کر غسل فرمایا۔ پھر اٹھنا چاہا کہ غش آ گیا۔ اس طرح تین دفعہ پوچھا، تین دفعہ غسل کیا، تین دفعہ غش آیا۔ آخر میں جب افاقہ ہوا تو ارشاد فرمایا کہ ابوبکرؓ نماز پڑھائیں۔ کوئی کہتا ہے سترہؔ نمازیں ابوبکرؓ نے پڑھائیں۔ کوئی کہتا ہے جمعہ، سنیچر، اتوار تین دن نمازیں پڑھائیں تا وفات حضور صلعم۔

وفات سے چار دن پہلے (جمعرات کو) آپ نے فرمایا کہ دوات کاغذ لاؤ۔ میں تمہارے لیے ایک تحریر لکھ دوں جس کے بعد تم گمراہ نہ ہو گے۔ بعض صحابہ نے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا کہ رسول اللہ صلعم کو مرض کی شدت ہے (غلبہ الوجع) اور تمہارے پاس قرآن موجود ہے جو ہمارے لیے کافی ہے۔ اس پر حاضرین میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ بعض نے کہا: اهجر استفهموا ہ (خود آپؐ سے دریافت کر لو) لوگ جب پوچھنے لگے تو آپؐ نے فرمایا: مجھے چھوڑ دو، میں جس مقام میں ہوں وہ اس سے بہتر ہے جس کی طرف تم مجھے بلاتے ہو۔ اس کے بعد تین وصیتیں فرمائیں جن میں سے ایک یہ تھی کہ "کوئی مشرک عرب میں رہنے نہ پائے۔"

یہ روایت (حدیثِ قرطاس) شیعہ سُنی کا بڑا معرکہ آرا میدان بن گئی ہے۔ شیعہ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلعم حضرت علیؓ کی خلافت کا فرمان لکھوانا چاہتے تھے۔ سُنی کہتے ہیں کہ آں حضرتؐ کو واقعی تکلیف شدید تھی اور یہ معلوم تھا کہ شریعت کے مطابق کوئی نکتہ باقی نہیں رہا۔ خود قرآن مجید میں یہ آخری آیت نازل ہو چکی تھی: الیوم اکملت لکم دینکم۔ اگر کوئی ضروری حکم ہوتا تو آں حضرتؐ کسی کے روکنے سے کیونکر رک سکتے تھے۔ اس واقعہ کے بعد چار دن تک آپؐ زندہ رہے اس وقت نہ سہی بعد کو لکھوا دیا ہوتا، اور یہ کیونکر معلوم ہوا کہ آپؐ کیا لکھوانا چاہتے تھے۔ اس اختلاف کے بعد آپؐ نے لوگوں کو زبانی تین وصیتیں فرمائیں۔ جو ضروری بات آپؐ کاغذ پر لکھوانا چاہتے تھے ممکن ہے کہ وہ یہی وصیتیں ہوں۔ یا اگر وہ ان کے علاوہ تھی تو آپؐ اس کو ان عام وصیتوں کے ساتھ زبانی بھی فرما سکتے تھے۔ اس کے بعد مجمع عام میں جو خطبہ دیا اس کا اظہار فرما سکتے تھے۔ سُنی یہ بھی کہتے ہیں کہ آپؐ ابوبکرؓ کی خلافت کا فرمان لکھوانا چاہتے تھے۔

دونوں فریق (شیعہ سُنی) کی باتوں کا دار و مدار قیاس و گمان، اٹکل اور اندازہ پر ہے۔ ان میں کسی کو علمِ غیب تو تھا نہیں۔ پھر محض قیاس و خیال کو یقین کا درجہ دینا گویا ہوا پر قلعہ بنانا اور ریت پر مکان تعمیر کرنا ہے۔ ان الظن لا یغنی من الحق شیئا۔ سیدھی اور صاف بات یہ ہے کہ حضورؐ اس کے بعد چار دن تک زندہ رہے مگر آخری دم تک نہ شیعوں کی بات کہی نہ سُنیوں کی بات کہی۔ کئی وصیتیں کیں، خطبہ دیا۔ خطبہ میں یہ بھی فرمایا کہ حلال و حرام کی نسبت میری نسبت نہ کی جائے۔

میں نے وہی چیز حلال کی ہے جو خدا نے اپنی کتاب میں حلال کی ہے، اور وہی چیز حرام کی ہے جو خدا نے حرام کی ہے۔ نیز یہ بھی فرمایا کہ :

"اے پیغمبر کی بیٹی فاطمہ! اور اے پیغمبر کی پھوپھی صفیہ! خدا کے ہاں کے لیے کچھ کر لو، میں تمہیں خدا سے نہیں بچا سکتا۔"

عین کرب کی شدت میں جبکہ چادر کبھی منہ پر ڈال لیتے تھے اور کبھی گرمی سے گھبرا کر اُلٹ دیتے تھے۔ آپؐ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ سُنے گئے :

لعنۃ اللہ علی الیھود والنصارٰی اتخذوا قبور انبیائھم مساجدًا۔

(یہود و نصارٰی پر خدا کی لعنت، انہوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو عبادت گاہ بنا لیا)

اور ایسی حالت میں آپؐ کی زبانِ مبارک سے یہ الفاظ بھی ادا ہوتے رہے :

مع الذین انعم اللہ علیھم۔

(ان لوگوں کے ساتھ جن پر خدا نے انعام کیا)

اور کبھی یہ فرماتے :

اللّٰھم الرفیق الاعلٰی۔

(اللہ تعالیٰ بڑے رفیق ہیں)

اب وفات کا وقت قریب آرہا تھا، سہ پہر تھی۔ سینہ میں سانس کی گھرگھراہٹ محسوس ہوتی تھی۔ اتنے میں لب مبارک ہلے تو لوگوں نے یہ الفاظ سُنے :

الصلوٰۃ وما ملکت ایمانکم۔ (نماز اور غلام)

پاس پانی کی لگن تھی اس میں بار بار ہاتھ ڈالتے اور چہرے پر ملتے۔ اتنے میں ہاتھ اٹھا کر انگلی سے اشارہ کیا اور تین دفعہ فرمایا :

بل الرفیق الاعلٰی۔

(اب اور کوئی نہیں بلکہ وہ بڑا رفیق کار ہے)

یہی کہتے کہتے ہاتھ لٹک آئے اور روح پاک عالم قدس میں پہنچ گئی۔ اللھم صل علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ صلوٰۃ کثیراً کثیراً۔

اب کسی کا یہ کہنا کہ آپؐ یہ کہنا چاہتے تھے۔ اور پھر آپؐ نے مصلحتاً نہ کہا، یا وہ کہنا چاہتے تھے اور کسی کے دباؤ کے سبب کہنے سے رُک گئے۔ یہ آپؐ کی ذاتِ والا صفات پر کس قدر سنگین الزام ہے کہ آپؐ نے معاذ اللہ فرض رسالت کی ادائیگی میں کوتاہی کی۔ اور ایسی ضروری بات بھی کسی وجہ سے نہ بتائی جس کے بغیر اُمّت کے گمراہ ہو جانے کا قوی اندیشہ تھا۔ ایسا عقیدہ رکھنے والے لوگ اتنا نہیں سمجھتے کہ جب آپؐ تن تنہا تھے اور سارا زمانہ آپؐ کے خلاف تھا۔ اُس وقت آپؐ نے

اعلائے کلمۃ الحق میں پس و پیش نہیں کیا۔ تو اس وقت جب کہ پورا عرب آپ کے صرف اشارے پر جان دینے کے لیے تیار تھا۔ کس کی مجال تھی کہ آپ کو اظہارِ حق سے روک سکتا۔ اس ذاتِ اقدس کے متعلق ایسی باتوں کو اس آیت کی روشنی میں خالی الذہن ہو کر غور فرمائیے۔

یٰایہا الرسول بلغ ما انزل من ربك وان لم تفعل فما بلغت رسالته و الله یعصمك من الناس۔

(اے پیغمبر! تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر جو کچھ نازل ہوا ہے اسے (خدا کے بندوں تک) پہنچا دو۔ اور دشمنوں کی مخالفت کی کچھ پروا مت کرو) اگر تم نے ایسا نہ کیا تو (پھر) خدا کا پیغام نہیں پہنچایا (یعنی فرض میں کوتاہی کی اور اللہ تمہیں انسانوں کے شر سے محفوظ رکھے گا ۵/۶۷ قرآن)

یہ امر سب کو تسلیم ہے کہ جو بات قرآن کے خلاف ہو وہ ناقابلِ قبول ہے اور جس حدیث سے حضورِ اقدسؐ کے دامنِ عصمت پر حرف آتا ہے وہ بھی ناقابلِ قبول ہے خواہ وہ کسی کتاب کی ہو اور اس کا راوی کوئی بھی ہو۔ حدیثوں کے نام سے دشمنانِ اسلام اور منافقوں نے جو حضورِ اکرمؐ کی زندگی میں آپؐ کے خلاف بدنام کرنے والی باتیں اور افواہیں پھیلایا کرتے تھے۔ آپؐ کے بعد آپؐ کے خلاف کیا کچھ سازش نہ کی ہو گی۔
